أفلا يتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

الفاتحة ۱ — البقرة ۲

فاران فاؤنڈیشن

تدبرِ قرآن

— جلد اوّل —

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبّرِ قرآن

جلد اوّل

مقدمہ و تفاسیر

آیت بسم اللہ، سورۃ فاتحہ (۱)، سورۃ بقرہ (۲)

امین احسن اصلاحی

فاران

فاران فاؤنڈیشن

لاہور ــــ پاکستان

اہتمام — حسن خاور

مطبع — فلک شیر پرنٹرز، ابراہیم روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت — نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ — فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

میں اس بات کا آرزومند تھا کہ میری ناچیز تالیفات، بالخصوص 'تدبر قرآن' کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری کوئی ایسا شخص اٹھائے جو اس فکر کا حامل ہو جو ان کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے یہ آرزو پوری کر دی — عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہٗ میرے پرانے رفقاء میں سے ہیں۔ وہ نہ صرف میرے فکر سے، بلکہ بحیثیتِ مجموعی پورے فکرِ فراہی سے بڑی گہری دل چسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اب اس فکر کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھا لیا ہے اور وہ اپنے ادارہ، فاران فاؤنڈیشن کو، اس کے قیام کے دن سے ہی، اسی مقصد کے لیے، مختص کیے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی صلاحیتوں سے پوری توقع ہے کہ وہ اس خدمت کو حسن و خوبی انجام دے سکیں گے اور خدا نے چاہا تو آئندہ تھوڑے عرصہ میں، ان کے اور ادارہ 'تدبر قرآن و حدیث' کے تعاون سے وہ قرآنی فکر و فلسفہ بالکل واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے گا جو اس عہد کے چیلنج کا اصلی جواب ہے۔

اپنی ناچیز تالیفات سے متعلق اگر میں مشہور فلسفی، عمانوئیل کانٹ کے لفظوں میں یہ بات کہوں تو غالباً بے جا نہ ہوگی کہ "میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں نے سوچا وہ سب لکھ دیا ہے، لیکن یہ ایک امرِ واقعی ہے کہ جو کچھ لکھا ہے وہ اچھی طرح سوچ کر لکھا ہے"۔ تفسیر 'تدبر قرآن' پر میں نے اپنی زندگی کے پورے ۵۵ سال صرف کیے ہیں۔ جن میں سے ۲۳ سال صرف کتاب کی تحریر و تسوید کے نذر ہوئے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ وہ مدت بھی ملا دی جائے جو استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کے غور و تدبر پر صرف کی ہے اور جس کو میں نے اس کتاب میں سمونے کی کوشش کی ہے تو یہ کم و بیش ایک صدی کا قرآنی فکر ہے جو آپ کے سامنے تفسیر 'تدبر قرآن' کی صورت میں آیا ہے۔ اگرچہ میں اپنے فکر کو حضرت الاستاذ علیہ الرحمۃ کے فکر کے ساتھ ملانا بے ادبی خیال کرتا ہوں، لیکن چونکہ واقعہ یہی ہے کہ میں نے عمر بھر استاذ ہی کے سُر میں اپنا سُر ملانے کی کوشش کی ہے اور میرا فکر ان کے فکر کے قدرتی نتیجہ ہی کے طور پر ظہور میں آیا ہے، اس وجہ سے یہ جوڑ ملانے کی جسارت بھی کر رہا ہوں۔ اگر یہ بے ادبی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائے۔

میں نے یہ بات تعلّی کے طور پر نہیں، بلکہ بیانِ واقعہ کے طور پر کی ہے اور مقصود اس سے یہ ہے کہ جو حضرات

میری کسی تحریر پر تنقید کرنے کا شوق رکھتے ہوں وہ شوق سے تنقید کریں، لیکن میرے دلائل ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں؛ اپنی اس خواہش کے احترام کی مجھ سے توقع نہ رکھیں کہ میں وہی کچھ لکھوں جو انھوں نے اساتذہ سے سنا اور اپنی مانوس کتابوں میں پڑھا ہے۔ کتاب و سنت کے سوا میں کسی چیز کو حجت نہیں سمجھتا اور غور و تدبر، میرے نزدیک، انسانی فضائل میں سب سے برتر اور سب سے اعلیٰ فضیلت ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ ایک مدتِ دراز سے قرآن و حدیث پر غور و تدبر کی جو راہ مسدود ہے وہ اب کھل جائے اور اگر اس راہ میں مجھ سے کوئی خدمت بن آتی ہے تو مجھے اس سے بچنا نہیں چاہیے۔ اگر نیت نیک ہے تو ان شاء اللہ مجھے اس کوشش کا اجر ملے گا۔

یہاں اُن دو باتوں کا ذکر بھی قارئینِ تدبرِ قرآن کی دلچسپی کا باعث ہوگا جو حسنِ اتفاق کے طور پر اس کتاب سے وابستہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن مجید کی کل آیات ۶۲۳۶ ہیں اور ان کی تفسیر، تدبرِ قرآن کے کم و بیش اتنے ہی صفحات میں آئی ہے۔ گویا ہر آیت کی تفسیر کے لیے اس کتاب کا تقریباً ایک صفحہ مختص ہوا۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید کا زمانۂ نزول ۲۳ سال ہے اور تدبرِ قرآن کا زمانۂ تحریر و تسوید بھی ۲۳ سال ہے۔ میں اس باب میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ 'ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ'۔

اس تمہیدی گزارش کے بعد اب وہ چند اصلاحات بھی سن لیجیے جو تدبرِ قرآن کے نئے دور کے نئے ایڈیشن میں ملحوظ رکھی گئی ہیں:

۱۔ تمام جلدوں کو حجم کے اعتبار سے متوازن کرنے کے لیے کتاب کو ۸ کی جگہ ۹ جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ آخری چار جلدیں تو اپنی موجودہ صورت ہی پر باقی رہیں گی، لیکن ابتدائی چار جلدیں، پانچ جلدوں میں کر دی گئی ہیں تاکہ ان کے حجم کا عدم توازن دور ہو جائے۔

۲۔ پورے متن پر نہایت اہتمام سے نظرِ ثانی کی گئی ہے اور اس کام میں خود مصنف نے بھی حصہ لیا ہے۔

۳۔ بعض عنوانات مزید واضح کر دیے گئے ہیں تاکہ ان سے پوری رہنمائی حاصل ہو سکے۔

۴۔ عنوانات میں یکسانی و ہم رنگی کا اہتمام کیا گیا ہے۔

۵۔ جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے، مزید ذیلی عنوانات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۶۔ متنوں میں بعض جگہ کسی آیت کی تفسیر یا کسی لفظ کا ترجمہ سہواً رہ گیا تھا، اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

۷۔ پچھلے ایڈیشنوں میں بعض جگہ آیات کی تفسیر کرتے ہوئے ان کا حوالہ مجملاً دیا گیا تھا، اب وہ آیات پوری نقل کر دی گئی ہیں۔

۸۔ ہر صفحہ کی پیشانی پر زیرِ تفسیر سورہ کا نام اور اس کا نمبر درج کر دیا گیا ہے۔

۹۔ ہر جلد کے آخر میں نئی مفصل فہرستِ مضامین دی گئی ہے۔

خاص تفسیر سے متعلق مستقبلِ قریب میں جو کام انجام دینے کی سکیم ہے، ان میں سے دو کام بڑی اہمیت رکھنے والے ہیں:

ایک یہ کہ 'نظام القرآن' کے نام سے پورا متنِ قرآن مع ترجمۂ قرآن اپنی معنوی تقسیم کے لحاظ سے ——— مطابق ترجمۂ تدبرِ قرآن ——— ایک ہی جلد میں اس طرح چھاپنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے کہ اس میں ہر سورہ سے متعلق تجزیاتی نوعیت کے اصولی مباحث شامل ہوں اور اس سے آیات کے باہمی نظم کی طرف بھی رہنمائی ہو تاکہ ایک عام قاری بھی قرآن مجید کی تلاوت کرے تو اس کے نظم کی رہنمائی سے، جو فہمِ قرآن کی کلید ہے، محروم نہ رہے۔ اسے عزیزم ماجد حسن اور صاحب سلمہٗ تدبرِ قرآن سے ترتیب دے رہے ہیں۔ اس کام کو نہایت اعلیٰ معیار پر انجام دینے کے لیے ضروری تیاریاں کر لی گئی ہیں۔ ان شاء اللہ یہ جلد سامنے آجائے گا۔ یہ کام اس کے علاوہ ہے جو برادرم خالد مسعود صاحب سلمہٗ تدبرِ قرآن پر مبنی ترجمہ و حواشی کے سلسلہ میں کر رہے ہیں۔

دوسرا یہ کہ مضامین کی جو فہرستیں تفسیر کی موجودہ جلدوں کے ساتھ لگی ہوئی ہیں ان کو مزید وسعت دے کر ایک جامع اور مکمل انڈکس کی شکل دی جا رہی ہے تاکہ یہ ان لوگوں کے لیے کارآمد ہو سکیں جو قرآن مجید پر ریسرچ کا کام کرنا چاہتے ہوں۔ یہ انڈکس ایک پوری جلد میں آجائے گا اور یہ جلد اس کتاب کی دسویں جلد ہوگی: تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔

یہ اپنے ارادے اور منصوبے ہیں۔ ان میں سے پورے وہی ہوں گے جن کا پورا ہونا اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا۔ ہم اس کے فیصلوں پر پوری طرح راضی و مطمئن ہیں۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

لاہور　　　　　　　　　　والسلام

۲۲ر مئی ۱۹۸۳ء

۸ر شعبان ۱۴۰۳ھ　　　　　　　امین احسن اصلاحی

تدبرِ قرآن

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

حامداً ومصلیاً

اس کتاب پر میں کوئی مقدمہ لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اب سے بہت پہلے میں نے "تدبرِ قرآن" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کے غالباً دو تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ یہ کتاب میں نے اسی مقصد کے لیے لکھی تھی کہ یہ میری تفسیر کے لیے مقدمہ کا کام دے گی، چنانچہ ارادہ یہی تھا کہ اسی کو تفسیر کے شروع میں لگا دیا جائے گا، لیکن اب جب اس نگاہ سے اس کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بہت پہلے لکھے جانے کی وجہ سے اس میں بعض کمیاں بھی رہ گئی ہیں اور اس کے بعض مقامات میں غیر ضروری طوالت بھی ہے۔ اگر اسی کو بعینہٖ کتاب کے ساتھ جوڑ دیا گیا تو یہ اس کتاب کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ چنانچہ دوسرے ضروری کاموں کو نظر انداز کر کے مجھے اس مقدمے کے لیے قلم سنبھالنا پڑا۔ وبیدہ اللہ التوفیق۔

۱۔ اس تفسیر کا مقصد اور فہمِ قرآن کے وسائل

اس کتاب کے لکھنے سے میرے پیشِ نظر قرآن حکیم کی ایک ایسی تفسیر لکھنا ہے جس میں میری دلی آرزو اور پوری کوشش اس امر کے لیے ہے کہ میں ہر قسم کے بیرونی اثرات اور لگاؤ اور ہر قسم کے تعصب و تحزب سے آزاد اور پاک ہو کر ہر آیت کا وہ مطلب سمجھوں اور سمجھاؤں جو فی الواقع اور فی الحقیقت اس آیت سے نکلتا ہے۔ اس مقصد کے تقاضے سے قدرتی طور پر میں نے اس میں فہمِ قرآن کے ان وسائل و ذرائع کو اصل اہمیت دی ہے جو خود قرآن کے اندر موجود ہیں۔ مثلاً قرآن کی زبان، قرآن کا نظم اور قرآن کے نظائر و شواہد، دوسرے وسائل جو قرآن سے باہر کے ہیں۔ مثلاً حدیث، تاریخ، سابق آسمانی صحیفے اور تفسیر کی کتابیں ـــــ اگرچہ اپنے امکان کی حد تک میں نے ان سے بھی فائدہ اٹھایا ہے لیکن ان کو داخلی وسائل کے تابع رکھ کر ان سے استفادہ کیا ہے۔ جو بات قرآن کے الفاظ، قرآن

کے نظم اور قرآن کی خود اپنی شہادتوں اور نظایر سے واضح ہوگئی ہے وہ میں نے لے لی ہے۔ اگر کوئی چیز اس کے خلاف میرے سامنے آئی ہے تو میں نے اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کے اعتبار سے اس کو جانچا ہے۔ اگر دینی و علمی پہلو سے وہ کوئی اہمیت رکھنے والی بات ہوئی ہے تو میں نے اس پر تنقید کر کے اس کو سمجھنے اور اس کے صحیح پہلو کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اگر بات کچھ یوں ہی سی ہوئی ہے تو اس کو نظرانداز کر دیا ہے۔ بے ضرورت اس پر طبع آزمائی نہیں کی ہے۔

۲۔ فہمِ قرآن کے داخلی وسائل

اب اختصار کے ساتھ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مذکورہ دونوں قسم کے وسائل سے میں نے اس کتاب میں کس کس طرح فائدہ اٹھایا ہے۔ پہلے داخلی وسائل سے متعلق کچھ باتیں عرض کرتا ہوں۔

قرآن کی زبان:

قرآن کی زبان عربی ہے اور عربی بھی وہ عربی جو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزے کی حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ جن و بشر میں سے کسی کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ اس کے مثل کلام پیش کر سکے۔ شعرائے سبعہ معلقہ میں لبید آخری شاعر ہیں۔ ان کے ایک شعر پر سوقِ عکاظ میں تمام شعرائے وقت نے ان کو سجدہ کیا اور عرب کی روایت کے مطابق اعزاز کے طور پر ان کا قصیدہ خانہ کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔ یہ لبید بعد میں مسلمان ہوگئے۔ مسلمان ہونے کے بعد انھوں نے شعر کہنا ترک کر دیا۔ جو شاعر تمام عرب شعرا کا مسجود، وقت کا ملک الشعرا اور عرب کی فصاحت و بلاغت کا مظہر کامل ہو، اس کے یوں ترک شعر پر لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ اب آپ شعر نہیں کہتے؟ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ اَبَعْدَ الْقُرْآنِ؟ کیا قرآن کے نازل ہو جانے کے بعد بھی اس کے لیے کوئی گنجائش باقی رہ گئی ہے۔

قرآن کے اعجازِ بلاغت کے آگے سرافگندگی و سپر اندازی کا یہ اظہار و اعتراف اس عظیم شاعر کی طرف سے ہے جو اپنے زمانے میں، جیسا کہ گزرا، عرب کی تمام فصاحت و بلاغت کا نشان و علم تھا۔ جب وہ اس طرح قرآن کے آگے سربسجود ہوگیا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عرب کی تمام فصاحت و بلاغت نے قرآن کی فصاحت و بلاغت کے آگے گھٹنے ٹیک دیے اس کے بعد کسی اور کے لیے قرآن کے آگے نگاہیں اونچی کرنے کا کیا امکان باقی رہا؟

اس درجے و مرتبے کے کلام کے زور و اثر اور اس کی خوبیوں اور لطافتوں کا اگر کوئی شخص اندازہ کرنا چاہے تو یہ کام، ظاہر ہے کہ وہ اس کے ترجموں، اس کی تفسیر اور اس کے لغتوں کے ذریعے سے نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے لیے اس کو اس زبان کا ذوق پیدا کرنا پڑے گا، جس میں وہ کلام ہے۔ کسی زبان کا ذوق پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے فطری رجحانِ طبیعت اور لطافتِ ذوق کے ساتھ ساتھ اس زبان کی مشق و ملازمت ناگزیر ہے۔ برسوں کی محنت و مزاولت کے بعد کہیں آدمی میں کسی زبان کا ذوق پیدا ہوتا ہے اور اگر زبان

اپنی مادری زبان نہ ہو تو یہ مشکل دو چند اور سہ چند ہو جاتی ہے۔

عربی زبان بالخصوص قرآن کی زبان کے معاملے میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ اس وقت وہ زبان کہیں بھی رائج نہیں ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ عرب اور عجم دونوں ہی میں اس وقت جو عربی پڑھی پڑھائی اور لکھی بولی جاتی ہے وہ اپنے اسلوب و انداز، اپنے لب و لہجہ اور اپنے الفاظ و محاورات میں اس زبان سے بہت مختلف ہے جس میں قرآن ہے۔ ہمارے اپنے عربی مدرسوں میں جو عربی پڑھی پڑھائی جاتی ہے وہ قلیوبی، نفحۃ الیمن یا زیادہ سے زیادہ حریری و متنبی کے قسم کی عربی ہے۔ عرب، شام اور مصر میں جو عربی رائج و مقبول ہے اس کا اندازہ ان ممالک کے رسائل و اخبارات سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ زبان عربی ضرور ہے، لیکن قرآن کی زبان سے یہ اتنی مختلف ہے کہ اس کا ذوق نہ صرف یہ کہ قرآن کی زبان کا کوئی ذوق نہیں پیدا کرتا بلکہ قرآن سے بیگانہ کرتا ہے۔

قرآن مجید جس زبان میں اترا ہے وہ نہ تو حریری و متنبی کی زبان ہے، نہ مصر و شام کے اخبارات و رسائل کی، بلکہ وہ اس ٹکسالی زبان میں ہے جو امرء، القیس، عمرو بن کلثوم، زہیر اور لبید جیسے شعراء اور قس بن ساعدہ جیسے بلند پایہ خطیبوں کے ہاں ملتی ہے۔ اس وجہ سے جو شخص قرآن کی زبان کے ایجاز و اعجاز کا اندازہ کرنا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دور جاہلیت کے شعراء و ادباء کے کلام کے محاسن و معایب کے سمجھنے کا ذوق پیدا کرے۔ اس کے بغیر کوئی شخص نہ تو یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن عربی زبان کے محاسن کا کیسا کامل نمونہ ہے اور نہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے اندر وہ کیا سحر ہے جس نے تمام فصیحوں اور بلیغوں کو جیتنے کے لیے عاجز و درماندہ کر دیا۔

اگرچہ اس بات میں شبہ نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت کے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کا بڑا حصہ دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا لیکن پھر بھی اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اصل مقصد کے لیے کفایت کرتا ہے۔ پچھلے پچاس سال میں بہت سے ایسے دواوین شائع ہو چکے ہیں جو پہلے ناپید تھے۔ شعراء کے کلام کے ایسے مجموعے بھی اب دستیاب ہیں جن میں کلام عرب کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اگرچہ ان کے اندر منحول کلام بھی شامل ہے لیکن عربیت کا ذوق رکھنے والے آسانی سے ان کے خالص اور منحول میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ خطبائے جاہلیت کے جواہر ریزوں کے لیے پہلے جاحظ، مبرد اور ابن حدید وغیرہ کی کتابوں کی خوشہ چینی کرنی پڑتی تھی اب یہ خطبات الگ کر کے شائع کر دیے گئے ہیں۔ غرض طالب اور قدر دان کے لیے تربیت ذوق کا کافی سامان موجود ہے۔ ضرورت ہمت اور شوق کی ہے۔

اس تمام دراز نفسی کو اس مفہوم میں نہ لیجیے کہ میں اس امر کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ میرے اندر یہ ذوق موجود ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ قرآن کی زبان کی نوعیت کیا ہے اور اس کے ادبی محاسن کو جانچنے اور تولنے کے لیے کسوٹی اور معیار کیا ہے۔ میں اس سلسلے میں جو کچھ کر سکا ہوں وہ صرف اس قدر ہے کہ میں نے اس تفسیر کے لیے قلم اٹھانے سے پہلے ادب جاہلی کے اس تمام ذخیرے کو اچھی طرح پڑھ لیا ہے جو مجھے دستیاب ہو سکا ہے اور جو قرآن کی کسی ادبی، نحوی اور معنوی مشکل کے حل کرنے میں کسی پہلو سے مددگار ہو سکتا ہے۔ میں بے تکلف یہ بات بھی اس موقع پر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ جو کچھ بھی میں نے کیا ہے اس میں زیادہ دخل مجھے نہیں بلکہ میرے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔

انھوں نے اس طرح کی ساری چیزیں پڑھ کر قرآن کی تفسیر میں کام آنے والی ہر چیز کو نشان زد کر دیا تھا۔ میرا کارنامہ صرف اس قدر ہے کہ میں نے ان چیزوں کو اچھی طرح ہضم کر لیا ہے اور قرآن کی مشکلات حل کرنے، اس کے اسالیب و محاورات کو جانچنے اور اس کی لطافتوں اور نزاکتوں کو پرکھنے میں ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔

صرف زبان و اسلوب ہی کے معاملے میں نہیں بلکہ اہل عرب کے معروف و منکر، ان کی معاشرتی زندگی کی خصوصیات، ان کی سوسائٹی میں خیر و شر کے معیارات، ان کے سماجی، تمدنی اور سیاسی نظریات، روزمرہ کی زندگی میں ان کی دلچسپیاں اور مشاغل، ان کے مذہبی رسوم و معتقدات، غرض اس طرح کی ساری چیزوں کے سمجھنے میں جو مدد ان کے لٹریچر سے ملتی ہے، وہ کسی دوسری چیز سے نہیں ملتی۔ ان چیزوں سے صحیح واقفیت اس شخص کے لیے نہایت ضروری ہے جو قرآن کے اشارات و تلمیحات اور اس کی تعریضات و کنایات کو اچھی طرح سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہو۔ قرآن نے اس طرح کی ساری ہی چیزوں سے تعرض کر کے ان کے اندر جو خیر تھا اس کو ابھارا ہے جو شر تھا اس کو مٹایا ہے، اس وجہ سے اثنائے کلام میں ایسے اشارے اور کنائے بار بار آتے ہیں جن کی پوری وضاحت اس وقت تک مشکل ہے جب تک اسلام کی اصلاحات کے ساتھ ساتھ آدمی جاہلیت کی بدعات سے بھی واقف نہ ہو۔ مسئلے کو واضح کرنے کے لیے بعض مثالیں پیش کرنا مناسب ہوتا لیکن تفسیر میں جگہ جگہ اس کی مثالیں آئیں گی اس وجہ سے یہاں صرف اشارے پر اکتفا کرتا ہوں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ عرب جاہلیت کے متعلق ہماری تاریخ کی کتابوں میں جو مواد ملتا ہے وہ زیادہ تر سطحی اور سرسری معلومات پر مبنی ہے۔ اس سے ان چیزوں کے باب میں کچھ زیادہ رہنمائی نہیں ملتی جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ عام طور پر ہمارے مورخوں نے اہل عرب کی جو تصویر کھینچی ہے وہ کسی انسانی معاشرے کی نہیں بلکہ ڈھوروں ڈنگروں کے کسی گلے کی ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ یہ اس قوم کی تصویر ہے جو کبھی ملت ابراہیم اور دین اسماعیل کی وارث رہی ہے۔ ایسا انھوں نے اس خواہش کے تحت کیا ہے کہ اس کے بغیر ان کے نزدیک اسلام کا اعجاز نمایاں نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے خیال میں اسلام کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے ڈھوروں ڈنگروں کا ایک گلہ لیا اور تمام عالم پر اس کا پلہ بھاری کر دیا۔ اس بات کا ایک پہلو اگرچہ صحیح ہے لیکن اس میں ایک دوسرا پہلو نظر انداز ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ اگر عرب فی الواقع ایسے ہی ڈھور ڈنگر ہوتے تو وہ قرآن جیسی کتاب کے حامل کیسے بن سکتے؟ میرے سامنے چونکہ ابتدا ہی سے یہ سوال رہا ہے اس وجہ سے مجھے تاریخ کی کتابوں سے قطع نظر کر کے عرب جاہلیت کے لٹریچر میں ان کی تصویر کا حسن و قبح دونوں دیکھنے کی کوشش کرنی پڑی اور اس کوشش سے میری معلومات میں جو اضافہ ہوا میں نے اس تفسیر میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ میں نے زبان کے مسئلے کو محدود مفہوم میں نہیں بلکہ نہایت وسیع مفہوم میں لیا ہے۔ اصل شے جو قرآن کے سمجھنے میں کار آمد ہے وہ اس زبان و ادب کا اعلیٰ مذاق ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ جس میں یہ مذاق نہ ہو وہ محض لغت کی ورق گردانی سے قرآن کے محاسن کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ لوگ

مجھ سے اکثر سوال کرتے رہتے ہیں کہ قرآن کی مشکلات حل کرنے میں کس لغت پر وہ اعتماد کریں؛ اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ یہ گمان رکھتے ہیں کہ اگر ان کو کوئی حسب منشا لغت مل گیا تو قرآن کی مشکلات کے لیے ان کو کلید ہاتھ آجائے گی حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ زبان کا مذاق رکھنے والے کے لیے تو لغت بے شک ایک کارآمد چیز ہے لیکن جس میں یہ مذاق پیدا نہیں ہوا ہے، اس کے لیے لغت ایک بے سود شے ہے میں نے جس لغت سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے وہ لسان العرب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب لسان، استعمالات اور شواہد و نظائر کے ذریعہ سے اکثر لفظ کے مختلف پہلو واضح کر دیتے ہیں۔ یہ چیز بہت مفید ہے۔ میرے نزدیک لسان کی اہمیت اسی پہلو سے ہے اور اسی مقصد کے لیے اس کی مراجعت کرنی چاہیئے۔ بعض اوقات قرآن کے کسی لفظ کے تحت اہل تاویل کے اقوال جو وہ نقل کر دیتے ہیں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن عام لوگ اسی کو بڑی تحقیق سمجھتے ہیں۔ امام راغب کی مفردات کو بعض لوگ بڑا درجہ دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے تو فی الواقع اس کا بڑا درجہ ہے کہ وہ خالص قرآن کا لغت ہے لیکن حل مشکلات کے سلسلے میں جب کبھی میں نے اس کی مراجعت کی تو مجھے اس سے مایوسی ہی ہوئی۔

نظم :

نظم کلام کسی کلام کا ایسا جزو لاینفک ہوتا ہے کہ اس کے بغیر کسی عمدہ کلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ قرآن جس کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ قرار دیا جاتا ہے اور جو فی الواقع معجزہ ہے بھی، ایک بہت بڑے گروہ کے نزدیک نظم سے بالکل خالی کتاب ہے۔ ان کے نزدیک نہ ایک سورہ کا دوسری سورہ سے کوئی ربط و تعلق ہے، نہ ایک سورہ کی مختلف آیات ہی میں باہم کوئی مناسبت و موافقت ہے۔ بس مختلف آیات، مختلف سورتوں میں بغیر کسی مناسبت کے جمع کر دی گئی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا فضول خیال ایک ایسی عظیم کتاب کے متعلق لوگوں کے اندر کس طرح جاگزیں ہو گیا ہے جس کے متعلق دوست دشمن دونوں ہی کو اعتراف ہے کہ اس نے دنیا میں ہلچل پیدا کر دی، اذہان و قلوب بدل ڈالے، فکر و عمل کی نئی بنیادیں استوار کیں اور انسانیت کو ایک نیا جلوہ دیا۔

اگر فی الواقع قرآن میں کوئی نظم و ترتیب نہیں ہے تو پھر تو بہترین ترتیب نزولی ہوتی۔ جس ترتیب سے آیتیں نازل ہوئی تھیں اسی ترتیب کے ساتھ مصحف میں جمع کر دی جاتیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ مصحف کی ترتیب نزولی نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص ہدایات کے تحت خاص خاص آیات کے لیے خاص خاص مواقع معین کیے گئے ہیں۔ دوسری مناسب ترتیب مقداری ہو سکتی تھی یعنی آیتیں برابر برابر کی مقدار میں مختلف سورتوں میں جمع کر دی جاتیں لیکن ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہ صورت بھی نہیں ہے بلکہ سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی اور کتنی ہی چھوٹی سورتیں ہیں جو اپنی سے بڑی سورتوں پر مقدم ہیں۔ یہ سورتوں کی حد بندی بھی اس صورت میں کچھ غیر ضروری سی ہو کر رہ جاتی ہے اس لیے کہ حفاظ کی سہولت کے لیے تو یہ پاروں کی حد بندی کافی تھی لیکن ہر صاحب علم کو معلوم ہے کہ سورتوں کی حد بندی اور ان کی ترتیب تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے تحت عمل میں آئی ہے درآنحالیکہ پاروں

کی تقسیم بہت بعد کی چیز ہے۔

اس خیال کی انھی کمزوریوں کی وجہ سے شروع ہی سے ہمارے ہاں علما کا ایک ایسا گروہ بھی رہا ہے جو قرآن میں نظم کا بڑی شدت سے قائل رہا ہے اور اس گروہ کے بعض اکابر نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ علامہ سیوطیؒ اتقان میں لکھتے ہیں۔

"علامہ ابو جعفر بن زبیر، شیخ ابو حیان نے نظم قرآن پر ایک خاص کتاب لکھی اور اس کا نام "البرھان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن" رکھا، اور ہمارے ہم عصروں میں سے شیخ برہان الدین بقاعی کی تفسیر نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" بھی اسی اصول پر لکھی گئی ہے۔"

علامہ سیوطیؒ نے خود اپنی ایک کتاب کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں انھوں نے نظم قرآن کے علاوہ قرآن کے معجزہ ہونے کے پہلو بھی واضح کیے ہیں۔ اسی سلسلے میں نظم قرآن کی اہمیت کا اعتراف وہ ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

"ترتیب اور نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے لیکن اس کے مشکل ہونے کے سبب سے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ امام فخر الدین کو اس چیز کا سب سے زیادہ اہتمام رہا ہے۔ ان کا قول یہ ہے کہ حکمت قرآن کا اصل خزانہ اس کے نظم و ترتیب ہی میں چھپا ہوا ہے۔"

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں آیت وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا الآیہ (حٰم السجدۃ) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے جواب میں اتری ہے جو ازراہ شرارت یہ کہتے تھے کہ اگر قرآن مجید کسی عجمی زبان میں اتارا جاتا تو بہتر ہوتا۔ لیکن اس طرح کی باتیں کہنا میرے نزدیک کتاب الٰہی پر سخت ظلم ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن کی آیتوں میں باہم کوئی ربط و تعلق ہی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ کہنا قرآن حکیم پر بہت بڑا اعتراض کرنا ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کو معجز ماننا تو الگ رہا اس کو ایک مرتب کتاب کہنا بھی مشکل ہے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک ایک مربوط کلام ہے۔ اس کے بعد تقریباً اٹھارہ سطروں میں سورۃ کی اجمالی تفسیر اور اس کا نظم بیان کر کے فرماتے ہیں کہ ہر منصف جو حق پسند ہے تسلیم کرے گا کہ اگر سورہ کی تفسیر اس طرح کی جائے جس طرح ہم نے کی ہے تو پوری سورت ایک ہی مضمون کی حامل نظر آئے گی اور اس کی تمام آیتیں ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کریں گی۔"

اسی سلسلہ کی ایک نہایت اہم شخصیت علامہ مخدوم مہائمیؒ بھی ہیں۔ ان کی تفسیر تبصیر الرحمان و تیسیر المنان تفسیر مہائمی کے نام سے نہایت مشہور ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق آیات کا نظم بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی مسلک کے علم بردار ایک عالم علامہ ولی الدین ملویؒ ہیں۔ نظم قرآن سے متعلق ان کا ارشاد یہ ہے۔

"جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول چونکہ حالات کے تقاضوں کے تحت تھوڑا تھوڑا کر کے ہوا ہے اس وجہ سے اس میں نظم نہیں تلاش کرنا چاہیے، ان کو دھوکا ہوا ہے۔ قرآن مجید کا نزول بلاشبہ حسب حالات حسبۃ

جستہ ہوا ہے لیکن اس کی ترتیب میں نہایت گہری حکمت ملحوظ ہے۔

اس تفصیل سے یہ امر واضح ہے کہ نظم قرآن سے متعلق ایک گروہ میں اگر غلط خیال موجود رہا ہے تو شروع ہی سے ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جس کا نظریہ بالکل صحیح ہے اور اس نے اپنے نظریے کے مطابق کتاب الٰہی کی خدمت کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جو لوگ نظم کے منکر ہوئے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں منکر ہوئے ہیں کہ ان کے پاس انکار نظم کی کوئی دلیل موجود تھی یا وہ بے نظمی ہی کو کلام کا کوئی ہنر سمجھتے تھے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہیں قرآن مجید میں جگہ جگہ بے نظمی محسوس ہوئی اور وہ اس کا کوئی حل نہ پا سکے تو جو کمزور سے کمزور آڑ بھی انھیں ملی اسی میں انھوں نے پناہ لے لی۔

اگرچہ ان کے لیے صحیح روش تو یہی تھی کہ یہ قرآن کو متہم کرنے کے بجائے سارا الزام اپنی کوتاہئ ہمت پر لیتے لیکن انصاف کیجیے تو دو باتیں ان کے حق میں بھی جاتی ہیں جن کے سبب سے ان کو معذور قرار دینا پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ نظم قرآن کی تلاش ہے ہی ایسا کام کہ ہر شخص اس کو کسی کے لیے اپنی زندگی وقف نہیں کر سکتا۔ دوسری یہ کہ جن لوگوں نے قرآن میں نظم کا دعوی کیا، ان کی خدمات کے اعتراف کے باوجود، یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں پیش کر سکے جو اس راہ میں قسمت آزمائی کرنے والوں کا حوصلہ بڑھاتی۔ اوپر جن بزرگ مصنفوں کے اقوال و ارشادات نقل ہوئے ہیں ان میں سے تین بزرگوں کی کتابوں سے استفادے کا موقع مجھے نصیب ہوا ہے۔ میں بلا کسی ارادۂ تحقیر کے عرض کرتا ہوں کہ ان میں سے کسی کی کتاب سے بھی مجھے کسی مشکل کے حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملی۔ مہائمی اور رازی کی تفسیریں عرصے تک میرے مطالعے میں رہی ہیں۔ بلکہ رازی کی تفسیر تو اب بھی پیش نظر رہتی ہے۔ یہ حضرات جس قسم کا نظم بیان کرتے ہیں اس کے متعلق یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ اس قسم کا نظم ہر دو غیر متعلق چیزوں میں جوڑا جا سکتا ہے۔

اصل ضرورت اس چیز کی تھی کہ لوگوں کے سامنے کوئی ایسی چیز آتی جو قرآن کے نظم کو اس طرح واضح کر دیتی کہ ہر صاف ذہن قاری کو وہ اپنے دل کی آواز معلوم ہونے لگتی، لیکن اس طرح کی کوئی چیز نہ صرف یہ کہ لوگوں کے سامنے آئی نہیں بلکہ جو چیزیں آئیں وہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مایوس کن ثابت ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے نظم کی تلاش کو 'کوہ کندن و کاہ برآوردن' کا مصداق سمجھ لیا۔

اس راہ میں سب سے پہلی کامیاب کوشش کی سعادت میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی کو حاصل ہوئی۔ مولانا نے بے شک اس کے حق میں نہایت مؤثر و دل نشین دلائل بھی دیے اور متعدد سورتوں کی تفسیر بھی انھوں نے لکھی جن کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہر سورہ نہایت حسین نظم کا نہایت دل آویز پیکر ہے۔ نظم کے دلائل پر مولانا کا ایک رسالہ 'دلائل النظام' کے نام سے موسوم ہے۔ وہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے لیکن مولانا کی تفسیر کے کچھ اجزا اور تفسیر کا مقدمہ عربی اور اردو دونوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جو ذہین اور منصف مزاج آدمی بھی ان کا مطالعہ کرے گا وہ دو باتوں کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک تو اس بات کا کہ قرآن مجید کے اندر نظم کا انکار قرآن پر سب سے بڑا ظلم ہے۔ دوسری اس بات کا کہ قرآن کے معارف و حکم کا اصل خزانہ درحقیقت اس کے نظم ہی کے اندر پوشیدہ ہے۔

اگر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی مہلت دی ہوتی کہ وہ اپنے اصولوں کے مطابق اپنی تفسیر مکمل کر پاتے تو یہ چیز ہر مخالف کے اوپر حجت قائم کر دیتی لیکن یہ ہماری محرومی ہے کہ ان کی تفسیر کا بہت تھوڑا حصہ لکھا جا سکا، خاص طور پر بڑی سورتوں میں سے تو کسی ایک سورہ کی تفسیر بھی وہ مکمل نہ کر سکے۔ یہ چیز بعض لوگوں کے ذہن میں کھٹک پیدا کرتی ہے کہ ممکن ہے مولانا کو چھوٹی سورتوں کے نظم بیان کرنے میں جو کامیابی ہوئی ہے، وہ کامیابی ان کو بڑی سورتوں کے نظم کھولنے میں نہ ہوتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض بڑی سورتوں، مثلاً بقرہ اور آل عمران میں بظاہر نظم کی جو مشکلات نظر آتی ہیں، چھوٹی سورتوں میں اس طرح کی مشکلات نہیں ہیں۔ خاص طور پر بقرہ تو سمجھیے کہ بہت سی مشکلات کا مجموعہ ہے۔ میں نے اسی خیال سے جب تفسیر پر کام شروع کیا تو اس کا آغاز فاتحہ سے کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور توفیق بخشی سے میں بقرہ اور آلِ عمران کی مشکلات حل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ چیز لوگوں کا تردد دور کرنے میں بڑی مؤثر ثابت ہوگی۔ مجھے اس کوشش میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ تو اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے ہی کر سکیں گے میں جو کچھ عرض کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے کسی مقام میں بھی بات بنانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر میرا ذہن و ضمیر پوری طرح مطمئن ہے۔ امکان ہے تو دو باتوں کا، جن سے میں اپنے آپ کو بری قرار نہیں دے سکتا۔ ایک اس کا کہ کہیں میری عقل نے ٹھوکر کھائی ہو اور میں بات کو سمجھ نہ سکا ہوں، دوسرے اس کا کہ کسی مسئلے کو کھولنے میں میرے قلم نے میری پوری مدد نہ کی ہو جس کے سبب سے بات ادھوری رہ گئی ہو۔

دو سوال اور ان کے جواب :

بعض لوگ جو نظم کی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ عموماً اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے دو سوال اٹھاتے ہیں۔ ایک یہ کہ نظم اگر ہے بھی تو اس کی حیثیت نکات اور لطائف کی ہے، اس کے اوپر قرآن کے سمجھنے اور نہ سمجھنے کا انحصار نہیں ہے، پھر اس پر اس شد و مد سے زور دینے کی کیا ضرورت ہے؟ دوسرا یہ کہ اگر قرآن میں نظم ہے تو آخر وہ اس قدر مخفی قسم کا کیوں ہے کہ صرف خال خال لوگ ہی اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو سکے اور وہ بھی برسوں کی جان کاہی اور دماغ سوزی کے بعد؟ یہاں مختصر طور پر ہم ان دونوں سوالوں کے جواب بھی عرض کر دینا چاہتے ہیں۔

نظم کی قدر و قیمت :

نظم کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ محض علمی لطائف کے قسم کی ایک چیز ہے جس کی قرآن کے اصل مقصد کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک تو اس کی اصل قدر و قیمت یہی ہے کہ قرآن کے علوم اور اس کی حکمت تک رسائی اگر ہو سکتی ہے تو اسی کے واسطے سے ہو سکتی ہے۔ جو شخص نظم کی رہنمائی کے بغیر قرآن کو پڑھے گا وہ زیادہ سے زیادہ جو حاصل کر سکے گا وہ کچھ منفرد احکام اور منفرد قسم کی ہدایات ہیں۔

اگرچہ ایک اعلیٰ کتاب کے منفرد احکام اور اس کی مفرد ہدایات کی بھی بڑی قدر و قیمت ہے لیکن آسمان و زمین کا فرق ہے اس بات میں کہ آپ طب کی کسی کتاب المفردات سے چند جڑی بوٹیوں کے کچھ اثرات و خواص معلوم کر لیں اور اس بات میں کہ ایک حاذق طبیب ان اجزا سے کوئی کیمیا اثر نسخہ ترتیب دے دے۔ تاج محل کی تعمیر میں جو سالا استعمال ہوا ہے وہ الگ الگ دنیا کی بہت سی عمارتوں میں استعمال ہوا ہوگا لیکن اس کے باوجود تاج محل دنیا میں ایک ہی ہے میں بلا تشبیہ یہ بات عرض کرتا ہوں کہ قرآن حکیم بھی جن الفاظ اور فقروں سے ترکیب پایا ہے وہ بہرحال عربی لغت اور عربی زبان ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں لیکن قرآن کی لاہوتی ترتیب نے ان کو وہ جمال و کمال بخش دیا ہے کہ اس زمین کی کوئی چیز بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جس طرح خاندانوں کے شجرے ہوتے ہیں اسی طرح نیکیوں اور بدیوں کے بھی شجرے ہیں۔ بعض اوقات ایک نیکی کو ہم معمولی نیکی سمجھتے ہیں حالانکہ اس نیکی کا تعلق نیکیوں کے اس خاندان سے ہوتا ہے جس سے تمام بڑی نیکیوں کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اسی طرح بسا اوقات ایک برائی کو ہم معمولی برائی سمجھتے ہیں لیکن وہ برائیوں کے اس کنبے سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہے جو تمام مہلک بیماریوں کو جنم دینے والا کنبہ ہے۔ جو شخص دین کی حکمت سمجھنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خیر و شر کے ان تمام مراحل و مراتب سے اچھی طرح واقف ہو ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ دق کا پتہ دینے والی بیماری کو زکام کا پیش خیمہ سمجھ بیٹھے اور نزلے کی آمد آمد کو دق کا مقدمۃ الجیش قرار دے دے۔ قرآن کی یہ حکمت اجزائے کلام سے نہیں بلکہ تمام تر نظم کلام سے واضح ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص ایک سورہ کی الگ الگ آیتوں سے تو واقف ہو لیکن سورہ کے اندر ان آیتوں کے باہمی حکیمانہ نظم سے واقف نہ ہو تو اس حکمت سے وہ کبھی آشنا نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح قرآن نے مختلف سورتوں میں مختلف اصولی باتوں پر آفاقی و انفسی یا تاریخی دلائل بیان کیے ہیں۔ یہ دلائل نہایت حکیمانہ ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ جس شخص پر یہ ترتیب واضح ہو وہ جب اس سورہ کی تدبر کے ساتھ تلاوت کرتا ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ زیر بحث موضوع پر اس نے ایک نہایت جامع، مدلل اور شرح صدر بخشنے والا خطبہ پڑھا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اس ترتیب سے بے خبر ہو وہ اجزا سے اگرچہ واقف ہوتا ہے لیکن اس حکمت سے وہ بالکل ہی محروم رہتا ہے جو اس سورہ میں بیان ہوئی ہوتی ہے۔

یہ تو اس مسئلے کا علمی و نظری پہلو ہوا۔ اس کا سیاسی و اجتماعی پہلو بھی نہایت اہم ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اس ملتِ مسلمہ کی شیرازہ بندی قرآن مجید کی حبل اللہ المتین ہی کے ذریعے سے ہوئی ہے اور تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ سب مل کر اس رسی کو مضبوطی سے پکڑیں اور متفرق نہ ہوں۔ اس ہدایت کا یہ فطری تقاضا ہے کہ ہمارے درمیان جتنے بھی اختلاف پیدا ہوں ہم ان کے فیصلے کے لیے رجوع قرآن کی طرف کریں۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ خود قرآن کے بارے میں ہماری رائیں متفق نہیں ہیں۔ ایک ایک آیت کی تاویل میں نہ جانے کتنے اقوال ہیں اور ان اقوال میں سے اکثر ایک دوسرے سے متناقض ہیں لیکن کوئی چیز ہمارے پاس ایسی نہیں ہے جو یہ فیصلہ کر سکے کہ ان میں سے کون سا قول حق ہے۔ کسی کلام کی تاویل میں اختلاف واقع ہو تو اس اختلاف کو رفع کرنے

کے لیے سب سے زیادہ اطمینان بخش چیز اس کا سیاق و سباق اور نظام ہی ہو سکتا ہے لیکن قرآن کے معاملے میں یہ مصیبت ہے کہ لوگ اس کے اندر کسی نظام کے قائل ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاں جو اختلاف بھی پیدا ہوا اس نے اپنا مستقل علم گاڑ دیا۔ ہماری فقہ کے بہت سے اختلافات صرف بات کو اس کے سیاق اور نظم میں نہ دیکھنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ اگر سیاق و نظم کو ملحوظ رکھا جائے تو اکثر مقامات ایسے ہیں جہاں ایک قول کے سوا کسی دوسرے قول کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔

فقہی اختلافات سے زیادہ سنگین معاملہ گمراہ فرقوں کی ضلالتوں کا ہے۔ ہمارے اندر جتنے بھی گمراہ فرقے پیدا ہوئے ہیں ان میں سے اکثر نے قرآنی آیات ہی کا سہارا لیا ہے۔ ایک آیت کو اس کے سیاق و سباق سے کاٹا اور پھر جو جی میں آیا اس کے اندر معنی پہنا دیے۔ ظاہر ہے کہ ایک کلام کو اس کے نظم اور سیاق و سباق سے الگ کر کے اس کے اندر آپ معنی پہنانے چاہیں تو بہت سے معنی پہنا سکتے ہیں جن میں سے بعض ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کا تصور اس قول کا کہنے والا کبھی نہیں کر سکتا۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں یہاں بہت سی ایسی آیتوں کا حوالہ دے سکتا ہوں جو تحریروں اور تقریروں میں نہایت غلط بلکہ گمراہ کن معنوں میں استعمال ہو رہی ہیں لیکن کسی کو بھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ذرا تکلیف کر کے یہ دیکھ لے کہ آیت کس موقع و محل کی ہے اور اس کا سیاق و سباق کیا ہے۔ قرآن کے معاملے میں جیسا کہ میں نے عرض کیا ان کے نزدیک نظم اور موقع و محل کا کوئی سوال ہی سرے سے نہیں ہے۔

میں نے اس تفسیر میں چونکہ نظم کلام کو پوری اہمیت دی ہے اس وجہ سے ہر جگہ میں نے ایک ہی قول اختیار کیا ہے بلکہ اگر میں اس حقیقت کو صحیح لفظوں میں بیان کروں تو مجھے یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے کیونکہ نظم کی رعایت کے بعد مختلف وادیوں میں گردش کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ صحیح بات اس طرح منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ آدمی اگر بالکل اندھا بہرا متعصب نہ ہو تو اپنی جان تو قربان کر سکتا ہے لیکن اس سے انحراف برداشت نہیں کر سکتا۔

نظم کا اشکال:

اب آیئے اس سوال پر غور کیجیے کہ جب قرآن کے سمجھنے کے لیے نظم کی یہ اہمیت ہے تو آخر اس کو اتنا مخفی کیوں کر دیا گیا ہے کہ امام رازیؒ جیسے ذہین آدمی کی کوششیں بھی اس کو کھولنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکیں اس سوال کے جواب کے کئی پہلو ہیں۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآن کا یہ اشکال جو ہے یہ درحقیقت قرآن کا اشکال نہیں ہے بلکہ یہ ہمارا اپنا اشکال ہے۔ قرآن نے اول اول جن لوگوں کو مخاطب کیا ان کو اس کے نظم کے بارے میں کوئی اشکال پیش نہیں آیا۔ زبان ان کی تھی، گرد و پیش ان کا تھا۔ حالات و مسائل اور اعتراضات و سوالات ان کے تھے۔ جو پارٹیاں قرآن کی مخاطب تھیں وہ سب سامنے موجود تھیں اور وہ جس قسم کے نظریات و عقائد رکھتی تھیں وہ سب معلوم و معروف تھے۔ اس وجہ سے قرآن مجید

کے لطیف سے لطیف اشارات اور مخفی سے مخفی کنایات بھی سمجھ لینے میں انھیں کوئی زحمت پیش نہیں آتی تھی جہاں آیات اتریں، بے تکلف ان کے ذہن ہر اشارے وکنائے کے محل ومصداق تک پہنچ گئے اور انھوں نے کلام کے پورے مالہٗ وما علیہ کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ کم از کم ان لوگوں کے لیے تو اس کے سمجھ لینے میں کسی زحمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا جو سارے حالات سے خود متعلق بھی تھے اور ذہین بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا حال مذکورہ تمام اعتبارات سے ان سے بالکل مختلف ہے۔ نہ زبان ہماری ہے نہ حالات ومسائل ہمارے ہیں، زمانے میں بھی صدیوں اور قرنوں کا فرق ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کے سمجھنے میں ہمیں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ بالکل فطری ہیں۔ بقدرِ ضرورت عملی واخلاقی تعلیمات وہدایات کو سمجھ لینے کی بات تو اور ہے لیکن اگر کوئی شخص ربط ونظام کی باریکیوں اور کلام کے منطقی تسلسل اور اس کے اسرار وحقائق کو سمجھنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے نہ صرف زبان کی اجنبیت کو دور کرنا پڑے گا بلکہ ذہنی وفکری صوت کے ذریعے سے اس بُعدِ زمانی پر بھی غالب آنا پڑے گا جو اس کے اور قرآن کے زمانۂ نزول کے درمیان حائل ہے۔ اور یہ چیز ظاہر ہے کہ ایک عظیم فکری وعلمی جہاد کے بعد ہی ممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کے اجزا اور اس کی ترکیب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اجزا کا علم بہت آسان ہوتا ہے لیکن ترکیب کے علم کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ نظم کا علم درحقیقت ترکیب کا علم ہے۔ یہ صرف یہی نہیں بتاتا کہ فلاں آیت سے فلاں آیت کا کیا جوڑ ہے بلکہ اس کا اصل مقصد دین واخلاق کے اجزا کے باہمی ربط کو واضح کرنا ہے ظاہر ہے کہ یہ مقصد ایک نہایت اعلیٰ علمی مقصد ہے۔ یہی چیز ہے جس کو حکمت کہتے ہیں۔ حکمت بہر حال ایک مخفی خزانہ ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص صرف یہ جاننا چاہے کہ قرآن نے عملی زندگی کے لیے کیا احکام دیے ہیں تو اس کے لیے اسے کسی بڑی کاوش کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص دین کی حکمت معلوم کرنا چاہے تو اسے بہر حال قرآن کے اندر معتکف ہونا اور اس کے لیے ساری زندگی کو قربان کرنا پڑے گا۔

تیسری چیز یہ ہے کہ عربی زبان کی (بالخصوص اس زبان کی جس میں قرآن ہے) کچھ خصوصیات ہیں جو صرف اسی کے ساتھ خاص ہیں۔ بلیغ عربی زبان میں تعبیرِ مدعا کے لیے الفاظ کا سہارا اسی حد تک لیا جاتا ہے جس حد تک ناگزیر ہے اگر کوئی شخص اس حد سے آگے بڑھ جائے تو یہ کلام کا عیب ہے جس کو قائل کے عجز کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ عرب کے لوگ نہایت ذہین تھے اس وجہ سے وہ کلام کے اندر سے ان تمام اجزا کو حذف کر دیتے تھے جن کو ایک ذہین سامع خود سمجھ لیتا ہے یا اسے سمجھ لینا چاہیے۔ زمانۂ نزولِ قرآن کے ادب اور قرآن کے مطالعے سے اس حذف وایجاز کے بہت سے اصول سامنے آتے ہیں جو ایک نئی ترتیب کے ساتھ میرے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی ایک کتاب ——— کتاب الاسالیب ——— میں جمع کر دیے ہیں۔ میرے لیے ان تمام اصولوں کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف ایک بات محض بطورِ مثال عرض کرتا ہوں جس سے اس بات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا جس کی طرف میں یہاں اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے اور اہلِ عرب کے درمیان ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ہم ایک بات کے بعد جب دوسری بات اسی کی دلیل یا اس کی مثال یا اس کے نتیجہ یا اس کی تکمیل یا اس پر استدراک یا کسی اور پہلو سے کہیں گے تو اس رابطہ کو لازماً ظاہر کریں گے جو دونوں

کے تعلق کی نوعیت کو واضح کر دے۔ اس مدعا کے لیے ہماری زبان میں بہت سے الفاظ اور اسلوب ہیں جن کا سہارا لیے بغیر ہم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ اہلِ عرب کا طریقہ اس معاملے میں ہمارے طریقہ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اس طرح کے مواقع میں زیادہ اعتماد سامع کی ذہانت پر کرتے ہیں اور رابطہ کو حذف کر دیتے ہیں کہ سامع کا ذہن خود اس خلا کو بھرے گا۔ اہلِ عرب اس حذف و ایجاز کو کلام کا حسن اور اس کی بلاغت قرار دیتے لیکن یہی چیز ہمارے لیے نظم کی مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔ ہم کلام کی مخفی کڑیوں سے بے خبر ہونے کی وجہ سے ہر بات کو الگ الگ سمجھ بیٹھتے ہیں۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں تمام علم اوّلین و آخرین ہے۔ اسے رہتی دنیا تک باقی رہنا اور خلق کی رہنمائی کرنا ہے۔ اس کے عجائب کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ یہ جس طرح آج سے کم و بیش چودہ سو سال پہلے دنیا کی رہنمائی کے لیے تمام صفات اور صلاحیتوں سے بھرپور تھی اسی طرح آج بھی ہے اور اسی طرح قیامت تک رہے گی۔ قوموں کے بعد قومیں اٹھیں گی اور ان میں سے جو اس کی طرف رجوع کریں گی وہ سب اپنے ظرف کے بقدر اس میں سے حصہ پائیں گی، لیکن سب کے حصہ پانے کے بعد بھی اس کے ذخیرۂ علم و حکمت میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ سمندر سے ایک سوئی کی نوک پانی کی جتنی مقدار اٹھا سکتی ہے قیامت تک سب مل کر بھی اس سے زیادہ اس کے ذخیرۂ علم کو کم نہیں کر سکتے۔ یہ سارا خزانۂ علم اس کتاب کے اتارنے والے نے اس کے الفاظ اور اس کے نظام کے اندر ودیعت کر دیا ہے اس وجہ سے اس کی نوعیت کسی پاٹ کتاب کی نہیں ہے کہ آپ اس کو دو چار مرتبہ پڑھ لیں اور اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو اخذ کر لیں بلکہ اس کی حیثیت ایک معدن کی سی ہے جس کے اندر جتنی ہی گہری کھدائی کی جائے اتنے ہی اس سے خزانے پر خزانے نکلتے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو صرف ایک دو بار پڑھ لینے کی ہدایت نہیں ہوئی بلکہ بار بار مختلف شکلوں اور مختلف مقداروں میں تلاوت کرتے رہنے اور اس پر برابر تدبر کرتے رہنے کی ہدایت ہوئی۔

قرآن کا نظام بحیثیت مجموعی :

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق ہر سورہ کے اندرونی نظم سے ہے۔ یعنی ہر سورہ ایک مستقل وحدت ہے، اس کا ایک علیحدہ عنوان و موضوع (عمود) ہے اور اس سورہ کے تمام اجزائے کلام اس عنوان و موضوع سے نہایت گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ اب ایک قدم آگے بڑھ کر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن میں بحیثیت مجموعی بھی ایک مخصوص نظام ہے جس کا ایک پہلو تو بالکل ظاہر ہے جو ہر شخص کو نظر آسکتا ہے لیکن ایک پہلو مخفی ہے جو غور و تدبر سے سامنے آتا ہے۔ میں ان دونوں پہلوؤں پر بالاجمال روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ پہلے اس کے ظاہری پہلو پر نظر ڈالیے۔

قرآن کے مجموعی نظام کا ظاہری پہلو :

اگر آپ سورتوں کی اس ترتیب پر ایک نظر ڈالیں، جس ترتیب سے وہ مصحف میں ہیں تو ایک چیز آپ کو بالکل صاف نظر آئے گی کہ قرآن میں مکی اور مدنی سورتوں کے ملے جلے سات گروپ بن گئے ہیں جن میں سے ہر گروپ ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے۔ ہر گروپ میں پہلے مکی سورتیں ہیں۔ ان کے بعد مدنی سورتیں ہیں۔

پہلا گروپ فاتحہ سے شروع ہوتا ہے، مائدہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس گروپ میں فاتحہ مکی ہے باقی چار مدنی ہیں۔

دوسرا گروپ انعام اور اعراف دو مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور انفال و توبہ دو مدنی سورتوں پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرے گروپ میں پہلے ۱۴ سورتیں یونس تا مومنون مکی ہیں۔ آخر میں سورہ نور ہے جو مدنی ہے۔ اس گروپ کی دو سورتوں رعد اور حج کو بعض لوگوں نے مدنیات میں شمار کیا ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس مسئلے پر ہم مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

چوتھا گروپ فرقان سے شروع ہوتا ہے احزاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۸ سورتیں مکی ہیں۔ آخر میں ایک احزاب مدنی ہے۔

پانچواں گروپ سبا سے شروع ہوتا ہے، حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۱۳ سورتیں مکی ہیں اور آخری تین مدنی ہیں۔

چھٹا گروپ ق سے شروع ہو کر تحریم پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں پہلے سات مکی ہیں اس کے بعد دس مدنی۔ اس گروپ میں بعض لوگوں نے سورۂ رحمان کو مدنی قرار دیا ہے لیکن ہم سورہ کی تفسیر میں واضح کریں گے کہ یہ خیال بے بنیاد ہے۔

ساتواں گروپ ملک سے شروع ہو کر الناس پر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس میں بھی مکیات اور مدنیات کی ترتیب اسی طرح ہے جس طرح دوسرے گروپوں میں ہے لیکن اس کی سورہ دہر اور آخری بعض سورتوں کے بارے میں چونکہ اختلافات ہیں اس وجہ سے ان پر بھی ہم ان سورتوں کی تفسیر ہی میں بحث کریں گے۔

سورتوں کی یہ ترتیب، ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔ یہ وہ ترتیب ہے جس ترتیب پر قرآن لوحِ محفوظ میں ہے۔ یہی ترتیب ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل امین، جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے، ہر رمضان میں قرآن مجید کا مذاکرہ فرماتے تھے، اسی ترتیب کے مطابق صحابہ رضی اللہ عنہم بھی رمضان میں قرآن مجید سنتے سناتے تھے۔ اور اسی ترتیب کے مطابق سیدنا عثمان غنیؓ نے مصحف کی نقلیں تمام ممالکِ اسلامیہ میں بھجوائیں۔ اس وجہ سے یہ ترتیب حکمت سے خالی نہیں ہو سکتی۔

قرآن کے مجموعی نظام کا مخفی پہلو:

مذکورہ ساتوں گروپوں کی تلاوت اگر بار بار غور و تدبر کے ساتھ کی جائے تو اس ترتیب کی بہت سی حکمتیں واضح ہوتی ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

(۱) جس طرح ہر سورہ کا ایک خاص عمود ہوتا ہے جس سے سورہ کے تمام اجزائے کلام وابستہ ہوتے ہیں اسی طرح ہر گروپ کا بھی ایک جامع عمود ہے اور اس گروپ کی تمام سورتیں اسی جامع عمود کے کسی خاص پہلو کی حامل ہیں، مطالب اگرچہ ہر گروپ میں مشترک سے ہیں لیکن اس اشتراک کے ساتھ جامع عمود کی چھاپ ہر گروپ پر نمایاں ہے۔ الگ الگ ہر گروپ کے موضوع پر بحث کے لیے موزوں جگہ یہاں نہیں ہے بلکہ تفسیر میں، ہر گروپ کی تمہید میں ہے۔ یہاں مثال کے طور پر اتنی بات ذہن میں رکھیے کہ کسی گروپ میں قانون و شریعت کا رنگ غالب ہے کسی میں ملت ابراہیمؑ کی تاریخ اور اس کے اصول و فروع کا۔ کسی میں کشمکش حق و باطل اور اس کے بارے میں سنن الٰہیہ کے بیان کا حصہ نمایاں ہے، کسی میں نبوت و رسالت اور اس کے خصائص و امتیازات کا، کسی میں توحید اور اس کے لوازم و مقتضیات ابھرے ہوئے نظر آئیں گے کسی میں بعث، حشر و نشر اور ان کے متعلقات، آخری گروپ منذرات کا ہے جو بیشتر ان کی سورتوں پر مشتمل ہے جو جھنجھوڑنے اور جگانے والی ہیں اور جنھوں نے پورے عرب میں ہلچل برپا کر دی۔

(۲) ہر گروپ میں جو مدنی سورتیں شامل ہیں وہ اپنے گروپ کے مجموعی مزاج سے بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہیں۔ ان کو اپنے گروپ کی مکی سورتوں سے وہی مناسبت ہے جو مناسبت کسی درخت کی جڑ اور اس کی شاخوں میں ہوتی ہے۔

(۳) ہر سورہ زوج زوج ہے۔ یعنی ہر سورہ اپنا ایک جوڑا اور مثنیٰ بھی رکھتی ہے اور ان دونوں میں اسی طرح کی مناسبت ہے جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ یعنی ایک میں جو خلا ہوتا ہے دوسری اس خلا کو بھرتی ہے۔ ایک میں جو پہلو مخفی ہے، دوسری اس کو اجاگر کرتی ہے اور اس طرح دونوں مل کر چاند اور سورج کی شکل میں نمایاں ہوتی ہیں۔ بڑی سورتوں میں اس کو بقرہ اور آل عمران کی مثال سے اور چھوٹی سورتوں میں معوذتین کی مثال سے سمجھیے۔ قرآن میں یہ نظام بالکل کائنات کے نظام کے مشابہ ہے۔ اس کائنات میں بھی ہر چیز جوڑا جوڑا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں بالعموم سورتوں کی تلاوت میں اس نسبت کو ملحوظ رکھتے تھے۔ سورۂ قیامہ اور دہر، سورۂ صف اور سورۂ جمعہ، اعلیٰ اور غاشیہ آپ نمازوں میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔

(۴) صرف سورہ فاتحہ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورہ درحقیقت پورے قرآن کے لیے بمنزلہ دیباچہ ہے۔ اس سورہ کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ اس نے اپنے اندر پورے قرآن کے بنیادی حقائق جمع کر لیے ہیں۔ یہ اپنے گروپ کے لیے بھی دیباچہ کی حیثیت رکھتی ہے اور پورے قرآن کے لیے بھی۔ اس کے مختلف ناموں میں سے ایک نام کافیہ بھی ہے۔ اس سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ خود مکتفی سورت ہے۔ یہ اپنے ساتھ کسی دوسری

سورت کے ملنے کی محتاج نہیں ہے۔

(۵) بعض سورتیں ایسی بھی ہیں جن کی حیثیت ضمنی سورہ کی ہے، یعنی وہ کسی سورہ کے مستقل مثنیٰ کی حیثیت نہیں رکھتی ہیں بلکہ اپنی ماسبق کے کسی ایک اہم پہلو کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔ اس کی ایک مثال سورۂ حجرات ہے جو اپنی سابق سورہ کی ایک آیت کی توضیح کی حیثیت رکھتی ہے۔ تفسیر میں اس کی وضاحت آئے گی۔

(۶) ہر گروپ پر الگ الگ تدبر کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ہر ایک کے اندر اسلامی دعوت کے تمام ادوار ابتدا سے لے کر انتہا تک نمایاں ہوتے ہیں، البتہ نمایاں ہونے کا پہلو ہر ایک کے اندر مختلف ہے، نیز ایجاز اور تفصیل کے اعتبار سے انداز الگ الگ ہیں۔

(۷) یہ بات بھی نظر آتی ہے کہ اس ترتیب میں قانون و شریعت کے گروپ کو تمام دوسرے گروپوں پر مقدم کر دیا گیا ہے اور منذرات کے گروپ کو آخر میں کر دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انذار سے مقصود درحقیقت لوگوں کو غلط راہ سے موڑ کر صحیح راہ پر لگانا ہے اور صحیح راہ شریعت کی راہ ہے اس وجہ سے جو چیز غایت مقصود کی حیثیت رکھتی ہے اس پر سب سے پہلے نگاہ پڑنی چاہیئے۔ امت کو بحیثیت امت مسلمہ جو دولت عطا ہوئی ہے وہ درحقیقت شریعت ہی ہے جو اہل کتاب سے اس امت کو منتقل ہوئی اس وجہ سے پہلے گروپ میں اہل کتاب کی معزولی بھی بیان ہوئی اور شریعت اسلامی کی تفصیل بھی۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے پہلے گروپ اور اس کے آخری گروپ میں وہی نسبت ہے جو نسبت ایک عمارت اور اس کی بنیاد میں ہوتی ہے جہاں تک تعمیر کا تعلق ہے تعمیر سے پہلے بنیاد ہوتی ہے لیکن عمارت بن چکنے کے بعد سامنے جو چیز آتی ہے وہ عمارت ہوتی ہے بنیاد نیچے ہو جاتی ہے۔

جب میرے سامنے قرآن عظیم کے یہ ساتوں گروپ آتے ہیں اور ساتھ ہی سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے پر نظر پڑتی ہے تو بے ساختہ میرا ذہن وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (۸۷۔۱۵) جس کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن اس آیت سے متعلق چونکہ بہت سی باتیں بحث طلب ہیں اس وجہ سے اس پر مفصل گفتگو اپنے مقام ہی پر موزوں رہے گی۔

تفسیر قرآن بالقرآن :

"تیسری چیز جو اس تفسیر میں میں نے بطور اصول کے پیش نظر رکھی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن کی مدد سے کی جائے۔ قرآن نے خود اپنی تعریف کِتَابًا مُتَشَابِهًا کے الفاظ سے کی ہے۔

اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِيَ (۲۳۔ زمر) — اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، کتاب باہم دگر مشابہ جوڑے جوڑے۔

اسی طرح یہ بات بھی قرآن نے بار بار واضح فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کی باتیں اور اپنی آیات مختلف

شکلوں اور گوناگوں پیرایوں سے پیش فرمائی ہیں۔ اس کے لیے "تصریف" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی گردش دینے کے ہیں۔ اگر آپ قرآن کی تلاوت کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک مضمون مختلف سورتوں میں بار بار سامنے آتا ہے۔ ایک جلدی یہ دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ یہ ایک ہی مضمون کی تکرار ہے لیکن قرآن پر تدبر کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن تکرارِ محض سے بالکل پاک ہے۔ اس میں ایک بات جو بار بار آتی ہے تو بعینہٖ ایک ہی پیش و عقب اور ایک ہی قسم کے لواحق و تضمنات کے ساتھ نہیں آتی بلکہ ہر جگہ اس کے اطراف و جوانب اور اس کے تعلقات و روابط بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ مقام کی مناسبت سے اس میں مناسبِ حال تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ ایک مقام میں ایک پہلو مخفی ہوتا ہے دوسرے مقام میں وہ واضح ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ اس کا اصل رُخ غیر معین ہوتا ہے، دوسرے سیاق و سباق میں وہ رخ بالکل معین ہو جاتا ہے بلکہ میرا ذاتی تجربہ اور مدتوں کا تجربہ تو یہ ہے کہ ایک ہی لفظ ایک آیت میں بالکل مبہم نظر آتا ہے دوسری آیت میں وہ بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ ایک بات کی دلیل سمجھ میں نہیں آتی لیکن دوسری جگہ وہ بالکل آفتاب کی طرح روشن نظر آتی ہے۔

قرآن کا یہ اسلوب ظاہر ہے کہ اسی مقصد کے لیے ہے کہ اس کی ہر بات طالب کے ذہن نشین ہو جائے چنانچہ میں بطور تحدیثِ نعمت کے یہ عرض کرتا ہوں کہ مجھ پر قرآن کی مشکلات جتنی خود قرآن سے واضح ہوئی ہیں دوسری کسی بھی چیز سے واضح نہیں ہوئی ہیں۔ میر انیس نے کہا ہے کہ ع

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ممکن ہے خود ان کے اپنے کلام کے بارے میں یہ محض شاعرانہ مبالغہ آرائی ہو لیکن قرآن کے باب میں یہ بات بالکل حق ہے۔ ایک ایک بات اتنے گوناگوں و بوقلموں اسلوبوں سے سامنے آتی ہے کہ اگر آدمی ذہنِ سلیم رکھتا ہو تو اس کو پکڑ ہی لیتا ہے۔

اس تفسیر کو پڑھنے والے انشاء اللہ محسوس کریں گے کہ میں نے نہ صرف آیات کے نظم اور ان کی تاویل کے تعین میں اصلی اعتماد قرآن ہی کے شواہد و نظائر پر کیا ہے بلکہ الفاظ و اسالیب کی مشکلات میں بھی بیشتر قرآن ہی سے استفادہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں لغت یا نحو کی کتابوں کے حوالے نہیں دے سکتا تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ معانی و حقائق کی طرح قرآن اپنی ادبی و نحوی مشکلات کے حل کے لیے بھی سب سے زیادہ مستند مرجع و ماخذ ہے۔ اس حقیقت کو ہمارے پچھلے علما نے بھی تسلیم کیا ہے۔

۳۔ فہمِ قرآن کے خارجی وسائل

فہمِ قرآن کے خارجی وسائل میں سے جن جن چیزوں سے، جس نوعیت سے، میں نے اس تفسیر میں فائدہ اٹھایا ہے اب مختصر طور پر ان کا تذکرہ کر،

سنّتِ متواترہ و مشہورہ :

جہاں تک قرآن مجید کی اصطلاحات کا تعلق ہے، مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، عمرہ، قربانی، مسجد حرام، صفا مروہ، سعی، طواف وغیرہ، ان کی تفسیر میں نے سو فی صدی سنّت متواترہ کی روشنی میں کی ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید اور شریعت کی اصطلاحات کا مفہوم بیان کرنے کا حق صرف صاحبِ وحی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہے۔ آپ جس طرح اس کتاب کے لانے والے تھے اسی طرح اس کے معلم اور مبیّن بھی تھے اور یہ تعلیم و تبیین آپ کے فریضۂ رسالت ہی کا ایک حصّہ تھی۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ بات قطعیت کے ساتھ معلوم ہو کہ فلاں اصطلاح کا یہ مطلب خود آنحضرت صلعم نے بتایا ہے۔ سو جہاں تک معروف دینی اصطلاحات کا تعلق ہے یہ سوال کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ اس قسم کی ساری اصطلاحات کا حقیقی مفہوم بالکل عملی شکل میں سنّت متواترہ کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور یہ سنّت متواترہ بعینہٖ انھی قطعی ذرائع سے ثابت ہے جن سے قرآن مجید ثابت ہے۔ اُمّت کے جس تواتر نے قرآن کریم کو ہم تک منتقل کیا ہے اسی تواتر نے دین کی تمام اصطلاحات کا عملی مفہوم بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر فرق ہے تو یہ فرق ہے کہ ایک چیز قولی تواتر سے منتقل ہوئی ہے، دوسری چیز عملی تواتر سے۔ اس وجہ سے اگر قرآن مجید کو ماننا ہم پر واجب ہے تو ان ساری اصطلاحات کی اس عملی صورت کو ماننا بھی واجب ہے جو سلف سے خلف تک بالتواتر منتقل ہوئی ہے۔ ان کی صورت میں اگر کوئی جزوی قسم کا اختلاف ہے تو اس اختلاف کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ پانچ وقت کی نمازیں سب جانتے اور مانتے ہیں اور اسی قطعیت کے ساتھ جانتے اور مانتے ہیں جس قطعیت کے ساتھ قرآن کو جانتے اور مانتے ہیں، رہا بعض جزوی امور میں کوئی فرق تو یہ فرق کوئی اہمیت رکھنے والی شے نہیں ہے۔ اس طرح کے معاملات میں دلائل کی روشنی میں جس پہلو پر بھی جس کا اطمینان ہو اس کو اختیار کر سکتا ہے۔

منکرینِ حدیث کی یہ جسارت کہ وہ صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ اور عمرہ و قربانی کا مفہوم بھی اپنے جی سے بیان کرتے ہیں اور اُمّت کے تواتر نے ان کی جو شکل ہم تک منتقل کی ہے اس میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق ترمیم و تغیر کرنا چاہتے ہیں، صریحاً خود قرآن مجید کے انکار کے مترادف ہے اس لیے کہ جس تواتر نے ہم تک قرآن کو منتقل کیا ہے اسی تواتر نے ان اصطلاحات کی عملی صورتوں کو بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر وہ ان کو نہیں مانتے تو پھر خود قرآن کو ماننے کے لیے بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔ اصطلاحات کے معاملے میں تنہا لغت پر اعتماد بھی ایک بالکل غلط چیز ہے۔ صوم و صلوٰۃ کا لغت میں جو مفہوم بھی ہو لیکن دین میں ان کا وہی مفہوم معتبر ہوگا جو شارع نے واضح فرمایا ہے ان دینی اصطلاحات کے بارے میں مولانا فراہیؒ اپنے مقدمۂ تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اسی طرح تمام اصطلاحاتِ شرعیہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، جہاد، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسکِ حج وغیرہ اور ان سے جو اعمال متعلق ہیں تواتر و توارث کے ساتھ سلف سے لے کر خلف تک سب محفوظ ہے۔ اس میں جو

> معمولی جزوی اختلافات ہیں وہ بالکل ناقابلِ لحاظ ہیں۔ شیر کے معنی سب کو معلوم ہیں اگرچہ مختلف ممالک کے شیروں کی شکلوں صورتوں میں کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ اسی طرح جو نماز مطلوب ہے، وہی نماز ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں ہر چند کہ اس کی صورت و ہیئت میں بعض جزوی اختلافات ہیں۔ جو لوگ اس قسم کی چیزوں میں زیادہ کھود کرید کرتے ہیں وہ اس دینِ قیم کے مزاج سے بالکل ہی ناآشنا ہیں جس کی تعلیم قرآنِ پاک نے دی ہے .... پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ کا معاملہ پیش آئے جن کی پوری حد و تصویر قرآن میں نہ بیان ہوئی ہو تو صحیح راہ یہ ہے کہ جتنے حصے پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور اخبار و آثار پر زیادہ اصرار نہ کرو، ورنہ خود بھی شک میں پڑو گے اور دوسروں کے کمال کو بھی غلط ٹھہراؤ گے اور تمہارے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے۔"

تمام دینی اصطلاحات کے بارے میں اسی مسلک کو میں صحیح سمجھتا ہوں اور اسی کو میں نے اختیار کیا ہے۔ البتہ ان کے اسرار و مصالح میں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس باب میں رہنمائی قرآن اور صحیح احادیث سے حاصل کی ہے۔

احادیث و آثارِ صحابہ:

تفسیر کے ظنی ماخذوں میں سے سب سے اشرف اور سب سے زیادہ پاکیزہ چیز ذخیرۂ احادیث و آثار ہے۔ اگر ان کی صحت کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہوتا تو تفسیر میں ان کی وہی اہمیت ہوتی جو اہمیت سنت متواترہ کی بیان ہوئی۔ لیکن ان کی صحت پر اس طرح کا اطمینان چونکہ نہیں کیا جا سکتا اس وجہ سے ان سے اسی حد تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جس حد تک یہ ان قطعی اصولوں سے موافق ہوں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ جو لوگ احادیث و آثار کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ ان کو خود قرآن پر بھی حاکم بنا دیتے ہیں وہ نہ تو قرآن کا درجہ پہچانتے ہیں نہ حدیث کا۔ برعکس اس کے جو لوگ احادیث و آثار کو سرے سے حجت ہی نہیں مانتے وہ اپنے آپ کو اس روشنی ہی سے محروم کر لیتے ہیں جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ قیمتی روشنی ہے۔ میں احادیث کو تمام تر قرآن ہی سے ماخوذ و مستنبط سمجھتا ہوں اس وجہ سے میں نے صرف انہی احادیث تک استفادے کو محدود نہیں رکھا ہے جو قرآن کی کسی آیت کے تعلق کی صراحت کے ساتھ وارد ہوئی ہیں بلکہ پورے ذخیرہ احادیث سے اپنے امکان کی حد تک فائدہ اٹھایا ہے۔ خاص طور پر حکمتِ قرآن کے مسائل میں جو مدد مجھے احادیث سے ملی ہے وہ کسی بھی دوسری چیز سے نہیں ملی۔ اگر کوئی حدیث مجھے ایسی ملی ہے جو قرآن سے متصادم نظر آئی ہے تو میں نے اس پر ایک عرصے تک توقف کیا ہے اور اسی صورت میں اس کو چھوڑا ہے جب مجھ پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ اس حدیث کو ماننے سے یا تو قرآن کی مخالفت لازم آتی ہے یا اس کی زد دین کے کسی اصول پر پڑتی ہے۔

جہاں تک صحیح احادیث کا تعلق ہے اس کی نوبت بہت کم آئی ہے کہ ان کی موافقت قرآن سے ہو ہی نہ سکے لیکن اگر کہیں ایسی صورت پیش آئی ہے تو وہاں میں نے بہر حال قرآن مجید کو ترجیح دی ہے اور اپنے وجوہِ ترجیح تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں۔

شانِ نزول:

شانِ نزول سے متعلق میرا جو مسلک ہے اور جس کی میں نے اس کتاب میں پیروی کی ہے وہ میں اپنے استاذ مولانا فراہیؒ کے الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں۔ مولانا اپنی تفسیر کے مقدمہ میں شانِ نزول سے متعلق لکھتے ہیں۔

"شانِ نزول کا مطلب، جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ کسی آیت یا سورہ کے نزول کا سبب ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد لوگوں کی وہ حالت اور کیفیت ہوتی ہے جس پر وہ کلام برسرموقع حاوی ہوتا ہے۔ کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاص امر یا چند خاص امور کو مد نظر رکھے بغیر کلام کیا گیا ہو۔ اور وہ امر یا امور جو کسی سورہ میں مد نظر ہوتے ہیں اس سورہ کے مرکزی مضمون کے تحت ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر شانِ نزول معلوم کرنی ہو تو اس کو خود سورہ سے معلوم کرو۔ ...... جس طرح ایک ماہر طبیب دوا کے نسخہ سے اس شخص کی بیماری معلوم کرسکتا ہے جس کے لیے نسخہ لکھا گیا ہے اسی طرح تم ہر سورہ سے اس کی شانِ نزول معلوم کرسکتے ہو۔ اگر کلام میں کوئی موضوع پیش نظر ہے تو اس کلام اور اس موضوع میں وہی مناسبت ہوگی جو مناسبت لباس اور جسم میں بلکہ جلد اور بدن میں ہوتی ہے۔ ...

... اور یہ جو روایتوں میں آتا ہے کہ فلاں فلاں آیتیں فلاں فلاں واقعات کے بارے میں نازل ہوئیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ سورہ کے نزول کے وقت یہ احوال و مسائل درپیش تھے۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں۔

"زرکشیؒ نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں بارے میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہٖ وہ بات اس آیت کے نزول کا سبب ہے۔ یہ گویا اس حکم پر اس آیت سے ایک قسم کا استدلال ہوتا ہے۔ اس سے مقصود نقل واقعہ نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ اسباب نزول میں ایک قابل لحاظ چیز یہ بھی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ آیت اسی زمانے میں نازل ہوئی ہو جس زمانے میں واقعہ پیش آیا۔"

زرکشیؒ کے اس بیان سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جس کا ذکر امام رازیؒ نے سورہ انعام کی تفسیر میں وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا الآیہ کے تحت کیا ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

"مجھے یہاں ایک سخت اشکال پیش آیا ہے۔ وہ یہ کہ لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک دفعہ نازل ہوئی ہے۔ اگر صورت معاملہ یہ ہے تو پھر ہر آیت کے بارے میں یہ کہنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ اس کا سبب نزول فلاں واقعہ ہے"

پس ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے واضح ہوا، صورتِ معاملہ یہ ہے کہ جس وقت جو سورہ بھی نازل کی گئی ہے اس غرض سے نازل کی گئی ہے کہ جو حالات محتاج توضیح و تشریح ہیں ان کی توضیح و تشریح کردی جائے اور کلام ایسا ہو کہ اس کے نظم میں کسی قسم کا التباس و ابہام نہ ہو۔ جس طرح ایک ماہر اور حکیم خطیب اپنے سامنے کے خاص حالات و

مقتضیات کی بنا پر ایک خطبہ دیتا ہے کہ بسا اوقات وہ ایک خاص معاملے کا ذکر اگرچہ نظر انداز کر جاتا ہے لیکن اس کا کلام اس طرح کے تمام معاملات و احوال پر حاوی ہوتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ذکر تو کسی خاص معاملے یا کسی خاص شخص کا کرتا ہے لیکن کلام ایک عالم گیر بارش کی طرح بالکل عام و ہمہ گیر ہوتا ہے، اسی طرح قرآن حکیم کا نزول بھی ہوا ہے...

پس اگر تم طمانیت اور یقین کے طالب ہو تو شان نزول کی پیروی میں سر رشتۂ نظم کو ہرگز ہاتھ سے نہ دینا ورنہ تمھاری مثال صحرا کے اس مسافر کی مانند ہو جائے گی جو اندھیرے میں کسی چوراہے پر پہنچ گیا ہے اور نہیں جانتا کہ اب کدھر جائے۔ شانِ نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیے اور احادیث و آثار کے ذخیرے میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی موافقت کریں نہ کہ اس کے سارے نظم کو درہم برہم کر کے رکھ دیں۔"

میں نے شان نزول کے معاملے میں ٹھیک اسی طریقے کی پیروی کی ہے۔ واقعات کو صرف انھی آیات کی تفسیر میں اہمیت دی ہے جن میں کسی واقعہ کی تصریح یا تلمیح ہے اور ان کو بھی ان تمام غیر ضروری تفصیلات سے الگ کر کے لیا ہے جن کی تائید قرآن کے الفاظ یا اشارات سے نہیں ہوتی۔

کتبِ تفسیر:

تفسیر کی کتابوں میں سے تین تفسیریں بالعموم میرے پیشِ نظر رہی ہیں، تفسیر ابنِ جریرؒ، تفسیر رازیؒ، تفسیر زمخشریؒ۔ اقوال سلف کا مجموعہ تفسیر ابنِ جریر ہے، متکلمین کی قیل و قال اور عقلی موشگافیاں تفسیر کبیر میں موجود ہیں، نحو و اعراب کے مسائل کشاف میں مل جاتے ہیں۔ یوں تو یہ تفسیریں میرے فکر و مطالعہ کی زندگی کے آغاز ہی سے میرے پیش نظر رہی ہیں لیکن لکھتے وقت خاص طور پر میں نے ان پر ایک نظر ضرور ڈال لی ہے۔ ان کے علاوہ جو تفسیر کی کتابیں ہیں ان کی طرف میں نے صرف اسی صورت میں رجوع کیا ہے جب کوئی ایسی اہم بات پیش آئی ہے جس کے لیے ہر اس گوشے کو ٹٹولنا پڑا ہے جہاں سے کسی رہنمائی کی امید ہوئی ہے۔ ان کتابوں سے میرے استفادے کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ میں نے کوئی بات مجرد ان کے اعتماد پر لکھ دی ہو بلکہ صرف وہی بات ان کی لی ہے جو ان اصولوں پر پوری اتری ہے جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ ہمارا طریقہ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ ہے کہ ہم ہر سورہ اور ہر آیت پر اس کے الفاظ، اس کے سیاق و سباق، اس کے نظم اور قرآن میں اس کے شواہد و نظائر کی روشنی میں غور کرتے ہیں۔ اس طرح جو باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں مزید اطمینان کے لیے ان کو تفسیروں میں بھی دیکھ لیتے ہیں جس نتیجے تک ہم پہنچتے ہیں ان کی تائید اگر تفسیروں سے بھی ہو جاتی ہے تو اس سے مزید اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر تفسیروں سے اس کی تائید نہیں ہوتی تو اس پر غور و فکر جاری رکھتے ہیں تا آنکہ یا تو اپنی غلطی دلائل کے ساتھ واضح ہو جائے یا تفسیروں میں جو بات ہے اس کے ضعف کے وجوہ و دلائل سامنے آجائیں۔ ہمارے نزدیک تفسیروں سے فائدہ اٹھانے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں تفسیروں کے حوالے بہت زیادہ نہیں ملیں گے۔ صرف انھی مقامات میں ان کے حوالے میں نے دیے ہیں جہاں مسئلے کی اہمیت اس کی داعی ہوئی ہے یا قاری کے اطمینان کے نقطۂ نظر سے حوالے کی ضرورت و اہمیت

محسوس ہوئی ہے۔ اہم مقامات ہیں سے جہاں میں اپنی تائید میں کوئی حوالہ نہیں دے سکا ہوں وہاں اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں اتنے دلائل جمع کر دیئے ہیں جو انشاء اللہ اطمینان پیدا کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔

قدیم آسمانی صحیفے :

قرآن مجید میں جگہ جگہ قدیم آسمانی صحیفوں، تورات، زبور، انجیل کے حوالے ہیں۔ بہت سے مقامات پر انبیائے بنی اسرائیل کی سرگزشتیں ہیں۔ بعض جگہ یہود اور نصاریٰ کی تحریفات کی تردید اور ان کی پیش کردہ تاریخ پر تنقید ہے۔ اس طرح کے مواقع میں میں نے ان روایات پر اعتماد نہیں کیا ہے جو ہماری تفسیر کی کتابوں میں منقول ہیں۔ یہ روایات زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں اس وجہ سے نہ تو یہ اہل کتاب پر حجت ہو سکتی ہیں اور نہ ان سے خود اپنے ہی دل کے اندر اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر میں نے بحث و تنقید کی بنیاد اصل ماخذ یعنی تورات و انجیل پر رکھی ہے۔ جس حد تک قرآن اور قدیم صحیفوں میں موافقت ہے وہ موافقت میں نے دکھا دی ہے اور جہاں فرق ہے وہاں قرآن کے بیان کی حجت و قوت واضح کر دی ہے۔ تفسیر کی پہلی جلد میں، بقرہ اور آل عمران دونوں کی تفسیر میں، ایسے بہت سے معرکے ملیں گے جن کو پڑھ کر قارئین یہ اندازہ کر سکیں گے کہ فی الواقع قرآن کا اصل زور اسی وقت واضح ہوتا ہے جب کسی معاملے میں اس کے بیان کو تورات و انجیل کے مقابل میں رکھ کے جانچا جائے۔

ان مقابل بحثوں کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اسی طرح تورات زبور اور انجیل بھی اللہ ہی کے اتارے ہوئے صحیفے ہیں۔ اگر ان کے بدقسمت حاملوں نے ان صحیفوں میں تحریفیں نہ کر دی ہوتیں تو یہ بھی اسی طرح ہمارے لیے رحمت و برکت تھے جس طرح قرآن ہے۔ لیکن ان تحریفات کے باوجود آج بھی ان کے اندر حکمت کے خزانے ہیں۔ اگر آدمی ان کو پڑھے تو یہ حقیقت آفتاب کی طرح سامنے آتی ہے کہ ان صحیفوں کا سرچشمہ بھی بلا شبہ وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ میں ان کو بار بار پڑھنے کے بعد اس رائے کا اظہار کرتا ہوں کہ قرآن کی حکمت کے سمجھنے میں جو مدد ان صحیفوں سے ملتی ہے وہ مدد مشکل ہی سے کسی دوسری چیز سے ملتی ہے۔ خاص طور پر زبور، امثال اور انجیلوں کو پڑھیے تو ان کے اندر ایمان کو وہ غذا ملتی ہے جو قرآن و حدیث کے سوا اور کہیں بھی نہیں ملتی۔ حیرت ہوتی ہے کہ جن قوموں کے پاس یہ صحیفے موجود تھے وہ قرآن اور پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے کیوں محروم رہیں۔

تاریخ عرب :

قرآن میں عرب کی پچھلی قوموں مثلاً عاد، ثمود، مدین اور قوم لوط وغیرہ کی تباہی کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی ان کے معتقدات، ان کے انبیا کی دعوت اور اس دعوت پر ان کے رد عمل کی طرف اشارات ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی عرب میں آمد، ان کی قربانی، ان کی دعوت، ان کے ہاتھوں تعمیر بیت اللہ اور

ان کی برکت سے عرب کے اخلاقی، تمدنی، معاشی، معاشرتی حالات کی تبدیلی کا مختلف اسلوبوں سے بیان ہے بعد میں قریش نے دینِ ابراہیمؑ کو جس طرح مسخ کیا اور بیت اللہ کو جو مرکزِ توحید تھا، جس طرح ایک بت خانہ بنایا اور اس کے نتیجے میں جو رسوم اور جو بدعتیں ظہور میں آئیں ان کے جگہ جگہ حوالے ہیں۔ ان ساری باتوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ اس دور کی پوری تاریخ پر آدمی کی نظر ہو۔ لیکن بدقسمتی سے اس دور کی کوئی مستند تاریخ موجود نہیں حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی تاریخ کا بھی وہ حصہ جو عرب میں ان کی آمد اور تعمیرِ بیت اللہ و قربانی وغیرہ سے متعلق تھا وہ، جیسا کہ تفسیر سورہ بقرہ میں معلوم ہوگا، یہود نے بالکل بدل ڈالا۔ مختلف کتابوں سے جو جستہ جستہ معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اگرچہ مفید ہیں لیکن کافی نہیں۔ عرب کے شعرا اور خطبا کے کلام میں ظاہر ہے کہ اس طرح کی باتوں کی طرف صرف اشارات مل سکتے ہیں جو اگرچہ نہایت کارآمد ہیں تاہم ان کی حیثیت اشارات کی ہے۔ میں نے جہاں جہاں سے کچھ معلومات حاصل ہونے کی توقع پائی ہے وہاں پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس کوشش سے مجھے بعض قیمتی معلومات حاصل ہوئی ہیں جن سے میں نے قرآن کے بعض اشارات کھولنے میں مدد لی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں مجھے اصلی اعتماد قرآن مجید ہی پر کرنا پڑا ہے۔ میں نے تاریخ کی روایات میں سے انھی باتوں کو لیا ہے جن کی تائید مجھے خود قرآن سے بھی حاصل ہو گئی ہے اور یہ جو کچھ بھی ہوا ہے سب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد سے ہوا ہے۔

۴۔ قرآن کے طالبوں کے لیے چند ہدایات

یہاں تک میں نے فہمِ قرآن کے جن خارجی و داخلی شرائط کا ذکر کیا ہے یہ سب باتیں علمی و فنی نوعیت کی ہیں۔ میں نے خود ان کو ملحوظ رکھا ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ انھیں ملحوظ رکھے بغیر کوئی شخص قرآن سے صحیح استفادہ نہیں کر سکتا لیکن ان کی حیثیت بہرحال وسائل کار اور اسلحہ کی ہے۔ جس طرح اسلحہ جنگ کے لیے ضروری ہیں اسی طرح یہ وسائل فہمِ قرآن کے لیے ناگزیر ہیں۔ مگر معلوم ہے کہ جنگ کے لیے صرف ہتھیار ہی کافی نہیں ہوتے بلکہ اس کی فتح و شکست میں اصلی عامل کی حیثیت دل کو حاصل ہے۔ اگر آدمی کے سینے میں مضبوط اور بہادر دل نہ ہو تو اس کو ہزار اسلحہ سے لیس کر دیجیے لیکن وہ کامیاب لڑائی نہیں لڑ سکتا۔

بر مخنث سلاحِ جنگ چہ سود!

اسی طرح فہمِ قرآن کے کام میں ان شرائط کی نگہداشت ہرچند ضروری ہے لیکن ان شرائط کی نگہداشت سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آدمی اپنے دل کے رُخ کو صحیح رکھے۔ اگر دل کا رخ صحیح نہ ہو تو ہر چیز بالکل بے سود ہو کے رہ جاتی ہے۔ اب میں چند باتیں دل کے رُخ کو صحیح رکھنے کے لیے عرض کرتا ہوں۔

نیت کی پاکیزگی:

اس کے لیے سب سے پہلی چیز نیت کی پاکیزگی ہے۔ نیت کی پاکیزگی سے میرا مطلب یہ ہے کہ آدمی قرآن مجید کو صرف طلب ہدایت کے لیے پڑھے، کسی اور غرض کو سامنے رکھ کے نہ پڑھے۔ اگر طلب ہدایت کے سوا آدمی کے سامنے کوئی اور غرض ہوگی تو وہ نہ صرف قرآن کے فیض ہی سے محروم رہے گا بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ قرآن سے جتنا دور وہ اب تک رہا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ دور ہٹ جائے۔ اگر آدمی قرآن پر اس لیے خامہ فرسائی کرے کہ لوگ اسے مفسر قرآن سمجھنے لگیں اور وہ کوئی تفسیر لکھ کر جلد سے جلد شہرت اور نفع حاصل کر سکے تو ممکن ہے اس کی یہ غرض حاصل ہو جائے لیکن قرآن کے علم سے وہ محروم ہی رہے گا۔ اسی طرح اگر آدمی کے کچھ اپنے نظریات ہوں اور وہ قرآن کی طرف اس لیے رجوع کرے کہ اس کے ان نظریات کے لیے قرآن سے کچھ دلائل ہاتھ آجائیں تو ممکن ہے وہ قرآن سے کچھ الٹی سیدھی دلیلیں گھڑنے میں کامیاب ہو جائے لیکن ساتھ ہی وہ اپنی اس حرکت کے سبب سے اپنے اوپر قرآن کا دروازہ بالکل بند کرلے گا۔

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا صحیفہ بنا کر اتارا ہے اور ہر آدمی کے اندر طلب ہدایت کا داعیہ ودیعت فرمایا ہے۔ اگر اس داعیے کے تحت آدمی قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ بقدر کوشش اور بقدر توفیق الٰہی اس سے فیض پاتا ہے۔ اور اگر اس داعیہ کے سوا کسی اور داعیہ کی تحریک سے، کسی حقیر مقصد کے لیے وہ قرآن کو استعمال کرنا چاہتا ہے تو لِکُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰی کے اصول کے مطابق وہ وہی چیز پاتا ہے جس کا وہ طالب ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا (اللہ اس کے ذریعہ سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے) اور اس کے بعد اس ہدایت و ضلالت کا ضابطہ بھی بیان فرما دیا ہے کہ وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ (اس کے ذریعے سے نہیں گمراہ کرتا مگر انھیں لوگوں کو جو نافرمان ہوتے ہیں) یعنی جو لوگ فطرت کی سیدھی راہ سے ہٹ کر چلتے ہیں اور ہدایت سے بھی ضلالت ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو وہی چیز دیتا ہے جس کے وہ بھوکے ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص کعبہ جا کر بھی بتوں ہی کی پرستش کرنا چاہتا ہے تو وہ ہرگز اس بات کا سزاوار نہیں ہے کہ وہ توحید کی لذت سے آشنا ہو۔ اگر کوئی شخص پھولوں کے اندر سے بھی کانٹے ہی جمع کرنا چاہتا ہے تو وہ ہرگز اس کا مستحق نہیں ہے کہ اس کو پھولوں کی خوشبو نصیب ہو۔ جو شخص اپنے فساد طبیعت کے سبب سے علاج کو بھی بیماری بنا لیتا ہے وہ اسی لائق ہے کہ شفا حاصل ہونے کے بجائے اس کی بیماری ہی میں اضافہ ہو۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے ان لفظوں میں اشارہ فرمایا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ (بقرہ-۲-۱۶)

یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اختیار کیا تو ان کی یہ تجارت ان کے لیے نفع بخش نہ ہوئی اور وہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔

قرآن کو ایک برتر کلام مانا جائے:

دوسری چیز یہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک اعلیٰ اور برتر کلام مان کر اس پر غور کرنے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر دل میں قرآن مجید کی عظمت و اہمیت نہ ہو تو آدمی اس کے سمجھنے اور اس کے حقائق و معارف دریافت کرنے پر وہ محنت صرف نہیں کر سکتا جو اس کے خزائن حکمت سے مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے۔ اگر کسی رقبہ زمین کے متعلق یہ علم ہو کہ وہاں سے سونا نکلتا رہا ہے اور کسی زمانہ میں اس سے کافی سونا نکل چکا ہے تو توقع یہی کی جاتی ہے کہ اگر کھدائی کی جائے تو یہاں سے سونا ہی نکلے گا اور پھر اس کی اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کا سروسامان کیا جاتا ہے اور اس پر اسی اعتبار سے محنت کی جاتی ہے۔ لیکن ایک معدن کو اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ گھورا ہے یا یہ کہ اگر یہاں محنت صرف کی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہاں سے کوئلہ یا چونا فراہم ہو سکے گا تو اس پر یا تو کوئی سرے سے اپنی محنت ضائع کرنا پسند ہی نہیں کرے گا اور اگر کرے گا تو صرف اس حد تک جس حد تک اس کو اس سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہو گی۔

بظاہر یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہو گی کہ ایک کتاب کے متعلق اس کے سمجھنے سے پہلے ہی یہ حسن ظن قائم کر لیا جائے کہ وہ نہایت ہی عظیم اور برتر کتاب ہے لیکن غور کیجیے تو قرآن کے متعلق یہ پیشگی حسن ظن کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ قرآن مجید اپنے پیچھے ایک عظیم تاریخ رکھتا ہے۔ کوئی شخص اس کتاب پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکتا کہ جتنا بڑا انقلاب دنیا میں اس کتاب نے برپا کیا ہے اتنا بڑا انقلاب کسی کتاب نے بھی نہیں برپا کیا۔ اس نے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک انسانی زندگی کے ہر گوشے کو نہایت گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ اس نے لوگوں کے سوچنے کے انداز بدل ڈالے، افکار و نظریات بدل ڈالے، تہذیب و تمدن بدل ڈالے، آئین و قانون بدل ڈالے، مذاہب و ادیان بدل ڈالے۔ اتنی ہمہ گیر و عالمگیر تبدیلیاں لانے والی کتاب کسی شخص کے نزدیک اچھی بھی ہو سکتی ہے، بری بھی لیکن کسی کے نزدیک بھی غیر اہم نہیں ہو سکتی۔ ہر انسان جو زندگی کے مسائل پر غور کرتا ہے، ان کو بے پروائی کے ساتھ نظر انداز کرنے کا عادی نہیں ہے، وہ اس کتاب کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ یہ ضرور جاننا چاہے گا کہ اس کتاب کے اندر وہ کیا چیز چھپی ہوئی ہے جس کے ذریعے سے اس نے اس دنیا کی کایا پلٹ دی؟ وہ یہ ضرور سمجھنا چاہے گا کہ آخر اس میں وہ کیا جادو پوشیدہ ہے کہ عربوں کی قوم، جس کو اونٹ چرانے کے سوا اور کسی بات کا بھی سلیقہ نہ تھا، اس کو پڑھ کر دفعتاً شتربانی کے درجے سے ترقی کر کے جہاں بانی کے مرتبے پر پہنچ گئی؟ وہ یہ ضرور معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ آخر اس کے اندر وہ کیا حکمت کا خزانہ بند ہے کہ جو قوم زیادہ سے زیادہ امرؤالقیس اور زہیر کے درجے کے آدمی مشکل سے پیدا کرتی تھی اس کے اندر ابوبکر صدیقؓ اور عمرؓ کے مرتبے کے لوگ پیدا ہونے لگے؟

پھر یہ بات بھی ہے کہ دنیا کی آبادی کا ایک عظیم حصہ اس کو صرف ایک کتاب ہی نہیں مانتا بلکہ آسمانی اور خدائی کتاب اور لوح محفوظ سے اترا ہوا کلام مانتا ہے۔ اس کو ایک ایسا معجز کلام مانتا ہے جس کی نظیر نہ انسان پیش کر سکتے، نہ جنات۔ ایک ایسا کلام جس کے ماضی و حاضر کے متعلق یہ احساسات اور یہ شہادتیں موجود ہوں ہر حال ایک

اہمیت رکھنے والا کلام ہے اور آدمی اس کو سمجھنے کا صحیح حق اسی صورت میں ادا کر سکتا ہے جب وہ اس کی اسی عظمت و اہمیت کو سامنے رکھ کر اس پر غور کرے۔ اگر یہ اہمیت اس کے سامنے نہ ہو تو ممکن ہے کہ آدمی کا ذہن اس کو اس اہتمام کا مستحق نہ سمجھے جس کا وہ فی الواقع مستحق ہے۔

یہ تنبیہ میں نے اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کے اندر قرآن مجید کے متعلق ایسی غلط فہمیاں موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں ہے کہ اس کو اس اعتنا و اہتمام کا مستحق سمجھا جائے جو اس سے حقیقی استفادے کے لیے ضروری ہے۔ یہ غلط فہمیاں قرآن کے ماننے والوں اور اس کے منکروں دونوں کے اندر موجود ہیں۔

جو اس کے منکر ہیں وہ اس بات کا تو ایک حد تک اعتراف کرتے ہیں کہ ایک خاص دور میں اس کتاب کے ذریعے سے کچھ اصلاحات واقع ہوئیں۔ لیکن ان کے خیال میں اب وہ زمانہ گزر چکا۔ عرب کے بدوؤں کے لیے جن کے مسائل سیدھے سادے تھے، یہ کتاب مفید ہو سکتی تھی، لیکن موجودہ زمانے کے اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کے لیے یہ کتاب کافی نہیں۔

جو اس کے ماننے والے ہیں ان میں سے بہت سے لوگ اسے محض حرام و حلال کے بتانے کا ایک فقہی ضابطہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ فقہ کے احکام علیحدہ مرتب ہو جانے کے بعد ان کی نگاہوں میں اگر اس کی کوئی اہمیت باقی رہ گئی ہے تو صرف تبرک کے نقطۂ نظر سے باقی رہ گئی ہے۔ بہت سے لوگ اس کو بس متبرک کلمات اور دعاؤں کا مجموعہ سمجھتے ہیں جن کا ورد تو ضروری ہے لیکن وہ اس کو غور و فکر کا محل نہیں سمجھتے۔ بہت سے لوگ اس کو نزع کی سختیوں کو دور کرنے یا ایصالِ ثواب کی کتاب سمجھتے ہیں اور جب بھی وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اسی قسم کی غرض کے لیے متوجہ ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس کو دفع آفات و بلیات کا تعویذ سمجھتے ہیں اور ان کی ساری دلچسپی اس کے ساتھ بس اسی پہلو سے ہوتی ہے ——— اس طرح کی غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے مسلمان نا ممکن ہے کہ قرآن حکیم سے وہ فائدہ اٹھا سکیں جس کے لیے فی الحقیقت وہ نازل ہوا ہے۔ ان لوگوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ان کو ایک توپ دی گئی کہ وہ اس کے ذریعے سے شیطان کے غلبے کا مقابلہ کریں لیکن وہ اس کو مچھر مارنے کی مشین سمجھ بیٹھے۔

قرآن کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم:

قرآن حکیم سے صحیح استفادے کے لیے تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر، قرآن مجید کے تقاضوں کے مطابق، اپنے ظاہر و باطن کو بدلنے کا مضبوط ارادہ موجود ہو۔ ایک شخص جب قرآن مجید کو گہری نگاہ سے پڑھتا ہے تو وہ ہر قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کے تقاضے اور مطالبے اس کی اپنی خواہشوں اور چاہتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے تصورات و نظریات بھی قرآن سے بیشتر الگ ہیں اور اس کے معاملات و تعلقات بھی قرآن کے مقرر کردہ حدود سے ہٹے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے باطن کو بھی قرآن سے دور پاتا ہے اور اپنے ظاہر کو بھی اس سے بالکل منحرف دیکھتا ہے۔ اس فرق و اختلاف کو محسوس کر کے ایک

صاحب عزم اور حق طلب آدمی تو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ خواہ کچھ ہو میں اپنے آپ کو تا حدِ امکان قرآن کے مطالبات کے مطابق بنانے کی کوشش کروں گا۔ وہ ہر قسم کی قربانیاں کر کے، ہر طرح کے مصائب جھیل کر، ہر نوع کی ناگواریاں برداشت کر کے اپنے آپ کو قرآن کے مطابق بنا لینے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی نیت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق پاتا ہے۔ لیکن جو شخص صاحب عزم نہیں ہوتا ہے وہ اس خلیج کو پاٹنے کی ہمت نہیں کرتا جو وہ اپنے اور قرآن کے درمیان حائل پاتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر میں اپنے عقائد و تصورات کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کروں تو مجھے ذہنی اور فکری اعتبار سے نیا جنم لینا پڑے گا۔ اسے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں اپنے اعمال و اخلاق کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کروں تو میرا اپنا ماحول میرے لیے بالکل اجنبی بن کے رہ جائے گا۔ اسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر میں اپنے آپ کو ان مقاصد کی تکمیل میں سرگرم کروں جن کا مطالبہ مجھ سے قرآن کر رہا ہے تو میں جن فوائد اور جن لذات سے متمتع ہو رہا ہوں ان سے متمتع ہونا تو الگ رہا، عجب نہیں کہ جیل اور پھانسی کی سزاؤں سے دوچار ہونا پڑے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اگر میں اپنے وسائل معاش کو قرآن کے ضابطۂ حرام و حلال کی کسوٹی پر پرکھوں تو آج جو عیش مجھے حاصل ہے اس سے محروم ہو کر شاید اپنی نانِ شبینہ کے لیے بھی فکرمند ہونا پڑے۔ ان خطروں کے مقابل ڈٹ جانا اور ان سے مقابلے کے لیے کمر ہمت باندھ لینا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ صرف مردانِ کار ہی ان گھاٹیوں کو پار کر سکتے ہیں۔ کمزور ارادے اور پست حوصلے کے لوگ یہیں سے اپنے رخ بدل لیتے ہیں۔ بعض، جو اپنی کمزوریوں پر زیادہ پردہ ڈالنے کے خواہشمند نہیں ہوتے، وہ تو یہ کہتے ہوئے اپنی خواہشوں کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں کہ قرآن مجید کا راستہ ہے تو بالکل صحیح لیکن اس پر ہمارے لیے چلنا نہایت مشکل ہے اس لیے ہم اسی راستے پر چلتے رہیں گے جس پر چلتے آئے ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنی کمزوریوں کو عزیمت اور اپنے نفاق کو ایمان کے روپ میں پیش کرنے کا شوق رکھتے ہیں، وہ اپنا یہ شوق مختلف تدبیروں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اضطرار و مجبوری کے بہانوں سے اپنے لیے ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال بنا لیتے ہیں۔ بعض جھوٹی اور باطل تاویلات کے ذریعے سے باطل پر حق کا ملمع چڑھاتے ہیں۔ بعض وقت کے مصالح اور حکمت عملی کے تقاضوں کی آڑ تلاش کرتے ہیں۔ بعض کتاب الٰہی میں اس قسم کی تحریفیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس قسم کی تحریفوں کے مرتکب یہود و نصاریٰ ہوئے ہیں۔ بعض کفر و ایمان کے بیچ سے ایک راہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، قرآن کے جس حصے کو اپنی خواہشوں کے مطابق پاتے ہیں اس کو تو لے لیتے ہیں اور جس حصے کو اپنی خواہشوں کے مطابق نہیں پاتے اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

یہ ساری راہیں شیطان کی نکالی ہوئی ہیں۔ ان میں سے جس راہ کو بھی آدمی اختیار کرے گا وہ اس کو سیدھا ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جائے گی۔ کامیابی اور فلاح کی راہ صرف یہ ہے کہ آدمی قرآن کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی ہمت کرے اور اس کے لیے ہر قربانی پر آمادہ ہو جائے۔ کچھ عرصے تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اس ارادے کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر آدمی اس آزمائش میں اپنے آپ کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اس کے لیے کامرانی کی راہیں کھلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو خدا

اس کے لیے دوسرا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اگر ایک ماحول سے وہ پھینکا جاتا ہے تو دوسرا ماحول اس کے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ اگر ایک زمین اس کو پناہ دینے سے انکار کر دیتی ہے تو دوسری سرزمین اس کے لیے اپنی آغوش کھول دیتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ۝	اور جو ہماری راہ میں جد وجہد کریں گے ہم ضرور ان پر اپنی راہیں کھولیں گے اور اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے۔
(عنکبوت - ۶۹)	

تدبّر:

قرآن حکیم سے استفادے کے لیے چوتھی شرط تدبّر ہے۔ اس شرط کا ذکر خود قرآن مجید نے بار بار کیا ہے۔
أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں) صحابہ رضی اللہ عنہم جو قرآن کے مخاطب اول تھے وہ قرآن کو برابر تدبّر کے ساتھ پڑھتے تھے اور جو لوگ جتنا ہی تدبّر کرتے تھے وہ اتنے ہی قرآن کے فہم میں ممتاز تھے۔ بعض صحابہؓ نے خود اپنے بارے میں یہ شہادت دی ہے کہ انھوں نے سورۂ بقرہ پر پورے آٹھ سال صرف کیے۔ صحابہؓ نے قرآن مجید کے مطالعے کے لیے حلقے بھی قائم کیے تھے جن میں اہل ذوق حضرات اکٹھے ہو کر اجتماعی مطالعہ کرتے تھے تاکہ ایک دوسرے کے فکر و تدبّر سے استفادہ کر سکیں۔ اس طرح کے قرآنی حلقوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص دلچسپی تھی اور روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ ذکر کے ان حلقوں کو ذکر کے حلقوں پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ بعد میں خلفائے راشدین، خصوصاً حضرت عمرؓ، اس قسم کے حلقوں اور قرآن مجید کے ماہرین سے نہایت گہری دلچسپی لیتے رہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی حوصلہ افزائی جن جن طریقوں سے حضرت عمرؓ نے فرمائی ہے اس کو بیان کروں تو ایک مستقل داستان بن جائے[1]۔

محض تبرک کے طور پر الفاظ کی تلاوت کر لینا اور معانی کی طرف دھیان نہ کرنا حضرات صحابہؓ کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ طریقہ تو اس وقت سے رائج ہوا ہے جب لوگوں نے قرآن مجید کو ایک صحیفۂ ہدایت کے بجائے محض حصول برکت کی ایک کتاب سمجھنا شروع کر دیا۔ جب زندگی کے مسائل سے قرآن عظیم کا تعلق صرف اس قدر رہ گیا کہ دم نزع اس کے ذریعے سے جان کنی کی سختیوں کو آسان کیا جائے اور مرنے کے بعد اس کے ذریعے سے میت کو ایصال ثواب کیا جائے جب زندگی کے نشیب و فراز میں رہنما ہونے کے بجائے اس کا مصرف صرف یہ رہ گیا کہ ہم جس ضلالت کا بھی ارتکاب کریں اس کا افتتاح اس کے ذریعے سے کریں تاکہ وہ برکت دے کر اس ضلالت کو ہدایت بنا دیا کرے۔ جب لوگوں نے اس کو ایک

---

[1] جن لوگوں کو ان باتوں کے حوالے مطلوب ہوں وہ میری کتاب مبادی تدبر قرآن دیکھیں۔ اس کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ پر بھی میرا ایک مضمون ملاحظہ ہو میثاق جلد نمبر ۲، عدد ۱ و ۲۔ مضمون بعنوان عہد صحابہؓ کے سب سے کم سن مفسر قرآن ہے جس میں میں نے دکھایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے قرآن کے تدبّر کے سلسلے میں کس کس طرح ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

تعویذ کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا تاکہ جب وہ اپنے دنیوی مقاصد کی تکمیل کے لیے نکلا کریں تو قرآن ان کی حفاظت کرے کہ اس راہ میں ان کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس نے قرآن حکیم سے زیادہ اس بات پر زور دیا ہو کہ اس کا حقیقی فائدہ صرف اسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے جب اس کو پورے غور و تدبر کے ساتھ پڑھا جائے لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ یہی ایک کتاب ہے جو ہمیشہ آنکھ بند کر کے پڑھی جاتی ہے۔ معمولی سے معمولی کتاب بھی پڑھنے کے لیے لوگ کھولتے ہیں تو اس کے لیے سب سے پہلے اپنے دماغ کو حاضر کرتے ہیں لیکن قرآن کے ساتھ لوگوں کی یہ انوکھی روش ہے کہ جب اس کو پڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو بالعموم سب سے پہلے اپنے دماغ پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے رہنمائی کی دعا:

قرآن مجید سے فائدہ اٹھانے کے لیے پانچویں شرط یہ ہے کہ اس کی مشکلات میں آدمی بددل اور مایوس ہونے یا قرآن مجید سے بدگمان یا اس پر معترض ہونے کے بجائے اپنی الجھن کو اپنے رب کے سامنے پیش کرے اور اسی سے مدد اور رہنمائی کا طلبگار رہو۔ قرآن میں تدبر کرنے والا کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے "قول ثقیل" کے نیچے دب گیا ہے جس کو اٹھانا اس کے لیے ناممکن ہو رہا ہے۔ اسی طرح وہ کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی ایسی مشکل آگئی ہے جس کی کوئی ایسی تاویل ممکن ہی نہیں ہے جس پر دل کا اطمینان ہو سکے۔ اس طرح کی عملی اور فکری مشکلوں اور الجھنوں سے نکلنے کا صحیح اور آزمودہ راستہ یہ ہے کہ آدمی اپنی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے مدد اور رہنمائی کے لیے دعا بھی کرتا رہے۔ شب کے پچھلے پہر میں ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھنا بھی اس مقصد کے لیے خاص چیز ہے۔ جہاں تک حکمت کا تعلق ہے اس کے دروازے تو آخر شب کی خلوتوں کے بغیر کھلتے ہی نہیں۔ مندرجہ ذیل دعا بھی اکثر پڑھتے رہنا چاہیے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ، ابْنُ عَبْدِكَ، ابْنُ اَمَتِكَ نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ، مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِیَّ قَضَاؤُكَ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ، سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجِلَاءَ حُزْنِیْ وَذَهَابَ هَمِّیْ وَغَمِّیْ۔

اے اللہ میں تیرا غلام، تیرے غلام کا بیٹا اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں۔ میری پیشانی تیری مٹھی میں ہے۔ مجھ پر تیرا حکم جاری ہے۔ میرے بارے میں تیرا فیصلہ حق ہے۔ میں تجھ سے تیرے ہر اس نام کے واسطے سے جو تیرا ہے جس سے تو نے اپنے کو پکارا ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں اتارا ہے یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے، یہ درخواست کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے غم کا مداوا اور میرے فکر و پریشانی کا علاج بنا دے۔

۵ - چند حرف خاص اس تفسیر سے متعلق

آخر میں چند باتیں خاص اس کتاب سے متعلق بھی عرض کرنی ہیں۔

میں بلا کسی شائبہ فخر کے محض بیان واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ یہ کتاب میری چالیس سال کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ میں نے اپنی جوانی کا بہترین زمانہ اس کتاب کی تیاریوں میں بسر کیا ہے اور اب اپنے بڑھاپے کی ناتوانیوں کا دور اسی کی تحریر و تسوید میں بسر کر رہا ہوں۔ اس طویل مدت میں میں نے زندگی کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں اور بہت سے تلخ و شیریں گھونٹ حلق سے اتارے ہیں لیکن اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ کسی دور اور کسی حال میں بھی میرا ذہنی و قلبی تعلق اس کتاب سے منقطع نہیں ہوا۔ میں نے اس ساری مدت میں جو کچھ پڑھا ہے اسی کو محور بنا کر پڑھا ہے جو کچھ سوچا ہے اسی کو سامنے رکھ کر سوچا ہے اور جو کچھ لکھا ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی سے متعلق لکھا ہے۔ میں نے قرآن حکیم کی ایک ایک سورہ پر ڈیرے ڈالے ہیں، ایک ایک آیت پر فکری مراقبہ کیا ہے اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک ادبی یا نحوی اشکال کے حل کے لیے ہر اس پتھر کے اٹھانے کی کوشش کی ہے جس کے نیچے مجھے کسی سراغ کے ملنے کی توقع ہوئی ہے اور یہ راز بھی میں برملا ظاہر کرتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی اس کام میں کوئی تکان یا افسردگی محسوس نہیں کی بلکہ ہمیشہ نہایت گہری لذت اور نہایت عمیق راحت کا احساس کیا ہے۔

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

میری چالیس سال کی محنتوں کے نتائج کے ساتھ ساتھ اس میں میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ۳۰-۳۵ سال کی کوششوں کے ثمرات بھی ہیں۔ مجھے بڑا فخر ہوتا اگر میں یہ دعویٰ کر سکتا کہ اس کتاب میں جو کچھ بھی ہے سب استاذ مرحوم ہی کا افادہ ہے اس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔ لیکن میں یہ دعوے کرنے میں صرف اس لیے احتیاط کرتا ہوں کہ مبادا میری کوئی غلطی ان کی طرف منسوب ہو جائے۔ مولاناؒ سے میرے استفادے کی شکل یہ نہیں رہی ہے کہ ہر آیت سے متعلق یقین کے ساتھ ان کی رائے میرے علم میں آگئی ہو، بلکہ میں نے ان سے قرآن حکیم پر غور کرنے کے اصول سیکھے ہیں اور خود ان کی رہنمائی میں پورے پانچ سال ان اصولوں کا تجربہ کرنے میں بسر کیے ہیں۔ پھر انھی اصولوں کو سامنے رکھ کر آج تک کام کرتا رہا ہوں۔ اس اعتبار سے اگرچہ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ یہ سب کچھ استاذؒ ہی کا فیض ہے لیکن اس میں چونکہ بلاواسطہ افادے کے ساتھ ساتھ بالواسطہ افادے کا بھی بہت بڑا حصہ ہے اس وجہ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اس کا جو حصہ مستحکم اور مدلل نظر آئے اس کو استاذ مرحوم کا صدقہ سمجھیے اور جو بات کمزور یا غلط نظر آئے اس کو میری کم علمی پر محمول فرمائیے۔

اختصار کے خیال سے میں نے اس کتاب میں ہر آیت کے تحت صرف اسی حد تک بحث کی ہے جس حد تک اس کا اصل مدعا واضح کرنے کے لیے مناسب خیال کی ہے۔ آیت سے متعلق دوسرے ضمنی مباحث میں پڑنے سے بالارادہ احتراز کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت کا صحیح مفہوم سمجھ لینے کے بعد ایک ذہین قاری اس کے متعلقات کو خود اخذ کر سکتا ہے۔ جب تک ایک کلام کا موقع و محل متعین نہیں ہوتا اس وقت تک اس میں بڑے اختلاف کی گنجائش ہوتی

ہے۔ ہر ٹکڑے کے دسیوں بیسیوں مفہوم نکل سکتے ہیں۔ اس کے سبب سے اجتہاد و استنباط کا کام نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے لیکن موقع و محل کے متعین ہو جانے کے بعد راہ نہایت مختصر ہو جاتی ہے۔ ہر آیت اپنے ابتدائی مفہوم کے ساتھ ساتھ اپنے لوازم بعیدہ کی طرف خود انگلی اٹھا کر اشارہ کرتی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن بیدار ہو اور یہ شرط ایک ایسی شرط ہے جو ہر علمی کتاب سے استفادے کے لیے ناگزیر ہے، چہ جائیکہ ایک تفسیر کی کتاب۔

اس کتاب میں دوسری تفسیروں کے حوالے زیادہ نہیں ملیں گے اس کی وجہ، جیسا کہ اوپر اصولی مباحث کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں، یہ ہے کہ اس کی بنیاد مروجہ طریقہ تفسیر کی طرح تفسیر کی کتابوں پر نہیں ہے بلکہ براہ راست فہم قرآن کے اصلی وسائل و ذرائع پر ہے تاہم خاص خاص اہم مباحث میں ان تفسیروں اور ان ارباب تاویل کے حوالے بھی میں نے دیے ہیں جن کی تائید مجھے حاصل ہو سکی ہے۔ ان مواقع کے سوا بھی اگر میں چاہتا تو مجھے اپنی تائید میں حوالے مل جاتے لیکن میں نے اس کی زیادہ کوشش اس وجہ سے نہیں کی کہ میں چاہتا ہوں کہ ہر بات کو لوگ اس کے اساسی دلائل کی کسوٹی پر کس کر قبول کریں یا رد کریں۔

کتاب کو ثقالت سے بچانے کے لیے کلام عرب کے حوالے بھی میں نے زیادہ نہیں دیے ہیں۔ صرف بقدر کفایت ہی دیے ہیں۔ یہ کتاب اردو میں ہے اور اس کے پڑھنے والوں کی غالب تعداد ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہو گی جو عربی سے ناواقف ہوں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے شعر عرب کے حوالے نامانوس بھی ہوں گے اور غیر مفید بھی۔ اس کمی کی تلافی میں نے قرآن مجید کے نظائر و شواہد سے اچھی طرح کر دی ہے اور یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے سب سے زیادہ قابل اطمینان تفسیر ہے۔ تاہم یہ بات نہیں ہے کہ کلام عرب کو میں نے بالکل ہی نظر انداز کیا ہو، اہم ادبی اور نحوی اشکالات کے مواقع میں اس سے بھی میں نے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اس کے حوالے بھی نقل کیے ہیں۔

میں اپنے رب کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے اس کتاب میں کسی ایک آیت کی بھی ایسی تفسیر نہیں کی ہے جس میں مجھے کوئی تردد ہو۔ جہاں ذرا بھی کوئی تردد ہوا ہے میں نے بے تکلف اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی عرض کرتا ہوں کہ کسی ایک مقام میں بھی میں نے یہ کوشش نہیں کی ہے کہ کسی آیت کو اس کے حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اپنے کسی نظریے یا کسی خیال کی تائید کے لیے استعمال کروں۔ قرآن سے باہر کی کسی چیز سے بھی کبھی میری کوئی خاص قلبی و ذہنی وابستگی نہیں ہوئی۔ اگر ہوئی ہے تو قرآن ہی کے لیے اور قرآن ہی کے تحت ہوئی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے والے محسوس کریں گے کہ جہاں کہیں مجھے اپنے استاذؒ سے بھی اختلاف ہوا ہے میں نے بے جھجک اس کا بھی اظہار کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب عزیز کی ایک نہایت ہی حقیر خدمت کی حیثیت سے اسے اس کے قدردانوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس وقت میرے دل میں جو جذبات ہیں ان کی تعبیر سے میرا قلم قاصر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ناچیز خدمت کو قبول فرمائے، لغزشوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمائے، اللہ کے بندوں اور بندیوں کو اس سے نفع پہنچے اور آخرت میں یہ میری نجات کا ذریعہ بنے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

تدبّرِ قرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع خدائے رحمان ورحیم کے نام سے

۱۔ اس آیت کی تاریخی حیثیت

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا مضمون بہت قدیم زمانہ سے اہل مذاہب میں نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ فصیح و بلیغ الفاظ تو ممکن ہے پہلی مرتبہ قرآن مجید ہی میں نازل ہوئے ہوں، لیکن جہاں تک اس کے مضمون کا تعلق ہے یہ کسی کام کے آغاز و افتتاح کے لئے اس قدر موزونیت و مناسبت رکھتا ہے کہ دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعلیم انسان کو بالکل شروع ہی میں دی ہوگی۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق خود قرآن مجید میں یہ نقل ہے کہ انہوں نے اپنے باایمان متعلقین اور ساتھیوں کو جب کشتی میں سوار کرایا تو اس وقت اسی سے ملتے جلتے الفاظ کہے:

قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؀ (هود - ۴۱)	اور اس نے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا بے شک میرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو جو نامہ لکھا، اس کا آغاز بھی انہی مبارک کلمات سے کیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ	یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اس کا آغاز بسم اللہ

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ (نمل۔ ۳۰) الرحمٰن الرحیم سے ہوا ہے۔

۲۔ یہ آیت دُعا ہے

یہ کلام خبر یہ نہیں ہے بلکہ سورۂ فاتحہ کی طرح، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، یہ دعا ہے، ایک سلیم الفطرت آدمی کے دل کی یہ ایک فطری صدا ہے جو ہر قابل ذکر کام کرتے وقت اس کی زبان سے نکلنی چاہیئے۔ اسی فطری صدا کو وحی الٰہی نے الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے اور ایسا خوبصورت جامہ پہنایا ہے کہ اس سے زیادہ خوبصورت جامہ کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی کام کرنے سے پہلے جب یہ دعا ارادہ اور شعور کے ساتھ زبان سے نکلتی ہے تو اوّل تو پہلے ہی قدم پر انسان کو متنبہ کر دیتی ہے کہ جو کام وہ کرنے جا رہا ہے وہ کام بہر حال خدا کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کی پسند کے مطابق اور اس کے احکام کے تحت ہونا چاہیئے۔ ثانیاً وہ اس دعا کی برکت سے خدا کی دو عظیم صفتوں ـــ رحمٰن اور رحیم ـــ کا سہارا حاصل کر لیتا ہے، یہ دونوں صفتیں اس بات کی ضمانت ہیں کہ اللہ تعالےٰ اس کام میں اُس کو برکت عطا فرمائے، اس کے اختیار کرنے میں اگر اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو اس کے وبال سے اس کو محفوظ رکھے، اس کو نباہنے اور تکمیل تک پہنچانے کی اس کو قوت و ہمت دے، شیطان کی چالوں اور فریبوں سے اس کو امان میں رکھے اور دنیا میں بھی اس کام کو اس کے لئے نافع اور بابرکت بنائے اور آخرت میں بھی یہ اس کے لئے رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنے ـــ جو کام اس دعا کے بغیر کیا جاتا ہے وہ ان تمام برکتوں سے خالی ہوتا ہے اسی وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کام بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہے۔

بسم اللہ کی یہ برکتیں تو ہر کام کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں لیکن خاص قرآن کی تلاوت کا آغاز اس دعا سے کرنے میں کچھ اور پہلو بھی ہیں جو پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

ایک یہ کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے قرآن مجید کی تلاوت کا آغاز کر کے بندہ اس حکم کی تعمیل کرتا ہے جو اللہ تعالےٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل ابتدائی وحی نازل کرتے وقت ہی دیا تھا۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۱۔ سورۂ علق) (اپنے خداوند کے نام سے پڑھ، جس نے پیدا کیا)

دوسرا یہ کہ یہ مبارک کلمہ اس حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے کہ انسان پر اللہ تعالےٰ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اس کو نطق اور گویائی کی نعمت عطا فرمائی جس کی بدولت وہ قرآن کی نعمت کا مستحق بن سکا۔ اس حقیقت کی طرف اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحمان اشارہ کر رہی ہے جس کا اس آیت میں حوالہ ہے۔ ایک دوسری جگہ یہ بات تصریح کے ساتھ کہی گئی ہے کہ یہ اللہ تعالےٰ کی رحمانیت ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کیا، اس کو نطق کی قابلیت عطا فرمائی اور اس کو قرآن کی تعلیم دی۔ فرمایا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۔ خدائے رحمان نے قرآن سکھایا، اس نے انسان کو پیدا

عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ (۵۵-۴- رحمٰن) کیا اور اس کو گویائی کی تعلیم دی۔

تیسرا یہ کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید سے متعلق ایک خاص پیشین گوئی کی تصدیق کر رہی ہے جس کی سند پچھلے آسمانی صحیفوں میں موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ خلق خدا کو جو تعلیم دیں گے وہ اللہ کا نام لے کر دیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچویں کتاب باب ۱۸- (۱۸- ۱۹) میں یہ الفاظ وارد ہیں۔

"میں ان کے لئے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا، اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔"

چوتھا یہ کہ جس طرح قرآن مجید خدا کی صفت رحمانیت کا مظہر ہے اسی طرح اس کی صفت رحمانیت ہی ہے جو قرآن کے فتح باب کی کلید ہے، اسی سے اس کے بند دروازے کھلیں گے، اسی سے اس کی مشکلیں آسان ہوں گی، اسی منبعِ فیض سے قاری پر معانی و حقائق کا فیضان ہوگا اور اسی کے سہارے وہ کجی و گمراہی اور نفس اور شیطان کی آفتوں سے محفوظ رہے گا۔

۳- آیت کے اسمائے حُسنیٰ

اس آیت میں اللہ تعالےٰ کے ناموں میں سے تین ناموں کا ذکر آیا ہے۔ اللہ، رحمان - رحیم۔ مختصراً ان کے مفہوم بھی سمجھ لینے چاہئیں۔

اللہ:

اللہ کا نام لفظ اِلٰہ پر الف لام تعریف داخل کر کے بنا ہے۔ یہ نام ابتدا سے صرف اس خدائے برتر کے لئے خاص رہا ہے جو آسمان و زمین اور تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے عرب جاہلیت میں بھی اس کا یہی مفہوم تھا۔ اہلِ عرب مشرک ہونے کے باوجود اپنے دیوتاؤں میں سے کسی کو بھی خدا کے برابر قرار نہیں دیتے تھے ان کو اس بات کا اقرار تھا کہ آسمان و زمین اور تمام مخلوقات کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، اسی نے سورج اور چاند بنائے ہیں، اسی نے ان کو مسخر کیا ہے اور وہی پانی برسانے والا اور روزی دینے والا ہے۔ دوسرے دیوتاؤں کی پرستش وہ محض اس غلط گمان کی بنا پر کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالےٰ کے مقرب ہیں اور اس کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے یہ خیالات نہایت تفصیل کے ساتھ نقل ہوئے ہیں، ہم اختصار کے خیال سے یہاں صرف دو تین آیتیں نقل کرتے ہیں۔

مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰهِ زُلۡفٰی ط (۳- زمر) ہم نہیں پوجتے ان کو مگر اس لئے کہ یہ اللہ سے ہم کو قریب کر دیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ
اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَبْسُطُ
الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ
لَهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ وَلَئِنْ
سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا
لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۶۱-۶۳- عنکبوت)

اگر تم ان سے پوچھو کس نے بنایا آسمانوں اور زمین
کو اور مسخر کیا سورج اور چاند کو؟ کہیں گے، اللہ نے
پھر کہاں ان کی عقل الٹ جاتی ہے! اللہ ہی
روزی میں وسعت دیتا ہے جس کے لئے چاہتا
ہے اپنے بندوں میں سے اور تنگ کر دیتا ہے اس
کے لئے۔ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ اور اگر ان سے
پوچھو کس نے اتارا بادل سے پانی، پھر زندہ کی اس سے
زمین اس کے خشک ہونے کے بعد؟ کہیں گے، اللہ نے۔

اسی طرح تمام قوتوں اور قابلیتوں، تمام زندگی اور موت اور کائنات کے تمام انتظام و انصرام کا حقیقی منبع اور مرکز بھی وہ اللہ تعالٰی ہی کو مانتے تھے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ
يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ
مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ
اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝
(۳۱- یونس)

ان سے پوچھو تم کو کون روزی دیتا ہے آسمان اور
زمین سے یا کون اختیار رکھتا ہے تمہارے سمع و بصر
پر اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے
مردہ کو زندہ سے اور کون سارے معاملہ کا انتظام کرتا
ہے؟ جواب دیں گے، اللہ، پھر پوچھو تو اس اللہ
سے ڈرتے نہیں؟

رحمان اور رحیم:

اسم رحمان، غضبان اور سکران کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اور اسم رحیم، علیم اور کریم کے وزن پر صفت کا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رحیم کے مقابل میں رحمان میں زیادہ مبالغہ ہے اس وجہ سے رحمان کے بعد رحیم کا لفظ ان کے خیال میں ایک زائد لفظ ہے جس کی چنداں ضرورت تو نہیں تھی لیکن یہ تاکید مزید کے طور پر آگیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے استعمالات کے لحاظ سے فعلان کا وزن جوش و خروش اور ہیجان پر دلیل ہوتا ہے اور فعیل کا وزن دوام و استمرار اور پائیداری و استواری پر۔ اس وجہ سے ان دونوں صفتوں میں سے کوئی صفت بھی برائے بیت نہیں ہے بلکہ ان میں سے ایک خدا کی رحمت کے جوش و خروش کو ظاہر کر رہی ہے، دوسری اس کے دوام و تسلسل کو۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ خدا کی رحمت اس خلق پر ہے بھی اسی نوعیت سے۔ اس میں جوش ہی جوش نہیں ہے، بلکہ پائیداری اور استقلال بھی ہے۔ اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ اپنی رحمانیت کے جوش میں دنیا پیدا تو کر ڈالی ہو لیکن پیدا کر کے پھر اس کی خبر گیری اور نگہداشت سے غافل ہوگیا ہو بلکہ اس کو پیدا

کرنے کے بعد وہ اپنی پوری شانِ رحیمیت کے ساتھ اس کی پرورش اور نگہداشت بھی فرما رہا ہے۔ بندہ جب بھی اسے پکارتا ہے وہ اس کی پکار سنتا ہے اور اس کی دعاؤں اور التجاؤں کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ پھر اس کی رحمتیں اسی چند روزہ زندگی ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ جو لوگ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں گے ان پر اس کی رحمت ایک ایسی ابدی اور لازوال زندگی میں بھی ہوگی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری حقیقت اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتی جب تک یہ دونوں لفظ مل کر اس کو ظاہر نہ کریں۔

۴۔ قرآن میں اس آیت کی جگہ

اس آیت سے متعلق ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ قرآن مجید میں اس کی اصل جگہ کہاں ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ یوں تو یہ ہر سورۃ کے شروع میں (سورۂ توبہ کے سوا) ایک مستقل آیت کی حیثیت سے لکھی ہوئی ہے لیکن کسی سورہ میں بھی (سوائے سورہ نمل) بظاہر اس کے ایک جزو کی حیثیت سے یہ شامل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ کسی خاص سورہ کا حصہ بھی ہے یا ہر سورہ کے اوپر یہ صرف بطور ایک تبرک آغاز اور ایک علامتِ امتیاز کے ثبت ہے۔ مدینہ، بصرہ اور شام کے قراء اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ قرآن کی سورتوں میں سے کسی سورہ کی بھی (بشمول سورۂ فاتحہ) آیت نہیں ہے بلکہ ہر سورہ کے شروع میں اس کو محض تبرکاً اور ایک علامتِ فصل کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ اس سے ایک سورہ دوسری سورہ سے ممتاز بھی ہوتی ہے اور قاری جب اس سے کسی سورہ کا افتتاح کرتا ہے تو اس سے برکت بھی حاصل کرتا ہے۔ یہی مذہب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

اس کے برعکس مکہ اور کوفہ کے فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ یہ سورۂ فاتحہ کی بھی ایک آیت ہے اور دوسری سورتوں کی بھی ایک آیت ہے۔ یہ مذہب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ اس کو سورۂ فاتحہ کی ایک آیت اور دوسری سورتوں کے لئے بمنزلۂ فاتحہ مانتے ہیں۔ مجھے تو مذہب قرائے مدینہ کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب تمام تر وحی الٰہی کی رہنمائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے تحت عمل میں آئی ہے اور بسم اللہ کی کتابت بھی اسی ترتیب کا ایک حصہ ہے۔ اس ترتیب میں جہاں تک بسم اللہ کے لکھے جانے کی نوعیت کا تعلق ہے سورۂ فاتحہ اور غیر سورۂ فاتحہ میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر سورہ کے آغاز میں اس کو ایک ہی طرح درج کیا گیا ہے۔ اس کی حیثیت سورہ سے الگ ایک مستقل آیت کی نظر آتی ہے۔

تدبرِ قرآن

۱

الفاتحة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا مضمون

اس سورہ میں پہلے اس جذبۂ شکر کی تعبیر ہے جو اللہ تعالیٰ کی پروردگاری، اس کی بے پایاں رحمت اور اس کائنات کے نظام میں اس کے قانونِ عدل کے مشاہدات سے ایک سلیم الفطرت انسان پر طاری ہوتا ہے یا طاری ہونا چاہیئے۔ پھر اس جذبۂ شکر سے خدا ہی کی بندگی اور اسی سے استعانت کا جو جذبہ ابھرتا ہے یا ابھرنا چاہیئے اس کو تعبیر کیا گیا ہے، پھر اس جذبہ کی تحریک سے جو مزید طلب و جستجو ہدایت و رہنمائی کے لئے پیدا ہوتی ہے یا پیدا ہونی چاہیئے وہ ظاہر کی گئی ہے۔

ب۔ سورہ کا اسلوب

اس سورہ کا اسلوب دعائیہ ہے، لیکن اندازِ کلام مخاطب کو سکھانے کا نہیں ہے کہ وہ یوں دعا کرے بلکہ اصل دعا ہماری زبان پر طاری کردی گئی ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ اگر ہماری فطرت سلیم ہے تو ہماری زبان سے ہمارے دل کا ترانۂ حمد یوں نکلنا چاہیئے۔ چونکہ یہ تعبیر اسی خدا کی بخشی ہوئی ہے جو ہماری فطرت کا بنانے والا ہے اس وجہ سے اس سے زیادہ سچی تعبیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر سلیم الفطرت انسان اس کو اپنے ہی دل کی آواز سمجھتا ہے۔ صرف وہی لوگ اس سے کوئی بیگانگی محسوس کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنی فطرت بگاڑ لی ہو۔

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ (۱)

مَكِّيَّةٌ —————— اٰيَاتُهَا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ
يَوْمِ الدِّيْنِ ○ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○ اِهْدِنَا
الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○ ع

شروع خدائے رحمان ورحیم کے نام سے

شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے، کائنات کا رب، رحمان اور رحیم، جزا و سزا کے دن کا مالک۔
ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھے رستے کی ہدایت بخش،
ان لوگوں کے رستے کی جن پر تُو نے اپنا فضل فرمایا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حمد کا مفہوم

حمد: حمد کا ترجمہ عام طور پر قرآن مجید کے مترجموں نے تعریف کیا ہے، لیکن میں نے اس کا ترجمہ شکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی یہ لفظ اس ترکیب کے ساتھ استعمال ہوا ہے اُسی مفہوم کو ادا

کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے جس مفہوم کو ہم شکر کے لفظ سے ادا کرتے ہیں مثلاً وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانَا لِهٰذَا ۔ ۴۳۔ اعراف (انھوں نے کہا شکر کا سزاوار ہے اللہ جس نے ہمیں اس کی ہدایت بخشی) وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱۰۔ یونس (اور ان کی آخری صدا یہ ہوگی کہ شکر ہے اللہ کے لئے جو عالم کا رب ہے) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۳۹۔ ابراہیم (شکر ہے اللہ کے لیے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ عطا فرمائے)۔

استعمالات کے لحاظ سے اگرچہ حمد کا لفظ شکر کے مقابل میں زیادہ وسیع ہے، شکر کا لفظ کسی کی صرف انہی خوبیوں اور انہی کمالات کے اعتراف کے موقع پر بولا جاتا ہے جن کا فیض آدمی کو خود پہنچ رہا ہو۔ برعکس اس کے حمد ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کے اعتراف کے لئے عام ہے، خواہ ان کا کوئی فیض خود حمد کہنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو، تاہم شکر کا مفہوم اس لفظ کا جزو غالب ہے۔ اس وجہ سے اس کے ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لیے یا تو تعریف کے لفظ کے ساتھ شکر کا لفظ بھی ملانا ہوگا یا پھر شکر کے لفظ سے اس کو تعبیر کرنا زیادہ مناسب رہے گا تاکہ یہ سورہ جس احساس شکر اور جس جذبۂ سپاس کی تعبیر ہے اس کا پورا پورا اظہار ہو سکے۔ یہ اظہار صرف تعریف کے لفظ سے اچھی طرح نہیں ہوتا۔ آدمی تعریف کسی بھی اچھی چیز کی کر سکتا ہے اگرچہ اس کی اپنی ذات سے اس کا کوئی دور کا بھی واسطہ نہ ہو، لیکن یہ سورہ ہماری فطرت کے جس جوش کا مظہر ہے وہ جوش ابھرا ہی ہے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و رحمانیت کے ان مشاہدات سے جن کا تعلق براہ راست ہماری ذات سے ہے۔ اگر یہ اچھی طرح واضح نہ ہو سکے تو اس سورہ کی جو اصل روح ہے وہ واضح نہ ہو سکے گی۔ شکر کے لفظ سے سورہ کا یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

اَللّٰه : اس کی وضاحت آیت بسم اللہ کے تحت ہو چکی ہے۔

رَبّ : رب کے معنی پرورش کرنے والے اور مالک و آقا کے آتے ہیں۔ یہ دوسرا مفہوم اگرچہ پہلے مفہوم ہی سے اس کے ایک لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوا ہے کیونکہ جو ذات پرورش کرنے والی ہے اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مالک اور آقا بنے، لیکن یہ مفہوم اس لفظ پر ایسا غالب ہو چکا ہے کہ اس سے الگ ہو کر محض پرورش کرنے والے کے لیے اس کا استعمال باقی نہیں رہا۔ رب کا مفہوم

قرآن مجید کے مخاطب اول کائنات کا خالق تو جیسا کہ آیت بسم اللہ کی تفسیر میں گزر چکا ہے، تنہا اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن رب انھوں نے اور بھی بنا رکھے تھے جن کی نسبت ان کا گمان تھا کہ خدا نے کائنات کے انتظام میں ان کو اپنا شریک بنا رکھا ہے، اس وجہ سے یہ عبادت و اطاعت کے حقدار ہیں۔ یہاں اللہ کے بعد اس کی پہلی ہی صفت رب العلمین بیان ہوئی جس سے مقصود اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ جو اللہ کائنات کا خالق ہے، وہی اس کا مالک بھی ہے کیونکہ وہی سب کی پرورش کرنے والا ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ : اللہ تعالیٰ کے ان دونوں ناموں کی وضاحت آیت بسم اللہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

لفظ دین

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ: دین کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

۱۔ مذہب و شریعت کے معنی کے لیے مثلاً اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ ۸۳۔ آل عمران (کیا خدا کے اتارے ہوئے یہ لوگ مذہب کے سوا وہ کسی اور مذہب کے طالب ہیں)۔

۲۔ قانون ملکی کے لیے مثلاً مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ ۷۶۔ یوسف (اس کو بادشاہ کے قانون کی رُو سے یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کو روک سکے)۔

۳۔ اطاعت کے معنی کے لیے مثلاً وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۵۲۔ نحل (اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے)

۴۔ جزا کے معنی کے لیے مثلاً اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۶۔ ذاریات (جس چیز کی تمہیں دھمکی سنائی جارہی ہے وہ سچ ہے اور جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی)۔

جزا سے مراد اس کے دونوں پہلو ہیں، نیک اعمال کا صلہ بھی اور بُرے کاموں کی سزا بھی۔ اس وجہ سے ہم نے ترجمہ میں جزا کے ساتھ سزا کا لفظ بھی بڑھا دیا ہے۔

جزا و سزا کے دن کا تنہا مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس دن سارا زور اور سارا اختیار اسی کو حاصل ہوگا۔ اس کے آگے سب عاجز و سرفگندہ ہوں گے کسی کی مجال نہ ہوگی کہ اس کی اجازت کے بغیر زبان کھول سکے۔ سارے معاملات کا فیصلہ تنہا وہی کرے گا جس کو چاہے گا سزا دے گا، جس کو چاہے گا انعام دے گا۔ جیسا کہ فرمایا ہے اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۵۶۔ حج (اس دن سارا اختیار اللہ ہی کو ہوگا، وہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا) لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۱۶۔ غافر (آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟ صرف خدائے واحد و قہار کی)

اس آیت کے تین لفظوں میں جو بات پوشیدہ ہے وہ اگر پھیلا دی جائے تو پوری بات یوں ہوگی کہ ایک دن جزا اور سزا کا آنے والا ہے، اس دن سارا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہوگا اور اس کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوگی۔ لیکن کلام کے دعائیہ اسلوب میں یہ بات اس طرح لپیٹ دی گئی ہے کہ دعا کرنے والا ایک ثابت شدہ حقیقت کی حیثیت سے ان سب باتوں کا اعتراف کر جاتا ہے۔ گویا خدا کی ربوبیت و رحمت اور اس کے عدل و انصاف کے ان آثار و دلائل کے بعد جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں، ایک ہٹ دھرم کے سوا کون ہے، جو اس حقیقت کے کسی جزو کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر سکے؟

عبادت کا مفہوم

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ: عبادت کے اصل معنی عربی لغت میں انتہائی خضوع اور انتہائی عاجزی و فروتنی کے اظہار کے ہیں۔ لیکن قرآن میں یہ لفظ اس خضوع و خشوع کی تعبیر کے لیے خاص ہو گیا ہے جو بندہ اپنے خالق و مالک کے لیے ظاہر کرتا ہے۔ پھر اطاعت کا مفہوم بھی اس لفظ کے لوازم میں داخل ہو گیا ہے کیونکہ یہ بات بالبداہت غلط معلوم ہوتی ہے کہ انسان جس ذات کو اپنے انتہائی خضوع و خشوع کا واحد مستحق سمجھے زندگی کے معاملات میں اس کی اطاعت کو لازم نہ جانے۔ چنانچہ عبادت کی اس حقیقت کو قرآن مجید نے بعض جگہ کھول بھی دیا

ہے ۔ مثلاً :۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ	ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ
فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ؀	تو اللہ ہی کی بندگی کرو اسی کے لیے اطاعت کو خاص
(۲۰ زمر)	کرتے ہوئے ۔

عبادت کے ساتھ اطاعت کا یہ تعلق اس قدر گہرا ہے کہ بعض جگہ یہ لفظ صاف صاف اطاعت کے مفہوم ہی کے لیے استعمال ہوگیا ہے مثلاً :

اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ	کہ شیطان کی عبادت نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا
عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۶۰۔ یٰس)	دشمن ہے ۔

اللہ تعالیٰ کا جو حق بندوں پر ہے اس آیت میں وہ بھی بیان ہوگیا ہے اور بندے کا جو حق خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب کیا ہے وہ بھی اس میں بیان ہوگیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا حق بندے پر یہ ہے کہ بندہ تنہا اسی کی بندگی کرے اور اسی سے التجا کرے ۔ بندے کا حق اس نے اپنے اوپر یہ بتایا ہے کہ وہ اس پر رحمت نازل کرتا ہے اور اس کی مدد فرماتا ہے ۔ آیت کے پہلے ٹکڑے میں بندہ اس حق کا اقرار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا اس کے اوپر ہے اور اس کے دوسرے ٹکڑے میں اس حق کے لئے درخواست پیش کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر بندے کا بتایا ہے لیکن پیش کرنے کا انداز نہایت مؤدبانہ ہے ۔ بندہ اپنے کسی حق کی طرف کوئی اشارہ کرنے کے بجائے صرف اپنی احتیاج اپنے اعتماد اور اپنی تمنا کا اظہار کر دیتا ہے کیونکہ بندے کے شایانِ شان یہی ہے کہ وہ اپنے رب سے التجا اور درخواست کرے نہ کہ اس پر اپنا کوئی حق جتائے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ وہ بغیر کسی استحقاق کے بندے کو سب کچھ بخشتا ہے اور پھر اس فضل و کرم کو بندہ کا حق قرار دیتا ہے ۔ چنانچہ اس سورہ سے متعلق جو مشہور حدیث قدسی ہے اس میں خاص اس ٹکڑے سے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں کہ جب بندہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے الفاظ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ٹکڑا میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ دیا جو اس نے مانگا ۔

"ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں" کے الفاظ عام ہیں ۔ اس وجہ سے یہ طلب مدد خاص عبادت کے معاملہ میں بھی ہو سکتی ہے اور زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی ۔ عبادت میں بندہ خدا کی مدد کا محتاج توفیق و رہنمائی اور ثبات و استقامت کے لیے ہوتا ہے کیونکہ عبادت بالخصوص جب کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں خدا کی اطاعت پر بھی مشتمل ہو ایک بڑی ہی آزمائش کی چیز ہے ۔ اس میں ایسے سخت مقامات بھی آتے ہیں جہاں بڑے بڑوں کے پائے ثبات بھی ڈگمگا جاتے ہیں ۔

اس جملہ میں مفعول کی تقدیم نے حصر کا مضمون بھی پیدا کر دیا ہے ۔ یعنی عبادت بھی صرف خدا ہی کی اور استعانت بھی تنہا اسی سے ۔ اس حصر نے شرک کے تمام علائق کا یک قلم خاتمہ کر دیا کیونکہ اس اعتراف کے بعد بندہ کے پاس کسی غیر اللہ کو نہ کچھ دینے کو رہا اور نہ اس سے کچھ مانگنے کی گنجائش باقی رہی ۔ اس کے بعد دوسرا دوسروں سے بندے کے

تعلق کی صرف وہی نوعیت جائز رہ گئی ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے ہی قائم کر دی ہو۔

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ : اِھْدِنَا کا مطلب صرف اسی قدر نہیں ہے کہ ہمیں سیدھا رستہ دکھا دے بلکہ اس کا مفہوم اس سے بہت زیادہ ہے۔ اس میں یہ مفہوم بھی ہے کہ اس راستہ کی صحت پر ہمارے دل مطمئن کر دے، اس پر چلنے کا ہمارے اندر ذوق و شوق پیدا کر دے، اس کی مشکلیں ہمارے لیے آسان کر دے اور اس پر چلا دینے کے بعد دوسری پگڈنڈیوں پر بھٹکنے سے ہمیں محفوظ رکھ۔ یہ سارا مضمون یہاں صلہ کو حذف کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔

"الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" پر الف لام عہد کا ہے۔ اس سے مراد وہ سیدھا رستہ ہے جو بندوں کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے کھولا ہے، جو دین اور دنیا دونوں کی فلاح و کامیابی کا ضامن ہے، جس پر چلنے کی دعوت نبیوں اور رسولوں نے دی ہے، جس پر ہمیشہ خدا کے نیک بندے چلے ہیں، جو قریب تر اور سہل تر ہے، جس کے اِدھر اُدھر سے گمراہوں اور گمراہ کرنے والوں نے بہت سی کج پیچ کی راہیں نکال لی ہیں، لیکن وہ بجائے خود قائم ہے اور خدا تک پہنچنے والے ہمیشہ اسی پر چل کر خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسی سیدھے رستہ کو حضورؐ نے ایک مرتبہ اس طرح سمجھایا کہ زمین پر ایک سیدھا خط کھینچا، پھر اس کے داہنے بائیں آڑے ترچھے خطوط کھینچ دیئے، پھر فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا رستہ ہے اور یہ آڑے ترچھے خطوط پگڈنڈیاں ہیں اور ان میں سے ہر پگڈنڈی کی طرف کوئی نہ کوئی شیطان بلا رہا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ الآیۃ: آدمی جس چیز سے جتنا ہی گہرا لگاؤ رکھتا ہے اس کو اسی قدر وضاحت کے ساتھ خود بھی سمجھنا چاہتا ہے اور دوسرے کو بھی سمجھانا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے صرف اتنے ہی پر بس نہیں کیا کہ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش بلکہ اس کی پوری وضاحت بھی کر دی ہے اور یہ وضاحت مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے ہے۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ رستہ ان لوگوں کا ہو جن پر تیرا انعام ہوا ہے اور منفی پہلو یہ ہے کہ جو نہ تو مغضوب ہوئے ہیں اور نہ گمراہ۔ اس وضاحت کے بعد مدعا اس طرح آئینہ ہو کر سامنے آگیا ہے کہ کسی اشتباہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

اس ساری وضاحت کی ضرورت اس وجہ سے نہیں تھی کہ (العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو دعا کا مدعا سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش آنے کا امکان تھا، بلکہ صرف یہ ہے کہ طالب اپنے مطلوب حقیقی کی طلب کے ساتھ ساتھ ان لوگوں سے اپنی بیزاری کا اظہار بھی کر رہا ہے جنھوں نے اس محبوب مطلوب سے منہ موڑا یا اس سے بھٹک گئے نیز اپنے لیے استقامت و استواری کا بھی طلب گار ہے کہ اس راستہ کو پا جانے کے بعد اس پر قائم رہنا نصیب ہو، ان لوگوں کا حشر نہ ہو جن کو یہ رستہ ملنے کو تو ملا لیکن وہ اس کو پا لینے کے بعد یا تو دیدہ و دانستہ اس سے منحرف ہو جانے کے سبب سے خدا کے غضب میں مبتلا ہوئے، یا اپنی بدعت پسندیوں کی وجہ سے اس کو پا کر اس سے محروم ہو گئے۔

اس آیت میں تین گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک منعم علیہم۔ دوسرا مغضوب علیہم۔ تیسرا ضالین۔ مختصراً ان تینوں گروہوں کی خصوصیات بھی معلوم کر لینی چاہئیں۔

منعم علیہم کون ہیں؟

"اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" میں نعمت سے مقصود دراصل ہدایت و شریعت کی نعمت ہے جس سے انسان دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کا رستہ معلوم کرتا ہے۔ فعل انعام یہاں اپنے کامل اور حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد درحقیقت وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے شریعت کی نعمت عطا فرمائی اور انھوں نے دل و جان سے اس کو قبول کیا، اس نعمت کے مل جانے پر وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار رہے، اس کی خود بھی قدر کی اور دوسروں کو بھی اس کی قدر کرنے پر ابھارا، اس کے تحفظ کے لیے انھوں نے اپنی قوتیں اور قابلیتیں بھی صرف کیں، مال بھی قربان کئے اور اگر ضرورت پیش آئی تو اس کی راہ میں جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ کہی گئی ہے اس وجہ سے واضح نہیں ہوتا کہ یہ اشارہ کس گروہ کی طرف ہے لیکن ایک دوسری آیت میں اس انعام یافتہ گروہ کی وضاحت ہو گئی ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ	پس یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے
مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ	اپنا انعام فرمایا انبیاء، صدیقین، شہداء اور
وَالصّٰلِحِيْنَ ۶۹۔ نساء	صالحین کے ساتھ۔

"مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح براہ راست نہیں ہے جس طرح انعام کے ذکر میں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو شوءِ ادب سے احتراز ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انعام ہمیشہ اور ہر حال میں بندہ پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے، برعکس اس کے خدا کے غضب کا مستحق بندہ اپنے اعمال کے سبب سے خود بنتا ہے۔

مغضوب علیہم سے مراد

مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کی نعمت نازل فرمائی لیکن انھوں نے اپنی سرکشی کے سبب سے نہ صرف یہ کہ اس کو قبول نہیں کیا، بلکہ اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور جن لوگوں نے اس کو ان کے سامنے پیش کیا ان کی بیخ کنی اور قتل کے درپے ہوئے جس کی پاداش میں ان پر خدا کا غضب نازل ہوا اور وہ ہلاک کر دیے گئے۔

دوسرے وہ لوگ جنھوں نے قبول تو کیا لیکن دل کی آمادگی کے ساتھ نہیں قبول کیا بلکہ مارے باندھے قبول کیا، پھر بہت جلد شہوات نفس میں پڑ کر انھوں نے اس کے کچھ حصہ کو ضائع کر دیا، کچھ حصہ میں کتر بیونت کر کے اس کو اپنی خواہشات کے مطابق بنا لیا اور جن لوگوں نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی یا ان کو صحیح راستہ پر لانا چاہا انھوں نے ان میں سے بعض کو جھٹلا دیا اور بعض کو قتل کر دیا۔ پچھلی امتوں میں اس کی سب سے واضح مثال یہود ہیں، چنانچہ ان کے مغضوب علیہم ہونے کا ذکر قرآن میں تصریح کے ساتھ ہوا بھی ہے۔ مثلاً

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ	جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر اس کا غضب ہوا،
مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ (۶۰۔ مائدہ)	اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور خنزیر بنائے۔
وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ	اور ان کے اوپر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ
وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۶۱۔ بقرہ)	خدا کا غضب لے کر پلٹے۔

ضالین کی حقیقت

ضَآلِّیْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دین میں غلو کیا، جنھوں نے اپنے پیغمبر کا رتبہ اتنا بڑھایا کہ اس کو خدا بنا کر رکھ دیا، جو صرف انہی عبادتوں اور طاعتوں پر قانع نہیں ہوئے جو اللہ اور اللہ کے رسول نے مقرر کی تھیں بلکہ اپنے جی سے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا، جنھوں نے اپنے اگلوں کی ایجاد کی ہوئی بدعتوں اور گمراہیوں کی آنکھ بند کر کے پیروی کی اور اس طرح صراطِ مستقیم سے ہٹ کر گمراہی کی پگڈنڈیوں پر نکل گئے۔ پچھلی امتوں میں سے اس کی نہایت واضح مثال نصاریٰ ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے انہی وجوہ کی بنا پر جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ان کو گمراہ اور گمراہ کرنے والے قرار دیا ہے۔ مثلاً

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَا تَغۡلُواْ فِي دِينِكُمۡ غَيۡرَ ٱلۡحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوٓاْ أَهۡوَآءَ قَوۡمٖ قَدۡ ضَلُّواْ مِن قَبۡلُ وَأَضَلُّواْ كَثِيرٗا وَضَلُّواْ عَن سَوَآءِ ٱلسَّبِيلِ (۷۷۔ مائدہ ۵)

کہہ دو اے اہل کتاب تم اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشوں (بدعتوں) کی پیروی نہ کرو جو پہلے سے گمراہ چلے آ رہے ہیں اور جنھوں نے بہتوں کو خدا کے رستے سے بھٹکایا اور جو خود بھی اس کے رستے سے بھٹکے۔

۴۔ سورہ کا استدلالی پہلو

توحید و آخرت کے دلائل

یہ سورہ چونکہ دعا کے اسلوب میں ہے اس وجہ سے اس میں استدلال کا پہلو واضح نہیں ہے لیکن اس میں جن باتوں کا بندے کی طرف سے اقرار اور پھر جس بات کی درخواست ہے ان میں سے ہر چیز نہایت مضبوط عقلی اور فطری دلائل پر قائم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک دعا تو ہماری زبان سے کہلا دی گئی ہو جس کے اندر ہماری طرف سے نہایت اہم اعترافات بھی موجود ہوں لیکن نہ تو ان اعترافات ہی کے لئے کوئی عقلی بنیاد ہو اور نہ اس درخواست ہی کے لیے۔

اس دعا کے اندر استدلال کے جو پہلو ہیں یہاں ہم اختصار کے ساتھ ان کو واضح کرتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلے اس امر کا اقرار ہے کہ شکر کا حقیقی سزاوار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس اقرار کی بنیاد خدا کی پروردگاری، اس کی رحمانیت، اس کی رحیمیت اور اس کے عدل کی ان نشانیوں کے مشاہدہ پر ہے جو ہمارے اندر بھی موجود ہیں اور جو اس کائنات کے بھی ہر گوشہ میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی کا بچہ ہو یا کسی حقیر سے حقیر حیوان کا، ابھی وہ دنیا میں قدم بھی نہیں رکھتا ہے کہ اس کی پرورش کا سامان پہلے سے بالکل تیار موجود ہوتا ہے۔ اس سامانِ پرورش کی تیاری کا عالم یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس کائنات کے تمام چھوٹے بڑے عناصر رات دن اسی کی فراہمی اور اسی کے اہتمام میں سرگرم ہیں۔ سورج بھی اسی کے لیے سرگرم ہے، چاند بھی اسی کے لیے مصروفِ کار ہے، ابر بھی اسی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے اور ہوا بھی ہر آن اسی کے لیے گردش میں ہے۔

پھر پرورش اور تربیت کا یہ اہتمام ہماری زندگی کے کسی ایک ہی گوشہ میں نہیں پایا جا رہا ہے، بلکہ غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ یہ زندگی کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔ ہمارے ظاہر کی بھی پرورش ہو رہی ہے، ہمارا باطن بھی زیرِ تربیت

ہے، ہمارا جسم بھی پل رہا ہے، ہماری عقل کو بھی غذا مل رہی ہے، ہماری جسمانی قوتیں اور قابلیتیں بھی پروان چڑھ رہی ہیں اور ہماری روحانی صلاحیتوں کو بھی بالیدگی حاصل ہو رہی ہے۔ غرض ہماری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو نظر انداز ہو رہا ہو۔

اس تمام اہتمام و انتظام سے پرورش کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے؟ کیا وہ اپنی سلطنت کے قیام و بقا کے لیے ہمارا محتاج ہے کہ وہ اس فیاضی کے ساتھ ہمارے اوپر خرچ کرے؟ کیا جس طرح بھیڑوں کے کسی گلے کا مالک یہ چاہتا ہے کہ اس کی بھیڑیں فربہ رہیں تاکہ وہ ان سے زیادہ سے نفع کما سکے اسی طرح کی کوئی غرض اس جہان کے رب کے سامنے بھی ہے جس کے لیے وہ ہمیں کھلا پلا اور ہماری دیکھ بھال کر رہا ہے؟

انسان جب ان سوالوں پر غور کرتا ہے تو اسے صاف نظر آتا ہے کہ اس طرح کی کسی غرض کا کوئی ادنیٰ شائبہ یہاں دور دور تک فرض بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جس ذات کی قدرت و حکمت کا ادنیٰ کرشمہ یہ آسمان و زمین ہیں وہ بھلا ہم جیسے حقیر بھنگوں کی محتاج کیا ہو سکتی ہے؟ اچھا، اگر یہ نہیں ہے تو کیا اس کائنات کے خالق و مالک پر ہمارا کوئی حق ہے، جو پہلے سے قائم ہے اور جس کے سبب سے وہ مجبور ہے کہ ہمارے لیے یہ کچھ اہتمام وہ کرے؟ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوئی چیز بھی فرض نہیں کی جا سکتی۔ جن کو وجود کی نعمت ملی ہی محض اس کے لطف و کرم کی بدولت ہو وہ بھلا اس پر اپنا کوئی حق قائم کرنے کے قابل کس طرح ہو سکتے ہیں؟ اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے اور صاف ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو اس کی اس تمام پروردگاری کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ رحمان اور رحیم ہے۔ یہ اس کی رحمانیت کا جوش ہے کہ اس نے ہم کو وجود بخشا اور یہ اس کی رحیمیت کا فیض ہے کہ وہ برابر ہماری دیکھ بھال کر رہا ہے۔

انسان جب خدا کی پروردگاری کے اس اہتمام کو دیکھتا ہے تو یہیں سے اس پر علم و معرفت کا ایک اور دروازہ کھلتا ہے۔ یہ دروازہ ایک روز جزا و سزا کی آمد کا دروازہ ہے جس دن تنہا وہی پورے اختیار کے ساتھ انصاف کی کرسی پر بیٹھے گا، اور نافرمانوں کو ان کی نافرمانیوں کی انصاف کے ساتھ سزا دے گا، اور نیکوں کو ان کی نیکیوں کا فضل و رحمت کے ساتھ صلہ دے گا۔

خدا کی پروردگاری اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت کی نشانیاں ایک روز جزا و سزا کی آمد کو کس طرح لازم کرتی ہیں؟ اس سوال کا جواب تھوڑی سی وضاحت کا طالب ہے۔

خدا کی پروردگاری سے روز جزا پر استدلال قرآن مجید نے جگہ جگہ اس طرح کیا ہے کہ جس خدا نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، اور آسمان کا شامیانہ تانا، جس نے تمہارے لیے سورج اور چاند چمکائے، جس نے ابر و ہوا جیسی چیزوں کو تمہاری خدمت میں لگایا، جس نے تمہارے تمام ظاہری اور باطنی، روحانی اور مادی مطالبات کا بہتر سے بہتر جواب مہیا کیا، کیا اس خدا کے متعلق تم یہ گمان کرتے ہو کہ بس اس نے تمہیں یوں ہی پیدا کر دیا ہے اور پیدا کر کے بس یوں ہی چھوڑ دے گا، یہ تمام کارخانہ محض کسی کھلنڈرے کا ایک کھیل ہے جس کے پیچھے کوئی غایت و مقصد نہیں ہے؟ تم ایک شتر بے مہار

کی طرح اس سرسبز و شاداب چراگاہ میں بس چرنے کے لیے چھوڑ دیئے گئے ہو، نہ تم پر کوئی ذمہ داری ہے اور نہ تم سے کوئی پرسش ہوگی؟ اگر تم نے یہ سمجھ رکھا ہے تو نہایت غلط سمجھ رکھا ہے۔ پرورش کا یہ سارا اہتمام پکار پکار کر شہادت دے رہا ہے کہ یہ اہتمام کسی اہم غایت و مقصد کے لیے ہے اور یہ ان لوگوں پر نہایت بھاری ذمہ داریاں عائد کرتا ہے جو بغیر کسی استحقاق کے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک دن ان ذمہ داریوں کی بابت ایک ایک شخص سے پرسش ہوگی، اور وہی دن فیصلہ کا ہوگا۔ جنھوں نے اپنی ذمہ داریاں ادا کی ہوں گی وہ سرخ رُو اور فائز المرام ہوں گے اور جنھوں نے ان کو نظر انداز کیا ہوگا وہ ذلیل اور نامراد ہوں گے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے لیکن اختصار کے خیال سے صرف ایک مثال نقل کرتے ہیں:۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ
اَوْتَادًا ۙ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ وَّجَعَلْنَا
نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ
وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۙ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ
سَبْعًا شِدَادًا ۙ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا
وَّهَّاجًا ۙ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً
ثَجَّاجًا ۙ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ
وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۗ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ
كَانَ مِيْقَاتًا ۙ (نبا۔ ۶-۱۷)

کیا ہم نے زمین کو تمہارے لیے گہوارہ نہیں بنایا اور اس میں پہاڑوں کی میخیں نہیں ٹھونکیں؟ اور ہم نے تم کو جوڑا جوڑا پیدا کیا۔ اور تمہاری نیند کو دافع کلفت بنایا۔ رات کو تمہارے لیے پردہ پوش بنایا اور دن کو حصول معاش کا وقت ٹھہرایا اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بلند کیے اور روشن چراغ بنایا اور ہم نے بدلیوں سے دھڑا دھڑ پانی برسایا تاکہ اس سے ہم غلے اور نباتات اگائیں اور گھنے باغ پیدا کریں بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے۔

"بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے" یعنی اوپر جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ جس نے یہ کچھ اہتمام انسان کے لیے کیا ہے وہ انسانوں کو یوں ہی شتر بے مہار کی طرح چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ اس کی نیکی یا بدی کے فیصلہ کے لیے فیصلہ کا ایک دن بھی لائے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ قرار دیا ہے کہ ایک ایسا دن وہ لائے جس میں اچھوں اور بُروں کے درمیان انصاف کرے۔ نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ دے، اور بدکاروں کو ان کی برائیوں کی سزا دے۔ ایک رحمان اور رحیم ہستی کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ظالم اور مظلوم، نیکوکار اور بدکار، باغی اور وفادار دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے۔ ان کے درمیان ان کے اعمال کی بنا پر کوئی فرق نہ کرے، نہ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا دے نہ مظلوم کی مظلومیت کا ظالم سے انتقام لے۔ اگر زندگی کا یہ کارخانہ اسی طرح ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد جزا و سزا اور انعام و انتقام کا کوئی دن آتا نہیں ہے تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ العیاذ باللہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی نگاہوں میں متقی اور مجرم دونوں برابر ہیں بلکہ مجرم نسبتاً اچھے ہیں جن کو جرم کرنے اور فساد برپا کرنے کے لیے اس نے بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ یہ چیز بداہتہً غلط اور اس کے رحمان و رحیم ہونے کے بالکل منافی ہے چنانچہ اس نے نہایت واضح الفاظ

میں اس کی تردید فرمائی۔ مثلاً ،

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ (۳۶-قلم)	کیا ہم اطاعت کرنے والوں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟

اور اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ بتایا ہے کہ ایک دن وہ سب کو جمع کرکے انصاف کرے گا اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے،

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۔ (۱۲- انعام)	اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کرلی ہے وہ قیامت تک جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے، تم کو ضرور جمع کرکے رہے گا۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ قیامت دراصل خدا کی رحمت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے اس وجہ سے وہ فیصلہ کا ایک دن ضرور لائے گا جس میں وہ سب کو اکٹھا کرکے ان کے درمیان انصاف فرمائے گا۔ اور یہ بھی عین اس کی اس رحمت ہی کا تقاضا ہے کہ اس دن کسی کی مجال نہ ہوگی کہ اس کے فیصلوں میں کوئی مداخلت کرسکے اور اپنی سفارشوں سے حق کو باطل یا باطل کو حق بنا سکے بلکہ ہر ایک کے لیے بالکل بے لاگ اور پورا پورا انصاف ہوگا۔

اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہوا کہ عدل اور رحمت میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ عدل عین رحمت ہی کا تقاضا ہے۔

جذبۂ شکر دین کی بنیاد ہے

ربوبیت، رحمت اور عدل کی ان نشانیوں کے مشاہدہ سے اللہ تعالیٰ کے لیے شکر کا جو بے پایاں جذبہ پیدا ہوتا ہے یہی جذبہ ہے جو بندہ کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرے اور اپنی ہر مشکل میں اسی سے مدد مانگے۔ غور کیجیے تو صاف واضح ہوگا کہ جس طرح یہ جذبہ رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کے مشاہدہ کا ایک فطری نتیجہ ہے اسی طرح اس جذبہ سے سرشار ہو کر بندہ کا خدا کی طرف اس کی عبادت کے لیے بڑھنا بھی اس جذبہ کا ایک بالکل فطری نتیجہ ہے۔ انسان کا ہر جذبہ اپنا ایک قدرتی ردعمل رکھتا ہے۔ اس جذبہ کا جو اپنے منعم حقیقی کی شکر گزاری کے لیے انسان کے اندر ابھرتا ہے، قدرتی ردعمل یہ ہے کہ وہ اسی کی بندگی کرے اور اسی سے مدد مانگے۔ جو ذات اس فیاضی اور اس اہتمام کے ساتھ پرورش کر رہی ہے، جس کی یہ پروردگاری نہ اس کی طرف سے کسی غرض پر مبنی ہے اور نہ ہماری طرف سے کسی استحقاق پر بلکہ تمام تر اس کی رحمانیت اور رحیمیت کا فیضان عام ہے، پھر جس کی ربوبیت اور رحمانیت صرف اسی حیات چند روزہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس زندگی کے بعد بھی اپنے نیک بندوں کے لیے اس نے ابدی زندگی کی نعمتیں محفوظ کر رکھی ہیں، اس کے سوا کون ہے جو انسان کی حقیقی شکر گزاری کا مستحق ہوسکے۔ اور اگر وہی ہمارے حقیقی شکر کا سزاوار ہے تو پھر اس کے سوا کون ہے جو اس بات کا حقدار ہوسکتا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں اور اس سے مدد مانگیں؟

اس طرح شکر کا جذبہ گویا دھکیل کر بندے کو اس کے منعم حقیقی کے دروازے پر ڈال دیتا ہے کہ وہ اسی کی بندگی کرے اور اسی سے طالب مدد ہو۔ اس حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی تعبیر کرسکتے ہیں کہ درحقیقت شکر کے جذبہ سے بندہ کے اندر خدا کی عبادت کا داعیہ ابھرتا ہے اور پھر اسی جذبہ اور اسی کے قدرتی ردعمل سے دین کی داغ بیل پڑتی ہے۔

اس کائنات میں اور خود اپنے وجود کے اندر خدا کی ربوبیت اور اس کی رحمت کے بے شمار آثار دیکھ کر انسان کے اندر اپنے منعم حقیقی کے لیے شکر کا جذبہ اور اس جذبہ کی تحریک سے انسان کے اندر اس کی عبادت کرنے کا ولولہ پیدا ہونا ایک ایسی بات ہے جو ہر پہلو سے بالکل ایک فطری اور بدیہی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس حقیقت کا انکار کر سکے۔

جذبہ خوف کو دین کی بنیاد قرار دینے کی لغویت

لیکن مذہب دشمنی کے اندھے جوش میں فلسفہ جدید کے مدعیوں نے دین کے آغاز سے متعلق اس سے بالکل مختلف نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر سب سے قدیم اور ابتدائی جذبہ خوف کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ ان ہولناک اور خوفناک حوادث کے مشاہدہ سے پیدا ہوا جو اس دنیا میں طوفانوں، زلزلوں اور وباؤں کی صورت میں آئے دن پیش آتے رہتے تھے۔ اس خوف کے جذبہ نے انسان کو اُن ان دیکھی طاقتوں کی پرستش پر مجبور کیا جن کو اس نے ان حوادث کا پیدا کرنے والا خیال کیا۔ اور اس طرح انسان نے شرک سے دین کا آغاز کیا۔

ہم اس غلط نظریہ کی تردید اپنی ایک دوسری کتاب[1] میں پوری تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ یہاں ہم صرف اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ مذہب کے آغاز سے متعلق قرآن کی یہ تقریر زیادہ دل نشین اور عقل و فطرت کے مطابق ہے یا فلسفہ جدید کا یہ نظریہ زیادہ قرین عقل و فطرت ہے؟ اس دنیا کے عام واقعات زلزلے، طوفان اور سیلاب ہی ہیں یا اس میں بہاریں بھی آتی ہیں، چاندنی بھی پھیلتی ہے، بارشیں بھی ہوتی ہیں، تارے بھی چھٹکتے ہیں، پھول بھی کھلتے ہیں اور فصلیں بھی پکتی ہیں۔ ہمارے عام مشاہدے میں زیادہ تر ربوبیت کی یہ برکتیں اور رحمت کی یہ شانیں آتی رہتی ہیں یا صرف زلزلوں اور طوفانوں کی ہولناکیاں ہی آتی ہیں؟ اس کائنات اور خود اپنی فطرت کے عجائب پر نگاہ ڈالنے کے بعد انسان پر ان دیکھی طاقتوں کا ہول طاری ہوتا ہے یا ایک رحمان و رحیم اور منعم و رباّن خدا کے احسانات کے احساس سے دل کا ریشہ ریشہ لبریز ہو جاتا ہے؟ جو شخص بھی ان سوالوں پر ضد اور ہٹ دھرمی سے پاک ہو کر غور کرے گا اور بے کم و کاست اپنے سچے تاثر کا اظہار کرے گا وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسانی عقل اور انسانی فطرت کے بہاؤ کا اصلی رخ وہی ہے جس کا پتہ قرآن مجید دے رہا ہے، نہ کہ وہ جس کی طرف فلسفہ جدید لے جا رہا ہے۔

یہ نظریہ بھی بدیہی طور پر غلط معلوم ہوتا ہے کہ خوف کا جذبہ تمام دوسرے جذبات سے مقدم ہے۔ خوف کا تجزیہ کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ خوف نام ہے اس چیز کا کہ آپ کو کسی ایسی چیز کے چھن جانے یا اس سے محروم ہو جانے کا اندیشہ یا خطرہ پیدا ہو گیا ہے جو آپ کو حاصل بھی ہے اور جو عزیز بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر خوف سے پہلے کسی نعمت کا شعور لازمی چیز ہے اور جب نعمت کا شعور پایا گیا تو ایک منعم کا شعور بھی لازمی ہوا اور پھر اس کی شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہونا بھی ناگزیر ہوا۔ انسان کے مشاہدۂ کائنات اور مشاہدۂ انفس کی فطری راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ نعمتوں اور رحمتوں کے مشاہدہ سے اس پر ایک منعم حقیقی کی شکر گزاری کا جذبہ اور احساس طاری ہوا اور پھر اس جذبہ

---

[1] ملاحظہ ہو ہماری کتاب حقیقت شرک و توحید حصہ دوم

کی تحریک سے وہ اس کی بندگی کی طرف مائل ہوا۔ رہا یہ سوال کہ اس صحیح شاہراہ پر ایک مرتبہ پڑ جانے کے بعد وہ دوسری غلط راہوں کی طرف کس طرح مڑ گیا تو اس کا سبب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کی فطرت میں کوئی خرابی موجود تھی جو اس گمراہی کا سبب بنی، بلکہ اس میں یا تو اختیار و ارادہ کے سوء استعمال کو دخل ہے یا عقل کی کج روی اور ہوا پرستی کو۔ اس مسئلہ پر بھی مفصل بحث ہم دوسری جگہ کر چکے ہیں[1]۔

اقرار بندگی اور اظہار اعتماد و توکل کے اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا ہمارے سامنے آتی ہے اور اسی دعا پر جو اس تمام تمہید کے بعد اصل حرفِ مدعا کی حیثیت رکھتی ہے، یہ سورہ ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد مغضوبوں اور گمراہوں کی روش سے اظہار بیزاری کا جو مضمون ہے وہ منفی پہلو سے اس دعا کی توضیح مزید ہے۔

۳۔ رسالت کی ضرورت پر ایک دلیل

اوپر کی ساری تمہید کا اقرار و اعتراف کی شکل میں نمایاں ہونا اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا دعا کی شکل میں سامنے آنا ایک خاص حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کا تعلق ہے، جہاں تک ان نشانیوں کے مشاہدہ سے شکر کے جذبہ کے ابھرنے کا تعلق ہے اور پھر اس جذبۂ شکر کی تحریک سے جہاں تک اسی منعم حقیقی کی بندگی اور اسی سے طلب اعانت کے ارادہ کا تعلق ہے، یہ باتیں ایسی کھلی ہوئی ہیں کہ ان کو ہر انسان محسوس کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے دل پر پردہ نہ پڑا ہوا ہو۔ اگر انسان اپنی عقل اور اپنی فطرت کو ان کی اپنی روش پر کام کرنے دے، غیر فطری اڑنگے ان کی راہ میں نہ ڈالے تو وہ ان باتوں میں سے کسی بات کے اقرار و اعتراف میں بھی بخل نہیں کرے گا، یہاں تک کہ ایک روز جزا کی آمد میں بھی اس کو شبہ نہیں ہو گا۔ البتہ اگر وہ رکے گا تو اس مقام پر آکر رکے گا کہ جس خدا کی وہ بندگی کرنا چاہتا ہے اور اپنی ہر مشکل میں جس کی مدد پر اس نے بھروسہ کیا ہے اس تک پہنچنے کا، اس کی عبادت کرنے کا، اس کی پسند اور ناپسند معلوم کرنے کا اور زندگی کی ہر مشکل میں اس سے مدد مانگنے کا صحیح طریقہ اور سیدھا رستہ کیا ہے؟ اسی صحیح رستہ کو معلوم کرنے کے لیے بندہ اللہ تعالیٰ سے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا کرتا ہے۔

اس بات کو صریح دعا کے اسلوب میں کہنے کے معنی یہ ہیں کہ یہاں انسان کی اپنی عقل اور سمجھ بالکل عاجز ہے۔ صرف خدا ہی ہے جو بتا سکتا ہے کہ صراطِ مستقیم کیا ہے اور وہی ہے جو اس صراطِ مستقیم کو اختیار کر لینے کے بعد اس پر جمے رہنے کی توفیق بخش سکتا ہے۔ یہیں سے انسانی فطرت کے اندر وہ خلا نمایاں ہوتا ہے جس کے سبب سے وہ نبوت اور رسالت کا محتاج ہوا ہے۔ انسان اگر کج فہمی سے کام نہ لے تو آفاق اور انفس کی نشانیوں سے وہ یہ تو معلوم کر سکتا ہے کہ ایک خدا ہے، وہ پرورش کرنے والا اور مہربان ہے اور وہ جزا اور سزا دینے والا بھی ہے، لیکن یہ معلوم کرنا اس کے بس میں نہیں ہے کہ اس خدا کی بندگی اور اطاعت کا طریقہ کیا ہے۔ یہی طریقہ بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو ہماری کتاب 'حقیقت شرک و توحید'۔

۴۔ سورہ پر دعا کے پہلو سے ایک نظر

دعا کے پہلو سے اس سورہ کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے تنہا یہی بات کافی ہے کہ یہ سورہ ہماری سب سے بڑی عبادت ـ نماز ـ کی خاص سورہ ہے صحیحین کی مشہور روایت ہے کہ لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب اس شخص کی نماز نہیں ہے جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔

سورہ کی تاثیر

پھر اپنی تاثیر کے لحاظ سے اس کا جو درجہ ہے اس کا اندازہ اس حدیث قُدسی سے ہوتا ہے جو مسلم میں موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ جب پورے شعور اور اخلاص کے ساتھ نماز میں اس سورہ کی تلاوت کرتا ہے تو اس کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے ساتھ ہی خدا کے ہاں شرفِ قبولیت پاتا ہے۔ حدیث ملاحظہ ہو:۔

عن ابی هریرة عن رسول الله	ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے
صلی الله علیه وسلم یقول الله	ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور
تعالیٰ قسمت الصلوٰة بینی وبین	اپنے بندہ کے درمیان دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس
عبدی نصفین فنصفها لی ونصفها	کا نصف حصہ میرے لیے ہے اور نصف میرے بندہ کے
لعبدی ولعبدی ما سأل اذا	لیے ہے اور میرے بندہ کو وہ بخشا گیا جو اس نے مانگا
قال العبد الحمد لله رب العلمین	جب بندہ الحمد للہ رب العالمین کہتا ہے، اللہ تعالیٰ
قال الله حمدنی عبدی واذا قال	فرماتا ہے میرے بندے نے میرا شکریہ ادا کیا اور جب وہ
الرحمن الرحیم قال الله اثنی علی	الرحمٰن الرحیم کہتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے
عبدی واذا قال ملك یوم الدین	بندے نے میری تعریف بیان کی ہے اور جب وہ مالک
قال مجدنی عبدی واذا	یوم الدین کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے
قال ایاك نعبد وایاك نستعین	نے میری بڑائی بیان کی اور جب بندہ ایاک نعبد و
قال هذا بینی وبین عبدی	ایاک نستعین کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ حصہ
ولعبدی ما سأل فاذا قال	میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میں
اهدنا الصراط المستقیم	نے اپنے بندے کو وہ بخشا جو اس نے مانگا۔ پھر جب
صراط الذین انعمت علیهم	بندہ اہدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب
غیر المغضوب علیهم ولا الضالین	علیہم ولا الضالین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ
قال هذا لعبدی ولعبدی	میرے بندے کے لیے ہے اور میں نے اپنے بندے
ما سأل۔	کو وہ بخشا جو اس نے مانگا۔

اس حدیث میں اس سورہ کا جو حقیقت افروز اور معنی خیز تجزیہ ہے وہ بجائے خود اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی

بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کے اس پہلو پر ہم غور کرنا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس نے اس کے لفظ لفظ کے اندر یہ تاثیر بھر دی ہے کہ بندے کی زبان سے لفظ ابھی نکلا نہیں کہ بارگاہِ رب العزت سے اس کی سندِ قبولیت اس کو عطا ہو گئی۔ دعائیں اور بھی ایک سے ایک بڑھ کر ہیں لیکن شاید ہی کسی دعا کے متعلق اس تفصیل سے بتایا گیا ہو کہ اس کے ایک ایک لفظ کا خود اس ذات پر کیا اثر پڑتا ہے جس سے یہ دعا کی جاتی ہے اور کن لفظوں میں وہ اس کو قبول فرماتا ہے۔

دعا کی خوبیاں اس دعا کی اس غیر معمولی اہمیت اور عظمت کے سبب سے ہم چاہتے ہیں کہ اس کی بعض خوبیاں ہم یہاں واضح کریں، اگرچہ توقع نہیں کہ اس کی خوبیوں اور بلاغتوں کا عشرِ عشیر بھی ہم بیان کرنے پر قادر ہو سکیں۔

اس دعا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جس چیز کے لیے دعا کی گئی ہے اس سے اعلیٰ اور اس سے برتر کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں بندہ خدا سے خود اسی تک پہنچنے اور اسی کو پانے کے سیدھے رستہ کی ہدایت مانگتا ہے۔ یہ دعا اولاً تو ہر شائبۂ نفس سے پاک ہے۔ ثانیاً یہ عین اس مقصد کے لیے دعا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ ثالثاً یہ ایک ایسے معاملہ میں خدا سے رہنمائی کی دعا ہے جس میں انسان کی اپنی عقل، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے، بالکل عاجز و درماندہ ہے۔ صرف خدا ہی کی رہنمائی سے وہ اسے پا بھی سکتا ہے اور اسی کی توفیق سے اسے پاکر اس پر قائم بھی رہ سکتا ہے۔ ان وجوہ سے جب بندہ یہ چیز اپنے رب سے مانگتا ہے تو ایک ایسی چیز مانگتا ہے جو فی الحقیقت مانگنے کی بھی ہے اور تنہا اسی سے مانگنے کی ہے۔

دوسری چیز اس دعا کی تمہید ہے جو ہر پہلو سے ایک ایسی تمہید ہے جس سے بہتر تمہید کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کریم کے دروازے سے سائل کو سب کچھ مل سکتا ہے بشرطیکہ مانگنے کا طریقہ صحیح ہو۔ اس تمہید کے بعض پہلوؤں پر نگاہ ڈالیے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا آغاز اعترافِ شکر سے ہوا ہے۔ شکر کا حقیقی سزاوار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ٹھہرایا گیا ہے اور یہ شکر ہی وہ چیز ہے جس سے بندہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مستحق قرار پاتا ہے اور جتنا ہی اس میں ترقی کرتا جاتا ہے اسی حساب سے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے چنانچہ فرمایا ہے:

نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۔ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ (۳۵۔ قمر)	یہ ہماری طرف سے فضل ہوا اور ایسا ہی ہم بدلہ دیتے ہیں ان لوگوں کو جو ہمارے شکر گزار رہتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (۷۔ ابراھیم)	اگر تم میرے شکر گزار رہو گے تو میں تمہارے لیے اپنی نعمتوں میں اضافہ کرتا رہوں گا۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جن صفتوں کے توسل سے یہ دعا کی گئی ہے وہ دوسری تمام صفات کے لیے بمنزلہ بنیاد کے ہیں۔ اس وجہ سے اس دعا میں گویا اللہ تعالیٰ کے سارے ہی اسمائے حسنیٰ کا سہارا حاصل کر لیا گیا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں کامل سپردگی اور کامل حوالگی کا اظہار ہے۔ بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے دروازے پر ڈال دیتا ہے۔ اس دروازے کے سوا اس کے لیے اور کوئی دروازہ نہیں بس ایک ہی ہے جس کی وہ بندگی کرتا ہے اور ایک ہی ہے جس سے وہ مدد کی درخواست کرتا ہے۔ جب اس طرح ساری دنیا سے کٹ کر بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دے گا تو آخر اس کی دعا کا ایک ایک حرف کیوں نہ شرف قبولیت پائے گا۔

اس دعا کے خاتمہ پر بھی غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی اس کی قبولیت کے لیے ایک بہترین سفارش فراہم کرتا ہے۔ یہاں جس صراط مستقیم کی ہدایت کی دعا کی گئی ہے، اوّل تو اس کے لیے جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے وہی اس مطلوب کے لیے بندے کے ذوق و شوق کا پورا پورا اظہار کر رہا ہے کیونکہ اِهْدِنَا کا مفہوم، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، صرف اسی قدر نہیں ہے کہ ہمیں سیدھا رستہ بتا دے، بلکہ یہ بات بھی اس اسلوب میں چھپی ہوئی ہے کہ اس رستہ کے لیے ہماری آنکھیں کھول دے، اس پر چلنے کا ہمیں شوق اور ولولہ عطا فرما، ہمارے دلوں میں اس کی محبت جاگزیں کر دے اور اسی پر ہمیں چلنے کی توفیق دے اور اسی پر مرنے کی سعادت نصیب کر۔ ثانیاً اس کی مزید وضاحت ایسے الفاظ سے کی گئی ہے جن سے ان لوگوں کے ساتھ بندے کی محبت کا اظہار ہوتا ہے جو اسی رستے پر جیے اور مرے ہیں اور ان لوگوں سے انتہائی بیزاری کا اظہار ہے جنھوں نے شرارت یا حماقت کے سبب سے اس سے انحراف اختیار کیا ہے۔

اس دعا کی بے شمار بلاغتوں میں سے یہ چند ہیں جن کی طرف اجمالی طور پر ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اس سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ دعا نماز کی مخصوص دعا کیوں قرار دی گئی۔ اور کیوں یہ بات ہے کہ زبان سے نکلتے ہی اس کا لفظ لفظ شرف قبولیت حاصل کرتا ہے۔ ایک طرف دعا کے ان الفاظ کو سامنے رکھیے اور دوسری طرف نماز کی مخصوص ہیئت اور اس کے مخصوص آداب کو ملحوظ رکھیے پھر تصور کیجیے کہ کتنی بہترین دعا ہے اور اس کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے کتنا بہترین طریقہ ہمیں سکھایا ہے۔

۵۔ سورہ پر دیباچۂ قرآن ہونے کی حیثیت سے ایک نظر

قرآنی علوم کے تین بنیادی عنوان

اس سورہ کو قرآن مجید کی ترتیب میں بھی دیباچۂ قرآن کی جگہ دی گئی ہے اور حدیثوں میں بھی اس کے جو مختلف نام آئے ہیں ان سے بھی اس کی یہی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً اس کو فاتحۃ الکتاب کہا گیا ہے جس کے صاف معنی دیباچۂ قرآن کے ہیں۔ اسی طرح اس کے لیے ام الکتاب یعنی مغز قرآن کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، جو پہلے لفظ سے بھی زیادہ اس کی اہمیت کو واضح کرنے والا ہے۔ کافیہ اور کنز وغیرہ بھی اس کے نام ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورہ اپنے اندر تمام قرآنی مطالب کو سمیٹے ہوئے ہے۔ مختصراً ہم سورہ کے اس پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک تین وجوہ سے اس سورہ کو دیباچۂ قرآن ہونے کا مرتبہ حاصل ہوا ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس سورہ میں دین اور شریعت کے نقطۂ آغاز کا پتہ دیا گیا ہے۔ یہ سورہ ہمیں بتاتی ہے کہ خدا پرستی کا اولین محرک کیا ہے۔ یہ محرک کن عوامل کا نتیجہ ہے۔ اس تحریک سے انسان خدا پرستی کی راہ میں پہلا قدم

کیا اٹھاتا ہے اور اس قدم کے بعد اس کے اندر اصل طلب و جستجو کس چیز کے لیے پیدا ہوتی ہے۔
ہر شخص یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ جس سورہ میں مذکورہ سوالوں کا جواب دیا گیا ہو وہی سورہ اپنے مضمون کے لحاظ سے دیباچۂ قرآن کی جگہ پانے کے لیے موزوں ترین سورہ ہے۔

اب آیئے ان اشارات کی روشنی میں، جو اوپر گزر چکے ہیں، یہ دیکھیے کہ یہ سورہ ان سوالوں کا کیا جواب دیتی ہے۔
یہ سورہ بتاتی ہے کہ آفاق اور انفس کے اندر خدا کی ربوبیت، اس کی رحمانیت اور رحیمیت اور اس کے عدل کی جو نشانیاں موجود ہیں وہ انسان کے اندر خدا کے شکر کا جذبہ ابھارتی ہیں۔ یہ جذبہ ایک زوردار محرک بن کر انسان کو خدا کی عبادت اور اسی سے استعانت کے لیے اکساتا ہے۔ اس کے بعد انسان میں اس سیدھے رستہ کی طلب و جستجو پیدا ہوتی ہے جو اس کو خدا تک پہنچائے۔ انسان کی اس طلب و جستجو کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبوت اور رسالت کا نظام قائم فرمایا اور اپنی ہدایت و شریعت نازل فرمائی۔ مذہب کی راہ میں انسان کا فطری ارتقا اسی طرح ہوا ہے اور اس سورہ میں یہ حقیقت چونکہ نہایت اجمال اور نہایت خوبی کے ساتھ واضح ہوئی ہے اس وجہ سے اس کو دیباچۂ قرآن کی جگہ ملی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن میں جو مطالب بیان ہوتے ہیں اگر ان کو سمیٹا جائے تو وہ تین عنوانوں کے تحت جمع کیے جا سکتے ہیں۔ توحید، قیامت، رسالت۔ یہ سورہ ان تینوں عنوانوں پر بنیادی رہنمائی دیتی ہے۔ اس وجہ سے اس نے گویا قرآن کے سارے علوم کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اس کی ابتدائی دو آیتوں میں خدا ہی کا تمام عالم کا مالک اور آقا ہونا اور تمام حمد و شکر کا سزاوار ہونا بیان ہوا ہے۔ اس کی تیسری آیت میں ایک روز جزا و سزا کی آمد کی طرف بھی اشارہ ہے اور ساتھ ہی اس میں توحید کا مضمون بھی شامل ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا بھی کوئی زور اور اختیار نہیں چلے گا۔ اس کی چوتھی آیت میں بندہ اپنے آپ کو بالکل اپنے رب کے حوالے کر دیتا ہے اور یہی توحید کی اصلی حقیقت ہے۔ پانچویں آیت میں اصل دعا ہے اور اس دعا ہی سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی سیدھی راہ معلوم کرنے کے لیے نبوت و رسالت کے سلسلہ اور اس کی نازل کردہ ہدایت و شریعت کا محتاج ہے۔ نیز اسی لپیٹ میں یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہے کہ خدائی شریعت پانے کے بعد کسی قوم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور اس کی قدر کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کیا معاملہ کرتا ہے۔ غرض اس سورہ کے اندر دین کے تمام بنیادی عناصر جمع ہیں۔ اگر ان کی تفصیل کر دی جائے تو دین کا پورا نظام کھڑا ہو جائے۔ گویا ان چند آیتوں کے اندر پورا قرآن عظیم بند ہے اور اس چھوٹے سے نگینہ کے اندر معانی و حقائق کا وہ پورا شہرستان دکھا دیا گیا ہے جو قرآن کے تیس پاروں کے اندر پھیلا ہوا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے باطن کی یہی پیاس، جو اس سورہ سے ظاہر ہو رہی ہے، درحقیقت نزول قرآن کا سبب بنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت سے پہلے یہود اور نصاریٰ کو صراط مستقیم دکھائی تاکہ وہ خود بھی اس پر چلیں اور دوسروں کو بھی اس پر چلنے کی دعوت دیں لیکن وہ اس راہ پر نہ خود قائم رہے اور نہ دوسروں کے لیے

انھوں نے اس کے نشانات باقی رہنے دیئے۔ اس راہ حق کو گم کر کے انھوں نے دنیا کو جاہلیت کے اندھیرے میں ڈال دیا تھا۔ یہ سورہ اسی اندھیرے سے نکلنے کی دعا ہے اور ایک ایسی دعا ہے جو فطرت انسانی کی گہرائیوں سے نکل رہی ہے۔ یہی دعا ہے جس کی برکت سے دنیا کو قرآن کی روشنی ملی اور جاہلیت کی تاریکی سے نکلنا نصیب ہوا۔ اور یہی دعا ہے جو قرآن کے فہم و تدبر اور اس سے زندگی کے مسائل میں رہنمائی حاصل کرنے کے معاملہ میں بھی ہمارے قدم کو جادۂ مستقیم پر استوار رکھ سکتی ہے۔ اس پہلو سے بھی یہ سورہ دیباچۂ قرآن بننے کے لیے نہایت موزوں تھی۔

۔سورہ کا تعلق بعد کی سورہ سے

پورے قرآن سے اس سورہ کا جو تعلق ہے وہ اوپر کی بحث سے اچھی طرح واضح ہو چکا ہے۔ اب ہم اس کا تعلق بعد کی سورہ (سورۂ بقرہ) سے واضح کرنا چاہتے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کے آخری حصہ اور سورۂ بقرہ کی پہلی آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں سورتوں میں وہی تعلق ہے جو تعلق ایک دعا اور اس کے جواب یا ایک دعا اور اس کے اثر اور اس کی قبولیت میں ہوتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ (ہمیں سیدھے رستہ کی ہدایت دے، ان لوگوں کے رستہ کی جن پر تو نے انعام کیا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ) اس کے مابعد سورۂ بقرہ اس طرح شروع ہوتی ہے۔ الٓمٓ. ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ ه (الٓمٓ۔ یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ خدا ترسوں کے لیے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے) گویا سورۂ فاتحہ میں جس آسمانی ہدایت و رہنمائی کے لیے دعا کی گئی تھی، سورہ بقرہ میں وہ ہدایت سامنے آگئی۔ ایک صاحب ذوق جب دعا کے فوراً بعد اس کے اثر اور نتیجہ کو سامنے موجود دیکھتا ہے تو اس کی روح خدا کے شکر کے جذبہ سے سرشار ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور پہلو بھی سامنے رکھنا چاہیئے، وہ یہ کہ سورۂ فاتحہ میں منعم علیہم گروہ کے رستہ کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ مغضوب اور گمراہ گروہوں کے طریقوں سے بچائے جانے کی بھی دعا ہے۔ دعا کے اس پہلو کو سامنے رکھ کر جب آدمی سورۂ بقرہ کی تلاوت کرتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس سورہ میں ملت ابراہیمی کی تجدید کے ساتھ ساتھ یہود کے ان تمام جرائم کی فہرست بھی بیان ہوئی ہے جو انھوں نے خدا، اس کے نبیوں اور رسولوں اور اس کی شریعت کے خلاف کیے ہیں اور جن کے سبب سے وہ اس بات کے مستحق ٹھہرے کہ ان پر خدا کا غضب نازل ہوا اور وہ قوموں کی امامت کے منصب سے معزول کیے جائیں۔ گویا سورۂ فاتحہ میں جس انعام یافتہ اور اس کے بالمقابل جس مغضوب گروہ کی طرف ایک اجمالی اشارہ تھا سورۂ بقرہ میں ان دونوں گروہوں سے متعلق پوری تفصیل سامنے آگئی اور واضح ہو گیا کہ کن کی پیروی کرنی ہے اور کن کے طریقوں سے بچنا ہے۔

بالکل یہی صورت سورہ آل عمران کی ہے جو سورۂ بقرہ کے بعد ہے۔ بقرہ میں جس طرح یہود کی شرارتوں کی

تفصیل ہے اسی طرح آل عمران میں نصاریٰ کی بدعتوں اور ان کی گمراہیوں کی تردید کی گئی ہے اور ساتھ ہی اس میں اس اسلام کی صحیح تصویر بھی پیش کی گئی ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیائے کرام بالخصوص حضرت مسیح علیہ السلام نے دی ہے۔ سورۂ فاتحہ کے بعد ترتیب قرآن میں انہی دو بڑی سورتوں کا جگہ پانا اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہ بعد کی دونوں سورتیں سورۂ فاتحہ کی دعا کی مقبولیت اور اس کے آخری حصہ کے اجمالات کی شرح ہیں۔

تدبرِ قرآن

۲

البقرۃ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود

سورہ کا مرکزی مضمون دعوتِ ایمان ہے

اس سورہ کا مرکزی مضمون دعوتِ ایمان ہے۔ ایمان کی طرف اشارہ تو، جیساکہ ہم نے بیان کیا، سورۂ فاتحہ میں بھی ہو چکا ہے لیکن وہ اجمالی ایمان ہے جو جذبۂ شکر کی تحریک اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و رحمت کی نشانیوں کے مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سورہ میں اس اجمال نے تفصیل کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اس میں نہایت واضح طور پر قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ گویا سورۂ فاتحہ میں ایمان باللہ کا ذکر ہے اور سورۂ بقرہ میں ایمان بالرسالت کا۔

ایمان بالرسالت کی اہمیت

ایمان کی اصلی حقیقت ایمان بالرسالت ہی سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ اگر ایمان بالرسالت موجود نہ ہو تو مجرد ایمان باللہ ہماری زندگی کو اللہ کے رنگ میں نہیں رنگ سکتا۔ زندگی پر اللہ کا رنگ اسی وقت چڑھتا ہے جب ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ ایمان بالرسالت بھی پایا جائے۔

ایمان بالرسالت پیدا ایمان باللہ ہی سے ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ پہلی چیز اس دوسری چیز ہی کا ایک بالکل فطری نتیجہ ہے۔ ایمان باللہ سے بندہ کے اندر خدا کی ہدایت کے لیے ایک پیاس اور ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ یہی پیاس اور تڑپ ہے جس کا اظہار سورۂ فاتحہ میں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا سے ہو رہا ہے۔ اسی دعا کے جواب میں یہ سورۂ بقرہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دے رہی ہے۔ گویا بندے کو بتایا جا رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی کے حق کو تسلیم کر چکنے کے بعد اس کے راستہ کی تلاش ہے تو اس کتاب پر اور اس رسول پر ایمان لاؤ جس پر یہ کتاب اتری۔

اس حقیقت کی روشنی میں اگر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سورۂ فاتحہ اگرچہ بظاہر ایک نہایت چھوٹی سی سورہ ہے، لیکن فی الحقیقت وہ ایک نہایت ہی عظیم الشان سورہ ہے۔ کیونکہ اس کے تنے سے پہلی ہی شاخ جو پھوٹی ہے وہی اتنی بڑی ہے کہ ہماری ساری زندگی پر حاوی ہو گئی ہے۔ اس سے ہماری اس بات کی تصدیق ہوتی ہے جس کی طرف ہم نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے کہ پورا قرآن درحقیقت اسی سورۂ فاتحہ کے تخم سے پیدا ہوا ہے اور یہ اسی شجرۂ طیبہ کے برگ و بار ہیں جو قرآن کے پورے تیس پاروں میں پھیلے

ہوتے ہیں۔

ب۔ سورہ میں خطاب

اس سورہ میں اصل خطاب | اس سورہ میں اصل خطاب تو یہود سے ہے لیکن ضمناً اس میں جگہ جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، مسلمانوں کو، اور بنی اسمٰعیل کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔

یہود سے | یہود کو مخاطب کر کے ان کے ان تمام مزعومات و توہمات کی تردید کی گئی ہے جن کے سبب سے وہ اپنے آپ کو پیدائشی حقدارِ امامت و سیادت سمجھے بیٹھے تھے اور کسی ایسے نبی پر ایمان لانا اپنی توہین سمجھتے تھے جو ان کے خاندان سے باہر اُمّی عربوں میں پیدا ہوا ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے جگہ جگہ آپ کو صبر و استقامت کی نصیحت کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت جو دعا کی تھی آپ اس دعا کے مظہر ہیں۔ مخالفین کی تمام حاسدانہ سرگرمیوں کے علی الرغم آپ کی دعوت کامیاب ہو کے رہے گی اور اللہ تعالےٰ آپ کے دین کو غالب کرے گا۔

مسلمانوں سے خطاب کر کے یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے خلق پر اپنے دین کی حجت تمام کرنے کے لیے ان کو ایک مستقل اُمّت کی حیثیت سے مامور کیا ہے اور اپنی آخری شریعت کا ان کو امین بنایا ہے، انہیں چاہیے کہ وہ اس امانت کی قدر کریں اور اس کے حامل بنیں تاکہ وہ خلق کے رہنما اور اپنے بعد والوں کے لیے نمونہ اور مثال بن سکیں۔

اسی ضمن میں ان کو جگہ جگہ یہود کی ان حاسدانہ سرگرمیوں سے بھی آگاہ کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرنے، ان کو ورغلانے اور ان کو آخری بعثت کی نعمتوں سے محروم کرنے کے لیے ان کی طرف سے ظاہر ہو رہی تھیں۔

بنی اسماعیل کو مخاطب کر کے ان کے سامنے اصل دینِ ابراہیمی ان تمام بدعتوں اور خرابیوں سے پاک کر کے پیش کیا گیا ہے جو مشرکین اور یہود نے اس میں پیدا کر دی تھیں اور ساتھ ہی ان پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالےٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنا آخری نبی تمہارے اندر سے اٹھایا، اور تمہیں ایک امت مسلمہ بنانا چاہا، تم اس احسان کی قدر کرو اور یہودیوں کی حاسدانہ چالوں کے چکر میں نہ پھنسو، ورنہ تم پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا بیٹھو گے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کا تفصیلی تجزیہ تو اس وقت سامنے آئے گا جب ہم آیات کے مناسب حصّوں کو الگ

الگ سے قرآن کی تفسیر کریں گے لیکن یہاں بھی ہم اس کے مطالب کا ایک سرسری جائزہ پیش کیے دیتے ہیں۔ اس سے سورہ کے عمود کے ساتھ اس کے ہر حصہ کا تعلق بھی سمجھنے میں مدد ملے گی اور سورہ پر بحیثیت مجموعی ایک اجمالی نظر بھی پڑ جائے گی۔

ہمارے نزدیک مضامین کی تقسیم کے لحاظ سے یہ سورہ ایک تمہید، چار ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

[۱-۳۹] یہ حصہ تمہیدی ہے۔ اس میں پہلے تو یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس کتاب پر کون لوگ ایمان لائیں گے، کون لوگ ایمان نہیں لائیں گے پھر ایمان نہ لانے والوں کی رکاوٹیں اور ان کی ذہنی الجھنیں بیان ہوئی ہیں جن میں وہ قرآن کے نزول کے بعد مبتلا ہو گئے تھے۔ اسی ضمن میں بنی اسمٰعیل کو تنبیہ کیا گیا ہے کہ ان پر اللہ کی اس کتاب نے حجت تمام کر دی ہے، اب ان کی شامت ہی ہے جو یہودی فتنہ پردازوں کے چکموں میں آکر وہ اپنے آپ کو اس نعمت عظمیٰ سے محروم کر بیٹھیں۔

یہ تمہیدی حصہ آدم کی خلافت اور شیطان کی حاسدانہ مخالفت کی سرگزشت پر ختم ہوتا ہے۔ آدم اور شیطان کی یہ سرگزشت ایک آئینہ ہے جس میں اس تمام مخالفت اور موافقت کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور قرآن کی دعوت سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ فرشتوں کا آدم کی خلافت پر اعتراض کرنا اور اپنے اعتراض کا جواب پا جانے کے بعد مطمئن ہو جانا مثال ہے ان لوگوں کی مخالفت کی جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے بعض پہلو نہ سمجھنے کے سبب سے شروع شروع میں آپ کی رسالت کے بارہ میں متردد یا اس کے مخالف رہے لیکن چونکہ یہ لوگ نیک دل اور حق پسند تھے، حاسد اور ہٹ دھرم نہ تھے، اس وجہ سے جونہی ان پر اصل حقیقت واضح ہو گئی وہ آپ کے حامی اور مددگار بن گئے۔

اس کے برخلاف شیطان کی مخالفت مثال ہے ان لوگوں کی مخالفت کی جو غرور نسب، غرور جاہ یا حسد کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے۔ مثلاً یہود اور سرداران قریش۔ اس طرح کی مخالفت کرنے والوں کی مخالفت اصل حقیقت کے واضح ہونے سے دور نہیں ہوتی بلکہ اور زیادہ بڑھ جایا کرتی ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی صداقت جتنی ہی زیادہ واضح ہوتی گئی اتنی ہی ان لوگوں کی عداوت بھی بڑھتی گئی۔

اس تصویر میں یہود اور ان کے ہم نواؤں پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ آدمؑ کی خلافت کے خلاف جس نوعیت کا غم و غصہ اور حسد ابلیس کو تھا اسی نوعیت کا غم و غصہ اور حسد اللہ کے آخری رسولؐ کے خلاف تم کو ہے۔ اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ جس طرح ابلیس کے غم و غصہ کے علی الرغم آدمؑ کی خلافت

قائم ہو کے رہی۔ اسی طرح تمہاری دشمنی اور تمہارے حسد کے علی الرغم نبی امی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت قائم ہو کے رہے گی۔

یہود کو دعوت

[۳۹ - ۱۲۱] اس حصہ میں بنی اسرائیل کو تصریح کے ساتھ مخاطب کر کے پہلے ان کو اس بات کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس نبی امی پر ایمان لائیں جس کی بعثت کی پیشین گوئیاں خود ان کے اپنے صحیفوں میں بھی موجود ہیں۔ پھر ان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جس دعوتِ حق کی تائید و حمایت میں سبقت کرنے کے لیے ان سے تورات میں عہد لیا جا چکا ہے، دنیا پرستی اور حسد میں مبتلا ہو کر اس کی مخالفت کے لیے سبقت نہ کریں۔ نیز اس ذلیل مقصد کے لیے حق اور باطل کو باہم گڈمڈ کرنے کا جو کاروبار انہوں نے جاری کر رکھا ہے اس سے باز آئیں۔ اور اس جہادِ نفس میں صبر اور نماز سے مدد حاصل کریں۔ (۴۰-۴۶)

اس کے بعد یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا کے ہاں عزت و تقرب کا ذریعہ ایمان اور عمل صالح ہے نہ کہ کسی خاص خاندان یا کسی خاص گروہ سے وابستہ ہونا۔ یہود اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ان کو جو عزت و عظمت حاصل ہوئی ہے وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہونے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اس غلط فہمی کے سبب سے ان کا سارا اعتماد ایمان اور عمل صالح کے بجائے محض اپنی خاندانی اور گروہی نسبت پر رہ گیا تھا۔ اور یہ غرہ ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے میں بہت بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ یہاں ان پر واضح کیا گیا ہے کہ تمام فضل و کرم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، جو فضل بھی تم پر ہوا ہے اسی کی طرف سے ہوا ہے اور جو فضل بھی ہو گا اسی کی طرف سے ہو گا۔ اس نے تم پر فضل بھی بڑے بڑے کیے ہیں اور تمہاری ناشکریوں پر تم کو سزائیں بھی بار بار دی ہیں۔ اس وجہ سے خاندان اور نسب کی نسبتوں کے بجائے اللہ کی طرف رجوع کرو اور اوہام میں مبتلا ہو کر حقائق سے منہ نہ موڑو۔ (۴۷-۹۳)

یہود کو تنبیہ

اس کے بعد یہود کی عہد شکنیوں کی پوری تاریخ بیان ہوئی ہے کہ انہوں نے کس کس طرح خدا سے کیے ہوئے عہد و پیمان اور خدا کے دیے ہوئے احکام توڑے ہیں اور عہد شکنی اور غداری کے لیے کیسی مجرمانہ ذہنیت شروع ہی سے ان کے اندر پرورش پاتی رہی ہے۔ نیز ان کے وہ اوہام اور وہ مشاغل بھی بیان ہوئے ہیں جن میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے ان کی نگاہوں میں خدا اور اس کی شریعت اور اس کی کتاب کی کوئی قدر سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔

یہ ساری تفصیل یہود پر یہ واضح کرنے کے لیے بیان کی گئی ہے کہ اگرچہ وہ کتاب الٰہی کے حامل ہونے کے مدعی ہیں لیکن فی الحقیقت انہوں نے اس کتاب کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے تمام عہد و پیمان انہوں نے توڑ ڈالے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کے منصبِ امامت سے معزول کرے اور یہ امانت ان کے حوالہ کرے جو اس کے اہل ہوں۔ (۹۴-۱۲۱)

حضرت ابراہیم کی سرگزشت

[۱۲۲ - ۱۶۲] اس باب میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت کا وہ حصہ بیان ہوا ہے جو خانہ کعبہ کی تعمیر نیز ایک امت

مسلمہ کے قیام اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی دعا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں پہلے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذریت کا دین اسلام تھا، نہ کہ یہودیت و نصرانیت۔ اسی اسلام کی دعوت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک امتِ وَسَط پیدا کی ہے۔ اس امتِ وسط کا قبلہ دعائے ابراہیمی کے بموجب مسجد حرام ہے نہ کہ بیت المقدس۔ بیت المقدس کی طرف اس کا نماز پڑھنا محض ایک عارضی معاملہ تھا چنانچہ اس کا قبلہ بدل دیا گیا۔

اس کے بعد ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ یہ قبلہ چونکہ ابھی مشرکین کے قبضہ میں ہے، اس وجہ سے اس کو حاصل کرنے کے لیے اہلِ ایمان کو جان اور مال کی قربانیاں بھی دینی پڑیں گی۔ اور اس جہاد میں کامیابی اللہ تعالیٰ کی مدد سے حاصل ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کی یہ مدد صبر اور نماز کے ذریعے سے حاصل ہوگی۔

اس ساری سرگزشت کے سنانے سے مقصود چونکہ یہ واضح کرنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس پیغمبر اور جس امت کے لیے دعا کی تھی وہ یہی ہیں، انہی کی دعوت اصل ملّتِ ابراہیمی کی دعوت اور انہی کا قبلہ اصل قبلۂ ابراہیمی ہے۔ اس وجہ سے اس میں خانۂ کعبہ اور مَروہ وغیرہ سے متعلق یہود کی وہ تمام تحریفات بھی بے نقاب کی گئی ہیں جو انھوں نے اپنے صحیفوں میں اس خیال سے کی تھیں کہ خانۂ کعبہ اور مروہ کی قربان گاہ کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعلق کی ہر شہادت ریکارڈ سے حذف کر دیں۔

احکام و قوانین

[۱۴۳ - ۲۴۲] یہ احکام و قوانین کا باب ہے۔ ملّتِ مسلمہ کو جو شریعت عطا ہوئی ہے اس باب میں اس شریعت کے بنیادی قوانین بیان ہوئے ہیں۔ یہود یا مشرکین نے ان احکام میں جو تحریفات کر دی تھیں یا جو بدعتیں شامل کر دی تھیں اس باب میں ان بدعتوں اور تحریفات سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے۔ ان احکام کے بیان کرنے میں فقہی ترتیب ملحوظ نہیں ہے بلکہ وقت کے حالات اور تعلیم و تربیت کے مصالح نے جس ترتیب کا تقاضا کیا ہے وہ ترتیب ملحوظ ہے۔ بالاجمال یہ احکام یہ ہیں: توحید (۱۴۳ - ۱۷۶) نماز اور زکوٰۃ (۱۷۷) قصاص اور دیت (۱۷۸، ۱۷۹) وصیت (۱۸۰ - ۱۸۲) روزہ (۱۸۳ - ۱۸۷) حرام خوری اور رشوت کی ممانعت (۱۸۸) حج اور اس تعلق سے جہاد اور انفاق کے احکام کیونکہ اس وقت تک خانۂ کعبہ پر مشرکین کا قبضہ تھا (۱۸۹ - ۲۱۸) شراب اور جوئے کی ممانعت، یتامیٰ کی اصلاحِ حال کے خیال سے ان کے معاملات کو اپنے معاملات کے ساتھ ملا لینے کی اجازت، مشرکات کے ساتھ نکاح کی ممانعت[1] (۲۱۹ - ۲۲۱) نکاح، طلاق، ایلاء، خلع، رضاعت، نان نفقہ، زوجہ متوفی عنہا، مہر اور ازدواجی زندگی سے متعلق دوسرے مسائل (۲۲۲ - ۲۴۲)

جہاد

[۲۴۳ - ۲۸۳] اس باب میں مرکزِ ملّتِ ابراہیمی — خانۂ کعبہ — کو کفار کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لیے مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا گیا ہے۔ اس جہاد ہی کے مقصد سے انفاق کا جذبہ بھڑکایا گیا ہے۔ بنی اسرائیل نے اپنے قبلہ کو فلسطینیوں سے آزاد کرانے کے لیے جو جنگ لڑی اور جو مختلف پہلوؤں سے ہمارے غزوہ بدر سے مشابہ

---

[1] یہ تینوں مسائل جیسا کہ ہم آگے چل کر ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے واضح کریں گے۔ انفاق کے حکم کے تعلق سے پیدا ہوئے ہیں۔

تھی، اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ پھر ایک جملہ معترضہ کے بعد انفاق پر مزید زور دیا گیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں مثالوں سے واضح فرمایا گیا ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں جن کو خدا تاریکی سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور کس طرح کے لوگوں کو تاریکیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد انفاق کی برکات، اس کے شرائط اس کی خصوصیات اور اس کے بعض اہم مصارف کی طرف اشارات ہیں اور ساتھ ہی جو چیز اس کی بالکل ضد ہے یعنی سود اس کی حرمت بیان کی گئی ہے اور قرض کے لین دین میں جو احتیاط اسلامی نقطۂ نظر سے ضروری ہے اس کے متعلق بعض احکام دیے گئے ہیں۔

خاتمہ [۲۸۴ - ۲۸۶] اس حصہ کی حیثیت سورہ کے خاتمہ کی ہے۔ اس میں پہلے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ آسمانؐ زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔ وہ تمام کھلے اور ڈھکے کا حساب لے گا اور پھر جس کو چاہے گا بخشے گا، اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔ اس کے بعد یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ یہ کتاب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری گئی ہے کوئی اس کو مانے یا نہ مانے لیکن اللہ تعالیٰ کے رسولؐ اور اہل ایمان نے اس کو مان لیا ہے۔ اس کے بعد اہل ایمان کی دعا پر یہ سورہ ختم ہوتی ہے۔ اس دعا کے لفظ لفظ سے کتاب الٰہی کے بارہ میں اس عظیم ذمہ داری کا احساس نمایاں ہو رہا ہے جس کو یہود اور نصاریٰ سنبھال نہ سکے اور جو اب اس امت پر ڈالی جا رہی ہے۔

سُورَةُ الْبَقَرَةِ (۲)

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۲۸۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

آیات ۱-۵

الٓمّٓ ۝۱ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا
رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴ اُولٰٓئِكَ
عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵

ترجمۂ آیات ۱-۵

یہ الف، لام، میم ہے۔ یہ کتابِ الٰہی ہے۔ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔
ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔ ان لوگوں کے لیے جو غیب میں رہتے ایمان لاتے
ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور ان کے
لیے جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی ہے اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے اور آخرت پر
یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

۱-۵

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

'حروفِ مقطعات' سورتوں کے نام ہیں

الٓمّٓ : یہ ایک مستقل جملہ ہے۔ عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق یہاں مبتدا محذوف ہے۔ اس کو ظاہر کر دیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی۔ ھٰذہٖ الٓمّٓ (یہ الف، لام، میم ہے) ہم نے ترجمہ میں اس حذف کو کھول دیا ہے۔

یہ اور اس طرح کے جتنے حروف بھی مختلف سورتوں کے شروع میں آتے ہیں چونکہ الگ الگ کرکے پڑھے جاتے ہیں اس وجہ سے ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں۔

یہ جس سورہ میں بھی آئے ہیں بالکل شروع میں اس طرح آئے ہیں جس طرح کتابوں، فصلوں اور ابواب کے شروع میں ان کے نام آیا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں۔ قرآن نے جگہ جگہ ذٰلِكَ اور تِلْكَ کے ذریعہ سے ان کی طرف اشارہ کرکے ان کے نام ہونے کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے۔ حدیثوں سے بھی ان کا نام ہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

جو سورتیں ان ناموں سے موسوم ہیں اگرچہ ان میں سے سب اپنے انہی ناموں سے مشہور نہیں ہوئیں، بلکہ بعض دوسرے ناموں سے مشہور ہوئیں لیکن ان میں سے کچھ اپنے انہی ناموں سے مشہور بھی ہیں۔ مثلاً طٰہٰ، یٰس، قٓ اور نٓ وغیرہ۔

'مقطعات' کے معانی

ان ناموں کے معانی کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا بڑا مشکل ہے اس وجہ سے ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ قرآن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ ایک بالکل واضح کتاب ہے، اس میں کوئی چیز بھی چیستاں یا معمے کی قسم کی نہیں ہے، پھر اس نے سورتوں کے نام ایسے کیوں رکھ دیے جن کے معنی کسی کو بھی نہیں معلوم؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک ان حروف کا تعلق ہے یہ اہل عرب کے لیے کوئی بیگانہ چیز نہیں تھے بلکہ وہ ان کے استعمال سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس واقفیت کے بعد قرآن کی سورتوں کا ان حروف سے موسوم ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے قرآن کے ایک واضح کتاب ہونے پر کوئی حرف آتا ہو۔ البتہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح حروف سے نام بنا لینا عربوں کے مذاق کے مطابق تھا بھی یا نہیں تو اس چیز کے مذاق عرب کے مطابق ہونے کی سب سے بڑی شہادت تو یہی ہے کہ قرآن نے نام رکھنے کے اس طریقہ کو اختیار کیا۔ اگر نام رکھنے کا یہ طریقہ کوئی ایسا طریقہ ہوتا جس سے اہل عرب بالکل ہی نامانوس ہوتے تو وہ اس پر ضرور ناک بھوں چڑھاتے اور ان حروف کی آڑ لے کر کہتے کہ جس کتاب کی سورتوں کے نام تک کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتے اس کے ایک کتاب مبین ہونے کے دعوے کو کون تسلیم کر سکتا ہے۔

قرآن پر اہل عرب نے بہت سے اعتراضات کئے اور ان کے یہ سارے اعتراض قرآن نے نقل بھی کیے ہیں لیکن ان کے اس طرح کے کسی اعتراض کا کوئی ذکر نہیں کیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان ناموں میں ان کے لیے

کوئی اجنبیت نہیں تھی۔

علاوہ بریں جن لوگوں کی نظر اہل عرب کی روایات اور ان کے لٹریچر پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اہل عرب نہ صرف یہ کہ اس طرح کے ناموں سے نامانوس نہیں تھے بلکہ وہ خود اشخاص، چیزوں، گھوڑوں، جھنڈوں، تلواروں حتیٰ کہ قصائد اور خطبات تک کے نام اسی سے ملتے جلتے رکھتے تھے۔ یہ نام مفرد حروف پر بھی ہوتے تھے اور مرکب بھی ہوتے تھے۔ ان میں یہ اہتمام بھی ضروری نہیں تھا کہ اسم اور مسمّٰی میں کوئی معنوی مناسبت پہلے سے موجود ہو بلکہ یہ نام ہی بتاتا تھا کہ یہ نام اس مسمّٰی کے لیے وضع ہوا ہے۔

اور یہ ایک بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ایک شے کے متعلق یہ معلوم ہو گیا کہ یہ نام ہے تو پھر اس کے معنی کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ نام سے اصل مقصود مسمّٰی کا اس نام کے ساتھ خاص ہو جانا ہے نہ کہ اس کے معنی۔ کم از کم فہم قرآن کے نقطۂ نظر سے ان ناموں کے معانی کی تحقیق کی تو کوئی خاص اہمیت ہے نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ چونکہ یہ نام اللہ تعالیٰ کے رکھے ہوئے ہیں اس وجہ سے آدمی کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ضرور یہ کسی نہ کسی مناسبت کی بنا پر رکھے گئے ہوں گے۔ یہ خیال فطری طور پر طبیعت میں ایک جستجو پیدا کر دیتا ہے۔ اسی جستجو کی بنا پر ہمارے بہت سے پچھلے علماء نے ان ناموں پر غور کیا اور ان کے معنی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ان کی جستجو سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا لیکن ہمارے نزدیک ان کا یہ کام بجائے خود غلط نہیں تھا اور اگر ہم بھی ان پر غور کریں گے تو ہمارا یہ کام بھی غلط نہیں ہو گا۔ اگر اس کوشش سے کوئی حقیقت واضح ہوئی تو اس سے ہمارے علم میں اضافہ ہو گا اور اگر کوئی بات نہ مل سکی تو اس کو ہم اپنے علم کی کوتاہی اور قرآن کے اتھاہ ہونے پر محمول کریں گے۔ یہ رائے بہر حال نہیں قائم کریں گے کہ یہ نام ہی بے معنی ہیں۔

اپنے علم کی کمی اور قرآن کے اتھاہ ہونے کا یہ احساس بجائے خود ایک بہت بڑا علم ہے۔ اس احساس سے علم و معرفت کی بہت سی بند راہیں کھلتی ہیں۔ اگر قرآن کا پہلا ہی حرف اس عظیم انکشاف کے لیے کلید بن جائے تو یہ بھی قرآن کے بہت سے معجزوں میں سے ایک معجزہ ہو گا۔ یہ اسی کتاب کا کمال ہے کہ اس کے جس حرف کا راز کسی پر نہ کھل سکا اس کی پیدا کردہ کاوش ہزاروں سربستہ اسرار سے پردہ اٹھانے کے لیے دلیل راہ بنی۔

حروف مقطعات کے متعلق امام فراہیؒ کا نقطۂ نظر

ان حروف پر ہمارے پچھلے علماء نے جو آراء ظاہر کی ہیں ہمارے نزدیک وہ تو کسی مضبوط بنیاد پر مبنی نہیں ہیں اس وجہ سے ان کا ذکر کرنا کچھ مفید نہیں ہو گا۔ البتہ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اجمالاً میں یہاں پیش کرتا ہوں۔ اس سے اصل مسئلہ اگرچہ حل نہیں ہوتا لیکن اس کے حل کے لیے ایک راہ کھلتی ضرور نظر آتی ہے۔ کیا عجب کہ مولانا نے جو سراغ دیا ہے دوسرے اس کی رہنمائی سے کچھ مفید نشانات راہ اور معلوم کر لیں اور اس طرح درجہ بدرجہ تحقیق کے قدم کچھ اور آگے بڑھ جائیں۔

جو لوگ عربی رسم الخط کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ عربی زبان کے حروف عبرانی سے لیے گئے ہیں اور عبرانی کے یہ حروف ان حروف سے ماخوذ ہیں جو عرب قدیم میں رائج تھے۔ عرب قدیم کے ان حروف

کے متعلق استاذ امام ؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ انگریزی اور ہندی کے حروف کی طرح صرف آواز ہی نہیں بتاتے تھے بلکہ یہ چینی زبان کے حروف کی طرح معانی اور اشیاء پر بھی دلیل ہوتے تھے اور جن معانی یا اشیاء پر وہ دلیل ہوتے تھے عموماً انہی کی صورت و ہیئت پر لکھے بھی جاتے تھے۔ مولانا ؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہی حروف ہیں جو قدیم مصریوں نے اخذ کیے اور اپنے تصورات کے مطابق ان میں ترمیم و اصلاح کر کے ان کو اس خط تمثالی کی شکل دی جس کے آثار اہرام مصر کے کتبات میں موجود ہیں۔

ان حروف کے معانی کا علم اب اگرچہ مٹ چکا ہے تاہم بعض حروف کے معنی اب بھی معلوم ہیں اور ان کے لکھنے کے ڈھنگ میں بھی ان کی قدیم شکل کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔ مثلاً الف کے متعلق معلوم ہے کہ وہ گائے کے معنی بتاتا تھا اور گائے کے سر کی صورت ہی پر لکھا جاتا تھا۔ "ب" کو عبرانی میں بیت کہتے بھی ہیں اور اس کے معنی بھی "بیت" (گھر) کے ہیں۔ "ج" کا عبرانی تلفظ جیمل ہے جس کے معنی جمل (اونٹ) کے ہیں۔ "ط" سانپ کے معنی میں آتا تھا اور لکھا بھی کچھ سانپ ہی کی شکل پر جاتا تھا۔ "م" پانی کی لہر پر دلیل ہوتا تھا اور اس کی شکل بھی لہر سے ملتی جلتی بنائی جاتی تھی۔

مولانا اپنے نظریہ کی تائید میں سورہ "ن" کو پیش کرتے ہیں۔ حرف "نون" اب بھی اپنے قدیم معنی ہی میں بولا جاتا ہے۔ اس کے معنی مچھلی کے ہیں اور جو سورہ اس نام سے موسوم ہوئی ہے اس میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر صاحب الحوت (مچھلی والے) کے نام سے آیا ہے۔ مولانا اس نام کو پیش کر کے فرماتے ہیں کہ اس سے ذہن قدرتی طور پر اس طرف جاتا ہے کہ اس سورہ کا نام نون ؒ (ن) اسی وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں صاحب الحوت (یونس علیہ السلام) کا واقعہ بیان ہوا ہے جن کو مچھلی نے نگل لیا تھا۔ پھر کیا عجب ہے کہ بعض دوسری سورتوں کے شروع میں جو حروف آئے ہیں وہ بھی اپنے قدیم معانی اور سورتوں کے مضامین کے درمیان کسی مناسبت ہی کی بنا پر آتے ہوں۔

قرآن مجید کی بعض اور سورتوں کے ناموں سے بھی مولانا کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً حرف "ط" کے معنی، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، سانپ کے تھے اور اس کے لکھنے کی ہیئت بھی سانپ کی ہیئت سے ملتی جلتی ہوتی تھی۔ اب قرآن میں سورہ طٰہٰ کو دیکھیے جو "ط" سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں ایک مختصر تمہید کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی لٹھیا کے سانپ بن جانے کا قصہ بیان ہوتا ہے۔ اسی طرح طٰسٓمٓ، طٰسٓ وغیرہ بھی "ط" سے شروع ہوتی ہیں اور ان میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لٹھیا کے سانپ کی شکل اختیار کر لینے کا معجزہ مذکور ہے۔

"الف" کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ گائے کے سر کی ہیئت پر لکھا بھی جاتا تھا اور گائے کے معنی بتاتا بھی تھا۔ اس کے دوسرے معنی اللہ واحد کے ہوتے تھے۔ اب قرآن مجید میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سورۂ بقرہ میں جس کا نام الف سے شروع ہوتا ہے، گائے کے ذبح کا قصہ بیان ہوا ہے۔ دوسری سورتیں جن کے نام الف سے شروع

ہوتے ہیں توحید کے مضمون میں مشترک نظر آتی ہیں۔ یہ مضمون ان میں خاص اہتمام کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان ناموں کا یہ پہلو بھی خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ جن سورتوں کے نام ملتے جلتے سے ہیں ان کے مضامین بھی ملتے جلتے ہیں بلکہ بعض سورتوں میں تو اسلوبِ بیان تک ملتا جلتا ہے۔

میں نے مولانا کا یہ نظریہ، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، محض اس خیال سے پیش کیا ہے کہ اس سے حروفِ مقطعات پر غور کرنے کے لیے ایک علمی راہ کھلتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی حیثیت ابھی تک ایک نظریہ سے زیادہ نہیں ہے۔ جب تک تمام حروف کے معانی کی تحقیق ہو کر ہر پہلو سے ان ناموں اور ان سے موسوم سورتوں کی مناسبت واضح نہ ہو جائے اس وقت تک اس پر ایک نظریہ سے زیادہ اعتماد کر لینا صحیح نہیں ہوگا۔ یہ محض علومِ قرآن کے قدردانوں کے لیے ایک اشارہ ہے، جو لوگ مزید تحقیق و جستجو کی ہمت رکھتے ہیں وہ اس راہ میں قسمت آزمائی کریں، شاید اللہ تعالیٰ اس راہ سے یہ مشکل آسان کر دے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲)

اشارہ قریب و بعید کی حقیقت

ذٰلِكَ: اہلِ نحو کہتے ہیں کہ 'ذٰلِكَ' اشارہ بعید کے لیے آتا ہے اور 'هٰذَا' اشارہ قریب کے لیے۔ اس سے عام طور پر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اگر کسی فاصلہ کی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہو تو 'ذٰلِكَ' لائیں گے اور اگر قریب کی کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہو تو 'هٰذَا' استعمال کریں گے۔ لیکن اہلِ نحو کا مطلب قرب اور بعد سے یہ نہیں ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز مخاطب کے علم میں ہے یا جس کا ذکر گفتگو میں ہو چکا ہے اگر اس کی طرف اشارہ کرنا ہو تو وہاں 'ذٰلِكَ' استعمال کریں گے اور اگر کسی ایسی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہو جس کا ذکر آگے آ رہا ہو تو وہاں 'هٰذَا'[1] لائیں گے۔ اہلِ زبان ان دونوں اشارات کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر کبھی ان کو اس عام ضابطہ کے خلاف استعمال کرتے ہیں تو بلاغت کے کسی نکتہ کو ملحوظ رکھ کر کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی سابق الذکر چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لیے 'هٰذَا' استعمال کر دیں تو اس سے مقصود اس شے کو نگاہوں کے سامنے حاضر کر دینا ہوگا۔ اسی طرح اگر کہیں 'هٰذَا' کی جگہ 'ذٰلِكَ' استعمال ہوتا ہے تو اس سے عموماً مقصود اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی شان اس سے ارفع ہے کہ اس کو سامنے لا کھڑا کیا جائے۔

یہاں ذٰلِكَ کا اشارہ سورہ کے اس نام کی طرف ہے جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ الٓمّٓ قرآن عظیم کا ایک حصہ ہے۔ قرآن میں اس قسم کے اشارات کی نظیریں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً حٰمٓ

---

[1] ان اشارات میں مذکر و مونث کا فرق بلاغت کے بعض تقاضوں کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہاں ہم تحقیقِ الفاظ میں ایک خاص حد سے آگے نہیں جانا چاہتے اس وجہ سے ان چیزوں سے زیادہ تعرض نہیں کریں گے جو دوسرے اہلِ تحقیق کی کتابوں میں بھی آسانی سے مل سکیں گی۔ بس اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ کبھی اشارہ میں معہود ذہنی کتاب یا قرآن ہوتا ہے کبھی سورہ۔ اس وجہ سے اشارہ کہیں ذٰلِكَ آتا ہے اور کہیں تِلْكَ۔

حٰمٓ ۔ عٓسٓقٓ ۔ کَذٰلِکَ یُوْحِیْٓ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ اللّٰہُ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (شوریٰ ۱-۳)
(یہ حٰم عسق ہے۔ اسی طرح خدائے عزیز و حکیم تمہاری طرف وحی کرتا ہے اور اسی طرح اس نے ان لوگوں کی طرف وحی کی جو تم سے پہلے گزرے) طٰسٓ تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَکِتَابٍ مُّبِیْنٍ ۝ (النمل) (یہ طٰس ہے۔ یہ قرآن اور ایک کتاب مبین کی آیتیں ہیں۔

لفظ کتاب کے معانی — اَلْکِتٰبُ : قرآن مجید میں کتاب کا لفظ پانچ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔ نوشتۂ تقدیر۔ مثلاً لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ فِیْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۶۸۔ انفال) اگر نوشتۂ الٰہی نہ گزر چکا ہوتا تو جس چیز میں تم مبتلا ہوئے اس کے باعث تمہیں ایک دردناک عذاب آ پکڑتا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا وہ رجسٹر جس میں ہر چیز ریکارڈ ہے۔ مثلاً وَعِنْدَنَا کِتٰبٌ حَفِیْظٌ (۴، ق) (اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے محفوظ رکھنے والی)

۳۔ خط اور پیغام۔ مثلاً اِنِّیْٓ اُلْقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ کَرِیْمٌ (۲۹۔ نمل) (میرے پاس ایک گرامی نامہ بھجوایا گیا ہے)

۴۔ احکام و قوانین۔ مثلاً وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (۲۔ جمعہ) (اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا کلام۔ اپنے اسی معنی کے لحاظ سے یہ لفظ کتاب الٰہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد کتاب الٰہی کا کوئی خاص حصہ بھی ہوا کرتا ہے اور اس کا مجموعہ بھی۔

مجموعہ کے مفہوم کے لیے نظیر اعراف کی یہ آیت ہے۔ وَالَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ (۱۷۰۔ اعراف) (اور جو کتاب الٰہی کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں)

دوسرے معنی کے لیے نظیر سورۂ آل عمران کی یہ آیت ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰہِ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ (۲۳۔ آل عمران) (ذرا دیکھو ان کو جنھیں کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا ان کو دعوت دی جا رہی ہے اللہ کی کتاب کی طرف تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے)

جس طرح کوئی لفظ اپنے مختلف معانی میں سے کسی ایک اعلیٰ اور برتر معنی کے لیے خاص ہو جایا کرتا ہے، اسی طرح یہ کتاب کا لفظ بھی خاص طور پر کتاب الٰہی کے لیے بولا جانے لگا۔ چنانچہ یہ استعمال قدیم زمانہ سے معروف ہے۔ یہود انبیاء کے صحیفوں میں سے ہر صحیفہ کو سِفر کہتے تھے جس کے معنی کتاب کے ہیں۔ عیسائی مترجموں نے ان کتابوں کو بائیبل کا نام دیا اس کے معنی بھی یونانی میں کتاب ہی کے ہیں۔ اسی طرح ان صحیفوں کے لیے (Scriptures) کا لفظ استعمال ہوا جس کے معنی لاطینی میں کتاب کے ہیں۔ الغرض کتاب کا لفظ کتاب اللہ کے لیے کوئی نیا استعمال نہیں ہے، یہ استعمال جیسا کہ واضح ہوا، بہت قدیم ہے۔ قرآن نے بھی اس معنی میں اس لفظ کو استعمال کیا اور اپنے استعمالات سے اس کے اس معنی کو اس قدر واضح کر دیا کہ اس کے مخاطب اس استعمال کو بے تکلف سمجھنے لگ گئے۔

’لَا رَیْبَ فِیْہِ‘ کا صحیح مفہوم — لَا رَیْبَ فِیْہِ : ریب کے معنی شک کے ہیں۔ ”اس میں کوئی شک نہیں ہے“ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کتاب

الٰہی ہونے یا ایک کتاب منزل ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ جملہ پہلے جملہ کی خبر نہیں بلکہ اس کی تاکید ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کے معنی ہیں، یہ کتابِ الٰہی ہے۔ اس کے بعد یہ تاکید اسی حقیقت کو مزید قوت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے کہ اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اگر اس کے معنی یہ نہ لیے جائیں تو پھر اس ٹکڑے کے لئے یہاں کوئی موزوں موقع ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ قرآن مجید کے نظائر سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً اسی سورہ میں چند ہی آیات کے بعد فرمایا ہے۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (۲۳۔ بقرہ) (اور اگر تم اس کی طرف سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر اتاری ہے تو لاؤ اس کے مانند کوئی ایک سورہ) الٓمّٓ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱۔ السجدہ ۲) (الٓمّٓ، کتاب کی تنزیل، جس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، عالم کے خداوند کی طرف سے ہے)۔ حٰمٓ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۱-۲ مومن) (حٰمٓ، کتاب کا اتارنا خدائے عزیز و علیم کی طرف سے ہے)

عام طور پر لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اس کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس میں شک کیا جا سکے۔ اگرچہ بجائے خود یہ ایک حقیقت ہے، قرآن میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہو لیکن ہمارے نزدیک اس جملہ کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔

اولاً تو قرآن کے نظائر جو ہم نے پیش کیے ہیں اس مطلب کے خلاف ہیں۔ ثانیاً شک و شبہ کتاب کی صفات میں سے نہیں ہے بلکہ آدمی کے ذہن کی صفات میں سے ہے۔ ایک ٹیڑھے ذہن کا آدمی سیدھی سے سیدھی بات میں سے بھی کوئی نہ کوئی ٹیڑھ نکال ہی لیتا ہے اس وجہ سے اس بات کے کہنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ ثالثاً شک و شبہ کا سوال درحقیقت پیدا کسی دعوے سے متعلق ہوتا ہے، یہاں دعویٰ یہ ہے کہ یہ کتابِ الٰہی ہے، اس وجہ سے اگر شک کی نفی کی ضرورت ہے تو اس دعویٰ سے متعلق ہے نہ کہ کتاب سے متعلق۔ رابعاً کتاب سے متعلق شک کی نفی سے کتاب کی شان میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا کیونکہ اس طرح کے شک کی نفی ریاضی یا اقلیدس کی کسی کتاب کے بارہ میں بھی کی جا سکتی ہے۔ خامساً قرآن کے ابتدائی مخاطبین کی اصل الجھن یہ نہیں تھی کہ قرآن کی کچھ باتیں ان کو مشکوک و مشتبہ معلوم ہوتی تھیں بلکہ ان کی اصلی الجھن یہ تھی کہ اس کتاب کو اللہ کی اتاری ہوئی بتایا جاتا تھا اور وہ اس کو اللہ کی اتاری ہوئی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ سادساً اگر کتاب سے متعلق شک کی نفی کر بھی دی جائے تو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ اس کے خدا کی طرف سے ہونے کا مسئلہ پھر بھی مشکوک ہی رہا۔ ہاں اس کا خدا کی طرف سے ہونا غیر مشکوک ہو جائے تو پھر اس کا ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہونا آپ سے آپ ثابت ہو جاتا ہے۔

ھُدًی کی تحقیق

ھُدًی: ھدی کا لفظ عربی زبان میں بھی اور قرآن مجید میں بھی کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جن معانی کے نظائر خود قرآن میں موجود ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ قلبی نور و بصیرت۔ مثلاً وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (۱۷۔ محمد) (اور جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں اللہ ان کی قلبی بصیرت میں اضافہ فرماتا ہے)

۲۔ دلیل و حجت اور نشانِ راہ۔ مثلاً اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى (۱۰۔ طٰہٰ) (یا مجھے آگ کے پاس پہنچ کر کوئی نشانِ راہ مل جائے)۔ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (۸۔ حج) (بغیر کسی علم، بغیر کسی دلیل اور بغیر کسی روشن کتاب کے)

۳۔ سیدھا اور صاف راستہ۔ مثلاً اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ (۶۷۔ حج) (بے شک تم ایک سیدھے راستے پر ہو) یہیں سے یہ لفظ طریقہ اور شریعت کے معنی میں استعمال ہوا۔ اس معنی کی مثالیں بھی قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (۹۰۔ انعام) (پس ان کے طریقہ کی پیروی کر) اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (۷۳۔ آلِ عمران) (اور شریعت تو بس اللہ کی شریعت ہے)

۴۔ فعلِ ہدایت۔ مثلاً لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (۲۷۲۔ بقرہ) (تمہارے ذمہ ان کو ہدایت دینا نہیں ہے بلکہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے)

قرآن مجید ظاہر ہے کہ ان چاروں معنوں کے اعتبار سے ھدی ہے۔

متقی کا مفہوم

لِلْمُتَّقِيْنَ: حرفِ لام بیانِ انتفاع کے مفہوم میں ہے، یعنی اس کتاب سے فائدہ وہی لوگ اٹھائیں گے جو متقی ہیں۔ جس طرح سورج چمکتا تو سب کے لیے ہے لیکن اس سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو آنکھیں رکھتے بھی ہیں اور جو ان آنکھوں کو دیکھنے کے لیے کھولتے بھی ہیں۔ اسی طرح یہ کتاب اتری تو سب ہی کی ہدایت کے لیے ہے لیکن چونکہ اس سے فائدہ فی الحقیقت وہی لوگ اٹھائیں گے جن کے اندر خدا کا خوف ہو، اس وجہ سے فرمایا کہ یہ متقین کے لیے ہدایت ہے۔

متقی کا لفظ اتقاء سے ہے۔ اتقاء کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ہم مثالوں سے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

۱۔ جس چیز سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو اس سے بچنا۔ مثلاً فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا (۱۷۔ مزمل) (اگر تم نے کفر کیا تو اس دن سے کیسے بچ سکو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا)

۲۔ کسی آفت کے ظہور سے اندیشہ ناک رہنا۔ مثلاً وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (۲۵۔ انفال) (اور اس آفت سے چوکنے رہو جو خاص طور پر انہی پر نہیں آئے گی جنہوں نے تم میں سے ظلم کا ارتکاب کیا ہوگا)

۳۔ اس ربِ قدوس سے برابر لرزتے اور کانپتے رہنا جو اپنے شکر گزار اور وفادار بندوں پر رحم فرماتا ہے، جو کفر و معصیت کو ناپسند کرتا ہے اور جو ہر ظاہر و پوشیدہ سے باخبر ہے۔ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا (۷۳۔ زمر) (اور جو لوگ اپنے پروردگار سے برابر ڈرتے رہے ان کو گروہ در گروہ جنت کی طرف

سے جایا جائے گا۔

۴۔ اس کا چوتھا مفہوم مذکورہ تینوں مفہوموں کا جامع ہے۔ یعنی گناہ سے اس کے بُرے نتائج اور خدا کے غضب کے ڈر سے بچتے رہنا۔ جب یہ لفظ مفعول کے بغیر استعمال ہوتا ہے تو عموماً یہی معنی مراد ہوتے ہیں اور اسی چیز کو تقوےٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۱۷۹۔ آل عمران)
(اگر تم ایمان لاؤگے اور تقویٰ اختیار کروگے تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہے)

اس تشریح کی روشنی میں متقی وہ شخص ہوگا جس کے دل میں خدا کی عظمت اور اس کے غضب کا خوف سمایا ہوا ہو اور جس کو گناہوں کے نتائج کا پورا پورا احساس ہو۔

تقویٰ میں عمل کی نسبت کیفیت اور حال کا پہلو اور فعل کے بالمقابل ترک کا پہلو اگرچہ زیادہ نمایاں ہے اور اس پہلو سے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں نفی اثبات پر غالب ہے لیکن چونکہ یہ دل کی تندرستی کی دلیل ہے اور دل تندرست ہو تو سب کچھ تندرست ہے اس وجہ سے اس سے علم اور عمل دونوں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳)

ایمان کے معنی

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ : ایمان، امن سے ہے۔ ایمان کے اصل معنی امن دینے کے ہیں۔ اگر اس کا صلہ لام کے ساتھ آئے تو اس کے معنی تصدیق کرنے اور ب کے ساتھ آئے تو یقین اور اعتماد کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ اس لفظ کی حقیقی روح یقین، اعتماد اور اعتقاد ہے۔ جو یقین، خشیت، توکل اور اعتقاد کی خصوصیات کے ساتھ پایا جائے اس کو ایمان کہتے ہیں۔ جو شخص اللہ تعالےٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کرکے اس کے فیصلوں پر پوری طرح راضی اور مطمئن ہو جائے وہ مومن ہے۔

یہ لفظ جب اپنے مفعول کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس سے خاص اسی چیز پر ایمان لانا مراد ہوتا ہے جس کا اس کے مفعول کی حیثیت سے ذکر ہوتا ہے لیکن اگر مفعول کے بغیر آئے تو اس کے تحت وہ ساری ہی چیزیں آسکتی ہیں جن پر ایمان لانے کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے یا جن پر قرینہ دلیل بن سکتا ہے۔

لفظ 'غیب' کی تحقیق

'غیب' کا لفظ قرآن مجید میں مندرجہ ذیل معنوں میں آیا ہے۔

وہ جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو۔ اس کا مدمقابل لفظ شہادت ہے۔ اللہ تعالےٰ کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان چیزوں سے بھی باخبر ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں اور ان چیزوں سے بھی باخبر ہے جو ہمارے سامنے ہیں۔

وہ چیز جس کے جاننے کا آدمی کے پاس کوئی ذریعہ نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن میں نقل ہے وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ (۱۸۸۔ اعراف) (اگر مجھے غیب کا پتہ ہوتا تو میں خیر میں بہت سا اضافہ کر لیتا)

وہ جگہ جو آدمی کے سامنے نہ ہو یا وہ سمت جو متعین نہ ہو رہی ہو۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ

إِلَيْكَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ (۱۰۲- یوسف) (یہ غیب کے واقعات میں سے ہے جس کو ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں اور جب وہ اپنے فیصلہ پر متفق ہوئے تو تم ان کے پاس موجود نہ تھے)

راز کے معنی میں بھی اس لفظ کا استعمال عام ہے مثلاً نیک بیبیوں کی تعریف میں آتا ہے۔ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ (وہ راز کی حفاظت کرنے والیاں ہیں)

بِالْغَيْبِ میں 'ب' ظرفیت کی ہے

'بِالْغَيْبِ' کی ب کے بارہ میں بھی دو رائیں ہو سکتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس کو ظرف کے معنی میں لیا جائے یعنی وہ غیب میں ہوتے ہوئے ایمان لاتے ہیں۔ اس معنی کی متعدد مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَهُم مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ (۴۹- انبیاء) (جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں ہوتے ہوئے اور قیامت سے ڈرنے والے ہیں) إِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ (۱۸- فاطر) (تم انہی کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں ہوتے ہوئے اپنے رب سے ڈریں اور نماز قائم کریں)

اس صورت میں يُؤْمِنُونَ عام رہے گا اور وہ تمام چیزیں اس کے تحت آسکیں گی جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان لانے کے لیے وہ اس بات کے منتظر نہیں ہیں کہ تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں، بلکہ وہ مشاہدہ کے بغیر محض عقل و فطرت کی شہادت اور پیغمبر کی دعوت کی بنا پر ان تمام چیزوں پر ایمان لاتے ہیں جن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ سلف میں سے ربیع بن انس نے یہی تاویل اختیار کی ہے اور ہم نے بھی ترجمہ میں اسی کو ترجیح دی ہے۔

دوسری رائے یہ ہو سکتی ہے کہ اس کو صلہ کی 'ب' مانا جائے اور بِالْغَيْبِ کو يُؤْمِنُونَ کا مفعول قرار دیا جائے۔ یہ رائے اگرچہ اکثریت کی رائے ہے، اور زبان کے اعتبار سے اس میں کوئی نقص بھی نہیں ہے لیکن مندرجہ ذیل وجوہ سے ہمیں یہ رائے کچھ زیادہ قوی نہیں معلوم ہوتی۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس صورت میں ایمان صرف غیب کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ جاتا ہے۔ غیب کے سوا بقیہ ساری چیزیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے، ایمان کے دائرہ سے باہر ہی رہ جاتی ہیں، برعکس اس کے پہلی صورت میں وہ تمام چیزیں ایمان کے دائرہ میں آجاتی ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے اور جن کی قرآن نے دوسرے مواقع پر تفصیل بیان کردی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ لفظ غیب کا اطلاق چاہے ان تمام چیزوں پر ہوتا ہو جن پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن نبی اور کتاب پر تو اس کا اطلاق بہر حال نہیں ہوتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ دونوں چیزیں جن پر اللہ تعالیٰ کے بعد ایمان لانا سب سے زیادہ ضروری ہے یہاں ایمان سے کیوں خارج کردی گئیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ غیب کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی نہیں بولا گیا ہے۔ غیب اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے نہیں ہے۔ اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوتے کہ یہاں اللہ تعالیٰ بھی ایمان کے اجزاء میں

شامل نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ بھی ایمان کے اجزا میں شامل نہیں ہے تو ایمان بالغیب کے تحت صرف آخرت اور فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ٹھہرتا ہے یا زیادہ سے زیادہ مستقبل کے حوادث پر۔ آخر ایمان کے دائرہ کو اس قدر محدود کر دینے کی کیا وجہ ہے؟

چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ دوسری تاویل لینے والے حضرات کہتے ہیں کہ غیب سے مراد احوالِ آخرت ہیں۔ اگر احوالِ آخرت ہی مراد ہیں تو آخرت کا ذکر تو آگے اسی سلسلہ میں مستقل طور پر آ ہی رہا ہے، فرمایا ہے۔ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں) آخر ایک ہی سلسلہ میں ایک ہی بات کو اس طرح دہرانے کی کیا ضرورت تھی؟

پانچویں وجہ یہ ہے کہ پہلی تاویل سے ایک بہت بڑی حقیقت سامنے آتی ہے جس سے یہ دوسری تاویل بالکل خالی ہے، وہ یہ کہ ایمان یا خشیت وہی معتبر ہے جو بصیرت اور تقویٰ سے پیدا ہو، جو ایمان یا خشیت گناہوں کے نتائج سامنے آجانے کے بعد پیدا ہو خدا کے ہاں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کا عذاب دیکھ کر ایمان لاتے ان کے بارہ میں اس کا ارشاد یہ ہے، اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (تو کیا پھر جب عذاب آ نازل ہی ہوگا تب ہی اس کو مانو گے، اس وقت تم کہیں گے اب! حالانکہ اس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے) (۵۱-یونس)

ظرفیت کے مفہوم کے خلاف ایک بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ جہاں جہاں بھی، قرآن میں لفظ ایمان کے ساتھ 'ب' آئی ہے کہیں بھی ظرفیت کے مفہوم میں نہیں آئی ہے، لیکن یہ بات کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ اس کے جواب میں بالکل اسی کے برابر کی بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ بالغیب کا لفظ قرآن میں جہاں جہاں بھی آیا ہے ظرف ہی کے طور پر آیا ہے، کہیں بھی مفعول کے طور پر نہیں آیا ہے، اس وجہ سے جہاں تک قرآن کے نظائر کا تعلق ہے وہ ظرفیت کے مفہوم کے حق میں زیادہ نمایاں ہیں۔

اقامت صلوٰۃ کا مفہوم

يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ: اقامت کے معنی کسی چیز کو کھڑے کرنے یا اس طرح سیدھے کرنے کے ہیں کہ اس میں کوئی ٹیڑھ باقی نہ رہ جائے۔ فرمایا ہے وہ نماز قائم کرتے ہیں، یہ نہیں کہا ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں۔ قرآن نے نماز کے لیے قائم کرنے کا لفظ استعمال کر کے ایک ہی ساتھ کئی حقیقتوں کی طرف توجہ دلا دی ہے۔

پہلی چیز جس کی طرف یہ لفظ متوجہ کرتا ہے وہ نماز میں اخلاص ہے یعنی نماز صرف اللہ ہی کے لیے پڑھی جائے کسی اور کو اس میں شریک نہ کیا جائے۔ اس کے اندر سیدھے کرنے کا جو مفہوم ہے اس کا تقاضا اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ ہی کے لیے نہ پڑھی جائے۔ دوسرے مقام پر یہ حقیقت واضح لفظوں میں بھی بیان کر دی ہے۔ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۲۹-اعراف) (اور اسی کی طرف اپنے رخ کرو ہر مسجد کے پاس اور اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے)

یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ نماز میں رُخ قبلہ کی طرف ہونا چاہیے کیونکہ وہی توحید اور اخلاص کا مرکز ہے۔

دوسری چیز جس کی طرف یہ لفظ اشارہ کرتا ہے وہ نماز کے اصل مقصود پر دل کو پوری طرح جمانا ہے۔ نماز کا اصل مقصود ذکرِ الٰہی میں خشوع و خضوع ہے، اگر آدمی اس چیز سے غافل ہو کر نماز پڑھے تو یہ نماز کو قائم کرنا نہیں ہوا بلکہ محض جِھدا اتارنا ہوا اس حقیقت کی طرف بھی قرآن نے بعض مقامات میں توجہ دلائی ہے، مثلاً وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ (۴۔ طٰہٰ) (اور نماز کو میرے ذکر کے لیے قائم کرو) دوسری جگہ فرمایا ہے، قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ (۱-۲۔ مومنون) (ان مومنوں نے فلاح پائی جو اپنی نمازیں خضوع و خشوع سے ادا کرتے ہیں)

تیسری چیز یہ ہے کہ نماز بغیر کسی کمی بیشی کے اس طریقہ کے مطابق ادا کی جائے جس طریقہ پر اللہ تعالیٰ نے اس کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے، فَاِذَاۤ اَمِنۡتُمۡ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُمۡ (۲۳۹۔ بقرۃ) (پس جب تم امن میں ہو جاؤ تو اس طریقہ پر اللہ کو یاد کرو جو طریقہ اس نے تم کو سکھایا ہے)

نماز کی صفوں کا ٹھیک کرنا اور ارکانِ نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا بھی اس میں شامل ہے، اسی وجہ سے حدیث میں آیا ہے کہ تسویۃ الصفوف من اقامۃ الصلوٰۃ (صفوں کو برابر کرنا بھی اقامت صلوٰۃ کا ایک جزو ہے)

چوتھی چیز اوقاتِ نماز کی پوری پوری پابندی ہے، فرمایا ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ (۷۸۔ اسراء) (اور نماز قائم کرو سورج کے زوال کے وقت سے لے کر رات کے تاریک ہونے تک اور صبح کے وقت کا قرآن پڑھنا)

اسی چیز کو دوسرے مقامات میں نمازوں کی نگرانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حٰفِظُوۡا عَلَی الصَّلَوٰتِ (۲۳۸۔ بقرۃ)

پانچویں چیز نماز پر قائم رہنا ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔ ہُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ دَآئِمُوۡنَ (۲۳۔ معارج) (وہ اپنی نمازوں پر برابر قائم رہتے ہیں)

چھٹی چیز جمعہ و جماعت کا قیام و اہتمام ہے، خصوصیت کے ساتھ جب امت یا امام کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تب تو واضح طور پر جمعہ و جماعت کا قیام و اہتمام ہی مدِنظر ہوتا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو۔ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ (اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے) (۴۱۔ حج) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا جس میں انہوں نے اپنی ذریّت کا مشن بتایا ہے، ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے۔ رَبَّنَاۤ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (۳۷۔ ابراھیم) (اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اس بن کھیتی کی زمین میں تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے، اے ہمارے رب، تاکہ یہ نماز قائم کریں)

لفظ صلوٰۃ کی حقیقت

صلوٰۃ کا لفظ اصل لغت میں کسی شے کی طرف متوجہ ہونے کے لیے آیا ہے۔ پھر یہیں سے یہ لفظ
رکوع کے معنی میں اور پھر تعظیم و تضرع اور دعا کے معنوں میں استعمال ہوا۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی
تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ عبادت کے معنی میں بہت قدیم ہے۔ کلدانی میں دعا اور تضرع کے معنی ہیں اور عبرانی میں
رکوع اور نماز کے معنی میں یہ استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ ایک اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے
جس کی وضاحت قرآن نے بھی کر دی ہے اور سنت نے بھی اس کی پوری وضاحت کی ہے۔ علاوہ ازیں امت کے
قولی و عملی تواتر نے اس کی شکل و ہیئت اور اس کے اوقات بالکل محفوظ رکھے ہیں۔ اگر اس کے کسی جزو میں کوئی
اختلاف ہے تو وہ محض فروعی قسم کا ہے جس سے اصل حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (۴)

ایمان اور ایقان کے درمیان فرق

وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ : آخرت سے مراد دار آخرت یا حیات آخرت ہے۔ آخرت کے لیے یہاں
ایمان کے بجائے ایقان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ایمان اور ایقان کے درمیان تھوڑا سا فرق ہے جس کو سمجھ لینا
چاہیے۔ ایمان کے معنی تصدیق کرنے اور مان لینے کے ہیں۔ اس کا ضد کفر و انکار اور تکذیب ہے۔ ایقان کے
معنی یقین کرنے کے ہیں۔ اس کا ضد گمان اور شک ہے جس طرح کسی شے پر یقین رکھنے کے لیے یہ ضروری
نہیں ہے کہ آدمی اس پر ایمان بھی رکھتا ہو،[1] اسی طرح کسی چیز پر ایمان رکھنے کے لیے اس پر یقین کرنا شرط نہیں
ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آدمی کا ایمان محض گمان غالب پر مبنی ہو اور وہ آہستہ آہستہ گمان کی منزل سے نکل کر یقین
کی منزل تک پہنچے اور اس طرح اس کے ایمان کی تکمیل ہو جائے۔ یہاں ایقان کا ذکر ایمان اور ایمان کے چند
معروف عملی مظاہر کے بعد ہوا ہے جس سے اس بات کا اشارہ نکلتا ہے کہ جو لوگ مذکورہ اوصاف کے حامل ہیں
درحقیقت وہی لوگ ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

أُولَٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۵)

ھُدٰی کا مفہوم

عَلَىٰ هُدًى : ھدی کے مختلف معانی اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں مذکورہ معانی میں سے نور و بصیرت کے
معنی بھی لیے جا سکتے ہیں اور صراط مستقیم کے معنی بھی لیے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں معنوں میں سے جو معنی
بھی لے لیا جائے آیت کی تاویل ٹھیک بن جاتی ہے اور لغت اور استعمالات قرآن سے اس کی تائید
ہوتی ہے۔

الْمُفْلِحُونَ : اس لفظ کی اصلی روح انشراح اور انکشاف ہے اور اس سے مراد وہ فائز المرامی اور کامیابی ہوتی
ہے جو اگرچہ حاصل تو ہو ایک صبر آزما اور جاں گسل جدوجہد کے بعد لیکن جب حاصل ہو تو محنت کرنے والے
نہال ہو جائیں اور ان کی توقعات کے سارے پیمانے اس کے ناپنے سے قاصر رہ جائیں۔

---

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو نشانیاں دکھائیں فرعون کو پورا یقین تھا کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں لیکن اس یقین کے باوجود وہ ان پر ایمان نہیں لایا۔

۲۔ مجموعۂ آیات ۱۔۵ کے مطالب پر ایک سرسری نظر

مذکورہ بالا آیات کے اندر جو باتیں، جس ترتیب کے ساتھ کہی گئی ہیں، پہلے ہم اجمال کے ساتھ ان کو سامنے رکھیں گے اس کے بعد ان کے عمیق اور گہرے پہلوؤں پر غور کریں گے اور جو سوالات یہاں پیدا ہوتے ہیں ان کے جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

یہاں سورہ کا نام ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے وہ دعویٰ سامنے رکھ دیا گیا ہے جس کو اس سورہ کا عمود یا مرکزی مضمون ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ اس سورہ کا مرکزی مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت ہے۔ چنانچہ یہاں سب سے پہلے جو بات کہی گئی ہے وہ یہی ہے کہ یہ کتاب الٰہی ہے۔ پھر یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جہاں تک اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے کا تعلق ہے۔ یہ چیز کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ یہ کتاب خود اپنے کتاب الٰہی ہونے پر ایک حجت قاطع ہے لیکن اس پر ایمان لانا ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح کے لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور کس طرح کے لوگ اس سے محروم رہیں گے۔ ایمان لانے کے لیے بنیادی چیز قلب کی صلاحیت کو قرار دیا گیا ہے جس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی ہے کہ جن لوگوں کے دل صلاحیت سے خالی ہیں وہ اس کتاب سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ یہ صلاحیت تقویٰ، خشیت اور خدا ترسی سے پیدا ہوتی ہے۔

اس کے بعد اس تقویٰ سے علم و عمل کی جو برکتیں پیدا ہوتی ہیں ان کا ذکر فرمایا ہے۔

اس تقویٰ کا پہلا ثمرہ ایمان بالغیب بتایا گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس کے دل میں صلاحیت ہو اس کی عقل دور بین اور دور رس ہو جاتی ہے۔ وہ حیوانات کی طرح صرف محسوسات و مادیات ہی میں گرفتار نہیں رہتا بلکہ وہ ان حقیقتوں کو بھی مانتا ہے جو اگرچہ آنکھوں سے دیکھی نہ جا سکتی ہوں، لیکن عقل سلیم ان کی شہادت دے رہی ہو۔ وہ ان حقیقتوں کو اسی طرح مانتا ہے جس طرح آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی حقیقتیں مانی جاتی ہیں، بلکہ جو یقین اس کو ان نادیدہ حقیقتوں پر ہوتا ہے، بسا اوقات وہ یقین اس کو ان چیزوں پر بھی نہیں ہوتا جو اس نے آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی ہوتی ہیں۔

اس کے بعد بعض وہ اعمال و عقائد بیان ہوئے ہیں جو اس ایمان بالغیب سے لازماً پیدا ہوتے ہیں۔

ایمان محض کسی تصور کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی اصل حقیقت وہ تصدیق ہے جو دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہوتی ہے اور جو آدمی کے ارادہ کو حرکت میں لاتی ہے۔ یہ ارادہ آدمی کو بہت سے کاموں کے کرنے اور بہت سی چیزوں کے چھوڑنے کے لیے اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ یہاں کرنے کے کاموں میں سے دو ہی کاموں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک نماز قائم کرنے کا، دوسرے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں کام دوسری

تمام نیکیوں کی جڑ اور تمام بھلائیوں کی بنیاد ہیں چنانچہ آگے ہم وضاحت کے ساتھ بتائیں گے کہ درحقیقت یہی دو بنیادی نیکیاں ہیں جن پر پورا دین قائم ہے۔

انفاق کے ذکر کے ساتھ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ (اس میں سے جو ہم نے ان کو بخشا ہے) کے الفاظ فرما کر کئی باتوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

ایک تو یہ کہ خدا کی راہ میں اسی کا بخشا ہوا مال خرچ کرنا درحقیقت بندہ کی طرف سے اس مال کے عطیۂ الٰہی ہونے کا اعتراف ہے۔

دوسرے اس سے خرچ کرنے کی ایک مؤثر دلیل سامنے آگئی۔ وہ یہ کہ خدا کے بخشے ہوئے مال کا کچھ حصہ اس لیے اس کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے کہ اس کی شکرگزاری کا حق ادا ہو سکے۔

تیسرے اس وضاحت نے انفاق کے مشکل کام کو ایک گونہ سہل بھی بنا دیا کیونکہ جو کچھ اس نے دیا ہے اس سارے کے لیے اس کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ اس میں سے صرف ایک قلیل حصہ ہی ہے جو اس کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ یہاں زکوٰۃ کے بجائے انفاق کا لفظ ہے جو اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ یہ لفظ صدقات و خیرات کی ساری ہی قسموں پر حاوی ہے۔

اس کے بعد ان متقین کے ایک خاص وصف کو خاص طور پر نمایاں کر کے بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ ہر قسم کے گروہی تعصبات سے پاک اور جمود و تقلید کی تمام بندشوں سے بالکل آزاد ہیں۔ وہ خدا کی اتاری ہوئی کتابوں اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں میں کوئی تفریق اور امتیاز نہیں کرتے۔ وہ اس سارے پر ایمان لاتے ہیں جو خدا کی طرف سے اترا ہے، خواہ وہ ان کی اپنی قوم کے کسی رسول پر اترا ہے یا کسی دوسری قوم کے رسول پر، ان کو اگر بحث ہوتی ہے تو صرف اس چیز سے ہوتی ہے کہ بات خدا کی اتاری ہوئی ہو، یہ نہ ہو کہ کسی غیر خدا کی بات خدا کی طرف منسوب کر دی گئی ہو یا کوئی بات باہر سے لا کر خدا کی بات میں ملا دی گئی ہو۔

اس کے بعد فرمایا کہ حقیقت میں آخرت پر ایمان اور یقین رکھنے والے لوگ یہی ہیں۔

جہاں تک آخرت پر ایمان کا تعلق ہے وہ ایمان بالغیب میں شامل تھا، اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں خاص طور پر اس کو الگ ذکر کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ایمان بالآخرت کے مدعی تو بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں، جو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جو خدا کی اتاری ہوئی ہر کتاب پر ایمان لاتے ہیں، درحقیقت وہی لوگ ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہی لوگ، جن کے اوصاف بیان ہوئے ہیں، اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور انہی کے لیے مزید ہدایتوں کے دروازے کھلیں گے، نیز یہی اس دنیا میں ہدایت پر ہیں اور انہی کے لیے آخرت میں فوز و فلاح ہے۔

۳۔ بعض اشارات و کنایات

قرآن نے یہ بتانے کے بعد کہ یہ کتاب خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے، ان لوگوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے، جو اس لفظ کے اُس زمانہ میں مصداق بن سکتے تھے۔ یہ اشارہ اس طرح کیا ہے کہ ان کی کچھ نمایاں خصوصیات بیان کر دی ہیں۔ ان خصوصیات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ان مسلمانوں کی خصوصیات ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے تھے۔ اس سے یہ اشارہ نکلا کہ ان لوگوں کے اندر تقویٰ اور خشیت کی صفت پہلے سے موجود تھی اس وجہ سے ان کو قرآن سے نفع پہنچا۔ ان کے اندر امی عربوں میں سے جو لوگ شامل ہوئے تھے، یہ وہ لوگ تھے جن کے اندر زمانہ کے عام فساد کے باوجود بہت سی خوبیاں موجود تھیں اور ان کو فطرت کی ہدایت کی جو روشنی ملی تھی اس کو انھوں نے اپنے اندر محفوظ رکھا تھا اسی طرح ان کے اندر اہلِ کتاب میں سے جو لوگ شامل ہوئے تھے، وہ بھی اپنی اپنی شریعتوں پر اپنے علم کی حد تک نیک نیتی سے عمل کرنے والے تھے اس وجہ سے یہ لوگ مستحق ٹھہرے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی آخری اور کامل ہدایت سے بہرہ ور کرے۔

یہود کی اخلاقی و روحانی بیماریاں

اس تصویر میں مسلمانوں کے جو خط و خال نمایاں کیے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے ایک طرف اگر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمان کے اصلی اوصاف کیا ہیں یا کیا ہونے چاہئیں تو دوسری طرف یہی تصویر ان لوگوں کو بھی سامنے لا کھڑا کرتی ہے جو اس کتاب پر ایمان نہیں لائیں گے۔ ساتھ ہی نہایت خوبی کے ساتھ اشارات و کنایات کے پردے میں، ان کے ایمان نہ لانے کے اسباب کی طرف بھی اشارے کر دیتی ہے۔ اشارات و کنایات کے اس پردے کو اٹھایے تو اس کے نیچے سے یہود برآمد ہوتے ہیں جن سے اس سورہ میں، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، اصلی بحث ہے۔ ساتھ ہی جن اخلاقی و روحانی بیماریوں کے سبب سے یہود قرآن کی نعمت سے محروم ہوئے ان کو بے نقاب کرنے کے لیے قرآن نے یہ بلیغ انداز اختیار کیا کہ مسلمانوں کی ان عملی و اعتقادی خصوصیات کو خاص طور پر نمایاں کیا جن کے بالکل ضد خصوصیات یہود نے اپنے اندر جمع کر رکھی تھیں۔ اور جو قبولِ حق میں ان کے لیے ایسی رکاوٹ بن گئی تھیں کہ ان پر قابو پانا ان کے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔

ہم قرآن کے ان لطیف اشارات کی یہاں تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ جو لوگ قرآن پر ایمان نہیں لا رہے تھے ان کے ایمان نہ لانے کے اسباب کیا تھے۔

قرآن پر ایمان نہ لانے کے

سب سے پہلے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے الفاظ پر غور کیجیے۔ یہ بات کہ یہ کتاب متقین ہی کے لیے ہدایت ہے یہود کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کے ایک اہم فیصلہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود سے توبہ کرائی اور ان کو تطہیر و تزکیہ کی بعض سخت آزمائشوں

سے گزرا تو اس وقت ان کے لیے انھوں نے یہ دعا بھی فرمائی کہ آئندہ یہ خدا کے غضب سے محفوظ رہیں اور اس کی رحمت سے کبھی محروم نہ ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول تو فرمائی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آئندہ اس کی جو رحمت، آخری شریعت کی شکل میں، نازل ہونے والی ہے اس سے بنو میں سے صرف وہی لوگ بہرہ یاب ہو سکیں گے جو خدا سے ڈرتے رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوں گی ان پر ایمان لائیں گے۔ سورۂ اعراف میں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ دعوت کا یہ واقعہ بیان ہوا ہے مندرجہ ذیل آیت بھی آتی ہے۔ اس آیت پر اس کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھ کر غور کیجیے۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَاَكْتُبُهَا	اور میری رحمت ہر چیز کو حاوی ہے، پس میں اس کو لکھ
لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ	رکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ پر قائم رہیں گے،
الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۚ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ	زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور ان لوگوں کے لیے جو ہماری آیتوں
الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ - الآیہ (۱۵۶-۱۵۷ اعراف)	پر ایمان لائیں گے یعنی جو رسول نبی امی کی پیروی کریں گے۔

یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ قرآن اور اسلام کی نعمت حضرت موسیٰؑ کی قوم میں سے صرف انھی لوگوں کو ملنے والی تھی جو تقویٰ پر قائم رہنے والے، زکوٰۃ ادا کرتے رہنے والے اور اللہ کی آیتوں پر ایمان لانے والے تھے۔ پھر آیت کے آخر میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ تھے جو نبی اُمّی کی پیروی کریں۔

بعینہٖ اسی شرط کو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے الفاظ یہاں یاد دلا رہے ہیں۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ اس شرط پر پورے اترے وہ ایمان لائے اور اسی سے یہ بات بھی نکلی کہ جو لوگ اس کتاب پر ایمان نہیں لائے وہ تقویٰ اور خشیت کی اس صفت سے عاری تھے جو اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے۔

ٹھیک اسی طرح کی بات اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی فرمائی تھی۔ ان کو مختلف امتحانوں میں جانچنے کے بعد جب قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز فرمانے کا وعدہ فرمایا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یہ منصب میری ذرّیت کو بھی حاصل رہے گا یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (۱۲۴- بقرہ) (میرا یہ عہد تمھاری ذرّیت میں سے ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے) ظالم سے مراد ظاہر ہے کہ وہ لوگ ہیں جو توحید و اخلاص سے عاری اور تقویٰ و خشیت سے خالی ہوں، خواہ ان کا تعلق حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہو یا حضرت اسحاقؑ کی نسل سے۔ ایسے لوگوں کے بارہ میں خود حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح فرما دی تھی کہ جس پیغمبر یا جس پیغمبر کی امت کو دنیا کی امامت ملنے والی ہے ظالم لوگ نہ اس پیغمبر پر ایمان لائیں گے اور نہ اس عزت میں حصہ دار ہوں گے جو اس کو اور اس کی امت کو ملنے والی ہے۔

يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ کے الفاظ یہود کی اس محسوسات پرستی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس میں وہ ابتدا سے مبتلا رہے ہیں۔ اپنی اسی بیماری کے سبب سے یہود عین اپنے نبی کی موجودگی میں ایک بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے۔ مصر کے دورِ غلامی میں وہ جس ذہنی و روحانی پستی میں مبتلا ہو گئے تھے اس سے آخر وقت تک ان کو نکلنا نصیب نہ ہُوا۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہزاروں معجزات دیکھنے کے بعد بھی ان کا اصرار یہی رہا کہ وہ ایک مرتبہ خود اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھ لیں تب وہ اس بات کو مانیں گے کہ فی الواقع وہ حضرت موسیٰؑ سے کلام بھی کرتا ہے۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (ہم تمھاری بات اس وقت تک باور نہیں کریں گے جب تک ہم خود بھی خدا کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں) (۵۵۔ بقرہ) اسی طرح کی بات مشرکینِ مکہ بھی کہتے تھے۔ ان کا اعتراض بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تھا کہ اگر اللہ آپ سے کلام کرتا ہے تو آخر ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا؟ قرآن نے یہ کہہ کر کہ اس کتاب پر وہی لوگ ایمان لائیں گے جو غیب میں رہتے ایمان لائیں، گویا دوسرے الفاظ میں یہ اعلان کر دیا کہ جو لوگ خدا کو چھو کر اور ٹٹول کر اور تمام حقائق کا سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے ایمان لانا چاہتے ہیں ان کے لیے قرآن میں کوئی حصہ نہیں ہے، قرآن کا فیض صرف ان معقول لوگوں کو پہنچے گا جو حواس ظاہری سے زیادہ عقل پر بھروسہ کرتے ہیں۔

ایمان لانے والوں کی یہ تعریف کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں، یہود[1] اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی اس حالت پر تعریض ہے جس کا ذکر قرآن نے دوسری جگہ ان الفاظ میں فرمایا ہے۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۵۹۔ مریم) (پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آئے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور شہوتوں کے پیچھے پڑ گئے تو جلد وہ اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے)

اہلِ ایمان کے انفاق کے ذکر میں یہود اور ان کے جتھے کے دوسرے ساتھیوں کی اس بخالت اور اس زر پرستی پر تعریض ہے جو ہمیشہ سے ضرب المثل رہی ہے۔ قرآن کے زمانۂ نزول میں ان کے عوام تو درکنار ان کے علما اور صوفیا کا جو حال تھا اس کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا	اے ایمان والو، بہت سے فقیہ اور صوفی لوگوں
مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ	کے مال باطل طریقوں سے ہڑپ کرتے ہیں اور
اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ	اللہ کے رستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور جو لوگ سونے
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ	اور چاندی کے ڈھیر اکٹھے کر رہے ہیں اور ان کو

---

[1] سورہ بقرہ کی آیت ۸۳ میں نہایت واضح الفاظ میں یہود کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ان سے نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دیتے رہنے کا جو عہد لیا گیا تھا وہ عہد انھوں نے توڑ ڈالا۔

وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۴ - توبہ)

اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر رہے ہیں ان کو دردناک
عذاب کی خوشخبری سنا دو۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ الآیۃ میں یہود کے اس گروہی تعصب پر تعریض ہے جو ان کے لیے قرآن پر ایمان لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ یہود کو جب دعوت دی جاتی کہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی آخری کتاب۔ قرآن۔ پر ایمان لاؤ تو وہ کہتے کہ جو کتاب ہم پر اتری ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھنا ہمارے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد ہم کسی اور کتاب اور قرآن کے قائل نہیں ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ
اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا
وَرَآءَهٗ (۹۱ - بقرہ)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس
چیز پر جو اللہ نے اتاری ہے تو کہتے ہیں ہم اس
چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی ہے۔
اس کے بعد جو کچھ ہے اس کا وہ انکار کرتے ہیں۔

اہل ایمان کی یہ تعریف کہ آخرت پر وہی یقین رکھتے ہیں، آخرت کے بارے میں یہود کی اس بے یقینی کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس کی شہادت ان کی عملی زندگی کے ہر گوشے سے مل رہی تھی۔ یوں تو وہ آخرت پر نہ صرف ایمان کے مدعی تھے بلکہ ان کا دعویٰ تو یہ تھا کہ آخرت کی ساری کامیابیاں تنہا انھی کا حصہ ہیں۔ لیکن دوسری طرف زندگی اور اسباب زندگی کی محبت میں اس قدر غرق تھے کہ ان مشرکین کو بھی مات کر گئے تھے جو آخرت کا تصور یا تو سرے سے رکھتے ہی نہیں تھے یا رکھتے تھے تو نہایت مبہم اور دھندلا۔ مشرکین ہی کی طرح انھوں نے بھی غلط قسم کی شفاعت کا تصور قائم کر لیا تھا اور اس وہم میں مبتلا ہو گئے تھے کہ دوزخ میں اول تو وہ ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں۔ ظاہر ہے کہ آخرت پر اس طرح کا ایمان ایک بالکل بے معنی ایمان ہے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے اس ایمان کی قلعی اس طرح کھولی ہے:

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ
عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝
وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝
وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى
حَيٰوةٍ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا (۹۴-۹۶ - بقرہ)

کہہ دو کہ اگر آخرت کی کامیابی دوسروں کے مقابل
میں خاص کر تمہارا ہی حصہ ہے تو موت کی آرزو
کرو اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو اور وہ اپنی
کرتوتوں کے سبب سے ہرگز موت کی تمنا نہیں
کریں گے۔ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ تم
ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے
ان سے بھی زیادہ جو مشرک ہیں۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ متقین کے ذکر کے بعد ان متقین کی جو تصویر قرآن نے پیش کی ہے اس سے

ایک طرف تو وقت کے اہلِ ایمان سامنے آگئے اور یہ معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ تھے جن کے اندر تقویٰ اور خشیت کی فطری صلاحیتیں موجود تھیں اس وجہ سے ان کو قرآن پر ایمان لانے کی توفیق نصیب ہوئی۔ دوسری طرف اسی تصویر نے یہود اور ان کے حلیفوں کو سامنے لا کھڑا کیا ہے کہ یہ لوگ ہیں جو خدا کے خوف اور اس خوف کی تمام برکتوں سے خالی ہیں، اس وجہ سے یہ قرآن کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے۔

ان چند الفاظ کے اندر اتنی لمبی تفصیل کو چھپا دینا اور یہود کا نام لیے بغیر ان کو اس طرح بے نقاب کر دینا قرآنی بلاغت کا اعجاز ہے۔

۴۔ چند سوالات اور ان کے جوابات

ان آیات پر جو شخص بھی تدبر کی نگاہ ڈالے گا اس کے ذہن میں چند سوالات ضرور پیدا ہوں گے۔

ایک یہ کہ یہاں قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا دعویٰ محض ایک دعوے کی شکل میں رکھ دیا گیا ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں دی گئی ہے، حالانکہ جب یہی بات اس سورہ کا عمود ہے تو اس کو صرف ایک دعوے کی شکل میں رکھ دینا کافی نہیں تھا، بلکہ نہایت مضبوط دلائل سے اس کو ثابت کرنا تھا۔

دوسرا یہ کہ اس کتاب کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ یہ متقیوں اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔ اگر یہ کتاب متقیوں ہی کے لیے ہدایت ہے تو پھر اس کے اترنے کا فائدہ کیا ہوا؟ ضرورت تو تھی کہ اس کی برکت سے جو بدکار تھے وہ پرہیزگار اور جو گنہگار تھے وہ نیکوکار بنتے لیکن جب بیماروں کو شفا دینے کے بجائے یہ تندرستوں ہی کو تندرست بنانے آئی ہے تو اس کا نازل ہونا تو تحصیل حاصل ہی رہا۔

تیسرا یہ کہ متقین کی پہلی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ ایمان بالغیب کے متعلق عام خیال تو یہ ہے کہ یہ محض عامیانہ تقلید یا وہمی پن یا خوش عقیدگی سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کے معنی تو یہ ہوتے کہ قرآن اپنی تاثیر کا جوہر صرف انھی پر دکھا سکتا ہے جو وہمی اور خوش عقیدہ قسم کے لوگ ہوں، سوچنے سمجھنے اور غور و فکر سے کام لینے والوں پر اس کا بیان یا استدلال کارگر نہیں ہو سکتا۔

چوتھا یہ کہ یہاں متقین کی چند صفات بھی گنائی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ ایمان بالغیب لاتے ہیں، وہ نماز قائم کرتے ہیں، وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، وہ خدا کی اتاری ہوئی ہر کتاب پر ایمان لاتے ہیں، وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ یہ سارے کام کر رہے ہیں تو اس کے بعد وہ کون سی ہدایت ہے جس کے یہ محتاج رہ جاتے ہیں اور جو یہ کتاب فراہم کرتی ہے؟ کیا ہدایت ان چیزوں سے بالاتر کسی چیز کا نام ہے جس کا ان سارے کاموں کے کرنے کے بعد بھی آدمی محتاج ہی رہ جاتا ہے؟

پانچواں سوال یہ ہے کہ یہاں ایمان کے بعد عملی نیکیوں میں سے صرف دو ہی کا ذکر کیا گیا ہے، ایک نماز کا، دوسری انفاق کا۔ آخر ان کی اہمیت کا وہ کیا خاص پہلو ہے جس کی وجہ سے ان کا ذکر کیا گیا ہے اور دوسری

کسی نیکی کا ذکر نہیں کیا گیا؟

سوالات تو بعض اور بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کا جواب تھوڑے سے غور و فکر سے ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے اس وجہ سے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ البتہ مذکورہ سوالات خاصی اہمیت رکھتے ہیں اس وجہ سے ہم ترتیب کے ساتھ ان کے جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے مخالفین اگر قرآن کا انکار کر رہے تھے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ قرآن کا کتاب اللہ ہونا ان پر واضح نہیں تھا، کم از کم سورۂ بقرہ کے زمانہ نزول یعنی اوائل ہجرت میں تو اس کتاب کا کتابِ الٰہی ہونا اہل کتاب اور مشرکین سب پر واضح ہو چکا تھا۔ قبولِ حق میں جو چیز مانع تھی وہ یہ نہیں تھی کہ حق اچھی طرح واضح نہیں تھا بلکہ یہ تھی کہ قبولِ حق کے لیے طبیعتوں میں جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ ان کے اندر موجود نہیں تھی۔ ایسی صورت میں ثابت کرنے کی بات یہ نہیں تھی کہ یہ کتابِ الٰہی ہے اور اس کے کتابِ الٰہی ہونے کی یہ یہ دلیلیں ہیں بلکہ کہنے کی بات یہی تھی کہ یہ کتابِ الٰہی ہے، اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے طبیعتوں میں صلاحیت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ قرآن نے یہی کیا ہے۔ یہاں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کہہ کر اس نے اس شرط کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے۔ یہ شرط ہے تقویٰ اور خداترسی۔ گویا قرآن یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے رہا ہے کہ نہ قرآن کا کتابِ الٰہی ہونا محتاجِ ثبوت ہے اور نہ تمہارا فرستادۂ الٰہی ہونا۔ یہ بالکل واضح حقیقتیں ہیں لیکن ان حقیقتوں کی وضاحت ان لوگوں کو کیا نفع پہنچا سکتی ہے جن کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہیں، جن کی آنکھوں پر محسوسات کی پٹیاں بندھی ہوئی ہیں، جو فطرت کی بنیادی نیکیوں کو بھی ختم کر چکے ہیں اور جن کو تعصب نے بالکل اندھا بہرا بنا دیا ہے۔

علاوہ بریں یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس سورہ میں اصلی خطاب، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہود سے ہے۔ یہود آخری کتاب اور آخری رسول سے ناآشنا نہیں تھے۔ توریت کی کتاب تثنیہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ان کے بھائیوں کے اندر سے ان کے لیے ایک نبی بھیجے گا، اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالے گا، اس کے ذریعہ سے شریعت کو کامل کرے گا، اس کے واسطہ سے ان کے دشمنوں سے انتقام لے گا، جو اس کی بات نہ سنیں گے وہ ان کو سزا دے گا، وہ خدا کے نام سے کلام کرے گا، اس کی پیشین گوئیاں سچی ہوں گی اور وہ اس وقت تک دنیا میں رہے گا جب تک اللہ کا کلمہ بلند نہ ہو جائے۔

یہود ان ساری باتوں سے اچھی طرح باخبر بھی تھے اور ان میں سے ایک ایک بات کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ کی زندگی کے حالات نے ثبوت بھی فراہم کر دیا تھا۔ بالخصوص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد تو وہ تمام آثار بالکل سامنے آ چکے تھے، جن کو دیکھ لینے کے بعد یہود کو یقین ہو

چکا تھا کہ توریت کی اس پیشین گوئی کے مصداق درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ پھر یہود اس پیشین گوئی ہی کی بنا پر ایک نبی اور کتاب کے منتظر بھی تھے۔ ایسے حالات کے اندر ذٰلِكَ الْكِتَابُ کا دعویٰ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ گویا انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہے ہیں کہ یہی موعود کتاب ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، جس کے تم منتظر رہے ہو اور جو ان تمام باتوں کی تصدیق کر رہی ہے جو اس کے بارے میں تمھیں پہلے بتائی جا چکی ہیں۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر معاملہ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں اس دعوے پر دلیل کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہود اپنے تعصب، اپنی ضد اور اپنے حسد سے باز آئیں اور اس کتاب کو جس کے لیے وہ مدت ہائے دراز سے چشم براہ تھے ہاتھوں ہاتھ لیں اور اس کی برکتوں اور رحمتوں کا تجربہ کریں۔

دوسرے سوال کا جواب اگرچہ پہلے سوال کے جواب کے ذیل میں ایک حد تک آ چکا ہے لیکن ہم اس کی مزید وضاحت کیے دیتے ہیں تاکہ اس کے وہ پہلو بھی سامنے آجائیں جو نہیں آسکے ہیں۔

انسان پر کسی چیز کے اثر انداز ہونے کے لیے تنہا یہی بات کافی نہیں ہے کہ وہ چیز بجائے خود مؤثر ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے اندر اثر پذیری کی صلاحیت بھی موجود ہو۔ سورج لاکھ چمکے لیکن ایک شخص اندھا ہو تو سورج کے چمکنے سے اس کو کیا فایدہ پہنچ سکتا ہے۔ چمن میں بلبل ہزار چہکے لیکن اگر ایک شخص بہرا ہے تو وہ اس کے چہکنے سے کیا لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قرآن کا نور ہونا، بصیرت ہونا، سرچشمہ ہدایت ہونا مسلم، لیکن اگر ایک شخص نے اپنی وہ صلاحیت ہی ضائع کر دی ہے جو اس نور اور اس سرچشمۂ ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے تو آخر قرآن کیا کرے گا۔ قرآن نے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی (اس میں خدا سے ڈرنے والوں کے لیے درس عبرت ہے) (۲۶، نازعات) اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ (بے شک اس کے اندر یاد دہانی ہے اس کے لیے جس کے پاس بیدار دل ہو یا وہ پوری طرح متوجہ ہو کر بات سنے (۳۷، ق)

یہ انسان کی اسی فطری صلاحیت کی طرف اشارہ ہے جو قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے۔ اسی چیز کو یہاں تقویٰ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

تقویٰ کے مختلف درجے: اس تقویٰ کے کئی درجے ہیں۔ ایک تو وہ تقویٰ ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، جس کی طرف قرآن نے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا کے الفاظ سے اشارہ کیا ہے۔ یہ تقویٰ نیکی کی ہر بات اور بھلائی کی ہر دعوت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک شرط ضروری ہے جس نے اپنے اندر سے یہ تقویٰ ضائع کر دیا گویا وہ اس معقولیت ہی سے خالی ہو بیٹھا جو اس کو نیکی اور بھلائی کی طرف راغب کر سکتی تھی۔ یہ تقویٰ جس طرح انسانیت اور شرافت کے سارے ہی کاموں پر آمادہ کرنے کے لیے ضروری ہے اسی طرح قرآن کی دعوت کی طرف مائل کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ قرآن چیز ہی ایسی ہے کہ اس کی طرف بے فکرے اور اوباش قسم

کے لوگ متوجہ نہیں ہو سکتے تھے۔ وہی لوگ متوجہ ہو سکتے تھے جن کے اندر نیکی اور شرافت کا جوہر موجود ہو چنانچہ تاریخ کی شہادت بھی یہی ہے کہ قرآن کی دعوت نے عربوں میں سے ان لوگوں کو اپیل کیا جو سنجیدہ اور معقول تھے اور اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جذب کیا جو متقی اور خدا ترس تھے۔

دوسرا تقویٰ وہ ہے جو قرآن کی پیروی کے نتیجہ اور ثمرہ کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بھی کئی درجے ہیں، لیکن یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں تو اس تقویٰ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک شرط ضروری ہے۔ لیکن اس کے بعد اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ سے لے کر وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ تک ان متقین کی جو صفتیں بیان ہوئی ہیں وہ اس تقویٰ کا نتیجہ ہیں جو قرآن کی پیروی سے پیدا ہوا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایمان بالغیب ضعیف الاعتقادی یا وہمی پن کا ثبوت نہیں فراہم کر رہا ہے بلکہ انسان کے عقلی اور روحانی ہستی ہونے کا ثبوت فراہم کر رہا ہے اور قرآن نے اسی پہلو سے اس چیز کا یہاں ذکر کیا بھی ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی تمام تگ و دو بس محسوسات ہی تک محدود ہوتی ہے، اس سے آگے کے لیے نہ ان کے اندر کوئی رغبت ہی ہوتی ہے اور نہ وہ اس سے آگے جانے کی کوئی کوشش ہی کرتے ہیں۔ وہ اپنی عقل کو بھی، جو بلند پروازی کی فطری صلاحیتیں رکھتی ہے، اور جس کا اصلی میدان محسوسات نہیں بلکہ ماورائے محسوسات ہے، انھی محسوسات کے اندر قید کر چھوڑتے ہیں کہ اس کو جتنا زور لگانا ہو انھی کے اندر لگائے، اس سے باہر نکلنے کو وہ بالکل بادیہ پیمائی اور ہرزہ سرائی خیال کرتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے نزدیک حقیقی قدر و قیمت محسوسات و مادیات کی نہیں بلکہ عقل اور اس کے ادراکات کی ہے، وہ عقل ہی کو انسانیت کا خاصہ اور اس کا جوہر سمجھتے ہیں، اسی چیز کو وہ انسان اور حیوان کے درمیان فرق کرنے والی مانتے ہیں اور ان کے دل کی حقیقی خوشی محسوسات کی فانی لذتوں میں نہیں بلکہ عقل کی ان روحانی فتوحات ہی میں ہوتی ہے۔ قرآن نے اسی گروہ کی طرف یہاں يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے الفاظ سے اشارہ کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہی گروہ ہے جو اس کی بلندیوں کا ساتھ دے سکتا ہے۔ پہلے گروہ کو تو اس نے چوپایوں سے تشبیہ دی ہے بلکہ ان کو چوپایوں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ فرمایا ہے۔ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (کیا تم گمان کرتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں، یہ تو بالکل چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ (۴۴۔ فرقان) یعنی جب وہ اپنی عقل جیسی اعلیٰ چیز کو بھی محسوسات ہی کی چاکری میں لگائے ہوئے ہیں تو نہ ان کا سننا سننا ہے اور نہ ان کا سمجھنا سمجھنا۔ یہ تو وہ بے وقوف لوگ ہیں جو ایک تیغ جوہر دار سے وہ کام لے رہے ہیں جو گھاس کاٹنے کی درانتی سے لیا جاتا ہے۔

پس غیب میں رہتے ہوئے ایمان لانے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ محض محسوسات کے غلام اور مادیات کے

پرستار نہیں ہیں بلکہ وہ عقل کی رہنمائی میں چلتے ہیں اور جو باتیں عقل سے ثابت ہیں یا فطرت جن کی شہادت دیتی ہے ان کو وہ تسلیم کرتے ہیں اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی جن محسوس اور مادی راحتوں اور لذتوں کو قربان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ان کو بے دریغ قربان کر دیتے ہیں۔

چوتھے سوال کا جواب اگرچہ دوسرے سوال کے جواب کے ضمن میں ایک حد تک آگیا ہے لیکن ہم اس کو بھی مزید واضح کیے دیتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ملحوظ رکھنے کی ہے کہ متقین کے بعد متقین کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان کی حیثیت توضیحی صفات کی ہے۔ یعنی اس لفظ کے جو مصداق اس زمانہ میں قرآن کے سامنے تھے قرآن نے بطور مثال ان کی طرف انگلی اٹھا دی ہے کہ یہ لوگ ہیں جن کے اندر تقویٰ موجود تھا، چناں چہ دیکھ لو، انھوں نے مجھ سے فائدہ اٹھایا۔ ان صفات کو آپ اس معنی میں نہ لیں کہ یہ سب قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ابتدائی شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ ان کی حیثیت قرآن کی پیروی کے ثمرات و برکات کی ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو قرآن نے هُدًى کہا ہے، جس کی وضاحت ہم تفصیل سے اس کے مقام میں کر چکے ہیں، وہ بہرحال ظاہری اعمال و عقائد سے ایک بالاتر حقیقت ہے۔ اعمال و عقائد یا تو اس ہدیٰ کے ثمرات و برکات ہیں یا اس کے حصول کے اسباب و ذرائع، وہ بعینہٖ ہدیٰ نہیں ہیں۔ اعمال و عقائد میں آدمی کا اہتمام و انہماک جتنا بڑھتا جائے گا اتنا ہی اس کے لیے هُدًى میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (۱۷۔ محمد) (جو ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں، خدا ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے)

اسلام میں بنیادی نیکیاں

آخری سوال کے جواب میں گزارش ہے کہ قرآن کے تدبر سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اسلام میں بنیادی نیکیوں کی حیثیت نماز اور زکوٰۃ کو حاصل ہے۔ دوسری نیکیاں انھی دو بڑی نیکیوں کے تحت ہیں، بلکہ انھی سے پیدا ہوتی ہیں۔ چناں چہ قرآن کے بے شمار مقامات میں ان دونوں کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ ان کا ذکر آگیا تو گویا سب کا ذکر آگیا۔ مثلاً فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ (۱۱۔ توبہ) (پس اگر وہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمھارے دینی بھائی بن گئے) حضرت اسماعیلؑ کی تعریف میں فرمایا ہے، وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا (۵۵۔ مریم) (اور وہ اپنے کنبے کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی منقول ہے، وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ (اور اس نے مجھے نماز اور روزہ کی ہدایت کی جب تک جیوں) (۳۱۔ مریم)

مذکورہ بالا آیات میں اگرچہ ذکر نماز اور زکوٰۃ ہی کا ہے لیکن ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ صرف یہی دو چیزیں مراد نہیں ہیں بلکہ دوسری نیکیاں بھی مراد ہیں لیکن ان ساری نیکیوں کی جڑ چونکہ یہی دونوں چیزیں

ہیں تو جب جڑ کا ذکر آ گیا تو شاخوں کا ذکر خود بخود ہو گیا۔

ان دونوں چیزوں کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ فی الواقع دین میں ان کی حیثیت ہونی بھی یہی چاہیے۔ ایک آدمی کے اللہ تعالیٰ کا ٹھیک بندہ بن جانے کے لیے آخر کس چیز کی ضرورت ہے؟ اسی چیز کی کہ ایک طرف وہ اپنے رب سے ٹھیک ٹھیک جڑ جائے اور دوسری طرف خلق سے اس کا تعلق صحیح بنیاد پر قائم ہو جائے، نماز انسان کو خدا سے صحیح طور پر جوڑ دیتی ہے اور انفاق سے خلق کے ساتھ اس کا تعلق بالکل صحیح بنیاد پر استوار ہو جاتا ہے۔ ایک شخص اگر اپنے رب کے حقوق ادا کرتا ہے اور خلق کے حقوق پہچانتا ہے تو وہ تمام نیکیوں کی کلید پا گیا۔ انھی دو کی مدد سے وہ دوسری ساری نیکیوں کے دروازے بھی کھول لے گا اور سب کا اختیار کر لینا اس کے لیے سہل ہو جائے گا۔ اسی سے ملتی جلتی بات حضرت مسیح نے بھی فرمائی ہے۔ انجیل متی ۲۲ : ۳۵-۴۰ میں ہے۔

"اور ان میں سے ایک عالم شرع نے آزمانے کے لیے اس سے پوچھا اے استاد توریت میں کون سا حکم بڑا ہے؟ اس نے اس سے کہا کہ خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انھی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیا کے صحیفوں کا مدار ہے۔"

حضرت مسیح علیہ السلام کے اس ارشاد سے صاف واضح ہے کہ انھی دونوں نیکیوں پر تمام دین و شریعت کا مدار ہے اور ان کا بنیادی نیکیاں ہونا صرف قرآن ہی سے واضح نہیں ہوتا بلکہ تورات، انجیل اور تمام انبیاء کے صحیفوں میں ان کی یہی حیثیت ہے۔

۵- آگے کا مضمون ——— آیات ۶-۷

یہ ان لوگوں کی خصوصیات بیان ہوئی ہیں جو قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے تھے۔ آگے ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو اس نعمت سے محروم رہنے والے ہیں۔ فرمایا۔

آیات ۶-۷

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰٓ أَبْصَٰرِهِمْ غِشَٰوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٧﴾

ترجمۂ آیات ۶-۷

جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے یکساں ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان لانے والے

نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ ۶-۷

۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۶)

کفر کی حقیقت

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: کفر کے معنی اصل لغت میں ڈھانکنے اور چھپانے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ شکر کے ضد کی حیثیت سے بھی استعمال ہوا ہے اور ایمان کے ضد کی حیثیت سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کے معنی ناشکری اور کفرانِ نعمت کے ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں انکار کے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ لفظ کی اصل روح ان دونوں معنوں کے اندر موجود ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ مطلق بھی استعمال ہوا ہے اور اپنے مفعول کے ساتھ بھی۔ جہاں مفعول کے ساتھ استعمال ہوا ہے وہاں تو متعین طور پر اس مفعول ہی کا کفر وانکار مراد ہے، لیکن جہاں کسی مفعول کے بغیر مطلق صورت میں استعمال ہوا ہے وہاں بالعموم قرآن تمام چیزوں کے انکار کے معنی میں استعمال ہوا ہے جن پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن کہیں کہیں ناشکری اور کفرانِ نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جس کا پتہ قرینہ اور موقع ومحل سے چلتا ہے۔

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے کون مراد ہیں؟

موقع کلام کا تقاضا یہ ہے کہ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے یہاں انکار کرنے والوں کا کوئی مخصوص گروہ مراد ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان لوگوں کی چند خاص صفات بھی بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کے لیے ڈرانا اور نہ ڈرانا دونوں برابر ہے، یہ کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں، یہ کہ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حال تمام کفار کا نہیں تھا، ان میں بہتیرے ایسے بھی تھے جو ابتدا میں منکر ومخالف رہے لیکن بعد میں اسلام لائے۔ اس وجہ سے یہ امر تو بدیہی ہے کہ یہاں کوئی مخصوص گروہ مراد ہے۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گروہ کن لوگوں کا ہے؟

ہمارے نزدیک اس سے مراد قریش، اہل کتاب اور منافقین کے وہ لیڈر اور سردار ہیں جن پر قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت پوری طرح واضح ہو چکی تھی لیکن اس وضاحت کے باوجود وہ محض ضد، ہٹ دھرمی، انانیت اور حسد وتکبر کے سبب سے مخالفت کر رہے تھے۔ اس تخصیص کے بعض وجوہ یہ ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس سے اوپر والے ٹکڑے میں اس گروہ کا بیان ہوا ہے جو قرآن پر ایمان

لانے والا تھا۔ وہاں ہم نے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس سے اہل کتاب اور بنی اسماعیل کے وہ تمام سلیم الفطرت اور خدا ترس لوگ مراد ہیں جن کے ضمیر زندہ، جن کی صلاحیتیں محفوظ اور جن کے دل بیدار تھے۔ انھی کے مقابل میں مذکورہ آیات میں اس گروہ کا بیان ہو رہا ہے جو ایمان لانے والا نہیں ہے۔ یہ تقابل خود دلیل ہے کہ اس سے مراد قریش اور اہل کتاب میں سے وہ لوگ ہوں جن کو دنیا پرستی اور حسد و انانیت نے بالکل اندھا بہرا کر دیا تھا، جن کی فطرت مسخ ہو چکی تھی اور جو قبول حق کی تمام صلاحیتوں سے یک قلم محروم ہو چکے تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں قرآن نے اس گروہ کی جو خصوصیات، اس کا نام لیے بغیر بیان کی ہیں بعینہٖ وہی خصوصیات دوسرے مقامات میں یا تو نام کی صراحت کے ساتھ بیان کی ہیں یا ایسے واضح قرائن کے ساتھ بیان کی ہیں جن سے گروہ کا تعین آپ سے آپ ہو جاتا ہے۔ ان مقامات کو سامنے رکھ کر اگر اس آیت کے اجمال کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے تو آدمی اسی نتیجہ تک پہنچتا ہے جس نتیجہ تک ہم پہنچے ہیں، یعنی اس سے مشرکین، یہود اور منافقین کے وہ سرداروں اور لیڈر مراد لیے جائیں جن پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی کہ قرآن کی دعوت حق ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ یہاں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے ہماری رائے کی تائید ہوتی ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا	جس نے کفر کیا اللہ کا ایمان کے بعد، بہ جز ان
مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ	کے جو مجبور کیے گئے اور جن کے دل ایمان پر
وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا	جمے رہے، پر جن کے سینے کفر کے لیے کھل گئے
فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ	تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے
عَظِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ	عذاب عظیم ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں
الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي	نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور
الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ	اللہ کافر قوم کو راہ یاب نہیں کرتا۔ یہی لوگ
طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَ	ہیں جن کے دلوں پر، کانوں پر اور جن کی آنکھوں
اَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ	پر اللہ نے مہر کر دی ہے اور یہی لوگ ہیں جو
الْغٰفِلُوْنَ ۝ (نحل ۱۰۶-۱۰۸)	بے خبر ہیں۔

اس آیت میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو لوگ ایمان لا چکنے یا حق کے واضح ہو جانے کے بعد محض دنیا پرستی کی وجہ سے کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان پر اللہ کا غضب ہوتا ہے، ان کے لیے عذاب عظیم ہے، ان کے لیے خدا ایمان کی راہ نہیں کھولا کرتا، ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے حقیقی مصداق اگر ہو سکتے تھے تو سرداران قریش، علمائے یہود اور منافقین ہی ہو سکتے تھے

یا پھر وہ لوگ جو انھی کی روش اختیار کریں۔

دوسری جگہ تمام انبیا کے مخالفین و معاندین کے بارہ میں فرمایا ہے:

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا
وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ
قَبْلُ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ
الْكٰفِرِيْنَ (۱۰۱ - اعراف)

یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتیں ہم تم کو سناتے
ہیں۔ ان کے پاس ان کے انبیا کھلی کھلی نشانیاں لے
کر آئے لیکن وہ ایمان لانے والے نہ بنے، بوجہ
اس کے کہ وہ جھٹلاتے رہے پہلے سے۔ اسی
طرح اللہ مہر کر دیا کرتا ہے کافروں کے دلوں پر۔

خاص طور پر یہود کے بارہ میں فرمایا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ
وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ
طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۵۵ - نساء)

پس بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ اپنے
عہد کو توڑا، اللہ کی آیات کا انکار کیا، نبیوں کو
ناحق قتل کیا اور کہا کہ ہمارے دل تو بند ہیں بلکہ
اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر مہر کر دی
ہے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم۔

اسی طرح منافقین کے بارہ میں یہ الفاظ وارد ہیں:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا
فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا
يَفْقَهُوْنَ (۳ - منافقون)

یہ اس وجہ سے کہ وہ ایمان لائے، پھر انھوں
نے کفر کیا پس ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی سو
وہ نہیں سمجھتے۔

قرآن کی ان تصریحات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ زیر بحث آیت میں اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا کا اشارہ ایک خاص گروہ کی طرف ہے۔ لیکن یہ گروہ نہ تو مخصوص طور پر مشرکین کا ہے نہ محدود مفہوم میں اہل کتاب کا بلکہ یہ مشرکین اور اہل کتاب دونوں گروہوں کے ان افراد پر مشتمل ہے جو حق کو اچھی طرح پہچان چکنے کے بعد اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

سلف سے اس آیت کی تاویل میں جو اقوال منقول ہیں ان سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اس سے اہل کتاب کے وہ ہٹ دھرم لوگ مراد ہیں جو ان تمام پیشین گوئیوں کو جھٹلا چکے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ان کے صحیفوں میں موجود تھیں اور اس طرح انھوں نے اس عہد کو توڑ دیا تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان سے آخری نبی سے متعلق لیا تھا۔ ربیع بن انس کے نزدیک اس سے ان مختلف پارٹیوں کے لیڈر مراد ہیں جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھیں۔ یہ دونوں قول ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں بس فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ ربیع بن انس کی تاویل نسبتہً جامع اور

وسیع ہے۔ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے اس وجہ سے ہم نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

ءَاَنْذَرْتَهُمْ: انذار کے معنی ڈرانے، ہوشیار کرنے اور خبردار کرنے کے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ ایک طرف تو نہایت ٹھوس انفسی و آفاقی دلائل پر مبنی ہوتی ہے۔ دوسری طرف اس میں انذار و تبشیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ تبشیر کا مفہوم اس فوز و فلاح اور اس کامیابی و کامرانی کی بشارت دینا ہے جو نبی کی دعوت قبول کر لینے اور اس کی بتائی ہوئی صراط مستقیم اختیار کر لینے سے دنیا اور آخرت دونوں میں حاصل ہوتی ہے۔ انذار کا مفہوم ان خطرات و مہالک سے آگاہ کرنا ہے جن سے نبی کی تکذیب کرنے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں لازماً دوچار ہونا پڑتا ہے۔ انبیا علیہم السلام عام حالات میں یہ دونوں ہی فرض انجام دیتے ہیں۔ لیکن جہاں ضدی اور ہٹ دھرم لوگ مقابل میں آن کھڑے ہوتے ہیں جن کی مخالفت کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں بلکہ محض حسد اور عناد کی بنا پر ہوتی ہے، وہاں قدرتی طور پر نبی کی دعوت میں انذار کا پہلو غالب ہو جاتا ہے کیونکہ اس وقت حالات اسی کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں آپ کے کام کو صرف انذار ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ آیت زیر بحث کا تعلق، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، ان مخالفین و معاندین سے ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں کر رہے تھے بلکہ یہ جانتے بوجھتے کر رہے تھے کہ آپ نبی برحق ہیں اور قرآن اللہ کی کتاب ہے۔

انذار ہو یا تبشیر دونوں کی حقیقت ان قدرتی نتائج سے آگاہ کرنا ہے جو ایمان یا کفر کے اندر مضمر ہیں۔ جس طرح ایک طبیب اپنے زیر علاج مریض کو دوا اور پرہیز کے فوائد اور بدپرہیزی اور مرض سے غفلت کے نتائج سے آگاہ کرتا ہے اسی طرح پیغمبر بھی اپنی قوم کو اپنی دعوت کے ماننے اور نہ ماننے کے فوائد اور نتائج سے آگاہ کرتا ہے۔

انذار کی حقیقت

بعض لوگ انذار کی اس حقیقت سے بے خبر ہونے کے سبب سے مذہب کے خلاف یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ یہ موہوم خطرات کے ڈراوے سنا سنا کر لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے، انسان کی عقل سے اپیل نہیں کرتا۔ یہ معترض عموماً دو باتوں سے بے خبر ہیں، ایک تو یہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ قرآن کی دعوت صرف انذار و تبشیر ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اندر نہایت مضبوط انفسی و عقلی دلائل بھی رکھتی ہے، انذار و تبشیر اس کی دعوت کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسری چیز جس سے یہ بے خبر ہیں وہ ایمانی و اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت ہے۔ یہ لوگ اس بات سے تو واقف ہیں کہ سنکھیا کھا لینے سے آدمی مر جایا کرتا ہے لیکن یہ حقیقت ان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کفر، نفاق اور جھوٹ سے بھی انسان ہلاک ہو جایا کرتا ہے۔ پیغمبر کو چونکہ اخلاقی اقدار کے ثمرات و نتائج کا اچھی طرح علم ہوتا ہے اس وجہ سے وہ لوگوں کو ان سے آگاہ کرتا ہے اور اسی انداز بیان میں آگاہ کرتا ہے جو انداز بیان اس کے علم و یقین کے شایان شان ہوتا ہے۔ اسی چیز کو قرآن مجید انذار کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۷)

ختم کا مفہوم

خَتَمَ اللّٰهُ، خَتْمٌ کے معنی عربی زبان میں موم یا مٹی یا کسی اسی طرح کی چیز پر ٹھپہ لگانے کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ خط پر مہر لگانے اور کسی چیز کے منہ کو اس طرح بند کر دینے کے لیے استعمال ہونے لگا جس کے بعد نہ اس میں کوئی چیز داخل ہو سکے اور نہ کوئی چیز اس سے نکل سکے۔

قرآن مجید میں بعض جگہ جب اللہ تعالیٰ کسی فعل کو اپنی طرف منسوب فرماتا ہے تو اس سے مقصود نفس اس فعل کو اپنی طرف منسوب کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس قانون یا اس سنت کو اپنی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے جس قانون اور سنت کے تحت وہ فعل ظہور میں آتا ہے۔ چونکہ یہ قانون خود اللہ تعالیٰ ہی کا مقرر کردہ ہوتا ہے اس وجہ سے وہ فعل جو اس قانون کے تحت ظہور میں آتا ہے بعض اوقات قانون کے بنانے والے کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ تعبیر مطلب کا یہ اسلوب کم و بیش ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ عربی زبان اور قرآن مجید میں بھی اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ اسی اسلوب کے مطابق یہاں دلوں پر مہر لگانے کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے لیکن مقصود اس سے اس سنت اللہ کی اپنی طرف نسبت ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے لیے جاری کر رکھی ہے اور جس کے تحت دلوں پر مہر کرنے کا یہ فعل واقع ہوتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ سنت اللہ کیا ہے تو اس کی وضاحت ہم آگے کریں گے۔

سمع کے واحد لانے کی وجہ

عَلٰى سَمْعِهِمْ، ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہاں سمع کا لفظ واحد کیوں استعمال ہوا جب کہ قلوب و ابصار کے الفاظ جمع استعمال ہوئے ہیں۔ کلام کی ہم آہنگی کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ بھی جمع یعنی اسماع استعمال ہوتا۔ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ اس چیز کا تعلق اہل زبان کے طریق استعمال سے ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کم و بیش ۲۰۔۲۲ مقامات میں استعمال ہوا ہے اور اکثر جگہ قلوب، افئدہ اور ابصار کے ساتھ استعمال ہوا ہے لیکن ہر جگہ واحد ہی کی شکل میں استعمال ہوا ہے، کہیں بھی جمع کی شکل میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید زبان کے لحاظ سے بھی ایک معیاری چیز ہے اس وجہ سے ماننا پڑے گا کہ فصحائے عرب اس سیاق میں اس لفظ کو اسی طرح استعمال کرتے رہے ہیں۔

۷۔ ختم قلوب کی حقیقت اور اس کے بارے میں قانون الٰہی

یہاں جس ختم قلوب کا ذکر ہے اس کے بارے میں دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔

ایک یہ کہ اس ختم سے مراد ختم ظاہری نہیں ہے بلکہ ختم معنوی مراد ہے۔ جہاں تک ظاہری چیزوں کے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کا تعلق ہے یہ لوگ ان کو دیکھتے، سنتے اور سمجھتے تھے لیکن اس مشرب کے لوگ اپنی سمجھ بوجھ کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں دنیا کے ظواہر و محسوسات ہی تک محدود رکھتے ہیں، ان ظواہر و محسوسات کے پس پردہ جو حقائق ہیں ان کی طرف نہ تو یہ خود متوجہ ہوتے ہیں اور نہ کسی دوسرے توجہ دلانے والے کی بات پر

کان ہی دھرتے ہیں۔ دنیا اور زخارفِ دنیا میں ان کا انہماک اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ کسی اور چیز کی طرف توجہ کرنے کی ان کے اندر گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ اپنی ذہانت و فطانت اسی ایک مقصد پر صرف کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان و زمین کا طول و عرض ناپنے میں تو ان کی عقل بڑی تیز ہو جاتی ہے لیکن روحانی اقدار و حقائق کے معاملہ میں وہ بالکل ہی کند ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال ان کے مذاق کو بھی اس قدر بگاڑ دیتی ہے کہ صرف وہی باتیں ان کو اچھی لگتی ہیں جن سے ان کے اس بگڑے ہوئے مذاق کو غذا ملے۔ جن باتوں سے اس کی حوصلہ شکنی ہو، خواہ وہ کتنی ہی معقول ہوں، ان سے ان کی طبیعت کو وحشت ہوتی ہے۔ اسی صورتِ حال کو یہاں ختم قلوب کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

دوسری یہ کہ اس ختم قلوب سے یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ان کی ماؤں کے پیٹوں ہی سے ان کے دلوں پر ٹھپے لگا کر پیدا کیا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بداعمالیوں سے اپنے آپ کو اس قدر بگاڑ لیا ہے کہ ان کے دل پیغمبر کی بات سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے اس نے ہر انسان کو اچھی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے، اس کو نیکی و بدی کا امتیاز بخشا ہے اور ساتھ ہی نیکی کو پسند کرنے اور بدی سے نفرت کرنے کا مذاق بھی اس کے اندر ودیعت کیا ہے۔ ان فطری صلاحیتوں سے آراستہ کرنے کے بعد اس نے انسان کو آزاد چھوڑا ہے کہ چاہے وہ نیکی کا راستہ اختیار کرے چاہے بدی کا۔ آگے چل کر یہی اختیاری نیکی یا بدی ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں کے بنانے یا بگاڑنے میں اصلی دخل رکھتی ہے۔ اگر انسان نیکی اور بھلائی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس سے اس کی فطری صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو نیکی کی راہ میں ترقی کی توفیق ملتی ہے اور اگر وہ خواہشاتِ نفس کے پیچھے لگ کے بدی کے راستے پر چل پڑتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ اس کا دل برائی کا رنگ پکڑنا شروع کرتا ہے یہاں تک کہ یہ رنگ اس پر اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ پھر اس کے اندر نیکی کی کوئی رمق باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت آدمی کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور اس کا مذاقِ طبیعت اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ اس کی ساری دلچسپی صرف بدی ہی کے کاموں سے باقی رہ جاتی ہے، نیکی کے کام کرنا تو الگ رہا نیکی کی باتیں سننے سے بھی اس کو وحشت ہوتی ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں یہ بات بار بار بیان ہوئی ہے کہ آدمی کے دل پر یہ مہر اس کے گناہوں کی پاداش میں لگتی ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ	کیا ان لوگوں کو جو اگلوں کے بعد اس زمین کے
مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ	وارث ہوئے اس بات سے کوئی سبق حاصل نہیں
بِذُنُوبِهِمْ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ	ہوتا کہ اگر ہم چاہتے تو ان کے گناہوں کی پاداش
فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۝ (۱۰۰- اعراف)	میں ان پر بھی آفت لاتے اور ان کے دلوں پر مہر کر

دیتے پس وہ سننے سمجھنے سے رہ جاتے۔

اس آیت میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ دلوں پر مہر گناہوں کی سزا کے طور پر لگتی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ	اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں
فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا	لے کر آئے لیکن یہ لوگ ایمان لانے والے نہ بنے
مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ	کیوں کہ یہ پہلے سے جھٹلاتے رہے تھے، اسی طرح
عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَمَا	اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے۔ ہم نے
وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَ	ان میں سے اکثر کے اندر عہد کی پابندی نہیں پائی
اِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ۝	بلکہ ہم نے ان میں سے اکثر کو بدعہد اور نافرمان
(۱۰۱-۱۰۲، اعراف)	پایا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد اور اس کے احکام کی خلاف ورزی میں یہ پہلے سے مشاق تھے۔ اس وجہ سے جب ان کے رسول بھی ان کے پاس اللہ کی آیات اور اس کی نشانیاں لے کر آئے تو انھوں نے ان کی بھی کوئی پروا نہ کی۔ جو لوگ حق کی تکذیب میں اس طرح دیدہ دلیر اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے جس سے ان کی عقل بالکل ہی ماری جاتی ہے۔

اس سے زیادہ وضاحت و تصریح کے ساتھ یہود کے بارے میں فرمایا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ	پس بوجہ اس کے کہ انھوں نے عہد کو توڑا، اللہ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ	کی آیات کا انکار کیا، انبیاء کو ناحق قتل کیا اور
حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ	کہا کہ ہمارے دل تو بند ہیں بلکہ اللہ نے ان کے
طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا	دلوں پر ان کے کفر کے سبب سے مہر کر دی ہے تو
يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (۱۵۵- نساء)	وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم۔

مذکورہ بالا آیات سے ایک تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی ماں کے پیٹ سے اس کے دل پر مہر کر کے نہیں بھیجتا بلکہ یہ مہر جس کے دل پر بھی لگتی ہے اس کے گناہوں کے قدرتی نتیجہ کے طور پر لگتی ہے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ ہر درجہ کا گناہ وہ چیز نہیں ہے جس کے نتیجہ میں کسی کے دل پر مہر لگ جایا کرے، بلکہ کوئی فرد یا کوئی گروہ جب حق کو حق سمجھتے ہوئے، اپنے دل کی گواہی کے بالکل خلاف محض ضد، نفسانیت اور ہٹ دھرمی کے سبب سے اس کی مخالفت کرتا ہے اور اس مخالفت پر جم جاتا ہے تب اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور وہ صحیح طور پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت

سے محروم ہو جایا کرتا ہے۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ دل کا اس طرح سر بند ہو جانا اور سمع و بصر کی صلاحیتوں سے اس طرح محروم ہو جانا اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہے جو اس کی نعمتوں کی ناشکری کی پاداش میں کسی فرد یا گروہ پر اس دنیا میں نازل ہوتا ہے اور اسی عذاب کا فطری نتیجہ وہ عذاب عظیم ہے جس میں اس طرح کے لوگ اس زندگی کے بعد والی زندگی میں مبتلا ہوں گے۔ چنانچہ زیر بحث آیت کے آخر میں یہ جو فرمایا ہے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے) وہ درحقیقت اسی ختم قلوب کے اس قدرتی نتیجہ کا بیان ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا۔

ختم قلوب کی جو حقیقت ہم نے بیان کی ہے اس کی یہی حقیقت احادیث سے بھی واضح ہوتی ہے۔ ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک حدیث پر یہاں اکتفا کرتے ہیں۔

ان المومن اذا اذنب كانت نكتة سوداء في قلبه فان تاب ونزع واستعتب صقل قلبه وان زادت حتى تعلو قلبه فذلك الران الذي قال الله تعالى كلا بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون۔	مومن جب کوئی گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کے سبب سے اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے، اس گناہ سے باز آجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا ہے تو اس کے دل کا وہ دھبہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کے گناہوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ ان کی سیاہی اس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے تو یہی وہ رَین ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ كلا بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون (ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی سیاہی چھا گئی ہے)
(ابن کثیر بحوالہ ترمذی)	

سلف صالحین کے نزدیک بھی ختم قلوب کی یہی حقیقت ہے۔ ابن کثیر نے اعمش کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اعمش کہتے ہیں کہ مجاہد نے ایک مرتبہ ہمیں سمجھایا کہ سلف (صحابہؓ) دل کو اس ہتھیلی کے مانند سمجھتے تھے۔ جب آدمی کسی گناہ میں آلودہ ہوتا ہے تو (انھوں نے اپنی انگلی سکیڑتے ہوئے سمجھایا) دل اس طرح سکڑ جاتا ہے۔ پھر جب مزید گناہ کرتا ہے تو (دوسری انگلی کو سکیڑتے ہوئے بتایا) دل اس طرح بھنچ جاتا ہے اسی طرح تیسری انگلی کو سکیڑا۔ یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے تمام انگلیوں کو سکیڑ لیا۔ پھر فرمایا کہ جب دل گناہوں کے غلبہ سے اس طرح بھنچ جاتا ہے تو اس پر مہر کر دی جاتی ہے۔ مجاہد نے بتایا کہ سلف (صحابہؓ) اسی چیز کو وہ رَین قرار دیتے تھے جس کا ذکر كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ الآیہ میں آیا ہے۔

جبر اور اختیار

ختم قلوب کی اصل حقیقت واضح ہو جانے کے بعد ہمیں جبر و اختیار کی اس بحث میں پڑنے کی ضرورت

باقی نہیں رہی جو اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان برپا ہے اور جس میں یہ حضرات بے ضرورت اس آیت کو بھی گھسیٹ لے گئے ہیں۔ قرآن مجید نہ تو اس جبر ہی کے حق میں ہے جس کے مدعی اشاعرہ ہیں اور نہ اس اختیار ہی کے حق میں ہے جس کے علم بردار معتزلہ ہیں بلکہ حق ان دونوں کے درمیان ہے لیکن یہ مقام اس مسئلہ کی تفصیلات کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ہم صرف چند اصولی باتیں یہاں بیان کیے دیتے ہیں جو ان لوگوں کے لیے ان شاء اللہ کفایت کریں گی جو اس مسئلہ پر ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر صرف علمی ذہن کے ساتھ غور کریں گے۔ یہ اصولی باتیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ مبداء فطرت سے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اچھی فطرت پر پیدا کیا ہے، اس کو نیکی و بدی کا امتیاز بخشا ہے اور ان میں سے جس کو بھی وہ اختیار کرنا چاہے اس کو اختیار کرنے کی اس کو آزادی دی ہے۔ اس کے بعد اس کا نیک یا بد بننا اس کے اپنے رویہ اور توفیقِ الٰہی پر منحصر ہے۔ اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کی توفیق بخشتا ہے اور اگر وہ بدی کی راہ پر جانا چاہتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ، اگر چاہتا ہے، بدی کی راہ پر جانے کے لیے بھی چھوڑ دیتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ جن چیزوں پر انسان کا مواخذہ کرے گا یا جن پر اس کو اجر دے گا ان کے لیے اس نے انسان کو اختیار و ارادہ کی آزادی بھی بخشی ہے۔ جو لوگ اس اختیار و ارادہ کے حامل نہیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو مواخذہ سے بھی بری رکھا ہے۔ یہ اختیار و ارادہ انسان کا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے اور اس کا استعمال بھی انسان اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی کے تحت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت اور حکمت کے تحت انسان کے جس ارادہ کو چاہے پورا نہ ہونے دے البتہ اگر وہ اپنی کسی حکمت کے تحت اس کے کسی نیکی کے ارادہ کو پورا نہیں ہونے دیتا تو اس نیکی کے اجر سے اس کو محروم نہیں کرتا۔ اسی طرح اگر اس کی کسی بدی کی اسکیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے نہیں دیتا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس کے اخروی خمیازہ سے بھی لازماً اس کو بری قرار دے دے۔

۳۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی مطلق مشیت کا بیان ہوا ہے اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کی مشیت کو اس کے سوا کوئی دوسرا روک یا بدل نہیں سکتا۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کی مشیت سرے سے کسی عدل و حکمت کی پابند ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ عادل اور حکیم ہے، اس کا کوئی کام بھی عدل اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا اس وجہ سے جہاں کہیں بھی اس نے اپنی مشیت کو بیان فرمایا ہے اس کو اس قانونِ عدل و حکمت ہی کے تحت سمجھنا چاہیے جس کے تحت اس نے اس دنیا کے نظم کو چلانا پسند فرمایا ہے۔ یہ خیال کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ اپنی جو سنت اس نے خود جاری کی ہے اور جس قانونِ عدل کو اس نے خود پسند فرمایا ہے اپنی مشیت کے زور سے خود ہی اس کو توڑے گا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ تو اس کے معنی یہ

نہیں ہیں کہ اس پر ہدایت و ضلالت کے لیے اس نے عدل و حکمت کا کوئی ضابطہ سرے سے مقرر ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہدایت و ضلالت اس سنت کے مطابق واقع ہوتی ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے لیے مقرر کر رکھی ہے اور کوئی دوسرا اس سنت کے توڑنے یا بدلنے پر قادر نہیں ہے۔

۴۔ قرآن مجید میں بعض افعال اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمائے ہیں لیکن ان سے اصل مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ان افعال کی نسبت نہیں ہے بلکہ ان ضابطوں اور ان قوانین کی نسبت ہے جن کے تحت وہ افعال واقع ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ ضابطے اور قاعدے خود اللہ تعالیٰ ہی کے ٹھہرائے ہوئے ہیں اس وجہ سے کہیں کہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے تحت واقع ہونے والے افعال کو بھی اپنی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے فلما ازاغوا ازاغ اللہ قلوبھم (جب وہ کج ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل کج کر دیئے) یا فرمایا ہے ونقلب افئدتھم وابصارھم (اور ہم ان کے دل اور ان کی آنکھیں الٹ دیتے ہیں) اس طرح کے مواقع پر عموماً قرآن مجید میں وہ اصول بھی بیان کر دیا جاتا ہے جس کے تحت وہ فعل واقع ہوتا ہے۔ مثلاً اس طرح کی کوئی بات کہہ دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں گمراہ کرتا مگر فاسقوں کو۔ ان اشارات کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ قاری اصل حقیقت کی طرف متوجہ ہو جائے اور ظاہر الفاظ سے کسی مغالطہ میں نہ پڑ جائے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا ازلی و ابدی اور محیط کل علم، اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سنتوں میں سے کسی سنت کی نفی نہیں کرتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ ہر شخص کے متعلق ازل سے یہ جانتا ہے کہ وہ ہدایت کی راہ اختیار کرے گا یا ضلالت کی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ ہدایت یا ضلالت کو اسی سنت اللہ کے مطابق اختیار کرے گا جو ہدایت و ضلالت کے لیے اس نے مقرر کر رکھی ہے۔

ان اصولی باتوں کو جو شخص پیش نظر رکھے گا وہ انشاء اللہ ان بہت سی الجھنوں سے آپ سے آپ نکل جائے گا جو جبر و اختیار کے معاملہ میں قرآن مجید کی پیدا کردہ نہیں بلکہ متکلمین کی موشگافیوں کی پیدا کردہ ہیں۔

۸۔ مجموعہ آیات ۶-۷ کا اصلی مدعا

ان آیات کا اصل مدعا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف یہ خبر دینا نہیں ہے کہ فلاں گروہ کے لوگ، خواہ تم ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، ایمان لانے والے نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں آیتیں (۶-۷) چند نہایت اہم حقائق سے پردہ اٹھا رہی ہیں۔ ہم ان میں سے بعض باتوں کی طرف یہاں اشارہ کریں گے تاکہ ان آیات کی اصل تعلیم واضح ہو سکے۔

۱۔ پہلی چیز جو ان آیات کے اندر سب سے زیادہ واضح ہے وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی اور آپ کے مخالفین کے لیے سرزنش اور دھمکی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے کہ آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہ لوگ اپنے کفر پر جو جمے ہوئے ہیں تو اس وجہ سے جمے ہوئے ہیں کہ آپ کے انذار و تبلیغ میں

کوئی کسر ہے یا آپ جو کلام سنا رہے ہیں وہ کسی پہلو سے غیر مؤثر ہے۔ نہ آپ کے انذار و تبلیغ میں کوئی کسر ہے نہ اس کلام میں کوئی نقص یا خلا ہے بلکہ ساری خرابی خود ان لوگوں کے اپنے دلوں کے اندر ہے۔ اللہ کے دین کی صداقتوں کو جھٹلاتے جھٹلاتے اب یہ قانونِ الٰہی کی زد میں آچکے ہیں جس کے سبب سے ان کے دلوں کے اندر سے اثر پذیری کی، ان کے کانوں کے اندر سے حق نیوشی کی اور ان کی آنکھوں کے اندر سے عبرت نگاہی کی ساری صلاحیتیں سلب ہو چکی ہیں۔ اب آپ ان کی صلاح و فلاح کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائیں۔ اب ان کے لیے اگر کوئی چیز باقی رہ گئی ہے تو وہ اللہ کا عذاب ہے جس سے وہ لازماً دوچار ہوں گے۔

٢۔ دوسری حقیقت جو واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر ایمان و ہدایت کے داخل ہونے کا رستہ اس کا دل، اس کی عقل، اس کے کان اور اس کی آنکھیں ہیں۔ اگر آدمی ان کو کھلا رکھے، آفاق اور انفس کے اندر ہر وقت جو مشاہدے ہو رہے ہیں ان پر بصیرت کی نگاہ ڈالے۔ خدا کے کلام اور داعیانِ حق کی باتوں کو سراپا گوش ہو کر سنے اور پھر ان ساری چیزوں پر تدبّر و تفکر کرے اور راستبازی و دیانتداری کے ساتھ جن حقائق تک پہنچے ان کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے اور ان کو حرزِ جاں بنائے تب اس کو ہدایت ملتی ہے اگر وہ یہ راہ نہ اختیار کرے اور قدرت کی بخشی ہوئی ان صلاحیتوں سے نہ کام لے تو وہ لاکھ سر مارے لیکن اس کے لیے ایمان و ہدایت کی راہ نہیں کھل سکتی۔

٣۔ تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان کی روحانی و عقلی ترقی اور اس کے کمال کا تمام تر انحصار اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سمع، بصر اور فواد کی جو عظیم صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں ان کو ان کے صحیح مقصد کے لیے استعمال کرے۔ اگر آدمی ان کو استعمال نہ کرے یا استعمال تو کرے لیکن اس اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال نہ کرے جس کے لیے یہ فی الحقیقت عطا ہوئی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو وبال بنا دیتا ہے۔ ان کے وبال ہونے کی صورت ان کے استعمال نہ کرنے کی حالت میں تو یہ ہوتی ہے کہ آدمی سب کچھ رکھنے کے باوجود فکر و عمل کے ہر میدان میں عاجز و درماندہ رہتا ہے اور غلط استعمال کرنے کی صورت میں یہ وبال اس طرح بنتی ہیں کہ یہ آدمی کو زندگی بھر ہر وادی اور ہر صحرا میں ہرزہ گردی کراتی ہیں یہاں تک کہ اس خلائے لامتناہی میں بھی اس کو چکر کراتی ہیں اگر نہیں پہنچنے دیتیں تو اسی دروازے پر جو نجات اور فلاح کا اصلی دروازہ ہے۔

٩۔ آگے کا مضمون ——— آیات ٨ - ١٦

اب آگے انھی ایمان نہ لانے والوں کا ایک اور گروہ کا بیان ہو رہا ہے جس کی خصوصیات اور جس کا ذہنی پس منظر مذکورہ بالا گروہ سے کچھ مختلف ہے اس وجہ سے وہ مستقلاً ذکر کیے جانے کا مستحق ہے فرمایا۔

آیات ٨-١٦

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨﴾ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩﴾ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ
بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿١٠﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا
فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿١١﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ
الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٢﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ
اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾ وَاِذَا لَقُوا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ
قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾ اَللّٰهُ
يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٥﴾
اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ
تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿١٦﴾

ترجمۂ آیات ٨-١٦

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان
رکھتے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ یہ لوگ اللہ کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکا دینا چاہتے
ہیں حالاں کہ یہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں اور اس کا احساس نہیں کر رہے
ہیں۔ ان کے دلوں میں روگ تھا تو اللہ نے ان کے روگ کو بڑھا دیا، اور ان کے لیے دردناک

عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پیدا کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے لوگ ہیں۔ آگاہ رہو کہ یہی لوگ فساد برپا کرنے والے ہیں لیکن یہ محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں، کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟ آگاہ رہو کہ بے وقوف یہی لوگ ہیں لیکن یہ جانتے نہیں۔ اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کی مجلسوں میں پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ ہیں، ہم تو ان لوگوں سے محض مذاق کرتے ہیں۔ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے اور ان کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دیئے جا رہا ہے، یہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی تو ان کی تجارت ان کے لیے نفع بخش نہ ہوئی اور یہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔ ۸ - ۱۶

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (۸) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۹)

'الناس' سے مراد

مِنَ النَّاسِ: الناس کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اس عام سے ایک خاص گروہ مراد ہے اور وہ گروہ ہے یہود کا۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ صرف یہود ہی ہو سکتے تھے جن کے اندر کی کوئی جماعت وہ روپ دھار سکتی تھی جس کی طرف قرآن نے ان آیات میں اشارہ کیا ہے۔ آگے مستقل عنوان سے اس اجمال کی وضاحت آئے گی۔

'خدع' اور 'مخادعت' کا مفہوم

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ: مخادعت کے معنی ہیں دھوکا دینے کی کوشش کرنا عام اس سے کہ وہ دھوکا کامیاب ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ یہاں مخادعت کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے اور خدع کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے، جہاں لفظ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے وہاں تو مخادعت استعمال ہوا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی خواہش تو کوئی شخص اپنی حماقت کے سبب سے کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کو دھوکا دے نہیں سکتا۔

برعکس اس کے خود ان کے لیے خدع کا لفظ استعمال ہوا ہے کیوں کہ جو شخص خدا کو دھوکا دینے کا ارادہ کرتا ہے وہ اپنی اس کوشش میں تو ناکام رہتا ہے لیکن خود اپنے آپ کو وہ ضرور دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ : شعور کا لفظ کسی محسوس چیز کے ادراک کے لیے آیا کرتا ہے۔ یہاں اس لفظ کا استعمال اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اگرچہ خدا کو دھوکہ دینے کی کوشش میں خود دھوکا کھا جانا ایک محسوس ہونے والی چیز ہے لیکن یہ بزعم خود ہوشیار لوگ ہوشیاری وچالاکی کے زعم کے باوجود اتنے غبی ہیں کہ اس حقیقت کا احساس نہیں کر رہے ہیں کیونکہ ابھی اس کا نتیجہ ان کے سامنے نہیں آیا ہے۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (۱۰)

مرض کا مفہوم

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ : مرض کا لفظ قرآن میں عموماً دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک کینہ اور حسد کے معنی میں۔ دوسرے نفاق کے معنی میں۔ جن مقامات میں یہ لفظ نفاق کے ساتھ استعمال ہوا ہے وہاں تو یہ واضح طور پر کینہ اور حسد کے معنی میں ہے لیکن جن مقامات میں یہ تنہا استعمال ہوا ہے وہاں یا تو دونوں معانی اس کے اندر جمع ہیں یا قرینہ اس کے دونوں معانی میں سے کسی ایک معنی کو متعین کرتا ہے۔ یہاں واضح قرینہ اس بات کے لیے موجود ہے کہ اس سے مراد حسد ہے کیوں کہ یہاں جس گروہ کا بیان ہے آگے چل کر واضح ہوگا کہ یہ یہود ہی کے اندر کا ایک گروہ ہے اور یہود کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں سے جو حسد تھا وہ معلوم ومشہور ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس کا ذکر فرمایا ہے۔

زیادتی مرض کا پہلو

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا : یہاں حسد کے بڑھانے کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے جو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے تو یہ درحقیقت اس سنت کو اس نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے جس کے تحت یہ فعل انجام پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے سینہ کو ایمان واسلام کی جلوہ گاہ بنانے کے بجائے اس کو بغض وحسد ہی کی پرورش گاہ بنائے رکھنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے اسی طرح کے حالات وواقعات ظاہر ہونے لگتے ہیں جو اس کی اسی لہلہاتی فصل کی آبیاری کرتے ہیں۔ یہود کو مسلمانوں پر حسد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی نعمت کیوں دے دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام اور اس کی برکتوں کی روز افزوں ترقی نے ان کے اس حسد کے اسباب میں اور زیادہ اضافہ کیا اور یہ اضافہ برابر ہوتا ہی رہا یہاں تک کہ اس چیز نے ان کو بالکل تباہ کر کے چھوڑا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (۱۱) اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (۱۲)

فساد فی الارض کی حقیقت

لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ : افساد فی الارض قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم اس نظام حق کو بگاڑنا یا اس کو بگاڑنے کی کوشش کرنا ہے جو اللہ واحد کی عبادت اور اس کے احکام وقوانین کی اطاعت پر مبنی ہوتا ہے اور جس کی دعوت انبیائے کرام علیہم السلام لے کر آتے ہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ جس

طرح اس کائنات کا نظام تکوینی اس وجہ سے قائم ہے کہ اس کے اندر ایک ہی رب قدیر و قہار کا ارادہ کارفرما ہے، اگر اس کے اندر کسی اور کا زور و اختیار بھی چلتا ہوتا تو یہ آن کے آن میں درہم برہم ہو کے رہ جاتا اسی طرح اس کے نظام تشریعی کے اندر اگر کسی اور کی عبادت و اطاعت کے جواز یا دخل کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے اس کا مزاج بالکل ہی بگڑ کے رہ جاتا ہے اور یہ بگاڑ سارے نظام تمدن کو خراب کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ کوشش قرآن کے نزدیک فساد فی الارض کے حکم میں داخل ہے جو اس بگاڑ کا دروازہ کھولے اگرچہ یہ کوشش بظاہر اصلاح کے نیک ارادہ ہی کے ساتھ کیوں نہ کی جائے

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۱۳)

كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ: یہاں الناس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (۱۴)

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ: خلوا کے بعد الیٰ کا صلہ تقاضا کرتا ہے کہ یہاں کوئی فعل ایسا محذوف مانا جائے جو اس صلہ سے مناسبت رکھنے والا ہو۔ ہم نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

لفظ 'شیطان' کی تحقیق

شیطان کا لفظ شاط یشیط سے فعلان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی جلد باز، تند خو مشتعل مزاج اور شریر و سرکش کے آتے ہیں۔ ان خصوصیات کے حامل جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔ یہاں یہ لفظ یہود کے ان لیڈروں کے لیے استعمال ہوا ہے، جو فساد فی الارض کے اس سارے کھیل کی رہنمائی کر رہے تھے۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۵)

اللہ کا مذاق

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ: مد کے معنی ڈھیل دینے اور کسی کی رسی دراز کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان پر حجت تمام کرنے کے لیے ان کی رسی دراز کرتا جا رہا ہے تاکہ جب ان کو پکڑے تو ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اپنے جس مذاق کا ذکر فرمایا ہے یمدھم فی طغیانھم کے الفاظ اسی کی وضاحت کر رہے ہیں۔ یہ لوگ خوش تھے کہ مسلمانوں کو بے وقوف بنانے اور اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں، حالانکہ صحیح راہ بتانے والے کو اپنے خیال کے مطابق جو شخص دھوکا دے کر ایک غلط راہ اختیار کرتا ہے وہ راہ بتانے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ وہ خود اپنے آپ ہی کو

آوارہ گردی کی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔ اب یہ محض اس کی خود فریبی اور حماقت ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے راہ بتانے والے کو دھوکا دیا ہے۔ دھوکا تو درحقیقت اس نے خود کھایا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (۱۶)

'اشتراء' کا مفہوم

اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ ، اشتراء کے معنی خریدنے کے ہیں۔ آدمی جس چیز کو کوئی قیمت ادا کر کے خریدتا ہے اس کو اس شے کے مقابل میں، جس کو وہ قیمت قرار دیتا ہے، ترجیح دیتا ہے۔ یہیں سے اس لفظ کے اندر ترجیح دینے کا مفہوم پیدا ہو گیا اور اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

۱۱۔ یہ اشارہ کن لوگوں کی طرف ہے؟

یہود کا ایک خاص گروہ

اوپر دو گروہوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک ان لوگوں کا جو ایمان لائے، دوسرے ان لوگوں کا جو ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے بعد یہ ایک تیسرے گروہ کا بیان ہے جو تعلق تو رکھتا ہے ایمان نہ لانے والے گروہ سے لیکن اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے ان سے کچھ مختلف مزاج رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ گروہ کن لوگوں کا ہے؟ لوگوں نے عام طور پر یہ سمجھا ہے کہ یہ منافقین کا گروہ ہے لیکن یہاں شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ منافقین کے لفظ سے جو گروہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہ ظاہرا ہر پہلو سے اپنے آپ کو مسلمانوں کے اندر شامل رکھنے کی کوشش کرتا تھا، اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اس کو جو عداوت تھی وہ چھپی ہوئی تھی جو صرف خاص خاص مواقع ہی پر ظاہر ہوتی تھی لیکن اس گروہ کی جو خصوصیات قرآن نے بیان فرمائی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ تو باطناً مسلمانوں کے ساتھ تھے اور نہ زبانی ہی ان کے ساتھ اتفاق کے اظہار کے لیے آمادہ تھے۔ مثلاً یہ لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان کا اظہار زبان سے بھی کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ علاوہ ازیں یہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے بالاتر سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ان سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ اگر ایمان کے مدعی ہو تو مسلمانوں کی طرح ایمان لاؤ تو کھلم کھلا مسلمانوں کو بے وقوف ٹھہراتے تھے۔ اس وجہ سے ان کو عام معنی میں منافقین کے زمرہ سے سمجھنا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ منافقین کے زمرہ سے تعلق نہیں رکھتے تو پھر یہ کون لوگ ہیں اور کس زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی یہود ہی کے اندر کا ایک گروہ تھا لیکن اسلام کی مخالفت میں اس کا کردار اس گروہ کے کردار سے کچھ مختلف نوعیت کا تھا جس کا ذکر اوپر گزرا ہے۔ اوپر جس گروہ کا ذکر ہوا ہے وہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات بھی سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا،

بلکہ اندھا بہرا ہو کر آپ کی مخالفت پر اُتر آیا تھا، لیکن یہ گروہ اسلام کی مخالفت مصلحت اندیشی کے رکھ رکھاؤ اور مصالحت پسندی کے روپ میں کرنا چاہتا تھا۔

مندرجہ بالا آیات پر اچھی طرح غور کرنے سے اس گروہ کا جو ذہنی پس منظر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں تک اسلام دشمنی کے جذبہ کا تعلق ہے یہ گروہ پچھلے گروہ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ یہود میں دوسروں کے بالمقابل اپنی برتری کا جو احساس تھا وہ بھی ان لوگوں کے اندر بدرجہ اتم موجود تھا۔ بنی اسماعیل پر، ان کے اندر آخری نبی کی بعثت کی پیشین گوئی کے سبب سے، یہود کو جو حسد تھا، اس حسد میں بھی یہ مبتلا تھے بلکہ اس پیشین گوئی کے عملاً ظہور، اسلام کی روز افزوں ترقی اور عربوں کے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی مقبولیت نے ان کے اس حسد میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ ان ساری باتوں میں یہ لوگ اپنے ہم قوموں کے شریک تھے۔ لیکن یہ اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے مجرد انکار اور ضد کی اس پالیسی کو صحیح نہیں سمجھتے تھے جو یہود کے اس گروہ نے اختیار کی تھی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بلکہ یہ لوگ یہودیت اور اسلام کے درمیان ایک قسم کے سمجھوتے کے خواہش مند تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ اسلام بھی اپنی جگہ پر رہے اور ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے خود ان کو جو مرتبہ اور امتیاز حاصل ہے وہ بھی باقی رہے۔ اس کی جو شکل ان کے ذہن میں تھی وہ ان آیات کی روشنی میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ مسلمانوں سے اس بات کے خواہش مند تھے کہ مسلمان اپنی طرح ان کو بھی مومن اور خدا پرست سمجھیں کیونکہ جہاں تک اللہ اور آخرت پر ایمان کا تعلق ہے ان کا دعویٰ تھا کہ ان دونوں چیزوں پر یہ بھی ایمان رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ مسلمان اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیغمبر اور ان کی پیش کی ہوئی کتاب کو آسمانی کتاب کی حیثیت سے ماننا چاہتے ہیں تو مانیں لیکن ان سے اُن کے ماننے کے لیے اصرار نہ کریں، اگر انھوں نے دوسروں کی نجات بھی ان کے ماننے پر منحصر کر دی اور جس نے نہ مانا اس کو اللہ اور اس کے رسول کا مکذب قرار دے دیا تو اس سے ان کے نزدیک اس ملک کے مختلف مذہبوں اور ان کے پیرووں کے درمیان ایک سخت قسم کی منافرت اور کشمکش کی حالت پیدا ہو جائے گی اور مذہبی رواداری کی وہ فضا جو اس ملک کے اندر اب تک قائم رہی ہے ختم ہو کے رہ جائے گی۔ اپنے اسی خیال کی بنا پر یہ لوگ اپنے آپ کو اصلاح کرنے والا بھی سمجھتے تھے۔ یعنی ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ہم اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کو نہیں مان رہے ہیں تو یہ کسی افساد کی کوشش نہیں ہے بلکہ یہ عین اصلاح کی کوشش ہے کیونکہ اس طرح ہم اس انتشار کو روک رہے ہیں جو اس نئی نبوت اور اس نئی دعوت سے پیدا ہو رہا ہے۔

۱۲- مجموعۂ آیات ۸-۱۶ پر تدبّر

اس گروہ کو اچھی طرح مشخص کر لینے اور اس کے ذہنی پس منظر کو وضاحت کے ساتھ سمجھ لینے کے بعد

ان آیات پر دوبارہ تدبر کی نگاہ ڈالیے تو ایک ایک لفظ کی خوبیاں اور ایک ایک فقرہ کی بلاغتیں اور باریکیاں اچھی طرح سمجھ میں آئیں گی۔ نیز یہ واضح ہوگا کہ اسلام کے یہ چالاک دشمن کیا کہتے اور کیا چاہتے تھے اور قرآن نے ان کی ہر بات پر کتنی سخت اور کیسی برمحل گرفت کی ہے۔

سب سے پہلے ان کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے دعوے کو لیجیے۔ اس دعوے سے ان کا مقصد محض اپنے آپ کو قرآن کی گرفت سے بچانا تھا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے اوپر قرآن میں جو اتنی لے دے ہو رہی ہے یہ بالکل غلط اور ناجائز ہے۔ ہم بھی اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ دینداری اور خدا پرستی تنہا مسلمانوں ہی کا اجارہ نہیں ہے۔ اس دھونس سے وہ اپنے خلاف مسلمانوں کی زبانیں بند کرنا چاہتے تھے۔ حالاں کہ یہ حقیقت ان سے مخفی نہیں تھی کہ قرآن ان سے جس ایمان و اسلام کا مطالبہ کر رہا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جس کے یہ مدعی ہیں۔ قرآن کا مطالبہ ان سے جس ایمان و اسلام کے لیے تھا وہ صرف اس شکل میں پورا ہو سکتا تھا جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خود قرآن پر اس طرح ایمان لاتے جس طرح مسلمان ایمان لائے تھے۔ چوں کہ یہ لوگ اس بات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہوئے بات بنانے اور دھونس جمانے کی کوشش کر رہے تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کی اس کوشش کو مخادعت یعنی دھوکہ بازی سے تعبیر فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا کہ ان کی یہ دھوکا بازی صرف مسلمانوں ہی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی ہے کیوں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے منشا کو سمجھتے ہوئے اس سے گریز کی راہ تلاش کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کے ساتھ چال بازی کرتا ہے خواہ وہ اپنے اس فعل کے اس مکروہ پہلو کو سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔

پھر یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ وہ کوشش تو کر رہے ہیں اللہ کو اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کی لیکن درحقیقت وہ اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص چال بازی کر کے اپنے کسی ناصح مشفق کے مشورہ کو ٹھکراتا ہے وہ اس ناصح مشفق کا کچھ نہیں بگاڑتا بلکہ وہ اپنے آپ ہی کو کسی کھڈ میں گراتا ہے۔ فرض کیجیے ایک حاذق اور خیر خواہ طبیب کسی مریض کے لیے ایک نسخہ لکھتا ہے۔ مریض اس نسخہ کو تو استعمال نہیں کرتا، البتہ طبیب کو مختلف حیلوں حوالوں سے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اس سے بہتر نسخہ استعمال کر رہا ہے اور وہ تمام تندرستوں سے زیادہ تندرست ہے۔ ہو سکتا ہے کہ طبیب اس کی جھوٹی قسموں اور اس کی ہیر پھیر کی باتوں سے خاموش ہو جائے لیکن اس دھوکا بازی کا خمیازہ کس کے سامنے آئے گا، طبیب کے سامنے یا مریض کے سامنے؟ ظاہر ہے کہ مریض ہی کے سامنے۔ اب یہ محض اس کی اپنی بے عقلی ہوگی اگر وہ اس امر واقعی کا احساس نہ کرے۔

اس کے بعد قرآن نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ ایک حقیقت کا جرأت کے ساتھ استقبال کرنے کے بجائے انھوں نے جھوٹ اور فریب کی یہ روش جو اختیار کی ہے اس کا سبب ان کا وہ حسد ہے جو بنی اسمٰعیل

کے خلاف وہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کے اندر اپنا آخری نبیؐ مبعوث فرمایا، اس پر اپنی کتاب اتاری، اس نبی کی دعوت پھیلنے لگی اور اس بات کے آثار صاف نظر آنے لگے کہ اب دنیا کی دینی رہنمائی کی باگ بنی اسرائیل کے ہاتھوں سے نکل کر بنی اسماعیل کے ہاتھوں میں جا رہی ہے تو یہ غصہ اور حسد سے کھولنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ انعام ان پر کیوں فرمایا، اس کے حق دار تو ہم تھے اور جتنا ہی بنی اسماعیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات بڑھتے گئے اتنا ہی ان کے حسد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

ان لوگوں کے اندر حق پسندی اور اخلاقی جرأت ہوتی تو یہ خود اس حق کا ساتھ دے کر اللہ تعالیٰ کے اس انعام میں حصہ دار بن سکتے تھے لیکن یہ لوگ نہ تو دینی پیشوائی کے موروثی پندار سے دستبردار ہونے کے لیے تیار تھے، نہ اپنے حسد کے سبب سے اس بات کے لیے تیار ہوئے کہ بنی اسماعیل کے اندر پیدا ہونے والے نبیؐ پر ایمان لائیں اور نہ یہی جرأت رکھتے تھے کہ خم ٹھونک کر میدان میں آئیں اور اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکیں۔ جب ان باتوں میں سے کسی بات کی بھی ہمت وہ نہ کر سکے تو واحد راہ جو ان کے لیے باقی رہ گئی تھی وہ یہی تھی کہ جھوٹ اور فریب کے دامن میں پناہ لیں۔ چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو خبردار کیا کہ یہ انھوں نے بہت ہی غلط پناہ گاہ تلاش کی ہے، اگر اس پناہ گاہ کے اندر انھوں نے چھپنے کی کوشش کی تو دنیا میں حسد کی آگ میں جلتے رہیں گے اور آخرت میں ان کا انجام دردناک عذاب ہے۔

دوسری چیز جو خاص طور پر توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی جو مخالفت کر رہے تھے قرآن نے اس کو زمین میں فساد برپا کرنے سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ درحقیقت کسی فعل کو اس کے آخری نتائج سے تعبیر کرنے کا ایک معروف اسلوب ہے جو قرآن میں بہت سے مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ اس اسلوب کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے سامنے اس کے کسی فعل کا آخری نتیجہ آجاتا ہے، یہ چیز کسی فعل سے باز رکھنے میں بھی مددگار ہوتی ہے اگر فعل بُرا ہو، اور اس پر ابھارنے میں بھی مددگار ہوتی ہے، اگر فعل اچھا ہو۔ بات جو ان لوگوں سے کہنی تھی وہ تو یہی تھی کہ دینِ حق کی دعوت میں روک نہ بنیں لیکن محض اتنی بات کہنے سے ان کے سامنے یہ حقیقت پوری طرح واضح نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی اس روش سے اس دنیا کی تباہی و بربادی میں کس درجہ کا حصہ لے رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس روش کا وہ انجام ان کے سامنے رکھ دیا گیا ہے جو سامنے آسکتا ہے اگر خدانخواستہ وہ اپنی اس مہم میں کامیاب ہو جائیں۔

رہا اس زمین کا صلاح و فساد تو اس کا انحصار، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، صرف اس چیز پر ہے کہ اس کے اندر کس کا حکم اور کس کا قانون چلتا ہے۔ اس کے حقیقی خالق و مالک کا، یا کسی اور کا۔ اگر اس کے خالق و مالک کا حکم چلتا ہے تو اس سے اس زمین پر امن و عدل کا صحیح نظام قائم ہو گا اور اس کی وہ تمام برکتیں ظہور میں آئیں گی جو اس کے اندر ودیعت ہیں۔ اور اگر صورت اس کے برعکس ہو تو اس کے ہر گوشہ میں فساد رونما ہو گا اگرچہ اس فساد کو تہذیب و تمدن کے کتنے ہی خوش نما ناموں سے موسوم کر دیا جائے۔

انبیاء علیہم السلام چونکہ اس زمین میں خدا کا قانون جاری کرنا چاہتے ہیں اس وجہ سے ان کی جدوجہد اس زمین کی اصلاح کی حقیقی جدوجہد ہوتی ہے اور اس کی مخالفت کی راہ میں ہر قدم فساد کا قدم ہے خواہ وہ بظاہر کتنے ہی نیک ارادہ کے ساتھ اٹھایا جائے۔ اسلام کے یہ مخالفین اپنی اس مخالفت کے لیے وجہ جواز یہ پیش کرتے تھے کہ ایک نئی نبوت کے ظہور اور خاص کر اس کے اس دعوے کے سبب سے کہ کہ خدا کا حقیقی دین وہی ہے جس کو اس نے پیش کیا ہے، اس ملک میں سخت انتشار پیدا ہو رہا ہے اس وجہ سے یہ جو اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں یا اس سے لوگوں کو روک رہے ہیں تو اس ملک میں فساد نہیں مچا رہے ہیں بلکہ اس کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔ فساد تو ان کے خیال میں وہ لوگ برپا کر رہے تھے جنھوں نے یہ نئی دعوت بلند کی تھی یا اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ قرآن مجید نے اس کا جواب یہ دیا کہ فساد برپا کرنے والے تو درحقیقت یہی لوگ ہیں لیکن ان کو اپنے فساد کا احساس نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنی خودغرضی اور تنگ نظری کے سبب سے اس حقیقت کو سمجھ نہیں رہے ہیں کہ اس دنیا کی اصلاح اس طرح نہیں ہو سکتی کہ حق اور باطل، کفر اور اسلام دونوں کو ملا کر رکھا جائے، بلکہ اس کی اصلاح کا واحد راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی ہے اس کی پیروی کی جائے۔ ان لوگوں کا پہلا جرم تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا کی بتائی ہوئی صراط مستقیم گم کی اور اب جب کہ اللہ تعالیٰ اس کو از سر نو دنیا کے لیے کھول رہا ہے تو ان مفسدین کی کوشش یہ ہے کہ لوگ اس صراط مستقیم کو اختیار کرنے کے بجائے اپنی اپنی پسند کردہ پگڈنڈیوں ہی پر بھٹکتے رہیں اور اس حماقت کو یہ لوگ اصلاح سمجھتے ہیں حالاں کہ یہ عین افساد ہے۔

تیسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے اس دعوائے ایمان اور اس مظاہرۂ رواداری کے پس پردہ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تحقیر کا جو خبث چھپا ہوا تھا قرآن نے نہایت خوبی کے ساتھ اس سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے تاکہ ان کی دھوکا بازی کے سبب سے اگر کسی مسلمان کو یہ غلط فہمی ہو رہی ہو کہ یہ لوگ دوسروں کے مقابل میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے کچھ فراخ دل ہیں تو یہ غلط فہمی دور ہو جائے۔ یہ پردہ قرآن نے اس طرح اٹھایا ہے کہ ان کا یہ راز فاش کر دیا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں پر تو اپنے مومن ہونے کی دھونس جماتے ہیں تاکہ مسلمان ان کو اپنے سے کچھ مختلف نہ سمجھیں لیکن دوسری طرف ان کے خبث باطن کا یہ حال ہے کہ اگر ان سے کوئی یہ کہہ بیٹھے کہ اگر آپ لوگ ایمان کے مدعی ہیں تو سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح قرآن پر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کیوں نہیں لاتے تو یہ بات سنتے ہی ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ کیا ہم ان ناسمجھ اور احمق لوگوں کی طرح ہر ایرے غیرے کو نبی مان لیں اور اس کے پیچھے لگ جائیں؟

قرآن مجید نے ان کی اس بات کا جواب یہ دیا کہ بے وقوف اور احمق تو درحقیقت یہی لوگ ہیں

لیکن چوں کہ ابھی ان کی اس بے وقوفی کا انجام ان کے سامنے نہیں آیا ہے اس وجہ سے موقع ہے کہ یہ کچھ دنوں یہ دانش فروشی اور کرلیں۔

قرآن مجید نے ان لوگوں کا یہ راز بھی یہاں کھول دیا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے پاس جب آتے ہیں تو ان پر یہ اثر جمانے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا ان کے اور مسلمانوں کے درمیان سرے سے کوئی تفاوت ہے ہی نہیں لیکن جب یہ اپنی مجلسوں میں جاتے ہیں اور اپنے لیڈروں سے ملتے ہیں تو وہاں مسلمانوں کے سامنے اپنی کہی ہوئی باتوں کی صفائی پیش کرتے ہیں اور ان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم تو بدستور آپ کے ساتھ ہیں، مسلمانوں سے جو باتیں ہم کہتے ہیں وہ تو محض ان کو بے وقوف بنانے کے لیے بطور مذاق کہتے ہیں۔

قرآن مجید نے ان کی اس بات کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ تو سمجھ رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مذاق کر رہے ہیں حالانکہ مذاق ان کے ساتھ قدرت کر رہی ہے جو ان کی اس سرکشی کے باوجود ان کو ڈھیل پر ڈھیل دیے جا رہی ہے۔ وہ اپنی چالوں میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور یہ نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ان کا یہ آگے بڑھنا اس ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لیے آگے بڑھنا ہے جو اس طرح کے لوگوں کے لیے خدا کی طرف سے مقدر ہے لیکن انھیں نظر نہیں آرہا ہے۔

اس سلسلہ کی آخری بات جو فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ عقل و دانش کے اس ادعا کے باوجود انھوں نے سودا بہت غلط کیا۔ انھوں نے ہدایت کے بدلہ میں ضلالت خریدی اور اس کو بڑا نفع بخش مال سمجھا لیکن یہ مال ان کے لیے نہ آخرت میں نفع بخشنے والا ہے نہ دنیا میں۔ آخرت میں تو اس کی قدر و قیمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن دنیا کے بازار میں اگر اس کی مانگ تھی تو نبی آخر الزمان کی بعثت سے وہ بھی ختم ہو گئی۔ اور اب یہ لوگ خسر الدنیا والآخرہ کے مصداق ہیں۔ ان کی یہی ضلالت پسندی ان کے اسلام سے محرومی کا سبب بھی بنی ہے۔

۱۳۔ ایک شبہ کا ازالہ

ان آیات میں قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مخالفوں کے لیے جو لفظ استعمال ہوئے ہیں وہ بظاہر سخت معلوم ہوتے ہیں، ممکن ہے ان کی وجہ سے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو کہ یہ اندازِ کلام اس حکمتِ دعوت کے منافی ہے جس کی نصیحت خود قرآن نے فرمائی ہے۔ قرآن مجید نے خود یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کے رستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور اہل کتاب کے بارے میں تو خاص طور پر اس کی یہ ہدایت ہے کہ ان سے صرف خوب صورت طریقہ ہی سے دین کے معاملہ میں بحث و گفتگو کی جائے۔ پھر یہاں قرآن نے انھی اہل کتاب کے ایک گروہ کے بارے میں سفہاء، مفسدین اور ان کے اکابر اور لیڈروں کے لیے شیاطین تک کے الفاظ کیوں استعمال فرمائے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ الفاظ دعوت کے دور میں استعمال نہیں ہوئے ہیں بلکہ یہ اس وقت استعمال ہوئے ہیں جب انھوں نے اپنی مسلسل ہٹ دھرمیوں اور شرارتوں اور اسلام کے خلاف اپنی پیہم ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے اور یہ کسی طرح بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اس مرحلہ میں آکر ان لوگوں کے لیے یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور مقصود ان کے استعمال سے صرف غصہ اور نفرت کا اظہار نہیں ہے بلکہ بیان واقعہ اور اظہار حقیقت ہے تاکہ دوسرے لوگ جو اپنے دین و ایمان کی سلامتی چاہتے ہیں ان لوگوں کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ آسمانی ہدایت کے ان قدیم وارثوں کا انحطاط اب کس درجہ تک پہنچ چکا ہے اور جن کو خدا نے اپنی زمین کی اصلاح کے کام پر مامور کیا تھا اب وہ اس میں کیا کیا فساد مچا رہے ہیں۔

یہ سورہ بقرہ، جس میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں، بنی اسرائیل کے لیے صرف دعوت کی سورہ نہیں بلکہ ان کے لیے ملامت کی سورہ بھی ہے۔ اس میں ان کے ان جرائم کی فہرست پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہے جو انھوں نے خدا کی شریعت اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے خلاف کیے ہیں اور جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بات کا مستحق قرار دیا ہے کہ وہ قوموں کی امامت کے منصب سے ہٹائے جائیں اور ان کی جگہ ایک دوسری امت اس منصب پر سرفراز کی جائے۔ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اچھی طرح اتمام حجت کر چکنے کے بعد فرمایا ہے اور اس کے وجوہ و دلائل آگے اس سورہ میں بیان ہوں گے۔ اس وجہ سے یہ بات عین اس سورہ کے مزاج کے مطابق ہے کہ اس میں بنی اسرائیل کے حقیقی چہرے سے نقاب اٹھا دی جائے تاکہ جن لوگوں پر ان کے مذہبی تقدس کا ایک رعب تھا اور جس سے یہ لوگ اسلام کے خلاف پراپیگنڈا کرنے میں فائدہ اٹھا رہے تھے وہ ختم ہو جائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی یہود کے علما اور لیڈروں کے لیے جو سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ بھی اس طرح کے اتمام حجت کے بعد استعمال فرمائے ہیں۔ حضرت مسیح کے یہ الفاظ انجیلوں میں موجود ہیں۔ اگر قرآن کے الفاظ سے ان کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے الفاظ بہت ہی نرم ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو ان کے لیے "سانپ کے بچوں" اور "سفیدی پھری ہوئی قبروں" تک کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔

۱۴- آگے کا مضمون —— آیات ۱۷-۲۰

اس کے بعد قرآن نے مذکورہ دونوں مخالف اسلام گروہوں کی ایک ایک تمثیل بیان کی ہے۔ پہلی تمثیل مقدم الذکر مختوم القلوب گروہ کی ہے جو اپنی فطرت کو اس قدر مسخ کر چکا ہے اور اسلام کی مخالفت میں اس قدر آگے جا چکا ہے کہ اب اس کے لیے اسلام قبول کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا ہے۔

دوسری تمثیل اس موخر الذکر گروہ کی ہے جو اسلام کی علانیہ مخالفت کے بجائے اس کے خلاف چالیں

چل رہا ہے اور ایک نہایت واضح حقیقت کا، جس کا حق ہونا خود اس پر بھی واضح ہے، نہایت اوچھی تدبیروں سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔

پہلے ان دونوں تمثیلوں کو، قرآن کے حکیمانہ الفاظ میں ملاحظہ فرما لیجیے، اس کے بعد ہم اپنے الفاظ میں ان کی وضاحت کریں گے۔ فرمایا:

آیات مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ
۱۷-۲۰ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ
لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾
أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ ۚ
يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ
الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ
أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ ۙ وَإِذَا أَظْلَمَ
عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ
أَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾ ع

ترجمۂ آیات ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے لوگوں کے لیے آگ جلائی، جب آگ
۱۷-۲۰ نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو ایسی تاریکی میں چھوڑ دیا جس میں ان کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اب یہ لوٹنے والے نہیں ہیں۔ ۱۷-۱۸

یا ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہو، اس میں تاریکی ہو، کڑک ہو اور چمک ہو۔ یہ کڑکے کی وجہ سے موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونسے لے رہے ہوں۔ حالانکہ اللہ کافروں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کو

خیرہ کیے دے رہی ہو جب جب چمک جاتی ہو یہ چل پڑتے ہوں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہو رک جاتے ہوں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھوں کو سلب کر لیتا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۹-۲۰

۱۵- الفاظ کی تحقیق

'صیب' کا مفہوم — صَیِّب کا لفظ سخت بارش کے لیے بھی آتا ہے اور زور کے ساتھ برسنے والے بادل کے لیے بھی۔ ہم نے اپنے ترجمہ میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تمثیل میں، جیسا کہ آگے واضح ہوگا، اس لفظ سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے اور قرآن کو خود قرآن میں بارش سے جگہ جگہ تشبیہ دی گئی ہے۔

'سماء' کا مفہوم — سَمَاء کا لفظ عام طور پر تو اس سقف نیلگوں کے لیے بولا جاتا ہے جس کو ہم آسمان کہتے ہیں، اس کے علاوہ یہ ابر کے معنی میں بھی آیا ہے اور اس فضائے بسیط و عریض کے لیے بھی جو ہمارے سروں پر ہے۔

بارش اگرچہ آسمان ہی سے ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ لفظ سماء کا اضافہ بظاہر کچھ غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس اضافہ سے ایک تو بارش کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اور اس تصویر کی کسی تمثیل میں بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ دوسرے اس سے قرآن مجید کے آسمانی ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہو رہا ہے کیوں کہ مراد اس بارش سے قرآن ہی ہے جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا۔

'صواعق' مفہوم — صواعق، صاعقہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی گرج اور کڑک کے بھی ہیں اور اس بجلی کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو کڑک کے ساتھ گرتی ہے۔

۱۶- دونوں تمثیلوں کی وضاحت

تمثیل ایک حقیقت — ان دونوں تمثیلوں کی وضاحت سے پہلے نفس تمثیل سے متعلق ایک اصولی حقیقت کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

وہ یہ کہ تمثیل اگرچہ تشبیہ ہی کی نوعیت کی ایک چیز ہے لیکن تشبیہ اور تمثیل میں بڑا فرق ہے۔ ایک عام تشبیہ میں اصلی نگاہ مشبہ اور مشبہ بہ پر ہوتی ہے اور ان دونوں کے اجزا کو الگ الگ ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کے دیکھا جاتا ہے کہ ان میں باہم دگر کتنی مشابہت و مطابقت پائی جاتی ہے اور پھر اسی مطابقت و مشابہت کے لحاظ سے اس تشبیہ کا حسن و قبح متعین ہوتا ہے لیکن تمثیل میں اجزا کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی بلکہ اس میں صورت واقعہ کو صورت واقعہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اگر ایک

صورت حال اور دوسری صورت حال میں پوری پوری مطابقت موجود ہے اور تمثیل صورت حال کی پوری تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کر رہی ہے تو وہ تمثیل مکمل ہے، اگرچہ تشبیہ کے وہ تمام ضوابط اس پر منطبق نہ ہو رہے ہوں جو ایک تشبیہ کے مکمل ہونے کے لیے اہل فن نے ضروری قرار دیے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب پہلی تمثیل کو لیجیے۔

پہلی تمثیل اور اس کا مصداق

یہ تمثیل ایک ایسے شخص کی تمثیل ہے جس نے اندھیری رات میں لوگوں کو روشنی دکھانے کے لیے آگ جلائی۔ اس نے یہ کام بڑی محنت اور بڑے اہتمام کے ساتھ کیا یہاں تک کہ اس کا تمام گردوپیش منور ہو گیا۔ لیکن جن لوگوں کے لیے اس نے یہ محنت برداشت کی انھوں نے اس روشنی کی کوئی قدر نہیں کی۔ ان کی اس ناقدری کی سزا اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دی کہ ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو ایک ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر چھوڑ دیا جہاں ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ پھر اس اندھیرے کے اوپر مزید غضب یہ ہے کہ یہ لوگ بہرے گونگے اور اندھے بھی ہیں اور یہ تمام اوصاف ان کے اندر بیک وقت موجود ہیں[1] اس وجہ سے نہ تو کبھی پکارنے والے کی پکار سن سکتے ہیں، نہ اس کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں اور نہ کسی نشان یا علامت یا اشارہ سے کوئی رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ جس راہ پر وہ چل پڑے ہیں اس سے مڑ کر کسی اور راہ کو اختیار کر سکیں۔

غور کیجیے تو یہ تمثیل ٹھیک ٹھیک یہود کے اس گروہ پر منطبق ہو رہی ہے جس کا ذکر پہلے ہوا ہے اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگ چکی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں اس وجہ سے اب وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

تمثیل میں آگ جلانے والے شخص سے اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔ انھوں نے اپنی قوم کے لیے ہدایت کی شمع جلائی اور اس شمع نے پوری قوم کے لیے اجالا بھی کر دیا لیکن زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ بنی اسرائیل کی اکثریت اس روشنی سے بیزار ہو گئی جس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر لعنت کر دی اور وہ ہدایت کی باتیں سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے۔

بنی اسرائیل کی اس محرومی و بدبختی کی تفصیلات تورات و انجیل میں بھی بیان ہوئی ہیں اور قرآن میں بھی اس کا ذکر مختلف مقامات میں آیا ہے۔ یہاں ان کی اسی حالت کو تمثیل کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تمثیل ایک قافلہ کی ہے جس کے تمام افراد بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، مزید براں رات اندھیری ہے اور اس اندھیری رات میں یہ قافلہ بھٹک رہا ہے، نہ یہ کسی کی سنتا ہے، نہ کسی کو پکار سکتا ہے نہ کسی کا

---

[1] صم بکم عمی سے متعلق استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ افادہ یہاں قابل ذکر ہے کہ اگر صفات کا بیان بغیر حرف عطف کے ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تمام صفات موصوف کے اندر بیک وقت موجود ہیں۔

جواب دے سکتا ہے اور نہ کسی نشان یا روشنی سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

دوسری تمثیل اور اس کا مصداق

دوسری تمثیل ایک ایسے قافلہ کی ہے جو رات کی تاریکی میں بارش میں گھر گیا ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے، بارش زوروں کی ہو رہی ہے، بارش کے ساتھ کڑک اور چمک بھی ہے۔ قافلہ والوں کا حال یہ ہے کہ جب کڑکا ہوتا ہے مارے خوف کے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں، جب بجلی کوندتی ہے تو اس کی روشنی میں چند قدم چل لیتے ہیں، جب غائب ہو جاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ تمثیل یہود کے اس دوسرے گروہ کی تصویر ہے جس کا ذکر وَمِنَ النَّاسِ الآیہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں بارش سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے۔ ظلمات سے اشارہ ان مشکلات راہ کی طرف ہے جن سے قرآن کی دعوت قبول کرنے والوں کو لازماً دوچار ہونا پڑتا تھا۔ رعد و برق سے مراد قرآن کی وہ دھمکیاں اور وعیدیں ہیں جو قرآن اپنے جھٹلانے والوں کو سنا رہا تھا اور جن کی زد خاص طور پر یہود پر پڑ رہی تھی۔ اس گروہ کو چونکہ قرآن کے حق ہونے کا پورا پورا احساس تھا اس وجہ سے یہ دھمکیاں اور وعیدیں ان کو بڑی شاق گزرتی تھیں۔ ان کا صحیح علاج یہ تھا کہ یہ قرآن کی دعوت قبول کر لیتے لیکن انھوں نے اس کے بالکل برعکس اس کا علاج یہ سوچا کہ قرآن کی بات سرے سے سنیں ہی نہیں۔ اس صورت حال کو تمثیل اس طرح مصور کر رہی ہے کہ یہ لوگ موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تدبیر ایک احمقانہ تدبیر ہے۔ اگر بجلی گرا چاہتی ہے تو اس سے بچاؤ کی یہ تدبیر کیا کارگر ہو سکتی ہے کہ آپ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں؟ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے کہ ایک شخص شیر کو دیکھے کہ وہ اس پر حملہ کیا چاہتا ہے لیکن وہ اپنی آنکھیں بند کر لے۔ کسی کے اس طرح آنکھیں بند کر لینے سے یہ تو ہونے سے رہا کہ شیر حملہ کرنے سے باز آ جائے۔ البتہ یہ ہو گا کہ اس کو شیر کا حملہ نظر نہیں آئے گا۔

اسی طرح قرآن مجید کی وعیدوں اور دھمکیوں کا یہ علاج کہ وہ سنی نہ جائیں ایک احمقانہ علاج ہے۔ اس سے ان کی واقعیت میں تو کوئی فرق پیدا نہیں ہو گا البتہ اگر ہو گا تو یہ ہو گا کہ یہ اس وقت واقع ہوں گی جب آدمی ان سے بالکل غافل ہو گا۔ شتر مرغ کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ طوفان کا خطرہ محسوس کرتا ہے تو اپنا سر ریت میں چھپا لیا کرتا ہے۔ کسی حقیقت سے فرار کے لیے یہود کے اس گروہ کی یہ پالیسی بھی شتر مرغ کی اس پالیسی سے کچھ مختلف نہ تھی۔

"جب بجلی چمکتی ہے تو چند قدم چلتے ہیں، جب غائب ہو جاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں"۔ یہ ان کی اس حیرانی و پریشانی کی تصویر ہے جس میں قرآن مجید کے نزول کے بعد وہ مبتلا ہو گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ قرآن کا مقابلہ کس طرح کریں۔ اس کی چمک اور دمک نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی تھی اور اس کی برق خاطف سے ان کے لیے بچنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ وہ حیران و درماندہ تھے کہ کیا کریں۔ اس حیرانی و درماندگی کی حالت میں اگر کوئی بات بنتی نظر آتی تھی تو بنانے کی کوشش کرتے تھے لیکن کسی حقیقت

کا مقابلہ محض سخن سازی سے زیادہ دیر تک ممکن نہیں ہے اس وجہ سے جب بنائی ہوئی بات بگڑ جاتی تو پھر حیران و درماندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگتے۔ چنانچہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ یہ مسلمانوں کو چکمہ دینے کے لیے یہ کہتے تھے کہ تم خدا اور آخرت پر ایمان کے مدعی ہو تو خدا اور آخرت پر تو ہم بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن جب اس پر یہ گرفت ہو جاتی کہ اگر ایمان کا دعویٰ ہے تو سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح کیوں ایمان نہیں لاتے تو پھر مجبور ہو کر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے اور ان کو گالیاں دینے لگتے۔

۱۷۔ دونوں گروہوں میں فرق

اس تفصیل سے یہ حقیقت تو واضح ہو گئی کہ مذکورہ دونوں تمثیلیں یہود ہی کے دو گروہوں کی ہیں لیکن اس بات کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے کہ ان دونوں گروہوں میں فرق و اختلاف کی نوعیت کیا ہے!

عام طور پر تو، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک گروہ کفار منکرین کا ہے اور دوسرا گروہ منافقین کا۔

جہاں تک پہلے گروہ کا تعلق ہے وہ تو بلا شبہ قرآن اور اسلام کے جامد مخالفین ہی کا ہے لیکن دوسرے گروہ کے متعلق ہم اوپر یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ اس کو عام معنی میں منافقین کا گروہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ منافقین جہاں تک کم از کم ظاہر کا تعلق ہے اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ نہیں رکھتے تھے لیکن ان لوگوں کا جو حال اوپر بیان ہوا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ یہ لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا اظہار نہ تو عملاً کرتے تھے اور نہ قولاً کرنے کے لیے تیار تھے۔ حد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو علانیہ بے وقوف ٹھہراتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کو عام معنی میں منافقین کے زمرہ سے سمجھنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

ہمارے نزدیک یہ دونوں گروہ ہیں تو یہود ہی کے اور دونوں اسلام اور قرآن کے مخالف بھی ہیں لیکن دونوں کی مخالفت کے مزاج الگ الگ ہیں۔ پہلے گروہ کی مخالفت کا مزاج جمود اور ہٹ دھرمی ہے، یہ اندھوں اور بہروں کی طرح انکار پر جم گیا ہے، اور اپنی رائے کے خلاف کوئی بات بھی سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دوسرے کی مخالفت کا مزاج حاسدانہ لیکن ساتھ ہی بزعم خود مصلحت اندیشانہ بھی ہے۔ یہ ان تمام خطرات کو بھانپ رہا ہے جو اسلام کے ظہور سے یہودیت اور نصرانیت سب کے لیے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ کسی طرح ان خطرات کا سدباب کرے۔ اس مقصد کے لیے جو تدبیر اس کی سمجھ میں آئی ہے، وہ یہ ہے کہ جس حد تک اپنے آبائی طریقہ پر قائم رہتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کی ہم آہنگی کی جا سکے ان کی ہم آہنگی کی جائے اور ساتھ ہی ان سے بھی یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ بھی اپنی انفرادیت سے دست بردار ہو کر دین داری اور خدا پرستی کا کوئی مقام ان کے لیے بھی تسلیم کرنے

پر راضی ہو جائیں لیکن قرآن نے اس بات کو نہایت غیر مبہم الفاظ میں ظاہر کر دیا ہے کہ دینِ حق اس قسم کی سودا بازی کے لیے نہیں آیا ہے، جس کو ایمان لانا ہو وہ سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح ایمان لائے ورنہ جو راہ اس کو پسند ہے اس کو اختیار کرے اور اس کے نتائج بھگتے۔

اگرچہ پہلے گروہ کی ہٹ دھرمی اور ضد کی طرح اس دوسرے گروہ کی یہ چالبازی بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے لیکن اس گروہ کا یہ احساس کہ قرآن کا مقابلہ ہٹ دھرمی اور ضد سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لیے ہوشیاری اور مصلحت بینی کی ضرورت ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے گروہ کی طرح قبولیتِ حق کی صلاحیت اس کے اندر بالکل مردہ نہیں ہو چکی ہے بلکہ اس کے اندر اس صلاحیت کی کچھ نہ کچھ رمق ابھی باقی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر اس نے بھی اس صلاحیت سے فائدہ نہ اٹھایا بلکہ حق سے فرار کی انھی تدبیروں میں مشغول رہا جن میں اس وقت مشغول ہے تو سنتِ الٰہی کے مطابق اس کی یہ رہی سہی صلاحیت بھی سلب ہو جائے گی۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن کے یہ الفاظ اشارہ کر رہے ہیں وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں سلب کر لیتا (لیکن وہ ہر ایک کو پوری مہلت دیتا ہے) بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

۱۸۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۱-۲۹

ان دونوں تمثیلوں کے بعد ذرا دیر کے لیے یہود سے صرفِ نظر کر کے چند آیتوں میں بنی اسمٰعیل (عربوں) کو خطاب کیا گیا ہے اور ان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس نعمت کی قدر کریں اور قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ اصل سلسلۂ کلام سے ہٹ کر اس دعوت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ یہود کی اس مخالفت کا اصلی محرک وہ حسد تھا جو وہ بنی اسمٰعیل سے اس بنا پر پہلے سے رکھتے تھے کہ ان کے صحیفوں میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ آخری نبی امیوں (بنی اسماعیل) کے اندر پیدا ہوں گے۔ اس پیشین گوئی نے قرآن کے نزول اور اسلام کے ظہور سے جب ایک واقعہ کی شکل اختیار کر لی اور یہود پر اس کی صداقت کے آثار ظاہر ہو گئے تو ان کا یہ حسد جو اب تک چھپا ہوا تھا، بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا۔ انھوں نے یہ ٹھان لی کہ جس طرح بھی ممکن ہو گا اس دعوت کو ناکام بنائیں گے اور دینی پیشوائی کی جو عزت ان کو اب تک حاصل رہی ہے اس کو عربوں کی طرف منتقل نہ ہونے دیں گے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر وہ جس طرح اپنی قوم کے لوگوں کو اسلام سے دور رکھنے کے لیے طرح طرح کے شگوفے چھوڑا کرتے تھے اسی طرح عربوں کے اندر بھی مختلف قسم کی وسوسہ اندازیاں کرتے رہتے تھے تاکہ یہ اس نعمت سے محروم رہ جائیں جو قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل فرمانی چاہی ہے اور جس کے نتیجے میں ان کو تمام عالم کی امامت و سیادت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہود اس قسم کی سازشوں میں ہمیشہ سے استاد رہے ہیں اس وجہ سے سادہ لوح عرب

ان کے جگھوں میں آجاتے تھے اور اسلام کے خلاف یہودیوں کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کو بے سمجھے
بوجھے خود بھی دہرانا شروع کر دیتے تھے۔ قرآن نے یہاں اصل سلسلہ کلام کو تھوڑی دیر کے لیے روک کر ان
کو متنبہ کیا کہ تم اللہ کی اس کتاب پر جس کی حجت تمہارے اوپر پوری ہو چکی ہے ایمان لاؤ۔ اگر تم نے محض یہود
کی وسوسہ اندازیوں کے فریب میں مبتلا ہو کر اس نعمت عظمیٰ سے اپنے آپ کو محروم کر لیا تو یاد رکھو کہ اس کی سزا بڑی
ہی سخت ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ٢١-٢٦

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ
فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ
مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا
فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٣﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا
النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ښ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٤﴾
وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ
قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ
وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥﴾ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ

بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۲۶
الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ
مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ
ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۲۷ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا
فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۲۸
ھُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۤ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى
السَّمَاۗءِ فَسَوّٰىھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَھُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۲۹ ع ۳

ترجمہ آیات ۲۱-۲۹

اے لوگو، بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو۔ اس کی بندگی، جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل تمہاری روزی کے لیے۔ تو تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ درآں حالے کہ تم جانتے ہو۔ ۲۱-۲۲

اگر تم اس چیز کی جانب سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو لاؤ اس کے مانند کوئی سورہ اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو۔ پس اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر، جو تیار ہے کافروں کے لیے اور بشارت دو ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے اس بات کی کہ ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ جب جب اس کے پھل ان کو کھانے کو ملیں گے تو کہیں گے، یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہمیں عطا ہوا تھا۔ اور ملے گا اس سے ملتا جلتا اور ان کے لیے اس میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۲۳-۲۵)

اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کوئی تمثیل بیان کرے، خواہ وہ مچھر کی ہو یا اس سے

بھی کسی چھوٹی چیز کی۔ تو جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی بات حق ہے ان کے رب کی جانب سے، رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تو وہ کہتے ہیں کہ اس تمثیل کے بیان کرنے سے اللہ کا کیا منشا ہے؟ اللہ اس چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ گمراہ نہیں کرتا مگر انھی لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔ جو اللہ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو نامراد ہونے والے ہیں۔ ۲۶-۲۷

تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مُردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے پھر زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف توجہ کی اور سات آسمان استوار کر دیے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۲۸-۲۹

۱۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

'یٰاَیُّھَا النَّاسُ' کا خطاب مشرکین سے ہے

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۲۱)

یٰاَیُّھَا النَّاسُ سے خطاب اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن یہاں مخاطب، جیسا کہ اوپر گزرا، خاص طور پر مشرکین عرب ہیں۔ اس خطاب کو مشرکین کے ساتھ مخصوص ماننے کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اس کے بعد جو بات کہی گئی ہے، جو طرزِ استدلال اختیار کیا گیا ہے اور مخاطب سے جو مطالبہ کیا گیا ہے، ہر چیز اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ یہاں خطاب کا اصل رُخ مشرکین ہی کی طرف ہے۔ یہود کے ذکر کے بیچ میں یہ خطاب بطور ایک التفات کے آگیا ہے۔

اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ: لفظ عبادت کی تحقیق سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہاں اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ سے مقصود مشرکین کو صرف خدا کی بندگی کی دعوت دینا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ خدا کی بندگی کی اس دعوت کو قبول کریں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔ اس کلام کی یہی پوشیدہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے اس کے ساتھ وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا کا ربط موزوں ہوا۔ یعنی پیغمبر جس بندگی کی

دعوت دے رہے ہیں اس کو قبول کرو اور اگر تمہیں اس کتاب کے بارے میں شبہ ہے کہ یہ کوئی من گھڑت چیز ہے، خدا کی اتاری ہوئی نہیں ہے، تو تم بھی اس کے مانند کوئی سورہ پیش کر دو۔

نیز اس کے اندر یہ بات بھی چھپی ہوئی ہے کہ تم خدا کی جس بندگی کے مدعی ہو وہ درحقیقت خدا کی بندگی نہیں ہے، خدا کی بندگی کا صحیح طریقہ وہی ہے جس کی دعوت یہ کتاب دے رہی ہے۔

خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ: خَلَقَكُمْ کے ساتھ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ کا اضافہ اس لیے فرمایا ہے کہ مشرکین عرب اس بات کے تو قائل تھے کہ ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن اپنے بزرگوں میں سے انھوں نے بعضوں کو خدائی صفات میں شریک قرار دے کر خالق کی صف میں کھڑا کر دیا تھا اور ان کے بت بنا کر ان کی پرستش کرنے لگ گئے تھے۔ یہاں قرآن نے ان کے ساتھ ساتھ ان کے تمام اگلوں کو بھی عام مخلوقاتِ الٰہی میں شامل کر کے اشارۃً اس بات کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ خدا کی بندگی کرنی ہے تو نہ صرف اپنے آپ کو مخلوق و مقہور مان کر خدا کے آگے جھکو بلکہ ان کو بھی خدا ہی کی مخلوق مانو جن کو تم نے اپنی حماقت سے خالق کا درجہ دے رکھا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ: لعل مختلف معنوں کے لیے آتا ہے جن میں سے کسی چیز کے ممکن و متوقع نتیجہ کے بیان کے لیے بھی اس کا استعمال مشہور و معروف ہے، ہم نے اس کو اسی معنی میں یہاں لیا ہے اور جس سیاق میں یہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے ہمارے نزدیک اس کے یہی معنی صحیح ہیں۔

تَتَّقُونَ کے یہاں دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم تقویٰ حاصل کرو، دوسرے یہ کہ تم خدا کے غضب اور اس کے عذاب سے بچو۔ یہاں دونوں معنوں کے صحیح ہونے کا امکان ہے لیکن ہم نے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے۔ اس صورت میں اس کے مفعول کو محذوف ماننا پڑے گا۔ اس محذوف کو قرآن نے اس کے بعد والی آیت میں خود کھول دیا ہے۔ فرمایا ہے۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (۲۴ - بقرہ) (پس اس آگ سے بچو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر بنیں گے)

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (۲۲)

فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ: انداد ندّ کی جمع ہے جس کے معنی ہم سر، ہم پایہ، مدِ مقابل، مشابہ اور کفو کے ہیں۔

اہل عرب صفات باری سے متعلق ان تمام بنیادی مقدمات کو تسلیم کرتے تھے جن سے بدیہی طور پر توحید ثابت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ خدا کے شریک بھی مانتے تھے اس وجہ سے یہ فرمایا کہ جب تم خود اس بات کو جانتے ہو کہ خدا ہی نے تمہیں پیدا کیا ہے، اسی نے تمہارے اگلوں کو پیدا کیا ہے، اسی نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا ہے، اسی نے آسمان کا شامیانہ تانا ہے، اسی نے آسمان سے پانی اتارا

ہے اور اسی نے تمہارے رزق کے لیے قسم قسم کے پھل اور میوے پیدا کیے ہیں تو پھر ان کو خدا کا شریک کیوں ٹھہراتے ہو جنھوں نے ان کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کیا ہے ؟ یہاں جانتے ہو کا مفہوم یہ ہے کہ ان ساری باتوں کو مانتے اور ان کا اقرار کرتے ہو۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲۳)

شہید کا مفہوم

وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ : شہید، قوم کے اس لیڈر، ترجمان اور نمائندہ کو کہتے ہیں، جو اہم مواقع پر اس کی ترجمانی اور نمائندگی کرتا ہے اور اس کا حمایتی بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ یہ حمایتی انسانوں میں سے بھی ہو سکتے تھے اور اہل عرب کے اعتقاد کے مطابق جنوں میں سے بھی ہو سکتے تھے۔ عرب جاہلیت میں شاعروں اور خطیبوں کی بڑی عزت و عظمت تھی کیونکہ یہی لوگ تمام اہم مواقع پر قومی وقار کے محافظ بن کر کھڑے ہوتے تھے مشرکین عرب یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک جن ہوا کرتا ہے جو اس کو شعر الہام کرتا ہے۔ چنانچہ وہ قرآن کے متعلق بھی یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ بھی اسی قسم کے الہام کا کرشمہ ہے۔ ان کے انھی خیالات کی بنا پر ان سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر تم قرآن کو کسی انسان یا جن کی گھڑی ہوئی چیز سمجھتے ہو تو اپنے ان حمایتیوں کی مدد سے اس کے مانند ایک ہی سورہ پیش کر دو۔ اگر یہ تمہارے حمایتی اس نازک موقع پر بھی، جب کہ تمہارے آبائی دین کے ساتھ ساتھ خود ان کی خدائی بھی معرض خطر میں ہے، تمہاری مدد کے لیے نہ اٹھیں تو سمجھ لو کہ یہ قرآن خدا کی کلام ہے اور تمہارے یہ سارے دیوی دیوتا بالکل بے حقیقت ہیں۔ قرآن میں دوسرے مواقع پر اس مضمون کی وضاحت بھی موجود ہے۔ مثلاً فرمایا ہے قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (۸۸ - بنی اسرائیل) (کہہ دو اگر تمام جن و انس متفق ہو کر بھی زور لگائیں کہ اس قرآن کی مثال پیش کریں تو اس کی مثال نہ پیش کر سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں) دوسری جگہ اس مضمون کی مزید وضاحت ہوئی ہے۔ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ (۱۳-۱۴، ہود) (اور اللہ کے سوا جن کو بھی تم بلا سکتے ہو اپنی مدد کے لیے بلا لو اگر تم سچے ہو، پس اگر وہ تمہاری امداد کو نہ پہنچیں تو سمجھ لو کہ یہ چیز اللہ کے علم سے اتری ہے)

إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ : اگر تم سچے ہو کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم قرآن کے بارے میں جو گمان رکھتے ہو اگر اس میں سچے ہو۔ دوسرا یہ کہ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ خدا کے سوا تمہارے کچھ اور حمایتی اور مددگار بھی ہیں۔ اگر فی الواقع تمہارے کچھ حمایتی اور مددگار موجود ہیں تو ان کو مدد کے لیے بلاؤ، اس سے زیادہ ان کی مدد طلب کرنے اور ان کے تمہاری مدد کے لیے اٹھنے کا اور کون سا موقع اہم ہو سکتا ہے۔

میرا اپنا رجحان اس دوسرے مفہوم کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلے مفہوم پر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (۲۴)

بتوں کو عذاب دینے کی وجہ

وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ: یہ الفاظ اس آگ کے مزاج کو ظاہر کر رہے ہیں جس سے قرآن کے ان جھٹلانے والوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آگ کے مرغوب ایندھن اول تو وہ لوگ ہوں گے جن کے اندر کفر اور شرک کا مواد موجود ہوگا، انھی کے جسموں سے یہ آگ اپنے اصلی رنگ میں بھڑکے گی اور دوسرے درجہ پر اس کے ایندھن وہ پتھر ہوں گے جو معبودوں کی حیثیت سے دنیا میں پوجے گئے ہیں یا پوجے جا رہے ہیں کیونکہ اس پرستش کے سبب سے شرک کا وہ آتش گیر مادہ کچھ نہ کچھ ان کے اندر بھی پیدا ہو جاتا ہے جو اس آگ کی مرغوب غذا ہے۔

الْحِجَارَةُ کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن موقع کلام سے واضح ہے کہ اس سے مراد وہی تراشے ہوئے پتھر ہیں جن کی دیوی دیوتا کی حیثیت سے پرستش ہوتی ہے۔ ان کو دوزخ میں پھینکنے سے مقصود دراصل ان کو عذاب دینا نہیں بلکہ ان کے پرستاروں کے عذاب میں اضافہ کرنا ہوگا۔ اس طرح ان کو دکھایا جائے گا کہ جن کے آگے وہ دنیا میں ڈنڈوت کرتے رہے ہیں اور جن کی ضیافت کے لیے دودھ اور حلوے پیش کرتے رہے ہیں ان کی یہاں کیا گت بن رہی ہے۔

کفر کے شعائر کی توہین سے مقصود درحقیقت کفر کی توہین ہوتی ہے۔ اس ساری حقیقت کی وضاحت قرآن مجید نے ایک دوسرے مقام پر خود فرما دی ہے:

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ	تم اور وہ چیزیں جن کی تم خدا کے سوا پرستش
حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ ۝ لَوْ	کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن بنیں گے، تم سب کو اس میں
كَانَ هَٰؤُلَاءِ آلِهَةً مَّا وَرَدُوهَا ۖ وَكُلٌّ	جانا ہوگا، اگر یہ واقعی معبود ہوتے تو جہنم میں نہ
فِيهَا خَالِدُونَ ۝ ۹۸-۹۹ (الانبیاء)	پڑتے اور تم سب اس میں ہمیشہ رہو گے۔

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِن ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوا هَٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِن قَبْلُ ۖ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۲۵)

جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ: باغ کا سب سے زیادہ دلکش تصور یہ ہے کہ وہ بلندی پر ہو اور اس کے نیچے نہر جاری ہو۔ بلندی اس کے منظر کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے اور سیلاب وغیرہ کی آفتوں سے محفوظ رکھتی ہے اور نیچے بہنے والی نہر اس کی شادابی کی ضمانت دیتی ہے۔ بلندی کے باغ کی تمثیل اسی

سورہ کی آیت ۲۶۵ میں بھی موجود ہے کَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ الآیۃ۔ زیر بحث آیت میں تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ کے الفاظ سے یہ بات خود بخود واضح ہو رہی ہے کہ یہ باغ بلندی پر ہوں گے۔

قول کی مختلف شکلیں — قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ، قول کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک قول وہ ہوتا ہے جو سنا جاتا ہے۔ ایک قول وہ ہوتا ہے جو سرا ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے سَوَاءٌ مِنْكُمْ مَنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ (۱۰ رعد) (یکساں ہیں تم میں سے وہ جو قول کو پوشیدہ رکھیں اور وہ جو اس کو ظاہر کریں) اجمروا شارہ کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ مثلاً:

فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ	اشارہ سے بتا دے کہ میں نے خدائے رحمان کے
صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ	لیے روزے کی منت مانی ہے، آج میں کسی انسان
إِنْسِيًّا (۲۶۔ مریم)	سے کلام نہیں کروں گی۔

زبان حال و فعل سے جو اشارہ نکلتا ہے وہ بھی قول کی ایک شکل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جو بات آدمی اپنے دل میں کہتا ہے اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب اور قرآن مجید میں اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں مثلاً سورۂ مائدہ میں منافقین کا حال بیان ہوا ہے:

يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ	وہ کہتے ہیں ہمیں اندیشہ ہے کہ کوئی مصیبت نہ ہم پر آپڑے
فَعَسَى اللّٰهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ	تو بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح لائے یا اپنی طرف سے
مِنْ عِنْدِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا	کوئی اور بات دکھائے اور ان کو اس بات پر نادم
فِي أَنْفُسِهِمْ نَادِمِينَ (۵۲۔ مائدہ)	ہونا پڑے جو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوتے ہیں۔

مذکورہ آیت میں ان منافقین کے دل کے خیال کو قول سے تعبیر فرمایا ہے اور پھر یہ تصریح بھی فرما دی ہے کہ یہ ان کے دل کی چھپی ہوئی بات ہے۔ اسی طرح زیر بحث آیت میں قالوا، سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے دلوں میں خیال کریں گے کہ دنیا میں ہمیں قرآن مجید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جن نعمتوں کے مزے اپنی بشارتوں سے چکھائے تھے وہی نعمتیں ہمارے سامنے اب اپنی حقیقی شکل و صورت میں آرہی ہیں۔ یہ خیال ایک گہری مسرت، ایک عمیق احساس کامیابی اور ایک پُرجوش جذبۂ شکر و سپاس کے ساتھ ان کے دلوں میں پیدا ہوگا۔ وہ خوش ہوں گے کہ الحمد للہ جن وعدوں پر وہ جیے اور مرے وہ سب سچے ثابت ہوئے اور جس جنت کی نعمتوں کے مزے اب وہ لوٹ رہے ہیں اس کی ایک تمثیلی سیر قرآن کی بدولت انھوں نے دنیا ہی میں کرلی تھی۔

رزق کی دو قسمیں — اس ٹکڑے میں رزق کا لفظ بھی قابل غور ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں بھی اور قرآن میں بھی رزق مادی اور رزقِ روحانی دونوں ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ صرف کھانے پینے کی چیزوں ہی کو رزق نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اصلی رزق وہ علم و معرفت ہے جو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں حاصل ہوا ہے

اسی وجہ سے وحی کو قرآن نے رزق کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔

'مِنْ قَبْلُ' کی دو تاویلیں لوگوں نے کی ہیں ایک یہ کہ اس سے پہلے دنیا میں، دوسری یہ کہ اس سے پہلے اسی جنت میں۔ میرے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں تاویلوں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میرے نزدیک، جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ اشارہ دنیا کی طرف ہے۔ اس کے وجوہ آگے چل کر واضح ہوں گے۔

'ازواج مطہرۃ' کا مفہوم

اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ: زوج کے معنی جوڑے کے ہیں، عورت کے لیے مرد جوڑا ہے اور مرد کے لیے عورت۔ انسان کے اندر قدرت نے خود ایک خلا چھوڑا ہے جو اس جوڑے کے سوا کسی اور شکل سے پورا نہیں ہوتا اس وجہ سے اس کے بغیر انسان کے لیے کسی نعمت کا تصور بھی کامل نہیں ہوتا چنانچہ جنت میں بھی، جو کمال نعمت کی تعبیر ہے، اس کا ذکر موجود ہے۔ اس کے ساتھ 'مطہرہ' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ نہایت اہتمام کے ساتھ ان کی تربیت ہوئی ہے اور ان کا تزکیہ کیا گیا ہے تاکہ وہ اہل جنت کی رفاقت کے لیے پوری طرح موزوں ہو سکیں۔ یہ مفہوم لفظ مطہرہ سے نکلتا ہے اس لیے کہ تطہیر کے معنی ہیں خاص اہتمام و توجہ کے ساتھ کسی کے عادات و خصائل اور طبیعت و مزاج کو سنوارنا اور پاکیزہ بنانا۔ سورۂ احزاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو بہت سے ضروری آداب کی تعلیم دینے کے بعد فرمایا ہے۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ	اللہ تو بس یہ چاہتا ہے، اے نبی کے اہل بیت
الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ	کہ تم سے آلائش دنیا کو دور کرے اور تمہیں
تَطْهِيْرًا (۳۳ - احزاب)	پاک کرے جیسا کہ پاک کرنے کا حق ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (۲۶)

تمثیل کی اصل قدر و قیمت

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا: ضرب مثل کے معنی ہیں کسی حقیقت کو تمثیل کے پیرایہ میں سمجھانا۔ اعلیٰ حقائق اور روحانی لطائف کو جب تک تمثیل کا جامہ نہ پہنایا جائے اس وقت تک وہ عام عقل کی گرفت میں نہیں آتے اس وجہ سے روحانی حقائق کی تعلیم میں اس صنف کلام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ انبیاء اور حکماء کے کلام میں اس کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ تورات اور انجیل پر ایک نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا کلام تمثیلات سے بھرا ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بھی بے شمار تمثیلات ہیں۔ قرآن میں بھی اس صنف کلام کی نہایت اعلیٰ مثالیں موجود ہیں۔

تمثیل میں جو چیز دیکھنے کی ہوتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس میں جو حقیقت پیش کی گئی ہے وہ کتنی خوبی کے ساتھ پیش ہوتی ہے۔ اس چیز سے کچھ زیادہ بحث نہیں ہوتی کہ تمثیل کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ ایک حقیقت کو نگاہوں کے سامنے مصور کر دینے کے لیے جو چیز بھی مفید مقصد ہو سکتی ہے اس سے تمثیل میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے خواہ وہ مکھی ہو یا مچھر یا مکڑی۔ قرآن مجید نے مشرکین کے معبودوں کی بے بسی کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ اگر مکھی بھی ان خداؤں سے کوئی چیز چھین لے تو یہ اس کا بھی کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اسی طرح شرکا اور شفعا پران کو جو اعتماد تھا، اس کی بے حقیقتی کی مثال مکڑی کے جالے سے دی ہے۔ یہود دین کے اصولوں سے بے پروا ہو کر اس کی جزئیات کا جو اہتمام کرتے تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کو مچھر کے چھاننے اور اونٹ کے نگل جانے سے تشبیہ دی ہے۔

یہ ساری تشبیہیں اور تمثیلیں اس اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں کہ ان میں جو حقائق پیش کیے گئے ہیں وہ ان تمثیلوں کے پیرایہ میں نہایت خوبی کے ساتھ ایک عام آدمی کی سمجھ میں بھی آجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے علم اور معرفت کے قدردان ان تمثیلوں کی بڑی قدر کرتے ہیں اور ان سے بڑا فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن جو لوگ علم و معرفت کے دشمن اور خواہشات نفس کے غلام ہوتے ہیں وہ ان تمثیلات سے بہت چڑتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمثیلات ان کے لیے وہ چیزیں بے نقاب کرتی ہیں جن کا بے نقاب ہونا ان کے نفس کی خواہشات کے خلاف ہوتا ہے۔ وہ اپنا یہ غصہ جب نکالنا چاہتے ہیں تو براہ راست اس حقیقت پر حملہ کرنا تو ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا جو وہ تمثیل پیش کر رہی ہوتی ہے کیونکہ وہ اس قدر واضح ہوتی ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہنا آفتاب پر خاک ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے۔ البتہ تمثیل کے کسی جزو کی آڑ لے کر وہ اس کے خلاف اپنا غصہ نکالنے کی کوشش کریں گے۔ مثلاً فرض کیجیے تمثیل میں مکھی یا مچھر کا ذکر آگیا ہے تو خواہ وہ تمثیل کتنی ہی حقیقت افروز ہو لیکن وہ کہیں گے کہ یہ کیا فضول تمثیل ہے، اگر یہ خدا کا کلام ہے تو کیا خدا کو تمثیل کے لیے مکھی اور مچھر ہی ملتے ہیں۔ اس طرح وہ خود اپنے ضمیر کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکنے کی کوشش کریں گے اور دوسروں کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکیں گے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ، فسق کے اصل معنی خروج کے ہیں۔ یہاں سے یہ لفظ معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے لیے استعمال ہوا۔ قرآن مجید میں ابلیس کے متعلق ہے۔ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (۵۰- کہف) (وہ جنات میں سے تھا پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔) فسق کے معنی

معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے مختلف مدارج ہو سکتے ہیں۔ منکر چھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور بڑا بھی۔ اسی طرح نافرمانی معمولی درجہ کی بھی ہو سکتی ہے اور بغاوت کے درجہ کی بھی۔ چنانچہ قرآن میں یہ لفظ عام منکرات سے لے کر کفر و بغاوت تک سب کے لیے استعمال ہوا ہے بلکہ زیادہ تر اس کا

استعمال ان بڑی نافرمانیوں ہی کے لیے ہوا ہے جن کے ساتھ ایمان جمع نہیں ہوتا اس وجہ سے قرآن میں اس لفظ کو اس ہلکے معنی میں ہرگز نہیں لینا چاہیے جس معنی میں اس کو عام طور پر ہمارے فقہا اور متکلمین نے لیا ہے۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲۷)

رشتۂ رحم کی اہمیت

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ، اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، ہمارے نزدیک اس سے مراد رشتۂ رحم اور رشتۂ قرابت کا کاٹنا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان توڑنے کے بعد دوسرا قدم جو ایک نافرمان اٹھاتا ہے وہ حقوق رحم سے بے پروائی یا ان میں بے اعتدالی اور ناانصافی ہے۔ چونکہ تمام صلاح و فلاح اور تمام تمدن و معاشرت کی بنیاد اسلام نے اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اور رشتۂ رحم کے احترام پر رکھی ہے اس وجہ سے جو شخص ان دونوں پابندیوں سے آزاد ہوا اس کا ہر اقدام لازماً فساد فی الارض کا موجب ہو گا۔ چنانچہ یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے اور رشتۂ رحم کے کاٹنے کا لازمی نتیجہ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن میں ان دونوں چیزوں کا ذکر اس طرح ساتھ ساتھ ہوتا ہے گویا یہ لازم و ملزوم ہیں۔ مثلاً فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (۲۲۔ محمد) (بس اغلب ہے کہ اگر تم اعراض کرو تو زمین میں فساد برپا کرو اور اپنے رحمی رشتوں کو کاٹو)

ان دونوں کے اسی تلازم کے سبب سے قتادہ نے یہاں رشتۂ رحم ہی مراد لیا ہے اور ابن جریر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو عام رکھا ہے اور اس سے ہر اس چیز کا کاٹنا مراد لیا ہے جس کو خدا نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ جہاں تک ظاہری الفاظ کا تعلق ہے اس معنی کو بھی غلط نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لیکن سوال صرف ظاہری الفاظ کا نہیں بلکہ قرآن مجید کے طرز بیان کا ہے۔ قرآن نے یہ طرز بیان جہاں جہاں بھی اختیار کیا ہے مرتع و محل دلیل ہے کہ رشتۂ رحم ہی کے لیے اختیار کیا ہے۔ اس طرز بیان میں جو ابہام ہے اس سے رشتۂ رحم کی عظمت و اہمیت واضح ہوتی ہے کیونکہ یہ ایسی واضح بدیہی اور معروف حقیقت ہے کہ بغیر اس کے کہ اس کا نام لیا جائے ہر شخص جانتا اور سمجھتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کو خدا نے کاٹنے کا نہیں بلکہ جوڑنے کا حکم دیا ہے اور تمدن اور معاشرے کی صلاح و فلاح کے پہلو سے جس کی اہمیت یہ ہے کہ جس نے اس کو کاٹا اس نے گویا تمدن اور معاشرے کی جڑ ہی پر کلہاڑا رکھ دیا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸)

کفر کا ایک خاص پہلو

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ: کفر کے معنی کی تحقیق آٹھویں فصل میں بیان ہو چکی ہے۔ یہاں اس لفظ کے ایک

خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے وہ یہ کہ یہ لفظ ان لوگوں کو مخاطب کر کے استعمال کیا گیا ہے جو خدا کے منکر نہیں تھے بلکہ صرف اس کے شریک ٹھہراتے تھے سا تھ ہی قیامت کے یا تو وہ منکر تھے یا کم از کم یہ کہ اس کو بہت ہی بعید از قیاس اور بعید از عقل چیز سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کو مخاطب کر کے سوال یہ کیا گیا ہے کہ تم اللہ کا کفر کس طرح کرتے ہو؛ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں اس لفظ کا استعمال وسیع معنوں میں ہوا ہے جس طرح خدا کا صریح انکار کفر ہے۔ اسی طرح اس کا وہ ماننا بھی کفر ہے جو اس کی حقیقی صفات مثلاً وحدانیت، قدرت اور علم وغیرہ کی نفی کے ساتھ ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۹)

'استواء' 'تسویۃ' اور 'سماء' کا مفہوم

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ، استوا کے معنی سیدھے کھڑے ہونے کے ہیں اور الیٰ کے ساتھ اس کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ لفظ توجہ کرنے یا اس کے ہم معنی کسی مفہوم پر مشتمل ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ زمین کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمان کو بنایا۔ محض تصویر حال کے لیے یہ اسلوب کلام اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں کھڑے ہونے یا متوجہ ہونے کا وہی مفہوم لینا چاہیے جو اللہ تعالیٰ جل شانہ کے شایان شان ہے۔

تسویہ کے معنی کسی شے کو برابر کرنے، ہموار کرنے اور اعتدال و توازن کے ساتھ قائم کر دینے کے ہیں۔ اس سقف نیلگوں کو جس حد تک ہماری نگاہیں دیکھ سکتی ہیں، خواہ مجرد حالت میں یا سائنس کے ایجاد کیے ہوئے اسلحہ سے مسلح ہو کر، اس کے اندر کوئی رخنہ نہیں تلاش کر سکتیں۔ اسی چیز کو فرمایا ہے۔

مَّا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ ۖ	تم خدائے رحمان کی صنعت کے اندر کوئی کسر نہ
فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ	پا سکو گے، اپنی نگاہ دوڑاؤ کیا پاتے ہو کوئی رخنہ
ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ	پھر بار بار نظر دوڑاؤ تمہاری نگاہ تھک کر پلٹ
الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ (۳-۴ ملک)	آئے گی لیکن کوئی رخنہ نہ پا سکے گی۔

سما کا لفظ سما یسمو سے ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ یہ شامیانہ، جو ہمارے اوپر تنا ہوا نظر آتا ہے، قرآن اس کے عجائب اور اس کی نیرنگیوں کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے اور ان سے جن واضح نتائج کی طرف رہبری ہوتی ہے ان کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کائنات کے مشاہدات سے متعلق قرآن کا مستقل اصول یہ ہے کہ جو چیزیں ہماری عام نگاہوں سے مخفی ہیں یا جو صرف گمان اور قیاس پر مبنی ہیں یا جو صرف خوردبینوں اور دوربینوں کی مدد سے ہی دیکھی جا سکتی ہیں، قرآن ان سے تعرض نہیں کرتا۔ اس لیے کہ ان میں بہت کچھ نزاع اور اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ قرآن ہمیں صرف انھی حقائق کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے جن میں کسی انصاف پسند کے لیے کسی نزاع اور اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

آسمان کے حقائق کی طرف توجہ دلانے میں بھی قرآن نے یہی روش اختیار کی ہے۔ ان باتوں کی طرف توجہ دلا دی ہے جن کو ثابت کرنے کے لیے صرف توجہ دلا دینا ہی کافی ہے۔ البتہ یہ اشارہ کر دیا ہے کہ یہ آسمان سات ہیں تاکہ انسان اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو جائے کہ خدا کی خدائی بس اس نظر آنے والی چھت اور ان چمکنے والے ستاروں ہی تک محدود ہے بلکہ اس پر واضح رہے کہ اس کے دولہ تفتیش و تحقیق کی جولانیوں کے لیے ان ستاروں سے آگے اور بھی میدان ہیں۔

۲۰۔ مجموعۂ آیات ۲۱ - ۲۹ میں مطالب کی ترتیب

مذکورہ بالا مجموعۂ آیات میں جو باتیں جس ترتیب کے ساتھ کہی گئی ہیں پہلے ہم اجمال کے ساتھ ان کو اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں اس کے بعد ان خاص خاص چیزوں سے بحث کریں گے جو وضاحت اور تفصیل کی محتاج ہیں۔

اس مجموعہ کی ابتدائی آیات میں بنی اسمٰعیل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنے اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ انداز کلام اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ یہ خدا کی بندگی کی دعوت ہے اور جو خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے اس کے لیے واحد رستہ یہ ہے کہ وہ بندگی کی اس دعوت کو قبول کرے اس میں ضمناً اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے کہ جس طریقہ پر وہ خدا کی بندگی کر رہے ہیں یہ خدا کی بندگی نہیں ہے اس لیے کہ انھوں نے اس بندگی میں دوسروں کو بھی شریک کر رکھا ہے۔ حالانکہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کائنات میں اس کے تصرفات اس طرح بیان کیے گئے ہیں جس سے اس کی توحید ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ان سے یہ کہا گیا ہے کہ اگر اس دعوت کو قبول کرنے میں تم اس لیے ہچکچا رہے ہو کہ تمہیں اس قرآن کے اللہ کی طرف سے ہونے میں شک ہے، تمہارے خیال میں یہ خود پیش کرنے والے یا ان کے کسی مددگار کی تصنیف ہے تو اس کا فیصلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس کی سورتوں کی طرح کی کوئی سورہ تصنیف کر کے پیش کر دو۔ اس سے اس کے منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ خود بخود باطل ہو جائے گا، اس کام میں تم اپنے شاعروں، ادیبوں، خطیبوں، کاہنوں، جناتوں اور دیویوں دیوتاؤں میں سے جس کی چاہو مدد بھی حاصل کر سکتے ہو۔

اس کے بعد اس انجام سے ڈرایا گیا ہے جس سے وہ لوگ دوچار ہوں گے جو اس قرآن کا جواب پیش کرنے سے تو قاصر ہیں لیکن اس کے منزل من اللہ ہونے کے دعوے کو جھٹلا رہے ہیں اور ساتھ ہی ان لوگوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے جو قرآن کی دعوت قبول کر کے ایمان اور عمل صالح کی روش اختیار کریں گے۔

جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں خاص بات جو یہاں کہی گئی ہے اور جو خاص توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ جب جنت کی نعمتیں اہلِ جنت کے سامنے پیش کی جائیں گی تو وہ اس بات پر خوش ہوں گے کہ جو نعمتیں انھیں یہاں مل رہی ہیں وہ ان سے پہلے سے آشنا ہیں، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کے منکرین تو قرآن کو آج ایک من گھڑت افسانہ سمجھ رہے ہیں لیکن ایک دن وہ بھی آنے والا ہے جب پردہ اٹھے گا اور قرآن کی ایک ایک بات کی صداقت اس طرح سامنے آئے گی کہ اہلِ ایمان ہر ملنے والی نعمت پر خوشی سے باغ باغ ہوں گے کہ الحمد للہ قرآن کی بدولت اس جنت اور اس کی نعمتوں کی سیر ہمیں دنیا ہی میں کرا دی گئی تھی۔

اس کے بعد سلسلۂ کلام کے بیچ میں ایک مناسب موقع تنبیہ بطور جملۂ معترضہ کے آ گئی ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کو متنبہ فرمایا ہے کہ یہ جنت اور اس کی نعمتوں کا جو ذکر ہوا ہے یہ بہر حال بہ شکل تمثیل ہے کیوں کہ اس دنیا میں تمھیں جنت اور دوزخ سے متعلق جو بات بھی سمجھائی جا سکتی ہے تمثیل ہی کے ذریعہ سے سمجھائی جا سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمھارا سمجھانا اس قدر مطلوب و محبوب ہے کہ وہ ہر اس تمثیل کو تمھاری تعلیم کا ذریعہ بناتا ہے جس سے حقیقت تمھارے ذہن نشین ہو سکے؛ عام اس سے کہ یہ تمثیل کسی مکھی کی ہو یا مچھر کی۔ جو لوگ علم اور حقیقت کے جویا ہوتے ہیں وہ ان تمثیلات کی قدر کرتے ہیں اور ان سے ان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جو ضلالت کے طالب ہوتے ہیں وہ ان تمثیلوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے سبب سے گمراہی میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر اشارۃً چند لفظوں میں یہ بھی بتایا ہے کہ فلاں فلاں صفات کے لوگ ہیں جو ان تمثیلات سے علم و معرفت کے بجائے ضلالت اور گمراہی حاصل کرتے ہیں۔ یہ تمام صفات یہود پر چسپاں ہوتی ہیں۔ اس طرح گویا بنی اسماعیل کو تنبیہ کیا گیا کہ نہ تو تم خود تمثیلات کے بارے میں اس قسم کی بیہودہ حجت طرازی کا مذاق اپنے اندر پرورش کرنا اور نہ یہود کی شہ سے فتنہ جوئی کی اس بیماری میں مبتلا ہونا ورنہ یاد رکھو کہ پرائے شگون پر تم اپنی ناک کٹوا بیٹھو گے۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ سے پھر وہ دعوت سامنے آ گئی ہے جو اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ سے شروع ہوئی تھی اس کے بعد قیامت کی دو دلیلیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک اس پہلو سے کہ جس خدا نے تمھیں عدم سے وجود بخشا وہ تمھیں مرنے کے بعد دوبارہ آخر کیوں نہیں پیدا کر سکتا؟ دوسری ربوبیت کے پہلو سے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ پورا سلسلۂ کلام اوپر سے بھی مربوط ہے اور اس کی ہر کڑی باہم دگر بھی ایک دوسری سے جڑی ہوئی ہے۔ پہلے خدا کی بندگی کی دعوت ہے اور اس کے ساتھ توحید کا بیان ہے کیوں کہ خدا کی بندگی بغیر توحید کے بے معنی ہے۔ اس کے بعد رسالت پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور اس کی دلیل کے طور پر قرآن حکیم کے معجزے کو پیش کیا گیا ہے۔ پھر انکار کی سزا اور ایمان کی جزا بیان ہوئی

ہے پھر بر سبیل تنبیہ آگاہ کیا گیا ہے کہ جزا اور سزا کا جو بیان بطور تمثیل تھا ہے یہود کی پیروی میں اس کا مذاق اڑانے کی کوشش میں نہ لگ جانا۔ پھر قیامت پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور اس دعوت کے پہلے ہی لفظ سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان کے مدعی ہوں لیکن وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن مانتے ہوں وہ درحقیقت خدا کے ماننے والے نہیں بلکہ اس کے منکر ہیں۔

۲۱۔ بعض دلائل کی وضاحت

اس مجموعہ آیات میں اسلام کے تینوں بنیادی عقائد — توحید، رسالت اور معاد کی بعض دلیلیں بیان ہوئی ہیں۔ اب ہم ان کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

توحید کی دلیل

پہلی دلیل توحید کی بیان ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے:

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۲۲- بقرہ)

جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا اور اس سے پھل پیدا کیے تمہاری روزی کے لیے تو تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ درآں حالے کہ تم جانتے ہو۔

توحید کی یہ دلیل اس توافق اور ہم آہنگی کے پہلو سے ہے جو اس کائنات کے تمام اضداد کے اندر پائی جاتی ہے۔ اس کائنات میں ایک طرف تو زمین کے مقابل میں آسمان، شب کے مقابلے میں روز، نور کے مقابل میں ظلمت، سردی کے مقابل میں گرمی اور عورت کے مقابل میں مرد کا وجود پایا جاتا ہے جس سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ کائنات اضداد اور باہم نبرد آزما قوتوں اور طاقتوں کی ایک رزمگاہ ہے۔ چنانچہ یہی دھوکا بعض قوموں کو ہوا جس کے سبب سے انھوں نے نور اور ظلمت، نیکی اور بدی کے الگ الگ خالق ٹھہرا لیے۔ اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اہل عرب بھی زمین کے لیے الگ اور آسمان کے لیے الگ دیوتا مانتے تھے۔ قرآن مجید نے اسی مغالطہ کو یہاں رفع کیا ہے کہ اس کائنات میں جو تضاد نظر آتا ہے وہ محض ظاہری ہے۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ اس کے تمام اضداد میں نہایت گہرے قسم کا توافق ہے۔ زمین تمہارے لیے بستر کی طرح بچھی ہوئی ہے اور آسمان تمہارے اوپر شامیانے کی طرح تنا ہوا ہے۔ پھر دیکھو آسمان سے پانی برستا ہے اور اس پانی سے زمین میں طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور یہ پھل تمہارے لیے غذا کا کام دیتے ہیں۔ زمین اور آسمان کے درمیان اس طرح کے توافق کے ہوتے ہوئے یہ کس طرح باور کرتے ہو کہ زمین کے اندر کسی اور دیوتا کا ارادہ کارفرما ہے اور آسمان میں کسی اور کی خدائی چل رہی ہے۔ مختلف ارادوں کے تصرفات میں یہ موافقت اور یہ سازگاری کس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ آسمان اور زمین دونوں مل کر ایک گہوارہ بنائیں اور اس گہوارے میں انسان کی اس طرح پرورش کریں جس طرح ماں بچے

کی پرورش کرتی ہے؟ اس اختلاف کا نتیجہ تو یہ ہونا تھا کہ یہ دونوں خود بھی درہم برہم ہو کے رہ جاتے اور ان کے ساتھ وہ بھی پس جاتے جو اس چکی کے دونوں پاٹوں کے بیچ میں آ جاتے۔

یہ دلیل بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ تم خدا کا کوئی ہمسر نہ ٹھہراؤ در آں حالے کہ تم جانتے ہو۔ "تم جانتے ہو" کا مطلب یہ ہے کہ تم اس بات کو مانتے ہو کہ زمین کا اس صورت پر پیدا ہونا اور آسمان کا اس شکل میں وجود میں آنا خدا ہی کی قدرت سے ہوا ہے، ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا کے سوا کسی اور نے نہیں بنایا ہے۔ اس اقرار کے بعد آسمان و زمین کے انتظام میں کسی کو خدا کا شریک ماننا ایک ایسی بے جوڑ بات ہے جس کا بے جوڑ ہونا بالکل واضح ہے۔ قرآن نے یہاں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہنی چاہیئے کہ مشرکین عرب، جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے، خدا کے منکر نہیں تھے۔ وہ خدا کو مانتے تھے البتہ وہ اس کے شریک ٹھہراتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے سامنے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ صرف شرک کی تردید کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہاں دلیل اثبات باری کی نہیں دی گئی ہے بلکہ توحید کی دی گئی ہے۔ لیکن اس دلیل کو پیش کرنے کا انداز ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے ایک خالق اور پروردگار کا ثبوت اس سے آپ سے آپ ہو رہا ہے۔

یہاں اس دلیل کی اسی قدر وضاحت پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ آگے مختلف شکلوں اور اسلوبوں میں یہ دلیل آئے گی اور ہر جگہ موقع کے لحاظ سے اس کی وضاحت ہوگی۔ یہ دلیل ہم نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنے رسالہ حقیقت توحید میں بھی بیان کی ہے۔ جو لوگ مزید وضاحت کے طالب ہوں اس رسالہ کو پڑھیں۔

رسالت کی دلیل

دوسری دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اثبات کی دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے:

وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی	اور اگر تم اس چیز کی طرف سے شک میں ہو جو ہم
عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ	نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو پیش کرو اس کے
وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	مانند کوئی سورہ اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو بھی
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا	اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو پس اگر تم یہ نہ کر سکو اور
وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا	ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن
النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ	بنیں گے آدمی اور پتھر۔ وہ کافروں کے لیے تیار
لِلْكٰفِرِيْنَ (۲۳-۲۴۔ بقرہ)	کی ہوئی ہے۔

قرآن کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو اس نے اپنے مقرب فرشتے — حضرت جبرئیل — کے ذریعہ سے بشکل وحی آپ پر اتاری ہے۔ آپ اس کتاب کو اپنی رسالت کے ثبوت میں پیش فرماتے تھے، مشرکین عرب آپ کے اس دعوے کے مخالف تھے اور ان کی اس مخالفت میں یہود بھی ان کے ہمنوا تھے بلکہ درپردہ وہی اس مخالفت کو اصلی ہوا دینے والے تھے۔ یہ

لوگ اس مخالفت میں مختلف قسم کی باتیں کہتے تھے۔ کبھی کہتے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خود اپنی تصنیف ہے جس کو یہ ہمارے اوپر اپنی نبوت کی دھونس جمانے کے لیے خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کبھی کہتے کہ کچھ لوگ ان کے شریک سازش ہیں اور وہ اس کتاب کی تیاری میں ان کی مدد کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ جس طرح شاعروں اور کاہنوں پر جنات القا کرتے ہیں اسی طرح ان پر بھی کوئی جن یہ کلام القا کرتا ہے، کبھی دعوی کرتے کہ یہ کلام کوئی مافوق کلام نہیں ہے، ہم بھی چاہیں تو اس قسم کا کلام بڑی آسانی کے ساتھ پیش کرسکتے ہیں۔ اس طرح کی باتوں سے وہ اس کے ایک خدائی کلام ہونے کو جھٹلانا چاہتے تھے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے کی تردید ہوسکے اور یہ کتاب آپ کی نبوت و رسالت کی دلیل نہ بن سکے۔

ان ساری باتوں کے جواب میں یہ فرمایا گیا کہ اگر تمھیں اس طرح کے شکوک و شبہات ہیں تو اس کا فیصلہ بڑی آسانی کے ساتھ یوں ہوسکتا ہے کہ تم بھی اس کے مانند کوئی سورہ پیش کردو۔ اگر تم نے اس کے مانند ایک سورہ بھی پیش کردی تو ثابت ہو جائے گا کہ تمھارے خیالات صحیح ہیں اور قرآن کا دعوی غلط ہے۔

پھر آخری اتمامِ حجت کے طور پر قرآن نے اپنی اس تحدی کے ساتھ تین باتیں شامل کردیں۔

ایک یہ کہ اس کتاب کے مانند کوئی ایک ہی سورہ پیش کردو۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے ان لوگوں سے یہ بات کہی گئی تھی کہ اس کے مانند کوئی کتاب پیش کرو اور پھر یہ بات کہی گئی کہ اس کے مانند دس سورتیں پیش کرو۔ جب وہ ان دونوں مطالبوں میں سے کوئی بھی پورا کرنے کی ہمت نہ کرسکے تو آخری بات یہ کہہ دی گئی کہ چلو، ایک ہی سورہ اس کے مانند پیش کرکے دکھاؤ۔

دوسری بات یہ کہی گئی کہ اگر تمھارے لیے تنہا اپنے بل بوتے پر یہ کام مشکل ہو تو تمھارے پاس ادیب بھی ہیں، خطیب بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، کاہن بھی ہیں، جنات بھی ہیں، شیطان بھی ہیں اور تمھارے بہت سے دیوی دیوتا بھی ہیں، قرآن کا مقابلہ کرنے کے لیے تم ان سب کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اگر ان سب کی مدد بھی تمھاری اس مشکل کو آسان نہ کرسکے تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس قرآن کو خدا کی کتاب مانو اور اس کو جھٹلانے کی کوشش میں بے فائدہ اپنی قوت ضائع نہ کرو۔

تیسری بات یہ کہی گئی کہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ تو تم آج کرسکتے ہو اور نہ کبھی آیندہ کرسکو گے۔ اس وجہ سے اس سعی لاحاصل میں اپنی دنیا اور آخرت برباد کرنے کے بجائے اس عذاب سے بچنے کی فکر کرو جس سے اس کتاب کی تکذیب پر جمے رہنے کی صورت میں لازماً دوچار ہونا پڑے گا۔

قرآن کے اس چیلنج کے اصلی مخاطب اگرچہ اہل عرب تھے، غیر اہل عرب کے لیے اس قسم کے چیلنج کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن قرآن کے ہر مخالف اور رسالت محمدی کے ہر منکر کے لیے، خواہ وہ عرب سے تعلق رکھتا ہو یا عجم سے، قرآن کے زمانۂ نزول سے لے کر آج تک، یہ چیلنج موجود ہے جس

کا جی چاہے وہ اپنے زور اور اپنی قابلیت کا امتحان کرلے، اسے خود اندازہ ہوجائے گا کہ وہ قرآن کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورہ کے مانند بھی کوئی کلام پیش کرسکتا ہے یا نہیں۔

قیامت کی دلیل

تیسری دلیل قیامت کی دی گئی ہے، وہ اس طرح بیان ہوئی ہے:۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا	تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے
فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ	کہ تم مردہ تھے اور اس نے تم کو زندہ کیا، پھر وہ تمھیں
ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ	مارتا ہے، پھر تم کو زندہ کرے گا پھر تم اس کی طرف
لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ	لوٹائے جاؤگے۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے
اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ	پیدا کیا وہ سب کچھ جو زمین میں ہے، پھر اس نے
سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ	آسمان کے بنانے کا قصد کیا اور ہموار کردیے سات
عَلِيْمٌ ۝ (۲۸-۲۹ بقرہ)	آسمان اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

یہاں کفر سے مراد خدا کا انکار نہیں بلکہ جیسا کہ ہم اوپر واضح کرچکے ہیں، قیامت کا انکار ہے۔ کیوں کہ قیامت کا انکار درحقیقت خدا کی تمام اعلیٰ صفات۔ قدرت، ربوبیت، حکمت اور علم۔ کا انکار ہے۔ جو شخص ان صفات کے بغیر خدا کو مانے اس کا خدا کو ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہے۔ اس وضاحت کے بعد اب دیکھیے یہاں قیامت کی کیا دلیل بیان ہوئی ہے۔

پہلے معاد کے ممکن ہونے کی دلیل دی گئی ہے۔ یہ وہی عام عقلی اور فطری دلیل ہے جو قرآن مجید میں مختلف پیرایوں اور اسلوبوں میں بیان ہوئی ہے کہ جب تم یہ مانتے ہو کہ خدا نے تم کو عدم سے وجود بخشا اور یہ بھی دیکھتے ہو کہ وہی خدا ہے جو تم کو زندگی کے بعد موت دیتا ہے تو پھر اس بات کو کیوں ناممکن سمجھتے ہو کہ وہ تمھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے، جس کے لیے پہلی بار پیدا کرنا ممکن ہوا آخر اس کے لیے دوبارہ پیدا کردینا کیوں ناممکن ہوجائے گا؟

لیکن کسی چیز کے ممکن ہونے سے یہ لازم نہیں ہوجاتا کہ وہ ضرور واقع بھی ہوکے رہے، قیامت کا واقع ہونا ممکن سہی لیکن آخر اس کی ضرورت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا کہ جس خدا نے تمھاری پرورش کے لیے یہ سارا جہان بنایا اور اپنی پروردگاری کی یہ شانیں دکھائیں، جس کی قدرت اس کائنات کے ہر گوشہ سے نمایاں ہو رہی ہے اور جس کی حکمت کی شہادت ذرہ ذرہ سے مل رہی ہے، کس طرح ممکن ہے کہ وہ تم کو پیدا کرکے یوں ہی چھوڑ دے اور تمھارے نیکوں اور بدوں میں کوئی امتیاز نہ کرے۔ اگر وہ ایسا کرے تو اس کی وہ ربوبیت بے معنی ہوجاتی ہے جس کی شہادت اس زمین کے ہر گوشہ سے مل رہی ہے، وہ قدرت و حکمت بے مقصد ہوجاتی ہے جس کی گواہی یہ آسمان دے رہا ہے، اور وہ محیط کل علم بے نتیجہ ہوجاتا ہے جس سے اس آسمان و زمین کے خالق کو لازماً متصف ہونا چاہیے اور وہ اس سے متصف ہے بھی۔

قیامت کی یہ دلیل اجمال و تفصیل کے مختلف پیرایوں میں قرآن میں بار بار آئے گی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اجمالی اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ اگرچہ بنی اسماعیل سے یہ تخاطب ضمنی طور پر محض برسبیل التفات تھا تاہم ان کے سامنے دعوت کے تینوں اصولی اجزاء، توحید، رسالت اور معاد ۔۔۔ ان کے بنیادی دلائل کے ساتھ رکھ دیے گئے۔

۲۲۔ قرآن مجید کی عظمت کے دو پہلو

تمام جن وبشر قرآن کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں

ان آیات میں قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس کی عظمت کے دو پہلو یہاں بے نقاب کیے ہیں۔ ایک پہلو کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں یعنی یہ کہ تمام جن وبشر اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ قرآن کی عظمت کا یہ پہلو اس وقت بھی واضح تھا جب کہ یہ نازل ہو رہا تھا کیوں کہ جو لوگ اس کو کسی جن یا بشر کا کلام سمجھتے تھے اس کی تردید کی انتہائی خواہش رکھنے کے باوجود اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز رہے۔ اور آج بھی یہ واضح ہے جب کہ اس کے نزول پر پوری چودہ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن اس کے کٹر سے کٹر مخالف بھی کوئی ایسی چیز پیش نہ کر سکے جس سے قرآن کے اس دعوائے یکتائی کی تردید ہو سکے۔

قرآن نے حقائق کو مجاز کے پیرایہ میں

اس کی عظمت کے ایک دوسرے پہلو کی طرف یہاں یوں اشارہ کیا گیا ہے کہ جس قرآن کو اس کے مخالفین آج ایک من گھڑت چیز سمجھتے اور اس کی تمثیلات کی آڑ لے کر اس کو جھٹلاتے ہیں، ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اس پر ایمان لانے والے جنت میں بیٹھے ہوئے جنت کی ایک ایک نعمت پر خوش ہو کر کہیں گے کہ الحمد للہ ہمیں قرآن نے ان ساری نعمتوں کے مزوں سے پہلے ہی آشنا کر دیا تھا اور آج ہم ان کی اصل حقیقت سے متمتع ہو رہے ہیں۔

اس سے اس بات کا اشارہ نکلتا ہے کہ جو شخص قرآن پر سچا ایمان رکھتا ہے اور اس کی باتوں کی روحانیت کو سمجھتا ہے وہ درحقیقت اسی دنیا میں بیٹھے ہوئے جنت کی نعمتوں کا بھی ایک جلوہ دیکھ لیتا ہے اور دوزخ کے عذاب کا بھی ایک نقشہ اس کے سامنے آجاتا ہے۔ پھر اس بات کا بھی اشارہ نکلتا ہے کہ قرآن نے جن نیکیوں کا حکم دیا ہے درحقیقت انھی کی لذتیں ہیں جو اپنی حقیقی شکل وصورت میں جنت میں اہل ایمان کے سامنے آئیں گی۔ اسی طرح جن برائیوں سے قرآن نے روکا ہے انھی کی تلخیاں ہیں جو دوزخ میں اپنی اصلی شکل میں مجرموں کے سامنے ظاہر ہوں گی۔ فرق جو کچھ ہوگا وہ مجاز اور حقیقت کا ہوگا۔ یہاں جو کچھ بتایا گیا ہے وہ مجاز اور تمثیل کے رنگ میں ہے اس لیے کہ آخرت کے حقائق کے لیے یہاں مجاز ہی کا پیرایہ اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن آخرت میں سارے پردے اٹھ جائیں گے اور باریک سے باریک حقیقت بھی بالکل بے پردہ ہو کر نگاہوں کے سامنے آجائے گی۔

اہلِ جنت کی یہ بات کہ جب ان کو جنت کی کوئی نعمت ملے گی تو وہ کہیں گے کہ یہ وہی چیز ہے جو ہمیں پہلے یعنی دنیا میں ملی تھی، اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اہل ایمان نیکیوں کی لذت و حلاوت سے بقدرِ استعداد اس دنیا میں بھی محظوظ ہوتے ہیں لیکن یہاں چونکہ محسوسات کے پردے پڑے ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کی حقیقی لذت بے نقاب نہیں ہو پاتی۔ انبیاء علیہم السلام اور عارفین سے بہت سی ایسی باتیں منقول ہیں جن سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ ایمان میں، اسلام میں، روزے میں، نماز میں، انفاق میں، ایثار میں اور نیکی کے دوسرے کاموں میں جو لذتیں اور حلاوتیں پنہاں ہیں ان سے وہ اس دنیا میں بھی لذت یاب ہوتے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے"۔ اسی طرح حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "اگر لوگ جان جائیں کہ عشا کی نماز میں کیا چیز پوشیدہ ہے تو وہ اس کے لیے پیٹوں کے بل رینگتے ہوئے بھی پہنچیں"۔ اسی سے ملتی جلتی باتیں صحابہ رضی اللہ عنہم اور بہت سے عارفین سے بھی منقول ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ان لذتوں سے اسی دنیا میں آشنا ہو چکے ہوں گے جب یہی لذتیں اپنی حقیقی شکل و صورت میں ان کے سامنے آخرت میں ظاہر ہوں گی تو وہ یہ تو محسوس کریں گے ہی کہ ان کی جھلکیاں وہ اس سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ اس سے پہلے ان کو ان جھلکیوں سے آشنا کرانے والی اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ قرآن ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن جو قرآن یہ پھلے کر نازل ہوا ہے، جو دنیا میں آخرت کا آئینہ بن کر اترا ہے، جس کی آیتوں اور سورتوں میں جنت کی یہ بہاریں چھپی ہوئی ہیں، بے بصیرت لوگ اس کی یہ قدر کر رہے ہیں کہ اس کی نہایت حقیقت افروز تمثیلات کو بہانہ بنا کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حالاں کہ اگر وہ اس کا ایک جلوہ بھی دیکھ پاتے تو اس کی سیر سے کبھی آسودہ نہ ہوتے۔

۲۳۔ آگے کا مضمون —— آیات ۳۰-۳۹

بنی اسمٰعیل کو مذکورہ بالا دعوت دینے اور ان کو یہود کی چالوں سے ہوشیار رہنے کی تاکید کرنے کے بعد آگے کی دس آیتوں (۳۰ - ۳۹) میں آدمؑ کی خلافت اور شیطان کی طرف سے اس کی مخالفت کی سرگزشت بیان ہوئی ہے۔ یہ سرگزشت اپنے اندر بہت سے حقائق رکھتی ہے جن کی تفصیل تو اپنے اپنے مواقع پر آگے آئے گی لیکن یہاں بطورِ تمہید اس کے اس پہلو کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے جس پہلو سے یہ پچھلے سلسلۂ کلام سے مربوط ہوتی ہے۔

یہ سرگزشت ایک آئینہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس ردِّ عمل کی پوری تصویر دکھائی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزولِ قرآن سے یہود پر خصوصاً اور وقت کی بعض دوسری جماعتوں پر عموماً نمایاں ہوا۔ یہود اپنے حسد اور تکبر کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بن گئے اور برابر

اس دشمنی پر جمے رہے۔ اس کے برعکس دوسرے بہت سے لوگ، جو حسد اور تکبر کی بیماری میں مبتلا نہیں تھے، اگرچہ اوّل اوّل حقیقت کے اچھی طرح واضح نہ ہونے کے باعث بعض شبہات میں مبتلا ہوئے لیکن جوں جوں ان کے شبہات دور ہوتے گئے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ قرآن نے یہ دکھایا ہے کہ یہ ردِ عمل بہت کچھ مشابہ ہے اس ردِ عمل سے جو آدمؑ کی خلافت کے فیصلہ سے ابلیس اور فرشتوں پر ہوا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس کی خبر فرشتوں کو دی تو اوّل اوّل انھیں بھی اس فیصلہ کے بارے میں بعض شبہات پیش آئے اور انھوں نے اپنے یہ شبہات اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش بھی کیے لیکن وہ شبہات محض اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی پوری اسکیم ان پر واضح نہیں ہوئی تھی۔ جوں ہی پوری اسکیم ان کے سامنے آگئی ان کے سارے شبہات دور ہوگئے اور وہ آدمؑ کی خلافت پر پوری طرح راضی اور مطمئن ہوگئے۔ برعکس اس کے ابلیس کو آدمؑ کی خلافت پر جو اعتراض تھا وہ حسد اور تکبر کی بنا پر تھا، اس نے خیال کیا کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے اور آدمؑ مٹی کا ایک پتلا ہے پھر اس کے مقابلہ میں آدمؑ کو خلافت کا یہ منصب کیوں ملے اور یہ نسلی برتری رکھتے ہوئے وہ آدمؑ کو سجدہ کیوں کرے؟

قرآن نے دکھایا ہے کہ بالکل اسی سرگزشت کا اعادہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت و رسالت کے معاملہ میں ہو رہا ہے۔ جو لوگ حق طلب اور معقولیت پسند ہیں ان کو اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت یا قرآن کے کسی پہلو میں تردد تھا تو وہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد دور ہوگیا ہے یا دور ہو جائے گا لیکن یہود کی ساری مخالفت حسد اور تکبر پر مبنی ہے، وہ نسب کے اعتبار سے بھی اپنے آپ کو بنی اسماعیل کے مقابل میں افضل سمجھتے ہیں اور اپنی قدیم دینی سیادت و پیشوائی کے غرّہ میں مذہبی اعتبار سے بھی اپنے آپ کو امّی عربوں کے بالمقابل برتر خیال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان پر یہ بات بڑی شاق گزر رہی ہے کہ وہ ایک امّی نبیؐ کی رسالت کا اقرار کر کے اپنے اوپر امّیوں کی سیادت تسلیم کر لیں اور دنیا کی امامت کا جو منصب ان کو اب تک حاصل رہا ہے اس سے دستبردار ہو جائیں۔

اس تصویر میں قرآن نے یہود کا اصلی مقام متعین کر دیا ہے کہ ان کا پارٹ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی مخالفت میں بعینہٖ وہی ہے جو ابلیس کا پارٹ حضرت آدمؑ کی مخالفت میں رہا ہے۔ دونوں کی مخالفت کے اسباب و محرکات بالکل ایک ہی قسم کے ہیں ساتھ ہی یہ بات بھی ظاہر کر دی ہے کہ دونوں کا انجام بھی ایک ہی ہوگا۔ جس طرح ابلیس کی مخالفت کے علی الرغم آدمؑ کی خلافت قائم ہو کے رہی اسی طرح یہود کی مخالفت کے علی الرغم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت و نبوت بھی قائم ہو کے رہے گی۔

نیز اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ کسی واقعی شبہ کی بنا پر کسی خلش کا پیدا ہو جانا یا کسی اعتراض کا اٹھانا کوئی معیوب بات نہیں ہے، نیک اور معقول لوگوں کے دلوں میں بھی اس طرح کی خلشیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ان کے سبب سے کسی چیز پر وہ اعتراض بھی کر گزرتے ہیں لیکن ان کے اعتراض کے

پسِ پردہ چونکہ حسد یا تکبر کا کوئی داعیہ چھپا ہوا نہیں ہوتا اس وجہ سے جوں ہی ان کے شبہ کے اسباب دور ہوئے وہ پورے شرحِ صدر کے ساتھ امرِ حق کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ یہ گویا ایک نہایت لطیف اسلوب سے ان لوگوں کے لیے ایک دعوتِ ایمان ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اگرچہ ایمان تو نہیں لائے تھے لیکن ان کا ایمان نہ لانا کسی حسد اور تکبر کی بنا پر نہیں تھا بلکہ صرف اس وجہ سے تھا کہ آپ کے دعوے اور آپ کی دعوت کے بعض پہلو ابھی ان پر اچھی طرح روشن نہیں ہوئے تھے ـــ اس سلسلۂ کلام کو سامنے رکھتے ہوئے اب آگے کی آیات کی تلاوت کیجیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ
قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ
نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا
لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ
عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ
بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ
اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا
كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا
اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ
اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪
وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ
عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ

بِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ مُسۡتَقَرّٞ وَمَتَٰعٌ إِلَىٰ حِينٖ ﴿٣٦﴾
فَتَلَقَّىٰٓ ءَادَمُ مِن رَّبِّهِۦ كَلِمَٰتٖ فَتَابَ عَلَيۡهِۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ
ٱلرَّحِيمُ ﴿٣٧﴾ قُلۡنَا ٱهۡبِطُواْ مِنۡهَا جَمِيعٗاۖ فَإِمَّا يَأۡتِيَنَّكُم مِّنِّي
هُدٗى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ
يَحۡزَنُونَ ﴿٣٨﴾ وَٱلَّذِينَ كَفَرُواْ وَكَذَّبُواْ بِـَٔايَٰتِنَآ أُوْلَٰٓئِكَ
أَصۡحَٰبُ ٱلنَّارِۖ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٣٩﴾ ع ۴

ترجمۂ آیات ۳۰-۳۹

اور یاد کرو جب کہ تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، انھوں نے کہا کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے اور ہم تو تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہی ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہی ہیں؟ اس نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے سکھا دیئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے ناموں سے آگاہ کرو۔ انھوں نے کہا کہ تو پاک ہے، ہمیں تو تو نے جو کچھ بتایا ہے اس کے سوا کوئی علم نہیں، بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔ کہا اے آدم! ان کو بتاؤ ان لوگوں کے نام۔ تو جب اس نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام تو اس نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے تھے۔ ۳۰-۳۳

اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے۔ اس نے انکار کیا اور گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے بن گیا۔ اور ہم نے کہا اے آدم تم اور

تمھاری بیوی دونوں رہو جنت میں اور اس میں سے کھاؤ فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو اور اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے بن جاؤ گے۔ تو شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا اور ان کو نکلوا چھوڑا اس عیش و آرام سے جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے کہا کہ اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمھارے لیے ایک وقت خاص تک زمین میں رہنا بسنا اور کھانا برتنا ہے۔ پھر آدم نے پا لیے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات تو اس نے اس کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے کہا اترو یہاں سے سب تو اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۳۹-۳۰

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۳۰)

'اذ' کا محل استعمال

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ : عربی زبان میں جب کلام کا آغاز 'اذ' سے ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس سے پہلے خیال کرو، تصور کرو، یاد کرو یا ان کے ہم معنی کوئی فعل یہاں محذوف ہے۔ عموماً اس کے بعد کسی ایسی ہی سرگزشت یا واقعہ کا حوالہ آتا ہے جو یا تو مخاطب کے علم میں ہو، یا خود متکلم اس کی قطعیت پر اس درجہ مطمئن ہو کہ ایک معلوم و معروف حقیقت کی حیثیت سے اس کا حوالہ دے سکے۔ یہاں اگرچہ آدم، ملائکہ اور ابلیس سے متعلق ایک ایسے ماجرے کا حوالہ دیا گیا ہے جو عالم غیب میں پیش آیا ہے اور جس کا علم خدا کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے۔ لیکن مخاطب یہاں اوّل تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے لیے زبان وحی کی ہر بات ایک امر واقعی اور ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ ثانیاً اس سرگزشت کا اصلی رخ، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، یہود کی طرف ہے اور یہود تورات کے ذریعہ

سے اس ماجرے سے واقف تھے اگرچہ انھوں نے تحریف کر کے اس کی اصلی شکل بہت کچھ بدل ڈالی تھی۔

مَلٰٓئِكَةِ: مَلَک کی جمع ہے۔ عربی زبان میں اَلوکہ کے معنی پیغام کے آتے ہیں اور مَلَک (جس کی اصل مَلْاَک ہے) کے معنی رسول اور پیغام بر کے ہیں۔ یہ لفظ ان روحانی پیغام بروں کے لیے مخصوص ہے جن کو ہم اپنی زبان میں فرشتہ کہتے ہیں۔ فرشتے اللہ تعالیٰ اور اس کی دوسری مخلوقات کے درمیان قابلِ اعتماد واسطہ ہیں۔ یہ اپنی روحانیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے بھی غایت درجہ قرب و اتصال رکھتے ہیں اور مخلوق ہونے کے سبب سے مخلوقات سے بھی نسبت اور تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے انوار و ترشحات کے بلاواسطہ قبول کرنے کی صلاحیت بھی ہے اور یہ ان انوار و ترشحات کو اللہ تعالیٰ کے بندوں تک منتقل کرنے کی قابلیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نبیوں اور رسولوں کے پاس وحی بھی لاتے ہیں اور اس کی مخلوق کے اندر اس کے احکام کی تنفیذ بھی کرتے ہیں۔ قرآن میں ان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ تمام تر ایک ذی عقل، ذی ارادہ اور ذی شعور مخلوق کی نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ صفات ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مجرد قوتیں ہیں جن کو ملٰئکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ ملٰئکۃ کا مفہوم

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً: خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کے معاملات سرانجام دینے کے لیے اس کی جگہ لے۔ اس وجہ سے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے زمین میں کس کا خلیفہ بنانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا، اپنا یا زمین میں بسنے والی کسی پیشرو مخلوق کا؟ ایک رائے یہ ہے کہ انسان سے پہلے زمین میں جنات آباد تھے، جب انھوں نے اس میں فساد مچایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پراگندہ و منتشر کر دیا اور ان کی خلافت بنی نوع انسان کے سپرد فرمائی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں خود اپنا خلیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ پہلی رائے اگرچہ بالکل بے بنیاد تو نہیں کہی جا سکتی لیکن قرآن یا تورات یا کسی قابلِ اعتماد حدیث میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ انسان سے پہلے زمین میں جنات کی حکمرانی تھی، اس کی تائید میں اگر کوئی چیز پیش کی جا سکتی ہے تو اس کی حیثیت اشارہ و کنایہ سے زیادہ نہیں ہے اور محض کسی اشارہ و کنایہ پر ایک حقیقت کی بنیاد رکھ دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ خلیفۃ کا مفہوم

دوسری رائے مختلف اعتبارات سے قوی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے انسان کی فضیلت کے بہت سے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزیں انسان کے لیے پیدا کی ہیں، فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں، نیز اس کے بارے میں فرمایا کہ جو امانت آسمان اور زمین اٹھانے سے قاصر رہے اس کو انسان نے اٹھا لیا۔ یہ ساری باتیں اس امر کے حق میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہو۔ لیکن ان تمام دلائل کے باوجود ایک سوال اس رائے سے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ خلیفہ تو اس کو مقرر کرنے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے جو غائب یا غیر حاضر ہوتا ہو، خدا تو نہ کبھی غائب

ہوتا ہے نہ غیر حاضر، آسمان و زمین ہر جگہ اس کی حکومت ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ پھر اس کے کسی کو خلیفہ مقرر کرلینے کے کیا معنی؟

یہ سوال ہمارے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زمین کے انتظام و انصرام کے معاملہ میں کچھ اختیارات دے کر یہ دیکھے گا کہ انسان ان اختیارات کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے یا خلافت پا کر وہ مطلق العنان بن جاتا ہے اور اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ گویا اصل حکمران کی طرف سے ایک نائب مقرر کیے جانے کی شکل ہوئی اور اس نائب کے تقرر کی ضرورت یہ نہیں تھی کہ اصل حکمران کو غائب یا غیر حاضر ہونا تھا بلکہ اس نائب کو کچھ اختیارات دے کر مقصود اس کی اطاعت و وفاداری کا امتحان کرنا تھا۔

فساد فی الارض کا مفہوم

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ: قرآن مجید کی اصطلاح میں فساد فی الارض کا مفہوم یہ ہے کہ زمین کا نظم و نسق، اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کے مطابق چلانے کے بجائے اس کو من مانے طریقہ پر چلایا جائے، خدا کی شریعت کی نافرمانی کی جائے اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی جائے، زمین کے اصلی حکمران کی مرضی نظر انداز کی جائے اور خود اپنی مرضی چلائی جائے۔ یہ چیز بجائے خود فساد فی الارض اور بغاوت ہے، عام اس سے کہ یہ دھینگا مشتی اور سرکشی کے ساتھ واقع ہو یا کسی فکر و فلسفہ کے تحت پر امن طریقہ پر۔ اس زمین کا اصلی حکمران اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کی حیثیت اس کے اندر اصل حکمران کی نہیں بلکہ اصل حکمران کے نائب کی ہے۔ اس وجہ سے اس زمین کے امن و عدل کا انحصار اس چیز پر ہے کہ اس کے ہر گوشے میں خدا ہی کا قانون چلے۔ اگر اس کے کسی حصہ میں بھی خدا کا قانون باقی نہیں رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس حصے میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے اور یہ چیز اس پوری زمین کے لیے ایک خطرہ ہے۔

خونریزی فساد فی الارض کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب خدا کا قانون عدل باقی نہیں رہے گا تو لازماً اس کی جگہ انسان کی اپنی خواہشات کی فرمانروائی ہوگی۔ اس چیز کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسی شخص کے بھی جان یا مال یا اس کی آبرو کے لیے کوئی ضمانت باقی نہیں رہے گی۔ کسی خاص خطۂ زمین کے مفسدین بالفرض کوئی ایسا نظام بنا بھی لیں جس میں باہم دگر ایک دوسرے کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے دیں تو اس سے وہ اپنے لیے تو ایک تحفظ کی شکل پیدا کر لیں گے لیکن دوسروں کے لیے وہ بدستور خطرہ ہی بنے رہیں گے۔ ان کی مثال ڈاکوؤں کے ایک جتھے کی ہوگی جس کے افراد نے آپس میں تو یہ سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ ایک دوسرے کے جان و مال پر دست درازی نہیں کریں گے لیکن ان کے جتھے سے باہر والوں کے جان و مال کو ان کی چیرہ دستیوں سے بچانے والی کوئی چیز بھی نہیں ہوگی۔ تمام عالم انسانی اور پورے کرۂ ارضی کے تحفظ کی ضمانت صرف خدا کا قانون ہی دے سکتا ہے جو سب کے جان و مال کی حفاظت کرتا ہے اور سب کو یکساں پابند کرتا اور یکساں آزادی بخشتا ہے۔

فرشتوں نے انسان کے بارے میں اس اندیشہ کا اظہار اس کے خلیفہ ہونے کی بنا پر کیا، اس لیے کہ خلیفہ کے لفظ کے اندر یہ چیز چھپی ہوئی ہے کہ اس کو ایک خاص حد کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیارات تفویض ہوں گے۔ فرشتوں نے محسوس کیا کہ اختیار کو استعمال کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، اس کو پا کر انسان بہک سکتا ہے اور اس بہکنے کا نتیجہ زمین میں بدامنی اور فساد کی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے۔

تسبیح کی حقیقت

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ: تسبیح کی اصل حقیقت، لغت کے اعتبار سے، کسی کے سامنے عجز و تذلل کے ساتھ بچھ جانا ہے۔ تسبیح قول سے بھی ہوتی ہے اور عمل سے بھی ہوتی ہے۔ عمل سے خدا کی تسبیح کا مفہوم خدا کے احکام کی تعمیل میں ہر وقت سرنگندہ رہنا ہے۔ یہ تسبیح اس کائنات کی وہ چیزیں بھی کرتی ہیں جو غیر ذی روح اور غیر ذی ارادہ ہیں۔ انسان کے جس عمل کو قرآن نے خاص طور پر تسبیح سے تعبیر کیا ہے وہ نماز ہے اس لیے کہ نماز سرنگندگی اور عجز و تذلل کی نہایت مکمل تصویر ہے۔ قولی تسبیح سے مراد خدا کی پاکی بیان کرنا ہے۔ یعنی خدا کو ان باتوں سے منزہ اور بالاتر قرار دینا جو اس کی شانِ الوہیت کے خلاف ہیں۔ اس اعتبار سے تسبیح میں منفی پہلو غالب ہے لیکن جب اس کے ساتھ حمد کی قید بڑھا دی جائے جیسی کہ یہاں ہے تو اس میں تنزیہہ کے ساتھ اثبات کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے، یعنی خدا کو منافیِ شانِ الوہیت صفات سے پاک قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان صفات سے متصف بھی قرار دینا جن کی بنا پر وہ سزاوار حمد و شکر ہے۔

'نقدس لك' کا مفہوم

نُقَدِّسُ لَكَ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم تیری پاکی، تیری برتری اور تیری قدوسیت بیان کرتے ہیں۔ تسبیح میں، تو جیسا کہ بیان ہوا، تنزیہہ کا مفہوم غالب ہے لیکن تقدیس کا مفہوم اللہ تعالیٰ کو پاکیزگی اور قدوسیت کی تمام صفات سے متصف قرار دینا ہے۔ تسبیح کے ساتھ تقدیس کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ جب تک انکار کے ساتھ یہ اقرار نہ ہو اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی تعریف کا حق نہیں ادا ہوتا۔

انسان کے متعلق مذکورہ بالا اندیشہ ظاہر کرنے کے بعد فرشتوں کی طرف سے اپنی اس تسبیح و تقدیس کا حوالہ دینا اس لیے نہیں تھا کہ انسان کے مقابل میں وہ خود اپنے حقدار خلافت ہونے کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ اصل مقصود ان کا اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی حکمت و مصلحت معلوم کرنا تھا۔ اس غرض کے لیے انھوں نے ایک طرف تو اس اندیشہ کو ظاہر کر دیا جو انسان کی خلافت کے اندر ان کو مضمر نظر آیا، دوسری طرف اس بات کو بھی ظاہر کر دیا کہ انسان کی تخلیق سے مقصود محض تسبیح و تقدیس تو ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ یہ کام تو ہم کر ہی رہے ہیں۔

قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ: فرشتوں کے مذکورہ بالا سوال کے جواب میں ارشاد ہوا کہ اس اسکیم کے سارے پہلوؤں پر تمھاری نظر نہیں ہے۔ اس وجہ سے تمھارے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا ہے، جب

پوری اسکیم تمہارے سامنے آجائے گی تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ اس کے اندر اس اندیشہ کے سدِباب کا اہتمام بھی ہے جو تم نے ظاہر کیا ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۱)

آدمؑ کو کن کے نام سکھائے گئے؟

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا، اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو کن کے نام سکھائے، اس سوال کے جواب میں تین قول ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد تمام چیزوں کے نام ہیں، دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد فرشتوں کے نام ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد آدمؑ کی ذریت کے نام ہیں۔

ان میں سے جہاں تک دوسرے قول کا تعلق ہے اس کی تائید میں قرآن میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس پر کسی گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔ باقی رہا پہلا اور تیسرا قول تو ان میں سے تیسرا قول ہمارے نزدیک زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے وجوہ یہ ہیں:۔

اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسماء پر الف لام عہد کا ہے۔ اگر اس کو عہد کا الف لام مانا جائے تو پھر اس سے کچھ خاص ناموں ہی کا مراد لینا صحیح ہوگا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے ضمیریں اور اشارے وغیرہ جو استعمال ہوئے ہیں وہ تمام تر وہ ہیں جو عربی زبان میں عام چیزوں کے لیے نہیں بلکہ خاص طور پر عقل و ادراک اور شعور و ارادہ رکھنے والی چیزوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً فرمایا ہے ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ (پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا) اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ (مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ) يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ (اے آدم ان کو ان کے ناموں سے آگاہ کرو) فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ (تو جب ان کو ان کے ناموں سے آگاہ کیا)

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں موقع فرشتوں کو قائل کرنے کا ہے۔ فرشتے حضرت آدمؑ کی ذریت کے متعلق یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ خلافت پا کر زمین میں فساد مچائے گی اور خونریزیاں کرے گی۔ ان کے اس گمان کی تردید اگر ہو سکتی تھی تو اسی طرح ہو سکتی تھی کہ ان کو ذریتِ آدمؑ کا مشاہدہ کرایا جائے اور اولادِ آدمؑ میں جو انبیاء و رسل، جو مجددین و مصلحین اور جو شہداء و صدیقین پیدا ہونے والے تھے ان سے ان کو آگاہ کیا جائے تاکہ ان پر یہ بات واضح ہو سکے کہ اگر اولادِ آدمؑ کے اندر ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے جو اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ اختیارات کو بے جا طور پر استعمال کریں گے تو ساتھ ہی ان کے اندر ایسے لوگ بھی اٹھیں گے جو خود بھی اس ذمہ داری کا حق ادا کریں گے اور دوسروں کو بھی ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں گے۔

یہ تینوں باتیں بڑی اہمیت رکھنے والی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے الگ الگ ہر ایک کے متعلق کوئی نہ کوئی کمزور قسم کا اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے لیکن یہ تینوں مجموعی طور پر مل کر نہایت مضبوط دلیل اس بات کی بن جاتی

ہیں کہ اسماء سے مراد حضرت آدمؑ کی ذریت کے نام اور خاص کر ان لوگوں کے نام ہیں جو دنیا میں فساد کو مٹانے اور عدل کو قائم کرنے کے لیے آنے والے تھے۔

رہا یہ سوال کہ آدمؑ کی یہ ذریت تھی کہاں کہ ان کا مشاہدہ کرایا گیا اور ان کے نام بتائے گئے تو اس کا جواب خود قرآن مجید سے معلوم ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں تصریح موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نسل آدمؑ کو ایک مرتبہ نکال کر ان سے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ	اور یاد کرو جب کہ تیرے رب نے تمام بنی آدم یعنی
ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى	ان کی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو نکالا اور ان کو خود
اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ	ان کے اوپر گواہ بنایا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟
شَهِدْنَا ۚ (۱۷۲۔ اعراف)	انھوں نے اقرار کیا کہ ہاں ہم گواہ ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھیجنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عالم غیب میں ایک مرتبہ تمام نسل آدمؑ کے ایک اجتماع عام میں ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار کرایا ہے۔ اسی اجتماع عام میں آدمؑ کو ان کی ذریت کے نام بھی بتائے گئے ہوں گے اور اسی موقع پر فرشتوں کے سامنے ان کو پیش کر کے وہ سوال و جواب بھی ہوا ہو گا جس کا یہاں حوالہ ہے۔

اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَاۗءِ هٰٓؤُلَاۗءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: یعنی اگر تم اس گمان میں سچے ہو کہ اولاد آدمؑ خلافت پا کر زمین میں فساد برپا کرے گی تو ان لوگوں کے نام بتاؤ کہ یہ کون لوگ ہیں، یہ زمین میں فساد برپا کرنے والے ہیں یا اس میں امن اور عدل قائم کرنے والے ہیں؛ اس میں فرشتوں کو قائل کرنے والا پہلو یہ ہے کہ نسل آدمؑ کے رویہ سے متعلق اگر کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے تو اسی شکل میں قائم کی جا سکتی ہے جب بہ حیثیت مجموعی ان کے بارے میں تمھیں واقفیت ہو، لیکن جب اس طرح کی کوئی واقفیت تمھیں نہیں ہے تو پھر اس طرح کی بدگمانی کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۳۲)

'سُبْحٰنَكَ' کے مواقع استعمال

سُبْحٰنَكَ: قرآن مجید میں یہ کلمہ مختلف مواقع پر استعمال ہوا ہے۔

نامناسب اور خلاف شان باتوں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کے لیے مثلاً سُبْحَانَ اللّٰهِ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۶۸۔ قصص) (اللہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں)

دعا کے موقع کے لیے مثلاً دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ (۱۰۔ یونس) (ان کی دعا اس میں یہ ہو گی کہ تو پاک ہے اے اللہ)

امر کے معنی کے لیے۔ مثلاً فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ (۱۷، روم) (پس اللہ کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے ہو اور جس وقت تم صبح کرتے ہو)

تعجب کے ساتھ کسی چیز کے انکار کے لیے، مثلاً سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۱۶۔ نور) (تو پاک ہے یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے)

یہاں یہ کلمہ اپنے پہلے مفہوم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یعنی فرشتوں کا مطلب یہ تھا کہ تیری شان اس سے ارفع ہے کہ تیرے ہاتھوں کوئی ایسا کام ہو جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو، ہم نے جس شبہ کا اظہار کیا ہے وہ محض ہمارے علم کی کمی کا نتیجہ ہے، ہمارے پاس تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں بخشا ہے۔ علم اور حکمت کا اصلی خزانہ تو تیرے ہی پاس ہے۔

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۳۳)

خدا کے سوا سارے غیب کا علم کسی کو نہیں

اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ الآیۃ: یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کا حوالہ دیا ہے جو اوپر آیت ۳۰ میں گزر چکا ہے یعنی اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) پہلے یہ بات اجمال کے ساتھ کہی گئی تھی لیکن جب فرشتوں کو اچھی طرح قائل کر دیا گیا اور وہ قائل ہو بھی گئے تو پھر اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ فرمایا تاکہ یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اس کارخانۂ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ساری حکمتیں اور مصلحتیں صرف اسی کو معلوم ہیں جس نے اس کارخانے کو بنایا ہے اور جو اس کو چلا رہا ہے۔ ان حکمتوں اور مصلحتوں کو فرشتے بھی جو خدا سے اس قدر قرب رکھتے ہیں، نہ جانتے ہیں اور نہ خدا کے بتلائے بغیر جان سکتے ہیں۔ اس وجہ سے قدرت کا کوئی فعل اگر بے حکمت و بے مصلحت نظر آئے تو اس کی بنا پر قدرت کو نشانۂ اعتراض یا خود اپنے آپ کو شکوک و شبہات کا مریض بنا لینے کے بجائے آدمی کو چاہیے کہ اس چیز کو اپنے علم کی کمی پر محمول کرے اور فرشتوں کی طرح سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ کا اقرار کرے۔ کیونکہ خدائے علیم و حکیم کا کوئی فعل بھی حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہے لیکن اس کے سارے کاموں کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھنا نہ فرشتوں کے لیے ممکن ہے، نہ جنوں کے لیے اور نہ انسانوں کے لیے۔

اس کے ساتھ یہ جو فرمایا ہے کہ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپا رہے تھے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے سوال کو بھی سمجھتا تھا اور اس اصل وجہ کو بھی جانتا تھا جس سے یہ سوال پیدا ہوا تھا۔ وہ وجہ یہ تھی کہ تم آدم کی خلافت کی اسکیم کے مضمرات سے بے خبر تھے، تم چاہتے تھے کہ وہ تم پر ظاہر کیے جائیں، اس مقصد کے لیے تم نے اس اسکیم کے بُرے پہلوؤں کی طرف، جو واضح طور پر تمہیں نظر آئے، تم نے بہ شکل سوال اشارہ کیا تاکہ تم پر اس کے وہ پہلو کھولے جائیں جو خیر کے ہیں۔ چنانچہ آدم کی ذریت کا مشاہدہ کرا کے اور ان کے ناموں سے تمہیں آگاہ کر کے تمہاری یہ خواہش پوری کر دی گئی۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر اپنے ایک احسان کے طور پر بیان فرمائی ہے کہ تمہارے سوال کے

ظاہر و باطن دونوں کا جواب تمہیں دے دیا گیا۔ اس میں فرشتوں کے لیے کسی ملامت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوٓا إِلَّآ إِبْلِيسَ أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِينَ (۳۴)

سجدہ کا مفہوم — سجدۂ تعظیمی

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ: سجدہ کا لفظ عربی زبان میں جھکنے کے معنی میں آتا ہے۔ جھکنے کے مختلف مدارج ہو سکتے ہیں۔ کسی کے آگے تعظیم کے طور پر سر نیہوڑا دینا بھی جھکنا ہے اور پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھ دینا بھی جھکنا ہے۔ پچھلے مذاہب میں تعظیم کی یہ قسم غیر اللہ کے لیے جائز تھی لیکن عموماً اس کی حد وہی تھی جو ہمارے ہاں رکوع کی ہے۔ بنی اسرائیل میں اس طرح کے تعظیمی سجدے کا عام رواج تھا اور تورات کے مختلف مقامات سے اس کی جو شکل معیّن ہوتی ہے وہ رکوع سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ اسلام نے تعظیم کی اس شکل کو خدائے رب العزت کے لیے خاص کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام خدا کا آخری اور کامل دین ہے، اس نے توحید کی حقیقت کو مکمل طور پر اجاگر کر دینے کے لیے خدا کے لیے تعظیم و تذلل کی شکلیں بھی خاص کر دی ہیں تاکہ اس کے اندر شرک کے داخل ہونے کے لیے کوئی رخنہ باقی نہ رہ جائے۔

فرشتوں کو آدم کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دینے میں شرک کا کوئی پہلو نہیں ہے اس لیے کہ اولاً تو یہ سجدہ خدا کے حکم کی تعمیل میں تھا اس لیے گویا خدا ہی کو سجدہ تھا، ثانیاً سجدہ شرک کی علامت، جیسا کہ عرض کیا گیا، اسلام میں قرار دیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے اس کی اہمیت تعظیم کے ایک طریقہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھی۔ اگر یہ کہا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدم کو تعظیم بجالاؤ، اس سے زیادہ اس کا مفہوم نہیں ہے۔

سجدے کے حکم کی علت

فرشتوں کو آدم کی تعظیم بجالانے کا حکم کیوں دیا گیا؟ ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی اطاعت اور بندگی کا ایک امتحان تھا۔ کسی کا امتحان اسی چیز میں لیا جاتا ہے جو اس کے نفس پر شاق ہو سکے۔ فرشتوں کی خلقت چونکہ نور سے ہوئی ہے اور وہ خدا کی تسبیح و تقدیس کے لیے پیدا ہوئے ہیں اس وجہ سے آدم خاکی کی تعظیم بجالانے کے حکم میں ان کے لیے ایک بڑی آزمائش تھی لیکن فرشتے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اصلی عزت و سرفرازی نور یا نار سے پیدا ہونے میں نہیں ہے بلکہ پیدا کرنے والے کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل میں ہے۔ چنانچہ وہ اس امتحان میں پورے اترے۔

اس میں شبہ نہیں کہ فرشتوں کے اس سجدے سے آدم کی بڑائی کا ایک پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے لیکن یہاں مقصود آدم کی بڑائی کا اظہار نہیں بلکہ فرشتوں کی بندگی و اطاعت کا اظہار ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ جو خدا کے مطیع و فرمانبردار ہوتے ہیں وہ نسل و نسب کے غرور میں مبتلا ہو کر ابلیس کی طرح اکڑا نہیں کرتے بلکہ وہ اس طرح کی ہر چیز کو خدا کا فضل و احسان سمجھتے ہیں اور اس فضل و احسان کا احساس ان کے اندر غرور و تکبر کے بجائے تواضع اور بندگی پیدا کرتا ہے۔

بنی اسرائیل کے لیے ایک سبق

موقع کلام کے لحاظ سے یہ بات ان بنی اسرائیل کے لیے ایک سبق ہے جو نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں فرشتوں کی سی روش اختیار کرنے کے بجائے شیطان کی پیروی میں غرور نسل و نسب کے فتنے میں مبتلا ہو گئے تھے۔

آدم کو سجدہ کرنے کے حکم کا مقصود

جو لوگ فرشتوں کی طرف سے آدم کی اس تعظیم کو آدم کی علمی فضیلت کا نتیجہ سمجھتے ہیں، میرے نزدیک ان کے اس خیال کے لیے کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے۔ اپنی ذریت کے اسماء کا علم جس طرح خدا کے بتانے سے آدمؑ کو حاصل ہو گیا اسی طرح آدم کے بتانے سے فرشتوں کو حاصل ہو گیا، پھر اس میں آدمؑ کی ایسی فضیلت کا کیا پہلو ہے جس کی بنا پر فرشتوں کو ان کے سجدہ کا حکم دیا جائے۔ علاوہ ازیں اس بات کا بھی کوئی قوی ثبوت موجود نہیں ہے کہ فرشتوں کو آدم کی اس تعظیم کا حکم اسی وقت دیا گیا جب آدمؑ نے ان کو ناموں سے آگاہ کیا ہے۔ بلاشبہ سجدہ کے حکم کا ذکر یہاں تعلیم اسماء کے ذکر کے بعد ہی آیا ہے۔ لیکن محض اتنی سی بات اس امر کے ثبوت کے لیے کافی نہیں ہے کہ پہلی چیز اسی دوسری چیز کا نتیجہ ہے۔ اول تو سجدے کے حکم کا بیان لفظ "اذ" سے شروع ہوتا ہے جو اس بات کے لیے ایک قوی قرینہ فراہم کرتا ہے کہ یہ ایک مستقل بات ہو، ضروری نہیں کہ یہ پہلی بات کے بعد ہی پیش آئی ہو۔ ثانیاً قرآن مجید کے دوسرے مواقع سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو آدم کے سجدے کا حکم نہ صرف آدم کی علمی فضیلت کے اظہار سے پہلے بلکہ ان کی پیدائش سے بھی پہلے دیا گیا تھا، مثلاً فرمایا ہے:-

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌۢ	اور یاد کرو جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ
بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ	میں سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے ایک بشر
فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي	بنانے والا ہوں تو جب میں اس کو مکمل کر لوں اور اس
فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ	میں اپنی روح میں سے روح پھونک لوں تو تم اس
كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ إِلَّآ إِبْلِيسَ أَبٰىٓ أَنْ يَكُونَ	کے لیے سجدہ میں گر جانا تو سارے فرشتوں نے سجدہ
مَعَ السّٰجِدِينَ	کیا مگر ابلیس نے۔ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل
(حجر ۲۸-۳۱)	ہونے سے انکار کر دیا۔

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں اور بھی ہیں جن سے واضح ہے کہ فرشتوں کو آدم کے سجدے کا حکم آدم کی پیدائش سے پہلے دیا گیا تھا اور ان آیات سے ضمناً یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اصل مقصود اس سجدے سے فرشتوں کی اطاعت اور وفاداری کا امتحان ہی تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہاں آدمؑ کے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیے جانے کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے تاکہ اس امتحان میں فرشتوں کے لیے آزمائش کا جو پہلو ہے، وہ ان کے سامنے واضح ہو کر آ جائے۔ ہم اوپر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ امتحان ہمیشہ اس چیز میں ہوا کرتا ہے جو نفس پر شاق ہو۔ فرشتوں کے لیے یہ بات بڑی ہی آزمائش کی تھی کہ وہ نور کی مخلوق ہوتے

کے باوجود آدم خاکی کو، جو سڑی ہوئی کیچڑ سے وجود میں آیا ہے سجدہ کریں لیکن وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ عزت و شرف بخشنے والی چیز درحقیقت خدا کی فرمانبرداری ہے نہ کہ نور یا نار سے پیدا ہونا، اس وجہ سے اس امتحان کے سخت ہونے کے باوجود وہ اس میں پورے اترے لیکن ابلیس اپنے غرور کے سبب سے اس امتحان میں ناکام ہوگیا۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ بعض آیات میں سجدے کا ذکر آدم کی پیدائش اور ان کی صورت گری کے بعد آیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض آیات میں ترتیب مضمون اس طرح بھی ہے لیکن اس طرح کے مواقع پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقصود انسان پر اپنی نعمتوں کا بیان ہے نہ کہ یہ واضح کرنا کہ فلاں واقعہ فلاں واقعہ کے بعد پیش آیا ہے۔

لفظ ابلیس کی تحقیق

اِلَّآ اِبْلِیْسَ: ابلیس، اَبْلَسَ سے افعیل کے وزن پر ہے۔ ابلس کے معنی غمگین ہونے، انکار کرنے اور مایوس ہونے کے ہیں۔ ابلیس دراصل اس جنی کا لقب ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ قرآن مجید میں اس بات کی تصریح ہے کہ یہ جنات میں سے تھا۔ سورہ طٰہٰ میں ہے وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (اور یاد کرو، جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم کو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے، وہ جنات میں سے تھا، اس نے اپنے رب کے حکم سے انحراف کیا)

قرآن مجید نے مکلف مخلوقات کی حیثیت سے تین مخلوقات کا ذکر کیا ہے۔ فرشتے، جنات اور بنی آدم۔ شیطان کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے۔ جنوں اور انسانوں میں سے جو لوگ خدا کی نافرمانی کی روش اختیار کر لیتے ہیں وہ لوگ ابلیس کی ذریت اور اس کے اولیاء میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے جنات اور انسان گمراہی پر پیدا نہیں کیے گئے، پیدا تو یہ ہوئے ہیں اسی فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام جنوں اور تمام انسانوں کو پیدا فرمایا ہے لیکن چوں کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو اختیار کی نعمت سے نوازا ہے اس وجہ سے ان میں سے جو لوگ اپنے لیے گمراہی کے راستے ہی کو پسند کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اسی راستے پر چلنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی قرآن مجید میں جگہ جگہ تفصیل فرمائی ہے۔ ہم اس کے مختلف پہلوؤں کی مناسب مواقع پر وضاحت کریں گے۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں ایک بات بعض لوگوں کو کھٹکے گی۔ وہ یہ کہ سجدے کا حکم تو فرشتوں کو دیا گیا تھا نہ کہ جنات کو تو ابلیس کو جو جنات میں سے تھا سجدہ نہ کرنے پر لعنت کا مستحق کیوں قرار دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جنات اور فرشتوں میں اصلی فرق خصائص اور صفات کے پہلو سے ہے، اپنی خلقت کے لحاظ سے جنات فرشتوں سے زیادہ دوری نہیں رکھتے، فرشتے نور سے پیدا ہوئے اور جنات نار سے۔ اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علی سبیل التغلیب جنات بھی اس حکم سجدہ میں شامل تھے، لیکن ان کے گمراہ فرد ابلیس نے

سجدہ سے انکار کیا۔ یہ رائے ہمارے بعض پچھلے مفسرین نے بھی ظاہر فرمائی ہے اور مجھے یہ رائے قوی معلوم ہوتی ہے۔[1]

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۳۵)

الشجرۃ سے مراد

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ: شجرہ پر الف لام داخل ہے جس سے یہ بات تو واضح ہے کہ جہاں تک آدمؑ اور حوا علیہما السلام کا تعلق ہے، ان کو یہ درخت تعین اور تخصیص کے ساتھ بتا دیا گیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ یہ درخت کس چیز کا تھا؟ تو اس سوال کا جواب نہ تو قرآن مجید ہی نے دیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث ہی میں اس کا جواب موجود ہے اس وجہ سے اس کو معلوم کرنے کی کوشش ایک لاحاصل کوشش ہے۔ ہمارے نزدیک اس بارے میں صحیح مسلک امام ابن جریرؒ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم تعین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ درخت کس چیز کا تھا، کیونکہ اس کے تعین کے لیئے کوئی دلیل نہ تو ہمیں قرآن ہی میں ملتی ہے نہ حدیث ہی میں، پھر آخر کوئی شخص کوئی بات کہے تو کس سند پر۔

ہمارے نزدیک اس درخت کو معلوم کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ اصل چیز جو یہاں قرآن مجید بتانی چاہتا ہے وہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح فرشتوں اور جنات کی وفاداری اور اطاعت کا امتحان آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر لیا اسی طرح آدمؑ کی اطاعت و وفاداری کا امتحان ان کے لیے جنت کے درختوں میں سے ایک درخت کو حرام ٹھہرا کر لیا۔ نعمتوں سے بھری ہوئی اس جنت میں صرف ایک درخت ایسا تھا جس سے فائدہ اٹھانے سے حضرت آدمؑ کو روکا گیا تھا، لیکن انسان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ جس چیز سے وہ روک دیا جاتا ہے اسی کا وہ زیادہ حریص بن جایا کرتا ہے۔ چناں چہ ابلیس نے آدمؑ کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور ان کو یہ سمجھانا شروع کر دیا کہ زندگیٔ جاوداں اور ملک لازوال کا راز اگر مضمر ہے تو بس اسی درخت کے پھلوں میں ہے جس سے ان کو محروم کر دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدمؑ شیطان کے اس چکمے میں آ گئے اور اس درخت کا پھل کھا بیٹھے لیکن یہ غلطی کر گزرنے کے بعد شیطان کی طرح اپنی غلطی پر ضد نہیں کی بلکہ اس پر نادم

---

[1] قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

اما الجن ایضا کانوا مامورین مع الملٰئکة لکنه استغنی بذکر الملٰئکة عن ذکرهم فانه اذا علم ان الاکابر مامورون بالتذلل لاحد والتوسل به علم ان الاصاغر ایضا مامورون به والضمیر فی فسجدوا راجع الی القبیلتین (یا جن بھی فرشتوں کے ساتھ سجدہ کے حکم میں شامل تھے لیکن فرشتوں کے ذکر کے بعد جنات کے ذکر کی ضرورت اس وجہ سے باقی نہیں رہی کہ جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ بڑوں کو کسی کی تعظیم و تکریم کا حکم ہوا ہے تو اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ چھوٹے بھی اس حکم میں شامل ہیں۔ اس صورت میں فسجدوا کی جو ضمیر ہے وہ دونوں گروہوں کی طرف لوٹے گی)

ہونے اور توبہ کی۔

بالکل اسی طرح کی صورت حال اس دنیا میں ہمارے سامنے ہے۔ اس زمین کی ہر نعمت ہمارے لیے مباح ہے۔ صرف گنتی کی چند چیزیں ہیں جن سے خدا نے ہمیں روکا ہے لیکن ہم میں سے بہتوں کا حال یہ ہے کہ وہ شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے سبب سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری اور دنیا کی ساری ترقی اور کامیابی کا راز بس انھی چند چیزوں کے اندر چھپا ہوا ہے جن سے خدا نے روک دیا ہے اور پھر ستم یہ ہے کہ نافرمانی کر کے اپنے باپ کی طرح نادم ہونے اور توبہ کرنے کے بجائے ابلیس کی طرح اکڑتے اور ضد کرتے ہیں۔

تورات میں اس درخت کو خیر و شر کی معرفت کا درخت کہا گیا ہے۔ یہ بات ہے تو دلچسپ لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ غالباً اہل تورات نے یہ بات اول اول بطور ایک تاویل کے اس وجہ سے اختیار کی ہوگی کہ اس درخت کے پھل کھانے کا اثر یہ بیان کیا گیا ہے کہ آدم و حوا دونوں ننگے ہو کے رہ گئے۔ ابتداءً تو یہ بات ایک تاویل کی حیثیت سے سامنے آئی ہوگی لیکن بعد میں دل پسند ہونے کے سبب سے تحریف کے چور دروازے سے اس نے اصل متن کی جگہ حاصل کر لی ہوگی۔ قرآن مجید نے اس بات کا ذکر تو کیا ہے کہ اس درخت کے پھل کھانے کے بعد آدمؑ ننگے ہو گئے لیکن قرآن سے یہ اشارہ نہیں نکلتا کہ یہ ننگے ہو جانا ان کے اندر دفعۃً عقل و شعور کے بیدار ہو جانے کا نتیجہ تھا بلکہ یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے خدا کی نافرمانی کر کے اپنے اوپر جو ظلم کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جنت کے لباس سے محروم ہو گئے۔

اگر آدمؑ اس درخت کے پھل کھانے سے پہلے اتنے بے شعور تھے کہ ان کو اپنی ستر کا بھی کوئی احساس نہیں تھا تو اس وقت ان کا کسی امتحان میں ڈالا جانا اور وہ بھی ابلیس جیسے زیرک دشمن کے ہاتھوں ایک بالکل خلافِ عقل بات معلوم ہوتی ہے۔ اس امتحان سے پہلے ان کے اندر اتنی سوجھ بوجھ کا ہونا ناگزیر تھا کہ وہ شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے مقابل میں اپنے خیر و شر کو سمجھ سکیں۔ اگر وہ اس سوجھ بوجھ سے عاری تھے تو ان کا شیطان کے فتنے میں پڑ جانا بالکل واضح تھا اور خدا کے انصاف سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ ان کو شیطان کے مقابل میں لا کھڑا کرتا اور پھر ان کی لغزش پر ان کی گرفت کرتا۔

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۳۶)

اِھْبِطُوْا کا خطاب کن سے ہے؟

اِهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ: اِھْبِطُوْا کا یہ خطاب حضرت ابن عباسؓ اور بعض دوسرے اہل تاویل کے نزدیک حضرت آدمؑ، حواؑ اور ابلیس سے ہے اور ابن زید کے نزدیک آدم و حوا اور ان کی ذریت سے۔ ہمارے نزدیک ان میں سے صحیح تاویل حضرت ابن عباسؓ کی ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہاں یہ جو فرمایا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے تو یہ دشمنی اپنی فطری بنیاد اگر رکھتی ہے تو آدم اور ابلیس کے اندر ہی رکھتی ہے آدم و حوا کے اندر نہیں رکھتی۔ آدم و حوا کے درمیان تو فطری

ربط الفت اور محبت کا ہے۔ اسی طرح اولادِ آدم کے اندر بھی فطری ربط و تعلق دراصل اخوت اور محبت کا ہے۔ ان کے اندر دشمنی اور عداوت کا بیج اگر پڑتا ہے تو شیطان کی کوششوں سے پڑتا ہے اور اسی کی فساد انگیزیوں سے یہ پرورش بھی پاتا ہے۔ انسان کی اپنی فطرت کے اندر اس تخمِ فساد کی پرورش کے لیے کچھ زیادہ صلاحیت نہیں ہے۔ شیطان اور آدم کی اس فطری عداوت کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا بھی ہے۔

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ	ہم نے کہا اے آدمؑ یہ ابلیس تمہارا اور تمہاری
وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ	بیوی کا دشمن ہے تو کہیں یہ تمہیں جنت سے نکلوا
الْجَنَّةِ (۱۱۷ طٰہٰ)	نہ چھوڑے۔
اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ	تو کیا تم ابلیس اور اس کی اولاد کو میرے بالمقابل اپنا
دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ (۵۰۔ کہف)	دوست بناؤ گے حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔

اولادِ آدم — اولادِ آدم میں سے اگر بہت سے لوگ ابلیس اور اس کی ذریت سے دوستی قائم کر لیتے ہیں تو اس کی
اور شیطان — وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے درمیان فطری تعلق درحقیقت دوستی ہی کا ہے۔ فطری تعلق تو ان کے درمیان
کے درمیان — دشمنی کا ہے اور دشمنی ہی کا رہنا چاہیے، جیسا کہ اوپر کی کہف والی آیت سے اشارہ نکلتا ہے، لیکن بہت سے
فطری تعلق — لوگ اپنی نادانی اور ناعاقبت اندیشی کے سبب سے اپنے دشمنوں ہی کو اپنا دوست سمجھ بیٹھتے ہیں اور ان
کی نوعیت — کے آلۂ کار بن کر خود اپنے آپ کو تباہ کر لیتے ہیں۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات میں اس بات کی تصریح ہے کہ جس طرح آدمؑ کو جنت سے نکلنے کا حکم دیا گیا تھا اسی طرح ابلیس کو بھی بعینہٖ انہی الفاظ میں یہ حکم دیا گیا تھا۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (خدا نے کہا تو یہاں سے اتر، تجھے کوئی حق نہیں ہے کہ تو یہاں گھمنڈ کرے، سو تو نکل، تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہو گا)

تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض جگہ اس حکم کے ساتھ جمیعًا کا لفظ بطور تاکید آ گیا ہے۔ مثلاً سورہ طٰہٰ میں ہے اهبطا منها جميعا، خود اس سورہ میں بھی آگے چل کر ہے قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا۔ اگر یہ خطاب صرف آدمؑ و حواؑ سے مانا جائے تو پھر جمیعًا کا لفظ کچھ غیر ضروری سا ہو کے رہ جاتا ہے۔ اور اگر اس کو مفید بنانے کے لیے یہ فرض کیا جائے کہ آدمؑ و حواؑ کے ساتھ یہ حکم ان کی اولاد کے لیے بھی تھا تو یہ ایک تکلف سا ہو گا، کیونکہ ذریتِ آدم کے متعلق اس مرحلے تک اگر کوئی بات سامنے آئی ہے تو صرف اس حد تک آئی ہے کہ ان سے خدا کی ربوبیت کا اقرار لیا گیا اور آدمؑ اور فرشتوں کو ان کا مشاہدہ کرایا گیا۔ یہ ماننے کے لیے قرآن میں مشکل ہی سے کوئی دلیل مل سکے گی کہ آدمؑ کی ذریت آدمؑ کے ساتھ جنت میں تھی بھی اور وہ اپنے باپ کے گناہ میں جنت سے نکالی بھی گئی۔

رہی یہ بات کہ بعض جگہ قرآن مجید میں مثنیٰ کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور یہ ایک واضح دلیل ہے اس بات کی کہ خطاب حضرت آدمؑ اور حواؑ ہی سے ہے تو ہمارے نزدیک یہ دلیل بھی کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے۔ بلاشبہ بعض جگہ مثنیٰ

کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ (۱۲۳- طٰہ) (اس سے اترو سب، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ پس اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے وہ نہ گمراہ ہوں گے اور نہ محروم)

لیکن یہ مثنیٰ کا صیغہ حضرت آدمؑ اور حواؑ کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ سیاق و سباق دلیل ہے کہ یہ آدم اور ابلیس دونوں کو بحیثیت دو فریقوں اور دو پارٹیوں کے خطاب ہو رہا ہے۔ اور یہاں ہدایت کی پیروی کے بارے میں جو حکم ہے وہ جس طرح بنی نوع انسان کے لیے موزوں ہے اسی طرح بنی نوع جن کے لیے بھی موزوں ہے۔

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۳۷)

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ: توبہ کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ جب اس کا صلہ علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر رحم کا مضمون چھپا ہوا ہے۔

"تَلَقَّىٰ" کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کے یہ الفاظ حضرت آدم علیہ السلام کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں ان الفاظ کا حوالہ بھی ہے۔ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۲۳- اعراف) (اور ان دونوں نے دعا کی کہ اے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ فرمائے گا تو ہم برباد ہونے والوں میں سے بن جائیں گے)

توبہ کے بارے میں سنت اللہ

توبہ کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کا بے قرار ہونا اور توبہ کے الفاظ کا ان کے دل میں ڈالا جانا اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا پتہ دیتا ہے جو توبہ سے متعلق اس نے پسند فرمائی ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ بندہ جب کوئی گناہ کر گزرتا ہے تو ندامت و شرمندگی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا ایک احساس اس کے اندر خود بخود ابھرتا ہے۔ یہ احساس اس کی فطرت کا ایک تقاضا ہے اور یہ اس وقت تک برابر ابھرتا رہتا ہے جب تک انسان غلطیوں اور گناہوں پر اصرار کر کے اپنے اس احساس کو بالکل کچل کے نہ رکھ دے۔ اسی خاص کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر نفس لوامہ کو ودیعت فرمایا ہے۔ اس سے متعلق دوسری تفصیلات مناسب مواقع پر آئیں گی۔

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۳۸)

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا: یہ الفاظ دو مرتبہ دہرائے گئے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت آدمؑ کی لغزش کے بعد، پھر دوبارہ ان کی توبہ کے بعد۔ لغزش کے بعد اس کا ذکر اس لغزش کا نتیجہ بیان کرنے کے لیے ہوا ہے اور توبہ کے بعد اس امتحان کی حکمت بیان کرنے کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اب تمہیں دنیا میں بھیج کر تمہارا امتحان کرنا چاہتا ہے تاکہ تمہارے برے اور بھلے میں امتیاز ہو سکے تو جو اس امتحان میں پورے اتریں گے وہ اس جنت کے وارث ہوں گے اور جو اس امتحان میں فیل ہو جائیں گے وہ اس جنت

سے محروم رہیں گے۔

نبوت کے اجرا کا پہلا وعدہ

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى : یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت کے لیے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کرنے کا پہلا وعدہ ہے۔ حضرت آدمؑ کی لغزش سے انسانی فطرت اور انسانی عقل کا وہ ضعف ظاہر ہو گیا جو انسان کو وحی الٰہی کی رہنمائی اور انبیا علیہم السلام کی دستگیری کا محتاج ثابت کرتا ہے چناں چہ انسان کی اس کمزوری پر نگاہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بطور تسکین و تسلی یہ وعدہ فرمایا کہ وہ خود اپنی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لیے روشنی بھیجے گا تو جو لوگ اس روشنی کی قدر کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔

"نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم" تک کے الفاظ قرآن مجید میں جنت کی تعبیر کے لیے خاص ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جنت کی تعبیر کے لیے یہ الفاظ بہت جامع ہیں۔ خوف کسی پیش آنے والے خطرے کا ہوا کرتا ہے اور حزن ماضی یا حاضر کے کسی خسارہ کا۔ ایسی جگہ جہاں نہ ماضی کا کوئی غم ہو نہ مستقبل کا کوئی خطرہ، جنت ہی ہو سکتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۳۹)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ ۔ یہ آیت اوپر والی آیت کے بالمقابل ہے۔ اوپر والی آیت میں ان لوگوں کا صلہ بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی ہدایت کی پیروی کریں گے۔ اس آیت میں ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کریں گے۔

لفظ 'آیت' کے مختلف مفہوم

آیات کا لفظ آیت کی جمع ہے۔ آیت کے اصل معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ لفظ ان دلائل اور نشانیوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو آسمان و زمین اور آفاق و انفس کے ہر گوشے میں موجود ہیں اور جو خدا کی قدرت و حکمت، اس کی توحید اور اس کے قانون جزا و سزا کی گواہی دے رہی ہیں۔

ان معجزات کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو حضرات انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے ظاہر ہوئے ہیں یا جن کے لیے کفار مطالبہ کرتے رہے ہیں۔

قرآن مجید کی ان آیتوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جن سے قرآن کی سورتیں مرکب ہیں۔ قرآن مجید کی آیات کے لیے اس لفظ کا استعمال اس حقیقت پر دلیل ہے کہ ان کی حیثیت بے دلیل احکامات کی نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر آیت ایک دلیل و شہادت اور ایک حجت و برہان کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔

۲۵۔ مجموعۂ آیات ۳۰-۳۹ کی تعلیمات

یہ مجموعۂ آیات جن حقائق پر مشتمل ہے ان میں سے بہت سی باتوں کی طرف ہم الفاظ اور جملوں کی تشریح

کرتے ہوئے اشارے کر چکے ہیں۔ یہ اشارے ہمارے نزدیک رہنمائی کے لیے کافی ہیں لیکن اس کے اندر بعض ایسے حقائق بھی ہیں جن سے وہ سوالات حل ہوتے ہیں جن پر اسلامی فکر و فلسفہ اور اسلامی نظام کی بنیادیں استوار ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس دنیا میں انسان کا اصلی مرتبہ و مقام کیا ہے؟ انسان اس دنیا میں خود مختار و مطلق العنان ہے یا پابند و محکوم؟ مسئول ہے یا غیر مسئول؟ مجبور ہے یا با اختیار؟ اس کو کسی نے اس دنیا میں بھیجا ہے یا وہ خود بخود اس میں در آیا ہے؟ اس کا وجود محض ایک انفرادی وجود ہے یا وہ اپنی کوئی اجتماعی ہستی بھی رکھتا ہے؟ اس کی رہنمائی کے لیے اس کی اپنی ہی عقل و فہم کافی ہے یا اس کے علاوہ وہ کسی اور مافوق رہنمائی کا بھی محتاج ہے؟ اس کائنات کے دوسرے عناصر کے ساتھ اس کے ربط کی نوعیت کیا ہے؟ یہ اپنی فطرت کے لحاظ سے بدی کی مخلوق ہے یا نیکی کی؟ اس کے اندر جو بدی پائی جاتی ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ غرض اس طرح کے بہت سے بنیادی سوالات ہیں جن کے جواب ان آیات کے اندر موجود ہیں۔ اب ہم ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ان کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

خلافت اور اس کے مقتضیات

ان آیات سے پہلی حقیقت تو یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ اور نائب کی ہے۔ یہ بات قرآن مجید کے الفاظ میں نہایت واضح طور پر کہی گئی ہے۔ اس خلافت و نیابت کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے کچھ لازمی تقاضے ہیں جن کے پورے ہوئے بغیر خلافت کا تصور مکمل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے نزدیک یہ تقاضے بالاجمال یہ ہیں۔

ایک یہ کہ انسان کو ایک خاص دائرے کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار تفویض ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ذات خود ہر جگہ حاضر و ناظر ہو، جو ہر قسم کے تصرف پر خود پوری پوری قدرت رکھتی ہو، جو کسی کی مدد اور کسی کی اعانت کی محتاج نہ ہو، جس کو ایک پل کے لیے بھی اپنی مملکت کے امور و معاملات سے دستکش یا غیر حاضر ہونے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو، اس کی طرف سے کسی کو اپنا خلیفہ یا نائب بنانے کے معنی اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتے کہ وہ اپنے خلیفہ کو کچھ اختیارات دے کر یہ امتحان کرنا چاہتی ہے کہ یہ ان اختیارات کو کس طرح استعمال کرتا ہے، ان کو اپنے مُسْتَخْلِف کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے یا اس کی مرضی سے بے پروا ہو کر اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ جب انسان خلیفہ اور نائب ہے تو یہ عین اس کی خلافت اور نیابت کا تقاضا ہے کہ مستخلف کی طرف سے اس کی آزادی کے حدود معین و معلوم ہوں، اس کو واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہو کہ کن امور میں اس کو مستخلف کے مقرر کردہ حدود کی پابندی کرنی ہے اور کن امور میں اس کو اپنی صوابدید پر عمل کرنے کی آزادی بخشی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی تعبیر اگر کی جائے تو یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ عین خلافت و نیابت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے خدا کی طرف سے شریعت و ہدایت نازل ہو۔

تیسرا یہ کہ جب انسان خدا کا خلیفہ اور نائب ہے تو اس کے مطلق العنان اور غیر مسئول ہونے کا تصور

بنیادی طور پر غلط ہے۔ کوئی صاحب قدرت اور علیم و خبیر مستخلف اپنے خلیفہ کو شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ لازماً اپنے خلیفہ کی ایک ایک بد دیانتی اور ایک ایک خیانت پر اس سے مواخذہ بھی کرے گا اور اگر اس نے اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دیے ہوں گے تو اس کو اس کی خدمات کا بھرپور صلہ بھی دے گا۔

چوتھا یہ کہ عین منصب خلافت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ منصب صفات کے ساتھ مشروط ہو۔ غیر مشروط نہ ہو یعنی منشائے خلقت کے لحاظ سے تو یہ منصب تمام بنی نوع انسان کے لیے عام ہے۔ ہر انسان خدا کا خلیفہ ہے، لیکن یہ اس منصب کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کے جائز حقدار وہی ہوں جو خدا کی خلافت کے حق کو وفاداری کے ساتھ ادا کریں۔ جو اس حق کو ادا نہ کریں وہ خدا کے خلیفہ نہیں بلکہ اس کے باغی اور غدار ہیں۔

پانچواں یہ کہ یہ منصب اپنے مزاج کے لحاظ سے صرف ایک انفرادی منصب نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی اور سیاسی منصب بھی ہے۔ تمام انسانوں کو یا کم از کم ان سارے لوگوں کو جو اس منصب کی ذمہ داریوں پر ایمان رکھتے ہیں، انفرادی طور پر بھی اس منصب کے فرائض پورے کرنے ہیں اور اجتماعی طور پر بھی اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ایک نظام قائم کرنا ہے کیونکہ اس نظام کے بغیر اس کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔

چھٹا یہ کہ یہ خلافت خیر و فلاح کی ضامن اس وقت تک رہ سکتی ہے جب تک یہ اصل مستخلف کے احکام و ہدایات کے مطابق چلائی جائے۔ اگر اس کے احکام کو پس پشت ڈال کر انسان اس کو اپنی خواہشات کے مطابق چلانے کی کوشش کرے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس زمین میں خونریزی اور فساد برپا ہو۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان کو جب اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ دیا ہے کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا اور ابلیس اس کو سجدہ نہ کرنے ہی کے سبب سے ملعون ہوا تو یہ بات کسی طرح اس کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ جنات یا فرشتوں میں سے کسی کو خدا کا شریک سمجھ کر ان کی پرستش کرے۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کے آگے جس طرح انسان عاجز و بے بس ہے اسی طرح فرشتے اور جنات بھی عاجز و بے بس ہیں۔ ان کے پاس جو علم ہے وہ بھی خود ان کا اپنا ذاتی نہیں بلکہ تمام تر اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو انسان علم میں فرشتوں سے بھی بازی لے جا سکتا ہے اس وجہ سے بندگی اور پرستش کا حقیقی حق دار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ انسان اگر اس حق میں جنوں اور فرشتوں کو بھی شریک کرتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی توہین نہیں کرتا بلکہ خود اپنی بھی توہین کرتا ہے۔

تیسری حقیقت ان آیات سے یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے کوئی مجرم اور فسادی وجود نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نہایت اچھی صلاحیتوں اور نہایت اعلیٰ قابلیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اگر گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ کوئی ازلی و ابدی گنہگار ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اختیار کی اس نعمت کو جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو مشرف فرمایا ہے، غلط استعمال کرنے کے فتنہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس فتنہ میں اس کو شیطان مبتلا کرتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے انسان کی وسیع آزادی پر جو چند پابندیاں عائد کر دی ہیں، شیطان انسان کو بہکاتا ہے کہ یہی پابندیاں ہیں جو اس کے سارے عیش و آرام کو کرکرا کیے ہوئے ہیں، اگر وہ ان کو جرأت کر کے توڑ دے تو بس اس کے لیے ترقی و کمال اور عیش و آرام کے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ شیطان کے ان مشوروں کا فائدہ چوں کہ انسان کو نقد نقد نظر آتا ہے اس وجہ سے وہ اس کے چکمے میں آجاتا ہے اور اپنی فطرت کے اعلیٰ تقاضوں کے خلاف گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس گناہ سے اس کو پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے توبہ اور اصلاح کی راہ کھولی ہے۔ چناں چہ حضرت آدمؑ سے جو لغزش صادر ہوئی اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کے بعد وہ معاف کر دی۔ اس کے بعد ان کو اس دنیا میں جو بھیجا تو اس کی وجہ حضرت آدمؑ کا معتوب ہونا نہیں ہے بلکہ محض ان کا امتحان ہے تاکہ وہ شیطان کے مقابل میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت دیں اور اس کے صلہ میں اس جنت کو پھر حاصل کریں جس سے وہ نکالے گئے۔

قرآن کے اس بیان سے عیسائیوں کے اس خیال کی پوری پوری تردید ہو جاتی ہے جو آدم کے ازلی و ابدی گنہگار ہونے سے متعلق ان کے ہاں پایا جاتا ہے اور جس کے حل کے لیے انھوں نے کفارہ کا عقیدہ گھڑا ہے۔

خدا کے کام میں حکمت ہے

چوتھی حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ خدا کی ہر بات کے اندر نہایت گہری حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں لیکن ان تمام حکمتوں اور مصلحتوں سے جب تک اللہ تعالیٰ ہی واقف نہ کرے نہ ان سے جنات واقف ہو سکتے ہیں نہ فرشتے اور نہ انسان۔ اللہ تعالیٰ کے کاموں کے بارے میں صحیح روش انسان کے لیے یہ ہے کہ ان کی حکمتیں معلوم کرنے کی کوشش تو برابر کرتا رہے لیکن اگر کسی چیز کی حکمت اس کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کو ہدف اعتراض و مخالفت نہ بنائے بلکہ یہ حسن ظن رکھے کہ اس کے اندر ضرور کوئی نہ کوئی حکمت ہو گی لیکن اپنے علم کی کمی کے سبب سے وہ اس حکمت کو سمجھ نہیں سکا ہے۔ یہی روش اختیار کر کے انسان ایمان و اسلام کے جادہ پر استوار رہ سکتا ہے اور یہی روش فرشتوں کی روش ہے۔ رہے وہ لوگ جو اپنے نہایت قلیل اور محدود علم کو خدا کے علم اور اس کی حکمتوں کے ناپنے کا پیمانہ بنا بیٹھتے ہیں تو وہ اسی قسم کی خود سری اور انانیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس قسم کی خود سری اور انانیت میں ابلیس مبتلا ہو گیا۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے ایمان و معرفت کے راستے کھلتے نہیں بلکہ جو راستے کھلے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی بند ہو جایا کرتے ہیں۔

آدمؑ اور ابلیس کے گناہ میں فرق

پانچویں حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جو گناہ انسان کے محض ارادہ کی کمزوری سے صادر ہوتا ہے اس کا مزاج اس گناہ سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس کا سرچشمہ حسد اور تکبر ہوتا ہے۔ ضعف ارادہ سے صادر ہو جانے والے گناہ کے بعد توبہ اور اصلاح حال کی توقع بہت غالب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو، اگر وہ بالکل ہی اپنے آپ کو چھوڑ نہیں بیٹھتے ہیں، سنبھالتا ہے اور ان کی رہنمائی صراط مستقیم کی طرف کرتا ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ حسد اور تکبر کی بنا پر خدا کی نافرمانی کرتے ہیں ان کی بیماری بہت ہی سخت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ

اصلاح پذیر ہونے کے بجائے بالعموم اپنے مرشد — ابلیس — ہی کی راہ پر جیتے اور اسی پر مرتے ہیں۔ حضرت آدمؑ کا گناہ پہلی قسم کا تھا اس وجہ سے ان کو توبہ کی توفیق حاصل ہوئی اور ابلیس کا گناہ دوسری قسم کا، اس وجہ سے وہ توبہ اور اصلاح سے محروم رہا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوئی۔

نبوت و رسالت کی ضرورت — چھٹی حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو انسان کے بہکانے کی مہلت دے کر انسان کو اس دنیا میں ایک سخت امتحان میں ڈالا ہے اس وجہ سے اس کی رحمت مقتضی ہوئی کہ وہ انسان کی ہدایت اور اصلاح کے معاملہ کو تنہا اس کی عقل و فطرت ہی پر نہ چھوڑے بلکہ اس کی فطرت کو بیدار رکھنے اور اس کی عقل کو کجرویوں اور گمراہیوں سے بچانے کا بھی سامان کرے تاکہ جو ہدایت کی راہ اختیار کرنا چاہیں وہ بھی علیٰ وجہ البصیرۃ اختیار کریں اور جو گمراہی کی راہ پر جانا چاہیں وہ بھی پوری طرح اتمام حجت کے بعد جائیں۔ نبوت و رسالت کے قیام سے اصل مقصود یہی چیز ہے اور اس امتحان گاہ عالم میں انسان کے لیے اصلی سرمایہ تسکین و تسلی درحقیقت یہی انبیا علیہم السلام کی تعلیمات ہیں۔ اگر یہ چیز انسان سے چھن جائے تو پھر انسان ہر فتنہ کا بڑی آسانی سے شکار ہو سکتا ہے کیوں کہ اس کی فطرت کے اندر جو خلا ہیں وہ صرف انبیا علیہم السلام کی تعلیم کی پیروی سے ہی بھر سکتے ہیں۔ اس کے بغیر انسان کے لیے شیطان کے فتنوں سے مامون ہونا ممکن نہیں ہے۔

۲۶- آگے کا مضمون —— آیات ۴۰-۴۶

شروع سورہ سے لے کر یہاں تک کا پورا سلسلۂ کلام ایک تمہید یا مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تمہید میں خطاب اگرچہ بیشتر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے، اس میں کہیں براہ راست یہود کو مخاطب کر کے کوئی بات ان سے نہیں کہی گئی ہے لیکن اشارات و کنایات کے پردے میں جو کچھ کہا گیا ہے، ہماری پیش کردہ تفصیلات سے واضح ہے کہ وہ تمام تر یہود ہی سے متعلق۔ اب یہ تمہید ختم ہو گئی۔ آگے یہود کو براہ راست مخاطب کر کے پہلے ان کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی گئی ہیں جو از روئے تورات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کی دعوت سے متعلق ان پر عائد ہوتی ہیں، پھر تفصیل کے ساتھ ان کے وہ جرائم بیان ہوئے ہیں جن کے سبب سے وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو منصب امامت سے معزول کر کے دوسروں کو اپنی ہدایت و شریعت سونپے۔ یہ مضمون تقریباً اس سورہ کے آدھے حصہ پر حاوی ہے اور اس میں دعوت و ملامت کے بعد ان کی معزولی کے وجوہ کی پوری تفصیل نہایت خوبی اور نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کر دی گئی ہے۔ اب ہم اس کے ایک ایک ٹکڑے کو لے کر اس کی تفصیل کریں گے۔ فرمایا:

آیات ۴۰-۴۶ — يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا
بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝۴۰ وَاٰمِنُوْا بِمَآ

اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۪
وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ز وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا
الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاَقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ
النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ط
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط وَاِنَّهَا
لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا
رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع ۵

ترجمۂ آیات ۴۰-۴۶

اے بنی اسرائیل یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم پر کی اور میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا، اور مجھی سے ڈرو۔ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو میں نے اتاری ہے تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے سب سے پہلے انکار کرنے والے نہ بنو اور میری آیات کو حقیر پونجی کے عوض نہ بیچو اور میرے غضب سے بچتے ہی رہو اور حق اور باطل کو گڈمڈ نہ کرو حق کو چھپانے کے لیے درآں حالے کہ تم جانتے ہو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ کیا تم لوگوں کو وفاداری کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو؟ کیا تم سمجھتے نہیں؟ اور مدد چاہو صبر اور نماز سے اور بے شک یہ بھاری چیز ہے مگر ان لوگوں کے لیے جو ڈرنے والے ہیں، جو گمان رکھتے ہیں کہ انھیں اپنے رب سے ملنا ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۴۰ - ۴۶

۲۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (۴۰)

لفظ اسرائیل کی تحقیق

يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ: اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ یہودی علماء اس کے معنی بطل اللہ کے بتاتے ہیں۔ یہ معنی لینے میں غالباً اس روایت کو بڑا دخل ہوگا جو یہود نے تورات میں حضرت یعقوبؑ کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کشتی لڑنے کی داخل کر رکھی ہے۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے۔ ان کی تحقیق میں یہ لفظ دو جزوں سے مرکب ہے۔ اسرا اور ایل۔ اسرا کے معنی ان کی تحقیق میں بندہ کے ہیں اور ایل عبرانی میں اللہ کے معنی کے لیے مشہور ہی ہے۔ اس طرح مولانا کے نزدیک اسرائیل کے معنی عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ کے ہوئے۔

یہود نے اسرائیل کی وجہ تسمیہ معین کرنے میں جس قسم کی ذہانت دکھائی ہے اسی قسم کی ذہانت انھوں نے یعقوبؑ کی وجہ تسمیہ معین کرنے میں بھی دکھائی ہے۔ ان کے نزدیک یعقوبؑ کا نام یعقوب اس لیے ہوا کہ وہ اپنے بھائی عیسو کی ایڑیاں پکڑے ہوئے پیدا ہوئے۔ استاذ امام کے نزدیک اس کی توجیہ بھی یہود کی توجیہ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ قرآن مجید کے اشارات کی روشنی میں حضرت یعقوبؑ کے یعقوب نام پانے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسحاقؑ کے بعد ان کے پیدا ہونے کی بشارت بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سنا دی تھی۔

اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ: اذکروا، یاد کرو۔ یہ بنی اسرائیل کو دعوت بانداز ملامت ہے یعنی یاد کرو اس لیے کہ تم بالکل بھول بیٹھے ہو اور جو فضل میں نے تم پر کیے تھے ان کو تم نے اپنے استحقاق ذاتی و خاندانی کا ثمرہ سمجھ لیا۔

نعمت کی وضاحت

نعمت سے یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے جن افضال و عنایات کی طرف اشارہ فرمایا ہے قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کی تفصیل بھی فرما دی ہے۔ ہم چند آیتیں یہاں نقل کرتے ہیں، ان سے اس اجمال کی وضاحت ہو جائے گی۔

اسی سورہ کے آگے والے رکوع میں فرمایا ہے :-

يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۴۷۔ بقرہ)	اے بنی اسرائیل میرے اس انعام کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور میں نے تم کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔

اس آیت میں اس انعام کا حوالہ دیا گیا ہے جو بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی سیادت و امامت کی

مدت میں عطا فرمایا تھا۔

پھر سورہ مائدہ میں فرمایا ہے:

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ	اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کے انعام کو اور اس
الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ (۷- مائدہ ۵)	کے اس عہد کو جو اس نے تمہارے ساتھ ٹھہرایا۔

اس آیت میں اس انعام کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ان کو اپنی شریعت دے کر فرمایا۔ یہ شریعت اللہ تعالیٰ اور ان کے درمیان ایک میثاق اور معاہدے کی حیثیت رکھتی تھی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی شریعت کی پابندی کا عہد لیا اور اس پابندی کے صلہ میں اپنی طرف سے ان کے لیے دنیا و آخرت کی فوز و فلاح کی ضمانت دی۔

پھر اسی مائدہ میں آگے چل کر اس انعام کی مزید وضاحت ان لفظوں میں فرمائی ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُوا	اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ	میری قوم کے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے انعام کو یاد
أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَآتَاكُمْ	رکھو کہ اس نے تمہارے اندر انبیا اٹھائے، تم کو
مَا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ۔	بادشاہ بنائے اور تم کو وہ کچھ بخشا جو تم سے پہلے
(۲۰- مائدہ ۵)	دنیا میں کسی قوم کو نہیں دیا۔

ان آیات سے اس اجمال کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے جو زیر بحث آیت میں ہے۔ مزید جو چیز اس آیت میں پیش نظر رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اول تو فرمایا کہ میرا انعام اور پھر اس پر مزید اضافہ یہ فرمایا کہ جو میں نے تم پر انعام کیا، یہ تاکید اس لیے ہے کہ بنی اسرائیل کی تمام گمراہیوں کی جڑ، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، یہی چیز تھی کہ ان کو جو بڑائیاں محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوئیں ان کو انھوں نے اپنی اہلیت و استحقاق کا ثمرہ اور اپنے نسل و نسب کا ایک قدرتی حق سمجھ لیا۔ یہاں نِعْمَتِيَ اور أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ کے الفاظ سے ان کی اسی ذہنیت کی اصلاح مقصود ہے اور آگے یہ چیز بتدریج کھلتی جائے گی۔

عہد سے مراد

وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ: عہد سے مراد یوں تو پوری شریعت ہی ہے اس لیے کہ شریعت درحقیقت بندوں اور خدا کے درمیان ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ معاہدہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام ہوتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ تمام آسمان و زمین کا خالق و مالک ہے کسی کی بھی یہ شان نہیں ہے کہ تمام آسمان و زمین کا بادشاہ اس سے کوئی معاہدہ کرے، اس کے باوجود اگر وہ کسی کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی طرف سے اس کو ایک بہت بڑا شرف بخشتا ہے۔ لیکن یہاں اس عام معاہدہ کے ساتھ ساتھ اس خاص عہد کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لیا گیا تھا۔ اس عہد کا ذکر تورات میں بھی ہے اور اس کی طرف قرآن میں بھی اشارات کیے گئے ہیں۔ کتاب استثناء ۱۸، ۱۹ میں ہے:

بنی اسرائیل سے آنحضرتؐ صلعم کے متعلق عہد

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سننا ..... میں ان کے لیے انھی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔"

قرآن مجید میں اس عہد کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے رحمت کی جو دعا کی، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا	اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔ میں اس کو لکھ رکھوں گا
لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ	ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیتے
هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ	رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے ــ یعنی
الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ	جو پیروی کرتے ہیں رسول نبی امی کی جس کو لکھا ہوا پاتے
مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ	ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں۔ وہ ان کو حکم
يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ	دیتے ہیں نیکی کا اور روکتے ہیں منکر سے اور ان کے
الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ	لیے جائز کرتے ہیں پاکیزہ چیزیں اور حرام کرتے ہیں ان
عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ	پر ناپاک چیزیں اور دفع کرتے ہیں ان پر سے بوجھ اور
وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ	پھندوں کو جو ان پر تھے۔ پس جو ان پر ایمان لائے اور
آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا	جنھوں نے ان کی حمایت کی اور مدد دی اور اس روشنی
النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ	کی پیروی کی جو ان کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ
هُمُ الْمُفْلِحُونَ (اعراف ۱۵۶-۱۵۷)	فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بنی اسرائیل سے جو عہد اللہ تعالیٰ نے لیا تھا اس میں بنی اسرائیل پر کیا ذمہ داری ڈالی گئی تھی اور اس ذمہ داری کے ادا کرنے کے صلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے کیا وعدے کیے گئے تھے۔

ہیبت کا مفہوم

وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ: کسی کی عظمت و جلالت کے تصور سے دل پر جو لرزش اور کپکپی کی حالت طاری ہو جاتی ہے اس کے لیے عربی زبان میں رھبت کا لفظ ہے اور یہ بات إِيَّاكَ نَعْبُدُ کی تفسیر کرتے ہوئے ہم واضح کر چکے ہیں کہ اگر فعل کے مفعول یا اس کے متعلق کو فعل پر مقدم کر دیا جائے تو یہ اس کے اہتمام اور اس پر زور دینے کی ایک شکل ہوتی ہے۔ علاوہ بریں اگر فعل پر فؔ آ جائے تو یہ مزید اہتمام کی ایک دلیل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر فعل کے بعد ضمیر بھی آ جائے تو اسی پہلو کی مزید وضاحت ہو گی۔ اس لحاظ سے وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ کے معنی ہوں گے پس صرف مجھی سے ڈرو۔

صرف مجھی سے ڈرو کا مطلب یہاں یہ ہے کہ میرے عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے میں تمہاری دوسری مصلحتوں اور دوسرے اندیشوں پر میری عظمت و جلالت کے تصور کو غالب ہونا چاہیے۔ تم ڈرتے ہو کہ اگر تم نے نبی آخر الزمان کی دعوت قبول کر لی تو تمہاری سیادت و ریاست ختم ہو جائے گی، امیوں کو تم پر فضیلت حاصل ہو جائے گی، تمہارے عوام تمہارے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور جو فوائد تم ان سے اب تک حاصل کرتے رہے ہو ان کے دروازے بند ہو جائیں گے حالاں کہ ڈرنے کی چیزیں یہ نہیں ہیں۔ ڈرنا تو صرف مجھ سے چاہیے جس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے اور جس نے تم سے عہد لیتے وقت پہاڑ کو تمہارے سروں پر چھتری کی طرح اوڑھا دیا تھا۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ (۴۱)

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کا اصل مفہوم

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ، مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اس چیز کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے پاس ہے۔ یعنی قرآن مجید اس پیشین گوئی کو سچی ثابت کر رہا ہے جو تورات میں آخری نبی کی بعثت اور اس بعثت کی خصوصیات سے متعلق وارد تھی۔ مقصود یہ ہے کہ اگر سمجھ سے کام لو تو قرآن مجید اور یہ پیغمبر تمہارے لیے چڑنے کی چیز نہیں ہیں بلکہ سر اور آنکھوں پر بٹھانے کی چیز ہیں کیوں کہ ان کے ظہور سے سب سے زیادہ تمہارا ہی سر بلند ہوا ہے۔ تمہارے صحیفوں میں ان کی پیشین گوئیاں موجود تھیں اور یہ پیشین گوئیاں اب تک اپنے حقیقی مصداق کے ظہور کی منتظر تھیں۔ اب اس کتاب اور اس پیغمبر کے ظہور نے ان کا مصداق دنیا کے سامنے پیش کر کے تمہاری کتاب کو سند تصدیق عطا کر دی تو تمہیں تو سب سے پہلے اس پر ایمان لانے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔

اس تصدیق کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جہاں تک تورات یا انجیل کے آسمانی صحیفے ہونے کا تعلق ہے قرآن مجید آشکارا طور پر ان کے آسمانی ہونے کی تصدیق کرتا ہے، ان کے لانے والوں کی نبوت و رسالت کی بھی نہایت غیر مبہم الفاظ میں تصدیق کرتا ہے، ان کی تعلیمات کی بھی اصولی طور پر تصدیق کرتا ہے۔ قرآن اگر تردید کرتا ہے تو صرف ان چیزوں کی تردید کرتا ہے جو غلط طریقوں سے ان صحیفوں میں شامل کر دی گئی ہیں یا تحریف کر کے جن کی اصلی شکل بگاڑ دی گئی ہے۔ اس طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جہاں تک اصل تورات کا تعلق ہے، قرآن مجید اس کی سچائی کا گواہ بن کر نازل ہوا ہے، وہ اس کو جھٹلاتا نہیں بلکہ ان چیزوں سے اس کو بری قرار دیتا ہے جو اس کو جھٹلانے والی ہیں۔

زبان کا ایک نکتہ

وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ، اَفْعَل کا مضاف الیہ اگر نکرہ مفرد ہو تو وہ تمییز کے مفہوم میں ہوا کرتا ہے لیکن اگر اس کی اضافت معرفہ کی طرف ہو تو اس شکل میں مضاف الیہ جمع ہوگا۔ مثلاً قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ (۸۱۔ زخرف) (کہہ دو، اگر خدا کے کوئی اولاد ہو تو میں سب سے پہلا عبادت کرنے والا ہوں)۔

اَوَّلَ کَافِرٍ اور اَوَّلَ الْکَافِرِیْنَ دونوں کے مواقع استعمال ہیں۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ ایک لطیف فرق بتاتے ہیں۔ جب اَوَّلَ کَافِرٍ کا استعمال ہوگا تو اس میں اس سے بحث نہیں ہوگی کہ اس کے علاوہ کوئی اور کافر پایا جاتا ہے یا نہیں اور دوسری شکل میں مفہوم یہ ہوگا کہ وہ کفر کرنے والوں میں سب سے پہلا شخص ہے۔

'کفر' کا لفظ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں حق کے انکار کے معنی میں بھی آتا ہے اور کفرانِ نعمت کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ یہاں یہ لفظ دونوں ہی مفہوموں پر حاوی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ قرآن پر ایمان لانے کا ان سے عہد لیا جا چکا تھا اس وجہ سے اس کا حق ہونا ان پر اچھی طرح واضح تھا، اس بنا پر یہ ایک عظیم حق کا انکار ہوا۔ پھر قرآن مجید ان کے لیے ایک بہت بڑی نعمت بن کر نازل ہوا تھا، اس پر ایمان لانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے ابدی نعمتوں کے وعدے تھے، اس وجہ سے اس سے اعراض درحقیقت ایک بہت بڑا کفرانِ نعمت بھی تھا۔

سب سے پہلے اس کے کفر کرنے والے نہ بنو، کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب دوسرے کفر کریں تو تمہارے لیے کفر کرنا جائز ہو جائے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ قرآن تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا نازل ہوا ہے اور اس پر ایمان لانے کا تم سے اس کے نزول سے پہلے ہی عہد لیا جا چکا ہے اس وجہ سے اس کو قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے کی سب سے پہلے تم ہی سے توقع کی جا سکتی تھی لیکن یہ عجیب صورت حال ہے کہ دوسرے تو اس سے ناآشنا ہونے کے باوجود اس پر ایمان لانے کے لیے سبقت کریں اور تم اس سے پہلے سے آشنا ہو کر اس کی مخالفت کی راہ میں سبقت کرو۔

نہی کے ساتھ قید کا فائدہ

اس طرح کے مواقع پر نہی کے ساتھ جو قید لگی ہوئی ہوتی ہے استاذ امامؒ کے نزدیک اس کا مقصود محض صورت واقعہ کے گھناؤنے پن کو ظاہر کرنا ہوتا ہے، نہی کا اصل تعلق تو فعل سے ہوتا ہے، قید اس کے ساتھ محض اس لیے بڑھا دی جاتی ہے تاکہ وہ صورتِ حال سامنے آ جائے جو اس کے ارتکاب میں مضمر ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (۱۳۰۔ آل عمران) سود نہ کھاؤ دُگنا چوگنا کرتے ہوئے۔

اس آیت میں مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر سود در سود کی شکل پیدا نہ ہو تو سود مباح ہے بلکہ مقصود اس صورتِ حال کے پیش کرنے سے اصل فعل کی نفرت انگیز شکل کو سامنے کر دینا ہے

اسی طرح زیر بحث ٹکڑے کے بعد فرمایا، وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (اور میری آیتوں کو حقیر پونجی کے عوض نہ بیچو) تو اس کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ اگر اچھے دام مل جائیں تو بیچ سکتے ہو، بلکہ نہی کا تعلق یہاں بھی اصل فعل سے ہے یعنی روکا جس چیز سے گیا ہے وہ دین فروشی ہے، لیکن ثَمَنًا قَلِيْلًا کی قید نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ دین فروشی کا یہ کاروبار نہایت ذلیل طریقہ سے ہو رہا ہے کیوں کہ اللہ

کی آیات کے بدلے میں اگر تمام دنیا بھی حاصل ہو جائے تو وہ بہرحال ایک متاعِ حقیر ہی ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے یہاں بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ قرآن کے انکار میں یہود سے پہلے تو قریش نے سبقت کی تو قرآن نے سبقت کا الزام یہود پر کیوں عائد کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات یہاں یہود سے بہ حیثیت قوم کے کہی جا رہی ہے اور مقابل میں یہاں امی عرب بہ حیثیت قوم کے ہیں، عام اس سے کہ وہ عدنانی ہیں یا قحطانی۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ قریش نے قرآن کا انکار کرنے میں سبقت کی لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انصار نے اس کے قبول کرنے میں سبقت کی۔ پھر قریش کے انکار کی نوعیت بھی بہرحال یہ نہیں تھی کہ سارا قریش اس کے انکار ہی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہو، ان میں قرآن کے انکار کرنے والے بھی تھے اور قرآن پر جان نثار کرنے والے بھی تھے، لیکن بنی اسرائیل کا حال اس سے بالکل مختلف تھا، یہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور مخالفت کے لیے من حیث القوم اٹھ کھڑے ہوتے اور آخر دم تک اس مخالفت پر اڑے رہے، دراں حالیکہ دینِ الٰہی کے وارث اور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں کے امین ہونے کے سبب سے امی عربوں کے مقابل میں ان کو اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ کا درجہ حاصل کرنا تھا۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا، میری آیات کو حقیر قیمت کے عوض نہ بیچو، یعنی اپنے دنیوی مفادات و مصالح پر تورات اور اس کے احکام و ہدایات کو قربان نہ کرو۔ یہ ایک جامع اسلوبِ بیان ہے جس میں یہود کی ان تمام عہد شکنیوں کی طرف اشارہ ہو گیا ہے جن کے وہ مرتکب ہوئے تھے اور جن کی تفصیل اسی سورہ میں آگے آ رہی ہے۔ یہود سے اللہ تعالیٰ نے جو عہد لیا تھا اس میں تین چیزیں خاص طور پر بہت نمایاں تھیں، ایک یہ کہ وہ تورات کی شریعت پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں گے، دوسری یہ کہ اس قرآن پر ایمان لائیں گے جو ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتا ہوا نازل ہو گا جو تورات میں موجود ہیں، تیسری یہ کہ ان کو جو کتاب عطا ہوئی ہے خلق کے سامنے اس کی شہادت دیں گے، اس کے کسی جزو کو چھپائیں گے نہیں۔

یہاں جب فرمایا کہ میری آیتوں کو حقیر معاوضے کے عوض نہ بیچو تو دوسرے الفاظ میں گویا یہ فرمایا کہ اپنے دنیوی مفادات کی خاطر ان تمام عہود کو خاک میں نہ ملاؤ جو تم خدا سے کر چکے ہو۔

نقضِ عہد کی تعبیر کے لیے ایک اسلوب

نقضِ عہد کے مفہوم کو تعبیر کرنے کے لیے قرآن مجید نے یہ اسلوب دوسرے مقامات میں بھی استعمال کیا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ	ہم نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی
نُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ أَسْلَمُوْا	ہے، اسی کے مطابق یہود کے معاملات کے فیصلے
لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ	کرتے رہے وہ انبیا جو خود بھی خدا کی فرمانبرداری
الْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ	کی اور ربّانیوں اور علما نے بھی اسی کے مطابق فیصلے
اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ فَلَا	کیے کیونکہ وہ کتابِ الٰہی کے امین بنائے گئے

تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا	تھے اور اس کے گواہ ٹھہرائے گئے تھے تو تم لوگوں
بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ	سے نہ ڈرو، صرف مجھی سے ڈرو، اور میری آیات کو حقیر
بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	قیمت کے عوض نہ بیچو۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ کی اتاری
الْكٰفِرُوْنَ (۴۴۔ مائدہ ۷)	ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کیا تو وہی لوگ کافر ہیں۔

اس آیت میں لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا کے موقع و محل کو دیکھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے دنیوی مفادات کی خاطر اللہ کے عہد کو، جو اس نے تورات میں تم سے لیا ہے، نہ توڑو۔ یہ مفادات تمھاری نگاہوں میں کتنی ہی اہمیت رکھنے والے ہوں لیکن خدا کے عہد و پیمان اور اس کے احکام و آیات کے بالمقابل بالکل ہی ہیچ ہیں۔

اس ٹکڑے کے مخاطب یہود کے عوام بھی ہیں اور خواص بھی۔ عوام اس وجہ سے کہ وہ اگرچہ بظاہر تورات کو مانتے تھے لیکن ان کی ساری دینداری محض رسمی و رواجی تھی، اصل شریعت انھوں نے اپنی خواہشات نفس پر قربان کر دی تھی۔ خواص اس وجہ سے کہ ان کے صحیفوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید سے متعلق جو پیشین گوئیاں تھیں انھوں نے ان پر یا تو تاویل کے پردے ڈال دیئے تھے یا ان پر تحریف کی قینچی چلا دی تھی اور محرک اس تاویل و تحریف کی دو چیزیں تھیں۔ ایک بنی اسماعیل کے خلاف حسد کا جذبہ، دوسری اس بات کا خوف کہ اگر اصل حقیقت ظاہر کر دی تو عوام بگڑ کھڑے ہوں گے اور جو عزت و سرداری اس وقت ان کو حاصل ہے وہ خطرے میں پڑ جائے گی۔

رہبت، تقویٰ اور خشوع ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں

وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ، اتقا اور تقویٰ کی تحقیق ہم هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں۔ اوپر والی آیت میں وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ فرمایا تھا۔ یہاں وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ فرمایا۔ پھر آگے کی ایک آیت میں خشوع کا لفظ آ رہا ہے رہبت، تقویٰ، خشوع سب ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ کسی کے عظمت و جلال کے تصور سے دل پر جو لرزش اور کپکپی طاری ہوتی ہے وہ رہبت ہے۔ اس لرزش و کپکپی سے صاحب عظمت وجلال کے لیے دل میں جو عجز و فروتنی اور پستی و نیاز مندی کی حالت پیدا ہوتی ہے اور طبیعت میں بے نیازی کی جگہ فقر کا اور گھمنڈ کی جگہ اخبات کا جو احساس ابھرتا ہے وہ خشوع ہے۔ اسی طرح اس صاحب عظمت و جلال کے قہر و غضب سے بچنے، اس کے مقرر کردہ حدود کی مخالفت سے احتراز اور اس کے احکام و آیات کی خلاف ورزی سے اجتناب و احتیاط کی جو بے چینی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے اور جو خلوت و جلوت ہر جگہ آدمی کو بیدار اور چوکنا رکھتی ہے وہ تقویٰ ہے۔

• مجھ ہی سے بچو کا ٹکڑا بیک وقت دو حقیقتوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو یہ کہ مجھے کوئی بہت نرم چیز سمجھ کر میری گرفت اور میرے غضب سے بے پروا نہ ہو جاؤ۔ جو میری نعمت کی ناقدری کرتے ہیں، میرے عہد کو پامال کرتے ہیں، میری آیات کو مال بیع و شرا سمجھتے ہیں۔ جب میرا غضب ان پر نازل ہوتا ہے تو وہ ان کی کمر توڑ کے رکھ دیتا ہے

اور اس وقت کوئی نہیں ہوتا ہے جو ان کو میرے غضب سے چھڑانے کے لیے کھڑا ہو سکے۔

دوسری حقیقت جو مفعول کی تقدیم سے یہاں پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم ڈرتے ہو کہ اگر تم نے اصل حقیقت ظاہر کر دی تو تمہارے عوام بگڑ کھڑے ہوں گے، تمہاری سرداری و پیشوائی خطرے میں پڑ جائے گی، تمہارے مقابل میں بنی اسماعیل کا سر اونچا ہو جائے گا اور تمہارے دوسرے دنیوی مفادات کو نقصان پہنچ جائے گا حالانکہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ڈرنے اور بچنے کی نہیں ہے، اصل ڈرنے کی چیز اگر کوئی ہے تو صرف میرا غضب ہے کیوں کہ اس سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ البتہ میں اگر چاہوں تو اپنے غضب سے ڈرنے والوں کو ہر خطرے سے بچا سکتا ہوں۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۴۲)

لبس حق بالباطل کا مفہوم

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ: لبس الثوب کے معنی ہیں اس نے کپڑا پہن لیا۔ لبس الامر علیہ کے معنی ہیں اس نے معاملہ کو گڈمڈ کر دیا۔ لَبَسَهُمْ کے معنی ہوں گے، ان کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیا یا باہم دگر ٹکرا دیا۔ قرآن مجید میں ہے اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا (یا تمھیں گروہ در گروہ کر کے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا دے)

لبس الشیئ بالشیئ کے معنی ہوتے ہیں ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ خلط ملط اور گڈمڈ کر دیا۔ آیت زیر بحث میں حق پر باطل کو ڈھانک دینے کا مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے۔ لبس کے اصل معنی میں یہ دونوں مفہوم مضمر ہیں اور یہاں یہ دونوں ہی نکلتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ اسلوب دوسری جگہ بھی استعمال ہوا ہے مثلاً فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ	جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو
بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ	شرک سے آلودہ نہیں کیا ان کے لیے امن ہے اور
مُّهْتَدُوْنَ (۸۲۔ انعام)	وہ راہ یاب ہونے والے ہیں۔

آیت زیر بحث میں اشارہ ہے یہود کی اس بات کی طرف کہ انھوں نے تورات میں اپنی رائیں اور بدعتیں داخل کر کے اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے حق اور اپنے داخل کیے ہوئے باطل کو ایک ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ قرآن مجید نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ	پس ہلاکی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے
بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا	کتاب تصنیف کرتے ہیں، پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا	اللہ کے پاس سے آئی ہے تاکہ اس کے ذریعے سے
قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا	حاصل کریں حقیر قیمت، پس ان کی تباہی ہے اس چیز
كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ	کے سبب جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کے لیے
مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ۔ (۷۹۔ بقرہ)	ہلاکی ہے اس چیز کے باعث جو وہ کما رہے ہیں۔

یہود نے حق پر پردہ ڈالنے کے لیے تورات میں ہر قسم کے تصرفات کر ڈالے تھے۔ بعض چیزیں انھوں نے

اس میں اپنی طرف سے داخل کر دی تھیں، بعض چیزیں اس میں سے نکال دی تھیں اور بعض چیزوں میں انھوں نے تبدیلیاں کر دی تھیں اور ان تمام تصرفات سے مقصود ان کا ان حقائق پر پردہ ڈالنا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی، ان کی قربان گاہ اور ان کے قبلہ وغیرہ سے متعلق تورات میں بیان ہوئے تھے اور جو آخری نبی کی بعثت کی نشان دہی کرنے والے تھے۔ یہود کو چونکہ یہ بات دل سے ناپسند تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نشانی تورات سے ظاہر ہو اس وجہ سے انھوں نے ان تمام باتوں کو چھپانے کی کوشش کی۔[1]

وَتَكْتُمُوا کا اعراب

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ، اس ٹکڑے میں کوئی خاص لغوی اشکال نہیں ہے البتہ وَتَكْتُمُوا کے اعراب کے بارے میں اہل تاویل نے اختلاف کیا ہے۔ بعض لوگ یہاں اَنْ کو پوشیدہ مانتے ہیں اس وجہ سے تَكْتُمُوا کو نصب کی حالت میں قرار دیتے ہیں، بعض اس کو سابق پر عطف قرار دے کر اس کو جزم کی حالت میں مانتے ہیں۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ عطف کی صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہاں حرف "لا" کا اعادہ نہ کرنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک ہی حقیقت کو ظاہر کر رہی ہیں پہلی بات کے بعد یہ دوسری بات صرف ایک وضاحت اور ایک بیان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہود نے حق اور باطل کو گڈمڈ کرنے کی جو کوشش کی اس سے اصل مقصود ان کا حق کو چھپانا ہی تھا۔ تورات میں ان کو جس چیز سے روکا گیا تھا وہ تو یہی حق کو چھپانا تھا لیکن اس حق کو چھپانے کی جو شکل ظاہر میں انھوں نے اختیار کی تھی وہ حق اور باطل دونوں کو گڈمڈ کرنے کی تھی اس وجہ سے قرآن نے ان کو پہلے حق و باطل کو گڈمڈ کرنے سے روکا، پھر اس کتمانِ حق سے روکا جو درحقیقت حق و باطل کے التباس کی اس تمام کوشش کا اصل مقصود و مدعا تھا۔

استاذ امامؒ اسی اصول پر وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ اور لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ والی آیات کی بھی تاویل کرتے ہیں۔ تفصیل ان کی اپنے مقام پر آئے گی۔

لفظ حق کی پوری تحقیق اسی سورہ میں آگے آ رہی ہے۔ یہاں موقع کلام سے واضح ہے کہ حق سے مراد وہ حقائق ہیں جو تورات میں واضح کر دیے گئے تھے اور جو اب قرآن نے اپنی تائید و تصدیق سے واضح سے واضح تر کر دیے ہیں۔ ان حقائق کا زیادہ تر تعلق نبی آخر الزمان کی نشانیوں سے تھا، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہود ان نشانیوں پر پردہ ڈالنے سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے تھے۔

---

[1] اس قسم کی بعض باتوں کی طرف اشارہ آگے اسی سورہ میں آئے گا۔ جو لوگ زیادہ تفصیل کے طالب ہوں، استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کے رسالہ ذبیح کا مطالعہ کریں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۴۳)

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ؛ اقامت صلوٰۃ کی پوری تحقیق شروع میں بیان ہو چکی ہے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

لفظ زکوٰۃ کی تحقیق

زکوٰۃ : زکوٰۃ کا لفظ زکا۔ یزکوا سے ہے جس کے معنی پاک ہونے کے ہیں۔ عربی میں نفس زکیہ اس نفس کو کہتے ہیں جو گناہوں سے پاک صاف ہو۔ دوسرا مفہوم اس مادے کے اندر بڑھنے اور نشوونما پانے کا ہے۔ زکا الزرع کے معنی ہوں گے، کھیتی بڑھی اور اپجی۔ زکوٰۃ کے اندر پاکیزگی اور نشوونما دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے کہ زکوٰۃ نفس اور مال دونوں کو پاکیزگی بھی بخشتی ہے اور اس سے مال میں برکت اور بڑھوتری بھی ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی بعض آیات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

مثلاً فرمایا ہے:۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (۱۰۳۔ توبہ)

ان کے مالوں کا صدقہ قبول کرو، ان کو اس کے ذریعہ سے تم پاک کروگے اور ان کا تزکیہ کروگے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۹۔ روم)

اور جو تم دیتے ہو سود تاکہ لوگوں کے مالوں میں بڑھوتری ہو تو یہ چیز اللہ کے ہاں نہیں بڑھتی اور جو تم دیتے ہو زکوٰۃ، اللہ کی رضا جوئی کے لیے، تو یہی لوگ اپنے دیے ہوئے کو اللہ کے ہاں بڑھانے والے ہیں۔

زکوٰۃ کا لفظ ابتدا میں تو انفاق فی سبیل اللہ کی تمام قسموں کے لیے استعمال ہوتا رہا اور اس کا مفہوم وہی تھا جو لفظ صدقہ کا ہے لیکن بعد میں قرآن و حدیث کے استعمالات نے اس کو انفاق کی ان متعین مقداروں کے لیے خاص کر دیا جو اللہ اور رسولؐ نے ہر مال میں غربا و فقرا کے لیے واجب کر دی ہیں۔

رکوع کا مفہوم

رکوع : کے معنی آگے کی طرف جھک پڑنے، تواضع ظاہر کرنے اور فقر و غربت سے پست ہو جانے کے ہیں۔ قرآن مجید میں اس سے مراد نماز ہوتی ہے اس لیے کہ یہ نماز کے اہم ترین ارکان میں سے ہے۔ اس کے ساتھ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (رکوع کرنے والوں کے ساتھ) کی قید، نماز باجماعت کی اہمیت اور اس کی تاکید کو ظاہر کرتی ہے۔ اگرچہ نماز باجماعت کا مفہوم اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے الفاظ کے اندر بھی موجود ہے لیکن مخاطب کے خاص حالات کی وجہ سے اس مضمون کو واضح الفاظ میں الگ بھی بیان کر دیا ہے۔

نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کے اس حکم کے مخاطب، جیسا کہ سیاق کلام سے واضح ہے، یہود ہیں، اور اشارہ ان کے عوام و خواص سب کی طرف ہے جس عہد الٰہی کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اس کے بنیادی احکام یہی تھے اور یہود نے ان کو بالکل ترک کر رکھا تھا۔ قرآن مجید

نے یہاں یہود کو ان احکام کے از سرِ نو زندہ کرنے کی طرف توجہ دلائی اور ساتھ اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا کہ انھوں نے عہدِ الٰہی کے ان بنیادی احکام کو بالکل ختم کر رکھا ہے لیکن صرف اشارہ کیا، اس بات کو صراحت کے ساتھ نہیں کہا تاکہ وہ بحث و تردید کے لیے نہ الجھ پڑیں۔

یہود کے متعلق یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ انھوں نے نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام تقریباً ختم کر دیے تھے۔

نماز اور زکوٰۃ کے معاملہ میں یہود کا رویہ

جہاں تک نماز کا تعلق ہے اس کا حکم تورات کے صحیفوں میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے یہاں تک کہ ان کے ایک فرقے کا تو یہ خیال ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس چیز کا حکم دیا ہی نہیں تھا، یہ محض بعد والوں کی بدعت ہے۔

زکوٰۃ کا اگرچہ انھوں نے انکار تو نہیں کیا لیکن ان کے علما اور کاہنوں نے اس کا مصرف فقرا اور مساکین کے بجائے اپنے آپ کو قرار دے لیا۔ چنانچہ کتاب احبار جس میں کاہنوں کے حقوق و فرائض اور نذرا اور قربانیوں وغیرہ کا بیان ہے، فقرا اور مساکین کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ پیداوار کے عشر، پہلوٹھی کے ہدیے اور ہر قسم کی نذریں اس میں کاہنوں کے لیے مخصوص کر دی گئی ہیں اور اس طرح زکوٰۃ کے اصلی حق دار فقرا اور غربا کے بجائے علما اور کاہن بن کے رہ گئے۔ قرآن مجید نے نماز اور زکوٰۃ دونوں معاملوں میں شریعتِ الٰہی کا حکم بھی واضح کیا اور یہود کی زیادتیوں پر نہایت واضح الفاظ میں ان کو ملامت بھی کی۔

نماز کے متعلق قرآن مجید نے یہ واضح کیا کہ سب سے پہلی چیز جو یہود پر فرض کی گئی وہ نماز ہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو توحید کی تعلیم کے بعد سب سے پہلا حکم نماز ہی کا دیا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ	بے شک میں ہی اللہ ہوں، نہیں ہے کوئی معبود مگر
وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (۱۴۔ طٰہٰ)	میں، تو میری ہی بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر

دوسری جگہ فرمایا۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْہِ اَنْ	اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی کی
تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا	طرف وحی کی کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر
وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قِبْلَۃً وَّاَقِیْمُوا	مقرر کر لو اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز
الصَّلٰوۃَ ط (۸۷۔ یونس)	قائم کرو۔

ان آیات سے صاف واضح ہے کہ یہود کی جماعتی شیرازہ بندی سب سے پہلے نماز باجماعت کے ذریعہ ہی سے ہوئی تھی لیکن اس کی اہمیت بعد میں انھوں نے بالکل ختم کر دی۔

وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ کے الفاظ کی روشنی میں استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک اس حقیقت کی طرف کہ یہاں یہود کو رکوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیوں کہ انھوں نے رکوع کو

بالکل ترک کر دیا تھا۔[1]

دوسرے نماز باجماعت کے اہتمام کی طرف، وہ اس طرح کہ لیڈروں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ نمازوں میں غربا اور عوام کے ساتھ شریک ہوں اور ان کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوں، کیونکہ پہلی چیز جو نماز کو ڈھانے والی ہے وہ یہی ترک جماعت ہے۔ امرا، عوام کے ساتھ مسجدوں کی حاضری کو کسرِ شان سمجھنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نماز کی عزت کم ہو جاتی ہے اور مسجدوں کی حاضری صرف غربا کے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہے۔ نماز باجماعت کی اسی اہمیت کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کو بھی جماعت کے اہتمام کی تاکید فرمائی۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۴۳۔ آل عمران) — اے مریم اپنے رب کی فرمانبردار رہ اور سجدہ اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۴۴)

'بِرّ' کا مفہوم

بِرّ: 'بِرّ' کا لفظ عربی زبان میں ایفائے عہد، وفاداری اور ادائے حقوق کے معنی میں آتا ہے۔ حقوق میں ہر قسم کے حقوق شامل ہیں۔ بنیادی اور حقیقی بھی۔ مثلاً خدا کی فرمانبرداری، والدین کی اطاعت اور خلق کے ساتھ ہمدردی۔ پھر آگے چل کر اس میں وہ حقوق بھی شامل ہو جاتے ہیں جو قول و قرار اور معاہدات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لفظ احسان اور نیکی کی تمام قسموں پر بھی حاوی ہے اور عدل کا بھی ہم معنی ہے۔ اپنے استعمالات کے لحاظ سے یہ لفظ اثم (حق تلفی)، عقوق (والدین کی نافرمانی)، غدر (بے وفائی) اور ظلم کا ضد ہے۔ بَرٌّ اور بَارٌّ اس سے صفت کے صیغے استعمال ہیں مثلاً کہیں گے بَرٌّ بِوَالِدِہٖ وہ اپنے باپ کا فرمانبردار ہے۔ بَرَّ بِالْقَسَمِ کے معنی ہیں اس نے اپنی قسم پوری کی۔ قرآن مجید میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تعریف میں وارد ہے وَكَانَ تَقِيًّا وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا (۱۳-۱۴۔ مریم) (وہ پرہیزگار اور اپنے ماں باپ کا فرمانبردار تھا، سرکش اور نافرمان نہ تھا) دوسری جگہ فرمایا ہے، لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ (۹۲۔ آل عمران) (تم خدا کی فرمانبرداری کا حقیقی درجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو) اللہ تعالیٰ کی تعریف میں ہے اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ (۲۸۔ طور) (بے شک وہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے والا اور مہربان ہے) نیز فرمایا ہے وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۲۔ مائدہ) (اور تعاون کرو ایفائے حقوق اور تقویٰ کے کاموں میں اور نہ تعاون کرو

---

[1] استاذ امام رحمۃ اللہ کے نزدیک یہود اپنے اوپر سال میں صرف ایک مرتبہ سجدہ کرنا واجب سمجھتے تھے اور اس کے لیے بھی ان کے علما نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ اگر کوئی شخص کھڑے کھڑے کسی دیوار یا کھمبے پر اپنی پیشانی رکھ دے تو ادائے فرض کے لیے یہ بھی کافی ہے۔ معلوم نہیں مولانا نے اس بیان کا ماخذ کیا ہے لیکن تورات میں یہود کو بار بار جو گردن کش کہا گیا ہے اس کی وضاحت ان کے اس طرزِ عمل کی روشنی میں بخوبی ہو جاتی ہے۔

حق تلفی اور تعدی کے کاموں میں) اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ بِر کا لفظ ایک پہلو سے نیکی اور بھلائی کے تمام کاموں پر مشتمل ہے لیکن اپنے خاص مفہوم کے لحاظ سے یہ حقوق اور فرائض کے ایفا کے لیے آتا ہے۔

اس آیت کے مخاطب یہود کے علماء اور اکابر ہیں۔ آخر کا ٹکڑا وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو) ہمارے اس خیال کی نہایت واضح طور پر تائید کر رہا ہے۔ ان علما اور اکابر کو مخاطب کر کے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ تم عوام کو تو بڑے زوروں سے حقوق اور فرائض ادا کرنے کی تلقین کرتے ہو لیکن یہ تلقین کرتے وقت اپنے آپ کو بالکل بھول جاتے ہو۔ لوگوں کو تو نصیحت کرتے ہو کہ اپنے مال تمہارے حوالہ کریں لیکن خود تمہارے اوپر خدا کے اور غریبوں کے جو حقوق ہیں ان کا خیال تمہیں کبھی نہیں آتا، بلکہ تم لوگوں کا دیا ہوا مال ہڑپ کر کے بیٹھ جاتے ہو۔ تم نے دوسروں پر تو اپنی اطاعت پوری سطوت کے ساتھ واجب کر رکھی ہے، یہاں تک کہ تم ان کے رب بن بیٹھے ہو لیکن خود خدا کی اطاعت اور اس کی فرمانبرداری سے بالکل آزاد ہو، نماز اور زکوٰۃ کو ضائع کر کے تم نے پورے دین کو بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ علمائے یہود کی اس حالت کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی نہایت بلیغ الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:۔

"اس نے کہا اے شرع کے عالمو تم پر بھی افسوس کہ تم ایسے بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے آدمیوں پر لادتے ہو اور آپ ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے:" (لوقا باب ۱۱-۴۶)

غور کیجیے، انجیل کے ان الفاظ اور قرآن مجید کے مذکورہ بالا الفاظ میں کتنی مطابقت ہے!

وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو) یعنی تم دین و شریعت کے عالم ہو اور جانتے ہو کہ از روئے عقل و نقل تم پر شریعت کی ذمہ داریاں دوسروں کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (۴۵)

لفظ صبر کی تحقیق لفظ صلوٰۃ کی تحقیق بقرہ کی آیت ۳ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں ہم صرف لفظ صبر کی تحقیق پر کفایت کریں گے۔

لفظ صبر کے اصل معنی روکنے کے ہیں یعنی نفس کو گھبراہٹ، مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر اپنے موقف پر جمائے رکھنا۔ قرآن مجید میں اسی حقیقت نے کچھ زیادہ پاکیزہ صورت اختیار کر لی ہے، یعنی قرآن میں عموماً اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بندہ پوری طمانیت قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عہد پر ڈٹا رہے اور اس کے وعدوں پر یقین رکھے اور اس راہ میں اس کو جن مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑے ان کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دے۔

صبر کا مفہوم لوگ عام طور پر عجز و مسکنت سمجھتے ہیں لیکن لغتِ عرب اور استعمالاتِ قرآن میں اس کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ استاذ امامؒ اپنی تفسیر سورۂ والعصر میں کلامِ عرب کی روشنی میں اس عام خیال کی تردید مندرجہ ذیل

الفاظ میں فرماتے ہیں:

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عربوں کے نزدیک صبر عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو بے بسوں اور درماندوں کا شیوہ ہے بلکہ یہ عزم اور قوت کی بنیاد ہے۔ کلام عرب میں اس کا استعمال بہت ہے اور اس کے تمام استعمالات سے اسی مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ حاتم طائی کہتا ہے:۔

وغمرة موت ليس فيه هوادة ... يكون صدور المشرفي جسورها

اور موت و ہلاکت کے کتنے ہولناک دریا ہیں جن پر تلواروں کے پل ہیں۔

صبرنا له في نهكها ومصابها ... باسيافنا حتى يبوخ سعيرها

ہم نے ان کے تمام آفات و شدائد کے مقابل اپنی تلواروں کے ساتھ ثابت قدمی دکھلائی، یہاں تک کہ وہ ٹھنڈے پڑ گئے۔

اصبغ کا شعر ہے۔

يا ابن الجحاجحة المدارة ... والصابرين على المكاره

اے شریف سرداروں اور شدائد پر صبر کرنے والوں کی اولاد۔

زہیر بن ابی سلمٰی۔ نے کہا ہے۔

قود الجياد واصهار الملوك وصبر ... في مواطن لو كانوا بها سئموا

اصیل گھوڑوں کی سواری، بادشاہوں کی دامادی اور ایسے مورچوں میں ثابت قدمی جہاں دوسرے ہمت ہار بیٹھیں۔

صبر کے اصلی معنی قرآن مجید نے خود بھی واضح کر دیے ہیں۔ چناں چہ فرمایا ہے:۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ ... اور ثابت قدمی دکھانے والے سختی میں، تکلیف میں

وَحِيْنَ الْبَاْسِ (۱۷۷۔ بقرہ) ... اور لڑائی کے وقت۔

اس آیت میں صبر کے تین موقعے ذکر کیے ہیں رغبت بیماری اور جنگ۔ غور کیجیے تو تمام مصائب و شدائد کے سرچشمے یہی تین ہیں۔[1]

اوپر عہد الٰہی کو از سر نو استوار کرنے کے لیے بنی اسرائیل کو جن باتوں کا حکم دیا ہے یا جن سے روکا ہے ان کا اختیار کرنا یا ان سے بچنا نفس کے لیے نہایت شاق ہے اس وجہ سے وہ نسخہ بھی بتا دیا ہے جو اس مشکل کام کو آسان بنا سکتا ہے۔ یہ نسخہ صبر اور نماز کے دو جزوں پر مشتمل ہے۔ ان دو چیزوں کے اختیار کرنے سے نفس کے لیے یہ چڑھائی آسان ہو جاتی ہے۔ صبر کا تعلق اخلاق و کردار سے ہے اور نماز کا تعلق عبادات سے ہے۔ انسان کے اندر اگر مشکلات و موانع کے علی الرغم حق پر ڈٹے رہنے کی خصلت موجود نہ ہو تو وہ دنیا میں

---

[1] تفسیر سورہ والعصر مولانا فراہیؒ فصل ۲

کوئی اعلیٰ کام تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا، لیکن مشکلات و موانع کے علی الرغم کسی صحیح موقف پر ڈٹے رہنے کی خصلت انسان کے اندر آسانی سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ ریاضت سے پیدا ہوتی ہے جس کا طریقہ نماز ہے۔ آدمی اگر ایک صحیح راہ پر چلنے کا عزم کرلے اور اس پر چل کھڑا ہو اور ساتھ ہی برابر اپنے رب کو یاد رکھے اور اس سے مدد مانگتا رہے (جس کی بہترین شکل نماز ہے) تو اس کے عزم کی قوت ہزار گنی بڑھ جاتی ہے، کوئی مشکل سے مشکل حالت بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش پیدا ہونے نہیں دیتی، اگر حالات کی نزاکت سے آدمی کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا وہ تعلق جو نماز کے واسطہ سے قائم ہوتا ہے، اس کو گرنے سے بچا لیتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہاں صبر کا جو حکم دیا ہے وہ اس لیے دیا ہے کہ اس وصف کو پیدا کیے بغیر کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے عہد پر قائم نہیں رہ سکتی اور نماز کا حکم اس لیے دیا ہے کہ یہی چیز صبر کے پیدا کرنے، اس کو ترقی دینے اور اس کو درجۂ کمال تک پہنچانے کا وسیلہ و ذریعہ ہے۔ آگے ان آیات پر تدبر کے سلسلہ میں چونکہ اس مسئلہ پر ہم تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے اس وجہ سے یہاں صرف اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک اور پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اگرچہ اس کو ہم نے اختیار نہیں کیا ہے لیکن ہے وہ نہایت لطیف۔ آگے ہم اس کی وضاحت کریں گے۔

وَ اِنَّهَا **میں ضمیر کا مرجع**

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ: اس ٹکڑے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وَاِنَّهَا میں ھَا کا مرجع کیا ہے؟ مجاہد کے نزدیک اس کا مرجع صلوٰۃ ہے۔ اسی قول کو امام ابن جریر نے ترجیح دی ہے مطلب یہ ہوا کہ نماز نفس پر بہت بھاری ہے۔ صرف وہی لوگ اس بارگراں کو اٹھا سکتے ہیں جن کے اندر خدا کا خوف ہو اور جن کے دل آخرت کی بازپرس کے ڈر سے ہر وقت خدا کے آگے جھکے رہتے ہوں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا مرجع وہ ہدایت و نصیحت ہے جو پچھلے جملہ میں مذکور ہوئی ہے۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ پہلے قول کے حق میں ہیں اور اس کی تائید میں انھوں نے چند دلیلیں بھی پیش کی ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں صبر کو نظر انداز کر کے صرف نماز کے بھاری اور مشکل ہونے کے ذکر کرنے کی تین وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ صبر کا شاق اور گراں ہونا بالکل واضح تھا اس وجہ سے اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی مثال میں وہ آیت وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ[1] پیش کرتے ہیں کہ اس میں یہ فرمایا کہ اللہ صابروں کے ساتھ ہے، یہ نہیں فرمایا کہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز میں اللہ تعالیٰ کی معیت کا حاصل ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح صبر کا مشقت طلب ہونا چونکہ واضح تھا اس وجہ سے اس کا ذکر نہیں کیا، صرف نماز کا ذکر کیا۔

---

[1] مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ سے، بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ (۱۵۳- بقرہ)

دوسری وجہ یہ ہے کہ صبر نماز کے لازمی شرائط میں سے ہے۔ صرف وہی لوگ نماز پر قائم رہ سکتے ہیں جن کے اندر صبر کی خصلت موجود ہے۔ نماز کی اس خصوصیت کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جب یہ بات کہہ دی گئی کہ نماز ایک بھاری اور مشکل چیز ہے تو گویا اس کے بھاری اور مشکل ہونے کے پہلو کی طرف خود بخود اشارہ ہو گیا، کہ یہ اس وجہ سے بھاری اور مشکل ہے کہ اس کے لیے صبر درکار ہے۔ اس اشارہ نے صبر کے تصریح کے ساتھ ذکر کرنے کی ضرورت سے مستغنی کر دیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ صبر کا ایک سخت چیز ہونا چونکہ واضح ہے اس وجہ سے اس کی سختی کا اظہار کرتے ہوئے اس کا حکم دینا مخاطب کی طبیعت پر گراں گزرتا اس وجہ سے اس کی سختی کا حوالہ نہیں دیا، صرف نماز کی سختی کا حوالہ دیا جو بظاہر ایک آسان چیز ہے۔

یہ نکتے اگرچہ نہایت لطیف ہیں اور ان سے زیر بحث آیت کے بعض نہایت اہم گوشے روشنی میں آتے ہیں لیکن میرا اپنا رجحان دوسرے قول کی طرف ہے۔ یعنی "ھا" کا مرجع میرے نزدیک صبر و صلوٰۃ سے استعانت کی وہ تلقین ہے جو اوپر والے ٹکڑے میں وارد ہوئی ہے۔ عربی زبان اور قرآن مجید میں اس اسلوب بیان کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ ہم قرآن مجید سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ فرمایا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ۔ (۸۰۔ قصص)

اور جن لوگوں کو علم عطا ہوا تھا انھوں نے کہا تمہارا برا ہو، اللہ کا اجر ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کے لیے ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے لیکن ایمان اور عمل صالح کا مرتبہ نہیں عطا ہوتا مگر ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہوں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۝ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ (۳۴-۳۵۔ حٰمٓ سجدہ)

اور بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں ہو سکتیں، تم ان کی برائی کو بھلائی سے دفع کرو تو تم دیکھو گے کہ جس کے درمیان اور تمہارے درمیان شدید عداوت ہے، وہ تمہارا سرگرم حامی بن گیا ہے اور یہ حکمت نہیں عطا ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کریں اور یہ دانش نہیں ملتی مگر نصیبہ وروں کو۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ ای وما یلقی ھذہ الوصیۃ الا الذین صبروا وما یلقاھا ای یوتاھا ویلھمھا الا ذو حظ عظیم (یعنی یہ ہدایت نہیں عطا ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہوں وما یلقاھا کے معنی ہیں کہ یہ ہدایت نہیں ملتی یا نہیں الہام ہوتی مگر ان کو جو بڑے

نصیب والے ہوں)

اس قول کو اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں "ھا" کی ضمیر کا تعلق صرف نماز سے نہیں رہ جاتا بلکہ صبر اور نماز دونوں سے ہو جاتا ہے۔ یہ بات عربی زبان کے قواعد کے بھی مطابق ہے اور اصل حقیقت کے بھی، کیوں کہ نفس پر شاق درحقیقت یہ دونوں ہی چیزیں ہیں۔ صبر کے مشکل ہونے میں تو کسی کو کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ نماز بھی مداومت اور پابندی کی شرط کے ساتھ اتنی سخت چیز بن جاتی ہے کہ اہل توفیق ہی ہیں جو اس کو نباہ سکتے ہیں۔

لَكَبِيرَةٌ: کبیرۃ کے معنی یہاں بھاری، ثقیل اور شاق کے ہیں۔ قرآن مجید میں دوسرے مواقع پر یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ (۱۴۳۔ بقرہ) (بے شک بھاری چیز ہے مگر ان کے لیے جن کو خدا ہدایت دے دے) وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ (۳۵۔ انعام) (اور اگر ان کا اعراض تم پر گراں گزر رہا ہے)

خشوع کا مفہوم

إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ: خشوع کی اصل حقیقت پستی اور فروتنی اور عجز و تذلل ہے۔ آواز پست ہو تو یہ لفظ اس کے لیے بھی بولا جائے گا، نگاہ جھکی ہوئی ہو تو اس کے لیے بھی بولا جائے گا۔ اونٹ کا کوہان لاغری کے سبب سے بیٹھ جائے تو اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوگا۔

اوپر عہد الٰہی پر استوار رہنے کے لیے صبر اور نماز سے استعانت کی جو نصیحت کی گئی ہے اس کے متعلق یہ فرمایا گیا کہ یہ راہ سہل انھی کے لیے ہے جن میں خشوع ہو، جو خدا سے ڈرنے والے ہوں، جو غرور و سرکشی کی بیماری سے پاک ہوں اور جن کے دل خدا کے حضور جواب دہی کے تصور سے ہر وقت اندیشہ ناک رہتے ہوں۔ وہ لوگ اس راہ پر نہیں چل سکتے جن کے سینے خوف خدا سے خالی ہوں، جو قومی اور نسلی غرور کے گھمنڈ میں مبتلا ہوں اور جو خدا اور آخرت سے زیادہ اپنی امارت و سیادت کی ساکھ جمائے رکھنے کی فکروں میں مبتلا ہوں۔

یہ خشوع صبر اور نماز دونوں کی بنیاد ہے۔ صبر سے یہاں مراد، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ہر طرح کے مصائب و شدائد اور ہر قسم کے ایذا و استخفاف کے باوجود خدا کے عہد پر جمے رہنا ہے اور یہ بات وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل پر خدا کی ایسی ہیبت و عظمت طاری ہو کہ اس کے مقابل میں ہر مصیبت و ذلت اس کو ہیچ معلوم ہوتی ہو۔

اسی طرح نماز کے متعلق ہر صاحب علم پر یہ حقیقت واضح ہے کہ اس کی بنیاد ہی خشوع و خضوع پر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے۔ مثلاً:۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ (۱۔ مومنون)

ان مومنوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں۔

دوسرے مقام میں ہے:۔

وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوْا لَنَا — وہ ہمیں پکارتے ہیں امید وبیم کے ساتھ اور وہ ہمارے

خَاشِعِيْنَ (۲۱-۹۰ انبیاء) عاجزی کرنے والے ہیں۔

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۴۶)

لفظ ظن کی تحقیق

آدمی کسی چیز کے متعلق اس کے دیکھے بغیر جو رائے قائم کرتا ہے اس کو ظن کہتے ہیں۔ اس طرح کی رائے پر بالعموم چونکہ یقین نہیں ہوا کرتا اس وجہ سے ظن کا لفظ کچھ شک کے ہم معنی سا بن گیا ہے۔ چنانچہ عربی زبان اور قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں بہت استعمال ہوا ہے۔ طرفہ کا مشہور شعر ہے۔

واعلم علماً ليس بالظن انه — اذا ذل مولى المرء فهو ذليل

(میں ایک بات جانتا ہوں جو محض گمان نہیں ہے کہ جب آدمی کا چچازاد بھائی ذلیل ہو جائے تو وہ خود بھی ذلیل ہو کر رہ جاتا ہے)

اسی طرح قرآن مجید میں ہے۔ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ (۳۲۔ جاثیہ) (ہم محض ایک گمان کر رہے ہیں اور ہم یقین کرنے والے نہیں ہیں)

لیکن ایک بن دیکھی چیز کے متعلق جو رائے قائم کی جاتی ہے ضروری نہیں کہ وہ مشکوک ہی ہو۔ بسا اوقات یہ رائے یقین پر مبنی ہوتی ہے لیکن ظن کا لفظ اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ ظن کا یہ استعمال اس کے عام معنی کے لحاظ سے ہوتا ہے، اس میں شک کا مفہوم مضمر نہیں ہوتا۔ اوس بن حجر کا ایک شعر ہے:

الالمعی الذی یظن بك الظن — كان قد رای وقد سمعا

(وہ ذہین کہ اگر تمہارے بارے میں کوئی گمان بھی کرے تو معلوم ہوتا ہے دیکھ کر اور سن کر کرتا ہے)

درید بن صمہ کہتا ہے:

فقلت لهم ظنوا بالفی مدجج — سراتهم فی الفارسی المسرد

(میں نے ان سے کہا کہ دو ہزار سلاح پوش سواروں کا یقین کرو جن کے سردار باریک کڑیوں کی زرہیں پہنے ہوں گے)

یہ خاشعین کی مزید تعریف ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے اور اپنے رب سے ملنے کا گمان رکھتے ہیں، آخرت سے بے پروا اور بے فکر نہیں ہیں۔

خاشعین کی تعریف میں یہ بات ان کے باطن پر روشنی ڈالتی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے اوپر عجز و مسکنت اور پستی و فروتنی کی جو حالت طاری ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں آخرت کا خوف اور خدا کے سامنے حاضری کا ڈر سمایا ہوا ہے۔

خاشعین کی اس باطنی حالت کی تعبیر کے لیے ظن کے لفظ کے استعمال میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ یہ لفظ اندیشہ اور گمان غالب سے لے کر یقین اور قطعیت تک کی حالت کی تعبیر کے لیے کافی ہے اور آخرت کا معاملہ ایک ایسا اہم معاملہ ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی کو جب اس کے بارہ میں یقین حاصل ہو جائے تب ہی اس کے لیے تیاری کرے، بلکہ اس کا اندیشہ اور گمان بھی اس بات کے لیے کافی ہے کہ آدمی اس

کے لیے تیار رہے سا ایک عظیم بند جس کے ٹوٹ جانے سے پورے شہر کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہو ہماری توجہ کا طالب صرف اسی وقت نہیں ہوتا جب کہ پانی اس کی دیواروں میں دراڑیں پیدا کر دے بلکہ اس کے ٹوٹنے کے ہولناک اندیشہ کے پیش نظر اس وقت بھی اس کی حفاظت کا اہتمام ہوتا ہے جب کہ وہ بظاہر بالکل محفوظ ہوتا ہے۔ ایک چھوٹے سے خطرے کے معاملہ میں جب انسان کی پیش بینی کا یہ حال ہے تو آخر مرنے کے بعد کی زندگی اور آخرت کے معاملہ میں، جس کا تعلق ایک ابدی زندگی سے ہے، وہ آتنا بے حس اور بلید کیوں ہو جائے کہ اس کے تمام آثار و علامات سے آنکھیں بند کیے ہوئے رہے اور اس وقت تک اس کے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہ سمجھے جب تک اس کو اس کا پورا پورا یقین نہ ہو جائے۔

وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ: "اور یہ کہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں" کے الفاظ بیک وقت توحید اور تفویض کی دو حقیقتوں کو ظاہر کر رہے ہیں۔

توحید کا پہلو یہ ہے کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آخرت میں سارے معاملات صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے سامنے پیش ہوں گے، وہی جزا اور سزا دے گا، اور وہ جو کچھ دے گا پورے عدل و انصاف کے ساتھ دے گا، کسی دوسرے کی مجال نہ ہو گی کہ اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے یا اس کے غضب سے بچا سکے۔ یہ مضمون اِلَيْهِ کی تقدیم سے پیدا ہوتا ہے اور اس توحید کا حوالہ یہاں اس لیے ضروری ہوا کہ اگر عقیدۂ شرک کا کوئی شائبہ دل میں موجود رہے تو خدا کی ملاقات کا عقیدہ بالکل بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ مشرک یہ سمجھتا ہے کہ اول تو خدا اپنے شرکاء کے لحاظ میں اس کے اوپر ہاتھ ہی نہیں ڈالے گا اور اگر ڈالے گا تو اس کے شرکاء اس کو اپنی سعی و سفارش سے بچا لیں گے۔

تفویض کا پہلو یہ ہے کہ اللہ کے عہد بندگی پر قائم رہنے والوں کو جو مشکلیں اور اذیتیں پیش آتی ہیں وہ ہر چیز کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے ہیں اس لیے کہ انھیں یہ اعتماد ہوتا ہے کہ وہ جس کی راہ میں یہ سب کچھ جھیل رہے ہیں، ہر قدم پر اسی کی طرف بڑھ رہے ہیں، پھر جب آگے وہ ہے جس کی طلب ہے تو پیچھے کے اس سارے شور و غوغا کی کیا پروا۔

کیا غم ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

۲۸۔ مجموعۂ آیات ۴۰-۴۶ میں مطالب کی ترتیب

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت کے بعد اب ہم مختصر طور پر یہ بتائیں گے کہ مذکورہ بالا مجموعۂ آیات میں مطالب کی ترتیب کیا ہے تاکہ کلام کا نظم بھی واضح ہو جائے اور ہر بات کی دلیل بھی سامنے آ جائے۔

اس مجموعۂ آیات میں پہلے بنی اسرائیل کو تین چیزوں کی یاددہانی کی گئی ہے۔

ایک اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو انعامات فرمائے ہیں ان کو وہ یاد رکھیں، ان کو بھول نہ جائیں۔ یہ انعامات اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان پر ہوئے ہیں، ان کے ذاتی یا خاندانی استحقاق کا نتیجہ نہیں ہیں جن پر وہ آبائی وراثت کی حیثیت سے قابض رہیں۔

دوسری اس بات کی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا ہے اس کو وہ پورا کریں۔ وہ اس عہد کو پورا کریں گے تو اللہ تعالیٰ وہ عہد پورا کرے گا جو اس نے ان سے کیا ہے۔

تیسری اس بات کی کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے ڈریں، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہ ڈریں۔

قرآن پر ایمان لانے کی دعوت تین پہلوؤں سے

ان تینوں باتوں کی یاد دہانی کرنے کے بعد ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اور یہ دعوت درحقیقت انھی تینوں چیزوں پر مبنی ہے جن کی اوپر یاد دہانی کی گئی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

انعام کے پہلو سے ان کے لیے قرآن پر ایمان لانا اس لیے ضروری قرار دیا کہ ان کو جو ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا ہوئی تھیں قرآن کے ذریعہ سے انھی نعمتوں کی تکمیل ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی شکل میں ان پر آخری فضل فرمایا۔ اور اس فضل کا اس کے ظہور سے پہلے ہی اس نے وعدہ بھی فرمایا تھا تاکہ بنی اسرائیل اس سے بے خبر اور ناآشنا نہ رہیں بلکہ اس سے آشنا اور اس کے منتظر رہیں تاکہ جب یہ نعمت نازل ہو تو خود بھی اس کو بڑھ کر قبول کریں اور دوسرے بندگانِ خدا کو بھی اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں۔ چنانچہ جب یہ موعود نعمت نازل ہوئی تو ان کو دعوت دی گئی کہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر کریں۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو یہ سب سے بڑا کفرانِ نعمت ہوگا جس کے وہ مرتکب ہوں گے اور اس کے بعد وہ اپنے لیے امید کا آخری دروازہ بھی بند کرلیں گے۔

عہد کے پہلو سے اس دعوت کو قبول کرنا اس لیے ضروری ٹھہرا کہ اس کتاب اور اس نبی پر ایمان لانے کا بنی اسرائیل سے تورات میں عہد لیا جا چکا تھا۔ اب اس کتاب اور اس پیغمبر پر ایمان نہ لانے کے معنی یہ تھے کہ انھوں نے محض محبتِ دنیا میں پھنس کر اس عہد کو توڑ دیا جو وہ اپنے رب کے ساتھ باندھ چکے تھے۔

خشیتِ الٰہی کے پہلو سے اس دعوت پر ایمان لانا اس لیے ضروری ٹھہرایا کہ ان واضح تصریحات اور ان قطعی عہود کے باوجود جو تورات میں موجود ہیں بنی اسرائیل کی طرف سے اس دعوت کی تکذیب اور مخالفت کی راہ میں پیش قدمی ایک ایسی جسارت تھی جو خدا کے غضب کو دعوت دینے والی تھی۔ قرآن نے ان کو متنبہ کیا کہ ان موہوم اندیشوں کے لیے جو اس دعوت کے قبول کرلینے کی صورت میں نظر آتے ہیں خدا کے اس حتمی عذاب سے بے پروا نہیں ہوجانا چاہیے جو اس دعوت کی تکذیب کی صورت میں لازماً نازل ہو کر رہے گا۔

اس عام یاد دہانی اور دعوت کے بعد خاص طور پر ان کے علماء اور لیڈروں کو مخاطب کرکے یہ تنبیہ فرمائی کہ جانتے بوجھتے اور کتاب و شریعت کا علم رکھتے ہوئے اپنی قوم کو گمراہ کرنے کے لیے حق اور باطل کو گڈمڈ کرنے اور حق کو چھپانے کا وہ کاروبار انھیں نہیں کرنا چاہیے جس میں وہ اس وقت پوری سرگرمی کے ساتھ مصروف ہیں؟ انھیں کتاب و شریعت کا جو علم ملا ہے اس کا اصلی حق یہ ہے کہ وہ اس کی روشنی میں اپنے عوام کی صراطِ مستقیم کی

طرف رہنمائی کریں نہ کہ اس منصب سے غلط فائدہ اٹھا کر ان کو اندھا بنانے کے لیے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکیں۔

عوام اور خواص دونوں طبقات کے اس بگاڑ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بالترتیب مذکورہ دونوں خرابیوں کا علاج بھی بتایا۔

پہلے اس عام خرابی کو لیا ہے جو کفرانِ نعمت، نقضِ عہدِ الٰہی اور خدا سے بے خوفی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ان تینوں بیماریوں کے علاج کے لیے بنی اسرائیل کو تین باتوں کا حکم دیا۔ نماز، زکوٰۃ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کا۔

نماز کا حکم اس لیے دیا کہ وہ ذکر و شکر کا مجموعہ اور ان تمام عہود کا سرنامہ ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوئے ہیں، اس کے اہتمام سے ان تمام چیزوں کی زندگی کی راہ کھل جاتی ہے جن پر شریعتِ الٰہی قائم ہے۔ نماز کی اس حقیقت کی طرف ہم اس سورہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے اشارات کر چکے ہیں۔ اس وجہ سے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

زکوٰۃ کا حکم اس لیے دیا کہ یہی اس مرضِ بخالت اور اس محبتِ دنیا کا علاج ہے جس کے سبب سے یہود اللہ تعالیٰ کا پیمان توڑنے اور خدا کی شریعت کو دنیا کی متاعِ قلیل کے عوض فروخت کرنے پر آمادہ ہوئے۔ یہود پر اس مرض کا جس قدر غلبہ تھا اس کا اندازہ قرآن مجید کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ
اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي
الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى
اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ بَلٰى
مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ
يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ
ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ
فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ
وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ○

(۷۵-۷۷ آل عمران)

اور ان میں سے وہ بھی ہیں جن کا حال یہ ہے کہ اگر
ان کے پاس ایک دینار کی بھی امانت رکھو تو وہ اس
کو ادا کرنے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر
پر نہ سوار ہو جاؤ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ
امیوں کے معاملہ میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے،
وہ جانتے بوجھتے اللہ پر یہ افترا باندھ رہے ہیں۔ اللہ
کا معاملہ تو یوں ہے کہ جو اس کے عہد کو پورا کرے اور
تقویٰ اختیار کرے تو اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو
دوست رکھتا ہے۔ بے شک جو لوگ اللہ کے عہد
اور اپنی قسموں کے بدلے حقیر قیمت لے رہے ہیں ان
کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اللہ ان سے
قیامت کے روز بات نہیں کرے گا اور نہ ان کی طرف
نگاہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، ان کے لیے
دردناک عذاب ہے۔

رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کا حکم[1] اس لیے دیا کہ عام نمازیوں کے ساتھ نمازوں کی حاضری ان کے کبر و نخوت کو توڑے، ان کے اندر خاکساری اور تواضع پیدا کرے اور یہ خاکساری و تواضع ان کے لیے نبی کی بعثت پر ایمان لانے کی راہ کھولے جس پر ایمان لانے میں ان کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہ غرور تھا کہ وہ اسرائیل کے برتر گھرانے سے ہو کر امیوں کے اندر سے اٹھنے والے ایک رسول پر کس طرح ایمان لائیں۔

یہود کے عام لگاڑ کا علاج بتانے کے بعد ان کے علما کی طرف توجہ فرمائی اور ان کا مرض یہ بتایا کہ وہ عوام کو تو نیکی اور دینداری کی تلقین کرتے ہیں لیکن اس تلقین کے وقت وہ خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں، حالانکہ نیکی اور دینداری کی ان باتوں کے جتنے مخاطب عوام ہیں اس سے زیادہ ان کے مخاطب یہ خود ہیں، اس لیے کہ کتاب الٰہی کے اسرار و رموز سمجھنے اور جاننے والے یہی ہیں۔ اگر یہ اپنے آپ کو بھی اسی طرح خدا ترس اور خدا کے حقوق و فرائض کو پہچاننے والا بنالیں جس طرح یہ عوام کو بنانا چاہتے ہیں تو چشم زدن میں لوگوں کے لیے قبول اسلام کی راہ کی ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں اس لیے کہ یہ ساری رکاوٹیں انھی کی پیدا کی ہوئی ہیں، کسی اور کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان نصیحت کرنے والوں کے خود اپنے کان بالکل بہرے واقع ہوئے ہیں۔

ان تنبیہات و ہدایات کے بعد وہ طریقہ بتایا ہے جس کو اختیار کر کے بنی اسرائیل اس آخری بعثت پر ایمان لانے کے مشکل کام کو اپنے لیے آسان بنا سکتے تھے۔ وہ طریقہ صبر اور نماز کا طریقہ ہے۔ فرمایا کہ اگر اپنی خواہشات و بدعات کو چھوڑ کر اور اپنی جمی جمائی سیادت و امامت سے دستکش ہو کر قرآن پر ایمان لانا مشکل معلوم ہوتا ہے تو اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ یہ دونوں سہارے اس چڑھائی کو آسان بنائیں گے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے کی فصلوں میں آئے گی۔

۲۹۔ دین میں نماز کی اہمیت

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نماز کا ذکر یکے بعد دیگرے دو مرتبہ آیا ہے۔ پہلے فرمایا وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ) (۴۳) پھر ایک ہی آیت کے بعد فرمایا وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ

---

[1] کبھی کبھی میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ وارکعوا مع الراکعین میں یہود کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اللہ کے جو بندے آج اللہ کی بندگی کی دعوت لے کر اٹھے ہیں اور اجتماعی شکل میں اس کی عبادت کر رہے ہیں اس عبادت کے خلاف مہم چلانے کے بجائے تم بھی اس عبادت میں شریک ہو جاؤ۔ اگر اس کا یہ مطلب لے لیا جائے تو یہ ٹکڑا گویا دوسرے الفاظ میں اسی دعوت کا اعادہ ہے جو اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ کے الفاظ سے بنی اسرائیل کو دی گئی ہے۔

(اور مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ سے اور یہ چیزیں بھاری ہیں مگر ان لوگوں پر جو خدا سے ڈرنے والے ہیں ۴۵)

نماز کا ذکر دو مختلف پہلوؤں سے

ظاہر ہے کہ ان دونوں مواقع پر نماز کا ذکر دو مختلف پہلوؤں سے ہوا ہے۔ پہلے موقع پر اس کا ذکر اس پہلو سے ہوا ہے کہ ایمان باللہ اور اقرار توحید کے بعد یہی اس عہد و میثاق کی پہلی دفعہ کی حیثیت رکھتی ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ اور دوسرے موقع پر اس پہلو سے ہوا ہے کہ یہی چیز درحقیقت تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ، سب کی کلید، سب کی مددگار، اور سب کے حصول کا وسیلہ و ذریعہ ہے۔ گویا یوں سمجھئے کہ شریعت کا آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے اور پھر شریعت کا قیام و بقا بھی اسی پر منحصر ہے پہلے مرحلہ میں اس کا لازمہ زکوٰۃ ہے۔ دوسرے مرحلہ میں اس کا ساتھی صبر ہے۔ دین جب عقیدہ سے نکل کر عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کا اوّلین قدم یہی ہوتا ہے اور پھر دین کی اقامت اور عہد الٰہی کی تجدید کے لیے جو جدّ و جہد عمل میں آتی ہے اس میں بھی اوّلین اہمیت اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی اس اہمیت کے سبب سے ہم چاہتے ہیں کہ اس کے دونوں پہلوؤں پر بالاجمال گفتگو کریں۔ اس فصل میں اس پر پہلے نقطۂ نظر سے گفتگو کریں گے، اس کے بعد مستقل عنوان سے اس کے دوسرے پہلو کی وضاحت کریں گے۔

احکام شریعت کی بنا نماز اور زکوٰۃ پر ہے

ساتویں فصل میں ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ تمام احکام شریعت کی بنیاد درحقیقت نماز اور زکوٰۃ پر ہے۔ نماز ان تمام احکام کا سرچشمہ ہے جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور زکوٰۃ ان تمام احکام کا منبع ہے جو حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ یہاں موقع کے اقتضا سے ہم چند ایسی آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان جو عہد و پیمان ہوا ہے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اس میں جس چیز کو حاصل ہے وہ نماز ہے۔ بنی اسرائیل کے میثاق کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا ہے:۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	اور یاد کرو جب کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا
وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ	اور اٹھائے ان میں سے بارہ نقیب اور اللہ نے کہا کہ
وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ	میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرتے رہوگے
وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ	اور زکوٰۃ دیتے رہوگے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤگے
وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ	اور ان کی مدد کروگے اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہوگے
قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ	اگر تم یہ سب کچھ کرتے رہوگے تو میں تمہارے گناہ
سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ	تمہارے اوپر سے جھاڑ دوں گا اور تم کو ایسے باغوں
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ	میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری
ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ	ہوں گی، لیکن جس نے اس عہد کے بعد تم میں سے
السَّبِيْلِ (۱۲- مائدہ)	کفر کیا تو وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔

یہ قرآن مجید نے اس عہد کا حوالہ دیا ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا۔ اس میں دیکھیے کہ پہلی چیز جس کا

ذکر آیا ہے وہ نماز کا قائم رکھنا ہے۔

اسی طرح جہاں بنی اسرائیل کے دورِ زوال و انحطاط کا ذکر کیا ہے وہاں سب سے پہلے ان کے اندر سے جس چیز کے غائب ہونے کا ذکر کیا ہے وہ نماز ہی ہے اور اسی کے غائب ہونے کا نتیجہ یہ بیان کیا ہے کہ وہ شہوات و خواہشات کے پیچھے پڑ گئے۔ فرمایا۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا	پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آئے جنھوں نے
الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ	نماز ضائع کر دی اور شہوات کے پیچھے پڑ گئے تو یہ
يَلْقَوْنَ غَيًّا (۵۹ - مریم)	عنقریب ایک بڑی گمراہی سے دوچار ہوں گے۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عہدِ الٰہی پر قائم رہنے کے لیے پہلی چیز جو مطلوب ہے وہ نماز کا قائم رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ	جو کتابِ الٰہی کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے ہیں اور
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ	جنھوں نے نماز قائم کی (تو وہی لوگ مصلح ہیں) اور ہم
الْمُصْلِحِيْنَ ○ (۱۷۰ - اعراف)	مصلحین کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔

اس آیت سے ایک طرف تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کتاب اللہ یا بالفاظ دیگر عہدِ الٰہی پر قائم رہنا صرف ان لوگوں کے لیے ممکن ہے جو نماز کو قائم کرنے والے ہوں اور دوسری بات اس سے یہ نکلتی ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں اور لوگوں کو اس پر مضبوطی کے ساتھ جمانے رکھنے کے لیے نماز قائم کریں درحقیقت وہی لوگ ہیں جو اس زمین کی اصلاح کرنے والے ہیں اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی سعیِ اصلاح کا اجر پائیں گے۔

۳۰۔ صبر اور نماز اقامتِ دین کی جدّ و جہد میں وسیلۂ ظفر ہیں

نماز کی یہ اہمیت میثاقِ الٰہی کے پہلو سے بیان ہوئی ہے جس میں اس کے تابع کی حیثیت زکوٰۃ کو حاصل ہوئی ہے۔ اب ہم مختصر طور پر اقامتِ دین کی جدوجہد کے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیں گے جس میں اس کے پہلو بہ پہلو صبر کا ذکر آتا ہے اور جس کی طرف وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کی زیرِ بحث آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد میں کامیابی کا انحصار صبر اور نماز پر

قرآنِ حکیم میں تدبر کرنے والوں پر یہ حقیقت واضح ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں کامیابی کا انحصار اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں پر رکھا ہے۔ ایک صبر پر اور دوسرے نماز پر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے اندر اقامتِ دین کی جو جدوجہد شروع کی اس میں اپنی قوم کو انہی دو چیزوں سے مدد حاصل کرنے کی تلقین کی۔ فرمایا۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا (۱۲۸۔ اعراف) — اور موسیٰ نے اپنی قوم کو نصیحت کی کہ اللہ سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔

اس آیت میں اگرچہ نماز کی بجائے اللہ کا لفظ آیا ہے لیکن ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استعانت کا واحد ذریعہ نماز ہی ہے۔ چنانچہ دوسری آیات میں اس چیز کی تصریح کر دی گئی ہے۔

اسی طرح مسلمانوں نے جب اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد شروع کی اور اس راہ کی آزمائشوں سے انھیں سابقہ پیش آیا تو انھیں بھی صبر اور نماز ہی سے مدد حاصل کرنے کی نصیحت کی گئی ہے۔ فرمایا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (۱۵۳۔۱۵۷۔ بقرہ)

اے ایمان والو، صبر اور نماز سے مدد چاہو، بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ خدا کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمھیں احساس نہیں ہوتا۔ اور ہم تمھیں آزمائیں گے کسی قدر خطرہ، بھوک، اور مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے اور خوش خبری دو ان ثابت قدموں کو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کسی آزمائش سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ راہ یاب و بامراد ہونے والے ہیں۔

ٹھیک یہی تلقین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار مکی زندگی کے اس دور میں کی گئی ہے جب آپ نے اسلام کی دعوت بلند کی اور آپ کو ہر طرف سے مخالفوں اور معاندوں نے گھیر لیا۔ چنانچہ مکی سورتوں میں کفار و مشرکین کی مخالفت کے ذکر کے بعد بالعموم آپ کو ثابت قدم رہنے اور ساتھ ہی نماز پڑھنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ اس کی مثالیں اکثر سورتوں میں مل سکتی ہیں۔ ہم بخیالِ اختصار صرف چند آیتوں کا حوالہ دیتے ہیں۔

فرمایا۔

فَاصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا (۱۳۰۔ طٰہٰ) — پس جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے۔

فَاصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ — پس صبر کرو ان باتوں پر جو یہ کہتے ہیں اور اپنے

بِحَمْدِ رَبِّكَ (۳۹۔ ق)	رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔
وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا	اور ثابت قدم رہو اپنے رب کے فیصلہ تک۔
وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ	بے شک تم ہماری نگاہوں میں ہو اور اپنے رب کی حمد
تَقُومُ (۴۸۔ طور)	کے ساتھ اس کی تسبیح کرو جس وقت تم اٹھتے ہو۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ صبر اور نماز یہ دو ہتھیار ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حق و باطل کی کشمکش میں باطل کا مقابلہ کرنے کے لیے دیے ہیں اور اگر ان دونوں کی فطرت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں باہم دگر ایک دوسرے کو غذا اور قوت بہم پہنچاتے ہیں۔ صبر سے نماز کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور نماز سے صبر کو غذا اور قوت ملتی ہے۔ نماز جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے، بڑی صبر طلب چیز ہے۔ جب تک کسی شخص میں صبر کی پختہ صفت موجود نہ ہو اس وقت تک وہ نماز کا صحیح حق ادا نہیں کر سکتا[1] اس پہلو سے صبر نماز کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اسی طرح صبر جس کی اصل حقیقت زندگی کے مراحل میں موقف حق پر ڈٹے رہنا ہے، کسی مضبوط سہارے کے بغیر انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ مضبوط سہارا اگر کوئی ہو سکتا ہے تو خدا ہی کا سہارا ہو سکتا ہے جو سب سے بہتر طریقہ پر نماز کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ (ثابت قدم رہو اور تمہارا ثابت قدم رہنا ممکن نہیں ہے مگر اللہ ہی کے سہارے سے) (۱۲۷۔ نحل)

مشکلات و مصائب کے مقابل میں اپنے موقف پر جمے رہنا، حوصلہ کو پست نہ ہونے دینا، ایک نہایت اعلیٰ وصف ہے جس کے بغیر نہ کسی فرد کی زندگی سنورتی ہے اور نہ کسی قوم کی زندگی بنتی ہے اس وجہ سے قومیں اپنے افراد کے اندر اس چیز کو پیدا کرنے کے لیے مختلف قسم کی تدبیریں اختیار کرتی ہیں۔ اس زمانے میں سب سے بہتر نسخہ اس کی تربیت کے لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ افراد کے اندر شہرت و ناموری کے جذبہ کو ابھارا جائے یا قومی عزت اور ناموس وطن کی رگ حمیت کو چھیڑا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک قسم کی گرمی دلوں کے اندر ان چیزوں سے بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن ان کا پیدا کیا ہوا نشہ شراب کے نشہ کی طرح عارضی اور ناعاقبت اندیشانہ ہوتا ہے۔ برعکس اس کے مذہب انسان کے عزم و حوصلہ کی تربیت اس طرح کرتا ہے کہ ایک طرف اس کی زندگی کے ہر مرحلہ کے

---

[1] استاذ امامؒ کا خیال تو یہ ہے کہ اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ میں اصل مقصود نماز پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جانے کی تاکید ہے۔ اس کے ساتھ صبر کا ذکر جو آیا ہے وہ محض اس لیے کہ اس کی حیثیت نماز کے لیے شرط اور ذریعہ کی ہے کیوں کہ نماز پر استقلال کے ساتھ جمے رہنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ نماز کی مثال مولانا کے نزدیک ایک عظیم محل کی ہے جس کی تعمیر صرف ایک محکم بنیاد ہی پر ممکن ہے۔ مولانا کا استدلال وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور اس پر جم جاؤ ۱۳۲۔ طٰہٰ) اور اس مضمون کی بعض دوسری آیات سے ہے۔ ہمارا نقطۂ نظر ذرا اس سے مختلف ہے۔

ییسا ایک موقف حق متعین کر دیتا ہے اور اس پر ڈٹ جانے کی تاکید کرتا ہے دوسری طرف اس کو نماز کے واسطے سے آسمان و زمین کی سب سے بڑی طاقت سے جوڑ کر اس کو زندگی کا یہ ملکوتی نصب العین دے دیتا ہے کہ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (کہہ دو، میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ ۱۶۲- انعام) غور کیجیے کہ حق پر استوار رہنے اور باطل سے نبرد آزما ہونے کے لیے جو روح اس تربیت سے پیدا ہو سکتی ہے، وہ تمغے اور انعامات کی لالچ اور حب قومی و وطنی کے کھوکھلے نعروں سے پیدا ہو سکتی ہے؟

یہاں ایک لطیف نکتہ اور بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ جہاں جہاں نماز کا ذکر اقامت دین کی جدوجہد کے وسیلہ یا ہتھیار کی حیثیت سے ہوا ہے وہاں اوّل تو اس کے ساتھ صبر کا ذکر ضرور ہوا ہے ثانیاً صبر کا ذکر ہر جگہ نماز پر مقدم ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق کو قائم کرنے اور باطل کو شکست دینے کی جدوجہد میں مقدم شے جو مطلوب ہے وہ مردانہ اقدام اور راہِ حق میں عزیمت و استقامت ہے۔ آدمی اگر اپنے اس جوہر کو نمایاں کرے اور ساتھ ہی نماز کا اہتمام کرے تو اس کے اس جوہر کو جلا ملتی ہے اور راہ حق کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کا سینہ کھلتا اور اس کا دل ایمان و یقین سے لبریز ہوتا ہے۔ لیکن آدمی اگر اپنے ارادے اور عزم کو کوئی حرکت نہ دے، صرف کسی حجرے میں بیٹھا ہوا اللہ ہو کا ورد کرتا ہے تو یہ نماز زیر بحث مقصد کے لیے بالکل غیر مفید ہے۔

۳۱- مجموعۂ آیات ۴۰-۴۶ کی ایک خاص تعلیم اصلاحِ ملّت کے نقطۂ نظر سے

مذکورہ بالا مجموعہ آیات سے جو تمام تعلیمات و ہدایات نکلتی ہیں بقدرِ ضرورت ہم ان کی وضاحت کر چکے ہیں۔ اب ہم ایک خاص حقیقت کی طرف توجہ دلائیں گے جو انہی آیات سے نکلتی ہے اور اصلاحِ امّت کے نقطۂ نظر سے جس کی بڑی اہمیت ہے۔

اوپر کی فصلوں میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ نماز کو میثاقِ خداوندی کے اندر ایمان کے بعد اولین اہمیت حاصل ہے اور یہ بات بھی بیان ہو چکی ہے کہ میثاقِ خداوندی کی تجدید کی جدوجہد میں بھی نماز ہی درحقیقت روح اور وسیلۂ ظفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں اعراف کی آیت ۱۷۰ اَلَّذِیْنَ یُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِیْنَ کی روشنی میں ہم یہ بات بھی واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کے نزدیک اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ کتاب اللہ کو جو اصل میثاق ہے، پوری مضبوطی سے تھاما جائے، اس پر خود قائم ہو کر دوسروں کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور کسی حال میں بھی یہ حبل اللہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ دی جائے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے اولین عہد کی حیثیت سے بھی اور وسیلۂ ظفر اور ذریعہ کامیابی ہونے کے پہلو سے بھی نماز کے قائم کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ قرآن کے نزدیک یہی اصلاح کا راستہ ہے اور جو لوگ یہ راستہ اختیار کریں وہی لوگ ملّت کے حقیقی مصلح ہیں جن کا اجر اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرے گا۔

قرآن حکیم کا یہ بیان تجدید دین و اصلاح ملّت کی تمام تحریکات اور تمام دعوتوں کے جانچنے کے لیے ایک کسوٹی فراہم کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف وہ دعوت یا تحریک اصلاح ملّت کی صحیح دعوت یا تحریک ہے جس کے مبداء و معاد، جس کی ابتدا اور انتہا، جس کے عقیدہ اور عمل، جس کے نصب العین اور پروگرام دونوں میں نماز اور اقامتِ نماز کو وہی اولیت و اہمیت حاصل ہو جو اللہ کے عہد اور اس کی اقامت کی جدوجہد میں فی الواقع از روئے قرآن اس کو حاصل ہے۔ جس دعوت یا تحریک میں نماز کو یہ اولیت و اہمیت حاصل نہ ہو وہ تجدید دین اور اصلاحِ ملّت کے نقطہ نظر سے ایک بے برکت بلکہ لاحاصل کام ہے، کیوں کہ وہ اس ریڑھ کی ہڈی سے بھی محروم ہے جس پر تجدید دین کی دعوت کا قالب کھڑا ہوتا ہے اور اس روح سے بھی محروم ہے جس سے اس قالب کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔

۳۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۴۷-۶۲

آگے یہود کو از سرِ نو مخاطب کر کے پہلے تو ایک مختصر تمہید میں ان کو اس بات کی یاد دہانی کی گئی ہے کہ فضیلت و بزرگی تمہیں جو کچھ بھی حاصل ہوئی ہے محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوئی ہے۔ اس میں نہ تو تمہارے استحقاق کو کوئی دخل ہے، نہ تمہارے خاندانی شرف کو۔ اس وجہ سے اس قسم کے کسی وہم یا گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اس دعوتِ حق سے منہ نہ موڑو جو تمہارے سامنے پیش کی گئی ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ ایک دن آنے والا ہے جس میں تمہیں اپنے اعمال کی خود ہی جواب دہی کرنی ہے، تمہارے فرائض سے متعلق نہ تو دوسروں سے سوال ہوگا اور نہ دوسرے تمہاری طرف سے کوئی جواب دہی کریں گے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کی ابتدائی تاریخ کے چند اہم واقعات کے حوالے دے کر ان کے سامنے تین حقیقتیں واضح فرمائی ہیں۔ *یہود کے سامنے تین حقیقتوں کی وضاحت*

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر جتنے بھی انعامات کیے ہیں سب تمہاری ناشکریوں کے باوجود محض اپنے فضل و کرم سے کیے ہیں۔ تمہاری پوری تاریخ شاہد ہے کہ تم نے اپنی ناسپاسی اور ناشکری کے سبب سے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کی ہے لیکن اس نے تمہارے اس کفرانِ نعمت کے باوجود تم کو اپنے احسانات سے نوازا ہے۔ اس وجہ سے تمہیں اپنے تقدس و تقرب کا بہت زیادہ غرور نہیں ہونا چاہیے۔

دوسری یہ کہ تم کو جو نعمت بھی خدا نے بخشی ذمہ داریوں اور فرائض کے ساتھ بخشی، خاندانی ورثہ کے طور پر نہیں بخشی، چنانچہ تمہاری تاریخ گواہ ہے کہ جب جب تم نے کسی نعمت کا حق ادا کرنے اور اس سے پیدا ہونے والی ذمہ داریاں پوری کرنے میں کوتاہی کی ہے تم پر مار بھی بڑی ہی سخت پڑی ہے۔

تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کو بھی کوئی شرف یا تقرب اس کے ذاتی یا خاندانی استحقاق یا کسی گروہ کے ساتھ نسبت رکھنے کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور عمل صالح کی بنا

پر حاصل ہوتا ہے۔

یہ سارا مضمون آیت ۴۰ سے شروع ہو کر آیت ۱۲۲ پر ختم ہوتا ہے اور مقصود اس ساری تفصیل سے بنی اسرائیل کی ان بیماریوں کو دور کرنا ہے جن کے سبب سے قرآن کی دعوت ان کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش بن گئی تھی۔

اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر اب آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ فرمایا۔

آیات ۴۷ - ۶۲ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ
فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ
نَّفْسٍ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ
وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ
سُوْۗءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ
ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ
وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى
اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾
ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا
مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى
لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى
بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ۭ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ
نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ
تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا
حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ
نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿٥٩﴾ ع وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى ع
لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا
عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا
مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٦٠﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ
يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ
لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّاۗىِٕهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا
وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ
خَيْرٌ ۭ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ
الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾ ع اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ ع
الَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

ترجمۂ آیات ۴۷-۶۲ اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی اور اس بات کو کہ میں نے تمھیں دنیا والوں پر فضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی، نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوگی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔ ۴۷-۴۸

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم کو آل فرعون کے قبضہ سے چھڑایا۔ وہ تمھیں بُرے عذاب چکھاتے تھے۔ تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بڑی ہی آزمائش تھی۔ ۴۹

اور یاد کرو جب کہ ہم نے دریا کو پھاڑ کر تمھیں پار کرایا، پس تمھیں نجات دی اور آل فرعون کو غرق کر دیا اور تم دیکھتے رہے۔ ۵۰

اور یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰؑ سے چالیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظلم کرنے والے ہو۔ پھر ہم نے تم سے درگزر کیا اس کے بعد تاکہ تم شکرگزار بنو۔ ۵۱-۵۲

اور یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور فرقان تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔ ۵۳

اور یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو اور اپنے مجرموں کو اپنے ہاتھوں قتل کرو، یہ تمھارے لیے تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے تو اس

نے تمھاری توبہ قبول فرمائی، بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ۵۴

اور یاد کرو جب کہ تم نے کہا کہ اے موسیٰؑ، ہم تمھارا یقین کرنے والے نہیں ہیں، جب تک ہم خدا کو کھلم کھلا دیکھ نہ لیں تو تم کو کڑک نے آدبوچا اور تم دیکھتے رہ گئے۔ پھر ہم نے تمھاری موت کے بعد تمھیں اٹھایا تاکہ تم شکر گزار بنو۔ اور تم پر بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر من وسلویٰ اتارے، کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں۔ اور انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ ۵۵، ۵۶، ۵۷

اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا، داخل ہو جاؤ اس بستی میں، پس کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو فراغت کے ساتھ اور داخل ہو دروازے میں سر جھکائے ہوئے اور دعا کرو کہ اے رب! ہمارے گناہ بخش دے، ہم تمھارے گناہ بخش دیں گے اور اچھی طرح حکم بجا لانے والوں پر ہم مزید فضل کریں گے تو جنھوں نے ظلم کیا انھوں نے بدل دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی دوسری بات سے پس ہم نے ان لوگوں پر جنھوں نے ظلم کیا ان کی نافرمانی کے سبب سے آسمان سے عذاب اتارا۔ ۵۸، ۵۹

اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا اپنی لٹھیا پتھر پر مارو تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ متعین کر لیا۔ کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے اور نہ بڑھو زمین میں فساد مچانے والے بن کر۔ ۶۰

اور یاد کرو جب کہ تم نے کہا اے موسیٰ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے تو اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کرو کہ وہ ہمارے لیے ان چیزوں میں سے نکالے جو زمین اگاتی ہے اپنی سبزیوں، ککڑیوں، لہسن، مسور اور پیاز میں سے۔ کہا، کیا تم اعلیٰ کو ادنیٰ سے بدلنا چاہتے ہو، کسی شہر میں اترو تو وہ چیز تمھیں ملے گی جو تم نے طلب کی ہے اور ان پر ذلت اور پست ہمتی

تھوپ دی گئی اور وہ خدا کا غضب لے کر لوٹے۔ یہ اس سبب سے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جانے والے تھے۔ ۶۱

بے شک جو ایمان لائے، جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، ان میں سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا اور جس نے عمل صالح کیا تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے اور ان کے لیے کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۶۲

۳۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ (۴۷)

بنی اسرائیل کی فضیلت کی نوعیت

لفظ نعمت کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ یہاں اس پر وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ کو عطف کیا ہے۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر اس اجمال کی وضاحت کر رہا ہے جو نعمت کے لفظ کے اندر موجود ہے۔ اس فضیلت سے مراد قوموں کی ہدایت و رہنمائی کا وہ منصب ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک خاص دور میں منتخب فرمایا۔ جو فضیلت کسی منصب کی ذمہ داریوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، وہ ایک مشروط فضیلت ہوتی ہے۔ اگر صاحب منصب قوم اس ذمہ داری کو ادا کرتی ہے تو یہ فضیلت اس کو حاصل رہتی ہے اور اگر اس کو چھوڑ بیٹھتی ہے تو صرف اس فضیلت ہی سے محروم نہیں ہو جاتی جو اسے بخشی گئی تھی بلکہ کفران نعمت کی پاداش میں اس کو مزید براں ذلت بھی نصیب ہوتی ہے۔ یہاں بنی اسرائیل کو یہ بات یاد دلائی گئی ہے کہ جس فضیلت پر تمھیں ناز ہے وہ فضیلت خدا ہی کی عطا کردہ تھی، اگر اس کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو خدا کے عہد پر قائم رہو اور اس کا حق ادا کرو۔ خدا کے عہد سے نکل کر تم اس فضیلت کو قائم نہیں رکھ سکتے۔

قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بنی اسرائیل کے منتخب کیے جانے کا ذکر قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:۔ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰي عِلْمٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۳۲۔ دخان (اور ہم نے ان کو دنیا والوں کی رہنمائی کے لیے منتخب کیا، دیکھ بھال کر) یہاں عَلٰي عِلْمٍ کے الفاظ سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ انتخاب کسی اندھے کا انتخاب نہیں تھا کہ جس پر ہاتھ پڑ گیا اس کو اس نے منتخب کر دیا۔ بلکہ یہ کام ایک صاحب علم و بصیرت نے کیا ہے جو اپنے علم و بصیرت سے یہ معلوم کر سکتا ہے کہ کب یا اس منصب کے اہل ہیں اور کب نہیں ہیں۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۴۸)

جَزٰى عَنْہُ کے معنی ہیں، اس کی طرف سے ادا کر دیا، یا اس کی طرف سے کافی ہو گیا۔ لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا کے معنی ہوں گے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کچھ کام نہ آ سکے گا جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہوگی کوئی دوسرا اس کی طرف سے وہ ادا نہ کر سکے گا۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے مثلاً وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى[1] (اور کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھا سکے گی) وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا[2] (اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی باپ اپنی اولاد کے کام نہ آ سکے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کے کچھ کام آ سکے گا) اس دن ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (۳۷۔ عبس)

’شفاعت‘ کا مفہوم

شفاعت، شفع سے ہے۔ شَفَعَ الشیء کے معنی ہیں، اس کے ساتھ اسی طرح کی چیز کو ملا کر اس کو جوڑا کر دیا۔ شفع لفلان یا شفع فیہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کی بات یا درخواست کے ساتھ کوئی شخص اپنی تائید یا سفارش ملا کر اس کو مؤید کر دے۔

عدل کے معنی انصاف کے ہیں۔ فرمایا اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ[3] (یہ کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو) پھر یہیں سے یہ لفظ مساوی اور برابر کے معنی میں استعمال ہوا۔ فرمایا اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا[4] (یا اس کے برابر روزے) نیز فدیہ کے معنی میں استعمال ہوا کیونکہ فدیہ جس کا فدیہ ہوتا ہے اس کے برابر سمجھا جاتا ہے۔

عربیت کا ایک اسلوب

لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ میں عربی زبان کا وہ اسلوب ملحوظ ہے جس میں بظاہر تو ایک شے کے لازم کی نفی ہوتی ہے لیکن مقصود درحقیقت ملزوم کی نفی ہوتی ہے۔ امراء القیس نے اپنے ایک شعر میں ایک صحرائی راستہ کی تعریف کی ہے کہ لا یھتدی بمنارہ (اس کی برجیوں سے رستہ معلوم نہیں کیا جاتا) ظاہر ہے کہ اس طرز تعبیر سے اس کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اس صحرا میں رہنمائی کے لیے برجیاں اور منارے سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ اسی اسلوب پر یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس دن نہ کوئی ان کے لیے شفاعت کرنے والا ہوگا، نہ کوئی شفاعت قبول ہوگی، نہ کسی کے پاس دینے کے لیے معاوضہ ہوگا، نہ کسی سے معاوضہ لیا جائے گا، نہ کسی کے حامی اور مددگار ہوں گے، نہ کسی کی حمایت و مدد کی جا سکے گی۔ یہی حقیقت دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان ہوئی ہے فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ[5] (پس ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ نفع نہیں دے گی) اور پھر دوزخیوں کی زبان سے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ[6] (نہ ہمارے کوئی سفارش کرنے والے ہیں اور نہ سرگرم دوست)

---

[1] ۳۸:۵۳۔ النجم [2] لقمان ۳۳ [3] ۵۸۔ نساء [4] ۹۵۔ مائدہ [5] ۴۸۔ مدثر [6] ۱۰۰۔ شعراء

بنی اسرائیل کو حضرت ابراہیمؑ حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوب علیہم السلام جیسے انبیاء کی اولاد میں سے ہونے کا جو گھمنڈ تھا اور جس کی بنا پر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ان کی نجات کے لیے ان بزرگوں کی نسبت اور سفارش ہی کافی ہو گی، یہ آیت ان کے اس واہمہ کی جڑ کاٹ رہی ہے اور ان کو اس بات کی یاد دہانی کر رہی ہے کہ خدا کے ہاں کام آنے والی اصل چیز عہد الٰہی کی پابندی اور ایمان و عمل صالح ہے۔ اس سے بے پروا ہو کر محض آرزوؤں کے ہوائی قلعہ پر اعتماد نہ کرو۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۴۹)

آل کا مفہوم

آلِ فرعون، یعنی قوم فرعون[1]۔ آل سے مراد صرف کسی شخص کی اولاد نہیں ہوا کرتی بلکہ یہ لفظ آل و اولاد، قوم و قبیلہ اور اتباع و انصار سب پر حاوی ہے۔

نابغہ ذبیانی کا شعر ہے:

من آل میة رائح او مغتدی   عجلان ذا زاد و غیر مزود

میہ کے قبیلہ کے لوگوں میں کوئی صبح روانہ ہوا کوئی شام، کوئی زاد راہ کے ساتھ، کوئی بغیر زاد راہ کے۔

سورہ مومن ۴۵ میں ہے، وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْۗءُ الْعَذَابِ (اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا) سورۂ اعراف میں ہے۔ وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ ۱۳۰ (اور ہم نے آل فرعون کو قحط اور پھلوں کی کمی میں مبتلا کیا)

ان آیات میں جس عذاب کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ فرعون اور اس کی ساری قوم ہی پر آیا، نہ کہ صرف اس کی اولاد پر، اس کی اولاد کا تو کہیں ذکر بھی نہیں ہے۔ بلکہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے وہ اس کا بے اولاد ہونا ثابت کرتے ہیں۔ تورات میں یہ ذکر ضرور ہے کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کو بچپن میں دریا سے جس نے نکلوایا تھا وہ فرعون کی لڑکی تھی لیکن قرآن نے اس غلطی کی بھی تصحیح کر دی ہے کہ یہ اس کی لڑکی نہیں بلکہ اس کی بیوی تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے۔ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ لَا تَقْتُلُوْهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ[2] (اور فرعون کی بیوی نے کہا، یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اس کو قتل نہ کرو۔ ممکن ہے ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنا لیں اور وہ اس بات کے انجام کا احساس نہیں رکھتے تھے)

سوم کے معنی

سَوم کے معنی کسی پر کوئی بوجھ یا بار ڈالنے کے ہیں، کہیں گے سامہ ظلما و سامہ خسفا اس کو ظلم کا یا ذلت کا مزہ چکھایا۔ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ (وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور

---

[1] لفظ آل کی یہ تحقیق مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن سے ماخوذ ہے۔ [2] ۹ قصص

تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے) یہ اس عذاب ظلم و ذلت کی تفصیل ہے جس میں فرعونیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے۔ اگرچہ مصر میں بنی اسرائیل پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے تھے اور بے شمار قسم کی ذلتوں سے انہیں سابقہ تھا جن کی تفصیل ان کی تاریخ میں موجود ہے لیکن یہاں ذکر صرف دو ہی باتوں کا بطور نمونہ فرمایا ہے، ان نمونوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل وہاں کس شکنجہ میں تھے۔

بلاغت کا ایک نکتہ

بیٹوں کے قتل کے اسباب اور اس کی نوعیت کی تفصیل تو کسی موزوں مقام پر آئے گی یہاں البتہ بلاغت کا ایک نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ لڑکوں کے ذبح کا ذکر جو کیا ہے تو (ابناء) بیٹوں کے لفظ سے کیا ہے تاکہ شفقت پدری کا جذبہ ابھرے اور لڑکیوں کے زندہ رکھنے کا ذکر کیا ہے تو ان کے لیے (نساء کم) تمھاری عورتوں کا لفظ استعمال کیا ہے اس لیے کہ غیرت کو حرکت میں لانے کے لیے یہ تعبیر زیادہ موثر تھی۔

وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ (اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی) اس آزمائش کے کٹھن ہونے کی طرف یہاں اشارہ اس لیے فرمایا کہ اس نجات کی اہمیت کا انھیں کچھ اندازہ ہو سکے جو انھیں حاصل ہوئی کہ کیسا عظیم ابتلا تھا جس سے ان کے رب نے ان کو چھڑایا، اگر وہ نہ چھڑاتا تو کوئی دوسری طاقت اس عذاب سے ان کو نہیں چھڑا سکتی تھی۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۵۰)

فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم نے تمھیں ساتھ لے کر دریا کو پھاڑتے ہوئے عبور کیا۔ مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح کوئی کسی کو گود میں اٹھا کر دریا پار کرا دے اسی طرح ہم نے تمھیں پار کرایا۔

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ، یعنی اپنی نجات کے بعد فرعون اور اس کے غرق ہونے کا ماجرا تم نے ساحل پر کھڑے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

واقعات کو پیش کرنے کی ایک مخصوص نوعیت

یہاں تاریخ بنی اسرائیل کے جن واقعات کی طرف اشارات کیے جا رہے ہیں ان کے متعلق دو باتیں ملحوظ رہنی چاہییں۔

ایک یہ کہ یہ تمام واقعات بنی اسرائیل کی تاریخ کے نہایت اہم اور مشہور واقعات ہیں جن سے ان کا بچہ بچہ واقف تھا اس وجہ سے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف اشارات کافی تھے۔

دوسری یہ کہ زمانۂ نزولِ قرآن کے بنی اسرائیل ان واقعات کو اپنی تاریخ کے واقعات کی حیثیت سے نہ صرف مانتے تھے بلکہ ان پر فخر کرتے تھے اس بنا پر قرآن نے ان واقعات کو ان کے سامنے اس طرح پیش کیا ہے گویا یہ انھیں کے ساتھ پیش آئے ہیں، یہ بلیغ اسلوب بیان اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے نہایت موثر اور مفید ہے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِہٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (۵۱) ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۵۲)

یہ اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو مصر سے نکلنے اور دریا پار کر چکنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام

سے اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام و ہدایات دینے کے لیے فرمایا اور اس مقصد کے لیے ان کو طور پر بلایا۔ یہ چالیس دن کی مدت اس قلبی و روحانی تیاری کے لیے تھی جو کتاب الٰہی کے بارِ عظیم کے متحمل ہونے کے لیے ضروری تھی ابتداءً یہ وعدہ تیس دنوں کا تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام مقررہ وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ ان کی اس جلدی کے سبب سے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تربیت مقتضی ہوئی کہ یہ مدت ۳۰ دنوں سے بڑھا کر چالیس دن کر دی جائے مذکورہ آیت میں یہ پوری مدت جمع کر دی گئی ہے سورۂ اعراف میں اس کی تفصیل اس طرح ہے۔ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا دس راتیں بڑھا کر۔ اس طرح اس کے رب کی مقررہ مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی)

گوسالہ پرستی کا واقعہ

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ، یعنی موسیٰ کے پہاڑ پر چلے جانے کے بعد تم وہاں ایک بچھڑا بنا کر اس کی پرستش میں لگ گئے۔ کتاب خروج باب ۳۲ میں اس واقعہ کی تفصیلات موجود ہیں لیکن یہود نے اپنی عادت کے مطابق اس میں حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی ملوث کر دیا ہے جس کی قرآن نے دوسرے مقام پر تردید فرمائی ہے:۔

> اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلے کیوں کہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہو گیا۔ . . . . تب خداوند نے موسیٰ کو کہا نیچے جا کیوں کہ تیرے لوگ جن کو تو ملک مصر سے نکال لایا بگڑ گئے ہیں۔ وہ اس راہ سے جس کا میں نے حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لیے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے اسرائیل یہ تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ یہ گردن کش قوم ہے اس لیے تو مجھے چھوڑ دے کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں ان کو بھسم کر دوں (باب ۳۲ - آیات ۱-۷)

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ، یعنی اس گوسالہ پرستی کا ارتکاب کر کے تم نے خود اپنی جانوں پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ چنانچہ دو ہی آیتوں کے بعد قرآن نے خود اس کی وضاحت کر دی ہے یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ (اے میری قوم کے لوگو، تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا) ظلم کی اصل حقیقت حق تلفی کرنا ہے۔ شرک کا ارتکاب کر کے انسان اپنے نفس کی سخت تحقیر کرتا ہے کیونکہ وہ خدا کا خلیفہ اور تمام مخلوقات سے اشرف ہونے کے باوجود اپنے ہی جیسی یا اپنے سے بھی کسی گھٹیا مخلوق کو اپنا خدا بنا بیٹھتا ہے۔ اپنے نفس کی اس سے بڑی حق تلفی اور کیا ہو سکتی ہے؟

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ، (۵۳)

فرقان کا مفہوم

فرقان کے معنی ہیں حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز یہاں واؤ بیان اور تفسیر کے لیے ہے۔

یعنی کتاب (تورات) ہی کو فرقان کے لفظ سے تعبیر کر کے اس کے ایک اور پہلو کو واضح کر دیا ہے۔ قرآن مجید میں قرآن اور تورات دونوں کے لیے فرقان کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ ۴۸۔ انبیاء (اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان دی) اسی طرح قرآن مجید کے متعلق ہے۔ تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ ۱۔ الفرقان (بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا)

ان کتابوں کو فرقان کے لفظ سے تعبیر کرنے میں کئی پہلو مدِ نظر ہیں۔ ایک یہ کہ یہ تمام احکام و ہدایات کی تفصیل پیش کرتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ حق و باطل اور حرام و حلال کے درمیان امتیاز کرتی ہیں۔ تیسرا یہ کہ اپنے مدعا و مقصد میں بالکل واضح ہیں۔ چوتھا یہ کہ ان سے انسان کو وہ حکمت حاصل ہوتی ہے جو زندگی کے تمام نشیب و فراز میں خیر و شر کی شناخت کے لیے روشنی بخشتی ہے۔

قرآن نے معرکۂ بدر کو بھی فرقان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اس لیے کہ اس نے بھی حق و باطل کو اچھی طرح آشکارا کر دیا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۵۴)

لفظ برء کا مفہوم

برء کا مفہوم لفظ خلق کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک ہی جگہ اللہ تعالیٰ کی تین صفتیں بیان ہوئی ہیں (هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ) خلق کا مفہوم ہے کسی چیز کا خاکہ [illegible] تیار کرنا، برء کا مفہوم ہے اس کو ٹھیک ٹھاک کرنا، تصویر کے معنی ہیں اس کو مکمل کرنا۔ اس اعتبار سے اگرچہ خالق اور باری دونوں لفظوں کے لغوی مفہوم میں ایک باریک سا فرق ہے لیکن عام استعمال میں دونوں ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہیں۔

'فاقتلوا انفسکم' کا مطلب

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (پس اپنے آپ کو قتل کرو) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اپنی تلواریں خود اپنی گردنوں پر چلا دو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قبیلہ میں سے جو لوگ اس فتنۂ شرک و گوسالہ پرستی سے الگ رہے ہیں اپنے اپنے قبیلہ کے ان لوگوں کی گردنیں اپنے ہاتھوں سے ماریں جنھوں نے قوم کے لیے اس فتنۂ ارتداد کی راہ کھولی ہے۔ یہ حکم دینے میں چند عظیم مصلحتیں تھیں۔

ایک یہ کہ اس طرح اس توبہ نے ایک اجتماعی توبہ کی شکل اختیار کر لی۔ گویا بنی اسرائیل کے اجتماعی ضمیر نے ان لوگوں کو اپنے اندر سے کاٹ پھینکا جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے عہدِ توحید کی اہانت کی تھی۔

دوسری یہ کہ اس سے توحید کی حقیقی عظمت اور شرک کی حقیقی کراہت پورے طور پر واضح ہو گئی۔ گویا شرک ایک ایسی برائی ہے کہ اگر آدمی کا بایاں ہاتھ اس کا ارتکاب کرے تو اس کے داہنے ہاتھ کا فرض ہے کہ اپنے بائیں ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دے۔ اس معاملہ میں نہ کسی مداہنت اور رواداری کو دخیل ہونے دے

اور نہ کسی قرابت اور رشتہ داری کا لحاظ کرے۔

تیسری یہ کہ ہر قبیلہ و خاندان کے اخیار اگر اپنے اپنے قبیلوں کے اشرار پر تلوار اٹھائیں گے تو اس سے خاندانی اور قبائلی عصبیت نہیں ابھرے گی بلکہ بغیر کسی فتنہ کے اندیشہ کے بنی اسرائیل کی تطہیر ہو جائے گی۔

تورات کے مطالعہ سے بھی تقریب قریب یہی بات نکلتی ہے۔ چنانچہ کتاب خروج میں ہے۔

"جب موسیٰ نے دیکھا کہ لوگ بے قابو ہوگئے کیوں کہ ہارون نے ان کو بے لگام چھوڑ کر ان کو ان کے دشمنوں کے درمیان ذلیل کر دیا[1] تو موسیٰ نے لشکر گاہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر کہا کہ جو خداوند کی طرف ہے (یعنی عہد توحید پر قائم ہے) وہ میرے پاس آجائے۔ تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہو گئے اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک پھاٹک گھوم کر سارے لشکر گاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو۔ اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق عمل کیا چنانچہ اس دن لوگوں میں سے تین ہزار مرد کھیت آئے اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو (یعنی عہد توحید کی تجدید کرو) بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف ہو تاکہ وہ تم کو آج ہی برکت دے۔" (باب ۳۲، آیات ۲۵-۳۰)

اگرچہ تورات کے اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مرتدوں کے قتل کے کام پر صرف بنی لاوی کو مامور کیا تھا لیکن خود مذکورہ اقتباس کا آخری حصہ شہادت دے رہا ہے کہ معاملہ کی اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی ہر قبیلہ کے موحدین اس کام پر مامور کیے گئے کہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کے مرتدوں کی گردنیں ماردیں تاکہ یہ اہل ایمان کے مزید ایمان کی ایک شہادت ہو اور لوگ سبق حاصل کریں کہ شرک اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس معاملہ میں باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو بھی معاف کرنے والا نہیں ہے۔

تاریخ اسلام میں، یاد ہوگا، اسی قسم کا مشورہ حضرت عمرؓ نے بدر کے قیدیوں کے متعلق دیا تھا۔

اس حکم سے ایک بات تو یہ نکلتی ہے کہ توبہ کی قبولیت کے لیے اصل گناہ سے پوری پوری بیزاری ضروری ہے۔ دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ جو برائی معاشرہ کے ذمہ داروں کی غفلت سے معاشرہ میں پھیل جائے اس کا کفارہ سب کو ادا کرنا پڑتا ہے، اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ جرم معاف نہیں ہوتا۔ تیسری بات یہ نکلتی ہے کہ ارتداد کی سزا حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں بھی قتل ہی تھی۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ: یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ یعنی تمہیں تو بظاہر یہ ایک بہت بڑا ظلم اور بہت بڑا قومی نقصان معلوم ہوگا کہ قوم کے اتنے بڑے حصہ کو قومی جسم سے کاٹ کر پھینک دیا جائے لیکن تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک اس حصہ کے کاٹ پھینکے جانے

---

[1] یہود نے حضرت ہارونؑ کو بدنام کرنے کے لیے تورات میں اس قسم کے جو اضافے کیے ہیں ان کی تردید ہم مناسب موقع پر کریں گے۔

ہی میں تمھارے لیے دین و دنیا کی خیر و برکت ہے۔ اگر خاندانی جذبات اور قومی محبت کے جوش میں تم نے اس فاسد حصہ کو اپنے وجود قومی کے ساتھ چپکائے رکھنے ہی کو بہتر سمجھا تو یاد رکھو کہ اس کا فساد تمھارے سارے وجود قومی کو فاسد کر کے چھوڑ دے گا۔ اصول و عقائد سے بنی ہوئی ایک جماعت کے ساتھ اگر ان اصولوں کے مخالف بھی محض نسلی تعلق کی بنا پر چپکے رہیں تو وہ پوری جماعت تباہ ہو کے رہتی ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ (۵۵)

بنی اسرائیل کی شک پرستانہ ذہنیت

ہم تمھارا یقین اس وقت تک نہیں کرنے کے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ بنی اسرائیل شک کے ایسے مریض تھے کہ انھیں کسی طرح یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ موسیٰ سے کلام بھی کرتا ہے اس وجہ سے جب موسیٰ علیہ السلام ان سے کہتے کہ خداوند تمھیں یہ یہ حکم دیتا ہے تو وہ کہتے کہ جب خدا تم سے کلام کرتا ہے تو وہ ہم سے بھی کلام کرے اور ہم بھی اس کو آنکھوں سے دیکھیں، اس کے بغیر ہم تمھاری بات کی صحت کس طرح تسلیم کر لیں؟

جہاں تک اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کا تعلق ہے، یہ خواہش کوئی قابلِ ملامت خواہش نہیں ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہ خواہش کی تھی لیکن بڑا فرق ہے اس بات میں کہ یہ خواہش شرح صدر اور اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لیے ہو اور اس بات میں کہ اس کو انکار اور تکذیب کا بہانہ بنایا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ خواہش اسی طرح کی تھی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے تاکہ آخرت کے باب میں انھیں پورا پورا شرح صدر حاصل ہو جائے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملامت نہیں فرمائی بلکہ صرف یہ فرمایا کہ تم ان ناسوتی آنکھوں سے میری ذات کو نہیں دیکھ سکتے، صرف میری صفات ہی کو دیکھ سکتے ہو۔ قرآن مجید میں اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ	اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر آیا اور
رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ	اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا کہ اے
قَالَ لَن تَرَانِي وَلَٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ	خداوند تو مجھے اپنے آپ کو دکھا، میں تجھے دیکھوں گا۔ فرمایا
فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ	تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر وہ اپنی
تَرَانِي ۚ فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ	جگہ پر ٹھہرا رہ سکے تو تم مجھے دیکھ سکو گے۔ تو جب اس کے
جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا ۚ	رب نے اپنی تجلی پہاڑ پر ڈالی تو اس کو پاش پاش کر دیا
فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحَانَكَ	اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو
تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ۔	بولے اے رب تو پاک ہے، میں نے توبہ کی اور میں
(۱۴۳۔ اعراف)	پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں۔

برعکس اس کے بنی اسرائیل کے لوگوں کا یہ مطالبہ محض ان کی بے یقینی اور خشک پرستانہ ذہنیت کا ایک مظاہرہ تھا اور یہ مظاہرہ وہ اللہ تعالیٰ کی نہایت کھلی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود قدم قدم پر کرتے رہتے تھے اس وجہ سے ان پر عتاب ہوا۔

ایک شبہے کا ازالہ

یہ عتاب یہاں فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے اور سورۂ اعراف ۱۵۵ میں فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ کے الفاظ سے۔ لفظ صاعقہ کی تحقیق ہم سترھویں فصل میں بیان کر چکے ہیں، اس کے معنی گرج اور کڑک کے بھی ہیں اور اس بجلی کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو کڑک کے ساتھ گرتی ہے۔ رجفہ کے معنی زلزلہ کے ہیں۔ ایک ہی واقعہ سے متعلق قرآن نے دو مقامات میں جو بظاہر دو الگ الگ لفظ استعمال کیے ہیں ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ ایک ہی حادثہ کے دو مختلف اثرات ہیں جو بیک وقت ظاہر ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مشاہدہ کرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی جب پہاڑ پر ڈالی تو جس طرح پہاڑ پاش پاش ہو گیا اسی طرح بنی اسرائیل کے مطالبہ پر جب اس کی تجلی ظاہر ہوئی ہے تو وہ صاعقہ کی شکل میں نمودار ہوئی جس نے سارے پہاڑ میں زلزلہ ڈال دیا اور یہ لوگ بھونچکے ہو کر گر پڑے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۵۶)

موت کا مفہوم

اس صاعقہ و زلزلہ سے ان ستر سرداروں پر جو اس موقع[1] پر حضرت موسیٰ کے ساتھ طور پر گئے تھے جو حالت طاری ہوئی، قرآن مجید نے اس کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ اس موت سے موت بھی مراد ہو سکتی ہے اور بطریق استعارہ بے ہوشی بھی۔ عربی زبان میں موت کا لفظ استعارہ کے طور پر نیند اور بے ہوشی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے[2]۔ چنانچہ سو کر اٹھنے کے بعد کی جو مشہور دعا احادیث میں نقل ہوئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں، الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور (اس اللہ کے لیے شکر ہے جس نے ہمیں مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا اور اسی کی طرف لوٹنا ہے) اسی طرح بعث کا لفظ بھی اصحاب کہف کے واقعہ میں ان کو نیند سے بیدار کرنے کے

---

[1] قرآن مجید سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اس موقع کی بات ہے جب گوسالہ پرستی کے حادثہ کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ستر منتخب آدمیوں کو لے کر طور پر اس مقصد سے گئے ہیں کہ اپنی قوم کے لیے معافی مانگیں اور اس کام میں اپنی قوم کے ان لیڈروں کو بھی شریک کریں۔

[2] لسان العرب میں ہے، مات الرجل وهمد وهوّم اذا نام .... الموت السكون وكل ما سكن فقد مات .... وفي حديث دعاء الانتباه: الحمد لله الذي احيانا بعد ما اماتنا واليه النشور، سمى النوم موتا لانه يزول معه العقل والحركة تمثيلا وتشبيها لا تحقيقا وقيل الموت في كلام العرب يطلق على السكون يقال ماتت الريح اى سكنت ومنها المنام لقوله تعالى والتي لم تمت في منامها وقد قيل المنام الموت الخفيف والموت النوم الثقيل .... والموتة جنس من الجنون والصرع يعتري الانسان فاذا افاق عاد اليه عقله كالنائم والسكران، والموتة الغشي۔

لیے استعمال ہوتا ہے۔

اگرچہ بنی اسرائیل اپنی سرکشی کے سبب سے سزاوار تو اسی بات کے تھے کہ ان کو دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خاص سے ان کو مزید مہلت بخشی اور ان کے پیغمبر نے بھی اس موقع پر ان کے لیے بڑی دل سوزی کے ساتھ دعا کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی، سورہ اعراف میں اس کا حوالہ اس طرح آیا ہے۔

وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا	اور موسیٰ نے ہمارے مقررہ وقت پر حاضری کے لیے
لِّمِيقَاتِنَا ۖ فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ	اپنی قوم سے ستر آدمی منتخب کیے تو جب ان کو زلزلے نے
قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن	آ پکڑا تو موسیٰ نے دعا کی کہ اے رب اگر تو چاہتا تو ان کو
قَبْلُ وَإِيَّايَ ۖ أَتُهْلِكُنَا بِمَا	اور مجھ کو پہلے ہی ہلاک کر چھوڑتا، کیا تو اس جرم میں ہم سب
فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا ۖ إِنْ هِيَ إِلَّا	کو ہلاک کرے گا جو ہم میں سے بے وقوفوں نے کیا ہے
فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَن تَشَاءُ	یہ تو بس تیری آزمائش تھی، اس کے ذریعے سے تو جس کو
وَتَهْدِي مَن تَشَاءُ ۖ أَنتَ وَلِيُّنَا	چاہے گمراہ کرے اور جس کو چاہے ہدایت دے، تو ہمارا
فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ۖ وَأَنتَ خَيْرُ	مددگار ہے۔ تو ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین
الْغَافِرِينَ (١٥٥- اعراف)	بخشنے والا ہے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۵۷)

یہ ان انعامات کا بیان ہے جو بنی اسرائیل پر صحرائے سینا میں اللہ تعالیٰ نے ان کو دھوپ اور فاقے کی مصیبت سے بچانے کے لیے کیے۔

'مَنّ' کی تحقیق

مَنّ کے اصل معنی فضل و احسان کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد وہ خاص غذا ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے صحرائے سینا میں خاص اپنے فضل سے مہیا فرمائی، جس کے لیے نہ انھیں ہل چلانے پڑے، نہ تخم ریزی اور آب پاشی کی زحمتیں اٹھانی پڑیں، تورات میں اس کی تفصیل اس طرح بیان ہوئی ہے۔

"اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا اور صبح کو خیمہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی اور جب اوس جو پڑی ہوئی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے، بنی اسرائیل اس کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے مَن؟ کیوں کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے، تب موسیٰ نے ان سے کہا یہ وہی روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تم کو دی ہے...... اور وہ ہر صبح کو اپنے اپنے کھانے کی مقدار کے مطابق جمع کر لیتے تھے اور دھوپ تیز ہوتے ہی وہ پگھل جاتا تھا" خروج باب ۱۶- ۱۳- ۲۱

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شبنم کی طرح ایک چیز زمین پر ٹپکتی تھی اور پالے کے دانوں کی طرح وہ جم جاتی

تھی۔ آفتاب کی تمازت بڑھنے سے پہلے پہلے اس کا جمع کر لینا ممکن ہوتا تھا۔ تمازت بڑھنے کے بعد یہ دانے پگھل جاتے تھے۔ چونکہ یہ نعمت، جیسا کہ عرض کیا گیا، بغیر کسی زحمت و مشقت اٹھائے حاصل ہوتی تھی اور ایک ایسے بے آب و گیاہ صحرا میں حاصل ہوتی تھی جہاں فراہمی غذا کے اسباب و وسائل مفقود تھے اس وجہ سے اس کا نام مَن قرار پایا (یہ واضح رہے کہ عربی اور عبرانی دونوں قریب الماخذ بانیں ہیں)

مَن کے وجہ تسمیہ سے متعلق یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے لیکن تورات کا مذکورہ بالا اقتباس یہ ظاہر کرتا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب اس عجیب و غریب چیز کو دیکھا تو ان کے اندر یہ سوال پیدا ہوا کہ مَن ھُوَ یہ کیا ہے؟ ان کے اسی سوال سے اس کا نام مَن پڑ گیا۔ ہمارے نزدیک یہ وجہ تسمیہ محض یہود کی بدمذاقی کی ایک ایجاد ہے۔ نہ لفظ اس کی تائید کرتا ہے، نہ عقل سلیم اس کو قبول کرتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس چیز کو جو روٹی سے تعبیر فرمایا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سچ مچ یہ روٹی کی قسم کی کوئی چیز تھی، بلکہ روٹی یہاں غذا کے مفہوم میں ہے۔ غذا کے مفہوم کی تعبیر کے لیے یہ لفظ قدیم صحیفوں میں بہت استعمال ہوا ہے، ہماری زبان میں بھی یہ لفظ اس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

سَلْوٰی کی تحقیق سَلوٰی:۔ مَن کی طرح لفظ سلوٰی بھی عربی میں اہل کتاب کے واسطہ سے آیا ہے اور اہل عرب نے اس کو اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ ان پرندوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے لیے بھیجے۔ یہ بٹیروں سے ملتے جلتے تھے، اور بٹیروں ہی کی طرح ان کا شکار نہایت آسان تھا۔ خروج میں ان کی تفصیل اس طرح آئی ہے:۔

> "پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت ملک مصر سے نکلنے کے بعد دوسرے مہینے کی پندرھویں تاریخ کو سین کے بیابان میں، جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے پہنچی اور اس بیابان میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت موسیٰ اور ہارون پر بڑبڑانے لگی، اور بنی اسرائیل کہنے لگے کاش کہ ہم خداوند کے ہاتھ سے ملک مصر میں جب ہی مار دیے جاتے جب ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھ کر دل بھر کر روٹی کھاتے تھے کیوں کہ تم تو ہم کو اس بیابان میں اسی لیے لے آئے ہو کہ سارے مجمع کو بھوکا مارو۔ ۔ ۔ ۔ اور خداوند نے موسیٰ سے کہا، میں نے بنی اسرائیل کا بڑبڑانا سن لیا ہے، سو ان سے کہہ دے کہ شام کو تم گوشت کھاؤ گے اور صبح کو تم روٹی سے سیر ہو گے اور تم جان لو گے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا (خروج باب ۱۶: ۱-۱۳)

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں) اس طرح کے مواقع پر عام طور پر ہمارے مفسرین قلنا کا لفظ محذوف مانتے ہیں، یعنی ہم نے یہ چیزیں ان کو بخشیں اور کہا کہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو ہم نے بخشی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس طرح کے مواقع پر 'کہا' کا لفظ محذوف کر دینے میں ایک خاص بلاغت ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت اپنی صورت و ہیئت یا بالفاظ دیگر اپنی زبان حال سے

بھی یہ دعوت دیتی ہے کہ اس نعمتِ الٰہی سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے پروردگار کے شکرگزار رہو۔ یہ اشارات قرآن مجید میں کہیں کہیں کھول دیئے گئے ہیں اور بعض جگہ (جیسا کہ یہاں ہے) مخفی چھوڑ دیئے گئے ہیں جن کے اندر اس کائنات کی پھیلی ہوئی نعمتوں کی اشارات سمجھنے والی عقل ہوتی ہے وہ ان اشارات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

یہاں کلام کا سیاق و سباق اس امر کو واضح کر رہا ہے کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں کا حق نہیں پہچانا۔ وہ ان نعمتوں کو پا کر شکرگزار رہنے کے بجائے ان کی ناقدری اور خدا کی نافرمانی کرتے رہے۔ یہ بات چوں کہ سیاقِ کلام سے واضح ہے اس وجہ سے لفظوں میں ظاہر نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کی جگہ پر یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے، اس فقرہ سے بنی اسرائیل کا ان نعمتوں سے متعلق رویہ بھی واضح ہو گیا اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جو لوگ خدا کی کسی نعمت کی ناقدری کرتے ہیں وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ اپنا ہی بگاڑتے ہیں۔ یہ آخری بات اوپر کی باتوں کی طرح یہود کو براہِ راست مخاطب کر کے کہنے کے بجائے ان سے منہ پھیر کر غائب کے صیغہ سے کہی گئی ہے جس سے ان کی طرف سے متکلم کی بیزاری کا اظہار ہو رہا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۸)

'قریہ' سے مراد — قریہ کے معنی اصل لغت میں جمع ہونے کی جگہ کے ہیں۔ عربی میں کہیں گے قری الماء فی الحوض (اس نے حوض میں پانی جمع کر دیا) یہیں سے یہ لفظ بستی کے معنی میں استعمال ہوا اس لیے کہ وہ لوگوں کے مجتمع ہونے کی جگہ ہوتی ہے۔ اس لفظ کے استعمالات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف چھوٹے دیہات ہی کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ بڑے بڑے شہروں اور مرکزی آبادیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس قریہ سے یہاں مراد سرزمین فلسطین ہی کا کوئی شہر ہو سکتا ہے اس لیے کہ آگے فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا کے الفاظ سے اس کی جو تعریف وارد ہے وہ اسی سرزمین کے کسی شہر پر منطبق ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد اریحا یا یریحو ہو۔ حضرت ابن عباسؓ اور ابن زید کی یہی رائے ہے۔ فلسطین کے علاقہ کا یہی شہر بنی اسرائیل کے قبضہ میں سب سے پہلے آیا ہے۔

'سجدہ' کا مفہوم — اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا، سجدہ کے اصل معنی سر جھکانے کے ہیں۔ اس سر جھکانے کے مختلف درجے ہو سکتے ہیں۔ اس کی کامل شکل زمین پر پیشانی رکھ دینے کی ہے جو ہم نماز میں اختیار کرتے ہیں۔ عمرو بن کلثوم نے اپنے مشہور فخریہ شعر میں اس کا یہی کامل مفہوم لیا ہے۔

اذا بلغ الفطام لنا صبی ۔۔۔ تخرله الجبابر ساجدینا

(جب ہماری قوم کا کوئی بچہ دودھ چھوڑنے کی مدت کو پہنچ جاتا ہے تو بڑے بڑے جبار اس کے آگے سجدوں میں گرتے ہیں)

یہاں آیت میں اس سے مراد صرف سر جھکانا ہے۔ موقع کلام اس پر دلیل ہے۔

'الباب' سے مراد

الباب سے مراد بعض لوگوں نے بستی کا دروازہ لیا ہے، بعض لوگوں نے خیمۂ عبادت کا دروازہ، میں اس دوسرے قول کو ترجیح دیتا ہوں۔ مفتوح شہر کے دروازوں میں متواضعانہ داخل ہونے کی نصیحت ہیں اگرچہ ایک قیمتی نصیحت ہے لیکن یہ نصیحت ایک ایسی قوم کے لیے موزوں ہو سکتی ہے جو بہادر اور زورآور ہو۔ بنی اسرائیل کا حال تو یہ تھا کہ جب دشت فاران میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو فلسطین پر فوج کشی کا حکم دیا ہے تو ان کے دل بیٹھ گئے تھے اور انھوں نے صاف صاف جواب دے دیا کہ اس ملک میں جبار اور زورآور لوگ ہیں، ہم ان سے مقابلہ کے لیے تیار نہیں ہیں، تم اور تمھارا خدا دونوں جاکر لڑو، جب ان جباروں سے علاقہ خالی ہو جائے گا تو ہم داخل ہو جائیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ نصیحت کچھ غیر ضروری ہی سی معلوم ہوتی ہے کہ شہر کے دروازے میں فاتحانہ تمکنت کے ساتھ نہ داخل ہوں بلکہ عاجزانہ اور سرافگندہ ہو کر داخل ہوں۔ اس وجہ سے ہمارا خیال ہے کہ یہاں دروازہ سے مراد خیمۂ عبادت کا دروازہ ہے اور مقصود یہ بتانا ہے کہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں داخل ہوں، اس کی زرخیزی اور شادابی سے پوری آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھائیں اور خیمۂ عبادت میں عاجزانہ حاضر ہو کر خدا کا شکر ادا کرتے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں، لیکن جس طرح انھوں نے ہر نعمت کی ناقدری اور ہر ہدایت کی خلاف ورزی کی اسی طرح اس نعمت اور اس ہدایت کی بھی ناقدری کی۔

'حطۃ' کی تحقیق

قُوْلُوْا حِطَّةٌ، حطۃ کا لفظ ایک جملہ کے قائم مقام ہے، مثلاً قرآن مجید میں ہے۔ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ (۸۰۔ نساء) اس وجہ سے یہاں مبتدا کو محذوف ماننا پڑے گا، زمخشری نے اس کی پوری وضاحت یوں کی ہے کہ مسئلتنا حطۃ (ہماری درخواست حطہ ہے) حِطّۃ حَطّ سے ہے جس کے معنی جھاڑ دینے کے ہیں۔ یہاں مراد اس سے گناہوں کا جھاڑ دینا ہے۔ عربی اور عبرانی دونوں کے قریب الماخذ ہونے کے سبب سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ مادہ جھاڑ دینے اور بخش دینے ہی کے مفہوم میں عبرانی میں بھی استعمال ہوا ہے اور یہان کے ہاں استغفار اور توبہ کے کلمات میں سے تھا، وہیں سے یہ عربی میں منتقل ہوا۔

'احسان' کا مفہوم

محسنین، عربی میں احسن الی فلان کے معنی ہوں گے فلاں کے ساتھ احسان کیا، اور احسن الشئ کے معنی ہوں گے اس چیز کو بہت خوبی کے ساتھ کیا، اس وجہ سے محسن کا لفظ عربی میں احسان کرنے والے کے لیے بھی آتا ہے اور کسی عمل کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دینے والے کے لیے بھی، موقع کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ لفظ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اردو میں اس کے لیے کوئی خوب صورت لفظ مجھ کو نہیں آیا، اس وجہ سے ترجمہ میں صرف مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر علامہ ابی السعود

بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (۵۹)

دعا کی تبدیلی کی نوعیت

یعنی دعا کے لیے جو لفظ ان کو تلقین کیا گیا تھا اس کو انھوں نے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل لیا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں مراد الفاظ کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ رویہ کی تبدیلی ہے۔ چنانچہ ان میں سے ابو مسلم اصفہانی کا یہی خیال ہے لیکن قرآن کے الفاظ سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ بَدَّلَ کا لفظ جب اپنے دو مفعولوں کے ساتھ آتا ہے (جیسا کہ یہاں ہے، اگرچہ ایک محذوف ہے) تو اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ ایک چیز کی جگہ دوسری چیز رکھ دی۔ پھر جب واضح الفاظ میں یہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ ظالموں نے اس قول کو جو ان سے کہا گیا تھا ایک دوسرے قول سے بدل دیا جو ان سے نہیں کہا گیا تو اس سے صرف رویہ اور عمل کی تبدیلی مراد لینا الفاظ قرآن سے صریح انحراف ہے۔

ہمارے نزدیک یہاں صرف رویہ اور عمل کی تبدیلی کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ قرآن کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ بنی اسرائیل کے کچھ بدبختوں نے حِطَّةٌ کے لفظ کو اس سے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل لیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ انھوں نے کس لفظ سے اس کو بدلا تھا تو قرآن میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ اہل تاویل سے مختلف اقوال منقول ہیں جن میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی جزم کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔

مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ جس طرح نصاریٰ نے اپنی سورہ فاتحہ کے فقروں کے مفہوم میں تبدیلی کر دی اسی طرح کی تبدیلی بنی اسرائیل نے اپنی اس دعا کے مفہوم میں کر دی۔ نصاریٰ کی فاتحہ مندرجہ لوقا باب ۱۱، ۳ میں یہ الفاظ جو آتے ہیں "ہماری روز کی روٹی ہمیں دیا کر" ظاہر ہے کہ اصل دعا کے مفہوم سے بالکل ہٹے ہوتے ہیں۔ اصل دعا تو یوں ہوگی کہ ہمیں وہ روح ہدایت بخش جو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے[1]۔ لیکن چوں کہ عبرانی میں روٹی کے لیے جو لفظ ہے وہ روحانی غذا اور مادی روٹی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس وجہ سے ہدایت کی تعبیر کے لیے یہی مشترک لفظ استعمال ہوا ہوگا۔ بعد میں ترجموں میں آ کر ہدایت کی روح غائب ہو گئی، صرف روٹی بیچ رہی۔ اسی طرح کی کوئی تبدیلی بنی اسرائیل نے بھی دعا کے الفاظ میں کر دی جس سے دعا کی اصل روح بالکل بدل گئی۔

رجز اور رجس کا مفہوم

فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ، رجز اور رجس، دونوں ایک ہی لفظ کی دو شکلیں ہیں۔ ان کا اصل مفہوم اضطراب اور ارتعاش ہے۔ یہیں سے یہ گندگی اور نجاست کے لیے استعمال ہوئے کیوں کہ گندگی اور نجاست کو دیکھ کر طبیعت میں ایک قسم کا اضطراب اور سنسنی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ عذاب کے لیے استعمال ہوئے کیونکہ عذاب بھی دلوں میں ایک اضطراب اور کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ مِّنَ السَّمَاءِ (آسمان سے) کا اضافہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس حادثہ کی نوعیت عام حوادث سے بالکل مختلف نوعیت

---

[1] ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فاتحہ

کی تھی۔ اس میں قدرت کی غضبناکی کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ تورات کے بعض مقامات میں اس مخصوص نوعیت کی یوں وضاحت کی گئی ہے:۔

> اگر یہ آدمی ویسے ہی موت سے مریں جو سب لوگوں کو آتی ہے یا ان پر ویسے ہی حادثے گزریں جو سب پر گزرتے ہیں تو میں خداوند کا بھیجا ہوا نہیں ہوں پر اگر خداوند کوئی نیا کرشمہ دکھلائے اور زمین اپنا منہ کھول دے اور ان کو اس کے گھر بار سمیت نگل جائے اور یہ جیتے جی پاتال میں سما جائیں تو تم جاننا کہ ان لوگوں نے خداوند کی تحقیر کی ہے۔ (گنتی باب ۱۶: ۲۹ - ۳۰)

قرآن نے مذکورہ عذاب کی اس مخصوص نوعیت کو مِنَ السَّمَآءِ کے لفظ سے ظاہر کیا ہے۔ جس طرح ہم کسی ہولناک آفت کو قہر آسمانی سے تعبیر کرتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ یہ عذاب کیا تھا تو خاص اس قریہ سے متعلق جس کا یہاں ذکر ہے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے، البتہ تورات کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس سفر کے دوران میں متعدد بار بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی شدید نافرمانیاں کیں اور ان نافرمانیوں کی پاداش میں وہ مختلف وباؤں کے شکار ہوئے۔ مثلاً جس زمانہ میں بنی اسرائیل شطیم میں (جو ارض فلسطین کے بالکل پاس کا ایک شہر تھا) ٹھہرے تھے تو ان لوگوں نے موآبی عورتوں کے ساتھ بدکاریاں کیں، ان کی دعوت پر یہ لوگ ان کی مشرکانہ قربانیوں میں شریک ہونے لگے اور اس طرح بالواسطہ ان کے دیوتا بعل فغور کی پرستش شروع کر دی جس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت وبا بھیجی جس میں ان کے چوبیس ہزار نفوس ہلاک ہوئے۔

کتاب گنتی کے باب ۳۳ میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے موآب کے میدانوں میں بنی اسرائیل کو یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ جب تم یردن کو عبور کر کے ملک کنعان میں داخل ہونا تو تم یہاں کے سب مشرکوں کو نکال دینا، ان کے شبیہ دار پتھروں اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ ڈالنا اور ان کے اونچے مقامات کو مسمار کر دینا مگر تم نے اس کی خلاف ورزی کی تو یاد رکھو کہ جیسا میں نے تم کو ان کے ساتھ کرنے کے لیے کہا ہے ویسا ہی میں تمہارے ساتھ کروں گا۔ معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل نے اپنی عادت کے مطابق پیغمبر کے اس حکم کی بھی خلاف ورزی کی جس کی پاداش میں ان پر اسی قسم کی کوئی وبا آئی جس قسم کی وبا ان پر شطیم میں آئی تھی۔

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ
عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (۶۰)

پانی کے لیے موسیٰ کی دعا

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کے لیے یہ دعا دشت صین میں کی ہے۔ کتاب گنتی باب ۲۰ میں ہے:۔

> "اور پہلے مہینہ میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت دشت صین میں آ گئی اور وہ لوگ قادس میں رہنے لگے ۔۔۔۔ اور جماعت کے لوگوں کے لیے وہاں پانی نہ ملا۔ سو وہ موسیٰ اور ہارون کے خلاف اکٹھے ہوئے اور لوگ موسیٰ سے

جھگڑنے اور یہ کہنے لگے کاش ہم بھی اس وقت مر جاتے جب ہمارے بھائی خداوند کے حضور مرے۔ تم خداوند کی جماعت کو اس دشت میں کیوں لے آئے ہو کہ ہم بھی اور ہمارے جانور بھی یہاں مریں اور تم نے کیوں ہم کو مصر سے نکال کر اس بری جگہ پہنچایا ہے۔ یہ تو بونے کی اور انجیروں کی اور تاکوں اور اناروں کی جگہ نہیں ہے بلکہ یہاں تو پینے کے لیے پانی تک میسر نہیں اور موسیٰؑ اور ہارونؑ جماعت کے پاس سے جا کر خیمہ اجتماع کے دروازے پر اوندھے منہ گرے، تب خداوند کا جلال ان کے اوپر ظاہر ہوا اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ اس لاٹھی کو لے اور تو اور تیرا بھائی ہارونؑ تم دونوں جماعت کو اکٹھا کرو اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس چٹان سے کہو کہ وہ اپنا پانی دے اور تو ان کے لیے چٹان ہی سے پانی نکالنا، یوں جماعت کو اور ان کے چوپایوں کو پلانا۔ چنانچہ موسیٰؑ نے خداوند کے حضور سے اسی کے حکم کے مطابق وہ لاٹھی لی اور موسیٰؑ اور ہارونؑ نے جماعت کو اس چٹان کے سامنے اکٹھا کیا اور اس نے ان سے کہا سنو اے باغیو! کیا ہم تمہارے لیے اس چٹان سے پانی نکالیں۔ تب موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس چٹان پر دو بار لاٹھی ماری اور کثرت سے پانی بہہ نکلا اور جماعت نے اور ان کے چوپایوں نے پیا (گنتی باب ۲۰-۱۲)

قَدۡ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ: قَدْ عَلِمَ یعنی جان لیا، متعین کر لیا۔ چوں کہ پہاڑی سے بارہ چشمے پھوٹے تھے اور بنی اسرائیل کے خاندان بھی بارہ ہی تھے اس وجہ سے ہر خاندان نے اپنے اپنے گھاٹ الگ الگ متعین کر لیے اور اس چیز کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا کہ پانی کے لینے پر کوئی جھگڑا برپا ہو۔ اگر اس بہتات کے ساتھ پانی کا انتظام نہ ہوا ہوتا تو اس صحرا میں ان لوگوں کے اندر روز پانی پینے پلانے ہی پر تلواریں کھنچی رہتیں۔ اس وجہ سے یہ واقعہ صرف ایک عظیم معجزہ ہی نہیں بلکہ ایک عظیم احسان بھی تھا۔ — ہر قبیلے کے لیے الگ الگ گھاٹ

كُلُوا وَاشۡرَبُوا ..... الآیہ، جس طرح مَن و سلویٰ کی نعمت کے ذکر کے بعد آیت ۵۷ میں فرمایا، كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقۡنَاكُمۡ (ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے بخشی ہیں کھاؤ) اسی طرح اس پانی کے انتظام کا حوالہ دینے کے بعد فرمایا، كُلُوا وَاشۡرَبُوا مِن رِّزۡقِ اللَّهِ وَلَا تَعۡثَوۡا فِي الۡأَرۡضِ مُفۡسِدِينَ (کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے اور زمین میں فساد مچاتے ہوئے نہ پھیلو) یہ اس عظیم نعمت کا حق بیان ہوا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت جو ہمیں حاصل ہوتی ہے زبانِ حال سے ہمیں اس حق کی یاد دہانی بھی کرتی ہے جو اس سے بہرہ مند ہونے کے سبب سے ہم پر عائد ہوتا ہے۔ یہ اس حق کی تعبیر ہے اور انسان کی فطرت اگر کفرانِ نعمت کی سیاہی سے مسخ نہ ہو چکی ہو تو وہ اس حق سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہی کی صدا ہے جو وحی الٰہی اس کے کانوں کو سنا رہی ہے۔ — نعمت کا حق

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنے کا ہے کہ مَن و سلویٰ کے ذکر کے بعد صرف كُلُوا (کھاؤ) کا لفظ وارد ہوا ہے اس لیے کہ اس وقت تک بہتات کے ساتھ صرف غذا کا اہتمام فرمایا تھا۔ جب اسی بہتات اور فراوانی کے ساتھ پانی کا بھی انتظام فرما دیا تو كُلُوا کے ساتھ وَاشۡرَبُوا (اور پیو) کا بھی اضافہ کر دیا۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (۶۱)

بقل کا مفہوم بقل کا لفظ سبزیوں اور ترکاریوں کے تمام اقسام کے لیے عام ہے۔

قثاء کا مفہوم قثاء کے معنی ککڑی اور کھیرے کے ہیں۔

فوم اور ثوم کا مفہوم فوم اور ثوم ایک ہی چیز ہے۔ اس کے معنی لہسن کے ہیں۔ اہل عرب ث کو کبھی کبھی ف سے بدل دیا کرتے ہیں مثلاً عاثور کو عافور اور اثافی کو اثافی کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں مقوم کا لفظ بھی یہیں سے چلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لہسن کے لیے یہ لفظ اس قدر مشہور ہے کہ اس سے روٹی یا گندم یا غلہ وغیرہ مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید کی تاویل ہمیشہ الفاظ کے مشہور معانی کے لحاظ سے کرنی چاہیے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کے جس مطالبہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا ذکر تورات کی کتاب گنتی کے باب ۱۱ میں اس طرح ہے۔

”اور جو ملی جلی بھیڑ ان لوگوں میں تھی وہ طرح طرح کی حرص کرنے لگی اور بنی اسرائیل بھی پھر رونے اور کہنے لگے کہ ہم کو کون گوشت کھانے کو دے گا۔ ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مصر میں مفت کھاتے تھے اور ہائے وہ کھیرے اور خربوزے اور وہ گندنے اور پیاز اور لہسن لیکن اب تو ہماری جان خشک ہو گئی۔ یہاں کوئی چیز میسر نہیں اور من کے سوا ہم کو اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔“ (۴-۷)

بنی اسرائیل کی اخلاقی پستی کی ایک مثال قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ، ’ادنیٰ‘ دناءت سے ہے، یعنی کیا تم ایک اعلیٰ غذا کو ایک ادنیٰ اور گھٹیا غذا سے بدلنا چاہتے ہو۔ یہ من وسلویٰ کی غذا تمہارے لیے تمہارے پروردگار نے مہیا فرمائی ہے اور تمہیں اس صحرا میں اس حالت میں مل رہی ہے کہ تم فرعونیوں کی غلامی اور شرک و کفر کی اطاعت کی ذلت سے بالکل آزاد ہو، روکھی پھیکی غذا جو آزادی کے ساتھ نصیب ہو، یہی ہے غلامی اور ذلت کے حلوے سے ہزار درجہ بڑھ کر ہے لیکن یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم چٹخاروں کے لیے رسیا ہو کر ان کے پیچھے تمہاری نگاہوں میں اس آزادی کی بھی، جس میں خدا کے سوا تمہارے اوپر کسی کی حکومت باقی نہیں رہی ہے، کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کے اس رویہ میں ان مسلمان قوموں کے لیے ایک بہت بڑا درس عبرت ہے جنھوں نے تمدن کے لوازم و تنوعات کے پیچھے اپنی آزادی کی نعمت خطرے میں ڈال دی اور اس بات پر دھیان نہیں کیا کہ اس طرح جو لذائذ دنیا انھوں نے حاصل کیے ہیں ان کے ساتھ ذلت کے کتنے گھناؤنے مفاسد چپکے ہوئے ہیں۔ قرآن مجید

کہ اس مقام سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسان کا ضمیر زندہ ہو تو وہ کھانے کی لذت دسترخوان کے تنوعات کے اندر نہیں ڈھونڈھتا بلکہ ضمیر و ارادہ کی آزادی کے اندر ڈھونڈھتا ہے۔ یہ چیز اگر اس کو حاصل ہو تو خشک روٹی بھی اس کے لیے جملہ الوانِ نعمت فراہم کر دیتی ہے۔

اِهْبِطُوْا مِصْرًا: 'ہبط' کے اصل معنی گرنے کے ہیں اور استعمال میں یہ کسی مسافر کے کسی منزل میں اترنے کے لیے بھی آتا ہے مثلاً کہیں گے ہبطنا الوادی (ہم وادی میں داخل ہوئے) یہیں سے اہبطوا مصرًا کا محاورہ رائج ہوا اور ہبوط کا لفظ نزول کے مرادف کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔ اس استعمال کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہوگی کہ مسافر جب کسی مقام پر قیام کا ارادہ کرتا ہے تو وہاں وہ اپنے مرکب سے اترتا ہے۔ 'مصر' سے مراد

اس خاص موقع پر اس لفظ میں یہ موزونیت بھی ہے کہ بنی اسرائیل نے جن چیزوں کا مطالبہ کیا تھا وہ کسی ہموار نشیبی اور زرخیز علاقہ ہی میں مل سکتی تھیں۔

مصرًا سے مراد کوئی شہر ہے۔ اس سے ملک مصر مراد نہیں ہو سکتا۔ مصر، ملک مصر کے لیے قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے لیکن ہر جگہ غیر منصرف آیا ہے۔ صرف اس آیت میں یہ منصرف کی صورت میں آیا ہے۔ اس وجہ سے لازماً یہ شہر کے عام مفہوم میں آیا ہے۔ البتہ شہر کے لیے خاص طور پر یہاں مصر کے لفظ کے استعمال میں بلاغت کا یہ پہلو ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کے ذریعہ سے ان کو وہ ذلتیں اور مصیبتیں یاد دلائی گئی ہوں جن میں وہ مصر میں مبتلا رہ چکے تھے اور مقصود اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اگر تم ان چٹخاروں کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے تو ان کے لیے تمہیں کسی مصر ہی کے شکنجہ میں اپنی گردن دینی پڑے گی۔ اس لیے کہ جو قوم کسی اعلیٰ نصب العین کے لیے اپنے اندر صبر و استقامت نہیں پیدا کر سکتی وہ اپنے آپ کو ذلت سے نہیں بچا سکتی۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ: مسکنت کے معنی عجز بے بسی، پست ہمتی اور بدحالی کے ہیں۔ ان کے اوپر ذلت اور پست ہمتی مار دی گئی کی تعبیر اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ جس طرح دیوار پر گیلی مٹی تھوپ دی جاتی ہے اسی طرح ان کی مسلسل ناشکریوں اور آیاتِ الٰہی کی ناقدریوں کے سبب سے ان پر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے نہایت ہی نرم چارہ بن کر رہ گئے، حالات و خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے اندر کوئی عزم و حوصلہ باقی نہ رہا۔ 'مسکنت' کا مفہوم

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو مواقع اس لیے فراہم کیے کہ وہ ان سے سرخروئی اور فائز المرامی حاصل کریں اپنی پست ہمتی اور نالائقی کے سبب سے وہ وہاں سے خدا کی لعنت اور پھٹکار لے کر لوٹے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ ۔۔۔۔ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ: یہ ان کے اوپر ذلت اور مسکنت کے تھوپے جانے کی علت بیان ہوئی ہے کہ ان کے کسی ایک ہی گناہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان کی پوری تاریخ سرمستیوں اور نافرمانیوں کا ایک سلسلہ ہے، یہ اپنی سرکشی اور تعدی کی فطرت کے سبب سے برابر اللہ کی آیتوں کا انکار اور اس کے نبیوں یہود کی ذلت کا سبب

کو قتل کرتے رہے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا یہ زعم کہ یہ خدا کے بڑے چہیتے اور محبوب ہیں اور کوئی ان کو ان کے اس مقام سے کھسکا نہیں سکتا ایک بالکل بے بنیاد گھمنڈ ہے، یہ تو اپنی کرتوتوں کے سبب سے خدا کی درگاہ سے راندے ہوئے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام میں سے جن جن کا یہود کے ہاتھوں قتل ہونا خود یہود کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے ان میں سب سے پہلا نام تو حضرت زکریا علیہ السلام کا ہے جن کو شاہ یہوداہ یوآس کے حکم سے عین ہیکل میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔

اس کے بعد حضرت یحییٰ علیہ السلام کا نام ملتا ہے جن کو یہودیہ کے فرمانروا ہیرودیس کے حکم سے قتل کیا گیا اور ان کا سر بادشاہ نے ایک تھال میں رکھ کر اپنی معشوقہ کو نذر کیا۔

پھر سیدنا مسیح علیہ السلام کا نام آتا ہے جن کو یہود نے اپنے زعم کے مطابق سولی پر لٹکوایا، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؑ کو ان کے شر سے بچا لیا۔

یہاں انبیاء علیہم السلام کے قتل کے ذکر کے ساتھ بغیر الحق (ناحق) کی قید بھی لگی ہوئی ہے۔ اس سے مقصود ان کے اس جرم کی سنگینی کو واضح کرنا ہے۔ اس لیے کہ قتل نفس بجائے خود انسانی معاشرے کا سب سے بڑا جرم ہے۔ یہ جرم مزید سنگین ہو جاتا ہے اگر اس کا ارتکاب انبیاء و مصلحین کے خلاف کیا جائے پھر اس کی سنگینی میں مزید اضافہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ اس جرم کا ارتکاب بغیر کسی وجہ جواز کے کیا جائے۔ یہاں قرآن نے یہود کے اس جرم میں تمام سنگینیاں جمع کر دی ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۶۲)

لفظ 'یہود' کی تحقیق

ھاد، یھود، ھود اً کے معنی رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے، وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ ۱۵۶ اعراف (اور ہمارے لیے اس دنیا میں اور آخرت میں بھلائی لکھ دے۔ ہم نے تیری طرف رجوع کیا) پھر ہَادَ اور تَہَوَّدَ یہودی ہونے کے معنی میں استعمال ہوتے اور یہ استعمال عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق ہے، جس طرح تَنَصَّرَ نصرانی ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اس لفظ کی اصل حقیقت یہی ہے لیکن بعض مخالفین اسلام نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ قرآن نے یہ لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہود کا لفظ ہود کے مادہ سے نہیں ہے بلکہ یہ یہوذا کی طرف نسبت ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے تھے۔ اس اعتراض کے سبب سے اس لفظ کی تحقیق ضروری ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں اس لفظ کی جو تحقیق بیان کی ہے ہم اس کے ضروری حصہ کا اقتباس یہاں درج کرتے ہیں۔ مولانا اس لفظ کے اشتقاق پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم یہاں اس لفظ کے اشتقاق پر گفتگو کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ جن لوگوں نے قرآن مجید کے خلاف یہ اعتراض اٹھایا ہے انھوں نے نہ تو قرآن مجید ہی کو سمجھا ہے اور نہ خود اپنے صحیفوں ہی کو سمجھا ہے۔ قرآن مجید نے یہ لفظ جو استعمال کیا ہے تو اپنی طرف سے ایجاد کر کے نہیں کیا ہے بلکہ عربی زبان کے ایک عام استعمال کردہ لفظ کو استعمال کیا ہے۔ اہلِ عرب ہاد یہود کا فعل یہودی ہونے کے معنی میں استعمال کرتے آئے ہیں اور قرآن مجید نے هُدْنَا کا لفظ جو استعمال کیا ہے تو لفظ یہود کا اشتقاق بیان کرنے کے لیے نہیں کیا ہے بلکہ یہ لفظ اپنے اصل معنی یعنی توبہ کرنے اور رجوع کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ خاص اس لفظ کے استعمال میں بلاغت کا ایک نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ یہ یہود کو ایک ایسی حقیقت کی طرف متوجہ کر رہا ہے جس کو وہ بالکل فراموش کر بیٹھے تھے۔ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔"

"اس اعتراض سے انھوں نے خود اپنے صحیفوں سے جس بے خبری کا ثبوت دیا ہے اس کی حقیقت اس تفصیل سے واضح ہو گی جو ہم آگے پیش کر رہے ہیں:

"یہوذا حضرت یعقوب علیہ السلام کے ان بارہ بیٹوں میں سے چوتھے بیٹے تھے جن سے بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں کا ظہور ہوا ہے۔ یشوع کے زمانہ میں مفتوحہ علاقہ انھی لوگوں کے درمیان تقسیم ہوا اور اس تقسیم میں ارشلیم سے لے کر اس کے جنوب کا تمام علاقہ بنی یہوذا کے حصہ میں آیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اسی خاندان سے تھے۔ ان کے زمانہ میں تمام سلطنتِ بنی اسرائیل ان کے قبضہ میں آئی جس سے اس خاندان کی عظمت و شوکت کو چار چاند لگ گئے۔ ان کے بعد ان کے وارث اُن کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام ہوئے جنھوں نے اپنے دارالسلطنت میں ہیکل کی تعمیر کی۔ اس سے بنی یہوذا کی عظمت میں مزید اضافہ ہوا۔"

"حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کے اندر اختلافات پیدا ہوئے اور یہ پوری قوم دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ یہوذا کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا بنی اسرائیل کے۔ بقیہ خاندانوں کے نام اس کے بعد بالکل غیر معروف ہو کر رہ گئے۔ بعد کی تاریخ میں یہوذا اور اسرائیل دو ہی نام آتے ہیں۔ پھر جب یہ لوگ کلدانیوں کی اسیری میں مبتلا ہوئے ہیں تو تمام بنی اسرائیل کے لیے یہود کا لفظ ایک مشترک نام کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ یہوذا اور یہود میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے۔"

"لفظ یہوذا کے اشتقاق میں یہود کو بڑا اشتباہ پیش آیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ لفظ یہو اور ذا سے مرکب ہے۔ یہو کے معنی اللہ کے اور ذا کے معنی ہذا کے ہیں۔ چوں کہ اس طرح یہو کے ساتھ ترکیب پائے ہوئے نام ان کے ہاں موجود ہیں اس وجہ سے ان کو یہ غلط فہمی پیش آئی اور یہوذا کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کتاب پیدائش میں جو عبارت موجود ہے اس کو یہ لوگ نہ سمجھ سکے۔ سفرِ تکوین کی عبارت

یہ ہے۔

اور وہ (لیہ زوجہ یعقوب علیہ السلام) پھر حاملہ ہوئی اور اس کے بیٹا ہوا۔ تب اس نے کہا کہ میں اب خداوند کی ستائش کروں گی۔ اس لیے اس کا نام یہوذا رکھا۔ (پیدائش باب ۲۹ ۳۵)

اس سے یہود نے یہ کہا کہ یہ لفظ اس واقعہ اور یہود کے لفظ کی طرف اشارہ کر رہا ہے حالانکہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی حمد کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ الفاظ اس تاویل کے محتمل ہیں، اور مندرجہ ذیل امور اس کی تائید میں ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کے ناموں کے معانی کی طرف جس طرح ان کی ولادت کے ذکر کے سلسلہ میں اشارہ ہوا ہے اسی طرح اس موقع پر بھی اشارہ ہوا ہے جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے لیے برکت کی دعا فرمائی ہے۔ مثلاً ولادت کے بیان کے سلسلہ میں کتاب پیدائش باب ۳۰ ۱۹-۲۰ میں ہے

اور لیاہ پھر حاملہ ہوئی اور یعقوب سے اس کے چھٹا بیٹا ہوا۔ تب لیاہ نے کہا کہ خدا نے مجھے اچھا مہر بخشا۔ اب میرا شوہر میرے ساتھ رہے گا کیونکہ میرے اس سے چھ بیٹے ہو چکے ہیں سو اس نے اس کا نام زبلون رکھا۔

پھر اسی کتاب میں دعائے برکت کے سلسلہ میں یہ الفاظ وارد ہیں۔

زبلون سمندر کے کنارے بسے گا ۴۹/۱۳

غور کر کے دیکھو، ان دونوں مواقع پر سکونت کے معنی کی طرف اشارہ موجود ہے۔

اسی طرح یہوذا کے متعلق اس کتاب میں جو دعا مذکور ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:-

اے یہوداہ! تیرے بھائی تیری مدح کریں گے۔

تیرا ہاتھ تیرے دشمنوں کی گردن پر ہوگا۔

تیرے باپ کی اولاد تیرے آگے سرنگوں ہوگی۔

اس سے واضح ہوا کہ یہوداہ کے تسمیہ میں درحقیقت حمد و طاعت کا مفہوم ملحوظ ہے۔ اور لفظ یہوذا یہو اور ذا سے مرکب نہیں ہے بلکہ یہ ایک ہی لفظ ہے اور اس کا مادہ ہود ہے۔

دوسرا یہ کہ کلدانیوں کی اسیری کے بعد سے ان کے لیے مشترک طور پر جو نام استعمال ہوا ہے وہ یہود اور یہودی کا ہے۔ اس کے ثبوت عزرا، نحمیا، استیر، اشعیا، ارمیا، دانیال اور انجیل سب میں موجود ہیں یہاں تک کہ یہی نام زبان زد عوام و خواص ہو گیا۔ اگر اصل نام یہوذا ہوتا، جیسا کہ ان لوگوں کا دعویٰ ہے تو پھر اس کی طرف نسبت یہوذی (ذال کے ساتھ) ہونی چاہیے تھی نہ کہ دال کے ساتھ۔

تیسرا یہ کہ لفظ یہو کے ساتھ کسی ایسے ہی لفظ کو ملایا جا سکتا ہے جس کا ملایا جانا اس کے ساتھ موزوں ہو۔ لفظ ذا کوئی ایسا موزوں لفظ نہیں ہے جو کسی مخلوق کا نام رکھنے کے لیے اس کے ساتھ ملایا جائے کیونکہ اس کے ملانے سے جو معنی بنتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ اللہ ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی مخلوق کے لیے اس لفظ کا استعمال

ایک نہایت ہی مکروہ سی بات ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قرآن مجید نے یہاں اپنے عام قاعدے کے مطابق یہود کو ان کی ایک غلطی پر متنبہ کیا اور یہ واضح کیا ہے کہ لفظ یہودا جس کی طرف وہ اپنے کو منسوب کرتے ہیں اس کی اصل مادہ ہود سے ہے اور اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان کے نام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔[1]

لفظ نصاریٰ کی تحقیق

نصاریٰ، لفظ نصاریٰ کی تحقیق استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں مندرجہ ذیل بیان فرمائی ہے:۔

نصاریٰ نصران کی جمع ہے جس طرح ندامیٰ ندمان کی جمع ہے۔ شروع شروع میں نصاریٰ کا یہی نام تھا اور ان کے متقدمین اس نام کو پسند کرتے تھے لیکن متاخرین نے اپنے متقدمین کے برخلاف اس کو اپنی تحقیر سمجھا اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نصاریٰ بعد کے دور میں دو فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک فرقے نے خلیفہ برحق شمعون (پطرس) کی پیروی کی، اس نے اپنے آپ کو نصاریٰ سے موسوم کیا۔ اس گروہ کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لائے۔ یہی گروہ ہے جس کی قرآن نے مختلف مقامات میں تعریف فرمائی ہے۔ مثلاً وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۸۲۔ مائدہ ۵ (اور تم اہل ایمان کی دوستی میں ان لوگوں کو زیادہ قریب پاؤ گے جنھوں نے اپنے آپ کو نصاریٰ کہا) اس آیت میں اس بات کی تصریح ہے کہ قرآن کا ممدوح گروہ وہی ہے جس نے اپنے آپ کو نصاریٰ سے موسوم کیا۔

ان کے دوسرے فرقے نے مبتدع بولس (پال) کی پیروی کی، موجودہ عیسائی اسی فرقہ سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک نصاریٰ کا لفظ ایک تحقیر کا لفظ ہے۔ ان کے خیال میں یہ ایک گاؤں کی طرف نسبت ہے جو ایک نہایت حقیر سا گاؤں تھا۔ چنانچہ یوحنا باب ۴۵ میں ہے:۔

فلپس نے نتن ایل سے مل کر اس سے کہا کہ جس کا ذکر موسیٰ نے توریت میں اور نبیوں نے کیا ہے وہ ہم کو مل گیا، وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے۔ نتن ایل نے اس سے کہا، کیا ناصرہ سے کوئی اچھی چیز نکل سکتی ہے؟" یہ بات اس گروہ کے تکبر کی ایک دلیل ہے۔ اگر حضرت عیسیٰؑ کا مولد ناصرہ ہی ہے تو اس کی طرف منسوب ہونے میں حقارت کا کون سا پہلو ہے۔ جب کہ ان لوگوں کا دعویٰ بھی ہے کہ ناصرہ حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش ہے اور یہ کہ وہ ناصری کے لقب سے پکارے جائیں گے۔ چنانچہ متی باب ۲۔ ۲۳ میں ہے:۔

---

[1] اس تمام تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن میں تحقیق لفظ 'هَادُوْا'

اور نام مرو تھا ایک شہر میں جا بسا تا کہ جرمنیوں کی معرفت کیا گیا تھا وہ پورا ہو کر وہ ناصری کہلائے گا۔" بعض مخالفین قرآن نے اس لفظ کو بھی قرآن پر اعتراض کا بہانہ بنایا ہے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ چوں کہ قرآن کو اس وجہ تسمیہ کا پتہ نہیں تھا اس وجہ سے اس نے نصاریٰ کو نصرت سے ماخوذ سمجھا ہے اور سورہ صف کی اس آیت میں اسی پہلو سے ان کا ذکر کیا ہے کہ إِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ (اور یاد کرو جب کہ عیسیٰ بن مریمؑ نے حواریوں سے کہا کہ خدا کی راہ میں میرا مددگار کون بنتا ہے، حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں) ہمارے نزدیک ان معترضین کا یہ اعتراض آیت کے مفہوم سے بالکل ناواقفیت پر مبنی ہے۔ یہاں قرآن مجید نے نصاریٰ کی وجہ تسمیہ نہیں بیان کی ہے بلکہ ایک امر واقعی بیان فرمایا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات اس آیت سے نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ایک لطیف تلمیح اس بات کی طرف ہے کہ جو لوگ نصاریٰ کے نام سے موسوم ہیں انھیں حق کا مددگار ہونا چاہیے کیوں کہ اس کا اشارہ خود ان کے نام کے اندر موجود ہے۔ اس قسم کی لطیف تلمیحات انبیاء علیہم السلام کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ چناں چہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شمعون سے جن کا لقب صفا تھا فرمایا کہ "اور میں بھی تجھ سے کہتا ہوں کہ تو پطرس ہے اور میں اس پتھر پہ اپنی کلیسا بناؤں گا" متی باب ۱۶: ۱۸[1]

لفظ صابئین کی تحقیق

صَابِئِينَ، صابئین کے متعلق اہل تاویل کے متعدد اقوال منقول ہیں۔ مجاہد اور حسن کے نزدیک یہ لوگ کسی خاص دین کے پیرو نہیں تھے بلکہ یہودیت اور مجوسیت کے بین بین تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک ان کا ذبیحہ حرام ہے ابن زید کا قول ہے کہ یہ ایک مخصوص دین کے پیرو تھے اور جزیرہ موصل میں آباد تھے، ان کا عقیدہ توحید تھا لیکن نہ تو یہ کسی نبی اور کسی کتاب کے پیرو تھے اور نہ ان کے ہاں شرعی اعمال کا کوئی مخصوص نظام تھا۔ قتادہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ملائکہ کی پرستش کرتے، قبلہ کی طرف نماز پڑھتے اور زبور کی تلاوت کرتے تھے۔ ابوالعالیہ اور سفیان کے نزدیک یہ لوگ اہل کتاب ہی سے ایک فرقہ تھے۔

مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اقوال بظاہر متضاد نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ان میں تضاد نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اول اول یہ لوگ دین حق پر تھے لیکن بعد میں یہ لوگ دین حق سے منحرف ہو کر ملائکہ اور ستاروں کی پرستش میں مبتلا ہو گئے۔ یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے جس طرح حضرت اسماعیلؑ کی اولاد پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر تھی لیکن بعد میں شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو گئی۔ قرآن مجید کی زیر بحث آیت سے مولاناؒ کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ قرآن نے اس گروہ کا جس انداز سے ذکر فرمایا ہے اس سے یہ امر تو بالکل واضح ہے کہ یہ لوگ ابتداءً دین حق پر تھے، بعد میں بدعتوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہوئے۔ مولاناؒ کا بیان

---

[1] اس تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن میں لفظ نصاریٰ کی تحقیق۔

یہ ہے کہ ان لوگوں کے اندر نماز کی عبادت معلوم ہوتا ہے بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ اسی اشتراک کے سبب سے مشرکین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو صابئین کہتے تھے۔

ان کی وجہ تسمیہ سے متعلق مولاناؒ کا خیال یہ ہے کہ چوں کہ صبا کے معنی طلوع ہونے کے آتے ہیں اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اپنی ستارہ شناسی اور معرفت نجوم میں مہارت کے سبب سے اس نام سے موسوم ہوئے ہوں۔

چوں کہ اس مذہب کے پیرؤوں کا وجود اب کہیں باقی نہیں رہا ہے اور نہ ان کی کوئی مستند تاریخ ہی موجود ہے اس وجہ سے ان کے متعلق اعتماد سے کوئی بات کہنا مشکل ہے لیکن قرآن مجید کے زمانہ نزول میں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرقہ کی حیثیت سے ان لوگوں کا وجود بالکل معروف تھا۔

۲۴۔ کیا اہل کتاب کے لیے رسول اللہ (صلعم) پر ایمان لانا ضروری نہیں؟

اس مجموعہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو تعلیمیں دی ہیں الفاظ اور جملوں کی وضاحت کرتے ہوئے ہم ان کی طرف بقدر ضرورت اشارہ کرتے آئے ہیں۔ اب ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ مجموعہ کی آخری آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (بقرہ ۶۲) پر ہم یہاں کچھ گفتگو کریں گے اس لیے کہ اس زمانہ کے بعض متکلمین اور منکرین سنت اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جو اہل کتاب اپنے اپنے صحیفوں کی تعلیمات پر نیک نیتی کے ساتھ عمل کر رہے ہیں، قرآن مجید ان کی نجات کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں ٹھہراتا۔ ان کے خیال میں ایسے اہل کتاب کی نجات کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے صحیفوں اور نبیوں کی تعلیم پر نیک نیتی کے ساتھ عمل کریں۔ ان لوگوں نے اپنے اس خیال کی تائید میں جن چیزوں سے استدلال کیا ہے ان میں بقرہ کی یہ آیت بھی شامل ہے، اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہم اس آیت کا سیاق و سباق اچھی طرح واضح کر دیں تاکہ جو لوگ قصداً غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوئے ہیں ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

اس آیت کو اس خیال کی تائید میں پیش کرنے کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں ان کے خیال میں مسلمان، یہود، نصاریٰ اور صابئین تمام قابل ذکر مذہبی گروہوں کا نام لے کر تصریح کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ ان میں سے جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا اور عمل صالح کرتا ہے اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے، اس کو نہ تو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ کوئی غم۔ ظاہر ہے کہ اگر اس آیت کا یہی مفہوم لیا جائے تو مذکورہ فرقوں کے لوگوں کے لیے نجات حاصل کرنے کے واسطے نہ تو رسول اللہ پر ایمان لانے کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ اللہ اور آخرت کے سوا ان دوسرے اجزائے ایمان پر ایمان لانے کی ضرورت باقی رہتی ہے جن پر ایمان لانا قرآن اور حدیث میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔

لیکن اس آیت کا یہ مفہوم صرف اس صورت میں لیا جا سکتا ہے جب سیاق و سباق اس بات پر دلیل

ہو کہ یہ آیت اجزائے ایمان کی تفصیل کے لیے نازل ہوئی ہے۔ آیت کے موقع و محل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سوال، جیسا کہ ہم اوپر بھی اشارہ کر چکے ہیں، یہ نہیں ہے کہ نجات کے لیے کن کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور کن چیزوں پر ضروری نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ خدا کے ہاں کسی کو کوئی درجہ یا مرتبہ کسی مخصوص خاندان یا فرقہ یا گروہ سے نسبت رکھنے کی بنا پر حاصل ہوتا ہے یا ایمان اور عمل صالح کی بنا پر؟ اس سوال کا جواب قرآن مجید نے یہ دیا ہے کہ یہ چیز صرف ایمان اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتی ہے، یہ کسی خاص خاندان یا کسی گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔ اور مقصود اس سے یہود کے سامنے اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ انبیاء کے خاندان سے نسبت رکھنے کے سبب سے اپنے آپ کو وہ ایک نجات یافتہ گروہ جو سمجھنے لگے ہیں تو یہ سر تا سر ان کی غلط فہمی ہے۔ خدا سے نسبت حاصل کرنے کے لیے اصل چیز اللہ اور آخرت پر ایمان اور عمل صالح ہے۔

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے مندرجہ ذیل حقائق بھی پیش نظر رکھیے۔

ایک یہ کہ یہ آیت اس سورہ میں وارد ہے جس کا عمود ہی، جیسا کہ ہم شروع میں تفصیل کے ساتھ واضح کر چکے ہیں[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور یہ دعوت خاص طور پر یہود ہی کے سامنے پیش بھی اس سورہ میں کی گئی ہے۔ چنانچہ تلمیحات اور اشارات سے قطع نظر خاص یہ سلسلہ کلام جس کے خاتمہ پر زیر بحث آیت وارد ہے اس طرح شروع ہوتا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ	اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے
اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ	تم پر کی اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے
بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ وَاٰمِنُوْا	عہد کو پورا کروں گا اور مجھی سے ڈرو اور ایمان لاؤ
بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ	اس چیز پر جو میں نے اتاری ہے تصدیق کرتی
وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ وَلَا	ہوئی اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے
تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّاِيَّايَ	پہلے انکار کرنے والے نہ بنو اور میری آیتوں کو حقیر
فَاتَّقُوْنِ (۴۰-۴۱ بقرہ)	قیمت پر نہ بیچو اور مجھی سے تقویٰ اختیار کرو۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کو صریح الفاظ میں مخاطب کر کے قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور اس کے انکار کو صریح الفاظ میں کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ غور کیجیے کہ قرآن پر ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر کس طرح ممکن ہے اور پھر اس بات پر غور کیجیے کہ جب اس آیت میں قرآن اور رسول اللہ پر ایمان نہ لانے کو کفر قرار دیا گیا ہے تو اسی سلسلہ کلام میں چند ہی آیتوں کے بعد اس مضمون کی آیت کس طرح آسکتی ہے کہ اہل کتاب کے لیے قرآن پر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ اس کے

---

[1] ملاحظہ ہو فصل ۱

بغیر بھی ان کی نجات ہو سکتی ہے۔ یہ تو نہایت بھونڈے قسم کا تضاد ہوگا جو کسی عام کتاب میں بھی سخت عیب ہے چہ جائیکہ قرآن حکیم میں۔

دوسری یہ کہ یہی آیت تھوڑے سے تغیر الفاظ کے ساتھ سورۂ مائدہ میں وارد ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَ	بے شک جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور
الصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَ	صابی اور نصاریٰ، جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور
الْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ	یوم آخرت پر اور اس نے عمل صالح کیا تو نہ ان پر کوئی
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۶۹۔ مائدہ ۵)	خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

وہاں ٹھیک اس کے اوپر کی آیت یہ ہے:۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ	کہہ دو، اے اہل کتاب تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے
حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ	جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہ کرو اور اس
وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ	چیز کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی
وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ	جانب سے اتاری گئی ہے اور ان میں سے بہتوں
إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ	کے اندر وہ چیز جو تیری طرف تیرے رب کی جانب سے
فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ	اتاری گئی ہے سرکشی اور کفر کو بڑھاتی ہے تو تم اس
الْكَافِرِينَ (۶۸۔ مائدہ ۵)	کافر قوم کے حال پر غم نہ کرو۔

یہاں ظاہر ہے کہ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ سے مراد قرآن مجید ہے جس کے تورات اور انجیل کے ساتھ قائم کرنے کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے اور جس کو قائم کیے بغیر ان کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ سرے سے خدا کے نزدیک ان کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے چہ جائیکہ وہ اپنے آپ کو خدا کی محبوب اور جنتی قوم سمجھیں۔ یہاں تورات و انجیل کو قائم کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ قرآن پر اور پیغمبر آخر الزماں پر ایمان لاؤ کیوں کہ ان پر ایمان لانے ہی سے وہ عہد پورا ہوگا جو ان صحیفوں میں پیغمبر آخر الزماں کے بارے میں تم سے لیا گیا تھا۔

اس مضمون کی مزید وضاحت اس کی اوپر کی آیتوں سے بھی ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوا ہے:۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَ	اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو
اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ	ہم ان سے جھاڑ دیتے ان کے گناہ اور ان کو نعمت
وَلَأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝ وَلَوْ	کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ تورات اور انجیل
أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ	کو قائم کرتے اور اس چیز کو قائم کرتے جو ان کے رب
وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا	کی جانب سے ان کی طرف اتاری گئی تو وہ اوپر اور

مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ	نیچے ہر طرف سے خدا کا فضل پاتے۔ ان میں سے ایک
مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ	جماعت میانہ رَو ہے لیکن ان میں زیادہ ایسے ہیں جن کے
سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ	عمل نہایت بُرے ہیں۔ اے رسول جو چیز تم پر تمہارے
بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ	رب کی جانب سے اُتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا
اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ	دو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو گویا خدا کا پیغام نہیں پہنچایا
اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا	اور اللہ تمہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا، اللہ کافروں
يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۶۶-۶۷، مائدہ)	کو راہ یاب نہیں کرتا۔

اس آیت میں بھی تورات وانجیل کے قائم کرنے سے مراد درحقیقت قرآن (مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ) پر ایمان لانا اور اس کو قائم کرنا ہے کیوں کہ اس پر ایمان لانے ہی سے اس عہد کی تکمیل ہوتی تھی جو ان سے آخری پیغمبر کے بارے میں تورات اور انجیل میں لیا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس میں یہود و نصاریٰ کو یہ اطمینان بھی دلایا گیا ہے کہ انھیں اس بات کا اندیشہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر وہ قرآن پر ایمان لائے تو ان تمام دنیوی فوائد و منافع سے وہ محروم ہو جائیں گے جن سے اس وقت وہ متمتع ہو رہے ہیں۔ اگر وہ اللہ سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کرنے کے لیے اپنے موجودہ مفادات سے دستکش ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے اپنی رحمتوں اور برکتوں کے دوسرے بہت سے دروازے کھول دے گا۔

تیسری یہ کہ قرآن مجید میں اس بات کی تصریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد سے اہل کتاب میں سے خدا کی رحمت میں سے وہی اہل کتاب حصہ پائیں گے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے۔ چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے لیے رحمت کی دعا کی ہے تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ رحمت ان لوگوں کے لیے خاص ہوگی جو تقویٰ اختیار کریں گے۔ زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے اور ان میں سے جن کو پیغمبر آخرالزماں کی بعثت نصیب ہوگی وہ ان پر بھی ایمان لائیں گے۔ سورہ اعراف میں ارشاد ہے:۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً	اور ہمارے لیے اس دنیا میں اور آخرت میں بھلائی
وَّفِى الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِىْۤ	لکھ دے، ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ فرمایا، میں اپنا
اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ	عذاب جس پر چاہتا ہوں نازل کرتا ہوں اور میری رحمت
كُلَّ شَىْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ	ہر چیز کو عام ہے۔ سو میں اس کو لکھ رکھوں گا۔ ان لوگوں کے
يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا	لیے جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکاۃ دیتے رہیں گے
يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ	اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔ یعنی جو اس رسول
النَّبِىَّ الْاُمِّىَّ الَّذِىْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا	نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جس کو لکھا ہوا پاتے ہیں

عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم	اپنے ہاں تورات اور انجیل میں، جو ان کو حکم دیتا ہے
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ	نیکی کا اور روکتا ہے برائی سے اور حلال ٹھہراتا ہے ان
الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ	کے لیے پاکیزہ چیزیں اور حرام ٹھہراتا ہے ناپاک چیزیں
عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ	اور ان سے دور کرتا ہے وہ بوجھ اور پھندے جو ان
فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ	پر تھے۔ پس جو اس پر ایمان لائے اور جنھوں نے اس
وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ	کی تائید اور مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے
مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○	ساتھ اتارا گیا ہے، وہی لوگ فلاح پانے والے
(١٥٥-١٥٧، اعراف)	ہیں۔

چوتھی یہ کہ قرآن مجید میں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام دنیا کے لوگوں کے لیے ہوئی ہے اور آپ نے تمام خلق کو عموماً اور اہل کتاب کو خصوصاً اپنی نبوت پر ایمان لانے کی نہایت غیر مبہم الفاظ میں دعوت بھی دی ہے چنانچہ اہل کتاب کو خاص طور پر مخاطب کر کے آپ نے ان الفاظ میں دعوت دی ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ	کہہ دو، اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو
جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ	کر آیا ہوں، اس اللہ کا جس کے لیے ہی ہے آسمانوں
وَالْأَرْضِ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ	اور زمین کی بادشاہی، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی، وہی جلا
فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ	زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر
الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ	اور اس کے رسول نبی امی پر جو ایمان لاتا ہے اللہ اور
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ○	اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم
(١٥٨- اعراف)	راہ یاب ہو۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نجات کے لیے جس طرح دوسروں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اہل کتاب کے لیے بھی ضروری ہے بلکہ قرآن کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے لیے دوسروں کے بالمقابل زیادہ ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے صحیفوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں اور علامتیں موجود تھیں اور ان سے ان کے نبیوں کے واسطے سے عہد لیا جا چکا تھا کہ جب آخری نبی کی بعثت ہوگی تو وہ اس پر ایمان لائیں گے اور سب سے آگے بڑھ کر اس کی مدد کریں گے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن نے ان کو مخاطب کر کے یہ کہا ہے کہ تمہارا فرض منصبی اس دعوت کو قبول کرنے میں سبقت کرنا ہے، تم اس کی تکذیب میں سبقت کرنے والے نہ بنو۔

یہاں یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ اس معاملہ میں قرآن مجید نے اچھے اہل کتاب اور برے اہل کتاب میں

کوئی فرق نہیں کیا ہے جہاں تک نجات کا تعلق ہے دونوں ہی قسم کے اہل کتاب کی نجات کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر اہل کتاب کے صالح لوگوں کی قرآن نے جگہ جگہ تعریف کی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی یہ نیکی ان کی نجات کے لیے کافی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا رویہ ان کی حق پسندی کے سبب سے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اچھا تھا اور اس قسم کے سارے لوگ آہستہ آہستہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ دوسرے آسمانی مذاہب اور آسمانی صحیفوں کے بارے میں قرآن مجید کا یہ موقف ضرور ہے کہ وہ ان کے آسمانی ہونے کی تصدیق کرتا ہے لیکن اس تصدیق کے بھی یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ان کو محفوظ مانتا ہے اور اگر ان کے پیرو نیک نیتی کے ساتھ ان کی پیروی کرتے رہیں تو یہ چیز ان کی نجات کے لیے کافی ہو جائے گی بلکہ وہ ان کے آسمانی ہونے کی تصدیق کے ساتھ بالکل غیر مبہم الفاظ میں یہ بات بھی کہتا ہے کہ ان صحیفوں میں بہت سی تحریفیں ہو چکی ہیں جن کے سبب سے یہ قابل اعتماد نہیں رہے۔ اب خدا کے دین کا محفوظ صحیفہ صرف قرآن ہے۔ اس کے سوا صراط مستقیم پانے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد دنیا کے لیے صراط مستقیم پانے اور نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اگر کوئی ہے تو یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا جائے اور آپ کی پیروی کی جائے۔ اس کے سوا نجات حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ اس کلیہ میں اگر کسی استثنا کی گنجائش نکلتی ہے تو صرف ان لوگوں کے لیے نکلتی ہے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سرے سے پہنچی ہی نہ ہو لیکن اس معاملہ کا فیصلہ ہم اور آپ نہیں کر سکتے بلکہ وہ عالم الغیب ہی کر سکتا ہے جو سب کے حالات اور ہر ایک کے ظاہر و باطن سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کون لوگ مستحق ہیں جنھوں نے حق کو ڈھونڈھنے کے لیے اپنی ذمہ داریاں ادا کیں لیکن دعوت نہ پہنچنے کے سبب سے وہ حق کو پانے سے محروم رہے۔ امید ہے کہ ایسے لوگوں کے عذر کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور ان سے ان کے علم ہی کے حد تک مواخذہ فرمائے۔

۲۵۔ مسلمانوں کے لیے ایک خاص تنبیہ

آیت زیر بحث میں مسلمانوں کے لیے ایک خاص تنبیہ بھی ہے جس کی طرف یہاں توجہ دلا دینا ضروری ہے۔ اس آیت میں اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سے مراد مسلمان بحیثیت ایک گروہ اور جماعت کے ہیں۔ ان کے متعلق فرمایا کہ خواہ مسلمان ہوں یا یہود یا نصاریٰ یا صابی، کوئی ہو اللہ کے ہاں بہ حیثیت ایک گروہ کے سب برابر ہیں ان میں سے کسی کو بھی خدا کے ہاں کوئی شرف اور عزت حاصل نہیں ہے مگر ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ سے۔ صرف ایمان اور عمل صالح ہی ہے جو خدا کے ہاں تقرب اور عزت کا وسیلہ بن سکتا ہے۔ اس فہرست میں سر فہرست مسلمانوں کو رکھا ہے جس سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ اگر بہ حیثیت ایک گروہ کے خدا کے ہاں کسی عزت کی توقع کر سکتے تھے تو مسلمان کر سکتے تھے جن کو خدا نے دنیا کی اصلاح کے لیے آخری ملت اور

خیرامت کی حیثیت سے مبعوث فرمایا ہے لیکن ایمان اور عمل صالح سے الگ ہو کر ان کے لیے بھی خدا کے ہاں کوئی مقام نہیں ہے۔ پھر آخر میں صابئین کا ذکر کیا ہے جن کی حیثیت ایک غیر معروف فرقہ کی تھی۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خواہ کوئی گروہ کتنا ہی گمنام اور بے حیثیت ہو لیکن اگر اس کے پاس ایمان اور عمل صالح کی دولت موجود ہو تو اس کو اللہ کے ہاں اونچا سے اونچا مقام حاصل کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

جس طرح یہود نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نسبت رکھنے کے سبب سے اپنے آپ کو خدا کی ایک محبوب قوم سمجھ رکھا تھا اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ایمان اور عمل صالح کی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو گئے تھے اور سمجھنے لگے تھے کہ دوزخ کی آگ صرف دوسروں ہی کے لیے ہے، ان کے لیے نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو صرف عارضی طور پر، اسی طرح مسلمان بھی امتِ مرحومہ میں ہونے کا یہ مطلب سمجھنے لگے ہیں کہ ان کے لیے تو بہرحال خدا کے ہاں معافی ہے خواہ ان کے اعمال کچھ بھی ہوں۔ یہ آیت اس قسم کے تمام توہمات کی جڑ کاٹتی ہے اور مسلمانوں کو تنبیہ کرتی ہے کہ خدا کے ہاں ایمان اور عمل صالح کی کسوٹی پر سب سے پہلے جو پرکھے جائیں گے ان میں مسلمان سرِ فہرست ہیں۔

۳۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۶۳-۸۲

آگے بنی اسرائیل کو ان تمام عہد شکنیوں کی یاد دہانی کی جارہی ہے جن کے وہ ابتدا سے خدا کی شریعت کے معاملہ میں مرتکب ہوتے رہے ہیں اور مقصود اس سے اس امر کو واضح کرنا ہے کہ کیوں وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو امامت کے منصب سے معزول کرے اور ان کی جگہ ایک دوسری امت کو اٹھائے جو اس کی شریعت کو از سرِ نو تازہ صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرے اور اس کو قائم کرے۔ یہ سلسلہ آگے دور تک جاتا ہے جس کے بیچ بیچ میں نئی برپا ہونے والی امت یعنی مسلمانوں سے مناسبِ موقع خطابات بھی ہیں لیکن یہ خطاب ضمنی ہیں۔ اصل خطاب یہود ہی سے ہے اور مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہود کی فردِ قرار دادِ جرم کو پوری تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے رکھ دینا ہے۔

آیات ۶۳-۸۲ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ
بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ
بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ
مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ
فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا

نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾ وَإِذْ
قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تَذْبَحُوا بَقَرَةً ۖ قَالُوا
أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٦٧﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا
بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ
صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن
لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾
قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ
مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا
وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا ۖ ع
وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ
كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾
ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ
قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا
لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ
اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٧٤﴾ أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا
لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن

بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ
بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاۗجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾
اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَ
مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِىَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا
يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۤ ثُمَّ النصف
يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ
لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَقَالُوْا
لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ
عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـــــَٔــتُهٗ
فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع ۹ ۱۱ ۹

ترجمہ آیات ۶۳ - ۸۲

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے تمہارا عہد لیا اور اٹھایا تمہارے اوپر طور کو، پکڑو اس
چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی کے ساتھ اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو تاکہ تم
خدا کے غضب سے محفوظ رہو۔ پھر تم نے اس سب کے بعد اعراض کیا، تو اگر تم پر اللہ کی عنایت
اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم نامرادوں میں سے ہو چکے ہوتے۔ اور ان لوگوں کا علم تو تمہیں

سے ہی جنھوں نے سبت کے معاملے میں حدودِ الٰہی کی بے حرمتی کی تو ہم نے ان کو دھتکارا کہ جاؤ، ذلیل بندر بن جاؤ۔ تو ہم نے اس کو نمونہ عبرت بنا دیا ان لوگوں کے لیے جو اس کے آگے اور پیچھے تھے اور اس کو خدا ترسوں کے لیے نصیحت بنایا۔ ۶۳-۶۶

اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ تو وہ بولے کہ کیا تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو۔ اس نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں سے بنوں۔ انھوں نے کہا اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ واضح کرے کہ گائے کیسی ہو؟ اس نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو، نہ بچھیا، بیچ کی راس ہو۔ تو کرو جو تمھیں حکم دیا جا رہا ہے۔ بولے اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ واضح کرے کہ اس کا رنگ کیا ہو؟ اس نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ سنہری ہو، شوخ رنگ، دیکھنے والوں کے لیے دل پسند۔ بولے اپنے رب سے دعا کرو کہ اچھی طرح واضح کر دے کہ وہ کیسی ہو، اس لیے کہ گایوں کے امتیاز میں گھپلا ہو رہا ہے۔ اور ان شاء اللہ اب ہم پتہ لگا لیں گے۔ اس نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے کمیری، زمین کو جوتنے والی اور کھیتوں کو سیراب کرنے والی نہ ہو۔ بالکل یک رنگ ہو، اس میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ بولے، اب تم واضح بات لائے۔ پھر انھوں نے ذبح کی اور وہ ذبح کرتے نظر نہ آتے تھے۔ ۶۷-۷۱

اور یاد کرو جب کہ تم نے ایک نفس کو قتل کر دیا، پھر اس کے بارے میں ایک دوسرے پر الزام بازی کی، حالانکہ اللہ وہ سب کچھ ظاہر کرنے والا ہے جو تم چھپاتے رہے ہو۔ تو ہم نے کہا اس کو اس کے ایک جزو سے مارو۔ اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا اور تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ پھر اس سب کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے، پس وہ پتھر کے مانند

ہو گئے یا ان سے بھی زیادہ سخت۔ پتھروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں، بعض پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی جاری ہو جاتا ہے اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو خوف خدا سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ ۷۲-۷۴

کیا تم لوگ یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمھاری بات مان لیں گے اور حال یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ اللہ کے کلام کو سنتا رہا ہے اور اس کو سمجھ چکنے کے بعد اس کی تحریف کرتا رہا ہے اور وہ جانتے ہیں۔ اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، کیا تم ان کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں کہ وہ تمھارے رب کے پاس تم سے حجت کریں۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟ کیا انھیں نہیں معلوم ہے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ۵-۷۷

اور ان میں اَن پڑھ ہیں جو کتاب الٰہی کو صرف اپنی آرزوؤں کا مجموعہ خیال کرتے ہیں حالانکہ وہ صرف اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں۔ پس ہلاکی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شریعت تصنیف کرتے ہیں پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تھوڑی سی قیمت حاصل کریں۔ پس ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے جو وہ کماتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ان کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر صرف گنتی کے چند دن۔ پوچھو کیا تم نے اللہ کے پاس اس کے لیے کوئی عہد کرا لیا ہے کہ اللہ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایک ایسی تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے

میں تمھیں کچھ علم نہیں۔ البتہ جس نے کمائی کوئی بدی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور جو ایمان لائے اور جنھوں نے بھلے کام کیے تو وہی لوگ جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۸۰-۸۲

۳۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۶۳)

میثاق کا مفہوم

موثق اور میثاق کے معنی عہد و پیمان کے ہیں۔ اس لفظ کی روح وثوق اور استحکام ہے اس وجہ سے یہ خاص طور پر اس عہد و پیمان کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی اہم معاملہ کے لیے پورے شعور اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ باندھا گیا ہو اور جس کی وفاداری کا تاکید کے ساتھ اظہار و اقرار کیا گیا ہو۔ یہاں اس سے مراد وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل سے تورات کی پابندی کا لیا گیا۔ شریعت الٰہی خدا اور بندوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوتی ہے اس وجہ سے اس کو میثاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سورۂ اعراف میں اس میثاق کا حوالہ اس طرح آیا ہے۔

أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِم مِّيثَاقُ الْكِتَابِ	کیا ان سے کتاب کے باب میں میثاق نہیں لیا گیا
أَن لَّا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا	کہ اللہ کی طرف نہیں منسوب کریں گے مگر حق بات اور
مَا فِيهِ ۗ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ	انھوں نے اس کو اچھی طرح پڑھا جو اس میں ہے اور
لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ وَ	دار آخرت کی کامیابی ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ
الَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَ	اختیار کریں، تو کیا تم سمجھتے نہیں! اور جو لوگ کتاب
أَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ	کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیں گے اور نماز قائم کریں گے
أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ۝ وَإِذْ نَتَقْنَا	وہی لوگ مصلح ہیں، ہم مصلحوں کا اجر ضائع نہیں کریں گے
الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا	اور یاد کرو جب کہ ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو اس طرح
أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم	اٹھا لیا گویا وہ سائبان ہے اور انھوں نے گمان کیا
بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ	کہ وہ ان پر گر کر رہے گا۔ لو اس کو جو ہم نے تم کو دیا
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝	ہے مضبوطی کے ساتھ اور جو کچھ اس میں ہے اس کو
(اعراف ۱۶۹ - ۱۷۱)	برابر یاد رکھو تاکہ تم خدا کے غضب سے محفوظ رہو۔

پہاڑ کو سر پر لٹکانے کا مفہوم

یہ معاہدہ قرآن مجید اور تورات دونوں میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل کے سرداروں سے دامن کوہ میں لیا گیا اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک سخت زلزلہ نے پہاڑ کو ہلا دیا۔ اگر زلزلہ کے وقت آدمی کسی اونچی دیوار کے زیرِ سایہ یا پہاڑ کے دامن میں بیٹھا ہو تو ایسا معلوم ہوگا کہ پہاڑ یا دیوار سائبان کی طرح سر پر ٹنگ رہے ہیں اور اوپر گرا چاہتے ہیں۔ اس حالت کو قرآن نے طور کو ان کے سروں پر اٹھا لینے سے تعبیر کیا ہے۔

قدرت اور جلال کا مظاہرہ

یہ پہاڑ ان کے سروں پر لٹکا دینا بنی اسرائیل کو معاہدہ پر مجبور کرنے کے لیے نہیں تھا کہ اگر وہ یہ معاہدہ نہیں کرتے ہیں تو اس پہاڑ سے وہ کچل کر رکھ دیے جائیں گے۔ معاہدہ کو قبول کرنا یا نہ کرنا ایک امر اختیاری ہے۔ دین کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے زبردستی اور جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے یہ جو کچھ ہوا وہ محض اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے جلال کا ایک مظاہرہ تھا تاکہ بنی اسرائیل اس بات کو یاد رکھیں کہ جس خدا کے ساتھ وہ شریک معاہدہ ہو رہے ہیں وہ کوئی کمزور اور بے اختیار ہستی نہیں ہے بلکہ اس کی قدرت بے پناہ ہے معاہدہ کی پابندی کی شکل میں جس طرح دنیا اور آخرت دونوں میں اس کے انعامات کی کوئی حد نہیں ہے اسی طرح اس کی خلاف ورزی کی صورت میں اس کے غضب کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ طور جیسے عظیم پہاڑ کو ان کے سروں پر لٹکا سکتا اور اس سے ان کو کچل کے رکھ دے سکتا ہے۔

اصل میثاق

خُذُوا مَآ اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّۃٍ وَّاذۡکُرُوۡا مَا فِیۡہِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ: یعنی اس تورات کو جو تمہارے لیے اللہ کا ایک عظیم عطیہ ہے، پوری مضبوطی اور پوری عزیمت کے ساتھ لو اور زندگی کے تمام مراحل میں پورے استقلال اور پوری پامردی کے ساتھ اس کے احکام اور اس کی ہدایات کو نباہو۔ اس کے احکام نرم بھی ہیں اور سخت بھی، نیز اس کی ذمہ داری یُسر میں بھی ہے اور عُسر میں بھی، اس وجہ سے کمزور ہاتھوں اور ڈھیلے ارادوں کے ساتھ اس کا حق ادا نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لیے قوت اور عزیمت مطلوب ہے۔

وَاذۡکُرُوۡا مَا فِیۡہِ: جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو، سے مراد احکام و ہدایات بھی ہیں اور خاص طور پر وہ تنبیہات اور تہدیدات بھی جو اس میثاق کی خلاف ورزی کے نتائج سے متعلق بنی اسرائیل کو سنا دی گئی تھیں۔ تورات میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان کو آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اگر وہ اس عہد پر قائم رہیں گے تو وہ زمین اور آسمان دونوں طرف سے خدا کا فضل پائیں گے اور اگر انھوں نے اس کی ناقدری کی تو دنیا اور آخرت دونوں میں اس کی سزا بھی بڑی ہی سخت ہوگی۔

لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ، سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو، اس لیے کہ کتاب الٰہی کا اصل مقصد ہی راہ تقویٰ کی نشان دہی ہوتا ہے لیکن ہم نے موقع کلام اور سیاق و سباق کی روشنی میں اس سے خدا کے قہر و غضب سے بچنا مراد لیا ہے۔ ہمارا ذہن اس طرف اس وجہ سے گیا ہے کہ اس سے پہلے ان کو خاص طور پر جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان تنبیہات و تہدیدات کو یاد رکھنے کی نصیحت کی گئی ہے جو تورات میں میثاق الٰہی کی

خلاف ورزی کے نتائج سے متعلق ان کو سنائی گئی تھیں اور ان کے سنانے سے مقصود یہی تھا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں خدا کے قہر و غضب سے محفوظ رہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ (۶۴)

اسلاف کے اعمال کی نسبت اخلاف کی طرف

پھر تم اس سب کے بعد پھر گئے۔ یہ خطاب ظاہر ہے کہ زمانۂ نزولِ قرآن کے بنی اسرائیل سے ہے درآنحالیکہ یہ فعل اعراض ان کے پہلوں سے صادر ہوا تھا اور یہ لوگ اس راہ میں موجد نہیں بلکہ اپنے اگلوں کے مقلد تھے۔ یہ طرزِ خطاب اس حقیقت کی طرف نہایت بلیغ اشارہ کر رہا ہے کہ اگر اخلاف گمراہی یا ہدایت کے معاملہ میں ٹھیک ٹھیک اپنے اسلاف کے نقشِ قدم ہی پر چل رہے ہوں تو ان کی تاریخ اور ان کے اسلاف کی تاریخ گویا ایک ہی ہے۔ اسلاف کے افعال بے تکلف اخلاف کی طرف بھی منسوب ہوں گے اور اخلاف کی گمراہیوں کی تاریخ اسی وقت سے شروع ہوگی جب سے ان کے اسلاف نے اس برائی کی اپنے معاشرے میں طرح ڈالی۔

مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ کا ترجمہ ہم نے اس سب کے بعد کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان اور قرآن میں اس اسلوب کے استعمالات سے واضح ہوتا ہے کہ ذٰلِكَ جب اس طرح استعمال ہوتا ہے تو اوپر بیان کی ہوئی پوری سرگزشت کی طرف ایک جامع اشارہ کر دیتا ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ تورات کی پابندی کا میثاق باندھ چکنے، خدا کا جلال دیکھ لینے اور تمام تنبیہات و تہدیدات سے اچھی طرح واقف ہو چکنے کے بعد تمہارے اسلاف نے اس عہد سے منہ موڑا اور تم نے اس معاملہ میں ٹھیک انھی کی روش کی تقلید کی۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ الآیہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے اعمال و افعال تو شروع ہی سے ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں دھتکار دیتا لیکن یہ محض اس کا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے تمھیں آج تک مہلت دی۔ اس کے اس فضل و رحمت کا حق یہ ہے کہ اس کے شکر گزار بنو اور اپنی اس روش کو درست کرو لیکن تم اُلٹا اپنی اس روش پر فخر کر رہے ہو۔ اور اس فخر میں مبتلا ہو کر اس آخری موقع کو بھی ضائع کرنا چاہتے ہو جس کے بعد تمہارے لیے اصلاحِ حال کا کوئی موقع بھی باقی نہیں رہے گا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٔيْنَ (۶۵)

یہود کے نقضِ عہد کی ایک مثال

یہ اس نقضِ عہد کی ایک مثال ہے جس کا اجمالی ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے سبت و ہفتہ کا دن عبادت کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس دن ان کو کام کاج اور سیر و شکار وغیرہ کی ممانعت تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے آپ کو شریعت الٰہی کی ان پابندیوں سے آزاد کرنے کے لیے بہت سے شرعی حیلے ایجاد کر لیے۔ یہاں تک کہ سیر و شکار وغیرہ کی بھی بہت سی راہیں کھول لیں۔ اس آیت میں ان کی اسی قسم کی حرکتوں کی طرف اشارہ ہے اور چونکہ یہ باتیں ان کے درمیان شہرت رکھتی تھیں اس وجہ سے قرآن نے اس کی طرف ایک معلوم و معروف حقیقت کی طرح اشارہ کر دیا ہے۔

فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٔيْنَ، لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس جرم کی پاداش میں

ان لوگوں پر لعنت فرمائی جن لوگوں نے اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں سبت کی حرمت برباد کی۔

یہود کے مسخ کی نوعیت

اہل تاویل کے درمیان اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس لعنت کے نتیجہ میں ان کا ظاہر بھی بندروں کے مشابہ ہوگیا تھا یا یہ مسخ، صرف عقلی اور روحانی مسخ تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اختلاف کچھ زیادہ اہمیت رکھنے والا اختلاف نہیں ہے۔ انسان اور بندر کے درمیان شکل وصورت کا فرق بہت زیادہ نہیں ہے۔ اصلی فرق جو ہے وہ عقل اور ارادہ کا ہے۔ انسان کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کی کوئی خواہش پوری کرتے وقت پہلے یہ دیکھتا ہے کہ اس خواہش کو پورا کرنا جائز بھی ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو اس کے لیے کیا شرعی اور اخلاقی حدود و قیود ہیں؟ برعکس اس کے بندر کی کسی خواہش اور اس کے فعل کے درمیان اخلاقی حدود و قیود کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی جس چیز کو اس کا نفس چاہ بیٹھتا ہے اس کو وہ فوراً کر گزرتا ہے۔ اگر یہی حالت اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں کسی انسان کی یا کسی انسانی گروہ کی ہوجائے تو اس کے درمیان اور بندر کے درمیان کوئی معنوی فرق نہیں رہ جاتا ہے۔ صرف ایک ظاہری فرق تھوڑا سا رہ جاتا ہے جو صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک عقل اور اخلاقی زوال اپنی آخری حد کو نہیں پہنچ جاتا۔ جب یہ زوال آخری حد کو پہنچ جاتا ہے تو یہ تھوڑا سا ظاہری فرق بھی بالآخر مٹ ہی کے رہتا ہے۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (۶۶)

'نکال' کا مفہوم

نَکَال کے معنی نمونہ عبرت کے ہیں۔ یہاں اشارہ اس بستی کی طرف ہے جس بستی کے لوگوں نے سبت کی حرمت برباد کرنے کے لیے وہ ناروا جسارتیں کی تھیں جن کی طرف اوپر کی آیت میں اشارہ کیا گیا۔ بستیوں اور مقامات کے لیے قرآن مجید میں اس طرح ایک سے زیادہ مقامات میں ضمیریں استعمال ہوتی ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس لعنت کے نتیجہ میں یہ بستی اپنے آگے پیچھے اور گرد وپیش کی بستیوں کے لیے نمونہ عبرت بنادی گئی جس کو دیکھ کر عقل اور خوف خدا رکھنے والے نصیحت حاصل کرسکتے تھے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بستی سمندر کے کنارے تھی۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اس بستی کے لوگ تجارت اور تمدن میں بہت ترقی کرچکے تھے لیکن اس لعنت کی پاداش میں ان کے اوپر ایسا زوال آیا کہ ان کا ظاہر اور باطن سب کچھ مسخ ہو کر رہ گیا اور وہ گرد وپیش کی بستیوں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک داستان عبرت بن کر رہ گئے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (۶۷)

یہود کے نقض عہد کی دوسری مثال

یہ یہود کے نقض عہد کی دوسری مثال بیان ہو رہی ہے اور اس مثال کو بیان کرنے کے لیے قرآن نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ایک ہی بات کو دو حصوں میں اس نے تقسیم کردیا ہے۔ ایک حصہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کی ذہنیت شروع ہی سے شریعت الٰہی کے قبول کرنے کے معاملہ میں کیسی حیلہ جویانہ

اور فرار پسندانہ ہی ہے اور اس کے دوسرے حصہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہزار حیلہ وحجت کے بعد جب وہ کسی بات کو قبول بھی کر لیتے رہے ہیں تو اس کی تعمیل بھی صحیح طریقہ پر نہیں کرتے تھے بلکہ اس حکم سے گریز کی راہیں تلاش کرتے تھے۔

اس چیز کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے بنی اسرائیل کی تاریخ سے قسامہ کے ایک واقعہ کو منتخب کیا ہے۔ قرآن مجید کے اشارات سے واقعہ کی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل میں کوئی شخص قتل ہوگیا جس کے قاتلوں کا سراغ نہیں لگتا تھا۔ حضرت موسیٰ نے اپنی شریعت کے قانون کے مطابق اس علاقہ کے لوگوں کو جہاں قتل ہوا تھا، یہ حکم دیا کہ وہ ایک گائے کی قربانی کر کے اس پر قسمیں کھائیں۔ ان لوگوں نے اول تو اس حکم کو ماننے ہی میں لیت ولعل کیے گائے کیسی ہو، اس کا رنگ کیسا ہو، عمر کتنی ہو وغیرہ وغیرہ لیکن بہ ہزار دقت کسی طرح گائے ذبح کی بھی تو معلوم ہوتا ہے کہ قسم جھوٹی کھائی۔

یہ بات کہ شریعت موسوی میں قسامہ کا طریقہ موجود تھا، کتاب استثنا کی مندرجہ ذیل آیتوں سے ثابت ہے۔

> "اگر اس ملک میں جسے خداوند تیرا خدا تجھ کو قبضہ کرنے کو دیتا ہے کسی مقتول کی لاش میدان میں پڑی ہوئی ملے اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے تو تیرے بزرگ اور قاضی نکل کر اس مقتول کے گرداگرد کے شہروں کے فاصلہ کو ناپیں اور جو شہر اس مقتول کے سب سے نزدیک ہو اس شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے کبھی کوئی کام نہ لیا گیا ہو اور نہ وہ جوتے میں جوتی گئی ہو۔ اور اس شہر کے بزرگ اس بچھیا کو بہتے پانی کی وادی میں جس میں نہ ہل چلا ہو اور نہ کچھ بویا گیا ہو لے جائیں اور وہاں اس وادی میں اس بچھیا کی گردن توڑ دیں۔ تب بنی لاوی جو کاہن ہیں نزدیک آئیں کیوں کہ خداوند تیرے خدا نے ان کو چن لیا ہے کہ خداوند کی خدمت کریں اور اس کے نام سے برکت دیا کریں اور ان ہی کے کہنے کے مطابق ہر جھگڑے اور مار پیٹ کے مقدمہ کا فیصلہ ہوا کرے۔ پھر اس شہر کے سب بزرگ جو اس مقتول کے سب سے نزدیک رہنے والے ہوں اس بچھیا کے اوپر جس کی گردن اس وادی میں توڑی گئی، اپنے اپنے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ ہمارے ہاتھ سے یہ خون نہیں ہوا اور نہ یہ ہماری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے۔ (استثنا باب ۲۱: ۱-۸)

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا، بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس حکم کو ایک مذاق تصور کیا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ قاتل کا سراغ لگانے کے لیے یہ تدبیر بھی کوئی کارگر تدبیر ہو سکتی ہے حالانکہ جہاں سراغ لگنے کی ساری راہیں بند ہوں وہاں اگر کوئی آخری تدبیر ہو سکتی تھی تو یہی ہو سکتی تھی کہ مقام قتل کے آس پاس کے سربرآوردہ لوگوں کو جمع کر کے ان سے قسمیں لی جائیں اور قسم کو زیادہ سے زیادہ احترام اور تقدیس کا رنگ دینے کے لیے یہ قسم قربان کیے ہوئے جانور پر لی جاتے۔ معاہدات اور قسموں کے معاملہ میں زمانہ قدیم سے یہ رواج رہا ہے کہ یہ عموماً معابد کے سامنے انجام دیے جاتے تھے تاکہ فریقین جھوٹ اور منافقت سے احتراز کریں۔ بعض حالتوں میں یہ طریقہ بھی اختیار کیا جاتا تھا کہ قربانی کے جانور کا خون قسم کھانے والوں پر چھڑک کر ان سے قسم لی جاتی۔ ممکن ہے

بنی اسرائیل کے ہاں بھی قسامہ کی صورت میں یہ شکل اختیار کی جاتی رہی ہو اگرچہ اوپر کے حوالے میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب امعان فی اقسام القرآن میں اس قسم کی بعض صورتوں کا ذکر کیا ہے

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ جہل کا لفظ علم کے مقابل میں بھی آتا ہے اور حلم و دانش کے مقابل میں بھی۔ یہاں یہ حلم کے مقابل میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ اللہ کے دین کے معاملہ میں کوئی ہنسی مسخری کی بات کروں، یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ خدا کا حکم ہے اور اسی میں تمہارے لیے خیر و برکت ہے، یہ بات میں نے اپنی طرف سے نہیں گھڑی ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ (۶۸)

یہود کی ایک مزاجی خصوصیت

گائے کی قربانی کے حکم کے بعد یہ سوال جو بنی اسرائیل نے کیا یہ محض ان کے فساد مزاج کا پیدا کردہ تھا ورنہ فی الواقع یہ سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر ان کے مزاج میں سلامت روی ہوتی تو وہ متوسط درجہ کی کوئی سی گائے ذبح کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اس ذہنیت سے واقف تھا جو اس سوال کے پس پردہ چھپی ہوئی تھی اس وجہ سے سوال کا وہ جواب تو اس نے دے دیا جو ان کے اشتباہ کے دور کرنے کے لیے کافی تھا، یعنی یہ کہ گائے اپنی عمر کے لحاظ سے اوسط درجہ کی ہو لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ جو حکم دیا جا رہا ہے اس کی بے چون و چرا تعمیل کرو، اس قسم کے سوال کر کے نہ شریعت سے گریز کی راہیں تلاش کرو اور نہ اپنے لیے دین کی وسعتوں کو تنگ کرو۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ (۶۹)

گائے کے رنگوں میں سنہرا اور زرد رنگ سب سے زیادہ دل پسند رنگ ہے۔ عرب شعرا اسی پسندیدگی کے سبب سے محبوبہ کے لیے بھی یہ صفت لاتے ہیں۔ "فاقع" کا لفظ اسی رنگ کی گہرائی اور شوخی کے لیے آتا ہے۔

اوپر کا سوال بھی اگرچہ غیر ضروری تھا لیکن عمر کی ایک حد متعین ہو جانے کے بعد تو گائے سے متعلق کسی سوال کی کوئی گنجائش سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی لیکن اس کے بعد انھوں نے رنگ سے متعلق سوال کر دیا جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اس رنگ کی گائے متعین فرمائی جس رنگ کی گائے سب سے زیادہ خوش رنگ اور پسندیدہ سمجھی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ سوال کے جواب میں سب سے زیادہ پسندیدہ رنگ ہی کی ہدایت ہونی تھی لیکن اس طرح کے سوالات ہی جن کے ذریعہ سے بنی اسرائیل نے اپنے آپ کو شریعت الٰہی کی وسعتوں اور رخصتوں سے محروم کر کے اس کو اصر و اغلال کا ایک مجموعہ بنا لیا۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ (۷۰)

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا قَالُوا الْـٰٔنَ

جِئۡتَ بِالۡحَقِّ ؕ فَذَبَحُوۡهَا وَمَا کَادُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ (۷۱)

رنگ کی وضاحت کے بعد بھی سوال کرنے والوں کی تشفی نہ ہوئی۔ انھوں نے مزید وضاحت چاہی تو ہدایت ہوئی کہ گائے کیری نہ ہو، اس سے کھیتوں میں ہل چلانے اور پانی دینے کی خدمت نہ لی گئی ہو۔ مزید یہ ہدایت ہوئی کہ بالکل یک رنگ ہو۔ اس میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو۔

اس طرح اپنے لیے گوناگوں قیدیں اور پابندیاں بڑھوا چکنے کے بعد بولے کہ ہاں اب بات اچھی طرح واضح ہوئی۔

لفظ 'حق' کا مفہوم

حق کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

وہ چیز جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔ قیامت کو اسی معنی کے لحاظ سے حق کہا گیا ہے۔

وہ چیز جو اخلاقی حیثیت سے واجب ہو۔ عدل کو اسی اعتبار سے حق کہا گیا ہے۔

وہ چیز جو جھگڑے اور اختلاف کے درمیان قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہو۔ قرآن مجید کو حق کہنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

غایت اور مقصد کے مفہوم کے لیے بھی یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ آسمان و زمین کی خلقت کو اسی معنی کے لحاظ سے بالحق کہا گیا ہے۔

جو چیز اپنے ظہور کے لحاظ سے بالکل واضح اور بیّن ہو اس کو بھی حق کہتے ہیں۔

آیت زیر بحث میں حق کا لفظ اسی آخری معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس آخری سوال کے ساتھ ان کی زبان سے وَاِنَّاۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ لَمُهۡتَدُوۡنَ (اور اب ہم انشاء اللہ پتہ لگا لیں گے) کے الفاظ نکلے۔ یہ الفاظ ان کے باطن پر عکس ڈالتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پے درپے سوالات کے بعد خود ان پر بھی اپنے سوالات کی نامعقولیت واضح ہو چکی تھی چنانچہ ان کے اسی احساس کی شاید یہ برکت تھی کہ ان کی زبان سے یہ کلمہ نکلا اور اس کلمہ کی برکت سے انھیں اس حکم کی تعمیل کی توفیق نصیب ہوئی ورنہ جس ذہنیت کا ان کی طرف سے اظہار ہو رہا تھا اس سے تو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کبھی بھی اس حکم کی تعمیل کریں گے۔

وَاِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا فَادّٰرَءۡتُمۡ فِیۡهَا ؕ وَاللّٰہُ مُخۡرِجٌ مَّا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ (۷۲)

دَرۡءٌ کے معنی دفع کرنے اور پھینکنے کے ہیں۔ اسی سے تدارأتم ہے جو ادغام کے قاعدے سے اِدّٰرَءۡتُمۡ ہو گیا ہے۔ اس کے معنی آپس میں ایک دوسرے پر الزام لگانے کے ہیں۔

ایک جملہ معترضہ

وَاللّٰہُ مُخۡرِجٌ مَّا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ، (اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے جو کچھ تم چھپاتے رہے ہو) یہاں بطور جملہ معترضہ کے ہے۔ اس کے بعد کا ٹکڑا فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡهُ بِبَعۡضِهَا (پس ہم نے کہا کہ اس کو اس کے بعض سے مارو) فادّٰرءتم فیہا سے لگتا ہوا ہے۔ اس جملہ معترضہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو قتل کر کے تم دنیا میں ایک دوسرے پر الزام ڈا

کرکے اس کو چھپانے کی کوشش کرسکتے ہو لیکن یاد رکھو کہ کوئی چیز اگر تم نے دنیا میں چھپالی تو وہ ہمیشہ چھپی نہیں رہ جائے گی بلکہ ایک دن اللہ تعالیٰ وہ سب کچھ ظاہر کرکے رہے گا جو تم چھپا رہے ہو۔

یہ وَاِذْ قَتَلْتُمْ سے گائے کے ذبح کے حکم کا اصل مقصد بیان ہو رہا ہے۔ اوپر یہ واضح کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل جو آج خدائی شریعت کے واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں، ان کی ذہنیت اس شریعت کے قبول کرنے کے معاملہ میں کیا رہی ہے، وہ کس طرح قدم قدم پر اس کے قبول کرنے کے معاملہ میں طرح طرح کی حجتیں کرتے رہے ہیں۔ اب وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا سے آگے کے حصے میں یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ گائے کے ذبح کا یہ حکم کس مقصد سے دیا گیا تھا اور اس معاملہ میں انھوں نے کیا روش اختیار کی۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۷۳)

"اس کو اس کے بعض سے مارو"۔ عام طور پر اہل تاویل نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ مقتول کو گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا چھوا دو جس سے وہ زندہ ہو جائے گا اور اپنے قاتل کا نام بتا دے گا۔ اگرچہ یہ مطلب لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہے، لیکن قسامہ کے تعلق سے کبھی کبھی مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ قسم لینے کی طرف اشارہ ہو یعنی مقتول پر قربان کی ہوئی گائے کا خون چھڑکو اور آس پاس والوں سے قسم لو۔ واقعہ کی تفصیل کے بجائے اس کی طرف صرف اشارہ اس لیے کافی سمجھا گیا ہو کہ یہاں مقصود واقعہ کو بیان کرنا نہیں بلکہ بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے ایک واقعہ کو صرف جتا دینا تھا۔

یہ مطلب لینے کی صورت میں كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى کا ٹکڑا بنی اسرائیل کی اس بات کا جواب ہوگا جو انھوں نے گائے ذبح کرنے کا حکم سن کر کہی تھی کہ اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (کیا تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو) یعنی تمھارے نزدیک تو یہ حکم ایک مذاق ہے لیکن اگر تم اس پر اس کی صحیح اسپرٹ کے ساتھ عمل کرو اور اس قربانی اور قسم میں ایمان داری برتو تو یہی راستہ ہے قاتلوں کے سراغ لگنے اور ان سے قصاص لینے کا جس میں سب کے لیے زندگی ہے

قصاص میں سب کے لیے زندگی ہے

یہ بات کہ قصاص میں سب کے لیے زندگی ہے قرآن مجید میں واضح طور پر مذکور ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ ۱۷۹۔ بقرہ (اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو) تورات میں بھی ایک کے قتل کو سب کا قتل اور ایک کے قصاص کو سب کی زندگی قرار دیا گیا تھا۔ قرآن مجید میں اس حکم کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے۔

كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ	ہم نے بنی اسرائیل پر یہ فرض کیا کہ جس نے کسی جان کو
نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا	قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی جان کو قتل کیا ہو یا
قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ	ملک میں بدامنی برپا کی ہو اس نے گویا سب کو قتل کیا اور

أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (۳۲ - مائدہ ۵) جس نے اس کو زندہ کیا اس نے گویا سب کو زندہ کیا۔

اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر قانونِ قصاص کا یہ فلسفہ واضح تھا کہ قصاص نہ لینے میں سب کی موت اور قصاص لینے میں سب کی زندگی ہے۔

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ کا تعلق اس صورت میں جملہ معترضہ سے ہوگا۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات کی نشانیاں دکھا رہا ہے کہ جو کچھ تم چھپا رہے ہو اس میں سے کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی رہنے والی نہیں ہے بلکہ ہر چیز ظاہر ہو کے رہے گی۔ یہ اشارہ ان باتوں کی طرف ہوگا جن کو یہود نے چھپانے کی کوشش کی اور جن کو چھپانے کے لیے دین میں طرح طرح کی تحریفیں کیں لیکن اب وہ قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ایک ایک کر کے ظاہر ہو رہی تھیں۔ یہ اس بات کی کھلی ہوئی نشانی تھی کہ خدا سے کسی بات کو چھپانے کی کوشش ایک بے سود کوشش ہے، وہ ایک دن سارے رازوں سے پردہ اٹھا دے گا۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۷۴)

دل کب سخت ہوتا ہے؟

"پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے" یہاں ثُمَّ کے استعمال سے یہ بات نکلتی ہے کہ دین کے معاملہ میں تمہاری اس قسم کی کٹھ حجتیوں اور فرار پسندیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ تمہارے دل سخت ہو گئے۔ یہاں اگرچہ تصریح نہیں ہے لیکن سیاق کلام دلیل ہے کہ بنی اسرائیل نے جس طرح گائے کے ذبح کے حکم کی تعمیل میں بہت سی حجتیں پیدا کیں اسی طرح اس کے ذبح کے بعد بھی اس قربانی کا صحیح احترام ملحوظ نہیں رکھا بلکہ جھوٹی قسمیں کھا کر قاتل کو چھپانے کی کوشش کی۔ کسی جرم کے ساتھ جب حیلہ بازی اور کٹھ حجتی اور پھر مزید براں ڈھٹائی اور جسارت بھی شامل ہو جائے تو ایسے مجرموں کے دل خدا کے قانون کے مطابق پتھر کے مانند سخت ہو جایا کرتے ہیں جس کے بعد نیکی اور تقویٰ کی روئیدگی کی صلاحیت ان کے اندر بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے۔

بگڑا ہوا دل پتھر سے زیادہ سخت ہوتا ہے

فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً (پس وہ پتھر کے مانند ہو گئے یا پتھر سے بھی زیادہ سخت) یہ اسی طرح کا اسلوب کلام ہے جیسا کہ دوسری جگہ وارد ہے أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۱۷۹ - اعراف (یہ لوگ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ) یہ محض مبالغہ کا ایک اسلوبِ بیان نہیں ہے بلکہ یکسر تعبیرِ حقیقت ہے۔ جمادات وغیرہ میں جو سختی ہوتی ہے وہ سختی ان کو ان صلاحیتوں سے محروم نہیں کرتی جو قدرت کی طرف سے ان کے اندر ودیعت ہوتی ہیں۔ برعکس اس کے انسان اگر اپنے آپ کو بگاڑتا ہے تو اس کا بگاڑ آہستہ آہستہ قانونِ الٰہی کے بموجب ان تمام صلاحیتوں سے اس کو محروم کر دیتا ہے جو فطرت کی طرف سے اس کو ودیعت ہوئی ہوتی ہیں۔ پتھر سخت سے سخت تر ہو کر بھی پتھر ہی رہتا ہے۔ اس کی رگوں کے اندر پانی کی سوت جاری کرنے کی صلاحیت اگر قدرت نے رکھی ہوتی ہے تو اس سختی کے باوجود یہ چیز اس کے اندر باقی رہتی ہے۔ برعکس

اس کے انسان کا دل اگر کسی اخلاقی بیماری کے سبب سے سخت ہو جائے تو اس کے دل کی تمام سوتیں بالکل خشک ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بگڑے ہوئے انسان کے بگاڑ کا مقابلہ دنیا کی کوئی چیز بھی نہیں کر سکتی اگرچہ وہ کتنی ہی بگڑی ہوئی کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ جو فرمایا کہ پتھروں میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل پڑتا ہے اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو خشیت الٰہی سے گر پڑتے ہیں، یہ پتھروں کی انھی فطری صلاحیتوں کی طرف اشارات ہیں جو قدرت نے ان کے اندر ودیعت کر رکھی ہیں اور جو بہر صورت باقی رہتی ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ محض کوئی شاعرانہ اسلوب بیان نہیں ہے جس کا واقعات کی دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ یہ تلمیح ہے ان شاہدات کی طرف جو صحرا کی زندگی میں خود بنی اسرائیل کی نگاہوں کے سامنے گزر چکے تھے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے ایک چٹان سے اکٹھے بارہ چشمے پھوٹتے اور طور کے ایک حصہ کو تجلی الٰہی سے پاش پاش ہوتے دیکھا تھا لیکن یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی ان کے اپنے دلوں کی سختی کا یہ حال رہا کہ وہ کسی نشانی کو بھی دیکھ کر نرم نہیں ہوتے تھے۔ پھر اس بات میں شبہ کرنے کی کہاں گنجائش رہی کہ ان کے دلوں کی سختی پتھروں اور چٹانوں کی سختی سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ "اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے رہے ہو" یعنی اپنے شرف و تقدس، اپنی بڑائی اور بزرگی اور اپنی پاک دامنی کی حکایت تو وہ بڑھائے جس کے کارنامے ڈھکے چھپے ہوئے ہوں اور اس کے سامنے بڑھائے جو بے خبر اور بے علم ہو، جو ہر بات سے باخبر ہو اس کے سامنے اس قسم کے ادعا اور غرور سے کیا حاصل!

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا لَـکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوۡنَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ (۷۵)

ایک التفات

یہود سے خطاب کے بیچ میں یہ مسلمانوں کی طرف اسی طرح کا التفات ہے جس طرح کا التفات آیات ۶۰-۷ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور آیات ۲۱-۲۹ میں بنی اسمٰعیل کی طرف گزرا ہے۔ اس التفات کے دو مقصد ہیں۔ ایک تو مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا کہ وہ بنی اسرائیل کی مخالفت سے نہ بددل ہوں اور نہ اس پر متعجب کہ یہ پڑھے لکھے اور دین و شریعت کے عالم لوگ اس دعوت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جن لوگوں کے ذہن ایسے ٹیڑھے واقع ہوئے ہیں کہ ایک بات کو اپنے نبی کی زبان سے سننے اور اس کا مدعا واضح طور پر سمجھ چکنے کے بعد بھی اس میں ٹیڑھ پیدا کرتے رہے ہیں اور اس کو اس کے منشا کے بالکل خلاف سمت میں موڑتے رہے ہیں، جیسا کہ گائے کی قربانی کے حکم کے معاملہ میں تم نے سنا، کیا ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگوں یا ان کی تقلید کرنے والوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمھاری سیدھی سے سیدھی بات بھی سیدھے طریقہ سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

دوسرا مسلمانوں کو ان یہود کی بعض پس پردہ حرکات سے آگاہ کرنا، تاکہ جو سادہ لوح مسلمان ان کے فریبکارانہ دعوائے ایمان سے دھوکے میں آکر ان سے حسن ظن رکھنے لگے تھے یا ان سے ربط ضبط بڑھانے کے خواہشمند تھے وہ متنبہ ہو جائیں کہ یہ تمام تر فریب کاری ہے، اس میں سچائی کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔

تحریف کا مفہوم اور اس کی شکلیں

يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ : حَرَّفَ الشَّيْءَ عَنْ وَجْهِهٖ کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے صحیح رُخ سے موڑ کر دوسری سمت میں کر دینا۔ اسی سے حَرَّفَ الْقَوْلَ یا حَرَّفَ الْكَلَامَ ہے جس کے معنی بات یا کلام کے بدل دینے کے ہیں۔ اس بدل دینے کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

ایک بات کی دیدہ و دانستہ ایسی تاویل کر دی جائے جو قائل کے منشا کے بالکل خلاف ہو۔

کسی لفظ کے طرز ادا اور قراءت میں ایسی تبدیلی کر دی جائے جو لفظ کو کچھ سے کچھ بنا دے۔ مثلاً مروہ کو بگاڑ کر مروہ یا مریا وغیرہ کر دیا گیا۔

کسی عبارت یا کلام میں ایسی کمی بیشی کر دی جائے جس سے اس کا اصل مدعا بالکل خبط ہو کر رہ جائے مثلاً حضرت ابراہیمؑ کے ہجرت کے واقعہ میں یہود نے اس طرح رد و بدل کر دیا کہ خانہ کعبہ سے ان کا کوئی تعلق ثابت نہ ہو سکے۔

کسی ذو معانی لفظ کا وہ ترجمہ کر دیا جائے جو سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہو۔ مثلاً عبرانی کے ابن کا ترجمہ بیٹا کر دیا گیا درآنحالیکہ اس کے معنی بندہ اور غلام کے بھی آتے ہیں۔

ایک بات کا مفہوم بالکل واضح ہو لیکن اس کے متعلق ایسے سوالات اٹھا دیئے جائیں جو اس واضح بات کو مبہم بنا دینے والے یا اس کو بالکل مختلف سمت میں ڈال دینے والے ہوں۔

اہل کتاب تحریف کی ان تمام قسموں کے مرتکب ہوئے اور قرآن نے ان کو ان سب کا مجرم گردانا ہے۔ موقع موقع کے لحاظ سے آگے اس کتاب میں ہر ایک کی تفصیل ضروری دلائل کے ساتھ ان شاء اللہ آئے گی۔ یہاں اجمال کے ساتھ صرف اس کی مختلف صورتوں کو اور اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ تحریف پر تحریف کا اطلاق صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب وہ دیدہ و دانستہ اور سمجھ بوجھ کر کی جائے۔ قرآن مجید نے اس کے ساتھ قید لگائی ہے مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (بعد اس کے کہ انھوں نے اس کو سمجھ لیا اور وہ جانتے تھے کہ وہ تحریف کر رہے ہیں) یہی علم و شعور ہے جو درحقیقت تحریف کو ایک سنگین جرم بناتا ہے اور اس جرم کی سزا میں اس جرم کے مرتکبین اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے نور علم سے یک قلم محروم کر دیئے جاتے ہیں۔

یہود کے دعوائے ایمان کی حقیقت

وَإِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا أَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۷۶)

اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں، یعنی دین و ایمان کے اجارہ دار تنہا مسلمان ہی نہیں ہیں، ہم بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اس قول سے ان کا مطلب جیسا کہ آیات ۸۔ ۹ کی تفسیر

کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں، محض مسلمانوں کو دھوکا دینا ہوتا تھا۔ وہ اس قول کے ظاہر الفاظ سے مسلمانوں کو یہ تاثر دیتے تھے تاکہ مسلمان ان کے اوپر اعتماد کرنے لگیں، خود اپنے ذہن میں وہ اس کا مطلب یہ لیتے تھے کہ وہ اپنے نبیوں اور اپنے صحیفوں پر تو ایمان رکھتے ہی ہیں، ایمان اور کس چیز کو کہتے ہیں۔ قرآن نے یہاں مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ان لوگوں کے اس قسم کے پر فریب جملوں کے دام میں آ کر ان سے کچھ اچھی امیدیں نہ لگا بیٹھیں اس لیے کہ ان کی خلوت اور جلوت کی باتوں میں بڑا فرق ہے۔ سامنے تو یہ آشنا کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب یہ اپنی خاص مجلسوں میں ہوتے ہیں تو وہاں آپس میں ایک دوسرے کا بڑی شدت سے محاسبہ کرتے ہیں۔ اگر اظہار رواداری کے جوش میں تمہارے سامنے ان میں سے کسی کی زبان سے غلطی سے کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے جو اسلام کے حق میں ہوتی ہے تو یہ اپنی مجلسوں میں اس پر سختی سے گرفت کرتے ہیں کہ کیا تم مسلمانوں کے سامنے نبی آخر الزمانؐ اور اسلام سے متعلق وہ باتیں کھولتے ہو جو خدا نے اپنے صحیفوں کے ذریعے سے صرف تم پر کھولی ہیں اور اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ تمہارے انھی بیانات کو مسلمان قیامت کے دن تمہارے خلاف شہادت اور حجت کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

اَوَلَا یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَمَا یُعۡلِنُوۡنَ (۷۷)، یوں تو یہ جملہ عام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کو جانتا ہے لیکن یہاں موقع کلام اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ دھوکا بازی کرتے ہوئے اس بات پر غور نہیں کرتے کہ خدا ان کے اس آشنا کی حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف ہے جس کو وہ ظاہر کرتے ہیں اور ان کی خاص مجلسوں میں آپس میں ایک دوسرے کو مسلمانوں کے سامنے افشائے راز پر جو سرزنشیں اور ملامتیں ہوتی ہیں ان کو بھی وہ خوب جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ احمق لوگ مسلمانوں کے سامنے تو اپنے آپ کو ظاہر داری کے اس لبادہ میں چھپا سکتے ہیں لیکن اس خدا سے انھوں نے اپنے آپ کو چھپانے کی کیا تدبیر سوچی ہے جو ان کی خلوت و جلوت ہر جگہ موجود ہے اور جس پر ظاہر و مخفی سب کچھ روشن ہے!

وَمِنۡهُمۡ اُمِّیُّوۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا یَظُنُّوۡنَ (۷۸)

'اُمّیؔ' سے مراد

اُمِّیُّوۡنَ، اُمی کی جمع ہے جس کے معنی تحریر و کتابت اور مدرسی تعلیم سے ناواقف کے ہیں۔ اس سے مراد یہاں یہود کے اَن پڑھ عوام ہیں۔

ان کے علیحدہ ذکر کرنے سے یہاں یہ بات نکلتی ہے کہ اوپر کی آیتوں میں فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ کے الفاظ سے جس گروہ کا ذکر ہوا ہے اس سے یہود کے پڑھے لکھے اور ہوشیار لوگ مراد ہیں۔ ان کی جو حرکتیں بیان ہوئی ہیں وہ بھی ہوشیاروں اور پڑھے لکھوں ہی کی ہو سکتی ہیں۔ اللہ کے کلام میں تحریف کرنا اور مسلمانوں کو چکمہ دینے کی کوشش کرنا ظاہر ہے کہ عوام کالانعام کا کام نہیں ہو سکتا۔ عیاروں اور چالاکوں ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان کا ذکر کرنے اور مسلمانوں کو ان کی طرف سے مایوس کرنے کے بعد اب یہ یہود کے عوام کا ذکر فرمایا اور یہ واضح کیا کہ مسلمانوں کو ان سے بھی قبولِ حق

لہ اس موقع پر اسی سورہ کی تفسیر آیات ۷۰۔ ۷۶ تدبر قرآن میں پڑھ لینی چاہیئے۔ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ایک ہی مضمون دونوں جگہ بیان ہوا ہے۔

کی توقع نہیں رکھنی چاہیے اس لیے کہ جس طرح پہلا گروہ شرارت اور حیلہ بازی میں مبتلا ہے اسی طرح یہ دوسرا گروہ بھی جھوٹی آرزوؤں اور اوہام میں مبتلا ہے۔

یہود کے امراض کا بیان

ان کی بیماری یہ بتائی ہے کہ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ (یہ تورات کو صرف اپنی آرزوؤں کا مجموعہ سمجھتے ہیں) اَمانی اُمنیہ کی جمع ہے جس کے معنی آرزو، تمنا اور خواہش کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی کتاب کی اصل حقیقت سے تو کچھ واقف نہیں کہ اس میں ان کو کیا تعلیم دی گئی ہے، کیا نہیں دی گئی ہے بس ان کے ذہن میں کچھ تمنائیں اور خواہشات ہیں جو اگرچہ بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں لیکن ان کے علماء کی غلط تعلیم سے ان کے اندر وہی رچی بسی ہوئی ہیں، وہ اپنی کتاب کو انہی خواہشات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان کی کتاب ان کے اوپر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتی بلکہ صرف ان کی ان خواہشات کی سند تصدیق عطا کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ قرآن مجید نے ان کی اس قسم کی بعض آرزوؤں کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا	اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی
مَّعْدُوْدَۃً (۸۰۔ بقرہ)	مگر گنتی کے چند دن۔
وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ	اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں نہیں جائیں گے مگر یہودی
کَانَ ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ (۱۱۱۔ بقرہ)	اور نصرانی۔ یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔
قُلْ اِنْ کَانَتْ لَکُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ عِنْدَ	کہہ دو کہ اگر آخرت کی کامیابیاں اللہ کے نزدیک
اللّٰہِ خَالِصَۃً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ	دوسروں کے مقابل میں تمہارے ہی لیے مخصوص ہیں
اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۹۴۔ بقرہ)	تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔
وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ وَالنَّصٰرٰی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا	اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور
اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ (۱۸۔ مائدہ)	اس کے محبوب ہیں۔

یہ ان کی آرزوؤں میں سے صرف چند بطور مثال ذکر ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے اوہام میں مبتلا اور ایسے لذیذ خواب دیکھ رہے ہوں جن پر ذمہ داری کا (چند رسوم کی ادائیگی کے سوا) کوئی بوجھ بھی نہ ہو اور حقوق جن کے لیے سارے کے سارے خدا کے ہاں محفوظ ہوں، وہ اس قرآن پر ایمان لانے والے کس طرح بن سکتے تھے جو ان کو ان لذیذ خوابوں سے بیدار کر کے زندگی کی حقیقتوں اور اس کی اصلی ذمہ داریوں کے سامنے کھڑا کرنا چاہتا تھا۔

وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ تمام آرزوئیں محض ان کے اور ان کے علماء کے ذہن کی پیداوار ہیں، ان کو اصل حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ لِیَشْتَرُوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْھِمْ وَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا یَکْسِبُوْنَ (۷۹)

من گھڑت فتوے

اس سورہ کے شروع میں لفظ کتاب کی تشریح کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ لفظ قرآن میں دوسرے معانی کے ساتھ شریعت کے احکام و قوانین کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ فتوے اور احکام ہیں جو علمائے یہود بغیر کسی شرعی سند کے محض اپنی دنیوی اغراض اور اپنے عوام کو خوش رکھنے کے لیے جاری کرتے تھے اور دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہی اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔

"اپنے ہاتھوں لکھنے" کا مطلب یہ ہے کہ ان فتووں کے لیے کتاب الٰہی کے اندر کوئی بنیاد اور سند نہیں ہوتی تھی، محض ان کے طبع زاد اور من گھڑت فتوے ہوتے تھے لیکن وہ ان کو منسوب خدا اور اس کی شریعت کی طرف کرتے تھے۔ اسی طرح کے فتوے تھے جن سے ان کے عوام شریعت کی حقیقی ذمہ داریوں سے بے پروا ہو کر ان اوہام میں مبتلا ہوئے جن کی طرف اوپر کی آیت میں اشارہ ہوا ہے اور اسی راہ سے ان کے دین میں ان چیزوں کی ملاوٹ ہوئی جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا (تاکہ اس کے عوض حقیر قیمت حاصل کریں) حقیر اس لیے کہ یہ دین فروشی وہ محض اپنے دنیوی اغراض کے لیے کرتے تھے اور دنیا کا بڑے سے بڑا فائدہ بھی اگر دین کو فروخت کر کے حاصل کیا جائے تو بہرحال وہ حقیر ہی ہے۔

فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ (ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے بھی جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور اس چیز کے سبب سے بھی جو وہ اس کے عوض میں کماتے ہیں) یعنی آخرت میں یہ دونوں چیزیں ان کے لیے الگ الگ خرابی اور تباہی کا سبب بنیں گی۔ ان کا یہ اپنے جی سے شریعت تصنیف کرنا بھی سبب تباہی اور اس کے عوض میں دنیوی منافع حاصل کرنا بھی موجب تباہی!

وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۸۰)

جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال

"اور وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی" یہ ان جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ یہود اپنے لیے کسی صورت میں ابدی عذاب دوزخ کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے جنت و دوزخ کو اعمال کا نتیجہ اور اعمال پر مبنی سمجھنے کے بجائے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ خدا کی برگزیدہ امت ہیں اس وجہ سے خواہ ان کے اعمال کچھ ہوں، اول تو وہ دوزخ میں بھیجے ہی نہیں جائیں گے اور اگر بھیجے بھی گئے تو معمولی طور پر کچھ سزا بھگت کر جنت کو واپس کر دیے جائیں گے۔ ان کے اس واہمے نے ان کے عوام اور خواص سب کو شریعت کی ذمہ داریوں سے بالکل بے پروا کر دیا۔ نجات کے معاملہ میں ان کا سارا اعتماد عمل اور عقیدہ کے بجائے اپنی گروہی نسبت پر رہ گیا تھا اور بدقسمتی سے ہم مسلمان بھی کچھ اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ "یا تم اللہ کی طرف وہ بات منسوب کر رہے ہو جو جانتے نہیں۔" "جانتے نہیں" یعنی جس کی سند تمھاری کتاب میں موجود نہیں، بس ایک بات تم نے اپنے جی سے گھڑ کر اپنے خدا کی طرف منسوب

کر دی ہے، حالانکہ تم سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ تم خدا کی طرف حق بات کے سوا کوئی بات منسوب نہیں کرو گے۔

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ (۱۶۹ - اعراف)

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۸۱)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۸۲)

یہود کے واہمہ کی تردید

یہ یہود کے اس واہمہ کی تردید ہے جس کا ذکر اوپر گزرا۔ یعنی جنت اور دوزخ کا تعلق خاندانی اور گروہی نسبتوں سے نہیں بلکہ تمام تر عمل سے ہے۔ جو شخص کسی برائی کا ارتکاب کرے اور وہ برائی اس کو اپنے گھیرے میں لے لے تو اس کے لیے خلود فی النار ہے خواہ اس کا تعلق کسی گروہ سے ہو، برعکس اس کے جو شخص ایمان اور عمل صالح کی روش پر قائم رہے اس کے لیے خلود فی الجنۃ ہے خواہ اس کا تعلق کسی خاندان سے ہو۔

جس طرح اس سورہ کے پہلے سلسلۂ بیان کے خاتمہ پر اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا الاٰية والی آیت وارد ہوئی تھی اسی طرح اس دوسرے سلسلہ بیان کے خاتمہ پر یہ بَلٰى مَنْ كَسَبَ الاٰية والی آیت وارد ہوئی ہے۔ ان دونوں آیتوں کا موقع اور مقصد بالکل ایک سا ہے اس وجہ سے ان دونوں کو ایک دوسرے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آگے مناسب مقام پر اس کی مزید شرح آئے گی۔

۳۸۔ آگے کا مضمون ____ آیات ۸۳-۹۶

یہود کے لیے، قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے معاملہ میں جو چیز حجاب بن گئی تھی وہ ان کا یہ گھمنڈ تھا کہ وہ خود کتاب اور شریعت کے حامل ہیں اور ایک ایسے برگزیدہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کو خدا نے دینی و مذہبی پیشوائی اور دنیا و آخرت دونوں میں اپنی محبت و محبوبیت کے لیے خاص کر لیا ہے۔ ایک ایسا برگزیدہ گروہ اوّل تو اس بات کا محتاج ہی کب ہے کہ وہ کسی اور کتاب و شریعت پر ایمان لائے۔ ثانیاً اس کے سوا کسی اور کو اللہ تعالیٰ کتاب و شریعت دے کس طرح سکتا ہے؟

یہود کے استکبار پر ضرب

قرآن نے یہاں پہلے ان کے اس استکبار پر ضرب لگائی اور فرمایا کہ وہ اپنے آپ کو کتاب و شریعت کا جو حامل سمجھتے ہیں وہ محض ایک خیال باطل ہے، اس لیے کہ ان سے خدائے واحد ہی کی عبادت، والدین، اقربا، اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک، نماز اور زکوٰۃ کی پابندی اور اپنے بھائیوں کی نصرت و حمایت کا جو ابتدائی عہد لیا گیا تھا اس کو انھوں نے توڑ ڈالا اور اس عہد کی تجدید اور یاددہانی کے لیے جو انبیاء بھیجے گئے ان کی بھی یا تو انھوں نے تکذیب کی یا ان کو قتل کر ڈالا۔ ایسی صورت میں ان کا یہ دعوٰی کہ وہ کتاب و شریعت کے حامل ہیں، کیا وزن رکھتا ہے؟

یہود کی نسبت

اس کے بعد فرمایا کہ یہ قرآن ان پیشین گوئیوں کے مطابق نازل ہوا ہے جو ان کے صحیفوں میں موجود ہیں اور یہ اس کے منتظر بھی رہے ہیں۔ لیکن اب جب کہ یہ موعود و منتظر چیز ان کے پاس آ گئی اور انھوں نے اس کو

پہچان بھی لیا ہے تو محض اس ضد کے سبب سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کے ایک فرد پر کیوں اتارا، ان کے اندر کے کسی فرد پر کیوں نہ اتارا۔

یہود کے دعوائے ایمان کی حقیقت

اس کے بعد ان کے دعوائے ایمان کی مزید قلعی کھولی ہے کہ یہ اپنے جس ایمان پر اس قدر نازاں ہیں کہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لا رہے ہیں، اس ایمان کا حال شروع سے یہ رہا ہے کہ انھوں نے عین موسٰیؑ کی موجودگی میں گوسالہ پرستی کی اور بعد کے زمانوں میں یہ اللہ کے نبیوں کی تکذیب بھی کرتے رہے اور ان میں سے بعض کو انھوں نے قتل بھی کر دیا۔

یہود کے خلاف خود ان کے ضمیر کی شہادت

پھر ان کے اس زعم کے خلاف کہ آخرت کی تمام سرفرازیاں صرف انھیں کا حصہ ہیں اس لیے کہ وہی خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں، خود ان کے باطن کی یہ شہادت پیش کی ہے کہ اگر وہ اپنے اس زعم میں سچے ہیں تو زندگی کے اتنے حریص کیوں بنے بیٹھے ہیں۔ پھر تو انھیں زندگی کے بجائے موت کا حریص ہونا چاہیے۔

یہ پوری تقریر جس کا ہر حصہ باہمدگر بالکل مربوط ہے بنی اسرائیل کے سامنے یہ حقیقت واضح کرنے کے لیے کی گئی ہے کہ قرآن کی مخالفت کے لیے انھوں نے جو پہلو اختیار کیے ہیں ان میں سے کسی ایک کی بھی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں صرف قومی نخوت، ہٹ دھرمی اور حسد پر مبنی ہیں۔

اس تقریر میں کچھ باتیں تو بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہی گئی ہیں۔ کچھ ان سے منہ پھیر کر کہی گئی ہیں اور بعض باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلائی گئی ہیں۔ تخاطب کے یہ مختلف اسلوب بلاغت کے تقاضوں کے تحت ہیں۔ جو شخص ان آیات کی تلاوت تدبر کے ساتھ کرے گا وہ انشاء اللہ خطاب کی ان تبدیلیوں کی خوبیاں خود سمجھ جائے گا، یہ ذوق سے تعلق رکھنے والی چیزیں بیان کی گرفت میں مشکل سے آتی ہیں۔

ان مطالب کو ذہن کے سامنے رکھتے ہوئے اب ان آیات کی تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیات ۸۳-۹۱

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا ٱللَّهَ وَ

بِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَقُولُوا۟

لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا

مِّنكُمْ وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَٰقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ

دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَٰرِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ

تَشْهَدُونَ ﴿٨٤﴾ ثُمَّ أَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا

مِّنكُم مِّن دِيَٰرِهِمْ تَظَٰهَرُونَ عَلَيْهِم بِٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ وَإِن

يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ
بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ
مِنْكُمْ اِلَّا خِزْىٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى
اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٥﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا
هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٨٦﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ ع
بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ
اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا
كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿٨٧﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ
بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٨٨﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ
مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ
فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾ بِئْسَمَا
اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ
وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٩٠﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ
مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩١﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ

مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٩٢﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ
خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَ
اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ
اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩٣﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ
الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٥﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى
حَيٰوةٍ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ معانقة ٢
سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾ ع ١٠ ١١

ترجمہ آیات ٨٢-٩٦

اور یاد کرو جب کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کروگے والدین کے ساتھ احسان کروگے۔ قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں کو ان کا حق دوگے اور یہ کہ لوگوں سے اچھی بات کہو۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ پھر تم برگشتہ ہوگئے مگر تم میں سے بہت تھوڑے لوگ۔ اور تم منہ موڑنے والے ہی لوگ ہو۔ ٨٣

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے اقرار لیا کہ اپنوں کا خون نہ بہاؤگے اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالوگے۔ پھر تم نے ان باتوں کا اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو۔ پھر تم ہی لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو۔ پہلے ان کے خلاف حق تلفی اور زیادتی کرکے ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو۔ پھر اگر وہ تمہارے پاس

قیدی ہوکر آتے ہیں تو ان کا فدیہ دے کر چھڑاتے ہو حالانکہ سرے سے ان کا نکالنا ہی تمہارے
لیے حرام تھا۔ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصّہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصّے کا انکار
کرتے ہو؟ جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں ان کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا اور کچھ
نہیں اور آخرت میں یہ شدید ترین عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے۔ اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں
ہے جو تم کر رہے ہو۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی تو نہ تو ان کا عذاب
ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد ہی پہنچے گی۔ ۸۴-۸۶

اور ہم نے موسٰی کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور عیسٰی بن مریم کو
کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی تو کیا جب جب آئے گا کوئی رسول
تمہارے پاس وہ باتیں لے کر جو تمہاری خواہشوں کے خلاف ہوں گی تو تم تکبّر کرو گے؟ سو تم نے
ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل تو بند ہیں بلکہ
خدا نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کر دی ہے تو شاذ و نادر ہی وہ ایمان لائیں گے۔
۸۷-۸۸

اور جب آئی ان کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے مطابق ان پیشین گوئیوں کے
جو ان کے ہاں موجود ہیں اور وہ پہلے سے کافروں کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے،
تو جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو وہ جانے پہچانے ہوئے تھے تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔
پس ان منکروں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔ کیا ہی بُری ہے وہ چیز جس سے اُنھوں نے اپنی جانوں کا
مبادلہ کیا کہ وہ انکار کر رہے ہیں اس چیز کا جو اللہ نے اتاری ہے محض اس ضد کی بنا پر کہ اللہ
نازل کرے اپنا فضل جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے۔ پس وہ اللہ کا غضب در غضب لے کر
لوٹے اور منکروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۸۹-۹۰

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتاری ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اس چیز پر تو ہم ایمان رکھتے ہی ہیں جو ہم پر اتری ہے اور وہ اس کے علاوہ کا انکار کرتے ہیں حالانکہ وہی حق ہے اور مطابق ہے ان پیشین گوئیوں کے جو ان کے ہاں موجود ہیں۔ ان سے پوچھو پھر تم خدا کے پیغمبروں کو اس سے پہلے کیوں قتل کرتے رہے ہو اگر تم مومن ہو۔ اور موسیٰ تمہارے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بنے۔ ۹۱ - ۹۲

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے عہد لیا اور تمھارے اوپر طور کو اٹھایا اور حکم دیا کہ جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور سنو اور مانو۔ انھوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔ اور ان کے کفر کے سبب سے بچھڑے کی پرستش ان کے دلوں میں رچ بس گئی۔ ان سے کہو کہ اگر تم مومن ہو تو کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کا تمھارا ایمان تم کو حکم دیتا رہا ہے۔ ۹۳

ان سے کہو کہ اگر دار آخرت کی کامیابیاں اللہ کے ہاں دوسروں کے بالمقابل تمھارے ہی لیے مخصوص ہیں تو موت کی آرزو کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ مگر یہ اپنی ان کرتوتوں کی وجہ سے جن کے یہ مرتکب ہوئے ہیں کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ۹۴ - ۹۵

اور تم ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے، ان لوگوں سے بھی زیادہ جنھوں نے شرک کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اس کو ہزار سال عمر ملے حالانکہ اگر یہ عمر بھی ان کو ملے تو بھی وہ اپنے آپ کو خدا کے عذاب سے بچانے والے نہیں بن سکتے اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ ۹۶

۳۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۸۳)

بنی اسرائیل سے ابتدائی عہد

یہ اس ابتدائی عہد کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے شرک سے اجتناب، والدین کے ساتھ حسن سلوک اعزا، اقربا اور یتامیٰ و مساکین کے حقوق کی ادائیگی اور نماز و زکوٰۃ کے قیام سے متعلق لیا گیا۔ اس میں سب سے پہلے لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ کا ذکر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو گے۔ یہ جملہ اگرچہ ہے تو بظاہر خبر کے قالب میں لیکن معنی میں ہے نہی کے۔ اس وجہ سے بعد کے انشائیہ جملوں کا عطف اس کے اوپر موزوں ہوا۔

خدا کے بعد سب سے بڑا حق

وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا، اللہ تعالیٰ کے حق کے بیان کے بعد متصلاً والدین کے حق کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کے بعد سب سے بڑا حق انسان پر اگر کوئی ہے تو ماں باپ ہی کا ہے اور کسی کا بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ حق صرف احسان یعنی حسن سلوک کا متقاضی ہے عبادت کا نہیں۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عبادت میں والدین کو شریک کرنے کی اجازت نہیں دی جن کا درجہ خدا کے بعد سب سے اونچا ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

وَذِی الْقُرْبٰى، کو احسان کے تحت بھی رکھ سکتے ہیں جس کا ذکر والدین کے لیے ہوا ہے اور اس کے لیے کوئی دوسرا مناسب فعل محذوف بھی مان سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان دونوں ہی شکلوں کے لیے نظیر موجود ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْـًٔا وَّ	اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کا کسی کو ساجھی نہ
بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰى وَ	ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور
الْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ (۳۶۔ النساء)	قرابت مندوں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ۔

اس آیت میں وَبِذِی الْقُرْبٰى کو اِحْسَانًا کے تحت ہی رکھا ہے لیکن دوسری جگہ فرمایا ہے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ	اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ تم نہ بندگی کرو
اِحْسَانًا ...... وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى	مگر اس کی۔ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک
حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ	کرو ...... اور قرابت مند اور مسکین اور مسافر
(۲۳۔ بنی اسرائیل)	کو اس کا حق دو۔

احسان اور ادائے حقوق

یہاں والدین کے لیے احسان اور ذی القربیٰ اور مسکین و مسافر کے لیے ایتائے حق کے الگ الگ فعل

استعمال کیے ہیں۔ ان دونوں مواقع کو ملانے سے یہ بات نکلتی ہے کہ احسان درحقیقت نام ادائے حقوق ہی کا ہے۔ اگر حقوق نہ ادا کیے جائیں تو محض خالی خولی باتوں سے احسان کا فرض ادا نہیں ہو سکتا۔

وَالْیَتَامٰی وَالْمَسٰکِیْنِ، حقوق کی ترتیب میں والدین، پھر اقربا اور ان کے بعد فوراً ہی یتامیٰ اور مساکین کا ذکر اس اہمیت کو ظاہر کرتا ہے جو اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام میں یتامیٰ اور مساکین کو حاصل ہے۔ اسلامی نظام میں ہر صاحب استطاعت پر اس کے والدین اور اقربا کے حقوق کے بعد یتیموں اور مسکینوں کے حقوق ہیں جن کو ادا کیے بغیر کوئی شخص اسلام کی عائد کی ہوئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

ان حقوق کے لیے حقوق کا لفظ ہم نے اپنی طرف سے صرف ایک استعارہ کے طور پر نہیں استعمال کیا ہے بلکہ یہ لفظ خود قرآن مجید نے استعمال کیا ہے اور اسلامی نظام میں حقوق ہی کی حیثیت سے ان کی حفاظت بھی کی گئی ہے۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کا مفہوم

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (اور لوگوں سے اچھی بات کہو) اس ٹکڑے کا ایک تو وہ عام مفہوم ہے جو اس کے ظاہر الفاظ سے نکلتا ہے۔ اس اعتبار سے نیکی و شرافت اور پند و نصیحت کی ہر وہ بات اس کے تحت داخل ہو گی جس کی تعلیم و تبلیغ کی ہر موقع پر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کو عام رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہمارے اہل تاویل نے اس کو عام ہی رکھا بھی ہے۔ لیکن بعینہٖ یہ بات اسی سیاق و سباق میں تھوڑے سے الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ، قرآن مجید میں دوسرے مقامات میں بھی کہی گئی ہے۔ ان تمام آیتوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سیاق میں یہاں یہ الفاظ وارد ہیں ان کا ایک خاص مفہوم بھی ہے جس سے قرآن کے ایک طالب علم کو بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ ہم یہاں تمام ہم معنی آیات جمع کر کے اس خاص مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

سورہ نساء میں یتیموں سے متعلق ان کے اولیاء کی بعض ذمہ داریوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۵۔ نساء)	اور تم ناسمجھ یتیموں کے حوالہ اپنے وہ مال نہ کرو جس کو اللہ نے تمہارے معاشی قیام و بقا کا وسیلہ بنایا ہے، البتہ تم اس مال سے ان کو فراغت کے ساتھ کھلاؤ اور پہناؤ اور معروف طریقہ پر ان کی دلداری کرتے رہو۔

اسی سورہ نساء میں دوسری جگہ فرمایا۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۔ وَلْیَخْشَ الَّذِیْنَ لَوْ	اور اگر تقسیم میراث کے وقت قرابت مند، یتیم اور مسکین آموجود ہوں تو اس میں سے ان کو بھی کچھ دو اور معروف طریقہ پر ان سے دلداری کی

تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا (۸۔ ۹ نساء)

بات کریں۔ اگر یہ اپنے پیچھے کمزور اولادیں چھوڑتے تو ان کے بارے میں ڈرتے تو انہیں چاہیے کہ اللہ سے ڈریں اور معقول بات کہیں۔

آگے اسی سورۂ بقرہ میں ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِىٌّ حَلِيْمٌ (۲۶۲-۲۶۳- بقرہ)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اپنے اس خرچ کے پیچھے اظہارِ احسان اور ایذا رسانی کی بلا نہیں لگا دیتے ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔ نہ ان کے لیے خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ دستور کے مطابق دلداری کا ایک کلمہ اور معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری کی بلا لگی ہوئی ہو۔ اللہ بڑا بے نیاز اور حلیم ہے۔

انفاق ہی کے سلسلہ میں سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا۔

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۤءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا (۲۸۔ بنی اسرائیل)

اگر تم کو اپنے رب کے کسی فضل کے انتظار میں جس کے تم متوقع ہو ان سے اعراض ہی کرنا پڑے تو ان سے نہایت نرم بات کہو۔

ان تمام آیات پر غور کرنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہاں قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کے الفاظ میں وہی بات کہی گئی ہے جو یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے متعلق اوپر کی آیات میں کہیں وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا کے الفاظ میں اور کہیں وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا اور قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ وغیرہ کے الفاظ میں کہی گئی ہے۔

قرآن مجید نے والدین، اقربا، یتامیٰ اور مساکین سے متعلق ایک طرف حسن سلوک اور ادائے حقوق کی تاکید کی ہے، دوسری طرف اس امر کی ہدایت کی ہے کہ ان کے ساتھ بات شریفانہ انداز میں کی جائے۔ ان کے خلاف دل میں برہمی ہو تو اس کو ضبط کیا جائے اور ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر کی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اخلاق کے بغیر کوئی شخص ان کے حقوق و فرائض سے کماحقہٗ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ بسا اوقات آدمی ان کی حاجت کی کمزوری کی بنا پر ان کی حرمتِ نفس ملحوظ رکھنے میں کوتاہی کر جاتا ہے جس سے ان کے مجروح دل اور زیادہ زخمی ہو جاتے ہیں، بعض اوقات آدمی کے دل میں ان کے خلاف کوئی رنجش ہوتی ہے جو ان کو مجبور و بے بس پا کر زیادہ کرخت انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ بعض حالات میں خود ان ضرورت مندوں کا رویہ بھی کچھ ناگوار سی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ چیز بھی آدمی کے لیے ترش کلامی کا باعث بن جاتی ہے۔ قرآن نے ان تمام چیزوں سے

بدکے کہ ان سے اچھے انداز میں بات کرنے کی ہدایت کی ہے اور تسلی و تسکین کے ایک کلمہ کو اس خیرات سے بھی بہتر قرار دیا ہے جس کے ساتھ تلخ کلامی، توہین اور دل آزاری شامل ہو۔ اسی بات کو یہاں قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن سیاق کلام اور نظم دلیل ہے کہ مفہوم یہی ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ، (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) یہاں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا ذکر تفصیل کے بعد اجمال کی نوعیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ دونوں چیزیں اوپر کی تمام باتوں کو اپنے اندر سمیٹ لینے والی ہیں۔ اوپر اللہ ہی کی عبادت کرنے، نیز اعزا و اقربا اور مساکین و یتامیٰ کے ساتھ حسن سلوک کی جو ہدایت کی گئی ہے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے ان تمام نیکیوں کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اجزا کے ذکر کے بعد ان اصولی چیزوں کا بھی ذکر کر دیا، جس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو رہی ہے کہ اگر تم نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے تو تمھارے لیے اوپر بیان کی ہوئی نیکیوں کا انجام دینا آسان رہے گا اور اگر نماز اور زکوٰۃ کو ضائع کر دو گے تو پھر سب کچھ ضائع کر بیٹھو گے۔

نماز اور زکوٰۃ سے تمام نیکیوں کی شیرازہ بندی ہوتی ہے

ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ، (پھر تم نے منہ موڑ لیا مگر تم میں سے تھوڑے لوگ اور تم منہ موڑنے والے ہی لوگ ہو) یہی وہ بات ہے جس کو واضح کرنے کے لیے اوپر کے میثاق کی یاددہانی کی گئی ہے۔ یعنی یہ عہد جو اتنے اہتمام سے تم نے باندھا، تم نے اس کو توڑ تاڑ کے رکھ دیا۔ صرف تھوڑے سے لوگ تم میں سے ایسے نکلے جو اس پر استوار رہ سکے۔

قرآن مجید نے یہاں ان کی اس عہد شکنی کو پہلے فعل کی شکل میں بھی بیان کیا ہے اور پھر وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ کہہ کر اس کو ان کی ایک مستقل صفت کی حیثیت سے بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے جو ان سے اتفاقی طور پر صادر ہو گیا ہو بلکہ یہ اعراض و انحراف ان کے قومی مزاج کی ایک خصوصیت بن چکا ہے۔ قرآن مجید نے ان کی جس مزاجی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے۔ انھوں نے بار بار بنی اسرائیل کی نافرمانیوں پر ان کو ملامت کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ تم بڑے ہی سرکش اور گردن کش لوگ ہو۔

یہود کی مزاجی خصوصیت کی طرف ایک اشارہ

یہاں نظم کلام کی اس حقیقت کو ذہن سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ بنی اسرائیل کو اس نقض عہد کی یاددہانی ان کے اس پندار پر ضرب لگانے کے لیے کی جا رہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کتاب الٰہی کا امین، شریعت خداوندی کا حامل اور اللہ تعالیٰ کی تمام دنیوی اور اخروی نعمتوں کا واحد اجارہ دار سمجھے ہوئے بیٹھے تھے اس وجہ سے نہ تو نئی نبوت و رسالت کی ضرورت کے قائل تھے اور نہ اپنے دائرے سے باہر کی کسی نبوت و رسالت پر ایمان لانے کے لیے تیار تھے۔ ان لوگوں کو اس آیت میں نیز اس کے بعد والی آیتوں میں یہ یاددہانی کی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عہد و میثاق ان سے لیا تھا اور جس پر ان کو اس قدر فخر و ناز ہے اس عہد و میثاق کی انھوں نے کس طرح دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ (۸۴)

ایک اور عہد کا حوالہ یہ ایک اور عہد کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا۔ یہ عہد اس بات کے لیے تھا کہ یہ آپس میں نہ تو ایک دوسرے کا خون بہائیں گے اور نہ اپنے بھائیوں کو ان کے گھروں سے جلاوطن کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن انھوں نے جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے اس عہد کو بھی نہایت بے دردی سے پامال کیا۔

اسلاف کے عہد کی ذمہ داری اخلاف پر اس عہد کی اہمیت واضح کرنے کے لیے فرمایا ہے ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ۔ جس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں اور دونوں سے اس کی اہمیت اور اس کے نقض کی شناعت واضح ہوتی ہے۔ ایک مفہوم تو جیسا کہ عام مفسرین نے لیا ہے، یہ ہے کہ تم کو اس عہد کا اقرار ہے اور تم آج بھی اس کے گواہ ہو اس لیے کہ اس کا ذکر تورات میں موجود ہے اور اس کا دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ تم نے اس عہد کا اقرار کیا اور تم اس اقرار کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ موجود تھے۔

یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کے احکام سے ہمیشہ پوری جماعت کے سامنے آگاہ کرتے اور پھر پوری جماعت سے ان احکام کی اطاعت اور پابندی کا اقرار لیتے تاکہ اس جماعتی اقرار سے لوگوں کے اندر اس کی پابندی کا احساس پوری اہمیت حاصل کرے اور نسلاً بعد نسلٍ ان کے اندر یہ روایت زندہ رہے کہ اس عہد کا اقرار ہم نے فلاں جگہ من حیث الجماعت کیا ہے۔ یہاں قرآن نے اپنے زمانۂ نزول کے بنی اسرائیل کو یاد دلایا ہے کہ تم اپنے جن آباؤ اجداد کی روایات پر فخر کرتے ہو، جب ان کی پوری جماعت کا یہ اقرار تمھاری کتاب میں موجود ہے تو تم اس کی ذمہ داری سے کس طرح انکار کر سکتے ہو۔

ثُمَّ أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ
بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۚ
أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۸۵)

ایک طرف دین کی مخالفت دوسری طرف دینداری کا مظاہرہ یعنی جس عہد کو تم نے اس اہتمام کے ساتھ باندھا اب تم ہی لوگ ہو کہ اس کو اس سرگرمی کے ساتھ توڑ رہے ہو۔ اس توڑنے کی شکل یہاں قرآن مجید نے یہ بیان کی ہے کہ تم اپنے بھائیوں کے خلاف ان کے دشمنوں سے ساز باز کرتے ہو اور پھر ان کے مددگار بن کر اپنے بھائیوں کو ان کی بستیوں سے جلاوطن کراتے ہو۔ اس طرح ان کو ذلیل و خوار کرا لینے کے بعد جب وہ دشمنوں کے ہاتھوں میں قیدی ہو کر تمھارے پاس آتے ہیں تو تم اپنی ملت پروری اور قوم دوستی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ان کو فدیہ دے کر چھڑاتے بھی ہو کہ یہ تورات کا حکم ہے، حالانکہ تورات میں جس طرح یہ فدیہ دے کر چھڑانے کا حکم ہے اسی طرح یہ ممانعت بھی موجود ہے کہ اپنے بھائیوں کو ان کی بستیوں سے نہ نکالنا۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہودیہ اور اسرائیل کی سلطنتیں الگ الگ قائم ہو جانے کے بعد سے بنی اسرائیل میں اس طرح کے واقعات بہت پیش آئے۔ دونوں سلطنتوں کے درمیان حریفانہ کاوشیں رہتیں اور ایک دوسری سے انتقام لینے کے لیے آسان نسخہ یہی ہوتا کہ مخالف طاقتوں کو ابھار کر ان سے حریف پر چڑھائی کرا دی جائے اور جب وہ قتل و نہب کے بعد دشمنوں کے ہاتھوں میں اسیر ہو کر طالب ہوں تو ان کو چھڑا کر قومی ہمدردی و بہی خواہی کی دھونس بھی عوام پر جما دی جائے۔

اسی طرح کے حالات ان یہودیوں کے بھی تھے جو نزولِ قرآن کے زمانہ میں عرب میں آباد تھے۔ ان کی مختلف شاخوں نے انصار کی مختلف شاخوں کے ساتھ حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ مثلاً بنو قینقاع اور بنو نضیر خزرج کے حلیف تھے اور بنو قریظہ اوس کے۔ اوس اور خزرج کے درمیان برابر قبائلی جنگیں برپا رہتیں۔ اور ان جنگوں میں یہود بھی اپنے حلیفوں کے ساتھ شریک ہوتے اور بھائیوں کے قتل اور ان کی جلاوطنی کا سبب بنتے لیکن اس برادر کشی کے ساتھ ساتھ اپنی دینداری کی نمائش کے لیے یہ بھی کرتے کہ جب ان کے دینی بھائی دشمنوں کے ہاتھوں میں قید ہوتے تو ان کو فدیہ دے کر چھڑاتے بھی کہ یہ تورات کا حکم ہے[1]۔

ایک طرف اللہ کے دین کی یہ مخالفت اور دوسری طرف دینداری کا یہ مظاہرہ صریح منافقت ہے کیونکہ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کتابِ الٰہی کی جو بات اپنی خواہشات کے مطابق ہو وہ تو مانی جائے اور جو بات خواہشات کے خلاف ہو اس کا انکار کر دیا جائے۔ اس طرح کا من مانا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہے جو لوگ شریعتِ الٰہی کے معاملہ میں یہ رویہ اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں بھی رسوا کرتا ہے اور ایسے لوگ آخرت میں بھی سخت عذاب کے مستحق ہوں گے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (۸۶)

یہاں اشتراء کے معنی خریدنے یا بیچنے کے نہیں بلکہ مجرد ترجیح دینے کے ہیں۔ آدمی جب ایک شے کو قیمت دے کر خریدتا ہے تو اس کو قیمت کے بالمقابل ترجیح دیتا ہے۔ لسان العرب نے آیت أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ سے متعلق ابو اسحاق کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہاں بیع و شراء مراد نہیں ہے بلکہ محض اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ جس طرح ایک مشتری اپنا مال دے کر اپنی مطلوب و مرغوب چیز لیتا ہے اسی طرح ان کفار نے ضلالت کو اپنی ایک مرغوب و محبوب چیز کی طرح پکڑ لیا ہے۔ اہل عرب ہر اس موقع پر جب ایک چیز چھوڑ کر دوسری چیز اختیار کی جائے، کہیں گے اِشْتَرَاہُ اس نے اس چیز کو خریدا یعنی اس کو ترجیح دی۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال ہوا ہے۔

---

[1] ان آیات کی تلاوت کرتے وقت مسلمان حکومتوں اور مسلم جماعتوں کی ان سازشوں پر بھی نگاہ رہے جو وہ ایک دوسرے کے خلاف کرتی رہتی ہیں اور اس معاملہ میں اس حد تک بڑھ جاتی ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کرنے میں بھی ان کو کوئی عار نہیں ہوتا۔

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ، نہ تو ان کا عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد ہی پہنچے گی یعنی نہ تو ان کے ساتھ اندر سے کوئی رعایت کی جائے گی اور نہ باہر سے ان کو کوئی مدد حاصل ہو سکے گی۔ اللہ کے اس ابدی عذاب میں گرفتار ہو جانے کے بعد ان کے لیے امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (۸۷)

عہد کی یاددہانی کا انتظام

اوپر والے عہد کی برابر یاددہانی کراتے رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو انتظام فرمایا یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو کتاب دینے کے بعد اس کتاب کی تذکیر کے لیے برابر انبیا بھیجے گئے اور خاص کر عیسیٰ بن مریم کو اللہ تعالیٰ نے بَيِّنٰت کے ساتھ بھیجا۔ "بَيِّنٰت" سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے اور جو اس قدر واضح تھے کہ ان کے خدا کی طرف سے ہونے میں کوئی ہٹ دھرم ہی شک کر سکتا تھا لیکن یہود نے ان کھلے معجزات کو بھی تائید ربانی اور فیض روح القدس کا نتیجہ قرار دینے کے بجائے نعوذ باللہ شیطانی تصرف کا نتیجہ قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ معجزے شیطانوں اور بھوتوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے دکھاتے ہیں۔ قرآن مجید نے یہود کے اسی الزام کی تردید کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بار بار یہ فرمایا ہے کہ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (ہم نے روح القدس سے اس کی مدد کی) یعنی اس سے جو معجزے صادر ہوتے یہ تائید روح القدس کا نتیجہ ہیں نہ کہ کسی شیطان یا جن کی مدد کا، جیسا کہ یہود سمجھتے ہیں۔

تائیدِ روح القدس کا مفہوم

انجیل میں یہود کے اس الزام کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اور ان کے اس الزام کا جو جواب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیا ہے وہ بھی نقل ہوا ہے۔ ہم یہاں ایک اقتباس متی سے پیش کرتے ہیں جس سے اس خیال کی پوری پوری تائید ہوتی ہے جو ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔ متی باب ۱۲ میں ہے۔

> اس وقت اس کے پاس لوگ ایک اندھے گونگے کو لائے جس میں بدروح تھی اس نے اسے اچھا کر دیا چنانچہ وہ گونگا بولنے اور دیکھنے لگا اور ساری بھیڑ حیران ہو کر کہنے لگی کہ کیا یہ ابن داؤد ہے۔ فریسیوں نے سن کر کہا یہ بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد کے بغیر بدروحوں کو نہیں نکالتا۔ اس نے ان کے خیالوں کو جان کر ان سے کہا جس بادشاہی میں پھوٹ پڑتی ہے وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس شہر یا گھر میں پھوٹ پڑے گی وہ قائم نہ رہے گا۔ اور اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف ہو گیا۔ پھر اس کی بادشاہی کیونکر قائم رہے گی؟ اور اگر میں بعلزبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں تو تمہارے بیٹے کس کی مدد سے نکالتے ہیں۔ پس وہی تمہارے منصف ہوں گے لیکن اگر میں خدا کے روح کی مدد سے بدروحوں کو

نکالتا ہوں تو خدا کی بادشاہی تمھارے پاس آپہنچی۔ یا کیوں کر کوئی آدمی کسی زورآور کے گھر میں گھس کر اس کا اسباب لوٹ سکتا ہے جب تک کہ پہلے اس زورآور کو نہ باندھ لے۔ پھر وہ اس کا گھر لوٹ لے گا۔ جو میرے ساتھ نہیں وہ میرے خلاف ہے۔ جو میرے ساتھ جمع نہیں کرتا وہ بکھیرتا ہے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ آدمیوں کا ہر گناہ اور کفر تو معاف کیا جائے گا مگر جو کفر روح کے حق میں ہے وہ معاف نہ کیا جائے گا۔ اور جو کوئی ابن آدم کے برخلاف کوئی بات کہے گا تو وہ معاف کی جائے گی لیکن جو کوئی روح القدس کے خلاف کوئی بات کہے گا وہ معاف نہ کی جائے گی، نہ اس عالم میں اور نہ آنے والے عالم میں۔ یا تو درخت کو بھی اچھا کہو اور اس کے پھل کو بھی اچھا۔ یا درخت کو بھی برا کہو اور اس کے پھل کو بھی برا، کیونکہ درخت پھل ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ (متی باب ۱۲۔ آیات ۲۲-۲۳)

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کے الفاظ پر غور کیجیے تو آیت کا اصلی زور سمجھ میں آجائے گا کہ اس میں کس بات کا اثبات اور کس بات کی تردید ہے۔ جہاں تک روح القدس کی تائید کا تعلق ہے وہ ہر پیغمبر کو حاصل ہوتی ہے اور پیغمبر سے جو معجزات صادر ہوتے ہیں وہ اسی تائید کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں اس بات کا اظہار بار بار اس لیے فرمایا گیا کہ یہود ان پر مذکورہ بالا الزام لگاتے تھے۔ روح القدس سے مراد وہ پاکیزہ روح ہے جو خدا کی طرف سے آتی ہے اور عبرانی میں اس سے مراد جبریل ہیں۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ (۸۸)

قُلُوْبُنَا غُلْفٌ کے دو مفہوم

یہ قول یہود کی طرف سے بطور ایک عذر لنگ کے بھی ہو سکتا ہے اور بطور اظہار تکبر کے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ باتیں (جو پیغمبر پیش کرتے ہیں) ہمارے دل میں تو کسی طرح اترتی نہیں، اگر یہ خدا کی طرف سے ہیں تو خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، آخر وہ ہمارے دلوں کو ان باتوں کے لیے کھول کیوں نہیں دیتا۔

دوسری صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے دل و دماغ اس قسم کی لایعنی باتوں کے لیے نہیں بنے ہیں اس وجہ سے یہ کسی طرح بھی ہمارے دلوں میں نہیں دھنستی ہیں، اگر ان میں ذرا بھی معقولیت ہوتی تو معقول باتوں کے قبول کرنے کے معاملہ میں ہم سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید کے نظائر و شواہد ان دونوں ہی مفہوموں کی تائید میں موجود ہیں لیکن ہم یہاں دوسرے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اس قول کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا ہے کہ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ (بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کر دی ہے) اس سے واضح تائید اسی مفہوم کی نکلتی ہے۔ یعنی وہ تو اپنے گھمنڈ اور غرور کے سبب سے یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبرؐ کی باتیں ہی ایسی ہیں جو کسی معقول آدمی کے دل میں نہیں اتر سکتیں حالانکہ حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے، یہ باتیں تو نہایت معقول اور نہایت دل نشین ہیں لیکن ان لوگوں کے کفر اور ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب سے ان کے

دلوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کر دی ہے اس وجہ سے اب ان کے اندر ان معقول باتوں کے قبول کرنے کے لیے کوئی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ

یہود پر قرآن كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۸۹)

کا احسان — کتاب سے یہاں مراد قرآن مجید ہے جو ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتا ہوا نازل ہوا تھا جو اس کے بارے میں یہود کے صحیفوں میں وارد تھیں۔ اس پہلو سے قرآن کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا احسان خود یہود پر تھا کہ اس نے ان کے صحیفوں کی بہت سی باتوں کو سچا ثابت کیا۔ اس احسان کا حق تو یہ تھا کہ وہ سب سے آگے بڑھ کر اس کتاب عزیز کو ہاتھوں ہاتھ لیتے لیکن انھوں نے اس کو قبول کرنے کے بجائے ضد اور حسد کے سبب سے اس کی مخالفت کی راہ میں سبقت کی۔ قرآن مجید کو پچھلے صحیفوں کے مصدق کہنے کی حقیقت اسی سورہ کی آیت ۴۱ کی تفسیر کرتے ہوئے ہم واضح کر چکے ہیں۔

قرآن اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں چونکہ یہود کے صحیفوں میں موجود تھیں اس وجہ سے ان کو ان پیشین گوئیوں کے ظہور کا بڑی شدت کے ساتھ انتظار تھا۔ ان کو امید تھی کہ جب اس نبی موعود کی بعثت ہوگی تو ان کی بدبختی اور مصیبت کے دن دور ہو جائیں گے اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ان کو ان کے تمام دشمنوں پر فتح دے گا۔ اس فتح کے لیے وہ دعائیں بھی کرتے تھے لیکن یہ عجیب بدقسمتی ہے کہ جب یہ پیشین گوئی پوری ہوگئی، جس کا انتظار تھا وہ آچکا اور اس کے کارناموں نے یہ ثابت بھی کر دیا کہ یہ وہی ہے جس کی علامتیں پچھلے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں اور یہود نے اس کو اچھی طرح پہچان بھی لیا تو محض ضد اور حسد کی وجہ سے اس کا انکار کر دیا۔ یہود کے اس رویہ کو حضرت مسیح علیہ السلام نے دس کنواریوں والی تمثیل میں واضح فرمایا ہے جو متی کے باب ۲۵ میں منقول ہے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

اشتراء کا عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۗ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۹۰)

مفہوم — یہاں اشتراء کے معنی بیچنے اور مبادلہ کرنے کے ہیں۔ بعینہ یہی مضمون اسی سورہ میں دوسری جگہ اس طرح وارد ہے وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۲-بقرہ) (کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کے عوض میں انھوں نے اپنی جان کو بیچا) عام طور پر اہل لغت اس لفظ کو اضداد میں شمار کرتے ہیں۔ اس کے اضداد میں سے ہونے کی امام راغب نے بڑی معقول توجیہ کی ہے وہ کہتے ہیں۔ فاما اذا كان بيع سلعة بسلعة صح ان يتصور كل واحد منهما مشتريا وبائعا ومن هذا الوجه صار لفظ البيع والشراء يستعمل كل واحد منهما في موضع الاخر لیکن جب شے کا مبادلہ شے سے ہو تو فریقین میں سے ہر ایک

کو مشتری اور ہر ایک کو بائع سمجھنا صحیح ہوگا، اس پہلو سے بیع اور شرا کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہیں) اس تحقیق کی روشنی میں مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ ہوگا (کیا ہی بری ہے وہ چیز جس سے انھوں نے اپنی جانوں کا مبادلہ کیا) یعنی اپنی نجات و فلاح کی فکر سے بے نیاز ہو کر دوسروں کی ضد میں مبتلا ہوئے اور پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا بیٹھے۔

اَنۡ یَّكۡفُرُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بَغۡيًا اَنۡ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ: یہ وضاحت ہے اس چیز کی جس کو ان لوگوں نے اختیار کیا۔ وہ یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب اور اس کے بھیجے ہوئے نبی پر ایمان لانے کے بجائے اس کے انکار اور اس کی مخالفت کی راہ اختیار کی اور چونکہ انکار اور مخالفت کی یہ راہ دیدہ و دانستہ اختیار کی گئی اس وجہ سے اس کا سبب اس ضد اور عناد کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ان کو اللہ تعالیٰ پر غصہ تھا کہ اس نے آخری دین اور آخری رسول کی نعمت سے بنی اسماعیل کو کیوں نوازا، خود ان کے اندر سے کسی کو رسول کیوں نہیں بنایا؟ گویا اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کے اجارہ دار یہی ہیں اور انھی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بتائیں کہ وہ کس منصب کے لیے کس کو منتخب کرے اور کس کو منتخب نہ کرے۔

بغی کے معنی یہاں ضد کے ہیں۔ یہ ضد ان کی خدا سے سرکشی اور ان کے استکبار کا نتیجہ تھی عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن اشارہ یہاں خاص طور پر بنی اسماعیل کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اختیار کی وسعت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ عموم کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ‌ؕ وَلِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ: "وہ اللہ کا غضب در غضب لے کر لوٹے" کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ جہاں سے ان کو سب سے بڑی رحمت لے کر لوٹنا تھا وہاں سے وہ اپنی شامتِ اعمال کے باعث خدا کا غضب لے کر لوٹے۔ ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت و کامرانی آخری نبی پر ایمان کے ساتھ وابستہ تھی اور یہ اس کے متوقع اور منتظر بھی تھے بلکہ اس کے لیے، جیسا کہ اوپر گزرا، دعائیں بھی کرتے رہے تھے۔ لیکن جب اس نعمت سے متمتع ہونے کا موقع آیا تو ان کی بدبختی نے ان کو ٹھوکر کھلائی اور وہ اس کی مخالفت کی پاداش میں غضبِ الٰہی کے مستحق قرار پائے۔ پھر صرف غضب ہی کے نہیں بلکہ غضب در غضب کے مستحق قرار پائے۔ ایک غضب کے مستحق تو وہ اس عہد کو توڑنے کے سبب سے ٹھہرے جو اللہ تعالیٰ سے انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطہ سے باندھا تھا اور دوسرے غضب کے مستحق اس وجہ سے ہوئے کہ جب ان کے لیے پھر خدا کے عہد میں داخل ہونے کا موقع آیا تو انھوں نے ضد اور حسد میں مبتلا ہو کر اس سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ سے مراد ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ یہ ذلیل کرنے والا عذاب ان کو اس لیے دیا جائے گا کہ ان کے جرائم کا اصل محرک استکبار تھا جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَهۡوٰٓى اَنۡفُسُكُمُ

اسۡتَكۡبَرۡتُمۡ (کیا جب جب کوئی رسول تمہارے پاس کوئی ایسی بات لے کر آئے گا جو تمہاری خواہشوں کے خلاف ہوگی تو تم استکبار کے ساتھ اس کا انکار کر دو گے) ۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَآ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَيَكۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمۡ ؕ قُلۡ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ (۹۱)

یہود کا ایمان نہ قرآن پر نہ تورات پر

یعنی جب ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ بڑے غرور کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہی ہیں جو ہم پر اتری ہے ۔ اس کے بعد ان کے قول کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ تورات کے بعد وہ کسی چیز پر ایمان لانے کے قائل نہیں ہیں حالانکہ اب تورات کی اپنی پیشین گوئیوں کے مطابق بھی صحیفۂ حق وہی ہے جس کو قبول کرنے کی ان کو دعوت دی جا رہی ہے نہ کہ تورات ۔

قُلۡ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ، یہ واضح کرنے کے بعد کہ قرآن کے نازل ہو جانے کے بعد معتبر ایمان وہی ہے جو قرآن پر ہو نہ کہ صرف تورات پر، یہ واضح فرمایا کہ ان یہود کا تورات پر ایمان کا دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے ۔ اگر یہ فی الواقع تورات پر ایمان رکھنے والے ہوتے تو اللہ کے ان نبیوں کو قتل کرنے کی جسارت کس طرح کرتے جو اسی تورات کی تجدید و تصدیق کے لیے آئے ۔

وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ مُّوۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ (۹۲)

یہود کے دعوائے ایمان کی مزید تردید

یہ یہود کے دعوائے ایمان کی مزید تردید ہے اور اس تردید کا خاص پہلو یہ ہے کہ ان کی ابتدائی تاریخ کے واقعۂ گوسالہ پرستی کو یاد دلا کر ان کو سرزنش کی گئی ہے کہ آج تم نے اپنے ایمان اور اپنی دینداری کی حکایت اتنی بڑھا رکھی ہے کہ نہ قرآن کو خاطر میں لانے کے لیے تیار ہو نہ پیغمبر آخر الزمان کو، حالانکہ تمہارے اس ایمان کا حال آج تو درکنار شروع سے یہ رہا ہے کہ عین موسیٰ کی موجودگی میں، ان کے کھلے کھلے معجزات کو دیکھتے ہوئے تم نے اپنے رب کو چھوڑ کر ایک بچھڑے کی عبادت شروع کر دی ۔

یہود کے اسی قسم کے فخر پر بعض پچھلے انبیا نے بھی ان کو سرزنش کی ہے اور اسی واقعۂ گوسالہ پرستی کی طرف تعریض کرتے ہوئے یہ الفاظ تک فرمائے ہیں کہ اے اسرائیل (بنی اسرائیل) تو تو وہ ہے کہ تو نے پہلی شب میں بے وفائی کی۔ قرآن کے الفاظ اس کے اپنے مرتبہ کے شایانِ شان ہیں لیکن بات وہی کہی گئی ہے جو سابق انبیاء نے فرمائی تھی۔

وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ٹھیک ٹھیک وَاَنۡتُمۡ مُّشۡرِكُوۡنَ کے معنی میں ہے ۔ قرآن میں شرک کو متعدد مقامات میں ظلم کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ ظلم کا اصل مفہوم حق تلفی ہے ۔ خدا کے حقوق اور خود اپنے نفس کی جو حق تلفی آدمی شرک کا ارتکاب کر کے کرتا ہے وہ کسی بھی اور دوسرے طریقہ سے نہیں کرتا ۔ اس کی وضاحت قرآن مجید نے متعدد

مقامات میں کی ہے۔ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُم بِهِ إِيمَانُكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۹۳)

حال کی تعبیر قول سے

اسی سورہ کی آیت ۶۳ کی تفسیر کرتے ہوئے اس ٹکڑے کے تمام اہم اجزا کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ یہاں یہود کا یہ جواب جو نقل ہوا ہے، قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (انھوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی) یہ صورتِ حال کی تعبیر ہے۔ انھوں نے عہد تو یہی کیا تھا کہ "ہم نے سنا اور ہم اطاعت کریں گے" لیکن عمل ان کا یہی ہوا کہ انھوں نے جو کچھ سنا اس کی نافرمانی کی۔ اس صورتِ حال کو، جو ان کے عمل سے ظاہر ہوئی، قرآن نے ان کے قول کی جگہ رکھ دیا ہے۔ گویا انھوں نے شروع ہی میں اقرار اطاعت کا نہیں بلکہ نافرمانی کا کیا تھا۔

منافقین اور یہود آنحضرت صلعم کی مجلس میں جب کبھی آتے تو سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا کی جگہ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ہی کہتے لیکن ادا اس طرح کرتے کہ سننے والا عَصَيْنَا کو أَطَعْنَا سمجھے۔ یہ روش انھوں نے اپنے اسلاف ہی سے سیکھی تھی۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ أَطَعْنَا کہتے اور اس سے عَصَيْنَا مراد لیتے اور یہ عَصَيْنَا کہتے اور یہی مراد بھی لیتے لیکن زبان کو توڑ مروڑ کر مغالطہ یہ دیتے کہ مسلمان ان کے عَصَيْنَا کو أَطَعْنَا سمجھیں۔

قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِندَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۹۴)

یہود کی دکھتی ہوئی رگ

اوپر کی آیت ۹۰ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ یہود اس بات سے بہت برافروختہ ہوتے تھے کہ خدا کے کسی فضل و انعام کا حق دار ان کے سوا کسی اور کو بھی سمجھا جائے۔ وہ دنیا میں بھی ہر خدائی نعمت کا حق دار اپنے ہی کو سمجھتے تھے اور آخرت کی نعمتوں کا حق دار بھی تنہا اپنے ہی کو سمجھتے تھے۔ قرآن نے ان کو متنبہ کیا کہ اگر تم فی الواقع آخرت کی تمام کامیابیاں اپنا ہی حصہ سمجھتے ہو، اس میں دوسروں کا کوئی حصہ تسلیم نہیں کرتے تو اس کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ تمھیں لقائے رب کا شوق ہو اور تم اس کے لیے موت کی آرزو کرو۔ لیکن تمھارا حال تو یہ ہے کہ تم زندگی کی محبت میں اہل کتاب ہو کر عرب کے مشرکوں کو بھی مات دے گئے ہو۔

قرآن نے یہود کی یہ ایک بہت دکھتی رگ پکڑی ہے تاکہ خدا کے محبوب و مقرب ہونے کا ان کو جو گھمنڈ تھا اس پر ذرا وہ شرمائیں۔ اگرچہ وہ اپنی عادت کے مطابق بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس بات کے جواب میں کہہ سکتے تھے کہ ہم تو موت کی بڑی آرزو رکھنے والے لوگ ہیں لیکن آدمی سے خود اپنے دل کا حال چھپا ہوا نہیں ہوتا اس وجہ سے یہ حقیقت ان کے لیے بڑی تلخ اور ان کو خود ان کی نگاہوں میں بڑی رسوا کرنے والی تھی۔

وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (۹۵)

یعنی اللہ تعالیٰ سے قرب اور آخرت کی اجارہ داری کے ادعا کے باوجود موت کی آرزو یہ کبھی نہیں کریں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا اور اس کی شریعت کے ساتھ جو بدعہدیاں اور غداریاں انھوں نے کی ہیں وہ دوسروں کے سامنے ہوں یا نہ ہوں لیکن خود ان سے یہ ڈھکی چھپی نہیں ہیں، اس وجہ سے موت کے تصور سے ان پر لرزہ طاری ہوتا ہے لیکن موت سے یہ کب تک بھاگیں گے اور اس سے بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ بالآخر ایک دن موت سے دوچار ہونا اور اس رب کے سامنے حاضر ہونا ہے جو ان ظالموں کے تمام اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اس حقیقت کو سورہ جمعہ میں اس طرح واضح فرمایا ہے۔ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۸) (کہہ دو وہ موت جس سے تم بھاگ رہے ہو تمھیں پاکے رہے گی، پھر تم غیب اور حاضر کے جاننے والے کے سامنے پیش کیے جاؤ گے اور وہ تمھیں ان ساری باتوں سے آگاہ کرے گا جو تم کر رہے ہو)۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَیٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ۗ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ (۹۶)

یہود مشرکین سے بھی گئے گزرے ہوئے ہیں

یعنی ایک طرف تو خدا کے ساتھ محبت و محبوبیت کے یہ دعوے ہیں، دوسری طرف زندگی کی محبت کا یہ حال ہے کہ ساری دنیا سے زیادہ زندگی کے حریص یہ ہیں۔ یہاں تک کہ اس معاملہ میں یہ عرب کے ان مشرکوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں جن کے ہاں یہ دنیا ہی دنیا ہے آخرت کا جن کے سامنے سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔

قرآن نے ایک سے زیادہ مقامات میں یہود کا موازنہ مشرکین عرب سے کر کے یہ دکھایا ہے کہ یہ عقیدہ اور عمل دونوں ہی اعتبارات سے مشرکین سے بھی گئے گزرے ہوئے ہیں۔ مشرکین کتاب و شریعت سے بے بہرہ ہونے کے سبب سے قدرتی طور پر فکری اور اخلاقی حیثیت سے نہایت پست سطح پر تھے، قرآن نے یہ واضح کیا ہے کہ کتاب اور شریعت کے نہایت بلند بانگ دعاوی کے باوجود اخلاقی اعتبار سے یہ یہود مشرکین کو بھی شرماتے ہیں حالانکہ یہ ان کو نہایت حقیر سمجھتے ہیں۔

وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ، اس کا ایک ترجمہ تو وہی ہو سکتا ہے جو ہم نے کیا ہے، دوسرا یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو اس کی عمر کی درازی اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ معنی کے اعتبار سے دونوں ترجموں میں کوئی فرق نہیں ہے اور زبان کے قواعد کے لحاظ سے بھی میرے نزدیک دونوں صحیح ہیں۔ لیکن اکثر اہل تاویل نے اختیار اسی دوسرے کو کیا ہے۔

وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ، یعنی لمبی سے لمبی عمر بھی کسی کے اعمال کو خدا سے چھپا نہیں سکتی۔ خدا ان ساری چیزوں کو دیکھ رہا ہے جو یہ کر رہے ہیں اور جب دیکھ رہا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان کا بدلہ نہ دے۔ یہاں دیکھنے سے مراد وہ چیز ہے جو اس دیکھنے سے لازم آتی ہے۔ کلام کا یہ اسلوب قرآن مجید میں بے شمار مواقع میں استعمال ہوا ہے۔

۴۰۔ اس مجموعۂ آیات کی بعض تعلیمات

اس مجموعۂ آیات کی تعلیمات کی طرف تو ہم اس کے اجزا کی وضاحت کرتے ہوئے اشارہ کرتے آئے ہیں! وہ کافی ہے۔ لیکن بعض چیزیں اس میں ایسی بیان ہوئی ہیں جن کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ ان کی طرف ہم پھر اشارہ کر دیں۔

۱۔ خدا کی شریعت کا حق اس کے ہر جزو پر عمل کرنے سے ادا ہوتا ہے — اس میں ایک بڑی اہم حقیقت تو یہ واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو شریعت دیتا ہے اس کا حق اس کے ہر جزو پر عمل کرنے سے ادا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے ان اجزا پر عمل کرے جو اس کی خواہشات کے موافق ہیں اور جن کو اپنی خواہشات کے خلاف پائے ان کو نظر انداز کر دے تو یہ چیز قرآن کی اصطلاح میں ایمان ببعض الکتاب اور کفر ببعض الکتاب ہے اور اس طرح کا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ صرف یہ کہ معتبر نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کی سزا قرآن نے یہ بیان کی ہے کہ "ان کے لیے دنیا کی زندگی میں رسوائی ہے اور آخرت میں یہ سخت ترین عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے۔"

۲۔ قبولِ حق کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ — دوسری حقیقت یہ واضح کی گئی ہے کہ قومی تفاخر، گروہی عصبیت اور جماعتی برتری کا زعم قبولِ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جو گروہ اس بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کے لیے اس حق کے سوا جس کو وہ خود حق قرار دے کسی اور حق کو قبول کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی چیز اس استکبار کی جڑ ہے جسے قرآن میں ابلیس کی خصوصیت بتایا گیا ہے اور اسی سے وہ حسد پیدا ہوتا ہے جو ہر اس حق سے نفرت اور چڑ پیدا کر دیتا ہے جو اپنی خواہشات کے خلاف ہو۔

۳۔ زندگی کی حرص محبتِ الٰہی کے منافی ہے — تیسری حقیقت یہ واضح کی گئی ہے کہ جس طرح زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر موت کی آرزو کرنا یا خودکشی کرنا ایمان اور تعلق باللہ کے منافی ہے اسی طرح زندگی اور درازیٔ عمر کا حریص ہونا اور موت سے فرار بھی ایمان اور محبتِ الٰہی کے منافی ہے۔ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ سے محبت کرتے ہیں وہ موت سے بھاگتے نہیں بلکہ وہ اللہ کی راہ میں موت کی تمنا کرتے ہیں۔ نیز ضمناً یہاں یہ حقیقت بھی واضح فرما دی ہے کہ جو چیز انسان کو موت سے ڈراتی ہے وہ درحقیقت گناہ اور خدا سے بغاوت کی زندگی ہے۔ اگر انسان اپنی زندگی کو گناہوں اور نافرمانیوں سے پاک رکھنے کی کوشش کرے تو موت اس کے لیے ایک محبوب چیز بن جاتی ہے۔

۴۱۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۹۷-۱۰۳

یہود کی قرآن دشمنی کی مزید تفصیل — آگے یہود کی اس قرآن دشمنی کی مزید تفصیل کرتے ہوئے یہ بیان فرمایا کہ یہود اس دشمنی میں اللہ، اس کے ملائکہ، اس کے انبیاء اور جبریل و میکائیل سب کے دشمن بن گئے ہیں اور اس طرح انھوں نے خدا کو اپنا

دشمن بنا لیا ہے۔ پھر فرمایا کہ اس قرآن کو دشمنی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حق کے دلائل ان پر واضح نہیں ہیں، دلائل تو پوری طرح واضح ہیں لیکن یہ نافرمان اور عہد شکن لوگ ہیں، ابتدا ہی سے ان کی روش یہ رہی ہے کہ جب بھی انھوں نے خدا سے کوئی عہد باندھا ہے اس کو انھی کے اندر کی ایک جماعت نے موقع آنے پر توڑ دیا ہے۔ چنانچہ خدا کے آخری رسول کے بارے میں بھی انھوں نے یہی روش اختیار کی۔ یہ تورات کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق آئے ہیں لیکن یہود نے تورات پر ایمان لانے کے مدعی ہوتے ہوئے محض ضد میں آکر اس طرح کتاب الٰہی کو پیٹھ پیچھے پھینکا ہے گویا اس سے کبھی آشنا ہی نہیں تھے۔ پھر فرمایا کہ ان کی اصل دلچسپی اللہ کی کتاب سے نہیں ہے بلکہ ان سفلی اور شیطانی عملیات سے ہے جو فلسطینیوں اور کلدانیوں وغیرہ سے انھوں نے سیکھی تھیں۔ سحر و شعبدہ اور گنڈے، تعویذ وغیرہ کی قسم کی چیزوں نے ان کو خدا کی کتاب سے بالکل بے پروا کر کے ایک بالکل دوسری ہی ڈگر پر ڈال دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۹۷-۱۰۳

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ
اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾
مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ
فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ
وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ
فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ
رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا
يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا
كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۤ وَ
مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ
مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ

مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ
بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ
وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئْسَ
مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا
لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ١٢

ترجمۂ آیات ٩٧-١٠٣

کہہ دو کہ جو جبریل کا مخالف ہوا تو وہ جان لے کہ جبریل نے اس کلام کو تمہارے دل پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اتارا ہے، مطابق ان پیشین گوئیوں کے جو اس کے پہلے سے موجود ہیں اور یہ ہدایت و بشارت ہے اہلِ ایمان کے لیے۔ جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسول اور جبریل و میکائیل کے دشمن ہوئے تو ایسے کافروں کا اللہ دشمن ہے۔ ٩٧-٩٨

اور ہم نے تمہارے اوپر نہایت واضح دلیلیں اتاری ہیں۔ ان کا انکار صرف عہد شکن ہی لوگ کر سکتے ہیں۔ کیا ان کی یہی روش قائم رہے گی کہ جب جب کوئی عہد کریں گے تو ان کا ایک گروہ اس کو اٹھا پھینکے گا، بلکہ ان میں سے اکثر ایمان سے عاری ہیں۔ ٩٩-١٠٠

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول ان پیشین گوئیوں کے مطابق آیا جو ان کے پاس موجود ہیں تو ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینکا گویا اس سے آشنا ہی نہیں اور ان چیزوں کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمان کے عہدِ حکومت میں شیاطین پڑھتے پڑھاتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں ہی نے کفر کیا، یہی لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ ١٠١-١٠٢

اور اس چیز میں پڑ گئے جو بابل میں دونوں فرشتوں، ہاروت اور ماروت پر اتاری گئی تھی

حالانکہ کسی کو سکھاتے نہیں تھے جب تک اس کو خبردار نہ کر دیں کہ ہم آزمائش کے لیے ہیں تو تم کفر میں نہ پڑ جانا۔ پس یہ لوگ ان سے وہ علم سیکھتے جس سے میاں اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال سکیں۔ حالانکہ یہ اس کے ذریعہ سے خدا کی مشیت کے بغیر کسی کو نقصان پہنچانے والے نہیں بن سکتے تھے اور یہ وہ چیز سیکھتے تھے جو ان کو نقصان پہنچائے۔ حالانکہ ان کو پتہ تھا کہ جس نے اس چیز کو اختیار کیا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ کیا ہی بُری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں انھوں نے اپنی جانوں کو بیچا۔ اے کاش وہ اس کو سمجھتے! ۱۰۲

اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کا ثواب ان کے لیے کہیں بہتر تھا کاش وہ سمجھتے! ۱۰۳

۴۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۹۷)

اس جملہ میں فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ جواب شرط کے محل میں ہے۔ عربی زبان میں جب کبھی شرط کا جواب اس طرح آئے تو اس کے اندر ایک تفصیل پوشیدہ ہوتی ہے جس پر بعد کے جملہ سے روشنی پڑتی ہے۔ یہاں سیاقِ کلام سے جملہ کا مطلب یہ واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ جبریل کے مخالف ہیں ان پر یہ حقیقت واضح رہنی چاہیئے کہ جبریل کی مخالفت درحقیقت اللّٰہ کی مخالفت ہے کیونکہ جبریل نے خدا کا کلام جو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتارا ہے تو اپنے جی سے نہیں اتارا ہے بلکہ خدا ہی کے حکم سے اتارا ہے۔ جبریل کوئی کام بھی من مانے طور پر نہیں کرتے، جو کچھ کرتے ہیں خدا کی مرضی کے مطابق اور اس کے حکم کے تحت کرتے ہیں نَزَّلَهٗ میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۹۱ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ سے چلا آ رہا ہے اس وجہ سے یہاں اضمار قبل الذکر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ بات اوپر والی بات ہی کا ایک جزو ہے۔

میں جبریلؑ سے دشمنی

معلوم ہوتا ہے کہ یہود، قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضد میں جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا مخالف ظاہر کرنے لگے تھے۔ ممکن ہے یہود کے علماء اور لیڈروں کو جب یہ اندیشہ ہوا ہو کہ قرآن کی دعوت ان کے عوام کو

کہیں متاثر نہ کر دے تو انھوں نے یہ شگوفہ چھوڑا ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ان کے اپنے بیان کے مطابق جبریل فرشتہ آتا ہے اور یہ فرشتہ ہمارا دیرینہ مخالف ہے۔ ہمارے اوپر فلاں فلاں آفتیں اسی کے ہاتھوں آئیں۔ اس وجہ سے ہم کسی ایسے شخص پر ایمان نہیں لا سکتے جس کی ہمارے مخالف فرشتہ سے ساز باز ہے۔

اگرچہ یہ بات بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ یہود حماقت کی اس حد کو پہنچ جائیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا دشمن سمجھنے لگ جائیں لیکن انسان جب ضد، حسد اور فرقہ سازی کے جنون میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس سے کوئی بات بھی بعید نہیں رہ جاتی۔ روافض کے ایک فرقہ کا بھی عقیدہ ہے کہ قرآن دراصل اترنا تو تھا حضرت علیؓ پر لیکن جبریل غلطی سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس اس کو لے کر چلے گئے۔ اس فرقہ کے لوگ اس گناہ پر (نعوذ باللہ) حضرت جبریل امین پر لعنت بھی کرتے ہیں۔[1]

قرآن نے یہود کی اس حماقت پر جو گرفت کی ہے وہ بڑی برمحل اور بڑی ہی سخت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس غصہ میں جبریل کے مخالف بن بیٹھے ہو کہ انھوں نے یہ وحی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کیوں اتاری تمھارے کسی آدمی پر کیوں نہ اتاری تو یہ تو سوچو کہ تمھاری یہ بات کہاں تک پہنچتی ہے! اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ تم اللہ کو بھی اپنا مخالف سمجھتے ہو کیونکہ جبریل بہرحال تمہارے اپنے عقیدہ کے مطابق بھی خدا کے فرشتے ہیں، وہ کوئی کام خدا کے حکم کے بغیر نہیں کر سکتے۔ لازماً یہ کام بھی انھوں نے خدا ہی کے حکم سے کیا ہے۔ پھر تم تنہا جبریل ہی کے نہیں بلکہ خدا کے بھی مخالف ہوئے اور خدا بھی تمھارا مخالف ٹھہرا۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَھُدًی وَّبُشۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ میں قرآن کی مزید تین صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ پچھلے صحیفوں کا مصدق ہے۔ دوسری یہ کہ وہ راہ حق کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ تیسری یہ کہ جو اس کی رہنمائی قبول کریں وہ ان کو آخرت کی فوز و فلاح کی بشارت سنا رہا ہے۔ یہ تفصیل یہاں اس لیے پیش کی گئی ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ یہود کی یہ مخالفت صرف قرآن ہی کی مخالفت نہیں ہے بلکہ خود ان کی اپنی کتاب کی بھی مخالفت ہے، وہ اس ہدایت کے بھی مخالف ہیں جو پہلے نازل ہوئی اور اس ہدایت کے بھی دشمن ہیں جو اب دنیا کی رہنمائی کے لیے نازل ہوئی۔

مَنۡ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَرُسُلِہٖ وَجِبۡرِیۡلَ وَمِیۡکٰلَ فَاِنَّ اللّٰہَ عَدُوٌّ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ (۹۸)

بات کہاں سے کہاں پہنچی!

حضرت جبریل کی مخالفت سے جس جس کی مخالفت لازم آتی ہے یہ اس کی تفصیل بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شرارت کی جو سزا ہے اس کا بیان بھی۔ اول درجہ میں تو اس سے خود اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی مخالفت

---

[1] حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ "رد روافض" میں روافض کے مختلف فرقوں کے عقائد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے "و طائفۂ غرابیہ از ایشاں می گویند کہ محمد بہ علیؓ مشابہ تر بود از مشابہت غراب بہ غراب و مگس بامگس و حق تعالیٰ وحی بجانب علی فرستادہ بود جبریل از کمال مشابہت غلط کردہ وحی بمحمد رسانید۔ . . . . . و ایشاں جبریل را لعن می کنند۔"

لازم آتی ہے اس کی وجہ اوپر والی آیت میں بیان ہو چکی ہے کہ جب یہ ایک ایسے کام کی بنا پر جبریل ہی سے خفا ہیں جو جبریل نے خدا کے حکم سے کیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خود خدا کے بھی مخالف ہیں۔ پھر اس سے تمام فرشتوں، تمام رسولوں اور جبریل و میکائیل سب کی مخالفت لازم آتی ہے اس لیے کہ خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں میں کامل ہم آہنگی ہے۔ فرشتے اور انبیاء سارے کام خدا کی مرضی کے مطابق اور اس کے احکام کے تحت ہی کرتے ہیں اور ایک ہی حزب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہو سکتی۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک کا بھی مخالف ہوا وہ سب کا مخالف ہوا اور جس نے کسی ایک کی بھی تکذیب کی اس نے سب کی تکذیب کی۔ یہاں یہ اجمالی اشارہ کافی ہے آگے اس کی مزید تفصیل آئے گی۔

یہاں عام فرشتوں کا ذکر کرنے کے بعد جبریل اور میکائیل کا ذکر خاص طور پر ایک تو ان کی اہمیت کے سبب سے ہے جس طرح عام کے بعد خاص کا ذکر ہوتا ہے۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل، جیسا کہ بعض روایات سے واضح ہوتا ہے، میکائیل فرشتہ کو حضرت جبریل کے برعکس اپنا ہمدرد فرشتہ سمجھتے تھے۔ قرآن نے یہاں حضرت جبریل کے ساتھ حضرت میکائیل کو شامل کر کے یہ واضح کیا ہے کہ جبریل کا مخالف جس طرح اللہ اور اس کے تمام نبیوں اور رسولوں کا مخالف ہے اسی طرح وہ میکائیل کا بھی مخالف ہے اس لیے کہ خدا کے تمام فرشتوں اور تمام رسولوں کی ملت ایک ہے۔ جبریل اور میکائیل دونوں اسی ملت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی رقابت اور چشمک نہیں ہے کہ جبریل سے جن کی لڑائی ہو میکائیل ان سے دوستی گانٹھے رکھیں۔

"فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ" کے ٹکڑے سے بیک وقت دو باتیں ثابت ہوئیں، ایک تو یہ کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں اور اس کے فرشتوں کے مخالف اور دشمن ہیں وہ کافر ہیں اور دوسری یہ کہ اللہ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ قرآن کے ایجاز بیان نے ان دونوں باتوں کو اس طرح سمیٹ دیا ہے کہ بات بھی پوری ہو گئی ہے اور مخاطب کے لیے انکار اور بحث کی کوئی گنجائش بھی پیدا نہیں ہونے پائی ہے۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ آيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ إِلَّا الْفٰسِقُوْنَ (۹۹)

'آیات بینات' سے مراد: خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ آیات بینات سے مراد آپ کی نبوت و رسالت کی وہ واضح اور قطعی دلیلیں ہیں جو آپ پر نازل ہوئیں، عام اس سے کہ وہ قرآن کے مدلل بیانات کی صورت میں ہیں یا ان کا ظہور علامات و شواہد اور معجزات کی شکل میں جو آپ کے ذریعہ سے ظہور میں آئے۔ فرمایا کہ یہ چیزیں آپ کی نبوت کے ثبوت میں اس قدر واضح ہیں کہ جس کے اندر ذرا بھی معقولیت ہو وہ ان کا انکار نہیں کر سکتا، صرف وہی لوگ ان کا انکار کر سکتے ہیں جو نافرمان اور عہد شکن ہوں۔

'فسق' کا مفہوم: فسق کا اصلی مفہوم خدا کی نافرمانی ہے۔ نافرمانی چھوٹی بھی ہو سکتی ہے، بڑی بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ بڑی سے بڑی نافرمانیوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا یہی مفہوم یہاں بھی ہے سیاق سباق سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر بات دلائل و شواہد کی ہو تب تو قرآن کی صداقت

واضح ہے لیکن جو لوگ خدا کے ہر عہد و پیمان کو توڑ ڈالنے کا فیصلہ کر چکے ہوں ان کے نزدیک ان دلائل و شواہد کی کیا اہمیت ہے۔

أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَّبَذَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُم ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۰۰)

یہ اسلوبِ کلام اظہارِ تعجب اور اظہارِ حسرت کا ہے۔ اوپر یہود کی عہد شکنیوں کا ذکر کرتے ہوئے بات یہاں تک پہنچی تھی کہ یہی عہد شکنی کی روش انھوں نے اس عہد کے معاملہ میں اختیار کی ہے جو آخری کتاب اور آخری رسول سے متعلق ان سے لیا گیا تھا۔ پھر باندازِ تعجب و اظہارِ حسرت فرمایا کہ کیا ان کی یہی روش ہمیشہ باقی رہے گی کہ جب کبھی یہ خدا سے کوئی عہد باندھیں گے تو وقت آنے پر یہ اس کو توڑ تاڑ کے رکھ دیں گے، صرف تھوڑے سے لوگ اس پر قائم رہ سکیں گے۔ پھر اصل حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دینے کے لیے فرمایا کہ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ یعنی ان کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو سرے سے ایمان ہی سے عاری ہیں، یہ تورات پر ایمان کا دعوے تو کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت ایمان کسی چیز پر بھی نہیں رکھتے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۱۰۱)

اوپر والی آیت میں یہود کی عہد شکنی کی جس روش کا ذکر ہوا ہے اس آیت میں اسی کی واقعاتی شہادت پیش کر دی گئی ہے کہ دیکھو جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول آیا جو ان پیشین گوئیوں کے بالکل مطابق ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہیں تو ان کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک دیا ہے گویا اس سے کبھی کے آشنا ہی نہیں ہیں۔

رسولؐ سے مراد: "رسول" سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لفظ اگرچہ نکرہ کی صورت میں استعمال ہوا ہے لیکن بعد کی صفات اور سیاق و سباق سے مراد متعین ہو جاتی ہے۔ نیز اس سے رسول کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

"کتاب اللہ" سے مراد تورات بھی ہو سکتی ہے اور قرآن بھی۔ تورات مراد لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان اہل کتاب نے اہل کتاب ہو کر اللہ کی کتاب کو نبی آخر الزمان کے معاملہ میں اس طرح نظر انداز کیا ہے گویا اس کو جانتے ہی نہیں۔ قرآن مجید مراد لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ایک کتاب کو شناخت کرنے کے سب سے زیادہ اگر اہل تھے تو یہ تھے اس لیے کہ یہ ایک آسمانی کتاب کے وارث اور امین ہونے کے مدعی بھی تھے اور اس طرح کی ایک کتاب کے نزول کی ان کو پہلے سے خبر بھی تھی لیکن ضد اور حسد کا بُرا ہو کہ اہل کتاب ہو کر وہ اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک رہے ہیں گویا اس کو جانتے ہی نہیں۔

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ ۚ وَمَا يُعَلِّمَانِ

مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ
وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا ھُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا
يَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا
بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۲)

اللہ کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک کر جس چیز کو انھوں نے سینہ سے لگایا یہ اس کا بیان ہے۔

قرآن مجید میں شیاطین سے متعدد جگہ جنوں اور انسانوں دونوں گروہوں کے مفسدین اور اشرار مراد لیے گئے ہیں، ہمارے نزدیک یہاں بھی دونوں ہی کے اشرار مراد ہیں۔

عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ سے مقصود حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی کا زمانہ ہے۔ عربی زبان کے عام قاعدہ کے مطابق یہاں ایک مضاف محذوف ہے۔ یعنی عَلٰى عَهْدِ مُلْكِ سُلَيْمٰنَ۔

کتاب الٰہی کی جگہ سحر سے دلچسپی

آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان ظالموں نے کتابِ الٰہی کو تو پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور سحر و شعبدہ اور علم نجوم وغیرہ جیسے علوم سفلیہ کو جو سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں جنوں اور ان کی پیروی کرنے والے انسانوں کے باہمی اشتراک سے رواج پائے، اس کی جگہ اختیار کر لیا۔

سحر و ساحری اور اس قسم کے سفلی اور شیطانی علوم کا چرچا کچھ نہ کچھ تو ہر دور میں رہا ہے لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے، ان کے روحانی علوم کے مقابلہ کے شوق میں، شیاطین جن و انس کے ایک طبقہ میں سحر و ساحری کے سیکھنے سکھانے کا رواج بہت بڑھ گیا تھا اور ان مفسدین نے اپنے ان علوم کو مرتب و مدون بھی کر ڈالا تھا۔ بعد کے زمانوں میں جب یہود دینی و اخلاقی انحطاط میں مبتلا ہوئے اور کتاب و شریعت کا ذوق ان کے اندر مردہ ہوا تو قدرتی طور پر اس طرح کی مزخرفات کے سیکھنے سکھانے میں ان کا انہماک بہت بڑھ گیا[1] اور جیسا کہ قاعدہ ہے ان چیزوں کو تقدس کا رنگ دینے کے لیے وہ ان کو براہ راست حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب بھی کرتے رہے ہوں گے اور لوگوں کو ان کا گرویدہ بنانے کے لیے یہ دعویٰ بھی کرتے رہے ہوں گے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام انھیں علوم کے ذریعہ سے وہ کارنامے انجام دیتے رہے ہیں جو ان کی طرف منسوب ہیں۔ آج بھی جو لوگ ان سفلی چیزوں کا ذوق رکھتے ہیں وہ اپنی ان خرافات کی تائید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا حوالہ بہت دیتے ہیں۔ بعض نقش تو خاص ان کے نام نامی ہی سے منسوب بھی ہیں۔ اس طرح کی ساری چیزیں معلوم ہوتا ہے یہود ہی کے ذریعہ سے ہمارے ہاں منتقل ہوئی ہیں اور یہ اسی

---

[1] سلاطین باب ۱۷: ۱۶، ۱۷ میں اسرائیل اور یہود دونوں کا حال اس طرح بیان ہوا ہے "اور انھوں نے خداوند اپنے خدا کے سب احکام ترک کر کے اپنے لیے ڈھالی ہوئی مورتیں یعنی دو بچھڑے بنا لیے اور یسیرت تیار کی اور آسمانی فوج کی پرستش کی اور بعل کو پوجا اور انھوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو آگ میں چلوایا اور فال گیری اور جادوگری سے کام لیا۔"

ذخیرہ ضلالت کے باقیات سیئات میں سے ہیں جن کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہدِ حکومت میں اشرار جن وانس نے مرتب کیا اور جس کو بعد میں یہود نے فروغ دیا۔

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ: یہ جملہ بطور استدراک یا بطور ایک جملہ معترضہ کے ہے۔ سلسلہ کلام کے بیچ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہود کے لگائے ہوئے الزام سے بری کرنے کے لیے فرمایا کہ سلیمان کا دامن ان علوم سفلیہ کی آلودگیوں سے بالکل پاک ہے، اس نے اس کفر کا ارتکاب کبھی نہیں کیا۔ البتہ یہ شیاطین جن وانس ہیں جنھوں نے ان چیزوں کو اختیار کیا اور پھر لوگوں کو ان مزخرفات کی تعلیم دی۔

یہاں اسلوب کلام سے متعلق دو باتیں ذہن میں رکھنے کی ہیں، ایک تو اس جملہ معترضہ کی بلاغت کہ اس کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ متکلم کو ان علومِ سفلیہ کی نسبت حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف اتنی ناگوار ہے کہ اس کی تردید کے معاملہ میں اس نے اتنا توقف بھی نہیں کیا کہ بات پوری ہولے۔ بلکہ سلسلۂ کلام کو روک کر فوراً اس کی تردید ضروری سمجھی۔ دوسری یہ کہ یہ تردید ایسے اسلوب سے شروع کی ہے جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ سحر کا کفر ہونا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ: اوپر والا جملہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بطورِ استدراک یا جملہ معترضہ کے ہے، اس وجہ سے اس جملہ کا عطف لازماً مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو انھوں نے ان علوم سفلیہ کی پیروی کی جو سلیمانؑ کے عہد حکومت میں شیاطین کے ذریعہ سے رواج پائے۔ دوسرے اس چیز کی پیروی کی جو بابل کی اسیری کے زمانہ میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اتاری گئی۔

ہاروت و ماروت پر کیا چیز اتاری گئی تھی؟

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان فرشتوں پر کیا چیز اتاری گئی تھی؟ اس سوال کا جواب عام طور پر مفسرین نے یہ دیا ہے کہ یہ جادو کا علم ہے۔ لیکن یہ جواب کئی پہلوؤں سے کھٹکتا ہے۔

ایک تو یہ کہ اس کا عطف، جیسا کہ ہم نے عرض کیا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ پر ہے جس سے مراد خود قرآن کی تشریح کے مطابق جادو ہے۔ اب اگر اس سے بھی مراد جادو ہی ہے تو اس کے علیحدہ ذکر کرنے کا کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ عربی زبان میں جب اس طرح معطوف اور معطوف علیہ آئیں تو عام اصول کے مطابق ان میں ایک حد تک مغایرت ہونی چاہیے۔ بغیر کسی خاص قرینہ کے اہل زبان اس عام ضابطہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے یہاں دونوں کے ایک ہی چیز ہونے کا نہ صرف یہ کہ کوئی قرینہ موجود نہیں ہے بلکہ قرائن اس کے خلاف ہیں۔

دوسرا یہ کہ اس کے لیے اُنْزِلَ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا واضح مفہوم یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ علم اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا تھا۔ اس لفظ میں عنایت اور افادیت کی جو شان ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے سحر جیسی شیطانی، ناپاک اور سراسر باطل بلکہ کفریہ چیز کے لیے اس کا استعمال ذوق پر گراں گزرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے

کہ قرآن مجید میں یہ لفظ چوپایوں اور لوہے وغیرہ جیسی چیزوں کے پیدا کیے جانے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے لیکن محض اتنی بات جادو کے لیے اس لفظ کی موزونیت ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ رہا لوہا اور چوپائے وغیرہ تمدنی اور معاشی نقطۂ نظر سے ہمارے لیے نہایت خیر و برکت کی چیزیں ہیں اس وجہ سے ان کے لیے تو اس کا استعمال سمجھ میں آتا ہے لیکن ہمارے علم میں قرآن میں کہیں بھی یہ لفظ کسی ایسی چیز کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے جو جادو کی طرح کفریہ اور شیطانی ہو۔ کفار پر عذابِ الٰہی نازل کرنے کے لیے بھی اس کا استعمال ہوا ہے لیکن کفار پر جو عذاب آتا ہے وہ اہلِ ایمان کے لیے رحمت ہوتا ہے اور اس سے خدا کی زمین کی تطہیر ہوتی ہے۔

ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ خیر ہو یا شر دنیا میں جو چیز بھی پائی جاتی ہے خدا کی مشیت ہی کے تحت پائی جاتی ہے۔ لیکن خدا کی مشیت کے تحت کسی باطل کو مہلت ملنا اور چیز ہے اور سحر جیسے شیطانی علم کا دو فرشتوں پر اتارا جانا بالکل دوسری چیز ہے۔

تیسرا یہ کہ یہ علم، جیسا کہ الفاظ قرآن سے واضح ہے، دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا۔ اور یہ فرشتے لوگوں کو اس علم کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ فرشتوں کے متعلق یہ بات مسلم ہے کہ شرک و کفر کی ہر آلائش سے ان کے دامن پاک ہیں۔ ان کے مزاج اللہ تعالیٰ نے ایسے بنائے ہیں کہ اس طرح کی کسی گندگی کی ان کو کبھی چھوت بھی نہیں لگتی۔ فرشتے ہمیشہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و عدل کے قیام اور خیر و فلاح کی دعوت و تعلیم کا ذریعہ بنے ہیں اور یہی چیزیں ان کے شایانِ شان ہیں۔ اس وجہ سے جادو کے علم کا ان پر اترنا اور ان کا اس کی اشاعت کرنا (اگرچہ کتنی ہی احتیاط کے ساتھ کیوں نہ ہو) عقل سے بعید بات ہے۔ اگر فرشتے اس طرح کے کام کرنے لگ جائیں تو پھر شیاطین کے لیے کیا کام باقی رہ جائے گا۔

چوتھا یہ کہ فرشتوں نے اپنے اس علم کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان سے بھی کچھ ایسا ہی مترشح ہوتا ہے کہ ان کا علم شیاطین کے سحر سے کچھ مختلف خصوصیات رکھتا تھا۔ شیاطین کا علم تو جیسا کہ قرآن مجید نے خود وضاحت کر دی ہے، یکسر کفر تھا لیکن فرشتوں نے اپنے علم کے لیے فتنہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ فتنہ کے معنی امتحان اور آزمائش کے ہیں۔ قرآن میں اس سے عموماً وہ چیزیں مراد لی گئی ہیں جو پیدا تو کی گئی ہیں اصلاً انسان کی نفع و بہبود کے لیے لیکن انسان اپنے استعمال کی غلطی سے یا ان کی حد سے بڑھی ہوئی محبت میں گرفتار ہو کر ان کو اپنے لیے فتنہ بنا لیتا ہے۔ جس کے سبب سے وہ مفید ہونے کے بجائے مضر بلکہ مہلک بن کر رہ جاتی ہیں۔ مثلاً مال اولاد کو قرآن مجید میں فتنہ کہا گیا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں بجائے خود شر نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، اگر انسان ان کے صحیح مقام کو پہچانے تو یہ اس کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں نفع پہنچانے والی بن سکتی ہیں لیکن جب انسان ان کی بے جا محبت میں گرفتار ہو کر ان کے پیچھے خدا اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے تو یہی چیزیں اس کے لیے وبال اور عذاب بن کے رہ جاتی ہیں کیونکہ بعض حالات میں آدمی کو ان کی محبت کفر تک پہنچا کے چھوڑتی ہے۔

یہ سارے پہلو اس بات کے خلاف ہیں کہ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ سے جادو مراد لیا جائے لیکن اگر جادو نہ مراد لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ وہ کون سا علم ہے جس کا فرشتوں پر اترنا موزوں بھی ہو اور جس کے انہماک یا غلط استعمال سے وہ خرابیاں بھی پیدا ہو سکتی ہوں جو یہاں اس علم میں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کا انہماک کتاب اللہ سے برگشتہ کرتا ہو، اس کی نوعیت ایک فتنہ کی ہو جس کے غلط استعمال سے آدمی کفر میں پڑ سکتا ہو، اس کو بدطینت لوگ میاں اور بیوی کے تعلقات کو خراب کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہوں۔

اشیاء اور کلمات کے روحانی خواص کا علم

ہمارے نزدیک اس سے مراد اشیاء اور کلمات کے روحانی خواص و تاثیرات کا وہ علم ہے جس کا رواج یہود کے صوفیوں اور پیروں میں ہوا اور جس کو انھوں نے گنڈوں، تعویذوں اور مختلف قسم کے عملیات کی شکل میں مختلف اغراض کے لیے استعمال کیا۔ مثلاً بعض امراض یا تکالیف کے ازالہ کے لیے یا نظر بد اور جادو وغیرہ کے برے اثرات دور کرنے کے لیے یا شعبدہ بازوں وغیرہ کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یا محبت اور نفرت کے اثرات ڈالنے کے لیے۔

یہ علم اس اعتبار سے جادو اور نجوم وغیرہ کے علم سے بالکل مختلف تھا کہ اس میں نہ تو شرک کی کوئی ملاوٹ تھی اور نہ اس میں شیطان اور جنات کو کوئی دخل تھا لیکن اپنے اثرات و نتائج کے پیدا کرنے میں یہ جادو ہی کی طرح زود اثر تھا۔ ممکن ہے بنی اسرائیل کو یہ علم بابل کے زمانہ اسیری میں دو فرشتوں کے ذریعہ سے اس لیے دیا گیا ہو کہ اس کے ذریعہ سے بابل کی سحر و ساحری کا مقابلہ کر سکیں اور اپنی قوم کے کم علموں اور سادہ لوحوں کو جادوگروں کے رعب سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس بات کی طرف ہمارا ذہن دو وجہ سے جاتا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل میں سحر و ساحری اور نجوم کا بڑا زور تھا[1] دوسری یہ کہ یہ بات سنت اللہ کے موافق معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی جگہ ایک غلط علم کا رعب اور زور رہو جس سے مفسد لوگ فائدہ اٹھا رہے ہوں تو وہاں اللہ تعالیٰ اس کے مقابلہ کے لیے اہل ایمان کو کوئی ایسا علم بھی عطا فرمائے جو جائز اور نافع ہو۔

هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ، قرآن سے واضح ہے کہ خدا کے دو فرشتے تھے اس وجہ سے تفسیر کی کتابوں میں ان کے متعلق جو فضول سا قصہ منقول ہے، وہ ہمارے نزدیک بالکل ناقابلِ التفات ہے۔ وہ ملکوتی صفات ہی کے ساتھ دنیا میں بھیجے گئے تھے اور ملکوتی صفات کے ساتھ ہی یہاں رہے۔ ان کا علم بھی، جیسا کہ عرض کیا گیا، ایک جائز اور مفید علم تھا لیکن یہود نے اپنے اخلاق کی پستی اور مذاق کی خرابی کی وجہ سے اس کو بری نیت سے سیکھا اور برے مقاصد

---

[1] یسعیاہ نبی بابل سے خطاب کر کے فرماتے ہیں، "تیرے جادو کی کثرت اور تیرے سحر کی افراط کے باوجود یہ مصیبتیں پورے طور سے تجھ پر آ پڑیں گی...... تجھ پر مصیبت آ پڑے گی جس کا منتر تو نہیں جانتی........ اب اپنا جادو اور اپنا سحر جس کی تو نے بچپن ہی سے مشق کر رکھی ہے استعمال کر...... اب افلاک پیما اور منجم اور وہ جو ماہ بماہ آئندہ حالات دریافت کرتے ہیں اٹھیں۔ اور جو کچھ تجھ پر آنے والا ہے اس سے تجھ کو بچائیں۔"

(یسعیاہ ۴۷ : ۹-۱۳)

ہی میں استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علم بھی ان کے ہاں سحر و ساحری کا ایک ضمیمہ بن کے رہ گیا اور اس کی دلچسپیوں میں وہ ایسا کھوئے گئے کہ کتاب اللہ سے اول تو انھیں کوئی تعلق ہی باقی نہیں رہ گیا اور اگر رہا بھی تو محض عملیات اور تعویذوں کی حد تک کہ فلاں آیت کے پھونکنے سے یہ فائدہ ہوا کرتا ہے اور فلاں آیت کے تعویذ سے یہ اثر پڑتا ہے۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ کیا اس طرح کا علم دنیا میں اپنا کوئی وجود بھی رکھتا ہے تو اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ اس کا انکار ایک بالکل بدیہی بات کا انکار ہے۔ اگرچہ میں خود اس طرح کے کسی علم کا کبھی عامل نہیں بنا لیکن متعدد بار میرے اپنے تجربہ میں ایسی باتیں آئی ہیں جن کے بعد میرے لیے اس چیز کا انکار ممکن نہیں رہا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ اسی علم کے باقیات ہیں جن کو ہمارے صوفیوں اور پیروں کے ایک طبقہ نے اپنایا اور اس سے انھوں نے لوگوں کو فائدہ بھی پہنچایا بلکہ واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات میں اس کی مدد سے انھوں نے جوگیوں اور جوتشیوں وغیرہ کے مقابل میں اسلام اور مسلمانوں کی برتری بھی ثابت کی لیکن اخلاقی زوال کے بعد جس طرح یہود کے ہاں یہ علم، علوم سفلیہ کا ایک ضمیمہ اور دوکانداری کا ایک ذریعہ بن کے رہ گیا اسی طرح ہمارے یہاں بھی یہ صرف پیری مریدی کی دکان چلانے کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔ اور حق سے زیادہ اس میں باطل کے اجزا شامل ہو گئے جس کے سبب سے لوگوں پر اس کے اثرات بھی وہی پڑے جو قرآن نے بیان فرمائے۔

فرشتوں کی طرف سے تعلیم سے پہلے تنبیہ

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ، جس طرح وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ والا ٹکڑا اَلطور جملہ معترضہ کے حضرت سلیمان علیہ السلام کی براءت کے لیے وارد ہوا ہے اسی طرح یہ ٹکڑا بطور استدراک ان فرشتوں کی براءت کے لیے وارد ہوا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ یہ اپنے اس علم کا اگر کسی پر انکشاف کرتے تو ساتھ ہی اس کو یہ تنبیہ بھی ضرور کر دیتے کہ دیکھو، ہمارا یہ علم ایک فتنہ ہے تو تم اس کو برے مقاصد میں استعمال کر کے کفر میں نہ پڑ جانا بلکہ اس کو صرف اچھے مقاصد ہی میں استعمال کرنا۔

فتنہ کا مفہوم

فتنہ کے مفہوم کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تمام دنیوی نعمتیں، بیوی بچے، مال و جاہ، اقتدار اور سلطنت وغیرہ دو دھاری تلوار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسان اگر ان سے صحیح کام لے تو یہ اس کے لیے نعمت ہیں اور اگر ان کی وجہ سے فتنہ میں پڑ جائے تو یہ اس کے لیے عذاب بن جایا کرتی ہیں۔ اسی طرح یہ علم بھی مضرت اور منفعت کے دونوں پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کو لوگوں کی خدمت میں استعمال کر کے اس سے ثواب بھی کمایا جا سکتا ہے اور اس کو انتشار اور تفریق کا ذریعہ بنا کر اس سے گمراہی اور ہلاکت کا سامان بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ انسان اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں کو زیادہ تر غلط ہی استعمال کرتا ہے اس وجہ سے فرشتوں نے ایک خیر خواہ معلم کی طرح اپنے سے ہر ربط پیدا کرنے والے کو پہلے سے آگاہ کر دیا کہ ہمارا علم ایک شمشیر دو دم کی حیثیت رکھتا ہے، کوئی اس کو سیکھ کر اس کو برے مقاصد میں نہ استعمال کرے ورنہ اس طرح

وہ کفر و شرک میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

یہاں فرشتوں کے تعلیم دینے کے معاملہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے جس سے بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگوں کو انسانی روپ میں تعلیم دیتے تھے۔ اگر یہ بات ہو تو اس میں کوئی خاص اشکال نہیں ہے۔ متعدد ایسے واقعات کا خود قرآن سے پتہ چلتا ہے جب فرشتے انسانوں کے اندر خود انسانوں کی شکل و صورت میں نمایاں ہوئے ہیں لیکن امکان اس بات کا بھی ہے کہ عملیات کے دلدادہ لوگ کسی خاص قسم کی ریاضت اور چلہ کشی کے ذریعہ سے ان سے روحانی قسم کا ربط پیدا کر کے یہ تعلیم حاصل کرتے رہے ہوں۔ اگر مطلب یہ لیا جائے تو قرآن کے الفاظ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے خلاف جاتی ہو۔

یہود کی پست مذاقی

وَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ، یعنی فرشتوں کی مذکورہ بالا تنبیہ کے باوجود لوگ خاص طور پر ان سے ان عملیات کی تعلیم حاصل کرتے تھے جن کے ذریعے سے شوہر اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال سکیں۔ اس ٹکڑے سے یہود کے فساد اخلاق اور ان کی پست ہمتی اور دنائت پر روشنی پڑتی ہے کہ ان کی سب سے زیادہ رغبت اس عمل سے تھی جس کو کسی میاں بیوی کے رشتۂ محبت کو قطع کرنے کے لیے بطور مقراض استعمال کر سکیں، حالانکہ میاں بیوی کے رشتہ کے استحکام پر پورے نظام تمدن کے استحکام کی بنیاد ہے۔ اگر کوئی مذہبی جماعت اپنے علم کو اس بنیاد کے اکھاڑنے میں لگا دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے شیطان کے کرنے کا جو کام تھا اس کو خود سنبھال لیا۔ جو علم اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے اس سے معاشرے کے صرف غنڈوں اور بدمعاشوں ہی کو نفع پہنچ سکتا ہے اور محبت و نفرت پیدا کرنے کے علم کا اس سے زیادہ مہلک استعمال کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ اس سے صحیح کام بھی لیا جا سکتا ہے جس سے لوگوں کو نفع پہنچ سکتا ہے۔

وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ، یہ ٹکڑا بھی بطور استدراک کے ہے یعنی ان عملیات کے شائقین یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں بجائے خود نافع اور ضار ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ اعمال شیطانیہ ہوں یا اعمال روحانیہ، ان سے اگر کسی کو نفع یا ضرر پہنچتا ہے یا پہنچایا جا سکتا ہے تو صرف اللہ کے اذن، اور اس کی مشیت کے تحت۔ یہ چیزیں بذاتِ خود مؤثر نہیں ہیں۔

نفع و ضرر خدا کے اختیار میں ہے

اس استدراک سے اس توحید و اخلاص کو اجاگر کیا گیا ہے جو قرآن کی تمام تعلیمات کی بنیاد ہے۔ ایک موحد کو اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ اللہ کی کتاب کے ہوتے ہوئے اول تو وہ اس طرح کی چیزوں کی رغبت ہی نہ کرے ثانیاً اگر ان میں سے کوئی چیز اس کے علم میں آئے تو اس کو مؤثر بالذات نہ مانے۔ نیز اگر اس طرح کی کسی چیز سے اس کو ضرر کا اندیشہ لاحق ہو تو صرف اللہ واحد ہی کی طرف مدد کے لیے رجوع کرے، ٹونوں، ٹوٹکوں اور عاملوں اور سیانوں کے چکر میں نہ پھنسے۔

وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ، یہ ٹکڑا سیکھنے والوں کی اخلاقی اور ذہنی پستی کو ظاہر کر رہا ہے۔ جو علم وہ سیکھتے تھے وہ بجائے خود تو جیسا کہ ظاہر ہوا اپنے اندر نفع و نقصان دونوں کے پہلو رکھتا تھا لیکن سیکھنے والوں

کی ذہنیت وہی ہوتی تھی جو اوپر مذکور ہوئی کہ اس کے ذریعے سے کسی جوڑے کے درمیان تفریق کرائیں، جن میں باہم الفت ہے ان کے درمیان نفرت کے بیج بوئیں، جن میں وصل ہے ان میں فصل پیدا کریں۔ اپنی اس فسادنیت کی وجہ سے انھوں نے اس کے نفع کے پہلو کو بالکل ہی ختم کر دیا تھا۔

تورات میں علوم سفلیہ کی ممانعت

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ، یعنی یہود کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جو لوگ اس طرح کے فتنوں میں پڑیں گے آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ تورات میں نہایت واضح الفاظ میں انھیں ان چیزوں سے روک دیا گیا تھا۔ استثناء باب ۱۸۔ آیات ۹ تا ۱۲ ملاحظہ ہوں۔

"جب تو اس ملک میں جو خداوند تیرا خدا تجھ کو دیتا ہے پہنچ جائے تو وہاں کی قوموں کی طرح مکروہ کام کرنے نہ سیکھنا۔ تجھ میں ہرگز کوئی ایسا نہ ہو جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو آگ میں چلوائے یا فال گیر یا شگون نکالنے والا یا افسوں گر یا جادوگر یا منتری یا جنات کا آشنا یا رمال یا ساحر ہو کیونکہ وہ سب جو ایسے کام کرتے ہیں خدا کے نزدیک مکروہ ہیں اور انھی مکروہات کے سبب سے خداوند تیرا خدا تیرے سامنے سے ان کو نکالنے پر ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان واضح تنبیہات کے باوجود یہود نے ان ساری چیزوں کو اختیار کیا اور ان کا ذوق ان کے اندر اس قدر بڑھ گیا کہ طالوت کو اپنے زمانہ میں پوری قوم کی تطہیر کرنی پڑی۔ چنانچہ سموئیل کے باب ۲۸-۳ میں ہے۔

"اور ساؤل نے جنات کے آشناؤں اور افسوں گروں کو ملک سے خارج کر دیا تھا۔"

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۳)

اس آیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے آیت ۱۰۱ کو بھی جو اوپر گزری ہے نگاہ میں رکھیے۔ وہاں فرمایا تھا کہ انھوں نے خدا کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا اور سحر و نجوم اور گنڈے تعویذ وغیرہ کے فتنوں میں پڑے رہ گئے۔ اب یہاں فرمایا کہ اگر وہ اللہ کے آخری رسول اور اس کی آخری کتاب پر ایمان لاتے اور ان فتنوں سے بچتے جن میں وہ مبتلا ہیں تو اس کا اجر بہت بڑا تھا۔ لیکن یہ اپنی رذالت اور پست ہمتی کی وجہ سے علوم سفلیہ کی دوکانداری ہی کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ انھیں کچھ اندازہ نہیں کہ اللہ کی کتاب پر ایمان اور اس کے بخشے ہوئے علم کا اجر و ثواب خدا کے ہاں کیا ہے۔ کاش وہ اس بات کو سمجھتے۔

۴۳۔ مجموعۂ آیات ۹۷-۱۰۳ کی چند اہم باتیں

اس مجموعۂ آیات کے اندر بھی چند باتیں ایسی ہیں جو مزید وضاحت کی محتاج ہیں تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔

ایک یہ کہ بسا اوقات ایک گمراہی یا بدعقیدگی بظاہر معمولی نظر آتی ہے لیکن وہ اپنے اندر اتنی گمراہیاں

چھوٹی گمراہی بڑی گمراہیوں کے دروازے کھول دیتی ہے

اور بدعقیدگیاں چھپائے ہوئے ہوتی ہے کہ اس سے آدمی کے سامنے دین و ایمان کی جڑیں اکھڑ کے رہ جاتی ہیں۔ یہود قرآن کی مخالفت کے جوش میں حضرت جبریل امین کے بھی مخالف بن گئے اور اس چیز کو انھوں نے ایک معمولی بات سمجھا۔ قرآن نے جب اس کے مضمرات واضح کیے تو معلوم ہوا کہ جبریلؑ کی مخالفت تنہا جبریلؑ ہی کی مخالفت نہیں ہے بلکہ یہ خود اللہ تعالیٰ کی بھی مخالفت ہے، اس کے تمام فرشتوں کی مخالفت ہے اور اس کے تمام رسولوں کی مخالفت ہے۔ پھر ساتھ ہی اس مخالفت کے ایک اور لازمی نتیجہ کو بھی واضح فرمایا جو مذکورہ نتائج سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ ایسے کٹر کافر ہیں کہ اللہ، ملائکہ اور انبیاء سب کے دشمن ہیں۔ اللہ ان کا دوست کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس وجہ سے لازماً ایسے کافروں کا اللہ بھی دشمن ہے۔ غور کیجیے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچی۔

اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں

دوسری بات جو مذکورہ بالا اصول ہی پر مبنی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ اور اس کے نبیوں اور رسولوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب سب کی تکذیب اور کسی ایک کی بھی دشمنی سب کی دشمنی ہے۔ اس وجہ سے مسلمانوں کا عقیدہ یہ بتایا گیا ہے کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲۸۵ - بقرہ) (اس کے رسولوں کے درمیان ہم کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے) مزید غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسی اصول پر وہ حدیث بھی مبنی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ من عادی لی ولیا فقد بارزنی بالحرب (جس نے میرے کسی دوست کے ساتھ دشمنی کی تو اس نے خود مجھے اعلانِ جنگ دیا) اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے جاننے اور ماننے والے ہیں وہ درحقیقت اسی ملت اور اسی حزب سے تعلق رکھتے ہیں جس میں انبیاء و رسل اور ملائکہ شامل ہیں۔ جس طرح ان میں سے کسی کی دشمنی بالواسطہ اللہ تعالیٰ کے خلاف جنگ ہے اسی طرح صلحا اور ابرار میں سے بھی کسی کی دشمنی بالواسطہ اللہ تعالیٰ کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

کتاب اللہ سے صحیح ربط کے لیے ضروری شرط

تیسری یہ کہ جس طرح سحر، شعبدہ، نجوم، حاضرات، فال اور کہانت وغیرہ کے قسم کی چیزیں خدا اور اس کی شریعت سے انسان کو برگشتہ کرنے والی ہیں، اسی طرح اشیا اور کلمات کے روحانی خواص یعنی گنڈے تعویذ اور جھاڑ پھونک کا علم بھی انسان کے لیے ایک فتنہ اور کتاب و شریعت سے منحرف کرنے والا ہے۔ کتاب اللہ کے ساتھ مضبوط اور مستحکم ربط پیدا کرنے کے لیے صحیح راہ یہی ہے کہ آدمی نہ صرف سحر و ساحری سے دور رہے بلکہ اس دوسری قسم کی چیزوں سے بھی حتی الوسع احتراز ہی کرے۔ انسان جب عملیات وغیرہ کے چکر میں پھنس جاتا ہے تو اس فتنہ میں لازماً گرفتار ہو جاتا ہے جس سے ہاروت و ماروت نے متنبہ کیا تھا اور پھر ان تمام مفاسد کا ظہور میں آنا لازمی ہے جو یہود کے ہاتھوں ظہور میں آئے اور جن کے سبب سے وہ کتاب اللہ کی روشنی سے محروم ہو گئے۔

۴۴۔ آگے کا مضمون —— آیات ۱۰۴-۱۲۱

مسلمانوں کو گمراہ کرنے کیلیے یہود کی شرارتیں

آگے مسلمانوں کو یہود کی بعض ان شرارتوں سے آگاہ کیا گیا جو وہ اس غرض سے کر رہے تھے کہ بنی اسماعیل کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی سعادت سے محروم کریں۔ اس ضمن میں یہود کے بعض ایسے اعتراضات نقل کر کے ان کے جواب بھی دیے ہیں جو وہ مسلمانوں کے دلوں میں شک و شبہ پیدا کرنے کے لیے اٹھاتے تھے اور وہ ہدایات بھی دی ہیں جن پر عمل کر کے مسلمان ان فتنوں کے مقابل میں راہِ حق پر استوار رہ سکتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۰۴ تا ۱۲۱

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا لَا تَقُولُوا رَٰعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ
وَلِلْكَٰفِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾ مَّا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ
أَهْلِ الْكِتَٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَن يُنَزَّلَ عَلَيْكُم مِّنْ خَيْرٍ مِّن
رَّبِّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيمِ ﴿١٠٥﴾ مَا نَنسَخْ مِنْ ءَايَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ
مِثْلِهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٦﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ
أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِن
وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١٠٧﴾ أَمْ تُرِيدُونَ أَن تَسْـَٔلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ
مُوسَىٰ مِن قَبْلُ ۗ وَمَن يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَٰنِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ
السَّبِيلِ ﴿١٠٨﴾ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ
إِيمَٰنِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ
لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِۦٓ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا الزَّكَوٰةَ ۗ وَمَا

تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا
تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٠﴾ وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ
هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ
صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ
أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾ وَقَالَتِ ع ١٣
الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ
عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ
مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا
فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَن
يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا ۚ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ
أَن يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ
فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١٤﴾ وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا
تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿١١٥﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ
اللَّهُ وَلَدًا ۗ سُبْحَانَهُ ۖ بَل لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ كُلٌّ
لَّهُ قَانِتُونَ ﴿١١٦﴾ بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا
فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿١١٧﴾ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا
يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم
مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۘ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۗ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿١١٨﴾

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ
الْجَحِيمِ ﴿١١٩﴾ وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ
مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ
بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا
نَصِيرٍ ﴿١٢٠﴾ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولَٰئِكَ وقف منزل
يُؤْمِنُونَ بِهِ ۗ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿١٢١﴾ ع ۱۴

ترجمہ آیات ۱۰۴-۱۲۱

اے ایمان والو تم راعنا نہ کہا کرو "انظرنا" کہا کرو اور توجہ سے سنا کرو۔ کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا، اہل کتاب ہوں یا مشرکین، نہیں چاہتے کہ تمھارے اوپر تمھارے رب کی طرف سے کوئی رحمت نازل ہو، اور اللہ اپنی رحمت کے لیے خاص کرتا ہے جن کو چاہتا ہے۔ اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۱۰۴-۱۰۵

جو کوئی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو نظر انداز کراتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے مانند دوسری لاتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار۔ ۱۰۶-۱۰۷

کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اس طرح کے سوال کرو جس طرح کے سوال اس سے پہلے موسیٰ سے کیے گئے اور جو لوگ ایمان کو کفر سے بدل لیں گے وہ شاہراہ سے بھٹک گئے ۱۰۸

بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ وہ تمھارے ایمان کے بعد پھر تمھیں کفر کی حالت میں پلٹا دیں، محض اپنے حسد کی وجہ سے، حق کے اچھی طرح واضح ہو جانے کے باوجود تو درگزر کرو اور

نظرانداز کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو نیکی بھی تم اپنے لیے کرو گے اسے اللہ کے پاس پاؤ گے۔ جو کچھ تم کر رہے ہو خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۰۹-۱۱۰

اور کہتے ہیں کہ جنت میں نہیں داخل ہو سکتے مگر وہ جو یہودی ہیں یا نصرانی۔ یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں۔ کہو اس بات پر اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ ہاں بلاشبہ جس نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور وہ ٹھیک طرح سے عمل کرنے والا ہے تو اس کے لیے اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے۔ نہ ان کو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کی کوئی بنیاد نہیں اور نصاریٰ نے کہا یہود کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور یہ دونوں کتاب کی تلاوت کرتے ہیں۔ اسی طرح کی بات ان لوگوں نے بھی کہی جن کو علم نہیں ہے۔ تو اللہ قیامت کے دن اس معاملہ کا فیصلہ کرے گا جس میں یہ جھگڑ رہے ہیں۔ ۱۱۱-۱۱۳

اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مساجد کو اس بات سے محروم کریں کہ ان میں اس کا ذکر کیا جائے اور ان کی ویرانی کے درپے ہوں۔ ان کے لیے زیبا نہ تھا کہ ان میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے اور مشرق ہو یا مغرب دونوں اللہ ہی کے ہیں تو جدھر بھی رخ کرو اسی طرف اللہ ہے، اللہ بڑی گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے۔ ۱۱۴-۱۱۵

اور کہتے ہیں کہ خدا اولاد رکھتا ہے۔ اس کی شان ان باتوں سے ارفع ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس کے لیے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے
۱۱۶-۱۱۷

اور جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا۔ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں انھوں نے بھی انھی کی طرح کی بات کہی۔ ان سب کے دل ایک ہی جیسے ہو گئے۔ جو لوگ یقین کرنے والے ہیں ان کے لیے ہم نشانیاں اچھی طرح واضح کر چکے ہیں۔ ہم نے تمھیں حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے اور تم سے دوزخ میں جانے والوں کے بارے میں کوئی پرسش نہیں ہوگی۔ ۱۱۸-۱۱۹

نہ یہود تم سے راضی ہونے والے ہیں اور نہ نصاریٰ تا وقتیکہ تم انھی کی ملت کے پیرو نہ بن جاؤ۔ ان سے کہو کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور اگر تم اس علم حقیقی کے بعد جو تمھارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشوں پر چلے تو اللہ کے مقابل میں نہ تمھارا کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ ۱۲۰

جن لوگوں کو ہم نے کتاب بخشی اور وہ اس کے پڑھنے کا حق ادا کرتے ہیں وہی لوگ اس (قرآن) پر ایمان لائیں گے اور جو اس کا انکار کریں گے تو وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔ ۱۲۱

۴۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۰۴)

رَاعِنَا کا مفہوم — رَاعِنَا مراعات سے امر کا صیغہ ہے۔ اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو تو متکلم کو پھر متوجہ کرنے کے لیے عربی میں رَاعِنَا کا لفظ ہے یعنی ذرا ہمارا لحاظ فرمایئے، پھر ارشاد ہو۔ جس طرح انگریزی میں (I BEG YOUR PORDON) ہے عربی میں اسی موقع و محل کے لیے اُنْظُرْنَا کا لفظ بھی ہے جو نظر سے امر کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی دیکھنے، مہلت دینے، انتظار کرنے اور توقف کرنے کے ہیں۔

آنحضرت صلعم کی مجلس میں یہود کی شرارت — اوپر گزر چکا ہے کہ یہ یہود کی ان شرارتوں اور اعتراضات سے متنبہ کیا جا رہا ہے جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے خلاف اس لیے کرتے تھے کہ اپنے دلوں کی بھڑاس نکالیں اور ہو سکے تو اس طرح مسلمانوں

کو اسلام کی نعمت عظمیٰ سے محروم کریں۔ سیاق و سباق پر نگاہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض یہودی محض منافقانہ اغراض کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں شریک ہوتے اور اپنے شوق استفادہ و ذوق تعلم کے اظہار کے طور پر رَاعِنَا کا لفظ بار بار دہراتے تاکہ حاضرین مجلس پر یہ اثر ڈالیں کہ یہ علم کے بڑے طالب اور قدردان لوگ ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اس لفظ کو صرف اس لیے استعمال کرتے تھے کہ ذرا سا زبان کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے سے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا پہلو پیدا کیا جا سکتا تھا۔ رَاعِنَا کو ذرا نیچے کی طرف دبا کر ادا کیجیے تو بڑی آسانی سے رَاعِیْنَا بن جائے گا جس کے معنی ہمارے چرواہے کے ہیں۔ یہود کی اس شرارت کا ذکر قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی ہے۔ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ (یہود میں وہ لوگ بھی ہیں جو کلام کو اس کے موقع و محل سے ہٹاتے ہیں اور اپنی زبانوں کو لچکا کر کہتے ہیں سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا دین پر طنز کرنے کے لیے) اس آیت سے واضح ہے کہ یہ شرارت رَاعِنَا کے تلفظ میں زبان لچکا کر پیدا کی جاتی تھی۔ اسی طرح عَصَيْنَا کو اس طرح ادا کرتے کہ سننے والے کو اَطَعْنَا کا دھوکا ہو اور اسمع کہتے ہوئے ذرا زبان دبا کر اس کے ساتھ چپکے سے غَيْرَ مُسْمَعٍ بھی لگا دیتے۔ یعنی ذرا ان کی ناشنیدنی سنو۔ مقصود ان شرارتوں سے جیسا کہ قرآن نے واضح فرمایا، اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز کرنا اور پھبتی چست کرنا ہوتا۔

الفاظ سے متعلق ایک نفسیاتی حقیقت

چونکہ یہود یہ طنز، جیسا کہ اوپر گزرا، اپنے دل کی بھڑاس نکالنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے اور آپ کو مسلمانوں کی نگاہوں سے گرانے کے لیے کرتے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس لفظ ہی کو مسلمانوں کے مجلسی الفاظ سے یک قلم خارج کر دیا اور اس کی جگہ زبان کا دوسرا معروف لفظ استعمال کرنے کا حکم دیا جو طنز کے شائبہ سے پاک تھا۔ الفاظ کے متعلق یہ نفسیاتی حقیقت ملحوظ رہنی چاہیے کہ اگر ان کے اندر کوئی روح فساد موجود ہو یا سوء استعمال سے پیدا کر دی گئی ہو تو پھر سلامتی ان سے دور رہنے ہی میں ہے ورنہ ان کا زہر غیر شعوری طور پر ان کے بولنے والوں اور سننے والوں کے اندر بھی سرایت کر کے رہتا ہے مسلمانوں کو اس چھوت سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے رَاعِنَا کے استعمال کی ممانعت فرما دی۔

پھر اس کا ایک اور فائدہ بھی ہوا وہ یہ کہ "رَاعِنَا" کی ممانعت اور "انظرنا" کی اجازت نے مخلصین اور منافقین کے درمیان ایک نشانِ امتیاز بھی پیدا کر دیا اور صریح ممانعت کے بعد ظاہر ہے کہ مجلس نبوی میں اس لفظ کے استعمال کی جسارت وہی لوگ کر سکتے تھے جن کے دلوں کے اندر حسد اور کینہ توزی کا اتنا بخار بھرا ہوا ہو کہ وہ کسی طرح بھی اس کو دبا سکنے پر قادر نہ ہوں۔

اس آیت میں "اسمعوا" کا لفظ اپنے کامل اور حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی غور سے پیغمبر کی باتیں سنو اور ان کو سمجھو تاکہ تمھیں بار بار پیغمبر کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اس میں ایک لطیف اشارہ

اس بات کی طرف بھی ہے کہ یہ یہود نہ تو سننے کے لیے آتے ہیں اور نہ سمجھنے کے لیے بلکہ صرف اس لیے آتے ہیں کہ کوئی موقع رَاعِنَا کے استعمال کا پیدا کر کے اپنے دل کا بخار نکالیں۔

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (۱۰۵)

معاندین کے باطن پر روشنی

یہ آیت معاندین اسلام کے باطن پر عکس ڈال رہی ہے اور خطاب مسلمانوں سے ہے کہ مسئلہ صرف ایک لفظ کے استعمال اور عدم استعمال کا نہیں ہے بلکہ یہ یہودی اور یہ مشرکین دونوں اس غصہ اور حسد میں جل رہے ہیں کہ تم خدا کی طرف سے اس خیر عظیم کے سزاوار کس طرح قرار پائے۔ ان کے نزدیک تو سارے خیر و شرف کے وارث و مورث یہ تھے نہ کہ تم قلاش اور بے سر و سامان مسلمان۔ لیکن جب وہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے علی الرغم تمھاری طرف سب سے بڑے خیر کی وراثت منتقل ہو رہی ہے اور تم اس کے حامل ہوا چاہتے ہو تو انھوں نے اس قسم کی چھچھوری حرکتیں شروع کر دی ہیں کہ اگر ہو سکے تو اس طرح تمھاری نظروں میں اسلام اور پیغمبر آخر الزماں ؐ کی وقعت کچھ گھٹائیں تاکہ جس طرح وہ خود اس نعمت سے محروم ہیں تم بھی اس سے محروم ہی رہو۔ تم ان کی ان چالوں سے ہوشیار رہو اور ان کے چکموں میں آ کر ان کی تمنا بر آنے کے سامان نہ کرو۔ پھر فرمایا کہ اللہ نے اپنے فضل و رحمت کا اجارہ دار نہ یہود کو بنایا ہے نہ قریش کے سرداروں کو بلکہ وہ اپنے فضل و رحمت کا خود مالک و مختار ہے۔ وہی اپنی صواب دید اور اپنی حکمت کے تقاضوں کے مطابق جس کو چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱۰۶)

نسخ کا مفہوم

نسخ کے اصل معنی ہٹانے اور مٹانے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ (۵۲-الحج) (پس اللہ مٹا دیتا ہے اس چیز کو جو شیطان داخل کر دیتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کو محکم کرتا ہے) یہاں یہ ایک قانون کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا قانون لانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ انساء کے معنی فراموش کر دینے کے ہیں۔

یہود کی وسوسہ اندازی کی تردید

یہود مسلمانوں کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالتے تھے کہ جب قرآن حضرت موسیٰ کو خدا کا پیغمبر اور تورات کو خدا کی کتاب تسلیم کرتا ہے تو پھر تورات کے احکام کے رد و بدل کے کیا معنی؟ کیا خدا اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کو خود اپنے ہی ہاتھوں بدلتا ہے۔ کیا اب تجربہ کے بعد خدا پر اپنی غلطیاں واضح ہو رہی ہیں اور وہ ان کی اصلاح کر رہا ہے؟

اس قسم کے اعتراضات اٹھا کر یہود مسلمانوں کو قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قرآن نے یہاں ان کا جواب دیا ہے کہ تورات کا جو قانون منسوخ کیا جاتا ہے اس سے

بہتر قانون اس کی جگہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح تورات کے جو احکام یہود نے فراموش کر دیے تھے، ان کی تجدید کی جاتی ہے اور اگر تجدید نہیں کی جاتی بلکہ ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو ان سے ملتے جلتے احکام دیے جاتے ہیں، یعنی اس تبدیلی سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایک تو خوب سے خوب تر کی طرف بڑھا رہا ہے، دوسرے دین کی جو دولت ضائع کر دی گئی تھی اس کی جگہ دین کے خزانہ کو نئی دولت سے معمور کر رہا ہے۔ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو قابلِ اعتراض قرار دی جا سکے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: یہ خطاب عام ہے۔ ان لوگوں سے بھی جو یہ وسوسہ اندازی کر رہے تھے اور ان لوگوں سے بھی جو اس وسوسہ اندازی سے متاثر ہو رہے تھے، ان سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود کو شریعت دے کر اپنی قدرت اور اپنے اختیار سے مستعفی نہیں ہو بیٹھا تھا کہ اب نہ وہ دنیا میں کسی کو شریعت دے گا، نہ اس میں کسی قسم کی ترمیم و تبدیلی کرے گا اور نہ اب وہ اس کی تجدید کرے گا اگرچہ یہ اس کو بالکل ہی برباد کر کے رکھ دیں۔ بلکہ وہ بدستور اپنے تمام اختیارات کا مالک ہے اور اپنی حکمت کے مطابق ان کو ہمیشہ استعمال کرتا رہا ہے اور کرے گا۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۱۰۷)

تردید کا ایک خاص پہلو

یہاں بھی مخاطب وہی ہیں جو اوپر والی آیت میں مخاطب ہیں۔ البتہ جواب میں اس ذہنیت کو ملحوظ رکھ کر جو مذکورہ بالا سوال کے پس پردہ چھپی ہوئی تھی، تھوڑی سی تفصیل آ گئی ہے۔ یہود نسخ کے سوال کو اٹھا کر سادہ لوح لوگوں کے اندر جو وسوسہ اندازی کر رہے تھے اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ وہ اس بات کو تاڑ گئے تھے کہ یہ تورات کے احکام کا منسوخ ہونا اور ان کی جگہ دوسرے احکام کا آنا محض تورات کے بعض احکام ہی کا منسوخ ہونا نہیں ہے بلکہ اس کے اندر یہود کی منصب امامت سے معزولی اور ان کی جگہ ایک دوسری امت کے نصب و تقرر کا پیام بھی مضمر ہے۔ دراصل اس چیز کا غم و غصہ تھا جو انہیں کھائے جا رہا تھا اور اس کے اظہار کے لیے وہ نسخ کے سوال کو ایک پردہ کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ قرآن نے اس پردے کو اٹھا کر ان کو یہ جواب دیا کہ آسمان و زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ جس سے چاہتا ہے اس کو چھینتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے، اب اگر تم اس منصب کے لیے نااہل ثابت ہو چکے ہو جس پر اس نے تم کو سرفراز کیا تھا اور اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہاری جگہ اس منصب پر کسی اور کو سرفراز فرمائے تو تمہارے غم و غصہ کے علی الرغم یہ بات ہو کے رہے گی اور تمہارا کوئی حامی و مددگار خدا کے اس فیصلہ سے تمہیں نہیں بچا سکتا۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْــَٔـلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ (۱۰۸)

لفظ سوال کا مفہوم

لفظ سوال کے اندر کئی مفہوم ہیں۔ مثلاً مانگنا، درخواست کرنا، مطالبہ کرنا، پوچھنا، پرسش کرنا، سوال کرنا۔

سوال بعض صورتوں میں اعتراض کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کے مفہوم میں اعتراض کرنا بھی داخل ہے۔ بعض حالات میں تحقیق کی نوعیت کا ہوتا ہے، اس صورت میں اس کا صلہ عن کے ساتھ آتا ہے۔ بعض حالات میں سوال استہزاء کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے، اس صورت میں اس کا صلہ 'ب' کے ساتھ آتا ہے مثلاً سَاَلَ سَائِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (معارج) (ایک مذاق اڑانے والے نے مذاق اڑایا ہونے والے عذاب کا) قرآن مجید میں یہ لفظ مذکورہ تمام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ یہ لفظ معترضانہ سوال کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

مسلمانوں کو ایک تنبیہ

یہاں مخاطب مسلمانوں کے اندر کے وہ کمزور لوگ ہیں جو یہود کے القاء کیے ہوئے مذکورہ بالا سوال سے متاثر ہو کر اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کرتے اور اس طرح اس سوال کے اٹھانے اور پھیلانے میں مسلمانوں کے اندر یہود کی نمائندگی کرتے۔ قرآن نے سوال کا جواب تو اوپر دے دیا تاکہ یہود کے پروپیگنڈے کا رد ہو جائے لیکن جس طرح اوپر والی آیت میں یہود کو تنبیہ کی اسی طرح مسلمانوں کے اندر ان کی نمائندگی کرنے والوں کو یہاں تنبیہ کی۔ یہ سوالات اپنی ذہنیت اور نوعیت کے اعتبار سے اسی طرح کے سوالات ہیں جس طرح کے سوالات یہود حضرت موسیٰ سے کرتے رہے ہیں اور یہ روش ایمان و ہدایت کی روش نہیں ہے بلکہ ایمان کو کفر سے بدلنے کی روش ہے۔ جو لوگ یہ روش اختیار کرتے ہیں وہ یہود ہی کی طرح جادۂ مستقیم سے بھٹک کے رہتے ہیں۔

چونکہ اس سوال کے پس پردہ درحقیقت یہود ہی تھے اس وجہ سے قرآن نے یہ کہہ کے کہ اسی طرح کے سوالات اس سے پہلے موسیٰ سے کیے گئے، بڑی بلاغت کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ان کی وسوسہ اندازیوں سے بے خبر نہیں ہے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (١٠٩)

مزید تنبیہ ہے کہ یہود کی یہ تمام سرگرمیاں صرف اس غرض سے ہیں کہ تمہیں ایمان سے ہٹا کر پھر کفر کی حالت میں پلٹا دیں۔ یہ نہ سمجھو کہ ان کی یہ تمام بھاگ دوڑ تمہاری خیر خواہی میں ہے یا یہ تمہارے سابق دین کو برحق سمجھتے ہیں اس کی حمایت میں ہے یا اسلام کے باب میں انھیں کوئی غلط فہمی ہے اس وجہ سے ہے بلکہ یہ محض حسد کا دورہ ہے جو ان کے نفس کی تحریک سے ان پر پڑا ہے باوجودیکہ اسلام کا حق ہونا ان پر اچھی طرح واضح ہو چکا ہے۔

یہ تنبیہ اس لیے ضروری تھی کہ بعض نیک دل یا سادہ لوح مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے تھے کہ یہ اہل کتاب محض ان کی خیر خواہی میں یا ایک دینی خدمت کے طور پر ان کے ایمان کے معاملہ میں اتنے سرگرداں ہیں۔ قرآن نے اس غلط فہمی کو رفع کر دیا کہ یہ سب کچھ محض حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ ہے یعنی یہ کسی جذبۂ دینی

کے تحت نہیں ہے بلکہ محض نفس کے ابھارے ہوئے جذبۂ حسد کی کرشمہ سازی ہے۔

یہود کو تہدید

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ، عفو کے ایک معنی تو دل سے معاف کر دینے کے ہیں اور دوسرے معنی کسی کو نظر انداز کر دینے کے بھی ہیں۔ مثلاً يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۱۵۔ مائدہ (اور تمہارے لیے بیان کرتا ہے بہت سی وہ چیزیں جو تم کتاب کی چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں کو نظر انداز کرتا ہے) صفح کے معنی چشم پوشی کرنے اور نظر انداز کرنے کے ہیں، کسی حماسی کا شعر ہے

صفحنا عن بني ذهل   وقلنا القوم اخوان

ہم نے بنی ذہل کی شرارتوں سے چشم پوشی کی اور خیال کیا کہ یہ لوگ اپنے ہی بھائی ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ ابھی کچھ دنوں ان یہودیوں کی شرارتوں کو نظر انداز کرو۔ یہاں تک کہ اللہ ان کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔ یہ پوری آیت یہود کے لیے تہدید و وعید ہے اور اس بِاَمْرِهٖ کے اجمال کے اندر وہ ساری باتیں چھپی ہوئی ہیں جو بعد میں یہود کے ساتھ جنگ کے حکم، ان کی ہزیمت اور قتل و جلاوطنی اور ادائے جزیہ وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱۰)

مخالفین کی مخالفتوں کا علاج

یہ مسلمانوں کو معاندین اسلام کی مخالفتوں کا علاج بتایا گیا ہے کہ اگر تم ان فتنوں پر غالب آنا چاہتے ہو تو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اسی سے تمہاری وہ روحانی و اخلاقی تربیت ہوگی جو تمہیں ایک طرف تو مخالفین کی وسوسہ اندازیوں سے بالکل مامون کر دے گی، دوسری طرف تم کو جماعتی حیثیت سے ایک ایسی بنیان مرصوص بنا دے گی کہ کوئی طاقت بھی تمہیں ہلا نہ سکے گی۔ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کو تمام دین کی بنیاد، تمام تربیت و اصلاح کی اساس اور تمام قوت و طاقت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ دوسری ساری چیزوں کو ان کے تابع قرار دیا گیا ہے۔ مکی سورتوں میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کے مقابل میں صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے وہاں نماز کی تاکید کی گئی ہے، اسی بقرہ میں تحویل قبلہ کے حکم کے بعد جب مخالفت کا طوفان اٹھا ہے تو فرمایا گیا کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۱۵۳۔ بقرہ (اے ایمان والو، صبر اور نماز کے ذریعہ سے مدد چاہو بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے) اسی طرح جو لوگ مضبوط تربیت کے بغیر جنگ و جہاد کے لیے جلدی مچاتے تھے ان کو نماز و زکوٰۃ کے ذریعہ سے اپنی تربیت کرنے کی ہدایت کی گئی۔ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (ابھی اپنے ہاتھ روکو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) سورہ حج میں مسلمانوں کو جہاد کا حکم دینے کے بعد ہدایت فرمائی کہ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ (پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو مضبوط پکڑو) یہاں بھی نماز اور زکوٰۃ کا حکم اسی پہلو سے ہے۔ اس پر مزید بحث آگے

آئے گی۔

وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۱۱۱)

هُوْد۔ ھائد کی جمع ہے۔ اس کی تحقیق آیت ۶۲ میں گزر چکی ہے۔

مسلمانوں کو بہکانے کے لیے یہود و نصاریٰ کا مشترکہ پروپیگنڈا

جس طرح نسخ کا اعتراض مسلمانوں کے دلوں میں شک اور تردد پیدا کرنے کے لیے اٹھایا گیا اسی طرح یہ پروپیگنڈا بھی یہود اور نصاریٰ دونوں کی طرف سے کیا گیا کہ نجات حاصل کرنے کا اگر کوئی راستہ ہے تو یہ ہے کہ آدمی یہودیت اختیار کرے یا نصرانیت، یہ دونوں خدائی دین ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کسی نئے دین کی نہ ضرورت ہے، نہ گنجائش۔

یہود اور نصاریٰ یوں تو آپس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، آئے دن ان کے اندر مذہبی اختلاف کی بنا پر خون خچر ہوتا رہتا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی مخالفت کے لیے دونوں آپس میں بڑے رواداربن گئے تھے۔ دونوں نے مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا تھا اور ہم زبان ہو کر یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ جس کو نجات مطلوب ہو وہ یہودی بنے یا نصرانی۔ یہ نیا دین جو چلا گیا ہے، یہ تو محض ایک فتنہ ہے۔

یہود نے اسلام کی مخالفت میں رواداری کی یہ روش مشرکین تک کے معاملہ میں اختیار کر لی تھی، نصاریٰ تو بہرحال ان کے اپنے ہی بھائی بند تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کی اس حق دشمنی کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ۔ ۵۱۔ نساء (کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا، وہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر ہیں)

اس پروپیگنڈے کو اس چیز سے تقویت پہنچی ہوگی کہ اہل عرب اہل کتاب سے پہلے سے حسن ظن رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی تائید میں یہ بھی کہتے رہے ہوں گے کہ یہودیت اور نصرانیت کے آسمانی دین ہونے سے تو قرآن کو بھی انکار نہیں ہے۔ ان وجوہ سے قرآن نے اس کی بھی تفصیل کے ساتھ تردید کی۔ فرمایا کہ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ، یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔ یعنی یہ محض ان کی من گھڑت باتیں ہیں جو بغیر کسی سند اور دلیل کے انھوں نے محض اپنے جی سے گھڑ رکھی ہیں۔ خدا نے یہودیت اور نصرانیت کسی کے حق میں بھی یہ پروانہ جاری نہیں کیا ہے کہ جو یہودی یا نصرانی بن گیا اس کے لیے جنت ہے۔ اگر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں تو اپنے اس دعوے کی سچائی پر اپنی کتاب سے کوئی دلیل پیش کریں۔ اس طرح کی ان کی بہت سی تمنائیں اور خواہشیں تھیں جو انھوں نے دین اور عقیدہ بنا کر بلا کسی سند کے اپنے دلوں میں پال رکھی تھیں۔ قرآن نے اگرچہ یہاں ذکر ایک ہی کا کیا ہے لیکن جمع کا لفظ استعمال کر کے اشارہ ان سب کی طرف کر دیا ہے۔ ہم سی

سورہ کی آیات (۸۰ - ۸۱) کی تفسیر کرتے ہوئے ان اَمانی کی تفصیل پیش کر چکے ہیں۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۱۱۲)

نجات کی اصلی راہ

یعنی نجات یافتہ اور مستحق جنت ہونے کے لیے یہودی یا نصرانی ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ آدمی ایک تو مسلم بنے دوسرے یہ کہ محسن بنے۔ اسلام کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کے حوالہ کر دے۔ اس کے نبیوں اور رسولوں میں کوئی تفریق کیے بغیر اپنی پوری زندگی کو اس کی شریعت کے تابع کر دے۔ احسان کا مفہوم یہ ہے کہ شریعت کے احکام کی تعمیل پورے خلوص، پوری دیانت داری اور کامل راستبازی کے ساتھ کرے۔ جو لوگ اس طرح خدا کی بندگی اور اس کی اطاعت کا حق ادا کریں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے، ایسے لوگوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم یہی تمام انبیاء اور تمام آسمانی صحیفوں کی تعلیم ہے اور یہی عقل اور فطرت کا تقاضا ہے۔

یہ پورا مضمون اسی سورہ کی آیات ۸۱ - ۸۲ میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس کے مختلف پہلوؤں پر وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۱۱۳)

یہود و نصاریٰ کی باہمی جنگ و جدال

یعنی اسلام کی مخالفت کے لیے یہود اور نصاریٰ دونوں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے اور ایک دوسرے کو بڑی فیاضی کے ساتھ نجات یافتہ اور جنتی قرار دے رہے ہیں لیکن اس پلیٹ فارم سے الگ ان کی باہمی تکفیر و تفسیق اور جنگ و جدل کا یہ حال ہے کہ یہود، نصاریٰ کی کوئی جڑ بنیاد تسلیم نہیں کرتے اور نصاریٰ یہود کے لیے کوئی بنیاد تسلیم نہیں کرتے، حالانکہ دونوں ایک ہی کتاب کی پیروی کے مدعی ہیں، تورات دونوں میں مشترک ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آج جو ان کے اندر یہ گٹھ جوڑ ہو گیا ہے یہ نہ تو دین کے تحفظ کے لیے ہے نہ کسی اخلاص اور نیک نیتی پر مبنی ہے بلکہ محض اسلام دشمنی کا جذبہ ہے جس نے ان کو متحد کر دیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (جو علم نہیں رکھتے) سے مراد مشرکین بنی اسماعیل ہیں، اس لیے کہ یہ کتاب و شریعت سے ناآشنا امی تھے۔ ان کے متعلق فرمایا کہ انھوں نے بھی انھی لوگوں کی سی بات کہی۔ یعنی یہ بھی اپنے سوا سب کو باطل پر سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام کی مخالفت کے لیے آج یہ بھی اس مشترکہ محاذ میں شامل ہیں وہ ایک کتاب کے علم اور عمل کے مدعی ہوتے ہوئے دین کی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور یہ بغیر کسی علم ہی کے پانچوں سواروں میں جا شامل ہوئے ہیں۔ کَذٰلِكَ اور مِثْلَ قَوْلِهِمْ کے الفاظ بظاہر دونوں ایک ہی مفہوم کے حامل نظر آتے ہیں لیکن غور کرنے سے دونوں سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک سے

محرک اور جذبہ کا اشتراک ظاہر ہوتا ہے، دوسرے سے تعبیر کا۔ یعنی یہ بھی نیت اور عمل دونوں میں اپنی یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

آخر میں بطور وعید کے فرمایا کہ ان کی اس نزاع کا فیصلہ اب آخرت میں خدا کی عدالت میں ہوگا۔ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی بھی ہے کہ تم اس نزاع میں صرف تبلیغ حق کے ذمہ دار ہو۔ اس سے زیادہ تمھارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا ۚ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۱۴)

ایک دوسرے کے معابد کی تخریب

یہ اشارہ ہے ان مدعیانِ جنت کے ان کارناموں کی طرف جو انھوں نے باہمی عناد و عداوت کی بنا پر ایک دوسرے کے معابد کو تباہ و برباد کرنے کے سلسلہ میں انجام دیے۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ یہود و نصاریٰ کے درمیان بیت المقدس میں بھی ایک دوسرے کو ذکر و عبادت سے روکنے کے لیے نہایت خونریز جنگیں ہو چکی ہیں اور باہر بھی جہاں جہاں اور جب جب ان میں سے کسی کو موقع ملا ہے اس نے مخالف فریق کے عبادت خانے برباد کرنے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ نصاریٰ نے لوگوں کو حج بیت اللہ سے روکنے کی سعی کی لیکن جب اس کوشش میں ان کو ناکامی ہوئی تو ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کر دی اور خانہ کعبہ کو منہدم کر دینے کا ارادہ کر لیا جس کی پاداش میں اس پر اور اس کی فوجوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔

ان واقعات کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ جو لوگ آج اسلام کی مخالفت میں یوں ہم زبان ہو گئے ہیں ان کے باہمی تعصبات کا کیا حال رہا ہے۔ اور نجات و ہدایت کے ان ٹھیکیداروں کے کارنامے خدا کی مساجد کے معاملہ میں کتنے سیاہ ہیں۔ ساتھ ہی مساجدِ الٰہی کا مرتبہ و مقام واضح کرنے کے لیے فرمایا کہ دنیا میں سب سے زیادہ ظالم وہ مدعیانِ ہدایت و تقویٰ ہیں جو اللہ کی مسجدوں سے اللہ کا ذکر کرنے والوں کو روکیں اور ان مساجد کی بربادی کے درپے ہوں۔ جو گھر خدا کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا ہے وہ خدا کا گھر ہے کسی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ خدا کے گھر میں اس کی تخریب کی جسارت کے ساتھ داخل ہو۔ اللہ کے گھر میں داخل ہونے کا واحد طریق یہ ہے کہ جو بھی اس میں داخل ہو ڈرتے ہوئے اور لرزتے ہوئے داخل ہو۔ جو لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کی نسبت فرمایا ہے کہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔

مساجدِ الٰہی کے احترام کے اسی اصول کے تحت مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کے ساتھ جنگ کی حالت میں بھی ان کے گرجوں اور معابد کے ہدم یا ان کی توہین کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ مقام ان مسلمانوں کے لیے

خاص طور پر قابلِ غور ہے جو محض گروہی تعصبات کے تحت اپنے سے ذرا مختلف مسلک رکھنے والوں کو اپنی مساجد سے روکتے ہیں اور بعض اوقات دوسرے مسلک رکھنے والوں کی مساجد کی بے حرمتی کرنے کی جسارت بھی کر گزرتے ہیں۔

وجہ نزاع کی طرف اشارہ

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۱۱۵)

یہ اس وجہ نزاع و اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو یہود و نصاریٰ کے درمیان معابد و مساجد کی توہین و تخریب کا سبب ہوئی۔ یہود و نصاریٰ دونوں کا قبلہ بیت المقدس تھا لیکن نصاریٰ نے خاص طور پر اس کی مشرقی سمت کو اپنے قبلہ کے لیے انتخاب کیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ وہ حصہ جس میں حضرت مریم نے اعتکاف فرمایا تھا اسی سمت میں تھا۔ بیت المقدس کے اس عہد کے نقشے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وہ حصہ جو خواتین کی عبادت کے لیے مخصوص تھا، اسی جانب تھا اور قرآن سے بھی کچھ ایسا ہی اشارہ نکلتا ہے۔ سورۂ مریم میں فرمایا ہے۔ وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (۱۶) (اور کتاب میں مریم کی سرگزشت کو یاد کرو، جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر مشرقی جانب میں معتکف ہو بیٹھی) اس ضد میں یہود نے اس کی مغربی سمت کو اختیار کیا ہوگا اور پھر اندرون بیت المقدس کی یہ تقسیم اس سے باہر نکل کر مستقلاً مشرق و مغرب کی تقسیم بن گئی ہوگی۔ یعنی نصاریٰ نے سمت مشرق کو اپنا قبلہ بنا لیا اور یہود نے مغرب کو۔ پھر اس مشرق و مغرب کے اختلاف لے دونوں کو خوب خوب لڑایا۔ بیت المقدس کے اندر بھی اور اس سے باہر بھی۔ اور اس کے نتیجہ میں دونوں فریق نے ایک دوسرے کے معابد کی پوری بے دردی کے ساتھ بے حرمتی کی۔

قرآن مجید نے یہاں اس سبب اختلاف و نزاع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی لغویت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ مشرق ہو یا مغرب، دونوں سمتیں اللہ ہی کی ہیں۔ ان میں سے جس سمت کو بھی انسان رخ کر کے اگر وہ خدا کی طرف متوجہ ہے تو اس کا رُخ خدا ہی کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس چیز کو یہود و نصاریٰ نے سر پھٹول اور ہدم معابد و مساجد کا سبب بنایا تو یہ ان کی جہالت و حماقت ہے۔ سمتوں اور جہتوں میں سے کسی سمت و جہت کو بھی خدا کے ساتھ اختصاص نہیں ہے۔ وہ بیت المقدس کو قبلہ قرار دے کر جدھر بھی رخ کرتے، خدا ہی کی طرف رخ کرتے۔ خدا کی قدرت اور اس کے علم کی وسعت ہر چیز کو محیط ہے۔

ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

یہ بحث مزید تفصیل کے ساتھ آگے تحویل قبلہ کی آیات کے تحت آ رہی ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (۱۱۶)

'ولد' کا مفہوم

وَلَد کے معنی اولاد کے ہیں۔ یہ لفظ واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے آتا ہے۔

فسادِ عقیدہ

اوپر اسلام کے خلاف محاذ قائم کرنے والوں کے ان کارناموں کا حوالہ دیا تھا جو انھوں نے خدا کی مساجد کی تخریب کے سلسلہ میں انجام دیے ہیں، اب یہ ایک اشارہ ان کے مشرکانہ عقائد کی طرف بھی فرما دیا تاکہ ہدایت اور

نجات کی اجارہ داری کے ان مدعیوں کا یہ پہلو بھی سامنے آجائے کہ عقیدہ کے اعتبار سے یہ کس سطح پر ہیں۔ اس سلسلہ میں فرمایا کہ یہ لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ یہود عزیر کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، نصاریٰ مسیح کو اور مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ان سب کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ سُبْحٰنَہٗ خدا اس طرح کی تمام نسبتوں سے پاک اور ارفع ہے۔ کوئی چیز کسی پہلو سے بھی اس کی ذات یا صفات یا اس کے حقوق میں شریک و سہیم نہیں ہے۔ بلکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں اس کی مخلوق و مملوک ہیں۔ کسی کا یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ اس کی بندگی اور اطاعت کے قلادہ سے آزاد ہو بلکہ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔

بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۱۱۷﴾

بدیع کی تحقیق

بَدِیۡع کے معنی کسی شے کو عدم سے وجود میں لانے اور بغیر کسی مادہ و مثال کے ایجاد کرنے کے ہیں۔ اسی سے بِدۡعَتۡ کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کرنا جس کے لیے کوئی مثال، نظیر اور کوئی ماخذ و مصدر نہ ہو۔ بدیع اسی سے فعیل کا وزن ہے اور معنی میں فاعل کے ہے۔

تنزیہ باری تعالیٰ کی مزید وضاحت

اوپر والی آیت کے مضمون تنزیہ باری کی یہ مزید وضاحت ہے کہ یہ بیٹے بیٹیاں جو خدا کے لیے فرض کیے گئے ہیں اس واہمہ کی بنیاد پر فرض کیے گئے ہیں کہ جس طرح دوسرے اپنے معاملات کے انتظام و انصرام میں معاونین اور شرکا کے محتاج ہوتے ہیں اسی طرح خدا بھی شرکا اور معاونین کا محتاج ہے۔ حالانکہ خدا اس قسم کے شرکا اور معاونین سے بالکل بے نیاز و مستغنی ہے وہ آسمان و زمین کو تنہا اپنی قدرت و حکمت سے وجود میں لایا اور جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو بس فرما دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ ایسی بے نیاز و مستغنی اور ایسی بے ہمہ و باہمہ قادر مطلق ذات کے ساتھ آل و اولاد کا کیا جوڑ!

وَقَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ لَوۡلَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ اَوۡ تَاۡتِیۡنَاۤ اٰیَۃٌ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِہِمۡ ؕ تَشَابَہَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ قَدۡ بَیَّنَّا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا ۙ وَّلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۱۹﴾

مشرکین کے بعض مطالبات کا جواب

اَلَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ، سے، جیسا کہ آیت ۱۱۳ کے تحت وضاحت ہو چکی ہے، مشرکین بنی اسماعیل مراد ہیں۔ اوپر اہل کتاب کے اعتراضات اور ان کی وسوسہ اندازیوں کا ذکر فرمایا تھا۔ اب اسی متحدہ محاذ مخالفت کے تیسرے رکن یعنی مشرکین کے بعض مطالبات کا ذکر کر کے ان کا جواب دیا ہے۔

ان کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا ان سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو خدا نے انھی کو ہمارے اندر سے ہم کلامی کے لیے کیوں منتخب کیا، آخر ہم جو قریش کے سردار اور لیڈر ہیں اور با ثروت و اقتدار ہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہیں اونچے ہیں، خدا ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا؟ اس مطالبہ کا جواب قرآن نے بعض جگہ دیا ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے کہ کسی انسان کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے براہ راست کلام کرے، وہ صرف وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی آڑ سے بات کرتا ہے۔ پھر وحی اور رسالت سے

متعلق یہ وضاحت فرمادی ہے کہ ہر کس و ناکس اس منصب کا اہل نہیں ہوا کرتا، یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کون اس منصب عظیم کے لیے اہل ہے۔ لیکن یہاں خاص اس مطالبہ کا جواب نہیں دیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا جواب نہ دینے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مطالبہ اس قدر گستاخانہ اور احمقانہ ہے کہ اس کا جواب نہ دینا ہی اس کا جواب ہے۔ غور کیجیے کہ قرآن کی اس موقع پر اس خاموشی نے سرداران قریش کے پندارِ سیادت پر کیسی کاری ضرب لگائی ہوگی۔

دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ نشانی سے ان کی مراد کوئی ایسی نشانی تھی جو ایک محسوس معجزہ کی نوعیت کی ہو جس کو دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھے کہ بے شک اس نشانی کا دکھانے والا خدا کا فرستادہ اور اس کا رسول ہے۔ مثلاً یہ کہ اس رسول کے ساتھ ساتھ کوئی فرشتہ اس کی رسالت کی منادی کرتا پھرے، یا اس کے حکم سے مُردے جی اٹھیں، یا اس کے اشارے سے پہاڑ چلنے لگیں یا اس کی خواہش پر صحرا چمن بن جائے یا اور نہیں تو کم از کم اس کے ایما پر اس عذاب ہی کا کوئی نمونہ نمودار ہو جائے جس کی یہ ہر روز دھمکی سنا رہے ہیں۔

اس مطالبہ کے جواب میں پہلی بات تو یہ فرمائی کہ جس طرح کی نشانی کے لیے یہ مطالبہ کر رہے ہیں بالکل اسی طرح کی نشانی کے لیے ان قوموں نے اپنے اپنے رسولوں سے مطالبے کیے جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں۔ انھوں نے بھی حق واضح ہو چکنے کے بعد محض رسول کو زچ کرنے کے لیے اس طرح کی نشانی کے لیے مطالبے کیے اور یہ بھی حق کو سمجھ چکنے کے باوجود محض زچ کرنے کی خواہش کے تحت یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ پھر فرمایا کہ ان کے دل بھی بالکل انھی لوگوں کے دلوں کی مانند ہو گئے ہیں۔ یعنی قساوت، طغیانی اور حق دشمنی کی جو سیاہی ان کے دلوں پر بھی چھا رہی ہے۔ پھر لازماً اس کے نتیجہ میں ان پر بھی خدا کی طرف سے اسی طرح کا کوئی عذاب آئے گا جس طرح کے عذاب ان پر آئے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ جہاں تک تمھاری رسالت اور تمھاری دعوت کے حق ہونے کا تعلق ہے اس کے دلائل آفاق سے، انفس سے، آسمان سے، زمین سے، تاریخ سے، آثار سے، ہر پہلو سے ہم نے کھول کھول کر قرآن میں بیان کر دیے ہیں۔ یہ دلائل اس قدر واضح ہیں کہ ان کے بعد کسی نشانی اور معجزہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن یہ دلائل ان لوگوں کے لیے مفید ہیں جو یقین کرنا چاہیں، جو یقین نہیں کرنا چاہتے ان کو دنیا کی کوئی چیز بھی قائل نہیں کر سکتی، ایسے لوگ تو عذاب دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے، یہاں تک کہ وہ عذاب ان کی کمر توڑ کر رکھ دیتا ہے۔

تیسری بات یہ فرمائی کہ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلَا تُسْــَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ۔ ہم نے تم کو حق دے کر اس لیے بھیجا ہے کہ تم اس کے قبول کرنے والوں کو نجات و فلاح کی خوش خبری سنا دو اور اس کی تکذیب کرنے والوں کو اس تکذیب کے انجام بد سے ڈراؤ۔ اس انذار و تبشیر

کا فرض انجام دے چکنے کے بعد تمہاری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے مطالبوں کی تعمیل میں ان کی خواہشات کے مطابق نشانیاں اور معجزے دکھانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ تم سے جو پرسش ہو گی تمہارے فرض رسالت کی ادائیگی کے بارے میں ہو گی، اس بارے میں ہرگز نہیں ہو گی کہ یہ جہنم میں جانے والے لوگ جہنم میں کیوں گئے ایمان کیوں نہیں لائے۔

یہ ساری باتیں جو اوپر عرض کی گئی ہیں مکی سورتوں میں پچھلی قوموں کی سرگزشتوں کے ضمن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوں گی اس وجہ سے ہم یہاں ان کی زیادہ تفصیل نہیں کرتے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ ھُدَى اللّٰهِ ھُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَاۗءَھُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۱۲۰)

یہود و نصاریٰ کی اصل بیماری

مشرکین کے رویہ سے مایوس کر دینے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہود و نصاریٰ کا رویہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ بھی تم سے اس وقت تک راضی ہونے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کی ملت کے پیرو نہ بن جاؤ یعنی یہودیت یا نصرانیت نہ اختیار کر لو۔ اس لیے کہ ان کے سامنے سوال صرف حق کی وضاحت اور دلائل کے ظہور کا نہیں ہے بلکہ اپنے اپنے طریقہ پر جمود کا ہے۔ وہ حق سے زیادہ اپنی خواہشات کے پرستار ہیں اور تمہارے لیے خدا کی طرف سے "العلم" یعنی علم وحی کے آ جانے کے بعد ان کی خواہشات و بدعات کی پیروی کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اس وجہ سے ان کو یہ فیصلہ کن جواب دے دو کہ اصل ہدایت تو وہ ہے جو اللہ کی طرف سے آئے تو اب جب کہ میرے پاس اللہ کی ہدایت آ چکی ہے میں اس کو چھوڑ کر کسی اور طریقہ کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں۔ یہاں یہود و نصاریٰ کے اختیار کیے ہوئے طریقوں کو اہواء (خواہشات) کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے ہدایت آ جانے کے بعد کسی اور طریقہ پر جمے رہ جانا درحقیقت اپنی خواہشات کی پیروی ہے۔

وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ، میں خطاب اگرچہ بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس میں جو تنبیہ اور عتاب ہے اس کا رخ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔ اس طرز خطاب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ملیں گی۔

اس آیت میں ملت کا جو لفظ آیا ہے اس کے اصل معنی طریقہ کے ہیں لیکن اس سے کسی شخص یا گروہ کا وہ طریقہ زندگی مراد ہوتا ہے جس کی بنیاد مذہب اور روایات مذہب پر ہو۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۲۱)

صالحین اہل کتاب کا ذکر

عام اہل کتاب کے رویہ سے مایوسی کے اظہار کے بعد ان اہل کتاب کا ذکر فرمایا جو اپنی کتاب پر فی الواقع ایمان رکھتے تھے۔ ان کے متعلق فرمایا کہ یہ لوگ اس ہدایت الٰہی پر ایمان لائیں گے جو تم ان کے سامنے پیش کر رہے ہو۔

یہاں صالحین اہل کتاب مراد لینے کی ہمارے نزدیک کئی وجہیں ہیں۔

ایک تو یہ ہے کہ ان کے متعلق فرمایا ہے یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے) ہمارے نزدیک یہ ضمیر مفعول سے حال پڑا ہوا ہے اور مقصود اس سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان کا حال شروع سے یہ رہا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی سچی قدر کی ہے جو ان کو ملی تھی۔ ان لوگوں کے مانند یہ کبھی نہیں رہے ہیں جن کا حال قرآن نے یہ بیان کیا ہے، کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا، چارپائے برو کتابے چند۔ پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ تو ہے لیکن کچھ خبر نہیں کہ ان کتابوں میں کیا ہے۔ بلکہ یہ فکر و تدبر کے ساتھ برابر اس کی تلاوت کرتے رہے ہیں اور ان کی یہ تلاوت طلب ہدایت کے لیے تھی نہ کہ محض اپنی من گھڑت آرزوؤں اور خواہشات کے حق میں دلائل ایجاد کرنے کے لیے۔

دوسری یہ کہ ان کے متعلق خبر دی ہے کہ یہ اس ہدایت پر ایمان لائیں گے جو آخری رسول کے ذریعہ سے اللہ نے ان پر اتاری ہے۔

تیسری یہ کہ یہاں ان اہل کتاب کے لیے اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ قرآن کے نظائر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صیغہ اہل کتاب کے لیے بالعموم مدح کے موقع میں استعمال ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (۱۴۶۔ بقرہ)	اور جن کو ہم نے کتاب بخشی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔
۲۔ وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ۔ (۱۱۴۔ انعام)	اور جن کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے حق لے کر اترا ہے۔
۳۔ وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ (۳۶۔ رعد)	اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی ہے وہ خوش ہوتے ہیں اس چیز سے جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے۔
۴۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ (۵۲۔ قصص)	اور جن کو ہم نے کتاب دے رکھی ہے اس کے پہلے سے وہ اس پر ایمان لائیں گے۔

اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کے مقابل میں اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ کے الفاظ کے اندر اہتمام اور عنایت کا جو پہلو نمایاں ہے وہ ان لوگوں سے مخفی نہیں ہو سکتا جو معروف اور مجہول کے مواقع استعمال اور عربی زبان میں ان دونوں اسلوبوں کی ادبی نزاکتوں سے واقف ہیں۔ مذکورہ اسلوب میں معروف کا صیغہ اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب حقیقت میں انھی کو دی جنھوں نے اس کی قدر کی، جنھوں نے اس کی قدر نہیں کی

ان کو گویا خدا نے کتاب دی ہی نہیں۔ اسی فرق کے سبب سے اُوْتُوا الْکِتٰبَ کا صیغہ مدح کے مواقع میں بہت کم استعمال ہوا ہے۔ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ، خبر ہے اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ کی۔ یعنی جو اہل کتاب اپنی کتاب کا حق صحیح طریقہ پر ادا کرتے رہے ہیں وہی اس ہدی اللہ پر ایمان لائیں گے جو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی روحانی نعمتوں میں برکت انہی کو عطا فرماتا ہے جو ان کی قدر کرتے ہیں، جو قدر نہیں کرتے ان کو مزید عطا ہونا تو الگ رہا جو عطا ہوئی ہوتی ہے وہ بھی ان سے سلب کر لی جاتی ہیں۔ آخری شریعت کے بارے میں یہی وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ اس میں تمہاری ذریت کے صرف اچھے ہی لوگ حصہ پائیں گے، جو بُرے ہوں گے وہ اس سے محروم رہیں گے۔ پھر یہی بات اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر واضح فرمائی تھی کہ جو تقویٰ پر قائم رہیں گے وہی آخری نبی پر ایمان لائیں گے۔ اسی حقیقت کو مختلف اسلوبوں سے حضرت مسیح نے واضح فرمایا۔ تفصیل ان چیزوں کی اپنے مقام پر آئے گی۔

۴۶۔ نسخ کی حقیقت اور اس کی ضرورت

اس مجموعۂ آیات کی تمام اہم تعلیمات کی طرف ہم آیات کی وضاحت کے ضمن میں اشارہ کرتے آئے ہیں، غور سے مطالعہ کرنے والوں کے لیے وہ کافی ہے، البتہ نسخ کا مسئلہ جو آیت ۱۰۶ میں بیان ہوا ہے وہ مزید وضاحت کا محتاج ہے۔ ہم اس کے بعض اہم پہلوؤں پر یہاں روشنی ڈالیں گے اور اس سلسلہ میں استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے فکر سے بھی استفادہ کریں گے۔

اوپر نسخ سے متعلق جو آیت گزری ہے، اس پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ فرمایا ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْ مِثْلِھَا (جو آیت (حکم) بھی ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو نظرانداز کراتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے مانند دوسری لاتے ہیں) سیاق و سباق اور نظم کلام کی روشنی میں ہم نے اس آیت کا تعلق صرف ادیانِ سابقہ سے مانا ہے۔ اہل کتاب نے یہ اعتراض جو اٹھایا تھا کہ قرآن جب ہماری کتابوں کو آسمانی تسلیم کرتا ہے تو ان کی تعلیمات کو منسوخ کیوں کرتا ہے، قرآن نے یہ ان کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ اب آئیے اس جواب کی نوعیت پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ یہ ہر پہلو سے معقول اور اطمینان بخش ہے یا نہیں۔ آیت پر تدبر کرنے سے جواب کے دو پہلو واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ یہ نسخ خوب سے خوب تر کی طرف عروج اور ترقی کے نقطۂ نظر سے ہے۔ بالفاظ دیگر یہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی تکمیل ہے جو اس نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے فرمایا تھا کہ وہ اپنا آخری نبی بھیجے گا جو اللہ کی شریعت کو کامل کرے گا، تمام طیبات کو حلال کرے گا، تمام خبائث کو حرام ٹھہرائے گا اور لوگوں کو ان بہت سی پابندیوں سے آزاد کرے گا، جو اس وقت ان پر ہیں۔

اس حقیقت کو واضح طور پر ذہن نشین کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھیے۔

الف:- یہ کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت درجہ بدرجہ ترقی کرتی ہوئی اس نقطۂ کمال تک پہنچی ہے جس نقطۂ کمال پر وہ قرآن حکیم میں نظر آتی ہے۔ اس تدریجی ترقی کے لیے جو چیز مقتضی ہوئی ہے وہ انسان کی فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ تدریجی تربیت ہی کے ذریعہ سے اس مقام تک پہنچ سکتا تھا جس مقام پر پہنچ کر وہ خدا کے دینِ کامل کا اہل بن سکا ہے۔ اس مقام پر پہنچنے سے پہلے تک اس کو جو دین ملا وہ بنیادی طور پر تھا تو اسلام ہی لیکن اپنی ظاہری شکل وصورت یا بالفاظ دیگر اپنی شریعت کے اعتبار سے بہت کچھ انھی سانچوں پر ڈھلا ہوا تھا جو سانچے اس عہد کے ذہنی، عقلی اور اجتماعی و تمدنی تقاضوں سے مناسبت رکھتے تھے۔ تدریجی تربیت کے ذریعہ سے جب اس کی فطرت کے تمام مضمرات واضح ہوگئے اور اس کی عقل بلوغ کو پہنچ گئی، محسوسات و رسوم کی قیدوں اور قومی و قبائلی تنگنایوں سے آزاد ہو کر اس نے سوچنا سمجھنا شروع کیا تب اللہ تعالیٰ نے اس کو اسلام اس شکل وصورت اور اس شریعت کے لباس میں دیا جو ٹھیک اس کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے، کوئی چیز نہ اس سے کم ہے نہ اس سے زیادہ۔ یہ ترقی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ پچھلی شریعتوں کی بہت سی چیزیں بدلیں اور اسلام میں وہ اپنی ان شکلوں میں نمودار ہوں جو ان کی بالکل معیاری اور فطری شکلیں ہیں۔

ب:- تورات کے بہت سے احکام کی ظاہری شکل بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ یہ جس وقت نازل ہوئے تھے خام حالت میں تھے، ان کو پختہ ہونے کے لیے کسی اور فصل و موسم کا انتظار تھا۔ اسلام کے ظہور نے ان کے لیے وہ منتظر موسم فراہم کیا اور وہ پختگی کو پہنچے۔ مثلاً شراب ان کے ہاں صرف عبادت خانہ کے ذمہ داروں کے لیے حرام تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اشارہ تھا اس بات کی طرف کہ یہ چیز تقویٰ و طہارت کے منافی ہے اور ایک دن آئے گا کہ یہ سب کے لیے حرام ہو کر رہے گی۔ چنانچہ اسلام نے اس کی حرمت کے سلسلہ میں پہلا قدم اس مقام سے اٹھایا کہ نماز کے اوقات میں اس کو حرام ٹھہرایا۔ پھر بتدریج اس کو بالکل حرام کر دیا۔ روایات بلکہ قرآن کے اشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر جو لوگ زیادہ ذہین اور روحِ دین کے ذوق آشنا تھے وہ پہلا ہی حکم سن کر ہوا کا رخ پہچان گئے اور اسی وقت سے وہ شراب سے بالکل تائب ہو گئے۔ اسی طرح کھانے پینے کی دوسری چیزوں کی حلت و حرمت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض چیزیں یا تو بنی اسرائیل کے خاص قومی ذوق کے تحت ان کے لیے حرام ٹھہرائی گئیں، یا ان کے بے جا قسم کے سوالات کی سزا کے طور پر، مثلاً اونٹ یا ذبیحہ کے بعض حصوں کی چربی۔ یہ حرمتیں اپنی حیثیت ہی سے ظاہر کر رہی تھیں کہ یہ عارضی اور وقتی ہیں، ایک دن آئے گا کہ اس قسم کی تمام پابندیاں فطرت انسانی کے منافی ہونے کے سبب سے اٹھ جائیں گی۔ چنانچہ دینِ فطرت نے اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ (اب تمھارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں) کا عام اعلان کر کے اس قسم کی تمام پابندیوں کو منسوخ کر دیا۔ تورات سے اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی

ہیں ۔لیکن مقصود یہاں تفصیل نہیں بلکہ ایک حقیقت کی طرف صرف اشارہ ہے۔

ج ۔ تکمیل و ترقی کی اس ضرورت کی طرف حضرت موسٰی اور حضرت عیسٰی علیہما السلام نے نہایت غیر مبہم الفاظ میں اشارہ بھی فرمایا تھا۔ مثلاً حضرت موسٰی علیہ السلام نے فرمایا کہ :۔

"خداوند تیرا خدا تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہو گا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو اپنے خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر نہ جاؤں اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں ۔ میں ان کے لیے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا ۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ (استثناء ۱۸ : ۱۵ ۔ ۲۰)

ان آیات میں جہاں ایک طرف نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا صریح الفاظ میں وعدہ ہے وہیں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ دین کی تکمیل آپ ہی کے ذریعہ سے ہو گی ۔ حورب کے مقام میں بنی اسرائیل نے خود اس امر کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ اب مزید شریعت کا بوجھ اٹھانے کی طاقت اپنے اندر نہیں پا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراف ضعف کی تحسین فرمائی اور وعدہ فرمایا کہ وہ ان کے بھائیوں میں سے حضرت موسٰیؑ کی مانند ایک دوسرا نبی برپا کرے گا اور اس کے ذریعہ سے اپنے دین کی تکمیل فرمائے گا۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اس حقیقت کو ظاہر فرمایا ۔ ملاحظہ ہو:۔

مگر اب میں اپنے بھیجنے والے کے پاس جاتا ہوں اور تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے بلکہ اس لیے کہ میں نے تم سے یہ باتیں کہیں تمہارا دل غم سے بھر گیا ۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے ۔کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے ۔ راستبازی کے بارے میں اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے ۔ عدالت کے بارے میں اس لیے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے ۔لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا ، اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ (یوحنا ۱۶ : ۵ ۔ ۱۴)

ان آیات میں "مددگار" اور "سچائی کا روح" یا بعض دوسرے ترجموں میں "معزی" اور "وکیل" کے الفاظ جو وارد ہوئے ہیں ، ان کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے ؟ حضورؐ ہی کے اوپر یہ بات منطبق

ہو سکتی ہے کہ "وہ تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا" اور حضور ہی کی یہ شان ہو سکتی ہے کہ "وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا" بعینہ یہی بات قرآن مجید میں ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے کہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (وہ یہ اپنے جی سے نہیں کہتا بلکہ یہ وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے) اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ پیشین گوئی فرمائی کہ "وہ وہی کچھ کہے گا جو خداوند خدا اس کے منہ میں ڈالے گا اور جو خبر وہ دے گا اس میں وہ سچا ٹھہرے گا۔"

تورات اور انجیل کی انہی پیشین گوئیوں کی طرف سورہ اعراف کی مندرجہ ذیل آیتوں میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

قَالَ عَذَابِیْۤ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۚ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ ؗ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۶-۱۵۷)

فرمایا کہ رہا میرا عذاب تو میں اس کو نازل کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اور میری رحمت تو ہر چیز پر محیط ہے سو میں اس کو لکھ رکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو خدا سے ڈرتے رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔ یعنی جو پیروی کریں گے اس رسول اور نبی امی کی جس کو لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں، وہ ان کو حکم دیتا ہے نیکی کا اور روکتا ہے برائی سے اور ان کے لیے جائز کرتا ہے تمام پاکیزہ چیزوں کو اور حرام ٹھہراتا ہے ناپاک چیزوں کو، اور ان سے دور کرتا ہے ان کے بوجھ اور ان پابندیوں کو جو ان پر پہلے سے تھیں، پس جو ایمان لائے اس پر اور جنھوں نے اس کی تائید اور مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

نسخ بغرض تجدید دین

۲- جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ نسخ تجدید و احیائے دین کے تقاضے کے تحت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو جو شریعت ملی تھی اس کے کچھ حصہ کو، جیسا کہ قرآن مجید میں تصریح ہے، انھوں نے فراموش کر دیا تھا۔ اس فراموش کردہ حصہ میں سے جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے ضروری ٹھہرایا اس دین کامل کے ذریعہ سے اس کی تجدید فرما دی تاکہ دین کے خزانہ سے جو دولت پاسبانوں کی غفلت اور نالائقی سے ضائع ہو گئی تھی، وہ ازسرِ نو محفوظ ہو جائے اور اگر اس کے کسی حصہ کو حکمتِ الٰہی نے ضروری نہیں ٹھہرایا بلکہ اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ اس حصہ کو نظر انداز کر دیا جائے، تو اس کی جگہ اس کے ہم پایہ و ہم مرتبہ دوسرے

احکام عنایت فرمائے۔

یہاں اِنْسَاءٌ کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ فراموش کرا دینے کے معنی میں ہے۔ آیت زیر بحث میں اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ نسبت اسی طرح کی ہے جس طرح قرآن مجید میں دوسری جگہ فرمایا ہے فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (جب وہ کج ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کج کر دیے) یہ اسلوب بیان اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ معاملہ اپنے قانون حکمت کے مطابق کیا اور اس لیے کیا کہ وہ اپنی شریعت کے معاملہ میں اپنی بے پروائی کے سبب سے اسی چیز کے مستحق تھے۔ لیکن چونکہ شریعت الٰہی تمام انسانیت کا مشترک سرمایہ ہے، اس وجہ سے جس طرح اس کے وقتی احکام کی اسلام کے دائمی اور اعلیٰ احکام کے ذریعہ سے تکمیل کی گئی، اسی طرح اس کے فراموش کردہ اور ضائع شدہ احکام کی ان کے مماثل احکام کے ذریعہ سے قرآن میں تجدید کی گئی۔

تطہیر شریعت

۳۔ نسخ کی یہ ضرورت تکمیل دین اور تجدید شریعت کے پہلو سے بیان ہوئی اور یہ ایسی واضح ہے کہ یہود اور نصاریٰ کے لیے اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی، لیکن قرآن مجید نے نسخ کے صرف انھی دو پہلوؤں کے بیان پر اکتفا نہیں فرمایا ہے، بلکہ ایک تیسرے پہلو سے بھی اس کی ضرورت بیان فرمائی ہے۔ یہ پہلو دین و شریعت کی تطہیر کا پہلو ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی شریعت کو ان بدعتوں اور ملاوٹوں سے پاک کرنا جو اہل بدعت اور خواہش پرستوں نے ان میں ملا دی ہوں۔ اس کا ذکر سورہ حج کی اس آیت میں ہوا ہے جس کا حوالہ ہم اوپر دے آئے ہیں، فرمایا ہے فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ (پس اللہ مٹا دیتا ہے اس چیز کو جو شیطان داخل کر دیتا ہے، پھر اللہ اپنی آیات کو محکم کرتا ہے)

اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ نسخ رد بدعات اور ابطال باطل کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اشرار و مفسدین نے آسمانی صحیفوں اور الٰہی شریعتوں میں جو بدعتیں اور مَن گھڑت چیزیں ملائیں، انبیاء علیہ السلام نے ان سے دین کو پاک و صاف کیا اور اس کی اصل تعلیمات کو از سر نو زندہ کر کے ان کو قائم کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام تشریف لائے ان کی اکثریت انھی انبیا پر مشتمل تھی جو کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے۔ بلکہ ان میں سے بیشتر کا مشن صرف یہی تھا کہ وہ پہلے سے نازل شدہ شریعت کو بدعتوں اور تحریفات سے پاک کر کے اس کو اس کی اصلی حالت پر لوٹا دیں۔ اس امت میں یہ خدمت اللہ و رسول کی طرف سے علما کے سپرد کی گئی ہے کہ وہ برابر دین کو بدعات و تحریفات سے پاک کرتے اور امت کو کتاب و سنت کی طرف لوٹاتے رہیں۔

پچھلی شریعتوں میں اس قسم کے جو اضافے کیے گئے اور اسلام نے جن کو منسوخ کر کے ان کی اصل حقیقت پیش کی، یہاں ہم ان کی چند مثالیں ذکر کرتے ہیں تاکہ اس پہلو سے نسخ کی جو ضرورت و اہمیت ہے وہ اچھی طرح واضح ہو کر سامنے آ جائے۔

عقائد وایمانیات کے باب میں یہود اور نصاریٰ نے جس قسم کی لغویات کا اضافہ کیا اور قرآن نے جس کی اصلاح کی ان میں سے ان کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا تین کا تیسرا ہے یا مثلاً یہ کہ یہود اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کو آسمان وزمین کے پیدا کرنے سے تکان ہو گئی اس وجہ سے اس نے ہفتہ کے دن آرام فرمایا، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اس بات کا اقرار لے رکھا ہے کہ جب تک کوئی نبی وہ قربانی پیش نہ کرے جس کو کھانے کے لیے آسمان سے آگ اترے اس وقت تک وہ اس پر ایمان نہ لائیں یا یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں برص کی بیماری تھی۔ قرآن مجید نے اس قسم کی تمام باتوں کی تردید کر کے اصل حقائق واضح فرمائے۔

اسی طرح یہود نے اپنی بدکارانہ زندگی کو جائز ٹھہرانے کے لیے اکثر انبیا علیہم السلام سے متعلق نہایت بے ہودہ قسم کی روایات اپنے صحیفوں میں شامل کر دیں جو ان کے اخلاق کو بالکل مجروح کر دینے والی تھیں۔ قرآن مجید نے ان انبیاء کو اس قسم کے تمام اتہامات سے بری کر کے ان کی زندگیوں کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کیا۔

اعمال کے باب میں ان لوگوں نے جس قسم کی بدعتیں کیں ان کی بعض مثالیں اس سورہ میں گزر چکی ہیں اور بعض کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ مثلاً ان کا وہ رویہ جو انہوں نے اپنی قوم کے قیدیوں کے بارہ میں اختیار کیا، یا جو روش انھوں نے سود کے معاملہ میں اختیار کی۔ نصاریٰ نے خنزیر اور گردن مروڑے ہوئے جانور کو جائز کر لیا۔

اسی طرح ان لوگوں نے تاریخ اور واقعات کو بھی مسخ کر کے اپنی خواہشات کے رنگ میں پیش کیا مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور خانہ کعبہ کی تاریخ کے اکثر حصہ پر پردہ ڈال دیا گیا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق بیت اللہ سے ثابت نہ ہو سکے اور اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں کو مسخ کیا جا سکے۔ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ سے متعلق بیانات میں بھی اسی مقصد کے تحت بہت سے تصرفات کیے گئے۔ قرآن مجید نے ان تمام تحریفات کا پردہ چاک کیا اور اصل حقائق بے نقاب کیے۔ استاذ امامؒ نے رسالہ ذبیح میں ان چیزوں پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ آگے ہم بھی مناسب مواقع سے بعض مفید باتوں کی طرف اشارے کریں گے۔

شریعت اسلامی میں نسخ کی نوعیت

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ سورۂ بقرہ کی زیر بحث آیت کا تعلق تمام تر ادیانِ سابقہ سے ہے اور اس میں جس نسخ کا حوالہ ہے اس کی ضرورت اور اس کی حکمت اس قدر واضح ہے کہ کسی انصاف پسند کے لیے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلامی شریعت میں بھی نسخ ہے یا نہیں تو اس بارے میں ہمارے یہاں تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو نہ صرف نسخ کے قائل ہیں، بلکہ اس کو بہت زیادہ وسعت دیتے ہیں، دوسرا گروہ اس کا یک قلم منکر ہے۔ تیسرا گروہ اس کا قائل تو ہے لیکن اس کو صرف چند احکامات تک محدود مانتا ہے۔

ان میں سے پہلے گروہ نے اس کے دائرے کو جو بہت زیادہ وسعت دی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ

اس کے نزدیک نسخ کا ایک خاص مفہوم ہے۔ یہ لوگ ان تمام مواقع میں بھی نسخ مان لیتے ہیں، جہاں کوئی بات کسی عام کو خاص یا خاص کو عام کر رہی ہو یا کسی اجمال کو تفصیل کا رنگ دے رہی ہو، حالانکہ اس طرح کے مواقع میں نسخ ماننے سے زیادہ معقول بات یہ ہے کہ عام و خاص اور مجمل و مفصل کے درمیان توفیق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ توفیق نہایت آسانی کے ساتھ پیدا کی جا سکتی ہے۔

جو گروہ نسخ کا یک قلم منکر ہے اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے احکام حالات کے تابع ہیں، جو احکام منسوخ ہوئے ہیں وہ صرف اس وجہ سے منسوخ ہوئے ہیں کہ جن حالات کے اندر وہ نازل ہوئے تھے، وہ حالات تبدیل ہو گئے۔ اب اگر وہی حالات دوبارہ پلٹ آئیں تو وہ احکام بھی از سرِ نو بحال ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے جو احکام بظاہر منسوخ ہیں، وہ فی الحقیقت منسوخ نہیں ہیں بلکہ اپنے مخصوص حالات کے اندر بدستور قائم و زندہ ہیں۔ یہ گروہ اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں یہ بات بھی پیش کرتا ہے کہ اسلامی شریعت کا ارتقا بتدریج نرمی سے سختی کی طرف ہوا ہے۔ اس وجہ سے جب حالات اس بات کے مقتضی ہو جائیں کہ نرمی کی طرف پلٹا جائے تو یہ پلٹنا اسلامی شریعت کے مزاج کے عین مطابق ہو گا۔

ہمارے نزدیک اس رائے میں متعدد غلطیاں ہیں۔

اوّل تو بجائے خود یہ دعویٰ ہی بالکل بے بنیاد ہے کہ اول اول شریعت ہلکی تھی، بعد میں یہ سخت ہوئی ہے۔ قرآن مجید پر غور کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض احکام میں اس کا ارتقا اگر نرمی سے سختی کی طرف ہوا ہے۔ مثلاً تحریم شراب اور حکم صیام وغیرہ۔ تو بعض احکام میں سختی سے نرمی کی طرف بھی ہوا ہے۔ مثلاً صلوٰۃ اللیل اور تعداد مقاتلین کے معاملہ میں۔ اس وجہ سے یہ فارمولا بنا کر کہ شریعت کا ارتقا نرمی سے سختی کی طرف ہوا ہے نسخ کے بارے میں کوئی نتیجہ نکال لینا مغالطہ سے محفوظ نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں اور ہمارے دَور میں جو فرق ہے اس کو اس میں ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلامی شریعت کی دنیا کو دعوت دی ہے اس وقت اسلام کی تعلیمات لوگوں کے لیے بالکل اوپری اور انوکھی تھیں، آپؐ کے صحابہؓ کی تعداد بہت تھوڑی تھی، لوگ جاہلی رسوم و عادات کے اتنے خوگر تھے کہ ان سے ان کے لیے نکلنا آسان نہ تھا۔ برعکس اس کے اس زمانہ میں حالات اس سے بہت مختلف ہیں۔ دنیا میں مسلمان کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اسلامی احکام و قوانین لوگوں کے لیے کوئی نامانوس اور اجنبی چیز نہیں ہیں، اس وجہ سے اس زمانہ کو اس زمانہ پر قیاس کر کے ایک کے احکام کو دوسرے پر منطبق کرنا ہمارے خیال میں کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

تیسری یہ کہ اگر حالات کی تبدیلی کے بہانے شریعت کے منسوخات کی طرف پلٹنے کے جواز کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے فتنہ پسند طبائع کے لیے شریعت سے فرار کی ایک ایسی راہ کھل جاتی ہے جس کا بند کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس زمانے میں بڑی آسانی کے ساتھ اس دلیل کے سہارے روزہ، نماز، حرمت شراب اور حدِ زنا

وغیرہ کے بارے میں سہولت پسند لوگ ایسے اجتہاد شروع کر دیں گے کہ دین کے معاملہ میں امان ہی اٹھ جائے گی۔ چنانچہ ماضی میں بھی گمراہ داعیوں کے ہاتھوں اس کا تجربہ ہو چکا ہے اور آج بھی اس کا تجربہ ہو رہا ہے۔ اسی چیز کی آڑ لے کر مبتدعین نے اپنے پیروؤں کے لیے شریعت کی حرام کی ہوئی بہت سی چیزوں کو جائز ٹھہرا دیا، اور پھر ان کے اندر سے ان چیزوں کی حرمت کا احساس بھی رخصت ہو گیا۔

اس امر میں شبہ نہیں کہ بگڑے ہوئے ماحول میں بعض مرتبہ اچھے داعیان دین نے بھی نو واردوں اور نو مسلموں کے لیے شریعت کے بعض معاملات میں نرمی برتی ہے۔ لیکن اس نرمی کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی، کہ وہ حالات کی تبدیلی کے تحت شریعت کے منسوخات کے اختیار کرنے کے قائل تھے، بلکہ یہ اس قسم کی ایک چشم پوشی اور مسامحت تھی جس قسم کی چشم پوشی بعض مرتبہ ارباب اصلاح و تربیت اپنے کمزور اور بگڑے ہوئے مریدوں اور شاگردوں کے کسی معاملہ میں اختیار کر لیتے ہیں۔ اس نوع کی مسامحت حکیمانہ تربیت کا ایک جزء ہے، یہ اس توقع پر اختیار کی جاتی ہے کہ بالتدریج اس طرح کے خام لوگوں کی حالت صحبت اور تربیت سے اصلاح پذیر ہو جائے گی۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر حالات میں یہ توقع پوری بھی ہوتی ہے، بشرطیکہ تربیت کرنے والے خود تقویٰ کی صفات سے متصف رہے ہیں، محض گندم نمائی اور جو فروشی کی دکان نہیں چلاتے رہے۔ اس چیز کو اس امر پر محمول کرنا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ یہ لوگ حالات کی تبدیلی کے تحت محکمات شریعت کو چھوڑ کر منسوخات کے اختیار کرنے کے قائل تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم نسخ کے باب میں مذکورہ بالا دونوں مسلکوں کو کمزور سمجھتے ہیں۔ اب رہ گیا تیسرا مسلک یعنی ان لوگوں کا مسلک جو قرآن کی بعض آیات کو منسوخ مانتے ہیں، ہمارے نزدیک یہی مسلک صحیح ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ آیات کون کون سی ہیں، وہ کن آیات سے منسوخ ہوئی ہیں اور ان کے منسوخ ہونے کی علت کیا ہے تو ان سوالوں کے جواب دینے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس کتاب میں اپنے اپنے موقع پر یہ بحثیں اللہ تعالیٰ نے چاہا تو آئیں گی۔ یہاں صرف چند اصولی باتیں ذہن نشین کر لیجیے۔

ایک تو یہ کہ قرآن کا کوئی حکم اگر منسوخ ہوا ہے تو قرآن ہی سے منسوخ ہوا ہے اور یہ ناسخ و منسوخ دونوں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ قرآن کے کسی حکم کو قرآن کے سوا کوئی دوسری چیز منسوخ نہیں کر سکتی۔ بعض فقہاء نے حدیث کو بھی قرآن کے لیے ناسخ مانا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ مسلک صحیح نہیں ہے۔ اس مسلک کا ضعف اس قدر واضح ہے کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ اس نسخ کا تعلق تمام تر صرف احکام و قوانین سے ہے، عقاید و ایمانیات یا اخلاق و صفات یا واقعات و حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ عقاید و ایمانیات اور واقعات و حقائق ایسی چیزیں نہیں ہیں جو آج کچھ ہوں اور کل کچھ اور بن جائیں۔ لیکن احکام و قوانین میں اگر کوئی ترمیم و اصلاح خود قانون کا دینے والا کر دے تو اس سے قانون کے مقصد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس سے اصل مقصد کو تقویت

حاصل ہوتی ہے۔

تیسری یہ کہ اس نسخ کی ضرورت اس وجہ سے نہیں پیش آئی کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی نقص ہے جس کے سبب سے اس کے نازل کیے ہوئے قانون کو تجربات اور آزمائشوں کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ بلکہ اس کی وجہ صرف بندوں کی بعض فطری خامیاں اور کمزوریاں ہیں، جن کے سبب سے وہ بسا اوقات کسی قانون کے قبول کرنے میں تدریج اور تربیت کے محتاج ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہے اس وجہ سے اس نے یہ پسند فرمایا کہ وہ اپنے قانون میں اس تدریج و تربیت کو ملحوظ رکھے۔

یہ تدریج اور تربیت قرآن کے ناسخ اور منسوخ احکام پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے، کہ مختلف تقاضوں کے تحت مختلف طرزِ عمل کی مقتضی ہوئی ہے، مثلاً

بعض حالات میں یہ اس بات کی مقتضی ہوئی ہے کہ معاشرہ کے ابتدائی حالات کے تقاضوں کی مناسبت سے کسی باب خاص میں کوئی عارضی حکم دیا جائے اور جب معاشرہ اپنے بلوغ کو پہنچ جائے تو اس عارضی حکم کو آخری اور کامل حکم سے بدل دیا جائے۔ مثلاً ابتداءً ورثہ کے حقوق کے تحفظ کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا، بدکاری کے سدباب کے لیے پنچایتی قسم کی تعزیر کی ہدایت کی گئی، انصار و مہاجرین کی اخوت کو اخلاقی اخوت سے بڑھا کر قانونی اخوت کا درجہ دیا گیا۔ لیکن بعد میں جب معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ کی حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا تو وراثت کے آخری اور حتمی قانون اور زنا کی معین اور قطعی حد نے ان عارضی قوانین کو منسوخ کر کے خود ان کی جگہ لے لی۔

بعض حالات میں یہ اس امر کی مقتضی ہوئی کہ عام انسانی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی قانون درجہ بدرجہ اپنی آخری حد پر پہنچے۔ مثلاً شراب چونکہ اہل عرب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، اس وجہ سے ابتداءً یہ صرف نماز کے اوقات کے لیے حرام ہوئی، روزہ چونکہ عرب جیسے گرم ملک کے لیے بڑی سخت چیز تھا اس وجہ سے شروع شروع میں سفر اور مرض کی صورت میں فدیہ دے دینے کی بھی گنجائش رکھی گئی۔ لیکن بعد میں جب طبائع کو ان چیزوں سے اُنس ہوگیا تو شراب کے قطعی حرمت کے حکم، ماہ رمضان کی تعداد کی تکمیل کی ہدایت اور فدیہ کی اجازت کی منسوخی نے ان ابواب میں بھی شریعت کو کامل کر دیا۔ ان احکام کے بعد صرف اضطرار کے تحت ایک محدود و مشروط اجازت باقی رہ گئی۔

بعض صورتوں میں اس کا اقتضا یہ بھی ہوا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ شریعت کے کسی حکم پر عمل کرنے کے لیے کچھ عرصہ تک آزاد چھوڑ دیا گیا۔ لیکن بعد میں اس اجازت کو منسوخ کر کے اس کی جگہ اسلامی شریعت کا مستقل حکم دے دیا گیا۔ مثلاً قبلہ کے معاملہ میں، اس سے مقصود جیسا کہ قرآن میں واضح کیا گیا ہے مسلمانوں کا امتحان لینا تھا کہ کون خدا اور رسول کی وفاداری میں پختہ ہے اور کون اب تک اپنی پچھلی روایات ہی کا اندھا پرستار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ امتحان تربیت ہی کا ایک جزو ہے۔

اسی طرح بعض حالات میں یہ اس بات کی مقتضی ہوئی کہ معاشرہ کی افرادی قوت کی کمی کی تلافی کے لیے وقتی طور پر بعض ایسے احکام بھی دیے جائیں جو کیفیت کو بڑھانے والے اور قلت تعداد کی حالت میں زیادہ بوجھ اٹھانے کی صلاحیت پیدا کرنے والے ہوں، مثلاً ابتداءً عام مسلمانوں کو بھی تہجد کی پابندی کا حکم دیا گیا، میدان جہاد میں ایک کو دس کفار کا مدمقابل قرار دیا گیا، جماعتی استحکام و تطہیر کے تقاضوں کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی رازدارانہ بات کرنے سے پہلے صدقہ کی ہدایت کی گئی۔ بعد میں جب مسلمانوں کی افرادی قوت بڑھ گئی اور تطہیر جماعت کا وقتی مقصد حاصل ہو گیا تو ان چیزوں میں تخفیف کر کے ان کو اسی عام سطح پر کر دیا گیا جو پہلے سے ان کے لیے شریعت میں مقرر تھی۔

یہ ہم نے صرف بعض اصولی باتوں کی طرف اشارات کیے ہیں۔ یہاں پیش نظر تمام ناسخ و منسوخ آیات کا استقصا اور ان کے مصالح کی وضاحت نہیں ہے۔ تفصیلی بحث منسوخ آیات کے تحت جیسا کہ عرض کیا گیا اپنے اپنے مقام میں آئے گی۔

اس تمام تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ خدا کی شریعت قرآن مجید میں اپنے ترقی و کمال کے آخری درجہ پر پہنچ چکی ہے۔ اب اس کے بعد کسی نسخ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس شریعت میں تمام احکام کے ساتھ مشکل اور مجبور کن حالات کے لیے رخصتیں اور رعایتیں بھی بیان کر دی گئی ہیں۔ اس وجہ سے حالات کی تبدیلی کے عذر پر منسوخ احکام کی طرف پلٹنے کے لیے بھی کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہی، البتہ اہل بدعت کی پیدا کردہ ضلالتوں کے نسخ کا کام قیامت تک باقی رہے گا اور یہ کام اسلام میں علماء اور مصلحین کے سپرد ہے۔

۴۷۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۲۲-۱۴۱

حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت

اوپر کے مباحث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اہل کتاب بالخصوص یہود کے لیے قبول اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہ پندار تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اس وجہ سے ہدایت ان کی ہدایت اور مذہب ان کا مذہب ہے۔ وہ اپنے دائرے سے باہر نہ کسی کے لیے نجات کے قائل تھے نہ کسی نبوت و رسالت کا تصور رکھتے تھے، نجات اور ہدایت حاصل کرنے کا واحد راستہ ان کے ہاں یہ تھا کہ آدمی یہودی بنے یا نصرانی۔ قرآن نے اوپر مختلف پہلوؤں سے ان کے اس زعم کی تردید فرمائی۔ اب آگے ان کے ان مزعومات کی تردید کے لیے ان کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزندوں کی سرگزشت حیات کا وہ حصہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ کی رسالت کی تائید اور یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے تمام دعاوی کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں ہی کے مورث اعلیٰ اور پیشوائے روحانی تھے، اس وجہ سے تاریخ کا یہ حصہ یکساں طور پر سب کے لیے حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ اس سورہ کے آغاز سے بنی اسرائیل اور ضمناً بنی اسمٰعیل

کے ساتھ جو بحث شروع ہوئی تھی وہ اس مقام پر آکر اپنے پورے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔

یہاں جو باتیں قرآن نے اس سرگزشت کی روشنی میں واضح کی ہیں ان کی تفصیل تو آیات کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی لیکن ہم خاص خاص اصولی باتوں کی طرف یہاں اشارہ کیے دیتے ہیں تاکہ کلام کا نظم اور تسلسل نگاہ کے سامنے آجائے۔ یہ اصولی باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامت و پیشوائی کا جو منصب اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا وہ ان کو وراثت کے طور پر نہیں ملا تھا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ تھا۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے مختلف امتحانوں میں ڈال کر ان کی اطاعت و وفاداری کی اچھی طرح جانچ کی، جب وہ اس جانچ میں پورے اترے تب ان کو یہ منصب عطا ہوا۔ یہ منصب تمام تر صفات پر مبنی ہے، اس کا کوئی تعلق بھی نسب اور خاندان سے نہیں۔ اس وجہ سے ان کی ذریت میں سے بھی وہی لوگ اس منصب کے سزاوار ہوں گے جو ان صفات کے حامل ہوں جو اس منصب کے شایان شان ہیں۔ بدعہد اور نافرمان لوگ اس کے حق دار نہیں ہو سکتے۔

۲۔ بیت اللہ کو اللہ تعالیٰ نے تمام ذریت ابراہیم کے لیے مرکز قرار دیا، اس کو قبلہ بنانے کا حکم ہوا اور حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کو اس کی تولیت سپرد ہوئی۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ نے اس گھر کی تعمیر کے وقت اپنی ذریت میں سے ایک امتِ مسلمہ برپا کرنے اور ان کے اندر انھی میں سے ایک رسول مبعوث کرنے کی دعا کی تھی۔

۴۔ یہ پیغمبر اسی دعائے ابراہیمیؑ کے مظہر اور اسی ملتِ ابراہیمیؑ کے داعی ہیں، اس وجہ سے جو لوگ ملتِ ابراہیمیؑ کی پیروی کا دعویٰ رکھتے ہوئے ان کی دعوت سے گریز اختیار کر رہے ہیں وہ خود اپنے آپ کو بے وقوف ٹھہرا رہے ہیں۔

۵۔ اسی ملتِ اسلام کی وصیت حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام نے اپنی اپنی اولاد کو کی اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد نے اسی ملت پر جینے اور اسی ملت پر مرنے کا حضرت یعقوبؑ سے عہد کیا۔

۶۔ ان تمام واقعات و حقائق کا تقاضا یہ ہے کہ اہل کتاب یہودیت یا نصرانیت کے تعصب میں مبتلا ہونے کے بجائے اس ملت ابراہیمی کی پیروی کریں جس کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں، خدا کے نبیوں کے درمیان کوئی تفریق نہ کریں بلکہ اس دین اسلام کو اختیار کریں جو مشترک طور پر تمام نبیوں اور تمام رسولوں کا دین ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں وہ اسلام کے رنگ کو اختیار کریں اور یہی رنگ اللہ کا رنگ ہے نہ کہ یہودیت اور نصرانیت۔ جو لوگ اس رنگ سے الگ کوئی رنگ اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ اللہ اور اس کے رسولوں سے الگ اپنی پارٹی بنانے کے درپے ہیں۔

۷۔ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کے سلسلہ کے دوسرے انبیا علیہم السلام یہودی یا نصرانی تھے۔ جو لوگ اس قسم کے دعوے کر رہے ہیں وہ حقیقت پر پردہ ڈال

رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان نبیوں کے دین و مذہب سے ان مدعیوں کے مقابل میں زیادہ باخبر ہے۔

۸۔ آخری بات جو اس سلسلۂ کلام میں بطور ٹیپ کے بند کے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ دو مرتبہ کہی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے جن آباؤ اجداد پر تم تکیہ کیے ہوئے ہو وہ اپنی زندگیاں گزار چکے اور اپنے اعمال اپنے ساتھ لے گئے، نہ ان کے کارناموں کا کریڈٹ تم کو ملے گا اور نہ ان کے کسی عمل کے بارے میں تم سے مواخذہ ہونا ہے۔

ان مطالب کو ذہن کے سامنے رکھتے ہوئے اب ان آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۲۲-۱۴۱

يَٰبَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ ٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتِيَ ٱلَّتِيٓ أَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَأَنِّي
فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴿١٢٢﴾ وَٱتَّقُواْ يَوۡمٗا لَّا تَجۡزِي نَفۡسٌ عَن
نَّفۡسٖ شَيۡـٔٗا وَلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٞ وَلَا تَنفَعُهَا شَفَٰعَةٞ
وَلَا هُمۡ يُنصَرُونَ ﴿١٢٣﴾ وَإِذِ ٱبۡتَلَىٰٓ إِبۡرَٰهِـۧمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمَٰتٖ
فَأَتَمَّهُنَّۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامٗاۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِيۖ
قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِي ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٢٤﴾ وَإِذۡ جَعَلۡنَا ٱلۡبَيۡتَ مَثَابَةٗ
لِّلنَّاسِ وَأَمۡنٗا وَٱتَّخِذُواْ مِن مَّقَامِ إِبۡرَٰهِـۧمَ مُصَلّٗىۖ وَعَهِدۡنَآ
إِلَىٰٓ إِبۡرَٰهِـۧمَ وَإِسۡمَٰعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيۡتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلۡعَٰكِفِينَ
وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ ﴿١٢٥﴾ وَإِذۡ قَالَ إِبۡرَٰهِـۧمُ رَبِّ ٱجۡعَلۡ هَٰذَا
بَلَدًا ءَامِنٗا وَٱرۡزُقۡ أَهۡلَهُۥ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ مَنۡ ءَامَنَ مِنۡهُم بِٱللَّهِ
وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِۚ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُۥ قَلِيلٗا ثُمَّ أَضۡطَرُّهُۥٓ
إِلَىٰ عَذَابِ ٱلنَّارِۖ وَبِئۡسَ ٱلۡمَصِيرُ ﴿١٢٦﴾ وَإِذۡ يَرۡفَعُ إِبۡرَٰهِـۧمُ
ٱلۡقَوَاعِدَ مِنَ ٱلۡبَيۡتِ وَإِسۡمَٰعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّآۖ إِنَّكَ
أَنتَ ٱلسَّمِيعُ ٱلۡعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَٱجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِن

ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا
اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٢٨﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا
مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٢٩﴾ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ ع
اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي
الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٣٠﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ
اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٣١﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ
يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ
قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ
اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ
نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٣﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ
لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٤﴾ وَقَالُوْا
كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٣٥﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا
وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ
وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ
بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٦﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ

مَآ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ
شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكۡفِيۡكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبۡغَةَ اللّٰهِ ۚ
وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً ۫ وَّنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلۡ
اَتُحَآجُّوۡنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمۡ ۚ وَلَنَآ اَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ ۚ
وَنَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَ
اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطَ كَانُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى ؕ قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ
اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ كَتَمَ شَهَادَةً عِنۡدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ
وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا
مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶ ۱۶

ترجمۂ آیات ۱۲۲ - ۴۱

اے بنی اسرائیل میرے اس فضل کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور اس بات کو کہ میں نے تمھیں اہل عالم پر فضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی کے کچھ کام نہ آئے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ قبول ہوگا، نہ اس کو کوئی شفاعت نفع پہنچائے گی اور نہ ان کی کوئی مدد ہی کی جا سکے گی۔ ۱۲۲ - ۱۲۳

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ اس نے پوری کر دکھائیں، فرمایا بے شک میں تمھیں لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ اس نے پوچھا اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے۔ ۱۲۴

اور یاد کرو، جب کہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ مسکن ابراہیم میں ایک نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم اور اسمٰعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو

طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع اسجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔ ۱۲۵

اور یاد کرو جب کہ ابراہیمؑ نے دعا کی کہ اے رب اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور اس کے باشندوں کو، جو ان میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں پھلوں کی روزی عطا فرما، فرمایا جو کفر کریں گے میں انھیں بھی کچھ دن بہرہ مند ہونے کی مہلت دوں گا۔ پھر میں ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف دھکیلوں گا اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ۱۲۶

اور یاد کرو جب کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ انھوں نے دعا کی کہ اے ہمارے رب ہماری جانب سے یہ دعا قبول فرما بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے۔ ۱۲۷

اے ہمارے رب ہم دونوں کو تو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری ذریت میں سے تو اپنی ایک فرمانبردار امت اٹھا اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بے شک تو توبہ قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے ہمارے رب تو ان میں انھی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔ ۱۲۸-۱۲۹

اور کون ہے جو ملتِ ابراہیم سے اعراض کر سکے مگر وہی جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے۔ ہم نے اس کو دنیا میں بھی برگزیدہ کیا اور آخرت میں بھی وہ صالحین کے زمرہ میں ہوگا۔ جب کہ اس کے رب نے اس کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو حوالہ کر دے۔ اس نے کہا میں نے اپنے آپ کو پروردگارِ عالم کے حوالہ کیا۔ ۱۳۰-۱۳۱

اور ابراہیم نے اسی ملت کی وصیت اپنے بیٹوں کو کی اور اسی کی وصیت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کی۔ اے میرے بیٹو، اللہ نے تمھارے لیے دینِ اسلام کو منتخب فرمایا تو تم نہ مرنا مگر

اسلام کی حالت پر۔ ۱۳۲

کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی موت کا وقت آیا۔ جب کہ اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے بعد کس کی پرستش کروگے؟ وہ بولے کہ ہم تیرے معبود اور تیرے آباؤاجداد — ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ — کے معبود کی پرستش کریں گے جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔ ۱۳۳

یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا، اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تمھیں ملے گا جو کچھ تم نے کمایا، اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کے بابت تم سے سوال نہیں ہوگا۔ ۱۳۴

اور کہتے ہیں کہ یہود یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤگے کہو بلکہ ابراہیم کی ملّت کی پیروی کرو جو اللہ کی طرف یک سُو تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد کی طرف اتاری گئی اور اس چیز پر ایمان لائے جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے ملی، ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم صرف اسی کے فرمانبردار ہیں۔ ۱۳۶-۱۳۵

اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعراض کریں تو پھر وہ درپئے مخالفت ہیں۔ ان کے مقابل میں تمھارے لیے اللہ کافی ہوگا وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ۱۳۷

کہہ دو، یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو، اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔ کہہ دو، کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کر رہے ہو۔ حالانکہ وہی ہمارا بھی رب ہے اور وہی تمھارا بھی رب ہے، ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے

اور ہم خالص اسی کے لیے ہیں۔ ۱۳۸ - ۱۳۹

کیا تم دعویٰ کرتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور ان کی ذریت کے لوگ یہودی یا نصرانی تھے۔ پوچھو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو جو ان کے پاس ہے چھپائیں۔ اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ ۱۴۰

یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا، اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تم کو ملے گا جو کچھ تم نے کمایا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کے بابت تم سے سوال نہ ہوگا۔ ۱۴۱

۴۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ (۱۲۲) وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۱۲۳)

یہ دونوں آیتیں معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ اوپر بھی گزر چکی ہیں اور وہاں ہم ان پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر آیات ۴۷ - ۴۸۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (۱۲۴)

ابتلاء کا مقصد

ابتلاء کے معنی جانچنے اور امتحان کرنے کے ہیں۔ یہ ابتلاء بندوں کی تربیت اخلاقی کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے۔ اسی چیز سے بندوں کی وہ صلاحیتیں ابھرتی اور نشوونما پاتی ہیں جو ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی ہیں اور اسی سے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ یہ امتحان نرم اور سخت، سرد اور گرم، خوش کن اور رنج دہ، حوصلہ افزا اور ہمت آزما دونوں طرح کے حالات کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور کسی صورت میں بھی اس سے مقصود بندے کو دکھ میں مبتلا کرنا نہیں ہوتا بلکہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا صرف اس کی صلاحیتوں کو ابھارنا اور پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ یہاں یہ اشارہ کافی ہے۔ آگے اس پر مفصل بحثیں آئیں گی۔

کلمات کا مفہوم

کلمات کلمہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی مفرد لفظ کے بھی آتے ہیں اور پوری بات کے بھی۔ یہاں کلمات

سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ احکام ہیں جو اس نے حضرت ابراہیمؑ کی عزیمت و استقامت کے امتحان کے لیے ان کو دیے اور انھوں نے بے چون و چرا ان کی تعمیل کی۔ مثلاً انھوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں عین اپنی قوم کے بتکدے میں اذان دی اور جو بت صدیوں سے معبود بن کر پج رہے تھے ان کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ ان کو دین کی منادی کی تو دین کے جرم میں آگ میں ڈالا گیا، وہ بے خطر اس آگ میں کود پڑے۔ ایک جبار بادشاہ نے ان کو دینِ حق سے پھیرنا چاہا، انھوں نے حجت ابراہیمی سے اس کے چھکے چھڑا دیے۔ ان کو خاندان، جائداد اور قوم و وطن سب کو چھوڑ کر ہجرت کا حکم ہوا، وہ سب کو چھوڑ کر ہجرت کر گئے۔ ان کو دشتِ غربت میں اکلوتے اور محبوب فرزند کی گردن پر چھری چلا دینے کا حکم ہوا، انھوں نے بے دریغ اس بازی کے لیے بھی آستینیں چڑھا لیں اور سیزدہ سالہ فرزند کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔ حکم الٰہی کی تعمیل میں جاں بازی و جان سپاری کے اس قسم کے عظیم کارناموں سے ان کی زندگی کا ہر ورق نورانی ہے۔ ہم نے صرف چند واقعات کی طرف بطورِ مثال اشارہ کر دیا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام و ہدایات کی تعبیر کے لیے کلمات کا جو لفظ استعمال فرمایا ہے اس میں بلاغت کا ایک خاص نکتہ مضمر ہے۔ وہ یہ کہ لفظ کلمہ ایک قسم کے اجمال و ابہام کا حامل ہے۔ یہ لفظ کلمہ کُن کی طرح ایک واجب التعمیل حکم کو تو مخاطب کے سامنے رکھ دیتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ اس کا فلسفہ، اس کا صلہ اور اس کا انعام بھی بیان ہو۔ وفاداری اور اطاعت کے امتحان کے لیے اس طرح کے احکام سب سے زیادہ سخت ہوتے ہیں اس وجہ سے جو بندہ اس طرح کے امتحان میں بازی لے جاتا ہے اس کا اجر و انعام بھی بہت بڑا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے خواب میں ایک اشارے کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کو ذبح کر دینے کا حکم دے دیا، نہ اس کی علت و حکمت واضح فرمائی، نہ اس کا اجر و انعام بیان فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چاہتے تو اس خواب کو صرف خواب کا درجہ بھی دے سکتے تھے اور چاہتے تو اس کی کوئی تعبیر بھی نکال لے سکتے تھے لیکن جس طرح اس کائنات کی ہر چیز خدا کے کلمۂ 'کن' کی تعمیل کرتی ہے، اس کو نہ تو اس کے فلسفہ سے بحث ہوتی ہے نہ اس کے اجر و ثواب سے، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کے ہر کلمہ کی تعمیل کی، نہ اس کا فلسفہ پوچھا، نہ اس کا اجر و ثواب معلوم کیا۔ حکم ہوا آگ میں کود پڑو وہ کود پڑے۔ حکم ہوا، قوم و وطن کو چھوڑ دو، چھوڑ دیا۔ حکم ہوا بیٹے کی گردن پر چھری چلا دو، اس کو پچھاڑ دیا۔ ان امتحانی احکام کی اس مخصوص نوعیت کی وجہ سے قرآن نے ان کو کلمات کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

حضرت ابراہیمؑ سے بیٹے کی قربانی کا امتحان

یوں تو ان امتحانات میں سے ہر امتحان نہایت کٹھن تھا لیکن خاص طور پر بیٹے کی قربانی والا امتحان تو ایک ایسا امتحان تھا جس میں پورا اترنا تو الگ رہا، اس کا تصور بھی ایک عظیم امتحان تھا لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں بھی پورے اتر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ وعدہ فرمایا کہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا

(میں تم کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں) یہ ایک ہی وعدہ بیک وقت دو وعدوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو اس پر کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے عظیم قومیں پیدا ہوں گی، دوسرے اس پر کہ حضرت ابراہیمؑ ان سب کے پیشوا ہوں گے۔ اس عظیم انعام کے حق دار وہ اس وجہ سے قرار پائے کہ انھوں نے اللہ کی خاطر نہ صرف اپنے خاندان اور اپنی قوم کو چھوڑا بلکہ ایک دشتِ غربت میں اپنے اس اکلوتے فرزند کو بھی قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے جو اس بڑھاپے اور اس تنہائی میں ان کی تمام تمناؤں کا واحد مرکز تھا۔ تورات میں اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سوانح کے خاص اس حصہ میں یہود نے بہت سی تحریفات کر دی ہیں تاہم یہ وعدہ تھوڑے سے تغیرِ الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب پیدائش باب ۲۲۔

"اور خداوند کے فرشتے نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہو گی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیوں کہ تو نے میری بات مانی۔" (۱۵-۱۸)

اس وعدے کے ایفا میں اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ دونوں کی نسل سے عظیم قومیں پیدا کیں جن کے مورثِ اعلیٰ اور روحانی پیشوا بلا اختلاف حضرت ابراہیمؑ تھے۔ پھر ان کے اندر نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری ہوا۔ ان میں جلیل القدر بادشاہ پیدا ہوئے جو دشمنوں کے پھاٹکوں کے فاتح بنے۔ پھر انہی کی ایک شاخ میں پیغمبر خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت ہوئی جن کے واسطہ سے تمام دنیا کو ایمان و ہدایت کی برکت نصیب ہوئی۔

مشرکین اس وعدے سے مستثنیٰ ہیں

اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا تو انھوں نے سوال کیا کہ امامت و پیشوائی کا یہ عہد انھی کے ساتھ خاص ہے یا ان کی ذریت بھی اس میں شامل ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِينَ (میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے) ظالم سے مراد قرآن میں صرف وہی لوگ نہیں ہوتے جو دوسروں پر ظلم ڈھانے والے ہوں بلکہ اس سے بیشتر وہ لوگ مراد لیے گئے ہیں جو شرک و کفر میں مبتلا ہو کر خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں مثلاً۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ (پس ان میں کتنے اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے اور کتنے میانہ رو ہیں) فاطر ۳۲۔ وَمِن ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِينٌ (اور ان دونوں کی ذریت میں ٹھیک عمل کرنے والے بھی ہیں اور اپنی جانوں پر کھلا ہوا ظلم کرنے والے بھی) ۱۱۳، صافات۔ مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ تمھاری ذریت میں سے تمھاری روش پر قائم اور میری دی ہوئی شریعت و ہدایت پر استوار رہیں گے وہ تو تمھارے بعد اس امامت کے وارث ہوں گے۔ لیکن جو بدعہدی اور نافرمانی کر کے شیطان کی راہ پر چل پڑیں گے وہ اس امامت میں سے کوئی حصہ نہیں پائیں گے۔

یہ تصریح یہاں اس لیے کی گئی ہے تاکہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ ان کو حضرت ابراہیمؑ کی ذریت ہونے پر جو ناز ہے اور جس کے سبب سے وہ ایمان اور عمل کی تمام ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو سبکدوش سمجھے بیٹھے ہیں، یہ بالکل غلط ہے۔ ابراہیمؑ کی وراثت میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جو شرک و کفر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ یہ حقیقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ پر اسی روز واضح کر دی تھی جس روز ان کو اس منصب امامت پر سرفراز فرمایا تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ اوپر ہم نے تورات کا جو حوالہ نقل کیا ہے، اس میں یہ تصریح بھی ضرور موجود رہی ہوگی لیکن چونکہ یہ بات یہود کے منشا کے خلاف تھی اس وجہ سے انہوں نے جس طرح اس سلسلے کے واقعات میں دوسری بہت سی تبدیلیاں کر دیں، اسی طرح اپنی خواہش کے خلاف پا کر اس تصریح کو بھی انھوں نے حذف کر دیا۔ استاذ امامؒ نے اپنے رسالۂ ذبیح میں ان تحریفات سے پردہ اٹھایا ہے۔ تفصیل کے طالب اس رسالہ کو ضرور پڑھیں۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ۖ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (۱۲۵)

'بیت' سے مراد بیت اللہ ہے

بیت سے مراد بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ ہے۔ قرآن مجید میں اس شکل میں یہ لفظ خانہ کعبہ ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش باب ۱۷ میں اس کو بیت ایل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایل عبرانی میں اللہ کو کہتے ہیں۔

'مثابۃ' کا مفہوم

مثابۃ کے معنی مرکز و مرجع کے ہیں جس کی طرف سب رجوع کریں، جس کے ساتھ سب وابستہ ہوں، جو سب کا مرکز اور سب کا قبلہ ہو۔

'لِلنَّاس' سے مراد

"للناس" سے یہاں مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا میں ہوا ہے، یعنی وہ تمام ذریت ابراہیمؑ جس کی امامت و پیشوائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حاصل ہوئی عام اس سے کہ وہ حضرت اسحاقؑ کی نسل سے ہوں یا حضرت اسماعیلؑ کے سلسلے سے ہوں۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی تمام ذریت کا پیشوا بنانے کا فیصلہ کیا گیا اسی طرح یہ فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ خدا کی عبادت کے لیے جو گھر وہ بنائیں گے وہ تمام ذریت ابراہیمؑ کا مرکز اور قبلہ ہوگا اور پھر ذریت اسماعیلؑ کے واسطے سے، جیسا کہ آگے ذکر آ رہا ہے، تمام دنیا کی قومیں اس گھر کی برکتوں میں سے حصہ پائیں گی۔

استاذ امام مولانا فراہیؒ اس مسئلہ میں اپنی تحقیق یہ بیان فرماتے ہیں۔

خانہ کعبہ کا ذکر تورات میں

تورات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو شروع ہی سے یہ حکم ملا تھا کہ وہ اپنی بڑی قربانیوں کا قبلہ مکہ کی سمت کو قرار دیں، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قربانی کے لیے ضروری تھا کہ وہ مسجد میں خداوند کے حضور پیش کی جائے۔ فصل دوم حرف ی میں ہم بتا چکے ہیں کہ جس قربانی کا نام ان کے ہاں قدس الاقدس

تھا اس کا رخ جنوب کی طرف ہونا ضروری تھا۔ اسی طرح سالانہ قربانی جوان کے ہاں سب سے بڑی قربانی خیال کی جاتی تھی اس کا رخ بھی جانب جنوب ہی ہوتا۔ یہ دیا تو اس معاملہ کے اصل راز سے بے خبر تھے جیسا کہ فصل دوم حرف ی میں ہم اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں یا انھوں نے بالقصد اس معاملے کو کریدنا نہیں چاہا۔ بلکہ اپنی عادت کے مطابق چاہا کہ اس پر پردہ ہی پڑا رہے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

حالانکہ یہ بات پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہے کہ ان کے خیمہ عبادت کا رخ ابتداء سے جانب شمال تھا یکھو سفر خروج ۲۷، ۹

مسکن کا گھر جنوب کی جانب برکت حاصل کرنے کے رخ پر بنایا جائے۔ نیز اسی سفر خروج کے باب۴۰ آیت ۲۱-۲۴ میں ہے۔

"اور میز کو اس پردے کے باہر مسکن کی شمالی سمت میں خیمۂ اجتماع کے اندر رکھا اور اسی پر خداوند کے حضور روٹی سجا کر رکھی جیسا کہ خداوند نے موسیٰ کو حکم کیا تھا اور خیمہ اجتماع کے اندر ہی میز کے سامنے مسکن کی جنوبی سمت میں شمعدان رکھا"

ہمارے نزدیک اس ساری ترتیب کا اصل فلسفہ یہ ہے کہ جو شخص خداوند کے حضور آئے اس کا رخ جانب جنوب یعنی مکہ معظمہ اور ابراہیمی قربان گاہ کی طرف ہو۔ اس کا مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ خیمہ کے اندر مسکن مقدس بھی جنوب ہی کی سمت میں تھا اور مذبح اس کے سامنے دروازے کی طرف تھا۔ اس لیے جو شخص وہ قربانی پیش کرتا جس کو قدس الاقداس کہتے ہیں وہ مذبح کے شمالی جانب کھڑا ہوتا تاکہ اس کا رخ مسکن ربانی کی طرف ہو سکے جس کے معنی یہ تھے کہ اس کا رخ لازماً خانہ کعبہ کی طرف ہوتا جس کے پاس ہی مروہ ہے جس کو اولین قربان گاہ ہونے کی عزت حاصل ہے اور اس کے پاس ہی مسکن اسماعیل بھی ہے"

(ملاحظہ ہو رسالہ ذبیح فصل ۱۵)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ جس طرح ہماری نمازوں اور قربانیوں کا قبلہ خانہ کعبہ ہے اسی طرح ابتداء ہی سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام ذریت کی عبادت و قربانی کا قبلہ بھی خانہ کعبہ ہی کو قرار دینے کا فیصلہ تھا تھا۔ چنانچہ اسی رخ پر ان کا خیمہ عبادت بھی تھا اور پھر بعد میں اسی رخ پر بیت المقدس کی بھی تعمیر ہوئی، لیکن یہود نے محض تعصب کی وجہ سے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

آگے اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں۔

"ہمارے مذکورہ دعاوی کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مسکن کو تمام ذریت ابراہیمؑ کا قبلہ قرار دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

اپنی اولاد کو عرب کے مشرق اور شمال میں آباد کیا اور ان کا قبلہ حضرت اسماعیلؑ کے مسکن کو قرار دیا چنانچہ تورات سے ثابت ہے کہ ان کو ان کے تمام بھائیوں کے آگے بسایا۔ پیدائش ۲۵۔۱۸ میں ہے۔

اور اس کی اولاد حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستے پر ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں، آباد تھی۔ یہ لوگ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسے ہوئے تھے۔

اور پیدائش ۱۶ : ۱۲ میں ہے۔

"وہ گورخر کی طرح آزاد مرد ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا۔"

"سب بھائیوں کے سامنے بسنے" کی جو تاویل ہم نے کی ہے، اس کے سوا اس کی کوئی دوسری صحیح تاویل ممکن نہیں ہے کیونکہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد ماسوا بنی اسمٰعیل کے مشرق و شمال میں آباد ہوئی، پس حضرت اسماعیل ان سب کے سامنے اسی وقت ہو سکتے ہیں جب یہ مانا جائے کہ ان کی بستی ان سب کے قبلے کے رخ میں تھی۔ ہمارے نزدیک اس بات کو ماننے میں کسی تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے کہ یہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے سب کا امام بنایا تھا اور ان کے بعد اس امامت کے وارث حضرت اسماعیل ہوئے۔ قرآن مجید نے اس معاملہ کی طرف بعض اشارات کیے ہیں[1]۔ (آگے مولاناؒ نے وہی آیت نقل فرمائی ہے جو یہاں زیر بحث ہے)

فَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (اور مسکنِ ابراہیمؑ کے ایک حصہ میں نماز کی ایک جگہ بنا لو) یہ جملہ اوپر والے ٹکڑے ہی کی مزید وضاحت ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ "ہم نے کہا" یا "ہم نے حکم دیا" کی تصریح کی ضرورت نہیں تھی۔ دونوں جملوں میں ایک ہی بات دو مختلف پہلوؤں سے کہی گئی ہے پہلے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو تمام اولادِ ابراہیمؑ کے لیے مرکز و قبلہ بنانے کا فیصلہ کیا پھر یہ فرمایا کہ اسی فیصلہ کو بروئے کار لانے کے لیے ابراہیمؑ اور اولادِ ابراہیمؑ کو یہ حکم ہوا کہ مسکنِ ابراہیمؑ کے ایک حصہ میں نماز کی ایک جگہ بنا لو۔

مقامِ ابراہیمؑ سے مراد

یہاں آیت میں مقامِ ابراہیمؑ کا لفظ آیا ہے، مقام سے کیا مراد ہے؟ علمائے تفسیر سے اس بارے میں دو قول منقول ہیں، ایک گروہ کے نزدیک اس سے مراد وہ پتھر ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ دوسرے گروہ[2] کے نزدیک اس سے مراد حرم کا پورا علاقہ ہے۔ اس گروہ نے مقام کے لفظ کو کسی مخصوص کھڑے ہونے کی جگہ کے بجائے مسکن و مستقر کے مفہوم میں لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے۔ اس تاویل میں وسعت و جامعیت کے ساتھ ساتھ خاص اہمیت رکھنے والا

---

[1] ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کا رسالہ ذبیح فصل ۱۶ [2] واضح رہے کہ اس گروہ میں ابن عباس، مجاہد اور عطا جیسے اکابر علمِ تفسیر شامل ہیں

پہلو یہ ہے کہ نظم کلام کے اعتبار سے یہ اس مقصد کو زیادہ واضح کرنے والی ہے جس کے لیے یہ بات یہاں کہی گئی ہے۔ یہاں یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہی گھر تمام اولادِ ابراہیمؑ کا قبلہ رہا ہے اس لیے کہ یہی گھر ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے اپنے اس مستقر میں تعمیر کیا جس میں ہجرت کے بعد انھوں نے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ سکونت اختیار کی۔

ہمارے اور یہود کے درمیان نزاعی مسئلہ

یہ مسئلہ ہمارے اور یہود کے درمیان ایک بڑا نزاعی مسئلہ ہے۔ یہود نے خانہ کعبہ اور مروہ کی قربان گاہ سے حضرت ابراہیمؑ کا تعلق بالکل کاٹ دینے کے لیے واقعہ قربانی میں بھی اور ان کی سرگزشت ہجرت میں بھی نہایت بھونڈی قسم کی تحریفات کر دی ہیں اور اس طرح انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس بیٹے کی قربانی کی وہ حضرت اسحاقؑ ہیں نہ کہ حضرت اسماعیلؑ، جس جگہ قربانی کی وہ جبل یروشلم ہے نہ کہ مروہ۔ خدا کی عبادت کے لیے انھوں نے جو گھر بنایا وہ بیت المقدس ہے نہ کہ بیت اللہ، انھوں نے جس جگہ ہجرت کے بعد سکونت اختیار کی وہ کنعان ہے نہ کہ حجاز، خانہ کعبہ۔ ان بیانات کی تصدیق یا تردید کا واحد ذریعہ چونکہ تورات ہی ہے اور تورات میں یہود نے اپنے حسب منشا جیسا کہ ہم نے عرض کیا، تحریف کر ڈالی، اس وجہ سے اصل حقائق سے پردہ اٹھانا بڑا مشکل کام تھا لیکن ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے یہود کی ان تمام تحریفات کا پردہ خود تورات ہی کے دلائل سے اپنے رسالہ ذبیح میں بالکل چاک کر کے رکھ دیا ہے، انھوں نے تورات ہی کے بیانات سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے وطن سے نکلنے کے بعد حضرت اسحاقؑ کی والدہ کو تو کنعان میں چھوڑا اور خود حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کے ساتھ بیر سبع کے بیابان میں قیام کیا۔ یہ جگہ ایک غیر آباد جگہ تھی اس وجہ سے انھوں نے یہاں سات کنوئیں کھودے اور درخت لگائے، یہیں ان کو خواب میں اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم صادر ہوا اور وہ حضرت اسماعیلؑ کو لے کر مروہ کی پہاڑی کے پاس آئے اور اس حکم کی تعمیل کی۔ اسی پہاڑی کے پاس انھوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کو آباد کیا، پھر یہاں سے لوٹ کر وہ بیر سبع گئے اور اپنے قیام کے لیے ایسی جگہ منتخب کی جو خانہ کعبہ سے قریب بھی ہو اور جہاں سے وقتاً فوقتاً حضرت اسحاقؑ کو دیکھنے کے لیے بھی جانا آسانی سے ممکن ہو سکے۔

مولاناؒ نے یہ ساری باتیں تورات کے نہایت ناقابلِ تردید دلائل سے ثابت کر دی ہیں۔ ہر سوال پر اصل کتاب کے اقتباسات پیش کرنے میں طوالت ہے اس وجہ سے ہم نے صرف خلاصۂ بحث اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ جو لوگ تفصیل کے طالب ہوں وہ مولاناؒ کے مذکورہ رسالہ کا مطالعہ کریں۔

ظاہر ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے قیام اسی علاقہ میں فرمایا نہ کہ شام میں تو ان کو نماز کے لیے ایک مرکز کی تعمیر بھی اسی علاقہ میں کرنے کا حکم ہونا چاہیے۔ چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں انھوں نے اس بیت اللہ کی تعمیر کی جس کا ذکر تورات کی کتاب پیدائش میں بیت ایل کے نام سے ہوا ہے۔ بیت اللہ اور بیت ایل

دونوں کے معنی بالکل ایک ہیں سایل کے معنی عبرانی میں اللہ کے ہیں۔ اس بیت ایل سے اگر یہود بیت المقدس کو مراد لیتے ہیں تو قطع نظر اس سے کہ اس سرزمین کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا مسکن نہیں بنایا، یہود کے اس دعوے کو جھٹلانے والی سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر بالاتفاق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سیکڑوں سال بعد حضرت سلیمانؑ کے عہد میں ہوئی ہے۔ چنانچہ خانہ کعبہ کی اسی قدامت اور اولیت کی وجہ سے قرآن نے اس کو "بیت عتیق" اور "اول بیت" کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ[1] مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ فِیْہِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا، ۹۔ آل عمران) (بے شک پہلا گھر جو لوگوں ـــ اولاد ابراہیم ـــ کے لیے تعمیر ہوا وہی ہے جو بکہ میں ہے، مبارک اور تمام عالم کے لیے سرچشمہ ہدایت۔ اس میں (اس کی اولیت کی) نہایت واضح نشانیاں ہیں، یہ مسکن ابراہیم ہے (اور اس کی روایت ہے کہ) جو اس میں داخل ہوا وہ مامون ہوا)

یہاں بیت اللہ کو "مصلّٰی" کے لفظ سے جو تعبیر فرمایا ہے تو اس سے اس گھر کے اصل مقصد تعمیر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ نماز کا مرکز ہوگا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کے جوارِ رحمت میں حضرت اسمٰعیلؑ کو بساتے وقت دعا بھی یہی کی تھی کہ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (اے رب میں نے ان کو اس لیے یہاں بسایا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں) لیکن دور جاہلیت میں اس کے مشرک اور مبتدع متولیوں نے اس کو بدعات کا ایک اڈا بنا لیا اور ان کی نماز پھونک مارنے اور تالی بجانے کی ایک بت پرستانہ رسم بن کر رہ گئی۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں "مصلّٰی" کے لفظ میں ایک اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ذریت ابراہیمؑ کی دونوں شاخوں نے اپنے قبلے کے بنیادی مقصد کو ضائع کر دیا[2] اور اب خدا نے اپنے اس نبی کو بھیجا ہے جو اس کے اصل مقصد کی تجدید کرنے والا ہے۔

بیت اللہ کی تعبیر مصلّٰی سے

وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ الآیۃ۔ عَھِدَ جب اِلٰی کے صلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی پر کوئی ذمہ داری ڈالنے یا اس کو کسی شرط کا پابند کرنے کے آتے ہیں مثلاً وَلَقَدْ عَھِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا (۱۱۵۔ طٰہٰ) (اور ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک شرط کا پابند کیا تو وہ بھول بیٹھا اور ہم نے اس میں ارادہ کی مضبوطی نہیں پائی) اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ (۶۰۔ یٰس)

---

[1] بکہ کے معنی شہر کے ہیں۔ قدیم صحیفوں میں مکہ کے لیے یہی لفظ وارد ہے۔ یہود نے تحریف کر کے اس کو وادی بکاء کر دیا ہے، متعلق آیت کی تفسیر کے تحت ہم اس تحریف پر بحث کریں گے۔

[2] یہ ملحوظ رہے کہ یہود نے جس طرح اپنے دینی لٹریچر سے خانہ کعبہ کے ذکر کو خارج کر دیا اسی طرح نماز کو بھی انھوں نے بالکل خارج کر دیا۔ ان کے ہاں اگر کوئی چیز ہے تو قربانی ہے۔ ان کے معبد کی بھی اصل حیثیت مرکز نماز کی نہیں بلکہ قربان گاہ کی ہے۔ ہمیں کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے نماز کی نعمت سے محروم ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ انھوں نے اپنے اصل قبلہ خانہ کعبہ سے اپنا تعلق توڑ لیا۔

(کیا میں نے تم کو اس شرط کا پابند نہیں کیا تھا، اے آدم کے بیٹو، کہ تم شیطان کی بندگی نہ کرو گے) پس عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر خانہ کعبہ کی تولیت کی ذمہ داری ڈالی اور ان کو اس شرط کا پابند کیا کہ وہ اس گھر کو طواف، اعتکاف اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھیں۔

تطہیرِ بیت اللہ کا مقصد

پاک صاف رکھنے سے مقصد ظاہر ہے کہ ان ساری چیزوں سے پاک صاف رکھنا ہے جو اس گھر کے مقصدِ تعمیر کے منافی ہوں عام اس سے کہ وہ گندگی اور نجاست ہو جس سے عبادت گزاروں کی طبیعت میں تکدر پیدا ہو، یا ارباب لہو و لعب کے ہنگامے ہوں جن سے ان کی یکسوئی میں خلل واقع ہو یا اصنام و اوثان ہوں جو خدا کے گھر کو شرک و بت پرستی کا گڑھ بنا کے رکھ دیں۔ ان ساری چیزوں سے اس گھر کو پاک رکھنے کی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ پر ذمہ داری ڈال دی گئی تھی اور تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے اس ذمہ داری کا حق ادا کیا لیکن بعد میں ان کی اولاد جب شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو گئی تو اس نے اس گھر کی تولیت کی اس شرط کے برعکس اس کے کونے کونے میں بتوں کو لا بٹھایا اور ان لوگوں کو اس گھر سے نہایت ظلم اور بے دردی سے نکالا جو اس کو از سرِ نو ذکرِ الٰہی کے زمزموں، طواف و اعتکاف کی رونقوں اور رکوع و سجود کی جبہ سائیوں سے آباد و معمور کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے یہاں خانہ کعبہ کی ابتدائی تاریخ کی اس حقیقت کی طرف اسی لیے اشارہ فرمایا ہے کہ قریش اس گھر سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں لیکن جب انھوں نے ان کو سمجھنے سے انکار کر دیا تو بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس کی تولیت کے منصب سے ان کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ، اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (توبہ ۹: ۱۷-۱۸) (مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے منتظم بنے رہیں، درآنحالیکہ وہ خود اپنے کفر پر گواہ ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے تمام اعمال اکارت گئے اور دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے یہی ہیں۔ اللہ کی مسجدوں کے منتظم تو وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں)

یہاں اس گھر کو تین چیزوں کے لیے خاص کرنے کا حکم ہوا ہے۔ طواف، اعتکاف اور رکوع و سجود۔

'طواف' کا مفہوم

طواف سے مراد خانہ کعبہ کے ارد گرد پھیرے لگانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے اس کا وہ طریقہ واضح فرما دیا ہے جو اس کا اصل ابراہیمی طریقہ ہے۔ طواف درحقیقت نماز کی ایک قسم ہے لیکن یہ نماز صرف خانہ کعبہ ہی کے پاس ادا ہو سکتی ہے اس کے سوا کہیں اور ادا نہیں ہو سکتی۔ اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے اس کا ذکر سب سے پہلے فرمایا۔ وقار و ادب کے حدود کے اندر رہتے ہوئے محبتِ الٰہی کے جذبات جس حد تک اس نماز میں ابھرتے ہیں بس اسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ شمع و پروانہ کی حکایت طواف میں ایک حقیقت بن جاتی ہے بشرطیکہ آدمی کے اندر حیاتِ ایمانی کی رمق ہو۔

عاکف، عکوف سے ہے جس کی اصل روح دوسری چیزوں سے صرف نظر کر کے کسی خاص چیز کو پکڑ لینا ہے۔ اعتکاف بھی اسی سے ہے جو دھیان گیان اور ذکر و فکر کی عبادت ہے۔ بندہ ہر چیز سے کٹ کر اپنے رب کی یاد کے لیے گوشہ نشین ہو جائے، یہ اعتکاف ہے۔ اس کی صحیح شکل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت سے واضح فرما دی۔ جس طرح طواف محبت الٰہی کے جذبات ابھارنے کے لیے اپنے اندر ایک خاص صفت رکھتا ہے اسی طرح اعتکاف ذکر الٰہی پر عقل اور دل کو جمانے کے لیے اپنے اندر ایک خاص صفت رکھتا ہے۔ ‘اعتکاف’ کا مفہوم

رُکَّعُ، رَاکِعٌ کی جمع ہے اور سُجُوْد، ساجد کی۔ رکوع اور سجدہ کی لغوی تحقیق آیات ۴۳-۴۲ کی تفسیر کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ یہاں یہ دونوں لفظ نماز کی تعبیر کے لیے وارد ہوئے ہیں۔ نماز کی تعبیر رکوع اور سجود سے دو اہم حقیقتوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ دونوں چیزیں نماز کے قدیم ترین اور اہم ترین ارکان میں سے ہیں۔ نماز کی ظاہری ہیئت میں جو تبدیلیاں بھی واقع ہوئی ہوں لیکن یہ دونوں چیزیں جس طرح ہماری نمازوں میں شامل ہیں اسی طرح ابراہیمی نمازیں بھی شامل تھیں۔ دوسری یہ کہ نماز سے صرف ذکر و فکر ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کی مخصوص صورت و ہیئت بھی مطلوب ہے اور اس کی صورت و ہیئت کا اصل جمال اس کے رکوع و سجود ہیں۔ ‘رکوع اور سجود’ کا مفہوم

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۲۶)

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (اے میرے رب اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور اس کے ساکنوں کو پھلوں کی روزی عطا فرما) آمن کے معنی مامون و مطمئن کے ہیں۔ یہ دعا حضرت ابراہیمؑ نے اس سرزمین کے لیے فرمائی ہے جس پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا اور جہاں حرم کی تعمیر کی۔ یہ علاقہ جیسا کہ واضح ہو چکا ہے تہذیب و تمدن اور آبادی و زرخیزی سے بالکل محروم تھا، خانہ بدوش قبائل پانی اور چراگاہوں کی تلاش میں موسموں کے تغیر کے ساتھ ساتھ ادھر سے ادھر منتقل ہوتے رہتے تھے۔ معاش کا ذریعہ یا تو گلہ بانی تھا یا شکار یا پھر لوٹ مار۔ اس وجہ سے اس سرزمین کے دو مسئلے خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں بڑے اہم تھے۔ ایک امن کا، دوسرا غذا کا۔ سرزمین حرم کے دو خاص مسئلے

حضرت ابراہیمؑ کی مذکورہ دعا انھی دو چیزوں کے لیے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا جس طرح قبول فرمائی اور اس کی جو برکتیں حضرت ابراہیمؑ کی ذریت اور اس علاقہ کے باشندوں کے لیے ظاہر ہوئیں وہ تاریخ کی ایک ایسی زندہ اور محسوس حقیقت ہے کہ کوئی کٹر سے کٹر مخالف بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ پھر عجیب ایمان پرور ماجرا یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے واسطہ ہی سے لوگوں کو بخشیں۔ اس حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی قبولیت

خدا ان کے سوا انھیں کسی اور واسطے اور ذریعے کو تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ قرآن میں اس گھر کو جو مبارک (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا گیا ہے، اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعا کن شکلوں میں پوری ہوئی

اب آیئے دیکھیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا اس سرزمین کے بسنے والوں کے لیے کن کن شکلوں میں پوری ہوئی۔

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف بیت اللہ کو بلکہ اس سرزمین کو بھی جہاں بیت اللہ واقع ہے محترم قرار دے دیا۔ اس میں لڑنا بھڑنا، کسی پر حملہ کرنا، کسی کو قتل کرنا، سب یک قلم ممنوع ہو گیا۔ جو شخص بھی اس میں داخل ہو گیا وہ خدا کی امان میں داخل ہو گیا۔ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں رہا کہ اس سے کسی قسم کا تعرض کر سکے۔ اس کے حدود سے باہر خطرہ ہی خطرہ تھا لیکن اس کے اندر ربِ ابراہیمؑ نے امن ہی امن پیدا کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کے دائرے میں کسی جانور کو بھی کوئی اذیت پہنچانا حرام ٹھہرا۔ اپنے اسی احسان کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قریش کو مخاطب کر کے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ، ۶۷- عنکبوت) (کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے ایک محفوظ حرم بنا دیا در آنحالیکہ ان کے گرد و پیش کا حال یہ ہے کہ لوگ دن دہاڑے اچک لیے جاتے ہیں)

اشہرِ حرم

دوسری یہ کہ اس گھر کے حج و زیارت کے لیے سال کے چار مہینے بھی محترم قرار دے دیے گئے۔ ان مہینوں میں لڑنا بھڑنا اور خونریزی و فساد بالکل ممنوع ہو گیا۔ وحشی سے وحشی لوگ بھی ان کے احترام میں اپنی تلواریں میانوں میں کر لیتے تھے اور خطرناک سے خطرناک علاقے بھی بالکل پُرامن ہو جاتے تھے تاکہ لوگ ملک کے ہر گوشے اور کونے سے حج و عمرہ کے لیے آسکیں اور پھر امن و سلامتی کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹ سکیں۔

بیرونی خطرات سے حفاظت

تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو بیرونی دشمنوں کے خطرات سے بھی بالکل مامون و محفوظ بنایا۔ اس گھر کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ بیرونی دشمنوں کو اوّل تو اس پر حملہ آور ہونے کی کبھی جرأت ہی نہیں ہوئی اور اگر کبھی کسی نے یہ جسارت کی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی قدرتِ قاہرہ سے نہایت عبرت ناک سزا بھی دی ہے۔ ابرہہ کی فوجوں کا جو حشر ہوا وہ تاریخ کی بھی ایک مشہور حقیقت ہے اور اس کا ذکر قرآن کی سورۂ فیل میں بھی ہوا ہے۔

معاشی فراغت کے مختلف پہلو

اسی طرح اس گھر کی برکت نے اس سرزمین کے ساکنوں کے لیے معاشی فراغت کے دروازے بھی کھول دیے۔ اس کے بھی بعض پہلوؤں کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ مرکزِ حج قرار پا جانے کی وجہ سے اس سرزمین کی طرف لوگوں کا رجوع بہت بڑھ گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت جتنی ہی پھیلتی گئی اسی حساب سے لوگ گوشہ گوشہ سے حج و زیارت کے لیے آنے لگے۔ اور پھر اسی اعتبار سے، قدرتی طور پر، تجارت اور کاروبار کو فروغ ہوا۔ باہر سے ہر قسم

کی چیزیں مکہ کے بازار میں پہنچنے لگیں اور یہاں سے جو چیزیں باہر جاسکتی تھیں وہ باہر نکلنے لگیں۔ اس گھر کی تعمیر سے پہلے اس علاقہ میں معاش کا تمام تر انحصار جیسا کہ ہم نے ذکر کیا یا تو گلہ بانی اور شکار پر تھا یا لوٹ مار پر لیکن اب تجارت کی راہ کھل جانے کی وجہ سے ہر قسم کی اجناس اور پھل اور ضرورت کی دوسری چیزوں کی فراوانی ہوئی جس سے لوگوں کی معیشت میں ایک نہایت خوشگوار تبدیلی آگئی۔

دوسرا یہ کہ خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کو وقار و احترام کا ایک ایسا مقام حاصل ہوگیا کہ تمام عرب پران کی سیاسی اور مذہبی دھاک بیٹھ گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کے تجارتی قافلے شام اور یمن وغیرہ تک برابر جاتے اور کوئی ان سے مزاحمت کی جرأت نہ کرتا۔ بلکہ تاریخوں سے یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ ان کے قافلے جن شاہراہوں سے گزرتے ان پر بسنے والے قبائل ان سے تعرض کرنے کے بجائے اپنے اپنے حدود کے اندر ان کی حفاظت اور رہنمائی کے لیے بدرقہ فراہم کرتے۔ سورۂ لایلاف میں قرآن مجید نے قریش کے انہی تجارتی سفروں کا حوالہ دے کر ان سے مطالبہ کیا ہے فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ (پس چاہیے کہ اس گھر کے رب کی وہ بندگی کریں جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور خطرے سے نچنت کیا) اس لیے کہ فی الواقع یہ اسی گھر کی برکت تھی کہ وہ ایک پُرخطر اور چٹیل بیابان میں امن سے بھی بہرہ مند ہوئے اور ان کے لیے معاش کی راہیں بھی فراخ ہوگئیں۔

ایک سوال کا جواب

بحث کے یہ سارے پہلو تو بالکل واضح ہیں البتہ یہاں ایک بات ایسی ہے جو ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہنوں میں کھٹکے وہ یہ کہ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے لیے رزق کے لیے جو دعا کی ہے وہ مخصوص طور پر پھلوں کے رزق کی دعا ہے۔ اپنی اولاد کے لیے رزق و فضل کی دعا کرنا بالخصوص جب کہ وہ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بسائی جارہی ہو ایک بالکل فطری چیز ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس رزق کے لیے پھلوں کی شرط کیوں لگائی۔ ذوق تو یہ کہتا ہے کہ انہیں رزق کی ایک جامع دعا مانگ کر معاملہ اپنے رب پر چھوڑنا تھا کہ یہ رزق وہ انہیں کس شکل میں دے۔ اپنی طرف سے کسی خاص نوعیت کے رزق کی تجویز پیش کرنا ایک پیغمبر کے لیے کچھ موزوں نظر نہیں آتا۔ قرآن مجید میں دوسرے انبیاء کی یا خود حضرت ابراہیمؑ کی دوسری دعائیں جو مذکور ہیں ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی تخصیص و تعیین سے جو ایک تجویز کی سی شکل اختیار کرلے ان میں بالعموم احتراز فرمایا گیا ہے۔

'ثمرات' کا مفہوم

ہمارے نزدیک یہ کھٹک محض اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ثمرات سے مراد صرف میوہ جات ہیں حالانکہ ثمرات کے معنی صرف میوہ جات کے نہیں آتے بلکہ میوہ جات کے ساتھ ساتھ اجناس اور غلہ جات بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ میوہ جات کے لیے مخصوص لفظ عربی میں فواکہ کا ہے۔ ثمرات کا لفظ اس سے عام اور وسیع ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ اسی ابراہیمی دعا کی برکتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ثمرات کل شیء (ہر چیز کے پھل) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں أَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ

ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ (۵۷ - قصص) (کیا ہم نے ایک مامون حرم میں ان کے قدم نہیں جمائے جہاں ہر چیز کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں)

ہم اوپر یہ ذکر کر چکے ہیں کہ یہ سرزمین جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیلؑ کو بسایا ایک چٹیل اور غیر آباد جگہ تھی۔ تورات میں اس کے لیے بیابان کا لفظ استعمال ہوا ہے اور خود حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا میں اس کو وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی وادی) سے تعبیر کیا ہے۔ تورات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی بسر اوقات گلہ بانی اور شکار پر تھی جس کے سبب سے ان کا زیادہ تر وقت باہر بسر ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب معاش کا انحصار گلہ بانی اور شکار پر ہو تو وہ پُرسکون اور برقرار زندگی وجود میں نہیں آسکتی تھی جو بیت اللہ کی تولیت کے فرائض اور اس مشن کی تکمیل کے لیے ضروری تھی جو حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کے سپرد فرمایا تھا۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لیے یہ دعا کی کہ ان کو بدویانہ زندگی کی بے اطمینانیوں اور پریشانیوں کی جگہ حضری زندگی کا سکون و اطمینان نصیب ہو تاکہ وہ توحید اور عبادت الٰہی کے اس عالم گیر مرکز کی پوری دلجمعی کے ساتھ خدمت کر سکیں جس کی خدمت پر وہ مامور کیے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا سورۂ ابراہیمؑ میں بھی نقل ہوئی ہے۔ وہاں کچھ الفاظ زیادہ ہیں جن سے وہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ فرمایا۔

رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ	اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد میں سے بعض
غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ ٱلْمُحَرَّمِ	کو ایک بن کھیتی کی زمین میں تیرے محترم گھر کے پاس
رَبَّنَا لِيُقِيمُوا ٱلصَّلَوٰةَ فَٱجْعَلْ أَفْـِٔدَةً	بسایا ہے۔ اے ہمارے رب، میں نے اس لیے بسایا
مِّنَ ٱلنَّاسِ تَهْوِىٓ إِلَيْهِمْ وَٱرْزُقْهُم	ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں پس تو لوگوں کے دل ان کی
مِّنَ ٱلثَّمَرَٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ	طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما
(۳۷ - ابراھیم)	تاکہ یہ تیرا شکر ادا کرتے رہیں۔

اس دعا کے الفاظ پر اچھی طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی اولاد کے لیے یہاں اپنے رب سے دو چیزوں کی درخواست کی ہے اور اس درخواست کے حق میں دو چیزوں کو بطور سفارش پیش کیا ہے۔ درخواست تو یہ پیش کی ہے کہ تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی دے اور اس کے حق میں سفارش یہ پیش کی ہے کہ یہ سرزمین زراعت سے بالکل محروم سرزمین ہے لیکن میں نے اپنی اولاد کو صرف اس لیے یہاں لا ڈالا ہے کہ یہ تیرے محترم گھر کی خدمت کریں اور تیری بندگی کی دعوت کے لیے نماز قائم کریں۔ غور کیجیے کہ جب ثمرات کی روزی کے لیے وہ وجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ بن کھیتی کی زمین ہے تو ان کا مدعا ثمرات سے صرف میوہ جات تو نہیں ہو سکتے بلکہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ گلہ بانی اور شکار کی بدویانہ زندگی کی بے اطمینانیوں سے چھوٹ کر حضری زندگی کے سکون سے بہرہ مند

ہوں کہ تیرے گھر اور تیرے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں ۔ آیت کے آخر میں لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ کے جو الفاظ آئے ہیں وہ بھی نہایت معنی خیز ہیں یعنی میں ان کے لیے جو سکون کی زندگی settled age کا طالب ہوں تو اس لیے نہیں کہ ان کے لیے سامانِ عیش کی فراوانی چاہتا ہوں بلکہ صرف اس لیے اس کا طالب ہوں کہ وہ اپنے مشن کے لیے یکسو رہ کر زیادہ سے زیادہ تیری شکر گزاری کا حق ادا کر سکیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی شرط

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الآية۔ حضرت ابراہیمؑ نے رزق کے لیے جو دعا فرمائی اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ اس کے حق دار صرف وہی لوگ ٹھہریں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہوں یا یقیناً یہاں یہ پیش بندی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس لیے فرمائی کہ اوپر امامت و خلافت کے معاملہ میں ان کو یہ صاف جواب مل گیا تھا کہ اس عہد کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہ ہو گا جو شرک و کفر میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ بات سامنے تھی اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے اس پر قیاس کر کے یہاں اپنی دعا میں از خود یہ قید لگا دی کہ میں یہ درخواست صرف اہلِ ایمان کے لیے کر رہا ہوں۔ اس سے حضرت ابراہیمؑ کے اس مرتبۂ تسلیم و رضا کا اندازہ ہوتا ہے جس پر وہ فائز تھے سا شارہ بھی اگر مل گیا ہے کہ فلاں سمت میں رب کی رضا ہے تو جھپٹ کر ادھر کو چل پڑے ہیں، اگرچہ اس اشارہ کا مطلب بعد میں کچھ اور ہی واضح ہوا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ امامت و خلافت اور معیشتِ دنیا کے معاملات کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کے نافرمان ہیں وہ خدا کی خلافت کے سزاوار تو ہرگز نہیں ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی نافرمانی کے سبب سے خدا ان کی روزی بھی چھین لے۔ روزی اللہ تعالیٰ نافرمانوں اور فرمانبرداروں دونوں کو اس حیاتِ چند روزہ میں دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس زندگی میں جو لوگ اس کے رزق سے نافرمانی کرتے ہوئے متمتع ہوتے ہیں ان کو مرنے کے بعد وہ دوزخ میں جھونک دے گا۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے وہ بڑی وضاحت کے ساتھ آگے مختلف سورتوں میں بیان ہو گی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اجمالی اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۲۷)

تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی دعا

قواعد، قاعدہ کی جمع ہے۔ قاعدہ کے معنی بنیاد اور اساس کے ہیں۔ اوپر والی آیت میں اس گھر کی تعمیر کے حکم کا حوالہ تھا۔ اب آگے یہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ اس کی بنیادیں اٹھاتے وقت حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ نے کیا دعا کی تھی، اس گھر کے ساتھ ان کی کیا آرزوئیں اور تمنائیں وابستہ تھیں اور مستقبل میں اس سے کس فیضِ عالم گیر کے جاری ہونے کی انھوں نے اپنے پروردگار سے التجا کی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت کا یہ حصہ صرف قرآن کے ذریعہ سے ہمارے علم میں آیا ہے، اس لیے کہ یہود نے جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا تورات سے خاص اس حصہ کو یا تو حذف کر دیا یا اس میں اپنے حسبِ منشا تحریف کر دی۔ لیکن یہ آپ کی سرگزشت

کا ایک ایسا ضروری حصہ ہے کہ اس کے بغیر یہ بالکل ناتمام معلوم ہوتی ہے۔ قرآن نے یہ تحریف کردہ حصہ بے نقاب کر کے اس کی تکمیل کر دی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ اے ہمارے رب ہماری طرف سے قبول کر، کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تیری عبادت اور تیری بندگی کی دعوت کے لیے یہ گھر جو ہم بنا رہے ہیں اس کو شرفِ قبولیت بخش اور ہماری یہ خدمت قبول فرما اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تیرے گھر کی بنیادیں اٹھاتے وقت کچھ التجائیں پیش کرتے ہیں ہماری یہ التجائیں قبول فرما۔ ہم اس دوسرے مطلب کو ترجیح دیتے ہیں۔ اول تو اس وجہ سے کہ اس صورت میں یہ جملہ خاص خانہ کعبہ سے متعلق ہونے کے بجائے اس پوری دعا کی تمہید بن جاتا ہے جو آگے آ رہی ہے، دوسرے جہاں تک خانہ کعبہ کی تعمیر کا تعلق ہے یہ کام حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق کر رہے تھے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس وجہ سے اس کی قبولیت پہلے سے معلوم تھی۔ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ میں خدا کی ان دو صفتوں کا حوالہ ہے، جن پر اعتماد کر کے بندۂ خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے اندر حصر کا جو مضمون ہے وہ دعا کرنے والوں کی طرف سے کامل سپردگی اور کامل اعتماد کا اظہار ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۱۲۸)

دعا کی وضاحت

دُعا کے بیچ بیچ میں بار بار 'رَبَّنَا' کا اعادہ اور دعا کے مناسب صفاتِ الٰہی کا حوالہ دعا کے آداب میں سے ہے۔ اس سے دعا شرفِ قبولیت حاصل کرتی ہے۔ یہ دعا ان دونوں چیزوں کے حکیمانہ استعمال کی بہترین مثال ہے۔

سب سے پہلے باپ بیٹے دونوں نے جس چیز کی دعا کی ہے وہ خود اپنے مسلم بنائے جانے کی ہے۔ مسلم کے معنی خدا کے کامل فرمانبردار کے ہیں۔ اس سے کئی حقیقتیں روشنی میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایمان و اسلام اور طلبِ خشیت و تقویٰ کی دعاؤں میں انسان سب سے پہلے اپنے آپ کو سامنے رکھے، یہ چیزیں ایسی نہیں جن سے کوئی بھی مستغنی ہو سکے اگرچہ وہ کتنا ہی عالی مقام ہو۔ دوسری یہ کہ اسلام کے درجات و مراتب کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ جیسے مسلم کامل بھی جن کے ذریعے سے دنیا اسلام کے نام اور اس کی روح سے آشنا ہوئی اپنے مسلم بنائے جانے کے لیے دعا کرتے تھے، تیسری حقیقت، جو خاص اس موقع سے تعلق رکھنے والی اور نظمِ کلام کو کھولنے والی ہے، یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ تاریخی موقع پر جب کہ وہ اپنے مشن کا مرکز تعمیر کر رہے تھے، اپنے لیے جس چیز کی دعا کی تھی، مسلم بنائے جانے کی تھی نہ کہ یہودی یا نصرانی بنائے جانے کی۔

وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ اپنے مسلم بنائے جانے کی دعا کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت

اسماعیل نے اپنی ذریت کے اندر سے ایک پوری امتِ مسلمہ اٹھائے جانے کی بھی اس موقع پر دعا فرمائی۔ اس دعا میں چونکہ حضرت ابراہیم کے ساتھ ان کی ذریت میں سے صرف حضرت اسماعیل شریک تھے۔ اس وجہ سے اس کا واضح مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ یہ انہی کی اولاد سے متعلق تھی چنانچہ انہی کی نسل کے اندر محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا اور آپ کی دعوت سے وہ امتِ مسلمہ ظہور میں آئی جس کے لیے یہ دعا کی گئی تھی۔ تورات سے یہ چیزیں تو غائب کر دی گئیں لیکن قربان ہونے والے فرزند سے متعلق یہ پیشین گوئی موجود ہے کہ تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی۔

لفظ ارادت کا مفہوم

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا: اَرِنَا کے اصل معنی ہمیں دکھا کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور اپنی شریعت کی طرف اپنے بندوں کی رہنمائی اس طرح کی وحی کے ذریعہ سے بھی کرتا ہے جس کا مظہر قرآن مجید ہے اور کبھی رؤیا یا کشف میں براہ راست اپنا کوئی فرشتہ بھیج کر اس کام کو عملاً دکھا یا بتا بھی دیتا ہے جو مطلوب ہوتا ہے۔ اس قسم کی رہنمائی قرآن مجید کی اصطلاح میں ارادت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء تشریف لائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی رہنمائی زیادہ تر ارادت ہی کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ یعنی یا تو رویا میں ان کو ایک بات دکھا دی جاتی تھی یا کوئی فرشتہ خداوندی ظاہر ہو کر مطلوب کام کی طرف رہنمائی کر دیتا تھا۔ تورات سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہاں دعا میں حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل نے اسی ارادت کی درخواست کی ہے۔

'مناسک' کی تحقیق

مناسک منسک کی جمع ہے، نسک کے اصل معنی دھونے اور پاک کرنے کے ہیں۔ نَسَکَ الثَّوْبَ کے معنی ہیں کپڑے کو دھو کر پاک کیا۔ اسی سے نُسک ہے جس کے معنی قربانی کے ہیں۔ قربانی بندے کو گناہ کی آلودگیوں اور آلائشوں سے پاک کر کے اللہ تعالیٰ کا تقرب عطا کرتی ہے۔ پھر اسی سے منسک ہے، جس کے معنی قربانی کے طریقہ کے بھی ہیں اور قربان گاہ کے بھی۔ اس کی جمع مناسک ہے جو حج کے تمام سلسلۂ عبادات و مراسم پر حاوی ہے، فرمایا ہے۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ ۔ ۲۰۰۔ بقرہ (جب تم حج کے مراسم ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو)۔

'توبہ' کا مفہوم

وَتُبْ عَلَيْنَا: توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے اور متوجہ ہونے کے ہیں۔ اس کا صلہ جب علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو جیسا کہ آیت ۳۷ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں یہ اس بات پر دلیل ہوتا ہے کہ اس کے اندر رحم کا مضمون پوشیدہ ہے۔ رحم کے اس پوشیدہ مضمون کو یہاں اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ کہہ کر کھول بھی دیا ہے۔ بندہ جب اپنے رب کی طرف خشیت کے ساتھ رجوع کرتا ہے تو رب رحیم رحمت کے ساتھ بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۲۹)

دعا کا تعلق ذریتِ اسماعیلؑ سے ہے

ان میں انھی میں سے ایک رسول اٹھا یعنی ہماری ذریت میں سے۔ چونکہ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ صرف حضرت اسماعیلؑ ہی تھے اور وہی اس وادیٔ غیر ذی زرع میں بسائے جا رہے تھے، اس وجہ سے اس دعا کا تعلق لازماً انھی کی ذریت سے تھا۔ اس کا کوئی تعلق بھی حضرت اسحاقؑ کی ذریت سے نہیں ہو سکتا۔ تورات کے الفاظ سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ آخری نبی کی بعثت حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہونے والی تھی۔ استثنا باب ۱۸ میں حضرت موسیٰؑ کی جو مشہور پیشین گوئی ہے اس میں فرمایا ہے "تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا" آگے چل کر ہے "میں ان کے لیے انھیں کے بھائیوں میں سے" یہ الفاظ صاف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس سے مراد بنی اسماعیل ہی ہیں۔ اگر بنی اسرائیل مراد ہوتے تو یہ تعبیر "انھی کے بھائیوں میں سے" کے بجائے "انھی میں سے" کی ہوتی۔ اسی طرح "تیرے ہی بھائیوں میں سے" کی جگہ "تمھارے ہی اندر سے" کے الفاظ وارد ہوتے۔ علاوہ ازیں یہاں "میری مانند" کے الفاظ بھی قابلِ لحاظ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نبی کی بعثت کی پیشین گوئی کی گئی تھی ایک صاحبِ رسالت رسول کی تھی۔ قرآن مجید کی مذکورہ دعا میں اسی لحاظ سے رسول کا لفظ وارد ہوا ہے۔ ہم آگے کسی مناسب موقع پر رسول اور نبی کے فرق کو ظاہر کریں گے۔

یہاں جس رسول کی بعثت کے لیے دعا کی گئی ہے اس کے تین مقاصد بتائے گئے ہیں۔ ایک تلاوتِ آیات، دوسرا تعلیم کتاب و حکمت، تیسرا تزکیہ۔

'تلاوتِ آیات' کا مفہوم

آیت لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں، جس سے کسی چیز پر دلیل لائی جا سکے۔ اس پہلو سے آسمان و زمین کی ہر چیز آیت ہے، اس لیے کہ ان میں سے ہر چیز خدا کی قدرت و حکمت اور اس کی مختلف صفات خلق و تدبیر پر ایک دلیل ہے۔ اسی طرح وہ معجزات بھی آیت ہیں جو انبیاء علیہم السلام سے ظاہر ہوئے اس لیے کہ وہ بھی اپنے پیش کرنے والوں کی سچائی پر دلیل تھے۔ علیٰ ہذا القیاس قرآن مجید کے الگ الگ جملوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ فی الحقیقت ان میں سے ہر آیت کی حیثیت ایک دلیل و برہان کی ہے جس سے خدا کی صفات اور اس کے احکام و قوانین اور اس کی مرضیات کا علم ہوتا ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ کے الفاظ سے اس زور و اختیار کا اظہار ہو رہا ہے، جس سے مسلح ہو کر خدا کا ایک رسول اس دنیا میں آتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ رسول محض ایک خوش الحان قاری کی طرح لوگوں کو قرآن سنانے نہیں آتا، بلکہ وہ خدا کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کو آسمان و زمین کے خالق و مالک کے احکام و فرامین اور اس کے دلائل و براہین سے آگاہ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وحی الٰہی کے لیے آیات کے لفظ سے اس حقیقت کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ خدا کا دین تحکم اور جبر پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر دلائل و براہین پر مبنی ہے اور اس کے ہر ٹکڑے کے اندر اس کی دلیل ہے۔

'تعلیم کتاب و حکمت' کا مفہوم

اب آیئے تعلیم کتاب و حکمت کے الفاظ پر غور فرمایئے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ تعلیم، تلاوت

سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ تلاوت آیات تو یہ ہوئی کہ رسول نے لوگوں کو آگاہ کر دیا کہ خدا نے اس کے اوپر یہ وحی نازل کی ہے۔ تعلیم یہ ہے کہ نہایت شفقت و توجہ کے ساتھ ہر استعداد کے لوگوں کے لیے اس کی مشکلات کی وضاحت کی جائے، اس کے اجمالات کی تشریح کی جائے، اس کے مقدرات کھولے جائیں اور اس کے مضمرات بیان کیے جائیں اور اس توضیح و بیان کے بعد بھی اگر لوگوں کے ذہن میں سوالات پیدا ہوں تو ان کے سوالوں کے جواب دیے جائیں۔ مزید براں لوگوں کی ذہنی تربیت کے لیے خود ان کے سامنے سوالات رکھے جائیں اور ان کے جوابات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ لوگوں کے اندر فکر و تدبر کی صلاحیت اور کتاب الٰہی پر غور کرنے کی استعداد پوری طرح بیدار ہو جائے۔ یہ ساری باتیں تعلیم کے ضروری اجزا میں سے ہیں اور ہر شخص جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیا ہے اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ آپ نے اپنے صحابہؓ کے لیے تعلیم کتاب کے یہ تمام طریقے اختیار فرمائے۔

تعلیم کے ساتھ یہاں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک کتاب کا دوسری حکمت کا۔

'حکمت' کی تحقیق — کتاب سے مراد تو ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہے۔ اس لفظ کی تحقیق ہم اس سورہ کی آیت ۲ کی تفسیر کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔ لفظ حکمت کی تحقیق مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں جو بیان فرمائی ہے اس کا ضروری حصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

> رہی حکمت تو وہ تعبیر ہے اس قوت و صلاحیت کی جس سے انسان معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرتا ہے۔ حضرت داؤدؑ کی تعریف میں ارشاد ہوا ہے وَاٰتَیۡنٰہُ الۡحِکۡمَۃَ وَفَصۡلَ الۡخِطَابِ (ہم نے اس کو حکمت عطا کی اور فیصلۂ معاملات کی صلاحیت) یہاں فصل الخطاب کے لفظ سے اس اثر کو بیان کیا ہے جو حکمت کا ثمرہ ہے۔ جس طرح فیصلۂ معاملات کی صلاحیت حکمت کے ثمرات میں سے ہے۔ اسی طرح اخلاق کی پاکیزگی اور تہذیب بھی اس کے ثمرات میں سے ہے۔ اسی وجہ سے اہل عرب حکمت کا لفظ نفس کی اس قوت و صلاحیت کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں جو عقل و رائے کی پختگی اور شرافت اخلاق کی جامع ہوتی ہے۔ چنانچہ دانش مند اور مہذب آدمی کو حکیم کہا جاتا ہے اور جو بات عقل اور دل دونوں کے نزدیک بالکل واضح ہو اس کو حکمت سے تعبیر کرتے ہیں۔

حکمت کا ذکر یہاں کتاب کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تعلیم حکمت تعلیم کتاب سے ایک زائد شے ہے، اگرچہ یہ حکمت سرتاسر قرآن حکیم ہی سے ماخوذ و مستنبط ہو۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک جو لوگ حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں، ان کی بات میں بڑا وزن ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حکمت چونکہ حکیمانہ بات کو بھی کہتے ہیں اور حکیمانہ بات کہنے کی صلاحیت کو بھی، اس وجہ سے تعلیم حکمت کے معنی جس طرح کسی کو کوئی حکیمانہ بات بتا دینے کے ہیں اسی طرح اس کے معنی لوگوں کے اندر حکمت کی صفت و صلاحیت پیدا کرنے کے بھی ہیں۔

'تزکیہ' کا مفہوم — رسول کا تیسرا مقصد تزکیہ بتایا گیا ہے۔ لفظ تزکیہ دو مفہوموں پر مشتمل ہے۔ ایک پاک و صاف کرنے پر، دوسرے نشو و نما دینے پر۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جو چیز

مخالف و مزاحم زوائد و مفاسد سے پاک ہوگی وہ لازماً اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پروان بھی چڑھے گی۔ انبیاء علیہم السلام نفوسِ انسانی کا جو تزکیہ کرتے ہیں اس میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں اور ان کے اعمال و اخلاق کو غلط چیزوں سے پاک صاف بھی کرتے ہیں اور ان کے اعمال و اخلاق کو نشوونما دے کر ان میں مفاسد اور مخالف و مزاحم چیزوں کے بالمقابل استقلال کے ساتھ سینہ سپر رہنے اور استقامت دکھانے کی قوت بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کتاب کے مقابلہ میں نفوس کا تزکیہ کہیں زیادہ دیدہ ریزی، مشقت اور صبر و ریاض کا طالب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کا ذکر تمام دین و شریعت کے غایت و مقصد کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت ہم انشاء اللہ آگے کسی موزوں مقام پر کریں گے۔

'عزیز' اور 'حکیم' کا مفہوم

آیت کے خاتمہ پر خدا کی دو صفتوں — عزیز و حکیم — کا حوالہ ہے۔ عزیز کے معنی غالب اور عزت و قوت والے کے ہیں۔ یعنی وہ ذات جو پوری قوت و صولت اور پورے اختیار و اقتدار کے ساتھ اس کائنات پر فرمانروائی کر رہی ہے — حکیم کے معنی ہیں جس کے ہر کام میں حکمت، مصلحت اور مقصد و غایت ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفتوں کا حوالہ بالعموم ایک ساتھ آتا ہے۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات پر پوری قوت اور پورے غلبہ کے ساتھ حاوی اور متصرف ہے لیکن اس کے اس غلبہ و اقتدار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس کے زور میں جو چاہے کر ڈالے، بلکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکمت و مصلحت کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کا کوئی کام بھی حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔

یہاں ان دونوں صفتوں کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جو خدا عزیز و حکیم ہے، اس کی عزت و حکمت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی اس مملکت میں اپنا سفیر اور پیغمبر بھیجے جو اس کی رعیت کو اس کے احکام و قوانین سے آگاہ کرے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۱۳۰)

رَغِبَ کا صلہ جب عَنْ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی چیز سے بے رغبت اور بیزار ہونے کے ہوتے ہیں۔

لفظ 'سَفِهَ' کی تحقیق

سَفِهَ زیادہ تر لازم آتا ہے۔ لیکن متعدی بھی آتا ہے۔ مثلاً سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنی ہوں گے اس نے اپنا نصیبہ بگاڑ لیا۔ سَفِهَ رَايَهٗ کے معنی ہوں گے اس نے احمقانہ رائے اختیار کی۔ اسی طرح سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنی ہوں گے۔ اس نے اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کیا۔

یہ اسلوب کلام اظہارِ تعجب اور اظہارِ افسوس دونوں کا جامع ہے۔ اشارہ یہاں یہود کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ ملت ابراہیمؑ کے پیرو ہونے کے مدعی ہیں، بلکہ اپنے زعم میں اس کے

واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں، دوسری طرف ان کا یہ حال ہے کہ جو پیغمبر ملت ابراہیمؑ کا داعی بن کر آیا ہے اس سے اور اس کی دعوت سے یہ سب سے زیادہ بیزار ہیں اور ان لوگوں کو بے وقوف قرار دے رہے ہیں جو اس دعوت کا ساتھ دے رہے ہیں۔ حماقت اور خود باختگی کی اس سے بڑھ کر مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا (اور ہم نے دنیا میں اس کو برگزیدہ ٹھہرایا) یہ اس برگزیدگی کی طرف اشارہ ہے جو ان کو دنیا کی قوموں کی سرداری و پیشوائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بخشی اور جس کا ذکر اوپر آیت ۱۲۴ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے سب کی امامت کے لیے منتخب فرمایا، احمق ہی ہوگا جو اس کی ملت کی پیروی سے اعراض اختیار کرے گا۔

صالحین کا لفظ قرآن مجید میں عام نیکوکاروں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور اس پورے زمرے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جو انبیاء صدیقین اور شہداء اور صالحین سب پر مشتمل ہے۔ اس آیت میں یہ لفظ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۳۱)

اسلام کا مفہوم

اسلام کے معنی اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کی مرضی اور اس کے احکام کے حوالہ کر دینا ہے۔ یہاں ہمارے نزدیک اس سے بیٹے کی قربانی کی طرف اشارہ ہے۔ یوں تو وہ تمام امتحانات، جن سے وہ گزارے گئے ان کے اسلام کی جانچ ہی کے لیے تھے، گویا ہر امتحان زبانِ حال سے ان کے سامنے اَسْلِمْ ہی کا مطالبہ رکھنے کے لیے نمودار ہوا لیکن خاص طور پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کا حکم جس میں کامیابی کے بعد وہ برگزیدگی اور امامت کی عزت سے نوازے گئے ہیں، کامل سپردگی اور کامل حوالگی کا ایک ایسا مطالبہ تھا جس کی تعبیر کے لیے سب سے زیادہ جامع اور حقیقت افروز لفظ اگر کوئی ہو سکتا تھا تو اَسْلِمْ ہی کا لفظ ہو سکتا تھا۔ یہ لفظ واقعہ قربانی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے قرآن مجید میں بعض دوسرے مقامات میں بھی آیا ہے مثلاً فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۱۰۳۔ صافات (پس جب باپ اور بیٹے دونوں نے اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالے کر دیا اور ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا)

یہاں اس واقعہ کی طرف اسلام کے لفظ سے اشارہ کر کے قرآن نے کئی حقیقتیں واضح کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت دونوں میں جو برگزیدگی بخشی وہ، جیسا کہ آیت ۱۲۴ میں اشارہ ہو چکا ہے، ان کی ان جان بازیوں اور قربانیوں کا صلہ ہے جو انھوں نے رب کی رضا طلبی کی راہ میں کیں۔ یہ عظمت ان کو مفت میں نہیں حاصل ہوئی جس طرح یہود اس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو کامل سپردگی اور کامل حوالگی یعنی اسلام کا حکم ہوا تھا اور انھوں نے اپنے قول و عمل سے اسی اسلام کا مظاہرہ کیا نہ کہ یہودیت یا نصرانیت کا جیسا کہ یہود یا نصاریٰ گمان کرتے ہیں۔ تیسری یہ کہ اسلام کی اصل روح اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالہ کر دینا ہے

یہاں تک کہ کوئی عزیز سے عزیز چیز بھی بندے کے نزدیک خدا سے زیادہ عزیز نہ رہ جائے۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۳۲)

تَوْصِيَه کے معنی تعلیم و تلقین کرنے کے ہیں، عام اس سے کہ یہ تعلیم و تلقین کوئی شخص اپنی وفات کے وقت کرے یا زندگی کے کسی دوسرے مرحلہ میں۔

بِهَا میں ضمیر ملت اسلام کے لیے ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ کے لفظ سے ہوا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی وصیت

حضرت ابراہیمؑ کی اس وصیت کا ذکر اگرچہ یہود کے صحیفوں میں کہیں نہیں ملتا لیکن ظاہر ہے کہ دین کے معاملہ میں اپنی اولاد اور اپنے اتباع کو وصیت و نصیحت انبیاء علیہم السلام کی عام سنت رہی ہے۔ بنی اسرائیلؑ بنی اسماعیل کے عام بزرگانِ خاندان اور سردارانِ قبائل سے متعلق بھی اس طرح کی تلقین و نصیحت کی بکثرت روایات منقول ہیں۔ یہاں تک کہ تالمود میں ایک وصیت حضرت یعقوبؑ کی بھی قرآن مجید کی بیان کردہ وصیت سے ملتی جلتی موجود ہے۔ خاندانوں اور ملتوں میں اس طرح کی روایات خاندانوں کے اکابر ہی کے طرزِ عمل سے قائم ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خود اپنے طرزِ عمل سے اپنے بعد والوں کے لیے یہ سنت چھوڑی ہو۔ رہی یہ بات کہ انھوں نے اپنی اولاد کو ملتِ اسلام کی وصیت کی تو یہ اس قدر واضح ہے کہ اس کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اوپر ان کی جو سرگزشتِ حیات بیان ہوئی ہے اس سے یہ واضح ہے کہ وہ جس ملت سے آشنا ہوئے، جس ملت کی انھوں نے دعوت دی اور اپنی عظیم قربانی سے جس ملت کی حقیقت کا انھوں نے مظاہرہ کیا، وہ اسلام ہے، تو پھر وہ اس ملت کو چھوڑ کر اپنی اولاد کو یہودیت یا نصرانیت کی تلقین کس طرح کرتے جن سے وہ سرے سے آشنا ہی نہیں ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت یعقوب کا ذکر یہاں اس خصوصیت کی وجہ سے ہوا کہ بنی اسرائیل براہِ راست انھی کی اولاد تھے۔ مطلب یہ ہوا کہ روایت اگر ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نیچے تین پشتوں تک برابر ملتِ اسلام ہی کی وصیت کی ہے نہ کہ یہودیت و نصرانیت کی، تو ملتِ ابراہیمی کی پیروی کے مدعیوں کے لیے پیروی کی چیز اسلام ہے یا یہودیت اور نصرانیت؟

'الدین' سے مراد

اَلدِّيْن سے مراد وہ دینِ حقیقی ہے جو شروع سے اللہ کا دین ہے یعنی اسلام۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۱۹۔ آل عمران (حقیقی دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے) ایک جگہ ارشاد ہے۔ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۸۳۔ آل عمران (کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ

آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں طوعاً یا کرہاً سب اسی کے مطیع ہیں اور سب اسی کی جانب لوٹیں گے) یہی دین اللہ کا دین ہے اور یہی دین اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے ہمیشہ بھیجا۔ اسی دین کی پیروی اور اسی پر جینے اور مرنے کی وصیت حضرت ابراہیمؑ و حضرت یعقوبؑ نے اپنی اپنی اولاد کو فرمائی لیکن بعد میں بنی اسرائیل نے اس میں تحریف کرکے اس کا حلیہ بگاڑ ڈالا اور اس کی جگہ یہودیت و نصرانیت کے نقشے کھڑے کر دیے۔

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (پس تم نہ مرنا مگر حالتِ اسلام پر) میں یہ مضمون پوشیدہ ہے کہ اس دین کی امانت ایک بھاری امانت ہے، اس امانت کا حق تمہیں عہد سے لے کر لحد تک ادا کرنا ہے۔ اس راہ میں بڑی بڑی آزمائشیں پیش آتی ہیں اور تمہیں ان آزمائشوں کا پورے عزم و ہمت سے مقابلہ کرنا ہے، خیال رکھنا، شیطان تمہیں کسی مرحلہ میں اس مقام سے ہٹانے نہ پائے۔ تمہیں اسی کے لیے جینا اور اسی کے لیے مرنا ہے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۳)

حضرت یعقوبؑ کی وصیت

یہ سوال کا انداز مخاطب کو تنبیہ کرنے اور تقریر کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے اختیار فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ تمہارے بزرگ آباء و اجداد یہودیت یا نصرانیت پر تھے تو کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کا آخری وقت آیا اور انھوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت کے لیے بلایا ہے۔ اس وقت انھوں نے ان سے کس چیز کا اقرار لیا۔ توحید اور اسلام کا یا یہودیت اور نصرانیت کا؟ اس سوال کے بعد قرآن نے حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے بیٹوں سے سوال اور ان کے بیٹوں کا متفقہ جواب نقل کیا ہے جو صاف صاف دینِ توحید اور اسلام کے حق میں ہے۔ یہود کے لٹریچر میں بھی اس وصیت سے متعلق جو روایت ملتی ہے اس کے الفاظ اگرچہ قرآن کے الفاظ سے کچھ مختلف ہیں لیکن ان سے تائید بہرحال قرآن ہی کے بیان کی نکلتی ہے نہ کہ بنی اسرائیل کے مذکورہ دعوے کی۔ اس لیے کہ اس میں یہودیت یا نصرانیت کی طرف کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔[1]

---

[1] ہمارے مخدوم مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے یہود کے لٹریچر سے تلاش کرکے اس موقع پر اپنی تفسیر میں دو حوالے نقل کیے ہیں، ایک حضرت اسحاقؑ کی وصیت سے متعلق ہے، دوسرا حضرت یعقوبؑ کی وصیت سے متعلق۔

"جب اسحاقؑ نے دیکھا کہ اس کا وقت موعود آپہنچا تو انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ میں تمہیں خدائے تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں جس کی صفات اعلیٰ، عظیم، قیوم، عزیز ہیں۔ اور جو آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا خالق ہے کہ تم خوف اسی کا رکھنا اور عبادت اسی کی کرنا۔" گنز برگ کی قصص یہود جلد اول صفحہ ۴۱۱ (باقی بر صفحہ ۳۴۶)

حضرت یعقوبؑ کی وصیت کے حوالے کی حکمت

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ ہے کہ قرآن نے خاص طور پر حضرت یعقوب علیہ السلام کے وقتِ موت کی وصیت کا حوالہ دیا ہے جس سے کئی باتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ایک تو اس بات کی طرف کہ حضرت یعقوبؑ نے یہ عہد و اقرار اپنی اولاد سے اپنے بالکل آخری لمحاتِ زندگی میں لیا ہے اس وجہ سے یہ گمان کرنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس کے بعد ان کے مسلک و مذہب میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہو۔ دوسری اس بات کی طرف کہ ایک شفیق و مہربان باپ، جو خدا کا ایک پیغمبر بھی ہے، اپنی اولاد سے جو عہد و اقرار اپنے بالکل آخری لمحاتِ زندگی میں لیتا ہے اس کے اور اس کی اولاد کے درمیان سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا واقعہ وہی عہد و اقرار ہو سکتا ہے اور باوفا اولاد کا یہ سب سے بڑا اور سب سے مقدس فرض ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات کے اندر اس عہد کو نباہے، صرف ناخلف اولاد ہی اس نوعیت کے عہد و اقرار کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ تیسری یہ کہ اللہ سے ڈرنے والے اور اپنی اولاد سے سچی محبت کرنے والے ایک باپ کا زندگی میں اپنی اولاد سے متعلق آخری فریضہ یہ ہے کہ وہ مرتے دم ان کی دنیا سے زیادہ ان کی آخرت کی فکر کرے اور ان کو دینِ حق پر قائم رہنے اور اسی دین پر جینے اور مرنے کی تلقین کرے۔

وصیت اور اس کے جواب کے بعض دقیق پہلو

حضرت یعقوب علیہ السلام نے مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ (تم میرے بعد کس چیز کی عبادت کرو گے؟) میں سوال کے لیے مَا کا لفظ استعمال کر کے سوال میں زیادہ سے زیادہ وسعت پیدا کر دی تاکہ جواب دینے والوں کے ذہن میں معبود سے متعلق اگر کوئی تردد ہو تو وہ اس سوال کے جواب میں ظاہر ہو جائے لیکن ان کے بیٹوں کا جواب واضح کرتا ہے کہ اس وقت تک ان کے ذہن میں معبود سے متعلق کوئی الجھن موجود نہیں تھی انھوں نے نہایت واضح الفاظ میں اس کی توحید کا بھی اقرار کیا اور اسی کو سزاوارِ عبادت اور سزاوارِ اطاعت قرار دیا۔

اس آیت میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ حضرت یعقوب کی اولاد نے اس موقع پر جس اظہارِ فخر و اعتماد کے ساتھ حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے آبا و اجداد میں گنایا ہے، اسی فخر و اعتماد کے ساتھ انھوں نے حضرت اسماعیلؑ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے زمانے تک ان کی اولاد کے اندر حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کے خلاف وہ تعصبات نہیں پیدا ہوئے تھے جو بعد میں پیدا ہو گئے۔

(حاشیہ ۱۳۵) "یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا، مجھے اندیشہ ہے، کہ تم میں سے کوئی بت پرستی کا میلان رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں بارہ بیٹوں نے کہا۔ سن اے اسرائیل، اے ہمارے باپ، ہمارا خدا وہی خدائے لم یزل ہے۔ جس طرح تیرا دلی ایمان ایک خدا پر ہے، اسی طرح ہم سب کا دلی ایمان ایک خدا پر ہے"

گنز برگ کی قصص یہود جلد ۲ صفحہ ۱۴۱

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْـَٔلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۳۴)

خلاصۂ بحث — یہ آیت اس سلسلۂ بیان میں دو مرتبہ آئی ہے۔ ایک یہاں، پھر چند ہی آیات کے بعد پارے کے خاتمے پر جہاں یہ سلسلۂ بیان ختم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ خلاصۂ بحث ہے جو مخاطب کے سامنے رکھنا مقصود ہے۔ بتانا یہ ہے کہ تمہارا سارا فخر و اعتماد اپنے باپ دادا پر رہ گیا ہے، تم سمجھتے ہو کہ تمہارے حصے کے اعمال بھی وہ انجام دیے گئے، اب تمہیں صرف ان کی نیکیوں کے پھل کھانے ہیں، تمہارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں رہ گئی ہے۔ یہ فخر و اعتماد بالکل وہم و خیال پر مبنی ہے، انھوں نے اپنے حصے کی ذمہ داریاں انجام دی ہیں اور ان ذمہ داریوں کو انجام دے کر اپنے رب کے پاس پہنچ چکے ہیں، وہ اپنی نیکیوں کا صلہ خود پائیں گے، اس کا کوئی حصہ بھی تمہیں ملنے والا نہیں ہے۔ تمہاری ذمہ داریاں تمہارے اوپر ہیں، اگر تم ان کو انجام دو گے تو ان کا صلہ پاؤ گے، ورنہ ان کی سزا بھگتو گے۔ خدا کے ہاں تم سے تمہارے آبا و اجداد کے اعمال سے متعلق پرسش نہیں ہونی ہے بلکہ خود تمہارے اپنے اعمال سے متعلق ہونی ہے۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۱۳۵)

اسلام اصل ملتِ ابراہیم ہے — اوپر آیت ۱۱۱ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسلام کی مخالفت کے جوش میں یہود اور نصاریٰ دونوں متحد ہو کر یہ بات کہتے تھے کہ جو شخص ہدایت اور نجات کا طالب ہو وہ یہودیت اختیار کرے یا نصرانیت، یہ دونوں خدائی دین ہیں، یہ تیسرا دین، جو اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے کوئی دین نہیں ہے۔

جواب میں فرمایا۔ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔ (کہہ دو، بلکہ ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو یکسو تھا) ملت کا لفظ یہاں حالتِ نصب میں ہے اس وجہ سے لازماً یہاں کوئی فعل محذوف ماننا پڑے گا۔ عام طور پر لوگ یہاں ماضی کا صیغہ محذوف مانتے ہیں۔ یعنی کہو ہم نے پیروی کی ملتِ ابراہیم کی۔ میں نے یہاں امر کا صیغہ محذوف مانا ہے اور ترجمہ میں اسی کا لحاظ کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہاں یہ جواب جیسا کہ لفظ قُلْ سے واضح ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دلوایا گیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بالخصوص اہل کتاب کی گمراہ کن دعوت کے جواب میں دعوت ہی کا خطاب موزوں تھا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی زبان سے اپنے ایمان و اسلام کا بیان آگے والی آیت میں قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ الآية کے الفاظ سے آ رہا ہے۔ اس وجہ سے اس آیت کو دعوت ہی کے مفہوم میں لینا زیادہ مناسب ہے۔ تیسری یہ کہ عربی زبان میں جب اس طرح منصوب آتا ہے تو اس کا مزاج مخاطب کو کسی بات پر ابھارنے یا اس کو کسی چیز سے ڈرانے کے موقع و محل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے جس کے لیے امر کا صیغہ زیادہ موزوں ہے۔

حنیف کا مفہوم — حَنِيفًا حنف سے ہے جس کے اصل معنی مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں۔ حنیف اس شخص کو کہتے ہیں جو

ہر طرف سے کٹ کر پوری یکسوئی کے ساتھ خدا کا ہو رہا ہے۔ یہاں یہ لفظ ابراہیمؑ سے حال پڑا ہوا ہے۔ اگرچہ ابراہیمؑ حالتِ جر میں ہے اور مجرور سے حال پڑنے کے معاملہ میں اہلِ نحو بہت متردد ہیں لیکن مولانا فراہیؒ نے اپنی تفسیر سورۂ فیل میں نہایت قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ عربی زبان میں یہ طریقہ معروف ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے حنیف کی صفت قرآن مجید نے بار بار استعمال کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین سب ان کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے اور ان تینوں ہی گروہوں کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ جس مذہب پر ہیں یہ حضرت ابراہیمؑ ہی کی وراثت ہے۔ قرآن مجید نے مختلف دلائل سے پہلے ان کے اس دعوے کی تردید کی۔ پھر فرمایا کہ ابراہیمؑ حنیف تھے، وہ خدا کی قائم کردہ صراطِ مستقیم — ملتِ اسلام — سے ہر گز ادھر ادھر نہیں ہوئے، نہ وہ یہودیت اور نصرانیت کی پگڈنڈیوں کی طرف مڑے، نہ مشرکین کی ضلالتوں میں مبتلا ہوئے۔ بلکہ برابر اسلام کی اسی شاہراہ پر قائم رہے جو خدا نے کھولی تھی اور جو خدا تک پہنچانے والی واحد سیدھی راہ ہے۔

قُولُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۶)

امتِ مسلمہ کا موقف — یہ یہود و نصاریٰ کی دعوت کہ یہودی یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے، کا مسلمانوں کی طرف سے جواب ہے کہ تم کہہ دو کہ ہم اللہ اور اللہ کی اس ہدایت پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتری ہے اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوب کی مختلف شاخوں پر ان کے انبیاء کے واسطے سے اتری ہے اور اس ہدایت پر بھی ہمارا ایمان ہے جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی جانب سے ملی۔ ہم ان انبیاء کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں۔

خدا کی شریعت اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے باب میں یہ امتِ مسلمہ یا امتِ وسط کا موقف یا بالفاظ دیگر کلمہ بیان ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امت خدا کی اتاری ہوئی کسی ہدایت کی نہ تو تردید کرتی اور نہ کسی نبی یا رسول کی تکذیب کرتی بلکہ بغیر کسی تفریق و استثناء کے سب پر ایمان رکھتی ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ خدا کے ان نبیوں اور رسولوں نے اپنی اپنی امتوں کو جو تعلیمیں دی تھیں ان کی امتوں نے ان میں یا تو ملاوٹ کر دی یا ان کے کچھ حصہ کو فراموش کر دیا۔ اب اس امت کو جو شریعت ملی ہے وہ خدا کی اصل ہدایت کو اس کی آخری اور مکمل شکل میں پیش کرتی ہے۔

اسباط کا — آیت میں اَسباط کا لفظ سبط کی جمع ہے۔ اس کا لغوی مفہوم بڑھنے اور پھیلنے کا ہے۔ اسی مفہوم کے لحاظ سے ایک باپ کی اولاد اور ان کی مختلف شاخوں کے لیے اس کا استعمال تھا اور نسلِ یعقوب کی مختلف شاخوں کے لیے تو اس کا استعمال اس قدر معروف ہے کہ معلوم ہوتا ہے انھی کے لیے وضع ہوا ہے۔

"لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ" (ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے) کا مطلب یہ ہے کہ ہم

رسولوں کے درمیان تفریق

یہود و نصاریٰ کی طرح یہ نہیں کرتے کہ ان میں سے کسی پر ایمان لائیں اور کسی پر ایمان نہ لائیں۔ اس مطلب کی وضاحت خود قرآن نے دوسری جگہ کر دی ہے۔ يُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۔ ۱۵۰-نساء (اور وہ چاہتے ہیں کہ تفریق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ سے کوئی راہ پیدا کریں) اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء میں سے کسی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا سب کے انکار کے ہم معنی ہے اور یہ صرف نبیوں اور نبیوں ہی میں تفریق نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول میں بھی تفریق ہے۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۱۳۷)

یہود اور نصاریٰ کے لیے نجات کی راہ

یعنی اگر یہی کلمۂ جامعہ وہ بھی قبول کر لیں جس طرح تم تمام انبیاء اور تمام ہدایتوں پر ایمان لائے ہو اسی طرح یہ بھی ایمان لائیں تو بلا شبہ وہ راہ یاب ہوں گے۔ راہ یاب ہونے کا راستہ یہودی یا نصرانی ہونا نہیں ہے جیسا کہ یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں، بلکہ اس کا راستہ یہی ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔ یعنی تمام نبیوں اور تمام رسولوں پر بلا کسی تفریق و تعصب کے ایمان لانا۔ اگر وہ اس چیز سے انکار کرتے ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ تمہاری مخالفت کے درپے ہیں اور اتحاد و اتفاق کی راہ چھوڑ کر یہ اللہ اور اس کے رسولوں کے خلاف اپنی ایک الگ پارٹی کھڑی رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو انھیں ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر چلنے دو، ان کے مقابلہ کے لیے تمہاری طرف سے اللہ کافی ہے۔ آخر میں اپنی صفات میں سے سمیع و علیم کا حوالہ دینے کا مقصد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلانا ہے کہ تمہاری مخالفت میں یہ جو سازشیں اور ریشہ دوانیاں بھی کریں تم ان سے مطلق ہراساں نہ ہو، جو خدا تمہاری طرف سے ان سے لڑنے کھڑا ہوا ہے وہ سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ (۱۳۸)

یہود و نصاریٰ کو دعوت

یہود و نصاریٰ کو مخاطب کر کے دعوت دی گئی ہے کہ اگر اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہو تو یہودیت و نصرانیت کو چھوڑ کر یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ یہ کلمۂ جامعہ جس کا اوپر ذکر گزرا، اپنے اندر اللہ کی تمام ہدایتوں اور اس کے تمام نبیوں اور تمام رسولوں کو سمیٹے ہوئے ہے یہی کلمہ ہے جس سے زندگی پر خدا کا اصلی رنگ چڑھتا ہے، پس اگر زندگی کو خدا کے رنگ میں رنگنا ہے تو اس رنگ میں رنگو، اس رنگ سے بڑھ کر کس کا رنگ ہو سکتا ہے! اس میں یہود و نصاریٰ کے بپتسمہ کی طرف ایک تعریض بھی ہے اور بغیر کسی فعل کے لفظ صبغۃ کا منصوب ہونا ہمارے نزدیک اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں کوئی ایسا صیغہ محذوف مانا جائے جو ابھارنے اور جوش دلانے کے مضمون پر مشتمل ہو۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ (۱۳۹)

یہود و نصاریٰ سے اظہارِ برأت

یعنی اگر اس کلمۂ جامعہ کو نہیں مانتے جو تمام نبیوں اور رسولوں اور اللہ کی اتاری ہوئی تمام ہدایتوں پر ایمان اور اللہ ہی کی بندگی و اطاعت کے اقرار پر مشتمل ہے بلکہ اس بات پر اڑ گئے ہیں کہ خدا کے بعض نبیوں کو مانیں گے بعض کو نہیں مانیں گے، اس کی بعض ہدایتوں کو قبول کریں گے، بعض کو نہیں قبول کریں گے درآنحالیکہ یہ تمام انبیا و رسل خدا ہی کے بھیجے ہوئے اور یہ ساری ہدایتیں اسی کی نازل کی ہوئی ہیں تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ خود خدا کے بارے میں تم سے جھگڑ رہے ہیں، گویا ان کا خدا کوئی اور ہے اور تمہارا خدا کوئی اور، حالانکہ تمہارا اور ان کا رب ایک ہی ہے۔ اگر انھوں نے فی الواقع بات اس حد تک بڑھا دی ہے کہ اپنا خدا بھی الگ بنا لیا ہے تو اب ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو بلکہ اب یہ بحث و گفتگو بالکل ختم کر کے صاف صاف کہہ دو کہ ہمارے اعمال ہمارے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ۔ یعنی اب ہم تمہارے ساتھ کوئی بحث و مناظرہ کرنا بالکل لاحاصل سمجھتے ہیں۔ جب تم خدا کے بارے میں بھی یکسو نہیں ہو تو ہم تم سے کوئی بحث کرنے کے بجائے صرف یہ واضح کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ ہم تو خالص اپنے رب ہی کے لیے ہیں۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ کَانُوْا ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰہُ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَھَادَۃً عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰہِ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۴۰)

یہ یہود و نصاریٰ سے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کے باب میں ان کے دعوے کو پھر دہرانے کا مطالبہ بطور اتمامِ حجت کے کیا ہے۔ یعنی کیا فی الواقع تم یہ سنگین بات کہتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کے اخلاف یہودی یا نصرانی تھے؛ پھر سرزنش کے انداز میں سوال کرایا ہے کہ ان لوگوں کے مذہب و عقیدہ کا حال تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؛ پھر بانداز حسرت و افسوس فرمایا کہ ان لوگوں سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو چھپائیں، یعنی تورات موجود ہے اس میں ان لوگوں کے مذہب و عقیدہ کی تفصیلات موجود ہیں، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے زمانوں میں یہودیت اور نصرانیت کا کہیں نام و نشان بھی پایا نہیں جاتا تھا۔ یہ نام تو تم نے ان کے صدیوں بعد گھڑے ہیں۔ خدا نے ہمیشہ اپنے نبیوں اور رسولوں پر وہی دین اتارا ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اس کے بعد نہایت سخت دھمکی کے انداز میں فرمایا کہ یہ اللہ کے دین کے خلاف جو شرارتیں تم کر رہے ہو خدا ان سے بے خبر نہیں ہے، اس کا انجام تمہارے سامنے آئے گا۔

تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۴۱)

بعینہٖ یہی آیت اوپر بھی گزر چکی ہے۔ جس سیاق میں یہ اوپر آئی ہے اسی سیاق میں یہاں بھی آئی ہے۔

وہاں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر آیت ۱۴۴۔

۴۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی

مذکورہ بالا مجموعۂ آیات کی آیت ۱۲۹ کی وضاحت اگرچہ بقدرِ ضرورت ہم اوپر کر آئے ہیں، لیکن چونکہ اس کا تعلق براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی سے ہے جن کے بارے میں منکرین سنت پچھلے اس زمانے میں بعض بہت بے ہودہ سوالات اٹھا دیے ہیں اس وجہ سے ہم اس آیت پر یہاں مزید روشنی ڈالیں گے۔

منکرین سنت کا دعویٰ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی ذمہ داری بحیثیت پیغمبر کے صرف یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ پر جو وحی نازل فرمائے آپ وہ لوگوں تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد بحیثیت رسولؐ کے آپؐ کا فرض ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر کوئی ذمہ داری ہی ہے اور نہ وحی الٰہی یعنی بالفاظِ دیگر قرآن کے سوا آپ کے کسی قول یا فعل کی کوئی مستقل شرعی اہمیت ہی ہے۔ ہمارے نزدیک منکرین سنت کے اس دعوے کی تردید کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت ہی کافی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی کی جو تفصیل کی گئی ہے اس میں صرف لوگوں کو قرآن سنا دینے ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ متعدد دوسری چیزوں کا بھی ذکر ہے اور اس آیت سے واضح ہے کہ ان چیزوں کا ذکر بھی آپ کے فرائض نبوت ہی کی حیثیت سے ہوا ہے۔ آیت پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ فرمایا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا
عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ
أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۱۲۹۔ بقرہ)

اے ہمارے رب، ان میں بھیج ایک رسول انھی
میں سے جو ان کو پڑھ کر سنائے تیری آیتیں اور
ان کو تعلیم دے کتاب اور حکمت کی اور ان کا تزکیہ
کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ اس دعا کے الفاظ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے فرمائی تھی۔ اسی دعا کے مطابق جب آنحضرتؐ کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اہل عرب پر اپنے اس احسانِ عظیم کا اظہار یوں فرمایا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا
مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا
مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ
(۲۔ جمعہ)

وہی خدا ہے جس نے بھیجا امیوں (بنی اسماعیل)
میں ایک رسول انھی میں سے جو ان کو پڑھ کر سناتا
ہے اس کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے۔ اور
ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک
یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

ان دونوں آیتوں پر غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو گی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جن صفات کے

پیغمبر کے لیے دعا کی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعینہا انھیں صفات کے ساتھ مبعوث ہوئے اور آپ نے امتیوں کے اندر عملاً وہ سارے کام انجام دیے بھی جن کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی تھی۔

ان دونوں ہی مقامات میں جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض کا تعلق ہے ان کے بیان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف یہ کہ اوپر والی آیت میں تزکیہ کا ذکر سب سے آخر میں ہے اور دوسری آیت میں تعلیم کتاب وحکمت سے پہلے لیکن تلاوتِ آیات کے بعد۔ یہ فرق کوئی خاص اہمیت رکھنے والا فرق نہیں۔ تزکیہ کے مقدم ومؤخر ہونے کی وجہ ایک دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں[1] کہ تزکیہ تمام دین وشریعت کی غایت اور بعثتِ انبیا کا اصل مقصود ہے اور جو چیز کسی کام میں غایت ومقصود کی حیثیت رکھتی ہے وہ عمل میں اگرچہ مؤخر ہوتی ہے لیکن ارادہ میں مقدم ہوتی ہے اس وجہ سے اصل اسکیم میں اس کا ذکر مقدم بھی ہو سکتا ہے اور مؤخر بھی۔ چنانچہ اسی اعتبار سے تزکیہ کا ذکر ایک آیت میں مقدم ہوا ہے دوسری میں مؤخر۔ اس ترتیب کے فرق کے علاوہ دوسری ساری باتیں دونوں آیتوں میں بالکل مشترک ہیں

نبی صلعم کے فرائض — اور ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل فرائض بتائے گئے ہیں۔

۱۔ تلاوتِ آیات

۲۔ تعلیم کتاب وحکمت

۳۔ تزکیہ

تلاوت آیات — ان میں سے جہاں تک پہلی چیز — تلاوتِ آیات — کا تعلق ہے، ہم بلا کسی بحث ونزاع کے تسلیم کیے لیتے ہیں کہ اس سے مراد لوگوں کو قرآن مجید سنانا ہی ہے۔ دین ودانش دونوں ہی سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ خدا کے ایک رسول کا اولین فریضہ یہی ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے بندوں تک اس کی وحی کو پہنچائے لیکن اس تلاوت کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ اس طرح نہیں ہوئی ہے کہ لوگوں کو پوری کتاب بیک دفعہ سنا دی گئی ہو بلکہ یہ ۲۳ سال کی وسیع وطویل مدت میں تھوڑی تھوڑی کر کے اتاری گئی اور اسی تدریج کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سبقاً سبقاً اس کی تعلیم دی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کتاب کوئی سہل اور سپاٹ کتاب نہیں ہے بلکہ یہ نہایت گہرے علوم ومعارف اور اعلیٰ اسرار وحقائق کی کتاب ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے یہ ضروری ہوا کہ یہ سبق سبق کر کے پڑھائی جائے تاکہ لوگوں کی اس کے خزانوں تک رسائی ہو سکے۔ اس حقیقت کو قرآن نے یوں واضح کیا ہے۔ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ (۱۰۶-۱۷) اور ہم نے اس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا تاکہ تم لوگوں کو اس کو وقفہ وقفہ کے ساتھ سناؤ۔

---

[1] اس نکتہ کی وضاحت کے لیے ہماری کتاب "تزکیۂ نفس" کی فصل اول ملاحظہ ہو۔

تعلیم کتاب و حکمت

قرآن حکیم کی مذکورہ بالا خصوصیت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ایک قاری کی طرح صرف سنا دینے ہی پر اکتفا نہ فرمائیں بلکہ ایک معلم کی طرح پوری دلسوزی اور پوری شفقت کے ساتھ لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیں۔ چنانچہ اسی بنا پر تلاوت کے ساتھ ساتھ آپؐ کا دوسرا فرض تعلیم کتاب بتایا گیا۔ یہ تعلیم کتاب کا فریضہ آپؐ کے فرائض نبوت ہی کا ایک جزو اور آپؐ کا معلم ہونا آپؐ کے منصب رسالت ہی کا ایک پہلو ہے۔ اس وجہ سے اپنی اس حیثیت میں آپؐ نے جو کچھ لوگوں کو سکھایا اور بتایا اس کو آپؐ کے فرائض نبوت سے نہ تو خارج کیا جا سکتا اور نہ اس کا درجہ اصل کتاب کے مقابل میں گرایا ہی جا سکتا۔

اب غور فرمائیے کہ اس تعلیم کے تقاضے کیا کیا ہو سکتے ہیں؟

اس کا ایک بالکل ابتدائی تقاضا تو یہ ہے کہ قرآن میں جو شرعی اصطلاحات مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، صیام، طواف، عمرہ، نکاح، طلاق وغیرہ استعمال ہوئی ہیں لیکن ان کی عملی شکلیں واضح نہیں کی گئی ہیں ان کو آپ اچھی طرح لوگوں پر واضح کر دیں تاکہ لوگ عملی زندگی میں ان کو اختیار کر سکیں اور ان کے مختلف اجزاء کا دین میں جو مقام ہے اس کو متعین کر سکیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ قرآن میں فکر و عمل کی تصحیح کے جو اصول دیے گئے ہیں ان کے لوازم و تضمنات کے ضروری گوشے واضح کر دیے جائیں تاکہ ان ابواب میں مزید رہنمائی حاصل کرنے کے لیے وہ روشنی کے میناروں کا کام دیں۔

اسی طرح ایک چیز یہ بھی ہے کہ قرآن میں جو احکام شریعت دیے گئے ہیں ان کی حیثیت صرف اصولی احکام کی ہے۔ ان میں سے ہر باب کے تحت بے شمار صورتیں ایسی آتی ہیں جن میں احکام کا تعین معلم کی رہنمائی اور اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اجتہاد کے لیے امت کو بہترین رہنمائی ان مثالوں ہی سے مل سکتی تھی جو اس کتاب کے معصوم معلم نے اپنے اجتہاد سے قائم کیں۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ قرآن اجتماعی زندگی کا ایک نظام بھی پیش کرتا ہے لیکن اس کے صرف چاروں گوشے متعین کر دینے والے اصول دے کر اس کی جزئیات و تفصیلات اور اس کے عملی ڈھانچے کے معاملہ کو معلم کی ذمہ داری پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس چیز کو بھی لوگوں نے حضورؐ ہی کی تعلیم سے سیکھا۔

ان کے علاوہ ایک اہم چیز یہ بھی ہے کہ زیر بحث آیت میں صرف تعلیم کتاب ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ تعلیم حکمت کا بھی ذکر ہے۔ تعلیم حکمت تعلیم شریعت سے بہت وسیع چیز ہے۔ اس سے مراد، جیسا کہ اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں، وہ دانش و بینش اور وہ بصیرت و معرفت ہے جو زندگی کے ان بعید گوشوں میں بھی انسان کی رہنمائی کرتی ہے جہاں رہنمائی کرنے والی اس کے سامنے کوئی اور روشنی نہیں ہوتی۔

اب غور کیجیے کہ یہ ساری باتیں تعلیم کے تقاضوں میں سے ہیں یا نہیں؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ان ساری چیزوں کی تعلیم کے لیے بحیثیت ایک خدائی معلم کے مامور تھے یا نہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا جواب اثبات ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے تو غور کیجیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس حیثیت میں جو کچھ کہا اور کیا ہے اس کو آپ کے فرائض نبوت کے دائرے سے الگ کس طرح کیا جا سکتا ہے اور اس کی اہمیت کو گھٹایا کس طرح جا سکتا ہے؟ اور پھر اس بات پر غور کیجیے کہ احادیث میں ان چیزوں کے سوا اور کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت معلم کتاب و حکمت ہونے کے بتائی ہیں یا ان پر عمل کر کے دکھایا ہے؟

اسی طرح اب تزکیہ پر غور کیجیے۔ تزکیہ کا عمل ظاہر ہے کہ تعلیم سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور وسیع الاطراف ہے۔ اوپر ہم واضح کر آئے ہیں کہ اس لفظ میں پاک صاف کرنے اور نشوونما دینے، دونوں کا مفہوم شامل ہے۔ یہ بہ یک وقت علمی بھی ہے اور عملی بھی، ظاہری بھی ہے باطنی بھی، مادی اور جسمانی بھی ہے اور عقلی و روحانی بھی، نیز یہ انفرادی بھی ہے اور سماجی و اجتماعی بھی۔ مختصراً چند بنیادی تقاضے اس کے بھی سامنے رکھ لیجیے۔

اس کا ایک ضروری تقاضا تو یہ ہے کہ لوگوں کے اذہان، اعمال اور اخلاق پر خوردبینی نگاہ ڈال کر ان جراثیم سے ان کو پاک کیا جائے جو روحانی اور اخلاقی بیماریوں کے سبب بنتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے اندر ان نیکیوں کی تخم ریزی کی جائے جو انسان کے ظاہر و باطن کو سنوارتی اور اس کے عادات و خصائل کو مہذب بناتی ہیں۔

اس کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ ہر خوبی ان کے اندر جڑ پکڑ جائے اور ہر برائی کے خلاف طبیعتوں میں نفرت بیٹھ جائے۔

اس کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ اس تعلیم و تربیت سے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے جو تزکیہ نفوس کے لیے ایک وسیع تربیت گاہ کا کام دینے لگ جائے، جو شخص بھی اس میں اٹھے اسی ماحول کے اثرات لیے ہوئے اٹھے اور جو شخص بھی اس کے اندر داخل ہو جائے اس پر اسی کا رنگ چڑھ جائے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ خیال بڑا مغالطہ انگیز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضۂ منصبی بحیثیت رسول کے صرف یہ تھا کہ آپ لوگوں کو قرآن پہنچا دیں۔ قرآن کا پہنچا دینا آپ کے فرائض منصبی کا صرف ایک جزو تھا۔ اس کے علاوہ آپ کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ آپ ایک معلم کی طرح لوگوں کو اس قرآن کی تعلیم دیں، اس کے مضمرات و تضمنات، اس کے اجمالات و اشارات اور اس کے اسرار و حقائق لوگوں پر واضح کر دیں، اس کے عجائب حکمت کے خزانوں تک لوگوں کی رہبری فرمائیں۔ اسی طرح آپ کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ آپ قرآنی حکمت کی روشنی میں افراد و معاشرہ کی تربیت کے اصول و فروع بھی متعین فرمائیں اور ان اصولوں کے مطابق لوگوں کا تزکیہ بھی کریں۔

یہ سارے کام آپ کے فرائض نبوت میں شامل تھے۔ اس وجہ سے ان مقاصد کے تحت آپ نے جو کچھ بتایا یا جو کچھ کیا اس سب کو امت نے اسی طرح واجب التعمیل سمجھا جس طرح قرآن کو سمجھا اور اسی اہمیت کے ساتھ اس کی حفاظت اور اس کے نقل و روایت کا اہتمام کیا۔ اس کے کسی جزو کے متعلق یہ سوال تو اٹھایا جا سکتا ہے کہ اس کا انتساب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پوری صحت کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں لیکن اس کو دین و شریعت سمجھنے سے انکار کرنا خود قرآن مجید کے انکار کے ہم معنی ہے۔

۵۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۴۲-۱۶۲

منصب امامت سے یہود کی معزولی کے اسباب و وجوہ کی تفصیل اس مجموعہ آیات پر ختم ہو رہی ہے۔ اب گویا ان کو معزول کر کے ایک نئی امت کے قیام کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ یہ امت امتِ وسط ہے یعنی یہ اس صراط مستقیم پر قائم ہے جو دینِ حق کی اصل خدائی شاہراہ ہے۔ اس کی ملت، ملت ابراہیم اور اس کا قبلہ، قبلۂ ابراہیمی بیت اللہ الحرام ہے۔ اس کا فریضۂ منصبی یہ ہے کہ جس طرح پیغمبرؐ نے اس کے سامنے اللہ کے اصلی دین کی گواہی دی ہے اسی طرح یہ خلق خدا کے سامنے اللہ کے دین کی شہادت دینے والی ہو گی۔

اِن آیات کے زمانۂ نزول تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان نمازوں میں بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے۔ اب ملت ابراہیمی کے تعلق سے ضروری ہوا کہ اس امت کا قبلہ مسجد حرام ہو۔ اس وجہ سے تحویل قبلہ کا حکم ہوا۔ پھر اس ردِ عمل کی تفصیلات بیان ہوئیں جو اس واقعہ کا یہود اور مسلمانوں کے بعض گروہوں پر ہوا اور ساتھ ہی تحویلِ قبلہ کی حکمتیں اور قبلہ سے متعلق وہ ضروری ہدایات بیان ہوئیں جو مسلمانوں کو قبلہ کے باب میں جادۂ مستقیم پر استوار رکھنے کے لیے ضروری تھیں اور جن کا اہتمام نہ رکھنے کی وجہ سے یہود اور نصاریٰ اصل قبلہ سے منحرف ہو گئے۔

پھر ایک مستقل امت کی حیثیت سے مسلمانوں سے یہ عہد لیا گیا کہ تحویلِ قبلہ کے بعد اب تم یہود و نصاریٰ سے الگ ایک مستقل امت کی حیثیت سے ممتاز ہو گئے۔ جس طرح تمہارا رسول ایک الگ رسول ہے جو ان تمام صفات کا مظہر ہے جن کے لیے ابراہیمؑ نے دعا کی تھی اسی طرح تمہارا قبلہ ابراہیمی قبلہ ہے۔ اب تم ان یہود سے ذرا بھی نہ ڈرو، صرف اللہ ہی سے ڈرو تاکہ تمہیں اللہ کے دینِ کامل کی نعمت نصیب ہو اور تمہارے لیے شریعتِ الٰہی کی راہیں کھلیں۔ تم مجھے یاد رکھو گے تو میں تمہیں یاد رکھوں گا، میری شکر گزاری کرتے رہنا، ناشکری نہ کرنا۔

اس کے بعد ان متوقع خطرات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ایک مستقل امت کی حیثیت سے نمایاں ہونے کے بعد مخالفین و معاندین کی طرف سے پیش آ سکتے ہیں اور ان خطرات کے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو جن تیاریوں اور جن ایمانی و اخلاقی اسلحہ سے مسلح ہونے کی ضرورت ہے، ان کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔

آخر میں خانہ کعبہ کے تعلق سے اس حقیقت کو واضح کردیا کہ خانہ کعبہ کی طرح صفا اور مروہ بھی اللہ کے شعائر میں داخل ہیں اس لیے کہ یہی مروہ ہے جو اصل قربان گاہ ہے، لیکن یہود نے تحریف کے ذریعہ سے ان نشانات راہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق اس گھر سے بالکل کاٹ دیں۔ یہود اپنی اس شرارت کے سبب سے اس بات کے مستحق ہیں کہ ان پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہو۔

اس تمہید کے بعد اب آیات تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا
۱۴۲-۱۴۷ عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا
جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ
مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ
هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ إِيْمَانَكُمْ ؕ إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ
لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ
قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ
حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَإِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ
اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ
بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ

مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ وقف لازم
الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا
مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وقف منزل
فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا ع
الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى وقف النبي صلی اللہ علیہ وسلم
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ
شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۗ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ
وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ ۛ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ
مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ ۛ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ معانقة
وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ ع
الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ

وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ
مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ
صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ إِنَّ
الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَإِنَّ اللّٰهَ
شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ
وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ أُولٰٓئِكَ
يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَأَصْلَحُوْا
وَبَيَّنُوْا فَأُولٰٓئِكَ أَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾
إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ
اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا
يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

ترجمہ آیات ۱۴۲-۱۶۲

اب جو بے وقوف لوگ ہیں وہ کہیں گے کہ ان لوگوں کو اس قبلہ سے جس پر یہ پہلے
تھے کس چیز نے روگردان کر دیا۔ کہہ دو مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے
سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر
گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔ اور جس قبلہ پر تم تھے ہم نے اس کو
صرف اس لیے ٹھہرایا تھا کہ ہم الگ کر دیں ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کرنے والے ہیں

ان لوگوں سے جو بیٹھ پیچھے پھر جانے والے ہیں۔ بے شک یہ بات بھاری ہے مگران لوگوں پر جن کو اللہ ہدایت نصیب کرے۔ اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تمھارے ایمان کو ضائع کرنا چاہے اللہ تو لوگوں کے ساتھ بڑا مہربان اور رحیم ہے۔ ۱۴۲-۱۴۳

ہم آسمان کی طرف تمھارے رُخ کی گردش دیکھتے رہے ہیں، سو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہم تمھیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیں جس کو تم پسند کرتے ہو۔ تو تم اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کرو۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو تو اپنے رخ اسی کی طرف کرو۔ جن لوگوں کو کتاب ملی وہ جانتے ہیں کہ یہی ان کے رب کی جانب سے حق ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اور اگر تم اہل کتاب کے سامنے ہر قسم کی نشانیاں بھی پیش کر دو تو بھی یہ تمھارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے۔ اور اگر تم اس علم کے بعد جو تمھارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے تو بلاشبہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ جن کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ البتہ ان میں ایک گروہ ہے جو جانتے بوجھتے حق کو چھپاتا ہے۔ یہی حق ہے تمھارے رب کی جانب سے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بن جانا۔ ۱۴۴-۱۴۷

ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف رخ کرنے والا ہے تو تم نیکیوں کی راہ میں سبقت کرو۔ جہاں کہیں بھی تم ہوگے، اللہ تم سب کو جمع کرے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۴۸

اور جہاں کہیں سے بھی تم نکلو تو اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف کرو۔ بے شک یہی

حق ہے تمھارے رب کی جانب سے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۱۴۹

اور جہاں کہیں سے بھی نکلو تو اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف کرو۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو تو اپنے رخ اسی کی جانب کرو تاکہ لوگوں کے لیے تمھارے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہے، مگر جو ان میں سے ظالم ہیں تو ان سے نہ ڈرو مجھی سے ڈرو۔ اور تاکہ میں اپنی نعمت تم پر تمام کردوں اور تاکہ تم راہ یاب ہو۔ چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے جو تمھیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ تو تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا۔ میری شکرگزاری کرتے رہنا، میری ناشکری نہ کرنا۔ ۱۵۰-۱۵۲

اے ایمان والو، ثابت قدمی اور نماز سے مدد چاہو۔ بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے۔ بے شک ہم تمھارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف، بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور ان ثابت قدموں کو خوش خبری سنادو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ راہ یاب ہونے والے ہیں۔ ۱۵۲-۱۵۷

بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں تو جو بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ ان کا طواف کرے اور جس نے کوئی نیکی خوش دلی کے ساتھ کی تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے۔ بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ہماری اتاری ہوئی

کھلی کھلی نشانیوں اور ہماری ہدایت کو، بعد اس کے کہ ہم نے وہ کتاب میں کھول کر لوگوں کے لیے بیان کر دی تھیں تو وہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور جن پر لعنت کرنے والے لعنت کریں گے۔ ۱۵۸-۱۵۹

البتہ جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اصلاح کر لی اور واضح طور پر بیان کر دیا تو ان کی توبہ میں قبول کروں گا۔ میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت ہی ملے گی۔ ۱۶۰-۱۶۲

۱۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۱۴۲)

یہود کو بے وقوف قرار دینے کی وجہ

سُفَہَاء سفیہ کی جمع ہے جس کے معنی نادان اور بے وقوف کے ہیں۔ یہاں اس سے اشارہ یہود کی طرف ہے۔ یہود کے بے وقوف قرار دینے کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم آیت وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ ۱۳۰۔ بقرہ (اور ابراہیم کی ملت سے اس کے سوا کون بے رغبتی ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے) میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہود ایک طرف تو ملت ابراہیم کے پیرو ہونے کے مدعی تھے دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیم و دعوت کے سخت دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے حالانکہ آپ اصل ملت ابراہیمی کے داعی بن کر تشریف لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی احمقانہ حرکت نادان اور بے وقوف لوگ ہی کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے قرآن نے ان کے لیے سفہا کا لفظ استعمال کیا۔

تحویل قبلہ کے متوقع ردعمل کی طرف پہلے سے اشارہ

یہ تمہید ہے تحویل قبلہ کے اس حکم کی جس کا ذکر آگے دو آیتوں کے بعد آ رہا ہے۔ اس تمہید میں اشارہ ہے اس ردعمل کی طرف جو اس حکم کا یہود اور منافقین پر ہوگا۔ اصل حکم سے پہلے اس کے ردعمل کے بیان کرنے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم کوئی معمولی حکم نہیں تھا۔ اسلام کے مخالفوں اور اس کے حامیوں دونوں ہی کے اندر یہ خاصی ہلچل پیدا کر دینے والا حکم تھا۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس حکم سے پہلے اس

کے متوقع ردِ عمل کے لیے ذہنوں کو تیار کر دیا جائے۔ دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ اس سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذریت کی جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر ہر قاری کے سامنے آچکی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد کا مذہب اسلام تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ میں عبادتِ الٰہی کے لیے جو مرکز تعمیر کیا وہ ان کی ساری ہی ذریت کا مرکز اور قبلہ تھا۔ یہاں تک کہ بیت المقدس بھی جب تعمیر ہوا تو اس کی تعمیر بھی اس طرح ہوئی کہ بنی اسرائیل کی قربانیوں کا رُخ خانہ کعبہ کی طرف ہو۔ یہ تمام باتیں بالکل غیر مبہم طور پر اس بات کو ظاہر کر رہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا ایک بالکل عارضی معاملہ تھا اور اب وقت آگیا ہے کہ آپ کو بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم دے دیا جائے۔ اس وجہ سے یہ تمہید ایک ایسے واقعہ کی تمہید تھی جس کے واقع ہونے کا انتظار یہود و نصاریٰ کو بھی تھا اور مسلمانوں کو بھی۔

تحویلِ قبلہ پر یہود کا اعتراض

مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا (ان کو ان کے اس قبلہ سے کس چیز نے ہٹا دیا جس پر وہ اب تک تھے) یہ تحویلِ قبلہ کے حکم پر اہلِ کتاب کے ردِ عمل کا بیان ہے کہ اب تک یہ لوگ مسلمانوں پر جو اعتراضات کرتے رہے ہیں ان کا بیان اوپر ہو چکا ہے۔ اب جب قبلہ بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کو قرار دیا جائے گا تو یہ اس پر بھی ہنگامہ اٹھائیں گے کہ مسلمانوں نے تمام انبیاء کے قبلہ —— بیت المقدس —— کو جس کی طرف رُخ کر کے وہ اب تک نماز پڑھتے رہے تھے، چھوڑ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد یہ الگ کیوں بنائی؟

اعتراض کا جواب

قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (کہہ دو، مشرق اور مغرب دونوں اللہ ہی کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھا دیتا ہے) یہ یہود و نصاریٰ کے مذکورہ بالا اعتراض کا جواب ہے کہ تمہیں اب قبلہ سے کیا واسطہ؟ تم تو اصل قبلہ کے بجائے مشرق و مغرب کے چکر میں پھنس گئے ہو، نصاریٰ مشرق کو اپنا قبلہ قرار دے بیٹھے ہیں اور یہود مغرب کو، حالانکہ سمتوں میں سے کسی سمت کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی خصوصیت کی کوئی وجہ نہیں، اللہ تعالیٰ تو ہر سمت میں ہے، مشرق و مغرب، شمال و جنوب سب اسی کی فرمانروائی میں ہیں۔ اس کے ساتھ اگر خصوصیت ہو سکتی ہے تو کسی ایسے گھر ہی کو ہو سکتی ہے جس کو وہ مخصوص فرمائے اور قبلہ قرار دے۔ یہ خصوصیت رکھنے والا گھر ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا تعمیر کردہ گھر مکہ کا بیت اللہ ہے۔ وہی تمام اولادِ ابراہیمؑ کا قبلہ قرار پایا تھا اور اسی کو قبلہ قرار دے کر بیت المقدس کی بھی تعمیر ہوئی تھی۔ اس حقیقت کے نشانات و آثار تورات میں موجود تھے۔ لیکن تم نے تعصب کی وجہ سے یہ نشانات مٹا دیے تھے۔ لیکن تمہاری ان مخالفانہ کوششوں کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے جن کو چاہا سیدھا راستہ دکھا دیا اور اب وہ تمہارے پیدا کردہ پیچ و خم سے

نکل کر ایک صراطِ مستقیم پر چل کھڑے ہوئے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ كَذٰلِكَ کا اشارہ اوپر والے معاملہ کی طرف ہے یعنی جس طرح ہم نے قبلہ کے معاملہ میں یہود و نصاریٰ کے پیدا کردہ پیچ و خم اور مشرق و مغرب کے چکر سے تمھیں نکال کر صراطِ مستقیم کی طرف تمھاری رہنمائی کی، اسی طرح ہم نے تم کو یہودیت اور نصرانیت کی پگڈنڈیوں سے بچا کر دین کی بیچ شاہراہ[1] پر قائم رہنے والی امت بنایا تاکہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دیں اور تم خلقِ خدا پر اللہ کے دین کی گواہی دو۔

امتِ وسط

وَسَط لفظ وَلَد کی طرح مذکر اور مؤنث، واحد اور جمع سب کے لیے آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ شے جو دو طرفوں کے درمیان بالکل وسط میں ہو۔ یہیں سے اس کے اندر بہتر ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا اس لیے کہ جو شے دو کناروں کے درمیان ہو گی وہ نقطۂ توسط و اعتدال پر ہو گی اور یہ اس کے بہتر ہونے کی ایک فطری دلیل ہے۔ امتِ مسلمہ کو امتِ وسط کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ امت ٹھیک ٹھیک دین کی اس بیچ شاہراہ پر قائم ہے جو اللہ تعالیٰ نے خلق کی رہنمائی کے لیے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے کھولی ہے اور جو ابتدا سے ہدایت کی اصلی شاہراہ ہے۔ یہود و نصاریٰ اللہ کے نبیوں میں تفریق کر کے اس شاہراہ سے ہٹ گئے اور انھوں نے یہودیت و نصرانیت کی پگ ڈنڈیاں نکال لیں، اسی طرح اصل قبلہ سے منحرف ہو کر مشرق و مغرب کے جھگڑوں میں پڑ گئے۔ لیکن یہ امت ان کج پیچ کی راہوں میں بھٹکنے کے بجائے دین کی اصلی راہ پر قائم ہے۔ اس کا کلمہ تفریق کے بجائے وحدت کا کلمہ ہے جس کا حوالہ اوپر ان الفاظ میں گزر چکا ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۶ - بقرہ)

تم کہو کہ ہم تو اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر جو ہم پر اتاری گئی اور اس چیز پر جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور اس چیز پر ایمان لائے جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے ملی۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

---

[1] یہاں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے آیات ۱۱۵ اور ۱۲۵ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اسی طرح اس امت نے قبلہ کے معاملہ میں مشرق و مغرب کے جھگڑے میں پڑنے کے بجائے اس قبلہ ابراہیمی کی پیروی کی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہدِ مبارک سے برابر تمام نبیوں اور رسولوں کا قبلہ رہا، چنانچہ بیت المقدس کی تعمیر بھی، جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے اسی کو قبلہ قرار دے کر ہوئی لیکن یہود نے بربنائے تعصب اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی۔

دین کے معاملہ میں امت مسلمہ کی یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے قرآن میں دوسری جگہ اس امت کو خیرِ امت (بہترین امت) کہا گیا ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ جو چیز ٹھیک نقطۂ اعتدال و توسط پر ہوگی وہ لازماً بہترین بھی ہوگی۔ یہ امت چونکہ امتِ وسط ہے اس وجہ سے یہ خیرِ امت بھی ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہود کا دین بہت سخت اور نصاریٰ کا دین بہت نرم ہے۔ اسلام ان دونوں کے درمیان ایک معتدل دین ہے اس وجہ سے اس دینِ معتدل کی حامل امت کو امتِ وَسَط قرار دیا گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے یہود و نصاریٰ دونوں کا دین ایک ہی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت پر تورات کی پابندی اسی طرح واجب قرار دی تھی جس طرح اس کی پابندی یہود پر واجب تھی۔ اگر انھوں نے اس سے الگ کوئی تعلیم دی ہے تو اس کی نوعیت تورات سے جدا کسی مستقل تعلیم کی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت صرف حکمتِ دین اور روحِ دین کی ہے۔ یہود اپنی دنیا پرستی کی وجہ سے دین کی اصل حقیقتوں سے ہٹ کر صرف رسوم و قیود کے غلام اور الفاظ و کلمات کے پرستار بن کے رہ گئے تھے، حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو حکمتِ دین سے آشنا کیا۔ انجیل تورات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ تورات ہی کے رموز و حقائق کی طرف ایک حکیمانہ توجہ دلاتی ہے۔

امتِ وسط کا فریضۂ منصبی

لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کے گواہ بنو اور رسول تمہارے اوپر اللہ کے دین کا گواہ بنے) یہ امتِ وسط کے فریضۂ منصبی اور اس کے قیام کی ضرورت کا بیان ہے۔ اوپر کی تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو رہنمائی کے منصب پر مامور کیا تھا انھوں نے خدا کے میثاق کو توڑ دیا، اس کی شریعت میں تبدیلیاں کر دیں، اس کی صراطِ مستقیم گم کر دی، اس کے مقرر کیے ہوئے قبلہ سے منحرف ہو گئے اور جن شہادتوں کے وہ امین بنائے گئے تھے ان کو انھوں نے چھپایا۔ ایسے حالات میں عالمِ انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو یہی ہو سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی امت برپا کرے جو خدا کی سیدھی راہ پر قائم ہو، جو اللہ کے رسول کے ذریعہ سے اصل دین کی حامل بنے اور پھر رہتی دنیا تک لوگوں کے سامنے اس دین کی گواہی دے۔

" رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو " سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ شہادت علی الناس

کا جو فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر، بحیثیت رسول کے تھا آپ کے بعد آپ کی امت کی طرف منتقل ہوا اور اب یہ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر دور، ہر ملک اور ہر زبان میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دے، اگر وہ اس فرض میں کوتاہی کرے گی تو اس دنیا کی گمراہیوں کے نتائج بھگتنے میں دوسروں کے ساتھ وہ بھی برابر کی شریک ہوگی۔

ہمارے ارباب تاویل نے عام طور پر اس شہادت کو آخرت سے متعلق مانا ہے کہ یہ امت گمراہوں کے خلاف انبیا کی تائید میں آخرت میں شہادت دے گی کہ ان گمراہوں کو اللہ کا دین پہنچ چکا تھا، اس کے باوجود انھوں نے گمراہی کی یہ روش اختیار کی۔ لیکن ہمارے نزدیک اس تخصیص و تحدید کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس امت کو شہداء اللہ ہونے کا یہ مرتبہ آخرت میں بھی حاصل ہوگا لیکن آخرت میں یہ مرتبہ اسی وجہ سے حاصل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اس کو اس منصب پر سرفراز فرمایا ہے۔ جو امت اس دنیا میں دینِ حق کی گواہ ہے، ظاہر ہے کہ وہی آخرت میں بھی اس پوزیشن میں ہوگی کہ گواہی دے کہ لوگوں کو اللہ کا دین ٹھیک ٹھیک پہنچایا یا نہیں۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ

جعل کا مفہوم

جَعَل کا لفظ وسیع معنوں میں آتا ہے۔ اس کے ایک معنی جائز ٹھہرانے اور مشروع قرار دینے کے بھی ہیں، مثلاً مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ ۱۰۳۔ مائدہ (اور خدا نے بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ کو مشروع نہیں کیا)۔

'علم نعلم' کا مفہوم

عَلِمَ يَعْلَمُ کے معنی جس طرح جان لینے اور معین کر لینے کے ہیں اسی طرح اس کے معنی ممیز کر دینے، چھانٹ کر الگ کر دینے اور ظاہر کر دینے کے بھی ہیں، مثلاً وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ ۳۱۔ محمد (اور ہم تمھیں جانچیں گے یہاں تک کہ ظاہر کر دیں تمھارے اندر سے ان لوگوں کو جو جہاد کرنے والے اور ثابت قدم رہنے والے ہیں) أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ ۱۴۲۔ آل عمران (کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تمھارے اندر سے ان لوگوں کو ظاہر نہیں کیا جنھوں نے جہاد کیا)

بیت المقدس کو عارضی طور پر قبلہ قرار دینے کی حکمت

مطلب یہ ہے کہ یہ جو تمھیں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کی اجازت دے دی گئی تھی تو اس لیے نہیں کہ یہی تمھارا مستقل قبلہ ہے بلکہ یہ اجازت ایک عارضی اور وقتی اجازت تھی اور مقصود اس اجازت سے یہ تھا کہ پھر اس قبلہ کی تبدیلی تمھارے لیے امتحان کی ایک کسوٹی بنے اور اس کے ذریعہ سے یہ ظاہر کر دیا جائے کہ تمھارے اندر کتنے آدمی ایسے ہیں جو فی الواقع رسول کے پیرو ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو رسول سے زیادہ اپنی پچھلی روایات کے پرستار ہیں اور وہ پھر مڑ کر اپنے قدیم دین ہی کی طرف چلے جاتے ہیں۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نماز کا حکم ہوا تو آپ نے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا۔ شروع شروع میں حضور کا طریقہ یہ تھا کہ جن معاملات میں آپ کے سامنے وحی الٰہی کی کوئی واضح رہنمائی نہ ہوتی ان میں آپ پچھلے انبیاء کے طریقہ پر عمل کرتے چنانچہ قبلہ کے معاملے میں بھی آپؐ نے یہی کیا۔ جب تک آپ مکہ میں رہے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نمازوں کے لیے اس طرح کھڑے ہوتے کہ بیت اللہ اور بیت المقدس دونوں سامنے ہوتے لیکن جب آپ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو سمت کے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا امکان باقی نہیں رہا۔ قدرتی طور پر خانہ کعبہ سے یہ انقطاع آپ کے قلب مبارک پر شاق گزرا اور آپ کو اس بارے میں وحی الٰہی کا انتظار رہنے لگا۔ لیکن حکمتِ الٰہی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ ابھی کچھ عرصہ تک آپ اور بیت المقدس ہی کی طرف نماز پڑھیں۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بھی ۱۶، ۱۷ مہینے آپ بیت المقدس ہی کی طرف نمازیں پڑھتے رہے، یہاں تک کہ غزوہ بدر سے کم و بیش دو ماہ پہلے قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا۔

دین میں آزمائشوں کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے اتنے عرصہ تک بیت المقدس کے قبلہ پر قائم رکھنے اور پھر اس سے ہٹا کر خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دینے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اس طرح اس نے مسلمانوں کو ایک امتحان میں ڈال کر ان کے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کیا ہے تاکہ مدینہ آنے کے بعد جو خام قسم کے عناصر اہل کتاب میں سے مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں وہ اس امتحان سے گزر کر یا تو اسلام کی طرف یک سو ہو جائیں یا چھٹ کر ان سے الگ ہو جائیں۔

وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ۔ یعنی یہ قبلہ کی تبدیلی ہے تو ایک سخت امتحان اس لیے کہ اس طرح کے معاملات میں جن کا تعلق دین سے ہو اور دین کی بھی ایک بنیادی چیز سے، آدمی فطری طور پر جذباتی اور روایت پرست بن جایا کرتا ہے، ان میں کوئی معمولی سی تبدیلی بھی اس کو سخت گراں گزرتی ہے، لیکن دین میں اصلی چیز جس کا وزن ہے وہ خدا اور رسول کی کامل اطاعت اور اخلاص ہے۔ اس وجہ سے ان تعصبات پر جو اخلاص کے لیے حجاب بنتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیا وقتاً فوقتاً ضرب لگاتے رہے ہیں۔ انبیا اور ادیان کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر نبی کی آمد پر امتوں کو اس قسم کے امتحانوں سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے، اسی سنت کے تقاضے سے ہر نبی کے زمانے میں دین کے رسوم و ظواہر میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں تاکہ کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہو سکے۔ جو لوگ اپنے قومی اور گروہی تعصبات کے پھندوں میں گرفتار ہو چکے ہیں ان کا کھوٹ ان امتحانوں سے ظاہر ہو جاتا ہے، وہ خدا اور رسول کی ہدایت اختیار کرنے کے بجائے اپنی روایات پر اڑ جاتے ہیں لیکن جن کے اندر اخلاص کی روح موجود ہوتی ہے وہ اپنے اس اخلاص کے فیض سے اللہ کی ہدایت قبول کرنے کی توفیق پاتے ہیں ۔۔۔ چنانچہ قبلہ کی اس تبدیلی کا ردعمل بھی اسی طرح کا ہوا جو لوگ اپنے

پچھلے تعصبات میں پڑے ہوئے محض کسی وقتی مصلحت کے تحت اسلام کی صفوں میں آ گھسے تھے اس تبدیلی کے بعد وہ پھر پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے برعکس جو لوگ محض اللہ کی بندگی اور اس کے رسول کی اطاعت کے جذبے کے ساتھ اسلام میں آئے تھے ان کے لیے اس تبدیلی نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رحمت کے نہایت وسیع دروازے کھول دیے۔

ایک اہم سوال کا جواب

یہ بات کہ اللہ کا معاملہ یوں نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے، وہ تو لوگوں کے معاملہ میں نہایت مہربان ہے۔ یہاں ایک نہایت اہم سوال کا جواب ہے جو از خود پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب قبلہ کی تبدیلی خود قرآن کے اپنے بیان کے مطابق بھی ایک سخت امتحان ہے تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس قسم کے سخت امتحان میں کیوں ڈالنا پسند فرمایا، جس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ بہت سے لوگ اس امتحان میں ناکام رہ جانے کے سبب سے اپنے ایمان ہی کھو بیٹھیں۔ قرآن نے اس شبہ کا ازالہ اس طرح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس طرح کے امتحانوں میں اس لیے نہیں ڈالتا کہ لوگ اپنے ایمان ضائع کر بیٹھیں بلکہ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی رافت و رحمت کے مظہر ہیں۔ انھی امتحانوں سے بندوں کی صلاحیتیں نشو و نما پاتی ہیں۔ انھی کے ذریعہ سے ان کی وہ قوتیں اور صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں جن کے خزانے قدرت نے ان کے اندر ودیعت کیے ہیں۔ انھی کے ذریعے سے ان کے کھرے اور کھوٹے، ان کے مخلص اور منافق اور ان کے سچے اور جھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ یہ امتحان نہ ہو تو اچھے اور برے، خام اور پختہ، گہرا اور پشنیر میں کوئی فرق ہی نہ رہ جائے۔ ہر مدعی کو اس کے دعوے میں سچا ماننا پڑے اور ہر کاذب کی باتوں کی تصدیق کرنی پڑے، یہاں تک کہ آخرت میں بھی کسی کو انعام یا کسی کو سزا دینے کے لیے کوئی حجت و دلیل باقی نہ رہ جائے۔ مزید غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کارخانۂ کائنات کا سارا حسن و جمال اور اس کی ساری حکمت و برکت اللہ تعالیٰ کی اسی سنتِ ابتلا کے اندر مضمر ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ سارا کارخانہ بالکل بے حکمت اور بے مصلحت بلکہ کھلنڈرے کا ایک کھیل بن کے رہ جائے۔

زبان کا یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اسما میں سے رؤف اور رحیم کا حوالہ دیا ہے۔ رؤف رافت سے ہے جس کے اندر دفع شر غالب ہے اور رحیم رحمت سے ہے جس کے اندر اثباتِ خیر کا پہلو نمایاں ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی دونوں پہلو اللہ تعالیٰ کی اس سنت ابتلا و امتحان میں ملحوظ ہیں جس کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے یعنی بندوں کو خرابیوں اور کمزوریوں سے پاک کر کے فضائل و محاسن سے آراستہ کرنا۔ یہاں ان اشارات پر ہم کفایت کرتے ہیں آگے مختلف مقامات پر یہ سنت اللہ مختلف پہلوؤں سے زیر بحث آئے گی۔

عام طور پر مفسرین نے اس آیت کو اس سیاق میں لیا ہے کہ تحویلِ قبلہ کے بعد لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جو لوگ پہلے ہی قبلہ کے دوران میں وفات پا چکے ان کا کیا بنے گا۔ ان کی نمازیں قبول ہوں گی یا نہیں؟ یہ اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک نہ تو اس سوال کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ تھی اور

نہ اس کے جواب دینے کی ضرورت تھی۔ اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

عربی زبان کا ایک خاص اسلوب

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۔ یہاں عربی زبان کا ایک خاص اسلوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے وہ یہ کہ افعالِ ناقصہ کے صیغے عموماً مضارع سے پہلے حذف کر دیے جاتے ہیں مثلاً کَانَ یَفْعَلُ میں صرف 'یفعل' کو کافی سمجھیں گے کلامِ عرب اور قرآن مجید دونوں میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ چند مثالیں ہم قرآن سے پیش کرتے ہیں۔

سورۂ ہود میں ہے۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ	پس تم ان چیزوں سے شک میں نہ پڑو جن کو یہ
هٰٓؤُلَآءِ ۚ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا	پوجتے ہیں، یہ ان چیزوں کو نہیں پوجتے مگر اسی
كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ	طرح جس طرح اس سے پہلے ان چیزوں کو ان
قَبْلُ (۱۰۹- ھود)	کے باپ دادا پوجتے تھے۔

اس آیت میں دیکھیے کَمَا کَانَ یَعْبُدُ کی بجائے صرف کَمَا یَعْبُدُ فرمایا۔ کان کو حذف کر دیا۔

اسی طرح سورہ زخرف میں ہے۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ	اور ہم نے کتنے نبی بھیجے اگلوں میں، اور نہیں آتا
وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا	تھا ان کے پاس کوئی نبی مگر وہ اس کا مذاق اڑاتے
بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۷-۶، زخرف)	تھے۔

اس میں وَمَا یَاْتِیْهِمْ دراصل وَمَا کَانَ یَاْتِیْهِمْ ہے لیکن عربی اسلوب کے مطابق کان کو حذف کر دیا۔

سورۂ انعام میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ	اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۷۵- انعام)	کارخانہ کا مشاہدہ کراتے تھے۔

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ دراصل کُنَّا نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ ہے لیکن عام اسلوب کے مطابق مضارع سے پہلے کُنَّا حذف ہو گیا۔

اسی اسلوب کے مطابق آیت زیرِ بحث میں قَدْ نَرٰی دراصل قَدْ كُنَّا نَرٰی ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس حذف کو کھول دیا ہے اس لیے کہ اردو میں حذف کا یہ اسلوب بیان نہیں ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ ہم تمہارے چہرے کی گردش آسمانوں کی طرف دیکھتے رہے تھے کہ تمہیں تحویلِ قبلہ کے لیے شدت سے انتظار ہے تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس کو تم پسند کرتے ہو۔

تحویل قبلہ کے لیے آنحضرت کے اضطراب کی وجہ

اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں رہے اس وقت تک تو دونوں قبلوں کو جمع کر لینا ممکن رہا لیکن مدینہ ہجرت فرما جانے کے بعد یہ صورت باقی نہیں رہی۔ اس وجہ سے قبلہ ابراہیمی

سے یہ انقطاع آپ پر شاق گزرنے لگا۔ بالخصوص جب وحی الٰہی کے ذریعہ سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ آپ ملت ابراہیم پر مبعوث ہوئے ہیں، آپ کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی، نیز حضرت ابراہیم کا قبلہ ہی درحقیقت تمام اولاد ابراہیم کا مشترک قبلہ ہے تو برابر آپ کو تحویل قبلہ کا انتظار رہنے لگا اور جیسا کہ قاعدہ ہے اگر کسی کا انتظار ذوق و شوق کے ساتھ ہو تو بار بار نگاہ دروازے کی طرف اُٹھ جاتی ہے اسی طرح آپ کی نظر بار بار اوپر آسمان کی طرف اٹھ جاتی، اس لیے کہ حضرت جبریل امین کا ظہور اسی طرف سے ہوتا تھا۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ کے لفظ میں اس فیصلہ کا اظہار ہے جو اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کے بارے میں فرمایا۔ میں نے ترجمہ میں لفظ کے اس مخفی مضمون کو کھول دیا ہے لیکن ضرورت اس پر بعض نظائر کے حوالہ کی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعض نظائر کی طرف اشارہ کیا تھا مگر افسوس ہے کہ بوقت تحریر میرے پاس حوالہ کی ضروری کتابیں موجود نہیں ہیں۔ ممکن ہے کتاب کی طباعت کے موقع پر اس کمی کی تلافی کر سکوں۔

تحویل قبلہ کے باب میں اصل حکم

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔ شطر کے معنی جہت، جانب اور طرف کے ہیں۔ مسجد حرام سے مراد وہ مسجد محترم ہے جو بیت اللہ کو اس کی ہر جہت سے ہالہ کی طرح اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ قبلہ تو دراصل بیت اللہ ہی ہے چنانچہ مسجد حرام کے اندر لوگ ہر چہار طرف سے بیت اللہ ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں لیکن باہر والوں کے لیے یہ مسجد بھی قبلہ ہی کے حکم میں داخل ہے، اس طرح امت کے لیے قبلہ کے معاملہ میں تھوڑی سی وسعت اور آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ جس طرح اصل قربان گاہ تو دراصل مروہ ہے لیکن اُمت کی آسانی کے لیے اس کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی ہے۔

ہمارے نزدیک یہی آیت ہے جس نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کی اس اجازت کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع شروع میں دی گئی تھی، منسوخ کیا اور اس کی جگہ مسجد حرام کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے ساتھ یہ جو فرمایا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو تو اپنے رُخ اسی کی طرف کرو، یہ مسلمانوں کو اس غلطی سے بچانے کے لیے ہدایت دی گئی ہے جس میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہو گئے تھے۔ اوپر آیت ۱۱۵ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بیت المقدس کے اندر تو بیت المقدس کو قبلہ بتاتے تھے لیکن اس سے باہر نکل کر ان کا قبلہ مشرق یا مغرب بن جاتا۔ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی گمراہی سے بچانے کے لیے یہ ہدایت فرمائی کہ تم جہاں کہیں بھی ہو، مسجد حرام کے اندر یا باہر، نمازوں کے اوقات میں تمہارا رخ اسی حقیقی قبلہ ہی کی طرف ہونا چاہیے۔

یہاں خطاب کی اس تبدیلی پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے جو اس آیت میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

خطاب کی تبدیلی کی حکمت بلاغت

پہلے تو خطاب واحد کے صیغہ سے ہے فَوَلِّ وَجْهَكَ پھر جمع کی صورت میں فرمایا فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ اس تبدیلی کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ پہلا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے ہے۔ اس دوسرے خطاب نے پہلے خطاب کے اس مضمر پہلو کو واضح کر دیا کہ اگرچہ وہ خطاب بظاہر ہے تو واحد کے صیغہ سے لیکن صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے نہیں ہے بلکہ اس میں پوری امت شامل ہے، علاوہ ازیں پہلے خطاب کے واحد کے صیغہ سے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کو تحویلِ قبلہ کے لیے جیسا کہ اوپر اشارہ ہے نہایت اضطراب تھا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ پہلے خاص طور پر آپ کو مخاطب کر کے اس تبدیلی کی بشارت دی جائے۔

اس قبلہ کا حق ہونا اہل کتاب پر واضح تھا

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ۔ اَنَّهٗ سے مراد یہاں مسجد حرام کا اس امت کے لیے قبلہ ہونا ہے۔ اس بات کا حق ہونا اور خدا کی طرف سے ہونا اہل کتاب پر بالکل واضح تھا، اس لیے کہ اوپر جو تفصیلات قرآن نے پیش کی ہیں ان سے مندرجہ ذیل باتیں واضح طور پر سامنے آگئی ہیں۔

ایک یہ کہ یہود کو یہ بات معلوم تھی کہ بیت اللہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کی تعمیر ہے اور یہی بیت اللہ تمام ذریت ابراہیم کا اصلی قبلہ رہا ہے۔

دوسری یہ کہ آخری نبی ذریت اسماعیلؑ میں پیدا ہوں گے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایک امت مسلمہ برپا کرے گا۔

تیسری یہ کہ اس ذریت اسماعیل کا مرکز اور قبلہ شروع سے یہی بیت اللہ رہا ہے۔

ان تمام باتوں کے اشارات و قرائن تورات میں موجود تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور اور آپ کے واقعات زندگی سے ہر قدم پر ان اشارات و قرائن کی تصدیق ہو رہی تھی لیکن یہود اس حسد اور عناد کے سبب سے جو ان کو بنی اسماعیل اور مسلمانوں سے تھا، جانتے بوجھتے ان ساری باتوں کو چھپاتے تھے۔ ان کے اسی کتمانِ حق پر بانداز تہدید یہ فرمایا ہے کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے، یعنی یہ اپنے اس کتمانِ حق کی قرار واقعی سزا پا کے رہیں گے۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۴۵)

ایک التفات

یہ آیت بطور التفات کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے رہی ہے کہ قبلہ کے معاملہ میں اہل کتاب کا یہ رویہ کسی شک و شبہ کی بنا پر نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اوپر واضح ہوا، دیدہ و دانستہ محض ضد و عناد اور حسد کی بنا پر ہے۔ اس وجہ سے اگر تم ان کو دنیا جہان کے تمام معجزے بھی دکھا دو جب بھی یہ تمہارے قبلہ

کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔ ان کو مطمئن کرنے والی کوئی چیز ہو سکتی ہے تو دلائل و معجزات نہیں بلکہ یہ کہ تم خود ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن جاؤ لیکن حق کے اچھی طرح واضح ہو چکنے کے بعد تمہارے لیے اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا کہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کر سکو۔ پھر یہ بات بھی واضح فرما دی کہ یہ ضد مضد کا رویہ کچھ تمہارے ہی ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ یہود و نصاریٰ خود ایک دوسرے کے قبلہ کی بھی پیروی نہیں کر سکتے۔ اب یہ مشرق و مغرب کے جس جھگڑے میں پڑ گئے ہیں یہ جھگڑا ختم ہونے والا نہیں۔ اور جب ایک ہی قبلہ کی پیروی کے مدعی آپس میں متحد نہیں ہو سکتے تو تمہارے قبلہ کی پیروی بھلا یہ کس طرح کر سکتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ علم وحی کے آجانے کے بعد اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے تو تم بھی ظالموں میں سے بن جاؤ گے۔ یہ ایک طرح کی تہدید ہے جس کا ظاہراً خطاب تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس کا رخ درحقیقت یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔ یہاں العلمؔ سے مراد علم حقیقی ہے جو وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور اھواء سے مراد اہل کتاب کی بدعتیں ہیں۔ ان دونوں لفظوں کا مفہوم آیت ۱۲۰ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ (۱۴۶)

'اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ' سے مراد یہاں صالحین اہل کتاب کا گروہ ہے جو اپنے علم کے حد تک اپنے دین پر قائم اور ان تمام پیشین گوئیوں کے ظہور کا دل سے متمنی تھا جو آخری بعثت سے متعلق ان کے صحیفوں میں موجود تھیں۔ اس سے صالحین اہل کتاب مراد لینے کے وجوہ و دلائل پوری تفصیل کے ساتھ ہم آیت ۱۲۱ کے تحت واضح کر چکے ہیں۔

'یَعْرِفُوْنَهٗ' میں ضمیر کا مرجع قرآن مجید اور اس کا یہ بیان ہے جو اس نے آخری بعثت اور اس کے قبلہ سے متعلق اوپر دیا ہے۔ یہ آیت بعینہٖ انہی الفاظ میں سورۂ انعام میں بھی وارد ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۲۰۔ انعام (جن کو ہم نے کتاب عنایت کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں)

تشبیہ کی بلاغت
بیٹوں کی طرح پہچاننے میں یہ تشبیہ مضمر ہے کہ جس طرح ایک مہربان باپ اپنے دور افتادہ بیٹے کے لیے پریشان و مضطرب رہتا ہے اور ایک مدت کی جدائی کے بعد جب وہ آتا ہے تو دور سے اس کے پیراہن کی خوشبو اس کے لیے نوید مسرت لاتی ہے اسی طرح یہ صالحین اہل کتاب آخری بعثت سے متعلق تمام پیشین گوئیوں کے ہر مصداق سے اچھی طرح آشنا ہیں اور ان میں سے جو مصداق بھی ان کے سامنے ظاہر ہوتا ہے وہ اس کا خیر مقدم یوسف گم گشتہ کی طرح کرتے ہیں۔ اچھے اہل کتاب کے اندر موعود و منتظر حق کے لیے انتظار و شوق کا جو جذبہ تھا اس کی تعبیر قرآن مجید نے ایک اور مقام میں اس طرح فرمائی ہے۔ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ

تَرٰۤى اَعۡيُنَهُمۡ تَفِيۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَـقِّ ۚ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ ۸۳ - مائدہ (اور جب وہ اس چیز کو سنتے ہیں جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس حق کی وجہ سے جس کو وہ اس کے اندر پہچانتے ہیں، وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو حق کی شہادت دینے والوں کے ساتھ لکھ۔)

اَلۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ (۱۴۷)

مبتدا محذوف کرنے کی بلاغت

اَلۡحَقُّ ہمارے نزدیک خبر ہے اور مبتدا اس کا محذوف ہے۔ اگر مبتدا کو واضح کر دیا جائے تو پوری بات یوں ہو گی۔ ھٰذَا ھُوَ الۡحَقُّ یعنی یہی بات حق ہے۔ مِنۡ رَّبِّكَ خبر سے متعلق ہے۔ مبتدا کو بالعموم عربی میں اس موقع پر حذف کر دیتے ہیں جہاں مخاطب کی پوری توجہ خبر پر مرکوز کر دینی ہو۔ اَلۡحَقُّ آیت ۱۴۴ میں خبر ہی کے محل میں وارد ہے اور اسی حیثیت سے وہ آیت ۱۴۹ میں بھی آیا ہے۔ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ کا خطاب ظاہر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن تنبیہ و عتاب کا رخ مخالفین کی طرف ہے۔ ملاحظہ ہو آیت نمبر ۱۴۵[1]

وَلِكُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ؕ اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يَاۡتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيۡعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ (۱۴۸)

لفظ کل کا مفہوم

کل کا لفظ اگرچہ لفظاً نکرہ ہے لیکن عموماً اس سے مراد وہ خاص گروہ یا اشخاص ہی ہوتے ہیں جن کا ذکر کلام میں اوپر گزر چکا ہوتا ہے مثلاً وَوَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلۡنَا نَبِيًّا ۴۹ - مریم (اور ہم نے اس کو عطا کیے اسحاق اور یعقوب اور ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا) وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِدۡرِيۡسَ وَذَا الۡكِفۡلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيۡنَ ۸۵ - انبیاء - (اور اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل، ان میں سے ہر ایک صابروں میں سے تھا)

چنانچہ یہاں بھی کُلٌّ سے مراد یہود و نصاریٰ کے وہی گروہ ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ ان کے متعلق فرمایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے قبلہ کے لیے ایک جہت ٹھہرا لی ہے، کسی نے مشرق، کسی نے مغرب، یہ اپنی اسی ٹھہرائی ہوئی جہت ہی کو قبلہ بنائیں گے، تم کتنا ہی زور لگاؤ یہ پتھر کسی طرح اپنے مقام سے کھسکنے والے نہیں ہیں۔ اس وجہ سے تم ان کے پیچھے اپنی راہ کھوٹی نہ کرو بلکہ خدا کی دکھائی ہوئی صراط مستقیم پر آگے بڑھو اور نیکیوں اور بھلائیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔

تحویل قبلہ کے بعد اہل کتاب کے رویے سے اظہار بیزاری

گویا وہی بات جو اوپر والی آیت میں فرمائی تھی کہ وَلَئِنۡ اَتَيۡتَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ

---

[1] خطاب کے مختلف پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مناسب ہے کہ مولانا فراہی کے مقدمہ تفسیر میں خطاب کی فصل غور سے پڑھ لیجیے۔ تفسیر سورۂ عبس بھی اس مقصد کے لیے مفید ہو گی۔

کُلًّا یُّمِتُّوْا قِبْلَتَکَ الآیہ اس آیت میں ایک دوسرے اسلوب سے فرمائی۔ مقصود اس سے ہرگز ہرگز قبلہ کے معاملہ میں کسی رواداری کا اظہار نہیں ہے بلکہ یہ یہود و نصاریٰ کے رویہ سے بیزاری کا اظہار ہے۔ مسلمانوں کو اس بات کی نصیحت کی جا رہی ہے کہ ان جامدوں اور ہٹ دھرموں کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور تم حصولِ سعادت کی راہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

جذبۂ عبدیت میں مسابقت کے لیے ایک نشان ہے

فَاسْتَبِقُوا کا مصدر استباق ہے جس کے معنی ہیں دوڑ میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرنا مثلاً اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ، ـ یوسف (ہم دوڑ میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہوئے دور نکل گئے) جس طرح دوڑ کے مقابلوں میں ایک نشان ٹھہرا کر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح قبلہ عبدیت و انابت اور فلاح و سعادت کی جدوجہد میں مقابلہ کے لیے خدا کا مقرر کردہ ایک نشان یا گول ہے۔ اس نشان کو جیسا کہ اوپر تفصیل گزر چکی ہے، پچھلی امتوں نے ضائع کر دیا تھا اس وجہ سے ان کی بھاگ دوڑ بھی بالکل دوسری وادیوں میں ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس نشانِ حق کو امتِ وسط کے لیے پھر نمایاں کیا اور اس کو دعوت دی کہ اگر دوسرے اس میدان میں اترنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور تم اپنی سرگرمیوں سے اس میدان کو پھر گرم کرو۔

قبلہ کے متعلق یہ بات کہ وہ فلاح و سعادت کے حصول کے لیے ایک نشان اور عَلَم کی حیثیت رکھتا ہے محض کوئی استعارہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے اس عظیم تاریخ کو حافظہ میں از سرِ نو تازہ کرنے کی کوشش کیجیے جو اس گھر کے ایک ایک پتھر پر نقش ہے جس کو قبلہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ گھر وہ گھر ہے جس کی تعمیر ابراہیم خلیل اللہؑ اور اسماعیل ذبیح اللہؑ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے کی ہے۔ یہ گھر وہ گھر ہے جو اس دنیا کے بتکدے میں خدائے واحد کی عبادت کا اولین مرکز ہے۔ اسی گھر کے پہلو میں مروہ کی پہاڑی ہے جس کے دامن میں چشمِ فلک نے رضائے الٰہی کے لیے بوڑھے باپ کو محبوب اور اکلوتے فرزند کی گردن پر چھری چلاتے اور اسلام کی حقیقت کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہے۔ یہی گھر ہے جس کے ارد گرد کے چٹیل میدانوں کو قدرت نے اس امتِ مسلمہ کے نشو و نما کے لیے منتخب فرمایا جس کے ذریعہ سے دنیا کی تمام قوموں کو خدا کی رحمت تقسیم ہونے والی تھی۔ وہی گھر ہے جو حضرت ابراہیم کے وقت سے لے کر برابر تمام قدسیوں کا قبلہ رہا ہے اور جس میں طواف و اعتکاف اور رکوع و سجود کی سعادت اتنے انسانوں نے حاصل کی ہے کہ جس طرح زمین کے ذروں اور آسمان کے ستاروں کا شمار ناممکن ہے اسی طرح ان نفوسِ قدسیہ کا شمار بھی ناممکن ہے۔ اسی کے قرب میں وہ میدان ہے جس کی ریت کا ایک ایک ذرہ توبہ و استغفار کے سجدوں کا گواہ اور خوفِ خدا سے رونے والوں کے آنسوؤں کا امین ہے۔ اسی گھر کے ایک کونے میں وہ مقدس پتھر ہے جس کو خدا کے دہنے ہاتھ سے تشبیہ دی گئی ہے اور جس کو ہاتھ لگا کر یا بوسہ دے کر لاکھوں کروڑوں انبیاء و صدیقین اور صلحاء و ابرار نے اپنے رب سے عہد بندگی و وفاداری استوار کیا ہے۔ اسی کے پاس وہ جمرات ہیں جو اس گھر کے دشمنوں کی ذلت و پامالی کی یادگار ہیں اور جن پر

سنگ باری کر کے اہل ایمان اپنے اندر برابر اعدائے دین کے خلاف جہاد کی روح تازہ کرتے رہے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی گھر کے سایہ میں خدا کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پرورش پائی جن کے لائے ہوئے نور اور جن کی بخشی ہوئی ضیا نے تمام دنیا میں اجالا کر دیا۔

ایک ایسی عظیم روایات کے امین گھر کو قبلہ بنانے کے معنی یقیناً یہی ہیں کہ اس کو ایک نشان قرار دے کر ان روحانی خزانوں کے حصول کے لیے جدوجہد کی جائے جو سیدنا ابراہیمؑ سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک اس گھر کو ودلیعت ہوئے یا دوسرے لفظوں میں اس کو ایک پاور ہاؤس سمجھئے جس سے پوری امت زندگی، حرارت، روشنی اور قوت حاصل کرتی ہے۔ جن لوگوں پر قبلہ کی عظمت واہمیت کا یہ پہلو واضح نہیں ہے وہ اکثر اس امر میں حیران ہوتے ہیں کہ اینٹ اور پتھر کے بنے ہوئے ایک مکان کو دین میں اس درجہ اہمیت کیوں دے دی گئی ہے لیکن اوپر کی تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اصل اہمیت اینٹ پتھر کے مکان کی نہیں بلکہ ان عظیم روایات کی ہے جو اس گھر سے وابستہ ہیں اور جو اس دنیا کی روحانی وایمانی زندگی کا واحد ذریعہ ہیں۔ ان روایات کی وجہ سے ملت کے نظام اجتماعی میں اس گھر کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ایک جسم کے نظام میں قلب کو حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح قلب کے بغیر جسم کا وجود نہیں اسی طرح قبلہ کے بغیر ملت کا کوئی تصور نہیں۔ یہاں قبلہ سے متعلق ان اجمالی اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ آگے مناسب مواقع پر ہم اس کی اہمیت کے بعض دوسرے گوشوں پر بھی نظر ڈالیں گے۔

اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس قبلہ کو قبلہ قرار دے کر جہاں کہیں سے بھی تم نیکی اور بھلائی کی راہ میں کوئی جدوجہد کرو گے وہ ضائع نہیں جائے گی، خدا تم کو ہر جگہ سے اکٹھا کرے گا اور تمہیں تمہاری ہر چھوٹی بڑی نیکی کا بدلہ دے گا۔ یہ استباق الی الخیر کے لیے ایک نشان کی طرح ہے۔ اس سے قرب وبُعد دل کے تعلق کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ ہر شخص ہر جگہ اس سے ربط قائم کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے تعلق رکھنے والوں کو ہر جگہ سے جمع کر سکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ جو جس سمت بھی رخ کرنا چاہتا ہے اس کو کرنے دو، تم ان بحثوں میں الجھنے کی بجائے نیکی اور بھلائی کی راہوں میں بڑھو، ایک دن آئے گا جب اللہ تم سب کو جمع کر کے فیصلہ کرے گا کہ کون حق کی راہ چلا اور کس نے ضد اور ہٹ دھرمی کی روش اختیار کی۔

وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ، وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۴۹)

سفر میں اہتمام قبلہ کی ہدایت

اوپر آیت ۱۴۴ میں تحویل قبلہ کے اصلی حکم کے ضمن میں یہ بات تو واضح ہو گئی تھی کہ آدمی جہاں کہیں بھی ہو قبلہ ہی کی طرف رخ کرے لیکن سفر کی حالت سے متعلق وہاں کوئی تصریح نہیں تھی کہ اس صورت میں

بھی اس حکم کی پابندی ضروری ہے یا اس میں کچھ ڈھیل ہے۔ سفر کی حالت میں کسی متعین قبلہ کی جستجو اور تحقیق ایک دشوار کام ہے اس وجہ سے خیال یہی ہوتا ہے کہ اس میں کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن اوپر قبلہ کی جو اہمیت بیان ہوئی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی حالت میں بھی اس روحانی پاور ہاؤس سے انسان کا تعلق منقطع نہیں ہونا چاہیے۔ اگر سفر کی حالت میں آزادی دے دی جاتی تو اس سے قبلہ کے معاملہ میں اس گمراہی کو اچھی خاصی راہ مل جاتی جس میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہوئے۔ اس وجہ سے اس امت کو واضح الفاظ میں اس بات کی تاکید کی گئی کہ حضر کی طرح سفر میں بھی قبلہ کا اہتمام ضروری ہے تاکہ امت اپنے اصل نصب العین سے کسی حالت میں بھی سہل انگاری میں مبتلا نہ ہونے پائے۔

اس تاکید کے ساتھ ساتھ یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ یہی قبلہ خدا کا مقرر کیا ہوا واقعی قبلہ ہے، سو اس بات کو یاد رکھنا کہ اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ یہ تنبیہ عذر سفر کی بنا پر قبلہ کے معاملہ میں ہر قسم کی آزادی، بے پروائی اور ہر قسم کی منافقانہ سہولت تراشی کی جڑ کاٹتی ہے۔ اس کے شروع میں خطاب واحد کے صیغہ سے ہے اور آخر میں جمع کے صیغہ سے، یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ شروع کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیتِ امت کے وکیل کے ہے، مراد اس سے پوری امت ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سفر کی حالت میں چونکہ بسا اوقات قبلہ کا تعین سخت مشکل ہو جاتا ہے اس وجہ سے جو چیز شریعت میں مطلوب ہے وہ صرف موجود وسائل تحقیق کے حد تک قبلہ کی جستجو ہے۔ اسلام نے کسی معاملہ میں طاقت سے زیادہ امت پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا ہے۔ بس بہتر وسائل تحقیق سے جو ظن غالب حاصل ہو جائے آدمی اسی کے مطابق نماز ادا کرے۔ یہ پابندی کسی صورت میں بھی ان رخصتوں کی نفی نہیں کرتی جو مجبوریوں کی حالت میں شریعت نے امت کو دی ہیں اور جن کی تصریح حدیث و فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ
شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ
وَاخْشَوْنِي ۚ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (١٥٠)

اعادۂ حکم کی حکمت

اوپر سفر اور حضر دونوں حالتوں سے متعلق یہ دونوں حکم بیان ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے انہی دونوں حکموں کا معاً یہ اعادہ بعینہٖ انہی الفاظ میں اپنے اندر بظاہر کچھ تکرار کی سی گرانی رکھتا ہے اور یہ چیز قرآن میں، جو ایجاز و بلاغت کا ایک معجزہ ہے، طبیعت کو کچھ کھٹکتی ہے لیکن یہ کھٹک محض قلت تدبر کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہاں ان احکام کے دہرانے سے مقصود ہرگز ہرگز ان احکام کو دوبارہ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی ان تین عظیم حکمتوں اور مصلحتوں کو بیان کرنا ہے جو ان احکام کے اندر اس امت کے لیے پیشِ نظر ہیں اور جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ یہ حکمتیں بحیثیتِ مجموعی دونوں ہی حکموں سے، جیسا کہ آگے واضح ہوگا، تعلق رکھتی ہیں اور ان سے معمولی بے خبری یا بے پروائی بھی اس امت کو ایسی غلطیوں میں مبتلا کر سکتی ہے جن کی اصلاح

کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ جائے گی اس وجہ سے قرآن نے ان حکمتوں کے بیان سے پہلے تمہید کے طور پر ان احکام کی طرف ذہنوں کو پھر متوجہ کر دیا کہ اس شد و مد اور اس تاکید و تنبیہ کے ساتھ اندر اور باہر، سفر اور حضر، ہر جگہ اور ہر صورت میں بیت اللہ ہی کی طرف رخ کرنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے یہ کوئی سرسری اور سطحی حکم نہیں ہے بلکہ نہایت عظیم مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی حکم ہے۔ اگر اس کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھنے میں تم نے ذرا بھی سہل انگاری سے کام لیا اور اس سہل انگاری کے سبب سے ایک قدم بھی غلط اٹھ گیا تو تمہارا سارا سفر ہی ایک غلط سمت میں ہو جائے گا۔ اس وجہ سے ان کا پورا پورا اہتمام کرو اور ان کی حکمتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ اس تمہید کے بعد اب آگے یہ حکمتیں ان الفاظ میں بیان ہو رہی ہیں۔

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔ غور کیجیے تو واضح ہوگا کہ یہاں ان احکام کی تین حکمتیں بیان کی گئی ہیں ایک قطع حجت، دوسری اتمام نعمت، تیسری راہ یابی۔ اب ہم اختصار کے ساتھ ان تینوں کی تشریح کرتے ہیں تاکہ مذکورہ احکام کے اعادہ کا فائدہ اور نظم کلام اچھی طرح واضح ہو جائے۔

قطع حجت سے مراد یہ ہے کہ اہل کتاب بالخصوص یہود کے لیے بات بات میں تمہارے اوپر گرفت کرنے اور تمہارے خلاف بدگمانی پھیلانے کے لیے کوئی موقع باقی نہ رہ جائے۔ یہاں للناس سے مراد موقع کلام گواہ ہے کہ اہل کتاب ہیں۔ قبلہ کے اشتراک کی وجہ سے اہل کتاب بالخصوص یہود، قدم قدم پر آنحضرت صلعم اور مسلمانوں کے خلاف یہ اعتراض اٹھاتے رہتے تھے کہ جب یہ ہمارے قبلہ ہی کی طرف نماز پڑھتے ہیں تو نماز اور عبادت کے طریقوں میں ہمارے طریقہ سے الگ راہ کیوں اختیار کرتے ہیں۔ ایک بنیادی چیز میں اشتراک کے بعد دوسری چیزوں میں اختلاف کو وہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی من گھڑت ایجاد قرار دیتے تھے۔ ان کا یہ پروپیگنڈا سادہ لوح لوگوں پر اثر انداز ہوتا تھا اور اس سے اس حقیقت کے واضح ہونے میں بڑی رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں کہ حضورؐ کی بعثت یہودیت یا نصرانیت پر نہیں بلکہ ملت ابراہیم پر ہوئی ہے۔ اب وقت آگیا تھا کہ اس پروپیگنڈے کا پوری طرح سدِ باب کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ رخنہ بندیاں ضروری ہوئیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ فرض کیجیے یہ احتیاطیں نہ اختیار کی جاتیں۔ مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا کہ جب وہ مسجد حرام سے باہر یا سفر کی حالت میں ہوں تو جس سمت کی طرف چاہیں نماز پڑھ لیا کریں تو قطع نظر اس سے کہ مسلمان قبلہ کے معاملہ میں اسی قسم کی گمراہی میں مبتلا ہو جاتے جس قسم کی گمراہی میں اہل کتاب مبتلا ہوئے، محض بعض حالات میں ظاہری اشتراک کی وجہ سے یہود مسلمانوں کے خلاف زبان درازی اور وسوسہ اندازی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتے۔ مذکورہ قیدوں نے ان تمام رخنوں کو بند کر دیا۔ اگرچہ شریر لوگ اس قطع حجت کے بعد بھی باز رہنے والے نہیں تھے لیکن دنیا میں کوئی احتیاط بھی ہر قسم کے لوگوں کا منہ بند نہیں کر سکتی۔ ایسے لوگوں کا علاج قرآن نے یہ بتایا ہے کہ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي (ان سے نہ ڈرو صرف مجھی سے ڈرو)

اتمام نعمت سے مراد تکمیل دین کی وہ نعمت ہے جس کی پیشین گوئی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے اس امت کے بارے میں فرمائی تھی اور جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس وقت فرمایا تھا جب وہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس وقت ان سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اس بیٹے کی نسل سے ایک عظیم امت پیدا ہوگی جس سے تمام دنیا کی قومیں دین کی برکت پائیں گی۔ چنانچہ انھیں کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لیے آخری ہادی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا، جن کا قبلہ وہ بیت اللہ قرار پایا جو تمام عالم کے لیے سرچشمۂ خیر و برکت اور تکمیل دین کا مرکز ٹھہرایا گیا تھا۔

راہ یابی سے مراد ہے اس صراط مستقیم کی راہ یابی جو خدا تک پہنچانے والی سیدھی اور فطری راہ ہے جس کے متعلق فرمایا گیا ہے۔ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۱۶۱۔ انعام (کہہ دو میرے رب نے میری رہنمائی ایک سیدھی راہ کی طرف فرمائی ہے۔ فطری دین ——— ملت ابراہیم ——— کی طرف جو بالکل یکسو تھا) اس ملت ابراہیم کی طرف رہنمائی کرنے والا مینارہ، جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، یہ قبلہ ہی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ رہنمائی کا یہ نشان ہمیشہ اس امت کی نگاہوں کے سامنے رہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَكِّیْكُمْ وَیُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۱۵۱)

"کما" میں "ک" حرف تشبیہ ہے۔ اس وجہ سے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تشبیہ کس چیز کی دی گئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ "کما" تقریباً اسی موقع میں استعمال ہوا ہے جس موقع میں ہم "چنانچہ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہ قبلہ کی تحویل اسی طرح اتمام نعمت اور ملت ابراہیمؑ کی طرف رہنمائی کے لیے کی ہے جس طرح دعائے ابراہیمی کے مطابق انہی مقاصد کے لیے ایک رسول تمہارے اندر بھیجا ہے۔ اس آیت پر آیت ۱۲۹ کے تحت ہم مفصل بحث کر چکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر میں یہ جو فرمایا ہے کہ وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ، یہ بنی اسماعیل پر ایک خاص فضل و کرم کا اظہار ہے کہ تم دین و شریعت سے ناآشنا امی لوگ تھے، خدا نے تمہاری تعلیم و ہدایت کے لیے اس پیغمبر کو بھیجا ہے تو تمہیں تو اس کی سب سے زیادہ قدر کرنی چاہیے۔

فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (۱۵۲)

تحویل قبلہ کے حکم کے بعد یہ امت ایک بالکل ممتاز امت کی حیثیت سے سامنے آگئی۔ یہود امامت کے منصب سے معزول ہوئے اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری قیامت تک کے لیے اس امت کے سپرد ہوئی۔ اس اہم موقع پر یہ یاددہانی کی گئی ہے کہ تم مجھے یاد رکھو گے تو میں تمہیں یاد رکھوں گا، میری شکرگزاری کرتے رہنا، ناشکری نہ کرنا۔ اس یاددہانی کی نوعیت اللہ تعالیٰ اور اس امت کے درمیان ایک عظیم معاہدے کی ہے اور خدا کو یاد رکھنے

اللہ تعالیٰ اور امت مسلمہ کے درمیان ایک عظیم معاہدہ

سے مقصود ان تمام ذمہ داریوں اور فرائض کو یاد رکھنا اور ان کی بجا آوری ہے جو اس امت کے سپرد کیے جا رہے ہیں۔ ان ذمہ داریوں اور فرائض کی بجا آوری کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ میں تمہیں یاد رکھوں گا، یعنی دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی، نصرت، فتح مندی اور سرخروئی کے جو وعدے میں نے اس امت سے کیے ہیں وہ پورے کروں گا۔ میری شکرگزاری کرتے رہنا: سے مراد ان تمام نعمتوں کا صحیح صحیح حق ادا کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں اور آئندہ ملنے والی ہیں، ان نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت خود وہ شریعت تھی جو اب اپنی کامل شکل میں اس امت کو منتقل ہو رہی تھی، آخر کے الفاظ وَلَا تَكْفُرُونِ (اور میری ناشکری نہ کرنا) میں تنبیہ ہے کہ اگر تم نے ناشکری کی تو جس طرح یہود ناشکری کر کے کیفرِ کردار کو پہنچے خدا کے اس قانون کی زد سے تم بھی نہ بچ سکو گے۔

بعینہٖ اسی طرح کی یاد دہانی بنی اسرائیل کو بھی کی گئی تھی لیکن انھوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ قرآن مجید میں اس کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے۔ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ۔۴۰ بقرہ (میری اس نعمت کو یاد رکھو جو میں نے تم پر کی ہے اور میرے عہد کو پورا کرو، میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہے اور مجھی سے ڈرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (۱۵۳)

منصبِ امامت کی مشکلات اور ان کا علاج

اب اس آیت اور آگے کی چار آیات میں ان خطرات و مشکلات کے مقابلہ کی تدابیر بتائی جا رہی ہیں، جو اس منصبِ امامت کے بعد پیش آئیں گی یا پیش آسکتی ہیں۔ یہود کو مسلمانوں کے ساتھ جو عناد تھا وہ تو اچھی طرح اوپر واضح ہو چکا ہے مگر قبلہ کے اس اشتراک کی وجہ سے یہود اب تک اس تمام اختلاف و نزاع کے اندر اتفاق کی بھی ایک جھلک دیکھتے تھے لیکن تحویلِ قبلہ کے بعد انھوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مسلمان اب ملتِ ابراہیمؑ کے وارث کی حیثیت سے اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ان سے بالکل ممیز ہو کر سامنے آگئے ہیں، اس چیز نے قدرتی طور پر مسلمانوں کے خلاف ان کے غیظ و غضب کو دوچند کر دیا۔ اسی طرح قریش جو مسلمانوں کو مکہ سے نکال کر اس طمعِ خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ یہ دعوت ایک اجنبی ماحول میں آپ سے آپ دب جائے گی، اب یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کی توقعات کے خلاف مسلمان مدینہ میں ایک طاقت بنتے جا رہے ہیں اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ملتِ ابراہیمؑ کے اصلی وارث اور خانہ کعبہ کے جائز متولی وہی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اب اس گھر کو اپنا قبلہ بھی بنا لیا ہے، جس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب وہ اس پر قبضہ بھی کرنے کی کوشش کریں، اس احساس نے انھیں بھی چوکنا کیا اور وہ اس خطرے کے سدِّباب کی تدبیریں سوچنے لگے، جس کے نتیجہ میں تحویلِ قبلہ کے دو ہی مہینوں کے بعد انھوں نے اس جنگ کے اسباب پیدا کر دیے جو تاریخِ اسلام میں غزوۂ بدر کے نام سے مشہور ہے، اس جنگ کے متعلق ہماری تحقیق، جیسا کہ ہم سورۂ انفال کی تفسیر میں پیش کریں گے، یہ ہے کہ یہ یہودِ مدینہ اور قریشِ مکہ کی باہمی سازش سے ہوئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان، جو اب ایک مستقل امت

کی حیثیت سے ملت ابراہیمی اور قبلہ ابراہیمی کے دعوے دار بن کر اٹھ رہے ہیں، ان کا زور اٹھنے سے پہلے ہی توڑ دیا جائے۔

یہ حالات اگرچہ ابھی پس پردہ تھے لیکن اس خدائے علام الغیوب سے مخفی نہیں تھے جو کھلے اور چھپے سب سے باخبر ہے اس وجہ سے اس کی رحمت اور حکمت متقضی ہوئی کہ وہ مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے متنبہ بھی فرمائے اور ان خطرات کے مقابلہ میں جو چیز ان کے عزم و حوصلہ کو برقرار رکھ سکتی ہے، اس کی ہدایت بھی فرمائے۔

اس سلسلہ کی پہلی بات جو آیت زیر بحث میں ارشاد ہوئی، یہ ہے کہ پیش آنے والی مشکلات میں صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ صبر اور نماز کی لغوی تحقیق، ان کے باہمی تعلق اور اقامت دین کی جدوجہد میں ان کی عظمت و اہمیت پر تفصیلی گفتگو ہم اسی سورہ کی آیت ۴۵ کے تحت کر چکے ہیں۔ نیز فصل ۲۷ میں بھی ان کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا چکی ہے اس وجہ سے یہاں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ بعض باتیں مخصوص اس مقام سے متعلق ہیں جن کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

ایک تو یہ کہ مشکلات و مصائب میں جس نماز کا سہارا حاصل کرنے کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد صرف پانچ وقتوں کی مقررہ نمازیں ہی نہیں ہیں بلکہ تہجد اور نفل نمازیں بھی ہیں۔ اس لیے کہ یہی نمازیں مومن کے اندر وہ روح اور زندگی پیدا کرتی ہیں جو راہ حق میں پیش آنے والی مشکلات پر فتح یاب ہوتی ہے، انھی کی مدد سے وہ مضبوط تعلق باللہ پیدا ہوتا ہے جو کسی سخت سے سخت آزمائش میں بھی شکست نہیں کھاتا، اور انھی سے وہ مقام قرب حاصل ہوتا ہے جو خدا کی اس معیت کا ضامن ہے جس کا اس آیت میں صابرین کے لیے وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اس حقیقت کی پوری وضاحت کی سورتوں میں آئے گی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

دوسری یہ کہ نماز تمام عبادات میں ذکر اور شکر کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نماز کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی شکرگزاری ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اوپر اس امت سے یہ عہد جو لیا گیا ہے فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي، اس کے قیام میں نماز سب سے بہتر وسیلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تیسری یہ کہ یہ نماز دعوت دین اور اقامت حق کی راہ میں عزیمت و استقامت کے حصول کے لیے مطلوب ہے۔ اس وجہ سے اس نماز کی اصلی برکت اس صورت میں ظاہر ہوتی ہے جب آدمی راہ حق میں باطل سے کشمکش کرتا ہوا اس کا اہتمام کرے۔ جو شخص سرے سے باطل کے مقابل میں کھڑے ہونے کا ارادہ ہی نہیں کرتا ظاہر ہے کہ اس کے لیے یہ ہتھیار کچھ غیر مفید ہی بن کر رہ جاتا ہے۔

چوتھی یہ کہ یہاں صبر اور نماز سے مدد حاصل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے، یہ نہیں فرمایا کہ اللہ نماز پڑھنے والوں اور صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس کی وجہ استاذ امام کے

نزدیک یہ ہے کہ نماز میں خدا کی معیت کا حاصل ہونا اس قدر واضح چیز ہے کہ اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، واضح کرنے کی بات یہی تھی کہ جو لوگ راہِ حق میں ثابت قدم رہتے ہیں اور اس ثابت قدمی کے حصول کے لیے نماز کو وسیلہ بناتے ہیں، اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

پانچویں یہ کہ اللہ کی معیت جس کا یہاں ثابت قدموں کے لیے وعدہ کیا گیا ہے کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ موقع کلام گواہ ہے کہ یہاں ان دو لفظوں کے اندر بشارتوں کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ تمام کائنات کا بادشاہِ حقیقی اور تمام امور و اختیارات کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے تو جب وہ کسی کی پشت پر ہے تو اس کو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی کس طرح شکست دے سکتی ہے؟

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (۱۵۴)

زندگی اور موت سے متعلق صحیح تصور

راہِ عزیمت و استقامت میں استوار رہنے کے لیے دوسری چیز جو مطلوب ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے یعنی زندگی اور موت سے متعلق صحیح اسلامی تصور کا استحضار۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے نزدیک تو زندگی نام بس اسی دنیا کی زندگی کا ہے، جو آدمی مرا یا مارا گیا بس وہ ختم ہو گیا۔ لیکن مومن کے نزدیک تو یہ زندگی چند روزہ اور فانی زندگی ہے، اصل زندگی کا ابتدا ہی ہے، آغاز تو اس کے نزدیک اس وقت سے ہوتا ہے جب یہ زندگی ختم ہوتی ہے۔ یہ زندگی عالمِ برزخ اور پھر عالمِ آخرت میں حاصل ہوتی ہے۔ جہاں تک موت کے بعد زندگی کا تعلق ہے یہ حاصل تو کافر و مومن سب ہی کو ہوتی ہے لیکن کفار کی زندگی چونکہ کلفت اور عذاب کی ہوتی ہے اس وجہ سے وہ قابلِ ذکر نہیں۔ البتہ اہلِ ایمان برزخ کی زندگی میں بھی اپنے اپنے مراتب و مدارج کے لحاظ سے مسرور و شادکام ہوتے ہیں۔ بالخصوص ان میں سے جو لوگ راہِ حق میں شہادت کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں ان کی برزخی زندگی کی کامرانیوں کا تو اس ناسوتی زندگی میں کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے مقدس خونِ شہادت سے اس دنیا کی کشتِ حق کو جو سیرابی اور زندگی بخشتے ہیں اس کے انعامات ان کو عالمِ برزخ ہی سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں، چنانچہ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۱۶۹ - آلِ عمران (جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردے نہ خیال کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس روزی پا رہے ہیں)

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ (۱۵۵)

آگے کی مشکلات کی طرف اجمالی اشارہ

یہ ان آزمائشوں کی طرف اجمالی اشارہ ہے جو آگے کے مراحل میں پیش آنے والی ہیں۔ یہ آزمائشیں اگرچہ پیش تو آئیں گی دشمنوں کی شرارتوں اور سازشوں کے باعث لیکن چونکہ یہ اس سنت اللہ کے تحت ہیں جو ازل سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ حق اور اہلِ باطل میں امتیاز کے لیے مقرر کر رکھی ہے اس وجہ سے ان کو منسوب اپنی طرف فرمایا ہے کہ ہم تمہیں آزمائیں گے، اور بات بصیغۂ تاکید فرمائی ہے۔ اس لیے کہ اہلِ حق کے لیے یہ

امتحان وآزمائش سنتِ الٰہی میں ناگزیر ہے۔ اس قسم کے امتحانوں سے گزر کر ہی بندوں کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور ان کے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ اس امتحان کے بغیر کوئی گروہ اللہ تعالیٰ کی اُخروی نعمتوں کا سزاوار قرار نہیں پاتا۔

خوف — اس سلسلہ میں سب سے پہلے خوف کا ذکر فرمایا ہے۔ خوف سے مراد دشمنوں کے حملہ و ہجوم کا اندیشہ ہے۔ اوپر اشارہ گزر چکا ہے کہ ایک مستقل امّت کی حیثیت سے نمایاں ہوتے ہی قریش نے بھی مسلمانوں پر حملے کے لیے بہانے پیدا کرنے شروع کر دیئے اور یہود نے بھی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں، پھر آہستہ آہستہ ان کی طرف سے حملوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ باہر کی قوموں نے بھی اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور یہ سلسلہ اس وقت جا کر ختم ہوا جب مسلمانوں نے اپنی عزیمت و استقامت سے اپنے تمام حریفوں کا نشہ اچھی طرح توڑ دیا۔

اس خوف کا ذکر ”بِشَیْءٍ“ یعنی کسی قدر کی قید کے ساتھ کیا ہے جس سے مقصود مسلمانوں کی ہمت افزائی ہے کہ یہ حالت پیش تو آئے گی لیکن یہ اس مقدار سے زیادہ نہ ہوگی جو تمہاری عزیمت و استقامت کی جانچ کے لیے ضروری ہے اس وجہ سے اس سے دل شکستہ اور پست ہمت ہونے کے بجائے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔

معاشی مشکلات — جوع سے مراد وہ معاشی مشکلات ہیں جو قریش اور یہود کی مشترکہ مخالفت، خوف و خطرے کی حالت اور ان کی طرف سے غذائی ناکہ بندیوں کے سبب سے پیش آسکتی ہیں۔ اس وقت تک ملک کی تمام تجارت اور دوسرے معاشی وسائل و ذرائع پر عملاً یہود اور قریش ہی قابض تھے۔ اس وجہ سے ان کے ساتھ جھگڑا مول لینا، دریا میں رہتے ہوئے مگرمچھوں سے بَیر مول لینے کے ہم معنی تھا۔ لیکن حق کی رفاقت مقتضی تھی کہ مسلمان یہ خطرہ بھی مول لیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ خطرہ بھی مول لیا اور تاریخ گواہ ہے کہ یہ خطرہ ظاہر تو ہوا بعض حالات میں بہت ہی بھیانک شکل میں لیکن عزم و ایمان کے مقابل میں یہ بھی ٹھہرا پرکاہ (بِشَیْءٍ) ہی کے برابر۔

مال اور جان کی کمی — اس کے بعد اموال و انفس یعنی مال اور جان کی کمی کی آزمائش کی طرف اشارہ فرمایا اس لیے کہ جنگ و جہاد میں یہی دونوں چیزیں وسیلہ کار بنتی ہیں جس کے سبب سے سب سے زیادہ قربانی انھی کی دینی پڑتی ہے۔ نیز امن و اطمینان کے فقدان کے سبب سے یہ اس نگہداشت سے بھی محروم ہو جاتی ہیں جو ان کی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔

ثمرات — ثمرات کا ذکر اگرچہ اموال کے ذکر کے بعد بظاہر کچھ زائد سا معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ یہ بھی اموال میں شامل ہے، لیکن اس کے ذکر میں موقع کلام کی رعایت ملحوظ ہے۔ اہلِ عرب کی دولت یا تو اونٹ اور بھیڑ بکریاں تھیں جن کے لیے اموال کا لفظ استعمال ہوتا تھا یا پھر پھل خصوصاً کھجور۔ ملک کی اس مخصوص حالت کی وجہ سے اموال کے ساتھ ثمرات کا ذکر بھی ہوا۔

آخر میں ان لوگوں کو خوش خبری دی گئی ہے جو ان تمام آزمائشوں کے باوجود حق پر جمے رہیں، اور اپنے

عزم وایمان میں کوئی ضعف پیدا نہ ہونے دیں، یہ خوش خبری قرآن کی دوسری جگہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی پر مشتمل ہے۔ مثلاً فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ
عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ
أَلِيمٍ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ
وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذَٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝
يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَ
يُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً
فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝
وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَ
فَتْحٌ قَرِيبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝
(۱۰-۱۳ صف)

اے ایمان والو، کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت
کا پتہ نہ دوں جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے
نجات دینے والی ہے؟ اللہ اور اس کے رسول پر
ایمان لاؤ، اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور
جانوں سے جہاد کرو، یہ تمہارے لیے کہیں بہتر ہے۔
اگر تم اس بات کو سمجھو۔ اللہ تمہارے گناہوں کو بخشے گا۔
اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے
نہریں جاری ہوں گی اور ایسے اچھے مکانوں میں اتارے گا
جو ابد کے باغوں میں ہیں، یہ وہ حاصل سب سے بڑی
کامیابی ہے۔ مزید برآں ایک دوسری چیز بھی تمہیں
حاصل ہوگی جس کو تم عزیز رکھتے ہو، وہ ہے اللہ کی مدد
اور عنقریب حاصل ہونے والی فتح۔ اور اس بات
کی ایمان والوں کو بشارت سنا دو۔

الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (۱۵۶)

صابرین کی ڈھال

یہ صابرین کی صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ آزمائشوں کا مقابلہ بد دلی اور پست ہمتی کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ خندہ پیشانی اور عزم و استقلال کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہاں جو ان کا یہ قول نقل ہوا ہے یہ درحقیقت ان کے اس عقیدے کا اظہار ہے جس کی چٹان پر صبر و استقامت کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اس عقیدے کا ایک جزو تو یہ ہے کہ آدمی اس بات پر ایمان رکھے کہ وہ اس دنیا میں اللہ ہی کا اور اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کا دوسرا جزو یہ ہے کہ مرنے کے بعد اس کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ جو شخص ان دو حقیقتوں پر مضبوط ایمان رکھتا ہے کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کے قدم کو جادۂ حق سے ہٹا نہیں سکتی۔ جب ہم اس دنیا میں خدا ہی کے بھیجے ہوئے آئے ہیں، اسی کے لیے ہمارا مرنا اور جینا ہے اور مرنے کے بعد وہی ہے جس کی طرف ہمیں جانا ہے تو پھر اس کی خاطر تو ہم ہر چیز سے منہ موڑ سکتے ہیں لیکن وہ کون سی طاقت ہو سکتی ہے جو ہمارے رخ کو اس سے موڑ دے؟

یہی کلمہ صابرین کی ڈھال اور سپر ہے۔ اسی پر وہ مصیبت کے ہر وار کو روکتے ہیں۔ اس میں اللہ کی طرف جو تفویض و سپردگی ہے وہ سرفروشی اور جاں بازی کی سپردگی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ بندۂ مومن جب وقت آجاتا

ہے تو یہی نعرہ لگاتا ہوا اپنے رب کے لیے دریا اور پہاڑ سے بھی لڑ جاتا ہے۔ وہ سب کے قدم اکھاڑ دیتا ہے لیکن اس کے قدم کو کوئی چیز بھی اکھاڑ نہیں سکتی۔

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (۱۵۷)

'صلوات' کا مفہوم

صَلَوات، صلوٰۃ کی جمع ہے جس کے اصل معنی لغت میں اقبال الی الشیء یعنی کسی چیز کی طرف بڑھنے کے ہیں۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ نماز کے لیے استعمال ہوا کہ بندہ نماز میں اپنے رب کی طرف بڑھتا ہے۔ اسی طرح یہ لفظ التفات و توجہ کے لیے بھی آتا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی طرف فرماتا ہے۔ اس صورت میں اس کے معنی الطاف و عنایات، الٰہی کے ہو جاتے ہیں۔ لفظ کی روح تو ایک ہی رہتی ہے لیکن نسبت کے بدل جانے سے ایک میں نیازمندی کا اور دوسرے میں لطف و عنایت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا ترجمہ ہم نے عنایتیں کیا ہے۔ نسبت کے بدل جانے سے الفاظ کے مفہوم میں اس قسم کی تبدیلیوں کی مثالیں عربی زبان میں بہت ملتی ہیں۔ یہاں ان صابرین کے لیے جس عنایت و رحمت اور جس ہدایت کی بشارت ہے اس کا تعلق دین اور دنیا اور آخرت، جیسا کہ اُوپر گزرا، دونوں ہی سے ہے۔ صبر و استقامت سے اہل ایمان اپنے رب کے افضال و عنایات کے مستحق قرار پاتے ہیں اور انہی افضال و عنایات سے انہیں اس صراطِ مستقیم کی ہدایت حاصل ہوتی ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی ضامن بنتی ہے۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۗ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ (۱۵۸)

اصل سلسلۂ کلام کی طرف رجوع

یہ آیت اصل سلسلۂ بحث یعنی قبلہ کی بحث سے متعلق ہے، اوپر والا مضمون، جیسا کہ واضح ہوا، ضمناً محض ایک تنبیہ کے طور پر آ گیا تھا کہ یہ قبلہ کی تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہیں ہے بلکہ یہ مسلمانوں کے لیے بہت سی آزمائشوں کا پیش خیمہ ہے جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صبر اور نماز وسیلۂ کار ہیں۔ اس ضمنی مضمون کے بعد اصل سلسلۂ بحث کو پھر لے لیا اور صفا و مروہ کے شعائر اللہ میں سے ہونے اور ان سے متعلق احکام و ہدایات کا ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ یہود نے جس طرح بیت اللہ کے قبلہ ابراہیمی ہونے کے معاملہ کو چھپانے کی کوشش کی جس کا ذکر تفصیل سے اوپر ہو چکا ہے، اسی طرح مروہ کو بھی جو حضرت ابراہیمؑ کی اصل قربان گاہ ہے، چھپانے کی کوشش کی جس کی تفصیل آگے والی آیت کے تحت آ رہی ہے۔

اصل مقام قربانی مروہ ہے

صفا اور مروہ بیت اللہ کے پاس کی وہ دونوں پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان حج و عمرہ کے موقع پر سعی کی جاتی ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'الرای الصحیح فی من ھو الذبیح' میں پوری تفصیل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اصل قربان گاہ، جہاں حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کی، یہی مروہ ہے[1]۔ جس کا ذکر تورات

[1] یہ واضح رہے کہ اصل قربان گاہ تو یہی مروہ ہے لیکن امت کی وسعت کے پیش نظر اس کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔ اس سلسلے کی تفصیلات کے لیے استاذ مرحوم کا رسالہ ذبیح ملاحظہ فرمائیے۔

میں آیا ہے لیکن یہود نے بیت اللہ سے حضرت ابراہیمؑ کا تعلق کاٹ دینے کے لیے اس لفظ کو تحریف کر کے کچھ سے کچھ کر دیا۔

شعائر سے مقصود

شعائر، شعیرہ کی جمع ہے۔ جس کے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی اور اس کا مظہر اور نشان ([illegible]) ہو۔ اصطلاح دین میں اس سے مراد شریعت کے وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کسی معنوی حقیقت کا شعور پیدا کرنے کے لیے بطور ایک نشان اور علامت کے مقرر کیے گئے ہوں۔ ان مظاہر میں مقصود بالذات تو وہ حقائق ہوا کرتے ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مقرر کیے ہوئے اللہ اور رسول کے ہوتے ہیں اس وجہ سے ان حقائق کے تعلق سے یہ مظاہر بھی تقدیس کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً قربانی حقیقتِ اسلام کا ایک مظہر ہے۔ اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالہ کر دے۔ اپنی کوئی محبوب سے محبوب چیز بھی اس سے دریغ نہ رکھے۔ اس حقیقت کا عملی مظاہرہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کی قربانی کر کے فرمایا، وہ تاریخ انسانی کا ایک بے نظیر واقعہ ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی یادگار میں جانوروں کی قربانی کو ایک شعیرہ کے طور پر مقرر فرما دیا تاکہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کے اندر اسلام کی اصل حقیقت برابر تازہ ہوتی رہے۔

اسی طرح حجر اسود ایک شعیرہ ہے۔ یہ پتھر حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے اس روایت کا ایک نشان ہے کہ اس کو بوسہ دے کر یا اس کو ہاتھ لگا کر بندہ اپنے رب کے ساتھ اپنے عہد بندگی اور اپنے میثاق اطاعت کی تجدید کرتا ہے۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں اس کو یمین اللہ (خدا کا ہاتھ) سے تعبیر کیا گیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ جب اس کو ہاتھ لگاتا ہے تو گویا وہ خدا کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر اس سے تجدید بیعت کرتا ہے۔ اور جب اس کو بوسہ دیتا ہے تو گویا یہ اس کی طرف سے خدا کے ساتھ عہد محبت و وفاداری کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی طرح جمرات بھی شعائر اللہ میں سے ہیں۔ یہ نشانات اس لیے قائم کیے گئے ہیں کہ حجاج ان پر کنکریاں مار کر اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کے دشمنوں اور اسلام کے دشمنوں پر، خواہ وہ ابلیس کی ذریات سے تعلق رکھنے والے ہوں یا انسانوں کے کسی گروہ سے، لعنت کرتے ہیں اور ان کے خلاف جہاد کے لیے ہر وقت مستعد ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس بیت اللہ بھی ایک شعیرہ بلکہ سب سے بڑا شعیرہ ہے جو پوری امت کا قبلہ اور توحید و نماز کا مرکز ہے۔ اس کے ارد گرد طواف کر کے اور اپنی نمازوں اور اپنی تمام مسجدوں کا اس کو قبلہ قرار دے کر ہم اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ جس خدائے واحد کی عبادت کے لیے یہ گھر تعمیر ہوا ہم اسی کے بندے، اسی کی طرف رخ کرنے والے، اسی کے عبادت گزار اور اسی کی شمع توحید پر پروانہ وار نثار ہیں۔

اسی طرح صفا اور مروہ بھی اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں۔ ان کے شعائر میں سے ہونے کی وجہ

عام طور پر تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ انھی دونوں پہاڑیوں کے درمیان حضرت ہاجرہ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں تگ و دو کی تھی لیکن استاذ امامؒ کا رجحان اس بات کی طرف ہے کہ اصل قربان گاہ مروہ ہے یہیں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں فرمانبردارانہ اور غلامانہ سرگرمی دکھائی اس وجہ سے ان دونوں پہاڑیوں کو شعائر میں سے قرار دے دیا گیا اور اُن کی سعی کی یادگار ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی گئی۔

ان شعائر سے متعلق چند اصولی باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

شعائر سے متعلق چند اصولی باتیں

ایک یہ کہ یہ شعائر، اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ ہیں۔ کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے طور پر کسی چیز کو دین کے شعائر میں سے قرار دے دے یا جو چیز شعائر میں داخل ہے اس کو شعائر کی فہرست سے خارج کر دے۔ دین میں اس قسم کے من مانے تصرفات سے شرک و بدعت کی راہیں کھلتی ہیں جن قوموں نے اپنے جی سے شعائر قرار دیے تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے اس طرح شرک و بت پرستی کی راہیں کھول دیں۔

دوسری یہ کہ جس طرح شعائر اللہ کے مقرر کردہ ہیں اسی طرح اسلام میں ان شعائر کی تعظیم کے حدود بھی خدا اور رسول ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ جس شعیرہ کی تعظیم کی جو شکل شریعت میں ٹھہرا دی گئی ہے وہی اس حقیقت کے اظہار کی واحد شکل ہے جو اس شعیرہ کے اندر مضمر ہے، اس سے سرِمو انحراف نہ صرف اس شعیرہ کی حقیقت سے انسان کو محروم کر دینے والی بات ہے بلکہ اس سے شرک و بدعت کے دروازے بھی کھل سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ حجرِ اسود ایک شعیرہ ہے۔ اس کی تعظیم کے لیے اس کو حالتِ طواف میں بوسہ دینے یا اس کو ہاتھ لگا کر ہاتھ کو چوم لینے یا اس کی طرف اشارہ کرنے کی شکلیں خود دین کے لانے والے کی طرف سے مقرر کر دی گئی ہیں۔ اگر کوئی شخص تعظیم کی صرف انہی شکلوں پر قناعت نہ کرے بلکہ تعظیم شعائر اللہ کے جوش میں وہ اس پتھر کے آگے گھٹنے ٹیکنے لگے یا اس کے سامنے نذریں پیش کرنے لگے یا اس پر پھول نثار کرنے لگے یا اس طرح کی کوئی اور حرکت کرنے لگے تو ان باتوں سے وہ نہ صرف یہ کہ اس حقیقت سے بالکل دور ہو جائے گا جو اس شعیرہ کے اندر مضمر ہے بلکہ وہ شرک و بدعت میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔

تیسری یہ کہ ان شعائر میں اصل مطمحِ نظر وہ حقیقتیں ہوا کرتی ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ ان حقیقتوں کے اظہار کے لیے یہ شعائر گویا قالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ملت کی زندگی کے لیے سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں یہ حقیقتیں برابر زندہ اور تازہ رکھی جائیں۔ اگر یہ اہتمام سرد پڑ جائے تو دین کی اصل روح نکل جاتی ہے صرف قالب باقی رہ جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ لوگوں کی اصل توجہ صرف قوالب پر مرکوز ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین صرف ایک مجموعۂ رسوم بن کے رہ جاتا ہے۔

زیرِ بحث آیت میں یہ جو فرمایا کہ "صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں" تو اس سے مقصود ایک طرف تو یہ ہے کہ ان دونوں شعائر کو جاہلیت کے گرد و غبار سے پاک کر کے ان کو وراثتِ ابراہیمی کی حامل امت کے لیے از سرِ نو اجاگر کیا جائے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عرب جاہلیت نے ان دونوں پہاڑوں پر جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے، دو بت رکھ دیے تھے اور ان بتوں کے لیے سعی و طواف کرنے لگے تھے جس کے سبب سے ان شعائر کا نہ صرف شعائر ابراہیمی میں سے ہونا مشتبہ ہو گیا تھا بلکہ یہ علانیہ شرک و بت پرستی کے مظہر بھی بن گئے تھے۔ قرآن نے اوپر کی آیات میں جس طرح بیت اللہ کو تمام مشرکانہ آلودگیوں سے پاک صاف کر کے، اس کے اصل ابراہیمی جمال میں پیش کیا اسی طرح یہاں صفا اور مروہ کی اصل تاریخ بیان فرمائی کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے شعائر اللہ میں سے ہیں اور ان کے سعی و طواف کی سنت حضرت ابراہیمؑ کی سعی و طواف کی یادگار ہے لیکن مشرکین نے جس طرح توحید کے مرکز بیت اللہ میں سیکڑوں بت لا کر رکھ دیے اسی طرح ان شعائر کو بھی بت پرستی سے ملوث کیا۔ اب یہ تمھاری ذمہ داری ہے کہ تم گندگی کے اس ڈھیر کو ہٹا کر ان شعائر کو از سرِ نو اجاگر کرو اور ان کے سعی و طواف کو صرف اللہ ہی کے لیے خاص کرو۔

دوسری طرف یہود نے ان شعائر پر تحریف اور کتمان کا جو پردہ ڈال دیا تھا، جیسا کہ آگے والی آیت میں ذکر آ رہا ہے قرآن نے وہ پردہ بھی اٹھا دیا۔ اوپر ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ تورات میں یہ ذکر صراحت کے ساتھ موجود تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی مروہ کے پاس کی لیکن یہود نے محض اس خیال سے اس لفظ کا صحیح تلفظ بالکل مسخ کر ڈالا کہ کسی طرح اس مقام کو مکہ کے بجائے بیت المقدس میں ثابت کر دیں۔ اور اس طرح آخری نبی کی بعثت سے متعلق جو پیشین گوئیاں تورات میں موجود ہیں وہ حضرت اسماعیلؑ کی نسل کی جگہ حضرت اسحاقؑ کی نسل کی طرف منتقل ہو سکیں۔ قرآن نے یہاں مروہ کا حوالہ دے کر اس نشان کی طرف انگلی اٹھا دی جس کو محض حسد اور شرارت کی بنا پر غائب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

ان دونوں پہاڑیوں کے طواف کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی صحیح شکل اور اس کے حدود کا تعین دوسرے مناسکِ حج کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں لفظ طواف کا استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مراد وہ سعی ہی ہے جو ان دونوں کے درمیان کی جاتی ہے۔ اس سعی کو طواف کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی شکل اس طواف سے ملتی جلتی ہوئی ہے جو خانہ کعبہ کے اردگرد ہوتا ہے۔ اس سعی کو حج و عمرہ کے ساتھ مشروط قرار دیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ حج و عمرہ کے مجموعہ ہی کا ایک جزو ہے، ان سے علیحدہ اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ اس سے ان مشرکانہ رسوم کی بالکل نفی ہو جاتی ہے جن کا اضافہ ان شعائر کے سلسلہ میں مشرکین نے کر دیا تھا۔

اس طواف کا حکم جن الفاظ میں وارد ہے وہ کسی قدر وضاحت طلب ہیں۔ فرمایا ہے۔

فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا   پس جو حج یا عمرہ کرے تو اس کے لیے اس بات میں

جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کا طواف کرے۔

اس اسلوبِ بیان سے بظاہر یہ بات نکلتی ہے کہ اس سعی کے لیے شریعت میں صرف اجازت ہے، اگر کوئی شخص یہ نہ کرے یا نہ کر سکے تو اس میں بھی کوئی خاص قباحت نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مراد یہ ہوتی تو اسلوبِ کلام، جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا کے بجائے اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ فرمانے کے بعد کہ صفا اور مروہ دونوں شعائر اللہ میں سے ہیں یہ کہنا کچھ ناموزوں اور بے جوڑ سا ہو جاتا ہے کہ ان کا طواف کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہے۔ پہلی بات کے بعد ان کے ہم وزن اور اس سے ہم آہنگ بات تو یہی ہو سکتی ہے کہ ان کا طواف ضروری قرار دیا جائے۔ رہا یہ سوال کہ یہ کس درجہ میں ضروری ہے، اس کی حیثیت فرض کی ہے یا واجب کی یا مستحب کی؟ اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ خیال کرنے کی تو کوئی گنجائش بھی نہیں ہے کہ اس قدر شاندار تمہید کے بعد اصل بات اتنی کمزور درجہ کی ہو۔ اسی وجہ سے ہمارا خیال یہی ہے کہ یہاں سعی کا حکم ہے اور یہ حکم وجوب کے درجہ میں ہے۔

حکمِ سعی کی نوعیت

لیکن اس پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر مدعا یہی ہے تو یہاں فَلَا جُنَاحَ کا مطلب کیا ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس رفع حرج کا تعلق سعی کے حکم سے نہیں ہے بلکہ اس قباحت سے ہے جو اس حکم کے نزول کے وقت مقام سعی میں بتوں کی موجودگی کی وجہ سے پائی جاتی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت صفا اور مروہ میں یہ قباحت موجود ہے لیکن چونکہ یہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے شعائر حج میں سے ہیں اس وجہ سے حج و عمرہ کے موقع پر ان کے درمیان سعی کرو، تمہارا عمل تمہاری نیت کے مطابق ہوگا۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ میں تطوع سے مراد یہ ہے کہ آدمی کسی فرض سے سبکدوش ہو چکنے کے بعد خدا کی خوشنودی اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لیے مزید اس کو ایک نفلی نیکی کی حیثیت سے انجام دے۔ یہاں اس تطوع کا تعلق صرف سعی کے حکم سے نہیں ہے۔ اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سعی کوئی مستقل عبادت نہیں ہے بلکہ یہ حج و عمرہ ہی کا ایک ضمیمہ ہے، اس وجہ سے اس تطوع کا تعلق بھی حج و عمرہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو حج و عمرہ وہ ہے جو ادائے فرض کے طور پر انجام دیا جائے، دوسرے تطوع کے طور پر بھی حج و عمرہ کیے جا سکتے ہیں، جو لوگ ایسا کریں گے اللہ ان کی اس نیکی کو قبول فرمائے گا اور یہ اس کے علم میں رہے گی۔ ایک دن وہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

شکر کا لفظ صلوٰۃ یا توبہ کے الفاظ کی طرح ان الفاظ میں سے ہے جن کے معنی میں نسبت کی تبدیلی سے فرق ہو جایا کرتا ہے۔ جب بندے کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے تو اس کے معنی شکر گزاری کے ہوتے ہیں، لیکن جب اس کی نسبت خدا کی طرف ہو تو اس کے معنی قبول کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ (١٥٩)

یہود کا کتمانِ حق یہ اشارہ یہود کی طرف ہے اور آیت میں بیّنات اور ہدیٰ سے مراد اگرچہ وہ عام تعلیمات بھی ہیں جن کو یہود نے چھپانے کی کوشش کی لیکن یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ اس سے خاص طور پر وہ نشانیاں مراد ہیں جو تورات میں اللہ تعالیٰ نے اس لیے واضح فرمائی تھیں کہ ان کی مدد سے یہود کو آخری پیغمبر کے باب میں رہنمائی حاصل ہوسکے۔ لیکن یہود نے ان نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ان کو چھپانے کی کوشش کی۔ اس کی بعض مثالیں ہم اس کتاب کے پچھلے صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ یہاں ہم استاذ امام کی عظیم تصنیف الرای الصحیح فی من ہو الذبیح کی آٹھویں فصل کا حوالہ دیں گے جس میں انھوں نے مروہ سے متعلق یہود کی تحریفات پر بحث کی ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی جگہ کو تورات سے غائب کرنے کے لیے کیا کیا تدبیریں کیں اور کس بیدردی کے ساتھ لفظ مروہ کا حلیہ بگاڑا تاکہ آخری نبی کی پیشین گوئیوں سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں گھپلا پیدا کیا جاسکے۔

ایک عظیم حقیقت کا چھپانا جب کہ وہ ان کی اپنی کتاب میں اچھی طرح واضح کی جاچکی ہو اور جس کو خلق کے سامنے واضح کرنے کا ان سے عہد بھی لیا جاچکا ہو جیسا کہ آل عمران ۱۸۷ میں حوالہ ہے۔ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ (اور یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے میثاق لیا کہ اس کتاب کو اچھی طرح لوگوں کے سامنے واضح کرنا) یہود کا ایک ایسا جرم تھا جس پر وہ خدا کی لعنت کے مستحق ٹھہرے اور کتاب الٰہی کی امانت جو ان کے سپرد کی گئی تھی ان سے چھین کر دوسروں کے سپرد کردی گئی۔

اس لعنت کے متعلق فرمایا ہے کہ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ اس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح اصطفا یعنی کسی امت کا دنیا کی امامت کے لیے منتخب کیا جانا اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے اسی طرح یہ لعنت اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے بڑی سزا ہے جس قوم کو یہ سزا دی جاتی ہے وہ دنیا میں توفیق ہدایت اور منصب امامت سے محروم کرکے ذلت و خواری میں مبتلا کردی جاتی ہے اور آخرت میں اس کے لیے ابدی عذاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اپنی حق پوشی سے صرف اپنی ہی ضلالت کا سامان نہیں کرتی بلکہ راہ کے نشانات ہدایت غائب کرکے دوسرے بے شمار لوگوں کو بھی گمراہی اور ہلاکت میں مبتلا کرتی ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (١٦٠)

توبہ کے لیے شرط یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس لعنت سے محفوظ رہیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حق پوشی کے جرم سے توبہ کرلیں۔ اس توبہ کے ساتھ أَصْلَحُوا کی شرط لگائی ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ توبہ اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک آدمی اس غلطی کی اصلاح نہ کرے جس کا مرتکب ہو رہا ہے۔ مزید شرط اس کے ساتھ

بَيَّنُوْا کی لگائی۔ یہ موقع کی مناسبت سے ہے اور سابق الذکر اَصْلَحُوْا کی وضاحت کر رہی ہے۔ یعنی آخری نبی سے متعلق تورات کے جن حقائق و بینات کو انھوں نے چھپایا ہے اس کو ظاہر کریں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کم از کم یہود کے خواص اور علماء ان تحریفات سے بے خبر نہیں تھے جو حق پوشی کی سازش کے تحت کی گئی تھیں یا کی جا رہی تھیں۔ اس کا ثبوت اس امر سے بھی ہم پہنچ رہا ہے کہ یہود کے اہل علم میں سے جو لوگ نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب ہوئے انھوں نے اس قسم کے بہت سے حقائق سے پردے اٹھائے بھی۔

اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ میں توبہ کے ساتھ علیٰ کا صلہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس کے اندر رحمت کا مضمون بھی پوشیدہ ہے۔ یعنی ایسے لوگوں کی توبہ میں قبول کرتا اور ان پر رحم کرتا ہوں۔ لفظ کی اس مخفی حقیقت کو اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ کہہ کر واضح فرمایا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (۱۶۱)

"جن لوگوں نے کفر کیا اور حالت کفر ہی میں مرے" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی ضد پر اڑے رہ گئے اور توبہ و اصلاح اور اظہار و اعلان حق سے محروم ہی دنیا سے اٹھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق پوشی ایک ایسا جرم ہے جو ان کی دینداری کی دوسری باتوں اور ان کے ایمان و محبتِ الٰہی کے تمام دعووں کو بالکل باطل کر دے گا۔ اور اس کی پاداش میں وہ اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت کے سزاوار ہوں گے۔ یہاں اللہ کی لعنت کے ساتھ فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت کا ذکر اس اجمال کو واضح کر رہا ہے جو اوپر والی آیت کے الفاظ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ میں موجود تھا اور النّاس کے ساتھ اجمعین کی قید یہ حقیقت واضح کر رہی ہے کہ قیامت کے روز جب اصل حقیقت سے پردہ اُٹھے گا تو صرف نیک لوگ ہی ان پر لعنت نہیں بھیجیں گے بلکہ وہ گنہگار بھی ان پر لعنت بھیجیں گے جو ان کی پیروی میں گمراہ ہوں گے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (۱۶۲)

یعنی نہ تو جس عذاب میں وہ ڈالے جائیں گے اس میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ اس کے تسلسل میں کوئی وقفہ یا انقطاع واقع ہوگا کہ اس سے انہیں ذرا دم لینے ہی کا موقع مل جائے۔

۵۲۔ آگے کا مضمون —— آیات ۱۶۳-۱۶۷

سورہ کے مطالب کا دوسرا باب

آیات ۱۶۲ پر اس سورہ کا پہلا باب ختم ہوا۔ اس باب میں یہود منصبِ امامت سے معزول ہوئے اور ایک نئی امت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ نمایاں ہوئی۔ اب آگے آیت ۱۶۳ سے اس سورہ کے مطالب کا دوسرا باب شروع ہو رہا ہے جس میں اس نئی امت کے لیے از سر نو شریعت الٰہی کی تجدید کی جا رہی ہے۔ اس باب میں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ امت کو وہ احکام دیے گئے ہیں جن کے لیے سورہ

کے زمانۂ نزول کے حالات متقاضی تھے اور ساتھ ہی ہر حکم کے تحت ان بدعات کی تردید کی گئی ہے جو یہود یا مشرکین نے شریعت الٰہی میں ملا دی تھیں۔

اس باب کا آغاز توحید کے بیان سے ہو رہا ہے اس لیے کہ تمام دین کی بنیاد اسی چیز پر ہے۔ توحید کے دعوے کے ذکر کے بعد اس کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ توحید کی یہ دلیل وہی دلیل ہے جس کی طرف اس کتاب کی فصل ۲۲ میں ہم دلیل توافق کے نام سے اشارہ کر چکے ہیں، یہاں یہ دلیل اپنے بعض نئے پہلوؤں کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے جن کی وضاحت آیات کی تفسیر کے تحت آئے گی۔ پھر شرک کی تردید فرمائی ہے اسی ضمن میں کسی چیز کو خدا کے حکم کے بغیر حرام یا حلال ٹھہرانے کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ اس لیے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ چیز بھی شرک ہی میں داخل ہے۔

پھر ان چیزوں کی طرف ایک سرسری اشارہ فرمایا جو فی الواقع اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مشرکین یا اہل کتاب نے بعض چیزیں جو اپنے جی سے محض اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت یا اپنی خواہشوں کے لیے حرام یا حلال کی ہیں ان کی تحریم و تحلیل کو شریعت الٰہی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے بعد چند آیات میں مشرکین کو ان کی اندھی بہری تقلید آبا پر اور اہل کتاب کو ان کی حق پوشی پر سرزنش فرمائی ہے کہ اگر یہ عقل سے کام لیتے اور محض خواہشات نفس کی پیروی میں ضلالت کو ہدایت پر ترجیح نہ دیتے تو وہ توحید کی مخالفت اور شرک کی حمایت نہ کرتے لیکن انھوں نے اپنی شامت اعمال سے اپنے لیے ابدی ہلاکت کی یہی راہ اختیار کی ہے۔

اس روشنی میں اب آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۶۳-۱۷۶ ع ۱۹ وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾
اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ مِنْ مَّاۗءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ
بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ
بَيْنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَمِنَ النَّاسِ
مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَ

الَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ ۗ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ
الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾
إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ
وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ
أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ
اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنَ
النَّارِ ﴿١٦٧﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ع ٢٠ ٤ ٢
وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿١٦٨﴾ إِنَّمَا
يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾
وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ
مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ
شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٧٠﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي
يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ
لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٧١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ
وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ
الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ
فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
رَّحِيمٌ ﴿١٧٣﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَ

يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ
بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى
وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ
اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ
ع ۲۱ ۵ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾

ترجمہ آیات ۱۶۳-۱۷۶

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ رحمان اور رحیم ہے۔ بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات اور دن کی آمد و شد، اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لیے سمندر میں نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے بادلوں سے اتارا اور جس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشی اور جس سے اس میں ہر قسم کے جان دار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مامور ہیں، ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۱۶۳-۱۶۴

اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہم سر ٹھہراتے ہیں، جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیئے۔ لیکن جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔ اور اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اس وقت کو دیکھ سکتے جب کہ یہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ سارا زور اور اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اللہ بڑا ہی سخت عذاب

دینے والا ہے۔ ۱۶۵

اس وقت کا خیال کرو جب کہ مقتدا اپنے پیروؤں سے اظہار براءت کریں گے، اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے اور ان کے تعلقات یک قلم ٹوٹ جائیں گے اور ان کے پیرو بھی کہیں گے کہ اے کاش ہمیں دنیا میں ایک بار اور جانا نصیب ہوتا کہ ہم بھی ان سے اسی طرح اظہار براءت کرسکتے جس طرح انھوں نے ہم سے اظہار براءت کیا ہے! اس طرح اللہ ان کے اعمال ان کو سرمایہ حسرت بنا کر دکھائے گا اور ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷

اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال طیب ہیں ان کو کھاؤ۔ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ تو بس تمھیں برائی اور بے حیائی کی راہ سوجھائے گا اور اس بات کی کہ تم خدا کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمھیں کوئی علم نہیں ہے۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹

اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہ ہدایت پر رہے ہوں؟ ان کافروں کی تمثیل ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسی چیزوں کو پکارے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سنتی سمجھتی ہوں۔ یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، یہ سمجھ نہیں سکتے۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱

اے ایمان والو، جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو بخشی ہیں ان کو کھاؤ اور اللہ ہی کے شکر گزار بنو اگر تم اسی کی بندگی کرنے والے ہو۔ اس نے تو بس تمھارے لیے مردار، خون، سور کا گوشت

اور غیر اللہ کے نام کے ذبیحہ کو حرام ٹھہرایا ہے۔ اس پر بھی جو مجبور ہو جائے اور وہ خواہش مند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس کے لیے کوئی گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ۱۷۲-۱۷۳

بے شک جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو خدا نے اپنی کتاب میں سے اتاری ہے اور اس کے عوض میں حقیر قیمت قبول کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹوں میں صرف دوزخ کی آگ بھر رہے ہیں۔ ان لوگوں سے خدا قیامت کے دن نہ تو بات کرے گا، نہ ان کو پاک کرے گا۔ ان کے لیے بس عذاب دردناک ہے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت پر اور عذاب کو مغفرت پر ترجیح دی، یہ دوزخ کے معاملہ میں کتنے ڈھیٹ ہیں! ۱۷۴-۱۷۵

یہ اس لیے ہوگا کہ اللہ نے اپنی کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے اور جن لوگوں نے اس کتاب کے معاملہ میں اختلاف کیا ہے وہ مخالفت میں بہت دور نکل گئے۔ ۱۷۶

۵۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۱۶۳)

اِلٰہ کے معنی معبود کے ہیں۔ اسی پر الف لام تعریف کا داخل کر کے لفظ اللہ، اللہ تعالیٰ کے لیے بطور اسم ذات استعمال ہوا۔ رحمان اور رحیم کی تحقیق اور ان دونوں کے فرق کی وضاحت سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

یہ توحید ہی سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز ہے جو ملت ابراہیم کی وراثت کی حیثیت سے اس امت مسلمہ کی طرف منتقل ہوئی۔ اس کا ذکر یہاں مثبت اور منفی دونوں ہی پہلوؤں سے فرمایا ہے تاکہ اس میں کسی رخنہ کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس میں اگر کوئی رخنہ پیدا ہو جائے تو یہ بنیاد کا رخنہ ہے جس سے شیطان کو پورے دین میں رخنہ اندازی کے لیے راہ مل جاتی ہے۔

رحمان اور رحیم کے ذکر کے دو پہلو

اس توحید کے ذکر کے ساتھ اسمائے حسنیٰ میں سے رحمان اور رحیم کا حوالہ دو مختلف پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔

اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ شرک کے اسباب و محرکات میں سے ایک بہت بڑا سبب خدا کے ہر قسم کے شغل و عمل اور ہر نوع کے تعلق سے ارفع اور بالاتر ہونے کا غلط تصور بھی ہے۔ یہ تصور ہے تو ایک تنزیہی تصور لیکن بعض صورتوں میں یہ خدا کی بے ہمگی کو اس قدر بڑھا دیتا ہے کہ خلق سے اس کا تعلق بالکل ہی منقطع ہو جاتا ہے اور اس تک رسائی حاصل کرنا یا خلق کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق رکھنا اس کی شانِ الوہیت کے منافی قرار پا جاتا ہے۔ خدا کی بے ہمگی کا یہ تصور فطری طور پر دلوں میں اس کی طرف سے ایک مایوسی پیدا کرتا ہے اور یہ مایوسی بالآخر ان وسائل و وسایط کو جنم دیتی ہے جن کو انسان خدا کے نہ پا سکنے کی شکل میں اپنے لیے تسلی و طمانیت کا ذریعہ بناتا ہے۔ قرآن نے معرفتِ الٰہی کی راہ کے اس مغالطے کو دور کرنے کے لیے جگہ جگہ یہ کیا ہے کہ خدا کی وحدانیت، اس کی بے ہمگی اور اس کی برتری کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کی ایسی صفات کا بھی حوالہ دے دیا ہے جو خلق کے ساتھ اس کے تعلق کو واضح کرنے والی ہیں تاکہ انسان وسائل و وسائط کا سہارا تلاش کرنے کے بجائے خود خدا کے دامنِ رحمت کو پکڑنے اور اسی میں چھپنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس پہلو سے سورۂ اخلاص میں، جو توحید کی سب سے بڑی سورہ ہے، اگر ایک طرف خدا کی بے ہمگی کو واضح کرنے کے لیے هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (وہ اللہ بے ہمہ ہے) فرمایا تو ساتھ ہی اس کی با ہمگی کو واضح کرنے کے لیے اَللّٰهُ الصَّمَدُ (اللہ با ہمہ ہے) بھی فرمایا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ خدا سب سے بے نیاز اور بالاتر ہونے کے باوجود سب کے لیے پناہ، سب کے لیے مرجع اور سب کے لیے سہارے کی چٹان بھی ہے۔

اسی اصول پر زیرِ بحث آیت میں بھی خدا کی وحدانیت کو مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے بیان کرنے کے بعد یہ بھی واضح فرما دیا کہ وہ خدا رحمان اور رحیم ہے۔ ہم سورۂ فاتحہ میں ان دونوں لفظوں کی وضاحت کر چکے ہیں کہ ان میں سے پہلا لفظ خدا کی رحمت کے جوش پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا اس کی رحمت کے تسلسل اور دوام پر۔ مقصد یہ ہے کہ خدا ہے تو واحد اور یکتا، سب سے بے نیاز، اور سب سے بالاتر لیکن وہ رحمان اور رحیم بھی ہے۔ اس نے اپنے جوشِ رحمت سے تمھیں وجود بخشا ہے، اپنی رحمت ہی کے آغوش میں تمھاری تربیت اور پرورش کر رہا ہے اور اپنی اس رحمت ہی کے لیے اس نے تمھارے واسطے جزا اور سزا کا ایک دن مقرر کیا ہے پس تم اسی کے لیے جیو اور اسی کے لیے مرو اور اپنی تمام آرزوئیں اور امیدیں اکیلے اسی سے وابستہ کرو۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ مشرک اور بت پرست قوموں نے ہمیشہ قہر و غضب کو الوہیت کے ضروری لوازم میں سے سمجھا ہے۔ انھوں نے کائنات کے بادشاہ کو دنیاوی بادشاہوں پر قیاس کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ جب دنیا کے بادشاہ صرف ایک ایک علاقے کے بادشاہ ہو کر یہ جلال و جبروت رکھتے ہیں کہ ان کے مقربین اور درباریوں کے سوا کسی کے لیے بھی ان کے سامنے مجالِ دم زدن نہیں ہوتی، وہ جس کو چاہیں اور جب چاہیں دار پر چڑھا دیتے ہیں تو جو سارے جہان کا بادشاہ ہے اس کے جلال و جبروت اور اس کے قہر و غضب کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اس طرح انھوں نے خدا کا تصور ایک نہایت خوفناک اور ہولناک ہستی کی حیثیت سے کیا اور پھر اس کے

کچھ مقربین اور درباری محض اپنے ذہن سے ایجاد کر کے ان کی پرستش شروع کی تاکہ یہ ان کو اس ہولناک خدا کی آفتوں سے محفوظ رکھیں۔ آسمانی مذاہب رکھنے والی قومیں اگرچہ خدا کے صحیح تصور سے ناآشنا نہیں تھیں لیکن امتدادِ زمانہ نے مشرک قوموں کے اثرات سے ان کے عقائد کو بھی آلودہ کر دیا اور ان کے یہاں بھی خدا کی جمالی صفات پر اس کی جلالی صفات کا رنگ غالب ہو گیا۔ چنانچہ تورات کے مطالعہ سے یہ حقیقت صاف عیاں ہوتی ہے کہ یہود نے بھی خدا کے قہر و جلال کی داستان اتنی بڑھا دی تھی کہ اس کے مقابل میں خدا کے رحمان و رحیم ہونے کا تصور بالکل دب گیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ بھی مشرک قوموں کی طرح خدا کی رحمت حاصل کرنے کے لیے مقربین اور سفارشیوں کے محتاج ہوگئے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے ان بزرگوں کو وسیلہ ٹھہرایا جن کے تقدس و تقرب کی روایتیں ان کے ہاں موجود تھیں اور پھر آہستہ آہستہ خاندانِ اسرائیل کو تو انھوں نے خدا کے چہیتوں اور محبوبوں میں شامل کر لیا اور غیر بنی اسرائیل خدا کے قہر و غضب کے لیے رہ گئے ـــــ چونکہ آیتِ زیرِ بحث میں توحید کی یہ امانت بنی اسرائیل سے واپس لے کر امتِ مسلمہ کے حوالے کی جا رہی ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ خدا کی صفاتِ رحمانیت و رحیمیت پر سے وہ پردہ اٹھا دیا جائے جو مشرکین کی تقلید میں یہود نے ان پر ڈال دیا تھا تاکہ یہ امت صفاتِ الٰہی کے باب میں اس نقطۂ اعتدال پر آجائے جو امتِ وسط ہونے کے پہلو سے اس کے مزاج کی خصوصیت ہے اور اس طرح شرک کے فتنوں کا سدِ باب ہو جائے۔

ہم یہاں صرف انھی دو پہلوؤں کے ذکر پر قناعت کرتے ہیں۔ اس کے کچھ اور پہلو بھی توجہ کے قابل ہیں لیکن ان کے ذکر کے لیے ہماری اس کتاب میں زیادہ موزوں مواقع آگے آئیں گے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَّتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُونَ (۱۶۴)

آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف ایک جامع اشارہ

آسمان اور زمین کی خلقت سے مراد ان کی وہ پیدائش بھی ہے جس سے خالق کی عظیم قدرت واضح ہوتی ہے، ان کی وہ ساخت بھی ہے جس سے اس کی بے مثال کاریگری اور حیرت میں ڈال دینے والی حکمت کی شہادت ملتی ہے، ان کی وہ نفع رسانی اور فیض بخشی بھی ہے جس سے خالق کی رحمانیت و رحیمیت اور پروردگاری ثابت ہوتی ہے، وہ مقصدیت بھی ہے جو گواہی دیتی ہے کہ اتنی حکمتوں سے معمور کارخانہ عبث اور بے غایت نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم مقصد ہے جس کے ظہور کے لیے ایک دن مقرر ہے، اور ان کی وہ موافقت اور سازگاری بھی ہے جو ثابت کرتی ہے کہ آسمان اور زمین دونوں ایک ہی خالق کے ارادہ سے ظہور میں آئے ہیں اور اسی کی اسکیم اور اسی کے حکم کے تحت چل رہے ہیں، ان کے اندر کسی اور کے ارادہ اور تصرف

کو کوئی دخل نہیں ہے ــــــ یہ مختلف پہلو قرآن مجید میں گوناگون اسلوبوں سے واضح کیے گئے ہیں جن کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

اختلافِ لیل و نہار سے مراد ایک تو رات اور دن کی یکے بعد دیگرے، پورے نظام و پوری پابندیٔ اوقات اور کامل تسلسل کے ساتھ آمد و شد ہے، جیسا کہ فرمایا ہے۔ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۶۲۔ الفرقان (اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا، ان لوگوں کے لیے جو یاد دہانی حاصل کرنا چاہیں یا خدا کے شکر گزار رہنا چاہیں) دوسرے ان کا وہ اختلاف بھی ہے جو ان کے مزاج، ان کی فطرت، ان کی شکل و صورت اور ان کے ظاہری اور باطنی اثرات و نتائج میں ہے لیکن اس اختلاف و تضاد کے باوصف یہ دونوں اس کائنات کی مجموعی خدمت و بہبود میں شب و روز سرگرم ہیں۔

فُلک کے معنی کشتی کے ہیں۔ یہ لفظ اسی شکل میں واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے آتا ہے۔ مؤنث تو اس آیت ہی میں استعمال ہوا ہے۔ مذکر کے لیے قرآن مجید میں فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ کی ترکیب موجود ہے۔

بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ سے مراد وہ سامان تجارت و معیشت ہے جس کے حمل و نقل کا یہ کشتیاں ذریعہ بنتی ہیں اور جس سے معاشرت و تمدن کی توسیع و ترقی کی نہایت وسیع راہیں کھلی ہیں۔

زمین کی موت اور اس کی زندگی سے مراد اس کا خشک اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد از سر نو سبزوں اور پودوں سے لہلہا اٹھنا ہے۔

لفظ 'دابۃ' کا استعمال

'دَابَّة' کا معروف استعمال تو زمین پر چلنے پھرنے والے جانوروں ہی کے لیے ہے بلکہ زیادہ نمایاں طور پر ان جانوروں کے لیے جو سواری یا بار برداری کے کام آتے ہیں، لیکن یہ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس معنی میں ہم 'جاندار' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے پہلے معنی کے لحاظ سے پرندے اس کے مفہوم سے خارج ہیں، صرف زمین پر چلنے پھرنے یا رینگنے والے جانور ہی اس سے مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے بعض مقامات پر پرندوں کو اس لفظ کے مفہوم سے الگ رکھا ہے، مثلاً فرمایا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ ۳۸۔ انعام (اور نہیں ہے زمین پر چلنے والا کوئی جانور اور نہ اپنے بازوؤں سے اڑنے والا کوئی پرندہ) لیکن جب یہ اپنے دوسرے وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے تحت سارے ہی جاندار آجاتے ہیں، عام اس سے کہ وہ چرند ہیں یا پرند بلکہ اس صورت میں یہ بنی نوع انسان کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ اس مفہوم کے لیے قرآن مجید سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ فرمایا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا	اور اگر اللہ لوگوں کو ان کی بد عملیوں پر فوراً سزا دینے
تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (۴۵۔ فاطر)	والا ہوتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار کو بھی جیتا نہ چھوڑتا

اس آیت میں ' دابۃ ' کا لفظ تمام جانداروں کے لیے استعمال ہوا ہے، عام اس سے کہ وہ چرند پرند ہوں یا انسان۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ (۶۰۔ عنکبوت)	اور کتنے جاندار ہیں جو اپنے ساتھ اپنی روزی اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ان کو بھی روزی دیتا ہے اور تم کو بھی۔

اس آیت میں ' دابہ ' کا لفظ چرند و پرند سب پر حاوی ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۶۔ ھود)	اور زمین میں کوئی جاندار نہیں ہے مگر اللہ ہی کے ذمہ ہے اس کی روزی۔

اس آیت میں بھی یہ لفظ اپنے وسیع معنی ہی میں استعمال ہوا ہے

ہمارے نزدیک آیت زیر بحث میں بھی یہ لفظ جاندار کے معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ ہم نے ترجمہ اسی مفہوم کے لحاظ سے کیا ہے۔

' تصریف ریاح ' سے مراد

' تَصْرِيفِ الرِّيَاحِ ' سے مراد ہواؤں کی گردش ہے۔ ان کی اس گردش کے مختلف پہلو خود قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ کبھی یہ اپنے کندھوں پر پانی سے بوجھل بادلوں کو لاد کر لاتی ہیں اور زمین کو جل تھل کر دیتی ہیں، کبھی یہ انھی بادلوں کو اس طرح اٹھا کر لے جاتی ہیں کہ کہیں ان کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ ایک قوم کے لیے یہ عذاب بن کر نمودار ہوتی ہیں، دوسری قوم کے لیے رحمت بن کر۔ انھی کی گردش سے فرعون اور اس کی قوم غرق دریا ہوئی اور انھی کے تصرف نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اسی دریا سے پار کرایا۔ پھر کبھی یہ مرطوب بن کر فصلوں کو نشو و نما دیتی، ان کو اگاتی اور پروان چڑھاتی ہیں، کبھی گرم اور خشک ہو کر ان کو پکاتی اور تیار کرتی ہیں، کبھی یہ خزاں بن کر پتوں کو مرجھاتی اور چمن کو اجاڑتی ہیں، کبھی بہار بن کر ایک ایک ٹہنی اور ایک ایک شاخ کو پھولوں اور کلیوں سے لاد دیتی ہیں۔ ان کے بھیس مختلف ہیں اور ہر بھیس میں نئی آن اور نئی شان ہے اور ہر شان میں ہے وہ ان کے مُصَرِّف (خدا) کی حکمت، قدرت اور اس کی رحمت و ربوبیت کا ایک عظیم نشان ہے۔

' تسخیر ' کا مفہوم

تسخیر کے معنی ہیں کسی کو مطیع و فرمانبردار بنا کر بلا کسی اجرت و معاوضہ کے کسی کی خدمت میں لگا دینا۔ بادلوں کے آسمان و زمین کے درمیان مسخر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ خدا کے امر و حکم کے تحت بالکل مقہور و مجبور ہر لمحہ و ہر آن، بالکل تیار کھڑے ہیں کہ جب، اور جس جگہ کے لیے اور جس شکل میں ان کو حکم ہو وہ اس حکم کی تعمیل کریں۔ یہ مسخر خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی اپنی ربوبیت اور اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت ان کو رحمت یا عذاب کی جس شکل میں چاہتا ہے استعمال کرتا ہے۔ قرآن میں انسانوں کی نسبت کے ساتھ جب ابر و ہوا کی تسخیر کا ذکر آتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ ابر یا ہوا یا سورج یا چاند انسان کے ہاتھ میں مسخر ہیں یا وہ ان کو مسخر کر سکتا ہے بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ پروردگار عالم نے ان چیزوں کو مسخر کر

کے ان کو انسان کی نفع رسانی اور اس کی خدمت میں لگا دیا ہے اور یہ رات دن خدمت میں لگے رہنے کے باوجود انسان سے کسی اجرت یا صلہ کے طالب نہیں بنتے۔ اسی وجہ سے جہاں کہیں یہ مضمون بیان ہوا ہے وہاں سَخَّرَ لَکُمْ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے ان کو تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا ہے، یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو تمہارے تابع فرمان بنا دیا ہے۔ تابع فرمان یہ صرف خدا ہی کے ہیں۔ انسان زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ خدا نے ان چیزوں کو جن طبیعی قوانین کے ماتحت رکھا ہے ان میں سے بعض کو اپنی سائنس کے زور سے دریافت کر لے اور ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ لیکن ان تمام قوانین کا اصل سررشتہ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ انسان اس سررشتہ پر کبھی قابو نہیں پا سکتا۔

عقل کی تربیت

مذکورہ بالا تمام چیزوں کا حوالہ دے کر فرمایا کہ ان کے اندر عقل سے کام لینے والوں کے لیے آیات ہیں۔ آیت کے معنی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، نشانی اور علامت کے بھی آتے ہیں۔ جو چیز کسی چیز کی نشانی اور علامت ہوتی ہے، وہ اس کی دلیل ہوا کرتی ہے اس وجہ سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں مذکورہ چیزیں کس چیز پر اور کس نوعیت سے دلیل ہیں، یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ یہاں یہ تو فرمایا کہ ان چیزوں کے اندر دلیلیں ہیں لیکن یہ نہیں واضح فرمایا کہ یہ دلیلیں کن چیزوں پر ہیں اور ان کے دلیل ہونے کی شکل کیا ہے۔ نشانیوں کی طرف اشارہ کر کے، اصل سوال کو ہماری عقل و بصیرت پر چھوڑ دیا ہے کہ جو لوگ اپنی عقل اور سمجھ سے کام لیں گے وہ ان دلیلوں کو خود سمجھ جائیں گے۔ قرآن مجید نے یہ طریقہ اکثر مقامات میں اختیار کیا ہے اور مقصود اس سے ہماری عقل و فکر کی تربیت ہے کہ ہم آفاق و انفس کے اندر پھیلے ہوئے دلائل کو خود سمجھنے اور ان سے صحیح نتائج تک پہنچنے کے قابل ہو سکیں۔

قرآن کے اجمالی اشارات پر غور کرنے کا طریقہ

اس طرح کے مواقع میں قرآن پر غور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اجمالی اشارات کو خود قرآن کی روشنی میں تفصیل کا رنگ دینے کی کوشش کی جائے تاکہ واضح ہو سکے کہ پیش کردہ چیزوں سے اس دعوے پر کس طرح دلیل قائم ہوتی ہے۔

مثلاً دیکھیے آسمان و زمین کی خلقت سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، کہیں تو خدا کی قدرت و حکمت پر استدلال کیا ہے، کہیں اس کی پروردگاری اور رحمانیت و رحیمیت پر۔ کہیں ان کے بامقصد و باغایت ہونے پر استدلال کیا ہے اور کہیں ان کے توافق کے پہلو سے ان کے خالق و مالک کی توحید پر۔

اسی طرح رات اور دن کے اختلاف کو کہیں تو حق و باطل کی کشمکش اور غلبۂ حق کی شہادت کے طور پر پیش کیا ہے، کہیں تمثیلی رنگ میں اس سے حیات بعد الموت پر استشہاد کیا ہے اور کہیں ان کے تضاد کے باوجود ان کے اندر ایک اعلیٰ اور برتر مقصد کے لیے جو سازگاری اور موافقت پائی جاتی ہے اس کو اس حقیقت کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ نور اور ظلمت، روشنی اور تاریکی سب کا خالق ایک ہی ہے اور وہی ان اضداد کو اپنی قدرت سے وجود میں لایا ہے اور وہی اپنی حکمت سے ان اضداد کے اندر سازگاری پیدا

کرتا اور اس کائنات کی مجموعی خدمت کے لیے ان کو استعمال کرتا ہے۔

کشتی اور سمندر کا ذکر بھی قرآن میں مختلف پہلوؤں سے ہوا ہے۔ بعض جگہ تو اس سے انسانی زندگی کا جزر و مد نمایاں کیا گیا ہے کہ انسان ذرا میں مغرور اور ذرا میں مایوس ہونے والی مخلوق ہے، زندگی کی کشتی ہمواری کے ساتھ رواں دواں رہے تو اس چیز کو وہ اپنی تدبیر و حکمت کا کرشمہ سمجھتا ہے اور اگر یہ کشتی حوادث کے تلاطم میں گھر جائے تو خدا خدا پکارنے لگتا ہے۔ پھر یہیں سے توحید کی اَنفُسی دلیل پیش کی ہے کہ اصل معبود جس کی شہادت دل کی گہرائیوں میں موجود ہے وہ تو اللہ واحد ہی ہے، جس کا سہارا انسان اس وقت ڈھونڈھتا ہے جب دوسرے تمام سہاروں پر سے اس کا اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ بعض جگہ سمندر اور کشتی دونوں کے اختلاف و تضاد مزاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے کہ کس طرح ایک بالاتر ہستی کا قانون قدرت و حکمت سمندر اور کشتی میں سازگاری پیدا کر دیتا ہے کہ انسان موجوں کے کندھوں پر سوار ہو کر ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک فتح و تسخیر کے دام بچھاتا اور تہذیب و تمدن کے عَلَم گاڑتا پھرتا ہے۔

آسمان سے بارش کا ذکر بھی گوناگوں پہلوؤں سے ہوا ہے۔ ربوبیت اور رحمت کی شہادت تو یہ ہے ہی، حیات بعد الموت پر بھی اس کی شہادت نہایت واضح ہے، اور اس کی طرف یہاں بھی اشارہ ہے۔ توحید پر بھی اس سے استدلال کیا ہے کہ جب آسمان سے اترنے والی بارش زمین کو زندگی اور روئیدگی بخشتی ہے تو یہ کس طرح باور کرتے ہو کہ زمین کے دیوتا الگ اور آسمان کے دیوتا الگ ہیں، اگر اس طرح ہر چیز کی خدائیاں الگ الگ تقسیم ہوتیں تو اس کارخانۂ کائنات میں ایسی حیرت انگیز سازگاری کس طرح پیدا ہوتی کہ آسمان سے پانی برستا اور زمین اس پانی کی بدولت اپنے تمام خزانے اگل دیتی اور پھر انسان اور چرند پرند سب ان سے فائدہ اٹھاتے۔ بعض جگہ تمثیلی رنگ میں بارش اور اس کے اثرات کے اختلاف کو اس اختلاف کو نمایاں کرنے کے لیے پیش کیا ہے جو آسمانی ہدایت قبول کرنے کے معاملہ میں مختلف صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں کے اندر نمایاں ہوتا ہے۔ ایک ہی بارش کہیں تو سبزے اور نباتات کی بانات بچھا دیتی ہے، کہیں خار و خس اور جھاڑیاں اُگاتی ہے اور کہیں صاف چٹیل میدان چھوڑ دیتی ہے، اسی طرح فرمایا ہے کہ آسمانی ہدایت کی جو بارش نازل ہوتی ہے اس سے ساری طبیعتیں یکساں فیضیاب نہیں ہوتیں، بعض تو اس کے چھینٹے پڑتے ہی باغ و چمن کی طرح لہلہا اٹھتی ہیں، بعض شور زمینوں کے مانند مردہ ہی پڑی رہ جاتی ہیں اور بعض صرف ضلالت اور عداوت کی خاردار اور بِس بھری جھاڑیاں اُگاتی ہیں۔

ہواؤں اور بادلوں کی گردش کو بھی مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے۔ خدا کی رحمت اور پروردگاری کی شہادت تو ان سے واضح طور پر ملتی ہی ہے، خاص طور پر جو چیز قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے وہ ہوا کے تصرفات کے پردہ میں خدا کی رحمت اور اس کے عذاب کا ظہور ہے جس سے بالآخر ایک مؤثر

جزا و سزا کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن نے اس پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اگر آسمان و زمین اور ابر و ہوا میں سے ہر ایک پر الگ الگ ارادوں کی کارفرمائی ہے تو ان مختلف عناصر کے اندر وہ ربط و تعلق کون پیدا کرتا ہے جس ربط و تعلق کے بغیر اس دنیا کا وجود اور بقا ناممکن ہے۔

یہاں ہمارا مقصود ان دلائل کی تفصیل نہیں ہے جو اوپر کے اجمالات کے اندر مضمر ہیں۔ ان دلائل کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا یا بیان کرنا ان مواقع ہی پر زیادہ موزوں رہے گا جن میں قرآن نے ان کی وضاحت کی ہے۔ یہاں ان اشارات سے ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ قرآن مجید نے یہ جو فرمایا ہے کہ ان چیزوں کے اندر آیات یعنی دلیلیں اور نشانیاں ہیں تو یہ بات یونہی نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے اور یہ حقیقت اجمال اور تفصیل کی مختلف شکلوں میں قرآن میں بیان ہوئی ہے اس وجہ سے ان اجمالات کو تفصیل کے آئینہ میں دیکھنا چاہیے۔

آیت ۱۶۴ کے مطا پر ایک خصوصی نظر

یہ تو اس آیت پر ایک عمومی نظر ہوگی۔ اب ہم اس پر ایک خصوصی نظر اس دعوے کو پیش نظر رکھ کر ڈالیں گے جو یہاں عنوان زیر بحث ہے۔ اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ یہاں اصل چیز جو زیر بحث ہے وہ توحید ہے اور یہ آیت اس توحید کی دلیل کے طور پر وارد ہوئی ہے اس وجہ سے اس آیت کے تمام مذکورہ حقائق و لطائف سب ضمنی ہیں، نظم کلام کے پہلو سے اصلی چیز جو واضح کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں توحید کی دلیل کیا ہے چنانچہ اب ہم اختصار کے ساتھ اس کو پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس آیت پر اگر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اس میں شروع سے لے کر آخر تک اس کائنات کے متقابل بلکہ متضاد اجزا و عناصر کا حوالہ دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کے اس حیرت انگیز اتحاد و توافق اور ان کی اس بے مثال باہم آمیزی و سازگاری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ان کے اندر اس کائنات کی مجموعی خدمت کے لیے پائی جاتی ہے۔ آسمان کے ساتھ زمین، رات کے ساتھ دن، کشتی کے ساتھ دریا۔ بظاہر دیکھیے تو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ضدین کی نسبت رکھتے ہیں لیکن ذرا گہری نگاہ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اگر یہ ایک طرف ضدین کی نسبت رکھتے ہیں تو دوسری طرف اس کائنات کی خانہ آبادی کے نقطۂ نظر سے آپس میں زوجین کا سا ربط و اتصال بھی رکھتے ہیں۔ یہ آسمان اور اس کے چمکتے ہوئے سورج اور چاند نہ ہوں تو ہماری زمین کی ساری رونقیں اور بہاریں ختم ہو جائیں بلکہ اس کی ہستی ہی نابود ہو جائے۔ اسی طرح یہ زمین نہ ہو تو کون بتا سکتا ہے کہ اس فضائے لامتناہی کے بے شمار ستاروں اور سیاروں میں سے کس کس کا گھر اجڑ کے رہ جائے۔ علیٰ ہذا القیاس، ہماری اور ہماری طرح اس دنیا کے تمام جانداروں کی زندگی جس طرح دن کی حرارت، تمازت، روشنی اور نشاط انگیزی کی محتاج ہے، اسی طرح شب کی خنکی، لطافت، سکون بخشی اور خواب آوری کی بھی محتاج ہے۔ یہ دونوں مل کر اس گھر کو آباد کیے ہوئے ہیں۔ اسی طرح سمندر کو دیکھیے اس کا پھیلاؤ کتنا ہوشربا اور ناپیدا کنار ہے اور اس کی موجیں کتنی مہیب اور ہولناک ہیں، لیکن دیکھیے اس سرکشی و طغیانی کے باوجود کس طرح اس نے عین اپنے سینہ پر سے ہماری کشتیوں اور ہمارے جہازوں کے

لیے نہایت ہموار اور محفوظ شاہراہیں نکال رکھی ہیں جن پر ہمارے جہاز دن رات دوڑ رہے ہیں اور تجارت و معیشت، تمدن و معاشرت اور علوم و فنون ہر چیز میں مشرق اور مغرب کے ڈانڈے ملائے ہوئے ہیں۔

آگے آسمان سے بارش اور اس بارش سے زمین کے از سر نو باغ و بہار اور معمور و آباد ہو جانے کا ذکر ہے۔ غور کیجیے کہاں زمین ہے اور کہاں آسمان۔ لیکن اس دوری کے باوجود دونوں میں کس درجہ گہرا ربط و اتصال ہے۔ زمین اپنے اندر روئیدگی اور زندگی کے خزانے چھپائے ہوئے ہے لیکن یہ سارے خزانے اس وقت تک مدفون ہی رہتے ہیں جب تک آسمان سے بارش نازل ہو کر ان کو ابھار نہیں دیتی۔ اسی طرح کا رشتہ بادلوں اور ہواؤں کے درمیان ہے۔ بادلوں کے جہاز لدے پھندے اپنے بادبان کھولے کھڑے ہیں لیکن یہ اپنی جگہ سے ایک انچ سرک نہیں سکتے جب تک ہوائیں ان کو دھکے دے کر ان کی جگہ سے نہ ہلائیں اور ان کو ان کی مقرر کی ہوئی سمتوں میں آگے نہ بڑھائیں، یہ ہوائیں ہی ہیں جو ان کو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں ہنکائے پھرتی ہیں اور جب چاہتی ہیں ان کو غائب کر دیتی ہیں اور جب چاہتی ہیں ان کو افق پر نمودار کر دیتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ غور و تدبر کی نگاہ اس دنیا کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہے۔ کیا یہ اضداد اور متناقضات کی ایک رزم گاہ ہے جس میں مختلف ارادوں اور قوتوں کی کشمکش برپا ہے یا ایک ہی حکیم و مدبر ارادہ ان سب پر حاکم و فرمانروا ہے جو ان تمام عناصر مختلفہ کو اپنی حکمت کے تحت ایک خاص نظام اور ایک مجموعی مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کائنات کے مشاہدہ سے یہ دوسری ہی بات ثابت ہوتی ہے۔ پھر مزید غور کیجیے تو یہیں سے ایک اور بات بھی نکلتی ہے وہ یہ کہ یہ دنیا آپ سے آپ وجود میں نہیں آئی ہے اور نہ اس کے اندر جو ارتقا ہوا ہے وہ آپ سے آپ ہوا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے عناصر مختلفہ میں ایک بالاتر مقصد کے لیے وہ سازگاری کہاں سے پیدا ہوتی جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔

غور کیجیے تو یہ ایک ہی حقیقت ایک طرف شرک کے تمام امکانات کا سدباب کر رہی ہے اور دوسری طرف یہ ڈارونزم کے بھی تمام وساوس کی جڑ کاٹ رہی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ (۱۶۵)

یعنی توحید کی اس واضح دلیل کے باوجود جو اوپر بیان ہوئی اس دنیا میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو خدا کے شریک اور ساجھی ٹھہراتے ہیں اور ان شریکوں اور ساجھیوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے۔ یہ اندازِ کلام اظہارِ تعجب کا ہے۔ یعنی اس بے عقلی کے لیے کوئی گنجائش

تو موجود نہیں تھی لیکن جو لوگ اپنی عقل سے کام ہی نہیں لیتے ان کا کیا علاج، ان کے لیے آسمان و زمین میں پھیلی ہوئی ساری دلیلیں بے کار ہیں۔

محبت کا اصل حق دار اللہ ہے

ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ اپنے مزعومہ شریکوں اور ساجھیوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنے کا حق ہے حالانکہ محبت کا اصلی حقدار اللہ ہی ہے۔ وہی ہے جس نے سب کچھ پیدا کیا ہے، وہی ہے جس کے ہاتھ میں سارا انتظام ہے اور اس کائنات کے ہر گوشہ میں پھیلی ہوئی ربوبیت و رحمت سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ وہ رحمان و رحیم ہے تو اس کے سوا کوئی دوسرا اس کے برابر کی محبت کا حقدار کس طرح ہو سکتا ہے۔ پھر کوئی دوسرا کسی نسبت اور تعلق کی وجہ سے محبت کا حق دار نکلے بھی تو بہر حال اس کی محبت خدا کی محبت کے تحت ہی ہو سکتی ہے نہ کہ اس کے برابر یا خدانخواستہ اس سے زیادہ۔ اس سے جہاں یہ بات نکلی کہ محبتِ حقیقی خدا کے حقوق میں سے ہے۔ اس میں کسی اور کو شریک کرنا شرک ہے وہیں یہ بات بھی نکلی کہ دوسروں کے لیے محبت کی مطلق نفی نہیں ہے۔ دوسروں سے بھی محبت کی جا سکتی ہے مثلاً بیوی، بچوں، قوم، قبیلہ اور ملک و وطن سے یا کسی بزرگ یا استاذ یا شیخ یا پیر سے لیکن اس محبت کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ خدا کی محبت کے تابع ہو یعنی جہاں کہیں اور جب کبھی اس محبت اور خدا کی محبت کے تقاضوں میں کوئی ٹکراؤ ہونے لگے تو آدمی خدا کی محبت کے تقاضے کو مقدم رکھے اور دوسری محبتوں کو نظر انداز کر دے۔ اس صورت میں بلاشبہ وہ توحید کا حق ادا کرنے والا ٹھہرے گا۔ چنانچہ حقیقی اہلِ ایمان کی یہی شان بیان ہوئی ہے۔ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (جو حقیقی ایمان رکھتے ہیں وہ خدا کی محبت میں سخت تر ہوتے ہیں) یعنی جب ان کے سامنے اللہ اور غیر اللہ کی محبت کے ایک دوسرے سے متضاد مطالبات ابھرتے ہیں تو وہ ہمیشہ محبتِ الٰہی کے پہلو کی طرف جھکتے ہیں، یہی توحیدِ خالص کی حقیقت اور یہی چیز ایمان کی روح ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں تک محبت کے ہونے کا تعلق ہے، یہ اللہ کے ساتھ ساتھ دوسروں سے بھی ہو سکتی ہے، یہ چیز ایمان اور توحید کے منافی نہیں ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ دوسروں کی محبت اللہ کی محبت کے تابع ہو، اس کے برابر یا اس سے بڑھ کر نہ ہو۔

وَلَوۡ یَرَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا الآیۃ۔ یہاں عربی زبان کے عام قاعدہ کے مطابق لَوۡ کا جواب محذوف ہے اور اَنَّ الۡقُوَّۃَ لِلّٰهِ جَمِیۡعًا اور اس کے بعد کے الفاظ اس محذوف جواب کی وضاحت کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اپنی جانوں پر یہ ظلم ڈھانے والے لوگ جو خدا کے ہمسر اور شریک ٹھہرائے ہوئے ہیں اور ان سے خدا کی طرح محبت کر رہے ہیں اس وقت کو دیکھ پاتے جب کہ وہ عذابِ الٰہی سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ خدا کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں جو اس کے برابر کی محبت کا حق دار ہو بلکہ وہی تنہا تمام قوت و اختیار کا مالک ہے اور وہ اپنے ساتھ شریک کرنے والوں کو

نہایت سخت عذاب دینے والا ہے جس سے ان کو کوئی بھی بچانے والا نہ ہوگا۔

اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں، ہم بقصد اختصار صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ	اگر آج جان سکتے یہ کفر کرنے والے اس وقت کو
لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا	جب کہ یہ اپنے چہروں اور اپنی پیٹھوں سے آگ کو
عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝	دفع نہ کر سکیں گے اور نہ اس وقت ان کی کوئی مدد
(۳۹۔ انبیاء)	کی جائے گی۔

اس آیت میں بھی لَوْ کا جواب محذوف ہے، یعنی اگر آج یہ اس عذاب کو جان سکتے جس کو آخرت میں جانیں گے تو یہ اس سرکشی کا اظہار نہ کرتے جس کا اظہار کر رہے ہیں لیکن یہ اس کو اس وقت جانیں گے جب یہ جاننا کچھ نفع نہ بخشے گا بلکہ صرف باعثِ حسرت واندوہ ہوگا۔ سورۂ سبا میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ (۱۶۶)

یہ اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ سے بدل پڑا ہوا ہے اور اسی عذاب کی مزید وضاحت کر رہا ہے کہ آج جن کو یہ خدا کا شریک و ہمسر ٹھہراتے ہیں اور جن سے اس طرح محبت کر رہے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے، جب عذاب آخرت ظاہر ہوگا تو یہ اپنے ان جاں نثاروں اور پیروں سے صاف صاف اظہار برأت کر دیں گے اور اس عذاب سے بچانے میں ان کے کچھ کام نہ آئیں گے جو ان کے سر پر کھڑا ہوگا۔

اسباب کا مفہوم — اسباب، سبب کی جمع ہے جس کے اصل معنی رسی کے ہیں، پھر یہیں سے اس کے اندر تعلق و توسل اور اسباب و وسائل کا مفہوم پیدا ہوا اور پھر مزید وسعت پا کر کسی شے کے متعلقات و اطراف کے لیے بھی اس کا استعمال ہونے لگا چنانچہ قرآن میں اسباب السماء کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ بِهِمْ کی ضمیر اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان مشرکین نے جن لوگوں کو شریک و شفیع سمجھ کر ان کے ساتھ تعلقات محبت و ارادت قائم کر رکھے ہیں ایک دن ان کے ان تعلقات کے تمام تار و پود بکھر جائیں گے اور یہ ایک دوسرے پر لعنتیں بھیجیں گے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (۱۶۷)

متبوعین اور تابعین — متبوعین کے بعد اب یہ تابعین کا ردِ عمل بیان ہو رہا ہے کہ جب پیرو دیکھیں گے کہ جن کو انھوں نے خدائی کا درجہ دیا اور زندگی بھر جن کو اپنی تمام محبتوں اور نیاز مندیوں کا سزاوار جانا وہ اس سب سے مشکل وقت میں اس طرح اظہار بیزاری کر رہے ہیں تو وہ بھی نہایت حسرت کے انداز میں کہیں گے کہ کاش ہمیں ایک بار پھر دنیا میں جانا نصیب ہو کہ ہم بھی ان سے اسی طرح اظہار بیزاری کر سکیں جس طرح انھوں نے

ہم سے اظہارِ بیزاری کیا ہے۔ لیکن ان کی یہ حسرت، حسرت ہی رہے گی، جس عذاب میں وہ پڑ چکے ہوں گے اس سے ان کو نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف مقامات میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ یہاں ہم اس کی وضاحت کے لیے بعض مثالیں پیش کرتے ہیں۔ فرمایا ہے۔

اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ز (۲۵ - عنکبوت)

اور یہ جو تم خدا کو چھوڑ کر دوسرے بت بنائے بیٹھے ہو تو یہ محض اس دنیا کی زندگی میں دوستی کے لیے ہیں، پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے۔

وَقَالُوْا رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَا اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ (۶۷-۶۸ احزاب)

وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار، ہم نے اپنے سرداروں اور لیڈروں کی بات مانی تو انھوں نے ہمیں راستے سے بھٹکایا۔ اے ہمارے پروردگار ان کو دونا عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت کر۔

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۝ (۶۷ - زخرف)

دنیا کے دوست اس دن سب ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، صرف متقی اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

یہاں یہ جو فرمایا ہے کہ ان کے اعمال، اللہ تعالیٰ ان کو سرمایۂ حسرت بنا کر دکھائے گا تو اس سے مراد ہمارے نزدیک ان کی وہ وفاداریاں اور قربانیاں ہیں جو ان مشرکین نے اپنے ان باطل معبودوں یا اپنے ان گمراہ کرنے والے سرداروں اور لیڈروں کے لیے کی ہوں گی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۱۶۸)

یہ خطاب عربوں سے ہے جن کے شرک کی طرف اوپر کی آیات میں اشارہ کیا تھا۔ پہلے توحید کے سلسلہ میں ان کی بدعات سے تعرض کیا ہے۔ پھر آگے چل کر اہل کتاب کی بدعات کی تردید کی ہے۔ عربوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ زمین کی چیزوں میں سے جو جائز و پاکیزہ چیزیں ہیں ان کو کھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔ شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی سے مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنے جی سے محض اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت جو حلال و حرام ٹھہرا رکھے ہیں ان کی کوئی شرعی سند نہیں ہے، بلکہ یہ سارا تمھیں شیطان نے سجھائی ہے اور تم نے اس کی پیروی میں خدا کی جائز کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہرا لیا اور اس طرح خدا کے

حق تحریم و تحلیل میں مداخلت کر کے شرک کے مرتکب ہوئے۔

حکم الٰہی کے بغیر تحلیل و تحریم شرک ہے

چونکہ خدا کے حکم کے بغیر تحریم و تحلیل شرک ہے اس وجہ سے قرآن میں شرک اور تحریم و تحلیل کا مضمون جگہ جگہ ایک ساتھ بیان ہوا ہے مثلاً سورہ نحل میں ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ وَّلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ (۳۵) (اور مشرک کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اس کے سوا کسی چیز کو پوج سکتے اور نہ اس کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہرا سکتے) اسی طرح سورہ انعام ۱۴۸ میں ہے۔ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ (یہ مشرک کہیں گے، اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور ہمارے آباواجداد کسی چیز کو اس کا شریک بنا سکتے اور نہ کسی چیز کو حرام ٹھہرا سکتے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ شرک اور تحریم و تحلیل دونوں ایک دوسرے سے متعلق مضمون ہیں۔ اسی تعلق سے آیت زیر بحث میں بھی شرک کی تردید کے سلسلہ میں یہ بات فرمائی گئی کہ تمام جائز و پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کی پیروی میں مشرکانہ توہمات کے تحت خدا کی جائز کردہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ۔ رہی یہ بات کہ شیطان کی پیروی میں مشرکین عرب نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت کن چیزوں کو حرام یا حلال ٹھہرایا تھا تو اس کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارے کیے ہیں۔ ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں۔ فرمایا ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ	اور جو کھیتیاں اور چوپائے خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں
الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا	ان میں انھوں نے اپنے شرکا کے ساتھ ساتھ خدا کا
فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ	بھی ایک حصہ مقرر کر رکھا ہے۔ کہتے ہیں یہ تو اللہ کے
هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ	لیے ہے، ان کے گمان کے مطابق، اور اتنا ہمارے شرکا
لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى	کے لیے ہے۔ تو جو حصہ ان کے شرکا کا ہوتا ہے وہ تو اللہ
اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ	کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا اور جو اللہ کا ہوتا ہے وہ ان
اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا	کے شرکا کو منتقل ہو سکتا ہے، کتنا برا فیصلہ یہ کرتے ہیں!
يَحْكُمُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ	اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے ان کے شرکا نے
مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ	قتل اولاد کو ایک پسندیدہ فعل بنا دیا ہے تاکہ ان کو
شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا	تباہ کریں اور ان کے دین کو گھپلا کر کے رکھ دیں۔ اور
عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ	اگر اللہ چاہتا تو یہ کچھ وہ ذکر پاتے تو ان کو اور ان کے
مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ	اس افترا کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اور کہتے ہیں کہ فلاں
وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ	فلاں چوپائے اور فلاں فلاں قسم کی فصلیں ممنوع ہیں،
حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ	ان کو صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جن کو ہم اجازت دیں۔

بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءً عَلَيْهِ ۚ سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِنْ يَكُنْ مَيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ ۚ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (۱۳۸-۱۴۰ انعام)

ان کے گمان کے مطابق، کچھ چوپائے ایسے ہیں جن کی پیٹھیں حرام قرار دے دی گئی ہیں اور کچھ پر اللہ کا نام نہیں لیتے، یہ محض اللہ پر ان کا افترا ہے۔ اللہ ان کو ان کے اس افترا کا بدلہ دے گا اور یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چوپایوں کے پیٹ میں جو کچھ ہے وہ صرف ہمارے مردوں ہی کے لیے جائز ہے، ہماری عورتوں کے لیے یہ ناجائز ہے اور اگر وہ مردار ہو تو دونوں اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اللہ ان کو ان کی اس تشخیص کا بدلہ چکھائے گا، وہ حکیم و علیم ہے۔ نامراد ہوئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو قتل کیا، محض بے وقوفی سے، بغیر کسی علم کے اور اللہ کے بخشے ہوئے رزق کو حرام ٹھہرایا محض اللہ پر افترا کر کے۔ یہ لوگ گمراہ ہوئے اور ہدایت حاصل کرنے والے نہ بنے۔

اسی طرح مشرکین نے بعض قسم کے چوپایوں کو اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت یا اپنے بتوں کی نسبت سے تقدیس کا درجہ دے دیا تھا جن پر کسی قسم کا تصرف وہ ناجائز خیال کرتے تھے۔ قرآن نے ایک جگہ اس کی تردید کی ہے

مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ ۙ وَلَٰكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَأَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۱۰۳- مائدہ)

اور یہ بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام خدا نے شرع نہیں ٹھہرائے ہیں بلکہ یہ کافر خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا نے مشروع کیے ہیں، اور ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔

ایک اور مقام پر ان کی اس مشرکانہ تحریم و تحلیل پر ان الفاظ گرفت فرماتی ہے۔

وَمِنَ الْأَنْعَامِ حَمُولَةً وَفَرْشًا ۚ كُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ ۖ مِنَ الضَّأْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ آلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ أَمِ الْأُنْثَيَيْنِ أَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأُنْثَيَيْنِ ۖ

اور چوپایوں میں سے بوجھ اٹھانے والے بھی پیدا کیے اور زمین سے لگے ہوئے بھی۔ خدا نے جو تمہیں بخشے ہیں ان میں سے کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ آؤ ان چوپایوں کی آٹھوں قسموں کو لو۔ بھیڑوں میں سے دو اور بکریوں میں سے دو۔ پھر پوچھو ان سے کہ خدا نے ان کے نروں کو حرام ٹھہرایا ہے یا ماداؤں کو یا ان بچوں کو جو

نَبِّئُونِي بِعِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝	ان ماداؤں کے پیٹوں میں ہیں۔ کچھ کر مجھے کسی سند کے
وَمِنَ الْإِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ	ساتھ بتاؤ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو۔
اثْنَيْنِ قُلْ آلذَّكَرَيْنِ	اور اسی طرح دو اونٹوں میں سے اور دو گایوں
حَرَّمَ أَمِ الْأُنثَيَيْنِ أَمَّا اشْتَمَلَتْ	میں سے نر اور ان سے پوچھو کہ ان کے نروں کو حرام
عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأُنثَيَيْنِ أَمْ كُنتُمْ	کیا ہے یا ان کی ماداؤں کو یا ان کو جو ان ماداؤں کے
شُهَدَاءَ إِذْ وَصَّاكُمُ اللَّهُ بِهَٰذَا	پیٹوں میں ہیں۔ ان سے پوچھو کیا تم اس وقت موجود
فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ	تھے جب خدا نے تمہیں ان باتوں کا حکم دیا؟ تو ان سے
كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ إِنَّ	بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو خدا پر جھوٹا بہتان لگائیں
اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝	تاکہ لوگوں کو کسی علم و سند کے بغیر گمراہی میں مبتلا کریں۔
قُل لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا	خدا ظالموں کو کبھی راہ یاب نہیں کرے گا۔ کہہ دو مجھ پر
عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَن يَكُونَ	جو وحی ہوئی ہے اس میں تو میں کسی کھانے والے پر
مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ	بجز اس کے کوئی چیز حرام نہیں پاتا کہ یا تو مردار ہو یا
لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ	بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت۔ یہ چیزیں نجس ہیں۔ یا
أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ	کسی چیز کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، خدا کے حکم
پ ۸ (۱۴۳-۱۴۵ - انعام)	کی نافرمانی کرتے ہوئے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آیت زیر بحث میں شیطان کے نقش قدم کی پیروی سے مراد یہی مشرکانہ توہمات کے تحت اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہرانا ہے۔ یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ شیطان اور اس کی ذریات کو خاص اس مسئلہ سے بڑی دلچسپی ہے۔ اس نے لوگوں کو توحید کے راستے سے ہٹانے کے لیے اس راستے کو بہت کامیاب اور آسان پایا ہے۔ اسی وجہ سے شروع ہی سے اس کو اپنے پروگرام میں شامل کرکے پوری جرأت اور صفائی کے ساتھ اس کا اعلان بھی کر رکھا ہے۔ قرآن کی مندرجہ ذیل آیت پر غور فرمائیے۔

وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا	اور شیطان نے کہا کہ میں تیرے بندوں میں سے اپنا ایک
مَّفْرُوضًا وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ	معین حصہ الگ کرکے رہوں گا۔ میں ان کو گمراہ کروں گا،
وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ	ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں گا اور ان کو سکھاؤں گا
فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ وَمَن يَتَّخِذِ	تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو سکھاؤں گا
الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّن دُونِ اللَّهِ	تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو تبدیل کریں گے اور جو
فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا	اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا کارساز بنائے گا تو وہ کھلی ہوئی
(۱۱۹ - نساء)	نامرادی میں مبتلا ہوا۔

آیت میں حلال کے ساتھ طیب کی صفت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اسلام میں جو چیزیں جائز ہیں وہ لازماً پاکیزہ بھی ہیں۔ گویا ہر چیز کے ساتھ جواز و عدم جواز کے امتیاز کے لیے جس طرح ایک شرعی اور قانونی معیار ہے اسی طرح ایک عقلی اور فطری معیار بھی ہے۔ جو چیزیں ظاہری گندگی اور عقلی و اخلاقی مفاسد سے آلودہ نہیں ہیں وہ سب چیزیں حلال ہیں، اس کے برعکس جن چیزوں کے اندر کوئی ظاہری یا باطنی گندگی موجود ہے وہ ناجائز ٹھہرا دی گئی ہیں۔

شیطان کے لیے 'عدو مبین' کی صفت

شیطان کے لیے عدو مبین کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ بنی نوع آدم کے ساتھ اس کی دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے بلکہ وہ روز اول سے آدم اور ان کی ذریت کا دشمن ہے اور اپنی اس دشمنی کا قیامت تک کے لیے کھلم کھلا اعلان بھی کر چکا ہے۔ اوپر ہم ایک آیت سورۂ انعام کی نقل کر آئے ہیں جس سے واضح ہے کہ وہ اپنی اس دشمنی کا خود اللہ تعالیٰ کے سامنے پوری جسارت کے ساتھ اظہار کر چکا ہے۔ اسی مضمون کی ایک دوسری آیت بھی ملاحظہ ہو۔

قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝	ابلیس بولا بھلا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی
قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ	سے بنایا ہے! اس نے کہا یہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت
عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ	بخشی ہے! اگر تو نے مجھے قیامت تک کے لیے مہلت
لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ قَالَ	بخشی تو میں اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا۔
اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ	صرف تھوڑے ہی میرے فتنوں سے محفوظ رہ سکیں گے
جَهَنَّمَ جَزَاۗؤُكُمْ جَزَاۗءً مَّوْفُوْرًا ۝	خدا نے فرمایا، جا، جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے
وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ	تو جہنم تمہارا پورا پورا بدلہ ہے۔ اور ان میں سے جن
بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ	کو اپنے شور و غوغا سے گھبرا سکے ان کو گھبرا لے اور
وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ	ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لے اور ان کے
الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ	مال و اولاد میں شریک بن جا اور ان کو وعدوں کے سبز
الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝	باغ دکھا لے اور شیطان کے یہ وعدے فریب کے سوا
(۶۱-۶۴ - بنی اسرائیل)	اور کچھ نہیں ہیں۔

ایک دوسرے مقام میں شیطان کے الٹی میٹم کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ	بولا، بوجہ اس کے کہ تو نے آدم کے سبب سے مجھے گمراہی
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ	میں ڈالا، میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں
مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ	بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے سے، ان کے پیچھے
وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ	سے، ان کے دہنے سے، ان کے بائیں سے ان کی

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ٥ (۱۶ - ۱۷ - اعراف)

راہ ماریں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہیں پائے گا۔

جو دشمن اتنے کھلے ہوئے الفاظ میں اعلان جنگ دے چکا ہو اس کے ایک کھلے ہوئے دشمن ([illegible]) ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس کو عدو مبین سے تعبیر کیا ہے اور مقصود اس سے بنی آدم کو آگاہ کرنا ہے کہ ایک چھپے ہوئے دشمن سے دھوکا کھا جانا تو کچھ بعید نہیں ہوتا لیکن ایک کھلے ہوئے دشمن سے دھوکا کھا جانا، یہاں تک کہ اس کو دوست اور کارساز سمجھ کر اس کے مشوروں پر کاربند ہونا ایک ایسی حماقت ہے جس سے بڑی حماقت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۶۹)

امر کے معنی 'امر' کے معنی جس طرح کسی بات کا حکم دینے کے ہیں اسی طرح کوئی بات سجھانے یا اس کا مشورہ دینے کے بھی ہیں۔ مثلاً

امرتهم امری بمنعرج اللوی فلم یستبینوا الرشد الا ضحی الغد

(میں نے ان کو اپنے مشورے سے منعرج اللوی ہی میں آگاہ کر دیا تھا لیکن میری بات ان کی سمجھ میں دوسرے دن کی صبح سے پہلے نہ آ سکی)۔

یا

اطعت الآمریك بصرم حبلی

(تو نے بالآخر انھی لوگوں کی بات سنی جو تجھے مجھ سے قطع تعلق کا مشورہ دینے والے تھے)۔

'سوء' کا استعمال وسیع معنوں میں 'سُوْٓء' کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے جسمانی اور مادی نقصان اور گزند بھی مراد ہوتا ہے مثلاً فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ - ۱۷۴ - آل عمران (اور وہ خدا کی نعمت اور اس کا فضل لے کر لوٹے اور ان کو کوئی گزند نہ پہنچا) اس سے بیماری بھی مراد ہوتی ہے۔ مثلاً وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۱۲ - نمل (اور تم اپنا ہاتھ گریبان میں داخل کرو، وہ اس کے اندر سے سفید برآمد ہو گا بغیر کسی مرض کے) اسی طرح یہ بدی اور گناہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، عام اس سے کہ بدی چھوٹی ہو یا بڑی مثلاً اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ - ۱۷ - نساء (اللہ کے ذمہ ان کی توبہ کی قبولیت ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر بیٹھیں پھر فوراً توبہ کر لیں)

'فحشاء' کا مفہوم 'فَحْشَآء' کا لفظ کھلی ہوئی بدکاری اور بے حیائی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں اس سے زنا، لواطت اور ننگے ہو کر طواف کرنے کی قسم کی برائیوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ جب سُوْٓء اور فحشاء دونوں لفظ ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں تو یہ نہ صرف تمام چھوٹی بڑی برائیوں ہی کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں بلکہ ہر طرح کے مالی، جسمانی اور عقلی نقصانات و مصائب بھی ان کے تحت آ جاتے ہیں۔

قول علی اللہ اور افترا علی اللہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی خدا کی طرف کوئی جھوٹی اور من گھڑت بات منسوب کرنا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خدا نے فلاں اور فلاں کو اپنا ساجھی اور شریک قرار دیا ہے یا بغیر کسی سند کے یہ دعوے کرنا کہ خدا نے فلاں فلاں قسم کی چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں۔

شیطان کے امر کرنے سے یہاں مطلب اس کا ان باتوں کے لیے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنا اور لگاتار میں ان کو کھبانا ہے۔ شیطان کے مفہوم میں اس کی ساری ذریت شامل ہے، عام اس سے کہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔ یہی مضمون ایک دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے۔ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ وَإِنَّ الشَّيٰطِينَ لَيُوحُونَ إِلٰى أَوْلِيَآئِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ۱۲۱۔ انعام (اور وہ چیزیں نہ کھاؤ جن پر خدا کا نام نہیں لیا گیا ہے بے شک شیاطین اپنے دوستوں کی طرف القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے)

ایک نکتہ یہاں ایک نکتہ قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ رحمان اور شیطان کے احکام میں ایسا واضح اور محسوس عقلی و فطری امتیاز موجود ہے کہ کسی سلیم الفطرت اور خوش ذوق انسان کو ان کے درمیان کوئی گھپلا پیش نہیں آسکتا۔ اوپر والی آیت میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں کھانے پینے کے لیے جائز ٹھہرائی ہیں وہ اپنے اثرات اپنے ظاہر، اور اپنے باطن کے لحاظ سے پاکیزہ، خوشگوار، معتدل، صحت بخش اور روح پرور ہیں، اس کے بالمقابل شیطان جن باتوں کو اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے وہ سب کی سب روح، عقل، جسم اور اخلاق کو نقصان پہنچانے والی اور بے حیائی و بدکاری کی راہیں کھولنے والی ہیں۔ اس واضح فرق کے بعد بھی جو لوگ شیطان کی پیروی اختیار کریں ان کی شامت ہی ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۱۷۰)

تنقید کے ساتھ ماضی کے ورثہ کا احترام یعنی ان تمام مشرکانہ رسوم کے معاملہ میں ان کا اعتماد کسی دلیل اور سند پر نہیں بلکہ محض پچھلوں کی تقلید اور ان کی بے سند روایات کی پیروی پر ہے اور جب ان کو اس بات کی دعوت دی جاتی ہے کہ ان بے سند باتوں کی جگہ اس کتاب کی پیروی کرو جو خدا کی اصل شریعت سے آگاہ کرنے کے لیے تم پر نازل کی جارہی ہے تو وہ بڑے غرور کے ساتھ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو بدستور اپنے باپ دادا کے طریقے پر جمے رہیں گے۔ اس پر قرآن نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا باپ دادا کے طریقے کی پیروی پر ان کا یہ جمود اور اصرار اس شکل میں بھی معقول قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ یہ واضح ہو کہ ان کے باپ دادا نے نہ تو ان معاملات میں عقل کی راہنمائی پر اعتماد کیا ہے نہ خدا کی تعلیم پر بلکہ یا تو بے سمجھے بوجھے پچھلوں کی لکیر پیٹتے رہے ہیں یا اپنی خواہشات اور شیطان کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کی ہیں؟

قرآن کے اس سوال کے انداز سے یہ بات نکلتی ہے کہ مجرد یہ چیز کہ ایک بات باپ دادا سے چلی آرہی ہے اس کی صحت و صداقت ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر اس کو رکھ کر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ بات اگر مجرد عقل و رائے سے تعلق رکھنے والی ہے تو وہ عقل کی میزان پر پوری اترتی ہے یا نہیں اور اگر دین سے تعلق رکھنے والی ہے تو اس کی کوئی مضبوط اور قابل اعتماد سند ہے یا نہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ قرآن ایک طرف تو مجرد تقلید پر اعتماد کرنے کے بجائے تحقیق اور تنقید کے لیے برابر آنکھیں کھولے رکھنے کی دعوت دیتا ہے، دوسری طرف وہ ماضی کے ورثہ کو احترام کی نگاہ سے دیکھنے کی بھی ہدایت کرتا ہے اور بغیر تحقیق و تنقید اس سے دستبردار ہو جانے کی اجازت نہیں دیتا۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۷۱)

'نعق ینعق' کے معنی

نَعَقَ يَنْعِقُ کے معنی چیخنے اور آواز دینے کے آتے ہیں۔ نعق المؤذن کے معنی ہیں مؤذن نے اذان دی۔ نعق الراعی بغنمہ کے معنی ہیں چرواہے نے اپنے گلے کو للکارا یا پکارا۔

صورت حال کی تمثیل صورت حال

یہ ایک تمثیل ہے جس میں ایک صورتِ حال کی تمثیل دوسری صورتِ حال سے دی گئی ہے۔ اس طرح کی تمثیلات میں، جیسا کہ ہم آیات ۱۷-۱۸ کی تمثیلات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں، مُمَثَّل اور مُمَثَّل بہ کے تمام اجزا کی ایک دوسرے سے مطابقت ضروری نہیں ہوتی بلکہ صرف صورت واقعہ کی صورت واقعہ سے مطابقت ضروری ہوتی ہے۔ نیز اس بات کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کہ جس چیز کی تمثیل دی جا رہی ہے اس کی پوری صورت واضح کی جائے بلکہ صرف اس صورتِ واقعہ کی وضاحت ضروری ہوتی ہے جس سے تمثیل دی جاتی ہے۔ اسی کے آئینہ میں اس کا عکس بھی دیکھ لیتے ہیں جس کی تمثیل پیش کرنی مقصود ہے۔

جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لینے کے بجائے اندھے بہرے ہو کر محض باپ دادا کی تقلید پر اڑ گئے ہیں ان کی تشبیہ بھیڑ بکریوں کے گلے سے دی گئی ہے جو عقل و ادراک سے بالکل عاری اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہوتا ہے۔ چرواہے کی آواز بے شک اس کے کانوں سے جا ٹکراتی ہے لیکن اس سے آگے اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ چرواہا کس کام کے لیے پکار رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ اس تمثیل کے بعد فرمایا کہ یہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں" جس سے مقصود اس امر کی وضاحت ہے کہ یہ تمثیل تمام عقلی اور روحانی تقاضوں سے ان کی محرومی کی تمثیل ہے۔ اس اسلوب کی بعض بلاغتیں آیت ۱۸ کے تحت بھی گزر چکی ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۱۷۲)

مسلمانوں کے تردد کا ازالہ

مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا اگر یہ مشرکین اپنی مشرکانہ بدعات پر اڑے رہنا چاہتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور تم ان ناروا پابندیوں کو اٹھا کر ان تمام پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ جو اللہ نے تمھیں بخشی ہیں۔ پھر فرمایا اگر تم اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو اسی کے شکر گزار بنو۔ اس کے بخشے ہوئے رزق اور اس کے پیدا کیے

ہونے چوپایوں کو کسی اور کی نسبت سے حرام ٹھہرانا خدا کی بندگی کے بھی منافی ہے اور اس کی شکرگزاری کے بھی۔

مسلمانوں کو خاص طور پر مخاطب کرکے یہ بات کہنے کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ کھانے پینے کا معاملہ، بالخصوص جب کہ ایسی چیزوں کے کھانے کا معاملہ ہو جن کو پرانے زمانہ سے مذہبی تقدس کی بنیاد پر حرمت کا درجہ حاصل رہا ہو، ایک نازک معاملہ تھا۔ اس طرح کے معاملات میں انسان کچھ شکی اور وہمی سا بن جاتا ہے۔ روایت کے خلاف کسی چیز کے کھانے سے طبیعت میں نہ صرف یہ کہ ایک قسم کی جھجک پیدا ہوتی ہے بلکہ بعض لوگ اس کو تقویٰ اور دینداری کے بھی خلاف سمجھتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ حالت کچھ مسلمانوں کو بھی پیش آئی اس وجہ سے قرآن نے ان کو یہ تنبیہ کی کہ یہ چیز خدا کی شکرگزاری اور اس کی بندگی کے منافی ہے۔

سورۂ انعام کے بعض مقامات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مشرکین کی حرام کردہ چیزوں کو جب قرآن نے مباح کردیا کہ اللہ کے نام پر ذبح ہونے کی صورت میں تم ان کو شوق سے کھاؤ تو مشرکین نے یہ پروپگنڈا شروع کردیا کہ مسلمانوں نے ان چیزوں کو بھی حلال کردیا ہے جو باپ دادا کے زمانوں سے حرام چلی آرہی تھیں، چونکہ اس طرح کے معاملات میں طبیعتیں، جیسا کہ اوپر گزرا، بڑی حساس ہوجاتی ہیں اس وجہ سے کچھ مسلمانوں پر اس پروپگنڈے کا اثر ہوا۔ سورۂ انعام کی آیات ذیل میں اسی پروپگنڈے کا رد ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ
اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ○ وَمَا
لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ
اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ
عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ
كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ
اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ○
وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ
بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ○ وَلَا تَاْكُلُوْا
مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ
اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ
لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ
وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ
لَمُشْرِكُوْنَ ○ (۱۱۸-۱۲۱- انعام)

پس جس پر اللہ کا نام ذبح کے وقت لے لیا گیا ہو اس کو بے جھجک کھاؤ، اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان رکھنے والے ہو۔ اور آخر تم ان چیزوں کو کیوں نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہے جب کہ وہ چیزیں تمہارے سامنے وضاحت سے بیان کی جاچکی ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں الا آنکہ تم ان میں سے بھی کسی چیز کے کھانے پر مجبور ہو جاؤ۔ بہت سے لوگ اپنی من گھڑت باتوں کی آڑ لے کر بغیر کسی علم کے لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے حدود الٰہی سے تجاوز کرنے والوں کو۔ گناہ ظاہر اور گناہ باطن دونوں سے باز آؤ۔ جو لوگ گناہ کی کمائی کررہے ہیں وہ اپنی کمائی کا عنقریب بدلہ پائیں گے۔ ہاں ان چیزوں میں سے نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، یہ خدا کی نافرمانی ہے۔ اور یہ شیاطین ہیں جو اپنے دوستوں کو القا کررہے ہیں تاکہ وہ تمہارے ساتھ بحثیں اٹھائیں اور اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم بھی مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے۔

ہمارے نزدیک آیت زیر بحث بھی بالکل اسی موقع و محل میں اور مسلمانوں کے سامنے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے وارد ہوئی۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۷۳)

ملت ابراہیم میں حرام و حلال

یہ اشارہ ہے ان چیزوں کی طرف جو اصلاً ملتِ ابراہیم میں حرام ٹھہرائی گئی تھیں اور مقصود اس سے ہرگز ہرگز حرام و حلال کی تفصیل پیش کرنا نہیں ہے بلکہ صرف مشرکین کی تردید ہے کہ انھوں نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت چوپایوں میں سے بعض کو جو حرام قرار دے دیا ہے یہ بالکل بے سند بات ہے، ملتِ ابراہیم میں صرف یہ یہ چیزیں حرام تھیں۔ بالکل اسی سیاق میں یہی بات سورۂ انعام میں اس طرح فرمائی گئی ہے۔ قُل لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۱۴۵ (کہہ دو کہ مجھے جو وحی کی گئی ہے اس میں تو کسی کھانے والے کے لیے میں بجز اس کے کسی چیز کو حرام نہیں پاتا کہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت، یہ چیزیں ناپاک ہیں، یا پھر خدا کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی چیز کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دیا جائے)

"قُل لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ" کے الفاظ پر ان کے سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو صاف معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مشرکین کے سامنے اس بات کی وضاحت کرائی جا رہی ہے کہ تم نے جو بعض چوپایوں کی حرمت کو ملتِ ابراہیم کی نسبت دے رکھی ہے یہ بالکل بے سند بات ہے مجھ پر ملتِ ابراہیم کے ضابطۂ حلت و حرمت سے متعلق جو بات وحی کی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ فلاں فلاں چیزوں کے سوا چوپایوں میں سے کوئی چیز بھی حرام نہیں ٹھہرائی گئی۔

بعض لوگ زیر بحث آیت کو اس کے موقع و محل سے بالکل الگ کر کے اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں بس یہی چیزیں حرام ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی چیز بھی حرام نہیں ہے لیکن یہ خیال صریحاً غلط ہے۔ اس طرح کے لوگوں کی تردید کے لیے دوسری باتوں سے قطع نظر تنہا یہی بات کافی ہے کہ زیر بحث آیت میں "میتۃ" کا جو لفظ آیا ہے سورۂ مائدہ کی آیت ۳ میں اس کی وضاحت میں پانچ چیزیں گنائی گئی ہیں، پھر مزید بعض دوسری چیزوں کی بھی حرمت بیان ہوئی ہے جن کی طرف آیت زیر بحث میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔

ظاہری گندگی اور باطنی گندگی

ان بیان کردہ چیزوں میں سے مردار، خون اور لحم خنزیر کی حرمت تو ان کی ظاہری گندگی کے سبب سے ہے اس لیے کہ اسلام میں صرف پاکیزہ چیزیں ہی، جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، حلال ٹھہرائی گئی ہیں، جو چیزیں دیکھنے ہی سے گندی اور نجس محسوس ہوتی ہیں ان کو اس دینِ فطرت میں حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ رہی غیر اللہ کے ذبیحہ کی حرمت، تو اس کی حرمت کی وجہ اس کی باطنی گندگی ہے۔ یہ حقیقت اسلام میں اپنی جگہ پر بالکل مسلم

اور واضح ہے کہ شرک سب سے بڑی عقلی اور باطنی نجاست ہے اس وجہ سے اگر کسی پہلو سے اس کی چھوت کسی پاک چیز کو بھی لگ جاتی ہے تو وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے۔ ان دونوں قسموں کی نجاستوں کی طرف اشارہ خود قرآن ہی نے کر دیا ہے چنانچہ انعام ۱۴۵ میں مردار، خون اور لحم خنزیر کے ذکر کے بعد فرمایا کہ فَاِنَّهٗ رِجۡسٌ یہ چیزیں اس وجہ سے حرام ہیں کہ یہ نجس ہیں اور غیر اللہ کے ذبیحہ کا ذکر اَوۡ فِسۡقًا اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ کے الفاظ کے ساتھ کیا جس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس کی نجاست ظاہری نہیں بلکہ عقلی اور عقائدی ہے۔ پھر سورۂ انعام ہی انھی مسائل کے بیان کے سلسلہ میں دین کی یہ ایک بہت بڑی حقیقت بھی واضح کر دی کہ اسلام کا مطالبہ اپنے ہر پیرو سے صرف گناہ ظاہر ہی کے چھوڑنے کا نہیں ہے بلکہ گناہ باطنی کے چھوڑنے کے لیے بھی ہے اس وجہ سے ظاہر گندگی سے آلودہ چیزوں کے ساتھ ساتھ باطنی اور روحانی گندگی سے ملوث چیزوں کو چھوڑنا بھی ضروری ہے وَذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَبَاطِنَهٗ (انعام) اسی ضابطہ کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض چیزوں کو حرام ٹھہرایا۔

'اضطرار' کا مفہوم

"اضطر" ضریضر سے باب افتعال ہے۔ عربی زبان کے قاعدے کے مطابق "ض" کی مناسبت سے افتعال کی "ت" "ط" سے بدل گئی ہے۔ ضرہ الی کذا کے معنی ہیں الجاءہ الیہ اس کو فلاں چیز کی طرف مجبور کر کے دھکیل دیا۔ اضطرہ الیہ کے معنی ہیں احوجہ والجاءہ اس کو فلاں چیز کی طرف مجبور کر دیا۔ بغی یبغی کے معنی یہاں چاہنے اور طلب کرنے کے ہیں۔ غَيۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ یہاں حال پڑے ہوئے ہیں۔ بعض جگہ "اضطرار" کے ساتھ مخمصہ کی قید بھی لگی ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو جائے تو وہ حرام کردہ چیزیں بھی جان بچانے کے لیے استعمال کر سکتا ہے لیکن یہ اضطرار واقعی ہو۔ نہ تو اس کے اندر حرام کی کسی چاہت کو دخل ہو اور نہ آدمی اس حد سے آگے بڑھنے والا ہو جس حد تک بڑھنا جان بچانے کے لیے ناگزیر ہو۔ ان احتیاطوں کے ساتھ کسی واقعی مجبوری میں اگر کوئی شخص کسی حرام چیز سے فائدہ اٹھائے تو فرمایا ہے کہ اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اللہ غفور رحیم ہے۔

رخصت اور عزیمت

قرآن کے الفاظ سے یہ ظاہر ہے کہ یہ اس حالت اضطرار کے لیے ایک رخصت ہے جو غذا میسر نہ آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر اسی پر قیاس کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص حالت اکراہ میں مبتلا ہو جائے وہ بھی اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر اپنی جان بچا سکتا ہے لیکن بعض فقہا نے اس حد سے بڑھ کر اس کو عزیمت کا درجہ دیا ہے۔ چنانچہ حنفیہ کے نزدیک تو وہ شخص خودکشی کا مجرم ٹھہرے گا جو اس طرح کے حالات میں حرام سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال دے گا۔ ہمارے نزدیک اس اجمال کے ساتھ یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک تفصیل بھی ہے جس کے سامنے آئے بغیر اس سے بعض غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہم آگے مستقل عنوان سے یہ تفصیل پیش کریں گے تاکہ رخصت و عزیمت کے معاملہ میں اسلام کا جو مزاج ہے وہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۷۴)

اہل کتاب کی بعض تحریمات

یہ اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح مشرکین نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت بعض چیزیں حرام ٹھہرالی تھیں اور اسلام کی طرف سے ان کی تحلیل کو خلاف تقویٰ و طہارت قرار دیتے تھے اسی طرح اہل کتاب نے بھی اپنے جی سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے لیا تھا اور اب جب کہ اسلام حرام و حلال کے معاملہ میں اس ضابطے کی طرف لوگوں کو لوٹا رہا تھا جو توہمات و بدعات کے بجائے ملت ابراہیمؑ کی اساس اور وحی الٰہی کی رہنمائی پر مبنی تھا تو یہ لوگ اس کی تائید کرنے کی جگہ کتاب الٰہی کی باتوں کو چھپاتے تھے۔ اس طرح کی ایک سے زیادہ چیزوں کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ مثلاً یہود اونٹ کے متعلق دعوے کرتے تھے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے حرام ہے حالانکہ تورات میں اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا چنانچہ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَمَنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (ان سے کہو کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو تورات لا کر پیش کرو۔ جو اس کے بعد بھی خدا پر جھوٹ باندھیں تو وہی لوگ اصلی ظالم ہیں)

اسی طرح بعض چیزیں یہود پر ان کی سرکشی اور کٹ حجتی کے سبب سے یا ان کے سوال در سوال کی بیماری کے باعث حرام ہو گئی تھیں لیکن اس طرح کی حرمتوں سے متعلق ان کو یہ آگاہی دے دی گئی تھی کہ جب آخری نبی مبعوث ہوں گے تو وہ تمہارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دیں گے اور جو قیدیں اور بندشیں تم پر آج عائد ہیں وہ سب دور ہو جائیں گی۔ لیکن یہود نے اس معاملہ میں بھی حق پوشی اور کفران نعمت کی وہی روش اختیار کی جو ابتدا سے ان کی روش تھی۔ انھوں نے ان چیزوں کی تحلیل کو آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا احسان قرار دینے کے بجائے اس کو دین داری اور تقویٰ کے خلاف قرار دیا اور اس کی آڑ میں قرآن، اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوب خوب مخالفت کی۔

اس باب میں بعض جرائم نصاریٰ کے بھی بڑے شدید ہیں۔ اگرچہ ان کا جرم تحریم سے زیادہ تحلیل کی نوعیت کا ہے۔ پال نے جو موجودہ مسیحیت کا بانی ہے یہ فلسفہ پیش کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے احکام غیر بنی اسرائیل پر واجب نہیں ہیں۔ اس طرح اس نے مسیحیوں کے لیے شراب بھی کھلے بندوں جائز کر دی اور خنزیر اور گلا گھونٹے ہوئے جانور کو بھی ان کے لیے مباح کر دیا۔

ان اہل کتاب کے متعلق قرآن نے فرمایا کہ یہ لوگ جو حق پوشی کر رہے ہیں اور اپنی دنیا بنانے کی خاطر دین کو جو بیچ رہے ہیں یہ سودا ان کو بڑا مہنگا پڑے گا۔ دین فروشی کے عوض جو دنیا آتی ہے، یہ آگ ہے جو وہ اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہیں اور اب قیامت کے دن نہ تو خدا ان سے بات کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔

اب ان کے لیے اذیت ناک عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

اہل کتاب پر عتاب

بات نہ کرنے کا مطلب ظاہر ہے کہ لطف و عنایت کی بات نہ کرنا ہے۔ گویا فعل کی نفی سے مقصود حقیقی فعل کی نفی ہے۔ دوسری جگہ اس سلسلہ میں وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ کے الفاظ بھی ہیں اس سے بھی مراد نگاہ التفات کی نفی ہے۔ یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ خدا جس قوم کو کتاب و شریعت دیتا ہے اور اپنا پیغام پہنچانے کے لیے اس کے اندر اپنا نبی بھیجتا ہے تو یہ بھی نبی کے واسطہ سے خداوند تعالیٰ گویا اس قوم کو اپنے شرف تکلم سے نوازتا ہے۔ پھر خاص طور پر بنی اسرائیل کو تو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے پیغمبر کو اپنے خطاب کے شرف سے نوازا۔ اس عظیم عزت افزائی کا تقاضا یہ تھا کہ یہود دل و جان سے خدا کی شریعت اور اس کے کلام کی قدر کرتے اور گوشے گوشے میں اس کا چرچا پھیلاتے لیکن جب انھوں نے اس کو شرف سمجھ کر اس کو پھیلانے کی جگہ اس کو عیب کی طرح چھپانے کی کوشش کی تو اب ان کا کیا منہ رہ گیا ہے کہ خدا ان کو قیامت کے دن پھر اپنے شرفِ خطاب سے نوازے۔

”اور نہ ان کو پاک کرے گا“ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت اور کتاب کی نعمت سے اسی لیے نوازا تھا کہ ان کو پاکیزہ بنائے لیکن جب انھوں نے اس نعمت کے باوجود گمراہیوں اور آلودگیوں ہی میں لتھڑے رہنا پسند کیا تو اب خدا ان کو آخرت میں پاک نہیں کرے گا۔ آخرت میں پاک نہ کرنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخرت تزکیہ و تطہیر کا محل نہیں ہے بلکہ جزا و سزا کا محل ہے اس وجہ سے وہاں کسی کے تزکیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی ان بداعمالیوں کے سبب سے چونکہ ان کا ایمان سلب ہو چکا ہے اس وجہ سے ان کو یہ موقع بھی نہیں حاصل ہوگا کہ یہ دوزخ میں اپنے اعمال کی سزا بھگت کر اور پاکیزہ ہو کر جنت میں جا سکیں بلکہ ان کے لیے دائمی عذاب ہوگا اور یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

مسلم شریف کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی آیت کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھے زانی، جھوٹے بادشاہ اور گدائے متکبر کو بھی داخل کیا ہے۔ یہ حدیث اس آیت کی تفسیر نہیں بلکہ اشتراکِ علت کی وجہ سے آیت کے حکم کی توضیح ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (۱۷۵)

’فَمَا أَصْبَرَهُمْ‘ کا اسلوب مَا أَحْسَنَ کی طرح اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو اس دیدہ دلیری کے ساتھ ہدایت کی جگہ ضلالت اور مغفرت کی جگہ عذاب کو ترجیح دے رہے ہیں تو دوزخ کے معاملہ میں ان کی ڈھٹائی اور جرأت حیرت انگیز ہے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ (۱۷۶)

عتاب کا سبب

یہ اس ناراضگی اور غضب کا سبب بیان ہو رہا ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس عتاب کے مستحق اس وجہ سے ٹھہریں گے کہ خدا نے ان کو راہِ راست پر لانے کے لیے ایک ایسی کتاب آتاری جو تمام جھگڑوں اور سارے اختلافات کو چکا دینے والی ہے لیکن انھوں نے اس کے بعد بھی ہدایت کی جگہ ضلالت ہی کو اختیار کیا تو یہ اسی بات کے مستحق ہیں کہ یہ ہمیشہ کے لیے خدا کی نظرِ التفات سے محروم ہو کر اس عذاب میں پڑیں جس سے ان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہو۔

اس میں بالحق[۱] کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ خدا نے یہ کتاب قولِ فیصل کے ساتھ آتاری ہے۔ یعنی اہلِ کتاب نے حق پوشی اور تحریف کر کے اللہ کے دین میں جو طرح طرح کے اختلافات پیدا کر دیے تھے اور جس کے سبب سے یہ معلوم کرنا سخت مشکل ہو گیا تھا کہ کیا حرام ہے، کیا حلال، کیا حق ہے اور کیا باطل، اللہ نے قرآن کے ذریعہ سے اس اختلاف و نزاع کو بالکل رفع کر دیا، اب حق کی راہ ہر طالبِ حق کے لیے پھر کھل گئی ہے اور خدا کی شریعت اپنی صحیح اور مکمل شکل میں لوگوں کے سامنے آگئی ہے، اس کے بعد بھی جو لوگ انھی جھگڑوں میں پڑے رہیں تو ان کی شامت اور بدبختی ہی ہے۔

شقاق کے معنی مخالفت اور عناد کے ہیں، چنانچہ فرمایا ہے یَا قَوْمِ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شِقَاقِیْٓ اَنْ یُّصِیْبَکُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ الآیۃ ۸۹۔ ہود (اے میری قوم کے لوگو، میری مخالفت اور دشمنی تمھارے لیے اس بات کا باعث نہ بن جائے کہ تمھارے اوپر بھی اس طرح کا عذاب آدھمکے جس طرح کا عذاب قومِ نوح پر آیا) شقاق کے ساتھ جب بعید کی صفت لگ جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی شخص یا چیز کی مخالفت اور دشمنی میں کوئی شخص اس قدر آگے بڑھ جائے اور اتنی دور نکل جائے کہ اس کو اپنے نفع و نقصان کا بھی کچھ ہوش نہ رہ جائے، اور پھر اس کے لیے اتنی دور سے پلٹنے اور تلافی مافات کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے۔ ان اہلِ کتاب کے متعلق فرمایا کہ تورات کے بعد اب قرآن میں بھی انھوں نے یہ جو اختلاف کیا ہے یہ محض ان کی ضدم ضدا کا کرشمہ ہے اور یہ اب اس راہ میں اتنی دور تک نکل گئے ہیں کہ ان کے واپس لوٹنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے۔

۵۴۔ رخصت اور عزیمت کے معاملہ میں صحیح نقطۂ نظر

آیت ۱۷۳۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ کی وضاحت کے ضمن میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ اس شخص کے لیے کسی حرام سے وقتی طور پر فائدہ اٹھا لینے کی رخصت ہے جس کی بھوک کے سبب سے جان پر آبنی ہو اور زندگی بچانے کی کوئی اور صورت حرام کھا لینے کے سوا اس کو نظر نہ آ رہی ہو۔ قرآن کے الفاظ

---

[۱] لفظ حق کے مختلف معانی کی تحقیق آیت ۷۱ کے تحت ملاحظہ ہو۔ یہاں مراد قولِ فیصل ہے۔

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (ایسی صورت میں اس پر کوئی گناہ نہیں) اور اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اللہ ایسی حالت میں بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے) صاف بتا رہے ہیں کہ یہ مجبوری کے حالات کے لیے ایک رخصت ہے اسی وجہ سے ہم ان فقہا کی رائے کے بارے میں متردد ہیں جو اس رخصت کو عزیمت کا درجہ دیتے ہیں اور اس شخص پر خودکشی کا حکم لگاتے ہیں جو اضطرار کی حالت میں حرام سے فائدہ نہ اٹھائے اور اس کے نتیجہ میں اس کی جان چلی جائے۔

ہمارے نزدیک یہ بات اس اجمال کے ساتھ، جیسا کہ ہم آیت کی تاویل کرتے ہوئے ظاہر کر چکے ہیں، صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ رخصت بہرحال رخصت ہے۔ کسی رخصت کو مطلق طور پر عزیمت کا درجہ کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص اضطرار کے باوجود حرام سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی موت حرام کی موت ہوئی۔

اس امر میں تو شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں جو رخصتیں رکھی ہیں وہ سب اس کی مہربانی اور رحمت کا مظہر ہیں۔ وہ ہماری کمزوریوں اور ہماری مجبوریوں سے سب سے زیادہ باخبر ہے۔ اس وجہ سے اس نے ہم پر کوئی بوجھ ایسا نہیں ڈالا ہے جو ہماری طاقت سے زیادہ ہو۔ اس نے وضو کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ اجازت بھی دے دی کہ اگر سفر کی حالت ہو، پانی نہ دستیاب ہو سکتا ہو یا بیماری کے سبب سے وضو کرنے میں مضرت کا اندیشہ ہو تو آدمی تیمم کر سکتا ہے۔ اس نے نماز کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ رخصت بھی عنایت فرمائی کہ سفر کی حالت میں آدمی قصر کر سکتا ہے۔ اسی طرح روزہ کا حکم دیا تو یہ اجازت بھی دی کہ اگر روزے کے مہینہ میں سفر پیش آ جائے یا آدمی بیمار پڑ جائے تو دوسرے دنوں میں اپنے روزے پورے کرے۔ اس طرح کی رخصتیں دین کے ان تمام احکام کے ساتھ مذکور ہیں جن کی تعمیل کے کسی مرحلہ میں کوئی ایسی مشکل پیش آ سکتی ہے جو عام قوتِ برداشت سے زیادہ ہو۔ ان کے بارے میں صحیح رویہ یہی ہے کہ آدمی ضرورت پیش آ جانے پر ان سے فائدہ اٹھائے اور عزیمت کے جوش میں خواہ مخواہ اپنی جان کو مشقت میں نہ ڈالے۔ اگر کوئی شخص مضرت کے اندیشہ کے باوجود تیمم کے بجائے وضو پر اصرار کرے یا زحمتوں کے باوجود سفر میں اتمامِ نماز ہی کو تقاضائے تقویٰ سمجھے یا مشقت کے باوجود سفر کی حالت میں بھی روزے پورے کرنے ہی کو عزیمت جانے تو ہمارے نزدیک ایسا شخص اسلام کا اصلی مزاج سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ یہ دین کے معاملہ میں تشدد پسندی ہے اور جو شخص دین میں تشدد پسندی کی راہ اختیار کرتا ہے اور رخصتوں کو خلافِ عزیمت جانتا ہے وہ درحقیقت دین سے دھینگا مشتی کرتا ہے اور ایسا شخص حدیث میں وارد ہے کہ دین سے شکست کھا جاتا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو تنبیہ فرمائی جو سفر میں روزے کی وجہ سے اپنے آپ کو سخت مشقت میں ڈالے ہوئے تھے لیکن اگر کسی شخص کو سفر میں ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہوں وہ بلا کسی خاص زحمت کے پوری نمازیں پڑھ سکتا ہے یا روزے رکھ سکتا ہے تو اس سے کسی گناہ کے لازم ہونے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے

اسی طرح اگر کسی شخص کو حالتِ اضطرار پیش آجائے اور جان بچانے کی اس کے سوا کوئی اور تدبیر باقی ہی نہ رہ جائے کہ وہ کسی حرام سے فائدہ اٹھائے تو عام حالات میں اسلام کا مزاج یہی تقاضا کرتا ہے کہ جان بچانے کی حد تک وہ اس حرام سے فائدہ اٹھالے۔ اس چیز کو نہ خلافِ تقویٰ خیال کرے نہ خلافِ عزیمت لیکن بعض شکلیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جب ایک غیرت مند مسلمان کے شایانِ شان بات یہی ہوتی ہے کہ وہ جان تو دے دے لیکن حرام کو ہاتھ لگانا گوارا نہ کرے۔ مثلاً اگر کسی جگہ فساق و فجار کے صاحبِ اختیار ہونے کی وجہ سے حرام و حلال کی تمیز اٹھ گئی ہو اور آدمی کو کوئی حرام چیز کھانے پر مجبور کیا جائے تو اس کے ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ وہ عزیمت کی راہ اختیار کرے اور دوسروں کے ایمان کو زندہ کرنے کے لیے اپنی زندگی قربان کر دے۔ یہ بازی کھیل کر وہ گنہگار نہیں ہوگا بلکہ انشاء اللہ اپنی غیرتِ ایمانی اور احترام حقوق شریعتِ الٰہی کے صلے میں شہادت کا مقام حاصل کرے گا۔ کم از کم علماء و مصلحین کے لیے تو ایسے حالات کے اندر یہی روش بہتر ہے۔ حضرات صحابہؓ نے مکہ کی ابتدائی زندگی میں جو تکلیفیں کلمۂ توحید کی خاطر اٹھائی ہیں وہ کس سے مخفی ہیں؟ کتنے اصحاب نے اعدائے توحید کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کیا اور زندگی تو سب ہی حضرات کی خطرے میں رہی لیکن ان میں سے کسی ایک صحابیؓ کے متعلق بھی ہمارے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ انھوں نے جان بچانے کی خاطر کلمۂ کفر زبان سے نکالا ہو حالانکہ قرآن میں اس بات کی صریح اجازت موجود تھی کہ اکراہ کی صورت میں آدمی جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہہ سکتا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ نہ تو دین کی رخصتوں کو حقیر سمجھنے کا رجحان صحیح ہے اور نہ رخصتوں ہی کو عزیمت قرار دے دینے کا رجحان صحیح ہے بلکہ صحیح مسلک یہ ہے کہ عام حالات میں جس طرح رخصتوں سے فائدہ اٹھانا مزاجِ شریعت کے مطابق ہے اسی طرح خاص حالات میں عزیمت کے تقاضوں پر عمل کرنا بھی دین کا مطالبہ ہے۔

۵۵۔ آگے کا مضمون ـــــ آیت ۱۷۷

دین محض چند رسوم و ظواہر کا نام نہیں

اوپر والے مجموعہ آیات میں، جیسا کہ واضح ہوا، توحید کا بیان تھا۔ اب آگے والی آیت میں اس کے لوازم و ثمرات یعنی ایمان، انفاق، اقامتِ صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، ایفائے عہد اور ہر طرح کے حالات میں حق پر استقامت کا بیان ہو رہا ہے۔ اس مضمون کی تمہید اس طرح ہے کہ خدا کے ساتھ وفاداری کا حق مشرق یا مغرب کی طرف رخ کر لینے سے ادا نہیں ہوگا جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے سمجھ رکھا ہے، چنانچہ اسی مسئلہ پر ان کے ہاں ایک مدت سے معرکۂ جدال و قتال گرم ہے۔ گویا ان کے خیال میں اصل دین یہی ہے۔ بلکہ اس کے لیے فلاں فلاں چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس تمہید سے مقصود مسلمانوں کو یہ آگاہی دینا ہے کہ دین محض چند رسوم و ظواہر کا نام نہیں ہے بلکہ وہ زندگی سے نہایت گہرے تعلق رکھنے والے اعمال و اخلاق کا مجموعہ ہے۔ اس وجہ سے وہ اگلی امتوں کی طرح صرف رسوم کے بندے بن کر نہ رہ جائیں بلکہ دین کی اصلی حقیقتوں کو اپنائیں جو یہ ہیں۔ انہی کو اپنا کر وہ خدا

کے ساتھ اپنی وفاداری کا حق ادا کر سکیں گے۔ ان کے بغیر محبت و وفاداری کے دعوے بالکل بے بنیاد ہیں۔ اس سلسلے میں آیت کی تلاوت فرمائیے ارشاد ہوتا ہے۔

آیت ۱۷۷
لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۖ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۱۷۷﴾

ترجمہ آیت ۱۷۷
خدا کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رخ کر لو بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر صدق دل سے ایمان لائیں۔ اور اپنے مال، اس کی محبت کے باوجود، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں، خاص کر وہ لوگ جو فقر و فاقہ، تکالیف جسمانی اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں۔

۵۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

بِرّ کے معنی
"بِرّ" کا اصل مفہوم عربی لغت میں کسی کے حق کو پورا کرنا ہے، عام اس سے کہ خدا کا حق ہو، ماں باپ کا حق ہو، یا اللہ کے بندوں کا حق ہو۔ ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا ایفا بھی اس کے مفہوم میں

شامل ہے جو معاہدات، قول و قرار، حلف و ولاء عقود و اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لفظ کی اسی وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہو جاتی ہیں جو عدل یا احسان کے تحت آسکتی ہیں۔ بَرّ اور بارّ اس سے صفت کے صیغے ہیں۔ بَـرٌّ بِوَالِـدَيْـهِ اس سعادت مند بیٹے کو کہیں گے جو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور ان کے حقوق پورے پورے ادا کرنے والا ہو۔ برّ بالقسم کے معنی ہیں اس نے اپنی قسم پوری کر دی۔ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی بَرّ کی صفت استعمال ہوئی ہے اس لیے کہ اس نے بندوں کے جو حقوق اپنے اوپر لیے ہیں یا جو وعدے ان سے کیے ہیں وہ ان کو ایک ایک کر کے دنیا اور آخرت دونوں جگہ پورے کرنے والا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ حقوق و واجبات ہوں یا نیکیاں اور بھلائیاں سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے ہمیں ترجمہ کے لیے اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں مل سکا جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کر دے۔ ہم نے جو لفظ اختیار کیا ہے وہ ہمارے نزدیک ایک حد تک لفظ کی اصل روح کو ادا کرتا ہے۔[1]

یہاں اصل بیان تو ایمان و انفاق اور نماز و زکوٰۃ وغیرہ کا ہے لیکن جیسا کہ اس باب کی تمہید میں ہم بیان کر آئے ہیں، ان احکام و شرائع کے پہلو بہ پہلو تجدید دین کے تقاضوں کے تحت ان بدعات کی تردید بھی ہے جو اہل کتاب یا مشرکین نے شریعتِ الٰہی میں داخل کر دی تھیں اور جن کے سبب سے پوری شریعت یا تو مسخ ہو کر رہ گئی تھی یا صرف چند ظواہر اور رسوم کا مجموعہ بن گئی تھی۔ یہاں اسی تجدید دین کے تقاضے کے تحت اصل احکام کے بیان کی تمہید اس طرح اٹھائی کہ خدا کی بندگی اور اطاعت کا حق صرف مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینے سے ادا نہیں ہو جاتا بلکہ اصل شے وہ اعمال و اخلاق ہیں جن کی شریعت نے تعلیم دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ پر تعریض ہے جن کے ہاں تورات و انجیل کی اصل تعلیمات تو طاقِ نسیاں پر رکھ دی گئی تھیں لیکن قبلہ کے معاملہ میں مشرق و مغرب کا جھگڑا، جیسا کہ آیات ۱۱۵، ۱۴۲ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں، ان کے درمیان اس طرح اٹھ کھڑا ہوا تھا گویا سارے دین کا انحصار بس اسی چیز پر ہے۔

اس امت کے لیے ایک تنبیہ

یہ تمہید جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے اس امت کے لیے تنبیہ ہے کہ اس طرح کی فروعی باتوں میں الجھ کر اصل دین سے دستبردار نہ ہو جانا ورنہ یہود و نصاریٰ ہی کی طرح تم بھی مچھر کو چھاننے والے اور اونٹ کے نگلنے والے بن کر رہ جاؤ گے اور جس طرح ان کا دعوائے خدا پرستی بے معنی ثابت ہوا اسی طرح تمہاری خدا پرستی بھی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ ٹھیک اسی مفہوم کی تنبیہ آگے حج کے بیان کے سلسلہ میں بھی فرمائی ہے۔ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰـكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۱۸۹۔ بقرہ (یہ کوئی تقویٰ نہیں ہے کہ گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو، تقویٰ تو اس کا ہے جو حدود الٰہی کا احترام ملحوظ رکھے) ان تمام تنبیہات

---

[1] لفظ بِرّ کی تحقیق زیادہ تر مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن سے ماخوذ ہے۔

ہے مقصود، جیسا کہ عرض کیا گیا، اس امت کو یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی بدعات اور ظاہر پرستیوں سے بچا کر دین کی اصل حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا تھا لیکن افسوس ہے کہ یہ امت بھی انھیں وادیوں میں بھٹک کر رہ گئی جن میں پچھلی امتیں ہلاک ہوئی تھیں۔

"وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ" میں ایک مضاف عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق محذوف ہے گویا پوری عبارت یوں ہوگی وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ۔ مضاف کے حذف کی مثال خود اسی زیر بحث آیت میں موجود ہے۔ فرمایا ہے۔ وَفِي الرِّقَابِ۔ ظاہر ہے کہ یہ وَفِي فَكِّ الرِّقَابِ ہے۔

ایمان اور اس کے اجزاء

ایمان سے یہاں، سیاق و سباق دلیل ہے کہ حقیقی ایمان مراد ہے۔ اس لیے کہ حقیقی ایمان ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی خدا کی وفاداری کا حق ادا کر سکتا ہے۔ حقیقی ایمان اللہ پر یہ ہے کہ آدمی بلا کسی شائبہ شرک کے اپنے کو پورا پورا اپنے رب کے حوالہ کر دے۔ آخرت پر حقیقی ایمان یہ ہے کہ آدمی مرنے کے بعد اٹھائے جانے کو تسلیم کرے، اپنے ہر قول و فعل کا خدا کے سامنے اپنے کو جواب دہ سمجھے اور جھوٹی شفاعتوں کے وہم میں مبتلا نہ ہو۔ فرشتوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ہستی کو تسلیم کرے، ان کو معصوم اور قدسی صفت جانے، ان کو اللہ کی ہدایت لانے والا، امین اور معتمد مانے اور ان کو قضا و قدر کے فیصلوں کی تنفیذ کا ذریعہ سمجھے۔ ایمان بالکتاب کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اللہ کا اتارا ہوا صحیفۂ ہدایت مانے، اس کو حق و باطل کی کسوٹی سمجھے اور زندگی کے ہر پہلو میں اس کی رہنمائی پر پورا پورا اعتماد کرے۔ نبیوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ان کو خدا کی طرف سے مامور اور واجب الاطاعت ہادی مانے، ان کے علم کو بے خطا سمجھے، ان کے عمل کو زندگی کے لیے اسوہ قرار دے اور ان کی اطاعت، اتباع اور محبت کو لازم جانے۔

ایمان بالملائکہ

یہاں ایک بات ممکن ہے بعض ذہنوں میں کچھ کھٹکے، وہ یہ کہ ایمان کے اجزاء میں فرشتوں پر ایمان کو کیوں داخل کر دیا ہے جب کہ ان کا تجربہ صرف نبیوں ہی کو ہوا ہے اور ان پر ایمان لانے کا کوئی خاص علمی یا عملی فائدہ ایک عام آدمی پر واضح نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ایمان باللہ کا حق آخرت، کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے بغیر ادا نہیں ہوتا، انھی چیزوں پر ایمان لانے سے ایمان باللہ ہماری زندگی کی ایک محسوس، مؤثر اور فعال حقیقت بنتا ہے اسی طرح ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسل کا ایک غیر منفک جزو ایمان بالملائکہ ہے۔ ملائکہ کو مانے بغیر خدا اور اس کے نبیوں کے درمیان کا واسطہ غیر واضح اور غیر متعین رہ جاتا ہے، جس کے غیر واضح رہنے سے نہ صرف سلسلۂ علم و ہدایت کی ایک نہایت اہم کڑی گم شدہ رہ جاتی ہے بلکہ ہدایت آسمانی کے باب میں عقل انسانی کو گمراہی کی بہت سی راہیں بھی مل جاتی ہیں۔ یہ بات تو دنیا ہمیشہ سے مانتی آئی ہے کہ خدا ہے اور یہ بات بھی اس نے ہمیشہ محسوس کی ہے کہ جب وہ ہے تو اسے اپنی مرضیات سے اپنے بندوں کو آگاہ بھی کرنا چاہیے لیکن جب وہ کبھی بے نقاب اور روبرو ہو کر ہمارے سامنے نہیں آتا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ ذریعہ اور واسطہ کیا ہے جس سے وہ خلق کو

اپنے احکام و ہدایات سے آگاہ کرتا ہے۔ اگر اس مقصد کے لیے اس نے اپنے خاص خاص بندوں کو منتخب کیا ہے، جن کو انبیاء و رُسل کہتے ہیں تو لعینہٖ یہی سوال ان کے بارے میں بھی اٹھتا ہے کہ ان نبیوں اور رسولوں کو وہ اپنے علم و ہدایت سے آگاہ کرنے کا کیا ذریعہ اختیار کرتا ہے۔ کیا روبرو ہو کر خود ان سے بات کرتا ہے یا کوئی اور ذریعہ اختیار فرماتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کے درمیان علم کا واسطہ وحی ہے جو وہ اپنے فرشتوں بالخصوص اپنے مقرب فرشتے جبریلؑ کے ذریعہ سے بھیجتا ہے۔
یہ فرشتے خدا کی سب سے زیادہ پاکیزہ اور برتر مخلوق ہیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ یہ براہ راست خدا سے وحی اخذ کر سکتے ہیں۔ یہ ہر وقت اپنے رب کی حمد و تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ خدا کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل کرتے ہیں اور چونکہ خدا کے حکم و اختیار کے تحت اور اس کی نگرانی میں کرتے ہیں اس وجہ سے نہ تو کوئی اور مخلوق ان کے کسی کام میں رکاوٹ ڈال سکتی اور نہ وہ خود ہی اس میں کبھی بھول چوک یا کسی غلطی کے مرتکب ہو سکتے۔
انہی کے زمرہ کی ایک مقرب ہستی حضرت جبریلؑ ہیں جو خدا کے ہاں سب سے زیادہ بلند مرتبہ اور مقرب ہیں۔
قرآن میں ان کی صفت ذی قوت، مطاع اور امین بھی آئی ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے وہ اس کے لیے تمام صلاحیتوں اور قوتوں سے بھرپور ہیں، دوسری قوتیں یا ارواحِ خبیثہ ان کو متاثر یا مغلوب نہیں کر سکتیں۔ ان کے دائرۂ کار میں سب بے چون و چرا ان کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں، مجال نہیں ہے کہ کوئی ان کے حکم سے سرتابی کر سکے، وحی الٰہی کی جو امانت نبیوں اور رسولوں تک پہنچانے کے لیے ان کے سپرد کی جاتی ہے وہ اس کو بے کم و کاست پہنچاتے ہیں، ممکن نہیں کہ اس میں کسی زیر زبر کا بھی فرق ہو سکے۔

وحی و رسالت کے ساتھ فرشتوں کے اس گہرے تعلق کی وجہ سے نبیوں اور کتابوں پر ایمان لانے کے لیے ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہوا۔ یہ خدا اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے درمیان رسالت کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور اس اعتبار سے یہ ناگزیر ہیں کہ یہی ایک ایسی مخلوق ہیں جو عالمِ لاہوت اور عالمِ ناسوت دونوں کے ساتھ یکساں ربط رکھ سکتے ہیں، یہ اپنی نورانیت کی وجہ سے خدا کے انوار و تجلیات کے بھی متحمل ہو سکتے ہیں اور اپنی مخلوقیت کے پہلو سے انسانوں سے بھی اتصال پیدا کر سکتے ہیں۔ ان کے سوا کوئی اور مخلوق خدا تک رسائی کا یہ درجہ اور مقام نہیں رکھتی اس وجہ سے ضروری ہوا کہ نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ان رسولوں پر بھی ایمان لایا جائے جو خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان رسالت کا واسطہ ہیں۔

یہ حقیقت یہاں پیشِ نظر رہے کہ عقلِ انسانی عالمِ لاہوت سے تعلق رکھنے والی ارواح کے تجسس میں ہمیشہ سے رہی ہے اور اس ضرورت کو اس نے اس شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ اس تلاش میں اگر اس کو کوئی صحیح چیز نہیں مل سکی ہے تو جو غلط سے غلط چیز بھی اس کے ہاتھ آ گئی ہے اسی کا دامن اس نے پکڑ لیا ہے۔
عرب کے کاہن و ساحر جنات، شیاطین اور ہاتفِ غیبی کو عالمِ لاہوت سے تعلق کا ذریعہ سمجھتے تھے، ہندوستان کے جوتشی اور منجم ستاروں کی گردشوں کے اندر غیب کے اسرار ڈھونڈھتے تھے، چین کے مندروں کے پجاری اپنے

باپ دادا کی ارواح کے توسط سے عالم غیب سے توسل پیدا کرتے تھے، قرآن نے ان تمام غلط وسائل اور واسطوں کی نفی کر دی اور ان کے ذریعہ سے حاصل شدہ علم کو رطب و یابس کا مجموعہ ٹھہرایا اور ساتھ ہی یہ حقیقت واضح فرمائی کہ علم الٰہی کا قابلِ اعتماد ذریعہ صرف ملائکہ ہیں جو انبیاء کے پاس آتے ہیں اور جتنا کچھ خدا ان کو دیتا ہے وہ بے کم و کاست ان کو پہنچا دیتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ایمان بالملٰئکہ، ایمان بالکتاب، اور ایمان بالانبیاء سب ایک دوسرے سے اتصال رکھنے والی کڑیاں ہیں اور جس طرح ایمان بالکتاب اور ایمان بالانبیاء ہماری زندگی کی نہایت محسوس حقیقتیں ہیں اسی طرح ایمان بالملٰئکہ بھی ہماری زندگی کی ایک نہایت اہم علمی و عملی حقیقت ہے۔

’علیٰ حُبِّہٖ‘ میں ضمیر کا مرجع

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ، میں ضمیر مجرور یوں تو خدا کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے یعنی آدمی اپنا مال خدا کی محبت کی راہ میں خرچ کرے لیکن ہمارے نزدیک مختلف وجوہ سے ان لوگوں کا قول قابلِ ترجیح ہے جو اس کا مرجع مال کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی آدمی مال کی محبت کے باوجود اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرے۔

مال کی محبت کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مال بجائے خود قیمتی اور دل پسند ہو، دوسرا یہ کہ آدمی خود اس کا ایسا ضرورت مند ہو کہ دوسرے کے لیے ایثار کرنا نفس پر شاق ہو رہا ہو۔ تیسرا یہ کہ زمانہ قحط اور گرانی کا ہو جس میں کشادہ دست آدمی بھی محتاط اور کفایت پسند بن جایا کرتا ہے۔ عَلٰی حُبِّہٖ کا لفظ ان تینوں ہی صورتوں پر حاوی ہے۔ اس مفہوم کو ترجیح دینے کی ہمارے نزدیک کئی وجہیں ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ قرآن کے نظائر سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ بندہ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و وفاداری کا اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنے کے لیے انسان کو کس قسم کا انفاق کرنا چاہیے۔ یہ مضمون دوسرے مقامات میں جہاں جہاں بیان ہوا ہے وہاں صراحت کے ساتھ یہ بات بتائی گئی ہے کہ یہ مرتبہ اس مال کے خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے جو محبوب ہو۔ مثلاً لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۹۲۔ (تم ہرگز کامل وفاداری کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک اس مال میں سے خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے) اسی طرح دوسرے مقام میں سچے اہلِ ایمان کی تعریف فرمائی گئی ہے کہ وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ ۹۔ حشر (اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انھیں خود احتیاج ہو)

دوسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ سب سے افضل صدقہ کون سا ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ جو ایک بے مایہ اپنی محنت کی کمائی میں سے اپنے کسی ایسے عزیز پر خرچ کرتا ہے جو اس کے خلاف اپنے دل میں عداوت رکھتا ہے۔

تیسری یہ کہ اہلِ عرب کے ہاں بھی سب سے زیادہ قابلِ تعریف فیاضی انھی لوگوں کی سمجھی جاتی تھی جو زمانۂ قحط و گرانی میں فیاضی کرتے تھے جب کہ مال، مالداروں کی نظر میں بھی بڑی محبوب چیز بن جاتا ہے۔ عرب شعرا نے اس صفت کی بالاتفاق تعریف کی ہے۔ دوسری قوموں میں بھی یہ صفت بلا اختلاف ممدوح ہے۔

چوتھی یہ کہ اس طرح کا انفاق اغلب یہی ہے کہ خدا کی محبت ہی میں ہو، اس لیے کہ بغیر اس قوی محرک کے نفس کا اس قسم کے ایثار پر آمادہ ہونا بڑا مشکل ہے۔ اس پہلو سے یہ مفہوم پہلے مفہوم پر خود بخود حاوی ہو جاتا ہے۔

انفاق کے مصارف

انفاق کے مصارف میں سب سے پہلے قرابت مندوں کو رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے اعزاء واقربا اگر وہ ضرورت مند ہیں، اس کی اعانت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ دل میں عداوت بھی چھپائے ہوئے ہوں جب بھی سب سے افضل انفاق، جیسا کہ اوپر والی حدیث سے واضح ہوا، وہی ہے جو ان کے لیے کیا جائے۔

قرابت مندوں کے بعد متصلاً یتامیٰ کا ذکر اسلامی معاشرہ میں ان کے درجہ و مرتبہ کو واضح کرتا ہے کہ اپنے عزیزوں کے بعد پہلی نظر آدمی کی ان بچوں پر پڑنی چاہیے جو سایۂ پدری سے محروم ہو چکے ہیں اور جن کی کفالت و تربیت کی ساری ذمہ داری معاشرہ پر منتقل ہو چکی ہے۔

اِبْنُ السَّبِیْل سے مراد مسافر ہے۔ مسافر مجرد اپنی مسافرت کی حالت کی بنا پر مستحق اعانت ہوتا ہے اس سے قطع نظر کہ وہ صاحب استطاعت ہے یا غیر صاحب استطاعت اگر مستحق اعانت ہونے کے لیے غیر صاحب استطاعت ہونے کی شرط ہوتی تو مسکین کے بعد اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

سائلین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اعانت کے لیے سوال کر بیٹھیں۔ مساکین کے بعد ان کے مستقل ذکر کرنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو شخص سوال کر بیٹھے اس کے متعلق زیادہ کھوج کرید کی ضرورت نہیں ہے کہ واقعی وہ محتاج ہے یا نہیں۔ اگر وہ بے ضرورت سوال کر رہا ہے تو اس کی جواب دہی خود اس کے اوپر اللہ کے ہاں ہے۔ ہمارا حق صرف یہ ہے کہ اگر ہم امداد کر سکتے ہوں تو ایسے شخص کی امداد کریں اور اگر معذور ہوں تو، جیسا کہ قرآن اور حدیث میں ہدایت ہے، شائستہ انداز سے اس کے سامنے اپنی معذرت پیش کر دیں۔

"وَفِی الرِّقَابِ" میں رقاب رقبہ کی جمع ہے جس کے معنی گردن کے ہیں۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یہاں مضاف محذوف ہے یعنی فی فَكِّ الرِّقَابِ گردنوں سے مراد یہاں غلاموں کی گردنیں ہیں۔ ان کو طوقِ غلامی سے چھڑانا اور آزاد انسانوں کی سطح پر لانا انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے اس وجہ سے اسلام نے اپنی مدّاتِ خیر میں ان کو بھی شامل کر لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کا معاملہ اسلام کے اپنے نظام کا کوئی جزو نہیں تھا، وقت کے بین الاقوامی قانونِ جنگ کے تحت اسلام نے اس کو محض وقتی طور پر اس لیے گوارا کیا تھا کہ اس وقت بین الاقوامی سطح پر جنگ کے قیدیوں کے مسئلہ کا کوئی اور حل موجود نہیں تھا۔ لیکن اس کو گوارا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام نے اپنے ماحول میں غلاموں کی آزادی کی مختلف نوعیتوں سے حوصلہ افزائی کی۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کو خرید کر آزاد کر دینے یا ان کی مکاتبت یعنی شرطِ آزادی کی رقم ادا کرنے کو ایک ثواب کا کام ٹھہرا دیا۔

اب اس زمانہ میں غلامی اگرچہ قانوناً ختم ہو چکی ہے اور یہ بات عین منشائے اسلام کے مطابق ہوئی ہے لیکن عملاً آج بھی بے شمار انسان اپنی معاشی مجبوریوں اور خاص طور پر سودی قرضوں کی لعنت کے سبب سے ایسے بندھنوں میں گرفتار یا جیلوں میں بند ہیں کہ ان کو اگر غلام نہیں تو غلاموں سے مشابہ ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی گلو خلاصی اور ان کے رہن شدہ مکانوں اور کھیتوں کو چھڑانا بھی انشاء اللہ فَكُّ رَقَبَةٍ ہی کے درجے کی نیکی ہے۔

نماز اور زکوٰۃ — اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ۔ پر مفصل بحث اس کتاب کے شروع میں ہو چکی ہے۔ یہاں ایمان و انفاق کے ذکر کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ان دونوں کے قانونی و عملی مظاہر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ایمان کی عظیم حقیقت کا مظہر عملی نماز ہے اور انفاق کی وسیع حقیقت کا مظہر قانونی زکوٰۃ۔ مطلب ان دونوں کے ذکر سے یہ ہے کہ ایمان اور انفاق کی شہادت دینے کے لیے کم سے کم جو چیز مطلوب ہے وہ نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں غائب ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ ایمان باقی رہا نہ انفاق در آنحالیکہ یہی وہ چیزیں ہیں جن سے بندہ خالق اور خلق کے ساتھ اپنے تعلق کو صحت مندانہ بنیاد پر قائم کرتا ہے۔

یہاں زکوٰۃ کا علیحدہ ذکر کرنے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اوپر جس انفاق کا ذکر ہے وہ اس قانونی مطالبہ سے الگ چیز ہے۔ بر و تقویٰ کا درجہ صرف ادائے زکوٰۃ سے نہیں بلکہ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فیاضانہ خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اسلوب کا ردو بدل — وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ (اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں) میں دفعتہً اسلوب کلام بدل گیا ہے۔ اوپر ایمان، انفاق، نماز اور زکوٰۃ کا ذکر فعل کی شکل میں آیا تھا، اَلْمُوْفُوْنَ کا عطف تو انھی پر ہے لیکن یہ اسم فاعل اور صفت کی صورت میں ہے۔ پھر آگے الصَّابِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ (اور ثابت قدم رہنے والے) آرہا ہے جو ہے تو صفت کی صورت میں لیکن 'مُوْفُوْنَ' پر معطوف ہونے کے باوجود صَابِرُوْنَ کے بجائے صَابِرِيْنَ یعنی حالتِ نصب میں ہو گیا ہے۔

اسلوب کا یہ ردو بدل صرف تنوع کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ معنوی فوائد بھی ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

عربی زبان کے طلبہ اس بات سے واقف ہیں کہ عربی میں فعل کے صیغے تو صرف کسی فعل کے وقوع کو ظاہر کرتے ہیں لیکن صفت کے صیغے کسی مستقل صفت، کسی خصلت اور کسی کردار کو ظاہر کرتے ہیں، بلکہ ان کے اندر ایک عزم و جزم کی روح بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اہلِ علم سے مخفی نہیں ہے کہ سلسلۂ کلام میں اگر کسی صفت کا ذکر بغیر کسی ظاہری سبب کے حالتِ نصب میں ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ متکلم اس پر خاص طور پر زور دینا چاہتا ہے۔ ہمارے اہلِ نحو اس بات کو 'عَلٰی سَبِيْلِ الْمَدح' یا 'عَلٰی سَبِيْلِ الْاِخْتِصَاص' کی اصطلاح میں تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً یہاں 'مُوْفُوْنَ' کے بعد دفعتہً اس سے بالکل مختلف اسلوب میں 'الصَّابِرِيْنَ' جو آگیا تو اس سے

معنی میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ گویا متکلم یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگرچہ تمام بالٰی کو الصابرین میں صابرین کا ذکر خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں۔

اسلوب کی اس وضاحت کے بعد اب یہ سوال ذہن میں پیدا ہو گا کہ اوپر عقائد اور عبادات کا ذکر تو سیدھے سادے فعل کے صیغوں سے کیا، پھر یہ ایفائے عہد اور صبر کی کیا خصوصیت تھی کہ ان کا ذکر اسلوب بدل بدل کر اس اہتمام و اختصاص اور اس تاکید و تنبیہ کے ساتھ فرمایا؟ اس کے جواب میں چند باتیں پیش نظر رکھیے۔

دین میں سیرت و کردار کی اہمیت

ایک تو یہ کہ ان دونوں چیزوں کا تعلق سیرت و کردار سے ہے۔ سیرت و کردار کا معاملہ بڑے عزم و جزم اور ریاضت و تربیت کا محتاج ہوتا ہے۔ جہاں تک ظاہری عقائد و عبادات کا تعلق ہے ان کو نبھانے والے تو دین کے زوال و انحطاط کے بعد بھی بہت سے نکل آتے ہیں لیکن کردار جو مغز دین اور روح دین ہے اس کا اہتمام بڑے بڑوں کے اندر بھی نہیں پایا جاتا۔ اہل مذاہب میں یہ کمزوری بہت نمایاں رہی ہے کہ انھوں نے عقائد و عبادات کے ظواہر پر تو بڑے بڑے معرکے اٹھائے ہیں لیکن کردار کی تعمیر پر انھوں نے بہت کم توجہ کی ہے۔ یہاں چونکہ اس آخری امت کی رہنمائی مقام بر و اطاعت کی طرف کی جا رہی ہے اس وجہ سے کردار کے پہلو پر خاص طور پر زور دیا گیا کہ یہ مقام بغیر اعلیٰ کردار کے جس میں ایفائے عہد اور صبر کو اولین اہمیت ہے، حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسری یہ کہ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ تمام عقائد و عبادات سے اصل مقصود اعلیٰ سیرت و کردار کی تعمیر ہی ہے۔ اللہ اور رسول پر ایمان لانے اور نماز روزے کے اہتمام سے مقصود صرف چند باتوں کو مان لینا یا چند رسوم کو بجا لانا ہی تو نہیں ہے۔ ان کا اصل مقصود تو یہ ہے کہ اللہ و رسول پر ایمان لانے سے انسان کے اندر جو روشنی پیدا ہوتی ہے اس سے ہمارے دل جگمگا اٹھیں اور نماز روزے سے جو مضبوط انفرادی و اجتماعی کردار پیدا ہوتا ہے وہ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کی خصوصیت بن جائے۔ یہ نہ ہو تو تمام عقائد و عبادات سمجھیے کہ بالکل بے جان و بے روح ہیں۔ یہی نکتہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ عقائد و عبادات کے پہلو بہ پہلو ان کے عملی اثرات کی طرف ضرور توجہ دلائی ہے تاکہ ان سے غفلت نہ ہونے پائے۔

تیسری یہ کہ امتحان و آزمائش کا اصلی میدان سیرت و کردار ہی کا میدان ہے۔ انسان کا اصلی خزانہ جو وہ دین کی مدد سے فراہم کرتا ہے یا کر سکتا ہے مضبوط اور پاکیزہ سیرت ہی ہے۔ یہی چیز اس کو انفرادی زندگی میں بھی مقام بر و تقویٰ پر سرفراز کرتی ہے اور اجتماعی زندگی میں بھی اس کے لیے ابرار و صالحین اور شہداء و صدیقین کی معیت کی ضامن بنتی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس پر خاص طور پر زور دیا جائے کہ مسلمان ہر قسم کی آزمائشوں اور ہر طرح کے فتنوں میں اپنے اس خزانہ کی حفاظت کے لیے چوکنا رہے۔

صبر اور ایفائے عہد

ایک سوال یہاں اور بھی پیدا ہو سکتا ہے وہ یہ کہ یہاں سیرت و کردار سے متعلق صرف دو ہی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ ایک ایفائے عہد کا، دوسری صبر کا۔ اس فہرست میں اور بھی چیزیں شامل ہو سکتی تھیں، آخر ان کا ذکر

کیوں نہیں فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں درحقیقت سیرت و اخلاق سے متعلق تمام اجزا کے لیے بمنزلہ شیرازہ ہیں۔ ایفائے عہد کے اندر تمام چھوٹے بڑے حقوق و فرائض آجاتے ہیں خواہ وہ خلق سے متعلق ہوں یا خالق سے، خواہ وہ کسی تحریری معاہدہ سے وجود میں آتے ہوں یا کسی نسبت، تعلق، رشتہ داری اور قرابت سے، خواہ ان کا اظہار و اعلان ہوتا ہو یا وہ ہر اچھی سوسائٹی میں بغیر کہے ہوئے سمجھے اور مانے جاتے ہوں۔ اللہ اور رسول، ماں اور باپ، بیوی اور بچے، خویش و اقارب، کنبہ اور خاندان، پڑوسی اور اہل محلہ، استاذ اور شاگرد، نوکر اور آقا، ملک اور قوم، ہر ایک کے ساتھ ہم کسی نہ کسی ظاہری یا مخفی معاہدہ کے تحت بندھے ہوئے ہیں اور یہ برو تقویٰ کا ایک لازمی تقاضا ہے کہ ان تمام معاہدوں کے حقوق ادا کرنے والے بنیں۔ گویا ایفائے عہد کی اصل روح ایفائے حقوق ہے اور ایفائے حقوق انسان کے تمام چھوٹے بڑے فرائض کو محیط ہے۔

اس کے ساتھ صبر کی صفت کو جمع کر کے یہ واضح فرما دیا کہ ہر وہ مزاحمت جو ایفائے حقوق کی اس راہ میں حائل ہو مومن عزیمت و استقامت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرے اور کسی حال میں بھی طمع، پست ہمتی یا خوف سے مغلوب نہ ہو۔

صبر کے تین مواقع کا حوالہ دیا ہے۔ ایک بَاْسَآء کا جس سے فقر و فاقہ کی تکالیف مراد ہیں۔ دوسرے ضَرَّآء کا جس سے تکالیف جسمانی کی طرف اشارہ ہے۔ تیسرے بَاْس کا جس سے جنگ کے حالات مراد ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ انسان کا عزم انھی تین راہوں سے آزمائش میں پڑ سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان تینوں حالتوں کے اندر موقف حق پر ثابت قدم رہنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کے برو تقویٰ کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے، چنانچہ فرمایا کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ (یہی لوگ ہیں جو اپنے دعوائے وفاداری میں سچے نکلے اور یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں متقی ہیں) اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل آئی کہ جو لوگ محض چند خالی خولی ظاہرداریوں سے خدا کی وفاداری کا حق ادا کرتے ہیں وہ نہ تو اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں، نہ متقی ہیں۔

ایک نکتہ یہاں اور بھی ملحوظ رہے وہ یہ کہ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ کے ساتھ اِذَا عٰھَدُوْا کی جو قید لگی ہوئی ہے اس سے بھی اس عزم و استقلال کا اظہار ہو رہا ہے جو ان وفا پرستوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہے کہ جب وہ کوئی عہد کر بیٹھتے ہیں تو خواہ کچھ ہی ہو، اس کے سبب سے انھیں کیسے ہی نقصانات و آلام سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے لیکن وہ پیٹھ نہیں دکھاتے بلکہ جان کی بازی لگا کر اس کو پورا کر کے رہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس معاملہ میں جو رویہ رہا ہے وہ پوری تاریخ انسانی میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ خاص کر صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے ابوجندل کے معاملہ میں معاہدہ کا جو احترام کیا وہ تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

۵۷- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۷۸-۱۷۹

قیامِ امن و عدل کی دو بنیادیں

برّ و تقویٰ کی اصل حقیقت واضح کرنے کے بعد ان معاملات کی طرف توجہ فرمائی جو اسی برّ و تقویٰ پر مبنی ہیں اور جن کی اس اعتبار سے بڑی اہمیت ہے کہ انھی پر معاشرہ کے امن و عدل اور اس کے تحفظ و بقا کا انحصار ہے۔ اگر ایک متوسط درجہ کا ذہن رکھنے والا آدمی بھی غور کرے گا تو وہ نہایت آسانی سے اس حقیقت تک پہنچ سکتا ہے کہ انسانوں اور انسانوں کے تعلقات کی استواری کی بنیاد اصلاً دو چیزوں پر ہے۔ ایک اس چیز پر کہ ہر شخص دوسرے کی جان کا احترام کرے، دوسرے اس چیز پر کہ ہر شخص دوسرے کے مال کا احترام کرے۔ اسی وجہ سے حرمتِ جان اور حرمتِ مال کے قانون کو ہمیشہ سے دوسرے تمام قوانین پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ اسی اصل کے تحت، جو تمام تر فطرتِ انسانی پر مبنی ہے، قرآن نے بھی برّ اور تقویٰ کی بنیاد استوار کرنے کے بعد سب سے پہلے احترامِ جان کے قانون کو لیا اور قصاص کو پورے معاشرے کی ذمہ داری قرار دیا۔ یعنی اگر کوئی شخص قتل ہو گیا ہے تو یہ صرف اس کے عزیزوں اور رشتہ داروں ہی کی ذمہ داری نہیں ہے کہ اس کے قاتل کا کھوج لگائیں اور اس کو سزا دیں بلکہ پورے معاشرے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا تعاقب کرے اور اس کو کیفرِ کردار کو پہنچائے۔ گویا ایک شخص کا قتل ہونا سب کا قتل ہونا اور اس کا زندہ ہونا سب کا زندہ ہونا ہے۔

قصاص کا یہ قانون موجود تو اہلِ کتاب کے ہاں بھی تھا اور اہلِ عرب کے ہاں بھی۔ مگر انھوں نے جس طرح ہر قانون کی روح کچل کے رکھ دی تھی اسی طرح اس قانون کی روح بھی ختم کر دی تھی۔ اس قانون کی اصل روح بے لاگ انصاف اور کامل مساوات ہے۔ یعنی اس معاملے میں ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، شریف و وضیع اور آقا و غلام سب ایک ہی سطح پر رکھے جائیں اور قانون اور عدالت، ہر ایک کے ساتھ بالکل یکساں معاملہ کریں۔ لیکن یہ بات نہ اہلِ کتاب کے یہاں باقی رہ گئی تھی نہ اہلِ عرب کے یہاں بلکہ یہ کہنا بھی شاید بے جا نہیں ہے کہ آج بھی تہذیب و تمدن کی اس ترقی کے باوجود، دنیا کے کسی ملک اور کسی قانون میں بھی احترامِ جان اور مساوات کا یہ تصور نہیں پایا جاتا جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیت ۱۷۸-۱۷۹

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلْقِصَاصُ فِى ٱلْقَتْلَى ۖ
ٱلْحُرُّ بِٱلْحُرِّ وَٱلْعَبْدُ بِٱلْعَبْدِ وَٱلْأُنثَىٰ بِٱلْأُنثَىٰ ۚ
فَمَنْ عُفِىَ لَهُۥ مِنْ أَخِيهِ شَىْءٌ فَٱتِّبَاعٌۢ بِٱلْمَعْرُوفِ وَأَدَآءٌ
إِلَيْهِ بِإِحْسَٰنٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ ٱعْتَدَىٰ

بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

ترجمۂ آیات ۱۷۸-۱۷۹

"اے ایمان والو تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض ٹھہرایا گیا ہے۔ آزاد آزاد کے بدلے غلام غلام کے بدلے، عورت عورت کے بدلے۔ پس جس کسی کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی گئی تو اس کے لیے دستور کی پیروی کرنا اور خوبی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے ایک قسم کی تخفیف اور مہربانی ہے۔ تو اس کے بعد جو زیادتی کرے گا اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور تمہارے لیے قصاص میں اے عقل والو، زندگی ہے۔ تاکہ تم حدودِ الٰہی کی پابندی کرو۔"

۵۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قصاص کا مفہوم

قصاص، قصص سے ہے جس کے اصل معنی کسی کے پیچھے، اس کے نقشِ قدم کے ساتھ ساتھ چلنے کے ہیں۔ مثلاً وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۱۱- قصص (اور اس نے اس کی بہن سے کہا، اس کے پیچھے پیچھے جا، تو وہ دُور سے اس کو دیکھتی رہی اور ان لوگوں کو اس کا علم نہیں ہوا) قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۶۴ کہف (اس نے کہا یہی تو ہمیں مطلوب تھا، پس وہ دونوں اپنے نقشِ قدم کا تعاقب کرتے ہوئے پیچھے پلٹے) اسی سے قصہ کو قصہ کہتے ہیں کیونکہ جس کا قصہ بیان کیا جاتا ہے، قصہ بیان کرنے والا گویا اس کے قدم بقدم اس کے حالات کا تعاقب کرتا ہے۔ اسی سے قصاص نکلا اس لیے کہ قاتل کا بھی کھوج لگایا جاتا اور اس کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ پھر قصاص اس سزا کو کہنے لگے جس میں مجرم کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے جس کا مرتکب وہ خود ہوا ہے۔ اس قصاص کی دو صورتیں ہیں۔ ایک جانی، دوسری مالی جس کو دیت یا خونبہا کہتے ہیں۔ قصاص کا لفظ اپنے وسیع معنی میں ان دونوں ہی صورتوں پر حاوی ہو جاتا ہے اس لیے کہ دیت بھی درحقیقت قصاص ہی کی ایک شکل ہے۔ اصل قانون تو جان کے بدلے جان ہی کا ہے۔ لیکن اولیائے مقتول کی بہبود کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس قانون میں اتنی رعایت فرما دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو جان کے بدلے دیت بھی لے سکتے ہیں۔

"کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی" میں کُتِبَ کے بعد عَلٰی کا استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں اس کے اندر فرضیت اور وجوب کا مضمون موجود ہے۔ قَتۡلٰی قتیل کی جمع ہے جس کے معنی مقتول کے ہیں۔ یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر کُتِبَ عَلَیۡکُمۡ سے قصاص کی فرضیت ثابت ہوتی ہے تو اس حکم کا مخاطب کون ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ قصاص کا معاملہ قابلِ راضی نامہ ہے۔ اگر مقتول کے ورثا چاہیں تو قاتل کو قتل بھی کر سکتے ہیں، چاہیں تو دیت بھی لے سکتے ہیں، چاہیں تو کچھ معاف بھی کر سکتے ہیں۔ تو جب وہ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ تم پر قصاص لینا فرض کیا گیا ہے؟

قصاص کی ذمہ داری حکومت پر ہے

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس حکم کا مخاطب پورا اسلامی معاشرہ بحیثیت مجموعی یا بالفاظِ دیگر اسلامی حکومت ہے۔ اس کے اوپر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ اس کے علاقہ میں اگر کوئی قتل ہو جائے تو اس کے قاتلوں کا سراغ لگائے، ان کو گرفتار کرے اور قانون کے مطابق ان پر سزا نافذ کرے۔ یہ ذمہ داری معاشرہ یا حکومت پر اس اصول کے تحت ڈالی گئی ہے کہ جو شخص کسی شخص کو بغیر کسی حق کے قتل کر دیتا ہے تو وہ صرف ایک شخص ہی کا قاتل نہیں ہے بلکہ سب کا قاتل ہے اس لیے کہ اس نے تحفظِ جان کے اس قانون کو ہدم کر دیا ہے جو سب کے لیے حرمتِ جان کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ پورے معاشرے اور پورے نظامِ اجتماعی کی ذمہ داری ٹھہری کہ سب اس کے قصاص کے درپے ہوں اور اس وقت تک دم نہ لیں جب تک حرمتِ جان کے اس قانون کو زندہ کر کے سب کی زندگی کی ضمانت کو بحال نہ کر لیں۔ اسی حقیقت کی طرف سورہ مائدہ میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے۔ اَنَّہٗ مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَیۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِی الۡاَرۡضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیۡعًا ؕ وَمَنۡ اَحۡیَاہَا فَکَاَنَّمَاۤ اَحۡیَا النَّاسَ جَمِیۡعًا ۳۲ (کہ جس نے کسی جان کو، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان ماری ہو یا زمین میں فساد مچایا ہو، قتل کر دیا تو گویا اس نے سارے ہی لوگوں کو قتل کر دیا اور جس نے اس کو زندہ کیا تو گویا سب کو زندہ کیا)

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ قصاص کی اصل ذمہ داری حکومت ہی پر ہونی چاہیے نہ کہ مقتول کے وارثوں پر اس لیے کہ اس کا بھی امکان ہے کہ ایک شخص قتل ہو جائے اور اس کا کوئی والی وارث نہ ہو، اس کا بھی امکان ہے کہ ایک شخص کے کچھ ورثا ہوں تو سہی لیکن کسی سبب سے ان کو مقتول کے قصاص کے معاملے سے کچھ دلچسپی نہ ہو، بلکہ امکان تو خاصی حد تک اس بات کا بھی ہے کہ ورثا کی اصل ہمدردی اور دلچسپی کسی سبب سے مقتول کے بجائے قاتل اور اس کے شرکائے کار ہی کے ساتھ ہو جائے۔ علاوہ ازیں کسی اس طرح کے معاملہ میں تحقیق و تفتیش کی ذمہ داریاں اور پھر حدود کی تنفیذ بڑے وسیع اختیارات کی مقتضی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے جہاں تک قصاص لینے کے فرض کا تعلق ہے وہ تو اسلامی حکومت ہی پر عائد کیا ہے لیکن اس سلسلے میں اس نے

حکومت پر یہ پابندی بھی عائد کر دی ہے کہ وہ بجائے خود فیصلہ کرنے کے مقتول کے اولیاء کو یہ اختیار دے دے کہ وہ اسلامی قانون کے حدود کے اندر مجرم کے ساتھ جو معاملہ پسند کریں وہ کر لیں۔ خواہ اسے قتل کر دیں، خواہ اس سے خون بہا قبول کر لیں۔ ورثا کو یہ اختیار دے دینا اور ان کے اختیار کو نافذ کر دینا حکومت کو اس فرض سے سبکدوش کر دے گا جو اس پر كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى کی رو سے عائد ہوتا ہے۔

قصاص میں اولیائے مقتول کی مرضی کے لحاظ کی حکمت

قصاص کے معاملہ میں مقتول کے اولیاء کی مرضی کو اسلام نے یہ اہمیت جو دی ہے، یہ مختلف پہلوؤں سے نہایت حکیمانہ ہے۔ قاتل کی جان پر مقتول کے وارثوں کو براہ راست اختیار مل جانے سے ایک تو ان کے بہت بڑے زخم کے اندمال کی ایک شکل پیدا ہوتی ہے، دوسرے اگر اس صورت میں یہ کوئی نرم رویہ اختیار کریں تو قاتل اور اس کے خاندان پر یہ ان کا براہ راست احسان ہوتا ہے جس سے نہایت مفید نتائج کی توقع ہو سکتی ہے۔ تیسرے دیت کی شکل میں مقتول کے ورثا کی، بالخصوص جب کہ وہ غریب ہوں، ایسی مدد ہو جاتی ہے جس سے ان کو بڑا سہارا مل سکتا ہے۔ اگر ورثا کو اس میں کوئی دخل نہ رہ جائے، سارا اختیار پولیس اور عدالت ہی کو سونپ دیا جائے جیسا کہ موجودہ قوانین میں ہے تو وہ ان تمام فوائد سے یکسر محروم ہو جاتے ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا لیکن ان کے اس حق کے تسلیم کیے جانے کے باوجود قصاص کی اصل ذمہ دار اور اس کی نافذ کرنے والی ہے حکومت ہی۔ اس وجہ سے اگر وہ کسی خاص معاملہ میں محسوس کرے کہ وارثوں کی سرد مہری یا ان کی قاتلوں کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے قصاص کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے جس سے حرمت جان کا قانون متاثر ہو رہا ہے تو وہ اس نقصان سے قانون کو بچانے کے لیے مناسب اقدام کرے گی۔

قصاص میں مساوات کا اہتمام

"آزاد، آزاد کے بدلے، غلام، غلام کے بدلے، عورت، عورت کے بدلے" یہ اس کامل مساوات کا بیان ہے جو قصاص میں لازماً ملحوظ رکھنی ہے۔ یعنی اگر ایک آزاد نے دوسرے آزاد کو قتل کیا ہے تو النفس بالنفس کے قانون کے بموجب وہ آزاد ہی اس آزاد کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اور بصورت خون بہا ایک آزاد ہی کی دیت اس کے بدلے میں واجب ہوگی۔ عرب جاہلیت کے طریقہ کے مطابق یہ نہیں ہوگا کہ مقتول کے ورثا اپنی شرافت و برتری کے زعم میں یہ مطالبہ کریں کہ وہ اپنے ایک مقتول کے بدلے میں قاتل کے خاندان کے دو یا اس سے زیادہ آزادوں کو قتل کریں گے، یا عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کریں گے یا غلام کے بدلے میں آزاد کو قتل کریں گے یا بصورت دیت عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر وصول کریں گے یا غلام کی دیت آزاد کی دیت کے معیار سے لیں گے۔ اسی طرح قاتل اور اس کے خاندان و قبیلہ والوں کو بھی اپنی شرافت و نجابت اور برتری کے زعم میں یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے کہ ہمارا غلام دوسروں کے آزاد کا کفو یا ہماری ایک عورت دوسروں کے مرد کے برابر ہے اس وجہ سے ہم قصاص جانی یا مالی میں اسی نسبت کا لحاظ کرتے ہوئے مقتول کے ورثا سے معاملہ کریں گے۔ اسلام نے اس کامل مساوات کا اعلان کر کے زمانہ جاہلیت کی مذکورہ تمام نابرابریوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہود نے بھی اس معاملے میں شریف و رذیل اور اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان امتیاز قائم کر رکھا تھا۔ اس

اعلان سے اس امتیاز کی بنیاد بھی ڈھے گئی ۔ ایک طرف اسلام کے اس قانون کو ملاحظہ فرمائیے ، جو چودہ سو سال سے اسلام کی کتاب تعزیرات میں موجود ہے ، دوسری طرف عدل و مساوات کے علمبردار امریکہ میں کالوں اور گوروں کے اس امتیاز پر نظر ڈالیے جو زندگی کے ہر شعبہ میں آج اس بیسویں صدی میں بھی برتا جا رہا ہے ۔

دیت کی ادائیگی میں فیاضی

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ ۔ یعنی اگر مقتول کے ورثا کی طرف سے قاتل کو کچھ چھوٹ دے دی جائے تو اس کو چاہیے وہ اس کی قدر کرے ۔ اس چھوٹ کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ وہ قصاص جانی کے بجائے قصاص مالی پر راضی ہو جائیں تو قاتل اور اس کے خاندان والوں کا فرض ہے کہ وہ احسان مندی اور شکر گزاری کے جذبے کے ساتھ معروف کے بموجب دیت ادا کریں اور ادائیگی نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کریں ۔ معروف سے مراد یہاں اہلِ عرب کا رواج اور دستور ہے جس کو دیت کے معاملے میں اسلام نے قانون کی حیثیت دے دی ۔ حسن و خوبی کے ساتھ ادائیگی کی تاکید اس لیے فرمائی کہ عرب میں دیت کی ادائیگی بالعموم نقد کی صورت میں نہیں بلکہ جنس و مال کی شکل میں ہوتی تھی ۔ اس وجہ سے اگر ادائیگی کرنے والوں کی نیت اچھی نہ ہوتی تو وہ اس میں بہت کچھ چالیں چل سکتے تھے ۔ یہ بات بڑی آسانی سے ممکن ہے کہ اونٹوں یا بکریوں کی تعداد یا غلہ اور کھجور کی مقدار و کمیت کے لحاظ سے تو دیت کا مطالبہ پورا کر دیا جائے لیکن باعتبارِ حقیقت و کیفیت اس کی حیثیت محض خانہ پری ہی کی ہو ۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان لوگوں کے احسان کی کوئی قدر نہیں کی گئی جنھوں نے ایک شخص کی جان پر شرعی اختیار پا کر اس کو معاف کر دیا اور اس کی طرف سے مال قبول کر لینے پر راضی ہو گئے ۔ ان کے احسان کا جواب تو احسان ہی ہونا چاہیے ۔ یعنی دیت کی ادائیگی اس خوبی ، فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ کی جائے کہ ان کو یہ صدمہ نہ اٹھانا پڑے کہ انھوں نے اپنے ایک عزیز کے خون کے بدلے میں بھیڑ بکریاں قبول کر کے کوئی غلطی یا بے غیرتی کی۔

قصاص کے حکم کے تحت یہاں بغیر کسی سابق قرینہ کے جو خون بہا کا ذکر آ گیا ہے تو اس کی بڑی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے یعنی قصاص کا لفظ اپنے عام مفہوم میں قصاص جانی اور قصاص مالی دونوں ہی پر مشتمل ہے ۔ اس میں کچھ چھوٹ ملنے کے معنی جیسا کہ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ کے الفاظ سے واضح ہے یہ ہے کہ اولیائے مقتول جان کے بدلے جان لینے کے بجائے رواج کے مطابق خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں ۔ یہ خون بہا کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رعایت و رحمت ہے ۔ حرمت جان کا اصل حق تو یہی تھا کہ جان کے بدلے جان لی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی مہربانی سے اس میں رعایت فرما دی ہے تو اس رعایت کی قدر کرنی چاہیے اور اس سے کوئی غلط فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے ۔

فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔ یعنی جو لوگ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد کسی ظلم و زیادتی کی راہ کھولیں گے تو وہ یاد رکھیں کہ پھر ان کے لیے آخرت کا عذاب دردناک ہی ہے جس سے چھڑانے والی کوئی چیز بھی نہیں ہو گی ۔ اس میں قاتل اور اس کے خاندان والوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ کی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد یہ انتہائی کفرانِ نعمت ہوگا کہ اس کے پردے میں مقتول کے خاندان پر کسی نئے ظلم کے لیے اسکیم بنائی جائے، مثلاً یہ کہ قاتل اور اس کے اعزا یہ منصوبہ بنائیں کہ اس وقت تو کسی طرح مقتول کے ورثا کو راضی کر کے اپنی جان بچالو پھر موقع پیدا کر کے اس کو مزید نقصان پہنچائیں گے۔ اسی طرح اس میں مقتول کے وارثوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ انھیں اپنے دل میں یہ منصوبہ رکھ کے دیت کا راضی نامہ نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت تو قاتل سے دیت لے لیتے ہیں، بعد میں موقع ملنے پر اس کی جان بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔ خدا کی بخشی ہوئی ایک رعایت کے تحت جو راضی نامہ ہو گیا ہے، دونوں فریقوں کو سچے دل سے اس کا احترام کرنا چاہیے۔ جو بھی یہ راضی نامہ ہو چکنے کے بعد کوئی زیادتی کرے گا وہ اللہ کے غضب کا مستحق ٹھہرے گا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۷۹)

قانون جذبات سے بالاتر ہے

یہ معاشرہ کو تلقین ہے کہ قصاص کے معاملہ میں کسی سہل انگاری، کسی جانب داری، کسی چشم پوشی اور کسی بے جا رحم و مروت کو حائل نہیں ہونے دینا چاہیے۔ جو کسی کو قتل کر دیتا ہے وہ صرف ایک شخص ہی کو قتل نہیں کرتا بلکہ ایک قانون کو قتل کرتا ہے جو سب کی جان کی حفاظت کا ضامن ہے، اس وجہ سے وہ گویا سب ہی کو قتل کر دیتا ہے، اس وجہ سے یہ سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا قصاص لے کر اس ضمانت کو بحال کریں جس میں سب کی زندگی ہے۔ معاشرے کا جو شخص کسی قاتل کو پکڑتا ہے یا اس کا سراغ لگاتا ہے یا اس کے جرم کے ثبوت فراہم کرتا ہے اور اس طرح مقتول سے قصاص کی راہ کھولتا ہے وہ گویا اس مقتول کو بھی زندہ کرتا ہے اور ساتھ ہی پورے معاشرے کو بھی زندگی بخشتا ہے کیونکہ وہ اپنی اس خدمت سے اس قانون کو زندہ کرتا ہے جو سب کے لیے زندگی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف سورۂ مائدہ میں یوں اشارہ فرمایا ہے جس کا حوالہ اوپر بھی گزر چکا ہے۔

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ	یہ کہ جس نے قتل کر دیا کسی جان کو بغیر اس کے کہ اس نے
اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ	کسی جان کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد برپا کیا ہو تو
جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا	گویا اس نے سب کو قتل کر دیا اور جس نے اس کو زندہ کیا
النَّاسَ جَمِيْعًا (۳۲۔ مائدہ ۵)	تو گویا اس نے سب ہی کو زندہ کیا۔

اس میں ان لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہے جو بے جا قسم کی مروت و پاسداری یا نا روا قسم کے احترام شرافت و امارت کے جذبے کے تحت بسا اوقات مقتول کے بجائے قاتل ہی کی ہمدردی کو ثواب قرار دے بیٹھتے ہیں حالانکہ اصلی ہمدردی ہر ایک کے ساتھ، غریب ہو یا امیر، شریف ہو یا رذیل، قریب ہو یا بعید، جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ۱۳۵ میں ہے، یہی ہے کہ اس کو خدا اور اس کے قانون کے حوالہ کیا جائے نہ کہ خدا کے قانون سے چھڑا کر شیطان کے حوالہ۔ لیکن اس حقیقت کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اہلِ عقل

ہیں۔ اس وجہ سے آیت میں اہل عقل کو خاص طور پر خطاب فرمایا ہے۔

کیا تعزیرات خلاف عقل ہیں؟

اہل عقل کو خاص طور پر توجہ دلانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس طرح جذبات بعض اوقات قانون قصاص کے نفاذ میں مزاحم ہوتے ہیں اسی طرح جذبات سے مرعوب و مغلوب عقل بھی اس قانون کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ خاص طور پر اس زمانے میں تو تمام جسمانی سزاؤں کے خلاف ایک مستقل فلسفہ بن گیا ہے جس کو پیش تو کیا جاتا ہے عقلیت اور فلسفہ کے روپ میں لیکن تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر بھی اصلی روح عقل کی نہیں بلکہ جذبات ہی کی ہے۔

ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ مجرموں سے جو جرم سرزد ہوتے ہیں وہ اصلاً جذباتی بے اعتدالی، عقلی عدم توازن اور ذہنی انتشار اور الجھاؤ کے نتیجہ میں صادر ہوتے ہیں اور یہ حالتیں آدمی کی بیماری کی حالتیں ہیں جن میں وہ مستحق اصلاح و تربیت اور علاج و دوا کا ہوتا ہے نہ کہ سزا کا۔ اس وجہ سے اس گروہ کے نزدیک کسی قاتل کو قتل کی سزا دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی مریض کو بیمار ہونے پر اس کے علاج کے بجائے کوئی سزا دے دینا۔ اس گروہ کے نزدیک اس طرح کے مجرموں یا خود ان کے الفاظ میں اس طرح کے مریضوں کا علاج تعلیم و تربیت اور اصلاح نفسی و ذہنی کے ذریعہ سے ہونا چاہیے نہ کہ سولی اور پھانسی سے۔

یہ نظریہ موجود تو دنیا میں ایک خاص گروہ میں شروع سے رہا ہے لیکن اس کو علمی اعتبار سے کبھی اہمیت حاصل نہیں ہو سکی اور نہ شاید کبھی حاصل ہو سکے۔ تاہم اس دور آخر میں چونکہ ٹالسٹائی اور مہاتما گاندھی جیسے لوگوں نے اس کی وکالت کی ہے اس وجہ سے بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن اس سے متاثر ہیں۔ ایسے لوگوں کی الجھن دور کرنے کے لیے قانون قصاص کی اس حکمت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے خاص طور پر اہل عقل کو مخاطب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اس کے اندر زندگی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ زندگی فرد کے لحاظ سے نہیں بلکہ معاشرے کے لحاظ سے ہے۔ اگر ایک شخص قتل کے جرم میں قتل کر دیا جاتا ہے تو بظاہر تو ایک جان کے بعد یہ دوسری جان بھی گویا تلف ہی ہوتی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے اگر دیکھیے تو اس کے قتل سے پورے معاشرے کے لیے زندگی کی ضمانت پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس سے قصاص نہ لیا جائے، تو یہ جس ذہنی خرابی میں مبتلا ہو کر ایک بے گناہ کے قتل کا مرتکب ہوا ہے وہ خرابی پورے معاشرے میں متعدی ہو جائے۔ بیماری اور بیماری میں فرق ہوتا ہے۔ جو بیماریاں قتل، ڈکیتی، چوری اور زنا وغیرہ جیسے خطرناک جرائم کا سبب بنتی ہیں ان کی مثال ان بیماریوں کی ہے جن میں پورے جسم کو بچانے کے لیے بسا اوقات جسم کے کسی عضو کو کاٹ کر الگ کر دینا پڑتا ہے۔ اگرچہ کسی عضو کو کاٹ پھینکنا ایک سنگ دلی کا کام معلوم ہوتا ہے لیکن ایک ڈاکٹر کو یہ سنگ دلی اختیار کرنی پڑتی ہے اگر وہ طبیعت پر جبر کر کے یہ سنگ دلی اختیار نہ کرے تو اس ایک عضو کی ہمدردی میں اسے مریض کے پورے جسم کو ہلاکت کے حوالہ کرنا پڑے گا۔

معاشرہ اپنی مجموعی حیثیت میں ایک جسم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس جسم کے بعض اعضا میں بھی بسا اوقات

اسی قسم کا فساد و اختلال پیدا ہو جاتا ہے جس کا علاج مرہم و ضماد سے ممکن نہیں ہوتا بلکہ عضوِ مریض پر اپریشن کر کے اس کو جسم کے مجموعے سے الگ کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ عضو مریض ہے اس وجہ سے نرمی اور ہمدردی کا مستحق ہے تو اس نرمی کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ ایک دن یہ عضو سارے جسم کو سڑا اور گلا کر رکھ دے۔

یہی نکتہ ہے کہ قرآن مجید نے اس قسم کی سزاؤں کو، جو سخت نوعیت کی ہیں، 'نکال' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ 'نکال' عربی میں اس سزا کو کہتے ہیں جو دوسروں کو عبرت دلانے والی ہو، جس کو دیکھ کر دوسرے نصیحت پکڑیں اور اس قسم کے جرم کے ارتکاب سے باز رہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح کی سزائیں نافذ کر کے گویا پورے معاشرہ کو ایسے ٹیکے لگا دیے جاتے ہیں جس سے وہ متعدی جرائم کے اثرات سے محفوظ ہو جاتے۔ اسی حقیقت کی طرف یہاں بھی قرآن نے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے جس کے معنی ہیں تاکہ تم بچو یعنی اللہ کے حدود کی خلاف ورزی اور ایک دوسرے پر ظلم و تعدی سے بچو۔

۵۹۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۱۸۰-۱۸۲

حرمتِ جان کے اس قانون کے بعد حرمتِ مال کے قانون کی طرف توجہ فرمائی۔ یہ دونوں مضمون قرآن[1] و حدیث دونوں میں بالعموم ساتھ ساتھ آتے ہیں اور عقل و فطرت میں بھی ان دونوں کے درمیان بڑا قریبی رشتہ ہے۔ حرمتِ مال کے سلسلے میں بنیادی چیز یہ ہے کہ ایک قانون کے تحت ہر شخص کے اور اس کے بعد اس کے وارثوں کے حقوق متعین و محفوظ ہوں اور دوسرے ان حقوق کا احترام کریں۔ اہلِ عرب میں اگرچہ معروف کے تحت والدین اور اعزا و اقربا کے حقوق کا فی الجملہ تعین تھا لیکن ان کی زندگی کے ہر پہلو میں جس طرح خرابیاں پیدا ہو گئیں اسی طرح اس پہلو میں بھی فساد رونما ہوا اور ان کے زور آور لوگوں میں کمزور وارثوں اور حق داروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا رجحان اس شدت کے ساتھ زور پکڑ گیا کہ معروف کی ان کے ہاں کوئی قدر و قیمت ہی باقی نہیں رہ گئی۔ سورۂ فجر میں اسی صورتِ حال کی طرف اشارہ فرمایا ہے وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (اور تم وراثت کو سمیٹ کر کھاتے ہو) یہ صورت تقاضا کر رہی تھی کہ قانون کے ذریعہ سے اعزا و اقربا کے حقوق کا تعین کر کے ان کی حفاظت کا سامان کیا جائے لیکن اس سورہ کے زمانۂ نزول تک معاشرہ ابھی اتنا مستحکم نہیں ہوا تھا کہ تقسیم وراثت کا وہ مستقل قانون نافذ ہو سکے جو سورۂ نساء میں ہے، اس وجہ سے عبوری دور کے لیے مورثوں کو دستور کے مطابق والدین اور قرابت مندوں کے لیے وصیت

---

[1] ملاحظہ ہو آیت ۲۹۔ نساء۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ حرمة ماله كحرمة دمه (اس کے مال کی عزت اس کی جان کی عزت کی طرح ہے)

کی ہدایت ہوئی اور وارثوں کو اس وصیت کی تعمیل کی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حقوق کے تعین سے متعلق خود اپنی وہ وصیت نازل فرما دی جو سورۂ نساء میں مذکور ہے تو بندوں کی وصیت منسوخ ہو گئی، صرف اللہ تعالیٰ کی وصیت باقی رہ گئی۔ پھر بندوں کے لیے وصیت کا حق صرف ایک محدود دائرے کے اندر رہ گیا جس کا ذکر سورۂ نساء کی مذکورہ آیت کے تحت آئے گا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۸۰-۱۸۲

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع ۲۲

ترجمۂ آیات ۱۸۰-۱۸۲

جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض کیا گیا ہے والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرنا، خدا سے ڈرنے والوں پر یہ حق ہے۔ تو جو لوگ اس وصیت کو اس کے سننے کے بعد بدل ڈالیں تو اس کا گناہ ان بدل ڈالنے والوں ہی پر ہے، بے شک اللہ سننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔ جس کو کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے کسی بے جا جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہوا اور وہ آپس میں صلح کرا دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔

۶۰- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (۱۸۰)

وصیت کا مفہوم

"كُتِبَ عَلَيْكُمْ" فرض کر دینے کے معنی میں قرآن اور کلام عرب دونوں میں معروف ہے۔ وصیت کے لفظ کی

تحقیق پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے کہ عربی میں یہ لفظ کسی شے کی طرف سے چھوٹوں کو تلقین و ہدایت کے معنی میں آتا ہے۔ عام اس سے کہ یہ تلقین و ہدایت کوئی شخص اپنے آخری وقت میں کرے یا عام حالات میں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں، قرآن میں ان کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہاں لفظ وصیت چونکہ مصدری معنی میں ہے، نیز اپنے فعل سے فاصلہ پر واقع ہے، اسی وجہ سے تذکیر و تانیث کا لحاظ نہ تو فعل میں ضروری ہوا نہ بعد کی ضمیروں ہی میں۔

وصیت کے لیے دو شرطیں

اس وصیت کی فرضیت کے ساتھ دو شرطیں لگائی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اس وقت کرے جب اسے اپنی موت قریب ہوتی نظر آنے لگے اور دوسری یہ کہ جب وہ کچھ مال اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہو۔ پہلی شرط کا ذکر 'اذا' کے ساتھ کیا ہے اس لیے کہ موت کا مرحلہ سب کو پیش آتا ہے۔ دوسری کا ذکر 'ان' کے ساتھ کیا ہے اس لیے کہ مال کا ہونا ہر ایک کے پاس ضروری نہیں۔ 'ان' اور 'اذا' کے استعمال کا یہ فرق عربی زبان کے طلبہ سے مخفی نہیں۔ وصیت میں یہ دونوں پہلو بڑی اہمیت رکھنے والے ہیں۔ جو لوگ اپنی چلتی پھرتی زندگی میں وصیت کر دیتے ہیں وہ بسا اوقات بڑی الجھنوں میں پڑ جاتے ہیں اور جو لوگ مال رکھتے ہوئے وصیت سے گریز کرتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے پیچھے جھگڑے چھوڑ جاتے ہیں۔

خیر کا لفظ مال کے لیے

خیر کے اصل معنی مطلوب و مرغوب شے کے ہیں اس وجہ سے علم، عقل، حکمت، عدل، نیکی اور بھلائی سب کے لیے اس کا استعمال ہے۔ پھر یہیں سے یہ مال کے لیے بھی استعمال ہونے لگا اس لیے کہ مال بھی ایک مرغوب مطلوب شے ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کئی جگہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حوالہ کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے مال کے لیے اس لفظ کو اختیار کر کے گویا بالواسطہ اس غلط فہمی کی اصلاح کر دی ہے جو عام طور پر رہبانی تصور کے زیر اثر لوگوں میں پھیلی ہوئی تھی کہ مال فی نفسہٖ ایک ناپاک و نجس چیز ہے اس وجہ سے اللہ والوں کے لیے اس سے آلودہ ہونا جائز نہیں۔

معروف اور شریعت میں نسبت

مَعروف کے لغوی معنی جانی پہچانی ہوئی چیز کے ہیں، یعنی جس کو عقل مانتی ہو، جو عدل پر پوری اُترتی ہو، اچھے لوگ جسے پہچانتے ہوں، سوسائٹی کے شریفوں میں جس کا چلن اور رواج ہو۔ یہ معروف بہت سے معاملات میں اسلامی قانون کا درجہ رکھتا ہے اور اس حیثیت سے قرآن میں اس کا جگہ جگہ حوالہ آیا ہے۔ اُوپر دیت کے سلسلہ میں بھی اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ قانون کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو معروف پر مبنی ہے، دوسرا وہ جو اللہ تعالیٰ کے حکم پر مبنی ہے جس چیز کے بارے میں خدا کا قانون موجود نہ ہو اس میں معروف معتبر ہوتا ہے لیکن جس باب میں خدا کا قانون نازل ہو گیا اس میں معروف کا اعتبار ختم ہو گیا۔ اس لیے کہ سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد ستاروں سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یہ حکم وصیت عبوری دور کے لیے تھا

اس آیت میں والدین اور اقربا کے لیے جو وصیت کا حکم دیا گیا وہ معروف کے تحت تھا اور اس عبوری دور کے لیے تھا جب کہ اسلامی معاشرہ ابھی اس استحکام کو نہیں پہنچا تھا کہ تقسیم وراثت کا وہ آخری حکم

دیا جائے جو سورۂ نساء میں نازل ہوا۔ اس حکم کے نزول کے لیے حالات کے سازگار ہونے سے پہلے یہ عارضی حکم نازل ہوا اور اس سے دو فائدے پیش نظر تھے۔ ایک تو فوری طور پر ان حصہ داروں کے حقوق کا ایک حد تک تحفظ جن کے حقوق عصبات کے ہاتھوں تلف ہو رہے تھے، اور دوسرے اس معروف کو از سر نو تازہ کرنا جو شرفائے عرب میں زمانۂ قدیم سے معتبر تھا لیکن اب وہ آہستہ آہستہ جاہلیت کے گرد و غبار کے نیچے دب چلا تھا تاکہ یہ معروف اس قانون کے لیے ذہنوں کو ہموار کر سکے جو اس باب میں نازل ہونے والا تھا۔

اور وصیت کے متعلق فرمایا کہ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۔ حَقًّا فعل محذوف کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی یہ تمام اہل ایمان پر جو خدا سے ڈرنے والے ہیں واجب اور ضروری ہے، جو اس سے گریز کریں گے ان کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس عبوری مدت میں، جو اصل قانونِ وراثت سے پہلے گزری، ہر مسلمان پر اس کی تعمیل ضروری تھی۔ اس کی حیثیت صرف ایک نیکی اور فضیلت کی نہیں تھی۔

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۸۱)

شاہدوں کی عظیم ذمہ داری

چونکہ اس قانون کے ٹھیک ٹھیک نفاذ کا تمام تر انحصار شاہدوں اور گواہوں کی امانت و دیانت ہی پر تھا، شریعت میں وارثوں کے حقوق کا ابھی تعین نہیں ہوا تھا، اس وجہ سے شاہدوں کی عظیم ذمہ داری واضح فرما دی کہ اگر وہ صاحبِ وصیت کی وصیت میں کوئی ردّ و بدل کریں گے تو اس کا سارا بارِ گناہ انھی کے سر ہو گا۔ اس کی کوئی ذمہ داری نہ تو صاحبِ وصیت پر عائد ہو گی نہ اس کو نافذ کرنے والوں پر۔ سمیع و علیم کی صفات کے حوالہ میں تبدیلی کی جسارت کرنے والوں کے لیے تنبیہ اور دھمکی ہے کہ وہ اس بات کو یاد رکھیں کہ خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے، وہ اس جرمِ عظیم کی سزا دیئے بغیر نہ رہے گا۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۸۲)

'خوف' کے معنی

'خوف' کے اصل معنی گمان کرنے، خیال کرنے، توقع کرنے، اندیشہ کرنے کے ہیں۔ پھر یہیں سے یہ ڈرنے کے معنی کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ایک حماسی شاعر کا شعر ہے۔

ولو خفت انی ان کففت تحیتی
تنکب عنی رمت ان یتنکبا

(اگر مجھے توقع ہوتی کہ میں بڑھاپے کا خیر مقدم نہ کروں گا تو وہ مجھ سے رک جائے گا تو میں اپنے خیر مقدم سے باز رہ کر اس کو روکنے کی کوشش کرتا)

یہاں زیر بحث آیت میں یہ لفظ اندیشہ، گمان اور علم ہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ صاحبِ کشاف نے اس معنی کی طرف اشارہ تو کیا ہے لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ ہم نے اس کی دلیل پیش کر دی ہے۔

'جنف' کے معنی

'جَنَفٌ' کے اصل معنی مائل ہونے کے ہیں لیکن اس کا غالب استعمال نیکی اور حق سے ہٹ کر برائی اور ناانصافی کی طرف مائل ہونے کے لیے ہے۔ آیت میں یہ بے جا پاسداری اور ناروا جانب داری کے لیے

استعمال ہوا ہے۔

'اثم' کے معنی

'اِثْم' میں اصلاً تاخر یعنی پیچھے رہ جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آثمہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تھک جانے کی وجہ سے پیچھے رہ جائے۔ پھر یہ لفظ ادائے حقوق میں پیچھے رہ جانے کے لیے استعمال ہوا، عام اس سے کہ وہ خدا کے حقوق ہوں یا بندوں کے۔ اپنے اس مفہوم کے لحاظ سے یہ 'بِرّ' کا ضد ہے۔ 'بِرّ' کا اصل مفہوم جیسا کہ ہم آیت ۱۷۷ کے تحت واضح کر چکے ہیں، ایفائے حق ہے۔ یہ لفظ 'عدوان' کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے کہ حقوق کے معاملہ میں گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک کوتاہی اور حق تلفی کی نوعیت کے، دوسرے دست درازی اور تعدی کی نوعیت کے۔ پہلی قسم کے لیے اثم کا لفظ ہے، دوسری کے لیے عدوان کا۔ آیت زیر بحث میں یہ لفظ جنف کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ جنف کے معنی ہم واضح کر چکے ہیں کہ جانب داری کے ہیں اس کے بالمقابل اثم کا ٹھیک مفہوم حق تلفی کا ہو گا۔ اور ایک نامنصف وصیت کرنے والے سے انھی دونوں باتوں میں سے کسی ایک بات کا اندیشہ ہو سکتا ہے یا تو وہ وارثوں میں سے کسی ایک کی جانبداری کرے گا یا کسی کی حق تلفی کا مرتکب ہو گا۔

تبدیلی کی ممانعت اصلاح کی ممانعت کے ہم معنی نہیں ہے

اوپر والی آیت میں وصیت کرنے والے کی وصیت میں کسی تبدیلی کرنے کی نہایت شدت کے ساتھ ممانعت فرمائی گئی تھی اب اس آیت میں یہ ارشاد ہوا کہ تبدیلی کی یہ ممانعت اصلاح کی ممانعت کے ہم معنی نہیں ہے۔ اگر کسی وصیت کرنے والے کے اندر جانب داری یا حق تلفی کا رجحان محسوس ہو رہا ہے یا اس کی وصیت واضح طور پر جانب داری اور حق تلفی کا پہلو لیے ہوئے ہے تو وصیت کے گواہوں کی طرف سے اس جانب داری اور حق تلفی کی اصلاح کی کوشش اس تبدیلی کے حکم میں نہیں ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ یہ چیز جائز ہے۔ البتہ یہ اصلاح انھیں بطور خود کر دینے کا حق نہیں ہے بلکہ اس کے لیے انھیں فریقوں کے درمیان سمجھوتے اور مفاہمت کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ اگر اس کا موقع ہے کہ خود وصیت کرنے والے کو سمجھا بجھا کر عدل و انصاف کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے تو یہ راہ اختیار کی جائے ورنہ بصورت دیگر وارثوں کے درمیان مفاہمت کرانے کی کوشش کی جائے۔ یہ مفہوم فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ کے الفاظ سے نکلتا ہے۔ اس لیے کہ ان الفاظ کا واضح مفہوم ان کے درمیان مصالحت کرا دینا ہے نہ کہ بطور خود کوئی اصلاح کر دینا۔

۱۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۸۳-۱۸۷

روزے کا بیان تربیت نفس کے لیے

حرمت جان اور حرمت مال کے مذکورہ بالا قوانین کے بعد اب یہ روزے اور اس سے متعلق احکام بیان ہو رہے ہیں۔ ہماری معروف فقہی ترتیب کے لحاظ سے تو روزہ عبادات کی فہرست میں شامل ہے اس وجہ سے خیال دل میں یہ گزرتا ہے کہ اس کا ذکر اوپر کی اس آیت کے ساتھ ہونا تھا جس میں نماز اور انفاق کا ذکر ہے لیکن قرآن حکیم میں احکام کے بیان کی ترتیب وہ نہیں ہے جو ہماری فقہ کی کتابوں میں ملحوظ رکھی گئی ہے

بلکہ حکمت شریعت، اصلاح معاشرہ، تزکیہ نفوس اور رعایت احوال کے تقاضوں کے تحت ہے۔ ان پہلوؤں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حرمت جان و حرمت مال کے قوانین کے بعد یہ روزے کا بیان اس عبادت کو سامنے لا رہا ہے جو ضبط نفس اور تربیت تقویٰ کے لیے اسلام نے مقرر کی ہے تاکہ طمع اور اشتعال، لالچ اور انتقام، خواہش اور ہیجان کے غیر معتدل رجحانات و داعیات کو انسان لگام لگا سکے اور اپنے رہوار نفس کو اس راستے پر ڈال سکے جو تقویٰ کا راستہ ہے۔ روزہ صبر اور تقویٰ پیدا کرنے کی خاص عبادت ہے اور یہی صفات ہیں جو انسان کو دست درازی اور حق تلفی سے بچاتی بھی ہیں اور بر و احسان اور حق و عدل کے قیام پر ابھارتی بھی ہیں چنانچہ یہاں روزے کا حکم جس طرح پچھلے احکام پر عمل کے لیے تربیت کی بنیاد قائم کرتا ہے اسی طرح اس کے بعد جو احکام رشوت دہی کی ممانعت اور حج و جہاد سے متعلق آ رہے ہیں ان کے لیے بھی صبر کی اساس فراہم کرتا ہے۔ گویا ترتیب میں اس کے موقع و محل ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ روزہ اسلام میں کیوں فرض کیا گیا اور اس کے مقاصد و فوائد کیا ہیں، زندگی کن پہلوؤں سے اس سے متاثر ہوتی ہے اور پھر حیات اجتماعی پر اس کے اثرات کیا پڑتے ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ
۱۸۳-۱۸۶ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ
مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ
يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ
خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾ شَهْرُ
رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ
مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ
وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ
يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا
الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٨٥﴾
وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾
أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ
لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ
أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا
مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ
الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى
اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ
حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ
لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

اے ایمان والو، تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا ترجمہ آیات ۱۸۳ - ۱۸۷
گیا تھا تاکہ تم تقوٰی حاصل کرو۔ گنتی کے چند دن۔ اس پر بھی جو کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو
تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کر دے۔ اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکیں ان پر
ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ جو کوئی مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر
ہے۔ اور یہ کہ تم روزہ رکھو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ ۱۸۳-۱۸۴

رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اُتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور
حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ، سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں
موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری
کرے۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔ اور چاہتا ہے

کہ تم تعداد پوری کر لو اور اللہ نے جو تمہیں ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔ ۱۸۵

اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو میں قریب ہوں۔ میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو چاہیے کہ وہ میرے حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔ ۱۸۶

تمہارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز کیا گیا۔ وہ تمہارے لیے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس ہو۔ اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت کی اور تم سے درگزر فرمایا تو اب تم ان سے ملو اور اللہ نے تمہارے لیے جو مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو۔ اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری شب کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔ اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو تو بیویوں سے نہ ملو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں تو ان کے پاس نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

۶۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۸۳)

لفظ صوم کی تحقیق — صوم اور صیام مصدر ہیں۔ صوم کے لغوی معنی کسی شے سے رک جانے اور اس کو ترک کرنے کے ہیں۔ صام الفرس صوماً کے معنی ہیں گھوڑے نے چارہ نہیں کھایا۔ نابغہ کا شعر ہے۔

خیل صیام وخیل غیر صائمة ۔۔۔ تحت العجاج واخری تعلك اللجما

بہت سے بھوکے اور بہت سے آسودہ گھوڑے میدان جنگ کے غبار میں کھڑے تھے اور دوسرے بہت سے اپنی لگامیں چبا رہے تھے۔

مولانا فراہیؒ لفظ صوم کی تحقیق کے سلسلے میں اپنی کتاب اصول الشرائع میں فرماتے ہیں۔

"اہل عرب اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو بھوک اور پیاس کا عادی بنانے کے لیے باقاعدہ ان کی تربیت کرتے تھے تاکہ مشکل اوقات میں وہ زیادہ سے زیادہ سختی برداشت کر سکیں۔ اسی طرح وہ اپنے گھوڑوں کو تند ہوا کے مقابلے کی بھی تربیت دیتے تھے۔ یہ چیز سفر اور جنگ کے حالات میں جب کہ ہوا کے تھپیڑوں سے سابقہ پیش آ جاتے، بڑی کام آنے والی ہے...... جریر نے اپنے ایک شعر میں ان دونوں باتوں کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

ظللنا بمستن الحرور كاننا لدى فرس مستقبل الريح صائم

(ہم لُو کے تھپیڑوں کی جگہ جمے رہے گویا ہم ایک ایسے گھوڑے کے ساتھ کھڑے ہوں جو بادِ تند کا مقابلہ کر رہا ہو اور روزہ رکھے ہوئے ہو)

اس شعر میں اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے حال کی تشبیہ ایک ایسے شخص سے دی ہے جو اپنے گھوڑے کے ساتھ کھڑا ہوا اس کو بھوک اور بادِ تند کے مقابلے کی تربیت دے رہا ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اہل عرب تشبیہ کے لیے انھی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں جو ان کے عام تجربے میں آئی ہوں۔ ان کو نادر چیزوں کی تلاش زیادہ نہیں ہوتی...... الغرض گھوڑوں کے صوم کے بارے میں اشعار بہت ہیں۔"

اسی سے صائم ہے جس کے معنی ہیں وہ شخص جو کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے رک جائے۔ اس کے لیے کچھ مخصوص شرعی حدود و قیود ہیں جن کی تفصیل قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

روزہ تربیتِ نفس کی قدیم ترین عبادت ہے

"كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ" یعنی روزہ کی یہ عبادت صرف تمھارے ہی اوپر پہلی بار فرض نہیں ہوئی ہے بلکہ تم سے پہلے دوسری امتوں پر بھی فرض کی گئی تھی۔ آسمانی شریعتوں میں یہ ابتدا سے تربیتِ نفس کی خاص ریاضت رہی ہے۔ مقصود اس بات کا حوالہ دینے سے صرف عام طبیعتوں کی گھبراہٹ دور کرنا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، شرائعِ الٰہی کی یہ قدیم وراثت ہے جو تمھاری طرف منتقل ہو رہی ہے اور تم اس کو اختیار کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے سب سے زیادہ اہل اور حق دار ہو۔

روزے کا مقصد

"لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" یہ روزے کی اصل غایت بیان ہوئی ہے۔ تمام شریعت کی بنیاد تقویٰ پر ہے، تقویٰ پیدا ہوتا ہے جذبات و خواہشات پر غالب پانے کی قوت و صلاحیت سے اور اس قوت و صلاحیت کی سب سے بہتر تربیت روزوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (۱۸۴)

"گنتی کے چند دن" یعنی روزے کی یہ مشقت تم پر کچھ زیادہ مدت کے لیے نہیں ڈالی گئی ہے بلکہ سال میں صرف گنتی کے چند دن اس کے لیے خاص کیے گئے ہیں جس طرح اوپر والی آیت میں كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ

مِّنْ قَبْلِكُمْ کے الفاظ تالیفِ قلوب کے طور پر آئے ہیں، اسی طرح اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کے الفاظ بھی بطور تالیفِ قلب وارد ہیں کہ تربیتِ تقویٰ اور تزکیۂ نفس کا یہ کورس چند روزہ ہے، اس سے پست ہمت اور دل شکستہ نہیں ہونا چاہیئے۔ نفس پر شاق ہونے والی عبادات کے بیان میں قرآن مجید نے تالیفِ قلب کا یہ انداز اکثر مقامات میں ملحوظ رکھا ہے۔ انفاق اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض چیزوں کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ آگے زیادہ واضح مثالیں اس کی آئیں گی۔

"ایامِ معدودات" سے مراد

گنتی کے چند دنوں سے یہاں کیا مراد ہے؟ اہلِ تاویل کے ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد ہر مہینے میں تین دن کے روزے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے ہر ماہ میں یہی تین دنوں کے روزے فرض ہوتے تھے۔

دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے مراد رمضان کے روزے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اسلام میں فرض روزوں کی حیثیت سے صرف رمضان ہی کے روزوں کا علم ہے۔ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے آنحضرت صلعم ہر ماہ میں جو تین دن کے روزے رکھتے تھے ان کی حیثیت فرض روزوں کی نہیں بلکہ نفلی روزوں کی تھی۔

امام ابن جریرؒ ان دونوں گروہوں کے اقوال نقل کر کے اپنی رائے دوسرے گروہ کے حق میں دیتے ہیں۔ ہمیں چونکہ ان کی اس رائے سے اتفاق ہے اس وجہ سے ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"ہمارے نزدیک حق سے قریب تر بات ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد ماہِ رمضان ہی کے ایام ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی قابلِ اعتماد روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مسلمانوں پر رمضان کے روزوں کے سوا کوئی اور روزہ فرض کیا گیا ہو جو رمضان کے روزوں سے منسوخ ہوا ہو۔ آیت کا سیاق خود اس بات پر دلیل ہے کہ جو روزے ہم پر فرض ٹھہرائے گئے وہ رمضان ہی کے روزے ہیں، کوئی اور روزے نہیں ہیں۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ کے الفاظ خود ان ایام کی بلا کسی اشتباہ کے تعیین کیے دیتے ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ رمضان کے سوا کوئی اور روزے مسلمانوں پر فرض تھے، جو رمضان کے روزوں سے منسوخ ہوئے ان سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسی روایت پیش کریں جو حجت بن سکے۔"

بارہ مہینوں میں سے صرف ۳۰ یا ۲۹ دن کے روزے، روزوں کی روحانی برکات کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ یہ کوئی بڑی مدت نہیں ہے بلکہ گنتی کے چند دن ہی ہیں۔ اس وجہ سے خدا کی رضا جوئی اور اصلاحِ نفس کے طالب اس مدت کو کوئی طویل مدت نہیں سمجھتے بلکہ نہایت قلیل اور چند روزہ سمجھتے ہیں۔ قرآن نے اس کی اس قدر و قیمت نیز تالیفِ قلب کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس کو اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے تعبیر فرمایا ہے۔

بعض غلط تاویل

"وَعَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ" کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ شروع

شروع میں جب روزوں کا حکم نازل ہوا تو چونکہ اہل عرب اس سخت عبادت کے عادی نہیں تھے۔ اس وجہ سے ان کی آسانی کے لیے یہ گنجائش رکھی گئی کہ جو شخص روزہ رکھنے کی قدرت کے باوجود روزہ نہ رکھنا چاہے وہ ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ بعد میں یہ اجازت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن یہ تاویل کسی طرح بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

اول تو روزے کی فرضیت کیا ہوئی جب کہ اس بات کی کھلی اجازت موجود تھی کہ کوئی شخص چاہے تو روزہ رکھے، نہ چاہے تو نہ رکھے، اس کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اگر روزے کے ابتدائی حکم کی نوعیت یہ تھی تو كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (تم پر روزے فرض کیے گئے) کا ٹکڑا بالکل غیر ضروری سا ہو جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں اس کی فرضیت بالکل بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔

دوسری یہ کہ یہ کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ ایک طرف تو مریض اور مسافر دونوں کے لیے دوسرے دنوں میں اپنے قضا کیے ہوئے روزوں کی تعداد روزے رکھ کر پورے کرنے کا حکم ہو، جیسا کہ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ کے الفاظ سے واضح ہے اور دوسری طرف یہ آزادی ہو کہ جو شخص چاہے روزے رکھے اور جو شخص چاہے مقدرت کے باوجود، نہ رکھے، صرف ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ مریض اور مسافر پر تو یہ پابندی ہے کہ وہ روزے ضرور رکھیں، یہاں تک کہ اگر سفر یا مرض کے سبب سے معین دنوں میں نہ رکھ سکیں تو دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کریں درآنحالیکہ دوسروں پر کسی حالت میں بھی روزے رکھنا ضروری نہیں، ایک تندرست اور مقیم بھی چاہے تو روزے کا بدل ایک مسکین کو کھانا کھلا کر پورا کر سکتا ہے۔

بعض لوگوں نے اس مشکل سے بچنے کے لیے يُطِيقُونَهُ کے معنی یہ لیے ہیں کہ جو لوگ مشکل سے طاقت رکھتے ہیں۔ یہ معنی لے لینے سے اوپر کے اعتراضات تو رفع ہو جاتے ہیں اور كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ الآیہ کے ٹکڑے کا ایک محل نکل آتا ہے لیکن اس صورت میں مذکورہ بالا اعتراضات سے بھی بڑا اعتراض اس پر یہ وارد ہوتا ہے کہ "يُطِيقُونَ" کے یہ معنی لغت میں ہیں بھی یا محض اپنے جی سے گھڑ لیے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک عربی لغت اس لفظ کے اس معنی سے بالکل خالی ہے۔ بعض لوگ یہ دعوے کرتے ہیں کہ باب افعال کا ایک خاصہ سلب ماخذ بھی ہے اس وجہ سے 'اطاقت' کے معنی طاقت نہ رکھنے کے بھی آسکتے ہیں۔ ہمیں اس بات سے تو انکار نہیں ہے کہ باب افعال کے خواص میں سے سلب ماخذ بھی ہے لیکن خاصیات الابواب کا معاملہ جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں، قیاسی نہیں بلکہ سماعی ہے اس وجہ سے اصل شے لفظ کا استعمال ہے۔ اگر اہل زبان نے اس لفظ کو مذکورہ معنی میں استعمال کیا ہو اور اس کی مثالیں موجود ہوں تب تو بلاشبہ اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن اگر اس معنی میں اس لفظ کے استعمال کی کوئی نظیر کلام عرب اور قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہے تو محض اس مفروضہ پر کہ باب افعال کے خواص میں ایک خاصہ سلب ماخذ نامی بھی ہے، لفظ کو اثبات کے

بجائے نفی کے معنی میں لے لینا عربی زبان پر بھی بہت بڑا ظلم ہے اور یہ چیز دین میں بھی ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اگر کوئی صاحب اس اصول کو بے دھڑک استعمال کرنے لگ جائیں تو وہ دین کے ایک بہت بڑے حصہ کو بڑی آسانی سے امر و حکم کے بجائے نفی و نہی سے بدل سکتے ہیں۔

بعض کم سواد یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کہنا کہ "فلاں شخص فلاں چیز کی طاقت رکھتا ہے" اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اس چیز کی مشکل سے طاقت رکھتا ہے۔ یہ بات بالکل طفلانہ ہے اس وجہ سے اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتے ہیں کہ طاقت رکھنے کے مفہوم میں مشکل کا یہ مضمون موجود ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ طاقت آدمی کو تکالیف شرعیہ اور احکام دینیہ کے اٹھانے کا ذمہ دار بناتی ہے یا اس کو شریعت کی ذمہ داریوں سے بری قرار دیتی ہے۔ جہاں تک اسلامی شریعت کا تعلق ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ یہ طاقت آدمی کو مکلف بناتی ہے نہ کہ اس کو بری قرار دیتی ہے۔ جب آپ یہ کہیں کہ میں فلاں چیز کی طاقت رکھتا ہوں تو اس کے واضح معنی یہی ہیں کہ آپ اس کے لیے مکلف ہونے کے درجہ میں ہیں نہ کہ اس سے استثنا کے درجہ میں، قطع نظر اس سے کہ آپ اس کی طاقت آسانی سے رکھتے ہیں یا مشکل سے۔

پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اگر کہنا یہ تھا کہ "جو لوگ روزہ رکھنے کی مشکل سے طاقت رکھتے ہیں" تو اس کے لیے عربی زبان میں بیسیوں اسلوب اور الفاظ نہایت معلوم و مشہود موجود ہیں جو اہلِ زبان استعمال کرتے ہیں آخر ان کو چھوڑ کر قرآن نے ایک ایسا لفظ کیوں استعمال کیا جس کا استعمال اس معنی کے لیے کسی کو معلوم نہیں۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ "انا اطیق حمل السلاح" تو ہر شخص اس کا مطلب یہی سمجھے گا کہ وہ ہتھیار اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ مطلب تو کوئی بھی نہیں سمجھے گا کہ وہ ہتھیار اٹھانے کی مشکل سے طاقت رکھتا ہے اس وجہ سے مستحق ہے کہ اسے جہاد کی ذمہ داریوں سے بری رکھا جائے۔ اسی طرح فرض کیجیے کہ کہا جائے کہ "لنا طاقۃ بجالوت وجنودہ" تو اس کا واضح مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ہمیں جالوت اور اس کی فوجوں سے مقابلہ کی طاقت ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا کہ "ہمیں طاقت نہیں ہے" یا "ہم مشکل سے طاقت رکھتے ہیں" تب تو قرآن میں بنی اسرائیل کا جو قول نقل ہوا ہے کہ لَا طَاقَۃَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِہٖ" اس میں لائے نفی کی مطلق ضرورت نہیں تھی بلکہ اثبات کی صورت میں ان کا مطلب صحیح طور پر ادا ہو جاتا۔

اصل اشکال اور اس کا حل بہرحال جن لوگوں نے "یطیقون" کے یہ معنی لیے ہیں انھوں نے بالکل غلط معنی لیے ہیں لیکن یہ معنی اگر غلط ہیں تو اس کے معروف معنی لینے کی صورت میں آیت کی تاویل کیا ہو گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ٹکڑے میں جو اشکال ہے وہ یطیقون کے لفظ میں نہیں ہے، اس کے معنی تو وہی ہیں جو معروف و مشہور ہیں، اس کے سوا کسی اور معنی کے لیے اس لفظ میں کوئی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے، دراصل اس میں اگر اشکال ہے تو "یطیقونہ" کی ضمیر مفعول میں ہے کہ اس کا مرجع کیا ہے؟ عام طور پر لوگ اس کا مرجع صوم کو مانتے ہیں اس

وجہ سے وہ سارے اشکالات پیدا ہوتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔ لیکن اس کا مرجع صوم نہیں بلکہ طعام ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ یہ تاویل ہمارے پچھلے اہل تاویل میں سے بھی بعض لوگوں نے لی ہے اور یاد پڑتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تاویل بھی یہی ہے۔ یہ تاویل ہمارے نزدیک بالکل واضح ہے لیکن ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکے کہ طعام کا لفظ چونکہ اوپر کہیں مذکور نہیں ہوا ہے اس وجہ سے اس کے ذکر سے پہلے اس کے لیے ضمیر لانا اضمار قبل الذکر ہے جو کلام کا ایک عیب ہے جس سے قرآن کو پاک ہونا چاہیے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اضمار قبل الذکر کلام کا ایک عیب ہے لیکن یہ عیب اس شکل میں ہے جب ضمیر کا مرجع متکلم کی نیت میں مقدم نہ ہو اور وہ اس کے لیے ضمیر لائے لیکن اگر مرجع متکلم کی نیت میں مقدم ہو اور محض تکرار سے بچنے کے لیے یا بلاغت کے کسی اور تقاضے کے تحت وہ مرجع کو موخر کرنے پر مجبور ہو تو اس صورت میں اضمار قبل الذکر نہ صرف یہ کہ عیب نہیں ہے بلکہ کلام کی ایک خوبی ہے اور اس کی نہایت عمدہ مثالیں کلام عرب میں موجود ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ ضمیر بھی جس کو ہمارے اہل نحو ضمیر شان کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اسی نوعیت کی چیز ہے۔ اس میں بھی متکلم ضمیر درحقیقت اس مرجع کے لیے لاتا ہے جو اس کے مافی الضمیر میں مضمر ہوتا ہے۔

یہاں پوری بات یوں تھی کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَ طَعَامَ مِسْكِيْنٍ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکتے ہیں تو ان کے لیے بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے) لیکن اس صورت میں جملہ نہایت ثقیل ہو جاتا تھا اس وجہ سے کلام کی روانی، ایجاز اور بلاغت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک جگہ طعام مسکین کو حذف کر کے اس کی جگہ ضمیر لا دی جائے اور دوسری جگہ جہاں اس کا اظہار ناگزیر ہے اس کو ظاہر کر دیا جائے تاکہ کلام غیر ضروری تکرار کے عیب سے پاک رہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے اضمار قبل الذکر کی صورت تو ضرور پیدا ہوئی لیکن دیکھ لیجیے ضمیر اصلاً جس چیز کے لیے لائی گئی ہے وہ صرف عبارت میں موخر ہے متکلم کی نیت میں موخر نہیں ہے۔

اس تاویل کو قبول کر لینے کے بعد مسئلہ کی جو شکل سامنے آتی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ پہلے جو روزے فرض ہوئے تھے اس میں اس بات کی بھی گنجائش تھی کہ اگر لوگ روزے نہ رکھنا چاہیں تو اس کا بدل مسکین کو کھانا کھلا کر پورا کر دیا کریں بلکہ قرآن کے الفاظ سے اس کی اصلی شکل یہ سامنے آتی ہے کہ جو لوگ بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے پورے نہیں کر سکتے تھے ان کو اس بات کی اجازت تھی کہ دوسرے دنوں میں یا تو روزے رکھ کر ان چھوٹے ہوئے روزوں کی تلافی کر دیں یا ایک روزے کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر اس کا بدل پورا کر دیں۔ گویا اس وقت تک قضا روزوں کی تلافی مسکین کو کھانا کھلا کر بھی ہو سکتی تھی، بعد میں یہ اجازت، جیسا کہ آگے والی آیت سے واضح ہوگا، منسوخ ہو گئی، یعنی قضا شدہ روزوں کی

جگہ بھی روزے رکھنا ہی ضروری قرار دے دیا گیا۔

"جو کوئی از خود کچھ مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور یہ کہ تم روزہ رکھو تو یہ زیادہ بہتر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ قضا روزے کا یہ فدیہ جو مقرر ہوا، یہ ایک مستطیع سے کم سے کم مطالبہ ہے جس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ مسکینوں کو کھانا کھلائے یا ان کے ساتھ کوئی اور نیکی کرے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ نیز یہ کہ اس فدیہ کی نوعیت صرف ایک رخصت اور رعایت کی ہے، اللہ کے نزدیک زیادہ بہتر یہی ہے کہ آدمی فدیہ کے بجائے دوسرے دنوں میں یہ روزے ہی پورے کرے۔ یہ گویا اس رخصت کے ساتھ ساتھ ایک اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا گیا تھا کہ یہ اجازت عارضی اور وقتی ہے جو منسوخ ہونے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ روزوں کی تعداد پوری کی جائے چنانچہ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا اور آگے آرہا ہے، کچھ عرصے کے بعد یہ فدیہ کی اجازت منسوخ ہو گئی اور فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ کا اصل حکم باقی رہ گیا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (١٨٥)

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اوپر والی آیت کے کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی جس میں ایک حقیقت تو یہ واضح کی گئی کہ رمضان کے مہینہ کو اللہ تعالیٰ نے روزوں کے لیے کیوں منتخب فرمایا۔ دوسری یہ کہ اب تک سفر یا بیماری کے سبب سے قضا شدہ روزوں کے لیے فدیہ کی جو اجازت تھی وہ اجازت منسوخ ہوئی اب روزوں کی تلافی روزوں ہی کے ذریعہ سے ضروری قرار دے دی گئی۔

روزے کے لیے رمضان کے مہینے کے انتخاب کی حکمت

پہلی حقیقت اس طرح واضح کی گئی ہے کہ یہی مبارک مہینہ ہے جس میں دنیا کی ہدایت کے لیے قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس ہدایت کے متعلق فرمایا کہ یہ ہدایت بھی ہے اور اس میں ہدایت اور فرقان کی بینات بھی ہیں۔ یعنی یہ صراط مستقیم کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عقل کی رہنمائی اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے لیے وہ واضح اور قاطع حجتیں بھی اپنے اندر رکھتی ہے جو کبھی کہنہ ہونے والی نہیں ہیں۔ لفظ 'ہدیٰ' کی تحقیق اسی سورہ کی آیت ۲ کے تحت اور 'فرقان' کی تحقیق آیت ۵۳ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ 'بینات' سے مراد واضح، دل نشین اور ہر الجھن کو دور کر دینے والے براہین و حجج ہیں۔ قرآن صرف حلال و حرام بتانے کا ضابطہ ہی نہیں ہے بلکہ حجج و حکمت کے بینات کا کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ بھی ہے اس وجہ سے یہ رہتی دنیا تک عقل انسانی کی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

اس عظیم نعمت کی شکر گزاری کا تقاضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرمایا

تاکہ بندے اس میں اپنے نفس کی خواہشات اور شیطان کی ترغیبات سے آزاد ہو کر اپنے رب سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو سکیں اور اپنے قول و فعل، اپنے ظاہر و باطن اور اپنے روز و شب ہر چیز سے اس حقیقت کا اظہار و اعلان کریں کہ خدا اور اس کے حکم سے بڑی ان کے نزدیک اس دنیا کی کوئی چیز بھی نہیں ہے۔

غور کرنے والے کو اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں پیش آسکتی کہ خدا کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت عقل ہے اور عقل سے بھی بڑی نعمت قرآن ہے اس لیے کہ عقل کو بھی حقیقی رہنمائی قرآن ہی سے حاصل ہوتی ہے، یہ نہ ہو تو عقل سائنس کی ساری دوربینیں اور خوردبینیں لگا کر بھی اندھیرے ہی میں بھٹکتی رہتی ہے اس وجہ سے جس مہینے میں دنیا کو یہ نعمت ملی وہ سزاوار تھا کہ وہ خدا کی تکبیر اور اس کی شکر گزاری کا خاص مہینہ ٹھہرا دیا جائے تاکہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر و عظمت کا اعتراف ہمیشہ ہمیشہ ہوتا رہے۔ اس شکر گزاری اور تکبیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزوں کی عبادت مقرر فرمائی جو اس تقویٰ کی تربیت کی خاص عبادت ہے جس پر تمام دین و شریعت کے قیام و بقا کا انحصار ہے اور جس کے حاملین ہی کے لیے درحقیقت قرآن ہدایت بن کر نازل ہوا ہے جیسا کہ اس سورہ کی بالکل پہلی ہی آیت میں اس نے خود یہ حقیقت واضح فرما دی ہے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (یہ آسمانی کتاب ہے، اس کے آسمانی ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے، یہ متقیوں کے لیے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے) گویا اس حکمتِ قرآنی کی ترتیب یوں ہوئی کہ قرآن حکیم کا حقیقی فیض صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہے جن کے اندر تقویٰ کی روح ہو اور اس تقویٰ کی تربیت کا خاص ذریعہ روزے کی عبادت ہے اس وجہ سے رب کریم و حکیم نے اس مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرما دیا جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن اس دنیا کے لیے بہار ہے اور رمضان کا مہینہ موسم بہار اور یہ موسم بہار جس فصل کو نشوونما بخشتا ہے وہ تقویٰ کی فصل ہے۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔

یہ اوپر کے مبتدا کی اصل خبر ہے۔ یعنی یہ مہینہ اپنی مذکورہ خصوصیات کی وجہ سے روزوں کے لیے منتخب کیا گیا ہے تو جو شخص اس مہینے میں حاضر ہو وہ اس پورے ماہ کے روزے رکھے۔ حاضر ہونے کا مفہوم خود آگے کے الفاظ سے واضح ہو رہا ہے کہ آدمی سفر یا بیماری کی حالت میں نہ ہو اور فَلْيَصُمْهُ کے معنی یہ ہوئے کہ اس پورے مہینہ کے روزے رکھے، اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے، اور اگر بیماری یا سفر کی وجہ سے روزے پورے نہ کر سکتا ہو تو دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر یہ کمی پوری کر دے۔ یہاں سے اوپر والی آیت کے الفاظ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ، فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ، وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ حذف فرما دیے جس کے معنی یہ ہیں کہ اصل حکم میں اس حصہ کے بقدر ترمیم ہو گئی۔ سفر یا بیماری کے زمانوں کے چھوٹے ہوئے روزوں کے لیے اب تک جیسا کہ اوپر گزرا فدیے کی بھی اجازت تھی، مذکورہ الفاظ کے حذف ہو جانے سے وہ ختم ہو گئی۔

روزے کے احکام کی حکمتیں

آگے یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ سے آخر آیت تک صعودی ترتیب کے ساتھ اوپر کے تمام احکام کی حکمت و مصلحت واضح فرما دی۔ اوپر جو باتیں بیان ہوئی تھیں ان کو ایک مرتبہ پھر ذہن کے سامنے کر لیجئے۔ ایک تو یہ بات بیان ہوئی تھی کہ رمضان کا مہینہ روزوں کے لیے کیوں مخصوص کیا گیا؟ دوسری یہ کہ فدیہ کی اجازت منسوخ کر دی گئی اب سفر اور بیماری کے زمانے کے روزوں کی تعداد بھی پوری کرنی ہوگی۔ تیسری یہ کہ سفر اور مرض کی حالت میں روزے دوسرے دنوں پر ملتوی کیے جا سکتے ہیں۔

ان تینوں کی حکمت و علت نیچے سے شروع کر کے اوپر کی طرف چڑھتے ہوئے یوں بیان فرمائی کہ سفر اور بیماری کی حالت میں روزے ملتوی کر دینے کی اجازت تمھیں اس لیے دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ تمھیں کسی تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا، فدیہ کی اجازت اس لیے منسوخ کر دی گئی کہ تم رمضان کے روزوں کی تعداد پوری کرو اور اس خیر و برکت سے محروم نہ ہو جو اس کے اندر مضمر ہے اور رمضان کے مہینہ کو اس کے لیے مخصوص اس وجہ سے فرمایا کہ تم اس نعمتِ عظمیٰ پر اللہ کی بڑائی اور اس کا شکر کرو جو تمھیں قرآن کی صورت میں اس مبارک مہینے میں عطا ہوئی۔ اس ترتیبِ صعودی کی مثالیں سورۂ قصص کی آیت ۴، اور انفال کی آیت ۱۱ میں موجود ہیں۔

لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ میں تکبیر سے مراد خدا کی عظمت و جلالت اور اس کی بزرگی و کبریائی کے احساس و اعتراف کی وہ حالت ہے جو ایک روزہ دار پر روزے کی حالت میں عملاً طاری ہوتی ہے اور جس کے سبب سے بندہ اپنی تمام جائز خواہشوں سے بھی محض اپنے رب کی رضا اور خوشنودی کی طلب میں دستبردار ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت پر مسلم کی اس حدیث سے بھی روشنی پڑتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ کل عمل ابن آدم یضاعف، الحسنۃ بعشر امثالھا الی سبع مائۃ ضعف، قال اللہ تعالیٰ الا الصوم فانہ لی وانا اجزی بہ، یدع شھوتہ وطعامہ من اجلی "ابن آدم کا ہر نیک عمل بڑھایا جائے گا، دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صرف روزے کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اپنے ہاتھوں اس کا بدلہ دوں گا کیونکہ بندہ صرف میری ہی خاطر اپنی خواہشوں اور اپنے کھانے کو چھوڑتا ہے۔"

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ احادیث میں جو رخصتیں حاملہ، مرضعہ یا پیر فانی وغیرہ سے متعلق بیان ہوئی ہیں وہ تمام تر یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ کے اصول یا اسی رخصت پر مبنی ہیں جو مریض و مسافر کے لیے بیان ہوئی ہے۔ قرآن حکیم کی حکمت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان گوشوں میں بھی وسعت دے دی ہے جو اس کے دائرہ میں آ سکتے تھے۔ جن لوگوں نے یُطِیْقُوْنَہٗ کے لفظ سے حاملہ یا مرضعہ وغیرہ کے لیے احکام نکالنے کی کوشش کی ہے انھوں نے دو بالکل غیر متعلق چیزوں میں جوڑ ملانے کا تکلف کیا ہے۔ ہم اوپر اس کی تردید کر چکے ہیں۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (۱۸۶)

شبہات اور مشکلات میں خدا کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت

یہ آیت تمہید ہے ان سوالوں کے جوابات کی جو روزے کے حکم کے نزول کے بعد ماہ رمضان کے احترام اور روزے کے احکام و آداب سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں ابھرے یا ان کی زبانوں پر آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی وضاحت فرمائی۔ ایسے لوگوں کو قرآن نے یہ ہدایت فرمائی کہ اپنے اس قسم کے شبہات و اعتراضات کو خدا اور اس کی شریعت کی مخالفت یا اس کی تنقید و تضحیک کا ذریعہ نہ بنا لیں بلکہ ان میں رہنمائی کی طلب کے لیے خدا ہی کی طرف رجوع کریں۔ جو آدمی اخلاص و صداقت کے ساتھ اپنی کسی حقیقی ضرورت کے لیے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے خدا اس کی طلب ضرور پوری کرتا ہے، عام اس سے کہ وہ ضرورت اس کی معاش سے متعلق ہو یا معاد سے، ذہنی و عقلی الجھنوں سے متعلق ہو یا شریعت اور اس کے احکام کے فوائد و مصالح سے۔

منافقین کا حال یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو دین کی کسی بات میں کوئی مشکل محسوس ہوئی وہ اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کے بجائے اس بات کو اعتراض و استہزا کا نشانہ بنا لیتے اور مسلمانوں کے اندر وسوسہ اندازی اور فتنہ انگیزی کی ایک مہم شروع کر دیتے۔ قرآن میں ان کی اس خصلت کا ذکر جگہ جگہ ہوا ہے۔ خاص طور پر سورۂ مجادلہ میں اس کے بعض نہایت اہم پہلو واضح ہوئے ہیں۔ اہلِ ایمان کی پسندیدہ روش قرآن نے یہ بتائی کہ وہ اپنی مشکلات کے لیے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی مشکلات دور فرما دیتا ہے۔

یہ تمہید ایک جامع تمہید ہے جو مختلف مواقع کے ساتھ مناسبت رکھنے والی ہے لیکن یہاں اس کا تعلق، جیسا کہ ذکر کیا گیا، خاص طور پر ماہ رمضان اور اس کے روزوں کے باب میں چند سوالوں کے جواب سے ہے۔ یہ سوالات مسلمانوں کے اندر جب پیدا ہوئے تو قرآن نے ان کی وضاحت فرمائی اور ساتھ ہی ان کی حوصلہ افزائی کی کہ جب خدا اور اس کی شریعت سے متعلق کوئی سوال پیدا ہو تو اس کے لیے خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، خدا سب سے قریب ہے اور وہ سب کی مشکلات حل فرماتا ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۚ میرے متعلق سوال سے مراد ضروری نہیں کہ خدا کی ذات و صفات ہی سے متعلق سوال ہو بلکہ یہ سوال اس کی ذات و صفات، اس کی پسند و ناپسند اور اس کے احکام و شرائع سب ہی پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ سوال کا تعلق ان احکام سے ہے جو ماہ رمضان اور روزوں کے آداب و شرائط سے متعلق اصل حکم کے نزول کے بعد پیدا ہوئے۔ قرآن کے تدبر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس میں سائلوں کے سوالات نہایت اجمال کے ساتھ نقل ہوتے ہیں، سوال کی اصل نوعیت اس جواب سے واضح ہوتی ہے جو اس کے بعد قرآن دیتا ہے۔ سوال کے اجمال کے ساتھ نقل کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کلام غیر ضروری طوالت سے محفوظ رہے، دوسری یہ کہ اکثر سوالوں کے جواب میں قرآن کی وضاحت صرف سوالوں ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ جب اس کا ابر کرم برسا ہے تو اس نے خشک و تر سب ہی کو سیراب

کر دیا ہے۔ جواب کی اس وسعت و ہمہ گیری کا تقاضا یہ ہوا کہ سوال مبہم شکل میں نقل کیا جائے تاکہ سوال اور جواب میں عدم مطابقت نمایاں نہ ہو۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لیے موزوں مواقع آگے آئیں گے اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

خدا اور بندے کا تعلق

"فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ" ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ اس لیے کہ خدا سے قرب و بُعد کا انحصار بندے کے اپنے دل کی حالت پر ہے۔ اگر بندہ خدا سے غافل اور بے پروا ہے تو اس سے زیادہ دور کوئی چیز بھی نہیں لیکن اگر وہ خدا کی طرف متوجہ رہے، اس کی یاد سے اپنے دل کو معمور رکھے، اس کی نعمتوں پر اس کا شکر گزار رہے اور اس کی آزمائشوں میں طلبِ صبر و استقامت کے لیے اسی کے آگے روئے اور گڑگڑائے تو خدا سے زیادہ قریب بندے سے کوئی چیز بھی نہیں، وہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

یہ قرابت بندوں کو یوں تو ہر حال اور ہر مقام میں حاصل ہے لیکن خاص کر نبی کی بعثت کا زمانہ تو، جس کی طرف یہاں اشارہ ہے، خدا سے قرب و اتصال کا خاص زمانہ ہوتا ہے۔ نبی خدا کا نائب اور بندوں کا وکیل ہوتا ہے، خدا کے فرشتے ہر وقت اس کے پاس آتے رہتے ہیں، وحی کا سلسلہ اس کے اور خدا کے درمیان قائم رہتا ہے، بندے اپنی جو مشکلات اور اپنے جو سوالات نبی کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ گویا اس کے واسطے سے اپنے رب کے حضور ہی میں پیش کرتے ہیں اور وحی کا زمانہ ہونے کی وجہ سے ہر لمحہ توقع ہوتی ہے کہ جو سوال اس کے حضور میں پیش ہوا ہے اس کا جواب نازل ہو جائے۔ اسی حقیقت کی طرف مائدہ کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔ وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ (۱۰۱) (اور اگر تم ان کی بابت اس زمانے میں سوال کرو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی)

"اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ" بھی ایک حقیقت کا بیان ہے۔ بندہ جب اپنے رب کو پکارتا ہے تو وہ اس کی پکار کا جواب دیتا ہے۔ جواب دینے سے مراد قبولیت کا جواب ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ بندہ اپنے رب کو پکارے اور وہ اس کی مدد، فریاد رسی اور داد رسی کو نہ پہنچے۔ شرط صرف یہ ہے کہ بندہ اخلاص و تضرع کے ساتھ پکارے اور اسی چیز کے لیے پکارے جس کے لیے پکارنا اس کو زیبا ہے۔ اگر بندہ اپنے رب سے وہ چیز مانگتا ہے جو مانگنے کی ہے اور اس طرح مانگتا ہے جس طرح مانگنا چاہیے تو وہ چیز اس کو ضرور عطا ہوتی ہے۔ اگر فوراً عطا نہیں ہوتی تو اس کے مستقبل کے لیے یا اس کی آخرت کے لیے خدا کے ہاں محفوظ ہو جاتی ہے اور اگر اس شکل میں نہیں ملتی جس شکل میں اس نے مانگی ہے تو اس سے بہتر شکل میں وہ اس کو مل جاتی ہے یا اس کے لیے محفوظ کر دی جاتی ہے۔ قبولیتِ دعا کے باب میں اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص سنت ہے جس کے مختلف اجزا اپنے اپنے مقامات میں بیان ہوں گے۔ یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

"فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ" اوپر اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں یہ ان کا لازمی تقاضا یا نتیجہ بیان ہوا ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ بندوں سے قریب تر بھی ہے اور وہ ان کی پکار سنتا اور اس کا جواب بھی دیتا ہے

تو پھر اسی کا حق ہے کہ سب اس کی دعوت پر لبیک کہیں اور اس پر ایمان لائیں، پھر اس سے منحرف ہو کر کسی اور کی طرف رخ کرنے کے لیے کوئی ادنیٰ وجہ جواز بھی نہیں ہے۔ خاص کر یہ تو اپنی جان پر بہت بڑا ظلم ہے کہ جو پروردگار اپنی شریعت کے اجمالات کی توضیح خود فرمانے کے لیے سراپا رحمت و کرم ہے اس کے کسی حکم کو کوئی اعتراضات و شبہات کا ہدف ٹھہرائے یا اس کے سبب سے کسی خیانت یا تنگی میں مبتلا ہو۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیت کے سیاق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اہل ایمان کی اس بات کے لیے حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے کہ اگر ان کو خدا اور اس کی شریعت کے باب میں کوئی کھٹک پیدا ہو تو وہ خدا اور اس کے رسول ہی کی طرف رجوع کریں، اللہ تعالیٰ ان کی کھٹک دور فرمائے گا۔ بظاہر یہ بات اس ہدایت کے خلاف معلوم ہوتی ہے جو لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ اور اس کی ہم معنی دوسری آیات میں دی گئی ہے۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ جہاں سوالات کرنے کی ممانعت ہے وہاں اس سے مراد اس طرح کے غیر ضروری سوالات ہیں جو یہود اپنے پیغمبر سے محض اس کو زچ کرنے اور شریعت سے فرار اختیار کرنے کے لیے کرتے تھے۔ وہ سوالات اس کے تحت نہیں آتے جو شریعت کی توضیح و تبیین کے لیے ضروری ہیں۔ اللہ اور رسول نے ایسے سوالات کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے اور ان کے جوابات سے دین کی دولت میں اضافہ ہوا ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ اللہ اور رسول نے ایسے سوالات کے مواقع فراہم کیے ہیں تاکہ لوگوں پر دین کی حکمتیں اور مصلحتیں اور بندوں کی ضروریات کے ساتھ شریعت کی مناسبتیں واضح ہوں۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ۭ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْھَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (۱۸۷)

روزے سے متعلق سوالات کے جوابات

اوپر کی تمہید کے بعد اب یہ ان سوالات کا جواب ہے جو روزے کے احکام و آداب سے متعلق اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوئے۔ اس کے آخر میں كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ کے الفاظ اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ آیت اصل حکم کے نزول کے کچھ عرصہ بعد توضیح و تبیین کے طور پر نازل ہوئی۔ جو لوگ قرآن مجید کے انداز بیان سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن میں جب کسی حکم کے بعد اس کی کوئی مزید توضیح و تفصیل نازل ہوئی ہے تو اس کے ساتھ بالعموم یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں جن سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حکم بعد میں بطور وضاحت نازل ہوا ہے۔ یہ قرآن سے متعلق اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی تکمیل ہے جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں ہوا ہے کہ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ۔ 'رَفَثٌ' کے اصل معنی تو شہوانی باتوں کے ہیں

لیکن یہاں اس کے بعد للی کا صلہ اس کے اندر بیویوں سے اختلاط و ملاقات کا مضمون پیدا کر دیتا ہے۔ پس کے جائز کر دینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پہلے یہ چیز حرام ٹھہرائی گئی تھی بعد میں یہ جائز کر دی گئی۔ یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ ابتدائی حکم میں اس قسم کی کوئی وضاحت چونکہ موجود نہیں تھی اس وجہ سے بہت سے مسلمانوں نے بنظر احتیاط و تقویٰ یہ سمجھا کہ جس طرح روزے کی حالت میں، دن میں زن و شو کے تعلقات کی اجازت نہیں ہے اسی طرح شب میں بھی اس کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت پہنچی ہوگی کہ یہود کے ہاں روزہ افطار کے بعد معاً پھر شروع ہو جاتا تھا جس کے سبب سے انھیں شب میں بھی وہ پابندیاں نباہنی پڑتی تھیں جو دن میں تھیں۔ چونکہ مسلمانوں کے سامنے عملی مثال کی حیثیت سے اہل کتاب ہی کا روزہ تھا اور قرآن میں اس کا حوالہ بھی دیا گیا تھا اس وجہ سے انھوں نے از خود اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر لی کہ دن کی طرح شب میں بھی ازدواجی تعلقات سے احتراز کرتے تھے لیکن اس معاملہ میں چونکہ اب تک کوئی واضح ہدایت نہیں تھی اس وجہ سے اس کی نوعیت ایک مشتبہ معاملہ کی تھی۔ اس اشتباہ کے سبب سے بعض لوگ نفس کی اکساہٹ کے باعث کبھی کبھی اس چیز کے مرتکب بھی ہو جاتے جو خود ان کے ضمیر کے نزدیک مشتبہ ہوتی۔ مشتبہ معاملات میں شریعت کی ہدایت، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے، یہ ہے کہ دع ما یریبك الی ما لا یریبك، مشتبہ کو چھوڑ کر آدمی اس پہلو کو اختیار کرے جو غیر مشتبہ ہو۔ اگر اس کے برعکس آدمی مشتبہ پہلو کو اختیار کرے تو یہ خود اپنے نفس کے ساتھ ایک قسم کی خیانت ہوتی ہے ،اس وجہ سے قرآن نے اس کو اپنے نفس کے ساتھ خیانت سے تعبیر فرمایا لیکن چونکہ یہ احتیاط شریعت کے منشا کے خلاف تھی محتاط مسلمانوں نے از خود اپنے اوپر عائد کر لی تھی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس خیانت سے درگزر فرمایا اور واضح الفاظ میں شب میں بیویوں سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دے دی۔

میاں بیوی کے لیے لباس کے استعارے کی بلاغت

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ (وہ تمھارے لیے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس ہو) میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ جس نوعیت کی وابستگی رکھتے ہیں، یہ اس کی طرف اشارہ ہے اور مقصود اس اشارے سے یہ بتانا ہے کہ ان دونوں میں ایسا چولی دامن کا رشتہ ہے اور یہ باہم دگر ایسے فطری تقاضوں کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں کہ ان کو کسی حالت میں بھی ایک دوسرے سے الگ الگ رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس وجہ سے دین فطرت نے ان کے باہمی تعلق پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کی ہے جو فطری داعیات کے درمیان کوئی دیوار کھڑی کر دے۔ اگر کوئی محدود قسم کی پابندی خاص خاص حالات میں عائد بھی کی گئی ہے تو وہ صرف تربیت نفس کی ضرورت کی حد تک ہے، ذرا بھی اس سے متجاوز نہیں ہے۔

میاں اور بیوی کے لیے لباس کا استعارہ ایک نہایت بلیغ استعارہ ہے۔ اس کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

لباس کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ آدمی کے جسم کے لیے ساتر ہوتا ہے۔ اس سے اس کے

عیوب برہنگی کو پردہ پوشی نصیب ہوتی ہے یہ نہ ہو تو آدمی ننگا ہو کر حیوانات کے درجے میں آجائے۔ ٹھیک اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے جنسی جذبات و داعیات کے لیے پردہ فراہم کرتے ہیں۔ ان کے اندر جو صنفی میلانات ابھرتے ہیں وہ ان کی تسکین اور آسودگی کے لیے خود اپنے اندر سامان رکھتے ہیں اس وجہ سے کبھی ان کے عریاں اور بے نقاب ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ اگر یہ نہ ہو تو جذبات کا ہیجان جنسی انارکی کا ایک ایسا طوفان برپا کر دے کہ کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہ رہ جائے۔ جسم کے جو حصے اپنے اندر جنسی کشش رکھتے ہیں وہ عریاں ہونے کے لیے زور لگائیں، زبان اور قلم پر فحاشی کا بخار و ہذیان طاری ہو جائے، دل ہرزہ گرد اور نگاہ بالکل آوارہ ہو کر رہ جائے۔ ہمارے نفس کے ان سارے عیوب کی پردہ پوشی اگر ہو سکتی ہے تو صرف بیوی کے لیے شوہر کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور شوہر کے لیے بیوی کے ذریعہ سے۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نگاہ کو باحیا بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز نکاح کو قرار دیا ہے۔ حیا کے متعلق معلوم ہے کہ وہ خود ایک باطنی لباس ہے بلکہ سچ پوچھیے تو اصلی لباس یہی ہے، باطن کا یہی لباس ہے جس کے سبب سے ہم ظاہر کے لباس کو اختیار کرتے ہیں اور حیا قائم رکھنے میں جو مدد شوہر کو بیوی سے اور بیوی کو شوہر سے ملتی ہے وہ کسی چیز سے بھی نہیں ملتی۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ زینت ہے۔ یہ درجہ ستر پوشی کے بعد کا ہے۔ انسان لباس کے ذریعہ سے آرائش، حسن و جمال اور تہذیب و سلیقہ سے اپنے آپ کو آراستہ کرتا ہے اور تمدن و ترقی کے میدان میں قدم رکھتا ہے۔ غور کیجیے تو یہی چیز اس سے بلند تر درجے میں عورت کو مرد سے اور مرد کو عورت سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے علمائے عمرانیات کہتے ہیں کہ انسان نے تہذیب و تمدن کا پہلا قدم اسی دن اٹھایا جس دن پہلے مرد نے پہلی عورت سے اپنا تعلق استوار کیا۔ یہ بات اپنے اندر ایک بہت بڑی حقیقت رکھتی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ مرد کے اندر گھر در کی خواہش، تجمل و تزئین کا جذبہ، حصول مال و جائداد کا ولولہ اصلاً عورت کے تعلق ہی سے پیدا ہوا، بعد میں دوسرے عوامل کی شرکت سے اس میں اضافہ ہوا۔ اسی طرح عورت کی زینت و آرائش، اس کے سگھڑ پن اور سلیقہ اور اس کی گھر داری کے جوش و انہماک میں اصلی دخل مرد کی تسخیر کی خواہش کو ہے۔ عورت اور مرد میں سے کوئی بھی اگر اپنے اس فطری محرک سے محروم ہو جائے تو ان کے تمام مذکورہ جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔ مرد اگر بیوی سے محروم ہو تو ایک مسافر بلکہ کچھ خانہ بدوش سا بن کے رہ جاتا ہے، اسی طرح عورت اگر شوہر سے جدا یا اس سے محروم ہو تو اس کے سارے احساسات مردہ اور اس کے سارے اسلحہ زنگ آلود اور کند ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ مرد اور عورت کا باہمی ارتباط و تعلق ہی ہے جس کے صدقے میں گھریلو زندگی کی وہ تمام رونقیں اور بہاریں ہمیں نصیب ہوتی ہیں جن سے دنیا میں تہذیب و تمدن پروان چڑھتے ہیں۔

لباس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ سردی اور گرمی کی سختیوں اور دشمن کے بہت سے خطرات سے آدمی

کو محفوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (اور ہم نے اس کو ایسے لباسوں کی صنعت سکھائی جو تمہیں حملہ سے محفوظ رکھے) اخلاقی پہلو سے ٹھیک یہی حال عورت کا مرد کے لیے اور مرد کا عورت کے لیے ہے۔ عورت مرد کے لیے زرہ اور بکتر ہے اور مرد عورت کے لیے زرہ اور بکتر ہے۔ جب یہ دونوں اپنے اپنے زرہ اور بکتر سے آراستہ اور مسلح ہوں تو شیطان کے حملے ان میں سے کسی پر بھی کارگر نہیں ہوتے اور اگر وہ اس لباس سے عاری ہوں تو دونوں ہی کے لیے شیطان سے مار کھا جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ایک عارف کا قول ہے کہ بیوی کو سفر و حضر میں گلے کا تعویذ بناؤ تاکہ شیطان کے حملوں سے محفوظ رہو۔

لباس کے یہ تینوں مقصد قرآن پاک میں مذکور ہوئے ہیں اور ان تینوں ہی اعتبارات سے عورت مرد کے لیے اور مرد عورت کے لیے لباس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے، جو دین فطرت ہے، ان کے تعلق کی اس فطری اہمیت کو ملحوظ رکھا ہے اور اس کو نہ صرف یہ کہ تقویٰ کے خلاف نہیں قرار دیا بلکہ جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا ہے، اس کو مختلف اعتبارات سے تقویٰ کا معاون قرار دیا ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں مسلمانوں نے غلط فہمی کے سبب سے، یا اہل کتاب کے طریقہ سے متاثر ہو کر، اپنے اوپر اس سلسلہ میں جو پابندی عائد کر لی تھی اس آیت کے ذریعہ سے وہ دور فرما دی گئی۔

خیانت سے کیا مراد ہے

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ بعض لوگوں نے یہ گمان رکھتے ہوئے کہ رمضان میں دن کی طرح راتوں میں بھی ازدواجی تعلقات جائز نہیں ہیں، اس کی خلاف ورزی کی۔ اس چیز کو قرآن نے اپنے نفس کے ساتھ خیانت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ مشتبہ معاملات میں آدمی کو وہ پہلو اختیار کرنا چاہیے جس میں احتیاط ہو اور پھر اسی کا التزام کرنا چاہیے۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو چیز اس کے اجتہاد یا گمان میں حکم شریعت ہے (اگرچہ وہ فی الواقع شریعت کا حکم نہ ہو) اس نے اس کی خلاف ورزی کی اور یہ چیز واضح طور پر اپنے ضمیر کے ساتھ خیانت ہے۔ ہمارے نزدیک یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ مجتہد کو اپنے اجتہاد پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر ایک چیز اس کے اجتہاد کی رو سے صحیح ہے تو پھر اس کی خلاف ورزی اس کے لیے درست نہیں ہے الا آنکہ دین ہی اس کے لیے متقاضی ہو ——— مگر یہ پابندی چونکہ منشائے الٰہی کے خلاف تھی اس وجہ سے اس خیانت پر اللہ تعالیٰ نے گرفت تو فرمائی لیکن ساتھ ہی معاف بھی فرما دی اور آئندہ کے لیے واضح الفاظ میں بیویوں سے ملاقات کی اجازت دے دی۔

ازدواجی زندگی کا اصل مقصد

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (اور اللہ نے جو کچھ تمہارے لیے مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو) یعنی اولاد جو ازدواجی زندگی کا اصل مقصد ہے اس کے طالب بنو۔ اور یہ یاد رکھو کہ اس چیز کا تمام تر انحصار تقدیر الٰہی پر ہے نہ کہ تمہارے اختیار پر، اللہ کے سوا کسی اور کے تصرف پر۔ اس چیز کا حوالہ دینے سے مقصود

یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی اصل غایت صرف لذت نہیں ہے بلکہ بقائے نسل ہے جو عین منشائے الٰہی ہے
اگر آدمی صرف لذت کے درپے ہو تب تو اس کا چھاپ انسان پر بُرا پڑ سکتا ہے لیکن اگر نگاہ اصلی غایت
پر ہو تو یہ بھی عبادت ہی میں داخل ہے۔ اس زمانے میں ضبط ولادت کی تحریک اس کے بالکل برعکس
ازدواجی زندگی کے اصل مقصد کی بیخ کنی کر رہی ہے اور لذت کو اصل مقصد کی اہمیت دے رہی ہے۔

کُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (کھاؤ پیو یہاں
تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے) یہ چیز ہمارے روزوں کو اہل کتاب کے
روزوں سے بالکل الگ کر دیتی ہے۔ ان کے ہاں رات کو اٹھ کر کھانے پینے یا ازدواجی تعلقات کی اجازت
نہیں تھی۔ اسلام نے نہ صرف یہ کہ اس کی اجازت دی بلکہ اس کی تاکید کی ہے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بھی صاف
معلوم ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی یہ اجازت صبح صادق کے اچھی طرح نمایاں ہو جانے تک ہے، اسی بات کی
تائید احادیث اور صحابہؓ کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے محض احتیاط میں غلو کے سبب سے اپنے یا
دوسروں کے روزے محض معمولی تقدیم و تاخیر پر مشتبہ قرار دے بیٹھنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

قرآن کے یہ الفاظ اس قدر واضح ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کہ صحابہؓ کے دور میں ان کا مفہوم سمجھنے میں بعض
لوگوں کو زحمت کیوں پیش آئی؟ عدی بن حاتمؓ کی روایت، جو تفسیر کی کتابوں میں نقل ہے کہ انھوں نے فجر کو
پہچاننے کے لیے دو سیاہ و سفید دھاگے باندھ لیے اگر پوری طرح قابل اعتماد ہے تو اس کو محض ان کی اس
شدتِ احتیاط پر محمول کرنا چاہیے جو نئے نئے اسلام لانے والوں میں بالعموم پائی جاتی ہے۔ اس طرح کی باتوں
کو صحابہؓ کی فہم و بصیرت پر طعن کا بہانہ نہیں بنانا چاہیے۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰکِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ۔ عَکَفَ کے اصل معنی اپنے آپ کو کسی چیز سے 'اعتکاف'
روک لینے یا کسی چیز پر جما دینے کے ہیں۔ اصطلاح دین میں اس سے مراد ہر چیز سے الگ ہو کر یادِ الٰہی کے سے مراد
لیے گوشہ نشین ہو جانا ہے۔ اسی چیز کو اعتکاف کہتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ سے واضح ہے کہ رمضان
کے مہینے اور مسجد سے اس عبادت کو خاص مناسبت ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور آپ کے
ارشادات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

اعتکاف سے مقصود چونکہ تَبَتُّل اِلَی اللّٰہ ہے اور اس میں دل کی کامل یکسوئی مطلوب ہے، نیز مسجد
کا قیام اس کے لوازم میں سے ہے اس وجہ سے اس کے دوران میں بیویوں سے زن و شو کا تعلق قائم کرنے کی
اجازت نہیں ہے۔

تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے نفس کی آزادی کے لیے جو حدیں مقرر کر دی
ہیں ان کی پوری احتیاط سے نگرانی کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو ان سے بچائے رکھنے کے لیے ذرا
ان سے دور ہی دور رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ جو جانور کسی چراگاہ کے بالکل پاس پاس چرتا ہے اس کے متعلق

بڑا اندیشہ ہے کہ وہ چراگاہ کے اندر جا پڑے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ، ہم اوپر یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ جب کسی حکم کے نزول کے بعد لوگوں کے سوال پر یا محض حالات کے اقتضا کے تحت اس حکم ہی کے متعلق کچھ مزید تفصیل نازل ہوتی ہے تو اس کے بعد بالعموم یہ آیت آتی ہے۔ اسی سورہ میں اس کی بعض مثالیں آگے آرہی ہیں اس وجہ سے ہم وہاں اس کے نظائر پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس قسم کی تفصیلات سے چونکہ تقویٰ کے طالبوں کے لیے تقویٰ کی مزید راہیں کھلتی ہیں اس وجہ سے فرمایا کہ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

۶۳۔ روزے کا اثر انسان کی صلاحیتِ کار پر

اس زمانہ میں جو لوگ مغرب کے مادہ پرستانہ فلسفۂ زندگی سے متاثر ہیں وہ روزے کے خلاف یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اس سے انسان کی صلاحیتِ کار اور اس کی قوتِ کارکردگی بہت کم ہو جاتی ہے جس سے فرد اور معاشرہ دونوں کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اعتراض کرنے والے دو بنیادی حقیقتیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ ان لوگوں کی نظر میں انسان کی جو کچھ قدر و قیمت ہے وہ محض اس کے مادی وجود کی ہے۔ اس کے روحانی وجود کی ان کی نگاہوں میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ان کے نزدیک جس طرح ایک فربہ بیل زیادہ ہل چلا سکتا ہے اسی طرح ایک آسودہ اور پیٹ بھرا آدمی زیادہ کام کر سکتا ہے۔ یہ لوگ سیدنا مسیحؑ کی اس حکمت سے بالکل ناآشنا ہیں کہ "آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔" اسی طرح یہ لوگ اس حقیقت سے بھی بالکل بے بہرہ ہیں جس کی طرف ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے۔ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ میں اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ ایک کھلانے والا مجھے کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا مجھے پلاتا ہے۔

انسان اگر صرف گوشت پوست کا مجموعہ ہے تب تو بلا شبہ ان معترضین کے اعتراض کے اندر کچھ وزن ہے لیکن اگر انسان کے اندر روح نامی کوئی شے بھی ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کی تازگی و توانائی کے لیے بھی کوئی غذا اور تدبیر ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کیا یہی دودھ مکھن، جن سے ہمارے جسم کی پرورش ہوتی ہے اس کے لیے بھی کافی ہیں یا اس کے لیے کسی اور تدبیر و غذا کی ضرورت ہے؟ مذہب اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ انسان کے اندر روح کا جوہر ارضی نہیں بلکہ آسمانی اور خدائی ہے اس وجہ سے اس کی غذا اس زمین سے نہیں بلکہ خدا کے تعلق و توصل اور اس کے کلام و الہام سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا تعلق خدا سے قریب تر اور قوی تر اس وقت ہوتا ہے جب یہ جسم کے لیے جو اس کے لیے صرف ایک مرکب کی حیثیت رکھتا ہے تقاضوں، اس کی خواہشات اور اس کے جذبات و میلانات سے فی الجملہ آزاد ہوتی ہے۔ جب تک یہ ان سفلی پابندیوں

میں گرفتار رہتی ہے اس وقت تک یہ ان بلندیوں میں پرواز نہیں کر سکتی جو اس کی فطرت کے لحاظ سے اس کی اصلی جولانگاہ ہیں اور جن میں پرواز کرنے ہی سے اس کے وہ شاہینی کارنامے ظہور میں آتے ہیں جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔

روزہ روح کو یہ آزادی دلانے کا سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ہے۔ اس سے انسان کے نفس کی جو تربیت ہوتی ہے اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ روح پر خواہشات و شہوات کا غلبہ کمزور ہو جاتا ہے، انسان کی قوتِ ضبط اور اس کی قوتِ ارادی مضبوط ہو جاتی ہے اور اس طرح اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ایک فرمانبردار غلام کی طرح ہاتھ باندھے ہوئے اپنی خواہشوں کے پیچھے پیچھے چلے وہ ایک صاحبِ عزم و ایمان کی طرح اپنی خواہشات و جذبات کو اپنے رب کی رضا اور اس کے احکام کے پیچھے لگا دیتا ہے۔

غور کیجیے تو یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گی کہ انسان کے اندر قوت اور طاقت کا اصلی خزانہ اس کے جسم کے اندر نہیں بلکہ اس کے دل اور اس کی روح کے اندر ہے۔ اگر دل کمزور اور روح پراگندہ ہو تو نہایت راحت و تنعم میں پلے ہوئے جسموں کا حال یہ ہوتا ہے کہ گویا وہ لکڑی کے کندے ہیں جن کو خوب صورت پوشاک پہنا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور ان کے خوف و بزدلی کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ، دنیا کے کسی گوشہ میں بھی کوئی خطرہ نمودار ہو ان کے دل دھڑکنے لگتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ بجلی ہمارے ہی خرمن پر گرنے والی ہے۔ برعکس اس کے جن کی روح بیدار، جن کے دل پُرعزم اور جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں وہ نانِ جویں پر گزارہ کر کے بھی بازوئے حیدرؓ کے کارنامے دکھاتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا ہے كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آ گئیں۔ اور اسی چیز کی طرف شاعر نے بھی اشارہ کیا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دوسری حقیقت جس سے یہ معترضین غفلت برت رہے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی چیز کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے وقتی اثرات و نتائج سے نہیں لگایا جاتا ہے بلکہ اس مستقل اور پائیدار اثر سے اس کا اندازہ کیا جاتا ہے جو زندگی پر اس کا پڑتا ہے یا متوقع ہوتا ہے بشرطیکہ صحیح طور پر اس کو برتا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دوا تقویتِ قلب و دماغ کے لیے نہایت مفید و مجرب ہو، اس کے اثرات نہایت پائیدار مترتب ہوتے ہوں، لیکن فوری طور پر اس کا ردِ عمل سستی یا اعضا شکنی یا خمار کی صورت میں نمایاں ہوتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس دوا کے اس فوری اثر کو دلیل قرار دے کر اس کو ایک مضر یا بے قیمت دوا قرار دے دینا کسی طرح بھی صحیح

نہیں ہے۔

ٹھیک یہی حال روزے کا ہے۔ اس کا فوری اثر ـــــ خاص طور پر خام اور نو مشق لوگوں پر ـــــ تو ضرور کسل اور اضمحلال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس سے وقتی طور پر ان کی صلاحیتِ کار بھی متاثر ہوتی ہے لیکن دیکھنے کی چیز اس کا یہ وقتی اثر نہیں ہے بلکہ وہ پائیدار اثر ہے جو انسان کے ظاہر و باطن پر (بشرطیکہ اس کو ٹھیک ٹھیک برتا جائے) اس کا مترتب ہوتا ہے۔

روزے کے لیے عربی میں، جیسا کہ آپ اوپر پڑھ آئے ہیں، صوم کا لفظ ہے۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق کے سلسلہ میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ ابتداءً یہ لفظ ان گھوڑوں کے لیے استعمال ہوا جن کو جوانی پر آنے کے بعد، جنگ کے لیے تیار کیا جاتا اور اس تیاری کے لیے بتدریج ان کا چارہ اور دانہ کم کیا جاتا تاکہ ان کا بدن بھاگ دوڑ کے لیے سبک نکل آئے اور وہ میدانِ جنگ کی سختیوں اور بھوک پیاس کی مشقتوں کو برداشت کرنے کے اچھی طرح قابل ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ گھوڑوں پر یہ عمل اس لیے نہیں کیا جاتا تھا کہ اس سے ان کی قوتِ کارکردگی کم ہو جائے بلکہ مقصود اس سے ان کی قوتِ کارکردگی کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا ہوتا تھا تاکہ وہ اپنے مقصدِ تخلیق کے لیے پوری طرح کار آمد ہو جائیں۔ ایک پلے ہوئے گھوڑے پر اگرچہ اس ٹریننگ کا فوری اثر اچھا نہیں پڑتا، وہ کمزور اور لاغر ہو جاتا ہے، لیکن ٹریننگ دینے والے اس کے اس پائیدار اثر کو نگاہ میں رکھتے ہیں جو گھوڑے کو ہر سختی و نرمی کے برداشت کے قابل بنا دیتا ہے اور جس سے وہ تھان پر بندھے ہوئے ایک پرخور جانور کے بجائے میدانِ جنگ کا ایک سخت کوش اور جاں باز سپاہی بن جاتا ہے۔

یہی صوم (روزہ) ہے جو مذہب نے انسانوں کی ظاہری و باطنی تربیت کے لیے تجویز فرمایا ہے اور مقصود اس سے ان کی صلاحیتِ کار کو ضعیف کرنا نہیں ہے بلکہ اس صلاحیتِ کار کو صبر اور تقویٰ کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ مستحکم کر دینا ہے تاکہ انسان حق کی مخالف طاقتوں کے مقابل میں، خواہ یہ طاقتیں شیطانی ہوں یا انسانی، جہاد کا اہل ہو سکے۔ قرآن اور حدیث پر نگاہ رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ روزے کے بنیادی مقصد دو بیان کیے گئے ہیں۔ تقویٰ اور صبر۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی زندگی کے ہر مرحلہ میں اور ہر قسم کے حالات میں اپنے نفس کو حدودِ الٰہی کا پابند رکھے۔ صبر یہ ہے کہ اس راہ میں خارج سے یا اس کے اپنے باطن سے جو مشکلات و موانع بھی سر اٹھائیں ان کا پورے عزم و جزم کے ساتھ مقابلہ کرے اور ان کے آگے سپر انداز نہ ہو۔ یہ جہاد زندگی بھر کا جہاد ہے۔ رمضان کے مہینہ میں ہر مسلمان اسی جہاد کی ٹریننگ حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ اس کا امکان ہے کہ نئے نئے بھرتی ہونے والوں پر اس ٹریننگ کا فوری اثر اضمحلال اور ضعف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہو۔ لیکن دیکھنے کی چیز یہ فوری اثر نہیں بلکہ اس کا مستقل اثر ہے۔ اس کا مستقل اثر یقیناً، اس کو صحیح طور پر برتنے کی شکل میں، یہی ہونا چاہیے کہ انسان کی بلادت کم ہو، اس کی روح قوی ہو، اس کا دل توانا ہو، اس کی قوتِ ارادی مضبوط ہو، اس کی قوتِ برداشت بڑھ جائے، وہ جہادِ زندگانی اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پوری طرح تیار ہو جائے۔

غور کیجیے کہ یہ انسان کی صلاحیتِ کار کا گھٹتا ہے یا بڑھتا؟ ہمارے نزدیک تو جن کے اندر یہ صفات ہوں وہی درحقیقت انسانیت کے گل سرسبد ہیں۔ جن میں یہ صفات نہیں وہ آدمی نہیں بلکہ گاڈر پرواری ہیں۔

۶۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیت ۱۸۸

روزے سے آگے اور پیچھے کے احکام میں مناسبت

اوپر ہم یہ اشارہ کر آئے ہیں کہ روزے کے حکم سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی عزیزوں اور رشتہ داروں کے حقوق اور دوسروں کے اموال و املاک غصب کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس سے شریعت کے نظام میں روزے کا مقام واضح ہوتا ہے کہ اس عبادت کا اصل مقصود حرص و طمع، بخل اور لالچ اور اس قبیل کی دوسری بیماریوں پر قابو پانا ہے۔ ان پر قابو پانے ہی سے انسان کے اندر وہ تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو حقوق و معاملات میں اس کو عدل پسند اور محتاط بناتا ہے۔ گویا جن چیزوں سے بچتے رہنے کی ہدایت کی ان سے نفس کو بچانے میں جو تدبیر سب سے زیادہ کارگر ہو سکتی ہے اس کی طرف بھی رہنمائی فرما دی۔

مزید غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی واضح ہوگی کہ روزے کے بیان سے پہلے تو حق داروں کے لیے وصیت کرنے کی، اس وصیت میں عدل و انصاف اور پھر اس وصیت کے، ایمان داری کے ساتھ، اجرا و نفاذ کی ہدایت کی اور روزے کے بیان کے بعد رشوت کے ذریعہ سے حکام کو خریدنے اور اس چیز کو دوسروں کے حقوق کے غصب کا ذریعہ بنانے کی ممانعت فرمائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ایمان باللہ کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک وہ شرک کی ملاوٹ سے پاک ہے، جہاں اس میں شرک ملا زندگی کے لیے اس کی ساری افادیت ختم ہوئی اسی طرح قانون کی ساری افادیت اسی وقت تک ہے جب تک قانون کے نفاذ کے لیے دیانت دار حکام موجود ہیں اور معاشرہ رشوت کی بیماری سے پاک ہے، جہاں رشوت معاشرے میں رواج پائی بس قانون کی افادیت کا جنازہ نکلا۔ اس وضاحت کی روشنی میں غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ گویا ایک ہی حکم کے دو پہلو یہاں مذکور ہوئے۔ ایک کا ذکر روزے سے پہلے کیا، دوسرے کا بعد میں اور روزے کا ذکر دونوں کے بیچ میں رکھ دیا تاکہ نظمِ کلام ہی سے یہ بات واضح ہو جائے کہ جو شخص اپنے آپ کو ان مطامع اور ان خواہشات پر غالب کرنا چاہتا ہے وہ اپنے نفس کی تربیت روزے سے کر کے یہ چڑھائی چڑھ سکتا ہے۔

اس روشنی میں اب آگے کی آیت تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

آیت ۱۸۸

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع ۲۳

ترجمۂ آیت ۱۸۸

اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ اور اس کو حکام رسی کا ذریعہ

نہ بناؤ کہ اس طرح دوسروں کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کرکے ہڑپ کر سکو۔ درانحالیکہ تم اس حق تلفی کو جانتے ہو۔

۶۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اکلِ اموال بالباطل کا مطلب — "وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" اکلِ اموال سے مراد مجرد کھانا نہیں بلکہ اس کا ناجائز استعمال و تصرف ہے۔ باطل حق کا ضد ہے، جس طرح حق کا لفظ، جیساکہ ہم واضح کر چکے ہیں، مختلف معنوں میں آتا ہے اسی طرح اس کا ضد بھی مختلف معنوں میں آتا ہے۔ باطل ایک تو عبث اور بے مقصد کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا " (۱۹۱۔ آل عمران) پروردگار تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں بنایا ہے) اس کے دوسرے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جس کی عقل یا فطرت یا شریعت کے اندر کوئی بنیاد نہ ہو۔ مثلاً وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ ۵ غافر (اور انھوں نے باطل کے ذریعہ سے مخالفت کی تاکہ اس سے حق کو پسپا کریں) اسی طرح باطل اس طریقہ کو کہتے ہیں جو عدل و انصاف، شریعت، معروف اور سچائی کے خلاف ہو۔ اس کے تحت جھوٹ، خیانت، غصب، رشوت، سود، سٹہ، جوا، چوری اور معاملات کی وہ ساری قسمیں آتی ہیں جن کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ کہی گئی ہے۔ دوسرے مقامات میں اس کی تفصیل آگئی ہے اور پھر مزید تفصیل احادیث میں ہے۔ اسلام میں تمام معاملات کی بنیاد اسی اصول پر ہے۔

ادلاء کا مفہوم — وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ۔ اِدلاء کے اصل معنی کنوئیں میں ڈول ڈالنے کے ہیں۔ مثلاً فرمایا ہے فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ (یوسف) یہیں سے اس کے اندر رسائی اور قربت حاصل کرنے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ جس طرح رسّی کے ذریعہ سے ڈول پانی تک پہنچتا ہے اسی طرح مال رشوت بھی حکام تک رسائی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ فرمایا کہ دوسروں کا مال ہڑپ کرنے کے لیے مال کو حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ اس لیے کہ رشوت حصولِ مال کا جائز ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ اثم یعنی گناہ، حق تلفی اور غصب حقوق کا راستہ ہے وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی اس کا گناہ اور حق تلفی ہونا تمھیں معلوم ہے۔ تمام دنیا کے معروف اور ہر دین و شریعت میں اس کا گناہ ہونا مسلم رہا ہے، عقل کے نزدیک بھی اس کا گناہ ہونا ایک امر بدیہی ہے۔

اس جملہ کا عطف پہلے جملہ پر ہے اور چونکہ یہ پہلے جملے ہی کی وضاحت کر رہا ہے اس وجہ سے اس میں حرف "لا" کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اسی سورہ کی آیت ۴۲ کے تحت ہم اس اسلوب کی بقدرِ ضرورت تشریح کر چکے ہیں۔

یہ آیت رشوت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالتی ہے۔

رشوت کی حرمت کے مختلف پہلو

ایک تو یہ کہ یہ ناجائز طریقہ سے دوسروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ چنانچہ یہاں دوسروں کا مال ناجائز طریقہ سے کھانے کی ممانعت کے بعد خاص طور پر اسی چیز کا ذکر کیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ قانون، جو لوگوں کے حقوق کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس کی افادیت کا تمام تر انحصار جیسا کہ ہم نے فصل کے شروع میں اشارہ کیا حکام کی راست روی اور دیانت پر ہے۔ وہی قانون کے اصلی محافظ ہیں، اس وجہ سے اگر ان کو کسی ذریعہ سے بددیانت بنا دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اب حقوق بکاؤ مال ہیں جس کے پاس پیسے ہوں وہ ان کو خرید سکتا ہے۔ رشوت حکام کو بددیانت بنانے کا ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ کارگر حربہ ہے۔

دوسرا یہ کہ رشوت کی گرم بازاری میں سب سے زیادہ مؤثر عامل خود معاشرہ ہے۔ جب لوگوں میں دوسروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی غرض پوری کرنے کے لیے رشوت کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس طرح حکام کے منہ کو خون لگا دیتے ہیں۔ پھر جب ان کے منہ رشوت کا خون لگ جاتا ہے تو وہ اس کے ایسے رسیا ہو جاتے ہیں کہ وہ رشوت لیے بغیر لوگوں کو خود ان کے واجبی حقوق بھی نہیں دیتے۔ اس وجہ سے اسلام نے سب سے پہلے خود معاشرے کو یہ راہ اختیار کرنے سے روکا ہے کہ اپنے ہی پہرہ داروں کو خود اپنی ہی بدآموزی سے چور نہ بناؤ۔ اور اس معاملہ میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ حکام کو تحفے اور ہدیے پیش کرنے اور ان کے لیے ان کے قبول کرنے کو بھی، جیسا کہ احادیث سے واضح ہے، پسند نہیں کیا اس لیے کہ یہ بھی رشوت کا ایک چور دروازہ ہے۔

تیسرا یہ کہ رشوت کا گناہ ہونا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس کو سب جانتے ہیں، عقل اس کی گواہ ہے، فطرت انسانی اس کی شاہد ہے، دنیا کا معروف اس پر حجت ہے اور تمام مذاہب و ادیان اس کی حرمت پر متفق ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (اور تم اس بات کو جانتے ہو)

۶۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۸۹-۲۰۳

اوپر روزے کے بیان کے ساتھ جس پہلو سے ضمناً لوگوں کے مال ہڑپ کرنے اور اس کے لیے رشوت کو ذریعہ بنانے کی ممانعت کا ذکر آیا ہے، اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ اب آگے حج اور جہاد کا بیان آ رہا ہے جن کی مناسبت روزے کے ساتھ کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے۔

حج بھی درحقیقت ایک جہاد ہے اور جہاد صبر و برداشت کی جن صفات کا متقاضی ہے وہ سب سے بہتر طریقہ پر روزے سے پیدا ہوتی ہیں۔ حج کے بیان کے سلسلہ میں سب سے پہلے ان محترم مہینوں کے احکام و آداب سے متعلق لوگوں کے سوال کو نقل کیا ہے جو حج و عمرہ کے لیے مخصوص اور اشہر حرم

کے نام سے معروف ہیں۔ یہ سوال لوگوں کے ذہنوں میں اس وجہ سے پیدا ہُوا ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو امتِ مسلمہ کا قبلہ اور کفار کے قبضہ سے اس کو آزاد کرانا ضروری قرار دیا ہے، جیسا کہ قبلہ کی بحث میں (آیات ۱۴۲ - ۱۶۰) گزر چکا ہے، تو اس سے لازم آتا ہے کہ حج کے لیے جہاد کے مرحلہ سے گزرنا پڑے گا۔ پھر اس جہاد کے تعلق سے کئی سوالات پیدا ہوتے۔ مثلاً یہ کہ اس جہاد کی نوبت محترم مہینوں میں آئے تو اس کا حکم کیا ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہُوا کہ ان محترم مہینوں میں جنگ ہمیشہ سے ممنوع رہی ہے، زمانہ جاہلیت میں بھی عرب ان کا پورا احترام کرتے رہے ہیں اور اسلام نے بھی ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح یہ سوال بھی پیدا ہُوا کہ اگر اس جنگ کی نوبت عین حرم اور حدودِ حرم میں پیش آئے تو اس کا حکم کیا ہوگا؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہُوا کہ حرم میں جنگ تو درکنار اس میں کسی جاندار کو چھیڑنے کی بھی زمانہ قدیم سے ممانعت تھی۔ اسی طرح جہاد کے تعلق سے انفاق کا سوال بھی سامنے آیا اس لیے کہ جہاد ممکن نہیں ہے جب تک کہ لوگ جان کے ساتھ ساتھ اپنے مال بھی پوری فیاضی سے راہِ خدا میں خرچ کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ انفاق اس انفاق سے زائد ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس طرح گویا حج کے مسئلہ نے اپنے اندر حج کے مسائل و احکام کے ساتھ ساتھ گوناگوں سوالات وقت کے مخصوص حالات کی بنا پر جہاد، اشہرِ حُرم اور انفاق وغیرہ سے متعلق بھی جمع کر لیے۔ ایک ظاہر بین جب ان مختلف قسم کے مسائل کو ایک دوسرے کے ساتھ الجھا ہُوا دیکھتا ہے تو اس کو کلام میں بے ربطی معلوم ہوتی ہے لیکن اگر کوئی شخص اس زمانہ کو پیش نظر رکھ کر اس پورے سلسلہ پر غور کرے جس زمانہ میں یہ احکام اترے ہیں تو اس کو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ یہ ساری باتیں ایک ہی سلسلہ کی مربوط کڑیاں ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ آیات ۱۸۹-۲۰۳
وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِھَا
وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ
يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾
وَاقْتُلُوْھُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَاَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَيْثُ
اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْھُمْ عِنْدَ

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ
كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾
وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ
انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ
بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ
فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا
تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۛ وَاَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ
فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ
الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ
رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۟
فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا
رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ
حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ ع ٢٣ ٨
الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ؗ وَاتَّقُوْنِ
يٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ
رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ
الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ
الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا
اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا
اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ
يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ
النصف حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ
وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِىْۤ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ
فَمَنْ تَعَجَّلَ فِىْ يَوْمَيْنِ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ
اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

ترجمہ آیات ۱۸۹-۲۰۳

وہ تم سے محترم مہینوں کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو یہ لوگوں کے فوائد اور حج کے اوقات ہیں۔ اور تقویٰ یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو بلکہ تقویٰ ان کا تقویٰ ہے جو حدود الٰہی کا احترام ملحوظ رکھیں۔ گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۱۸۹

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کریں اور حد سے بڑھنے والے نہ بنو۔ بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور ان کو جہاں کہیں تم پاؤ قتل کرو اور ان کو وہاں سے نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس خود پہل کر کے جنگ نہ کرو جب تک وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں۔ پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان کو قتل کرو، یہی کافروں کا بدلہ ہے۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہ جائے اور دین اللہ کا ہو جائے۔ اور اگر یہ باز آجائیں تو پھر اقدام صرف ان کے خلاف جائز ہے جو ظالم ہیں۔ ۱۹۰-۱۹۳

شہر حرام، شہر حرام کا بدلہ ہے اور اسی طرح دوسری محترم چیزوں کا بھی قصاص ہے، تو جو تم پر زیادتی کریں تم بھی ان کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر ان کو جواب دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ اللہ حدودِ الٰہی کا احترام کرنے والوں کے ساتھ ہے ۱۹۴

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو تباہی میں نہ جھونکو۔ اور انفاق خوبی کے ساتھ کرو، بے شک اللہ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ۱۹۵

اور حج و عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو۔ پس اگر تم گھر جاؤ تو جو ہدی میسر ہو وہ پیش کرو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک ہدی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ جو تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو اس کے لیے روزے یا صدقہ یا قربانی کی شکل میں فدیہ ہے۔ جب اطمینان کی حالت ہو تو جو کوئی حج تک عمرہ سے فائدہ اٹھائے تو وہ قربانی پیش کرے جو میسر آئے۔ جس کو میسر نہ آئے تو وہ تین دن کے روزے دورانِ حج میں رکھے اور سات

دن کے روزے واپسی کے بعد، یہ کل دس دن ہوئے۔ یہ ان کے لیے ہے جن کا گھر در بجوارِ حرم میں نہ ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اچھی طرح جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۱۹۶

حج کے متعین مہینے ہیں تو جو کوئی ان میں حج کا عزم کرے تو پھر اس کے لیے حج میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی ہے، نہ فسق و فجور کی، نہ لڑائی جھگڑے کی۔ اور نیکی کے جو کام بھی کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے اور اس کے لیے تقویٰ کا زادراہ لو۔ بہترین زادِ راہ تقویٰ کا زادِ راہ ہے اور مجھ سے ڈرتے رہو، اے عقل والو۔ ۱۹۷

اس امر میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے رب کے فضل کے طالب بنو۔ پس جب عرفات سے چلو تو خدا کو یاد کرو مشعرِ حرام میں ٹھہر کر اور اس کو اس طرح یاد کرو جس طرح خدا نے تم کو ہدایت کی ہے۔ اس سے پہلے بلاشبہ تم گمراہوں میں تھے۔ ۱۹۸

پھر تم بھی وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلیں اور اللہ سے گناہوں کی معافی مانگو، بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ۱۹۹

پھر جب تم حج کے مناسک ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو، جس طرح تم پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے رہے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں کامیابی عطا کر، حالانکہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور کچھ ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی کامیابی عطا فرما اور آخرت میں بھی اور دوزخ کے عذاب سے بچا۔ یہی لوگ ہیں جن کو ان کے کیے کا حصہ ملنا ہے اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔ ۲۰۰-۲۰۲

اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔ سو جو دو ہی دنوں میں اٹھ کھڑا ہوا اس پر کوئی گناہ

نہیں اور جو ٹھہر رہے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ رعایت ان کے لیے ہے جو تقویٰ کو ملحوظ رکھیں۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ تم اسی کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے۔ ۲۰۳

۶۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّةِ ؕ قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۱۸۹)

اَھِلَّۃٌ ہلال کی جمع ہے۔ ہلال شروع ماہ کے چاند کو بھی کہتے ہیں اور اس سے مراد مہینہ بھی ہوتا ہے۔ خاص طور پر جمع کی صورت میں تو اس کا استعمال مہینوں ہی کے لیے معروف ہے۔ اہلہ پر الف، لام اس بات کی دلیل ہے کہ سوال کچھ مخصوص مہینوں سے متعلق ہے اور سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال اشہر حرم اور ان کے احکام و آداب سے متعلق تھا۔ چنانچہ آگے کی آیات میں اس سوال کے جو جواب دیے ہیں وہ تمام تر حج اور اشہر حرم ہی سے متعلق ہیں۔ قرآن مجید میں، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، سائلوں کے سوالات چونکہ اجمال و اختصار کے ساتھ نقل ہوئے ہیں اس وجہ سے عام اہل تاویل کو یہ گمان ہوا کہ یہ سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق تھا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس کے صحیح نہ ہونے کے مختلف وجوہ ہیں جن میں سے بعض کا ہم ذکر کریں گے۔

(حاشیہ: اہلۃ سے مراد — سوالات نقل کرنے میں قرآن کا طریقہ)

اول یہ کہ اس قسم کا سائنسی اور فلکیاتی سوال عربوں کے مذاق اور ان کی عام افتاد مزاج کے خلاف ہے۔ اہل عرب سورج اور چاند کو خدا کی مخلوق اور اس کے قانون طبیعی کے تحت ان کو مسخر اور محکوم مانتے تھے پھر اس نامعقول سوال کی کیا گنجائش تھی کہ چاند گھٹتا بڑھتا کیوں ہے؟ وہ خود سمجھ سکتے تھے کہ یہ سوال پیغمبر کو زیر بحث کرنے والا نہیں بن سکتا، وہ بڑی آسانی سے اس کا جواب یہ دے سکتے ہیں کہ یہ خدا کے حکم سے گھٹتا بڑھتا ہے اور یہ اس کے مسخر و محکوم ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ یہ جواب اس سے پہلے مختلف اسلوبوں اور شکلوں میں مکی سورتوں میں دیا بھی جا چکا تھا بلکہ وہ دلیلیں بھی ان کے سامنے موجود تھیں جو چاند کے طلوع و غروب سے حضرت ابراہیم نے توحید کے حق میں نکالی تھیں۔ پھر اس قسم کے سوال کا کیا موقع تھا۔

دوسری یہ کہ یہاں سیاق و سباق دلیل ہے کہ سوال عام عربوں یا اہل کتاب کی طرف سے نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی طرف سے ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے چاند یا سورج کے گھٹنے بڑھنے کا سوال ایک بالکل ہی بعید از قیاس سوال ہے۔ وہ سوال کر سکتے تھے تو مہینوں کے احکام و آداب سے متعلق کر سکتے تھے نہ کہ ایک بالکل ہی غیر ضروری اور لایعنی سوال۔

تیسری یہ کہ اگر سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق ہوتا تو یہ یوں نقل ہوتا کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْهِلَالِ (وہ تم سے چاند کے بابت سوال کرتے ہیں) یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ کے الفاظ نہ ہوتے کیونکہ اس کے معروف معنی تو جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہوں گے کہ وہ تم سے مخصوص مہینوں کی بابت سوال کرتے ہیں۔

چوتھی یہ کہ قرآن نے یہ سوال نقل کر کے اس کے جو جوابات دیے ہیں وہ تمام تو جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا، حج اور اشہرِ حرم کے احکام و آداب ہی سے متعلق ہیں، ان میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علت کی طرف نہیں ہے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ قرآن نے ان کے اس سوال کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اس وجہ سے اس سے بالکل صرفِ نظر کر کے ان کو مہینوں سے متعلق کچھ مفید باتیں بتا دیں تو کم از کم یہاں کوئی اشارہ اس بات کی طرف ضرور ہونا تھا کہ لوگوں کو غیر ضروری سوالات نہیں کرنے چاہئیں جیسا کہ دوسرے بعض مقامات پر اس قسم کی تنبیہ لوگوں کو کی گئی ہے۔

سوالِ شہرِ محرم سے متعلق تھا

بہرحال ہمارے نزدیک اس سوال کا کوئی تعلق بھی چاند اور اس کے اتار چڑھاؤ سے نہیں ہے بلکہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان محترم مہینوں سے اس کا تعلق ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے محترم چلے آ رہے تھے اور جن میں لڑنا بھڑنا جاہلیت کے زمانے میں بھی حرام سمجھا جاتا تھا۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوا کہ خانۂ کعبہ کے قبلہ قرار پا جانے اور کفار کے قبضہ سے اس کا چھڑانا ضروری ہو جانے کے بعد ان کے احترام کے ملحوظ رکھنے کے حدود و قیود کیا ہوں گے؟ اس سوال کو قرآن نے اجمال کے ساتھ نقل کر کے اس کا تفصیل کے ساتھ جواب دیا ہے اوپر آیت ۱۰۸ کے تحت ہم یہ اشارہ کر آئے ہیں کہ قرآن میں بالعموم لوگوں کے سوالات نہایت اختصار کے ساتھ نقل ہوتے ہیں اور یہی بلاغت کا تقاضا ہے۔ کیونکہ سوال کی اصل نوعیت تو خود اس جواب ہی سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے جو اس کے بعد دیا جاتا ہے، پھر سوال کے نقل کرنے میں طولِ بیان کی کیا ضرورت ہے؟ یہی اسلوب عربی زبان میں پسندیدہ اسلوب ہے، دوسری زبانوں میں بھی ماہرینِ زبان کا معروف طریقہ یہی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قرآن میں اس اختصار کی وجہ سے لوگوں کو تاویل میں الجھنیں پیش آئیں۔ بہت سے لوگوں نے سوال کی نوعیت جواب سے متعین کرنے کے بجائے خود سوال کے مجمل الفاظ سے کرنے کی کوشش کی اور اس طرح انھوں نے سوال اور جواب میں 'سوال از آسمان جواب از ریسمان' کی شترگربگی پیدا کر دی۔ لیکن یہ قرآن کا قصور نہیں ہے بلکہ تاویل کرنے والوں کا اپنا قصور ہے۔

قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ، یہ سوال کے جواب کا ایک حصہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ محترم مہینے لوگوں کی عوامی بہبود اور خاص کر حج و عمرہ کی سہولتوں کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ ہم اوپر قبلہ کی بحث میں یہ وضاحت کر آئے ہیں کہ اشہرِ حرم نہ صرف عبادت کے نقطۂ نظر سے اہلِ عرب کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے بلکہ ان کی معاشی و تجارتی سرگرمیوں کا تمام تر انحصار بھی انھیں مہینوں پر تھا۔ اہلِ عرب زمانہ جاہلیت

میں سارا سال لڑنے بھڑنے میں گزارتے اس وجہ سے ملک میں تجارتی نقل و حرکت تقریباً معطل رہتی۔ یہ حرمت اشہر حرم کا فیض تھا کہ سال میں پورے چار مہینے امن و امان سے گزرتے اور ان مہینوں میں اہل ملک حج و عمرہ کی برکتوں سے بھی سعادت اندوز ہوتے اور ملک و بیرون ملک کی تجارتی منڈیوں تک بھی بغیر کسی خطرہ کے پہنچتے اور ان سے لین دین کرتے، بالخصوص قریش کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے تو یہ مہینے گویا بہار کے مہینے تھے۔ سارا عرب ان مہینوں میں مکہ کا رخ کرتا اور یہ وادی غیر ذی زرع سارے ملک کی تجارت کا مرکز بن جاتی۔ خانہ کعبہ اور اشہر حرم کی روحانی برکتوں کے ساتھ ساتھ قرآن نے ان کی ان مادی برکتوں کا بھی جگہ جگہ ذکر کیا ہے اور قریش کو اپنے اس احسان عظیم کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف یہاں مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ یعنی ان محترم مہینوں کے اندر لوگوں کے لیے گوناگوں فوائد و مصالح مضمر ہیں اس وجہ سے ان کا احترام ہر حال میں ملحوظ رہنا چاہیے۔ اس عام فائدے کے ذکر کے بعد اس کے خاص فائدہ — حج — کا بھی ذکر فرمایا کہ یہی مہینے ہیں جن میں لوگ امن و امان کے ساتھ اس سنت ابراہیمیؑ کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ یہ پہلو بھی خاص طور پر ان کی حرمت کا متقاضی ہے۔

ایک تجدیدی اصلاح

اہل عرب کی حج کے سلسلہ کی بدعتیں

"وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ" یہ حج کے ذکر کے ساتھ اسی طرح کی ایک تجدیدی اصلاح و تنبیہ ہے جس طرح کی اصلاحی و تجدیدی تنبیہ و تذکیر آیت ۱۷۷ میں دین کی بنیادی باتوں کے ذکر کے ساتھ گزر چکی ہے کہ تقویٰ یہ نہیں ہے کہ تم مشرق و مغرب کی طرف رخ کرو بلکہ تقویٰ ان کا تقویٰ ہے جو ایمان لائیں ..... یہاں ارشاد ہوا کہ تقویٰ یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو بلکہ تقویٰ ان کا تقویٰ ہے جو حدود الٰہی کا احترام ملحوظ رکھیں۔ امتوں کی یہ عام بیماری رہی ہے کہ آہستہ آہستہ لوگ دین کے اصل احکام و فرائض تو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور ان کی خانہ پری بدعات و رسوم سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اہل عرب پر بھی یہی گزری۔ یہ لوگ حج تو زمانہ جاہلیت میں بھی کرتے رہے لیکن اس کی اصل روح سے اس کو بالکل خالی کر کے اور رسوم و اوہام کا ایک گورکھ دھندا بنا کر۔ انہی جملہ انھوں نے حج کے سلسلہ میں یہ بدعت ایجاد کر لی تھی کہ حج کے لیے احرام باندھ چکنے کے بعد اگر انھیں گھروں میں داخل ہونے کی ضرورت پیش آتی یا حج کے بعد جب گھروں کو واپس ہوتے تو ان دروازوں سے گھروں میں داخل نہ ہوتے جن دروازوں سے نکلتے بلکہ مکانوں کے پچھواڑوں سے کسی دوسرے راستے سے داخل ہوتے۔ اس عجیب و غریب حرکت کا محرک یہ وہم رہا ہو گا کہ جن دروازوں سے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے نکلے ہیں، پاک ہو جانے کے بعد انھی دروازوں سے گھروں میں داخل ہونا خلاف تقویٰ ہو گا۔ یہ وہم اسی طرح کا ایک وہم تھا جس طرح کے وہم میں وہ طواف کے معاملہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بہت سے عرب جاہلیت میں ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔ غالباً ان کا خیال یہ رہا ہو گا کہ لباس، جو زینت و آرائش کی چیزوں میں داخل ہے، اس کی کوئی دھجی بھی زہد و رہبانیت کی اس عبادت میں جسم سے لگی کیوں رہ جائے۔

قرآن نے اس بدعت کی تردید کی اور فرمایا کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو اس سے تقویٰ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا البتہ آخرت کی فلاح اور خدا کی خوشنودی مطلوب ہے تو اس کے حدود کی پاسداری ملحوظ رکھو اور اس سے برابر ڈرتے رہو۔ حج سے اصل مقصود یہی تقویٰ ہے۔

شہر حرام میں دفاعی جنگ جائز ہے

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (۱۹۰)

یہ مسلمانوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ اگر حج کے سلسلہ میں جنگ کی نوبت آجائے تو اشہر حرم میں دفاعی جنگ جائز ہے۔ البتہ حدود سے تجاوز اللہ کو پسند نہیں ہے۔ یعنی نہ تو یہ بات جائز ہے کہ تم خود اشہر حرم میں جنگ کے لیے پہل کرو اور نہ یہ جائز ہے کہ مدافعت کے لیے جتنی کارروائی ضروری ہے، اس سے آگے کوئی قدم اٹھاؤ البتہ مدافعت کرنے کے تم پورے طور پر مجاز ہو، اشہر حرم یا خود حرم کا احترام اس میں کسی پہلو سے مانع نہیں ہے بلکہ یہ عین ان کے احترام کا تقاضا ہے۔ اس نکتہ کی تفصیل آگے کی آیات میں آرہی ہے۔

حج کے ذکر کے ساتھ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہوئی کہ اس وقت تک حرم پر مشرکین کا قبضہ تھا اس وجہ سے اس بات کا اندیشہ نہایت قوی تھا کہ اگر مسلمان حج کے لیے جائیں گے تو کفار روکیں گے اور جنگ کی نوبت آجائے گی۔ بالخصوص جب کہ مشرکین پر اس دوران میں یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی کہ مسلمانوں نے بیت اللہ کو اپنا قبلہ قرار دے لیا ہے اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بنائے ہوئے اس گھر کی تولیت کے اصلی وارث وہی ہیں۔ ایسی حالت میں یہ ضروری ہوا کہ مسلمانوں کو حرم اور اشہر حرم کے احکام و آداب سے متعلق وہ ضروری ہدایات دے دی جائیں جو آگے کے امکانی حالات میں ان کی رہنمائی کر سکیں۔ یہ حقیقت یہاں پیش نظر رہے کہ حرم اور اشہر حرم کے احترام کے باب میں پوری قوم عرب کے احساسات نہایت نازک تھے۔ ان میں لڑنا بھڑنا سب ہی کے نزدیک سب سے بڑی معصیت تھی اس وجہ سے مسلمان بھی اس وقت تک ان میں کسی جنگ کے لیے، اگرچہ وہ مدافعت ہی میں کیوں نہ ہو، تیار نہیں ہو سکتے تھے جب تک قرآن اس کی اجازت نہ دیے۔

وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَاَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ وَالْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْھُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْکُمْ فِیْہِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْکُمْ فَاقْتُلُوْھُمْ کَذٰلِکَ جَزَآءُ الْکٰفِرِیْنَ (۱۹۱)

یعنی بیت اللہ کا حج تم پر فرض ہے اور ملت ابراہیمؑ کے اصلی وارث ہونے کی حیثیت سے یہ تمہارا حق بھی ہے بلکہ اس کے اصلی حق دار تم ہی ہو اس وجہ سے اگر تمہارے اس حق و فرض کی راہ میں قریش مزاحم ہوں تو ان کا مقابلہ کرو اور جہاں کہیں ان سے تصادم ہو وہیں ان کو قتل کرو۔ اگرچہ اس قتال کی نوبت حرم اور حدود حرم ہی میں پیش آجائے اور جس طرح سے انھوں نے تم کو نکالا ہے تم بھی ان کو وہاں سے نکالو، اس لیے کہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی وراثت صرف نسل و نسب کی بنا پر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ خود حضرت ابراہیم

کے ارشاد کے بموجب اس کے اصلی حق دار وہ ہیں جو ان کی ملت پر قائم ہیں۔ یہ درجہ تم کو حاصل ہے نہ کہ ان کو۔ اس وجہ سے اس گھر سے نکالے جانے کے مستحق وہ ہیں نہ کہ تم۔

فتنہ کا مفہوم

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (اور فتنہ قتل سے بھی بڑا جرم ہے) فتنہ کے معنی یہاں کسی کو جبر و ظلم سے اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ انگریزی میں اس کو (persecution) کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۱۰۔ بروج (بے شک جن لوگوں نے ایمان لانے والوں اور ایمان لانے والیوں کو دین سے پھیرنے کے لیے اذیتیں پہنچائیں ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے) عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۸۳۔ یونس (فرعون اور اس کے درباریوں سے ڈرتے ہوئے کہ مبادا وہ ان کو مصیبت میں مبتلا کر دیں) ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ۱۱۰۔ نحل (پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے ہجرت کی بعد اس کے کہ وہ طرح طرح کی ایذاؤں میں مبتلا کیے گئے)

اوپر کی اجازت کی دلیل

اوپر مشرکین قریش سے قتال کی جو اجازت دی گئی ہے یہاں تک کہ اگر حدود حرم اور اشہر حرم میں بھی وہ جنگ کریں تو ان کو قتل کرنا اور مکہ سے ان کو بے دخل کرنا جائز ٹھہرایا گیا ہے، یہ اس کی دلیل ارشاد ہوئی ہے۔ اس چھوٹے سے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ ہر چند حدود حرم اور اشہر حرم میں قتل و قتال بڑی سنگین بات ہے لیکن جس گھر میں اللہ کے بندوں اور بندیوں کو اس بنا پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان کیوں لائے، یہ ظلم و ستم اس قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے اور اس سنگین تر فتنہ کو مٹانے کے لیے تمھیں یہ اجازت دی جاتی ہے کہ اگر نوبت جنگ پیش آ جائے تو تم کفار کو ترکی بہ ترکی جواب دو اور جہاں کہیں وہ تمھارے مقابل میں آئیں ان کو قتل کر دو۔ یہ چیز نہ احترام حرم کے منافی ہے نہ حرمت اشہر حرم کے۔

احتیاط کی تاکید

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ یہ تاکید ہے اس بات کی کہ مسلمان مسجد حرام کے پاس جنگ میں پہل نہ کریں۔ ہاں اگر ان کو مسجد حرام سے روکنے کے لیے ان پر کفار کی طرف سے حملہ کیا جائے تو اس کا منہ توڑ جواب دیں۔ مسجد حرام کا احترام ایک مشترک ذمہ داری ہے اگر کفار مسلمانوں کی دشمنی میں اس کے احترام کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں تو پھر وہ خود بھی اس کے احترام کے نام پر کسی رعایت کے مستحق نہیں رہتے ہیں۔ یہ درحقیقت ان کے اپنے کیے کی سزا ہے۔ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ یعنی ایسے کافروں کا ایسا ہی بدلہ ہے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۹۲)

فَاِنِ انْتَهَوْا کا مطلب

پس اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ غفور رحیم ہے۔ "باز آ جائیں" سے مراد صرف جنگ سے رک جانا نہیں ہے۔ یہاں اس "باز آ جانے" کا صلہ یہ بتایا ہے کہ پھر اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ظاہر ہے کہ کفار اگر مسلمانوں سے جنگ نہ کریں تو اس کا زیادہ سے زیادہ صلہ یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان بھی ان کو مہلت دیں اور بالفعل ان

سے جنگ نہ کریں، یہ مطلب اس کا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام کفر و فسق معاف کر دے۔ اس وجہ سے یہاں باز آجانے سے مقصود اس عناد و مخالفت، اور اس جبر و ظلم (PERSECUTION) سے باز آجانا ہے جس کے قریش مرتکب ہو رہے تھے اور جس کے ذریعہ سے انھوں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا تھا، اور ساتھ ہی بیت اللہ سے مسلمانوں کو روک دیا ہے باز آجانا ہے جس کے وہ کسی پہلو سے بھی حقدار باقی نہیں رہ گئے تھے۔

کفار قریش اور مسلمانوں کی نزاع

اس سورہ میں قبلہ کی بحث سے لے کر یہاں تک کے مباحث پر اگر آپ کی نظر ہے تو یہ حقیقت آپ سے مخفی نہیں ہو سکتی کہ یہ ساری بحث عام کفار سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق خاص کفار قریش سے ہے۔ ان کی اور مسلمانوں کی نزاع کسی جزوی معاملہ کے لیے محض ایک وقتی نزاع نہیں تھی بلکہ اصلاً یہ نزاع بیت اللہ کی تولیت کے لیے تھی۔ قرآن کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے بنائے ہوئے اس گھر کی تولیت کے اصل حقدار اہل ایمان ہیں نہ کہ کفار و مشرکین جنھوں نے اس گھر کو اس کے بنیادی مقاصد کے بالکل خلاف شرک و کفر کا ایک گڑھ بنا کے رکھ دیا ہے۔ قرآن کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور وعدہ الٰہی کے بموجب جس آخری نبی کے ذریعہ سے اس گھر کے مقاصد کی تجدید و تکمیل ہونی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور قدسی نے اس وعدے کی تکمیل کر دی اور اب یہ لازمی ہے کہ یہ گھر کفار و مشرکین کے تسلط سے آزاد اور کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک ہو کر ملت ابراہیم — اسلام — کا مرکز اور تمام اہل ایمان کا قبلہ بنے۔ یہ دعویٰ جس دلائل و براہین اور جس زور و قوت کے ساتھ اس پوری سورت میں پیش ہوا ہے اس میں کہیں کسی لچک اور کسی نرمی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ واضح الفاظ میں بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ بیت اللہ کو کفار کے قبضہ سے چھڑانا اور اس کو شرک و کفر کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے از سر نو اس کو توحید، اسلام اور ملت مسلمہ کا مرکز بنانا رسالت محمدی کا اصل نصب العین تھا اور اس نصب العین کا حصول ہی گویا آنحضرت صلعم کے مقدس مشن کا آخری کام تھا۔ اس روشنی میں غور کیجیے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ فَاِنِ انْتَهَوْا کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ کفار قریش جنگ سے رک جائیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی ان تمام مخالفانہ و معاندانہ حرکتوں سے جن کے وہ آج اس دعوت حق کی مزاحمت کے لیے مرتکب ہو رہے ہیں، باز آکر اس کے حامی و معاون بن جائیں۔ اگر وہ یہ راہ اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے وہ تمام جرائم معاف کر دے گا جن کے وہ اب تک مرتکب ہوئے ہیں۔ بعینہٖ یہی بات کفار قریش ہی کو مخاطب کر کے سورۂ انفال میں یوں فرمائی گئی ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا	ان کافروں کو بتا دو کہ اگر وہ باز آگئے تو جو کچھ وہ
يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا	پہلے کر چکے ہیں وہ معاف کر دیا جائے گا اور اگر انھوں نے
فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ	پھر اسی طرح کی حرکتوں کا اعادہ کیا تو ہم نے اس طریقہ

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ	کرتا ہے جو ہم نے پچھلی آیت کے سلسلے میں اختیار
فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ	کیا۔ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ
لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ	باقی نہ رہ جائے اور اس سرزمین پر سارا دین
بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ	صرف اللہ کا ہو جائے۔ پس اگر وہ باز آ جائیں تو جو
(۳۹-انفال)	کچھ کریں گے اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

یہی حقیقت سورۂ توبہ میں اس طرح واضح کی گئی ہے کہ بیت اللہ کی تولیت میں کفار قریش کا کوئی حصہ نہیں ہے، یہ خاص مسلمانوں کا حق ہے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ	مشرکین کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں
اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ	کے منتظم بنے رہیں جب کہ وہ خود اپنے کفر کے
اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ	گواہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال اکارت ہیں
خٰلِدُوْنَ ۔ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ	اور یہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی مسجدوں کے
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ	منتظم تو وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ	پر ایمان لائیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور
فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ	اللہ کے سوا کسی چیز سے نہ ڈریں۔ انہی لوگوں
الْمُهْتَدِيْنَ ۝ (۱۷-۱۸، توبہ)	کے متعلق توقع ہے کہ وہ بامراد ہوں۔

یہی خاص پہلو ہے جس کے سبب سے عام کفار کے برخلاف کفار قریش کے لیے یہ حکم ہوا کہ جب تک یہ توبہ کر کے نماز نہ قائم کریں اور زکوٰۃ نہ دیں اس وقت تک ان کے لیے کوئی ڈھیل نہیں ہے۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا	پس جب اشہر حرم گزر جائیں تو مشرکوں کو قتل کرو
الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ	جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ان کو پکڑو اور ان کو گھیرو
وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ	اور ان کے لیے ہر گھات میں بیٹھو۔ پس اگر وہ توبہ
فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا	کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی
الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ	راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵-توبہ)	ہے۔

یہاں ہم ان اجمالی اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ سورۂ توبہ میں ان شاء اللہ کفار قریش کے اس مسئلہ پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ
اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۹۳)

سرزمین حرم میں اسلام کے سوا کسی اور دین کے لیے گنجائش نہیں

اس آیت سے اوپر والی آیت کے مضمون کی مزید وضاحت ہو گئی کہ کفار قریش سے یہ جنگ اس وقت تک جاری رہنی ہے جب تک سرزمین حرم پر فتنہ کا کوئی اثر باقی ہے اور اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین یہاں قائم ہے۔ یہ گھر صرف اللہ واحد کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا تھا اس لیے اللہ کے دین کے سوا کسی دوسرے دین کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اور اب یہ کام حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور اللہ کے وعدے کے مطابق ہونا ہے، کفار اس کو پسند کریں یا ناپسند۔ اسی بات کو سورۂ صف میں یوں فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى — وہی خدا ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا اپنی ہدایت
وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ — اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس دین کو سارے دینوں
كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۹- صف) — پر غالب کرے، اگرچہ مشرکین اس چیز کو ناپسند کریں۔

رسولوں کے باب میں سنت الٰہی

"وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ" کا صحیح موقع و محل اور اس کا اصلی زور سمجھنے کے لیے یہاں بالاجمال اس سنت اللہ کو سمجھ لینا ضروری ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے باب میں پسند فرمائی ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجتا ہے تو وہ رسول اس قوم کے لیے خدا کی آخری اور کامل حجت ہوتا ہے۔ جس کے بعد کسی مزید حجت و برہان کی اس قوم کے لیے ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ قوم ایمان نہیں لاتی بلکہ تکذیب رسول اور عداوت حق ہی پر اڑی رہ جاتی ہے تو وہ فنا کر دی جاتی ہے۔ عام اس سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی عذاب کے ذریعہ سے فنا ہو یا حق کے اعوان و انصار اور رسول کے ساتھیوں کے ہاتھوں اور عام اس سے کہ یہ واقعہ رسول کی زندگی ہی میں ظہور میں آئے یا اس کی وفات کے بعد۔ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا اور اس مضمون کی دوسری آیات میں اسی سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے اور اس کے ظہور کے لیے قرآن میں ایک مخصوص ضابطہ بیان ہوا ہے جس کی تفصیل کے لیے موزوں مقامات ہماری اس کتاب میں آئیں گے[1]۔

اسی سنت اللہ کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ اس آخری رسالت کے مقصد کی تکمیل اس بات پر ہونی ہے کہ سرزمین حرم پر دین حق کے سوا اور کوئی دین باقی نہیں رہنے پائے گا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن نے کفار عرب کے سامنے، جن کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت براہ راست تھی اور جو بیت اللہ پر بالکل ناجائز طور پر قابض تھے، صرف دو ہی راہیں باقی رکھی تھیں۔ یا تو اسلام قبول کریں یا تلوار۔ دوسرے کفار کی طرح ان کے لیے جزیہ کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ جب اتمام حجت کا تقاضا پورا ہو گیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر فوج کشی کی اور بیت اللہ پر قبضہ کر کے اس کو کفر و شرک کی تمام آلائشوں سے بالکل پاک کر دیا اور جاء

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ ہم نے یہاں جس سنت اللہ کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا تعلق خاص طور پر رسولوں سے ہے، ان انبیاء سے نہیں ہے جو صرف نبی تھے رسول نہیں تھے۔ نبی اور رسول کے اس فرق پر بھی مفصل بحث اپنے مقام میں آئے گی۔

الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کا اعلان فرما دیا۔

حرم الٰہی کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کا فرض

پھر حرم الٰہی کو مستقل طور پر کفر و شرک کے غلبہ سے پاک رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوا کہ اس پورے علاقہ کو غیر اسلامی قبضہ یا مداخلت سے بالکل محفوظ کر دیا جائے جس میں یہ حرم واقع ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے جزیرہ عرب کے متعلق یہ ہدایت دے دی کہ لَا يَجْتَمِعُ فِيهِ دِينَانِ اس میں دین حق کے ساتھ کوئی اور دین جمع نہیں ہو سکتا، اور آخر وقت میں آپ نے یہود و نصاریٰ کو بھی اس سرزمین سے نکال دینے کی وصیت فرمائی جس کی تعمیل حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں کی۔ یہ تدبیر مرکز اسلام کے سیاسی تحفظ کے لیے ضروری تھی اور یہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس گھر کے تحفظ کے لیے ہمیشہ بیدار رہیں اور کسی بھی غیر اسلامی طاقت کے قدم اس سرزمین پر جمنے نہ دیں۔

عربی زبان کا ایک اسلوب

فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ، انْتَهَوْا کا مفہوم ہمارے نزدیک وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ عدوان کے اصل معنی تو تعدی اور زیادتی کے ہیں لیکن جہاں یہ لفظ مجرد اقدام (action) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں کبھی کبھی بعض الفاظ محض مجانست و ہم آہنگی کے لیے استعمال ہو جاتے ہیں۔ ان کا مفہوم موقع و محل سے متعین ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوا (ہم نے ان کو بدلہ دیا جیسا کہ انھوں نے ہمارے ساتھ کیا) ظاہر ہے کہ یہاں دانوا محض دنّا کی مشابہت کی وجہ سے لایا گیا ہے ورنہ موقع فعلوا یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا ہے۔ یا قرآن میں ہے جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا (برائی کا بدلہ اسی کے مانند بدلہ ہے) ہر شخص جانتا ہے کہ کسی برائی کا بدلہ کوئی برائی نہیں ہے لیکن محض سابق لفظ کی ہم آہنگی کی وجہ سے جرم کے ساتھ اس کی سزا کو بھی سیئۃ سے تعبیر کر دیا۔ اسی طرح آگے والی آیت میں ہے فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ (جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کی زیادتی کے برابر اس کے خلاف اقدام کرو) اس آیت میں کسی کی زیادتی کے جواب میں جو اقدام کیا جائے اس کو بھی اعتداء کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، حالانکہ یہ معنی میں محض اقدام کے ہے، صرف اپنے ما سبق کے ساتھ ہم آہنگی کی وجہ سے اس شکل میں استعمال ہوا۔ عربی زبان کے اسی معروف اسلوب کے مطابق زیر بحث آیت میں بھی لفظ عدوان استعمال ہوا لیکن مراد اس سے مجرد وہ اقدام ہے جو جوابی کارروائی کے طور پر کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز آ کر اسلام کی راہ اختیار کر لیں تو ان کے پچھلے جرائم کی بنا پر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی، پھر صرف انہی کے خلاف کوئی اقدام ہوگا جو اپنے کفر و شرک اور اپنے ظلم و عدوان پر جمے رہ جائیں۔

الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۱۹۴

اوپر بیان کیے ہوئے احکام کی یہ دلیل ارشاد ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ شہر حرام میں یا حدود حرم میں لڑائی

جنگ کرنا ہے تو بہت بڑا گناہ لیکن جب کفار تمہارے لیے اس کی حرمت کا لحاظ نہیں کرتے تو تمھیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ قصاص کے طور پر تم بھی ان کو ان کی حرمت سے محروم کر دو۔ ہر شخص کی جان شریعت میں محترم ہے لیکن جب ایک شخص دوسرے کی جان کا احترام نہیں کرتا، اس کو قتل کر دیتا ہے تو اس کے قصاص میں وہ بھی حرمتِ جان کے حق سے محروم کر کے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اشہرِ حرم اور حدودِ حرم کا احترام مسلم ہے بشرطیکہ کفار بھی ان کا احترام ملحوظ رکھیں اور ان میں دوسروں کو ظلم و ستم کا ہدف نہ بنائیں لیکن جب ان کی تلواریں ان مہینوں میں اور اس بلد امین میں بے نیام ہوتی ہیں تو وہ سزاوار ہیں کہ ان کے قصاص میں وہ بھی اس کے امن و احترام کے حقوق سے محروم کیے جائیں۔ مزید فرمایا کہ جس طرح اشہرِ حرم کا یہ قصاص ضروری ہے، اسی طرح دوسری حرمتوں کا قصاص بھی ہے۔ یعنی جس محترم چیز کے حقوقِ حرمت سے وہ تمھیں محروم کریں تم بھی اس کے قصاص میں اس کے حقِ حرمت سے انھیں محروم کرنے کا حق رکھتے ہو۔ پس جس طرح کے اقدامات حرم اور اشہرِ حرم کی حرمتوں کو برباد کر کے وہ تمھارے خلاف کریں، تم ان کے جواب ترکی بہ ترکی دو۔ البتہ تقویٰ کے حدود کا لحاظ رہے۔ کسی حد کے توڑنے میں تمھاری طرف سے پیش قدمی نہ ہو اور نہ کوئی اقدام حدِ ضرورت سے زائد ہو۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت انھی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ہر طرح کے حالات میں اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ ۚۖ وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۹۵)

انفاق کا حکم جہاد کے لیے — انفاق کا یہ حکم، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس جہاد کے لیے ہے جس کا یہاں حکم دیا گیا ہے۔ جہاد، جان اور مال دونوں کی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے، اس وجہ سے قرآن میں جہاں کہیں بھی جہاد و قتال کا بیان ہوتا ہے انفاق کا حکم بھی اس کے ساتھ ضرور جڑا ہے۔ تُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (اور تم جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے)

"وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ" میں "بِاَیْدِیْكُمْ" کے الفاظ سے ایک ایسے شخص کی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے کسی دریا یا غار میں چھلانگ لگا رہا ہو۔ بعض عرب شاعروں نے بھی یہ اسلوب استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے سے جی چراتے ہیں بظاہر تو وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خطرات سے بچا رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ اپنے آپ کو ہلاکت کے جہنم میں جھونکتے ہیں۔ انسان کے لیے زندگی اور بقا کا اصل خزانہ خدا کی راہ میں جان اور مال کی قربانی میں ہے نہ کہ ان کے سینتنے اور بچانے میں۔ قرآن نے جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف اشارے کیے ہیں۔ سورۂ توبہ میں منافقین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے

وَسَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا ۔۔۔ اور وہ عنقریب تمہیں اللہ کی قسمیں کھا کر یقین دلائیں گے

لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿ ۴۲ - توبہ ﴾

کہ اگر ہم سامان کر پاتے تو ضرور آپ کے ساتھ جہاد کے لیے نکلتے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ہلاکت میں جھونک رہے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ بالکل جھوٹے ہیں۔

اس آیت میں يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ کے الفاظ سے اسی بخل اور بزدلی کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے بچنے کی تاکید وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ کے ٹکڑے میں فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کو زندگی اور مال کے حریص کامیابی سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نظر میں وہ موت اور ہلاکت ہے۔

انفاق اور احسان کا مفہوم

وَأَحْسِنُوا کا عطف أَنفِقُوا پر ہے۔ یہاں احسان کے معنی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں یعنی اللہ کی راہ میں فیاضی اور خوش دلی کے ساتھ خرچ کرو اور وہ مال خرچ کرو جو تمہیں عزیز و محبوب ہو۔ انفاق کے معاملے میں اس احسان کی تاکید قرآن نے جگہ جگہ فرمائی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿ ۲۶۷ - بقرہ ﴾

اے ایمان والو، ان پاکیزہ مالوں سے خرچ کرو جو تم نے تجارت وغیرہ سے کمائے ہیں اور جو ہم نے زمین سے تمہارے لیے پیدا کیے ہیں اور اس میں سے بُرے مال کے خرچ کرنے کا خیال نہ کرو، جسے خرچ (کرو) لیکن اگر وہی مال تمھیں لینا پڑ جائے تو آنکھ میچے بغیر نہ لے سکو اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ رکھو کہ اللہ بے نیاز اور حمید ہے۔

انفاق میں جب تک اللہ تعالیٰ کے لیے یہ جوش و جذبہ اور یہ احتیاط شامل نہ ہو اس وقت تک اس کو احسان کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے مال کا محتاج نہیں ہے۔ وہ سب سے بے نیاز و بے پروا ہے۔ البتہ ہم خود اس کے جود و کرم کے ہر وقت محتاج ہیں۔ وہ اگر ہم سے انفاق کا مطالبہ کرتا ہے تو اپنے لیے نہیں بلکہ خود ہمارے لیے کرتا ہے تاکہ اس طرح وہ ہمارے خلوص کا امتحان کرے اور ہمارے خزف ریزوں کو قبول فرما کر ان کو ایک ابدی اور لازوال خزانے کی شکل میں ہمیں ایک دن واپس لوٹائے۔

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۖ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ۚ فَإِذَا أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذَٰلِكَ لِمَن لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

عمرہ کی نوعیت

جس طرح فرض نمازوں کے ساتھ سنتیں اور نوافل ہیں جن سے اصل نماز کے لیے طبیعت میں بیداری

اور آمادگی بھی پیدا ہوتی ہے اور اگر اس میں کوئی کمی رہ جاتی ہے تو ان سے اس کسر کا جبر بھی ہوتا ہے اسی طرح عمرہ کی نوعیت بھی حج کے لیے ایک ریہرسل کی ہے۔ اس سے حج کے لیے طبیعت میں آمادگی بھی پیدا ہوتی ہے اور بعض حالات میں اس کے کسر کا جبر بھی ہوتا ہے۔ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے بھی یہ لفظ تعمیر، رونق اور آبادی کے مضمون کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کے گھر کی رونق بھی ہے اور دلوں کی زندگی اور بیداری بھی۔ اور یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آیت ۱۹۶ کا اصل مفہوم "اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ" میں اصل زور "لِلّٰہِ" کے لفظ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب جنگ و جہاد کے مراحل سے گزر کر حج و عمرہ کی سعادت حاصل ہو تو تم یہ حج و عمرہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے لیے پورا کرو۔ اس تاکید و تنبیہ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حج و عمرہ تو اہل عرب اسلام سے پہلے بھی کیا کرتے تھے لیکن یہ حج و عمرہ صرف اللہ واحد کے لیے نہیں ہوتا تھا بلکہ اس میں ان کے وہ معبودانِ باطل بھی شریک تھے جن کے بت انھوں نے عین بیت اللہ میں بھی اور مناسک حج کے دوسرے مقامات میں بھی نصب کر رکھے تھے۔ چنانچہ جب یہ حرم میں نماز کے لیے جاتے یا حج و عمرہ کے قصد سے وہاں پہنچتے تو ان کے پیش نظر صرف اللہ ہی کی عبادت نہ ہوتی بلکہ اللہ سے زیادہ ان بتوں کی خوشنودی اور ان کی پرستش ہوتی۔ وہ ان کی پوجا بھی کرتے، ان کے آگے نذر و نیاز بھی پیش کرتے اور ان کے لیے قربانیاں بھی کرتے۔ چونکہ آیت زیر بحث کے نزول کے وقت یہ حالات مکہ میں موجود تھے اس لیے مسلمانوں کو یہ تاکید کی گئی کہ جب تم حج و عمرہ کرو تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کرو، اس میں کسی شرک و بدعت کی کوئی آلائش شامل نہ ہونے پائے۔ اس حقیقت کی طرف سورۂ کوثر میں بھی ارشاد فرمایا ہے "اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ، فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ" (ہم نے تمھیں کوثر عطا کیا تو تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور اسی کے لیے قربانی کرو) مولانا فراہیؒ نے اپنی تفسیر سورۂ کوثر میں وضاحت کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ کوثر سے یہاں مراد خانہ کعبہ ہے، جو آخرت کے حوض کوثر کا اس دنیا میں مجاز ہے اور اللہ ہی کے لیے نماز اور قربانی کی تاکید اس لیے ہوئی کہ اسلام سے پہلے نماز اور قربانی دونوں ہی بیشتر غیر اللہ کے لیے تھیں۔

علاوہ ازیں "لِلّٰہِ" پر زور دینے کی ایک دوسری وجہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ اہل عرب کے لیے حج و عمرہ عبادت سے زیادہ تجارت کا ذریعہ بن گئے تھے۔ ان کے لیے ان کی حیثیت تجارتی میلوں کی رہ گئی تھی اور وہ مقاصد امتداد زمانہ سے ان کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئے تھے جن کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کی تعمیر فرمائی تھی۔ چنانچہ اسی تجارتی مقصد ہی کے تحت انھوں نے نسیء کا قاعدہ ایجاد کر کے حج کے مہینے کو قمری کے بجائے شمسی حساب کے مطابق کر لیا تھا تاکہ یہ مہینہ تجارتی نقطۂ نظر سے ان کے لیے مناسب زمانہ میں پڑے۔ یہاں "لِلّٰہِ" کے لفظ سے مسلمانوں کو حج و عمرہ کے اصل مقصود کی طرف توجہ دلائی گئی کہ یہ عبادتیں اللہ کی رضا حاصل کرنے اور تقویٰ کی تربیت کے لیے مشروع کی گئی ہیں نہ کہ میلوں کے انعقاد اور کاروباری ہنگاموں

کے لیے اس وجہ سے تم کفار و مشرکین کے برخلاف اللہ کو اپنا مقصود بناؤ۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو تجارتی فوائد حاصل کرنے کی جو محدود اجازت دی گئی ہے، اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

امکانی خطرے کے لیے ہدایت

'فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ' احصار کے معنی گھیر لینے کے ہیں اور یہاں گھیر لیے جانے سے مراد دشمن کی طرف سے گھیر لیے جانے کے ہیں۔ آگے فَاِذَآ اَمِنْتُمْ کے الفاظ سے بھی اسی مضمون کا اشارہ نکلتا ہے اور وقت کے حالات بھی اسی بات کے حق میں ہیں، اس لیے کہ ان آیات کے نزول کے زمانہ میں مکہ پر مشرکین قریش کا قبضہ تھا اور انھوں نے وہاں سے مسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ نکال چھوڑا تھا بلکہ کسی قیمت پر بھی ان کو دوبارہ مکہ آنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھے، اس امر کا سخت اندیشہ تھا کہ مسلمان اگر حج یا عمرہ کے لیے مکہ کا رخ کرتے تو وہ پوری قوت سے مزاحم ہوتے، چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے عمرہ کا ارادہ فرمایا تو کفار نے سخت مزاحمت کی۔ یہ صورت حال متقاضی تھی کہ پہلے اس امکانی خطرے کے لیے مسلمانوں کو ہدایت دے دی جائے۔ چنانچہ یہ ہدایت دے دی گئی کہ اگر دشمن تمھیں گھیر لے اور بیت اللہ تک پہنچنا ممکن نہ ہو تو جو قربانی تمھیں میسر ہو وہ وہیں پیش کر دو، جہاں گھر جاؤ۔ حضورؐ نے اسی ہدایت کے بموجب حدیبیہ ہی میں قربانی کر کے احرام کھول دیا۔

'مَحِلّ' کا مفہوم

'وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ' مَحِلّ، جیسا کہ صاحب لسان العرب نے تصریح کی ہے، حَلَّ يَحِلُّ سے ظرف ہے اور وقت اور جگہ دونوں کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سر اس وقت تک نہ مونڈو جب تک قربانی ٹھکانے نہ لگ جائے اور نذر پوری نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ امن اور احصار کی دو مختلف حالتوں میں قربانی کے ٹھکانے لگنے کی شکلیں دو مختلف ہوں گی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے دونوں کے ثبوت موجود ہیں۔ حدیبیہ کے موقع پر آپ نے اس صورت پر عمل فرمایا جس پر مجبوری کی صورت میں عمل کرنے کی اجازت ہے اور بعد میں حج اور عمرہ دونوں کے موقع پر وہ طریقہ اختیار فرمایا جو عام حالات کے لیے ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہاں جس امن یا احصار کا ذکر ہے اصلاً اس کا تعلق دشمن سے ہے۔ دوسری مزاحمتیں جو مرض یا کسی اور مجبوری کے سبب پیش آجائیں ان کا حکم اصلاً نہیں بلکہ تبعاً یہاں سے نکلتا ہے اور اس کا تعلق اجتہاد سے ہے۔

قربانی سے پہلے سر منڈانے کا کفارہ

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ۔ کسی بیماری یا تکلیف کے سبب سے اگر کوئی قربانی سے پہلے ہی سر منڈانے پر مجبور ہو جائے تو اس صورت میں اس کے اوپر کفارہ ہے۔ قرآن میں اس کفارے کی تین صورتیں بالاجمال بیان ہوئی ہیں۔ روزے یا صدقہ یا قربانی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کی تشریح فرما دی ہے کہ یا تو تین دن کے روزے رکھ لے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا کم از کم ایک بکری کی قربانی دے دے۔

آفاقی حجاج کے لیے ایک رخصت

فَإِذَآ أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذَٰلِكَ لِمَن لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ یہ آفاقی حاجیوں یعنی حدودِ حرم سے باہر کے عازمینِ حج کے لیے ایک رخصت بیان ہوئی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات حدودِ حرم کے اندر رہنے والوں کے لیے تو ٹھیک تھی اس لیے کہ ان کے لیے حج اور عمرہ کے لیے الگ الگ سفر کرنا کچھ مشکل نہ تھا لیکن دور سے آنے والے حجاج کے لیے اس میں زحمت تھی اس وجہ سے شریعت نے ان کو یہ رخصت مرحمت فرمائی کہ وہ ایک ہی سفر میں حج و عمرہ دونوں ادا کر سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ وہ پہلے عمرہ کر کے احرام کی پابندیوں سے فارغ ہو جائیں پھر حج کی تاریخوں میں اس کے لیے نیا احرام باندھیں اور مناسکِ حج ادا کریں۔ البتہ اس صورت میں ان کے لیے قربانی ضروری ہے۔ اگر قربانی میسر نہ آئے تو دس دن کے روزے رکھنے ضروری ہیں۔ تین دن کے روزے ایامِ حج میں اور سات دن کے حج سے لوٹنے کے بعد۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ، یہ احکام و ہدایات کی تفصیل کے بعد احکام کی اصل روح کی طرف توجہ دلادی کہ اصل مقصود ان تمام احکام سے تقویٰ ہے۔ یہی ان کا حاصل ہے اور اسی سے ان کے اندر زندگی پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان اس چیز کو نگاہ میں نہ رکھے تو نہ تو ان کا حق ہی ادا کر پاتا ہے اور نہ ان سے کچھ حاصل ہی کر پاتا بلکہ اس کی ساری زندگی خدا سے جھوٹی آرزوئیں باندھنے اور اپنے نفس کو ناروا الاؤنس دینے میں گزر جاتی ہے حالانکہ خدا کے طبعی قوانین جس طرح اپنے نتائج میں بے لاگ ہیں اسی طرح اس کے شرعی و اخلاقی قوانین بھی اپنے نتائج میں بے لاگ ہیں۔

اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَٰتٌ ۚ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُونِ يَٰٓأُولِي الْأَلْبَٰبِ (۱۹۷)

لفظ حج کا جامع استعمال

موقع دلیل ہے کہ حج کا لفظ یہاں حجِ اکبر اور حجِ اصغر یعنی حج اور عمرہ دونوں ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ لفظ قصاص پر بحث کرتے ہوئے ہم الفاظ کی اس مخصوص نوعیتِ استعمال کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

معلومات سے مقصود

" أَشْهُرٌ مَّعْلُومَٰتٌ " سے مقصود، ایامِ معدودات، کی طرح ان کے معین و محدود ہونے کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ کچھ ایسی غیر محدود و غیر معین مدت نہیں ہے کہ حج یا عمرہ کی نیت کرنے والا ان کی پابندیوں کے تصور سے گھبرا اٹھے۔ بس چند معلوم و متعین مہینے ہیں تو جو شخص ان میں حج یا عمرہ کا عزم کرے وہ ان کی پابندیوں کو نباہے اور شہوت و نافرمانی اور لڑائی جھگڑے سے بچے اور زیادہ سے زیادہ نیکی اور تقویٰ کی کمائی کرنے کی کوشش کرے اگرچہ انسان کو اس جہاد میں اپنے جذبات و شہوات کی قربانی ضرور دینی پڑتی ہے لیکن یہ چیز رائیگاں ہونے کی نہیں۔ انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ جو چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی کرتا ہے وہ اللہ کے علم میں رہتی ہے اور وہ اس کا ایک دن بھرپور صلہ دے گا۔

حج میں رفث، فسوق اور جدال کی ممانعت کے وجوہ

یہاں رفث، فسوق اور جدال تین چیزوں کی نفی کی ہے۔ رفث سے مراد شہوانی باتیں ہیں، اس لفظ کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے، فسوق کے معنی خدا کی نافرمانی کے ہیں اور جدال سے مراد آپس کے لڑائی جھگڑے ہیں۔

ان تینوں چیزوں کی ممانعت سے نفسانی محرکات کے وہ تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں جن سے انسان گناہ میں داخل ہوتا ہے۔ حج میں ان چیزوں کی قطعی ممانعت کے بعض خاص وجوہ ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلام میں یہ عبادت انسان کو ترک دنیا اور زہد کی اس آخری حد سے آشنا کرنے والی ہے جس سے آشنا ہونا اسلام میں مطلوب و مرغوب ہے اور جو تربیت و تزکیہ کے لیے ضروری ہے۔ اس سے آگے رہبانیت کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں جن میں داخل ہونے سے اسلام نے روکا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ احرام کی پابندیوں کی وجہ سے ان چیزوں کے لیے نفس کے اندر اکساہٹ بہت بڑھ جاتی ہے۔ انسان کے اندر یہ کمزوری ہے کہ جس چیز سے وہ روک دیا جائے اس کی خواہش اس کے اندر دوچند ہو جاتی ہے اور شیطان اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ سفر کی حالت ہونے کے سبب سے ان چیزوں کے مواقع بہت پیش آتے ہیں۔ آدمی اگر چوکنا نہ رہے تو ہر قدم پر فتنہ میں پڑ سکتا ہے۔

زبان کا ایک خاص اسلوب

"وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی" میں ہمارے نزدیک اصل ترکیب کلام یوں ہے کہ تَزَوَّدُوا التَّقْوٰی فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی۔ یعنی سفر حج کے لیے نکلو تو تقویٰ کا زادِ راہ لے کر نکلو کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ پہلی جگہ ایجاز اور بلاغت کے تقاضے کے تحت تقویٰ کے لفظ کو حذف کر دیا اس لیے کہ آگے اس کا اظہار ضروری تھا۔ اگر پہلے مقام میں بھی اس کا اظہار کر دیا جاتا تو اس سے کلام میں تکرار کا عیب پیدا ہو جاتا اور قرآن مجید ہر عیب سے پاک ہے۔

اکثر لوگ یہاں تقویٰ کے لفظ کو محذوف نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک "تَزَوَّدُوْا" کے لفظ سے لوگوں کو حج کے لیے مادی زادِ راہ لے کر نکلنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ان کے خیال میں اس تاکید کی وجہ یہ پیش آئی کہ اکثر اہل عرب بغیر کسی زادِ راہ ہی کے حج کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور اس طرح خود بھی زحمت اٹھاتے تھے اور دوسروں کے لیے بھی موجب زحمت بنتے تھے۔ اس وجہ سے ان کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب حج کے لیے نکلا کریں تو اس کے لیے زادِ راہ کا انتظام کر کے نکلا کریں۔

اگرچہ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے کہ حج کے لیے زادِ راہ کا انتظام مقدم ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شریعت نے حج فرض ہی ان لوگوں پر کیا ہے جو ہر پہلو سے اس کے لیے استطاعت رکھتے ہیں لیکن یہاں یہ معنی لینا عربیت کے بالکل خلاف ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں "فَاِنَّ" کا لفظ جب اس طرح آیا کرتا ہے جس طرح اس آیت میں آیا ہے تو وہ اپنے ماسبق کی توجیہ و تعلیل کے لیے آیا کرتا ہے۔ اگر "تَزَوَّدُوْا" سے مراد مادی زادِ راہ ہوتا

تو اس کے بعد اس کی توجیہ و تعلیل میں بھی اسی کی حکمت بیان ہوئی کہ کیوں اس سفر کے لیے زادِ راہ کا اہتمام ضروری ہے لیکن یہاں حکمت بیان ہوئی ہے تقویٰ کے زادِ راہ کی۔

اس ہدایت کے موقع و محل سے بھی اسی مضمون کی تائید نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اوپر والے ٹکڑے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص حج کے عزم سے نکلے تو وہ شہوانی باتوں، فاسقانہ حرکتوں اور لڑائی جھگڑے سے کلیتہً احتراز کرے۔ اس مضمون کے ساتھ اگر سب سے زیادہ قریبی جوڑ ہو سکتا ہے تو اسی بات کا ہو سکتا ہے کہ اس مقدس سفر کے لیے آدمی کو رفث، فسوق اور جدال کے بجائے تقویٰ کا زادِ راہ لے کر نکلنا چاہیے اس لیے کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہی کا زادِ راہ ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ (۱۹۸)

فضل سے مراد

یعنی حج سے اصل مقصود تو تقویٰ ہے، اس لیے اس کے واسطے اصل زادِ راہ تقویٰ ہی کا ہونا چاہیے لیکن اس امر میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ کوئی شخص اس سفر سے کوئی چھوٹا بڑا تجارتی فائدہ بھی اٹھا لے۔ یہاں فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ سے مراد تجارتی فائدہ ہے۔ اس قسم کے معاشی فوائد کے لیے قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ خدا کے حدود کے اندر رہتے ہوئے اور اس کے حقوق ادا کرتے ہوئے بندہ جو معاشی فتوحات حاصل کرتا ہے وہ سب فضلِ رب میں داخل ہیں۔

اوپر والی آیت کے تحت ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ جاہلیت میں حج کا اجتماع ایک بہت بڑے تجارتی میلے کی نوعیت اختیار کر گیا تھا جس کے سبب سے حج کا اصل مقصد بالکل دب کر رہ گیا تھا۔ قرآن نے یہاں واضح کیا کہ حج کا اصل مقصد عبادت ہے نہ کہ تجارت۔ اس وجہ سے اس سفر میں اسی کے شایانِ شان زادِ راہ لو، اور وہ ہے تقویٰ۔ لیکن اس کے اصل مقصد کے اہتمام کے ساتھ اگر کوئی شخص کوئی نفع بخش کاروبار بھی کرے تو اس سے اس عبادت میں کوئی خرابی واقع نہ ہوگی۔ یہ چیز جائز ہے۔

جاہلی رسوم کی مخالفت

"وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ" عرفات سے واپس ہوتے ہوئے مشعر حرام (مزدلفہ) میں رات گزارنے اور وہاں اللہ کی یاد کرنے کا حکم ہے۔ اس یاد کرنے کے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ یہ اس طریقہ پر ہو جو اللہ نے تمہیں بتایا اور سکھایا ہے، یعنی تسبیح و تہلیل اور ذکر و عبادت کی صورت میں۔ اس طریقہ پر نہ ہو جو تم نے جاہلیت کے زمانے میں اختیار کر رکھا تھا جس طرح اس زمانے میں لوگ عید وغیرہ کے موقعوں پر چراغاں کرتے ہیں، ہلڑ کے پروگرام بناتے ہیں، مشاعروں کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں، یہاں تک کہ رقص و سرود کی محفلیں بھی کہیں کہیں آراستہ ہو جاتی ہیں، اسی طرح جاہلیت میں بھی لوگ مزدلفہ میں جگہ جگہ آگ جلاتے اور قصیدہ خوانی، داستان گوئی اور مفاخرت کی مجلسیں منعقد کرتے۔ قرآن نے ان چیزوں کی جگہ ان کو تسبیح و تہلیل کی ہدایت فرمائی اس لیے کہ اصلاً ان مقامات کی حاضری اسی مقصد کے لیے ہے۔

'وَاِنْ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ' بطور امتنان و احسان کے ارشاد ہوا ہے۔ جس طرح سورۂ جمعہ میں ہے۔ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے) مطلب یہ ہے کہ ان مقامات کے احکام و آداب سے متعلق تمھیں جو رہنمائی کی جا رہی ہے اس کی قدر کرو، اس لیے کہ اب تک تم ان مقامات کو کھیل تماشے کی جگہیں بنائے بیٹھے تھے حالانکہ یہ مقامات انوارِ معرفت کی جلوہ گاہ ہیں لیکن تم نے اپنی جہالت کے سبب سے جواہرات کے معادن کو کوئلے کی کانیں سمجھا۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۹۹)

قریش کی شیخی پر ایک ضرب

قرینہ دلیل ہے کہ یہاں خطاب خاص قریش سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مناسک حج کے معاملہ میں جو پابندیاں دوسروں پر ہیں بعینہٖ وہی پابندیاں تمھارے اوپر بھی ہیں اس وجہ سے جس طرح دوسرے تمام لوگ عرفات جاتے اور وہاں سے لوٹتے ہیں اسی طرح تم بھی عرفات جا کر وہاں سے لوٹا کرو۔ اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ قریش زمانۂ جاہلیت میں حج کے موقع پر خاص اپنے لیے عرفات کی حاضری ضروری نہیں سمجھتے تھے، صرف مزدلفہ تک جاتے اور وہیں سے لوٹ آتے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ بیت اللہ کے پروہت اور مجاور ہیں اس وجہ سے ان کے لیے حدودِ حرم سے باہر نکلنا مناسب نہیں۔ بندگی میں بھی انھوں نے اپنے لیے ایک امتیاز قائم کر لیا تھا۔ قرآن نے ان کے اس خود ساختہ امتیاز کو ختم کر کے سب کو ایک سطح پر کر دیا۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاۗءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲۰۰)

ایک لغویت کی اصلاح

مناسک حج سے فراغت کے بعد لوگوں پر، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، تفریحات اور دلچسپیوں کا موڈ طاری ہوتا تھا اور شعر و شاعری اور مفاخرت کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، خاص کر قیام منٰی کے ایام تو انھی چیزوں کے لیے خاص ہو کر رہ گئے تھے۔ شعراء اور خطباء اپنے اپنے قبیلوں اور اپنے اپنے آباؤ اجداد کے مفاخر نثر و نظم میں بیان کرتے اور طلاقت لسانی سے ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتے۔ قرآن نے اس لغویت کی بھی اصلاح کی اور اس کی جگہ اس سے زیادہ اہتمام اور اس سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ ذکر الٰہی میں مشغول رہنے کی ہدایت کی۔

طالبین دنیا کو تنبیہ

'فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ الآیۃ' یہ اشارہ ہے ان لوگوں کی طرف جن کے دل و دماغ کے ہر گوشے پر محبت دنیا کا غلبہ ہوتا ہے اور اس غلبہ کی وجہ سے وہ ہر جگہ اسی چیز پر نگاہ رکھتے ہیں جو ان کے دل میں سرفہرست ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر انھیں حج جیسی عظیم عبادت کا موقع بھی نصیب ہوتا ہے تو اس میں بھی قبولیت دعا کے ہر موقع و محل میں خدا سے اپنی دنیوی آرزوؤں ہی کی تکمیل کے لیے دعا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا ان کی آخرت کا خانہ بالکل ہی خالی ہوتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو حج کرتے ہی اپنے کسی نہ کسی دنیوی مقصد کے لیے ہیں، وہ جس مقام کو بھی سمجھتے ہیں کہ یہاں دعا قبول ہوتی ہے وہاں وہ اپنی وہی درخواست پیش کرتے ہیں جو ان کے

دل پر غالب ہوتی ہے، وہ اس کے ساتھ اخروی فلاح کا کوئی ذکر بھی پسند نہیں کرتے کہ مبادا یہ چیز ان کی اصل آرزو کے لیے خدا کے سامنے کوئی حجاب بن جائے۔

اسی طرح کے لوگ ہیں جنھوں نے دین کی ہر چیز کو دنیوی مفادات کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، جس سے دین کا حلیہ بگڑا ہے۔ اسی طرح کے لوگ تھے جن کی دنیا پرستیوں نے حج جیسی عظیم عبادت کو بھی زمانۂ جاہلیت میں، جیساکہ اوپر گزرا، ایک تجارتی میلے کی شکل میں بدل دیا، اور یہی رجحان ہے جو اس دور میں حج کو صرف ایک سالانہ کانگریس کی حیثیت سے نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ حالانکہ حج کی اصل اور اس کی روح ہجرت الی اللہ ہے۔ اس کے دنیوی فوائد صرف ضمنی ہیں۔

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ اُولٰٓـئِكَ لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّمَّا كَسَبُوۡا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ (۲۰۱-۲۰۲)

صحیح روش کی طرف اشارہ — یہ اشارہ ہے ان لوگوں کی طرف جن کے ذہن دنیا اور آخرت دونوں کے معاملہ میں بالکل متوازن ہیں اور جو دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی اپنے رب سے مانگتے ہیں۔ پہلے گروہ کے بعد اس گروہ کا ذکر یہ بتانے کے لیے ہے کہ اس گروہ کی طلب اللہ کی نگاہوں میں پسندیدہ ہے اور اہل ایمان کو یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس دعا سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ بندے کو اپنے رب سے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی طلب کرنی چاہیے۔ اور اس بھلائی کا فیصلہ اور انتخاب اسی پر چھوڑنا چاہیے۔ وہی سب سے زیادہ بہتر طریقہ پر جانتا ہے کہ ہمارے لیے حقیقی خیر کس چیز میں ہے۔ خاص طور پر دنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کا خیر ہونا تو منحصر ہے اس امر پر کہ وہ چیز ہمارے لیے آخرت کی کامیابی کا وسیلہ و ذریعہ بن سکے اور کسی چیز کے اس پہلو کو جاننا صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ اس وجہ سے بندے کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اس معاملے کو اللہ تعالیٰ ہی پر چھوڑے، اپنی طرف سے کوئی تجویز پیش نہ کرے۔ البتہ دوزخ کے عذاب سے برابر پناہ مانگتا رہے، یہ بڑی سخت چیز ہے بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ سے پناہ میں رکھے۔

"اُولٰٓـئِكَ لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّمَّا كَسَبُوۡا" (یہی لوگ ہیں جو اپنی کمائی کا حصہ پائیں گے) پہلے گروہ کے متعلق، جو صرف دنیا کا طالب بنتا ہے، یہ فرمایا کہ "ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے" لیکن اس دوسرے گروہ کے متعلق ارشاد ہوا کہ یہ اپنی کمائی کا حصہ پائیں گے اور یہ حصہ اس اصول کے مطابق ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی نیکیوں کے بدلہ کے لیے مقرر فرما رکھا ہے۔

'واللہ سریع الحساب' کا مفہوم — "وَاللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ" (اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے) تہدید اور تسلی دونوں موقعوں کے لیے موزوں ہے اور قرآن مجید میں یہ دونوں ہی موقعوں پر استعمال ہوا ہے۔ جو لوگ آخرت کے عذاب و ثواب کو ایک بہت بعید چیز سمجھ کر اپنی بدعملیوں میں بدمست رہتے ہیں کہ جو چیز اتنی دور ہے اس کی فکر میں ابھی سے مبتلا ہو کر اپنے عیش کو کیوں مکدر کریں، ان کو ان الفاظ سے یہ بات یاد دلائی جاتی ہے کہ آج تم جس حساب و کتاب

کو بہت دور کی چیز سمجھ رہے ہو جب وہ سر پر آئے گا تو تم یہ سمجھو گے کہ اس پر تو ایک صبح و شام بھی نہیں گزری۔

اسی طرح جو لوگ اللہ کے اچھے وعدوں کو وعدۂ فردا سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کے ظہور میں ایک غیر متناہی مدت باقی ہے، ان کو ان الفاظ سے یہ تسلی دی جاتی ہے کہ اطمینان رکھو، خدا کے وعدوں کے پورے ہونے میں دیر نہیں ہوگی، جب تمھیں اجر ملے گا تو محسوس کرو گے کہ تمھاری مزدوری تمھارا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی تم کو مل گئی۔

موقع دلیل ہے کہ یہاں یہ دھمکی کے سیاق میں نہیں بلکہ تسلی کے سیاق میں ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ان معاملات میں ساری اہمیت اس احساس کی ہے جو انسان کو جزا و سزا کے وقت ہوگا۔ اگر جزا و سزا کے وقت کا احساس یہی ہوگا کہ عمل اور جزا کے درمیان کا فاصلہ بالکل غائب ہو گیا تو پھر یہ فاصلہ بالکل ناقابل لحاظ ہے۔ پھر تو صحیح یہی ہے کہ مجرم اپنی سزا کو سامنے رکھے اور مومن اپنی جزا کو، نہ وہ مہلت سے مغرور ہو نہ یہ تاخیر سے بے صبر، اور اگر کوئی شخص اپنی نافہمی سے اس فاصلہ کو اہمیت دے بھی تو اسے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ من مات فقد قامت قیامتہ کہ جو شخص مرا اس کی قیامت کھڑی ہو گئی۔ جو مومن ہے آنکھ بند ہوتے ہی، اس پر اس کے نیک اعمال کی کیفیات کا ظہور شروع ہو جاتا ہے اور کافر پر اس کے بداعمال کی۔ پھر عمل اور جزا میں فاصلہ کیا رہا؟ ادھر انسان نے زندگی کا بوجھ اتارا ادھر جزا اور سزا کھڑی ہے!

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْۤ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۲۰۳)

حج کا اجتماع روز حشر کے اجتماع کی یاددہانی ہے

"ایام معدودات" کے الفاظ جس مقصد سے روزے کے ذکر میں وارد ہوئے ہیں اسی مقصد سے یہاں بھی وارد ہوئے ہیں اور مراد ان سے ایام تشریق یعنی قیام منیٰ کے ایام ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ گنتی کے چند دن ہی تو ہیں تو ان میں ذکر الٰہی کے خزانے میں جتنا اضافہ کر سکتے ہو کر لو۔ اس قلیل مدت کو بھاری اور گراں سمجھ کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ ویسے اس امر کی اجازت ہے کہ جسے کوئی عجلت ہو تو ۱۲ ذی الحجہ ہی کو واپس ہو جائے ورنہ ۱۳ تک کے قیام کا ثواب حاصل کرے۔ دونوں ہی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں، البتہ یہ ملحوظ رہے کہ اس عجلت کا باعث ان ایام کی گرانی اور طوالت کا احساس نہ ہو بلکہ کوئی واقعی ضرورت اس کی داعی ہو۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ بہت سے لوگ عرفات سے واپس ہوتے ہی جلد سے جلد بقیہ مناسک سے فارغ ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ چیز ایک حد تک تو فطری ہے لیکن اس میں بیزاری اور گھبراہٹ کی کیفیت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر اس چیز کا کوئی اثر ہو تو یہ تقویٰ سے بعید بات ہے اور انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے اور اس دن اس کے حکم کے بغیر کوئی اس کے سامنے سے ہٹ نہ سکے گا۔ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ کے الفاظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ حج کا یہ اجتماع روز حشر کے اجتماع کی ایک یاددہانی ہے اس وجہ سے اس مجاز میں اس حقیقت سے غفلت نہیں ہونی چاہیے۔

۶۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۰۴-۲۱۴

اوپر حج کے بیان کے سلسلے میں آخر میں یہ بات جو آگئی تھی کہ بعض لوگ حج کو صرف اپنی دنیوی تمنا برآری ہی کا ذریعہ بناتے ہیں، آخرت کی طلب سے ان کے سینے بالکل خالی ہوتے ہیں، وہیں سے کلام منافقین کے ذکر کی طرف مڑ گیا۔ اس لیے کہ جو لوگ اتنے دنیا طلب ہوں کہ حج کی دعاؤں میں بھی اپنی دنیا ہی بنانے کی کوشش کریں وہ منافق ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ذکر کی مناسبت سے چند آیتوں میں منافقین کے کردار پر تبصرہ بھی ہو گیا اور ساتھ ہی سچے اہل ایمان کا جو کردار ہونا چاہیے اس کا ذکر بھی آگیا اور ان کو بعض مناسب موقع ضروری تنبیہات بھی کر دی گئیں تاکہ منافقوں کی منافقانہ روش ان کے لیے کسی ٹھوکر کا باعث نہ بنے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ
۲۰۴-۲۱۴ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا
تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ
الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ
النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ
بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً
وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ
زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ
ع ۲۵ الْغَمَامِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾
سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ

نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢١١﴾
زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ وقف لازم
يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢١٢﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ
اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ
اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ
فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ
وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢١٣﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ
اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ
قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ
الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ
قَرِيْبٌ ﴿٢١٤﴾

ترجمہ آیات ۲۰۴-۲۱۴

اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی باتیں تو اس دنیا کی زندگی میں تمھیں بڑی میٹھی معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنی دلی نیت پر خدا کو گواہ بھی بنا لیتے ہیں لیکن ہیں وہ کٹر دشمن۔ اور جب وہ تمھارے پاس سے ہٹتے ہیں تو ان کی ساری بھاگ دوڑ اس لیے ہوتی ہے کہ زمین میں فساد مچائیں اور کھیتی اور نسل کو تباہ کریں اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کا خوف کرو تو گھمنڈ ان کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔ سو ایسوں کے

لیے جہنم کافی ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ۲۰۴۔۲۰۵۔۲۰۶

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضاجوئی کے لیے اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے۔ ۲۰۷

اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اگر تم ان کھلی ہوئی تنبیہات کے بعد بھی جو تمہارے پاس آچکی ہیں، پھسل گئے تو جان رکھو کہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ ۲۰۸۔۲۰۹

اب تو یہ لوگ صرف اسی بات کے منتظر ہیں کہ اللہ نمودار ہو جائے بدلیوں کے سایہ میں اور اس کے فرشتے اور معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے۔ یہ امور اللہ ہی کے حوالے ہیں۔ بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے ان کو کتنی کھلی کھلی نشانیاں دیں۔ اور جو اللہ کی نعمت کو، اس کے پانے کے بعد، بدل ڈالے تو اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ان کافروں کی نگاہوں میں دنیا کی زندگی کھبا دی گئی ہے اور یہ اہل ایمان کا مذاق اڑا رہے ہیں حالانکہ جو لوگ تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہیں، قیامت کے دن، وہ ان پر بالا ہوں گے۔ اور اللہ جسے چاہے بے حساب روزی دے۔ ۲۱۰۔۲۱۱۔۲۱۲

لوگ ایک ہی امت بنائے گئے۔ انھوں نے اختلاف پیدا کیا تو اللہ نے اپنے انبیا بھیجے جو خوشخبری سناتے اور خبردار کرتے ہوئے آئے اور ان کے ساتھ کتاب بھیجی قول فیصل کے ساتھ تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں، ان میں فیصلہ کر دے۔ اور اس میں اختلاف نہیں کیا مگر انہی لوگوں نے جن کو یہ دی گئی تھی، بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات آچکی تھیں، محض باہمی ضدم ضدا کے سبب سے۔ پس اللہ نے اپنی توفیق بخشی سے

اہل ایمان کی اس حق کے معاملے میں رہنمائی فرمائی جس میں لوگوں نے اختلاف کیا۔ اللہ جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمھیں ان حالات سے سابقہ پیش نہیں آیا جن سے تمہارے اگلوں کو پیش آیا، ان کو آفتیں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہو گی! بشارت ہو کہ اللہ کی مدد قریب ہے! ۲۱۳-۲۱۴

۶۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲۰۴)

منافقین کردار کے کمزور اور گفتار کے غازی ہوتے ہیں

یہ اشارہ ہے منافقین کی طرف۔ جن لوگوں کے کردار کمزور ہوتے ہیں، عموماً وہ گفتار کے بڑے غازی ہوتے ہیں، یہ اپنی عملی کمزوریوں پر اپنی چرب زبانی اور خوش گفتاری سے پردے ڈالتے اور مخاطب کی نیک نیتی اور کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر اس کو اپنے طرزِ عمل کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدینہ کے منافقین میں بھی ایک گروہ ایسے لوگوں کا تھا۔ یہ لوگ کھاتے پیتے، سہل پسند، تن آسان اور چرب زبان تھے۔ شکلیں اچھی، لباس صاف ستھرے، مجلسی آداب میں مشاق لیکن دل کے بودے اور عمل کے چور تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اسلام کی حمایت میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے لیکن جب وہاں سے ہٹتے تو ان کی ساری بھاگ دوڑ اسلام کی مخالفت کی راہ میں ہوتی۔ انھی لوگوں کی تصویر سورۂ منافقون میں ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ	اور جب تم ان کو دیکھتے ہو تو ان کی شکلیں تمھیں اچھی لگتی
وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ	ہیں اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو ان کی چرب زبانی کی وجہ
كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ	سے تم ان کی بات سنتے ہو، لیکن حقیقت میں یہ لکڑی کے
كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ	کندوں کے مانند ہیں جن کو ٹیک لگا دی گئی ہو، یہ ہر خطرہ
الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قَاتَلَهُمُ	کو اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں، اصل دشمن یہی ہیں، پس ان سے

اللّٰہُ ؗ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ (۴) | بچ کر رہو۔ اللہ انہیں ہلاک کرے، یہ کس طرح اوندھے ہوئے جاتے ہیں۔

یعنی ان کے پلے ہوئے جسم اور پالش کی ہوئی شکلیں بظاہر دل کو بھاتی ہیں اور ان کی چکنی چپڑی باتیں، جو یہ تمھیں خوش کرنے کے لیے کرتے ہیں، حمایت اسلام کے جوش میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں اس وجہ سے تمھیں دل کش معلوم ہوتی ہیں اور تم ان کی یہ باتیں سنتے ہو، لیکن حقیقت میں یہ اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں۔ ان کے سینوں میں نہ دل ہیں، نہ ایمان نہ اسلام۔ یہ بالکل لکڑی کے کھوکھلے کندوں کے مانند ہیں جن کو گویا لباس پہنا کر دیواروں سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا گیا ہے۔ دولتِ ایمان سے محروم ہونے کے سبب سے یہ انتہا درجہ کے بزدل ہیں اس وجہ سے یہ ہر خطرے کو اپنے ہی اوپر آتا دیکھتے ہیں اور اپنی اس بزدلی کو اپنی چکنی چپڑی باتوں کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تمھاری توجہ ہٹانے کے لیے تو دوسروں کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں کہ وہ اسلام کے لیے خطرہ ہیں لیکن اسلام کے لیے حقیقی خطرہ خود ان کے نفاق اور ان کی بزدلی کی طرف سے ہے اس وجہ سے ان کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہو۔

بعینہٖ یہی بات اس زیر بحث آیت میں فرمائی گئی ہے کہ جہاں تک ان کی باتوں کا تعلق ہے یہ دل کو بڑی موہ لینے والی ہوتی ہیں لیکن یہ ساری باتیں ملمع کی ہوئی ہیں اور اس ملمع کی یہ مصنوعی آب و تاب چند روزہ ہے۔ اس دنیا میں بے شک وہ ان جھوٹے موتیوں سے لوگوں کو جُل دینے کی کوشش کر سکتے ہیں لیکن عنقریب وہ دن آنے والا ہے جب جھوٹے اور سچے اور کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہو جائے گا اور ان کے چہرے کی یہ پُرفریب نقاب اتر جائے گی۔

وَیُشْہِدُ اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِہٖ (اور وہ اپنے دل کی نیت پر خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے) خدا کو گواہ ٹھہرانے کے معنی خدا کی قسم کھانے کے ہیں۔ منافق کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کے لیے بات بات پر قسم کھاتا ہے۔ اس کے پاس چونکہ کردار کی حجت نہیں ہوتی اس وجہ سے ہر قدم پر قسم کو بطور دلیل پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جھوٹا آدمی، اپنی نفسیاتی کمزوری کی وجہ سے، سمجھتا ہے کہ مخاطب اس کی بات اس وقت تک باور نہیں کرے گا جب تک وہ اس کو قسم کھا کر یقین نہ دلائے۔ ایک راستباز اور صاحب کردار اپنے عمل پر اعتماد کرتا ہے اور جب اس پر کوئی گرفت ہوتی ہے تو وہ اپنے عمل ہی کی دلیل سے اس کی مدافعت کرتا ہے لیکن ایک منافق کے پاس چونکہ عمل کا سہارا نہیں ہوتا اس وجہ سے جب اس پر کوئی گرفت ہوتی ہے تو وہ قسم کو اپنی ڈھال بناتا ہے اور اسی کے سہارے لوگوں کی گرفت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ سورۂ منافقون میں منافقین کے اس کردار کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْہَدُ | جب تمھارے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم
اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ ؗ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ | گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں

اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ	اللہ خوب جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول
الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ اِتَّخَذُوْٓا	ہیں لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک یہ منافق بالکل
اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ	جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے
اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا	اور اس طرح وہ اللہ کے راستہ سے رک گئے ہیں بہت
يَعْمَلُوْنَ (۱-۲ منافقون)	ہی بری ہے وہ حرکت جو یہ کر رہے ہیں۔

وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ، خصام خصم کی جمع ہے اور اَلَدّ کے معنی شدید الخصومۃ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو ان کی باتیں تمہارے سامنے بڑی چکنی چپڑی ہوتی ہیں لیکن ان کے دلوں کے اندر تمہارے اور اسلام کے خلاف نہایت شدید قسم کا بغض و حسد بھرا ہوا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورہ منافقون میں هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ (اصل دشمن وہی ہیں، ان سے بچ کے رہو) کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲۰۵)

اسلام کی مخالفت فساد فی الارض ہے

یعنی تمہارے سامنے تو ان کی باتیں بڑی دل لبھانے والی ہوتی ہیں لیکن تمہارے پاس سے ہٹنے کے بعد ان کی ساری بھاگ دوڑ فساد فی الارض کی راہ میں ہوتی ہے۔ فساد فی الارض سے مراد، جیسا کہ ہم آیت ۱۱ کے تحت واضح کر چکے ہیں، اللہ کی بندگی اور اطاعت کی اس دعوت کی مزاحمت و مخالفت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ زمین کے تمام امن و عدل کا انحصار اس بات پر ہے کہ اللہ کے بندے اللہ ہی کی بندگی اور اسی کی اطاعت میں داخل ہو جائیں، جیسا کہ آگے ارشاد ہو رہا ہے۔ اُدْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ (اللہ کی اطاعت میں سب کے سب داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو) اس بندگی و اطاعت میں داخل ہو جانے کے بعد شیطان کے لیے دراندازیوں اور فساد کی تمام راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ بصورت دیگر تمام نسل انسانی شیطان کی فساد انگیزیوں کی آماجگاہ بنی رہتی ہے اور وہ برابر بغض و عداوت کی آگ بھڑکاتا رہتا ہے جو حرث و نسل دونوں کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ اہل عرب نے اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں اس صورت حال کا اچھی طرح تجربہ کر لیا تھا اس وجہ سے ان کے لیے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ تباہی کے اس جہنم سے خلق خدا کو نکالنے کے لیے سلم و اطاعت کی وہ دعوت کتنی بڑی رحمت و برکت تھی جو قرآن نے پیش کی تھی اور پھر انسانیت کے کتنے بڑے دشمن تھے وہ لوگ جو اس دعوت کی مخالفت کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ دنیا اسی جہنم میں پڑی جلتی رہے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ۔ یعنی بظاہر وہ کتنی ہی چکنی چپڑی باتیں کیوں نہ کریں اور اسلام اور پیغمبر کی دوستی کا دم کیوں نہ بھریں لیکن وہ اللہ کی نظروں میں کوئی مقام کس طرح حاصل کر سکتے ہیں جب وہ اپنے طرز عمل سے اس فساد کو ہوا دے رہے ہیں جس کے نتیجہ میں تمام انسانیت کی تباہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب یہ دنیا بنائی ہے تو وہ اس کی فلاح و بہبود کو پسند کرتا ہے، اس میں فساد اور مفسدین کو وہ پسند نہیں کرتا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ (٢٠٦)

دینداری کے جھوٹے مدعیوں کا غرور

اسلام دوستی اور دینداری کے ایسے جھوٹے مدعیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب ان کی کسی خلاف اسلام حرکت پر گرفت کی جائے اور ان کو توبہ اور اصلاح کی طرف توجہ دلائی جائے تو ان کے پندار کو بڑی چوٹ لگتی ہے۔ وہ اپنی کمزوری و بے اعتمادی اور احساس کہتری کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ انھوں نے اپنی کمزوری تسلیم کر لی تو ان کا سارا بھرم ختم ہو جائے گا، اس وجہ سے وہ اپنی اکڑ میں کوئی خم نہیں پیدا ہونے دیتے۔ منافقین کے اس خاص پہلو کی طرف سورۂ منافقون میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ توبہ کرو، اللہ کا
رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَ	رسول بھی تمہارے لیے خدا سے مغفرت مانگے گا تو
رَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ	وہ اپنی گردن موڑ لیتے ہیں اور تم ان کو دیکھو گے کہ
سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ	وہ استکبار کے ساتھ اعراض کرتے ہیں۔ ان کے لیے
أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ	یکساں ہے تم ان کے لیے مغفرت مانگو یا نہ مانگو۔
اللَّهُ لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ	اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ اللہ بدعہدوں
الْفَاسِقِينَ (٥-٦)	کو راہ یاب نہیں کرتا۔

اسی حقیقت کی طرف سورہ نساء کی یہ آیتیں بھی اشارہ کر رہی ہیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات کے
أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ	فیصلہ کے لیے اللہ کی اتاری ہوئی چیز اور رسول کی طرف
الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا	آؤ تو تم منافقین کو دیکھتے ہو کہ وہ تم سے بڑی بے پروائی
فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ بِمَا	سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت کیا ہوگا جب
قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ	ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو کوئی مصیبت پہنچے گی
يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا	پھر یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ،
وَتَوْفِيقًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ	خدا کی قسم! ہم نے تو یہ محض خیرخواہی اور سازگاری
يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ	پیدا کرنے کے جذبے کے تحت کیا! اللہ ان کے
فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ	دلوں کی بات کو خوب جانتا ہے تو ان سے اعراض
لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا	کرو اور ان کو نصیحت کرو اور ان کو خود ان کے مفاد
وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ	میں دلنشین بات کہو۔ اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول
بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ	مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے
ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ	اور اگر وہ اس وقت جب کہ انھوں نے اپنی جانوں پر

فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (۶۱-۶۴-نساء)

ظلم کیا تمھارے پاس آتے، پھر اللہ سے مغفرت مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت مانگتا تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ (پس اس کے لیے جہنم ہی کافی ہے) یہ ٹکڑا بالعموم اس موقع پر آیا ہے جہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ جن کو دنیا میں ان سنگین شرارتوں کے باوجود ڈھیل دی جاتی ہے تو یہ ڈھیل ان کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے بلکہ یہ صرف اس لیے دی جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے آگے جو جہنم تیار ہے وہ ساری کسر پوری کردینے والی ہے، اس کے ہوتے ان کے لیے اس دنیا میں کسی عذاب کی ضرورت نہیں ہے۔ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

اہلِ اخلاص کی حوصلہ افزائی

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ (۲۰۷)

شریٰ یشری کے معنی بیچنے کے ہیں۔ یہ اشارہ ہے مخلص اہلِ ایمان کی طرف جنھوں نے اللہ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لیے اپنا سب کچھ بیچ دیا ہے۔ ان کا ذکر یہاں دو پہلوؤں سے ہے۔ ایک یہ کہ ان منافقین کو غیرت آئے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے کہ سب تمھارے ہی جیسے مفاد پرست اور ابن الوقت نہیں ہیں بلکہ تمھارے ہی آنکھوں کے سامنے اللہ کے وہ بندے بھی ہیں جو اپنا تن، من، دھن سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور اپنی زندگی کا مقصد اس کی رضا کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ دوسرا یہ کہ اس ذکر سے ان اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی ہو جو ان منافقین کے برعکس اللہ ہی کے لیے جینے اور اللہ ہی کے لیے مرنے والے تھے۔ منافقین کے ذکر کے پہلو بہ پہلو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر فرما دیا کہ اس کے جانباز و وفادار بندے بھی موجود ہیں اور وہی اس کی رافت و رحمت کے سزاوار ہیں۔

"وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر چند اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیع و شرا کا عہد بڑا کٹھن ہے اور اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنی ساری زندگی کو بیچ دینا ایک عظیم جہاد ہے جس کے تقاضے بڑے صبر آزما ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے، وہ ان پر ان کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، اور اگر اس عہد کے تقاضوں میں ان سے کوئی بھول چوک ہو جاتی ہے تو اس کو معاف کرتا ہے، لغزشوں اور کوتاہیوں کے لیے اس نے توبہ و اصلاح کی راہیں کھلی رکھی ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۲۰۸)

سلم کا مفہوم

سِلْم کے معنی اطاعت کے ہیں اور مراد اس سے اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی اسلام کے لیے ہیں۔ لیکن یہ فرق محض ظاہر کا فرق ہے، اس لیے کہ اسلام کی اصل حقیقت اللہ و رسول کی اطاعت ہی ہے۔ یہ لفظ حرب کا ضد بھی آتا ہے اس صورت میں اس کے معنی صلح و امن کے ہوتے ہیں، اس

مفہوم میں بھی اسلام کی روح موجود ہے، اس لیے کہ صلح و امن کی اصل راہ اللہ و رسول کی اطاعت ہی ہے۔

'کافّۃ' کا مفہوم

'کافّۃ' کے معنی جماعت کے ہیں اور یہ یہاں حال پڑا ہوا ہے۔ قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی یہ اسی شکل میں استعمال ہوا ہے۔

منافقین کو خصوصاً اطاعت کی دعوت

خطاب اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے عام یعنی تمام مسلمانوں سے ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ ان سے خطاب کر کے یہ کہا جا رہا ہے کہ سچے اور پکے اہل ایمان کی طرح تم بھی اللہ و رسول کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ اس ہدایت کی وجہ یہ ہے کہ ان منافقین کی وفاداری تقسیم تھی۔ یہ ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے مدعی تھے اور اسلام کی حمایت کا دم بھرتے تھے اور دوسری طرف اسلام کے مخالفین کے ساتھ بھی ان کا ساز باز تھا۔ قرآن نے جگہ جگہ ان کی اس روش کی طرف اشارے کیے ہیں۔ مثلاً سورۂ محمد میں انھیں لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا	یہ اس وجہ سے ہے کہ ان منافقین نے ان لوگوں سے
مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ	جنھوں نے اللہ کی اتاری ہوئی چیز کا برا منایا، یہ کہا کہ
بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ	ہم بعض معاملات میں آپ ہی لوگوں کی اطاعت کریں گے
اِسْرَارَهُمْ (۲۶ - محمد)	اللہ ان کی اس رازداری کو خوب جانتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا سے اشارہ یہود اور مشرکین کے لیڈروں ہی کی طرف ہو سکتا ہے۔

سورۂ نساء کی مندرجہ ذیل آیات بھی ان کی اسی روش کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ	ذرا ان لوگوں کو دیکھو جو مدعی ہیں کہ وہ اس چیز پر
اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ	بھی ایمان لائے ہیں جو تم پر اتری ہے اور اس چیز پر
اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ	بھی جو تم سے پہلے اتری ہے، یہ چاہتے ہیں کہ اپنے
اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ	معاملات فیصلہ کے لیے طاغوت کے پاس لے جائیں
قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَ	حالانکہ ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس کا انکار کریں۔
يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا	شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بڑی ہی دور کی گمراہی میں
بَعِيْدًا ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا	پھینک دے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس
اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ	چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی
رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ	طرف تو تم ان منافقین کو دیکھتے ہو کہ وہ طرح طرح
صُدُوْدًا ۝ (۶۰-۶۱ نساء)	سے گریز کی راہیں اختیار کرتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ یہاں طاغوت سے مراد یہود کی عدالتیں ہیں، چونکہ ان عدالتوں سے رشوت دغیرہ دے کر خلاف عدل و انصاف فیصلے کرانا بڑی آسانی سے ممکن تھا، نیز علمائے یہود نے اپنی کثرت بیرت سے

شریعت کے بہت سے احکام اپنی خواہشات کے مطابق کر دیے تھے اس وجہ سے منافقین اپنے بہت سے معاملات انھی کی عدالتوں میں لے جانا چاہتے تھے اور جب ان سے کہا جاتا کہ ایمان و اسلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ اپنے معاملات قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کریں تو وہ مختلف حیلوں حوالوں سے گریز اختیار کرنے کی کوشش کرتے۔

تقسیمِ وفاداری شرک ہے

وفاداری کی یہ تقسیم ایمان و اسلام کے منافی بلکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرک ہے جس سے شیطانوں کو انسانوں کو گمراہ کرنے کی، جیسا کہ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں اشارہ ہے، نہایت کشادہ راہ مل جاتی ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس فتنہ کے دروازے کو بند کرنے کی ہدایت کی اور حکم دیا کہ سب کے سب بغیر کسی استثنا اور بغیر کسی تحفظ کے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں داخل ہو جائیں۔ اطاعتِ کامل کا یہی راستہ امن و عدل کا راستہ ہے اور اسی راستہ پر چلنے والوں کے لیے فوز و فلاح ہے۔ جو لوگ اس سے ہٹ کر کوئی راہ نکالنی چاہتے ہیں اور بیک وقت کفر اور اسلام دونوں سے رسم و راہ رکھنے کے خواہشمند ہیں، وہ شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں اور شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے اس لیے کہ اس نے روزِ اول ہی سے اس کی راہ مارنے اور اس کو گمراہ کرنے کا کھلم کھلا الٹی میٹم دے رکھا ہے۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۰۹)

'بینات' سے مراد

'بینات' سے مراد وہ تنبیہات و تہدیدات بھی ہیں جو شیطان کی چالوں اور اس کے فتنوں سے آگاہ کرنے کے لیے نہایت تفصیل کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئی ہیں اور وہ واضح اور قطعی ہدایات بھی جو ایمان و اسلام کے تقاضوں کو بیان کرنے کے لیے وارد ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر سورج کی طرح روشن ہدایات و تنبیہات کے بعد بھی تم نے (خطاب منافقین ہی سے ہے) اپنے ازلی اور کھلے ہوئے دشمن ہی کے نقشِ قدم کی پیروی کی تو اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ خدا کی پکڑ سے تم کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ خدا عزیز و حکیم ہے۔

'عزیز' اور 'حکیم' کی وضاحت

عزیز کی صفت کے حوالہ سے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ایک تو اس حقیقت کی طرف کہ خدا کوئی کمزور و ناتواں ہستی نہیں ہے بلکہ وہ غالب و توانا ہے تو جو اس کی تنبیہات کے باوجود شیطان ہی کی پیروی کریں گے ان کو وہ اس عذاب میں ضرور پکڑے گا جو شیطان کے پیروؤں کے لیے اس نے مقدر کر رکھا ہے اور جس کی اس نے پہلے سے خبر دے رکھی ہے۔ دوسرا اس طرف کہ جو لوگ ان واضح ہدایات کے بعد بھی راہِ حق کو چھوڑ کر شیطان ہی کی پیروی اختیار کریں گے وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ اپنا ہی بگاڑیں گے اس لیے کہ خدا عزیز ہے یعنی ہر نفع و نقصان سے بالاتر۔

اسی طرح حکیم کی صفت بھی یہاں دو حقیقتوں کو نمایاں کر رہی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس دنیا کا خالق حکیم ہے اور اس کے حکیم ہونے کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ وہ اپنی ہدایت پر جمے رہنے والوں اور اس سے منحرف ہو جانے والوں کے درمیان ان کے انجام کے لحاظ سے امتیاز کرے، اگر وہ ان میں کوئی امتیاز نہ کرے بلکہ دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے

یا دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ایک حکیم نہیں بلکہ ایک کھلنڈرا ہے اور یہ دنیا ایک پر حکمت اور با مقصد کارخانہ نہیں بلکہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے۔ دوسری یہ کہ بدی اور نیکی کے نتائج کے ظہور میں جو دیر سویر ہوتی ہے وہ سب حکمت پر مبنی ہوتی ہے، بسا اوقات شیطان کے پیروکاروں کو اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے اور بسا اوقات اہل حق کسی آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، اس سے نہ تو اہل باطل کو مغرور ہونا چاہیئے نہ اہل حق کو مایوس۔ بلکہ یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ مہلت اور یہ آزمائش دونوں خدائے حکیم و دانا کی حکمت پر مبنی ہے اور اس حکمت کے تحت اس کے قوانین اور ان کے نتائج بالکل قطعی اور اٹل ہیں، ان میں سرِ مو فرق ممکن نہیں ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۲۱۰)

• نظر ینظر کے معنی جس طرح دیکھنے کے آتے ہیں اسی طرح اس کے معنی انتظار کرنے کے بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان بینات اور ان تنبیہات و تہدیدات کے بعد بھی جو لوگ جادۂ مستقیم پر ہموار نہ ہو سکے بلکہ شیطان کے پیچھے بھٹکتے ہی رہ گئے۔ اب سنت اللہ کے تحت تو ان پر اتمام حجت کے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اب بھی اگر وہ کسی چیز کے منتظر ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ اس طرح ان کو اپنا جلال دکھائے کہ اس کے ساتھ بدلیوں میں اس کا عذاب چھپا ہوا ہو اور اس کے جلو میں اس کے فرشتوں کی افواج قاہرہ ہوں اور حق و باطل کی اس کشمکش کا آخری فیصلہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ فیصلہ نبی کے کرنے کا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کس قوم کا فیصلہ کب ہونا چاہیئے اور کس طرح ہونا چاہیئے۔

معتبر ایمان — اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان و ہدایت وہ معتبر ہے جو نتیجہ ہو آیاتِ الٰہی کے سننے اور سمجھنے کا نہ کہ وہ جو منتظر ہو جلالِ الٰہی اور قہر خداوندی کے ظہور اور مشاہدہ کا۔ جو گروہ اس چیز کا منتظر ہوتا ہے وہ صرف اپنی شامت کے ظہور کا منتظر ہوتا ہے اس لیے کہ وہ حقائق کو آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو مطلوب یہ ہے کہ انسان اپنی عقل سے کام لے اور اس کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کی رہنمائی کو قبول کرے۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰھُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۲۱۱)

ایمان کی راہ اہل عقل کے لیے کھلتی ہے — • آیات بینات سے مراد ہیں وہ کھلے کھلے معجزات جو بنی اسرائیل کو دیے گئے۔ ان کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ ایمان و ہدایت کا راستہ ان لوگوں پر کھلتا ہے جو عقل اور سمجھ سے کام لیتے ہیں، جو عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی بدستور اپنے تذبذب اور اپنی بے اعتقادی ہی میں پڑے رہتے ہیں۔ آخر دیکھو، بنی اسرائیل نے کتنے معجزے اپنی آنکھوں سے دیکھے، ان معجزات سے قطع نظر جو حضرت موسیٰ کے ہاتھوں سرزمین مصر پر ظاہر ہوئے، خود بنی اسرائیل کے لیے سمندر خشک ہوا، کوہ طور شق ہوا، ایک خشک پہاڑی

سے اکٹھے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، ایک صحرائے بے آب وگیاہ میں ان کے لیے من وسلویٰ کا خوانِ نعمت بچھا دیا گیا، غرض قدم قدم پر ان کے لیے معجزے ظاہر ہوئے لیکن جو بے اعتقادی ان پر روزِ اول سے مسلط تھی وہ بدستور مسلط رہی، پھر انھی کے نقشِ قدم پر چلنے والوں سے یہ توقع کس طرح کرتے ہو کہ اگر ان کے سامنے ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ ظاہر ہو جائے گا تو ان کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ یہ غلط ہے۔ ان کی آنکھیں بڑے سے بڑے معجزے دیکھنے کے بعد بھی بند ہی رہیں گی۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کا حوالہ دینے میں خاص پہلو یہ ہے کہ جن منافقین کے حال پر یہاں تبصرہ ہو رہا ہے وہ زیادہ تر بنی اسرائیل ہی کے گروہ سے تعلق رکھنے والے تھے، اس وجہ سے ان کے سامنے انھی کی پچھلی تاریخ کا آئینہ رکھ دینے میں ایک نہایت ہی بلیغ تعریض ہے۔

’نعمۃ اللہ‘ سے مراد

"وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ". نِعْمَةَ اللّٰهِ سے مراد یہاں اللہ کی ہدایت اور شریعت ہے۔ اور اس کے بدلنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی قدر کر کے اس کو ایمان وہدایت کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کی ناقدری کر کے اس کو کفر کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بعض مقامات میں تبدیلی کی اس نوعیت کی وضاحت بھی ہو گئی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا ۲۸- ابراہیم (کیا دیکھو تو ان لوگوں کو جنھوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل دیا) مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی اس عظیم نعمت کو پا کر اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کسی ایسے نشان کے ظہور کے منتظر ہیں جو حق کے آگے ان کی گردنیں زبردستی خم کر دے تو وہ درحقیقت ہدایت کو ضلالت سے اور نعمت کو نقمت سے بدل رہے ہیں اور ایسے لوگ سنتِ الٰہی کے مطابق اللہ تعالیٰ کی سخت پاداش سے دوچار ہوتے ہیں۔

زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَیَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ (۲۱۲)

اہلِ باطل کا فریبِ نظر

یہ اس فریبِ نظر کی طرف اشارہ ہے جس میں مبتلا ہونے کے سبب سے اہلِ باطل اپنی باطل پرستیوں ہی میں مگن زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں اور ان کو نبی اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے جب ان کی اس غفلت کے انجامِ بد کی خبر دی جاتی ہے تو ان کا مذاق اڑاتے اور ان کو زچ کرنے کے لیے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر والی آیت میں اشارہ ہو چکا ہے۔

’حق وباطل‘ دونوں کے لیے مہلت کا قانون

فریبِ نظر یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں حق اور باطل اور کفر وایمان دونوں کو مہلت ملی ہوئی ہے۔ کوئی شخص اگر نیکی اور اطاعت کی راہ اختیار کرتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ ابتلاء کے قانون سے بالاتر ہو جائے بلکہ بعض حالات میں اس کا ابتلاء اس کے ایمان کے اعتبار سے سخت سے سخت تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کفر ونافرمانی کی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اس کے لیے بھی سنتِ الٰہی یہ نہیں ہے کہ فوراً خدا کے فرشتے اتر کر اس کی گردن ناپ دیں بلکہ اکثر حالات میں اس کو ایسی ڈھیل پر ڈھیل ملتی جاتی ہے کہ اس کی جسارت

دن بدن بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اسی فریبِ نظر کو یہاں "زُيِّنَ" سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی اس دنیاوی زندگی کا یہ فریب اس طرح ان کی نگاہوں میں کھبا دیا گیا ہے کہ وہ اس کے اس پہلو سے نگاہ ہٹا کر کسی اور پہلو سے اس کو دیکھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ ان کی نگاہوں میں اس زندگی کی اس خاص پہلو سے تزئین شیطان نے کی ہے، جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں اس کی تصریح ہے۔ اور یہ امر بھی ظاہر ہے کہ شیطان کو اس تزئین کا موقع انسان کی عاجلہ پرستی اور اتباعِ شہوات نے فراہم کیا ہے۔

جو لوگ اس فریبِ نظر میں مبتلا ہوتے ہیں ان کو جب اہلِ ایمان ان کے اعمال و عقائد پر دنیا یا آخرت میں کسی پکڑ یا سزا وغیرہ کی یاد دہانی کرتے ہیں تو وہ ان پر ہنستے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ بتاؤ، تمہارا حال اچھا ہے یا ہمارا، اگر ہمارا حال اچھا ہے اور ظاہر ہے کہ تم سے بدرجہا اچھا ہے تو ہم کیوں نہ سمجھیں کہ ہمارا ہی رویہ بھی صحیح ہے۔ پھر جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی تمام بدمستیوں کے باوجود اس قسم کی کوئی گرفت ان پر نہیں ہو رہی ہے جس کے ڈراوے اہلِ ایمان ان کو سناتے ہیں تو اپنی روش پر ان کا اطمینان اور بھی بڑھ جاتا ہے اور وہ ان کا مذاق اڑانے میں اور بھی زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔

"وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" یعنی اس دنیا میں تو بلاشبہ صورت حال ایسی ہی ہے کہ ظاہر پرست، اہلِ ایمان اور اہلِ تقویٰ کا مذاق اڑا سکتے ہیں اس لیے کہ اس دنیا کا کارخانہ جزا اور سزا کے قانون پر نہیں چل رہا ہے بلکہ ابتلا کی سنت کے تحت چل رہا ہے لیکن اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے جو جزائے اعمال کا مظہر ہوگی، اس دن وہ اہلِ ایمان جو دنیا کے اس فریبِ نظر میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے تقویٰ کی زندگی گزاری ہے وہ بالا ہوں گے۔

یہاں صرف یہ فرمایا کہ وہ بالا ہوں گے، یہ نہیں بتایا کہ ان کے مذاق اڑانے والے کہاں ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیز بالکل متعین تھی، اس کی خبر ان کو پیغمبر اور اہلِ ایمان کے انذار کے ذریعہ سے دے دی گئی تھی اس وجہ سے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ اہلِ ایمان کی فوقیت کی وضاحت کے لیے یہ فرمایا کہ اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ "رزق" تعبیر ہے اللہ تعالیٰ کے فضل کی اور اس فضل کے بابت ارشاد ہوا کہ بے حساب ہوگا، یعنی توقعات اور اندازوں، قیاسوں اور گمانوں کے تمام پیمانے ان کے ناپنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ اس حقیقت کی تمثیل بعض احادیث میں نہایت موثر انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل دوسرے مقام میں آئے گی۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۱۳)

اہل ایمان کی حوصلہ افزائی
اوپر اہل ایمان کے ساتھ کفار و منافقین کے مذاق و استہزا کا ذکر ہوا ہے، اب اس آیت میں اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے کہ اطمینان رکھو، موقف حق پر تم ہی ہو، اختلافات و نزاعات کے درمیان فیصلہ کرنے والی حقیقت تمہارے ہی پاس ہے اور کفر و ضلالت کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر صرف تمھی ہو جن کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب ہوئی ہے۔ یہ کفار و منافقین جو تمہاری مخالفت کر رہے ہیں اور تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں یہ سب اس باہمی ضد اور عناد کا کرشمہ ہے جس میں یہ ہمیشہ سے مبتلا ہیں اور جس میں مبتلا ہونے کی وجہ سے یہ خدا کی ہدایت کے ایسے دشمن ہو گئے ہیں کہ نہ اس کو خود پانا چاہتے اور نہ کسی دوسرے کو پانے دینا چاہتے تو تم ان کی ان مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود اپنے موقف پر جمے رہو۔ آزمائش کا یہ دور، جو اللہ تعالیٰ کی سنت کے تحت ہے، گزر جانے کے بعد کامیابی اور فتحمندی تمہارے ہی لیے ہے۔

"کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً" میں "کَانَ" ہمارے نزدیک تامہ ہے دوام کے مفہوم میں جیسا کہ کَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے اس نے لوگوں کو ایک ہی دین دیا اور ایک ہی امت بنایا، جیسا کہ فرمایا ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ہمیشہ سے اللہ کا دین اسلام ہی ہے فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا یہی دین فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا اور یہی دین ہے جو اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجا۔ نہ اس نے اسلام کے سوا کسی اور دین کو پسند فرمایا نہ امت مسلمہ کے سوا کوئی امت بنانی چاہی۔ اس کے ہاں دین صرف اسلام اور امت صرف امت مسلمہ ہے۔

آیت ۲۱۳ کے اجزا کی بحث
کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً کے بعد فَاخْتَلَفُوْا کا لفظ محذوف ہے۔ اس محذوف کو آگے چل کر کھول دیا ہے چنانچہ فرمایا ہے لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ۔ یہ حذف عربی اسلوب کے مطابق تکرار سے بچنے کے لیے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو ایک ہی دین دیا اور ایک ہی امت بنائی لیکن لوگوں نے اس دین میں اختلاف کیا اور اس کے نتیجے میں تحزب اور گروہ بندی میں مبتلا ہوئے تو اللہ نے اپنے انبیا بھیجے کہ وہ لوگوں کو دین میں اختلاف کے نتائج بد سے آگاہ کریں اور حق پر قائم رہنے والوں کو کامیابی اور نجات کی خوشخبری سنا دیں۔ اللہ نے ان نبیوں کو کتابیں عطا فرمائیں، یہ کتابیں حق یعنی قول فیصل کے ساتھ اتریں تاکہ ان تمام نزاعات کا جو دین حق میں پیدا کر دی گئی تھیں، فیصلہ کر کے از سر نو حق کو اجاگر کر دیا جائے۔ لیکن جن امتوں کو یہ حق عطا ہوا انھوں نے نہایت واضح دلائل کی روشنی میں اس حق کو سمجھ لینے کے بعد محض آپس کی ضد م ضدا کے سبب سے خود ہی اس حق میں اختلاف کیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار حق کی وضاحت کے باوجود اختلاف قائم ہی رہا اور انھی لوگوں کے ہاتھوں قائم رہا جو اس حق کے امین بنائے گئے تھے۔

اب اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق سے اس نزاع و اختلاف میں حق کی راہ پھر اس قرآن کے ذریعے سے اہل ایمان یعنی پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں پر کھولی ہے اور اللہ ہی ہے جو اپنی مشیت

اور حکمت کے تقاضوں کے مطابق جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔

امت مسلمہ کی عظیم ذمہ داری — اس آخری ٹکڑے کے اندر اس عظیم ذمہ داری کی طرف اشارہ بھی ہے جو اس امت پر دینِ حق کی امانت سے متعلق عائد ہوتی ہے کہ اس حق کو پاکر تم بھی اس میں اس طرح کے اختلافات برپا کرنے والے نہ بن جانا جس طرح دوسرے تم سے پہلے بن گئے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ بازی کوئی آسان بازی نہیں ہے بلکہ یہ بڑی جان جوکھوں کا کام ہے، ادیانداری اور حق پرستی کے پشتینی ٹھیکیدار، جن کے کاروبار کی ساری کامیابی کا دار و مدار حق کے گم ہی رہنے میں ہے، تمھیں آسانی سے نہیں چھوڑیں گے بلکہ تمہارے پیچھے جھاڑ کے کانٹے بن کر پڑ جائیں گے۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ (۲۱۴)

حاملینِ حق کے لیے امتحان کی کسوٹی — یہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جس کی کسوٹی پر ہر وہ جماعت پرکھی جاتی ہے جو اصل حق کی حامل بن کر اٹھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ منافقین اور کفار کی اس مخالفت اور اس استہزا سے گھبرا نہ جاؤ، ابھی تو اس راہِ عشق کی یہ ابتدا ہے، آگے اس سے کہیں کٹھن مقامات آنے ہیں، تمھیں بھی ان سارے مراحل سے گزرنا ہے جن سے تم سے پہلے اٹھنے والے حاملینِ حق کو گزرنا پڑا ہے، تم سے پہلے جنھوں نے اس راہ میں قدم رکھے ان کو ایسے مصائب و شدائد پیش آئے اور وہ آزمائشوں کے ہاتھوں اس طرح جھنجھوڑ دیے گئے کہ رسول اور اس کے ساتھی سب مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ پکار اٹھے۔

"حَتّٰى يَقُوۡلَ" ہمارے نزدیک حال کے معنی میں ہے اور مقصود اس سے تصویرِ حال ہے۔ اور مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ کا اسلوب اس فریاد کو ظاہر کرتا ہے جس کی نوعیت امید کے دروازے پر آخری دستک کی ہوتی ہے۔ فرمایا کہ نصرتِ الٰہی کا دروازہ اسی دستک کی کلید سے کھلتا ہے۔ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ۔ ؎

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا — اب لیا چشمۂ بقا تو نے

۷۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۱۵-۲۲۱

اوپر کا مضمون، واضح ہو چکا ہے کہ حج کے مضمون سے بطور ایک التفات کے پیدا ہو گیا تھا جس سے اہلِ نفاق کو ایک مناسب موقع تنبیہ ہو گئی اور اہلِ ایمان کو ایک برمحل تذکیر۔ اصل سلسلہ بیان حج اور جہاد و انفاق سے متعلق تھا چنانچہ اس ضمنی مضمون کے ختم ہونے کے بعد وہ سلسلۂ کلام پھر لوٹ آیا اور مذکورہ چیزوں سے متعلق اس دوران میں لوگوں کے اندر جو سوالات پیدا ہوئے ان کے جوابات دیے گئے۔

عربِ جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اور شراب کا جوڑ

یہ سوالات، جیسا کہ آگے کی تفصیلات سے واضح ہوگا، انھی مسائل سے متعلق ہیں جو اوپر زیرِ بحث آئے ہیں۔ البتہ شراب اور جوئے سے متعلق جو سوال ہے وہ اس موقع پر ان لوگوں کو شاید بے جوڑ معلوم ہو جو عرب کے اس زمانے کے تمدنی و معاشرتی حالات سے واقف نہیں ہیں جس زمانے میں یہ آیتیں اتری ہیں۔ یہ سوال درحقیقت اس انفاق کے تعلق سے یہاں پیدا ہوا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

اہل عرب کی ایک محبوب روایت

ہم آیات کی وضاحت کرتے ہوئے بتائیں گے کہ عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اور شراب کے جہاں بہت سے مضر پہلو تھے وہاں ان کے بعض مفید پہلو بھی تھے۔ عرب کے سخی اور حوصلہ مند لوگوں میں یہ روایت تھی کہ قحط، خاص طور پر سردیوں کے زمانے میں، وہ جگہ جگہ اکٹھے ہوتے، خوب شراب پیتے، پھر شراب کی مستی میں جس کسی کے اونٹ یا اونٹنی کو چاہتے ذبح کر دیتے، پھر اس کے مالک کو منہ مانگے دام دیتے اور اس کے گوشت پر جوا کھیلتے اور ہر شخص جتنا گوشت جیتتا جاتا وہ ان غریبوں اور فقیروں میں لٹاتا جاتا جو اس طرح کی کسی تقریب کی خبر سن کر موقع پر پہلے ہی سے جمع ہو جاتے۔ یہ روایت عرب میں بڑی محبوب روایت تھی۔ جب شمال کی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں اور ملک میں قحط کی سی حالت پیدا ہو جاتی تو جو لوگ اس قسم کی تقریبیں منعقد کرتے یا ان میں شریک ہوتے ان کو بڑا سخی داتا سمجھا جاتا اور سوسائٹی میں ان کی بڑی عزت ہوتی۔ اس کے برعکس جو لوگ اس چیز سے الگ الگ رہتے ان کے لیے ایک خاص لفظ برم کا استعمال ہوتا جس کے معنی بخیل کے ہیں۔

عرب شعرا اس جوئے اور شراب کا ذکر اپنے قصائد میں بڑی دھوم دھام سے کرتے ہیں۔ میں یہاں بعض مشہور شعرا کے کلام کے حوالے نقل کرنا چاہتا تھا لیکن اس قسم کی خاص علمی چیزوں سے عام قارئین کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھاتے اس وجہ سے ان کو نظر انداز کرتا ہوں۔

غرض جوئے اور شراب کا یہ پہلو تھا جس کی وجہ سے عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں ان کا شمار فیاضی اور سخاوت کے خصائل اور خدمتِ خلق اور ہمدردی غربا کے محرکات میں سے ہوتا تھا۔ چنانچہ جب قرآن نے انفاق اور ہمدردی غربا پر بہت زور دیا تو بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جب اسلام غریبوں اور یتیموں کی ہمدردی اور ان کی امداد کے لیے مال خرچ کرنے پر اتنا زور دیتا ہے تو آخر اس جوئے اور شراب میں کیا خرابی ہے جو قحط کے زمانے میں غربا کی امداد کا ذریعہ بنتے ہیں۔ قرآن نے یہاں اسی سوال کو نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے کہ اس میں شبہ نہیں کہ ان چیزوں سے سوسائٹی کو بعض اعتبارات سے کچھ فائدے تو ضرور پہنچ جاتے ہیں لیکن ان سے فرد اور سماج دونوں کو جو مادی و اخلاقی نقصانات پہنچتے ہیں وہ ان کے فوائد کی نسبت سے بہت زیادہ ہیں اس وجہ سے اسلام نے ان کو حرام قرار دیا۔

یہ سوال بالکل اسی طرح کا سوال ہے جس طرح کا سوال وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو آج قحط، زلزلہ اور سیلاب وغیرہ کے مصیبت زدوں کی امداد کے لیے فنڈ جمع کرنے کی خاطر رقص و سرود کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں یا سنیما کے

شو دکھاتے ہیں یا فلم اسٹاروں کے مظاہرے اور ان کے میچ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو بھی اگر ان برے راستوں کے اختیار کرنے پر (اگرچہ وہ کسی اچھے ہی مقصد سے اختیار کیے گئے ہوں) ملامت کی جائے تو وہ کہتے ہیں کہ جب ہم یہ کام انسانیت کی خدمت کے لیے کر رہے ہیں تو آخر اس میں کیا خرابی ہے؟ درحقیقت یہ لوگ بھی عرب جاہلیت کی طرح اپنی ان حماقتوں کے صرف انھی پہلوؤں کو دیکھتے ہیں جو ان کی نگاہوں میں بظاہر نفع عوام کے ہیں، ان کی نظر ان ہولناک نقصانات کی طرف نہیں جاتی جو ان سے پورے معاشرے کو پہنچتے ہیں۔ یہاں ہم صرف اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔ آگے آیات کی تفسیر کے تحت اس کی ضروری تفصیل آئے گی۔

اسی طرح اس ضمن میں یتامیٰ سے متعلق بھی ایک سوال پیدا ہوا تھا۔ اوپر انفاق کے سلسلہ میں والدین اور اقربا کے ساتھ یتیموں کا بھی حوالہ دیا گیا تھا کہ اس انفاق کے مستحق وہ بھی ہیں۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے خاندان کے کسی یتیم کے معاملات کو، جس کی اس کے سر ذمہ داری ہے، اپنے ساتھ شامل کر لے اور اس کی ماں کے ساتھ نکاح کر لے تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔ یہاں قرآن نے اس سوال کے بھی بعض پہلوؤں کو واضح فرمایا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت کیجیے تو وہ بالکل مربوط کڑیوں کی شکل میں نظر آئیں گی۔

آیات ۲۱۵-۲۲۱

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ
وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا
مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢١٥﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ
لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ
ع ۲۶ ۱۰ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾
يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ
كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ
وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ
الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ
اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ
هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَ

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ
يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ
الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ
اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ
الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِي
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ
خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ
الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾
وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ
مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى
يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ
يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ
بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ ع ٢٧ ٥ ١١

ترجمانیات ۲۱۵ - ۲۲۱

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دو جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو تو وہ والدین،
قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے اور جو نیکی بھی تم کرتے ہو اللہ
اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۲۱۵

تم پر کفار سے جنگ فرض کی گئی اور وہ تمہارے لیے ایک ناگوار شے ہے۔ ممکن ہے

تم ایک شے کو ناگوار خیال کرو حالانکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم ایک شے کو پسندیدہ سمجھو اور وہ تمھارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ۲۱۶

وہ تم سے شہر حرام میں جنگ کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اس میں جنگ بڑی سنگین بات ہے۔ لیکن اللہ کے راستہ سے روکنا، اس کا کفر کرنا، مسجد حرام سے روکنا اور اس کے لوگوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس جنگ سے بھی زیادہ سنگین ہے اور جبر و ظلم کے ذریعہ سے لوگوں کو دین سے پھیرنا قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور یہ لوگ تم سے برابر جنگ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ تم کو تمھارے دین سے پھیر دیں اگر وہ پھیر سکیں اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا اور حالت کفر میں مرے گا تو یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور یہی لوگ دوزخ میں پڑنے والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ البتہ جو لوگ ایمان پر جمے رہیں گے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ اللہ کی رحمت کے متوقع ہیں۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۲۱۷-۲۱۸

وہ تم سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو ان دونوں چیزوں کے اندر بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے۔

اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضروریات سے بچ رہے۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم غور کرو، دنیا اور آخرت دونوں کے معاملات میں۔ ۲۱۹

اور وہ تم سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو جس میں ان کی بہبود ہو وہی بہتر ہے

اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ شامل کر لو تو وہ تمہارے بھائی ہی ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ کون بگاڑ چاہنے والا ہے اور کون بہبود، اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا۔ بے شک اللہ غالب و حکیم ہے۔ ۲۲۰

اور مشرکہ عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرو۔ ایک مومنہ لونڈی ایک آزاد مشرکہ سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بھلی لگے اور مشرکوں کو جب تک وہ ایمان نہ لائیں اپنی عورتیں نکاح میں نہ دو، ایک مومن غلام ایک آزاد مشرک سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بھلا لگے۔ یہ لوگ دوزخ کی طرف بلانے والے ہیں اور اللہ اپنی توفیق بخشی سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ ۲۲۱

۷۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲۱۵)

سوال کرنے والوں کی بیمار ذہنیت

اس سورہ میں شروع ہی سے انفاق اور زکوٰۃ کا حکم باربار آ رہا ہے۔ خاص طور پر آیت ۱۹۵ میں بیت اللہ کی آزادی کے جہاد کے سلسلے میں بڑی تاکید سے انفاق پر ابھارا ہے۔ وہاں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے تو خطاب عام ہے لیکن روئے سخن درحقیقت ان مسلمانوں کی طرف ہے جو جان و مال کی قربانی میں کمزور تھے۔ قاعدہ ہے کہ آدمی کے دل میں اگر کسی چیز سے متعلق کمزوری ہو، وہ اس کے کرنے کی ہمت نہ کر رہا ہو تو وہ اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے بار بار سوال کرتا ہے اور اس طرح گویا وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ جہاں تک اصل کام کا تعلق ہے اس کو کرنے کے لیے تو وہ جی جان سے حاضر ہے لیکن کرے کیا کہ ابھی تو اصل بات ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ یہی بھید ہے کہ سوالات سچے اور پکے مسلمانوں کی طرف سے بہت کم کیے گئے زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے کیے گئے جو کم ہمت اور بخیل تھے اور اپنی اس کمزوری کو سوالات کے پردے میں چھپانا چاہتے تھے۔ اسی طرح کے لوگ تھے جنھوں نے انفاق کے حکم کے جواب میں یہ سوال اٹھایا جس کا آیت

زیر بحث میں حوالہ دے کر جواب دیا گیا ہے۔ اس سوال سے خود اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ گویا وہ انفاق کے مطالبوں سے دبے جا رہے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ مطالبے کس حد پر جا کر رکیں گے، چنانچہ قرآن نے سوال کرنے والوں کی اس ذہنیت کو سامنے رکھ کر جواب دیا ہے اور اس جواب کے دو حصے ہیں۔

جواب کے دو پہلو

ایک حصہ تو یہ ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ وہ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں اس کا کوئی حصہ بھی خدا کے جیب میں نہیں جاتا، وہ کسی کے مال و اسباب کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ ایک ہاتھ سے جو کچھ لیتا ہے دوسرے ہاتھ سے ہماری ہی طرف لوٹا دیتا ہے، ہمارے ہی ماں باپ، ہمارے ہی خویش و اقارب، ہمارے ہی یتیم، ہمارے ہی مسکین اور ہمارے ہی مسافر اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ گویا خدا کی راہ میں ہم جو کچھ خرچ کرتے ہیں، کسی دوسرے کی خدمت پر نہیں بلکہ اپنی ہی خدمت پر خرچ کرتے ہیں۔ بس فرق ہے تو یہ ہے کہ اس خرچ کی نوعیت ایک اجتماعی نظم کی ہے جس کا فائدہ سب کو بحیثیت مجموعی پہنچتا ہے۔ یہی حقیقت حضورؐ نے تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِھِمْ وَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِھِمْ (ان کے مالداروں سے لے کر ان کے غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے) کے الفاظ سے واضح فرمائی اور اسی بات کی طرف سورۂ سبا کی آیت قُلْ مَا سَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَھُوَ لَکُمْ ۴۷ (کہہ دو میں نے جو تم سے اجر مانگا ہے وہ تمہارے ہی لیے ہے) بھی اشارہ کر رہی ہے۔

اس جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان جو نیکی بھی کرتا ہے اسے اطمینان رکھنا چاہیے کہ اس کا ایک ایک ذرہ سب خدا کے علم میں ہے۔ کوئی چیز نہ تو اس کے علم سے باہر ہے اور نہ کسی چیز کو وہ فراموش کرنے والا ہے، پھر جب وہ سب کچھ جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس کا بھرپور صلہ بھی دے گا، پھر جب ہر چیز کا صلہ ملنے والا ہے اور وہ بھی دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک تو ایسے نفع بخش کاروبار میں سرمایہ لگانے سے انسان کیوں گھبرائے؟ وَلَا یُنْفِقُوْنَ نَفَقَۃً صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً وَّلَا یَقْطَعُوْنَ وَادِیًا اِلَّا کُتِبَ لَھُمْ لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۱۲۱- توبہ (اور وہ خدا کی راہ میں جو چھوٹا یا بڑا انفاق کرتے ہیں یا کوئی وادی قطع کرتے ہیں تو یہ ان کے لیے لکھ لیا جاتا ہے تاکہ اللہ ان کو اس سے بہتر بدلہ دے)

ناگزیر حالات میں انفاق فی سبیل اللہ کی آخری حد

یہ جواب اگرچہ نہایت واضح اور جامع تھا لیکن اس کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ غالباً اسی کمزوری کے سبب سے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، سوال کرتے ہی رہے چنانچہ آگے آ رہا ہے وَیَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ، قُلِ الْعَفْوَ ۲۱۹ (اور وہ تم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دو کہ جو ضروریات سے فاضل بچ رہے) اس جواب نے انفاق کی آخری حد معین کر دی کہ یہ انفاق چونکہ امت کے تحفظ و بقا کے جہاد کے سلسلہ کا انفاق ہے اس وجہ سے اس میں دین کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اپنی ناگزیر ضروریات سے جو کچھ بچا سکے وہ سب خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے تیار رہے۔

مولانا فراہیؒ اس آیت کو ذرا اس سے مختلف زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی تاویل یہ ہے کہ چونکہ یہ انفاق اس جہاد کے لیے تھا جس کا حکم خانہ کعبہ کو مشرکین کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لیے ہوا تھا اس وجہ سے اس

نے مسلمانوں کی ساری توجہ اپنی طرف جذب کر لی اور اس جہاد کی تیاریوں میں وہ اس قدر منہمک ہو گئے کہ انفاق کے دوسرے مصارف — والدین، اقربا، یتامیٰ، مساکین وغیرہ — کی طرف ان کو وہ توجہ نہیں رہی جو ہونی چاہیے تھی اس وجہ سے لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ انفاق کی مقدار کیا ہو۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا جائے اس کے اولین حق دار وہ مستحقین ہیں جن کا ذکر ہوا، پھر مزید جو کچھ خرچ کیا جائے تو وہ سب اللہ کے علم میں رہے گا اور وہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ یہاں مقدار کی تشریح نہیں فرمائی کہ لوگ خود اپنی عقل سے کام لیں اور مختلف دینی ضروریات میں توازن قائم کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی بعض لوگوں کے ذہن میں مقدار سے متعلق شبہ رہ گیا تو انھوں نے پھر سوال کیا۔ ان کے جواب میں یہ تصریح کر دی گئی کہ جو کچھ مستحقین سے فاضل بچے وہ خرچ کرو، چونکہ اوپر مستحقین کا ذکر ہو چکا تھا اس وجہ سے یہ مختصر جواب کافی ہوا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۱۶)

جہادِ مالی اور جہادِ جانی

اوپر یہ بات تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے کہ یہ انفاق اور یہ جنگ دونوں ایک ہی سلسلے کی باتیں ہیں اس لیے کہ جہاد جان اور مال دونوں سے ہوتا ہے۔ اوپر والی آیت میں اس تردد کو دور کیا ہے جو بعض ذہنوں میں مالی قربانی سے متعلق پیدا ہوا اب اس آیت میں وہ تردد رفع کیا جا رہا ہے جو جان کی قربانی کے معاملہ میں تھا۔ اس تردد کو رفع کرنے کے لیے ایک اصولی حقیقت جو واضح فرمائی وہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے فوز و فلاح اور عروج و کمال کا راستہ خود نہیں طے کر سکتا ہے بلکہ وہ خدا ہی طے کر سکتا ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے، اس لیے کہ اسی کو علم ہے کہ انسانی فطرت کے مضمرات اور اس کی صلاحیتیں کیا ہیں اور وہ طریقے اور قاعدے کیا ہیں جن کو اختیار کر کے وہ اپنی تمام صلاحیتیں اجاگر کر سکتا ہے۔ اگر اپنے لیے خیر و شر کا فیصلہ کرنے کا سارا معاملہ انسان کی اپنی ہی خواہش اور اس کی اپنی ہی عقل پر چھوڑ دیا جاتا تو عجب نہیں کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اپنی زندگی کے پروگرام سے وہ ساری باتیں ایک ایک کر کے خارج کر دیتا جو اس کے عروج کمال اور اس کے روحانی و اخلاقی ارتقا کا ذریعہ ہیں کیونکہ ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو اس کے نفس کے لیے دل پسند ہو بلکہ ایک سے ایک بڑھ کر نفس پر شاق گزرنے والی ہیں۔ اسی طرح اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ وہ اپنے اندر وہ ساری باتیں جمع کر لیتا جو اس کو اسفل سافلین میں لے جانے والی ہیں کیونکہ یہ ساری باتیں نفس کے لیے نہایت آسان اور لذیذ ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ عجیب رمز ہے کہ جو چیزیں اس کے نفس کو مرغوب ہیں وہ اس کو پست کرنے والی ہیں اور جو چیزیں اس کو بلند کرنے والی ہیں وہ اس کے نفس کو عموماً بہت شاق ہیں۔ اس وجہ سے اس کی فلاح کی راہ بتانے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہے اور اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ سے اس کی رہنمائی کی ہے۔

جہاد کا ایک خاص پہلو

جنگ و جہاد کے معاملے کی نوعیت بھی بعینہ یہی ہے۔ اس کے ظاہری پہلو پر نگاہ ڈالی جائے تو اس سے زیادہ ہولناک چیز کیا ہو سکتی ہے، لیکن بسا اوقات اس ہولناک شے کو سب سے زیادہ محبوب بنانا پڑتا ہے اس لیے کہ اگر اس سے گریز کیا جائے تو تمام انسانی اقدار بالکل تباہ ہو کر رہ جائیں۔

یہ جو فرمایا ہے کہ "اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے" تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان کسی معاملے میں خیر و شر کے پہلو کو متعین کر ہی نہیں سکتا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو اس راہ میں بہت سے مغالطے پیش آتے ہیں اس وجہ سے وہ بسا اوقات ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ یہ صرف اللہ ہی کی شان ہے کہ اس کا علم ظاہر و باطن اور ماضی و مستقبل سب کو محیط ہے اس وجہ سے اس نے انسان کی رہنمائی کے لیے زندگی کا سارا پروگرام خود بنا کر نازل فرما دیا ہے۔ اور یہ پروگرام ایسا جامع ہے کہ اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی و ترقی کا ضامن ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ
اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَ
مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ
الْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۱۷)

اشہر حرم سے متعلق مزید سوال اور اس کے جواب

اوپر آیات ۱۹۰-۱۹۵ میں اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا تھا کہ اگر مشرکین تمہارے ارادہ حج میں مزاحم ہوں اور ان کی مزاحمت کے سبب سے جنگ کی نوبت آ جائے تو تم ان سے جنگ کرو اور ان کو قتل کرو اگرچہ یہ جنگ اشہر حرم میں بلکہ عین حدود حرم میں لڑنی پڑے۔ یہ بات اگرچہ واضح تھی لیکن اشہر حرم کے معاملہ میں زمانہ جاہلیت سے عربوں کی روایات اتنی سخت تھیں اور ان میں جنگ و خونریزی کو وہ اتنا بڑا گناہ سمجھتے تھے کہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ بات آسانی سے نہیں اتر سکتی تھی۔ اس طرح کے معاملات میں چونکہ جذبات کو بڑا دخل ہوتا ہے اس وجہ سے مخالفین کو پروپیگنڈے کا بھی بڑا موقع ہاتھ آ جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق لوگوں کی طرف سے سوال ہوا اور قرآن نے اس سوال کا تفصیل سے جواب دیا۔

اشہر حرم کی حرمت کا قصاص

قرآن نے جس طرح اوپر کی آیات میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اشہر حرم میں قتل و خونریزی بڑا سنگین گناہ ہے اسی طرح یہاں بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ "قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ" (کہہ دو کہ اشہر حرم میں جنگ کرنا بڑی سنگین بات ہے) لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرما دی ہے کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنا، اللہ کا کفر کرنا، مسجد حرام سے اللہ کے بندوں کو محروم کرنا اور جو اپنے اعمال و عقائد کے اعتبار سے اس مسجد حرام کے سب سے زیادہ حقدار رہیں ان کو یہاں سے ہجرت پر مجبور کرنا، اشہر حرم میں جنگ کرنے سے بھی بڑے جرائم ہیں۔ اس وجہ سے اگر ان سنگین تر جرائم کے سدباب کے لیے اشہر حرم میں جنگ کرنی پڑ جائے تو یہ اشہر حرم کی حرمت کا قصاص ہوگا اور یہ گناہ نہیں بلکہ بہت بڑی نیکی ہے۔

فتنہ کا استعمال

پھر خاص طور پر فتنہ کا حوالہ دیا ہے کہ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ کہ یہ فتنہ جو کفر میں پایا جا رہا ہے یہ تو قتل سے بھی کہیں زیادہ سنگین جرم ہے۔ فتنہ کی تحقیق ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اس سے مراد وہ سنگدلانہ اذیتیں اور تکلیفیں ہیں جو کفار و مشرکین مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کے لیے پہنچا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ فتنہ تو قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ پھر جب یہ فتنہ آج عین بلد امین اور بلد حرام میں موجود ہے، نہ سرزمین حرم کا احترام اس سے ظالموں کو روک رہا ہے اور نہ اشہر حرم کا احترام اس میں مانع ہے تو آخر مظلوموں کی مدافعت ہی کے لیے اشہر حرم میں جنگ کیوں گناہ ٹھہرے!

پھر اس فتنہ کی سنگینی کو واضح کرنے کے لیے فرمایا کہ کفار و مشرکین مسلمانوں کو دین حق سے پھیرنے کے لیے جو مظالم کر رہے ہیں ان کی نوعیت صرف انفرادی واقعات ہی کی نہیں ہے جو کسی وقتی جوش کے تحت صادر ہو گئے ہوں بلکہ مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کے لیے یہ لوگ خونریز جنگوں کا ایک سلسلہ چھیڑنے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور یہ (اگر ان کے امکان میں ہو تو) اس وقت تک دم لینے والے نہیں ہیں جب تک تمہیں اسلام سے پھیرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ کیا ایسے سخت و شدید فتنہ کے مقابلہ کے لیے بھی اشہر حرم میں لڑائی گناہ ہی رہے گی۔

ایک مناسب موقع تنبیہ

یہاں تک تو اصل سوال کا جواب تھا۔ اس کے بعد ارتداد کے ذکر کے تعلق سے ایک مناسب موقع تنبیہ مسلمانوں کو بھی کر دی کہ اگر ان کے ظلم و ستم سے مرعوب ہو کر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا اور اسی حالت میں مر جائے گا تو اس کے تمام اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو جائیں گے اور وہ دوزخ میں پڑے گا جس میں ہمیشہ رہے گا۔ یہاں اکارت ہونے کے لیے حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو بظاہر نیکی کے ہیں اور حبط سے مراد ان کا بالکل بے نتیجہ اور بے اثر ہو جانا ہے۔ یعنی اس کفر کے بعد اس نے اسلام کے جو کام کیے وہ بھی بالکل برباد ہو کر رہ جائیں گے۔

ارتداد کی سزا

اس آیت میں ایک خاص نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ اعمال کے اکارت ہونے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو کر رہ جائیں گے، حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ آخرت میں مرتد ہو جانے والوں کے اعمال کا اکارت ہو جانا تو واضح ہے البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں ان کے اعمال کے اکارت ہونے کی شکل کیا ہو گی؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص مرتد ہو جاتا ہے وہ اسلامی ریاست میں جملہ شہری حقوق سے محروم ہو جاتا ہے، ریاست پر اس کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری باقی نہیں رہتی چنانچہ اسی اصول پر اسلامی تعزیرات کا وہ قانون مبنی ہے جو مرتدوں کی سزا سے متعلق ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۱۸)

اہل استقامت کا مقام

کفار کے ظلم و ستم سے گھبرا کر مرتد ہو جانے والوں کا انجام بتانے کے بعد ان لوگوں کا مقام بھی بتا دیا جو

کفار کی ان تمام ستم رانیوں کے باوجود اپنے ایمان پر جمے رہیں گے اور ہجرت و جہاد کی بازیاں کھیلیں گے۔ ان لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ بے شک اس بات کے سزاوار ہیں کہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں۔ موقع و محل دلیل ہے کہ یہاں لفظ اٰمَنُوْا اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی وجہ سے ہم نے اس کا ترجمہ "اپنے ایمان پر جمے رہے" کیا ہے۔

اس وقت ہجرت اور جہاد مسلمانوں پر بیک وقت دونوں واجب تھے، بیت اللہ کی آزادی اور فتنہ کے قلع قمع کے لیے جہاد کا بھی حکم ہو چکا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت اور ایمان کے تحفظ کے لیے ہجرت کا بھی، اور یہ دونوں ہی مہمیں بڑی سخت تھیں اس وجہ سے ان دونوں ہی باتوں کا ذکر فرمایا۔ اس میں مسلمانوں کے لیے یہ رہنمائی بھی تھی کہ کفار کی ستم رانیوں کا جواب ارتداد نہیں بلکہ ہجرت اور جہاد ہے۔

جو لوگ یہ بازیاں کھیل سکیں ان کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو سکتے ہیں۔ یعنی یقین تو ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد بھی کسی کو نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ کوئی بھی اپنے عمل سے نجات نہیں حاصل کرے گا بلکہ جس کو بھی نجات حاصل ہوگی خدا کی بخشش اور اس کی مہربانی ہی سے ہوگی، چنانچہ آگے فرما دیا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْـمُهُمَآ اَكْبَرُ
مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ
تَتَفَكَّرُوْنَ (۲۱۹)

جوئے اور شراب سے متعلق سوال کی نوعیت

اوپر فصل کی تمہید میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ شراب اور جوئے سے متعلق یہ سوال ان کے ان فوائد کو سامنے رکھ کر بعض لوگوں نے کیا جو اس وقت کی عرب کی مخصوص سوسائٹی کی روایات کی بنا پر ان میں پائے جاتے تھے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اور شراب کی نوعیت موجودہ قماربازی اور موجودہ بادہ خواری سے بالکل مختلف تھی۔ ہمارے ہاں جوا نری قسمت آزمائی اور بربادی اور شراب نوشی نری عیاشی ہے لیکن عرب جاہلیت میں ان کے اندر ہمدردی خلق کے بعض ایسے پہلو بھی تھے جن کی بنا پر اہلِ عرب ان کو رذائل میں نہیں بلکہ فضائل میں گنتے تھے۔ اسی پہلو سے یہاں انفاق اور جہاد کے سلسلے میں ان کے متعلق بھی سوال پیدا ہوا کہ انفاق کی ایک راہ تو یہ بھی ہے کہ قحط کے زمانے میں مالدار لوگ شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں اور جو کچھ جیتتے جاتے ہیں وہ غریبوں میں لٹاتے جاتے ہیں، پھر اس کے متعلق قرآن کا کیا ارشاد ہے؟

مضر چیز کے بارے میں اسلامی شریعت کا اصول

قرآن نے اس کا جواب دیا کہ ٹھیک ہے، ان میں بعض پہلو فائدے کے بھی ہیں لیکن ان سے سوسائٹی کو جو نقصانات پہنچتے ہیں وہ ان کے فوائد سے کہیں زیادہ ہیں اس وجہ سے اخلاقی بہبود کے نقطۂ نظر سے یہ ناجائز ہیں۔ گویا قرآن نے یہاں اسلامی شریعت کا یہ مزاج بتا دیا کہ جن چیزوں کا نقصان ان کے نفع سے زائد

ہے وہ اس شریعت میں ممنوع ہیں۔

بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ قرآن نے یہاں جوئے اور شراب کے جن فوائد و منافع کا اعتراف کیا ہے وہ ان کے مادی اور طبی منافع ہیں لیکن یہ خیال غلط ہے اولاً تو قرآن کو اشیا یا اعمال کے طبی و مادی فوائد سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اور اگر کسی پہلو سے ہو بھی تو آخر دنیا میں کون سی بری سے بری اور ناپاک سے ناپاک چیز ہے جس کے اندر مضرت کے ساتھ کچھ پہلو فوائد کے نہ ہوں، پھر جوئے اور شراب ہی کی کیا خصوصیت ہے کہ قرآن نے ان کے ان فوائد کا اعتراف کیا؟ آخر چوری، زنا، سود اور خنزیر وغیرہ کے اندر جو بعض پہلو فوائد کے ہیں قرآن نے ان کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ ایک غلط فہمی

ہمارے نزدیک اس ساری غلط فہمی کے سبب تین ہیں۔ غلط فہمی

ایک تو یہ کہ لوگوں نے اس جوئے اور شراب کو بالکل اس جوئے اور شراب پر قیاس کیا جس کا رواج ہماری سوسائٹی میں ہے اس وجہ سے وہ اس کے اندر کسی اخلاقی اور انسانی قدر کے پائے جانے کا تصور ہی نہیں کر سکے۔ کے وجوہ

دوسرا یہ کہ لوگوں کی نظر عام طور پر عرب جاہلیت کے کلام، ان کی روایات اور ان کے معروف و منکر پر بہت کم ہے اس وجہ سے قرآن کے ایسے اشارات تک مشکل ہی سے نگاہ پہنچتی ہے۔

تیسرا یہ کہ لوگ قرآن کے الفاظ پر بھی غور کرنے کا حق پورا پورا ادا نہیں کرتے سرسری طور پر جو بات سامنے آجاتی ہے اسی کو لے اڑتے ہیں۔ دیکھیے یہاں آیت میں 'نفع' کا مدمقابل لفظ 'اثم' استعمال کر کے قرآن نے بالکل واضح کر دیا تھا کہ یہاں زیر بحث ان کے مادی اور طبی فوائد نہیں ہیں بلکہ اخلاقی فائدے ہیں اس لیے کہ اثم کا لفظ طبی نقصانات کے لیے نہیں استعمال ہوتا بلکہ اخلاقی مفاسد اور گناہوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اگر سوال شراب کے طبی نفع و نقصان سے متعلق ہوتا تو نفع کے مقابل میں 'ضرر' کا لفظ استعمال ہوتا نہ کہ 'اثم' کا۔

اس آیت نے اسلامی شریعت کا یہ مزاج واضح کر دیا کہ جو چیزیں اخلاقی اعتبار سے مضر ہیں، اگر ان سے کوئی فائدہ بظاہر نوع انسان کو پہنچتا بھی ہو یا پہنچایا بھی جا سکتا ہو جب بھی ان کے ضرر کے پہلو کے غلبہ کے سبب سے اسلام میں ان سے احتراز ہی واجب ہے۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ کسی جگہ لوگ لاٹری ڈالیں تاکہ اس کی یافت سے ایک شاندار مسجد تعمیر کریں یا فلم ایکٹرسوں کا ایک امدادی شو منعقد کریں تاکہ اس کے ٹکٹ فروخت کر کے کسی مصیبت زدہ علاقے کے مسلمانوں کی مدد کریں۔ بظاہر یہ کام نیکی اور خدمت خلق کے ہیں لیکن اسلام نے اس نیکی کو جائز نہیں رکھا کیونکہ اس نیکی کے پردے میں جو بدی پرورش پاتی ہے وہ اس نیکی سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

وَیَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۵ قُلِ الْعَفْوَ ط کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ جواب میں تدریج

ایک ہی چیز سے متعلق اس بار بار کے سوال کا سبب میں واضح کر چکا ہوں کہ یہ سوالات ان کمزور قسم کے لوگوں کی حکمت

کی طرف سے ہیں جو انفاق میں مشقت محسوس کر رہے تھے۔ ان کی اسی کمزوری کا لحاظ تھا کہ قرآن نے ان کو جواب بھی درجہ بدرجہ دیا تاکہ ان پر زیادہ شاق نہ گزرے۔ دوا سے گھبرانے والے مریض کو اگر پوری خوراک ایک ہی مرتبہ میں نہ دی جا سکتی ہو تو تقاضائے حکمت یہی ہے کہ وہ دو تین مرتبہ میں دی جائے۔ چنانچہ انفاق کے متعلق بار بار سوال کرنے والوں کو بھی قرآن نے آخری اور فیصلہ کن جواب یہ تیسری مرتبہ میں دیا۔ یہ جواب اگر پہلی ہی مرتبہ میں دے دیا جاتا تو عجب نہیں کہ زیادہ کمزور قسم کے لوگوں کے ایمان کے لیے آزمائش بن جاتا۔

یہ جواب نہایت مختصر ہے مگر ساتھ ہی نہایت واضح اور قطعی ہے۔ فرمایا کہ قُلِ الْعَفْوَ (جو فاضل بچے وہ خرچ کرو) فاضل سے مراد ظاہر ہے کہ آدمی کی اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچے وہ ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں وہ انفاق زیر بحث نہیں ہے جو عام مستحقین کے لیے صدقات واجبہ اور زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں ہر مسلمان پر ضروری ہے بلکہ یہ وہ انفاق ہے جس کا تعلق جہاد اعلائے کلمۃ اللہ اور تحفظ و دفاع ملت سے ہے۔ ان مقاصد کے لیے ایک مسلمان پر انفاق کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی یہ آخری حد بتا دی گئی ہے کہ اگر ملت کی حفاظت و مدافعت کے لیے ضرورت پڑ جائے تو اپنی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچا سکو وہ سب اس جہاد میں قربان کر دو۔ قومی زندگی میں ایسے حالات و اوقات بھی پیش آتے ہیں جب قوم و مذہب کے لیے سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے اور دنیا کی ہر غیرت مند قوم خواہ کافر ہو یا مومن یہ بازی کھیلنے پر مجبور ہوتی ہے، اسلام نے یہ چاہا ہے کہ ہم اس قربانی و جاں بازی کے لیے اپنی خوشی سے تیار رہیں۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ۔ یہ اوپر کے پورے سوال و جواب پر تبصرہ ہے۔ ہم عرض کر آئے ہیں کہ یہ سارے سوالات ان ہی مسائل سے متعلق ہیں جو اشہر حرم، جہاد اور انفاق سے متعلق حج کے سلسلہ میں مذکور ہوئے تھے۔ ان ہی مسائل سے متعلق بعد میں کچھ مزید سوالات پیدا ہوئے قرآن کی وضاحت فرمائی اور بطور ذکر نعمت کے اشارہ فرما دیا کہ یہ اوپر کے اجمالات کی توضیح اور اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی تکمیل ہے جو اس نے سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (کہ ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا سنانا، تو جب ہم سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت)

یہاں اس تبیین کا فائدہ یہ بتایا ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ تاکہ تم غور و فکر کرو۔ قرآن مجید نے مسائل کے بیان کرنے میں یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ ہر بات کے ہر پہلو کو ایک ہی ساتھ نہیں پیش کیا بلکہ ان کے بعض پہلوؤں کو مجمل چھوڑ دیا یہاں تک کہ جب ذہنوں میں ان سے متعلق سوالات پیدا ہوئے تو تدریج کے ساتھ ان کی وضاحت فرمائی، یہ محض اس لیے ہے کہ لوگوں کو غور و فکر کی تربیت حاصل ہو اور لوگ دین کے معاملات میں مجرد لکیر کے فقیر بن کر نہ رہیں بلکہ اس کے اسرار و رموز اور فوائد و مصالح تک پہنچنے کے لیے خود اپنی عقل بھی

استعمال کریں۔

ایک پرحکمت اضافہ

بظاہر تو یہ آیت تَتَفَكَّرُونَ پر ختم ہو جاتی ہے لیکن یہاں اس کے بعد فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ کا اضافہ بھی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافہ نہایت قیمتی ہے۔ اوپر کے سارے سوالات پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ سوالات جو پیدا ہوئے تو محض اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ لوگوں کی نگاہوں میں عام طور پر وہ توازن نہیں ہوتا جو دین اور دنیا دونوں کے لوازم و مصالح کو صحیح صحیح تول سکے۔ اس عدم توازن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر دینداری کی طرف میلان ہوا تو لوگ دین کو نری رہبانیت بنا کے رکھ دیتے ہیں، یہاں تک کہ جنگ و جہاد خواہ کسی حالت میں بھی ہو، ان کے ہاں خلافِ تقویٰ قرار پا جاتا ہے اور اگر دنیاداری کی طرف میلان ہو گا تو جوئے اور شراب جیسی چیزوں کو بھی محض اس خیال کی بنا پر نیکی قرار دینے کی کوشش کریں گے کہ آخر ان میں بھی تو کچھ پہلو فائدے کے ہیں۔ قرآن نے فکرِ انسانی کی تربیت کی جو راہ اختیار کی ہے وہ اس عدم توازن کو دور کر کے اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کا حق صحیح صحیح پہچان سکے۔

لفظ عفو سے اشتراکیت کا غلط استدلال

عفو کے لفظ سے اشتراکی نظریات سے متاثر لوگوں نے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ ناگزیر ضروریات سے فاضل آمدنی ایک اسلامی حکومت اجتماعی مقاصد کے لیے اپنے قبضہ میں لے سکتی ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اول تو یہاں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق حکومت سے نہیں بلکہ عام افراد سے ہے کہ وہ اپنی آزادیٔ رائے سے اس حد تک ایثار کے لیے تیار رہیں، دوسرے یہ کہ اس چیز کا تعلق، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، عام حالات سے نہیں ہے بلکہ ایمرجنسی کے حالات سے ہے جب ملت کے تحفظ کا سوال سامنے آن کھڑا ہو۔ ایسے حالات میں اول تو افراد خود ہی ہر طرح کی قربانیاں کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اگر حکومت کوئی پابندی عائد کرنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں سمجھتے۔ اگرچہ اسلام کا حقیقی رجحان یہی ہے کہ افراد کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان کے اندر ارادہ اور اختیار کی آزادی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نیکی کرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔ اسلام کی نظر میں اس آزادی کی جتنی قدر ہے، اتنی قدر مجبوری اور پابندی کی نیکی کی نہیں ہے۔

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۖ وَإِن تُخَالِطُوهُمْ
فَإِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۲۰)

یتیموں کے بارے میں مسلم معاشرہ کی ذمہ داری

یتامیٰ سے متعلق یہ سوال بھی اس معاشرتی خدمت و تعاون کے تعلق سے پیدا ہوا جس کی ہدایت آیت ۲۱۵ میں دی گئی ہے۔ اسلام نے جب ہر شخص پر اس کے والدین و اقربا کے ساتھ ساتھ یتامیٰ اور خاص کر خاندان کے یتامیٰ کی ذمہ داری بھی ڈالی کہ اگر وہ محتاج و بے وسیلہ ہوں تو ان پر خرچ کرو اور اگر ان کے پاس مال ہو تو پوری احتیاط کے ساتھ حتی الامکان بلا معاوضہ اس کی نگرانی اور اس کو نشو و نما دینے کی کوشش کرو تو لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ایک شخص انتظامی سہولت کے پیشِ نظر کسی یتیم کے مال یا اس

کے کاروبار کو اپنے مال اور کاروبار میں شامل کر لے اور اس کے حقوق کی حفاظت کے پہلو سے ایسے یتیم کی ماں سے نکاح کر لے تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟ یہ سوال خاص طور پر اس وجہ سے پیدا ہوا کہ اسلام نے یتیموں کے حقوق اور ان کے مال کے تحفظ سے متعلق جن احتیاطوں کی تاکید فرمائی ہے وہ بڑی ہی سخت ہیں، قرآن میں صاف ارشاد ہے کہ نیک مقصد کے سوا یتیموں کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو، یہ بھی تنبیہ ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھرتے ہیں، ایک متقی آدمی ان تنبیہات کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کی اجازت کے بغیر یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ یتیموں کے معاملات اور اپنے معاملات کو یکجا کر سکے۔

اس سوال کے جواب میں قرآن نے اصولی بات جو فرمائی وہ یہ ہے کہ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ، اصل مقصود یہ ہے کہ ہر پہلو سے یتیموں کی بہبود پیش نظر ہے۔ جس چیز میں ان کی بہتری ہو وہی بہتر ہے۔ اگر تمہارے حالات کے لحاظ سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان کے معاملات الگ رکھ کر ان کی دیکھ بھال کرو تو ایسا کرو، اور اگر محسوس کرو کہ اپنے ساتھ شامل کر کے زیادہ بہتر طریقہ سے یہ فرض انجام دے سکتے ہو تو تمہیں اس کی بھی اجازت دی جاتی ہے، آخر وہ تمہارے اپنے ہی بھائی بند تو ہیں، پھر علیحدگی کیوں لازم قرار دی جائے؟ لیکن اس اجازت کے ساتھ یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ یعنی ہر شخص یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ اس اشتراک سے کس کے پیش نظر یتیم کی بہبود ہے اور کس کے پیش نظر اس پردے میں اس کے مال کو ہڑپ کرنا، اگر کسی نے اس اجازت سے غلط فائدہ اٹھایا تو وہ یاد رکھے کہ خدا عزیز و حکیم ہے، کوئی اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکے گا۔ ساتھ ہی اس احسان کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس نے تمہاری سہولت کے پیش نظر تمہیں اس قسم کے اشتراک کی اجازت دے دی ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ تمہیں اس اشتراک سے روک دیتا اور ساتھ ہی یہ حکم دے دیتا کہ یتیم کے مال یا جائداد کی حفاظت کرو۔ اگر ایسا ہوتا تو تم ایک بڑی مشقت میں پڑ جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے تم پر بڑا کرم فرمایا کہ اس نے بغیر کسی مشقت میں ڈالے تمہارے لیے خدمت اور نیکی کی ایک راہ کھولی تو تم میں سے ہر شخص خدا کے اس احسان کا شکر گزار ہو اور اس اجازت سے کوئی غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

'عنت' کا مفہوم
اسلامی شریعت کا مزاج

عَنَت کے معنی زحمت اور مشقت کے ہیں اور اعنات کے معنی مشقت میں ڈالنے کے ہیں۔ اس سے اسلامی شریعت کا مزاج معلوم ہوتا ہے کہ اس شریعت نے مشقت میں ڈالنے کی نہیں بلکہ مشقتوں سے بچانے کی راہیں کھولی ہیں۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۚ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا
الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۗ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ
وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۲۲۱)

مشرکات سے نکاح کی ممانعت

اور یتیموں کی بہبود کے پہلو سے جس اشتراک کی اجازت دی گئی ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کسی یتیم کا ولی، یتیم کے حقوق ہی کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے یہ مناسب خیال کرے کہ اس یتیم کی ماں سے نکاح کر لے تاکہ اس طرح ایک بیوہ کی پرورش اور اس کی حفاظت و عصمت کا انتظام بھی ہو جائے اور یتیم کے حقوق کی نگہداشت کے لیے اس کے گھر میں ایک بیدار نگاہ رکھنے والی بھی آجائے تو اس کا حکم کیا ہے؟ قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ مصلحت بجائے خود اہمیت رکھنے والی ہے اور اس کو پیشِ نظر رکھ کر یتامیٰ کی ماؤں سے نکاح کیا جا سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مومنہ ہوں۔ یہ شرط اس وجہ سے لگائی ہے کہ اس وقت تک صورتِ حال یہ تھی کہ بہت سے ایسے یتیم بھی تھے جن کی مائیں اسلام میں داخل نہیں ہوئی تھیں اس وجہ سے یہ ہدایت ہوئی کہ اس مصلحت کی خاطر بھی مشرکات سے نکاح کی اجازت بہر حال نہیں ہے کیونکہ اس سے دوسرے مفاسد کے پیدا ہونے کے اندیشے ہیں جن کی طرف آگے اشارہ فرمایا ہے۔

مشرکین اور مشرکات کا استعمال بطور اصطلاح

یہ امر ملحوظ رہے کہ مشرکین اور مشرکات کا لفظ قرآن میں خاص عرب کے مشرکین اور مشرکات کے لیے بطور لقب یا علم کے استعمال ہوا ہے، دوسری قومیں جن میں شرک پایا جاتا ہے، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشابہ اہل کتاب میں سے، وہ براہِ راست اس لفظ کے تحت نہیں ہیں اس وجہ سے ان کے احکام کی تفصیل اپنی جگہ پر آئے گی۔

پسند اور ناپسند کے لیے اسلامی معیار

یہاں بنی اسماعیل کے مشرکین اور مشرکات سے متعلق یہ وضاحت فرما دی کہ نہ ان کی عورتوں کو اپنے نکاح میں لینا تمہارے لیے جائز ہے اور نہ اپنی لڑکیاں ان کو دینا جائز ہے۔ اس ممانعت کے ساتھ یہ وضاحت بھی بڑی تاکید کے ساتھ فرما دی کہ ایک مسلمان لونڈی ایک آزاد مشرکہ پر ترجیح رکھتی ہے اگرچہ وہ تمہیں کتنی ہی دلکش معلوم ہو، اسی طرح ایک غلام مومن ایک آزاد مشرک پر ترجیح رکھتا ہے، اگرچہ وہ تمہیں کتنا ہی بھلا لگتا ہو۔ پھر اس کی وجہ بتا دی کہ اسلام میں پسند اور ناپسند کے لیے معیار نہ ظاہری شکل و صورت ہے، نہ نسل و نسب اور نہ آزادی اور غلامی بلکہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ اس وجہ سے اب تمہارے رشتے ناتے قانوں اور برادریوں کے پابند نہیں رہ گئے بلکہ عقیدے اور عمل کے تابع ہو گئے ہیں۔ قریش کی ایک مہ جبین شہزادی تمہارے لیے دو کوڑی کی ہے اگر وہ ایمان کے زیور سے آراستہ نہیں ہے اور سواحل افریقہ کی ایک کالی کلوٹی لونڈی تمہارے لیے حورِ جنت ہے اگر اس کا دل جمالِ ایمان و اسلام سے نورانی ہے۔ اسی طرح تمہارے لیے یہ بات تو جائز ہے کہ تم اپنی لڑکی کا ہاتھ ایک غلام زادہ کے ہاتھ میں پکڑا دو اگر وہ دولتِ ایمان رکھتا ہے اور قریش کے ایک صاحبِ شوکت سردار کو بھی اپنی لڑکی دینے سے انکار کر دو اگر وہ ایمان و اسلام سے محروم ہے۔

زندگی پر رشتے ناتے کے اثرات

پھر اس کا فلسفہ بتایا کہ رشتے ناتے کے اثرات زندگی پر سطحی اور سرسری نہیں ہوتے بلکہ بڑے گہرے ہوتے ہوتے ہیں، اگر آدمی ان چیزوں میں عقائد و اعمال کو کوئی اہمیت نہ دے، صرف حسن، یا مال، یا خاندان یا شوکت ہی کو سامنے رکھے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ہی خرچ پر اپنے گھر میں ایک ایسی بلا پال لے جو صرف اسی کے نہیں بلکہ اس کی آئندہ نسلوں کے ایمان و اسلام کا بیج بھی مار دے۔ شادی بیاہ کے تعلقات سے نے مذہب، روایات

اور تہذیب و تمدن میں جو عظیم تبدیلیاں کی ہیں اس کی عملی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر بے شمار عقائدی گمراہیاں ان عورتوں کے ذریعہ سے پھیلیں جو وہ دوسری بت پرست قوموں میں سے بیاہ کے لائے۔ اسی طرح ہمارے ہاں مغل سلاطین نے ہندو راجاؤں کے ہاں سیاسی مصالح کے تحت جو شادیاں کیں تو ان کی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ ان کے عقائد، اوہام، رسوم اور عبادت کے طریقے بھی اپنے گھروں میں گھسا لائے۔ آج بھی جو لوگ قوموں اور مذہبوں کے امتیازی نشانات و نظریات کو ختم کرنے کے درپے ہیں وہ اس کا سب سے زیادہ کارگر نسخہ آپس کی شادیوں ہی کو سمجھتے ہیں اس وجہ سے ایک مسلمان کو اس معاملے میں بے پروا اور سہل انگار نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس عظیم حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جس رب پر وہ ایمان رکھتا ہے اس کی دعوت مغفرت اور جنت کی طرف ہے اور جو لوگ اس ایمان سے محروم ہیں وہ دوزخ کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں، عام اس سے کہ عورت ہوں یا مرد۔

یہ آیت بھی چونکہ اوپر کے مباحث کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی ہے اس وجہ سے آخر میں فرما دیا کہ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۔ اور اللہ اپنی آیتوں کی وضاحت کر رہا ہے تاکہ لوگ یاد دہانی حاصل کریں۔

اوپر کی دو آیتوں میں یتامیٰ سے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں سورۂ نساء میں بھی ان کی طرف اشارے ہیں۔ ہم متعلق آیات یہاں نقل کیے دیتے ہیں تاکہ دونوں کو سامنے رکھنے سے ہر پہلو واضح ہو جائے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا	اور یتیموں کا مال ان کے حوالہ کرو اور ان کے اچھے مال
الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ	کے بدلے اپنا برا مال نہ دو اور ان کے مالوں کو اپنے مالوں
اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝	کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے اور اگر تمھیں
وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى	اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ کما حقہٗ انصاف نہ کر سکو گے
فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى	تو جو اچھی ہوں عورتوں میں سے ان سے نکاح کر لو دو دو
وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا	تین چار تک۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ عورتوں میں عدل نہ کر
فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ	سکو گے تو ایک ہی پر قناعت کرو، یا پھر جو تمھاری لونڈیاں
اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ وَاٰتُوا النِّسَاۗءَ صَدُقٰتِهِنَّ	ہوں۔ اور یہ زیادہ اس بات کے قرین ہے کہ تم عدل سے
نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ	نہ ہٹو۔ اور ان عورتوں کو راضی خوشی ان کے مہر دو، اگر
مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗــــًٔـا مَّرِيْۗـــــًٔـا ۝	وہ اس کا کوئی حصہ تمھارے لیے بخوشی چھوڑ دیں تو
وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ	اس کو باطمینان اپنے تصرف میں لاؤ اور بے وقوف یا
جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰـمًا وَّارْزُقُوْھُمْ	نادانوں کو اپنا وہ مال حوالہ نہ کرو جو خدا نے تمھاری
فِيْھَا وَاكْسُوْھُمْ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا	قیام معیشت کا ذریعہ بنایا ہے، البتہ اس میں ان کو کھلاؤ

مَّعْرُوفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا
النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا
فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَأْكُلُوهَا
إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا ۚ وَ
مَن كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَن
كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ
فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ
فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ
حَسِيبًا (۵-۶ نساء)

کے ساتھ کھلاؤ پہناؤ، احسان کر تسلی دیتے رہو اور یتیموں کو جانچتے رہو، جب وہ شادی کی عمر کو پہنچ جائیں تو اگر تم ان میں معاملات کی سوجھ بوجھ پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو اور فضول خرچی اور جلد بازی کے ساتھ کہ کہیں وہ بڑے ہو جائیں ان کا مال ہڑپ نہ کرو۔ جو غنی ہو تو چاہیے کہ وہ احتراز کرے اور جو محتاج ہو تو وہ دستور کے مطابق اس میں سے لے، پھر جب تم ان کا مال ان کے حوالہ کرنے لگو تو ان پر گواہ ٹھہرا لو، ویسے اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔

۷۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۲۲-۲۳۱

اوپر آپ نے دیکھا کہ کس طرح حج کے تعلق سے جہاد، جہاد کے تعلق سے انفاق، انفاق کے تعلق سے جوئے اور شراب اور ساتھ ہی یتامیٰ کی ہمدردی کے مسائل یکے بعد دیگرے پیدا ہو گئے۔ اسی طرح یتامیٰ کی ماؤں کے ساتھ نکاح کے مسئلہ نے ایک طرف تو طلاق و نکاح سے متعلق بعض مناسب وقت مسائل کے بیان کے لیے تقریب پیدا کر دی اور دوسری طرف عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے تقاضے سے بعض احکام و ہدایات کے نزول کے لیے نہایت سازگار فضا پیدا ہو گئی اور قرآن مجید کا طریقہ یہی ہے کہ جب ایک بات کے بیان کے لیے موزوں حالات پیدا ہو گئے ہیں تو بارش کی طرح کلام ایک وسیع دائرے میں برس گیا ہے چنانچہ یہاں بھی متعلق مسائل کا ایک نہایت اہم حصہ بیان ہو گیا ہے۔ ان مسائل کا آغاز ایام ماہواری سے متعلق ایک سوال کے جواب سے ہوا ہے۔ اس خاص سوال کی اہمیت اس سلسلے میں یہ ہے کہ نکاح و طلاق کے بہت سے مسائل کی، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، یہی چیز حد بندی کرتی ہے۔ اس وجہ سے اصل مسائل سے پہلے خود اس چیز سے متعلق شریعت کے احکام و ہدایات کا جاننا نہایت ضروری تھا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۲۲-۲۳۱ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ
فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ
فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَ

يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ
اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ
مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٢٣﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ
اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿٢٢٤﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ
يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿٢٢٥﴾ لِلَّذِيْنَ
يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢٦﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٢٧﴾
وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ
لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ
اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ
وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٨﴾ اَلطَّلَاقُ ع ٢٨ ١٧
مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ
لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا
يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا
تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٢٩﴾

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا
غَيْرَهٗ ؕ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ أَنْ يَّتَرَاجَعَآ إِنْ
ظَنَّآ أَنْ يُّقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ
يَّعْلَمُونَ ﴿٢٣٠﴾ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ
بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ
هُزُوًا ؗ وَّاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ
الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾ ع ٢٩ ٣ ١٠ ١٤

ترجمانیات ۲۲۲-۲۳۱

اور وہ تم سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو، یہ ناپاکی ہے تو عورتوں سے
حیض کے دنوں میں الگ رہو، اور ان سے قربت نہ کرو جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں،
پس جب وہ صفائی کر لیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے، اللہ
توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔
عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ، اور اپنے
لیے آگے بڑھاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ تمہیں اس سے لازماً ملنا
ہے اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دو۔ ۲۲۲-۲۲۳

اور اللہ کو اپنی ایسی قسموں کا ہدف نہ بناؤ کہ احسان نہ کرو گے یا حدودِ الٰہی کا احترام نہ
کرو گے یا لوگوں کے درمیان صلح نہ کراؤ گے، اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اللہ تم سے

تمہاری عادی قسموں کے باب میں تو کوئی مواخذہ نہیں کرے گا لیکن ان قسموں کے باب میں تم سے ضرور مواخذہ کرے گا جو تمہارے دل کے ارادے کا نتیجہ ہیں اور اللہ بخشنے والا اور حلیم ہے جو لوگ اپنی بیویوں سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا، مہربان ہے اور اگر طلاق کا فیصلہ کر لیں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۲۴۔ ۲۲۷

اور مطلقہ عورتیں اپنے بارے میں تین حیض تک توقف کریں، اور اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحموں میں جو کچھ پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں۔ اور اس دوران میں ان کے شوہر ان کے لوٹانے کے زیادہ حق دار ہیں اگر وہ سازگاری کے طالب ہیں اور ان عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں، ہاں مردوں کے لیے ان پر ایک درجہ ترجیح کا ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ ۲۲۸۔

طلاق دو مرتبہ ہے۔ پھر دستور کے مطابق یا تو روک لینا ہے یا احسان کے ساتھ رخصت کر دینا ہے، اور تمہارے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم نے جو کچھ ان عورتوں کو دیا ہے اس میں سے کچھ واپس لو مگر اس صورت میں کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ حدود الٰہی کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہیں رہ سکتے تو ان پر اس چیز کے باب میں کوئی گناہ نہیں ہے جو عورت فدیہ میں دے، یہ اللہ کے حدود ہیں تو ان سے تجاوز نہ کرو اور جو اللہ کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ پس اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے جائز

نہیں ہے تا آنکہ وہ اس کے سوا کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے۔ پس اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو پھر ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ مراجعت کر لیں، اگر یہ توقع رکھتے ہوں کہ وہ اللہ کے حدود پر قائم رہ سکتے ہیں، یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں، وہ ان کو واضح کر رہا ہے، ان لوگوں کے لیے جو علم کے طالب ہیں۔ ۲۲۹-۲۳۰

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ پہنچ جائیں اپنی مدت کو تو ان کو دستور کے مطابق رکھ لو یا دستور کے مطابق رخصت کر دو اور تم ان کو نقصان پہنچانے کے ارادے سے نہ روکو کہ تم حدود سے تجاوز کرو اور جو ایسا کرے گا تو وہ اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد رکھو اور اس کتاب و حکمت کو یاد رکھو جو اس نے تمہاری نصیحت کے لیے اتاری اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ۲۳۱

۷۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (۲۲۲)

ایامِ حیض کے احکام

ایام ماہواری سے متعلق یہ سوال صرف اسی پہلو سے نہیں پیدا ہوا کہ اس زمانے میں عورت سے قربت جائز ہے یا نہیں، اس زمانے میں قربت تو نہ صرف تمام آسمانی مذاہب میں ممنوع رہی ہے بلکہ عرب جاہلیت بھی اس کو نا جائز سمجھتے تھے، ان کے اشعار میں مختلف پہلوؤں سے اس کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ اس سے متعلق دوسرے بہت سے مسائل تھے، جن میں بڑی افراط و تفریط پائی جاتی تھی مثلاً یہ کہ اس زمانے میں عورت سے اجتناب کے حدود کیا ہیں، اس کے لیے طہارت کے کیا آداب و شرائط ہیں اور طلاق و عدت وغیرہ کے معاملات میں اس کی اہمیت کیا ہے؟ بالخصوص موخر الذکر سوال کی بڑی اہمیت تھی اس لیے کہ اس کے اثرات نکاح، طلاق، عدت، وراثت اور دوسرے تقریباً تمام عائلی مسائل پر پڑتے تھے اس وجہ سے نکاح و طلاق کی اس

بحث میں قرآن نے سب سے پہلے اسی سوال کو لیا اور اس کا جواب دیا۔

علیحدگی کی حد

اس زمانے میں عورت سے علیحدہ رہنے (اعتزال) کا جو حکم دیا ہے اس کی صحیح حد آگے کے الفاظ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ (اور تم ان سے قربت نہ کرو یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں تو جب وہ پاکیزگی حاصل کر لیں تو ان کے پاس آؤ جہاں سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے) سے خود واضح ہو رہی ہے کہ یہ علیحدگی صرف زن و شو کے خاص تعلق کے حد تک ہی مطلوب ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت کو بالکل اچھوت بنا کے رکھ دو، جیسا کہ دوسرے مذاہب میں ہے۔ اس چیز کی وضاحت احادیث اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ہوئی ہے۔

اس آیت میں 'طہر' اور 'تطہر' دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ طہر کے معنی تو یہ ہیں کہ عورت کی ناپاکی کی حالت ختم ہو جائے اور خون کا آنا بند ہو جائے اور تطہر کے معنی یہ ہیں کہ عورت نہا دھو کر پاکیزگی کی حالت میں آجائے۔ آیت میں عورت سے قربت کے لیے طہر کو شرط قرار دیا ہے اور ساتھ ہی فرما دیا ہے کہ جب وہ پاکیزگی حاصل کر لیں تب ان کے پاس آؤ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ چونکہ قربت کی ممانعت کی اصلی علت خون ہے اس وجہ سے اس کے انقطاع کے بعد یہ پابندی تو اٹھ جاتی ہے لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب عورت نہا دھو کر پاکیزگی حاصل کرے تب اس سے ملاقات کرو۔

تمام بدیہیات فطرت شریعت کا اجزا ہیں

"فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ" (تو ان کے پاس آؤ، جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے) سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تمام بدیہیات فطرت اللہ کے اوامر میں شامل ہیں اور اس پہلو سے وہ شریعت الٰہی کے اجزا ہیں اگرچہ لفظوں میں خدا کی طرف سے ان کا حکم دیا گیا ہو یا نہ دیا گیا ہو۔ مثلاً یہ کہ اگرچہ اس بات کا کہیں حکم نہیں دیا گیا ہے کہ لقمہ منہ میں ہی ڈالنا چاہیے، ناک یا آنکھ میں نہیں ڈالنا چاہیے تاہم یہ خدا کا حکم ہے اس لیے کہ فاطر نے ہماری فطرت یہی بنائی ہے، اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرے تو درحقیقت وہ خدا کے ایک واضح بلکہ واضح تر حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے اور اس پر وہ خدا کے ہاں سزا کا مستحق ہوگا۔ ہم نے اس کو واضح کے بجائے واضح تر اس لیے قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے معاملات کو صرف اس وجہ سے ہماری فطرت پر چھوڑ دیا ہے کہ فطرت ان کی وضاحت کی وجہ سے ان میں کسی رہنمائی کی محتاج نہیں تھی۔ بعینہٖ یہی معاملہ محلِ مباشرت کا ہے، اگر کوئی شخص اس میں اندھے پن کا ثبوت دیتا ہے تو وہ حیوانات سے بھی گیا گزرا ہے اس لیے کہ وہ اس میں کوئی غلطی نہیں کرتے اگرچہ وہ کسی قرآن اور کتاب سے آشنا نہیں ہیں۔

توبہ اور تطہر کی حقیقت

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ توبہ اور تطہر کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ توبہ اپنے باطن کو گناہوں سے پاک کرنے کا نام ہے اور تطہر اپنے ظاہر کو نجاستوں اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے اس اعتبار سے ان دونوں کی حقیقت ایک ہوئی اور مومن کی یہ دونوں خصلتیں اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں اس کے برعکس جو لوگ ان سے محروم ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں۔ یہاں جس سیاق میں یہ بات

آئی ہے اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو لوگ عورت کی ناپاکی کے زمانے میں قربت سے اجتناب نہیں کرتے یا تقاضائے شہوت کے معاملے میں فطرت کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک نہایت مبغوض ہیں۔ احادیث میں اس بات کی وضاحت موجود ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (۲۲۳)

"حرث" کے معنی عربی میں کھیتی کے ہیں، عام اس سے کہ وہ باغوں کی نوعیت کی ہو یا دوسری فصلوں کی۔

عورت کے لیے کھیتی کا استعارہ

عورتوں کے لیے کھیتی کے استعارہ میں ایک سیدھا سادا پہلو تو یہ ہے کہ جس طرح کھیتی کے لیے قدرت کا بنایا ہوا یہ ضابطہ ہے کہ تخم ریزی ٹھیک موسم میں اور مناسب وقت پر کی جاتی ہے، نیز بیج کھیت ہی میں ڈالے جاتے ہیں کھیت سے باہر نہیں پھینکے جاتے، کوئی کسان اس ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اسی طرح عورت کے لیے فطرت کا یہ ضابطہ ہے کہ ایام ماہواری کے زمانے میں یا کسی غیر محل میں اس سے تقاضائے شہوت نہ کی جائے اس لیے کہ حیض کا زمانہ عورت کے جمام اور غیر آمادگی کا زمانہ ہوتا ہے، اور غیر محل میں مباشرت باعث اذیت اضاعت ہے۔ اس وجہ سے کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے اس کا ارتکاب جائز نہیں۔ اپنے اس پہلو سے یہ آیت اوپر والی آیت کی گویا توضیح مزید ہوئی۔

آزادی اور پابندی کے حدود

فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (پس اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ) میں بیک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اس آزادی، بے تکلفی، خود مختاری کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی کے مالک کو اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں حاصل ہوتی ہے اور دوسری اس پابندی، ذمہ داری اور احتیاط کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی والا اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں ملحوظ رکھتا ہے۔ اس دوسری چیز کی طرف "حرث" کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اور پہلی چیز کی طرف أَنَّىٰ شِئْتُمْ کے الفاظ۔ وہ آزادی اور یہ پابندی، یہ دونوں چیزیں مل کر اس رویہ کو متعین کرتی ہیں جو ایک شوہر کو بیوی کے معاملہ میں اختیار کرنا چاہیے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ازدواجی زندگی کا سارا سکون و سرور فریقین کے اس اطمینان میں ہے کہ ان کی خلوت کی آزادیوں پر فطرت کے چند موٹے موٹے قیود کے سوا کوئی قید، کوئی پابندی اور کوئی نگرانی نہیں ہے۔ آزادی کے اس احساس میں بڑا کیف اور بڑا نشہ ہے۔ انسان جب اپنے عیش و سرور کے اس باغ میں داخل ہوتا ہے تو قدرت چاہتی ہے کہ وہ اپنے اس نشہ سے سرشار ہو لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس کے سامنے قدرت نے رکھ دی ہے کہ یہ کوئی جنگل نہیں بلکہ اس کا اپنا باغ ہے اور یہ کوئی ویرانہ نہیں بلکہ اس کی اپنی کھیتی ہے اس وجہ سے وہ اس میں آنے کو تو سو بار آئے اور جس شان، جس آن، جس سمت اور جس پہلو سے چاہے آئے لیکن اس باغ کا باغ ہونا اور کھیتی کا کھیتی ہونا یاد رکھے، اس کے کسی آنے میں بھی اس حقیقت سے غفلت نہ ہو۔

اپنی کھیتی سے متعلق ہر کسان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس سے برابر نہایت اچھی فصل حاصل

ہوتی ہے، مناسب وقت پر اس میں ہل چلاتے رہیں، ضرورت کے مطابق اس کو کھاد اور پانی ملتا ہے، اور ہی آفتوں سے وہ محفوظ رہے، آشد روند، چرند و پرند اور دشمن اور چور اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں، جب وہ اس کو دیکھے تو اس کی طراوت و شادابی اس کو خوش کر دے اور جب وقت آئے تو وہ اپنے پھلوں اور پھولوں سے اس کا دامن بھر دے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے نظریے کی تردید

قرآن نے عورت کے لیے کھیتی کے استعارے میں یہ ساری باتیں جمع کر دی ہیں اور اس استعارے نے ان لوگوں کے نظریے کی تو جڑ ہی کاٹ دی ہے جو خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیمیں چلاتے ہیں، اس لیے کہ کھیتی سے متعلق یہ رہنمائی تو معقول قرار دی جا سکتی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اور اچھی سے اچھی پیداوار کس طرح حاصل کی جائے لیکن یہ بات بالکل غیر منطقی ہے کہ لوگوں کو اس بات کے سبق پڑھائے جائیں کہ وہ بیج زیادہ سے زیادہ ڈالیں لیکن فصل کم سے کم حاصل کریں۔ اس قسم کی نامعقول منطق صرف نادانوں ہی کو سوجھ سکتی ہے۔

'وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ' (اور اپنے لیے آگے بڑھاؤ) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح زمین کی کھیتی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے تم اپنے مستقبل کی معاش کا انتظام کرو اسی طرح عورت کی کھیتی کی اصلی غایت یہ ہے کہ اس سے تم نسلِ انسانی کے مستقبل میں اپنی جگہ محفوظ اور اس کے قیام و بقا میں اپنا حصہ ادا کر سکو۔ 'فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ' کے بعد ان الفاظ کے اضافے نے یہ حقیقت نہایت واضح الفاظ میں سامنے رکھ دی کہ عورت سے مواصلت کی اصل غایت بقائے نسل ہے، لذت اس کا صرف ضمنی فائدہ ہے اس وجہ سے ہر وہ طریقہ جو اس مقصد کو ضائع کرنے والا یا اس کو نقصان پہنچانے والا ہو اگرچہ لذت کے تقاضے اس سے پورے ہو جاتے ہیں، فاطر کی بنائی ہوئی فطرت اور اس کے تقاضوں کے بالکل خلاف ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ انسان جس طرح اپنی اولاد کے ذریعے سے نسلِ انسانی کے اندر اپنا ایک مقام محفوظ کرتا ہے اسی طرح ان کے ذریعے سے اگر وہ ان کی اچھی تربیت کر سکے آخرت میں بھی اپنے سرمائے میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے اس لیے کہ اولادِ صالح کی نیکی ایک خیرِ جاری ہے جس کا سلسلہ آدمی کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ احادیث میں اس کی دلیل موجود ہے۔ 'قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ' میں یہ دونوں ہی پہلو موجود ہیں۔

بعض اہلِ تاویل نے اس کی تاویل اس سے مختلف کی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے۔ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ اسی سورہ میں دوسری جگہ اس طرح وارد ہے 'فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ' ۱۸۷۔ بقرہ ۲ (پس اب تم ان سے مباشرت کرو، اور وہ چیز چاہو جو اللہ نے تمہارے لیے مقدر کی ہے) اس آیت کی تاویل اوپر گزر چکی ہے۔

'وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ' (اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ بالآخر تمہیں اس سے ملنا ہے) کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تم فطرت کے ان قوانین اور اللہ کے ان حدود کو آج خلوت میں بھی اور جلوت

میں بھی تڑپ سکتے ہو اور تمھیں اس کی مہلت ملی ہوئی ہے لیکن یاد رکھو کہ ایک دن تمھیں خدا کو بھی منہ دکھانا ہے جس کی آنکھیں تمھیں ہر جگہ دیکھ رہی ہیں اور جس کی پکڑ سے تمھیں کوئی بھی نہ بچا سکے گا۔ اس دھمکی کے ساتھ ان اہل ایمان کو بشارت بھی دے دی جو نفس کی تمام ترغیبات کے باوجود اس امر کو یاد رکھتے ہیں کہ ایک دن انھیں اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۲۴)

اللہ کو قسموں کا ہدف بنانے کا مطلب

عُرْضَةً کے معنی ہدف اور نشانہ کے ہیں۔ اللہ کو قسموں کا ہدف بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نام پر بے ضرورت اور لایعنی قسمیں یا ایسی قسمیں کھائی جائیں جو نیکی و تقویٰ اور مقصد اصلاح کے خلاف ہوں۔ خدا کے عظیم نام کو لایعنی قسموں کے لیے استعمال کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مچھر مارنے کے لیے توپ داغتا پھرے اور نیکی اور تقویٰ کے خلاف قسموں کے لیے اس کے پاک نام کو استعمال کرنا گویا اسی کے نام سے نیکی اور تقویٰ کی جڑ کاٹنا ہے جو تمام نیکی اور تمام خیر کا سرچشمہ ہے۔

عربی زبان میں 'اَنْ' سے پہلے بعض حالات میں مضاف اور بعض مواقع میں اس کے بعد حرف 'لا' کو حذف کر دیتے ہیں۔ اس محذوف کو سیاق و سباق سے سمجھتے ہیں۔ یہاں واضح قرینہ ہے کہ 'اَنْ' کے بعد 'لا' محذوف ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ استاذ امام نے اس کے شواہد اپنی کتاب الاسالیب میں جمع کر دیے ہیں۔

'بر'، 'تقویٰ' اور 'اصلاح' سے مراد

بر، تقویٰ اور اصلاح کے تینوں لفظوں نے یہاں خیر اور نیکی کے تمام اقسام کو جمع کر لیا ہے۔ 'بر' ان تمام نیکیوں پر حاوی ہے جن کا تعلق والدین، رشتہ داروں، مسکینوں، یتیموں اور دوسرے حقوق العباد سے ہے۔ 'تقویٰ' ان نیکیوں پر حاوی ہے جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور 'اصلاح' سے مراد وہ نیکیاں ہیں جو معاشرہ سے تعلق رکھنے والی ہیں۔

آیت ۲۲۴ کے مسائل کی تمہید ہے

یہ آیت آگے بیان ہونے والے مسائل کی تمہید ہے۔ آگے ایلاء کا اور اس کے بعد نکاح و طلاق سے متعلق بعض اہم مسائل کا ذکر آ رہا ہے۔ ایلاء اس قسم کو کہتے ہیں جو کوئی شخص بیوی سے ازدواجی تعلق نہ رکھنے کے لیے کھا بیٹھے۔ قسم چونکہ تمام معاشرتی، سماجی اور سیاسی معاملات و معاہدات میں اعتماد و استحکام کا ذریعہ ہے اور اس سے تمدن کے نہایت اعلیٰ مقاصد پورے ہوتے ہیں اس وجہ سے ایلاء اور نکاح و طلاق کے مسائل سے پہلے خود قسم کی اہمیت واضح کرنے کے لیے یہ فرمایا کہ خدا کے نام کو کبھی ایسی قسموں کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے جو نیکی و تقویٰ اور اصلاح کے منافی ہوں۔ خدا کی قسم کھانے کے معنی اس کو گواہ ٹھہرانے کے ہیں، اگر کوئی شخص اس کے نام پر کوئی ایسی قسم کھاتا ہے جو نیکی یا سچائی یا عدل کی مخالفت کے لیے ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خدا کو خود خدا کے خلاف اور شیطان کے حق میں گواہ بنانا چاہتا ہے۔ اس قسم کی تمام

قسمیں خدا کے ساتھ مذاق کے ہم معنی ہیں اس وجہ سے ایسی قسمیں اوّل تو جائز ہی نہیں ہیں لیکن اتفاق سے کوئی شخص کھا بیٹھے تو اسلام نے اس کو توڑ دینے کا حکم دیا ہے۔

اخیر میں سمیع اور علیم کے حوالہ میں کچھ دھمکی کا انداز ہے کہ جو لوگ خدا کے قدوس نام کو اس طرح تختۂ مشق ستم بنائیں گے وہ اس حقیقت کو نہ بھولیں کہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے، وہ ایسے گستاخوں کو سزا دیے بغیر نہ رہے گا۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (۲۲۵)

ارادی اور غیرارادی قسمیں

یعنی اس مواخذہ سے صرف وہی قسمیں مستثنیٰ ہیں جو بالکل غیرارادی طور پر زبان پر جاری ہو جاتی ہیں، جن کا تعلق دل سے نہیں بلکہ محض زبان سے ہوتا ہے، جو کسی نفع و نقصان کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں کھائی جاتی ہیں بلکہ محض تکیہ کلام کے طور پر زبان سے اثنائے کلام میں ٹپک پڑا کرتی ہیں۔ لیکن جو قسمیں دل کے قصد و ارادہ اور قلب کے تعمد کا نتیجہ ہوں گی اور جن کا کوئی قریب یا بعید اثر آدمی کے اپنے یا دوسرے کے حقوق و مفادات پر پڑنے والا ہوگا، اگر ان میں خدا کے نام کو غلط طور پر استعمال کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان قسموں پر ضرور مواخذہ فرمائے گا۔

'لغو' قسموں کو اگرچہ مواخذہ سے مستثنیٰ رکھا ہے اس لیے کہ خدا غفور اور حلیم ہے لیکن ان کو لغو کے لفظ سے تعبیر کر کے واضح کر دیا کہ ثقہ اور سنجیدہ لوگوں کو ان سے بھی احتراز کرنا واجب ہے۔ قرآن میں شریف و شائستہ لوگوں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان میں یہ بات خاص طور پر بیان ہوئی ہے کہ وہ لغو چیزوں سے احتراز کرتے ہیں۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۲۶)

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۲۷)

ایلاء کے احکام

قسموں کے متعلق مذکورہ بالا تمہید کے بعد اب یہ ایک ایسا مسئلہ شرعی بیان ہو رہا ہے جس میں اصل عامل کی حیثیت قسم کو حاصل ہے۔ یہ مسئلہ ایلاء کا ہے۔ 'ایلاء' 'الایا لو' سے باب افعال ہے۔ 'الایا لو' کا اصل لغوی مفہوم کسی امر میں کوتاہی اور کمی کرنا ہے اور 'ایلاء' کے معنی کسی چیز کے ترک کی قسم کھا لینے کے ہیں۔ یہ عرب جاہلیت کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم بیوی سے زن و شوہر کا تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا لینا ہے۔ چونکہ اس لفظ میں ترک کا مضمون خود موجود ہے اس وجہ سے قطع تعلق کے معنی کو ادا کرنے کے لیے کسی اور لفظ کی اس کے ساتھ ملانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس قسم کی قسم چونکہ ازدواجی مقاصد کے خلاف اور بر و تقویٰ کے منافی ہے، اس سے بیوی بالکل معلق ہو کے رہ جاتی ہے، اس وجہ سے اسلام نے اس طرح کی قسم کھا بیٹھنے والوں کے لیے چار ماہ کی حد مقرر

کردی ہے کہ اس کے اندر یا تو وہ بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کرلیں یا طلاق دینے کا فیصلہ ہے تو اس کو طلاق دے دیں۔ جو پہلی شکل اختیار کریں گے ان کے متعلق فرمایا کہ اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ یعنی اگرچہ ان کی یہ قسم ایک حق تلفی پر مبنی تھی اور قسم کو کسی حق تلفی کے لیے سپر بنانا جائز نہیں لیکن اصلاح حال کے بعد اللہ تعالیٰ اس کوتاہی کو معاف کردے گا۔ یہاں اگرچہ اس قسم کے توڑنے پر کسی کفارہ کا ذکر نہیں ہے لیکن قسموں کے توڑنے کے بارے میں قرآن نے دوسرے مقام میں جو عام ضابطہ بیان فرمایا ہے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ یہ صورت اس سے مستثنیٰ رہے؟ اس وجہ سے ہم ان فقہاء کی رائے کو زیادہ قوی سمجھتے ہیں جو اس صورت میں بھی کفارہ کے قائل ہیں۔

دوسرے گروہ سے متعلق فرمایا کہ اگر انھوں نے طلاق کا فیصلہ کرلیا ہے تو وہ یہ راہ اختیار کرسکتے ہیں لیکن اس معاملے میں اللہ نے جو حدود و قیود مقرر کر دیے ہیں ان کی پوری پوری نگہداشت ملحوظ رہے۔ اللہ ہر چیز کو سنتا اور جانتا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر چار ماہ کی مذکورہ مدت گزر جائے اور اس دوران میں ایک شخص نہ رجوع ہی کرے اور نہ طلاق ہی دے تو کیا ہوگا؟ فقہاء کا ایک گروہ اس سوال کا یہ جواب دیتا ہے کہ چار ماہ کی مدت گزرتے ہی ایک طلاق آپ سے آپ پڑ جائے گی، بعض کے نزدیک یہ ایک طلاق بائن ہوگی اور بعض کے نزدیک رجعی، دوسرے گروہ کے نزدیک چار ماہ کی مدت گزرنے پر معاملہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوگا اور وہ شوہر کو حکم دے گا کہ یا تو وہ رجوع کرے یا طلاق دے۔ قرآن کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ چار ماہ گزرنے پر شوہر کو بہرحال یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ یا تو رجوع کرے یا طلاق دے۔ اگر وہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہ کرے تو عورت ایسے شوہر سے بذریعہ عدالت طلاق حاصل کرے گی۔

قرآن کے الفاظ سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ عورت کو طلاق حاصل کرنے کا یہ حق صرف اس صورت میں حاصل ہوگا جب شوہر نے بربنائے بغض و نفرت بیوی سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہو اور پیش نظر اس کو معلق بنا کے رکھنا ہو۔ اگر یہ صورت نہ ہو بلکہ کسی اور وقتی اور عارضی مصلحت، خواہ بتقاضائے صحت یا بارادۂ تنبیہ، کوئی شخص بیوی سے مخصوص ازدواجی تعلق منقطع رکھے تو یہ صورت اس حکم کے تحت نہیں آتی اگرچہ اس انقطاع کی مدت چار ماہ سے متجاوز ہی کیوں نہ ہو جائے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ
فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ
اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۲۸)

'قروء' کا مفہوم

'قروء' قرء کی جمع ہے۔ اس کے معنی کی تعیین میں اہل لغت نے اختلاف کیا ہے۔ بعض نے اس کے معنی حیض کے لیے ہیں اور بعض نے طہر کے۔ اس کے اصل مادہ اور اس کے مشتقات پر ہم نے جس قدر غور کیا ہے اس سے ہمارا رجحان اسی بات کی طرف ہے کہ اس کے اصل معنی تو حیض ہی کے ہیں لیکن چونکہ ہر حیض کے ساتھ طہر بھی لازماً لگا ہوا ہے اس وجہ سے عام بول چال میں اس سے طہر کو بھی تعبیر کر دیتے ہیں، جس طرح رات کے لفظ سے اس کے ساتھ لگے ہوئے دن کو یا دن کے لفظ سے اس کے ساتھ لگی ہوئی رات کو۔ اس قسم کے استعمال کی مثالیں ہر زبان میں مل سکتی ہیں۔

یہاں جو مسئلہ بیان ہوا ہے اس کا ظاہری قرینہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قروء سے مراد حیض ہی ہے۔ اس لیے کہ آیت میں مطلقہ عورتوں کو جس توقف کی ہدایت ہے اس کی اصل حکمت، جیسا کہ اس آیت سے خود واضح ہے، یہ ہے کہ یہ متعین ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ حاملہ ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ اصلاً حیض ہی سے ہوتا ہے نہ کہ طہر سے۔ اس وجہ سے اس کو حیض ہی کے معنی میں لینا زیادہ اقرب ہے۔ معنی کے اس اختلاف کی وجہ سے زمانہ عدت کے تعین میں حنفیہ اور شافعیہ کے درمیان اختلاف ہوا جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

طلاق کی عدت کی حکمت

اصل مقصود اس تین حیض کی مدت سے چونکہ یہ متعین کر لینا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں، اس لیے کہ اس چیز پر بہت سے اہم امور کا انحصار ہے اس وجہ سے ان مطلقات کے ایمان و اسلام کا یہ لازمی تقاضا ٹھہرایا ہے کہ اگر حمل کے قسم کی کوئی چیز وہ محسوس کرتی ہیں تو اس کو چھپانے کی کوشش نہ کریں ورنہ اس سے ان تمام مصالح کو سخت نقصان پہنچے گا جو شریعت نے اس حکم میں عورت اور مرد اور پیٹ میں موجود بچے کے لیے ملحوظ رکھے ہیں۔

اس مدت کے دوران میں شوہر کو حق حاصل ہے کہ وہ اگر سازگاری اور بحالی تعلقات کا طالب ہے تو وہ مراجعت کر سکتا ہے۔ شریعت میں میاں بیوی کے تعلق کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، اس کا ٹوٹنا صرف اسی صورت میں گوارا کیا گیا ہے جب سازگاری کا کوئی امکان بھی باقی نہ رہ گیا ہو۔ اس وجہ سے یہ مدت رکھ دی گئی ہے جس میں دوسرے مصالح کے ساتھ یہ مصلحت بھی ہے کہ اگر طلاق کا باعث کوئی وقتی ناراضگی ہوئی ہے تو فریقین اطمینان کے ساتھ ٹھنڈے دل سے اپنے معاملے پر نظر ثانی کر سکتے ہیں لیکن قرآن نے شوہر کے اس حق مراجعت کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی لگا دی ہے کہ یہ صرف بارادۂ اصلاح یعنی خوشگواری اور محبت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے ہو، اس سے ہرگز ہرگز عورت کو تنگ کرنا اور ستانا نہ ہو، ورنہ یہ اس حق کا نہایت ظالمانہ استعمال ہو گا جو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہے۔

میاں اور بیوی دونوں کے حقوق ہیں

اس کے بعد عورت اور مرد دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق کی نہایت جامع الفاظ میں وضاحت فرما دی ہے کہ شوہروں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ حقوق صرف انہی کے ہیں، بیویوں کا کوئی حق ہی نہیں ہے بلکہ

جس طرح ان پر شوہروں سے متعلق فرائض اور ذمہ داریاں ہیں اسی طرح دستور کے مطابق شوہروں پر ان کے حقوق بھی ہیں، اور یہ فرائض اور یہ حقوق دونوں بالکل متوازن ہیں۔ ہر شوہر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے حقوق کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ بیوی کے حقوق کا بھی لحاظ کرے۔ اسی لحاظ پر میاں بیوی کے سنجوگ اور ان کی ازدواجی زندگی کی خوشگواری کا انحصار ہے۔

گھر کا قوام مرد ہے

البتہ یہ بات ہے کہ خاندانی نظام کے بقا و استحکام کے نقطۂ نظر سے اسلام نے مرد کو عورت پر ایک درجہ ترجیح کا دیا ہے۔ اس ترجیح سے مراد، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات کی تصریحات سے واضح ہے، یہ ہے کہ خاندان کا قوام اور سرپرست اسلام نے عورت کو نہیں بلکہ مرد ہی کو بنایا ہے جس طرح ایک ریاست کا نظم ایک سربراہ کی سربراہی کا محتاج ہے، اسی طرح چھوٹے پیمانہ پر ایک گھر کا نظم بھی ایک قوام کی قوامیت کا محتاج ہے اور اس قوامیت کے لیے اپنی فطرت اور اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے مرد ہی موزوں ہے نہ کہ عورت[1]۔

مرد کے وجوہ ترجیح پر قرآن نے دوسری جگہ دلیل دی ہے اس وجہ سے یہ بحث اپنے مقام ہی پر موزوں رہے گی۔ یہاں جس چیز کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ قرآن کے یہ الفاظ ہیں کہ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ اس کے معنی ظاہر ہیں کہ یہی ہو سکتے ہیں کہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ ترجیح حاصل ہے۔ قرآن کے ان واضح الفاظ کی موجودگی میں ایک مسلمان کے لیے مساوات مرد و زن کے اس نظریے پر ایمان لانے کی تو کوئی گنجائش نظر نہیں آتی جو ہمارے ہاں مغرب سے درآمد ہوا ہے۔ قرآن اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ عورت پر جس درجے کی ذمہ داریاں ہیں، اسی کے ہم وزن اس کے حقوق بھی ہیں لیکن وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ عورت اور مرد دونوں ہر اعتبار سے بالکل برابر ہیں بلکہ صاف الفاظ میں مرد کو عورت پر ایک درجہ ترجیح دیتا ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ جو فرمایا ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ تو اس کے معنی بھی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ عورت اور مرد دونوں کے حقوق برابر ہیں بلکہ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عورت پر جس طرح ذمہ داریاں ہیں، اسی طرح اس کے حقوق بھی ہیں۔

قرآن نے اسی لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ کے اصول کو بنیاد قرار دے کر خاندان میں قوامیت اور سربراہی کا مقام، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، مرد کو دیا ہے اور پھر اسی پر اس نے تمام عائلی قوانین و احکام کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر اس بنیاد کو ڈھا کر مغربی نظریۂ مساوات کی اساس پر، جو ہر اعتبار سے عورت و مرد دونوں کو ایک ہی درجہ میں رکھنے کا مدعی ہے، اسلام کے عائلی قوانین کو سمجھنے اور ڈھالنے کی کوشش کی جائے تو اس کوشش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا کہ پورا دین محرف ہو کر رہ جائے۔

عزیز و حکیم کی وضاحت

آیت کے آخر میں خدا کی دو صفتوں — عزیز اور حکیم — کا حوالہ ہے۔ خدا عزیز ہے اس وجہ سے اسی

---

[1] جو لوگ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے طالب ہوں، وہ ہماری کتاب اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام پڑھیں۔ اس میں ہم نے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، قرآن اور فلسفۂ جدید دونوں کی روشنی میں۔

کو حق ہے کہ وہ حکم دے اور وہ حکیم ہے اس وجہ سے جو حکم بھی اس نے دیا ہے وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے بندوں کا کام یہ ہے کہ اس کے احکام کی بے چون وچرا اطاعت کریں۔ اگر وہ اس کے احکام کی مخالفت کریں گے تو اس کی غیرت وعزت کو چیلنج کریں گے اور اس کے عذاب کو دعوت دیں گے اور اگر خدا سے زیادہ حکیم اور مصلحت شناس ہونے کے خبط میں مبتلا ہوں گے تو خود اپنے ہاتھوں اپنے قانون اور نظام سب کا تیا پانچا کر کے رکھ دیں گے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۲۹)

طلاق کا صحیح طریقہ

اب یہ طلاق کا صحیح طریقہ بتا دیا کہ تمام معاشرتی زندگی کی بنیاد چونکہ نکاح کے پاکیزہ رشتے ہی پر ہے اس وجہ سے اگر کسی مجبوری کے باعث اس کے ٹوٹنے کی نوبت آئے تو یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آدمی ایک ہی جھٹکے میں اس مقدس رشتے کو توڑ تاڑ کے رکھ دے بلکہ مطلقہ کے لیے جس طرح یہ ہدایت ہے کہ وہ تین حیض تک انتظار کرے اسی طرح طلاق دینے والے کے لیے یہ ہدایت ہے کہ وہ الگ الگ طہروں میں دو مرتبہ میں طلاق دے اور پھر تیسرے طہر میں یا تو بیوی سے مراجعت کرے اگر مراجعت کرنا چاہے یا اس کو رخصت کر دے اگر اس کا آخری فیصلہ اس کو رخصت کر دینے ہی کا ہے۔ مراجعت کی شکل میں اس کو معروف کی پابندی کی ہدایت کی گئی یعنی اس مراجعت سے مقصود بیوی کو اس طریقہ سے بیوی بنا کر رکھنا ہو جس طرح ایک شریف، مہذب اور خدا ترس آدمی بیوی کو رکھتا ہے اور جس کا بھلے لوگوں میں چلن ہے، مقصود اس سے بیوی کو معلق رکھنا اور دکھ دینا نہ ہو۔ رخصت کرنے کی شکل میں اس کو احسان کی ہدایت ہوئی کہ ہر چند اب اس کا بیوی کی حیثیت سے کوئی حق باقی نہ رہا لیکن مرد کی مردانگی اور فتوت کی شان یہی ہے کہ جس کے ساتھ مہر ومحبت کے روابط رہ چکے ہوں اور جو ایک صنف ضعیف بھی ہے اس کو حسب توفیق دے دلا کر خوب صورتی کے ساتھ رخصت کرے۔

مطلقہ کے لیے تین حیض تک توقف میں جس طرح بہت سی مصلحتیں ہیں اسی طرح طلاق دینے والوں کے لیے مذکورہ ترتیب کے ساتھ طلاق دینے میں بہت سی برکتیں ہیں جن سے وہ لوگ محروم ہو جاتے ہیں جو غصہ اور جوش کی حالت میں شریعت کی اس ہدایت کی پیروی نہیں کرتے اور ایک ہی سانس میں تین یا اس سے زیادہ طلاقیں دے ڈالتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ عموماً اپنے کیے پر زندگی بھر پچھتاتے ہیں لیکن ان کا یہ پچھتانا بالکل بے سود ہوتا ہے۔ شریعت نے یہ طریقہ اسی لیے بتایا ہے کہ ازدواجی رشتہ ایک نہایت اہم رشتہ ہے، اس کا ٹوٹنا نہیں بلکہ تا حد امکان اس کا جڑا رہنا مطلوب ہے، اس وجہ سے اس کے متعلق کوئی فیصلہ غصہ یا عجلت میں نہیں ہونا چاہیے بلکہ سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے ہونا چاہیے، اور یہ اسی صورت

میں ممکن ہے جب مذکورہ ہدایت پر عمل کیا جائے[1]۔

مردکی فتوت کا حق — وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا (اور تمہارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ تم نے ان کو جو کچھ دیا دلایا ہو وہ ان سے واپس لو) سے ظاہر ہے کہ نان نفقہ اور مہر وغیرہ کی قسم کی چیزیں مراد نہیں ہو سکتیں اس لیے کہ یہ چیزیں تو عورت کا حق ہیں، ان کو واپس لینے یا کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس وجہ سے لازماً وہ چیزیں مراد ہیں جو بطور تحفہ وغیرہ دی گئی ہوں۔ ان چیزوں کے بارے میں فرمایا کہ طلاق ہو جانے کے بعد مرد کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ ان کا حساب کتاب کرنے بیٹھ جائے۔ اس ممانعت کی وجہ جیسا ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ اس قسم کی خست اس فتوت اور بلند حوصلگی کے منافی ہے جو ایک مرد میں ہونی چاہیے۔ چنانچہ عورتوں کے معاملے میں قرآن نے مردوں کو اس فتوت کی طرف ایک سے زیادہ مقامات میں توجہ دلائی ہے، خاص طور پر تعلقات کے منقطع ہو جانے کی صورت میں، مثلاً وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ ۱۹ - نساء (اور ان کو اس مقصد سے تنگ کرنے کی کوشش نہ کرو کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا تھا اس کو واپس لے سکو) دوسری جگہ ہے وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۲۱ - نساء (اور تم ان سے کس طرح لو گے جب کہ تم ایک دوسرے کی طرف محبت سے بڑھ چکے ہو اور وہ تم سے نہایت مضبوط عہد لے چکی ہیں) اور اسی بقرہ میں آگے مردوں کو خطاب کر کے یہ آیت آرہی ہے وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۲۳۷ - بقرۃ (اور یہ کہ عورت کی طرف سے معافی کے خواہشمند ہونے کے بجائے تم اپنا حق چھوڑ دو، یہ زیادہ تقویٰ سے قریب ہے اور تم میں سے ایک کو دوسرے پر جو ترجیح حاصل ہے اس کو نہ بھولو)

خلع کے احکام — اس کے بعد وہ شکل بیان ہوئی ہے جو اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔ یہ وہ شکل ہے جب کہ بیوی کو بھی میاں سے ایسا اختلاف ہو کہ صاف نظر آرہا ہو کہ ازدواجی زندگی کے نباہ کے لیے جن حدود و قیود کی نگہداشت ضروری ہے ان کو فریقین ملحوظ نہیں رکھ سکتے تو اس امر میں کوئی حرج نہیں ہے کہ بیوی کوئی مال یا رقم فدیہ کے طور پر دے کر اپنے میاں سے چھٹکارا حاصل کرلے۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کو خلع کہتے ہیں۔ اس صورت میں چونکہ غالب مصلحت عورت کی ہوتی ہے اس وجہ سے کمزور عنصر ہونے کے باوجود اس معاوضہ کو لینے کی اجازت دی گئی۔

قرآن کے الفاظ سے اس خلع کے متعلق دو باتیں نمایاں ہوتی ہیں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ اگر میاں بیوی آپس میں کوئی بات طے نہ کر سکیں تو عورت لازماً یہ معاملہ عدالت میں لے

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ اگر کوئی شخص اس ہدایت کے خلاف طلاق دے تو وہ طلاق واقع ہی نہیں ہوگی۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب "فائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ" میں کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

جاسکتی ہے اور عدالت خلع اور معاوضہ دونوں کا فیصلہ کرے گی۔ اس کا ثبوت فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ (پس اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ میاں بیوی اللہ کے حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو .....) سے ملتا ہے۔ اس میں خِفْتُمْ کا خطاب ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرہ سے بحیثیت مجموعی ہے اور معاملات و نزاعات میں معاشرے کی مداخلت عدالت ہی کے واسطے سے ممکن ہے۔

۲- دوسری یہ کہ خلع یا فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق عورت کو اسی صورت میں ہے جب یہ ثابت ہو سکے کہ ازدواجی زندگی میں جن حدود اللہ کا قیام مطلوب ہے مرد ان کو قائم رکھنے کے قابل نہیں یا ان کو قائم نہیں رکھنا چاہتا اور عورت کے لیے ان کے قیام کے بغیر حدود اللہ پر قائم رہنا ناممکن یا دشوار ہے۔ اس کا ثبوت أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ سے ملتا ہے۔ اگر اختلاف محض ذوقی اور سطحی نوعیت کا ہے جس کو انگیز کیا جا سکتا ہے تو ایسی صورت میں عورت کو خلع یا فسخ نکاح کا مطالبہ لے کر نہیں اٹھنا چاہیے۔ اگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی عورت کو یہ حق استعمال کرنے کی راہ کھول دی جائے تو اس سے خاندانی نظام کی چولیں ہل جائیں گی درآنحالیکہ خاندان کے اس نظام ہی کو اسلام میں سیاسی نظام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ معاملے کی اس اہمیت کی وجہ سے خلع یا فسخ نکاح کے مطالبے کی شکل میں عدالت یہ دیکھے گی کہ کیا فی الواقع صورت معاملہ ایسی ہے کہ فریقین کے لیے نباہ ناممکن یا دشوار ہے یا محض کندھا بدلنے اور ذائقہ تبدیل کرنے کی خواہش ہے جس کے تحت عورت نے مرد کو عدالت میں کھینچ بلایا ہے۔

"تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ الآية" یہ ان تمام احکام و ہدایات سے متعلق ہے جو آیت (۲۲۲) سے لے کر یہاں تک بیان ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ یہ تمھاری ازدواجی زندگی سے متعلق خدا کی حد بندیاں ہیں، جس طرح تم اپنے رقبوں اور اپنی چراگاہوں کے ارد گرد حد بندیاں کرتے ہو اور یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان حدوں کو توڑے اور اگر کوئی ان حدود میں مداخلت کرتا ہے تو تم اس کو اپنی ملکیت میں مداخلت اور اپنی عزت و غیرت کے لیے ایک چیلنج سمجھتے ہو اسی طرح خدا نے بھی اپنے محارم کے ارد گرد یہ حدیں قائم کر دی ہیں، تم ان سے باہر آزاد ہو لیکن ان کے اندر تمھیں مداخلت کی اجازت نہیں ہے، اگر کسی نے ان حدوں کو توڑنے یا لانگھنے کی جسارت کی تو وہ یاد رکھیں کہ وہی لوگ ظالم ہیں۔ یعنی اس کے نتیجے میں جو کچھ اس دنیا میں یا آخرت میں ان کے سامنے آئے گا اس کی ساری ذمہ داری خود انھیں پر ہے، خدا پر نہیں ہے اور اس سے وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھائیں گے خدا کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ خدا کے قوانین تمام تر فطرت انسانی کے تقاضوں اور بندوں کے اپنے مصالح پر مبنی ہیں اسی وجہ سے جو لوگ ان کو توڑتے ہیں وہ اپنی ہی فطرت اور اپنے ہی مصالح کی دھجیاں خود اپنے ہی ہاتھوں بکھیرتے ہیں۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا

بِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۲۳۰)

ایک پرحکمت پابندی

آخری طلاق دے چکنے کے بعد اگر کوئی شخص پھر اس عورت سے نکاح کرنا چاہے تو یہ اس کا حکم بیان ہو رہا ہے کہ جب تک وہ عورت کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے اور وہ اس کو طلاق نہ دے اس وقت تک یہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے جائز نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اوپر والا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ طلاق کا فیصلہ غصہ یا عجلت میں نہ کیا جائے اسی طرح اس پابندی سے مقصود طلاق کو ایک سہل کھیل بنانے سے بچانا ہے۔ اگر طلاق کے بعد بھی طلاق دینے والے کے لیے اس عورت سے نکاح کی آزادی باقی رہتی تو بہت سے لوگ طلاق کی حقیقی اہمیت نہ سمجھ سکتے لیکن جب یہ پابندی لگ گئی کہ چھوڑی ہوئی بیوی دوبارہ اسی صورت میں مل سکتی ہے جب وہ کسی اور کی بیوی بنے اور وہ کسی سبب سے چھوڑے اور عورت اس سے نکاح پر راضی ہو تو گویا بیچ میں ایک پورا ہفتخواں حائل ہو گیا، ظاہر ہے کہ اب اس پابندی کے سامنے آجانے کے بعد جو طلاق دے گا وہ سو بار سوچ کر طلاق دے گا اور اسلام کا منشا یہی ہے کہ جو بھی طلاق دے وہ خوب سوچ سمجھ کر طلاق دے، دور تک سارے نتائج کو سامنے رکھ کر۔

لفظ نکاح، عقد نکاح کے مفہوم میں

"حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ" میں نکاح کا لفظ ہمارے نزدیک عقد نکاح ہی کے معنی میں ہے۔ جن لوگوں نے اس کو وطی کے معنی میں لیا ہے انھوں نے ایک غیر ضروری سا تکلف کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ معنی لینے سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہاں اس لفظ کا طریق استعمال اس معنی سے اِبا کر رہا ہے۔ یہاں تَنْكِحَ کا فاعل ظاہر ہے کہ عورت ہے، اگر اس کے معنی وطی کے لیے جائیں تو اس کا ترجمہ ہو گا کہ "یہاں تک کہ وہ عورت کسی دوسرے شوہر سے وطی کرے"۔ وطی کرنا مرد کا کام ہے نہ کہ عورت کا۔ اور اگر یہ ترجمہ کریں کہ "یہاں تک کہ وہ کسی اور شوہر سے وطی کرائے" تو اس نادر معنی کے لیے ثبوت کہاں سے لائیں گے؟

نکاح کا اصل مقصد

اصل یہ ہے کہ لفظ نکاح شریعت اسلامی کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کا اطلاق ایک عورت اور مرد کے اس ازدواجی معاہدہ پر ہوتا ہے جو زندگی بھر کے نباہ کے ارادے کے ساتھ زن و شو کی زندگی گزارنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگر یہ ارادہ کسی نکاح کے اندر نہیں پایا جاتا تو وہ فی الحقیقت نکاح ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک سازش ہے جو ایک عورت اور ایک مرد نے باہم مل کر کر لی ہے۔ نکاح کے ساتھ شریعت نے طلاق کی جو گنجائش رکھی ہے تو وہ اصل اسکیم کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ یہ کسی ناگہانی افتاد کے پیش آ جانے کا ایک مجبورانہ مداوا ہے۔ اس وجہ سے نکاح کی اصل فطرت یہی ہے کہ وہ زندگی بھر کے سنجوگ کے ارادے کے ساتھ عمل میں آئے۔ اگر کوئی نکاح واضح طور پر محض ایک معین و مخصوص مدت تک ہی کے لیے ہو تو اس کو متعہ کہتے ہیں اور متعہ اسلام میں قطعی حرام ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس نیت سے کسی عورت سے نکاح کرے کہ اس نکاح کے بعد طلاق دے کر وہ اس عورت کو اس کے پہلے شوہر کے لیے

جائز ہونے کا حیلہ فراہم کرے تو شریعت کی اصطلاح میں یہ حلالہ ہے اور یہ بھی اسلام میں متعہ ہی کی طرح حرام ہے۔ جو شخص کسی کی مقصد برآری کے لیے یہ ذلیل کام کرتا ہے وہ درحقیقت ایک قرم ساق یا بھڑوے یا جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کرایہ کے سانڈ کا رول ادا کرتا ہے اور ایسا کرنے والے اور ایسا کروانے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔

'متعہ اور 'حلالہ' میں فرق

البتہ متعہ اور حلالہ میں اس اشتراک کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ وہ یہ کہ متعہ صریح طور پر ایک متعین مدت کے لیے ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے متعلق واضح طور پر ایک فقیہ یہ حکم لگا سکتا ہے کہ یہ نکاح منعقد نہیں ہوا لیکن حلالہ کی نوعیت ایک درپردہ سازش کی ہوتی ہے، اس کے متعلق کوئی ظاہری ثبوت اس بات کا موجود نہیں ہوتا کہ نکاح کے نام سے یہ اللہ کی شریعت کے ساتھ مذاق کیا گیا ہے اس وجہ سے اللہ کے نزدیک تو یہ نکاح اور یہ طلاق سب باطل ہو گا لیکن ایک فقیہ جو صرف ظاہر حالات کو سامنے رکھ کر فتویٰ دینے پر مجبور ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کا نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر بعض فقہا اس کے انعقاد کو مانتے ہیں اور مجھے ان کی یہ بات قوی معلوم ہوتی ہے۔

ایک قابل تحلیل بات

رہی یہ بات کہ ایسی عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے صرف اس صورت میں جائز ہو گی جب اس کا دوسرا شوہر اس کو وطی کے بعد طلاق دے تو کم از کم اس وطی کے لیے قرآن سے کوئی ثبوت نہیں نکلتا تنکح کے لفظ سے جو دلیل دی جاتی ہے اس کا بے بنیاد ہونا، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بالکل واضح ہے، پھر دیکھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ فعل وطی کے واقع ہو جانے سے حلالہ کی سنگینی اور اس کی ملعونیت میں کیا کمی ہو جائے گی؟ اگر ایک نکاح حلالہ کی سازش کے تحت ہوا ہے تو اس بات سے اس کی نوعیت میں کیا فرق پیدا ہوتا ہے کہ طلاق قبل از وطی دی گئی یا بعد از وطی؟ اگر بغیر وطی کے دی گئی تو یہ بھڑواپن ہے اور اگر وطی کے بعد دی گئی تو ایسے شخص کو حدیث کے الفاظ میں تیس مستعار یعنی کرائے کا سانڈ کہیے۔ بہر حال دونوں ہی صورتوں میں یہ نکاح و طلاق کا ڈرامہ شریعت الٰہی کے ساتھ ایک مذاق ہوا۔ اس آیت میں ہمیں جو تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ عورت فی الواقع زندگی بھر کے نباہ کے ارادے کے ساتھ کسی دوسرے شوہر کے حبالۂ عقد میں داخل ہو اور یہ دوسرا شوہر اسی طرح کی کسی مجبوری کے تحت اس کو طلاق دے جس طرح کی مجبوریوں میں کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے۔ اگر یہ صورت ہو گی تو بلاشبہ یہ عورت اپنے پہلے شوہر کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے۔ لیکن اگر اس نکاح و طلاق میں کسی سازش کو دخل ہے تو یہ نکاح و طلاق اور اس کے سارے عنصر کار عنداللہ ملعون و مغضوب ہیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ یہ سب کچھ وطی کے بعد ہوا ہے یا وطی کے بغیر۔

یہ مسئلہ درحقیقت پیدا ایک حدیث کی بنا پر ہوا ہے، قرآن سے اس کے لیے استدلال تو محض ایک نکتہ بعد الوقوع ہے، لیکن ہمارے نزدیک حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ بھی نہایت کمزور ہے۔

حدیث کے مختلف طریقوں کو جمع کر کے جو نتیجہ سامنے آتا ہے ہم نے دیکھا ہے کہ وہ قرآن کے بالکل موافق ہے۔ اگر ہم نے اپنی اس کتاب میں فقہی مباحث کے لیے ایک خاص حد نہ مقرر کر لی ہوتی تو ہم اس حدیث پر بھی تفصیل کے ساتھ بحث کر کے دکھاتے کہ اصل حقیقت کیا بیان ہوئی ہے اور لوگوں نے اس کو کیا بنا دیا ہے لیکن یہ بحث ہمارے دائرہ سے باہر ہے۔

آگے فرمایا کہ دوسرے شوہر سے طلاق مل جانے کے بعد اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ دونوں سابق میاں بیوی آپس میں پھر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں بشرطیکہ یہ توقع رکھتے ہوں کہ وہ اللہ کے حدود کو قائم رکھ سکیں گے۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ نکاح و طلاق بہرحال بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ جب بھی عمل میں آئے، اچھے ارادے اور سازگاری کی مخلصانہ خواہشوں کے ساتھ ہی عمل میں آئے۔

فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں

آخر میں فرمایا کہ اللہ نے اپنی مقرر کی ہوئی حدوں کو اچھی طرح لوگوں کے لیے واضح کر دیا ہے کہ جو لوگ حدود الٰہی کے علم کے طالب ہیں ان کی قدر کریں اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے بچیں۔ یَعۡلَمُوۡنَ کا ترجمہ ہم نے جو لوگ علم کے طالب ہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں فعل کے استعمالات کے مواقع پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فعل جس طرح اپنے ظاہری یا ابتدائی معنی کے لیے آتا ہے یا جس طرح اپنے کامل اور حقیقی معنی کے لیے آتا ہے اسی طرح ارادۂ فعل اور طلب فعل کے لیے بھی آتا ہے اور امتیاز ان کے درمیان موقع کلام اور سیاق و سباق سے ہوتا ہے۔

وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ ۚ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ؗ وَّاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمَآ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَالۡحِكۡمَةِ يَعِظُكُمۡ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ (۲۳۱)

شریعت الٰہی سے مذاق کا انجام

مابک مطلقہ کے لیے انتظار کی جو مدت شریعت نے مقرر کی ہے وہ آیت ۲۲۸ میں بتا دی گئی ہے اور آیت ۲۲۹ میں طلاق کا صحیح طریقہ بھی بتا دیا گیا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ تیسرے طہر میں یا تو دستور کے مطابق بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لو اور اگر یہ منظور نہ ہو تو پھر حسن و خوبی کے ساتھ اس کو رخصت کر دو۔ اب اس آیت میں اس امر کی مزید وضاحت فرما دی کہ دستور کے مطابق روکنے سے شریعت کا کیا منشا ہے؟ اس منشا کی وضاحت یوں فرمائی کہ یہ روکنا ہرگز ہرگز اس ارادے کے ساتھ نہ ہو کہ اس طرح یہ تمہارے پنجۂ ستم میں اسیر رہے اور تم اس کو اپنی خواہش کے مطابق اذیت پہنچا سکو۔ مثبت پہلو سے بات اوپر کہہ چکنے کے بعد منفی پہلو سے بھی اس کی وضاحت اس لیے کر دی گئی کہ ظالم لوگ طلاق اور طلاق کے بعد مراجعت کے شوہری حق کو اس ظلم کے لیے استعمال کر سکتے تھے حالانکہ یہ صریح اعتداء یعنی اللہ کے حدود سے تجاوز اور اس کی شریعت کو مذاق بنانا ہے۔ فرمایا کہ جو ایسی جسارت کرتے ہیں بظاہر تو وہ ایک عورت کو نشانۂ ظلم

بناتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ سب سے بڑا ظلم اپنی جان پر کرتے ہیں کیونکہ اللہ کے حدود کو پھاندنے اور اس کی شریعت کو مذاق بنانے کی سزا بڑی ہی سخت ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو کہ اس نے تمھیں ایک برگزیدہ امت کے منصب پر سرفراز فرمایا، تمھاری ہدایت کے لیے تمھارے اندر اپنا نبی بھیجا، تمھیں خیر و شر اور نیک و بد سے آگاہ کرنے کے لیے تمھارے اوپر اپنی کتاب اتاری جو قانون اور حکمت دونوں کا مجموعہ ہے۔ اللہ کی ایسی عظیم نعمتیں پانے کے بعد اگر تم نے ان کا یہی حق ادا کیا کہ خدا کے حدود کو توڑا اور اس کی شریعت کو مذاق بنایا تو سوچ لو کہ ایسے لوگوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے! پھر فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ وہ تمھاری ہر بات سے باخبر ہے، یعنی وہ لوگوں کی شرارتوں کے باوجود ان کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن جب وہ پکڑے گا تو اس کی پکڑ سے کوئی بھی چھوٹ نہ سکے گا۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ شریعت کو مذاق بنانے سے صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جائے بلکہ اس کی ایک نہایت سنگین شکل یہ بھی ہے کہ ظاہری اعتبار سے تو کام ایسا کیا جائے کہ اس پر کوئی اعتراض نہ کیا جا سکے لیکن مقصد و منشا کے لحاظ سے وہ کام شریعت کے مقصد کے بالکل خلاف ہو۔ مثلاً تیسرے طہر میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مراجعت کر لے تو از روئے شریعت اس کو اس کا حق تو حاصل ہے لیکن اگر اس سے اس کا مقصد بیوی کو تنگ کرنا ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اللہ کی آیات کے پردے میں اللہ ہی کی مخالفت کی۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ اور اس کی شریعت کے ساتھ صریح مذاق ہے۔

۴۷۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۲۳۲-۲۳۷

نکاح و طلاق سے متعلق جو مضمون اوپر بیان ہوا اسی سلسلے کی مزید ہدایات آگے بیان ہو رہی ہیں۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ آیات ۲۳۲-۲۳۷

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ

كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ
وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ
مِثْلُ ذٰلِكَ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَن تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدتُّمْ أَن تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُم مَّا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا
أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٣﴾ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَ
يَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا
فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي
أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٣٤﴾ وَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي
أَنفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ
سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ
حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ أَجَلَهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي
أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾ لَا ع ٣٠ ١٤
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ
تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ
وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾
وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ

فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ
بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا
تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

ترجمۂ آیات ۲۳۲-۲۳۷

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو تم اس بات میں مزاحم نہ ہو کہ وہ اپنے ہونے والے شوہروں سے نکاح کریں جب کہ وہ آپس میں معاملہ دستور کے مطابق طے کریں۔ یہ نصیحت تم میں سے ان لوگوں کو کی جاتی ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہی تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ اور ستھرا طریقہ ہے۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ۲۳۲

اور مائیں اپنے بچوں کو ان لوگوں کے لیے پورے دو سال دودھ پلائیں جو پوری مدت دودھ پلوانا چاہتے ہوں۔ اور بچے والے کے ذمے بچوں کی ماؤں کا دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا ہے۔ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ نہ کسی ماں کو اس کے بچے کے سبب سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کے سبب سے اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے۔ پھر اگر دونوں باہمی رضامندی اور صلاح سے دودھ چھڑا دینا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، جب کہ تم ان کو دستور کے مطابق وہ ادا کرو جو تم نے دینے کا وعدہ کیا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۲۳۳

اور جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں اپنے بارے میں

چار ماہ دس دن توقف کریں پھر جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو جو کچھ وہ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں اور اللہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور اس بات میں بھی کوئی گناہ نہیں جو تم ان عورتوں سے پیغام نکاح کے قسم کی بطریق کنایہ و اشارہ کہو یا اپنے دلوں میں رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم ان سے ذکر کرو گے لیکن چھپے سے ان کے ساتھ نکاح کا قول و قرار نہ کر بیٹھو، ہاں دستور کے مطابق کوئی بات کہہ سکتے ہو۔ اور عقدِ نکاح کا عزم اس وقت تک نہ کرو جب تک قانون اپنی مدت کو نہ پہنچ جائے اور جان رکھو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔ ۲۳۴-۲۳۵

اور اگر تم عورتوں کو اس صورت میں طلاق دو کہ نہ ان کو ہاتھ لگایا ہو اور نہ ان کے لیے متعین مہر مقرر کیا ہو تو ان کے مہر کے باب میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ البتہ ان کو دستور کے مطابق دے دلا کر رخصت کرو، صاحبِ وسعت اپنی وسعت کے مطابق اور غریب اپنی حالت کے مطابق، یہ بھلے لوگوں پر حق ہے۔ اور اگر تم نے ان کو طلاق تو دی ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے لیکن ایک متعین مہر ٹھہرا چکے ہو تو مقررہ مہر کا آدھا ادا کرو الا آنکہ وہ اپنا حق چھوڑیں یا وہ اپنا حق چھوڑے جس کے ہاتھ میں سررشتۂ نکاح ہے اور یہ کہ تم اپنا حق معاف کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ اور تمہارے درمیان ایک کو دوسرے پر جو فضیلت ہے اس کو نہ بھولو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۲۳۶-۲۳۷

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ

بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۳۲)

'عضل' کا مفہوم

'عضل' کے معنی رکاوٹ پیدا کرنے اور اڑنگے ڈالنے کے ہیں اور 'اَزْوَاجَهُنَّ' میں ازواج سے مراد ان کے وہ ہونے والے شوہر ہیں جن سے آئندہ وہ نکاح کرنے کی خواہش مند ہیں۔

مطلقہ کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے

جو عورت طلاق پا کر اپنی عدت پوری کر چکی ہو وہ آزاد ہے کہ جہاں پسند کرے نکاح کرے۔ اس کے اس ارادے میں طلاق دینے والے شوہر یا اس کے خاندان والوں کو کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرنی چاہیے، عام اس سے کہ یہ رکاوٹ صریح ممانعت کے قسم کی ہو یا اندرونی سازش اور جوڑ توڑ کی نوعیت کی۔ بعض خاندانوں اور برادریوں میں یہ جہالت پائی جاتی ہے کہ اگر ان کے اندر کوئی عورت بیاہی جا چکی ہو تو اس کے طلاق پا جانے یا اس کے شوہر کے وفات پا جانے کے بعد بھی یہ لوگ برداشت نہیں کرتے کہ ایسی عورت کہیں اور نکاح کرے، اس میں وہ اپنی توہین خیال کرتے ہیں اور طرح طرح کے اڑنگے اس کے راستے میں ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے سبب سے بسا اوقات قتل و فساد کے نہایت سنگین حادثے ہو جاتے ہیں۔ جس طرح یہ جہالت ہمارے ملک میں پائی جاتی ہے، اسی طرح عرب میں بھی پائی جاتی تھی۔ قرآن نے اس سے روکا کہ جس نے ایک عورت کو طلاق دے چھوڑی اب اسے اس کی راہ میں رکاوٹ بننے کا کوئی حق نہیں رہا، وہ جہاں چاہے اور جس کے ساتھ اس کا معاملہ طے پا جائے اگر معاملہ دستور کے مطابق طے پایا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔

'دستور کے مطابق' سے مراد یہاں عرب کے شرفا کا وہ رواج و دستور ہے جس کو اسلام نے بُرے رواجوں سے پاک کر کے اسلامی شریعت کا جزو بنا لیا تھا اور بہت سے معاملات میں لوگوں کو انہی پر عمل کرنے کی یا تو ہدایت کی یا ان پر عمل کی آزادی دے دی۔ یہاں معاملہ طے کرنے کے لیے معروف کی جو شرط لگائی ہے تو اس سے مقصود یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ معاملہ طے کرنے میں کوئی ایسی بات نہ کریں جو شریف خاندانوں کی روایات کے خلاف ہو اور جس سے سابق شوہر یا ہونے والے شوہر یا خود عورت کے خاندان کی عزت و شہرت کو بٹہ لگنے کا اندیشہ ہو۔

فرمایا کہ یہ نصیحتیں ان لوگوں کو کی جا رہی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، یعنی جن لوگوں کے اندر خدا اور آخرت پر ایمان موجود ہے ان کے ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ان نصیحتوں پر عمل کریں۔ پھر فرمایا کہ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ اور ستھرا طریقہ ہے۔ یعنی اگر عورت کی حسب مرضی نکاح کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی گئی تو اس سے خاندان اور پھر معاشرے میں بہت سی برائیاں پھیلنے کے اندیشے ہیں۔ یہیں سے خفیہ روابط، پھر زنا، پھر اغوا اور فرار کے بہت سے چور دروازے پیدا ہوتے ہیں اور ایک دن ان سب کی ناک کٹ کے رہتی ہے جو ناک ہی اونچی رکھنے کے زعم میں فطری جذبات کے

مقابل میں بے ہودہ رسوم کی رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے: یعنی تمہارا علم اور تمہاری نظر بہت محدود ہے، تمہارے لیے زندگی کے تمام نشیب و فراز کو سمجھ لینا بڑا مشکل ہے اس وجہ سے جو کچھ تمہیں خدا کی طرف سے حکم دیا جا رہا ہے اس پر عمل کرو۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَن يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ ۗ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَن تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَإِنْ أَرَدتُّمْ أَن تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُم مَّا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۲۳۳)

رضاعت سے متعلق مسائل

اس آیت میں رضاعت سے متعلق اکٹھے بہت سے مسائل بیان ہو گئے ہیں جو بالترتیب یہ ہیں۔

۱۔ مطلقہ پر اپنے بچے کو پورے دو سال دودھ پلانے کی ذمہ داری ہے اگر طلاق دینے والا شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت یہ رضاعت کی مدت پوری کرے۔

۲۔ اس مدت میں بچے کے باپ پر مطلقہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری ہے اور اس معاملہ میں دستور کا لحاظ ہو گا یعنی شوہر کی حیثیت، عورت کی ضروریات، اور مقام کے حالات پیش نظر رکھ کر فریقین فیصلہ کریں گے کہ عورت کو نان و نفقہ کے طور پر کیا دیا جائے۔

۳۔ فریقین میں سے کسی پر بھی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، نہ بچے کے بہانے سے ماں کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی اور نہ بچے کی آڑ لے کر باپ پر کوئی ناروا دباؤ ڈالا جائے گا۔

۴۔ اگر بچے کا باپ وفات پا چکا ہو تو بعینہٖ یہی پوزیشن مذکورہ ذمہ داریوں اور حقوق کے معاملے میں اس کے وارث کی ہو گی۔

۵۔ اگر باہمی رضامندی اور مشورہ سے دو سال کی مدت کے اندر ہی اندر بچے کا دودھ چھڑا دینے کا عورت مرد فیصلہ کر لیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

۶۔ اگر باپ یا بچے کے ورثا بچے کی والدہ کی جگہ کسی اور عورت سے دودھ پلوانا چاہتے ہیں تو وہ ایسا کرنے کے مجاز ہیں بشرطیکہ بچے کی والدہ سے دینے دلانے کی جو قرارداد ہوئی ہے وہ پوری کر دی جائے۔

آخر میں یہ تنبیہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب خدا کے سامنے کرتے ہو کوئی چیز اس سے مخفی نہیں رہتی۔

مذکورہ بالا معاملات عام حالات میں تو عورت اور مرد اور متعلقہ خاندان کے ذمہ داروں کے خود طے

کر لیتے ہیں لیکن اگر کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو انھی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر پنچائتیں اور عدالتیں فیصلہ کردیں گی۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۲۳۴

بیوہ کی عدت

اگر کسی عورت کے شوہر کی وفات ہو جائے تو ایسی عورت کی عدت چار ماہ دس دن ہے (اور حاملہ ہونے کی صورت میں وضع حمل) عام مطلقہ کی نسبت سے بیوہ کی عدت میں یہ اضافہ استبرائے رحم، عورت کی عزت اور سوگ وغیرہ کی مختلف مصلحتوں سے ہے۔ عورت کمزور فریق، نازک دل اور شدید الاحساس ہونے کی وجہ سے شوہر کے صدمہ کو محسوس بھی زیادہ کرتی ہے اور حالتِ بیوگی میں وہ ہمدردی کی محتاج بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کا زمانۂ عدت زیادہ رکھا گیا ہے تاکہ شوہر کی وفات کے صدمے کے ساتھ ساتھ معاً اس کو شوہر کی ڈیوڑھی چھوڑنے کا صدمہ بھی نہ اٹھانا پڑ جائے۔ چنانچہ اسی مصلحت کے تحت آگے اسی آیت کی مزید توضیح کے طور پر ایک عارضی ہدایت یہ بھی ہوئی کہ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ - ۲۴۰ - بقرہ (اور جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ رہے ہوں، وہ اپنی بیویوں کے لیے وصیت کر جائیں کہ انھیں گھر سے نکالے بغیر ایک سال تک نان و نفقہ دیا جائے۔ اور اگر وہ خود نکلیں تو جو کچھ وہ اپنے معاملے میں دستور کے مطابق کریں اس میں تم پر کوئی الزام نہیں۔ اللہ غالب اور حکیم ہے)

مذکورہ عدت گزار چکنے کے بعد وہ آزاد ہیں کہ اپنے معاملہ میں دستور کے مطابق جو قدم مناسب خیال کریں اٹھائیں۔ اس کے بعد نہ اولیاء پر کوئی الزام ہے اور نہ انھی پر کوئی الزام ہے، اگر انھوں نے معروف کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غیر شرعی رسوم کو شریعت کا درجہ دے کر خواہ مخواہ ایک دوسرے کو موردِ طعن و الزام نہیں بنانا چاہیے۔ نہ شوہر کے وارثوں اور عورت کے اولیاء کو یہ طعنہ دینا چاہیے کہ عورت اپنے شوہر کا پورا سوگ بھی نہ منا سکی کہ وہ اس سے تنگ آگئے اور نہ عورت کو یہ طعنہ دینا چاہیے کہ ابھی شوہر کا کفن بھی میلا نہ ہونے پایا تھا کہ یہ شادی رچانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خدا نے جو حدود مقرر کر دیے ہیں بس انھیں کی پابندی کرنی چاہیے اور اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ بندوں کے ہر عمل سے باخبر ہے۔

عورت کے لیے معروف کی پابندی کی جو شرط لگائی ہے اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ نکاح کے معاملے میں کفو کا بھی لحاظ ہونا چاہیے تاکہ متعلق خاندانوں کی وجاہت کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ

سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۥ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ
حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
حَلِيْمٌ (۲۳۵)

اسلامی معاشرہ میں جذبات کا احترام

اسلامی معاشرے میں ایک دوسرے کے جذبات کے لحاظ و احترام کی بڑی اہمیت ہے۔ اس وجہ سے ممانعت فرمائی گئی کہ اگر کوئی انتقال کر جائے تو کسی کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اس کی بیوہ سے اس کے زمانہ عدت ہی میں نکاح کی پینگیں بڑھانا شروع کر دے۔ اپنے ایک مرحوم بھائی کے لیے ایک حساس اور درد مند بھائی کے اندر جو جذبات ہونے چاہئیں، یہ بات اس کے بھی منافی ہے اور ایک غمزدہ بیوہ کے جذبات کا ایک شریف آدمی کو جو لحاظ ہونا چاہیے یہ اس کے بھی خلاف ہے۔ مسلمانوں کا معاشرہ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا معاشرہ ہے، جانوروں کا گلہ نہیں ہے۔ فرمایا کہ اگر کوئی شخص بیوہ سے نکاح کا طالب ہو تو وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ کوئی کلمہ بطور اشارہ زبان سے نکال دے یا اپنے دل میں نکاح کا ارادہ کرے لیکن یہ جائز نہیں ہے کہ پوشیدہ طور پر نکاح کا قول و قرار کرے۔ بس تعزیت و ہمدردی تک بات محدود رہنی چاہیے جو اس طرح کے حالات کے لیے معروف ہے، اگر اس ہمدردی کے سلسلہ میں کوئی کلمہ ایسا تراوش کر جائے جو غمازی کر دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ۔ بطور جملہ معترضہ ہے اور مقصود اس سے تنبیہ ہے کہ دل کے مخفی ارادوں کے متعلق یہ گمان نہ رکھو کہ یہ خدا سے مخفی رہتے ہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ تم اس ارادے کو ظاہر کرو گے، سو ظاہر کرو تو اس طرح نہ کرو کہ وہ قول و قرار اور عہد و پیمان کی شکل اختیار کر لے بلکہ اسی انداز میں ہو جو اس طرح کے حالات کے لیے پسندیدہ اور دستور کے موافق ہے۔

کتاب کا لفظ ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ قرآن میں کسی متعین شرعی قانون کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس سے مراد چار ماہ دس دن کی عدت کا وہ قانون ہے جو ایک بیوہ کے لیے اوپر بیان ہو چکا ہے۔ کسی خاص قانون کو کتاب کے لفظ سے تعبیر کرنا اس کی اہمیت کو واضح کرتا ہے، فرمایا کہ جب تک قانون کی مدت پوری نہ ہو جائے اس وقت تک عقدِ نکاح کا عزم نہ کرو۔

آخر میں اپنی صفتِ علم کا حوالہ دیا جس کی یادداشت ہی پر خدا کے قوانین کا صحیح احترام مبنی ہے۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ خدا سے ڈرتے رہو، اس کی ڈھیل سے دھوکے میں نہ پڑو، وہ غفور اور بردبار ہے اس وجہ سے درگزر کرتا ہے لیکن کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ
عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ (۲۳۶)

الاحسان پر ایک حق

اس آیت میں لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ کا تعلق ایک محذوف سے ہے۔ پوری بات یوں ہے کہ اگر صورت

یہ ہو کہ ایک شخص اپنی منکوحہ کو اس حال میں طلاق دے کہ نہ اس نے ابھی اس کے ساتھ تعلق زن وشو قائم کیا ہو نہ اس کے لیے مہر ہی مقرر کیا ہو تو ایسی صورت میں درباب مہر اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بلکہ مہر کے بجائے اسے چاہیئے کہ وہ دستور کے مطابق اس کو کچھ دے دلا کر رخصت کرے۔ دستور کے موافق سے مراد یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی حد معین نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار آدمی کے معیار زندگی پر ہے، ایک غریب اپنی وسعت کے مطابق دے، امیر اپنی وسعت کے مطابق۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی بنانے اور سنوارنے کے خواہش مند ہیں اور اہل احسان کے زمرے میں شامل ہونا چاہتے ہیں ان پر یہ ایک حق ہے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

مرد کی فتوت کے تقاضے

یہ اوپر کی صورت سے ایک مختلف صورت بیان ہو رہی ہے۔ وہ یہ کہ مہر تو طے شدہ ہے لیکن طلاق ملاقات سے پہلے ہی دے دی گئی۔ ایسی صورت میں مقررہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔ البتہ عورت اگر اپنا حق چھوڑ دے تو الگ بات ہے یا مرد اپنا حق چھوڑ دے یعنی نصف کے بجائے پورا مہر ادا کر دے۔ اگرچہ ایک محرک عورت کے لیے بھی مہر چھوڑنے کا موجود ہے کہ شوہر نے ملاقات سے پہلے ہی طلاق دی ہے لیکن قرآن نے مرد کو اکسایا ہے کہ اس کی فتوت اور مردانہ بلند حوصلگی اور اس کے درجے مرتبے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عورت سے اپنے حق کی دستبرداری کا خواہش مند نہ ہو بلکہ اس میدان ایثار میں خود آگے بڑھے۔ اس ایثار کے لیے قرآن نے یہاں مرد کو تین پہلوؤں سے ابھارا ہے۔ ایک تو یہ کہ مرد کو خدا نے یہ فضیلت بخشی ہے کہ وہ نکاح کی گرہ کو جس طرح باندھنے کا اختیار رکھتا ہے اسی طرح اس کو کھولنے کا بھی مجاز ہے، دوسرا یہ کہ ایثار و قربانی جو تقویٰ کے اعلیٰ ترین اوصاف میں سے ہے وہ جنس ضعیف کے مقابل میں جنس قوی کے شایان شان زیادہ ہے، تیسرا یہ کہ مرد کو خدا نے اس کی صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت پر جو ایک درجہ ترجیح کا بخشا ہے اور جس کے سبب سے اس کو عورت کا قوام اور سربراہ بنایا ہے یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کو عورت کے ساتھ کوئی معاملہ کرتے وقت مرد کو بھولنا نہیں چاہیئے، اس فضیلت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ مرد عورت سے لینے والا نہیں بلکہ اس کو دینے والا بنے۔

اس دور کے معاشرتی فکروں کے لیے ایک تنبیہ

یہاں بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ کے الفاظ میں ایک اور نکتہ بھی ہے جو اس دور کے معاشرتی مفکروں اور مصلحوں کو خاص طور پر نگاہ میں رکھنا چاہیئے۔ وہ یہ کہ نکاح کی گرہ جس طرح مرد کے قبول سے بندھتی ہے اسی طرح اسی کی طلاق سے کھلتی ہے، گویا یہ سررشتہ اصلاً شریعت نے مرد ہی کے اختیار میں

رکھا ہے اس وجہ سے طلاق کے معاملے میں عورت کو مرد کے مساوی اختیار دینے کا رجحان، جو مغرب کی نقالی ہیں، ہمارے مسلمان ممالک میں بڑھتا جا رہا ہے، شریعت کے بالکل خلاف ہے اور اس سے خاندانی نظام کا شیرازہ بالکل پراگندہ ہو کر رہ جائے گا۔

۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۳۸-۲۴۲

احکام و قوانین کا باب جو آیت ۱۶۳ سے توحید اور اس کے بعد نماز اور زکوٰۃ کے ذکر سے شروع ہوا تھا اب ان آیات پر ختم ہو رہا ہے۔ اس مجموعۂ آیات کی ترتیب اس طرح ہے کہ ایک آیت، جو اصل خاتمۂ باب کی حیثیت رکھتی ہے، خوف اور امن ہر طرح کے حالات میں نمازوں کی حفاظت سے متعلق ہے اور دو آیتوں میں بیوہ اور مطلقہ سے متعلق، جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا تھا، بعض ضمنی ہدایات ہیں جو بعد میں نازل ہوئیں۔ یہ دونوں آیتیں خاتمۂ باب کے ساتھ ملحق کر دی گئیں تاکہ کلام میں ان کی ترتیب ہی سے واضح ہو جائے کہ یہ آیات اصل احکام کے بعد بطور وضاحت نازل ہوئی ہیں چنانچہ ان کے ساتھ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ کا ٹکڑا لگا کر ان کے توضیحی آیات ہونے کی طرف اشارہ بھی فرما دیا تاکہ نظم کلام کے طالب کو ربطِ کلام کے سمجھنے میں کوئی زحمت نہ پیش آئے۔

نماز سارے دین کے لیے حصار ہے

گویا خاتمۂ باب کی اصل آیت حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى والی آیت ہے۔ اب اس باب کے آغاز پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے آغاز میں توحید کے ذکر کے بعد احکامِ شریعت کے سلسلہ میں سب سے پہلے آیت ۱۷۷ میں نماز اور ساتھ ہی زکوٰۃ کا ذکر آتا ہے۔ یہاں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس باب کا خاتمہ بھی نماز ہی کے ذکر پر ہوا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دین میں جو اہمیت نماز کی ہے وہ دوسری کسی چیز کی بھی نہیں ہے۔ ساری شریعت کا قیام و بقا اسی کے قیام و بقا پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو شریعت کی اقامت اور اس کی محافظت کے لیے ایک حصار اور ایک باڑھ کی حیثیت دی ہے۔ جو شخص اس کی حفاظت کرتا ہے وہ گویا پوری شریعت کی حفاظت کرتا ہے اور جو شخص اس میں رخنے پیدا کر دیتا ہے وہ، جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے، باقی دین کو بدرجۂ اولیٰ ضائع کر دیتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ شروع باب میں جس نماز کا ذکر ہے وہ امن و اطمینان کے حالات کی پنج وقتہ معروف نماز ہے اور یہاں امن و اطمینان کی نماز کے علاوہ خوف و خطرے کی نماز کا بھی ذکر ہے۔ یہ نماز کے احکام کے بیان میں حالات کی تبدیلی کے ساتھ ایک تدریجی ارتقا ہوا ہے۔ جس وقت باب کے آغاز کی آیتیں نازل ہوئی ہیں جنگ و جہاد کے حالات نہیں تھے لیکن تحویلِ قبلہ کے بعد سے آپ نے پڑھا کہ جنگ و جہاد کے احکام نہایت تفصیل سے بیان ہوئے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل سلسلہ کلام جو چل

رہا تھا تو وہ جہاد اور انفاق ہی کا تھا، دوسرے مسائل تو، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، ضمناً پیدا ہو گئے ہیں۔ حالات کی یہ تبدیلی متقاضی ہوئی کہ امن کی نماز کے ساتھ خوف اور خطرے کی نماز کا بھی ذکر کر دیا جائے چنانچہ پہلی صورت کی نماز کا ذکر اقامتِ صلوٰۃ کے لفظ سے کیا ہے اور اس دوسری حالت کی نماز کا ذکر محافظت علی الصلوات کے الفاظ سے فرمایا۔ بیان کے ان دونوں اسلوبوں میں شدتِ اہتمام کا جو فرق نمایاں ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہو سکتا۔

یہ بات کہ نماز پورے دین کے لیے بمنزلہ حصار اور شہر پناہ ہے اگرچہ قرآن میں تدبر کرنے والوں سے مخفی نہیں ہو سکتی، اس کے شواہد و نظائر قرآن میں بہت ہیں، لیکن ممکن ہے، ایک عام قاری کو یہ شبہ ہو کہ یہاں ہم نے ربطِ کلام جوڑنے میں تکلف سے کام لیا ہے اس وجہ سے ہم سورہ مومنون کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اس ربطِ کلام کی نہایت واضح مثال موجود ہے۔ فرمایا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ	ان اہلِ ایمان نے فلاح پائی جو اپنی نمازوں
صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ	میں خشوع کرنے والے ہیں، جو لغو سے منہ
عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ	موڑنے والے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں،
لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ	جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں،
لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ	مگر اپنی بیویوں یا لونڈیوں سے، سو اس بارے
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ	میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو اس سے
فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	آگے بڑھے تو وہ لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں،
الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ	اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ
وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى	کرنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی برابر
صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۱-۹- مومنون)	نگہداشت رکھتے ہیں۔

ان آیات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کا آغاز نماز سے ہوا ہے اور پھر دین و اخلاق کی چند بنیادی باتیں بیان کرنے کے بعد ان کا خاتمہ بھی نماز ہی پر ہوا ہے۔ علاوہ ازیں پہلی نماز کے ساتھ خشوع کا ذکر ہے جو نماز کی اصل روح ہے اور اس دوسری نماز کے ساتھ محافظت کا حوالہ ہے جو اس کے تمام ظاہری اہتمام کی ایک جامع تعبیر بھی ہے اور جس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ درحقیقت نمازوں کی حفاظت ہی ہے جو دین کی دوسری باتوں کی حفاظت کی ضامن ہے۔

بالکل اسی طرح کا نظم سورۂ معارج کی مندرجہ ذیل آیات میں بھی ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ اِذَا مَسَّهُ	بے شک انسان جلد باز پیدا ہوا ہے۔ جب
الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ	اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے گھبرا اٹھتا ہے

مَنُوعًا ۝ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۝ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ وَالَّذِينَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ۝ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝ (۱۹-۳۴ معارج)

اور جب اس کو بھلائی پہنچتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے۔ صرف وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو اپنی نمازوں پر قائم دوائم رہنے والے ہیں، جن کے مالوں میں سائلوں اور محروموں کا ایک معین حق ہے، جو روز جزا کی تصدیق کرتے ہیں اور جو اپنے رب کے عذاب سے برابر ڈرتے رہنے والے ہیں۔ بے شک ان کے رب کا عذاب بے خوف رہنے کی چیز نہیں۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں مگر اپنی بیویوں اور لونڈیوں سے سو ان کے باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں البتہ جو اس حد سے آگے قدم بڑھائیں تو وہ لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرنے والے ہیں اور جو اپنی شہادتوں کے قائم کرنے والے ہیں اور جو اپنی نماز کی برابر نگہداشت رکھتے ہیں۔

یہاں بھی دیکھیے نماز ہی سے آغاز اور نماز ہی پر اختتام ہے۔ جس طرح ایک شہر پناہ پورے شہر کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہوتی ہے اسی طرح نماز دوسری تمام نیکیوں کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہے اور مقصود اس سے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ سارے دین کی محافظ نماز ہے۔ جس نے اس کی حفاظت کی اس نے سارے دین کی حفاظت کی اور جس نے اس کو ضائع کیا اس نے سارے دین کو ضائع کیا۔

بالکل اسی اصول پر سورہ بقرہ میں بھی اس پورے باب کو جو احکام و قوانین سے متعلق ہے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے نماز کے حکم سے گھیر دیا ہے۔

اس روشنی میں اب آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۲۳۸-۲۴۲

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴿۲۳۸﴾
فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۚ فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ

كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ
مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۚ وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى
الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا
فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَ
لِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۲۴۱﴾ كَذَٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۲۴۲﴾ ع ۳۱ ۱۵

ترجمہ آیات ۲۳۸-۲۴۲

نمازوں کی نگہداشت رکھو، خاص طور پر بیچ کی نماز کی اور نمازوں میں خدا کے حضور فرمانبردارانہ کھڑے ہو۔ اگر خطرے کی حالت ہو تو پیدل یا سوار جس صورت میں ادا کر سکو نماز ادا کرو۔ پھر جب خطرہ دور ہو جائے تو اللہ کو اس طریقہ پر یاد کرو جو اس نے تم کو سکھایا ہے، جس کو تم نہیں جانتے تھے۔ ۲۳۸ - ۲۳۹

اور جو تم میں سے وفات پائیں اور بیویاں چھوڑ رہے ہوں وہ اپنی بیویوں کے لیے سال بھر کے نان نفقے کی گھر سے نکالے بغیر وصیت کر جائیں۔ اگر وہ خود گھر چھوڑیں تو جو کچھ وہ اپنے باب میں دستور کے مطابق کریں اس کا تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ عزیز و حکیم ہے۔ ۲۴۰

اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق کچھ دینا دلانا ہے، یہ خدا سے ڈرنے والوں پر حق ہے۔ ۲۴۱

اسی طرح اللہ اپنی آیتوں کی تمہارے لیے وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ ۲۴۲

۷۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (۲۳۸)

نماز کی محافظت: نماز کی محافظت میں ان تمام چیزوں کی نگہداشت اور ان کا اہتمام شامل ہے جو اس کے لوازم و شرائط اور اس کے آداب و ارکان سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ اقامت صلوٰۃ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم ان چیزوں کا ذکر کتاب کے شروع میں کر چکے ہیں۔ یہاں اقامت کی جگہ محافظت کا لفظ جس نئے پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ مشکل اور پُرخطر حالات میں بھی، ہر طرح کے خطرات کا مقابلہ کر کے، اس کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ آگے والی آیت میں صلوٰۃ الخوف کا ذکر بھی ہے جس سے واضح ہے کہ تلواروں کی چھاؤں میں بھی جس چیز کو مومن نہیں بھولتا ہے، وہ یہی ہے۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تمھاری یاد سے غافل نہیں رہا

'صلوٰۃ وسطیٰ' سے مراد: 'الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى' کے لغوی معنی توبیچ والی نماز کے ہیں۔ اسلوب کلام صاف شہادت دے رہا ہے کہ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس خاص سے کیا مراد ہے تو اس کے جواب میں اہل تاویل نے بڑا اختلاف کیا ہے۔ زیادہ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔ ہمارا اپنا رجحان بھی اسی قول کی طرف ہے۔ یہ نماز ہماری شب و روز کی تقسیم میں ایک ایسی نماز کی حیثیت رکھتی ہے جو رات اور دن دونوں کی سرحد پر واقع ہو۔ سرحد پر تو کہہ سکتے ہیں کہ فجر کی نماز بھی واقع ہے لیکن جس سرحد پر عصر کی نماز واقع ہے وہ عام حالات میں بھی پُرخطر ہے اور اگر حالات جنگ کے ہوں تب تو یہ بہت ہی پرخطر بن جاتی ہے۔ عام حالات میں دیکھیے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ چونکہ عصر کے وقت دن کی تمام سرگرمیاں اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو رہی ہوتی ہیں اس وجہ سے دنیا طلبوں کے لیے یہ بڑی آپا دھاپی کا وقت ہوتا ہے، مسافر رات آنے سے پہلے منزل پر پہنچنا چاہتا ہے، دکاندار دکان بڑھانے سے پہلے کچھ کمائی کر لینے کی دھن میں ہو جاتا ہے، نوکر اپنی مقررہ ڈیوٹی کے سرانجام دینے کے چکر میں پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ میدانوں میں کھلاڑی بھی اپنے آخری داؤں اور اپنی آخری بازی کے منصوبوں میں ایسے غرق ہوتے ہیں کہ کسی کو کسی دوسری چیز کا کوئی ہوش نہیں رہ جاتا۔

اب اسی پر قیاس کیجیے کہ اگر خدانخواستہ حالات جنگ کے ہو جائیں تو پھر یہ آپا دھاپی کتنی بڑھ سکتی ہے، خاص طور پر دن کے اس حصے میں جس میں عصر کی نماز واقع ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے عام نمازوں کی نگہداشت کا بھی حکم دیا اور ساتھ ہی عصر کی نماز کی نگہداشت کے لیے

خاص طور پر تاکید فرمائی۔

رہا یہ سوال کہ اگر مقصود عصر کی نماز ہی تھی تو اس کو صاف صاف عصر کے لفظ ہی سے کیوں نہیں تعبیر کر دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس لفظ کے استعمال سے اس نماز کا وہ نازک جائے وقوع ہمارے سامنے آجاتا ہے جس کے سبب سے یہ خاص نگہداشت کی محتاج ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہی نماز ہے جس کے بارے میں حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے دو نبیوں کو ابتلا پیش آیا، ایک حضرت سلیمان علیہ السلام کو فوجی پریڈ کے موقع پر، دوسرے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ احزاب کے موقع پر۔

"قنت" کے معنی خضوع اور تذلل کے ہیں۔ یہاں اس کا موقع ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ نماز کی محافظت کے حکم میں نماز کا یہ ادب بھی داخل ہے۔

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (۲۳۹)

'صلوٰۃ الخوف' سے مراد

رجال، راجل کی اور رکبان، راکب کی جمع ہے۔ فرمایا کہ اگر دشمن نے حالت خطرے کی پیدا کر رکھی ہو، نماز اپنے تمام شرائط و آداب کے ساتھ ادا کرنی ممکن نہ ہو تو سوار پیادہ جس حال میں ہو اسی حال میں نماز ادا کر لو۔ خطرے کے حالات میں نماز کی محافظت یہی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ وہ شکل بھی بتا دی گئی ہے جو خطرے کے حالات میں نماز باجماعت کے قیام کے لیے اختیار کی جا سکتی ہے اگر اس کا امکان ہو۔

پھر فرمایا کہ جب امن کے حالات میسر ہوں تو اس طرح اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا ہے۔ اللہ کو یاد کرو سے مراد ادائیگی نماز ہے۔ ذکر کا لفظ نماز کے لیے قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ نماز کی اصل حقیقت چونکہ ذکر ہی ہے اس وجہ سے کبھی کبھی اصل حقیقت سے اس کی شکل بھی تعبیر کر دی جاتی ہے تاکہ شکل اختیار کرتے وقت آدمی کی نظر اصل روح پر رہے، صرف شکل پر جم کر نہ رہ جائے۔

پیغمبر کی تعلیم عین اللہ کی تعلیم ہے

"كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ" سے یہ بات بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم عین اللہ تعالیٰ کی تعلیم ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں نماز کا حکم تو ہوا ہے لیکن اس کے ادا کرنے کا طریقہ کہیں نہیں بتایا گیا ہے، یہ چیز صرف پیغمبر کی تعلیم سے امت کو معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود فرمایا کہ "جیسا کہ اس نے تعلیم دی" اب سوال یہ ہے کہ اگر پیغمبر کی تعلیم عین اللہ کی تعلیم نہیں ہے تو وہ کیا چیز ہے جس کو یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیم سے تعبیر فرمایا ہے۔

ہم آیت وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تصور کہ وہ صرف قرآن سنا دینے کے لیے تشریف لائے تھے بنیادی طور پر غلط ہے۔

آپ قرآن سنانے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کام پر بھی مامور تھے کہ لوگوں کو قرآن پڑھائیں اور سکھائیں اور اس کے مضمرات واشارات اور اس کی حکمتیں اور اس کے اسرار اچھی طرح واضح کردیں۔ اس کام پر آپ چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مامور تھے اس وجہ سے ایک معلم کی حیثیت سے آپ نے اُمّت کو جو کچھ بتایا سکھایا وہ سب آپ کے فریضۂ نبوت ہی کے تحت ہے۔ تعجب ہے کہ ان واضح آیات کی موجودگی میں بھی بعض لوگ نماز کے اوقات اور اس کی رکعات وغیرہ سے متعلق بے سروپا بحثیں اٹھاتے ہیں۔

'مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ' کے الفاظ بطور اظہار فضل واحسان کے ہیں۔ امی عربوں پر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہوا تھا کہ ان پر اس نے دین وشریعت کے وہ اسرار کھولے جو نہ ان پر کھلے تھے اور نہ ان کے اگلوں پر کھلے تھے اور نہ کسی اور ہی پر کھلے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس فضل واحسان کا جواب ان کی طرف سے یہی زیبا ہے کہ اس کی قدر کریں، بنی اسرائیل کی طرح اس کی ناقدری نہ کریں۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۴۰)

وصیت کا لفظ فعل محذوف کا مفعول ہے۔ متاعاً وصیت کا مفعول ہے اور غیر اخراج ہمارے نزدیک لازواجہم سے حال پڑا ہوا ہے۔ ترجمے میں ہم نے یہ ترکیب کلام واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر نہ واضح ہو سکی ہو تو اس کو ہماری کوتاہی پر محمول کیجیے۔ تالیف کلام بہر حال ہمارے خیال میں یہی درست ہے۔

بیوہ کے لیے وصیت کا عارضی حکم

اوپر آیت ۲۳۴ میں بیوہ عورتوں کی عدت بیان ہوئی ہے۔ انہی سے متعلق بعد میں یہ مزید ہدایت اوپر والی آیت ہی کی توضیح مزید کے طور پر نازل ہوئی کہ بیوائیں چھوڑ جانے والے شوہر اپنی بیواؤں کے لیے ایک سال کے نان ونفقہ اور اپنے گھروں میں سکونت کی اجازت کی وصیت کر جائیں۔ اگر اس دوران میں بیوہ خود اپنی مرضی سے گھر چھوڑ دے اور اپنے نکاح ثانی یا اپنی سکونت کے سلسلہ میں دستور کے مطابق کوئی قدم اٹھائے تو اس کا اس کو حق حاصل ہے۔ میت کے ورثا کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ وصیت کی خلاف ورزی کریں۔

اس وصیت کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ ان آیات کے نزول کے زمانے تک میراث کا قانون ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اسی باب کے شروع میں (آیت ۱۸۰) والدین اور قرابت داروں کے لیے بھی وصیت کی ہدایت گزر چکی ہے اور ہم وہاں بیان کر چکے ہیں کہ یہ حکم عارضی طور پر اس وقت تک کے لیے دیا گیا تھا جب تک سورۂ نساء والا قانون وراثت نازل نہیں ہوا تھا۔ اسی قانون کے تحت بیوگان سے متعلق بھی یہ ہدایت ہوئی کہ ان کے لیے ایک سال کے نان نفقہ اور سکونت کی وصیت کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ بعد میں جب وراثت کا قانون جاری ہو گیا اور مورث کے دوسرے وارثوں کی طرح اس کی بیوہ یا بیوگان کا حصہ بھی شریعت میں معین ہو گیا تو جس طرح والدین اور دوسرے وارثوں سے متعلق وصیت

کی مذکورہ ہدایت منسوخ ہو گئی، بیوگان کے لیے بھی یہ منسوخ ہو گئی اور اس کی جگہ وراثت کے مستقل قانون نے لے لی۔

اگر یہ آیت اوپر والی آیت یعنی آیت ۲۳۴ کے ساتھ ہوتی جس میں بیوہ کی عدت مذکور ہوئی ہے تو اس کا نظم سمجھنے میں کسی کو زحمت نہ ہوتی لیکن اس صورت میں یہ بات نہ واضح ہو سکتی کہ یہ آیت پہلے حکم کے بعد اسی حکم کی توضیح کے طور پر نازل ہوئی ہے، حالانکہ احکام کی تدریج اور ان کی حکمتیں سمجھنے کے لیے یہ چیز ضروری ہے۔ اسی حکمت کے لیے اس آیت کو اور اس کے ساتھ والی آیت کو جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں خاتمہ باب پر رکھ دیا اور یہ اشارہ کر دیا کہ یہ بعد میں نازل ہونے والی توضیحات ہیں۔

عزیز و حکیم کی صفات خدا کے حق قانون سازی اور اس کے قانون کے پُرحکمت ہونے کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہیں اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کی طرف بھی۔ اسلام میں تمام دین و شریعت اور تمام امر و نہی کی بنیاد خدا کی صفات ہی پر ہے، اس وجہ سے کہیں بھی ان کو محض برائے بیت نہیں خیال کرنا چاہیے بلکہ ہر جگہ ان پر اسلام کے فلسفۂ قانون اور فلسفۂ اخلاق کی بنیاد کی حیثیت سے غور کرنا چاہیے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ ۝ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲۴۱-۲۴۲)

صفات پر مبنی حقوق کا درجہ

اوپر آیت ۲۳۶ میں مطلقہ عورتوں کو دے دلا کر رخصت کرنے کی جو ہدایت فرمائی تھی آخر میں یہ پھر اس کی یاد دہانی کر دی اور اس کو اہل تقویٰ پر ایک حق قرار دیا۔ جو حقوق صفات و کردار پر مبنی ہوتے ہیں بعض حالات میں وہ اس دنیوی زندگی میں تو قانون کی گرفت کے دائرے سے باہر ہوتے ہیں لیکن خدا کے ہاں ان صفات کے لیے وہ حقوق ہی معیار ٹھہریں گے۔ مگر ایک چیز مومنین یا محسنین یا متقین پر حق قرار دی گئی ہے تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ اسلام کا قانون اس دنیا میں اس کی خلاف ورزی کرنے والوں پر کوئی گرفت نہ کرے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آخرت میں بھی ان کی خلاف ورزی پر کوئی اثر مترتب نہیں ہو گا۔ آخرت میں آدمی کا ایمان یا احسان یا تقویٰ انھی حقوق کی ادائگی یا عدم ادائگی کے اعتبار سے وزن دار یا بے وزن ٹھہرے گا۔

آخری آیت میں كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ الاٰية کا ٹکڑا بطور اظہار احسان ہے اور اس سے، جیسا کہ ہم دوسری جگہوں پر واضح کر چکے ہیں، ان آیات کی نوعیت واضح ہوتی ہے جن کی طرف كَذٰلِكَ کا اشارہ ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عموماً یہ ٹکڑا ان آیات کے بعد آتا ہے جن کی حیثیت توضیح مزید کی ہوتی ہے اور جو اپنے باب کے اصل احکام کے بعد لوگوں کے اندر سوال یا مزید جستجو اور تلاش پیدا ہونے کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ نظم قرآن کے طالبوں کو بہت سے مقامات میں ان سے بڑی قیمتی رہنمائی ملتی ہے اس وجہ سے ان کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔

قرآن نے اجمال کے بعد تفصیل، ایجاز کے بعد توضیح اور توضیح کے بعد توضیح مزید کا یہ طریقہ جو اختیار کیا ہے اس میں تربیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ ازاں جملہ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے دین میں غور و فکر اور اس کے فوائد و مصالح اور اس کے اسرار و حکم تک پہنچنے کے لیے ہماری عقل کی تربیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تدریج کو نمایاں کر کے اس حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی فرماتا ہے کہ ہم دین میں عقل کو کس طرح استعمال کر سکتے ہیں اور پیش آنے والے حالات و معاملات میں ان کلیات سے کس طرح جزئیات مستنبط کر سکتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

۷۸- آگے کا مضمون ——— آیات ۲۴۳-۲۵۳

پیچھے کے سلسلۂ مضمون کی طرف اشارہ

یہاں ذرا پیچھے مڑ کر سلسلۂ کلام کو ذہن میں پھر تازہ کر لیجیے۔ فصل ۷۴ میں ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ اصل بیان تو بیت اللہ کے تعلق سے جہاد و انفاق کا ہو رہا تھا لیکن انفاق کی بحث نے یتیموں کی صلاح و فلاح اور ان کی ماؤں کے ساتھ نکاح کا سوال سامنے کر دیا اور اس طرح نکاح و طلاق سے متعلق بعض مناسب وقت مسائل کے بیان کے لیے ایک تقریب پیدا ہو گئی۔ قرآن کا طریقہ یہی ہے کہ جب کسی مسئلے کے بیان کے لیے تقریب پیدا ہو جاتی ہے تو اصل سلسلۂ بیان کو روک کر، اس مسئلے سے متعلق اتنی باتیں بیان کر دیتا ہے جتنی باتوں کے لیے وقت کے حالات تقاضا کر رہے ہوتے ہیں اور پھر اصل سلسلۂ بیان شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ نکاح و طلاق سے متعلق مناسب وقت مسائل بیان کر چکنے کے بعد اصل بیان جہاد و انفاق کا پھر شروع ہو گیا۔

آگے کے مضامین کا خلاصہ اور ان کا نظم

آگے کے مطالب کی ترتیب یوں ہے کہ پہلے بنی اسرائیل کے ایک واقعہ کا حوالہ دیا ہے کہ وہ ایک بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے دشمنوں کے ڈر سے اپنا وطن چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے اور اس طرح انھوں نے اپنے لیے اخلاقی اور سیاسی موت اختیار کر لی۔ اس واقعے کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ انھوں نے مکہ سے مدینہ کو جو ہجرت کی ہے تو یہ موت اور دشمن سے فرار نہیں ہے بلکہ کفر اور فتنہ سے فرار ہے اور اصل مقصد اس سے جانیں بچانا نہیں بلکہ اللہ کے دین کی نصرت اور اس کی راہ میں جہاد کے لیے منظم ہونا ہے۔

اس تمہید کے بعد مسلمانوں کو جہاد و انفاق پر ابھارا ہے اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کی اس جنگ کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کی تحریک ان کے ہاں بھی بعینہٖ اسی مقصد کے لیے ہوئی تھی جس مقصد کے لیے مسلمانوں کو یہاں جہاد پر ابھارا جا رہا ہے۔ یعنی بنی اسرائیل نے بھی یہ جنگ اپنے قبلہ کی آزادی کے لیے لڑی تھی اور مسلمان بھی اپنے قبلہ ہی کی آزادی کے لیے اٹھ رہے تھے۔

بنی اسرائیل اپنی اس جنگ کے مختلف مراحل میں جن آزمائشوں سے گزرے اور جن فتنوں میں مبتلا

ہوئے وہ بڑے ہی سبق آموز تھے اس وجہ سے مسلمانوں کو جو بعینہٖ انہی مراحل سے گزرنے کے لیے کمربستہ ہو رہے تھے ان کی سرگزشت کا یہ حصہ سنا دینا ضروری تھا تاکہ مسلمان اس سے سبق حاصل کریں اور ان فتنوں سے اپنے آپ کو بچا سکیں جو آگے کے مراحل میں پیش آ سکتے ہیں۔

اس کے بعد چند آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اس سرگزشت کے ذکر سے مقصود داستان سرائی نہیں ہے بلکہ یہی کچھ تمہارے سامنے بھی آنے والا ہے اور اس سے تمہاری نبوت کی تصدیق ہو گی لیکن بنی اسرائیل خود اپنے آئینے میں بھی تمہاری تصویر دیکھ لینے کے باوجود اسی طرح اپنی ضد اور مخالفت پر اڑے رہیں گے، سو ان کی مخالفت کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے خدا تمہاری نصرت فرمائے گا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۲۴۳-۲۵۳

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٢٤٣﴾ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٤﴾ مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٤٥﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ (وقف لازم) قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٢٤٦﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّىٰ

يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ
لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ
وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ
مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ
بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ
اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا ع ٣٢ ١٦
فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ
فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ
مِنِّىْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا
قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا
لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ
يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ
فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا
لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ
اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۫ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ
وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ

بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ
الجزء ۳ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ
مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى
ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ
اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ
الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ
ع ۳۳ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

ترجمہ آیات ۲۵۳-۲۴۳

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے تو اللہ نے ان کو کہا کہ جاؤ مر جاؤ، پھر اللہ نے ان کو زندہ کیا، اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ ۲۴۳

اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور یہ خوب سمجھ رکھو کہ اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے اور کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے کہ اللہ اس کو اس کے لیے کئی گنا بڑھائے۔ اللہ ہی ہے جو تنگ دستی بھی دیتا ہے اور کشادگی بھی دیتا ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹنا بھی ہے۔ ۲۴۵-۲۴۴

کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا جب کہ موسیٰ کے بعد انھوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک امیر مقرر کر دیجیے کہ ہم خدا کی راہ میں

جہاد کریں۔ اس نے کہا، ایسا نہ ہو کہ تم پر جہاد فرض کردیا جائے تو تم جہاد نہ کرو۔ وہ
بولے کہ بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے جب کہ ہم اپنے گھروں اور بچوں سے
نکالے گئے ہیں۔ پھر جب ان پر جہاد فرض کردیا گیا تو ان کی ایک قلیل تعداد کے سوا
سب منہ موڑ گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اور ان کے نبی نے ان کو بتایا کہ
اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو امیر مقرر کردیا ہے۔ وہ بولے کہ بھلا اس کی امارت ہمارے
اوپر کیسے ہو سکتی ہے جب کہ اس سے زیادہ حق دار ہم اس امارت کے ہیں اور اسے
تو مال کی وسعت بھی حاصل نہیں ہے۔ نبی نے کہا اللہ نے تمہاری سرداری کے لیے اسی کو
چنا اور اس کو علم اور جسم دونوں میں کشادگی عطا فرمائی ہے۔ اللہ اپنی طرف سے جسے
چاہے اقتدار بخشے، اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ اور ان کے نبی نے ان سے
کہا کہ اس کی امارت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے
رب کی طرف سے سامانِ تسکین اور آلِ موسٰی اور آلِ ہارون کی چھوڑی ہوئی یادگاریں
ہیں۔ صندوق کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے
اگر تم ایمان رکھنے والے ہو۔ ۲۴۶ - ۲۴۸

پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو انھوں نے بتایا کہ اللہ ایک ندی کے ذریعہ
سے تمہاری جانچ کرنے والا ہے تو جو اس میں سے پی لے گا وہ میرا ساتھی نہیں اور جو اس
کو نہیں چکھے گا تو بے شک وہ میرا ساتھی ہے، مگر یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر
لے۔ تو انھوں نے اس میں سے خوب پیا، صرف ان میں سے تھوڑے لوگ اس سے بچے
پھر جب طالوت اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان پر ثابت قدم رہے دریا پار کر گئے تو

یہ لوگ بولے کہ اب ہم میں تو جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں۔ جو لوگ یہ گمان رکھتے تھے کہ بالآخر انھیں اللہ سے ملنا ہے انھوں نے للکارا کہ کتنی چھوٹی جماعتیں رہی ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں، اللہ تو ثابت قدموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جب جالوت اور اس کی فوجوں سے ان کا سامنا ہوا تو انھوں نے دعا کی، اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر انڈیل دے، ہمارے قدم جمائے رکھ، اور کافر قوم پر ہمیں غلبہ عطا فرما۔ تو اللہ کے حکم سے انھوں نے ان کو شکست دی۔ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اس کو بادشاہی اور حکمت بخشی اور اس علم سے اس کو سکھایا جس میں سے وہ چاہتا ہے۔ اور اگر اللہ ایک کو دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ ۲۴۹-۲۵۱

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں سناتے ہیں مقصد کے ساتھ اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو۔ یہ رسول جو ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے بعض سے اللہ نے کلام کیا، اور بعض کے درجے بلند کیے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے واضح دلائل کے بعد نہ لڑتے لیکن انھوں نے اختلاف کیا، سو ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ اختلاف نہ کر پاتے لیکن اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ۲۵۲-۲۵۳

۷۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ، فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ (۲۴۳)

اَلَمْ تَرَ کے خطاب کی نوعیت

"اَلَمْ تَرَ" کا خطاب ضروری نہیں کہ واحد کے لیے ہو بلکہ یہ عموماً، جیسا کہ استاذ امامؒ نے سورہ فیل کی تفسیر میں واضح کیا ہے، جمع کے لیے آتا ہے اور خطاب اس میں گویا مخاطب گروہ کے ہر شخص سے فرداً فرداً ہوتا ہے۔ اس کے بعد جس واقعہ کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ یا تو مخاطب گروہ کا عینی مشاہدہ ہوتا ہے یا واقعے کی شہرت اس وجہ کی ہوتی ہے کہ اس کی نسبت یہ باور کیا جاتا ہے کہ اس سے مخاطب باخبر ہیں یا انھیں باخبر ہونا چاہیے۔ یا متکلم کو یہ اعتماد ہوتا ہے کہ واقعے کی صداقت ایسی مسلم ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

الفاظ 'موت و حیات' کا مفہوم

موت کے لفظ پر اسی سورہ کی آیت ۵۶ کے تحت ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں یہ لفظ جس طرح زندگی کے فنا ہونے کے لیے استعمال ہوا ہے اسی طرح نیند، بے ہوشی اور اخلاقی و ایمانی موت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے سو وہاں ہم نے لسان العرب کا حوالہ دیا ہے۔ یہاں قرآن کے بعض نظائر ملاحظہ ہوں۔ اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا ۴۲۔ زمر (اللہ جانوں کو وفات دیتا ہے ان کی نیند کے وقت) ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۵۶۔ بقرہ (پھر ہم نے تمھاری بے ہوشی کے بعد تم کو اٹھایا تاکہ تم شکر کرو) اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ ۸۰۔ نمل (تم اپنی دعوت مردہ دلوں اور بہروں کو نہیں سنا سکتے) اَوَمَنْ كَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ ۱۲۲۔ انعام (کیا وہ جو مردہ دل تھا تو ہم نے اس کو حیات ایمانی بخشی اور اس کو نور ہدایت عطا کیا جس کو لے کر لوگوں کے درمیان چلتا ہے)

اسی طرح حیات کا لفظ بھی مادی زندگی سے لے کر نیند سے بیداری اور ایمانی و اخلاقی زندگی تک سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی ایک واضح نظیر تو انعام کی مقدم الذکر آیت ہی میں موجود ہے، دوسری واضح تر نظیر انفال سے ملاحظہ ہو۔ اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ۲۴۔ انفال (اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب کہ تمھیں بلاتا ہے اس چیز کی طرف جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے)

اَلَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ کے واقعہ کا مصداق

اس آیت میں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے اس کا تعلق بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس دور سے ہے جس کا ذکر صحیفہ سموئیل میں ہے۔ سموئیل نبی کے ظہور کے ابتدائی دور میں بنی اسرائیل سخت انتشار میں مبتلا تھے، اگرچہ تعداد کے لحاظ سے یہ اس وقت تین لاکھ سے زیادہ تھے، جیسا کہ سموئیل

میں تصریح ہے،[۱] لیکن بدعات اور شرک کے غلبے کی وجہ سے ان کی مذہبی و اخلاقی حالت بھی بڑی خراب تھی اور اجتماعی تنظیم مفقود ہونے کی وجہ سے سیاسی حالت بھی بڑی ابتر تھی۔ ہر طرف سے دشمنوں کی یورش تھی اور یہ ان سے اس قدر مرعوب اور دہشت زدہ تھے کہ کسی سے مقابلے کی ہمت اپنے اندر نہیں پا رہے تھے۔ خاص طور پر فلسطینیوں نے ان کو بری طرح مرعوب کر لیا تھا۔ انھوں نے ان پر چڑھائی کر کے ان کا قتل عام بھی کیا اور ان سے خدا کا وہ صندوق بھی چھین لے گئے جس کی حیثیت ان کے ہاں بالکل قبلہ کی تھی، جس کو وہ اپنی تمام عبادات اور تمام مہمات میں آگے آگے رکھتے تھے۔ ان کے ڈر سے بنی اسرائیل نے اپنے عقرون سے لے کر جات تک کے سارے شہر بھی خالی کر دیے تھے۔[۲] خوف و بزدلی کی یہ موت ان پر بیس برس طاری رہی۔ اس کے بعد سموئیل نبی نے ان کے اندر اصلاح و تجدید کا کام شروع کیا، ان کو شرک و بدعت سے توبہ کرنے اور اپنے انتشار کو دور کر کے از سر نو منظم و متحد ہونے کی دعوت دی۔ ان کی اس دعوت کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی بخشی اور اس طرح بنی اسرائیل میں بیس سال کی مردنی کے بعد از سر نو ایمانی و سیاسی زندگی کی حرکت پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ہوئے کہ فلسطیوں کے مقابل میں کھڑے ہو سکیں اور اپنے ان شہروں کو ان سے واپس لے سکیں جن کو خود خالی کر کے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

سموئیل میں یہ داستان بہت پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس کے کچھ ضروری حصے یہاں نقل کرتے ہیں جن سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔

فلسطیوں سے بنی اسرائیل کی مرعوبیت، ان کے ہاتھوں ان کے قتل عام اور خدا کے صندوق کے چھن جانے کا ذکر اس طرح ہوا۔

"اور فلستی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے ڈیرے کو بھاگا اور وہاں نہایت بڑی خونریزی ہوئی کیونکہ تیس ہزار اسرائیلی پیادے وہاں کھیت آئے اور خدا کا صندوق چھن گیا۔" سموئیل باب ۴: ۱۰-۱۱

خدا کے صندوق کے چھن جانے کا جو اثر بنی اسرائیل پر پڑا اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

"اس خبر لانے والے نے جواب دیا اسرائیلی فلستیوں کے آگے سے بھاگے اور لوگوں میں بڑی خونریزی ہوئی اور تیرے دونوں بیٹے حفنی اور فنحاس بھی مر گئے اور خدا کا صندوق چھن گیا۔ جب اس نے خدا کے صندوق کا ذکر کیا تو وہ کرسی پر سے پچھاڑ کھا کر پھاٹک کے کنارے گرا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی . . . .

. . . . اور کہنے لگی کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی اس لیے کہ خدا کا صندوق

---

[۱] سموئیل باب ۹ [۲] سموئیل باب ۱۴ [۳] سموئیل باب ۲

چھن گیا تھا اور اس کا خسر اور خاوند جاتے رہے تھے سو اس نے کہا کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی کیونکہ خدا کا صندوق چھن گیا ہے۔ سموئیل باب ۴، ۱۸-۲۲

اس حادثہ کے بعد بنی اسرائیل پر پورے بیس سال تک خوف و بزدلی اور نوحہ و ماتم کی جو مردنی طاری رہی اور پھر سموئیل نبی نے ان کے اندر اصلاح و تجدید کی جو دعوت بلند کی اس کا ذکر اس طرح آتا ہے۔

"اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا تب سے ایک مدت ہو گئی یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا اور سموئیل نے اسرائیل کے سارے گھرانے سے کہا کہ اگر تم اپنے سارے دل سے خداوند کی طرف رجوع لاتے ہو تو اجنبی دیوتاؤں اور عستارات کو اپنے بیچ سے دور کرو اور خداوند کے لیے اپنے دلوں کو مستعد کر کے فقط اسی کی عبادت کرو اور وہ فلستیوں کے ہاتھ سے تمھیں رہائی دے گا۔ تب بنی اسرائیل نے بعلیم اور عستارات کو دور کیا اور فقط خداوند کی عبادت کرنے لگے۔ پھر سموئیل نے کہا کہ سب اسرائیل کو مصفاہ میں جمع کرو اور میں تمھارے لیے خداوند سے دعا کروں گا۔"

سموئیل باب ۷، ۲-۶۔

اس اجتماعی توبہ و استغفار اور تنظیم و اتحاد کے بعد بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ فلستیوں کے مقابل میں کھڑے ہو سکیں اور ان کو شکست دے کر ان سے اپنے چھنے ہوئے شہر اور ساتھ ہی اپنی چھنی ہوئی حشمت واپس لے سکیں۔ بنی اسرائیل کی اس نئی زندگی کا ذکر اس طرح آتا ہے۔

"اور سموئیل بنی اسرائیل کے لیے خداوند کے حضور فریاد کرتا رہا اور خداوند نے اس کی سنی اور جس وقت سموئیل اس سوختنی قربانی کو گزران رہا تھا اس وقت فلستی اسرائیلیوں سے جنگ کرنے کو نزدیک آئے لیکن خداوند فلستیوں کے اوپر اس دن بڑی کڑک کے ساتھ گرجا اور ان کو گھبرا دیا اور انھوں نے اسرائیلیوں کے آگے شکست کھائی اور اسرائیل کے لوگوں نے مصفاہ سے نکل کر فلستیوں کو رگیدا اور بیت کر کے نیچے تک انھیں مارتے چلے گئے...... سو فلستی مغلوب ہوئے اور اسرائیل کی سرحد میں پھر نہ آئے اور سموئیل کی زندگی بھر خداوند کا ہاتھ فلستیوں کے خلاف رہا اور عقرون سے جات تک کے شہر جن کو فلستیوں نے اسرائیلیوں سے لے لیا تھا وہ پھر اسرائیلیوں کے قبضہ میں آئے اور اسرائیلیوں نے ان کی نواحی بھی فلستیوں کے ہاتھ سے چھڑا لی۔" سموئیل باب ۷، ۱۰-۱۴

ہمارے نزدیک تاریخ بنی اسرائیل کا یہی جزو ہے جس کی طرف آیت زیر بحث میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ جب انھوں نے خوف اور بزدلی کی زندگی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس ایمانی و اخلاقی موت کے حوالہ کر دیا جس کی تعبیر مُوْتُوْا سے فرمائی ہے۔ یہ معاملہ ٹھیک ٹھیک اس سنت اللہ کے مطابق ہوا جس کی طرف فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی جب انھوں نے گمراہی پسند کی تو اللہ نے ان کو گمراہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر جب ان کے اندر تجدید و احیائے ملت کی دعوت اٹھی اور

انھوں نے از سرِ نو ایمان و اسلام کی حیات تازہ اختیار کر لینے کا عزم کر لیا تو اللہ نے ان کو از سرِ نو زندہ و متحرک کر دیا۔ اسی چیز کو یہاں ثُمَّ اَحْیَاھُمْ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اسی اصول پر ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے لیے ذلت و نامرادی کو پسند کرتی ہے تو خدا اس کو ذلت و نامرادی کے حوالہ کر دیتا ہے اور اگر کوئی قوم عروج و سربلندی کی طالب ہوتی ہے اور اس طلب کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کی ہمت دکھاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو عزت و سربلندی بخشتا ہے اور یہ مرتبہ دے کر اس کا امتحان کرتا ہے۔

واقعہ کے ذکر کا مقصد — اس واقعہ کے ذکر سے مقصود مسلمانوں خصوصاً کمزور مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جہاد و انفاق پر ابھارنا ہے۔ گویا یہ اس مضمون کی تمہید ہے جو آگے کی آیات میں بیان ہوا ہے۔ ہم تمہید والی فصل میں اشارہ کر آئے ہیں کہ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بھی ان کے قبلہ کی جنگ سے متعلق ہے اور مسلمانوں کو بھی یہاں جس جنگ اور جس انفاق کے لیے ابھارا جا رہا ہے اس کا تعلق اصلاً قبلہ ہی کی آزادی سے ہے۔ دونوں میں نہایت واضح قدرِ مشترک موجود ہے۔ گویا مسلمانوں کے سامنے بھی اس وقت زندگی اور موت دونوں کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اگر وہ موت سے ڈر گئے تو یاد رکھیں کہ ان کو موت سے کوئی چیز بچا نہ سکے گی۔ ان کے اوپر ذلت و خواری اور نفاق کی موت طاری ہو کر رہے گی اور اگر وہ موت سے بے پروا ہو کر زندگی کی راہ پر بڑھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ ان کو دنیا میں ایمان و اسلام کی باعظمت زندگی اور آخرت میں فوز و فلاح کی حیاتِ جاوداں سے سرفراز فرمائے گا۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۲۴۴)

جہاد کے لیے دو محرک — اوپر کی تاریخی تمہید کے بعد یہ مسلمانوں کو جنگ پر ابھارا ہے۔ اور اس ابھارنے کے لیے دو محرک یہاں نمایاں فرمائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ جنگ اللہ کی راہ میں ہے، نفس یا شیطان کی راہ میں نہیں ہے اس وجہ سے اس میں ہر قدم پر بندے کو اللہ کی معیت حاصل ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے، تمہاری جانبازیاں اور قربانیاں، تمہاری دعائیں اور فریادیں، تمہارے دشمنوں کی چالیں اور تدبیریں سب اس کے علم میں ہیں اس وجہ سے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ

مر گئے ہم انھیں خبر نہ ہوئی

ظاہر ہے کہ ان صفات کا حوالہ دینے سے مقصود یہاں اس کا لازم ہے یعنی جب اللہ سنتا اور جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمہاری پکار پر تمہاری مدد و نصرت فرمائے گا اور تمہاری جانبازیوں کا تمھیں بھرپور صلہ دے گا۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗٓ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ط وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (۲۴۵)

انفاق کے لیے قرض کی تعبیر

جانی قربانی کی دعوت کے بعد یہ مالی قربانی کی دعوت ہے اور اس کے لیے جو اسلوب اختیار فرمایا ہے وہ غایت درجہ مؤثر ہے۔ ماول تو سوال کا یہ انداز ہی کہ کون ہے جو خدا کو قرض دینے کے لیے آگے بڑھتا ہے!' غایت درجہ شوق انگیز ہے، پھر یہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو 'قرض دینے' سے تعبیر فرمایا ہے۔ قرض، قرضدار کے ذمہ واجب ہوتا ہے اور یہ رب کریم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ جو مال اس نے خود بندوں کو عنایت فرمایا ہے وہی مال وہ جب ان سے اپنی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کہتا ہے تو اس کو اپنے ذمہ قرض ٹھہراتا ہے یعنی اس کی واپسی از خود اپنے ذمہ واجب قرار دیتا ہے۔ پھر اس سے زیادہ روح و دل کو بے خود کر دینے والی بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ رب کریم یہ قرض اس لیے مانگتا ہے کہ وہ بندوں کے دیئے ہوئے خزف ریزوں کو خوب بڑھائے اور ان کو بڑھا کر ایک لازوال خزانہ کی شکل میں ان کو واپس کرے۔ یعنی اس قرض کی ضرورت اس لیے نہیں پیش آئی ہے کہ خدا کے خزانے میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہے، اس کا خزانہ بھرپور اور وہ بالکل بے نیاز و بے پروا ہے، البتہ اس کی کریمی نے اپنے بندوں کے لیے نفع کمانے کی یہ راہ کھولی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ایک خرچ کر کے دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک اس کا اجر حاصل کر لیں۔

'قرضِ حسن' کا مفہوم

اس قرض کے متعلق شرط صرف ایک لگائی ہے۔ وہ یہ کہ یہ قرض 'قرض حسن' ہو۔ قرض حسن کا مفہوم قرآن کے دوسرے مواقع سے جو نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دل کی تنگی کے ساتھ محض چھلاوا ٹالنے کے لیے نہ دیا جائے بلکہ پوری فراخدلی اور حوصلے کے ساتھ دیا جائے، ریا اور نمائش کے لیے نہ دیا جائے بلکہ صرف خدا کی خوشنودی کے لیے دیا جائے، کسی دنیوی طمع کے حصول کی غرض سامنے رکھ کر نہ دیا جائے بلکہ صرف آخرت کے اجر کی خاطر دیا جائے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حقیر، کم قیمت اور ناجائز ذرائع سے حاصل کیے ہوئے مال میں سے نہ دیا جائے بلکہ محبوب، عزیز اور پاکیزہ کمائی میں سے دیا جائے۔ اسی سورہ میں آگے بھی ان باتوں کی وضاحت ہو گی اور احادیث میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے۔

آخر میں اصل نکتے کی بات فرما دی کہ تنگی اور کشادگی کا انحصار آدمی کی اپنی تدبیروں پر نہیں ہے بلکہ یہ چیز خدا کے اختیار میں ہے اس وجہ سے اگر وہ اپنا مال خدا سے بچاتا اور چھپاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اسی سے چھپاتا ہے جس کے اختیار میں بخشنے کے بعد چھین لینا بھی ہے۔

'وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ' میں یہ پہلو بھی ہے کہ آج خدا سے منہ چھپانے والے اس بات کو نہ بھولیں کہ کل ان کو خدا کو منہ دکھانا بھی ہے۔ اور یہ پہلو بھی ہے کہ جس دنیا کی زندگی کے لیے یہ خدا سے بخالت کر رہے ہیں یہ زندگی تو چند روزہ ہے، اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جس کے لیے اصل فکر ہونی چاہیے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَآئِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ (۲۴۶)

لفظ ملأ کی تحقیق "ملأ" کا اصل لغوی مفہوم بھرنا ہے۔ اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی قوم کے اشراف، اعیان اور اکابر و سادات کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی ہوگی کہ قوم کے اعیان و اشراف ہی ہوتے ہیں جو اس کی چوپالوں، پنچایتوں، مجلسوں، کونسلوں اور اس کے درباروں کو پُر کرتے ہیں۔

ملک کا مفہوم "ملک" کے معنی صاحبِ اختیار و اقتدار کے ہیں۔ یہ اختیار و اقتدار مطلق قسم کا بھی ہو سکتا ہے جس طرح کا اختیار و اقتدار کسی جبار و مطلق العنان بادشاہ کو حاصل ہوتا ہے اور محدود و مقید قسم کا بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ ایک پابند آئین و قانون یا پابند شریعت بادشاہ کو یا کسی امیر لشکر یا سپہ سالار کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ یہ دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس کے تقرر کے لیے بنی اسرائیل کے اعیان نے درخواست اس زمانے کے نبی حضرت سموئیل سے کی اور انہی کے تقرر سے اس کا تقرر ہوا اور تورات کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہی کی ہدایات کے تحت[1] اور انہی کی دعاؤں کے زیر اثر وہ اپنے سارے فرائض انجام دیتا تھا۔ قرآن نے یہ لفظ مدح و ذم دونوں کے محل میں استعمال کیا ہے۔ ایک بادشاہ وہ بھی تھا جس نے حضرت ابراہیمؑ سے حجت کی اور جس نے زندگی اور موت دونوں پر اختیار کا دعویٰ کیا۔ قرآن نے اس کی مذمت کی۔ اس کے برعکس ذوالقرنین، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ بھی بادشاہ ہیں لیکن قرآن نے ان کی تعریف فرمائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک سیاسی نظام میں اصل اہمیت اس کی صورت کی نہیں بلکہ اس کی روح کی ہے۔ اگر اس کی روح خدا اور اس کے رسول کے قانون کے تابع ہے تو وہ قابلِ ستائش ہے، اس کی شکل کچھ بھی ہو۔ اگر روح خدا اور رسول کی باغی ہے تو وہ قابلِ مذمت ہے عام اس سے کہ وہ ملوکیت ہو یا جمہوریت۔

آیت ۲۴۶ کی تعلیم اور واقعہ کی نوعیت جس طرح اوپر کی آیات میں بنی اسرائیل کی ایمانی و اخلاقی موت و حیات کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو زندگی کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ زندگی خدا کی راہ میں جان اور مال کی قربانی سے حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اس آیت میں اور آگے کی چند آیات میں تاریخ بنی اسرائیل کے اسی سلسلے کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو اجتماعی و سیاسی زندگی سے متعلق بعض نہایت اہم سبق دیے گئے ہیں۔

زیر بحث آیت میں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل تورات کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے کہ سموئیل نبی[2] نے بنی اسرائیل کے اندر تجدید و اصلاح اور ان کی تنظیم کا جو کام شروع کیا اس سے بنی اسرائیل کے اندر کچھ زندگی تو پیدا ہوئی اور وہ فلستیوں کے مقابل میں کھڑے ہونے اور ان سے اپنے بعض چھنے ہوئے

---

[1] سموئیل باب ۸: ۵ [2] ان کا زمانہ ۱۰۰۰ قبل مسیح کا زمانہ ہے۔

شہر واپس لینے میں کامیاب ہوئے لیکن بنی اسرائیل ہر طرف سے دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے، ان کے بہت سے شہر اب بھی مخالفوں کے قبضے میں تھے، فلسطیوں کے علاوہ موآب، بنی عمون، ادوم اور ضوباہ کے بادشاہوں سے بھی ہر وقت ان کو خطرہ تھا، پھر سموئیل نبی بوڑھے ہو چکے تھے اور انھوں نے بنی اسرائیل کی قیادت و تنظیم کی جو ذمہ داریاں اپنے بیٹوں کے سپرد کی تھیں وہ ان کو بنی اسرائیل کی توقع کے مطابق نہیں نباہ رہے تھے اس وجہ سے انھوں نے سموئیل سے یہ درخواست کی کہ وہ ان کی قیادت کے لیے کسی امیر کو مامور کریں تاکہ وہ اس کی سربراہی میں جہاد کر سکیں اور اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکیں[1]۔

سموئیل اپنے تجربات کی بنا پر جانتے تھے کہ بنی اسرائیل کی اصلی کمزوری یہ نہیں ہے کہ میدانِ جنگ میں رہنمائی کرنے والا ان کے پاس کوئی لیڈر نہیں ہے بلکہ ان کی اصلی کمزوری یہ ہے کہ جنگ کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے اندر عزم و ایمان نہیں ہے اس وجہ سے انھوں نے، جیساکہ تورات سے واضح ہوتا ہے، ان کے اس مطالبے کی مخالفت کی اور ان کی اصلی کمزوری کی طرف توجہ دلائی کہ ایسا تو نہیں ہوگا کہ جہاد بھی فرض ہو جائے اور امیر بھی مقرر ہو جائے لیکن پھر تم جہاد سے انکار کر دو، اس پر انھوں نے بڑے جوش و جذبے کا اظہار کیا کہ ہم اپنے گھروں اور بیوی بچوں سے نکالے گئے ہیں، اگر اب بھی ہم جنگ نہ کریں گے تو پھر کب کریں گے، لیکن سموئیل کا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ انھوں نے تو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ان کی قیادت کے لیے امیر بھی مقرر کر دیا اور جہاد کا حکم بھی دے دیا لیکن بنی اسرائیل نے حسب عادت عین وقت پر کندھا ڈال دیا۔ آگے کی تفصیلات سے معلوم ہوگا کہ اول تو انھیں منتخب سردار کی سرداری ہی پر اعتراض ہوا، پھر جب بادلِ ناخواستہ اس کی فوج میں بھرتی ہوئے بھی تو پہلے ہی امتحان میں پھسڈی ثابت ہوئے۔

"وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ" (اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے) سے مراد اس کا لازمی نتیجہ ہے یعنی جب خدا خوب جانتا ہے تو ان کے ساتھ معاملہ بھی اپنے علم کے مطابق ہی کرے گا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۴۷)

لفظ بَعَثَ کا مفہوم

"بَعَثَ" کے معنی اٹھانے، ابھارنے، بھیجنے کے ہیں پھر اسی مفہوم سے اس کے اندر مامور کرنے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ چونکہ اس سالار کا انتخاب سموئیل نے خدا کی ہدایت کے مطابق کیا تھا، جیساکہ تورات سے بھی ثابت ہے اور قرآن کے الفاظ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ سے بھی واضح ہے، اس وجہ سے اس کے لیے بَعَثَ کا لفظ

---

[1] ملاحظہ ہو سموئیل باب ۸

استعمال ہوا۔

طالوت اور ساؤل

"طالوت" یہ اس مامور سالار کا نام ہے۔ تورات میں ان کا نام ساؤل آیا ہے۔ اور ان کے غیر معمولی طور پر قدآور ہونے کا ذکر خاص طور پر ہوا ہے: "اور جب وہ لوگوں کے درمیان کھڑا ہوا تو ایسا قدآور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے"[1] کچھ بعید نہیں کہ اپنے اس غیر معمولی قد و قامت کی وجہ سے وہ لوگوں میں اس لقب سے بھی مشہور رہے ہوں۔ طالوت کے معنی "لمبے تڑنگے" کے ہیں۔ عربی اور عبرانی دونوں زبانیں قریب قریب ہیں اس وجہ سے دونوں میں بہت سے مادے مشترک ہیں۔ گمان ہوتا ہے کہ تورات نے ان کا ذکر نام سے کیا ہے اور قرآن نے لقب سے۔ ورنہ پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے نام کے بارے میں تورات کا بیان غلط ہے، اصل نام طالوت ہی ہے۔ قرآن نے یہاں بعض دوسرے واقعات کے بارے میں بھی تورات کے بیانات کی تردید کی ہے۔ آگے ہم ان کی طرف اشارہ کریں گے اور یہ بھی واضح کریں گے کہ اس طرح کے اختلافات کی صورت میں قرآن کا بیان کیوں قابل ترجیح ہے۔

طالوت کا انتخاب اور اس پر بنی اسرائیل کا اعتراض

بنی اسرائیل کے اپنے مطالبے پر جب سموئیل نے ایک سالار کا انتخاب کیا اور اس کو ان کے سامنے پیش کیا تو بجائے اس کے کہ خوشی سے اس کو قبول کرتے انھوں نے حسب عادت اس انتخاب پر اعتراض کر دیا کہ بھلا یہ ہمارا سردار کیسے ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ حق دار تو ہم اس منصب کے ہیں؟ اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ طالوت کوئی مال دار آدمی نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں طالوت بنیامین کے قبیلہ سے تھے، بنیامین کا قبیلہ اول تو بنی اسرائیل کے تمام قبیلوں میں سب سے چھوٹا قبیلہ تھا پھر طالوت اس قبیلے کے تمام گھرانوں میں سب سے چھوٹے گھرانے کے تھے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت کو اپنے قبیلے کی کمزوری کا خود بھی احساس تھا۔ چنانچہ جب سموئیل نے ان کے انتخاب کا ان سے ذکر کیا تو انھوں نے بڑی خاکساری کے ساتھ یہ الفاظ کہے۔

"ساؤل نے جواب دیا کیا میں بنیمینی یعنی اسرائیل کے سب سے چھوٹے قبیلے سے نہیں؟ اور کیا میرا گھرانا بنیمین کے قبیلے کے سب گھرانوں میں سب سے چھوٹا نہیں"[2]

ظاہر ہے کہ مالی اور عددی دونوں ہی اعتبار سے ایک کمزور آدمی کو بنی اسرائیل کے وہ قبیلے کس طرح خاطر میں لا سکتے تھے جن کو اپنی مضبوط عصبیت اور اپنی مالی برتری کا گھمنڈ تھا چنانچہ انھوں نے اس انتخاب پر اعتراض کر دیا۔ تورات میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

"پر شریروں میں سے بعض کہنے لگے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا، سو انھوں نے اس کی تحقیر کی اور اس کے لیے نذرانے نہ لائے پر وہ ان سنی کر گیا"[3]

---

[1] سموئیل باب ۱۰: ۲۳ [2] سموئیل باب ۹: ۲۱ [3] سموئیل باب ۱۰: ۲۷

اور لوگ سموئیل سے کہنے لگے کس نے یہ کہا تھا کہ کیا ساؤل ہم پر حکومت کرے گا؟[1]

اعتراض کا جواب

اس اعتراض کا جواب سموئیل نبی نے یہ دیا کہ یہ انتخاب خدا کا انتخاب ہے۔ اسی نے اس کو تمھاری سرداری کے لیے چنا ہے۔ تم سرداری کو تعداد اور مال کے پیمانوں سے تولتے اور ناپتے ہو لیکن خدا علم اور عمل کے پیمانے سے ناپتا ہے۔ طالوت کے پاس اگرچہ خاندان کی شوکت اور مال کی فراوانی نہیں ہے لیکن علم کی وسعت اور عمل کی قوتوں سے وہ بھرپور ہے اور خدا کے انتخاب میں اصلی اہمیت انھی چیزوں کو حاصل ہے نہ کہ خاندان اور مال کو۔

اس کے بعد فرمایا کہ اقتدار و اختیار خدا کی دین ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور جس کو بخشتا ہے اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت بخشتا ہے۔ اس کا اقتدار تمام اقتداروں کو محیط ہے اور اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اس کے پاس نہ بخشنے کے لیے کمی ہے، نہ بخش کر واپس لینے میں کوئی مانع ہے، نہ کسی معاملے کے ظاہر و باطن یا اس کے ماضی و مستقبل کا کوئی گوشہ اس سے مخفی ہے۔

"وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ تم ہر معاملے کو اپنی تنگ اور محدود نگاہوں سے دیکھتے ہو لیکن خدا اپنے فیصلے اپنی قدرت اور اپنے علم کی روشنی میں صادر فرماتا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۲۴۸)

تابوت کی حقیقت

"تابوت" کے معنی صندوق کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد بنی اسرائیل کا وہ صندوق ہے جس کو تورات میں "خدا کا صندوق" یا "خدا کے عہد کا صندوق" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے زمانے سے لے کر بیت المقدس کی تعمیر تک اسی صندوق کو بنی اسرائیل کے قبلہ کی حیثیت حاصل رہی۔ وہ اس کو اپنے خیمۂ عبادت میں ایک مخصوص مقام پر نہایت مخصوص اہتمام کے ساتھ پردوں کے بیچ میں رکھتے اور تمام دعا و عبادت میں اسی کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان کے ربی اور کاہن غیبی رہنمائی کے لیے بھی اسی کو مرجع بناتے۔ مشکل حالات، قومی مصائب اور جنگ کے میدانوں میں بھی بنی اسرائیل کا حوصلہ قائم رکھنے میں اس صندوق کو سب سے بڑے عامل کی حیثیت حاصل رہی۔ حضرت موسیٰ کے زمانے تک تو اس میں تورات اور صحرائی زندگی کے دور کی بعض یادگاریں محفوظ کی گئیں لیکن پھر اس میں حضرت موسیٰ، حضرت ہارونؑ اور ان کے خاندان کے بعض اور تبرکات بھی محفوظ کر دیے گئے۔

سکینہ کی تحقیق

"سَكِيْنَةٌ" کے معنی اطمینان، قرار اور حوصلہ کے ہیں، بالخصوص وہ اطمینان و حوصلہ جو پرخطر حالات

[1] سموئیل باب ۱۲

اور جنگ کے مصائب میں آدمی کے عزم کو قائم رکھے۔ مثلاً هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا ۴ - الفتح (وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں عزم و اطمینان اتارا تاکہ وہ اپنے ایمان میں اضافہ کریں) فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ۱۸ - فتح (توان کے دلوں میں جو کمزوری تھی اللہ نے اس کو جان لیا پس ان پر عزم و اطمینان آتارا اور ایک فوری فتح سے ان کو نوازا) اس تابوت کے ساتھ بنی اسرائیل کو جو والہانہ عقیدت تھی اس کا ایک خاص پہلو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ بھی تھا کہ مصائب و مشکلات اور میدانِ جنگ میں ان کے حوصلے (MORALE) کو قائم رکھنے میں اس کو سب سے زیادہ دخل تھا۔ فِیْهِ سَكِیْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ سے اس کے اسی خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے۔

تابوت کی بنی اسرائیل میں واپسی

اوپر فلسطیوں کے ہاتھوں اس تابوت کے چھینے جانے کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس کے چھن جانے کو بنی اسرائیل کے بزرگوں نے اسرائیل سے ساری حشمت کے چھن جانے سے تعبیر کیا اور ساری قوم نے اس عظیم حادثے پر ماتم کیا۔ چنانچہ اس دور میں بنی اسرائیل کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس تابوت کو اپنے دشمنوں سے واپس لینے کا تھا۔ اسی بنا پر سموئیل نے طالوت کے انتخاب کے خدائی انتخاب ہونے کی یہ نشانی ٹھہرائی کہ اس کے بعد تابوت تمھارے پاس فرشتوں کی مدد سے آپ سے آپ آجائے گا۔ چنانچہ ان کی یہ پیشینگوئی پوری ہوئی اور فلسطیوں نے اس صندوق کو ایک گاڑی پر رکھ کر اس کو بنی اسرائیل کے علاقے کی طرف ہانک دیا۔ سموئیل میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

"اب تم ایک نئی گاڑی بناؤ اور دو دودھ والی گائیں، جن کے جوا نہ لگا ہو، لو۔ اور ان گایوں کو گاڑی میں جوتو اور ان کے بچوں کو گھر لوٹا لاؤ اور خداوند کا صندوق لے کر اس گاڑی پر رکھو اور سونے کی چیزوں کو جن کو تم جرم کی قربانی کے طور پر ساتھ کر دو گے، ایک صندوقچہ میں کر کے اس کے پہلو میں رکھ دو اور اسے روانہ کر دو کہ چلا جائے اور دیکھتے رہنا .... سو ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور دو دودھ والی گائیں لے کر ان کو گاڑی میں جوتا اور ان کے بچوں کو گھر میں بند کر دیا اور خداوند کے صندوق .... اور صندوقچہ کو گاڑی پر رکھ کر دیا۔ ان گایوں نے بیت شمس کا سیدھا راستہ لیا۔ وہ سڑک ہی سڑک ڈکارتی گئیں اور دہنے یا بائیں ہاتھ نہ مڑیں اور فلستی سردار بیت شمس کی سرحد تک ان کے ساتھ گئے اور بیت شمس کے لوگ وادی میں گیہوں کی فصل کاٹ رہے تھے انھوں نے جو آنکھیں اٹھائیں تو صندوق کو دیکھا اور دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔ سموئیل باب ۶: ۷-۱۲۔

تابوت کی گاڑی کا بغیر کسی گاڑیبان اور بغیر کسی محافظ کے اور وہ بھی دو ایسی گایوں کے ذریعے سے جن کے دودھ پیتے بچے گھروں پر روک لیے گئے تھے، اس طرح بغیر دہنے بائیں مڑے ٹھیک منزل پر پہنچ جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو کر و بیوں کی رہنمائی اور فرشتوں کی مدد ہی سے ہو سکتا ہے۔ اسی چیز کو

"تَحۡمِلُهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تابوت کی واپسی سے متعلق تورات اور قرآن کے بیانات کا اختلاف

تابوت کی واپسی سے متعلق تورات اور قرآن کے بیان میں بڑا فرق ہے۔ قرآن کی زیر بحث آیت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی واپسی کا واقعہ اس وقت پیش آیا ہے جب طالوت کا خدا کے مقرر کردہ بادشاہ کی حیثیت سے اعلان ہوا ہے اور یہ واقعہ گویا ایک نشان تھا اس بات کا کہ طالوت کا انتخاب من جانب اللّٰہ ہے، سموئیل نے خدا کے حکم سے ان کو مسح کر کے برکت دی ہے اور ان کا تقرر بنی اسرائیل میں ایک نئے دور خیر و برکت اور ایک جدید تاریخ کامیابی و فتحمندی کا آغاز ہے۔

اس کے بالکل برعکس تورات کا بیان یہ ہے کہ اس سے بہت پہلے ہی تابوت کو ایک گاڑی پر رکھ کر، جیسا کہ اوپر کے حوالے میں تصریح ہے، فلسطیوں نے گاڑی بنی اسرائیل کے علاقہ کی طرف ہانک دی تھی۔ اور تابوت پوری حفاظت کے ساتھ ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس طرح واپس کرنے کی وجہ تورات میں یہ بیان ہوئی ہے کہ فلسطینی تابوت چھین لے جانے کو تو چھین لے گئے لیکن وہ ان کے لیے مصیبت بن گیا، انھوں نے اس کو جہاں جہاں رکھا وہاں مختلف قسم کی وبائیں پھوٹ پڑیں جس سے ان کے ہزاروں آدمی مر گئے بالآخر اس سے تنگ آ کر انھوں نے سات ماہ کے بعد اپنے نجومیوں کے مشورے سے اس سے نجات حاصل کرنے کی وہ تدبیر اختیار کی جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا۔

قرآن کے بیان کے صحیح ہونے کے وجوہ

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں بیانوں میں سے کون سا بیان روایت اور درایت کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے؟ ہمارے نزدیک مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر قرآن کا بیان صحیح اور تورات کا بیان غلط ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ ان واقعات کے بیان کے خاتمہ پر قرآن نے یہ کہا ہے کہ تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۲۵۲ - بقرہ (یہ اللّٰہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور بے شک تم اللّٰہ کے رسولوں میں سے ہو) اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ امر یہاں قرآن کے پیش نظر ہے کہ یہ واقعہ جس شکل میں وہ پیش کر رہا ہے وہ تورات کے بیان سے مختلف ہے لیکن واقعہ کی صحیح شکل وہی ہے جس شکل میں اس کو قرآن پیش کر رہا ہے نہ کہ جس شکل میں اس کو تورات پیش کر رہی ہے۔ اور پھر اس چیز کو رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی رسالت کی ایک دلیل قرار دیا ہے کہ قدیم آسمانی صحیفوں کی جن سرگزشتوں کے جاننے کا تمھارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ان کو اس صحت کے ساتھ پیش کرنا کہ یہ سرگزشتیں محض بے مقصد داستان سرائی کے بجائے اپنے منطقی ربط و تسلسل اور اپنے حکیمانہ ثمرات و نتائج کے ساتھ لوگوں کے سامنے آئیں بغیر اس کے ممکن نہیں ہوا کہ اللّٰہ نے تم کو اپنا رسول بنایا اور ان باتوں سے تمھیں اپنی وحی کے ذریعہ سے آگاہ فرمایا۔

ایک ہٹ دھرم یہ کہہ سکتا ہے کہ ان واقعات کے پیش کرنے میں قرآن کا بیان تورات کے بیان سے مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم کو تورات کا براہ راست کوئی علم نہیں تھا، وہ نعوذ باللّٰہ سنی سنائی باتیں پیش کرتے تھے اس وجہ سے ان کا بیان تورات سے مختلف ہوتا تھا، لیکن یہ کہنا کسی طرح بھی

صحیح نہیں ہے۔ اول تو جو سنی سنائی بات کہتا ہے اس کی بات عام اور مشہور روایت کے مطابق ہوتی ہے، نہ کہ اس سے بالکل مختلف، دوسرے یہ کہ جو شخص سنی سنائی بات نقل کرتا ہے وہ کبھی پورے جزم و یقین کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ فلاں بات جو تم کہتے ہو یوں نہیں بلکہ یوں ہے۔ یہ انداز تو وہی اختیار کرتا ہے اور وہی اختیار کر سکتا ہے جو پورے علم و بصیرت کے ساتھ ایک بات کو جانتا ہو اور چیلنج دے کر اس پر تنقید یا اس کی تصحیح کرنا چاہتا ہو۔ یہاں صاف نظر آتا ہے کہ صورت معاملہ یہی ہے۔ قرآن نے ساؤل کے نام کی بھی تصحیح کی، تابوت کی واپسی کے واقعہ کو بھی اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا اور آپ دیکھیں گے کہ نہر والے امتحان کے صحیح موقع و محل کو بھی متعین کیا اور پھر کہا کہ حق یہ ہے جو قرآن میں بیان ہو رہا ہے نہ کہ وہ جو تورات میں بیان ہوا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عقل اور منطق کی رو سے بھی وہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ تورات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تابوت کی واپسی تمام تر نتیجہ تھی ان کرامات کا جو خود تابوت سے ظاہر ہوئیں۔ فلسطینی اس کے لے جانے کے بعد سے برابر آفات و مصائب کے ہدف بن گئے۔ انھوں نے ان آفات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بہتری اسی میں دیکھی کہ یہ جن کی چیز ہے ان کے حوالہ کریں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جان چھڑانے کی وہ شکل اختیار کی جو اوپر بیان ہوئی۔ بنی اسرائیل جیسی ضعیف الاعتقاد اور کرامات پرست قوم کے ذہن سے یہ بات چونکہ بہت قریب تھی اس وجہ سے انھوں نے اس کو گھڑ بھی لیا اور پھر اسی عوام پسند روایت کو تورات میں داخل بھی کر دیا لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اتنے بڑے بڑے واقعات کسی قوم کی زندگی میں محض بچوں کے کھیل کی طرح ہو جایا کرتے ہیں؟ تابوت کی حیثیت بنی اسرائیل کے قبلہ کی تھی، نہ اس کا چھن جانا کوئی اتفاقی حادثہ ہو سکتا نہ اس کا واپس ہونا کوئی معمولی واقعہ ہو سکتا۔ اس طرح کا حادثہ پیش آیا تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل اس وقت ایسی عملی و اعتقادی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے ہوں جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اس سزا کے مستحق قرار پائے ہوں۔ اور اگر وہ اس کے واپس لینے میں کامیاب ہوئے تو اس کی راہ بھی اسی طرح کھلی ہو گی کہ انھوں نے اپنے حالات و معاملات کی ایسی اصلاح کی ہو کہ خدا کی رحمت ان کی طرف متوجہ ہوئی ہو اور ان کے دشمن ان سے مرعوب ہوئے ہوں۔

تورات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں قبلہ کے چھن جانے کا واقعہ پیش آیا ہے اس زمانے میں بنی اسرائیل اعتقادی و عملی اعتبار سے بھی بالکل تباہ حال تھے اور سیاسی اعتبار سے بھی سخت پراگندگی اور انتشار میں مبتلا تھے۔ ہم اوپر اس کے ثبوت میں بعض حوالے نقل کر آئے ہیں۔ سموئیل نے ان حالات کی اصلاح کی کوشش کی اور اس کوشش میں ان کو ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا انتشار اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ بڑھاپے میں ان کے لیے تنہا اس پر قابو پانا سخت مشکل تھا لیکن طالوت کے تقرر کے بعد سے حالات میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ سموئیل اور طالوت دونوں نے مل کر بنی اسرائیل کے اندر

ایک تازہ امنگ پیدا کر دی۔ طالوت کے تقرر کے موقع پر سموئیل نے جو تقریر بنی اسرائیل کی پوری قوم کے سامنے کی ہم اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ طالوت کے تقرر سے پہلے کے حالات کیا تھے اور بعد میں کن حالات کے پیدا ہونے کی امید بندھی۔

> "پھر سموئیل لوگوں سے کہنے لگا وہ خداوند ہی ہے جس نے موسیٰ وہارون کو مقرر کیا اور تمھارے باپ دادا کو ملک مصر سے نکال لایا سو اب ٹھہرے رہو تاکہ میں خداوند کے حضور ان سب نیکیوں کے بارے میں جو خداوند نے تم سے اور تمھارے باپ دادا سے کیں گفتگو کروں۔ جب یعقوب مصر میں گیا اور تمھارے باپ دادا نے خداوند سے فریاد کی تو خداوند نے موسیٰ اور ہارون کو بھیجا جنھوں نے تمھارے باپ دادا کو نکال کر اس جگہ بسایا پر وہ خداوند خدا کو بھول گئے سو اس نے حصور کی فوج کے سپہ سالار سیسرا کے ہاتھ اور فلستیوں کے ہاتھ اور شاہ موآب کے ہاتھ بیچ ڈالا اور وہ ان سے لڑے۔ پھر انھوں نے خداوند سے فریاد کی اور کہا کہ ہم نے گناہ کیا اس لیے کہ ہم نے خداوند کو چھوڑا اور بعلیم اور عستارات کی پرستش کی پر اب تو ہم کو ہمارے دشمنوں کے ہاتھ سے چھڑا تو ہم تیری پرستش کریں گے سو خداوند نے یرُبعل اور بدان اور افتاح اور سموئیل کو بھیجا اور تم کو تمھارے دشمنوں کے ہاتھ سے جو تمھارے چاروں طرف تھے رہائی دی اور تم چین سے رہنے لگے اور جب تم نے دیکھا کہ بنی عمون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا تو تم نے مجھ سے کہا کہ ہم پر کوئی بادشاہ سلطنت کرے حالانکہ خداوند تمھارا بادشاہ ہے۔ سو اب اس بادشاہ کو دیکھو جسے تم نے چن لیا اور جس کے لیے تم نے درخواست کی تھی، دیکھو خداوند نے تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر تم خداوند سے ڈرتے اس کی پرستش کرتے اور اس کی بات مانتے رہو اور خداوند کے حکم سے سرکشی نہ کرو اور تم اور وہ بادشاہ بھی جو تم پر سلطنت کرتا ہے خداوند اپنے خدا کے پیرو بنے رہو تو خیر، پر اگر تم خداوند کی بات نہ مانو بلکہ خداوند کے حکم سے سرکشی کرو تو خداوند کا ہاتھ تمھارے خلاف ہوگا جیسے وہ تمھارے باپ دادا کے خلاف ہوتا تھا۔ سو اب ٹھہرے رہو اس بڑے کام کو دیکھو جسے خداوند تمھاری آنکھوں کے سامنے کرے گا۔"
>
> سموئیل باب ۱۲ - ۶ - ۱۶

ایک طرف سموئیل نبی کی یہ اصلاحی سرگرمیاں تھیں، دوسری طرف طالوت نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ قوم کی تنظیم اور ان کے اندر روح جہاد پیدا کرنے کا کام پورے جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے عمونیوں کے مقابلے کے لیے بنی اسرائیل کے مردوں کی مردم شماری کرائی تو معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل تین لاکھ اور یہوداہ کے مرد تیس ہزار ہیں۔ پھر عمونیوں پر اس زور کا حملہ کیا کہ وہ بالکل تتر بتر ہو گئے اور دوستوں، دشمنوں دونوں پر ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہ حالات بلاشبہ ان کے مخالفوں کے لیے مرعوب کن ثابت ہوئے ہوں گے اور اس مرعوبیت کی وجہ سے فلسطیوں نے یہ مناسب سمجھا ہو گا کہ تابوت کو واپس کر کے ایک خوفناک جنگ کے خطرے سے اپنے کو بچا لے جائیں۔ بلاشبہ یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک ایسا واقعہ تھا جو طالوت کی اقبال مندی اور ان کے منجانب اللہ بادشاہ ہونے کا نشان ہو سکتا تھا۔ چنانچہ

قرآن نے یہی کہا ہے اور یہ بات ہر اعتبار سے قرینِ عقل و قیاس معلوم ہوتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ تورات کے اس بیان کی خود تورات ہی کے بیانات سے تردید ہوتی ہے۔ اگر واقعہ یہی ہے کہ فلسطیوں نے سات مہینے کے بعد ہی تابوت کو اس کی کرامات اور اس کے خوارق سے ڈر کر واپس کر دیا تھا تو تورات کے اس بیان کا کیا مطلب ہے۔

"اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا تب سے ایک مدت ہو گئی یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا۔" سموئیل باب ۱

سوال یہ ہے کہ قریت یعریم اگر بنی اسرائیل ہی کے علاقہ میں شامل تھا اور تابوت انہی کی حفاظت میں تھا تو بیس برس تک اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کیوں کرتا رہا؟ اور اس "خداوند کے پیچھے" کے الفاظ کا کیا مطلب ہے؟

اصل یہ ہے کہ سموئیل میں یہود نے متضاد روایات کا اتنا انبار لگا دیا ہے کہ اس کے اندر حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہے۔ یہ قرآن کا احسان ہے کہ اس نے بعض واقعات کے صحیح پہلو نمایاں کیے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ
لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ
فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ
يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۲۴۹﴾

جنگِ بدر کی تصویر قدیم صحیفوں میں

"فَصَلَ فُصُولًا" کے معنی کہیں سے چلنے، نکلنے اور روانہ ہونے کے ہیں۔ یعنی طالوت اپنی فوجیں لے کر مہم پر روانہ ہوئے۔ تورات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم فلسطیوں کے مقابلہ کے لیے تھی جن کا سردار جاتی جولیت تھا جس کا ذکر قرآن نے جالوت کے نام سے کیا ہے۔ اس جنگ میں طالوت اور جالوت کی فوجوں کے ایک دوسرے کے بالمقابل فوج آرائی کی جو شکل بیان ہوئی ہے وہ بالکل اس شکل سے ملتی ہے جو ہمارے ہاں بدر کے موقع پر کفار اور مسلمانوں کے مابین پیش آئی۔ سموئیل میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

"پھر فلستیوں نے جنگ کے لیے اپنی فوجیں جمع کیں اور یہوداہ کے شہر شوکہ میں فراہم ہوئے اور شوکہ اور عزیقہ کے درمیان افسدمیم میں خیمہ زن ہوئے اور ساؤل اور اسرائیل کے لوگوں نے جمع ہو کر ایلہ کی وادی میں ڈیرے ڈالے اور لڑائی کے لیے فلستیوں کے مقابل صف آرائی کی اور ایک طرف کے پہاڑ پر فلستی اور دوسری طرف کے پہاڑ پر بنی اسرائیل کھڑے ہوئے اور ان دونوں کے درمیان وادی تھی۔" سموئیل باب ۱۷، ۱-۳

اس نقشہ پر غور کیجیے اور پھر ایک نظر اس نقشہ پر ڈالیے جو سورۂ انفال میں بدر کے موقع پر کفار اور مسلمانوں کے آمنے سامنے ہونے کا بیان ہوا ہے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ بالکل جنگِ بدر کی تصویر ہے۔ تحویلِ قبلہ کے بعد پہلی جنگ جو کم و بیش دو مہینوں کے بعد پیش آئی ہے وہ یہی بدر کی جنگ ہے۔ اس طرح گویا

جنگ بدر کے پیش آنے سے پہلے اس کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کی جنگ میں مسلمانوں کو دکھا دیا تھا۔ ہم سورۂ انفال میں یہ واضح کریں گے کہ یہود بدر کا نقشہ دیکھ کر اس حقیقت کو تاڑ گئے تھے لیکن انھوں نے مشرکین کو برانگیختہ کرنے کے معاملہ میں بالکل شیطان کی روش اختیار کی۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اس جنگ میں طالوت کے ساتھیوں کی تعداد بھی کم و بیش اتنی ہی تھی جتنی بدر میں حضورؐ کے ساتھیوں کی تھی۔

فوج کی اطاعت کا امتحان

"اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ" دشمن کے آمنے سامنے ہونے سے پہلے طالوت نے اپنی فوج کے ڈسپلن اور ان کی اطاعت و وفاداری کا امتحان لینے کے لیے یہ اعلان کیا کہ سامنے جو فلاں ندی ہماری راہ میں آرہی ہے اس کے ذریعہ سے اللہ تمھاری جانچ کرے گا، تم میں سے جو اس کا پانی پی لے گا وہ میرا ساتھی نہ بن سکے گا جو اس کو بالکل نہ پیے گا وہ میرا ساتھی ہوگا۔ اگر کسی نے ہاتھ سے ایک آدھ چلو پی لیا تو وہ قابلِ درگزر ہے۔ اس امتحان میں فوج کی اکثریت فیل ہوگئی۔ لوگوں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ صرف تھوڑے سے لوگ اس امتحان میں پورے اترسکے۔

بنی اسرائیل نے امیر لشکر کا انتخاب تو بڑے ہمہمہ سے کرایا لیکن یہ لوگ نظم اور ڈسپلن کے معاملے میں، بالخصوص جہاں جان و مال کی قربانی کا سوال ہو، بڑے کچے تھے۔ اس کا اظہار، جیسا کہ اوپر گزرا، سموئیل نبی نے پہلے ہی دن کر دیا تھا۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ انھی کی ہدایت سے طالوت نے اس امتحان کا اعلان کیا تاکہ ان کے کھرے کھوٹے میں پہلے ہی سے امتیاز ہو جائے اور عین میدانِ جنگ میں ان کے ہاتھوں دھوکا نہ کھانا پڑے، جو کچے ہیں وہ پہلے ہی سے چھٹ کے الگ ہو جائیں۔ یہ امتحان چونکہ سموئیل نبی کی ہدایت کے تحت ہوا اس وجہ سے طالوت نے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔ جس ندی کے ذریعہ سے یہ امتحان ہوا اس کا نام یہاں مذکور نہیں اس لیے کہ مقصود امتحان کا ذکر ہے نہ کہ کسی ندی کا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دریائے اردن ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ اس وادی کے درمیان کا کوئی چشمہ یا نالا ہو جو دونوں فوجوں کے درمیان حائل تھی۔

اس امتحان میں سو فی صدی کامیابی کے لیے تو شرط یہ تھی کہ اس کا پانی سرے سے کوئی چکھے ہی نہیں جیسا کہ ارشاد ہے "وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ" لیکن ایک آدھ چلو پی لینے کو قابلِ درگزر قرار دیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ بھی "بِيَدِهٖ" کی قید لگی ہوئی تھی کہ مبادا یہ اجازت کٹورے، گلاس اور ڈونگے تک نوبت پہنچائے۔

"وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ" سے وہ صداقت شعار اور کامل الایمان لوگ مراد ہیں جو اس امتحان میں پورے اترے۔ یہاں "اٰمَنُوْا" کا فعل اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ لوگ جو اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ اس امتحان میں پھسڈی ثابت ہوئے وہ اپنے دعوائے ایمان میں بھی منافق تھے۔

"قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ" ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو خوب پانی پی پی کے ڈھے گئے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ندی کو پار کرنے کی بھی زحمت نہیں

اٹھائی بلکہ اسی پار سے کھڑے کھڑے انھوں نے آگے بڑھنے والے ساتھیوں کو سنا دیا کہ اب ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی ہمت نہیں۔ یہاں جالوت کے نام لینے سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ اس کی ہیبت ان لوگوں کے دلوں پر بہت تھی :

فتح کا انحصار کثرت و قلت پر نہیں بلکہ عزم و ہمت پر ہے

" قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ الاٰية " لفظ ظن کی تحقیق ہم آیت ۴۶ کے تحت بیان کر آئے ہیں۔ یہ اوپر والے بزدلوں کے جواب میں طالوت اور ان کے باایمان ساتھیوں کا قول ہے۔ ان کی خاص صفت جس کا یہاں ذکر فرمایا وہ یہ ہے کہ وہ اللہ سے ملنے کا گمان رکھتے تھے۔ اس خاص صفت کے ذکر کی وجہ، جیسا کہ آیت ۱۵۴ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں، یہ ہے کہ وہ حقیقی شجاعت جو خدا کی راہ میں موت کو زندگی سے بھی زیادہ عزیز و محبوب بنا دیتی ہے وہ مومن کے اس عقیدے سے پیدا ہوتی ہے کہ خدا کی راہ میں قتل ہونے والے مرتے نہیں ہیں بلکہ حقیقی زندگی اور اپنے رب کی ملاقات سے مشرف ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے ہمت چھوڑ بیٹھنے والے ساتھیوں کو ابھارا کہ فلسطینیوں کی کثرت تعداد سے مرعوب ہو کر ہمت نہ ہارو۔ اصل شے تعداد نہیں بلکہ اللہ کی تائید اور اس کی نصرت ہے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ نہایت قلیل التعداد گروہ محض اللہ کے حکم اور اس کی تائید سے دل بادل فوجوں پر غالب آگیا ہے۔ خدا کی تائید حاصل کرنے کے لیے جو چیز مطلوب ہے وہ صبر و استقامت اور عزم و ہمت ہے نہ کہ تعداد کی کثرت و قلت۔
شاید طالوت کے بیٹے یونتن نے اسی موقع پر وہ فقرہ کہا ہو جو سموئیل میں نقل ہے۔

" سو یونتن نے اس جوان سے جو اس کا سلاح بردار تھا کہا آ ہم ادھر ان نامختونوں کی چوکی کو چلیں، ممکن ہے کہ خداوند ہمارا کام بنا دے کیونکہ خداوند کے لیے بہتوں یا تھوڑوں کے ذریعہ سے بچانے کی قید نہیں۔" سموئیل باب ۱۴

نہر کے امتحان کے متعلق تورات اور قرآن کے بیانات کا اختلاف

تورات میں اس امتحان کا ذکر نہیں ہے لیکن اسی سے ملتے جلتے ایک امتحان کا ذکر ہے۔

" اور اسرائیلی مرد اس دن بڑے پریشان تھے کیونکہ ساؤل نے لوگوں کو قسم دے کر یوں کہا تھا کہ جب تک شام نہ ہو اور میں اپنے دشمنوں سے بدلہ نہ لے لوں اس وقت تک اگر کوئی کچھ کھائے تو وہ ملعون ہو۔ اس سبب سے ان لوگوں میں سے کسی نے کھانا چکھا تک نہیں اور سب لوگ جنگل میں جا پہنچے اور وہاں زمین پر شہد تھا اور جب یہ لوگ جنگل میں پہنچ گئے تو دیکھا کہ شہد ٹپک رہا ہے پر کوئی اپنا ہاتھ اپنے منہ تک نہیں لے گیا اس لیے کہ ان کو قسم کا خوف تھا لیکن یونتن نے اپنے باپ کو ان لوگوں کو قسم دیتے نہیں سنا تھا سو اس نے اپنے ہاتھ کے عصا کے سرے کو شہد کے چھتے میں بھونکا اور اپنا ہاتھ اپنے منہ سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں میں روشنی آئی۔ تب ان لوگوں میں سے ایک نے اس سے کہا کہ تیرے باپ نے لوگوں کو قسم دے کر سخت تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ جو شخص آج کے دن کھانا کھائے وہ ملعون ہو۔ اور لوگ بے دم سے ہو رہے تھے۔ تب یونتن نے کہا کہ میرے باپ نے ملک کو دکھ دیا ہے، دیکھو، میری آنکھوں میں ذرا سا شہد چکھنے سے کیسی روشنی آئی! کتنا زیادہ اچھا ہوتا اگر سب لوگ دشمن کی لوٹ میں سے جو ان کو ملی دل کھول کر کھاتے ...... سو وہ لوگ لوٹ پر

گئے اور بھیڑوں، بکریوں، بیلوں اور بچھڑوں کو لے کر ان کو زمین پر ذبح کیا اور خون سمیت کھانے لگے۔

سموئیل باب ۱۴: ۲۴-۳۲

اس واقعے سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ طالوت نے فلسطینیوں سے جنگ کے موقع پر اپنی فوج کا امتحان لیا تھا اور اس امتحان میں ان کی پوری فوج ناکام رہی تھی یہاں تک کہ طالوت کے بیٹے یونتن بھی، جن کا کردار تورات کے دوسرے بیانات سے نہایت بلند ثابت ہوتا ہے، اس امتحان میں نہ صرف یہ کہ ناکام رہے بلکہ مذکورہ بالا بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ انھی کی غلط رہنمائی سے ان کے باپ کی پوری فوج گمراہ ہوئی۔

قرآن کا بیان مندرجہ ذیل پہلوؤں سے تورات کے بیان سے مختلف ہے۔

ایک یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے یہ امتحان اس وقت لیا ہے جب دشمن سے عملاً مڈبھیڑ ہو چکی ہے اور مقصود اس امتحان سے صرف یہ تھا کہ جب تک دشمن کا اچھی طرح قلع قمع نہ ہو جائے لوگ کھانے پینے میں مصروف نہ ہوں۔ برعکس اس کے قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے یہ امتحان دشمن سے مڈبھیڑ ہونے سے پہلے لیا ہے اور مقصود اس سے اپنی فوج کا جائزہ لینا تھا کہ اس میں کتنے ایسے ہیں جو کٹھن حالات میں ثابت قدم رہ سکیں گے اور کتنے محض دکھاوے کے مجنوں ہیں جن کا دعوائے عشق آزمائش کی پہلی ہی چوٹ سے ہرن ہو جائے گا۔

دوسرا یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے کھانے کی ممانعت کی تھی۔ اس کے برعکس قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ممانعت فوج کے مارچ کے دوران میں ایک خاص ندی یا نالے کے پانی کے لیے تھی۔

تیسرا یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت کی پوری فوج اس امتحان میں ناکام رہی یہاں تک کہ خود ان کے فرزند بھی ناکام رہے بلکہ انھی نے پوری فوج کے لیے اس ناکامی کی راہ کھولی۔ اس کے خلاف قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے اندر سے ایک جماعت اپنے عزم و ایمان پر قائم رہی اور اسی کے عزم و ایمان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فلسطینیوں پر فتح دی۔

قرآن کا بیان صحیح اور با مقصد ہے

اب یا تو یہ مانا جائے کہ تورات میں جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ الگ ہے اور قرآن میں جو بیان ہوا ہے وہ الگ۔ یا یہ مانا جائے کہ واقعہ تو ایک ہی ہے، تورات میں اس کو بے احتیاط راویوں نے بالکل مسخ اور بے مقصد بنا کے رکھ دیا ہے۔ قرآن نے اس کو بالحق یعنی بالکل ٹھیک ٹھیک اور اس کے فوائد و مصالح کے ساتھ سنا دیا۔ ان دونوں میں سے جو بات بھی صحیح ہو یہ بہرحال ہر صاحب ذوق تسلیم کرے گا کہ قرآن کا بیان ہر پہلو سے با مقصد، نتیجہ خیز اور پُر حکمت ہے۔ برعکس اس کے تورات کا بیان ایک بالکل بے مقصد داستان ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (۲۵۰-۲۵۱)

جالوت — جالوت، فلسطینیوں کا سپہ سالار تھا۔ تورات میں اس کا نام جاتی جولیت آیا ہے۔ یہ بڑا گرانڈیل، دیوہیکل اور ماہر جنگ سپہ سالار مانا جاتا تھا، دشمنوں پر اس کا بڑا رعب تھا، خاص طور پر بنی اسرائیل اس سے بہت مرعوب تھے۔

حضرت داؤد کی زندگی کا آغاز — داؤد، یہ وہی حضرت داؤد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت سے سرفراز فرمایا اور جن کی صلب سے حضرت سلیمان علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدا غریبانہ لیکن انتہا نہایت شاندار ہوئی۔ انھوں نے اپنے بارے میں خود فرمایا ہے کہ خداوند نے مجھے بھیڑ سالے سے نکالا اور اسرائیل کے تخت پر لا بٹھایا۔ یہ طالوت کی اس فوج میں شامل تھے جس کا ذکر چلا آرہا ہے۔ اس شمولیت کے متعلق تورات میں دو مختلف روایتیں ہیں۔ ایک سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس جنگ کے پیش آنے سے پہلے ہی طالوت کے سلاح بردار کی حیثیت سے ان کے لشکر میں داخل ہو چکے تھے اور در پردہ یہ سموئیل کے ممسوح اور مستقبل کے بادشاہ بھی تھے۔ دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بالکل وقت کے وقت اپنی بکریاں چراگاہ میں چھوڑ کر اپنے بڑے بھائیوں کو، جو جنگ میں شریک تھے، اپنے باپ کے حکم سے کچھ کھانے کی چیزیں دینے آئے۔ یہاں انھوں نے دیکھا کہ جالوت مقابلہ کے لیے چیلنج دے رہا ہے لیکن کوئی اس کے مقابلے کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر ان کی غیرت کو جوش آیا۔ انھوں نے طالوت سے اس کے مقابلہ کی اجازت مانگی۔ یہ اس وقت ایک نوخیز، سرخ رُو اور خوش قامت نوجوان تھے۔ طالوت کو ان کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی بنا پر اجازت دینے میں تردد ہوا۔ لیکن جب انھوں نے کہا کہ میں اپنی بکریوں پر حملہ کرنے والے شیروں اور ریچھوں کے جبڑے توڑ دیا کرتا ہوں، بھلا اس نامختون فلسطینی کی کیا حیثیت ہے کہ یہ زندہ خداوند کی فوجوں کو رسوا کرے تو طالوت نے ان کے عزم و ہمت کو دیکھ کر ان کو اجازت دے دی اور خود اپنا جنگی لباس پہنا کر اپنے مخصوص اسلحہ سے ان کو لیس کیا۔ اس وقت تک ان کا زمانہ بھیڑوں بکریوں کی چرواہی میں گزرا تھا، اس جنگی لباس اور ان جنگی اسلحہ کا ان کو کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ ان کو پہن کر کچھ بندھا بندھا سا محسوس کرنے لگا۔ آخر طالوت کی اجازت سے اس قید سے رہائی حاصل کی اور چرواہوں کی طرح اپنی فلاخن اٹھائی، چادر کے ایک کونے میں کچھ پتھر رکھے اور وقت کے سب سے بڑے دلیر کے مقابل میں جا کے ڈٹ گئے۔ پہلے تو اس نے ان کا مذاق اڑایا لیکن جب ان کی طرف سے اس کو ترکی بہ ترکی جواب ملا تو اس نے کہا کہ "اچھا! آج تیرا گوشت چیلوں اور کوؤں کو کھلاتا ہوں"۔ اتنے میں حضرت داؤدؑ نے فلاخن میں پتھر رکھ کر جو اس کو مارا تو پتھر اس کے ماتھے سے چپک کر رہ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اتنے بڑے سپہ سالار کا ایک الھڑ چرواہے کی فلاخن سے اس طرح مارا جانا ظاہر ہے کہ ایک عظیم واقعہ تھا۔ چنانچہ فلسطینی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور ادھر بنی اسرائیل کی عورتوں کی زبان پر یہ گیت جاری ہو گیا ؎

"ساؤل نے تو ہزاروں کو مارا پر داؤدؑ نے لاکھوں کو مارا"

بس اسی واقعہ سے حضرت داؤد کی زندگی کا آغاز ہوا اور پھر وہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں اس مقام پر

پہنچے جوان کے لیے مقدر تھا۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ، میں اس حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے کہ فتح ہو یا شکست، جو کچھ بھی پیش آتا ہے اس کا اصل تعلق قلت و کثرت اور وسائل و تدابیر سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اس وجہ سے اصل اعتماد اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہیے نہ کہ اسباب و وسائل پر۔ اس سے مقصود اسباب و وسائل کے اختیار کرنے کی نفی نہیں بلکہ تنہا انہی کو وسیلۂ ظفر سمجھ لینے کی نفی ہے۔ حضرت داؤد جنھوں نے ایک دیو ہیکل سورما کو ایک پتھر سے ڈھیر کر دیا، اگرچہ اس زمانے تک نبی نہیں تھے، لیکن اس حقیقت سے آگاہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے جالوت کو مخاطب کر کے یہ کہا تھا کہ

"اور یہ ساری جماعت جان لے کہ خداوند تلوار اور بھالے کے ذریعے سے نہیں بچاتا اس لیے کہ جنگ تو خداوند کی ہے اور وہی تم کو ہمارے ہاتھ میں کر دے گا۔" سموئیل باب ۱۷: ۴۸

یہی بات قرآن مجید کی آیت وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى" سے ثابت ہوتی ہے۔

"وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ" یہ ان انعامات کا بیان ہے جو اس واقعہ کے بعد حضرت داؤد پر ہوئے۔ اس کے بعد وہ طالوت کے داماد بھی ہو گئے اور پھر بنی اسرائیل کے بادشاہ بھی۔ علاوہ ازیں ان کو حکمت کا وہ خزانہ بھی عطا ہوا جس کا مظہر زبور ہے۔ درحقیقت یہی حکمت ہے جس کا جوڑ جب بادشاہی کے ساتھ ملتا ہے تو وہ بادشاہی زمین میں خدا کی خلافت کا درجہ حاصل کرتی ہے، یہ نہ ہو تو بادشاہی چنگیزی ہے۔ بادشاہی اور درویشی کا یہی امتزاج ہے جو اللہ کی نظروں میں پسندیدہ ہے۔ اور حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سب درویش بادشاہ تھے اس لیے کہ ان کی بادشاہی کا تخت و تاج سونے چاندی سے نہیں بلکہ حکمت کے لعل و گہر سے آراستہ ہوا تھا۔

یہاں ایک چھوٹا سا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ فرمایا عَلَّمَهٗ مَّا شَآءَ نہیں فرمایا، میرا خیال ہے کہ یہ اسلوب اس لیے اختیار فرمایا کہ یہ بات حضرت داؤدؑ کے ساتھ خاص ہو کے نہ رہ جائے۔ بلکہ یہ ایک سنت اللہ کے بیان کا اسلوب اختیار کر لے کہ اللہ نے اس کو وہ کچھ سکھایا اور بتایا جو وہ اپنے ایسے بندوں کے لیے چاہتا ہے کہ وہ ان کو بتائے اور سکھائے۔

جہاد کی ضرورت اور اس کی حکمت

"وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ الاٰية" یہ جہاد کی ضرورت اور اس کا فلسفہ بیان ہوا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ جہاد کا حکم نہ دیتا اور اس کے صالح بندے زمین کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کے لیے تلوار نہ اٹھاتے تو اشرار و مفسدین دنیا کو شر و فساد سے بھر دیتے اور اللہ کی زمین نیکی اور تقویٰ کے تمام آثار سے خالی ہو جاتی۔ قرآن میں جہاد کی اس ضرورت و حکمت کی طرف مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ اشارے کیے گئے ہیں، مثلاً سورۂ حج میں فرمایا۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۴۰۔ حج (اور اگر اللہ ایک کو دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو صومعے اور گرجے اور عبادت خانے اور مسجدیں، جن میں کثرت

سے خدا کا ذکر ہوتا ہے، سب ڈھائے جا چکے ہوتے۔

اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ مذہب کے راہبانہ اور جوگیانہ تصور کے اثر سے عام طور پر جنگ اور جہاد کو تقویٰ اور دین داری کے منافی تصور کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جنگ بدر سے پہلے تک تو قریش مسلمانوں کی کمزوری کو ان کے خلاف ایک دلیل ٹھہراتے رہے اور جنگ بدر کے بعد ان کے جوش جہاد کو ان کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ اس کی تفصیلات اپنے مقام میں آئیں گی یہاں قرآن نے پہلے سے اس طرح کے تمام اعتراضات کا جواب دے دیا کہ انبیاء اور صالحین جو جہاد کرتے ہیں اس سے مقصود حق اور عدل کا قیام اور شر و فساد کا استیصال ہوتا ہے ورنہ خدا کی زمین نیکی اور بھلائی کے لیے بالکل بنجر ہو کے رہ جائے۔ اس وجہ سے صالحین کا جہاد اہل زمین کے لیے خدا کی ایک بہت بڑی عنایت ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۵۲)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات اور آپ کی رسالت کا اثبات

یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت، یہ دونوں آیتیں سلسلۂ کلام کے بیچ میں بطور التفات وارد ہیں یعنی اصل سلسلۂ کلام کو روک کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا اور ارشاد ہوا کہ بنی اسرائیل نے اپنی تاریخ کی ایک نہایت اہم سرگزشت بالکل بے مقصد اور بے معنی بنا کر رکھ دی تھی اب ہم نے اس کو بالکل ٹھیک اس کے نتائج و فوائد اور اس کے حکم و مصالح کے ساتھ تمہیں سنایا ہے تاکہ اس آئینے میں تم اور تمہارے ساتھی اپنے مستقبل کے نقشۂ کار کو دیکھ سکو اور یہ اس بات کی نہایت روشن دلیل ہے کہ تم انبیاء و رسل کے مبارک سلسلے کی کڑی ہو ورنہ جس چیز کے تمہارے پاس جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس کو تم کس طرح جان سکتے اور وہ بھی ایسی صحت و صداقت کے ساتھ کہ اصل واقعہ تمام غیر منطقی اور غیر فطری ملاوٹوں سے بالکل پاک ہو کر لوگوں کے سامنے آ گیا۔ اگر اہل کتاب معاملے کے صرف اسی ایک پہلو پر غور کرتے تو تمہاری رسالت کے ثبوت کے لیے یہی دلیل کافی تھی لیکن ان کا اندھا بہرا تعصب اس امر میں مانع ہے کہ وہ اپنے نبی کے سوا کسی اور رسول کی رسالت اور اس کے لیے کوئی فضیلت تسلیم کر سکیں حالانکہ اللہ کے نبیوں اور رسولوں میں سے کسی کے لیے بھی مطلق برتری کا دعوے صحیح نہیں ہے۔ اللہ نے اپنے تمام رسولوں کو کسی نہ کسی فضیلت سے مختص کیا ہے اور سب کے لیے مراتب و درجات ہیں لیکن اہل کتاب گروہی تعصبات میں مبتلا ہو کر اپنے سوا سب کی تکذیب اور سب کی مخالفت کے لیے کمربستہ ہیں، سو اس حالت پر صبر کرو اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں شر کو بھی مہلت دے رکھی ہے۔ بلاشبہ اگر وہ چاہتا تو یہ کچھ بھی نہ کر پاتے لیکن اس نے یہی چاہا ہے اور جو کچھ اس نے چاہا ہے اسی میں حکمت اور مصلحت ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ (۲۵۳)

تِلْكَ کا اشارہ ان رسولوں کی طرف ہے جن کا حوالہ اوپر وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ کے الفاظ سے دیا گیا ہے۔

رسولوں کے بارے میں صحیح روش

اس آیت میں اس صحیح رویے کی وضاحت ہے جو اللہ کے رسولوں کے بارے میں ان کی امتوں کو اختیار کرنا تھا لیکن انھوں نے اس کو اختیار نہیں کیا بلکہ اس کی جگہ ایک بالکل غلط رویہ اختیار کر لیا جس کے سبب سے ان کے درمیان تعصبات کی دیواریں کھڑی ہو گئیں اور وہ ایک دوسرے کی دشمن اور مخالف ہو کر باہم جنگ و جدل میں مبتلا ہو گئیں۔ مقصود اس بیان سے یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ واضح کرنا ہے کہ آج تمھاری مخالفت میں بھی یہ اہل کتاب جو ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اس کی بڑی وجہ ان کی یہی غلط روش ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں میں سے ہر رسول کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت بخشی ہے اور اس فضیلت کے اعتبار سے وہ دوسروں پر ممتاز ہے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا ہے یہ ان کی فضیلت کا ایک خاص پہلو ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کھلے کھلے معجزات دیے اور روح القدس کی خاص تائید سے ان کو نوازا، یہ ان کے مخصوصات میں سے ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے رسولوں کو درجات و مراتب عطا ہوئے ہیں جو ان کے لیے خاص ہیں۔ انبیاء و رسل کے فضائل کے باب میں یہی نقطۂ نظر حقیقت کے مطابق ہے۔ لیکن ان انبیا کی امتوں نے جو روش اختیار کی وہ یہ ہے کہ ان میں سے جس نے جس نبی و رسول کو مانا سارے فضائل و خصوصیات کا جامع تنہا اسی کو بنا کر رکھ دیا اور دوسرے کسی نبی و رسول کے لیے کسی فضیلت کا تسلیم کرنا ان کے نزدیک ایمان کے منافی قرار پا گیا۔ اس تعصب و تنگ نظری کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلی امتوں میں سے ہر امت اپنے اپنے خول میں بند ہو کر رہ گئی اور اس کے لیے دوسرے نبیوں اور رسولوں کی برکات سے فائدہ اٹھانے کی راہ مسدود ہو گئی۔ اگر وہ صحیح روش اختیار کرتیں تو ہر رسول ان کا رسول اور ہر ہدایت ان کی ہدایت ہوتی اور وہ اس ہدایت میں سے بھی حصہ پاتیں جو اب قرآن مجید کی صورت میں آخری ہدایت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے ظاہر ہوئی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ بنی اسرائیل میں بھی اشارہ فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۵۵ (اور ہم نے انبیا میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عنایت کی)

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی

آیت کے دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ نے اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اس نے پسند فرمائی ہے اور جس کا قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ اس نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں جبر کا طریقہ نہیں اختیار فرمایا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس میں شبہ نہیں کہ کسی کے لیے بھی ایمان کو چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ بندوں کو آزادی دی کہ وہ اپنی سوچ سمجھ اور اپنے اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ چاہیں کفر

کی راہ اختیار کریں، چاہیں ایمان کی راہ اختیار کریں۔ اگر وہ ایمان کی راہ اختیار کریں گے تو اس کا صلہ پائیں گے اور اگر کفر کی راہ اختیار کریں گے تو اس کا انجام دیکھیں گے۔ آخر میں فرمایا کہ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے) سو اس نے یہی چاہا کہ وہ اس معاملے میں بندوں پر جبر نہ کرے اور جب اس نے یہی چاہا تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ اسی کے اندر حکمت و مصلحت ہے، کیونکہ خدا کا کوئی ارادہ حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہو سکتا۔

یہاں اس قانون کے بیان کرنے سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ لوگوں کی ہدایت و ضلالت کے معاملے میں آپ کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ آپ لوگوں تک حق واضح الفاظ میں پہنچا دیں۔ اس کو قبول کرنا یا رد کرنا یہ ان کے اوپر چھوڑ دیجیے۔ یہ نہ تو آپ کی ذمہ داری ہے اور نہ آپ اس کے لیے پریشان ہوں۔

آیت میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق وَاٰتَيْنَا ... بِرُوْحِ الْقُدُسِ ہی کے جو الفاظ آئے ہیں ان کی حقیقت اسی سورہ کی آیت ۸۷ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ سے جس کلام کا ذکر ہے اس سے مراد وہ براہ راست مخاطبۂ الٰہی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو مشرف فرمایا۔ اس مخاطبت کا ذکر تورات میں بھی بار بار ہوا ہے اور قرآن نے بھی اس کی طرف جا بجا اشارے کیے ہیں۔

۸۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۵۴-۲۵۶

اوپر سے مضمون جہاد اور انفاق کا چلا آ رہا تھا پھر ضمناً دو آیتیں التفات کی بطور تنبیہ و تذکیر آگئیں جن کی نوعیت جملہ معترضہ کی ہے۔ اس کے بعد انفاق کا مضمون از سر نو آ گیا۔ اس مضمون کی وضاحت کے لیے جو استدلال اختیار فرمایا ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ خدا کے ہاں کام آنے والی اصل چیز تو خدا کی راہ میں جان اور مال کی قربانی ہے لیکن یہ منکرین یہ کرنے کے لیے تو تیار نہیں ہیں البتہ انھوں نے اپنے جی سے خدا کے شریک و شفیع بہت سے گھڑ لیے ہیں اور ان کی شفاعت و حمایت پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں حالانکہ یہ جھوٹے سہارے کچھ کام آنے والے نہیں ہیں۔ جو لوگ اس حماقت میں مبتلا ہیں وہ اپنے اوپر بہت بڑا ظلم ڈھا رہے ہیں۔

اس کے بعد نہایت مختصر لیکن نہایت جامع الفاظ میں توحید کی حقیقت واضح فرمائی اور شرک کی تردید کی تاکہ ایک بالکل غلط سہارے پر جو لوگ جی رہے ہیں وہ چونکتے ہوں اور خدا پرستی کی صحیح راہ اختیار کریں۔

اس کے بعد یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعے سے حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ تبلیغ و تعلیم اور انذار و تبشیر کا جو حق تھا وہ ادا ہو چکا ہے۔ اب جس کا جی چاہے وہ غیر اللہ سے کٹ کر اللہ کی مضبوط رسی کو تھام لے اور جس کا جی چاہے اپنے غلط سہاروں کے اعتماد پر اپنی عاقبت برباد کرے۔ اللہ کو ایسے لوگوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی سمجھ بوجھ سے ایمان لائیں، اگر وہ سب کو نیکی کے راستے پر ہانک دینا چاہتا تو وہ ایسا کر سکتا تھا لیکن ہدایت و ضلالت

کے معاملے میں اس نے اس جبر کو پسند نہیں فرمایا۔

اس کے بعد یہ واضح فرمایا کہ کون لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دیتا ہے اور کون لوگ ہیں جو حق کی وضاحت کے بعد بھی گمراہی کی وادیوں ہی میں بھٹکتے رہ جاتے ہیں۔

اب اسی روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۲۵۴-۲۵۶

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٥٤﴾ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ۖ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿٢٥٥﴾ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥٦﴾

ترجمہ آیات ۲۵۴-۲۵۶

اے ایمان والو، جو کچھ ہم نے تم کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش نفع پہنچائے گی اور جو لوگ انکار کرنے والے ہیں اپنے اوپر اصلی ظلم ڈھانے والے وہی ہیں۔ ۲۵۴

اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے، سب کا قائم رکھنے والا

ہے، نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔ کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جو وہ چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں اور وہ بلند اور عظیم ہے۔ ۲۵۵

دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے تو جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا اس نے مضبوط رسی پکڑی جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۵۶

۸۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۵۴)

انفاق کی دلیل اور اس کی تسہیل

اوپر آیت ۲۴۵ میں انفاق کی جو دعوت گزری ہے، یہ اس کی مزید تفصیل ہے۔ مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ میں جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، انفاق کی دلیل بھی ہے اور اس کی تسہیل بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تم سے انفاق کا جو مطالبہ کر رہا ہے تو یہ تم پر گراں نہ گزرے، وہ تم سے کوئی تمہاری چیز نہیں مانگ رہا ہے بلکہ اپنی ہی بخشی ہوئی چیز مانگ رہا ہے۔ پھر یہ نہیں ہے کہ جو کچھ اس نے بخشا ہے اس سارے کے لیے اس کا مطالبہ ہے بلکہ وہ اس میں سے صرف ایک حصے کے انفاق کا مطالبہ کر رہا ہے۔

پھر فرمایا کہ اس دنیا کے مال و متاع کا کوئی ابدی و دائمی نفع ہے تو صرف اسی صورت میں ہے جب آج اس کو خدا کی راہ میں خرچ کر کے اس کو ایک لازوال خزانے کی صورت میں تبدیل کر لو اس لیے کہ آگے جو دن آنے والا ہے اس میں نفع پہنچانے والی چیز اگر کوئی ہے تو صرف وہ نیکی ہے جو اس دنیا میں کمائی گئی ہو۔ اس کے سوا اس عالم میں کوئی چیز کام آنے والی نہیں ہے۔ اس دنیا میں خرید و فروخت سے بھی کام چل جاتے ہیں، دوستیاں بھی کام دے جاتی ہیں اور سفارشیں بھی بعض اوقات نفع پہنچا دیتی ہیں لیکن اس دنیا میں ان چیزوں کی ساری راہیں بند ہوں گی، وہ صرف ایمان اور عمل صالح کے نتائج کے ظہور کی دنیا ہوگی۔

لفظ بیع کا مفہوم ہم نے یہاں خرید و فروخت دونوں لیا ہے اس کی وجہ، جیسا کہ ہم کسی دوسری جگہ اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہے کہ جب صورت چیز سے چیز کے مبادلہ کی ہو تو بیچنا اور خریدنا دونوں اس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔

'اَلْکٰفِرُوْنَ' سے مراد ہمارے نزدیک وہ لوگ ہیں جو اس طرح کے کسی دن کے ظہور کے منکر ہیں جس سے یہاں ڈرایا گیا ہے۔ جو لوگ آخرت کے منکر ہوں ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کل کے ادھار کے لیے آج کے نقد کو قربان کر سکیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ اگرچہ یہ لوگ اپنی دانست میں اپنے آپ کو بہت حقیقت پسند سمجھتے ہیں اور ان کا گمان یہ ہے کہ وہ اپنے کو نفع پہنچا رہے ہیں لیکن درحقیقت یہ اپنی جانوں پر سب سے بڑے ظلم ڈھانے والے ہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (۲۲۵)

'قَیُّوْمٌ' کے معنی

'قَیُّوْمٌ' مبالغہ کا وزن ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم اور دوسروں کے قیام و بقا کا واسطہ اور ذریعہ ہو۔

'سِنَةٌ' کے معنی

'سِنَةٌ' کے معنی اونگھ اور نوم کے معنی نیند کے ہیں۔ ان دونوں کی نفی سے نیند کی ابتدا اور انتہا دونوں کی نفی ہو گئی جس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ غفلت کے تمام اثرات سے کمال درجہ پاک ہے۔

مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم لوگوں کے آگے اور پیچھے اور ان کے ماضی اور مستقبل سب پر حاوی ہے۔ برعکس اس کے دوسروں کی علمی پہنچ صرف اس حد تک ہے جس حد تک خدا نے چاہا کہ وہ اس کے علم میں سے حصہ پائیں۔ اس سے آگے کسی کی رسائی نہیں۔ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ۔

'کرسی' کے معنی

'کُرْسِی' کے معنی عربی لغت میں کسی چیز کی جمی جمائی تہ کے ہیں۔ اسی سے کرسی کا لفظ بنا جو بیٹھنے کی جگہ یا چیز مثلاً تخت وغیرہ کے لیے استعمال ہوا۔ بیٹھنے کی جگہ یا چیز جب کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لیے خاص ہو اس کے اقتدار کا مرکز ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کرسی کا لفظ اقتدار کی تعبیر کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے معنی ہوئے کہ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین کے تمام اطراف و اکناف پر حاوی ہے۔ کوئی گوشہ اور کونہ بھی اس کے دائرۂ اقتدار سے الگ نہیں ہے۔

'اٰدَ یَئُوْدُ اَوْدًا' کے معنی ہیں کسی چیز کا ایسا بھاری اور گراں ہونا کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا کے معنی یہ ہوئے کہ آسمان و زمین کی دیکھ بھال ذرا بھی خدا پر گراں نہیں ہے کہ اس کو کسی سہارے

یا مددگار کی احتیاج پیش آئے۔

آیت الکرسی توحید کی ایک عظیم آیت ہے

اوپر والی آیت میں یہ فرمایا کہ اس دن کے آنے سے پہلے پہلے خدا کی راہ میں خرچ کرلو جس میں نہ خرید فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش کچھ نفع پہنچائے گی۔ یہ اسی مضمون کی مزید تفصیل ہے گویا رد شفاعت اور رد شرک کے اس مضمون نے توحید خالص کی وضاحت کے لیے ایک تقریب پیدا کردی اور اس طرح توحید کے بیان میں ایک ایسی آیت نازل ہوگئی جس کی خوبیوں اور بلاغتوں کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

سب سے پہلے فرمایا کہ اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے بعد اس کے لیے ان صفات کا اثبات کیا جو اس کی الوہیت کا لازمی تقاضا ہیں اور جن کے نہ ماننے سے اس کی الوہیت کی نفی ہوجاتی ہے اور ساتھ ہی ان باتوں سے اس کو بری قرار دیا جن کے ماننے سے بھی اس کی الوہیت کو بٹہ لگتا ہے۔ جن صفات کا اثبات کیا ہے ان میں سب سے پہلے اس کے حیّ و قیّوم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ حیّ کے معنی زندہ کے ہیں اور قیّوم کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم اور سب کو قائم رکھنے والی اور سب کو سنبھالنے والی ہو۔ ظاہر ہے کہ جو خود زندہ نہ ہو وہ تمام دنیا جہان کے لیے زندگی بخش کس طرح ہوسکتا ہے اور جو خود اپنی ذات سے قائم نہ ہو وہ آسمان و زمین کو قائم رکھنے والا کس طرح ہوسکتا ہے اور جو ذات ان صفات سے عاری ہو اس کو خدا ماننے کے کیا معنی؟ اور جب خدا ان صفات سے متصف ہے اور لازماً اس کو ان صفات سے متصف ہونا چاہیے بھی تو پھر کسی کو اس کا شریک و سہیم ماننا ایک بالکل بے جوڑ سی بات ہے۔

اس طرح قرآن نے ان تمام معبودوں کی نفی کردی جو نہ زندہ ہیں، نہ زندگی کا سرچشمہ اور نہ خود قائم ہیں اور نہ دوسروں کے قائم رکھنے والے بلکہ خود اپنی زندگی اور اپنے قیام و بقا کے لیے ایک حیّ و قیوم کے محتاج ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی نہ نیند۔ یہ نیند کی ابتدا اور اس کی انتہا دونوں سے اس کو بری قرار دیا گیا ہے اور یہ اس کے حیّ و قیوم ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ نیند، موت کے ظلال و آثار اور اس کے مظاہر و مبادیات میں سے ہے اس وجہ سے یہ خدا کی شان کے منافی ہے۔ پھر یہ اس کے قیوم ہونے کے بھی منافی ہے، جو خود نیند سے مغلوب ہوکر اپنے کو قائم نہ رکھ سکے گا وہ دنیا کو کیا قائم رکھے گا اور جب وہ ہر لمحہ خود بیدار ہے اور اپنی دنیا کی نگرانی کر رہا ہے تو پھر یہ کیوں فرض کیا جائے کہ وہ اس دنیا کے انتظام و انصرام میں کسی اور کا بھی محتاج ہے۔

شفاعت کی حقیقت

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت ہے اور اسی کے اختیار میں ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے قرآن کے مخاطبوں میں سے نہ کسی کو انکار تھا اور نہ کسی کے لیے اس سے انکار کی گنجائش تھی، اس لیے کہ اس سے انکار کے معنی خدا کی خدائی کے انکار کے تھے۔ چنانچہ اس مسلمہ حقیقت سے شفاعت کے اس عقیدے کے باطل ہونے کی طرف رہنمائی فرمائی جس میں عرب کے مشرکین اور اہل کتاب سب کسی نہ کسی نوعیت سے مبتلا تھے۔ فرمایا کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ

عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ، یعنی جب سب کے سب خدا ہی کے مملوک و محکوم اور اسی کے تابعدار و محکوم ہیں تو کس کی مجال ہے کہ خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور میں کسی کی سفارش کے لیے زبان کھول سکے۔ اس ارشاد نے شفاعت کے اس تصور کا بالکل خاتمہ کر دیا جس کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ بعض شرکا کو خدا کے ہاں اعتماد اور تدلل کا یہ درجہ حاصل ہے کہ وہ کسی کے لیے خود بڑھ کر خدا سے سفارش کر سکتے ہیں اور خدا ان کی ناز برداری میں لازماً ان کی سفارش قبول بھی فرمائے گا۔ فرمایا کہ نہ خدا کے ہاں کسی کا یہ درجہ ہے اور نہ کوئی اس کے دربار میں اس کی اجازت کے بغیر زبان کھولنے کی جرأت کر سکے گا۔ اسی حقیقت کو دوسری جگہ اس طرح ظاہر فرمایا ہے۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ، بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۲۶-۲۷ الانبیاء (اور مشرکین کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہے، اللہ ان چیزوں سے پاک و برتر ہے فرشتے خدا کی اولاد نہیں بلکہ اس کے باعزت بندے ہیں، وہ اس کے آگے بات کرنے میں سبقت نہیں کرتے وہ بس اس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں)

پھر فرمایا کہ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ یعنی خدا کے سامنے کسی کے بارے میں زبان کھولنے کی جسارت تو وہ کرے جو خدا کی معلومات میں کچھ اضافہ کر سکتا ہو اور یہ کہنے کی پوزیشن میں ہو کہ فلاں کے بارے میں نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو پوری آگاہی نہیں ہے ملا سے ہے۔ لیکن یہ حیثیت کس کی ہے؟ اللہ تعالیٰ سب کے آگے اور پیچھے اور اس کے ماضی و مستقبل ہر چیز سے باخبر ہے۔ برعکس اس کے دوسرے کسی کا بھی یہ درجہ و مرتبہ نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم کے کسی حصے کا بھی احاطہ کر سکے۔ دوسروں کے لیے اس کے علم میں سے بس اتنا ہی ہے جتنا وہ از خود اپنے بندوں میں سے کسی پر کھول دے۔ اللہ تعالیٰ کے علم کی یہ وسعت اور دوسروں کے علم کی یہ محدودیت مشرکین کے تصور شفاعت کا بالکل خاتمہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ قرآن نے شفاعت کی تردید کرتے ہوئے اکثر مقامات میں علم الٰہی کی اس وسعت اور دوسروں کے علم کی محدودیت کا حوالہ دیا ہے مثلاً يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۲۸ - انبیاء (اللہ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر ان کے لیے جن کے لیے اللہ پسند فرمائے اور وہ اس کی خشیت سے ڈرتے ہوں گے) يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ۱۰۹-۱۱۰ طٰہٰ (اور اس دن کسی کو کسی کی شفاعت کچھ نفع نہ پہنچائے گی مگر جس کے لیے خدائے رحمان اجازت دے اور اس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے، وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے پیچھے اور ان کے آگے ہے اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا)

شفاعت کا یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے اس لیے کہ یہ بندے کا اعتماد خدا کے بجائے بندے پر جاتی

ہے اور اس طرح یہ شرک کی راہ کھولتی ہے۔ اس کے بجائے قرآن نے شفاعت کا یہ تصور دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں میں سے جس کو چاہے گا اور جس کے لیے چاہے گا شفاعت کی اجازت دے گا اور وہ خدا سے ڈرتے ہوئے وہی بات زبان سے نکالے گا جو بالکل حق ہوگی۔ یہ شفاعت چونکہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوگی نیز اسی کے لیے ہوگی جس کے لیے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے، اور یہ نہ تو کسی حق کو باطل بنائے گی اور نہ کسی باطل کو حق بلکہ ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہوگی اس وجہ سے یہ بندے کا اعتماد خدا پر جمانے والی اور توحید کے تقاضوں کے مطابق ہے چنانچہ اس شفاعت کے لیے اس نے گنجائش رکھی ہے اور اس سے وہ اپنے ان بندوں کو نوازے گا جن کو چاہے گا۔ اس موضوع پر ہم انشاء اللہ سورۂ انعام میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔ یہاں اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

جس طرح شفاعت میں یہ استثنا ہے اسی طرح علم کے باب میں بھی یہ استثنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم میں سے جتنا کسی بندے کے لیے چاہتا ہے، دیتا ہے۔ یعنی خدا کے تمام علم کا احاطہ کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کے نبیوں، رسولوں اور اس کے فرشتوں کو جو علم حاصل ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہی ہوتا ہے جتنا وہ کسی کو بخشتا ہے۔

آگے ارشاد ہوا وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا۔ یعنی اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین کے ہر گوشے اور کونے پر حاوی ہے۔ یہ صورت نہیں ہے کہ اس کی وسیع مملکت کے بعض دور دراز گوشے ایسے ہوں جہاں اس کو اپنا اقتدار پوری طرح جمانے میں کامیابی نہ ہوئی ہو اور وہ ان میں اقتدار جمانے کے لیے دوسرے معبودوں کو اپنا شریک اقتدار بنانے پر مجبور ہو۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہیں ہے جو اپنی سلطنت کو سنبھالے رکھنے کے لیے نائبوں اور مددگاروں کے محتاج ہوتے ہیں، ان کے بغیر ان کے لیے حکومت کا انتظام دشوار ہو جاتا ہے بلکہ وہ غیر محدود علم، غیر محدود قدرت اور غیر محدود قوتِ تصرف کا مالک ہے اس لیے جس طرح ہم اپنے مکان کے صحن کی دیکھ بھال کر لیتے ہیں اس سے ہزاروں لاکھوں درجہ سہولت کے ساتھ وہ اپنی اس آسمان و زمین پر حاوی مملکت کا انتظام فرماتا ہے اور ذرا بھی اس کا بوجھ محسوس نہیں کرتا کہ وہ کسی کی طرف سے ہاتھ بٹانے کا محتاج ہو۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ علی اور عظیم ہے۔ یعنی اس کی ہستی بڑی ہی بلند اور بڑی ہی عظیم ہے، اس کے علم، اس کی قدرت اور اس کی وسعت کو اپنے محدود پیمانوں سے نہ ناپو، یہیں سے اس کے بارے میں گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں اور شرک کی راہیں کھلتی ہیں۔ اپنی صفات کے باب میں جو کچھ وہ خود بتاتا ہے اس پر ایمان لاؤ اور ظن و قیاس اور تشبیہ و تمثیل کی خیال آرائیوں سے بچو۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۵۶)

لفظ 'طاغوت' کی تحقیق

طاغوت بروزن ملکوت و جبروت، طغیٰ کے مادہ سے ہے جس کے معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ جو چیز اپنی حد مناسب سے آگے بڑھ جائے اس کے لیے عربی میں کہیں گے طغیٰ، طغی الماءُ پانی حد سے آگے بڑھ گیا۔ قوم ثمود جس آفت سے ہلاک ہوئی اس کے لیے طاغیہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی آفت کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ حدود عبدیت و بندگی سے نکل جانے کے لیے استعمال ہوا اور جو حدودِ بندگی سے نکل جائے اس کو طاغوت کہنے لگے۔ پھر وسعت اختیار کر کے یہ لفظ ان چیزوں پر بھی حاوی ہو گیا جو حدودِ بندگی سے نکل جانے کا باعث یا ذریعہ بنیں۔ اہل لغت اسی وجہ سے اس کی تشریح عام طور پر یوں کرتے ہیں کہ اَلطَّاغُوْتُ عِبَارَۃٌ عَنْ کُلِّ مُتَعَدٍّ وَکُلِّ مَعْبُوْدٍ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (طاغوت سے مراد ہر وہ وجود ہے جو بندگی سے نکل جائے اور ہر وہ معبود ہے جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے)

قرآن نے اس لفظ کو مختلف مقامات میں استعمال کیا ہے اور ہر جگہ اس کے مقابل کا ذکر کر کے اس کے مختلف مفہوموں پر روشنی ڈال دی ہے۔ مثلاً زیر بحث آیت میں ہے فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ یہاں اللہ کے مقابل سے واضح ہے کہ طاغوت سے مراد ماسوا اللہ ہے۔ سورہ نحل میں ہے اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ یہاں بھی اللہ کے سوا دوسرے معبودان باطل مراد ہیں۔ سورہ نساء میں ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ اس کے بعد معاً فرمایا فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ جس سے متعین ہو گیا کہ طاغوت سے مراد شیطان ہے اور شیطان کا لفظ شیاطین انس اور شیاطین جن دونوں کو شامل ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام میں اس لفظ کو کتابِ الٰہی اور طریقۂ رسول کے مخالف طریقہ کے لیے استعمال فرمایا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا ۝ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا۔ ۶۰-۶۱- اس آیت میں یَتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ کے بالمقابل تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ کہہ کر یہ واضح کر دیا کہ طاغوت سے یہاں مراد وہ چیزیں ہیں جو کتابِ الٰہی اور سنتِ رسول کے خلاف ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو خدا کی بندگی و اطاعت سے نکل جائے یا نکل جانے کا باعث اور ذریعہ ہو وہ سب اس لفظ کے مفہوم میں شامل ہے۔

'لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ' کا مفہوم

اوپر آیت وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِھِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْھُمُ الْبَیِّنٰتُ الآیۃ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے جس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا یہ اس کی مزید وضاحت فرما دی کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اللہ کے رسول کی اصل ذمہ داری صرف حق کو واضح طور پر پہنچا دینا ہے اور جب یہ کام ہو چکا، حق باطل سے بالکل الگ ہو کر سامنے آ گیا، تو رسول کی جو ذمہ داری ہے وہ پوری ہو چکی۔

اب ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جن پر حجت تمام ہو چکی ہے، وہ چاہیں تو ایمان لائیں اور چاہیں تو کفر کی روش پر اڑے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں جبرِ فطری کی راہ نہیں اختیار فرمائی ہے بلکہ لوگوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی بخشی ہے۔ اگر وہ چاہتا تو ساری دنیا کو نیکی ہی کی ڈگر پر ہانک دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اس نے لوگوں کو آزادی دی ہے۔ جو لوگ ایمان لائیں گے وہ اس کا صلہ پائیں گے، جو کفر کی راہ اختیار کریں گے وہ اس کی سزا بھگتیں گے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف مقامات میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے مثلاً وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۳۵-۳۷ نحل (اور یہ مشرکین کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کو نہ پوجتے، نہ ہم نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہرا سکتے ایسا ہی سوال اٹھایا ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں تو کیا رسولوں پر واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری بھی ہے؟ ہم نے تو ہر امت میں ایک رسول اٹھایا اس دعوت کے ساتھ کہ لوگو، اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو، تو ان میں سے کچھ ایسے ہوئے جن کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کچھ ایسے ہوئے جو گمراہی کے سزاوار ٹھہرے، تو ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ رسولوں کو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا! اگر تم ان لوگوں کی ہدایت کے حریص ہو تو یاد رکھو کہ اللہ ان لوگوں کو ہدایت دینے والا نہیں ہے جن کو گمراہی کا سزاوار ٹھہرا چکا اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے)۔

یہ جبرِ فطری کی نفی ہے، جبرِ قانونی کی نہیں،

قرآن مجید میں یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے مختلف مقامات میں بیان ہوا ہے۔ ہم نے طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک آیت کے نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے ٹکڑے میں جس جبر و اکراہ کی نفی کی گئی ہے اس سے مقصود جبرِ فطری کی نفی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں یہ طریقہ نہیں اختیار فرمایا ہے کہ وہ اپنی مشیت و قدرت کے زور سے لوگوں کو ہدایت پر چلا دے یا گمراہی کی طرف ہانک دے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا تو نہیں تھا لیکن یہ بات اس کی حکمت اور اس کے عدل کے خلاف ہوتی۔ اس نے اس کے برعکس یہ طریقہ اختیار فرمایا ہے کہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے لوگوں کے سامنے حق اور باطل دونوں کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے، پھر جو لوگ حق کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کو راہِ حق اختیار کرنے کی توفیق ارزانی کرتا ہے اور جو لوگ باطل کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کو اس کے لیے ڈھیل دے دیتا ہے۔

مقصود اس حقیقت کے واضح کرنے سے ایک تو ان کفار و مشرکین کو جواب دینا تھا جو اس جبر کی آڑ

لے کر اپنے کفر و شرک کو ثواب ٹھہرانا چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ان کا عقیدہ و عمل باطل ہے تو خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، وہ اپنی قدرت کاملہ سے کام لے کر ان کو ٹھیک کیوں نہیں کر دیتا۔ دوسرے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح کرنا تھا کہ بحیثیت نبی اور رسول کے ان کی ذمہ داری صرف دین حق کو اچھی طرح واضح کر دینا ہے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ لازماً ایمان و ہدایت کی راہ اختیار بھی کر لیں۔

اس زمانے میں بعض کم سواد اس آیت کو اس کے اس مفہوم سے ہٹا کر جبر قانونی کی نفی کے معنی میں لیتے ہیں اور اس سے یہ دلیل لاتے ہیں کہ چونکہ اسلام میں اکراہ نہیں ہے اس وجہ سے اسلام کے نام سے فلاں اور فلاں باتوں کو جو مستوجب سزا قرار دیا جاتا ہے یہ محض مولویوں کی من گھڑت باتیں ہیں، اسلام سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس گروہ کے اس استدلال کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلامی شریعت حدود و تعزیرات سے ایک بالکل خالی شریعت ہے جس میں ہر شخص کو سب کچھ کر گزرنے کی چھوٹ حاصل ہے۔ نہ زنا، تہمت اور چوری پر کوئی سزا ہے۔ نہ ڈکیتی، رہزنی، فساد فی الارض اور بغاوت پر کوئی تعزیر۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام میں حدود و تعزیرات کا ایک پورا نظام ہے جس کا نفاذ واجبات دین میں سے ہے۔ اگر ایک شخص نماز نہ پڑھے یا روزے نہ رکھے تو اسلامی حکومت اس کو بھی سزا دے سکتی ہے یہ چیز لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے منافی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان اسلام کے خلاف بغاوت کی روش اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے بھی اسلامی قانون میں سزا ہے۔ یہ چیز بھی لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے خلاف نہیں ہے۔ فتنہ و فساد کو خدا کی زمین سے مٹانے کے لیے اسلام نے اہل ایمان پر جہاد بھی واجب کیا ہے، یہ چیز بھی لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے منافی نہیں ہے۔

اس امر میں شبہ نہیں ہے کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ ایک شخص اسلام کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد بھی جو اس کے جی میں آئے کرتا پھرے اور اس پر کوئی گرفت نہ ہو بلکہ وہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اسلام کے حدود و قیود کی پابندی کرے۔ لادینی نظاموں میں مذہب کو نجی زندگی سے متعلق مانا جاتا ہے اس وجہ سے ان میں حکومت کی نافرمانیوں پر تو سزائیں اور تعزیرات ہیں لیکن خدا سے بغاوت کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اسلام میں مذہب کے پرائیویٹ زندگی سے مخصوص ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ اسلامی حکومت اصلاً خدا ہی کی حکومت ہوتی ہے، اور ریاست کا سیاسی ادارہ صرف خدا کے احکام و قوانین کے اجراء و نفاذ کا ایک ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس میں خدا کی ہر نافرمانی قابل گرفت ہوتی ہے۔ خواہ وہ نافرمانی مخفی ہو یا ظاہر۔ فرق ہے تو یہ ہے کہ مخفی نافرمانیوں پر خدا کی اخروی عدالت گرفت کرے گی اور ظاہری نافرمانیوں پر اسلام کی دنیوی عدالتیں گرفت کرنے اور ان پر سزا دینے کی مجاز ہیں۔ ارتداد بھی اسی زمرے کا ایک جرم بلکہ بہت بڑا جرم ہے اور اس پر جو سزا ایک اسلامی نظام میں دی جاتی ہے۔ وہ اس بات پر نہیں دی جاتی کہ ایک

شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس بات پر دی جاتی ہے کہ اس نے خدا کی حکومت اور اس کے قانون کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہے۔

اسی طرح اس امر سے ہمیں انکار نہیں ہے کہ مجرد کسی قوم کے اندر کفر کا وجود اس امر کے لیے کافی وجہ نہیں ہے کہ اسلام کے علمبرداران کے خلاف جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور تلوار کے زور سے ان کو اسلام پر مجبور کر دیں۔ کافر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق لازماً ہر شکل میں معاندانہ ہی نہیں بلکہ مصالحانہ بھی ہو سکتا ہے۔ جہاد اصلاً فتنہ اور فساد فی الارض کے مٹانے کے لیے شروع ہوا ہے اگر یہ چیز کہیں پائی جاتی ہے تو اہلِ ایمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ استطاعت رکھتے ہوں تو اس فتنہ اور فساد فی الارض کو مٹانے کے لیے جہاد کریں، خاص طور پر اس فتنہ کو مٹانے کے لیے جو اہلِ کفر کے ہاتھوں اس لیے برپا کیا جائے کہ اہلِ ایمان کو ان کے دین سے پھیرا جائے یا اسلامی نظام کو برباد کیا جائے۔ اس فتنے کے استیصال کے بعد اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس نے اپنے نظام میں اس بات کی پوری گنجائش رکھی ہے کہ اہلِ کفر اپنے کفر پر قائم رہتے ہوئے اسلامی حکومت کی رعایا رہ سکتے ہیں۔ اور ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ صرف مشرکین بنی اسمٰعیل کا معاملہ اس کلیہ سے ایک استثنا کی نوعیت رکھتا ہے۔ اس کے وجوہ تفصیل کے ساتھ اسی سورہ کی آیات ۱۹۲-۱۹۳ کے تحت بیان کر چکے ہیں اور مزید وضاحت کے ساتھ اس پر ہم ان شاء اللہ سورۂ برأت کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے) یہ مذکورہ اکراہ کی نفی کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ خدا کی طرف سے اتمامِ حجت کے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے اپنے نبی کے ذریعے سے حق و باطل کو الگ الگ کر دیا۔ اس کے بعد اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔ جس کا جی چاہے حق کو اختیار کرے اور جس کا جی چاہے باطل کے ساتھ چمٹا رہے۔ البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جو لوگ اس وضاحت کے بعد بھی باطل سے چمٹے رہیں گے تو ایک دن آئے گا کہ خود یہ باطل ان کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ نہ ٹوٹنے والی رسی صرف ان کے ہاتھ میں ہوگی جو آج غیر اللہ سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف یکسو ہو جائیں۔

آخر میں سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ کی صفت کا حوالہ اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ جو لوگ غیر اللہ کو چھوڑ کر اللہ ہی کی رسی پکڑتے ہیں وہ ایک ایسے کا دامن پکڑتے ہیں جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے اس وجہ سے وہ ہر قدم پر اور ہر مرحلے میں ان کا ملجا و ماویٰ ہے۔ برعکس اس کے جو غیر اللہ کی پرستش کر رہے ہیں وہ ایسوں کے سہارے پر جی رہے ہیں جنھیں ان کے آغاز و انجام کا تو درکنار خود اپنے آغاز و انجام کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ یہاں تک کہ انھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ کچھ نادان لوگ ان کی پرستش کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی اس بے خبری کا اظہار آخرت میں کریں گے اور اپنے ان پرستاروں پر لعنت بھیجیں گے۔

۸۲۔ آگے کا مضمون ____ آیات ۲۵۷-۲۶۰

’لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ الایۃ‘ میں ہدایت وضلالت سے متعلق جس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے آگے کی چند آیات میں اس کی مزید وضاحت فرمادی ہے۔ پھر کلام اصل سلسلہ بیان یعنی انفاق سے جڑ گیا ہے۔ یہ وضاحت تین واقعاتی مثالوں کے ذریعے سے کی گئی ہے اس لیے کہ حقائق جب تک مثالوں سے نہ واضح کیے جائیں اس وقت تک وہ اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتے۔ قرآن مجید کا عام اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ پہلے ہر مسئلے سے متعلق عقلی وفطری دلائل پیش کرتا ہے۔ پھر تاریخی اور واقعاتی مثالوں سے اس کو مدلل اور دل نشین بناتا ہے چنانچہ یہاں بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ ہدایت وضلالت سے متعلق اصل قانون الٰہی اصولی شکل میں پیش کرنے کے بعد تین مثالیں پیش کی ہیں جن میں سے ایک سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں جو شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور جن کو گمراہی سے نکل کر ہدایت کی طرف آنا نصیب نہیں ہوتا اور دوسے یہ واضح ہوتا ہے کہ کس طرح کے لوگ ہوتے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ دستگیری فرماتا ہے اور ان کو ہر قسم کی الجھنوں سے نکال کر ایمان ویقین کی روشنی اور شرح صدر کی طمانیت بخشتا ہے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۲۵۷-۲۶۰
اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ
النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ۲۵۷ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ ع ۳۴ / ۲
اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وقف لازم
وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ
يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ
فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۲۵۸
اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ

قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ
مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا
اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى
طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ
اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا
لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿٢٥٩﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىْ كَيْفَ تُحْىِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ
اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ ؕ قَالَ فَخُذْ
اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ
مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٦٠﴾ ع ٣٥ ٣

ترجمۂ آیات ٢٥٧-٢٦٠

اللہ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے کارساز طاغوت بنتے ہیں، وہ ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف دھکیلتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخی ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ٢٥٧۔

کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے باب میں اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا، جب کہ ابراہیم نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، وہ بولا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے

کہا کہ یہ بات ہے تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو اسے پچھم سے نکال دے تو وہ کافر یہ سن کر بھوچکا رہ گیا اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا ۔ ۲۵۸

یا جیسے کہ وہ جس کا گزر ایک بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی، اس نے کہا کہ بھلا اللہ اس کو اس کے فنا ہو چکنے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اس کو سو سال کی موت دے دی، پھر اس کو اٹھایا۔ پوچھا کتنی مدت اس حال میں رہے؟ بولا ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ، فرمایا بلکہ تم پورے سو سال اس حال میں رہے۔ اب تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو، ان میں سے کوئی چیز بسی تک نہیں، اور اپنے گدھے کو دیکھو، ہم اس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں تاکہ تمھیں اٹھائے جانے پر یقین ہو اور تاکہ ہم تمھیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور ہڈیوں کی طرف دیکھو، کس طرح ہم ان کا ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس پر حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی وہ پکار اٹھا کہ میں مانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۵۹

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب، مجھے دکھا دے تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ فرمایا کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے؟ بولا ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا، تو چار پرندے لو اور ان کو اپنے سے ہلا لو، پھر ان کو ٹکڑے کر کے ہر پہاڑی پر ان کا ایک ایک حصہ رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ وہ تمھارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے اور جان رکھو کہ اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۲۶۰

۸۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۥ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۵۷)

ولی کا مفہوم

ولی، کے معنی مددگار، کارساز، ساتھی اور حمایتی کے ہیں۔

نور اور ظلمت سے مراد اور ان کی نوعیت

نور سے مراد یہاں عقلی، ایمانی، عملی اور اخلاقی روشنی ہے۔ اسی طرح ظلمت سے یہاں مراد عقلی و اخلاقی ظلمت ہیں۔ چونکہ حق کی روشنی کا منبع ایک ہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ، نیز حق میں انتشار نہیں بلکہ وحدت پائی جاتی ہے اس وجہ سے یہ لفظ واحد استعمال ہوا۔ برعکس اس کے ظلمت، جمع استعمال ہوا اس لیے کہ اس کے ظہور میں آنے کے راستے بھی مختلف ہیں اور اس کے مزاج میں انتشار و اختلاف بھی ہے۔

لفظ 'طاغوت' کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں اصل نکتہ

مطلب یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اصل اہمیت رکھنے والی شے یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کا دامن پکڑتا ہے یا کسی غیر کا۔ اگر خدا کا دامن پکڑتا ہے تو خدا اپنے بندے کا کارساز و مددگار بن جاتا ہے اور اپنی توفیق بخشی سے درجہ بدرجہ اسے نفس و شبہات کی تمام تاریکیوں اور کفر، شرک اور نفاق کی تمام ظلمات سے نکال کر ایمان کامل و توحید خالص کی شاہراہ پر لا کھڑا کرتا ہے اور اگر بندہ اپنے رب سے منہ موڑ کر کسی اور راہ پر جا نکلتا ہے تو پھر وہ شیطان اور اس کی ذریات کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور وہ اس کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے کر عقل و فطرت کی ہر روشنی سے دور کر کے اس کو ضلالت کے کھڈ میں گرا دیتے ہیں۔ مشہور مثل ہے 'خانہ خالی را دیو میگیرد' جس گھر میں آدمی نہیں رہتا وہ شیطان کا مسکن بن جاتا ہے۔ اسی طرح جو دل ایمان سے خالی ہوتا ہے وہ شیطان کا اڈا بن جاتا ہے۔ اور پھر شیاطین ایسے شخص کو گمراہی کی وادیوں میں سرگشتہ و حیران رکھتے ہیں۔ سورۂ انعام میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓي اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ (۷۱) (کہہ دو کیا ہم اللہ کے سوا ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع پہنچاتے نہ نقصان اور اللہ کی ہدایت بخشی کے بعد پھر پیٹھ پیچھے پلٹا دیے جائیں، اس شخص کے مانند جس کو شیاطین نے بہکا کر کسی صحرا میں سرگشتہ و حیران چھوڑ دیا ہو) اعراف میں بھی اس کا ذکر ہے۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ (۱۷۵) (اور ان کو اس کا ماجرا سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتوں سے نوازا تو وہ ان سے نکل بھاگا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہوں میں سے بن گیا)۔ یہی بات سورۂ زخرف میں بھی ارشاد ہوئی ہے۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُـقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (۳۶) (جو لوگ اللہ کے ذکر سے بے پروا ہو جاتے ہیں، ہم ان پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں

اور وہ ان کا ساتھی بن جاتا ہے)۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَاۗجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ
الَّذِيْ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ
الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۵۸)

"اَلَمْ تَرَ" کے خطاب کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔

الَّذِیْ حَآجَّ سے کیا مراد ہے

"اَلَّذِیْ" سے اگرچہ یہاں واضح نہیں ہے کہ کون مراد ہے لیکن ہمارے مفسرین نے اس سے عام طور پر نمرود کو مراد لیا ہے۔ یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کا ہم عصر بادشاہ تھا اور تالمود میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اس کا وہ مناظرہ بھی مذکور ہے جس کی طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے۔

اوتار بادشاہ کا تصور

"فِیْ رَبِّهٖ" رب کے بارے میں بحث کی وجہ یہ ہوئی ہو گی کہ اس زمانے میں عام طور پر جو بادشاہ ہوتے تھے وہ اپنے آپ کو اوتار بادشاہ (God Kings) کی حیثیت سے نمایاں کرتے تھے۔ یعنی ان کی قوم کے لوگ جن دیوتاؤں کو پوجتے تھے بادشاہ ان میں سے سب سے بڑے دیوتا کا مظہر سمجھا جاتا تھا، اس طرح بادشاہ کو بیک وقت سیاسی اور مذہبی دونوں قسم کا اقتدار حاصل ہو جاتا تھا۔ ہندوستان، چین اور مصر وغیرہ کے قدیم بادشاہوں میں سے اکثر کی حیثیت یہی تھی۔ نمرود کی قوم جن دیوتاؤں کو پوجتی تھی، قدیم صحیفوں اور قرآن دونوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سورج کو سب سے بڑے دیوتا کا درجہ حاصل تھا اس وجہ سے لازماً نمرود سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا رہا ہو گا۔ اس زعم کے ساتھ، ظاہر ہے کہ اپنی خدائی میں کسی اور خدا کی خدائی کی دعوت اس کے لیے ایک بالکل ناقابلِ برداشت چیز تھی۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اس بات کا اعلان کیا ہو گا کہ رب حقیقی صرف اللہ واحد ہی ہے، اس کے سوا کوئی رب نہیں تو اس دعوت کی زد اس نے اپنی خدائی پر بھی پڑتی محسوس کی ہو گی اور حضرت ابراہیمؑ کو بلا کر ان سے باز پرس کی ہو گی کہ یہ کون رب ہے جس کی تم دعوت دے رہے ہو، رب تو میں ہوں کہ سورج دیوتا کا مظہر اور اس کا اوتار ہوں۔

ضلالت کا سب سے بڑا سبب استکبار ہے

"اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ" میں عربی زبان کے اسلوب کے مطابق "اَنْ" سے پہلے حرفِ جر محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس خدائی کے گھمنڈ میں وہ اس وجہ سے مبتلا ہوا کہ اللہ نے اس کو حکومت اور اقتدار بخشا۔ ہونا تو یہ تھا کہ اللہ کی بخشی ہوئی یہ نعمت پا کر وہ خدا کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بنتا لیکن تنگ ظرفوں اور کم عقلوں کے لیے نعمت اکثر گمراہی کا باعث ہوئی ہے اور انھوں نے اس کو شکر کی جگہ کفر کا سبب بنایا ہے۔ جن لوگوں کو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے جب وہ اس اقتدار کو اللہ کے فضل و کرم کے بجائے اپنے استحقاق، اپنے علم اور اپنی تدبیر کا ثمرہ سمجھ بیٹھتے ہیں تو وہ اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ خدا یہ اقتدار بخش کر ان کا امتحان کر رہا ہے بلکہ وہ استکبار میں مبتلا ہو کر خود اپنی خدائی کا تخت بچھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے تدبیر یہ اختیار کرتے ہیں کہ خدا کے اوتار یا مظہر یا ظل اللہ کے روپ میں اپنے کو پیش کرتے ہیں۔

چنانچہ دولت و نعمت اور اقتدار کا گھمنڈ ہمیشہ ضلالت کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب رہا ہے۔ بہت کم خوش قسمت ایسے نکلے ہیں جو اپنے آپ کو اس فتنہ سے بچا سکے ہیں۔

حضراتِ انبیاء کا طریقِ بحث

نمرود کے سوال کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب کی تعریف میں سب سے پہلے وہی بات کہی جو سب سے زیادہ واضح تھی۔ یعنی میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے۔ جو شخص بھی زندگی اور موت کے سوال پر غور کرتا ہے یہ سوال اس کو خدا کے ماننے پر مجبور کر دیتا ہے بشرطیکہ اس کے دماغ میں کوئی خلل نہ ہو لیکن نمرود کے ذہن میں اقتدار کا خناس سمایا ہوا تھا اس وجہ سے اس نے اس واضح حقیقت پر بھی یہ معارضہ کر دیا کہ موت اور زندگی پر اختیار تو میں بھی رکھتا ہوں، جس کا چاہوں سر قلم کر دوں، جس کو چاہوں بخش دوں۔ ظاہر ہے کہ یہ معارضہ ایک بالکل ہی احمقانہ معارضہ تھا اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک بالکل ہی دوسری بات فرمائی تھی اور یہ ایک بالکل ہی دوسری بات تھی۔ حضرت ابراہیمؑ چاہتے تو دونوں باتوں کے درمیان جو فرق ہے اس کو واضح کر دیتے لیکن انھوں نے محسوس فرما لیا کہ ان کی واضح بات پر اس قسم کا احمقانہ معارضہ وہی کر سکتا ہے جو کٹ حجتی پر اتر آیا ہو اس وجہ سے انھوں نے اس کو مزید حجت کے لیے موقع دینا پسند نہیں فرمایا۔ انبیاء علیہم السلام مناظر نہیں بلکہ داعی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے خاص اس پہلو پر الجھنے کے بجائے اپنے رب کی ایک دوسری صفت بیان کر دی جس میں نمرود کے لیے کسی بحث کی راہ بالکل مسدود تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ اچھا، اگر یہ بات ہے تو میرا رب روز سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم ایک دن ذرا اس کو مغرب سے نکال کر دکھا دو۔ حجت ابراہیمی کا یہ وار ایسا بھرپور تھا کہ وہ بکا بکا رہ گیا۔ یہاں بلاغت کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خاص طور پر سورج کی تسخیر کا ذکر فرمایا جس کو نمرود کی نظر میں معبودِ اعظم کی حیثیت حاصل تھی اور وہ اپنے آپ کو اسی معبودِ اعظم کا مظہر بنائے ہوئے بیٹھا تھا۔ بہترین استدلال اور لطیف ترین طنز کی یہ ایک نہایت خوب صورت مثال ہے۔

ہدایت و ضلالت کے معاملے میں سنت اللہ

آخر میں فرمایا کہ "اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں بخشا کرتا" یہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں بطور خلاصۂ بحث وہ اصول بیان ہوا ہے جس کو واضح کرنے ہی کے لیے اوپر والا واقعہ مذکور ہوا ہے۔ اس میں ظالم کا لفظ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں ظالم سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو بے جا استعمال کرتے ہیں، جو اللہ کے انعامات کو اس کا فضل قرار دینے کے بجائے ان کو اپنا حق سمجھتے ہیں، جو نعمتوں پر خدائے منعم کے شکرگزار رہنے کے بجائے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہوتے اور ابلیس کی طرح اکڑتے ہیں، جو خدا کی بندگی اور فرمانبرداری کی روش اختیار کرنے کے بجائے خود اپنی خدائی کے تخت بچھاتے اور اپنے کو رب ٹھہراتے ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ اس ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں ان پر ہدایت کی راہ نہیں کھلا کرتی۔ ایسے لوگوں کے سامنے حق کتنے ہی واضح طریقہ پر آئے وہ اس کو قبول کرنے کے بجائے بحث اور کٹ حجتی کی کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کو اس کی کوئی راہ ملتی نظر نہیں

آتی تو وہ نمرود کی طرح بھکے بکے اور ششدر ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن حق کو قبول پھر بھی نہیں کرتے۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۵۹)

'او کالذی' استعمال

حرف 'او' اصلاً تقسیم کے لیے آیا کرتا ہے۔ پہلے ان لوگوں کی مثال پیش کی جن کا ذکر اوپر 'اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓـُٔھُمُ الطَّاغُوْتُ' کے الفاظ سے فرمایا تھا، اب یہ ان لوگوں کی مثال بیان ہو رہی ہے جن کا ذکر 'اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ' سے فرمایا ہے۔

ایک بندۂ مومن جو طالب یقین تھا

اس تقسیم کی مثال اسی سورہ کی آیات ۲۰۱، ۲۰۲ میں گزر چکی ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک صاحب کشاف کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہاں جس شخص کا حوالہ دیا گیا ہے وہ کافر تھا بلکہ یہ ایک ایسے بندۂ مومن کا ذکر معلوم ہوتا ہے جو ایمان سے تو بہرہ ور تھا لیکن وہ اپنے اس ایمان میں اس اطمینانِ قلب اور یقین کا طالب تھا جس کو حق الیقین کہتے ہیں۔ اس کا یہ سوال کہ اس بستی کو خدا اس طرح فنا ہو جانے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟ انکار کی نوعیت کا نہیں بلکہ اظہار حیرت کی نوعیت کا ہے۔ انسان بسا اوقات ایک چیز کو مانتا ہے اس لیے کہ عقل و فطرت اس کی گواہی دے رہی ہوتی ہے لیکن وہ بات بجائے خود ایسی حیران کن ہوتی ہے کہ اس سے متعلق دل میں بار بار یہ سوال ابھرتا رہتا ہے کہ یہ کیسے واقع ہو گی؟ یہ سوال انکار کے جذبہ سے نہیں بلکہ جستجوئے حقیقت کے جوش سے ابھرتا ہے اور خاص طور پر ان مواقع پر زیادہ زور سے ابھرتا ہے جب سامنے کوئی ایسا منظر آجائے جو باطن کو جھنجوڑ دینے والا ہو۔ یہ حالت ایمان کے منافی نہیں بلکہ اس ایمان کے مقتضیات میں سے ہے جس کی بنیاد عقل و بصیرت پر ہو۔ یہ سلوک باطن کی ایک ریاضت ہے جس سے ہر طالب حقیقت کو گزرنا پڑتا ہے اور یہ سفر برابر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ کے انوار سے قلب و نظر جگمگا نہ جائیں۔ اس سفر میں ہر منزل اگرچہ خوب سے خوب تر کی طرف اقدام کی نوعیت کی ہوتی ہے لیکن عارف کی نظر میں اس کا ہر آج اس کے گزشتہ کل سے اتنا زیادہ روشن ہوتا ہے کہ وہ کل اس کو آج کے مقابل میں شب نظر آتا ہے۔

'الذی' آیت ۲۵۹ میں کون مراد ہے؟

'اَلَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ' سے یہاں کس کی طرف اشارہ ہے؟ اس سوال کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ ارباب تفسیر میں سے کسی نے خضرؑ کا نام لیا ہے، کسی نے عزیرؑ کا لیکن قدیم صحیفوں میں ان دونوں بزرگوں سے متعلق کوئی اس قسم کا واقعہ منقول نہیں ہے جس کی طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے۔ البتہ صحیفۂ حزقی ایل میں اس سے ملتی جلتی ہوئی ایک چیز ملتی ہے جس کی نوعیت ایک مکاشفہ کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

حزقی ایل نبی کا ایک مکاشفہ

"خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے اپنی روح میں اٹھا لیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے پُر تھی مجھے اتار دیا اور مجھے ان کے پاس چوگرد پھرایا اور دیکھو وہ وادی کے میدان میں بکثرت اور نہایت سوکھی تھیں اور اس نے مجھے فرمایا اے آدم زاد، کیا یہ ہڈیاں زندہ ہو سکتی ہیں؟ میں نے جواب دیا، اے خداوند خدا تو ہی جانتا ہے، پھر اس نے مجھے فرمایا تو ان ہڈیوں پر نبوت کر اور ان سے کہہ اے سوکھی ہڈیو، خداوند کا کلام سنو۔ خداوند خدا ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ میں تمہارے اندر روح ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گی اور تم پر نسیں پھیلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تم کو چمڑا پہناؤں گا اور تم میں دم پھونکوں گا اور تم زندہ ہو گی اور جانو گی کہ میں خداوند ہوں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور جب میں نبوت کر رہا تھا تو ایک شور ہوا اور ایک زلزلہ آیا اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں، ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے۔ اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور ان پر چمڑے کی پوشش ہو گئی پر ان میں دم نہ تھا۔ تب اس نے مجھے فرمایا کہ تو نبوت کر، تو ہوا سے نبوت کر اے آدم زاد اور ہوا سے کہہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اے دَم تو چاروں طرف سے آ اور ان مقتولوں پر پھونک کہ زندہ ہو جائیں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور ان میں دم آیا اور وہ زندہ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئیں۔ ایک نہایت بڑا لشکر۔" (حزقی ایل باب ۳۷: ۱-۱۱)

قرآن اور تورات کے اختلاف کی نوعیت

اگرچہ قرآن اور تورات کے بیان میں کچھ فرق ہے لیکن یہ فرق تضاد کی نوعیت کا نہیں بلکہ اجمال و تفصیل کی نوعیت کا ہے۔ اس طرح کا فرق بسا اوقات ایک ہی مقصد کی دو روایات میں پایا جاتا ہے جس کو تناقض پر نہیں بلکہ اجمال و تفصیل پر محمول کیا جاتا ہے۔ قرآن میں بعض باتیں زیادہ ہیں جو تورات میں نہیں ہیں۔ ایسے مواقع میں قرآن کے بیان کو ترجیح حاصل ہو گی اس لیے کہ وہ براہِ راست خدا کا کلام اور بالکل محفوظ ہے۔ مثلاً تورات میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ خود حزقی ایل پر بھی سو سال کے لیے موت طاری کر دی گئی۔ اسی طرح ان کے کھانے کے نہ بُسنے اور گدھے کے دوبارہ زندہ ہونے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ لیکن ان کے ذکر نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ مشاہدات حزقی ایل کو نہیں ہوئے۔ جو مشاہدات ان کو کرائے گئے ان میں یہ بھی ہیں لیکن تورات میں یا تو ان کا ذکر نہیں ہوا یا ذکر تو ہوا لیکن اہلِ تورات نے اس کو ضائع کر دیا۔

آیات الٰہی کے مشاہدہ کے لیے سیر ملکوت

اگر قرآن کے اس حوالہ کا تعلق حزقی ایل نبی کے اسی مشاہدہ ملکوت سے مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ آیاتِ الٰہی کے مشاہدہ کے لیے اسی طرح کی ایک سیر ملکوت تھی جس طرح کی سیر ملکوت کی اس سے اعلیٰ مثال ہمارے یہاں واقعہ معراج ہے۔ یہ معاملات چونکہ ایک ایسے عالم میں پیش آتے ہیں جو ہمارے عالم کون و فساد کے ضابطوں اور زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماوریٰ ہے اس وجہ سے ایک کے احکام کو دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس عالم میں صدیوں اور قرنوں کے معاملات لمحوں

اور لمحوں میں انجام پاتے ہیں۔

"وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا" یہ گری ہوئی بستی کی تصویر ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ کہنہ عمارتیں جب گرتی ہیں تو ان کے انہدام کا آغاز ان کے کنگروں، میناروں اور ان کی چھتوں سے ہوتا ہے۔ پہلے بلندیاں پست ہوتی ہیں، اس کے بعد دیواروں کی باری آتی ہے۔

"اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهٖ" کے سوال کی نوعیت

"اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا" یہ سوال، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، انکار کی نوعیت کا نہیں بلکہ حیرت واستعظام کی نوعیت کا ہے۔ اس سے مقصود حق الیقین کی طلب تھی اس وجہ سے یہ ایمان کے منافی نہیں بلکہ اس کے مدارج ومقامات میں سے ہے۔ یقین کے مختلف مدارج ہیں اس وجہ سے اس کی طلب ہر درجے کے اشخاص میں پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ حضرات انبیاء بھی جو ایمان ویقین کے بلند ترین مدارج پر فائز ہوتے ہیں، اس سے مستغنی نہیں ہوتے بلکہ اس میں اضافہ کے لیے وہ بھی برابر دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے سوالات کے ابھرنے کا محل ایک طالبِ حقیقت کا اپنا ہی باطن ہوتا ہے۔ وہ یہ سوال دوسروں سے نہیں بلکہ خود اپنے ہی سے کرتا ہے اور اس کا جواب دوسروں سے نہیں بلکہ اس رہنمائے غیب سے چاہتا ہے جس کی تجلیات اس کے اپنے باطن کے افقِ اعلیٰ پر نمایاں ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، اسی نوعیت کی ایک خلش حزقی ایل بھی اپنے اندر محسوس فرماتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کا مشاہدہ کرا کے ان کی یہ الجھن دور فرما دی اور اس طرح ان کو نہ صرف حیات بعد الموت کے معاملے میں اطمینانِ قلب کی ٹھنڈک حاصل ہوگئی بلکہ جیسا کہ آگے واضح ہوگا، احیائے بنی اسرائیل کی اس مہم کے لیے بھی ان کا دل پوری طرح مضبوط ہوگیا جس پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوئے تھے۔ یہ سنت الٰہی ہے کہ وہ ہدایت کے طالبوں پر اپنی راہیں کھولتا اور ان کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے ان کی تربیت فرماتا اور ان کو روشنی عطا کرتا ہے۔

"كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ" یہ سوال و جواب اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ آدمی کا جو زمانہ عالم برزخ میں گزرے گا، اٹھنے پر اس کا کوئی احساس باقی نہیں رہے گا، ایسا معلوم ہوگا کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ اٹھے ہیں۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی، پھر موت، پھر برزخ، پھر قیامت ایک بہت دور کی بات ہے، اس کے لیے ابھی سے اپنا عیش مکدر کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن جب قیامت کو اٹھیں گے تو معلوم ہوگا جو کچھ گزرا ہے وہ بہت دور کی بات نہیں بلکہ بالکل صبح وشام کا قصہ ہے۔

"وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ" یہاں "اُنْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ" کے بعد كَيْفَ نُحْيِيْهِ کے الفاظ محذوف ہیں۔ یعنی دیکھو کہ کس طرح ہم اس گدھے کو زندہ کیے دیتے ہیں۔ اس حذف کی وجہ یہ ہوئی کہ آگے زندہ کرنے سے زیادہ عجیب ماجرے، اس کی سڑی گلی ہڈیوں کو جوڑنے اور ان پر گوشت دکھانا

چڑھانے کی تفصیل آرہی ہے۔ اس مذکور کے اندر یہ محذوف آپ سے آپ موجود ہے۔

"وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ" میں حرف عطف کا وجود، درآنحالیکہ یہاں کوئی لفظ ایسا موجود نہیں ہے جو اس کا معطوف علیہ بن سکے اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہاں معطوف علیہ محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔ آگے جگہ جگہ اس کی وضاحت ہوگی۔ اس حذف کا فائدہ یہ ہے کہ الفاظ بہت کم استعمال ہوتے ہیں اور بات اس کے اندر بہت زیادہ سما سکتی ہے۔ اس لیے کہ ایسے مواقع میں وہ ساری بات حذف کی جا سکتی ہے جس پر سیاق و سباق دلیل بن سکے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ لِتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ اور اس معنی کے الفاظ محذوف ہیں۔ گویا پوری بات یوں ہوگی کہ "اور تم اپنے گدھے کو دیکھو کہ کس طرح ہم اس کو زندہ کیے دیتے ہیں تاکہ حیات بعد الممات پر تمہارا ایمان پکا ہو جائے اور تاکہ تمہیں ہم لوگوں کے لیے نشانی بنائیں۔ یہ نشانی بنانا چونکہ اس کا ایک بعید فائدہ تھا جس کی طرف آسانی سے ذہن منتقل نہیں ہو سکتا تھا اس وجہ سے اس کو ظاہر کر دیا اور ایمان بالبعث اس کا بالکل واضح اور قریبی فائدہ تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا اور حرف ربط کے ذریعہ سے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

بنی اسرائیل کے لیے پیغام حیات

"اور تاکہ ہم تم کو لوگوں کے لیے نشانی بنائیں" یعنی ہم نے تم کو آیات الٰہی کا یہ مشاہدہ اس لیے بھی کرایا ہے کہ تم بنی اسرائیل کے لیے اس بات کی نشانی بن سکو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ وہ ان کو از سر نو غلامی و محکومی کی ذلت سے چھڑا کر آزادی اور قوت و عزت کی زندگی بخش دے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ حزقی ایل نبی منکروں کی طرف نہیں بلکہ بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے اور ان کا خاص مقصد بنی اسرائیل کو از سر نو زندہ کرنا تھا لیکن تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بنی اسرائیل اپنے مستقبل کی طرف سے بہت مایوس تھے۔ چنانچہ اوپر ہم نے صحیفہ حزقی ایل کی جو عبارت نقل کی ہے اس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

> "تب اس نے مجھے فرمایا اے آدم زاد یہ ہڈیاں تمام بنی اسرائیل ہیں، دیکھ یہ کہتے ہیں، ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی ہم تو بالکل فنا ہو گئے اس لیے تو نبوت کر اور ان سے کہہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اے میرے لوگو، دیکھو میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو ان سے باہر نکالوں گا تب تم جانو گے کہ خداوند میں ہوں اور میں اپنی روح تم میں ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گے اور میں تم کو تمہارے ملک میں بساؤں گا تب تم جانو گے کہ میں خداوند نے فرمایا۔" حزقی ایل باب ۳۷۔ ۱۱۔ ۱۴

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حزقی ایل نبی کو ان آیات کا مشاہدہ کرانے سے مقصود ایک تو یہ تھا کہ موت کے بعد زندگی کے مسئلہ میں خود ان کو شرح صدر حاصل ہو جائے، دوسرا یہ کہ ان کا یہ مشاہدہ بنی اسرائیل کے لیے پیغام حیات کا کام دے اور ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ انھیں بھی دوبارہ ایک زندہ قوم بنانے پر قادر ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہاں کھانے پینے کی چیزوں سے متعلق تو فرمایا کہ لَمْ يَتَسَنَّهْ ان میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا، برعکس اس کے گدھے کی ہر چیز سڑ گل گئی۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ ایک ہی طرح کے حالات میں یہ دو مختلف اثرات کیوں نمایاں ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ طالب کی جو اصلی ذہنی خلش تھی وہ یہی تھی کہ ایک چیز مر کھپ جانے اور مٹی میں مل جانے کے بعد از سر نو زندگی کس طرح حاصل کرے گی؟ اس مشاہدے نے اس کی یہ خلش دور کر دی۔ ساتھ ہی کھانے پینے کی چیزوں کا کوئی تغیر نہ قبول کرنا اس کے لیے اس بات کا ثبوت بن گیا کہ اصل شئی اللہ کا حکم ہے، اگر اللہ چاہے تو کسی ایک شے کو اس کے گل سڑ جانے کے بعد بھی از سر نو زندگی بخش سکتا ہے اور اگر چاہے تو کسی شے کو تمام قوانین طبعی کے عمل سے بالاتر بھی رکھ سکتا ہے۔ قرآن میں اصحاب الکہف کا جو واقعہ مذکور ہے وہ اس کی مثال ہے۔

آخر میں فرمایا کہ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ یعنی اس مشاہدے کے بعد جب ان پر حیات بعد الممات کا راز بے نقاب ہو گیا تو وہ پکار اٹھے کہ اب میں مانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہاں أَعْلَمُ کا لفظ اپنے کامل معنی میں ہے۔ یعنی وہ جاننا جس کو قرآن نے علم الیقین سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ علم الیقین ان کو قیامت سے متعلق بھی حاصل ہو گیا اور بنی اسرائیل کے مستقبل کے باب میں بھی۔ گویا اس پردے میں انھوں نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہڈیوں میں زندگی پیدا ہوتے اور ان پر گوشت پوست چڑھتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اپنے مشن کی کامیابی پر انھیں پورا اعتماد ہو گیا۔ اس پہلو سے وہ اپنی قوم کے لیے ایک نشانی ٹھہرائے گئے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۶۰)

لفظ 'اطمینان' کی حقیقت

'اطمینان' کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ٹھیک اس طرح ٹک جانا کہ اس کے ادھر یا ادھر جھکنے یا لڑھکنے کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ برتن اگر اپنی جگہ پر ٹھیک جم کر بیٹھ گیا ہے تو کہیں گے اطْمَأَنَّ اگر چراغ کی لو بالکل سیدھی ہے، اس میں ہوا کے سبب سے کسی طرف کو جھکاؤ نہیں ہے تو اس کے لیے بھی یہی لفظ لائیں گے۔ یہیں سے یہ لفظ نفس یا دل کی حالت کی تعبیر کے لیے استعمال ہونے لگا۔ جو نفس اپنے عقائد اور اعمال میں بالکل پابرجا ہے، حالات کے تغیر و تلون سے اس کے اطمینان اور اس کی دلجمعی میں کوئی فرق واقع نہ ہو، اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔ یہ اطمینان ایمان کے اعلیٰ مدارج میں سے ہے۔ قرآن مجید میں اس کو شرح صدر کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (کیا ہم نے تمہارے سینے کو کھول نہیں دیا؟) سلوک باطن کے مدارج و مقامات درجہ بدرجہ طے ہوتے ہیں اس وجہ سے سیر باطن کے ایک دور میں حضرات انبیا بھی اس مقام کے طالب ہوتے ہیں حالانکہ

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے وہ اس سے روزِ اوّل سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ یہ طلب ایمان کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ اس کی تکمیل ہے۔

'فصرھن' کی تحقیق

" صَوْرٌ " کے معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں۔ صُرْتُ الشَّیْئَ یا اَصَرْتُ الشَّیْئَ کے معنی ہوں گے میں نے اس کو اپنی طرف مائل کر لیا، جھکا لیا، اپنے سے اس کو ہلا لیا۔ اسی سے فَصُرْھُنَّ ہے۔ یعنی ان پرندوں کو اپنے سے ہلا لو۔

حضرت ابراہیم کی درخواست شرح صدر کے لیے تھی

جس طرح اوپر والے واقعے میں ایک بندۂ مومن نے اپنی ایک باطنی خلش کا اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہار کیا تو اس نے اس کے لیے اپنی ملکوت کا ایک گوشہ بے نقاب کر کے اس کی خلش دور فرما دی اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے سلوکِ باطن کے ایک دور میں (یہ دوران کی زندگی کا ابتدائی دور ہی ہو سکتا ہے) اس بات کی خواہش کی کہ ان کو مشاہدہ کرا دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ حشر کے وقت مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ یہ خواہش اسی طرح کی ایک خواہش ہے جس طرح کی خواہش حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے لیے پیدا ہوئی۔ اس خواہش کی وجہ یہ نہیں تھی کہ نعوذ باللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قیامت کا اعتقاد نہیں تھا، اعتقاد تو تھا۔ لیکن ایک حقیقت عقل کے نزدیک کتنی ہی واضح اور مدلل کیوں نہ ہو جب تک وہ نادیدہ ہوتی ہے اس وقت تک اس کو ماننے کے باوجود انسان اس کے باب میں شرحِ صدر کا آرزومند ہی رہتا ہے۔ یہ آرزو انبیاء کی شان کے خلاف نہیں ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن میں یہ دعا سکھائی گئی کہ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (دعا کرتے رہو کہ اے رب میرے علم کو بڑھا) یہ تشنگی تو اسی وقت دور ہو سکے گی جب اسباب کے تمام پردے بیچ سے ہٹا دیے جائیں گے اور اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے گی۔ لیکن یہ چیز اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں حاصل ہوگی۔ البتہ جہاں تک اطمینانِ قلب اور شرحِ صدر کا تعلق ہے اس سے وہ اپنے ان بندوں کو محروم نہیں رکھتا جو صدقِ دل سے اس کے طالب ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس مقصد کے لیے اگر اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے تو وہ اپنے خاص بندوں کو اپنی قدرت کے بعض مخصوص گوشوں کا بھی مشاہدہ کرا دیتا ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے فضلِ خاص کی دلیل ہے۔ وہ اپنے اوپر ایمان رکھنے والوں کا مددگار اور ولی ہے وہ ان کو کبھی حیرانگی و تشنگی میں نہیں چھوڑتا بلکہ ان کو ہمیشہ تاریکی سے روشنی اور اضطراب سے اطمینان کی طرف بڑھاتا رہتا ہے۔

حضرت ابراہیم کے اضطراب کو دور کرنے کے لیے ان کو یہ ہدایت ہوئی کہ چار پرندے لے کر ان کو پہلے اپنے سے ہلا لو، پھر ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے گوشت کا ایک ایک حصہ اپنے گرد و پیش کی پہاڑیوں پر رکھ دو۔ پھر ان کو اپنی طرف بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آ جائیں گے۔

چار پرندوں کی ہدایت اس لیے ہوئی ہوگی کہ چاروں سمتوں سے ان کے مجتمع ہونے کا ان کو مشاہدہ کرایا جائے تاکہ اس بات پر ان کا یقین مستحکم ہو جائے کہ قیامت کے دن اسی طرح نفخِ صور پر تمام مخلوق ہر سمت

سے اپنے پروردگار کی طرف دوڑے گی۔

اپنے سے ہلا لینے کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی ہو گی کہ ان کو وہ اچھی طرح پہچان رکھیں تاکہ ان کو اس امر میں کوئی اشتباہ نہ پیش آئے کہ جو پرندے زندہ ہو کر آئے ہیں وہی ہیں جن کو انھوں نے ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا، دوسرے نہیں ہیں۔ نیز یہ حقیقت بھی ان پر واضح ہو جائے کہ دوبارہ جو زندگی ہو گی اس میں دنیوی زندگی کی ساری یادداشتیں بھی زندہ ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ مانوس پرندے اپنے مالکوں کی آواز بھی پہچانتے ہوں گے۔

اگرچہ یہاں پرندوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے معنی کے لیے کوئی خاص لفظ استعمال نہیں ہوا لیکن اس سے یہ معنی لینے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اول تو یہاں "جزءا" کا جو لفظ آیا ہے وہ واضح قرینہ اسی بات کا ہے کہ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہی پہاڑوں پر ڈالنے کی ہدایت ہوئی تھی۔ اگر ایک ایک پرندے کو زندہ الگ الگ پہاڑ پر رکھوا دینا مقصود ہوتا تو اس مفہوم کے لیے زبان کا یہ اسلوب صحیح نہیں ہے۔ عربی میں اس معنی کو ادا کرنے کے لیے اسلوب اس سے بالکل مختلف ہو گا۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو تردد مردوں کے زندہ ہونے کے باب میں تھا، یہ تردد اس طرح تو دور نہیں ہو سکتا تھا کہ چند مانوس چڑیاں ان کی آواز پر ان کے پاس آجائیں۔ اس قسم کا تجربہ تو تیتر، بٹیر، کبوتر، وغیرہ، شکرے پالنے والے ہر روز کرتے ہی رہتے ہیں۔ اگر یہی تجربہ حضرت ابراہیمؑ کو کرا دیا جاتا تو اس سے ان کی وہ الجھن کس طرح دور ہو سکتی تھی جو انھوں نے اپنے رب کے سامنے پیش کی تھی۔ یہ دور ہو سکتی تھی تو اسی شکل میں دور ہو سکتی تھی جب ایک شے کے اجزا فنا اور انتشار کے بعد از سر نو مختلف گوشوں سے جمع ہو کر حیات تازہ حاصل کریں۔

پرندوں کا واقعہ حضرت ابراہیمؑ کا مشاہدہ خاص تھا

البتہ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ واقعہ ان معجزات میں سے نہیں ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے اپنی قوم پر حجت قائم کرنے کے لیے ظاہر ہوئے۔ بلکہ یہ ان مشاہدات میں سے ہے جو ذاتی طور پر حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لیے کرائے گئے کہ ان کو اطمینانِ قلب اور شرح صدر کی دولت حاصل ہو۔ اس قسم کے مشاہدات حضرات انبیاء علیہم السلام کو اس لیے کرائے جاتے ہیں کہ ان کی تربیت ہو اور وہ اس بارِ عظیم کے اٹھانے کے لیے پوری طرح اہل ہو جائیں جو قدرت کی طرف سے ان پر ڈالا جاتا ہے۔ دوسرے طالبینِ حق بھی اس میں سے حصہ پاتے ہیں لیکن ان کا حصہ ان کی استعداد اور ان کے درجے اور مرتبے کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اس قسم کا مشاہدہ عالم ظاہر میں بھی ہو سکتا ہے اور عالم روح میں بھی۔ مگر جس کو ہوتا ہے اس کے لیے موجب اطمینان و یقین ہوتا ہے اور یہی ان کا مقصود ہوتا ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کی صفات۔ عزیز، حکیم۔ پر نگاہ جمائے رکھنے کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ انھی صفتوں کی یاد داشت سے یہ یقین مضبوط ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو دوبارہ ضرور اٹھائے گا اس لیے کہ وہ اس پر قادر بھی ہے اور ایسا کرنا اس کی حکمت کا مقتضیٰ بھی ہے۔

۴۔۸۔ آگے کا مضمون —— آیات ۲۶۱-۲۶۴

ہم اوپر یہ اشارہ کر آئے ہیں کہ یہاں اصل سلسلۂ بیان تو جہاد و انفاق کا تھا لیکن آیت لَآ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ میں ہدایت و ضلالت سے متعلق ایک سنت اللہ کا ذکر آ گیا تھا جس کی وضاحت کے لیے مذکورہ مثالوں کا ذکر ضروری ہوا اور اس طرح اس بحث میں وسعت پیدا ہو گئی۔ اب یہ ضمنی بحث ختم ہو گئی اور انفاق کا مضمون جو سلسلے کا اصل مضمون تھا پھر سامنے آ گیا اور نہایت تفصیل کے ساتھ انفاق کی برکات، اس کی خصوصیات اور اس کی آفات بیان ہوئیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ
۲۶۱ تا ۲۶۴ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ
وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ
يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا
مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ
صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ
يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ
فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ
فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ
اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ

جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ
لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٦٥﴾
اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ
اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ
فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ
مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ
وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿٢٦٧﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ
وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦٨﴾ ۚ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ
الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾
وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ
وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ
وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ
عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٧١﴾ لَيْسَ
عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا

مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَ
مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝۲۷۲
لِلْفُقَرَاۗءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُھُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاۗءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ
تَعْرِفُھُمْ بِسِيْمٰھُمْ ۚ لَا يَسْــَٔـلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا
مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝۲۷۳ ۧ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ ع ۳۷ ۲
بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۲۷۴ وقف منزل

ترجمہ آیات ۲۶۱-۲۶۴

ان لوگوں کے مال کی تمثیل جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانے کے مانند ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور اس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں اللہ برکت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اللہ بڑی گنجائش والا اور علم والا ہے۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے نہ دل آزاری کرتے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ اور نہ تو ان کے لیے کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ دلداری کا ایک کلمہ کہہ دینا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو، اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔ اے ایمان والو، احسان جتا کر اور دل آزاری کر کے اپنی خیرات کو اکارت مت کرو، اس شخص کے مانند جو اپنا مال دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت پر وہ ایمان نہیں رکھتا۔ ایسے شخص کی تمثیل یوں ہے کہ ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کا

مینہ پڑے اور وہ اس کو بالکل سپاٹ پتھر چھوڑ جائے۔ ان کی کمائی میں سے کچھ بھی ان کے پلے نہیں پڑے گا اور اللہ ناشکروں کو بامراد نہیں کرے گا۔ ۲۶۱-۲۶۴:

اور ان لوگوں کے عمل کی تمثیل جو اپنے مال اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دلوں کو جمائے رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اس باغ کے مانند ہے جو بلندی پر واقع ہو۔ اس پر بارش ہو گئی تو وہ چند پھل لایا، بارش نہ ہوئی تو پھوار بھی کافی ہو گئی اور اللہ جو کچھ بھی تم کر رہے ہو، اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۲۶۵

کیا تم میں سے کوئی بھی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، نیچے اس کے نہریں بہہ رہی ہوں، اس میں اس کے واسطے ہر قسم کے پھل ہوں اور وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے ابھی ناتواں ہوں اور باغ پر سموم کا بگولا پھر جائے اور وہ جل کر خاک ہو جائے۔ اللہ اس طرح اپنی باتیں تمہارے لیے واضح کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔ ۲۶۶

اے ایمان والو، اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں اور اس میں سے وہ مال تو خرچ کرنے کا خیال بھی نہ کرو، جس کو خدا کی راہ میں تو خرچ کرنے پر آمادہ ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو بغیر آنکھیں میچے اس کو نہ لے سکو اور اس بات کو خوب یاد رکھو کہ اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ ۲۶۷

شیطان تمہیں تنگ دستی سے ڈراتا اور بے حیائی کی راہ سجھاتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ وہ جس کو

چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔ مگر یاددہانی وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹

اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے یا جو کچھ بھی نذر مانو گے تو یاد رکھو کہ اللہ اس سے اچھی طرح واقف ہے اور ان لوگوں کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ ۲۷۰

اور اگر تم اپنے صدقات ظاہر کرکے دو تو وہ بھی اچھا ہے اور اگر تم ان کو چھپاؤ اور چپکے سے غریبوں کو دے دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تمہارے گناہوں کو جھاڑ دے گا اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ ۲۷۱

ان کو ہدایت دینا تمہارے ذمے نہیں ہے بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے اس کا نفع تمہیں کو حاصل ہونا ہے اور نہ خرچ کیجیو مگر اللہ کی رضا جوئی ہی کے لیے اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے وہ تم کو پورا کر دیا جائے گا اور تمہارے حق میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے گی۔ ۲۷۲

یہ ان غریبوں کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، زمین میں کاروبار کے لیے نقل و حرکت نہیں کر سکتے، بے خبر ان کی خودداری کے سبب ان کو غنی خیال کرتا ہے، تم ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ جو لوگ اپنے مال رات اور دن پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور نہ ان کے لیے خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴

۸۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۶۱)

'فی سبیل اللہ' کا مفہوم: "فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کے تحت وہ سارے کام آتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیے جائیں۔ حالات کے اعتبار سے کوئی کام زیادہ اہم ہو سکتا ہے، کوئی کم لیکن جو کام بھی رضائے الٰہی کے لیے اور شریعت کی ہدایات کے تحت کیا جائے وہ فی سبیل اللہ ہے۔

'انفاق فی سبیل اللہ' کی تمثیل: یہ اس بڑھوتری کی تمثیل ہے جو راہِ خدا میں خرچ کیے ہوئے مال کے اجر و ثواب میں ہوگی۔ فرمایا کہ جس طرح ایک دانے سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں اسی طرح ایک نیکی کا صلہ سات سو گنے تک بندے کو آخرت میں ملے گا۔ اس مضمون کی وضاحت احادیث میں بھی ہوئی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ نیکیوں کا بدلہ دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ملے گا۔ یہ فرق ظاہر ہے کہ عمل کی نوعیت عمل کے زمانے اور عمل کرنے والے کے ظاہری و باطنی حالات پر مبنی ہوگا۔ اگر ایک نیکی مشکل حالات اور تنگ وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اس کا اجر زیادہ ہوگا اور اگر ایک نیکی آسان حالات اور کشادہ وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اس کا اجر کم ہوگا۔ پھر نیکی کرنے والے کے احساسات کا بھی اس پہ اثر پڑے گا۔ ایک نیکی پوری خوش دلی اور پورے جوش و خروش کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری سرد مہری اور نیم دلی کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ دونوں کے اجر و ثواب میں بھی فرق ہوگا۔ آیت میں اجر کی وہ شرح بیان ہوئی ہے جو سب سے اونچی ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھاتا ہے۔ یہ اس ضابطے کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی چاہنا بھی عدل و حکمت کے خلاف نہیں ہوتا اس وجہ سے یہ بڑھوتری انہی کے لیے وہ چاہتا ہے جو اس کے ٹھہرائے ہوئے ضابطے کے مطابق اس کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

'واسع علیم' کا محل: "وَاسِعٌ عَلِیْمٌ" میں ایک تو یہ بات واضح فرمائی کہ اجر کی اس وسعت پر بندہ اپنی تنگ دامانی پر قیاس کر کے حیران ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ غیر محدود سمائی رکھنے والا ہے، دوسری یہ بات فرمائی کہ خدا کی راہ میں جو چھوٹی یا بڑی، پوشیدہ یا علانیہ نیکی کی جاتی ہے سب اس کے علم میں رہتی ہے اس وجہ سے ہر شخص اپنے اجر کی طرف سے مطمئن رہے۔ جب دینے والے کا خزانہ بھی غیر محدود ہے اور اس کا علم بھی غائب و حاضر سب پر محیط ہے تو تشویش کی گنجائش کہاں باقی رہی!

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲۶۲)

"اذٰی" کا لفظ ہر اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو باعث رنج واذیت ہو عام اس سے کہ یہ رنج و اذیت جسمانی ہو یا جذباتی و روحانی۔ یہاں اس سے مراد وہ طعن و تشنیع اور توہین و تحقیر ہے جو کم ظرف کی طرف سے ان لوگوں کے لیے ظاہر ہوتی ہے جن پر وہ کبھی کوئی احسان کر بیٹھتے ہیں۔

انفاق کے اجر کے اصل حق دار

فرمایا کہ یہ اجر عظیم جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوا ان خرچ کرنے والوں کے لیے ہے جو خرچ کرنے کے بعد نہ تو ان لوگوں پر کوئی احسان جتائیں جن پر انھوں نے خرچ کیا ہے اور نہ کسی پہلو سے ان کی کوئی دل آزاری کریں۔ واضح رہے کہ یہ احسان جتانا اور دل آزاری کرنا دونوں چیزیں ایک ہی فاسد کردار کے دو پہلو ہیں۔ لئیم اور کم ظرف لوگ اگر کسی پر کچھ خرچ کر بیٹھتے ہیں تو اس کے بدلے میں ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ شخص زندگی بھر ان کا ممنونِ احسان بلکہ زر خرید غلام بن کے رہے۔ اگر وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہو رہی ہے تو پھر وہ اس کو اپنے طعنوں کا ہدف بنا لیتے ہیں اور جہاں ان کو موقع ملتا ہے اس کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔ اجر ان لوگوں کے لیے ہے جن کا انفاق اس بلا سے محفوظ رہے۔

"وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" دوسری جگہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ جنت کی تعبیر ہے اس لیے کہ جنت ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ ہو گا اور نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا۔ یہاں جنت کی تعریف ان لفظوں میں جو کی گئی ہے اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ انفاق کرنے والے اس جنت کے سزاوار اس لیے ٹھہریں گے کہ نہ تو خدا کی راہ میں خرچ کر کے انھوں نے کبھی اس بات کا غم کیا کہ کیوں خرچ کر دیا اور نہ کبھی شیطان کے ڈراووں سے متاثر ہو کر مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا ہوئے کہ کل کیا کھائیں گے۔ ان کے اس حوصلے کے صلے میں خدا ان کو سات سو گنے تک اجر بھی دے گا اور وہ بہشت بھی جو ماضی اور مستقبل دونوں طرف سے انھیں مطمئن اور نچنت کر دے گی۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ (۲۶۳)

یہاں اگرچہ صرف "اَذًی" (دل آزاری) کا ذکر ہوا، احسان جتانے کا ذکر نہیں ہوا لیکن ظاہر ہے کہ مراد دونوں ہی باتیں ہیں۔ ایک کے حذف کر دینے کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ یہ درحقیقت ایک ہی کردار کے دو پہلو ہیں۔ جہاں احسان جتانا ہے وہاں ایذا ہے، جہاں ایذا ہے وہاں احسان جتانا بھی ہے۔

دلداری کا ایک کلمہ اس خیرات سے بہتر ہے جس کے ساتھ دل آزاری ہو

فرمایا کہ دلداری کا ایک کلمہ اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو۔ سائلوں اور محتاجوں سے اچھے انداز میں بات کرنے اور ان کے غلط رویے سے درگزر کرنے کی ہدایت قرآن میں بار بار ہوئی ہے اس کے وجوہ پر ہم اسی سورہ کی آیت ۸۳ کے تحت تفصیل کے ساتھ نظائر قرآن کی روشنی میں بحث کر چکے ہیں۔ آدمی میں اگر غنا کے ساتھ حلم نہ ہو تو وہ انفاق کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اگر وہ انفاق کرتا

بھی ہے تو بسا اوقات ثواب کمانے کے بجائے الٹا اس سے گناہ کما لیتا ہے جن کے پاس مال ہوتا ہے ان کے اندر عموماً ایک احساس برتری پیدا ہو جاتا ہے اس وجہ سے وہ محتاجوں اور سائلوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ اکثر مانگنے والوں کو جھڑک دیتے ہیں۔ بعض اوقات سائلوں کا رویہ بھی کچھ ناگوار ہوتا ہے جو تنک مزاج مال داروں کے پارے کو اور بھی گرم کر دیتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ اصلی مستحقین کو اس لیے نظر انداز کر جاتے ہیں کہ کسی صحیح یا غلط بنیاد پر ان کو ان سے شکایت ہوتی ہے۔ یہ تمام خرابیاں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ اکثر مالداروں کے پاس مال تو ہوتا ہے لیکن ان کے مال کی نسبت سے ان کے اندر عفو و درگزر کی صفت نہیں ہوتی۔ قرآن نے اسی بنیاد پر جہاں انفاق کی تاکید کی ہے وہاں اس صفت کی بھی تاکید کی ہے۔ اس کے بغیر کوئی انفاق احسان کا درجہ حاصل نہیں کرتا۔ آل عمران کی ایک آیت ملاحظہ ہو۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۳۴۔ آل عمران (جو خرچ کرتے ہیں خوش حالی اور تنگ دستی میں اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ یہی لوگ خوب کار ہیں اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے)۔

غنی و حلیم کی صفات کا تقاضا

یہاں غنی و حلیم کی صفات کے حوالے میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ اللہ چونکہ غنی ہونے کے ساتھ ساتھ حلیم بھی ہے اس وجہ سے اپنے بندوں کی تمام کوتاہیوں اور نافرمانیوں کے باوجود ان کو اپنے جود و کرم سے نوازتا رہتا ہے، اگر وہ بندوں کی کوتاہیوں پر ان کو اپنے فضل سے محروم کر دیا کرے تو کون ہے جو کسی فضل کا مستحق قرار پا سکے۔ یہ اس غنی کا حلم ہی ہے جس کی بدولت نیکوکار اور گنہگار سب اس کے خزانے سے رزق پا رہے ہیں۔ جب اس کی صفات یہ ہیں تو وہ چاہتا ہے کہ انہیں صفات کا عکس اس کے بندوں کے اندر بھی نمایاں ہو۔ یعنی جن کو اس نے غنی بنایا ہے، ان کے اندر ان کے غنا کے بقدر بردباری بھی ہو۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ غریبوں کی آستینوں کے اندر سے جو ہاتھ مالداروں کے سامنے پھیلتا ہے وہ، جیسا کہ مشہور حدیث قدسی میں وارد ہے، درحقیقت خدا ہی کا ہاتھ ہوتا ہے اس وجہ سے اس ہاتھ کی تحقیر کرنے والوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ جس ہاتھ کو رد کر رہے ہیں یہ درپردہ اسی غنی کا ہاتھ ہے جس کے ہاتھ سے انھوں نے سب کچھ پایا ہے۔ اگر ان کی طرف سے اس طرز عمل کے باوجود بھی وہ ان سے درگزر فرما رہا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حلیم ہے۔ ورنہ حق تو یہ تھا کہ ایسے ناشکرے لوگ خدا کی ہر نعمت سے محروم کر دیے جاتے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶۴)

'صفوان' کے معنی

'صَفْوَانٌ' کے معنی چکنے پتھر یا چکنی چٹان کے ہیں۔

'وابل' کے معنی: وابل کے معنی ہیں زور کی بارش، زور کا دونگڑا۔

'صلد' کے معنی: صلد کے معنی سخت اور چکنی چیز کے ہیں۔ ارض صلد یا مکان صلد اس زمین کو کہیں گے جہاں کوئی چیز اگتی نہ ہو۔ راس صلد ایسے سر کو کہیں گے جس پر بال نہ اگتے ہوں۔

تمثیل میں مدنظر صورت: پہاڑوں پر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی بڑی چٹان پر ادھر ادھر سے مٹی آ کر جم جاتی ہے جس سے ایک موٹی تہ بن جاتی ہے۔ کسان بعض اوقات اس کو زرخیز پاکر اس پر کھیتی شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی زمینوں کو کبھی کبھی یہ خطرناک صورت پیش آتی ہے کہ پہاڑ کے بالائی حصے میں زور کی بارش ہوئی اور اس کا ریلا جو آیا تو اس نے ساری مٹی وادی سطح وادی کی طرف پھسلا دی اور نیچے صرف سخت چٹان رہ گئی۔ پہاڑی علاقوں سے اس قسم کے حوادث کی اطلاعات اخبارات میں وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہیں۔ اس کو (landslide) کہتے ہیں۔ یہاں تمثیل میں یہی صورت مدنظر ہے۔

فرمایا کہ جو لوگ انفاق کر کے احسان جتاتے یا دل آزاری کرتے ہیں ان کی خیرات بالکل اکارت جاتی ہے، آخرت میں ان کو اس کا کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ ایمان پر ہونے کے باوجود ان کا یہ عمل اسی طرح ضائع ہو جائے گا جس طرح اس شخص کا عمل ضائع ہو جائے گا جو محض دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس سے احسان جتانے اور ایذا دینے کی غایت درجہ سنگینی واضح ہوتی ہے کہ آدمی کے انفاق کو برباد کر دینے کے معاملے میں یہ باتیں بالکل کفر کے برابر ہیں۔

ایسے شخص کی تمثیل اس کسان سے دی ہے جس نے اپنی فصل ایک ایسی زمین پر بوئی جس کے نیچے سخت اور چکنی چٹان تھی۔ بارش کا جو ایک زور کا دونگڑا پڑا تو اوپر کی ساری مٹی فصل سمیت وادی میں بہ گئی اور نیچے سے گنجے سر کے مانند چٹان نکل آئی۔ فرمایا کہ جس طرح اس محروم القسمت کسان کی ساری محنت رائگاں چلی جاتی ہے اسی طرح اس خیرات کرنے والے کی خیرات برباد ہو کر رہ جاتی ہے جو خیرات کرنے کے بعد احسان جتاتا اور دل آزاری کرتا ہے۔ فرمایا کہ ایسے لوگ اپنی ساری خیر خیرات ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ اس کا کوئی حصہ بھی وہ بچا نہیں پاتے۔

ہدایت کی مختلف صورتیں: "وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الاٰية" میں جس ہدایت کا ذکر ہے وہ غایت و مقصود کی ہدایت ہے۔ ہم تفسیر کے شروع میں بیان کر آئے ہیں کہ ہدایت کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک ہدایت جبلت و فطرت کی ہدایت ہے جو سب حیوانات اور انسانوں کو عطا ہوئی ہے۔ ایک ہدایت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں کو ان کی تدبیروں اور کوششوں میں بخشتا ہے جس سے وہ کسی کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایک ہدایت وہ ہے جو انبیا اور شرائع کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے اور جس سے بندہ قبول حق کی توفیق پاتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک وہ ہدایت ہے جو آخرت میں حاصل ہوگی جس سے بندے اپنی کوششوں کے آخری ثمرات و نتائج کی طرف رہنمائی حاصل کریں گے۔ ہدایت کا لفظ قرآن میں ان تمام مقاصد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ آیت زیر بحث

میں یہ لفظ ہمارے نزدیک اسی آخری معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی جو کافر اور ناشکرے لوگ ہیں وہ اپنے اعمال میں بامراد نہ ہوں گے بلکہ ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲۶۵)

تثبیت کا مفہوم

"تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ" تثبیت کے معنی مضبوط کرنے، جمانے اور مستحکم کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ اپنے مال خدا کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ اس مقصد سے بھی خرچ کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے نفس کی تربیت کریں کہ وہ دین کے احکام کی تعمیل میں اچھی طرح پختہ ہو جائے۔ مِنْ یہاں گویا تَثْبِيْتًا کے مفعول پر داخل ہے۔

انفاق تربیت نفس کے لیے ریاضت ہے

جس طرح روزے سے مقصود نفس کی تربیت ہے کہ آدمی تقویٰ کے مطالبات پورے کرنے کے لیے اچھی طرح مضبوط ہو جائے اسی طرح انفاق بھی ایک ریاضت ہے جس سے انسان اپنے نفس پر قابو پاتا ہے اور خدا کے قرب کی راہ اس کے لیے آسان ہوتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ بات نکلی کہ تمام دوسری عبادات کی طرح انفاق کا حقیقی فائدہ بھی خدا کی طرف نہیں بلکہ بندے ہی کی طرف لوٹتا ہے، دوسری طرف یہ کہ سب سے اعلیٰ انفاق وہ ہے جو قحط کے زمانے میں ہو، جو غربت کے باوجود ہو، جو اپنی ذاتی ضروریات کو نظر انداز کر کے ہو، جو عزیز و محبوب مال میں سے ہو اور خاص طور پر ان حق داروں کے لیے ہو جن سے آدمی کا دل خوش نہ ہو اس لیے کہ یہی انفاق ہے جس سے نفس کو حق پر جمائے رکھنے کی حقیقی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو خواہشاتِ نفس کے خلاف چلانے میں جتنا مشاق ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کے لیے خدا کا قرب حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

ربوۃ کی تحقیق

"ربوۃ" کے معنی بلند و مرتفع زمین کے ہیں۔ استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتفع ہونے کے ساتھ ساتھ مسطح اور ہموار ہونا بھی اس کی خصوصیات میں سے ہے۔ قرآن میں اس کی صفت ایک دوسرے مقام میں ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ (۵۰ مومنون) آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلندی کے ساتھ ہمواری بھی اس کے لوازم میں سے ہے۔ بلند اور ہموار زمین کے لیے آب و ہوا کی خوشگواری ایک مسلّم شے ہے۔ اگر ایسی زمین پر باغ ہو تو اس کی بلندی ایک طرف تو اس کی خوش منظری کا باعث ہوتی ہے، دوسری طرف اس کو سیلاب وغیرہ سے محفوظ کرتی ہے۔ نیز ہموار زمین پر ہونے کے سبب سے اس کے لیے اس طرح پھل کر فنا ہو جانے کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا جو ڈھلوان زمینوں کے باغوں اور فصلوں کے لیے ہوتا ہے، پھر آب و ہوا کی خوبی اس کی بارآوری کی ضامن ہوتی ہے۔ اگر موسم سازگار رہا تو پوچھنا ہی کیا ہے اگر سازگار نہ ہوا جب بھی وہ پھل دے جاتا ہے۔

اس انفاق کی تمثیل جو رضائے الٰہی کے لیے ہو

یہ اوپر والے گروہ کے بالمقابل ان لوگوں کے انفاق کی تمثیل ہے جو اپنے مال اللہ کی رضا جوئی اور اپنے نفس کی تربیت کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ فرمایا یہ لوگ بلاشبہ اپنے انفاق کا اجر پائیں گے، انھوں

نے بہہ جانے والی زمین پر باغ لگانے کے بجائے ایسی بلند سطح اور اچھی آب و ہوا والی زمین پر اپنا باغ لگایا ہے کہ بارش ہو تو اس کو برباد کرنے کے بجائے اس کی بار آوری کو دوگنا کر دیتی ہے اور اگر بارش نہ ہو تو ہلکی پھوار بھی آب و ہوا کی خوبی کی وجہ سے اس کے لیے کفایت کر جاتی ہے۔

'وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ' تسکین و تسلی کے لیے ہے۔ یعنی اللہ کے نیک بندے اس کی رضا جوئی اور اپنے نفس کی تربیت کے لیے جو ریاض کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں ہے، وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے ہر بندے کو اس کی محنت اور اس کے ایثار کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمۡ اَنۡ تَكُوۡنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُۙ لَهٗ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِۙ وَاَصَابَهُ الۡكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَآ اِعۡصَارٌ فِيۡهِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ‌ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ (۲۶۶)

باغ کے بارے 'جَنَّةٌ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ لَهٗ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ' یہ عرب کے
میں اہل عرب تصور کے مطابق ایک اچھے باغ کی تصویر ہے۔ ان کے ہاں اچھے باغ کا تصور یہ ہے کہ اس کے کناروں پر
کا ذوق کھجوروں کے درخت ہوں، بیچ میں انگور کی بیلیں ہوں، مناسب مواقع سے مختلف فصلوں کی کاشت کے لیے قطعات ہوں، باغ بلندی پر ہو، اس کے نیچے نہر بہہ رہی ہو جس کی نالیاں باغ کے اندر دوڑا دی گئی ہوں۔

قرآن نے دوسری جگہ ایک باغ کی تصویر اس طرح کھینچی ہے جَعَلۡنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيۡنِ مِنۡ اَعۡنَابٍ وَّحَفَفۡنٰهُمَا بِنَخۡلٍ وَّجَعَلۡنَا بَيۡنَهُمَا زَرۡعًا ؕ كِلۡتَا الۡجَـنَّتَيۡنِ اٰتَتۡ اُكُلَهَا وَلَمۡ تَظۡلِمۡ مِّنۡهُ شَيۡـئًا ۙ وَّفَجَّرۡنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۳۲-۳۳، کہف (ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ بنائے اور ان کو گھیر دیا کھجوروں سے اور ان کے درمیان کھیتی بھی رکھی، دونوں باغ خوب پھل لائے، ذرا کمی نہ کی، اور ہم نے ان کے درمیان ایک نہر جاری کی) اس سے معلوم ہوا کہ باغ کے کناروں پر کھجوروں کے درخت ہوتے تھے تاکہ ان سے پھل بھی حاصل ہو سکے، گرمی، لو، باد تند اور تمازت آفتاب سے باغ محفوظ بھی رہ سکے اور باغ کی رونق میں بھی اضافہ ہو سکے۔ پھر بیچ بیچ میں انگور اور دوسرے پھل دار درخت بھی لگائے جاتے اور مناسب ٹکڑوں میں مختلف فصلوں کی کاشت بھی ہوتی۔ زیر بحث آیت میں لَهٗ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ سے اسی آخری چیز کی طرف اشارہ ہے۔ ہم ایک دوسرے مقام میں یہ بات وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ عربی میں ثمرات کا لفظ صرف میوہ جات کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ غلہ جات بھی اس میں شامل ہیں۔

لفظ اعصار 'اِعۡصَارٌ فِيۡهِ نَارٌ' اعصار کے معنی گردباد اور بگولے کے ہیں۔ اس کے ساتھ جس آگ کا ذکر ہے
کی تحقیق وہ ہماری معروف آگ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد سموم اور لو ہے جو بسا اوقات گردباد کے اندر پائی جاتی ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو باغ اس کی زد میں آ جاتا ہے وہ بالکل جھلس کے رہ جاتا ہے۔

اوپر ریاکاری، احسان داری اور ایذا رسانی کی آفتوں سے اپنے انفاق کو برباد کرنے والوں کی تمثیل

اوپر والی تمثیل کی مزید وضاحت

سنائی ہے۔ یہ تمثیل اس کی مزید وضاحت ہے۔ اس میں یہ دکھایا ہے کہ اس طرح انفاق کرنے والے عین اس وقت اپنی امیدوں کے باغ کی بربادی کا حسرت انگیز منظر دیکھیں گے جب وہ اس کے سب سے زیادہ محتاج ہوں گے اس لیے کہ اس وقت ان کے لیے سعی و عمل کے دروازے بند ہو چکیں گے۔

یہ تمثیل ایک ایسے شخص کی ہے جس نے انگوروں اور کھجوروں کا باغ لگایا، اس باغ کے نیچے نہر جاری تھی جو اس کی شادابی کی ضامن تھی۔ باغ میں دوسرے مختلف قسم کے پھل بھی تھے اور اس سے ہر قسم کی اجناس بھی حاصل ہوتی تھیں۔ باغ کا مالک بوڑھا ہو گیا اور اس کے بچے سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ اسی دوران میں ایک روز سموم کا ایک بگولا اس باغ پر گزرا اور سارا باغ تباہ ہو کر رہ گیا۔ فرمایا کہ یہی حال آخرت میں ان لوگوں کا ہو گا جو اپنے انفاق کو برباد کرنے والی آفتوں سے نہیں بچاتے۔ ان کے خرمن کے لیے بجلی خود ان کی آستینوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہے اور وہ ٹھیک اس وقت ظاہر ہو گی جب ان کے لیے کھو کر پھر پانے کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَنفِقُوا۟ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا۟ ٱلْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِـَٔاخِذِيهِ إِلَّآ أَن تُغْمِضُوا۟ فِيهِ ۚ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ غَنِىٌّ حَمِيدٌ (۲۶۷)

طیبات کا مفہوم

مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ (اپنی کمائی کے پاکیزہ حصے میں سے) میں طیبات کا لفظ بیک وقت دو باتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اپنی کمائی میں سے وہی مال خرچ کرو جو پاکیزہ طریقہ سے آیا ہو، غلط یا مشتبہ طریقہ سے نہ آیا ہو۔ دوسری یہ کہ مال بجائے خود اچھا ہو، بے وقعت، گھٹیا اور نکما نہ ہو۔ غلط طریقہ سے آئے ہوئے یا نکمے مال سے نہ تو خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے اور نہ نفس کی وہ تربیت ہو سکتی جس کا ذکر اوپر تثبیت کے لفظ سے ہوا ہے۔

'وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ' کا علیحدہ ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ 'مَا كَسَبْتُمْ' والے ٹکڑے سے مراد وہ مال ہے جو تجارت وغیرہ کے طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔ زمین کی پیداوار کے علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پیداوار پر زکوٰۃ کا نظام دوسرے اموال سے بالکل مختلف ہے۔

مال خبیث کا انفاق قبول نہیں ہوتا

'وَلَا تَيَمَّمُوا۟ ٱلْخَبِيثَ مِنْهُ' میں ناپاک اور گھٹیا مال سے بچنے کی غایت درجہ تاکید ہے جس طرح 'لَا تَقْرَبُوا۟' کا لفظ ہے کہ فلاں چیز کے پاس بھی نہ پھٹکو، اسی طرح 'لَا تَيَمَّمُوا۟' کا مفہوم یہ ہے کہ برے مال کے دینے کا ارادہ بھی نہ کرو۔ پھر برے مال کی وضاحت بھی فرما دی کہ اس سے مراد اس طرح کا مال ہے جو خدا کی راہ میں دینے کے لیے تو تیار ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو آنکھیں میچے اور دل پر جبر کیے بغیر نہ لے سکو۔ جس چیز کو آدمی اپنے لیے پسند نہ کر سکے وہ خدا کو پیش کرنا درآں حالیکہ سب کچھ اسی کا بخشا ہوا ہے انتہائی دنائت کی بات ہے اور اس سے خدا کی خوشنودی یا نفس کی تربیت حاصل ہونا تو الگ رہا اس سے مزید دوری و مہجوری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔

'غنی وحمید' کی وضاحت

خدا 'غنی وحمید' ہے یعنی اللہ کسی کے مال اور کسی کی خیرات کا محتاج نہیں، وہ اگر لوگوں سے یہ چاہتا ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کریں تو اس لیے نہیں کہ اس کے خزانے میں کمی ہے بلکہ اس سے لوگوں کی وفاداری کا امتحان مقصود ہے کہ دیکھے کہ لوگ اس کے بخشے ہوئے مال کو جب خود اس کو دینے کا وقت آتا ہے تو کس طرح دیتے ہیں۔ پھر 'غنی' کے ساتھ 'حمید' کی صفت لگائی ہے۔ حمید کے معنی ہیں وہ ذات جو سزاوار حمد و تعریف کاموں کا منبع ہے۔ یعنی سب سے بے نیاز ہونے کے ساتھ اس کی ذات ستودہ صفات ہے، اس کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے اور سب اس سے فیضیاب ہوتے ہیں، نیک بھی اور بد بھی۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۶۸)

'فحشاء' سے مراد

'فَحْشَآء' کے معنی کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کے ہیں۔ قرآن میں اس سے زنا، لواطت اور عریانی وغیرہ جیسے کھلے جرائم کو تعبیر کیا گیا ہے۔ 'امر' کا لفظ جس طرح حکم دینے کے معنی میں آتا ہے اسی طرح مشورہ دینے اور سجھانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ تحقیق اس کی ہم دوسری جگہ بیان کر آئے ہیں۔

انفاق کی راہ کی مزاحمتیں

یہ ان مزاحمتوں کی طرف اشارہ ہے جو شیطان اور اس کی ذریات کی طرف سے انفاق کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ آدمی جب کسی نیک کام میں خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان اور اس کے ایجنٹ اس کو دو طرح سے اس کے ارادے سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک تو مستقبل کے موہوم خطرات سے اس کو ڈراتے ہیں کہ فلاں اور فلاں مشکل کام اس کے آگے پڑے ہیں اس وجہ سے وہ اپنے ہاتھ روکے رکھے ورنہ سخت دشواریوں میں پھنس جائے گا۔ دوسرے اس کو عیاشی، مے نوشی، سینما بینی اور اسراف و تبذیر کی دوسری لتوں میں پھنساتے ہیں تاکہ کسی اعلیٰ مقصد میں خرچ کرنے کے لیے کوئی گنجائش اس کے پاس باقی ہی نہ رہ جائے۔ شیطان کا فتنہ بڑا ہی سخت و شدید ہے۔ جو لوگ اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اپنی بدمستیوں میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے بندوں میں سے کسی کا حق ادا کرنے کے قابل رہ ہی نہیں جاتے۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں جہاں انفاق کا حکم دیا ہے وہاں شیطان کے اس ہتھکنڈے سے بچتے رہنے کی خاص طور پر تاکید فرمائی ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝ (۲۶-۲۷۔ بنی اسرائیل)

قرابت مند، مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو اور اپنے مال کو عیاشیوں میں نہ اڑاؤ۔ بے شک اس طرح اپنے مال کو اڑانے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔

بعینہٖ یہی مضمون اسی طرح کے سیاق و سباق کے ساتھ آل عمران کی آیات ۱۳۴، ۱۳۵ میں بیان ہوا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ 'مغفرت' یہاں 'فحشاء' کے مقابل میں ہے اور 'فضل' کا لفظ 'فقر' کے مقابل میں ہے۔ یعنی شیطان تو تمہیں اللہ کی راہ میں انفاق کے بجائے نفس کی راہ میں فضول خرچی

اور عیاشی کی راہ سجھاتا ہے تاکہ تمھیں سیدھے جہنم میں لے جائے لیکن اللہ اپنی راہ میں خرچ کی دعوت دے کر تمھیں مغفرت اور جنت کی طرف بلاتا ہے۔ اسی طرح شیطان تمھیں فقر کے ہتھے سے ڈرا کر تمھارے دل بجھاتا ہے لیکن اللہ تم سے اس انفاق کے عوض میں دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے بے پایاں فضل و انعام کا وعدہ فرماتا ہے۔ اللہ بڑا سمائی رکھنے والا اور تمھارے ایک ایک عمل سے واقف ہے۔ نہ اس کے پاس دینے کے لیے کمی ہے اور نہ وہ تمھارے راہِ خدا میں دیے ہوئے کسی پیسے دھیلے سے بے خبر ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (۲۶۹)

انفاق حکمت کے خزانے کی کلید ہے

لفظ 'حکمت' کی تشریح ہم اسی سورہ کی آیت ۱۲۹ کے تحت کر چکے ہیں۔ یہاں اس کا دہرانا باعثِ طوالت ہوگا۔ البتہ اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی اصل روحِ ایمان اور عمل کی وہ پختگی ہے جس کی بنیاد گہری بصیرت پر ہو۔ جس کو یہ چیز حاصل ہوتی ہے وہ اپنا خزانہ اس دنیائے فانی میں نہیں جمع کرتا بلکہ اپنے خدا کے پاس جمع کرتا ہے۔ وہ شیطان کے ڈراووں سے نہیں ڈرتا بلکہ اپنے پروردگار کے وعدوں پر اعتماد کرتا ہے اور اس دنیا کے خزف ریزے نہیں جمع کرتا بلکہ ان کے بدلے میں حکمت کے خزانے کا طالب بنتا ہے اور یہ حکمت کا خزانہ بہت بڑی چیز ہے۔ اتنی بڑی کہ دنیا کا کوئی خزانہ بھی اس کے آگے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ یہ خزانہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ یعنی اس کو دیتا ہے جو اس خزانے کے پانے کا استحقاق پیدا کرتے ہیں اس لیے کہ اللہ کا کوئی چاہنا بھی حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس کی سنت یہ ہے کہ جو اس دنیائے فانی کی لذتوں پر فریفتہ ہونے کے بجائے خدا کی مغفرت اور اس کے فضل کے حصول کے لیے اپنے مال لٹاتے ہیں وہ اس کے صلے میں اپنے دل کے خزانے حکمت کے لعل و گہر سے بھرتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ یہ بات ہر ایک کے سمجھنے کی نہیں ہے۔ اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ یعنی جن کی عقل حکمت کے نور سے منور ہے۔ اس دنیا کی نقد لذتوں کو چھوڑ کر ایک نادیدہ عالم کی کامرانی کے لیے اپنی کمائی کو لٹانا انھی لوگوں کا حوصلہ ہو سکتا ہے جن کو حکمت سے بہرہ وافر ملا ہو۔

وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَّفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَّذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ (۲۷۰)

'نذر' کا مفہوم

'نذر' کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی منت مانے کہ اگر میری فلاں مراد پوری ہو گئی تو میں فلاں عبادت یا ریاضت یا اتنا صدقہ کروں گا۔ اسلام میں، جیسا کہ احادیث سے واضح ہے، منت ماننے کو مستحسن نہیں قرار دیا گیا ہے لیکن کوئی شخص اگر اس طرح کی منت مان بیٹھے اور اس میں کسی شرعی قباحت کا کوئی پہلو نہ ہو تو اس کو پورا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک قسم کا عہد ہے جو منت ماننے والا اپنے رب سے کر رہا ہے اور عہد چھوٹا ہو یا بڑا اگر خلافِ شریعت نہیں ہے تو اس کو پورا کرنا ضروری ہے اس لیے کہ خدا کے ہاں ہر عہد سے متعلق، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، پرسش ہونی ہے۔ ہم سورۂ مائدہ میں بتائیں گے کہ تمام شریعت

اور تمام اخلاق کی بنیاد عہد ہی پر ہے اس وجہ سے اسلام نے اس پہلو میں کسی ڈھیل کو گوارا نہیں کیا ہے۔

'فَاِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُہٗ' یہ ٹکڑا شرط کے جواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی جو شخص خدا کی راہ میں کچھ خرچ کرتا ہے یا اس کے لیے کوئی منّت مانتا ہے تو وہ یہ اطمینان رکھے کہ خدا اس کی خیرات اور اس کی نذر ہر چیز کو اچھی طرح جانتا ہے۔ 'جانتا ہے' سے مقصود اس کا لازم ہے یعنی جب وہ جانتا ہے تو لازماً وہ اس کا اپنے وعدے کے مطابق صلہ بھی دے گا۔ زبان کا یہ اسلوب عربی زبان اور قرآن میں بہت عام ہے۔

'وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ' ظالم سے مراد یہاں خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں یعنی وہ لوگ جو یا تو دولتِ دنیا ہی کو معبود بنائے بیٹھے ہیں، خدا کی راہ میں سرے سے خرچ کرتے ہی نہیں یا خرچ کرتے ہیں تو ریا، احسان داری اور دل آزاری سے اس کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگ بدقسمت ہیں، ان کا سارا اعتماد انفاق و ایثار اور خدا کے فضل و رحمت کے بجائے اپنے مال اور اپنے جھوٹے معبودوں پر ہے، یہ ان پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں، حالانکہ خدا کے ہاں ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲۷۱)

علانیہ اور پوشیدہ انفاق کے درجے

یہاں چونکہ زیرِ بحث عام صدقات و خیرات ہیں، صدقاتِ واجبہ نہیں ہیں جو علانیہ دیے جاتے ہیں، اس وجہ سے ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو پوشیدہ طور پر دینا بہتر ہے یا علانیہ۔ قرآن نے یہ اس سوال کا جواب دیا ہے کہ اگر ظاہر کر کے دو تو یہ بھی اچھا ہے، اس لیے کہ اس کے بھی بعض پہلو مفید ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس سے دوسروں کو بھی انفاق کی ترغیب ہوتی ہے، خاص طور پر ان مواقع میں، جب کسی اجتماعی مہم کے لیے لوگوں کو ابھارنا اور شوق دلانا ہو، لیکن جب اس طرح کے حالات نہ ہوں تو زیادہ بہتر یہی ہے کہ پوشیدہ طور پر غریبوں کو دے دو تاکہ ریا و نمائش کے فتنہ سے بھی محفوظ رہ سکو اور خوددار حاجت مندوں کی خودداری کی لاج بھی قائم رہ سکے۔ یہاں 'یُکَفِّرُ عَنْکُمْ' کا عطف 'فَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ' کے مفہوم پر ہے۔ یعنی اس پوشیدہ انفاق کا اجر بھی سوا ملے گا اور یہ تمہارے دامن سے گناہوں کو جھاڑنے میں بھی زیادہ کارگر ہوگا۔ پھر فرمایا کہ پوشیدہ اور علانیہ کا مسئلہ تمہارے لحاظ سے ہے۔ خدا سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں، تم جو کچھ بھی کرو گے، جہاں بھی کرو گے، جس جگہ بھی کرو گے، خدا ہر چیز سے باخبر ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۲۷۲)

خبر کے اسلوب میں انشائیہ جملہ

اس آیت میں کوئی خاص لفظ تحقیق طلب نہیں ہے صرف 'وَمَا تُنْفِقُوْنَ' الآیہ کے اسلوب کے باب میں کچھ تردد سا ہے۔ مجھے بار بار خیال ہوتا ہے کہ یہ خبر کے اسلوب میں انشائیہ جملہ ہے۔ عربی زبان میں یہ طریقہ معروف ہے۔ قرآن میں اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں کہ امر یا نہی کے مضمون کو ان مواقع میں خبریہ اسلوب

ہیں کر دیتے ہیں جب مخاطب کو کوئی بات شفقت اور التفاتِ خاص کے ساتھ سمجھانی ہو۔ میں نے ترجمہ میں اس کا لحاظ کیا ہے۔ پچھلوں میں سے بھی بعض لوگوں نے اس کو اختیار کیا ہے۔ لیکن مجھے اس پر پورا پورا جزم نہیں ہے۔ اہلِ علم اس کو نگاہ میں رکھیں۔

پوری آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بیک وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بطریق التفات مخاطب فرمایا ہے اور عام مسلمانوں کو بھی۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت اللہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اس سنت اللہ کی یاددہانی کی گئی ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے اور جس کا ذکر اس سورہ میں بھی ایک سے زیادہ مقامات میں ہوا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی مختلف اسلوبوں اور شکلوں میں ہوا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ نبی کی ذمہ داری لوگوں کی ہدایت کے معاملے میں صرف یہ ہے کہ وہ ان کو اللہ کی تعلیمات و ہدایات سے اچھی طرح آگاہ کر دے۔ اگر یہ کام اس نے کر دیا تو اس کا فرض پورا ہو گیا۔ یہ ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ لوگ ان تعلیمات و ہدایات کو قبول بھی کر لیں۔ ان کو قبول کرنے کی توفیق دینا اللہ کا کام ہے اور وہ یہ توفیق ان کو دیتا ہے جن کو چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس چاہنے کے لیے خود اس کا مقرر کیا ہوا ایک ضابطہ ہے جس کی وضاحت ہم آیات ۲۵۶-۲۶۰ کے تحت کر چکے ہیں۔

مقصود اس سنت اللہ کی طرف اشارہ کرنے سے یہ ہے کہ در بابِ انفاق جو باتیں بتانی تھیں وہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفصیل کے ساتھ بتا دیں۔ آپ کا فرض ادا ہو گیا۔ اب یہ لوگوں کا کام ہے کہ ان کو قبول کریں یا رد کریں۔ آپ اس چیز کے لیے پریشان نہ ہوں۔ اگر لوگ ان کی قدر نہ کریں گے تو اس کا خمیازہ خود ہی بھگتیں گے۔

خدا کو دینا اپنے لیے جمع کرنا ہے

مسلمانوں کو خطاب کر کے آخری تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ جو مال بھی تم خدا کی راہ میں خرچ کرو گے یہ نہ سمجھو کہ یہ کسی دوسرے کو دے رہے ہو بلکہ یہ تم اپنے ہی لیے جمع کر رہے ہو جو تمہیں سات سو گنے تک بڑھ کر ایک دن واپس ملنا ہے۔ بس یہ شرط ہے کہ تمہارا یہ خرچ کرنا اللہ کی خوشنودی کے سوا کسی اور مقصد سے نہ ہو۔ اللہ کی خوشنودی کے لیے جو کچھ خرچ کرو گے سب تمہارا پورا کر دیا جائے گا اس میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے گی۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲۷۳)

'لِلْفُقَرَآءِ' سے پہلے مبتدا محذوف ہے۔ یعنی یہ صدقہ و انفاق جس کی دعوت دی جا رہی ہے ان فقرا کے لیے ہے جن کی صفات یہ ہیں۔ مبتدا کے حذف کر دینے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ قرینہ خود اس پر دلیل ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے صدقے کے اخفا کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہو رہا ہے۔ گویا آیت نے انگلی اٹھا

کر محتاجوں کی طرف تو اشارہ کر دیا لیکن یہ بات کہ کس کام کے لیے اشارہ کیا گیا ہے، مخاطب کے فہم پر چھوڑ دی ہے۔ اس طرح صدقہ کے اخفا کے ساتھ ساتھ محتاجوں کی اس خودداری کی بھی آن محفوظ رہ گئی جس کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، یعنی کسی دینی مقصد نے ان کو کسبِ معاش کی جدوجہد سے روک رکھا ہے۔ یہ لوگ تجارت وغیرہ کے لیے ادھر ادھر سفر نہیں کر سکتے۔ ضَرْبٌ فِی الْاَرْضِ کے معنی سفر کرنے کے ہیں، مثلاً فرمایا ہے وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ۔ مزمل (اور کچھ دوسرے ایسے بھی ہوں گے جو فضلِ الٰہی کی تلاش میں زمین میں سفر کریں گے)

یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ، جاہل کے معنی یہاں بے خبر کے ہیں اور تَعَفُّف کے معنی خودداری کے ہیں۔ یعنی یہ لوگ خودداری کے سبب سے کسی کے آگے نہ تو دستِ سوال دراز کرتے نہ اپنے فقروفاقہ کا اظہار کرتے، اس وجہ سے جو شخص ان کے حالات سے بے خبر ہے ان کو مستغنی خیال کرتا ہے۔

تَعْرِفُھُمْ بِسِیْمٰھُمْ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا، سیما کے معنی علامت اور ہیئت کے ہیں جیسا کہ فرمایا ہے سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (ان کی پہچان، ان کے چہروں پر سجدوں کا نشان ہے)

لَا یَسْـَٔلُوْنَ الآیۃ کا مفہوم

الحاف کے معنی لپٹ کر سوال کرنے کے ہیں۔ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے) میں اصل مقصود سوال کرنے کی نفی ہے، اِلْحَافًا کی قید اس کے ساتھ صرف سوال کرنے والوں کی عام حالت کی تصویر اور اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے لگائی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے کہ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ (اپنی اولاد کو فقر کے اندیشے سے قتل نہ کرو) اس میں ممانعت درحقیقت قتل کی ہے، خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ کی قید محض اس کے گھنونے پن کو واضح تر کرنے کے لیے ہے یا فرمایا ہے کہ لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً (اور سود نہ کھاؤ دوگنا چوگنا کر کے) اس میں ممانعت دراصل سود کھانے کی ہے۔ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً کی قید محض اس کی کراہت کو نمایاں کرنے کے لیے ہے، یا فرمایا ہے کہ لَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ قیدِ نکاح میں آنا چاہتی ہیں) اس میں بھی مقصود مطلق اکراہ کی ممانعت ہے، اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا کی قید محض اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے ہے۔

اسی طرح لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا میں مقصود ان کے سوال کرنے کی نفی ہے نہ الحاف کی، قید محض سوال کرنے والوں کی عام حالت کے اظہار کے لیے ہے کہ بھلا جو لوگ اتنے خوددار ہیں کہ جو ان کے حال سے بے خبر ہو وہ ان کو غنی سمجھتا ہے، وہ گداگروں اور بھک منگوں کی طرح کی حرکت کس طرح کر سکتے ہیں؟ چنانچہ ان کی اسی خودداری اور پردہ داری کی وجہ سے قرآن نے اہلِ انفاق کو ان کا سراغ دینے کے لیے ان

کی پہچان یہ بتائی ہے کہ ان کو صرف چہرے بشرے سے پہچان کر ڈھونڈھنے کی کوشش کرو اور ان کے پاس خود پہنچو، یہ توقع نہ رکھو کہ عام گداگروں کی طرح یہ لوگ تمہارے پیچھے پیچھے بھاگیں گے۔

قرآن کے زمانہ نزول میں اس آیت کے بہترین مصداق اہل صفہ تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ احادیث میں ان کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں وہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے ان اشارات کے مطابق ہیں۔ قرآن نے ان آیات میں وہ نمونہ بھی دکھا دیا ہے جو باایمان فقراء کا ہونا چاہیے اور اس طریقے کی طرف بھی رہنمائی کر دی ہے جو ان فقراء کے معاملے میں باایمان اغنیا کو اختیار کرنا چاہیے۔ آج کے فقراء اور آج کے اغنیا اس آئینہ میں اپنی شکلیں دیکھیں۔

آخر میں فرمایا کہ "جو تم خرچ کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہے"۔ یعنی ایسے خوددار سائلوں کو تلاش کر کے چپ چپاتے ان کی حاجت روائی کرنا خلق سے چھپا رہے گا لیکن خالق سے چھپا نہیں رہے گا، وہ تمہارے ہر انفاق سے باخبر ہے اور وہ اس کا بھرپور صلہ دے گا۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲۷۴)

اس آیت میں رات اور دن، پوشیدہ اور علانیہ میں جو مناسبت اور تقابل ہے وہ ملحوظ رہے تو اوقات بھی سب احاطہ میں آگئے ہیں، اور حالتیں بھی دونوں اس میں جمع ہو گئی ہیں۔ نیز اہل ایمان کے اندر انفاق کے لیے جو جوش ہونا چاہیے اسلوبِ کلام سے وہ خود بخود ابلا پڑ رہا ہے۔ علاوہ بریں انفاق کا خدا کے ہاں جو صلہ ہے وہ بھی پورا پورا بیان ہو گیا ہے۔ یہ آیت انفاق کے سلسلے میں خاتمۂ باب کی حیثیت رکھتی ہے۔

۸۶- آگے کا مضمون ——— آیات ۲۷۵-۲۸۳

انفاق کے مضمون کے بعد اب آگے سود کی حرمت کا بیان ہوا۔ سود کا تعلق چونکہ قرض سے ہوتا ہے اس وجہ سے قرض کے لین دین سے متعلق جو ضروری ہدایات ہیں اسی سلسلے میں وہ بھی دی گئیں۔ رہن بھی اسی سے تعلق رکھنے والی چیز ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ اس کا حکم بھی بیان ہوا۔

سود کے متعلق یہ امر محتاجِ بیان نہیں ہے کہ یہ انفاق کا بالکل ضد ہے۔ انفاق کی محرک بلند ہمتی، ہمدردی، فیاضی، ایثار، رحم دلی ہے اور سود کی محرک بزدلی، خود غرضی، سنگدلی اور دوسروں کی مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ہے۔ انفاق ضرورت مندوں کو سہارا دینا چاہتا ہے اور سود گرے ہوؤں کا خون چوسنا چاہتا ہے۔ دونوں میں نسبت ضدین کی ہے اور فطرت کا اصول یہ ہے کہ کسی شے کی حقیقت اس وقت تک اچھی طرح واضح نہیں ہوتی جب تک اس کے ساتھ اس کے ضد کا بیان نہ ہو۔ اسی اصول کی بنا پر قرآن نے

اکثر چیزوں کے بیان میں یہ طریقہ ملحوظ رکھا ہے کہ ضدین کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے۔ مثلاً اہلِ ایمان کا بیان ہے تو اس کے ساتھ اہلِ کفر کا بھی بیان ہوا ہے۔ جنت کا ذکر آیا ہے تو اکثر اس کے ساتھ دوزخ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ یہاں تک کہ یہ چیز قرآن کے نظم کی ایک خصوصیت بن گئی ہے۔ اسی اصول پر قرآن نے انفاق کے ساتھ اکثر یا تو بخل کا ذکر کیا ہے یا سود خواری کا۔ یہاں اس کا ذکر انفاق کے بعد آیا ہے۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۳۰ میں انفاق کے بیان سے پہلے ہے۔ لیکن مقصود دونوں جگہ ایک ہی ہے کہ ایک کی تاریکی دوسرے کی روشنی کو اور ایک کا جمال دوسرے کی بدصورتی کو بے نقاب کر سکے۔ اس نظمِ کلام سے حکمت کے بعض ایسے گوشے آشکارا ہو جاتے ہیں جو کسی اور طریقے سے آشکارا نہیں ہو سکتے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۷۵-۲۸۳

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ
يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا
(وقف لازم) الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ
جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ
اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾
يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ
كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا
الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا
اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ
تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾
وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ

إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ
ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ ع ٣٨
آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُبْ
بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ
اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ
وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا
أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ
وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ ۖ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ
فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا
فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۚ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ
وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ
عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا ۖ إِلَّا أَنْ
تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ
وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِنْ تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَ
يُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨٢﴾ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ
وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ
بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ ۗ

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ
ع ۳۹ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

ترجمۂ آیات ۲۷۵-۲۸۳ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے مگر اس شخص کے مانند جس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے اور حال یہ ہے کہ اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا اور سود کو حرام۔ تو جس کو اللہ کی تنبیہ پہنچی اور وہ باز آگیا تو جو کچھ وہ لے چکا وہ اس کے لیے ہے۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو اب اس کے مرتکب ہوں تو وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ سود کو گھٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا، اور اللہ ناشکروں اور حق تلفوں کو پسند نہیں کرتا۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے بھلے کام کیے، نماز کا اہتمام کیا، زکوٰۃ ادا کی، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے، نہ ان کے لیے کوئی اندیشہ ہوگا نہ ان کو کوئی غم لاحق ہوگا۔ ۲۷۵-۲۷۷

اے ایمان والو، اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو سود تمھارا باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کر لو تو اصل رقم کا تمھیں حق ہے۔ نہ تم کسی کا حق مارو، نہ تمھارا حق مارا جائے۔ اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو فراخی تک اس کو مہلت دو اور بخش دو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو جو اس نے کمائی کی ہے پوری پوری مل جائے گی اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ ۲۷۸-۲۸۱

اے ایمان والو، جب تم کسی معین مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو اور اس کو لکھے تمھارے مابین کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ۔ اور جیسے لکھنا آتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ جس طرح اللہ نے اس کو سکھایا اس طرح وہ دوسروں کے لیے لکھنے کے کام آئے اور یہ دستاویز لکھوائے وہ جس پر حق عاید ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ سے، جو اس کا رب ہے، ڈرے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے۔ اور اگر وہ، جس پر حق عاید ہوتا ہے، ناداں یا ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھوائے۔ اور اس پر اپنے لوگوں میں سے دو مردوں کو گواہ ٹھہرا لو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہی، یہ گواہ تمھارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں۔ دو عورتیں اس لیے کہ ایک بھول جائے گی تو دوسری یاد دلا دے گی۔ اور گواہ جب بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں۔ اور قرض چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی مدت تک کے لیے اس کو لکھنے میں تساہل نہ برتو۔ یہ ہدایات اللہ کے نزدیک زیادہ قرین عدل، گواہی کو زیادہ ٹھیک رکھنے والی اور اس امر کے زیادہ قرین قیاس ہیں کہ تم شبہات میں نہ پڑو۔ ہاں اگر معاملہ دست بدست لین دین اور دست گرداں نوعیت کا ہو تب اس کے نہ لکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور تم کوئی معاملہ خرید و فروخت کا کرو تو اس صورت میں بھی گواہ بنا لیا کرو۔ اور کاتب یا گواہ کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچایا جائے اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمھاری بڑی پائدار نافرمانی ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ تمھیں تعلیم دے رہا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ۲۸۲

اور اگر تم سفر میں ہو اور کاتب نہ مل سکے تو رہن قبضہ میں کرا دو، پس اگر ایک دوسرے پر اعتماد کی صورت نکل آئے تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ اس کی امانت ادا کرے

اور اللہ سے جو اس کا رب ہے ڈرے۔ اور شہادت کو چھپاؤ مت۔ جو اس کو چھپائے تو وہ یاد رکھے کہ اس کا دل گنہگار ہے، اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کو جاننے والا ہے۔ ۲۸۳

۸۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۷۵)

لفظ ربٰو کا مفہوم ربا، یربو، ربآءً کے معنی بڑھنے اور زیادہ ہونے کے ہیں۔ اسی سے ربٰو ہے جس سے مراد وہ معین اضافہ ہوتا ہے جو ایک قرض دینے والا مجرد مہلت کے عوض اپنے مقروض سے اپنی اصل رقم پر وصول کرتا ہے۔ جاہلیت اور اسلام دونوں میں یہ اصطلاح مذکورہ مفہوم کے لیے مشہور رہی ہے، اس کی شکلیں مختلف رہی ہیں، لیکن اس کی اصل حقیقت یہی ہے کہ قرض دینے والا قرضدار سے ایک معین شرح بعد صرف اس حق کی بنا پر اپنے دیے ہوئے روپے کا منافع وصول کرے کہ اس نے ایک خاص مدت کے لیے اس کو روپے کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ اس امر کو اس کی حقیقت کے تعین میں کوئی دخل نہیں ہے کہ قرض کسی غریب و نادار کو دیا گیا ہے یا کسی امیر و تاجدار کو اور نہ اس بات سے اس میں کوئی فرق واقع ہوتا کہ قرض کسی میت کی تجہیز و تکفین کے لیے دیا گیا ہے یا کسی رفاہی اسکیم کے لیے دیا گیا ہے، یا تجارت، زراعت اور صناعت کے کسی انفرادی یا اجتماعی منصوبے کے لیے دیا گیا ہے۔ جاہلیت اور اسلام دونوں میں ربٰو کی اصطلاح کا جو مفہوم مسلم رہا ہے اس میں ان ظاہری اختلافات سے سر مو فرق واقع نہیں ہوتا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مقصد قرض یا قرضدار کی نوعیت و حیثیت کی تبدیلی ربٰو کی عرفی حیثیت کو بدل دیتی ہے ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ خود قرآن کے الفاظ سے اس خیال کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے۔

تخبط کی تحقیق 'تخبط' کا لفظ 'خبط اللیل' سے ہے جس کے معنی رات کی تاریکی میں بھٹکنے کے ہیں۔ خابط اللیل اس شخص کو کہیں گے جسے داہنے بائیں کا کچھ ہوش نہ ہو، بس یوں ہی ہرزہ گردی کر رہا ہو۔ اسی سے یخبط خبط عشواء کا محاورہ ان لوگوں کے لیے پیدا ہوا جو بصیرت سے بالکل محروم ہوں اور اندھے بھینسے کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے ہوں۔ اسی سے تخبطہ الشیطٰن نکلا جس کے معنی ہیں مسّہ الشیطٰن بخبل او جنون اس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل اور دیوانہ بنا دیا۔

مس کے معنی

مَسّ کے اصل معنی چھونے کے ہیں۔ اس کا غالب استعمال کسی برائی، آفت اور دکھ کے پہنچنے اور لاحق ہونے کے لیے ہوتا ہے۔ ہم نے موقع کے لحاظ سے اس کا ترجمہ چھوت کیا ہے۔ جو لفظی بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ یوں تو دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے خدا ہی کے اذن سے ہوتا ہے لیکن شیطان کو جن کاموں کے لیے جبلت ملی ہوئی ہے ان کی نسبت بعض اوقات اس کی طرف کر دی جاتی ہے۔ جیسے حضرت ایوبؑ کی دعا میں ہے إِنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ۴۱۔ ص (شیطان نے مجھے دکھ اور تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے) نیک بندوں پر تو ارواح خبیثہ کا اثر اس سے زیادہ نہیں ہوتا کہ ان کو کوئی اذیت یا آزمائش پیش آجائے لیکن جن کی روحیں خود خبیث ہوتی ہیں، جس طرح ان کا قلب شیطان کی مٹھی میں ہوتا ہے اسی طرح کبھی کبھی ان کے عقل و دماغ سب پر شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے اور وہ ظاہر میں بھی بالکل پاگل ہو کر کپڑے پھاڑتے، گریبان چاک کرتے، منہ پر جھاگ لاتے اور پریشان حال، پراگندہ بال جدھر سینگ سمائے ادھر آوارہ گردی اور خاکبازی کرتے پھرتے ہیں۔

صاحب انفاق اور سود خوار کے ساتھ اللہ کا معاملہ

اوپر اہل انفاق کے متعلق آپ پڑھ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی تربیت فرماتا ہے، ان کو علم اور عمل دونوں میں رسوخ و عزیمت عطا فرماتا ہے، ان کے انفاق میں برکت بخشتا ہے، ان کا کارساز بن کر ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے، ان کو حکمت کا لازوال خزانہ بخشتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آخرت میں ان کو لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کے سرور ازلی و ابدی سے نوازے گا۔

اب یہ اس کے بالکل مخالف کردار رکھنے والوں یعنی سود خواروں کا بیان ہے۔ ان کی نسبت فرمایا کہ یہ جب روز قیامت کو اٹھیں گے تو بالکل اس طرح اٹھیں گے جس طرح وہ شخص اٹھا کرتا ہے جس پر کسی جنات یا چھوت کا سایہ ہو، جس سے وہ بالکل مخبوط الحواس ہو رہا ہو۔ اس تشبیہ کی زیادہ وضاحت نہیں فرمائی ہے اس لیے کہ اس کے اجمال ہی میں ساری وضاحت موجود ہے۔ جس طرح قرآن میں ایک جگہ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ کی تشبیہ ہے جس کے الفاظ کو سن کر ہی دل پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، اسی طرح يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ کے الفاظ سے خود ہی وحشت زدگی اور پریشان حالی کی ایک ایسی تصویر سامنے آجاتی ہے جو کسی وضاحت کی محتاج نہیں رہ جاتی۔

آگے فرمایا کہ ان کی یہ حالت اس وجہ سے ہوگی کہ سود کی حرمت پر وہ اعتراض اٹھاتے تھے کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے تو پھر بیع کو اللہ نے حلال اور سود کو حرام کیوں ٹھہرایا؟ چونکہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو بالکل مخبوط الحواس ہو، جس کی عقل ماری گئی ہو اور شیطان نے جس کو اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو اس وجہ سے عمل اور جزا کی مشابہت کے قانون کے تحت، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے مَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (جو دنیا میں عقل اور دل کا اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی اٹھے گا) ایسا شخص جب قیامت میں اٹھے گا تو پاگلوں اور دیوانوں کی طرح اٹھے گا۔

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا کا موقع و محل

یہاں ان کے قول کا حوالہ دے کر اس کو نظر انداز کر دیا ہے، اس کی تردید نہیں کی ہے۔ اس لیے کہ اس قول کی لغویت اتنی واضح ہے کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو بالکل پاگل ہو چکا ہو اور پاگلوں کی کسی بات کی تردید کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ ہمارے اہل تاویل نے عام طور پر وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا کے ٹکڑے کو ان کی اس بات کی تردید کے معنی میں لیا ہے اور اسی پہلو سے اس کی تاویل کی ہے۔ اگرچہ اس بات کا بھی ایک محل ہے کیونکہ اللہ کا کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا بجائے خود اس امر کی بہت بڑی دلیل ہے کہ عقل و فطرت اور معاش و معاد کے نقطۂ نظر سے اس چیز کی حلت یا حرمت بالکل معقول ہے لیکن یہ دلیل صرف مومن کے لیے قابلِ اعتماد ہے، منکر کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس وجہ سے مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ٹکڑا الگ نہیں ہے بلکہ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا کے تحت ہی ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو ربٰو ہی کی طرح ہے، جب ایک تاجر اپنے سرمایہ پر نفع لیتا ہے تو ایک سرمایہ دار اگر اپنے سرمایہ کا نفع حاصل کرتا ہے تو آخر وہ مجرم کیوں ٹھہرے، پھر اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیوں ٹھہرایا؟ ہر چند یہ جملہ بشکل سوال نہیں ہے لیکن اس کے اندر وہی سوال یا اعتراض پوشیدہ ہے جو پہلے ٹکڑے کے اندر ہے۔

تاجر اور سودخوار کے سرمایہ میں فرق

اس اعتراض سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی کہ سود کو بیع پر قیاس کرنے والے پاگلوں کی نسل دنیا میں نئی نہیں ہے بلکہ بڑی پرانی ہے۔ قرآن نے اس قیاس کو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، لائق توجہ نہیں قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بداہتہً باطل اور قیاس کرنے والے کی دماغی خرابی کی دلیل ہے۔ ایک تاجر اپنا سرمایہ ایک ایسے مال کی تجارت پر لگاتا ہے جس کی لوگوں کو طلب ہوتی ہے، وہ محنت، زحمت اور خطرات مول لے کر اس مال کو ان لوگوں کے لیے قابلِ حصول بناتا ہے جو اپنی ذاتی کوشش سے اوّل تو آسانی سے اس کو حاصل نہیں کر سکتے تھے اور اگر حاصل کر سکتے تھے تو اس سے کہیں زیادہ قیمت پر جس قیمت پر تاجر نے ان کے لیے مہیا کر دیا۔ پھر تاجر اپنے سرمایہ اور مال کو کھلے بازار میں مقابلہ کے لیے پیش کرتا ہے اور اس کے لیے منافع کی شرح بازار کا اتار چڑھاؤ مقرر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس اتار چڑھاؤ کے ہاتھوں بالکل دیوالیہ ہو کر رہ جائے اور ہو سکتا ہے کہ کچھ نفع حاصل کرے۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں کہ وہ ایک بار ایک روپے کی چیز ایک روپے دو آنے یا چار آنے میں بیچ کر پھر اس روپے سے ایک دھیلے کا بھی کوئی نفع اس وقت تک نہیں کما سکتا جب تک اس کا وہ روپیہ تمام خطرات اور سارے اتار چڑھاؤ سے گزر کر پھر میدان میں نہ اترے اور معاشرے کی خدمت کر کے اپنے لیے استحقاق نہ پیدا کرے۔

بھلا بتایئے کیا نسبت ہے ایک تاجر کے اس جانباز، غیور اور خدمت گزار سرمایہ سے ایک سودخوار کے اس تنگ دل، بزدل، بے غیرت اور دشمنِ انسانیت سرمایہ کو جو جوکھم تو ایک بھی برداشت

کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن منافع بٹانے کے لیے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ سود خور کا سرمایہ دو بھیسوں میں ظاہر ہوتا ہے اور دونوں ہی میں وہ یکساں بزدل اور خونخوار ہے۔ ایک تو یہ سودی کاروبار کرنے والے بنیوں، پٹھانوں اور یہودیوں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، اس شکل میں تو اس کی خونخواری سے کسی کے لیے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے اس لیے کہ ایک بنیا یا پٹھان جب ایک مرتبہ اپنے جال میں کسی کو پھنسا پاتا ہے تو چاہے اس مظلوم کے جسم پر گوشت کی ایک بوٹی بھی باقی نہ رہ گئی ہو لیکن وہ اپنی ہر میعاد پر آکر اپنا ایک پونڈ گوشت کاٹ لے گا اور مدت العمر کی اس قطع و برید کے بعد بھی بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ نہ صرف بنیے کا اصل سرمایہ قرضدار پر لدا رہتا ہے بلکہ وہ اصل سے کئی گنا ہو کر اکاس بیل کی طرح مظلوم قرض دار کے گھر در، اس کے اثاث البیت اور اس کے زن و فرزند ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور خاندان کے خاندان کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے رکھ دیتا ہے۔ بتایئے کس تاجر کے سرمایہ میں یہ سکت ہے کہ وہ کسی پر یہ ظلم ڈھا سکے؟ وہ تو زیادہ سے زیادہ اگر کر سکتا ہے تو یہ کہ بازار کے سارے اتار چڑھاؤ کا مقابلہ کر کے اگر موقع پا جائے تو اپنی ایک روپیہ کی چیز ڈیڑھ یا دو روپے میں بیچ لے اور وہ بھی ایک مرتبہ۔

سود خور کے سرمایہ کا دوسرا بھیس وہ ہے جس میں وہ رفاہی کاموں، اجتماعی منصوبوں اور ملکی اسکیموں کی سرپرستی کے نام سے اٹھتا ہے۔ اس زمانے میں بہت سے سادہ لوح اس بھیس میں اس کو بڑا معصوم سمجھتے ہیں لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بزدلی اور خودغرضی کی خصلت بد اس کے اس جامے میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح پہلے بھیس میں موجود ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ فرض کیجیے ملک کی حکومت ملک کے کسی حصے کو سیلاب کی تباہ کاریوں سے یا کسی اور خطرے سے بچانے کے لیے کوئی بڑا منصوبہ عمل میں لانا چاہتی ہے اور اس کے لیے پانچ یا سات فی صد کی شرح پر لوگوں سے قرض لیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حکومت کا منصوبہ کروڑوں روپے خرچ کرنے کے بعد کسی ارضی و سماوی آفت کی زد میں آکر تباہ ہو جائے۔ اب بتایئے کہ ملک نے تو بحیثیت مجموعی ایک شدید قسم کا نقصان اٹھایا لیکن جن سود خوروں نے اس کے لیے قرض دیے تھے نہ صرف ان کا سرمایہ محفوظ ہے بلکہ ایک معین شرح کے ساتھ اس کا سود بھی دمبدم اس میں اضافے پر اضافہ کیے چلا جا رہا ہے۔ آخر یہ قومی خدمت کی کون سی شکل ہوئی؟ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ پہلی صورت میں اور اس دوسری صورت میں حقیقت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ پہلی صورت میں سود خور کو صرف اس امر سے بحث ہے کہ اس کا سرمایہ محفوظ رہے اور منافع کا ایک پونڈ گوشت بغیر کسی غل و غش کے فصل فصل پر اس کو ملتا رہے، چاہے قرض دار کی سات پشتیں فاقہ کرتی مر جائیں۔ اور اس صورت میں بھی اس کے سامنے یہی چیز ہے کہ اس کا اصل سرمایہ بے داغ محفوظ ہے، معین سود اس کے حساب میں جمع ہو رہا ہے، رہا قوم کا مردہ تو وہ چاہے دوزخ میں جائے

یا بہشت ہیں۔

برعکس اس کے ایک تاجر کا سرمایہ قوم اور ملک کی خدمت کے لیے سب سے پہلے خود اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ اگر حالات کے رد و بدل، بازار کے اتار چڑھاؤ، یا کسی اور سبب سے اس کو نقصان پہنچ جائے تو اس نقصان کو وہ اپنے ہی اوپر برداشت کرتا ہے۔ اس کے لیے ایک لمحہ کے واسطے بھی اس بات کا امکان نہیں ہوتا کہ وہ سودخور کے سرمائے کی طرح کسی کمین گاہ میں چھپ کر بیٹھے اور دوسروں سے اپنا نفع وصول کرتا رہے۔ اگر اس کو سازگار سے سازگار حالات بھی میسر آجائیں تب بھی بہرحال اس کے منافع کی شرح پر بازار کا فیصلہ ناطق ہوتا ہے اور اس طرح جو کچھ وہ حاصل کر پاتا ہے درحقیقت وہ اس کا جائز حق المحنت ہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاجر کے منافع کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تعبیر فرمایا ہے اور سُود خور کے سرمایہ کو، جیساکہ ہم سورۂ روم کی تفسیر میں واضح کریں گے، اس سانڈ سے تشبیہ دی ہے جو دوسروں کی چراگاہ میں چر کر فربہ ہو رہا ہو۔

سود خواروں کے لیے تنبیہ

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ الآیۃ۔ موعظت کے لفظ میں زجر و تنبیہ کا پہلو غالب ہے اس وجہ سے اس کی اصل روح کو پیش نظر رکھ کر ہم نے اس کا ترجمہ تنبیہ کیا ہے۔ اس کی تانیث چونکہ غیر حقیقی ہے اس وجہ سے لفظ کے مفہوم کے لحاظ سے اس کے لیے فعل مذکر آیا ہے۔ 'مِنْ رَّبِّهٖ' کے الفاظ نے اس تنبیہ کے اندر ایک خاص زور پیدا کر دیا ہے۔ یعنی یہ تنبیہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے بلکہ یہ سب کے مالک و آقا کی طرف سے تنبیہ ہے اس وجہ سے اس کو سہل نہیں خیال کرنا چاہیے۔ 'فَلَهٗ مَا سَلَفَ' یعنی اس تنبیہ کے بعد جو سودی لین دین سے رک گیا، اس سے اس کے پچھلے لیے ہوئے سود کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ اس قانون کا نفاذ اگر ماضی پر بھی اثر انداز ہوتا تو اس سے ناقابلِ حل مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ یعنی ایسے شخص سے اسلامی حکومت تو اس کے سابق سودوں پر کوئی گرفت نہیں کرے گی لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا سے بھی اس کو معافی مل گئی، بلکہ اس کا معاملہ خدا کے حوالے ہے۔ خدا کے حوالے کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کی پکڑ سے بچنے کے لیے مجرد یہ بات کافی نہیں ہے کہ آدمی سود نہ لے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے دل سے بھی سود کا ہر شائبہ نکل جائے۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس طرح کے لوگ آخرت سے بے خوف ہو کر نہ بیٹھ رہیں بلکہ جس حد تک بھی ہو سکے اپنے پچھلے مظالم کی تلافی کی کوشش کریں، اس لیے کہ یہ مظالم حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے ہیں اور حقوق العباد کا معاملہ خدا کے ہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ یعنی اس واضح تنبیہ کے بعد بھی جو لوگ سودی کاروبار کریں گے وہ دوزخی ہیں اور وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے دائمی دوزخ کی سزا کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ان کا یہ رویہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ خدا کے اس حکم

کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی اگر جذبات کے غلبے کے سبب سے ہو جاتی ہے تو توبہ کے ذریعے سے اس کی اصلاح کی راہ کھلی ہوئی ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ توبہ سے غفلت کے باوجود اللہ تعالیٰ کسی کو معاف کر دے یا اس کے گناہوں کے بقدر اس کو سزا دے کر رہائی دے لیکن جب نہایت واضح تذکیر و تنبیہ کے بعد بھی ایک شخص کسی حکم کی خلاف ورزی پر اصرار کیے چلا جا رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کے اس حکم کا منکر ہے۔ اگر وہ اس کے ساتھ ایمان کا بھی دعویٰ کرتا ہے تو یہ محض ایک منافقانہ قسم کی حرکت ہے جو اس عالم الغیب سے مخفی نہیں ہے جو دلوں کے تمام بھیدوں سے بخوبی واقف ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے وہ مستحق ہیں، یعنی ان کو جہنم کے اس دائمی عذاب میں جھونک دے گا جو کفار و منافقین کے لیے مقرر ہے۔

گناہ کا احاطہ دائمی عذاب کا موجب ہے

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایک چیز تو ہے کسی جرم کا مرتکب ہونا اور ایک چیز ہے کسی جرم کو اوڑھنا بچھونا بنا لینا۔ جو جرم اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے وہ مجرم کی زندگی کے کسی ایک ہی پہلو کو متاثر نہیں کرتا بلکہ اس کی زندگی کا ہر پہلو اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ اس کا ظاہر، اس کا باطن، اس کا عقیدہ، اس کا عمل اور اس کا ایمان و اسلام سب اس جرم کی چھاپ قبول کر لیتا ہے۔ اس حالت کو قرآن نے 'احاطہ' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لیے دائمی عذاب نار ہے۔ مثلاً ارشاد ہے۔ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۸۱۔ بقرہ) (البتہ جس نے کوئی بدی کمائی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (٢٧٦-٢٧٧)

'محق' کے معنی گھٹانے اور مٹانے کے ہیں۔ اسی سے 'مَحَقَ اللّٰهُ الشَّيْءَ' نکلا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے اس چیز کی برکت مٹا دی۔ 'ارباء' کے معنی بڑھانے اور زیادہ کرنے کے ہیں۔

سود کی بے برکتی اور صدقات کی برکت

مطلب یہ ہے کہ سود خور تو یہ سمجھتا ہے کہ سود سے سرمایہ بڑھتا اور خیرات سے گھٹتا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اللہ تعالیٰ سود کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ یہ گھٹانا اور بڑھانا دنیوی زندگی کے محدود تصور کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کی مجموعی زندگی کے لحاظ سے ہے۔ جب اخروی زندگی کی صبح ہوگی تو سود خور دیکھے گا کہ دنیا کے بنک میں تو اس کے لاکھوں روپے جمع تھے لیکن خدا کے بنک میں اس کی ایک کوڑی بھی نہیں ہے، صرف حسرت و ندامت ہی اس کا سرمایہ ہے۔ برعکس اس کے خدا کی راہ میں انفاق کرنے والا جب اس زندگی میں آنکھ کھولے گا تو دیکھے گا کہ اس کے

خزف ریزوں کے عوض یہاں ابدی قدر و قیمت رکھنے والے جواہرات کے پہاڑ بنے ہوئے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ اس امر کی وضاحت بھی ہے کہ اس گھٹنے اور بڑھنے کا تعلق آخرت ہی کی زندگی سے ہے۔ مثلاً وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا۟ فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۳۹۔ روم (اور جو مال تم سود کے لیے دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے مال میں مل کر بڑھے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو، اس کی رضا طلبی میں، تو یہی لوگ خدا کے ہاں بڑھانے والے ہیں)

احادیث سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صدقہ کو قبول کرتا ہے اور اس کو اپنے داہنے ہاتھ سے لیتا ہے، پھر وہ اس کی تمہارے لیے اس طرح پرورش کرتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بچھڑے کی پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ تمہارا دیا ہوا ایک لقمہ خدا کے ہاں احد پہاڑ کی مانند بن جائے گا۔"

اگرچہ سود کے سرمایہ میں کوئی خیر و برکت اس دنیا کی زندگی میں بھی نہیں ہوتی لیکن آیت کا تعلق آخرت ہی کے نتائج و ثمرات سے ہے۔

سود کی بے برکتی کا باعث

'کفار' کے معنی یہاں ناشکرے کے ہیں اور 'اثیم' کے معنی، جیسا کہ ہم دوسری جگہ وضاحت کر چکے ہیں، دوسروں کے حقوق تلف کرنے والے کے ہیں، یہ ٹکڑا اس بات کی وضاحت کر رہا ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ سود خور کے سرمایہ کو گھٹائے گا۔ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ناشکرا اور اللہ کے بندوں کے حقوق تلف کرنے والا ہے اور اللہ ان لوگوں کو کبھی دوست نہیں رکھ سکتا جو اس کی ناشکری کرنے والے اور اس کی مخلوق کے حقوق تباہ کرنے والے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی ضرورت سے زیادہ مال دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ وہ خدا کا شکر گزار بندہ بنے اور جس طرح اللہ نے اس کے اوپر احسان فرمایا ہے اسی طرح وہ دوسروں پر احسان کرے لیکن جب وہ مال کو پا کر اس مال ہی کی بندگی میں لگ جاتا ہے اور دوسروں کے لیے سہارا بنانے کے بجائے اس کو ان کا خون چوسنے اور ان کے حقوق تلف کرنے کا ذریعہ بنا لیتا ہے تو ایسا قسی القلب اور ناشکرا اسی بات کا سزاوار ہے کہ اللہ کے ہاں اس کی دولت صرف موجبِ وبال و خسران ہو، اور محرومی کے سوا اس کے پلے کچھ نہ پڑے۔

اس کے بعد اہل ایمان کے عظیم اجر و ثواب کا ذکر فرمایا ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اشارہ ان اہل ایمان کی طرف ہے جن کے صدقات میں برکت کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ فرمایا ہے۔ اس آیت کے تمام اجزاء کی تشریح مختلف مقامات میں گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۲۷۸)

سودی کاروبار پر کاری ضرب

اس آیت میں اہل ایمان کو براہ راست خطاب کر کے اللہ سے ڈرتے رہنے اور سود کا جو حصہ قرضداروں کے ذمہ ابھی باقی تھا اس سے بالکل دستبردار ہو جانے کی ہدایت فرمائی اور اس کو ایمان کا لازمی تقاضا ٹھہرایا۔ اس سے پہلے سود سے متعلق جو آیات نازل ہوئی تھیں ان کی نوعیت نصیحت و موعظت کی تھی اور ان کی بنیاد اس امر پر تھی کہ آسمانی مذاہب اور دنیا کے معروف میں اس کی حیثیت ہمیشہ سے ایک حرام یا کم از کم ایک مکروہ شے کی رہی ہے۔ اہل عرب اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھے۔ اس وجہ سے قرآن نے مکی دور ہی سے اس کا ظلم ہونا واضح کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ اسی پہلو سے اس کا ذکر سورۂ روم میں بھی ہوا ہے اور وہ ایک مکی سورہ ہے لیکن چونکہ اس کی نوعیت ایک وسیع معاشی فساد کی تھی جس کی اصلاح بغیر اس کے ممکن نہیں تھی کہ ملک کا پورا نظام عملاً اسلام کے زیر اقتدار ہو اس وجہ سے اس پر آخری ضرب حجۃ الوداع کے موقع پر لگائی گئی۔ یہ آیتیں اسی موقع پر نازل ہوئیں اور مضمون کی مناسبت کی وجہ سے ان کو ترتیب میں یہاں جگہ دی گئی۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ ۚ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (۲۷۹)

سود خواروں کو الٹی میٹم

اس کی نوعیت بالکل الٹی میٹم کی ہے یعنی اب جو لوگ اس حکم کو نہ مانیں گے وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جائیں۔ سود کے متعلق جو لب و لہجہ ان آیات کا ہے بعینہٖ یہی لہجہ سود سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع میں معلوم ہوتا ہے جس سے ان آیات کے زمانۂ نزول کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس آیت سے صریح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی نظام میں سودی کاروبار کرنے والوں کی حیثیت باغیوں اور مفسدوں کی ہے جن کی سرکوبی کے لیے عند الضرورت فوجی کاروائی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

اس الٹی میٹم کے بعد سودی کاروبار رکھنے والوں کو صرف اس امر کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنی اصل رقمیں قرض داروں سے واپس لے سکتے ہیں، نہ وہ اس میں کسی چال سے سود کی کوئی رقم جوڑ کر قرض دار کی حق تلفی کی راہ ڈھونڈھیں اور نہ قرض داروں کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ اس اصلاح سے فائدہ اٹھا کر مہاجنوں کی اصل رقمیں بھی دبا بیٹھنے کی کوشش کریں۔ یہ تنبیہ اس لیے ضروری ہوئی کہ جب کوئی اہم معاشرتی اور معاشی اصلاح عمل میں آتی ہے تو اس سے متاثر ہونے والے طبقات میں بڑی ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ جن کو اس اصلاح سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے وہ ایسی تدبیریں اور ایسے حیلے اختیار کرتے ہیں جن سے وہ اپنے آپ کو نقصان سے بچا لے جائیں اور جنھیں فائدہ پہنچنے کی توقع ہوتی ہے وہ فائدہ کی اسی مقدار پر قناعت نہیں کرنا چاہتے جو انھیں قانون پہنچا رہا ہے بلکہ وہ قانون کی حدود سے آگے بڑھ کر ہاتھ مارنا چاہتے ہیں۔ اس افراتفری اور کشاکش کو روکنے کے لیے قرآن نے اول تو اس کے لیے

بہت پہلے سے، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، ذہنوں کو تیار کیا، پھر جب آخری حکم دیا تو اس کے ساتھ یہ ہدایت فرما دی کہ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ اسی ہدایت کی یہ برکت تھی کہ عرب میں یہ عظیم معاشی اصلاح بغیر کسی طبقاتی کش مکش کے عمل میں آ گئی۔ نہ مہاجنوں پر کوئی آفت آئی نہ قرضداروں کو کوئی گزند پہنچا بلکہ دونوں اس اصلاح کی برکت سے یکساں طور پر مستفید ہوئے۔ اگر بات کے اپنے حدود سے آگے بڑھ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو یہاں ہم دکھاتے کہ دنیا میں دوسری قوموں کو اس قسم کی اصلاحات کے لیے کیا کیا قیمتیں دینا پڑی ہیں۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲۸۰-۲۸۱)

اوپر مہاجنوں کو یہ اجازت جو دی ہے کہ وہ اپنی اصل رقم قرضداروں سے واپس لے سکتے ہیں، اس کے ساتھ ان کو یہ ہدایت دی کہ اگر قرض دار تنگ دست ہو تو اس کو ہاتھ کشادہ ہونے تک مہلت دو اور اگر ایسی حالت میں اپنی اصل رقم بھی معاف کر دو تو یہ بہت بہتر ہے، اس کا اجر و ثواب بے پایاں ہے۔

حامیانِ سود کا ایک مغالطہ اور اس کا جواب

اس زمانے میں بعض کم سواد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں زمانۂ نزول قرآن سے پہلے جو سود رائج تھا یہ صرف مہاجنی سود تھا۔ غریب اور نادار لوگ اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے لیے مہاجنوں سے قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے اور یہ مہاجن ان مظلوموں سے بھاری بھاری سود وصول کرتے تھے، اسی سود کو قرآن نے ربٰو قرار دیا ہے اور اسی کو یہاں حرام ٹھہرایا ہے۔ رہے یہ تجارتی کاروباری قرضے جن کا اس زمانے میں رواج ہے تو ان کا اس زمانے میں نہ دستور تھا نہ ان کی حرمت و کراہت سے قرآن نے کوئی بحث کی ہے۔

عرب میں تجارتی قرضوں پر سود لینے کا بھی رواج تھا

ان لوگوں کا نہایت واضح جواب خود اس آیت کے اندر ہی موجود ہے۔ جب قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ اگر قرض دار تنگ دست (ذُوْ عُسْرَةٍ) ہو تو اس کو کشادگی (میسرہ) حاصل ہونے تک مہلت دو تو اس آیت نے گویا پکار کر یہ خبر دے دی کہ اس زمانے میں قرض لینے والے امیر اور مال دار لوگ بھی ہوتے تھے۔ بلکہ یہاں اگر اسلوبِ بیان کا صحیح صحیح حق ادا کیجیے تو یہ بات نکلتی ہے کہ قرض لین دین کی معاملت زیادہ تر مال داروں ہی میں ہوتی تھی۔ البتہ امکان اس کا بھی تھا کہ کوئی قرض دار تنگ حالی میں مبتلا ہو کہ اس کے لیے مہاجن کی اصل رقم کی واپسی بھی ناممکن ہو رہی ہو تو اس کے متعلق یہ ہدایت ہوئی کہ مہاجن اس کو اس کی مالی حالت سنبھلنے تک مہلت دے اور اگر اصل بھی معاف کر دے تو یہ بہتر ہے۔ اس معنی کا اشارہ آیت کے الفاظ سے نکلتا ہے اس لیے کہ فرمایا ہے کہ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ (اگر قرض دار تنگ حال ہو تو اس کو کشادگی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے)۔ عربی زبان میں اِنْ کا استعمال عام اور عادی حالات کے لیے نہیں ہوتا بلکہ بالعموم نادر اور شاذ حالات کے بیان کے لیے ہوتا ہے۔ عام حالات کے بیان کے لیے عربی میں 'اذا' ہے۔ اس روشنی میں غور کیجیے تو آیت کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اس زمانہ میں عام طور پر قرض دار ذو میسرۃ (خوش حال) ہوتے تھے لیکن گاہ گاہ ایسی صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی

کہ قرضدار غریب ہو یا قرض لینے کے بعد غریب ہو گیا ہو تو اس کے ساتھ اس رعایت کی ہدایت فرمائی۔

یوں تو اس تفسیر میں جو کچھ بھی میں لکھ رہا ہوں سب استاذ رحمۃ اللہ علیہ ہی کا فیض ہے لیکن خاص اس آیت سے متعلق ان کے اپنے الفاظ بھی مجھے مل گئے ہیں جو کم از کم آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ان کے قلم سے نکلے ہیں جب سود کے مسئلہ میں معترضین کی یہ موشگافیاں نہیں پیدا ہوئی تھیں جو اب پیدا ہو گئی ہیں۔ اس وقت مولیناؒ نے بالکل غیر جانبدارانہ ذہن کے ساتھ، مجرد قرآن کے الفاظ سے جو رائے اس مسئلہ پر قائم فرمائی تھی وہ یہ ہے۔

"فَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ میسو م من هذه الكلمات انهم كانوا ياخذون الربٰوا من ذي ميسرة والقريش كانت تجارا واصحاب الربٰو فلا ارى فرقا بين حالهم وحال ابناء زماننا في الربٰوا والله اعلم بالصواب۔

فَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ الآیۃ کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اہل عرب خوش حالوں سے بھی سود لیتے تھے۔ پھر قریش تاجر لوگ تھے اور سودی بیوپار ان میں رائج تھا۔ اس وجہ سے اس معاملے میں ان کے اور ہمارے حالات کے درمیان کوئی خاص فرق مجھے درباب سود نظر نہیں آتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ظاہر ہے کہ مالدار لوگ اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی کے لیے مہاجنوں کی طرف رجوع نہیں کرتے رہے ہوں گے بلکہ وہ اپنے تجارتی مقاصد ہی کے لیے قرض لیتے رہے ہوں گے۔ پھر ان کے قرض اور اس زمانے کے ان قرضوں میں جو تجارتی اور کاروباری مقاصد سے لیے جاتے ہیں کیا فرق ہوا؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ
كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ
وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَـيْـــًٔـا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ
لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ
لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ
اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْــَٔـمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا
اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً
حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْھَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا
يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۸۲)

'املاء' اور 'املال' کا مفہوم

اس آیت میں کوئی خاص لفظی یا نحوی اشکال نہیں ہے۔ لفظ املال کے معنی وہی ہیں جو املاء کے ہیں، یعنی لکھوانے کے۔ قرآن نے ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے اور بعینہ ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔ میں نے ان دونوں کے مادے اور مشتقات پر جہاں تک غور کیا ہے اس سے میرا رجحان اس بات کی طرف ہے کہ لکھوانے کے معنی میں اصل لفظ تو 'املاء' ہی کا ہے لیکن صوتی مشابہت کی وجہ سے 'املال' بھی اس معنی میں استعمال ہونے لگا ورنہ بجائے خود املال کے مادے میں لکھنے یا لکھانے کے مضمون کے لیے کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ صوتی مشابہت کی بنا پر ایک مادے سے دوسرے مادے کی طرف الفاظ کے منتقل ہو جانے کی عربی زبان میں بکثرت مثالیں موجود ہیں لیکن اس قسم کی تفصیلات میں ہمارے لیے زیادہ گھسنے کی گنجائش نہیں ہے۔

'فُسُوقٌ بِكُمْ' کا مفہوم

آیت کے آخر میں لفظ 'فسوق' کے ساتھ جو 'بکم' کا لفظ آیا ہے اس میں 'ب' کا تعلق 'فسوق' کے ساتھ بعض لوگوں کو بیگانہ سا محسوس ہوگا۔ ایسے لوگوں کو عربی زبان کا یہ اسلوب یاد رکھنا چاہیئے کہ جب صلہ اور اس کے متعلق میں بیگانگی ہو تو وہاں کوئی ایسا لفظ محذوف مان لیتے ہیں جو اس صلہ سے موافقت رکھنے والا ہو۔ یہاں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'فسوق' کے بعد کوئی لفظ لازم ہو جانے اور چپک جانے کے مفہوم کا محذوف ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم نے فلاں بات کی تو یہ تمہاری طرف سے ایسے فسق کا ارتکاب ہوگا جو تمہارے ساتھ چپک کے رہ جائے گا، اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔

قرض لینے والوں اور دینے والوں کو نقصان اور نزاع سے بچانے کے لیے ہدایات

یہاں سودی قرضوں کے سلسلے کو یک قلم ختم کرنے کے بعد قرض دینے والوں اور قرض داروں دونوں کو نزاع اور نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل ہدایات دی ہیں:۔

(ا) جب کوئی قرض لین دین ایک خاص مدت تک کے لیے ہو تو اس کی دستاویز لکھ لی جائے۔

(ب) یہ دستاویز دونوں پارٹیوں کی موجودگی میں کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے، اس میں کوئی دخل فصل نہ کرے اور جس کو لکھنے کا سلیقہ ہو اس کو چاہیئے کہ وہ اس خدمت سے انکار نہ کرے۔ لکھنے کا سلیقہ اللہ کی ایک نعمت ہے، اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ آدمی ضرورت پڑنے پر لوگوں کے کام آئے۔ اس نصیحت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس زمانے میں لکھے پڑھے لوگ کم تھے۔ دستاویزوں کی تحریر اور ان کی رجسٹری کا سرکاری اہتمام اس وقت تک نہ عمل میں آیا تھا اور نہ اس کا عمل میں آنا ایسا آسان تھا۔

(ج) دستاویز کے لکھوانے کی ذمہ داری قرض لینے والے پر ہوگی۔ وہ دستاویز میں اعتراف کرے گا کہ میں فلاں بن فلاں کا اتنے کا قرضدار ہوں اور لکھنے والے کی طرح اس پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اس اعتراف میں تقویٰ کو ملحوظ رکھے اور ہرگز صاحبِ حق کے حق میں کسی قسم کی کمی کرنے کی کوشش نہ کرے۔

(د) اگر یہ شخص کم عقل ہو یا ضعیف ہو یا دستاویز وغیرہ لکھنے لکھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو جو اس کا ولی یا وکیل ہو وہ اس کا قائم مقام ہو کر انصاف اور سچائی کے ساتھ دستاویز لکھوائے۔

(و) اس پر دو مردوں کی گواہی ثبت ہوگی جن کے متعلق ایک ہدایت یہ ہے کہ وہ مِنْ رِّجَالِکُمْ یعنی اپنے مردوں میں سے ہوں۔ جس سے بیک وقت دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمان ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے میل جول اور تعلق کے لوگوں میں سے ہوں کہ فریقین ان کو جانتے پہچانتے ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ یعنی پسندیدہ اخلاق و عمل کے ثقہ، معتبر اور ایماندار ہوں۔

(ز) اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسر نہ آسکیں تو اس کے لیے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ دو عورتوں کی شرط اس لیے ہے کہ اگر ایک سے کسی لغزش کا صدور ہوگا تو دوسری کی تذکیر و تنبیہ سے اس کا سدِ باب ہو سکے گا۔ یہ فرق عورت کی تحقیر کے پہلو سے نہیں ہے بلکہ اس کی مزاجی خصوصیات اور اس کے حالات و مشاغل کے لحاظ سے یہ ذمہ داری اس کے لیے ایک بھاری ذمہ داری ہے اس وجہ سے شریعت نے اس کے اٹھانے میں اس کے لیے سہارے کا بھی انتظام فرما دیا ہے۔ یہ موضوع اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ سورہ نساء میں زیرِ بحث آئے گا۔

(ز) جو لوگ کسی دستاویز کے گواہوں میں شامل ہو چکے ہوں، عند الطلب ان کو گواہی سے گریز کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے کہ حق کی شہادت ایک عظیم معاشرتی خدمت بھی ہے اور شہداء اللّٰہ ہونے کے پہلو سے اس اُمت کے فریضۂ منصبی کا ایک جزو بھی۔

(ح) قرض لین دین کا معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، اگر وہ کسی مدت کے لیے ہے، دست گرداں نوعیت کا نہیں ہے، تو اس کو قیدِ تحریر میں لانے سے گرانی نہیں محسوس کرنی چاہیئے۔ جو لوگ اس کو زحمت سمجھ کر ٹال جاتے ہیں وہ سہل انگاری کی وجہ سے بسا اوقات ایسے جھگڑوں میں پھنس جاتے ہیں۔ جن کے نتائج بڑے دور رس نکلتے ہیں۔

(ط) مذکورہ بالا ہدایات اللّٰہ تعالیٰ کے نزدیک حق و عدالت سے قرین، گواہی کو درست رکھنے والی اور شک و نزاع سے بچانے والی ہیں اس لیے معاشرتی صلاح و فلاح کے لیے ان کا اہتمام ضروری ہے۔

(ی) دست گرداں لین دن کے لیے تحریر و کتابت کی پابندی نہیں ہے۔

(ک) ہاں اگر کوئی اہمیت رکھنے والی خرید و فروخت ہوئی ہے تو اس پر گواہ بنا لینا چاہیئے تاکہ کوئی نزاع پیدا ہو تو اس کا تصفیہ ہو سکے۔

(ل) نزاع پیدا ہو جانے کی صورت میں کاتب یا گواہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کسی فریق کے لیے جائز نہیں ہے۔ کاتب اور گواہ ایک اہم اجتماعی و تمدنی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو بلا وجہ نقصان پہنچانے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ثقہ اور محتاط لوگ گواہی اور تحریر وغیرہ کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے لگیں گے اور لوگوں کو پیشہ ور گواہوں کے سوا کوئی معقول گواہ ملنا مشکل ہو جائے گا۔ اس زمانے میں ثقہ اور سنجیدہ لوگ گواہی وغیرہ کی ذمہ داریوں سے جو بھاگتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے

کہ کوئی معاملہ نزاعی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس کے گواہوں کی شامت آجاتی ہے، یہ بے چارے ہتک، اغوا اور نقصانِ مال و جائداد بلکہ قتل تک کی تعدیوں کے نشانہ بن جاتے ہیں۔ قرآن نے اس قسم کی شرارتوں سے روکا کہ جو لوگ اس قسم کی حرکتیں کریں گے وہ یاد رکھیں کہ یہ کوئی چھوٹی موٹی نافرمانی نہیں ہے جو آسانی سے معاف ہو جائے گی بلکہ یہ ایک ایسا فسق ہے جو ان کے ساتھ چمٹ کے رہ جائے گا اور اس کے بُرے نتائج سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ یہ اس شہادت کی بنیاد کو ڈھانے کی کوشش ہے جو اس اُمت کی بعثت کی اصل غایت ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ خدا نافرمانیوں پر فوراً نہیں پکڑا کرتا لیکن جب پکڑتا ہے تو کوئی اس سے چھوٹ نہیں سکتا۔ پھر فرمایا کہ یہ اللہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے، جس میں سرتاسر تمہارا اپنا ہی نفع ہے اور وہی ہے جو ساری باتوں سے واقف ہے اس وجہ سے اسی کو تعلیم و ہدایت دینے کا حق پہنچتا ہے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (۲۸۳)

'رِهَانٌ مَّقْبُوْضَةٌ' کا مفہوم

'رہان' 'رہن' کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ شے ہے جو قرض دینے والے کے قرض کی ضمانت کے طور پر اس کے قبضے میں کرا دی جائے۔ 'فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ' بالکل اسی طرح کا جملہ ہے جس طرح سورۂ یوسف میں 'فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ' ہے۔ اس کو مبتدا مان کر اس کی خبر کو محذوف بھی قرار دے سکتے ہیں اور اس کو خبر مان کر اس کے مبتدا کو محذوف بھی مان سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر لکھا پڑھی اور گواہی شہادت کی صورت مفقود ہو تو کوئی چیز بطورِ رہن قبضے میں کرا کے بھی قرض کی معاملت کی جا سکتی ہے۔

"امن فلان فلانا" کے معنی یہ ہیں کہ فلاں شخص اپنے آپ کو فلاں کی طرف سے خطرے سے محفوظ سمجھتا ہے، اس کی طرف سے مامون ہے، اس پر اعتماد کرتا ہے۔

'اٰثِمٌ قَلْبُهٗ' کی حقیقت

'اٰثِمٌ قَلْبُهٗ' (اس کا دل آلودۂ گناہ ہے) اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ بعض گناہ تو ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر انسان کے محض ظاہری اعضا ہی تک محدود رہتا ہے، اس کی نوعیت بس اوپری گرد و غبار کی ہوتی ہے، مثلاً لغو قسمیں جو بے مقصد کھائی جاتی ہیں۔ اس طرح کے گناہ یا تو انسان کی روزمرہ کی معمولی نیکیوں سے آپ سے آپ جھڑ جاتے ہیں یا معمولی توجہ سے ان کی اصلاح ہو جایا کرتی ہے۔ دوسرے گناہ وہ ہوتے ہیں جن کی تحریک دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے۔ ایسے گناہوں کے اثرات بھی دل تک متعدی ہوتے ہیں۔ گناہ کی یہ قسم خطرناک ہے، یہ دل کے فساد کی غمازی کرتی ہے۔ اگر اس سے احتیاط نہ کی جائے یا صادر ہو جانے کے بعد فوراً اس کی اصلاح کی کوشش نہ کی جائے تو اس کے جڑ پکڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اوپر ہم احاطہ کرنے والے گناہ اور چمٹ جانے والے فسق پر گفتگو کر چکے ہیں اس کو نگاہ میں رکھیے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ شہادت

کو چھپانا اسی نوعیت کا گناہ ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہے کہ شہادت علی الناس اس امت کا وہ اصل فریضہ منصبی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو مامور فرمایا ہے اس وجہ سے اس سلسلے کی ہر کوتاہی بڑے دوررس نتائج کی حامل ہے۔

رہن کے احکام

اس آیت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر حالتِ سفر میں قرض لین دین کی ضرورت پیش آن پڑے اور تحریر و شہادت کا اہتمام ممکن نہ ہو اور قرض دینے والا بغیر کسی ضمانت کے قرض دینے پر آمادہ نہ ہو تو یہ شکل بھی اختیار کی جا سکتی ہے کہ کوئی چیز بطور رہن اس کے قبضے میں کرا دی جائے۔ لیکن یہ شکل صرف اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک قرض دینے والے کے لیے اطمینان و اعتماد کی صورت نہیں پیدا ہو جاتی۔ جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک دوسرے پر اعتماد کے لیے جو باتیں مطلوب ہیں وہ فراہم ہو جائیں، مثلاً سفر ختم کر کے حضر میں آ گئے، دستاویز کی تحریر کے لیے کاتب اور گواہ مل گئے، اپنوں کی موجودگی میں قرض معاملت کی تصدیق ہو گئی اور اس امر کے لیے کوئی معقول وجہ باقی نہیں رہ گئی کہ قرض دینے والا رہن کے بغیر اعتماد نہ کر سکے تو پھر اس کو چاہیے کہ وہ رہن کردہ چیز اس کو واپس کر دے اور اپنے اطمینان کے لیے چاہے تو وہ شکل اختیار کرے جس کی اوپر ہدایت کی گئی ہے۔ یہاں رہن کردہ مال کو امانت سے تعبیر فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرض دینے والے کے پاس رہن بطور امانت ہوتا ہے جس کی حفاظت ضروری اور جس سے کسی قسم کا استفاع ناجائز ہے۔

مجاہدؒ اور ضحاکؒ کے متعلق تفسیروں میں منقول ہے کہ یہ حضرات رہن کو سفر کے ساتھ مخصوص مانتے تھے۔ مجھے ان کی یہ رائے قوی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جب اعتماد کرنے کے لیے وجوہ و اسباب موجود ہوں تو رہن پر قبضہ جمائے رکھنے کے لیے کوئی وجہ باقی نہیں ہے یہ امانت، امانت رکھنے والوں کو لوٹا دینی چاہیے۔ بالخصوص جب معاملہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو تب تو یہ چیز نہ صرف اسلامی اخوت و مروت کے خلاف ہے بلکہ یہ ایک قسم کی دنائت بھی ہے۔ جب ایک شخص دستاویز اور گواہی کی ضمانتیں حاصل کر سکتا ہے تو یہ بات نہایت بھونڈی ہے کہ وہ اپنے قرض کی ضمانت میں قرض دار کا مکان، یا اس کا کھیت، یا اس کا باغ، یا اس کا گھوڑا، یا اس کی بکری یا اس کے بیوی بچوں کے پہننے کے زیور اور کپڑے اپنے قبضہ میں رکھے۔

رہن سے متعلق حدیث کی توجیہ

ہمیں اس روایت سے انکار نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس کچھ جَو کے بدلے رہن رکھی۔ لیکن اس سے جو بات زیادہ سے زیادہ نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کو کسی شدید مجبوری کے سبب سے کسی بنیے یا یہودی سے قرض لینے کی نوبت آ جائے اور وہ رہن کے سوا کسی اور صورت پر معاملہ کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جا سکتا ہے۔ اور بہت کھینچ تان کی جائے تو اس سے یہ بات بھی نکالی جا سکتی ہے کہ کسی تنگ دل مسلمان سے بھی بدرجہ

مجبوری اس طرح معاملہ کیا جا سکتا ہے لیکن عام مسلمانوں کے لیے جب باہمی معاملت کی ایک واضح اقابل اعتماد اور اسلامی اخوت و مروت کے تقاضوں کے مطابق ایک شکل بیان کر دی گئی ہے تو اس کے ہوتے ہوئے کس طرح اس کو پسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ بلا کسی مجبوری کے بھی وہ رہن پر قرض لین دین کریں۔ یہ بات قرآن کی اس آیت کے تو بالکل خلاف ہے، رہی حدیث تو اس سے بھی رہن کے عام جواز پر استدلال کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ ایک تو یہ معاملہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک یہودی کے ساتھ ہوا۔ دوسرے صورت واقعہ صاف گواہی دے رہی ہے کہ یہ بہت مجبوری کی صورت میں ہوا۔

زیر بحث آیت میں مفسرین نے عام طور پر امانت سے وہ قرض مراد لیا ہے جو کوئی شخص کسی کو بغیر رہن کے مجرد اعتماد پر دے دے۔ لیکن قرض کے لیے امانت کی تعبیر گوناگون پہلوؤں سے ہمارے نزدیک غلط ہے۔ اصل میں یہ حضرات چونکہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ سفر ختم ہو جانے کے بعد جب اعتماد و اطمینان کی شکل پیدا ہو جائے تو رہن واپس کر دینا چاہیے اس وجہ سے انہیں امانت کی تاویل میں یہ تکلف کرنا پڑا لیکن ہم نے جو تاویل کی ہے اس میں آیت و حدیث دونوں کا محل الگ الگ معین ہو گیا ہے اس وجہ سے نہ اس تکلف میں پڑنے کی ضرورت باقی رہی اور نہ اس کی تردید میں دلائل جمع کرنے کی ضرورت باقی رہی۔

۸۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۸۴-۲۸۶

اب یہ عظیم سورہ ختم ہو گئی۔ آگے کی آیات بطور خاتمہ ہیں۔ اس خاتمہ میں پہلے تو تنبیہ ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کی ملکیت اور اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ بندوں کے تمام ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ وہ ہر چیز کا حساب کرے گا اور اپنے اختیارِ مطلق سے جس کو مغفرت کا سزاوار قرار دے گا اس کی مغفرت فرمائے گا اور جس کو سزا کا مستحق پائے گا اس کو سزا دے گا، کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے ارادے اور فیصلے میں مداخلت کر سکے۔

دین کی یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کا صحیح شعور اس امانت کا اہل بناتا ہے جو اس سورہ میں امتِ مسلمہ کے سپرد کی گئی ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو فراموش کر دینے کے سبب سے یہود اور نصاریٰ اس امانت کی سعادتوں سے محروم ہوئے۔ اس اہمیت کی وجہ سے جس طرح جگہ جگہ اس سورت میں اس کی یاد دہانی کی گئی ہے اسی طرح خاتمہ پر بھی اس کی یاد دہانی فرمائی۔

اس کے بعد فرمایا کہ اللہ کے رسول اور اس کے ایمان لانے والے بندوں نے اس چیز کو قبول کر لیا ہے جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔ یہی اس پر ایمان لانے کے سزاوار تھے۔ یہ یہود و نصاریٰ کی طرح خدا کے نبیوں اور رسولوں کے باب میں کسی تعصب میں مبتلا نہ تھے کہ کسی کو مانیں، کسی کو نہ مانیں اس وجہ سے اللہ نے ان کے لیے ہدایت کی راہ کھولی اور وہ فائز المرام ہوئے۔ رہے وہ لوگ جو تعصبات کے پھندوں

یں گرفتار ہیں تو اللہ کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے، وہ جس وادی میں چاہیں بھٹکتے پھریں۔ اپنا انجام خود دیکھیں گے
اس کے بعد وہ عظیم دعا نمودار ہوتی ہے جو اس امت کے ہر فرد کی صدائے حال ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے اس بھاری ذمہ داری کا احساس بھی ٹپک رہا ہے جو اس امت پر ڈالی گئی ہے، وہ اعتراف بھی نمایاں ہو رہا ہے جو روحِ ایمان ہے، ان باتوں سے بچائے جانے کی التجا بھی جھلک رہی ہے جو پچھلی امتوں کے لیے ٹھوکر کا باعث ہوئیں اور ادائے فرض کی راہ میں جن مشکلات کے اندیشے ہیں ان میں استعانت اور جن لغزشوں کے خطرے ہیں ان سے درگزر کی درخواست بھی ہے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات
۲۸۴-۲۸۶

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ
اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ
يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾
اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ
مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ
اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا
كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ
اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ
وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا
عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

ترجمۂ آیات
۲۸۴-۲۸۶

جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے۔ جو کچھ تمہارے دلوں

میں ہے اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، خدا اس کا تم سے حساب لے گا، پھر جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۸۴

رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین ایمان لائے۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ ان کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔ اے پروردگار! ہم تیری مغفرت کے طلبگار ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ہر ایک پائے گا جو کمائے گا اور بھرے گا جو کرے گا۔ اے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہم سے مواخذہ نہ فرمانا۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر اس طرح کا کوئی بار نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ لاد جس کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہمیں معاف کر، ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما تو ہمارا مولیٰ ہے، پس کافروں کے مقابل میں ہماری مدد کر۔ ۲۸۵-۲۸۶

۸۹-الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۸۴)

"جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے"۔ یہ جملہ اپنے اندر بیک وقت تین مفہوم رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر چیز خدا ہی کی ملکیت ہے، دوسرا یہ کہ ہر چیز اسی کے اختیار و تصرف میں ہے، تیسرا یہ کہ بالآخر ہر چیز کا مرجع خدا ہی ہے۔ اردو میں کوئی ایسا ترجمہ اس کا جو ان تینوں مفہوموں کو بیک وقت اٹھا لے میری سمجھ میں نہیں آیا۔

دل کی پوشیدہ باتوں کے محاسبے کا مفہوم

اِنْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۔ دل کی پوشیدہ باتوں کا محاسبہ کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ دل میں جو خیالات اور وسوسے گزرتے رہتے ہیں ان کا بھی محاسبہ ہوگا بلکہ اس سے صرف وہ عزائم مراد ہیں جو مضبوط ارادے کے ساتھ دل میں موجود ہیں لیکن کسی مجبوری یا مزاحمت کے سبب سے وہ ظاہر نہ ہو سکے یا عمل میں نہ آ سکے۔ مثلاً ایک شخص اگر کسی کے قتل کا دل میں پختہ ارادہ رکھتا ہے تو ہر چند کسی خوف یا مجبوری کے سبب سے اس کا ارادہ بروئے کار نہ آ سکے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اس ارادے پر اس کی پکڑ ہوگی۔

خدا کی مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ الآیۃ۔ اور اس طرح کی دوسری آیات میں، جیسا کہ ہم بار بار اپنی اس کتاب میں واضح کر چکے ہیں، اصل زور جس بات پر ہوتا ہے وہ اس پر ہوتا ہے کہ خدا کی مشیت میں کوئی مزاحمت کرنے والا نہیں ہے اور مقصود اس سے شرک کی نفی ہوتی ہے۔ یہ مقصد نہیں ہوتا ہے کہ خدا کی اس مشیت کے لیے سرے سے کوئی ضابطہ و قاعدہ ہی نہیں ہے۔ خدا کی ہر مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے، چنانچہ یہ مغفرت اور عذاب کا معاملہ بھی اسی ضابطۂ حکمت کے تحت عمل میں آئے گا جو اس کے لیے اس نے مقرر فرما رکھا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی اور کے لیے اس میں کسی مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔

آیت ۲۸۴ کا دو گونہ ربط

اس پوری آیت کے موقع و محل پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک پہلو سے تو اپنے ماسبق سے مربوط ہے اور دوسرے پہلو سے یہ سورہ کے خاتمہ کی نہایت جامع اور مؤثر تمہید ہے۔ اوپر والی آیت میں فرمایا تھا کہ "شہادت کو نہ چھپاؤ، جو شہادت کو چھپاتا ہے اس کا دل آلودۂ معصیت ہو جاتا ہے۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔" اب اس کے ساتھ اگر یہ مضمون لگا دیجیے کہ "جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے، اللہ تمہارے ظاہر و باطن سب کا محاسبہ کرنے والا ہے، پھر جس کو چاہے گا وہ بخشے گا اور جس کو چاہے گا، عذاب دے گا" تو گویا بات پوری طرح مدلل بھی ہو گئی اور مکمل بھی۔ یہ آیت کا ربط ماسبق سے ہوا۔

آگے سے اس کا ربط، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ یہ توحید کی آیت ہے۔ احکام و قوانین کے باب میں جس طرح نماز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اسی طرح عقائد کے باب میں توحید کو اساسِ دین کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ یاد ہوگا کہ جہاں سے اس سورہ میں امت کے لیے تعلیم شریعت کا باب شروع ہوا ہے وہاں سب سے پہلے توحید کا بیان ہوا ہے اس کے بعد نماز کا۔ اب خاتمے پر امت کو کامل حوالگی اور سپردگی کی تعلیم دینے کے لیے توحید کی پھر یاد دہانی کی اور یاد دہانی کا انداز تعلیم سے زیادہ تنبیہ کا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ امت اس امانت کی گراں باریوں کو سمجھے اور غلط سہاروں پر اعتماد کرنے کے بجائے صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے آگے جواب دہی کے لیے تیار رہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ‌ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓـئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ ‌ۚ وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ‌ۖ غُفۡرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيۡكَ الۡمَصِيۡرُ (۲۸۵)

ایمان نہ لانے والوں سے بے پروائی

یہاں رسول اور مسلمانوں کے ایمان کی خبر دینے سے مقصود محض ایک واقعے کی خبر دینا نہیں ہے بلکہ قرآن کے مخالفین بالخصوص یہود کی مخالفت سے بے پروائی کا اظہار ہے۔ سورہ کا آغاز، یاد ہوگا، اس بات سے ہوا تھا کہ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے میں تو کسی شبے کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس پر ایمان وہی لوگ لائیں گے جن کے اندر خدا ترسی، حقیقت بینی اور حق طلبی ہوگی۔ جو لوگ گروہ پرستی، عصبیت اور اپنی برتری کے زعم میں مبتلا ہوں گے وہ اس کتاب پر ایمان لانے سے محروم رہیں گے۔ اب یہاں خاتمے پر یہ اعلان فرما دیا کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں نے واضح کر دیا کہ اس ایمان کی سعادت سے بہرہ مند ہونے والے کون لوگ تھے۔ گویا دودھ کے اندر جتنا مکھن تھا وہ نکال کر سامنے رکھ دیا اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کر دیا کہ اس دودھ کے اندر یہ مکھن تھا جو نکل آیا ہے۔ اب جو بچ رہا ہے یہ چھاچھ ہے خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

قانون کی فرمانبرداری کے سلسلے میں نبی اور امتی یکساں ہیں

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ کتابِ الٰہی پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے جس کا ذکر ہوا ہے وہ خود رسول کی ذات ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں قانون کی فرمانبرداری اور اطاعت کے معاملے میں پیغمبر بھی اسی سطح پر ہے جس پر عام اہل ایمان ہیں۔ دنیوی بادشاہ اپنی رعایا کو جو قانون دیتے ہیں وہ خود اس قانون سے بالاتر ہوتے ہیں لیکن خدا کے قانون میں خود اس قانون کا لانے والا نہ صرف یہ کہ اس کے تحت ہوتا ہے بلکہ اسے سب سے آگے بڑھ کر اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اور اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ کہتے ہوئے اس کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالنا پڑتا ہے۔ یہ ان پیغمبروں کی سچائی کی ایک ایسی شہادت ہے جس کو صرف ایک ہٹ دھرم ہی جھٹلا سکتا ہے۔

اجمالی ایمان تمام انبیاء اور تمام صحیفوں پر

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ الاٰیۃ میں جن اجزائے ایمان کا ذکر ہوا ہے ان پر ہم اسی سورہ کی آیت ۱۷۷ کے تحت گفتگو کر چکے ہیں۔ وہاں اللہ، فرشتوں، کتابوں اور نبیوں پر ایمان کی حقیقت سمجھنی چاہیے۔ خاص طور پر فرشتوں پر ایمان کی ضرورت ہم نے وہاں تفصیل سے واضح کی ہے۔ البتہ ایک بات کی طرف یہاں بھی اشارہ ضروری ہے۔ وہ یہ کہ وہاں کتاب کا لفظ ہے، یہاں کتاب کے بجائے کُتُب کا لفظ ہے جو کتاب کی جمع ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے لیے تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اہل کتاب صرف اپنی کتاب اور صرف اس نبی یا ان نبیوں پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں جن کو وہ اپنے یا اپنا نبی خیال کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے یہ امت اللہ کے تمام نبیوں اور تمام کتابوں پر ایمان رکھتی ہے۔ جہاں تک اجمالی ایمان کا تعلق ہے ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء، قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

البتہ چونکہ دوسرے انبیا اور ان کے صحیفوں کی تعلیم محفوظ نہیں رہی نیز ان صحیفوں اور ان انبیا نے خود خبر دی تھی کہ ان کی شریعت کامل نہیں ہے، کامل شریعت قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دنیا کو ملے گی، اس وجہ سے ہم قرآن اور خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف اجمالی نہیں بلکہ تفصیلی ایمان بھی رکھتے ہیں اور اسی تفصیلی ایمان کی دعوت دنیا کو بھی دیتے ہیں۔

اسلوب کی تبدیلی میں بلاغت کا نکتہ

'لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ' اس ٹکڑے کی شرح ہم اسی سورہ کی آیت ۱۳۵ کے تحت امتِ وسطٰی کے کلمہ کی وضاحت کرتے ہوئے کر چکے ہیں۔ البتہ اس میں ایک اسلوب کی جو تبدیلی ہوتی ہے یعنی بات غائب کے صیغے سے نکل کر جو متکلم کے صیغے میں آگئی ہے، یہ دھیان میں رکھنے کی ہے۔ اوپر کے ٹکڑے میں بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہی گئی ہے لیکن یہ جملہ براہ راست امت کی طرف سے اعتراف و اظہار کی شکل میں نمایاں ہوا ہے۔ اس میں بلاغت کا یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ اوپر کے ٹکڑے میں مسلمانوں کا جو ایمان و عقیدہ بیان ہوا ہے پوری امت اس کا اقرار و اظہار کرتی ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کے باب میں کسی تعصب میں گرفتار نہیں ہیں، یہ تمام انبیا ایک ہی سلسلۃ الذہب کی کڑیاں ہیں، اس وجہ سے ہم یہود و نصاریٰ کی طرح یہ نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں اور کسی کو رد کر دیں۔ 'احد' کا لفظ چونکہ جمع کے مفہوم میں آتا ہے، جیسے لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اس وجہ سے اس کے ساتھ لفظ 'بین' کا استعمال صحیح ہے۔

'سمع و طاعت' کا مفہوم

'وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' سمع کا لفظ یہاں مجرد سننے کے معنی میں نہیں بلکہ ماننے اور قبول کرنے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ اردو میں بھی سننے کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں 'سَمِعْنَا' کا لفظ دل کی قبولیت کا اظہار کرتا ہے اور 'اَطَعْنَا' کا لفظ عملی اطاعت کا۔ اور ایمان و اسلام کی اصل حقیقت یہی ہے۔ اس میں یہود کے 'سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا' پر ایک لطیف تعریض بھی ہے۔

حذفِ فعل کا ایک فائدہ

'غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ' غفرانک فعل محذوف کا مفعول ہے۔ اس طرح کے مواقع میں فعل کا حذف دعا کرنے والے کے اضطراب کو ظاہر کرتا ہے جو قبولیت دعا کے لیے ایک نہایت مؤثر سفارش ہے۔

سمع و طاعت کے اقرار سے دعا کا تعلق

سمع و طاعت کے اقرار کے بعد معاً دعا کا زبان پر جاری ہو جانا اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ اقرار ایک عظیم ذمہ داری کا اقرار ہے، یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے، اس میں بڑی بڑی آزمائشیں پیش آتی ہیں اور ہر قدم پر لغزشوں، کوتاہیوں اور ٹھوکروں کے اندیشے ہیں۔ اس حقیقت کے شعور نے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کے اقرار کے فوراً بعد طلبِ مغفرت کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس لیے کہ جب راہ بھی کٹھن ہے اور پرسش بھی ہر پوشیدہ اور علانیہ پر ہونی ہے جیسا کہ اوپر والی آیت میں گزر چکا ہے اور عذاب اور رحمت سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے تو اس کی مغفرت کے سہارے کے سوا ہر سہارا بے حقیقت

ہے۔ وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ میں کامل سپردگی ہے، یعنی تیرے سوا کوئی نہیں ہے جو کسی پہلو سے مرجع و ماویٰ بن سکے۔ اس میں ایک لطیف تعریض یہود و نصاریٰ پر بھی ہے کہ وہ اپنے آباء و اجداد اور شرکاء و شفعاء کے اعتماد پر سمع و طاعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو بیٹھے۔ لیکن اس امت پر یہ حقیقت واضح ہے کہ سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا، اسی کے آگے پیش ہونا اور اسی کے سامنے جواب دہی کرنی ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۲۸۶)

دعا کے بیچ میں جملہ معترضہ

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا) یہ دعا کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ ہے اور مقصود اس کے لانے سے اس اہم حقیقت کا اظہار ہے کہ سمع و طاعت کی یہ ذمہ داری جو اس امت پر ڈالی گئی ہے ہے تو ایک بھاری ذمہ داری، لیکن اس کے بھاری ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت کا یہ پہلو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وہ بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص بس اسی حد تک مکلف ہے جس حد تک اس کو طاقت عطا ہوئی ہے، جو چیز اس کے حدود اختیار و امکان سے باہر ہے اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ شریعت نے خود اپنے احکام و قوانین میں اس امر کو ملحوظ رکھا ہے اور مجبوریوں کی صورت میں اس پہلو سے بندوں کو رخصتیں دی ہیں۔ اس وجہ سے نہ تو اللہ کو یہ پسند ہے کہ بندے اپنے آپ کو کسی تکلیف مالایطاق میں ڈالیں اور نہ کسی دوسرے ہی کے لیے یہ جائز ہے کہ ان پر کوئی ایسا بوجھ ڈالے جس کو وہ اٹھا نہ سکتے ہوں۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں سے سمع و طاعت کا عہد لیتے تو از خود یاد دہانی کر کے ان سے "تا بحدِ استطاعت" کی شرط لگوا دیتے۔ یہ حضورؐ کی طرف سے اسی آیت کی تعمیل تھی۔ اس میں اہلِ ایمان کے لیے جو تخفیف اور بشارت ہے وہ بالکل واضح ہے بالخصوص اس موقع پر جب ان پر ایک عظیم شریعت کی ذمہ داریاں ڈالی جا رہی ہیں۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اس کو ملے گا جو اس نے کمایا اور وہ بھگتے گا جو اس نے کیا) یہ بات چونکہ اسی بات کا ایک پہلو ہے جو اوپر گزری ہے اس وجہ سے اسی کے ساتھ اس کو جوڑ دیا ہے، اس سے الگ نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو نفع یا ضرر جو کچھ بھی پہنچے گا اس کے اپنے عمل ہی سے پہنچے گا، کسی اور شے سے نہیں پہنچے گا۔ جو وہ بوئے گا وہی کاٹے گا اور جو کچھ کرے گا وہی بھرے گا۔ نہ دوسرے کے نیک اعمال کا کریڈٹ اس کو ملنے والا ہے اور نہ دوسرے کی بدیاں اس کے کھاتے میں پڑنے والی ہیں۔

اور نہ کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نفس پر ذمہ داری اس کی طاقت اور اس کے اختیار کے پیمانے سے ناپ کر ڈالی ہے۔ اس وجہ سے ہر شخص کی کامیابی اور ناکامی اس ذمہ داری کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا كَسَبَتۡ رَهِينَةٌ ۔

خطا اور نسیان کا فرق اور اس دعا کی حکمت

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَآ إِن نَّسِينَآ أَوۡ أَخۡطَأۡنَا ۚ، اوپر والا جملہ معترضہ محض اہل ایمان کی تسلی اور ایک مناسب موقع حقیقت کی یاددہانی کے لیے تھا۔ اب اصل دعا پھر زبان پر جاری ہو گئی۔ اس ٹکڑے میں نسیان اور خطا پر مواخذہ نہ کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ نسیان تو یہ ہے کہ آدمی سمع و طاعت کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے کوئی چیز بھول جائے اور خطا یہ ہے کہ اپنی ناسمجھی سے کسی کام کو غلط طور پر کر بیٹھے۔ اگرچہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف ہیں لیکن معاف شدہ چیزوں کی معافی کی درخواست بندے کی طرف سے غایت درجہ خشیت کا اظہار ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت کے مزید دروازے کھلتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف تھے، پھر بھی آپ استغفار میں زیادہ سے زیادہ مشقت اٹھاتے تھے۔ جب آپ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا، کیا میں یہ نہ چاہوں کہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنوں!

اصر کا مفہوم اور اس دعا کا رمز

رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ إِصۡرٗا كَمَا حَمَلۡتَهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِنَا ۚ، اصر کے اصل معنی عہد اور ذمہ داری کے ہیں مثلاً ءَأَقۡرَرۡتُمۡ وَأَخَذۡتُمۡ عَلَىٰ ذَٰلِكُمۡ إِصۡرِي ۔ ٨١۔ آل عمران (کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور ان باتوں کے لیے میری ڈالی ہوئی ذمہ داری تم نے اٹھائی) یہیں سے اس کا استعمال ان بھاری اور گراں ذمہ داریوں اور بوجھوں کے لیے ہوا جن کا اٹھانا دشوار ہو۔ اسی مفہوم میں یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے۔ یہود کی شریعت میں اس قسم کے اِصر اور اغلال جن کی تفصیل سورۂ اعراف کی تفسیر میں آئے گی، موجود تھے اور خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آپ اللہ کی شریعت کو ان بوجھل طوق و سلاسل سے آزاد کر کے اس کو فطرت کی اساس پر قائم کریں گے جیسا کہ ارشاد ہے وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ إِصۡرَهُمۡ وَٱلۡأَغۡلَٰلَ ٱلَّتِي كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ ۔ ١٥٧۔ اعراف (اور ان کے اوپر سے وہ دور کرے گا وہ بوجھ اور وہ طوق جو ان پر پہلے سے ہیں) یہاں دعا کے ان الفاظ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم پر اس قسم کے بوجھ نہ ڈالے جائیں جس قسم کے بوجھ یہود پر ان کی سرکشی کی وجہ سے ڈالے گئے اور جن کو بالآخر وہ اٹھا نہ سکے۔ دعا کے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اس امت کے مزاج اور اس کو ملنے والی شریعت کے مزاج میں کامل موافقت ہے۔

طاقت سے باہر آزمائشوں سے بچنے کی دعا

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِۦ ۖ، تحمیل کے معنی کسی پر کوئی بھاری بوجھ لادنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس سمع و طاعت کی راہ میں آگے جو آزمائشیں پیش آنے والی ہیں ان میں کوئی آزمائش ایسی نہ ہو جو ہماری برداشت سے زیادہ ہو اور جو ہمیں تیری وفاداری کے امتحان میں ناکام بنا دے۔ جہاں تک

ابتلا و امتحان کا تعلق ہے وہ تو لازمۂ ایمان و اسلام بلکہ لازمۂ حیات ہے جس سے اس دنیا میں مفر نہیں ہے۔ کھرے کھوٹے میں امتیاز اور بندوں کی صلاحیتوں کے اجاگر ہونے کے لیے اس سے گزرنا ضروری ہے۔ لیکن یہ دعا بندے کو کرتے رہنا چاہیے کہ کوئی امتحان اس کی طاقت سے زیادہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے امتحان کے معاملے میں اپنی کمزوری و ناتوانی کا اعتراف ہی صحیح رویہ ہے۔ جو لوگ اپنے اوپر زیادہ اعتماد کر بیٹھتے ہیں وہ اکثر اس امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ احادیث میں مختلف پہلوؤں سے اس کی ممانعت آئی ہے۔

یہاں اوپر والے ٹکڑے اور اس ٹکڑے کے فرق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اوپر والے ٹکڑے میں تو اس بات کی دعا ہے کہ ہماری شریعت اس قسم کے اصر و اغلال سے پاک رہے جو پچھلی شریعتوں میں موجود ہیں۔ اور اس دوسرے ٹکڑے میں ان خارج از استطاعت آزمائشوں سے محفوظ رکھے جانے کی دعا ہے جو اس شریعت کے حقوق ادا کرنے کی راہ میں پیش آسکتی ہیں۔

'وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْ لَنَا، وَارْحَمْنَا': اس میں اکٹھی تین چیزوں کی درخواست ہے۔ عفو، مغفرت اور رحم۔ عفو کے معنی چشم پوشی کے بھی ہیں اور معاف کر دینے کے بھی۔ یہاں لفظ دوسرے معنی میں ہے۔ غفر کے معنی ڈھانک دینے کے ہیں، رحم کا مفہوم واضح ہے۔ بندے کا سارا اعتماد بس انھی تینوں چیزوں پر ہونا چاہیے۔ رب کریم کوتاہیوں سے درگزر فرمائے، گناہوں کو ڈھانک دے اور اپنی رحمت سے نوازے۔ آخرت کا سارا سہارا بس یہی تین چیزیں ہیں۔

'اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ' 'مَوْلٰی' کے معنی مرجع کے ہیں جس کی طرف مشکلات میں رجوع کیا جائے۔ یہ آخر میں مخالفین اسلام کے مقابل میں مدد و نصرت کی دعا ہے۔ اس لیے کہ سمع و طاعت کا یہ بارِ گراں امت نے ایسے حالات میں اٹھایا ہے جب کہ دوسرے، جیسا کہ پچھلی تفصیلات سے واضح ہو چکا ہے، اس بار کو نہ صرف اپنے کندھوں سے پھینک چکے تھے بلکہ اس بنا پر مسلمانوں کے جانی دشمن بھی بن گئے تھے کہ انھوں نے ان کے پھینکے ہوئے اس بوجھ کو سنبھال کیوں لیا۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس سورہ کی تفسیر میں لکھنے کی اس گنہگار اور بے مایہ کو توفیق نصیب ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

فہرست مضامین

فہرست مضامین

مقدمہ

تفسیر آیت بسم اللہ

تفسیر سورۃ الفاتحۃ - ۱

تفسیر سورۃ البقرۃ - ۲

افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

آل عمران ۳ — المآئدۃ ۵

فاران فاؤنڈیشن

تدبر قرآن

جلد دوم

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبرِ قرآن

جلد دوم

تفاسیر

سورۂ آل عمران (۳) ـــــ تا ـــــ سورۂ مآئدہ (۵)

امین احسن اصلاحی

فاران

فاران فاؤنڈیشن

لاہور ـــــ پاکستان

جملہ حقوق عکس و طباعت

اہتمام — حسن خاور

مطبع — کیو۔ وائی پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت — نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ — فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

تدبرِ قرآن

۳

آلِ عمران

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

مندرجہ ذیل پہلوؤں سے یہ سورہ سابق سورہ (بقرہ) سے نہایت گہرا ربط رکھتی ہے۔

۱۔ ان دونوں کا موضوع ایک ہی ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات۔ لوگوں پر عموماً اور اہل کتاب پر خصوصاً۔

۲۔ دونوں میں یکساں شرح وبسط کے ساتھ دین کی اصولی باتوں پر بحث ہوئی ہے۔

۳۔ دونوں کا قرآنی نام بھی ایک ہی ہے۔ یعنی الٓـمّٓ۔

۴۔ دونوں شکلاً بھی ایک ہی تنے سے پھوٹی ہوئی دو بڑی بڑی قاشوں کی طرح نظر آتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو شمس وقمر سے تشبیہ دی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ دونوں حشر کے دن دو بدلیوں کی صورت میں ظاہر ہوں گی۔ اہل بصیرت سمجھ سکتے ہیں کہ وصف اور تمثیل میں یہ اشتراک بغیر کسی گہری مناسبت کے نہیں ہو سکتا۔

۵۔ دونوں میں زوجین کی سی نسبت ہے۔ ایک میں جو بات مجمل بیان ہوئی ہے، دوسری میں اس کی تفصیل بیان ہوگئی ہے۔ اسی طرح ایک میں جو خلا رہ گیا ہے، دوسری نے اس کو پر کر دیا ہے۔ گویا دونوں مل کر ایک اعلیٰ مقصد کو اس کی مکمل شکل میں نہایت خوب صورتی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔

ب۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے امتیازی پہلو

لیکن اس اشتراک اور یکسانی کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی کچھ الگ الگ خصوصیات بھی ہیں جو ان کو ایک دوسری سے ممتاز کرتی ہیں۔ مثلاً

بقرہ پر غور کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب اہل کتاب نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ اسلام ایک سچا دین ہے اور یہ آہستہ آہستہ جڑ پکڑ رہا ہے لیکن حسد اور ضد کے باعث وہ اس کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ اس احساس نے ان کو شدید کشمکش میں ڈال دیا ہے۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر اس کی مخالفت کے لیے تو اٹھ کھڑے ہوئے لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ مخالفت

کس عنوان سے کریں۔ جس کے منہ میں جو آیا اس نے وہ اگلنا شروع کر دیا۔ کسی نے کہا نبوت و رسالت کے لیے تو بنی اسرائیل کا گھرانا مخصوص رہا ہے، اس گھرانے سے باہر کسی کو نبوت کس طرح مل سکتی ہے؟ کسی نے کہا ہدایت کے لیے تو بس تورات کافی ہے اور جب اس کے حامل ہم موجود ہیں تو اب کسی نئی ہدایت کی ضرورت کہاں باقی رہی؟ اسی جھنجھلاہٹ میں بعضوں نے حضرت جبریلؑ تک کو مطعون کر ڈالا کہ یہ فرشتہ شروع سے ہمارا بیری ہے۔ کچھ لوگوں نے یہود و نصاریٰ کا ایک متحدہ محاذ بنا کر مخالفت کا یہ پہلو اختیار کیا کہ آسمانی ہدایت یا تو یہودیت کے اندر ہے یا نصرانیت کے اندر، جس کو ہدایت مطلوب ہو وہ ان میں سے کسی کو اختیار کرے، ان کے سوا آسمانی ہدایت حاصل ہونے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ ایک گروہ نے دھوکا بازی کی روش اختیار کی۔ اس نے مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا چاہا کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں، مسلمان ایمان کا اجارہ دار تنہا اپنے ہی کو نہ سمجھیں، خدا، آخرت اور اپنے پیغمبر کو تو ہم بھی مانتے ہیں، اس سے کیا فرق پیدا ہوتا کہ ہم تمھارے مدعی نبوت کو نہیں مانتے۔ ان حالات میں یہ سورہ اتری۔ اس میں ایک طرف تو تفصیل کے ساتھ ان تمام اعتراضات کے جواب دیے گئے جو اہل کتاب کی طرف سے اٹھائے گئے، دوسری طرف نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی جو اعلیٰ سند خود ان کے صحیفوں میں موجود تھی، اس کو واضح کیا گیا اور تیسری طرف نبی امی کی رسالت سے دین حق کی جو تجدید و تکمیل ہوئی تھی اس کی طرف رہنمائی کی گئی۔ اس طرح یہ سورہ گویا دعوت ایمان و اثباتِ رسالت بھی ہے اور دعوتِ جہاد برائے آزادیٔ قبلہ و غزوۂ بدر بھی۔

سورۂ آل عمران پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بقرہ کے کچھ عرصہ بعد اس دور میں نازل ہوئی ہے جب افق پر اسلام کے غلبہ اور اس کی صداقت کے آثار اتنے نمایاں ہو چکے ہیں کہ اہل کتاب کے لیے اس کی علانیہ مخالفت کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس صورتِ حال نے اہل کتاب کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن یہ اسلام صرف اس کی زبانوں ہی تک رہا، اس کے دلوں میں نہیں گھسا۔ دوسرے گروہ نے اسلام تو نہیں قبول کیا لیکن اس نے مسلمانوں کے ساتھ مذہب کے معاملے میں ایک سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔ اس سمجھوتے کے لیے اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہر مذہب کے پیروؤں کے لیے ان کا اپنا دین حق ہے اس وجہ سے مسلمان ہم کو ہماری یہودیت و نصرانیت پر چھوڑ دیں اور ہم مسلمانوں کو ان کے اسلام پر۔ اس طرح دونوں اپنے اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے ایک ہی ملک میں ایک ساتھ امن کی زندگی بسر کر سکیں گے۔

---

[1] سورہ بقرہ کے شروع میں اس گروہ کی طرف اشارہ ہے لیکن اس وقت تک یہ گروہ پوری طرح سامنے نہیں آیا تھا۔ اس سورت میں یہ بے نقاب ہو کر سامنے آگیا ہے۔ اس گروہ کا نظریہ بعینہ وہی ہے جو آج وحدتِ ادیان کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔

اس طرح ان دونوں گروہوں کا رویہ اسلام کے ساتھ بدل تو گیا لیکن یہ تبدیلی دل کی تبدیلی کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ سراسر مصلحت پرستی پر مبنی تھی۔ پہلے گروہ نے اسلام کا جو اظہار کیا تو محض مسلمانوں کی متوقع کامیابیوں میں حصہ بٹانے کے لیے۔ دوسرے نے صلح جویانہ پالیسی اختیار کی تو صرف متوقع خطرات سے اپنے کو محفوظ کرنے کے لیے۔

اسی اثنا میں احد کا معرکہ پیش آیا جس میں مسلمانوں ہی کی ایک جماعت کی بے تدبیری سے ان کو ایک عارضی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس واقعے کا اثر اہل کتاب کے مذکورہ دونوں گروہوں پر یہ ہوا کہ انھوں نے اسلام کے بارے میں اپنی پالیسی پھر تبدیل کر دی۔ جو گروہ محض دنیوی کامیابیوں کے لالچ میں اسلام کی صفوں میں آگھسا تھا جب اس نے دیکھا کہ اس راہ میں خطرات بھی پیش آسکتے ہیں تو اس نے اس خطرے کے سودے سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور اسلام کی اطاعت کا قلادہ اتار کر پھر اپنے کفر کی طرف پلٹ گیا۔ دوسرے گروہ نے جب دیکھا کہ اسلام کو زک بھی پہنچائی جا سکتی ہے تو اس نے سوچا کہ ہم نے جو اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اس کے ساتھ صلح جویانہ روش اختیار کر لی ہے، یہ غلط ہے، کیوں نہ ہم مخالف طاقتوں کو قوت پہنچا کر یہ کوشش کریں کہ ایک مرتبہ اسلام کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی کھلم کھلا اپنی دشمنی کا اعلان کر دیا۔

اس طرح یہ دونوں ہی گروہ کھلم کھلا اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کی راہ پر چل پڑے اور انھوں نے طرح طرح کی چالوں سے مسلمانوں کے ذہنوں میں شبہات و شکوک بھرنے شروع کیے تاکہ جس طرح وہ خود فرقوں اور گروہوں میں بٹ چکے ہیں اسی طرح مسلمان بھی اپنی وحدت و یکجہتی کھو کر پراگندہ ہو جائیں اور ان کی طاقت ختم ہو جائے۔ ان حالات نے تقاضا کیا کہ اہل کتاب اور مسلمانوں دونوں کے سامنے دین کی یہ حقیقت واضح کی جائے کہ اللہ کی طرف سے لوگوں کو کئی دین نہیں ملے ہیں بلکہ ایک ہی دین ملا ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اس دین میں تقسیم اور تجزیہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس کے کچھ حصے کو تو مانا جائے اور کچھ کو نہ مانا جائے بلکہ بیک وقت اس کے کل کو ماننا یا کل کو چھوڑنا ہے۔ اس دین کا مطالبہ ہر حالت میں اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام کی فرمانبرداری ہے، خواہ حالات نرم ہوں یا سخت اور خواہ راہ ہموار نظر آ رہی ہو یا آزمائشوں اور فتنوں نے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہوں، حق بہر حال حق ہے، وہ بعض حالات میں مخفی تو ہو جاتا ہے جس طرح چھلکے کے اندر مغز لیکن معدوم نہیں ہوتا۔ اس طرح کے حالات میں وہی لوگ ثابت قدم رہتے ہیں جن کے ایمان اور علم میں پختگی ہوتی ہے، جو حق سے بے خبر ہوتے ہیں ان کے قدم اکھڑ جاتے ہیں۔

غزوہ احد بھی اسی طرح کا ایک امتحان بن کر لوگوں کے سامنے آیا۔ جس طرح غزوہ بدر کی نوعیت ایک فرقان کی تھی جس نے حق اور باطل کو الگ الگ کر دیا اسی طرح غزوہ احد کی حیثیت ایک آیت

متشابہ کی تھی جس کے باطن میں حکمت تھی لیکن اس کا ظاہر کمزور لوگوں کے لیے آزمائش بن گیا چنانچہ اس نے پختہ فکر و پختہ ایمان مسلمانوں کو چھانٹ کر ان لوگوں سے بالکل الگ کر دیا جن کے دلوں میں کجی اور دماغوں میں فتنہ جوئی تھی۔

یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ اتری چنانچہ اس میں ان تمام خامیوں اور گمراہیوں پر تبصرہ ہے جو اس وقت نمایاں ہوئیں، عام اس سے کہ وہ مسلمانوں سے ظاہر ہوئیں یا اہل کتاب سے۔ اس میں اس شک اور تذبذب کی ضلالت بھی واضح کی گئی ہے جس میں اہل کتاب مبتلا تھے اور اس اختلاف اور عدم اطاعت کے انجام بد پر بھی تبصرہ ہے جس کا اظہار منافقوں اور کمزور قسم کے مسلمانوں کی طرف سے ہوا تھا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو ان تمام چالوں سے آگاہ کیا گیا ہے جو ان کو زک پہنچانے کے لیے ان کے دشمن چل رہے تھے اور احد کی شکست سے ان کو جو بددلی ہوئی تھی اس کو نہایت مؤثر انداز میں دور کیا گیا۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ جس طرح سورۂ بقرہ سورہ بدر ہے اسی طرح یہ سورۂ آل عمران سورۂ احد ہے۔ مزید غور کیجیے تو یہ بات بھی واضح ہو گی کہ بقرہ میں ایمان کی حقیقت واضح کی گئی ہے اور اس سورہ میں اسلام کی۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بقرہ میں اللہ کے آخری رسول پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور اس سورہ میں اسلامی نظام اور اللہ کی حکومت میں داخل ہونے کی دعوت ہے۔

ان دونوں سورتوں کے موضوع اور عمود سے متعلق یہ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ بقرہ میں ایمان کا پہلو نمایاں ہے اور اس سورہ میں اسلام کا۔ اس حقیقت کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ہمیں رہنمائی ملتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ نمازوں میں کبھی کبھی ایک رکعت میں بقرہ میں سے آیت ایمان پڑھتے اور دوسری رکعت میں آل عمران میں سے آیت اسلام۔ یہ گویا ایک لطیف اشارہ ہوتا اس بات کی طرف کہ ان دونوں سورتوں میں موضوع اور مقصود کی حیثیت کن مضامین کو حاصل ہے۔ علاوہ ازیں بقرہ کا خاتمہ ایک ایسی آیت پر ہوا ہے جو ایمان کے باب میں ایک نہایت جامع آیت ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ الآیۃ اور پھر اس کا خاتمہ کامل اطاعت الٰہی کے مضمون پر ہوا ہے تاکہ ہم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ایمان کا لازمی ثمرہ اسلام ہے، جہاں صحیح ایمان موجود ہو گا اس سے لازماً اسلام ظہور میں آئے گا۔ اس طرح بقرہ کے خاتمے کی آیت نے آل عمران کے ساتھ اس کے ربط کو خود واضح کر دیا۔

دوسرا پہلو ان دونوں کے درمیان امتیاز کا یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں زیادہ تر خطاب یہود سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کی حیثیت سے اصلی مقام انھی کو حاصل تھا۔ نصاریٰ کی حیثیت محض ایک ضمنی فرقے کی تھی۔ چنانچہ قرآن نے بقرہ میں ان سے خطاب کیا بھی ہے تو وہ سرسری نوعیت کا ہے۔ البتہ آل عمران میں ان سے براہ راست خطاب کیا ہے اور بحث کا زیادہ حصہ انھی سے متعلق ہے۔ سورہ کی تمہید بھی ایک

جامع نوعیت کی ہے جو یہود و نصاریٰ دونوں کے لیے موزوں ہے۔ پھر اس سے آگے جو مضمون شروع ہوا ہے وہ تدریجی طور پر نصاریٰ کی تردید میں نمایاں ہوتا گیا ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ بقرہ میں استدلال زیادہ تر ایسے امور فطرت سے ہے جو کفار اور اہل کتاب دونوں پر یکساں حجت ہو سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف آل عمران میں زیادہ تر استدلال صفات الٰہی یا ایسے مسلمات سے ہے جو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہیں۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ ان دونوں ہی سورتوں میں اہل کتاب کو سخت توبیخ فرمائی ہے لیکن انداز توبیخ دونوں میں الگ الگ ہے۔ بقرہ میں توبیخ براہ راست ہے برعکس اس کے آل عمران میں ان کو براہ راست خطاب کرنے کے بجائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ ان کو یہ یہ تہدیدات پہنچا دو۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام ہو جانے کے بعد یہ لوگ لائق خطاب نہیں رہے۔ اب خطاب کے اہل صرف پیغمبرؐ اور اہل ایمان ہی ہیں۔

ج۔ دونوں سورتوں کی تقدیم و تاخیر کے وجوہ

ان دونوں سورتوں کے موضوع، ان کے زمانۂ نزول کی خصوصیات، ان کے اسلوب بیان کے امتیازات پر ہم نے یہ جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مضامین کے اشتراک کے باوجود ان دونوں میں نسبت اس نوعیت کی ہے کہ مصحف میں تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے ان کی یہی ترتیب ہونی چاہیے تھی جو ہے۔ یہاں بقرہ کے آل عمران پر مقدم رکھنے کے مندرجہ ذیل وجوہ بالکل واضح ہیں۔

ایمان اسلام کی بنیاد ہے، جس طرح علم عمل کی بنیاد ہے۔

یہود، نصاریٰ سے اقدم ہیں اس وجہ سے ضروری ہوا کہ پہلے یہود پر حجت تمام کی جائے۔

دلائل فطرت سے استدلال، صفات الٰہی سے استدلال کے مقابل میں زیادہ واضح، زیادہ قدیم، زیادہ وسیع ہے اس وجہ سے قرآن نے پہلے اس کو استعمال کیا۔

علیٰ ہذا القیاس حضرت آدم اور حضرت ابراہیم علیہما السلام چونکہ انبیاء متقدمین میں سے ہیں اس وجہ سے یہ مناسب ہوا کہ پہلے ان کے عہد و میثاق کا حوالہ دیا جائے اور اس سے استدلال کیا جائے۔ چنانچہ بقرہ میں ان کے عہد کا حوالہ دیا۔ بعد کی سورہ میں دوسرے انبیا کے عہد کا ذکر ہوا۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ ترتیب میں سورتوں کی تقدیم و تاخیر صرف ان کی ظاہری بڑائی چھوٹائی پر مبنی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا تعلق معانی و مطالب سے ہے۔ معانی کی ترتیب کے لحاظ سے حکمت جس ترتیب کی مقتضی ہوئی ہے وہ ترتیب قرآن میں اختیار فرمائی گئی ہے۔ البتہ اگر کہیں معانی کے اعتبار سے دو سورتیں ایک ہی درجے اور ایک ہی مزاج

کی ہوئی ہوں تو ممکن ہے، وہاں بجز وطول وحجم کی بنا پر ایک کو دوسرے پر مقدم کر دیا گیا ہو۔ لیکن یہ بات محض قیاس کے حد تک صحیح قرار دی جا سکتی ہے، ورنہ ایسے مواقع میں بھی گمان یہی ہوتا ہے کہ کوئی گہری معنوی حکمت ایک کو دوسرے پر مقدم کرنے کا باعث ہوئی ہوگی اگرچہ وہ حکمت ہماری سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔

د - سورہ کے مطالب کا تجزیہ

یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے اس کا تعلق سورہ کے موضوع، اس کے ظاہری نظام اور سابق سورہ کے ساتھ اس کے تعلق سے ہے۔ اب ہمیں چند باتیں اس کے اندرونی نظام اور اس کے مختلف اجزا کے باہمی ربط و تعلق کے بابت بھی کہنی ہیں۔

اس سورہ پر جو شخص بھی تامل کی نظر ڈالے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ یہ دو بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ اس کے نصف اول میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اثبات اور اہل کتاب خصوصاً نصاریٰ کی گمراہیوں کا بیان ہے اور اس کے دوسرے نصف میں مسلمانوں کو اہل کتاب کی ان گمراہ کن چالوں سے خبردار کیا گیا ہے جو وہ ان کو راہ حق سے ہٹانے کے لیے اختیار کر رہے ہیں یا اختیار کرنے والے ہیں، ساتھ ہی ان کو اللہ کی رسی مضبوطی سے تھامے رہنے، اطاعت پر جمے رہنے، جہاد کرنے اور امتحان کے مواقع پر انتشار و اختلاف سے بچنے کی تاکید فرمائی کہ اسی طرح وہ اسلام کی پیروی کا صحیح حق ادا کر سکیں گے اور نرمی و سختی دونوں صورتوں میں اللہ کی اطاعت پر قائم رہ سکیں گے۔ اگر وہ ان باتوں کی خلاف ورزی کریں گے تو ان کا حشر بھی وہی ہوگا جو موسیٰ علیہ السلام کی امت کا ہوا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کی نافرمانی کی تو چالیس سال تک صحرا ہی میں بھٹکتے رہ گئے۔

اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے نصف اول کی حیثیت تمہید کی ہے اور نصف ثانی کی حیثیت مقصود کی۔ اس روشنی میں پوری سورہ کی تلاوت کیجیے تو آیات کا باہمی نظم سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی اور اس تمہید سے اصل مقصود یہی ہے۔ رہا آیات کا باہمی نظم اور اس کے معانی کی وضاحت تو یہ چیز اس وقت سامنے آئے گی جب ہم سورہ بقرہ کی طرح اس کے اجزا کو بھی الگ الگ مجموعوں کی شکل میں لے کر ان کی تفسیر کریں گے۔ چنانچہ اب ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق کی رہنمائی میں اس سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔
وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ[1]

---

[1] یہ تمہیدی بحث بیشتر استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے ماخوذ ہے۔

سُورَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ (۳)

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۲۰۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

آیات الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَيْكَ
۱-۶ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ
وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۳﴾ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَاللّٰهُ
عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ
وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۵﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ
يَشَآءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶﴾

شروع خدائے رحمان ورحیم کے نام سے

ترجمۂ آیات یہ الٓمّٓ ہے۔ اللہ ہی معبود ہے، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی، زندہ اور قائم
۱-۶ رکھنے والا۔ اس نے تم پر کتاب اتاری حق کے ساتھ مصداق اس کی جو اس کے آگے سے موجود ہے۔ اور اس نے تورات اور انجیل اتاری اس سے پہلے لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر۔ اور پھر فرقان اتارا۔ بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے۔ اللہ سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں۔ وہی ہے جو تمھاری صورت گری کرتا ہے رحموں کے اندر جس طرح چاہتا ہے۔ نہیں کوئی معبود مگر وہ، وہ غالب اور حکیم ہے۔

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓ (۱) سورۂ بقرہ کی تفسیر میں حروف مقطعات پر ایک جامع بحث ہم کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے اس باب میں استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر بھی پیش کر دیا ہے۔ اس کے سوا کوئی نئی چیز اس سلسلے میں ہمارے سامنے ایسی نہیں آئی جو یہاں قابل ذکر ہو۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (۲) اس آیت میں جو اسمائے حسنیٰ مذکور ہیں سب کی تحقیق گزر چکی ہے۔ بعض کی تفسیر سورۂ فاتحہ میں، بعض کی سورہ بقرہ میں۔

صفات حیات و قیومیت کے اسرار و مقتضیات

یہ امر، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، ملحوظ رہے کہ اس سورہ میں استدلال بیشتر صفات الٰہی سے ہے۔ صفات الٰہی میں سب سے پہلے صفات حیات و قیومیت کو لیا ہے۔ ان دونوں صفتوں کے اسرار و حقائق پر ہم آیت الکرسی کے اسرار و حقائق کے ضمن میں گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں ان کا اعادہ باعث طوالت ہوگا۔ یہاں موقع کلام کی مناسبت سے ان صفات کا حوالہ کتاب الٰہی کی ضرورت کے اثبات کے پہلو سے ہے، چنانچہ بعد کی آیات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ایک زندہ خدا ہے تو ناگزیر ہے کہ وہ سب کچھ دیکھتا سنتا ہے، ہماری دعائیں، فریادیں اس تک پہنچتی ہیں ہمارے اعمال و افعال اس کی نظر میں ہیں۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ ہماری دعائیں اپنی حکمت کے مطابق قبول فرماتا ہے اور ہمارے اعمال پر وہ ایک دن جزا اور سزا بھی دے گا۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ بندے اپنی زندگی میں وہ رویہ اختیار کریں جو اسے پسند ہو۔ یہ چیز اس بات کی مقتضی ہے کہ بندوں میں اس بات کی جستجو ہو کہ کون سے اعمال خدا کو پسند ہیں، کون سے ناپسند، تاکہ وہ اس کی اطاعت و ہدایت کی راہ اختیار کر کے سعادت کا مقام حاصل کر سکیں اور حقیقی زندگی کے چشمۂ حیواں سے فیضیاب ہو سکیں۔

اہل کتاب "خداوند خدا"، "زندہ خدا" کی تعبیر سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان کے انبیا کے صحیفوں میں بکثرت یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ جہاں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کے علم اور اس کی غیرت کا اظہار ہوا ہے بالعموم اس کے لیے "زندہ خداوند" ہی کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ نصاریٰ اگرچہ اپنے زعم کے مطابق ایک مصلوب خدا کی پرستش کرتے ہیں لیکن وہ بھی "زندہ خدا" کی تعبیر سے ناآشنا نہیں تھے۔ اس وجہ سے یہ بات بداہتہً ان کے خلاف جاتی ہے کہ ایک طرف تو وہ زندہ خدا کا تصور رکھتے ہیں اور دوسری طرف اس کا مصلوب ہونا بھی مانتے ہیں۔

اسی طرح "قیوم" کی صفت بھی انبیا کے صحیفوں میں بار بار مذکور ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اللہ ہی کے حکم اور اسی کی قدرت سے

قائم ہے۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ کی ان بدیہی صفات میں سے ہے جن پر عقلاً بھی ایمان لانا ضروری ہے اور انبیا کے صحیفوں کی رو سے بھی۔ نصاریٰ بھی ان صحیفوں پر ایمان کے مدعی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ حضرت مسیح کی الوہیت کے قائل ہیں۔ اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ جب تم خود اقرار کرتے ہو کہ حضرت مسیح بھوک پیاس محسوس کرتے تھے، غذا اور پانی کے محتاج تھے، بغیر ان چیزوں کے وہ اپنی ہستی کو قائم رکھنے پر قادر نہ تھے تو پھر وہ خدا کس طرح ہوئے، جب کہ خدا کے لیے تمہارے اپنے انبیا کے ارشادات کے بموجب قیوم ہونا ضروری ہے؟ یا یہ سوال کیا جائے کہ جب تمہاری اپنی انجیلوں سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح مصائب و شدائد پیش آنے پر روئے، ان کا دل تنگ ہوا اور سولی پر انھوں نے فریاد کی تو پھر وہ آسمان و زمین کے تھامنے والے اور قائم رکھنے والے کیسے ہو سکتے ہیں؟ تو ان سوالوں کے جواب میں ان کے پاس ضد اور کٹ حجتی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یہاں قیوم کی صفت کا حوالہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ہمیں ہدایت بخشے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ واحد، ہمارا پروردگار، جس طرح ہمارا پیدا کرنے والا اور ہمیں زندگی بخشنے والا ہے اسی طرح وہ، جیسا کہ آیت الکرسی میں ارشاد ہوا، اپنی خلق کو قائم رکھنے والا بھی ہے اور اس کے لیے اس نے ہر قسم کے اسباب و وسائل پیدا کیے ہیں۔ پھر جب اس نے ہماری معیشت کے لیے یہ کچھ سامان کیے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ہماری اجتماعی زندگی کے لیے وہ چیز نہ دے جو ہمارے قیام و بقا کی ضامن ہو سکے در آنحالیکہ یہ چیز ہماری خلقت کی اصل غایت ہے۔ چنانچہ یہی چیز قیام عدل و قسط کی اصل اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے شرائع و احکام کے نزول کی بنیاد بنی اس لیے کہ اس کے بغیر فطرت انسانی ارتقا کے اس درجے کو حاصل نہیں کر سکتی تھی جو اس کے وجود کے اندر مضمر ہے۔

یہ قیومیت اس بات کی بھی مقتضی ہوئی کہ خدائے قیوم و کارساز اس امر کی بھی نگرانی رکھے کہ جب بندے اپنی خود مختاری اور سرکشی سے کام لے کر اس کے نظام عدل کو بالکل مٹا دینے کی کوشش کریں تو وہ اپنے ایسے بندوں کو بھی اٹھاتا رہے جو اس کو از سر نو بحال کرنے کے لیے اپنی مساعی صرف کریں۔ چنانچہ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک اللہ تعالیٰ نے دنیا کو عدل و حق اور اپنی سیدھی راہ پر استوار رکھنے کے لیے اپنے بے شمار نبی اور رسول بھیجے اور خاتم الانبیا پر دین کی تکمیل کر دینے اور کتاب الٰہی کو ہر قسم کی دست اندازیوں سے محفوظ کر دینے کے بعد اس مقصد کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ ہر دور میں اس امت کے اندر ایک ایسا گروہ، خواہ وہ کتنا ہی قلیل التعداد ہو، پیدا ہوتا رہے گا جو خود حق و عدل پر قائم اور دوسروں کو اس عدل و حق کے قائم کرنے کی دعوت دیتا رہے گا۔ اس حقیقت کی وضاحت حدیثوں میں بھی ہوئی ہے اور اس کی طرف

بعض لطیف اشارات اس سورہ میں بھی آرہے ہیں جن کی طرف ہم آگے ان شاء اللہ موزوں مقامات میں توجہ دلائیں گے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۳)

قرآن کے اتارے جانے کی ضرورت

'حق' کے معنی کی تحقیق تفسیر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے مختلف معانی میں سے 'قولِ فیصل' مراد ہے۔ یعنی وہ بات جو نزاع و اختلاف کا فیصلہ کر دے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو جو کتاب دی گئی تھی اس میں انھوں نے اختلافات پیدا کر دیے جس کے سبب سے اصل حقیقت گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس گم شدہ حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن اتارا تاکہ لوگ اللہ کے اصل دین سے بہرہ مند ہوں اور اختلافات و نزاعات کی بھول بھلیاں سے نکل کر دین کی اصل شاہراہ پر آجائیں۔

'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ' پر بھی تفصیلی بحث سورہ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ قرآن کے مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ہونے کے ایک مشہور معنی تو یہ ہیں کہ یہ بنیادی طور پر پچھلے صحیفوں کی تمام صحیح تعلیمات کی تصدیق کرتا ہے، صرف ان باتوں کی تردید کرتا ہے جو ان میں ملاوٹ کرنے والوں کی طرف سے ملا دی گئی ہیں۔ قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں کی یہ ہم آہنگی و ہم رنگی اس بات کی صاف شہادت ہے کہ یہ سب ایک ہی آفتابِ حق کی شعاعیں اور ایک ہی منبعِ انوار کے پرتو ہیں۔ دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ قرآن اور اس کے حامل کی صفات پچھلے صحیفوں کی پیشین گوئیوں میں مذکور رہیں، یہ پیشین گوئیاں اب تک اپنے مصداق کی منتظر تھیں، قرآن کے نزول اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ان کی تصدیق ہوئی۔ یہ قرآن کے حق ہونے کی ایک بہت بڑی شہادت ہے اور ساتھ ہی اس سے ان صحیفوں کی بھی تصدیق ہو رہی ہے کہ ان میں جو پیشین گوئیاں وارد تھیں وہ بھی ثابت ہوئیں۔ اس پہلو سے قرآن سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے خیر مقدم کا سزاوار تھا جو اگلے صحیفوں پر ایمان کے مدعی تھے کہ اصلاً قرآن کے ظہور سے سب سے زیادہ انھی کے سر اونچے ہوئے تھے لیکن انھوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب سے اس کا انکار کیا۔

خلاصہ مطلب

وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ الاٰية۔ یہ اوپر والے ٹکڑے کے اجمال کی تفصیل ہے جس سے قرآن کے اتارے جانے کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ حی و قیوم ہے اس وجہ سے اس نے ہماری زندگی کی رہنمائی اور ہمیں عدل و قسط پر استوار رکھنے کے لیے قرآن کو قولِ فیصل بنا کر اتارا ہے۔ اس سے پہلے اس نے لوگوں کی ہدایت

کے لیے تورات اور انجیل نازل فرمائیں لیکن ان کے پیروؤں نے ان میں تحریف اور ان کے بعض حصوں کو فراموش کر کے ان میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے جن کے سبب سے حق و باطل میں امتیاز ناممکن ہو گیا یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ قرآن کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بنا کر اتارے۔ چنانچہ اس نے یہ کتاب نازل فرمائی اب جو لوگ اس کتاب کا انکار کریں گے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت عذاب ہے اس لیے کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے اس نظامِ عدل و قسط کے دشمن ہیں جو اس کی مخلوق کی صلاح و فلاح اور اس کی دنیا و آخرت دونوں کی سعادت کے لیے ضروری ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو چھوڑ دے، ان کی عدل دشمنی کی ان کو سزا نہ دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اپنی دنیا کو تباہی کے لیے چھوڑ دیا اور اس کے بقا سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ درآنحالیکہ اس کی صفت، جیسا کہ اسی سورہ میں آگے ذکر آئے گا، قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ہے۔ اس قوامیت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اس قسط کے دشمنوں سے انتقام لے اور ان کو واجبی سزا دے۔ وہ عزیز یعنی غالب اور قدرت والا ہے، کمزور اور ناتوان نہیں ہے کہ کوئی اسے بے بس کر دے، اسی طرح وہ انتقام والا ہے یعنی عدل و قسط کے معاملے میں غیور ہے، سرد مہر اور بے احساس نہیں ہے کہ ان کی پامالی پر راضی ہو جائے۔ یہ اس کی انھی صفات کا ظہور ہے کہ جن قوموں نے اس کے قائم کردہ قسط کو مٹایا ہے، ایک خاص حد تک ان کو مہلت دینے کے بعد اس نے ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے اور جب جب اس کے شرائع و احکام کو نابود کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس نے ان کو از سرِ نو تازہ کرنے اور سنوارنے کا اہتمام فرمایا ہے۔ عدل و قسط کے قیام و بقا کے لیے اپنی اسی سنت کو یہاں انتقام سے تعبیر فرمایا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (۵) هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۶)

قیام عدل پر صفاتِ الٰہی سے استدلال

اوپر والی آیت میں کتابِ الٰہی کے مخالفین یا بالفاظ دیگر عدل و قسط کے ہادمین کے لیے جو سزا مذکور ہوئی ہے یہ اس کی دلیل ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدا کی اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے وہ بے خبر رہتا ہے۔ اس سے کوئی بات بھی مخفی نہیں رہتی، خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، اور خواہ زمین میں پیش آئے یا آسمانوں میں، خدا کا علم ہر چیز اور ہر جگہ کو محیط ہے اور محیط کیوں نہ ہو، اسی نے تو سب کو پیدا کیا اور وہی ہے جو رحموں کے اندر صورت گری فرماتا ہے تو جس نے پیدا کیا اور جس نے صورت گری فرمائی کیا وہ بھی بے خبر ہو سکتا ہے اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (کیا جس نے پیدا کیا وہ بھی نہ جانے گا)

اس کے بعد توحید اور خدا کی صفات میں سے عزیز اور حکیم کا حوالہ دیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ محیطِ کُل علم رکھنے والی ہستی اگر قیامِ عدل و قسط کا اہتمام نہ کرے تو اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس کو عزت و قدرت حاصل نہیں ہے یا عزت و قدرت تو حاصل ہے لیکن اس کو اپنے کاموں میں کسی حکمت و

مصلحت کی کوئی پروا نہیں، بس ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے، خیر ہو یا شر، ظلم ہو یا انصاف اس سے اسے کچھ بحث نہیں، دونوں ہی چیزیں اس کی نظر میں یکساں ہیں، یہ خیال بالبداہت باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ عزیز بھی ہے اور حکیم بھی، اسے ہر چیز پر قدرت بھی حاصل ہے اور اس کے ہر کام میں عدل و حکمت بھی ہے اور ساتھ ہی وہ ہر چیز سے باخبر بھی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں سے انتقام نہ لے گا جو اللہ کی اس کتاب کا انکار کریں گے جو اس نے دنیا میں از سر نو حق و عدل کے آثار و اعلام کو اجاگر کرنے کے لیے نازل فرمائی ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۷-۱۷

قرآن کے نزول کی ضرورت واضح کرنے کے بعد اب یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں جو اس قرآن کا انکار کر رہے ہیں اور وہ کیا چیزیں ہیں جن کو وہ اپنے اس انکار کے لیے بہانہ بنا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں فرمایا ہے کہ انکار کی راہ ان لوگوں نے اختیار کی ہے جن کے دلوں میں کجی اور جن کی طبیعتوں میں فتنہ پسندی ہے۔ اپنے اس ذوق کی وجہ سے وہ قرآن کی اصل تعلیمات سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ وہ اس میں صرف ایسی چیزیں ڈھونڈھتے ہیں جن کی آڑ لے کر وہ قرآن کے خلاف لوگوں کے دلوں میں کچھ شبہات و شکوک پیدا کر سکیں اور اس طرح خود بھی راہ حق سے گریز اختیار کریں اور جس حد تک ان کا زور چلے دوسروں کو بھی اس سے بدکائیں۔ چنانچہ ان کی ساری دلچسپی محکمات کے بجائے صرف متشابہات سے ہوتی ہے اس لیے کہ ان کا تعلق آخرت کی زندگی کی تمثیلات و تشبیہات سے ہوتا ہے، ان کے اندر موشگافی اور کرید کر کے کوئی ایسی بات نکالی جا سکتی ہے جو خود ان کی ضلالت کے لیے بھی ایک بہانہ بن سکے اور دوسروں کو بھی اس سے فتنے میں مبتلا کیا جا سکے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جن کے اندر علم و عقل کی پختگی موجود ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی آیات کی قدر کرتے ہیں اور اس کی تعلیمات و ہدایات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ قرآن کے محکمات کی طرح اس کے متشابہات کی بھی قدر کرتے ہیں اور ان کو اعتراض و فتنہ جوئی کا ذریعہ بنانے کے بجائے ان کو اضافۂ علم کا ذریعہ بناتے اور ان پر صدق دل سے ایمان لاتے ہیں۔ اگر کوئی بات اپنی فہم کی گرفت سے ماورا پاتے ہیں تو اس کی حقیقت و ماہیت کے درپے ہونے اور اس کو فتنہ بنانے کے بجائے اس کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں کہ یہی رویہ علم و ایمان کی پختگی کا مقتضیٰ ہے، نیز ان کے اندر آخرت کا پختہ یقین ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ شیاطین کی وسوسہ اندازیوں سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے برابر دعا بھی کرتے رہتے ہیں کہ ایمان کی دولت سے بہرہ یاب فرمانے کے بعد وہ ان کو کسی گمراہی میں پڑنے سے محفوظ رکھے۔

اس کے بعد گمراہی کے ان اسباب کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ان کے پچھلے ہم مشربوں کی تباہی کے باعث ہوئے اور ساتھ ہی مسلمانوں کی کامیابی کے بعض تازہ واقعات کا حوالہ دے کر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اگر ان واقعات سے انھوں نے عبرت نہ پکڑی تو ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو پچھلوں کا ہو چکا ہے۔

اس کے بعد ان حجابات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ان کے اور قرآن کے درمیان آج حائل ہیں اور ساتھ ہی ان کی بے حقیقتی اور بے ثباتی کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ دنیائے فانی کی جن چیزوں پر ریجھ کر قرآن سے منہ موڑ رہے ہو ان کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ان کے پیچھے بھاگنے کے بجائے ابدی زندگی کی نعمتوں اور خدا کی خوشنودی کے طالب بنو جس کی راہ صبر، سچائی، اطاعتِ الٰہی، انفاق فی سبیل اللہ اور استغفار سے کھلتی ہے اور قرآن اسی راہ کی طرف بلانے کے لیے نازل ہوا ہے۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ آیات
اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ ٧-١٧
فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم
وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ وقف منزل وقف لازم
اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا
الْاَلْبَابِ ﴿٧﴾ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ
لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿٨﴾ رَبَّنَآ
اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ
الْمِیْعَادَ ﴿٩﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ ع ٩
وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ﴿١٠﴾
كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۱﴾ قُلْ
لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ
الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ
الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ
النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ
وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ
مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ
اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ
اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ
وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

ترجمۂ آیات ۷-۱۷

وہی ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری جس میں محکم آیات ہیں جو اصل کتاب
کا درجہ رکھتی ہیں اور دوسری کچھ آیتیں اس میں ایسی ہیں جو متشابہ ہیں۔ تو جن کے دلوں
میں کجی ہے وہ اس میں سے متشابہات کے درپے ہوتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان
کی حقیقت و ماہیت معلوم کریں حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور

جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے یہ سب ہمارے رب ہی کے پاس سے ہیں۔ اور یاددہانی تو اہلِ عقل ہی حاصل کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت بخشنے کے بعد کج نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش۔ تو نہایت بخشنے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! تو سب لوگوں کو ایک ایسے دن کے لیے جمع کر کے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ ۹-۷

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، نہ ان کے مال خدا کے ہاں کچھ کام آئیں گے، نہ ان کی اولاد۔ اور وہی لوگ دوزخ کے ایندھن بنیں گے۔ ان کا بھی وہی حال ہونا ہے جو آلِ فرعون اور ان لوگوں کا ہوا جو ان سے پہلے گزرے۔ انھوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا اور اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۱۱-۱۰

ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا ہے یہ کہہ دو کہ تم مغلوب ہو گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ جن دو گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی ان کی سرگزشت میں تمھارے لیے نشانی ہے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، دوسرا کافر تھا، یہ ان کو کھلم کھلا ان سے دو گنے دیکھتے تھے اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی تائید سے مدد فرماتا ہے۔ اس میں آنکھیں رکھنے والوں کے لیے بصیرت ہے۔ ۱۳-۱۲

لوگوں کی نگاہوں میں مرغوباتِ دنیا عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے، چوپائے اور کھیتی کھبا دی گئی ہیں۔ یہ دنیوی زندگی کے سروسامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ ان سے کہو، کیا میں تمھیں ان چیزوں سے بہتر چیز کا پتہ

دوں؟ جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوشنودی ہوگی۔ اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ہے، جو یہ دعا کرتے رہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے پس تو ہمارے گناہوں کو بخش اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ جو صابر، راستباز، فرمانبردار، راہِ خدا میں خرچ کرنے والے اور اوقاتِ سحر میں مغفرت چاہنے والے ہیں۔ ۱۴-۱۷

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا
الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ
وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا
يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۷)

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ (وہی خدا ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری) سے اشارہ اس عزیز و حکیم اور حی و قیوم خدا کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور اس سے مقصود یہاں مخاطب کو کئی چیزوں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

ایک تو اس عظیم رحمت کی طرف اشارہ کرنا ہے جو اس کتاب کی شکل میں ظہور میں آئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات حیات و قیومیت کا ظہور ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو زندگی جاوداں سے بہرہ مند اور ان کو جادۂ حق پر استوار کرنے کے لیے یہ کتاب اتاری ہے۔ اس عظیم نعمت کا حق یہ ہے کہ بندے اس کی قدر پہچانیں، اس پر ایمان لائیں اور اس کے ذریعے سے حیاتِ جاوداں اور بقائے دوام حاصل کریں۔

دوسرے اس میں ان لوگوں کے لیے تخویف و تہدید کا پہلو بھی ہے جو اس کی تردید و تکذیب کریں گے اس لیے کہ جس خدا نے یہ کتاب اتاری ہے وہ عزیز بھی ہے اور قیوم بھی۔ اس کی اس عزت و حکمت اور اس قیومیت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ان لوگوں کو سزا دے جو اس کے قانونِ حق و عدل کی راہ میں مزاحم ہوں۔

تیسرے اس سے نفسِ کتاب کے مزاج کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ ایک خدائے عزیز و حکیم کا کلام ہے اس وجہ سے یہ خود بھی عزیز و حکیم ہے۔ چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ اس کی صفت عزیز و حکیم آئی بھی ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کتاب الجھنے اور موشگافی کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ بقدرِ ظرف و توفیق فائدہ اٹھانے کے لیے ہے۔ آدمی اس ناپیداکنار سمندر کی حکمتوں سے جو فائدہ اٹھا سکے اٹھالے، یہ توقع نہ کرے کہ وہ اس کے تمام اسرار و حقائق کا احاطہ کر سکتا ہے۔ اس کی جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں ان کو فتنہ اور شبہات و شکوک کا ذریعہ نہ بنائے بلکہ ان کو اللہ کے حوالہ کرے۔

اس آیت میں چند الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہیں جن کی نوعیت کچھ قرآنی اصطلاحات کی سی ہے۔ چونکہ آیت کا ٹھیک ٹھیک مفہوم اس وقت تک واضح نہیں ہو سکے گا جب تک ان اصطلاحات کا مفہوم اچھی طرح واضح نہ ہو جائے، اس وجہ سے پہلے ہم ان کی وضاحت کرتے ہیں۔

'آیاتِ محکمات' سے مراد

اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ: آیاتِ محکمات سے مراد قرآن کی وہ آیات ہیں جو آفاق و انفس کی بالکل بدیہیات، خیر و شر کے مسلّمات، اور معروف و منکر کے قطعیات و یقینیات پر مشتمل ہیں، جن کو دل قبول کرتے ہیں اور جن کو قبول کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی شرط نہیں ہے کہ دل سلیم ہو، جن کے حق میں ہر عقل گواہی دیتی ہے بشرطیکہ اس پر تعصب، جذبات اور غیر فطری عقلیات کے پردے پڑے ہوئے نہ ہوں۔ انھی محکمات پر ہر صحیح مذہب کی بنیاد ہوتی ہے اس وجہ سے تمام آسمانی مذاہب اور تمام انبیا سے یہ تواتر کے ساتھ نقل ہوئی ہیں۔ چونکہ فطرتِ انسانی کے اندر ان کی جڑیں نہایت مستحکم ہوتی ہیں، شبہات و شکوک کی آندھیاں ان کو ہلانے سے قاصر رہتی ہیں اس وجہ سے قرآن نے ان کو محکمات سے تعبیر کیا ہے۔

'ام الکتاب' کا مفہوم

اُمُّ الْكِتٰبِ: آیاتِ محکمات کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ ان کی حیثیت ام الکتاب کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بقیہ ساری کتاب کا مرجع و مرکز وہی محکمات ہوتی ہیں، انھی پر ساری بحث کا مدار ہوتا ہے، ساری شاخیں انھی سے پھوٹتی ہیں۔ اگر کوئی نزاع و اختلاف پیدا ہوتا ہے تو اس کا فیصلہ بھی انھی کی کسوٹی پر پرکھ کر ہوتا ہے۔ پھر انھی کا یہ درجہ ہوتا ہے کہ ان کو اصول قرار دے کر ان سے مسائل مستنبط کیے جائیں اور ان مسائل پر اسی طرح اعتماد کیا جائے جس طرح اصولوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

'آیاتِ متشابہات' سے مراد

مُتَشٰبِهٰتٌ: متشابہات سے مراد وہ آیتیں ہیں جن میں ہمارے مشاہدات و معلومات کے دائرے سے باہر کی باتیں تمثیلی و تشبیہی رنگ میں قرآن نے بتائی ہیں۔ یہ باتیں جس بنیادی حقیقت سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں وہ بجائے خود واضح اور مبرہن ہوتی ہے، عقل اس کے اتنے حصے کو سمجھ سکتی ہے جتنا سمجھنا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ البتہ چونکہ اس کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہوتا ہے اس وجہ سے قرآن ان کو تمثیل و تشبیہ کے انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ علم کے طالب بقدرِ استعداد ان سے فائدہ اٹھالیں اور ان کی اصل صورت و حقیقت کو علمِ الٰہی کے حوالہ کریں۔ یہ باتیں خدا کی صفات و افعال یا آخرت کی نعمتوں

اور اس کے آثار سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں۔ ان کا جس حد تک ہمارے لیے سمجھنا ضروری ہے اتنا ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اور اس سے ہمارے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اگر ہم اپنی حد سے آگے بڑھ کر ان کی اصل حقیقت اور صورت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کریں تو یہ چیز فتنہ بن جاتی ہے اور اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے ذہن سے شک کا ایک کانٹا نکالنا چاہتا ہے اور اس کے نتیجے میں بے شمار کانٹے اس کے اندر چبھا لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس نایافتہ کی طلب میں اپنی یافتہ دولت کو بھی ضائع کر بیٹھتا ہے اور نہایت واضح حقائق کی اس لیے تکذیب کر دیتا ہے کہ ان کی شکل و صورت ابھی اس کے سامنے نمایاں نہیں ہوئی۔ قرآن نے اسی چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ (بلکہ انھوں نے اس چیز کو جھٹلایا جو ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور ابھی تک اس کی حقیقت ان کے سامنے ظاہر نہیں ہوئی ہے) یونس۔ ۳۹۔

متشابہات کی بعض مثالیں

ہم یہاں قرآن سے اس قسم کے بعض متشابہات کی مثالیں نقل کرتے ہیں۔ سورۂ مدثر میں قرآن نے دوزخ کے عذاب کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا — میں اس کو دوزخ میں داخل کروں گا اور تمھیں کیا پتہ کہ
سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ — دوزخ کیا ہے؟ وہ نہ ذرا ترس کھائے گی اور نہ کسی چیز
لِّلْبَشَرِ ۝ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝ — کو چھوڑے گی۔ جسموں کو جھلس دینے والی ہوگی۔ اس پر
(۲۶-۳۰) — خدا کے انیس سرہنگ مقرر ہوں گے۔

اس آیت میں جس سزا کا ذکر ہے وہ ایک حقیقت ہے اور قانون مجازات پر جس کا ایمان ہو اس کے لیے اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں، رہی اس کی تفصیل تو اس کا تعلق چونکہ ایک نادیدہ عالم سے ہے اس وجہ سے اس کی اصل صورت کسی طرح ہماری گرفت میں نہیں آسکتی۔ اس طرح کے معاملات میں صحیح روش یہ ہے کہ آدمی اتنے پر قناعت کرے جو سمجھ میں آتا ہے۔ جو سمجھ میں نہیں آتا وہ اس عالم میں سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا، اس وجہ سے اس کے درپے ہونے کے بجائے اس کو خدا کے حوالے کرے۔ سلیم الطبع انسان ایسا ہی کرتے ہیں لیکن جن کے دلوں میں کجی اور عقلوں میں ٹیڑھ ہوتی ہے وہ یہ روش اختیار کرنے کے بجائے متشابہات و تمثیلات کی حقیقت معلوم کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں جس سے وہ خود بھی فتنوں میں پڑتے ہیں اور اپنے جیسے دوسرے بہتوں کو بھی فتنوں میں ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ دیکھیے مذکورہ بالا آیت میں تِسْعَةَ عَشَرَ کا جو لفظ آیا تو قرآن نے اس کے متعلق شرارت پسندوں کا ردِ عمل یہ بتایا ہے کہ وہ اسی کے درپے ہو گئے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے فرشتے مراد ہیں تو یہ سوال انھوں نے اٹھایا کہ انیس کے عدد کی تخصیص میں کیا رمز ہے؟ قرآن نے ان کے اس ردِ عمل پر ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا۔

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا — اور ہم نے دوزخ کی پہرہ داری پر نہیں مقرر کیے ہیں مگر

مَلٰٓئِكَةً ۠ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ (المدثر - ۷۴ : ۳۱)

فرشتے، اور ہم نے ان کی تعداد کو نہیں بنایا مگر کافروں کے لیے فتنہ، تاکہ وہ لوگ یقین کریں جن کو کتاب ملی ہے اور ایمان والے اپنے ایمان میں اضافہ کریں اور کتاب پانے والے اور اہل ایمان شک میں نہ پڑیں اور جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جو کافر ہیں وہ یہ کہیں کہ اس قسم کی تمثیل سے اللہ تعالیٰ کا کیا مطلب ہے! اسی طرح اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور یہ نہیں ہے مگر انسانوں کے لیے یاددہانی۔

اسی طرح سورہ بقرہ میں جنت کی نعمتوں کا تمثیلی رنگ میں ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب اہل جنت کے سامنے جنت کی نعمتیں پیش کی جائیں گی تو وہ خوشی سے پکار اٹھیں گے کہ یہ تو وہی نعمتیں ہیں جن کی ہمیں پہلے قرآن میں سیر کرادی گئی تھی، قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (البقرۃ - ۲۵) (وہ پکاریں گے، یہ تو وہی چیز ہے جو ہمیں اس سے پہلے بخشی گئی اور وہ دیے جائیں گے اس سے ملتی جلتی) یعنی جنت کی نعمتوں کا ذکر جو تمثیلات و متشابہات کے رنگ میں قرآن میں ہوا ہے اس سے اہل ایمان کو تو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں بیٹھے ہوئے ایک سیر جنت کی کر لیتے ہیں لیکن انہی تمثیلات و متشابہات سے متعلق فتنہ جویوں اور ضلالت پسندوں کے رویہ کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (البقرۃ - ۲ : ۲۶)

اللہ اس بات سے نہیں جھجکتا کہ کوئی تمثیل بیان کرے خواہ وہ کسی مچھر کی ہو یا اس سے بھی کسی چھوٹی چیز کی، تو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے پروردگار کی جانب سے ہے لیکن جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کی تمثیلیں پیش کرنے سے اللہ تعالیٰ نے کیا چاہا! اللہ ان تمثیلوں سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور ان سے بہتوں کو راہ یاب کرتا ہے اور ان سے نہیں گمراہ کرتا مگر انہی لوگوں کو جو خدا کی نافرمانی کرنے والے ہوں۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آیات متشابہات سے مراد قرآن کی وہ آیتیں ہیں جن میں یا تو

آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں میں سے کسی نعمت و نقمت کا بیان تمثیلی و تشبیہی رنگ میں ہوا ہے یا خدا کی صفات و افعال میں سے کوئی بات تمثیلی اسلوب میں پیش ہوئی ہے۔ مثلاً آدم میں خدا کا اپنی روح پھونکنا یا حضرت عیسیٰ کو بن باپ کے پیدا کرنا وغیرہ۔ اس طرح کی آیات سے جیسا کہ اوپر بیان ہوا اہل ایمان کے علم و ایمان میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جن کی طبیعتوں میں فتنہ پسندی ہوتی ہے وہ انھی کے اندر موشگافیاں کر کے بہت سے فتنے پیدا کر لیتے ہیں۔

تاویل کا مفہوم

تاویل۔ تاویل کا لفظ بھی اس آیت میں ذرا ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے یہاں مراد مذکورہ بالا قسم کی کسی بیان کردہ شے کی حقیقت اور اس کی صورت ہے۔ جس مفہوم میں یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے اسی مفہوم میں سورۂ یوسف میں استعمال ہوا ہے۔ قَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا، (اس نے کہا اے میرے باپ، یہ ہے میرے اس خواب کی حقیقت جو میں نے اس سے پہلے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اس کو واقعہ ثابت کر دکھایا) (یوسف ۱۰۰)

محکمات و متشابہات کے بارے میں چند تنبیہات

یہاں چند باتیں بطور تنبیہ اور بھی قابل ذکر ہیں۔ ان سے اس راہ کی ساری الجھنیں انشاء اللہ دور ہو جائیں گی۔

ایک یہ کہ اس آیت میں اسلوب کلام حصر کا نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ نہیں گمان کرنا چاہیے کہ بس قرآن کی آیات دو ہی قسموں، محکمات اور متشابہات، ہی میں تقسیم ہیں۔ یہاں صرف انھی دونوں قسموں کا ذکر دو متقابل قسموں کی حیثیت سے ہوا ہے اور مقصود ان کے ذکر سے محض فتنہ پسندوں اور ہدایت پسندوں کے اختلافِ ذوق کو نمایاں کرنا ہے کہ جو طبیعتیں فتنہ پسند ہوں ان کی ساری دلچسپی صرف متشابہات سے ہوتی ہے تاکہ ان کے ذوق فتنہ جوئی کے لیے کوئی غذا فراہم ہو سکے۔ برعکس اس کے جو علم و معرفت کے طالب ہوتے ہیں اور جن پر حقیقت پسندی کا رنگ غالب ہوتا ہے ان کی اصل دلچسپی محکمات سے ہوتی ہے۔ جہاں تک متشابہات کا تعلق ہے ان کا جتنا حصہ ان کی سمجھ میں آتا ہے اس سے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، جو حصہ سمجھ میں نہیں آتا اس کی صورت و ہیئت معلوم کرنے کے پیچھے نہیں پڑتے بلکہ اس کو خدا کے حوالے کرتے ہیں۔ محکمات کی بدولت چونکہ ان کے قدم علم میں بہت راسخ ہو جاتے ہیں اس وجہ سے اس طرح کی چیزیں ان کو متزلزل نہیں کرتیں۔ قرآن میں ان دو قسموں کے علاوہ بھی آیات ہیں لیکن مقصود بیان چونکہ آیات قرآنی کی تمام انواع کا احاطہ نہیں ہے اس وجہ سے ان کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، مثلاً قصص قرآن، امثال قرآن، تلمیحات و اشارات۔ یہ چیزیں نہ تو امّ الکتاب کے درجے اور مرتبے کی ہیں اور نہ ان کو ان متشابہات کے درجے میں رکھنا صحیح ہے جن کی تاویل میں غور و فکر کرنا ممنوع ہو۔

دوسری یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن کی آیات کا محکم و متشابہ ہونا ہرگز بلحاظ الفاظ نہیں ہے بلکہ صرف بلحاظ معنی ہے۔ قرآن، اپنے الفاظ اور اپنی زبان کے اعتبار سے، تمام تر عربی مبین میں ہے الفاظ

کی تاویل میں جو اختلافات ہوئے ہیں وہ بالعموم تین اسباب سے ہوئے ہیں۔ یا تو غور و تحقیق میں کوتاہی ہوئی ہے یا کسی غلط عقیدے کی بے جا عصبیت اس کا باعث ہوئی ہے، یا عربی زبان سے ناواقفیت اس کا سبب بنی ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں اس طرح کے کسی سبب سے کوئی الجھن پیدا ہوئی ہو تو اس پر غور و فکر عربی زبان کے معروف و مسلم قواعد و ضوابط کی روشنی میں ہونا چاہیئے۔ یہ ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن پر غور و فکر ممنوع ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ متشابہات ہوں یا محکمات، قرآن میں یہ دونوں قسمیں ممیز اور معلوم ہیں۔ یہ بات نہیں ہے، جیسا کہ بعض متکلمین نے گمان کیا ہے کہ یہ دونوں غیر ممیز ہیں اور نہ یہ بات ہے کہ الفاظ کی اپنے معانی پر دلالت کوئی مشتبہ اور مشکوک چیز ہے۔ جن لوگوں نے ایسا سمجھا ہے انھوں نے بالکل غلط سمجھا ہے۔ ان میں سے پہلی بات تو صریحاً غلط ہے اور دوسری بات نہایت مبہم ہے جو سرے سے قرآن ہی سے مایوس کر دینے والی ہے حالانکہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے نور و برہان بنا کر اتارا ہے۔ جو باتیں عالم غیب سے تعلق رکھنے والی ہیں ان کے متعلق خدا نے ہماری ضرورت کے حد تک خبر دے دی ہے، اس کا جو حصہ ہم سے محجوب رکھا گیا ہے بس اس کی تاویل پردۂ خفا میں ہے۔

چوتھی یہ کہ قرآن نے یہاں محکم اور متشابہ کا ایک خاص مفہوم مراد لیا ہے جو ان کے لغوی مفہوم سے ایک حد تک الگ ہے۔ بعض دوسرے مقامات میں بھی قرآن میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں جہاں ان کے لغوی مفہوم مراد ہیں۔ مثلاً محکم سے مراد وہ کلام ہے جو جامع، واضح اور موجز ہو۔ اس صورت میں اس کا مقابل لفظ مفصل آتا ہے۔ مثلاً كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (ھود-۱) (یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں، پھر ان کی تفصیل کی گئی خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے) سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ شروع شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیمات و ہدایات قولِ محکم کی شکل میں اتاریں تاکہ وہ ذہن و حافظے میں اچھی طرح راسخ ہو سکیں اور دل اور زبان دونوں کے لیے وہ ہلکی پھلکی محسوس ہوں۔ پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ذریعے سے ان کی تفصیل فرما دی۔ اسی طرح متشابہ کا ایک عام مفہوم بھی ہے وہ یہ کہ ایک دوسری سے ملتی جلتی ہم آہنگ و ہم رنگ چیز۔ اپنے اس مفہوم کے اعتبار سے پورا قرآن متشابہ ہے۔ چنانچہ اسی پہلو سے قرآن کو متشابہ کہا گیا ہے۔ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (زمر-۲۳)

پانچویں یہ کہ جس طرح قرآن محکمات و متشابہات دونوں ہی قسم کی آیات پر مشتمل ہے اسی طرح عالم انفس اور عالم آفاق میں جو نشانیاں ہیں وہ بھی محکمات و متشابہات دونوں ہی پر مشتمل ہیں۔ ان کے باب میں بھی اربابِ علم اور اہلِ زیغ کا رویہ وہی ہوتا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ جن کے ذہن و فکر میں پختگی ہوتی ہے وہ محکمات سے اطمینان و یقین حاصل کرتے ہیں اور متشابہات سے شبہات و شکوک میں گرفتار ہونے کے

بجائے ان کو خدا کے علم و حکمت کے حوالے کرتے ہیں اور اپنے علم کی کوتاہی کا اقرار کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ ان متشابہات کو اپنی اور دوسروں کی گمراہی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس مسئلے پر مفصل بحث انشاء اللہ ہم سورۂ کہف کی تفسیر میں کریں گے۔ غزوۂ احد کے واقعہ کو بھی، جیسا کہ ہم تمہیدی بحث میں اشارہ کر چکے ہیں، ایک متشابہ واقعہ کی نوعیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس جنگ کے بعد اس عظیم آیت کا اترنا اس کائنات کی ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لیے تھا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جس طرح غزوۂ بدر حق و باطل کے درمیان ایک یوم فرقان تھا جس سے اہل ایمان کے قلوب اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر مطمئن ہوئے اور اس نے ایک آیت محکم بن کر اہل کفر پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری کر دی اسی طرح غزوۂ احد کی حیثیت ایک آیت متشابہ کی ہے اس لیے کہ اس میں بظاہر باطل کو حق پر غلبہ حاصل ہوا جس سے کفار کو یہ گمان ہوا کہ جنگ میں کامیابی و ناکامی کا تعلق صرف تدابیر اور اسباب و وسائل ہی سے ہے اس میں نہ خدا کو کوئی دخل ہے اور نہ اس کا کوئی تعلق حق اور باطل سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک شدید قسم کی غلط فہمی تھی، جس کا دور ہونا نہایت ضروری تھا چنانچہ جب اس کے دور کرنے کے لیے مناسب وقت آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں یہ دور فرمائی اور یہ اس سلسلے کی ایک عظیم آیت ہے۔

زیغ کی حقیقت

اس آیت میں زیغ کا جو لفظ آیا ہے مختصراً اس کی حقیقت بھی سمجھ لینی چاہیے۔

زیغ کے اصل معنی میل یعنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں، یہ لفظ بیک وقت دو مفہوموں کا حامل ہے، ایک کجی اور دوسرے سقوط، کوئی چیز جو کھڑی ہو جب جھک جاتی ہے تو گرنے سے قریب ہو جاتی ہے۔ یہ حالت اس رسوخ کے برعکس حالت ہے جو اس آیت میں وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کی بیان ہوئی ہے۔

اہل کتاب کی عام بیماری

یہ زیغ یوں تو اہل ضلالت کی عام بیماری ہے لیکن اہل کتاب اس مرض میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ مبتلا رہے ہیں۔ یہود کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ شروع ہی سے اس بیماری میں مبتلا رہے ہیں اور ان کے زیغ کا یہ پہلو خاص طور پر نہایت سنگین ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں اس میں مبتلا رہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے سبب سے خدا کے غضب میں مبتلا ہوئے۔ قرآن میں اس بات کا ذکر ہوا ہے۔ سورہ صف میں اس کا ذکر اس طرح ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ (صف - ۵)

اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! تم مجھے کیوں دکھ پہنچا رہے ہو جب کہ تم اچھی طرح یہ جان چکے ہو کہ میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، پس جب وہ کج ہو گئے تو خدا نے بھی ان کے دل کج کر دیے اور اللہ بدعہدوں کو ہدایت نہیں بخشتا۔

یہود و نصاریٰ کی گمراہیوں میں فرق

یہی یہود ہیں جنھوں نے کلمۃ اللہ اور اس قسم کے بعض دوسرے الفاظ کی حقیقت کی تشریح میں فلسفیانہ قسم کی موشگافیاں پیدا کر کے ان کو ایک گورکھ دھندا بنایا جس سے نصاریٰ کے لیے گمراہی کی راہیں کھلیں اور وہ حضرت مسیح کی الوہیت کے عقیدے میں مبتلا ہوئے۔ بعد میں نصاریٰ کی اس گمراہی پر مزید اضافہ بت پرست قوموں کی تقلید سے ہوا اور پھر آہستہ آہستہ وہ حق سے اتنے دور ہو گئے کہ اس سے ان کا رشتہ ہی منقطع ہو گیا اور وہ صریح کفر میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے بارے میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ (ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے یہ کہا کہ اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے) (مائدہ ۵: ۷۲)

یہود اور نصاریٰ کی گمراہی کی نوعیت میں بس یہ فرق ہے کہ یہود کی گمراہی اصلاً عملی ہے اور نصاریٰ کی اعتقادی۔ اس فرق کی وجہ سے حق کی مخالفت میں ان کا رویہ بھی ایک دوسرے سے مختلف رہا۔ یہود تو قرآن کو حق جاننے کے باوجود اس کی مخالفت کرتے تھے۔ نصاریٰ جس طرح تورات اور انجیل کے متشابہات میں پڑنے کی وجہ سے گمراہ ہوئے تھے اسی طرح قرآن میں بھی ان کی ساری دلچسپی بس متشابہات ہی سے تھی۔ انہیں میں موشگافیاں کر کے وہ طرح طرح کے فتنے پیدا کرتے اور اس طرح اپنی گمراہی کا بھی سامان کرتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے۔ قرآن کے محکمات سے نہ انھوں نے خود دلچسپی لی اور نہ ان لوگوں کو دلچسپی لینے دی جن پر ان کا بس چلا۔ بالغرض قلب و نظر کے زیغ اور متشابہات کی پیروی کے باب میں تھے تو یہود و نصاریٰ دونوں ایک ہی سطح پر، یہ بیماری ان میں مشترک تھی لیکن ان کے ذوقی رجحانات ذرا الگ الگ تھے۔ یہود ابتغاء فتنہ سے زیادہ رغبت رکھتے تھے اور نصاریٰ ابتغائے تاویل سے۔ یہ گمراہیاں چونکہ دنیا کے تمام گمراہوں میں مشترک ہیں اس وجہ سے قرآن نے اسلوب بیان عام ہی رکھا ہے تاکہ کلام میں وسعت پیدا ہو سکے یہود و نصاریٰ کی تخصیص نہیں کی۔ لیکن قرآن کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اشارہ انھی کی طرف ہے۔ یہی انداز سورۂ فاتحہ میں بھی ہے۔ اس میں بھی مغضوب علیہم اور ضالین کے الفاظ ہر چند عام ہیں اور ان کے عام ہونے کی وجہ سے ان میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے لیکن ان کا خاص اشارہ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔

متشابہات کی گمراہی کی ایک مثال

متشابہات کی پیروی کی وجہ سے نصاریٰ جس قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے اس کو ایک مثال سے واضح کرنا مفید رہے گا۔

قرآن اور انجیل دونوں اس امر میں باہم متفق ہیں کہ حضرت مسیح کلمۃ اللہ ہیں۔ کلمۃ اللہ کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اس سے امر و حکم کی تعبیر کی جاتی ہے۔ حضرت مسیح کی پیدائش چونکہ فطرت کے عام ضابطے کے خلاف ہوئی تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے کلمہ سے تعبیر کیا یعنی ان کی ولادت اللہ تعالیٰ کے کلمۂ کن سے ہوئی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ اصل شے کسی چیز کے واقع ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہی ہے۔ اسباب محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ یہ بات قرآن میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے اور اس میں کسی قسم

کا ایچ پیچ نہیں ہے جس سے کسی صاف ذہن کے آدمی کے اندر کوئی الجھن پیدا ہو سکے۔ قرآن نے نہایت غیر مبہم الفاظ میں فرمایا ہے۔ اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۔ آل عمران ۔ ۵۹ (بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسی آدم کی، آدم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ ہو جا بس وہ ہو گیا) یعنی آدم کو کلمۂ 'کن' کے ذریعے سے حی و ناطق بنایا۔ اسی چیز کو دوسری جگہ نفخ روح سے تعبیر فرمایا ہے۔ بعینہٖ یہی معاملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے۔

نصاریٰ نے اس واضح بات میں جو تحریف کی اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب ان کو بت پرست قوموں سے سابقہ پیش آیا اور ان کے ساتھ ان کی مذہبی بحثیں شروع ہوئیں تو انھوں نے ان پر یہ اعتراض شروع کیا کہ تم تو ایک مصلوب خدا کی پرستش کرتے ہو، ہم تم سے ہزار درجے افضل ہیں اس لیے کہ ہم آسمانی دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ نصاریٰ نے اپنے حریفوں کے اس اعتراض سے بچنے کے لیے یہ کوشش کی کہ اپنے عقیدے کو بھی انھی کے عقیدے کے سانچے میں ڈھال دیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ مسیح تو ابن اللہ ہیں، وہ مخلوق نہیں ہیں۔ اپنے اس نئے عقیدے کی آرائش میں انھوں نے ایک طرف تو یونانیوں، مجوسیوں اور ہندوؤں کے فکر و فلسفہ سے مواد لیا اور دوسرے ان یہودی متکلمین کے علم کلام سے رہنمائی حاصل کی جو یہود کے آخری دور کی پیداوار تھے اور جو نہ صرف خالق اور مخلوق کے درمیان وسائل و وسائط کے قائل تھے بلکہ ان کو مستقل ذوات کا درجہ دیتے اور ان کو کلمۃ اللہ کہتے تھے۔ نصاریٰ نے بعینہٖ یہی عقیدہ حضرت عیسیٰؑ کے لیے اختیار کر لیا۔ کچھ عرصے تک تو بات اسی حد تک رہی لیکن آہستہ آہستہ گمراہی سے گمراہی پیدا ہونی شروع ہوئی اور انھوں نے ان کو خدا کا کفو، اسی کے جوہر سے اور ازل سے اس کے ساتھ قرار دے دیا۔ اور پھر اس عقیدے کی تائید کے لیے انجیل یوحنا کے آغاز میں تحریف کے چور دروازے سے بعض عبارتیں بھی داخل کر دیں تاکہ باہر سے برآمد کیے ہوئے اس عقیدے کے لیے گھر کی ایک دلیل بھی فراہم ہو جائے۔

'وَمَا یَعۡلَمُ' الآیۃ پر وقف ہے

وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ (اور اس کی اصل حقیقت نہیں جانتا مگر اللہ) اوپر کی تفصیلات سے یہ بات آپ سے واضح ہو گئی کہ یہاں وقف ہے۔ یہی مذہب جمہور اہل سنت کا ہے اور یہی حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، مالک بن انسؓ، کسائی اور فرا سے منقول ہے۔ البتہ شیعہ اور بعض متکلمین یہاں وصل کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک متشابہات کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں۔ اس کی وجہ جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے، وہ تو یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے ائمہ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کو ہر بات کا علم ہوتا ہے۔ رہے دوسرے لوگ جو اس بات کے قائل ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ تاویل سے مراد معنی لیتے ہیں حالانکہ آیت کا سیاق و سباق اس

کے خلاف ہے۔ اوپر اس کی وضاحت ہو چکی ہے[1]

اگرچہ آیت کے الفاظ اور اس کے مختلف اجزا کی اس وضاحت کے بعد آیت کی صحیح تاویل خود بخود سامنے آگئی ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر مزید اطمینان کے لیے ہم اس کا واضح مفہوم بھی پیش کیے دیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ وہی خدا جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی، جو زندہ بھی ہے اور قیوم بھی، اسی نے تورات اور انجیل اتاریں۔ پھر جب ان میں گھپلا کر دیا گیا تو اس کی حکمت اور قیومیت مقتضی ہوئی کہ یہ قرآن اتارے تاکہ اس کے ذریعے سے حق و باطل میں امتیاز ہو سکے تو جو لوگ اس کی مزاحمت کریں گے وہ یاد رکھیں کہ خدائے عزیز حق کو مظلوم نہیں چھوڑے گا، وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔

اس کے بعد اس بات کی وضاحت فرمائی کہ اہل کتاب جو اس فرقان کی مخالفت کر رہے ہیں تو اس کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ فی نفسہٖ اس کتاب میں کوئی بات ایسی ہے جو ان کی وحشت کا باعث ہو رہی ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ان کے اپنے دلوں میں کجی ہے۔ اس کجی کے سبب سے ان کو اس کتاب کے محکمات سے، جن کی حیثیت اصل کتاب کی ہے اور جن پر اس کی تمام تعلیمات اور اس کے سارے حکمت و فلسفہ کی بنیاد ہے، کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ انہیں اگر دلچسپی ہے تو بس اس کی ان آیات متشابہات سے ہے جن میں کوئی بات تمثیلی و تشبیہی رنگ میں بتائی گئی ہے۔ وہ اپنی طبیعت کے بگاڑ کے سبب سے انھی کے درپے ہوتے ہیں اور فساد انگیزی اور فتنہ آرائی کے لیے ان کی صورت و حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ جس حد تک ان کا علم ضروری ہے وہ خدا نے کھول دیا ہے، بس اتنے پر قناعت کرنی چاہیے، ان کی اصل حقیقت کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرنا چاہیے، وہ اس دن کھلیں گی جس دن وہ سامنے آئیں گی۔ جو لوگ علم میں راسخ ہیں ان کی روش متشابہات کے معاملے میں یہی ہے وہ محکمات اور متشابہات دونوں کو اپنے رب ہی کا عطیہ سمجھتے ہیں اور دونوں پر یکساں ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اپنے علم کی پختگی کی وجہ سے اس رمز سے واقف ہیں کہ آیات الٰہی کا مقصود بندوں کو یاد دہانی ہے اور چونکہ وہ عقل رکھتے ہیں اس وجہ سے ان سے جو فائدہ اٹھانا چاہیے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، کسی سعی نامراد و لاطائل میں اپنا وقت برباد کر کے اپنے خسران کے اسباب نہیں فراہم کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ اس کی آیات سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو عقل رکھتے ہیں اور اس عقل سے صحیح طور پر کام لیتے ہیں۔

---

[1] ان مطالب کا اکثر حصہ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے ماخوذ ہے، صرف بعض مطالب کی توضیح میری طرف سے ہے اس وجہ سے اس کی صحیح باتیں مولانا کی طرف منسوب کیجیے اور اگر کہیں خامی ہو تو اس کی ذمہ داری تنہا میرے سر ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۸-۹

ان دونوں آیتوں میں کوئی لغوی یا نحوی اشکال نہیں ہے۔ زیغ کے لفظ کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔

یہ راسخین فی العلم کی دعا ہے جس سے اس امر کا اظہار ہو رہا ہے کہ وہ اپنے دین کے معاملے میں اتنے بے پروا نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ شبہات اور شکوک کو بلاوے بھیج کر بلائیں اور اپنا ایمان و اسلام کو خطرے میں ڈالیں بلکہ وہ اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے برابر اپنے پروردگار سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ دین میں ان کے جمے ہوئے قدم اکھڑنے نہ پائیں اور جب فتنوں کی یورش ہو تو خدا ان کو اپنے پاس سے ان کے لیے وہ روحانی کمک بھیجے جو ان کے ثبات قدم کا ذریعہ بنے۔

دوسری آیت میں اس یقین کا اظہار ہے جو ان راسخین کے اندر آخرت کے باب میں ہوتا ہے۔ موقع کلام یہاں اشارہ کر رہا ہے کہ درحقیقت یہی یقین ہے جو دل اور عقل دونوں کا اصلی پاسبان ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کے ذہن و فکر کو کوئی چیز بھی ہرزہ گردی سے نہیں روک سکتی۔ وہ زندگی کو ایک نہایت سہل بازی سمجھتا ہے اور ہر داؤں پر اس کو لگا دینے کے لیے تیار رہتا ہے لیکن جن کے اندر آخرت کا یقین رچا بسا ہوتا ہے وہ ہر قدم احتیاط کے ساتھ اٹھاتے اور نہایت پھونک پھونک کر رکھتے ہیں، یہ احتیاط ان کو ہمیشہ جادۂ مستقیم پر استوار رکھتی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ۝ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۱۰-۱۱

مادہ حق کی اصل رکاوٹ — إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سے یہاں مراد، جیسا کہ آیت ۴ میں گزر چکا ہے، قرآن کے منکرین ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ مال و اولاد، جن کی محبت آج ان کے لیے ایک سورج سے زیادہ واضح حق کے قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے، انھیں خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکیں گے۔ اس وجہ سے ان کی محبت میں اس خدا کو نہیں بھولنا چاہیے جس کے حقوق سب پر مقدم ہیں اور جس کی پکڑ بھی بے پناہ ہے۔ مال و اولاد کا ذکر یہاں قبولِ حق کی راہ کے اصل حجاب کی حیثیت سے ہوا ہے۔ آگے آیت ۱۴ میں ان کا ذکر تفصیل کے ساتھ آ رہا ہے۔ درحقیقت انھی کی محبت ہے جو انسان کے لیے قبولِ حق میں رکاوٹ بنتی ہے لیکن انسان اصل حقیقت کے اعتراف سے گریز کرتا ہے اور اپنے اغراض کے لیے کچھ ایسے بہانے تلاش کرتا ہے جو اس کی اصل بیماری پر پردہ ڈال سکیں۔ قرآن نے یہ ان لوگوں کی اصلی اندرونی بیماری سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ درحقیقت مال و اولاد کی محبت ہے جو انھیں قرآن کی پیش کردہ سچائیوں کے آگے جھکنے سے روک رہی ہے لیکن وہ اس کو چھپانے کے لیے متشابہات کے اندر سے کچھ اعتراضات و شبہات پیدا کرنے کی

کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی دنیا پرستی بے نقاب نہ ہونے پائے۔ انسان کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ ایک حقیقت سے گریز تو اختیار کرتا ہے اپنے نفس کی کسی کمزوری کے سبب سے لیکن نمائش کچھ ایسی کرتا ہے جس سے مخاطب پر یہ اثر پڑے کہ فی الواقع اس کے اس گریز کے لیے کچھ وجوہ و اسباب اور کچھ اعتراضات و شبہات ہیں۔

اصل بیماری پر پردہ ڈالنے کی کوشش

اس کے بعد فرمایا کہ ان کی یہ روش بعینہٖ وہی روش ہے جو اس سے پہلے فرعون اور اس کی قوم نے اور خدا کے رسولوں کو جھٹلانے والی دوسری قوموں نے اختیار کی۔ انھوں نے بھی جان بوجھ کر محض دنیا کی محبت میں، خدا کی نشانیوں اور اس کی آیتوں کو جھٹلایا اور ظاہر یہ کرنے کی کوشش کی کہ گویا وہ نبی کو کوئی کاہن یا جادوگر اور اس کی پیش کردہ نشانیوں کو کوئی سحر و شعبدہ خیال کر رہے ہیں اس وجہ سے ان کو قبول نہیں کر رہے ہیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا اور جب پکڑ لیا تو پھر کوئی نہیں تھا جو خدا کی پکڑ سے ان کو بچا سکے۔

'شدید العقاب' کا مفہوم

'شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ' کے لفظ میں دو مفہوم موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا کی طرف سے انسان کو جو سزا بھی ملتی ہے وہ انسان کے اپنے ہی اعمال کا ردِّعمل ہوتی ہے، دوسرا یہ کہ جس طرح خدا کے قوانین طبیعی کے نتائج بے لاگ اور لازمی ہیں اسی طرح خدا کے اخلاقی قوانین کے نتائج بھی بے لاگ اور لازمی ہیں جب ان کے ظہور کا مرحلہ آئے گا تو وہ اسی طرح بے لاگ لپیٹ اور ایسی قطعیت اور قوت کے ساتھ ظاہر ہوں گے کہ نہ کوئی ان سے بچ سکے گا اور نہ کوئی ان سے بچا سکے گا۔

قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَتُغۡلَبُوۡنَ وَتُحۡشَرُوۡنَ اِلٰی جَہَنَّمَ ؕ وَبِئۡسَ الۡمِہَادُ (۱۲)

منکرین قرآن کو عذاب کی دھمکی

اب یہ صاف صاف قرآن کے تمام منکرین کو دھمکی ہے کہ تم قرآن کے خلاف یہ سازشیں جو کر رہے ہو، کامیاب ہونے والی نہیں ہیں، تم قرآن کے حاملین کے ہاتھوں شکست اٹھاؤ گے اور تمہارے یہ اسباب و وسائل جن پر تمہیں بڑا ناز ہے اور تعداد کی یہ کثرت جس پر تمہیں بڑا بھروسا ہے، یہ چیزیں ذرا بھی کام آنے والی ثابت نہیں ہوں گی۔ تم دنیا میں بھی مغلوب ہو گے اور آخرت میں بھی جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور اس جہنم کو کوئی سہل چیز نہ خیال کرو، یہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ جو چیز انسان نے دیکھی نہ ہو اوّل تو اس کا صحیح صحیح اندازہ ہی نہیں کر پاتا اور اگر کسی حد تک اندازہ کرتا بھی ہے تو اپنی غفلت سرشتی کے سبب سے اس کو ملحوظ رکھنے میں سہل انگار اور بے پروا ہو جاتا ہے۔

قَدۡ کَانَ لَکُمۡ اٰیَۃٌ فِیۡ فِئَتَیۡنِ الۡتَقَتَا ؕ فِئَۃٌ تُقَاتِلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَاُخۡرٰی کَافِرَۃٌ یَّرَوۡنَہُمۡ مِّثۡلَیۡہِمۡ رَاۡیَ الۡعَیۡنِ ؕ وَاللّٰہُ یُؤَیِّدُ بِنَصۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَعِبۡرَۃً لِّاُولِی الۡاَبۡصَارِ (۱۳)

غزوۂ بدر سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت

یہ اوپر والے دعوے کی ایک دلیل ایک ایسے واقعے سے پیش کی گئی ہے جس پر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا۔ اشارہ بدر کے واقعے کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کے حاملین اور اس کے مخالفین

میں اس وقت جو کشمکش برپا ہے اس میں بالآخر شکست مخالفین ہی کو ہو گی۔ اس پیشین گوئی کی صداقت کی ایک نشانی اس معرکے میں موجود ہے جو قریش اور مسلمانوں کے درمیان پیش آچکا ہے۔ اس معرکے میں ایک گروہ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے اٹھا تھا اور دوسرا، جو کفار کا تھا، شیطان کا کلمہ بلند کرنے کے لیے۔ ہر چند کفار کی تعداد ہزار سے متجاوز تھی اور مسلمان کل تین سو تیرہ تھے لیکن جب مقابلے کی نوبت آئی تو کفار نے کھلی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھا یہ بات اللہ تعالیٰ کی خاص تائید و نصرت کی وجہ سے ہوئی اور فتح و شکست کا اصلی تعلق تعداد کی کثرت و قلت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ہی سے ہے اور یہ تائید و نصرت ان کو حاصل ہوتی ہے جو اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اٹھتے ہیں۔ جو لوگ آنکھیں رکھتے ہیں وہ اس واقعہ میں مستقبل کا نقشہ دیکھ سکتے ہیں کہ حق و باطل کی یہ آویزش بالآخر کس فیصلے پر ختم ہونے والی ہے۔

غزوۂ بدر میں کفار کے لیے نشانی

بدر کے واقعہ میں کفار کے ان تمام گروہوں کے لیے غلبۂ حق کی نشانی موجود تھی جو اس وقت قرآن اور اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اس وقت یہود و نصاریٰ اور قریش تین جماعتیں براہِ راست اسلام کی مخالفت کر رہی تھیں، اب دیکھیے کہ ان تینوں جماعتوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کس طرح بدر کے معرکے کو ایک نشانی بنایا۔

یہود کے لیے نشانی

جہاں تک یہود کا تعلق ہے سورۂ بقرہ میں ہم، طالوت و جالوت کی جنگ کے سلسلہ میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ جنگ اپنے مقصد، اپنی خصوصیات، اپنے نقشہ اور طالوت کی فوج کی تعداد کے لحاظ سے بالکل جنگ بدر کا آئینہ تھی۔ جس طرح مسلمان اپنے گھروں سے نکالے اور اپنے قبلہ سے محروم کیے گئے تھے اسی طرح بنی اسرائیل بھی اپنے گھروں سے بے دخل اور اپنے قبلہ — تابوت — سے محروم کیے گئے تھے۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تین سو تیرہ آدمی تھے اسی طرح طالوت کے ساتھ بھی، جیسا کہ بنی اسرائیل کی روایات سے معلوم ہوتا ہے، اتنے ہی آدمی تھے، جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معرکہ سے پہلے اپنی فوج کے حوصلے کا امتحان لیا، اسی طرح ایک خاص طریقے پر طالوت نے بھی اپنے ساتھیوں کے عزم و نظم کی جانچ کی، پھر جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جنگ میں اپنی تائید و نصرت سے نوازا کر نہایت ناموافق اور ناساعد حالات میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور قریش کے بڑے بڑے لیڈر مارے گئے اسی طرح طالوت کی اور ان کے ساتھیوں کی بھی اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور ان کے ساتھیوں کی قلیل تعداد دشمنوں کی نہایت بھاری تعداد پر غالب رہی اور فلسطینیوں کا مشہور سپہ سالار حضرت داؤدؑ کی فلاخن سے ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ ان دونوں جنگوں کی یہ حیرت انگیز مشابہت یہود پر بالکل واضح تھی۔ ایک کا سارا نقشہ اپنے صحیفوں میں دیکھ چکے تھے اور دوسری کا سارا ماجرا انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اس وجہ سے ان کے لیے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں تھا کہ بدر کے میدان میں ہتھیاروں کی لڑائی نہیں تھی بلکہ حق و باطل کی

جنگ تھی اور انسانوں اور انسانوں کی آویزش نہیں بلکہ فرشتوں اور شیطانوں کی جنگ تھی۔ چنانچہ قرآن میں، جیسا کہ سورۂ انفال کی تفسیر میں ہم وضاحت کریں گے، اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ یہود پر یہ حقیقت پوری طرح آشکارا تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نشانی کی کوئی قدر نہیں کی اور برابر اسلام کی مخالفت ہی کرتے رہے۔

نصاریٰ کے لیے نشانی

اسی طرح نصاریٰ کے لیے بھی اس جنگ میں بہت بڑی نشانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی موجود تھی۔ یوحنا کے مکاشفات میں یہ مکاشفہ موجود ہے کہ نبی موعود (خاتم النبیین، صلی اللہ علیہ وسلم) جب ظاہر ہوں گے تو وہ حق کی طاقت کے ساتھ جہاد کریں گے اور ان کے جلو میں کروبیوں کا لشکر ہوگا۔ یہ پیشینگوئی بدر کے موقع پر اس طرح ظاہر ہوئی کہ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے ملائکہ کو کفار سے لڑتے دیکھا۔ اس نشانی کے بعد بھی اگر نصاریٰ متشابہات کے چکروں ہی میں پھنسے رہے اعترافِ حق کی سعادت انھیں حاصل نہیں ہوئی تو اس کو ان کی بدبختی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

قریش کے لیے نشانی

قریش کے لیے تو یہ جنگ ان کے اپنے مطالبے کے لحاظ سے بھی قرآن اور اسلام کی حقانیت کی ایک ناقابلِ تردید شہادت تھی۔ انھوں نے خود نہایت آشکارا طور پر اس جنگ کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کی ایک کسوٹی قرار دیا تھا۔ اُن کا اپنا اعلان یہ تھا کہ اس جنگ میں جس کی جیت ہوگی وہ حق پر سمجھا جائے گا اور جس کو شکست ہوگی وہ باطل پر۔ ابوجہل نے عین میدانِ جنگ میں یہ دعا کی تھی کہ اللّٰھم اقطعنا للرحم فاحنہ الغداۃ (اے اللہ فریقین میں سے جو سب سے زیادہ رشتہ رحم کا کاٹنے والا ہے کل تو اس کو کچل دیجیو!) اس جنگ کے متعلق قرآن نے بھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہایت غیر مبہم الفاظ میں پیشین گوئیاں فرمائی تھیں جو حرف بحرف پوری ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو قریش کے خاص خاص لیڈروں کے قتل ہونے کی جگہیں تک متعین کر دی تھیں اور جنگ کے خاتمہ پر لوگوں نے دیکھا کہ حضورؐ کی ہر بات سچی ثابت ہوئی۔ چنانچہ انھی وجوہ سے قرآن نے غزوۂ بدر کو فرقان سے تعبیر فرمایا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے حق و باطل کے درمیان ایک ایسا امتیاز قائم کر دیا جس سے اسلام کے موافقین کو اپنے برحق ہونے کی دلیل مل گئی اور اس کے مخالفین پر اللہ کی حجت پوری ہو گئی۔

حذف کا ایک اسلوب

آیت میں اہلِ ایمان کے گروہ کی صفت یہ بیان کی ہے کہ 'یہ اللہ کی راہ میں جنگ کر رہا تھا' لیکن کفار کے متعلق اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ ان کی جنگ کس کی راہ میں تھی۔ اس تصریح کے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کا یہ معروف اسلوب قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے کہ دو مقابل باتوں میں سے بخیالِ اختصار ایک مقابل کو حذف کر دیتے ہیں اس لیے کہ مذکور خود محذوف کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے۔ یہاں اس اسلوب کے بموجب پوری بات اگر کھول دی جائے تو یوں ہوگی، فِئَۃٌ مُّؤْمِنَۃٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاُخْرٰی کَافِرَۃٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ۔ فقرے کے پہلے حصے میں سے لفظ 'مومنہ' کو حذف کر دیا اور

دوسرے میں سے فِی سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ کو اس لیے کہ دوسرے میں کَافِرَۃٌ کی صفت پہلے میں مُؤْمِنَۃٌ کا پتہ دے رہی ہے اور پہلے میں فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ کا حوالہ دوسرے میں فِی سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ کی ضرورت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حذف کا یہ اسلوب قرآن مجید میں بہت استعمال ہوا ہے جو واضح نہ ہو تو کلام کا اصلی زور سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ایجاز کی ایک شاخ ہے اور ایجاز بلاغت کی جان ہے۔

کس نے کس کو دگنا دیکھا

یَرَوْنَھُمْ مِّثْلَیْھِمْ میں یَرَوْنَھُمْ کی قرأت نافع نے تَرَوْنَھُمْ کی ہے لیکن یہ قرأت ہمارے نزدیک بطور تفسیر ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ فعل مخاطبین یعنی کفار کے لیے ہے یعنی اسے کافرو! تمہارا حال یہ تھا کہ تم مسلمانوں کو اپنے سے دگنا دیکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی اس تفسیر سے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ حریف کو اپنے سے دگنا دیکھنے کا معاملہ مسلمانوں کو نہیں پیش آیا بلکہ کفار کو پیش آیا۔ نافع کی یہ تاویل بہت صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ آیت میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ اس چیز کو اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے ایک آیت (نشانی) بنایا اور اس بات کی بھی خاص طور پر تصریح فرمائی کہ انھوں نے اس نشانی کو سر کی آنکھوں سے دیکھا۔ اگر واقعہ اس کے برعکس ہوتا، مسلمانوں نے کفار کو اپنے سے دگنا دیکھا ہوتا تو اس میں کفار کے لیے کیا نشانی تھی اور ان کو مخاطب کر کے اس نشانی کا ذکر کیوں کیا جاتا؟

ایک سوال کا جواب

ایک سوال ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں یہاں پیدا ہو۔ وہ یہ کہ سورہ انفال میں جہاں غزوۂ بدر کا واقعہ بیان ہوا ہے وہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار بھی مسلمانوں کی نظر میں کم کر کے دکھائے گئے تھے اور مسلمان بھی کفار کی نگاہوں میں کم دکھائے گئے تھے۔ یہ چیز آیت کی مذکورہ بالا تاویل کے خلاف پڑتی ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ یہ کم دکھانے اور زیادہ دکھانے کا معاملہ دو مختلف مرحلوں میں دو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا ہے۔ میدان جنگ میں اترنے سے پہلے تو بلاشبہ یہی صورت رہی کہ مسلمانوں نے بھی کفار کی تعداد معمولی محسوس کی اور کفار نے بھی مسلمانوں کو نہایت حقیر پوزیشن میں محسوس کیا لیکن میدانِ جنگ میں عملاً اتر جانے اور جنگ کے بالفعل شروع ہو جانے کے بعد دفعتہً صورتِ حال بدل گئی۔ اب جو کفار نے میدانِ جنگ پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ نقشہ ہی اور ہے، فرشتوں کی شرکت سے مسلمانوں کی فوج کو اتنی فوقیت حاصل ہو گئی کہ وہ کفار کی نگاہوں میں ان سے دگنی نظر آنے لگی۔ قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو مختلف مرحلوں میں ظاہر ہونا ایک خدا ساز بات تھی اور مقصود اس سے یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل کو ایک دوسرے سے ٹکرائے اور حق کی امداد کے لیے اپنی غیبی تائید و نصرت ظاہر فرما کر حق کے مخالفوں پر اپنی حجت تمام کر دے۔ چنانچہ اس حکمت کے تحت اس نے ابتدائی مرحلے میں مسلمانوں کی نگاہوں میں کفار کو اور کفار کی نگاہوں میں مسلمانوں کو کم کر کے دکھایا تاکہ ان میں کوئی فریق بھی ایک دوسرے سے ٹکر لینے سے خوف نہ کھائے۔ لیکن جب دونوں میں ٹکر ہو گئی اور میدانِ جنگ گرم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ذریعے سے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور کفار میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ کر بالکل مرعوب ہو گئے۔

ہم یہاں سورۂ انفال کی متعلق آیتیں نقل کیے دیتے ہیں تاکہ دونوں موقعوں کا فرق اور دونوں کی حکمت و مصلحت سامنے آجائے۔ ارشاد ہوا ہے۔

إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَ	اور یاد کرو جب تم وادی کے ورلے کنارے پر تھے
هُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ	اور وہ پرلے سرے پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے تھا
أَسْفَلَ مِنْكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ	اور اگر تم ایک دوسرے کو الٹی میٹم دے کر نکلتے تو میعاد
فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ أَمْرًا	میں ضرور اختلاف کرتے لیکن اللہ نے اس کا سامان کیا
كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ	تاکہ ایسے معاملے کا فیصلہ فرمائے جس کا فیصلہ طے
عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ	ہو چکا تھا۔ تاکہ جس کو ہلاکت کی راہ اختیار کرنی ہے وہ
بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ	یہ راہ اتمام حجت کے بعد اختیار کرے اور جسے زندگی کی
إِذْ يُرِيكَهُمُ اللّٰهُ فِي مَنَامِكَ	راہ اختیار کرنی ہے وہ بھی دلیل کے ساتھ یہ راہ اپنائے
قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا	بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ خیال کرو
لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي	جب کہ اللہ تمھیں ان کو دکھاتا ہے رویا میں قلیل التعداد
الْأَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۗ	اور اگر وہ ان کو کثیر التعداد دکھاتا تو تم ہمت ہار بیٹھتے
إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ	اور اس امر میں تنازع کرتے۔ لیکن اللہ نے تمھیں اس
وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ	سے بچایا۔ وہ سینوں کے بھید تک جاننے والا ہے۔
فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ	نیز یاد کرو جب وہ تمھیں ان کو دکھاتا ہے اس وقت
فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ أَمْرًا	جب کہ تم آمنے سامنے ہوئے، تمھاری نگاہوں میں تھوڑا
كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللّٰهِ	اور تم کو دکھاتا ہے ان کی نگاہوں میں تھوڑا تاکہ ایک
تُرْجَعُ الْأُمُورُ	ایسے معاملے کا فیصلہ کر دے جس کا فیصلہ طے ہو
(۴۲ - ۴۴ - انفال)	چکا ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ آیت زیر بحث اور آیات انفال میں موقع و محل کا فرق ہے۔ انفال میں جس موقع کا ذکر ہے وہ، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، جنگ شروع ہونے سے پہلے کا ہے۔ اور آیت زیر بحث میں جنگ شروع ہو جانے کے بعد کا جب تائید الٰہی ملائکہ کی کمک کی صورت میں ظاہر ہو گئی ہے۔ اس طرح ان دونوں آیتوں میں پوری پوری موافقت ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ انفال میں بھی یہ اشارہ موجود ہے کہ جنگ شروع ہو جانے کے بعد کفار کو میدان جنگ کا نقشہ کچھ اور ہی نظر آیا اور اس مشاہدہ نے ان کے حوصلے پست کر دیے۔ ان اشارات کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ وہیں ہم یہ بھی واضح کریں گے کہ یہود اگرچہ در پردہ قریش کو مسلمانوں پر چڑھا لانے کی سازش میں شریک رہے لیکن بدر کا نقشہ دیکھ کر انھوں نے بھی ہمت

چھوڑ دی۔ وَاللّٰہُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تائید و نصرت سے جس کو چاہے نواز سکتا ہے، کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا اور جس کو وہ اپنی تائید و نصرت سے نوازے اس کے لیے کثرت و قلت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو قطرے کو دریا اور ذرے کو آفتاب بنا دے۔ کتنے کمزور و ناتواں گروہوں کو اس نے دل بادل فوجوں پر فتح عطا فرمائی ہے۔ فتح و شکست کا اصلی سر رشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

عبرت کا مفہوم

'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ' عبرت کے معنی ہیں ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک عبور کر جانا۔ ایک صاحب بصیرت اور ایک بلید میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ ایک اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھتا لیکن دوسرے کے لیے ایک معمولی سی نشانی، ایک ادنیٰ سی تنبیہ اور ایک سرسری سا اشارہ حقائق کا ایک دفتر کھول دیتا ہے، ایک دروازہ اس کے لیے کھل جائے تو دوسرے دروازے کھولنے کے لیے کلید ہاتھ آجاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآن "اولوالابصار" کہتا ہے کیونکہ ان کی آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت کا نور بھی ہوتا ہے جو جزو میں کل اور قطرہ میں دجلہ کے مشاہدہ کی صلاحیت رکھتا ہے۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (۱۴)

تزئین کی حقیقت

شہوات کا لفظ یہاں مشتہیات یعنی مرغوبات کے معنی میں ہے۔ مال و اولاد اور زن و فرزندان چیزوں میں سے ہیں جو انسان کو بالطبع مرغوب بھی ہیں اور ان کو مرغوب ہونا چاہیے بھی اس لیے کہ یہ چیزیں اس کے ذاتی و نوعی بقا کے لوازم میں سے ہیں لیکن یہاں مجرد ان کی رغبت زیر بحث نہیں ہے بلکہ ان کی تزئین کا ذکر ہے۔ 'تزئین' کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز اس طرح آنکھوں میں کھب جائے کہ آدمی اس کے اثر سے ہر چیز اسی کے رنگ میں دیکھنے لگ جائے۔ یہاں تک کہ اس سے الگ ہو کر اس کے لیے کسی چیز کو دیکھنا ممکن ہی نہ رہ جائے۔ وہ ہر چیز کو تولنے اور پرکھنے کے لیے اسی کو پیمانہ اور کسوٹی قرار دے لے۔ کسی چیز کی رغبت کا اس درجہ غلبہ ظاہر ہے فاطر فطرت کے منشا کے خلاف ہے۔ اسی سے زندگی میں وہ بے اعتدالیاں ظہور میں آتی ہیں جو انسان کو فطرت اور شریعت کے جادۂ مستقیم سے ہٹا دیتی ہیں۔ یہ ایک بیماری کی حالت ہے جو بے بصیرتی اور حدود الٰہی کے عدم احترام یا بالفاظ دیگر عدم تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں اصل دخل نفس اور شیطان کا ہوتا ہے۔ نفس اپنی چاہتوں میں فطری حدود سے آگے نکل جاتا ہے، پھر شیطان ان چاہتوں پر ایسا دلفریب ملمع کر دیتا ہے کہ آدمی کی نظر ان سے ہٹ کر کسی اور طرف کا رخ ہی نہیں کرتی۔ قرآن نے اسی وجہ سے اس تزئین کو دوسرے مقامات میں شیطانوں کی طرف منسوب کیا ہے۔

قنطار اور مقنطرۃ کا مفہوم

'قنطار' کے معنی مال کثیر کے ہیں۔ اس کے ساتھ 'مُقَنْطَرَة' کی صفت اسی طرح استعمال ہوتی ہے جس

طرح عربی میں لیل الیل یا ظل ظلیل وغیرہ کی ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں۔

'مسومۃ' کا مفہوم

'مسومۃ' سومۃ سے ہے جس کے معنی علامت کے ہیں۔ 'مسومۃ' کے معنی ہوں گے، نشان زدہ چونکہ اصیل اور نفیس گھوڑوں پر بالعموم نشان لگایا جاتا ہے اس وجہ سے یہ لفظ اصالت اور عمدگی کی تعبیر کے لیے معروف ہو گیا۔

'ناس' سے ایک خاص گروہ مراد ہے

آیت میں 'ناس' کا لفظ اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن مراد اس سے ایک خاص گروہ ہے۔ یہ اسی طرح کا استعمال ہے جس طرح قرآن میں 'انسان' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور مقصود اس سے مخصوص وہ گروہ ہوتا ہے جس کے حالات اس مقام میں زیر بحث ہوتے ہیں۔ یہاں سیاق و سباق دلیل ہے کہ وہ لوگ مراد ہیں جو بصیرت اور تقویٰ سے عاری ہیں اس وجہ سے دنیا کی مرغوبات پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں اور قرآن جن اعلیٰ اقدار کی طرف توجہ دلا رہا ہے ان کی طرف وہ آنکھ ہی نہیں اٹھاتے۔

مرغوبات نفس

مرغوبات نفس کے بیان میں ایک خاص ترتیب ملحوظ ہے جو نگاہ میں رکھنے کی ہے۔ پہلے اہل و عیال کا ذکر کیا ہے اس لیے کہ محبت کے لحاظ سے سب سے اونچا مقام انھی کا ہے، دوسری چیزوں کی محبت اصلاً ان کے تابع ہے بلکہ زیادہ تر انھی کے لیے ہے۔ اس کے بعد مال کا ذکر ہے اور مال میں سونے کا ذکر اس کی گراں قیمتی کی وجہ سے دوسرے نقود پر مقدم ہے۔ پھر سامان میں سب سے پہلے گھوڑوں کا ذکر ہے اس لیے کہ اہل عرب زینت، فخر اور دفاع، تینوں کے نقطۂ نظر سے گھوڑے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس کے بعد چوپایوں کا ذکر ہے اس لیے کہ تمدن کے ظہور سے پہلے بدویت کے دور میں معاش کا انحصار بیشتر انھی پر تھا۔ آخر میں کھیتی اور باغ کا ذکر ہے اس لیے کہ ان کی اہمیت تمدن کے دور میں داخل ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے جب انسان نے شہروں اور دیہاتوں کی رہائش اختیار کی ہے۔

'ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا' کے چھوٹے سے فقرے میں معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ اس میں اس دنیا کی ناپائداری کی طرف بھی اشارہ ہے، ان چیزوں کی بے حقیقی کی طرف بھی، اور ایک عالم باقی کے مقابل میں اس جہان فانی کی ناپائدار لذتوں پر ریجھنے کی حماقت کی طرف بھی۔

نظم کے پہلو سے یہ آیت گویا اوپر کی آیت ۱۰ کے مضمون کی تشریح ہے۔ اس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اصل چیز جو لوگوں کو قرآن کی مخالفت پر اکسا رہی ہے وہ ہے تو اس دنیا کی محبت اور اس کی مرغوبات کی طمع لیکن اس بیماری کو چھپائے رکھنے کے لیے یہ طرح طرح کے شبہات و شکوک اور اعتراضات ایجاد کرتے اور پھیلاتے ہیں تاکہ اس طرح اپنے اس گریز کے لیے جواز پیدا کریں۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝

(۱۵-۱۷)

مخاطبین کو زاویۂ نگاہ بدلنے کی دعوت

یہ مخاطبین کو زاویۂ نگاہ بدلنے کی دعوت ہے اس لیے کہ اس کے بدلے بغیر قرآنی اقدار کی طلب دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے نزدیک انسان کی اصل بیماری اس کی تنگ نظری اور پست حوصلگی ہے۔ وہ اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو کل زندگی سمجھ بیٹھا ہے، جس کے سبب سے اس کی ساری بھاگ دوڑ اسی دنیا کی مرغوبات و مطلوبات تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے حالانکہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے جو ابدی اور لازوال ہے۔ اگر انسان اس زندگی کی طلب میں تقویٰ کی روش اختیار کرے یعنی اس دنیا سے متعلق خدا نے جو حدود حرام و حلال ٹھہرا دیے ہیں ان کی پابندی کرے تو اسے آخرت کی ابدی زندگی میں وہ نعمتیں ملیں گی جن کا آج وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ازواج مطہرۃ

نعمتوں میں 'ازواج مطہرۃ' کا ذکر خاص طور پر فرمایا ہے۔ اس لفظ پر بقرہ کی آیت ۲۵ کے تحت ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہاں خاص طور پر جنت کی نعمتوں میں اس کا ذکر اس وجہ سے ہوا کہ اوپر آیت ۱۴ میں واضح ہو چکا ہے کہ دنیا کے مرغوبات میں سر فہرست جس چیز کو جگہ حاصل ہے وہ اہل و عیال ہیں اس وجہ سے جنت کی نعمتوں میں بھی ان کا ذکر خاص طور پر فرمایا۔

رضوان

'رضوان' کے معنی تو خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے ہیں، لیکن قرآن میں یہ لفظ بالعموم جنت کی نعمتوں کی ایک جامع تعبیر کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جب اس کا ذکر ہو گیا تو گویا ہر نعمت کا ذکر ہو گیا۔ اس کا بھی جس کے لیے تعبیر کا کوئی جامہ موجود ہے اور اس کا بھی جو گمان و خیال اور قیاس و وہم ہر چیز سے بالاتر ہے۔

بصیر بالعباد میں دھمکی اور تسلی دونوں ہے

'وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ' دھمکی اور تسلی دونوں ہی قسم کے مواقع پر استعمال ہو سکتا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ تسلی کے محل میں ہے۔ یعنی جو لوگ آخرت کے لیے اس دنیا کی زندگی میں تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی تمام قربانیوں اور مشقتوں سے باخبر ہے۔ ان کو ان تمام قربانیوں کا پورا پورا صلہ دے گا، ان کی کوئی قربانی بھی ضائع نہیں جائے گی۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ الاٰیۃ، لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا سے بدل ہے۔ یہ تفصیل ان لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو قرآن کی اس دعوت کو قبول کر کے آخرت سے غافل کرنے والی مرغوبات سے دستکش ہو گئے اور اپنی پچھلی زندگی کی تو د فراموشیوں سے تائب ہو کر ایمان و عمل صالح کی پاکیزہ زندگی میں آ گئے۔ ساتھ ہی اس میں ایک خاموش تبلیغ بھی ان لوگوں کے لیے ہے جو اس راہ پر آنے سے ہچکچا رہے تھے اور اپنی اس ہچکچاہٹ کے لیے مختلف قسم کے حیلے بہانے پیدا کر رہے تھے۔

حاملین قرآن کا کردار

اَلصّٰبِرِيْنَ الاٰیۃ۔ یہ دوسرا بدل ہے۔ اس سے ان اخلاقی اوصاف کی وضاحت ہو گئی ہے جن سے یہ پاکیزہ صفات گروہ متصف ہے اور اسی سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ وہ اخلاق و کردار کن اجزا سے مرکب ہے جو قرآن کا حامل ہونے کے لیے ضروری ہے۔ یہ آیت گویا اس کے بالکل ضد اخلاق و کردار پیش کر رہی ہے جو اوپر 'زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ' والی آیت میں نمایاں ہوا۔

یہاں صرف پانچ صفات بیان ہوئی ہیں۔ صبر، صدق، قنوت، انفاق، استغفار۔

صبر کی حقیقت — صبر کی حقیقت نرم وگرم ہر طرح کے حالات میں حق پر جزم واستقامت ہے۔ غربت، بیماری، مصیبت، مخالفت، جنگ، غرض جس قسم کے بھی حالات سے آدمی کو دوچار ہونا پڑے عزم وہمت کے ساتھ ان کو برداشت کرے، ان کا مقابلہ کرے، ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے اور اپنے امکان کے حد تک موقف حق پر جما رہے، دل کو مایوسی اور گھبراہٹ سے، زبان کو شکوۂ تقدیر سے اور اپنی گردن کو کسی باطل کے آگے جھکنے سے بچائے۔ دین کا بڑا حصہ اسی صبر پر قائم ہے۔ اگر آدمی کے اندر یہ وصف نہ ہو تو کوئی طمع، کوئی ترغیب، کوئی آزمائش بھی اس کو حق سے ہٹا کر باطل کے آگے سرنگوں کر دے سکتی ہے۔ جو شخص سچائی کے راستے پر چلنا چاہے اور اس پر چل کر استوار رہنے کا آرزومند ہو اسے سب سے پہلے اپنے اندر صبر کی صفت پیدا کرنی چاہیے۔ مزاحمتوں کے مقابلے کے لیے (اور اس راہ میں ہر قدم پر مزاحمتوں سے مقابلہ ہے) اصل ہتھیار بندے کے پاس یہی ہے۔ فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے دین نصف شکر ہے اور نصف صبر، لیکن عملی تجربہ گواہ ہے کہ آدمی میں صبر نہ ہو تو شکر کا حق بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ یہاں چونکہ خطاب ان لوگوں سے ہے جنھیں سچائی کی سب سے بڑی بلندی پر چڑھنے کی دعوت دی جا رہی ہے اس وجہ سے ان کے سامنے جن لوگوں کا نمونہ پیش کیا گیا ہے ان کے کردار میں سب سے پہلے ان کے صبر ہی کے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔

صدق کی حقیقت — 'صدق' کی اصل حقیقت کسی شے کا بالکل مطابق واقعہ ہونا ہے۔ اس کی روح پختگی اور ٹھوس پن ہے۔ نیزے کی گرہیں دیکھنے میں جیسی مضبوط ظاہر ہو رہی ہیں آزمائش سے بھی ویسی ہی مضبوط ثابت ہوں تو ایسے نیزے کو عربی میں صادق الکعوب کہیں گے۔ زبان، دل سے ہم آہنگ ہو، عمل اور قول میں مطابقت ہو، ظاہر اور باطن ہم رنگ ہوں، عقیدہ اور عمل دونوں ہم عناں ہوں، یہ باتیں صدق کے مظاہر میں سے ہیں اور انسانی زندگی کا سارا ظاہر و باطن انھی سے روشن ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کی ساری معنویت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی چیز ہے جو انسان کو وہ پرِ پرواز عطا کرتی ہے جس سے وہ روحانی بلندیوں پر چڑھتا ہے اور اسی سے اس کے صبر کو بھی سہارا ملتا ہے۔

قنوت کی حقیقت — 'قنوت' کی اصل روح اللہ جل شانہ کے لیے تواضع و تذلل ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کے شعور اور اس کی بے نہایت عظمتوں کے احساس کا قدرتی ثمرہ ہے۔ یہ نعمت کو شکر کا اور مصیبت کو صبر کا ذریعہ بناتی ہے اور ہر حالت میں بندے کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ رکھتی ہے۔ اصلاً تو یہ عقل و دل کی فروتنی اور انکساری ہے لیکن جس طرح قلب کی ہر حالت کا عکس انسان کے ظاہر پر بھی نمایاں ہوتا ہے اسی طرح اس کا عکس بھی انسان کی وضع قطع، چال ڈھال، گفتار کردار ہر چیز میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہ اس غرور اور گھمنڈ کی ضد ہے جو نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ سمجھنے کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس تمرد اور بے صبرے پن کے بھی منافی ہے جو صبر و صدق کے فقدان سے پیدا ہوتا ہے۔

'انفاق' کی حقیقت

'انفاق' کے معنی واضح ہیں۔ یہ مرغوبات دنیا کی اس محبت کی ضد صفت ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ اگر مرغوبات دنیا کی محبت دل پر اس طرح چھا جائے کہ وہ خدا اور بندوں کے حقوق سے انسان کو روک دے تو یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن نے 'زُیِّنَ لِلنَّاس' سے تعبیر کیا ہے۔ انفاق کی خصلت اس امر کی شہادت ہے کہ صاحبِ انفاق کی نظر میں اصل قدر و قیمت دنیوی خزف ریزوں کی نہیں بلکہ آخرت کی ابدی زندگی اور اس کی لازوال نعمتوں کی ہے۔ برعکس اس کے جو شخص خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے وہ اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ اس کی نگاہوں میں ساری قدر و قیمت بس اس فانی دنیا کی فانی لذتوں ہی کی ہے، آخرت کی زندگی کا اس کے ذہن میں سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔

'استغفار' کی حقیقت

'استغفار' کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ سے تضرع و زاری کہ وہ اپنے بندے کی کوتاہیوں، گناہوں اور جرموں پر پردہ ڈالے۔ یہ تضرع اس حیا اور خوف کا نتیجہ ہے جو بندے کے دل میں اپنے پروردگار کے بے پایاں احسانات و انعامات کے احساس اور اس کے عدل و انتقام کے تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ 'وقت سحر' کی قید لگی ہوئی ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ وقت قبولیتِ استغفار کے لیے سب سے زیادہ موزوں، ریا کی آفتوں سے سب سے زیادہ محفوظ، دلجمعی اور آیاتِ الٰہی میں تفکر و تدبر کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہے۔ قرآن اور حدیث دونوں ہی میں مختلف پہلوؤں سے اس کی وضاحت ہوئی ہے اور یہ رب کریم کا عظیم احسان ہے کہ اس نے استغفار کی ہدایت کے ساتھ ساتھ استغفار کی قبولیت کے لیے سب سے زیادہ سازگار وقت کا بھی خود ہی پتہ دے دیا۔

اس ٹکڑے پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو اس سے جہاں ایک طرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کن صفات کے لوگ ہیں جو قرآن کے حامل ہو سکتے ہیں وہیں یہ بات بھی اس سے نکلی کہ وہ موانع کیا ہیں جو قرآن کے ان مخالفین اور قرآن کے درمیان حائل ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان میں وہ صبر نہیں ہے جو نفس اور شیطان کی مزاحمتوں کے مقابل میں ان کو پا برجا رکھ سکے، وہ صدق نہیں ہے جو ان کے عقیدہ اور عمل، قول اور فعل، ظاہر اور باطن میں مطابقت پیدا کر سکے، وہ قنوت نہیں ہے جو سب سے بڑے صاحبِ حق کے آگے ان کی گردن اور ان کے دل دونوں کو جھکا دے، ابدی زندگی کا وہ شوق نہیں ہے جو انھیں آخرت کے لیے دنیا کو قربان کرنے پر ابھار سکے اور خدائے منعم و دیان کی نعمتوں اور نقمتوں کا وہ شعور و احساس نہیں ہے جو انھیں غفلت کے بستروں سے اٹھا کر مناجات سحر کے لیے ان کو ان کے رب کے حضور لا کھڑا کرے ـــــ اور ساتھ ہی اسلوب بیان نے ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا کہ آج جن لوگوں نے اس قرآن کو قبول کر لیا ہے اور اس کے پھیلانے میں اللہ کے رسول کا ساتھ دے رہے ہیں وہ ان صفات سے متصف ہیں اور ان صفات سے متصف ہونے ہی کے سبب سے وہ اس بارِ گراں کے اٹھانے کے اہل بن سکے ہیں۔

۴- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۸-۲۲

وہی اوپر والا مضمون ایک دوسری شاندار تمہید کے ساتھ ایک دوسرے پہلو سے بیان ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ، اس کے فرشتوں اور علم حقیقی کے تمام حاملین کی شہادت ابتدا سے یہی ہے کہ اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور وہ عدل و قسط کو قائم کرنے والا اور عزیز و حکیم ہے۔ اس نے بندوں کی ہدایت اور ان کو عدل و قسط پر قائم کرنے کے لیے جو دین عطا فرمایا وہ اسلام ہے۔ یہی دین اللہ کا حقیقی دین ہے۔ یہی دین اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے بھیجا لیکن یہود و نصاریٰ نے اپنی باہمی ضدم ضدا کے سبب سے دیدہ و دانستہ اس دین میں اختلافات برپا کیے اور اسلام کے بجائے یہودیت و نصرانیت کے الگ الگ بت کھڑے کر لیے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر یہود و نصاریٰ تم سے اس دین حقیقی کے باب میں جھگڑنا چاہتے ہیں تو تم ان کی اس مخالفت کو ذرا خاطر میں نہ لاؤ بلکہ صاف صاف اہل کتاب کو بھی اور قریش کو بھی سنا دو کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو اسلام کی راہ اختیار کر لی ہے، اب جس کا جی چاہے اپنی گمراہی پر اڑا رہے۔ تمہارے اوپر ذمہ داری صرف اس پیغام کو پہنچا دینے کی ہے، اس کے بعد معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ وہ سب کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے جس کو جس چیز کا سزاوار پائے گا اس کو وہ دے گا۔

آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے واسطے سے اہل کتاب کو یہ دھمکی دی ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں، جنھوں نے اللہ کے نبیوں کا خون ناحق بہایا ہے اور جو دین کے مصلحین و مجددین اور عدل و قسط کے علم برداروں کے درپئے آزار و قتل رہے، اب ان کی عدالت کا وقت آ گیا ہے، اب وہ خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکیں گے، ان کے اعمال دنیا و آخرت دونوں میں اکارت جائیں گے اور کوئی ان کا حامی و مددگار نہ بن سکے گا۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ آیات
قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ ۱۸-۲۲ النصف
الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۫ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْؕ وَمَنْ

يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿١٩﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ
فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ
ع ۱۰ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ
وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢١﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٢﴾

ترجمۂ آیات ۱۸-۲۲

اللہ، فرشتوں اور اہلِ علم کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عدل و قسط کا قائم رکھنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب اور حکمت والا ہے۔ ۱۸

اللہ کا اصل دین اسلام ہے۔ اہلِ کتاب نے تو اس میں اختلاف علمِ حق کے آجانے کے بعد محض باہمی ضدم ضدا کے سبب سے کیا ہے۔ جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کریں گے تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے۔ اگر وہ تم سے اس بارے میں جھگڑتے رہیں تو تم ان سے کہہ دو کہ میں نے اور میرے پیرووں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کیا اور اہلِ کتاب اور امیوں سے پوچھو کہ کیا تم بھی اسی طرح اسلام لاتے ہو؟ اگر وہ بھی اسی طرح اسلام لائے تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعراض کریں تو تمہارے اوپر ذمہ داری صرف پہنچا دینے کی ہے، اللہ اپنے بندوں کا نگرانِ حال ہے۔ ۱۹-۲۰

جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں، نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں اور

ان لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں جو لوگوں میں سے عدل و قسط کی دعوت لے کر اٹھے تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت گئے اور ان کا کوئی مدد کرنے والا نہ بنے گا۔ ۲۱-۲۲

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۸)

توحید اور قسط کی شہادت کے تین پہلو

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت اور قائم بالقسط ہونے پر اپنی، اپنے فرشتوں اور اہل علم کی شہادت کا حوالہ دیا ہے۔ یہ شہادت تین مختلف پہلوؤں سے ہے۔

آفاق کی شہادت

ایک تو آفاق کی شہادت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات کے خالق نے اس کو جس طرح بنایا ہے اور جس طرح اس کے نظام کو چلا رہا ہے اس سے اس بات کی صاف شہادت مل رہی ہے کہ وہ ایک ہی ہے، کوئی اس کا ساجھی نہیں ہے۔ قرآن نے اس شہادت کو توحید کی دلیل کے عنوان سے اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اسی نظام کائنات سے قرآن نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے ہر گوشے میں اس کائنات کے خالق نے ایک میزان رکھی ہے، مجال نہیں کہ کوئی شے اپنے معین محور و مدار سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہو سکے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کا خالق و فاطر عدل و قسط کو پسند کرتا ہے، یہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس عدل و قسط سے بال برابر بھی انحراف کرے۔ قرآن میں اس حقیقت کے شواہد بہت ہیں، ہم بخیال اختصار صرف ایک آیت بطور مثال نقل کرتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَ	سورج اور چاند دونوں ایک حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔
الشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا	تارے اور درخت سب سجدہ کرتے ہیں اور اس نے آسمان کو بلند
وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ۝	کیا اور اس میں ایک میزان رکھی، کہ تم بھی میزان کے معاملے میں تجاوز
وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا	نہ کرو بلکہ وزن کو انصاف کے ساتھ قائم کرو، اور میزان میں کوئی
الْمِيْزَانَ ۝ (۵-۹ رحمان)	کمی نہ کرو۔

یعنی یہ کائنات اپنے وجود سے اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ اس کا خالق عدل و قسط کو پسند کرنے والا ہے اور اس کے سورج اور چاند، شجر و حجر، آسمان و زمین اپنی زبانِ حال سے ہر وقت یہ سبق دے

رہے ہیں کہ جس طرح وہ خدا کے مقرر کردہ پیمانے سے سر مو تجاوز نہیں کرتے، ان کی ہر حرکت اس پیمانے سے نپی تلی ہوتی ہے اسی طرح انسان بھی اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں خدا کی میزان میں نپی تلی روش اختیار کرے، اس کے ٹھہرائے ہوئے حدود سے ذرا بھی تجاوز نہ کرے۔

تاریخ کی شہادت اسی آفاقی شہادت کے ذیل میں قوموں کی تاریخ بھی آتی ہے۔ قرآن نے قوموں کی تاریخ بھی پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ اس کا خالق و مالک اس کو ایک نظام عدل و قسط کے تحت چلا رہا ہے۔ اس کے اسٹیج پر یکے بعد دیگرے وہ مختلف قوموں کو بھیجتا ہے اور ان کا امتحان کرتا ہے کہ وہ خدا کے قانون عدل و قسط کے اندر اپنے اختیار اور اپنی قوتوں کو استعمال کرتی ہیں یا اس سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کرتی ہیں۔ جب تک کوئی قوم خدا کے حدود کے اندر رہ کر اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتی ہے، وہ اس کو برومند کرتا اور پروان چڑھاتا ہے، جب وہ اس راہ سے ہٹ کر سرکشی کی راہ اختیار کر لیتی ہے تو ایک خاص حد تک مہلت دے چکنے کے بعد وہ اس کو فنا کر دیتا ہے اور دوسری قوم کو اس کی وارث بناتا ہے۔ قرآن نے اس سنت کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

انفس کی شہادت دوسری شہادت انفس کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ خود توحید کی اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ اس شہادت کے دلائل ہم اپنی اس کتاب میں بھی جگہ جگہ بیان کر رہے ہیں اور خاص اس موضوع پر ہم نے حقیقت شرک اور حقیقت توحید کے نام سے دو کتابیں بھی لکھی ہیں۔ تفصیل کے طالب ان کو پڑھیں۔ انسانی فطرت کی یہی توحید پسندی ہے جس کے سبب سے قرآن نے توحید کو دین فطرت قرار دیا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (اللہ کی بنائی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) اور یہی عدل پسندی ہے جس کی بنا پر جزا و سزا کے منکرین سے قرآن یہ سوال کرتا ہے۔ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ (۳۵-۳۶-قلم) (کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے، تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟)

وحی کی شہادت تیسری شہادت وحی کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی پسند ناپسند اور اپنے اوامر و نواہی سے بندوں کو آگاہ کرنے کے لیے اپنے بے شمار نبی اور رسول بھیجے اور ان سب پر اپنی توحید اور اپنے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دی اور ان نبیوں اور رسولوں نے یہ شہادت اپنی امتوں کو پہنچائی۔ اس شہادت کے آثار و نشانات آج بھی ان امتوں کی روایات اور ان کے صحیفوں کی تعلیمات میں موجود ہیں لیکن انھوں نے ان آثار و روایات کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو ایسے نظریات و عقاید میں مبتلا کر لیا جو توحید کے بھی منافی ہیں اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کے بھی لیکن ان امتوں کی اس غلط روش کی وجہ سے وہ اپنی ان اعلیٰ صفات سے دستبردار نہیں ہو گیا ہے بلکہ وہ بدستور ان سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا۔ چنانچہ انھیں صفات کا یہ تقاضا ہے کہ اس نے قرآن کو، جیسا کہ اوپر کی تمہید میں گزرا، حق و باطل کے درمیان فرقان

بنا کر اتارا تاکہ حق و عدل کی صراط مستقیم پھر واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے اور باطل پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ خدا کی وحدانیت اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت کسی ایک ہی پہلو سے نہیں مل رہی ہے بلکہ تین مختلف پہلوؤں سے مل رہی ہے۔ اس کی بنائی ہوئی کائنات کا نظام اور اس کی تاریخ اس کی شہادت دے رہی ہے، اس کی پیدا کی ہوئی فطرت اس پر گواہ ہے اور آسمان کے پیغمبروں نے ہمیشہ اس حقیقت کی منادی کی ہے۔ اس آیت میں یہ بات نہایت اجمال کے ساتھ بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کے تیس پاروں میں اس اجمال کی تفصیلات پھیلی ہوئی ہیں۔

ملائکہ کی شہادت

اللہ تعالیٰ نے اپنی شہادت کے ساتھ یہاں ملائکہ کی شہادت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ یہ ایک امر واقعی کا اظہار و بیان ہے۔ کائنات میں خدا کے ارادوں کے نفاذ کا ذریعہ اور خدا کے پیغمبروں تک اس کی وحی پہنچانے کا واسطہ ملائکہ ہی بنتے ہیں اس وجہ سے خدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کے اس کی مخلوقات میں شاہد اول وہی ہیں۔ ان کی گواہی ایک امر واقعی ہونے سے قطع نظر اس پہلو سے بھی خاص طور پر بیان ہوئی کہ نادانوں نے ان کو خدا کا شریک اور شفاعت باطل کا واسطہ قرار دے کر توحید کی بھی نفی کی اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کی بھی۔ اس لیے کہ جب تصور یہ ہو کہ سفارش حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دے سکتی ہے تو پھر خدا قائم بالقسط کہاں رہا؟ فرشتوں کے متعلق اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے قرآن نے خود ان کی زبان سے بھی جگہ جگہ ان کے اعترافات کا حوالہ دیا ہے۔ ہم بخیال اختصار صرف ایک مثال نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَـهٗ مَقَامٌ مَّعۡلُوۡمٌ ۝ وَ	اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک متعین مقام
اِنَّا لَنَحۡنُ الصَّآفُّوۡنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحۡنُ	ہے اور ہم تو صفیں باندھ کر حاضر رہنے والے ہیں اور
الۡمُسَبِّحُوۡنَ ۝ (۱۶۴-۱۶۶ - صافات)	ہم تو اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔

فرشتوں سے متعلق ایک تفصیلی بحث سورۂ بقرہ میں بضمن آیت ایمان ہم کر چکے ہیں۔

اولوا العلم کی شہادت

ملائکہ کے بعد اولوا العلم کی شہادت کا ذکر ہے۔ العلم قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد وہ علم حقیقی ہوتا ہے جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے دنیا کو ملا ہے۔ اس پر مفصل بحث ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ اس علم کے حاملین نے ہر دور میں خدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دی ہے یہ مصلحین و مجددین کے گروہ کی طرف اشارہ ہے جو ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں اور جنھوں نے اللہ کے دین کو بدعات اور آمیزشوں سے پاک کر کے عقاید کو توحید خالص کی بنیاد پر اور شرائع و قوانین اور اعمال و اخلاق کو حق و عدل کی اساس پر استوار کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کی طرف آگے کی آیت میں یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ کے لفظ سے اشارہ ہوا ہے اور جن کے متعلق فرمایا ہے کہ اہل کتاب ان کو قتل کرتے رہے ہیں۔

حکمتِ دین کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ یہاں اللہ اور ملائکہ کے ساتھ حاملین علم کا حوالہ ہے اور توحید کے ساتھ عدل و قسط کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں اہل علم کا کیا مقام ہے اور خدائی شریعت کے نظام میں عدل و قسط کا کیا درجہ و مرتبہ ہے۔ علم حقیقی کے حاملین ملائکہ کے زمرے سے نسبت رکھنے والے ہیں اور عدل و قسط کا درجہ صفاتِ الٰہی میں اتنا بلند و ارفع ہے کہ توحید کے بعد سب سے پہلے جس کا ذکر ہو سکتا ہے وہ یہی ہے۔

'قسط' کا مفہوم

" قَآئِمًا بِالْقِسْطِ " ترکیب کے لحاظ سے ہمارے نزدیک 'اَنَّہٗ' کی ضمیر سے حال پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد و یکتا ہے، کوئی اس کا ساجھی نہیں، تمام اختیار و تصرف تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس اختیار و تصرف کو ٹھیک ٹھیک عدل و قسط کے مطابق استعمال کر رہا ہے۔

"قسط" کا مفہوم وہی ہے جو ہم عام بول چال میں حق، عدل، انصاف وغیرہ کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ اس کا ضد ظلم، جور اور اس معنی کے دوسرے الفاظ ہیں۔ فکر، عمل، قول، اخلاق، کردار، مظاہر اور اشکال غرض ظاہر و باطن کے ہر گوشے میں ایک نقطہ تو وہ ہے جو ہر چیز کے خالق و فاطر کی بنائی ہوئی فطرت اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود و قیود کے اندر ہے، اس کو نقطۂ اعتدال یا بالفاظِ دیگر مرجع عدل و قسط سمجھیے۔ اگر کسی گوشے میں اس نقطہ سے شو شے کے برابر بھی انحراف واقع ہو جائے تو یہ بات عدل و قسط کے منافی ہوگی۔ اعتبارات اور نسبتوں کی تبدیلی سے تعبیرات بدل بدل جائیں گی۔ کسی دائرے میں ہم اس انحراف کو ظلم و جور سے تعبیر کریں گے، کسی گوشے میں بدصورتی اور بدہئیتی سے، اسی طرح کسی پہلو میں اس اعتدال کو حق و عدل سے تعبیر کریں گے، کسی محل میں حسن و جمال سے لیکن اصل حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہوگی۔ وہ یہ کہ ایک شے اپنے اصل فطری مقام سے ہٹ گئی تو بگاڑ پیدا ہو گیا اور اگر اپنے جوڑ سے پیوست ہو گئی تو بناؤ نمودار ہو گیا۔

خالقِ کائنات چونکہ اس دنیا کا خالق و مالک ہے اس وجہ سے اس کو اس کا بگاڑ نہیں بلکہ بناؤ مطلوب ہے۔ اس کے نظامِ تکوینی کی اس نے اس طرح چول سے چول بٹھائی ہے کہ مجال نہیں کہ کہیں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے اور اگر اس کی قدرت ہی کی کسی معجز نمائی سے کہیں کوئی رخنہ پیدا ہوتا نظر آتا ہے تو دفعۃً اسی کے کارفرما ہاتھ اس کو درست کرنے کے لیے نمودار ہو جاتے ہیں تاکہ جس توازن پر یہ کارخانہ قائم ہے اس میں کوئی خلل نہ پیدا ہونے پائے۔ اس کی یہی توازن پسندی ہماری زندگی کے اس دائرے کے لیے بھی ہے جس دائرے میں اس نے ہمیں محدود قسم کی آزادی دی ہے۔ جب ہم اپنے اختیار کو غلط استعمال کر کے اپنے اخلاق و عمل کے کسی گوشے میں فساد پیدا کر لیتے ہیں تو وہ ہمیں ڈھیل تو دیتا ہے لیکن یہ ڈھیل بس ایک خاص حد تک ہی ہوتی ہے۔ اس کی عدل پسندی یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ ہمیں ہماری خواہشات کی پیروی کے لیے آزاد اور اس کے نتیجے میں اپنی خلق کو تاراج و پامال ہونے کے لیے چھوڑ دے بلکہ وہ اس ڈھیل پر گرفت

کرتا ہے اور ہمارے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کو از سر نو درست کر دیتا ہے اس لیے کہ وہ قائم بالقسط ہے۔

اس قیام بالقسط ہی کے لیے اس نے مکافاتِ عمل کا قانون رکھا ہے، اسی کے لیے اس نے انبیا و شرائع کے بھیجنے کا سلسلہ جاری کیا، اسی کے لیے اس نے یہ اہتمام فرمایا کہ جب شریعت میں تحریفات و بدعات سے فساد پیدا ہو جائے تو مجددین و مصلحین اس کی اصلاح و تجدید کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں، اسی کی خاطر اس نے قوموں کے عروج و زوال کو ان کے اخلاقی عروج و زوال کے تابع کیا اور پھر سب سے بڑھ کر اس عدل و قسط ہی کے کامل ظہور کے لیے اس نے ایک ایسا دن مقرر کیا ہے جس میں اس کی میزانِ عدل نصب ہوگی اور وہ تول کر بتا دے گی کہ کس کا کون سا عمل ترازو میں پورا ہے، کون سا نہیں، اور پھر اسی کے مطابق جزا و سزا ہوگی۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ ایک ہی آیت میں دو مرتبہ کلمہ توحید کا اعادہ ہے اور دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دو الگ الگ صفتوں کا حوالہ ہے۔ پہلے فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ قائم بالقسط ہے۔ پھر فرمایا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عزیز و حکیم ہے۔ اس اسلوب میں مخاطب۔ اہل کتاب کے لیے سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا، فرشتوں اور تمام حاملینِ علم کی شہادت یہی ہے کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور وہ اپنے امور دنیا سے بے تعلق نہیں ہے کہ لوگوں کو ان کی خواہشات کی چراگاہ میں شترِ بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے، وہ دندناتے پھریں اور وہ حی و قیوم ہونے کے باوجود ان کا کوئی نوٹس نہ لے بلکہ وہ تمہاری خواہشوں کے علی الرغم اپنے نظامِ عدل و قسط کو ضرور قائم کرے گا اور کوئی اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکے گا۔ پھر فرمایا کہ وہ ایسا کیوں نہ کرے گا جب کہ وہ وحدہٗ لا شریک بھی ہے اور عزیز و حکیم بھی۔ اس کی عزت اور حکمت دونوں کا تقاضا ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یا تو وہ بے بس اور حق کے لیے غیرت سے خالی ہے یا وہ ایک کھلنڈرا ہے جس نے دنیا کو محض ایک کھیل تماشا بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی عظیم ہستی کے متعلق اس قسم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۱۹)

'الدِّین' سے مراد دینِ حقیقی، یعنی وہ دین جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے اتارا اس پر الف لام اسی طرح کا ہے جس طرح کا 'الکتٰب' پر ہے۔ اس کی وضاحت تفسیر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہم کر چکے ہیں۔

'الْعِلْمُ' سے مراد علمِ حق ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کو واضح کرنے اور اختلاف کو دور کر دینے کے لیے نازل ہوا۔

دینِ اسلام ہی اللہ کا دین ہے

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ عدل و قسط کو قائم کرنے والا ہے اس وجہ سے اس نے بندوں کو صحیح

زندگی گزارنے کا طریقہ بتانے کے لیے ایک دین عطا فرمایا جس کا نام اسلام ہے۔ یہی دین اللہ کا دین ہے یہ دین عدل و قسط کی میزان ہے۔ یہی دین اس کائنات کے تمام نظام تکوینی میں نافذ ہے۔ اسی دین پر فطرتِ انسانی کی تخلیق ہوئی ہے۔ یہی دین اس نے ابتدا سے تمام نبیوں اور رسولوں پر اتارا۔ اس سے الگ اس نے کسی کو کوئی اور دین نہیں دیا لیکن یہود و نصاریٰ نے باہمی اختلاف و عناد اور ضدم ضدا کی وجہ سے اس میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے اور یہودیت و نصرانیت کے ناموں سے اپنے الگ الگ دین کھڑے کر لیے۔ ان کا یہ اختلاف کسی بے خبری پر مبنی نہیں تھا بلکہ حق واضح ہو جانے کے باوجود محض شرارتِ نفس، باہمی عناد اور اپنی اپنی بدعات کی پچ میں تھا۔ اس طرح انھوں نے اللہ کی عظیم نعمت پا کر ضائع کر دی۔ اللہ چونکہ حی و قیوم اور قائم بالقسط ہے اس وجہ سے اس نے اس نظام عدل و قسط یعنی اسلام کو از سر نو تازہ اور مکمل صورت میں نازل فرمایا تاکہ لوگ ہدایت کی صراطِ مستقیم پائیں اور دنیا و آخرت دونوں کی فلاح حاصل کریں۔ اب بھی اگر انھوں نے وہی روش اختیار کیے رکھی جو اس سے پہلے اختیار کی اور خدا کی آیتوں کا انکار کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا حساب بہت جلد چکا دینے والا ہے۔ یعنی یہ مہلت جو انھیں ملی ہوئی ہے اس کو بہت طویل نہ سمجھیں بلکہ حضرت یحییٰؑ کے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے۔

یہ مضمون سورہ بقرہ میں بھی آچکا ہے اور وہاں ہم تفصیل کے ساتھ اس پر گفتگو کر چکے ہیں۔ ہم آیت نقل کیے دیتے ہیں۔ تفصیل کے طالب اسی مقام میں اس کی تفسیر دیکھیں۔ فرمایا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۱۳ - بقرہ)

لوگوں کو اللہ نے ایک ہی امت بنایا۔ پھر انھوں نے اختلافات پیدا کیے تو اللہ نے اپنے انبیا بھیجے خوش خبری دیتے ہوئے اور آگاہ کرتے ہوئے اور ان کے ساتھ کتاب اتاری حق کے ساتھ تاکہ لوگوں کے درمیان ان کے اختلافات کا فیصلہ کرے۔ اور اس میں اختلاف انھی لوگوں نے کیا جن کو یہ کتاب ملی، کھلی کھلی نشانیات کے باوجود، محض آپس کی ضدم ضدا کے سبب سے، تو اللہ نے ایمان لانے والوں کو اپنی توفیق بخشی سے اس حق کی ہدایت دی جس میں ان لوگوں نے اختلاف کیا اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ

الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (۲۰)

"اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ" (میں نے اپنا چہرہ اللہ کے حوالے کیا) اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کرنے کی تعبیر ہے۔ چہرہ انسان کی ذات کا سب سے اعلیٰ و اشرف حصہ ہے۔ جب سب سے اعلیٰ و اشرف حصہ حوالے کر دیا تو گویا سب کچھ حوالے کر دیا۔ یہ اسی طرح کی تعبیر ہے جس طرح ہم کسی کی اطاعت کی تعبیر کے لیے سر جھکا دینا بولتے ہیں۔ اس تعبیر میں غایت درجہ تذلل و نیازمندی اور سپردگی پائی جاتی ہے۔ موقع دلیل ہے کہ یہاں یہ اسلوب اصلاً تو اسلام لانے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن ساتھ ہی اس سے اسلام کی اصل روح بھی واضح ہو گئی ہے تاکہ دینداری کے ان مدعیوں کو، جو اسلام کی مخالفت میں بحث و جدال کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے تھے، تنبیہ ہو کہ وہ کس چیز کے خلاف یہ زور دکھا رہے ہیں۔

'اُمّی' کا مفہوم

'اُمّی' مدرسی و کتابی تعلیم و تعلّم سے ناآشنا کو کہتے ہیں۔ 'اُمیین'، کا لفظ اسماعیلی عربوں کے لیے بطور لقب استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مدرسی اور رسمی تعلیم و کتابت سے ناآشنا اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے اور اس طرح بنی اسرائیل کے بالمقابل، جو حاملِ کتاب تھے، اُمیت ان کے لیے ایک امتیازی علامت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ عربوں کے لیے اس کے استعمال کا آغاز اہل کتاب سے ہی ہوا ہو اس لیے کہ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ذریت کی بدویت و امیت کا ذکر تورات میں بھی ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس لفظ کے استعمال میں عربوں کے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ چنانچہ قرآن نے اس لفظ کو عربوں کے لیے ان کو اہل کتاب سے محض ممیز کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسی پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے 'نبی امی' کا لقب استعمال ہوا ہے۔ اس میں تورات کی پیشین گوئیوں کی ایک تلمیح بھی ہے۔ عرب خود بھی اس لفظ کو اپنے لیے استعمال کرتے تھے، جو اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ اس میں اپنے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہیں پاتے تھے۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی قوم کے لیے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے۔ مثلاً وہ حدیث جس میں ارشاد ہوا ہے نَحْنُ اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ الحدیث۔ بعض جگہ اگر یہ لفظ تحقیر کے طور پر استعمال ہوا ہے تو وہاں اس کا مفہوم محض لغوی ہے اصطلاحی نہیں مثلاً وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الآیۃ)، اس سے مراد یہود کے اَن پڑھ عوام ہیں۔

'ءَاَسْلَمْتُمْ' (کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟) یہ اسلوب دھمکی اور دعوت دونوں پر مشتمل ہے بلکہ فی الجملہ اس سے بیزاری کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ یعنی تم کو بھی اسلام لانا ہے تو لاؤ، ہم اپنا وقت اب تمہارے ساتھ مناظرہ بازی میں ضائع کرنا نہیں چاہتے، ہم نے تو اپنی راہ اختیار کر لی ہے، اب اپنی منزل کھوٹی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے جس وقت اللہ کے دین - اسلام - کو یہودیت و نصرانیت کی صورت میں مسخ کیا جان بوجھ کر مسخ کیا اور اب جو یہودیت و نصرانیت کی حمایت اور اسلام کی مخالفت میں یہ تم سے مناظرہ و مباحثہ چھیڑے ہوئے ہیں یہ بھی جان بوجھ کر رہی ہے۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ حق کیا ہے اور تم جس دین کی دعوت دے رہے ہو اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس وجہ سے ان کے ساتھ بحث و جدال میں وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان سے بھی اور اُمّی عربوں سے بھی کہہ دو کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دیا اور اسلام کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیا اگر تم بھی اس بازی کے لیے تیار ہو تو بسم اللہ آگے بڑھو اور اگر تیار نہیں تو ہماری راہ چھوڑو، اب تمھارے پیچھے ہم اپنی اوقات رائیگاں کرنا نہیں چاہتے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ اگر یہ اسلام کی راہ اختیار کرتے ہیں تو اور اگر یہ راہ نہیں اختیار کرتے بلکہ اپنی حماقتوں پر جمے رہنا چاہتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو، تمھارے اوپر ذمہ داری صرف حق کو پہنچا دینے کی تھی، وہ ذمہ داری تم نے ادا کر دی، اب تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو۔ اب ان کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ اپنے بندوں کے سارے حالات و معاملات کو دیکھ رہا ہے اور ہر ایک کے ساتھ وہ وہی معاملہ کرے گا جس کا اس کو مستحق پائے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۲۱)

قتل انبیاء بغیر حق

'يَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ' میں 'بغیر حق' کے الفاظ سے ایک تو یہود کے اس جرم کی سنگینی کا اظہار ہو رہا ہے، کیونکہ قتل ناحق بجائے خود ایک سنگین جرم ہے اور اگر یہ قتل ناحق کسی نبی کا ہو تو پھر تو اس کی سنگینی کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ دوسرے اس سے حق کی عظمت کا اظہار ہو رہا ہے کہ حق سب سے بالاتر چیز ہے یہاں تک کہ انبیا بھی اس کے تحت آتے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے فرمایا ہے۔

آمرین بالقسط سے مراد

'الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ' سے مراد وہ مصلحین و مجددین ہیں جو عام لوگوں کے اندر سے اٹھے اور جنھوں نے یہود و نصاریٰ کی تحریفات و بدعات کی اصلاح اور ان کی زندگیوں کو از سر نو خدا کے دیے ہوئے نظام حق و عدل کے تحت لانے کی جد و جہد کی۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی یہود و نصاریٰ نے وہی معاملہ کیا جو خدا کے نبیوں کے ساتھ کیا۔ اپنے تمام حربوں سے کام لے کر ان کی مخالفت کی اور جس پر بس چل گیا اس کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اوپر والی آیت کے آخر میں یہ جو فرمایا تھا کہ اللہ اپنے بندوں کا نگران حال ہے، ہدایت و ضلالت میں سے جس کو جس چیز کا سزاوار پائے گا اس کو وہی بخشے گا، اب یہ اس کے مضمرات کھل رہے ہیں مطلب

یہ ہے کہ جن لوگوں کا ہمیشہ یہ شیوہ رہا ہے کہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے رہے ہیں، جو اللہ کے نبیوں کو قتل کرتے رہے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں جو ان کے اندر اصلاح و تجدید اور حق و عدل کی دعوت لے کر اٹھے یہ کس طرح ممکن ہے کہ آج ان کا مزاج بدل جائے۔ جس نظامِ حق و عدل کو انھوں نے ہمیشہ بگاڑا اور اس کی اصلی بنیادوں پر قائم کرنے والوں کے یہ درپے آزار بھی رہے اور ان کو قتل بھی کیا اسی نظامِ عدل اور اس کے داعیوں کو آج وہ کس طرح گوارا کریں گے؟ جب اخلاف اپنے اسلاف ہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں تو انبیاء اور مصلحین کے قاتلوں اور تورات و انجیل کے محرفوں کی اولاد سے یہ کس طرح توقع رکھتے ہو کہ وہ تم کو اور تمھاری پیش کی ہوئی کتاب کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کریں گے۔ انجیل میں جگہ جگہ سیدنا مسیح نے قاتلینِ انبیا کی اولاد کے ایمان اور ان کی نجات سے جو مایوسی کا اظہار فرمایا ہے وہ بھی بالکل اسی موقع کی بات ہے۔ بعینہٖ وہی بات قرآن نے یہاں اپنے اسلوب میں کہی ہے کہ یہ لوگ ایمان و اسلام کی راہ اختیار کر کے نجات و فلاح کی خوشخبری کے اہل نہیں ہیں۔ بس انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (۲۲)

'حبطِ عمل' کی حقیقت

'حبطِ عمل' سے مطلب ہے کوششوں اور محنتوں کا اکارت ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ وہ ساری دینداریاں جو سیدنا مسیح کے الفاظ میں، مچھر کو چھاننے اور اونٹ کو نگلنے کے مترادف تھیں ان کے آخرت میں نتیجہ خیز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہیں وہ کوششیں اور تدبیریں جو وہ قرآن و اسلام یا دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل و قسط کی مخالفت میں صرف کر رہے تھے تو اس آیت نے ان کے بھی اکارت ہونے کی پیشین گوئی کر دی اس لیے کہ اس آیت میں دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے اعمال کے اکارت ہونے کا ذکر ہوا ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ اس ذلت و نامرادی سے بچانے میں ان کا کوئی مددگار ان کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ خواہ یہ مددگار روحانی ہوں یا مادی۔ تاریخ گواہ ہے کہ قرآن کی پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

۶۔ ایمان بالقسط ایمان کے اہم ارکان میں سے ہے

اس مجموعہ آیات میں جو تعلیم امت کو دی گئی ہے آیات کی وضاحت کے ضمن میں بقدرِ ضرورت ہم اس پر روشنی ڈال چکے ہیں لیکن ایمان باللہ کے ذیل میں اللہ تعالیٰ کے قائم بالقسط ہونے کی صفت کا جو جز ہے یہ ایمان کے نہایت اہم اجزا میں سے ہے اور اسلام کی حقیقت میں تو اس کو اس درجہ دخل ہے کہ گویا اسلام عبارت ہی اسی سے ہے۔ اس کی یہ اہمیت تقاضا کر رہی ہے کہ اس کے متعلق استاذ امام کے چند نکات یہاں درج کر دیے جائیں تاکہ جو لوگ حکمتِ دین پر غور کرنا چاہتے ہیں وہ ان سے فائدہ اٹھا

سکیں۔ مولانا کے نزدیک اس صفت کی اہمیت مندرجہ ذیل پہلوؤں سے ہے۔

ایمان بالقسط کی اہمیت کے چار پہلو

۱۔ ایمان امن سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اعتماد و اعتقاد اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ایمان کے لیے ناگزیر ہے کہ آدمی کو اللہ کے وجود پر یقین راسخ ہو۔ لیکن یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک یہ اعتماد نہ کیا جائے کہ عقل اعلیٰ رہنمائی کے لیے بنی ہے نہ کہ گمراہ کرنے کے لیے۔ یعنی یہ مانا جائے کہ عقل اپنی فطرت کے لحاظ سے انسان کے اندر ایک میزان قسط ہے۔ پھر یہ چیز ایک اور نتیجہ کو مستلزم ہے کہ فطرت کو اس کے فاطر نے حق و عدل کے اصولوں پر استوار کیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بہمہ وجوہ عدل و قسط، عدل و قسط کو پسند کرنے والا اور اس کو قائم کرنے والا ہے۔ یہ تمام نتائج عقلاً لازم بلکہ بدیہیات میں سے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے حق ہونے کا ثبوت اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک فاطر فطرت کو حق و عدل نہ مانا جائے۔ اسی سے اس کے تمام افعال کا حق و صدق ہونا ثابت ہوگا۔ جس طرح عقلاً یہ چیز لازم ہے اسی طرح اخلاقی مسلمات سے بھی اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نیکی کو اللہ تعالیٰ نے فطرت میں داخل کیا ہے اور دلوں میں اس کے قبول کرنے اور اس کی عزت کرنے کی رغبت ودیعت فرمائی ہے۔ ایسی حالت میں ہمارے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم خود تو نیکی کو پسند کریں اور خدا کو نیکی کو پسند کرنے والا نہ قرار دیں۔ ہم اپنی اس خیر پسندی کی صحت و اصابت پر اطمینان کس طرح کر سکتے ہیں اگر خود فاطر کی خیر پسندی پر ہمارا دل مطمئن نہ ہو۔ ہم اس کو نیکی کر کے خوش کرنا تو اسی وجہ سے چاہتے ہیں کہ ہم یہ اطمینان رکھتے ہیں کہ وہ نیکی کو پسند کرتا ہے۔ اس کو اچھی صفات سے موصوف کرنا بھی اسی بنیاد پر ہے کہ ان صفات کو پسند کرنے کے معاملے میں ہمیں اپنی فطرت کے صحیح ہونے پر پورا اعتماد ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ ایمان کی اصل خدا کی محبت ہے۔ ہم ایک ایسے معبود پر ایمان رکھتے ہیں جس سے ہم محبت کرتے ہیں، جس سے امید رکھتے ہیں اور جس کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ یہ چیز اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک ہمیں یہ یقین نہ ہو کہ وہ ظلم و ناانصافی کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ وہ اپنا انعام انھی پر فرمائے گا جو اس کی اطاعت کریں گے اور سزا انھی کو دے گا جو اس کے مستحق ٹھہریں گے۔ کسی ظالم و ناانصف آقا سے محبت کرنا انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات پر غور کرنے سے فطرت میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا جو تقاضا ابھرتا ہے اس کی بنیاد شکر پر ہے۔ یہ شکر اس صورت میں لازم ہوتا ہے جب ہم یہ مانیں کہ یہ منعم کا حق اور اس کے انعام کا مقتضا ہے۔ یہی رمز ہے کہ قرآن میں شرک کو ظلم اور ایمان کو شکر قرار دیا گیا ہے۔ اسی اصول پر تمام حقوق کے استحقاق کی بنیاد عدل کے وجوب پر رکھی گئی ہے۔ یہ شریعت و تعاون کی ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اس وجہ سے ہر شریعت کی اساس و بنیاد قسط ہے۔

۴۔ چوتھا یہ کہ ایمان کا ثمرہ اطاعتِ الٰہی ہے اور اطاعت کا ثمرہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر گوشے میں اعمال اور ان کے اثرات میں یہ رشتہ اپنے خلق و تدبیر اور اپنے امر و حکم سے قائم کر رکھا ہے اور مختلف طریقوں سے اس حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور ہم چونکہ اعمال کے ان نتائج پر پورا اعتماد رکھتے ہیں اس وجہ سے اس کے وعدے پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگر اس بات پر ہمارا ایمان نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کر سکتا تو تمام اعمال کی بنیاد ہی ڈھے جائے گی اور پھر سارا اعتماد دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز پر رہ جائے گا یا تو نصاریٰ کی طرح جھوٹی شفاعت پر جن کا سارا اعتماد حضرت مسیحؑ پر ہے، جن کو معبود بنا کر وہ ان کی عبادت کرتے اور جن سے خدا سے بڑھ کر محبت کرتے ہیں یا پھر یہود کی طرح کامل بے فکری اور ناعاقبت بینی پر۔ انھوں نے ہوا کے رُخ پر اپنی کشتی چھوڑ دی، اپنے تکبر اور حسد کے سبب سے وہ خدا کے فیصلے پر راضی نہ ہوئے، گویا ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ہاں نیک اور بد میں امتیاز کے لیے کوئی ضابطہ ہی نہیں ہے۔ اس ضلالت سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس بات پر پورا یقین رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ قائم بالقسط ہے، اس کا ہر حکم عدل اور اس کا ہر وعدہ سچا ہے۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے۔ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔

ان چاروں پہلوؤں پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ ایمان بالقسط ایمان کے نہایت اہم ارکان میں سے ہے اور اس پر عقاید، اخلاق اور شرائع کے نہایت بنیادی مسائل مبنی ہیں۔

۷۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۳-۲۷

پہلے ان منکرین قرآن کی حالت پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان سے توقع تو اس بات کی تھی کہ جس کتاب کا ایک حصہ ان کو دیا گیا تھا لیکن اپنی بدبختی سے اس کو انھوں نے ضائع کر دیا اس کو از سرِ نو اس کی مکمل صورت میں پا کر اس کی قدر کریں گے اور اس کی روشنی میں اپنے تمام اختلافات رفع کر کے نئے سرے سے عدل و حق کی راہ اختیار کریں گے لیکن انھوں نے حسبِ عادت اعراض ہی کی روش اختیار کی۔

اس کے بعد ان کے اس اعراض کے ایک نہایت اہم سبب کا سراغ دیا ہے کہ یہ اپنے آپ کو ایک برگزیدہ امت سمجھنے کی وجہ سے یہ غلط عقیدہ ایجاد کر بیٹھے ہیں کہ یہ دوزخ کے عذاب سے ہر شکل محفوظ ہیں، اوّل تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو بس سرسری طور پر کچھ سزا بھگت کر اس سے نجات پا جائیں گے۔ یہ عقیدہ ان کی ایک من گھڑت ایجاد ہے جس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اسی خود فریبی نے اُن کو ان کے دین سے بالکل غافل کر دیا ہے حالانکہ ایک دن

رتی رتی کا حساب ہونا ہے۔ اس دن ان کی آنکھیں کھلیں گی کہ ان کا سارا کیا دھرا ان کے سامنے موجود ہے اور خدا کی میزان نے نہ ان کے ساتھ کوئی رعایت کی ہے اور نہ کوئی کمی۔

اس کے بعد اس امر کا اعلان ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ اب منصب امامت سے معزول ہوئے اور شریعت الٰہی کی یہ امانت اس امت کے سپرد کی جا رہی ہے جس کو خدا نے اس امانت کا اہل پایا ہے۔ مالک الملک خدا ہی ہے، وہ جس سے چاہے چھینے اور جس کو چاہے بخشے، عزت اور ذلت سب اسی کے ہاتھ میں ہے، رات کو دن میں داخل کرنا اور زندہ کو مردہ سے نکالنا اسی کا کام ہے۔ یہ بات خبر کے بجائے دعا کے اسلوب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے آپ کے صحابہؓ کو تلقین کی گئی ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بار گراں اب جن کے کندھوں پر ڈالا جا رہا ہے وہ اس کو خدا کی امانت سمجھیں اور اس کے اٹھانے میں اسی کے سہارے کے طالب بنیں۔ اب اس کی روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۳-۲۷

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ
إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَ
هُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا
أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾
فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ
نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٥﴾ قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ
الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ
وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ إِنَّكَ
عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٦﴾ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ
فِي اللَّيْلِ ۖ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۖ
وَتَرْزُقُ مَن تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾

ترجمۂ آیات ۲۳-۲۷

ذرا ان کو تو دیکھو جن کو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ عطا ہوا، ان کو اللہ کی کتاب ہی کی طرف دعوت دی جا رہی ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ پھر ان کا ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور یہ منہ پھیر لینے ہی والے لوگ ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ کی آگ بس گنتی کے چند دن چھوئے گی۔ یہ جو کچھ گھڑتے رہے ہیں اس نے ان کو ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ اس وقت کیا ہوگا جب ہم ان کو ایک ایسے دن کے لیے اکٹھا کریں گے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے اور ہر جان کو جو اس نے کمائی کی ہوگی پوری کی جائے گی، ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ۲۳-۲۵۔

دعا کرو، اے اللہ، بادشاہی کے مالک، تو ہی جس کو چاہے بادشاہی دے، جس سے چاہے بادشاہی چھینے اور تو ہی جس کو چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلت دے، تیرے ہی ہاتھ میں خیر ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور ظاہر کرتا ہے مردہ کو زندہ سے اور تو جس پر چاہتا ہے اپنا بے حساب فضل کرتا ہے۔ ۲۶-۲۷

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ (۲۳)

أَلَمْ تَرَ کے خطاب کی نوعیت

'أَلَمْ تَرَ' کے خطاب پر ہم سورہ بقرہ میں لکھ چکے ہیں۔ ہر جگہ اس کو واحد کے معنی میں لینا صحیح نہیں ہے، اس کا خطاب جماعت سے بھی ہوتا ہے، گویا فرداً فرداً جماعت کا ہر فرد مخاطب ہوتا ہے۔ پھر یہ محض ایک سادہ خطاب ہی نہیں ہے بلکہ یہ فی الجملہ اظہارِ تعجب کا مفہوم بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں نسبت جزو و کل کی ہے

'نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ' سے مراد تورات اور انجیل وغیرہ ہیں اور کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے جس طرح پچھلے آسمانی مذاہب اور شریعتِ اسلامی میں نسبت جزو اور کل کی ہے اسی طرح دوسرے آسمانی صحیفوں اور قرآن میں بھی نسبت جزو اور کل کی ہے۔ اللہ کی شریعت انسانی ذہن اور انسانی معاشرہ کے تدریجی ارتقا کے لحاظ سے درجہ بدرجہ عطا ہوئی ہے۔ جب تک انسان، کامل شریعت اور کامل کتاب کا اہل نہیں ہوا تھا اس وقت تک اس کو کامل شریعت اور کامل کتاب نہیں دی گئی بلکہ اس کے حالات اور اس کی ضروریات کے مطابق کتاب دی گئی لیکن یہ کتاب اصلاً اس کامل شریعت اور اس کامل کتاب ہی کا ایک حصہ تھی جو اس کے لیے پہلے سے خدا کی اسکیم میں مقرر تھی۔ انبیائے بنی اسرائیل نے جو تعلیم دی وہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے کوئی الگ چیز نہیں بلکہ اسی تعلیم کا اتنا حصہ تھا جو ان کے دور اور ان کے حالات کے لیے موزوں تھا۔ اسی طرح تورات اور انجیل قرآن مجید سے کوئی الگ چیز نہیں ہیں بلکہ اسی صحیفۂ کامل کے یہ وہ اوراق تھے جو آخری امت سے پہلے کی امتوں کے لیے نازل ہوئے۔ اس طرح گویا تمام آسمانی کتابیں ایک ہی کتابِ الٰہی کے مختلف حصے اور مختلف ابواب کی حیثیت رکھتی ہیں، اصلاً اور نظرتاً ان میں کامل ہم آہنگی و ہم رنگی ہے۔ اگر تورات اور انجیل میں ملاوٹ اور تحریف نہ واقع ہوئی ہوتی تو ان کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں اجمال و تفصیل اور آغاز و تکمیل کے سوا کوئی فرق نظر نہ آتا تاہم آج بھی ایک صاحب نظر آسانی سے یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ سب صحیفے ایک ہی مشکوٰۃ علم و معرفت کے انوار اور ایک ہی شجرۂ طوبیٰ کے برگ و بار ہیں۔ اس باہمی یک رنگی کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے جو تورات و انجیل کو جانتے اور مانتے ہوں قرآن کا پہچاننا کچھ مشکل نہ تھا بشرطیکہ انھوں نے اپنی آنکھوں پر تعصب اور ضد کی پٹیاں نہ باندھ رکھی ہوتیں۔ جس کتاب کے ابتدائی ابواب انھوں نے پڑھے ہوں، جس کے انداز، اسلوب اور مزاج سے آشنا ہوں، جس کی ہدایات و تعلیمات کا ابتدائی عکس اور خاکہ انھوں نے دیکھا ہو جس کی پیشین گوئیوں سے وہ باخبر اور ان کے مصداق کے وہ منتظر ہوں، یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ کتاب عزیز جب اپنے اصلی جمال و کمال کے روپ میں نمایاں ہو تو وہ اس کو نہ پہچان سکیں، پھر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اہل کتاب نے اس سے منہ موڑا اور جان کر اس سے انجان بن گئے!

قرآن کی ضرورت رفع اختلاف کے پہلو سے

'لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ' یہ قرآن کا وہ مقصد بیان ہوا جو اہل کتاب کو، اگر وہ اللہ کی شریعت کے قدر داں ہوتے تو بہت عزیز ہونا تھا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے تورات اور انجیل اتاری تھیں لیکن انھوں نے ان میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو فرقان بنا کر اتارا تاکہ یہ تمام اختلافات کا فیصلہ کر کے اصل حق کو پھر واضح کر دے۔ اسی بات کو یہاں پھر دہرایا ہے کہ اس کتاب کی طرف جو ان کو بلایا جا رہا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس میں بلانے والے کا کوئی فائدہ ہے بلکہ سرتاسر انھی کا فائدہ ہے۔ ان کو اس لیے بلایا جا رہا ہے کہ خدا کی شریعت میں انھوں نے جو اختلافات

پیدا کر دیے ہیں وہ رفع ہوں اور جو ہدایت انھوں نے گم کر دی تھی اس سے پھر بہرہ مند ہوں۔

ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ، 'ثُمَّ' یہاں استعجاب کے مفہوم میں ہے اور فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ سے مقصود یہ ظاہر کرنا نہیں ہے کہ اہل کتاب کا ایک قلیل گروہ اس کتاب الٰہی سے منہ موڑ رہا ہے، اس لیے کہ اس جرم کے مرتکب تو اہل کتاب من حیث الجماعت ہوئے تھے، ان کے اندر سے صرف تھوڑے سے لوگ نکلے، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، جو اسلام لانے والے بنے، بلکہ اس میں اصلی زور مِّنْهُمْ کے لفظ پر ہے یعنی تعجب کا اظہار اس بات پر ہے کہ یہ منہ موڑنے والا گروہ ان اہل کتاب کا ہے جو سب سے زیادہ سزاوار اس بات کے تھے کہ سب سے پہلے اس پر ایمان لانے والے بنتے لیکن وہ ایمان کی راہ میں سبقت کرنے کے بجائے کفر کی راہ میں سبقت کرنے والے بنے۔

یہود کا جماعتی مزاج

آخر میں وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ سے اہل کتاب کے اصل جماعتی مزاج پر روشنی ڈال دی کہ حق سے ان کا یہ اعراض کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے ان کی روش یہی رہی ہے۔ اس فقرے میں اہل کتاب کے لیے سخت ملامت کا پہلو بھی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی کا بھی۔ مطلب یہ ہے کہ حق سے اعراض جن کی فطرت ثانیہ اور جن کا قومی مزاج بن چکا ہو ان کے دل میں اگر حق نہیں اترتا تو اس میں قصور تمھارا یا حق کا نہیں ہے بلکہ ان کے فساد مزاج کا ہے۔ پتھر میں جونک کہاں لگی ہے!

جو لوگ بنی اسرائیل کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ سے لے کر سیدنا مسیحؑ تک بلا استثنا ہر پیغمبر نے ان کے مزاج پر ماتم کیا ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم انبیاے بنی اسرائیل کے صحیفوں سے اس کی مثالیں پیش کرتے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَّغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۴)

یہ مضمون سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کے ہر پہلو کی وضاحت کر چکے ہیں۔ وہاں ارشاد ہوا ہے کہ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗئَتُهٗ فَاُولٰۗئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۸۰-۸۱ بقرہ (اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن، ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے عہد کرا لیا ہے تو اللہ اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایک تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے میں تمھارے پاس کوئی علم نہیں۔ اصل معاملہ تو یوں ہے کہ جس نے گناہ کی کمائی کی اور اس کے اس گناہ نے اس کو اپنے لپیٹ میں لے لیا تو یہی لوگ دوزخ والے ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)

بقرہ میں یہ آیت بنی اسرائیل کی ان جھوٹی آرزوؤں (امانی) کے ضمن میں وارد ہے جن کو کوئی سند

یہود کی جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال

ان کے دین میں موجود نہیں تھی۔ ان کے علماء نے محض اپنے جی سے گھڑ کر ان کو اپنی شریعت کا جزو بنا دیا تھا اور دل پسند ہونے کی وجہ سے یہ بدعتیں ان کے عوام کے دلوں میں اس طرح راسخ ہو گئی تھیں کہ اب ان کا سارا تکیہ انہی جھوٹی آرزوؤں پر رہ گیا تھا۔ ازاں جملہ ان کا یہ من گھڑت عقیدہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل چونکہ برگزیدہ امت ہیں اس وجہ سے ان کے اعمال خواہ کچھ بھی ہوں لیکن ان کے لیے دائمی عذاب نار نہیں ہے، اول تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے گئے بھی تو بس تھوڑی بہت اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر چھوٹ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ ایجاد کر لینے کے بعد دین کی اصلی ذمہ داریوں کو سوچنے سمجھنے کی ان کو کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی، پھر وہ اس قرآن کی طرف کیوں توجہ کرتے جو ان کو اس جنت الحمقا سے نکال کر ان کو روبرو ان کی ان ذمہ داریوں کے آگے کھڑا کرنا چاہتا تھا جو ان پر فی الواقع ان کے دین کی رو سے عاید ہوتی تھیں۔ قرآن نے واضح کیا کہ ان کا یہ عقیدہ 'افتراء علی اللہ' یعنی اللہ تعالیٰ کے اوپر ایک تہمت اور ایک بہتان ہے۔ اس نے کہیں بھی بنی اسرائیل کو یہ لائسنس نہیں دیا ہے کہ وہ جو چاہیں کرتے رہیں، بس چند دن کی سزا کے بعد وہ جنت میں پہنچ جائیں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ درحقیقت ان کی اسی قسم کی من گھڑت بدعات و خرافات ہیں جن میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے وہ اپنے دین کے معاملے میں دھوکے میں پڑے ہیں۔ اب ان کا دین ان کی چند دل پسند آرزوؤں اور ان کے چند لفریب خوابوں کا ایک مجموعہ بن کر رہ گیا ہے جن میں ان کے لیے خدا کے ہاں حقوق تو بے شمار ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر، لیکن یہ ان کے اوپر چند رسوم کے سوا کوئی ذمہ داری عاید نہیں کرتا۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۟ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲۵)

یعنی یہ تو یہ امیدیں لگائے بیٹھے ہیں اور آخرت سے متعلق یہ لذیذ خواب دیکھ رہے ہیں لیکن اس وقت کیا بنے گا جب ہم ان کو ایک ایسے یوم الفصل کے احوال و نتائج دیکھنے کے لیے جمع کریں گے جو اس کائنات کی ایک اٹل حقیقت ہے اور جس کے پیش آنے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے؟ ہمارے نزدیک لام یہاں 'فی' کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ اس کے اندر ظرفیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اور عربی زبان کے قواعد کی رو سے اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ یہاں حرف جر کے بعد ایک مضاف محذوف مان لیا جائے۔ ہم نے اسی دوسرے پہلو کو سامنے رکھ کر آیت کی وضاحت کی ہے۔

اس دن کی ایک خصوصیت تو یہ بیان ہوئی کہ اس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے، دوسری یہ کہ اس دن ہر نفس کو اس کی کمائی پوری کی جائے گی، کسی کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہ اہل کتاب خود سوچ لیں کہ آج ایک من گھڑت عقیدے میں مبتلا ہو کر یہ جس خواب خوش کے مزے لے رہے ہیں اس سے بیدار ہونے کے بعد انھیں کس حقیقت سے دوچار ہونا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ

تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۶-۲۷)

امت مسلمہ کے لیے ایک عظیم بشارت دعا کے اسلوب میں

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے پوری امت کو ایک دعا تلقین کی گئی ہے جو مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہے۔

۱۔ پہلی چیز وہ عظیم بشارت ہے جو اس امت کے لیے اس کے اندر مضمر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ دعا در پردہ اشارہ کر رہی ہے کہ اہل کتاب کی ضد اور ان کے حسد کے علی الرغم امامت و سیادت کا وہ منصب جس پر بنی اسرائیل اب تک فائز رہے ہیں اب وہ بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو رہا ہے اور بنی اسرائیل کی کوئی مخالفت خدا کے اس فیصلہ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اپنے ملک کا مالک خدا ہے، جس کو چاہے وہ ملک بخشے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلت دے، خیر کے تمام خزانوں کا مالک وہی ہے۔ بنی اسرائیل یہ جو سمجھتے رہے ہیں کہ تمام خیر کے وارث و مورث وہی ہیں، کسی اور کے لیے، خاص کر بنی اسمٰعیل کے لیے، اس خیر میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس دعا نے ان کے اس خیال باطل کی بساط الٹ دی۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اب مالک کائنات نے اس خزانۂ خیر کی کنجیاں بدعہدوں اور خائنوں سے چھین کر ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جو اس امانت کے اہل ہیں۔

۲۔ اس بشارت کے ساتھ اس میں بنی اسرائیل کے لیے انذار بھی ہے اور یہ انذار درحقیقت مذکورہ بالا بشارت ہی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب سیادت بنی اسمٰعیل کو حاصل ہو گی تو لازماً اس سیادت سے بنی اسرائیل محروم ہوں گے، جب بنی اسماعیل عزت سے سرفراز ہوں گے تو لازماً بنی اسرائیل کے لیے ذلت مقدور ہو چکی ہے۔ نصب و عزل، عزت و ذلت اور حیات و موت دونوں کا ذکر کر کے قرآن نے اپنے مخالفین اور موافقین دونوں کے لیے تقدیر کا فیصلہ سنا دیا۔

۳۔ اس میں اس امت کے لیے ایک عظیم نصیحت بھی ہے کہ اب یہ امانت جو تمہاری طرف منتقل ہو رہی ہے تو یہود کی طرح یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ یہ تمہارے استحقاق ذاتی کا کرشمہ یا تمہارے حسب و نسب کا ثمرہ ہے بلکہ یہ سرتاسر خدا کا فضل ہے جس کے تم اس وقت تک سزاوار قرار پاؤ گے جب تک اس کا حق ادا کرتے اور اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے معاملے میں برابر خدا سے دعا کرتے رہو گے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ آیت درحقیقت یہود کے عزل کا اعلان اور امت مسلمہ کے نصب کی بشارت ہے، لیکن بات بجائے خبر اور بشارت کے دعا کے اسلوب میں کہی گئی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان آیات کے نزول کے وقت تک حالات ابھی پردے میں تھے اور جو چیز پردے میں ہو اس کے متعلق یہی اسلوب موزوں ہے کہ امت اس کے لیے دعا کرے۔ اور دوسری یہ کہ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ امت اس بشارت کو فخر اور غرور کے ساتھ نہ قبول کرے بلکہ تواضع، تذلل،

احساس عبدیت اور دعا کے ساتھ قبول کرے اس لیے کہ سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، جو محروم ہوتا ہے وہ بھی خدا ہی کے حکم سے محروم ہوتا ہے اور جو پاتا ہے وہ بھی خدا ہی کے ہاتھ سے پاتا ہے۔

بشارت کے دعائیہ اسلوب میں ظاہر ہونے کی بعض اور نہایت بلیغ مثالیں بھی قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً ہجرت کے حکم سے ذرا پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھائی گئی۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ	اور دعا کرو کہ اے رب مجھے داخل کر عزت کے
وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ	ساتھ اور مجھے نکال عزت کے ساتھ اور مجھے خاص
مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ٥ وَقُلْ جَآءَ	اپنے پاس سے نصرت کا پروانہ عطا فرما۔ اور یہ اعلان
الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ	کر دو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہوا اور باطل نابود ہونے
كَانَ زَهُوْقًا (۸۰-۸۱ بنی اسرائیل)	ہی کے لیے ہے۔

اس دعا میں ہجرت کی خبر بھی ہے اور ساتھ ہی اس بات کی بشارت بھی کہ آپ کا مکہ سے نکلنا اور دار الہجرت میں داخل ہونا دونوں عزت کے ساتھ ہوگا اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کے لیے خاص بدرقہ اور نصرت کا خاص پروانہ عطا ہوگا بلکہ اس میں ایک لطیف بشارت اس بات کی بھی ہے کہ آپ کے پُر وقار داخلہ کا انتظام آپ کے نکلنے سے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اس کا اشارہ اس بات سے ہو رہا ہے کہ دعا میں داخل ہونے کا ذکر نکلنے کے ذکر پر مقدم رکھا گیا ہے بلکہ زیادہ تدبر سے کام لیجیے تو یہ بات بھی آیت سے نکلتی ہے کہ ہجرت درحقیقت فتح کا دیباچہ اور غلبۂ حق کا مقدمہ ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کو خبر اور بشارت کے اسلوب میں کہنے کے بجائے دعا کے اسلوب میں کہا گیا ہے اور اس میں حکمت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

نظامِ تکوینی کی شہادت 'تُوْلِجُ الَّيْلَ' الآیہ میں اسی بات پر جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی اس کائنات کے نظامِ تکوینی کی شہادت کا حوالہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو خدا رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور رات کے بعد دن کو نمودار کرتا ہے، جو مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو ظاہر کرتا ہے اس کے سوا دنیا میں عزل و نصب اور عزت و ذلت کا اختیار ہو بھی کیسے سکتا ہے!

یہ دن کو رات میں داخل کرنا اور رات کو دن میں داخل کرنا رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کے آمد و شد کی نہایت خوب صورت تشبیہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے دونوں ایک دوسرے کا پوری سرگرمی سے تعاقب کر رہے ہیں، کبھی رات دن کے اندر گھس جاتی ہے، کبھی دن رات کے اندر چھپ جاتا ہے، یہ چکر پورے تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے۔ قرآن میں یہ تشبیہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے ظاہر ہونے کے نشانات بھی ہر گوشے میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں، مادیات میں بھی، معنویات میں بھی۔ یہ ایک لطیف تعریض اس صورت حال پر بھی ہے جو بنی اسرائیل کی موت

اور بنی اسماعیل کی زندگی سے نمایاں ہو رہی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے جو پودا فلسطین کی سر سبز و شاداب زمین میں لگایا تھا اب وہ سوکھ چکا تھا اور جیسا کہ حضرت یحییٰ نے فرمایا، اس کی جڑ پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا۔ اس کے برعکس انھوں نے جو پودا عرب کی خشک اور بنجر زمین میں لگایا تھا اور جو مرجھایا ہوا پڑا تھا اب اس میں شگوفے نکل رہے تھے اور جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا، وہ ایک تناور درخت بن کر ایک عالم کو اپنے سائے کی پناہ میں لینے والا تھا۔

'بغیر حساب' کے دو مفہوم

'وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ' رزق یہاں فضل و انعام کی تعبیر ہے، روزی کے محدود مفہوم میں نہیں ہے۔ بِغَيْرِ حِسَابٍ یہاں دو مفہوموں پر مشتمل ہے۔ ایک کثرت کے مفہوم پر یعنی وہ جس کو چاہتا ہے بے اندازہ فضل و انعام سے نوازتا ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں، جیسا کہ فرمایا ہے اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (صابروں کو ان کے صبر کا بے حساب اجر ملے گا) دوسرے بے سان گمان کے مفہوم پر، جیسا کہ فرمایا ہے وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۳۔ طلاق (اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا)

۹۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۸-۳۲

اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اب اہل کتاب کی حیثیت ایک اجڑے ہوئے گھر کی ہے جس کا ڈھے جانا مقدر ہو چکا ہے اس وجہ سے آگے کی آیات میں ان کمزور اور مبتلائے نفاق مسلمانوں کو جو اہل کتاب بالخصوص یہود کی طرف میلان رکھتے تھے متنبہ فرمایا کہ اب ان سے موالات رکھنا ایک اجڑے ہوئے گھر کی دربانی ہے اور اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جب وہ گھر گرے تو اس کے نیچے وہ لوگ بھی دب کے رہ جائیں جو اس کی دیواروں کے نیچے سائے کی تلاش میں گئے ہیں۔

اس کے بعد ان کے اس نفاق پر تنبیہ فرمائی کہ اگر ان کے دلوں میں کفر اور اہل کفر کی محبت چھپی ہوئی ہے تو وہ یہ یاد رکھیں کہ خدا سے کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے، ایک دن آئے گا جب ہر شخص کے سامنے اس کا سارا کھلا چھپا آجائے گا، اس دن خدا کا عدل ظاہر ہوگا اور ہر شخص اس کا مزا چکھے گا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہے اس وجہ سے وہ پہلے سے اس دن سے آگاہ کر رہا ہے۔

پھر ایمان اور محبتِ الٰہی کا صحیح تقاضا واضح فرمایا کہ جو لوگ اللہ پر ایمان اور اس کی محبت کے مدعی ہوں ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے مخالفوں سے موالات رکھیں بلکہ ان کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی پیروی کریں، جو لوگ ایسا کریں گے خدا بھی ان سے محبت کرے گا۔ یہی راہ خدا کے محبوب بننے کی راہ ہے۔ جو لوگ اس کے خلاف روش اختیار کریں گے وہ

درحقیقت کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں رکھتا۔
اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۸-۳۲
لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ
وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ
تُقٰىةً ؕ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾
قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰہُ ؕ
وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ
شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾ یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ
معانقہ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۚۛ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَھَا
وَبَیْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِیْدًا ؕ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ
ع ۲ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ
اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِیْعُوا
اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمۂ آیات ۲۸-۳۲
اہل ایمان مومنوں کے برخلاف کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کریں گے
تو اللہ سے ان کو کوئی تعلق نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچو جیسا بچنے کا حق ہے، اللہ تمہیں
اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے، کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے دلوں
میں ہے اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اس سے باخبر ہے اور وہ اس سب کو جانتا ہے
جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس دن ہر جان
اپنی کی ہوئی نیکی کو اپنے سامنے موجود پائے گی اور جو برائی کی ہو گی اس کو بھی موجود

پلٹے گی اور وہ آرزو کرے گی کہ کاش اس کے اور اس کے درمیان ایک زمانہ دراز حائل ہوتا اور اللہ اپنی ذات سے تمھیں ہوشیار کرتا ہے، اللہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑا مہربان ہے۔ ۲۸-۳۰

کہہ دو، اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمھارے گناہوں کو بخشے گا، اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، اگر یہ اعراض کریں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۳۱-۳۲

۱۰- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (۲۸)

آیت ۲۸ میں مومنین سے مراد مذبذب مسلمان اور کافرین سے مراد یہود ہیں

"مُؤْمِنُوْنَ" کا لفظ اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن مراد اس سے خاص طور پر وہ مسلمان ہیں جو ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوئے تھے بلکہ کچھ اپنے ذاتی مصالح کی وجہ سے اور کچھ اسلام کے مستقبل کے بارے میں، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، غیر مطمئن ہونے کے باعث، یہود کی طرف میلان رکھتے تھے، اور یہود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں کرتے تھے اس میں وہ ان کو آلۂ کار بنا لیتے تھے اور یہ ان کے آلۂ کار بن جاتے تھے۔ ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اب یہود کے ساتھ موالات اور دوستی اُجڑے گھر کی دربانی بھی ہے اور یہ حرکت ایمان و اسلام کے دعوے کے منافی بھی ہے۔

"کٰفِرِیْنَ" سے یہاں مراد اہل کتاب خاص طور پر یہود ہیں جیسا کہ آیت ۲۱ میں ان کے کفر کی تصریح گزر چکی ہے۔

کفار سے مسلمانوں کے برخلاف موالات ناجائز ہے

"وَلِیّ" کے معنی کارساز، حمایتی، ساتھی، دوست اور مددگار کے ہیں جس کی طرف ضرورت کے وقت رجوع کیا جائے اور جس کا حمیت و حمایت کے جذبے سے ساتھ دیا جائے۔ فرمایا کہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ کافروں کو اپنا ولی بنائیں لیکن اس کے ساتھ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ کی قید ہے یعنی کافروں کے ساتھ صرف اس قسم کی موالات ناجائز ہے جو مسلمانوں کے بالمقابل یا ان کے مفاد و مصالح کے خلاف ہو۔ اسلام اور مسلمانوں کا حق اور مفاد دوسرے تمام حقوق و مفادات پر مقدم ہے اس وجہ سے مسلمانوں کی کسی جماعت کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح کے بخلاف کفار کی کسی جماعت کے ساتھ موالات

کا تعلق قائم کرے۔ اس قید نے یہ بات واضح کر دی کہ غیر حربی کفار کے ساتھ اس نیکی، عدل اور احسان کی ممانعت نہیں ہے جس کی اسلام نے تمام بنی نوع انسان کے معاملے میں ہدایت فرمائی ہے۔ مسلمان غیر مسلم قوموں اور حکومتوں کے ساتھ دوستانہ سیاسی و اقتصادی معاہدے بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ نہ ہوں۔ اس مسئلے پر تفصیلی بحث ہم آگے موزوں مقام پر کریں گے۔

اِلَّاۤ اَنۡ تَتَّقُوۡا آیت کا صحیح مفہوم

اِلَّاۤ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً (مگر یہ کہ ان سے بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے) تُقٰىةً، جس طرح اسی سورہ کی آیت ۱۰۲ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ میں مفعول مطلق کے طور پر استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں بھی مفعول مطلق ہے جس سے فعل کی تاکید ظاہر ہو رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کفار سے موالات کا تعلق رکھتے ہیں ان کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس قسم کے لوگ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ انہی لوگوں کے اندر شامل ہیں جن سے یہ موالات رکھتے ہیں۔ اللہ اور اعداء اللہ دونوں کے ساتھ بیک وقت دوستی قائم نہیں رکھی جا سکتی، اللہ سے دوستی کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں سے اپنا دامن بچا کے رکھو جو اللہ کے، اس کے دین کے اور اس کے وفادار بندوں کے دشمن ہیں[1]۔ یہ جملہ گویا لَيۡسَ مِنَ اللّٰهِ فِىۡ شَىۡءٍ سے استثنا ہے یعنی اس نفی سے مستثنیٰ صرف وہی ہیں جو ان کفار کی مخالفِ اسلام موالات سے اس طرح بچیں جس طرح اس سے بچنے کا حق ہے۔ اس آیت سے جن لوگوں نے تقیہ کا جواز نکالا ہے انھوں نے لغت، نظائرِ قرآن اور سیاق و سباق ہر چیز کو نظر انداز کیا ہے لیکن صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اب اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

منافقین کے لیے تنبیہ کا ایک خاص پہلو

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفۡسَهٗ (اور اللہ تمھیں اپنی ذات سے ہوشیار کرتا ہے) میں منافقین کے لیے تنبیہ کا ایک خاص پہلو ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کی کریمی سے دھوکے میں پڑ کے اس کی ذات کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز نہ کر جاؤ۔ وہ اگر شرارتوں سے درگزر کرتا ہے، سازشوں کو نظر انداز کرتا ہے اور ریشہ دوانیوں کا فوراً نوٹس نہیں لیتا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ جرائم اس کے نزدیک جرائم نہیں یا وہ ان جرائم پر گرفت نہیں کر سکتا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بندوں کو آخری حد تک مہلت دیتا ہے۔ یہ مہلت بہرحال مہلت ہے جو ایک دن ختم ہونی ہے۔ اس کے بعد اس کا عدل ظہور میں آئے گا اور یہ عدل بھی اس کی ذات ہی کا ایک پہلو ہے۔ یہ اگر ابھی ظہور میں نہیں آیا ہے تو اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ ظہور میں آئے گا ہی نہیں۔ خدا کے کاموں میں دیر ہے اندھیر نہیں، جب اس کی ذات کا یہ پہلو سامنے آئے گا

---

[1] اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت بھی پیش نظر رہے: لَا تَجِدُ قَوۡمًا يُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ يُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ (المجادلۃ-۵۸: ۲۲) تم کوئی ایسی قوم نہیں پا سکتے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہو، پھر وہ ان لوگوں سے دوستی رکھے جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے ہیں۔

تو ہر شخص پر کھل جائے گا کہ اس سے زیادہ زور آور، اس سے زیادہ بے لاگ اور اس سے بڑا منتقم و قہار کوئی بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے اسی پہلو سے یہاں ہوشیار کیا ہے اور آگے واضح ہو گا کہ بار بار ہوشیار کیا ہے۔ ایک دوسری جگہ فرمایا ہے۔ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (اے انسان تجھ کو تیرے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے) اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

جن کمزور اور منافق قسم کے مسلمانوں کو یہاں تنبیہ فرمائی انھی کا ذکر اسی سورہ میں آگے بھی آ رہا ہے اس سے اس آیت کے بعض مخفی گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِھِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ھٰٓاَنْتُمْ اُولَاۗءِ تُحِبُّوْنَھُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّھٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِھَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَـيْـــًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ (۱۱۸-۱۲۰ - آل عمران)

اے ایمان والو، اپنے سے باہر والوں کو اپنا محرم راز نہ بناؤ، وہ تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے، وہ تمھارے لیے زحمتوں کے آرزومند ہیں۔ ان کی زبانوں سے ان کی دشمنی آشکارا ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی شدید ہے۔ ہم نے تمھیں واضح تنبیہات پہنچا دی ہیں، اگر تم سمجھنے والے لوگ ہو۔ تمھی ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو، وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم پوری کتاب پر ایمان رکھتے ہو۔ اور جب وہ تمھارے سامنے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب وہ الگ ہوتے ہیں تو غصے سے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں، کہہ دو کہ تم اپنے اس غصے میں مر جاؤ، اللہ دلوں کے بھیدوں سے باخبر ہے۔ اگر تمھیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر کوئی گزند تمھیں پہنچ جائے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم ثابت قدم اور تقویٰ پر قائم رہے تو ان کی چالوں سے تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ اللہ ان کے اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ (۲۹-۳۰)

'مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ' میں اشارہ ہے اس نفاق اور اہل کفر کی دوستی کی طرف جو یہ لوگ اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ فرمایا کہ اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو خدا سے کوئی چیز بھی چھپی نہیں ہے، وہ صرف تمہارے دلوں کے رازوں ہی سے نہیں بلکہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے، سب سے باخبر بھی ہے اور ہر چیز پر قادر بھی ہے۔ اس علم و قدرت کے باوجود اگر وہ ڈھیل دے رہا ہے تو اس لیے کہ اس نے جزا اور سزا کے لیے ایک خاص دن مقرر کر رکھا ہے جس میں ہر ایک کے سامنے اس کی نیکی اور بدی سب آجائے گی اور ایسے نتائج کے ساتھ سامنے آئے گی کہ جو لوگ اس ڈھیل سے دھوکے میں پڑ کر اس دن کو اتنا بعید سمجھ بیٹھے کہ اس کے لیے کسی فکر و اہتمام کی ضرورت ہی سے نچنت ہو گئے، وہ یہ آرزوئیں کریں گے کہ کاش ان کے اور ان کے ان نتائج اعمال کے درمیان ایک زمانۂ بعید کی دوری حائل ہو جائے۔

'مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ' کے بعد 'مُحْضَرًا' کا لفظ محذوف ہے۔ چونکہ پہلے ٹکڑے میں اس کا اظہار ہو چکا ہے اس وجہ سے دوسرے میں تکرار سے بچنے کے لیے اس کو حذف کر دیا۔ 'بَیْنَهَا وَبَیْنَهٗ' میں پہلی ضمیر کا مرجع نفس، دوسری کا سوء محضر ہے۔

'وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ' 'رَءُوْفٌ' کے لفظ پر ہم کہیں بحث کر آئے ہیں کہ اس میں دفع شر کا پہلو غالب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہے، وہ ان کو ان کے اعمال کے نتائج بد سے بچانا چاہتا ہے اس وجہ سے وہ ان کو اپنی ذات سے بار بار ہوشیار کر رہا ہے کہ وہ اس کی ڈھیل سے کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں، وہ ڈھیل تو بے شک دیتا ہے لیکن جب پکڑے گا تو اس کی پکڑ بھی بڑی سخت ہو گی۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝
قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (۳۱-۳۲)

اہل ایمان کے لیے صحیح روش

یہ ان مذبذب قسم کے مسلمانوں کو اس صحیح رویے کی تعلیم دی گئی ہے جو سچے مسلم کی حیثیت سے انھیں اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ اگر تم اللہ کے ساتھ محبت رکھنے کے مدعی ہو تو اس محبت کے ساتھ ان لوگوں کی محبت جمع نہیں ہو سکتی جو اللہ کے، اس کی کتاب کے اور اس کے دین کے دشمن ہیں بلکہ اس کا راستہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی پیروی کرو۔ اگر تم رسول کی پیروی کرو گے تو یہی راستہ اللہ سے محبت کرنے کا ہے اور اس کا انعام یہ ہے کہ اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور اب تک تم سے جو غلطیاں اور کمزوریاں صادر ہوئی ہیں ان کو معاف فرما دے گا۔ اللہ غفور رحیم ہے۔

اس کے بعد نہایت واضح الفاظ اور تہدید آمیز انداز میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرا دیا کہ ان کو خبردار کر دو کہ سیدھے سیدھے اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور اگر وہ

اس چیز سے اعراض کرتے ہیں تو یاد رکھیں کہ وہ بھی انھی کافروں میں شامل ہیں جن سے ان کا یارانہ ہے اور اس کے ساتھ اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو کبھی دوست نہیں رکھتا۔

ان دونوں آیتوں میں بعض باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ ان دونوں کا لب و لہجہ الگ الگ ہے۔ پہلی آیت میں شفقت ہے اور دوسری میں تنبیہ بلکہ تہدید۔ گویا درشتی و نرمی ہم در بہ است۔

دوسری یہ کہ ایمان کی اصل روح اللہ کی محبت ہے اور اس محبت کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی محبت جمع نہ ہونے پائے جو اس کے ضد ہو۔

تیسری یہ کہ اللہ سے محبت کرنے کا واحد راستہ رسول کی پیروی ہے، اس سے ہٹ کر جو راستے نکالے گئے ہیں وہ سب بدعت و ضلالت ہیں۔

چوتھی یہ کہ خدا کی محبوبیت کا راستہ بھی رسولؐ کی پیروی ہی ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی رسولؐ کی سنت سے منحرف ہو اور وہ اس زعم میں مبتلا ہو کہ وہ خدا کا محبوب ہے یا دوسرے اس کو محبوب خدا سمجھیں تو یہ بالکل خبط ہے۔

پانچویں یہ کہ دین کا کم سے کم مطالبہ اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ مطالبہ پورا کرنے سے اعراض اختیار کرتا ہے تو اس کا شمار دین کے منکروں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت نہیں رکھتا۔

۱۱۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۳-۴۴

آیت ۳۲ پر سورہ کی تمہید ختم ہوئی۔ اب آگے نصاریٰ کی بدعات کی تردید شروع ہو رہی ہے جو اس سورہ میں اصل مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا آغاز بھی ایک تمہید سے ہوا ہے۔ پہلے اس سلسلۂ رشد و ہدایت کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی رہنمائی کے لیے قائم فرمایا۔ اس ذیل میں حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران کا ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کی امامت و ہدایت کے لیے منتخب فرمایا۔ اس زمرے میں آلِ عمران کا ذکر خاص طور پر سیدنا مسیحؑ کے ذکر کی گویا تمہید ہے اس لیے کہ اسی مبارک خاندان کی چشم و چراغ حضرت مریمؑ ہیں اور انھی حضرت مریمؑ کے بطن سے سیدنا مسیحؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ مقصود حضرت آدمؑ سے لے کر آلِ ابراہیمؑ و آلِ عمران تک کے اس شجرے کا حوالہ دینے سے یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کے متعلق نصاریٰ کے سامنے یہ بات واضح طور پر آجائے کہ ان کی اپنی مانی ہوئی تاریخ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ حضرت مسیحؑ یا ان کی والدہ کوئی مافوق بشر ہستی ہیں بلکہ ان کا تعلق بھی رشد و ہدایت کے اسی سلسلۃ الذہب سے

ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت کے لیے منتخب فرمایا۔ اس مبارک خانوادہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد و ہدایت کے لیے برگزیدگی کا شرف ضرور حاصل ہوا لیکن یہ برگزیدگی اللہ کی بندگی اور اس کی بندگی کی دعوت کے لیے تھی، جس طرح اس سلسلے میں دوسرے اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں اسی طرح حضرت مسیحؑ بھی خدا کے ایک برگزیدہ بندے ہیں، پھر ان کو اور ان کی والدہ کو الوہیت کا درجہ دینے کا جواز کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔

آگے حضرت مریمؑ کی ابتدائی زندگی کے واقعات کا حوالہ ہے کہ ان کی ولادت سے پہلے کس طرح ان کی والدہ نے اپنے پیٹ کے بچے کے لیے ایک منت مانی، پھر جب توقع کے خلاف ان کے ہاں لڑکی کی ولادت ہوئی تو انھیں کس نوعیت کا اضطراب پیش آیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ اضطراب کس طرح دور فرمایا، حضرت زکریا نے ان کو کس طرح اپنی تربیت میں لیا اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی قبولیت سے نوازا یہاں تک کہ ان کے روحانی فیوض و برکات سے حضرت زکریا جیسے صاحبِ فیوض و برکات بھی اس اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے لیے بھی اولادِ صالح کی دعا مانگی۔ حضرت مریمؑ کی اس سرگزشت کا حوالہ دینے سے مقصود نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک پاکیزہ خصائل تا بعدار اور فرمانبردار بندی کی سرگزشت ہے نہ کہ ان کے زعم کے مطابق نعوذ باللہ خدا کی ماں کی!

اس کے بعد حضرت زکریا کی دعا کی قبولیت کا ذکر ہے کہ باوجودیکہ وہ خود بڑھاپے کی آخری منزل میں داخل ہو چکے تھے اور ان کی بیوی بھی بانجھ تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی بشارت دی اور وہ اس بشارت کے بموجب پیدا ہوئے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خارقِ عادت ولادت اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک نشانی ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جس کی ولادت اسباب کے عام ضابطے کے خلاف ہو اس کو خدا یا اوتار بنا دیا جائے۔ اگر نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کی خارقِ عادت ولادت کی دلیل پر ان کو خدا بنا بیٹھے تو یہ دلیل تو حضرت یحییٰؑ کے حق میں بھی موجود ہے!

اس روشنی میں اب ابطالِ نصرانیت کی اس تمہید کو پڑھیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۳۳-۴۴

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٣٣﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾ إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٥﴾

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا
وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَ
إِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٣٦﴾ فَتَقَبَّلَهَا
رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا
كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا
قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ
يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٧﴾ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ
قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ
الدُّعَاءِ ﴿٣٨﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ
أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا
وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٣٩﴾ قَالَ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي
غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ قَالَ كَذَٰلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ
مَا يَشَاءُ ﴿٤٠﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ
النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا وَاذْكُرْ رَبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ
بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴿٤١﴾ وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ ع
اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ ﴿٤٢﴾
يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿٤٣﴾
ذَٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۖ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿٤٤﴾

ترجمۂ آیات ۳۳-۴۴

اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو اہل عالم کی رہنمائی کے لیے منتخب فرمایا۔ یہ ایک دوسرے کی ذریت ہیں۔ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۳۳-۳۴

یاد کرو جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ اے میرے رب جو بچہ میرے پیٹ میں ہے میں نے اس کو ہر چیز سے چھڑا کر تیرے لیے خاص کیا، سو تو اس کو میری طرف سے قبول فرما، بے شک تو ہی ہے جو سننے والا جاننے والا ہے۔ تو جب اس نے اس کو جنا تو اس نے کہا کہ اے رب یہ تو میں لڑکی جنی ہوں ــــ اور اللہ کو خوب پتا تھا اس چیز کا جو وہ جنی تھی ــــ اور لڑکا لڑکی کی مانند تو نہیں ہوتا، اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ تو اس کے رب نے اس کو اپنی پسندیدگی کی قبولیت سے نوازا، اس کو عمدہ طریقے پر پروان چڑھایا اور زکریا کو اس کا سرپرست بنایا۔ جب جب زکریا محراب میں اس کے پاس جاتا وہاں رزق پاتا، اس نے پوچھا اے مریم یہ چیز تمھیں کہاں سے حاصل ہوتی ہے۔ اس نے کہا یہ اللہ کے پاس سے ہے۔ بے شک اللہ جس کو چاہے بے حساب فضل فرماتا ہے۔ ۳۵-۳۷

اس وقت زکریا نے اپنے رب کو پکارا۔ اس نے دعا کی اے میرے پروردگار! تو مجھے بھی اپنی جناب سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو دعا سننے والا ہے۔ تو فرشتوں نے اس کو ندا دی جب کہ وہ محراب میں نماز میں کھڑا تھا کہ اللہ تجھ کو یحیٰی کی خوش خبری دیتا ہے، جو اللہ کے ایک کلمہ کے مصداق، سردار، لذاتِ دنیا سے کنارہ کش اور زمرۂ صالحین

سے نبی ہوں گے۔ اس نے کہا اے میرے رب میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، میں تو بوڑھا ہو چکا اور میری بیوی بھی بانجھ ہے؟ فرمایا، اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس نے کہا اے میرے رب تو میرے لیے کوئی نشانی ٹھہرا دے۔ فرمایا تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا مگر اشارے سے۔ اور اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کیجیو اور صبح و شام اس کی تسبیح کیجیو۔ ۳۸ - ۴۱

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا۔ تم کو پاک کیا اور تم کو دنیا کی عورتوں پر ترجیح دی۔ اے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری میں لگی رہو اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے ساتھ سجدہ اور رکوع کرتی رہو۔ ۴۲ - ۴۳

یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تم کو وحی کر رہے ہیں اور تم ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی سرپرستی کرے اور تم اس وقت بھی ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ۴۴

۱۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىٓ اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۳۳ - ۳۴)

حضرت مسیحؑ کا خاندان۔

آدمؑ، نوحؑ اور ابراہیمؑ (علیہم السلام) یہ سلسلۂ نبوت و رسالت کے اساطین و عمائد ہیں۔ ان کا ذکر ہو گیا تو گویا نبوت کے پورے مبارک سلسلے کا ذکر ہو گیا۔ حضرت ابراہیمؑ کے ذکر کے ساتھ ان کے آل کے ذکر نے ان دونوں شاخوں کو جمع کر دیا جو ان سے پھوٹی ہیں، یعنی حضرت اسحاقؑ کی شاخ کا بھی، جس کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور حضرت اسماعیلؑ کی شاخ کا بھی جس میں خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ آلِ ابراہیم کے بعد آلِ عمران کا ذکر یہاں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اس خاندان مبارک کا ذکر ہے جس میں حضرت مریمؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ عمران بن ماثان، حضرت مریمؑ کے والد ماجد کا نام ہے۔

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جد امجد ہیں۔ اس سارے شجرے کے ذکر سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ حضرت عیسیٰ بھی اسی سلسلۂ مبارک کی ایک کڑی ہیں، ان کی والدہ، ان کے نانا اور ان کے دوسرے اجداد سب معلوم ہیں۔ یہ سارے خاندان ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ اور ایک دوسرے کی ذریت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پھر اسی خاندان سے اٹھے ہوئے ایک شخص کو الوہیت کے مقام پر پہنچا دینے کے کیا معنی؟

'وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو نبوت و رسالت کے لیے انتخاب فرمایا، یہ انتخاب تمام تر سمع و علم پر مبنی تھا، اس نے جن کو اس منصب کے لیے اہل پایا ان کو اس کے لیے انتخاب فرمایا۔ اس چیز کا انحصار تمام تر اہلیت و صلاحیت اور اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت پر ہے، اس میں کسی خاندان کے شرف ذاتی کو کوئی دخل نہیں ہے، جیسا کہ شرف نسبی کے گھمنڈ میں مبتلا ہونے والوں نے گمان کیا۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۳۵)

حضرت مریمؑ کی ابتدائی سرگزشت

اوپر کی آیت میں آل عمران کا شجرۂ نسب واضح کرنے کے بعد اب یہ حضرت مریمؑ کی ولادت کا ذکر فرمایا کہ جب یہ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھیں تو ان کی والدہ۔ عمران کی بیوی نے یہ منت مانی تھی کہ اس پیدا ہونے والے بچے کو اللہ تعالیٰ کے لیے نذر کر دوں گی۔ کسی بچے کو اللہ تعالیٰ کے لیے نذر کرنے کا مقصد بنی اسرائیل میں یہ ہوتا تھا کہ اس کو معبد کی خدمت کے لیے خاص کر دیا جائے گا۔

'مُحَرَّرًا' کے معنی ہیں آزاد کر کے۔ یعنی بڑے ہونے پر اس بچے پر گھر در اور کمانے کھلانے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی، اس کی ساری زندگی صرف بیت المقدس کی خدمت ہی کے لیے وقف ہوگی۔ آگے آ رہا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ کو توقع لڑکے کی ولادت کی تھی لیکن پیدا ہوئی لڑکی۔ یہ چیز ان کے لیے موجب تردد ہوئی کیونکہ ہیکل کی خدمت کے لیے لڑکیوں اور عورتوں کے لینے کا رواج نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کی والدہ کی نذر قبول فرمائی اور وہ ہیکل میں داخل کر لی گئیں ــــ حضرت مریمؑ کی یہ ابتدائی سرگزشت اور آگے کے حالات کے بیان کرنے سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ جس اللہ کی بندی کی زندگی پیدا ہونے کے پہلے ہی سے خدا اور اس کے ہیکل کی خدمت اور اللہ کی عبادت و اطاعت کے لیے وقف ہو چکی تھی اور پیدا ہونے کے بعد سے دم واپسیں تک اس کے لیے وقف رہی یہ کیسی خرد باختگی ہے کہ اس کو خدا کی بندی کے بجائے نعوذ باللہ خدا کی ماں بنا دیا گیا۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (۳۶)

'اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی' سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ کو، جیسا کہ اوپر گزرا، توقع فرزند

کی ولادت کی تھی اور اسی توقع پر انھوں نے منت مانی تھی لیکن ولادت، توقع کے خلاف، لڑکی کی ہوگئی۔ اس پر انھوں نے اپنے رب کے حضور اپنے تردد کا اظہار فرمایا کہ یہ تو میں لڑکی جنی ہوں اور بہر حال وہ بچہ جس کو میں نے تیری نذر گمان کیا تھا، میرے خیال کے مطابق لڑکا تھا، یہ لڑکی اس کا بدل تو نہیں ہوسکتی لیکن اس پر بھی اگر تو یہ نذرِ حقیر قبول فرمالے تو یہ تیرا فضل ہی فضل ہوگا۔

'وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ' (اور اللہ خوب جانتا تھا اس چیز کو جو وہ جنی تھی) یہ حضرت مریمؑ کی والدہ کی بات کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جملہ معترضہ ہے۔ والدۂ مریمؑ کا یہ کہنا کہ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی (میں تو یہ لڑکی جنی ہوں) نومولود سے متعلق ایک کہتری کے احساس کی غمازی کر رہا تھا اور انھیں اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنا یہ ہدیہ بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت درجہ رافت و رحمت سے یہ واضح فرمایا کہ والدۂ مریمؑ تو مریمؑ کو ایک لڑکی ہونے کی بنا پر نہایت حقیر چیز سمجھ رہی تھیں لیکن اللہ کو خوب علم تھا کہ لڑکی کی صورت میں ان کے پیٹ سے کیسی عظیم اور بابرکت ہستی ظہور میں آئی ہے!

'وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی' یہ والدۂ مریمؑ کی بات کا حصہ ہے اور اس کا مطلب وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یعنی کہاں وہ لڑکا جو ذہن میں تھا اور کہاں یہ لڑکی جو وجود میں آئی۔ یہ اس کا بدل تو نہیں ہوسکتی تاہم تو قبول فرمالے تو تیری نوازش۔

'وَاِنِّیْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ' یہ دعا والدۂ مریمؑ کی طرف سے مریمؑ اور ان کی اولاد کے لیے ایک فطری چیز ہے۔ مقصود اس ذکر سے یہ ہے کہ جس لڑکی کی ماں اپنی لڑکی اور اس کی اولاد کے لیے یہ دعا مانگتی ہے اور جس کو خدا کے حضور نذر کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اس درجہ کہتری کا احساس اس کے اندر پیدا ہوتا ہے اسی کو نصاریٰ بعد میں خدا کی ماں کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ قرآن کا مقصد اس ساری سرگزشت کے پیش کرنے سے یہی ہے کہ واقعات کی اصل نوعیت سامنے لاکر وہ لوگوں کو دکھائے کہ کس طرح سیدھے سادے واقعات کو ایک افسانہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۷)

حضرت مریمؑ کا روحانی فضل و کمال

'فَتَقَبَّلَهَا الآیۃ' یعنی والدۂ مریمؑ کو ان کے لڑکی ہونے کی بنا پر جو احساس تھا اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے اپنے حسنِ قبولیت سے ان کو نوازا، ان کی تمام عقلی، اخلاقی، روحانی صلاحیتیں خوب پروان چڑھیں۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فضل ہوا کہ ان کی کفالت و تربیت کی ذمہ داری حضرت زکریاؑ نے اٹھائی جو حضرت مریمؑ کے خالو بھی تھے اور اس دور میں بیت المقدس کے اسرائیلی اصطلاح میں کاہنِ اعظم بھی۔

'کُلَّمَا دَخَلَ عَلَیۡهَا زَکَرِیَّا الۡمِحۡرَابَ وَجَدَ عِنۡدَهَا رِزۡقًا' محراب سے مراد یا تو معبد کا وہ حصہ ہو جو عورتوں کی عبادت اور اعتکاف کے لیے مخصوص تھا یا کوئی خاص گوشہ اور حجرہ جو حضرت مریم کے لیے خاص کیا گیا ہو۔ بیت المقدس میں اس طرح کے حجرے اور گوشے عبادت گزاروں کے لیے بنے ہوئے تھے۔ 'کُلَّمَا دَخَلَ عَلَیۡهَا زَکَرِیَّا الۡمِحۡرَابَ' سے بیک وقت دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت زکریا حضرت مریم کی دیکھ بھال کے لیے اکثر ان کے پاس جاتے رہتے تھے، دوسری یہ کہ حضرت مریم اپنا سارا وقت محراب میں، ذکر و عبادت میں، گزارتی تھیں۔

'وَجَدَ عِنۡدَهَا رِزۡقًا' سے حضرت مریم کے غیر معمولی روحانی کمال کا اظہار ہو رہا ہے کہ حضرت زکریا جیسے صاحب کمال بھی ان کے پاس جاتے تو ان کے کمالِ روحانی کے نفحات محسوس کرتے یہاں تک کہ ایک روز وہ استعجاب و تحسین کے طور پر یہ بھی پوچھ بیٹھے کہ اے مریم! یہ چیزیں تمھیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔

'رزق' سے مراد حکمت و معرفت ہیں

'رزق' سے مراد یہاں حکمت و معرفت ہے۔ قرآن نے وحی و ہدایت کے لیے یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال کیا ہے۔ تورات اور انجیل میں بھی یہ تعبیر موجود ہے۔ حضرت مسیح کا ارشاد مشہور ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمے سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔ آگے والی آیت میں آرہا ہے کہ حضرت زکریا حضرت مریم کی علم و معرفت کی باتوں سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے پیرانہ سالی میں، بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود، اپنے لیے بھی ایسی ہی اولاد صالح کی دعا مانگی ــــ ظاہر ہے کہ حضرت زکریا جیسے صاحبِ معرفت کو سیب و انگور والا رزق اس درجہ متاثر نہیں کر سکتا تھا کہ وہ یہ کرشمہ دیکھ کر اولاد کی دعا شروع کر دیں۔ اس طرح کی باتیں اربابِ کمال کے ہاں کوئی خاص درجہ و مرتبہ نہیں رکھتی ہیں۔ حضرت زکریا جیسے صاحبِ کمال تو متاثر ہو سکتے تھے تو کسی ایسے ہی رزق روحانی سے متاثر ہو سکتے تھے جو خود ان کی اشتہائے روحانی کو بھی بھڑکا دے، جس کو دیکھ کر وہ بھی عش عش کر اٹھیں اور جوان کے اندر بھی یہ تمنا پیدا کر دے کہ کاش ان کی نسل سے بھی کوئی اس کمال کا حامل اٹھے۔

'اَنّٰی لَکِ هٰذَا' (یہ چیزیں تمھیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں؟) بغرضِ استفسار و تحقیق نہیں بلکہ بطور استعجاب و تحسین کے ہے۔ جب کسی کا کمال اس کی عمر کے اعتبار سے بہت زیادہ اور متکلم کے گمان و خیال سے بہت بڑھ کر ہو تو اس طرح کا استعجاب قدرتی ہے۔ یہ استعجاب اظہارِ تحسین کا ایک اسلوب ہے۔ اس سے حضرت زکریا کی تواضع اور قدر دانی کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ اپنی ایک زیرِ تربیت لڑکی کو، جس کی عمر ابھی کچھ بھی نہیں ہے، اس کی صلاحیتوں پر کس فیاضی سے داد دے رہے ہیں۔ حضرت مریم کا جواب 'هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ' بھی اس کم سنی میں ان کی پختگی عقل کا شاہد ہے کہ انھوں نے اس سب کو اللہ کا فضل و احسان قرار دیا، اس کو اپنے زہد و ریاضت کا کرشمہ نہیں قرار دیا۔ 'اِنَّ اللّٰهَ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ' ہمارے نزدیک حضرت مریم کے جواب کا حصہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے حضرت مریم کی تحسین اور اپنے فضل بے پایاں کا اظہار ہے۔ بِغَيْرِ حِسَابٍ کا مفہوم ہم اوپر واضح کر آئے ہیں۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۖ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ (۳۸)

حضرت یحییٰؑ کی ابتدائی سرگزشت

'هُنَالِكَ' سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ حضرت مریم کی حیرت انگیز حکمت و معرفت سے حضرت زکریا اس درجہ متاثر ہوئے کہ اولاد کی آرزو جو ان کے اندر دبی ہوئی تھی وہ دفعۃً بھڑک اٹھی کہ کاش حکمت و معرفت کا کوئی ایسا ہی وارث اللہ تعالیٰ ان کو بھی بخشے۔ چنانچہ اس کے لیے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ مِن لَّدُنكَ کے الفاظ سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اپنے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کی وجہ سے ظاہری حالات کو تو وہ غیر مساعد پا رہے تھے لیکن اللہ تعالیٰ سے یہ امید رکھتے تھے کہ وہ اگر چاہے تو اس کے فضل و قدرت سے ایک بوڑھے کی تمنا بھی بر آ سکتی ہے اور ایک بڑھیا بانجھ کی گود بھی ہری ہو سکتی ہے۔ اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں، اصل چیز تو خدا کی قدرت اور اس کی عنایت ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ (۳۹)

ملائکہ کے جمع لانے کی وجہ

مَلٰٓئِكَةُ کا لفظ یہاں اور خاص اس سیاق میں جہاں جہاں بھی آیا ہے جمع کی صورت میں آیا ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ حضرت زکریا نے ہاتفِ غیبی کی ندا سنی، تعین کے ساتھ انھوں نے فرشتے کو نہیں پہچانا، اس ابہام کے سبب سے قرآن نے کسی خاص فرشتہ کے بجائے فرشتوں کا ذکر فرمایا ہے جس سے یہ بات تو نکلتی ہے کہ زکریا کو جو آواز سنائی دی وہ ملکوتی تھی لیکن ساتھ ہی اس بات کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ یہ محض ایک غیبی آواز تھی جو ان کے کانوں میں پڑی۔

'وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ' یعنی ہاتفِ غیبی کی یہ آواز انھیں اس وقت سنائی دی جب وہ حجرے کے اندر نماز میں کھڑے تھے، یہ ایک قرینہ تھا اس بات کا کہ یہ آواز ملکوتی ہی ہو گی اس لیے کہ نماز کی حالت فرشتے کے قرب و اتصال کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ ایک اور اشارہ اس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ دعا و مناجات اور اپنے رب سے راز و نیاز کے لیے سب سے زیادہ موزوں وقت وہ ہوتا ہے جب بندہ نماز میں ہوتا ہے۔ اسی سے نماز میں زندگی اور حرارت پیدا ہوتی ہے اور یہی نماز ہماری زندگی کا ربط براہِ راست ہمارے خالق و مالک سے قائم کرتی ہے۔ قرآن میں تمام مشکلات و مسائل کے اندر نماز کی جو تاکید پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کی جاتی ہے اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ زندگی کی مشکلات کے حل کی کلید اسی کے اندر ہے۔ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی نمازوں کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نمازیں فی الواقع خدا سے راز و نیاز کی نمازیں تھیں، ان کی تمام دعائیں اور فریادیں نماز کے

سجدوں اور قیام میں ہوتی تھیں اور وہ اپنی نمازوں سے جب اٹھتے تھے تو اپنے دامن اور اپنی جھولیاں بھر کے لوٹتے تھے ان کے لیے نماز زندگی کی ایک ایسی ہی ضرورت تھی جس طرح پیاسوں کو گھاٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری نمازوں کے اندر یہ شان باقی نہیں ہے۔ اب نمازیں صرف رسم داری کی نوعیت کی چیزیں ہو کر رہ گئی ہیں، زندگی سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے۔ اب ہم نمازیں تو بے جان اور بے شرح پڑھتے ہیں اور لمبی لمبی دعائیں نمازوں سے فارغ ہو کر مانگتے ہیں، حالانکہ مانگنے کا اصلی وقت نمازوں میں ہوتا ہے جب کہ بندہ اپنے رب کے حضور میں ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكَ بِیَحْیٰی الآیہ' یہ وہی حضرت یحییٰؑ ہیں جن کا نام انجیلوں میں یوحنا آیا ہے۔ انجیلوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت عیسٰیؑ سے صرف چھ ماہ پہلے پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ان کی تین خصوصیات بیان کی گئی تھیں۔

'کلمۃ من اللہ' کی تصدیق

ایک یہ کہ وہ 'مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ' ہوں گے، یعنی اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ کی تصدیق کریں گے اور اس کی بشارت دیں گے۔ 'بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ' سے مراد حضرت عیسٰی علیہ السلام ہیں۔ چنانچہ آگے آیت ۴۵ میں تصریح کے ساتھ ان کا ذکر اسی لقب سے ہوا ہے یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ ۴۵۔ آل عمران (اے مریم اللہ تم کو اپنے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے جس کا نام عیسٰی بن مریم ہوگا) حضرت عیسٰیؑ کو کلمۃ اللہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ولادت اسباب کے عام ضابطے کے خلاف اللہ تعالیٰ کے کلمہ کن سے ہوئی۔ 'کلمۃ' کی تنکیر سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان گنت کلمات میں سے حضرت عیسٰیؑ بھی ایک کلمہ ہیں۔ جس طرح اس کائنات کی بے شمار چیزیں مجرد کلمہ 'کن' سے ظہور میں آئی ہیں اسی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام بھی اس کلمہ سے ظہور میں آئے ہیں۔ اس سے نصاریٰ کے ایک دعوے کی تردید ہو رہی ہے۔ وہ یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ کلمۃ اللہ صرف حضرت مسیحؑ ہیں اور پھر اس سے ان کی الوہیت کا عقیدہ ثابت کرتے ہیں۔

'بِكَلِمَةٍ' کی 'ب' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں تصدیق کا لفظ بشارت کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے۔ یعنی حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسٰیؑ کی تصدیق بھی کریں گے اور ان کی بشارت بھی دیں گے۔ انجیلوں سے ثابت ہے کہ انھوں نے یہ دونوں فرض انجام دیے۔ انھوں نے خود اپنی زندگی کا جو مشن واضح کیا وہ یہی تھا کہ وہ آنے والے کی راہ صاف کرنے آئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس مشن کی تکمیل کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ ان کی زندگی سراپا سیدنا مسیحؑ کی تصدیق تھی۔ ان کی ولادت بھی سمجھیے کہ ایک پہلو سے حضرت مسیحؑ کی ولادت کی طرح خارق عادت ہی تھی۔ زہد و توکل اور تجرد میں بھی گویا وہ اپنے بعد آنے والے کا نقش اوّل تھے اور منادی تو انھوں نے جس شان سے حضرت عیسٰیؑ کی کی ہے واقعہ یہ ہے کہ اس سے دشت و جبل گونج اٹھے۔

نبی اپنی فطرت اور دعوت کے لحاظ سے سردار ہوتا ہے

دوسری یہ کہ وہ "سید" ہوں گے۔ سید کے معنی سردار کے ہیں۔ نبی اپنی فطرت، اپنی دعوت اور اپنے مشن کے لحاظ سے سردار ہوتا ہے۔ وہ داعی بن کر لوگوں کو پکارتا، منذر بن کر لوگوں کو جگاتا اور ہادی و مرشد بن کر لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کام کے لیے وہ قدرت کی طرف سے تمام لوازم و اسلحہ سے مسلح ہوتا ہے۔ اس کا سینہ خلق کے لیے شفقت و رافت سے لبریز ہوتا ہے، اس کے کلام میں بے پناہ سطوت و جلالت ہوتی ہے، اس کی آواز اور اس کے انداز میں ہیبت ہوتی ہے، اس کی تابناک پیشانی اس کی عظمت و صداقت کی گواہی دیتی ہے۔ اگرچہ وہ کمل کی پوشاک پہنتا ہو اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں پر گزارہ کرتا ہو لیکن اس کے رعب و دبدبہ سے بادشاہوں پر لرزہ طاری ہوتا ہے[1]۔ وہ حق کے لیے ان کو بھی اسی طرح سرزنش کرتا ہے جس طرح دوسروں کو کرتا ہے۔ انجیلوں میں حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں حضرات کے متعلق آتا ہے کہ وہ 'بااختیار' کی طرح بات کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے کلام میں بااختیاری کی یہ شان ان کی اس منصبی سرداری ہی کا ایک جلوہ تھی۔ اس کی تحویل میں قدرت کی طرف سے ایک گلہ بھی ہوتا ہے جس کی چرواہی اس کے سپرد کی جاتی ہے اور اس بات سے اس کی حیثیت عرفی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ گلے نے اس کی اطاعت کی یا نہیں کی۔ اگر اس نے اپنا فرض ادا کیا تو اس نے سرداری کا حق ادا کر دیا اور یہی اس سے مطلوب ہوتا ہے۔

اس نقطے سے اس گمان کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے کہ حضرت یحییٰؑ کوئی راہب تھے اور ان کی زندگی خلق سے الگ تھلگ تھی۔ وہ اپنی ذات کے معاملے میں بلاشبہ زاہد تھے لیکن ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ اس توبہ کی منادی کے لیے وقف تھا جس کے لیے وہ مامور ہوئے تھے اور اسی راہ میں انھوں نے اپنا سر کٹوا دیا۔

'حصور' کا مفہوم

تیسری یہ کہ وہ 'حصور' ہوں گے۔ حصور، حصر سے فعول کے وزن پر ہے جس کے لغوی معنی ہوں گے اپنے آپ کو گھیرے رکھنے والا۔ یہیں سے اس کا استعمال اس شخص کے لیے ہوا جو لذات دنیا سے منقطع اور اپنے آپ کو کامل ضبط میں رکھنے والا ہو۔ یوں تو یہ ضبطِ نفس اس سرداری کی خصوصیات میں سے ہے جس کا ذکر اوپر ہوا اس لیے کہ جو اپنے آپ کو ضبط میں رکھ سکے گا وہی خلق کو بھی ضبط میں رکھنے والا بن سکے گا۔ لیکن حضرت یحییٰؑ و حضرت مسیحؑ دونوں نبیوں کی زندگیاں بالکل درویشانہ تھیں، انھوں نے زندگی کی ان لذتوں سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جو عام حالات میں کسی درجے میں بھی داخل دنیاداری نہیں قرار دی جا سکتیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے حالات خاص تھے۔ ان کے

---

[1] انجیل میں ہے کہ حضرت یحییٰ کمل کی پوشاک پہنتے تھے اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں پر گزارہ کرتے تھے لیکن وقت کے حکمران کو انھوں نے اس کی ایک بیہودگی پر سخت سرزنش کی۔

زمانے میں یہود پر دنیا کی محبت اتنی غالب آگئی تھی کہ ان کا رخ موڑنے کے لیے ان کو زندگی کا ایک بالکل زاہدانہ و درویشانہ نمونہ رکھنا پڑا۔ یہ علاج بالضد کی ایک شکل ہے جو جسمانیات کی طرح روحانیات و اخلاقیات میں بھی خاص حالات میں اختیار کرنی پڑتی ہے۔ مقصود تو اس سے یہ ہوگا کہ یہ امت بالتدریج اس نقطۂ اعتدال کو اختیار کرنے کے قابل بنے جو بالآخر اللہ کے آخری دین میں ان کے سامنے آنے والا تھا لیکن نصاریٰ نے ان کے اس زہد کو رہبانیت کا رنگ دے دیا اور بعد کے زمانوں میں رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔

نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ کا مفہوم

چوتھی یہ کہ وہ نبی ہوں گے۔ نبی کا مفہوم واضح ہے۔ البتہ اس کے ساتھ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ کی جو وضاحت ہے اس سے مقصود ان کے زمرے کو بتانا ہے کہ وہ باہمہ صفات و کمالات تھے زمرۂ صالحین ہی میں سے۔ یہ نہیں ہے کہ ان کو الوہیت کا کوئی مقام حاصل ہو گیا ہو۔ درآنحالیکہ کمالات و فضائل کے علاوہ حضرت عیسیٰ سے رشتہ داری کا تعلق بھی رکھتے ہیں اور ان کی ولادت بھی حضرت عیسیٰ کی ولادت سے بہت مشابہ ہے بلکہ انجیلوں سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انھی نے حضرت عیسیٰ کو بپتسمہ دیا اور حضرت عیسیٰ نے ان کی بابت فرمایا کہ ماؤں نے جن کو جنا ان میں یوحنا سے بڑا کوئی نہیں۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (۴۰)

سوال طلب تصدیق کے لیے

یہ سوال تعجب یا شک یا انکار کی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ یہ نہایت حسین و بلیغ انداز سے طلب تصدیق ہے۔ ان کے سامنے اس بشارت کے ظاہر ہونے میں جو رکاوٹیں تھیں وہ بیان کر کے حضرت زکریا نے چاہا کہ یہ تصریح کرالیں کہ ان رکاوٹوں کے باوجود یہ بشارت ظاہر ہونے کی شکل یہ ہوگی۔ کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ۔ یہ بات یوں ہی ہوگی۔ یعنی اللہ کا ارادہ یوں ہی ہے کہ یحییٰ کی ولادت بوڑھے باپ اور بانجھ ماں کے ہاں ہو۔ اصل چیز اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی ہے۔ اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اللہ چاہے تو پتھر کے اندر سے پانی کے چشمے جاری ہو سکتے ہیں اور صحرا کے سینے سے حباب اٹھ سکتے ہیں۔ قرآن میں اس قسم کا سوال و جواب حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت میں بھی منقول ہے۔ اس کی نوعیت بھی بعینہٖ یہی ہے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَۃً ؕ قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْکُرْ رَّبَّکَ کَثِیْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِ (۴۱)

اس بات کی نشانی کہ یہ بشارت من جانب اللہ ہے

حضرت زکریا نے یہ باتیں ایک ہاتف غیبی سے سنی تھیں اور اچھی ساعت اور اچھے حالات میں سنی تھیں اس وجہ سے ان کو گمان تو یہی تھا کہ یہ بشارت من جانب اللہ ہی ہے۔ لیکن وہ نہایت متواضع، متقی اور محتاط بندے تھے اس وجہ سے دل کے ایک گوشے میں کھٹک یہ بھی تھی کہ ممکن ہے

یہ اپنے ہی گنبدِ دل کی صدائے بازگشت سنائی دی ہو، ممکن ہے اس کے اندر نفس کی مخفی آرزوؤں کو کوئی دخل ہو جس سے شیطان نے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو، اس وجہ سے انھوں نے اپنے رب سے درخواست کی کہ اے رب میرے لیے کوئی ایسی نشانی ٹھہرا دے جس سے مجھے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ بشارت تیری ہی طرف سے ہے، اس میں نفس یا شیطان کا کوئی دھوکا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمائی اور فرمایا کہ تمھارے لیے نشانی یہ ہے کہ تم تین شبانہ روز کسی سے کوئی بات زبان سے نہ کر سکو گے، صرف اشارے سے کر سکو گے، البتہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی تسبیح کر سکو گے سو اس دوران میں زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کرنا اور شام و صبح اپنے پروردگار کی تسبیح میں مشغول رہنا۔

ظاہر ہے کہ ایک خاص مدت کے لیے آدمی پر ایک ایسی حالت کا طاری ہو جانا کہ وہ زبان سے کوئی دنیوی قسم کی بات تو نہ کر سکے لیکن تسبیح و تہلیل کر سکے کسی شیطانی تصرف کا نتیجہ نہیں ہو سکتی، یہ ہو سکتی ہے تو رحمانی تصرف ہی کا کرشمہ ہو سکتی ہے۔ کسی شیطانی اثر سے یہ بات پیدا ہوتی تو اس کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ظاہر ہونا تھا، یعنی آدمی اپنی دنیا داری کی باتیں تو کر سکتا لیکن اللہ اللہ کرنا اس پر شاق گزرتا۔ اگر حضرت زکریا پر یہ حالت غیر اختیاری طور پر طاری کر دی گئی تو یقیناً یہ اس بات کی ایک قطعی نشانی تھی کہ ان کو بیٹے کی جو بشارت ملی ہے من جانب اللہ ہے، اس میں شیطانی دھوکے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں ضمناً اس بات کی تردید بھی کر دی جو انجیل لوقا میں بیان ہوئی ہے کہ حضرت زکریا کو جو یہ حالت پیش آئی وہ ان کے اس جرم کی سزا کے طور پر تھی کہ انھوں نے فرشتے کی بات کا اعتبار نہ کیا اور سوال کر بیٹھے کہ مجھے اس کی کوئی نشانی دی جائے۔

جو لوگ قرآن کے اسلوبِ بیان سے اچھی طرح آشنا نہیں ہیں ان کو ممکن ہے یہ شبہ پیش آئے کہ آیت میں یہ تو مذکور ہے کہ تم تین دن کسی سے بجز اشارہ کے بات نہ کر سکو گے لیکن اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ ذکر و تسبیح کر سکو گے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ آیت میں اس تصریح کی جگہ تسبیح و تہلیل کی ہدایت رکھ دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہدایت اسی لیے کی گئی ہے کہ وہ یہ کام کر سکتے تھے۔ اگر اس ہدایت کے ساتھ وہ تصریح بھی ہوتی تو یہ ایک بے فائدہ طوالت ہوتی جو قرآن کی بلاغت کے شایانِ شان نہیں ہے۔

'بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ' اور اس قسم کے دوسرے اسالیب، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ احاطہ کے مفہوم پر دلیل ہوتے ہیں، جس طرح ہم بولتے ہیں صبح و شام، رات دن اللہ کو یاد رکھو۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ (۴۲-۴۳)

'اِصْطِفَاء' کے معنی چھانٹنے اور انتخاب کرنے کے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کا [illegible]

حضرت مریمؑ کا اصطفا کس کام کے لیے تھا

کا اپنے کسی بندے کو کسی کارِ خاص کے لیے منتخب کر لینا ہے۔ حضرت مریم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ یہ نشانی ایک بہت بڑی خدائی امانت بھی تھی جو ان کے سپرد ہونے والی تھی اور ساتھ ہی ایک عظیم ابتلا بھی۔ یہ چیز اس بات کی متقضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اس بارِ امانت کے اٹھانے کے لیے ان کی خاص تربیت فرمائے تاکہ وہ آنے والے مراحل میں حالات کا مقابلہ کرنے کی اہل بن سکیں۔ اسی تربیت کو یہاں تطہیر سے تعبیر فرمایا ہے۔ پھر اس اصطفا کے متعلق تصریح فرمائی کہ یہ اصطفا کوئی معمولی اصطفا نہیں تھا بلکہ یہ تمام عالم کی عورتوں پر تھا۔ اصطفا کے بعد علیٰ کا صلہ جب آتا ہے تو اس کے اندر ترجیح اور فضیلت کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم امانت سپرد کرنے کے لیے تمام دنیا کی عورتوں میں سے انھیں کا انتخاب فرمایا۔ یہ ایک ایسا شرف ہے جس میں حضرت مریم کا کوئی شریک وسہیم نہیں۔

اس بارِ امانت کی تیاریوں کے لیے ہاتفِ غیبی نے ان کو ہدایت کی کہ اُقْنُتِیْ لِرَبِّكِ الآیۃ قنوت کے معنی دوسرے مقام پر ہم واضح کر چکے ہیں کہ پوری نیازمندی اور پورے تذلل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف جھک جانے کے ہیں۔ اس نیازمندی اور تذلل کا بہترین اظہار نماز میں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے بعد وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ گویا وَاقْنُتِیْ کے اجمال کی تفصیل ہوئی۔ بلاغت کا یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ ہے کہ نماز کا ذکر یہاں اس کے اہم اجزا سے ہوا ہے۔ یہ اسلوب قرآن نے جہاں جہاں اختیار کیا ہے اس سے نماز کے استغراق و انہماک، اس کی مداومت اور اس کے لیے اضطراب و بیقراری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نکتے کی خدا نے چاہا تو ہم آیت تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا کی تفسیر کرتے ہوئے وضاحت کریں گے۔ اس کے ساتھ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ کی قید باجماعت کی اہمیت کو بھی واضح کرتی ہے اور یہ اس نماز کی تصویر بھی ہے جس کی سعادت حضرت مریمؑ کو حاصل تھی۔ وہ چونکہ ہیکل ہی میں معتکف تھیں اس وجہ سے انہیں خلوت کی نمازوں کے ساتھ ساتھ جماعت کی نمازوں کی برکات بھی حاصل تھیں۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ (۴۴)

ایک التفات

یہ ایک آیت اثنائے کلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت رکھتی ہے۔ آپ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ غیب کی باتیں ہیں یعنی تمہارے علم و اطلاع سے باہر کی ہیں اس لیے کہ نہ تو یہ ساری باتیں تورات و انجیل ہی میں موجود ہیں اور نہ تم شخصاً ہی ان واقعات کے پیش آنے کے وقت موجود تھے، پھر اس صحت و صداقت کے ساتھ تمہارا ان واقعات کا پیش کرنا کہ اہل کتاب کی بھی آنکھیں کھل جائیں بغیر اس کے کس طرح ممکن ہوا کہ اللہ نے تم کو منصبِ رسالت سے نوازا اور شرفِ وحی سے ممتاز کیا۔ یہ اہل کتاب پر تمہاری نبوت و رسالت کی ایک بہت بڑی حجت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انجیلوں میں اہل کتاب کی تاریخ کا یہ حصہ تقریباً غائب ہے، بس کچھ غیر مربوط باتیں لوقا میں حضرت یحییٰؑ کے متعلق ملتی ہیں اور بعض اشارات حضرت مریمؑ کے متعلق، اور سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ حضرت مریم کا ذکر جو ہے بھی وہ ایک عام عورت کا ذکر معلوم ہوتا ہے، علاوہ یہ ہے کہ انجیل کے بعض مقامات سے تو یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ بھی ان کا اس طرح احترام نہیں کرتے تھے جس طرح ماں کا احترام کرنا چاہیے۔ عیسائیوں نے عقیدے کے طور پر چاہے حضرت مریمؑ کو جو درجہ بھی دیا ہو لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کا اصلی اور حقیقی شرف قرآن ہی نے نمایاں کیا ہے۔ آگے مناسب مقامات پر ہم اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

حضرت مریمؑ کے معاملہ میں قرعہ اندازی کی نوعیت

اقلام سے مراد قرعے کے تیر ہیں۔ جوئے کے تیروں کا استعمال تو شریعت میں حرام ہے لیکن قرعے کے لیے تیروں کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں ہے، حقوق مساوی ہونے کی صورت میں تصفیہ نزاع کے لیے قرعے کا طریقہ بالکل جائز ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ قرعہ اندازی کا یہ طریقہ صرف حضرت مریمؑ کی کفالت ہی کے باب میں اختیار کیا گیا یا دوسرے زیر تربیت خدام ہیکل کے لیے بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ ہمارے نزدیک دونوں ہی باتوں کا امکان ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ تمام نووارد خدام کی کفالت کا فیصلہ اسی طریقہ سے ہوتا رہا ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ حضرت مریم کا معاملہ لڑکی ہونے کی وجہ سے خاص نزاکت کا حامل تھا اس وجہ سے قرعہ سے اس کا فیصلہ کیا گیا ہو۔ قرعہ ایک اشارۂ غیبی پر بھی محمول کیا جاتا ہے۔ ہیکل میں اس کے خدام کے فرائض کی تقسیم کے لیے قرعہ کا طریقہ رائج تھا۔ لوقا میں ذکر ہے کہ جس روز حضرت زکریا کو بیٹے کی بشارت ملی ہے اس روز جس خدمت پر وہ مامور تھے اس کا فیصلہ قرعہ ہی کے ذریعے ہوا تھا۔

جھگڑا کس بات کے لیے تھا؟

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ، میں جس جھگڑے کا ذکر ہے اس کا تعلق صرف حضرت مریم کی سرپرستی سے نہیں معلوم ہوتا، ایسا ہوتا تو اس کا ذکر الگ کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کو بھی پہلے جھگڑے ہی کے تحت آنا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ جھگڑا خدام ہیکل میں اس سوال پر ہوا ہو گا کہ ایک لڑکی ہیکل کے زمرۂ خدام میں شامل ہو سکتی ہے یا نہیں؟ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ اس کی روایت ہیکل کی تاریخ میں کم از کم معروف نہیں تھی۔ اس وجہ سے یہ سوال موجب نزاع ہو سکتا تھا۔ ویسے یہ بات بھی بعید نہیں ہے کہ محض تنافس فی الخیر اس جھگڑے کا باعث ہوا ہو اس لیے کہ ایک ایسی لڑکی کی کفالت جو معبد کی خدمت کے لیے وقف کی جا رہی ہو اور جس کی قبولیت روز اول سے نمایاں ہو، ایک بہت بڑی سعادت تھی جس سے محروم ہونا ہیکل کے خدام میں سے کوئی بھی پسند نہ کر سکتا تھا۔

۱۳۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۵-۶۳

اب وہ اصل بات آ رہی ہے جو درحقیقت سورہ کا عمود ہے۔ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ

اس سورہ میں خطاب نصاریٰ سے ہے اور مقصود ان پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں حقیقتِ حال کا اظہار ہے۔ اوپر خاندانِ عمران کا شجرہ، حضرت مریم کی ولادت اور ان کے بارے میں ان کی ماں کی نذر، حضرت زکریا کی بیٹے کے لیے دعا اور حضرت یحییٰؑ کی ولادت کے واقعات جو بیان ہوئے ہیں، سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کی تمہید و تقریب کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔ اب آگے یہ بیان ہو رہا ہے کہ جس طرح فرشتے نے حضرت زکریا کو بیٹے کی بشارت دی تھی اسی طرح فرشتے نے حضرت مریم کو بھی بشارت دی کہ ان کے ہاں اللہ کے کلمہ 'کن' کے ذریعے سے ایک فرزند کی ولادت ہوگی جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ جس طرح حضرت یحییٰؑ کے بابت ارشاد ہوا کہ وہ سردار، ضابط، نبی اور صالح ہوں گے اسی طرح عیسیٰؑ بن مریم کے بابت فرمایا کہ دنیا اور آخرت دونوں میں باوقار، مقرب اور صالح ہوں گے پھر جس طرح حضرت زکریا نے اپنے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ پن کے باعث اس بشارت پر تعجب کا اظہار کیا اسی طرح حضرت مریم نے بھی تعجب کا اظہار فرمایا کہ جب انھیں کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا تو انھیں اولاد کس طرح ہوگی۔ فرشتے نے جو جواب حضرت زکریا کو دیا تھا وہی جواب حضرت مریم کو دیا کہ اصل چیز اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اس کو ہو جانے کا حکم دیتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی کلمہ 'کن' کے ذریعے سے وہ مسیح عیسیٰ بن مریم کو پیدا کرے گا اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا اور ان کو بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول بنا کر بھیجے گا۔

اس کے بعد تین آیتوں میں حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے وہ ابتدائی پیغام ہے جو انھوں نے اپنی رسالت کے اثبات اور اس مقصد کے اظہار کے طور پر بنی اسرائیل کو دیا ہے۔

پھر دو آیتوں میں اس امر کا بیان ہے کہ جب بنی اسرائیل کے علما اور فقیہوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے آپ کو مایوس کر دیا تو آپ نے ان کو چھوڑ کر ان غریبوں کو اپنا معتمد اور ساتھی بنایا جو ان پر ایمان لائے تھے اور انھی کو اللہ کے دین کی نصرت و حمایت کے لیے کمربستہ ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ یہی غریب لوگ آپ کے ساتھی بنے اور حضرتؑ نے انھی کو تبلیغِ دین کی مہم پر روانہ کیا۔

اس کے بعد چار آیتوں میں اس ردِ عمل کا ذکر ہوا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی اس آخری کوشش کا بنی اسرائیل کے لیڈروں، فقیہوں اور فریسیوں پر ہوا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی مدد فرمائی اور آئندہ مدد فرمانے کا وعدہ کیا اس کا حوالہ ہے۔

اس کے بعد پانچ آیتیں التفات کی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ واضح فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اصل حقیقت یہ ہے جو بیان ہوئی ہے۔ اگر اس وضاحت کے بعد بھی نصاریٰ تم سے حجت کرتے رہیں تو ان سے کہو کہ آؤ مباہلہ کریں، اگر وہ اس سے بھی گریز کریں تو سمجھ لو کہ یہ پکے مفسد ہیں، ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔۔۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت کیجیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۴۵–۶۳

إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ
مِنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ
وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٤٦﴾ قَالَتْ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي
وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ ۖ قَالَ كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا
يَشَاءُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٤٧﴾
وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ﴿٤٨﴾
وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ
مِنْ رَبِّكُمْ ۖ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ
الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ
وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ
وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ ۚ
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٤٩﴾ وَ
مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ
بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۚ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ
فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿٥٠﴾ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ
هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿٥١﴾ فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ
قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ

اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا
بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾
وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ ع
يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ
فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا
لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ
نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾ اِنَّ مَثَلَ
عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ
قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ
الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَمَنْ حَاۗجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ
الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاۗءَنَا وَاَبْنَاۗءَكُمْ وَنِسَاۗءَنَا
وَنِسَاۗءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ
اللّٰهِ عَلَي الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ ھٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا
مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا

فَإِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٣﴾

ع ۶ / ۱۴

ترجمۂ آیات ۴۵-۶۳

یاد کرو، جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تمھیں اپنی طرف سے ایک کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں ذی وجاہت اور اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہوگا۔ وہ لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرے گا اور ادھیڑ ہو کر بھی اور وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوگا۔ وہ بولی کہ اے میرے پروردگار میرے کس طرح لڑکا ہوگا جب کہ کسی مرد نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ارشاد ہوا، اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ جب وہ کسی امر کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور حکمت، تورات اور انجیل سکھائے گا اور اس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا، چنانچہ اس نے بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ میں تمھارے خداوند کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں ـــــ میں تمھارے لیے مٹی سے پرندوں کی صورت کے مانند صورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مار دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے واقعی پرندہ بن جاتی ہے اور میں اللہ کے حکم سے اندھے اور کوڑھی کو اچھا اور مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور میں تمھیں بتا سکتا ہوں جو کچھ تم کھاتے اور ذخیرہ کرتے ہو اپنے گھروں میں، بے شک ان باتوں کے اندر تمھارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو۔

اور میں مصداق ہوں اپنے سے پیشتر سے آئی ہوئی تورات کا اور اس لیے آیا ہوں کہ بعض ان چیزوں کو تمھارے لیے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں اور میں تمھارے پاس تمھارے خداوند کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے تمھارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ یہی

سیدھی راہ ہے۔ ۴۵-۵۱

پس جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے کفر کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار! ہم آپ گواہ رہیئے کہ ہم مسلم ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے اس چیز پر جو تو نے اتاری اور ہم نے رسول کی پیروی کی سو تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ۔ ۵۲-۵۳

اور انھوں نے خفیہ چالیں چلیں تو اللہ نے بھی ان کا خفیہ توڑ کیا اور اللہ بہترین توڑ کرنے والا ہے۔ جب کہ اللہ نے کہا کہ اے عیسیٰ میں تمھیں قبض کر لینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان سے تمھیں پاک کرنے والا ہوں۔ جن لوگوں نے تمھاری پیروی کی ہے ان کو قیامت تک کے لیے ان لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں جنھوں نے تمھارا انکار کیا ہے۔ پھر میری طرف تم سب کا پلٹنا ہوگا اور میں تمھارے درمیان ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کو سخت عذاب دوں گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے تو ان کو ان کا پورا اجر دے گا اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۵۴-۵۷

یہ ہم تمھیں سنا رہے ہیں اپنی آیات اور اپنی پر حکمت یاددہانی میں سے۔ عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے۔ اس کو مٹی سے بنایا، پھر اس کو امر کیا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا۔ یہی بات تمھارے رب کی طرف سے حق ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ سو جو تم سے اس بارے میں حجت کریں بعد اس کے کہ تمھارے پاس صحیح علم آچکا ہے تو ان سے

کھو کر آؤ، ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں، تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو جمع کریں تم اپنی عورتوں کو جمع کرو، ہم اپنے آپ کو اکٹھا کریں تم اپنے آپ کو اکٹھا کرو، پھر ہم مل کر دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت بھیجیں۔ بے شک یہی سچا بیان ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ ہی عزیز اور حکیم ہے۔ پس اگر وہ اعراض کریں تو اللہ مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔ ۵۸-۶۳

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ (۴۵)

'اذ' کا اعادہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں جو بات کہی جا رہی ہے یہ اس سے الگ ہے جو اوپر کہی گئی۔ پہلے حضرت مریم کو دعا اور عبادت میں مشغول ہو جانے کی تاکید ہوئی پھر کچھ عرصے کے بعد فرشتہ یہ بشارت لے کر حضرت مریم کے پاس آیا۔

'کلمہ' کا مفہوم اور اس کے نکرہ لانے کا فائدہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ یہاں موقع کی رعایت سے ایک نکتہ توجہ کے لائق ہے۔ وہ یہ کہ اصل بشارت تو یہ تھی کہ حضرت مریمؑ کے ہاں بغیر مرد کی ملاقات کے مجرد اللہ تعالیٰ کے امر و حکم سے ایک بیٹا ہو گا لیکن بات حضرت مریم سے کہی جا رہی تھی جو کنواری بھی تھیں اور شرم و حیا کی پیکر بھی۔ اس وجہ سے نہایت اختصار بلکہ ابہام کے ساتھ صرف کلمہ کی بشارت دی گئی۔ البتہ آگے حضرت عیسیٰؑ کے نام اور صفات کے ذکر سے بات واضح ہو گئی کہ کلمہ سے مراد کیا ہے۔

'مسیح' لقب ہے:

'مسیح' حضرت عیسیٰؑ کا لقب ہے۔ لقب کے لیے قاعدہ یہ ہے کہ نام سے پہلے اس کو لاتے ہیں۔ بنی اسرائیل میں یہ روایت رہی ہے کہ ان کے ہاں جو نبی ہونے والا ہوتا اس کے سر پر اس کا پیشرو نبی ایک قسم کا مقدس تیل مل کر اس کو اپنا جانشین بناتا۔ جب نبوت کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں بادشاہی کا سلسلہ شروع ہوا تو مسح کرنے کی یہی روایت بادشاہوں کے لیے بھی اختیار کی گئی۔ جو وقت کا نبی ہوتا وہ ہونے والے بادشاہ کے سر پر مقدس تیل ملتا جس سے واضح ہو جاتا کہ یہ مستقبل کا بادشاہ بھی ہے اور عنداللہ برگزیدہ بھی۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت اور حضرت داؤدؑ کو سموئیل نبی نے اسی طرح مامور کیا تھا۔ حضرت مسیحؑ کے بارے میں انجیلوں سے یہ تو ثابت ہے کہ حضرت یحییٰؑ نے ان کو بپتسمہ دیا لیکن تیل ملنے

کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ پیدائشی مسیح تھے۔ بخاری شریف میں ان کا جو حلیہ بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سر کا حال یہ تھا کہ گویا اس سے تیل ٹپک رہا ہے۔ ممکن ہے ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے ان کو مسیح کا لقب عنایت ہوا ہو۔ انجیل میں ان کے لیے "خدا کا مسیح" کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

وجیہ کا مفہوم حضرت مسیح کی وجاہت کے بعض پہلو

"وجیہ" کے لفظ سے اس سرداری کی شان کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جس کا ذکر اوپر حضرت یحییٰؑ کے بیان میں گزر چکا ہے۔ لوقا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ سال کی عمر میں حضرت مسیحؑ نے پہلی بار ہیکل میں تعلیم دی لیکن اس کم سنی کے باوجود ان کی تعلیم کی حکمت و معرفت، کلام کی بلاغت و جزالت اور لب و لہجہ کی عظمت و جلالت کا عالم یہ تھا کہ فقیہ اور فریسی، سردار کاہن اور ہیکل کا تمام عملہ دم بخود رہ گیا۔ وہ حیرانی کے عالم میں ایک ایک سے پوچھتے پھرتے تھے کہ یہ کون ہے جو اس شکوہ سے بات کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے اس کو اختیار ملا ہوا ہے۔ یہودیہ کی بستیوں میں جب انھوں نے تبلیغ شروع کی تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل مچ گئی، خلقت ان پر ٹوٹی پڑتی تھی۔ فقیہ اور فریسی سب پر ایک سراسیمگی کا عالم تھا، وہ ان کو زچ کرنے اور عوام میں ان کی مقبولیت کم کرنے کے لیے ان سے طرح طرح کے سوالات کرتے لیکن سیدنا مسیحؑ دو دو لفظوں میں ان کو ایسے دندان شکن جواب دیتے کہ پھر ان کو زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی وجاہت کا یہ غلغلہ ہوا کہ عوام ان کو اسرائیل کا بادشاہ کہنے اور ان کی بادشاہی کے گیت گانے لگے، یہاں تک کہ رومی حکام ــ ہیرودیس اور پیلاطوس ــ کے سامنے بھی یہ مسئلہ ایک نہایت اہم مسئلہ کی حیثیت سے آگیا لیکن وہ بھی اپنی تمام قوت و جبروت کے باوجود سیدنا مسیحؑ کی عظمت و صداقت اور ان کی بے پناہ مقبولیت سے مرعوب ہو گئے۔

اس وجاہت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ باوجودیکہ سیدنا مسیحؑ بن باپ کے پیدا ہوئے اور بن باپ کے پیدا ہونے والے کسی بچے کے لیے عام حالات میں کسی عزت و وجاہت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن سیدنا مسیحؑ چونکہ اللہ تعالیٰ کے کلمۂ کن سے پیدا ہوئے تھے اس وجہ سے اس کا معجزانہ اثر یہ ظاہر ہوا کہ روز اول سے ان کو خلق کی نگاہوں میں وہ وجاہت حاصل رہی جو اس عہد میں کسی کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ زندگی بھر اپنے جانی دشمنوں میں گھرے رہے لیکن اس پہلو سے کسی کو ان پر طعن کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہود کے ایک گروہ نے اگر جسارت بھی کی تو بعد کے زمانوں میں کی، ان کے عہد مبارک میں کسی کو بھی اس قسم کی جرأت نہ ہو سکی۔ ان کی اس وجاہت کی بشارت ان کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ہی حضرت مریمؑ کو اس لیے دی گئی کہ ان کو اس پہلو سے کوئی خلجان نہ ہو کہ بن باپ کے پیدا ہونے کے سبب سے بچے کی یا خود ان کی وجاہت پر کوئی اثر پڑے گا۔

اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے ان تمام خرافات کی تردید ہو رہی ہے جو انجیلوں میں مذکور ہیں کہ یہودیوں نے سیدنا مسیح کے نعوذ باللہ طمانچے لگائے، ان کا مذاق اڑایا، ان کو گالیاں دیں، ان کے منہ پر تھوکا۔ ان خرافات کا اکثر حصہ، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے، غلط ہے۔ اللہ کے رسولوں کے دشمن ان کی توہین و تحقیر کی جسارت تو کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ڈھیل بھی مل جاتی ہے لیکن یہ ڈھیل بس ایک خاص حد تک ہی ہوتی ہے، جب کوئی قوم اس حد سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے اور اس ناہنجار قوم کا بیڑا غرق کر دیا جاتا ہے۔ آگے اس سنت اللہ کی ہم وضاحت کریں گے۔

حضرت مسیحؑ ابن مریم ہیں: اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کو ابن مریم کہہ کر قرآن نے ان لوگوں کے لیے گفتگو کی ہر گنجائش ختم کر دی ہے جو نہایت کمزور تاویلات کے ذریعے سے قرآن کے نہایت واضح نصوص کی تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ اگر حضرت عیسیٰؑ کسی باپ کے بیٹے تھے تو آخر قرآن کو مسیح بن مریم کہنے کے بجائے ان کے باپ کی طرف ان کی نسبت کرنے میں کیا رکاوٹ تھی؟ قرآن بھی مسیحؑ بن یوسف کہہ سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ آخر کیوں نہیں کہا؟

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۴۶)

حضرت مسیحؑ کا کلام گہوارے میں: سیدنا مسیحؑ کا گہوارے میں بات کرنا حضرت مریم کی پاکدامنی کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ تھا۔ اس معجزے کی بشارت بچے کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ہی حضرت مریم کو اس لیے دے دی گئی کہ وہ مطمئن رہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگر اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے ان کو واسطہ بنایا ہے تو ان کے ناموس کو اعدا کی بدزبانیوں سے بچانے کے لیے بھی اس نے ایسا انتظام فرمایا ہے کہ کسی تہمت کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ اپنی ایک مومنہ و قانتہ بندی کو ساری خدائی کی تہمتوں کا ہدف بنا دے اور اس کی مدافعت میں کوئی ایسی زبان نہ کھولے جو سب کی زبانیں بند کر دے۔

کہل کا مفہوم: 'کہل' کے معنی ادھیڑ کے ہیں۔ موجودہ انجیلوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ادھیڑ ہونے سے بہت پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے لیکن قرآن کی اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو ضمناً حضرت عیسیٰؑ کے کہولت تک پہنچنے کی بھی بشارت دی گئی تھی۔ رسولوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت رہی ہے اس کے لحاظ سے یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ انجیل میں بھی بعض اشارات اس کی تائید میں ہیں۔ مثلاً یوحنا ۸ : ۵۷ میں ہے۔

"اور یہودیوں نے اس سے کہا تیری عمر تو ابھی پچاس برس کی بھی نہیں ہے پھر کیا تو نے ابرہام کو دیکھا ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ بات ایسے ہی شخص کو خطاب کر کے کہی جا سکتی ہے جو پچاس سال کے قریب پہنچ رہا ہو۔

گہوارے میں کلام کے ساتھ ان کے کہولت کے کلام کا حوالہ دینے سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ان کی گہوارے کی بات بچوں کی سی نہیں ہوگی بلکہ اس کے اندر بھی پختہ سن وسال کی دانائی ہوگی اس لیے کہ یہ بات من جانب اللہ ہوگی۔

آخر میں وَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ فرما کر جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ واضح کر دیا کہ وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوں گے یعنی ان تمام کمالات و اوصاف کے باوجود یہ نہیں ہے کہ ان کو الوہیت کا کوئی درجہ حاصل ہو جائے بس وہ اللہ کے صالح بندوں میں سے ہوں گے۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۴۷)

آیت ۴۵ کے تحت اس آیت کے اہم اجزا کی وضاحت گزر چکی ہے۔ البتہ اس میں اس کلمہ کی وضاحت بھی ہو گئی ہے جس سے حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی۔ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (اللہ جب کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کو حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے)

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (۴۸)

انجیل مجموعۂ حکمت ہے

تورات اور انجیل کے الفاظ یہاں کتاب اور حکمت کی تفسیر کے طور پر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان دونوں چیزوں کی تعلیم دے گا۔ سیدنا مسیح جہاں تک کتاب و شریعت کا تعلق ہے حضرت موسیٰ کی شریعت ہی کے پیرو اور داعی تھے، وہ تورات سے کوئی الگ شریعت لے کر نہیں آئے تھے۔ اس حقیقت کا اعلان بار بار بڑے زور اور تاکید کے ساتھ انھوں نے خود فرمایا ہے۔ انجیلوں میں ان کی تصریحات موجود ہیں۔ البتہ انھوں نے اس شریعت کی روح اور اس کی حکمت نہایت معجزانہ انداز میں بے نقاب فرمائی ہے اور اناجیل درحقیقت ان کی انھی حکمتوں کا مجموعہ ہیں۔ یہود نے تورات کو بالکل بے روح احکام اور بے جان رسوم کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا تھا اس وجہ سے ان کی شریعت زندگی سے بالکل خالی ان کے لیے صرف ایک بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔ حضرت مسیح نے اس کے اندر اپنی تعلیم حکمت سے زندگی پیدا کی لیکن یہود نے اس کی قدر نہ کی۔

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔــةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۴۹)

نبی اور رسول میں فرق

وَرَسُوْلًا سے پہلے ایک فعل محذوف ہے۔ یعنی یَبْعَثُہٗ رَسُوْلًا سیدنا مسیح حضرت یحییٰ کی طرح صرف ایک نبی نہیں تھے بلکہ جس طرح حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اسی طرح یہ بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ رسول اور نبی میں فرق ہوتا ہے رسول جس قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے اس کے لیے خدا کی عدالت بن کر آتا ہے۔ اس کے لازماً اس قوم کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ایمان لاتی ہے تو نجات پاتی ہے اور اگر اپنے کفر پر اڑی رہ جاتی ہے اور اپنے نبی کو گزند پہنچانے کی کوشش کرتی ہے تو فنا کر دی جاتی ہے۔ اس حقیقت کی طرف حضرت یحییٰؑ نے مختلف اسلوبوں سے اشارہ فرمایا تھا۔ مثلاً یہ کہ ”میں تو تمھیں پانی سے بپتسمہ دے رہا ہوں، پر جو آرہا ہے وہ تمھیں آگ سے بپتسمہ دے گا“، یا یہ کہ ”اب درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے“، یا یہ کہ، ”اس کے ہاتھ میں اس کا چھاج ہوگا اور وہ اپنے کھلیان کو اچھی طرح پھٹکے گا اور گندم کو بھس سے علیحدہ کرے گا“، اس کی پوری تفصیل دوسرے مقام میں آئے گی۔

اس سے حضرت عیسیٰ کی رسالت کا بنی اسرائیل کے لیے خاص ہونا بھی واضح ہو گیا۔ سیدنا مسیح کا خود اپنا اعلان بھی یہی ہے۔ انھوں نے جب اپنے حواریوں کو تبلیغِ دین کی مہم پر روانہ کیا تو ان کو غیر اسرائیل کی طرف جانے سے نہایت صاف لفظوں میں روک دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ”میں صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں ہی کی تلاش کے لیے آیا ہوں“۔ ایک غیر اسرائیلی عورت ان سے دعائے شفا کی طالب ہوئی تو انھوں نے اس جواب میں یہی کہا کہ ”بچوں کے حصے کی روٹی کتوں کے آگے ڈالنا ٹھیک نہیں“۔ انجیل میں ضیافت والی جو تمثیل ہے اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ آپ کی دعوت جن معروفات پر مبنی تھی یہ معروفات بنی اسرائیل کے لیے دلیل و حجت بن سکتے تھے لیکن دوسری قوموں کے لیے ان کا سمجھنا ممکن نہیں تھا۔ اس وجہ سے یہ دعوت اپنی فطرت ہی کے لحاظ سے دوسری قوموں کے لیے بالکل ناموزوں تھی۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ دوسری قوموں نے، جن کے سامنے یہ دعوت پیش کی گئی، اس کو بالکل نہیں سمجھا۔ انھوں نے انجیلوں سے بس یہ سمجھا کہ حضرت عیسیٰ نے بے شمار معجزے دکھائے ہیں۔ اس کا جو اثر ان پر پڑا وہ یہ کہ انھوں نے ان معجزات کے بل پر ان کو ایک معبود بنا کر رکھ دیا۔

سرگزشتوں کے بیان میں غیر ضروری حصے کا حذف

اِنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ: یہاں رَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ کے بعد حضرت مسیح کی سرگزشت کا وہ سارا حصہ حذف ہے جو اس بشارت اور ان کے عملاً بنی اسرائیل کے سامنے دعوتِ رسالت لے کر اٹھنے کے درمیان کی مدت سے تعلق رکھنے والا ہے۔ قرآن نے انبیا علیہم السلام کی سرگزشتوں کے بیان میں حذف کا یہ طریقہ بہت استعمال کیا ہے۔ اسی کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاری کی توجہ کلام کے اصل مقصد پر مرکوز رہتی ہے، کوئی زائد چیز بیچ میں مخل نہیں ہونے پاتی۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ ان کے مقصدِ بعثت کو واضح کر دینے کے بعد گویا ان کو داعی بنا کر بنی اسرائیل کے سامنے کھڑا کر دیا کہ انھوں نے ان کو یہ دعوت

دی اور اپنی رسالت کے ثبوت میں یہ نشانیاں دکھائیں۔

تورات اور قرآن کے بیان کا ایک فرق

یہاں جو معجزات مذکور ہیں ان میں سے پہلے اور آخری کے سوا انجیل میں بھی سب مذکور ہیں۔ البتہ قرآن میں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ باذن اللہ کی قید لگی ہوئی ہے لیکن انجیل میں اس قسم کی تصریحات غائب ہیں۔ اس لیے کہ جب حضرت عیسیٰ کے لیے خدا کا تصور پیدا ہوا ہوگا تو اس قسم کے الفاظ خدائی کے تصور سے بے جوڑ سمجھ کر نکال دیے گئے ہوں گے۔ لیکن یہ لوگ کہاں کہاں حقائق کو چھپاتے، ان کی ساری کوششوں کے علی الرغم آج بھی انجیلوں میں توحید خالص کی ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ان روشن شواہد کے ہوتے ہوئے نصاریٰ شرک میں کس طرح مبتلا ہو گئے؟ آگے بعض چیزوں کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

نکرہ وحدت کے لیے نہیں بلکہ تعمیم کے لیے

'جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ' لفظ آیت کی تنکیر وحدت کو نہیں بلکہ تعمیم کو ظاہر کرتی ہے۔ یعنی میں اپنی رسالت کے ثبوت میں اپنے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی تعداد کیا ہے۔

• وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ (۵۰)

'مصدقا لما بین یدی' کے دو مفہوم

'مُصَدِّقًا' ہے تو حال لیکن یہ محض مشابہت کی وجہ سے سابق جملے پر عطف ہو گیا ہے۔ اس کے دو مفہوم ہیں اور ان دونوں مفہوموں کی دوسرے مقام میں ہم وضاحت کر چکے ہیں۔ ایک یہ کہ میں تورات کی تصدیق کرتا ہوں۔ اس تصدیق کے شواہد انجیلوں میں موجود ہیں۔ حضرت مسیح نے بڑے زور اور بڑی تاکید کے ساتھ یہ بات بار بار فرمائی ہے کہ میں تورات کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ اس کو قائم کرنے آیا ہوں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن اس کا (تورات کا) ایک نقطہ بھی نہیں ٹل سکتا جب تک ہر بات پوری نہ ہو لے۔ انھوں نے عملاً جس شریعت کی خود پیروی کی اور جس کی پیروی کی ہدایت اپنے پیرؤوں کو دی وہ تورات ہی کی شریعت تھی۔ انھوں نے تورات پر جو اضافہ فرمایا ہے وہ شریعت کا نہیں بلکہ صرف حکمت کا ہے اور اس اضافے کی نوعیت یہ ہے کہ انھوں نے تورات کے اس باطن کو کھول دیا ہے جس سے یہود کے علما اور فریسیوں کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کے نام لیواؤں نے تورات سے بغاوت کا اعلان تو پال کے زمانے سے کیا ہے۔

دوسرا یہ کہ میں تورات کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہوں، میرے ظہور سے ان کی تصدیق ہوئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیشرو نبیوں سے ایسی پیشین گوئیاں موجود تھیں جن کی بنا پر یہود کو ایک نبی کی بعثت کا انتظار تھا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کی شہرت ہوئی تو بہت سے حلقوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ جس کا انتظار تھا وہ آ گیا۔ بعض لوگ اس منتظر کا نام ایلیا لیتے تھے۔ انجیلوں میں حضرت یوحنا کے متعلق بھی منقول ہے کہ جب وہ ہیرودیس کے حکم سے جیل میں تھے تو انھوں نے اپنے چند شاگردوں کو

حضرت مسیحؑ کی خدمت میں بھیج کر پچھوایا کہ وہ جس کا انتظار رہتا تھا تو ہی ہے، یا ہم کسی اور کا انتظار کریں؟ حضرت مسیحؑ نے پیغام لانے والوں سے کہا کہ جو کچھ دیکھ رہے ہو وہ جا کر بتا دو کہ لنگڑے چل رہے ہیں، گونگے بول رہے ہیں، اندھے دیکھ رہے ہیں، اب اور کس بات کا انتظار ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے متعدد ایسی باتوں کا خود بھی حوالہ دیا ہے جو ان کے بارے میں پچھلے نبیوں نے فرمائی ہیں، یہ حوالے انجیلوں میں موجود ہیں۔

حضرت مسیح کا حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھیرانا

'وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ' یہ جملہ بھی معنی پر عطف ہے۔ بعض حرام کردہ چیزوں کے حلال کرنے سے ان چیزوں کو حلال کرنا مراد ہے جو علمائے یہود نے محض اپنے من گھڑت فتووں اور اپنے غلو کی وجہ سے حرام کر رکھی تھیں اور یہ چیزیں روایت بن کر شریعت میں داخل ہو گئی تھیں۔ مثال کے طور پر سبت کے احترام کے مسئلہ کو لیجیے۔ اس حکایت کو یہود کے فقیہوں اور فریسیوں نے اس قدر بڑھا دیا تھا کہ سبت کے دن کسی مریض کو شفا کی دعا دینا بھی ان کے نزدیک احترام سبت کے منافی تھا چنانچہ احترام سبت کے مسئلے پر حضرت مسیحؑ اور علمائے یہود کے درمیان متعدد مناظروں کا ذکر انجیلوں میں بھی ہے۔ اسی طرح متعدد ایسی روایات کا بھی انجیلوں میں ذکر ہے جن کو سیدنا مسیحؑ اور ان کے شاگردوں نے علانیہ توڑا اور جب ان کے توڑنے پر علمائے یہود نے ان پر بے دینی کا الزام لگایا تو آپؑ نے ان کی اس جھوٹی دینداری کی اچھی طرح قلعی کھولی۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۵۱)

خدا کے لیے 'اب' کے استعمال کی حقیقت

انجیلوں میں خدا کے لیے میرا باپ اور تمھارا باپ، کی جو تعبیر بار بار آتی ہے یہ قرآن نے اس کی تصحیح فرمائی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دراصل جو بات فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی، سو اسی کی بندگی کرو۔ لیکن نصاریٰ نے متشابہات کی پیروی کی اور آپؑ کی واضح تعلیمات کو نظر انداز کر دیا۔ عبرانی میں 'اب' کا لفظ باپ اور رب دونوں معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح ابن کا لفظ بیٹے اور عبد دونوں معنوں میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو سیاق و سباق متعین کرتا ہے کہ لفظ کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے لیکن جب نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا عقیدہ بنا لیا تو جو چیز بھی انھیں مفید مطلب نظر آئی اس کو انھوں نے اسی عقیدے کی تائید میں استعمال کر لیا قطع نظر اس سے کہ اس کا موقع و محل کیا ہے۔ پھر جب اصل انجیل کی جگہ صرف اس کے ترجمے رہ گئے تو ہر چیز کی تعبیر بھی یک قلم بدل کے کچھ سے کچھ ہو گئی لیکن ان ساری تحریفات کے باوجود آج بھی انجیل میں ایسی تصریحات موجود ہیں جن سے صاف واضح ہے کہ حضرت مسیحؑ جب خدا کو 'اب' کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد 'رب' ہی ہوتی ہے چنانچہ بعض مقامات میں انھوں نے دوسرے مترادف اس لفظ کے استعمال کر کے مطلب کو بالکل واضح کر دیا ہے چنانچہ یوحنا

باب ۲۰: ۱۸ میں ہے:-

لیکن میرے بھائیوں کے پاس جا کر ان سے کہہ کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں۔

اس ارشاد سے صاف واضح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جس معنی میں اللہ تعالیٰ کو اپنا 'اب' کہتے ہیں اس معنی میں وہ اس کو تمام خلق کا 'اب' کہتے ہیں اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ وہ اس لفظ کو اللہ تعالیٰ کی تعبیر کے لیے اس کی ربوبیت کے پہلو سے استعمال کرتے ہیں نہ کہ اس کے ساتھ اپنا نسبی رشتہ جوڑنے کے لیے علاوہ ازیں وہ خدا کے لیے خدا کی تعبیر بھی استعمال کرتے ہیں اور اس کو جس طرح دوسروں کا خدا کہتے ہیں اسی طرح اس کو اپنا بھی خدا کہتے ہیں۔

توحید صراط مستقیم ہے

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ یعنی خدا تک پہنچنے کی سیدھی راہ یہی ہے کہ اسی کو سب کا رب مانا جائے اپنا بھی اور دوسروں کا بھی اور اسی کی عبادت کی جائے۔ جن لوگوں نے دوسرے وسیلے اور واسطے بیچ میں پیدا کر لیے ہیں انھوں نے اس سیدھی راہ میں بہت سے کج پیچ پیدا کر لیے ہیں جن کے سبب سے وہ شرک و گمراہی کی وادیوں میں بھٹک گئے ہیں۔ یہ راہ بغیر کسی کجی و عوج کے ہے، یہ سیدھی خدا تک پہنچاتی ہے۔ نکرہ یہاں اس شاہراہ فطرت کی اہمیت و شان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (۵۲-۵۳)

'حواری' کا مفہوم

'حواری' کا لفظ عربی میں عبرانی سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے لغوی مفہوم میں اہل لغت کا اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے معنی خیر خواہ، حامی، ناصر اور مددگار کے ہیں۔ جس طرح لفظ 'انصار' مدینہ کے ان جانثاروں کے لیے خاص ہوا جنھوں نے ابتدائے دعوت ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اسی طرح 'حواریین' کا لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان خاص شاگردوں کے لیے استعمال ہوا جو آپ پر ایمان لائے، ہر قسم کے نرم و گرم حالات میں آپ کے ساتھ رہے، آپ نے پوری شفقت اور دل سوزی سے شب و روز جن کی تعلیم و تربیت کی اور جو بالآخر آپ کے داعی، نقیب اور آپ کے پیغام بر بن کر بنی اسرائیل کی ایک ایک بستی میں پہنچے۔ ان شاگردوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ انجیل میں موجود ہے۔

'انصار' کا مفہوم

'انصار' ناصر کی بھی جمع ہے اور نصیر کی بھی۔ معنی واضح ہیں۔ ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، معنی کے اعتبار سے انصار اور حواریین کے لفظ میں کچھ ایسا فرق نہیں ہے۔ چنانچہ اسی اشتراک معنوی کے پہلو سے حواریین کو قرآن نے، جیسا کہ ہم سورۂ صف میں بتائیں گے، انصار مدینہ کے سامنے بطور مثال پیش کیا ہے۔

آیت ۵۲ کا مطلب

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے علماء اور سرداروں کے رویے سے یہ محسوس کر لیا کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں تو انھوں نے اپنی ساری توجہ اپنے ان غریب ساتھیوں کی طرف پھیر دی جو اگرچہ منصب وجاہ نہیں رکھتے تھے لیکن دولت ایمان سے متمتع تھے۔ انبیا علیہم السلام کی یہ سنت رہی ہے کہ اول اول تو انھوں نے اپنی اپنی قوموں کے بااثر لوگوں کو جھنجھوڑنے اور جگانے کی کوشش کی ہے لیکن جب انھوں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ یہ خواب غفلت کے ماتے لوگ کروٹ بدلنے والے نہیں ہیں تو انھوں نے ان سرمستوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنی ساری توجہ اپنے غریب باایمان ساتھیوں پر مرکوز کر دی ہے۔ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار سے اعراض کرنے اور اہل ایمان کو تذکیر کرنے کی جو بار بار ہدایت ہوئی ہے وہ اسی مرحلے کی بات ہے۔ اور یہی مرحلہ ہے جس میں سیدنا مسیحؑ نے دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے مچھلیوں کے پکڑنے والو آؤ، میں تمھیں آدمیوں کا پکڑنے والا بناؤں۔

انبیاء کے کردار کا ایک پہلو

اس آیت سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ حالات کے بگاڑ اور قوم کی ہٹ دھرمی سے مایوس اور دل شکستہ نہیں ہوتے بلکہ خدا کی راہ میں وہ اپنی جدوجہد جاری رکھتے ہیں۔ اگر زور و اثر رکھنے والے لوگ ان کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ اپنے غریب، وفادار اور کمزور و بے اثر ساتھیوں ہی کو لے کر اپنا سفر شروع کر دیتے ہیں۔ حالات کی تاریکی ان کے اندر روشنی اور قوم کی بے مہری ان کے اندر مزید قوت اور عزم پیدا کرتی ہے۔ بقول

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

سورہ نوحؑ کی تفسیر میں انبیاء کے کردار کے اس پہلو پر ان شاء اللہ ہم تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ کا مفہوم

'مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ' سے ایک طرف تو اس جوشِ دعوت کا اظہار ہو رہا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، دوسری طرف ان کے اس اقدام اور اس عزم و جزم کا اظہار ہو رہا ہے جو اللہ کے سوا ہر معیت و رفاقت سے بالکل بے نیاز ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ دعوت کی اس للکار میں یہ مضمون بھی مضمر ہے کہ میں تو اپنے رب کی راہ پر، یہ دیکھو، چل کھڑا ہوا ہوں، اب جس کے اندر حوصلہ ہو وہ اس وادی پرخار میں میرا ساتھ دے۔

نبی کا یہ فیصلہ کن عزم مردوں کے اندر بھی زندگی کی لہر دوڑا دینے کا اثر رکھتا ہے۔ جن روحوں کے اندر کچھ صلاحیت ہوتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ بیدار ہو جاتی ہیں بلکہ تڑپ اٹھتی ہیں اور جب تڑپ اٹھتی ہیں تو برسوں کی منزل لمحوں میں طے کر لیتی ہیں۔ جو لوگ عربی کے ادا شناس ہیں ان کے لیے یہاں ایک نکتہ قابل ذکر ہے۔

زبان کا ایک نکتہ

حضرت مسیح علیہ السلام نے تو فرمایا کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ لیکن حواریین نے جو جواب دیا وہ یہ نہیں ہے کہ نَحْنُ اَنْصَارُکَ اِلَی اللّٰہِ بلکہ بے دھڑک جواب دیا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ۔ سیدنا مسیحؑ کے ارشاد

میں ڈالی اس مسافت کو واضح کر رہا ہے جو راہ اور منزل کے درمیان واقع ہے اور ایک داعی کی حیثیت سے ان کے شایانِ شان یہی تھا کہ اس راہ کی مشکلات اور درمیان کی مسافت سے آگاہ کر دیں لیکن حواریین نے اپنے جواب میں جوشِ فدویت کی ایک ہی جست میں گویا ساری مسافت طے کر لی ہے اور دعوتِ حق کے اس نازک مرحلے میں ان کے جذبۂ ایمان و اسلام کے شایان شان بات یہی تھی۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ حضرت مسیحؑ کے سوال میں تو بڑا اختصار ہے لیکن حواریین کے جواب میں بڑی تفصیل ہے۔ انھوں نے اپنے ایمان کا بھی اقرار کیا، اپنے مسلم ہونے پر بھی حضرت مسیحؑ کو گواہ ٹھہرایا، اور اپنے ایمان و اتباعِ رسول کے اقرار کے ساتھ خدا سے دعا بھی کی کہ ان کو حق کی شہادت دینے والوں میں لکھا جائے۔

نحن انصار اللہ کے مضمرات اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حواریین اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اللہ کے انصار میں سے ہونے کے معنی کیا ہیں اور یہ اجمال کن تضمنات و مضمرات پر مشتمل ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کے تقاضوں میں سے یہ ہے کہ خدا پر صدقِ دل سے ایمان لایا جائے، اس کے جملہ احکام کی بے چون و چرا پیروی کی جائے، جو کچھ اس نے اتارا ہے اس کو مانا جائے، اس کے بھیجے ہوئے رسول کی پیروی کی جائے اور قول، عمل، زندگی اور موت سے اس حق کی شہادت دی جائے جس کا خدا نے امین بنایا ہے یہی وہ شہادت ہے جو اگر جان دے کر دی جائے تو اصل شہادت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھیے کہ حواریین نے سیدنا مسیحؑ کو جس چیز پر خاص طور پر گواہ ٹھہرایا ہے وہ اپنا مسلم ہونا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ حواریین کے ذہن میں صرف اسلام اور مسلم کا تصور تھا، نصاریٰ اور نصرانیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ بات اس سورہ کے عمود سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم سورہ کے تمہیدی مباحث میں واضح کر چکے ہیں کہ اس سورہ کا عمود اسلام ہے۔

فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ، یہ اس بات کی دعا ہے کہ قیامت کے روز ان کا شمار حق کی شہادت دینے والوں میں لکھا ہو، حق کو چھپانے والوں میں نہ لکھا جائے۔ یہی شہادتِ حق وہ اصل ذمہ داری ہے جو ہر نبی کی امت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی جاتی ہے۔ نبی، جان کی بازی لگا کر امت پر اللہ کے دین کی گواہی دیتا ہے اور نبی کے بعد یہ امت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس حق کی گواہی، ہر طمع اور ہر خوف سے بے پروا ہو کر، خلق پر دے۔ یہ گواہی دل، زبان، قول، عمل اور جان و مال کی قربانی، ہر پہلو سے دینے کا مطالبہ ہے۔ اس شہادت کا ضد کتمانِ حق ہے جو شریعتِ الٰہی کے شدید ترین جرائم میں سے ہے۔ مذاہب کی تاریخ سے ثابت ہے کہ یہود اس جرم کے سب سے بڑے مجرم ہوئے ہیں اور یہ جرم من جملہ ان جرائم کے ہے جن کے سبب سے وہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کے مستحق قرار پائے۔ حواریین کی اس دعا کے باطن پر غور کیجیے تو محسوس ہو گا کہ اس میں یہود کی اس حق پوشی پر بالواسطہ تعریض بھی ہے۔

اس آیت کا مضمون تھوڑے سے تغیرِ الفاظ کے ساتھ سورۂ صف میں بھی بیان ہوا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ (۱۴)

اے ایمان والو، اللہ کے مددگار بن جاؤ، جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنتا ہے؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ تو بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کیا، پس ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابل میں مدد کی تو وہ ان پر غالب ہو گئے۔

یہاں یہ بات ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اللہ کی مدد سے مراد اللہ کے رسول اور اللہ کے اس دین کی تائید و حمایت ہے جس کو قائم کرنے کی دعوت لے کر اللہ کا رسول اٹھتا ہے۔ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ کے الفاظ سے خود اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی امداد سے بے نیاز ہونے کے باوجود اس کو اپنی امداد سے جو تعبیر فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام اللہ کو پسند ہے اور اس میں اس کے بندوں کی فلاح و بہبود ہے۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (۵۴)

لفظ مکر کا اصل مفہوم

'مکر' کے معنی ہیں کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی مخفی تدبیر کرنا۔ اس میں مذمت کا پہلو یہاں سے پیدا ہوا کہ مخفی تدابیر کا استعمال آدمی کی کمزوری کی دلیل ہے۔ چونکہ عام طور پر صورت یہی ہوتی ہے کہ خفیہ تدبیریں کمزور لوگ ہی استعمال کرتے ہیں اس وجہ سے اس کی مذمت کا پہلو ذہنوں پر غالب ہو گیا اور یہ گمان کیا جانے لگا کہ مکر لازماً مذموم ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ خفیہ تدبیر بعض حالات میں کسی مکر کرنے والے کے مکر کے توڑ یا اس کی سزا کے طور پر بھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ ایک خفیہ چالیں چلنے والے کے خلاف اگر کوئی علانیہ انتقامی کارروائی کی جائے تو وہ اس کو ظلم و زیادتی قرار دے گا اور حالات سے ناواقف اس کو حق بجانب ٹھہرائیں گے۔ اسی طرح کوئی مخفی تدبیر کسی سازشی دشمن کے خلاف بعض اوقات اس کو متنبہ کرنے کے لیے اختیار کرنی پڑتی ہے تاکہ اس پر یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی سازشیں مخفی نہیں ہیں، جن کے لیے وہ یہ جال بن رہا ہے وہ اس کے اس جال سے واقف ہیں۔ یہ چیز اس کو رسوا بھی کرتی ہے اور آئندہ کے لیے اس کو ایسی حرکتوں سے باز رکھنے میں بھی مددگار ہوتی ہے بشرطیکہ اس کے اندر سبق حاصل کرنے کی صلاحیت ہو۔ یہاں جس مکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اس سے مراد یہی مکر ہے جو حق کے دشمنوں کی سازشوں کے توڑ یا ان کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ اختیار فرماتا ہے۔ یہ تدبیریں ایسی تیر بہدف ہوتی ہیں کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور ساتھ ہی ان سے خلق کو

بے شمار برکتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ وَاللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح کو یہود کے شر سے بچانے کے لیے کیا تدبیر اختیار فرمائی تو اس کے جواب کے لیے موزوں موقع سورۂ نساء میں آئے گا۔

حضرات انبیاء کی زندگی کی ایک مشترک حقیقت

اس آیت میں جس بات کی طرف اشارہ ہے وہ تمام انبیا علیہم السلام کی زندگی کی ایک مشترک حقیقت ہے۔ تمام انبیا کی زندگی شہادت دیتی ہے کہ جب انھوں نے اپنی قوم کے اعیان و اکابر سے مایوس ہو کر اپنی پوری توجہ اپنے غریب ساتھیوں اور قوم کے عام لوگوں پر مرکوز کی ہے اور ان کی دعوت ان لوگوں کے اندر اپنے اثرات پھیلانے لگی ہے تو یہ اعیان و اکابر اس چیز کو اپنے اقتدار کے لیے ایک شدید خطرہ سمجھ کر نبی کے خلاف مختلف قسم کی سازشوں میں مصروف ہو گئے ہیں تاکہ اس کے قتل کا کوئی بہانہ پیدا کر کے اپنے خیال کے مطابق اس مصیبت سے پیچھا چھڑائیں۔

سیدنا مسیح کے خلاف

یہ مرحلۂ آزمائش یوں تو ہر نبی کی زندگی میں، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، پیش آیا ہے، لیکن ہم یہاں سیدنا مسیح سے متعلق یہود کے اعیان و اکابر کی بعض سازشوں کا ذکر کرتے ہیں۔

یہود کی سازشیں

انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے علما اور ان کے کاہنوں اور فقیہوں نے اس موقع پر آنحضرتؑ کے خلاف مختلف قسم کے جال پھیلائے۔

ایک تو انھوں نے آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر اسلاف کی روایات توڑنے اور بزرگوں کی توہین و تحقیر کا الزام لگایا تاکہ عوام کے جذبات ان کے خلاف بھڑکائے جا سکیں۔

دوسرا جال انھوں نے یہ بچھایا کہ اپنے مخصوص آدمی بھیج بھیج کر ان سے ایسے سوالات کیے جن کے جوابوں سے ان کے خلاف کفر و ارتداد کے فتوے کا مواد فراہم ہو سکے۔ یہ کام یہود کے فقیہوں اور فریسیوں نے بڑی سرگرمی سے انجام دیا اور سیدنا مسیحؑ کی تمثیلوں اور تشبیہوں کے اندر سے انھوں نے اپنی دانست میں وہ مواد فراہم کر لیا جس کی بنیاد پر ان کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دیا جا سکے۔

تیسرا یہ کہ اس زمانے میں چونکہ ملک پر سیاسی اقتدار رومیوں کا تھا اس وجہ سے ان کو بھڑکانے کے لیے مواد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلے تو خراج کی ادائگی سے متعلق سیدنا مسیح علیہ السلام سے سوالات کیے گئے جن سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ شخص لوگوں کو قیصر کو خراج دینے سے روکتا ہے۔ لیکن اس قسم کے سوالوں کے جواب سیدنا مسیح نے ایسے دندان شکن دیے کہ علمائے یہود اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ پھر انھوں نے یہ الزام لگایا کہ یہ شخص اسرائیل کا بادشاہ ہونے کا مدعی ہے۔ اس کے لیے حضرت مسیح کے بعض تمثیلی اقوال سے مواد حاصل کرنے اور اس کے ذریعہ سے رومی حکومت کو بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔

چوتھی تدبیر یہ کی گئی کہ سیدنا مسیح کے بارہ شاگردوں میں سے ایک شاگرد یہوداہ کو، جو منافق تھا، یہود نے رشوت دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ آنحضرتؑ کی مخبری کرے اور ان کو گرفتار کرائے۔

ان تمام سازشوں کی تفصیل انجیلوں میں موجود ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہ سارا مواد ایک مناسب ترتیب کے ساتھ یہاں جمع کر دیتے لیکن بہتر یہی معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن نے صرف اشارے پر اکتفا کیا ہے اسی طرح ہم بھی اشارات ہی پر اکتفا کریں۔

پیغمبر کی زندگی کا یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں وہ قوم کو چھوڑ کر اور اپنے دشمنوں سے اعلان براءت کر کے ہجرت کرتا ہے اور یہ ہجرت مختلف شکلوں میں، جن کی تفصیل اپنے مقام میں آئے گی، ظاہر ہوتی ہے۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۵۵)

حضرت مسیح کی حفاظت کے لیے تدبیر الٰہی

اب یہ بیان ہو رہا ہے اس بہترین مخفی تدبیر کا جو اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح علیہ السلام کو یہود کی سازش سے بچانے کے لیے اختیار فرمائی اور جس سے ان کی سازش کے تمام تار پود بکھر کر رہ گئے۔

توفی کے حقیقی اور مجازی مفہوم

تَوَفِّي کے اصل معنی عربی لغت میں الاخذ بالتمام کسی شے کے پورا پورا لے لینے یا کسی چیز کو اپنی طرف قبض کر لینے کے ہیں۔ موت دینے کے معنی میں اس لفظ کا استعمال حقیقۃً نہیں بلکہ مجازاً ہوا ہے۔ ایسے الفاظ جو اپنے حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، اپنے صحیح مفہوم کے تعین میں قرائن کے محتاج ہوتے ہیں۔

یہاں مندرجہ ذیل قرائن اس بات کے خلاف ہیں کہ اس کے معنی یہاں موت دینے کے لیے جائیں۔

قرائن جو اس بات کے خلاف ہیں کہ اس کے معنی موت دینے کے لیے جائیں

ایک یہ کہ یہ موقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدنا مسیح اور ان کے ساتھیوں کے لیے بشارت اور وعدۂ نصرت کا ہے۔ جملہ رسولوں کی سرگزشتیں اس امر کی شاہد ہیں کہ جب ان کی قوموں نے ان کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی حفاظت و نصرت کی بشارت دی ہے۔ یہاں بھی آیت پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ پوری آیت بشارت اور وعدۂ نصرت ہی کی ہے۔ اس سیاق و سباق میں آخر یہ کہنے کا کیا محل ہے کہ میں تمہیں موت دینے والا ہوں، یہ تو وہی چیز ہوتی جس کے خواہاں یہود تھے۔ فرق صرف ذریعے کا ہوتا کہ موت یہود کے ہاتھوں نہیں بلکہ قدرت کے ہاتھوں واقع ہوتی۔

دوسرا یہ کہ اگر اس لفظ سے یہاں موت دینا مراد ہے تو اس کے بعد رَافِعُكَ إِلَيَّ کے الفاظ بالکل غیر ضروری ہو کے رہ جاتے ہیں۔ آخر یہ کہنے کا کیا فائدہ کہ میں تمہیں موت دینے والا اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں۔ موقع دلیل ہے کہ یہاں مُتَوَفِّيكَ کے بعد رَافِعُكَ إِلَيَّ کے الفاظ تَوَفِّي کے مفہوم کو واضح کر رہے ہیں کہ تمہاری تَوَفِّي کی شکل یہ ہوگی کہ میں تمہیں اپنی طرف اٹھاؤں گا۔

تیسرا یہ کہ رَافِعُكَ إِلَيَّ کے معنی مجرد رفع درجات لینا صحیح نہیں ہے۔ اس صورت میں إِلَيَّ کا لفظ بالکل

بے ضرورت ہو کر رہ جاتا ہے اور قرآن میں کوئی لفظ بھی بے ضرورت استعمال نہیں ہوا ہے۔ اگر صرف درجے کی بلندی کا اظہار مقصود ہوتا تو عربیت کے لحاظ سے 'رَافِعُكَ' کافی تھا۔ 'اِلَیَّ' کی ضرورت نہیں تھی۔ قرآن میں دیکھیے جہاں بھی یہ لفظ بلندئ مرتبہ کے مضمون کے لیے استعمال ہوا ہے بغیر اِلٰی کے استعمال ہوا ہے، مثلاً

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (۲۵۳۔ بقرہ)	ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے بات کی اور بعض کے مدارج بلند کیے
وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (۱۷۶۔ اعراف)	اور اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے ذریعے سے اس کا رتبہ بلند کرتے لیکن وہ تو بس زمین ہی کی طرف جھک پڑا
وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (۵۷۔ مریم)	اور ہم نے اس کو فائز کیا اونچے درجے پر۔

اگر حرف 'اِلٰی' کا صحیح صحیح حق ادا کیا جائے اور یہ حق ادا کرنا ضروری ہے تو 'رَافِعُكَ اِلَیَّ' کے معنی یہ ہوں گے کہ میں تم کو عزت و اکرام کے ساتھ اپنی جانب اٹھا لینے والا ہوں۔

چوتھا یہ کہ قرآن نے دوسرے مقام میں جہاں یہ مضمون بیان کیا ہے وہاں 'مُتَوَفِّیْكَ' کا لفظ بالکل اڑا دیا ہے، قتل اور سولی کی نفی کے بعد جس چیز کا اثبات کیا ہے وہ صرف اٹھا لیے جانے کا ہے۔ 'بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ' (بلکہ اللہ نے اس کو اپنی جانب اٹھا لیا)۔ یہ اس بات کا نہایت واضح قرینہ ہے کہ قرآن نے 'تَوَفِّی' کی اصل شکل بتائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی جانب اٹھا لیا۔ آیت ملاحظہ ہو۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۱۵۷۔۱۵۸)	اور نہ انھوں نے اس کو قتل کیا اور نہ اس کو سولی دی بلکہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا وہ اس کی طرف سے شک میں ہیں، انھیں اس کے بارے میں کوئی علم نہیں، محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہیں اور انھوں نے اس کو قتل یقیناً نہیں کیا بلکہ اس کو اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ آیت سب سے زیادہ موزوں مقام اپنے اندر رکھتی تھی اس بات کے بیان کے لیے کہ حضرت عیسیٰؑ کی موت کس طرح ہوئی؟ اس لیے کہ یہاں قرآن نے بڑی تاکید اور شدت کے ساتھ ان لوگوں کی تردید کی ہے جو ان کے قتل یا ان کی سولی کے مدعی تھے۔ اگر آپ کی موت واقع ہوئی ہوتی تو اس موقع پر قرآن صاف صاف یوں کہتا کہ نہ ان کو قتل کیا گیا اور نہ ان کو سولی دی گئی بلکہ اللہ نے ان کو وفات دی۔ لیکن قرآن نے نہ صرف یہ کہ یہ کہا نہیں بلکہ یہاں 'تَوَفّٰی' کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا، صرف 'رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ' کا لفظ استعمال کیا۔ ہر صاحبِ ذوق اندازہ کر سکتا ہے کہ قتل اور سولی کی نفی کے بعد اس رفع سے موت مراد لینے کی کس حد تک گنجائش ہے۔

"وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا" یعنی اس گندے معاشرے سے الگ کرکے تمہیں صالحین و ابرار کے زمرے میں داخل کروں گا۔ انبیا علیہم السلام کے لیے سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ جس قوم کی اصلاح کے لیے بھیجے جاتے ہیں اس کے اندر اس وقت تک وہ قیام کرتے ہیں جب تک ان کے ایمان لانے کی کچھ توقع ہوتی ہے۔ یہ توقع اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب قوم کے لوگ نبی کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت نبی بحکمِ الٰہی ہجرت کر جاتا ہے۔ پھر جس طرح روح کی علیحدگی کے بعد جسم کے لیے سڑنے اور گلنے کے سوا کوئی اور شکل باقی نہیں رہ جاتی اسی طرح نبی کی علیحدگی کے بعد اس کے جھٹلانے والوں کے لیے ہزیمت اور ذلت کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ جاتی۔ نبی اور اس کے ساتھی گندے ماحول سے نکل کر پاکیزہ اور صحت بخش ماحول میں داخل ہو جاتے ہیں جس سے ان کی روحانی قوت و صحت میں اضافہ ہوتا ہے۔ برعکس اس کے نبی کے دشمن تشنگی بخش عناصر سے یک قلم محروم ہو کر پوری تیزی کے ساتھ ہلاکت کی وادی کی طرف چل پڑتے ہیں۔ استاذ امامؒ نے سورۂ کافرون کی تفسیر میں ہجرت کے ان اثرات و نتائج پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ سیدنا مسیحؑ کا یہ رفعِ آسمانی بھی چونکہ ایک نوعیت کی ہجرت ہی ہے اس وجہ سے جس طرح تمام رسولوں کو ہجرت کے بعد فتح و کامیابی کی بشارت ملی اسی طرح آپ کو بھی اس ہجرت کے ساتھ کامیابی و فتحمندی کی، جیسا کہ آگے بیان ہے، بشارت ملی۔

سیدنا مسیحؑ کا رفعِ آسمانی ہجرت ہی کی نوع ہے

"وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا" الآیۃ اس میں اس بات کی بشارت ہے کہ حضرت مسیحؑ کے نام لیوا ان کے منکرین پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔ تاریخی طور پر یہ بات ایک امرِ واقعہ ہے کہ نصاریٰ من حیث القوم اس بشارت کے بعد سے یہود پر ہمیشہ حاوی و غالب رہے ہیں۔ آج بھی جب کہ بظاہر یہود کی ایک چھوٹے سے خطہ میں سلطنت قائم ہو چکی ہے، یہ حقیقت اپنی جگہ پر اسی طرح قائم و ثابت ہے جس طرح پہلے قائم و ثابت تھی۔ اس لیے کہ یہود کی یہ نام نہاد سلطنت قائم بھی نصاریٰ ہی کے ہاتھوں ہوئی ہے اور باقی بھی انہی کے بل بوتے پر ہے۔

حضرت مسیحؑ کے متبعین کا یہود پر غلبہ

البتہ ایک بات یہاں دل میں ضرور کھٹکتی ہے وہ یہ کہ یہ نصاریٰ خود متبعِ مسیحؑ کب ہیں؟ یہ تو بالکل مبتدع اور حضرت مسیحؑ کی تعلیم سے یک قلم منحرف ہیں؟ اس کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ "الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ" سے یہاں مراد صرف ان کے صحیح قسم کے متبعین ہی نہیں ہیں بلکہ اس میں ان کے عام متبعین اور نام لیوا بھی شامل ہیں۔ ہماری اس رائے کے حق میں کئی باتیں جاتی ہیں۔ مثلاً

ایک شبہ کا ازالہ

ایک یہ کہ قرآن میں "اَهْلُ الْكِتَابِ" اور "الَّذِينَ اُوْتُوا الْكِتَابَ" کے الفاظ بھی دو مختلف مفہوموں میں استعمال ہوئے ہیں۔ بعض جگہ ان سے اہلِ کتاب کو بحیثیت گروہ کے مراد لیا گیا ہے، اس سے بحث نہیں کہ فی الواقع ان کے عقائد و اعمال کیا ہیں، اور بعض جگہ ان سے صرف حقیقی اہلِ کتاب مراد لیے گئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے نزدیک "الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ" اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے۔ حضرت مسیحؑ کے تمام منتسبین اس میں شامل ہیں۔ عام اس سے کہ وہ ان کے حقیقی پیرو ہیں یا محض نام لیوا ہیں۔

دوسری یہ کہ یہاں 'الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ' کے مقابل 'الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' رکھا ہے جس سے قرینہ یہی نکلتا ہے کہ تقابل درحقیقت منکرین مسیح اور متبعین مسیحؑ کے درمیان ہے نہ کہ مخلصین و مبتدعین کے درمیان۔

تیسری یہ کہ یہ موقع بشارت کا ہے۔ بشارت کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں وسعت ہو۔ اگر 'الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ' سے، صرف حقیقی متبعین ہی مراد ہوتے تو بشارت کا دائرہ بہت محدود ہو کر رہ جاتا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ذریت ابراہیمؑ کے لیے رزق کی جو بشارت دی تو اس کو صرف اہل ایمان ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اہل ایمان اور غیر اہل ایمان سب کے لیے عام رکھا ہے اسی طرح یہاں 'الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ' بھی خالص اور غیر خالص متبعین کے لیے عام ہے۔

رسول اپنی قوم کے لیے عدالت ہوتا ہے

اوپر ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ انبیا میں سے جو رسول کے درجے پر فائز ہوتے ہیں وہ اپنی قوم کے لیے عدالت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے لازماً قوم کے درمیان حق و باطل کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ رسول اور اس کے ساتھیوں کو غلبہ حاصل ہوتا ہے اور اس کے مخالفین شکست کھاتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ یہ غلبہ رسول کی موجودگی میں حاصل ہو یا اس کے رخصت ہو چکنے کے بعد۔ سیدنا مسیحؑ کے متعلق قرآن کی تصریح کی روشنی میں اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ صرف نبی ہی نہیں تھے بلکہ 'رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ' بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ ان کے اس منصب کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ ان کے متبعین کو ان کے مخالفین پر وہ غلبہ حاصل ہوتا جس کی اس آیت میں بشارت ہے۔ 'لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ' والی آیت میں بھی اسی سنت اللہ کا بیان ہے۔ یہی وہ عدالت ہے جس کا ذکر انجیلوں میں بار بار آتا ہے۔ رسولوں کی اس امتیازی خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے دشمنوں کو یہ مہلت نہیں دیتا کہ وہ ان کو قتل کر دیں۔ چنانچہ رسولوں میں سے کسی کا قتل ہونا ثابت نہیں۔ یہ بات بھی نصاریٰ کے اس دعوے کے خلاف جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھایا گیا۔ اس مسئلے پر مفصل بحث سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَھُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (۵۶-۵۷)

یہ اسی عدالت کا ظہور ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جو کسی قوم کی طرف رسول کی بعثت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس میں عذاب دنیا اور عذاب آخرت دونوں کی دھمکی ہے۔ یہود پر اس دنیا میں جو دل ہلا دینے والی آفتیں آئیں سب ان کے اسی کفر کا نتیجہ تھیں۔ 'وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ' سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ مسیحؑ پر ایمان رکھنے کے مدعی بھی اگر ایمان کے بعد شرک و بدعت میں مبتلا ہو گئے تو آخرت کی پکڑ سے وہ بھی نہ بچ سکیں گے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو ایمان کے بعد شرک و بدعت میں مبتلا ہوں اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ (۵۸)

پیغمبر کی طرف التفات

یہ آیت اور اس کے ساتھ کی پانچ آیتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اثنائے کلام میں آپ کو مخاطب کر کے مخالفین خصوصاً نصاریٰ کے رویے کے مقابل میں تسلی بھی دی گئی ہے۔ اور بعض ضروری ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو عیسیٰؑ کی پوری تاریخ تمہیں سنائی گئی ہے۔ تو یہ ہے اصل حقیقت مسیح کی۔ یہ اس قسم کی من گھڑت داستان نہیں ہے جیسی کہ نصاریٰ نے تصنیف کر رکھی ہے بلکہ یہ اللہ کی آیات ہیں اور یہ ایک پُر حکمت یاددہانی ہے۔ یعنی نصاریٰ نے تو اس کو ایک میتھولوجی بنا کر رکھ دیا ہے جس سے صرف گمراہی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن اللہ نے اس کو ازسرِ نو تمہارے ذریعے سے آشکار کیا ہے تاکہ اس سے حق و ہدایت اور حکمت و موعظت کی راہیں کھلیں۔ بعینہٖ اسی قسم کا التفات آگے آیت ۱۰۸ میں آ رہا ہے۔ اس سے اس آیت کے بعض الفاظ کی وضاحت بھی ہو رہی ہے۔ ارشاد ہے تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ۱۰۸ (یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمہیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور اللہ دنیا والوں پر کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتا) یعنی یہ حق کو ازسرِ نو اس لیے واضح فرما دیا ہے تاکہ لوگوں کے لیے گمراہی پر جمے رہنے کے لیے عذر باقی نہ رہ جائے اور اگر وہ گمراہی پر جمے رہیں تو ذمہ داری ان کی اپنی ہو۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۵۹-۶۰)

عیسیٰ کی مثال آدمؑ کی ہے

یہ آیت اس باب میں خاتمۂ بحث کی آیت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح خدا نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کو فرمایا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے کلمۂ 'کُن' سے عیسیٰؑ کو پیدا کر دیا۔ بلکہ ولادت کے معاملے میں آدمؑ کو اس اعتبار سے عیسیٰؑ پر فضیلت حاصل ہے کہ ان کی ولادت میں نہ باپ کو دخل ہے نہ ماں کو تو جب نصاریٰ ان کو معبود نہیں مانتے تو آخر حضرت عیسیٰؑ کو کیوں معبود بنا بیٹھے۔

لفظ 'ابن' کا استعمال دوسروں کے لیے

جس طرح پیدائش کے معاملے سے کسی مغالطے کے لیے کوئی وجہ موجود نہیں تھی، اسی طرح 'ابن' کے لفظ سے بھی، اگر نصاریٰ عقل سے کام لیتے تو کسی گمراہی میں پڑنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، تورات اور انجیل میں 'ابن' کا لفظ صرف عیسیٰؑ ہی کے لیے نہیں استعمال ہوا ہے بلکہ حضرت آدمؑ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو لوقا ۳: ۳۸۔ فرشتوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، ملاحظہ ہو پیدائش ۶: ۲ و ۴۔ حضرت یعقوبؑ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو استثناء ۱:۱۔ نصاریٰ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو یوحنا ۱: ۱۱-۱۲۔ اگر کسی کو معبود بنا دینے کے لیے یہ لفظ کافی ہے تو پھر حضرت عیسیٰؑ کی کوئی تخصیص نہیں رہ جاتی، پھر تو معبودوں کا ایک پورا لشکر تیار ہو سکتا ہے، نصاریٰ نے صرف حضرت عیسیٰؑ ہی پر کیوں قناعت کر لی!

گویا بحث اتمامِ حجت کے آخری نقطہ پر پہنچ گئی اس وجہ سے قرآن نے یہ کہہ کر کہ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ الآیہ مزید بحث و گفتگو کا دروازہ بند کر دیا۔ اس جملے میں ہمارے نزدیک مبتدا محذوف ہے اور یہ بات ہم دوسرے

مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ جب مبتدا کو حذف کرتے ہیں تو اس سے مقصود مخاطب کی ساری توجہ خبر پر مرکوز کرانی ہوتی ہے۔ یعنی حضرت مسیح سے متعلق اصل حقیقت یہی ہے جو قرآن نے واضح کر دی ہے، باقی جو کچھ ہے وہ سب نصاریٰ کی افسانہ طرازی ہے۔ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ میں ظاہر خطاب اگرچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس طرح کے مواقع میں، جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مواقع میں واضح کر چکے ہیں، روئے سخن پیغمبر کی طرف نہیں بلکہ امت کی طرف ہوتا ہے اور اگر اس میں کوئی عتاب مضمر ہوتا ہے تو اس کا تعلق درحقیقت مخالفین سے ہوتا ہے، لیکن وہ لائقِ خطاب نہیں رہ جاتے اس وجہ سے ان کے بجائے اپنوں کو خطاب کر کے بات کہہ دی جاتی ہے۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (۶۱)

العلم سے مراد

'العلم' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ گفتگو کر چکے ہیں کہ قرآن میں اس سے مراد وہ علم حقیقی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی آتا ہے۔ اس کا مقابل لفظ ظن ہے۔

آیت ۶۱ کے بعض محذوفات

اس آیت میں عربی زبان کے اسلوب کے مطابق بعض چیزیں حذف ہیں۔ اگر محذوفات کو ظاہر کر دیا جائے تو پوری بات گویا یوں ہو گی۔ نَدْعُ نَحْنُ اَبْنَآءَنَا وَ اَنْتُمْ اَبْنَآءَكُمْ وَ نُحْضِرُ نَحْنُ اَنْفُسَنَا وَ اَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ نَحْنُ وَ اَنْتُمْ۔ ہم نے اپنے ترجمے میں ان محذوفات کو کھول دیا ہے۔

مباہلہ کا موقع و محل

'ابتہال' کے معنی دعا اور تضرع کے ہیں لیکن اس کے اندر ترک کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے یہ ایک دوسرے پر لعنت کی بددعا کے لیے معروف ہے۔

جن معاملات میں بنائے اختلاف کوئی عقلی و استدلالی چیز ہو ان میں تو مسئلے کو طے کرنے کا صحیح طریقہ عقل و استدلال ہی ہے لیکن جہاں عقل و استدلال کے تمام مرحلے طے ہو چکے ہوں، مخاطب دلیل و حجت سے بالکل عاری ہو، حق اس کے سامنے سورج کی طرح روشن ہو، اس کے لیے اس سے گریز و فرار کی کوئی راہ نہ ہو لیکن وہ محض اپنی بات کی پچ اور ہٹ دھرمی کی آن قائم رکھنے کے لیے اپنی بات پر اڑا ہو تو ایسے مواقع کے لیے مباہلہ کا طریقہ آخری چارہ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ نصاریٰ نے قرآن کے اس چیلنج کو قبول کرنے کی جرأت نہیں کی جس سے یہ بات آخری درجے میں واضح ہو گئی کہ سیدنا مسیح کے بارے میں وہ اپنے موقف کو صحیح نہیں سمجھتے تھے بلکہ محض اپنے گروہی تعصب کے تحت اس کی حمایت کرتے تھے۔ برعکس اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ کھلا ہوا چیلنج اس بات کا نہایت کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ کو اپنے موقف کی صحت و صداقت پر پورا پورا یقین تھا۔

مباہلے میں اپنے ساتھ اپنے اہل و عیال اور اپنے اعزا و متعلقین کی شمولیت اس کی سنجیدگی اور اہمیت کو دو چند بلکہ دہ چند کر دیتی ہے اس لیے کہ کوئی شخص جانتے بوجھتے اپنے زن و فرزند اور اپنے محبوں اور

مجبوروں پر لعنت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ (۶۲-۶۳)

یعنی حضرت عیسیٰؑ کی اصل حقیقت یہ ہے جو بیان ہوئی۔ ان کا جو درجہ و مرتبہ بھی ہے خدا کے ایک بندے اور اس کے نبی و رسول کی حیثیت سے ہے۔ خدا کی خدائی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ معبود تو صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہ عزیز اور حکیم ہے۔ عزیز یعنی سب پر غالب اور سب سے بالاتر، حکیم یعنی اس کا ہر کام حکمت اور مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ دونوں صفتیں شرک کی کامل نفی کرتی ہیں۔

شرک فساد فی الارض ہے

دوسری آیت میں فرمایا کہ مباہلہ اس قضیے کو طے کرنے کی آخری صورت تھی لیکن اگر وہ اس پر بھی راضی نہیں ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ حق کی پیروی نہیں کرنا چاہتے بلکہ حق کی مخالفت کر کے خدا کی زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ شرک تمام فساد کی جڑ ہے۔ اگر زمین و آسمان میں بہت سے معبود ہوتے تو ان کا سارا نظام تکوینی درہم برہم ہو کر رہ جاتا، اسی طرح اگر دین میں شرک کے لیے کوئی گنجائش تسلیم کر لی جائے تو اس دنیا کا سارا نظام عدل و قسط درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

۱۵۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۶۴-۷۱

توحید ایک مشترک حقیقت ہے

حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل حقیقت واضح اور نصاریٰ پر حجت تمام کر دینے کے بعد یہود و نصاریٰ دونوں کو مخاطب کر کے ان کو توحید اور اسلام کی دعوت دی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح فرمایا ہے کہ توحید کو ایک مشترک حقیقت قرار دیا ہے کہ جس طرح اسلام اس کی دعوت لے کر آیا ہے اسی طرح پچھلے انبیا اور صحیفوں نے بھی اسی چیز کی دعوت دی ہے۔ اس وجہ سے اگر تم توحید کو جھٹلاتے ہو تو صرف قرآن کو نہیں جھٹلاتے بلکہ خود اپنے انبیا اور اپنے صحیفوں کو بھی جھٹلاتے ہو۔

حضرت ابراہیمؑ مسلم تھے

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ دیا ہے کہ اپنی بدعات کی تائید میں ان کے نام کو کیوں ملوث کرتے ہو؟ وہ تو نہ یہودی تھے، نہ نصرانی، وہ تو ایک حنیف مسلم تھے۔ تورات اور انجیل ان کے بعد نازل ہوئیں اور یہودیت و نصرانیت کے شاخسانے تم نے ان کے بعد کھڑے کیے، پھر اپنی حمایت میں ان کو کیوں گھسیٹنے کی کوشش کرتے ہو؟ ان کے ساتھ نسبت اور قربت کے حقدار تو وہ ہو سکتے ہیں جو ان کی ملت اسلام کی پیروی کریں، اور یہ شرف اگر حاصل ہے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان پر ایمان لانے والوں کو حاصل ہے نہ کہ تم کو جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش ہو۔

مسلمانوں کو تنبیہ

اس کے بعد مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ ان اہل کتاب کے فتنوں سے بچ کے رہو، ان کی ساری کوشش اس بات کے لیے ہے کہ تمہیں صراط مستقیم سے ہٹا کر گمراہی کی راہ پر ڈال دیں۔ ساتھ ہی اہل کتاب کو بھی سرزنش

کی ہے کہ جانتے بوجھتے کہ حق کیا ہے، اس حق کی مخالفت کرنا اور دوسروں کو بھی اس حق سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرنا آخر یہ کیا پیشہ ہے جو تم نے اہل کتاب ہوتے ہوئے اپنے لیے پسند کیا ہے۔ ـــ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۴-۷۱

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ
بَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ
بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟
ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٦٤﴾ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِىٓ
إِبْرَٰهِيمَ وَمَآ أُنزِلَتِ ٱلتَّوْرَىٰةُ وَٱلْإِنجِيلُ إِلَّا مِنۢ بَعْدِهِۦٓ ۚ
أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٦٥﴾ هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ حَٰجَجْتُمْ فِيمَا لَكُم بِهِۦ
عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُم بِهِۦ عِلْمٌ ۚ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَ
أَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ إِبْرَٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا
وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴿٦٧﴾
إِنَّ أَوْلَى ٱلنَّاسِ بِإِبْرَٰهِيمَ لَلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا ٱلنَّبِىُّ
وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ۗ وَٱللَّهُ وَلِىُّ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٨﴾ وَدَّت طَّآئِفَةٌ
مِّنْ أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ لَوْ يُضِلُّونَكُمْ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ
وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٦٩﴾ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِـَٔايَٰتِ
ٱللَّهِ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٧٠﴾ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تَلْبِسُونَ
ع ٱلْحَقَّ بِٱلْبَٰطِلِ وَتَكْتُمُونَ ٱلْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٧١﴾

ترجمۂ آیات ۶۴-۷۱

کہہ دو، اے اہل کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان

یکساں مشترک ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے۔ اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔ ۶۴

اے اہل کتاب تم ابراہیم کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو، درآنحالیکہ تورات اور انجیل نہیں نازل کی گئی ہیں مگر اس کے بعد؟ کیا تم اس بات کو نہیں سمجھتے؟ تمہیں لوگ ہو کہ تم نے حجت کی ان چیزوں کے بارے میں جن کے باب میں تمہیں کچھ علم تھا تو اس چیز کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو جس کے باب میں تمہیں کوئی علم نہیں؟ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ تو یہودی تھا، نہ نصرانی، بلکہ حنیف مسلم تھا، اور وہ مشرکین میں سے بھی نہ تھا۔ ابراہیم کے ساتھ نسبت کے سب سے زیادہ حقدار وہ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی، پھر یہ پیغمبر ہیں اور جو ان پر ایمان لائے اور اللہ اہل ایمان کا ساتھی ہے۔ ۶۵-۶۸

اہل کتاب کا ایک گروہ یہ آرزو رکھتا ہے کہ کاش تمہیں گمراہ کر دیں۔ حالانکہ وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے ہی کو، لیکن وہ اس کا احساس نہیں کرتے۔ اے اہل کتاب اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو۔ اے اہل کتاب تم کیوں حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو درآنحالیکہ تم جانتے ہو۔ ۶۹-۷۱

۱۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (۶۴)

'يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ' کا خطاب اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں سے یکساں ہے لیکن اس سورہ میں نصاریٰ چونکہ

خاص طور پر مخاطب ہیں اس وجہ سے روئے سخن ان کی طرف زیادہ ہے۔

لفظ سواء کی تحقیق

'سواء' کے معنی وسط کے ہیں۔ 'سواء الراس' سر کے بیچ کے حصے کو کہیں گے۔ 'سواء الطریق' کے معنی ہوں گے وسط شاہراہ۔ جو چیز دو جماعتوں کے بیچوں بیچ ہو گی وہ دونوں میں یکساں مشترک، مسلّم اور جانی پہچانی ہوئی ہو گی۔ توحید کے متعلق قرآن مجید کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان یکساں مشترک و مسلّم ہے۔ قرآن نے اسی مشترک کلمہ کو بنیاد قرار دے کر ان سے بحث کا آغاز کیا ہے کہ جب توحید ہمارے اور تمہارے درمیان ایک مشترک حقیقت ہے تو موازنہ کرو کہ اس قدر مشترک کے معیار پر قرآن اور اسلام پورے اترتے ہیں یا یہودیت اور نصرانیت؟

دعوت دین کا حکیمانہ طریقہ

بحث کا یہ طریقہ قرآن کے اس قرارداده طریقہ کے بالکل مطابق ہے جس کی اس نے آیت 'اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ' (اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے دعوت دو) میں تلقین فرمائی ہے۔ اس طریقۂ حکمت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اگر مخاطب سے بحث کے لیے کوئی مشترک بنیاد مل سکتی ہو تو اسی پر گفتگو کو آگے بڑھایا جائے، خواہ مخواہ اپنی انفرادیت کی دھونس جمانے کی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ قرآن نے یہاں یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ اہل کتاب آسمانی صحیفوں کے حامل ہونے کے سبب سے توحید کی تعلیم سے اچھی طرح آشنا بھی تھے اور اس کے علمبردار ہونے کے مدعی بھی تھے۔ ان کے صحیفوں میں نہایت واضح الفاظ میں توحید کی تعلیم موجود تھی۔ انھوں نے اگر شرک اختیار کیا تھا تو اس وجہ سے نہیں کہ ان کے دین میں شرک کے لیے کوئی گنجائش تھی بلکہ اپنے نبیوں اور صحیفوں کی تعلیمات کے بالکل خلاف محض بدعت کی راہ سے انھوں نے یہ چیز اختیار کی اور پھر متشابہات کی پیروی کر کے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، اس کے حق میں الٹی سیدھی دلیلیں گھڑنے کی کوشش کی۔ قرآن نے ان کو دعوت دی کہ یہ بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مسلّم ہے کہ اللہ کے سوا نہ کسی کی بندگی کی جائے، نہ اس کا کسی کو ساجھی ٹھہرایا جائے اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو رب ٹھہرائے، پھر اس مسلّم و مشترک حقیقت کے برخلاف تم نے خدا کی عبادت میں دوسروں کو شریک کیوں بنا رکھا ہے اور اپنے احبار و رہبان اور فقیہوں، صوفیوں کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا درجہ کیوں دے دیا۔

اسی نقطہ سے بحث کا آغاز کیا ہے اور پھر بتدریج اس کے تقاضے اور لوازم واضح فرمائے ہیں اور جو چیزیں اس کے تقاضوں کے خلاف اہل کتاب میں پیدا ہو گئی تھیں ان کی تردید فرمائی ہے۔

یہ بات کہ توحید بنیادی طور پر ہمارے اور اہل کتاب کے درمیان ایک مشترک حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے، وضاحت کی محتاج نہیں ہے۔ جو شخص بھی تورات اور انجیل پر نگاہ رکھتا ہے، وہ اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ جہاں تک تورات کا تعلق ہے اس میں تو توحید کی تعلیم اس قدر وضاحت و قطعیت اور اتنی کثرت کے ساتھ ہے کہ اس کے حوالے نقل کرنا محض بات کو طول دینا ہو گا۔ البتہ انجیل سے کچھ حوالے

یہاں ہم پیش کرتے ہیں اس لیے کہ توحید کے معاملے میں سب سے زیادہ گمراہی نصاریٰ ہی کو پیش آئی ہے اور آیت میں درحقیقت، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، روئے سخن ہے بھی انھی کی طرف۔ لوقا ۴:۸ میں ہے۔

انجیلوں میں توحید کے شواہد

"یسوع نے جواب میں اس سے کہا، لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اسی کی بندگی کر۔"

مرقس ۱۲: ۲۹-۳۰ میں ہے۔

"یسوع نے جواب دیا کہ اوّل (حکم) یہ ہے اے اسرائیل سن! خداوند ہمارا ایک ہی خداوند ہے۔"

یوحنا ۱۷:۳ میں ہے۔

"اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد و برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔"

متی ۱۹:۱۷ میں ہے۔

"اس نے اس سے کہا کہ تو مجھ سے نیکی کی بات کیوں پوچھتا ہے؟ نیک تو ایک ہی ہے۔"

یہاں جس لفظ کا ترجمہ "نیکی" کیا گیا ہے، ہمارے نزدیک اس کا ترجمہ "پاکی" ہونا چاہیے۔ اس طرح "نیک تو ایک ہی ہے" بھی ٹھیک ترجمہ نہیں ہے۔ یہ دراصل "پاک تو ایک ہی ہے" ہوگا۔ انجیل کے اس ٹکڑے کا ترجمہ بعض دوسرے نسخوں میں مختلف ہے۔ اگرچہ غلط یہ بھی ہے لیکن اس میں نسبتہً وضاحت ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"تو مجھے نیک کیوں ٹھہراتا ہے، نیک تو ایک ہی ہے اور وہ اللہ ہے۔"

یہ فقرہ بھی دراصل یوں ہے "تو مجھے پاک کیوں ٹھہراتا ہے؟ پاک تو ایک ہی ہے اور وہ اللہ ہے۔"

توحید کی ان واضح تعلیمات کی موجودگی میں اہل کتاب سے قرآن کا یہ مطالبہ کتنا معقول ہے کہ وہ بھی ان نصوص کی روشنی میں اپنے عقائد کا جائزہ لیں اور جو باتیں ان کے بالکل خلاف، محض بدعات و متشابہات کی پیروی کر کے، انھوں نے اپنے عقاید میں شامل کر لی ہیں ان سے اپنے عقاید کو پاک کریں۔ پھر آخر میں مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ اگر یہ لوگ اپنے ہی نبیوں اور صحیفوں کی تعلیمات سے اعراض کرتے ہیں تو تم یہ واضح کر دو کہ ہم تو ان حقائق سے اعراض کرنے والے نہیں ہیں، ہم تو اپنے آپ کو اسی ربِ واحد کے حوالہ کرتے ہیں اور یہی درحقیقت اصل اسلام ہے۔

اس آیت میں یہ بات جو آئی ہے کہ "ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو رب نہ بنائے"۔ اس کی وضاحت دوسرے مقام میں ہوتی ہے کہ اہل کتاب نے اس ہدایت کے برخلاف اپنے احبار و رہبان کو رب بنا لیا۔ اس پر بعض اہل کتاب کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا کہ "ہم احبار و رہبان کو رب تو نہیں مانتے"۔ حضورؐ نے جواب میں فرمایا کہ "کیا یہ بات نہیں ہے کہ جس چیز کو وہ حرام ٹھہرا دیں تم اس کو حرام ٹھہرا دیتے ہو اور جس چیز کو حلال ٹھہرا دیں اس کو حلال؟" سائل نے اقرار کیا کہ یہ بات تو ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہی ان کو رب بنا دینا ہے۔ اور جب اس طرح کسی کی اطاعت کی جائے کہ اس کے لیے تحریم و تحلیل کا حق تسلیم کر لیا جائے تو درحقیقت یہ چیز اس کی عبادت کرنے کے ہم معنی ہے اگرچہ بظاہر اس کو سجدہ نہ کیا گیا

کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

آیت کے آخر میں یہ بات بھی واضح فرما دی کہ اگر یہ اہل کتاب توحید کی اس مشترک حقیقت کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو تم ان کو صاف صاف سنا دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔ 'گواہ رہو' کے الفاظ بطور اظہار برأت ہیں۔ یعنی سن رکھو اور اس بات کے گواہ رہو کہ ہم نے تمہیں پوری وضاحت کے ساتھ سنا دیا تھا۔ اب کل کو خدا کے حضور ساری ذمہ داری تمہاری ہے۔ ہم اپنا فرض ادا کر چکے ہیں۔

'بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ یہی توحید اس سپردگی اور حوالگی کی روح ہے جس سے اسلام عبارت ہے اور جو اصل مطلوب و مقصود ہے۔ جس کو یہ توحید حاصل نہیں اس کو اسلام حاصل نہیں اور جس کو اسلام حاصل نہیں اس کو خدا حاصل نہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (۶۵ - ۶۸)

حضرت ابراہیم کا دین

ان آیات میں کوئی نحوی یا ادبی اشکال نہیں ہے۔ مضمون بھی ان کا پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں ہی کے مسلّم خاندانی و روحانی پیشوا تھے اس وجہ سے یہود، نصاریٰ اور مشرکین تینوں ہی گروہ اپنی اپنی بدعات کی حمایت میں ان کے نام کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہود کہتے کہ حضرت ابراہیم ہمارے طریقہ پر تھے۔ نصاریٰ ان کو اپنے طریقہ پر بتاتے اور مشرکین عرب اپنے طریقہ پر۔ یوں تو یہ ہوائے فخر ان میں سے ہر گروہ کو ایک دوسرے کے مقابل میں ہمیشہ رہا لیکن اسلام کی دعوت شروع ہونے کے بعد اس کی مخالفت میں خاص حربہ جو ان تینوں ہی گروہوں نے استعمال کیا وہ یہی تھا کہ نیا دین دینِ ابراہیمی کے خلاف ہے، اصل دینِ ابراہیمی کے حامل ہم ہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو ہمارے اصلی جدی دین سے برگشتہ کر کے گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن نے یہاں ان کے اس پروپیگنڈے کی تردید کی ہے کہ تورات اور انجیل کا نزول تو حضرت ابراہیم کے صدیوں بعد ہوا ہے، پھر وہ یہودیت یا نصرانیت پر کس طرح ہوئے! بے وقوفی کی بات کے لیے بھی آخر کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی بنیاد ہوا کرتی ہے۔ تم نے بعض ایسے معاملات میں بھی حجتیں پیدا کی ہیں جن کے بارے میں تمہیں کچھ نہ کچھ علم تھا، ان کے لیے تم کسی جواز کا سہارا لے سکتے ہو اور اپنے آپ کو تسلی دے سکتے ہو لیکن تمہاری یہ بات تو بالکل ہی بادِ ہوا ہے، آخر جس چیز کے باب میں تمہیں کچھ معلومات

ہی نہیں اس میں دخل در معقولات کے لیے جواز کیا گنجائش ہے، حق کی مخالفت و عداوت کا یہ کیسا جنون ہے کہ اتنی موٹی سی بات بھی تمھاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے!

اس کے بعد قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین بتایا کہ وہ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ حنیف مسلم تھے۔ "حنیف" کے معنی، جیسا کہ سورہ بقرہ میں وضاحت ہو چکی ہے، یکسو کے ہیں، یعنی وہ توحید کی صراط مستقیم پر تھے۔ انھوں نے اس سے ہٹ کر کج پیچ کی مشرکانہ راہیں نہیں اختیار کی تھیں اور وہ مسلم یعنی اپنے رب کے فرمانبردار تھے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ یہودیت اور نصرانیت توحید سے ہٹی ہوئی کج پیچ کی راہیں ہیں جو ہدایت کے بجائے ضلالت کی طرف لے جاتی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت فرما دی کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہودیت اور نصرانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی طرح ان کو مشرکین سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ بات جملے کے عام سیاق سے الگ کر کے اس لیے فرمائی کہ یہ مشرکین بنی اسماعیل کی تردید میں ہے جو اس سورہ میں براہ راست مخاطب نہیں ہیں۔ اس سورہ کا خطاب، جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی ہے، اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ سے ہے، مشرکین کی تردید میں اگر اس میں کوئی بات آئی ہے تو وہ ضمناً ہی آئی ہے۔ یہ بات بھی ضمنی باتوں ہی میں سے ہے، اور اس کے ذکر کی ضرورت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس لیے تھی کہ جس طرح یہود اور نصاریٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کو اپنی گمراہیوں کی تائید میں پیش کرتے تھے اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ زور و شور کے ساتھ قریش کے مشرکین ان کے نام کو اپنی حمایت میں پیش کرتے تھے بلکہ ان کا تو یہ دعویٰ تھا کہ جس دین پر وہ ہیں، یہ دین ان کو حضرت ابراہیمؑ ہی سے وراثت میں ملا ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا کہ ابراہیمؑ سے نسبت کے اصل حقدار وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی ہے۔ یعنی یہ نسبت صرف خاندان اور نسب سے حاصل ہونے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اتباع اور اطاعت سے ہے۔ اس اعتبار سے حضرت ابراہیمؑ سے سب سے زیادہ اولیٰ و اقرب یہ پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان پر ایمان لانے والے صحابہؓ ہیں، نہ کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین جنھوں نے دین ابراہیمی کو بالکل مسخ اور برباد کیا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ یہی اہل ایمان ہیں جن کا ساتھی اللہ ہے، وہ ان کی مدد فرمائے گا اور ان کے مخالفوں پر ان کو غالب کرے گا اس لیے کہ یہی اس دین حق پر ہیں جو حضرت ابراہیمؑ لے کر آئے تھے۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۶۹-۷۱)

اہل کتاب کو ملامت

ان میں سے پہلی آیت کا خطاب مسلمانوں سے بطور تنبیہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کو یہودیت اور نصرانیت کی ان بدعات سے کوئی ادنیٰ تعلق بھی نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہ محض اس لیے پروپگنڈا کر رہے ہیں کہ تمہیں تمہارے دینِ حق سے برگشتہ کریں حالانکہ اس کوشش سے وہ صرف اپنی ہی محرومی اور گمراہی کا سامان کر رہے ہیں۔ جو شخص اپنی گمراہی کو ہدایت ثابت کرنے کے لیے دیدہ و دانستہ دوسرے کو راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے وہ سب سے پہلے خود اپنے ہی کو گمراہی میں مبتلا کرتا ہے۔ لیکن دوسرے کی مخالفت کے جوش میں اس کو اپنی اس حرکت کے اصلی نتیجہ کا احساس نہیں ہوتا۔

بعد کی دو آیتوں میں خطاب اہل کتاب سے ہے اور دونوں میں "یا اہل الکتاب" کی تکرار سے حسرت اور ملامت کا اظہار ہو رہا ہے کہ افسوس ہے کہ اہل کتاب ہو کر تم نے رہنمائی کے بجائے گمراہ کرنے اور اظہارِ حق کے بجائے کتمانِ حق کا پیشہ اپنے لیے پسند کیا۔

"وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آج تم اللہ کی جن آیات کا انکار کر رہے ہو، تمہارے دل ان کے باب میں گواہی دے رہے ہیں کہ یہ اللہ کی آیات ہیں۔ دوسرا یہ کہ آج حسد اور عداوت کے جوش میں تم جس حق کو جھٹلانے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہو اس کی تائید و تصدیق اور خلق کے آگے اس کی شہادت دینے کا تم سے عہد لیا جا چکا ہے اور تم اس ذمہ داری کے اٹھانے کا اقرار کر چکے ہو۔ پہلا مضمون محتاج ثبوت نہیں ہے۔ اس دوسرے مطلب کے لیے نظیر اسی سورہ میں آگے موجود ہے۔ فرمایا ہے۔

وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَـنۡصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ ۝ (۸۱ - آل عمران)

اور یاد کرو جب کہ اللہ نے تم سے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا کہ چونکہ میں نے تم کو کتاب و حکمت عطا فرمائی ہے تو جب آئے تمہارے پاس ایک رسول سچی ثابت کرتا ہوا ان پیشین گوئیوں کو جو تمہارے اپنے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے، پوچھا کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور اس پر میری طرف سے تم نے ذمہ داری اٹھائی؟ بولے ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو اس پر گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ اس کے گواہوں میں سے ہوں۔

اس آیت کی پوری تشریح آگے آ رہی ہے۔

حق اور باطل کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کرنے کی وضاحت سورۂ بقرہ کی تفسیر میں اچھی طرح ہو چکی

ہے۔ یہود نے یوں تو پوری تورات کو اپنی تحریفات سے مسخ کر ڈالا تھا جس کے سبب سے حق و باطل کا امتیاز مشکل ہو گیا تھا لیکن یہاں خاص طور پر ان کی ان تحریفات کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور تعمیرِ بیت اللہ سے متعلق حالات و واقعات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے اندر کی تھیں۔ ان تحریفات کا مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کا تعلق مکہ اور بیت اللہ سے اس طرح کاٹ دیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انبیا کے بیان کردہ حقائق پر پردہ ڈالا جا سکے۔ قرآن کے الفاظ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ نزولِ قرآن کے علمائے یہود بھی ان تحریفات سے واقف تھے اور فی الواقع ان تحریفات کی نوعیت ہے بھی ایسی کہ ادنیٰ تامل ان پر گرفت کی جا سکتی ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہاں زیرِ بحث یہود کے عوام کا کردار نہیں بلکہ ان کے علماء کا کردار ہے۔ سیاق و سباق اور آیت کے الفاظ اس پر دلیل ہیں۔

۱۷۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۷۲-۷۶

یہود کی بعض شرارتیں

آگے اہل کتاب، بالخصوص یہود کی بعض سازشوں اور شرارتوں کا ذکر کیا ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح وہ مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیریں۔ پھر اس گہرے بغض و حسد کا پتہ دیا ہے جو بنی اسرائیل کے اندر بنی اسماعیل کے خلاف تھا جس کے سبب سے وہ کسی طرح بھی اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ بنی اسماعیل بھی ان کی طرح کتاب و شریعت کے حامل سمجھے جائیں اور اللہ کے ہاں ان کے جرائم کے گواہ بنیں۔ گویا اس جوشِ عداوت میں خدا کے فضل کے اجارہ دار وہ خود بن بیٹھے تھے کہ جس کو چاہیں اس میں سے حصہ دیں اور جس کو چاہیں محروم کر دیں۔

اس عداوت و حسد نے بنی اسماعیل کے خلاف بنی اسرائیل کے مجموعی اخلاق و کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ وہ ان کے معاملے میں کسی اخلاقی و شرعی ضابطے کی پابندی کے قائل نہیں تھے۔ ان کی رکھی ہوئی امانتوں میں خیانت کرنا وہ ثواب سمجھتے تھے کہ یہ کافر کا مال ہے، اس کو دبا بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ قرآن نے ان باتوں کا حوالہ اس لیے دیا کہ مسلمانوں کو متنبہ کرے کہ جن کا حسد اور بغض تمہارے خلاف اس حد تک بڑھا ہوا ہے ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ ان کا کوئی مشورہ تمہارے لیے خیر خواہانہ ہو سکتا ہے اور تمہارے حق میں ان کی زبان سے کوئی سچی بات نکل سکتی ہے۔ یہ تو تمہارے ایک پیسے کی بھی چوری کر سکتے ہیں، پھر ان سے یہ توقع کیسے رکھتے ہو کہ یہ تمہاری ایک لاکھ کی امانت ادا کر دیں گے اور تمہارے نبی کے بارے میں اس حق کی شہادت دیں گے جس کے وہ امین بنائے گئے تھے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۲-۷۶

وَقَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اٰمِنُوۡا بِالَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ

عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ
الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ
يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ
يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ
مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾ وَمِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ
مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْھُمْ مَّنْ اِنْ
تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ
قَاۗىِٕمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ
سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾
بَلٰي مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

ترجمۂ آیات ۷۲-۷۶

اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو چیز نازل کی گئی ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دیا کرو تاکہ وہ بھی اس سے برگشتہ ہوں اور تم اپنے دین کی پیروی کرنے والے کے سوا اور کسی کی بات کا اعتبار نہ کیا کرو — ان سے کہو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے — کہ مبادا اس طرح کی چیز کسی اور کو بھی مل جائے جس طرح کی چیز تمھیں ملی ہے یا وہ تم سے تمھارے رب کے حضور حجت کر سکیں۔ ان سے کہو کہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے

لیے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۷۲-۷۴

اور اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر ان کے پاس امانت کا ڈھیر بھی رکھو تو مانگنے پر لوٹا دیں گے اور ان میں وہ بھی ہیں کہ اگر تم ان کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک اس کو لوٹانے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان امیوں کے معاملے میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے۔ اور یہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں ـــــ ہاں، جو لوگ اس کے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ڈریں گے تو بے شک اللہ اپنے سے ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ۷۵-۷۶

۱۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (۷۲)

اہل کتاب کی اس سازش کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے اس بات کی تصریح فرما دی ہے کہ یہ ان کے ایک مخصوص گروہ کی سازش ہے۔ یہ تصریح اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اپنے مخالفین کے جرائم بیان کرتے ہوئے بھی حق و انصاف کے حدود سے سرِ مُو تجاوز نہیں کرتا۔ اگر ایک جرم مخالف گروہ کی کسی مخصوص پارٹی ہی کا جرم ہے تو وہ اس کی ذمہ داری اسی پارٹی پر ڈالتا ہے، یہ نہیں کرتا کہ چند کی شرارت کی ذمہ داری مخالفت کے جوش میں پوری قوم پر لاد دے۔ یہ انصاف پسندی صداقت کے عام نصب العین سے قطع نظر دعوتِ حق کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت بابرکت اور نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ آگے اس کی بعض نہایت موثر مثالیں آرہی ہیں۔

منافقانہ شرارت کی ایک خاص قسم

یہاں جس شرارت کا ذکر ہے وہ منافقانہ شرارت کی ایک مخصوص قسم ہے۔ وہ یہ کہ اپنے حریف کے سامنے اپنے آپ کو اس کا دوست اور ساتھی ظاہر کر کے اندر سے اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ یہود نے اپنے اس منصوبے کے تحت جو مختلف قسم کی چالیں چلیں، ان میں سے ایک چال یہ بھی تھی کہ ان کے

لیڈروں نے اپنے کچھ آدمیوں کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ پہلے اپنے ایمان و اسلام کا اظہار و اعلان کر کے مسلمانوں کے اندر شامل ہوں، پھر اسلام کی کچھ خرابیوں کا اظہار کر کے اس سے علیحدگی اختیار کر لیا کریں۔ اس کا فائدہ انھوں نے ایک تو یہ سوچا ہوگا کہ اس طرح بہت سے جدید العہد مسلمانوں کا اعتماد اسلام پر سے متزلزل ہو جائے گا، وہ یہ سوچنے لگیں گے کہ فی الواقع اسلام میں کوئی خرابی ہے جس کے سبب سے یہ پڑھے لکھے لوگ اسلام کے قریب آ کر اس سے بدک جاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس تدبیر سے وہ خود اپنی قوم کے عوام کو اسلام کے اثر سے بچا لے جائیں گے، جب وہ یہ دیکھیں گے کہ ان کی اپنی قوم کے کچھ پڑھے لکھے لوگ اسلام کو آزما کر چھوڑ چکے ہیں تو ان کی وہ رغبت کمزور ہو جائے گی جو اسلام اور مسلمانوں کی کشش کے سبب سے ان کے اندر اسلام میں داخل ہونے کے لیے پیدا ہوتی تھی۔

اس سازش کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہود نے جب بھی کسی ملت کو اپنا نشانہ بنایا ہے اس کے لیے تدبیر یہی اختیار کی ہے کہ اس کے اندر گھس کر اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ دین مسیحی کو بگاڑنے کے لیے پال نے جو کامیاب کوشش کی وہ مذاہب کی تاریخ کی ایک نہایت دردانگیز داستان ہے۔ پھر مسلمانوں کے عقائد و نظریات کو مسخ کرنے کے لیے یہود و نصاریٰ دونوں نے جو فتنے خود ہمارے کتب خانوں میں بیٹھ کر ہمدردانہ بھیس میں اٹھائے ہیں، وہ بھی کوئی مخفی چیز نہیں ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہاں بعض حقائق کی طرف اشارہ کرتے۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۷۳-۷۴)

اسلوب کی بعض مشکلات

اس آیت کی تشریح و تفسیر میں ہمارے ارباب تاویل کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اسلوب کی بعض مشکلیں ہیں۔ ہم پہلے ان اسلوبوں کی وضاحت کریں گے اس کے بعد آیت کی صحیح تاویل بیان کریں گے۔

اس میں پہلی سمجھنے کی چیز قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (کہہ دو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے) کے ٹکڑے کا جملہ کے اندر مقام ہے۔ یہ ٹکڑا در اصل سلسلۂ کلام کا جزو نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک جملہ معترضہ کی ہے۔ یعنی سلسلۂ کلام کے بیچ میں مخاطب کی ایک غلط بات کی برسرموقع تردید فرما دی گئی ہے۔ اصل سلسلۂ کلام یوں ہے کہ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ الایۃ یہود جن لوگوں کو سکھا پڑھا کر مذکورہ بالا سازش کے لیے مسلمانوں کے اندر بھیجتے تھے ان کو پورے اہتمام کے ساتھ یہ تاکید بھی کر دیتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے کے لیے اسلام کا اظہار تو کر دینا لیکن بات بہرحال ماننی اپنے ہی لوگوں کی ہے، اپنے دائرہ سے باہر کسی کی بات ماننا ہمارے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ بات چونکہ یہود کی

تمام گمراہیوں کی جڑ تھی اس وجہ سے قرآن نے بالکل برمحل موقع اس پر ٹوک دیا کہ یہ کیا اندھا بہرا گروہی تعصب ہے جس میں یہ مبتلا ہیں، ان سے کہو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے جس کی ان کو پیروی کرنی چاہیے، خواہ وہ کسی اسرائیلی پیغمبر کے ذریعہ سے ملے یا کسی اسماعیلی پیغمبر کے واسطہ سے۔ نجات کے حصول کا ذریعہ تو خدا کی ہدایت کی پیروی ہے نہ کہ یہودیت و نصرانیت۔ یہ بات چونکہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں پوری وضاحت سے بیان ہو چکی ہے، نیز آگے کی سورتوں میں بھی اس کی طرف اشارات آئیں گے اس وجہ سے یہاں اس کے شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری چیز اس آیت میں یہ سمجھنے کی ہے کہ اَنْ سے پہلے عربی زبان میں بعض اوقات لفظ مخافۃ یا اس کے کوئی ہم معنی لفظ محذوف ہو جاتا ہے۔ اس حذف کی مثالیں کلام عرب میں بھی موجود ہیں اور قرآن میں بھی۔ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے نظائر اپنی کتاب اسالیب القرآن میں جمع کر دیے ہیں۔ ہم بھی اپنی اس تفسیر میں جگہ جگہ اس کو واضح کر رہے ہیں۔

یہود کے دل کا ایک چور

اس اسلوب کو ذہن میں رکھنے کے بعد آیت سے مذکورہ بالا جملہ معترضہ کو الگ کر کے اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ کو وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَکُمْ کے ٹکڑے سے ملائیے تو معلوم ہوگا کہ یہ درحقیقت ان کے اس باطنی محرک پر روشنی ڈالی جا رہی ہے جس کے تحت وہ اپنے آدمیوں کو بڑے شد و مد کے ساتھ یہ سبق پڑھاتے تھے کہ وہ کسی حال میں بھی کسی غیر اسرائیلی نبی کے دعوے کی صداقت تسلیم نہ کریں۔ یہ باطنی محرک یہ ہے کہ ان کے دل میں یہ چور تھا کہ کہیں اس طرح کی دینی سیادت و پیشوائی بنی اسماعیل کو بھی حاصل نہ ہو جائے جس طرح کی سیادت اب تک صرف ان کو حاصل رہی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی دل میں تھا کہ اگر ہماری طرف سے کوئی اعتراف اس دین اور اس نبی کے حق میں زبان سے نکل گیا تو مسلمان اس کو قیامت کے دن ہمارے خلاف حجت بنائیں گے کہ ہم نے حق واضح ہونے کے باوجود اس کی تکذیب کی۔ قرآن نے ان کے دل کے اس چور کو ایک دوسرے مقام میں بھی پکڑا ہے جہاں یہ واضح فرمایا ہے کہ یہود اپنے لوگوں کو اس بات کی سخت تاکید کرتے رہتے تھے کہ آخری نبی اور آخری دین کے باب میں تورات کے کسی اشارے کو مسلمانوں پر نہ کھولا جائے ورنہ وہ اس چیز کو قیامت کے روز ان کے خلاف دلیل بنائیں گے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا	اور جب یہ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی
اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَا بَعْضُھُمْ	ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے
اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَھُمْ	سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم مسلمانوں کو وہ باتیں بتاتے
بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ	ہو جو اللہ نے تمہارے اوپر کھولی ہیں تاکہ مسلمان ان
لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ	کی بنا پر تمہارے رب کے سامنے تمہیں قائل کریں، کیا

رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○	تم لوگ یہ بات نہیں سمجھتے؟ کیا یہ لوگ یہ نہیں جانتے
أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللّٰهَ	کہ اللہ ان کی اس بات کو بھی جانتا ہے جو آپس میں
يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا	رازدارانہ طور پر کہتے ہیں اور اس بات کو بھی جانتا
يُعْلِنُونَ ○ (۷۶-۷۷، بقرہ)	ہے جو وہ مسلمانوں سے علانیہ کہتے ہیں۔

ان دونوں اسلوبوں کے واضح ہو جانے کے بعد اب آیت کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ یہود کے علما اور لیڈروں کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ تم اپنی قوم کے اندر اس تعصب کی آگ بھڑکا رہے ہو کہ کسی اسرائیلی کے لیے کسی غیر اسرائیلی کی نبوت کی تصدیق جائز نہیں۔ حالانکہ یہ بات محض حماقت اور تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اصل شے تو خدا کی ہدایت ہے جس کا تمھیں طالب ہونا چاہیے۔ خواہ وہ بنی اسرائیل کے کسی شخص پر نازل ہو یا بنی اسماعیل کے۔ تمھارا یہ تعصب حق کی عصبیت وحمیت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض خوف وحسد کا نتیجہ ہے۔ تم ڈرتے ہو کہ مبادا وہ سیادت و پیشوائی جو اب تک صرف تمھیں حاصل رہی ہے کسی دوسرے کو حاصل ہو جائے۔ آیت میں اَحَدٌ کا لفظ ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اس اَحَدٌ کا اشارہ بنی اسماعیل ہی کی طرف ہے جن کے اندر نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی۔ چونکہ یہاں بنی اسرائیل کے دل کے ایک راز کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اس وجہ سے قرآن نے اس کو مبہم ہی رکھا ہے۔ اَوْ يُحَاجُّوْكُمْ سے جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا، ان کے اس اندیشے کی طرف اشارہ ہے کہ اگر آج اسلام اور پیغمبر اسلام کے حق میں ان کے کسی آدمی کی زبان سے کوئی بات نکل گئی تو اس کو قیامت کے دن مسلمان ان کے خلاف حجت بنائیں گے۔

قرآن نے اس پر فرمایا کہ اپنی جس سیادت و پیشوائی کو بچانے کے لیے تم یہ جتن کر رہے ہو، یہ تمھارے اختیار کی بات نہیں ہے۔ عزت و فضیلت اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے بخشتا ہے اور جس سے چاہے چھینتا ہے۔ اسی نے تم کو یہ عزت بخشی تھی اور اب وہی اگر اس کے لیے کسی دوسرے کو منتخب کر رہا ہے تو تم اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے۔ اس کا فیصلہ نافذ ہو کر رہے گا۔ اَللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت کو تمھارے تنگ پیمانوں سے ناپ کر نہیں دیتا جن میں تمھارے سوا کسی اور کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے بلکہ وہ بڑی سمائی رکھنے والی ہستی ہے اور اس کا ہر فیصلہ علم و خبر پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کس چیز کا مستحق ہے اور کون مستحق نہیں ہے۔

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ الآیۃ میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اس بات کی طرف کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ایک عظیم اور بے پایاں برکت و رحمت ہے۔ دوسری اس بات کی طرف کہ یہ بنی اسماعیل پر اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام ہے کہ اس نے ان کے خاندان کو اس عظیم اور عالمگیر برکت کے ظہور کے لیے منتخب فرمایا۔ اس سے لازمی نتیجہ کے طور پر دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ بنی اسماعیل پر یہ حق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم انعام کی قدر کریں اور اس کے شکر گزار ہوں۔ دوسری یہ کہ بنی اسرائیل کے غصہ

اور حسد کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے اپنی اس عظیم برکت سے امیوں کو نوازا وہ جس کو چاہے اپنی رحمت کے لیے خاص کرے، اس کی مشیت میں خود اس کی حکمت کے سوا اور کسی کو بھی دخل نہیں ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ (۷۵)

اُمیین اور سبیل کا مفہوم

'اُمِّيّٖنَ' سے مراد بنی اسماعیل ہیں۔ اس لفظ پر مفصل بحث ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔ 'سَبِيْلٌ' کے معنی یہاں الزام اور مواخذہ کے ہیں۔ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ یعنی امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی الزام اور مواخذہ نہیں۔

یہود کا ایک من گھڑت فتویٰ

یہ قرآن نے امیین سے متعلق بنی اسرائیل کے ذہن اور ان کے مجموعی کردار کو واضح کیا ہے کہ وہ ان کی امانتوں میں خیانت کرنے اور ان کے مال کو ہڑپ کر جانے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے بلکہ اس کو اپنی دینداری کا حق سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ تورات میں غصب، خیانت اور سود خواری وغیرہ کی جو ممانعت وارد ہے اس کا تعلق غیر قوموں خصوصاً کافر قوموں سے نہیں ہے۔ اپنے اس من گھڑت شرعی فتوے کے تحت انھوں نے دوسری قوموں سے ہر قسم کی بدمعاملگی جائز کر لی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ عرب بنی اسماعیل کو بھی اسی فہرست میں داخل کرتے تھے اس وجہ سے ان کے مال کو بھی خیانت، بدعہدی یا سود وغیرہ کی راہ سے ہڑپ کرنا ان کے نزدیک کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی۔ اہلِ عرب، یہودی سود خواروں اور مہاجنوں کے پاس اگر کوئی چیز بطور امانت یا رہن رکھتے تو شاید ہی کوئی قسمت والا ہوتا جو ان کے حلق سے اپنا مال نکالنے میں کامیاب ہوتا۔ وہ اس کو دبا بیٹھتے اور اپنے اس فعل کو ثواب ثابت کرنے کے لیے انھوں نے اپنے مولویوں سے فتوے بھی حاصل کر رکھے تھے کہ کافروں کا مال ہڑپ کر جانے میں کوئی عیب نہیں ہے۔

قرآن نے ان کا یہ کردار نمایاں کرنے کے لیے واضح کیا ہے کہ جو تمھاری چند ٹکوں کی امانت واپس کرنے میں یہ لیت و لعل کرتے ہیں اور اس کے لیے انھوں نے اس اہتمام سے شرعی حیلے ایجاد کر رکھے ہیں، ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ تمھارے نبی اور تمھارے مذہب و شریعت کے بارے میں یہ پچھلے نبیوں کی جن پیشین گوئیوں کے امین بنائے گئے تھے ان کو وہ آسانی سے ادا کریں گے اور خلق کے سامنے ان کی شہادت دینے کی ذمہ داری اٹھائیں گے۔ جو لوگ دنیا کی نہایت حقیر چیزوں میں خائن ہیں وہ اتنی بڑی امانت ادا کرنے کے لیے دل گردہ کہاں سے لائیں گے!

لیکن یہود جیسی ذلیل قوم کے اس کردار کو بیان کرتے ہوئے بھی قرآن نے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، بلکہ ان میں جو اچھے کردار کے لوگ تھے ان کے کردار کی اچھائی کی داد دی بلکہ پہلے انھی کا ذکر

کیا نا کسان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ اس میدان میں اور آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ یہی لوگ تھے جو بعد میں اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔

وَيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔ یہ ان کے اس من گھڑت اور خانہ ساز فتوے کی تردید کی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا، کہ امیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ اخلاق و شریعت کی پابندیوں سے بری ہیں۔ یہ اللہ اور شریعت پر ان کا بہتان تھا اور اس کے خلافِ شریعت ہونے سے وہ خود بھی واقف تھے لیکن محض اپنی خواہشات کی پیروی اور حرصِ دنیا میں انھوں نے اس قسم کے حیلے ایجاد کر لیے تھے۔ بعد میں یہی فتوے تحریف کی راہ سے تورات میں داخل ہو گئے۔ یہاں تک کہ اب اگر کوئی تورات کو پڑھے تو وہ عام اخلاقی و انسانی حقوق و معاملات میں بھی محسوس کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے شریعت کچھ اور ہے اور غیر بنی اسرائیل کے لیے، جن کو تورات میں اجنبیوں اور پردیسیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے، کچھ اور۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۷۶)

اس آیت میں اور اس اسلوب پر مبنی جتنی بھی آیات ہیں سب میں جواب شرط محذوف ہوتا ہے۔ اس کی بعض مثالیں سورۂ بقرہ میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ یہاں اگر جواب شرط کو واضح کیا جائے تو پوری بات یوں ہو گی کہ ہاں جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کریں اور حدود الٰہی کی حفاظت کریں تو وہ لوگ متقی ہیں اور اللہ متقین ہی کو دوست رکھتا ہے۔

اوپر والی باتوں پر استدراک — یہ آیت یہود کی اوپر والی باتوں پر استدراک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہود کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ان کے لیے خدا کے ہاں کوئی خاص مرتبہ و مقام ہے جس کے سبب سے وہ دوسروں سے بالاتر اور امیوں کے معاملے میں ذمہ داریوں سے بری ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جو مرتبہ و مقام بھی ہے وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کریں اور ہر طرح کے حالات میں اس عہد کے تحت قائم کردہ حدود کی نگہداشت کریں۔ جن لوگوں کی روش یہ ہو گی وہ اللہ کے نزدیک متقی ہیں اور اللہ ایسے ہی متقی بندوں کو دوست رکھتا ہے۔ جو لوگ خدا کے عہد اور اس کے حدود کو توڑنے میں بے باک ہیں اور اس کے باوجود تقویٰ اور محبوبِ الٰہی ہونے کے مدعی ہیں وہ محض خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔

عام طور پر مترجمین قرآن نے اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ کا ترجمہ "اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں" کیا ہے۔ میرے نزدیک ضمیر کا مرجع اللہ ہے۔ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ آگے والی آیت ملاحظہ ہو۔ ابن جریر نے بھی یہی تاویل کی ہے۔

۱۹۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۷۷-۸۰

آگے کی آیات میں پہلے تو اہل کتاب کی اس عہد شکنی بلکہ عہد فروشی پر عتاب ہے جس کا ذکر اوپر

ہوا ہے۔ فرمایا کہ اللہ نے ان کو اپنے کلام و پیام سے نوازا، ان کے لیے تعلیم و تزکیہ کا اہتمام فرمایا اور ان کو اپنی نگاہِ لطف و کرم سے مشرف کیا لیکن انھوں نے دنیا کے حقیر مفادات کے بدلے میں اللہ کے عہد کو فروخت کیا اور اس کی بے پایاں عنایات کی نہایت بے دردی کے ساتھ ناقدری کی اس وجہ سے اب آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔

پھر ان کی بعض تحریفی کوششوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ نے جو کتاب انھیں ہدایت و رہنمائی کے لیے عطا فرمائی، انھوں نے اس میں توڑ مروڑ اور لچک لچکا کر اس غرض کے لیے تصرفات کیے کہ جو چیز اللہ کی کتاب کی نہیں تھی وہ کتاب کی سمجھی جائے۔

پھر اہلِ کتاب بالخصوص نصاریٰ کو دعوت دی ہے کہ وہ عقلِ سلیم کی روشنی میں غور کریں کہ آج جن باتوں کو وہ مسیح کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ باتیں وہ کتاب و حکمت اور نبوت کے حامل ہوتے ہوئے کس طرح کہہ سکتے ہیں۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

آیات ۷۷-۸۰ إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا
أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ
إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ
أَلِيمٌ ﴿٧٧﴾ وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ
لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ
عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ
وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٨﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ
وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ
دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ
الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ﴿٧٩﴾ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا
الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا ۗ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ

ع ۸ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۰﴾

ترجمۂ آیات ۷۷-۸۰

جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو ایک حقیر قیمت کے عوض بیچتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور اللہ نہ ان سے بات کرے گا، نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ ۷۷

اور ان میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی ہے جو اپنی زبان کو کتابِ الٰہی کے ساتھ توڑتا مروڑتا ہے تاکہ تم اس کو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ سمجھو حالانکہ وہ کتابِ الٰہی کا حصہ نہیں اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے حالانکہ وہ اللہ کے پاس سے نہیں ہے۔ وہ اللہ پر جانتے بوجھتے جھوٹ باندھتے ہیں۔ ۷۸

کسی بشر کی شان نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، قوتِ فیصلہ اور منصبِ نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں کو یہ دعوت دے کہ لوگو! اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو لوگوں کو یہی دعوت دے گا کہ لوگو! اللہ والے بنو، بوجہ اس کے کہ تم کتابِ الٰہی کی دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ تمہیں یہ حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ۔ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم خدا کے فرمانبردار ہو۔ ۷۹-۸۰

۲۰- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَشۡتَرُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَاَيۡمَانِهِمۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنۡظُرُ اِلَيۡهِمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيۡهِمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۷۷﴾

اشتراء کا مفہوم

اشتراء کے لفظ پر سورہ بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے۔ جب مبادلہ چیز کا چیز سے ہو، جس کا عموماً قدیم زمانہ میں رواج تھا تو ہر شے مبیع بھی ہو سکتی ہے اور ثمن بھی۔ اس وجہ سے کسی شے کا اشتراء درحقیقت اس مفہوم میں خریدنا نہیں ہوتا تھا جس مفہوم میں ہم خریدنا بولتے ہیں بلکہ اس کا مفہوم مبادلہ ہوتا

تھا۔ اس وجہ سے 'اشتراء' کا لفظ بدلنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور پھر اس مفہوم سے ترقی کر کے ترجیح دینے کے معنی میں بھی۔

'عہد اللہ' سے مراد

'عَهْدِ اللّٰهِ' سے مراد کتاب و شریعت ہے اس لیے کہ کتاب و شریعت کی حیثیت اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان معاہدے کی ہوتی ہے۔ یہاں اس عام مفہوم کے اندر ایک خاص اشارہ اس عہد کی طرف بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے آخری بعثت کے باب میں لیا تھا اور جس کو اہل کتاب نے نہ صرف نسیاً منسیاً کر دیا تھا بلکہ اس کے آثار انھوں نے اپنی کتابوں سے بھی مٹا ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

'ایمان' سے مراد

'اَیْمَان' سے مراد وہ عام عہد و پیمان ہیں جن پر اجتماعی و تمدنی زندگی کی بنیاد ہوتی ہے اور جن سے معاشرتی زندگی اور معاملات میں اعتماد اور حسن ظن کی فضا بنتی ہے۔ یہود کا اس معاملے میں جو حال تھا وہ اوپر واضح ہو چکا ہے کہ انھوں نے امانتوں میں خیانت کرنے اور اپنے کیے ہوئے عہد و پیمان کی ذمہ داریوں سے فرار کے لیے کیسے کیسے شرعی حیلے ایجاد کر لیے تھے۔

'لَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ' میں فعل کی نفی اس کے حقیقی معنی کے اعتبار سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان سے اس معنی میں کلام نہیں کرے گا یا ان کی طرف نظر نہیں کرے گا جو کلام کرنے اور نظر کرنے کا اصلی مفہوم ہے۔ یہ اسلوب عربی زبان ہی میں عام ہے بلکہ ہر زبان میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنے قول و قرار کو اس طرح خرید و فروخت کی چیز بنائے ہوئے ہیں اور اپنے دنیوی مفادات پر (جن کی بڑی سے بڑی مقدار بھی اجر آخرت کے بالمقابل حقیر ہی ہے) ان کو اس بے دردی سے قربان کر رہے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ اپنے جواہرات کو کوڑیوں کے عوض فروخت کر چکے ہیں اور جو لوگ اللہ کی امانت کے معاملے میں ایسے نااہل ثابت ہوئے ان سے نہ تو اللہ اب بات کرے گا، نہ ان کی طرف نظر کرے گا، اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ اب آخرت میں ایسے شامت زدوں کے لیے دردناک عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

یہود سے شدید نفرت کا اظہار

الفاظ کے تیور جو لوگ پہچانتے ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں ان کے اندر کتنی نفرت اور کیسی شدید بیزاری چھپی ہوئی ہے لیکن اہل کتاب بالخصوص یہود اپنی ان کارستانیوں کے باعث جن کا اوپر ذکر ہوا اسی کے سزاوار تھے۔ خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ یہ وہ قوم تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے پیغمبر کے واسطے سے اپنے خاص کلام و خطاب کے شرف سے نوازا۔ یہ فرعونیوں کے قدموں کے نیچے روندی جا رہی تھی تو خدا نے اس پر عنایت کی نظر کی اور اس کو اس ذلت سے نکال کر سیادت و امامت کے تخت پر بٹھایا۔ اس کے تزکیہ کے لیے کتاب نازل فرمائی اور اس کو سنوارنے اور سدھارنے کے لیے اس کے اندر اپنے نبی اور رسول بھیجے لیکن اس قوم نے نہ تو اس خطاب و کلام کی کچھ قدر کی اور نہ اس نظر شفقت و عنایت اور اس تزکیہ و تطہیر کی۔ جس کا خدا اور اس کے نبیوں نے یہ کچھ اہتمام کیا تھا اب اس قوم کا یہی منصب ہے کہ اللہ اس سے بات

کرے، یا اس کی طرف نظر کرے یا اس کو پاک کرے۔ اس نے تو اپنے اوپر امید کے سارے دروازے خود بند کر لیے۔

اس آیت میں تزکیہ کی جو نفی ہے اس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آخرت تزکیہ کا محل نہیں ہے، اس کا محل یہ دنیا ہے۔ جب انھوں نے یہاں اس کا موقع ضائع کر دیا تو آخرت میں وہ اس کو حاصل نہ کر سکیں گے۔ دوسرا یہ کہ ان کے جرائم ایسے نہیں ہیں کہ یہ آخرت میں تھوڑی بہت سزا پا کر ان سے پاک ہو جائیں بلکہ یہ جرائم ان کو ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم میں لے ڈوبنے والے ہیں۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۷۸)

لوی، یلوی کا مفہوم: لوی، یلوی، لَیًّا کے معنی کسی چیز کو بٹنے، اینٹھنے، مروڑنے اور ایٹھنے کے ہیں۔ يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ کے معنی یہ ہوئے کہ کتابِ الٰہی کے بعض الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ اپنی زبان اس طرح توڑتے مروڑتے ہیں کہ الفاظ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔

عہدِ الٰہی سے فرار کی ایک تدبیر: یہ اہل کتاب کی ان تدبیروں میں سے ایک تدبیر ہے جو انھوں نے عہدِ الٰہی کی ذمہ داریوں سے فرار کے لیے اختیار کی تھیں۔ تفسیر بقرہ میں جہاں ہم نے تحریف کے سوال پر بحث کی ہے وہاں بتایا ہے کہ تحریف کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ قرأت کی راہ سے لفظ یا جملہ کا تلفظ توڑ مروڑ کر اس طرح بگاڑ دیتے تھے کہ اصل حقیقت بالکل گم ہو کر رہ جاتی تھی۔ اس جرم کا ارتکاب یہود اور نصاریٰ دونوں ہی نے کیا ہے۔ اس کی مثال میں ہم نے لفظ "مروہ" کا ذکر کیا ہے۔ یہ لفظ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت کے سلسلہ میں آیا ہے کہ اس مقام پر ان کو بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا۔ یہود نے اس قربانی کے واقعے میں جہاں کی اور بہت سی نوعیت کی بہت سی تبدیلیاں کی ہیں وہیں لفظ مروہ کی قرأت کو بگاڑ کر موریا، موریا، موریاہ، مورہ اور نہ جانے کیا کیا بنایا تاکہ مکہ کی مشہور پہاڑی مروہ کے بجائے اس سے بیت المقدس کے کسی مقام کو مراد لے سکیں اور اس طرح حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ہجرت و قربانی کے واقعہ کا تعلق بیت اللہ سے بالکل کاٹ دیں۔ مقصد اس ساری کاوش سے ان کا یہ تھا کہ اس ایر پھیر سے ان پیشین گوئیوں اور اشارات کا رخ موڑا جا سکے جو نبی اسماعیل اور ان کے اندر نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تورات کے صحیفوں میں وارد تھیں۔ اسی طرح کی حرکت انھوں نے لفظ بکہ کی قرأت میں کی جس پر آگے چل کر ہم بحث کریں گے۔

اس سازش کے ذکر کے بعد ان کی جسارت اور ڈھٹائی کی طرف توجہ دلائی کہ یہ حرکت وہ اس مقصد سے کرتے ہیں کہ جو چیز کتاب الٰہی کی نہیں ہے اس پر کتاب الٰہی کا لیبل چسپاں کر دیں اور جو چیز اللہ کی طرف سے نہیں ہے اس کو اللہ کے نام پر پیش کریں، فرمایا کہ یہ جانتے بوجھتے اللہ کے اوپر جھوٹ باندھتے ہیں اور اللہ پر جھوٹ باندھنے سے بڑی جسارت اور کیا ہو سکتی ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا ؕ أَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۷۹-۸۰)

'حکم' کے مختلف مفہوم

'حکم'[1] کے معنی قضا اور فیصلہ کے ہیں۔ اپنے اسی مفہوم کی روح کو لیے ہوئے یہ قرآن میں تین مختلف پہلوؤں سے استعمال ہوا ہے۔

بعض جگہ مجرد فیصلہ کے معنی میں مثلاً وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ (۷۸۔ انبیاء) (اور ہم ان کے فیصلہ کے وقت موجود تھے) أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا (۵۰۔ مائدہ) (کیا وہ جاہلیت کے فیصلہ کے طالب ہیں اور اللہ سے بڑھ کر کون فیصلہ کرنے والا ہے)

بعض مقامات میں قوتِ فیصلہ اور بصیرت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (۷۴۔ انبیاء) (اور لوط کو ہم نے قوتِ فیصلہ عطا فرمائی اور علم) وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً (۱۲-۱۳۔ مریم) (اور ہم نے اس کو بچپن میں فیصلہ کی قوت دی اور خاص اپنے پاس سے سوز و گداز اور پاکیزگی)

بعض آیات میں امر و حکم کے معنی میں ہے مثلاً فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۱۲۔ غافر) (پس حکم خدائے بلند و بزرگ کے لیے ہے) وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۷۰۔ قصص) (اور اسی کے لیے حکم ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے)

یہاں موقع و محل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اپنے دوسرے اور تیسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

'ربانی' کا مفہوم

'رَبّٰنِيّ' کے معنی خدا پرست اور اللہ والے کے ہیں۔ یہ لفظ عربی میں عبرانی سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ربّی کا لفظ تورات اور انجیل میں بہت آیا ہے۔ صورت ذرا دونوں کی مختلف ہے لیکن معنًا کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔

اس آیت کا رخ خاص طور پر نصاریٰ کی طرف ہے جو اس سورہ میں اصلاً مخاطب ہیں۔ اب تک کی بحث بیشتر نقل پر مبنی تھی۔ اس آیت میں عقلِ سلیم کو مخاطب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ سوچنے کی بات ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک انسان جس کو اللہ تعالیٰ کتاب و حکمت اور نبوت سے سرفراز فرمائے، وہ لوگوں کو اللہ کے بجائے اپنا بندہ بننے کی دعوت دے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری بدعات نہ صرف مسیحؑ کی تعلیمات، تمہاری مسلمہ تاریخ، اور انبیاء کے متفق علیہ عقاید کے بالکل خلاف ہیں بلکہ عقلِ سلیم بھی مسیحؑ کی طرف ان کی نسبت قبول نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو نبوت و رسالت کے منصب پر سرفراز فرماتا ہے اور اس

---

[1] لفظ حکم کی یہ تحقیق استاذ امامؒ کا افادہ ہے۔

کو کتاب و حکمت عطا فرماتا ہے تو اس لیے کہ وہ لوگوں کو دوسروں کی بندگی اور غلامی سے چھڑا کر خدا کی بندگی و غلامی میں لائے نہ کہ ان کو خدا سے چھڑا کر اپنا بندہ بنانے کی کوشش کرے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جس کو خدا نے اپنے گلّے کی تلاش کے لیے بھیجا وہ خود ہی اس کے گلّے کو بھٹکانے والا بن گیا۔ بھلا اس سے بڑی تہمت خدا کے ایک رسول پر اور کیا ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد بتایا کہ ایک حامل کتاب و حکمت نبی اگر تمھیں دعوت دے سکتا ہے تو اس بات کی دے سکتا ہے کہ لوگو! خدا پرست اور اللہ والے بنو اس لیے کہ تمھارے کتاب الٰہی کے پڑھنے پڑھانے والے ہونے کا اگر کوئی صحیح تقاضا ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے۔

پھر فرمایا کہ جس طرح وہ لوگوں کو اپنا بندہ بننے کی دعوت نہیں دے سکتا اسی طرح وہ یہ دعوت بھی نہیں دے سکتا کہ فرشتوں اور نبیوں کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ بنالو اس لیے کہ دعوتِ ایمان کے ساتھ یہ کفر کی دعوت کس طرح جمع ہو سکتی ہے؟ کیا جو شخص تمھارے لیے ایمان و اسلام کی دعوت لے کر آئے گا وہی تمھیں مسلم بنانے کے بعد کفر میں جھونکنے کی کوشش کرے گا۔

اس آخری ٹکڑے میں خطاب میں ذرا وسعت پیدا ہو گئی ہے یعنی نصاریٰ کے ساتھ ساتھ اس میں ایک اشارہ قریش کی طرف بھی ہو گیا ہے جو فرشتوں اور نبیوں کے بھی بت بنا کر پوجنے لگے تھے۔

۲۱۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۸۱-۹۱

اب آگے پہلے ایک جامع میثاق کا حوالہ دیا ہے جو اہل کتاب سے انبیا علیہم السلام خصوصاً آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت کے لیے لیا گیا تھا اور اہل کتاب نے من حیث الجماعت اس کا اقرار کیا تھا لیکن اب وہ، جیسا کہ اوپر تفصیلات گزریں، اس کی ذمہ داریوں سے گریز اختیار کر رہے ہیں۔

پھر اہل کتاب سے باندازِ تعجب سوال کیا ہے کہ اگر وہ آخری نبی پر ایمان لانے اور اپنے باندھے ہوئے عہد کی ذمہ داریوں سے گریز اختیار کر رہے ہیں تو کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں؟ اللہ کا دین تو اسلام ہے اور یہی دین اس تمام کائنات کا دین ہے اس لیے کہ اس کائنات کی ہر چیز اپنے دائرہ تکوینی میں طوعاً و کرہاً بہرحال اللہ ہی کی اطاعت کرتی ہے۔

اس کے بعد امت مسلمہ کے کلمۂ جامعہ کا حوالہ دیا ہے کہ اگر یہ اہل کتاب اپنے تعصبات کی جکڑ بند سے آزاد نہیں ہونا چاہتے تو تم ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور یہ اعلان کر دو کہ ہم تمام انبیا پر ایمان لاتے ہیں، ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم خدا ہی کے فرماں بردار ہیں۔

پھر آگے کی آیات میں ان اہل کتاب کے انجام بد کا ذکر فرمایا ہے کہ بھلا یہ لوگ جنھوں نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کی ہے اور آخری رسولؐ کو پہچاننے کے بعد اس کی تکذیب کی ہے، خدا کی ہدایت سے

کس طرح بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔ یہ تو اس کے سزاوار ہیں کہ ان پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام خلق کی لعنت ہو ـــ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۸۱-۹۱

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ
حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ
بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ
اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ
الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾
اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ
وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ
اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَ
النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ
مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ
مِنْهُ ۚ وَھُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ
قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ
حَقٌّ وَّجَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾
اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا
هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ
ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ
يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۭ
ع ۹ ۱۱ ۱۷ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾

ترجمۂ آیات ۸۱-۹۱

اور یاد کرو جب کہ خدا نے تم سے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا۔ ہر گاہ میں نے تمھیں کتاب اور حکمت عطا فرمائی، پھر آئے گا تمھارے پاس ایک رسول مصداق بن کر ان پیشین گوئیوں کا جو تمھارے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ پوچھا کیا تم نے اس امر کا اقرار کیا اور اس پر میری ڈالی ہوئی ذمہ داری تم نے اٹھائی، بولے کہ ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا کہ تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ تو جو لوگ اس عہد کے بعد پھر جائیں گے وہی لوگ نافرمان ٹھہریں گے۔ ۸۱-۸۲

کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ جو آسمان و زمین میں ہیں طوعاً و کرہاً سب اسی کے فرمانبردار ہیں اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے تم کہہ دو کہ ہم تو اللہ پر اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہم پر اتاری گئی اور اس چیز پر جو ابراہیم اسماعیل، اسحاق، یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور اس چیز پر جو موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے دی گئی، ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب بنے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا۔

اللہ ان لوگوں کو کس طرح بامراد کرے گا جنھوں نے ایمان کے بعد کفر کیا درآنحالیکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ رسول سچے ہیں اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں بھی آچکی ہیں اور اللہ ظالموں کو بامراد نہیں کرے گا۔ ان لوگوں کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور سارے لوگوں کی لعنت ہوگی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا، نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی۔ البتہ جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ اور اصلاح کرلی تو بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد اور اپنے کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی اور یہی لوگ اصلی گمراہ ہیں۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے اگر وہ زمین بھر سونا بھی فدیہ میں دیں تو قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان کے لیے عذاب دردناک ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

۹۱-۸۳

۲۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ
لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ ۚ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا أَقْرَرْنَا ۚ
قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ ۝ فَمَن تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۸۱-۸۲)

انبیا کے باب میں بنی اسرائیل سے میثاق

'مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ' میں اضافت فاعل کی طرف نہیں بلکہ مفعول کی طرف ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ انبیا سے میثاق لیا گیا بلکہ یہ مطلب ہے کہ انبیا کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا۔ یہ میثاق، جیسا کہ آیت میں ذکر ہے، اس بات کے لیے تھا کہ بنی اسرائیل چونکہ کتاب و حکمت کے حامل اور امین بنائے گئے ہیں اس وجہ سے ان کے اس منصب کا فطری تقاضا یہ ہے کہ جو انبیا آئیں خاص طور پر آخری نبی جب آئیں تو سب سے آگے بڑھ کر ان پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں۔ اس عہد کا ذکر قرآن میں مختلف اسلوبوں سے ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ میں ہے۔

وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ	اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ اور اٹھائے ہم نے
وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا ۖ وَقَالَ	ان میں سے بارہ نقیب اور اللہ نے فرمایا کہ میں تمہارے

اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ
وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ
وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا
لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ
كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ
سَوَآءَ السَّبِیْلِ (۱۲ - مائدہ)

ساتھ ہوں اگر تم نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے
رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان
کی عزت کی اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہے، میں
تمہارے گناہ تم سے جھاڑ دوں گا اور تم کو ایسے باغوں
میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔
جس نے اس کے بعد تم میں سے کفر کیا تو وہ وسط شاہراہ
سے بھٹک گیا۔

نبی اُمّی کے باب میں میثاق

اس آیت میں رُسُل کا لفظ ہے جو عام ہے لیکن ایک دوسری آیت میں نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم
کی تصریح بھی ہے، ملاحظہ ہو۔

فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۝
اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ
الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ
فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ
بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ
عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ
وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ
وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۱۵۶ - ۱۵۷ اعراف)

پس میں اپنی اس رحمت کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا
جو تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور
جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے یعنی ان لوگوں پر
جو اس رسول اور نبی امی کی پیروی کریں گے جس کو
وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں،
جو انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، ان کے لیے پاکیزہ چیزوں
کو حلال ٹھہراتا ہے، ان پر گندی چیزوں کو حرام کرتا
ہے اور ان پر سے اس بوجھ اور ان پابندیوں کو دور
کرتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں۔ تو جو لوگ اس
پر ایمان لائے، اس کی توقیر اور مدد کی اور اس روشنی
کی پیروی کی جو اس پر اتاری گئی، وہی فلاح پانے
والے ہیں۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہود اور نصاریٰ دونوں ہی سے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی تائید و نصرت کا عہد لیا گیا تھا، لیکن انھوں نے اس عہد کی کوئی پروا نہیں کی۔ اس عہد کے کچھ آثار تورات اور انجیل میں ابھی موجود ہیں لیکن اب وہ تحریف کے گرد و غبار سے بہت بڑی حد تک دھندلے ہو چکے ہیں، مناسب موقع پر وہ زیر بحث آئیں گے۔

رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ سے مراد نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ کی وضاحت ہم بقرہ میں کر چکے ہیں۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک خاص اہمیت رکھنے والا پہلو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے ظہور اور آپ کی صفات اور کارناموں سے ان پیشین گوئیوں کا مصداق سامنے آیا تھا جو تورات اور انجیل میں موجود تھیں اور جن کے مصداق کے ظہور کے لیے اہل کتاب منتظر بھی تھے اور ان کو منتظر ہونا چاہیئے بھی تھا۔ اس لیے کہ ان پیشین گوئیوں کی تصدیق سے سب سے پہلے انھی کا سر اونچا ہوتا۔ لفظ تصدیق کے اس مفہوم کے لیے ایک حماسی شاعر کا یہ شعر پیشِ نظر رکھیے۔

فدت نفسی وما ملکت یمینی　　فوارس صدقوا فیھم ظنونی

"میری جان اور میرا مال ان شہسواروں پر قربان جنھوں نے اپنے بارے میں میرے سارے گمان سچے ثابت کر دیئے۔"

اس پہلو سے اگر یہود و نصاریٰ غور کرتے تو وہ دیکھتے کہ حضورؐ کی بعثت سے خود ان کی اور ان کی کتابوں کی تصدیق ہو رہی ہے لیکن یہ ان کی شامت تھی کہ جس نے ان کی تصدیق کی اس کو انھوں نے جھٹلایا اور جس کی حجت اور جس کی شہادت کا بارِ گراں وہ اتنی مدت تک اٹھائے پھرے جب وہ آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کر دی۔

بنی اسرائیل میں میثاق لینے کی صورت

ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰی ذٰلِكُمۡ اِصۡرِیۡ کا ایک خاص موقع و محل ہے جس کو نگاہ میں رکھنا چاہیئے تب اس ٹکڑے کا زور سمجھ میں آجائے گا۔ موسوی شریعت میں یہ قاعدہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرح کی ہدایات اترتیں تو حضرت موسیٰؑ ان کو انفرادی طور پر اپنے صحابہ کو صرف سنا دینے ہی پر اکتفا نہ فرماتے بلکہ بنی اسرائیل کی پوری جماعت یا کم از کم ان کے تمام سرداروں کو خیمۂ عبادت میں جمع کرتے، تلاوت سامنے ہوتا، حضرت موسیٰؑ وعظ و تذکیر کے بعد خدا و ندِ خدا کا حکم سناتے پھر سب سے اس کی اطاعت کا اقرار لیتے سب کے اقرار کے بعد لوگوں کو اس کا گواہ رہنے کی تاکید کرتے، اور خدا کو اس پر گواہ ٹھہراتے۔ آخر میں اس حکم کی نافرمانی کے دنیوی و اخروی عواقب و نتائج سے بھی آگاہ فرما دیتے۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ کا ہر امر و نہی اللہ تعالیٰ اور بنی اسرائیل کے درمیان ایک عہد و میثاق کا درجہ حاصل کر لیتا۔ اب یہ کس قدر جسارت کا مقام ہے کہ جس شریعت کے تحفظ کے لیے یہ جتن کیے گئے اس کے حاملوں نے اس کے ایک ایک عہد کے پرزے اڑا کے رکھ دیئے۔ اس روشنی میں فَمَنۡ تَوَلّٰی بَعۡدَ ذٰلِكَ کے الفاظ پر غور کیجیے تو بَعۡدَ ذٰلِكَ کا حقیقی وزن محسوس ہوگا کہ اس کے بعد بھی جو لوگ اپنے عہد سے منہ موڑیں تو ان سے بڑھ کر عہد شکن کون ہوگا؟ فاسق کا لفظ یہاں عام معنوں میں نہیں ہے بلکہ جس طرح ابلیس کے بارے میں وارد ہے کہ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهٖ کہ وہ اپنے رب کے حکم سے نکل بھاگا اسی مفہوم میں یہاں بنی اسرائیل کے لیے استعمال ہوا۔

اَفَغَیۡرَ دِیۡنِ اللّٰهِ یَبۡغُوۡنَ وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا وَّاِلَیۡهِ یُرۡجَعُوۡنَ (۸۳)

اسلام تمام کائنات کا دین ہے

اہل کتاب کے اس تمام گریز و فرار پر اب یہ باندازِ استعجاب سوال کیا ہے کہ آخر اسلام اور پیغمبر اسلام سے اس سعی فرار کا مقصد کیا ہے؟ کیا اللہ کے دین کے سوا یہ اہل کتاب کسی اور دین کے طلبگار ہیں۔ اللہ کا دین ازل سے اسلام ہے۔ یہی دین اس نے تمام نبیوں اور رسولوں کو دیا اور یہی دین اس پوری کائنات کا دین ہے۔ سورج، چاند، ابر، ہوا اور آسمان و زمین سب اسی دین کے پیرو ہیں۔ اسلام کی حقیقت اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دینا ہے۔ کس کی مجال ہے جو خدا کے حکم اور اس کے قانون سے سرتابی کر سکے۔ جو اپنے محدود دائرۂ اختیار میں (اور یہ دائرۂ اختیار بھی خدا ہی کا قائم کردہ اور اسی کی مشیت کے تحت ہے) کوئی سرتابی کرتے بھی ہیں تو وہ بھی دائرۂ تکوینی کے اندر خدا کے قوانین کے تحت عاجز و سرفگندہ ہیں کس کی تاب ہے کہ وہ زندگی اور موت کے طبعی قوانین سے بھاگ سکے۔ پس فطرت اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنے محدود دائرہ اختیار میں بھی اسی خالق و مالک کے قوانین کی طوعاً تابعداری کرے جس کے قوانین کی تابعداری اپنے دائرۂ تکوینی میں کرہاً کر رہا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی اس پوری کائنات کے ذرہ ذرہ سے ہم آہنگ و ہم رنگ ہو جائے گی۔ اس کے دائرۂ اختیار اور دائرۂ تکوینی دونوں میں کامل موافقت پیدا ہو جائے گی اور انسان خدا کی بخشی ہوئی آزادی کو خدا ہی کی شریعت کے حوالہ کر کے اپنے آپ کو فرشتوں اور نبیوں کی طرح خدا کے رنگ میں رنگ دے گا۔ یہی اسلام ہے۔ یہی صبغۃ اللہ ہے۔ یہی خدا کا دین ہے۔ یہی مذہب آدمؑ، یہی دعوتِ نوحؑ اور یہی ملتِ ابراہیمؑ ہے اور اسی کی دعوت لے کر یہ آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آئے ہیں۔ پھر اس دینِ فطرت اور اس دینِ کائنات کو چھوڑ کر یہ اہل کتاب ——— اہل کتاب ہو کر ——— کس دین کے طلبگار ہیں۔

"وَاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح اس زندگی میں خدا کے قانون سے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے، اسی طرح آگے بھی راہ بندھی ہوئی ہے۔ جو مر کے اس سے چھوٹتا ہے وہ بھی چھوٹتا نہیں بلکہ وہ بھی خدا ہی کے پاس جاتا ہے اور اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرتا ہے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓی اِبْرٰہِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّہِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْہُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ (۸۴)

اسلام کا کلمۂ جامعہ

یہ آیت بعینہٖ سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے تمام الفاظ اور مطالب پر بحث ہو چکی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۱۳۶ بقرہ۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اسلام کے کلمۂ جامعہ کا اعلان کرایا گیا ہے اور سیاقِ کلام یہ ہے کہ یہ اہل کتاب اگر اسلام کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں تو انھیں ان کی خواہش کے حوالہ کرو۔ شیطان جس وادی میں چاہے ان کو ٹھوکر کھلائے۔ تم ان کے پیچھے اپنی اوقات رائیگاں نہ کرو بلکہ اعلان کر دو کہ ہم تو اللہ اور اس کے اس دین پر ایمان لائے جو تمام انبیا کا دین ہے۔ ہم ان انبیا میں کوئی تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں، کسی کو نہ مانیں۔ ہم سب پر ایمان رکھتے ہیں اور ہم خدا ہی کے فرمانبردار ہیں

اور اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرتے ہیں۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۸۵)

اسلام کے حق میں دلائل واضح کر دینے کے بعد اب یہ صاف الفاظ میں اعلان فرما دیا کہ جو لوگ اسلام کے سوا کسی اور دین کے طالب بنیں گے یا اس پر جمے رہیں گے، عام اس سے کہ وہ یہودیت ہو یا نصرانیت یا کوئی اور دین، وہ اللہ کے ہاں قبول نہ ہوگا۔ ایسے لوگ آخرت میں محروم و نامراد ہوں گے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۸۶-۸۹)

لفظ 'ہدایت' کا خاص مفہوم

لفظ 'ہدایت' پر ہم بقرہ میں بحث کر چکے ہیں کہ اس کے تین مرحلے ہیں۔ آخری مرحلہ اس کا ہدایت آخرت کا ہے۔ اس مرحلہ میں غایت و مقصود کی طرف ہدایت ہوتی ہے اور بندہ اپنی مساعی کے ثمرہ سے بہرہ مند اور اپنی جدوجہد زندگی کے حاصل سے بامراد ہوتا ہے۔ ہدایت کا لفظ اس معنی میں بھی قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مجھے بار بار خیال ہوتا ہے کہ 'یھدی' اس آیت میں اسی معنی میں ہے۔ استاذ مرحوم اس سے ہدایت کا عام مفہوم ہی مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں بنی اسرائیل کے لیے جس ہدایت کی نفی ہے وہ من حیث القوم ہے، من حیث الافراد نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو قوم ایسے شدید جرائم کی مرتکب ہوئی ہے اس کے لیے اسلام کی راہ کس طرح کھل سکتی ہے!

'شھدوا' میں شہادت سے مراد دل کی شہادت ہے کہ ان اہل کتاب کے دل مانتے ہیں کہ یہ رسول سچے ہیں۔ ان کی وہ نشانیاں جو ان پر ظاہر ہوئی ہیں وہ اس قدر واضح ہیں کہ ان کی صداقت پر ان کے دل گواہی دیتے ہیں لیکن محض ضد، تعصب اور حسد کے سبب سے اس کو جھٹلاتے ہیں۔

یہ اوپر والی آیت کی توجیہ بیان ہوئی ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کس طرح بامراد کر سکتا ہے جنھوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا، جن کے پاس اس رسول کی صداقت کی کھلی ہوئی نشانیاں آ چکی ہیں لیکن وہ ان کی تکذیب کر رہے ہیں، جن کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہ رسول برحق ہیں لیکن پھر بھی ان کی زبانیں اس کو جھٹلاتی ہیں؟ ایسے لوگ اپنی فطرت، اپنی عقل اور اپنی رُوح پر بہت بڑا ظلم ڈھانے والے ہیں اور یہ سنت الٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو بامراد نہیں کرتا جو خود اپنے ہاتھوں اپنے نشاناتِ راہ گم کریں اور اپنے آپ کو خود ٹھوکر کھلائیں۔ ایسے لوگوں کی سزا یہی ہے کہ ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور ساری خلقت کی لعنت ہو۔ 'الناس' کے ساتھ 'اجمعین' کی تاکید اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ قیامت کے دن ان پر نیک اور بد سب ہی لعنت کریں گے۔ نیکوں کی لعنت کی وجہ تو واضح ہے، بد اس لیے

لعنت کریں گے کہ وہ ان کے سبب سے گمراہ ہوئے ـــــ چنانچہ قرآن میں تصریح ہے کہ قیامت کے دن گمراہ لیڈر اور ان کے گمراہ پیرو دونوں ایک دوسرے پر لعنت کریں گے، پیرو کہیں گے کہ تم نے ہمیں برباد کیا، اگر تم ہماری راہ نہ مارتے تو ہم ہدایت پر ہوتے، لیڈر کہیں گے ہم جیسے تھے ویسا ہی ہم نے تم کو بنایا، تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہدایت کی راہ اختیار نہ کی۔

خٰلِدِیْنَ فِیْھَا میں ضمیر کا مرجع دوزخ ہے۔ اگرچہ دوزخ کا ذکر الفاظ میں موجود نہیں ہے لیکن اوپر جس لعنت کا ذکر ہے اس نے اس کا ایسا واضح قرینہ بہم پہنچا دیا ہے کہ لفظوں میں اس کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ گویا لعنت خود عذاب کی قائم مقام بن گئی۔ زبان میں اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ سورۂ حدید کی تفسیر میں ہم اس اسلوب پر بحث کریں گے۔ اس عذاب کی نسبت فرمایا کہ نہ اس میں کسی مرحلے میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ اس سے ان کو کبھی مہلت ملے گی۔ اس میں پڑ جانے کے بعد ان کے لیے امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے البتہ وہ لوگ اس عذاب سے بچ جائیں گے جو ان تنبیہات کے بعد توبہ کر کے اپنے حالات کی اصلاح کر لیں گے اور جن حق پوشیوں کے اب تک مجرم ہوئے ہیں ان کا برملا اظہار و اعلان کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِم مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ (۹۰-۹۱)

ان لوگوں کا بیان جن کی توبہ قبول نہیں ہوتی

یہ ان لوگوں کا بیان ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ان تمام جرائم کا ارتکاب کر کے جن کا ذکر اوپر ہوا، ایمان کے بعد کفر میں مبتلا ہوئے۔ پھر اس کفر پر درجے کے بعد درجے چڑھاتے چلے گئے۔ جب وقت آخر آیا تو زبان سے توبہ توبہ کر لی، نہ اپنے جرائم کی اصلاح کی، نہ اپنی حق پوشیوں کا پیغمبر اور اہل ایمان کے سامنے اظہار و اعتراف کیا، نہ اللہ کی راہ میں انفاق اور پیغمبر کی حمایت و نصرت سے اپنے گناہ دھونے کی کوشش کی۔ بلکہ جیسا کہ قرآن میں اشارہ ہے، اس غلط آرزو میں مر گئے کہ سَیُغْفَرُ لَنَا اللہ ہماری ساری غلطیوں کو معاف فرما دے گا۔ قرآن نے یہاں واضح فرما دیا کہ جو لوگ اس قسم کی طمع خام میں مبتلا ہیں، نہ ان کی یہ توبہ توبہ ہے، نہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی توبہ کو پذیرائی بخشے گا۔

اسی طرح کا معاملہ ان لوگوں کا ہے جو ایمان کے بعد کفر میں مبتلا ہوئے اور اسی حالت کفر میں مر گئے۔ فرمایا کہ اگر اس طرح کے لوگ زمین برابر سونا بھی اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے بچانے کے لیے فدیہ میں دیں تو بھی قبول نہیں ہوگا۔ یہ اسلوب بیان محض ان کی نجات کے عدم امکان کی تعبیر کے لیے اختیار کیا گیا ورنہ آخرت میں نہ کسی کے پاس فدیہ میں دینے کے لیے کچھ ہوگا، نہ آخرت اس قسم کے لین دین کی کوئی جگہ ہے۔ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ، میں ان لوگوں کی اس طمع خام کی نفی ہے جو یہ اپنے بزرگ اسلاف کی شفاعت

کی رکھتے تھے۔ فرمایا کہ آخرت میں ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

یہ مضمون سورہ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ آیت ہم یہاں بھی نقل کیے دیتے ہیں تاکہ زیرِ بحث آیت کے بعض مضمرات روشنی میں آجائیں۔ فرمایا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ۝ (۱۵۹-۱۶۲ بقرہ)	بے شک جو لوگ ان واضح آیات اور اس ہدایت کو چھپاتے ہیں جو ہم نے اتاری ہے، بعد اس کے کہ ہم نے اس کو اپنی کتاب میں لوگوں کے لیے اچھی طرح واضح کر دیا ہے وہی لوگ ہیں جن پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور ان پر لعنت کرنے والے بھی لعنت کریں گے۔ البتہ وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کریں اور کھول دیں چھپائی ہوئی باتوں کو۔ یہی لوگ ہیں جن کی توبہ میں قبول کروں گا اور میں توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی حالتِ کفر میں مر گئے ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور سارے لوگوں کی لعنت ہے۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی

۲۳۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۹۲-۹۹

اوپر کا مضمون اگر ذہن میں موجود ہے تو آگے کا سلسلۂ بیان سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ اوپر آیت ۶۳ سے یہ بحث شروع ہوئی تھی کہ یہود اور نصاریٰ ملتِ ابراہیمؑ پر ہونے کا جو دعویٰ کرتے ہیں محض بے بنیاد دعویٰ ہے۔ ملتِ ابراہیمؑ پر یہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھی ہیں لیکن یہ یہود و نصاریٰ طرح طرح کی سازشوں اور تحریفوں سے اصل حقائق پر پردہ ڈالنا اور خلق کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں کہ قربانی کوئی نہ دینی پڑے۔ بس دینداری کی چند جھوٹی سچی رسمیں ادا کر کے خدا کی وفاداری کے سبب سے اونچے مقام کے حق دار سمجھے جاتے رہیں۔

یہاں سب سے پہلے تو یہ مغالطہ دور فرمایا کہ خدا کی وفاداری کا مقام محض جھوٹی رسم داری اور نمائشی دین داری سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اصل شے یہ ہے کہ خدا کی راہ میں ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو تمہیں محبوب ہیں۔ جب تک انسان خدا کے لیے اپنی محبوبات کی قربانی کا عادی نہیں ہوتا اس وقت تک اس میں خدا کے عہد و پیمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کا حوصلہ پیدا نہیں ہوتا۔

مسلمانوں پر ملتِ ابراہیم کی مخالفت کا الزام

اس کے بعد ضمنی طور پر یہود کے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے جو انھوں نے مسلمانوں کو ملتِ ابراہیم کے خلاف ثابت کرنے کے لیے اٹھایا تھا۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے ہاں کھانے پینے کی بعض ایسی چیزیں جائز ہیں جو یہود کے زعم کے مطابق ابراہیمی شریعت میں حرام تھیں، مثلاً اونٹ کی نسبت ان کا دعویٰ تھا کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں حرام ہے لیکن مسلمانوں کے ہاں نہ صرف یہ کہ حلال طیب ہے بلکہ ان کے ہاں یہ محبوب ترین مال ہے اور وہ اس کے نحر اور قربانی کو بڑے ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ اس پروپیگنڈے سے ان کا مقصد، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، محض عوام کو یہ باور کرانا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھی ملتِ ابراہیمؑ سے برگشتہ ہیں۔ قرآن نے اس کا جواب دے دیا کہ یہ بات محض یہود کا افترا ہے۔ تورات خود اس بات پر شاہد ہے کہ اونٹ کی حرمت کا تعلق اگر ہے تو شریعتِ موسوی سے ہے نہ کہ شریعتِ ابراہیمی سے۔

اس ضمنی اعتراض کا جواب دینے کے بعد ان کو پھر ملتِ ابراہیمی کی پیروی کی دعوت دی ہے اور ان پیشین گوئیوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو تورات میں خانہ کعبہ کی اولیت، اس کی مرکزیت اور اس کے سرچشمۂ برکت و ہدایت ہونے کے باب میں وارد تھیں لیکن ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی، نیز ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو صاف شہادت دیتی ہیں کہ اسی سرزمین کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا مسکن بنایا، اسی کو دارالامن قرار دیا، اسی کو حج و عبادت کا مرکز ٹھہرایا اور ہزاروں سال سے ان کی ذریت اس سرزمین پر ان کے نام اور ان کی روایات کی حامل چلی آرہی ہے۔

آخر کی دو آیتوں میں اہل کتاب کو ملامت کی ہے کہ جس راہ کی نشان دہی کے لیے تم خدا کی طرف سے مقرر کیے گئے تھے یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تم اس سے لوگوں کو روکنے اور اس کو گم کرنے کے لیے اپنی کوششیں صرف کر رہے ہو۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۹۲-۹۹

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ
شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۹۲ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا
لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ
قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۹۳ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ
مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۹۴ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ

فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾
اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ
كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ
سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾ قُلْ
يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى
مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

ترجمۂ آیات ۹۲-۹۹

تم خدا کی وفاداری کا درجہ ہرگز نہیں حاصل کر سکتے جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو اور جو کوئی چیز بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۹۲

کھانے کی ساری چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں، مگر وہ جو اسرائیل نے تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اپنے اوپر حرام ٹھہرا لی تھیں۔ کہہ دو لاؤ تورات اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔ جو لوگ اس کے بعد بھی اللہ پر جھوٹ باندھیں وہی لوگ ظالم ہیں۔ ۹۳-۹۴

کہہ دو اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو حنیف تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔ بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ عالم والوں

کے لیے برکت اور ہدایت کا مرکز۔ وہاں واضح نشانیاں ہیں، مسکن ابراہیم ہے۔ جو اس میں داخل ہو جائے وہ مامون ہے۔ اور جو لوگ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہیں ان کے اوپر اللہ کے لیے اس گھر کا حج ہے اور جس نے کفر کیا تو اللہ عالم والوں سے بے پروا ہے۔ ۹۵-۹۷

پوچھو اے اہل کتاب تم اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو، درآنحالیکہ جو کچھ تم کر رہے ہو سب خدا کی نظر میں ہے؟ کہو، اے اہل کتاب تم ایمان لانے والوں کو اللہ کی راہ سے کیوں روک رہے ہو، تم اس میں کجی پیدا کرنی چاہتے ہو حالانکہ تم گواہ بنائے گئے ہو، جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۹۸-۹۹

۲۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۥ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ (۹۲)

خدا کے ساتھ وفاداری کی شرط محبوب مال کا انفاق

لفظ 'بر' کی تحقیق تفسیر سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اس لفظ کی اصل روح ایفائے عہد اور ادائے حقوق و فرائض ہے عام اس سے کہ یہ خدا کے حقوق و فرائض ہوں یا اس کے بندوں کے۔ بنی اسرائیل ایفائے عہد اور ادائے حقوق کے معاملے میں تو بالکل صفر تھے لیکن محض چند رسوم کی ظاہر دارانہ پیروی کر کے یہ سمجھتے تھے کہ خدا کی وفاداری میں جو مرتبہ و مقام ان کا ہے وہ کسی کا نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسی زعم میں وہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے تمام انبیا کی وراثت کا تنہا اجارہ دار سمجھتے تھے اور یہ سوچنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ کوئی اس میدان میں ان کا حریف ہو سکتا ہے۔ قرآن نے یہاں ان کے اسی زعم باطل پر ضرب لگائی ہے کہ خدا کی وفاداری کا مقام مجرد خالی خولی دعووں اور چند رسموں کے ادا کر دینے سے نہیں حاصل ہو جاتا بلکہ اس کے لیے قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک تم خدا کی راہ میں اپنی محبوب چیزوں میں سے خرچ نہ کرو اس وقت تک تمہارا یہ دعویٰ بالکل بے دلیل ہے۔

محبت اور وفاداری کی جانچ کے لیے یہ کسوٹی ایک ایسی کسوٹی ہے جو فی الحقیقت بنی اسرائیل کا سارا بھرم کھول دینے کے لیے کافی تھی اس لیے کہ دینداری کی بے خرچ ظاہر داریاں تو وہ کسی نہ کسی حد تک نباہتے

کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن جہاں معاملہ خرچ کرنے کا پیش آجاتا ہے اور وہ بھی محبوب مال کے خرچ کرنے کا تو پھر ان کا سارا دعوائے عشق و محبت ہرن ہو جاتا تھا۔ حالانکہ جن حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور جن کی وراثت و نیابت کے وہ تنہا اجارہ دار بنے بیٹھے تھے ان کے متعلق جانتے تھے کہ ان کو خدا کی وفاداری کا جو مقام حاصل ہوا محض زبانی جمع خرچ سے نہیں حاصل ہوا بلکہ اپنے محبوب اکلوتے بیٹے کی قربانی سے حاصل ہوا۔

قرآن نے یہود کی اس رسمی دینداری پر جگہ جگہ تعریض کی ہے مثلاً فرمایا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (۱۷۷۔ بقرہ)

خدا کی وفاداری کا حق اس سے ادا نہیں ہو جاتا کہ اپنا رخ مشرق اور مغرب کی طرف کرو بلکہ اصل وفاداری تو ان کی ہے جو اللہ پر، روز آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے مال اس کے محبوب ہونے کے باوجود دیتے ہیں قرابت مندوں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافروں کو، سائلوں کو نیز اس کو خرچ کرتے ہیں گردنوں کو آزاد کرنے میں، اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور جب عہد کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں اور خاص کر وہ لوگ جو بھوک اور بیماری میں اور جنگ کے وقت ثابت قدم رہنے والے ہوں، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ والایۃ (اور جو کوئی چیز بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو اللہ اس سے باخبر ہے) سے مقصود اس کا لازم ہے یعنی خدا جب تمہارے خرچ کیے ہوئے پیسے پیسے سے باخبر ہے تو اطمینان رکھو کوئی حبہ ضائع جانے والا نہیں ہے۔ اگر ایک خرچ کرو گے تو دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک پاؤ گے اور اللہ کا فضل مزید براں ہے جس کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ ۗ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَمَنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۹۳-۹۴)

یہود کے ایک اعتراض کا جواب

یہ یہود کے اس اعتراض کا ضمنی جواب ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ یہود مدعی تھے کہ اصل ملت ابراہیمؑ پر وہ ہیں نہ کہ مسلمان۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں جو باتیں وہ کہتے تھے ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ مسلمانوں نے جو چیزیں جائز کر رکھی ہیں ان میں سے بعض چیزیں ملت ابراہیمؑ میں حرام تھیں لیکن مسلمان نہ صرف یہ کہ ان کو جائز رکھتے ہیں بلکہ ان کے بر و تقویٰ اور ان کے انفاق و قربانی کا انحصا

انھی چیزوں پر ہے یہاں کا اشارہ اونٹ کے ذبیحہ اور اس کی قربانی کی طرف ہوگا اس لیے کہ اونٹ عرب کے محبوب ترین اموال میں سے تھا، اور یہود کی شریعت میں، جیسا کہ احبار میں وارد ہے، وہ حرام ہے۔

قرآن نے یہاں مناسب موقع پا کر ان کے اس غلط خیال کی تردید کر دی۔ فرمایا کہ جو چیزیں طیبات میں داخل اور کھانے پینے کی ہیں وہ سب ابتداءً بنی اسرائیل کے ہاں بھی حلال تھیں منجملہ ان کے اونٹ بھی ہے۔ البتہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے یعقوبؑ نے بعض چیزیں اپنے اوپر حرام ٹھہرا لی تھیں۔ چنانچہ تورات میں دیکھ لو کہ اونٹ یا بعض دوسری چیزیں جن کو تم حرام قرار دیتے ہو ان کی حرمت کا کوئی ذکر عہد ابراہیمی میں نہیں ملتا۔ اگر ملتا ہے تو تورات میں ملتا ہے۔

یہود کی حرام کردہ طیبات کی تین قسمیں

تورات میں ملتِ ابراہیمی کے خلاف جن طیبات کو حرام ٹھہرایا گیا ہے وہ تین قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو محض یہود کے فقہا کی تحلیل و تحریم اور ان کی موشگافیوں کی پیدا کردہ ہیں۔ انھوں نے اپنے فتوے کے تحت کسی چیز کو حرام ٹھہرایا اور بعد میں ان کا یہی فتویٰ تورات میں شامل ہو کر اس کا ایک جزو بن گیا اور اس طرح فقیہوں کے ایک فتوے نے کتاب الٰہی کی حیثیت حاصل کر لی۔ تورات میں اس قسم کے جو گھپلے ہوئے ہیں ان پر یہاں بحث کا موقع نہیں ہے، ان کا تعلق تورات کی تاریخ سے ہے اور یہ ایک الگ موضوع ہے۔

دوسری وہ ہیں جو یہود کی سرکشی، ان کی کٹ حجتی اور ان کی سوال بازی کے سبب سے حرام ہوئیں۔ انھوں نے کسی چیز کے متعین کرانے میں اتنے سوالات اٹھائے کہ ان کے لیے جواز کی راہ تنگ سے تنگ ہوتی چلی گئی اور اچھی بھلی طیب و طاہر چیزیں بھی ان کے لیے حرام ہو کر رہ گئیں۔

تیسری وہ ہیں جن سے احتراز و اجتناب کا تصور ان کے ہاں بزرگوں سے چلا آ رہا تھا۔ مثلاً بعض چیزیں حضرت یعقوبؑ کسی احتیاط یا محض طبعی و ذوقی عدم مناسبت کی بنا پر نہیں استعمال کرتے تھے۔ یہود نے اس طرح کی چیزوں کا سرا حضرت ابراہیمؑ سے ملا دیا اور ان کی حرمت بھی تورات کی محرمات کی فہرست میں شامل ہو گئی۔

یہی وہ حرمتیں ہیں جن کو قرآن میں "اصر و اغلال" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہود کے صحیفوں میں ملتِ ابراہیمؑ پر مبعوث ہونے والے پیغمبرؐ کے بارے میں یہ پیشین گوئی موجود تھی کہ جب وہ آئیں گے تو یہود کے لیے تمام طیبات کو حلال کریں گے اور جو طوق و سلاسل انھوں نے اپنے اوپر لاد رکھے ہیں ان سے ان کو نجات دیں گے۔ اس مسئلہ پر ہم سورۂ انعام کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کرنے والے ہیں اس وجہ سے یہاں ان مختصر اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔

'فَمَنِ افْتَرٰی الآیہ'، یعنی جو لوگ اس وضاحت کے بعد بھی اس بات پر اڑے رہیں کہ جن چیزوں کو انھوں نے حرام ٹھہرا رکھا ہے وہ ملتِ ابراہیمؑ میں بھی حرام تھیں اور ان کو اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے تو یہ لوگ اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہیں اور جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھیں ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے!

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۹۵)

فرمایا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ تو محض اللہ پر جھوٹا بہتان ہے البتہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے یہ سچ ہے۔ تو اپنی بدعات کو ملتِ ابراہیمؑ ثابت کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اس ملتِ ابراہیمؑ کی پیروی کرو جس کی دعوت میں دے رہا ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام اسلام کی راہ پر بالکل یکسو تھے، نہ انھوں نے اس راہ سے دوسری پگڈنڈیاں نکالیں اور نہ وہ مشرکین میں سے تھے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۚ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (۹۶-۹۷)

بکہ کی تحقیق

'بکّہ' سے مراد مکّہ ہے[1]۔ قدیم صحیفوں میں اس کا یہی نام آیا ہے۔ لغوی معنی اس کے شہر کے ہیں مثلاً بعلبک (بعل کا شہر)۔ یہود نے آخری بعثت کے نشانات گم کرنے کے لیے تورات کے ترجموں یا الفاظِ قرآن 'لَیًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ' کے ذریعہ سے جو تحریفیں کی ہیں، ان کی ایک مثال یہ لفظ بھی ہے۔ اس کو یہود نے بگاڑ کر 'بکّہ' کے بجائے بکا بنایا اور اس کو مصدر قرار دے کر ترجمہ اس کا رونا کر دیا اور اس طرح 'وادیٔ بکّہ' کو رونے کی وادی میں تبدیل کر کے اس سب سے بڑے نشان کو گم کر دیا جس سے خلق کو آخری نبیؐ کے بارے میں رہنمائی مل سکتی تھی۔ اس آیت میں قرآن نے مکہ کو بکّہ کے نام سے ذکر کر کے مکّہ کے اس قدیم نام کی یاد دہانی کی ہے جو تورات کے صحیفوں میں تھا، بلکہ بعض صحیفوں میں اب بھی ہے مثلاً زبور میں[2]۔

اس آیت میں ان چیزوں کی طرف اشارہ ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کی عبادت کا وہ گھر جو حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر فرمایا یہی مکّہ کا بیت اللہ ہے۔ اسی گھر کو حضرت ابراہیمؑ نے ملتِ ابراہیمؑ کا مرکز بنایا اور اسی گھر سے ان کی مشہور دعا 'رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ' الآیہ کے بموجب اس پیغمبر کی دعوت بلند ہوئی، جو امیوں میں پیدا ہونے والے تھے اور جن کی دعوت سے ساری دنیا کو فیض پہنچنے والا تھا۔ 'مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ' میں اس بات کا اشارہ موجود ہے۔

یہ بات محتاجِ ثبوت نہیں ہے کہ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں جس بیت ایل (بیت اللہ) کی

---

[1] مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں لفظ مکّہ پر لکھا ہے کہ لوگوں نے اس لفظ کے اشتقاق کے بارے میں اختلاف کیا ہے لیکن اس امر میں شبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ بکّہ کی بدلی ہوئی صورت ہے چنانچہ یہ لفظ خود قرآن میں آیا ہے۔ جس وقت حضرت اسماعیلؑ اس وادی میں آباد کیے گئے ہیں اس وادی کا یہی نام تھا۔ اس کے معنی آبادی کے ہیں جیسا کہ لفظ بعلبک سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ چونکہ حضرت ابراہیمؑ بابل سے تشریف لائے تھے اس وجہ سے انھوں نے مکّہ کے نام کے لیے اپنی زبان کا لفظ پسند فرمایا۔

[2] ملاحظہ ہو مزمور ۸۴۔

تعمیر کا ذکر ہے اس کا مصداق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو مکہ کا بیت اللہ ہی ہو سکتا ہے نہ کہ بیت المقدس۔ اس لیے کہ بیت المقدس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کے سینکڑوں سال بعد حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ یہی گھر ملت ابراہیمؑ کی برکتوں کا مظہر ہو سکتا ہے نہ کہ بیت المقدس۔

کعبہ کے بیت اللہ ہونے کی نشانیاں

فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ، یعنی اس میں نہایت واضح نشانیاں اس بات کی موجود ہیں کہ یہی گھر حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا ہے۔ ان نشانیوں کو اگرچہ یہود نے مٹانے کی کوشش کی لیکن تورات میں آج بھی ایسے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں جو یہود کی تمام تحریفات کا پردہ چاک کر کے اصل حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیتے ہیں۔ ہم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں قبلہ کی بحث میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جو لوگ تفصیل کے طالب ہوں، اس بحث کو پڑھیں۔ یہاں اس کے دہرانے میں طوالت ہو گی۔

نشانیوں کا بالاجمال ذکر کرنے کے بعد جس طرح عام کے بعد خاص کا ذکر ہوتا ہے تین چیزوں کی طرف خاص طور پر اشارہ فرمایا ہے۔ ایک یہ کہ یہ مقام ابراہیم ہے، دوسری یہ کہ جو اس حرم میں داخل ہو جائے وہ امن میں ہو جاتا ہے، تیسری یہ کہ تمام اہل استطاعت پر اس گھر کا حج فرض ہے۔

اگرچہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ان ساری چیزوں پر ہم بحث کر چکے ہیں لیکن بالاجمال ہم یہاں بھی ان تینوں چیزوں کے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں جن سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ درحقیقت یہی گھر حضرت ابراہیمؑ کا تعمیر کردہ ہے اور یہی ملت ابراہیمؑ کا مرکز ہے۔

مقام ابراہیمؑ سے مراد

مقام ابراہیمؑ سے مراد، جیسا کہ ہم نے تفسیر سورۂ بقرہ میں بدلائل واضح کیا ہے، یہ ہے کہ اسی مقام کو حضرت ابراہیمؑ نے ہجرت کے بعد اپنے قیام کے لیے منتخب فرمایا، یہیں مروہ کے پاس اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی کی، یہیں ان کو بیت اللہ کی خدمت اور نماز کے اہتمام کے لیے بسایا اور یہیں ان سے نسبت رکھنے والی ایک پوری قوم صدیوں سے آباد ہے۔ یہ ساری باتیں خود تورات کے دلائل سے اس قدر قطعیت کے ساتھ ثابت ہیں کہ کوئی صاحب انصاف ان کا انکار نہیں کر سکتا۔

مکہ امن کا شہر ہے

وَمَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا، سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس سرزمین میں اپنی اولاد کو بساتے ہوئے اس کے لیے امن کی جو دعا کی تھی یہ سرزمین اور یہ گھر اس دعا کی مقبولیت کا مظہر ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا قرآن میں یوں نقل ہوئی ہے۔

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰہِیۡمُ رَبِّ اجۡعَلۡ ہٰذَا	اور جب کہ ابراہیمؑ نے دعا کی اے میرے پروردگار اس
الۡبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجۡنُبۡنِیۡ وَبَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ	سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں
الۡاَصۡنَامَ (۳۵-ابراہیم)	کو پوجنے سے محفوظ رکھ۔

یہ اسی دعا کی برکت ہے کہ شہر حرم کی سنت قائم ہوئی اور اس گھر کے جوار میں آدمی تو درکنار کسی جانور کو

بھی ایذا پہنچانا جرم ٹھہرا۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ الآیہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس سرزمین اور اس گھر کے لیے مرجعیت کی جو دعا کی تھی اس کی قبولیت بھی اس کے پیچھے جھلکنے سے نمایاں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کا ذکر قرآن میں یوں ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۔ (۳۷ - ابراہیم)

اے ہمارے رب، میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اسماعیل کو، ایک بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا اے ہمارے رب تاکہ یہ نماز قائم کریں تو تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا کر تاکہ یہ تیری شکر گزاری کریں۔

حج کی سنت

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت اس گھر کے لیے اعلان حج کی ملی تھی اس کی سنت بھی ان کے عہد سے لے کر آج تک چلی آ رہی ہے۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْقَاۗىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۔ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰي كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (۲۶ - ۲۷ - حج)

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیمؑ کو بیت اللہ کے پاس اس ہدایت کے ساتھ بسایا کہ میرا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیو اور میرے گھر کو طواف، قیام اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھیو اور لوگوں میں حج کی منادی کر دو، لوگ تمہارے پاس پیادہ اور لاغر اونٹنیوں پر تمام گہرے راستوں سے آئیں گے۔

ان تمام نشانیوں کے حوالے دینے سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا اہل کتاب پر یہ ثابت کرنا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی گھر حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا اور ان کی ملت اور ان کی دعوت کا مرکز ہو سکتا ہے تو یہی کعبہ بیت اللہ ہو سکتا ہے۔ اہل کتاب کی تمام تحریفی کوششوں کے باوجود آج بھی یہود کے صحیفوں میں ایسے اشارات و قرائن موجود ہیں جو اصل حقیقت کو کھولنے کے لیے کافی ہیں۔ ان اشارات کی تفصیل کے لیے ہماری سورہ بقرہ کی تفسیر پڑھیے۔

حج کے بارے میں ایک تنبیہ

وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۔ یعنی ان تمام تفصیلات کے بعد بھی جو اہل کتاب اپنی ضد پر اڑے ہی رہ جائیں گے اور یہی دعویٰ کرتے رہیں گے کہ ملت ابراہیمؑ وہی ہے جس پر وہ ہیں اور ملت ابراہیمؑ کا مرکز بیت المقدس ہے تو یہ لوگ اللہ کی آیات کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ حجت تمام کر دینے کے بعد اس بات سے بے پروا ہو جاتا ہے کہ کون کفر کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون ایمان کی۔

آیت کے اسی آخری ٹکڑے پر وہ حدیث مبنی ہے جس میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص استطاعت کے باوجود حج سے بے پروا ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی پروا نہیں رہ جاتی کہ وہ یہودی ہو کے مرے گا یا نصرانی ہو کر۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کے رویے میں درحقیقت یہود و نصاریٰ کی اس بے پروائی کا ایک عکس ہے جو انھوں نے بیت اللہ کے معاملے میں اختیار کی اور جس کے نتیجے میں وہ اپنا ایمان ہی گنوا بیٹھے۔

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۝ قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۹۸-۹۹)

اب یہ اہل کتاب کو زجر اور ملامت ہے کہ اللہ کی جو نشانیاں ملت ابراہیمؑ، بیت اللہ اور آخری رسول سے متعلق خود تمہارے اپنے صحیفوں میں موجود ہیں ان کو اور ان کے مصداق کو جان بوجھ کر کیوں جھٹلاتے ہو؟ اور لوگوں کے ذہن میں کیوں شبہات بھر رہے ہو؟ یہ بات تمہیں معلوم رہنی چاہیے کہ اللہ اور اس کی آیات کے ساتھ یہ شرارت جو تم کر رہے ہو یہ گویا اللہ کی موجودگی میں کر رہے ہو اور وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ جنھوں نے اللہ کی توفیق سے یہ راہ پالی ہے اب تم یہ چاہتے ہو کہ ان کے ذہن میں شبہات پیدا کر کے ان کو کسی ایسے رخ پر موڑ دو کہ ان کی ملی ہوئی راہ پھر گم ہو کر رہ جائے حالانکہ تم کو اللہ نے پہلے سے اس راہ پر اس لیے کھڑا کیا تھا کہ تم لوگوں کو رستہ بتاؤ گے لیکن تم نے شہداء اللہ ہو کر رہزنوں اور بٹ ماروں کا پیشہ اختیار کر لیا، یاد رکھو کہ یہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔

۲۵- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۰۰-۱۰۹

یہاں تک خطاب کا اصلی رخ اہل کتاب کی طرف تھا، ان پر حجت تمام کر دینے کے بعد اب آگے کی آیت سے خطاب مسلمانوں سے ہو گیا ہے اور ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اہل کتاب کی بات مانی تو یہ تم کو پھر اسی کفر و جاہلیت کے گڑھے میں گرا کے رہیں گے جس سے نکل کر تم ایمان و اسلام کی روشنی میں آئے ہو۔

پھر اس عظیم نعمت کی قدردانی اور شکرگزاری کا احساس دلاتے ہوئے جو انھیں پیغمبرؐ اور قرآن کی شکل میں حاصل ہوئی ہے، اس طریقے کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جس کو اختیار کر کے وہ ان فتنوں سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں جو اہل کتاب ان کو گمراہ کرنے کے لیے اٹھا رہے ہیں۔ ساتھ ہی اس اجتماعی نظام کی طرف بھی رہنمائی فرمائی ہے جو اس ملت کو صراط مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ ورنہ اس ملت کا انجام بھی وہی ہوگا جو اہل کتاب کا ہوا ــــــ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
۱۰۰-۱۰۹ الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ
تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ
وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ ع ۱۰ ۱
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا
وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا
تَفَرَّقُوْا ۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً
فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ
عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ
يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ
تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ
لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۟ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ
فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾
تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ

ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى
ع اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

ترجمۂ آیات ۱۰۰-۱۰۹

اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کے ایک گروہ کی بات مان لو گے تو یہ تم کو تمہارے ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف پلٹا دیں گے، اور تمہارا کفر میں پڑنا کس طرح جائز ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں اور تمہارے اندر اس کا رسول موجود ہے۔ اور جو اللہ کو مضبوطی سے پکڑے گا تو وہی ہے جس کو صراط مستقیم کی ہدایت ملی۔ ۱۰۰-۱۰۱

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرو تم مگر اس حال میں کہ تم اسلام پر ہو اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور پراگندہ نہ ہو اور اپنے اوپر اللہ کے اس فضل کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا اور تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے تو اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی ہدایات کو واضح کرتا ہے تاکہ تم راہ یاب ہو۔ اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۱۰۲-۱۰۴

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو پراگندہ ہو گئے اور جنھوں نے اختلاف کیا بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح ہدایات آچکی تھیں اور وہی ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اس دن جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا ہے تو اب

چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں۔ رہے وہ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت کے سایہ میں ہوں گے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمہیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور اللہ عالم والوں پر کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتا، اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کے حضور میں پیش کیے جاتے ہیں۔ (۱۰۵-۱۰۹)

۲۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن تُطِيعُوا۟ فَرِيقًا مِّنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَٰنِكُمْ كَٰفِرِينَ (۱۰۰)

مسلمانوں کو اہل کتاب کے اشرار سے بچتے رہنے کی تاکید

فَرِيقًا مِّنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ سے اہل کتاب کا وہی گروہ مراد ہے جس کی مخالفتوں اور وسوسہ اندازیوں کا اوپر تفصیل سے ذکر ہوا ہے۔ اہل کتاب میں ایک گروہ جیسا کہ اوپر بھی ذکر گزر چکا ہے اور آگے بھی آرہا ہے، اہل انصاف کا بھی تھا، اس وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے۔ چنانچہ یہاں بھی مسلمانوں کو اہل کتاب کی وسوسہ اندازیوں اور فتنہ انگیزیوں سے بچتے رہنے کی جو تاکید فرمائی ہے تو تعیین کے ساتھ اس گروہ کی طرف انگلی اٹھا دی ہے جس سے بچانا پیش نظر ہے۔ یہ انصاف کا بھی تقاضا تھا اور دعوت و تبلیغ کے نقطۂ نظر سے بھی یہی بات مطابق حکمت و مصلحت تھی۔

اس آیت میں تنبیہ کا خاص پہلو یہ ہے کہ یہ ہیں تو اہل کتاب میں سے اس وجہ سے ایک نیک نیت آدمی کو یہ حسن ظن ہو سکتا ہے کہ بھلا یہ دیندار لوگ کسی گمراہی کی بات کس طرح سوچ سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلام کے ایسے پکے دشمن ہیں کہ جو مسلمان ان کی باتوں میں آجائے گا یہ اس کو پھر کافر بنا کے چھوڑیں گے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ ءَايَٰتُ ٱللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُۥ ۗ وَمَن يَعْتَصِم بِٱللَّهِ فَقَدْ هُدِىَ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۱۰۱)

فتنوں سے محفوظ رہنے کی تدبیریں

اعتصام کے معنی کسی شے کو مضبوطی سے پکڑنے اور تھامنے کے ہیں۔ اعتصام باللہ کے معنی اللہ کے احکام و ہدایات اور اس کی کتاب پر مضبوطی سے نرم و گرم ہر طرح کے حالات میں مخالفت و موافقت سے بے نیاز ہو کر قائم رہنا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو کفر وارتداد ہر حالت میں انسان کی بدبختی اور اس کی شامت کی دلیل ہے لیکن آج تم نے اگر یہ راہ اختیار کی جب کہ اللہ کی آیات تمہیں سنائی جا رہی ہیں اور خدا کا رسول تمہارے اندر موجود ہے تو یہ محرومی و بدبختی کی انتہا ہو گی۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم نے پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی اور اپنے لیے عذر کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ پھر اس قسم کی ٹھوکر سے بچنے کی تدبیر بتا دی کہ اگر چاہتے ہو کہ تمہارے قدم جادۂ مستقیم پر استوار رہیں اور تمہارے مخالفین تمہیں ٹھوکر نہ کھلا سکیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کو مضبوط پکڑو، یعنی اللہ کی جو آیات و ہدایات تمہیں سنائی جا رہی ہیں، ان کو حرز جان بناؤ اور تمام مخالفتوں اور تمام فاکبازیوں کے علی الرغم ان پر قائم و دائم رہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۰۲)

اعتصام باللہ کی حقیقت

یہ اعتصام باللہ کی حقیقت واضح فرما دی کہ اللہ کو مضبوط پکڑنے کے معنی یہ ہیں کہ اس سے اس طرح ڈرتے رہو جس طرح اس سے ڈرتے رہنے کا حق ہے۔ یہ تقویٰ اگرچہ مطلوب تو اسی حد تک ہے جس حد تک بندے کی استطاعت میں ہے، اس کی وضاحت خود قرآن ہی نے فرما دی ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (۱۶- تغابن) لیکن خدا سے ڈرنے اور دوسروں سے ڈرنے میں بڑا فرق ہے، اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ خدا سے ڈرتے رہو جس طرح خدا سے ڈرتے رہنے کا حق ہے۔ اول تو بندے پر خدا کے جو حقوق ہیں وہ کسی اور کے نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ خدا نے جو حدود و قیود قائم کیے ہیں اور ان کے توڑنے کی جو سزا مقرر کی ہے وہ تمام تر بندوں کی دنیوی و اخروی بہبود کے پیش نظر کی ہے، ان کی پابندی سے خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ بندوں ہی کو پہنچتا ہے۔ تیسری یہ کہ خدا کی آنکھیں ہر جگہ نگراں ہیں یہاں تک کہ وہ دلوں کے وسوسوں سے بھی باخبر ہے۔ چوتھی یہ کہ خدا کی پکڑ سے کوئی دوسرا بچا نہیں سکتا اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں سزا دے سکتا ہے اور ہمیشہ کے لیے دے سکتا ہے۔ خدا سے ڈرنے میں جب تک بندہ ان تمام پہلوؤں کو مدنظر نہ رکھے وہ خدا سے ڈرنے کا صحیح مفہوم سمجھ بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ وہ اس کا صحیح حق ادا کر پائے۔ بہت سے لوگ جو انسانوں سے ڈر کر خدا اور اس کی شریعت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں ان کی بنیادی گمراہی یہی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی مخالفت اور خدا کے غضب میں فرق نہیں کر پاتے۔

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ میں یہ لطیف حقیقت واضح فرمائی ہے کہ خدا سے یہ ڈرنا صرف عارضی اور وقتی طور پر مطلوب نہیں ہے بلکہ یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ اسی پر جینا اور اسی پر مرنا ہے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے یہ جدوجہد شروع ہوتی اور زندگی کی آخری سانس پر تمام ہوتی ہے۔ اگر آخری مرحلے میں بھی یہ تسلسل کہیں ٹوٹ گیا تو ساری عمر کی محنت برباد گئی۔ آیت کے اسلوب میں یہ بات بھی مخفی ہے کہ یہ راہ بہت ہموار نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سے نشیب و فراز اور ہر قدم پر اتار چڑھاؤ ہیں۔ اس میں آزمائشوں اور فتنوں سے دوچار ہونا ہوگا اور شیاطین کے شب خونوں اور معاندین کی دراندازیوں اور فساد انگیزی

سے سابقہ پیش آئے گا۔ کبھی طمع ورغلانے کے لیے عشوہ گری کرے گی، کبھی خوف دھمکانے کے لیے اپنے اسلحہ سنبھالے گا۔ جو ان سب مرحلوں سے اپنا ایمان واسلام بچاتا ہوا منزل پر پہنچا اور اسی حال میں اس نے جان، جان آفریں کے سپرد کی درحقیقت وہ ہے جو خدا سے اس طرح ڈرا جس طرح خدا سے ڈرنے کا حق ہے اور یہی ہے جس کو اعتصام باللہ کا مقام حاصل ہوا۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۖ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۱۰۳)

'حبل اللہ' سے مراد

'حبل' کے معنی رسی کے ہیں، اپنے اسی معنی سے ترقی کرکے یہ لفظ تعلق اور ربط کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس لیے کہ رسی دو چیزوں میں ربط و تعلق کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ایک حماسی شاعر کا مشہور شعر ہے۔

وَلٰكِنِّي وصلت الحبل منه　　　　مواصلة بحبل ابي بيان

"لیکن میں نے اس سے اپنا تعلق جوڑے رکھا، ابو بیان کے تعلق سے وابستگی کی بنا پر۔"

پھر مزید ترقی کرکے یہ لفظ معاہدہ کے مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگا اس لیے کہ رسی جس طرح دو چیزوں کو ایک ساتھ باندھ دیتی ہے اسی طرح معاہدہ بھی دو قوموں کو ایک دوسرے سے باندھ دیتا ہے۔ معاہدہ کے مفہوم میں یہ لفظ خود قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ الا بحبل من الله وحبل من الناس (مگر اللہ کے اور لوگوں کے کسی معاہدے کے تحت) آیت زیر بحث میں حبل سے مراد قرآن ہے اس لیے کہ یہی ہمارے رب اور ہمارے درمیان ایک عہد و میثاق ہے۔ خدا کو مضبوطی سے پکڑنا ظاہر ہے کہ اپنے ظاہری مفہوم میں نہیں ہے اس لیے کہ خدا چھونے اور پکڑنے کی چیز نہیں، اس کو مضبوطی سے پکڑنے کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ ہم اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں جو ہمارے اور اس کے درمیان واسطہ ہے۔ گویا اوپر والی آیت میں وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ جو فرمایا تھا وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ کے الفاظ سے اس کی وضاحت فرما دی۔

سلف میں سے قتادہ، سدی، عبداللہ بن عباسؓ، مجاہد اور ضحاک کی یہی رائے ہے۔ ابن جریر نے ابوسعید خدریؓ کے واسطے سے ایک روایت بھی نقل کی ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كتاب الله هو حبل الله الممدود من السماء الى الارض: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک خدا اور اس کے بندوں کے درمیان تنی ہوئی ہے۔

'اعتصام بحبل اللہ' کی جامع حقیقت مطلوب ہے

گویا یہی چیز ہے جو بندوں کو خدا سے جوڑتی ہے، جس نے اس کو تھام لیا، گویا خدا کو تھام لیا۔ سلف میں سے جو لوگ حبل اللہ کی تعبیر عہد اللہ سے کرتے ہیں وہ بھی درحقیقت حبل اللہ سے قرآن ہی کو مراد لیتے ہیں، اس لیے کہ ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان معاہدہ کی حیثیت قرآن ہی کو حاصل ہے۔ قرآن اور دوسرے

آسمانی صحیفوں کو میثاق اور عہد سے اسی بنا پر تعبیر کیا گیا ہے۔ اس پر مفصل بحث سورۂ مائدہ میں آئے گی۔ مضبوط پکڑنے کے ساتھ ساتھ جَمِیْعًا کی تاکید اور وَلَا تَفَرَّقُوْا کی نہی نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ یہ چیز جماعتی حیثیت سے مطلوب ہے، سب مل کر اس کو مضبوطی سے تھامیں۔ اسی حبل اللہ سے مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہوئی ہے، اس کو چھوڑ کر وہ اپنے شیرازے کو پراگندہ نہ کریں ورنہ اس کے ساتھ تعلق میں ضعف پیدا ہو گیا، اس کی جگہ انھوں نے دوسری رسیوں کا سہارا لے لیا اور حق و باطل کے جانچنے کے اس سے الگ کچھ معیارات بنا لیے تو وہ بھی اسی طرح پراگندہ ہو جائیں گے جس طرح یہود و نصاریٰ پراگندہ ہو گئے۔

مسلمانوں کو ایک تنبیہ

اس کے بعد اس عظیم احسان کی یاد دہانی فرمائی ہے جو اس کتاب کے ذریعہ سے عرب قوم پر ہوا۔ اس کتاب کے نزول سے پہلے عرب کا ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کا دشمن تھا۔ ان میں باہم خونریز جنگیں برپا رہتی تھیں، ان کے دیوتا الگ الگ اور ان کے اغراض و مفادات باہم متصادم تھے۔ لیکن اس حبل اللہ نے ان کو ایک رشتہ میں پرو کر ان کو موتیوں کی لڑی بنا دیا اور وہ جو ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے ایک دوسرے کے جگری دوست اور غمخوار بھائی بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس حالت کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس حبل اللہ کے ساتھ اپنی وابستگی کو برابر برقرار رکھو۔ اگر یہ رشتہ کمزور رہا تو پھر وہی جاہلیت کی حالت لوٹ آئے گی، جس میں اس سے پہلے مبتلا تھے، تم تباہی کے گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے، خدا نے تم کو اس سے بچایا ہے۔ اس کو چھوڑ کر پھر اسی گڑھے میں گرنے کا سامان نہ کر لینا۔

چونکہ یہ مقام بہت اہم ہے، جو ہدایات یہاں دی جا رہی ہیں وہ مسلمانوں کے مستقبل سے بڑا گہرا تعلق رکھنے والی ہیں، ان میں معمولی غلطی یا غلط فہمی بھی بڑے ہولناک فتنوں کے دروازے کھول سکتی تھی، اس وجہ سے یہاں، جیسا کہ اوپر کے سلسلۂ کلام سے واضح ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایات بڑی وضاحت سے بیان فرمائی ہیں تاکہ کسی گمراہی کے لیے کوئی وجہ باقی نہ رہے۔ اسی چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ (الآیہ)

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰۴-۱۰۵)

خلافت کے قیام کا بنیادی مقصد

یہ امت کو اس اہتمام و انتظام کی ہدایت فرمائی گئی ہے جو اعتصام بحبل اللہ پر قائم رہنے اور لوگوں کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ ہدایت ہوئی کہ مسلمان اپنے اندر سے ایک گروہ کو اس کام پر مقرر کریں کہ وہ لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔ معروف و منکر سے مراد شریعت اور سوسائٹی دونوں کے معروفات و منکرات ہیں اور ان کے لیے امر و نہی کے جو

الفاظ استعمال ہوئے ان کا غالب قرینہ یہی ہے کہ یہ کام مجرد وعظ و تلقین ہی سے نہیں انجام دینا ہے۔ بلکہ اختیار اور قوت سے اس کو نافذ کرنا ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ یہ گروہ امت کی طرف سے سیاسی اقتدار و اختیار کا حامل ہو۔ اگر تنہا دعوت و تبلیغ ہی سے یہ کام لینا مدنظر ہوتا تو اس مطلب کو ادا کرنے کے لیے یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ کے الفاظ کافی تھے یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (الآیہ) کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے نزدیک اس آیت سے اس امت کے اندر خلافت کے قیام کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلا کام جو کیا وہ خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام تھا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ اس امر کی نگرانی کرے کہ مسلمان اعتصام باللہ کے نصب العین سے ہٹنے نہ پائیں۔ اس کے لیے جو طریقے اس کو اختیار کرنے تھے وہ اصولی طور پر تین تھے۔ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف، نہی عن المنکر۔ انہی تین سے خلافت راشدہ کے دور میں وہ تمام شعبے وجود میں آئے جو ملت کی تمام داخلی و خارجی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا ذریعہ بنے۔

وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کا تعلق صرف اس مخصوص گروہ ہی سے نہیں ہے بلکہ یہ اشارہ پوری امت کی طرف ہے کہ جو امت اعتصام باللہ کے لیے یہ اہتمام کرے گی وہی دنیا اور آخرت میں فلاح حاصل کرنے والی بنے گی۔

اس کے بعد یہود و نصاریٰ کے انجام سے مسلمانوں کو عبرت دلائی ہے کہ وہ خدا کی واضح تنبیہات کے باوجود خدا کی رسی چھوڑ بیٹھے اور پھر جس کے ہاتھ میں جو رسی آگئی وہ اسی کو حبل اللہ سمجھ بیٹھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے درمیان ایسے اختلافات پھوٹ پڑے جن کی اصلاح ناممکن ہوگئی۔ فرمایا کہ تم بھی انہی یہود و نصاریٰ کی طرح اپنی دنیا و عاقبت نہ برباد کر لینا۔ یہ فلاح کی راہ نہیں بلکہ عذاب الیم کی مستوجب ہے۔

یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ ۟ اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ ﴿﴾ وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِیْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ ۭ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿﴾ تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿﴾ وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۱۰۶-۱۰۹)

مسلمانوں کو چند تنبیہات

نظم کلام کی روشنی میں ان آیات پر غور کیجیے تو مندرجہ ذیل حقائق سامنے آئیں گے۔

اول یہ کہ اعتصام بحبل اللہ سے محروم ہو جانے کے بعد اہل کتاب اختلاف و انتشار میں مبتلا ہوئے اور یہ انتشار و اختلاف درحقیقت ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانے کے ہم معنی ہے۔

دوم یہ کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ یہ سرفرازی و سرخروئی بخشتا ہے کہ ان کے ہاتھ میں خود اپنی رسی پکڑاتا ہے اگر وہ اپنی شامتِ اعمال سے اس رسی کو چھوڑ کر دوسرے پھندے اپنی گردنوں میں ڈال لیتے ہیں تو قیامت کے دن ان کو اسی درجے کی روسیاہی بھی حاصل ہوگی جس درجے کی ان کو سرخروئی بخشی گئی تھی۔ چہرے روشن ان کے ہوں گے جو ہر طرح کے حالات میں اس رسی کو تھامے رہیں گے۔ یہ لوگ بے شک اللہ کے فضل و رحمت

کے حق دار ہوں گے۔

سوم یہ کہ یہ ساری تنبیہات بالحق ہیں یعنی ہر بات شدنی ہے۔ ان کو محض خالی خولی دھمکی سمجھ کر جو لوگ نظر انداز کریں گے وہ اپنی روسیاہی کا سامان خود کریں گے اور اس کی تمام تر ذمہ داری انھی پر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آگاہی پہلے سے اسی لیے سنا دی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ کسی کو سزا اس پر حجت تمام کیے بغیر دے۔

چہارم یہ کہ آسمان و زمین میں سارا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ سارے امور اسی کے حضور پیش ہوں گے اور اسی کا فیصلہ ناطق و نافذ ہوگا۔ اگر کسی نے کسی اور سے امید باندھ رکھی ہو تو اس کی یہ امید محض ایک واہمہ ہے جو حقیقت کے ظہور کے بعد بالکل سراب ثابت ہوگی۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہ ساری تنبیہات مسلمانوں کو سنائی جا رہی ہیں کہ ان تمام خطرات سے بچ کے رہنا۔

۲۷۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۱۰-۱۲۰

اوپر کی تنبیہات کے اندر یہ حقیقت خود بول رہی تھی کہ اہل کتاب جس منصبِ امامت پر اب تک سرفراز رہے ہیں ہر پہلو سے وہ اس کے لیے نااہل ثابت ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اس منصب سے معزول ہوئے اور خدا نے یہ امانت اس امت کے سپرد فرمائی جو اس کی اہل ہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ بشارت دی ہے کہ اب یہ اہل کتاب تمھاری مخالفت میں جتنا زور چاہیں لگا لیں وہ تمھارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے بلکہ ہر جگہ منہ کی کھائیں گے اور ان کے لیے ذلت مقدر ہو چکی ہے۔

اثنائے کلام میں اہل کتاب کے اس گروہ کی تحسین بھی فرمائی ہے جو حق پر قائم تھا اور جو بالآخر دولتِ اسلام سے سرفراز ہوا۔

پھر اہل کتاب کی اصل بیماری کی طرف اشارہ ہے جو فی الحقیقت قبولِ حق میں ان کے لیے حجاب بنی اور یہ واضح فرمایا کہ اس حق سے محروم رہنے کے بعد اب وہ اپنی دینداری کا بھرم رکھنے کے لیے جو ظاہرداری بھی کریں گے سب اکارت جائے گی، اس کا کچھ حاصل نہیں ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ اب تم ان سے تمام تعلقات دوستی و محبت ختم کر لو اس لیے کہ اب تمھارے لیے ان کے دلوں میں دشمنی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور ان کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے ——— اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ
۱۱۰-۱۲۰ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ۗ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۱۱۰﴾
لَن يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى ۖ وَإِن يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ
لَا يُنصَرُونَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ
مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ
عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَ
يَقْتُلُونَ الْأَنبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿۱۱۲﴾
لَيْسُوا سَوَاءً ۗ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ
اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُسَارِعُونَ
فِي الْخَيْرَاتِ ۖ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ
فَلَن يُكْفَرُوهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿۱۱۵﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا
لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ
أَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنفِقُونَ فِي
هَٰذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا
أَنفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَٰكِنْ أَنفُسَهُمْ
يَظْلِمُونَ ﴿۱۱۷﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن
دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ
الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ قَدْ

بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ
وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا
اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ
مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ
تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ
وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا
ع ۱۲ يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾

ترجمۂ آیات ۱۱۰-۱۲۰

تم بہترین امت ہو، لوگوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے ہو، معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے یہ بہتر ہوتا۔ ان میں سے کچھ تو مومن ہیں اور اکثر نافرمان ہیں۔ وہ تمھیں تھوڑی سی زبان درازی کے سوا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں گے تو پیٹھ دکھائیں گے۔ پھر ان کی کوئی مدد بھی نہیں ہوگی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہیں ان پر ذلت تھوپ دی گئی ہے۔ بس اگر کچھ سہارا ہے تو اللہ اور لوگوں کے کسی عہد کے تحت۔ وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں اور ان پر پست ہمتی تھوپ دی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ کی آیتوں کا انکار اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں کیونکہ یہ نافرمان اور حد سے آگے بڑھنے والے رہے ہیں۔ ۱۱۰-۱۱۲

سب اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں ایک گروہ عہد پر قائم ہے۔ یہ رات کے وقتوں میں اللہ کی آیات کی تلاوت اور سجدہ کرتے ہیں۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان

رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں اور یہ لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں۔ جو نیکی بھی یہ کریں گے تو اس سے محروم نہیں کیے جائیں گے اور اللہ خدا ترسوں سے باخبر ہے۔ ۱۱۳-۱۱۵

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مال اور ان کی اولاد خدا کے مقابل میں کام آنے والے نہیں۔ یہ لوگ دوزخی ہوں گے اور وہ اسی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جو کچھ اس دنیا میں خرچ کرتے ہیں اس کی تمثیل ایسی ہے کہ کسی ایسی قوم کی کھیتی پر جس نے اپنے اوپر ظلم کیا ہو، پالے والی ہوا چل جائے اور وہ اس کو تباہ کر کے رکھ دے۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ یہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے ہیں۔ ۱۱۶-۱۱۷

اے ایمان والو! اپنے سے باہر والوں کو اپنا محرم راز نہ بناؤ، یہ تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ یہ تمھارے لیے زحمتوں کے خواہاں ہیں۔ ان کی عداوت ان کے مونہوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے بھی سخت تر ہے۔ ہم نے تمھارے لیے اپنی تنبیہات واضح کر دی ہیں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ یہ تمھی ہو کہ تم ان سے دوستی رکھتے ہو، وہ تو تم سے دوستی نہیں رکھتے حالانکہ تم ساری کتاب پر ایمان رکھتے ہو۔ اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ملتے ہیں تو تم پر غصہ سے انگلیاں کاٹتے ہیں، کہہ دو تم اپنے غصے میں مر جاؤ۔ اللہ سینوں کے بھید سے خوب واقف ہے۔ اگر تمھیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو اس سے تکلیف پہنچتی ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچ جاتا ہے تو اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو ان کی چال تمھیں کوئی نقصان نہ

پہنچا سکے گی۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، اللہ اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ ۱۱۸-۱۲۰

۲۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم ۚ مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ (۱۱۰)

'کَانَ' یہاں تامہ ہے جس طرح کَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا میں ہے۔ خَیْرَ اُمَّۃٍ میں اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ اب دین کی صحیح شاہراہ پر تمھی ہو۔ اللہ نے جو دین نازل فرمایا تھا، اہل کتاب نے اس میں کج پیچ کی راہیں نکال کر اصلی دین کو گم کر دیا۔ اب خلق کی رہنمائی کے لیے خدا نے تم کو کھڑا کیا ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ بقرہ میں کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (الآیہ) کے الفاظ سے واضح فرمایا ہے۔ وہاں ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ امت چونکہ ٹھیک نقطۂ اعتدال اور وسط شاہراہ پر ہے اس وجہ سے یہ خیرِ امت ہے۔ لِلنَّاس میں ایک مضاف محذوف ہے یعنی لوگوں کی اصلاح، رہنمائی اور ان پر اللہ کے دین کی گواہی دینے کے لیے، جیسا کہ فرمایا ہے لِتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ۔

خیرِ امت کا منصب صفات کے ساتھ مشروط ہے

تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ یہ اس امت کے خیرِ امت ہونے کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس لیے خیرِ امت ہو کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو، اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس منصب پر تم نسل و نسب کی بنا پر نہیں سرفراز ہوئے ہو، جیسا کہ اہل کتاب نے اپنی بابت گمان کیا، بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری نے تمھیں اس کا استحقاق بخشا ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ یہ منصب صفات اور ذمہ داریوں کے ساتھ مشروط ہے، کسی مخصوص گروہ کے ساتھ اللہ نے اس کو باندھ نہیں چھوڑا ہے کہ لازماً یہ اس کے ساتھ بندھا ہی رہے، اگرچہ وہ یہود و نصاریٰ کی طرح معروف کو منکر اور منکر کو معروف بنا کے رکھ دے۔

ایمان ہر نیکی کی جڑ ہے

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اصل بنیاد اللہ پر ایمان ہے۔ کسی کو جو کچھ بھی عزت و فضیلت اللہ کی نگاہوں میں حاصل ہوتی ہے وہ اسی کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی معتبر وہی ہے جو ایمان باللہ کے ساتھ ہو۔ منبروں اور اسٹیجوں سے خدا پرستی اور دینداری کے جو وعظ کھوکھلے سینوں سے نکلتے ہیں ان کی حیثیت وہی ہے جس کا ذکر قرآن نے علمائے یہود سے متعلق فرمایا ہے کہ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ (کیا تم دوسروں کو نیکی اور تقویٰ کے وعظ سناتے ہو لیکن اپنے آپ کو بھول جاتے ہو)۔

فسق کا لفظ یہاں ایمان و اطاعت سے نکل جانے کے معنی میں ہے۔ اس کی تشریح ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔

اس امت کے منصب امامت کا اعلان

نظم کے اعتبار سے یہ آیت جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں اس امت کے منصب امامت کا اعلان ہے۔ اس سورہ کی تمہید میں اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ والی دعا کے ضمن میں ہم یہ لکھ آئے ہیں کہ اس کے اندر اہل کتاب کی معزولی اور امت مسلمہ کی تقرری کا فیصلہ مضمر ہے۔ چنانچہ پوری تفصیل کے ساتھ یہود و نصاریٰ دونوں کی بدعہدیاں واضح کر چکنے کے بعد یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب خیر امت کے منصب کے حق دار یہ اہل ایمان ہیں نہ کہ یہود و نصاریٰ۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ قرآن اور پیغمبر پر ایمان لاتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ 'بہتر ہوتا' کے الفاظ کے اندر جو ابہام و اجمال ہے یہ متکلم کے اس غضب کا غماز ہے جس کے متحمل الفاظ نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد بانداز حسرت فرمایا کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود ان میں ایمان لانے والے تھوڑے نکلے اکثریت بدعہدوں اور نافرمانوں ہی کی نکلی۔

لَنْ یَّضُرُّوْکُمْ اِلَّآ اَذًی ؕ وَاِنْ یُّقَاتِلُوْکُمْ یُوَلُّوْکُمُ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ (۱۱۱)

اذیٰ کا مفہوم

'اذیٰ' کے معنی دکھ اور تکلیف کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان کی جڑ کٹ چکی ہے، ان کے اندر اب اتنا دم خم نہیں ہے کہ تمھیں کوئی بڑا نقصان پہنچا سکیں۔ بس زیادہ سے زیادہ جو یہ کر سکتے ہیں وہ یہ کہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کچھ طعن و تشنیع، کچھ زبان درازی اور کچھ افترا پردازی و تہمت تراشی کر لیں۔ اس سے زیادہ کا حوصلہ ان کے اندر نہیں ہے۔ اور اگر یہ تم سے لڑنے کے لیے نکلے تو پیٹھ دکھائیں گے اور پھر ایسے ذلیل و خوار ہوں گے کہ کسی طرف سے بھی ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔ بعد کے واقعات نے قرآن کی اس پیشین گوئی کی حرف بحرف تصدیق کر دی۔ یہی مضمون آگے اس طرح بیان ہوا ہے وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا (۱۸۶) اور تم ان لوگوں کی طرف سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور مشرکین کی طرف سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔

ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ (۱۱۲)

ذلت کی مار

ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ یعنی جس طرح دیوار پر گیلی مٹی تھوپ دی جاتی ہے اسی طرح ان پر ذلت تھوپ دی گئی ہے۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ انھوں نے عزت کی جگہ ذلت کی راہ اختیار کی تو ان پر پوری طرح ذلت مسلط کر دی گئی۔ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا سے اس ذلت کے احاطہ اور اس کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ ہے کہ جہاں کہیں بھی یہ ہیں ذلت ان پر مسلط ہے، یہاں تک کہ اپنے مرکز میں بھی یہ ذلیل و خوار ہیں۔ دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں ان کو عزت حاصل ہو اور یہ اپنی کمر کے بل بوتے پر

کھڑے ہوں۔

'اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ' کا مفہوم

'اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ کہیں قائم ہیں تو اپنی سطوت وعزت کے اعتماد پر نہیں بلکہ یا تو اللہ والوں کے کسی معاہدے نے ان کو امان دے رکھی ہے یا اپنے پاس پڑوس کے قبائل سے انھوں نے کوئی اسی قسم کا سہارا حاصل کر رکھا ہے۔ یہ سہارے وقتی اور عارضی ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً ان کے مختلف قبائل سے جو معاہدے کیے تھے ان کی عہد شکنیوں اور شرارتوں کی وجہ سے بعد میں وہ ختم کر دیئے گئے اور یہ یا تو اپنے جرائم کی پاداش میں قتل کر دیئے گئے یا جلا وطن کر دیے گئے۔ دوسرے قبائل سے انھوں نے جو معاہدے کر رکھے تھے وہ قبائل بھی آہستہ آہستہ اسلام کے زیر اثر آ گئے تو وہ معاہدے بھی عملاً بے اثر ہو کر رہ گئے۔ جس درخت کی اپنی جڑیں کھوکھلی ہوں وہ تھونیوں کے سہارے آخر کب تک کھڑا رہ سکتا تھا۔ اس زمانے میں یہود کی نام نہاد سلطنت اسرائیل بھی، جیسا کہ ہم اس کتاب میں کہیں اشارہ کر چکے ہیں، اسی حکم میں داخل ہے۔ وہ بھی درحقیقت اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ بِحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ امریکہ اور انگلستان کے سہارے پر کھڑی ہے اور جو چیز دوسرے کے سہارے کھڑی ہو اس کا کھڑا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔

'بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ' کا مفہوم

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ کا مفہوم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ یہود کی شامت اعمال اور ان کی بدبختی کا بیان ہے کہ جہاں سے ان کو عزت و سرفرازی کی بدولت دو جہان لے کے لوٹنا تھا یہ اپنی دوں ہمتی کی وجہ سے وہاں سے خدا کا غضب لے کر لوٹے جس کے نتیجے میں ان پر ذلت مسلط کر دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب امامت و شہادت پر مامور فرمایا تھا۔ اگر یہ اس کی ذمہ داریاں ادا کرتے اور اپنے عہد پر استوار رہتے تو دنیا اور آخرت دونوں میں ان کا مقام بہت اونچا تھا لیکن یہ اپنی دنیا پرستی اور پست ہمتی کی وجہ سے اس کی ذمہ داریاں نہ سنبھال سکے اور خدا کے غضب کے مستحق ٹھہرے۔ یہ حقیقت یہاں پیش نظر رہے کہ جو مقام جتنا ہی اونچا ہوتا ہے اس کی چڑھائی اتنی ہی سخت ہوتی ہے اور پھر اسی اعتبار سے اس سے گرنے کا انجام بھی نہایت خطرناک ہوتا ہے۔

'مسکنت' کا مفہوم

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ مسکنت سے مراد بے حوصلگی اور پست ہمتی ہے۔ قرآن نے اہل کتاب کی پست ہمتی کو نہایت حقیقت افروز تمثیلوں سے جگہ جگہ واضح فرمایا ہے۔ ان تمثیلوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہود پر دنیا پرستی کا اتنا غلبہ تھا کہ آخرت کی طلب اور اس کے لیے ایثار و قربانی کا کوئی حوصلہ ان کے اندر باقی رہ ہی نہیں گیا تھا۔ وہ آخرت کے بڑے سے بڑے نسیہ کے لیے اپنی دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے نقد کو قربان کرنے کی بھی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے تھے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ان کی اس بزدلی اور پست ہمتی پر بار بار ملامت کی ہے، بعد کے انبیاء نے بھی اس کا نوحہ کیا ہے۔ قرآن نے بھی جگہ جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ کتے والی تمثیل ان کی پست ہمتی ہی کی تمثیل ہے اور غور کیجیے تو معلوم

ہوگا کہ ان کی یہ پست ہمتی ہی تھی جس کے سبب سے وہ اس بات کے مستحق ہوئے کہ ان پر ذلت مسلط کر دی جائے۔

ذلت و مسکنت کے عذاب کا سبب

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ الایہ۔ یہ علت بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں یہ ذلت، غضب اور مسکنت کے عذاب کے مستحق قرار پائے؟ فرمایا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ اللہ کی آیات کا انکار اور انبیا کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں۔ بلندی اور رفعت کا ذریعہ اللہ کی آیات ہیں، جو لوگ ان کا انکار کریں اور اس انکار کو اپنا شیوہ بنالیں وہ اگر ذلت کے سزاوار نہ ہوں گے تو کس چیز کے ہوں گے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس تمثیل میں پیش کیا ہے جس میں فرمایا ہے کہ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے ذریعے سے اس کو بلند کرتے لیکن یہ تو برابر زمین ہی کی طرف جھکا رہا۔ ایسا ہی معاملہ انبیا اور آمرین بالقسط کے قتل کا ہے۔ یہ انسانیت کے گل سر سبد ہوتے ہیں۔ انھی کے سہارے انسانیت سعادت اور کمال کے مدارج طے کرتی ہے۔ اگر کوئی گروہ ان کا قاتل رہا ہو تو وہ خدا کی طرف سے غضب اور ذلت کے سوا اور کس چیز کا حقدار ہو سکتا ہے؟

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ یہ سبب بیان ہوا ہے ان کے کفر بآیات اللہ اور قتل انبیاء کا یعنی نافرمانی اور حدود الٰہی سے تجاوز ان کی عادت رہی ہے۔ اسی چیز نے ان کو کفر اور قتل انبیا پر اکسایا۔ بالآخر یہ جرائم ان کے لیے خدا کے غضب کا باعث ہوئے اور ان پر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی۔

اجزا کی وضاحت کے بعد نظم کے پہلو پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اوپر کی آیت میں جو بات فرمائی گئی تھی، اس آیت میں اس کی دلیل بیان ہوگئی کہ بھلا وہ لوگ تمھارا کیا بگاڑ سکیں گے جن پر ہر جگہ خدا کی مار ہے اور جو اب تمھارے سہاروں ہی پر جی رہے ہیں۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ (۱۱۳-۱۱۵)

'اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ' یعنی وہ گروہ جو اللہ کے عہد و میثاق اور اس کی شریعت پر قائم ہے۔ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ یعنی وہ شب کے اوقات میں کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ شب کی نماز و تلاوت ان کے عہد الٰہی پر قائم رہنے کا ثبوت ہے اس لیے کہ اس بے ریا نماز و تلاوت کی بے قراری انھی لوگوں کے اندر پیدا ہو سکتی ہے جو اپنی عظیم ذمہ داری کا نہایت گہرا احساس رکھتے ہوں۔ نماز کی تعبیر سجدہ سے ایک تو اس پہلو سے ہے کہ سجدہ نماز کے اہم ترین ارکان میں سے ہے، دوسرے یہ خشیت اور تذلل کا سب سے بڑا مظہر ہے، تیسرے اس پہلو سے بھی ہے کہ یہود نے، جیسا کہ ہم اس کتاب میں کہیں ذکر کر چکے ہیں، سجدہ کو اپنی نماز سے خارج کر دیا تھا۔

اہل کتاب کا باایمان گروہ

یہ اہل کتاب کے اس گروہ قلیل کا ذکر ہے جو اس اکثریت سے مستثنیٰ ہے جس کا حال اوپر والی آیت

میں بیان ہوا ہے۔ فرمایا کہ سب اہل کتاب اسی طرح کے نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے بلکہ ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو اپنے عہد پر قائم، شب بیدار و تہجد گزار، اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والے اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرنے والے ہیں۔ اس گروہ میں وہ لوگ بھی تھے جو علی الاعلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو اگرچہ ان آیات کے نزول کے وقت تک اپنے اسلام کا اعلان نہیں کر سکے تھے لیکن اندر سے وہ بالکل مومن صادق تھے اور بالآخر وہ اسلام لائے۔ ان لوگوں کو قرآن نے صالحین و متقین میں شمار کیا ہے۔ یہ لوگ جو نیکی بھی کریں گے اس کے اجر سے محروم نہیں رہیں گے۔ یہ اسلام میں آجانے کے بعد اپنی ان نیکیوں کا بھی پورا پورا اجر پائیں گے جو اسلام میں آنے سے پہلے انھوں نے کی ہیں۔ اسی گروہ کا ذکر اس سورہ کے آخر میں فرمایا ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔ (۱۹۹- آل عمران)

اور بے شک اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے اور جو ان کی طرف اتاری گئی ہے خدا سے ڈرتے ہوئے۔ یہ اللہ کی آیات کے عوض میں حقیر قیمت قبول نہیں کرتے، یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا صلہ ہے۔ بے شک اللہ جلد حساب چکا دینے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ......

کفر و شرک سے تمام نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں

یہ ان اہل کتاب کا ذکر ہے جو اوپر والے گروہ کے برعکس اپنے کفر پر اڑے رہ گئے۔ ان کے بابت فرمایا کہ جس مال و اولاد کی محبت نے انہیں خدا سے بے پروا کیا وہ ان کو خدا کی پکڑ اور دوزخ سے نہ بچا سکیں گے۔ یہ لوگ دوزخ میں پڑیں گے اور اس سے کبھی نہ نکل سکیں گے۔ اس دنیا کی زندگی میں اپنی رسمی دینداری کی نمائش کے لیے جو کچھ یہ خرچ کرتے ہیں، یہ خرچ کرنا بھی آخرت میں ان کے لیے کچھ سودمند نہیں۔ ان کے اس خرچ کی تمثیل اس کھیتی کی ہے جس پر پالے والی ہوا چل جائے اور وہ اس کو برباد کر کے رکھ دے۔ کفر و شرک کے ساتھ جو کام نیکی اور دینداری کی نوعیت کے کیے جاتے ہیں وہ سب اکارت جاتے ہیں۔ کفر و شرک ٹھنڈی آگ ہے جو ساری محنت کو راکھ کا ڈھیر بنا کے رکھ دیتی ہے۔ اوپر والی آیت میں بیان ہوا تھا کہ جو اہل کتاب اپنے ایمان پر قائم رہے اور قرآن کے نزول کے بعد قرآن پر بھی ایمان لائے ان کی پچھلی

نیکیاں بھی سب شرفِ قبولیت پائیں گی۔ اس آیت میں واضح فرمایا ہے کہ جو لوگ نہ اپنے عہد پر قائم رہے نہ اسلام میں داخل ہوئے ان کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ الآیہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ یہ ظلم انھوں نے خود اپنے اوپر کیا ہے۔ درخت اپنی جڑ کے سلامت رہنے سے سلامت رہتا ہے۔ اگر درخت کی جڑ اکھاڑ دی جائے تو اس کی شاخوں اور اس کے پتوں پر پانی دینے میں خواہ کوئی کتنی ہی محنت اٹھائے اور کتنی ہی زحمت جھیلے سب بے سود ہے۔ اس کی محنت کی بربادی پر اگر قابلِ ملامت ہے تو وہ خود ہے نہ کہ قدرت اور قدرت کا قانون۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِھِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ھٰٓاَنْتُمْ اُولَاۗءِ تُحِبُّوْنَھُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّھٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ڔ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِھَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَـيْـــًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (۱۱۸ - ۱۲۰)

'لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً' بِطَانَة لحاف وغیرہ کے استر کو کہتے ہیں۔ بطانة الرجل سے آدمی کے اہل و عیال اور اس کے خواص و محرمانِ راز مراد ہوتے ہیں[1]۔ 'خبال' کے معنی فساد اور بگاڑ کے ہیں لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا یعنی تمھارے اندر فساد پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ 'عنت' کے معنی مشقت، زحمت اور تکلیف کے ہیں۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ یعنی تمھارے لیے وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ تمھیں اس راہ میں ٹھوکریں پیش آئیں اور تم زحمتوں میں پھنسو۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ سے مراد اسلام دشمنی کی وہ باتیں ہیں جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اہلِ کتاب سب کچھ گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اسلام اور مسلمانوں کو کسی قیمت پر بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں چنانچہ قرآن نے ان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ یہ کھلم کھلا مشرکین تک کو بھی مسلمانوں پر ترجیح دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے تو کہیں زیادہ ہدایت پر یہ ہیں۔ (هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا)

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ میں ضمیرِ خطاب ھا اور اولاء کے بیچ میں آگئی ہے۔ ھا درحقیقت تنبیہ کا کلمہ ہے اس وجہ سے جب اس پر زور دینا ہوتا ہے تو اہلِ عرب یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں، اسی طرح ھا انا ذا بھی کہتے ہیں۔

---

[1] بطانة الرجل وليجته الذي يكاشفه باسراره ثقة بمودته۔ اقرب الموارد

اللہ کی پوری کتاب صرف قرآن ہے

'تُؤْمِنُوْنَ بِالْکِتٰبِ کُلِّہٖ' پر تفصیل کے ساتھ ہم سورۂ بقرہ میں بحث کر چکے ہیں۔ اصل میں پچھلے صحیفوں اور قرآن میں نسبت جزو اور کل کی ہے۔ اہل کتاب کو کتاب الٰہی کا صرف ایک حصّہ دیا گیا تھا، پوری کتاب کا دیا جانا آخری بعثت پر اٹھا رکھا گیا تھا۔ چنانچہ اہل کتاب کے متعلق بار بار یہ الفاظ آئے ہیں 'اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ' ۔ نساء: ۴۴ (بھلا ان کو تو دیکھو جنھیں کتاب الٰہی کا ایک حصّہ دیا گیا) اللہ تعالیٰ کی پوری کتاب قرآن ہے، جس طرح اس کا پورا دین اسلام ہے۔ اس وجہ سے جب مسلمان قرآن پر ایمان لاتا ہے تو خدا کی پوری کتاب پر ایمان لاتا ہے، اس پر بھی جو پہلے اتری اور اس پر بھی جو بعد میں اتری۔ قرآن سب کا جامع ہے۔

وَاِذَا خَلَوْا یعنی جب وہ اپنی مجلسوں میں ہوتے ہیں جیسا کہ سورۂ بقرہ میں بالکل اسی قسم کے سیاق میں فرمایا ہے وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ (اور جب یہ اپنے لیڈروں کے پاس ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو آپ کے ساتھ ہیں)

مسلمانوں کو اہل کتاب سے ہوشیار رہنے کی ہدایت

ان آیات میں مسلمانوں کو اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ آیت ۲۸ میں گزر چکی ہے۔ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن پیش نظر، جیسا کہ ہم نے آیت ۲۸ کے تحت اشارہ کیا ہے، وہ مسلمان ہیں جو یا تو اپنی سادگی کی وجہ سے اہل کتاب کی چالوں کو اچھی طرح سمجھتے نہیں تھے یا اپنی کمزوری کے سبب سے ان سے اپنے پچھلے روابط توڑنا نہیں چاہتے تھے درآنحالیکہ اس مرحلے میں اہل کتاب کے تعلقات کسی مسلمان کے ساتھ مخلصانہ نہیں رہ گئے تھے بلکہ جس حد تک بھی تھے محض سازشانہ اغراض و مقاصد کے لیے تھے۔ اس وجہ سے قرآن نے نہایت واضح الفاظ اور بالکل قطعی لب و لہجہ میں متنبہ کیا کہ اے ایمان والو! اپنے سے باہر والوں کو اپنا محرم راز نہ بناؤ۔ یہ تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ یہ اس بات کے خواہشمند نہیں ہیں کہ تمھیں تمھارے مقاصد میں کامیابی حاصل ہو بلکہ یہ تمھارے لیے زحمتوں اور پریشانیوں کے آرزومند ہیں۔ ان کی دشمنی ان کی باتوں سے ہی ظاہر ہو چکی ہے لیکن دلوں میں جو کچھ ہے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ سخت و شدید ہے۔ فرمایا کہ ہم نے یہ بات اچھی طرح کھول کر سمجھا دی ہے۔ اب بھی اگر تم نہ سمجھے تو اس کا خمیازہ بھگتو گے۔

اس کے بعد غیرت دلائی ہے کہ تم تو ان سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو لیکن وہ تم سے ذرا محبت نہیں کرتے حالانکہ تم پوری کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور تمام نبیوں پر ایمان لائے ہو اور وہ تمھاری کتاب پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جب تم سے ملتے ہیں تو تمھیں دھوکا دینے کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں[1]، اور جب اپنوں کے اندر ہوتے ہیں تو تم پر غصّے سے دانت پیستے اور اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔

اسی بیچ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان دانت پیسنے والوں کو مخاطب کر کے کہلا دیا کہ تم اسی غیظ و غضب کی بھٹی میں جا ہو تو جل کر مر جاؤ لیکن تم اسلام کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔

۱؎ اس کی وضاحت ہم سورۂ بقرہ میں کر چکے ہیں، وہاں دیکھیے۔

صبر اور تقویٰ کلید کامیابی ہے۔

اس جملہ معترضہ کے بعد اوپر والا سلسلۂ کلام پھر لے لیا اور فرمایا کہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تم کو کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو انھیں بڑا رنج ہوتا ہے اور اگر تمھیں کوئی نقصان پہنچ جائے تو یہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اگر تم نے ثابت قدمی دکھائی اور ان باتوں سے بچتے رہے جن سے بچتے رہنے کی تمھیں نہایت واضح ہدایات دے دی گئی ہیں تو ان کی چالیں تمھیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی ساری سرگرمیوں اور ساری چالوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس آخری ٹکڑے کی مزید وضاحت کے لیے اسی سورہ کی آیات ۱۲۵ اور ۱۸۶ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا کے تحت ابن جریرؒ کا ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہاں جس تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے اس میں سب سے مقدم لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ کی ہدایات پر عمل ہے یعنی کفار کو اپنا محرم راز بنانے سے احتراز۔

۲۹۔ آگے کا مضمون ____ آیات ۱۲۱-۱۲۹

اب آگے ان واقعات و حالات پر تبصرہ ہے جو غزوۂ احد کے موقع پر پیش آئے اور یہ سلسلۂ بیان سورہ کے آخر تک چلا جائے گا۔ ہم اس سورہ کے تمہیدی مباحث میں واضح کر چکے ہیں کہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کی اپنی ہی ایک جماعت کی بے تدبیری سے جو شکست پیش آئی اس نے اسلام اور کفر کی اس کشمکش سے تعلق رکھنے والے ہر گروہ پر کسی نہ کسی پہلو سے اثر ڈالا۔ مسلمانوں میں جو لوگ کمزور تھے وہ اس حادثہ سے بددل ہو گئے اور ان کی اس بددلی سے منافقین نے فائدہ اٹھا کر ان کے دلوں میں اسلام، اسلام کے مستقبل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مختلف قسم کے وسوسے بھرنے شروع کر دیے۔ یہود کو بھی اس حادثے سے بڑی شہ ملی اور وہ از سرِ نو اسلام کے خلاف پروپیگنڈا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں سرگرم ہو گئے۔ قریش کو بدر کی شکست سے جو ضرب پہنچی تھی اس کا زخم بھی گویا اس واقعہ سے مندمل ہو گیا اور وہ پھر یہ حوصلہ کرنے لگے کہ اسلام کو زک پہنچائی جا سکتی ہے۔

یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ احد کے واقعات پر تبصرہ کر کے ان تمام غلط فہمیوں کو دور کیا جائے جو اس موقع پر مخالفین، ذہنوں میں پیدا کر رہے تھے۔ ساتھ ہی یہی بہترین موقع تھا اس بات کے لیے کہ مسلمانوں کی کمزوریوں اور غلطیوں پر گرفت کی جائے اور آئندہ ان کو ان سے احتراز کرنے کی ہدایت کی جائے تاکہ یہ امت کمزوریوں سے پاک ہو کر اس منصب کی ان ذمہ داریوں کی صحیح طور پر اہل ہو سکے جس پر كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ والی آیت میں اس کو سرفراز کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب اس سورہ میں بات یہاں تک پہنچی کہ تم ہی غالب اور فتحمند ہو گے اور تمہارے مخالفوں کی کوئی چال بھی تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی بشرطیکہ تم صبر اور تقویٰ پر قائم رہو تو بہترین موقع گویا احد کے واقعات پر تبصرہ کر کے یہ دکھانے کا آ گیا کہ صبر اور تقویٰ کے پہلو سے وہ کیا خامیاں ابھی جماعتی زندگی میں موجود تھیں جو اس افتاد کا باعث ہوئیں اور اس سے انفرادی اور اجتماعی اصلاح و تزکیہ کے کیا کیا سبق ملتے ہیں۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۭ
۱۲۱-۱۲۹ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۲۱ اِذْ هَمَّتْ طَّاۗىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ
وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲۲ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ
اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲۳
اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ
اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝۱۲۴ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا
وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ ھٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ
الربع اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝۱۲۵ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى
لَكُمْ وَلِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۱۲۶ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ
يَكْبِتَھُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَاۗىِٕبِيْنَ ۝۱۲۷ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ
يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَھُمْ فَاِنَّھُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۱۲۸ وَلِلّٰهِ مَا
فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ
مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲۹ ع

ترجمۂ آیات ۱۲۱-۱۲۹

اور یاد کرو جب کہ تم اپنے گھر سے نکلے مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں میں مامور کرنے کے لیے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۱۲۱

جب کہ تم میں سے دو جماعتوں نے حوصلہ چھوڑ دینے کا ارادہ کیا حالانکہ اللہ ان کا

مددگار تھا۔ اور اللہ ہی پر چاہیے کہ اہلِ ایمان بھروسہ کریں۔ اور اللہ نے تو تمہاری مدد بدر میں بھی کی جب کہ تم نہایت کمزور تھے۔ پس اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ اس کے شکر گزار رہ سکو۔ ۱۲۲-۱۲۳

یاد کرو کہ جب تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لیے کافی نہیں ہے کہ تمہارا رب تین ہزار تازہ دم فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے؟ ہاں اگر تم ثابت قدم رہو گے اور بچتے رہو گے اور وہ تمہارے اوپر ابھی آدھمکے، تو تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا، جو اپنے خاص نشان لگائے ہوئے ہوں گے۔ ۱۲۴-۱۲۵

اور اللہ نے اس کو نہیں بنایا مگر تمہارے لیے بشارت اور تاکہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں، اور مدد نہیں آتی مگر خدائے غالب و حکیم ہی کے پاس سے، تاکہ اللہ کافروں کے ایک حصے کو کاٹ دے یا انھیں ذلیل کر دے کہ وہ خوار ہو کر لوٹیں۔ ۱۲۶-۱۲۷

تمہیں اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں، خدا ان کی توبہ قبول کرے یا انھیں عذاب دے۔ کیونکہ وہ ظالم ہیں اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۱۲۸-۱۲۹

۳۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ (۱۲۱)

'بَوّأ، يُبَوِّئُ' کے معنی ٹھہرانا، ٹکانا، متعین کرنا، مامور کرنا۔ مقاعد، مقعد کی جمع ہے جس کے معنی بیٹھنے کی جگہ کے ہیں لیکن وسیع استعمال میں اس کے معنی گھات لگانے کی جگہ کے بھی ہو سکتے ہیں اور قرینہ موجود ہو جیسا کہ یہاں ہے تو اس سے جنگ کا مورچہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔

یہ آیت تمہید ہے اس تبصرے کی جو جنگ اُحد کے واقعات اور ان سے پیدا شدہ اثرات پر آگے آرہا

غزوۂ احد کے واقعات پر تبصرہ

ہے۔ یہ جنگ چونکہ ابھی تازہ تازہ ہوئی تھی، اس وجہ سے ہر شخص کے سامنے تھی، نام لیے بغیر بھی اس کے واقعات کی طرف اشارہ کر دینا کافی تھا۔ لیکن یہ تبصرہ چونکہ بعض ایسے حالات و اثرات پر بھی تھا جن کے بعض گوشے بعض پارٹیوں کی درپردہ سازشوں سے تعلق رکھنے والے تھے یا ان کا تعلق ذہنی و قلبی تصورات و تاثرات سے تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات ۔سمیع وعلیم۔ کا حوالہ دے کر تمہید ہی میں سب کو متنبہ کر دیا کہ اس تبصرے پر کسی کے لیے چون وچرا، رد وقدح اور بحث وتردید کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے کہ یہ تبصرہ اس کی طرف سے ہے جو سب کچھ جانتا سنتا ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کہا ہے سب کچھ بے خطا سمع وعلم پر مبنی ہے۔

إِذْ هَمَّت طَّائِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۱۲۲-۱۲۳)

'فشل' کا مفہوم

'فشل' کے معنی ہمت ہار دینے اور حوصلہ چھوڑ دینے کے ہیں۔ جنگ میں اصل اہمیت حوصلہ وہمت کو حاصل ہے، اسلحہ اور دوسری چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس وجہ سے سب سے پہلے بعض جماعتوں کی اس کمزوری پر گرفت فرمائی۔

'اذلۃ' کا مفہوم

'اذلۃ' ذلیل کی جمع ہے۔ ذلیل عزیز کا متقابل لفظ ہے۔ عزیز کے معنی ہیں غالب، زبردست اور دوسروں کی دسترس سے باہر۔ ذلیل کے معنی کمزور، ناتوان اور دوسروں کے لیے نقمۂ تر کے ہیں۔ اخلاقی رذالت اس لفظ کے بنیادی اجزا میں سے نہیں ہے بلکہ اس کے لوازم بعیدہ میں سے ہے۔ چنانچہ یہ لفظ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً۔ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ (۵۴۔ مائدہ) (وہ مسلمانوں کے لیے نہایت نرم اور کافروں کے لیے نہایت سخت ہیں) یعنی اگر کفار ان کے اندر انگلی دھنسانا اور ان کو اپنے اغراض کے لیے نرم کرنا چاہیں تو وہ پتھر کی چٹان ہیں لیکن مسلمانوں کے لیے نہایت نرم خو ہیں۔ وہ ان سے جس طرح چاہیں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آیت زیر بحث میں بھی یہ لفظ مسلمانوں کی صرف اس وقت کی عددی ومادی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے اس میں اخلاقی ضعف وذلت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

منافقین کی ایک شرارت

آیت میں جن دو گروہوں کی طرف اشارہ ہے، مفسرین کے بیان کے مطابق، وہ قبیلہ خزرج کے بنوسلمہ اور قبیلہ اوس کے بنوحارثہ ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے اندر منافقین کی شرارت کی وجہ سے کچھ بزدلی پیدا ہوئی لیکن پھر وہ سنبھل گئے۔ منافقین درحقیقت اس جنگ کے لیے نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اس کمزوری کا اندازہ تھا۔ چنانچہ آپ نے یہ چاہا کہ نکلنے سے پہلے صحیح صورتِ حال سامنے آجائے۔ اس کے لیے امتحاناً آپ نے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ قریش کا مقابلہ مدینہ کے اندر سے کیا جائے یا باہر نکل کر؟ اس کا جواب سچے اور پکے مسلمانوں کی طرف سے تو ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ باہر نکل کر، چنانچہ انھوں نے پورے جوش وجذبے کے ساتھ یہی جواب دیا۔ لیکن منافقین نے مدینہ میں محصور ہو کر

مقابلے کی مصلحتیں سمجھانے کی کوشش کی۔ آنحضرتؐ نے جب صورتِ حال کا اندازہ کر لیا، منافقین کی کمزوری آپ پر واضح ہو گئی تو آپ نے وہی کیا جو آپ کے دل میں تھا اور جس کا اظہار آپ کے جان نثار ساتھیوں نے کیا تھا۔ منافقین نے جب دیکھا کہ ان کی یہ سازش ناکام ہو گئی تو وہ نکلنے کو تو مسلمانوں کے ساتھ نکلے لیکن نکلنے کے بعد ان کے لیڈر ابن اُبی نے ان کو ورغلایا اور اس چیز کو بہانہ بنا کر کہ اس کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی، راستے ہی میں تین سو آدمیوں کے لشکر کے ساتھ الگ ہو گیا۔ اس واقعہ سے قدرتی طور پر مسلمانوں کی بعض جماعتوں کے حوصلے پر اثر پڑا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار کفار کے مقابلے میں کل ایک ہزار تھی، ایک ہزار آدمیوں میں سے تین سو آدمیوں کا عین موقع پر فرار ظاہر ہے کہ ایک اہم حادثہ تھا جس سے کمزور طبائع کا اثر لینا قدرتی امر تھا۔

خدا اہلِ ایمان کا کارساز ہے

قرآن نے اس کمزوری پر گرفت کی اور فرمایا کہ جو مسلمان اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلتے ہیں اللہ ان کا مددگار اور کارساز ہوتا ہے اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان خدا کی مدد اور اس کی کارسازی پر پورا پورا بھروسہ کریں۔ جب خدا ساتھ ہے تو منافقوں اور بزدلوں کی کوئی جماعت ساتھ چھوڑ بھی دے تو اس سے کیا بنتا بگڑتا ہے۔

واقعۂ بدر کی یاد دہانی

ایمان اور توکل کا تقاضا واضح کرنے کے بعد بدر کے واقعہ کی بھی یاد دہانی فرما دی کہ جب تمہاری عددی قلت اور مادی بے سروسامانی کے باوجود بھی کل خدا نے تمہاری مدد فرمائی اور تمہیں شاندار فتح دی تو اس خدا سے کیوں مایوس ہوتے ہو، وہ آج بھی تمہارا حامی و ناصر اور ولی و کارساز ہے۔

تقویٰ کا لفظ وسیع معنوں میں

'فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ'، میں تقویٰ کا لفظ جیسا کہ ہم آیت ۱۰۲ کے تحت اشارہ کر چکے ہیں، اپنے وسیع معنی میں ہے۔ یعنی ایمان اور توکل اور خدا کو ولی اور کارساز ماننے کے تقاضوں کے خلاف بزدلی اور بے ہمتی کی راہ اختیار کرنے سے بچو۔ خدا کی شکر گزاری کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے یہ تقویٰ ضروری ہے۔ جو لوگ عزم و ہمت سے خالی ہوں گے وہ شیطان سے ہر قدم پر مار کھائیں گے اور حق کے بجائے باطل کی راہ اختیار کر لیں گے۔ ایسے لوگ خدا کی شکر گزاری کا حق ادا نہ کر سکیں گے۔

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ ۝ بَلَىٰ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِنْ فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ (۱۲۴-۱۲۵)

مُسَوِّمِیْن کا مفہوم

'مُسَوِّمِیْنَ'، 'سومۃ'، 'سیمۃ' سے ہے جس کے معنی علامت اور نشان کے ہیں۔ الخیل المسومۃ، ان گھوڑوں کو کہتے ہیں جن پر نشان لگے ہوئے ہوں۔ فرشتوں کے لیے مسومین کی صفت سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو خاص اہتمام کے ساتھ اس مہم کے لیے بھیجے گا اور وہ خاص اس جنگ کے لیے اپنے امتیازی نشان اور بیج لگائے ہوئے ہوں گے۔

یہ اس بات کا حوالہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کا حوصلہ بحال کرنے کے لیے اس وقت فرمائی

جب عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس ہو گیا اور مسلمانوں کی بعض جماعتوں میں، جیسا کہ اوپر والی آیت میں ذکر ہے، اس سے بددلی پھیلی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تین سو آدمی الگ ہو گئے تو کیا ہوا! کیا تمھارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تین سو کمزور اور پست ہمت آدمیوں کی جگہ تین ہزار تازہ دم اتارے ہوئے فرشتوں کے ذریعے سے تمھاری مدد فرمائے۔ 'اتارے ہوئے' سے مقصود اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اسی کار خاص کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تازہ دم کمک کے طور پر آسمان سے اتارے جائیں گے۔

بَلٰٓی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کی تائید ہے۔ آپ نے جو امید مسلمانوں کو دلائی تھی وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت کے بھروسے پر دلائی تھی کہ یہ تین سو آدمیوں کی کمی تین ہزار فرشتوں سے پوری ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی اس بات کی تائید فرمادی اور اپنے فضل سے اس پر دو ہزار فرشتوں کا اور اضافہ فرما دیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا، اگر تم ثابت قدم رہے اور خدا اور رسول کے احکام کی نافرمانی سے بچتے رہے۔ جنگ اُحد کے واقعات شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو پورا فرمایا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی حملے میں کفار کو اچھی طرح تہ تیغ کیا اور ان کو شکست دے دی لیکن شکست دے چکنے کے بعد ان کی ایک جماعت نے کمزوری دکھائی اور رسولؐ کی صریح ہدایت کے خلاف مال غنیمت کی طمع میں ایک نہایت اہم مورچہ خالی چھوڑ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حاصل کی ہوئی فتح صبر و تقویٰ کی کمزوری کے سبب سے شکست میں تبدیل ہو گئی۔ آگے اسی سورہ میں اس بات کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ	اور اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا جب کہ
اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى	تم خدا کے حکم سے ان کافروں کو تہ تیغ کر رہے تھے
اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى	یہاں تک کہ تم نے کمزوری دکھائی اور تعمیل حکم میں
الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ	اختلاف کیا۔ اور اس وقت نافرمانی کی جب کہ خدا
اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ	نے تمھیں تمھاری محبوب چیز ـــ فتح ـــ دکھا دی۔
يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ	تم میں کچھ دنیا کے طالب ہو گئے اور کچھ آخرت کے،
يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ	تو خدا نے تمھارا رخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمھیں آزمائش
عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ (۱۵۲)	میں ڈالے۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَاۗىِٕـبِيْنَ (۱۲۶-۱۲۷)

جَعَلَهُ میں ضمیر کا مرجع وہ وعدۂ نصرت ہے جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے سے جو تمھاری مدد کا خاص طور پر وعدہ فرمایا تو یہ اس لیے کہ یہ

تمھارے لیے بشارت کا باعث ہوا اور تمھیں مخالفین و منافقین کے رویے سے جو بددلی ہوئی ہے وہ دور ہو جائے۔ اگر یہ بشارت نہ بھی اترتی جب بھی اہل ایمان کو یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ فتح و نصرت ہمیشہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ عزیز و غالب ہے جس کو چاہے فتح و غلبہ عطا فرمائے اور حکیم بھی ہے اس وجہ سے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس آیت پر مزید بحث ہم سورۂ انفال میں کریں گے۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا الآیہ۔ یہ مقصد بیان ہوا ہے اس موقع پر خاص اہتمام کے ساتھ حوصلہ افزائی کا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اس جنگ میں یا تو قریش کی قوت بالکل پامال ہو جائے گا یہ ذلیل و خوار ہو کر واپس ہوں یا کم از کم ان کی طاقت کا ایک حصہ ٹوٹ جائے۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۲۸-۱۲۹)

آنحضرت کو تسلی

یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت کی ہے۔ اس جنگ کے سلسلے میں منافقین نے جو روش اختیار کی اور اپنی روش سے جو اثر دوسرے مسلمانوں پر انھوں نے ڈالا اس کی طرف اشارہ اوپر گزرا۔ قدرتی طور پر اس بات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہنچا ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ اس معاملے میں نہ تم کو کوئی دخل ہے اور نہ اس کی تم پر کوئی ذمہ داری ہے۔ تم نے اپنا فرض کما حقہٗ انجام دے دیا۔ اب اگر کوئی گروہ خود اپنی جان پر ظلم ڈھاتا ہے تو اس کا غم تم کیوں کرو۔ اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ وہ چاہے گا تو ان کو توبہ کی توفیق دے گا یہ توبہ کریں گے اور وہ ان کو معاف کرے گا۔ اور اگر وہ اس کے اہل نہ ہوں گے تو ان کو سزا دے گا۔ آسمان و زمین کا سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ آخر میں اپنی صفاتِ غفور رحیم کا حوالہ دے کر یہ ظاہر فرما دیا کہ خدا غفور رحیم ہے۔ اس وجہ سے اگر وہ کسی کو سزا دے گا تو اسی وقت دے گا جب وہ اس کو سزا کا مستحق پائے گا۔

۳۱۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۳۰-۱۴۳

آگے کی آیات میں پہلے اسی جہاد کے تعلق سے جس کا ذکر چلا آ رہا ہے انفاق پر ابھارا ہے، پھر اُحد کی شکست سے جو بددلی پیدا ہوئی تھی اس کو دور کرنے کے لیے اس کی بعض حکمتیں اور مصلحتیں واضح فرمائی ہیں تاکہ جن مسلمانوں کے اندر کچھ افسردگی پیدا ہو گئی ہے ان کے اندر از سرِ نو انفاق و جہاد کی حرارت پیدا ہو جائے۔ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن سیاق و سباق دلیل ہے کہ روئے سخن خاص طور پر انھی مسلمانوں کی طرف ہے جن سے اس جنگ کے دوران میں کوئی کمزوری صادر ہوئی تھی، یا جنگ کے نتیجہ نے ان کے ذہن پر کوئی برا اثر ڈالا تھا۔ گویا اس جنگ نے بہت سی طبیعتوں کے اس میل کچیل کو اوپر ابھار دیا تھا جو اب تک اندر دبا ہوا تھا اور اب وقت آ گیا تھا کہ اس کو دھو کر صاف کیا جائے۔ چنانچہ اب آگے کا سلسلۂ بیان زیادہ تر اسی نوعیت کا ہے۔ یہ گویا

تزکیہ و تطہیر کے باب کا ایک حصہ ہے۔

انفاق کے مضمون کا آغاز سود کی ممانعت کے ذکر سے کیا ہے اس لیے کہ سود خوری اور انفاق میں نسبت ضدین کی ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب بہت استعمال ہوا ہے کہ جب ایک چیز بیان ہوتی ہے تو بالعموم اس کے ضد کا بھی اس کے ساتھ ذکر ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں بھی انفاق کے ذکر کے ساتھ سود کی حرمت کا ذکر ہوا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ بقرہ میں سود کی حرمت کا ذکر انفاق کے بعد ہے اور اس سورہ میں انفاق سے پہلے۔ ان دونوں اسلوبوں کے الگ الگ فوائد ہیں، لیکن اس مسئلے پر بحث کے لیے یہ مقام موزوں نہیں۔ یہاں نظم کلام کی وضاحت کے لیے بس اتنی بات یاد رکھیے کہ انفاق کے حکم سے پہلے سود سے روکنے کی بات بالکل ایسی ہی ہے جس طرح سچ بولنے کی ہدایت سے پہلے جھوٹ سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔ سود اور انفاق کے تعلق پر سورہ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس موقع پر ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۳۰-۱۳۶

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠
وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ
لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾
وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ
وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ
وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا
اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ
يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ
يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿١٣٧﴾ هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَ
هُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٣٨﴾ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ
الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾ إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ
مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ
النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۗ
وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٠﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا
وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ﴿١٤١﴾ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا
يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ﴿١٤٢﴾
وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ
رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿١٤٣﴾ ع ۱۴ ۵

ترجمۂ آیات ۱۳۰-۱۴۳ اے ایمان والو! سود نہ کھاؤ دگنا چوگنا بڑھتا ہوا۔ اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار ہے۔ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۱۳۰-۱۳۲

اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کے لیے مسابقت کرو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی طرح ہے، یہ پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو کشادگی اور تنگی ہر حال میں خرچ کرتے رہتے ہیں، غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔ یہ لوگ جب کسی کھلی برائی،

کا ارتکاب یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخشے۔ اور یہ جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کیا ہی خوب صلہ ہے کارگزاروں کے لیے! تم سے پہلے بہت سی مثالیں گزر چکی ہیں تو زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے۔ یہ تنبیہ ہے لوگوں کے لیے اور ہدایت و نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لیے۔ ۱۳۳-۱۳۸

اور پست ہمت نہ ہو اور غم نہ کرو، اگر تم مومن ہو تو تمہی غالب رہو گے۔ اگر تمھیں کوئی چوٹ پہنچے تو اس سے پست ہمت نہ ہو آخر دشمن کو بھی تو اسی طرح کی چوٹ پہنچی ہے۔ یہ ایام اسی طرح ہم لوگوں کے اندر الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں، تاکہ اللہ تمھارا امتحان کرے اور ممیز کر دے ایمان والوں کو، اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور تاکہ اللہ مومنوں کو چھانٹ کر الگ کر دے اور کافروں کو مٹا دے۔ کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں جا داخل ہو گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو ممیز نہیں کیا جنھوں نے جہاد کیا اور تاکہ ممیز کرے ثابت قدم رہنے والوں کو۔ اور تم موت کی تمنا کر رہے تھے اس سے ملنے سے پہلے سو اب تم نے اس کو دیکھ لیا، آنکھیں چار کر کے۔ ۱۳۹-۱۴۳

۳۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَ

اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۱۳۰-۱۳۲)

اضعافاً مضاعفۃً کی قید کا مقصد

لفظ رِبٰوا کی تحقیق اور اس سے متعلق دوسرے بعض اہم سوالات پر سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے ساتھ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کی جو قید لگی ہوئی ہے اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ اسلام میں ممنوع صرف سود در سود ہے، بلکہ یہ قید، جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ میں لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کے تحت متعدد مثالوں سے واضح کر چکے ہیں، محض صورتِ حال کی تصویر اور اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے ہے، جس طرح لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَي الْبِغَاۗءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو اگر وہ قیدِ نکاح میں آنا چاہتی ہیں) میں اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا کی شرط سے مقصود یہ نہیں ہے کہ اگر وہ قیدِ نکاح میں نہ آنا چاہیں تو ان کو پیشہ کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، بلکہ مقصود اس سے صرف حال کی تصویر اور اس کے نفرت انگیز ہونے کا اظہار ہے۔ اسی طرح آیت زیرِ بحث میں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کی قید ہے۔

سودخوری کے میدان میں مسابقت کے بجائے انفاق میں مسابقت کی دعوت

یہاں اس قید کے نمایاں کرنے میں بلاغت کا ایک نکتہ بھی ہے۔ اوپر ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ یہاں اصل مضمون جو بیان ہو رہا ہے وہ جہاد کے سلسلہ سے انفاق کا ہے۔ اس کی تمہید کے طور پر یہ سود خواری کی مخالفت کا ذکر ہوا ہے اس لیے کہ یہ انفاق کا ضد ہے۔ انفاق کا ذکر یہاں جس نوعیت سے ہوا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس راہ میں مسابقت یعنی ایک دوسرے کے مقابل میں بڑھنے، بازی لے جانے اور میدان مارنے کی دعوت دی گئی ہے۔ گویا اہل ایمان کے لیے مقابلہ و مسابقت کا میدان اگر ہے تو یہ ہے۔ چنانچہ اس مضمون کی تمہید سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ الآیہ (اور مسابقت کرو اپنے رب کی رحمت اور ایسی جنت ...) ہے۔ یہ مضمون اس بات کا مقتضی ہوا کہ اس میدانِ مسابقت کی دعوت دینے سے پہلے لوگوں کو اس میدان سے موڑا جائے جس میں یہودی ساہوکار اور مہاجن اب تک ایک دوسرے پر سبقت کرنے کے لیے سود کی بازی لگائے ہوئے تھے اور ان کی دیکھا دیکھی عربوں کو بھی اس کا چسکا لگ رہا تھا۔ عربی زبان کا جن لوگوں کو کچھ ذوق ہے وہ اندازہ کر سکیں گے کہ سود خوری کے میدان میں اس مسابقت کا اظہار اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ اگر یہ الفاظ نہ ہوتے تو یہ حقیقت پوری طرح سامنے نہ آتی۔ قرآن نے یہ چاہا ہے کہ لوگ اس ناپاک میدان میں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کی غلاظت کا انبار جمع کرنے کے بجائے اس جنت کے لیے بازیاں لگائیں جس کی پہنائی آسمان و زمین کے برابر ہے۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ کا ٹکڑا اس سیاق میں اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اس تنبیہ کے بعد بھی جو لوگ سود خوری پر مصر رہیں گے وہ کافر ہیں اور ان کے لیے دوزخ کی آگ تیار ہے۔ اس نکتہ پر ہم سورۂ بقرہ میں بحث کر چکے ہیں۔ درحقیقت ایسے لوگ اپنی آگ کے لیے اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ایندھن خود فراہم کر کے چھوڑتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی آگ بالکل تیار ہے۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۚ

جنت کی وسعت کی ایک تمثیل

یعنی سود کے ذریعہ سے اگر بہت تیر مارو گے تو ایک کا دس یا بیس یا سو یا ہزار بنا لو گے اور اس کا نفع بہرحال اسی زندگی تک محدود رہے گا۔ آخرت میں یہ سارا اندوختہ تمہارے جلانے کے لیے ایندھن بنے گا۔ برعکس اس کے اگر اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرو گے تو اس کے بدلے میں خدا کی مغفرت کے حق دار اور اس کے نتیجے میں ایسی وسیع جنت کے وارث ٹھہرو گے جس کی وسعت کے آگے تمام آسمانوں اور پوری زمین کی وسعت گرد ہو کے رہ جائے گی۔ پھر ایک بندگلی کی ایک محدود تنگنائے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کے بجائے ابدی زندگی کی یہ ناپیداکنار بادشاہی حاصل کرنے کے لیے مقابلہ کیوں نہ کرو۔ یہی مضمون سورہ حدید میں اس طرح آیا ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ	جان رکھو کہ یہ دنیا کی زندگی — لہو ولعب، زینت،
وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ	باہمی تفاخر، مال و اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے کا
فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ	مقابلہ — اس کی تمثیل اس بارش کی ہے جس کی اگائی
الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا	ہوئی نباتات کسانوں کے دل موہ لیں۔ پھر وہ خشک
ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ	ہو کر رہ جائیں پھر تو دیکھے ان کو زرد، پھر وہ ریزہ ریزہ
شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ	ہو جائے اور آخرت میں سخت عذاب بھی ہے اور اللہ
وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ○	کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی بھی ہے اور یہ دنیا کی
سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ	زندگی محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت
عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ	اور ایک ایسی جنت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کی طرح
لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ	ہے یہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں
فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ	پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ دے گا
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۲۰-۲۱)	جس کو چاہے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

جنت کی وسعت کی یہ تمثیل بھی بہرحال ایک تمثیل ہی ہے جس سے انسان اس کی وسعت کا بس ایک دھندلا سا تصور کر سکتا ہے۔ اصل حقیقت اس کی وسعت کی کیا ہے یہ صرف اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن اس وسعت کے باوجود انسان اگر چاہے تو خدا کی راہ میں انفاق کر کے اس کو خرید سکتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ (الآیہ) میں اس انفاق کی بعض وہ خصوصیات بیان کر دی گئی ہیں جن کے اہتمام کے بغیر نہ تو انفاق کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ اس انفاق کو احسان کا درجہ حاصل ہوتا ہے — ان خصوصیات پر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں غصہ کو دبا لینے اور لوگوں سے درگزر کرنے کی جو تاکید ہے اس کا خاص پہلو ہے۔ اس کی توجیہ آیات ۲۶۲ - ۲۶۵ بقرہ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْھَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (۱۳۵-۱۳۶)

انفاق کی راہ کی ایک مزاحمت

یہ راہ انفاق کی ایک نہایت اہم مزاحمت کا بیان ہے جس طرح سود خوری کی علت روپے کی ایسی تونس پیدا کرتی ہے کہ آدمی کے لیے کسی اچھے کام میں خرچ کرنا پہاڑ ہو جاتا ہے اسی طرح بدکاری اور عیاشی کی چاٹ بھی کسی نیکی کے کام میں خرچ کرنے کی راہ بند کر دیتی ہے۔ جو لوگ اس راہ پر چل پڑتے ہیں وہ اپنی خواہشوں کے ہاتھوں اس طرح بے بس ہو جاتے ہیں کہ ان کو کسی اور طرف نگاہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس وجہ سے قرآن نے انفاق کی تعلیم کے سلسلے میں جہاں سود خوری سے روکا ہے وہیں بدکاری، بے حیائی اور اس کے لازمی نتیجہ اسراف و تبذیر سے بھی روکا ہے۔ بقرہ کی آیت ۲۶۸ کے تحت ہم اس پر بحث کر آئے ہیں۔ مزید بحث اس پر بنی اسرائیل کی آیات ۲۶-۲۷ کے تحت آئے گی۔

فرمایا کہ اس انفاق کی راہ میں وہی لوگ بڑھ سکیں گے جو بدکاری و عیاشی کی لت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں گے۔ جو لوگ جانتے بوجھتے اپنے گناہوں پر اصرار کیے چلے جائیں گے وہ اپنے اوپر اس سعادت کے دروازے بند کر لیں گے، سعادت کی راہ یہ ہے کہ آدمی اگر غلبۂ جذبات سے کسی بڑے یا چھوٹے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو خدا کی یاد اس کو چوکنا کر دے اور وہ فوراً اس سے معافی مانگے۔ خدا کے سوا کوئی نہیں ہے جو معافی دے سکے۔ جو لوگ دوسروں کی سفارش کی امید پر گناہوں کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں، وہ صرف اپنی شامتِ اعمال سے دوچار ہوں گے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ ھٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَھُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (۱۳۷-۱۳۸)

سُنن کا مفہوم

'سنن' سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ ضابطے اور قاعدے ہیں جن کے تحت وہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ ایک قوم اگر اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات کی تعمیل اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو برومند اور کامیاب کرتا ہے۔ برعکس اس کے اگر کوئی قوم خدا کے احکام و قوانین کی نافرمانی اور اس کے رسولوں کی تکذیب کرتی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس سنت کے مظاہر خدا کی زمین میں بے شمار ہیں، سرزمینِ عرب میں بھی، جس کے بسنے والے اس آیت میں مخاطب ہیں، اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے مظاہر عاد، ثمود، اہلِ مدین، قوم لوط وغیرہ کے آثار کی شکل میں موجود تھے۔ عدلِ الٰہی کے انھی مظاہر کو یہاں "سنن" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ اس مفہوم میں بار بار استعمال ہوا ہے۔ "سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ" (احزاب: یہ اللہ کی سنت رہی ہے گزشتہ قوموں میں)، فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ (۴۳- فاطر) (یہ لوگ نہیں منتظر ہیں مگر اس بات کے کہ ان کے لیے بھی اللہ کی وہی

سنت ظاہر ہو جائے جو اگلوں کے لیے ظاہر ہوئی)

سود خوری کی ممانعت اور اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت کے بعد یہ دو آیتیں تنبیہ و تہدید کی نوعیت کی ہیں۔ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن پیش نظر خاص طور پر وہ لوگ ہیں جو یا تو ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوئے تھے یا صریح نفاق میں مبتلا تھے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں ان کے انجام کا اندازہ کرنے کے لیے بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھارے اپنے ہی ملک میں کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ یہ واضح تنبیہ ہم نے نازل کر دی ہے اس میں ان لوگوں کے لیے ہدایت و نصیحت کا پورا سامان موجود ہے جن کے اندر خدا کا خوف ہے۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ (۱۳۹-۱۴۱)

'وھن' کا مفہوم

'وھن' کے معنی ضعف کے ہیں۔ عام اس سے کہ یہ ضعف عمل کا ہو یا ارادے کا، جسم کا ہو یا کردار و اخلاق کا۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہؓ سے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ تم سیلاب کے خس و خاشاک کے مانند ہو جاؤ گے۔ صحابہؓ نے پوچھا، یا رسول اللہ! اس کا کیا سبب ہوگا؟ آپ نے فرمایا تمھارے اندر 'وہن' پیدا ہو جائے گا۔ لوگوں نے پوچھا، یا رسول اللہ! 'وہن' کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا۔ حب الدنیا وکراھۃ الموت دنیا کی محبت اور موت کا ڈر۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عزم و حوصلہ اور عمل و ارادہ کی وہ پستی جو دنیا اور دنیا کی زندگی کی محبت اور موت کے خوف سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو راہ حق میں جہاد سے روکتی ہے وہ 'وہن' ہے۔ یہ حدیث اس لفظ کی بہترین تشریح ہے۔ یہاں بھی لَا تَهِنُوا سے یہی مراد ہے کہ احد میں جو افتاد تمھیں پیش آئی ہے اس سے مرعوب اور خوف زدہ ہو کر ہمت نہ ہار بیٹھو۔ گویا پوری بات یوں ہے لَا تَهِنُوا بِمَا أَصَابَكُمْ وَلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ اس شکست کے سبب سے جو تمھیں پیش آئی ہے حوصلہ ہار دو اور نہ اس نقصان کا جو تمھیں پہنچا غم کرو۔

'القوم' سے مراد

'القوم' کا لفظ اس سیاق و سباق میں جب آتا ہے تو اس سے مراد حریف مقابل اور دشمن ہوتا ہے۔ یہاں اشارہ کفار قریش کی طرف ہے۔

'الایام' سے مراد

'الایام' جب اس طرح جمع کی شکل میں آتا ہے تو اس سے مراد تاریخ کے وہ دن ہوتے ہیں جن میں بڑے بڑے واقعات و حوادث پیش آئے ہوں۔ ایام العرب سے مراد اہل عرب کی جنگیں ہیں۔ قرآن میں ہے وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ یعنی دنیا میں قوموں پر اللہ کی رحمت اور اس کے عذاب کے جو بڑے بڑے واقعات پیش آئے ہیں ان کے ذریعہ سے لوگوں کو یاد دہانی کرو۔ آیت زیر بحث میں بھی اسی

حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس طرح کے فتح و شکست کے جو واقعات پیش آتے ہیں، یہ ہر قوم کو پیش آتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کے قانونِ آزمائش کے تحت پیش آتے ہیں۔

معطوف علیہ، معطوف علیہ کے

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِينَ الآیہ کا معطوف علیہ یہاں مذکور نہیں ہے۔ ہم اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ذکر کر چکے ہیں کہ جب اس طرح حرفِ عطف آئے تو اس کا معطوف علیہ محذوف ہوتا ہے اور وہ قرینہ سے معین ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس سے پہلے لِنَبْتَلِيَكُمْ محذوف ہے۔ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔

'شہداء' سے مراد

وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ میں شہدا سے مراد اللہ کی راہ میں شہادت کا درجہ حاصل کرنے والے ہیں۔ ان لوگوں کو شہید کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس امت پر شہادت علی الناس کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اس کا حق یہ جان دے کر کرتے ہیں، اس وجہ سے یہ مستحق ٹھہرے کہ ان کو شہید کے لقب سے ملقب کیا جائے۔ یہ گویا لفظ کا استعمال اس کے حقیقی مصداق کے لیے ہے۔ اس ٹکڑے سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شہادت کا مرتبہ ایسا عالی مرتبہ ہے اور اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے اندر اس کی طلب اتنی شدید تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس میدان میں گوئے سبقت لے جانے والوں کے شوق و جذبہ کی تسکین کے لیے مواقع فراہم فرمائے۔ چنانچہ اُحد میں جو افتاد پیش آئی اس میں جہاں دوسری حکمتیں اور مصلحتیں تھیں وہاں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ جن کے لیے یہ منصبِ عالی مقدر ہے وہ اس موقع پر اس سے سرفراز ہو جائیں۔

'تمحیص' کا مفہوم

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا الآیہ میں تمحیص کے معنی کسی چیز کو میل کچیل اور کھوٹ سے بالکل پاک صاف کر دینا ہے۔ مَحَّصَ الذَّهَبَ بِالنَّارِ کے معنی ہوں گے سونے کو غل و غش اور کھوٹ سے پاک صاف کر دیا۔

الفاظ کی تحقیق کے بعد اب ان آیات کے مطالب ترتیب کے ساتھ ہم پیش کرتے ہیں۔

احد کی شکست سے کمزور قسم کے لوگوں پر جو دل شکستگی طاری ہوئی اس نے بہت سے ذہنوں میں یہ خیال بھی پیدا کر دیا کہ اسلام کے لیے فتح و غلبہ کی جو بشارتیں سنائی جاتی رہی ہیں وہ سب بس یوں ہی بادِ ہوا باتیں تھیں۔ مقصود ان سے محض اپنی ہوا باندھنا اور لوگوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا تھا۔ اب ساری حقیقت کھل گئی۔ منافقین اور مخالفین نے موقع غنیمت پا کر اس خیال کو خوب ہوا دی تاکہ مسلمانوں کو اسلام کے مستقبل کی طرف سے بالکل مایوس کر دیں۔ قرآن نے یہاں اس پروپیگنڈے کا رد کیا اور مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ اُحد کے حادثہ سے دل شکستہ اور پست ہمت نہ ہو۔ حق و باطل کی اس کشمکش میں غالب اور سربلند، جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے، تمہی رہو گے بشرطیکہ تم سچے اور پکے مومن بن جاؤ۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے جیسا کہ جنگ احد میں پہنچ گیا تو یہ کوئی مایوس ہو جانے کی بات نہیں ہے۔ تمہارے دشمنوں کو بھی خود اسی جنگ میں اور اس سے پہلے بدر میں کافی چوٹ

پہنچ چکی ہے۔ فتح و شکست کے یہ رد و بدل جو ہوتے ہیں خدا کی حکمت کے تحت اور اس کے حکم سے ہوتے ہیں، ان سے یہ نتیجہ نکال لینا جائز نہیں ہے کہ خدا کی سنت میں کوئی تبدیلی ہوگئی ہے اور اب وہ نیکوں کے بجائے بدوں کو ہی پیار کرنے لگا ہے بلکہ اس سے مقصود لوگوں کو جانچنا پرکھنا اور ان کی صلاحیتوں کو ابھارنا ہوتا ہے۔ اسی سے سچے اور کچے، مخلص اور منافق میں امتیاز ہوتا ہے اور حق کے لیے جان کی بازی کھیلنے والے شہدا کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔

توحید سے مقصود کفر کو مٹانا ہے

پھر فرمایا کہ یہ نہ خیال کرو کہ احد میں اگر قریش کو فتح ہوگئی تو اللہ تعالیٰ اب اہل ایمان کے بجائے ان ظالموں ہی سے محبت کرنے لگا ہے بلکہ درحقیقت یہ بھی اہل کفر کو مٹانے ہی کی ایک تدبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو امتحان کی بھٹی سے گزار کر یہ چاہتا ہے کہ ان کے اندر سے ہر قسم کا کھوٹ نکال کر ان کو بالکل زرِ خالص بنا دے اور کفر و اہل کفر سے ان کو چھانٹ کر بالکل الگ کر دے۔ اس علیحدگی کے بعد اہل ایمان اس زنجیر سے بالکل آزاد ہو جائیں گے جو ان کی ترقی میں مزاحم ہے اور ساتھ ہی پھر اہل کفر کا مٹ جانا بھی قطعی ہے، کیونکہ اس دنیا میں باطل صرف اسی وقت تک باقی رہ سکتا ہے جب تک اس کو کچھ حق کا سہارا حاصل رہے۔ اگر حق کا سہارا اس سے بالکل ہی چھن جائے تو اس کا نابود ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے بالحق پیدا کیا ہے، اس وجہ سے کسی باطل مجرد کی پرورش اس کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ تمحیص کے ذکر کے بعد يَمۡحَقَ الۡكٰفِرِيۡنَ سے اسی فلسفہ کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ نبی اور اس کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد اہل کفر پر جو عذاب آتا ہے اس میں بھی یہی رمز ہے۔ تفصیل اس کی سورۂ برأت میں آئے گی۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَـنَّةَ وَلَـمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَيَعۡلَمَ الصّٰبِرِيۡنَ ۞ وَلَقَدۡ كُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَلۡقَوۡهُ ۖ فَقَدۡ رَاَيۡتُمُوۡهُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ (۱۴۲-۱۴۳)

عَلِمَ يَعۡلَمُ کے مختلف معانی پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ ممیز کرنے اور چھانٹ کر الگ کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ کے بعد اس کا مقابل جملہ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُجَاهِدُوۡا عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق حذف کر دیا گیا ہے وَيَعۡلَمَ الصّٰبِرِيۡنَ میں يَعۡلَمَ کے فتحہ کے بارے میں لوگوں نے مختلف توجیہیں پیش کی ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کا عطف اوپر وَلِيَعۡلَمَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا پر ہے، وہاں چونکہ کلام قانون ابتلا کی دوسری حکمتوں کے بیان کی طرف مڑ گیا تھا اس وجہ سے عجب کے ذکر کو مضمون جہاد سے وابستہ کر دیا لیکن اس کے فتحہ سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ آزمائش کر کے اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو چھانٹنا چاہتا ہے ان میں صابرین بھی ہیں۔

راہِ حق میں آزمائشیں ناگزیر ہیں

احد کی شکست سے جو لوگ بددل ہوئے تھے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تمہارا یہ گمان تھا کہ حق کی راہ خطرات اور آزمائشوں سے خالی ہے اور تم اسلام کا دعویٰ کر کے ایک ٹھنڈی سڑک سے سیدھے سیدھے جنت میں جا براجو گے تو تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے، خدا کی جنت میں کوئی شخص اس وقت تک داخل

نہیں ہو سکتا جب تک امتحان سے یہ تعین نہ ہو جائے کہ یہ اللہ کی راہ میں جہاد کا ولولہ رکھتا ہے یا نہیں اور حق کے لیے آزمائشوں کی تاب لا سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ اسی چیز کی جانچ کے لیے تمھیں یہ احد کی آزمائش پیش آئی۔ اب تک تمھاری طرف سے جہاد کے لیے بڑے جوش و خروش کا اظہار ہوتا رہا ہے، لیکن اس کی نوعیت صرف زبانی جمع خرچ کی تھی۔ ضرورت تھی کہ سچے اور جھوٹے، عاشق صادق اور بوالہوس کے درمیان امتیاز کے لیے کوئی ایسا موقع پیش آئے جب موت سے رو در رو ہو کر تمھیں لڑنا پڑے۔ چنانچہ یہ موقع اللہ نے تمھیں دکھا دیا اور تمھارے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کی ایک کسوٹی سامنے آگئی۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ جو لوگ دل کے کمزور تھے بالعموم وہ زبان سے شوقِ جہاد کا اظہار زیادہ کرتے تھے تاکہ ان کی کمزوری پر پردہ پڑا رہے۔ سورۂ نساء میں انھی لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (۷۷) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جن سے کہا جاتا تھا کہ ابھی اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح خدا سے ڈرنا چاہیے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور کہتا ہے کہ اے رب تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی، کچھ دن اور مہلت کیوں نہ دی؟

۳۳۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۴۴-۱۴۸

آگے کی آیات میں پہلے یہ غلط فہمی دور فرمائی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی مافوق بشر ہستی نہیں ہیں، وہ اللہ کے رسولوں میں سے ایک رسول ہیں جس طرح بہت سے رسول گزر چکے ہیں اس طرح ایک دن ان کو بھی بہر حال وفات پانا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ وہ شہید کر دیے جائیں لیکن اللہ کے دین کو ہمیشہ باقی رہنا ہے تو اس دین کے ساتھ آدمی کی وابستگی اس مفروضہ پر مبنی نہیں ہونی چاہیے کہ آپ اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے آئے ہیں۔ اس غلط فہمی کی اصلاح اس لیے ضروری تھی کہ اگر اس قسم کا کوئی وہم دلوں میں چھپا ہوا رہتا تو آپ کی وفات پر سب کے دل بیٹھ جاتے اور منافقین و معاندین، اسلام کی مخالفت میں اس سے بڑا فائدہ اٹھا سکتے۔ چنانچہ جوں ہی اس غلط فہمی کی موجودگی کے کچھ آثار نمایاں ہوئے قرآن نے اس کی اصلاح فرما دی۔ روایات میں آتا ہے کہ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کو شکست ہو گئی تو یہ خبر بھی مشہور ہو گئی کہ خود سرورِ عالم بھی شہید ہو گئے۔ اس اندوہناک خبر نے بہت سے مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیے۔ انھوں نے خیال کیا کہ جب حضورؐ ہی شہید ہو گئے تو اب بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ذی ہوش لوگوں نے یہ کہہ کر حالات کو سنبھالا کہ جب حضورؐ شہید ہو گئے تو ہمارے زندہ رہنے سے کیا حاصل، ہمیں بھی اسی مقصدِ حق کے لیے شہید ہو جانا چاہیے

جس کے لیے حضورؐ شہید ہوئے، تاہم مسلمانوں کے اندر یہ ایک ایسی کمزوری نمایاں ہوئی تھی جس کی بروقت اصلاح خود قرآن کی زبان سے ضروری تھی تاکہ آئندہ کے لیے فتنوں کا سدِ باب ہو جائے۔

اس کے بعد پچھلے انبیاء اور ان کے جاں نثار صحابہ کا ذکر بطور مثال کیا ہے کہ انھیں بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرنا پڑا، اور اس راہ میں انھیں تکلیفیں اور مصیبتیں بھی پہنچیں لیکن وہ دل شکستہ نہ ہوئے تو پھر تم کو اگر شکست ہوئی یا تمھارے پیغمبر کو کوئی تکلیف پہنچی تو تم کیوں دل شکستہ ہوتے ہو تم بھی انھی کی روش اختیار کرو جب کہ اسی کام کے لیے اٹھے ہو جس کے لیے وہ اٹھے تھے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

آیات وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ
۱۴۴-۱۴۸ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي
عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾
وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَ
مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ
الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ
قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَھُمْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾
وَمَا كَانَ قَوْلَھُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا
فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾
فَاٰتٰىھُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ
ع الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

ترجمۂ آیات محمد تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ وفات
۱۴۴-۱۴۸ پا گئے یا قتل کر دیے گئے تو تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے۔ جو پیٹھ پیچھے پھر جائے گا وہ اللہ کا

کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکر گزاروں کو صلہ عطا فرمائے گا۔ ۱۴۴

اور کوئی جان مر نہیں سکتی مگر اللہ کے حکم سے ایک مقررہ نوشتہ کے مطابق۔ جو دنیا کا صلہ چاہتے ہیں ہم انھیں دنیا میں سے دیتے ہیں اور جو اجرِ آخرت کے طالب ہیں ہم انھیں اس میں سے دیں گے اور ہم شکر گزاروں کو بھرپور صلہ دیں گے۔ ۱۴۵

اور کتنے انبیا گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی تو وہ ان مصیبتوں کے سبب سے جو انھیں خدا کی راہ میں پہنچیں نہ تو پست ہمت ہوئے نہ انھوں نے کمزوری دکھائی اور نہ دشمنوں کے آگے گھٹنے ٹیکے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ان کی دعا تو ہمیشہ بس یہ رہی کہ اے رب ہمارے گناہوں اور ہمارے معاملے میں ہماری بے اعتدالیوں کو بخش دے، ہمارے قدم جمائے رکھ اور کافروں کے مقابل میں ہماری مدد فرما۔ تو اللہ نے ان کو دنیا کا صلہ بھی عطا فرمایا، اور آخرت کے اچھے اجر سے بھی نوازا اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔ ۱۴۶-۱۴۸

۳۴- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (۱۴۴)

'عقب' کے معنی ایڑی کے ہیں۔ اِنْقَلَبَ عَلٰی عَقِبَیْہِ پیٹھ پیچھے پھرنے کی تعبیر ہے۔ یہاں اس سے مراد اسلام کو چھوڑ کر پھر جاہلیت کی طرف مڑ جانا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں بہت سے رسول گزرے ہیں اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے ایک رسول ہیں۔ جس طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں دوسرے رسولوں کو پیش آئیں اسی طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں انہیں بھی پیش آسکتی ہیں۔ جس طرح تمام رسولوں کو موت کے مرحلے سے گزرنا پڑا انھیں بھی ایک دن وفات پانا ہے۔ ان کے رسول ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ وفات نہیں پائیں گے یا

قتل نہیں ہو سکتے یا کسی مصیبت یا ہزیمت کا ابتلا انھیں پیش نہیں آسکتا۔ اگر کسی نے اس غلط فہمی کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا اور اب اُحد کے حادثے کے بعد کسی تذبذب میں مبتلا ہو گیا ہے اور وہ از سرِ نو جاہلیت کی زندگی کی طرف پلٹ جانا چاہتا ہے تو پلٹ جائے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا بلکہ اپنی ہی دنیا اور آخرت برباد کرے گا۔ جو لوگ اسلام کو دیکھ کر بھی جاہلیت اور اسلام کے فرق کو سمجھ نہ سکے اور اسلام کے قدردان نہ بنے اللہ کو ان کی کچھ پروا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے انعامات کا حق دار ان کو سمجھتا ہے جو اسلام کی نعمت پانے پر اپنے رب کے شکر گزار ہیں، جاہلیت کی طرف بازگشت کا ان کے ذہن میں خیال بھی نہیں گزرتا۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا ۗ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ (۱۴۵)

"کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا" اس طرح کی ترکیب ہے جس طرح وعد اللہ یا صنع اللہ الذی اتقن وغیرہ ہے۔

منافقین کی دو خاص کمزوریاں

اس آیت میں کمزور اور منافق قسم کے لوگوں کی دو کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے۔

ایک یہ کہ یہ اس بات پر عقیدہ نہیں رکھتے کہ ہر شخص کی موت کے لیے ایک نوشتۂ الٰہی ہے۔ جب تک اس نوشتہ کی مقررہ مدت پوری نہیں ہوگی اس وقت تک کسی کی موت نہیں آسکتی، اسی طرح جب نوشتہ پورا ہو جائے گا تو کسی کی موت ایک منٹ کے لیے ٹل بھی نہیں سکتی۔ اس وجہ سے خدا کے مقرر کردہ فرائض سے فرار کے بجائے آدمی کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ عزم و حزم کے ساتھ اپنا فرض ادا کرے اور موت کے معاملے میں اطمینان رکھے کہ اس کا وقت بھی خدا کے ہاں لکھا ہوا ہے اور اس کی شکل بھی متعین ہے۔

دوسری کمزوری یہ ہے کہ یہ اپنے دنیوی مفادات کو تمام تر اپنی سعی و تدبیر ہی پر منحصر سمجھتے ہیں اور یہ اندیشہ رکھتے ہیں کہ اگر آخرت کے پیچھے زیادہ پڑے تو دنیا سے یک قلم محروم ہو جائیں گے۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ خدا دنیا کے طالبوں کو دنیا میں سے اتنا ہی حصہ دیتا ہے جتنا ان کے لیے مقدر ہوتا ہے اور وہ آخرت کے اجر سے بالکل ہی محروم رہتے ہیں، برعکس اس کے جو آخرت کے طلبگار ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو آخرت کے انعامات سے بھی نوازتا ہے اور دنیا میں سے بھی ان کو اتنا دیتا ہے جتنا ان کے لیے مقدر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے صحیح رویہ یہ نہیں ہے کہ آدمی آخرت کو چھوڑ کر صرف دنیا کا بندہ بن کر رہ جائے بلکہ یہ ہے کہ آخرت کا طالب بنے اور دنیا میں سے اللہ تعالیٰ جو کچھ بخشے اس پر قناعت کرے۔ آگے کی آیت میں اس مضمون کی وضاحت آرہی ہے۔

"وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ" میں قرینہ دلیل ہے کہ فعل اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور "شاکرین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کے دل سے قدردان ہیں جو انہیں آخری اور کامل ہدایت کی صورت میں ملی ہے۔ فرمایا کہ ہم انہیں اس قدردانی کا بھرپور صلہ دیں گے۔ رہے وہ لوگ جو اس روشنی کو دیکھ کر بھی ظلمت ہی کے طالب ہیں وہ تاریکی ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیئے جائیں گے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاٰتٰىھُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۴۶-۱۴۸)

وہن، ضعف اور استکانت کا مفہوم

رِبِّی' اور وَہن' کے الفاظ پر پیچھے بحث گزر چکی ہے۔ وہن، ضعف اور استکانت کے الفاظ اگرچہ ظاہر کمزوری کے مفہوم کے لیے کچھ مشترک سے ہیں لیکن ان تینوں میں ایک نازک سا فرق بھی ہے۔ موت سے خوف اور زندگی کی محبت سے دل میں جو بزدلی پیدا ہوتی ہے، یہ وہن ہے۔ اس وہن سے ارادے اور عمل میں جو تعطل پیدا ہوتا ہے وہ ضعف ہے۔ اس ضعف سے حریف کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کا جو نتیجہ ظہور میں آتا ہے وہ استکانت ہے۔

انبیاء اور ان کے صحابہ کی ایک سنت

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ میں اس سے پہلے بھی ایسی مثالیں گزر چکی ہیں کہ اللہ کے نبیوں نے جہاد کیا ہے اور اس جہاد میں اللہ کے بہت سے نیک بندوں نے ان کا ساتھ دیا ہے اور انھیں اس راہ میں مصیبتوں اور ہزیمتوں سے بھی سابقہ پیش آیا ہے لیکن اس چیز کا اثر ان پر یہ نہیں پڑا کہ وہ ہمت ہار جائیں، بزدلا پن دکھائیں یا دشمن کے آگے گھٹنے ٹیک دیں بلکہ انھوں نے راہِ حق میں استقامت دکھائی اور اللہ ایسے ہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

یہ اشارہ ہے ان جنگوں کی طرف جو حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام اور بعض دوسرے انبیا کو لڑنی پڑیں۔ حضرت سموئیل کے زمانے کی ایک جنگ کا، جو غزوۂ بدر سے مشابہ تھی، ذکر سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ مقصود اس اشارے سے ان لوگوں کو جو احد کی شکست سے بددل ہو رہے تھے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ نہ تو نبی اور اس کے صحابہؓ کے لیے جنگ کا پیش آنا کوئی انوکھی بات ہے اور نہ مصائب و شدائد سے ان کا گزرنا کوئی نیا حادثہ ہے۔ یہ انبیا کی ایک سنت اور خدا کے قانونِ ابتلا کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جو نبی ہوتا ہے وہ اور اس کے ساتھی امتحان سے گزرے بغیر ہی منزل پر جا پہنچتے ہیں۔ اللہ کو محبوب تو صرف وہی لوگ ہیں جو اس کی راہ میں استقامت دکھائیں نہ کہ ہر مدعی دینداری۔ پھر جھوٹے اور سچے میں امتیاز آخر اس امتحان کے بغیر کیسے ہوگا!

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا الآیہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انھیں جب مصیبتیں اور آزمائشیں پیش آئیں تو انھوں نے اس طرح کی باتیں نہیں بنائیں جس طرح کی باتیں آج کمزور قسم کے مسلمان اور منافق لوگ بنا کر پیغمبر کے خلاف طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا کر رہے ہیں، بلکہ جو افتاد انھیں پیش آئی اس کو انھوں نے خدا اور رسول کی طرف منسوب کرنے کے بجائے خود اپنی کمزوری اور اپنے تجاوز پر محمول کیا اور اللہ تعالیٰ سے اپنے قصوروں کی معافی مانگی۔ اس کا صلہ ان کو یہ ملا کہ دنیا میں بھی خدا نے ان کو اقتدار

اور حکومت سے سرفراز فرمایا اور آخرت میں بھی ان کے لیے نہایت اعلیٰ صلہ و انعام موجود ہے۔ آخر میں فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو مرتبۂ احسان پر فائز ہیں اور اللہ ایسے ہی خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔

۲۵- آگے کا مضمون ___ آیات ۱۴۹-۱۵۵

آگے بھی انہی کمزوریوں پر تبصرہ ہے جو جنگِ احد اور اس کی شکست سے ابھر کر سامنے آئی تھیں۔ قرآن نے ان میں سے ایک ایک کو لے کر ان کے باطن کو نمایاں کیا ہے، ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائی ہیں اور اس آزمائش سے مسلمانوں کی تربیت و تطہیر کے جو مصالح پورے ہوئے ہیں ان کی طرف اشارے فرمائے ہیں۔

آیات ۱۴۹-۱۵۵

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ
عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ
وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا
الرُّعْبَ بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ
وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ
اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ
تَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ
مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ
صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّ
الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا
تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا

يَغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ
بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ
مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ
لَكَ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا
قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ
اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ
مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ
بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱۴۹-۱۵۵

اے ایمان والو، اگر تم کافروں کی بات مانو گے تو یہ تمھیں پیٹھ پیچھے لوٹا کے رہیں گے اور تم نامراد ہو کے رہ جاؤ گے۔ تمھارا مولیٰ تو اللہ ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔ ہم ان کافروں کے دلوں میں تمھارا رعب ڈال دیں گے کیونکہ انھوں نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہرا رکھا ہے جن کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ۱۴۹-۱۵۱

اور اللہ نے تو تم سے جو وعدہ کیا وہ سچ کر دکھایا جب کہ تم ان کو اللہ کے حکم سے تہ تیغ کر رہے تھے یہاں تک کہ جب تم خود ڈھیلے پڑ گئے اور حکم میں تم نے اختلاف کیا اور رسول کی نافرمانی کی جب کہ اللہ نے تمھیں وہ چیز دکھا دی تھی جس کے تم تمنائی تھے۔ تم میں کچھ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کے۔ پھر خدا نے تمھارا رُخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمھیں آزمائش میں

ڈالے اور اللہ مسلمانوں پر فضل فرمانے والا ہے۔ یاد کرو، جب کہ تم منہ اٹھائے بھاگے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور خدا کا رسول تم کو تمہارے پیچھے سے پکار رہا تھا تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا تاکہ تم دل شکستہ نہ ہوا کرو، نہ کسی نقصان پر اور نہ کسی مصیبت پر۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ ۱۵۲-۱۵۳

پھر خدا نے تم پر غم کے بعد اطمینان نازل فرمایا یعنی نیند جو آ کر تم میں سے ایک گروہ کو چھا لیتی ہے اور ایک گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی ہوئی، یہ خدا کے بارے میں خلافِ حقیقت زمانہ جاہلیت کے قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا رہے، یہ کہتے رہے کہ بھلا ہمیں ان معاملات میں کیا دخل؟ کہہ دو سارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ کچھ چھپائے ہوئے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ وہ دل میں کہتے ہیں کہ اگر اس امر میں کچھ ہمارا بھی دخل ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے جب بھی جن کا قتل ہونا مقدر تھا وہ اپنی قتل گاہوں تک پہنچ کے رہتے۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ تم میں امتیاز کرے، جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اس کو پرکھے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو صاف کرے اور اللہ سینوں کے بھیدوں سے خوب واقف ہے۔ دونوں گروہوں کی مڈبھیڑ کے دن جو لوگ تم میں سے پھر گئے ان کو شیطان نے ان کی بعض کرتوتوں کے سبب سے پھسلا دیا۔ اللہ نے ان سے درگزر فرمایا۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۵۴-۱۵۵

۳۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ۝ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۖ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ (۱۴۹-۱۵۰)

احد کی شکست کے بعد کفار اور یہود نے یہ چاہا کہ بدر کی فتح کے اثرات کو یک قلم مٹا کے رکھ دیں گے۔

کفار اور منافقین کا پروپیگنڈا

چنانچہ انھوں نے اپنے منظم پروپیگنڈے سے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ تمھارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ محمد خدا کے کوئی فرستادہ ہیں اور ان کو خدا اور فرشتوں کی مدد حاصل ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو تم اُحد میں شکست کیوں کھاتے؟ بدر میں تم نے فتح حاصل کی، اُحد میں ہم فتح مند رہے۔ یہ تدبیر اور وسائل کا کھیل ہے۔ اس کو خدا اور اس کے فرشتوں سے وابستہ کر دینا اور اپنے آپ کو خدا کی مدد کا اجارہ دار سمجھ بیٹھنا محض طفلانہ خام خیالی ہے۔

پروپیگنڈے کا جواب

کفار کا یہ پروپیگنڈا ان مسلمانوں پر اثر انداز ہوا جو کمزور قسم کے تھے۔ منافقین نے بھی اپنی وسوسہ اندازیوں سے اس کو تقویت پہنچائی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ اگر تم نے ان کفار کی باتوں کا اثر قبول کیا تو یہ تم کو پھر اسی جاہلیت کی تاریکی میں واپس لے جائیں گے جس سے نکال کر خدا تمھیں اسلام کی روشنی میں لایا ہے اور تمھاری کامیابی پھر نامرادی سے بدل جائے گی۔ تمھارے ولی و مرجع یہ کفار نہیں ہیں کہ تم اپنی مشکلات اور پریشانیوں میں ان سے رجوع کرو اور ان سے رہنمائی چاہو بلکہ تمھارا مرجع و مولیٰ اللہ ہے تم اس کی طرف رجوع کرو اور اس سے مدد چاہو، وہ بہترین مددگار ہے۔ اوپر لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً والی آیت میں بھی یہی مضمون گزر چکا ہے۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَکُوْا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىہُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَی الظّٰلِمِیْنَ (۱۵۱)

شرک کی کوئی بنیاد نہیں

یعنی اس وقت ذرا ان کا حوصلہ جو بڑھ گیا ہے تو یہ محض ایک وقتی اور عارضی نشہ ہے۔ اس کی کوئی پائیدار بنیاد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد ان کے حوصلے پست کر دے گا اور ان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کا رعب ڈال دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ایسی چیزوں کو خدا کی خدائی میں شریک بنا رکھا ہے جن کی کوئی شہادت نہ تو عقل و فطرت کے اندر موجود ہے، نہ نظام کائنات میں اور نہ خدا کے اتارے ہوئے صحیفوں میں۔ ایسی وہمی چیزیں اول تو حقائق کے مقابلے میں کچھ سہارا نہیں دے سکتیں، دوسرے اتنے مختلف دیوتاؤں کے ساتھ ان کی وابستگی ان کے دل کو اس طرح منتشر اور پراگندہ کیے ہوئے ہے کہ ان کو وہ دل جمعی و یکسوئی کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی جو تمام عزم اور حوصلے کی بنیاد ہے۔ آیت میں 'ظالمین' سے مراد مشرکین ہیں۔ شرک کو ظلم سے تعبیر کرنے کے وجوہ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ از انجملہ یہ بات بھی ہے کہ شرک درحقیقت انسان کا خود اپنے نفس پر بہت بڑا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات سے اشرف بنایا ہے۔ اس شرف کا احساس ہی ہے جس کے اندر اس کی تمام قوت و عظمت کا راز مضمر ہے۔ انسان جب اپنے سے فروتر مخلوق کو اپنا رازق و حاکم مان کر اس کی پرستش کرنے لگتا ہے تو گویا وہ شاہین ہو کر کنجشک فرومایہ کی غلامی اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح نہ صرف اپنی شاہینی کھو دیتا ہے بلکہ کنجشک سے بھی زیادہ حقیر و فرومایہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث کی سورتوں میں آئے گی۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۵۲)

'حَسٌّ' کا مفہوم

'حَسٌّ' کے معنی دشمن کو اس طرح قتل کرنے کے ہیں کہ اس کو بالکل پامال اور اس کا استیصال کر دیا جائے۔ 'بِاِذْنِهٖ' کا مفہوم یہ ہے کہ یہ شاندار نتیجہ صرف تمہاری تدبیر اور تمہاری قوت کا کرشمہ نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیئت کا کرشمہ تھا۔

'فشل' کا مفہوم

'فشل' کے معنی سست پڑ جانے، ڈھیلے پڑ جانے اور کمزوری دکھانے کے ہیں۔

'تنازع فی الامر' کا مفہوم

'تنازع فی الامر' 'تنازع فی الحدیث' سے نکلا ہوا محاورہ ہے۔ 'تنازع فی الحدیث' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک بات میں کوئی شخص کچھ رائے دے، دوسرا کچھ رائے دے۔ اسی طرح 'تنازع فی الامر' کا مطلب اس موقع پر یہ ہے کہ نبیؐ نے جو حکم دیا اس کی تعمیل میں کسی نے کچھ موقف لیا، کسی نے دوسرا موقف لیا۔

'ما تحبون' کا مفہوم

'مَا تُحِبُّوْنَ' میں اشارہ فتح کی تمنا کی طرف ہے۔ قرآن نے بعض جگہ اس ابہام کو کھول بھی دیا ہے، مثلاً سورۂ صف میں ہے۔ 'وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ' (اور دوسری ایک اور چیز بھی جس کو تم محبوب رکھتے ہو، یعنی اللہ کی مدد اور جلد حاصل ہونے والی فتح)

احد میں شکست کی وجہ

اب یہ اس پروپیگنڈے کی تردید ہو رہی ہے جو کفار و منافقین نے پھیلانا شروع کیا تھا۔ کہ مسلمان خواہ مخواہ کو اس خبط میں مبتلا ہیں کہ خدا اور اس کے فرشتے ان کی مدد کرتے ہیں۔ اگر مدد کرتے ہیں تو یہ مدد اُحد میں کہاں چلی گئی؟ اوپر آیت ۱۴۹ کے تحت ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ کمزور قسم کے مسلمان اس پروپیگنڈے سے مسموم ہوئے۔ اس فتنہ سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے قرآن نے آگاہ فرمایا کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے وعدۂ نصرت کے پورے ہونے کا تعلق ہے وہ تو اُحد میں بھی پورا ہوا، اس لیے کہ شروع شروع میں تم نے کفار کو خوب تہ تیغ کیا، یہاں تک کہ وہ پسپا ہو گئے اور فتح بالکل تمہارے سامنے تھی لیکن قبل اس کے کہ تم دشمن کو اچھی طرح کچل کے اس کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیتے، تم ڈھیلے پڑ گئے۔ رسولؐ نے پشت کے درے کی حفاظت پر جن لوگوں کو اس قطعی ہدایت کے ساتھ مامور کیا تھا کہ وہ کسی حال میں بھی اس کو نہ چھوڑیں، انھوں نے رسولؐ کے حکم کے منشا کے تعین میں اختلاف کیا اور ان کی اکثریت یہ سوچ کر کہ اب تو فتح سامنے ہے، رسولؐ کے حکم کے خلاف مالِ غنیمت حاصل کرنے میں مصروف ہو گئی۔ تم میں کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ لوگ آخرت کے۔ اسلام کی صفوں میں ایسے لوگوں کا موجود ہونا، جو دنیا کی خاطر رسول کے حکم کو نظر انداز کر دیں، اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے اس وجہ سے اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ تمھیں امتحان میں ڈالے تاکہ جو لوگ دنیا کے طالب ہیں وہ تم سے چھٹ کر الگ ہو جائیں، چنانچہ اس نے تمھارا رخ ان سے پھیر دیا اور تمھاری فتح شکست سے بدل گئی۔

خدا کا وعدۂ نصرت مشروط ہے

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے اللہ کا وعدۂ نصرت غیر مشروط نہیں ہے کہ وہ جو رویہ بھی چاہیں اختیار کریں لیکن خدا کی نصرت ہر حال میں ان کے ہم رکاب ہی رہے بلکہ یہ مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ مسلمان ادائے فرض میں تو ڈھیلے نہ پڑیں، اطاعتِ امر میں اختلاف نہ کریں، خدا اور رسول کی نافرمانی نہ کریں، آخرت کو چھوڑ کر دنیا کے طالب نہ بنیں۔

اگر اس طرح کی کوئی چیز ان کے اندر پائی جاتی ہے تو بھی اللہ تعالیٰ یہ نہیں کرتا کہ ان پر اپنا غضب نازل کر دے بلکہ ان کو ایسی آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے جن سے ان کی یہ کمزوریاں دور ہوں اور وہ زیادہ سے زیادہ خدا کی تائید و نصرت کے سزاوار بن سکیں یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر اور اس کے فضل و عنایت ہی کی ایک شکل ہوئی۔ چنانچہ آیت کے آخر میں اس عفو اور فضل کی طرف بھی اشارہ فرما دیا۔

غزوہ احد کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس امر پر تمام اربابِ سِیَر متفق ہیں کہ اس جنگ میں مسلمانوں کا ابتدائی حملہ بہت کامیاب رہا۔ انھوں نے دشمن پر غلبہ پا لیا تھا لیکن ایک دستہ جو ایک اہم درے کی حفاظت پر مامور تھا اور جس کو حضورؐ کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ کسی حال میں بھی اپنی جگہ کو نہ چھوڑے قبل از وقت اپنی جگہ چھوڑ کر مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گیا، صرف تھوڑے سے آدمی اس دستے کے اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اس چیز سے دشمن کے ایک دستہ نے فائدہ اٹھایا اور کاوا لگا کر اس نے پشت سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور یہ حملہ ایسا اچانک اور کامیاب ہوا کہ مسلمان اوسان کھو بیٹھے۔ آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۵۳)

'اصعاد' کا مفہوم

اصعاد کے اصل معنی کسی چڑھائی کی سمت میں جانے کے ہیں۔ اسی سے اصعد فی العدو کا محاورہ نکلا جس کے معنی کسی سمت میں منہ اٹھائے بھاگ کھڑے ہونے کے ہیں۔

'غمًّا بغمٍّ' کا مفہوم

غمًّا بغمٍّ میں 'ب' تلبس کے مفہوم میں ہے یعنی ایک غم تو شکست کا تھا ہی اس کے ساتھ لپٹا ہوا ایک اور غم بھی سامنے آ گیا۔ ہمارے نزدیک اس غم سے مراد وہ غم ہے جو اس دوران میں مسلمانوں کو کفار کی اڑائی ہوئی اس افواہ سے پہنچا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید کر دیے گئے۔ اس افواہ کا ذکر تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں بھی ہے اور قرآن کی اس آیت سے بھی اس کا اشارہ نکلتا ہے اس لیے کہ فرمایا ہے کہ تم اس طرح بگٹٹ بھاگے چلے جا رہے تھے کہ تمھیں اپنے دہنے بائیں کا بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ تم ذرا مڑ کے دیکھ سکتے کہ کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے، یہاں تک کہ اس رسول کی طرف بھی تم نے توجہ نہیں کی جو تمھارے پیچھے سے تمھیں برابر پکارتا رہا کہ اللہ کے بندو، میری طرف آؤ۔ اس کے بعد 'ف' کے ساتھ، جو عربی میں نتیجہ کے بیان کے لیے آتی ہے، اس غم کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ یہ غم پیغمبر کی ذات ہی سے

متعلق ہوگا تاکہ پیغمبر کی جو ناقدری ان سے صادر ہوئی ہے اس پہلو کو تنبیہ کی جائے۔

آیت ۱۵۴ کا نظام

اس آیت کے نظام کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اوپر والی آیت پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اوپر فرمایا تھا کہ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ یعنی خدا نے تمھاری فلاں فلاں غلطیوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے تمھیں پسپا کر دیا تاکہ تمھیں ابتلا میں ڈالے۔ اس کے بعد یہ واضح فرما دیا کہ یہ ابتلا میں ڈالنا اس لیے ہوا کہ خدا نے تم کو تمھاری غلطی پر سزا دینے کے بجائے یہ پسند فرمایا کہ تمھیں معاف کرے اور تم پر اپنا فضل فرمائے۔ اس کے بعد اِذْ تُصْعِدُوْنَ سے لے کر فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ تک اس ابتلا کی تفصیل ہے۔ پھر لِكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ میں اس ابتلا کا وہ فائدہ مذکور ہوا ہے جو اہلِ ایمان کو حاصل ہو سکتا ہے اگر وہ اس کا حق ادا کریں۔

ابتلا کا مقصد

یہ امر محتاجِ بیان نہیں ہے کہ ابتلا خدا کا عذاب نہیں ہے بلکہ اس کی رحمت ہے۔ عذاب کفار پر آتا ہے اور ابتلا میں اہلِ ایمان مبتلا کیے جاتے ہیں۔ عذاب کا مقصد کفار کو مٹانا ہوتا ہے اور ابتلا کا مقصد اہلِ ایمان کو عقلی و اخلاقی کمزوریوں سے پاک کرنا، ایک موت ہے دوسرا زندگی۔ قانونِ الٰہی یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی قوم کو باقی رکھنا چاہتا ہے اس وقت تک وہ اس کے جرموں پر اس طرح کی سزا نہیں دیتا جس طرح کی سزا مجرموں اور باغیوں کو دی جاتی ہے بلکہ مختلف آزمائشوں اور امتحانوں کے ذریعہ سے اس کے اندر پیدا ہونے والی بیماریوں کو وہ دور فرماتا رہتا ہے۔ ہلاکت کے حوالہ وہ کسی قوم کو اسی وقت کرتا ہے جب وہ زندگی کے اصلی اوصاف سے بالکل خالی ہو جاتی ہے۔

احد کے ابتلا میں ازالۂ غم کے پہلو

رہا یہ سوال کہ احد کے اس ابتلا میں حزن سے بچانے والی کیا بات تھی تو اس کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے تو یہ بات یاد رکھیے کہ یہاں حزن سے مراد وہ عام رنج و غم نہیں ہے جو کسی موقع کے ضائع ہو جانے یا کوئی نقصان پہنچ جانے پر فطرتاً ہو جایا کرتا ہے بلکہ اس سے مراد وہ مایوسی اور دل شکستگی ہے جو انسان کے عزم و حوصلہ کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ اوپر آیت ۱۳۹ لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا میں اسی حزن سے منع فرمایا ہے۔ یہ مایوسی اور دل شکستگی پیدا کرنے والے متعدد اسباب اس وقت موجود تھے جو اصلاح و علاج کے محتاج تھے۔ مثلاً یہ کہ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ جو شخص نبی ہو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو لازماً ہر مہم میں کامیابی ہی حاصل ہونی چاہیے، ان کے لیے شکست ان کے نزدیک ان کے تمام دعوے کو مشتبہ کر دینے کے مترادف تھی، اسی طرح ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو اس وہم میں مبتلا تھا کہ جب ہم مسلمان ہیں اور پیغمبرؐ کا ساتھ ہم نے دیا ہے تو ہمیں اپنی غلطیوں کے نتائج سے بالاتر ہونا چاہیے، کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کا سارا اعتماد اپنی رائے اور اپنی تدبیروں پر ہی تھا، ان پر یہ حقیقت واضح نہیں تھی کہ اس دنیا میں تدبیر ہی کارفرما نہیں ہے بلکہ اصلی کارفرما تقدیر ہے۔ ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو خدا کے بارے میں اس طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا تھے جو زمانۂ جاہلیت کی باقیات میں

سے تھیں، ان تمام گروہوں کی طرف آگے کی آیات میں اشارات آرہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اتنی ساری غلط فہمیاں اور خام خیالیاں مسلمانوں میں موجود تھیں تو ان کے ہوتے ہوئے ناممکن تھا کہ وہ ان حالات و مشکلات کا مقابلہ کر سکتے جن سے وہ ہر قدم پر دوچار تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اس غزوۂ اُحد کے ابتلا کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ان بہت سی خام خیالیوں سے پاک کر دیا جن سے نازک اوقات میں ان کے عزم و حوصلے کو تزلزل پیش آسکتا تھا۔ ان مضامین کو کھولنے والی جو آیتیں خود اس سورہ میں ہیں وہ بعض اوپر گزر چکی ہیں اور بعض آگے آ رہی ہیں البتہ سورۂ حدید کی ایک آیت ہم یہاں نقل کرتے ہیں، اس سے ایک نہایت اہم گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ (۲۲-۲۳) تمہیں جو مالی یا جانی تکلیف بھی پہنچتی ہے وہ ہم نے وجود میں لانے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ رکھی ہے، یہ اللہ کے لیے ایک معمولی بات ہے، تاکہ تم غم نہ کرو اگر کوئی موقع تم سے کھو جائے اور نہ اتراؤ اس چیز پر جو اس نے تم کو بخشی ہے۔ اللہ اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۗىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَاۗىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِھِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا ھٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۱۵۴)

'امنۃ' کا مفہوم

'امنۃ' کے معنی راحت، سکون اور اطمینان کے ہیں۔ نعاس اونگھ اور نیند کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ بدلیت کے طریقے پر امنۃ کی گویا وضاحت ہے۔ نیند، اطمینان و راحت کا ذریعہ بھی ہے اور دل کے اطمینان اور دماغ کی یکسوئی کی شہادت بھی۔ جس کا ذہن پریشان اور دماغ منتشر ہو اس کی نیند اڑ جایا کرتی ہے اور ایسے شخص کے لیے کوئی کام عزم و حوصلہ اور استقلال و عزیمت کے ساتھ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے دوران جنگ میں فوج کے لیے سونے کا موقع ملنا اور اس موقع سے فائدہ اٹھانا نہایت ضروری ہوتا ہے۔

جنگی نقطۂ نظر سے نیند کی اہمیت

نیند کی اسی اہمیت کی وجہ سے دشمن فوج کے حوصلے کو پست کرنے والی تدابیر میں سے ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اس کو سونے کا موقع نہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل ہوتا ہے اگر کسی فوج کو اس کا موقع ملے، اور وہ اس سے فائدہ بھی اٹھا سکے کیونکہ اس سے فائدہ اٹھا سکنا صرف موقع ملنے ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا بہت کچھ انحصار سونے والے کی ذہنی و قلبی صلاحیت پر بھی ہے۔ غزوۂ بدر سے متعلق سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جو احسانات گنائے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ جنگ سے پہلے والی

رات میں خوب سوئے اور اس طرح صبح کو لڑنے کے لیے خوب چاق و چوبند ہو گئے۔ یہاں آیت زیر بحث میں فرمایا ہے کہ ایک گروہ تو آرام سے سویا لیکن ایک دوسرے گروہ کو برابر اپنی جانوں کی پڑی رہی۔ اگرچہ دشمن واپس جا چکا تھا لیکن وہ اپنے خوف اور بزدلی کے سبب سے یہی سمجھتے رہے کہ ابھی وہ سر ہی پر کھڑا ہے۔

ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ کا مفہوم

يَغْشٰى طَآئِفَةً میں حال کا صیغہ صورتِ حال کی تصویر کے لیے ہے یَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ میں ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ غیر الحق کی وضاحت ہے، اور مقصود اس وضاحت سے ان کے خیال کے گھونٹ کو ظاہر کرنا ہے کہ باوجودیکہ یہ لوگ مسلمان بنے پھرتے ہیں لیکن اب تک خدا کی صفات اور انسانی زندگی سے اس کے تعلق کے باب میں ان کے خیالات و تصورات وہی ہیں جو زمانہ جاہلیت کی تاریکی میں تھے یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا الآیہ ان کے ظن جاہلیت کی ایک مثال بھی ہے اور وہ اپنے دل میں جو کچھ چھپائے ہوئے تھے اس کا اظہار و بیان بھی۔

حذف کی ایک مثال

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ کا معطوف علیہ حذف ہے اور اس طرح کے مواقع میں نہ صرف یہ کہ معطوف علیہ محذوف ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ چیز بھی محذوف ہوتی ہے جس کی ان صیغوں کے ذریعے سے علت بیان ہوتی ہے۔ اس کی مثال سورۂ حدید کی اس آیت میں بھی ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ اگر سیاق و سباق کی روشنی میں اس محذوف کو کھول دیا جائے تو پوری بات گویا یوں ہوگی کہ اگر تم اپنی ہی رائے پر عمل کرتے جب بھی تم، اگر تمہاری موت مقدر ہو چکی ہوتی، اپنے آپ کو موت سے نہ بچا سکتے بلکہ انھی مقامات میں پہنچ کر قتل ہوتے جن مقامات میں تمہارا قتل ہونا اللہ نے لکھ رکھا ہے۔ لیکن یہ رسول کے ہاتھوں اللہ نے اس لیے کرایا کہ تمہارے دلوں میں یہ حسرت کا ایک کانٹا بنے اور تمہارے دلوں میں جو کمزوریاں ہیں وہ ابھر کر سامنے آئیں۔

احد کے واقعات پر تبصرہ

یہ آیت بھی پوری کی پوری اُحد کی شکست سے ظاہر ہونے والے واقعات و حالات پر تبصرہ ہے۔ اور مقصود اس تبصرے سے جیسا کہ اوپر واضح ہوا، یہ دکھانا ہے کہ نبی اور اہل ایمان کے لیے اللہ کی نصرت کا وعدہ برحق ہے لیکن جماعت کے اندر جو کمزوریاں چھپی ہوئی تھیں ان کا علاج بھی ضروری تھا۔ فرمایا کہ احد کی شکست کے بعد تم میں ایک گروہ تو بے شک ایسے لوگوں کا رہا جو خدا اور رسول سے شاکی اور بدگمان نہیں ہوا۔ اس نے اپنا حوصلہ قائم رکھا۔ اس نے اس افتاد کو جو پیش آئی جماعت ہی کی بعض خامیوں کا نتیجہ سمجھا۔ اور خدا کے فیصلے پر راضی رہا۔ چنانچہ بددل و ہراساں ہونے کے بجائے وہ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے آنے والی شب میں اطمینان کے ساتھ سویا جو اس کی دل جمعی اور ایمانی مضبوطی کی ایک شہادت ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایک دوسرا گروہ بھی تھا جسے برابر اپنی جانوں کی پڑی رہی اور وہ خدا سے اس قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا رہا جو ایمان و اسلام کے شایانِ شان نہیں بلکہ زمانۂ جاہلیت سے مناسبت رکھنے والی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ معاملات کے فیصلے کرنے میں پیغمبر استبداد اور خود رائی سے کام لیتے ہیں۔ ان کے مشوروں کی کوئی قدر نہیں کرتے۔ اگر ان

کی صلاح مان لی جاتی اور مدینہ کے اندر محصور ہو کر جنگ کی جاتی تو یہ افسوسناک صورت پیش نہ آتی اور ہم یہاں یوں ذلت کے ساتھ قتل نہ ہوتے۔ ان کی تردید میں فرمایا کہ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اگر تم اپنے گھروں میں بند ہوتے جب بھی جس کو جہاں مرنا تھا وہیں مرتا۔ یہ امور تمہاری تدبیر کے تابع نہیں بلکہ خدا کی مقدر کی ہوئی تقدیر کے تابع ہیں۔ تمہارے اندر چونکہ یہ کمزوریاں موجود تھیں اس وجہ سے اللہ نے چاہا کہ ایسے حالات پیش آئیں کہ تمہاری کمزوریاں ظاہر ہوں، تمہارے دلوں کی جانچ ہو اور تمہارے کھوٹ باہر آئیں۔ اللہ دلوں کے امراض اور ان کے علاج سے اچھی طرح واقف ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ (۱۵۵)

اوپر آیت ۱۲۲ کے تحت گزر چکا ہے کہ منافقین کی شرارت خاص کر ابن اُبی کے حوصلہ شکن طرزِ عمل سے کچھ کمزور قسم کے مسلمان بھی متاثر ہوئے جن میں سے کچھ تو فوراً ہی سنبھل گئے لیکن بعض سے کمزوری صادر ہو گئی۔ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اگرچہ معاف فرما دیا اس لیے کہ بعد میں ان میں سے ہر شخص کو خود اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، لیکن ساتھ ہی یہ واضح فرما دیا کہ ان کی کچھ پچھلی غلطیاں تھیں جن کے سبب سے شیطان نے ان کو ٹھوکر کھلائی۔ گناہ سے گناہ جنم لیتا ہے اور شیطان کے داؤں انھی لوگوں پر زیادہ آسانی سے کارگر ہوتے ہیں جن کے اندر گناہ کی کوئی جڑ موجود ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جب آدمی سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کو دل میں جگہ نہ پکڑنے دے بلکہ استغفار اور توبۂ نصوح کے ذریعہ سے اس کا استیصال کر دے، ورنہ اسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو بڑی بڑی جماعتوں کے لیے وجہ ابتلا بن جاتے ہیں۔ اوپر آیاتِ قرآن کی روشنی میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ احد کے معرکے میں مسلمانوں کو جو ابتلا پیش آیا وہ بعض گروہوں کی اسی طرح کی کمزوریوں کے نتیجہ میں پیش آیا۔

۳۷۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۱۵۶-۱۸۹

جنگِ اُحد سے پیدا شدہ حالات و خیالات پر جو تبصرہ اوپر سے چلا آ رہا ہے اسی سلسلے کی کچھ مزید باتیں ارشاد ہو رہی ہیں۔

آیات ۱۵۶-۱۸۹

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ
إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا
وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ يُحْيِي

وَيُمِيتُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۱۵۷﴾
وَلَئِنْ مُتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ ﴿۱۵۸﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ
اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ
حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ
فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿۱۵۹﴾
إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي
يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۶۰﴾ وَمَا
كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ
ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۶۱﴾ أَفَمَنِ
اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۚ
وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا
يَعْمَلُونَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ
رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿۱۶۴﴾ النصف
أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ
قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۶۵﴾
وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ

الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا
قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا
لَاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ
يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا
يَكْتُمُونَ ﴿۱۶۷﴾ الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا
مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ
صَادِقِينَ ﴿۱۶۸﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِينَ بِمَا
آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا
بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۷۰﴾ وقف لازم
يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ
الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۷۱﴾ الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا ع
أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۱۷۲﴾ مع
الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ
فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ﴿۱۷۳﴾
فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ
وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ ﴿۱۷۴﴾ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ
الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ
اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَھُمْ حَظًّا
فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ
بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَ
لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَھُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ
اِنَّمَا نُمْلِيْ لَھُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ مَا
كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ
مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ
يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ
تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ
يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ھُوَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ بَلْ ھُوَ
شَرٌّ لَّھُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ
مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ ع
لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ
نَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَھُمُ الْاَنْۢبِيَاۗءَ وقف لازم
بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا
قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ ۚ
اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى

يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ
قَبْلِي بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِي قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِينَ ﴿١٨٣﴾ فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ
جَآءُو بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيرِ ﴿١٨٤﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ
الْمَوْتِ ۗ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۖ فَمَنْ زُحْزِحَ
عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ
إِلَّا مَتٰعُ الْغُرُورِ ﴿١٨٥﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيٓ أَمْوٰلِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ
مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوٓا
أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿١٨٦﴾
وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ
وَلَا تَكْتُمُونَهُ ۫ فَنَبَذُوهُ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ
ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ﴿١٨٧﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ
يَفْرَحُونَ بِمَآ أَتَوْا وَّيُحِبُّونَ أَنْ يُّحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا
تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٨٨﴾
وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٨٩﴾ ع ١٩ ١٠

ترجمۂ آیات ۱۵۶-۱۸۹

اے ایمان والو! ان لوگوں کے مانند نہ بن جانا جنھوں نے کفر کیا اور جو اپنے بھائیوں کے بابت جبکہ وہ سفر یا جہاد میں نکلتے ہیں اور ان کو موت آجاتی ہے، کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے، نہ قتل ہوتے۔ یہ خیال ان کے اندر اس لیے پیدا

ہوا کہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں باعثِ حسرت بنا دے۔ اللہ ہی ہے جو جلاتا اور مارتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ خدا کی نگاہوں میں ہے۔ اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل ہو گئے یا مر گئے تو وہ مغفرت اور رحمت جو تمہیں اللہ کی طرف سے حاصل ہو گی اس سے کہیں بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔ اور تم مرو یا قتل ہو بہر حال اللہ ہی کے پاس اکٹھے کیے جاؤ گے۔ ۱۵۶-۱۵۸

یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ تم ان کے لیے نرم خُو ہو۔ اگر تم درشت خُو اور سخت دل ہوتے تو تمہارے پاس سے یہ منتشر ہو جاتے، سو ان سے درگزر کرو، ان کے لیے مغفرت چاہو اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو، پس جب تم فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ بے شک اللہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے گا تو کوئی تم پر غالب نہیں ہو سکتا اور اگر وہ چھوڑ دے گا تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی کے اوپر چاہیئے کہ بھروسہ کریں اہلِ ایمان۔ ۱۵۹-۱۶۰

اور ایک نبی کی شان سے بعید ہے کہ وہ بدخواہی کرے اور جو کوئی بدخواہی کرے گا تو قیامت کے دن وہ اپنی بدخواہی سمیت پیش ہو گا۔ پھر ہر جان کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ کیا وہ جو خدا کی خوشنودی کا طالب ہو، اس کے مانند ہو جائے گا جو خدا کا غضب لے کر لوٹا اور جس کا ٹھکانا جہنّم ہے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے! خدا کے ہاں ان کے درجے الگ الگ ہوں گے۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۶۱-۱۶۳

یہ اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو شریعت اور حکمت

کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ ۱۶۴
اور کیا جب تمھیں ایک مصیبت پہنچی جس کی دوگنی مصیبت تم نے پہنچائی تو تم نے کہا
کہ یہ کہاں سے آگئی؟ کہہ دو یہ تمہارے اپنے ہی پاس سے ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور دونوں جماعتوں کی
مڈبھیڑ کے دن تمھیں جو مصیبت پہنچی یہ اللہ کے حکم سے پہنچی اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو
ممیّز کر دے اور ان منافقین کو بھی ممیّز کر دے جن سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو
یا دشمن کو دفع کرو، انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں اندازہ ہوتا کہ جنگ ہونی ہے تو ہم ضرور
تمھارے ساتھ ہوتے۔ یہ لوگ اس دن ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ یہ
اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ اس چیز کو خوب
جانتا ہے جس کو یہ چھپاتے ہیں۔ یہ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہا کہ
اگر وہ ہماری بات مانتے تو یوں نہ قتل ہوتے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنی اس بات میں
سچے ہو تو خود اپنے آپ سے موت کو دفع کر لو۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں
ان کو مردہ نہ خیال کرو۔ بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، انھیں روزی مل رہی ہے،
فرحاں و شاداں ہیں اس پر جو اللہ نے اپنے فضل میں سے ان کو دے رکھا ہے اور ان لوگوں
کے باب میں بشارت حاصل کر رہے ہیں جو ان کے اخلاف میں سے اب تک ان سے نہیں
ملے ہیں کہ ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ بشارت حاصل کر رہے ہیں
اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کی اور اس بات کی کہ اللہ اہل ایمان کے اجر کو ضائع نہیں
کرے گا۔ ان اہل ایمان کے اجر کو جنھوں نے چوٹ کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی
پکار پر لبیک کہی۔ ان میں سے جنھوں نے بھی خوبی کے ساتھ کام کیے اور جو تقویٰ کی راہ چلے

ہیں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ یہ وہ ہیں کہ جن کو لوگوں نے سنایا کہ دشمن نے تمہارے لیے بڑی طاقت اکٹھی کی ہے تو اس سے ڈرو تو اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بولے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ سو یہ لوگ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کے ساتھ واپس آئے، ان کو ذرا گزند نہ پہنچا، اور یہ اللہ کی خوشنودی کے طالب ہوئے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ شیطان ہے جو اپنے رفیقوں کے ڈراوے دے رہا ہے تو تم ان سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔ ۱۷۲-۱۷۵

اور یہ لوگ تمہارے لیے باعث غم نہ بنیں جو کفر کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں۔ یہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے۔ ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ بے شک جنھوں نے ایمان سے کفر کو بدلا وہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑیں گے اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے یہ نہ گمان کریں کہ یہ جو ہم ان کو ڈھیل دے رہے ہیں تو یہ ان کے حق میں کوئی بہتر بات ہے، ہم تو بس اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں کچھ اور اضافہ کر لیں اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۱۷۶-۱۷۸

اللہ یہ نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمانوں کو، جس حال پر تم تھے اسی پر، خبیث کو طیب سے الگ کیے بغیر، چھوڑے رکھے اور نہ یہ کر سکتا تھا کہ وہ تمھیں سارے غیب سے باخبر کر دے بلکہ اللہ اس کام کے لیے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کرتا ہے تو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لائے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ ۱۷۹

اور جو لوگ بخالت کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ ہی نے ان کو اپنے فضل میں سے بخشی ہے ، یہ نہ خیال کریں کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے ۔ بلکہ یہ ان کے حق میں بہت برا ہے ۔ جس چیز میں وہ بخالت کریں گے اس کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائے گا ۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے باخبر ہے ۔ اللہ نے ان لوگوں کی بات سن رکھی ہے جنھوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں ۔ ہم ان کی اس بات کو بھی لکھ رکھیں گے اور ساتھ ہی ان کے ناحق قتل انبیا کو بھی ! اور کہیں گے کہ اب چکھو عذاب آگ کا ۔ یہ تمھارے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت ہے ، اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی کرنے والا نہیں ۔ ۱۸۰-۱۸۲

جنھوں نے کہا کہ اللہ نے ہمیں یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ ہم اس وقت تک کسی رسول کی بات باور نہ کریں جب تک یہ وہ قربانی نہ پیش کرے جس کو کھانے کے لیے آگ اترے ، ان سے کہو کہ مجھ سے پہلے تمھارے پاس رسول کھلی کھلی نشانیاں اور وہ چیز بھی لے کر آئے جس کے لیے تم کہہ رہے ہو تو تم نے ان کو قتل کیوں کیا ، اگر تم سچے ہو؟ پس اگر یہ تمھاری تکذیب کرتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ، تم سے پہلے بھی رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے جو کھلی ہوئی نشانیاں ، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے ۔ ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے اور تم پورا پورا اجر تو بس قیامت ہی کے دن پاؤ گے ۔ پس جو دوزخ سے بچا یا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ کامیاب رہا اور یہ دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سودا ہے ۔ ۱۸۳-۱۸۵

تمھارے مال اور تمھاری جان میں تمھاری آزمائش ہونی ہے اور تمھیں ان لوگوں کی

طرف سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی اور ان لوگوں کی طرف سے جنھوں نے شرک کیا بہت سی تکلیف دہ باتیں سننی پڑیں گی۔ اور اگر تم ثابت قدم رہے اور تم نے تقویٰ کو ملحوظ رکھا تو بے شک یہ چیز عزیمت کے احوال میں سے ہے۔ ۱۸۶

اور یاد کرو جب کہ اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جن کو کتاب دی گئی کہ تم لوگوں کے سامنے اس کتاب کو اچھی طرح ظاہر کرنا، اسے چھپانا مت تو انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے میں ایک حقیر قیمت لے لی، کیا ہی بری ہے وہ چیز جسے وہ لے رہے ہیں۔ جو لوگ اپنی ان کرتوتوں پر مگن ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کاموں پر ان کو سراہا جائے جو انھوں نے کیے نہیں ان کو عذاب سے بری نہ سمجھو، ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اور اللہ ہی کے لیے آسمان و زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۸۷-۱۸۹

۳۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ
اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ
وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ
مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ (۱۵۶-۱۵۸)

ل کا مفہوم 'وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ' میں 'لِ' اس طرح کا ہے جس طرح کا 'وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ' (اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ ایمان لانے والوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر یہ نئی دعوت کوئی خیر و برکت والی چیز ہوتی تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہیں کر سکتے تھے) میں ہے۔ یعنی بابت اور متعلق کے معنی میں۔ 'اخوان' سے مراد بھائی بند اور تعلق و رشتہ کے لوگ ہیں۔ 'غُزًّى' غازی کی جمع ہے۔ 'لِيَجْعَلَ' سے پہلے اس کا متعلق محذوف ہے۔ یعنی یہ بات جو ان کے ذہن میں گھسی ہوئی ہے یہ اس لیے گھسی ہوئی ہے کہ ان کی منافقت کی وجہ سے اللہ یہ چاہتا ہے کہ یہ بدعقیدگی ان کے دلوں میں خار غم بن کر کھٹکتی رہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں گزر چکی ہیں۔

موت اور زندگی خدا کے اختیار میں ہے

یہ مسلمانوں کو نصیحت کی جا رہی ہے کہ کفار و منافقین کی روش کی تقلید سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔ ان کی بزدلی کی اصلی وجہ ان کی یہ بدعقیدگی ہے کہ وہ موت اور زندگی کو اپنی تدبیروں کے تحت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بھائی بندوں میں سے کوئی کسی سفر یا جنگ میں مارا جائے تو بڑی حسرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس ہوتا یا ہمارے مشورے پر عمل کرتا تو یہ افتاد اس کو پیش نہ آتی۔ چنانچہ یہی بات انھوں نے جنگِ اُحد کے مقتولوں کے بارے میں بھی کہی۔ حالانکہ موت و زندگی کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے زندگی دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے موت دیتا ہے۔ اس نے جس کی موت جس وقت، جس مقام اور جس شکل میں لکھ رکھی ہے وہ آ کے رہے گی اگرچہ وہ اپنے آپ کو آہنی قلعوں کے اندر بند کر چھوڑے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی تدبیروں سے موت کو ٹال سکتے ہیں وہ اس وہم سے ایک دائمی خلش، غم اور بزدلی کے سوا کچھ نہیں حاصل کر سکتے۔ اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس فتنہ سے محفوظ رکھیں۔ زندگی اور موت خدا ہی کے اختیار میں ہے اور وہ ہمارے ہر عمل کو قدم قدم پر دیکھ رہا ہے۔

مزید حوصلہ افزائی کے لیے ارشاد ہوا کہ اگر تم کو خدا کی راہ میں شہادت حاصل ہوئی یا کسی اور طرح سے موت آگئی تو یہ چیز غم کرنے کی نہیں ہے اس لیے کہ اس کے صلے میں جو مغفرت و رحمت تمھیں حاصل ہو گی وہ ان تمام فانی ذخیروں سے کہیں بہتر ہے جو اس زندگی کے پرستار اپنے لیے جمع کر رہے ہیں۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہ آیت تہور کی دعوت نہیں دے رہی ہے بلکہ اس حقیقت سے آگاہ کر رہی ہے کہ فرائض سے فرار زندگی بچانے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ آدمی کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ جو فرض جب عائد ہو جائے پورے عزم و حزم کے ساتھ اس کو ادا کرے اور یہ یقین رکھے کہ موت اس وقت آئے گی جب اس کا وقت مقرر ہے اور ساتھ ہی یہ بھی یقین رکھے کہ ادائے فرض کی راہ میں مرنا اس دنیا کی زندگی اور اس زندگی کے تمام اندوختوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اس مضمون کی مزید وضاحت آگے آیات ۱۷۰-۱۷۱ کے تحت آ رہی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ جو مرتا یا قتل ہوتا ہے بہرحال خدا ہی کے پاس پہنچتا ہے تو مومن خدا کے قرب سے کیوں گھبرائے یہی تو قربانی کی حقیقت اور اس کا اصل مدعا ہے!

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۵۹-۱۶۰)

'فَبِمَا رَحْمَةٍ' میں زبان کا وہی اسلوب استعمال ہوا ہے جو فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ میں ہے۔ اہلِ نحو اس طرح کے مواقع میں عموماً 'ما' کو تاکید کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک بعض مواقع میں یہ محض فقرے

کے آہنگ کو ٹھیک رکھنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

فظاً کا مفہوم — 'فظ' کے معنی درشت خو اور غلیظ القلب کے معنی سخت دل کے ہیں۔

منافقین کے بارے میں آنحضرت صلعم کے رویہ کی تصویب — یہ آیت بطور التفات وارد ہوئی ہے۔ اوپر سخت الفاظ میں منافقین پر جو تنقید ہوئی ہے اس کا اثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور پھر قدرتی طور پر باحیثیت مسلمانوں پر یہ پڑ سکتا تھا کہ آپ کا اور آپ کے مخلص صحابہؓ کا رویہ ان کے بارے میں سخت ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مرحلے میں یہ پسند نہیں فرمایا کہ یہ تبدیلی واقع ہو۔ اگرچہ منافقین کی روش نہایت قابل اعتراض تھی، وہ حضورؐ کی رافت اور چشم پوشی سے بہت غلط فائدہ اٹھا رہے تھے لیکن یہ مریض تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہی پسند فرمایا کہ ابھی ان کو اصلاح حال کی مزید مہلت دی جائے تاکہ جن کے اندر ادنیٰ گنجائش بھی اصلاح پذیری کی باقی ہے وہ اپنی اصلاح کر سکیں۔ چنانچہ اس حکمت کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی کریمانہ طرز عمل کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و تصویب فرما دی گئی جو اب تک ان لوگوں کے ساتھ رہا تھا اور اس کی مصلحت بھی واضح فرما دی گئی کہ یہ منافقین اپنی صحت اور اصلاح کے اتنے قدر دان نہیں ہیں کہ اس کے لیے کوئی تلخ گھونٹ برداشت کر سکیں، یہ تو اللہ کی عنایت ہی تھی کہ اس نے تم کو نہایت نرم خو اور حلیم بنایا اور تم نے اسی نرم خوئی اور اسی رافت و شفقت کے ساتھ ان کی اصلاح کی کوشش کی۔ اگر تم ذرا بھی ان کے ساتھ سخت گیری کی روش اختیار کرتے تو یہ ایسے وحشی اور ناقدرے ہیں کہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے، اگرچہ دنیا جہان کے روگ ان کے ساتھ چمٹے رہتے، تو ان کے ساتھ ابھی اپنی رافت و رحمت کی یہی روش قائم رکھو، ان کی ناقدریوں سے درگزر کرو اور ان کے لیے اللہ سے استغفار کرتے رہو۔

یہ ملحوظ رہے کہ بعد میں جب منافقین کے ایک گروہ نے اپنے رویہ سے بالکل مایوس کر دیا اور یہ بات واضح ہو گئی کہ چشم پوشی کی روش سے یہ لوگ اصلاح قبول کرنے والے نہیں ہیں تو آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اور مسلمانوں کو بھی ہدایت ہوئی کہ ان لوگوں کے بارے میں اپنے رویے کو بدل دیں اور نرمی سے اگر یہ غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں تو سختی سے ان کو صحیح راہ پر لائیں۔ اس پر مفصل بحث توبہ کی آیات ۷۳، ۱۲۳ اور تحریم کی آیت ۹ کے تحت آئے گی۔

یہاں عفو اور استغفار کی ہدایت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت بھی ہوئی کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ، یعنی معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔ اس بات کے ذکر کا یہاں ایک خاص موقع ہے جس کو مختصراً سمجھ لینا چاہیے۔

اسلامی نظام میں شورائیت کا درجہ — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معاملاتِ دین میں کسی کے مشورے کے محتاج نہیں تھے اس لیے کہ آپ ہر کام وحی الٰہی کی رہنمائی میں کرتے تھے لیکن سیاسی و انتظامی معاملات میں آپ اپنے صحابہؓ سے برابر مشورہ کرتے رہتے تھے اور اس طرح گویا حضورؐ نے خود اپنے طرز عمل سے اس شورائیت کی بنیاد ڈالی جو اسلام کے سیاسی

نظام کی ایک بنیادی خصوصیت رہی ہے۔ اسی شورائیت کے پیش نظر آپ نے غزوۂ احد کے موقع پر بھی، جس کے اثرات و نتائج بیان زیر بحث ہیں، صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ شہر کے اندر سے کیا جائے یا باہر نکل کر۔ مقصود اس مشورے سے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ تھا کہ جماعت کے اندر جو کمزور لوگ ہیں وہ کھل کر سامنے آجائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو کمزور اور منافق قسم کے لوگ تھے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ شہر کے اندر محفوظ ہو کر مقابلہ کیا جائے اور اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ اس طرح وہ اپنی کمزوری اور نفاق کو چھپانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن مخلصین اور جاں نثاروں کی رائے اس کے خلاف ہوئی اور یہی رائے صائب اور حضورؐ کی رائے کے مطابق تھی، اس وجہ سے حضورؐ نے اسی رائے پر عمل فرمایا۔ منافقین کو جب اپنا مشورہ منوانے میں ناکامی ہوئی تو انھوں نے مختلف طریقوں سے اپنا غصہ نکالا۔ ایک گروہ تو یہ بہانہ بنا کر عین موقع پر فوج سے الگ ہو گیا کہ اس کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی۔ دوسرا گروہ جو بادلِ ناخواستہ ساتھ رہا، اس نے شکست کے بعد مسلمانوں میں یہ بددلی پھیلانا شروع کر دی کہ جنگ کا یہ نتیجہ اس وجہ سے نکلا کہ اس کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی، اگر ان کی رائے مان لی جاتی تو یہ افتاد پیش نہ آتی۔ ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کا مقصود شرارت اور مسلمانوں میں بددلی پھیلانا تھا لیکن اس مرحلے میں مصلحت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی تھی کہ ان منافقین سے درگزر کی

۱؎ تاریخ و سیرت کی کتابوں میں یہ بات جو نقل ہوئی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے بھی یہی تھی کہ مدینہ کے اندر محصور رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے لیکن پُرجوش صحابہؓ نے آپ کو نکلنے پر مجبور کر دیا، یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔ آنحضرت صلعم نے جس وقت لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا اس کے بارے میں خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرمائی تاکہ ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کر سکے اور مقصود اس سے لوگوں کے حوصلہ کا جائزہ لینا تھا تاکہ جنگ سے پہلے فوج کی صحیح حالت کا اندازہ ہو جائے۔ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے شہر کے اندر سے مقابلہ پر اصرار کیا اور جاں نثاروں نے باہر نکل کر۔ آپ نے اس تدبیر سے جب کمزوروں اور حوصلہ مندوں کا اندازہ فرما لیا تو گھر کے اندر داخل ہوئے اور اسلحہ پہن کر باہر تشریف لائے۔ یہ اس امر کا اظہار تھا کہ مقابلہ باہر نکل کر کرنا ہے۔ جاں نثاروں کو بطور خود یہ گمان ہوا کہ مبادا حضورؐ نے یہ رائے ان کے اصرار کی وجہ سے اختیار فرمائی ہو اس وجہ سے انھوں نے معذرت کے ساتھ اپنی رائے واپس لینی چاہی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ نبی ہتھیار پہن کر اتارا نہیں کرتا۔ یعنی اب جب کہ عزم ہو چکا تو یہ بدل نہیں سکتا۔ جب منافقین نے دیکھا کہ ان کی بات نہیں چلی تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ الگ ہو گیا۔ یہ واضح رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی اہم جنگ کے لیے نکلنے سے پہلے فوج کے حوصلے کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی حکیمانہ تدبیر ضرور اختیار فرماتے تھے۔ بدر کے موقع پر بھی آپؐ نے یہ تدبیر اختیار فرمائی تھی اور اسی موقع پر انصار کے لیڈر نے وہ تقریر کی تھی جو اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی۔

روش اختیار کی جائے اور جو مجلسی اور جماعتی حقوق ان کو حاصل ہیں وہ ان کی ان غلطیوں کے باوجود بھی ابھی باقی رہیں۔ چنانچہ جس طرح حضورؐ کو ان کے لیے عفو و استغفار کی ہدایت ہوئی اسی طرح اس بات کی بھی ہدایت ہوئی کہ جو امور مشورہ کے تحت آتے رہے ہیں ان میں آپ بدستور ان سے مشورہ لیتے رہیں۔ اگرچہ ان کی کمزوری اور بدخواہی واضح ہو چکی ہے۔

اکثریت اور اقلیت کے باب میں صحیح نقطۂ نظر

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کے بعد فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ انتظامی و سیاسی امور میں مشورے کی یہ ہدایت صاحب امر کی تقویت اور اس کے اطمینان کے پہلو سے ہے۔ مشورہ کرنا تو بہرحال ضروری ہے لیکن مشورے کے بعد جس بات پر اس کا دل ٹھک جائے اللہ کے بھروسے پر وہ کام اسے کر گزرنا چاہیے۔ صاحب امر کے اطمینان کے بعد یہ امر کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ جو رائے اس نے اختیار کی وہ اکثریت کی ہے یا اقلیت کی۔ نہ اکثریت فی نفسہٖ دلیل صحت و صواب ہے نہ اقلیت دلیل خطا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اکثریت کی رائے میں فی الجملہ صحت کا گمان غالب ہے اس وجہ سے فصل نزاعات میں اگر اس کو فیصلہ کن مانا جائے تو مصلحت کے پہلو سے یہ راہ مامون ہے۔ بالخصوص اس زمانے میں جب کہ اتباع ہوا کا زور ہے اور اختیار و اقتدار کو حدود کے اندر استعمال کرنے والے لوگ کمتر ہی ہیں۔

چند نکات

مذکورہ بالا دونوں آیتوں سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ عام افراد کی طرح ارباب اقتدار و سیاست کے لیے بھی پسندیدہ روش نرمی و چشم پوشی ہی کی روش ہے۔ اسی سے افراد میں حسن ظن اور اعتماد پیدا ہوتا ہے جس سے اجتماعی نظام میں وحدت، قوت اور استحکام کی برکتیں ظہور میں آتی ہیں۔ سختی اور سخت گیری اس کی فطرت میں نہیں بلکہ اس کے عوارض میں سے ہے۔ جس طرح صحت کے لیے اصل شے غذا ہے لیکن کبھی کبھی کسی مرض کے علاج کے لیے دوا کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے اسی طرح اجتماعی نظام میں اصل چیز نرمی ہے۔ سختی کبھی کبھی ضرورت کے تحت اختیار کرنی پڑتی ہے۔

دوسری یہ کہ اجتماعی نظام میں شورائیت اس حسن ظن و اعتماد کا مظہر ہے جو راعی اور رعایا اور امیر و مامور میں ہونا چاہیے۔ اسی سے استبداد اور سخت دلی کی جڑ کٹتی ہے اور راعی اور رعایا دونوں طرف سے وہ تعاون ظہور میں آتا ہے جو استحکام کی بنیاد ہے۔

تیسری یہ کہ توکل، بے عملی اور تعطل کا کوئی بہانہ اور گوشہ نشینوں کا کوئی تکیہ نہیں ہے بلکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں عزم و عمل کی بنیاد ہے۔

چوتھی یہ کہ اصل قوت توکل علی اللہ ہے۔ وسائل و اسباب کی حیثیت ثانوی ہے۔

پانچویں یہ کہ توکل ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ جو شخص خدا پر ایمان کا مدعی ہے لیکن اس کو خدا پر بھروسہ نہیں ہے اس کا ایمان بے معنی ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ (۱۶۱-۱۶۳)

لفظ غلّ کا صحیح مفہوم

غلّ یغلّ غلولاً کے معنی خیانت، بدعہدی اور بے وفائی کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ دراصل لفظ نصح کا ضد ہے جس کے معنی خیرخواہی اور خیرسگالی کے ہیں۔ اصحاب لغت میں سے زجاج نے مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ کی تشریح، جیسا کہ صاحب لسان العرب نے تصریح کی ہے، مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَخُونَ أُمَّتَهُ کے الفاظ سے کی ہے۔ لفظ غِلّ جو قرآن میں متعدد جگہ استعمال ہوا ہے، غش، عداوت، ضغن (کینہ) حقد اور حسد کے معنی میں استعمال ہوا ہے (لَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا) اس لفظ کو صرف مالی خیانت کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی دلیل میرے علم میں نہیں آئی۔

آنحضرت صلعم پر منافقین کا الزام اور اس کا جواب

یہ منافقین کے اس الزام کی تردید ہے جو انھوں نے احد کی شکست کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگایا اور جس کو مسلمانوں کے اندر بددلی پیدا کرنے کے ارادے سے اچھی طرح پھیلایا۔ الزام یہ تھا کہ ہم نے تو اس شخص پر اعتماد کیا، اس کے ہاتھ پر بیعت کی، اپنے نیک و بد کا اس کو مالک بنایا لیکن یہ اس اعتماد سے بالکل غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہمارے جان و مال کو اپنے ذاتی حوصلوں اور امنگوں کے لیے تباہ کر رہے ہیں۔ ہم نے تو واضح طور پر یہ مشورہ دیا تھا کہ شہر کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے لیکن انھوں نے ہمارے مشوروں کی اور ہمارے بھائیوں کی جانوں کی کوئی قدر و قیمت نہ سمجھی اور ان کو ایک بالکل نامناسب مقام میں لے جا کر دشمن سے تہ تیغ کرا دیا، یہ صریحاً قوم کی بدخواہی اور اس کے ساتھ غداری و بے وفائی ہے۔

اس الزام کی طرف اوپر کی آیات میں بھی اشارات موجود ہیں اور آگے بھی اس کی وضاحت آئے گی۔ قرآن نے یہاں کے اس الزام کی تردید فرمائی ہے کہ تمہارا یہ الزام بالکل جھوٹ ہے۔ کوئی نبی اپنی امت کے ساتھ کبھی بے وفائی و بدعہدی نہیں کرتا۔ نبی جو قدم بھی اٹھاتا ہے رضائے الٰہی کی طلب میں اور اس کے احکام کے تحت اٹھاتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوتا کہ ہر بدعہدی و بے وفائی خدا کے حضور پیش ہوگی اور ہر بدعہد اپنے کیے کی پوری پوری سزا بھگتے گا۔ رضائے الٰہی کے طالب اور اس کے قہر و غضب کے سزاوار یکساں نہیں ہوں گے۔ ان کے درجے اور ٹھکانے ان کے اعمال کے مطابق الگ الگ ہوں گے۔ اللہ ہر ایک کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

آیت کی یہ تاویل الفاظ قرآن اور نظم کلام کے مطابق ہے۔ ارباب تاویل میں سے بھی بعض لوگوں نے، جیسا کہ تفسیر ابن جریر سے واضح ہوتا ہے، یہی تاویل اختیار کی ہے۔ اس وجہ سے اس روایت کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے جو تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے کہ مال غنیمت میں سے ایک چادر گم ہو گئی تھی جس کا الزام منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگایا تھا اور یہ اس کی تردید ہے۔ اوّل تو یہ روایت بجائے

کے مال غنیمت سے متعلق بیان کی جاتی ہے (اس لیے کہ اُحد میں مال غنیمت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، اس میں تو مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی) اور یہاں حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے اُحد کے۔ اس بیچ میں بغیر کسی قرینہ اور بدون کسی حوالہ کے بدر کے کسی واقعہ کا جس پر ایک عرصہ گزر چکا تھا، ذکر کرنے کا کیا موقع تھا! پھر سب سے زیادہ خیال کرنے کی بات یہ ہے کہ منافقین ایسے بے وقوف نہیں تھے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایسا الزام لگائیں جس کو کوئی بھی باور نہ کرے بلکہ جو شخص بھی سنے اس کو سن کر ہنس دے۔ منافقین تو درکنار آپ کے کٹر سے کٹر معاندین قریش تک کا حال یہ تھا کہ انھوں نے آپ پر کسی مالی خیانت کا، خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، کوئی الزام لگانے کی جسارت کبھی نہیں کی۔ اسلام اور جاہلیت دونوں میں آپ امین کے لقب سے مشہور رہے اور آپ کی اس شہرت کی دھاک جس طرح دوستوں پر تھی، اسی طرح دشمنوں پر بھی تھی۔ مالی معاملات میں اگر بعض نادان لوگوں نے حضورؐ کے خلاف کبھی کچھ کہا بھی ہے تو اس کی نوعیت الزامِ خیانت کی نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ کسی کے مقابل میں کسی کو کچھ زیادہ دے دینے کی ہے۔ ان مواقع پر بھی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد الزام لگانے والے فریق نے سخت ندامت کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً فتح مکہ اور غزوہ حنین کے موقع پر۔ اس وجہ سے یہ بات تو بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ منافقین آپ پر ایک حقیر چادر کی خیانت کا الزام لگائیں۔ البتہ یہ بات کہہ کر وہ کمزور لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر سکتے تھے کہ (نعوذ باللہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم کے وفادار اور بہی خواہ نہیں ہیں، وہ اپنے حوصلوں پر اپنی قوم کو قربان کر رہے ہیں۔ اُحد کی شکست کے بعد اس قسم کے پروپیگنڈے کے لیے ان کو ایک موقع ہاتھ آگیا تھا۔ جس سے انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ شہر سے باہر نکل کر جنگ کے مخالف تھے لیکن جان نثار صحابہؓ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے قبول نہیں کی۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۱۶۴)

بعثتِ نبوی کی برکات

یہ آیت تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے تمام اہم اجزا کی تشریح ہو چکی ہے۔ نظم کے پہلو سے یہ آیت اسی حقیقت کو مثبت پہلو سے پیش کر رہی ہے جو اوپر والی آیت میں منفی پہلو سے ظاہر کی گئی۔ اوپر کی آیت میں، جیسا کہ بیان ہوا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملت کے ساتھ بدخواہی و بے وفائی کے الزام سے بری قرار دیا گیا ہے، اس آیت میں اس عظیم احسان کا اظہار کیا گیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں تمام دنیا پر اور خاص طور پر قوم عرب پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ احسان یہاں تین مختلف پہلوؤں سے ظاہر کیا گیا ہے۔

ایک تو اس پہلو سے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کے اندر انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرمایا تاکہ زبان کی اجنبیت، نسل و نسب کی غیریت، رجحانات و میلانات کی بیگانگی اور ماضی و حاضر سے بے خبری

کسی تعصب اور بدگمانی کا باعث نہ بنے اور لوگ اس پر اپنے ہی باپ اور بھائی کی حیثیت سے اعتماد کر سکیں اور اس کی آواز کو خود اپنے ضمیر کی آواز کی طرح پہچان اور سن سکیں۔ اس حقیقت کا اظہار مِنْ اَنْفُسِهِمْ کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔

دوسرے اس رسول کے مقصد اور مشن کے پہلو سے کہ یہ رسول، اللہ کی آیتیں سناتا ہے، تم کو تمام عقلی، اخلاقی اور عملی گمراہیوں سے پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے رہا ہے۔ بھلا جس کے فیوض و برکات سے تمہاری انفرادی و اجتماعی اور ظاہری و باطنی زندگی کا ہر گوشہ یوں منور ہو رہا ہے اس سے بڑا بھی تمہارا کوئی خیر خواہ ہو سکتا ہے!

تیسرے مخاطب کی ضرورت کے پہلو سے۔ اہل عرب دین و شریعت سے بے خبر اور نبوت و رسالت سے ناآشنا امی لوگ تھے۔ ایک زمانۂ دراز سے کفر و جاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ان کی دستگیری فرمائی اور ان کو گمراہی کی وادیوں سے نکال کر ہدایت کی صراط مستقیم پر لا کھڑا کیا۔ اس حقیقت کا اظہار وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یہاں پر اِنْ مخففہ ہے جو اِنَّ کے معنی میں آتا ہے اور اس کے بعد جو لَ ہے یہ اس کا قرینہ ہے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۶۵)

'أ' حرف استفہام ہے اور 'وَ' حرفِ ربط ہے۔ عربی زبان میں حرفِ استفہام کی اصل جگہ جملہ کے آغاز ہی میں ہے۔ مثلاً اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۔ (الواقعہ: ۸۱) یہ حرفِ استفہام اظہارِ تعجب کے لیے ہے اور حرفِ ربط اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بات بھی منجملہ ان اعتراضات کے ایک اعتراض ہے جن کے جواب اوپر دیے گئے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ جو شخص خدا کا رسول ہو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے محفوظ ہونا چاہیے، جب وہ کسی مہم پر نکلیں تو ان کے ساتھ خدا کے فرشتوں کی مدد بھی ہونی چاہیے، جب انھیں کوئی جنگ پیش آئے تو ضروری ہے کہ وہ اس میں فتح مند ہوں۔ اس خیال کے لوگوں کو احد کی شکست سے قدرتی طور پر بڑا دھکا لگا۔ وہ سوچنے لگ گئے کہ اگر اسلام ایک سچا دین ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچ مچ خدا کے رسول ہیں تو یہ شکست ان کو کہاں سے پیش آئی؟ کمزوروں کی اس نفسیاتی کیفیت سے منافقین نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس شکست کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک دلیل کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ قرآن نے اس آیت میں اور اس کے بعد کی آیات میں تفصیل کے ساتھ اس غلط فہمی کو دور کیا ہے اور اہل حق

کہ جو آزمائشیں پیش آتی ہیں، ان کی حکمت واضح فرمائی ہے۔

اس آیت میں پہلی بات یہ فرمائی کہ جو افتاد تمھیں پیش آئی یہ صرف تمھی کو پیش نہیں آئی کہ تم اس کو بدگمانی اور مایوسی کی دلیل بنا لو بلکہ اس سے دو چند نقصان تمھارے ہاتھوں تمھارے دشمنوں کو پہنچ چکا ہے۔ بدر میں تم نے دشمن کے ۷۰ آدمی قتل کیے، ۷۰ قیدی بنائے۔ احد میں بھی پہلے تمھارا ہی پلہ بھاری تھا اور تمھارے ہاتھوں دشمن کے کچھ آدمی قتل اور زخمی بھی ہوئے لیکن بعد میں خود تمھاری غلطی سے تمھیں شکست ہو گئی۔ اللہ فتح اور شکست دونوں پر قادر ہے اور اس کی قدرت ہمیشہ اس کی حکمت کے تحت ظاہر ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ اس افتاد کے سبب تم خود ہوئے ہو۔ اس کی وضاحت اوپر آیت ۱۵۲ میں ان الفاظ کے ساتھ ہو چکی ہے۔ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ (اور اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا جب کہ تم خدا کے حکم سے ان کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم کمزور پڑ گئے، تم نے معاملے میں اختلاف کیا اور تم نے نافرمانی کی جب کہ خدا نے تمھیں وہ چیز دکھا دی جس کو تم عزیز رکھتے تھے تم میں کچھ دنیا کے طالب تھے، کچھ آخرت کے، پھر خدا نے تمھارا رخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے اور اللہ نے تم سے درگزر کیا اور اللہ مومنوں پر بڑے فضل والا ہے)

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ښ وَقِيْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّااتَّبَعْنٰكُمْ ۭ ھُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْھُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِھِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِھِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۶۶-۱۶۸)

راہ حق کی آزمائشوں کی حکمت

اب یہ اس ابتلاء کی حکمت واضح کی جا رہی ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے خدا کے حکم سے پیش آیا ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ سچے مسلمانوں اور منافقوں کو اچھی طرح واضح کر دے تاکہ ہر شخص کھلی آنکھوں سے دیکھ لے کہ کون لوگ جماعت کے اندر قابل اعتماد ہیں کون لوگ نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ آزمائش جماعتی تطہیر کے لیے ضروری تھی۔ اگر مخلصین اور منافقین دونوں اسی طرح رلے ملے رہتے تو معلوم نہیں مفسد عناصر کس وقت پوری جماعت کا بیڑا غرق کر دیتے۔

'وَقِيْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا' یہ منافقین کے ایک گروہ کی طرف اشارہ ہے جن کو اس موقع پر جہاد کی دعوت دی گئی کہ اٹھو اگر جنگ ہو گئی تو جہاد کا ثواب حاصل ہو گا اور اگر دشمن ہماری جمعیت سے مرعوب ہو گیا تو دفاع کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ لیکن یہ لوگ جہاد کے لیے نہ اٹھے اور اپنے نفاق اور بزدلی پر پردہ ڈالنے

کے لیے انھوں نے یہ بات بنائی کہ ہمیں علم ہے کہ اس موقع پر لڑائی نہیں ہونی ہے۔ اگر ہمیں لڑائی کا علم ہوتا تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ قرآن نے ان کے بابت فرمایا کہ یہ بات کہتے وقت یہ ایمان سے زیادہ کفر سے قریب تر تھے اور انھوں نے زبان سے وہ بات کہی جو ان کے دل میں نہیں تھی۔ دل میں وہ جو کچھ چھپائے ہوئے تھے اس کا خدا کو خوب پتا ہے۔

اس کے بعد ان کے دل کا راز کھول دیا کہ یہ خود تو سخن سازی کر کے گھروں میں بیٹھے رہے لیکن ان کے جو بھائی بند جہاد میں شریک اور شہید ہوئے، ان کی بابت انھوں نے کہا کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو یوں قتل نہ ہوتے۔ مقصد یہ ہے کہ اصل چیز جو ان کے لیے مانع ہوئی وہ ہے تو موت کا خوف لیکن انھوں نے بات یہ بنائی کہ وہ اس لیے نہیں اٹھ رہے ہیں کہ جنگ و ذمک کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اگر یہ موت و زندگی کے مواقع سے ایسے ہی باخبر ہیں تو وہ اپنے آپ کو موت سے بچائیں!

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ اَمْوَاتًا ۚ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ
فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۘ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۶۹-۱۷۱)

منافقین کو ایک تنبیہ

یہ ان منافقین کو تنبیہ ہے کہ خدا کی راہ میں شہید ہونے والوں کو مردہ نہ سمجھو۔ مردہ وہ نہیں ہیں بلکہ تم ہو۔ وہ تو زندہ ہیں اور اپنے رب کے جوار رحمت میں اس کی نعمتوں سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ تم اپنی جہالت اور بے بصیرتی سے ترس کھا رہے ہو کہ وہ مارے گئے اور خیال کر رہے ہو کہ اگر وہ تمھاری رائے پر چلتے، تمھاری ہی طرح گھروں میں بیٹھ رہتے تو نہ مارے جاتے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ اس فضل و نعمت پر فرحاں و شاداں ہیں جس سے اللہ نے ان کو نواز رکھا ہے۔ تمھیں ان کی موت پر حسرت و افسوس ہے اور ان کا عالم یہ ہے کہ دمبدم ان کو اپنے ان اخلاف و اولاد سے متعلق جو ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور ان سے ملنے کے آرزومند ہیں اگرچہ ابھی ملے نہیں ہیں، یہ بشارت مل رہی ہے کہ وہ بھی عنقریب ان سے ملیں گے اور ان کو بھی انھی کی طرح وہ مقام حاصل ہوگا جہاں نہ تو مستقبل کا کوئی اندیشہ ہوگا نہ ماضی کی کوئی حسرت۔

شہدا کے با ایمان اخلاف کے ساتھ رعایت

یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن میں یہ حقیقت مختلف اسلوبوں سے واضح کی گئی ہے کہ عالی مقام اہلِ ایمان کے ساتھ جنت میں ان کی ذریت اور ان کے اخلاف میں سے ان لوگوں کو بھی جمع کر دیا جائے گا جن کا خاتمہ ایمان پر ہوگا اگرچہ اپنے عمل کے لحاظ سے یہ ان کے درجے کے نہ ہوں۔ یہ شہدا اور صدیقین پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوگا کہ ان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ان کی با ایمان ذریت کو ان کے ساتھ جمع کر دیا جائے گا اور اس مقصد کے لیے اسلاف کا درجہ نیچا نہیں کیا جائے گا بلکہ اخلاف کا درجہ بلند کر دیا جائے گا۔ اس مسئلہ پر خدا نے چاہا تو ہم سورۂ طور کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

ان آیات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے نہایت بلاغت کے ساتھ ان تمام برے اثرات کو

مٹایا ہے جو منافقین مسلمانوں کے دلوں پر عموماً اور شہداء کی ذریات اور ان کے اخلاف پر خصوصاً ڈالنا چاہتے تھے۔

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ ۞ الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۞ فَانقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ ۞ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۞ (۱۷۲-۱۷۵)

احد کی شکست کے بعد بھی مخلصین کا حوصلہ برقرار رہا

'الَّذِينَ' ان مومنین کی صفت ہے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ اس صفت کے اضافے نے کلام کو بالکل مطابق حال بنا دیا اور اوپر والی آیت میں جو اصولی بات فرمائی گئی تھی اس کا ایک متعین محمل سامنے آ گیا۔ یعنی اس عظیم اجر کے مستحق وہ لوگ ٹھہریں گے جن کے عزم و ایمان کا حال یہ ہے کہ احد کی شکست کا زخم کھانے کے بعد بھی ان میں کوئی ضعف نہیں پیدا ہوا بلکہ جوں ہی اللہ و رسول کی طرف سے ایک تازہ مہم کی منادی ہوئی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ احد میں مسلمانوں کی شکست کے بعد قریش کی فوج اول اول تو واپس چلی گئی لیکن روحاء کے مقام تک پہنچنے کے بعد ابوسفیان اور ان کے ساتھیوں کو احساس ہوا کہ انھوں نے اس قدر جلد واپس ہونے میں سخت غلطی کی ہے، لگے ہاتھوں انھیں مدینہ کا قصہ بھی پاک کر دینا تھا۔ یہ سوچ کر انھوں نے اپنی فوج کی از سر نو تنظیم شروع کر دی اور ادھر مسلمانوں کو ہراساں کرنے کے لیے منافقین کے ذریعے سے یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ قریش نئے ساز و سامان سے مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے تیاریاں کر رہے ہیں۔ حضورؐ کو جب اس کی اطلاع پہنچی تو آپؐ نے بھی لوگوں کو قریش کے تعاقب کے لیے تیار ہو جانے کا حکم دے دیا۔ اس فوج میں صرف انہی لوگوں کو شامل ہونے کی اجازت دی گئی جو پہلے روز کی جنگ میں شریک رہے تھے۔ یہ احتیاط غالباً اس لیے کی گئی کہ منافقین کے لوث سے یہ لشکر پاک رہے۔ چنانچہ حضورؐ جاں نثاروں کی ایک جماعت کے ساتھ ابوسفیان کے تعاقب میں نکلے اور حمراء الاسد تک گئے جو مدینہ سے ۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ ابوسفیان نے جب دیکھا کہ ابھی مسلمانوں کے حوصلہ میں کوئی فرق نہیں آیا ہے تو ارادہ بدل دیا اور مسلمان کامیاب و بامراد واپس آ گئے۔

'لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا' یہاں 'احسان' اللہ و رسول کی وفاداری کے حق کو بہتر سے بہتر شکل میں ادا کرنے اور 'تقویٰ'، نفاق کی تمام آلائشوں سے بچنے کے معنی میں ہے۔ یہ درجہ ایک نہایت اونچا درجہ ہے اور اس کے لیے جد و جہد کرنے والوں کے درجات و مراتب ان کے باطنی خلوص اور ان کے ظاہری اعمال و اقدامات کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔

کتنی بے جگری طبع آزمائی ہے محابا

'الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ الآیۃ' میں مذکورہ اصحابِ احسان کا بیان ہے کہ جب منافقین نے ان کو ہراساں کرنے کے لیے یہ افواہ پھیلائی کہ قریش نئے ساز و سامان کے ساتھ حملہ کی پھر تیاریاں کر رہے ہیں تو

پیغمبر بجائے اس کے کہ ان کے اندر خوف و ہراس پیدا کرتی ان کے عزم و ایمان کو بڑھانے کا سبب بن گئی۔ قاعدہ ہے کہ جس کنوئیں کے سوتے زور دار ہوں اس کے اندر سے جتنا ہی پانی نکالا جائے اتنا ہی اس کے سوتے اور زیادہ جوش کے ساتھ اُبلتے ہیں۔ اسی طرح آگ اگر قوت ور ہو تو گیلی لکڑی بھی اس میں ڈالیے تو اس کو بھی اپنی غذا بنا کر مزید طاقت ور بن جاتی ہے۔ یہی حال اصحاب عزم و ایمان کا ہے۔ ان کو بھی کاوشیں ضعیف کرنے کے بجائے اور زیادہ پرعزم اور پرحوصلہ بنا دیتی ہیں، ہر آزمائش ان کی مخفی صلاحیتوں کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور ہر امتحان ان کے لیے فتحمندی کا ایک نیا میدان کھولتا ہے۔

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

وَقَالُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ یہ اس زیادتِ ایمان کا مظہر ہے جس کا ذکر فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا کے الفاظ سے ہوا ہے۔ اہل ایمان کی تمام قوت و طاقت کا خزانہ درحقیقت یہی حَسْبُنَا اللّٰهُ کا عقیدہ ہے۔ مومن کا ایمان اس بات پر ہوتا ہے کہ تمام قوت و طاقت اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کے ہاتھ میں ہے تو جب بندہ خدا کے مقرر کیے ہوئے کسی فرض کو ادا کرنے کے لیے خود خدا ہی کے حکم سے اٹھ رہا ہے تو اس کو دنیا کی کوئی طاقت کس طرح ڈرا سکتی ہے۔ بہترین ہستی جس کو بندہ اپنا معاملہ سپرد کر سکتا ہے وہ خدا کی ہستی ہے تو جس نے خدا کو اپنا وکیل و معتمد بنا لیا اب اس کے لیے کسی خوف و ہراس کی گنجائش کہاں باقی رہی!

کیا غم ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ الآیہ یعنی یہ ڈراوے سب شیطان کی طرف سے تھے اور اس طرح وہ تم پر اپنا اور اپنے ساتھیوں اور دوستوں کا رعب جمانا چاہتا تھا تو تم شیطان اور اس کے ساتھیوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف مجھی سے ڈرو، اگر تم سچے مومن ہو۔ ظاہر ہے کہ یہاں شیطان اور اس کے اولیا سے اشارہ قریش اور ان کے ساتھیوں کی طرف ہے اور ان سے جس ڈر کی ممانعت کی گئی ہے یہ وہ ڈر ہے جس کا ہوا منافقین دکھا رہے تھے کہ ان کے ڈر سے خدا کے دین کے احکام و مطالبات کو پس پشت ڈال دیا جائے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ
لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ
شَيْئًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا
نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ
عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ
رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۱۷۶-۱۷۹)

آیاتِ التفات یہ آیتیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں۔ احد کی شکست کے بعد جیسا کہ

اوپر کی آیات سے واضح ہے اور ہم سورہ کی تمہید میں بھی اشارہ کر چکے ہیں، وہ لوگ جو منافقانہ اسلام کی صفوں میں آگھسے تھے یا تو علانیہ کفر کی طرف پلٹ گئے یا پلٹ جانے کے لیے تمہیدیں استوار کرنے لگ گئے۔ یہ لوگ اس طمع خام میں مبتلا ہو گئے کہ قریش کی حمایت کر کے اس دین کو شکست دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ان کی تمام سرگرمیاں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اور کفر اور اہل کفر کی حمایت کے لیے وقف ہو گئیں۔ اس صورت حال پر ارشاد ہوا کہ اس سے ذرا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کفر کی راہ میں ان لوگوں کی یہ سرگرمیاں اللہ اور اس کے دین کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔ جو لوگ کفر کو ایمان پر ترجیح دے رہے ہیں اللہ بھی ان کے لیے یہی چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کا حصہ صرف دردناک عذاب ہو۔ اللہ نے ان کی معاندانہ سرگرمیوں کے باوجود ان کو جو ڈھیل دے رکھی ہے اس ڈھیل کو یہ اپنی کامیابی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ان کی کامیابی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ ان پر حجت تمام ہو جائے اور ان کے گناہوں کا پیمانہ اچھی طرح لبریز ہو جائے تاکہ جب ان کی کشتی ڈوبے تو پھر اس کو ابھرنا نصیب نہ ہو۔ اس ڈھیل کے بعد ان کے لیے صرف ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ایسا عذاب جس کے بعد کسی کو بھی ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہوگی بلکہ صرف دنیا و آخرت کی رسوائی ہوگی۔

واقعۂ احد کی حکمت

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الاٰیۃ یہ اشارہ ہے اس حکمت کی طرف جو احد کی اس آزمائش میں اہل ایمان کے لیے مضمر تھی۔ فرمایا کہ اب تک مسلمانوں کی جماعت خام و پختہ، خبیث و طیب اور مخلص و منافق ہر قسم کے افراد پر مشتمل رہی ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تھی کہ جو جماعت تمام دنیا کی صلاح و فلاح کا ذریعہ بننے والی ہے وہ اس طرح صالح و فاسد کا ملغوبہ بنی رہے۔ چنانچہ اس نے چاہا کہ اس کے فاسد عناصر کو اس سے الگ کیا جائے تاکہ مخلص اہل ایمان ابھر کر سامنے آئیں اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق پروان چڑھیں۔ اس کے لیے ایک شکل تو یہ تھی کہ تمام مسلمانوں کو غیب کا علم دے دیا جاتا کہ وہ خود معلوم کر سکتے کہ کون ان کے اندر مخلص ہے، کون منافق۔ لیکن یہ بات اللہ کی سنت کے خلاف ہے کہ وہ غیب کے اسرار سے ہر ایک کو واقف کر دے۔ غیب کی باتوں کے لیے اپنے رسولوں میں سے وہ جن کو چاہتا ہے منتخب کرتا ہے اور ان کو امور غیب میں سے جس چیز سے چاہتا ہے آگاہ فرماتا ہے۔ اس کی دوسری شکل یہ تھی کہ تمہاری جماعت کو کوئی ایسا امتحان پیش آئے جو خود تمہارے کھرے اور کھوٹے اور مخلص و منافق کو چھانٹ کر الگ کر دے۔ یہی شکل اللہ کی سنت کے مطابق ہے چنانچہ واقعۂ احد کی صورت میں یہ امتحان تمہارے سامنے آگیا اور اس امتحان نے تمہارے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کر دیا۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ الاٰیۃ یہ اس امتحان کی برکات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے اور ایمان و تقویٰ کے تمام تقاضے پورے کرتے رہنے کی تاکید ہے تاکہ اس تطہیر کے بعد نفاق کی بیماری کو پھر جماعت کے اندر گھسنے کی راہ نہ ملے۔ یہاں یہ فعل اپنے کامل معنی میں ہے اور آخر میں اس کے اجر عظیم کا وعدہ ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ

مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (۱۸۰-۱۸۲)

منافقین کی کمزوری انفاق کے معاملے میں

اہلِ نفاق جس طرح اپنی جان کے معاملے میں چور ہوتے ہیں اسی طرح اپنے مال کے معاملے میں بھی چور ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کی اس کمزوری پر بھی تنبیہ فرمائی تاکہ مسلمان اس بیماری سے بھی ہوشیار رہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے سے دریغ کر رہے ہیں درآنحالیکہ وہ خدا ہی کا بخشا ہوا ہے اور خدا نے ان کو کسی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ محض اپنے فضل سے بخشا ہے، وہ یہ نہ سمجھیں کہ اپنے مستقبل کی مصلحت کے لیے وہ کوئی بڑا مفید کام کر رہے ہیں۔ خدا کے حقوق و فرائض سے چرا چرا کر جو مال جمع کیا جا رہا ہے وہ قیامت کے دن ان کی گردنوں کا بوجھل طوق بنے گا اور سونے کے جو طوق آج زینت و فخر کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں یہ سانپوں اور اژدہوں کی شکل میں تبدیل ہو جائیں گے۔

مزید فرمایا کہ آسمان و زمین کی ساری میراث بالآخر خدا ہی کی طرف پلٹ جانے والی ہے۔ جو کچھ جس کو ملا ہے خدا ہی سے ملا ہے اور پھر یہ سب کچھ اسی کی طرف لوٹ جانے والا ہے۔ یہ ساری چیزیں خدا نے ہیں بطور امانت بخشی ہیں اور مقصود اس سے ہمارا امتحان ہے سو وہ اس بات سے اچھی طرح باخبر ہے کہ ہم نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں میں کس طرح کا تصرف کیا ہے اور اپنے اس علم کے مطابق وہ جزا یا سزا دے گا۔

منافقین کا طنز اللہ جل شانہ کی شان میں

'لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا الاية' یہ منافقین کے اس استہزا پر تہدید و وعید ہے جو وہ اپنی مجلسوں میں قرآن کی دعوتِ انفاق کا کیا کرتے تھے۔ قرآن جب یہ کہتا کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تو یہ منافقین اس پر یہ فقرہ چست کرتے کہ ان دنوں اللہ میاں بہت غریب ہو گئے ہیں اور ہم ان سے زیادہ امیر ہیں کہ وہ ہم سے قرض مانگنے پر اتر آئے ہیں، یہ منافقین زیادہ تر یہود میں سے تھے اس وجہ سے خدا پر طنز کرنے میں بھی انھوں نے بالکل یہود ہی کی ہمنوائی کی۔ سورۂ مائدہ میں یہود کا یہ قول جو نقل ہوا ہے کہ 'يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ' اس کی نوعیت بھی، جیسا کہ ہم تشریح کریں گے بالکل یہی تھی۔ وہ بھی قرآن کی مذکورہ بالا دعوتِ انفاق کا مذاق اڑانے کے لیے کہتے کہ آج کل مسلمانوں کے اللہ میاں کا ہاتھ بہت تنگ ہے کہ وہ بندوں سے قرض مانگتے پھرتے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ 'سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا' یہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کو ہم نوٹ کر رکھیں گے۔

بلاغت کا ایک لطیف نکتہ

فنِ بلاغت کے اداشناس اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دو لفظوں کے اندر جو قہر و غضب چھپا ہوا ہے اس کی تعبیر ہم عاجزوں کے قلم سے صفحوں میں بھی ممکن نہیں ہے۔ پھر اس سے زیادہ بلیغ بات یہ ہے کہ اسی پر عطف کر دیا ہے 'وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ' کو یعنی ان کے ناحق قتلِ انبیا کو بھی ہم نے لکھ رکھا ہے۔ یہ قتلِ انبیا کا جرم ظاہر ہے کہ یہود کا ہے۔ منافقین کے ایک قول اور یہود کے ایک فعل کو ایک ہی زمرے میں اس طرح شامل کرنا اور دونوں کے لیے ضمیر بھی ایک ہی استعمال کرنا یہاں دو باتوں پر دلیل ہے۔ ایک تو اس بات پر کہ

یہ سنگین بات کہ یہ منافقین یہود کی اسی برادری میں پھر جا شامل ہوگئے ہیں جس سے نکل کر انھوں نے اسلام میں داخل ہونے کا ڈھونگ رچایا تھا۔ دوسری یہ کہ منافقین کا یہ استہزا اور یہود کا یہ عمل دونوں ایسے سنگین جرائم ہیں کہ خدا ان کو بھولنے والا نہیں ہے بلکہ وہ بھی ایک دن ان سے کہے گا کہ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ خدا کا یہ عذاب چکھو اور یہ عذاب جو کچھ بھی ہوگا ان کے اعمال ہی کا ثمرہ و نتیجہ ہوگا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر کسی قسم کا ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاۗءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۔ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۱۸۳-۱۸۶)

بات جب منافقین کے ذکر سے یہود کے ذکر تک پہنچ گئی تو ان کی ایک اور شرارت کا حوالہ دے کر اس کی بھی لگے ہاتھوں تردید فرما دی اور ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دی کہ ابھی اس طرح کی بہت سی دل آزار باتیں تمھیں اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے دیکھنی اور سننی پڑیں گی۔ یہ تمھارے صبر و عزیمت کا امتحان ہے۔

یہود کی ایک شرارت

یہود کی جس شرارت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو چپ کرنے کے لیے یہ کہتے کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہے کہ ہم کسی شخص کے دعوائے رسالت کی اس وقت تک تصدیق ہی نہ کریں جب تک اس سے یہ معجزہ نہ صادر ہو کہ وہ ایسی قربانی پیش کرے جس کو کھانے کے لیے قبولیت کے نشان کے طور پر، آسمان سے آگ اترے۔ یہ بات یہود محض شرارت کی وجہ سے کہتے تھے۔ تورات میں بعض انبیا سے اس معجزے کا صادر ہونا مذکور ہے مثلاً سلاطین ۱۸: ۲۰-۲۸ میں ایلیا نبی کے متعلق اور تواریخ ۷: ۱ میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق لیکن یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ یہ معجزہ لوازم و شرائط نبوت میں سے ہے، جب تک کوئی نبی یہ معجزہ نہ دکھائے اس کا دعوائے نبوت ہی قابلِ غور نہیں، بالخصوص آخری نبی سے متعلق تو ان کے ہاں جو پیشین گوئیاں ہیں وہ اس قسم کے تکلفات سے بالکل ہی خالی ہیں۔ یہ عذر یہود نے محض شرارت سے جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا گھڑا تھا اس وجہ سے قرآن نے ان کے ذہن کو سامنے رکھ کر جواب دے دیا کہ ان سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے ایسے رسول آچکے ہیں جو نہایت واضح نشانیاں لے کر آئے اور وہ معجزہ بھی انھوں نے دکھایا جس کا تم نے ذکر کیا تو تم نے ان کو قتل کیوں کیا؟ تمھارا یہ فعل تو اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ تم اپنی اس بات میں بھی

جھوٹے ہو۔ اگر تم کو یہ معجزہ بھی دکھا دیا جائے گا جب بھی تم اپنی اسی ضد پر اڑے رہو گے اور ایمان نہ لانے کا کوئی اور بہانہ تلاش کر لو گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ اگر یہ تمھاری تکذیب کر رہے ہیں تو تم اس کا غم نہ کرو۔ نہ یہ بات تمھاری کسی کوتاہی کے سبب سے ہے اور نہ اس وجہ سے ہے کہ تم ان کے حسب منشا ان کو معجزہ نہیں دکھا رہے ہو بلکہ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ یہ لوگ تم پر ایمان نہیں لانا چاہتے۔ یہ معاملہ خاص تمھی کو نہیں پیش آیا ہے، تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے حالانکہ وہ معجزے، صحیفے اور روشن کتاب سب کچھ لے کر آئے تھے، خالی ہاتھ نہیں آئے تھے۔

یہاں تین لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ بینات ۔ زبر ۔ کتاب منیر۔

'بینات' کا مفہوم

'بینات' کے معنی واضح اور روشن کے ہیں۔ یہ لفظ آیات کی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں یہ لفظ تنہا بغیر موصوف کے استعمال ہوا ہے دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ واضح اور مسکت دلائل کے معنی میں یا حسی معجزات کے معنی میں۔

'زبر' کا مفہوم

'زبر' زبور کی جمع ہے۔ اس کے معنی ٹکڑے، قطعے اور صحیفے کے ہیں۔ مزامیر داؤد کے لیے اس کا استعمال معروف ہے۔ یہاں اس سے مراد انبیا کے وہ صحائف ہیں جو تورات کے مجموعہ میں شامل ہیں۔

'کتاب منیر' سے مراد

'کتاب منیر' سے مراد تورات ہے۔ قرآن سے پہلے کی نازل شدہ چیزوں میں سے تورات ہی ہے جو اس لفظ کا اصلی مصداق ہو سکتی ہے۔

تہدید اور تسلی دونوں

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ الآیہ، میں تہدید اور تسکین دونوں کے پہلو موجود ہیں۔ منافقین و معاندین کے لیے یہ تہدید ہے اور اہل ایمان کے لیے پیام تسکین۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو اور تمھارے مخالفوں کو سب کو موت کی منزل سے گزر کر بالآخر خدا ہی کے پاس آنا ہے، وہاں قیامت کے دن سب کو ان کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ وہاں بازی دراصل اس کی ہے جو دوزخ سے محفوظ رہا اور جنت میں داخل ہوا۔ یہ دنیا اور اس کی چمک دمک تو محض ایک جلوۂ سراب ہے اور شامت ہی ہے ان کی جو اس کے پیچھے پڑ کر آخرت کو گنوا بیٹھے۔

مسلمانوں کو صبر اور تقویٰ کی تلقین

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ الآیہ یہ مسلمانوں کو معاندین کی تمام سرگرمیوں کے علی الرغم صبر اور تقویٰ پر جمے رہنے کی تلقین ہے۔ فرمایا کہ اہل کتاب اور مشرکین کے ہاتھوں تمھیں جانی و مالی آزمائشیں بھی پیش آئی ہیں اور ان کی طرف سے تمھیں ابھی بہت سی دل آزار باتیں بھی سننی پڑیں گی۔ یہ دراصل تمھارے صبر اور تقویٰ کا امتحان ہے۔ اگر ان باتوں کے باوجود تم اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور تم نے حدود الٰہی کا احترام ملحوظ رکھا تو یہی وہ عزیمت کا مقام ہے جو انبیاء اور اولوالعزم اور ان کے جاں نثاروں کا خاص حصہ ہے اور جو بالآخر اس راہ میں کامیابی کی کلید ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ

ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ۝ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوا
وَّيُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُم بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝
وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۱۸۷-۱۸۹)

اہل کتاب کو آخری تنبیہ — اس سورہ میں اہل کتاب کو یہ آخری تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ خود ساختہ عہود کے حوالے دے کر یہ حق کی مخالفت کے معاملے میں تو بڑے چابکدست ہیں لیکن وہ اصل میثاق جو اللہ نے ان سے اپنی کتاب کو ایک ایک کے آگے آشکارا کرنے کا لیا تھا اور یہ جو ہدایت فرمائی تھی کہ اس کی کسی چیز کو چھپانا مت، اس عہد کو انھوں نے پس پشت ڈال دیا اور دنیا کے حقیر فائدے کے عوض اس کو قربان کر دیا۔

تورات اور انجیل میں تبیین کتاب کی تاکید — اس عہد کا حوالہ تورات اور انجیل دونوں میں مختلف اسلوبوں اور پیرایوں سے ہوا ہے۔ ہم بخیال اختصار صرف دو حوالے نقل کرتے ہیں۔ استثنا میں ہے۔

"اس لیے میری ان باتوں کو تم اپنے دل اور اپنی جان میں محفوظ رکھنا اور نشان کے طور پر ان کو اپنے ہاتھوں پر باندھنا اور وہ تمھاری پیشانی پر ٹیکوں کی مانند ہوں اور تم ان کو اپنے لڑکوں کو سکھانا اور تو گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اٹھتے وقت ان ہی کا ذکر کیا کرنا اور تو ان کو اپنے گھر کی چوکھٹوں پر اور اپنے پھاٹکوں پر لکھا کرنا" ۱۱: ۱۸-۲۱

ان الفاظ پر غور فرمایئے، جس کتاب کی تبیین کا ان الفاظ میں یہود سے عہد لیا گیا تھا اس کو انھوں نے نہ صرف یہ کہ گلدستۂ طاق نسیاں بنا کر رکھ دیا بلکہ اس میں تحریف کر کے اس کے حقائق کی قلب ماہیت بھی کر ڈالی۔

اسی طرح انجیلوں میں بھی نہایت مؤثر اسلوبوں میں یہ ہدایت موجود ہے اور خاص طور پر یہ فقرہ تو آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

"جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں اجالے میں کہو اور جو کچھ تم کان میں سنتے ہو کوٹھوں پر اس کی منادی کرو" متی ۱۰: ۲۷

فرمایا جن کے کارنامے یہ کچھ ہیں، جنھوں نے حقیر دنیوی مفادات کی خاطر اس ڈھٹائی کے ساتھ شریعت فروشی کی ہے اور پھر اپنے اس کارنامے پر خوش بھی ہیں، جو چاہتے ہیں کہ اس کام کا کریڈٹ حاصل کریں جو انھوں نے کیا نہیں۔ فرمایا کہ ان کو عذاب الٰہی سے محفوظ نہ سمجھو، وہ دنیا میں بھی عذاب کی زد میں ہیں اور آخرت میں بھی ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

'مفازۃ' کے معنی نجات اور پناہ کی جگہ کے ہیں اور 'وَيُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا' کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب پر اللہ تعالیٰ نے کتاب کی جو ذمہ داری ڈالی اور اس کے اظہار و اعلان، اس کی تعلیم و تبیین، اور اس کے اجزا و نفاذ سے متعلق جو عہد ان سے لیا اس کا کوئی جزو انھوں نے پورا نہیں کیا بلکہ الٹے اس کے کتمان

اور تحریف کے لیے سازشیں کیں اور اس کو اپنے دنیوی اغراض کے لیے حقیر داموں بیچا لیکن اس کے باوجود ان کی خواہش یہ ہے کہ انھیں حامل کتاب سمجھا جائے، انھیں خدا کی برگزیدہ امت قرار دیا جائے اور ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کے تمام فضل و انعام اور تمام لطف و احسان کا حق دار مانا جائے۔ اہل کتاب کے اسی طرح کے لذیذ خواب ہیں جن کو قرآن نے سورہ بقرہ میں 'اَمَانِیّ' باطل آرزوؤں سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ الآیہ یہ اوپر والی دھمکی کی تصدیق و توثیق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے، اس میں کسی اور کے ذرہ داثر کا کوئی دخل نہیں ہے۔ جو لوگ خدا سے سرکشی کر رہے ہیں وہ ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہیں اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

۳۹۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۹۰-۲۰۰

اس مجموعۂ آیات کی حیثیت خاتمہ سورہ کی ہے اور یہ خاتمہ موازنہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ بہت کچھ ملتا جلتا ہوا ہے سورۂ بقرہ کے خاتمہ سے۔ خاص طور پر اس میں جو دعا ہے وہ تو بالکل عکس ہے اس دعا کا جس پر سورۂ بقرہ ختم ہوئی ہے۔ خاتمۂ سورہ

اس خاتمہ میں پہلے تو اس عالم گیر حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جہاں تک خدا کی قدرت و حکمت کی نشانیوں کا تعلق ہے ان سے تو آسمان و زمین کا گوشہ گوشہ معمور ہے۔ اصل شے نبی کی دعوت پر ایمان لانے کے لیے جو ضروری ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ ایسی سوختنی قربانی پیش کرے جس کو کھانے کے لیے آسمان سے آگ اترے بلکہ یہ ہے کہ اس کی باتوں کو سننے کے لیے لوگوں کے کان کھلیں، آسمان و زمین میں تصرفات قدرت کے عجائب دیکھنے کے لیے لوگ اپنی آنکھیں کھولیں اور اس کارخانۂ کائنات کی حکمت و غایت پر غور کرنے کے لیے لوگ اپنے دماغوں اور اپنی عقلوں سے کام لیں۔

پھر فرمایا کہ جن کے دل بیدار ہیں، جو اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے خدا کو یاد رکھتے ہیں اور آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں وہ اس نتیجے پر خود پہنچ جاتے ہیں کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے جس کو بنانے والے نے یوں ہی بے مقصد بنا ڈالا ہو اور یوں ہی اس کو ایک شتر بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے بلکہ اس کے پیچھے ضرور غایت و مقصد اور جزا و سزا ہے، چنانچہ وہ خدا سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان کو انجام کار کے عذاب سے محفوظ رکھے۔

آگے فرمایا کہ اس طرح کے بیدار عقل اور بیدار دل لوگ معجزوں اور کرشموں کی تلاش میں نہیں رہتے۔ ان کے کانوں میں جب دعوت حق پڑتی ہے تو اس کی صداقت کے جانچنے کے لیے کسوٹی خود ان کی عقل اور ان کے دل کے اندر ہوتی ہے وہ اس پر پرکھ کر خود اس کی قدر و قیمت پہچان لیتے ہیں۔ ان کے لیے پیغمبر کی دعوت

اور اس کا چہرہ ہی سب سے بڑا معجزہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا جو ان اوصاف کے اس عہد میں حقیقی مصداق تھے اور ان کی ان جاں بازیوں اور قربانیوں کا ذکر کیا جو اس دعوتِ حق کی راہ میں وہ پیش کر رہے تھے اور ان کے لیے اللہ کے پاس جو اجرِ عظیم ہے اس کی بشارت دی۔

آگے چند آیتوں میں اس بات کی وضاحت فرمادی کہ آج جو حق کے مخالفین زور لگا رہے ہیں اس سے کوئی مغالطہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ مہلت جو ان کو ملی ہے اللہ ہی کی طرف سے ملی ہے اور اس کے بھی مصالح ہیں۔ یہ مہلت عارضی ہے جو بہت جلد ختم ہوجانے والی ہے۔ انجام کار کی کامیابی خدا کے متقی اور وفادار بندوں ہی کے لیے ہے۔

آخر میں اہل کتاب کے اس گروہ کی تحسین فرمائی جو حاسدین کے برعکس حق پر قائم رہا اور اسی نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی توفیق پائی۔ فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کے ہاں اپنی اس استقامت اور حق پرستی کا انعام پائیں گے۔

سب سے آخر میں مسلمانوں کو نہایت مختصر مگر جامع الفاظ میں ان باتوں کی ہدایت فرمائی جن کا اہتمام اس ذمہ داری کے ادا کرنے کے لیے ضروری ہے جو آخری امت کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے ان پر ڈالی تھی۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۹۰-۲۰۰

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ
لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا
وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا
عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾ رَبَّنَآ إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهٗ
وَمَا لِلظّٰلِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿١٩٢﴾ رَبَّنَآ إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا
يُّنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ اٰمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا
ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ﴿١٩٣﴾ رَبَّنَا

وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ
اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَاۤ
اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ
مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ
اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ
وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾ لَا يَغُرَّنَّكَ
تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۫ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ
جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الثلثة
الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَاۤ اُنْزِلَ
اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ
الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَ
رَابِطُوْا ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ ع ۲۰ ۱۱

ترجمۂ آیات ۱۹۰ - ۲۰۰

بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد و شد میں اہلِ عقل
کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ ان کے لیے جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر خدا

کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں۔ ان کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ تو اس بات سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے۔ سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب! جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا بے شک اس کو تو نے رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا۔ اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ایمان کی دعوت دیتے کہ لوگو، اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لائے اے ہمارے رب، ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمیں موت اپنے وفادار بندوں کے ساتھ دے۔ اے ہمارے رب اور ہمیں بخش وہ کچھ جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانی ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا۔ ۱۹۰-۱۹۴

تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو۔ سو جنھوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے اور ہماری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے ہیں ان سے ان کے گناہ دور کر دوں گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یہ اللہ کے پاس سے ان کا بدلہ ہوگا اور بہترین بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ ۱۹۵

اور ملک کے اندر کافروں کی یہ سرگرمیاں تمھیں کسی مغالطہ میں نہ ڈالیں، یہ چند دن کی چاندنی ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے۔ البتہ وہ لوگ جو اپنے رب

سے ڈرتے رہے ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کی طرف سے ان کے لیے پہلی میزبانی ہوگی اور جو کچھ اللہ کے پاس اس کے وفادار بندوں کے لیے ہے وہ کہیں بہتر ہے۔ ۱۹۷-۱۹۸

اور بے شک اہل کتاب میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتارا گیا اور اس پر بھی جو ان پر اتارا گیا ہے، اللہ سے ڈرتے ہوئے، وہ اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر سودا نہیں کرتے۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے، بے شک اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔ ۱۹۹

اے ایمان والو، صبر کرو، ثابت قدم رہو، مقابلے کے لیے تیار رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب رہو! ۲۰۰

۴۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۱۹۰-۱۹۲)

ارباب بصیرت کی نگاہ

محبت دنیا کے ان اندھوں کا ذکر کرنے کے بعد جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لیے اس قسم کی کٹ حجتیاں پیدا کر رہے تھے جن کی تفصیل اوپر بیان ہوئی اب یہ ان ارباب بصیرت کا بیان ہو رہا ہے جو اللہ کو ہر جگہ اور ہر حال میں یاد رکھتے ہیں اور زمین و آسمان کی خلقت پر برابر غور کرتے رہتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ ذکر و فکر خود بخود ان کو اس نتیجے تک پہنچا دیتا ہے کہ یہ عظیم کارخانہ بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا، اور جب بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا تو لازم ہے کہ یہ محض اتنے ہی پر تمام نہ ہو جائے جتنا ظاہر ہو رہا ہے بلکہ ضروری ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں گنہگار اور نیکوکار دونوں اپنے اپنے اعمال کا بدلہ پائیں اور اس دنیا کی خلقت میں جو عظیم حکمت پوشیدہ ہے وہ ظاہر ہو۔

فلسفۂ کائنات — آسمان وزمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد و شد میں جو نشانیاں ہیں ان کی طرف یہاں صرف اجمالی اشارہ ہے۔ ان کی تفصیل پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن نے بڑی وضاحت کے ساتھ گوناگوں پہلوؤں سے آفاق کی ان نشانیوں کو نمایاں کیا ہے جو شہادت دیتی ہیں کہ اس کائنات کے پیچھے صرف ایک عظیم طاقت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عظیم حکمت بھی ہے، صرف بے پناہ قدرت ہی نہیں ہے بلکہ بے پایاں رافت ورحمت بھی ہے، صرف بے اندازہ کثرت ہی نہیں ہے بلکہ اس کثرت کے اندر نہایت حیرت انگیز توافق و توازن بھی ہے۔ یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ اس دنیا کا پیدا ہونا نہ تو کوئی اتفاقی سانحہ ہے نہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے بلکہ یہ ایک قدیر و حکیم، عزیز و غفور اور سمیع و علیم کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اس وجہ سے یہ بات اس کی فطرت کے خلاف ہے کہ یہ خیر و شر اور نیک و بد کے درمیان امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی تمام ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یا تو اس کا کوئی خالق و مالک ہی نہیں ہے، یہ آپ سے آپ کہیں سے آدھمکی ہے اور اسی طرح چلتی رہے گی یا یہ کہ نعوذ باللہ اس کا خالق کوئی کھلنڈرے مزاج کا ہے جو کسی کو گداگر، کسی کو تونگر، کسی کو ظالم اور کسی کو مظلوم بنا کر اس کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں اس قدرت اور اس حکمت کے بالکل منافی ہیں جن کی شہادت اس کائنات کے گوشے گوشے سے مل رہی ہے۔ ایسی علیم و حکیم ہستی کی شان علم و حکمت کے یہ بات بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے حکمت کام کرے۔

اس طرح اس کائنات کی قدرت و حکمت پر غور کرنے والا شخص نہ صرف خدا تک بلکہ اقرار آخرت تک خود پہنچ جاتا ہے اور جس کا ذہن اس حقیقت تک پہنچ جائے گا ظاہر ہے کہ جزا و سزا کے تصور سے اس کا دل کانپ اٹھے گا اور اس کے اندر شدید داعیہ اس بات کے لیے پیدا ہو گا کہ وہ اس عذاب اور اس رسوائی سے پناہ مانگے جو ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو اس دنیا کو بس ایک کھلنڈرے کا کھیل سمجھتے ہیں اور اس طرح انھوں نے اپنی ساری زندگی بالکل بطالت میں گزار دی۔

چند نکات — یہ ان آیات کا سیدھا سادا مطلب ہوا۔ ان پر مزید غور کیجیے تو چند اور باتیں بھی سامنے آئیں گی اور وہ بھی نہایت قیمتی ہیں۔

ایک یہ کہ قرآن کے نزدیک اولوا الالباب صرف وہ لوگ ہیں جو اس کائنات کے نظام پر غور کر کے خدا کے ذکر اور آخرت کی فکر تک رہنمائی حاصل کریں۔ جن کو یہ چیز حاصل نہیں ہوتی وہ اگرچہ آسمان و زمین کی تمام مسافت ناپ ڈالیں اور چاند و مریخ تک سفر کر آئیں لیکن وہ اولوا الالباب نہیں ہیں۔ ان کے سروں پر کھوپڑیاں تو ہیں لیکن ان کے اندر مغز نہیں ہے۔ اگر ان کے اندر مغز ہوتا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ انھیں سب کچھ نظر آجاتا اور یہ تل کی اوٹ میں چھپا ہوا پہاڑ نظر نہ آتا۔

دوسری یہ کہ جہاں تک خدا کا تعلق ہے وہ فکر و نظر کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اس کائنات کی بدیہی

حقیقت بلکہ ابدہ البدیہیات ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی منادی کر رہا ہے۔ ہماری فطرت اس کی شہادت دے رہی ہے۔ انسان کے اندر اگر عقل سلیم ہو تو وہ خدا کو اسی طرح دیکھتی ہے جس طرح سلیم آنکھ سورج کو دیکھتی ہے۔ خدا کو پانے کے لیے یہ کافی ہے کہ انسان اس کو یاد رکھے۔ البتہ آخرت کا معاملہ تفکر و تدبر کا محتاج ہے۔

تیسری یہ کہ جہاں تک ذکرِ الٰہی کا تعلق ہے وہ ہر حال میں مطلوب ہے۔ اس کے لیے قیام و قعود، نرمی و گرمی اور صبح و مسا کی کوئی قید نہیں ہے۔ انسان کی مادی زندگی کے بقا کے لیے جس طرح سانس کی آمد و شد ضروری ہے اسی طرح اس کی روحانی زندگی کے بقا کے لیے اللہ کی یاد ضروری ہے اور قرآن کی زیرِ بحث آیات سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اولوالالباب کی خاص صفت یہی ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔

چوتھی یہ کہ دین میں جس طرح ذکر مطلوب ہے اسی طرح فکر بھی مطلوب ہے۔ اگر ذکر ہو اور فکر نہ ہو تو بسا اوقات یہ ذکر صرف زبان کا ایک شغل بن کے رہ جاتا ہے۔ اس سے معرفت کے دروازے نہیں کھلتے۔ اولوالالباب کے ذکر کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ فکر بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کے قدم درجہ بدرجہ حکمت و معرفت میں راسخ ہوتے جاتے ہیں اس لیے کہ یہی فکر، آخرت کے یقین کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

پانچویں یہ کہ اس کائنات میں تفکر سے جس طرح اولوالالباب اس حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں کہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے اس وجہ سے ایک روزِ عدل کا ظہور ضروری ہے اسی طرح یہ حقیقت بھی ان پر واضح ہو جاتی ہے کہ اس دن حقیقی رسوائی سے وہ لوگ دوچار ہوں گے جو جھوٹی شفاعتوں پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں اس لیے کہ اس دن ایسے بدقسمتوں کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا[1]۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰي رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (۱۹۳ - ۱۹۵)

---

۱ اگر قیامت میں باطل شفاعتوں کے لیے گنجائش مان لی جائے تو یہ دنیا پھر اسی طرح بازیچۂ اطفال بن کے رہ جاتی ہے جس طرح آخرت نہ ماننے کی صورت میں۔ اور یہ بات بالبداہت غلط ہے۔

دعوت اسلامی کے باب میں اولوا الالباب کا رویہ

اب یہ مذکورہ بالا اولوا الالباب کا رویہ بیان ہو رہا ہے کہ وہ اللہ کے رسول اور اس کی دعوت کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔ فرمایا کہ نہ وہ کٹ حجتیاں کرتے، نہ خوارق اور معجزات مانگتے۔ پیغمبر کی دعوت خود ان کے اپنے دل کی آواز ہوتی ہے۔ وہ جس خدا اور آخرت پر ایمان کی دعوت دے رہا ہوتا ہے اس کی شہادت وہ خود اپنے باطن سے سنتے ہیں اس وجہ سے ان کے لیے پیغمبر کی آواز اور اس کا چہرہ ہی معجزے کا کام کرتا ہے۔ جب اس کی دعوت سنتے ہیں تو اس کی مخالفت کر کے اس کو دبانے کے بجائے اس پر لبیک کہتے ہیں اور اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں کہ ان کے گناہوں کو وہ معاف فرمائے، ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ان کا خاتمہ اپنے وفا شعار بندوں کے ساتھ کرے۔

بدعہدوں پر ایک لطیف تعریض

'تَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ' خدا کے وفادار بندوں کے زمرے میں شامل کیے جانے کی تمنا کا اظہار ہے۔ یعنی جب ہمارا خاتمہ ہو تو ہمیں ان کی معیت نصیب ہو جو آخر دم تک تیرے عہد و پیمان میں مضبوط رہے۔ لفظ 'بار' پر ہم دوسرے مقام میں گفتگو کر چکے ہیں کہ اس لفظ کی اصل روح وفاداری، پابندی عہد و میثاق اور ادائے حقوق و فرائض ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو یہاں اس میں ان اہل کتاب پر ایک لطیف تعریض بھی ہے جن سے آخری رسول کی تائید و حمایت کا عہد لیا گیا تھا لیکن انھوں نے اس عہد کے برخلاف سارا زور اس کی مخالفت میں صرف کیا۔ یہ واضح رہے کہ یہاں کلام میں پیش نظر اہل کتاب ہی ہیں۔

صحیح اور بروقت دعا ضرور قبول ہوتی ہے

'فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ' نہایت بلیغ اسلوب میں دعا کی قبولیت کا اظہار ہے۔ گویا ادھر ان کی زبان سے دعا کے الفاظ نکلے ادھر بارگاہ خداوندی سے ان کی قبولیت کی سند مل گئی۔ جو دعائیں صحیح جذبے کے ساتھ صحیح محل اور ٹھیک وقت پر نکلتی ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہے۔ اس حقیقت کی طرف ہم دوسرے مقام میں بھی اشارہ کر چکے ہیں۔

دعا کی بلاغت

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ اولوا الالباب کی طرف سے حق کی یہ تائید دعوے کی شکل میں نہیں بلکہ دعا کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے اس 'آمَنَّا' کی ذمہ داریوں اور اس کی مشکلات سے اچھی طرح واقف ہیں اس وجہ سے بجائے اس کے کہ وہ اس کا اظہار فخر کے ساتھ کرتے انھوں نے نہایت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دیا ہے کہ جس طرح اس نے یہ 'آمَنَّا' کہنے کی توفیق دی ہے اسی طرح وہ تمام اگلی اور پچھلی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے اور اس راہ کی ذمہ داریوں اور مشکلات سے عہدہ برا ہونے کی توفیق دے۔

مظلوم مہاجرین اور کمزور مجاہدوں کی حوصلہ افزائی

'لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ' میں تمام اہل ایمان کی حوصلہ افزائی ہے جو دعوت اسلامی کے اس نازک مرحلے میں اس کی تائید کے لیے خطرات سے بے پروا ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ مرحلہ جیسا کہ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا کے الفاظ سے واضح ہے ہجرت، جہاد، راہ خدا میں مصائب جھیلنے اور مرنے مارنے کا مرحلہ تھا۔ اس مشکل وقت میں جو لوگ

اس میدان عشق میں سر دھڑ کی بازیاں لگا کر اترے تھے ان میں آزاد بھی تھے اور غلام بھی، مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، اور سب ایک سے ایک بڑھ کر قربانیاں پیش کر رہے تھے اور ایمان و اسلام کے جرم میں معاندین اسلام کے ہاتھوں لرزہ خیز مظالم کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ خاص طور پر کمزوروں یعنی عورتوں اور غلاموں پر جو ستم توڑے جا رہے تھے ان کو سن کر تو آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ کفار کی یہ تمام ستم رانیاں کسی ایک شخص کو بھی اسلام سے پھیرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں بلکہ یہ کہنا بھی ذرا مبالغہ نہیں ہے کہ جو جتنا ہی کمزور تھا اس نے اسی قدر زیادہ استقلال اور پامردی کا ثبوت دیا، یہ صورت حال مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے میں ان کمزوروں کی دلداری اور حوصلہ افزائی کا خاص طور پر اہتمام فرمائے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ إِنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم تم میں سے جو شخص بھی آج میرے دین کی کوئی خدمت کر رہا ہے میں اس کو ضائع نہیں کروں گا بلکہ اس کا بھرپور صلہ دوں گا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ کے الفاظ بھی بڑھا دیے یعنی عام اس سے کہ مرد ہو یا عورت، جو بھی آج میرے لیے کوئی دکھ جھیل رہا ہے میرا یہ وعدہ ان سب کو شامل ہے۔ اس ٹکڑے نے کلام کو بالکل مطابق حال کر دیا۔ اور کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان دو لفظوں نے ان مظلوم خواتین کی کتنی ڈھارس بندھائی ہو گی جو محض اسلام کی خاطر طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنی ہوئی تھیں!

اعمال کی میزان میں عورت اور مرد دونوں برابر ہیں

'بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ' اثنائے کلام میں بالکل ضمنی طور پر اس بات کی دلیل بیان ہو گئی ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ کی میزان میں مرد اور عورت دونوں کا عمل بالکل یکساں وزن رکھتا ہے؟ فرمایا کہ اس لیے کہ عورت اور مرد دونوں ایک ہی جنس سے ہیں، دونوں ایک ہی آدم و حوّا کی اولاد ہیں، دونوں ایک ہی قسم کے گوشت پوست سے بنے ہوئے ہیں۔ ان دو لفظوں سے قرآن نے ان تمام جاہلی نظریات اور غلط مذہبی تصورات کی تردید کر دی جو عورت کو مرد کے مقابل میں، ایک فروتر مخلوق قرار دیتے تھے۔ اس مسئلے پر ہم آگے والی سورہ میں بحث کرنے والے ہیں اس وجہ سے یہاں اس مختصر اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔

عمل اور ردعمل

'ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ' ثاب، یثوب، ثوبا کے اصل معنی رجوع کرنے اور لوٹنے کے ہیں۔ اسی سے ثواب ہے جس کے معنی اس ثمرے اور نتیجے کے ہیں جو کسی عمل کرنے والے کے عمل کے ردعمل کے طور پر اس کو حاصل ہو۔ اگرچہ لفظ میں گنجائش خیر اور شر دونوں کی ہے لیکن اس کا غالب استعمال اچھے عمل کے اچھے ردعمل کے لیے ہے۔ بندوں کے حقیر اعمال پر اللہ تعالیٰ جو ابدی اور لازوال انعامات عطا فرمائے گا ان کو ثواب کے لفظ سے تعبیر کر کے رب کریم نے بندوں کے اعمال کی قدر و قیمت بڑھائی ہے۔ ورنہ ذرّے اور پہاڑ میں کیا نسبت ہے۔ مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ کے الفاظ سے اسی بُعد کو رفع فرمایا گیا ہے۔ یعنی ہے تو تمہارے ہی عمل کا بدلہ لیکن ہے اللہ کے پاس سے جس کے پاس حسن ثواب کے خزانے ہیں، وہ داتا جس کو جتنا چاہے دے دے، اس کے پاس کیا کمی ہے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۣ ثُمَّ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّھُمْ لَھُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ (۱۹۶-۱۹۸)

لایغرنک میں خطاب عام ہے

'لَا يَغُرَّنَّكَ' میں خطاب عام مسلمانوں سے ہے۔ اس طرح واحد کے صیغے سے خطاب، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مخاطب ہے۔

تقلب کا مفہوم

'تَقَلُّب' کے معنی آمد و شد، چلت پھرت اور ایاب و ذہاب کے ہیں۔ موقع و محل کے لحاظ سے اس کے اندر غرور، اکڑ اور دندنانے کے معنی بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس آیت میں موقع کلام دلیل ہے کہ اس سے مراد اس وقت کفار کا ملک کے حالات و معاملات میں وہ آزادانہ و خود مختارانہ تصرف ہے جو مسلمانوں کے مقابل میں ان کو حاصل تھا۔ اس وقت تک مسلمان ابھی کمزور اور مظلوم تھے۔ اور کفار اپنی سطوت کے گھمنڈ میں ہر جگہ دندناتے پھر رہے تھے اور کمزور مسلمانوں پر ظلم ڈھاتے تھے۔

'نُزُل' اس ضیافت و میزبانی کو کہتے ہیں جو کسی مہمان کی آمد پر سب سے پہلے پیش کی جاتی ہے۔

'مَتَاعٌ قَلِيْلٌ' مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور یہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ جب اس طرح مبتدا کو حذف کر دیں تو مقصود اس سے ساری توجہ صرف خبر پر مرکوز کرانا ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی مزید حوصلہ افزائی

اوپر کی آیات میں کمزور اور مظلوم مسلمانوں کی جو حوصلہ افزائی فرمائی گئی ہے اسی مضمون کی یہ مزید تائید ہے۔ مسلمانوں کو بالخصوص کمزور اور مظلوم مسلمانوں کو خطاب کر کے یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ اس وقت کفار کو ملک میں جو غلبہ اور زور حاصل ہے اس سے کوئی مغالطہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ چمک دمک محض چند روزہ ہے۔ اس کے بعد ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ حقیقی اور ابدی کامیابی انہی لوگوں کے لیے ہے جو تقویٰ اختیار کریں گے اور تقویٰ پر قائم رہیں گے۔ ان کے لیے پہلی پیشکش جو ہوگی وہ جنت کی ہوگی اور ایسے وفادار بندوں کے لیے ان کے رب کے پاس مزید جو کچھ ہے وہ ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَـمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۱۹۹)

پچھلے اہل کتاب کی تحسین

اوپر کی آیات اور بحیثیت مجموعی اس پوری سورہ میں اہل کتاب کے رویے کی چونکہ شدید مذمت ہوئی ہے اس وجہ سے یہ آخر میں ان اہل کتاب کی تحسین فرمائی جو اپنی سابقہ کتب پر بھی قائم رہے اور دولت اسلام سے بھی مشرف ہوئے۔ یہ اس بات کی طرف ایک نہایت لطیف اشارہ ہے کہ اس دودھ میں جتنا مکھن تھا وہ یہ نکل آیا ہے۔ اب جو بچ رہا ہے وہ صرف چھاچھ ہے۔ ان کے بابت فرمایا کہ یہ لوگ اپنا وہ

اجر خدا کے ہاں پائیں گے جو ان کے لیے خاص ہے۔ پھر تسلی دی کہ یہ خیال نہ کریں کہ اس اجر کے ملنے میں بہت دیر ہے۔ جب یہ اجر ملے گا تو یہ معلوم ہوگا کہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی مل گیا۔ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ جب تسلی کے موقع پر آتا ہے تو اس کا یہی مفہوم ہوتا ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَ صَابِرُوۡا وَ رَابِطُوۡا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (۲۰۰)

شریعت کے حقوق ادا کرنے کے لیے بنیادی ہدایات

یہ اس سورہ کی آخری آیت ہے جس میں خاتمہ کلام کے طور پر وہ تمام بنیادی ہدایات جمع کر دی گئی ہیں جو شریعت کے حقوق ادا کرنے اور ان حالات و مشکلات سے عہدہ برا ہونے کے لیے ضروری تھیں، جن میں مسلمان گھرے ہوئے تھے۔ یہ ہدایات چار چیزیں اختیار کرنے اور ان پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے کے لیے ہیں۔

'صبر' کی حقیقت

پہلی چیز صبر ہے۔ اس لفظ پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ اس لفظ کی اصل روح کسی حق پر اپنے آپ کو مزاحمتوں کے مقابل میں جمائے رکھنا ہے۔ عام اس سے کہ یہ مزاحمتیں خود اپنے اندر سے سر اٹھائیں یا خارج سے حملہ آور ہوں اس خصلت کو پختہ کیے بغیر کوئی شخص کسی چھوٹے سے چھوٹے حق کا بھی حق ادا نہیں کر سکتا۔

'مصابرت' کی حقیقت

دوسری چیز مصابرت ہے۔ مصابرت کے معنی ہیں اپنے حریف کے مقابل میں ثابت قدمی کا مظاہرہ اور اس پر اس وصف میں بازی لے جانے کی کوشش کرنا۔ اس چیز کی تاکید اس موقع پر خاص طور سے اس وجہ سے کی گئی کہ اس مرحلے میں مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان عملاً مسلح کشمکش شروع ہو چکی تھی اور اس کشمکش میں آخری کامیابی اس گروہ کے لیے مقدر تھی جو اپنے حریف پر استقلال و پامردی کے میدان میں بازی لے جا سکے۔ میدانِ جنگ میں فتح و شکست کا اصل انحصار تعداد اور اسلحہ پر نہیں بلکہ اخلاق و کردار پر ہوتا ہے۔

'مرابطت' کی حقیقت

تیسری چیز مرابطہ ہے۔ مرابطہ، ربط الخیل سے ہے۔ اس کا اصل ابتدائی مفہوم دشمن کے مقابلے اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جنگی گھوڑے تیار کر رکھنا ہے۔ اب گھوڑوں کی جگہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں نے لے لی ہے اس وجہ سے حالات کی تبدیلی سے اس لفظ کا مفہوم بھی تبدیل ہو جائے گا۔ مصابرت کی ہدایت کے بعد یہ مرابطت کی ہدایت دشمن کے مقابلے کے لیے اخلاقی تیاری کے ساتھ ساتھ مادی تیاری کی ہدایت ہے۔

'تقویٰ' کی حقیقت

چوتھی چیز تقویٰ ہے۔ اس لفظ پر تفسیر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ خدا کے مقرر کردہ تمام حدود و قیود کی اخلاص و خشیت کے ساتھ نگرانی کرنا تقویٰ ہے۔ یہی چیز تمام دین کا خلاصہ اور مقصود ہے۔

فرمایا کہ مسلمانو، یہ چیزیں اختیار کرو تاکہ تم دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح پاؤ۔

یہ آخری سطریں ہیں جو آل عمران کی تفسیر میں اس بے مایہ کو لکھنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

لاہور

۲۳ ربیع الثانی ۱۳۸۶ھ

۱۱ اگست ۱۹۶۶ء

تدبّرِ قرآن

۴

النسآء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ اپنی سابق سورہ — آلِ عمران — کے بعد اس طرح شروع ہو گئی ہے کہ اس کے ابتدائی الفاظ ہی سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ یہ آلِ عمران کا تکملہ و تتمہ ہے۔ آلِ عمران کی آخری اور نساء کی پہلی آیت پڑھیے تو معلوم ہو گا کہ جس اہم مضمون پر آلِ عمران ختم ہوئی ہے اسی مضمون سے سورۂ نساء کی تمہید استوار ہوئی ہے۔ گویا آلِ عمران کے خاتمے اور نساء کے آغاز نے ایک حلقۂ اتصال کی صورت اختیار کر لی ہے۔ آلِ عمران کی آخری آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ہے جس میں مسلمانوں کو فوز و فلاح کی راہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ انفرادی و اجتماعی حیثیت سے ثابت قدمی دکھائیں، آپس میں جڑے رہیں، دشمن کے مقابل میں ڈٹے رہیں اور خدا سے ڈرتے رہیں۔ اب اس سورہ کو دیکھیے تو اسی 'اتقوا اللہ' کے مضمون سے شروع ہو گئی ہے۔ (یایھا الناس اتقوا ربکم) اور آگے آپس میں جڑے رہنے اور مخالفین کے بالمقابل ثابت قدمی کے لیے جو باتیں ضروری ہیں وہ نہایت وضاحت و تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔[1]

ثابت قدمی بالخصوص اجتماعی ثابت قدمی بغیر مضبوط جماعتی اتصال کے ممکن نہیں ہے اور جماعتی اتصال کوئی اتفاق سے پیدا ہو جانے والی چیز نہیں ہے بلکہ یہ بنیاد کا بھی محتاج ہے، مثبت تدابیر کا بھی متقاضی ہے اور اس کو ان فتنوں سے محفوظ رکھنے کی بھی ضرورت ہے جو اس کو درہم برہم کر سکتے ہوں۔ چنانچہ اس سورہ میں وہ ساری چیزیں بیان ہوئی ہیں جو اسلامی معاشرہ اور اس کے فطری نتیجہ اسلامی حکومت کو مستحکم رکھنے اور اس کو انتشار سے بچانے کے لیے ضروری ہیں۔

اس سورہ کے مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ اس کا آغاز اس حقیقت کے اظہار

---

[1] سابق اور لاحق سورہ میں ربط کی یہ صورت صرف انہی دو سورتوں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس کی متعدد نہایت لطیف مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں جو اپنے موقع پر بیان ہوں گی۔

سے ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ اس عقیدے پر قائم ہے کہ مرد اور عورت سب کا خالق اللہ وحدہٗ لاشریک ہی ہے، اُسی نے سب کو ایک آدم و حوا سے وجود بخشا ہے۔ اس وجہ سے خدا اور رحم سب کے درمیان مشترک ہیں۔ اس کے بعد معاشرے کے سب سے زیادہ کمزور عناصر یتیموں اور عورتوں کے حقوق معین فرمائے ہیں اور ان کو ادا کرنے پر زور دیا ہے۔ پھر اسی تعلق سے وراثت کی تقسیم سے متعلق قانون کی وضاحت فرمائی ہے۔ پھر مسلمانوں کے باہمی حقوق و فرائض پر زور دیتے ہوئے اللہ، رسول اور اولوالامر کی اطاعت پر سب کو مجتمع و متفق رہنے کی تاکید فرمائی، اس لئے کہ اسی چیز پر اسلامی حکومت کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد تفصیل کے ساتھ منافقین کی قلعی کھولی ہے جو اسلامی معاشرے کے اندر ناسور کی حیثیت رکھتے تھے اور مسلمانوں کے اندر ان کے دشمنوں — یہود و نصاریٰ — کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اس روشنی میں غور کیجئے تو اس سورہ میں گویا اس ارتباط باہمی کی بنیادیں استوار کی گئی ہیں جس کی ہدایت پر سابق سورہ ختم ہوئی تھی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

یہ سورہ کے عمود اور سابق سورہ کے ساتھ اس کے تعلق کی طرف ایک اجمالی اشارہ تھا۔ اب ہم اس کے مطالب کا تجزیہ بھی کئے دیتے ہیں تاکہ پوری سورہ کے مضامین پر ایک سرسری نگاہ پڑ جائے۔

(۱- ۲) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی ہدایت جس نے سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، تمام مرد اور تمام عورتیں ایک ہی آدمؑ و حوا کی اولاد ہیں اس وجہ سے خدا اور رشتہ رحم سب کے درمیان مشترک ہے۔ اس کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ سب خدا سے ڈرتے رہیں اور سب رشتۂ رحم کا احترام ملحوظ رکھیں۔ انہی دو بنیادوں پر اسلامی معاشرہ کی عمارت قائم ہے۔

یتیموں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید اور اس بات کی ممانعت کہ زورآور سرپرست اپنے رشتہ دار یتیموں کے اچھے مال اپنے بُرے مال سے بدلتے یا اپنے مال کے ساتھ ملا کر اس کو ہڑپ کرنے کی تدبیریں کریں۔ یتیموں کے حقوق کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے ان کی ماؤں سے نکاح کی اجازت اور اس کے لئے چار تک کی قید، عدل اور ادائے مہر کے شرائط کے ساتھ تعدد ازواج کی رخصت۔

سرپرستوں کو اس بات کی ہدایت کہ وہ اس وقت تک یتیموں کے مال و جائداد اُن کے حوالہ نہ کریں جب تک اُن کے اندر معاملات کی سوجھ بوجھ نہ پیدا ہو جائے لیکن اس دوران میں ان کی ضروریات اور ان کی دلداری کا پورا خیال رکھیں۔ جب اُن میں معاملات کی سوجھ بوجھ پیدا ہو جائے تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دیا جائے۔ اس تولیت کے دوران میں اگر کوئی سرپرست غریب ہو تو یتیم کے مال میں سے بقدر کفاف لے سکتا ہے لیکن اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یتیم کے بڑے ہو جانے کے اندیشے سے اس کے

بڑے ہونے سے پہلے ہی اس کی ساری املاک دبا لے اور ٹھکانے لگا دینے کی کوشش کرے۔

(۷-۱۴) تقسیم وراثت کے ضابطے کی تفصیل تاکہ ضعیف و قوی سب کے حقوق معین ہو جائیں اور معاشرے میں ظلم و حق تلفی اور نزاع و مخاصمت کے دروازے بند ہو جائیں۔

(۱۵-۱۸) معاشرے کو فواحش سے پاک رکھنے کے لئے ایک ابتدائی حکم اور اس کے تعلق سے اس امر کی وضاحت کہ کن لوگوں کی توبہ قبول ہوتی ہے، کن کی نہیں؟

(۱۹-۲۱) اس امر کا بیان کہ عورت مال وراثت نہیں ہے کہ باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملے عورتوں سے اپنا دیا ہوا مال واپس لینے کے لئے ان کو تنگ نہ کیا جائے۔ اگر کوئی شخص ایک عورت کو چھوڑنا اور دوسری سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو محض مال اینٹھنے کے لئے پہلی کو تہمت اور بہتان کا ہدف نہ بنائے۔

(۲۲-۲۵) باپ کی منکوحہ کے ساتھ بیٹے کو نکاح کی ممانعت اور ان عورتوں کی تفصیل جن کے ساتھ نکاح ناجائز ہے۔ نیز شرائط نکاح کا بیان تاکہ معاشرہ بدکاری و بے حیائی اور ظلم و زیادتی کے مفاسد سے پاک رہے۔ جو لوگ اس وقت آزاد عورتوں سے نکاح کی استطاعت نہیں رکھتے تھے ان کو مسلمان لونڈیوں سے بعض شرائط کے ساتھ نکاح کی اجازت اور قید نکاح میں آجانے کے بعد اگر ان لونڈیوں سے بدکاری کا صدور ہو تو ان کے لئے تعزیر کا ضابطہ۔

(۲۶-۲۸) مسلمانوں کو آگاہی کہ اللہ تعالیٰ ان احکام و ہدایات کے ذریعے سے تمہاری رہنمائی ایمان، عمل صالح اور توبہ و اصلاح کی اس شاہ راہ کی طرف فرما رہا ہے جو اس نے ہمیشہ سے اپنے صالح بندوں کے لئے پسند فرمائی ہے۔ ان احکام و ہدایات میں اس نے وہ سہولت بھی ملحوظ رکھی ہے جو لوگوں کی طبعی کمزوری کے پیش نظر ضروری تھی تو خبردار ان نفس پرستوں کے ورغلانے میں نہ آجانا جو تمہیں پاکیزگی کی اس شاہ راہ سے ہٹا کر شہوات کی وادیوں میں بھٹکا دینے کے لئے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں۔

(۲۹-۳۱) مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مال ناجائز ذرائع سے کھانے اور ایک دوسرے کا خون بہانے کی ممانعت۔ خدا رحیم ہے اس وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے آپس میں ایک دوسرے کے لئے رحیم ہوں۔ جو لوگ معاشرے میں ظلم و عدوان کی تخم ریزی کریں گے وہ سب جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔ البتہ جو لوگ بڑے گناہوں سے بچتے رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کے چھوٹے گناہوں سے درگزر فرمائے گا۔

(۳۲-۳۳) شریعت میں عورت اور مرد دونوں کے لئے جو حدود و حقوق معین کر دیئے گئے ہیں سب ان کے اندر ہی رہیں۔ اپنے اپنے حدود کے اندر ہر ایک خدا کے ہاں اپنی محنت کا اجر پائے گا۔ اس لئے ایک دوسرے کی ریس اور ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ خدا نے حقوق بھی معین فرما دیئے ہیں اور فرائض بھی اور وہ سب کو دیکھ بھی رہا ہے۔

(۳۴-۳۵) خاندان اور معاشرے میں سربراہی اور قوامیت کا مقام مرد کو حاصل ہے۔ اپنی خلقی صفات

اور کفالتی ذمہ داریوں کے لحاظ سے وہی اس کے لئے موزوں ہے۔ نیک بیبیاں اس حق کا احترام کرتی ہیں۔ جن عورتوں سے سرکشی کا اندیشہ ہو ان کو ان کے شوہر نصیحت کریں اور اگر ضرورت محسوس کریں تو ایک حد مناسب تک ان کو تنبیہ بھی کر سکتے ہیں اور اگر محسوس ہو کہ فریقین کے اختلاف کی نوعیت کچھ زیادہ شدید ہے تو اس کے لئے یہ تدبیر اختیار کی جائے کہ میاں اور بیوی دونوں کے خاندانوں سے ایک ایک پنچ مقرر کر دیا جائے، جو حالات کی اصلاح کی کوشش کریں۔

(۳۶-۴۰) خدا، والدین، اقربا، یتامیٰ، مساکین، پڑوسی (عام اس سے کہ قرابت مند ہو یا غیر قرابت مند، مستقل ہو یا عارضی اور وقتی) مسافر اور غلام، سب کے حقوق پہچاننے اور ادا کرنے کی تاکید۔ خدا کو وہی بندے پسند ہیں جو متواضع اور نرم مزاج ہوں، وہ اُن لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اکڑنے والے، فخر کرنے والے، بخیل اور بخل کا مشورہ دینے والے ہوں، جو اول تو ادائے حقوق میں خرچ ہی نہ کریں اور اگر کریں تو محض ریا و نمائش کے لئے۔ ادائے حقوق اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے گھاٹے میں رہنے والے نہیں۔ ان کے لئے خدا کے ہاں بڑا اجر ہے۔

(۴۱-۴۲) ان لوگوں کے حال پر اظہار افسوس جو آخرت سے بالکل بے پروا ہو کر اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی پر اٹھے ہوئے تھے، ایمان و عمل صالح کی صحیح راہ نہ خود اختیار کرتے تھے نہ دوسروں کو اختیار کرنے دینا چاہتے تھے۔

(۴۳-۴۵) خدا کے سب سے بڑے حق ـــ نماز ـــ کے بعض آداب و شرائط اور اس کے بعض مفسدات کا بیان اور ان مفسدات کے ازالہ کی تدبیر۔

(۴۶-۴۷) یہود کی بعض شرارتوں کا حوالہ جو وہ اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی نگاہوں سے گرانے کے لئے کر رہے تھے اور اس شرارت کے آخری نتائج سامنے آنے سے پہلے ان کو توبہ اور اصلاح کی دعوت۔

(۴۸-۵۷) یہود اپنی پاکی و برتری کے جھوٹے دعوے کر کے مسلمانوں کو گرانے کی جو کوشش کر رہے تھے، یہاں تک کہ مشرکین کو بھی ان پر ترجیح دیتے تھے، اُس کی تردید کہ یہ ساری باتیں محض ان کے حسد کا نتیجہ ہیں لیکن ان کے حسد کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے نبی خاتمؐ اور ان کی امت کے لئے یہ فیصلہ فرما لیا ہے کہ وہ ان کو کتاب و حکمت اور ایک عظیم حکومت عطا فرمائے گا اور یہ حاسد یہود ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ یہ حکومت گویا اسلامی معاشرے کا قدرتی ثمرہ ہے۔

(۵۸-۵۹) مسلمانوں کو اس بات کی نصیحت کہ اب اہل کتاب سے چھین کر شریعت الٰہی کی یہ امانت تمہارے سپرد جو کی جا رہی ہے تو تم یہود کی طرح اس امانت میں خیانت کرنے والے نہ بن جانا بلکہ اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے والے بننا اور ہر حال میں عدل پر قائم رہنا۔ نیز اللہ اور رسول اور اپنے

اولوالامر کی اطاعت کرتے رہنا، اس کے بغیر اس امانت کی ذمہ داریاں ادا نہیں ہو سکتیں اور اگر کبھی امر میں اختلاف واقع ہو تو ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو اللہ و رسول ہی کی طرف لوٹانا تاکہ اس نزاع کا صحیح فیصلہ ہو سکے اور وہ تمھارے شیرازے کو درہم برہم نہ کرنے پائے۔

(۶۰-۷۰) منافقین کو ملامت کہ وہ اللہ اور رسول کی اطاعت پر مجتمع ہونے کے بجائے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں سے میل جول رکھتے ہیں اور اس کو بڑی دانش مندانہ سیاست سمجھتے ہیں حالانکہ اس وقت تک اُن کا ایمان ہی معتبر نہیں ہے جب تک وہ پورے طور پر اپنے آپ کو پیغمبر کے حوالہ نہ کر دیں اور ہر معاملے میں اُن کی اطاعت نہ کریں۔

(۷۱-۷۶) مسلمانوں کو اپنی مدافعت اور دارالکفر میں گھرے ہوئے مظلوم مسلمانوں کی آزادی کے لئے جہاد کی تاکید۔ ان منافقین کو ملامت جو جہاد سے جی چراتے تھے، مسلمانوں کی ہمتیں پست کرتے تھے، مال غنیمت میں حصہ داری کے تو متمنی و مدعی تھے لیکن خطرہ کوئی بھی مول لینے کے لئے تیار نہ تھے۔

(۷۷-۸۰) منافقین کی اس متضاد روش پر ملامت کہ جب تک جہاد کا حکم نہیں ہوا تھا اس وقت تک تو وہ اپنی منافقت پر پردہ ڈالنے کے لئے جہاد کے لئے بڑی بے قراری کا اظہار کرتے تھے لیکن اب کہ جہاد کا حکم دے دیا گیا تو جس طرح خدا سے ڈرنا چاہئے، اس طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اسلام کے دشمنوں سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ موت سے کہیں بھی مفر نہیں۔ ان کی کج فہمی کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اس کو تو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن اگر کوئی ابتلا پیش آ جائے تو اس کو پیغمبر کی بے تدبیری کا نتیجہ قرار دیتے ہیں حالانکہ خیر و شر سب خدا ہی کی طرف سے ہے البتہ شر جو پیش آتا ہے تو اُن کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ جو تمھاری اطاعت کریں وہی درحقیقت خدا کی اطاعت کرنے والے ہیں، جو تمھاری اطاعت سے گریز اختیار کریں ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ تم پر ان کی ذمہ داری نہیں ہے۔

(۸۱-۸۵) منافقین کی روش کی مزید تفصیل کہ جب پیغمبر کے سامنے ہوتے ہیں تب تو ان کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرتے ہیں لیکن جب وہاں سے ہٹتے ہیں تو ہر بات میں میں میکھ نکالنا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ پیغمبر جو کچھ بھی کہتے ہیں سب خدا ہی کی طرف سے ہے۔ قرآن کی کامل ہم آہنگی شاہد ہے کہ اس میں کوئی چیز بھی غیر اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔

پھر منافقین کی اس شرارت کی طرف اشارہ کہ اگر ان کو امن یا خطرے کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو سنسنی پیدا کرنے کے لئے اس کو فوراً پھیلا دیتے ہیں حالانکہ صحیح روش یہ ہے کہ اس کو رسول اور ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کرتے تاکہ وہ اس پر غور کر کے اس کے تدارک کے لیے صحیح قدم اٹھاتے لیکن یہ مسلمانوں کے دل بٹھانے کے لئے یہ شرارت کرتے ہیں۔ انھیں یاد رکھنا چاہیئے

کہ جو کسی حق کی تائید میں کوئی کلمۂ خیر کہے گا تو اس کو اس میں سے حصہ ملے گا اور جو کسی حق کی مخالفت میں کلمۂ شر زبان سے نکالے گا تو اس کو اس میں سے حصہ ملے گا۔

(۸۶-۸۷) منافقین کی مذکورہ بالا روش کے باوجود مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ معاشرہ کے اندر ان کو نکو بنانے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ ظاہری سلوک ان کے ساتھ وہی رکھا جائے جو مسلمانوں کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ یعنی اُن کے ساتھ سلام کلام باقی رکھا جائے۔

(۸۸-۹۱) جو منافقین دارالکفر میں پڑے ہوئے ہیں اور جن کی ساری ہمدردیاں کفار کے ساتھ ہیں، دارالاسلام کے مسلمانوں کو ان کے ساتھ اس وقت تک دوستی و حمایت کا تعلق پیدا نہیں کرنا چاہیئے جب تک وہ دارالکفر کو چھوڑ کر دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کر آئیں۔ اگر وہ ہجرت نہ کریں تو ان کے ساتھ بھی اسی طرح جنگ جائز ہے جس طرح دشمن کے ساتھ۔ اس سے صرف وہ مستثنیٰ ہوں گے جن کا تعلق یا تو کسی ایسی قوم سے ہے جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ ہے یا جن کے متعلق یہ علم ہے کہ یہ اپنی کمزوری کی وجہ سے نہ تو اپنی قوم کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنا چاہتے ہیں نہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنی قوم سے لڑنے کی ہمت رکھتے۔ مگر جن کے متعلق معلوم ہے کہ ان کے اوپر خود ان کی قوم کا یا دوسرے کفار کا دباؤ پڑ جائے گا تو وہ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے تو وہ دشمن ہی کے حکم میں ہیں۔ ان سے جنگ جائز ہے۔

(۹۲-۹۴) دارالحرب میں پڑے ہوئے مسلمانوں کے جان و مال کے احترام سے متعلق بعض احکام۔

(۹۵-۱۰۰) دارالحرب کے مسلمانوں کو ہجرت اور جہاد کی تاکید تاکہ وہ کفر کے ماحول سے نکل کر اسلامی معاشرہ میں آئیں اور اپنے ایمان کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کو قوت بہم پہنچائیں۔

(۱۰۱-۱۰۴) جہاد کے لئے ہر وقت مستعد رہنے کے حکم کے تعلق سے خطرے کی حالت میں نماز کا طریقہ۔

(۱۰۵-۱۲۶) ان مسلمانوں کو تنبیہ جو کھلے ہوئے منافقین کے معاملے میں بھی مداہنت برتتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کی طرف سے مدافعت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ فرمایا کہ پیغمبر کے خلاف منافقین کی سرگوشیاں اور سرگرمیاں اور اسلام کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرنے کی کوشش کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ یہ چیز اپنی فطرت کے لحاظ سے شرک ہے اور شرک کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف فرمانے والا نہیں ہے۔ خدا کے ہاں جھوٹی آرزوئیں کام آنے والی نہیں ہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح کام آنے والا ہے۔

(۱۲۷-۱۳۰) ابتدائے سورہ میں جو احکام یتیموں، ان کی ماؤں اور عورتوں سے متعلق بیان ہوئے

ان کے متعلق بعد میں پیدا ہونے والے بعض سوالوں کے جواب۔

(۱۳۱-۱۴۷) مسلمانوں کو پوری سختی کے ساتھ اس بات کی تاکید کہ جو کچھ حکم دیا جا رہا ہے اس پر بے چون وچرا عمل کرو، اس سے گریز و فرار کی راہیں نہ اختیار کرو اور منافقین کی کفر دوستی سے پوری شدت کے ساتھ اظہار بیزاری اور یہ تنبیہ کہ منافقین اور کفار دونوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔

(۱۴۸-۱۴۹) مسلمانوں کو اس بات کی نصیحت کہ ہر چند منافقین ہر ملامت کے سزاوار ہیں لیکن بے ضرورت بدزبانی و سخت کلامی ان کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

(۱۵۰-۱۶۲) اہل کتاب بالخصوص یہود کو، جو اس مرحلے میں طرح طرح کی سازشوں اور مختلف قسم کے اعتراضات سے مخالفت کے محاذ کو تقویت پہنچا رہے تھے سرزنش اور ان کے اعتراضات کے جواب۔

(۱۶۳-۱۷۵) قرآنی دعوت کے مرتبہ و مقام کی وضاحت اور اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کو دعوت و نصیحت کہ اس روشنی کی، جو اللہ نے اُتاری ہے، قدر کریں اور اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے نہ پھریں۔

(۱۷۶) ایک آیت مبینہ جو شروع میں بیان کردہ احکام کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی۔

مذکورہ بالا تجزیے پر تدبر کی نگاہ ڈالئے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ آیت ۱۰۴ تک تو معاشرے سے متعلق احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں اور ضمناً کہیں کہیں اس ردِ عمل کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے جو ان احکام کا مخالفین پر ہوا لیکن آیت ۱۰۵ کے بعد کلام کا رُخ بالتدریج اسلامی نظامِ حکومت کی اساسات کی وضاحت اور اسلام کے مخالفین کی طرف مُڑ گیا ہے اور اس رویے پر تفصیل کے ساتھ تنقید کی گئی ہے جو اس نظامِ حق کی مزاحمت کے لئے اہل کتاب اور منافقین نے اختیار کیا۔ منافقین اس میں خاص طور پر زد میں آئے ہیں۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے سورہ کے دیباچہ میں ظاہر کی، یہ ہے کہ معاشرے اور حکومت کے استحکام کے نقطۂ نظر سے اس مارِ آستین گروہ کی بیخ کنی ضروری تھی۔

قرآن مجید کے متعلق یہ بات یاد رکھئے کہ یہ صرف فقہی احکام کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ دعوت کا صحیفہ بھی ہے۔ اس وجہ سے اس کے لئے اس ردِ عمل سے تعرض ناگزیر ہے جس سے ان احکام کی تعلیم کے دوران میں سابقہ پیش آیا۔ چنانچہ قرآن ہر جگہ ان احکام کے پہلو بہ پہلو ان حالات سے بھی بحث کرتا ہے جو مخالفین نے اس وقت بالواسطہ یا بلاواسطہ پیدا کئے اور ان سے بحث کرنا تعلیم و دعوت کے نقطۂ نظر سے نہایت ضروری ہے۔ لیکن جو لوگ قرآن کی اس خصوصیت سے واقف نہیں ہیں وہ اس بات سے حیران ہوتے ہیں کہ ان فقہی احکام کے ساتھ منافقین و معاندین کے اس تفصیلی ذکر کا کیا موقع تھا۔

سُوْرَةُ النِّسَآءِ (۴)

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۱۷۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیت ۱ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ
وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا
كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ
وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①

ترجمۂ آیت ۱ اے لوگو، اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ اور ڈرو اس اللہ سے جس کے واسطے سے تم باہدگر طالبِ مدد ہوتے ہو اور ڈرو قطعِ رحم سے۔ بے شک اللہ تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔ ۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت

خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا کے معنی ہیں اسی کی جنس سے۔ اگرچہ اس کے معنی لوگوں نے اور بھی لیے ہیں لیکن جس بنیاد پر لیے ہیں وہ نہایت کمزور ہے۔ ہم نے جو معنی لیے ہیں اس کی تائید خود قرآن میں موجود ہے

سورۂ نحل میں فرمایا ہے وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (۷۲) ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں، اس کے یہ معنی کوئی بھی نہیں لے سکتا کہ یہ بیویاں ہر ایک کے اندر سے پیدا ہوئیں۔

تساءل کا مفہوم

'تساءل' کے معنی باہدگر ایک دوسرے سے پوچھنے، سوال کرنے اور مانگنے کے ہیں۔ اسی سے ترقی کر کے ایک دوسرے سے طالب مدد ہونے کے معنی میں بھی یہ استعمال ہوتا ہے۔ سورۂ مومنون میں ہے فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ (جب صور پھونکا جائے گا تو نہ ان کے نسبی تعلقات باقی رہیں گے اور نہ وہ ایک دوسرے سے طلب مدد ہی کر سکیں گے) ۱۰۱

ارحام کا مفہوم

'ارحام' سے مراد رحمی رشتے ہیں۔ اس کو اللہ پر عطف کر کے اس کی وہ اہمیت واضح فرمائی ہے جو دین میں اس کی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خدا کے بعد پہلی چیز جو تقویٰ اور احترام کی سزاوار ہے وہ رشتۂ رحم اور اس کے حقوق ہیں۔ خدا سب کا خالق ہے اور رحم سب کے وجود میں آنے کا واسطہ اور ذریعہ ہے اس وجہ سے خدا اور رحم کے حقوق سب پر واجب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی بنیاد پر رحم کا یہ درجہ رکھا ہے کہ جو اس کو جوڑتا ہے خدا اس سے جڑتا ہے اور جو اس کو کاٹتا ہے خدا اس سے کٹتا ہے۔ یہ بات ایک حدیث قدسی سے بھی ثابت ہے اور یہی بات قرآن سے بھی نکلتی ہے۔

معاشرہ کی تنظیم سے متعلق بنیادی حقائق

زیر بحث آیت ایک جامع تمہید ہے ان تمام احکامات و ہدایات کے لیے جو انسانی معاشرہ کی تنظیم کے لیے اللہ تعالیٰ نے اتارے ہیں اور جو آگے آرہے ہیں۔ اس تمہید میں جو باتیں بنیادی حقائق کی حیثیت سے واضح کی گئی ہیں ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس آیت میں جس تقویٰ کی ہدایت کی گئی ہے اس کا ایک خاص موقع و محل ہے۔ اس تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ یہ خلق آپ سے آپ وجود میں نہیں آگئی ہے بلکہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہے جو سب کا خالق بھی ہے اور سب کا رب بھی۔ اس وجہ سے کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس کو ایک بے مالک اور بے راعی کا ایک آوارہ گلہ سمجھ کر اس میں دھاندلی مچائے اور اس کو اپنے ظلم و تعدی کا نشانہ بنائے بلکہ ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اس کے معاملات میں انصاف اور رحم کی روش اختیار کرے ورنہ یاد رکھے کہ خدا بڑا زور آور اور بڑا منتقم و قہار ہے۔ جو اس کی مخلوق کے معاملات میں دھاندلی مچائیں گے وہ اس کے قہر و غضب سے نہ بچ سکیں گے۔ وہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔

دوسری یہ کہ تمام نسل انسانی ایک ہی آدم کا گھرانا ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آدم و حوا کی نسل سے پیدا کیا ہے۔ نسل آدم ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ اس پہلو سے عربی و عجمی، احمر و اسود اور افریقی و ایشیائی میں کوئی فرق نہیں، سب خدا کی مخلوق اور سب آدم کی اولاد ہیں۔ خدا اور رحم کا رشتہ سب کے درمیان مشترک ہے اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ سب ایک ہی خدا کی بندگی کرنے والے

اور ایک ہی مشترک گھرانے کے افراد کی طرح آپس میں حق و انصاف اور صبر و محبت کے تعلقات رکھنے والے بن کر زندگی بسر کریں۔

تیسری یہ کہ جس طرح آدمؑ تمام نسلِ انسانی کے باپ ہیں اسی طرح حوا تمام نسلِ انسانی کی ماں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حوا کو آدمؑ ہی کی جنس سے بنایا ہے اس وجہ سے عورت کوئی ذلیل، حقیر، فروتر اور فطری گنہگار مخلوق نہیں ہے بلکہ وہ بھی شرفِ انسانیت میں برابر کی شریک ہے۔ اس کو حقیر و ذلیل مخلوق سمجھ کر نہ اس کو حقوق سے محروم کیا جا سکتا نہ کمزور خیال کر کے اس کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔

چوتھی یہ کہ خدا اور رحم کا واسطہ ہمیشہ سے باہمی تعاون و ہمدردی کا محرک رہا ہے۔ جس کو بھی کسی مشکل یا خطرے سے سابقہ پیش آتا ہے وہ اس میں دوسروں سے خدا اور رحم کا واسطہ دے کر اپیل کرتا ہے اور یہ اپیل چونکہ فطرت پر مبنی ہے اس وجہ سے اکثر حالات میں یہ مؤثر بھی ہوتی ہے۔ لیکن خدا اور رحم کے نام پر حق مانگنے والے اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ جس طرح ان واسطوں پر حق مانگنا حق ہے اسی طرح ان کا حق ادا کرنا بھی فرض ہے۔ جو شخص خدا اور رحم کے نام پر لینے کے لیے تو چوکس ہے لیکن دینے کے لیے آمادہ نہیں ہے وہ خدا سے دھوکا بازی اور رحم سے بے وفائی کا مجرم ہے اور اس جرم کا ارتکاب وہی کر سکتا ہے جس کا دل تقویٰ کی روح سے خالی ہو۔ خدا اور رحم کے حقوق پہچاننے والے جس طرح ان ناموں سے فائدے اٹھاتے ہیں اسی طرح ان کی ذمہ داریاں بھی اٹھاتے ہیں اور درحقیقت حق طلبی و حق شناسی کا یہی توازن ہے جو صحیح اسلامی معاشرے کا اصلی جمال ہے۔ اسی حقیقت کی طرف وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ کا ٹکڑا اشارہ کر رہا ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲-۱۰

آگے کی آیات میں تقویٰ، عدل، رحم اور رحم کی انہی بنیادوں پر جن کا ذکر اوپر ہوا، سب سے پہلے یتیموں کے سرپرستوں کو مخاطب کر کے ان کی ذمہ داریاں بتائیں اور اس مشکل فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عدل و انصاف کے اندر رہتے ہوئے جو صورتیں ممکن تھیں ان کی طرف رہنمائی فرمائی۔ مثلاً یہ کہ کوئی شخص اگر محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے زیرِ سرپرستی یتیموں کے مال اور حقوق کی پوری احتیاط کے ساتھ نگرانی اسی صورت میں کر سکتا ہے جب کہ وہ ان کی ماں کو بھی اپنے ساتھ اس ذمہ داری میں شریک کر لے تو اس مقصد کے لیے وہ تعددِ ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ عدل، چار تک کی قید اور مہر کے عام قانون کی ان کے باب میں بھی پابندی کرے۔ یہ عذر نہ پیدا کرے کہ چونکہ ان میں سے کسی سے اس نے نکاح کیا ہے تو انہی کی اولاد کی مصلحت سے کیا ہے اس وجہ سے وہ ان کے بارے میں عدل اور مہر وغیرہ کی ذمہ داریوں سے آزاد ہے۔

اس کے بعد بتایا ہے کہ یتیم کا مال کب اس کے حوالے کرنا چاہیے اور زمانۂ سرپرستی میں ایک نادار یا ایک مال دار سرپرست کو اس مال سے فائدہ اُٹھانے کے معاملے میں کیا روش اختیار کرنی چاہیے۔

پھر ہدایت فرمائی ہے کہ شریعت میں وارثوں کے حقوق معین ہو جانے کے بعد بھی اگر کسی مورث کے مال کی تقسیم کے وقت اقربا، یتامیٰ اور مساکین آجائیں تو گو قانونی طور پر اس میں ان کا حق نہ بنتا ہو تاہم اخلاقی طور پر ان کو اس میں سے کچھ دے دلا کر رخصت کیا جائے اور ان کی دلداری کی جائے۔

آخر میں فرمایا کہ جو لوگ ظلم و زیادتی کر کے یتیموں کا مال ہڑپ کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور بالآخر وہ دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲-۱۰
وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ
وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا
كَبِيْرًا ﴿۲﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا
مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ
خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ
ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ ﴿۳﴾ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ
نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَىْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ
هَنِيْٓــًٔا مَّرِيْٓــًٔا ﴿۴﴾ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ
اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا
لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۵﴾ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا
النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ
اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ
وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ

بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا
عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا
تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا
تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ
نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝۷ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ
الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا
مَّعْرُوْفًا ۝۸ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً
ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا
سَدِيْدًا ۝۹ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا
ع ۱۲ يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰

ترجمۂ آیات ۲-۱۰

اور یتیموں کے مال ان کے حوالہ کرو، نہ اپنے بُرے مال کو ان کے اچھے مال سے بدلو اور نہ ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ گڈمڈ کرکے اس کو ہڑپ کرو۔ بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ۲

اور اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے معاملے میں انصاف نہ کر سکو گے تو عورتوں میں سے جو تمھارے لیے جائز ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر لو۔ اور اگر ڈر ہو کہ ان کے درمیان عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر بس کرو یا پھر کوئی لونڈی جو تمھاری ملک میں ہو۔ یہ طریقہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو۔ اور ان عورتوں کو ان کے مہر دو مہر کی حیثیت سے

پس اگر وہ اس میں سے تمہارے لیے کچھ چھوڑ دیں اپنی خوشی سے تو تم اس کو کھاؤ کہ وہ تمہیں راس اور سازگار ہے۔ ۴-۳

اور تم وہ مال جس کو خدا نے تمہارے لیے قیام و بقا کا ذریعہ بنایا ہے نادان یتیموں کے حوالہ نہ کرو۔ ہاں اس سے ان کو فراغت کے ساتھ کھلاؤ، پہناؤ اور دستور کے موافق ان کی دلداری کرتے رہو اور ان یتیموں کو جانچتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں تو اگر تم ان کے اندر سوجھ بوجھ پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو اور اس ڈر سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے اسراف اور جلد بازی کر کے اُن کا مال ہڑپ نہ کرو اور جو غنی ہو اس کو چاہیے کہ وہ پرہیز کرے اور جو محتاج ہو تو وہ دستور کے مطابق اس سے فائدہ اُٹھائے۔ پھر جب تم ان کا مال ان کے حوالے کرنے لگو تو ان پر گواہ ٹھہرا لو۔ ویسے اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔ ۵-۶

والدین اور اقربا کے ترکے میں سے مردوں کے لیے بھی ایک حصہ ہے اور والدین اور اقربا کے ترکے میں سے عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے خواہ ترکہ کم ہو یا زیادہ۔ ایک مقررہ حصہ۔ اور اگر تقسیم کے وقت قرابت مند، یتیم اور مسکین آ موجود ہوں تو اس میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان سے دستور کے مطابق بات کرو۔ ان لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو اپنے پیچھے اگر ناتوان بچے چھوڑتے تو ان کے معاملے میں بہت اندیشہ ناک ہوتے۔ پس انھیں چاہیے کہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات زبان سے نکالیں۔ ۷-۹

جو لوگ ظلم و ناانصافی سے یتیموں کے مال ہڑپ کر رہے ہیں وہ تو بس اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور وہ دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے۔ ۱۰

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۔ (۲)

آیت کا خطاب یتیموں کے سرپرستوں سے ہے

اس آیت میں خطاب یتیموں کے اولیاء اور سرپرستوں سے ہے اور اوپر والی آیت پر اس کا عطف اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں جس بات کا حکم دیا جا رہا ہے یا جس چیز سے روکا جا رہا ہے اس کی بنیاد انھی اصولی حقائق پر ہے جو اوپر مذکور ہوئے۔

خبیث و طیب کا مفہوم

'خبیث' اور 'طیب' کے الفاظ جس طرح ان اشیا اور دخولات کے لیے استعمال ہوتے ہیں جو اخلاقی و شرعی نقطۂ نظر سے خبیث یا طیب ہوتی ہیں اسی طرح، جیسا کہ بقرہ کی آیت ۲۶۷ کے تحت گزر چکا ہے، ان اشیا کے لیے بھی ان کا استعمال عربی میں معروف ہے جو مادی اعتبار سے ناقص یا عمدہ ہوتی ہیں۔

'اکل' کے ساتھ 'الیٰ' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں 'ضمّا' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔

یتیموں کے مال کی حفاظت کے لیے ضروری ہدایات

یتیموں کے بعض سرپرست، جن کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہوتے ہیں اوّل تو یتیموں کا سارا حق ہی دبا بیٹھتے ہیں اور اگر دبا نہیں بیٹھتے تو اس میں خورد برد کرنے کی نیت سے، انتظامی سہولت کی نمائش کر کے، ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا لیتے ہیں اور اس طرح اپنے لیے ہاتھ رنگنے کے نہایت آسان مواقع پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کو ہدایت فرمائی کہ یتیموں کا مال یتیموں کو دو، خود ہضم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ پھر اس مقصد کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال ہوتے ہیں ان سے واضح لفظوں میں بھی روک دیا کہ نہ اپنا ناقص مال ان کے اچھے مال سے بدلنے کی تدبیریں کرو اور نہ ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر اس کو خورد برد کرنے کی کوشش کرو۔

اگر کوئی سرپرست انتظامی سہولت کے نقطۂ نظر سے یتیم کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانا چاہے تو اس کی اجازت اگرچہ، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۰ کے تحت گزر چکی ہے، شریعت نے دی ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس اختلاط و اشتراک سے مقصود اصلاح ہو نہ کہ افساد۔ بصورت دیگر یتیم کے حق کی حفاظت اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا (۳)

یتامیٰ کا مفہوم

'یتامیٰ' کا لفظ ان نابالغوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا باپ فوت ہو چکا ہو، عام اس سے کہ وہ نابالغ، لڑکے ہیں یا لڑکیاں۔ صرف نابالغ لڑکیوں کے لیے اس کا استعمال نہ عربی زبان میں معلوم ہے، نہ قرآن مجید اور حدیث میں۔ قرآن میں یہ لفظ کم از کم پندرہ جگہ اسی جمع کی صورت میں

استعمال ہوا ہے لیکن کسی جگہ بھی صرف یتیم بچیوں کے مفہوم میں نہیں استعمال ہوا ہے۔

'مَا طَابَ لَكُمْ' کا مفہوم

'مَا طَابَ لَكُمْ' کے معنی بعض اہل تاویل نے 'مَا حَلَّ لَكُمْ' (یعنی جو عورتیں تمہارے لیے جائز ہوں) لیے ہیں۔ یہ مفہوم لفظ کے استعمالات کے مطابق ہے۔ اگرچہ ائمۂ لغت واہل نحو نے استعمال اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو راضی ہوں۔ آگے والی آیت میں 'فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ' کے الفاظ سے اس مفہوم کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ نیز یہ مفہوم بھی اس کا ہو سکتا ہے کہ جن سے تمہاری زندگی میں خوشگواری پیدا ہو۔ یہاں یہ تمام معانی بنتے ہیں لیکن ہم نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موقع و محل سے یہ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

'نِسَاء' سے مراد یتامیٰ کی ماںئیں ہیں

'نِسَاء' کا لفظ اگرچہ بظاہر یہیں عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے عام عورتیں مراد نہیں ہیں بلکہ یتیموں کی مائیں مراد ہیں۔ عام بول کر خاص مراد لینا، بشرطیکہ قرینہ موجود ہو، عربی زبان میں بہت معروف ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں بکثرت ہیں۔ یہ قرینہ چونکہ مضمون کے تدریجی ارتقا سے خود بخود واضح ہو جائے گا اس وجہ سے یہاں اس کے دلائل کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

مصلحت کے لیے تعدد ازدواج کی اجازت

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم (مخاطب یتیموں کے اولیا اور سرپرست ہی ہیں) بر بنائے احتیاط یہ اندیشہ رکھتے ہو کہ تمہارے لیے یتیموں کے مال اور ان کے دوسرے حقوق کی کما حقہ نگہداشت ایک مشکل کام ہے، تم تنہا اپنی ذمہ داری پر اس سے بحسن و خوبی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، اگر یتیموں کی ماں بھی اس ذمہ داری میں تمہارے ساتھ شریک ہو جائے تو تم اس فرض سے عمدہ طریقے پر عہدہ برآ ہو سکتے ہو اس لیے کہ یتیموں کے ساتھ جو قلبی لگاؤ اس کو ہو سکتا ہے، کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا اور ان کے حقوق کی نگہداشت جس بیداری کے ساتھ وہ کر سکتی ہے کسی اور کے لیے ممکن نہیں تو ان میں سے جو تمہارے لیے جائز ہوں ان سے تم نکاح کر لو، بشرطیکہ عورتوں کی تعداد کسی صورت میں چار سے زیادہ نہ ہونے پائے اور تم ان کے درمیان عدل قائم رکھ سکو۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ عدل نہیں قائم رکھ سکو گے تو پھر ایک سے زیادہ نکاح نہ کرو۔ فرمایا کہ یہ طریقہ تمہیں حق و انصاف پر استوار رکھنے کے نقطۂ نظر سے زیادہ صحیح ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بیویوں کے معاملے میں عدل کی شرط ایک ایسی اٹل شرط ہے کہ یتیموں کے حقوق کی نگہداشت جیسی اہم دینی مصلحت کے پہلو سے بھی اس میں کسی لچک کی شریعت نے گنجائش نہیں رکھی ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ

یہاں بعض لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو گا کہ آیت کی تاویل اگر یہ ہے جو بیان ہوئی تو اس سے تو صاف یہ بات نکلتی ہے کہ اسلام میں تعدد ازواج کی اجازت مطلق نہیں بلکہ یتیموں کی مصلحت کے ساتھ مقید ہے۔ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ یہاں مسئلے کے بیان کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ یتیموں

کی مصلحت کی قید کے ساتھ تعددِ ازواج کی اجازت دی گئی ہو اور بصورتِ دیگر یہ ممنوع ہو بلکہ یہ ہے کہ یتامیٰ کی مصلحت کے نقطۂ نظر سے تعددِ ازواج کے اس رواج سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عرب میں تھا البتہ اس کو چار تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اگر مقصود تعددِ ازواج کو یتیموں کی مصلحت کے ساتھ مقید کرنا ہوتا تو اس کے لیے اسلوبِ بیان اس سے بالکل مختلف ہوتا۔ اس اسلوبِ بیان سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ تعددِ ازواج کی مروجہ وقت صورت پر ایک قید عائد کر کے اس سے ایک معاشرتی مصلحت میں فائدہ اٹھانے کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے لیکن معاشرتی مصلحت صرف ایک یتیموں ہی کی مصلحت نہیں ہے بلکہ اور بھی ہو سکتی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس میں اس سے فائدہ اٹھانے کی ممانعت ہو۔

ایک اور شبہے کا جواب

ممکن ہے یہاں ایک اور شبہ بھی بعض لوگوں کو ہو کہ ہم نے یہاں ان لوگوں کے قول کو جنھوں نے یتامیٰ سے یتیم لڑکیوں کو مراد لیا ہے، محض اس دلیل کی بنیاد پر نظر انداز کر دیا ہے کہ اس لفظ کا استعمال صرف لڑکیوں کے لیے معروف نہیں ہے درآں حالیکہ 'نساء' سے ہم نے یتیموں کی ماؤں کو مراد لیا ہے جب کہ اس لفظ کا بھی استعمال اس معنی کے لیے معروف نہیں ہے۔ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ ہم نے اس قول کو صرف اسی بنیاد پر نظر انداز نہیں کیا ہے کہ لغت اور استعمال اس کے حق میں نہیں ہے بلکہ اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ یہ معنی لینے میں آیت کی تاویل صحیح نہیں بنتی۔ کسی شخص کو یہ اندیشہ ہو کہ اگر وہ ایک یتیم بچی سے نکاح کرے گا تو چونکہ اس کا باپ یا بھائی موجود نہیں ہے اس وجہ سے وہ اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا تو اس کو یہ ہدایت ہونی تھی کہ وہ اس وقت تک اس کے ساتھ نکاح کرنے میں توقف کرے جب تک وہ بالغ ہو کر اپنے حقوق و فرائض کو اپنے اختیار و ارادے کے ساتھ سمجھ نہ سکے یا صرف یہ ہدایت ہونی تھی کہ ایسا شخص کسی اور عورت سے نکاح کرے، اس کے ساتھ تعددِ ازواج کی اجازت اور اس کے قیود و شرائط کے بیان کے لیے کوئی ضرورت داعی نہیں تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک یتیمہ بالغ ہونے کے بعد بھی باپ بھائی کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے بے بس ہی ہوتی ہے تو یہ ہدایت ہونی تھی کہ ایسی عورتوں سے نکاح کرو جن کے باپ بھائی زندہ ہوں، اس لیے کہ اس قسم کی بے بسی دوسری عورتوں کو بھی لاحق ہو سکتی ہے اگرچہ ان کو یتیمی کی بے بسی سے سابقہ نہ پیش آیا ہو۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر کسی کی نگرانی میں کوئی یتیمہ ہو، وہ اس کی اچھی طرح تعلیم و تربیت کرے اور اس کے بالغ ہونے پر اس کی رضی سے اس سے نکاح کرے تو شریعت میں یہ بات ناپسندیدہ نہیں بلکہ پسندیدہ ہے۔

بہرحال ہم نے اس قول کو صرف ایک ہی وجہ کی بنا پر نہیں بلکہ متعدد وجوہ کی بنا پر چھوڑا ہے

اور نساء کے لفظ کی جو تخصیص کی ہے وہ ان قرائن کی بنا پر ہے جن میں سے بعض اوپر مذکور ہوئے اور بعض آگے آ رہے ہیں۔

'مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ' سے مراد لونڈیاں ہیں۔ چونکہ ان کے معاملے میں عدل وغیرہ کی شرط نہیں ہے اس وجہ سے اِن کی اجازت دی۔ اس مسئلے کی صحیح نوعیت پر ہم بقرہ میں لکھ چکے ہیں۔ آگے موزوں مقام پر اس پر مزید بحث کریں گے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِہِنَّ نِحۡلَۃً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَکُمۡ عَنۡ شَیۡءٍ مِّنۡہُ نَفۡسًا فَکُلُوۡہُ ہَنِیۡٓـًٔا مَّرِیۡٓـًٔا (۴)

'نِحۡلَۃً' کا مفہوم

اس آیت میں بھی 'نساء' سے مراد یتیموں کی مائیں ہی ہیں۔ 'نحل' کے معنی کسی کو کچھ دینے کے ہیں اور جب عورت کے تعلق سے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنی مہر ادا کرنے کے ہوتے ہیں۔ 'نحلۃ' یہاں فعل کی تاکید کے لیے ہے یعنی ان کو اس طرح مہر دو جو مہر دینے کا طریقہ ہے۔ اس تاکید کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ جب ان کے ساتھ نکاح انہی کے بچوں کی مصلحت کے پہلو سے کیا گیا ہے تو ایک شخص خیال کر سکتا ہے کہ اس صورت میں مہر وغیرہ کی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ فرمایا کہ نہیں، جس طرح عدل شرط ہے اسی طرح مہر کی ادائیگی بھی شرط ہے اور یہ مہر، مہر کی طرح ادا ہونا چاہیے، صرف چھڑانے کی کوشش نہیں ہونی چاہیے۔

مہر کی ادائیگی کی شرط

'فَاِنۡ طِبۡنَ لَکُمۡ عَنۡ شَیۡءٍ مِّنۡہُ' میں حرف 'عن' دستبرداری کے مفہوم کی طرف اشارہ کر رہا ہے یعنی وہ اپنی خوشی سے اگر اپنے مہر کا کوئی حصہ معاف کر دیں تو تم اُس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو، یہ تمہارے لیے رچنے پچنے والی چیز ہو سکتی ہے۔

وَلَا تُؤۡتُوا السُّفَہَآءَ اَمۡوَالَکُمُ الَّتِیۡ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ قِیٰمًا وَّارۡزُقُوۡہُمۡ فِیۡہَا وَاکۡسُوۡہُمۡ وَقُوۡلُوۡا لَہُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا (۵)

'سُفَہَآء' سے مراد نادان یتامیٰ ہیں

'سُفَہَآء' سے مراد وہی یتامیٰ ہیں جن کا ذکر چل رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حکم جو تمہیں دیا گیا ہے کہ یتیموں کا مال ان کو دو تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر وہ بالکل نادان و ناسمجھ ہوں جب بھی جو کچھ اُن کا ہے ان کے حوالے کر دو۔ مال کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے قیام و بقا کا ذریعہ بنایا ہے اس وجہ سے اس کے اندر انفرادی حق کے ساتھ خاندانی اور اجتماعی بہبود کا بھی ایک پہلو ہے۔ اس پہلو سے اس کی بربادی میں ایک ہی کا نقصان نہیں ہے بلکہ پورے خاندان اور بالآخر پورے معاشرے کا نقصان ہے۔ یہ چیز مقتضی ہے کہ کوئی ایسی شکل اختیار نہ کی جائے جو کسی مال کی بربادی کا باعث ہو۔ اگر یتیم ابھی نادان اور ناسمجھ ہے تو سرپرست کا فرض ہے کہ وہ اس کا مال اپنی حفاظت و نگرانی میں رکھے البتہ اس کو کھلائے پہنائے اور اس کی دلداری کرتا رہے تاکہ اس کو اطمینان رہے کہ یہ نگرانی اسی کے فائدے کے لیے ہے۔ ذمہ داری سنبھالنے کے قابل ہو جانے کے بعد اس کی ہر چیز اسی کو ملنی ہے۔

مال کے اندر انفرادی اور اجتماعی بہبود کے پہلو

'فَارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا' میں 'فِیْهَا' کے لفظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یتیموں کی ضروریات پوری کرنے میں سرپرستوں کو کشادہ دلی سے کام لینا چاہیے۔ خسیس اور مکھی چوس سرپرستوں کا سا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ عربی میں جب کہیں گے کہ 'ارزقوھم فیھا' تو اس کے معنی ہوں گے ان کو فراخی سے کھلاؤ پہناؤ اور اگر کہیں 'فارزقوھم منھا' جیسا کہ آگے آیت ۸ میں آرہا ہے، تو اس کے معنی ہوں گے ان کو اس میں سے کچھ دے دلا دو۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ
وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا
فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (۶)

یتیموں کا مال کب ان کے حوالے کیا جائے

یہ وہ طریقہ بتایا ہے جو یتیموں کا مال ان کے حوالے کرنے کے معاملے میں سرپرستوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ یتیموں کو جانچتے رہو یعنی کوئی چھوٹی موٹی ذمہ داری ان کے سپرد کر کے ان کی صلاحیت کا امتحان کرتے رہو کہ معاملات کی سوجھ بوجھ ان کے اندر پیدا ہو رہی ہے یا نہیں۔ نکاح کی عمر، یعنی بلوغ تک، ان کے ساتھ یہی معاملہ رکھنا چاہیے۔ جب بالغ ہو جائیں تو اس وقت اگر یہ محسوس ہو کہ ان کے اندر اب اپنی ذمہ داریوں کے اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے تو ان کا مال ان کے سپرد کر دینا چاہیے۔

جنسی بلوغ عقلی بلوغ کو مستلزم نہیں ہے

آیت میں اس بات کا اشارہ صاف موجود ہے کہ جنسی بلوغ ہر حال میں عقلی بلوغ کو مستلزم نہیں ہے۔ ایسے بھی کتنے بالغ ہو سکتے ہیں جو بالغ ہو جانے کو تو ہو جاتے ہیں لیکن ناک لگی ہی رہ جاتی ہے۔ ایسے افراد اور بالغ نادانوں کے معاملے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس چیز کو ان کے مال پر قابض رہنے کا بہانہ نہیں بنانا چاہیے بلکہ جو کچھ کرنا چاہیے ان کی بہبود پیش نظر رکھ کر کرنا چاہیے۔

غریب سرپرست یتیم کے مال سے دستور کے مطابق فائدہ اٹھا سکتا ہے

سرپرست اگر مستغنی آدمی ہو تو اس کو یتیم کے مال میں سے کچھ لینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر غریب ہو تو دستور کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ دستور کے مطابق سے مراد یہ ہے کہ ذمہ داریوں کی نوعیت، جائداد کی حیثیت، مقامی حالات اور سرپرست کے معیار زندگی کے اعتبار سے وہ فائدہ اٹھانا جو معقولیت کے حدود کے اندر ہو، یہ نوعیت نہ ہو کہ ہر معقول آدمی پر یہ اثر پڑے کہ یتیم کے بالغ ہو جانے کے اندیشے سے اسراف اور جلدبازی کر کے یتیم کی جائداد ہضم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مال کی حوالگی کے وقت گواہ مقرر کرنے کی ہدایت

آخر میں یہ ہدایت ہوئی کہ یتیم کا مال جب اس کے حوالے کرنے لگو تو اس پر کچھ ثقہ اور معتبر لوگوں کو گواہ بھی بنا لو تاکہ کسی سوئے ظن اور نزاع کا احتمال باقی نہ رہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھو کہ سارے معاملات کا حساب خدا کے ہاں بھی دینا ہے۔ اگر کسی قسم کی خیانت ہوئی تو ہو سکتا ہے کہ دنیا

کے شاہدوں اور گواہوں کی نگاہ اس پر نہ پڑے لیکن خدا کی نگاہ کسی چیز سے بھی نہیں چوک سکتی۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا (۷-۱۰)

یتامیٰ کے حقوق کے تحفظ نے دوسروں کے حقوق کی راہ کھول دی

یتیموں کے حقوق کے تحفظ کے بعد اب یہ تمہید ہے اس قانون وراثت کی جس میں مردوں اور عورتوں دونوں کے حقوق، ان کے والدین و اقربا کے ترکے میں سے معین کر دیے گئے تاکہ زورآور عصبات اور وارثوں کے لیے مورث کی تمام املاک و جائداد سمیٹ کر اس پر قابض ہو جانے کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے۔ اسلام سے پہلے نہ صرف عرب میں بلکہ ساری دنیا میں یہ حال رہا ہے کہ یتیموں اور عورتوں کا کیا ذکر، تمام کمزور ورثہ زورآور وارثوں کے رحم و کرم پر تھے۔ قرآن نے اس صورت حال کی طرف دوسرے مقام پر وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ اس صورت حال کو ختم کر دینے کے لیے قرآن نے تمام وارثوں کے حقوق معین کر دیے۔ مردوں کے بھی، عورتوں کے بھی۔ اوپر کی آیات کی تلاوت کرتا ہوا آدمی جب اس آیت پر پہنچتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ گویا یتیموں کی برکت سے دوسروں کے حقوق معین کرنے کی بھی راہ کھل گئی۔ یعنی جو خود حقوق سے محروم تھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ حقوق حاصل کیے بلکہ ان کی بدولت دوسروں کو بھی حقوق حاصل ہوئے۔

قانون وراثت کی تمہید

خاص طور پر عورتوں کا ذکر اس طرح آیا ہے گویا پہلی بار ان کو بھی مردوں کے پہلو بہ پہلو حق داروں کی صف میں جگہ ملی اور اپنے والدین و اقربا کے ترکے میں سے، خواہ کم ہو یا زیادہ، ان کا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک معین حصہ فرض کر دیا گیا۔

حصے معین ہو جانے کے بعد قانونی حق دار تو وہی ہوں گے جو ازروئے شریعت وارث قرار پاتے ہیں لیکن صلہ رحم اور خاندانی و انسانی ہمدردی کے عام حقوق پھر بھی باقی رہیں گے۔ چنانچہ وارثوں کو خطاب کر کے ہدایت ہوئی کہ اگر کسی کی وراثت تقسیم کرتے وقت قرابت مند، یتیم اور مسکین آموجود ہوں تو ہر چند وراثت میں ان کا کوئی شرعی حق نہ ہو تاہم وہ ڈانٹے ڈپٹے نہ جائیں بلکہ ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دلا کر ان کی دلداری کی کوشش کی جائے۔ فرمایا کہ یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ جس طرح دوسروں کے بچے یتیم ہوئے ہیں اسی طرح ان کے بچے بھی یتیم ہو سکتے تھے۔ پھر سوچیں کہ اگر یہ اپنے پیچھے یتیم چھوڑتے تو ان کے دل میں ان سے متعلق کیا کچھ اندیشے ہوتے۔ اس وجہ سے اللہ سے ڈرنا چاہیے اور سیدھی بات کرنی چاہیے۔

آخر میں آخری تنبیہ فرمائی کہ جو لوگ ظلم و حق تلفی کی راہ سے اپنے پیٹوں میں یتیموں کے مال بھر رہے ہیں وہ انجام کار کے اعتبار سے اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور آخرت میں وہ اس آگ کو لیے ہوئے دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے۔

۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۱-۱۴

آگے تقویٰ، عدل اور رحم کے انہی تقاضوں کے مطابق جن پر اسلامی معاشرے کی بنیاد قائم ہے اس شرعی تقسیم وراثت کی وضاحت فرمادی جس کی طرف ساتویں آیت میں اشارہ ہوا تھا تاکہ ظلم و حق تلفی اور نزاع و اختلاف کے ایک بہت بڑے سبب کا خاتمہ ہو جائے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔ وراثت کی شرعی تقسیم

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ آیات
فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ ۱۱-۱۴
وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ
وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ
فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ
فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِنْ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ
لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِنَ
اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۱۱﴾ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ
أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ
فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا
أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ

فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ
كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ
مِنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ
فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ
مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿١٢﴾ تِلْكَ
حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ
جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ
الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١٣﴾ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ
حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ
ع ۲ ۱۲ مُهِينٌ ﴿١٤﴾

ترجمۂ آیات ۱۱-۱۴

اللہ تمھاری اولاد کے باب میں تمھیں ہدایت دیتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ اگر لڑکیاں دو سے زائد ہیں تو اُن کے لیے ترکے کا دو تہائی ہے اور اگر اکیلی ہے تو اُس کے لیے آدھا ہے اور میت کے ماں باپ کے لیے ان میں سے ہر ایک کے لیے اس کا چھٹا حصہ ہے جو مُورث نے چھوڑا، اگر میت کے اولاد ہو۔ اور اگر اُس کے اولاد نہ ہو اور اُس کے وارث ماں باپ ہی ہوں تو اُس کی ماں کا حصہ ایک تہائی اور اگر اُس کے بھائی بہنیں ہوں تو اُس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے۔ یہ حصے اس وصیت کی تعمیل یا ادائے قرض

کے بعد ہی جو وُہ کر جاتا ہے۔ تم اپنے باپوں اور بیٹوں کے متعلق یہ نہیں جان سکتے کہ تمھارے لیے سب سے زیادہ نافع کون ہوگا۔ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے بے شک اللہ ہی علم و حکمت والا ہے۔ ۱۱

اور تمھارے لیے اس ترکے کا نصف ہے جو تمھاری بیویاں چھوڑیں، اگر اُن کے اولاد نہیں ہے اور اگر اُن کے اولاد ہے تو ان کے ترکے میں سے تمھارے لیے چوتھائی ہے۔ بعد اس وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے جو وہ کر جائیں۔ اور اُن کے لیے چوتھائی ہے تمھارے ترکے کا اگر تمھارے اولاد نہیں ہے اور اگر تمھارے اولاد ہے تو اُن کے لیے آٹھواں حصہ ہے تمھارے ترکے کا۔ اس وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد جو تم کر جاؤ۔

اور اگر کسی مرد یا عورت کی وراثت اِس حال میں تقسیم ہو کہ نہ اس کے اصول میں کوئی ہو، نہ فروع میں' اور ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو اُن میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اور اگر وُہ اس سے زیادہ ہوں تو وُہ ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔ اس وصیت کی تعمیل کے بعد جو کی گئی یا ادائے قرض کے بعد بغیر کسی کو ضرر پہنچائے۔ یہ اللہ کی طرف سے وصیت ہے اور اللہ علیم و حلیم ہے۔ ۱۲

یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدیں ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسُول کی اطاعت کرتے رہیں گے اللہ اُن کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریں گے اور اس کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کریں گے،

اُن کو ایسی آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کے لیے
ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۱۳-۱۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مذکورہ بالا مجموعۂ آیات میں وراثت کے جو احکام بیان ہوئے ہیں وہ خود بھی واضح ہیں اور ان کی تفصیل فرائض کی کتابوں میں بھی موجود ہے اس وجہ سے ہم صرف بعض اہم باتوں کی وضاحت پر کفایت کریں گے۔

وصیت کا صحیح مفہوم — پہلی قابلِ توجہ چیز یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے تقسیمِ وراثت سے متعلق جو احکام دیے ہیں ان کو اپنی وصیّت سے تعبیر فرمایا ہے۔ وصیت کا صحیح مفہوم عربی زبان میں یہ ہے کہ کوئی شخص کسی پر یہ ذمہ داری ڈالے کہ جب فلاں صورت پیش آئے تو وہ فلاں طریقہ یا فلاں طرزِ عمل اختیار کرے۔ اس میں وصیت کرنے والے کی پیش بینی، خیر خواہی اور شفقت کا پہلو بھی مضمر ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک عہد اور معاہدے کی ذمہ داری بھی پائی جاتی ہے۔ لفظ کے ان تمام مضمرات کو ادا کرنے کے لیے اُردو میں کوئی لفظ مجھے نہیں ملا۔ میں نے جو لفظ اختیار کیا ہے وہ اس کے مفہوم پر پوری طرح حاوی نہیں ہے۔

لڑکیوں کے بالمقابل لڑکوں کا حصہ دونا رکھنے کی وجہ — دوسری چیز یہ ہے کہ وراثت میں لڑکوں کا حصہ اللہ تعالیٰ نے لڑکیوں کے بالمقابل دُونا رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ معاشرت میں کفالتی ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ نے تمام تر مرد ہی پر ڈالی ہیں۔ عورت پر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے۔ مرد ہی بیوی کے نان نفقے کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے اور وہی بچوں کا بھی کفیل بنایا گیا ہے۔ قرآن نے یہ بات بھی واضح طور پر بتا دی ہے کہ اپنی خلقی صفات کے اعتبار سے مرد ہی اس کا اہل ہے کہ وہ خاندان کا سردھرا اور قوام بنایا جائے اور یہ قوامیت خاندان کے نظم اور اس کے قیام و بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر خاندان کا کوئی قوام نہ ہو تو یہ بات خاندان کی فطرت کے خلاف ہے اور اگر خاندان کی قوام مرد کے بجائے عورت ہو تو یہ چیز انسانی فطرت کے خلاف ہے اور فطرت کی ہر مخالفت لازماً فساد و اختلال کا سبب ہوگی جس سے سارا معاشرہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ مرد کو اس کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے بعض حقوق میں ترجیح ہو۔ جو لوگ ہر پہلو سے مرد و عورت کی کامل مساوات کے مدعی ہیں ان کا دعویٰ عقل و فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اس

موضوع پر آگے ہم اس سورہ میں بھی بحث کریں گے اور ہم نے اس پر ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے جس میں اس مسئلے کے سارے پہلو زیر بحث آئے ہیں۔[1]

خدا کی تقسیم کی خلاف ورزی خدا کی حکمت کی تحقیر ہے

تیسری چیز یہ ہے کہ قرآن حکیم نے یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ تقسیم اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم پیش و عقب ہر چیز پر حاوی اور حاضر و غائب سب پر محیط ہے۔ کسی کا علم بھی اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اس کی ہر بات اور اس کے ہر کام میں نہایت گہری حکمت ہوتی ہے اور کسی کا بھی یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اس کی حکمت کی تمام باریکیوں کو سمجھ سکے۔ اس وجہ سے خدا کی اس تقسیم پر نہ تو اپنے علم و فلسفے کے غرّے میں کسی کو معترض ہونا چاہیے نہ جذباتی جنبہ داری کے جوش میں کسی کو کوئی قدم اس کے خلاف اٹھانا چاہیے۔ بسا اوقات آدمی اپنے ذاتی میلان کی بنا پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے لیکن یہ ترجیح دنیا اور آخرت دونوں ہی اعتبارات سے غلط ہوتی ہے، اسی طرح کسی کو اپنے ذاتی میلان کی بنا پر نظر انداز کرتا ہے حالانکہ بعد کے حالات ثابت کرتے ہیں کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں ہی اعتبار سے اس کا رویہ زیادہ صحیح رہا جس کو اس نے نظر انداز کیا۔ پس صحیح روش یہی ہے کہ آدمی جو قدم بھی اٹھائے اپنے ذاتی میلانات کے بجائے شریعت کی ہدایت کے مطابق اٹھائے اسی میں خیر و برکت ہے۔ جو لوگ شریعت کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں وہ خدا کے علم و حکمت کی تحقیر کرتے ہیں جس کی سزا بالعموم انھیں دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں تو بہر حال ملنی ہی ہے۔ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعًا الآیۃ پر اس روشنی میں غور فرمائیے۔

وارثوں کے حق میں وصیت جائز نہیں

چوتھی چیز یہ ہے کہ خدا نے جب اس تقسیم کو اپنی وصیت سے تعبیر فرمایا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جن کو اس نے کسی مورث کا وارث قرار دیا ہے ان کے لیے اس نے انصاف اور حکمت پر مبنی وصیت خود فرما دی ہے۔ رب کریم و حکیم کی اس وصیت کے بعد اگر کوئی مورث کسی وارث کے لیے وصیت کرتا ہے تو در حقیقت یہ خدا کی وصیت کی اصلاح بلکہ صحیح تر الفاظ میں اس کی مخالفت ہوئی جو تقویٰ کے بالکل منافی ہے۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ مورثوں کو وصیت کی جو اجازت دی گئی ہے اس کا تعلق ان وارثوں سے نہیں ہے جن کے باب میں خود خدا کی وصیت موجود ہے بلکہ یہ غیر وارثوں کے لیے خاص ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لا وصیۃ لوارث۔

غیر مضار کی قید کی حکمت

پانچویں یہ کہ مورث کی وصیت کی تعمیل اور اس کے قرض کی ادائگی کی تاکید جو بار بار آئی ہے اس کے ساتھ غَیْرَ مُضَآرٍّ کی شرط بھی لگی ہوئی ہے۔ اگرچہ اس شرط کا ذکر صرف کلالہ کے سلسلے میں ہوا ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہ ہر جگہ مقصود ہے۔ کلالہ کے ساتھ اس کے ذکر کی وجہ صرف یہ ہے کہ جس مورث

---

[1] اس کے لیے ہماری کتاب 'اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام' کا باب: نظریۂ مساوات مرد و زن پڑھیے۔

کے اصول میں کوئی ہو نہ فروع میں، اس کے اندر اس خواہش کے ابھرنے کا بڑا امکان ہوتا ہے کہ وہ اپنی جائداد ان لوگوں کی طرف نہ منتقل ہونے دے جن کی طرف اس کا طبعی میلان نہیں ہے اگرچہ قانونی حق دار وہی ہیں۔ اس کے لیے وہ وصیت میں بھی تجاوز کر سکتا ہے اور غلط قسم کے نمائشی قرض کا بھی مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اس رجحان کو روکنے کے لیے قرآن نے وصیت اور قرض دونوں کے لیے یہ شرط لگا دی کہ غیر مضار ہو یعنی اس سے مقصود محض شرعی وارثوں کو نقصان پہنچانا نہ ہو۔ اسی بنیاد پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کو ثلث مال تک محدود فرما دیا تاکہ اس سے اصلی وارثوں کی حق تلفی نہ ہو۔

۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۵-۱۸

صنفی انتشار کی روک تھام کے لیے ایک عارضی حکم

اوپر کی آیات میں ان مفاسد کے دروازے بند کیے گئے تھے جو مال کی حد سے بڑھی ہوئی طمع سے پیدا ہوتے اور معاشرے میں فساد و اختلال اور قطع رحم کا سبب بنتے ہیں۔ اب آگے صنفی انتشار اور شہوانی بے قیدی پر پابندی عائد کی جا رہی ہے اس لیے کہ یہ بے قیدی بھی حرص مال ہی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ معاشرے کو شیطان کی بازی گاہ بنا دینے والی ہے۔

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ احکام اس باب کے ابتدائی احکام ہیں جو اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ مدینہ میں اسلامی معاشرہ ابھی پوری طرح منظم و مستحکم نہیں ہوا تھا۔ مدینہ کے آس پاس غیر مسلم قبائل موجود تھے جو اس وقت تک اسلام کے زیرنگین نہیں ہوئے تھے اور مسلمانوں نے ابھی وہ قوت حاصل نہیں کی تھی کہ اسلامی حدود و تعزیرات ان پر بھی نافذ کر سکیں۔ یہ صورت حال ایک پیچیدہ صورت حال تھی۔ نہ یہ بات قرین مصلحت تھی کہ معاشرے کی تطہیر کے نقطۂ نظر سے جو حدود و تعزیرات ضروری ہیں وہ بے درنگ نافذ کر دی جائیں اس لیے کہ مخالفین اس سے غلط فائدے اٹھا سکتے تھے اور نہ یہ بات ممکن تھی کہ فحشا اور منکر کے دروازے کھلے چھوڑ دیے جائیں اس لیے کہ اس سے بدکاری و بے حیائی کے اس رجحان کو شہ ملتی جس کا اس وقت عرب سوسائٹی میں زور تھا اور اسلام جس کو مٹانے کے لیے آیا تھا۔ ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام نے یہ حکیمانہ طریقہ اختیار کیا کہ جہاں تک مسلمانوں کی سوسائٹی کا تعلق تھا اس کو بدکاری و بے حیائی سے پاک رکھنے کے لیے کچھ ایسے ابتدائی نوعیت کے عارضی احکام دے دیے جو فی الجملہ مفاسد کے سدباب کے لیے بھی مفید تھے اور جو مسلمانوں کے ذہن کو ان احکام کے قبول کرنے کے لیے تیار کرنے والے بھی تھے جو بعد میں اس سلسلے میں نازل ہوئے اور ساتھ ہی ان کے اندر یہ پہلو بھی ملحوظ تھا کہ مخالفین ان کو اسلام کے خلاف وسوسہ اندازیوں اور ریشہ دوانیوں کا ذریعہ نہیں بنا سکتے تھے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۵-۱۸

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْہِدُوْا عَلَیْہِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ فَاِنْ شَہِدُوْا فَاَمْسِکُوْہُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِہَا مِنْکُمْ فَاٰذُوْہُمَا فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْہُمَا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ﴿۱۷﴾ وَلَیْسَتِ التَّوْبَۃُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَہُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَہُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ اَعْتَدْنَا لَہُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۸﴾

ترجمۂ آیات ۱۵-۱۸

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر اپنے اندر سے چار گواہ طلب کرو۔ پس اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں کے اندر محبوس کر دو، یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کر دے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکالے۔ ۱۵

اور جو دونوں تم میں سے اس بدکاری کا ارتکاب کریں تو ان کو ایذا پہنچاؤ پس اگر وہ توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو ان سے درگزر کرو۔ بے شک اللہ توبہ قبول

کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ١٤-

اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری تو انہی کے لیے ہے جو جہالت سے مغلوب ہو کر برائی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں، وہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے اور ان لوگوں کی توبہ نہیں ہے جو برابر برائی کرتے رہے، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوئی تو بولا کہ اب میں نے توبہ کر لی اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو کفر ہی پر مر جاتے ہیں۔ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ١٧-١٨

٧- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْہِدُوْا عَلَیْہِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ فَاِنْ شَہِدُوْا فَاَمْسِکُوْہُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیْلًا ۝ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِہَا مِنْکُمْ فَاٰذُوْہُمَا ج فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْہُمَا ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ۝ (١٥-١٦)

فاحشۃ زنا کی تعبیر کے لیے معروف ہے

'فاحشۃ' کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کو کہتے ہیں اور زنا کی تعبیر کے لیے یہ لفظ معروف ہے

مِنْ نِّسَآئِکُمْ کا مفہوم

مِنْ نِّسَآئِکُمْ (تمہاری عورتوں میں سے) یعنی بدکاری کا ارتکاب کرنے والی عورت مسلمانوں کے معاشرے سے تعلق رکھنے والی ہو۔

یہ اشارہ کہ یہ حکم عارضی ہے

"اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیْلًا" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ حکم عارضی ہے۔ اس باب میں آخری حکم بعد میں نازل ہونے والا ہے۔ چنانچہ سورۂ نور میں زنا کی جو سزا بیان ہوئی ہے اس سے یہ وعدہ پورا ہوا۔

صیغہ کا استعمال تغلیب کے اعتبار سے

'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِہَا مِنْکُمْ' یعنی بدکاری کا ارتکاب کرنے والے دونوں فریق، مرد اور عورت، مسلمانوں ہی کے اندر کے ہوں۔ اس میں مذکر کا صیغہ عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق تغلیب کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے۔ جیسے کہ 'والدین' کا لفظ ہے جو ہے تو مذکر لیکن ماں باپ دونوں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ایذا کا مفہوم

'فَاٰذُوْہُمَا' میں توہین و تذلیل، ڈانٹ ڈپٹ اور نصیحت و ملامت سے لے کر اصلاح کے حد تک

مار پیٹ ہر چیز داخل ہے۔

ان آیات میں خطاب ظاہر ہے کہ معاشرہ کے ارباب حل وعقد اور ذمہ داروں سے ہے۔ ان کو خطاب کر کے بدکاری پر تعزیر کے لیے دو مختلف صورتوں میں دو الگ الگ ہدایات دی گئی ہیں۔

دو صورتوں کے لیے دو الگ الگ ہدایات

ایک صورت یہ ہے کہ بدکاری کا ارتکاب کرنے والی عورت تو مسلمانوں کے معاشرے سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کا شریک مرد، اسلامی معاشرے کے دباؤ میں نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہدایت فرمائی کہ عورت کو گھر کے اندر محبوس کر دیا جائے، اس کی باہر کی آمد و شد پر پوری پابندی عائد کر دی جائے تاآنکہ موت اس کا خاتمہ کرے یا اس باب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نیا حکم نازل ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بدکاری کے دونوں فریق مسلمانوں ہی سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایسی صورت میں ان کو زجر و توبیخ، تحقیر و تذلیل، ڈانٹ ڈپٹ اور اصلاح کے حد تک مار پیٹ سے درست کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر وہ اس کے اثر سے توبہ کر کے اپنے چال چلن درست کر لیں تو ان سے درگزر کیا جائے۔ اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

عورت کے معاملے میں شدت احتیاط کی حکمت

ان دونوں صورتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ پہلی صورت میں احتیاط کا پہلو زیادہ شدت کے ساتھ ملحوظ ہے۔ دوسری صورت میں تو عورت اور مرد دونوں کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ اگر وہ توبہ کر کے اپنے چال چلن درست کر لیں تو ان سے درگزر کر لیا جائے لیکن پہلی صورت میں عورت کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اگر وہ توبہ و اصلاح کر لے تو اس پر عائد کردہ قدغن اٹھا لی جائے۔

اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ دوسری صورت میں تو دونوں فریق اسلامی معاشرہ کے دباؤ میں ہیں، ان کے رویے میں جو تبدیلی ہوگی وہ سب کے سامنے ہوگی، نیز ان کے اثرات اور وسائل معلوم و معین ہیں، ان کے لیے بہر حال اپنے خاندان اور قبیلے سے بے نیاز ہو کر کوئی اقدام ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ہوگا۔ لیکن پہلی صورت میں مرد، جو اصل جرم میں شریک غالب کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں کے معاشرہ کے دباؤ سے بالکل آزاد ہے، نہ اس کے رویے کا کچھ پتہ نہ اس کے عزائم کا کچھ اندازہ، نہ اس کے اثرات و وسائل کے حدود معلوم و معین۔ ایسی حالت میں اگر عورت کو یہ موقع دے دیا جاتا کہ توبہ کے بعد اس سے درگزر کی جائے تو یہ بات نہایت خطرناک نتائج پیدا کر سکتی تھی۔ اول تو مرد کے رویہ کو نظر انداز کر کے عورت کی توبہ و اصلاح کا صحیح اندازہ ہی ممکن نہیں ہے اور ہو بھی تو جب مرد بالکل قابو سے باہر اور مطلق العنان ہے تو اغوا، فرار اور قتل و خون کے امکانات کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ اس پہلو سے اس میں احتیاط کی شدت ملحوظ ہے۔

اگرچہ یہ تعزیرات سورۂ نور میں نازل شدہ حدود کے بعد منسوخ ہو گئیں لیکن بدکاری کے معاملے میں شہادت کا یہی ضابطہ بعد میں بھی باقی رہا۔

تعزیری مقاصد کے لیے جیل کے سسٹم کا جواز

علاوہ ازیں فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ کے الفاظ سے تعزیری مقاصد کے لیے جیل کے سسٹم کا جواز بھی نکلتا ہے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ○ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ○ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۱۷-۱۸)

لفظ 'جہالت' کا مفہوم

'جہالت' کے معنی عربی میں صرف نہ جاننے کے نہیں آتے بلکہ اس کا غالب استعمال جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی شرارت یا ظلم یا گناہ کا کام کر گزرنے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ عام طور پر علم کے بجائے حلم کے ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک حماسی کا شعر ہے۔

فالحلم خیر فاعلمن مغبۃ   من الجھل الا ان تشمس من ظلم

اور یاد رکھو کہ جہالت کے مقابلے میں تحمل و بردباری انجام کار کے اعتبار سے بہتر ہے مگر یہ کہ تمہیں ظلم کی وجہ سے ذلیل کرنے کی کوشش کی جائے۔

معلقات کا مشہور شعر ہے۔

الا لا یجھلن احد علینا   فنجھل فوق جھل الجاھلینا

آگاہ، کہ کوئی ہمارے خلاف جہالت کا اظہار نہ کرے کہ ہم بھی تمام جاہلوں سے بڑھ کر جہالت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

توبہ کی قبولیت کے شرائط

اوپر والی آیت میں یہ جو فرمایا تھا کہ اگر وہ توبہ اور اصلاح کر لیں تو ان سے درگزر کرو، اس سے اتنی بات تو بالکل واضح ہو گئی تھی کہ رویے کی اصلاح توبہ کے لازمی شرائط میں سے ہے، اگر کوئی شخص اس برائی سے باز نہ آئے جس کا وہ مرتکب ہوا ہے تو زبان سے لاکھ توبہ توبہ کا ورد کرے، اس کی توبہ بالکل غیر معتبر ہے۔ اسی تعلق سے توبہ کے آداب و خصوصیات کی مزید وضاحت فرمادی۔

فرمایا کہ اللہ کے اوپر صرف ان کی توبہ کا حق قائم ہوتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی برائی کر گزرتے ہیں پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ انہی لوگوں کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔ نہ وہ کسی بات سے بے خبر، نہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی۔ پھر وہ ان لوگوں کی توبہ کی کوئی ذمہ داری اپنے اوپر کیوں لے گا جو جانتے بوجھتے ٹھنڈے دل سے گناہ بھی کیے جا رہے ہیں اور توبہ کا وظیفہ بھی پڑھتے جا رہے ہیں۔

اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے جو زندگی بھر تو گناہوں میں ڈوبے رہے جب

دیکھا کہ موت سر پر آن کھڑی ہوئی تو بولے کہ اب میری توبہ! علیٰ ہذا القیاس کفر کی حالت میں مرنے والوں کی بھی توبہ نہیں ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ان دونوں آیتوں پر غور کرنے سے توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کی دو صورتیں متعین ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی برائی کر بیٹھتے ہیں پھر فوراً توبہ اور اصلاح کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر ان کی توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ برابر گناہ کیے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ملک الموت ان کے سر پر آ دھمکتا ہے اس وقت وہ توبہ کرتے ہیں یا وہ لوگ جو کفر کی حالت ہی میں مرتے ہیں ان کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ ان دونوں حدوں کے متعین ہو جانے کے بعد اب ایک سوال رہ جاتا ہے کہ ان لوگوں کی توبہ کا کیا حکم ہے جن کو گناہ کے بعد جلدی توبہ کرنے کی سعادت تو حاصل نہیں ہوئی لیکن اتنی دیر بھی انھوں نے نہیں لگائی کہ موت کا وقت آن پہنچا ہو۔ اس سوال کے جواب میں یہ آیت خاموش ہے اور یہ خاموشی جس طرح امید پیدا کرتی ہے اسی طرح خوف بھی پیدا کرتی ہے اور قرآن حکیم کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بین الرجا والخوف ہی رہے لیکن کبھی کبھی ذہن اس طرف جاتا ہے کہ اس امت کے اس طرح کے لوگ امید ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے نجات پا جائیں گے اس لیے کہ ان کے باب میں شفاعت کے ممنوع ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۹-۲۲

عورتوں کے حقوق معاشرے کے اندر محفوظ کرنے اور ان کو ظلم و تعدی سے بچانے کے لیے جو ہدایات اوپر دی گئی ہیں اسی سلسلے میں مزید ارشاد ہوا۔

آیات ۱۹-۲۲

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا ٱلنِّسَآءَ كَرْهًا ۖ
وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّآ أَن
يَأْتِينَ بِفَٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ ۚ
فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا شَيْـًٔا وَيَجْعَلَ
ٱللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾ وَإِنْ أَرَدتُّمُ ٱسْتِبْدَالَ زَوْجٍ
مَّكَانَ زَوْجٍ وَءَاتَيْتُمْ إِحْدَىٰهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ

شَيْـًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿٢٠﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ
وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا
غَلِيْظًا ﴿٢١﴾ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا
مَا قَدْ سَلَفَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ۭ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿٢٢﴾ ع ۲ / ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۹-۲۲

اے ایمان والو، تمہارے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن جاؤ اور نہ یہ بات جائز ہے کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ واپس لینے کے لیے ان کو تنگ کرو مگر اس صورت میں کہ وہ کسی کھلی ہوئی بدکاری کی مرتکب ہوئی ہوں اور ان کے ساتھ معقول طریقے کا برتاؤ کرو۔ اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو بعید نہیں کہ ایک چیز کو تم ناپسند کرو اور اللہ تمہارے لیے اس میں بہت بڑی بہتری پیدا کر دے۔ ۱۹

اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم نے ایک کو ڈھیروں مال دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو، کیا تم بہتان لگا کر اور کھلی ہوئی حق تلفی کرکے اس کو لوگے؟ اور کس طرح اس کو لوگے جب کہ تم ایک دوسرے کے آگے بے حجاب ہو چکے ہو اور انھوں نے تم سے مضبوط عہد لے رکھا ہے۔ ۲۰-۲۱

اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے نکاح نہ کرو۔ مگر جو کچھ ہو چکا۔ بے شک یہ کھلی بے حیائی اور نفرت کی بات ہے اور نہایت بُرا طریقہ ہے۔ ۲۲

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا
بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ
كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (۱۹)

عضل کے معنی — عضل یعضل، کے معنی تنگ کرنے، زچ کرنے اور روکنے کے ہیں۔

معاشرت بالمعروف — 'عاشروھن بالمعروف' یعنی ان کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرو جو شریفوں کے شایانِ شان، عقل و فطرت کے مطابق، رحم و مروت اور عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ یہاں لفظ معروف کے استعمال سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگرچہ عرب جاہلیت کے بعض طبقات میں عورتوں کے ساتھ سلوک کے معاملہ میں بعض نہایت نار وا قسم کی زیادتیاں رواج پا گئی تھیں تاہم وہ اس بات سے ناآشنا نہیں تھے کہ عورت کے ساتھ معقولیت کا برتاؤ کیا ہے۔

عرب جاہلیت کے ایک مکروہ رواج کی اصلاح — اس آیت میں پہلے عرب جاہلیت کی ایک نہایت مکروہ رسم کی اصلاح کی ہے۔ وہ یہ کہ ان کے بعض طبقات میں یہ رواج تھا کہ مورث کی جائداد اور اس کے مال مویشی کی طرح اس کی بیویاں بھی وارث کی طرف منتقل ہو جاتی تھیں۔ حد یہ ہے کہ باپ کی منکوحہ عورتوں پر بھی بیٹے قبضہ کر لیتے تھے۔ باپ کے مرنے پر خلفِ اکبر اس کی منکوحات میں سے جن پر اپنی چادر ڈال دیتا تھا وہ سب اس کے تصرف میں آجاتیں اور آگے آیت ۲۲ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ان سے زن و شو کے تعلقات قائم کرنے میں بھی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ قرآن نے یہاں واضح فرمایا کہ عورت متروکہ جائداد نہیں بلکہ آزاد ہستی ہے۔ اس کے ساتھ مورث کی بھیڑ بکریوں کی طرح کا معاملہ جائز نہیں ہے بلکہ وہ اپنی مرضی کی مالک اور شریعت کے حدود کے اندر آزاد ہے۔

ناپسند بیوی سے حسن سلوک کی ہدایت — دوسری بات یہ فرمائی کہ اگر کسی کو اس کی بیوی ناپسند ہو تو اس سے اپنا دیا دلایا اور کھلایا پہنایا اگلوانے کے لیے اس کو ضیق میں ڈالنے اور تنگ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس قسم کا رویہ صرف اس شکل میں جائز ہے جب اس کی طرف سے کھلی ہوئی بدکاری کا صدور ہو۔ اگر اس قسم کی کوئی بات اس سے صادر نہیں ہوئی ہے، وہ بدستور اپنی وفاداری اور پاک دامنی پر قائم ہے تو محض اس بنیاد پر کہ بیوی پسند نہیں ہے اس سے کچھ اینٹھنے کے لیے اس کو تنگ کرنا عقل، انصاف، شرافت اور فتوت کے بالکل منافی ہے۔ قابلِ نفرت چیز صرف اخلاقی فساد ہے۔ محض شکل و صورت اور رنگ و روغن کے ناپسند ہونے کی بنا پر یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ شریفانہ معاشرت کے حقوق سے محروم کر دی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ مجرد شکل و صورت کی بنا پر کوئی شخص اپنی بیوی کو ناپسند کرتا ہو لیکن اللہ تعالیٰ اس

کے ذریعے سے اس کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں برکتوں کے جنت سے دروازے کھول دے۔ پھر صحیح مومنانہ رویہ یہی ہے کہ اگر کسی کو اس طرح کی آزمائش پیش آجائے تو زوجی عدم مناسبت کے باوجود خدا کے خوف اور اپنی فتوت و شرافت کے پیش نظر ایسی بیوی سے نہایت اچھا برتاؤ کرے اور خدا سے خیر و برکت کی امید رکھے۔

ایک ادبی نکتہ — یہاں لفظ اگرچہ 'عسٰی' استعمال ہوا ہے جو عربی میں صرف اظہار امید اور اظہار توقع کے لیے آتا ہے لیکن عربیت کے اداشناس جانتے ہیں کہ اس طرح کے مواقع میں، جیسا کہ یہاں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا وعدہ مضمر ہوتا ہے۔ اس اشارے کے پیچھے جو حقیقت جھلک رہی ہے وہ یہی ہے کہ جو لوگ ظاہری شکل و صورت کے مقابل میں اعلیٰ اخلاقی و انسانی اقدار کو اہمیت اور ان کی خاطر اپنے جذبات کی قربانی دیں گے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کثیر کا وعدہ ہے۔ جن لوگوں نے اس وعدے کے لیے بازیاں کھیلی ہیں وہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ بات سو فی صدی حق ہے۔ اور خدا کی بات سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے۔

وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ۝ وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا (۲۰-۲۱)

'قنطار' کا مفہوم — 'قنطار' اصل میں تو ایک وزن ہے جس کی مقدار زمانے کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہی ہے لیکن عام استعمال میں اس سے مراد مال کثیر ہوتا ہے۔ جیسے ہم منوں مال، ڈھیروں مال، بولتے ہیں، عربی میں اسی مفہوم کی تعبیر کے لیے یہ لفظ ہے۔ اسی سے قناطیر مقنطرہ کی ترکیب بھی قرآن میں استعمال ہوئی ہے۔

'افضٰی بعضکم الی بعض' کا مفہوم — 'اَفْضٰی بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ' افضی فلان الی فلان کے معنی ہیں وصل الیہ ودخل فی حیزہ اسی طرح افضی الی فلان بسرہ کے معنی ہیں کہ اس نے فلاں کے آگے اپنے سارے بھید بے نقاب کر دیے۔ یہ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کی نہایت جامع اور نہایت شائستہ تعبیر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اس طرح بے نقاب ہو جاتے ہیں کہ ان کے ظاہر و باطن اور احساسات و جذبات کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو ایک دوسرے سے مخفی نہیں رہ جاتا۔

بیوی سے دیا ہوا مال واپس لینا مروت کے منافی ہے — اوپر کی آیت میں بتایا تھا کہ ناپسندیدگی کے باوجود اعلیٰ طریقہ یہی ہے کہ آدمی بیوی کے ساتھ شائستہ طریقے پر نباہنے کی کوشش کرے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی شخص اپنے حالات کے تقاضوں سے اگر اس فیصلہ پر پہنچ ہی گیا ہے کہ ایک بیوی کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے شادی کرے تو یہ تو ہرگز وہ نہ کرے کہ جو کچھ پہلی بیوی کو اس نے دیا ہے اس کو واپس لینے کی کوشش کرے۔ یہاں تک کہ اگر اس کو ڈھیروں مال بھی اس نے دیا ہے جب بھی اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کے واپس لینے کے

لیے ہتھکنڈے استعمال کرے، خاص کر اس خیال سے اس پر بہتان لگانا کہ اس سے دیا ہوا مال واپس لینے کے لیے جواز پیدا ہوسکے اور بھی بڑا گناہ اور ظلم ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ مرد کی فتوت کے بالکل منافی ہے کہ جس عورت کے ساتھ اس نے زندگی بھر کا پیمانِ وفا باندھا، جو ایک نہایت مضبوط میثاق کے تحت اس کے حبالۂ عقد میں آئی، جس نے اپنا سب ظاہر و باطن اس کے لیے بے نقاب کر دیا اور دونوں نے ایک مدت تک یک جان و دو قالب ہو کر زندگی گزاری، اس سے جب جدائی کی نوبت آئے تو اپنا کھلایا پہنایا اس سے اگلوانے کی کوشش کی جائے یہاں تک کہ اس ذلیل غرض کے لیے اس کو بہتانوں اور تہمتوں کا ہدف بھی بنایا جائے۔

عقدِ نکاح ایک محکم میثاق ہے

یہاں ایک اور چیز بھی قابلِ غور ہے وہ یہ کہ فرمایا ہے وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (اور ان عورتوں نے تم سے مضبوط میثاق لیا ہے) ظاہر ہے کہ 'میثاق غلیظ' سے مراد یہاں عقدِ نکاح ہی ہے۔ اس کے سوا کسی اور میثاق کا نہ یہاں کوئی قرینہ ہے نہ اس کی کوئی تاریخی شہادت۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقدِ نکاح کی ذمہ داری کو یہاں 'میثاق غلیظ' سے کیوں تعبیر فرمایا۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ عقدِ نکاح کی اصل عرفی اور شرعی حقیقت یہی ہے کہ وہ میاں اور بیوی کے درمیان حقوق اور فرائض کا ایک مضبوط معاہدہ ہوتا ہے جس کے ذریعے سے دونوں زندگی بھر کے سنجوگ کے عزم کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑتے ہیں اور دونوں یکساں طور پر حقوق بھی حاصل کرتے ہیں اور یکساں طور پر ایک دوسرے کے لیے ذمہ داریاں بھی اٹھاتے ہیں۔ بظاہر تو اس میثاق کے الفاظ نہایت سادہ اور مختصر ہوتے ہیں لیکن اس کے مضمرات و تضمنات بہت ہیں اور یہ مضمرات و تضمنات ہر مہذب سوسائٹی اور ہر شریعت میں معلوم و معروف ہیں۔ یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ میثاق بندھتا تو ہے میاں اور بیوی کے درمیان لیکن اس میں گرہ خدا کے حکم سے لگتی ہے اور جس طرح خلق اس کی گواہ ہوتی ہے اسی طرح خالق بھی اس کا گواہ ہوتا ہے۔ پھر اس کے 'میثاق غلیظ' ہونے میں کیا شبہ رہا؟ یہاں اس رشتے کو اس لفظ سے تعبیر فرما کر قرآن نے اس کی اصل عظمت واضح فرمائی ہے کہ مرد کو کسی حال میں بھی یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ بیوی کے ساتھ اس کا تعلق کچے دھاگے سے نہیں بندھا ہے بلکہ یہ رشتہ نہایت محکم رشتہ ہے اور اس کے تحت جس طرح مرد کے حقوق ہیں اسی طرح بیوی کے بھی حقوق ہیں جن سے مرد کے لیے فرار کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر وہ ان سے بھاگنے کی کوشش کرے گا تو اپنی فتوت کو بھی رسوا کرے گا اور اپنے خدا کو بھی ناراض کرے گا۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ۭ وَسَآءَ سَبِيْلًا (۲۲)

مقت اور ممقوت، مبغوض اور نفرت انگیز شے یا فعل کو کہتے ہیں۔ باپ کی منکوحہ سے نکاح کے

لیے نکاح المقت کی تعبیر مشہور رہی ہے۔ اسی طرح اُس شخص کو مقتی کہتے تھے جو اس فعلِ شنیع کا مرتکب ہوتا ہو۔

الا ما قد سلف کا مفہوم

'الا ما قد سلف' کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون ماضی پر لاگو نہیں ہوگا کہ اس کو بنیاد قرار دے کر تمام پچھلے رشتوں کی تحقیق ہو اور اس کی روشنی میں جائز و ناجائز کے احکام صادر ہوں۔ یہ چیز عملاً ناممکن ہے۔ قانون اپنی فطرت ہی سے ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا نفاذ حاضر و مستقبل ہی پر ہو۔ چنانچہ ماضی سے درگزر کر کے ان برائیوں کی اصلاح کر دی گئی جو بالفعل موجود تھیں اور آئندہ کے لیے اس بے حیائی کا سدِ باب کر دیا گیا۔

نکاح المقت

آیت ۱۹ کے تحت گزر چکا ہے کہ عرب جاہلیت کے بعض طبقات میں یہ رواج تھا کہ باپ کی منکوحات بیٹے کو وراثت میں ملتی تھیں اور بیٹے ان سے زن و شو کے تعلقات قائم کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے تھے۔ اس آیت نے اس فعلِ شنیع کی حتمی ممانعت کر دی۔ فرمایا کہ یہ فعل کھلی ہوئی بے حیائی و بدکاری، نہایت مبغوض اور نہایت بُرا رواج ہے۔

مخصوص طبقات کی برائیوں کا ذکر صیغۂ عام سے

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ اس قسم کی برائیوں اور بے حیائیوں کا ذکر قرآن میں عام صیغے سے جو آتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس میں لازماً پوری قوم مبتلا تھی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ برائی کسی خاص طبقے کے اندر محدود ہوتی ہے لیکن اس سے متعلق قانون چونکہ سب پر حاوی ہوتا ہے اس سے خطاب عام ہوتا ہے۔ یہاں اس برائی کے لیے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ خود شاہد ہیں کہ اس کا کھلی ہوئی بے حیائی اور مبغوض ہونا عرب کے شرفا کو بھی معلوم تھا۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۳-۲۵

باپ کی منکوحات کے ساتھ نکاح کی ممانعت سے عورتوں میں جو حلال و حرام ہیں ان کے بیان کے لیے راہ ہموار کر دی تاکہ اس پہلو سے معاشرے میں جو گندگیاں اور ناانصافیاں ہیں وہ واضح ہو کر سامنے آ جائیں اور ان کی اصلاح ہو سکے۔ فرمایا:

آیات ۲۳-۲۵

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْأَخِ وَبَنٰتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ز

وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا
بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا
رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ الجزء ۵
كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا
بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۭ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ
مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا
حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ
الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ
وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ
بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ
غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ
فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ
مِنَ الْعَذَابِ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ وَاَنْ تَصْبِرُوْا
خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ ع ۱

ترجمۂ آیات ۲۳-۲۵

تم پر حرام کی گئیں تمھاری مائیں، تمھاری بیٹیاں، تمھاری بہنیں، تمھاری پھوپھیاں، تمھاری خالائیں، تمھاری بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا، تمھاری رضاعی بہنیں، تمھاری ساسیں اور تمھاری ربیبائیں جو تمھاری

گودوں میں پلیں اور تمھاری مدخولہ بیویوں سے ہوں، اگر وہ تمھاری مدخولہ نہ رہی ہوں تو کچھ گناہ نہیں ــــ اور تمھارے صلبی بیٹوں کی بیویاں اور یہ کہ تم دو بہنوں کو بیک وقت جمع کرو مگر جو گزر چکا۔ بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ ۲۳

اور وہ عورتیں بھی حرام ہیں جو قیدِ نکاح میں ہوں مگر یہ کہ وہ تمھاری ملک یمین بن جائیں۔ یہ تم پر اللہ کا لکھا ہوا فریضہ ہے۔ ان کے ماسوا جو عورتیں ہیں وہ تمھارے لیے حلال ہیں، اس طرح کہ تم اپنے مال کے ذریعے سے ان کے طالب بنو، ان کو قیدِ نکاح میں لے کر، نہ بدکاری کے طور پر۔ پس ان میں سے جن سے تم نے تمتع کیا ہو تو ان کو ان کے مہر دو، فریضہ کی حیثیت سے۔ مہر کے ٹھہرانے کے بعد جو تم نے آپس میں راضی نامہ کیا ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۲۴

اور جو تم میں سے آزاد مومنات سے نکاح کرنے کی مقدرت نہ رکھتا ہو تو وہ مومنہ کنیزوں میں سے جو تمھارے قبضہ میں ہوں ان سے نکاح کرے اور اللہ تمھارے ایمان سے خوب باخبر ہے، تم سب ایک ہی جنس سے ہو۔ سو ان سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرلو، اور دستور کے مطابق ان کو ان کے مہر دو۔ ان کو قیدِ نکاح میں لاکر نہ کہ بدکاری کرنے والیاں اور آشنائی گانٹھنے والیاں ہوں۔ پس جب وہ قیدِ نکاح میں آجائیں تو اگر وہ بدکاری کی مرتکب ہوں تو آزاد عورتوں کے لیے جو سزا ہے اس کی نصف سزا ان پر ہے۔ یہ اجازت تم میں سے اُن کے لیے ہے جن کو گناہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو اور یہ کہ تم صبر کرو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۲۵

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْأَخِ وَبَنٰتُ
الْأُخْتِ وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ
فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَ
حَلَآئِلُ أَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ
اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۲۳)

وہ عورتیں حرام ہیں جن کو رحمی رشتے سے قربت قریبہ حاصل ہے

اس آیت میں جو حرمتیں بیان ہوئی ہیں وہ انسانی فطرت کے اس تقاضے پر مبنی ہیں کہ جہاں رحمی رشتے کی قربت قریبہ موجود ہو یا اس سے مشابہت پائی جاتی ہو وہاں باہمی ارتباط کی بنیاد صرف رحم، محبت اور رافت و شفقت کے اعلیٰ جذبات ہی پر ہونی چاہیے، اس میں نہ تو نفس کی شہوات و رغبات کی کوئی آمیزش ہونی چاہیے نہ رشک و رقابت کو اس میں خلل انداز ہونے کا موقع دینا چاہیے۔ یہ چیز اس فطرت اصلیہ کے خلاف ہے جس پر فاطر کائنات نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس وجہ سے ان تمام عورتوں سے ازدواجی تعلق کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے جن کو بلا واسطہ یا بالواسطہ رحمی قربت قریبہ حاصل ہے۔

رضاعت کے رشتہ کو مادرانہ رشتے سے مناسبت حاصل ہے

رضاعت کے تعلق کو لوگ ہمارے ہاں اس گہرے معنی میں نہیں لیتے جس معنی میں اس کو لوگ عرب میں لیتے تھے۔ اس کا سبب محض رواج کا فرق ہے۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ اس کو مادرانہ رشتے سے بڑی گہری مناسبت ہے۔ جو بچہ جس ماں کی آغوش میں، اس کی چھاتیوں کے دودھ سے پلتا ہے وہ اس کی پوری نہیں تو آدھی ماں تو ضرور بن جاتی ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جس کا دودھ اس کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے اس سے اس کے جذبات و احساسات متاثر نہ ہوں۔ اگر نہ متاثر ہوں تو یہ فطرت کا بناؤ نہیں بلکہ بگاڑ ہے اور اسلام، جو دین فطرت ہے، اس کے لیے ضروری تھا کہ اس بگاڑ کو درست کرے۔

رضاعت کے رشتے نے معاشرہ کو عظیم فائدے پہنچائے

رضاعت کے تعلق کو اس کا صحیح مقام دینے سے معاشرت کو جو فوائد پہنچے ہیں ان کا صحیح اندازہ بھی عام طور پر نہیں کیا جاتا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس رشتے نے گڈریوں اور چرواہوں کی ماؤں بہنوں کو سرداروں بلکہ تاجداروں کی مائیں بہنیں بنا دیا۔ اس رشتے کی برکت سے دیہاتیوں اور شہریوں، غریبوں اور امیروں کے مابین ایسے روابط قائم ہو گئے جن کو کوئی چیز بھی توڑ نہیں سکتی تھی۔

معتبر رضاعت کے لیے ضروری شرط

لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ تعلق مجرد کسی اتفاقی واقعے سے قائم نہیں ہو جاتا۔ قرآن نے یہاں جن لفظوں میں اس کو بیان کیا ہے اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ یہ اتفاقی طور پر نہیں بلکہ اہتمام کے ساتھ، ایک مقصد کی حیثیت سے عمل میں آیا ہو، تب اس کا اعتبار ہے۔ اوّل تو فرمایا ہے "تمھاری وہ مائیں

جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہے۔" پھر اس کے لیے رضاعت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مِّنَ الرَّضَاعَةِ، عربی زبان کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ 'ارضاع' باب افعال سے ہے جس میں فی الجملہ مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اسی طرح 'رضاعت' کا لفظ بھی اس بات سے اِبا کرتا ہے کہ اگر کوئی عورت کسی روتے بچے کو بہلانے کے لیے اپنی چھاتی اس کے منہ سے لگا دے تو یہ رضاعت کہلائے۔

ربیبہ کس صورت میں حرام ہے

'ربیبہ' بیوی کی اس لڑکی کو کہتے ہیں جو اس کے سابق شوہر سے ہو۔ اس کو چونکہ خود اپنی لڑکی سے مشابہت حاصل ہو جاتی ہے اس وجہ سے اس کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ ان لڑکیوں کی حرمت بیان کرتے ہوئے ان کو دو صفتوں کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ایک یہ کہ وہ تمھاری آغوش تربیت میں پلی ہیں، دوسری یہ کہ وہ تمھاری مدخولہ بیوی کے بطن سے ہیں۔ یہ دونوں صفتیں حرمت کے حکم کو مؤثر بنانے کے لیے مذکور ہوئی ہیں۔ عربی زبان میں ہر صفت کو لازماً قید و شرط کی حیثیت حاصل نہیں ہو جاتی کہ ان میں سے کوئی نہ پائی جائے تو وہ حکم کالعدم ہو جائے بلکہ اس کا انحصار قرینے پر ہوتا ہے۔ قرینہ بتاتا ہے کہ کون سی صفت قید اور شرط کا درجہ رکھتی ہے اور کون سی صفت محض تصویر حال کے لیے ہے۔ یہاں صرف قرینہ ہی نہیں بلکہ تصریح ہے کہ ربیبہ کی ماں اگر تمھاری مدخولہ نہیں ہو تو اس ربیبہ سے نکاح میں کوئی قباحت نہیں۔ اس سے یہ بات صاف ہو گئی کہ ربیبہ کی حرمت میں اصل مؤثر چیز اس کی ماں کا مدخولہ ہونا ہے۔ اگر وہ مدخولہ ہے تو اس کی لڑکی سے نکاح ناجائز ہو گا، قطع نظر اس سے کہ وہ آغوشِ تربیت میں پلی ہے یا نہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اعلیٰ عربی بالخصوص قرآن حکیم میں اثبات کے بعد نفی کے اسلوب یا نفی کے بعد اثبات کے اسلوب میں جو باتیں بیان ہوتی ہیں وہ محض سخن گسترانہ نہیں ہوتیں بلکہ کسی خاص فائدے کے لیے ہوتی ہیں۔ ان سے مقصود اکثر صورتوں میں رفع ابہام ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کا خیال قرآن کے خلاف ہے جو ربیبہ کے ساتھ نکاح صرف اس صورت میں حرام سمجھتے ہیں جب وہ نکاح کرنے والے کے آغوشِ تربیت میں پلی ہو۔ بصورتِ دیگر وہ اس کے ساتھ نکاح کو جائز سمجھتے ہیں۔

جمع بین الاختین کی ممانعت کی علت

جمع بین الاختین کی ممانعت بھی اسی اصولِ حکمت پر مبنی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ قرآن حکیم انسانی فطرت کے اس تقاضے کو اُبھارنا چاہتا ہے کہ جہاں رحمی رشتے کی قربت قریبہ موجود ہو وہاں باہمی ارتباط کی فطری بنیاد رافت و رحمت ہی ہونی چاہیے۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ ان اسباب کو دبا دیا جائے جو رحمی رشتوں کے اندر رشک و رقابت کا زہر گھولنے والے ہوں۔ چونکہ دو بہنوں کے بیک وقت کسی کی قید نکاح میں ہونے کی صورت میں اس کا غالب امکان ہے کہ دو بہنیں، بہنیں ہوتے ہوئے بھی، سوکنوں کے جلاپے اور رشک و رقابت کے جذبات میں مبتلا ہو جائیں اس وجہ سے اس کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ چونکہ یہی صورت خالہ اور بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی کے جمع کرنے کی شکل میں بھی موجود تھی اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا کہ حدیثوں سے واضح ہے، ان کے جمع

کرنے کی بھی ممانعت فرما دی۔

صلبی اور متبنّٰی بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں قرآن نے جو فرق کیا ہے اس پر تفصیلی بحث کے لیے موزوں مقام سورۂ احزاب میں آئے گا۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ بیٹوں کے ساتھ مِنْ اَصْلَابِكُمْ کی قید نے متبنّٰی بیٹوں کی بیویوں کو اس حکم سے خارج کر دیا۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۭ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۲۴)

'احصان' کا مفہوم

احصان کے معنی کسی شے کو اپنی حفاظت و حمایت میں لینے کے بھی ہیں اور کسی کی حفاظت و حمایت میں ہونے کے بھی۔ اسی سے 'محصنٰت' کا لفظ ہے جو ان عورتوں کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی کی قید نکاح میں ہوں۔ نیز یہ لونڈیوں کے مقابل لفظ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کا اطلاق حرائر اور شریف زادیوں پر ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ ان دونوں ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں پہلے معنی میں ہیں، بعد والی آیت میں دوسرے مفہوم میں۔

'سفح' اور 'مسافحت' کا مفہوم

سفح کے لغوی معنی بہانے کے ہیں۔ اسی سے مسافحت ہے جس کے معنی عیاشی اور بدکاری کے ہیں اس لیے کہ اس میں بھی عورت اور مرد دونوں محض تلذذ کو مقصد قرار دے کر اپنا مادۂ منی برباد کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سابق الذکر محرمات کی فہرست میں وہ عورتیں بھی شامل ہیں جو کسی کی قید نکاح میں ہوں اس لیے کہ کوئی عورت بیک وقت دو مردوں کی زوجیت میں نہیں ہو سکتی۔ صرف ملک یمین اس سے مستثنیٰ ہے، اس کا کسی کی ملکیت میں آ جانا ہی اس کے سابق نکاح کو، جو دار الحرب میں ہوا، کالعدم قرار دے دیتا ہے۔

نکاح کے لیے دو بنیادی شرطیں

ان عورتوں کے ماسوا عورتوں سے نکاح جائز ہے مگر اس کے ساتھ دو شرطیں ہیں اور یہ دونوں شرطیں بیک وقت مطلوب ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح مال یعنی مہر کے ساتھ ہو۔ دوسری یہ کہ اس نکاح سے مقصود عورت کو اپنی حمایت و حفاظت میں لینا ہو نہ کہ وقتی طور پر شہوت رانی کر کے محض ہیجان نفس کو تسکین دے لینا۔

مہر کی شرط کا اصلی مقصد

مال اور مہر کی شرط لگانے سے ایک مقصد تو یہ ہے کہ عورتوں کے معاملے میں اکراہ یا توارث کے ان امکانات کا بالکل سدباب ہو جائے جن کی طرف اوپر اشارہ گزرا۔ ہر چند اس کا بہت کچھ سدباب رحمی رشتوں کو حرام قرار دینے سے بھی ہو گیا تھا لیکن اس شرط نے اس کو اور بھی مسدود کر دیا۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ نکاح کے معاملے کو ایک سنجیدہ معاہدے کی حیثیت حاصل ہو جائے، اس کے

لڑکوں کا کھیل نہ بنایا جا سکے۔ جس معاملے کے ساتھ ادائے مال کی شرط لگی ہو اور اس ادائے مال کی حیثیت محض ایک تبرع اور احسان کی نہ ہو بلکہ ایک فریضہ کی ہو، یہاں تک کہ اگر وہ مذکور نہ بھی ہو جب بھی لازماً مضمر سمجھا جائے اور عورت کی حیثیت عرفی کے اعتبار سے اس کی ادائگی واجب قرار پائے، شرعاً وعرفاً ایک اہم اور سنجیدہ معاملہ بن جاتا ہے کوئی بھی ذی ہوش آدمی ایسے معاہدے میں ایک پارٹی بننے کی جرأت نہ کرے گا جب تک وہ سو بار سوچ کر اس میں شرکت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ کرے ـــــ ان مصالح سے مہر کی شرط ضروری ہوئی۔ جن لوگوں کی نظر ان مصالح کی طرف نہیں گئی وہ سمجھتے ہیں کہ اس شرط نے عورت کو ایک خریدنی و فروختنی شے کے درجے تک گرا دیا ہے۔ یہ خیال محض ناسمجھی کا نتیجہ ہے۔ یہ شرط تو ایک آگاہی ہے کہ جو بھی عورت کے حرم میں قدم رکھنا چاہے وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر قدم رکھے۔ نکاح و طلاق کے معاملے میں کسی مذاق کی گنجائش نہیں ہے یہاں مذاق بھی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ع

ہشدار کہ رہ بردم تیغ است قدم را

احصان کی شرط متعہ کی نفی ہے — 'احصان' کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ نکاح کو 'سفاح' سے ممیز کر دیا جائے۔ نکاح کا اصل مقصد اسی شکل میں پورا ہوتا ہے جب اس کے ساتھ 'احصان' پایا جائے۔ یعنی ایک مرد ایک عورت کو سنجیدہ ارادے اور زندگی بھر کے سنجوگ کے عزم کے ساتھ اپنی حفاظت و حمایت میں لے اور عورت اسی شعور و ارادے کے ساتھ اس کے حصن حمایت میں داخل ہو۔ اس احصان کے بغیر عورت اور مرد کے تعلق سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جو قدرت نے اس سے پورا کرانا چاہا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے ایک وقتی اور عارضی تعلق پیدا کرتا ہے تو گو اس کے لیے اس نے نکاح کی رسم بھی پوری کی ہو اور اس کو مال بھی دیا ہو لیکن یہ احصان نہیں ہوا۔ یہ محض پیشاب کرنے کے لیے ایک پیشاب خانہ تلاش کیا گیا ہے جس سے مقصود محض وقتی طور پر شانے کے بوجھ کو ہلکا کر لینا ہے۔ قرآن نے یہ شرط لگا کر متعہ کے اس مکروہ رواج کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جو جاہلیت میں رائج تھا۔

آگے فرمایا کہ مقرر شدہ مہر ایک فریضہ کی حیثیت سے ادا کیا جائے۔ البتہ مہر کے مقرر کرنے کے بعد میاں بیوی باہمی رضا مندی سے اگر اس میں کوئی کمی بیشی کر لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آخر میں علیم و حکیم کی صفات کا حوالہ اس قانون کی عظمت اور حکمت کے اظہار کے لیے ہے کہ جس نے یہ قانون اتارا ہے وہ علیم و حکیم ہے اس وجہ سے اس کی ہر بات بے خطا علم اور اتھاہ حکمت پر مبنی ہے۔ بندوں کے لیے نہ یہ جائز ہے کہ اس کی خلاف ورزی کریں، نہ یہ جائز ہے کہ اس میں ترمیم و اصلاح کی کوشش کریں۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۵)

'طول' کے معنی قدرت، غنی اور فضل کے ہیں۔

'وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ' یعنی عزوشرف کی اصلی بنیاد ایمان پر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک عورت لونڈی ہوتے ہوئے اپنے ایمان کے اعتبار سے بڑے بڑے شریف زادوں اور شریف زادیوں پر فوقیت حاصل کرے۔ اس وجہ سے مجرد اس خیال کی بنا پر کہ ایک عورت لونڈی ہے اس کے اندر شرف کے امکان کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اور ایمان ایک ایسی چیز ہے جس کے ناپنے اور تولنے کا حقیقی پیمانہ اللہ ہی کے پاس ہے، دوسرے اس کا صحیح صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔

'بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لونڈی اور غلام ہونا تو ایک حالت عارضی ہے۔ نسل کے اعتبار سے تو جتنے غلام اور آزاد اور جتنی بانویں اور باندیاں ہیں سب ایک ہی آدم اور ایک ہی حوا کی نسل سے ہیں۔

لفظ 'فاحشۃ' کی تنکیر

'فاحشۃ' سے مراد زنا ہے۔ اس کی تنکیر اظہار کراہت و نفرت کے لیے ہے جیسا کہ اسی سورہ کی آیت ۴۷ میں 'نطمس وجوھا' آیا ہے۔ وہاں ہم اس نکرہ کی وضاحت کریں گے۔ 'عنت' کے معنی زحمت و مشقت کے ہیں لیکن اس کا استعمال ایسی زحمتوں اور مشقتوں کے لیے ہوتا ہے جو آدمی کے لیے وجہ ابتلا اور مزلۂ قدم بن جائیں۔

دوسرے مالکوں کی لونڈیوں سے نکاح کی اجازت احتیاط کے ساتھ

آیت کا مدعا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شریف زادی سے نکاح کی قدرت نہیں رکھتا تو وہ کسی مسلمان لونڈی سے نکاح کر لے۔ عزت و شرافت کی اصل بنیاد ایمان ہے اور ایمان کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔ جہاں تک جنس و نسل کا تعلق ہے، اس اعتبار سے سب ایک ہی ہیں اس لیے کہ سب ایک ہی آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ پس لونڈی سے نکاح میں کوئی حرج نہیں ہے البتہ یہ شرط ہے کہ یہ نکاح ان کے مالکوں کی اجازت سے ہو اور ان لونڈیوں کو دستور کے مطابق مہر دیا جائے۔ نیز یہ لونڈیاں بھی قید احصان کی پابند ہو کر رہیں محض وقتی تلذذ اور یاری آشنائی پیش نظر نہ ہو۔ اس قید احصان میں آجانے کے بعد اگر یہ زنا کی مرتکب ہوں تو سورۂ نور میں جو سزا شریف زادیوں کے لیے بیان ہوئی ہے یعنی سو کوڑے، اس کی نصف سزا ان کو بھی دی جائے گی۔

آخر میں فرمایا کہ لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے کی یہ اجازت ان لوگوں کے لیے ہے جنھیں یہ اندیشہ ہو کہ اگر انھوں نے کہیں نکاح نہ کیا تو وہ مبتلائے معصیت ہو جائیں گے۔ جو لوگ اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتے ہوں ان کے لیے صبر ہی بہتر ہے۔

اسلامی معاشرہ میں لونڈیوں اور غلاموں کا درجہ

یہ خیال ہم اس سے پہلے کئی مقامات میں ظاہر کر چکے ہیں کہ غلام اور لونڈیاں اسلام کے اپنے نظام

معاشرت کا کوئی جزو نہیں ہیں بلکہ یہ چیز اس وقت کے بین الاقوامی حالات اور اسیرانِ جنگ کے مسئلے کے ایک حل کی حیثیت سے پہلے سے موجود تھی جس کو اسلام نے گوارا کر لیا۔ اسلام اس کو اگر یک طرفہ طور پر اپنے ہاں ختم کر دیتا تو اس سے مسلمانوں کے معاشرے کے اندر بھی نہایت سخت قسم کی افراتفری پھیل جانے کا اندیشہ تھا اور دشمن قومیں بھی اس سے غلط قسم کا فائدہ اٹھا سکتی تھیں۔ اس کو مکمل طور پر ختم کر دینے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے بین الاقوامی سطح پر لوگوں کے اندر انسانی مساوات کا شعور پیدا ہو۔ چنانچہ اسلام نے خود اپنے نظام میں ایسے قواعد و ضوابط رکھ دیے جن سے اس پست حال طبقہ سے متعلق لوگوں کے اندر انسانی مساوات کا شعور بھی بیدار ہو اور بالتدریج یہ ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے اتنا بلند ہو جائے کہ اسلامی معاشرے میں اپنا صحیح مقام حاصل کر لے۔

غلاموں اور لونڈیوں کا درجہ اونچا کرنے کے بعض احکام

مکاتبت اور ام الولد وغیرہ کے مسئلے پر ہم دوسرے مقام پر بحث کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں کہ اس طرح اسلام نے تمام ذی صلاحیت غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کی ایک نہایت کشادہ راہ کھول دی تھی۔ اب اس آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں اس پست حال طبقہ کے بلند کرنے کے لیے نہایت اہم حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو یاد دلایا ہے کہ عزت و شرف کی بنیاد ایمان و اسلام پر ہے اور یہ چیز ایسی ہے کہ جس طرح ایک آزاد اس سے بہرہ ور ہو سکتا ہے اسی طرح ایک غلام بھی ہو سکتا ہے۔ رہا نسل و نسب کا معاملہ تو اس اعتبار سے آزاد و غلام بلکہ تمام انسان برابر ہیں۔ پھر یہ حقیر کیوں سمجھے جائیں؟

دوسری چیز یہ ہے کہ لونڈیوں کے لیے بھی مہر اور احصان کی وہی شرطیں مقرر ہوئیں جو آزاد عورتوں کے لیے تھیں تاکہ سوسائٹی کے اندر ان کا معیار اونچا ہو۔

ارتکابِ زنا کی صورت میں ان کے لیے بھی سزا مقرر ہوئی تاکہ بالتدریج ان کا اخلاقی معیار سوسائٹی کے معیار پر آجائے۔ سزا میں ان کے لیے آزاد عورتوں کے بالمقابل جو رعایت رکھی گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو وہ تحفظ حاصل نہیں تھا جو قدرتی طور پر خاندانی عورتوں کو حاصل تھا۔

دوسرے مالکوں کی لونڈیوں کے ساتھ مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دی گئی اور اس سے بھی مقصود لونڈیوں کے معاشرتی معیار کو اونچا کرنا تھا لیکن چونکہ اس صورت میں حقوقِ ملکیت اور حقوقِ نکاح میں تصادم کے اندیشے تھے اس وجہ سے اس طرح کے نکاح میں احتیاط کی تاکید فرمائی گئی۔

رجم کی سزا کا ماخذ

اس آیت کے تعلق سے ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ آیت سورہ نور کی بیان کردہ حدِ زنا کو ہر قسم کے زانیوں کے لیے، شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ، عام کر دیتی ہے تو زنا کے لیے رجم کی سزا کا ماخذ کیا ہے؟ اس سوال پر ان شاء اللہ ہم سورۂ مائدہ اور سورۂ نور میں بحث کریں گے۔

۱۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۶-۲۸

معاشرتی اصلاح سے متعلق احکام وہدایات کے بیچ میں یہ تین آیتیں بطور تنبیہ وتذکیر آگئی ہیں جن سے مقصود ایک طرف تو مسلمانوں کو ان احکام کی عظیم قدر وقیمت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ تمہاری طرف تمام انبیاء وصالحین کی وراثت منتقل کر رہا ہے تو اس کی سچے دل سے قدر کرو اور رحمت الٰہی کے مستحق بنو، دوسری طرف اس طوفان مخالفت سے آگاہ کرنا ہے جو ان اصلاحات کی مخالفت میں اس مفاد پرست طبقہ کی طرف سے اٹھ رہا تھا جو یتیموں، بیواؤں، کمزوروں اور غلاموں کے حقوق پر غاصبانہ تسلط جمائے بیٹھا تھا اور کسی طرح بھی اپنے اس تسلط سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۶-۲۸

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦﴾ وَاللّٰهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۚ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ﴿٢٧﴾ يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ﴿٢٨﴾

ترجمۂ آیات ۲۶-۲۸

اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم پر اپنی آیتیں واضح کر دے اور تمہیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت بخشے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور تم پر رحمت کی نگاہ کرے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ ۲۶

اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم پر رحمت کی نگاہ کرے اور وہ لوگ جو اپنی شہوات کی پیروی کر رہے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ تم راہ حق سے بالکل ہی بھٹک کر رہ جاؤ۔ ۲۷

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ کو ہلکا کرے اور انسان کمزور بنایا گیا ہے۔ ۲۸

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لفظ ارادہ کے دو مفہوم

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ اور وَاللّٰهُ يُرِيدُ اَنْ يَّتُوبَ عَلَيْكُمْ کے اسلوب پر غور کیجیے تو دونوں میں ایک نمایاں فرق نظر آئے گا کہ ایک جگہ یرید کے بعد 'لِ' ہے اور دوسری جگہ 'اَنْ' یہ فرق بے فائدہ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ان دونوں اسلوبوں کے تتبع سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ 'ارادہ' کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو قطعی فیصلہ اور حتمی ارادہ کے معنی میں، دوسرے چاہنے کے معنی میں جب پہلے معنی مراد ہوتے ہیں تو اس کے بعد 'لِ' آتا ہے اور جب مجرد چاہنے کے معنی میں آتا ہے تو اس کے بعد 'اَن' آتا ہے مثلاً۔

اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ۔ ۳۳۔ احزاب	اللہ کا ارادہ تو بس یہ ہے کہ اے اہل بیت نبی کہ تم سے ناپاکی کو دور کرے۔
يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ۔ ۶ مائدہ	ارادہ الٰہی یہ ہے کہ تم کو پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے۔
اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ ۵۵۔ توبہ	اللہ تو بس یہ ارادہ کیے ہوئے ہے کہ اس کے ذریعے سے ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب دے۔

اس اسلوب کی وضاحت کے بعد زیر بحث آیات کے مطلب پر غور فرمائیے۔ پہلے یہ واضح فرمایا کہ اللہ نے اپنے علم و حکمت سے تمہیں اس مقصد کے لیے منتخب فرمایا ہے کہ تمہارے لیے اپنی آیتیں اور اپنے احکام و ہدایات واضح فرمائے اور انبیاء و صالحین کے ذریعے سے ایمان و عمل صالح کی جو راہیں دنیا کے لیے کھولی گئی تھیں اور جو اب گم کر دی گئی تھیں ان کی تمہیں از سر نو ہدایت بخشے تاکہ تم اللہ کی طرف رجوع کرو اور اللہ تم پر رحمت کی نظر فرمائے۔ اس بات کو ایک فیصلہ الٰہی کی حیثیت سے ظاہر فرمایا ہے اس لیے کہ آخری بعثت کے ذریعہ سے ایک ایسی امت کا برپا کرنا جو پورے دین و شریعت کی حامل اور تمام اولین و آخرین کی وارث ہو پہلے سے اللہ تعالیٰ کی سکیم میں طے تھا اور سابق انبیاء نے اس کی خبر بھی دے دی تھی اور اس کا برپا ہونا خدا کے علم و حکمت کا مقتضیٰ بھی تھا اس لیے کہ وہ علیم و حکیم اس بات کو پسند نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق کو یوں ہی گمراہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے، اس کی ہدایت کے لیے کوئی انتظام نہ فرمائے۔

اس بات کو ایک حتمی فیصلہ کی حیثیت سے ظاہر کرنے کا مقصد ایک تو مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے دوسرے اسلام کے ان معاندین و مخالفین کی ہمت شکنی جو ان معاشرتی اصلاحات کی وجہ سے جو اس سورہ میں مذکور ہوئی ہیں، جھاڑ کے کانٹے کی طرح مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ معاشرتی اصلاحات کو عام طور

مفاد پرست طبقہ مستقلے پیشوں برداشت نہیں کرتا۔ اس وجہ سے یہود و نصاریٰ، مشرکین سب میں ان اصلاحات سے ایک آگ سی لگ گئی جنھوں نے بھی دیکھا کہ ان کی زد ان کی بے لگام آزادیوں اور بے قید شہوت پرستیوں پر پڑ رہی ہے وہ اس ارادے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے کہ ان تمام اصلاحات کو ناکام کر کے خلق خدا کو پھر اسی تاریکی کے گڑھے میں دھکیل دیں جس سے نجات دینے کے لیے اسلام نے یہ روشنی دکھائی تھی۔ اسی طرح جن لوگوں نے اپنے اوپر اپنی خود ساختہ شریعتوں اور خانہ ساز رسموں اور رواجوں کے بوجھ لاد رکھے تھے انھوں نے جب دیکھا کہ یہ بوجھ لوگوں کے سر سے اتر رہا ہے اور اصر و اغلال کی غیر فطری بیڑیاں کٹ رہی ہیں تو چیخنے لگے کہ اسلاف کا سارا سرمایہ معرض خطر میں ہے۔ قرآن نے ان سب کے جواب میں مسلمانوں کو بتایا کہ تم ان مخالفوں کی ہفوات کی پروا نہ کرو۔ انبیائے سابقین اور اسلاف صالحین کی اصلی وراثت یہی ہے جو تمھاری طرف منتقل ہو رہی ہے۔ خدا نے تمھیں رحمت سے نوازنا چاہا ہے لیکن یہ اشرار و مفسدین یہ چاہتے ہیں کہ تمھیں اس رحمت سے محروم کر دیں۔ آخری آیت میں یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ ان اصلاحات سے جو بیڑیاں کاٹی جا رہی ہیں وہ اس لیے کاٹی جا رہی ہیں کہ یہ غیر فطری اور خود ساختہ تھیں۔ قدرت نے انسان کو جس فطرت سلیم پر پیدا کیا ہے وہ فطرت ان غیر فطری بوجھوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ آگے اسی سورہ میں آیت ۴۴ سے ان تمام مخالفتوں کی تفصیل آ رہی ہے۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۹-۳۳

اس ضمنی تذکیر و تنبیہ کے بعد اصلاح معاشرہ ہی سے متعلق احکام و ہدایات کا مضمون پھر شروع ہو گیا اور چند ایسی ہدایات دی گئی ہیں جن سے پچھلی اصلاحات کی تائید و توثیق بھی ہو رہی ہے اور ان اصلاحات کا دائرہ وسیع بھی ہو رہا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۹-۳۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ
بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا
تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ
ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ
عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَتَمَنَّوْا

مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيۡبٌ
مِّمَّا اكۡتَسَبُوۡا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا اكۡتَسَبۡنَ ؕ وَسۡـئَلُوا اللّٰهَ
مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلۡنَا
مَوَالِىَ مِمَّا تَرَكَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ ؕ وَالَّذِيۡنَ عَقَدَتۡ
اَيۡمَانُكُمۡ فَاٰتُوۡهُمۡ نَصِيۡبَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ
شَهِيۡدًا ﴿۳۳﴾ ع

ترجمۂ آیات ۲۹-۳۳

اے ایمان والو، اپنے مال آپس میں باطل ذریعے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ کوئی مال باہمی رضامندانہ تجارت کی راہ سے حاصل ہو جائے اور ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، اللہ تم پر بڑا مہربان ہے اور جو لوگ تعدی اور ظلم کی راہ سے ایسا کریں گے ہم ان کو جلد ایک سخت آگ میں جھونک دیں گے اور یہ اللہ کے لیے بہت ہی آسان ہے۔ تم جن باتوں سے روکے جا رہے ہو اگر ان کے بڑے گناہوں سے تم بچتے رہے تو ہم تم سے تمھاری چھوٹی برائیاں جھاڑ دیں گے اور تمھیں ایک عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔ ۲۹-۳۱

جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انھوں نے کمایا اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انھوں نے کمایا اور اللہ سے اس کے فضل میں سے حصہ مانگو۔ بے شک اللہ ہر چیز سے باخبر ہے اور ہم نے والدین اور قرابت مندوں کے چھوڑے ہوئے میں سے ہر ایک کے لیے وارث ٹھہرا دیے ہیں اور جن سے تم نے کوئی پیمان باندھ رکھا ہو تو ان

کو ان کا حصہ دو۔ بے شک اللہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔ ۳۱-۳۳

۱۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا۔ (۲۹)

حرمتِ مال اور حرمتِ جان میں باہمی گہرا رشتہ ہے

اس آیت میں باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانے اور قتل نفس کو حرام ٹھہرایا ہے اور ان دونوں حرمتوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا ہے۔ ان کو ایک ساتھ جمع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ان دونوں میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ مال کی حرص اس کے حصول کے جائز و ناجائز طریقوں کی تمیز اٹھا دیتی ہے اور پھر یہ بیماری لوگوں کو اس طرح اندھا کر دیتی ہے کہ اس کے لیے قتل و خون تک نوبت آجاتی ہے۔ سماجی فسادات اور خونریزی کے اسباب کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ حرص مال کو ان میں سب سے زیادہ دخل ہے۔ اسلام نے ان دونوں چیزوں کے اس گہرے باہمی رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے کے مال اور ایک دوسرے کی جان دونوں چیزوں کی حرمت کی یکساں تاکید فرمائی ہے حرمۃ مالہ کحرمۃ دمہ (مومن کا مال بھی اسی طرح محترم ہے جس طرح اس کی جان محترم ہے)۔

کسی معاملت کے لیے فریقین کی حقیقی رضامندی شرط ہے

باطل طریقہ سے مراد لین دین، کاروبار اور تجارت کے وہ طریقے ہیں جن میں معاملت کے دونوں فریقوں کی حقیقی رضامندی یکساں طور پر نہیں پائی جاتی بلکہ اس میں ایک کا مفاد محفوظ ہوتا ہے، دوسرا ضرر یا غرر کا ہدف بنتا ہے۔ قرآن نے اس مفہوم کی طرف خود اشارہ فرما دیا ہے۔ چنانچہ باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانے کی نہی کے بعد یہ جو فرمایا ہے کہ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ، یہ مثبت پہلو سے اسی اجمال کی وضاحت ہے جو پہلے ٹکڑے میں پایا جاتا ہے۔ اس ٹکڑے نے واضح کر دیا کہ معاملت اور لین دین کی بنیاد جب حقیقی باہمی رضامندی پر ہو تب ہی اس سے جو نافع ہوتا ہے وہ جائز ہوتا ہے اور اگر اس میں کوئی دھوکا پایا جاتا ہے یا اس میں ایک فریق کی بے بسی اور مجبوری کو دخل ہے تو اگرچہ وہ بظاہر اس پر راضی بھی ہو لیکن یہ 'اکل اموال بالباطل' کے حکم میں داخل ہے۔ اسی بنا پر معاملت اور تجارت کی وہ تمام شکلیں اسلام میں ناجائز قرار پائیں جن میں ضرر یا غرر کا شائبہ ہے۔ ربٰوا اس کاروبار کی ایک قبیح ترین شکل ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں ربٰوا اور تجارت کے فرق پر ہم جو بحث لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'لا تقتلوا انفسکم' کا مفہوم

'وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ' بالکل 'لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ' کا ہم وزن ٹکڑا ہے یعنی نہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ہڑپ کرو، نہ ایک دوسرے کو قتل کرو۔ اس کے معنی خودکشی کے لینے کا نہ

کوئی موقع و محل بیان ہے نہ ان الفاظ میں اس مفہوم کی کوئی گنجائش ہے۔ اگر خودکشی کے مفہوم کو ادا کرنا چاہیں گے تو اس کے لیے اسلوب بالکل مختلف ہوگا۔ 'اَنْفُسَكُمْ' کا لفظ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ جو شخص معاشرہ کے اندر کسی قتل کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنوں ہی کے قتل کا مرتکب ہوتا ہے اس لیے کہ معاشرہ کے تمام افراد اپنے ہی بھائی بند ہیں 'اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ' اور 'اَلْمُؤْمِنُوْنَ كُلُّهُمْ اِخْوَةٌ' کے اصول پر ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے ایک کے قاتل کو سب کا قاتل قرار دیا ہے۔

خدا کی صفتِ رحمت کے تقاضے

'اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا' درحقیقت علت بیان ہوئی ہے ان ممانعتوں کی جن کا ذکر اوپر ہوا۔ یعنی جب تمہارا رب تمہارے اوپر مہربان اور رحیم ہے تو وہ کس طرح یہ پسند کر سکتا ہے کہ تم ایک دوسرے کے مال ہڑپ کرو اور ایک دوسرے کو قتل کرو۔ رؤف و رحیم رب تو یہی چاہے گا کہ تم آپس میں 'رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ' بن کر رہو۔ پھر یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ اگر اس کے برخلاف لوگ آپس میں ظلم و عدوان کے مرتکب ہوں تو یہ عین اس کی رافت و رحمت ہی کا تقاضا ہے کہ وہ عدل و انصاف کا ایک ایسا دن لائے جس میں ان لوگوں کو کیفرِ کردار کو پہنچائے جو اس کے مرتکب ہوتے ہوں۔ چنانچہ آگے والی آیت اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ۔ ۳۰

'ذٰلِكَ' کا اشارہ ان دونوں ہی چیزوں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔

'عدوان' اور 'ظلم' کا خاص مفہوم

'عدوان' اور 'ظلم' کے الفاظ جب ایک ساتھ آئیں تو جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں لکھ چکے ہیں، یہ گناہ کی دو الگ الگ صورتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی شخص زور و زبردستی سے دوسرے کے جان یا مال پر دست درازی کرے، دوسری شکل یہ ہے کہ کوئی شخص دھاندلی سے کسی کا حق واجب ادا نہ کرے بلکہ اس کو دبا بیٹھے۔ پہلی صورت عدوان کی ہے دوسری ظلم کی۔ اگر یہ الگ الگ آئیں تو ایک دوسرے کے مضمون پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

'نَارًا' کا لفظ نکرہ تفخیم کے لیے استعمال ہوا ہے یعنی ایسے لوگوں کو ایک سخت بھڑکتی ہوئی آگ میں ہم ڈالیں گے۔

ایک لطیف نکتہ

'وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا' (یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے) ایک مخفی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ خدا کو مانتے ہیں لیکن خدا کی صفات عدل و رحم کا صحیح تصور نہیں رکھتے وہ اپنے آپ کو الاؤنس دینے میں بڑے فیاض ہوتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے جرائم کرتے چلے جاتے ہیں لیکن یہود کی طرح توقع یہی رکھتے ہیں کہ خدا ان پر بڑا مہربان ہے اس لیے سب بخش دے گا۔ قرآن نے یہود کا قول 'سَيُغْفَرُ لَنَا' جو نقل کیا ہے وہ اسی ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے۔ درحقیقت اس قماش کے لوگ نہ تو حاصل

کرتے ہیں اس ڈھیل اور مہلت سے جو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق عطا فرماتا ہے لیکن ان کی حیلہ جو طبیعت آڑ ڈھونڈتی ہے خدا کی رحمت کی۔ حالانکہ خدا رحیم ہے تو آخر وہ ظالموں پر کیوں رحم فرمائے گا۔ اس کی رحمت کے اصلی مستحق تو وہ مظلوم ہیں جو ان کے ہاتھوں زندگی بھر ستائے گئے اور آہ بھی نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی ذہنیت رکھنے والوں کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ جو لوگ ظلم و عدوان کی زندگی بسر کر رہے ہیں ان کو جہنم میں جھونک دینا خدائے رحیم پر ذرا بھی شاق نہیں گزرے گا اس لیے کہ وہ جس طرح رحیم ہے اسی طرح عادل بھی ہے اور یہ عدل بھی اس کی رحمت ہی کا تقاضا ہے۔

اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا - ۳۱

'کبائر اور صغائر' سے مراد

'سیّات' کا لفظ چونکہ یہاں کبائر کے مقابل میں آیا ہے اس وجہ سے اس سے مراد صغائر یعنی چھوٹے گناہ ہیں۔ جس طرح نیکیاں، جن کا حکم دیا گیا ہے، بڑی بھی ہیں اور چھوٹی بھی، اسی طرح بدیاں، جن سے روکا گیا ہے، چھوٹی بھی ہیں بڑی بھی۔ یہ چھوٹا اور بڑا ہونا اگرچہ حالات اور نسبتوں کے بدلنے سے تبدیل بھی ہوتا رہتا ہے اس وجہ سے ان کی منطقی حدبندی ذرا مشکل ہے تاہم یہ ایسی چیز نہیں جس کا سمجھنا دشوار ہو۔ جس طرح ہجرت اور جہاد بھی نیکی ہے اور راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو دور کر دینا بھی نیکی ہے لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے اور اس فرق کو ہر شخص سمجھتا ہے، اسی طرح کسی کا گھر لوٹ لینا بھی برائی ہے اور راستے میں کوئی گندی چیز پھینک دینا اور کسی غلط جگہ تھوک دینا بھی برائی ہے لیکن دونوں برائیوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور اس فرق کو بھی ہر شخص سمجھتا ہے۔ درحقیقت نیکیوں اور بدیوں دونوں کی بڑائی چھٹائی کے ناپنے کے لیے پیمانہ ان کے اثرات و نتائج ہیں۔ اگر ہماری نگاہ دوررس ہو اور ہم خواہشات نفس کی جانبداری سے بالاتر ہو کر حقائق پر غور کریں تو اس کے سمجھنے میں کوئی التباس پیش نہیں آ سکتا۔ لیکن بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ عقل پر خواہشاتِ نفس کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ پربت رائی بن جاتا ہے اور رائی پربت۔ شریعت نے اس التباس سے بچنے کے لیے حرام بھی واضح کر دیے اور حلال بھی۔ لیکن ان کے درمیان کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں التباس پیش آ سکتا ہے۔ ایسی چیزوں کے باب میں تقویٰ کا تقاضا تو یہی ہے کہ آدمی احتیاط کے پہلو کو اختیار کرے لیکن اگر بشری کمزوری سے کوئی غلطی صادر ہو گئی تو حدودِ حرام و حلال کے ملحوظ رکھنے والے کے دل پر اللہ تعالیٰ اس کا میل جمنے نہیں دیتا۔

جنت کی راہ

اس آیت میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ خدائی گرفت سے بچنے اور اس کی جنت میں داخل ہونے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو بڑی فراخ دلی سے الاؤنس دیتے چلو بلکہ اس کا راستہ یہ ہے کہ جن چیزوں سے اس نے روکا ہے ان کے کبائر سے پرہیز رکھو۔ اگر کبائر سے پرہیز رکھو گے تو صغائر کو وہ اپنے

فضل و رحمت سے خود دور فرما دے گا ورنہ کبائر و صغائر سب تمہارے اعمال نامے میں درج ہوں گے اور سب کا تمہیں حساب دینا ہوگا۔

صغائر سے بچنے کی راہ بھی کبائر سے اجتناب ہے

یہاں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ صغائر سے بچنے کی راہ بھی یہی ہے کہ آدمی کبائر سے اجتناب کرے۔ جو آدمی اپنے ہزاروں کے قرضے چکاتا رہتا ہے وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ کسی کے پانچ روپے دبا کر نادہند کہلانے کی ذلت گوارا کرے۔ برعکس اس کے جو لوگ کبائر کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی نیکیوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں ان کا حال زندگی بھر یہ رہتا ہے کہ مچھر کو چھانتے رہتے ہیں اور اونٹ کو نگلتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو تو یہ زیرے اور سونف تک کی زکوٰۃ کا حساب سمجھاتے ہیں لیکن خود یتیموں کے مال اور اوقاف کی آمدنیوں سے اپنی کوٹھیاں بنواتے اور ان کو سجاتے ہیں۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَسْـــَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِـيْمًا ۔ ۳۲

تنافس کا اصل میدان اکتسابی صفات کا میدان ہے

معاشرے میں بے شمار کشمکشیں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ کون سا میدان قسمت آزمائی اور جدوجہد کا ہے اور کون سا نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلط ارمان اور ایک اندھا بہرا حوصلہ لوگوں کو ایسے میدانوں میں ڈال دیتا ہے جن میں آدمی کی ساری جدوجہد اور اس کی تمام قابلیت و صلاحیت ایک لاحاصل تصادم اور بے فائدہ تنازع کی نذر ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو ان کی خلقی صفات کے لحاظ سے بعض لوگوں پر ترجیح دی ہے۔ مثلاً بعض کو خوب صورت پیدا کیا، بعض کو بدصورت، بعض کو سلیم الاعضا پیدا کیا بعض کو ناقص الاعضا، بعض کو امیر گھرانوں میں پیدا کیا بعض کو غریب گھرانوں میں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں خلقی ہیں۔ ان میں مقابلے اور تنافس کی لاگ ڈانٹ تلخی اور ناگواری کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح کسی کو مرد بنایا، کسی کو عورت، یہ چیز بھی خلقی ہے۔ اگر عورت مرد بننے کی کوشش کرے یا مرد، عورت، تو یہ بھی نری حماقت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس خدا نے اپنے قانون میں ہر ایک کے لیے حدود و حقوق معین کر دیے ہیں۔ یہ حقوق و حدود فطرت اور حکمت پر مبنی ہیں۔ اگر مساوات طلبی کے غلط جوش میں ان حقوق اور حدود کو لانگنے کی کوشش کی جائے، عورت چاہے کہ مجھے مرد کے برابر حصہ ملے، اقربا چاہیں کہ سب کا ایک ہی درجہ قرار پائے تو یہ بھی فطرت اور خدا کی حکمت سے جنگ ہے جس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا کہ سارا نظام تلپٹ ہو کر رہ جائے۔

آج دنیا میں جو ابتری و انتشار، جو تصادم و تنافس اور جو قتل و نہب ہے زیادہ تر اسی غلط اندیشی اور خدا ناشناسی کا نتیجہ ہے۔ قرآن نے اس آیت میں یہی بتایا ہے کہ تنافس کا میدان خلقی صفات یا فطری ترجیحات کا نہیں بلکہ اکتسابی صفات کا میدان ہے۔ یہ میدان نیکی، تقویٰ، عبادت، ریاضت، توبہ،

انابت یا جامع الفاظ میں ایمان و عمل صالح کا میدان ہے۔ اس میں بڑھنے کے لیے کسی پر کوئی روک نہیں ہے۔ مرد بڑھے وہ اپنی جدوجہد کا پورا پورا ثمرہ پائے گا۔ عورت بڑھے وہ اپنی سعی کا پھل پائے گی۔ آزاد، غلام، بانو، باندی، شریف، وضیع، اعمیٰ، بصیر سب کے لیے یہ میدان یکساں کھلا ہوا ہے۔ اگر کسی میں کچھ فطری اور خلقی رکاوٹیں ہیں تو اس کے کسر کا جبر بھی یہاں موجود ہے۔ خدا نے خلقی طور پر جو فضیلتیں بانٹی ہیں ان سے ہزارہا اور لکھوکھا درجے زیادہ اس کا فضل یہاں ہے تو جو فضیلت کے طالب ہیں وہ اس میدان میں اتریں اور خدا کے فضل کے طالب بنیں (وَاسْئَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ) دینے والا سب کی طلب، سب کے ذوق و شوق اور سب کی نیت اور سب کے اخلاص سے واقف ہے اور اس کے خزانے میں نہ کمی ہے، نہ وہ دینے میں بخیل ہے۔ تو غلط میدان میں اپنی محنت برباد کرنے سے کیا حاصل ہے جس کو قسمت آزمائی کرنی ہو اس میدان میں کرے۔ وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا (۳۳)

لفظ موالی کا مفہوم

لفظ 'مولیٰ' عربی میں بہت وسیع معنوں میں آتا ہے۔ زیادہ تر اس کا تعیین موقع و محل اور قرینے سے ہوتا ہے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد ہر مورث کے ورثہ ہیں۔

خدا کے مقررکردہ وارث ہی اصلی وارث ہیں

اس آیت میں اشارہ تقسیم وراثت کے اس ضابطے کی طرف ہے جو آیت ۷ میں مذکور ہے۔ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ الایۃ اس حوالے سے مقصود اس کو مزید مؤکد کرنا ہے کہ ہر مورث کے جو وارث خدا نے ٹھہرا دیے ہیں وہی اصلی وارث ہیں۔ اب ان میں اپنے ذاتی رجحانات کی بنا پر نہ کسی ترمیم و تبدیلی کی گنجائش ہے اور نہ ان کے مقررہ حصوں میں کسی کمی بیشی کی۔ اگر کسی نے کسی غیر وارث سے کچھ دینے دلانے کا وعدہ کر رکھا ہے تو اس کو وہ حصہ دے جو اس کا ہے۔ 'اس کا حصہ' سے مراد ظاہر ہے کہ وہی حصہ ہو سکتا ہے جس کی مورث کو وصیت کی اجازت ملی ہوئی ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تقسیم سے علیحدہ کر رکھا ہے۔ یہ حصہ درحقیقت ایسے ہی لوگوں کے لیے خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھوڑا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے لیے 'نَصِيبَهُمْ' کا لفظ استعمال ہوا۔ آخر میں اپنی صفت 'عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدًا' کا حوالہ بطور تنبیہ دیا ہے کہ بے جا جانبداری کی مخفی سے مخفی کوشش بھی اللہ کے علم سے مخفی نہیں رہ سکتی۔ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ہر جلی و خفی سے آگاہ ہے۔

۱۶۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۳۴-۳۵

خاندان کی تنظیم کے لیے ہدایات

اوپر وَلَا تَتَمَنَّوْا الایۃ میں عورت اور مرد دونوں کو اپنے اپنے فطری اور شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے حصول سعادت و کمال کی جدوجہد کی جو ہدایت فرمائی تھی اسی ہدایت کو خاندانی زندگی کی

تشکیل تنظیم کے لیے رہنما اصول قرار دے کر اب یہ خاندان کی تنظیم کے لیے ہدایات دی جا رہی ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ معاشرہ خاندانوں سے مرکب ہوتا ہے اور معاشرے ہی سے ریاست وجود میں آتی ہے گویا خاندان ہی وہ چیز ہے جو معاشرہ اور پھر ریاست کی بنیادی اینٹ ہے۔ اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ پہلی اینٹ نہایت صحیح رکھی جائے۔ اگر یہ ذرا بھی کج ہو گئی تو ع "تا ثریا مے رود دیوار کج"۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۳۴-۳۵

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا ﴿۳۵﴾

ترجمۂ آیات ۳۴-۳۵

مرد عورتوں کے سرپرست ہیں، بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کیے۔ پس جو نیک بیبیاں ہیں وہ فرمانبرداری کرنے والی، رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں بوجہ اس کے کہ خدا نے بھی رازوں کی حفاظت فرمائی ہے اور جن سے تمھیں سرتابی کا اندیشہ ہو تو ان کو نصیحت کرو اور ان کو ان کے بستروں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو سزا دو۔ پس اگر وہ تمھاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک اللہ بہت بلند اور بہت بڑا ہے۔ ۳۴

اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ ہو تو ایک پنچ مرد کے لوگوں میں سے مقرر کرو اور ایک پنچ عورت کے لوگوں میں سے۔ اگر دونوں اصلاح کے طالب ہوئے تو اللہ ان کے درمیان سازگاری پیدا کر دے گا۔ بے شک اللہ علیم و خبیر ہے۔ ۳۵

۱۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاهْجُرُوْھُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا (۳۴)

'قوام علی' کا مفہوم

عربی میں 'قام' کے بعد 'علی' آتا ہے تو اس کے اندر نگرانی، محافظت، کفالت اور تولیت کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ 'قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ' میں بالاتری کا مفہوم بھی ہے اور کفالت و تولیت کا بھی اور یہ دونوں باتیں کچھ لازم و ملزوم سی ہیں۔

گھر کی ریاست کا سربراہ مرد ہے

گھر کی چھوٹی سی وحدت بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس طرح ہر ریاست اپنے قیام و بقا کے لیے ایک سربراہ کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح یہ ریاست بھی ایک سربراہ کی محتاج ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس ریاست میں سربراہی کا مقام مرد کو حاصل ہو یا عورت کو؟ قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ مقام مرد کو حاصل ہے اور اس کے حق میں دو دلیلیں دی ہیں۔

مرد کی سربراہی کے حق میں دو دلیلیں

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے۔ مرد کو بعض صفات میں عورت پر نمایاں تفوق حاصل ہے جن کی بنا پر وہی سزاوار ہے کہ قوامیت کی ذمہ داری اسی پر ڈالی جائے۔ مثلاً محافظت و مدافعت کی جو قوت و صلاحیت یا کمانے اور ہاتھ پاؤں مارنے کی جو استعداد و ہمت اس کے اندر ہے، وہ عورت کے اندر نہیں ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث کل فضیلت نہیں ہے بلکہ صرف وہ فضیلت ہے جو مرد کی قوامیت کے استحقاق کو ثابت کرتی ہے۔ بعض دوسرے پہلو عورت کی فضیلت کے بھی ہیں لیکن ان کو قوامیت سے تعلق نہیں ہے۔ مثلاً عورت گھر در سنبھالنے اور بچوں کی پرورش و نگہداشت کی جو صلاحیت رکھتی ہے وہ مرد نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے قرآن نے یہاں بات ابہام کے انداز میں فرمائی ہے جس سے مرد اور عورت دونوں کا کسی نہ کسی پہلو سے صاحب فضیلت ہونا نکلتا ہے۔ لیکن قوامیت کے

پہلو سے مرد ہی کی فضیلت کا پہلو راجح ہے۔

دوسری یہ کہ مرد نے عورت پر اپنا مال خرچ کیا ہے۔ یعنی بیوی بچوں کی معاشی اور کفالتی ذمہ داری تمام اپنے سر اٹھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری مرد نے اتفاقیہ یا تبرعاً نہیں اٹھائی ہے بلکہ اس وجہ سے اٹھائی ہے کہ یہ ذمہ داری اسی کے اٹھانے کی ہے۔ وہی اس کی صلاحیتیں رکھتا ہے اور وہی اس کا حق ادا کر سکتا ہے۔

نیک بیبیاں وہ ہیں جو قوام کی اطاعت گزار اور راز دار ہیں۔

مرد کو قوامیت کے منصب پر سرفراز کرنے کے بعد نیک بیبیوں کا رویہ بتایا کہ وہ نہایت فرمانبرداری کے ساتھ اپنے قوام کی اطاعت کرتی، اس کے رازوں اور اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرتی ہیں۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو عورتیں، اس کے بالکل برعکس آج اس بات کے لیے زور لگا رہی ہیں کہ وہ عورت بن کر نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد بن کر رہیں گی وہ صالحات نہیں بلکہ فاسقات ہیں اور انھوں نے اس نظام کو بالکل تلپٹ کر دینا چاہا ہے جس پر عائلی زندگی کی تمام برکتوں اور خوشحالیوں کا انحصار ہے[۱]۔

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ کا مطلب

'حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ' کا مطلب میں نے یہ لیا ہے کہ وہ رازوں کی حفاظت کرنے والی ہیں۔ یہ معنی لینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ 'غیب' کا لفظ راز کے مفہوم کے لیے مشہور ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں ترکیب کلام ایسی ہے کہ 'پیٹھ پیچھے' کے معنی لینے کی گنجائش نہیں، تیسری یہ کہ عورت اور مرد کے درمیان رازوں کی امانت داری کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا مسئلہ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے قدرتی امین ہیں۔ بالخصوص عورت کا مرتبہ تو یہ ہے کہ وہ مرد کے محاسن و معائب، اس کے گھر در، اس کے اموال و املاک اور اس کی عزت و ناموس ہر چیز کی ایسی رازدان ہے کہ اگر وہ اس کا پردہ چاک کرنے پر آ جائے تو مرد بالکل ہی ننگا ہو کر رہ جائے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس صفت کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ اس کے ساتھ بما حفظ اللہ کا جو اضافہ ہے اس سے اس صفت کی عالی نسبی کا اظہار مقصود ہے کہ ان کی اس صفت پر خدا کی صفت کا ایک پرتو ہے اس لیے کہ خدا نے بھی اپنے بندوں اور بندیوں کے رازوں کی حفاظت فرمائی ہے ورنہ وہ لوگوں کا پردہ چاک کرنے پر آ جاتا تو کون ہے جو کہیں منہ دکھانے کے قابل رہ جاتا۔

نشوز کی حقیقت

نشوز کے معنی سر اٹھانے کے ہیں لیکن اس لفظ کا غالب استعمال اس سرتابی و سرکشی کے لیے ہوتا ہے جو کسی عورت کی طرف سے اس کے شوہر کے مقابل میں ظاہر ہو۔ اگر کسی عورت کے رویے سے ظاہر ہو کہ وہ سرکشی کی راہ پر چل پڑی ہے تو مرد چونکہ قوام ہے اس وجہ سے اس کو عورت کی تادیب کے لیے بعض تادیبی اختیارات دیے گئے ہیں۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہ اختیارات صرف اس صورت کے لیے دیے ہیں جب 'نشوز' کا اندیشہ ہو، نشوز جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، عورت کی ہر کوتاہی

---

[۱] مساوات مرد و زن کے جدید نظریے کے ہر پہلو پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام' میں کی ہے تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

غفلت یا بے پروائی یا اپنی شخصیت اور اپنی رائے اور ذوق کے اظہار کی فطری خواہش کو نہیں کہتے۔ نشوز یہ ہے کہ عورت کوئی ایسا قدم اٹھاتی نظر آئے جو مرد کی قوامیت کو چیلنج کرنے والا اور جس سے گھر کی مملکت میں بدامنی و اختلال پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ اگر ایسی صورت پیدا ہوتی نظر آئے تو مرد تین صورتیں اختیار کر سکتا ہے اور قرآن کا انداز بیان دلیل ہے کہ ان تینوں میں ترتیب و تدریج ملحوظ ہے۔

نشوز کا مرحلہ پر مرد کے تادیبی اختیارات

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ نصیحت و ملامت کرے۔ قرآن میں 'وعظ' کا لفظ ہے جس کے اندر فی الجملہ زجر و توبیخ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اگر اس سے کام چلتا نظر نہ آئے تو دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ان سے بے تکلفانہ قسم کا خلا ملا ترک کر دے تاکہ انھیں اندازہ ہو جائے کہ انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو اس کے نتائج دور رس ہو سکتے ہیں۔ اگر معاملہ اس سے بھی بنتا نظر نہ آئے تو آخری درجے میں مرد کو جسمانی سزا دینے کا بھی اختیار ہے۔ لیکن یہ صرف اس حد تک ہونی چاہیے جس حد تک ایک معلم و مؤدب اپنے کسی زیر تربیت شاگرد کو دے سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے 'غیر مبرح' کے الفاظ سے اس کی حد واضح فرما دی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سزا ایسی نہ ہو کہ وہ کوئی پائدار اثر چھوڑ جائے۔

اصلاح کے بعد پچھلی کدورتیں بھلا دی جائیں

مرد کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے۔ اگر اس کا نتیجہ مفید مطلب برآمد ہو، عورت بغاوت کے بجائے اطاعت کی راہ پر آجائے، تو پچھلی کدورتیں بھلا دینی چاہییں۔ اس سے انتقام لینے کے بہانے نہیں ڈھونڈنے چاہییں۔ مرد کو اپنی قوامیت کے زعم میں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ سب سے بلند اور سب سے بڑا خدا ہے۔ جب وہ قیم السموات والارض ہو کر ہم سب کے نشوز سے درگزر فرماتا اور توبہ و اصلاح کے بعد سب کی نافرمانیوں کو معاف کر دیتا ہے تو بندے اپنی قوامیت کی لے حد سے آگے کیوں بڑھائیں۔

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا (۳۵)

اصلاح احوال کی ایک اور تدبیر

اگر مرد وہ سارے جتن، جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئے، کرنے کے بعد بھی عورت کے 'نشوز' پر قابو نہ پا سکا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ خلیج اختلاف بہت وسیع ہے اور تعلقات ٹوٹنے کی حد پر پہنچے ہوئے ہیں۔ لیکن اس حد پر پہنچ جانے کے بعد بھی شریعت نے مرد کو یہ اجازت نہیں دی ہے کہ وہ بیوی کو طلاق دے کر اس سے پیچھا چھڑا لے۔ اسلام، میاں بیوی کے رشتے کو معاشرے کے استحکام کی بنیاد قرار دیتا ہے، اس وجہ سے اس کے ٹوٹنے کو صرف اسی صورت میں گوارا کرتا ہے جب اصلاح کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کر چکنے کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ اب اس کا جڑا رہنا ناممکن یا مزید فساد کا باعث ہے۔ چنانچہ شوہر کی کوششوں کی ناکامی کے بعد اصلاح احوال کے لیے ایک دوسری تدبیر اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی۔ یہ ہدایت میاں بیوی کے قبیلہ برادری اور ان کے رشتہ داروں اور خیر خواہوں کو دی گئی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنے اثرات سے کام لے کر اس بگاڑ کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اس کی عملی شکل یہ بتائی کہ ایک پنچ میاں کے

رشتہ داروں میں سے منتخب کیا جائے، دوسرا بیوی کے خاندان میں سے۔ یہ دونوں مل کر اصلاح کی کوشش کریں۔ بسا اوقات فریقین جس جھگڑے کو خود طے کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے دوسرے خیرخواہوں کی مداخلت سے وہ طے ہو جاتے ہیں۔ فریقین کو ان کی غیرجانبداری اور خیرخواہی کا احترام بھی کرنا پڑتا ہے اور بے جا ضد پر دوسروں کی ملامت کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ شکل زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔

میاں اور بیوی کو ترغیب متعلق

اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَہُمَا میں مراد اگرچہ حکمین بھی ہو سکتے ہیں لیکن میرا رجحان اس طرف ہے کہ اس سے مراد میاں بیوی ہی ہیں یعنی اگر یہ دونوں اپنی ضد چھوڑ کر اصلاح احوال کے طالب ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان میں سازگاری پیدا کر دے گا۔ یہ درحقیقت نہایت بلیغ اسلوب سے میاں بیوی کو تشویق و ترغیب ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور افتراق کے بجائے خدائے کریم و کارساز کی طرف سے سازگاری کے طالب بنیں۔

اس آیت میں ہمارے نزدیک خطاب، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، میاں بیوی کے خویش و اقارب اور ان کی قوم و قبیلہ کے بڑے بوڑھوں سے ہے اور ان پنچوں کا اختیار تمام تر اصلاح حال کی کوشش ہی تک محدود ہے۔ اس کوشش کی ناکامی کے بعد شوہر اپنے شرعی اختیارات کے مطابق خود بھی کوئی قدم اٹھا سکتا ہے اور معاملہ عدالتی نوعیت کا ہو تو عدالت میں بھی جا سکتا ہے۔ البتہ اس بات کی گنجائش ہے کہ کوئی معاملہ عدالت میں جانے کے بعد عدالت کی طرف سے کسی پنچایت کے حوالہ کر دیا جائے اور عدالت پنچایت کو فیصلہ کا اختیار بھی تفویض کر دے۔

آخر میں علیم و خبیر کی صفات کے حوالے سے مقصود ہر ایک کو تنبیہ کرنا ہے کہ خدا اچھی طرح باخبر ہے کہ اس قضیے میں کس کا رول کیسا رہا ہے اور اسی کے مطابق وہ اس کے ساتھ معاملہ کرے گا۔

۱۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۶-۴۳

اب آگے یہ خاتمۂ باب کی آیات ہیں۔ معاشرتی احکام و ہدایات کا سلسلہ جو شروع سے چلا آ رہا تھا وہ ان آیات پر ختم ہو رہا ہے جس طرح اللہ سے ڈرتے رہنے کی ہدایت سے اس باب کا آغاز فرمایا تھا اسی طرح اللہ کی عبادت کرتے رہنے کی ہدایت پر اس کو ختم کیا۔ اللہ تعالیٰ کا حق سب سے بڑا ہے جو لوگ اس حق کو کما حقہٗ ادا کرتے رہیں گے درحقیقت وہی دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی توفیق پائیں گے۔ چنانچہ اس حق کی یاددہانی کے بعد بالاجمال والدین، اقربا، یتامیٰ، مساکین، پڑوسی، مسافر اور لونڈی غلام سب کے حقوق کی یاددہانی فرما دی۔ اللہ کا حق اس کی عبادت ہے اور اس کو باطل کرنے والی چیز شرک ہے اس وجہ سے اس حق کی یاددہانی کے ساتھ شرک کی نفی کر دی۔ بندوں کا سب سے بڑا حق ان کے ساتھ

احسان اور ان کے لیے انفاق ہے۔ بخل، تکبر اور ریا اس کے ہادم ہیں اس وجہ سے احسان و انفاق کی تاکید کے ساتھ ان چیزوں کی نفی کر دی۔ اس کے بعد انفاق کی حوصلہ افزائی کے لیے فرمایا کہ یہ سودا خسارے کا سودا نہیں ہے۔ جو ایک خرچ کرے گا، دس پائے گا۔ پھر تنبیہ فرما دی کہ اس رسول کے ذریعے سے انذار و تبلیغ کا حق ادا ہو چکا ہے جو اب بھی نہیں سنیں گے وہ سوچ لیں کہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس دن اللہ سب رسولوں کو ان کی اُمتوں پر گواہ ٹھہرا کر پوچھے گا کہ تم نے اپنی اپنی اُمتوں کو کیا دعوت دی اور انھوں نے کیا جواب دیا۔ پھر یہی سوال اس آخری اُمت کے متعلق اس آخری رسول سے بھی ہو گا۔ وہ دن ایسا ہو گا کہ نہ کسی کے لیے کوئی جائے پناہ ہو گی اور نہ کوئی شخص کوئی بات چھپا سکے گا۔

آخر میں اللہ کی عبادت، جس کا ذکر اوپر والی آیت میں گزرا، کے سب سے بڑے مظہر ـــ نماز ـــ کے بعض آداب و شرائط کا ذکر فرمایا۔ ان آداب و شرائط کے ذکر سے مقصود نماز کو اسی طرح مفسدات سے پاک کرنا ہے جس طرح اوپر انفاق کو اس کے موانع و مفسدات سے پاک کیا ہے ـــ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي آیات
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَ ۳۶-۴۲
الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝۳۶ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ
النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا
لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۳۷ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ
وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا
فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ۝۳۸ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ
اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِــيْمًا ۝۳۹ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ
مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا
عَظِيْمًا ۝۴۰ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي

وقف النبی علیہ السلام

ع

هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ
تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ
وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ
عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ
تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ
اَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

ترجمۂ آیات ۳۶-۴۳

اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور والدین، قرابت مند، یتیم، مسکین، قرابت دار پڑوسی، بیگانہ پڑوسی، ہم نشین، مسافر اور اپنے مملوک کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اللہ اترانے اور بڑائی مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو خود بھی بخل کرتے اور دوسروں کو بھی بخالت کا مشورہ دیتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل میں سے جو کچھ انھیں دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں، ہم نے ایسے ناشکروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے ـــ جو اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جس کا ساتھی شیطان بن جائے تو وہ نہایت برا ساتھی ہے۔ ان کا کیا نقصان تھا اگر یہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان لاتے اور اللہ نے ان کو جو کچھ بخش رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے! اللہ تو ان سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اللہ ذرا بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا۔ اگر ایک نیکی ہو گی تو اس کو کئی گنا بڑھائے گا اور خاص اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ ۳۶-۴۰

اس دن ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر کھڑا کریں گے! اس دن وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور جنھوں نے رسُول کی نافرمانی کی، تمنا کریں گے کاش ان کے سمیت زمین برابر کر دی جائے اور اُس دن وہ خُدا سے کوئی بات بھی چھپا نہ سکیں گے۔ ۴۱-۴۲

اے ایمان والو، نشے کے حال میں نماز کے پاس نہ جایا کرو یہاں تک کہ جو کچھ تم زبان سے کہتے ہو اس کو سمجھنے لگو اور جنابت کی حالت میں مگر یہ کہ بس گزر جانا پیشِ نظر ہو، یہاں تک کہ غسل کر لو اور اگر تم مریض ہو، یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے یا عورتوں سے ہم صُحبت ہوا ہو، پھر پانی نہ میسر آئے تو کوئی پاک جگہ دیکھو اور اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لو بے شک اللہ درگزر کرنے والا، بخشنے والا ہے۔ ۴۳

۱۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُــوْرَۨا ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا (۳۶-۳۸)

'بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا' میں 'ب' اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں احسان کا لفظ 'بِرّ' کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ یعنی یہ احسان ادائے حقوق کے ساتھ ہو، محض چھدا تارنے کی کوشش نہ ہو۔ 'ب' کا استعمال لفظ بِرّ کے ساتھ ہی مناسبت رکھتا ہے۔ چنانچہ سورۂ مریم میں ہے وَبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا (اور اپنے والدین کا فرماں بردار تھا، سرکش اور نافرمان نہ تھا) اردو ترجمے میں اس طرح کے اسالیب کے ترجمے کا حق مشکل ہی سے ادا ہوتا ہے۔

پڑوسی کی دو قسمیں

'اَلْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى' یعنی پڑوسی بھی ہے اور اس کے ساتھ رشتہ داری کا بھی تعلق ہے۔

'اَلْجَارِ الْجُنُبِ'۔ جُنُب کے معنی اجنبی کے ہیں یعنی پڑوسی ہے لیکن رشتہ داری اور قرابت کا تعلق اس کے ساتھ نہیں ہے۔

'الصاحب بالجنب' 'جنب' کے معنی پہلو کے ہیں، جو شخص وقتی اور عارضی طور پر بھی کسی مجلس، کسی حلقے، کسی سواری، کسی دکان، کسی ہوٹل میں آپ کا ہم نشین و ہم رکاب ہو جائے، وہ الصاحب بالجنب ہے۔

اسلامی معاشرہ میں ان تینوں قسم کے لوگوں کو ایک دوسرے پر حقوق جوار حاصل ہو جاتے ہیں۔

خدا کا حق سب سے بڑا ہے — ان آیات میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنا حق ادا کرنے کا حکم دیا ہے اس لیے کہ خالق و مالک اور رب ہونے کی وجہ سے اس کا حق سب سے بڑا ہے اور اسی حق کی ادائیگی پر دوسرے حقوق کی ادائیگی کا انحصار ہے۔ جو لوگ خدا کا حق ادا نہیں کرتے وہ دوسروں کے حقوق بھی صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق نہیں پاتے۔ خدا کا حق عبادت ہے اور ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ عبادت میں پرستش اور اطاعت دونوں چیزیں شامل ہیں۔ اس عبادت کے لیے یہ شرط ہے کہ اس میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے اس لیے کہ خدا کی خدائی میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں ہے۔ اگر اس حق میں کسی دوسرے کو شریک کر دیا جائے تو یہ عبادت باطل ہو کر رہ جاتی ہے۔

خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے — خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ انہی کو آدمی کے وجود میں آنے اور اس کی پرورش کا ذریعہ بناتا ہے۔ لیکن ان کا حق عبادت نہیں بلکہ بر و احسان ہے۔ اس کے بعد قرابت مندوں کے حقوق ہیں جو درحقیقت اسی حق سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر یتامیٰ، مساکین اور پڑوسیوں کے حقوق ہیں۔

'قرابت مندوں، مساکین اور پڑوسیوں کے حقوق' — پڑوسی تین طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو پڑوسی بھی ہے اور قرابت مند بھی، دوسرا وہ جو پڑوسی تو ہے اگرچہ قرابت مند نہیں ہے، تیسرا وہ جو وقتی طور پر کسی سفر یا حضر میں ساتھی اور ہم نشین بن گیا ہے۔ ان سب کے ساتھ احسان کی ہدایت ہوئی۔ پھر مسافر اور غلاموں لونڈیوں کا ذکر ہے۔

لونڈیوں اور غلاموں کے متعلق ہم ذکر کر چکے ہیں کہ غلامی، اسلام کے نظام کا کوئی جزو نہیں ہے اسلام نے وقت کے بین الاقوامی حالات کے تحت اس کو گوارا کیا تھا اور خود اپنے نظام میں غلاموں کی ترقی و بہبود کی ایسی شکلیں تجویز کر دی تھیں جن سے وہ بالتدریج اسلامی معاشرے میں مساوی درجے کے رکن بن جائیں۔ اس آیت میں ان کو بھی احسان کے مستحقوں میں شامل کیا ہے اور مقصود اس سے یہی ہے کہ ان کے متعلق لوگوں کا زاویۂ نگاہ بدلے اور لوگ نیکی اور احسان کے مواقع میں ان کی اصلاح و ترقی کو ایک مستقل مسئلے کی حیثیت سے پیش نظر رکھیں۔

ادائے حقوق کے منافی ذہنیت — اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۔ یہ ادائے حقوق اور احسان کے منافی ذہنیت کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اسباب و وسائل کی فراوانی کو اللہ کا انعام و احسان سمجھتے ہیں ان کے اندر تو شکر گزاری اور تواضع کا جذبہ ابھرتا ہے اور یہ جذبہ ان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے اسی طرح یہ دوسروں پر احسان کریں چنانچہ وہ لوگوں پر احسان کرتے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے سزاوار بنتے ہیں۔ برعکس اس کے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو خود اپنی قوت و قابلیت اور اپنی تدبیر و حکمت کا ثمرہ سمجھنے لگتے ہیں ان کے اندر تواضع اور شکر گزاری کے جذبے کے بجائے گھمنڈ اور فخر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ لوگوں پر احسان

کرنے کے بجائے ان پر دھونس اور رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے ناشکروں اور کم ظرفوں کو دوست نہیں رکھتا۔ 'دوست نہیں رکھتا' کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔

اترانے اور فخر کرنے والوں کی چند خصوصیات

اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ الآیۃ۔ اکڑنے اور فخر کرنے والوں کی یہ چند مزید خصوصیات بیان ہوئی ہیں جو ہم بالترتیب واضح کریں گے۔

پہلی یہ کہ یہ خود بھی بخیل برتتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں۔ 'بخیل' اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں تنگ دل ہو۔ جو شخص دوسروں کے حقوق فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ ادا کرتا ہے لیکن خود اپنی ذات کے معاملے میں احتیاط اور تنگی برتتا ہے اس کو بخیل نہیں کہتے۔ بخالت کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے مال و اسباب کو خدا کی دین سمجھنے کے بجائے خود اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر تواضع اور شکر گزاری کا وہ جذبہ ہی مردہ ہو جاتا ہے جو فیاضی اور جود و کرم کا اصل محرک ہے۔

بخیل آدمی دوسروں کو بھی بخالت کا مشورہ دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کی فیاضی سے خود اس کی بخالت کا راز فاش ہوتا ہے۔ اپنے اس عیب پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ دوسروں کے حقوق دبائے بیٹھا ہے اسی طرح دوسرے بھی بیٹھے رہیں کہ نہ کوئی ناک والا ہوگا، نہ اس کو نکو بننا پڑے گا۔ قاعدہ ہے کہ جو آدمی بزدل ہوتا ہے وہ دوسروں کو بھی بزدلی ہی کا درس دیتا ہے تاکہ خود اس کی بزدلی کا بھانڈا نہ پھوٹے۔

بخیل مالداروں کا ایک نفسیاتی پہلو

دوسری یہ کہ یہ اللہ کے اس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے ان کو دے رکھا ہے۔ یہ بخیل مالداروں کے ایک نہایت مخفی نفسیاتی پہلو کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ بخیل مالداروں کی خواہش ایک طرف تو یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص پر ان کی ریاست و امارت کی دھونس جمی رہے، دوسری طرف یہ کوشش بھی وہ کرتے رہتے ہیں کہ کوئی شخص ادائے حقوق کے معاملے میں ان کو کوئی ملامت نہ کر سکے۔ چنانچہ یہ ہر ملنے جلنے والے اور ہر طالب و سائل کے سامنے اپنے وسیع اخراجات، کاروبار میں نقصانات، اپنی پھیلی ہوئی ذمہ داریوں اور طالبوں اور سائلوں کی کثرت کا ذکر اور دہراتے رہتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ہے تو یہ شخص غنی و دریا دل لیکن بے چارہ کیا کرے، بڑی بھاری ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اس وجہ سے ہزاروں لاکھوں کی آمدنی رکھنے کے باوجود اس کے پاس بچتا بچاتا کچھ بھی نہیں ہے۔

وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا۔ ایسے ناشکروں اور کافر نعمتوں کے لیے فرمایا کہ ہم نے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ 'ذلیل کرنے والا عذاب' اس وجہ سے کہ یہ اللہ کی نعمت پا کر اس کے شکر گزار اور حق گزار بندے بننے کے بجائے اکڑنے اور اترانے والے اور اس کے فضل کو چھپانے والے بنے۔

دکھاوے کا انفاق کاروباری خرچ ہے

وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ الآیۃ۔ یہ بھی اسی سلسلے کی بات ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ یعنی یہ اگر خرچ کرتے ہیں تو محض دکھاوے کے لیے۔ دکھاوے کا خرچ ایک کاروباری خرچ ہوتا ہے۔ اول تو اس کا فائدہ شاذ و نادر ہی ان لوگوں کو

پہنچتا ہے جو اصلی حقدار ہوتے ہیں اس لیے کہ اصلی حقداروں کے معاملے میں نمائش اور دکھاوے کا کچھ زیادہ موقع نہیں ہوتا۔ پھر منافق کی نماز کی طرح نمائش کے انفاق کا بھی کوئی تعلق اللہ تعالیٰ سے نہیں ہوتا۔ اس طرح کے لوگ خدا اور آخرت پر ایمان کے تو مدعی ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں نہ ان کا ایمان خدا پر ہوتا ہے نہ آخرت پر، اور انفاق اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہ معتبر ہوتا ہے جو خدا اور آخرت پر ایمان کے ساتھ ہو اس لیے کہ وہی انفاق اس دنیا کے لیے بھی باعث خیر و برکت ہے اور وہی آخرت میں بھی موجب خیر و برکت ہوگا۔ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان سے خالی ہوتے ہیں ان کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے اور جس کا ساتھی شیطان بن جائے اس کے لیے خیر و برکت کا کوئی کام کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۔ ۲۷- بنی اسرائیل۔

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا (۳۹-۴۰)

یہ ان تنگ دلوں اور بخیلوں کی بدقسمتی پر اظہار افسوس ہے کہ یہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے اور اللہ کی راہ میں خود اسی کی بخشی ہوئی دولت کو خرچ کرنے میں بڑا خسارہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ سرتاسر نفع ہی نفع ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کے عمل سے بے خبر ہے، نہ ذرہ برابر وہ کسی کی حق تلفی کرنے والا ہے بلکہ کسی کی کوئی نیکی ہوگی تو وہ اس کو بڑھا کر کئی گنی کرے گا اور اس پر مزید وہ خود اپنی طرف سے ایک بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (۴۱-۴۲)

قیامت میں انبیاء کی شہادت اپنی امتوں پر

مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اتمام حجت کا تعلق ہے اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے سے ان کو اپنے دین سے آگاہ کر دیا اور ان پر حجت تمام کر دی۔ اب دین و شریعت سے آگاہ کرنے کے معاملے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد بھی اگر یہ لوگ اللہ اور رسول سے منحرف ہی رہے تو آج تو یہ اپنے کفر و نفاق کو چھپا سکتے ہیں لیکن کل کو یہ کیا کریں گے جب میدان حشر میں اللہ تمام امتوں اور ان کے پیغمبروں کو جمع کر کے پیغمبروں سے گواہی دلوائے گا کہ انھوں نے لوگوں کو دین پہنچا دیا تھا اور اسی طرح کی گواہی تم (خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) اس امت کے لوگوں پر دینے کے لیے کھڑے کیے جاؤ گے۔ اس دن وہ سارے لوگ جنھوں نے کفر اور نافرمانی رسول کا ارتکاب کیا ہوگا یہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ زمین میں دھنس جائیں اور زمین ان کے سمیت برابر کر دی جائے۔ اس دن کوئی شخص خدا سے کوئی بات چھپا نہ سکے گا۔

لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا میں نفی فعل، عدم استطاعت فعل کے مفہوم میں ہے۔ کسی بات کو نہ چھپا سکنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس دن مجرموں کے ہاتھ پاؤں اور ان کے تمام اعضاء و جوارح خود ان کے خلاف گواہی دینے کے لیے

بول اٹھیں گے۔ اس حقیقت کو قرآن نے دوسرے مقام میں یوں واضح فرمایا ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ (۲۰ - فصلت)

یہاں تک کہ جب وہ حاضر ہوں گے تو ان کے خلاف گواہی دیں گے ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کے رونگٹے

یہاں اس لفظ کے اندر ایک لطیف تعریض بھی پوشیدہ ہے۔ یہ لوگ اللہ کے اس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے ان کو دے رکھا ہے وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ یہاں فرمایا کہ اس دن اللہ سے کوئی چیز بھی چھپا نہ سکیں گے۔ ہر چیز خود بے نقاب اور گواہی دینے کے لیے ناطق ہو جائے گی۔

یہ بات کہ انبیاء قیامت کے روز اپنی اپنی امتوں پر گواہ کی حیثیت سے کھڑے کیے جائیں گے قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے بھی ثابت ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (۱۰۹ - مائدہ)

جس دن اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب ملا وہ کہیں گے کہ ہمیں علم نہیں، غیب کی باتوں کا جاننے والا تو ہی ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ رسولوں سے قیامت کے دن سوال فرمائے گا کہ جب تم نے اپنی اپنی امتوں کو اللہ کا دین پہنچایا تو انھوں نے دین کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ رسول جواب دیں گے کہ ہم نے تو تیرا دین بے کم و کاست لوگوں کو پہنچا دیا۔ انھوں نے اس دین کے ساتھ کیا معاملہ کیا، اس کا علم تیرے ہی پاس ہے اس لیے کہ غیب کا جاننے والا تو ہی ہے۔

اس شہادت کی پوری حقیقت سیدنا مسیحؑ کی شہادت سے واضح ہو جاتی ہے جو سورۂ مائدہ میں یوں مذکور ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

جب کہ اللہ پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ، کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی معبود بناؤ؟ وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے، یہ مجھ سے کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہو گی تو تجھ کو اس کا علم ہو گا۔ تو میرے دل کی باتوں کو جانتا ہے، میں تیرے دل کی باتوں کو نہیں جانتا۔ غیب کی باتوں کو جاننے والا تو ہی ہے۔ میں نے ان سے نہیں کہی مگر وہی بات جس کا تو نے مجھے حکم دیا، یہ کہ اللہ ہی کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ میں جب تک ان کے اندر رہا اسی بات کی گواہی دینے والا رہا، پھر جب تو نے مجھے وفات دی تو

شَہِیۡدًا ﴿۴۱-۴۲﴾ ان کا نگران حال ہو رہا اور تو ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔

فسادکی اس آیت سے متعلق روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن مسعودؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سنا رہے تھے جب اس آیت پر پہنچے تو حضورؐ شدت تاثر سے آبدیدہ ہو گئے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عظیم شرف کے ساتھ ساتھ ایک عظیم ذمہ داری کی بھی حامل ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنۡتُمۡ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىۡ سَبِيۡلٍ حَتّٰى تَغۡتَسِلُوۡا ؕ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤى اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآٮِٕطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَيَمَّمُوۡا صَعِيۡدًا طَيِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِكُمۡ وَاَيۡدِيۡكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوۡرًا ﴿۴۳﴾

لفظ 'صلوٰۃ' نماز اور موضع نماز دونوں معنی میں

'صلوٰۃ' کے معنی نماز کے ہیں لیکن جس طرح کبھی ظرف بولتے ہیں اور مظروف اس کے مفہوم میں آپ سے آپ شامل ہوتا ہے اسی طرح کبھی مظروف، اگر قرائن موجود ہوں، ظرف پر بھی مشتمل ہو جاتا ہے۔ یہاں دو قرینے موجود ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ 'صلوٰۃ' کا لفظ موضع صلوٰۃ یعنی مسجد پر بھی مشتمل ہے۔ ایک تو یہ کہ فرمایا نشے اور جنابت کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ ظاہر ہے کہ اگر 'صلوٰۃ' سے مراد مجرد نماز ہوتی تو اس کے لیے 'نماز نہ پڑھو' کہہ دینا کافی تھا۔ 'لَا تَقۡرَبُوۡا' کے الفاظ سے اس مطلب کو ادا کرنے کا کوئی خاص فائدہ سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرا یہ کہ اس کے ساتھ 'اِلَّا عَابِرِىۡ سَبِيۡلٍ' کا استثنا بھی ہے۔ یعنی اگر نماز کی جگہ سے محض گزر جانا پیش نظر ہو تو اس میں مضائقہ نہیں۔ یہ گزر جانا، نماز کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا بلکہ اس کی واضح مناسبت ہو سکتی ہے تو موضع نماز ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ بعض لوگوں نے اسی عدم مناسبت سے بچنے کے لیے 'عَابِرِىۡ سَبِيۡلٍ' سے مراد حالت سفر کر لیا ہے لیکن یہ محض تکلف ہے۔ اول تو سفر کے لیے یہ تعبیر بالکل اجنبی ہے، دوسرے یہ کہ حالت سفر کے لیے جو رخصت ہے وہ اسی آیت میں 'اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ' کے الفاظ سے مستقلاً بیان ہوئی ہے۔ پھر یہاں اس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔

تحریم شراب کی راہ میں اسلام کا ابتدائی قدم

'سُكٰرٰى' 'سکران' کی جمع ہے۔ 'سکران' شراب کے نشہ میں دھت کو کہتے ہیں۔ نشے کی حالت میں نماز اور موضع نماز سے روک کر اسلام نے تحریم شراب کی راہ میں یہ ابتدائی قدم اٹھایا۔ یہود کے ہاں شراب کی ممانعت صرف اوقات عبادت میں اماموں کے لیے تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس راہ میں اسلام کا پہلا قدم بھی ان کے آخری قدم سے آگے ہے۔

نشہ عقل کی نجاست ہے، جنابت بدن کی

نشہ اور جنابت دونوں کو ایک ساتھ ذکر کر کے اور دونوں کو یکساں مفسد نماز قرار دے کر قرآن نے اس حقیقت کی طرف رہنمائی فرمائی ہے کہ یہ دونوں حالتیں نجاست کی ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ نشہ عقل کی نجاست ہے اور جنابت جسم کی۔ شراب کو قرآن نے جو 'رجس' کہا ہے یہ اس کی وضاحت ہو گئی۔

'جُنُب' کا لفظ جس طرح اجنبی کے لیے آتا ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، اسی طرح جنبی کے لیے بھی آتا ہے اور واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب میں اس کی شکل ایک ہی رہتی ہے۔

تیمم کی حکمت

'تیمم' کے معنی قصد اور رخ کرنے کے ہیں۔ 'صعید' سطح ارض کو کہتے ہیں۔ مرض، سفر اور پانی نہ ملنے کی صورت میں

طہارت حاصل کرنے کے لیے یہ ہدایت ہوئی کہ کوئی پاک صاف جگہ دیکھ کر چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔ اگرچہ یہ مسح پاکیزگی کے حصول کے نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اصل طریقۂ طہارت کی یادداشت ذہن میں قائم رکھنے کے پہلو سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ شریعت کے اکثر عبادات میں یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ جب اصلی صورت میں ان کی تعمیل ناممکن یا دشوار ہو تو شبہی صورت میں ان کی یادگار باقی رکھی جاتی تاکہ جب حالات درست ہو جائیں، ان کی طرف پلٹنے کے لیے طبیعت میں آمادگی باقی رہے۔

تیمم کے تین مواقع

تیمم کے یہاں تین مواقع بیان ہوئے ہیں۔ مرض، سفر اور پانی کی نایابی۔ اس سے یہ بات خود بخود نکلتی ہے کہ مرض اور سفر کی حالت میں پانی موجود ہوتے ہوئے بھی آدمی تیمم کر سکتا ہے۔ مرض میں وضو یا غسل سے ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے اس وجہ سے یہ رعایت ہوئی ہے۔ اسی طرح سفر میں مختلف حالتیں ایسی پیش آسکتی ہیں کہ آدمی کو تیمم ہی پر قناعت کرنی پڑے۔ مثلاً یہ کہ پانی نایاب تو نہ ہو لیکن کمیاب ہو۔ اندیشہ ہو کہ اگر غسل وغیرہ کے کام میں لایا گیا تو پینے کے لیے پانی ختم ہو جائے گا یا یہ ڈر ہو کہ اگر نہانے کے اہتمام میں لگے تو قافلے کے ساتھیوں سے بچھڑ جائیں گے، یا ریل اور جہاز کا ایسا سفر ہو کہ غسل کرنا شدید زحمت کا باعث ہو۔

حدث اور جنابت دونوں حالتوں میں تیمم کی اجازت

نجاست کی یہاں دو حالتیں مذکور ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ (یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے) لفظ 'غائط' اصلاً نشیبی زمین کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ قضائے حاجت سے کنایہ ہے اس لیے کہ سادہ دیہاتی زندگی میں لوگ رفع حاجت کے لیے عموماً نشیبی زمینوں اور جھاڑیوں ہی میں جاتے ہیں۔ دوسری اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (یا تم نے عورتوں سے ملاقات کی ہو) 'ملامست' کے معنی اصلاً چھونے اور ہاتھ لگانے کے ہیں لیکن یہاں یہ کنایہ ہے مباشرت سے۔ نجاست کی ان دونوں حالتوں کے ذکر سے مقصد یہ ہے کہ تیمم ہر قسم کی نجاست میں کفایت کرتا ہے۔ اگر یہ وضاحت نہ ہوتی تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ معمولی حدث میں تو تیمم جائز ہے لیکن دوسری صورت میں جائز نہیں ہے۔

آیت ۴۳ کا موقع و محل اور نظم

اجزا کی وضاحت کے بعد آیت کے موقع اور اس کے نظم کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لیجیے۔ آیت ۳۶ میں اللہ کی عبادت اور والدین و اقربا وغیرہ کے ساتھ احسان و انفاق کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ جو چیزیں عبادت اور احسان و انفاق کو باطل کر دینے والی ہیں مثلاً شرک اور ریا وغیرہ ان کا ذکر فرمایا۔ اب یہ عبادت الٰہی کے سب سے بڑے مظہر۔ نماز۔ کے ان مفسدات کا ذکر فرمایا جو نماز کو باطل کر دینے والے ہیں۔ اوپر شرک کا ذکر ہو چکا ہے جو عقائدی نجاست ہے۔ اس آیت میں ظاہری نجاستوں اور ان کے ازالہ کی تدابیر کی طرف رہنمائی فرمائی۔ فرمایا کہ نشے اور جنابت کی حالت میں نماز اور جائے نماز کے پاس نہ جاؤ۔ نشے کی حالت میں، جب کہ آدمی کو کچھ ہوش نہیں کہ زبان سے کیا کلمات نکال رہا ہے اور کس کام کے کرنے اور نہ کرنے کا اللہ سے عہد کر رہا ہے، نماز پڑھنا ایک کارِ عبث ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ آیت اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب شراب کی قطعی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اس حکم نے گویا لوگوں کو متنبہ کر دیا کہ اب شراب

کی قلبی حرمت کے لیے لوگ اپنی تربیت کریں۔ اسی طرح منع فرمایا کہ جنابت کی حالت میں بھی نماز اور جائے نماز کے پاس نہ جاؤ۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح شراب کا نشہ مُبطلِ نماز ہے، اسی طرح جنابت کا کسل اور انقباض بھی اس انشراح اور حضورِ قلب کے منافی ہے جو نماز کے لیے مطلوب ہے۔ اس ممانعت کے ساتھ اتنا استثنا رکھ دیا کہ اس حالت میں کوئی شخص اگر کسی ضرورت سے نماز کی جگہ سے گزرنا چاہے تو اس کی رخصت ہے۔ جنابت کے لیے طہارت غسل ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص بیمار یا سفر میں ہے یا اسے پانی نہیں مل رہا ہے تو وہ تیمم کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ قضائے حاجت اور مباشرت کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ تیمم ہر قسم کی نجاست میں جائز ہے۔ تیمم کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ کوئی پاک جگہ دیکھ کر چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ یعنی بندوں کے ساتھ اس نے یہ جو رعایت فرمائی ہے تو اس لیے کہ وہ عفو اور غفور ہے۔

۲۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۴-۵۷

آیت ۴۳ پر، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، اصلاحِ معاشرہ سے متعلق احکام کا باب ختم ہو گیا۔ آگے اس ردِ عمل کا بیان آ رہا ہے جو ان اصلاحات کے مخالفین کی طرف سے ظاہر ہوا اور ساتھ ہی مسلمانوں کو ایک عظیم مملکت کی بشارت سنائی جا رہی ہے جو معاشرہ کے بلوغ اور کمال کا قدرتی نتیجہ ہے۔ مخالفین میں سب سے پہلے یہود کو لیا ہے اس لیے کہ حاملِ کتاب ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ انہی کو ان اصلاحات کا حامی ہونا چاہیے تھا لیکن بدقسمتی سے سب سے زیادہ مخالفت انہی کی طرف سے ہوئی چنانچہ ان کی مخالفانہ شرارتوں کا ذکر کرنے کے بعد ان کو براہِ راست خطاب کر کے دھمکی دی کہ اے اہلِ کتاب، اگر تم اس کتاب پر ایمان نہ لائے تو یاد رکھو کہ تمہارے لیے وقت آ گیا ہے کہ اصحابِ سبت کی طرح تم پر لعنت کر دی جائے اور تمہارے چہرے مسخ کر دیے جائیں۔

اس کے بعد یہود کے بعض مشرکانہ اعمال و عقاید اور ان کے اس زعمِ بیجا کو سرزنش کی ہے کہ یہ اپنے آپ کو ایک برگزیدہ امت سمجھے بیٹھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے عقاید و اعمال خواہ کچھ ہوں، یہ خدا کے محبوبوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں جا براجیں گے۔ فرمایا کہ ان کے اس زعمِ باطل نے، جو سرتاسر اللہ پر افترا ہے، ان کو ایمان و عمل کی ذمہ داریوں سے بالکل بے فکر کر دیا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو بندگی کے دائرے سے نکال کر الوہیت کے دائرہ میں شامل کر رکھا ہے۔

اس کے بعد اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ ایک طرف تو تقدس اور برتری کا یہ ادعا ہے، دوسری طرف ذہنی اور اخلاقی پستی کا یہ حال ہے کہ اہلِ کتاب ہو کر جبت و طاغوت پر ایمان رکھتے اور مسلمانوں کے خلاف حسد میں ایسے اندھے ہو گئے ہیں کہ کفار و مشرکین تک کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دیتے

ہیں۔ فرمایا کہ اگر یہ حسد سے اندھے ہو رہے ہیں تو ہو جائیں، اب تو تقدیر الٰہی کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ اللہ اولاد اسمٰعیل کو کتاب و حکمت اور ایک عظیم خلافت کا وارث بنا کے رہے گا۔

اس کے بعد اولاد اسمٰعیل میں سے جن لوگوں نے یہ دعوت قبول کر لی تھی ان کی حوصلہ افزائی فرمائی اور جو لوگ اس کی مخالفت پر اڑے ہوئے تھے ان کو آخرت کے عذاب کی دھمکی دی۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۴-۵۷

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ
وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ ﴿٤٤﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ وَ
كَفَىٰ بِاللَّهِ وَلِيًّا ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ نَصِيرًا ﴿٤٥﴾ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا
يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ
غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ
قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ
أَقْوَمَ وَلَٰكِن لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٤٦﴾
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا
مَعَكُم مِّن قَبْلِ أَن نَّطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ
نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿٤٧﴾
إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ
وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ﴿٤٨﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ
يُزَكُّونَ أَنفُسَهُم ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٤٩﴾
انظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُّبِينًا ﴿٥٠﴾ ع
أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ

وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ
آمَنُوا سَبِيلًا ﴿٥١﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ
اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿٥٢﴾ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ
فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ
مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ
وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾ فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ
وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ﴿٥٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ
كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم
بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ
الربع عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ
جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ
لَّهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿٥٧﴾

ترجمۂ آیات
۵۷-۴۴

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا۔ وہ گمراہی
کو ترجیح دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ کھو بیٹھو! اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب
واقف ہے اور اللہ کافی ہے حمایت کے لیے اور اللہ کافی ہے مدد کے لیے۔ ۴۵

یہودیوں سے ایک گروہ زبان کو توڑ مروڑ کر اور دین پر طعن کرتے ہوئے الفاظ کو
ان کے موقع و محل سے ہٹا دیتا ہے اور سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا "اسمع غیر مسمع"
اور رَاعِنَا کہتا ہے اور اگر وہ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا "اسمع" اور اُنْظُرْنَا کہتے تو یہ

ان کے حق میں بہتر ہوتا اور بات برمحل ہوتی لیکن اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے
ان پر لعنت کر دی ہے اس وجہ سے وہ شاذ ہی ایمان لائیں گے۔ ۴۶

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی اس چیز پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے،
مصداق اُن پیشین گوئیوں کی جو خود تمھارے پاس موجود ہیں، قبل اس کے کہ ہم چہروں کو
بگاڑ دیں اور ان کو ان کے پیچھے کی جانب اُلٹ دیں یا ان پر بھی اسی طرح لعنت کر
دیں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کر دی اور خدا کی بات شدنی ہے۔ ۴۷

اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔ اس کے سوا جو کچھ
ہے اس کو جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے وہ ایک
بہت بڑے گناہ کا افترا کرتا ہے۔ ذرا ان کو تو دیکھو جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ ٹھہراتے
ہیں! بلکہ اللہ ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا
جائے گا۔ دیکھو، یہ اللہ پر کیسا جھوٹ باندھ رہے ہیں اور صریح گناہ ہونے کے لیے
تو یہی کافی ہے۔ ۴۸-۵۰

ذرا ان کو دیکھو جنھیں کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا۔ یہ جبت اور طاغوت پر
عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر تو
یہ ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو تم ان
کا کوئی مددگار نہیں پا سکتے۔ کیا خدا کے اقتدار میں کچھ اُن کا بھی دخل ہے کہ یہ لوگوں
کو کچھ بھی دینے کو تیار نہیں؟ کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں، اس فضل پر جو اللہ نے
اُن کو بخشا؟ تو ہم نے تو بخش دی آلِ ابراہیم کو کتاب و حکمت اور ہم نے ان کو ایک

عظیم سلطنت بھی بخشی۔ ۵۱-۵۴

پس ان میں سے ایسے بھی ہیں جو اس پر ایمان لائے اور ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس سے منہ موڑا۔ ایسوں کے لیے جہنم کی بھڑکتی آگ ہی کافی ہے۔ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا ہم ان کو ایک سخت آگ میں جھونک دیں گے۔ جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کو دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ یہ عذاب کا مزا خوب چکھیں۔ بے شک اللہ عزیز و حکیم ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اس میں ہمیشہ رہیں گے، اس میں ان کے لیے پاک بیویاں ہوں گی اور ہم ان کو گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔ ۵۵-۵۷

۲۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ ۝
وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَلِيًّا وَكَفَىٰ بِاللَّهِ نَصِيرًا (۴۴-۴۵)

قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں نسبت جزو اور کل کی ہے

أَلَمْ تَرَ کا خطاب، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں لکھ چکے ہیں، عموماً جمع اور اظہارِ تعجب و افسوس کے لیے آتا ہے۔ یہاں خطاب مسلمانوں سے ہے اور أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ سے مراد یہود ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ پچھلے آسمانی صحیفوں اور قرآن عظیم میں نسبت جزو اور کل کی ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کامل کتاب ہے، دوسرے آسمانی صحیفے اس کے اجزاء و حصص کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وجہ سے جو لوگ اس کتاب کامل کے اجزاء و حصص کے حامل بنائے گئے تھے ان سے سب سے زیادہ توقع اس بات کی ہو سکتی تھی کہ جب یہ کتاب کامل ان کے پاس آئے گی تو وہ اس کا آگے بڑھ کر خیر مقدم کریں گے لیکن ان کا عجیب حال ہے کہ وہ اس ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کو قبول کرنا تو الگ رہا، دل و جان سے ان کی کوشش یہ ہے کہ تم بھی اس پائی ہوئی صراطِ مستقیم کو کھو بیٹھو۔ اوپر آیت ۲۶ میں یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اس کتاب کے ذریعے سے پچھلے انبیاء و صالحین

کے طریقوں کی طرف رہنمائی فرما رہا ہے لیکن خواہشات نفس کے پیرو یہ کوشش کر رہے ہیں کہ تم راہ حق سے بالکل ہی دور ہٹ جاؤ۔ اب یہ اسی اشارے کی تفصیلات آ رہی ہیں۔

وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ الآیۃ، مسلمانوں کے لیے تسکین و تسلی کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ان دشمنوں سے بے خبر نہیں ہے۔ ان سے اور ان کی چالوں اور شرارتوں سے خوب واقف ہے، وہ ان کی ہر شرارت کو ناکام بنا دے گا۔ جس کا حامی و ناصر اللہ ہو اس کے لیے اللہ کی حمایت و نصرت کافی ہے۔ پس اپنی راہ پر آگے بڑھتے چلو اور اللہ کی کارسازی اور مدد پر بھروسہ رکھو۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۚ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴۶)

یہود کی ایک شرارت

اس آیت کے تمام الفاظ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہ ان شرارتوں کی طرف اجمالاً اشارہ ہے جو یہودی اشرار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی نگاہوں سے گرانے اور اسلام کو بے وزن اور حقیر بنانے کے لیے کرتے تھے۔

اچھے مجلسی الفاظ کا استعمال طنز کے طور پر

'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'، 'اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ'، اور 'رَاعِنَا' وغیرہ الفاظ جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، عرب کے مجلسی الفاظ میں سے تھے جو متکلم کی تحسین و قدر افزائی، سامع کے اظہار ذوق و شوق اور مخاطب کے اعتراف و قبول پر دلیل ہوتے تھے۔ جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں۔ بجا ارشاد ہے۔ سر تسلیم خم ہے، سنیے، کیا خوب بات فرمائی ہے۔ نادر نکتہ ہے۔ مکرر ارشاد ہو۔ پھر فرمائیے۔ اسی طرح عرب میں بھی مذکورہ الفاظ و کلمات رائج تھے۔ یہ الفاظ اصلاً تو اظہار تحسین یا اعتراف و قبول کے لیے ہیں لیکن اگر کوئی گروہ شرارت اور بدتمیزی کرنا چاہے تو ذرا زبان کو توڑ مروڑ کر، تلفظ کو بگاڑ کر، یا لب و لہجہ میں ذرا مصنوعی انداز پیدا کر کے بڑی آسانی سے تحسین کو تقبیح اور اعتراف و اقرار کو طنز و استہزا بنا سکتا ہے۔ اس سے متکلم کے وقار کو کوئی نقصان پہنچے یا نہ پہنچے لیکن شرارت پسند اشخاص اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔ اب ان الفاظ کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ سمجھیے۔

'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا مفہوم

'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کے لفظی معنی ہیں، ہم نے سنا اور اطاعت کی، اہل عرب یہ اس موقع پر بولتے تھے جب اپنے کسی بڑے، کسی سردار، کسی بادشاہ کے حکم و ارشاد پر اپنی طرف سے امتثال امر کے لیے آمادگی اور مستعدی کا اظہار کرنا چاہتے۔ عربی میں اس کے لیے 'طَاعَةٌ' کا لفظ بھی ہے جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہودی اشرار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں جاتے تو اپنی سعادت مندی اور وفاداری کی نمائش کے لیے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' تو بات بات پر کہتے لیکن لب و لہجہ کے تصرف سے اس کو ادا اس طرح کرتے کہ 'اَطَعْنَا' کو 'عَصَيْنَا' بنا لیتے۔ چونکہ دونوں کے حروف ہم آہنگ اور قریب المخرج ہیں اس وجہ سے اس تحریف

میں ان کو کامیابی ہو جاتی۔ اس طرح وہ تسلیم و اطاعت کے جملہ کو نافرمانی و سرکشی کے قالب میں ڈھال دیتے اور بھنے والے ان کی اس شرارت پر کوئی گرفت بھی نہ کر سکتے اس لیے کہ وہ بڑی آسانی سے یہ بہانہ بنا سکتے تھے کہ ہم نے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شریف اور خوددار آدمی بات کو سُن اور سمجھ کر بھی خاموشی سے ٹال دینے ہی کو بہتر خیال کرتا ہے۔

اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ کا مفہوم

'اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ' کے لفظی معنی ہیں، سُنو وہ بات جو پہلے سنائی نہیں گئی۔ اس فقرے کا اچھا محل یہ ہے کہ مجلس میں متکلم یا خطیب کی کوئی حکیمانہ بات سُن کر ایک سامع دوسرے سامع کو متوجہ کرے کہ یہ دانشمند اور حکیمانہ بات سُنیے، یہ بات پہلی بار ہمارے کانوں نے سنی ہے، اس سے پہلے یہ بات کبھی ہم نے نہیں سنی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات نہ صرف متکلم اور خطیب کی قدردانی کی دلیل ہے بلکہ دوسروں کو اس کی قدردانی کے لیے تشویق و ترغیب بھی ہے لیکن کوئی شخص ہوٹنگ (HOOTING) کے انداز میں یا انداز تمسخر یہی بات کہے تو اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ "ذرا اس کی ناشنیدنی سنو، یہ کیسی بے پر کی اُڑا رہا ہے، ایسی بات کاہے کو کبھی کسی نے سنی ہوگی!" ظاہر ہے کہ محض انداز اور لب و لہجہ کی تبدیلی نے اس نہایت اعلیٰ فقرے کو طعن و طنز کا ایک زہر آلود نشتر بنا دیا لیکن اس پر بھی کوئی گرفت نہیں ہو سکتی اس لیے کہ گرفت ہو تو کہنے والا صفائی پیش کر سکتا ہے کہ میں نے تو طنز کے طور پر نہیں بلکہ تحسین کے طور پر کہا ہے۔ چونکہ اس فقرے میں طنز کا پہلو 'غَیْرَ مُسْمَعٍ' کے الفاظ سے پیدا ہوتا تھا اس لیے قرآن نے اس کی یہ نوک توڑ دی اور ہدایت کی کہ صرف 'اِسْمَعْ' کہا جائے۔

رَاعِنَا کا مفہوم

'رَاعِنَا' کے لفظی معنی ہیں، ذرا ہماری رعایت فرمائیے۔ اس لفظ کا اچھا محل استعمال یہ ہے کہ اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو یا بات ایسی لطیف اور حکیمانہ ہو کہ خود متکلم کی زبان سے اس کو مکرر سُننا چاہے تو اس کو دوبارہ متوجہ کرنے کے لیے جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں، پھر ارشاد ہو، پھر فرمائیے، اسی طرح عربی میں 'رَاعِنَا' کہتے ہیں۔ یہ لفظ سامع کے ذوق و شوق اور اس کی رغبت علم کی دلیل ہے۔ لیکن یہودی اشرار 'لَیًّا بِاَلْسِنَتِہِمْ' یعنی زبان کے توڑ مروڑ کے ذریعہ سے اس کو بھی طنز کے قالب میں ڈھال لیتے تھے۔ اس کی شکل یہ ہوتی کہ 'رَاعِنَا' میں 'ع' کے کسرہ کو ذرا دبا دیجیے تو یہ لفظ 'رَاعِیْنَا' بن جائے گا اور اس کے معنی ہوں گے "ہمارا چرواہا"۔ قرآن نے یہود کی اس شرارت کی وجہ سے اس لفظ کو سرے سے مسلمانوں کے مجلسی الفاظ ہی سے خارج کر دیا اور اس کی جگہ 'اُنْظُرْنَا' کے استعمال کی ہدایت فرمائی جس کے معنی ہیں ذرا ہمیں مہلت عنایت ہو، ذرا پھر توجہ فرمائیے۔ یعنی مفہوم کے لحاظ سے یہ ٹھیک ٹھیک 'رَاعِنَا' کا قائم مقام ہے اور اس میں لہجہ کے بگاڑ سے کسی بگاڑ کے پیدا کیے جانے کا کوئی توقع نہیں ہے۔[1]

---

[1] اس لفظ پر آیت ۱۰۴ کے تحت سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔ وہاں ہم نے اس مجلسی اصلاح کے فوائد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ حاملِ کتاب گروہ ہو کر یہ جسارت اور بدتمیزی جو آخری پیغمبر کے ساتھ یہ لوگ کر رہے ہیں، یہ یونہی نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی لعنت کا نتیجہ ہے جو ان کے کفر کے سبب سے ان پر ہوئی ہے۔ خدا نے ان کو اپنے دروازے سے دھتکار دیا ہے۔ اب مشکل ہی ہے ان میں سے کچھ لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب ہو گی۔

نبی پر طعن خود دین پر طعن ہے

اس آیت میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ یہود کی یہ تمام شرارتیں تھیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز کی نوعیت کی لیکن قرآن نے ان کو طَعْنًا فِي الدِّينِ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ نبی درحقیقت مجسّمۂ دین اور مظہرِ شریعت ہوتا ہے اس وجہ سے اس پر طعن خود دین پر طعن ہے۔ اس نکتے پر انشاء اللہ ہم سورۂ حدید کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَى أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا (۴۷)

چہروں کو سپاٹ کر دینے کی علت

'طمس الشیٔ' کے معنی ہیں کسی شے کے آثار و علامات کو مٹا دینا۔ چہروں کو مٹا دینے کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو آنکھ، کان، ناک اور منہ کے نشانات ہیں یہ سب مٹا کر برابر کر دیے جائیں اس لیے کہ اللہ نے یہ قوتیں نہایت اعلیٰ مقصد سے بخشی تھیں لیکن جب ان سے وہ کام نہیں لیا گیا جس کے لیے یہ عطا ہوئی تھیں بلکہ اس کے بالکل برعکس یہ سب چیزیں ٹھوکر کھانے کے گڑھے بن کر رہ گئی ہیں تو آخر یہ گڑھے کیوں باقی رکھے جائیں؟ یہ بھر کیوں نہ دیے جائیں؟ یہ ملحوظ رہے کہ سورۂ بقرہ میں ان لوگوں کو صُمٌّ، بُكْمٌ، عُمْيٌ کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سب کچھ رکھتے ہوئے یہ گونگے، بہرے اور اندھے بن چکے ہیں تو یہ اسی کے سزاوار ہیں کہ یہ نشانات بھی مٹا ہی دیے جائیں۔

'وجوھا' کے نکرہ لانے کی بلاغت

'وُجُوهًا' کی تنکیر میں بھی بڑی بلاغت ہے۔ یہ تنکیر نفرت و کراہت کے اظہار کے لیے ہے۔ اوپر والی آیت میں ان پر لعنت کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس تنکیر سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ یہ ملعون چہرے اس درجہ قابلِ نفرت ہیں کہ متکلم تعیین کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ 'وُجُوهَهُمْ' نہیں کہا بلکہ ان سے منہ پھیر کر 'وُجُوهًا' کہا۔ اس قسم کی تنکیر أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (۲۴ محمد) میں لفظ 'قُلُوبٍ' میں بھی ہے۔ اس کی بلاغت پر ہم اس کے محل میں انشاء اللہ بحث کریں گے۔

'فنردھا علی ادبارھا' کا مفہوم

'فَنَرُدَّهَا عَلَى أَدْبَارِهَا' اسی اوپر والی بات کی تفصیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کے چہرے اور گدّی میں کوئی فرق ہی نہیں، جس طرح پیچھے کا حصہ سپاٹ ہے اسی طرح عملاً آگے کا حصہ بھی سپاٹ ہی ہے تو یہ آگے کا حصہ بھی پیچھے ہی کی طرف کیوں نہ موڑ دیا جائے۔

'أَصْحَابَ السَّبْتِ' پر لعنت کی وجہ اور اس کے اثرات پر بقرہ کی آیات ۶۵-۶۶ کے تحت مفصل بحث گزر چکی ہے۔

یہود کو آخری دھمکی

یہ آیت یہود کے لیے دعوت کی نہیں بلکہ تہدید و وعید کی آیت ہے۔ دعوت کا ذکر اس میں محض اتمامِ حجت کے طور پر ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہ آخری موقع ہے کہ تم سنبھلنا چاہو تو سنبھل جاؤ۔ یہ موقع نکل گیا تو پھر

یہ کبھی میسر نہ آئے گا بہتر ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جو تمھاری اپنی کتاب کی پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتی ہوئی اتری ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ اب تمھارے لیے وہ وقت آپہنچا ہے کہ تمھارے چہرے بگاڑ دیے جائیں یا تمھارے اوپر بھی اسی طرح کی لعنت کر دی جائے جس طرح کی لعنت سبت والوں پر کر دی گئی کہ وہ ذلیل بندر ہو کر رہ گئے۔

وہ لعنت جس کے یہود مستحق تھے

رحمت کی طرح لعنت اور نقمت کے بھی مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ یہاں ان کو جس درجے کی لعنت کی دھمکی دی گئی ہے یہ وہ لعنت ہے جس کے فی الواقع وہ اپنی شرارتوں کی وجہ سے مستحق بن چکے تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس سے کم درجے کی لعنت ان پر کی تو یہ ان کو گویا تھوڑی سی مہلت دی گئی اور ہر مہلت جو کسی قوم کو ملتی ہے اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتی تو یہ اس کے اخروی عذاب میں زیادتی کا باعث ہوتی ہے۔

عمل اور سزا میں مشابہت

یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ چہروں کو بگاڑ دینے کی دھمکی جو ان کو دی گئی اس میں عمل اور سزا کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اوپر والی آیت میں ان کی یہ حرکت جو بیان ہوئی ہے کہ پیغمبر کا مذاق اڑانے کے لیے منہ بنا بنا کر اور لہجے بگاڑ بگاڑ کر الفاظ کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں اور اس منہ بنانے اور الفاظ کے بگاڑنے کو انھوں نے ہنر سمجھ رکھا ہے اس کی بنا پر وہ مستحق ہوئے کہ واقعی ان کے چہرے مسخ ہی کر دیے جائیں۔ علیٰ ہذا القیاس جنھوں نے حق سے منہ موڑنے ہی کو شیوہ بنا لیا ہے تو وہ سزاوار ہیں کہ ان کے منہ پیچھے ہی کی طرف الٹ دیے جائیں۔

'وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا' میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ آدمیوں کے چہروں کو گدیوں کی طرح سپاٹ کر دینا، ان کو الٹ دینا یا ان کو مسخ کر کے بندروں کی شکل کا کر دینا خدا کے لیے کوئی مشکل کام ہے۔ اس کے کسی حکم اور اس کے وقوع میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ ادھر حکم ہوا ادھر اس کا نتیجہ موجود۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى إِثْمًا عَظِيْمًا ۝ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ أَنْفُسَهُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفٰى بِهٖٓ إِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ أُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ أَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۖ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝ (۴۸-۵۲)

جبت اور طاغوت کا مفہوم

جبت سے مراد اعمال سفلیہ، مثلاً سحر، شعبدہ، گنڈے ٹوٹکے، رمل جفر، فال گیری، نجوم، آگ پر چلنا اور اس قسم کی دوسری خرافات ہیں۔ ہاتھ کی لکیروں کا علم بھی اسی میں شامل ہے۔

سورۂ بقرہ کی تفسیر میں آیات ۲۸۶-۲۸۸ کے تحت ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ یہود اپنے دور زوال میں کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال کر بس انھی چیزوں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے انبیاء نے نہایت درد انگیز الفاظ میں ان کی اس حالت پر نوحہ کیا ہے۔ اس سے متعلق ضروری حوالے وہاں نقل ہو گئے ہیں۔ یہاں اعادے میں طوالت ہو گی۔

'طاغوت' پر تفصیلی بحث بقرہ کی آیت ۲۵۶ کے تحت گزر چکی ہے۔

دین کی بنیاد توحید پر ہے

دین کی بنیاد توحید پر ہے۔ یہ صرف عقیدوں میں سے ایک عقیدہ ہی نہیں ہے بلکہ سارے دین کے قیام و بقا کا انحصار اسی پر ہے۔ جو لوگ ہر پہلو سے اس کی حفاظت کرتے ہیں وہی اپنی دوسری کوتاہیوں کے باوجود اپنے اصل دین کی حفاظت کرتے ہیں، برعکس اس کے جو لوگ توحید میں رخنہ پیدا کر دیتے ہیں وہ اصل دین کو ہدم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے دوسرے کام بھی، جو بظاہر دینداری کے ہوں، بالکل بے سود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا لیکن دوسرے گناہوں کو جن کے لیے چاہے گا معاف فرما دے گا۔ 'جن کے لیے چاہے گا' کی قید اس بات کی دلیل ہے کہ دوسرے گناہوں کے معاملے میں بھی کسی کو دلیر نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ ان کی معافی بھی اللہ ہی کی مشیت پر منحصر ہے۔ اس کی مشیت میں نہ تو کسی دوسرے کو کوئی دخل ہے، نہ اس کی کوئی مشیت حکمت سے خالی ہے۔ علاوہ ازیں گناہوں کے معاملے میں یہ دلیری اور ڈھٹائی بجائے خود بھی شرک کی ایک قسم ہے۔

شرک کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا

یہ تمہید اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بیان ہوئی ہے کہ یہود جو لعنت کے مستحق قرار پاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حامل کتاب ہوتے ہوئے انھوں نے دین کی جو بنیاد ہے وہی اکھاڑ دی ہے اور اس کی جگہ انھوں نے شرک کو اختیار کر لیا ہے۔ 'شرک' اللہ پر ایک افترائے عظیم ہے جس کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف فرمانے والا نہیں ہے۔ شرک کو افترا کہنے کی وجہ ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ شرک کرنے والے اپنی تمام مشرکانہ حرکات کو دین کی سند دینے کے لیے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان باتوں کا حکم ان کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ پر صریح تہمت ہے اور اگر کوئی گروہ جو اللہ کے دین کی گواہی دینے پر مامور ہو، وہ خدا پر تہمت باندھنے کا پیشہ اختیار کر لے تو وہ لعنت کے سوا اور کس چیز کا مستحق ہو سکتا ہے!

اس تمہید کے بعد یہاں ان کے تین قسم کے شرک گنائے ہیں۔

یہود کے مشرکانہ عقائد

ایک یہ کہ یہ اپنے آپ کو ایک برتر اور برگزیدہ گروہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اللہ کے محبوبوں کی اولاد اور خود خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں اس وجہ سے ان کے لیے خدا کے ہاں کوئی بازپرس یا سزا نہیں ہے۔ ان کے اعمال و اخلاق خواہ کچھ ہوں، اول تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے، اگر ڈالے بھی گئے تو محض تھوڑی مدت کے لیے۔ اس گھمنڈ نے ان کو عمل اور اطاعت کی ذمہ داریوں سے بالکل فارغ کر دیا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو بندگی کے دائرے سے نکال کر الوہیت کے زمرے میں داخل کر لیا ہے حالانکہ کہیں بھی اللہ نے ان کو برگزیدگی کی یہ سند عطا نہیں فرمائی ہے۔ جس کسی کو بزرگی عطا ہوتی ہے وہ خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا نے اس چیز کو ایمان و عمل اور نیکی و تقویٰ سے وابستہ کیا ہے نہ کہ نسل و نسب سے۔ ہر شخص جو کرے گا وہ بھرے گا۔ اللہ ان کے ساتھ ذرہ برابر بھی ناانصافی کرنے والا نہیں۔ اپنی برتری کا یہ عقیدہ جو انھوں نے گھڑا ہے، یہ ان کا اپنا طبع زاد ہے۔ اس کو خدا سے جو وہ منسوب کرتے ہیں تو یہ خدا

پر مجبور تا افتراء ہے اور ان کے مجرم ہونے کے لیے، دوسرے جرائم سے قطع نظر، یہی جرم کافی ہے۔

اعمالِ سفلیہ اور ارواحِ خبیثہ

دوسرا یہ کہ حاملِ کتاب ہوتے ہوئے یہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے اور اعمالِ سفلیہ کے قائل اور ان پر عامل ہیں۔ اعمالِ سفلیہ کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کا تعلق بیشتر شیطانی قوتوں اور ارواحِ خبیثہ سے ہوتا ہے ساتھی کو یہاں طاغوت کہا گیا ہے۔ جو لوگ ان اعمال کے درپے ہوتے ہیں اول تو وہ ارواحِ خبیثہ کو بالذات مؤثر مانتے ہیں پھر ان سے تعلق پیدا کرنے اور ان کو اپنے مقاصد میں استعمال کرنے کے لیے ان کو نہ صرف خلافِ شرع بلکہ صریح مشرکانہ اعمال کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے جس سے عقیدہ اور عمل دونوں یکسر تباہ ہو کے رہ جاتے ہیں۔ تفسیر سورۂ بقرہ میں اس پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

تیسرا یہ کہ یہ لوگ اہلِ ایمان کے مقابل میں کفار و مشرکین کی حمایت کرتے اور ان کو مسلمانوں سے زیادہ حق و ہدایت پر سمجھتے ہیں۔ یہ بات سورۂ بقرہ اور آلِ عمران میں بھی گزر چکی ہے۔

اہلِ ایمان کے بالمقابل مشرکین کی حمایت

یہود اسلام کی مخالفت میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ کھلم کھلا مشرکینِ مکہ کو مسلمانوں پر ترجیح دیتے تھے اور اپنی اس مخالفت کے لیے آڑ اسلام کی ان تعلیمات اور رخصتوں کو بناتے تھے جو ان کی بدعات یا ان کی شریعت کے تشددات کے خلاف تھیں۔ مثلاً حدث اور جنابت کی حالت میں، اسلام نے پانی میسر نہ آنے کی صورت میں، تیمم کی اجازت دی تو اس کو بھی انھوں نے فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ بھلا جو مذہب جنابت کی حالت میں زمین پر ہاتھ مار کر نماز تک پڑھ لینے کی اجازت دیتا ہو وہ بھی کوئی خدائی مذہب ہو سکتا ہے، ان سے زیادہ اچھا مذہب تو ان بت پرستوں کا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ طہارت کے باب میں یہود کے فقہاء نے اتنے تشددات پیدا کر لیے تھے کہ آدمی حالتِ جنابت میں بالکل ہی اچھوت بن کے رہ جاتا تھا۔ جنابت تو در کنار انجیل سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہودی فقہاء حضرت مسیح کے صحابہ پر اس بات کے لیے بھی معترض ہوتے تھے کہ یہ لوگ بعض اوقات ہاتھ دھوئے بغیر ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔ سیدنا مسیح نے ان کی اسی طرح کی خردہ گیریوں پر ان کو سفیدی پھری ہوئی قبروں سے تشبیہ دی تھی کہ جس طرح قبروں کے اوپر سفیدی پھری ہوئی ہوتی ہے لیکن اندر سڑی گلی ہوئی ہڈیاں ہوتی ہیں اسی طرح یہ لوگ اوپر سے تو بڑے اُجلے اور صاف معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر لوٹ کا مال بھرا ہوا ہے۔ یہود کی یہی ذہنیت مسلمانوں کے خلاف نمایاں ہوئی۔ وہ مشرکین تک کو گوارا کرنے کے لیے تیار تھے نہیں تیار تھے تو مسلمانوں کو گوارا کرنے کے لیے! ظاہر ہے کہ جس طرح حق کی حمایت حق پرستی ہے اسی طرح شرک کی حمایت شرک پرستی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے ان کا کوئی مددگار ان کے کچھ کام نہیں آ سکتا۔ جس پر خدا کی لعنت ہو جائے خدا کے ہاں سے اس کی جڑ کٹ جاتی ہے اور جس درخت کی جڑ کٹ جائے اسے کوئی لاکھ پانی دے اس کا ہرا ہونا ممکن نہیں۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۝ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (۵۳-۵۴)

'ملک' سے مراد یہاں خدائی اقتدار و اختیار ہے اور 'الناس' سے مراد یہاں مسلمان ہیں۔

یہود بنی اسمٰعیل کے حاسد تھے — مطلب یہ ہے کہ کیا خدا کے اقتدار و اختیار میں کچھ ان کی بھی حصہ داری ہے کہ اس کے فضل و انعام میں سے یہ جس کو چاہیں حصہ دیں، جس کو چاہیں محروم کر دیں، چنانچہ اپنے اسی اختیار کی بنا پر وہ مسلمانوں کو خدا کے فضل و کرم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے — اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے — تو پھر اس تمام لاالفضولی سے کیا حاصل؟ تقدیر الٰہی سے پنجہ آزمائی کر کے کون جیتا ہے جو یہ جیت سکیں گے!

اس کے بعد اصل راز سے پردہ اٹھا دیا ہے کہ یہ سارا طوفان اس حسد کا نتیجہ ہے جو یہ مسلمانوں سے رکھتے ہیں۔ ان کو یہ غم و غصہ ہے کہ نبوت تو ان کے خاندان کا حصہ تھی، یہ ان کے خاندان سے نکل کر بنی اسمٰعیلؑ کے اندر کس طرح چلی گئی؟ انھیں خبر نہیں ہے کہ نبوت اور شریعت اللہ کا فضل ہے، اللہ جس کو چاہے اپنا فضل بخشے۔ اللہ کے بخشے ہوئے فضل پر حسد کرنا اور اس حسد کے بحران میں مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہونا خود اللہ سے لڑنے کے مرادف ہے۔ اگر یہ اللہ سے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو لڑیں، ہم نے تو آلِ ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت بھی بخش دی اور ان کو ایک عظیم سلطنت بھی بخش دی۔ یعنی جو کچھ انھیں کرنا ہے کر لیں، ہم نے تو جو کچھ کرنا تھا کر دیا۔

زبان کا ایک اسلوب — فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الاية. شرطیہ اور انشائیہ جملوں میں جب اس طرح 'فقد' آتا ہے تو اس سے پہلے کلام میں کچھ حذف ہوتا ہے جس کی تفصیل بعد کے جملہ سے ہوتی ہے۔ یہاں مدعا یہ ہے کہ اگر بنی اسمٰعیل پر حسد کی وجہ سے یہ لوگ اس نبی کی مخالفت کر رہے ہیں تو جتنا حسد کرنا ہے کر لیں، ہم نے تو آلِ ابراہیم کو کتاب و حکمت بھی بخش دی اور ایک عظیم بادشاہی بھی۔

آل ابراہیم سے مراد بنی اسمٰعیل ہیں — 'آلِ ابراہیم' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں مراد بنی اسمٰعیل ہیں۔ قرینہ اس پر دلیل ہے۔ اس لیے کہ یہ بات بنی اسرائیل کو بطور سرزنش کہی جا رہی ہے۔ اس وجہ سے وہ اس میں شامل نہیں ہو سکتے اور جب وہ شامل نہیں ہو سکتے تو اس کے واحد مصداق صرف بنی اسمٰعیل رہ جاتے ہیں۔ پھر یہاں کتاب و حکمت اور خلافت کے عطا کیے جانے کا ذکر ہے اور یہ عطا کیا جانا بنی اسرائیل پر لعنت کے بعد ہے اس وجہ سے ان کے اس میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں تورات سے خود ثابت ہے کہ یہود نے اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کے بجائے ہمیشہ حضرت اسحٰقؑ ہی سے منسوب کیا۔ تورات میں ہے کہ "ابراہیمؑ کی اولاد اسحٰقؑ کے نام سے پکاری جائے گی" اس کے برعکس اہلِ عرب اپنے آپ کو ہمیشہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرتے رہے، اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وہیں قیام کیا، وہیں بیت اللہ کی تعمیر فرمائی اور وہیں اپنے تمام مناسک ادا کیے۔

اس اسلوب بیان سے ایک تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل یہ نہ خیال کریں کہ آل ابراہیمؑ ہونے کا شرف انہی کو حاصل ہے یہ شرف بنی اسمٰعیل کو بھی حاصل ہے۔ دوسری یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو اس نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا تھا اور جو صریحاً حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد ہی سے متعلق تھا۔ تورات میں یہ وعدہ یوں مذکور ہے۔

"اور خداوند کے فرشتے نے آسمان سے دوبارہ ابراہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی" کتاب پیدائش باب ۲۲

تورات کے اس بیان سے صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدۂ برکت حضرت ابراہیمؑ سے اس وقت فرمایا ہے جب انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے — حضرت اسمٰعیل — کی قربانی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس وجہ سے لازماً یہ وعدہ حضرت اسمٰعیلؑ اور انہی کی نسل سے متعلق ہو سکتا ہے۔

بنی اسمٰعیلؑ کے لیے اللہ تعالیٰ کے تین وعدے

اس وعدے میں تین باتوں کا ذکر ہے۔

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو ایک عظیم امت بنائے گا۔

دوسری یہ کہ ان کو عظیم فتوحات حاصل ہوں گی اور دشمنوں کے پھاٹکوں پر ان کا قبضہ ہوگا۔

تیسری یہ کہ اس نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی۔

یہ تینوں وعدے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پورے ہوئے۔ آپؐ کی بعثت سے ایک عظیم امت ظہور میں آئی، یہ امت دشمنوں کے پھاٹکوں کی مالک بنی، اور آپ کی دعوت سے تمام عالم انسانی کو دین و شریعت کی برکت نصیب ہوئی۔

وعدے کا ذکر بشکل واقعہ

اسی وعدے کا عملی ظہور ہے جس کی طرف آیت زیر بحث میں اشارہ ہے۔ اگرچہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے اس وقت تک یہ وعدہ مکمل طور پر ظاہر نہیں ہوا تھا لیکن اس کے پورے ہونے کے لیے فیصلۂ الٰہی صادر ہو چکا تھا اس وجہ سے اس کو تعبیر اس طرح فرمایا ہے کہ گویا یہ عملاً پورا ہو چکا ہے۔

اس اسلوب بیان کی قرآن مجید میں متعدد مثالیں ہیں۔ ہم ایک مثال یہاں پیش کرتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا	اور یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ	میری قوم کے لوگو، اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد
اَنْۢبِیَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ	کرو کہ اس نے تم میں انبیا اٹھائے، تمھیں بادشاہ بنایا
مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۝ یٰقَوْمِ	اور تمھیں وہ کچھ بخشا جو دنیا والوں میں سے کسی کو نہیں

ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ (۲۰-۲۱ مائدہ)

بخشا۔ اے میری قوم کے لوگو، اس ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور پیچھے نہ پلٹو کہ نامراد ہو جاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تقریر قوم کے سامنے اس وقت فرمائی ہے جب وہ اس کو ارض مقدس پر حملہ کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ظہور میں نہیں آئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ان باتوں کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس نے حضرت موسیٰ کو اس فیصلے سے آگاہ بھی فرما دیا تھا اس وجہ سے حضرت موسیٰ نے ان کا ذکر اس طرح فرمایا ہے گویا یہ وعدے پورے ہو چکے ہیں۔

حکومت کتاب
حکمت کے
ثمرات میں
سے ہے

اس آیت سے ایک لطیف نکتہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سلطنت و خلافت کتاب و حکمت کے ثمرات و نتائج میں سے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو کتاب و حکمت کی نعمت عطا فرماتا ہے اور وہ قوم سچی شکر گزاری کے ساتھ اس کو قبول بھی کر لیتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو امامت و خلافت کا منصب بھی سونپ دیا گیا۔ یہ مضمون بیان تو قرآن مجید میں کئی جگہ ہوا ہے لیکن یہاں خاص اہتمام سے بیان ہوا ہے۔ جو لوگ عربی زبان کا ذوق رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں اٰتَيْنَا کے فعل کے اعادے میں بڑی بلاغت ہے۔ یہود کا سارا حسد تو اسی وجہ سے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ اس قرآن کے ساتھ اس زمین کی بادشاہی بھی بندھی ہوئی ہے چنانچہ ان کے اسی حسد پر کاری ضرب لگانے کے لیے فرمایا کہ ہم نے نہ صرف کتاب و حکمت ان کو دی بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک عظیم سلطنت بھی ان کو دی۔ تمہارے حسد کے علی الرغم!

فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَّهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا (۵۵-۵۷)

بنی اسمٰعیل
کو تنبیہ

یہ آیات بنی اسمٰعیل سے متعلق ہیں۔ فرمایا کہ ان میں سے ایک گروہ تو اس کتاب و حکمت کو قبول کر کے ایمان سے مشرف ہو چکا ہے لیکن ایک گروہ ابھی اس سے رُوگرداں ہے۔ اس گروہ کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ اپنے کفر پر اڑا رہا تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ میں داخل کرے گا جہاں ان کے عذاب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی، ان کو دوسری کھالیں پہنا دی جائیں گی تاکہ ان کا عذاب تازہ ہوتا رہے۔ اللہ عزیز یعنی غالب ہے کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ حکیم ہے یعنی اس کا کوئی فعل عدل و حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

دوسرا گروہ جو ایمان لایا ان کے متعلق فرمایا کہ ان کو ہم جنت میں داخل کریں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اس میں ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ ان تمام اجزا کی تشریح سورۂ بقرہ میں ہو چکی ہے۔

قرآن نے جہاں کہیں بنی اسمٰعیل پر اپنے اس احسانِ عظیم کا ذکر فرمایا ہے وہاں اس امر کی وضاحت ضرور فرما دی ہے کہ اس احسان کا تعلق ایمان و اسلام سے ہے۔ مجرد خاندان و نسب سے نہیں ہے بنی اسمٰعیل میں سے بھی وہی لوگ اس انعامِ الٰہی میں حصہ دار ہیں جو اس قرآن اور اس نبی پر ایمان لائے ہیں، جو ایمان نہیں لائے وہ سب دوزخ میں جائیں گے، اسرائیلی ہوں یا اسمٰعیلی۔ سورۂ جمعہ میں فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۲-۳ جمعہ)

وہی خدا ہے جس نے اُمیوں (بنی اسمٰعیل) میں انہی میں سے ایک رسول اٹھایا جو سناتا ہے ان کو اس کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے ۔۔ اور ان دوسروں میں بھی جو ابھی تک ان سے ملے نہیں ہیں اور اللہ عزیز و حکیم ہے۔

یہاں بھی آخری ٹکڑے میں کفارِ قریش کی طرف اشارہ ہے جو ابھی تک اس نعمت کو قبول کرنے والوں میں شامل نہیں ہوئے تھے اور الفاظ کچھ تنبیہ کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ یہ تنبیہ اسی لیے ہے کہ بنی اسمٰعیل اس حقیقت سے آگاہ رہیں کہ اللہ نے بہت بڑا فضل ان پر فرمایا ہے لیکن یہ فضل انہی لوگوں کے لیے ہے جو اس کی قدر کریں، جو اس کی قدر نہ کریں گے ان کو یہ مجرد اس بنیاد پر حاصل نہیں ہو جائے گا کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہیں۔ چونکہ یہود اسی طرح کی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم ہوئے تھے اس وجہ سے پہلے ہی مرحلے میں قرآن نے یہ آگاہی بنی اسمٰعیل کو سنا دی۔

۲۲- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۵۸-۷۰

آگے مسلمانوں کو خطاب کر کے پہلے ان کو یہ نصیحت کی گئی ہے کہ شریعتِ الٰہی کی یہ امانت یہود سے چھین کر اب تمہارے حوالہ جو کی جا رہی ہے تو تم یہود کی طرح قومی اور گروہی تعصب کی بیماری میں مبتلا نہ ہو جانا بلکہ ہمیشہ حق و انصاف کو نگاہ میں رکھنا۔ اب تم کتاب و حکمت کے ساتھ ایک ملک عظیم کے وارث بھی بنائے جا رہے ہو اور تم پر لوگوں کے معاملات کی ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے تو تم لوگوں کے حقوق ادا کرنا اور ہمیشہ اپنے فیصلوں میں عدل کو ملحوظ رکھنا اور اس بات کو یاد رکھنا کہ جس خدا نے تم کو اس ذمہ داری پر مامور کیا ہے وہ سمیع و بصیر ہے۔

اس کے بعد وہ طریقہ بتایا ہے جس کو اختیار کر کے مسلمان بحیثیت امتِ مسلمہ کے منظم و مستحکم، حق و عدل پر استوار اور اختلاف و نزاع سے ابھرنے والی آفتوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ یہ گویا ان اساسات کی تفصیل ہے جن پر اسلامی نظامِ حکومت مبنی ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی طرف توجہ فرمائی ہے جو مسلمانوں میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن ان کی وفاداری ابھی تقسیم تھی، وہ پوری طرح اللہ و رسول اور امامت کے اولوالامر کی اطاعت پر ابھی مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ چونکہ امت کی وحدت اور اسلامی حکومت کے اندر اصل رخنہ انہی کی طرف سے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اس وجہ سے ان کی طرف تفصیل کے ساتھ توجہ فرمائی۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا ۙ وَإِذَا حَكَمْتُمْ آیات ۵۸-۷۰
بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۗ
إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿۵۸﴾ يٰأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا
اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي
شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿۵۹﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى ع
الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ
قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا
أَنْ يَكْفُرُوا بِهٖ ۖ وَيُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيدًا ﴿۶۰﴾
وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ
الْمُنٰفِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ﴿۶۱﴾ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ
مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ ۖ بِاللّٰهِ إِنْ
أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ﴿۶۲﴾ أُولٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِي
قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا
بَلِيغًا ﴿۶۳﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَلَوْ

أَنَّهُمْ إِذْ ظَّلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ
لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿٦٤﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا
يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ
حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ
أَنِ اقْتُلُوٓا أَنفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا مِن دِيَارِكُم مَّا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ
مِّنْهُمْ ۖ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَشَدَّ
تَثْبِيتًا ﴿٦٦﴾ وَإِذًا لَّآتَيْنٰهُم مِّن لَّدُنَّآ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٦٧﴾ وَلَهَدَيْنٰهُمْ
صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿٦٨﴾ وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ
الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَآءِ
وَالصّٰلِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيقًا ﴿٦٩﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۚ
ع ۹ ۱۱ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيمًا ﴿٧٠﴾

ترجمۂ آیات ۵۸-۷۰ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو۔ اور جب لوگوں
کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ خوب بات ہے یہ جس کی اللہ تمھیں
نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ۵۸

اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر
کی۔ پس اگر کسی امر میں اختلاف رائے واقع ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ،
اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ طریقہ بہتر اور باعتبار مآل اچھا ہے۔ ۵۹

ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں

جو تم پر اتاری گئی ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے لیکن چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات فیصلہ کے لیے طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انھیں اس کے انکار کا حکم دیا گیا ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ انھیں نہایت دور کی گمراہی میں ڈال دے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور رسول کی طرف آؤ تو تم منافقین کو دیکھتے ہو کہ تم سے کترا جاتے ہیں۔ اس وقت کیا ہو گا جب ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو کوئی مصیبت پہنچے گی، پھر یہ تمھارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ خدا کی قسم ہم نے تو صرف بہتری اور سازگاری چاہی۔ ان لوگوں کے دلوں کے اندر جو کچھ ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے تو ان سے اعراض کرو، ان کو سمجھاؤ اور ان سے خود ان کے باب میں دل میں دھنسنے والی بات کہو۔ ۶۰-۶۳

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اور اگر وہ، جب کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا، تمھاری خدمت میں حاضر ہوتے اور خدا سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی چاہتا تو وہ خدا کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔ پس نہیں، تیرے رب کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات میں تمھی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔ اور اگر ہم ان پر یہ فرض کرتے کہ اپنے آپ کو قتل کر دو یا اپنے گھروں کو چھوڑ دو تو ان میں سے بس تھوڑے ہی اس کی تعمیل کرتے اور اگر یہ لوگ وہ کرتے جس کی ہدایت کی جاتی تو ان کے لیے یہ بات بہتر اور ایمان پر قدم جمانے والی ہوتی۔ اس وقت ہم انھیں اپنے پاس سے بڑا اجر دیتے اور انھیں

صراط مستقیم کی ہدایت بخشتے۔ ۶۴-۶۸

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے وہی ہیں جو انبیاء، صدیقین اور شہدا و صالحین کے اس گروہ کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا فضل فرمایا اور کیا ہی اچھے ہیں یہ رفیق! یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے اور اللہ کا علم کفایت کرتا ہے۔ ۶۹-۷۰

۲۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا (۵۸)

امانت کا لفظ اپنے وسیع مفہوم میں

'امانت' کا لفظ یہاں اپنے محدود مفہوم میں نہیں ہے بلکہ جس طرح اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الاٰیۃ (ہم نے امانت کو پیش کیا آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر) والی آیت میں یہ آیا ہے اسی طرح یہاں بھی نہایت وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ تمام حقوق و فرائض، خواہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہوں یا حقوق العباد سے، انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے، اپنوں سے متعلق ہوں یا بیگانوں سے، مالی معاملات کی قسم سے ہوں یا سیاسی معاہدات کی قسم کے، صلح و امن کے دور کے ہوں یا جنگ کے۔ غرض جس نوعیت اور جس درجے کے حقوق و فرائض ہوں وہ سب امانت کے مفہوم میں داخل ہیں اور مسلمانوں کو شریعت اور اقتدار کی امانت سپرد کرنے کے بعد اجتماعی حیثیت سے سب سے پہلے جو ہدایت ہوئی وہ یہ ہے کہ تم جن حقوق و فرائض کے ذمہ دار بنائے جا رہے ہو ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔

امانت کا حق

اگر اس سورہ کے پچھلے مطالب ذہن میں محفوظ ہیں تو یہ بات سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہو سکتی کہ اس ہدایت کے اندر یہ تلمیح بھی مضمر ہے کہ یہ امانت جن سے چھین کر تمھیں دی جا رہی ہے انھوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا۔ جس منصب شہادت پر ان کو مامور کیا گیا اس کو انھوں نے چھپایا، جو کتاب ان کی تحویل میں دی گئی اس میں انھوں نے تحریف کی، جس شریعت کا ان کو حامل بنایا گیا اس میں انھوں میں اختلاف پیدا کیا، جن حقوق کے وہ امین بنائے گئے ان میں انھوں نے خیانت کی، جو فرائض ان کے سپرد ہوئے ان میں وہ چور ثابت ہوئے، جو عہد انھوں نے باندھے وہ سب توڑ ڈالے۔ اس وجہ سے تمھاری اولین ذمہ داری یہ ہے کہ اس عظیم امانت کی صورت میں جن حقوق و فرائض کے اب تم حامل بنائے جا رہے ہو ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔

حقوق و فرائض کے لیے امانت کا لفظ ایک تو یہ تصور پیدا کرتا ہے کہ یہ سب خدا کی سپرد کردہ امانتیں ہیں اس لیے کہ ان کا عائد کرنے والا خدا ہی ہے۔ دوسرا یہ کہ ان ساری امانتوں سے متعلق ایک دن لازماً امانت سونپنے والے کی طرف سے پرسش ہونی ہے، اگر ان میں کوئی خیانت ہوگی تو کوئی نہیں ہے جو خدا کی پکڑ سے بچا سکے۔

امانت کا سب سے اہم پہلو

وَاِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ الآیۃ یہ امانت کے سب سے اہم پہلو کی تفصیل بھی ہے اور اقتدار کے ساتھ جو ذمہ داری وابستہ ہے اس کی وضاحت بھی۔ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں اقتدار بخشتا ہے ان پر اولین ذمہ داری جو عاید ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے جھگڑوں کو عدل و انصاف کے ساتھ چکائیں۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں امیر و غریب، شریف و وضیع، کالے اور گورے کا کوئی فرق نہ ہو، انصاف خریدنی و فروختنی چیز نہ بننے پائے، اس میں کسی جنبہ داری، کسی عصبیت، کسی سہل انگاری کو راہ نہ مل سکے۔ کسی دباؤ، کسی زور و اثر اور کسی خوف و طمع کو اس پر اثر انداز ہونے کا موقع نہ ملے۔

جن کو بھی اللہ تعالیٰ اس زمین میں اقتدار بخشتا ہے، اسی عدل کے لیے بخشتا ہے۔ اس وجہ سے سب سے بڑی ذمہ داری اسی چیز کے لیے ہے۔ خدا کے ہاں عادل حکمران کا اجر بھی بہت بڑا ہے اور غیر عادل کی سزا بھی بہت سخت ہے۔ اس وجہ سے تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ بہت ہی اعلیٰ نصیحت ہے جو اللہ تعالیٰ تمھیں کر رہا ہے اس میں کوتاہی نہ ہو۔ آخر میں اپنی صفات سمیع و بصیر کا حوالہ دیا ہے کہ یاد رکھو کہ خدا سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے، کوئی مخفی سے مخفی ناانصافی بھی اس سے مخفی رہنے والی نہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا (۵۹)

'اولی الامر' سے مراد

اولی الامر سے مراد اسلامی معاشرے کے ارباب حل و عقد، ذمہ دار اور سربراہ کار ہیں۔ معاشرے کے حالات کے لحاظ سے اس کے مصداق ارباب علم و بصیرت بھی ہو سکتے ہیں اور ارباب اقتدار و سیاست بھی۔ جو لوگ بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ عوام کی سربراہی کر سکیں وہ اس لفظ کے مصداق ہیں۔ اگر امام و خلیفہ موجود ہو تو وہ اور اس کے حکام اولی الامر ہیں اور اگر یہ موجود نہ ہوں تو جماعت کے اندر جو معاملہ فہم اور صاحب بصیرت ہوں وہ اس سے مراد ہوں گے۔ اسی سورہ میں ایک اور مقام میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

وَاِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ ؕ وَلَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَی الرَّسُوۡلِ وَاِلٰۤی اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِیۡنَ یَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ (۸۳ - نساء)

اور جب ان کو امن یا خطرے کی کوئی خبر ملتی ہے اس کو لے اڑتے ہیں حالانکہ اگر وہ اس کو رسول اور اپنے اولی الامر کے سامنے پیش کرتے تو جو لوگ بات کی تہ کو پہنچنے والے ہیں وہ صورت معاملہ کو سمجھ لیتے۔

اولوالامر کی استنباط کا خصوصیت

جس زمانہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اس زمانے میں ظاہر ہے کہ نہ ابھی خلافت کا وجود تھا نہ باضابطہ امرا و حکام تھے۔ اس وجہ سے اولوالامر سے مراد صحابہؓ میں سے وہ لوگ ہوں گے جو دینی و اجتماعی معاملات کی گہری سوجھ بوجھ رکھنے والے اور لوگوں کے مرجع اعتماد تھے۔ یہاں استنباط کا لفظ اولوالامر کی امتیازی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اسلام میں مذہبی و سیاسی قیادت کا منصب اصلاً انھیں لوگوں کے لیے ہے جو بصیرت و اجتہاد کی صلاحیت کے مالک ہیں۔ طبقے، برادری، خاندان اور جائداد وغیرہ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

تاویل کا مفہوم

"تاویل" کے لفظ پر سورۂ آلِ عمران کی آیت ۷ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ آل، یئول اولاً و مآلاً کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف لوٹنا، رجوع کرنا۔ اسی سے تاویل کا لفظ ہے جس کے معنی بات کو اس کے اصل مآل و مرجع کی طرف لوٹانے کے ہیں۔ اسی مفہوم سے یہ خواب کی تعبیر، کسی بات کی حقیقت اور کسی کلام کی تفسیر و توضیح کے لیے استعمال ہونے لگا اس لیے کہ ان صورتوں میں بھی بات اپنے اصل مآل اور مدعا کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ آیت زیرِ بحث میں اَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا کا مطلب یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں اللہ و رسول کی بات کی طرف رجوع کرنا حقیقت رسی اور مآل کار دونوں اعتبار سے بہتر ہے۔ خدا ہی کا علم تمام علم و حقیقت کا مرجع بھی ہے اور اسی کی ذات سب کا ملجا و ماویٰ بھی، اور اسی کو حقیقی حاکمیت بھی حاصل ہے۔

اسلام میں امر و طاعت کے تین مرکز

ہر اجتماعی و سیاسی نظام کی تشکیل امر اور طاعت سے ہوتی ہے۔ اسلام میں امر و طاعت کے مرکز تین ہیں۔ اللہ، رسول، اولوالامر۔ ان میں سے دو سابق الذکر مستقل اور بالذات مرکزِ اطاعت ہیں۔ اس وجہ سے ان کے ساتھ اَطِیۡعُوۡا کا فعل مستقلاً استعمال ہوا۔ اولوالامر کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت کے تحت ہے اس وجہ سے ان کے لیے 'اطیعوا' کا فعل الگ نہیں استعمال ہوا بلکہ اس کو صرف سابق پر عطف کر دیا ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اولوالامر صرف اللہ و رسول کے احکام کی تنفیذ کا ذریعہ ہیں اس وجہ سے ان کی اطاعت خدا اور رسول کے احکام کے خلاف جائز نہیں۔[1]

اختلاف رائے کی صورت میں کتاب اللہ اور سنت کی مراجعت کی ہدایت

فان تنازعتم فی شیء ۔ تنازع فی الشیء، تنازع فی الحدیث، تنازع فی الامر کے معنی جیسا کہ ہم سورۂ آلِ عمران کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، اختلاف رائے کے آتے ہیں یعنی کسی معاملے میں کسی کی رائے کچھ ہو کسی کی کچھ۔ موقع دلیل ہے کہ یہاں اس سے مراد وہ اختلاف رائے ہے جو کسی معاملے میں حکم شریعت معین کرنے کے باب میں ہو سکتا ہے۔ مثلاً کسی نص شرعی کی تعبیر و تاویل میں اختلاف رائے ہو جائے۔ یا کسی امر اجتہادی میں اختلاف پیدا ہو جائے۔ یہ اختلاف قرآن کی کسی آیت یا رسول کی کسی سنت کی تاویل میں بھی ہو سکتا ہے اور غیر منصوص معاملات میں کتاب و سنت سے اوفق کے تعین میں بھی۔ علیٰ ہذا القیاس۔

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ اللہ و رسول کے احکام کے خلاف کسی کے حکم کی اطاعت جائز نہیں ہے لیکن امرا و حکام کے معاملے میں شریعت کے اس حکم کے ساتھ کچھ تفصیلات بھی بیان ہوئی ہیں جن کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ ہم نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب "اسلامی ریاست" کے باب "اطاعت کے حدود و شرائط" میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

یہ اولوالامر اور عوام کے درمیان بھی ہو سکتا ہے اور خود اولوالامر کے اندر آپس میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح کا جب کوئی اختلاف واقع ہو تو اس کے حل کے لیے امت کو یہ ہدایت ہوئی کہ اس معاملے کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ۔ اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کتاب و سنت کے نصوص میں اس معاملے کے لیے کوئی قطعی رہنمائی موجود نہیں ہے تو ان کے اشارات، مقتضیات، فحوٰی اور امثال و نظائر کو پیش نظر رکھ کر اس میں اوفق بالکتاب والسنۃ کا تعین کرو اور اس کو اختیار کرو۔ فرمایا کہ یہ طریقہ تاویل کے پہلو سے سب سے زیادہ بہتر اور اعلیٰ ہے۔ اس لیے کہ ظن غالب یہی ہے کہ یہ بات اللہ و رسول کی بات کے موافق ہوگی اور اختلاف کا فیصلہ اس قانون کے مطابق ہوگا جو اسلام میں اصل قانون اور تمام فقہ و اجتہاد کا مرکز و مرجع ہے اور یہی طریقہ ہے نظام اجتماعی و سیاسی میں حاکمیتِ الٰہی کے پوری مضبوطی کے ساتھ پکڑنے اور اعتصام بحبل اللہ کا اور یہی حقیقی توحید ہے۔

اجماع رفع اختلاف کا منصوص طریقہ ہے

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ یہ ہدایت امت کو بحیثیت امت دی گئی ہے۔ اس طرح کی ہدایات میں خطاب اگرچہ عام ہوتا ہے لیکن ان کی عملی تنفیذ کی ذمہ داری امت کے ارباب حل و عقد یا قرآن کے الفاظ میں اولوالامر ہی پر عاید ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یہ انھی کی ذمہ داری ہے کہ اگر کسی امر میں اختلاف رائے واقع ہو تو وہ اصل قانون شریعت یعنی کتاب و سنت کی طرف رجوع کریں اور جو بات اس سے اوفق نظر آئے اس کو اختیار کریں۔ ارباب حل و عقد یا ان کی اکثریت کا صاحب امر یعنی خلیفہ اور امام کی رہنمائی میں، کسی امر کے اوفق بالشریعت ہونے پر اتفاق کر لینا شریعت میں اجماع کہلاتا ہے جو رفع اختلاف کے لیے ایک منصوص طریقہ ہے اور اس کی مخالفت کسی کے لیے جائز نہیں ہے[1]۔

کتاب، سنت اور اجتہاد

'رد الی اللہ والرسول' کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی امر میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہو تو پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں نہ ملے تو نبی کی سنت کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں بھی نہ ملے تو پھر اس کے معلوم کرنے کا راستہ اجتہاد ہے۔ اجتہاد کے آداب و شرائط جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابہؓ کے تعامل سے معلوم ہوتے ہیں وہ اصولِ فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں اور ایسے فطری اور عقلی ہیں کہ کسی معقول آدمی کے لیے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے[2]۔

کتاب اللہ کی طرح سنت کی حیثیت بھی دائمی ہے

اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ قانون اسلامی کے مرجع کی حیثیت سے کتاب اللہ کی طرح سنت رسول کی حیثیت بھی مستقل اور دائمی ہے۔ اس لیے کہ فرمایا ہے کہ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (پس اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ)۔ ظاہر ہے کہ یہ ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک ہی تک کے لیے محدود نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس اختلاف کے پیدا ہونے کا غالب امکان تو حضورؐ کی وفات کے بعد ہی تھا

---

[1] اجماع پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی قانون کی تدوین' میں کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

[2] ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی قانون کی تدوین' میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

اور آیت خود شہادت دے رہی ہے کہ اس کا تعلق مستقبل ہی سے ہے۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی سنت ہی ہے جو آپؐ کے قائم مقام ہو سکتی ہے۔ یہ تسلیم کرنے کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وقت کے اولوالامر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام ہو سکتے ہیں اس لیے کہ یہاں اولوالامر کو حذف کر دیا ہے جو اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اولوالامر قانون کے مرجع کی حیثیت سے دین میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے۔ مستقل حیثیت صرف اللہ اور رسول کی ہے اور رسول کی بھی اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے قانون کی تعلیم و تبیین پر مامور فرمایا اور اس منصب کی ذمہ داریاں ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کے لیے اسے غلطی اور گناہ سے محفوظ کیا۔ گویا اصل حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، رسول صرف اللہ کے احکام اور اس کی مرضیات کے بتانے کا ایک معصوم ذریعہ ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن
يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝
وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا ۝
فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا
وَتَوْفِيقًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا (۶۰-۶۳)

'تحاکم الی الحاکم' کے معنی ہیں 'تخاصم الیہ' یعنی اپنا قضیہ اور معاملہ حاکم کے سامنے پیش کیا۔

تحاکم الی الطاغوت ایمان کے منافی ہے

'طاغوت' کی تحقیق سورہ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے مقابل میں فرمایا ہے تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہاں 'طاغوت'، کتاب اللہ اور رسول کی ضد کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ مدینہ اور اطراف مدینہ میں آیت کے زمانۂ نزول تک یہ حیثیت صرف یہود کے سرداروں اور لیڈروں ہی کو حاصل تھی کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے بچنا چاہتے، وہ اپنے معاملات ان کے پاس لے جاتے اس وجہ سے طاغوت سے مراد وہی ہو سکتے ہیں اور ہر اعتبار سے وہ اس لفظ کے بالکل ٹھیک ٹھیک مصداق تھے۔

یہ بانداز تعجب منافقین کا ذکر ہو رہا ہے (اور قرائن سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ منافقین اہل کتاب میں سے آئے ہوئے لوگ تھے) جو دعویٰ تو یہ کرتے تھے کہ وہ قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور پچھلے صحیفوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن اپنے معاملات میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کے بجائے یہود کے سرداروں اور ان کی عدالتوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ حالانکہ جس اللہ و رسول پر وہ ایمان کے مدعی تھے ان کی طرف سے یہ واضح ہدایت آ چکی ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان کے لیے لازم ہے کہ طاغوت کا انکار کیا جائے، بغیر اس انکار کے ایمان معتبر نہیں، لیکن یہ دونوں کو جمع کرنا چاہتے تھے اور شیطان یہ چاہتا ہے کہ اس طرح ان کو بھٹکا کر صراط مستقیم سے اتنی دور کر دے کہ پھر ان کے لیے اس کو پانے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہ جائے۔

منافقین کو دھمکی

فرمایا کہ آج تو جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات اللہ اور رسول ہی کے سامنے پیش کرو، ایمان کا یہی تقاضا ہے، تو کسی نہ کسی بہانے سے کترا جاتے ہیں لیکن اس وقت کیا ہوگا جب ان کی ان شرارتوں کی پاداش میں ان پر ایسا وقت آجائے گا کہ یہ بھاگے ہوئے تمہارے پاس آئیں گے اور قسمیں کھا کھا کے یقین دلائیں گے کہ جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں کسی بری نیت سے نہیں کرتے رہے ہیں بلکہ بھلائی اور سازگاری کی نیت سے کرتے رہے ہیں۔

منافقین کا طرزِ عمل

جس مصیبت کے پیش آنے کا یہاں ذکر ہے وہ بعد میں اس طرح پیش آئی کہ جب اسلام نے طاقت پکڑ لی اور یہود کی سیاسی طاقت بالکل کمزور ہو گئی تو مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ اب منافقین کے معاملے میں چشم پوشی اور اغماض کی روش وہ بدل دیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنی روش بدل لی اور قدم قدم پر منافقین کا احتساب شروع کر دیا۔ منافقین اس صورتِ حال سے بہت پریشان ہوئے۔ نہ یہود میں اتنا دم خم باقی رہا تھا کہ ان کی سرپرستی کر سکیں، نہ مسلمان اب ان کے چکموں میں آنے کے لیے تیار تھے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین بھاگ بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور قسمیں کھا کھا کے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ وہ یہود سے جو ربط ضبط اب تک رکھتے اور کبھی کبھی اپنے معاملات میں ان کی بالاتری تسلیم کرتے رہے ہیں اس میں کسی فساد نیت کو دخل نہیں تھا بلکہ ان کی خواہش صرف یہ رہی ہے کہ اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا اور جو خلیج اختلاف و عناد یہود اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہو گئی ہے وہ زیادہ وسیع نہ ہونے پائے گی۔ اس طرح وہ اپنی منافقت کو مصالحت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے اور اس کو احسان اور توفیق کے خوب صورت الفاظ سے تعبیر کرتے لیکن واقعات کے تشت ازبام ہو جانے کے بعد اس سخن سازی کا موقع بالکل نکل چکا تھا چنانچہ آگے اس سورہ میں بھی اور پھر تفصیل کے ساتھ سورۂ براءت میں منافقین کے چہرے کی یہ نقاب نوچ کر پھینک دی گئی اور ان کے لیے منہ چھپانا ناممکن ہو گیا۔

ایک سیاسی نکتہ

اس سے یہ بات نکلی کہ حریف طاقتوں کے ساتھ اختلاف یا رواداری کی پالیسی بنانا امت کے اربابِ حل و عقد اور اس کے سربراہوں کا کام ہے، نہ کہ عوام کی کسی ٹولی کا۔ اگر اربابِ حل و عقد کسی حریف طاقت سے برسرِ جنگ ہیں اور عوام کے اندر کے کچھ افراد ان کی طرف محبت و اعتماد کی پینگیں بڑھائیں اور اس کو امت کی خیر خواہی اور باہمی سازگاری کی کوشش کا نام دیں تو یہ صریح بدخواہی اور کھلی ہوئی منافقت ہے۔

منافقین کے دلوں کا اصل راز

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے، یہ امت کی خیر خواہی اور سازگاری پیدا کرنے کا جذبہ ہے جو ان سے یہ پاپڑ بلوا رہا ہے یا منافقت اور طاغوت پرستی کا فساد ہے جو انھیں اسلام کی طرف ابھی یکسو ہونے نہیں دے رہا ہے اور یہ دل میں اس امید کی پرورش کر رہے ہیں کہ شاید اس کشمکش کا نتیجہ یہود اور کفار کی فتح مندی کی شکل میں نکلے تو ان کی یہ منافقت کی پالیسی کامیاب رہے گی۔ فرمایا کہ ان کی اس حرکت سے اعراض کرو، ان کو نیک و بد اچھی طرح سمجھا دو، اور ان کے حق میں جو کچھ بہتر ہے اس سے

لیسے انداز میں ان کو آگاہ کر دو کہ ان کے کان کھلیں اور بات دلوں میں اترے ہیں۔

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ الاية میں جو دھمکی ہے وہ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا میں اور زیادہ تیز و تند ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اپنی اس منافقت کے لیے جو بہانے سازی کر رہے ہیں، خدا اس کی حقیقت سے خوب واقف ہے، اس وجہ سے تم معاملہ خدا کے حوالہ کرو اور ابھی ان سے اعراض کرو، البتہ ان کو نیک و بد اچھی طرح سمجھا دو کہ جو کھیل یہ کھیل رہے ہیں یہ خود ان کے لیے مستقبل میں نہایت خطرناک ثابت ہوگا۔ وعظ کے لفظ کے متعلق ہم کہیں یہ لکھ آئے ہیں کہ عربی میں یہ لفظ زجر و تنبیہ کے مفہوم کا بھی حامل ہے۔

قولاً بلیغاً کی وضاحت

وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا میں فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ کے الفاظ اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ ان پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ یہ نصیحت خود ان کے حق میں بہتر ہے، ان کی اس روش سے اسلام کو کوئی ضرر پہنچنے والا نہیں ہے، اللہ اپنے دین کی حفاظت کے لیے کافی ہے، البتہ یہ خود اپنے آپ کو تباہ کر لیں گے۔ قَوْلًا بَلِيْغًا کے الفاظ اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اب نصیحت کا انداز کان کھولنے والا اور دل میں دھنسنے والا ہونا چاہیے۔ یہ بہرے اور بلید لوگ ہیں اس وجہ سے کریمانہ انداز نصیحت ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ آپ اگر کسی کی غلطی پر کوئی گرفت فرماتے تو کمال درجہ رافت و شفقت کی وجہ سے نہایت ہی نرم اور کریمانہ انداز میں اس کی طرف اشارہ فرماتے۔ اگرچہ حضورؐ کے شایان شان انداز یہی تھا اور ذی صلاحیت لوگوں کے لیے یہ اشارہ کافی بھی ہو جاتا تھا لیکن منافقین اس کریم النفسی کے قابل تھے نہ قدردان، بلکہ وہ اس سے غلط فائدہ اٹھاتے اور روز بروز اپنی شرارتوں میں دلیر ہوتے جا رہے تھے۔ اس وجہ سے یہ ہدایت ہوئی کہ اب ان کے ساتھ زیادہ نرمی برتنے کا موقع نہیں ہے بلکہ وقت آگیا ہے کہ ان کو واضح الفاظ میں تنبیہ کی جائے اور ان کے نیک و بد سے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیا جائے تاکہ یہ سنبھلنا چاہیں تو تباہی کے گڑھے میں گرنے سے پہلے پہلے سنبھل جائیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۶۴-۶۵)

رسول کا اصلی مرتبہ

اب یہ رسول کا صحیح مرتبہ واضح فرمایا کہ رسول صرف مان لینے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ وہ اس لیے آتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ وہ صرف عقیدت ہی کا مرکز نہیں بلکہ اطاعت کا مرکز بھی ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت صرف ایک واعظ و ناصح ہی کی نہیں بلکہ ایک واجب الاطاعت ہادی کی بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اذن کے تحت اس کو اس لیے مامور فرماتا ہے کہ لوگ جملہ معاملات میں اس کے احکام کی اطاعت کریں اس لیے کہ اس کی اطاعت ہی بالواسطہ خدا کی اطاعت ہے۔ جو لوگ رسول کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس کے

سیاسی اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے یا اس سے اپنے آپ کو آزاد رکھنا چاہتے ہیں ان کا دعوائے ایمان جھوٹا ہے۔

یہاں 'باذن اللہ' کی قید اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ اصل حاکمیت اللہ ہی کی ہے لیکن اپنے اذن سے اپنے رسول کو یہ منصب بخشتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس کے امر و نہی سے آگاہ فرمائے اور اس مقصد کے لیے وہ اس کو غلطی اور خطا سے محفوظ فرماتا ہے اس وجہ سے رسول، خدا کی قانونی و تشریعی حاکمیت کا مظہر ہوتا ہے اور اس پر ایمان اور ساتھ ہی اس کی بے چون و چرا اطاعت خدا پر ایمان اور خدا کی اطاعت کے ہم معنی بن جاتی ہے۔

رسول خدا کی تشریعی حاکمیت کا مظہر ہے

ظاہر ہے کہ جب رسول، خدا کی حاکمیتِ قانونی و تشریعی کا مظہر ہے تو اس امر کی کوئی گنجائش کسی صاحبِ ایمان کے لیے باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ رسول کی عدالت کو چھوڑ کر اپنے کسی معاملے کو فیصلہ کے لیے طاغوت کی عدالت میں لے جائے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر بہت بڑا ظلم ڈھاتا ہے اس لیے کہ فی الحقیقت یہ چیز خدا کی حاکمیت کا انکار اور بالواسطہ شرک اور کفر کا ارتکاب ہے۔ چنانچہ ان منافقین سے متعلق، جو اپنے معاملات یہود کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، فرمایا کہ جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ان کے لیے اس کی اصلاح اور اس کے عواقب سے نجات کی واحد شکل یہ تھی کہ وہ رسول کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے، خدا سے مغفرت کے طالب ہوتے اور رسول بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کے ذریعہ سے ان کی سفارش کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتا اور ان پر رحم فرماتا۔ اس کے سوا اس کی تلافی کی کوئی اور شکل نہیں۔

ایمان کی بنیادی شرط۔ رسول کی اطاعت ظاہراً و باطناً

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے درمیان پیدا ہونے والی تمام نزاعات میں تمہی کو حکم نہ مانیں اور پھر ساتھ ہی ان کے اندر یہ ذہنی تبدیلی نہ واقع ہو جائے کہ وہ تمہارے فیصلے کو بے چون و چرا پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ مانیں اور اپنے آپ کو بلا کسی استثنا و تحفظ کے تمہارے حوالے کر دیں۔ رسول کی اطاعت خود خدا کی اطاعت کے ہم معنی ہے اس وجہ سے اس کا حق صرف ظاہری اطاعت سے ادا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے دل کی اطاعت بھی شرط ہے۔

یہاں 'فَلَا وَرَبِّكَ' کی قسم کا موقع و محل بھی ملحوظ رہے۔ اس سے صرف رسول کی ظاہری و باطنی اطاعت کی تاکید ہی مقصود نہیں ہے بلکہ یہ منافقین کی جھوٹی قسم کی جو آیت ۶۲ میں مذکور ہے، سچی قسم کے ساتھ تردید بھی ہے۔ پھر 'وَرَبِّكَ' کے خطاب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے التفاتِ خاص کی جو دل نوازی ہے اس کی بلاغتوں کا اندازہ تو صرف اہلِ ذوق ہی کر سکتے ہیں، قلم ان کی تعبیر سے قاصر ہے۔

رسول کا استغفار بمنزلۂ شفاعت ہے

'فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ' میں ان کے لیے رسول کے استغفار کی جو شرط لگائی گئی ہے اس میں دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ رسول کا یہ استغفار ان کے لیے اس دنیا میں بمنزلۂ شفاعت ہے جس سے

ان کے اس گناہِ عظیم کے بخشے جانے کی توقع ہے، دوسرا یہ کہ رسول کی عدالت کے ہوتے ان کا تحاکم الی الطاغوت رسول کی صریح توہین ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ وہ رسول کی رضا اور ان کی دعا بھی حاصل کریں منافقین سمجھتے تو ان کو رسول کی برکتوں سے متمتع ہونے کا بڑا موقع حاصل تھا لیکن ان میں سے بہتوں نے اس موقع کی قدر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بعد میں محروم کر دیا۔ سورۂ منافقون میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کا رسول
رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ	تمہارے لیے اللہ سے مغفرت مانگے گا تو وہ اپنی گردنیں
يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ	موڑ لیتے ہیں اور تم ان کو گھمنڈ کے ساتھ اعراض کرتے
اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ	دیکھتے ہو، ان کے لیے برابر ہے، تم ان کے لیے مغفرت
لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي	مانگو یا نہ مانگو، اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے،
الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۵-۶)	اللہ نافرمانوں کو بامراد کرنے والا نہیں ہے۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا (۶۶-۷۰)

منافقین کی بنیادی کمزوری

اب یہ ان منافقین کے اصل سبب نفاق سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ بننے کو تو اسلام کے مدعی بن بیٹھے ہیں لیکن ابھی یہ جاہلیت کے سابق روابط و تعلقات کے پھندوں سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے ہیں ابھی تک خاندان، برادری، قبیلہ اور قوم کی زنجیریں بھی ان کے پاؤں میں ہیں اور وطن اور سرزمین کی وابستگیاں بھی دامن گیر ہیں اس وجہ سے یہ آگے بڑھنے کی بجائے بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں حالانکہ اسلام کا اول مطالبہ یہی ہے کہ آدمی ہر زنجیر کو توڑ کر صرف اللہ کے لیے اٹھ کھڑا ہو جس طرح مہاجرین اولین اٹھ کھڑے ہوئے۔

حق کی دعوت کا اصل تقاضا

یہ ملحوظ رہے کہ یہ منافقین زیادہ تر یہود اور اطراف مدینہ کے قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ یہ اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر اسلام کے اظہار پر تو مجبور ہو گئے تھے لیکن جیسا کہ اوپر گزرا یہ اپنے روابط یہود اور اپنے قبائلی سرداروں کے ساتھ بھی رکھنا چاہتے تھے اور اسی غرض کے لیے اپنے معاملات و مقدمات میں بھی ان سے رجوع کرتے تھے۔ قرآن نے یہ ان کی اسی کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کو اپنوں سے لڑنے اور اپنے گھر بار چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ آملنے کا حکم دیا جائے تو اس جہاد

اور ہجرت کے لیے ان میں سے بہت تھوڑے آمادہ ہوں گے۔ 'اقتلوا انفسکم' کے مفہوم پر ہم بقرہ آیت ۵۴ اور نساء آیت ۲۹ کے تحت جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ جہاد اول تو اپنی فطرت ہی سے ایک سخت آزمائش ہے لیکن جب یہ تلوار ان کے خلاف اٹھانی پڑے جن سے خون اور قرابت کے رشتے ہوں اور جن کی حمیت وحمایت کا جذبہ رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوتے ہو تو یہ آزمائش سخت تر ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس صورت میں تلوار گویا اپنی ہی گردنوں پر چلانی پڑتی ہے۔ لیکن اسلام حق کے مقابل میں خون اور نسب کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس وجہ سے خدا کی وفاداری کا امتحان پاس کرنے کے لیے اہل ایمان کو اس مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ بدر کے موقع پر ماموں کی تلوار بھانجے کے اور بھتیجے کی تلوار چچا کے مقابل میں بے نیام ہوئی اور عصبیت جاہلیت کے تمام روابط حق کے آگے بالکل بے حقیقت ہو کے رہ گئے۔

اسلام کی اسی حقیقت کی طرف یہاں ان منافقین کو بھی توجہ دلائی جا رہی ہے کہ اگر یہ بھی اپنے خاندان و قبیلہ اور گھر در کی وابستگیوں سے آزاد اور یکسو ہو کر کلیتہً مسلمانوں کے معاشرے میں شامل ہو جائیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے اور اسلام پر ان کے قدم جمانے میں یہ چیز نہایت کارگر ہوگی۔ فاسد ماحول سے نکل کر جب یہ پاکیزہ ماحول میں پہنچ جائیں گے تو ان کی کمزوریاں دور ہوں گی اور یہ بھی اسلام کے جاں نثاروں کے ساتھ مل کر خدا کے وفادار اور حق کے خدمت گزار بن جائیں گے۔

ہجرت اور جہاد کی برکات: اس کے بعد ان کی حوصلہ افزائی کے لیے فرمایا کہ یہ نہ خیال کریں کہ یہ کوئی تباہی و خودکشی کا راستہ ہے۔ اگر وہ اللہ کے لیے اپنے گھر در چھوڑ دیں گے تو اللہ ان کو خاص اپنے پاس سے اجر عظیم دے گا اور ان کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب کرے گا۔ جو لوگ سب سے کٹ کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کو اللہ کے انعام یافتہ بندوں — انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین — کی معیت و رفاقت حاصل ہوتی ہے اور کیا ہی خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو اس پاک گروہ کی معیت و رفاقت حاصل ہو! یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ اس فضل خاص کے مستحق بندوں سے بے خبر نہیں ہے۔ جو لوگ اس فضل کے حاصل کرنے کے لیے ہجرت اور جہاد کی بازیاں کھیلیں گے وہ مطمئن رہیں کہ اللہ ان کی جاں بازیوں سے اچھی طرح باخبر ہے۔

۲۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۷۱-۷۶

وہی اوپر والا مضمون آگے چل رہا ہے۔ خطاب اگرچہ عام مسلمانوں سے ہے لیکن تبصرہ انہی منافقین کے رویے پر ہے جن کی بابت اوپر فرمایا ہے کہ یہ اسلام کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن اس راہ میں کوئی چوٹ کھانے اور ہجرت و جہاد کی آزمائشوں سے گزرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

پہلے مسلمانوں کو جہاد کے لیے لیس ہونے اور جنگ کے لیے اٹھنے کا حکم دیا۔ فرمایا کہ اگر جماعتی حیثیت سے جنگ کے لیے اٹھنے کی ضرورت پیش آئے تو جماعتی شکل میں اٹھو اور اگر ٹکڑیوں اور دستوں کی شکل میں نکلنے کا موقع ہو تو ٹکڑیوں اور دستوں کی صورت میں نکلو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ اس کے بعد منافقین کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ خود بزدل ہیں اور دوسروں کو بھی بزدل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تم کو کوئی گزند پہنچ جاتے تو خوش ہوتے ہیں کہ خوب ہوا کہ اس فوج یا دستے میں ہم شامل نہیں ہوئے اور اگر تمھیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو حاسدانہ یہ کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی اس فوج یا دستے میں شامل ہوتے کہ اس کے حاصل کردہ مالِ غنیمت میں حصہ دار بن سکتے۔

اس کے بعد جہاد پر ابھارنے کے لیے اس کے اجرِ عظیم کا بھی ذکر فرمایا اور ساتھ ہی نہایت موثر الفاظ میں اس ضرورت کی طرف بھی توجہ دلائی جو اس وقت اس کی داعی تھی۔ وہ ضرورت یہ تھی کہ جگہ جگہ مسلمان مرد، عورتیں اور بچے کفار کے نرغے میں گھرے ہوئے، اسلام لانے کے جرم میں، ان کے ہاتھوں طرح طرح کے مظالم کا ہدف بنے ہوئے تھے اور ان کے پنجۂ ستم سے نجات حاصل کرنے کے لیے فریادیں کر رہے تھے۔ اس ظلم و ستم سے ان کو نجات دلانا ایک عظیم انسانی و اسلامی فریضہ تھا۔

پھر مسلمانوں کے جہاد اور کفار کی جنگ کے فرق کو واضح فرمایا کہ مسلمانوں کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے اور کفار کی جنگ شیطان کی راہ میں ہے۔ شیطان خواہ کتنی ہی چالیں چلے لیکن خدا کے مقابل میں اس کی ہر چال بودی ثابت ہو کے رہے گی۔ آخری کامیابی بہرحال انھی لوگوں کو حاصل ہوگی جو اللہ کے دین کا ساتھ دینے کے لیے اٹھیں گے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۷۱ - ۷۶

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا
جَمِيْعًا ﴿٧١﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ
قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿٧٢﴾ وَلَئِنْ
اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ
مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧٣﴾ فَلْيُقَاتِلْ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَ
مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا

عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ
مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا
مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ
وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ
الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ
ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾ ع ۱۰

ترجمۂ آیات ۷۱-۷۶

اے ایمان والو، اپنے اسلحہ سنبھالو اور جہاد کے لیے نکلو، ٹکڑیوں کی صورت میں یا جماعتی شکل میں۔ اور تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، پس اگر تم کو کوئی گزند پہنچ جائے تو کہتے ہیں کہ مجھ پر اللہ نے فضل کیا کہ میں ان کے ساتھ شریک نہ ہوا اور اگر تمھیں اللہ کا کوئی فضل حاصل ہو تو، اس طرح کہ گویا تمھارے اور ان کے درمیان کوئی رشتۂ محبت ہے ہی نہیں، کہتے ہیں کہ اے کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا کہ ایک بڑی کامیابی حاصل کرتا۔ پس چاہیے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے وہ لوگ اٹھیں جو دنیا کی زندگی آخرت کے لیے بیچ چکے ہیں اور جو اللہ کی راہ میں جنگ کرے گا تو خواہ مارا جائے یا غالب ہو ہم اس کو اجر عظیم دیں گے۔ ۷۱-۷۴

اور تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے جنگ نہیں کرتے جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس ظالم باشندوں کی بستی سے نکال اور ہمارے لیے اپنے پاس سے ہمدرد پیدا کر اور ہمارے لیے

اپنے پاس سے مددگار کھڑے کر۔ ۷۵

جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جنھوں نے کفر کیا وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں تو تم شیطان کے حامیوں سے لڑو، شیطان کی چال تو بالکل بودی ہوتی ہے۔ ۷۶

۲۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ۝ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۷۱-۷۳)

لفظ حذر کی تحقیق 'حذر' کے اصل معنی کسی خطرہ اور آفت سے بچنے کے ہیں۔ اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ ان چیزوں کے لیے استعمال ہوا جو جنگ میں دشمن کے حملوں سے بچنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً زرہ بکتر، سپر، خود وغیرہ۔ اس کا خاص استعمال تو دفاعی آلات ہی کے لیے ہے لیکن اپنے عام استعمال میں یہ ان اسلحہ پر بھی بولا جاتا ہے جو حملے کے کام آتے ہیں۔ مثلاً تیر، تفنگ، تلوار وغیرہ۔ یہاں یہ لفظ اپنے عام مفہوم ہی میں معلوم ہوتا ہے۔ اس پر مزید بحث اسی سورہ کی آیت ۱۰۲ کے تحت آرہی ہے۔ وہاں اس کے عام اور خاص دونوں استعمالات کو قرآن نے خود واضح کر دیا ہے۔

'ثبات' کا مفہوم 'ثبات'، 'ثُبَةٌ' کی جمع ہے۔ 'ثبۃ' کے معنی سواروں کی جماعت، ٹکڑی اور دستے کے ہیں۔

عرب میں جنگ کے دو طریقے معروف تھے۔ ایک منظم فوج کی شکل میں لشکر آرائی۔ دوسرا وہ طریقہ جو گوریلا جنگ (GUERRILLA WARFARE) میں اختیار کیا جاتا ہے یعنی ٹکڑیوں اور دستوں کی صورت میں دشمن پر چھاپہ مارنا۔ یہاں 'ثبات' کے لفظ سے اسی طریقے کی طرف اشارہ ہے۔ مسلمانوں نے یہ دونوں طریقے استعمال کیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظم فوج کشی بھی فرمائی اور وقتاً فوقتاً سریے بھی بھیجے۔

'بطأ یبطئ' کا مفہوم 'بَطَّا یُبَطِّیُٔ' کے معنی ڈھیلے پڑنے، سست پڑنے اور پیچھے رہ جانے کے بھی ہیں اور دوسرں کو سست کرنے کے بھی۔ لسان العرب میں ہے 'بطأ فلان بفلان اذا ثبطہ' فلاں نے فلاں کو سست اور لپست ہمت کر دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ 'من بطأ به عمله لم يسرع به نسبه' (جس کا عمل اس کو پیچھے کر دے گا اس کا نسب اس کو آگے نہ بڑھا سکے گا)

یہ مسلمانوں کو من حیث الجماعت خطاب کر کے مسلح ہونے اور جنگ کے لیے اٹھنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا کہ اگر دستوں اور ٹولیوں کی صورت میں دشمن پر چھاپے مارنے کی نوبت آئے تو اس کے لیے بھی نکلو، اور اگر منظم ہو کر جماعتی تشکل میں فوج کشی کی ضرورت پیش آئے تو اس سے بھی دریغ نہ کرو۔

منافقین کی بزدلی اور مسلمانوں کی کامیابی پر ان کا حسد

پھر فرمایا کہ تم میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو جنگ سے خود بھی جی چراتے ہیں اور دوسروں کی بھی پست ہمت کرتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تمہیں کسی مہم میں کوئی گزند پہنچ جائے تو خوش ہوتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں خوب بچایا کہ ہم اس مہم میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے اور اگر تمہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو حاسدانہ کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی اس میں شامل ہوتے تاکہ خوب مال غنیمت حاصل کر سکتے۔ اس دوسری بات کے ساتھ کَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ کے الفاظ اس بات کے کہنے والوں کے باطن پر عکس ڈال رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی شامتِ اعمال سے کسی مہم میں شامل نہیں ہوتے تو ایمانی و اسلامی اخوت کا کم از کم تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی پر خوش ہوں کہ اللہ نے ان کے دینی بھائیوں کو سرخرو کیا لیکن انہیں اس بات کی کوئی خوشی نہیں ہوتی بلکہ جس طرح حریف کی کسی کامیابی پر آدمی کا دل جلتا ہے کہ وہ اس میں حصہ دار نہ ہو سکا اسی طرح یہ لوگ اس کو اپنی کامیابی نہیں بلکہ حریف کی کامیابی سمجھتے ہیں اور اپنی محرومی پر سر پیٹتے ہیں۔ گویا اسلام اور مسلمانوں سے ان کا کوئی رشتہ ہی نہیں۔

فَلْيُقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (۷۴)

شریٰ یشری کا مفہوم

'اَلَّذِيْنَ' یہاں مفعول کے محل میں نہیں بلکہ فاعل کی حیثیت میں ہے اور 'شریٰ یشری' یہاں بیچنے کے معنی میں ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ (اور انھوں نے یوسف کو نہایت حقیر قیمت پر بیچ دیا، گنتی کے چند درہموں پر، اور وہ اس کی قدر سے ناآشنا تھے) دُنیا کی زندگی کو آخرت سے بیچتے ہیں یعنی دنیا کی زندگی پر آخرت کو ترجیح دیتے ہیں۔

خدا کی راہ میں جہاد کے سزاوار کون ہیں؟

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین تو صرف اس جنگ کے غازی بننا چاہتے ہیں جس میں نکسیر بھی نہ پھوٹے اور مالِ غنیمت بھی بھرپور ہاتھ آئے۔ خدا کے دین کو ایسے نام نہاد غازیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کی راہ میں جہاد کے لیے وہ اٹھیں جو آخرت کے لیے اپنی دُنیا بیچ چکے ہوں۔ جو لوگ دُنیا کو بیچ کر صرف آخرت کی کامیابی کے لیے جہاد کریں گے وہ مارے جائیں یا فتحمند ہوں، دونوں ہی صورتوں میں ان کے لیے اجرِ عظیم ہے۔ رہے یہ لوگ جو صرف اس وقت تک کے لیے مجنوں بنے ہیں جب تک لیلیٰ کی طرف سے ان کو دودھ کا پیالہ ملتا ہے، خونِ جگر کا مطالبہ نہ ہو، تو ایسے مجنوں یہاں درکار نہیں ہیں۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ښ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (۷۵)

'وَمَا لَكُمْ' (تمہیں کیا ہوا ہے) کا اسلوب کسی کام پر اُبھارنے اور شوق دلانے کے لیے ہے۔

'مُسْتَضْعَف' سے مراد مظلوم، مجبور اور بے بس کے ہیں۔ 'مُسْتَضْعَفِيْن' کا عطف 'فِیْ سَبِیْلِ اللہ' پر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جو لوگ دین کی وجہ سے ستائے جا رہے ہوں ان کی آزادی کے لیے جنگ 'قتال

فی سبیل اللہ' میں سب سے اول درجہ رکھتی ہے۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ اسلامی جہاد کا اصلی مقصد دنیا سے فتنہ (PERSECUTION) کو مٹانا ہے۔ 'قریہ' کو یہاں صرف مکہ کے لیے خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ان آیات کے نزول کے زمانے میں مکہ کے علاوہ اور بھی بستیاں تھیں جن میں بہت سے مرد، عورتیں اور بچے مسلمان ہو چکے تھے اور وہ اپنے کافر سرپرستوں یا اپنے قبیلے کے کافر زبردستوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ 'من لدنک' کا موقع استعمال اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ظاہر حالات تو بالکل خلاف ہیں، کسی طرف سے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی لیکن اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اپنی عنایت سے کوئی راہ کھول دے تو کچھ بعید نہیں۔

جہاد کے لیے ایک اہم محرک — مطلب یہ ہے کہ تم ان مردوں، عورتوں اور بچوں کو کفار کے ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لیے کیوں نہیں اٹھتے جو کفار کے اندر بے بسی کی حالت میں گھرے ہوئے اور ان سے چھوٹ کر مسلمانوں سے آملنے کی کوئی راہ نہیں پا رہے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ رات دن نہایت بے قراری کے ساتھ یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے پروردگار ہمیں ان ظالم باشندوں کی بستی سے نکال اور غیب سے ہمارے ہمدرد پیدا کر اور غیب سے ہمارے مددگار کھڑے کر۔

آیت ۷۵ کے اشارات — اس آیت سے کئی باتیں ظاہر ہو رہی ہیں۔

ایک یہ کہ ظالم کفار نے کمزور مسلمانوں پر خود ان کے وطن کی زمین اس طرح تنگ کر دی تھی کہ وہ وطن ان کو کاٹنے کو دوڑتا تھا اور باوجودیکہ وطن کی محبت ایک فطری چیز ہے لیکن وہ اس سے اس قدر بیزار تھے کہ اس کو ظالم باشندوں کی بستی کہتے ہیں اس کی طرف کسی قسم کا انتساب اپنے لیے گوارا کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

دوسری یہ کہ کوئی وطن اسی وقت تک اہل ایمان کے لیے وطن کی حیثیت رکھتا ہے جب تک اس کے اندر ان کے دین و ایمان کے لیے امن ہو۔ اگر دین و ایمان کو اس میں امن حاصل نہ ہو تو وہ وطن نہیں بلکہ وہ خونخوار درندوں کا بھٹ، سانپوں اور اژدہوں کا مسکن اور شیطانوں کا مرکز ہے۔

تیسری یہ کہ اس زمانے میں حالات اس قدر مایوس کن تھے کہ مظلوم مسلمانوں کو ظاہر میں نجات کی کوئی راہ بھی سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ سارا بھروسہ بس اللہ کی مدد پر تھا کہ وہی غیب سے ان کے لیے کوئی راہ کھولے تو کھولے۔ اس کے باوجود یہ مسلمان اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ اللہ اکبر! کیا شان تھی ان کی استقامت کی! پہاڑ بھی اس استقامت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

چوتھی یہ کہ اگر کہیں مسلمان اس طرح کی مظلومیت کی حالت میں گھر جائیں تو ان تمام مسلمانوں پر جو ان کی مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ان کی مدد کے لیے نہ اٹھیں تو یہ صریح نفاق ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا

أَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا (۷۶)

طاغوت کے لفظ پر بحث بقرہ اور آل عمران دونوں کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہاں قرآن نے فَقَاتِلُوْٓا أَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ کہہ کر خود واضح فرما دیا کہ طاغوت سے مراد شیطان ہے۔

یہ آیت اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کی جنگ خدا کی راہ میں ہوتی ہے اور خدا ان کے سرپر ہوتا ہے۔ برعکس اس کے اہل کفر کی جنگ شیطان کی راہ میں ہوتی ہے اور شیطان ان کے سرپر ہوتا ہے۔ گویا مقابلہ اصلاً رحمان اور شیطان کے درمیان ہوتا ہے۔ چونکہ خدا نے شیطان کو بھی ایک محدود دائرے کے اندر مہلت دی ہے اس وجہ سے وہ اپنے حامیوں کو کچھ چالیں بتاتا اور سکھاتا ہے لیکن آخر خدا کے کید متین کا مقابلہ وہ اور اس کے اولیا کیا کر سکتے ہیں؟ اس وجہ سے اہل ایمان کو ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ اگر انھوں نے خدا کی وفاداری میں کوئی کمزوری نہیں دکھائی تو بہرحال کامیابی انھی کی ہے۔

شیطان کی چالوں میں کمزوری کے جو فطری اسباب مضمر ہیں ان پر گفتگو کے لیے موزوں مقام دوسرا ہے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ کسی کام کی کوئی مضبوط بنیاد اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک وہ بنیاد حق پر نہ ہو۔ شیطان کے ہر کام کی بنیاد چونکہ باطل پر ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے مستحکم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۶۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۷۷-۸۵

آگے انھیں منافقین کی مزید کمزوریاں اور شرارتیں واضح کی جا رہی ہیں تاکہ مسلمان ان کے فتنوں سے آگاہ ہو جائیں اور ان کی وسوسہ اندازیوں سے مسلمانوں کے اندر جو غلط اور منافی توحید و اسلام رجحانات ابھر سکتے ہیں ان کا اچھی طرح ازالہ ہو جائے۔

پہلے ان منافقین کے اس عجیب و غریب رویے پر توجہ دلائی کہ اب تک تو یہ اپنے ایمان و اخلاص کی دھونس جمانے کے لیے بہت بڑھ بڑھ کر جہاد کے لیے مطالبہ کر رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے ایک ایک شخص جہاد کے عشق سے سرشار ہے لیکن پیغمبر کی طرف سے ان کو صبر و انتظار کی ہدایت کی جاتی تھی کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے، ابھی نماز اور زکوٰۃ کے اہتمام کے ذریعے سے اپنے آپ کو مضبوط اور منظم کرو تاکہ وقت آنے پر پوری مردانہ شان استقامت کے ساتھ خدا کی راہ میں لڑ سکو۔ لیکن اب جب کہ جنگ کا حکم دے دیا گیا ہے تو چھپتے پھرتے ہیں اور خدا سے زیادہ انسانوں سے ڈرتے ہیں اور شاکی ہیں کہ اتنی جلدی جہاد کا حکم کیوں دے دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ فرائض سے فرار موت سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

موت اپنے وقت ہی پر آئے گی اور جب اس کا وقت آجائے گا تو وہ ہر شخص کو ڈھونڈھ نکالے گی، خواہ وہ کتنے ہی مضبوط قلعوں کے اندر چھپا بیٹھا ہو۔

پھر منافقین کے ایک خاص ذہنی الجھاؤ سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان لوگوں کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ پیغمبر جو کچھ بھی کرتے ہیں خدا ہی کے حکم اور خدا ہی کی رہنمائی میں کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر انھیں کامیابی حاصل ہو تو اس کو تو یہ خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اگر کوئی افتاد پیش آجائے تو اس کو پیغمبرؐ کی بے تدبیری کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض ان کی ناسمجھی ہے۔ خیر ہو یا شر سب خدا ہی کی مشیت سے ظہور میں آتا ہے۔ اس کارخانۂ کائنات میں دو مشیتیں کارفرما نہیں ہیں، صرف ایک ہی کی مشیت کارفرما ہے۔ البتہ یہ بات ہے کہ شر جب ظہور میں آتا ہے تو وہ انسان کے اپنے اعمال پر مترتب ہوتا ہے۔

اس کے بعد اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اگر ان کو تمھاری رسالت کے باب میں تردد ہے تو ہوا کرے۔ بہرحال تم اللہ کے رسول ہو اور تمھاری رسالت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ اب اللہ کی اطاعت کی راہ یہی ہے کہ لوگ تمھاری اطاعت کریں، جو تمھاری اطاعت سے گریز کرنا چاہتا ہے وہ جہاں چاہے بھٹکتا پھرے، تمھارے اوپر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

پھر فرمایا کہ ان لوگوں کے دوغلے پن کا یہ حال ہے کہ جب تمھارے پاس ہوتے ہیں اور تم اللہ کی آیات اور اس کے احکام ان کو سناتے ہو تو ہر بات پر سرِ تسلیم خم کرتے ہیں لیکن جب تمھارے پاس سے ہٹتے ہیں تو قرآن کے خلاف آپس میں طرح طرح کی سرگوشیاں کرتے اور باتیں بناتے ہیں۔ اس کی جو باتیں اپنے اغراض و خواہشات کے خلاف پاتے ہیں انھیں اپنی نجی مجلسوں میں نکتہ چینیوں اور اعتراضات کا ہدف بناتے ہیں۔ ایک طرف قرآن کو اللہ کی کتاب بھی مانتے ہیں اور اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا اظہار بھی کرتے ہیں، دوسری طرف اس کی بہت سی باتوں کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ گویا انھوں نے قرآن کو بیک وقت دو ارادوں کا ملغوبہ سمجھ رکھا ہے، جس میں کچھ حصہ تو اللہ کی طرف سے ہے جسے یہ مانتے ہیں اور کچھ حصہ غیر اللہ کی طرف سے ہے جس کی یہ مخالفت کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی وحدت اور اس کی ہم رنگی و ہم آہنگی اس بات کی نہایت قطعی شہادت ہے کہ اس میں مختلف ارادوں کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ہی خدائے علیم و حکیم کا اتارا ہوا ہے۔ اگر اس میں اللہ کے سوا غیر اللہ کی بھی کوئی مداخلت ہوتی تو اس میں قدم قدم پر تناقض ہوتا اس لیے کہ دو مختلف ارادوں اور دماغوں کی لکھی ہوئی چیز میں اختلاف و تناقض کا پایا جانا لازمی ہے۔

اس کے بعد منافقین کی ایک شرارت کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ مسلمانوں سے متعلق امن یا خطرے کی کوئی بات سنتے ہیں تو اس کو لے اڑتے ہیں اور لوگوں کے اندر سنسنی پیدا کرنے کے لیے اس کو پھیلا

دیتے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ملت کے بدخواہ اور اس کے اندر انتشار کے خواہاں ہیں۔ اگر یہ خیر خواہ ہوتے تو اس طرح کی کوئی بات اگر ان کے علم میں آتی تو پہلے اس کو رسولؐ اور امت کے ارباب حل وعقد کے سامنے لاتے تاکہ وہ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے فیصلہ کر سکتے کہ اس صورت میں کیا قدم اٹھانا چاہیے۔

آخر میں فرمایا کہ جنگ کا جو حکم تمہیں دیا جا رہا ہے اس میں تم پر اصل ذمہ داری تمہارے اپنے ہی نفس کی ہے، تم خود اٹھو اور مومنین مخلصین کو اٹھنے کی ترغیب دو۔ اللہ چاہے گا تو تمہارے ہی ذریعہ سے وہ ان کفار کا زور توڑ دے گا۔ اللہ بڑی زبردست طاقت والا ہے۔ رہے یہ منافقین تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جو کسی کارِ خیر میں تعاون کرتا اور اس کے حق میں لوگوں کو ابھارتا ہے وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو کسی کارِ خیر سے خود رکتا ہے اور دوسروں کو روکنے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے اس عمل سے حصہ پائے گا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۷-۸۵ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ
وَآتُوا الزَّكَاةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ
يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوا رَبَّنَا
لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا
تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٧٧﴾ أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ
كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ
مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِنْدِكَ
قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ
يَفْقَهُونَ حَدِيثًا ﴿٧٨﴾ مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ
وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ

رَسُولًا ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴿٧٩﴾ مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ
أَطَاعَ اللَّهَ ۖ وَمَنْ تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ﴿٨٠﴾ وَيَقُولُونَ
طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ
الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ
عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿٨١﴾ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ
كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿٨٢﴾
وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ
رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ
يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ
لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٨٣﴾ فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا
تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ ۚ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ
بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا ﴿٨٤﴾
مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا ۖ وَمَنْ
يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ
كُلِّ شَيْءٍ مُقِيتًا ﴿٨٥﴾

ترجمۂ آیات ۷۷ - ۸۵

تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا جاتا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے
رکھو اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوۃ دیتے رہو تو جب ان پر جنگ فرض کردی
گئی تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح اللہ سے

ڈرا جاتا ہے، یا اس سے بھی زیادہ۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی، کچھ اور مہلت کیوں نہ دی۔ کہہ دو اس دنیا کی متاع بہت قلیل ہے اور جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لیے آخرت اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اور تمہارے ساتھ ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔ اور موت تم کو پالے گی تم جہاں کہیں بھی ہوگے، اگرچہ مضبوط قلعوں کے اندر ہی ہو۔ اور اگر ان کو کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی گزند پہنچ جائے تو کہتے ہیں یہ تمہارے سبب سے ہے۔ کہہ دو ان میں سے ہر ایک اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ تمہیں جو سکھ بھی پہنچتا ہے خدا کی طرف سے پہنچتا ہے اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ تمہارے اپنے نفس کی طرف سے پہنچتا ہے اور اے رسول ہم نے تم کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی گواہی کافی ہے اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے اس پر تم کو نگران نہیں مقرر کیا۔ ۷۷-۸۰

اور یہ کہتے ہیں کہ سر تسلیم خم ہے، پھر جب تمہارے پاس سے ہٹتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ بالکل اپنے قول کے برخلاف مشورت کرتا ہے اور اللہ لکھ رہا ہے جو سرگوشیاں وہ کر رہے ہیں۔ تو ان سے اعراض کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ بھروسہ کے لیے کافی ہے۔ اور کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں وہ بڑا اختلاف پاتے۔ ۸۱-۸۲

اور جب ان کو کوئی بات امن یا خطرے کی پہنچتی ہے تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر یہ اس کو رسول اور اپنے اولوالامر کے سامنے پیش کرتے تو جو لوگ ان میں سے بات کی تہ کو پہنچنے والے ہیں وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے سے لوگوں کے سوا تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔ ۸۳

پس اللہ کی راہ میں جنگ کرو۔ تم پر اپنی جان کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں ہے اور مومنوں کو اس کے لیے ابھارو۔ توقع ہے کہ اللہ کافروں کے دباؤ کو روک دے اور اللہ بڑے زور والا اور عبرت انگیز سزا دینے والا ہے۔ جو کسی اچھی بات کے حق میں کہے گا اس کے لیے اس میں سے حصہ ہے اور جو اس کی مخالفت میں کہے گا اس کے لیے اس میں سے حصہ ہے اور اللہ ہر چیز کی طاقت رکھنے والا ہے۔ ۸۵

۲۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلٰى أَجَلٍ قَرِيبٍ ۚ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا (۷۷)

گفتار کے غازی عمل کے بودے

اس دور میں کفار کے علاقوں میں مسلمانوں کی مظلومیت اور بے بسی کا جو حال تھا اس کا ذکر اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے۔ ان حالات سے مدینہ کے مسلمانوں کے اندر جنگ کا احساس پیدا ہونا گزیر تھا۔ مسلمان اپنے اس احساس کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے تو منافقین بھی پورے جوش و خروش سے جذبۂ جنگ کا اظہار کرتے بلکہ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے کچھ زیادہ ہی جوش و خروش کا اظہار کرتے۔ قاعدہ ہے کہ جس کا عمل کمزور ہو وہ ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے جس

کے سبب سے اسے لاف زنی کا سہارا لینا پڑتا ہے تاکہ اس کی بزدلی کا راز دوسروں پر کھلنے نہ پائے۔ چنانچہ منافقین بھی زبان سے بڑے دعوے کا اظہار کرتے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم انھیں روکتے کہ ابھی انتظار کرو اور نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کے ذریعے سے اپنے تعلق باللہ، اپنی تنظیم اور اپنے جذبۂ انفاق کو ترقی دو۔ لیکن جب اس کا وقت آگیا اور جنگ کا حکم دیا گیا تو زبان کے ان غازیوں کا سارا جوش سرد پڑ گیا، اب یہ چھپنے کی کوشش کرتے اور دل میں جو رعب اور خشیت خدا کے لیے ہونی چاہیے اس سے زیادہ دہشت ان کے دلوں پر انسانوں کے لیے طاری تھی۔ یہ دل ہی دل میں کہتے کہ اے خدا اتنی جلدی تو نے یہ جنگ کا حکم کیوں دے دیا، کچھ اور مہلت کیوں نہ دی۔ 'قَالُوْا' کا لفظ یہاں ان کی ذہنی حالت کی تعبیر کر رہا ہے۔ عربی زبان اور قرآن میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اس دنیا کی زندگی اور اس کا عیش و آرام تو چند روزہ ہے۔ اس کے لیے اتنی بے قراری کیوں ہے۔ عیشِ دوام تو آخرت میں ہے جو لوگوں سے ڈرنے والوں کے بجائے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہے۔ اس کے لیے کمر باندھیں اور اطمینان رکھیں کہ جو کریں گے اس میں سے رتی رتی کا صلہ پائیں گے۔ ذرا بھی ان کے ساتھ کمی نہیں کی جائے گی۔

جہاد اور نماز و زکوٰۃ میں گہری مناسبت

اس آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ اسلامی جنگ کی روح اور نماز و زکوٰۃ میں نہایت گہری مناسبت ہے۔ جو لوگ خدا کی راہ میں لڑنے کے لیے تیار ہو رہے ہوں ان کے لیے اسلحہ کی ٹریننگ سے زیادہ ضروری اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ جہاد میں جو للہیت، اخلاص اور نظم و طاعت کی جو پابندی مطلوب ہے اس کی بہترین تربیت نماز سے ہوتی ہے اور اس کے لیے انفاق فی سبیل اللہ کا جو جذبہ درکار ہے وہ ایتائے زکوٰۃ کی پختہ عادت سے نشوونما پاتا ہے۔ ان صفات کے بغیر اگر کوئی گروہ جنگ کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو اس جنگ سے کوئی اصلاح وجود میں نہیں آسکتی، اس سے صرف فساد فی الارض میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ یہی حکمت ہے کہ اسلامی جنگ کے سخت سے سخت حالات میں بھی نماز کے اہتمام و التزام کی تاکید ہوئی۔ آگے اسی سورہ میں اس مسئلے پر ہم بحث کرنے والے ہیں اس وجہ سے یہاں اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔

أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ وَإِن تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۖ فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا (۷۸)

'بروج'، 'بُرج' کی جمع ہے۔ اپنے ابتدائی مفہوم میں تو ہر کسی نمایاں اور واضح چیز کے لیے استعمال ہوا لیکن پھر یہ بلند عمارتوں اور قلعوں کے لیے معروف ہو گیا۔ اس کے ساتھ 'مُشَيَّدَة' کی صفت بلندی اور استحکام دونوں مفہوموں پر مشتمل ہے۔

خوفِ موت کی علت اور اس کا علاج

اب یہ ان منافقین کے خوفِ موت کی علت بھی واضح فرمائی ہے اور اس عقیدے کو بھی بیان فرمایا ہے جو اس خوف کا واحد علاج ہے۔ فرمایا کہ موت سے کسی کے لیے مفر نہیں ہے، جس کی موت جس گھڑی، جس مقام اور جس شکل میں لکھی ہے وہ آکے رہے گی، آدمی مضبوط سے مضبوط قلعوں کے اندر چھپ کے بیٹھے وہاں بھی موت اس کو ڈھونڈھ لے گی، اس وجہ سے اس سے ڈرنا اور بھاگنا بے سود ہے۔ آدمی پر جو فرض جس وقت عاید ہوتا ہے اس کو عزم و ہمت سے ادا کرے اور موت کے مسئلے کو خدا پر چھوڑے۔ آدمی کے لیے یہ بات تو جائز نہیں ہے کہ وہ تدابیر اور احتیاطوں سے گریز اختیار کرے اس لیے کہ اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ خدا کو آزمائے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی جائز نہیں ہے کہ وہ یہ گمان رکھے کہ وہ اپنی تدابیر سے اپنے آپ کو موت سے بچا سکتا ہے۔

رسول کا ہر کام خدا کی رہنمائی میں ہوتا ہے

پھر منافقین کی ایک اور حماقت کی طرف بھی اشارہ فرمایا جس کو ان کی اس بزدلی کی پرورش میں بڑا دخل تھا وہ یہ کہ حق و باطل کی اس کشمکش کے دوران میں جو نرم و گرم حالات پیش آ رہے تھے وہ ان سب کو خدا کی طرف سے نہیں سمجھتے تھے بلکہ کامیابیوں کو تو خدا کی طرف سے سمجھتے، لیکن کوئی مشکل یا کوئی آزمائش پیش آجاتی تو اسے پیغمبر کی بے تدبیری پر محمول کرتے کہ یہ مدبر لیڈر نہیں ہیں اس وجہ سے غلط اندازے اور غلط فیصلے کرتے ہیں جس کے نتائج غلط نکلتے ہیں (چنانچہ سورۂ آل عمران میں یہ بات گزر چکی ہے کہ منافقین نے احد کی شکست کی ساری ذمہ داری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالنے کی کوشش کی کہ انھی کی بے تدبیری سے یہ شکست پیش آئی) اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ یہ لوگ نہ تو یہ مانتے تھے کہ کائنات میں صرف خدا ہی کی مشیت کارفرما ہے اور نہ یہ مانتے تھے کہ رسول کا ہر کام خدا کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ بظاہر تو آپ کی رسالت کا اقرار کرتے لیکن باطن میں ان کے یہی خیال چھپا ہوا تھا کہ آپ سارے کام اپنی رائے اور تدبیر سے کرتے ہیں۔ ان کے اس واہمے کی تردید کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی کہ ان پر واضح فرما دیجیے کہ کامیابی ہو یا ناکامی، دکھ ہو یا سکھ، ان میں سے کوئی چیز بھی میری طرف سے نہیں ہے بلکہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے اس لیے بھی کہ میں کوئی کام خدا کے حکم کے بغیر نہیں کرتا اور اس لیے بھی کہ متصرفِ حقیقی اس کائنات کا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہی ہے، اس کی مشیت کے بغیر نہ اس دنیا میں کسی کو دکھ پہنچ سکتا ہے نہ سکھ۔ لیکن ان لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ کسی بات کو سمجھنے کے پاس ہی نہیں پھٹکتے۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝ (۷۹-۸۰)

یہ آیتیں اوپر والی آیت ہی کے بعض اجمالات کو واضح کر رہی ہیں۔ پہلے ان لوگوں کو، جو کامیابیوں

خیر خدا کی رحمت کا تقاضا ہے اور شر انسان کے اپنے اعمال پر مترتب ہوتا ہے

کو اللہ تعالیٰ کی طرف اور ناکامیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر رہے تھے، مخاطب کر کے فرمایا کہ اصل حقیقت تو یہی ہے کہ خیر و شر ہر چیز کا ظہور خدا ہی کی مشیت سے ہوتا ہے۔ اس کے حکم و اذن کے بغیر کوئی چیز بھی ظہور میں نہیں آ سکتی۔ لیکن خیر اور شر میں یہ فرق ہے کہ خیر خدا کی رحمت کے تقاضا سے ظہور میں آتا ہے اور شر انسان کے اپنے اعمال پر مترتب ہوتا ہے۔ اس پہلو سے شر کا تعلق انسان کے اپنے نفس سے ہے۔

یہ حقیقت یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ خیر مطلق ہے۔ اس نے یہ دنیا اپنی رحمت کے لیے بنائی ہے۔ اس وجہ سے اس کی طرف کسی شر کی نسبت اس کی پاکیزہ صفات کے منافی ہے۔ شر جتنا کچھ بھی ظہور میں آتا ہے وہ صرف انسان کے اپنے اختیار کے سوء استعمال سے ظہور میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک خاص دائرے کے اندر آزادی بخشی ہے۔ یہ آزادی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اسی پر انسان کے تمام شرف کی بنیاد ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان آخرت میں جزا و سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔ اگر یہ آزادی انسان کو حاصل نہ ہوتی تو حیوان اور انسان کے درمیان کوئی فرق نہ ہوتا۔ لیکن اس آزادی کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ غیر محدود اور غیر مقید نہیں ہے بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک خاص دائرے کے اندر محدود ہے۔ پھر اس دائرے کے اندر بھی یہ خدا کی مشیت اور اس کی حکمت کے تحت ہے۔ خدا کے اذن و مشیت کے بغیر انسان اپنے کسی ارادے کو پورا نہیں کر سکتا۔ نیک ارادے بھی اسی کی توفیق بخشی سے پورے ہوتے ہیں اور برے ارادے بھی اسی کے مہلت دینے سے بروئے کار آتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کے کسی برے ارادے کو بروئے کار آنے دیتا ہے تو اس پہلو سے تو وہ خدا کی طرف منسوب ہوتا ہے کہ اس کا بروئے کار آنا خدا ہی کے اذن و مشیت سے ہوا لیکن دوسرے پہلو سے وہ انسان کا فعل ہے کیونکہ اس کا ارادہ انسان نے خود کیا۔

شر کو مہلت دینے کی حکمت

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی فرد یا جماعت کے کسی شر کو سر اٹھانے کی مہلت دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ اس میں بحیثیت مجموعی اس کی خلق کے لیے کوئی حکمت و مصلحت مدنظر ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس ڈھیل سے اہل حق کی آزمائش ہوتی ہے کہ اس سے ان کی کمزوریاں دور ہوں اور ان کی خوبیاں نشو و نما پائیں۔ بعض اوقات اس سے اہل باطل پر حجت تمام کرنا اور ان کے پیمانے کو لبریز کرنا ہوتا ہے۔ بعض اوقات قدرت خود ایسے حالات پیدا کرتی ہے جن سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ طبائع کے اندر جو کچھ دبا ہوا ہے وہ ابھرے، اس سے نیکیاں بھی ابھرتی ہیں اور جن کے اندر بدیاں مضمر ہوتی ہیں، ان کی بدیاں بھی ابھر آتی ہیں۔

رسول کی کسی بات پر اعتراض اس کی رسالت کے انکار کو مستلزم ہے

منافقین کو مخاطب کرنے کے بعد آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر یہ منافقین تمھاری رسالت کے باب میں متردد ہیں اور تمھارے ہر قول و فعل کو خدا کی طرف سے نہیں سمجھتے تو اس بات کی پروا نہ کرو۔ تمھاری رسالت ان کی گواہی کی محتاج نہیں ہے۔ اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ یہ لوگ

مانیں یا نہ مانیں، اب اللہ کی اطاعت کی واحد راہ یہی ہے کہ لوگ تمہاری اطاعت کریں۔ خدا کی اطاعت رسول ہی کی اطاعت کے واسطے سے ہوتی ہے۔ جو لوگ تم سے اعراض کریں تم ان کی ہدایت کے ذمہ دار بنا کے نہیں بھیجے گئے ہو، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اب ذمہ داری تمہاری نہیں بلکہ خود ان کی ہے۔

اگر التباس نہ ہو تو ضمیر کے انتشار میں کوئی قباحت نہیں

یہاں خطاب ایک ہی سیاق میں منافقین سے بھی ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی۔ لیکن ایسے مواقع میں اس طرح کے خطاب میں کوئی حرج نہیں ہے جہاں التباس کا اندیشہ نہ ہو۔ چونکہ پہلی بات واضح طور پر منافقین ہی کو مخاطب کر کے کہی جا سکتی تھی اس لیے کہ یہ انہی کے شبہے کا جواب ہے اس وجہ سے یہاں کسی التباس کا اندیشہ نہیں تھا۔ پھر دوسرے ٹکڑے میں آنحضرت صلعم کو مخاطب کر کے جو بات کہی گئی ہے اس میں بھی غور کیجیے تو روئے سخن درحقیقت منافقین ہی کی طرف ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے اعراض کے اظہار کے طور پر ان کو مخاطب کرنے کے بجائے اپنے رسول کو مخاطب کر لیا۔ گویا ان کی طرف سے رسول کی اس ناقدری کے بعد اب وہ اس بات کے اہل نہیں رہے کہ ان کو خطاب کر کے ان سے رسول کے باب میں کوئی بات کہی جائے۔

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۔ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۸۱-۸۲)

مبتدا کے حذف کا فائدہ

'طاعۃ' خبر ہے، مبتدا اس کا محذوف ہے اور یہ بات ہم واضح کر چکے ہیں کہ جب مبتدا کو حذف کر دیا جاتا ہے تو مقصود سارا زور خبر پر دینا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ پیغمبر کی مجلس میں ہوتے ہیں اور پیغمبر ان کو خدا کا کلام اور اس کے احکام سناتے ہیں تو وہ ہر بات پر کہتے ہیں کہ سر تسلیم خم ہے۔

بیّت یبیّت کا مفہوم

'بَیَّتَ یُبَیِّتُ' کے معنی اصلاً تو کوئی عمل رات میں کرنے کے آتے ہیں لیکن اپنے عام استعمال میں یہ لفظ رات کی قید سے مجرد ہو کر چھپ کر کوئی کام، کوئی مشورہ، کوئی رائے کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ الفاظ کے اس طرح اپنے ابتدائی مفہوم سے مجرد ہو جانے کی مثالیں عربی زبان میں بہت ہیں۔ اضحٰی اور بات بھی اپنے عام استعمال میں دن اور رات کی قید سے مجرد ہو کر استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ نبی کی مجلس میں تو یہ ہر بات پر سر تسلیم خم کرتے ہیں لیکن جب وہاں سے ہٹتے ہیں تو اپنی مجلسوں میں ان آیات و احکام کے خلاف مشورے کرتے ہیں جن کو اپنی خواہشات اور اپنے مفاد ذاتی کے خلاف پاتے ہیں۔

ان کے اس رویے پر قرآن نے پہلے تو ان کو دھمکی دی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی یہ ساری باتیں نوٹ ہو رہی ہیں، وہ یہ نہ سمجھیں کہ اگر وہ چھپ کر یہ سرگوشیاں کر رہے ہیں تو خدا سے بھی یہ چھپی ہوئی ہیں، ایک دن یہ سارا ریکارڈ ان کے سامنے آ جائے گا۔ اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ آپ

ان سے اعراض فرمائیے اور خدا پر بھروسہ کیجیے، خدا کا بھروسہ کافی ہے، یہ شامت زدہ لوگ ان سرگوشیوں سے دین حق کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے، جو بگاڑیں گے، اپنا ہی بگاڑیں گے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے ارادے کا کوئی دخل نہیں

پھر منافقین کے اس تضاد فکر کی طرف ان کو توجہ دلائی کہ ایک طرف قرآن اور پیغمبر کی باتوں پر سر تسلیم خم کرنا اور دوسری طرف اسی قرآن اور اسی پیغمبر کی باتوں کو ہدف اعتراض بنانا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا ان کا خیال ہے کہ اس قرآن میں بیک وقت دو ارادے (دو ہوز ال) کی کارفرمائی ہے اس کی کچھ باتیں دانشمندانہ اور حکیمانہ ہیں جو سراہنے کے قابل ہیں اور کچھ باتیں خلاف حکمت و مصلحت ہیں جو اعتراض و تنقید کی سزاوار ہیں؟ کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر غور کرتے تو خود دیکھ لیتے کہ قرآن کی ہر بات اپنے اصول اور فروع میں اتنی مستحکم اور مربوط ہے کہ ریاضی اور اقلیدس کے فارمولے بھی اتنے مستحکم و مربوط نہیں ہو سکتے۔ وہ جن عقائد کی تعلیم دیتا ہے وہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ و پیوستہ ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی الگ کر دیجیے تو پورا سلسلہ ہی درہم برہم ہو جاتے۔ وہ جن عبادات و طاعات کا حکم دیتا ہے وہ عقائد سے اس طرح پیدا ہوتی ہیں جس طرح تنے سے شاخیں پھوٹتی ہیں، وہ جن اعمال و اخلاق کی تلقین کرتا ہے وہ اپنے اصول سے اس طرح ظہور میں آتے ہیں جس طرح ایک شے سے اس کے قدرتی اور فطری لوازم ظہور میں آتے ہیں۔ اس کی مجموعی تعلیم سے زندگی کا جو نظام بنتا ہے وہ ایک بنیان مرصوص کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے اس طرح جڑی ہوتی ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی الگ کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ پوری عمارت میں خلا پیدا ہو جائے۔

جس طرح اس کائنات کے اجزائے مختلفہ کا باہمی توافق اور ان کی سازگاری اس بات کی نہایت واضح شہادت ہے کہ اس کے اندر ایک ہی خدائے حی و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے، کوئی اور اس میں شریک نہیں ہے اسی طرح اس کتاب عزیز کے مختلف اجزا کی باہمی سازگاری و ہم آہنگی اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ یہ ایک ہی خدائے علیم و حکیم کی وحی ہے، اس میں کسی اور جن یا بشر کی کوئی مداخلت نہیں ہے۔ اس کائنات میں اگر مختلف ارادے کارفرما ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتی۔ اسی طرح اس کتاب عزیز میں بھی اگر کسی اور فکر کی دراندازی ہوتی تو یہ متناقضات اور اختلافات کا ایک پراگندہ دفتر بن کے رہ جاتی۔

یہ آیت اس زمانے کے ان لوگوں کے لیے اپنے اندر بڑی تنبیہ کا سامان رکھتی ہے جو ایک طرف تو قرآن کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں، دوسری طرف اس کی ان تمام تعلیمات کو ہدف تنقید بھی بناتے ہیں جو ان کی خواہشات یا ان کے مزعومہ مصالح کے خلاف ہیں۔ ان کا یہ طرز عمل اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ بھی ان منافقین ہی کی طرح اس کتاب میں خدا کے ساتھ غیر خدا کا ہاتھ بھی شریک مانتے ہیں، ورنہ آخر اس کے کیا معنی کہ اس کو خدا کی کتاب بھی مانا جائے اور پھر اس کی بہت سی باتوں کو اعتراض، تنقید، تضحیک اور استہزا کا نشانہ بھی بنایا جائے!

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنۢبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا (۸۳)

اولوالامر پر بحث

'اُولُوا الْاَمْرِ' پر بحث اسی سورہ کی آیت ۵۹ کے تحت گزر چکی ہے۔

استنباط کا مفہوم

'اِسْتِنْبَاط' کا اصل مفہوم کنواں کھود کر اس سے پانی نکالنا اور کسی پوشیدہ چیز کو ظاہر کرنا ہے۔ اپنے اسی مفہوم سے ترقی کرکے کسی بات کی تہ کو پہنچنے اور اس کی حقیقت کو پالنے کے معنی میں یہ استعمال ہوا۔

منافقین کی دلچسپی افواہوں سے

منافقین چونکہ ملت کے خیر خواہ نہیں تھے اس وجہ سے افواہیں پھیلانے کے معاملے میں بڑے چابک دست تھے۔ امن یا خطرے کی جو بات بھی ان کو پہنچتی آن کی آن میں جنگل کی آگ کی طرح ان کے ذریعے سے لوگوں میں پھیل جاتی۔ جماعتی زندگی میں افواہیں عام حالات میں بھی بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہیں اور جب حالات جنگ کے ہوں، جیسے کہ اس وقت تھے، تب تو ان کی خطرناکی دو چند ہو جاتی ہے۔ منافقین ان افواہوں سے یوں تو مختلف فائدے اٹھانے کی کوشش کرتے لیکن خاص طور پر مسلمانوں، بالخصوص کمزور مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لیے یہ ان کا خاص حربہ تھا۔ بعض مرتبہ وہ اس طرح کی افواہوں سے مسلمانوں کے اندر غلط قسم کا اطمینان بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور ظاہر ہے کہ بے جا تشویش کی طرح غلط اطمینان بھی ایک خطرناک چیز ہے۔

افواہوں کے بارے میں صحیح طرز عمل

فرمایا کہ اگر یہ اللہ، رسول اور ملت کے خیر خواہ ہوتے تو ان کے لیے صحیح طریقہ یہ تھا کہ اس طرح کی جو باتیں ان کے علم میں آئیں ان کو عوام میں سنسنی پیدا کرنے کا ذریعہ بنانے کے بجائے ان کو رسولؐ اور امت کے ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کرتے تاکہ ان کے اندر جو لوگ معاملات کی گہری سوجھ بوجھ رکھتے ہیں ان کے موقع و محل کا تعین کرتے اور ان کے باب میں صحیح پالیسی اختیار کرتے۔ 'علم' کے معنی کسی شے کے موقع و محل کے تعین کے بھی آتے ہیں۔ ہم بقرہ میں 'قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ' (اور بنی اسرائیل کے ہر قبیلے نے اپنا اپنا گھاٹ متعین کر لیا) کے تحت لفظ کے اس مفہوم کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

'وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ' الآیہ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اب بھی ان کے لیے سنبھل جانے کا موقع ہے۔ یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ ابھی اس نے ان کو شیطان کے پیچھے بگٹٹ چل کھڑے ہونے کے لیے چھوڑ نہیں دیا ہے، ویسے ہے یہ بھی شیطان ہی کی راہ۔

اسلام میں سیاسی نظام کی اہمیت اور اولوالامر کا درجہ

اس آیت سے اسلام میں سیاسی نظام کی اہمیت و عظمت واضح ہوتی ہے کہ عوام کو اجتماعی نفع و ضرر کے معاملات میں مرجع و معتمد اپنے اولوالامر کو بنانا چاہیے۔ بطور خود اس طرح کی چیزوں کو عوام میں پھیلانا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اسلام میں اولوالامر کے لیے ضروری ہے کہ وہ دین اور دنیا دونوں کی ایسی سوجھ بوجھ رکھنے والے ہوں کہ پیش آنے والے حالات و معاملات میں شریعت و مصلحت کے تقاضوں کے مطابق قدم اٹھا سکیں۔

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ ۚ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا ۝ مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا ۖ وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُقِيتًا (۸۴-۸۵)

'شفع' کا مفہوم

'شفع' کے معنی ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ جوڑنے کے ہیں۔ اسی مفہوم سے ترقی کر کے کسی کی بات کی تائید و حمایت یا اس کے حق میں سفارش کرنے کے معنی میں یہ استعمال ہوا۔ یہاں شفاعت حسنہ اور شفاعت سیئہ دو قسم کی شفاعتوں کا ذکر ہے۔ شفاعت حسنہ تو ظاہر ہے کہ یہ ہوگی کہ کسی مقصدِ حق کو اس سے تائید و تقویت حاصل ہو۔ اس کے برعکس شفاعت سیئہ یہ ہے کہ اس سے تقویت و تائید کے بجائے اس مقصد کو نقصان پہنچے۔ منافقین، قرآن کی دعوتِ جہاد کے لیے لوگوں کو ابھارنے کے بجائے، جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا اور آگے تفصیل آرہی ہے، لوگوں کا حوصلہ پست کرنے کی کوشش کر رہے تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کی اس کوشش کو شفاعت سیئہ سے تعبیر کیا۔

شفاعت حسنہ اور شفاعت سیئہ

'مقیت' کا مفہوم

'مقیت' کے معنی شہید و حفیظ اور مقتدر کے ہیں۔

یاد ہوگا، اس مجموعۂ آیات کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ پہلے تو منافقین بہت بڑھ بڑھ کر جنگ و جہاد کی باتیں بناتے تھے لیکن اب جب کہ جنگ کا حکم دے دیا گیا ہے تو چھپتے پھرتے ہیں اور دوسروں کا حوصلہ بھی پست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد اسی سلسلہ کی دوسری باتیں زیر بحث آگئی تھیں اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ پر ذمہ داری صرف اپنے نفس کی ہے، آپ خود جنگ کے لیے اٹھیے اور مسلمانوں کو اٹھنے کے لیے ابھاریے، جس کو توفیق ہوگی وہ اٹھے گا، جو نہیں اٹھے گا اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ اللہ کے کام دوسروں پر منحصر نہیں ہوتے، وہ خود بڑی قوت رکھنے والا ہے اور مخالفوں کو عبرت انگیز سزا دینے والا ہے۔ وہ آپ کے اور آپ کے مخلص ساتھیوں ہی کے اندر اتنی قوت پیدا کر دے گا کہ اسی سے کفار کا زور ٹوٹ جائے گا۔

حق کی حمایت میں زبان سے کچھ کہنا بھی موجب اجر ہے

اس کے بعد فرمایا کہ منافقین جو ریشہ دوانیاں اور افواہ بازیاں مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے اور جہاد سے روکنے کے لیے کر رہے ہیں اس کی پروا نہ کیجیے۔ جو آج حق کی تائید و حمایت میں اپنی زبان کھولیں گے وہ اس کا اجر پائیں گے اور جو اس کے خلاف کہیں گے وہ اس کی سزا بھگتیں گے، خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔

۲۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۸۶-۱۰۰

آیت ۸۸ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین سے اعراض کا جو حکم دیا گیا تھا اس کا اثر قدرتی طور پر جاں نثار صحابہؓ پر یہ پڑ سکتا تھا کہ جن کے باب میں ان کو شبہ بھی ہو جاتا کہ ان کا تعلق منافقین سے ہے،

ان سے وہ ربط ضبط اور سلام وکلام ختم کر دیتے اور اس طرح ایک معاشرتی بائیکاٹ کی شکل پیدا ہو جاتی جو ابھی اس مرحلے میں مطلوب نہیں تھی۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس موقع پر مسلمانوں کو ایسی ہدایات دی جائیں جو ان کو اعتدال پر قائم رکھیں۔ وہ منافقین سے ہوشیار تو رہیں لیکن ان سے سلام وکلام بند نہ کریں۔ ابھی ان کو اصلاح حال کا اور موقع دیں۔ چنانچہ سب سے پہلے مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ جو تمھیں سلام کرے اس کو اس کے سلام کا اس سے بہتر جواب دو یا کم از کم یہ کہ اس کے سلام کو لوٹا دو۔

پھر ان لوگوں کو خطاب کر کے جو دارالحرب کے منافقین کے لیے اپنے دل میں بڑا نرم گوشہ رکھتے تھے، اور ان کی منافیٔ اسلام حرکات کے واضح ہونے کے باوجود یہ توقع رکھتے تھے کہ ان کے ساتھ روابط قائم رکھے جائیں گے تو بالآخر یہ اچھے مسلمان بن جائیں گے، فرمایا کہ یہ لوگ تو مسلمان بننے سے رہے البتہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ تم ان کے ساتھ بندھے رہے تو یہ تمھیں بھی لے ڈوبیں گے۔ پھر ان کے مخلص سمجھے جانے کے لیے یہ کسوٹی قرار دی کہ یہ اپنے ماحول سے ہجرت کر کے تمھارے ساتھ آملیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر ان سے تعلق رکھنے کے بجائے ان کو دشمن اور دشمنوں کا ساتھی سمجھو، ان کے ساتھ جنگ کرو۔

اس حکم عام سے صرف ان مسلمانوں کو مستثنیٰ کیا جن کا تعلق ایسے غیر مسلم قبائل سے ہو جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ ہو یا معاہدہ تو نہ ہو لیکن ان قبائل کے مسلمان فی الحال اپنی غیر جانبداری باقی رکھنا چاہتے ہوں، نہ اپنی قوم کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنے کے لیے تیار ہوں، نہ مسلمانوں کے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑنے کی جرأت کر رہے ہوں۔ فرمایا کہ اگر یہ اپنی غیر جانبداری باقی رکھیں، تم سے تعرض نہ کریں، تمھارے ساتھ ان کے تعلقات مصالحانہ رہیں تو تم بھی ان کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہ کرو۔ اس کے ساتھ یہ وضاحت بھی فرما دی کہ ضروری ہے کہ یہ غیر جانبداری واقعی اور حقیقی ہو۔ بعض جماعتیں ایسی ہیں جو بظاہر تو غیر جانبداری کی مدعی ہیں لیکن جب ان پر کفار کا دباؤ پڑ جاتا ہے تو یہ اسلام دشمنی کے لیے آمادہ ہو جاتی ہیں۔ ان کے بابت فرمایا کہ ان کے ساتھ دشمنوں ہی کا سا معاملہ کرو، اگر یہ تمھارے خلاف جارحانہ اقدام سے باز نہ آئیں تو تم بھی ان کو قتل کرو۔

اس کے بعد دارالحرب میں خطأً یا عمداً قتل ہو جانے والے مسلمانوں کی دیت کا حکم بیان فرمایا اور نہایت سخت الفاظ میں وعید فرمائی کہ جو شخص عمداً کسی مسلمان کو قتل کر دے گا اس کے لیے دائمی عذاب جہنم اور اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ تم کفار کے جس علاقے پر حملہ کرو اس کے اندر کے مسلمانوں کے بارے میں پہلے اچھی طرح تحقیق کر لو تاکہ مسلمان تمھاری تلوار سے محفوظ رہیں اور اگر کوئی شخص اپنے ایمان کے اظہار کے لیے تمھیں سلام کرے تو تم محض طمع مال میں اس کو مسلمان تسلیم کرنے سے انکار نہ کرو۔

اس کے بعد تمام غیر معذور مسلمانوں کو جان و مال دونوں کے ساتھ خدا کی راہ میں جہاد پر اور تمام غیر معذور

مسلمانوں کو دارالحرب اور دارالکفر سے ہجرت پر ابھارا ہے اور ان کے مراتب و مدارج بیان فرمائے ہیں۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۸۶-۱۰۰ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
النصف عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ۸۶ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى
ع ۱۱ ۸ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۸۷
فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَھُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ
اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ
سَبِيْلًا ۸۸ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً فَلَا
تَتَّخِذُوْا مِنْھُمْ اَوْلِيَاۗءَ حَتّٰي يُھَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ
تَوَلَّوْا فَخُذُوْھُمْ وَاقْتُلُوْھُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا
مِنْھُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۸۹ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ
وَبَيْنَھُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَاۗءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُھُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ
اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَھُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَھُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ
فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ
اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۹۰ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ
يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَھُمْ ۭ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ
فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَھُمْ
فَخُذُوْھُمْ وَاقْتُلُوْھُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ
ع ۳ ۹ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۹۱ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا

إِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَن قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ
مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦٓ إِلَّآ أَن يَصَّدَّقُوا۟ ۚ فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ
وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ
بَيْنَهُم مِّيثَـٰقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ
فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ ٱللَّهِ ۗ وَ
كَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٩٢﴾ وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُۥ
جَهَنَّمُ خَـٰلِدًا فِيهَا وَغَضِبَ ٱللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُۥ وَأَعَدَّ لَهُۥ عَذَابًا
عَظِيمًا ﴿٩٣﴾ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا ضَرَبْتُمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ فَتَبَيَّنُوا۟
وَلَا تَقُولُوا۟ لِمَنْ أَلْقَىٰٓ إِلَيْكُمُ ٱلسَّلَـٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ
ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فَعِندَ ٱللَّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ ۚ كَذَٰلِكَ كُنتُم مِّن
قَبْلُ فَمَنَّ ٱللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوٓا۟ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ
خَبِيرًا ﴿٩٤﴾ لَّا يَسْتَوِى ٱلْقَـٰعِدُونَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُو۟لِى ٱلضَّرَرِ وَ
ٱلْمُجَـٰهِدُونَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ ٱللَّهُ
ٱلْمُجَـٰهِدِينَ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ عَلَى ٱلْقَـٰعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا
وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ ٱللَّهُ ٱلْمُجَـٰهِدِينَ عَلَى ٱلْقَـٰعِدِينَ أَجْرًا
عَظِيمًا ﴿٩٥﴾ دَرَجَـٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿٩٦﴾ ع ۵ ۱۰
إِنَّ ٱلَّذِينَ تَوَفَّىٰهُمُ ٱلْمَلَـٰٓئِكَةُ ظَالِمِىٓ أَنفُسِهِمْ قَالُوا۟ فِيمَ كُنتُمْ ۖ
قَالُوا۟ كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِى ٱلْأَرْضِ ۚ قَالُوٓا۟ أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ ٱللَّهِ

وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ
مَصِيرًا ﴿٩٧﴾ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ
لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولَٰئِكَ عَسَى
اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٩٩﴾ وَمَنْ يُهَاجِرْ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَنْ
يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ
فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿١٠٠﴾ ۱۴ ع ۱۱

ترجمۂ آیات ۸۶-۱۰۰

اور جب تمھیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو۔ اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔ اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تم سب کو قیامت کے دن کی طرف لے جا کے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور اللہ سے بڑھ کر سچی بات کہنے والا کون ہو سکتا ہے۔ ۸۶-۸۷

پس تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم منافقین کے باب میں دو گروہ ہو رہے ہو۔ اللہ نے تو انھیں ان کے کیے کی پاداش میں پیچھے لوٹا دیا ہے، کیا تم ان کو ہدایت دینا چاہتے ہو جن کو خدا نے گمراہ کر دیا ہے؟ جن کو خدا گمراہ کر دے، تم ان کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔ یہ تو آرزو رکھتے ہیں کہ جس طرح انھوں نے کفر کیا ہے تم بھی کفر کرو کہ تم سب برابر ہو جاؤ تو تم ان میں سے کسی کو اپنا ساتھی نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ اگر وہ اس سے اعراض کریں تو ان کو گرفتار کرو اور قتل کرو جہاں کہیں بھی پاؤ اور ان میں سے کسی کو ساتھی اور مددگار نہ بناؤ۔ صرف وہ

لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جن کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہو جن کے ساتھ تمہارا کوئی معاہدہ ہے۔ یا وہ لوگ جو تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ نہ اپنے اندر تم سے لڑنے کی ہمت پا رہے ہیں نہ اپنی قوم ہی سے۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر دلیر کر دیتا تو وہ تم سے لڑتے۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، تم سے جنگ نہ کریں، تمہارے ساتھ صلح جویانہ رویہ رکھیں تو اللہ تم کو بھی ان کے خلاف کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا۔ ۸۸۔۔۔۹۰

اور دوسرے کچھ ایسے لوگوں کو بھی تم پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی محفوظ رہیں اور اپنی قوم سے بھی محفوظ رہیں لیکن جب جب فتنے کی طرف موڑے جاتے ہیں اس میں گر پڑتے ہیں۔ پس اگر یہ تم سے کنارہ کش نہ رہیں، تم سے صلح جویانہ رویہ نہ رکھیں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تم ان کو گرفتار کرو اور قتل کرو جہاں کہیں پاؤ۔ یہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تم کو کھلا اختیار دیا ہے۔ ۹۱

اور کسی مومن کے لیے روا نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے مگر یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کے ذمہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور خوں بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے الّا یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ پس اگر مقتول تمہاری دشمن قوم کا فرد ہو لیکن وہ بذاتِ خود مسلمان ہو تو ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی قوم کا فرد ہے جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے تو خوں بہا بھی ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا بھی۔ جس کو یہ استطاعت نہ ہو تو وہ لگا تار دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ اللہ

کی طرف سے ٹھہرائی ہوئی توبہ ہے۔ اللہ علیم و حکیم ہے اور جو کوئی کسی مسلمان کو عمداً قتل کرے گا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے ایک عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔ ۹۲-۹۳

اے ایمان والو، جب تم خدا کی راہ میں نکلا کرو تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو اور جو تمھیں سلام کرے اس کو دنیوی زندگی کے سامان کی خاطر یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔ اللہ کے پاس بہت سامان غنیمت ہے۔ تمھارا حال بھی پہلے ایسا ہی رہ چکا ہے۔ اللہ نے تم پر فضل فرمایا تو تحقیق کر لیا کرو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۹۴

مسلمانوں میں غیر معذور بیٹھ رہنے والے اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں۔ مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ فضیلت کا بخشا ہے۔ یوں دونوں سے اللہ کا وعدہ اچھا ہے لیکن اللہ نے مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر ایک اجر عظیم کی فضیلت دی ہے۔ اس کی طرف سے درجے بھی اور مغفرت و رحمت بھی۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۹۵-۹۶

جن لوگوں کی جان فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہوئے ہیں وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں پڑے رہے۔ وہ جواب دیں گے ہم تو اس ملک میں بالکل بے بس تھے۔ وہ کہیں گے کہ خدا کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ البتہ وہ بے بس مرد، عورتیں اور بچے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکتے اور نہ کوئی راہ پا رہے ہیں، یہ لوگ توقع ہے کہ اللہ ان سے درگزر فرمائے۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور

بخشنے والا ہے۔ اور جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بڑے ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے نکلے گا پھر اس کو موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے لازم ہو گیا اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ۹۷-۱۰۰

۲۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ۞ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ۞ ۸۶-۸۷

'تحیت' کا مفہوم — حیاہ تحیۃ کے اصل معنی کسی کو زندگی کی دعا دینے کے ہیں۔ اسی سے دعائیہ کلمہ حیاک اللہ ہے جس کے معنی ہیں، اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ سلام اور اس کے ہم معنی دوسرے دعائیہ کلمات بھی چونکہ کم و بیش یہی یا اسی سے ملتے جلتے مفہوم اپنے اندر رکھتے ہیں اس وجہ سے لفظ کے عام مفہوم میں وہ سب اس کے اندر شامل ہو جاتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں سلام کی اہمیت — ہر معاشرے میں کچھ ایسے دعائیہ کلمات مروج ہوتے ہیں جو معاشرے کے افراد آپس میں ملتے جلتے وقت ابتدائی تعارف، اظہارِ محبت و اعتماد، نشانِ اخوت و مودت اور علامتِ وحدتِ فکر و عقیدہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ معاشرتی اتصال و ارتباط کے نقطۂ نظر سے ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ معاشرے کے افراد، خواہ ان کے اندر کتنی ہی دوری و بے گانگی ہو، آمنے سامنے ہوتے ہی ان کے واسطے سے اس طرح باہم ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں گویا ان کے اندر کوئی اجنبیت و بیگانگی تھی ہی نہیں۔ عربوں میں اس مقصد کے لیے بہت سے الفاظ و فقرے معروف تھے۔ مثلاً حیاک اللہ، اہلاً و سہلاً و مرحبا، وغیرہ۔ سلام کا لفظ بھی معروف تھا۔ جب اسلامی معاشرہ ظہور میں آیا تو بجز ان کلمات کے جن میں شرک کی کوئی آلائش تھی باقی تمام پاکیزہ کلمات باقی رہے البتہ السلام علیکم کو ایک خاص اسلامی شعار کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ یہ کلمہ گویا مومن و کافر کے درمیان ایک علامتِ فارقہ بن گیا۔ جب ایک شخص نے دوسرے کے سامنے السلام علیکم کہہ دیا اور اس نے وعلیکم السلام سے اس کا جواب دے دیا تو گویا من و تو کا فرق اٹھ گیا اور دونوں دو قالب و یک جان ہو گئے اور جواب نہ دیا تو اس کے معنی صرف یہی نہیں ہوتے تھے کہ اس نے اس کا سلام قبول نہیں کیا بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہوتے تھے کہ اس نے اس کے اسلام کو بھی تسلیم نہیں کیا۔

کلمۂ تحیت کی اس اہمیت کی وجہ سے اس موقع پر جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، جیسا کہ ہم نے

اشارہ کیا، منافقین سے اعراض کی ہدایت ہوئی تو ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ جب کوئی شخص تمہیں سلام و تحیت سے مخاطب کرے تو اس کا اسلامی و معاشرتی حق یہ ہے کہ اس کے سلام و تحیت کا اس کو جواب دو۔ اس کا اعلیٰ طریقہ تو یہ ہے کہ اس سے بہتر طریقہ پر جواب دو، اگر یہ نہیں تو کم از کم اسی کے الفاظ اس کی طرف لوٹا دو۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس لیے تھی کہ زیادہ پرجوش لوگوں کی طرف سے اس مرحلے میں منافقین کے ساتھ معاشرتی بائیکاٹ کی نوبت نہ آنے پائے۔ خاص طور پر اس کا یہ پہلو بہت نازک تھا کہ بعض حالات میں اس کی زد میں وہ لوگ بھی آ سکتے تھے جو فی الحقیقت تو منافق نہ ہوتے لیکن زیادہ حساس لوگوں کو کسی سبب سے ان پر منافقت کا شبہ ہو جاتا۔

یہ پیچیدگی تو ان منافقین کے معاملے میں تھی جو دارالاسلام میں تھے۔ ان سے زیادہ پیچیدہ معاملہ ان مسلمانوں کا تھا جو دارالحرب میں تھے۔ ان مسلمانوں کے اندر بھی، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، منافق اور مخلص دونوں ہی قسم کے تھے۔ قرآن نے اگرچہ ان کے درمیان امتیاز کے لیے نہایت واضح کسوٹیاں مقرر کر دیں تاہم اس کا اندیشہ باقی رہتا تھا کہ کوئی مخلص مسلمان مسلمانوں کی تلوار کی زد میں آ جائے، اس لیے مسلمانوں کو آگے آیت ۹۴ میں یہ ہدایت کی گئی کہ جس علاقے پر حملہ کرو اس کے مسلمانوں کے متعلق اچھی طرح معلومات حاصل کر لو، اگر کوئی تمہیں سلام کرے اور اس طرح تمہارے ساتھ اپنی دینی اخوت و مودت کا اظہار کرے تو بے تحقیق کیے اس کے مسلمان ہونے سے انکار نہ کرو۔

الغرض یہ سلام اور جواب سلام کا معاملہ کوئی رسمی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اسلامی معاشرہ میں یہ وصل و فصل کی بنیاد تھا اس وجہ سے قرآن نے اہمیت کے ساتھ اس کو بیان فرمایا اور تنبیہ فرمائی کہ خدا ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے اور قیامت کے دن سب کو اپنے اعمال و اقوال کی جواب دہی کرنی ہے۔

'لَيَجْمَعَنَّكُمْ' کے بعد 'اِلٰی' کا صلہ، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں اس اسلوب کی وضاحت کر چکے ہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں کوئی لفظ ہانکنے، دھکیلنے اور لے جانے کے معنی میں محذوف ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ حَتّٰي يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۸۸-۸۹)

'فِئَتَيْنِ' ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ مثلاً کہیں گے 'مالک قائمًا'۔

'رَكَسَ الشَّيْءَ' کے معنی ہیں چیز کو الٹ دیا۔ 'اَرْكَسَهٗ' اس کو اوندھا کر دیا۔ 'ركس الشیء' چیز کو اس کی

سابقہ حالت پر لوٹا دیا۔

دارالکفر کے مسلمانوں کے کفروایمان کے لیے کسوٹی ہجرت ہے

اب یہ ذکر ہو رہا ہے ان منافقین کا جو بلا کسی عذر معقول کے، محض اپنے رشتوں اور قرابتوں یا جائداد واملاک کی محبت میں ہجرت سے گریزاں اور مدینہ میں دارالاسلام قائم ہو جانے کے باوجود، اب تک بدستور دارالکفر یا دارالحرب میں پڑے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے پاس چونکہ کوئی عذر شرعی موجود نہیں تھا اس وجہ سے ان کا نفاق واضح تھا لیکن مسلمانوں میں سے کچھ لوگ، جو ان کے ساتھ رشتہ داریاں اور قرابتیں یا خاندانی اور قبائلی نسبتیں رکھتے تھے، ان کے معاملے میں بہت نرم تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کو نہ صرف ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے بلکہ ان کے ساتھ ربط ضبط بھی قائم رکھا جائے، آہستہ آہستہ یہ لوگ سچے اور پکے مسلمان بن جائیں گے۔ قرآن نے اس خیال کے لوگوں کو تنبیہ کی کہ جو لوگ اس طرز پر سوچ رہے ہیں، غلط سوچ رہے ہیں۔ اب یہ منافقین اسلام کی طرف بڑھنے والے نہیں ہیں، انھوں نے اسلام کی طرف جو قدم بڑھایا تھا، دنیا کی محبت میں انھوں نے اپنے اٹھائے ہوئے قدم کو پھر پیچھے ہٹا لیا جس کی سزا میں اللہ نے اپنی سنت کے مطابق ان کو پھر اسی کفر میں دھکیل دیا جس میں وہ پہلے تھے۔ جو لوگ خدا کے قانون اور اس کی سنت کی زد میں آچکے ہوں وہ اب راہ راست پر نہیں آسکتے، کوئی لاکھ چاہے ان کو راہ ملنی ناممکن ہے۔ فرمایا کہ تم ان کی ہدایت کی توقع رکھتے ہو اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ تمھیں بھی اسی کفر میں واپس لے جانے کی آرزو رکھتے ہیں جس میں وہ خود ہیں اس وجہ سے جب تک وہ ہجرت نہ کریں اس وقت تک تم ان کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھو۔ یہ ہجرت ہی ان کے ایمان و اسلام کی کسوٹی ہے۔ اگر وہ اس سے گریز کرتے ہیں تو تم ان کو دشمن اور دشمنوں کا ساتھی سمجھو اور ان کو جہاں پاؤ گرفتار اور قتل کرو۔

إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ ۚ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا (۹۰)

'حَصِرَ حَصَرًا' کے معنی عاجز ہونا، تنگ ہونا، بے ہمت ہونا۔ حصر الرجل ضاق صدرہ' اس کا سینہ تنگ ہوا، اس نے ہمت چھوڑ دی۔

'سَلَم' کے معنی انقیاد و اطاعت اور حوالگی و سپردگی کے ہیں۔ 'القاء السلم' سے مراد کسی کے آگے سپر ڈال دینا، گھٹنے ٹیک دینا، سپرانداز ہونا اور اس سے صلح کی درخواست کرنا۔

مذکورہ بالا حکم کے بعض مستثنیات

اب یہ ان لوگوں کا حکم بیان ہو رہا ہے جو مذکورہ بالا اخذ و قتل کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ دو قسم کے لوگ ہیں۔

ایک وہ جو کسی ایسی قوم اور قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ صلح ہے۔ ایسے لوگوں کی جان بخشی محض معاہدے کے احترام میں کی گئی۔ اس لیے کہ معاہدے کے قیام تک ان کے کسی فرد کو گرفتار یا قتل کرنا عہد شکنی ہوتی، عام اس سے کہ وہ کافر ہے یا منافق۔

دوسرے وہ لوگ جو اپنی کمزوری اور پست ہمتی کی وجہ سے مسلمانوں کے پاس غیر جانبداری کی درخواست لے کر آئیں، نہ وہ اپنی قوم اور قبیلے کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہوں اور نہ مسلمانوں میں شامل ہو کر اپنی قوم سے جنگ کے لیے آمادہ ہوں۔ ان کو مہلت دیے جانے کی یہ مصلحت واضح فرمائی کہ ایسے کمزور لوگوں کی طرف سے یہ غیر جانبداری کا رویہ بھی غنیمت ہے۔ آخر یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اللہ ان کو جرأت دے دیتا تو یہ کھلم کھلا دشمن بن کر تم سے جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تو جب تک یہ تم سے تعرض کرنے سے کنارہ کش رہیں، تم سے جنگ نہ کریں، تمہارے ساتھ صلح جویانہ روش رکھیں تم بھی ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کرو۔

سَتَجِدُونَ اٰخَرِیۡنَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّاۡمَنُوۡكُمۡ وَیَاۡمَنُوۡا قَوۡمَهُمۡ ؕ كُلَّمَا رُدُّوۡۤا اِلَى الۡفِتۡنَةِ اُرۡكِسُوۡا فِيۡهَا‌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَعۡتَزِلُوۡكُمۡ وَيُلۡقُوۡۤا اِلَيۡكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوۡۤا اَيۡدِيَهُمۡ فَخُذُوۡهُمۡ وَاقۡتُلُوۡهُمۡ حَيۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ‌ ؕ وَاُولٰٓـئِكُمۡ جَعَلۡنَا لَـكُمۡ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا (۹۱)

'فتنہ' سے مراد

'فتنۃ' کے لفظ پر ہم سورہ بقرہ کی تفسیر میں مفصل بحث کر چکے ہیں، یہاں اس سے مراد کفار کے وہ جابرانہ اور ظالمانہ اقدامات ہیں جو وہ مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے اور بزعم خویش اسلام کو مٹانے کے لیے کر رہے تھے۔

'سلطان' کا مفہوم

'سُلۡطٰن' کا لفظ قرآن میں دلیل، حجت کے معنی میں بھی آیا ہے اور اختیار و اقتدار کے معنی میں بھی۔ اس دوسرے معنی کے لیے بھی متعدد نظیریں موجود ہیں مثلاً مَا كَانَ لِیَ عَلَیۡكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ ۲۲ ابراہیم (مجھے تم پر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا) وَمَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِيِّهٖ سُلۡطٰنًا ۳۳ اسراء (جو مظلومانہ قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے وارث کے لیے قاتل پر اختیار بخشا)

غیر جانبداری کے جھوٹے مدعیوں کا حکم

یہاں جھوٹے غیر جانبداروں کی طرف اشارہ ہے جو اسلام کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کے خطرے سے بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور اپنی قوم کے اندر شامل رہ کر اس سے بھی مامون رہنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ بظاہر تو غیر جانبداری کے مدعی تھے لیکن یہ غیر جانبداری محض نمائشی

تھی۔ جب ان پر ان کی قوم کا دباؤ پڑ جاتا یہ ان شرارتوں میں شریک ہو جاتے جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کرنا چاہتی۔ ان لوگوں کی بابت فرمایا کہ یہ لوگ اس رعایت کے مستحق نہیں ہیں جو مذکورہ بالا جماعت کے لیے بیان ہوئی ہے۔ بلکہ یہ بھی کھلے ہوئے دشمنوں ہی کے حکم میں داخل ہیں۔ اگر یہ تمہاری مخالفت نہ چھوڑیں، تمہارے ساتھ صلح جویانہ رویہ نہ اختیار کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو تم جہاں کہیں پاؤ ان کو گرفتار اور قتل کرو، ان کو گرفتار کرنے اور ان کے قتل کرنے کا خدا نے تم کو کھلا ہوا اختیار بخشا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (۹۲-۹۳)

دارالحرب کے مخلص مسلمانوں کی جان کا تحفظ

اوپر جو احکام بیان ہوئے ہیں اگرچہ اہل ایمان اور منافقین کے درمیان التباس رفع کر دینے کے لیے کافی تھے لیکن کفار کے علاقوں میں بہت سے مخلص مسلمان بھی تھے جو خود تو ہجرت کے دل سے آرزومند تھے لیکن مجبوریوں نے ان کی راہ روک رکھی تھی۔ جنگ پیش آجانے کی صورت میں اندیشہ تھا کہ مبادا ان کو خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں کوئی گزند پہنچ جائے۔ اس وجہ سے قرآن نے قتل مومن کے جرم کی سنگینی بھی واضح فرما دی اور اس سلسلے میں ایسے واضح احکام بھی دے دیے جن کے بعد کسی خدا ترس مسلمان کے لیے اس معاملے میں کسی بے احتیاطی و سہل انگاری کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

پہلے فرمایا کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کرے، غلطی سے یہ فعل صادر ہو جائے تو اس کی بات دوسری ہے۔ غلطی کی صورت میں بھی لازم ہے کہ جس سے یہ غلطی صادر ہوئی ہے وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا ادا کرے الا آنکہ وارثانِ مقتول خون بہا معاف کر دیں۔

پھر اس اجمال کی وضاحت فرمائی کہ اگر مقتول مسلمان، دشمن قوم یا قبیلہ کا فرد ہو تب تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کر دینا ہی کافی ہے۔ لیکن اس کا تعلق اگر معاہد قوم اور قبیلے سے ہے تو اس صورت میں خون بہا ادا کرنا بھی ضروری ہوگا اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا بھی۔ اگر کوئی شخص غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس صورت میں اس کو لگاتار دو ماہ کے روزے رکھنے

ہوں گے۔ فرمایا کہ یہ اللہ کی مشروع کی ہوئی توبہ ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

قتلِ عمد کے جرم کی سنگینی

قتلِ خطا کے احکام بیان کرنے کے بعد قتلِ عمد کے بارے میں فرمایا کہ جو مسلمان کسی مسلمان کو عمداً قتل کرے گا اس کی سزا جہنم ہے وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اس کے لیے عذاب دردناک خدا نے تیار کر رکھا ہے۔

یہاں قتلِ عمد کے جرم کی جو سزا بیان ہوئی ہے وہ بعینہٖ وہی سزا ہے جو کفر کا فروں کے لیے قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اس آیت کو پڑھ کر ہر مسلمان کا دل لرز اٹھتا ہے۔ اس سزا کی سنگینی کی علت سمجھنے کے لیے اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر سب سے بڑا حق اس کی جان کا احترام ہے، کوئی مسلمان اگر دوسرے مسلمان کی جان لے لیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حقوق العباد میں سے اس نے سب سے بڑے حق کو تلف کیا جس کی تلافی و اصلاح کی بھی اب کوئی شکل باقی نہیں رہی اس لیے کہ جس شخص کے حق کو اس نے تلف کیا وہ دنیا سے رخصت ہو چکا اور حقوق العباد کی اصلاح کے لیے تلافی مافات ناگزیر ہے پھر اس کا ایک اور پہلو بھی بڑا اہم ہے، وہ یہ کہ یہ ایک ایسے مسلمان کے قتل کا معاملہ ہے جو دارالکفر اور دارالحرب میں گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے اسلامی شریعت کے ان تحفظات سے بھی محروم تھا جو دارالاسلام میں ایک مسلمان کو حاصل ہوتی ہیں۔ اپنے دین اور اپنے نفس کے معاملے میں اس کو اگر کسی سے خیر کی امید ہو سکتی تھی تو وہ مسلمانوں ہی سے ہو سکتی تھی۔ اب اگر کوئی مسلمان ہی اس کو قتل کر دے اور وہ بھی عمداً اور ایسی جگہ پر جہاں اس کو اسلامی قانون کی حفاظت بھی حاصل نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ نہ ایسے مقتول سے بڑھ کر کوئی مظلوم ہو سکتا ہے اور نہ ایسے قاتل سے بڑھ کر کوئی ظالم!

عرف پر مبنی احکام حالات کی تبدیلی سے متغیر ہوتے ہیں

خوں بہا کے مسئلے کے بعض پہلوؤں پر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بھی گفتگو کر چکے ہیں۔ اسلام نے اس معاملے میں عرب کے معروف کو قانون کی حیثیت دے دی تھی۔ اور یہ بات ہم دوسرے مقام میں لکھ چکے ہیں کہ جن معاملات کا تعلق معروف سے ہو وہ زمانہ اور حالات کے تغیر سے اپنے اصل مقصد کو باقی رکھتے ہوئے متغیر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً خوں بہا میں اونٹوں اور بکریوں کی جگہ نقد بھی دیا جا سکتا ہے اور نقد کی مقدار بھی معاشی حالات کی تبدیلی سے تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس تغیر کی نوعیت کو طے کرنا ارباب اجتہاد کا کام ہے اور سلف کے اجتہادات کی نظیریں اس باب میں موجود ہیں۔

غلام کا بدل

زیرِ بحث آیت میں توبہ کے طور پر غلام آزاد کرنے کا حکم بھی ہے۔ اس زمانے میں چونکہ غلامی ختم ہو چکی ہے اور یہ بات ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس کا ختم ہونا

عین منشائے اسلام کے مطابق ہوا ہے۔ اسی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ شخص کیا کرے جو غلام آزاد کرنے کی مقدرت تو رکھتا ہو لیکن غلام میسر نہیں ہیں اور شریعت نے اس کا کوئی بدل بھی معین نہیں فرمایا ہے۔ ہمارے نزدیک اس زمانے میں اس کا بدل صدقہ ہے جو غلام کی قیمت کے تناسب سے ہو اور اگر یہ صدقہ غریب و نادار مسلمانوں کے قرضوں کی ادائیگی اور ان کے رہن شدہ مکانوں اور سامانوں کے چھڑانے پر صرف کیا جائے تو انشاء اللہ یہ طریقہ شریعت کے منشا کے خلاف نہ ہوگا۔

تو بہ کی تاکید اور اس کے لوازمات

'تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا' کا ٹکڑا بھی خاص طور پر قابل غور ہے۔ ہم دوسرے مقام میں لکھ چکے ہیں کہ جب مفعول اس طرح فعل کے بغیر آئے تو اس پر خاص تاکید اور عزم کے ساتھ زور دینا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں خوں بہا کے ساتھ ساتھ ایک غلام آزاد کرنے اور غلام آزاد کرنے کی مقدرت نہ ہونے کی صورت میں مسلسل دو مہینے کے روزے رکھنے کی جو ہدایت ہوئی تو اس پر خاص تاکید کے ساتھ زور دیا کہ یہ خدائے علیم و حکیم کی طرف سے مقرر کردہ توبہ ہے، نہ کوئی اس کو شاق سمجھے، نہ اس کی خلاف ورزی کرے۔ قتل مومن، غلطی ہی سے سہی، عظیم گناہ ہے۔ اس گناہ کو دھونے کے لیے صرف خوں بہا کافی نہیں ہے بلکہ غلام بھی آزاد کیا جائے اور اگر اس کی مقدرت نہ ہو تو لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے جائیں تاکہ دل پر سے ہر داغ اس گناہ کا دھل جائے۔ گویا ایسے سنگین معاملے میں زبانی توبہ کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اس کے مؤیدات بھی ہونے ضروری ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۹۴)

دار الحرب کے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے مزید اہتمام

دار الحرب میں چھپے ہوئے مسلمانوں کے تحفظ ہی کے پہلو سے مزید ہدایت یہ ہوئی کہ جب کسی علاقے پر حملے کے لیے نکلو تو اس علاقے کے اندر جو مسلمان ہوں ان کے متعلق پوری تحقیق کر لو کہ مسلمان کہاں کہاں اور کس حال میں ہیں تاکہ تمہارے حملے سے وہ محفوظ رہیں۔ مزید ارشاد ہوا کہ اگر کوئی مسلمان اپنے ایمان کی شہادت کے لیے تمہیں سلام کرے تو مال غنیمت کی طمع میں اس کے ایمان کا انکار نہ کرو۔ مال غنیمت کے طالبوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خدا کے پاس غنیمت کے بڑے ذخیرے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ کل تک یہی حال تمہارا بھی رہ چکا ہے۔ تم بھی انھی مظلوموں کی طرح کفار کے

حصار میں گھرے ہوئے تھے۔ اب اللہ نے تمہیں دارالاسلام کی آزاد اور کھلی ہوئی فضا نصیب کی ہے تو تمہیں کسی احساسِ برتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اچھی طرح تحقیق کر کے اقدام کرنا چاہیے۔ اگر کسی نے اس معاملے میں بے پروائی اور سہل انگاری کو راہ دی یا مالِ غنیمت کی طمع میں کسی مسلمان کو قتل کر دیا تو یاد رکھو کہ خدا تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔

مومن کی جان کے احترام کی آخری حد یہی ہو سکتی ہے جو اس آیت سے ظاہر ہوتی ہے۔ دارالحرب میں عین دورانِ جنگ میں بھی اگر ایک شخص اپنے ایمان کے اظہار کے لیے سلام کر دے یا کلمہ پڑھ دے تو مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ بغیر تحقیق کے اس کے خلاف تلوار اٹھائے۔ جنگ کے ہنگامی حالات میں اس طرح کی تحقیق اگرچہ نہایت مشکل کام ہے اور یہ اندیشہ بھی ہے کہ اس سے دشمن فائدہ اٹھائے لیکن اسلامی غزوات میں اس ہدایت کی پوری پابندی کی گئی۔ ایک غزوہ میں ایک صحابیؓ سے اس معاملے میں بے احتیاطی ہو گئی تو حضورؐ نے اس طرح اس پر تنبیہ فرمائی کہ سننے والوں کے دل دہل گئے۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی غزوات کا اصل مقصود فتوحات حاصل کرنا اور مالِ غنیمت جمع کرنا نہیں تھا بلکہ، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، مظلوم مسلمانوں کو کفار کے پنجہ سے چھڑانا تھا۔ جب اصل مقصد یہ تھا تو اس کے لیے تو ہر خطرہ گوارا کیا جا سکتا تھا لیکن یہ بات کس طرح گوارا کی جا سکتی تھی کہ کسی مسلمان کی جان خطرے میں پڑے۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۹۵-۹۶)

اب یہ تمام غیر معذور مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا ہے۔ گویا آیت ۷۱ میں جہاں سے بات چلی تھی اور پھر جہاد سے جان چرانے والوں کا ذکر آگیا تھا، کلام پھر اسی طرف لوٹ آیا۔ فرمایا کہ جن مسلمانوں کے پاس کوئی معقول عذر نہیں ہے، پھر بھی وہ جہاد کے لیے نہیں اٹھ رہے ہیں انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ خدا کے ہاں اجر کے لحاظ سے ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکیں گے جو آج خدا کی راہ میں جان و مال دونوں سے جہاد کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس اعتبار سے دونوں گروہ اللہ کے ہاں اچھے اجر کے مستحق ہیں کہ دونوں اسلام کے مخلص ہیں، ان

میں سے منافق اور اسلام کا بدخواہ کوئی بھی نہیں ہے تاہم مجاہدین کا درجہ اللہ کے ہاں بہت اونچا ہے۔ ان کے لیے خدا کے ہاں اجر عظیم ہے۔

اس آیت نے جہاد کی ترغیب و تشویق کے ساتھ یہ بات بھی واضح فرما دی کہ اگرچہ وہ مسلمان جو بغیر کسی عذر و مجبوری کے جہاد میں عملاً حصہ نہیں لے رہے ہیں درجے اور مرتبے میں ان مسلمانوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو عملاً جہاد میں حصہ لے رہے ہیں، ان کے درجے خدا کے ہاں بہت بلند ہیں تاہم جہاد میں حصہ نہ لینے کی وجہ سے یہ منافق نہیں سمجھے جا سکتے۔ اس لیے کہ جہاد میں عملاً حصہ نہ لینا اس صورت میں نفاق ہے جب آدمی اس سے جی چرائے، دوسروں کی ہمت پست کرے یا جہاد کی نفیر عام ہو جانے کے باوجود گھر میں بیٹھا رہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو جہاد ایک فضیلت ضرور ہے جس کے حاصل کرنے کا جذبہ ہر شخص کے اندر ہونا چاہیے لیکن اس کی حیثیت ایک درجۂ فضیلت ہی کی ہے، یہ شرائط ایمان میں سے نہیں ہے کہ جو اس کو حاصل نہ کرے وہ منافق خیال کیا جائے۔ وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى کے الفاظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ اوپر منافقین کو اس جہاد ہی کے معاملے میں جس طرح ملامت کی گئی ہے اور ان سے مسلمانوں کو جس طرح متنبہ رہنے کی ہدایت کی گئی ہے اس سے بعض لوگوں کے اندر یہ تاثر پیدا ہو سکتا تھا کہ ان مخلص مسلمانوں کے بارے میں بھی ان کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا جو نہایت سچے مسلمان تھے لیکن اب تک جہاد میں حصہ نہیں لے سکے تھے۔ اس آیت نے ایک طرف تو ان کو جہاد پر ابھارا، دوسری طرف یہ واضح کر دیا کہ یہ مخلص مسلمان ہیں، ان کے اخلاص کے بارے میں کسی کو بدگمانی نہیں ہونی چاہیے، اللہ کے ہاں ان کے درجے اور مرتبے کے لحاظ سے ان کے لیے بھی اجر ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولٰٓئِكَ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيرًا ۝ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ۝ فَأُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُورًا ۝ وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝

(۹۷-۱۰۰)

جمع کے استعمال کا ایک خاص قرینہ

'توفّٰهم الملٰئكة' میں لفظ 'ملٰئكة' اسی طرح جمع آیا ہے جس طرح آلِ عمران کی آیات ۳۹، ۴۲ اور ۴۵ میں آیا ہے۔ وہاں 'فنادته الملٰئكة' کے تحت ہم اس کے جمع لانے کی وجہ بیان کر چکے ہیں۔ بعض مرتبہ جمع سے مقصود صرف جنس کا اظہار ہوتا ہے۔

'ظالمی انفسهم' حال ہے۔ اپنی جانوں پر ظلم سے مقصود یہاں ہجرت کی استطاعت کے باوجود دارالکفر میں پڑے رہنا اور اس طرح اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

سوال بطور زجر و توبیخ

'فیم کنتم' (تم کہاں پڑے رہے) یہ سوال زجر و توبیخ کی نوعیت کا ہے۔

'مراغم' کے معنی ایسی جگہ کے ہیں جہاں انسان نکل کے جا سکے۔

'مستضعف' کے معنی ہیں بے بس، مجبور، دبا ہوا، زیردست۔

تمام غیر معذور مسلمانوں کو ہجرت کا حکم

اب ان تمام غیر معذور مسلمانوں کو جو اب تک دارالحرب میں پڑے ہوئے تھے، ہجرت پر ابھارا ہے اور یہ گویا ان کے لیے آخری تنبیہ ہے۔ اس کی تمہید اس طرح اٹھائی ہے کہ جو لوگ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود بلا کسی شدید مجبوری و عذر شرعی، کے اب تک دارالکفر میں پڑے ہوئے ہیں، اسی حالت میں ان کی موت آئی تو فرشتے ان سے سوال کریں گے کہ یہ تم کس حال میں پڑے رہے؟ یہ جواب دیں گے کہ ہم تو بے بس و مجبور تھے۔ فرشتے جواب دیں گے، کیا خدا کی زمین میں تمہارے لیے کہیں سمائی نہیں تھی کہ تم وہاں ہجرت کر جاتے۔ پھر فرمایا کہ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو حقیقتاً بے بس اور معذور ہیں۔ فرمایا، خدا کے ہاں معذور صرف وہ مرد، عورتیں اور بچے قرار پائیں گے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ان کے لیے کوئی راہ کھل رہی ہے۔ یہ لوگ امید ہے کہ اللہ ان سے درگزر فرمائے گا۔

اس کے بعد ہجرت کی راہ میں کمر ہمت باندھ کر اٹھ کھڑے ہونے والوں کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ جو اللہ کی راہ میں ہجرت کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا وہ خدا کی زمین میں بہت ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا آخر میں یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ ہجرت کے اجر عظیم کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آدمی دارالہجرت میں پہنچ ہی جائے بلکہ صرف یہ کافی ہے کہ اللہ و رسول کی طرف ہجرت کے ارادے سے آدمی گھر سے نکل کھڑا ہو جو گھر سے نکل کھڑا ہوا اگر فوراً ہی اس کی موت آگئی یا وہ قتل کر دیا گیا تو اس سے اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اللہ کے اوپر اس کا اجر لازم ہو گیا۔

ان آیات سے ہجرت کے متعلق مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

ہجرت سے متعلق بعض حقائق

ایک یہ کہ ہر نقل مکانی ہجرت نہیں ہے۔ ہجرت یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسے مقام کو جہاں اس کے لیے اپنے دین و ایمان پر قائم رہنا جان جوکھوں کا کام بن گیا ہو، چھوڑ کر ایک ایسے مقام کو منتقل ہو جائے جہاں اسے توقع ہو کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کر سکے گا۔

دوسرا یہ کہ اگر دارالاسلام موجود ہو، اس کی طرف ہجرت کی راہ باز ہو، کوئی سخت مجبوری بھی نہ ہو تو ایسے مقام سے ہجرت کرکے دارالاسلام میں منتقل ہوجانا واجب ہے ورنہ ایسے شخص کا ایمان معتبر نہیں۔

تیسرا یہ کہ ہجرت کے معاملے میں ہر عذر، عذر نہیں ہے، معتبر عذر یہ ہے کہ آدمی اتنا بے بس ہو کہ نہ اس سے خود کوئی تدبیر بن آ رہی ہو نہ اس کے لیے کوئی راہ کھل رہی ہو۔ ایسی مجبوری میں بھی اس پر اپنے ایمان کی حفاظت بہرحال لازم ہے۔ اگرچہ اس کو اصحابِ کہف کی طرح کسی غار ہی میں پناہ لینی پڑجائے۔

چوتھا یہ کہ ہجرت کا اجر آخرت میں تو جو ہے وہ ہے، دنیا میں بھی مہاجر کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص مدد فراہم ہوتی ہے۔ خدا کی زمین اس کے لیے راہیں کھولتی ہے اور غیب سے اس کے لیے اسباب و سامان فراہم ہوتے ہیں۔

پانچواں یہ کہ اس راہ میں پہلا قدم بھی منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیت خالص اور ارادہ راسخ ہو تو گھر سے نکلتے ہی مہاجر کو موت آجائے تو ہجرت کا اجر اس کے لیے لازم ہوگیا۔

۳۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰۱-۱۰۴

آگے صلوٰۃ الخوف یعنی جنگ کے خطرات کے دوران نماز باجماعت کی شکل بتائی گئی ہے۔ جہاد کے اس ذکر کے ساتھ نماز بالخصوص نماز باجماعت، کے اس اہتمام سے کئی حقیقتیں سامنے آتی ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

جہاد کی اصل روح نماز ہے

پہلی یہ کہ اس سے نماز کی دین میں عظمت و اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس سورہ کی آیت ۷۷ کے تحت نماز اور جہاد کے باہمی ظاہری و باطنی تعلق پر ہم گفتگو کرچکے ہیں۔ یہاں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نماز وہ چیز ہے کہ جنگ کے خطرات کے اندر بھی یہ نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں جنگ، خونریزی اور لوٹ مار کے لیے نہیں ہے بلکہ جیسا کہ دوسرے مقامات میں واضح ہوچکا ہے، اس لیے ہے کہ خدا کی زمین سے اس ظلم و جبر کا خاتمہ کیا جائے جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی سے روکنے کے لیے اللہ کے دشمنوں کی طرف سے برپا کیا جاتا ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو جہاد کی اصل روح نماز ہی ہے۔ اسی سے جہاد، اللہ کی عبادت بنتا ہے۔ اگر اس کے اندر یہ روح نہ ہو تو یہ بھی اسی طرح فساد فی الارض ہے جس طرح اللہ کے باغیوں کی ہر جنگ فساد فی الارض ہے۔ اس روح کے تحفظ کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ عین میدان جنگ میں بھی تاحدِامکان نماز سے غفلت نہ ہو تاکہ ہر مجاہد کو اس حقیقت کی یاددہانی ہوتی رہے کہ اس کی میدانِ جنگ کی صفیں بھی اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے اس کی نماز کی صفوں سے مختلف نہیں ہیں۔

نماز باجماعت کی اہمیت

دوسری یہ کہ اس سے نماز باجماعت کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۹ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا الآیۃ کے تحت یہ بات بیان ہوچکی ہے کہ لڑائی کے دوران میں حالات بہت پرخطر ہوں،

نماز اس کے آداب کے مطابق ادا کرنی ممکن نہ ہو تو سوار، پیادہ، کھڑے، بیٹھے، چلتے، بھاگتے جس طرح ممکن ہو ادا کرنے کی کوشش کی جائے، یہاں تک کہ قبلہ رو ہونے کی پابندی بھی ضروری نہیں ہے لیکن ان سب رخصتوں کے ساتھ زیر بحث آیات سے یہ حقیقت بھی واضح ہو رہی ہے کہ اگر نماز باجماعت کا اہتمام ممکن ہو تو میدانِ جنگ میں بھی اس کا اہتمام باقی رکھا جائے چنانچہ اس کے لیے قرآن نے ایک ایسی شکل بیان فرمائی ہے جس سے نماز باجماعت کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے اور دفاع کا بھی۔

دفاع کی اہمیت

تیسری یہ کہ اس سے دفاع کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اول تو یہی بات اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے نماز جیسی اہم عبادت میں تخفیف فرما دی[1]۔ دوسری یہ کہ نماز کی جو شکل بیان فرمائی ہے اس میں اس امر کا پورا اہتمام ملحوظ ہے کہ دشمن کو اس سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پر حملہ کر دینے کا کوئی موقع نہ ملے۔ گویا اس مضمونِ جہاد کے آغاز میں مسلمانوں کو خُذُوا حِذْرَكُمْ (اپنے سامان دفاع سے لیس رہو) کا جو حکم دیا تھا تو اس کا اہتمام نماز میں بھی پوری طرح قائم رکھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دینِ فطرت میں توکل اور تدبیر، شجاعت اور حکمت، تہور اور احتیاط کا کیسا معتدل اور حسین امتزاج ہے کہ نماز بھی جہاد بن جاتی ہے۔

پیغمبر صلعم کے اقتداء کی اہمیت

چوتھی یہ کہ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کے جذبے اور اس کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ آگے ہم واضح کریں گے کہ نماز کی یہ خاص شکل جو یہاں بیان ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کی صورت میں صحابہؓ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ حضورؐ نماز باجماعت کی امامت کرائیں اور کوئی مسلمان اس جماعت کی شرکت سے محروم رہنے پر راضی ہو۔ صحابہؓ کا یہ جذبہ چونکہ فطری تھا اور دین میں اس جذبے کی اہمیت بالکل واضح ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نماز کی ایک ایسی شکل بیان فرما دی جس سے اس جذبے کی حوصلہ افزائی بھی ہو اور دفاع کے مقصد کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۰۱-۱۰۴ وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ
الصَّلَاةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكَافِرِينَ
كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ﴿١٠١﴾ وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ

---

[1] یہ امر ملحوظ رہے کہ نماز میں قصر کی رخصت اصلاً سفر جہاد کے تعلق ہی سے نازل ہوئی ہے۔ دوسرے سفروں میں اس کی حیثیت اصل کی نہیں بلکہ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے واضح ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک صدقے کی سی ہے۔ ہم اس پر آگے بحث کریں گے۔

فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا
فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا
مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ
تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً
وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى
اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ
قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ
كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَلَا تَهِنُوْا فِى ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ
اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ وَتَرْجُوْنَ مِنَ
اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾ ۱۵ ع ۱۲

ترجمۂ آیات ۱۰۱-۱۰۴

اور جب تم سفر میں نکلو تو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں قصر کرو۔ اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ کافر تمھیں فتنہ میں ڈال دیں گے۔ بے شک یہ کفار تمھارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ ۱۰۱

اور جب تم ان کے درمیان موجود ہو اور نماز میں ان کی امامت کر رہے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور وہ اپنے ہتھیار لیے ہوئے ہو، پس جب وہ سجدہ کر چکیں تو وہ تمھارے پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ آگے آئے جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے اور وہ تمھارے ساتھ نماز پڑھے اور یہ بھی اپنی حفاظت کا سامان اور اپنے اسلحہ لیے ہوئے ہوں۔ کافر یہ تمنا رکھتے ہیں کہ تم اپنے اسلحہ اور اپنے سامان سے

خدا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں اور اس بات میں تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں کہ اگر تمہیں بارش کے سبب سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو اپنے اسلحہ اتار دو البتہ اپنی حفاظت کا سامان لیے رہو۔ اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۱۰۲

پس جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے۔ پس جب حالت اطمینان میں ہو جاؤ تو پوری نماز قائم کرو۔ بے شک نماز اہل ایمان پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض ہے۔ ۱۰۳

اور دشمن کے تعاقب میں تھڑدلا پن نہ دکھاؤ۔ اگر تم دکھ اٹھاتے ہو تو آخر وہ بھی تمہاری ہی طرح دکھ اٹھاتے ہیں اور تم خدا سے وہ توقع رکھتے ہو جو توقع وہ نہیں رکھتے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔ ۱۰۴

۳۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا (۱۰۱)

نماز میں قصر کی اجازت دفاع کے تعلق سے

اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ نماز میں قصر کی یہ اجازت خُذُوْا حِذْرَكُمْ کے حکم کے تعلق سے نازل ہوئی۔ جب حکم ہوا کہ اپنے سامانِ دفاع سے لیس اور کفار کے مقابلے کے لیے مستعد رہو تو یہ سوال آپ سے آپ پیدا ہوا کہ اس حکم میں اور نماز میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی، کیونکہ نماز کی حالت میں دفاع کے لوازم پورے نہیں ہو سکتے، اس کے لیے ایک تو نماز میں قصر کی اجازت ہوئی اور آگے کی آیات میں نماز باجماعت اور بیماری اور بارش وغیرہ کے حالات میں جو شکلیں اختیار کی جانی چاہئیں وہ بیان ہوئیں۔

قصر کی شکل جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے عملی تواتر سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جو نمازیں چار رکعت والی ہیں وہ دو رکعت پڑھی جائیں، مغرب اور فجر میں قصر نہیں ہے۔

قصر کی اجازت ایک رخصت ہے

فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ قصر کی اجازت ایک قسم کی رخصت ہے۔ رخصتوں کے متعلق سورہ بقرہ کی تفسیر میں، ایک مستقل فصل میں، ہم واضح کر چکے ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھانے

کو تقویٰ کے خلاف سمجھنا دین میں تشدد اور غلو کے رجحان کی غمازی کرتا ہے جس کو قرآن و حدیث دونوں میں مذموم ٹھہرایا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی غلو سے خالی نہیں قرار دی جا سکتی کہ کسی رخصت کو عزیمت اور وجوب کا درجہ دے دیا جائے یہاں تک کہ اس کی خلاف ورزی سے گناہ لازم آئے۔ اس باب میں تفصیل کے طالب مذکورہ فصل پر ضرور ایک نظر ڈال لیں۔

قصر کی اجازت سفر جہاد ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے

قصر کی یہ اجازت اس میں شبہ نہیں ہے کہ نازل تو ہوئی ہے سفر جہاد ہی کے تعلق سے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ بس سفر جہاد ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ سفر کوئی بھی ہو اس میں فی الجملہ بے اطمینانی، آپا دھاپی اور سر و سامان کی فکر ہوتی ہی ہے۔ بس یہ فرق ہوتا ہے کہ کسی میں کم، کسی میں زیادہ۔ یہ عین ممکن ہے کہ جہاد کا ایک سفر زیادہ اطمینان سے گزر جائے اور تجارت یا حج کے سفر میں زیادہ الجھنیں پیش آ جائیں۔ اس اشتراکِ علت کی وجہ سے دوسرے سفر بھی اصلاً نہ سہی تبعاً اسی حکم میں داخل ہیں۔ چنانچہ اسی بنیاد پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے قسم کے سفروں میں بھی قصر کی اجازت دی۔ خود بھی اس پر عمل فرمایا اور صحابہ نے بھی اس پر عمل کیا۔

یہ بات بھی یہاں ملحوظ رکھنے کی ہے کہ الفاظ یہاں وَاِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (جب تم سفر میں نکلو) کے استعمال ہوئے ہیں جو ہر سفر کے لیے عام ہیں۔ اس میں سفر جہاد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ جہاد کے سفر کے لیے خاص لفظ اِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ (جب تم اللہ کی راہ میں نکلو) کا ہے جو آیت ۹۴ میں گزر چکا ہے۔ اس وجہ سے الفاظ کا تقاضا یہی ہے کہ قصر کی اجازت ہر سفر کے لیے عام ہو۔ رہی اس کے بعد اِنۡ خِفۡتُمۡ کی شرط تو وہ صرف آیت کے موقع نزول کے اعتبار سے اس علت کو ظاہر کر رہی ہے جس کے سبب سے یہ اجازت مرحمت ہوئی۔ اس سے یہ بات تو ضرور نکلتی ہے کہ یہ رخصت بہرحال رخصت ہے جو حالات کے تابع ہے لیکن یہ بات نہیں نکلتی کہ یہ سفر جہاد ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ تقریباً یہی صورت تعدد ازواج والے مسئلے میں بھی ہے جس کی بحث سورہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَاِذَا كُنۡتَ فِيۡهِمۡ فَاَقَمۡتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلۡتَقُمۡ طَآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ مَّعَكَ وَلۡيَاۡخُذُوۡۤا اَسۡلِحَتَهُمۡ فَاِذَا سَجَدُوۡا فَلۡيَكُوۡنُوۡا مِنۡ وَّرَآئِكُمۡ وَلۡتَاۡتِ طَآئِفَةٌ اُخۡرٰى لَمۡ يُصَلُّوۡا فَلۡيُصَلُّوۡا مَعَكَ وَلۡيَاۡخُذُوۡا حِذۡرَهُمۡ وَاَسۡلِحَتَهُمۡ ۚ وَدَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡ تَغۡفُلُوۡنَ عَنۡ اَسۡلِحَتِكُمۡ وَاَمۡتِعَتِكُمۡ فَيَمِيۡلُوۡنَ عَلَيۡكُمۡ مَّيۡلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِنۡ كَانَ بِكُمۡ اَذًى مِّنۡ مَّطَرٍ اَوۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤى اَنۡ تَضَعُوۡۤا اَسۡلِحَتَكُمۡ ۚ وَخُذُوۡا حِذۡرَكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا (۱۰۲)

حذر کا مفہوم

لفظ حِذۡر پر آیت ۷۱ کے تحت گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ لفظ جب تنہا استعمال ہو تو اس سے ہر قسم کے اسلحہ مراد ہو سکتے ہیں، خواہ مجرد دفاعی و حفاظتی نوعیت کے ہوں مثلاً سپر، خود اور زرہ وغیرہ یا جارحانہ نوعیت

کے ہوں مثلاً تلوار اور بندوق وغیرہ۔ لیکن جب لفظ اسلحہ، کے ساتھ استعمال ہو جیسا کہ زیر بحث آیت میں ہے اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ (اپنے اسلحہ رکھ دو اور اپنے احتیاطی و حفاظتی سامان لیے رہو) تو اس سے مراد صرف وہی چیزیں ہوں گی جن کو ایک سپاہی اپنے دشمن سے بچاؤ کے لیے استعمال کرتا ہے۔

دفاع اور نماز باجماعت کے تقاضوں میں تطبیق جب کہ امامت پیغمبر صلعم فرمائیں

اس آیت میں وہ شکل بیان ہوئی ہے جو نماز باجماعت کے لیے میدان جنگ میں اختیار کی جا سکتی ہے۔ میدان جنگ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کی صورت میں ایک مشکل یہ پیدا ہونے کا امکان تھا کہ قیام جماعت کے امکان کی شکل میں جب حضورؐ نماز کی امامت کے لیے کھڑے ہوتے، ہر سپاہی کی یہ آرزو ہوتی کہ وہ آپ ہی کی اقتدا میں نماز ادا کرے۔ یہ آرزو ایک فطری آرزو تھی جس کا لحاظ بھی ضروری تھا اور ساتھ ہی دفاعی تدبیروں کا اہتمام بھی ناگزیر تھا کہ دشمن مسلمانوں کی مصروفیت نماز سے فائدہ اٹھا کر اچانک کوئی حملہ نہ کر دے۔ یہ دونوں تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے قیام جماعت کی تدبیر یہ بتائی کہ ایک گروہ اسلحہ کے ساتھ امام کے پیچھے نماز کے لیے کھڑا ہو، دوسرا گروہ حفاظت کا فرض انجام دے، جب پہلا گروہ سجدہ کر چکے تو پیچھے ہٹ کر وہ حفاظت و نگرانی کا کام سنبھالے اور دوسرا گروہ، جس نے نماز نہیں پڑھی ہے، امام کے پیچھے اسی مسلح حالت میں نماز کے لیے کھڑا ہو۔

اس صورت میں نماز باجماعت کے قیام، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا اور دفاع، تینوں کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ لیکن مقتدیوں اور امام کی نماز کی رکعتوں کی تعداد کیا ہو گی؟ اس سوال کا جواب اس آیت سے پوری طرح واضح نہیں ہوتا جس کے سبب سے اس باب میں فقہا کی رائیں مختلف ہوئیں جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ ہمارے لیے یہ ساری تفصیل نہ یہاں پیش کرنے کی گنجائش ہی ہے، اور نہ چنداں اس کی ضرورت ہی ہے اس لیے کہ یہ شکل، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس مشکل کے حل کرنے کے لیے بتائی گئی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کی صورت میں پیدا ہو سکتی تھی۔ حضورؐ کے بعد کسی ایک ہی امام کی اقتدا کی خواہش نہ تو اتنی شدید ہو سکتی اور نہ اس کی اتنی اہمیت ہی ہے، اس وجہ سے دفاع کے تقاضوں کے مطابق اہل لشکر الگ الگ اماموں کی اقتدا میں نماز ادا کر سکتے ہیں۔

صلوٰۃ خوف کی شکل آیت ۱۰۲ کی روشنی میں

آیت کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ امام قصر نماز دو رکعت ادا کرے اور مقتدیوں کے دونوں گروہ ایک ایک رکعت امام کے پیچھے اور ایک ایک رکعت بطور خود ادا کر کے اپنی نماز پوری کریں۔ امام دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہونے سے پہلے اتنا توقف کرے کہ پہلی جماعت اپنی دوسری رکعت اختصار کے ساتھ ختم کر کے پیچھے ہٹ سکے اور دوسری جماعت اس کی جگہ لے سکے۔ اس طرح مقتدی اور امام دونوں کی دو دو رکعتیں ہوں گی۔

بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ امام چار رکعت پڑھے گا اور مقتدیوں کے دونوں گروہ دو دو رکعتوں میں اس کی اقتدا کریں گے۔ اس صورت میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ امام تو اتمام کرے گا اور مقتدی قصر کریں گے۔

حالانکہ قصر کی اجازت جس طرح مقتدیوں کے لیے ہے اسی طرح امام کے لیے بھی ہے۔ امام و مقتدی دونوں کے حالات بھی بعینہ ایک ہی طرح کے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں، امام دو رکعتیں ادا کرے گا اور مقتدیوں کے دونوں گروہ اس کے پیچھے ایک ایک رکعت ادا کر کے اپنی نماز ختم کر دیں گے۔ اس شکل میں مقتدیوں کی نماز صرف ایک رکعت کی ہو جاتی ہے حالانکہ قصر میں بھی کوئی نماز ایک رکعت نہیں ہے۔

ہمارے اس رجحان کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس طرح امام اور مقتدی دونوں کی نماز میں کامل توافق ہوگا، نیت کے اعتبار سے بھی اور ظاہر کے اعتبار سے بھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت میں فَاِذَا سَجَدُوْا کے الفاظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ایک رکعت مقتدیوں کو اپنے طور پر بھی ادا کرنی ہے۔ اگر یہ رکعت ادا نہ کرنی ہوتی یا امام کی اقتدا ہی میں ادا کرنی ہوتی تو فَاِذَا سَجَدُوْا کی جگہ فَاِذَا سَجَدَتْ کے الفاظ ہوتے۔ اس امر کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ سجدہ درحقیقت رکعت کی تعبیر ہے اس لیے کہ رکعت سجدہ ہی سے پوری ہوتی ہے۔

اس خاص شکل کا تعلق نبی صلعم کی موجودگی سے تھا

اس اشارے پر ہم بیان اکتفا کرتے ہیں۔ اس کی زیادہ تفصیل میں ہم اس لیے نہیں جانا چاہتے کہ ہمارے نزدیک باجماعت صلوٰۃ الخوف کی شکل لازماً ہر حالت میں اور ہر زمانے میں یہی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی سے تھا۔ آیت کے الفاظ میں خود اس کی تصریح موجود ہے۔ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ ظاہر ہے کہ یہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے۔ آپ کو مخاطب کر کے ارشاد ہو رہا ہے کہ جب تم موجود ہو اور لوگوں کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہو تب یہ شکل اختیار کی جائے۔ آنحضرت کی موجودگی میں اس شکل کے اختیار کرنے کی ضرورت وہی تھی جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ ہر شخص آپ کی اقتدا کا ثواب بھی حاصل کر سکے اور دفاع کے مقصد کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس زمانے میں اول تو جنگ کی صورت ہی بالکل تبدیل ہو چکی ہے۔ دوسرے حضورؐ کی موجودگی کا سوال بھی نہیں ہے۔ اس وجہ سے حالات کے تقاضے کے مطابق قیام جماعت کی جو شکل اختیار کی جائے وہ اختیار کی جا سکتی ہے اور اگر قیام جماعت کا امکان نہ ہو تو جس طرح ممکن ہو پڑھی جا سکتی ہے۔

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الاٰيۃ یہ وجہ بیان ہوئی ہے حالت نماز میں اس شدت کے ساتھ دفاع کے اس اہتمام کی۔ اس سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اسلام میں احتیاط کے تقاضوں سے بے پروا ہونے کی اجازت کسی حال میں نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بیماری اور بارش وغیرہ کی تکلیف کے سبب سے اگر اسلحہ اتارنے کے لیے مجبور ہونا پڑے تو صرف اسلحہ اتار سکتا ہے؛ حذر یعنی حفاظتی نوعیت کی چیزوں سے پھر بھی بے پروا ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ۔ الآیۃ کے ٹکڑے میں یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ ان کفار کی سرکوبی

کے لیے جہاں تک تمھارا تعلق ہے تم پوری طرح مستعد رہو۔ ویسے اللہ نے ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر ہی رکھا ہے۔ یہ بات اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کے لیے فرمائی گئی ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ
اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۱۰۳)

قصر کے کسر کا جبر ذکر الٰہی کی کثرت سے

قصر کی اجازت سے نماز کے ظاہر میں جو کمی واقع ہوئی تو نماز سے فراغت کے بعد اس کی اصل حقیقت — ذکر الٰہی — کے اہتمام میں زیادہ سرگرم ہونے کی ہدایت فرمائی تاکہ اس کسر کا جبر بھی ہو جائے اور دوام ذکر الٰہی، جو روح دین ہے، کی یاددہانی بھی ہو جائے۔ بالخصوص میدانِ جنگ میں اس کی خاص اہمیت اِس وجہ سے بھی ہے کہ تمام عزم و حوصلہ کا منبع درحقیقت اللہ تعالیٰ کی یاد ہی ہے۔

نبی صلعم کا مقرر کردہ فریضہ عین اللہ کا فریضہ ہے

حالتِ خوف دور ہو جانے کے بعد جب حالتِ امن و اطمینان عود کر آئے تو معاً اقامتِ صلوٰۃ کا حکم بھی عود کر آئے گا۔ یعنی پوری نماز، جماعت اور وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنی ہوگی۔ اس آیت سے ایک تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اوقات کی پابندی اقامتِ صلوٰۃ کے شرائط میں سے ہے۔ دوسری یہ بات نکلتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان پر جو کچھ فرض کیا ہے وہ عین اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ فریضہ ہے۔ یہ بات اس طرح نکلتی ہے کہ نمازوں کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ اوقات کے اہتمام کے ساتھ فرض ہیں۔ درآنحالیکہ اوقاتِ نماز تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ ہیں، قرآن میں ان کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کچھ اشارات ہیں۔

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ
اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۱۰۴)

القوم سے مراد دشمن

'القوم' کا لفظ، جب اِس سیاق و سباق میں آئے گا جس سیاق و سباق میں یہاں ہے تو اس سے مراد دشمن اور حریف ہوگا۔ کلام عرب میں اس مخصوص استعمال کی مثالیں بہت ہیں۔ قرآن میں بھی اس کی مثال موجود ہے۔ مثلاً اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ — ۱۴۰ - آل عمران (اگر تمھیں کوئی چوٹ پہنچی تو کوئی تعجب کی بات نہیں، آخر دشمن کو بھی اسی طرح کی چوٹ پہنچی)

ترغیب جہاد کے مضمون کی مزید تاکید

یہ اسی ترغیب جہاد کے مضمون کی تاکید مزید ہے جو اوپر سے چلا آ رہا ہے بلکہ یہاں صلوٰۃ الخوف کا ذکر بھی جیسا کہ ہم نے واضح کیا، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب یہ فرمایا کہ اگر تمھیں دشمن کے ہاتھوں کوئی نقصان پہنچ جائے تو اس سے بددل ہو کر اس کے تعاقب میں تمھیں پست ہمت نہیں ہونا چاہیے۔ نقصان جس طرح تمھیں پہنچتا ہے انھیں بھی پہنچتا ہے۔ اِس اعتبار سے تم اور وہ یکساں ہوئے رہی عاقبت کار کی کامیابی تو اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، وہ سو فی صد تمھاری ہی ہے، اس میں ان کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں ہے تو اس وقتی اور عارضی نقصان سے کیوں پست ہمت ہو۔

یاد رکھو کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔ اگر وہ اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کو کسی آزمائش میں ڈالتا ہے، ان کو کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے تو یہ چیز اس کے علم و حکمت کا تقاضا ہوتی ہے جس سے اہل ایمان کی اصلاح و تربیت مقصود ہوتی ہے۔

۲۲- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۰۵-۱۱۵

آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ ہدایت فرمائی کہ اللہ نے تمہیں جو کتاب عطا فرمائی ہے اب یہی حق و باطل کی کسوٹی ہے، تم اسی کسوٹی پر پرکھ کے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرو جو اس پر پورے اتریں وہ مومن و مخلص ہیں، جو اس پر کھوٹے ثابت ہوں وہ عہد شکن اور غدار ہیں، تم خدا کے حضور میں ان کے سفارشی اور وکیل نہ بنو۔ خدا ایسے بدعہدوں اور گناہگاروں کو پسند نہیں کرتا۔ آیت ۸۸ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ الآیۃ میں جس بات کی طرف اجمالاً اشارہ فرمایا تھا اب یہ اس کی تفصیل آگئی۔ وہاں یہ بات گزر چکی ہے کہ مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے دل میں منافقین کے لیے بڑا نرم گوشہ رکھتے تھے، وہ ان کو جا و بیجا رعایت دینے کی کوشش کرتے اور بسا اوقات ان معاملات میں بھی انھیں معذور ٹھہراتے جن میں معذور ٹھہرانے کی کوئی بھی گنجائش نہ ہوتی۔ یہ رویہ اگرچہ طبیعت کی نرمی ہی کی بنا پر ہو لیکن خدا کی کتاب جنھیں معذور نہ ٹھہراتی ہو انھیں معذور ٹھہرانا اور ان کی حمایت کرنا نفاق کو شہ دینے بلکہ اس کی پرورش کرنے کے ہم معنی ہے۔ چنانچہ یہاں سب سے پہلے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چیز سے روکا۔ حضورؐ کی طرف یہ خطاب اسی طرح کا ہے جس کی مثالیں ایک سے زیادہ اس کتاب میں گزر چکی ہیں اور ہم نے واضح کیا ہے کہ ان میں خطاب کا رُخ تو حضورؐ کی طرف ہوتا ہے لیکن جو عتاب ان میں مضمر ہوتا ہے اس کا رُخ اُن لوگوں کی طرف ہوتا ہے جو اس غلطی کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرنے کے بعد براہِ راست ان منافقین کی حمایت کرنے والے مسلمانوں کو مخاطب کیا کہ اس دنیا میں تو تم ان کی حمایت کر رہے ہو لیکن آخرت میں ان کی حمایت کون کرے گا؟ اس کے بعد فرمایا کہ صحیح طریقہ نہ تو یہ ہے کہ اپنی غلطی کی حمایت کی جائے اور نہ یہ ہے کہ جب کسی پر گرفت ہو تو وہ اپنا بوجھ کسی دوسرے بے گناہ پر لادنے کی کوشش کرے، بلکہ توبہ و استغفار ہے۔ یہ تنبیہ اس لیے فرمائی گئی کہ منافقین اول تو اپنی کوئی غلطی تسلیم کرتے ہی نہیں تھے اور اگر کوئی غلطی اس طرح گرفت میں آجاتی کہ اس کی ذمہ داری سے بچنے کی کوئی سبیل ان کو نظر ہی نہ آتی تو جھوٹ اور بہتان کے ذریعے سے اس کو کسی بے گناہ کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ محض اللہ کا فضل و احسان اور اس کی

بخشی ہوئی کتاب و حکمت کی برکت ہے کہ ان منافقین کے فتنوں اور ان کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہے ورنہ انھوں نے تو تمھیں راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

اس کے بعد منافقین کی مفسدانہ سرگرمیوں پر ان کو تنبیہ فرمائی ہے کہ جو لوگ حق واضح ہو جانے کے بعد رسول کی عداوت اور مسلمانوں کے طریقہ کی مخالفت میں یہ سرگرمیاں دکھا رہے ہیں ان کو اللہ اسی راہ پر موڑ دے گا جو انھوں نے اپنے لیے اختیار کی ہے اور یہ راہ جہنم کی راہ ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَـٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ آیات
أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴿۱۰۵﴾ وَٱسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ ۖ ۱۰۵-۱۱۵
إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿۱۰۶﴾ وَلَا تُجَـٰدِلْ عَنِ ٱلَّذِينَ يَخْتَانُونَ
أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿۱۰۷﴾ يَسْتَخْفُونَ
مِنَ ٱلنَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ
مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ ٱلْقَوْلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿۱۰۸﴾
هَـٰٓأَنتُمْ هَـٰٓؤُلَآءِ جَـٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فَمَن
يُجَـٰدِلُ ٱللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَـٰمَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿۱۰۹﴾
وَمَن يَعْمَلْ سُوٓءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُۥ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ يَجِدِ
ٱللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَن يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُۥ
عَلَىٰ نَفْسِهِۦ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَن يَكْسِبْ
خَطِيٓـَٔةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِۦ بَرِيٓـًٔا فَقَدِ ٱحْتَمَلَ بُهْتَـٰنًا
وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿۱۱۲﴾ ع وَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُۥ لَهَمَّت ع ۱۶ ۱۴
طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ أَن يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ ۖ وَمَا

يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿١١٣﴾ الثلثة
لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىھُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ
اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ
اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١١٤﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ
مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ
نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿١١٥﴾ ع ۱۷

ترجمۂ آیات ۱۰۵-۱۱۵

ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمھیں دکھایا ہے اور تم بدعہدوں کے حمایتی نہ بنو۔ اور اللہ سے مغفرت مانگو، بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ اور ان لوگوں کی وکالت نہ کرو جو اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو بدعہد اور حق تلف ہیں۔ یہ لوگوں سے تو چھپتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے حالانکہ وہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ وہ ناپسندیدہ سرگوشیاں کرتے ہیں اور اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ۱۰۵-۱۰۸

یہ تم ہو جنھوں نے دنیا کی زندگی میں ان کی مدافعت کی تو قیامت کے دن اللہ سے کون ان کی مدافعت کرے گا یا کون ان کا ذمہ دار بنے گا اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرے یا اپنی جان پر کوئی ظلم ڈھائے، پھر اللہ سے مغفرت چاہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا، رحم کرنے والا پائے گا اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا وبال اسی

پڑا تا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے اور جو کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کرتا ہے پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگاتا ہے تو اس نے اپنے سر ایک بہت بڑا بہتان اور گناہ لیا۔ ۱۰۹-۱۱۲

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو یہ ٹھان ہی لی تھی کہ تمہیں بے راہ کر کے رہے گا حالانکہ یہ اپنے آپ ہی کو بے راہ کر رہے ہیں، تمہارا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں۔ اور اللہ نے تم پر کتاب و حکمت نازل فرمائی اور تمہیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے۔ ۱۱۳

ان کی سرگوشیوں کا زیادہ حصہ ایسا ہے جس میں کوئی خیر نہیں۔ خیر والی سرگوشی تو صرف اس کی ہے جو صدقہ کی صلاح دے یا کسی نیکی کی راہ سجھائے یا اصلاح ذات البین کی دعوت دے۔ جو اللہ کی رضا جوئی میں ایسا کریں گے تو ہم ان کو اجر عظیم عطا فرمائیں گے اور جو کوئی راہ ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا اور مسلمانوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے گا تو ہم اس کو اسی راہ پر ڈالیں گے جس پر وہ پڑا اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ ۱۱۴-۱۱۵

۲۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ۝ وَٱسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ وَلَا تُجَٰدِلْ عَنِ ٱلَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ۝ يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱلنَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ ٱلْقَوْلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا (۱۰۵-۱۰۸)

'اراءت' کا مفہوم

اراءت' کا لفظ قرآن میں اس وحی کے لیے بھی آیا ہے جو انبیاء علیہم السلام کو رویا میں ہوتی ہے جیسا کہ

انفال آیت ۴۳ میں ہے اور اس رہنمائی کے لیے بھی آیا ہے جو وحی متلو کے ذریعے سے ہوتی ہے، جیساکہ اس آیت میں ہے۔ اس لفظ کے معنی چونکہ دکھا دینے کے ہیں اس وجہ سے اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ پیغمبر کو وحی کے ذریعے سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ گویا چشم سر سے حقائق کا مشاہدہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے اس سے ہٹ کر کوئی راہ اختیار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آگے آیت ۱۱۳ میں بھی یہ مضمون آ رہا ہے۔

لفظ مجادلہ اچھے اور برے دونوں معنوں میں

مجادلہ کا لفظ قرآن میں اچھے اور برے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ اس کے معنی مناظرہ، کٹ حجتی اور جھگڑنے کے بھی ہیں اور اعتماد و تذلل کی بنیاد پر کسی سے شکوہ کرنے اور اصرار و الحاح کے ساتھ کسی کے حق میں سفارش کرنے کے بھی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا مجادلہ قوم لوطؑ کے بارے میں اور سورۂ مجادلہ میں جس مجادلہ کا ذکر ہے وہ اسی نوع کا ہے۔

منافقت خود اپنے ضمیر سے خیانت ہے

'اَلَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ' سے مراد منافقین ہیں جن کا ذکر 'خائنین' کے لفظ سے ہوا ہے۔ خیانت اس بے وفائی اور غداری کے لیے ایک معروف لفظ ہے جو بیوی اپنے شوہر سے کرتی ہے جس طرح ایک بے وفا عورت اپنے آپ کو جائز عقد میں تو کسی اور مرد کے دیتی ہے لیکن عشق کی پینگیں کسی اور کی طرف بڑھاتی ہے اسی طرح منافقین اطاعت و وفاداری کا عہد تو اللہ اور رسول سے کرتے ہیں لیکن دم دوسروں کا بھرتے ہیں۔ ان کی اس خیانت کی بابت ارشاد ہوا کہ یہ خود اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں اس لیے کہ ان کی اس خیانت سے خدا اور رسول کا کچھ نہیں بگڑتا، بگڑتا انہی کا ہے لیکن ان کو نظر نہیں آتا۔ علاوہ ازیں اس میں یہ پہلو بھی ہے کہ یہ خود اپنے ضمیر کی نگاہ میں مجرم ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ یہ سامنے کیا کر رہے ہیں اور پیٹھ پیچھے کیا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی وکالت کرنا 'مدعی سست گواہ چست' کا مصداق بنتا ہے۔

خطاب پیغمبر سے، عتاب دوسروں پر

'وَلَا تَکُنْ'، 'وَاسْتَغْفِرِ اللّٰہَ' اور 'وَلَا تُجَادِلْ' میں بظاہر خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں عتاب کا رُخ ان مسلمانوں کی طرف ہے جو منافقین کی حمایت کرتے تھے۔ اس طرح کے خطاب جیسا کہ ہم اس کتاب میں متعدد مقامات میں واضح کر چکے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت اُمّت کے وکیل کے ہوتے ہیں۔ بات آپ کو مخاطب کر کے کہی جاتی ہے لیکن مقصود یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ یہ حرکتیں کر رہے ہیں وہ ان سے باز آئیں۔ اس اسلوب میں یہ بلاغت بھی ہوتی ہے کہ ان لوگوں سے ایک قسم کی بے التفاتی و بے پروائی کا اظہار ہو جاتا ہے جن کو سرزنش مقصود ہوتی ہے۔ گویا وہ لائق خطاب نہیں اس وجہ سے اللہ نے اپنے رسولؐ کو مخاطب کر کے جو بات فرمانی تھی وہ فرما دی۔ قرآن مجید میں اس طرح کے جو خطاب وارد ہوئے ہیں بالعموم کلام کے تدریجی ارتقا سے اُن کا اصلی رُخ بھی واضح ہو گیا ہے کہ خطاب فی الحقیقت کن سے ہے۔ چنانچہ یہاں بھی آگے

والی آیت هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ الآیۃ نے واضح کر دیا ہے کہ اس میں اشارہ کن کی طرف ہے۔

اللہ اور رسول ایمان کا معیار پسند ناپسند الگ الگ نہیں ہو سکتا

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الآیۃ کے اسلوب میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ اور رسول اور مومنین کی پسند اور ناپسند کا معیار الگ الگ نہیں ہو سکتا۔ جن صفات و کردار کے لوگوں کو اللہ پسند نہیں کرتا، کس طرح ممکن ہے کہ رسول اور مومنین انھیں پسند کریں۔ اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ان لوگوں کو بھی پسند کرتے ہیں جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں تو وہ خود سوچ لیں کہ ان کی یہ بات کہاں تک پہنچتی ہے۔

مومن و منافق کے درمیان امتیاز کے لیے کسوٹی قرآن ہے

اجزائے کلام کی وضاحت کے بعد آیات کا مدعا چنداں وضاحت طلب نہیں رہا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے کتاب جو اتاری ہے حق کے ساتھ اتاری ہے، اس وجہ سے اب حق و باطل کے درمیان امتیاز کے لیے کسوٹی یہی ہے، اسی کسوٹی پر پرکھ کر تمھیں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا ہے کہ کون حق پر ہے کون باطل پر، کون مخلص ہے کون منافق۔ یہ اللہ کی دی ہوئی روشنی اور اس کی دکھائی ہوئی راہ ہے جس کے بعد تمھارے لیے بھٹکنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس وجہ سے تم ان لوگوں کے حامی اور وکیل نہ بنو جو اللہ اور رسول سے بدعہدی اور خیانت کر رہے ہیں۔ تم اللہ سے مغفرت مانگو، اللہ بڑا غفور رحیم ہے۔ جو لوگ اللہ سے بدعہدی کر رہے ہیں وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں بلکہ خود اپنے ہی نفس سے بدعہدی کر رہے اور اپنے ہی قلب و ضمیر کے مجرم ہیں۔ خدا ایسے بدعہدوں اور حق تلفوں کو پسند نہیں کرتا۔ تو جو خود اپنے ضمیر کی عدالت میں مجرم اور خدا کے مبغوض ہیں، ان کی مدافعت تم کیوں کرو؟ فرمایا کہ یہ انسانوں سے تو چھپتے ہیں اور چھپ چھپ کر اللہ و رسول کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہیں لیکن اس اللہ سے کہاں چھپ سکتے ہیں جو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ اپنی ناپسندیدہ سرگوشیوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ اللہ کا علم تو ہر چیز کو محیط ہے۔

ان منافقین کی درپردہ سازشوں اور سرگوشیوں کا ذکر اسی سورہ کی آیت ۸۱ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں بھی دیکھیے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاءاللہ سورۂ مجادلہ میں ہوگی۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰي نَفْسِهٖ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓــًٔـا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا (۱۰۹-۱۱۲)

'ھا' کلمہ تنبیہ ہے

'ھَا' عربی میں کلمۂ تنبیہ ہے۔ اس پر دوسرے مقام میں بحث گزر چکی ہے۔ یہ جملہ کے شروع میں آتا ہے اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کان کھول کر بات سنے۔

لفظ وکیل کے تین معنی

لفظ 'وکیل' کے ساتھ جب 'علیٰ' ہو تو موقع کے لحاظ سے یہ تین معنوں میں آتا ہے۔

۱۔ مسئول اور ذمہ دار کے معنی میں۔ مثلاً وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۱۰۷ انعام۔

(ہم نے تم کو ان پر نگران نہیں بنایا ہے اور تم ان کے ایمان کے باب میں مسئول نہیں ہو)

۲۔ نگران کے معنی میں۔ مثلاً خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۱۰۲ انعام (وہ ہر چیز کا خالق ہے، پس اسی کی بندگی کرو اور وہی ہر چیز پر نگران ہے)

۳۔ ضامن کے معنی میں۔ مثلاً أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ۲۸ قصص (دونوں میں سے جو مدت بھی میں پوری کر دوں تو مجھ پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی اور ہم جو قول و اقرار کر رہے ہیں اس پر اللہ ضامن ہے)

ظاہر ہے کہ أَمْ مَنْ يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا میں یہ پہلے معنی میں ہے۔ یعنی آج تو ان کی حمایت کرنے والے ان کی حمایت میں لڑ جھگڑ سکتے ہیں لیکن قیامت کے دن جب خدائے علیم و خبیر کی عدالت میں ان کا مقدمہ پیش ہوگا تو ان کی طرف سے کون مسئول اور جواب دہ بن کر کھڑا ہوگا۔ اس دن تو بہر حال انھیں خود ہی جواب دہی کرنی ہوگی۔

منافقین کی حمایت کرنے والوں سے خطاب

اب بات سامنے کھل کر آ گئی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے اوپر کی آیات میں کن کے رویے پر سرزنش کی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم شخصاً نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر منافقین کی حمایت میں آستینیں چڑھا لیتے اور ان کی صریح غلطیوں کے باوجود ان کی برأت کے لیے کوئی نہ کوئی عذر تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ لوگو، کان کھول کر سن لو کہ آج تو تم ان کی حمایت میں لڑ جھگڑ سکتے ہو لیکن کل جب خدا کے ہاں ان کی ردبکاری ہوگی تو خدا سے ان کی مدافعت میں کون جھگڑنے گا یا کون ان کی طرف سے مسئول بنے گا۔ اس کے بعد فرمایا کہ خدا سے چھوٹنے کا راستہ یہ نہیں ہے کہ مجرم کی حمایت میں دوسرے پشت پناہ بن کر کھڑے ہوں بلکہ یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی برائی یا کسی ظلم نفس (شرک) کا ارتکاب ہو جائے تو وہ اللہ کی طرف رجوع کرے اور اس سے مغفرت مانگے، جو شخص خلوص کے ساتھ استغفار کرے گا وہ اللہ کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا۔ خدا کے ہاں ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا، جو کسی گناہ کا مرتکب ہوگا اس کا وبال اسی پر آئے گا، اس لیے کہ خدا علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔ اس کے علم اور اس کے عدل و حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ زید کا حساب بکر کے کھاتے میں نہ پڑنے پائے بلکہ ہر ایک اپنے عمل کا جواب دہ خود بنے۔

سازشی گروہ کا ایک شاخسانہ

وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً الآیۃ' میں منافقین کی ایک اور شرارت سے پردہ اٹھایا کہ یہ لوگ اپنی کسی غلطی یا کسی حق تلفی پر جب گرفت میں آ جاتے ہیں تو اعتراف کے بجائے جھوٹ اور بہتان کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس کا بوجھ کسی بے گناہ پر لادنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرمایا کہ خدا سے برأت کا یہ راستہ بھی غلط ہے۔ اس بہتان اور جھوٹ سے دنیا کو دھوکا دیا جا سکتا ہے، خدا کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ خدا کے ہاں ایسے مجرم نہ صرف اپنے جرم کا بوجھ اٹھائیں گے بلکہ اپنے اصل جرم پر بہتان اور جھوٹ کا بھی اضافہ کر لیں گے۔

یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ اوپر منافقین کی سازشوں اور سرگوشیوں کا ذکر گزر چکا ہے۔ سازشی گروہوں کا خاص حربہ اپنے دفاع کے لیے یہی ہوتا ہے کہ جب وہ پکڑے جاتے ہیں تو اس کا الزام یا تو دوسرے بے گناہوں کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں یا کم از کم ان کو بھی اس میں ملوث کرنے کے لیے بہتان طرازی کرتے ہیں تاکہ اپنا بار گناہ کچھ ہلکا کر لیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (۱۱۳)

آنحضرت صلعم کی طرف التفات اور مسلمانوں کو آگاہی

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات اور آپ کے واسطے سے مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ یہ اللہ کا تمہارے اوپر خاص فضل و احسان ہے کہ تم ان منافقین کے شر سے محفوظ رہے ورنہ ان کی ایک جماعت کی تو رات دن کوشش اور سازش رہی ہے کہ تمہیں راہ سے بے راہ کر کے رہے لیکن اللہ نے اپنے فضل خاص سے تمہیں کتاب و حکمت کی جو روشنی عطا فرمائی ہے اس نے تمہیں لغزش سے محفوظ رکھا۔ اس میں مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ اس گروہ کی آفتوں اور فتنوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں اور ساتھ ہی اس سے محفوظ رہنے کی تدبیر بھی بتا دی کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کتاب و حکمت کی جو نعمت ان کو ملی ہے اس کی سچے دل سے قدر کریں اور ان لوگوں کے چکموں میں نہ آئیں جو اس سے ہٹ کر اپنی راہ نکال رہے ہیں۔

راہ حق سے ہٹ کر چلنے والے خود اپنے کو گمراہ کرتے ہیں

'وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ' میں اس حقیقت نفس الامری کا بیان ہے کہ راہِ حق سے منحرف ہو کر چلنے والے اگر راہِ حق پر چلنے والوں کو حق سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو پھر وہ اپنی تمام دانش فروشیوں کے باوجود صرف اپنے ہی کو گمراہ کرتے ہیں، جادۂ حق پر استوار رہنے والوں کو وہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے موقف حق پر ڈٹے ہوئے دیکھتے رہو کہ یہ تباہی کے کس کھڈ میں جا گرتے ہیں۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىھُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا (۱۱۴ - ۱۱۵)

نجویٰ کا صحیح محل اور اس میں خیر و شر کا پہلو

نجویٰ کے معنی سرگوشی اور راز داری کے انداز میں کسی سے بات کرنے کے ہیں۔ اس میں بجائے خود کوئی برائی نہیں ہے اس لیے کہ ایسے مواقع بہت سے ہو سکتے ہیں جہاں راز داری اور سرگوشی کا طریقہ ہی قرین مصلحت ہو۔ ہر جگہ اور ہر موقع پر اذان دینا ہی ضروری نہیں ہے۔ اس میں برائی یا بھلائی بات کی نوعیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر بات نیکی اور تقویٰ کی ہے تو وہ نجوائے خیر ہے اور اگر بات شرارت اور فتنے کی ہے تو وہ نجوائے شیطانی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی وضاحت سورۂ مجادلہ میں فرما دی ہے۔ 'يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ

فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ۹ (اے ایمان والو، جب تم آپس میں رازداری کے ساتھ بات کرو تو گناہ اور تعدی کی مشورت نہ کرو بلکہ نیکی اور تقویٰ کی بات کرو)

نجویٰ نیک مقاصد سے

'اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ' میں ایک مضاف محذوف ہے جس طرح 'وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ' میں ہے، جس کا ذکر بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یعنی ان کا نجویٰ تو بیشتر شیطانی ہوتا ہے البتہ ان کے نجویٰ میں خیر ہے جو صدقہ، نیکی اور اصلاح کے لیے نجویٰ کریں۔

'مشاقۃ' اور 'الھدٰی' کا مفہوم

'مشاقۃ' اور 'الھدٰی' کے الفاظ پر سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ رسولؐ کے ساتھ 'شاقۃ' کے معنی ہیں رسول کے مقابل میں اپنی ایک پارٹی کھڑی کرنے کی کوشش کرنا اور 'الھدٰی' کے معنی 'ھُدَی اللّٰہ' یعنی اللہ کی ہدایت کے ہیں جس طرح 'الکتٰب' کے معنی کتاب اللہ کے۔

'سبیل المؤمنین' سے مراد

'سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ' میں مومنین سے مراد صحابۂ رسولؐ ہیں۔ انھوں نے زندگی کا جو طریقہ اختیار کیا وہ سرتاسر ہدایت الٰہی پر مبنی تھا اس وجہ سے اس کی اتباع ہی اللہ اور رسولؐ کی اتباع ہے اس سے ہٹ کر کوئی راہ نکالنا گمراہی ہے۔

'نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی' کا اسلوب

'نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی' میں وہی اسلوب ملحوظ ہے جو 'فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ' میں ہے یعنی جو لوگ اہل ایمان کے راستہ سے ہٹ کر کوئی راہ نکالنے کی کوشش کریں گے خدا ان کو اسی راہ پر موڑ دے گا جس پر وہ جانا چاہتے ہیں۔ حق کے ترک و اختیار کے معاملے میں خدا کے ہاں جبر نہیں ہے جو خدا کی راہ پر چلنا چاہتا ہے اللہ اس کو اس کی توفیق ارزانی فرماتا ہے، جو اس سے الگ ہو کر اپنی پسند کردہ کوئی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے لیے بھی اس کو ڈھیل دے دیتا ہے۔

منافقین کی سرگوشیوں کی نوعیت

اوپر آیت ۱۰۸ میں 'اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ' کے الفاظ سے منافقین کی جن سرگوشیوں اور سازشوں کی طرف اشارہ فرمایا تھا اب یہ اس کی وضاحت ہو رہی ہے کہ ان کی سرگوشیوں کا اکثر حصہ خیر سے بالکل خالی محض فتنہ و فساد کی باتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بابرکت سرگوشی تو وہ ہو سکتی ہے جو صدقے کی ترغیب، نیکی کی تشویق اور باصلاح ذات البین کے مقصد سے ہو اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے در پردہ ان اعلیٰ مقاصد کے لیے کام کریں اللہ ان کو بڑا اجر دے گا۔

اس کے بعد فرمایا کہ جو لوگ یہ اچھی طرح سمجھ چکنے کے بعد کہ رسول جس طریق ہدایت کے داعی ہیں یہ اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت ہے، رسول کی مخالفت کر رہے ہیں اور اہل ایمان کے اختیار کیے ہوئے طریقے کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں اللہ ان کو ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دے گا اور یہ اس راہ سے سیدھے جہنم میں پہنچ جائیں گے جو نہایت برا ٹھکانا ہے۔

ان دونوں آیتوں پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے نہایت بلیغ اسلوب سے ان منافقین کے نجویٰ کی نوعیت بھی واضح کر دی ہے اور اس کا مقصد بھی بے نقاب کر دیا ہے، جب یہ فرمایا کہ ان کے

نجوٰی میں کوئی خیر نہیں، بجز اس کے کہ خیر تو ان کا نجوٰی ہے جو صدقہ پر ابھاریں، معروف پر چلنے کی ترغیب دیں اور اصلاح ذات البین کی کوشش کریں تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل آئی کہ یہ لوگ جو سرگوشیاں کرتے ہیں اس میں یہ لوگوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتے ہیں، معروف کے بجائے منکر کی ترغیب دیتے ہیں اور اصلاح ذات البین کے بجائے مسلمانوں میں نفاق ڈلوانے کی سازش کرتے ہیں۔

اسی طرح جب یہ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی ہدایت اچھی طرح واضح ہو چکنے کے بعد رسول کی اور اللہ کی ہدایت کی مخالفت کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے راستہ سے الگ اپنی ایک پگڈنڈی نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں اللہ ان کو ان کی پسند کردہ راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دے گا جو ان کو سیدھے جہنم میں لے جا کے گرائے گی تو گویا یہ واضح کر دیا کہ ان لوگوں کی ان تمام سازشوں اور سرگوشیوں کا مدعا درحقیقت یہ ہے کہ یہ رسول کے بالمقابل اپنی ایک الگ پارٹی بنانا، ہدی اللہ کے بالمقابل اپنی ایک علیحدہ ڈگر نکالنا اور طریقۂ مومنین کے بالمقابل طریقۂ جاہلیت کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔

میں جب یہ آیتیں پڑھتا ہوں تو میرا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو ان منافقین کی حمایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین مخلصین سے بحثیں اور مناظرے کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان منافقین کی ان خفیہ مجلسوں اور درپردہ سازشوں کی اطلاعات جب حضورؐ کو اور صحابہؓ کو پہنچتی رہی ہوں گی تو ان پر کسی نہ کسی نوعیت سے گرفت بھی ہوتی رہی ہو گی۔ اس وقت اُن کے یہ حمایتی جن کا اوپر ذکر ہُوا، ان کی صفائی میں کہتے رہے ہوں گے کہ یہ لوگ تو بڑے مخلص ہیں، یہ تو ملت کے بڑے ہوا خواہ ہیں، ان کی مجلسوں میں جو باتیں ہوتی ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں کی بہبود اور خیر خواہی کی ہوتی ہیں اور اگر اس ذیل میں کوئی ایسی بات گرفت میں آتی رہی ہو گی جس کا جواب نہ بن آتا ہو گا تو اس کا الزام، جیسا کہ اُوپر اشارہ گزرا، کسی ایسے بھلے مانس پر تھونک دیتے رہے ہوں گے جس کے حاشیہ خیال میں بھی وہ بات کبھی نہیں آئی ہو گی۔ ان لوگوں کی اس وکالت کے جواب میں قرآن نے نہایت بلیغ طریقے سے ان اندرونِ خانہ سرگوشیوں سے پردہ اُٹھایا اور دیکھیے کتنی خوبصورتی سے پردہ اٹھایا ہے کہ ساری بات بھی سامنے آ گئی اور مخاطب کے لیے کسی بحث و تردید کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی۔

۲۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۱۶-۱۲۶

آگے پہلے وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ یہ منافقین جو اللہ کی ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد رسول کی مخالفت اور مومنین کی راہ سے الگ اپنی راہ نکالنا چاہتے ہیں جہنم میں پڑیں گے تو کیوں پڑیں گے؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ کی ہدایت کے خلاف کوئی راہ اختیار کرنا، خدا کے رسولؐ کے خلاف اپنی پارٹی کھڑی کرنا اور مومنین کے راستے سے الگ راہ نکالنا اپنی حقیقت کے لحاظ سے شرک ہے اور

اللہ تعالیٰ کا شرک کے متعلق یہ فیصلہ ہے کہ وہ اس کو معاف فرمانے والا نہیں۔

شرک کی حقیقت — اس کے بعد شرک کے ذکر کے تعلق سے شرک کی حقیقت واضح فرمائی کہ جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ درحقیقت شیطان کے پیرو ہیں۔ اس نے ان کے لیے آرزوؤں کے جو پرفریب دام بچھائے ہیں اس میں وہ پھنس گئے ہیں اور جو کچھ وہ انھیں سجھاتا ہے بالکل اندھے بہرے ہو کر اس کی تعمیل کر رہے ہیں حالانکہ اس کے تمام وعدے بالکل فریب ہیں۔ ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے جس میں داخل ہونے کے بعد اس سے ان کو نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

فوز و فلاح توحید — پھر اہل توحید کی فوز و فلاح کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ بے شک خدا کی ابدی بہشت میں داخل ہوں گے صرف اہل توحید کے لیے — اور ان کے لیے اللہ کے جو وعدے ہیں وہ شیطان کے وعدوں کی طرح محض فریب نہیں ہیں بلکہ سرتاسر حقیقت ہیں اور خدا کی بات سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے!

خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ایمان و عمل صالح — اس کے بعد فرمایا کہ جھوٹی آرزوؤں پر جو لوگ جی رہے ہیں، خواہ منافقین ہوں یا اہل کتاب، سب دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی کی آرزو بھی پوری ہونے والی نہیں۔ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ایمان اور عمل صالح ہے۔ خدا کی بہشت میں وہی داخل ہوں گے جن کے پاس یہ متاع ہوگی جو اس سے محروم ہوں گے وہ اپنی برائیوں کی سزا بھگتیں گے خواہ کوئی ہوں۔

ملت ابراہیم سے بڑھ کر کوئی ملت توحید کی سامل نہیں — آخر میں فرمایا کہ اصل دین ان لوگوں کا ہے جو اسلام کے پیرو ہیں۔ یہی ملت ابراہیم ہے۔ ابراہیم خدائے واحد کے پرستار تھے اور ان کی اس توحید ہی کی وجہ سے خدا نے ان کو دوست بنایا تھا۔ اس کائنات کی ہر چیز خدا ہی کی ہے اور خدا ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱۶-۱۲۶

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن
يَشَاءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١١٦﴾ إِن
يَدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا
مَّرِيدًا ﴿١١٧﴾ لَّعَنَهُ اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا
مَّفْرُوضًا ﴿١١٨﴾ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ
آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ ۚ وَمَن يَتَّخِذِ
الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّن دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا ﴿١١٩﴾

وقف لازم

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾
اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ
مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ
مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا
وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ
هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾
وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ
اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع ۱۸

ترجمۂ آیات ۱۱۶-۱۲۶

بے شک اللہ اس چیز کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے، اس کے نیچے جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ یہ اس کے سوا پکارتے بھی ہیں تو دیویوں کو اور پکارتے بھی ہیں تو شیطان سرکش کو۔ اس پر اللہ کی پھٹکار ہے! اور اس نے کہہ رکھا ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک معین حصہ ہتھیا کے رہوں گا، ان کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا، ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں گا، ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کو بگاڑیں گے اور جو اللہ کے سوا

شیطان کو اپنا کارساز بنائے تو وہ کھلی ہوئی نامرادی میں پڑا۔ وہ ان کو وعدوں کے بہلاوے دیتا ہے، آرزوؤں میں پھنساتا ہے اور شیطان کے وعدے سرتاسر فریب ہیں۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ اس سے گریز کی کوئی راہ نہیں پائیں گے۔ ۱۱۶-۱۲۱

اور جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اللہ کا وعدہ حق ہے اور اللہ سے زیادہ وعدے کا سچا کون ہو سکتا ہے۔ ۱۲۲

آرزوئیں نہ تمھاری پوری ہونی ہیں نہ اہل کتاب کی۔ جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے مقابل کوئی کارساز اور مددگار نہ پا سکے گا اور جو نیکی کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہے تو یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔ ۱۲۳-۱۲۴

اور باعتبار دین اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے درآنحالیکہ خوب کار بھی ہو اور ابراہیم کی ملت کی پیروی کرے جو بالکل یکسو تھا اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ۱۲۵-۱۲۶

۳۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا (۱۱۶)

'دون' کا لفظ اپنے استعمالات کے لحاظ سے وسع اور ہے، نیچے اور اوپر، آگے اور پیچھے دونوں معنوں

توحید و شرک کا مفہوم

میں آتا ہے۔ قرینہ متعین کرتا ہے کہ کہاں کیا مراد ہے۔ یہاں ظاہر ہے کہ ورے یا نیچے کے معنی میں ہے۔ جس طرح تمام خیر کا منبع توحید ہے یعنی خدا کی ذات، صفات اور اس کے حقوق میں کسی کو ساجھی نہ ٹھہرانا اسی طرح تمام شر کا منبع شرک ہے یعنی خدا کی ذات، صفات اور اس کے حقوق میں کسی کو شریک ٹھہرانا۔

شرک کے ناقابلِ معافی جرم ہونے کی وجہ

توحید پر قائم رہتے ہوئے انسان اگر کوئی ٹھوکر کھاتا ہے تو وہ غلبۂ نفس و جذبات سے اتفاقی ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی غلطی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لے۔ اس وجہ سے وہ گرنے کے بعد لازماً اٹھتا ہے۔ برعکس اس کے شرک کے ساتھ اگر کسی سے کوئی نیکی ہوتی ہے تو وہ اتفاقی ہوتی ہے جس کا اصل منبع خیر یعنی خدا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس وجہ سے وہ بے بنیاد ہوتی ہے۔ مشرک خدا سے کٹ جانے کی وجہ سے لازماً اپنی باگ نفس اور شیطان کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اس وجہ سے وہ درجہ بدرجہ صراطِ مستقیم سے اتنا دور ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے خدا کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا تا آنکہ وہ شرک سے توبہ کرے۔ اس وجہ سے خدا کے ہاں شرک کی معافی نہیں ہے۔ البتہ توحید کے ساتھ اگر کسی سے گناہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے گا معاف فرما دے گا۔

خدا کی ہدایت کے برخلاف کسی طریقے کی پیروی کرنا شرک ہے

اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ یہاں یہ شرک کا ذکر ان منافقین کے تعلق سے ہوا ہے جو رسول کی ہدایت الٰہی کی اور طریقۂ اہلِ ایمان کی مخالفت کر رہے تھے۔ خدا کی شریعت اور اس کے قانون کے ہوتے ہوئے کسی اور کے قانون و شریعت کی پیروی کی جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ جو حق خدا کا ہے اس میں دوسرے کو شریک کر دیا گیا ہے۔ رسول، اللہ کی شریعت لاتا ہے، ہدی اللہ، اللہ کی شریعت ہے اور اہلِ ایمان کا طریقہ اسی شریعت پر قائم ہے۔ اب جو لوگ اس سے الگ کوئی راہ نکالنے کے درپے ہیں وہ راہ اللہ کی نہیں بلکہ شیطان کی ہے اور اس پر چلنے والے شیطان اور طاغوت کے پیرو ہیں اور یہ چیز اسی طرح شرک ہے جس طرح تحاکم الی الطاغوت شرک ہے جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔[1]

وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ میں مَن يَشَاءُ کی قید بھی قابلِ غور ہے۔ ایمان کے ساتھ جو گناہ صادر ہو جاتے ہیں ان کی معافی کے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے لِمَن يَشَاءُ (جس کے لیے چاہے گا) کی قید بھی لگائی ہے جو نہایت اہمیت رکھنے والی قید ہے۔ ہم اس کتاب میں بار بار ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن سے یہ بات بالکل غیر مشتبہ طور پر ثابت ہے کہ خدا کی کوئی مشیت بھی اس کی حکمت سے الگ نہیں ہے اس وجہ سے یہ معافی انہی کو حاصل ہو گی جو اس کے عدل و حکمت کے تحت اس کے سزاوار ٹھہریں گے۔ اس قید نے اس معاملے میں بے جا جسارت کے تمام دروازے بند کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس مشیت کے لیے جو قاعدے ضابطے رکھے ہیں وہ اس نے خود قرآن میں بیان فرما دیے ہیں۔

---

[1] توحید اور شرک کی حقیقت اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہماری کتاب 'حقیقتِ شرک و توحید' پڑھیے۔

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۝ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ
مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ
خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ۝ يَعِدُھُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا
يَعِدُھُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا (۱۱۷-۱۲۱)

'اِنْ يَّدْعُوْنَ' یہاں پکارنے سے مراد وہ پکارنا ہے جو دعا، فریاد، استغاثہ، استعانت، استمداد وغیرہ کے قصد سے اس معنی میں ہو جس معنی میں معبود کو پکارا جاتا ہے۔

اناث سے مراد معبود دیویاں ہیں

اناث، انثی کی جمع ہے۔ انثی، لغوی مفہوم میں تو نرم و نازک اور ڈھیلی ڈھالی چیز کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن معروف استعمال اس کا عورت کے لیے ہے۔ یہاں چونکہ مشرکین کے دیویوں دیوتاؤں کے ذکر کے سیاق میں ہے اس وجہ سے اس سے مراد دیویاں ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مشرکین کی دیومالا میں، خواہ وہ کسی قوم و ملک کے مشرکین ہوں، دیویوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ چین، ہندوستان، عرب، مصر اور بابل و نینوا وغیرہ کے مشرکانہ مذاہب کی جو تاریخ موجود ہے اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ یہ بات بھی خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہے کہ زندگی کی جو اصل ضرورتیں ہیں وہ بیشتر انھیں دیویوں سے متعلق سمجھی جاتی رہی ہیں۔ عرب جاہلیت میں بھی خدائی کے نظام پر بیشتر دیویوں ہی کا قبضہ تھا۔ لات، منات، عزیٰ وغیرہ دیویوں ہی کے نام ہیں۔ یہ، جیسا کہ سورۂ نجم کی تفسیر میں واضح ہوگا، فرشتوں کے بت تھے جن کے متعلق مشرکین کا عقیدہ تھا کہ یہ خدا کی لاڈلی اور چہیتی بیٹیاں ہیں جن کی بات خدا کبھی نہیں ٹالتا اس وجہ سے ان کے واسطہ سے جو کچھ مانگا جائے اگر یہ راضی ہوں تو وہ مل کے رہتا ہے۔ قرآن میں ان کے اس عقیدہ کا جگہ جگہ حوالہ ہے مثلاً وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا۔ ۱۹ زخرف (اور انھوں نے فرشتوں کو جو خدائے رحمان کے بندے ہیں دیویاں بنا ڈالا ہے) پیچھے جبت و طاغوت کی بحث کے ضمن میں ہم یہ بات بھی واضح کر چکے ہیں کہ اہل کتاب نے بھی، جب مشرک قوموں سے ان کو سابقہ پیش آیا، ان کے بہت سے مشرکانہ طریقے اختیار کر لیے اور انھی کی طرح بہت سے دیوی دیوتا اپنے لیے بنا لیے جس کا ماتم ان کے انبیا نے کیا ہے اور یہ ماتم خود ان کے صحیفوں میں موجود ہے۔ نصاریٰ حضرت مریم کی نسبت جو عقیدہ رکھتے ہیں وہ بھی معلوم ہے۔

شرک کا امام شیطان ہے

'وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا' شیطان کے پکارنے کا ذکر اصل مرشد شرک کی حیثیت سے ہے اس لیے کہ وہی ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے کے معاملے میں خدا کے حکم کی رو در رو نافرمانی کی اور جب خدا نے اس کے اس تمرد و سرکشی پر اس کو لعنت کی تو اس نے دھمکی دی کہ میں تیرے بندوں کو مختلف طریقوں سے توحید سے ہٹا کر شرک میں مبتلا کروں گا۔ اس وجہ سے شرک جہاں کہیں بھی اور جس شکل میں بھی پایا جاتا ہے اس کا امام درحقیقت شیطان ہی ہے اور اس اعتبار سے ہر وہ دعا اور التجا اور ہر وہ عبادت و اطاعت جو

کسی غیر اللہ سے یا کسی غیر اللہ کے لیے کی جا رہی ہے وہ بالواسطہ شرک کے اس امام ہی سے اور اسی کے لیے ہوتی ہے۔

لعنہ اللہ بطور جملہ معترضہ کے مفہوم میں

'لَعَنَهُ اللّٰهُ' صفت بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ جس وقت شیطان نے اللہ کے بندوں کو شرک میں مبتلا کرنے کی دھمکی دی تھی اسی وقت اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے، اس پر لعنت بھی کر دی تھی اس وجہ سے وہ اس صفت کا دائمی موصوف ہے لیکن میں نے اس کو جملہ معترضہ کے مفہوم میں لیا ہے اور اسی اعتبار سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بلاغت کا یہ پہلو ہے کہ گویا جوں ہی اس امام شرک کا نام آیا اللہ تعالیٰ نے عین اس کے عابدوں کے منہ پر اس پر لعنت کر دی۔ یہ اظہارِ نفرت کا سب سے زیادہ موثر طریقہ ہے۔

شیطان کی دھمکی بنی آدم کو

'وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ الاٰیۃ' میں شیطان کی اس دھمکی کا حوالہ ہے جو اس نے اس وقت دی تھی جب اس نے آدم کو سجدہ کرنے کے معاملے میں کھلم کھلا خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور خدا نے اس کو راندۂ درگاہ قرار دیا۔ اس دھمکی کا ذکر قرآن نے متعدد مقامات میں کیا ہے۔ مثلاً

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۚ
قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ
نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ
فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ
تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ
الصّٰغِرِيْنَ ۝ قَالَ اَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ
يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝
قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ
مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ
اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا
تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ قَالَ
اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ
لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ
مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ (اعراف ۱۲-۱۸)

خدا نے پوچھا کہ جب میں نے تجھے سجدے کا حکم دیا تو تجھے
سجدے سے کس چیز نے روکا؟ شیطان نے جواب دیا
کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور
اس کو مٹی سے بنایا ہے۔ خدا نے فرمایا تو یہاں سے اترا
تجھے یہ حق نہیں ہے کہ تو اس میں اپنی بڑائی کا گھمنڈ کرے
پس تو یہاں سے نکل، تو خوار ہونے والوں میں سے ہے
اس نے کہا مجھے لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک
مہلت دے دے۔ خدا نے فرمایا تجھے مہلت دی گئی۔
شیطان نے کہا چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اس وجہ سے
میں ان کی گھات میں تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ پھر میں
ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے، ان کے دہنے سے،
ان کے بائیں سے ان پر چھاپے ڈالوں گا اور تو ان میں سے
اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ خدا نے فرمایا تو ذلیل و
خوار ہو کر یہاں سے دور ہو۔ ان میں سے جو تیری پیروی
کریں گے تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

شیطان کے اس مناظرے سے اس کے اس جوش و سرگرمی کا بھی پورا پورا اظہار ہو رہا ہے جو وہ بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اپنے اندر رکھتا ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ اس کی تمام مساعی ضلالت کا خاص

ہدف توحید کا عقیدہ ہے۔ چنانچہ اس نے یہ جو کہا کہ میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں بیٹھوں گا تو یہ "سیدھی راہ" وہی توحید کی راہ ہے جس کو قرآن نے صراط مستقیم سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ جو اس نے کہا کہ تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکرگزار نہ پائے گا، تو یہ بھی اس بات کی تعبیر ہے کہ میں ان کو شرک میں مبتلا کر دوں گا اور یہ تیری حمد کے بجائے دوسروں کی حمد کے ترانے گائیں گے۔

امانی باطلہ

وَلَاُمَنِّیَنَّھُمْ (میں ان کو جھوٹی آرزوؤں میں پھنساؤں گا) میں اس طرح کی جھوٹی آرزوؤں کی طرف اشارہ ہے جن میں بالعموم مشرک قومیں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً عربوں کا یہ عقیدہ کہ وہ جن دیویوں اور دیوتاؤں کو پوجتے ہیں وہ خدا سے ان کے لیے سفارش کرتے ہیں۔ انھی کی سفارش سے ان کو دنیا کی نعمتیں بھی ملتی ہیں اور اگر آخرت کوئی چیز ہے تو انھی کی سفارش سے آخرت میں بھی وہ جنت کے حقدار ٹھہریں گے۔ اسی طرح یہود اس وہم میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ ابراہیم خلیل اللہ اور خدا کے برگزیدہ بندوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے وہ خدا کے بیٹوں اور محبوبوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور جنت کے پشتینی حق دار ہیں، ان کے اعمال کچھ ہوں دوزخ کی آگ اول تو ان کو چھوئے گی ہی نہیں اور اگر چھوئے گی تو محض عارضی طور پر۔ ان کی ان باطل آرزوؤں پر ہم البقرہ کی آیت ۸۰ اور ۱۱۱ کے تحت بحث کر چکے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ خدا نے اپنے بیٹے کو ان کے تمام گناہوں کا کفارہ بنا دیا ہے، اب وہ عمل و اطاعت کی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہیں۔

مشرکانہ نذریں

فَلَیُبَتِّکُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ۔ بتک کے معنی کاٹنے، چیرنے اور پھاڑنے کے ہیں۔ مشرک قوموں میں یہ مشرکانہ روایت رہی ہے کہ وہ خاص خاص جانوروں کو ان کے کان چیر کر اپنے فرضی معبودوں کے نام پر بطور نذر چھوڑ دیتی رہی ہیں۔ یہ کان چیرنا اس مقصد کے لیے ہوتا تھا کہ دوسرے ان کو نذر سمجھ کر ان سے تعرض نہ کریں۔

تغییر خلق اللہ کا مفہوم

فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰہِ (پس وہ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلیں گے) اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلنے سے اصلاً مراد اس فطرت اللہ کو بدلنا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام خلائق کو پیدا کیا ہے۔ مثلاً توحید دین فطرت ہے لیکن شیطان اور اس کے ایجنٹوں نے اس کو شرک سے مسخ کیا۔ سورۂ روم میں شرک کی تردید کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ط لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ط ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ق وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ہ مُنِیْبِیْنَ اِلَیْہِ وَاتَّقُوْہُ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (۳۰-۳۱ روم)

پس تم یکسو ہو کر اپنا رخ دین حنیفی کی طرف کرو۔ یہی اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلنا جائز نہیں۔ یہی سیدھا فطری دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ بنو۔

اس آیت میں توحید کو دین فطرت' اور دین قیم سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ اسی پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت اور ساخت کو بدلنا جائز نہیں۔ ہمارے نزدیک زیر بحث ٹکڑے میں بھی یہی مراد ہے۔ ضمناً اس کے تحت وہ ساری چیزیں آ جائیں گی جو فطرت اللہ کی تبدیلی کے حکم میں ہیں۔ مثلاً عورتوں کا مرد بننا یا مردوں کا عورت بننا یا عورتوں اور مردوں کو ناقابل اولاد بنانا اور اس قبیل کی دوسری خرافات۔

لفظ امر کے مختلف مفہوم

'وَلَاٰمُرَنَّھُمْ' میں شیطان کے جس امر کا ذکر ہے اس کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عربی میں امر کا لفظ حکم دینے، مشورہ دینے اور سجھانے، سب معنوں میں آتا ہے۔ شیطان ان تمام طریقوں سے توحید کی راہ مارتا ہے۔ وہ اپنے القائے شیطانی سے دلوں میں وسوسے بھی ڈالتا ہے اور جنوں اور انسانوں میں سے جو لوگ اس کے ایجنٹ بن جاتے ہیں ان کے واسطے سے مشورے بھی دیتا ہے اور اگر اس کے ایجنٹ زور آور اور با اقتدار ہوتے ہیں تو ان کے ہاتھوں قانون بھی بنوا تا ہے اور اس قانون کو نافذ بھی کرواتا ہے۔

اجزا کی تشریح کے بعد اب ان آیات کے نظام اور ان کے مفہوم پر بحیثیت مجموعی بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

شرک کا بودا پن اور اس کا حسب و نسب

اوپر کی آیت میں شرک کے ناقابل مغفرت جرم ہونے کا ذکر ہوا تو آگے ہاتھوں شرک کے بودے پن اور اس کے حسب و نسب کا بھی ذکر فرما دیا تاکہ اس کا مکروہ چہرہ اچھی طرح بے نقاب ہو جائے۔

بودے پن کا ذکر دو پہلوؤں سے فرمایا۔ ایک تو یہ کہ شرک کا سارا کارخانہ دیویوں کے بل بوتے پر قائم ہے، اول تو یہی پرلے سرے کی حماقت ہے کہ خدائے واحد کے سوا کسی اور کا سہارا انسان ڈھونڈے پھر حماقت در حماقت یہ کہ سہارا بھی فرضی عورتوں کا جن کی بے بسی اور ناتوانی خود ضرب المثل ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کی تمام تر بنیاد شیطان کی پیدا کی ہوئی جھوٹی آرزوؤں اور اس کے پرفریب وعدوں پر ہے اور شیطان کے سارے وعدے بالکل بے حقیقت ہیں۔ جب حقیقت کھلے گی تو نظر آئے گا کہ نہ ابراہیمؑ کا حسب و نسب کچھ نافع ہے اور نہ لات و منات اور ان کی شفاعت کا کوئی وجود ہے بلکہ سارا معاملہ ایمان و عمل صالح پر منحصر ہے۔ جن کے پاس یہ متاع نہیں ہے ان کے لیے صرف جہنم ہے جس سے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے۔

اس کے حسب و نسب کا بیان اس طرح فرمایا کہ اس کا موجد اور امام ابلیس لعین ہے جس نے جوش حسد میں پہلے ہی روز یہ دھمکی دی تھی کہ میں تیرے بندوں میں سے اپنا حصہ لے کر رہوں گا، میں ان کو گمراہ کروں گا، ان کو طرح طرح کی جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا کروں گا اور میرے حکم سے بتوں کو نذرانے پیش کریں گے اور میرے القا سے فطرت اللہ کو مسخ کریں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ اس شیطان لعین و متمرد کو اپنا مرجع اور کارساز بنائیں ان سے زیادہ بدبخت اور نامراد کون ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ شیطان ان کو وعدوں کے سبز باغ دکھا رہا ہے اور آرزوؤں کے جال ان کے آگے بچھا رہا ہے حالانکہ شیطان کے سارے وعدے محض فریب ہیں۔ نہ شفاعت ان کے کام آنی ہے نہ بزرگوں سے نسبت۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے جس سے کوئی مفر نہ ہوگا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ۝ لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ۝ (۱۲۲-۱۲۴)

نجات کی راہ ایمان و عمل صالح ہے۔ یعنی شیطان کے وعدے اور اس کی پیدا کی ہوئی آرزوئیں تو محض جھوٹ اور فریب ہیں۔ البتہ اللہ کا وعدہ یہ ہے کہ جو ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کریں گے ان کو وہ جنت میں داخل کرے گا اور یہ وعدہ بالکل حق ہے اس لیے کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کے وعدے سے زیادہ سچا وعدہ کس کا ہو سکتا ہے۔

جھوٹی تمنائیں پھر فرمایا کہ نجات سے متعلق یہ جھوٹی آرزوئیں خواہ تمھاری ہوں (اشارہ منافقین کی طرف ہے) یا اہل کتاب کی ان میں سے کوئی بھی پوری ہونے والی نہیں ہے۔ جو بھی برائی کرے گا وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا اور خدا کے سوا کوئی اس کا کارساز و مددگار نہ بن سکے گا۔ اسی طرح جو عمل صالح کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، اگر وہ مومن ہے تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ذرا بھی ان کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

منافقین اور اہل کتاب دونوں کی آرزوؤں کا ایک ساتھ ذکر کر کے قرآن نے یہ واضح کر دیا کہ شرک، شفاعت اور خاندانی برگزیدگی کے بل پر جنت کے خواب دیکھنے والے سب ایک ہی جنت الحمقا کے بسنے والے اور ایک ہی دامِ فریب کے گرفتار ہیں اور ان سب کی نامرادی ایک ہی طرح کی ہے۔ آخرت کی بازی ان لوگوں کی ہے جو ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جس کے پاس یہ دولت ہوگی، وہ فائز المرام ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اسرائیلی ہے یا اسمٰعیلی، عربی ہے یا عجمی۔ اس طرح کی کسی نسبت کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی کمی نہیں ہوگی۔

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ۝ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطًا ۝ (۱۲۵-۱۲۶)

ملت ابراہیم اب یہ اس هُدَى الله اور سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ کی سند اور اس کا درجہ و مرتبہ واضح فرمایا جس کی مخالفت کو شرک قرار دیا ہے اور جس سے یہ اوپر والی بحث پیدا ہوئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی مخالفت اور اس سے انحراف کے کیا معنی؟ آخر اس کے دین سے بڑھ کر کس کا دین ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو یک قلم اللہ کے سپرد کر دے اور ساتھ ساتھ وہ محسن بھی ہو یعنی اپنے رب کے ہر حکم کی تعمیل اس طرح کرے جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے۔ یہی ملت ابراہیمؑ ہے۔ جس نے یہ راہ اختیار کی اس نے ملت ابراہیمؑ کی پیروی کی اور ابراہیمؑ کی ذات تو وہ ہے جن کو خدا نے اپنا دوست بنایا تو ان کی ملت سے بڑھ کر کس کی ملت ہو سکتی ہے؟ آخر میں 'أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ' کی علت واضح فرما دی کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ واحد ہی کا ہے اور وہ ہر چیز کا احاطہ بھی کیے ہوئے ہے تو اس کے سوا

حق دار بھی کرتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دیا جائے۔

حضرت ابراہیمؑ کے خلیل اللہ ہونے کی وجہ

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے خلیل اللہ ہونے کا ذکر تورات میں بھی بار بار ہوا ہے اور یہ چیز منجملہ ان چیزوں کے ہے جن کے سبب سے بنی اسرائیل اس آرزوئے باطل میں مبتلا ہوئے کہ چونکہ وہ اللہ کے دوست کے خاندان سے ہیں اس وجہ سے ان کی حیثیت اَبْنَاءُ اللہ اور اَحِبَّاءُ اللہ کی ہے اور جب ان کی حیثیت یہ ہے تو دوزخ کی آگ کی کیا مجال ہے کہ وہ ان کو چھوئے۔ اس وہم کی تردید کے لیے یہاں یہ بھی واضح فرمایا کہ ابراہیمؑ کو اللہ نے اپنا جو دوست بنایا تو اس وجہ سے بنایا کہ انھوں نے ہر طرف سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دیا۔ ان کی ملت اسلام اور توحید کی ملت ہے اور وہ اس ملت توحید کے امام ہیں۔ اس وجہ سے دینِ حق ان کا دین ہے جو اس امامِ توحید کی ملت کے پیرو ہیں نہ کہ ان کا جو امامِ شرک ابلیس کے پیرو ہیں۔

۳۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۲۷-۱۳۴

اسلامی معاشرہ کی تاسیس، تنظیم اور تطہیر سے متعلق جو اہم اصول تھیں وہ اوپر کی آیات پر تمام ہوئیں۔ اب آگے کا حصہ، سورہ کے آخر تک، خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں پہلے بعض سوالات کے جواب دیے ہیں جو اسی سورہ کی آیات ۲-۴ میں بیان کردہ احکام سے متعلق بعد میں پیدا ہوئے، اس کے بعد آخر سورہ تک مسلمانوں کو، منافقین کو اور اہل کتاب کو خطاب کر کے آخری تنبیہ کی نوعیت کی نصیحتیں فرمائی ہیں۔ یہ سوالات بعد میں پیدا ہوئے اس وجہ سے ان کے جواب سورہ کے آخری باب کے ساتھ رکھے گئے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ یہ بعد میں نازل ہوئے ہیں۔ اس سے احکام کی حکمت سمجھنے میں رہنمائی ملتی ہے۔

زیرِ بحث مجموعۂ آیات کو سمجھنے کے لیے آیات ۲-۴ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ وہاں یتامیٰ کی مصلحت اور بہبود کے پہلو سے ان کی ماؤں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے تو اس کے ساتھ چار کی قید اور ادائے مہر اور عدل کی شرط لگی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، مہر اور عدل دونوں ہی چیزوں سے متعلق لوگوں کے اندر سوالات پیدا ہوئے۔ مہر سے متعلق یہ کہ جن عورتوں سے نکاح انہی کے یتیم بچوں کی مصلحت سے کیا جائے، انھیں مہر ادا کرنے کی پابندی ایک بھاری مشقت ہے جس کو لوگ برداشت نہیں کر سکیں گے اسی طرح اگر عدل کا مفہوم قلبی میلان اور ظاہری سلوک دونوں میں کامل مساوات ہے تو یہ بھی ناممکن ہے۔ ایک شخص نے اپنی ایک پسندیدہ بیوی رکھتے ہوئے اگر ایک عورت سے صرف اس خیال سے نکاح کیا ہے کہ اس کے یتیم بچوں کی تربیت اور ان کے حقوق کی نگہداشت میں سہولت ہو جائے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنی چہیتی بیوی اور اس دوسری بیوی دونوں سے یکساں محبت اور یکساں سلوک کر سکے۔ قرآن نے یہاں ان دونوں سوالوں کا جواب دیا ہے۔ پہلے سوال کا یہ جواب دیا کہ اگر ایک شخص ایک عورت

کو پسند نہیں کرتا تو اس سے نکاح ہی کیوں کرے، اگر پسند کر کے نکاح کرتا ہے تو پھر نباہ کرے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی واضح فرما دی کہ مہر کا معاملہ اصلاً عورت کا معاملہ ہے۔ وہ اگر اپنی مصلحت کے تحت اپنے شوہر سے کوئی سمجھوتہ کرلے تو اس کا اس کو اختیار ہے اور یہی بہتر ہے۔ ویسے مرد کے شایانِ شان بات یہ ہے کہ وہ دبے ہوئے کو دبانے کے بجائے احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کرے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ دیا کہ عدل سے مراد یہ نہیں ہے کہ قلبی میلان اور ظاہری سلوک بالکل کانٹے کی تول برابر برابر ہو۔ اس طرح کا عدل کوئی پوری نیک نیتی سے کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔ مطلوب جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ ظاہری سلوک و معاملات میں روش ایسی رہے کہ دونوں کے حقوق ادا ہوتے رہیں، یہ نہ ہو کہ ایک بیوی بالکل معلقہ بن کے رہ جائے نہ اسے دل کی محبت حاصل ہو، نہ ظاہر کا سلوک، نہ بیوی رہے نہ مطلقہ۔

اس کے بعد بانداز تنبیہ نصیحت فرمائی کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے۔ اس نے اہل کتاب کو بھی اپنے حدود کی پابندی کی ہدایت فرمائی تھی اور اسی کی ہدایت وہ تمہیں بھی کر رہا ہے اگر تم ان کی پابندی کرو گے تو اپنا بناؤ گے، اگر نافرمانی کرو گے تو خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑو گے۔ خدا سب سے بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور تمہاری جگہ دوسروں کو بخش دے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو دنیا ہی کے طالب بنتے ہیں وہ دنیا میں سے جتنا مقدر ہوتا ہے اتنا پالیتے ہیں اور جو آخرت کے طالب بنتے ہیں تو خدا کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کے خزانے ہیں ۔۔۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۲۷-۱۳۴

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيمًا ﴿۱۲۷﴾ وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۚ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۗ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ ۚ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ
تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ
فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَكَانَ
اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ
وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ
اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ
مَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا
النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ
كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ
۱۹ ع ۸ ۱۶ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱۲۷-۱۳۴

اور لوگ تم سے عورتوں کے باب میں فتویٰ پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ اللہ ان کے باب میں بھی اور اس حکم کے باب میں بھی جو تمہیں کتاب میں ان عورتوں کے یتیموں کے بارے میں دیا جا رہا ہے جن کو تم وہ نہیں دیتے جو ان کے لیے لکھا گیا ہے لیکن ان سے نکاح کرنا چاہتے ہو اور بے سہارا بچوں کے باب میں یہ فتویٰ دیتا ہے کہ ان کے مہر دو اور یتیموں کے ساتھ انصاف کرو اور جو مزید بھلائی تم کرو گے تو اللہ اس سے باخبر ہے۔

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بیزاری یا بے پروائی کا اندیشہ ہو تو اس بات میں کوئی

حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی سمجھوتا کرلیں اور سمجھوتا ہی بہتر ہے۔ طبیعتوں میں حرص رچی بسی ہوتی ہے۔ اور اگر تم حسن سلوک کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے تو جو کچھ کروگے اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۱۲۷-۱۲۸

اور تم پورا پورا عدل تو بیویوں کے درمیان کر ہی نہیں سکتے اگرچہ تم اس کو چاہو بھی تو یہ تو نہ ہو کہ بالکل ایک ہی کی طرف جھک پڑو کہ دوسری کو بالکل معلقہ بنا کر رکھ دو اور اگر تم اصلاح کرتے رہوگے اور خدا سے ڈرتے رہوگے تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے اور اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں گے تو اللہ ان میں سے ہر ایک کو اپنی وسعت سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور حکیم ہے۔ ۱۲۹-۱۳۰

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی ہم نے انھیں بھی ہدایت کی اور تم کو بھی کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور اگر تم کفر کروگے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ بے نیاز، ستودہ صفات ہے اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بھروسے کے لیے اللہ کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے، اے لوگو، اور دوسروں کو لائے، اللہ اس چیز پر قادر ہے۔ جو دنیا کے صلے کا طلبگار ہے تو اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا صلہ موجود ہے اور اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ۱۳۱-۱۳۴

٢٧- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ اَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَاَنْ تَقُومُوا لِلْيَتٰمٰى

بِالْقِسْطِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا (۱۲۷)

سوال کے نقل کرنے میں اجمال ہی بلاغت ہے

'وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ' (وہ تم سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں) میں اسی طرح کا اجمال ہے جس طرح کا اجمال وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ (اور وہ تم سے اشہرِ حُرُم کے بارے میں سوال کرتے ہیں) میں ہے۔ وہاں ہم بیان کر آئے ہیں کہ قرآن میں لوگوں کے سوال بالعموم نہایت اجمال کے ساتھ بیان ہوتے ہیں اور یہی طریقہ قرینِ بلاغت ہے۔ جب جواب سے سوال کی نوعیت خود واضح ہو جاتی ہے تو سوال کے نقل کرنے میں طولِ کلام کی کیا ضرورت باقی رہی۔

الکتٰب سے یہاں مراد ہی سورہ کی آیات ۲-۶ ہیں

'وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ' کا عطف 'فِيهِنَّ' کی ضمیر مجرور پر ہے اور الکتٰب سے مراد قرآن ہے اور یہاں اشارہ ہے اسی سورہ کی آیات ۲-۶ کی طرف جن میں بیان کردہ حکم سے متعلق ہی سوالوں کے یہاں جواب دیے گئے ہیں۔ یعنی اللہ عورتوں سے متعلق سوال کا جواب بھی دے رہا ہے اور اس حکم سے متعلق بھی جو تمہیں اسی سورہ کی ابتدائی آیات میں سنایا گیا ہے۔ 'یُتْلٰی' حال کا صیغہ تصویرِ حال کے لیے ہے اس لیے کہ اس وقت یہ آیتیں زیرِ تعلیم بھی تھیں اور ہر حلقے میں زیرِ بحث بھی۔

نکاح میں ادائے مہر اور عدل کی شرط کی وضاحت

'فِي يَتَامَى النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ' یہ ان آیات میں بیان کردہ حکم کی طرف اجمالی اشارہ ہے۔ یعنی یہ فتویٰ اس حکم کے بارے میں بھی ہے جو تمہیں ان عورتوں کے یتیم بچوں کے بارے میں دیا گیا ہے جن عورتوں کو تم ان کا حق تو دینے کے لیے تیار نہیں ہو لیکن ان سے نکاح کرنے کے خواہشمند ہو۔ اس سے ضمناً یہ بات بھی نکل آئی کہ 'وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ' اور 'وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ' میں 'نساء' سے مراد یتیموں کی مائیں ہیں، جیسا کہ ہم نے اختیار کیا ہے، اور یہ اشارہ بھی نکلا کہ لوگ یتیموں کی مصلحت سے ان سے نکاح تو کرنا چاہتے تھے لیکن مہر اور عدل کی شرط ان پر شاق تھی۔ 'مَا كُتِبَ لَهُنَّ' کے معنی ہیں جو ان کے لیے خدا کی طرف سے ٹھہرائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح ان کے معاملے میں مہر کی شرط ضروری قرار دی گئی ہے اسی طرح عدل کی شرط بھی ہے۔ اس وجہ سے یہ دونوں چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہوں گی۔

سوال کا جواب اور عربی زبان کا ایک اسلوب

'وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ' یہ وہ فتویٰ ہے جو استفتا کے جواب میں ارشاد ہوا ہے لیکن یہاں عربی زبان کا یہ اسلوب یاد رکھنا چاہیے کہ جب معطوف اس طرح آئے کہ کلام میں اس کا معطوف علیہ موجود نہ ہو تو وہاں وہ باتیں معطوف علیہ کی حیثیت سے محذوف مان لینے کی گنجائش ہوتی ہے جن پر قرینہ دلیل ہو۔ اس کی ایک سے زیادہ مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں اور آگے بھی اس کتاب میں اس کی نہایت واضح مثالیں آئیں گی۔ یہاں کلام میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہے جو 'وَأَنْ تَقُومُوا' کا معطوف علیہ بن سکے۔ اس وجہ سے لازماً یہاں محذوف ماننا پڑے گا اور یہ محذوف سیاقِ کلام کی روشنی میں متعین کیا

جائے گا۔ چنانچہ یہاں وَاَنْ تَقُوْمُوْا سے پہلے یہ مضمون محذوف ہوگا کہ ان عورتوں کو ان کے مہر دو، ان کے ساتھ عدل کا معاملہ کرو، پھر اس کے اوپر وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ کا عطف موزوں ہوگا یعنی اور یتیموں کے لیے عدل کی حفاظت کرنے والے بنو۔ گویا فتوے میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ مہر اور عدل کی شرط جس طرح عام عورتوں کے معاملے میں ہے اسی طرح یتیموں کی ماؤں کے بارے میں بھی ہے اور آیات وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا الاية میں عورتوں کے ساتھ عدل کا اور آیت وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً الاية میں ادائے مہر کا جو حکم ہے تو وہ یتیموں کی ماؤں سے متعلق ہی ہے، جن سے تم نکاح تو کرنا چاہتے ہو لیکن مہر اور عدل کی کھکھیڑ میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ اس طرح گویا قرآن نے آیات ۳، ۴ کے اجمال کو کھول دیا اور اس فتوے کے ذریعے سے ان میں دیے ہوئے احکام کو مزید مؤکد کر دیا۔

آیت ۱۲۷ کا مطلب تالیف کلام کی روشنی میں

اس آیت کی تاویل میں چونکہ بڑا اختلاف ہے اور یہ اختلاف زیادہ تر نتیجہ ہے کلام کی تالیف نہ سمجھنے کا، اس وجہ سے ہماری توضیح کی روشنی میں کلام کی تالیف پر غور کر کے اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔ اس روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ لوگ عورتوں کے مہر اور مختلف بیویوں کے درمیان عدل کے بارے میں تم سے سوالات کر رہے ہیں، خاص طور پر یتیموں کی ماؤں کے مہر اور ان کے درمیان عدل کے بارے میں کہ جب ان کے ساتھ نکاح میں اصل مصلحت انہی کے بچوں کی ہے تو کیا مہر اور عدل کی شرط ان کے معاملے میں بھی اسی طرح لازمی ہوگی جس طرح دوسری عورتوں کے بارے میں ہے؟ فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ اللہ عام عورتوں کے بارے میں بھی اور یتامٰی کی ان ماؤں کے بارے میں بھی جن کا حکم آیات ۳-۴ میں بیان ہوا ہے، جن سے تم نکاح تو کرنا چاہتے ہو لیکن ان کے لیے عدل و مہر کے حق کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے، نیز بے بس یتیموں کے باب میں یہ فتویٰ دیتا ہے کہ ان کے مہر دو، ان کے ساتھ عدل کا معاملہ کرو اور یتیموں کے لیے حق و انصاف کے قائم کرنے والے بنو۔ مزید براں جو نیکی اور حسن سلوک تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہوگا اور خدا کے ہاں اس کا صلہ پاؤ گے۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۱۲۸)

نُشُوْز کے لفظ پر پیچھے بحث گزر چکی ہے۔ نُشُوْز عورت کی طرف سے ہو تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ شوہر کی قوامیت کو تسلیم نہ کرے۔ مرد کی طرف سے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بیوی کے حقوق تسلیم کرنے سے انکار کرے اور اس سے پیچھا چھڑانے پر آمادہ ہو جائے۔

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ، 'شُحّ' کے معنی بخل کے بھی ہیں اور حرص کے بھی۔ بخل تو یہ ہے کہ آدمی ادائے حقوق میں تنگ دلی برتے۔ یہ چیز ہر حال میں مذموم ہے۔ لیکن حرص اچھی چیز کی بھی ہو سکتی ہے، بری چیز کی بھی، حد کے اندر بھی ہو سکتی ہے اور حد سے باہر بھی، اس وجہ سے اس کا اچھا اور برا ہونا ایک امر اضافی ہے۔ اپنے اچھے پہلو کے اعتبار سے یہ انسانی فطرت کے اندر اپنا ایک مقام رکھتی ہے لیکن اکثر

طبائع پر اس کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ یہ ایک بیماری بن کے رہ جاتی ہے۔ اُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ میں اس کے اسی پہلو کی تعبیر ہے۔

رشتۂ نکاح کو برقرار رکھنے کے لیے عورت اور مرد دونوں کو ایثار کی ترغیب

یعنی مہر اور عدل تو ہر عورت کا ایک حق شرعی ہے لیکن کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے اگر یہ اندیشہ ہو کہ ان پابندیوں کا بوجھ اگر اس پر اس نے لادے رکھا تو وہ اس کو چھوڑ دے گا یا اس سے بے پروائی برتے گا تو اس امر میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں مل کر آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیں۔ یعنی عورت اپنے حق مہر، عدل اور نان نفقہ کے معاملے میں ایسی رعایتیں شوہر کو دے دے کہ قطع تعلق کا اندیشہ رفع ہو جائے۔ فرمایا کہ صلح اور سمجھوتے ہی میں بہتری ہے اس لیے کہ میاں اور بیوی کا رشتہ ایک مرتبہ قائم ہو جانے کے بعد فریقین کی فلاح اسی میں ہے کہ یہ قائم ہی رہے اگرچہ اس کے لیے کتنا ہی ایثار کرنا پڑے۔ فرمایا کہ حرص، طبائع کی عام بیماری ہے جو باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ یا تو دونوں فریق ایثار پر آمادہ ہوں اور اگر ایک فریق کا مرض لا علاج ہے تو دوسرا قربانی پر آمادہ ہو۔ غرض رشتۂ نکاح کو برقرار رکھنے کے لیے اگر عورت کو قربانی بھی دینی پڑے تو بہتری اس کے برقرار رہنے ہی میں ہے۔ اس کے بعد وَاِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا الآیہ کے الفاظ سے مرد کو ابھارا ہے کہ ایثار و قربانی اور احسان و تقویٰ کا میدان اصلاً اسی کے شایانِ شان ہے، وہ اپنی فتوت اور مردانگی کی لاج رکھے اور عورت سے لینے والا بننے کی بجائے اس کو دینے والا بنے۔ اللہ ہر ایک کے ہر عمل سے باخبر ہے اور ہر نیکی کا وہ بھرپور صلہ دے گا۔

وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ فَتَذَرُوۡهَا كَالۡمُعَلَّقَةِ‌ ؕ وَاِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۞ وَاِنۡ يَّتَفَرَّقَا يُغۡنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنۡ سَعَتِهٖ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيۡمًا (۱۲۹-۱۳۰)

بیویوں کے معاملے میں عدل کا معیار

اب یہ عدل کا مفہوم واضح فرما دیا کہ جس عدل کو تم ناممکن سمجھ رہے ہو وہ تمہارا اپنا ذہنی عدل ہے۔ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ دل کا لگاؤ اور ظاہر کا سلوک دونوں بالکل برابر برابر مطلوب ہیں۔ اس وجہ سے یہ بات ناممکن نظر آ رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس معنی میں عدل کا لحاظ تمہاری طاقت سے باہر ہے۔ اگر تم اس طرح کا عدل کرنا چاہو بھی تو نہیں کر سکو گے۔ دل کا میلان آدمی کے اپنے اختیار کی چیز نہیں ہے۔ مطلوب جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری بالکل اُدھر میں لٹکی رہ جائے بلکہ سلوک اور حقوق میں توازن قائم رکھنے اور اگر کوئی حق تلفی اور کوتاہی ہو جائے تو اس کی اصلاح اور تلافی کرنے کی کوشش کرو اور خدا سے ڈرتے رہو۔ اصلاح اور تقویٰ کی اس کوشش کے باوجود اگر کوئی فروگزاشت ہو گئی تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ایثار کی حد

اس کے بعد فرمایا کہ شریعت میں مطلوب تو یہی ہے کہ ازدواجی رشتہ ٹوٹنے نہ پائے لیکن حالات اگر مجبور ہی کر دیتے ہیں اور دونوں میں علیحدگی ہو ہی جاتی ہے تو بہر حال اصل رزاق اور کارساز میاں اور بیوی دونوں کا اللہ ہے۔ وہ ہر ایک کو اپنے فضل سے مستغنی کر دے گا وہ بڑی سمائی رکھنے والا اور حکیم

ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس رشتے کو قائم رکھنے کے لیے میاں اور بیوی دونوں سے ایثار اور کوشش تو مطلوب ہے لیکن یہ غیرت اور خودداری کی حفاظت کے ساتھ مطلوب ہے۔ میاں اور بیوی میں سے کسی کے لیے جس طرح اکڑنا جائز نہیں ہے اسی طرح ایک حد خاص سے زیادہ دبنا بھی جائز نہیں ہے، اگرچہ الفاظ میں عمومیت ہے لیکن سیاقِ کلام دلیل ہے کہ اس میں عورتوں کی خاص طور پر حوصلہ افزائی ہے کہ وہ حتی الامکان نباہنے کی کوشش تو کریں اور مصالحت کے لیے ایثار بھی کریں لیکن یہ حوصلہ رکھیں کہ اگر کوشش کے باوجود نباہ کی صورت پیدا نہ ہوئی تو رزاق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ اپنے خزانۂ جود سے ان کو مستغنی کر دے گا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّھَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ (۱۳۱-۱۳۴)

ان آیات میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

'لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ الایۃ' کی تکرار کی بلاغت

ایک تو یہ کہ 'لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ' (اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے) بار بار دہرایا گیا ہے۔ دو مرتبہ تو آیت ۱۳۱ ہی میں اور پھر آیت ۱۳۲ میں۔ علاوہ ازیں جہاں سے یہ مضمون چلتا ہے یعنی آیت ۱۲۶، وہاں بھی بعینہٖ یہی ٹکڑا ہے۔ اس مضمون کا بار بار اعادہ بلاسبب نہیں ہے بلکہ خاتمہ سورہ کا مزاج اس کا متقضی ہوا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ اس خاتمے میں مسلمانوں کو، منافقین کو اور اہل کتاب کو آخری تنبیہ کی گئی ہے کہ جو ہدایات تمہاری رہنمائی کے لیے ضروری تھیں، وہ دلائل کی وضاحت کے ساتھ، دے دی گئیں، اب ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے، مانو گے تو تمہارا نفع ہے، نہ مانو گے تو خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ لو گے۔ خدا اس پوری کائنات کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہے، اس کی حکومت اپنے بل بوتے پر قائم ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ چونکہ پوری کائنات کا مالک ہے اس وجہ سے اس نے تم سے پہلے اہل کتاب کو بھی اپنے احکام و حدود سے آگاہ کیا اور اب تمہیں بھی اس سے آگاہ کر دیا کہ خدا سے ڈرتے رہو۔ اہل کتاب نے نافرمانی کی تو انھوں نے خود اپنی شامت بلائی۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اسی طرح اگر تم بھی کفر کرو گے تو یاد رکھو کہ خدا تمہارا محتاج نہیں بلکہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ وہ تمہارے لیے کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کو اس کی احتیاج ہے بلکہ اس لیے کہ وہ حمید ہے۔ اس کی اس صفت کا تقاضا ہے کہ بے نیاز ہونے کے باوجود ساری خلق کو اپنے جود و کرم سے نوازے۔ ساری کائنات کا مالک ہونے کی وجہ سے وہی سزاوار ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے اور زندگی کی باگ اس کے حوالہ کی جائے۔ نافرمانی کی صورت میں اگر وہ چاہے تو سب کو فنا کر دے اور اس دنیا میں دوسری مخلوق لا بسائے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔

حذف کا ایک اسلوب

دوسری قابلِ غور چیز آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا الآیۃ میں حذف کا اسلوب ہے ہم پیچھے کسی مقام میں اشارہ کر آئے ہیں کہ عربی میں کلام کے دو متقابل اجزا میں سے بعض اجزا کو اس طرح حذف کر دیتے ہیں کہ مذکور جزو، محذوف کی طرف خود اشارہ کر دیتا ہے ہمارے نزدیک اس آیت کے محذوفات کھول دیے جائیں تو تالیفِ کلام یہ ہوگی مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، پہلے میں سے فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا کو حذف کر دیا اور دوسرے میں سے وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ کو۔ اس حذف کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ مذکور ٹکڑے محذوف ٹکڑوں کی نشان دہی خود کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو دنیا ہی کے صلے کا طالب ہوتا ہے تو دنیا کا مالک بھی خدا ہی ہے وہ اس میں سے اس کو جتنا چاہتا ہے دیتا ہے اور جو آخرت کا طالب ہوتا ہے تو اللہ اس کو دنیا میں بھی جو چاہتا ہے دیتا ہے اور آخرت کا صلہ بھی بھرپور عطا فرمائے گا۔ یہ ان لوگوں کو تنبیہ و موعظت ہے جو اپنے دنیوی مفادات کی خاطر خدا کی شریعت سے فرار اختیار کر رہے ہوں۔ فرمایا جو صرف دنیا کا طالب بنتا ہے تو بہر حال اس میں سے وہ پاتا اتنا ہی ہے جتنا خدا کو منظور ہوتا ہے اور آخرت سے وہ بالکل محروم ہی رہتا ہے تو آخرت کا طالب کیوں نہ بنے کہ آخرت کا بھرپور صلہ بھی ملے اور دنیا میں سے جو مقدر ہو وہ بھی ملے۔ یہی مضمون بعینہٖ آل عمران کی آیات ۱۴۵ اور ۱۴۸ میں بھی گزر چکا ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس کے ساتھ سمیع و بصیر کی صفات کے حوالہ سے مقصود اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ خدا نہ کسی کی دعا و فریاد سے بے خبر ہے نہ کسی کی احتیاج اور حالت اس سے مخفی ہے تو آخر انسان اسی سے کیوں نہ چاہے اور مانگے، دوسروں سے کیوں آرزومند اور دادخواہ ہو۔

۳۸- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۳۵-۱۵۲

آگے پہلے مسلمانوں کو اس فریضۂ منصبی کی یاد دہانی فرمائی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو، اہل کتاب کو معزول کر کے، مامور فرمایا ہے۔ پھر منافقین کے خطرات سے ان کو ہوشیار بھی کیا ہے اور منافقین کو تنبیہ بھی کی ہے۔ نظم کلام بالکل واضح ہے۔

آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۳۵-۱۵۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا

فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ
تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ
الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَ
كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا
لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ
بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ
مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ
لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ
اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى
يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ
الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَۨا ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ
بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ
كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ
مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ
اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ ع ۲۰ ۱۴
اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ

النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ
لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ
سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ
دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾
اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ
نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا
دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ
اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۚ
الجزء ۶ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ
الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا
اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا
بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ
ع ۲۱ ۱ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾

ترجمۂ آیات ۱۳۵-۱۵۲

اے ایمان والو، حق پر جمے رہو اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے۔

اگرچہ یہ شہادت خود تمہاری اپنی ذات، تمہارے والدین اور تمہارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے۔ کوئی امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کا سب سے زیادہ حق دار ہے تو تم خواہش کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر کج کرو گے یا اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ، جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اے ایمان والو، ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری۔ اور جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روز آخرت کا انکار کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر کفر میں بڑھتے گئے، اللہ نہ ان کی مغفرت فرمانے والا ہے اور نہ ان کو راہ دکھانے والا ہے۔ منافقوں کو خوش خبری دے دو کہ ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ان کے لیے جو مسلمانوں کے مقابل میں کافروں کو دوست بنائے ہوئے ہیں۔ کیا ان کے ہاں عزت و رسوخ چاہتے ہیں، عزت تو سراسر اللہ کے لیے ہے۔ ۱۳۵-۱۳۹

اور وہ کتاب میں تم پر یہ ہدایت نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ آیات الٰہی کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو تاآنکہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں ورنہ تم بھی انہی کے مانند ہو جاؤ گے۔ اللہ منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔ ان کو جو تمہارے لیے گردشوں کے منتظر ہیں۔ اگر تمہیں اللہ کی طرف سے کوئی فتح حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کوئی جیت ہو جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر چھائے نہیں رہے اور

ہم نے مسلمانوں سے تم کو بچایا نہیں ؟ تو اللہ ہی فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن اور اللہ کافروں کو مومنوں پر کوئی راہ نہیں دے گا۔ ۱۴۰-۱۴۱

منافقین خدا سے چالبازی کرنا چاہتے ہیں حالانکہ چال وُہ ان سے چل رہا ہے اور جب یہ نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو الکسائے ہوئے اٹھتے ہیں محض لوگوں کے دکھانے کے لیے اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ درمیان ہی میں لٹک رہے ہیں، نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر۔ اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو تم ان کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔ ۱۴۲-۱۴۳

اے ایمان والو، مسلمانوں کے مقابل میں کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی صریح حجت قائم کرا لو۔ ۱۴۴

منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں ہوں گے اور تم ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو توبہ اور اصلاح کر لیں گے اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑیں گے اور اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر لیں گے وہ ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ ایمان والوں کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ ۱۴۵-۱۴۶

خدا کو تمہیں عذاب دینے سے کیا نفع ہے اگر تم شکرگزاری اختیار کرو اور ایمان لاؤ۔ اللہ تو بڑا قبول فرمانے والا اور جاننے والا ہے۔ ۱۴۷

اللہ بدزبانی کو پسند نہیں کرتا مگر یہ کہ کوئی مظلوم ہو۔ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اگر تم نیکی کو ظاہر کرو گے یا اس کو چھپاؤ گے یا کسی برائی سے درگزر کرو گے تو اللہ معاف کرنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔ ۱۴۸-۱۴۹

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا کفر کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے

رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی راہ نکالیں، یہی لوگ درحقیقت پکے کافر ہیں اور ہم نے ان کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ان کو ان کا اجر دے گا اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ۱۵۰-۱۵۲

۳۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (۱۳۵)

'کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ' 'قسط' کے لفظ پر آل عمران کی آیات ۱۸ اور ۲۱ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اس سے مراد حق و عدل کی وہ میزان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی شکل میں عطا فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمہارا ہر قول و فعل اسی باٹ اور اسی ترازو سے تولا ہوا ہو اور تم اسی پر قائم رہنے والے اور اسی کو قائم کرنے والے بنو۔ 'شُھَدَآءَ لِلّٰہِ' یعنی مجرد اس پر قائم رہنا ہی تمہاری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ تم دنیا کے سامنے اللہ کی طرف سے اس کے داعی اور گواہ بھی ہو جیسا کہ فرمایا ہے 'وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا' (اور اسی طرح ہم نے تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہی دے۔)

'وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ' یعنی یہ میزان عدل صرف لینے ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ دینے کے لیے بھی ہے۔ اگر اس کا فیصلہ کسی معاملے میں تمہارے، تمہارے والدین کے اور تمہارے اقربا کے خلاف ہو جب بھی تمہیں اسی پر قائم رہنا اور اسی کی گواہی دینا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ یہود کو جو کتاب دی گئی تو وہ اس کی وہ باتیں تو مانتے تھے جو اپنی خواہشوں کے مطابق پاتے لیکن جو باتیں ان کی خواہشوں کے خلاف پڑتیں ان سے کنی کاٹ جاتے۔

عدل پر قائم رہو خواہ اپنے حق میں ہو یا اپنے خلاف

'اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا' یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ امیر کے لیے اور باٹ سے تولو، غریب کے لیے اور باٹ سے، قوی اور با اثر کے لیے الگ قانون و شریعت ہو، کمزور و بے اثر کے لیے الگ حکم و قانون

امیر و غریب مفلس کے لیے ایک ہی ضابطہ یکساں نافذ

بلکہ سب کو اللہ کے ایک ہی قانونِ عدل کے تحت ہونا چاہیے اس لیے کہ اللہ کا حق سب پر یکساں قائم ہے اور یہ حق دوسرے تمام حقوق سے بڑا ہے۔ اگر کوئی شخص امیر اور باثر ہے تو اس وجہ سے وہ خدا کے حق سے بری الذمہ نہیں ہو جاتا کہ وہ خدا کے قانون کی ذمہ داریوں سے بری کر دیا جائے اور اس کے ساتھ کسی اور قانون کے تحت معاملہ کیا جائے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھنے کے لیے حضور کے اس ارشاد کو سامنے رکھیے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتی ہیں۔

> جب ایک مخزومیہ عورت نے چوری کی تو اس کے معاملے کی قریش کو بڑی فکر ہوئی۔ لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کون شخص ایسا ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کرے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اس کی جرأت صرف اسامہؓ بن زید کر سکتے ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے چہیتے ہیں۔ لوگوں کے کہنے پر اسامہؓ نے حضورؐ سے اس کی سفارش کی۔ حضورؐ نے فرمایا، اسامہ، تم اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود میں سے ایک حد کے معاملے میں سفارش کرنے آئے ہو، پھر آپ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا، لوگو، تم سے پہلے قوموں کو اسی چیز نے تباہ کیا کہ ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ اگر ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ خدا کی قسم میں ایسا نہیں کرنے کا۔ میں تو اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ (متفق علیہ)

اتباعِ ہویٰ ہدی اللہ کی ضد ہے فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا۔ ’ھویٰ‘ ’ھدی اللہ‘ کی ضد ہے یعنی اگر تم نے اللہ کی یہ ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہشوں اور بدعتوں کی پیروی کی تو تم اس قسط سے ہٹ جاؤ گے جس پر اللہ تعالیٰ نے تم کو قائم کیا ہے اور جس کی دعوت اور شہادت پر تم مامور کیے گئے ہو۔

نظامِ قسط کو بگاڑنے کی دو صورتیں وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا اس میں اس نظامِ قسط کو بگاڑنے کی دو شکلوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کو کج کرنے، بگاڑنے اور مسخ کرنے کی کوشش کی جائے جیسا کہ یہود نے کیا اور جس کا ذکر آل عمران کی آیت ۷۸، يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ الآیۃ میں ہوا ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو بگاڑنے کی کوشش تو نہ کی جائے، اس کی شکل باقی رہے لیکن زندگی کے معاملات میں اس کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ فرمایا کہ ان میں سے جو ظلم بھی کرو گے خدا اس سے بے خبر نہیں رہے گا اور جب بے خبر نہیں رہے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس جرمِ عظیم کی سزا دیے بغیر بھی نہ چھوڑے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (۱۳۶)

زبان کا ایک اسلوب ’يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا‘ ہم دوسرے مقام پر زبان کا یہ اسلوب واضح کر چکے ہیں کہ فعل اپنے

ابتدائی اور ظاہری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اپنے حقیقی اور کامل معنی میں بھی۔ یہاں مسلمان من حیث الجماعت مخاطب ہیں جن میں خام و پختہ، ناقص و کامل اور مخلص و منافق ہر قسم کے عناصر شامل تھے۔ ان سب کو خطاب کر کے تنبیہ فرمائی ہے کہ اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو، سچے اور پکے مومن بن جاؤ۔ گویا خطاب تو عام ہے لیکن رُوئے سخن خام کاروں اور مدعیوں کی طرف ہے۔

قرآن سے پہلے اصل کتاب الٰہی کی حیثیت صرف تورات کو حاصل ہے

'وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ' میں کتاب سے مراد تورات ہے۔ واحد سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن سے پہلے اصل کتاب الٰہی کی حیثیت درحقیقت تورات ہی کو حاصل ہے، دوسرے انبیا کے صحیفوں کی حیثیت مستقل بالذات صحیفوں کی نہیں ہے اس لیے کہ ان انبیا میں سے سب تورات ہی کے داعی بن کر آئے۔ یہاں تک کہ حضرت مسیحؑ بھی درحقیقت تورات ہی کو قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان انبیا کے صحیفوں میں جو تعلیم ہے وہ تورات سے کوئی الگ شے نہیں بلکہ اسی کے احیاء و تجدید کی دعوت اور اسی کے حکم و اسرار کا اظہار و بیان ہے۔ اس وجہ سے باعتبار حقیقت تو ایک ہی کتاب ہے لیکن ظاہر کا لحاظ کیا جائے تو جمع بھی قرار دے سکتے ہیں۔ قرآن نے دونوں طرح سے ذکر کیا ہے اور اس سے مقصود اصل حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے تاکہ ظاہری تعدد کو جن نادانوں نے تفریق بین الرسل کا ذریعہ بنایا ان کو اپنی حماقت پر تنبیہ ہو۔

'اَنْزَلَ' اور 'نَزَّلَ' میں فرق

یہاں 'نَزَّلَ' اور 'اَنْزَلَ' کا فرق بھی قابل توجہ ہے۔ جو لوگ عربی زبان کی باریکیوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ 'اَنْزَلَ' کا مفہوم تو صرف اتار دینا ہے لیکن 'نَزَّلَ' کے اندر اہتمام اور تدریج کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ لفظوں کا یہ فرق تورات اور قرآن دونوں کے اتارے جانے کی نوعیت کو واضح کر رہا ہے۔ یہاں یہ اشارہ کافی ہے۔ کسی موزوں محل میں ہم اس پر وضاحت سے گفتگو کریں گے۔

آیت سیاق و سباق کے درمیان بیچ کی کڑی ہے

اس آیت میں ایمان کے جو اجزا مذکور ہوئے ہیں ان سب پر تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ میں بحث ہو چکی ہے۔ یہاں جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیت اوپر کی آیت اور آگے کی آیات کے درمیان بیچ کی کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک طرف تو یہ اس کلمۂ جامعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو امت وسط اور قائم بالقسط امت کا کلمہ ہے یعنی بلاتفریق تمام انبیا و رسل اور تمام آسمانی صحیفوں پر ایمان جو اس بات کی شہادت ہے کہ یہ امت عدل و قسط پر قائم ہے، یہود و نصاریٰ کی طرح تعصب و تحزب کے جنون میں مبتلا ہو کر اس نے حق و عدل کی شاہراہ نہیں چھوڑی۔ دوسری طرف یہ ان منافقین کے ذکر کی تمہید ہے جو یا تو خود یہود میں سے تھے یا درپردہ ان کے زیر اثر تھے۔ اس وجہ سے بعینہٖ انہی گمراہیوں میں مبتلا تھے جو یہود کا ورثہ تھیں چنانچہ بعد کی آیات سے اس حقیقت کا پوری طرح انکشاف ہو گیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ سَبِیْلًا ۝ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمَا ۝ (۱۳۷-۱۳۸)

اہل کتاب کے اندر سے آئے ہوئے منافقین کا کردار

اہل ایمان کا صحیح موقف و مقام واضح کرنے کے بعد منافقین کی طرف توجہ فرمائی کہ جو لوگ ایمان لائے پھر کفر کیا پھر ایمان لائے پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر ہی میں بڑھتے گئے، یہ خدا کی مغفرت اور ہدایت کے سزاوار نہیں ہیں، ان منافقین کو خدا کے دردناک عذاب کی بشارت پہنچا دو۔ یہ بات کہ یہاں ذکر منافقین ہی کا ہے خود قرآن کی ان آیات ہی سے واضح ہے بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ کے الفاظ سے خود یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ یہ کن لوگوں کا کردار بیان ہوا ہے۔ البتہ یہ سوال قابل غور ہے کہ یہ ایمان پھر کفر، پھر ایمان، پھر کفر کی حالت جو ان کی بیان ہوئی ہے یہ محض ان کے تذبذب کی ایک تعبیر ہے یا بیان واقعہ ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ بیان واقعہ ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ یہ منافقین زیادہ تر اہل کتاب بالخصوص یہود میں سے تھے اور انہی کے زیر اثر بھی تھے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو ان کے ایمان و کفر کا ایک کھیل تو وہ ہے جو وہ تورات کے ساتھ پہلے کھیل چکے ہیں اور دوسرا کھیل یہ ہے جو وہ اسلام کے ساتھ کھیل رہے ہیں کہ پہلے آگے بڑھ کر اس کے ماننے کا اقرار کیا اور اب رات دن اس کے خلاف سازشیں کرنے کے درپے ہیں۔ فرمایا کہ اب ان کو خدا نہ تو بخشنے کا ہے نہ ان کو کوئی اور راہ دکھانے کا ہے۔ کوئی اور راہ دکھانے سے مطلب یہ ہے کہ اب ان پر حجت تمام ہو چکی ہے، اب ان کے مزید امتحان کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب ان کے لیے صرف جہنم کی راہ باقی رہ گئی ہے۔ آگے اس مضمون کو اس طرح واضح فرما دیا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَہُمْ وَلَا لِیَہْدِیَہُمْ طَرِیْقًا اِلَّا طَرِیْقَ جَہَنَّمَ ۱۶۷-۱۶۸ (جن لوگوں نے کفر کیا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے، اللہ نہ تو ان کو بخشنے کا ہے اور نہ کوئی اور راستہ ان کو دکھانے کا ہے بجز جہنم کے راستے کے) اسی مضمون کو یہاں بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَہُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا سے تعبیر فرمایا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَہُمُ الْعِزَّۃَ فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا ؕ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِہَا وَیُسْتَہْزَاُ بِہَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَہُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖۤ ۫ۖ اِنَّکُمْ اِذًا مِّثْلُہُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْکٰفِرِیْنَ فِیْ جَہَنَّمَ جَمِیْعًا (۱۳۹-۱۴۰)

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ میں سورۂ انعام آیت ۶۸ کا حوالہ ہے

'وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ' میں حوالہ ہے سورۂ انعام کی آیت ۶۸ کا۔ وہاں فرمایا ہے۔ وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْہُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ ؕ وَاِمَّا یُنْسِیَنَّکَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (اور جب تم ان کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں کج بحثیاں کر رہے ہیں تو ان سے اعراض کرو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں اور اگر تمہیں شیطان یہ بات فراموش کرا دے تو یاد آنے کے بعد ان ظالموں کے پاس نہ بیٹھو) پھر یہی مضمون اسی انعام کی آیت ۷۰ میں بھی بیان ہوا ہے۔

مجالس میں اللہ کی آیات کا مذاق

'اَلَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الآیۃ'، یہ منافقین کی صفت بیان ہوئی ہے کہ یہ مسلمانوں کے بالمقابل کفار یعنی یہود کو اپنا دوست اور کارساز بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں عزت و سرخروئی حاصل کرنے کے آرزومند ہیں حالانکہ عزت و ذلت سب خدا کے اختیار میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ یہ ان کی مجالس میں حاضری دیتے ہیں جہاں اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن میں یہ صریح ہدایت نازل ہو چکی ہے کہ جب دیکھو کہ اللہ کی آیات کا کفر کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو، یہاں تک کہ یہ مذاق اڑانے والے کسی اور بات میں لگ جائیں۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو یہ بھی انھیں کا ساتھی بن جاتا ہے اس لیے اللہ ایسے منافقوں کو انہی کافروں کے ساتھ دوزخ میں جمع کرے گا۔

جن مجلسوں میں اللہ کے دین اور اس کی شریعت کا تمسخر ہوتا ہو ان میں اگر کوئی مسلمان شریک ہو تو یہ اس کی بے حمیتی اور بے غیرتی کی دلیل ہے۔ اگر کوئی شخص ان میں شرکت کو اپنے لیے وجہ عزت و شرف سمجھے تو یہ صرف بے حمیتی کی ہی نہیں بلکہ اس کے مسلوب الایمان ہونے کی بھی دلیل ہے۔ اس قسم کے منافقوں کا حشر انھی لوگوں کے ساتھ ہوگا جن کے ساتھ خدا کے دین کے استہزا میں یہ شریک رہے ہیں۔ اس آیت سے دعوت دین کے بعض اہم اصول بھی نکلتے ہیں لیکن ان پر گفتگو کے لیے موزوں مقام سورۂ انعام میں آئے گا۔

الَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ ۚ فَاِنْ کَانَ لَکُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰہِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ ۫ۖ وَاِنْ کَانَ لِلْکٰفِرِیْنَ نَصِیْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْکُمْ وَنَمْنَعْکُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ فَاللّٰہُ یَحْکُمُ بَیْنَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا ۱۴۱

استحوذ علیہ کا مفہوم

'اِسْتَحْوَذَ عَلَیْہِ' کے معنی ہیں اَحَاطَ بِہٖ، غلبہ، استولی علیہ' اس کو گھیرے میں لے لیا۔ اس پر غالب آگیا۔ نر، مادہ کو جب اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے، کسی دوسرے نر کو اس کی طرف بڑھنے نہیں دیتا تو اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

'یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ' یعنی یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ تمہارے لیے گردشوں کے منتظر رہتے ہیں۔

منافقین کی دو طرفہ ساز باز

یہ انھی منافقین کے کردار کی مزید تفصیل ہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے نہایت بدخواہ ہیں۔ یہ ہمیشہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تمھیں کوئی افتاد پیش آتی، کوئی ٹھوکر لگے، تم شکست کھاؤ۔ تمھیں فتح حاصل ہو تو کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہیں تھے اور اگر کہیں دشمن کا پلہ بھاری ہو جاتے تو ان کے پاس پہنچیں گے اور ان کو یقین دلائیں گے کہ یہ تو ہماری تدبیر تھی کہ تم مسلمانوں سے محفوظ رہے۔ ہم اس طرح تمھیں بچاتے رہے کہ مسلمان تم پر مکمل کر حملہ نہ کر سکے اور ان کا پورا دباؤ تم پر نہ پڑ سکا۔ فرمایا کہ آج یہ ان سخن سازیوں سے کام چلا رہے ہیں لیکن ایک دن آنے کا کہ سارے حالات بے نقاب ہو جائیں گے اس دن خدا تمھارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا اور تمھارے مقابل میں ان کی کچھ پیش نہ جائے گی۔ اس دن یہ اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ کا دعویٰ ذکر سکیں گے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ سَبِیْلًا (۱۴۲-۱۴۳)

'یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ' کے ہر پہلو پر پوری تفصیل کے ساتھ سورہ بقرہ کی آیت ۹ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔

منافقین کے تذبذب کی تصویر

مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ۔ 'ذَبْذَبَ الشَّیْءُ' کے معنی ہیں، چیز فضا میں ٹنگی ہوئی حرکت کر رہی ہے۔ 'ذَبْذَبَ الرَّجُلُ' کے معنی ہیں آدمی حیران و متردد ہے۔

'بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ' یعنی نہ مسلمانوں کے ساتھ نہ کفار کے ساتھ، دونوں کے بیچ میں حیران و درماندہ، کبھی مسلمانوں کے پاس جا کر ان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں، کبھی کفار کے پاس پہنچ کر ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں حالانکہ ساتھ کسی کے بھی نہیں؛ دو گلوں کے بیچ میں بھٹکنے والی بکری کے مانند کبھی اس گلے میں شامل ہو جاتے ہیں کبھی دوسرے گلے میں۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'کُسَالٰی'، 'یُرَآءُوْنَ' اور 'مُذَبْذَبِیْنَ' تینوں حال پڑے ہوئے ہیں۔ ان تینوں کو بیک وقت چشم تصور کے سامنے لائیے تب صحیح تصویر سامنے آئے گی۔

اللہ کے ساتھ دھوکا بازی کرنے والا خود دھوکے میں ہے

مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین صرف اللہ کے بندوں ہی کو دھوکا نہیں دے رہے ہیں بلکہ خدا کو بھی دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ جو خدا کو دھوکا دینا چاہتا ہے وہ خدا کو دھوکا نہیں دیتا بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اس لیے کہ خدا اس کی رسی دراز کر دیتا ہے جس سے وہ سمجھتا ہے کہ اس نے خدا کو دھوکا دے دیا ہے حالانکہ دھوکا اس نے خدا سے کھایا۔ 'وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ الاٰیۃ' یہ ان کی اس دھوکا بازی کی مثال ہے یعنی نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو طبیعت پر جبر کر کے، الکسائے ہوئے، مارے باندھے محض اس ڈر سے اٹھتے ہیں کہ اگر شریک جماعت نہ ہوئے تو مسلمانوں کے رجسٹر سے نام ہی خارج ہو جائے گا۔ یہ محض دکھاوے کی نماز ہوتی ہے کہ مسلمان ان کو اپنے اندر شامل سمجھیں اس وجہ سے اس میں اللہ کا ذکر اتنا ہی ہوتا ہے جتنا مجبوری اور دکھاوے کی نماز میں ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ صریح دھوکا بازی ہے۔ فرمایا یہ خدا کے راندے ہوئے ہیں، اس نے ان کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اور جن کو خدا نے بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہو اب ان کو راہ پر کون لا سکتا ہے۔

عہد اول میں مسجد کی حاضری ایمان اور کفر کے درمیان علامت فارق تھی

اس آیت سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اس دور میں مسجد کی حاضری ایمان اور کفر کے درمیان ایک علامت فارق کی حیثیت رکھتی تھی۔ جو شخص بلا کسی عذر معلوم کے مسجد سے غیر حاضر رہتا اس کے لیے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا ہی ناممکن ہو جاتا۔ ایک یہ دور تھا یا اب یہ دور آیا ہے جماعت کی حاضری تو درکنار سرے سے نماز پڑھنا ہی مسلمان سمجھے جانے بلکہ مسلمانوں کا لیڈر

ماننے جانے کے لیے بھی ضروری نہیں رہا۔ یا للعجب!

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ ٱلْكَٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۚ أَتُرِيدُونَ أَن تَجْعَلُوا۟ لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَٰنًا مُّبِينًا (۱۴۴)

ٱلْكَٰفِرِينَ اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ مراد اس سے وہی اہل کتاب ہیں جن سے منافقین کا سازباز تھا۔
مِن دُونِ ٱلْمُؤْمِنِينَ کی قید یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ کفار کو دوست اور حلیف بنانا اسی حالت میں ممنوع ہے جب یہ مسلمانوں کے بالمقابل ہو۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

سُلْطَٰنًا مُّبِينًا واضح اور قطعی حجت۔

مسلمانوں کے بالمقابل کفار سے دوستی دلیل کفر ہے

خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن منافقین ہی کی طرف ہے کہ مسلمانوں کے بالمقابل کفار کو اپنا دوست اور ساتھی نہ بناؤ۔ یہ جرم کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ اس جرم کا ارتکاب کر کے تم اپنے خلاف اللہ کو ایک ایسی حجت قاطع دے دو گے کہ پھر تمہارے لیے کسی عذر کی گنجائش باقی نہ رہ جائے گی۔ تمہارا کفر بالکل قطعی اور تمہارا سزاوار دوزخ ہونا بالکل مبرہن ہو جائے گا۔

إِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ فِى ٱلدَّرْكِ ٱلْأَسْفَلِ مِنَ ٱلنَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ۝ إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ وَأَصْلَحُوا۟ وَٱعْتَصَمُوا۟ بِٱللَّهِ وَأَخْلَصُوا۟ دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُو۟لَٰٓئِكَ مَعَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۖ وَسَوْفَ يُؤْتِ ٱللَّهُ ٱلْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ مَّا يَفْعَلُ ٱللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَءَامَنتُمْ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا (۱۴۵-۱۴۷)

الدرک الاسفل کا مفہوم

'ٱلدَّرْكِ ٱلْأَسْفَلِ'، درک، کے معنی اقصی قعر الشیء یعنی کسی شے کا سب سے نچلا حصہ۔

دین بمعنی اطاعت

'وَأَخْلَصُوا۟ دِينَهُمْ لِلَّهِ' لفظ 'دین' کے مختلف معانی پر ہم کہیں بحث کر چکے ہیں۔ انہی میں سے اس کے معنی اطاعت کے بھی ہیں مثلاً قُلْ إِنِّىٓ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ ٱللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ ٱلدِّينَ (۱۱ - زمر)
(کہہ دو مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اللہ ہی کی بندگی کروں اس کی مخلصانہ اطاعت کے ساتھ)

منافقین کا درجہ کفار سے بھی نیچے ہے

یہ منافقین کو آخری تنبیہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ کفر صریح کے بالمقابل ان کا یہ مذبذب ایمان بھی تو بہرحال کچھ قیمت رکھتا ہی ہے۔ فرمایا کہ نہیں، یہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے یعنی ان کا درجہ کٹر اور معاند کفار کے درجے سے بھی نیچے ہے۔ توبہ کے سوا کوئی چیز بھی ان کو اس انجام سے نہیں بچا سکتی۔ اور اس توبہ کے لیے اصلاح، اعتصام باللہ اور اخلاص کی شرط ہے۔ اصلاح یعنی اپنے رویے کی اصلاح کریں، اعتصام یعنی اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑیں، اخلاص یعنی اللہ و رسول کی مخلصانہ اطاعت کریں، بغیر کسی تذبذب اور ریا کے۔ فرمایا کہ تب یہ آخرت میں مسلمانوں کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔ اور یہ اطمینان رکھیں کہ اللہ کے ہاں اہل ایمان کے لیے بڑا اجر ہے۔ اس کے بعد خود ان منافقین کو مخاطب کر کے، بانداز التفات فرمایا کہ خدا کو تمہیں عذاب دینے میں کوئی نفع نہیں ہے۔ اگر تم شکرگزار بنو اور ایمان اختیار کرو تو اللہ بڑا قدردان اور ہر ایک کے ایمان و عمل سے اچھی طرح باخبر ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ فلسفۂ دین کے اعتبار سے شکر ہی ایمان کا سرچشمہ ہے۔ نیز یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ بعض مرتبہ نسبت کے بدل جانے سے الفاظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ شکر کی نسبت جب خدا کی طرف ہوتی ہے تو اس کے معنی قبول کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں باتوں پر دوسرے مقام میں بحث گزر چکی ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۔ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْۗءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (۱۴۸-۱۴۹)

تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار صرف مظلوم کے لیے جائز ہے

یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی ایک تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ آیت ۸۶ میں گزر چکی ہے۔ جس طرح وہاں منافقین سے جب اعراض کا حکم ہوا تو ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ جو تمھیں سلام کرے تم اس کے سلام کا جواب دو اور مقصود اس سے یہ تھا کہ مبادا پرجوش مسلمان ان لوگوں سے سلام کلام ہی بند کر دیں جن پر ان کو منافقت کا شبہ ہو جائے۔ اسی طرح یہاں اوپر والی آیات میں منافقین کے لیے چونکہ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ تک کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس سے اس بات کا اندیشہ تھا کہ مسلمان علانیہ سخت الفاظ میں منافقین کی برائیوں کا اظہار و اعلان شروع کر دیں گے اس وجہ سے یہ ہدایت کر دی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار صرف مظلوم کے لیے جائز ہے۔ دوسروں کے لیے اللہ اس کو پسند نہیں فرماتا۔

یہ بات چونکہ جماعتی زندگی کے نہایت اہم مسائل میں سے ہے اس وجہ سے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

جماعتی زندگی کی ایک اہم ہدایت

جماعتی زندگی میں کسی گروہ کے اندر اگر کوئی ایسی برائی جڑ پکڑ رہی ہو یا پکڑ چکی ہو جو پوری جماعت کے لیے خطرہ بن سکتی ہو تو اس کا تدارک ضروری ہوتا ہے اور اس تدارک کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس برائی کی قباحت و شناعت، اس کے نتائج بد اور اس کے مرتکبین کے انجام کو اچھی طرح واضح کر دیا جائے تاکہ جماعت کے افراد اس کے شر سے محفوظ رہیں لیکن ساتھ ہی اس امر کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ جماعت کے عام افراد، عام صیغہ سے کہی ہوئی بات کو بطور خود اپنے اندازے، قیاس اور گمان کی بنا پر معین اشخاص پر منطبق کرنا نہ شروع کر دیں۔ اس سے نہ صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ بہت سے بے گناہ اشخاص تہمتوں کے ہدف بن جائیں گے بلکہ جماعت میں انتشار و فساد پیدا ہو جانے کا خطرہ بھی ہے۔ یہاں منافقین سے متعلق جو باتیں بیان ہوئی ہیں، دیکھ لیجیے، بالکل عام صیغے سے بیان ہوتی ہیں اور مقصود یہ ہے کہ جو لوگ یہ حرکتیں کر رہے ہیں وہ اگر اپنی اصلاح کرنا چاہیں تو اصلاح کر لیں اور اگر وہ اصلاح نہ کریں تو کم از کم مسلمان اپنے آپ کو ان فتنوں سے محفوظ رکھیں۔ اس حد تک یہ چیز نہ صرف یہ کہ ٹھیک ہے بلکہ جماعتی بقا کے لیے ناگزیر ہے لیکن اگر یہی چیز یہ شکل اختیار کر لے کہ اس کو دلیل بنا کر عام افراد تعین کے ساتھ ایک دوسرے کو ہدف مطاعن بنانا شروع کر دیں کہ تو منافق ہے، تو کافر ہو گیا اور فلاں فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کا سزاوار ہے تو پوری جماعت میں ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔ اس فتنے کے سدباب کے لیے یہ ہدایت فرما دی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار و اعلان صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جس

پر شخصاً ظلم ہوتا ہے۔ اس صورت میں ظلم، ظالم اور مظلوم تینوں متعین ہوں گے اور قانون اس کا مداوا کر سکے گا جب تک یہ شکل نہ ہو بات عام صیغے ہی سے کہنی چاہیئے جس طرح قرآن نے کہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں بھی جب اس طرح کی کوئی برائی آتی تو آپ ہمیشہ عام صیغے ہی سے اس پر لوگوں کو ملامت فرماتے۔ آپ کا عام انداز کلام یہ ہوتا، 'مَا بَالُ قَوْمٍ يَفْعَلُوْنَ كَذَا وَكَذَا' ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو اس اس طرح کے کام کرتے ہیں۔ البتہ جب کوئی متعین شخص کسی متعین جرم کے ساتھ سامنے آتا تو اس پر قانون کے مطابق گرفت فرماتے۔

صفات الٰہی کے ذکر سے مقصود ان کا لازم — 'وَكَانَ اللهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا' بطور تنبیہ ہے یعنی کوئی شخص اگر اس ہدایت کے خلاف روش اختیار کرے گا تو وہ یاد رکھے کہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ہم ایک سے زیادہ مقامات پر یہ اصول بیان کر چکے ہیں کہ اس طرح جب صفات الٰہی کا حوالہ آتا ہے تو مقصود اس سے ان کا لازم ہوتا ہے یعنی جب خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے تو اس پر وہ گرفت بھی لازماً فرمائے گا۔

پسندیدہ روش کا بیان — 'اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا' الآیۃ خدا کو جو روش ناپسند ہے اس کو بیان فرمانے کے بعد یہ پسندیدہ روش کا بیان ہے۔ فرمایا کہ پسندیدہ روش یہ ہے کہ آدمی اچھی بات کا اظہار کرے، اچھا جذبہ دل میں پرورش کرے اور دوسروں کی برائیوں سے درگزر کرے۔ اس کے بعد اپنی دو صفتوں — عفو اور قدیر — کا حوالہ دیا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ خدا ہر طرح کی قدرت رکھنے کے باوجود لوگوں کی برائیوں سے درگزر فرماتا ہے۔ اس وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ اس کی ان صفات کا عکس اس کے بندوں کے اندر بھی پایا جائے۔ آدمی طاقت رکھتا ہو کہ وہ کسی کو ترکی بہ ترکی جواب دے سکے لیکن اس کے باوجود وہ درگزر کر جائے تو یہ عفو ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۞ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۱۵۰-۱۵۲)

اہل کتاب کے کفر کا فریب — ان آیات میں اہل کتاب کی جو فرد قرارداد جرم بیان ہوئی ہے اس کے ہر جزو پر مفصل بحث پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ البتہ ان کا موقع و محل وضاحت طلب ہے۔ اوپر آیت ۱۴۴ کے تحت یہ بات گزر چکی ہے کہ 'لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ' میں کافرین سے مراد اہل کتاب ہیں۔ اگرچہ اہل کتاب کا کفر بالکل واضح ہے لیکن جیسا کہ بعض طبیعتیں، جو ان سے ساز باز رکھنا چاہتی تھیں، اپنے روابط ان سے کاٹنے کے لیے تیار نہ تھیں وہ اپنے اس رویے کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ حیلہ شرعی تراشتی تھیں کہ اہل کتاب بہر حال اہل کتاب ہیں، ان کے اندر دین کے نقطۂ نظر سے کچھ خرابیاں ہو سکتی ہیں اور ہیں لیکن ان خرابیوں کی بنا پر ان کو

بالکل کفار کی صف میں کھڑا کر دینا اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کرنا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ قرآن نے اگلی حیلہ بازیوں کے اس فریب کا ان آیات میں پردہ چاک کیا ہے اور نہایت صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ پکے کافر تو درحقیقت یہ اہل کتاب ہی ہیں اس لیے کہ یہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرتے ہیں جن کو خدا نے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے ان میں سے جس کو چاہتے ہیں مانتے ہیں جس کو چاہتے ہیں نہیں مانتے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خدا پر ایمان اپنے شرائط پر لانا چاہتے ہیں نہ کہ خدا کے شرائط پر، حالانکہ ایمان صرف وہ معتبر ہے جو خدا کے شرائط پر ہو۔ اگر ایمان کی شرطیں یہی مقرر کریں گے اور رسولوں کا انتخاب یہ اپنی ہی صواب دید پر کریں گے تو پھر خدا کی خدائی کہاں رہی۔ پھر تو خدا کا منصب انھوں نے خود ہی سنبھال لیا۔ فرمایا کہ ان کے کٹر کافر ہونے میں ذرا شبہ نہیں اور ایسے بر خود غلط اور مغرور کافروں کے لیے ہم نے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ مومن صرف وہ لوگ شمار ہوں گے جو اللہ اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لاتے، ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی۔ یہ لوگ بے شک اپنا اجر پائیں گے۔ خدا غفور رحیم ہے۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کفر صرف یہی نہیں ہے کہ کوئی شخص صریح لفظوں میں خدا اور رسولوں کا انکار کرے بلکہ یہ بھی کفر اور صریح کفر ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کو تو مانے لیکن اپنی شرائط پر۔

۴۰۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۱۵۳-۱۶۲

آگے اہل کتاب — یہود اور نصاریٰ — کو تنبیہ ہے اور یہ تنبیہ اتنی سخت و شدید ہے کہ لفظ لفظ سے جوشِ غضب ابلا پڑ رہا ہے۔ پوری تقریر از ابتدا تا انتہا صرف فردِ قرار دادِ جرائم پر مشتمل ہے اور کلام کے جوش اور روانی کا یہ عالم ہے کہ بات شروع ہونے کے بعد یہ متعین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ختم کہاں ہوتی۔ اس قسم کے پرجوش اور پرغضب کلام میں عموماً خبر حذف ہو جاتی ہے گویا متکلم کا جوش ہی خبر کا قائم مقام بن جاتا ہے اور مبتدا ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ متکلم کیا کہنا چاہتا ہے ـــ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ آیات
سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ ۱۵۳-۱۶۲
الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ
الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا
فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا

لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا
نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ
حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾
وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ
وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ
مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ
رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾
فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ
وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ
نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ
مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ
الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ
اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع ۲۲ ۱۰ ۲

ترجمۂ آیات ۱۵۳-۱۶۲

اہلِ کتاب تم سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم ان پر براہِ راست آسمان سے ایک کتاب اتار دو۔ یہ تعجب کی بات نہیں، موسیٰ سے تو انھوں نے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا۔

انھوں نے مطالبہ کیا کہ ہمیں تم اللہ کو کھلم کھلا دکھا دو۔ تو ان کو ان کی اس زیادتی کے باعث کڑک نے آ دبوچا۔ پھر نہایت واضح نشانیاں آ چکنے کے بعد انھوں نے گوسالے کو معبود بنا لیا۔ ہم نے اس سے درگزر کیا اور موسٰی کو ہم نے نہایت واضح حجت عطا کی۔ اور ہم نے ان کے اوپر طور کو معلق کیا ان کے عہد کے ساتھ اور ہم نے ان کو کہا کہ دروازے میں داخل ہو سر جھکائے ہوئے اور ان کو کہا کہ سبت کے معاملے میں حکم عدولی نہ کرنا۔ اور ہم نے ان سے ایک مضبوط عہد لیا۔ ۱۵۳-۱۵۴

پس بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنے عہد کو توڑا، بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، بوجہ اس کے کہ انھوں نے انبیاء کو ناحق قتل کیا اور بوجہ اس کے کہ انھوں نے کہا کہ ہمارے دل تو بند ہیں ـــ بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے تو وہ کم ہی ایمان لائیں گے ـــ اور بوجہ ان کے کفر کے اور بوجہ ان کے مریم پر ایک بہتان عظیم لگانے اور بہ سبب ان کے اس دعوے کے کہ ہم نے مسیح بن مریم اللہ کے رسول کو قتل کیا ـــ حالانکہ نہ تو انھوں نے اس کو قتل کیا، نہ سولی دی بلکہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا اور جو لوگ اس کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ اس کے معاملے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں، ان کو اس بارے میں کوئی قطعی علم نہیں بس گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ قتل اس کو انھوں نے ہرگز نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۱۵۵-۱۵۸

اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں ہے جو اس کی موت سے پہلے اس کا یقین نہ کر لے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔ ۱۵۹

پس ان یہودیوں کے ظلم کے سبب سے ہم نے بعض پاکیزہ چیزیں ان پر حرام کر دیں جو ان کے لیے حلال تھیں اور بوجہ اس کے کہ وہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے ہیں اور بوجہ اس کے کہ وہ سود لیتے ہیں حالانکہ اس سے ان کو روکا گیا ہے اور بوجہ اس کے کہ وہ لوگوں کا مال باطل طریقہ سے کھاتے ہیں اور ہم نے ان میں سے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ البتہ ان میں جو علم میں راسخ اور صاحب ایمان ہیں وہ ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی اور خاص کر نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم اجر عظیم دیں گے۔ ۱۶۰-۱۶۲

۴۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَسْـَٔلُكَ أَهْلُ الْكِتٰبِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا
اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ
فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۔ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا
الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ
مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ
اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ (۱۵۳-۱۵۵)

ان آیات میں تاریخ بنی اسرائیل کے جن واقعات کا حوالہ ہے وہ بلا استثنا سب کے سب سورۂ بقرہ کی تفسیر میں زیر بحث آ چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر آیات ۴۷-۹۲۔

'بظلمھم' کا مفہوم 'بِظُلْمِهِمْ' یعنی اس کی کہ انھوں نے اپنی بدبختی سے خود دعوت دی۔ یہ اللہ نے ان کے اوپر ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا۔ انھوں نے ایک ایسے تجربے کے لیے ضد کی جس کی وہ تاب نہیں لا سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس کی زد میں آ گئے۔

'سلطان مبین' سے مراد 'سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا' سے مراد وہ حجت قاطع ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معجزات کی شکل

میں عطا فرمائی۔ یہ معجزات ایسے مسکت اور قاہر تھے کہ ان کے بعد کسی انصاف پسند کے لیے کسی تردد کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

رفع طور اور میثاق

'وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ' میں 'ب' میرے نزدیک تلبس کے مفہوم میں ہے۔ بقرہ آیت ۶۳ کے تحت ہم نے رفع طور کی حقیقت بھی واضح کی ہے اور اس کا مقصد بیان کیا ہے کہ اس قدرت قاہرہ کے اظہار سے مقصود بنی اسرائیل پر یہ واضح کرنا تھا کہ جس خدا سے یہ معاہدہ کر رہے ہو اس کے ہاتھ میں یہ پہاڑ کو ہلا دینے والی طاقت بھی ہے۔ اگر معاہدہ کر چکنے کے بعد اس کو توڑا تو یاد رکھو کہ اس عہد شکنی کی سزا سے تمہیں کوئی نہ بچا سکے گا۔ یہاں اسی حقیقت کو اس طرح مصور کیا ہے کہ خدا نے ان کے اوپر طور کو بھی اٹھایا اور اس کے ساتھ معاہدہ کو بھی کہ یہ معاہدہ ہے اور یہ پہاڑ، اگر اس معاہدے کی بے حرمتی ہوئی تو اسی پتھر سے تمہارا سر کچل دیا جائے گا۔

'بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا' جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے قول 'قُلُوْبُنَا غُلْفٌ' کا مفہوم اور اس جملہ معترضہ کی بلاغت اور اس کی حقیقت سورۂ بقرہ میں بیان ہو چکی ہے۔

بلاغت کا ایک اسلوب

اس پورے رکوع میں بلاغت کا یہ اسلوب قابل توجہ ہے کہ بنی اسرائیل کے جرائم کی ایک طویل فہرست تو سنا دی گئی ہے لیکن الفاظ میں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اس فہرست کے سنانے سے مدعا کیا ہے۔ جرائم کی فہرست کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ آگیا ہے اور اس کے ختم ہوتے ہی پھر ان کے جرائم کے بیان کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اقتضائے کلام سے ایک اور طویل جملہ معترضہ آگیا ہے اور اس کے بند ہوتے ہی پھر فہرست جرائم شروع ہو گئی۔ یہ اسلوب بیان، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، متکلم کے زور بیان اور جوش، سامع کی ذہانت اور ہوش، دعوے کی قوت اور وضاحت اور فیصلہ کے مستغنی عن البیان ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ خطبائے عرب کے خطبات میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ قرآن میں بھی آگے اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ اس طرح کے پر زور کلام کو ایک صاحب ذوق سامع سمجھ تو سکتا ہے لیکن اس کے زور اور اس کی بلاغت کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

کلام کا مدعا اپنے الفاظ میں

مطلب یہ ہے کہ یہود تم سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ قرآن اور تمہاری رسالت پر اس وقت ایمان لائیں گے جب تم ان کے اوپر آسمان سے اس طرح ایک کتاب اتار دو کہ وہ اس کو اترتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ تم ان کے اس مطالبے پر تعجب نہ کرو۔ یہ جن اسلاف کے خلف ہیں وہ اپنے پیغمبر سے اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر مطالبہ کر چکے ہیں۔ یہ تو صرف کتاب ہی اترتے دیکھنا چاہتے ہیں، انھوں نے تو یہ مطالبہ کیا تھا کہ تم ہمیں خدا کو کھلم کھلا دکھاؤ، جب تک تم خدا کو نہ دکھاؤ گے ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ تم سے ہم کلام ہوتا ہے اور تم اس کے فرستادہ ہو۔ چنانچہ اس طرح انھوں نے خود اپنی شامت بلائی اور ان کو ایک کڑک نے آدبوچا۔ پھر اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ انھوں نے نہایت واضح معجزات دیکھنے

کے بعد بھی ایک بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ لیکن ہم نے اس سے درگزر کیا اور موسیٰ کو نہایت واضح حجت عطا کی تاکہ ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔ ہم نے ان سے میثاق لینے کے موقع پر ان کے سروں پر طور کو لٹکا دیا، ان کو خیمۂ عبادت میں فروتنی کے ساتھ داخل ہونے کی ہدایت کی، ان کو حکم دیا کہ سبت کی بے حرمتی نہ کرنا اور ان سب باتوں کے لیے ان سے نہایت مضبوط میثاق لیا لیکن انھوں نے کسی عہد کی بھی پروا نہ کی بلکہ ہر عہد کو توڑا، اللہ کی آیات کا انکار کیا، انبیاء کو بے گناہ قتل کیا، اور کہا کہ ہمارے دلوں کے دروازے تو تمھاری باتوں کے لیے بند ہیں۔ یہ بند نہیں ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر مہر کر دی ہے تو یہ شاذ و نادر ہی ایمان لائیں گے ـــــ ان باتوں کے حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جن کی تاریخ یہ ہے، جن کا قومی مزاج یہ ہے، ان سے کس خیر کی امید کی جا سکتی ہے؟ ان کے ان مسلسل جرائم کے سبب سے، جن کا سلسلہ اسلاف سے لے کر اخلاف تک کہیں ٹوٹا نہیں ہے، خدا نے ان پر لعنت کر دی ہے، اب کوئی سا معجزہ بھی تم ان کو دکھا دو، معجزات دیکھنے کی تو نوبت باقی ہی رہے گی، ایمان کی سعادت ان کو ہرگز حاصل نہیں ہوگی۔

وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا ۝ وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۝ بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۱۵۶ - ۱۵۸)

'وَبِكُفْرِهِمْ' کا عطف: 'وَبِكُفْرِهِمْ' کا عطف اوپر کے سلسلۂ کلام پر ہے۔ بیچ میں جملہ معترضہ آ گیا تھا اس کے ختم ہونے کے بعد پھر فہرست جرائم شروع ہو گئی۔

حضرت مریمؑ پر بہتان کی نوعیت: 'وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ' میں جس بہتان عظیم کا ذکر ہے اس کے متعلق سورۂ آل عمران کی تفسیر میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یہود نے یہ الزام سیدنا مسیحؑ کے دور میں لگانے کی جرأت نہیں کی۔ یہ تمام تر بعد کی ایجادات میں سے ہے۔

'إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ' میں 'رَسُولَ اللَّهِ' کا لفظ ہمارے نزدیک یہود کے قول کا جزو نہیں ہے بلکہ ان کے جرم کی سنگینی کو واضح تر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سیدنا مسیحؑ کے مرتبہ کو واضح فرمایا ہے۔

واقعہ قتل مسیح کی تردید کا مقصد: 'وَمَا قَتَلُوهُ' سے 'عَزِيزًا حَكِيمًا' تک جملہ معترضہ ہے۔ اس میں یہود کے دعوائے قتل مسیح کی فوری تردید کر دی گئی ہے۔ اس فوری تردید سے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ کے رسول اس کی حفاظت میں ہوتے ہیں، ان کے خلاف اس کے دشمنوں کی چالیں خدا کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ اس وجہ سے یہود کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے ان کو قتل کیا، یا سولی دی بالکل بے بنیاد ہے۔ وہ اپنی اس شرارت میں بالکل ناکام رہے۔ البتہ ایک جھوٹے دعوے کا بار اپنے سر لے کر ہمیشہ کے لیے مبغوض و ملعون بن گئے۔ دوسرا یہ کہ نہ کہیں مسیحؑ کے قتل کا واقعہ پیش آیا نہ سولی کا لیکن پال (۵ - ۶۷ء) کے متبع نصاریٰ نے اس فرضی افسانے کو لے کر اس پر ایک پوری دیومالا (MYTHOLOGY) تصنیف کر ڈالی اور اس طرح پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا بیٹھے۔

وَلٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ کا مفہوم

'وَلٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ' یعنی یہود جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ تو وہ کر نہ پائے البتہ صورت حالات ایسی بنا دی گئی کہ وہ یہی سمجھے کہ انھوں نے مسیح کو سولی دلوا دی ہے۔ یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ اس کی شکل کیا ہوئی۔ جس واقعہ کے بارے میں خود ان لوگوں کے درمیان، جیسا کہ انجیلوں سے ثابت ہے، شدید اختلاف ہو جو اس وقت موجود تھے اب دو ہزار سال کے بعد اس کی شکل متعین کرنے کی کوشش کرنا محض اٹکل کے تیر تکے چلانا ہے۔ قطعی بات بس اتنی ہی ہے جو قرآن نے بتائی ہے کہ حضرت مسیح کو یہود نہ تو قتل کر سکے نہ سولی دے سکے بلکہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا۔

واقعہ کی نوعیت انجیلوں کی روشنی میں

واقعہ کی جو روداد انجیلوں میں موجود ہے اس سے چند باتیں بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس وقت ملک پر رومیوں کی حکومت تھی اور وہی تمام سیاسی و تعزیری اختیارات کے مالک تھے۔

دوسری یہ کہ رومی حکام اور پولیس کو نہ صرف یہ کہ حضرت مسیح کو سولی دینے سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ رومی حاکم پیلاطوس اور دوسرے حکام اس ظلم کی ذمہ داری کسی طرح بھی اپنے اوپر لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

تیسری یہ کہ گرفتاری اور سزا کے وقت کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں وہ ایسے ہنگامہ خیز ہیں کہ ایسے حالات کے اندر عوام کو ہر بات باور کرائی جا سکتی تھی اور وہ بڑی آسانی سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ مان سکتے تھے۔

چوتھی یہ کہ سولی کے مزعومہ واقعہ کے بعد بھی انجیلوں سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح کے شاگردوں نے ان کو دیکھا۔

پانچویں یہ کہ سیدنا مسیح کے وعظوں، ان کے معجزوں اور ان کے کارناموں کی تو بڑی دھوم تھی لیکن اس وقت تک صورتًا نہ وہ عوام ہی میں اچھی طرح متعارف تھے اور نہ رومی حکام اور ان کی پولیس کے آدمی ہی ان کو پہچانتے تھے۔

چھٹی یہ کہ خود نصاریٰ میں بھی ایک جماعت شروع سے اس بات کی قائل رہی ہے کہ سولی حضرت مسیح کو نہیں دی گئی بلکہ ایک اور ہی شخص کو دی گئی لیکن مشہور یہ کر دیا گیا کہ انھی کو سولی دی گئی۔

ان تمام باتوں کے دلائل خود انجیلوں میں موجود ہیں اور نہایت آسانی سے ہم ان کو جمع کر سکتے ہیں لیکن اس سے بس اتنی ہی بات ثابت ہو گی جو قرآن نے بتا دی ہے کہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا۔ رہا یہ سوال کہ اس گھپلے کی شکل کیا ہوئی تو اس باب میں جو کچھ بھی کہا جائے گا اس کی حیثیت ظن و گمان سے کچھ زیادہ نہیں ہے اور ہم گمان کے پیچھے پڑنا پسند نہیں کرتے۔

یکی پرٹ شگون پر اپنی ناک کٹوا بیٹھے

'وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ' سے مراد نصاریٰ ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ نصاریٰ میں نفس واقعہ سے متعلق بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بڑا اختلاف ہے اور اس پر جو دیو مالا (MYTHOLOGY) انھوں نے تصنیف کی ہے اس میں بھی بڑے اختلافات ہیں اور یہ اختلاف قدرتی نتیجہ ہے اس بات کا کہ انھوں نے اپنے سارے علم کلام کی بنیاد حقیقت کے بجائے محض ظن پر رکھی اور اس طرح جس سولی سے اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح کو محفوظ رکھا نصاریٰ نے اس پر خود چڑھ کر خودکشی کر لی۔

رفع سے مجرد ترقی درجات مراد لینا عربیت کے خلاف ہے

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ، رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کے ٹکڑے پر ہم سورۂ آل عمران کی تفسیر میں بحث کر چکے ہیں ۔ وہاں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اس سے مجرد ترقی درجات و مراتب لینا عربیت کے خلاف ہے ۔ عزیز و حکیم کی صفات کے حوالے سے مقصود یہاں یہ ہے کہ خدا جب کسی کام کو کرنا چاہے تو وہ اپنے ارادے پر غالب ہے ۔ اس کے لیے کوئی راہ بھی بند نہیں ہے ، وہ جہاں سے چاہے اپنی تدبیر و حکمت سے راہ کھول لیتا ہے ۔

اصل سلسلۂ کلام

یہ امر ملحوظ رہے کہ اصل مسئلہ زیر بحث ان آیات میں حضرت مسیحؑ کے قتل یا سولی کی تردید یا ان کے رد و قبول کا نہیں ہے ۔ یہ بات ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ، محض ایک ضمنی بات کے طور پر ، سلسلۂ کلام کے بیچ میں آگئی ہے ۔ اصل سلسلۂ کلام جو یَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ سے چل رہا ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان نہ لانے کے لیے جو بہانے بنا رہے ہیں وہ سب بہانے ان کی اس خوئے بد کے کرشمے ہیں جو ابتدا ہی سے ان کی سرشت میں داخل ہے ۔ انھوں نے ایک سے ایک بڑھ کر معجزے دیکھے لیکن کوئی معجزہ ان کو مطمئن نہ کر سکا ۔ انھوں نے ہمیشہ عہد شکنی کی ، ہمیشہ تکذیب کی اور ہر حق کا مقابلہ ضد اور مکابرت ، تکبر اور سرکشی سے کیا ۔ یہاں تک کہ مریم پر بہتان لگایا اور خدا کے رسول مسیح ابن مریم کے قتل کرنے کے خود مدعی ہیں ۔ ——— جب بات یہاں تک پہنچی تو ضمنی طور پر قتل اور سولی کے واقعہ کی تردید فرما دی اور ساتھ ہی نصاریٰ کو بھی تنبیہ فرما دی کہ انھوں نے بھی بے سمجھے بوجھے اسی جھوٹ کو سچ مان کر اس پر پورے علم کلام کا محل تعمیر کر دیا ۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ سے مراد یہود اور نصاریٰ دونوں ہیں

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (۱۵۹)

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ کا اسلوب بیان تعمیم کو ظاہر کر رہا ہے ، یعنی یہ یہود و نصاریٰ دونوں گروہوں پر مشتمل ہے اگرچہ اوپر سے ذکر یہود ہی کا چلا آ رہا تھا لیکن چونکہ جملہ معترضہ میں ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا نصاریٰ کی حماقت کا بھی ذکر آ گیا تھا اس وجہ سے ان کے حوالے کے لیے بھی تقریب پیدا ہو گئی اور یہاں جو بات بیان ہوئی ہے وہ دونوں گروہوں سے بحیثیت گروہ کے متعلق ہے ، بحیثیت افراد کے نہیں ۔

ایمان کا لفظ یقین کرنے کے معنی میں

لَيُؤْمِنَنَّ میں لام ، تاکید اور قسم کا ہے اور ایمان کا لفظ یہاں یقین کرنے کے معنی میں ہے ۔ دین میں معتبر ایمان صرف وہ ہے جو یقین ، تصدیق اور اقرار تینوں اجزا پر مشتمل ہو ۔ اس کے علاوہ ایک وہ ایمان ہے جس کے اندر یقین اور تصدیق کے اجزا تو نہیں پائے جاتے لیکن اظہار و اقرار کا جزو پایا جاتا ہے ، یہ منافقین کا ایمان ہے ۔ اسی طرح ایک وہ ایمان بھی ہے جس کے اندر یقین تو پایا جاتا ہے لیکن اس کے اندر تصدیق اور اقرار کے اجزا مفقود ہوتے ہیں یہ منکرین اور متمردین کا ایمان ہے ۔ ان پر حق کا حق ہونا تو بالکل واضح ہو جاتا ہے لیکن وہ اپنی رعونت اور شرارت کی وجہ سے اس کی تصدیق و اقرار سے گریز کرتے ہیں اور اپنی اس شرارت کو مختلف بہانوں کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ سورۂ نمل میں اسی گروہ کا ذکر ہوا ہے وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۱۴ (اور ان لوگوں نے ظلم اور گھمنڈ کے سبب سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا) اسی کے تحت وہ ایمان بھی ہے جو غرق ہوتے وقت فرعون لایا تھا ۔

ہر چند اس کے ایمان میں ایمان کے تمام اجزا موجود تھے لیکن جو ایمان پانی سر سے گزر چکنے کے بعد لایا جائے اس ایمان کا دین میں کوئی درجہ نہیں ہے۔ آیت زیر بحث میں ہمارے نزدیک جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ایمان سے مراد یقین ہے۔

'لیؤمنن بہ' میں ضمیر کا مرجع

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ اور قَبْلَ مَوْتِهٖ میں پہلی ضمیر کا مرجع ہمارے نزدیک قرآن مجید ہے اور دوسری کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج یہ اہل کتاب قرآن اور نبی کی صداقت تسلیم کرنے کے لیے یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ وہ آسمان سے کتاب اترتی ہوئی دکھائیں تب وہ یقین کریں گے کہ قرآن فی الواقع اللہ کی کتاب ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی اللہ کے رسول ہیں اور اس حیلے سے وہ ان تمام عقلی، نقلی، فطری اور تاریخی دلائل کو نظر انداز کر رہے ہیں جو قرآن اور پیغمبر کی صداقت کے ثبوت میں موجود ہیں لیکن وہ وقت بھی دور نہیں ہے جب یہ یہود و نصاریٰ قرآن اور پیغمبر کی کہی ہوئی ایک ایک بات کو واقعات کی شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور قرآن ان کے لیے جس رسوائی و نامرادی اور جس ذلت و شکست کی خبر دے رہا ہے وہ پیغمبر کے دُنیا سے اُٹھنے سے پہلے پہلے اس طرح ان کی آنکھوں کے سامنے آجائے گی کہ اس کو جھٹلانا ان کے لیے ممکن نہیں رہے گا اگرچہ ایمان کی سعادت ان کو یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوگی۔

یہ مجرد خبر نہیں بلکہ تہدید ہے

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ جملہ قسمیہ ہے اس وجہ سے اس کو مجرد خبریہ جملہ کے مفہوم میں لینا ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا صرف یہ مفہوم نہیں ہے کہ پیغمبر کے دُنیا سے اُٹھنے سے پہلے پہلے یہ لوگ قرآن کا یقین کر لیں گے بلکہ اس کے اندر تہدید اور وعید بھی ہے۔ یعنی آج جو باتیں دلیل سے انھیں سمجھائی جا رہی ہیں لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آرہی ہیں کل واقعات کی شکل میں جب ان کے سامنے آجائیں گی تب یہ کیا کریں گے، اس وقت تو انھیں ماننی ہی پڑیں گی اگرچہ وہ زبانوں سے لاکھ انکار کرتے رہیں۔

عکرمہ کی رائے

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سلف میں سے عکرمہ پہلی ضمیر کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے ہیں لیکن عام طور پر لوگوں نے اس بُعد کے سبب سے جو ایک طویل جملہ معترضہ نے پیدا کر دیا ہے، اس قول کو اہمیت نہیں دی، حالانکہ جملہ معترضہ سے جو بُعد پیدا ہوتا ہے وہ قابلِ لحاظ نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اس سے صرفِ نظر کر کے سلسلۂ کلام کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔

آنحضرت صلعم کی شہادت 'دنیا و آخرت' دونوں میں

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا یہ اس شہادت کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن ان تمام لوگوں پر دیں گے جن پر آپ نے اس دنیا میں دینِ حق کی شہادت دی ہے۔ اس شہادت کا ذکر اسی سورہ کی آیت ۴۱ میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم نے وضاحت کے ساتھ اس پر بحث کی ہے۔ یہ شہادت اگرچہ تمام انبیا اپنی اپنی امتوں پر دیں گے، چنانچہ حضرت مسیح جو شہادت دیں گے اس کا ذکر بھی مائدہ کی آیات ۱۱۷-۱۱۹ میں ہوا ہے لیکن آنحضرت صلعم چونکہ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ نے یہود، نصاریٰ اور اہلِ عرب سب پر یہ واضح فرمایا ہے کہ اللہ کا اصل دین کیا ہے اس وجہ سے آپ ہی کا یہ منصب ہے کہ آپ قیامت کے دن یہ بتائیں کہ آپ نے لوگوں کو اللہ کی طرف سے کیا بتایا اور آپ کی اسی شہادت سے لوگوں پر حجت قائم ہوگی۔

یہ جملہ بھی ہمارے نزدیک اسی تہدید و وعید کا حامل ہے جس کا حامل پہلا جملہ ہے۔ یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و حقانیت اس دنیا میں بھی ان اہل کتاب پر اس طرح واضح ہو جائے گی کہ ان کے لیے مجال انکار باقی نہ رہے گی اور آخرت میں بھی آپ شہادت دیں گے کہ یہود و نصاریٰ کی ایک ایک ضلالت پر آپ نے ان کو اچھی طرح متنبہ کر دیا تھا، ان تنبیہات کے بعد بھی اگر یہ اپنی انھی گمراہیوں میں پڑے رہے تو یہ ان کی اپنی ذمہ داری ہے، ان پر حجت تمام ہو چکی تھی۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۱۶۰-۱۶۱)

یہود پر جائز چیزوں کے حرام ہونے کی نوعیت

'فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ' میں لفظ ظلم کی تقدم سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہود پر حلال چیزیں جو حرام ہوئیں تو یہ بھی خود انھی کے اپنے نفس پر ظلم کرنے کے سبب سے حرام ہوئیں۔ اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ جائز چیزوں کے حرام کیے جانے کی ان کے ہاں جو صورتیں پیدا ہوئیں ان پر ہم بقرہ کی تفسیر میں بھی گفتگو کر چکے ہیں اور آل عمران کی آیت ۵۰ کے تحت بھی اس پر بحث ہو چکی ہے۔

سود کی حرمت

'وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ' سود کی حرمت کا صریح حکم احبار باب ۲۵: ۳۰-۳۸ میں ملاحظہ ہو۔

اکل اموال بالباطل

'وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ' کے مفہوم پر اسی سورہ کی آیت ۲۹ کے تحت گفتگو ہو چکی ہے۔

یہود کے اصل موانع ایمان

ان باتوں کا تعلق بھی یہود کی اسی فہرست جرائم سے ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن اور پیغمبر پر ایمان لانے میں ان کے لیے جو چیزیں مانع ہیں وہ دراصل ان کے یہ جرائم ہیں نہ یہ کہ تم ان کو آسمان سے کوئی صحیفہ اترتا ہوا نہیں دکھا رہے ہو۔ یہ ہمیشہ سے گردن کش اور نافرمان ہیں۔ انھوں نے اپنی گردن کشی ہی سے اپنے اوپر حلال چیزیں حرام کرائیں، اور اپنی گردن کشی ہی کے سبب سے ہمیشہ حق کی راہ میں روڑا بنے اور یہی چیز ہے جس نے ان کو آمادہ کیا کہ انھوں نے سود کو جائز کر لیا حالانکہ تورات میں ان کو صریح الفاظ میں اس کی ممانعت کی گئی تھی اور اسی کے سبب سے انھوں نے حرام خوری کے دوسرے تمام دروازے بھی کھول لیے حالانکہ یہ ان دروازوں کو بند کرنے پر مامور کیے گئے تھے۔ جن کا کردار یہ ہو ان سے کس طرح توقع کرتے ہو کہ وہ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ دیکھ کر بھی قرآن پر ایمان لائیں گے۔ فرمایا کہ ان میں سے جتنے بھی کفر پر جم گئے ہیں ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا (۱۶۲)

'راسخون فی العلم' سے مراد اہل کتاب کے علمائے حقانی ہیں

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ، 'الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ' سے مراد وہ علما ہیں جن کے قدم علم شریعت میں خوب جمے ہوئے ہوں جو عقیدہ اور عمل ہر چیز میں راسخ اور کردار و اخلاق ہر پہلو سے جادۂ مستقیم پر استوار تھے۔ یہود میں علما کم نہیں تھے، بے شمار تھے، لیکن شریعت ان کے لیے بس ایک نمائشی جلے

کی حیثیت رکھتی تھی جس کو چن کر وہ باہر بازاروں اور عوام میں نکالا کرتے۔ ان کے فکر و نظر اور ان کے طلب و رُجح سے اس علم کو کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ علماء ان تمام جرائم میں، جو اوپر مذکور ہوئے، اپنی قوم کے نہ صرف شریک تھے بلکہ یہی ان میں ان کے مرشد تھے اس وجہ سے ان سے تو اگر کسی چیز کی توقع کی جا سکتی تھی تو صرف اسی چیز کی کہ وہ قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اپنی قوم کی پیشوائی کریں۔ البتہ ان میں جو نفوس قدسیہ حکمت دین کی لذت سے آشنا تھے ان کے قدم علم شریعت میں راسخ تھے۔ اس وجہ سے ان کو اپنی قوم کی متفقہ مخالفت کے طوفان کے مقابلے کے لیے کھڑے ہونے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ملی۔ یہاں انھی نفوس قدسیہ کو عام علمائے یہود سے ممتاز کرنے کے لیے علما کے بجائے 'رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ' کے لقب سے مشرف فرمایا ہے۔ یعنی یہ آندھی کے خس و خاشاک کی طرح ہوا کے رُخ پر اڑنے والے نہیں ہیں بلکہ چٹانوں کی طرح اپنے موقف حق پر جمنے والے ہیں۔

'اَلْمُؤْمِنُوْنَ' سے مراد سلیم الفطرت اور متوازن افراد ہیں

'اَلْمُؤْمِنُوْنَ' سے مراد وہ سلیم الفطرت لوگ ہیں جو اگرچہ رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کا درجہ تو نہیں رکھتے تھے لیکن اپنی فطرت کی سلامتی، دل کی صلاحیت اور کردار کی پاکیزگی کے اعتبار سے تمام سوسائٹی میں ممتاز تھے اور یہود کے عام بگاڑ کے باوجود وہ خدا کی ہدایت و شریعت پر قائم رہے اور جب اسلام کی دعوت ان کے کانوں میں پڑی تو وہ اس کو بھی قبول کرنے کے لیے آگے بڑھے۔

یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یہ خبر ہے۔ یعنی یہ راسخین فی العلم علماء اور سلیم الفطرت لوگ اس قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اس سے پہلے کی کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اہل کتاب کا یہی گروہ ہے جس کی تعریف جگہ جگہ قرآن نے فرمائی ہے۔ آل عمران کی آیت ۱۱۳ کے تحت بھی اس گروہ کا ذکر گزر چکا ہے۔

'وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ' کا اسلوب اور اس کے فائدے

'وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ' عطف تو ہے 'اَلْمُؤْمِنُوْنَ' پر لیکن یہ منصوب ہو گیا ہے فصیح عربی کے اس قاعدے کے مطابق جس کو ہمارے اہل نحو 'علٰی سبیل الاختصاص' یا 'علٰی سبیل مدح' کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ شعرائے عرب کے کلام میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ اسلوب کی اس تبدیلی کا لفظی اثر تو سامع پر یہ پڑتا ہے کہ یہ توجہ اس کو لفظ پر متوجہ کر دیتا ہے اور معنوی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ محض اسلوب کی تبدیلی سے، بغیر ایک حرف کے اضافے کے، اس کے اندر اختصاص اور مدح و تعریف کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہی لفظ اپنے عام اسلوب کے مطابق 'وَالْمُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ' ہوتا تو اس کے معنی صرف یہ ہوتے کہ 'اور نماز کے قائم کرنے والے' لیکن جب اسلوب بدل کر 'وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ' کہہ دیا تو اس کے معنی یہ ہو گئے کہ 'اور خاص کر نماز کو قائم کرنے والے' جس سے ان موصوفین کی غیر معمولی تعریف اور ان کی خصوصیت بھی واضح ہوئی اور نماز کی وہ اہمیت و عظمت بھی جو دین کے نظام میں اس کو حاصل ہے۔ اس اسلوب کی ایک نہایت عمدہ مثال سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں فرمایا ہے۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ (بقرہ ۱۷۷) (اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے جب کہ عہد کر بیٹھیں اور خاص کر وہ لوگ جو ثابت قدم رہنے والے ہیں فقر و فاقہ، جسمانی تکالیف اور جنگ کی آزمائشوں میں) یہاں بھی دیکھ لیجیے 'وَالصّٰبِرِیْنَ' معطوف تو ہے

وَالْمُوْفُوْنَ' پر، اس اعتبار سے اس کو 'وَالصَّابِرُوْنَ' ہونا تھا لیکن اسی قاعدے کے مطابق جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا 'الصَّابِرِيْنَ' ہو گیا۔

شریعت میں صبر اور نماز کا درجہ

یہاں حکمتِ دین کے اس رمز کو سمجھنے کے لیے کہ شریعت میں صبر اور نماز کا کیا درجہ ہے آیت 'وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ' الآیہ کی تفسیر، جو بقرہ میں گزر چکی ہے، پڑھ لیجیے تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جائے کہ ان دونوں چیزوں کے اس اہتمام و تاکید کے ساتھ ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے۔ جہاں تک صبر کا تعلق ہے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس شخص کے اندر صبر کی صفت نہ ہو اس کے دین کی عمارت تمام تر ریت پر ہے، وہ کسی بھی جھٹکے سے آسانی سے گر سکتی ہے۔ رہی نماز تو درحقیقت یہی وہ چیز ہے جو اس عہد کی برابر یاد دہانی کرتی ہے جو بندہ اپنے رب سے کرتا ہے اس وجہ سے جو شخص اس کو ضائع کر دے گا وہ بالآخر پورے دین کو ضائع کر بیٹھے گا۔ یہود کے متعلق قرآن میں بیان ہوا ہے کہ انھوں نے نماز بالکل ضائع کر دی تھی (اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ ۵۹ مریم) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پورے دین ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان میں سے صرف وہی لوگ دین پر قائم رہے جو نماز پر قائم رہے اور یہی لوگ ہیں جو بالآخر اسلام کی دعوت قبول کرنے والے بھی بنے۔ اسی گروہ کا ذکر آل عمران میں اس طرح ہوا ہے۔ لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۱۱۳ (سب اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو دین پر قائم ہیں، شب کے وقتوں میں آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتے اور سجدہ کرتے ہیں) 'وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ' بالکل بقرہ کی آیت ۴ 'وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ' کی طرح ہے۔ جس طرح وہاں 'يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ' اور دوسری صفات کے ذکر کے بعد بظاہر اس ٹکڑے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی لیکن یقینِ آخرت کو، جو تمام خیر و تقویٰ کا اصل محرک ہے، نمایاں کرنے کے لیے اس کا ذکر فرمایا اسی طرح یہاں بھی بظاہر 'وَالْمُؤْمِنُوْنَ' کے بعد دوبارہ اس کے اعادے کی ضرورت نہیں تھی لیکن آخرت کی تذکیر کے لیے اس کا اعادہ فرمایا اس لیے کہ دین میں تمام زندگی اور حرکت آخرت پر ایمان ہی سے ہے۔

۴۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۶۳-۱۷۵

آگے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے پہلے تسلی دی ہے کہ تم ان مخالفوں کی کوئی پروا نہ کرو جو آج تم پر نازل شدہ وحی کو نہیں مانتے بلکہ آسمان سے اتری ہوئی کھلی کتاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ نہ وحی دنیا میں ایسی انجانی چیز ہے جس کا تجربہ دنیا میں کبھی کو ہوا ہو اور نہ نبوت و رسالت ایسی اجنبی چیز ہے جس کا اظہار تمھی نے کیا ہو۔ وحی بھی دنیا میں تم سے پہلے آ چکی ہے اور رسول بھی بے شمار آ چکے ہیں، اگر ایک ایسی جانی پہچانی ہوئی چیز سے لوگ بھڑکتے ہیں اور جس کے جانچنے اور پرکھنے کے لیے اتنے معیارات اور اتنی کسوٹیاں موجود ہیں لوگ اس کو پہچاننے سے انکار کر رہے ہیں تو قصور تمھارا نہیں بلکہ خود انھی کا ہے۔ تمھارے اطمینان

کے لیے تو یہ چیز بس کرتی ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتوں کی شہادت تمھارے حق میں ہے۔ رہے یہ لوگ جو کفر اور مخالفت پر اڑ گئے ہیں تو انھوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہیں اور اس کے سبب سے اب یہ اس قابل نہیں رہ گئے ہیں کہ ان کے لیے ایمان و ہدایت کی راہ کھلے۔ اب تو ان کے لیے صرف جہنم کی راہ باقی رہ گئی ہے۔

اس کے بعد لوگوں کو عام طور پر اور نصاریٰ کو خاص طور پر خطاب کر کے تنبیہ فرمائی ہے کہ اللہ نے قرآن کی شکل میں جو نورِ مبین خلق کی رہنمائی کے لیے اتارا ہے اس کی قدر کرو اور ضلالت کی راہ چھوڑ کر ہدایت کی راہ پر آجاؤ ورنہ یاد رکھو کہ جو لوگ اس سے اعراض و انکار کریں گے وہ بڑے ہی دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے ـــ اب آیات کی تلاوت فرمایئے۔

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ ۚ وَ آیات
أَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَ ۱۶۳-۱۷۵
عِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ ۚ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ﴿۱۶۳﴾
وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ
وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿۱۶۴﴾ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ
لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۱۶۵﴾
لَّٰكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنزَلَهُ بِعِلْمِهِ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ
يَشْهَدُونَ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴿۱۶۶﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن
سَبِيلِ اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿۱۶۷﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا
لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ﴿۱۶۸﴾ إِلَّا طَرِيقَ
جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿۱۶۹﴾ يَا أَيُّهَا
النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ
وَإِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا

حَكِيمًا ﴿۱۷۰﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا
الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ
اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ڟ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭ
اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ
ع ۲۳ ۴ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ لَنْ
يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ
وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ
جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ
اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا
وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِـيْمًا ڏ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ
اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾

ترجمۂ آیات ۱۷۵-۱۶۳ ہم نے تمھاری طرف اسی طرح وحی کی ہے جس طرح نوح اور اس کے بعد آنے والے
نبیوں کی طرف وحی کی اور ہم نے ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب،
یونس، ہارون اور سلیمان پر وحی بھیجی۔ اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی اور دوسرے بھی بہت
سے رسولوں پر وحی بھیجی جن کا حال ہم تم کو پہلے سنا چکے ہیں اور بہت سے رسولوں کا حال

نہیں سنایا اور موسیٰ سے تو اللہ نے کلام کیا۔ اللہ نے رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۱۶۳-۱۶۵

پر اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز کی جو اس نے تم پر نازل کی ہے۔ اس نے اس کو اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور گواہی کو تو اللہ ہی کافی ہے بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑے۔ جن لوگوں نے کفر کیا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو تو خدا نہ بخشنے کا ہے اور نہ جہنم کے سوا جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے، ان کو کوئی اور رستہ دکھانے کا ہے اور اللہ کے لیے یہ بات آسان ہے۔ ۱۶۶-۱۶۹

اے لوگو، رسول تمہارے پاس تمہارے رب کے پاس سے حق لے کر آگیا ہے۔ پس ایمان لاؤ، اسی میں تمہاری بہتری ہے اور اگر کفر پہ جمے رہو گے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ ڈالو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف القا فرمایا اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کا دعویٰ نہ کرو۔ باز آجاؤ۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ معبود تو بس تنہا اللہ ہی ہے۔ وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کارساز بس ہے اور مسیح کو ہرگز اللہ کا بندہ بننے سے عار نہ ہوگا اور نہ مقرب فرشتوں کو عار ہوگا اور جو اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا

تو اللہ ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔ پس جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے تو ان کو تو ان کا پورا پورا اجر بھی دے گا اور اپنے فضل میں سے بھی ان کو مزید بخشے گا اور جنھوں نے عار اور تکبر کیا ہو گا ان کو دردناک عذاب دے گا اور وہ اللہ کے بالمقابل نہ کسی کو اپنا دوست پائیں گے نہ مددگار۔ ۱۷۰-۱۷۳

اے لوگو، تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے ایک حجت آچکی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایک نور مبین اُتار دیا تو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کو انھوں نے مضبوطی سے پکڑ لیا ان کو وہ اپنی رحمت اور اپنے فضل میں داخل کرے گا اور انھیں اپنی طرف سیدھی راہ کی ہدایت بخشے گا۔ ۱۷۴-۱۷۵

۴۴- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (۱۶۳-۱۶۴)

لفظ 'اسباط' پر سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔

زبور — 'زبور' کے نام سے ایک صحیفہ حضرت داؤد کی دعاؤں اور مناجاتوں پر مشتمل تورات کے مجموعہ میں شامل ہے۔ قرآن میں اس کا نام معرفہ کی شکل میں بھی آیا ہے۔ یہاں نکرہ کی صورت میں میرے نزدیک تفخیم شان کے لیے ہے جس سے زبور کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اگرچہ موجودہ زبور کو تورات کے دوسرے صحیفوں ہی کے درجے میں رکھنا صحیح ہے۔ اس میں ترجمہ کے نقائص بھی ہیں اور کمی بیشی کا بھی خاصا امکان ہے تاہم اس کو پڑھیے تو سینہ ایمان و توکل کے نور سے لبریز ہو جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ سے مکالمۂ الٰہی کی نوعیت — 'وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا' پر ہم دوسرے مقام میں گفتگو کر چکے ہیں۔ تورات اور قرآن دونوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے خاص خطاب و کلام سے نوازا ہے اور اس خطاب و کلام کی شان اس وحی سے مختلف تھی جس سے دوسرے انبیا مشرف ہوئے

ہیں۔ اگرچہ قرآن اور تورات دونوں سے ثابت ہے کہ یہ خطاب و کلام بھی خدا سے رو در رو نہیں بلکہ من وراء حجاب، یعنی پردے کی اوٹ ہی سے تھا۔

انبیاء کے ناموں میں ترتیب کی حکمت

یہاں حضرات انبیاء کے جو نام گنائے گئے ہیں ان کی ترتیب حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد کے ذکر تک تو تاریخی ہے لیکن اس کے بعد ترتیب صفاتی ہو گئی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت یونسؑ، حضرت ہارونؑ اپنے خاص نوع کے ابتلا اور خاص نوع کی تائید الٰہی میں فی الجملہ اشتراک رکھتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ دونوں نبی بھی ہیں اور دونوں بادشاہ بھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد لانے کی وجہ خاص اہتمام کے ساتھ زبور کی طرف توجہ دلانا ہے۔ سب سے آخر میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰؑ مماثل نبی ہیں۔ اس بات کا ذکر قرآن اور احادیث دونوں میں ہے۔

انبیاء کے ذکر سے مقصود

یہاں اگرچہ تمام انبیاء کا ذکر نہیں ہوا ہے لیکن ان کے اندر اشتراک کے ساتھ ساتھ باعتبار صفات جو تنوع ہے وہ بھی نمایاں ہو گیا ہے اور باعتبار وحی و خطاب اور کلام ان میں سے اگر کسی کو کوئی اختصاص و امتیاز حاصل ہوا ہے تو وہ بھی سامنے آگیا ہے۔ اس تمام حوالے سے قرآن کا مقصود یہ ہے کہ یہ انبیاء ہیں جن کے نام اور کام تورات کے صحیفوں میں بھی بیان ہوئے ہیں اور یہ طریقہ رہا ہے جس طریقہ پر اللہ نے ان نبیوں کو اپنی وحی اور اپنے خطاب و کلام سے نوازا ہے[1] ان سب سے اہل کتاب واقف ہیں، بتلاؤ ہے اس میں کہیں ذکر اس بات کا کہ اللہ نے کسی نبی پر اس طرح کتاب اتاری ہو کہ اس کو اترتے سب نے دیکھا ہو؟ موسیٰؑ سے بے شک اللہ تعالیٰ نے کلام کیا، جس طرح کلام کیا جاتا ہے، لیکن ان یہود کا اطمینان اس سے بھی نہ ہوا، انھوں نے اس پر بھی یہ شبہ وارد کر دیا کہ جب تک خدا ہم سے رو در رو ہو کر کلام نہ کرے ہم کس طرح باور کریں کہ وہ تم سے کلام کرتا ہے۔ شک کے ایسے مریضوں کا کیا علاج؟

ان آیات میں استدلال کا پہلو

ان آیات میں استدلال کا پہلو جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ ہے کہ اگر وحی کوئی ایسی چیز ہوتی جس کا تجربہ تنہا تمھی نے پیش کیا ہوتا اور نبوت و رسالت کوئی ایسی چیز ہوتی جس کا دعویٰ دنیا میں اکیلے تمھی نے کیا ہوتا تب تو ایک حد تک گنجائش تھی کہ ان لوگوں کو معذور خیال کیا جائے جو تمھارے دعوے پر اضطراب کا اظہار کریں اور اس انوکھے دعوے کو اس وقت تک تسلیم نہ کریں جب تک ہر پہلو سے اپنا اطمینان نہ کر لیں لیکن جب انبیاء کا ایک طویل سلسلہ موجود ہے اور ان پر جن شکلوں میں اور جن باتوں کی وحی آتی ان کے بھی دفاتر موجود ہیں تو ان لوگوں کی طرف سے تمھاری صداقت کے ثبوت کے لیے ایسے بے سروپا مطالبات کے کیا معنی جو ان تمام رسولوں اور نبیوں کے نام لیوا بھی ہیں اور ان تمام کتابوں کے حامل ہونے کے مدعی بھی

---

[1] وحی کی حقیقت اور اس کے اقسام پر ان شاء اللہ ہم سورۂ شوریٰ میں بحث کریں گے۔

جو ان انبیا پر نازل ہوئیں جس طرح ہر گروہ کی کچھ مشترک خصوصیات وصفات ہوتی ہیں اسی طرح انبیا کے گروہ کی بھی مشترک خصوصیات وصفات ہیں اور یہ ایسی نمایاں ہیں کہ ان کے حامل تمام دنیا سے الگ نظر آتے ہیں۔ نہ تو یہ ممکن ہے کہ کوئی جھوٹا مدعی ان کے اندر داخل ہو سکے اور نہ اس کا امکان ہے کہ جو ان کے اندر شامل ہو اس کو ان کے زمرے سے الگ کیا جا سکے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۱۶۵)

'رُسُلًا' فعل محذوف سے منصوب بھی ہو سکتا ہے اور بدل بھی ہو سکتا ہے۔ دونوں ہی شکلوں میں معنی کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں ہوگا۔

انبیا کا مشترک مشن

اس آیت میں رسولوں کا مشترک مشن بھی بتا دیا اور وہ ضرورت بھی جو ان کے بھیجنے کی داعی ہوئی۔ ان کا مشترک مشن لوگوں کو بشارت دینا اور خطرے سے آگاہ کرنا ہے۔ بشارت اس بات کی کہ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کریں گے ان کے لیے ابدی زندگی کی خوشیاں اور کامرانیاں ہیں۔ آگاہی اس بات کی کہ جو لوگ کفر اور بدعملی کی راہ اختیار کریں گے ان کے لیے دائمی عذاب نار ہے۔

انبیاء کی بعثت کی ضرورت

اس کی ضرورت یہ بتائی کہ لوگوں پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔ یہ کہنے کا موقع کسی کے لیے باقی نہ رہے کہ ان کے پاس اس خطرے سے آگاہ کرنے والا کوئی نہیں آیا ورنہ وہ ہرگز کفر و بدعملی کی راہ نہ اختیار کرتے۔ اگرچہ خدا عزیز ہے، وہ انبیا کے بھیجے بغیر بھی لوگوں کو ان کی نافرمانیوں پر سزا دیتا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا لیکن وہ حکیم بھی ہے، اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ کسی کو سزا دے تو اتمام حجت کے بعد ہی دے۔ یہ حجت رسولوں کے آنے کے بعد پوری ہو گئی۔ عقل و فطرت کی جو شہادت ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور نیکی اور عدل سے محبت، ظلم و گناہ سے نفرت کی انسان کے اندر ودیعت تھی وہ ان انبیا نے پوری طرح آشکارا کر دی۔ اِن کے جو تقاضے ہو سکتے تھے وہ بھی پوری تفصیل سے بیان کر دیے۔ اب اگر کوئی ٹھوکر کھاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دونوں آنکھیں رکھتے ہوئے پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھاتا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسانی فطرت خیر و شر کے شعور سے محروم نہیں ہے اور نہ عقل حق و باطل میں امتیاز سے قاصر ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے احسن تقویم پر پیدا کیا ہے اور اس کو خیر و شر کی معرفت بخشی ہے لیکن اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ عقل و فطرت کی رہنمائی کے ساتھ وحی اور انبیا کی رہنمائی سے بھی اس کو نوازے تاکہ عقل و فطرت کے تقاضے اس کے سامنے بالکل مبرہن ہو کر آ جائیں اور گمراہی کے لیے ادنیٰ عذر بھی باقی نہ رہ جائے۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ
شَهِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ
يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۝ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت (۱۶۶ - ۱۶۹)

استدراک کا پہلو

حرف 'لٰکِنْ' استدراک کے لیے آتا ہے۔ یہ استدراک اس بات پر ہے جو اوپر والے ٹکڑے سے نکلتی ہے۔ اوپر انبیا کے سلسلے اور ان کی طرف وحی بھیجے جانے کا تفصیل کے ساتھ جو حوالہ دیا ہے اس سے مقصود، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، اہل کتاب کے مکذبین پر یہ واضح کرنا تھا کہ جو حقیقت ایسی جانی پہچانی ہوئی ہے، جس کو پرکھنے اور جانچنے کے لیے اتنے معیارات اور اتنی کسوٹیاں موجود ہیں، اگر یہ اس کو جھٹلاتے ہیں تو بس ان کی شامت ہی آئی ہوئی ہے۔

اس کے بعد اس پر استدراک کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ جھٹلاتے ہیں تو جھٹلائیں اللہ تو اس چیز کی گواہی دیتا ہے جو اس نے تمھاری طرف اتاری ہے۔ یعنی اس بات کی گواہی کہ یہ من جانب اللہ ہے، اس میں نفس اور شیطان کو کوئی دخل نہیں ہے، اللہ نے اس کو اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے، اس میں کسی وسوسۂ نفسانی یا کسی دندغۂ شیطانی کی کوئی آمیزش نہیں ہے، اس کا تعلق علم الٰہی کے پاک سرچشمہ سے ہے اور یہ آب حیات کی طرح بالکل خالص اور بے آمیز ہے۔ مزید فرمایا کہ اس کے حق میں گواہی تو اللہ ہی کی کافی ہے لیکن اللہ کے ساتھ فرشتے بھی اس کے گواہ ہیں۔

یہ کلام پیغمبر کی تسلی کے لیے ہے

یہ ارشاد، جیسا کہ واضح ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے ہے کہ یہ مخالفین تمھاری وحی کو وحی نہیں مانتے تو نہ مانیں، اس کی صحت و صداقت ان کے ماننے نہ ماننے پر منحصر نہیں ہے۔ تمھارے اطمینان کے لیے یہ بس ہے کہ خدا اور فرشتے اس کے گواہ ہیں۔ تم جس بزم قدس سے وابستہ ہو تمھارے لیے سند اس کی سند ہے نہ کہ ان محروم القسمت لوگوں کی جو کبر اور پندار میں اتباع سے قاصر ہیں۔ یہ لوگ تو حق سے دور ہوتے ہوتے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ اب ان کے لیے راہ حق کی طرف مڑنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا ہے۔ انھوں نے اپنے کفر اور اپنی جانوں پر خود اپنے ہاتھوں ظلم سے اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا ہے کہ خدا ان کی مغفرت فرمائے یا جہنم کے راستے کے سوا کوئی اور راہ ان کو دکھائے۔ اب یہ جہنم ہی میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اور خدا کے لیے یہ معاملہ بہت آسان ہے۔ اس نے ان پر حجت تمام کر دی، اب یہ چیز ذرا بھی اس پر شاق نہیں گزرے گی کہ یہ جہنم میں پڑیں اور اس میں ہمیشہ رہیں۔ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا کے ٹکڑے پر ہم دوسری جگہ بھی بحث کر چکے ہیں۔

نبی کی صداقت کی ایک باطنی دلیل

یہ کلام اگرچہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، تسلی کے محل میں ہے لیکن یہ وحی کی صداقت کی ایک دلیل بھی ہے جس کا تعلق پیغمبر کی ذات سے ہے۔ اوپر وحی کی صداقت کی جو دلیل بیان ہوئی ہے اس کی نوعیت تاریخی شہادت کی ہے۔ یعنی انبیا کی تاریخ اور ان کی وحی کی کسوٹی پر جانچ کر قرآن اور پیغمبر کا درجہ متعین کیا گیا ہے۔ اب یہ ایک دوسری دلیل بیان ہوئی ہے جس کی نوعیت ایک باطنی دلیل کی ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ پیغمبر اپنے باطن میں خدا اور فرشتوں کی شہادت اس طرح سنتا سمجھتا اور پرکھتا ہے کہ اس کے

لیے اپنی وحی کی صداقت پر کسی شبہے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس طرح کی شہادت کسی غیر نبی کو حاصل نہیں ہوتی اس وجہ سے کسی غیر نبی کے الہام اور نبی کی وحی میں آسمان و زمین کا فرق ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی جس کیفیت کو الہام سمجھ رہا ہے وہ محض ایک وسوسۂ نفسانی یا شیطانی ہو لیکن پیغمبر پر وحی جس افق سے آتی ہے، جس زور و قوت کے ساتھ آتی ہے اور ملائکہ اور اللہ کی جس تائید و شہادت کے ساتھ آتی ہے وہ بجائے خود ایک ایسی برہان ہوتی ہے جس کے بعد کسی شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ وحی کی صداقت کا یہی پہلو ہے جس کی وجہ سے ساری خدائی بھی نبی کی تکذیب کرے تب بھی اس کے اعتماد میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی بزم و انجمن اس کے باطن کے اندر ہوتی ہے جہاں اس کو خدا اور روح القدس کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اس مسئلے پر مزید بحث انشاءاللہ ہم سورۂ تحریم میں کریں گے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ ٱلرَّسُولُ بِٱلْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَـَٔامِنُوا۟ خَيْرًا لَّكُمْ ۚ وَإِن تَكْفُرُوا۟ فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (۱۷۰)

ایک عام تعبیر میں روئے سخن عیسائیوں کی طرف ہے

خطاب اگرچہ عام ہے لیکن آگے والی آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ روئے سخن اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کی طرف ہے۔ فرمایا کہ اے لوگو، اللہ کا رسول تمہارے پاس حق لے کر آگیا ہے۔ اللہ کے دین میں تم نے جو ملاوٹیں کر دی تھیں اور جن کے سبب سے یہ معلوم کرنا ناممکن ہو گیا تھا کہ حق کیا ہے، اب ان تمام ملاوٹوں سے پاک ہو کر دین از سرِ نو اپنی کامل شکل میں تمہارے پاس آگیا ہے۔ اس پر ایمان لاؤ، اس میں تمہاری ہی بہتری ہے۔ اگر تم اس کا انکار کرو گے تو یاد رکھو کہ خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تمہارا ہی بگڑے گا۔ خدا تو سب سے بے نیاز ہے۔ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ سب اس کے قابو میں ہیں اور وہ ہر ایک کے اعمال سے واقف ہے، وہ ہر نفس کو اس کے اعمال کی جزا دے گا۔ اگر یہ چیز آج ٹل رہی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جزا ہے ہی نہیں۔ بلکہ یہ اس کی حکمت کے تحت ٹل رہی ہے۔ خدا حکیم بھی ہے۔

يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لَا تَغْلُوا۟ فِى دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا۟ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْحَقَّ ۚ إِنَّمَا ٱلْمَسِيحُ عِيسَى ٱبْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ ٱللَّهِ وَكَلِمَتُهُۥٓ أَلْقَىٰهَآ إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ۖ فَـَٔامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرُسُلِهِۦ ۖ وَلَا تَقُولُوا۟ ثَلَٰثَةٌ ۚ ٱنتَهُوا۟ خَيْرًا لَّكُمْ ۚ إِنَّمَا ٱللَّهُ إِلَٰهٌ وَٰحِدٌ ۖ سُبْحَٰنَهُۥٓ أَن يَكُونَ لَهُۥ وَلَدٌ ۘ لَّهُۥ مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ ۗ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ وَكِيلًا (۱۷۱)

غلو کا مفہوم

لَا تَغْلُوا۟ فِى دِينِكُمْ، غَلَا يَغْلُو کے معنی بڑھنے، زیادہ ہونے، متجاوز ہونے کے ہیں۔ جب یہ لفظ دین کے تعلق سے آئے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ دین میں جس چیز کا جو درجہ، مرتبہ یا جو وزن و مقام ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے، جو چیز پاؤ سیر ہے وہ من بھر کر دی جائے، جو حکم صرف استحباب و استحسان کا درجہ رکھتا ہے اس کو فرض اور واجب کا درجہ دے دیا جائے، جو شخص ایک فقیہ یا مجتہد یا

مصائب ہے اس کو امام معصوم بنا دیا جائے، جس کو اللہ نے نبی اور رسول بنایا اس کو شریک خدا یا خدا بنا ڈالا جائے، جس کی صرف تعظیم مطلوب ہے اس کی عبادت شروع کر دی جائے۔ یہ اور اس قبیل کی ساری باتیں غلو میں داخل ہیں اور جس طرح مذہب کے معاملات میں تفریط بہت بڑا جرم ہے، اسی طرح یہ افراط بھی بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے مذہب کا وہ مزاج، جو سراسر اعتدال ہے، بالکل درہم برہم ہو جاتا ہے اور اس کی وہ خدائی ترکیب و تالیف جو اس کے اجزا کو حسن و جمال کا ایک دلآویز پیکر بناتی ہے بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ یوں تو اس غلو میں تمام اہل مذاہب مبتلا ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ہم مسلمان بھی، جن کو عدل و قسط پر قائم رہنے کی سب سے زیادہ تاکید ہوئی ہے، اس فتنے میں مبتلا ہو گئے لیکن نصاریٰ کو تو یوں سمجھئے کہ اس فساد میں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی اصلی بیماری یہی ہے کہ انھوں نے اپنے اس غلو کے سبب سے پورے دین کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے اور اس کے رسول تھے۔ ان کو انھوں نے خدا کا بیٹا بنایا اور پھر ان کو بے جا کر خدائی کے عرش پر بٹھا دیا۔ حضرت مریم حضرت عیسیٰ کی والدہ تھیں، ان کو نعوذ باللہ خدا کی ماں بنایا، حضرت جبریلؑ خدا کے بندے اور فرشتے ہیں ان کو بھی ایک اقنوم کی حیثیت دے کر خدائی کی تثلیث میں شریک کر دیا، سیدنا مسیح نے دنیا اور دنیوی زندگی کے زخارف سے بچتے رہنے کی تاکید فرمائی تو انھوں نے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ غرض اس غلو کے ہاتھوں انھوں نے مذہب کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں چھوڑی جو اپنی جگہ پر برقرار رہ گئی ہو۔ فرش کی چیز عرش پر پہنچ گئی اور عرش کی چیز فرش پر آ رہی۔

غلو کے فتنہ کا راستہ — وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ: دین میں غلو کا فتنہ جس راہ سے پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کی تائید و تقویت کا ساز و سامان جہاں سے فراہم ہوتا ہے، یہ اس کا سدباب ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی طرف وہی بات منسوب کی جائے جو اس نے فرمائی ہے تو اس سے کسی فتنے کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ فتنے کا دروازہ اس وقت کھلتا ہے جب اس کی طرف وہ بات منسوب کی جائے جو اس نے نہیں فرمائی ہے۔ یہی چیز بدعت ہے اور یہیں سے شیطان کو دین میں گھسنے اور اس میں فساد برپا کرنے کی راہ کھلتی ہے۔ نصاریٰ جہاں سے ہلاک ہوئے ہیں وہ بھی دروازہ ہے۔ انھوں نے پال کی تمام خرافات کو اپنے دین کا جزو بنا دیا اور پھر اس پر اپنے سارے علم کلام کی عمارت کھڑی کر لی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انجیلوں میں تحریفات کے باوجود، اس فتنے کی آرائش کے لیے کچھ زیادہ مواد موجود نہیں ہے جس میں مسیحی مبتلا ہوئے بعض چیزیں تحریف کی راہ سے ان میں داخل بھی کی گئیں تو ان کی تردید کا سامان بھی، جیسا کہ ہم نے آل عمران میں واضح کیا ہے، ان میں موجود ہے۔ اصل گمراہی کا مواد پال کی تعلیمات میں ہے اور ان کا تعلق نہ خدا سے ہے نہ مسیح سے۔

مسیح کی اصل حقیقت — اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ الاية: اب یہ مسیح کے بارے میں وہ صحیح بات بتائی گئی ہے جو اللہ

نقصان کے باب میں فرائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، ان کی ولادت اللہ کے کلمۂ کن سے ہوئی جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم کی طرف القا فرمایا، اور ان کو روح بھی خدا ہی کی جانب سے عطا ہوئی مطلب یہ ہے کہ ان کی خارق عادت ولادت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پران کو خدائی کا درجہ دے دیا جائے۔ ان کی ولادت اسی طرح خدا کے کلمۂ کن سے ہوئی ہے جس طرح آدمؑ کی ولادت کلمۂ کن سے ہوئی ہے اور ان کے اندر بھی خدا نے اسی طرح روح پھونکی ہے جس طرح آدم کے اندر روح پھونکی۔ اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں، وجود اور زندگی تو جس کو بھی ملتی ہے [illegible] کے حکم اور اسی کی عطا کردہ روح سے ملتی ہے آل عمران آیت ۵۹ کے تحت بھی یہ بحث گزر چکی ہے۔

'فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ' یعنی اپنے چند اوہام کو بنیاد بنا کر یہ تثلیث کا گورکھ دھندا جو تم نے کھڑا کیا ہے اس سے تائب ہو کر اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ 'رسولوں پر ایمان لاؤ' کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جب خدا کے تمام رسولوں کی تعلیم تورات و انجیل میں موجود ہے اور اس تعلیم میں مسیح سے لے کر آدم تک کہیں تثلیث کا سراغ نہیں ملتا تو آخر یہ فتنہ تم نے کہاں سے گھڑ لیا۔ پس صحیح راستہ تو یہ ہے کہ یہ الگ پگڈنڈی نکالنے کے بجائے تم بھی اسی صراط مستقیم پر چلو جس پر تمام نبی اور رسول چلے۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ مسیح کی تعلیم اللہ اور اس کے رسولوں کی متفقہ تعلیم سے بالکل الگ ہو۔

تثلیث کا عقیدہ

'ثَلٰثَةٌ' سے مراد نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث ہے جو پال کی اختراعات میں سے ہے۔ اس عقیدے کی رو سے الوہیت میں باپ، بیٹے اور روح القدس تینوں شریک ہیں۔ یہ عقیدہ یوں تو بالکل مشرکین کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے لیکن ساتھ ہی اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ انجیلوں میں توحید کی تعلیم جو نہایت واضح الفاظ میں دی گئی ہے، کچھ اس کی بھی لاج رکھی جائے۔[1]

'اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ' میں 'خَيْرًا' اسی طرح فعل محذوف سے منسوب ہے جس طرح اوپر والی آیت میں

---

[1] ہمارے مخدوم مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تفسیر میں مسیحیوں کا یہ عقیدہ خود ان کے الفاظ میں اس طرح نقل کیا ہے۔

"باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر، عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح القدس غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود اور روح القدس غیر محدود۔ باپ ازلی، بیٹا ازلی، اور روح القدس ازلی۔ تاہم تینوں ازلی نہیں بلکہ ایک ازلی۔ اس طرح تین غیر محدود نہیں اور نہ تین غیر مخلوق بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود۔ یوں ہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق، اور روح القدس قادر مطلق۔ تو بھی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق۔ ویسا باپ خدا، بیٹا خدا اور روح القدس خدا۔ بس ہی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا۔"

اس کی ایک تعبیر خود نصاریٰ ہی کے الفاظ میں، ہم نے اپنی کتاب حقیقت شرک میں بھی نقل کی ہے وہ ابتدائی تعبیر ہے۔ ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

ہے۔ یہ بات یہاں دھمکی کے اسلوب میں ہے۔ یعنی یہ تین میں ایک اور ایک میں تین کے چکر سے باہر نکلو ورنہ شامت آجائے گی۔ اللہ ہی واحد الٰہ ہے۔ اس کی الوہیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کی صفات الوہیت کے یہ بات بالکل منافی ہے کہ اس کے اولاد مانی جائے۔ وہ ازلی و ابدی اور سب سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے تو اسے بیٹوں اور بیٹیوں کی کیا ضرورت ہے؟ وہ سب کی کارسازی، سب کی مدد، اور سب کے بھروسے کے لیے کافی ہے تو اس کے ساتھ کسی دوسرے کو جوڑنے کے کیا معنی؟ یعنی یا تو خدا اپنی ذات میں کوئی خلا رکھتا ہو تب شرک کی گنجائش پیدا ہوتی ہے یا دوسروں کی ضروریات کے اعتبار سے کوئی کمی اس کے اندر ہو تب اس کی گنجائش پیدا ہوتی ہے، اگر وہ اپنی ذات اور صفات میں بھی کامل ہے اور اپنی خلق کے لیے بھی کافی و وافی ہے تو شرک کی گنجائش کدھر سے نکلی؟

لَنْ یَّسْتَنْكِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَ مَنْ یَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ یَسْتَكْبِرْ فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ جَمِیْعًا ۞ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ یَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَیُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا وَّ لَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا (۱۷۲-۱۷۳)

غلو کا بڑا سبب استکبار ہے

'اِسْتِنْکَاف' کے معنی ہیں کسی چیز سے غیرت، حمیت، خودداری یا استکبار کے سبب سے اعراض کرنا۔ اس آیت کا صحیح زور سمجھنے کے لیے لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ والی آیت نگاہ میں رکھیے۔ غلو کے فتنے میں مبتلا ہونے کا بڑا سبب درحقیقت استکبار ہے۔ جو لوگ کسی چیز یا کسی شخص کو مان لیتے ہیں، وہ اگر حدود سے واقف یا ان کو ملحوظ رکھنے والے نہ ہوں تو ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس چیز یا شخص کو سب چیزوں اور تمام اشخاص سے بڑھ کر ثابت کر دکھائیں۔ پھر وہ اپنے استکبار کے اعتبار سے اس کو بڑھانا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کو بڑھاتے بڑھاتے اس حد تک پہنچا دیتے ہیں جہاں پہنچ کر ان کے استکبار کو تسلی ہو جاتی ہے کہ اب برتری کے میدان میں کوئی ان کا حریف نہیں رہا اور یہاں کوئی ان کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ عیسائیوں کو یہی فتنہ پیش آیا۔ انھوں نے جب حضرت عیسیٰ کو مانا تو صرف اتنے ہی پر قانع نہ رہ سکے کہ ان کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول مانیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ اللہ کے بندے اور رسول تو بہت سے ہیں اگر مسیح بھی اللہ کے بندے اور رسول ہی ہیں تو پھر ان کا اور ان کے ماننے والوں کا امتیاز کیا ہوا؟ اس محرک نے، جو کھلا ہوا استکبار ہے، انھیں آمادہ کیا کہ وہ کھینچ تان کر ان کو شریک خدا ثابت کریں۔

قرآن نے عیسائیوں کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا ہے کہ خدا کی بندگی کو تو مسیح نے نہ عار سمجھا نہ سمجھیں گے، نہ روح القدس اور دوسرے مقرب فرشتے اس کو عار سمجھیں گے۔ وہ اپنے درجے اور مرتبے کو خوب جانتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں نے خدا کی بندگی کو عار سمجھا اور اپنے استکبار کے نشے میں یہ سارا فساد

برپا کیا ہے ایسے سارے لوگوں کو خدا اپنے حضور میں جمع کرے گا۔ اس دن ان لوگوں کو جنھوں نے ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کی ہوگی اللہ پورا پورا اجر بھی دے گا اور ان کو اپنے فضل سے بھی نوازے گا۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے خدا کی بندگی کو عار سمجھا اور غرور میں آ کر بات کا بتنگڑ بنایا تو ان کو دردناک عذاب دے گا اور ان کا کوئی کارساز و مددگار نہ ہوگا جو ان کی طرف سے اللہ کے مقابل میں کھڑا ہو سکے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ (۱۷۴-۱۷۵)

'برہان' اور 'نور مبین' سے مراد

'برہان' اور 'نور مبین' سے مراد قرآن مجید ہے۔ 'برہان' کے لفظ سے اس کے عقلی و استدلالی پہلو کو واضح فرمایا ہے کہ وہ ایک حجت قاطع ہے، اس کے اندر ہر شبہ، ہر اعتراض اور ہر سوال کا مسکت اور تشفی بخش جواب موجود ہے بشرطیکہ آدمی اس پر کھلے دل سے غور کرے۔

'نور مبین' سے اس کے عملی پہلو کو واضح فرمایا ہے کہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز میں حق و باطل کو واضح کر کے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرماتا ہے اور تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔

'ہدایت' سے مراد مطلوب و مقصود کی ہدایت

'وَيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا' میں ہدایت کا لفظ میرے نزدیک اس ہدایت کے لیے ہے جو اہل ایمان کو آخرت میں حاصل ہوگی۔ قرآن میں یہ لفظ اس مفہوم میں متعدد مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ بقرہ میں ہدایت کے مختلف مدارج پر بحث گزر چکی ہے۔ آخرت کی ہدایت مقصود و مطلوب کی طرف ہدایت ہے۔ یہ بات کہ اس ہدایت کا تعلق آخرت سے ہے اس سے نکلتی ہے کہ اس کا عطف 'فَسَيُدْخِلُهُمْ' پر ہے جس کا تعلق صریحاً آخرت سے ہے اور یہ بات کہ یہ ہدایت مطلوب و مقصود کی طرف ہے 'اِلَيْهِ' کے لفظ سے نکلتی ہے۔ یعنی جو لوگ اللہ پر ایمان اور اس حبل اللہ کو، جو قرآن کی شکل میں ان کی طرف نازل ہوئی ہے، مضبوطی سے پکڑ لیں گے خدا ان کو اپنی رحمت اور فضل بے پایاں سے بھی نوازے گا اور براہ مستقیم اور براہِ راست ان کی رہنمائی اپنے قرب کی طرف بھی فرمائے گا اور یہ آخرت کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہوگی اس لیے کہ تمام ہدایت و شریعت کی اصل غایت اور اہل ایمان کی تمام مساعی کا اصل مقصود و مطلوب یہی قرب الٰہی ہے۔ اس آیت کا خطاب عام ہے جس میں مسلمان، اہل کتاب اور اہل عرب سب آ گئے ہیں۔

۴۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیت ۱۷۶

آخری آیت بطور ضمیمہ

اوپر والی آیت پر یہ سورہ تمام ہوئی۔ اب آگے ایک آیت بطور ضمیمہ لگا دی گئی ہے جو ابتدائے سورہ کے بیان کردہ احکام وراثت کے ایک خاص مسئلے کی وضاحت کے لیے بعد میں نازل ہوئی۔ اس کے

آخر میں كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ کے الفاظ سے اشارہ بھی فرما دیا ہے کہ یہ توضیحی آیت ہے جو بعد میں توضیح کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ اس قسم کے ضمیمے کی مثال سورہ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ آیت کی تلاوت فرمائیے۔

آیت ۱۷۶ يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ
لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ
اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ
مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ
مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ
۲۴ ع ۴ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

ترجمۂ آیت ۱۷۶ وہ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اللہ تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص مرے، اس کے کوئی اولاد نہ ہو، اس کے ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کے ترکہ کا نصف ہے اور وہ مرد اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس بہن کے کوئی اولاد نہ ہو۔ اور اگر بہنیں دو ہوں تو ان کے لیے اس کے ترکہ کا دو تہائی ہوگا اور اگر کئی بھائی بہن مرد عورتیں ہوں تو ایک مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔ اللہ تمھارے لیے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ مبادا تم گمراہی میں پڑ جاؤ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۱۷۶

۱۰۔۲۵ الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت

کلالہ کی میراث کا حکم کلالہ کی میراث کا حکم آیت ۱۲ میں گزر چکا ہے۔ کلالہ سے مراد وہ مورث ہے جس کے نہ اصول میں کوئی ہو، نہ فروع میں، صرف بھائی بہن وغیرہ ہوں۔ اگر آیت ۱۲ کے حکم کو صرف اخیافی بہن

کے ساتھ مخصوص مان لیا جائے تو اس توضیحی حکم کے بعد کلالہ کی وراثت کے حکم کا ہر پہلو واضح ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیلات فقہ و فرائض کی کتابوں میں موجود ہیں۔

سورۂ نساء کی تفسیر کی یہ آخری سطریں ہیں جو اس گنہگار کے قلم سے حوالۂ قرطاس ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

تدبرِ قرآن

۵

المآئدة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود

یہ سورہ، جیسا کہ مقدمۂ کتاب میں واضح ہو چکا ہے، پہلے گروپ کی آخری سورہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ سے، آخری امت کی حیثیت سے، اپنی آخری اور کامل شریعت پر پوری پابندی کے ساتھ قائم رہنے اور اس کو قائم کرنے کا عہد و پیمان لیا ہے۔ اس سے پہلے یہ عہد و پیمان اہل کتاب سے لیا گیا تھا لیکن وہ، جیسا کہ پچھلی سورتوں سے واضح ہوا، اس کے اہل ثابت نہ ہوئے اس وجہ سے معزول کیے گئے اور ان کی جگہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو دی اور اس کو اپنی آخری اور مکمل شریعت کا حامل اور امین بنایا۔ اب اس سورہ (مائدہ) میں عہد و پیمان لیا جا رہا ہے کہ تم پچھلی امتوں کی طرح خدا کی شریعت کے معاملے میں خائن اور غدار نہ بن جانا بلکہ پوری وفاداری اور کامل استواری کے ساتھ اس عہد کو نباہنا، اس پر خود بھی قائم رہنا، دوسروں کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کرنا اور اس راہ میں پوری عزیمت و پامردی کے ساتھ تمام آزمائشوں اور تمام خطرات کا مقابلہ کرنا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کی نوعیت

سورہ کے موضوع کے تقاضے سے اس میں جو مطالب بیان ہوئے ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی چند باتیں بالکل نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس میں جو احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں وہ دعوت اسلامی کے اس دور سے تعلق رکھنے والے ہیں جب تکمیل دین اور اتمام نعمت الٰہی کا مرحلہ سامنے آ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ عہد و پیمان لینے کے لیے سب سے زیادہ موزوں احکام یہی ہو سکتے تھے۔ ان پر عہد و پیمان لینے کے معنی یہ ہیں گویا پوری شریعت پر عہد و پیمان ہو گیا۔

دوسری یہ کہ ان احکام میں امتحان و ابتلا کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ پچھلی امتوں کو اس طرح کے جو احکام دیے گئے تھے ان میں انھوں نے ٹھوکریں کھائیں جن کے نتیجے میں وہ خدا کی معتوب و مغضوب ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر یہ فضل فرمایا کہ عہد و پیمان لیتے وقت ایسے احکام خاص طور پر سامنے کر دیے تاکہ یہ امت پاؤں پھسلنے کے ان مقامات سے اچھی طرح ہوشیار رہے۔ ظاہر ہے کہ جو خطرے کی جگہوں پر اپنے کو سنبھال سکے گا اس سے توقع یہی ہے کہ وہ ہموار جگہوں میں ٹھوکر نہیں کھائے گا۔

تیسری یہ کہ اس میں تفصیل کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے نقض عہد کی تاریخ بھی بیان ہوئی ہے اور اس کے

اسباب و محرکات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ یہ تاریخ اس امت کے لیے سبق آموزی اور عبرت پذیری کا ذریعہ بن سکے
چوتھی یہ کہ اس میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے ان مخفی گوشوں کی خاص طور پر نشان دہی کی گئی ہے جہاں سے شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو در آنے کا موقع ملتا ہے اور پھر وہ فتنے سر اٹھاتے ہیں جو روکے نہ جائیں تو پوری شریعت تاراج ہو کے رہ جاتی ہے۔

پانچویں یہ کہ اس میں وہ اصول و ضوابط پوری طرح واضح کر دیے گئے ہیں جن کا اہتمام عہد الٰہی پر قائم و استوار رہنے کے لیے ضروری ہے۔

یہ پانچ باتیں سامنے رکھ کر جو طالب حق تدبر کے ساتھ اس سورہ کی تلاوت کرے گا وہ اس کے موضوع اور اس کے نظام کے سمجھنے میں انشاء اللہ کوئی الجھن نہیں محسوس کرے گا۔ اگرچہ سورہ کے نظام کو سمجھنے کے لیے یہ اشارات بھی کافی ہیں تاہم پوری سورہ کے مضامین کا تجزیہ بھی ہم کیے دیتے ہیں تاکہ تمام مطالب بیک نظر سامنے آ جائیں۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۵) اللہ سے باندھے ہوئے ہر عہد کو پورا کرنے کی تاکید۔ اشہر حرم اور تمام شعائر الٰہی کی نگہداشت کی ہدایت یہاں تک کہ حالت احرام میں شکار بھی ناجائز ہے اور قدسیوں کی انگیخت بھی اس بات کے لیے عذر نہیں ہو سکتی کہ شعائر الٰہی کی حرمت کو کوئی بٹہ لگے۔ تعاون نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ہونا چاہیے، نہ کہ گناہ اور حدود الٰہی سے تجاوز کے کاموں میں۔

اس امت کے لیے کھانے پینے کی چیزوں میں سے جو چیزیں حرام ہیں ان کی تفصیل و تکمیل اور یہ ہدایت کہ اب تمہیں کسی کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تمہارے مخالفین نہ یہ توقع رکھتے کہ ان کے دین اور تمہارے دین میں کوئی مفاہمت ہو سکے گی اور نہ یہ امید وہ کرتے کہ وہ اس دین کو شکست دے سکیں گے۔ اب تمہارا دین کامل ہو گیا اور تم پر اللہ نے اپنی شریعت کی نعمت تمام کر دی۔ اب تم بس اسی کی پیروی کرو اور دوسروں سے بے پروا ہو جاؤ۔

تربیت کردہ شکاری جانوروں کے شکار، اہل کتاب کے کھانے اور کتابیہ سے نکاح کے بارے میں حکم اور یہ تنبیہ کہ جو ایمان کے ساتھ کفر کو جمع کریں گے ان کے سارے عمل اکارت جائیں گے۔

(۶-۷) نماز کے لیے وضو کا حکم اور عذر و مجبوری کی حالت میں تیمم کی اجازت اور تنبیہ کہ اس حکم اور اس رخصت سے اللہ نے تمہیں پاکیزہ بنانا اور تم پر اپنی شریعت کی نعمت کو کامل کرنا چاہا ہے تو اللہ کے شکر گزار رہنا، اس کے اس انعام کو یاد رکھنا، اور سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا کا اقرار کر کے اپنے رب سے جو عہد تم نے باندھا ہے اس پر مضبوطی سے جمے رہنا۔

(۸-۱۱) مسلمانوں کو مخالفوں اور دشمنوں کی شرانگیزیوں کے باوجود حق و عدل پر قائم رہنے کی ہدایت۔ اللہ کا وعدۂ مغفرت انہی کے لیے ہے جو ایمان و عمل صالح پر قائم رہیں گے۔ مسلمانوں کو یہ یاددہانی کہ دشمن کے ایک گروہ نے تم کو زک پہنچانی چاہی تو خدا نے اس کو بے بس کر دیا تو اللہ ہی سے ڈرو اور اسی پر بھروسہ کرو۔

(۱۲-۱۳) بنی اسرائیل سے میثاق کا حوالہ کہ اللہ نے ان سے عہد لیا کہ اگر وہ اللہ کی شریعت پر قائم رہیں گے تو اللہ ان کے ساتھ ہوگا اور اگر وہ اس عہد کو توڑ دیں گے تو گمراہ اور خدا کی معیت سے محروم ہو جائیں گے لیکن انھوں نے اس عہد کو توڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان پر لعنت کر دی۔

(۱۴) نصاریٰ کے میثاق کا حوالہ کہ خدا نے ان سے بھی میثاق لیا لیکن وہ اس کا ایک حصہ بھلا بیٹھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر قیامت تک کے لیے عناد و اختلاف کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ آخرت میں بھی اس کی سزا بھگتیں گے۔

(۱۵-۱۶) اہل کتاب کو دعوت کہ اللہ نے اپنے آخری پیغمبر اور قرآن کے ذریعہ سے جو روشنی تمہیں دکھائی ہے اس کی قدر کرو اور اندھیرے میں بھٹکنے کے بجائے سلامتی کی راہ اور صراط مستقیم کی طرف آؤ۔

(۱۷-۱۹) نصاریٰ کو ملامت کہ انھوں نے مسیح کو خدا بنا لیا اور یہود و نصاریٰ دونوں کے اس زعم کی تردید کہ وہ خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں، نیز یہ تنبیہ کہ خدا نے اپنا رسول بھیج کر ان پر حجت تمام کر دی ہے۔ اب ذمہ داری تمام تر ان کی ہے۔

(۲۰-۲۶) بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے اس واقعہ کی یاددہانی کہ خدا نے ان کو اپنے عظیم فضل سے نوازا، ان کو فتح و نصرت کے وعدے کے ساتھ ارض مقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا لیکن انھوں نے بزدلی دکھائی اور اپنے اندر کے دو اولوالعزم آدمیوں کی ہمت افزائی کے باوجود اپنے پیغمبر کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا جس کی سزا ان کو یہ ملی کہ چالیس سال تک صحرا ہی میں بھٹکتے رہ گئے اور ان کو ارض مقدس میں داخل ہونے کی سعادت نہ حاصل ہوئی۔

(۲۷-۳۱) آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصہ جس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ایک خدا ترس انسان کس طرح دشمن کی انگیخت کے باوجود خدا کے عہد پر قائم رہتا ہے اور ایک شریر انسان کس طرح فاسد جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے بھائی کو قتل کر دیتا اور پھر اعتراف گناہ کے بجائے اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

(۳۲) اس امر کا بیان کہ نفس انسانی کی مذکورہ بالا خرابی کے سدباب کے لیے اللہ نے بنی اسرائیل کے لیے یہ قانون بنایا کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل اور ایک کا بچانے والا سب کا بچانے والا ہے یعنی قتل جماعتی جرم اور حفاظت جان جماعتی ذمہ داری ہے لیکن بنی اسرائیل نے اس قانون کا احترام نہیں کیا بلکہ اپنے رسولوں کی کھلی ہوئی ہدایات و تنبیہات کے باوجود خدا کی زمین میں فساد مچاتے رہے۔

(۳۳-۳۴) ان لوگوں کی سزا کا بیان جو جسارت اور ڈھٹائی کے ساتھ خدا کا قانون توڑنے اور ملک میں فساد برپا کرنے کی کوشش کریں۔

(۳۵-۴۰) مسلمانوں کو اس بات کی تاکید کہ حدود الٰہی پر قائم رہو، پابندی شریعت کو حصول قرب الٰہی کا وسیلہ بناؤ اور اس شریعت کے قیام کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل رہو۔ خدا کے عذاب سے یہی چیز نجات دینے والی ہے۔ اس کے

سوا کوئی چیز بھی نفع پہنچانے والی ثابت نہیں ہو گی۔

(۳۸-۴۰) چوری کی سزا قطع ید ہے۔ اس کی بے رو رعایت تنفیذ کی تاکید اور یہ تنبیہ کہ خدا کے قانون سے بھاگنے والوں کو آخرت میں کوئی بچانے والا نہ ہو گا۔

(۴۱-۴۵) منافقین اور یہود کی ان چالوں اور شرارتوں کا بیان جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے گریز کے لیے کر رہے تھے۔ ان حرکات کی پردہ دری جو ان شرارتوں کے پیچھے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ آپ ان لوگوں کی شرارتوں سے آزردہ نہ ہوں اور یہ خواہ کچھ کریں، آپ جب بھی ان کے معاملے کا فیصلہ کریں ٹھیک قانونِ عدل کے مطابق کریں۔ یہود کو ملامت کہ یہ ان کی کیسی بدبختی ہے کہ جس کتاب کے وہ شاہد اور امین بنائے گئے اس کے واضح احکام کے مطابق اپنے معاملات کے فیصلے کرانے سے گریز اختیار کر رہے ہیں۔

(۴۶-۴۷) نصاریٰ کو تنبیہ کہ انھیں بھی یہ حکم ہوا تھا کہ وہ تمام معاملات کے فیصلے انجیل کے مطابق کریں اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے وہ نافرمان اور عہد شکن قرار پائیں گے۔

(۴۸-۵۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کہ قرآن تمام اختلافات کے درمیان قولِ فیصل بن کر نازل ہوا ہے۔ اب یہی تمام پچھلے صحیفوں کے لیے کسوٹی ہے۔ اہل کتاب کی بدعات کی کوئی پروا نہ کرو۔ ہر معاملے کا فیصلہ اسی کی روشنی میں کرو۔ اگر یہ اہل کتاب اپنی بدعات چھوڑنا نہیں چاہتے تو تم ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان کا فیصلہ قیامت میں ہو گا۔ ہوشیار رہو کہ یہ تمھیں اپنی بدعات و خواہشات کی طرف موڑنے نہ پائیں۔

(۵۱-۵۶) مسلمانوں کو تنبیہ کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، جو ان کو اپنا دوست بنائے گا اس کا شمار انہی میں ہو گا۔ منافقین کے اس راز کا اظہار کہ یہ ڈرتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ سے کھلم کھلا بگاڑ کر لیا اور کل کو پلہ انہی کا بھاری رہا تو کیا ہو گا حالانکہ انھیں یہ سوچنا چاہیے کہ اسلام کی فتح کے بعد اگر ان کا سارا پول کھول دیا گیا تب کیا ہو گا۔ منافقین کو دھمکی کہ یہ مرتد ہونا چاہتے ہیں تو ہو جائیں، خدا کو کوئی پروا نہیں، خدا اسلام کی حمایت کے لیے ایسے لوگوں کو کھڑا کرے گا جن سے خدا محبت کرے گا اور جو خدا سے محبت کریں گے۔

(۵۷-۶۶) منافقین کی بے حمیتی پر ملامت کہ ان یہود کو یہ اپنا دوست بناتے ہیں جو اپنی مجلسوں میں اسلام اور اس کے شعائر کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہود کو سرزنش کہ انھیں آخرت میں پتہ چلے گا کہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ برا انجام کون ہے۔ یہود کی دھوکہ بازی اور ان کے علماء کی بے حسی و بے غیرتی کی طرف اشارہ۔ یہود کا طنز اللہ تعالیٰ پر اور اس کا جواب۔ یہ اشارہ کہ حسد کے جوش میں یہود برابر جنگ کی آگ بھڑکاتے رہیں گے لیکن خدا ان کی کسی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ اہل کتاب کو ملامت کہ ان کی شامت ہی ہے کہ انھوں نے اسلام کو اپنے لیے خطرہ سمجھا۔ اگر وہ اس کو قبول کرتے تو درحقیقت تورات و انجیل کو قائم کرتے اور ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابیوں کے دروازے کھل جاتے لیکن ان میں عدل پسند تھوڑے نکلے، اکثریت بدعملوں ہی کی ہے۔

(۶۷-۷۱) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ تم بالکل نڈر ہو کر ان اہل کتاب کو حق پہنچا دو کہ جب تک تم

تورات وانجیل اور اس قرآن کو قائم نہ کرو تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ خدا سے نسبت صرف ان کو حاصل ہوگی جو ایمان و عمل سے نسبت پیدا کریں گے۔ یہود کی تاریخ کا حوالہ کہ ان سے میثاق لینے کے بعد اللہ نے اس میثاق کی تجدید کے لیے برابر رسول بھیجے لیکن انھوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔ رسولوں کے ایک گروہ کی انھوں نے تکذیب کردی اور بعض کو قتل کر دیا۔ انھوں نے خدا کی ڈھیل سے یہ گمان کر لیا کہ اب کوئی پکڑ نہیں ہوگی اور وہ برابر اندھے بہرے بنے رہے۔

(۷۲-۷۷) نصاریٰ کے کفر کا بیان کہ انھوں نے مسیح کی تعلیمات کے بالکل خلاف حلول اور تثلیث کے عقیدے ایجاد کر لیے۔ حضرت مسیح اور اُن کی والدہ کے اصل مرتبہ کی وضاحت اور نصاریٰ کو یہ تنبیہ کہ ایک گمراہ قوم کی ایجاد کردہ بدعات کی تقلید میں انھوں نے اپنے کو ہلاکت میں مبتلا کیا۔

(۷۸-۸۶) بنی اسرائیل پر حضرت داؤدؑ اور حضرت مسیحؑ کی لعنت کا حوالہ۔ کفر دوستی اور اسلام دشمنی کے جوش میں مشرکین مکہ تک سے ان کی دوستی کی طرف اشارہ۔ اسلام دشمنی میں یہود، مشرکین، قریش اور نصاریٰ کے مزاج کا فرق۔ حق پرست نصاریٰ کی حق پرستی اور اسلام دوستی کی تحسین۔

(۸۷-۱۰۵) سورہ کے شروع میں بیان کردہ احکام حلت و حرمت کے بعض پہلوؤں کی وضاحت اور ان سے متعلق سوالوں کے جواب۔ خدا کی مباح کردہ چیزوں کو اپنے جی سے حرام ٹھہرانے کی ممانعت۔ احترام عہد و پیمان کے پہلو سے قسم کے معاملے میں احتیاط کی تاکید اور ارادی قسموں کا کفارہ۔ شراب، جوا، انصاب و ازلام کی قطعی حرمت کا اعلان۔ شراب اور جوئے کے شرعی اور معاشرتی مفاسد۔ جو لوگ درجہ بدرجہ تحریم و تحلیل کے معاملے میں خدا کے احکام کا احترام کرتے آئے ہیں ان کی پچھلی غلطیوں پر کوئی گرفت نہیں۔ حالت احرام میں شکار کی ممانعت ایک سخت آزمائش ہے اس وجہ سے اس معاملے میں بیدار رہنے کی ہدایت اور اگر غلطی ہو جائے تو اس کے کفارے کی صورت، نیز اس ممانعت میں جس حد تک رخصت ہے اس کا بیان۔ خانہ کعبہ اور اس سے متعلق تمام شعائر کے برابر احترام کرتے رہنے کی تاکید اور یہ تنبیہ کہ رسول کا کام اللہ کی ہدایات کا پہنچا دینا تھا، اس نے پہنچا دیں اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔ برائی کی کثرت برائی کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتی اس وجہ سے دانشمندی اور فلاح کی راہ یہی ہے کہ برائی سے بچا جائے۔ غیر ضروری سوالات کرنے کی ممانعت، اس سے یہود کو جو نقصانات پہنچے اُن کی طرف اشارہ۔ تحریم و تحلیل سے متعلق قریش کی بعض بدعات کا حوالہ اور ان کی اندھی تقلید آباء پر سرزنش۔ مسلمانوں کو ہدایت کہ جو نہیں سنتے ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔

(۱۰۶-۱۰۸) شہادت حق اور عہد و قسم کے تحفظ کے پہلو سے حالت سفر کی وصیت اور اس سے متعلق گواہی کا ضابطہ اور اگر اس کے بارے میں کوئی شبہ پیش آجائے تو اس کے تدارک کا طریقہ۔

(۱۰۹-۱۲۰) خاتمۂ سورہ ـــــ قیامت کے دن انبیاء اپنی اپنی اُمتوں کے باب میں شہادت دیں گے کہ انھوں نے اللہ کی طرف سے لوگوں کو کیا بتایا اور سکھایا اور لوگوں سے کن باتوں کے کرنے اور کن باتوں کے نہ کرنے کا عہد و اقرار لیا تاکہ ہر امت پر حجت قائم ہو سکے کہ جس نے بھی کوئی بدعہدی کی ہے اس کی ذمہ داری تمام تر اسی

پر ہے، اللہ کے رسول اس سے بری ہیں۔ اس شہادت کی نوعیت واضح کرنے کے لیے بطورِ مثال حضرت عیسیٰؑ کی شہادت کا تفصیلی تذکرہ تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اللہ نے اپنے نبیوں اور رسولوں پر جس شہادتِ حق کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ اس کے بارے میں عنداللہ مسئول ہوں گے اور ان کے واسطہ سے امتوں نے جس قیام بالقسط اور شہادتِ حق کا عہد و پیمان خدا سے باندھا ہے وہ اس کے لیے مسئول ہوں گی اور آخرت کی فلاح اور خدا کی خوشنودی ان کو حاصل ہوگی جو اس عہد کا حق ادا کرنے والے ثابت ہوں گے۔

اس فہرستِ مطالب پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی سورہ کے تمام اجزا کا ربط اس کے موضوع سے بالکل واضح نظر آتا ہے۔ اب ہم اللہ کی توفیق اور اس کی رہنمائی کے بھروسے پر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

سُورَةُ الْمَآئِدَةِ (۵)

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۱۲۰

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

المنزل ۲ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۚ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ
آيات ۵-۱ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۗ اِنَّ اللهَ
يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللهِ
وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ
الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۚ وَاِذَا
حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ
وقف لازم عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ
التَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللهَ ۗ اِنَّ
الربع اللهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ② حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَ
لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ
وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۗ وَمَا
ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۚ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ
اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ
لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ
لِإِثْمٍ ۙ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٣﴾ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ ۖ
قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ
تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللَّهُ ۖ فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا
اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٤﴾ الْيَوْمَ
أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ ۖ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ
وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ ۖ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ
مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ
مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ ۗ وَمَنْ يَكْفُرْ
بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٥﴾ ع ۵

ترجمۂ آیات ۱-۵

اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان پورے کرو۔ تمہارے لیے انعام کی قسم کے تمام
چوپائے حلال ٹھہرائے گئے بجز ان کے جن کا حکم تم کو پڑھ کر سنایا جا رہا ہے۔ نہ جائز
کرتے ہوئے شکار کو حالتِ احرام میں۔ اللہ حکم دیتا ہے جو چاہتا ہے۔ ۱

اے ایمان والو! شعائر الٰہی کی بے حرمتی نہ کیجیو، نہ محترم مہینوں کی، نہ قربانیوں
کی، نہ پٹے بندھے ہوئے نیاز کے جانوروں کی، نہ بیت اللہ کے عازمین کی، جو اپنے رب
کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طالب بن کر نکلتے ہیں۔ اور جب تم حالتِ احرام سے
باہر آ جاؤ تو شکار کرو۔ اور کسی قوم کی دشمنی، کہ اس نے تمہیں مسجد حرام سے روکا ہے

تمھیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم حدود سے تجاوز کرو۔ تم نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو، گناہ اور تعدی میں تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۲

تم پر مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور حرام کیا گیا جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اور وہ جو گلا گھٹنے سے مرا ہو، جو چوٹ سے مرا ہو، جو اوپر سے گر کر مرا ہو، جو سینگ لگ کر مرا ہو، جس کو کسی درندے نے کھایا ہو بجز اس کے جس کو تم نے ذبح کر لیا ہو اور وہ جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو اور یہ کہ تقسیم کرو تیروں کے ذریعے سے، یہ سب باتیں فسق ہیں۔ اب یہ کافر تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے تو ان سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو، اب میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔ پس جو بھوک میں مضطر ہو کر، بغیر گناہ کی طرف مائل ہوتے، کوئی حرام چیز کھا لے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۳

وہ پوچھتے ہیں ان کے لیے کیا چیز حلال ٹھہرائی گئی ہے۔ کہو تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال ٹھہرائی گئی ہیں۔ اور شکاری جانوروں میں سے جن کو تم نے سدھایا ہے اس علم میں سے کچھ سکھا کر جو خدا نے تم کو سکھایا تو تم ان کے اس شکار میں سے کھاؤ جو وہ تمھارے لیے روک رکھیں اور ان پر اللہ کا نام لے لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔ ۴

اب تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا تمھارے

لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور شریف عورتیں مسلمان عورتوں میں سے اور شریف عورتیں ان اہل کتاب میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تمہارے لیے حلال ہیں بشرطیکہ ان کو قیدِ نکاح میں لا کر ان کے مہران کو دو، نہ کہ بدکاری کرتے ہوئے اور آشنائی گانٹھتے ہوئے۔ اور جو ایمان کے ساتھ کفر کرے گا تو اس کا عمل ڈھے جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں ہو گا۔ ۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَوْفُوا۟ بِٱلْعُقُودِ ۚ أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ ٱلْأَنْعَٰمِ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى ٱلصَّيْدِ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ (۱)

لفظ عقد کا مفہوم اور اس کی وسعت

'اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ' عقد کا لفظ عہد و میثاق کے الفاظ کے مقابل میں عام ہے۔ اس میں قول قرار، قسم اور کسی معاملے میں گواہی کی ذمہ داری سے لے کر اس عہد و میثاق تک، جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے، سب آ گیا۔ چنانچہ اس سورہ میں میثاق شریعت کی پوری تاریخ بھی اس کے تمام نتائج و عواقب کے ساتھ بیان ہوئی ہے، قسم اور شہادت کی ذمہ داریاں بھی واضح کی گئی ہیں۔

انعام اور بہیمہ میں فرق

'اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ' 'اَنْعَام' کا لفظ عربی میں بھیڑ بکری، اونٹ اور گائے بیل کے لیے معروف ہے۔ اس کی تصریح خود قرآن نے سورۂ انعام کی آیات ۱۴۳، ۱۴۴ میں فرما دی ہے۔ 'بہیمہ' کا لفظ اس سے عام ہے۔ اس میں 'انعام' کی نوع کے دوسرے چوپائے بھی داخل ہیں۔ انعام کی طرف اس کی اضافت سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ اونٹ، گائے، بکری اور اس قبیل کے سارے ہی چوپائے خواہ گھریلو ہوں یا وحشی، تمہارے لیے جائز ٹھہرائے گئے۔ 'جائز ٹھہرائے گئے' سے مطلب یہ ہے کہ وہ پابندیاں جو تم نے اپنے اوہام کی بنا پر عائد کی ہیں وہ بھی ختم اور جو پچھلے صحیفوں کی روایات کی بنا پر تھیں وہ بھی کالعدم۔

'اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ' یہ اشارہ ہے آگے آیت ۳ میں بیان کردہ حرمتوں کی طرف۔

حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت اور اس کی اہمیت

'غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ' یہ ان حرمتوں میں سب سے پہلی حرمت کا ذکر ہے۔ یعنی تمہارے لیے انعام کے قسم کے تمام چوپائے خواہ پالتو ہوں یا وحشی جائز ہیں بایں پابندی کہ حالتِ احرام میں شکار کو جائز کر لینے والے نہ بن جانا۔ اس کے حالیہ اسلوبِ بیان اور اس کے سب سے پہلے ذکر کرنے سے اس کی اہمیت

ظاہر ہوتی ہے جس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔

ہم اوپر تمہیدی گفتگو میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں جو احکام بیان ہوتے ہیں وہ تکمیلی و اتمامی نوعیت کے بھی ہیں اور ان میں امتحان و آزمائش کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ اپنے اسی پہلو سے وہ اس سورہ کے لیے، جو سورۃ المیثاق ہے، موزوں قرار پائے ہیں۔ ان پر عہد لینے کے معنی ایک طرف تو یہ ہیں کہ پوری شریعت کی پابندی کا عہد لیا گیا، دوسری طرف یہ کہ ان چیزوں پر عہد لیا گیا جو دوسری ملتوں کے لیے مزلۂ قدم ثابت ہو چکی تھیں۔ چنانچہ یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں ہی پہلو ملحوظ ہیں۔

کھانے پینے کے باب میں یہاں جو حرمتیں اور حلتیں بیان ہوئی ہیں وہ بالکل آخری نوعیت کی ہیں۔ اس سے پہلے اس باب کے بہت سے احکام بقرہ میں گزر چکے ہیں بلکہ بقرہ سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۂ انعام میں بیان ہوئے ہیں جو ایک مکی سورہ ہے۔ صرف کچھ جزئیات و تفصیلات باقی رہ گئی تھیں جو اس سورہ میں بیان ہو گئی ہیں اور ان کے بعد یہ باب گویا بالکل مکمل ہو گیا۔ یہ حقیقت آگے کی آیات سے خود اس قدر واضح ہو جائے گی کہ دلیل کی محتاج نہیں رہے گی۔

ابتلا و امتحان کے زاویہ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت کا معاملہ بالکل اس حکم سے مشابہ ہے جو یہود کو سبت کے احترام سے متعلق دیا گیا تھا۔ ان کو سبت کے دن شکار کی ممانعت تھی لیکن وہ اس عہد کو نباہ نہ سکے بلکہ مختلف حیلے ایجاد کر کے انہوں نے اس کو جائز بنا لیا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی۔ سبت کے حکم سے اس کی مشابہت خود قرآن نے اسی سورہ میں آگے آیات ۹۴-۹۶ میں واضح کر دی ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو، اپنے رب سے اس کی شریعت کی پابندی کا جو عہد و میثاق تم نے کیا ہے وہ پورا کرنا۔ تمہارے لیے انعام کی قسم کے تمام چوپائے، بجز ان کے جو آگے بیان کیے جا رہے ہیں، اس پابندی کے ساتھ حلال ٹھہرائے گئے کہ احرام کی حالت میں شکار نہ کرنا۔ آخر میں اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ فرما کر اس حکم کے امتحانی پہلو کی طرف اشارہ فرما دیا کہ یہ حکم تمہاری وفاداری کی جانچ کے لیے ہے، اس میں میکھ نکالنے اور اس سے گریز و فرار کی راہیں نہ ڈھونڈنا۔ خدا جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے اور اس کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت ہی میں اس کے بندوں کے لیے خیر و برکت ہے۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ جو احکام امتحان کے مقصد سے ہوتے ہیں ان میں بندوں کی مصلحت کا پہلو مخفی ہوتا ہے اس وجہ سے جب تک یہ عقیدہ دل میں مضبوط نہ ہو کہ خدا کو حکم دینے کا اختیار مطلق حاصل ہے اور اس کا ہر حکم بندوں

لے ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ آیت ۱۷۳ اور سورۂ انعام آیات ۱۴۲-۱۴۴

ہی کی مصلحت کے لیے ہوتا ہے اس وقت تک بھی وفاداری کے ساتھ ان کی تعمیل نہیں ہوسکتی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآىِٕدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۭ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۭ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۲)

شعائر کا احترام ظاہر و باطن دونوں پہلوؤں سے مطلوب ہے

'لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ' بقرہ آیت ۱۵۸ کے تحت 'شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ' پر تفصیل کے ساتھ بحث ہو چکی ہے۔ شعائر کسی اہم دینی و روحانی حقیقت کے مظہر اور پیکر ہیں۔ ان میں اصل مقصود کی حیثیت تو ان روحانی و معنوی حقائق کی ہے جو ان مظاہر کے اندر مضمر ہیں اس لیے کہ ان حقائق ہی کا احساس دلانے کے لیے ان کو بطور نشان اور علامت کے مقرر کیا گیا ہے لیکن یہ مقرر کردہ خدا کے ہیں اس وجہ سے ان کے ظاہر و باطن دونوں کا یکساں احترام مطلوب ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ ان کے احترام کے جو آداب و شرائط مقرر ہیں ان کی خلاف ورزی کرے یا جو چیزیں یا جو باتیں ان کے تعلق سے حرام ہیں ان کو جائز کرے۔ مثلاً چار محترم مہینوں — ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب حج و عمرہ کے تعلق سے محترم مہینے قرار دیے گئے ہیں، ان میں لڑائی بھڑائی ممنوع ہے۔ اگر کوئی گروہ ان میں لڑائی چھیڑ دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے ان حرام مہینوں کو اپنے لیے جائز کر لیا اور ان کی بے حرمتی کی۔

ہدی اور قلائد کا مفہوم

'ھَدْی' قربانی کے جانوروں کو کہتے ہیں جو بطور ہدیہ خدا کے حضور پیش کرنے کے لیے بیت اللہ لے جائے جاتے ہیں۔ 'قَلَآىِٕد' قلادہ کی جمع ہے جس کے معنی پٹے کے ہیں۔ اس میں مضاف محذوف ہے یعنی — ذوات القلائد، یعنی قربانی اور نذر و نیاز کے وہ جانور جن کو تخصیص کے طور پر پٹے باندھ دیے گئے ہیں کہ پہچانے جائیں، کوئی ان سے تعرض نہ کرے۔ 'ہدی' کے بعد 'قلائد' کا ذکر عام کے بعد خاص کے ذکر کی نوعیت رکھتا ہے اور مقصود اس سے تعرض کی سنگینی کو واضح کرنا ہے کہ جن جانوروں کے گلے میں خدا کی تخصیص کے پٹے بندھ گئے ان پر حملہ خاص خدا کے گلے پر حملہ کرنا ہے۔ اسی طرح 'آمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ' کے ساتھ 'يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا' کی صفت کا ذکر اس نہی کو مؤثر بنانے کے لیے ہے کہ جو اللہ کے بندے خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں گھر سے نکلے ہوں ان کو نقصان پہنچانے کے درپے ہونا خود خدا سے تعرض کرنے کے مترادف ہے۔

قریش کی دشمنی بھی زیادتی کے لیے دلیل جواز نہیں ہے

'وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ الآیۃ'، 'شَنَاٰن' کے معنی بغض و عداوت کے ہیں اور 'لَا يَجْرِمَنَّكُمْ' کے معنی ہیں، تمہارے لیے سبب و محرک نہ بنے، تمہیں آمادہ نہ کرے۔ 'قوم' سے مراد یہاں قریش ہیں اور 'اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ'، اس بغض و عداوت کے سبب کی تفصیل ہے۔ یعنی قریش نے تمہیں بیت اللہ سے روک کر ہر چند تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے لیکن اس چیز کا غم و غصہ

بھی تمھیں اس بات پر نہ اُبھارے کہ تم شعائر الٰہی کے معاملے میں حدود الٰہی سے تجاوز کرو۔ ان کے عازمین حج کے قافلوں کو یا ان کے نذر و نیاز کے جانوروں کو کوئی گزند نہ پہنچاؤ۔

'وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى الآیۃ' یہ اوپر والی بات ہی کی ایک دوسرے پہلو سے تاکید ہے یعنی جس گروہ کو اللہ نے دنیا میں نیکی اور تقویٰ قائم کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اس کے لیے پسندیدہ روش یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں سے مشتعل ہو کر خود اسی طرح کی زیادتیاں کرنے لگے۔ وہ ایسا کرے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس نے گناہ اور زیادتی کے کام میں تعاون کیا اور شریروں نے برائی کی جو خیر جاری اس پر اس نے بھی چند رقمے رکھ دیے، حالانکہ اس کا کام نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرنا تھا۔[1]

دوسروں کی انگیخت پر حدود الٰہی سے تجاوز تعاون علی الاثم ہے

اجزا کو سمجھ لینے کے بعد آیت کے مجموعی نظام پر ایک بار پھر نظر ڈال لیجیے۔

اوپر والی آیت میں حالت احرام میں شکار کی ممانعت فرمائی تھی کہ یہ چیز احرام کے تقدس اور اس کے درویشانہ مزاج کے خلاف تیر شعائر الٰہی میں سے ایک شعیرہ کی توہین ہے۔ اب اسی تعلق سے تمام شعائر الٰہی کے احترام کی پہلے بحیثیت مجموعی تاکید فرمائی پھر چند مخصوص شعائر کا حوالہ دیا۔ پھر شکار کی ممانعت سے متعلق یہ واضح فرما دیا کہ اس کا تعلق صرف حالت احرام سے ہے۔ احرام سے باہر آجانے کے بعد یہ ممانعت اٹھ جائے گی۔

پھر اس اشتعال انگیز سبب کا ذکر فرمایا جو اس وقت تازہ بتازہ موجود تھا۔ اندیشہ تھا کہ مسلمان اس سے مغلوب ہو کر کوئی ایسی بات کر گزریں جو احترام شعائر کے منافی ہو۔ قریش نے ان کو بیت اللہ کے حج و زیارت سے محروم کر رکھا تھا۔ یہ معاملہ نہایت نازک اور صبر آزما تھا اور اب کہ مسلمانوں نے بیا کی قوت حاصل کر لی تھی خاصا اندیشہ اس بات کا تھا کہ اس عہد کے احترام میں ان سے کوئی بے اعتدالی صادر ہو جائے۔ یہ صورت حال مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ان کو مزلۂ قدم سے ہوشیار کر دے کہ دوسروں کی زیادتیاں بھی ان کے لیے کسی زیادتی کا جواز فراہم نہیں کر سکتیں۔ وہ دنیا میں شعائر الٰہی کا احترام قائم کرنے اور نیکی اور تقویٰ کے علم بردار بن کر اُٹھے ہیں اس وجہ سے جب تک اپنے بچاؤ کی ضرورت مجبور نہ کر دے ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نیکی اور تقویٰ کے خلاف اٹھائیں۔ اس کے بعد نکتے کی بات یہ ارشاد ہوئی کہ دوسروں کے غلط رویے سے متاثر ہو کر انھی کی سی روش اختیار کر لینا درحقیقت ان کی برپا کی ہوئی بدی میں ان کے ساتھ تعاون کرنا ہے، اور یہ چیز

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ یہاں جس چیز سے روکا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے کے طرزِ عمل سے مشتعل ہو کر کوئی کام جارحانہ طور پر خود مسلمان بھی ایسا کر گزریں جو شعائر الٰہی کے احترام کے منافی ہو۔ اگر مسلمانوں کو اپنے تحفظ اور دفاع کے لیے مجبوراً کوئی قدم اٹھانا پڑے تو وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ دفاعی جنگ اشہر حرم بلکہ حرم میں بھی لڑی جا سکتی ہے۔ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

اہلِ ایمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اہل ایمان کے شایانِ شان بات یہ ہے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کریں۔ دشمن کے ہاتھوں بھی کوئی کام نیکی کا ہو رہا ہو تو اس میں مزاحم ہونے کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ آخر میں شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ کا حوالہ دینے سے مقصود مسلمانوں کو سخت الفاظ میں تنبیہ ہے کہ عہد الٰہی کی حرمت سخت سے سخت حالات میں بھی قائم رکھنی ہے۔ مدد نہ یاد رکھو کہ جس خدا نے تم کو اپنے عہد و میثاق سے دُنیا کی امامت کی سرفرازی بخشی ہے، اس کے ہاں نقضِ میثاق کی پاداش بھی بڑی ہی سخت ہے۔

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةُ وَالدَّمُ وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالۡمُنۡخَنِقَةُ وَالۡمَوۡقُوۡذَةُ وَالۡمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيۡحَةُ وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيۡتُمۡ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ‌ ذٰ لِكُمۡ فِسۡقٌ‌ اَلۡيَوۡمَ يَئِسَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ دِيۡـنِكُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِ‌ اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَـكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَـكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا‌ فَمَنِ اضۡطُرَّ فِىۡ مَخۡمَصَةٍ غَيۡرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثۡمٍ‌ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (۳)

میتہ کی تفصیل — مَیۡتَۃ، دَم، لَحۡمُ خِنۡزِیۡر اور مَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ کا ذکر سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۳ کے تحت گزر چکا ہے۔

مُنۡخَنِقَۃ اس جانور کو کہتے ہیں جو گلا گھٹ کر مر جائے۔

مَوۡقُوۡذَۃ جو چوٹ سے مر جائے۔ مثلاً کسی جانور پر دیوار گر پڑی یا وہ کسی ٹرک کے نیچے آگیا۔

مُتَرَدِّیَۃ جو اوپر سے نیچے گر کر مر جائے۔

نَطِیۡحَۃ جو کسی جانور کی سینگ سے زخمی ہو کر مر جائے۔

مَاۤ اَکَلَ السَّبُعُ جس کو کسی درندے نے پھاڑ کھایا ہو۔

مذکورہ پانچوں چیزوں کا ذکر درحقیقت میتہ کی تفصیل کے طور پر ہوا ہے اور اس تفصیل سے گویا اس حکم کی تکمیل ہو گئی جو بقرہ اور اس سے پہلے انعام میں بیان ہو چکا ہے۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لیے تھی کہ بعض ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ ایک مردار میں جو طبعی موت مرا ہو اور اس جانور میں، جو کسی چوٹ یا کسی حادثہ کا شکار ہو کر اچانک مر گیا ہو، کچھ فرق ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہ شبہ اس زمانے میں بھی بعض لوگ پیش کرتے ہیں بلکہ بعض سے لوگ تو اسی کو بہانہ بنا کر گردن مروڑی ہوئی مرغی بھی جائز کر بیٹھے۔ قرآن کی اس تفصیل نے اس شبہے کو صاف کر دیا۔

تھان، استھان اور مزارات پر قربانی کی ممانعت — وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ، نُصُب تھان اور استھان کو کہتے ہیں۔ عرب میں ایسے تھان اور استھان بے شمار تھے جہاں دیویوں، دیوتاؤں، بھوتوں، جنوں کی خوشنودی کے لیے قربانیاں کی جاتی تھیں۔ قرآن نے اس قسم کے ذبیحے بھی حرام قرار دیے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ ان کے اندر حرمت مجرد بارادۂ

تقرب و خوشنودی، استھان پر ذبح کیے جانے ہی سے پیدا ہو جاتی ہے اس سے بحث نہیں کہ ان پر نام اللہ کا لیا گیا ہے یا کسی غیر اللہ کا۔ اگر غیر اللہ کا نام لینے کے سبب سے ان کو حرمت لاحق ہوتی تو ان کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، اوپر 'مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ' کا ذکر گزر چکا ہے، وہ کافی تھا۔ ہمارے نزدیک اسی حکم میں وہ قربانیاں بھی داخل ہیں جو مزاروں اور قبروں پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں بھی صاحب مزار اور صاحب قبر کی خوشنودی مدنظر ہوتی ہے۔ ذبح کے وقت نام چاہے اللہ کا لیا جائے یا صاحب قبر و مزار کا، ان کی حرمت میں دخل نام کو نہیں بلکہ مقام کو حاصل ہے۔

استقسام بالازلام کی نوعیت

'وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ'۔ استقسام کے معنی ہیں حصہ یا قسمت یا تقدیر معلوم کرنا۔ ازلام جوئے یا فال کے تیروں کو کہتے ہیں۔ عرب میں فال کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے سے وہ اپنے زعم کے مطابق غیب کے فیصلے معلوم کرتے تھے اور جوئے کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے سے وہ گوشت یا کسی چیز کے حصے حاصل کرتے تھے۔ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں خمر و میسر کے تحت بیان کر آئے ہیں کہ عرب شراب نوشی کی مجلسیں منعقد کرتے، شراب کے نشے میں جس کا اونٹ چاہتے ذبح کر دیتے، مالک کو منہ مانگے دام دے کر راضی کر لیتے پھر اس کے گوشت پر جوا کھیلتے۔ گوشت کی جو ڈھیریاں جیتتے جاتے ان کو بھونتے، کھاتے، کھلاتے اور شرابیں پیتے اور بسا اوقات اسی شغل بدمستی میں ایسے ایسے جھگڑے کھڑے کر لیتے کہ قبیلے کے قبیلے برسوں کے لیے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے اور سینکڑوں جانیں اس کی نذر ہو جاتیں۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ یہاں 'اِسْتِقْسَام بِالْاَزْلَام' سے یہی دوسری صورت مراد ہے۔

'ذٰلِكُمْ فِسْقٌ'۔ 'ذٰلکم' کا اشارہ اوپر ذکر کی ہوئی تمام چیزوں کی طرف ہے اور 'فسق' کا لفظ یہاں عام فقہی مفہوم میں نہیں ہے بلکہ قرآنی مفہوم میں ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کھلی ہوئی نافرمانی، سرکشی، کفر اور شرک سب کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ ابلیس کے متعلق ہے 'فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ'۔

کفار سے معاشرتی انقطاع کا اعلان

'اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ الآیۃ'۔ 'الیوم' سے مراد کوئی معین دن نہیں ہے بلکہ وہ زمانہ ہے جس میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ ہم تمہید میں اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ سورہ تمام تر اسلام کے تکمیلی دور کے احکام و ہدایات پر مشتمل ہے۔ کفار کے اس دین سے مایوس ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ اب تک تو وہ اس طمع خام میں مبتلا رہے ہیں کہ وہ اس کو یا تو مغلوب کر لیں گے یا 'کچھ لو اور کچھ دو' کے اصول پر کوئی ایسا سمجھوتہ کر لیں گے کہ دونوں کا نباہ ہو سکے۔ لیکن اب ان کی اس طمع خام کا خاتمہ ہو گیا۔ اب انھوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ دونوں راہیں ایک دوسری سے اس طرح الگ الگ ہو گئی ہیں کہ اب ان کا کسی نقطۂ اتصال پر جمع ہونا بالکل ناممکن ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کے اشتراک کو معاشرتی ارتباط میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر صورت یہ پیدا ہو جائے کہ ایک کے ہاں جو چیزیں حلال و طیب ہوں دوسرے کے ہاں وہ خبیث و حرام قرار دے دی جائیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں میں مکمل معاشرتی انقطاع

کا اعلان ہو گیا اور اب ان مغلوں کے مل بیٹھنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے۔ قدرتی طور پر اس چیز نے ان کو اسلام اور مسلمانوں سے آخری درجے میں مایوس کر دیا۔ آخری مایوسی سے بعض مرتبہ آخری جھلاہٹ بھی پیدا ہوتی ہے لیکن یہ مریض کا آخری سنبھالا ہوتی ہے جس کے بعد آخری ہچکی کے سوا کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی وجہ سے قرآن نے فرمایا کہ اب ان سے اندیشہ ناک ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب وہ زور لگائیں بھی تو ان میں دم کیا ہے۔ اب تم صرف مجھی سے ڈرو۔ ان کی کوئی پروا نہ کرو۔

تکمیل دین اور اتمام نعمت

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ الآیۃ" تکمیل دین سے مراد اصل دین کی تکمیل ہے اور اتمام نعمت سے مراد اس آخری شریعت کا اتمام ہے۔ جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے اس کا آغاز تو حضرت آدمؑ سے ہوا ہے۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ حالات اور حکمت الٰہی کے تقاضوں کے مطابق، مختلف انبیاء و رسل پر اترتا رہا یہاں تک کہ خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کامل ہو گیا۔ اس سے پہلے جو دین آئے وہ اسی دین کے اجزا تھے۔ ان کی حیثیت پورے دین کی نہیں تھی۔ پورے دین کی حیثیت صرف اسی دین کو حاصل ہے۔ اس حقیقت کے اشارات پچھلے آسمانی صحیفوں میں بھی موجود ہیں جن کے حوالے اس کتاب میں بھی گزر چکے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی اور اس قصرِ دین کے کونے کی آخری اینٹ ہیں۔

جہاں تک اس آخری امت پر اللہ کی نعمت کا تعلق ہے اس کا آغاز غارِ حرا کی پہلی وحی سے ہوا اور درجہ بدرجہ ۲۳ سال کی مدت میں اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کا اتمام فرمایا۔ چنانچہ اس مرحلے میں آ کر ایک طرف اللہ کا دین بھی اپنے کمال کو پہنچ گیا، دوسری طرف اس امت پر اللہ تعالیٰ کی نعمت بھی پوری ہو گئی۔ اسی کا مجموعی نام اسلام ہے جو ہمیشہ سے اللہ کا دین ہے اور جو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کی وراثت کی حیثیت سے نبی امی اور ان کی امت کو منتقل ہوا۔ "وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" میں اس دین کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس پسندیدگی اور انتخاب کا اظہار ہے جس کے وجوہ و دلائل تفصیل کے ساتھ بقرہ اور آلِ عمران میں گزر چکے ہیں۔ اس پسندیدگی کے اظہار سے بالواسطہ یہودیت اور نصرانیت کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار بھی ہو گیا کہ وہ اللہ کے دین نہیں بلکہ دین سے انحراف کی مختلف شکلیں ہیں۔

اضطرار کی شرعی حد

"فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ" "مَخْمَصَۃ" کے معنی بھوک کے ہیں۔ بھوک سے مضطر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی بھوک کی ایسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے کہ موت یا حرام میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی اور راہ بظاہر کھلی ہوئی باقی ہی نہ رہ جائے۔ ایسی حالت میں اس کو اجازت ہے کہ حرام چیزوں میں سے بھی کسی چیز سے فائدہ اٹھا کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ "غَیْرَ مُتَجَانِفٍ" کی قید اسی مضمون کو ظاہر کر رہی ہے جو دوسرے مقام میں "غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ" سے ادا ہوا ہے۔ یعنی نہ تو دل سے چاہنے والا بنے اور نہ سدِ رمق کی حد سے آگے بڑھنے والا۔ "مَخْمَصَۃ" کی قید سے یہ بات صاف

نکلتی ہے کہ جہاں دوسرے غذائی بدل موجود ہوں وہاں محض اس عذر پر کہ شرعی ذبیحہ کا گوشت میسر نہیں آتا، جیسا کہ یورپ اور امریکہ کے اکثر ملکوں کا حال ہے، ناجائز کو جائز بنا لینے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ گوشت زندگی کے بقا کے لیے ناگزیر نہیں ہے۔ دوسری غذاؤں سے نہ صرف زندگی بلکہ صحت بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم رکھی جا سکتی ہے۔ غَیۡرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثۡمٍ کی قید اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ رخصت بہرحال رخصت ہے اور حرام بہر شکل حرام ہے، نہ کوئی حرام چیز شیر مادر بن سکتی نہ رخصت کوئی ابدی پروانہ ہے۔ اس وجہ سے یہ بات کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ رفع اضطرار کی حد سے آگے بڑھے۔ اگر ان پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی شخص کسی حرام سے اپنی زندگی بچالے گا تو اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اگر اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر اپنے حظ نفس کی راہیں کھولے گا تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے، یہ اجازت اس کے لیے قیامت کے دن عذر خواہ نہیں بنے گی۔

اجزاء کی وضاحت کے بعد آیت کے مجموعی نظام پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہ ان حرمتوں کی تفصیل بیان ہو رہی ہے جن کا پہلی آیت میں اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ کے الفاظ سے حوالہ دیا گیا تھا۔ اس میں پہلے ان چیزوں کا ذکر ہوا جن کی حرمت پہلے ہی بیان ہو چکی تھی، مزید تاکید اور تکمیل بحث کے طور پر ان کا بیان بھی اعادہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد 'میتہ' کی تفصیل فرمائی کہ جس طرح طبعی موت سے مرا ہوا جانور، مردار ہے اسی طرح ناگہانی اور اتفاقی حوادث سے مرے ہوئے جانور بھی مردار ہیں دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔ اسی طرح کسی درندے کا پھاڑا ہوا جانور بھی مردار ہے الا آنکہ تم نے اس کو زندہ پایا ہو اور ذبح کر لیا ہو۔ اسی طرح کسی استھان پر پیش کی ہوئی قربانی اور جوئے کے ذریعے سے تقسیم کیا ہوا گوشت بھی حرام ہے، جس طرح غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانور کو شرک کی آلودگی سے حرمت لاحق ہو جاتی ہے اسی طرح غیر اللہ کی خوشنودی اور جوئے کے تعلق سے ان چیزوں کو حرمت لاحق ہو جاتی ہے۔ حرمتوں کا یہ اعلان چونکہ کفار سے کامل معاشرتی انقطاع کے اعلان کے مترادف تھا، اس وجہ سے فرمایا کہ اب کفار تم سے اور تمہارے دین سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اب ان کے اندر یہ دم خم باقی نہیں رہا کہ تمہارے دین کو مغلوب کرنے یا اس کو کچھ نرم بنانے کا حوصلہ کریں۔ اب اگر وہ کچھ کریں گے بھی تو وہ بس مایوسی کا مظاہرہ ہوگا تو تم اس کی پروا نہ کرنا، صرف میری ہی پروا کرنا۔ اس کے بعد مسلمانوں کو بشارت دی کہ اب اللہ کا دین بھی تکمیل کی حد کو پہنچا اور تمہاری شریعت بھی اتمام کی منزل کو پہنچی اور اسلام کو خدا نے تمہارے لیے دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔ آخر میں اضطرار کی حالت میں، حرام سے فائدہ اٹھا لینے کی جو رخصت ہے اس کا ذکر فرمایا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ الآیۃ حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ نازل تو اسی سلسلے میں حجۃ الوداع سے پہلے ہوئی ہے لیکن اس بشارت کا اعلان عام چونکہ حجۃ الوداع ہی کے موقع پر ہوا اس وجہ سے بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ اس کا نزول اسی موقع پر ہوا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا
عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴﴾

سدھائے ہوئے جانوروں کے پکڑے ہوئے شکار کا حکم

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ، سوال قرآن کے معروف اسلوب بیان کے مطابق اختصار کے ساتھ نقل ہوا ہے لیکن جواب بتا رہا ہے کہ سوال سدھائے اور سکھلائے ہوئے جانوروں کے پکڑے ہوئے شکار سے متعلق ہے کہ اگر وہ شکار پکڑیں اور شکار ذبح کی نوبت آنے سے پہلے ہی دم توڑ دے تو اس کا کیا حکم ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوا ہوگا کہ اوپر والی آیت میں درندے کے پھاڑے ہوئے جانور کو صرف اس صورت میں جائز بتایا ہے جب اس کو زندہ حالت میں ذبح کر لیا جائے۔

تحریم و تحلیل کے باب میں ایک کلیہ

'قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ'۔ یہ جواب کا صرف ایک حصہ ہے جو ایک کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کا یہ بھی ایک اسلوب ہے کہ وہ کسی سوال کا جواب دیتا ہے تو اس کا آغاز بالعموم جامع بات سے کرتا ہے کہ جواب صرف سوال ہی تک محدود نہ رہ جائے بلکہ ایک وسیع دائرے میں سائل کی رہنمائی کرے۔ چنانچہ پہلے فرمایا کہ تمہارے لیے 'طیبات' حلال ہیں۔ 'طیبات' کا لفظ خبائث کا ضد ہے۔ 'طیبات' اچھی، ستھری اور پاکیزہ چیزوں کو کہتے ہیں۔ سوال چونکہ جانوروں سے متعلق ہے اس وجہ سے اس سے مراد وہ جانور ہوں گے جو اول تو خود اپنے مزاج، اپنی سرشت اور انسان کے لیے اپنی افادیت اور اپنے اثرات کے لحاظ سے اچھے اور پاکیزہ ہوں۔ ثانیاً ان کو اللہ کے نام پر ذبح کر لیا گیا ہو۔ اس طرح اس سے وہ تمام جانور نکل جائیں گے جو اپنے مزاج اور سرشت کے اعتبار سے انسان کے صالح مزاج سے مناسبت رکھنے والے نہ ہوں۔ مثلاً خنزیر، کتے، بندر، درندے اور شکاری پرندے وغیرہ۔ یا مزاج سے مناسبت رکھنے والے تو ہوں لیکن کسی خارجی سبب سے ان کے اندر خبث و فساد پیدا ہو گیا ہو۔ مثلاً جانور مر گیا یا غیر اللہ کے نام پر یا کسی استھان پر اس کو ذبح کیا گیا ہو۔ یہ خبائث میں داخل ہیں۔ قرآن کے اس جواب سے یہ رہنمائی ملی کہ شکار کیے ہوئے جانوروں میں بھی حلال صرف طیبات ہیں، خبائث اس حلت سے خارج ہیں۔

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ۔ جوارح، شکاری جانوروں کو کہتے ہیں، عام اس سے کہ وہ درندوں میں سے ہوں مثلاً کتے، شیر، چیتے وغیرہ یا پرندوں میں سے مثلاً باز اور شکرے وغیرہ۔

'کلب' کتے کو کہتے ہیں۔ اسی سے 'تکلیب' بنا لیا ہے جس کے معنی کتے کو شکار کی ٹریننگ دینے کے ہیں۔ ابتداءً تو یہ لفظ اسی معنی کے لیے استعمال ہوا لیکن پھر اس کا استعمال شکاری جانوروں کی تربیت کے لیے عام ہو گیا، خواہ کتا ہو یا شکاری درندوں اور پرندوں میں سے کوئی اور جانور۔ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ سے اس تربیت اور ٹریننگ کی نوعیت کا اظہار ہو رہا ہے کہ تم نے اس سلیقہ میں سے ان کو کچھ بتایا اور سکھایا ہو جو اللہ نے تم کو سکھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر تربیت میں مربی کے ذوق، اس کی پسند و ناپسند اور اس کے

مقصود تربیت کی جھلک ہوتی ہے اور اس چیز کو جس طرح زیر تربیت انسان اپناتا ہے اسی طرح اپنی جبلی استعداد کے حد تک حیوانات بھی اپناتے ہیں۔ یہ چیز سدھائے ہوئے جانوروں کو دوسرے جانوروں سے بالکل الگ کر دیتی ہے اس وجہ سے ایک عام کتے کے شکار اور ایک سدھائے ہوئے کتے کے شکار میں فرق ایک امر فطری ہے۔ بلکہ ایک مسلمان کے تربیت کردہ کتے اور ایک عیسائی کے تربیت کردہ کتے کے میلان اور سلیقہ میں بھی فرق ہو جائے گا۔ میرے نزدیک تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ کے الفاظ سے اسی خاص سلیقہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جو کسی سدھائے ہوئے جانور کو اس کے مسلمان مربی سے ملتا ہے۔ اپنے اس سلیقہ کی وجہ سے یہ جانور اپنے مربی کا آلہ اور جارحہ بن جاتا ہے اور اس کا کیا ہوا شکار اس کے لیے اسی طرح طیب بن جاتا ہے جس طرح اس کے اپنے ہاتھ کا ذبیحہ

تربیت یافتہ جانور کا شکار

'فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ'، امساک کے معنی روک رکھنے اور تھامنے کے ہیں۔ جب اس کے ساتھ 'علیٰ' آئے جیسا کہ 'أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ' میں ہے تو اس کے اندر اختصاص کا مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے یعنی کسی شے کو کسی خاص کے لیے روک یا سینت رکھنا۔ اب یہ سوال کا اصل جواب ہے۔ فرمایا کہ اگر مذکورہ شرائط کے مطابق تربیت کیا ہوا جانور ہو تو اس کے پکڑے ہوئے شکاروں میں سے وہ شکار تمھارے لیے جائز ہوگا جو وہ خاص تمھارے لیے روک رکھے۔ چونکہ یہاں اختصاص کا مضمون پایا جاتا ہے اس وجہ سے میں ان لوگوں کے مذہب کو زیادہ قوی سمجھتا ہوں جو کہتے ہیں کہ شکاری جانور شکار میں سے کچھ کھا لے تو وہ شکار جائز نہ ہوگا۔ یہی بات بعض احادیث سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اس معاملے میں درندے اور پرندے کے شکار کے درمیان فرق کرنے کی بھی کوئی قوی بنیاد نہیں ہے۔ اس حد تک تربیت جس طرح درندے قبول کر لیتے ہیں، تجربہ کار بتاتے ہیں کہ باز، عقاب، شاہین بھی قبول کر لیتے ہیں۔

'وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ' کا مفہوم

'وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ' میں ضمیر مجرور کے مرجع سے متعلق سلف سے تین قول منقول ہیں۔ ایک یہ کہ شکاری جانور کو چھوڑتے وقت اس پر بسم اللہ پڑھ لیا کرو، اس قول کے قائلین کے نزدیک مرجع 'وَمَا عَلَّمْتُمْ' ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر شکار زندہ ہاتھ آ گیا ہو تو اس کو بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرو۔ اس گروہ کے نزدیک مرجع 'مَا أَمْسَكْنَ' ہے۔ تیسرا یہ کہ اس شکار کو کھاتے وقت اس پر بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ ان لوگوں کے نزدیک اس کا تعلق 'فَكُلُوا' سے ہے۔ ان میں سے پہلے قول کی تائید میں ایک حدیث ہے جو بخاری میں عدی بن حاتم سے مروی ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں اپنے سدھائے ہوئے کتے کو شکار پر چھوڑتا ہوں اور کوئی دوسرا کتا بھی اس میں شریک بن جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا ایسا شکار نہ کھاؤ کیونکہ تم نے اللہ کا نام اپنے کتے پر لیا ہے، دوسرے کتے پر نہیں لیا ہے۔

دوسرے قول میں یہ ضعف ہے کہ جب اوپر یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ درندے کا کھایا ہوا شکار اگر زندہ ہاتھ آ جائے تو اس کو ذبح کرکے کھا سکتے ہو تو تربیت یافتہ جانور کے شکار سے متعلق بعینہٖ اسی حکم کا اعادہ

ایک بالکل غیر ضروری بات کا اعادہ ہے۔

تیسرے ٹکڑے میں اس طرح کا کوئی ضعف یا اشکال اگرچہ نہیں ہے لیکن یہ بات، عام آداب طعام سے تعلق رکھنے والی بات ہے، یہاں اس کا محل سمجھ میں نہیں آتا۔

شکار بادیہ نشین قوموں کی ایک معاشی ضرورت ہے

اس سوال اور اس کے جواب کی یہ اہمیت ملحوظ رہے کہ شکار عرب میں محض ایک شوقیہ تفریح نہیں تھا بلکہ ان کے ہاں اس کو معاش کے ایک اہم ذریعے کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کی معاش کا انحصار تین چیزوں پر تھا۔ گلہ بانی، تجارت، شکار۔ اس معاشی اہمیت کے سبب سے ان کے ہاں شکاری جانوروں کی تربیت کا فن بھی کافی ترقی کر گیا تھا۔ امرؤالقیس جب اپنے شعروں میں اپنی کتیا کا ذکر کرتا ہے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کسی کتیا کا ذکر ہے یا کسی شعلہ صفت پُرفن قاتلہ کا۔ اور یہ چیز کچھ عربوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کی تمام بادیہ نشین قوموں کی یہ مشترک خصوصیت ہے۔ اس وجہ سے حلت و حرمت کی اس بحث میں یہ سوال پیدا ہوا اور قرآن نے اس کا جواب دیا۔ اور اس جواب سے یہ حقیقت نہایت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ حلت و حرمت اور پاکی و ناپاکی کے حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے شکار، فن شکار اور شکاری جانور ہر چیز کی اسلام نے عزت بڑھائی ہے۔ ایک تربیت پائے ہوئے درندے کی یہ عزت بڑھائی کہ اس کا پکڑا ہوا شکار اگر ذبح سے پہلے ہی دم توڑ دے جب بھی طیب ہے، اس فنِ تربیت کی عزت یہ بڑھائی کہ اس کو تعلیم الٰہی کا ایک جزو قرار دیا، اور یہ رہنمائی دی کہ کتوں اور درندوں کی تربیت کے معاملے میں بھی ایک مسلمان کو اپنے مخصوص اسلامی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ گویا اسلام میں فنِ شکار بھی دوسروں کے فن شکار سے مختلف مزاج رکھتا ہے۔

آخر میں 'وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ' فرما کر اللہ کے مقرر کردہ حدود اور اس کے عہد و پیمان کے احترام کی یاددہانی یہاں بھی فرما دی کہ شکار کی حرص و ہوس میں خدا کے حدود حلت و حرمت کو نہ بھول جانا ورنہ روز حساب بہت دور نہیں ہے۔ یہ یاددہانی اس پہلو سے بھی بہت ضروری تھی کہ جب شکار معاشی ضرورت ہو تو اس میں بے احتیاطی کے بڑے امکانات ہیں۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۖ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْۤ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ؗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۵)

اس آیت میں کوئی مشکل لفظ یا مشکل ترکیب نہیں ہے۔ اس کے تمام اجزا پچھلی سورتوں میں زیر بحث آچکے ہیں۔ البتہ اس کا موقع محل اچھی طرح سمجھ لینے کا ہے۔

[illegible]

یہ آیت اس انعام عام کا اعلان ہے جو خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ذریعے

سے تمام دُنیا پر عموماً اور اہل کتاب پر خصوصاً ہونے والا تھا پچھلے صحیفوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق جو پیشین گوئیاں وارد ہیں اور جن میں سے بعض کا حوالہ بقرہ اور آل عمران کی تفسیر میں ہم دے چکے ہیں، ان میں یہ تصریح موجود ہے کہ جب آخری نبی آئیں گے تو اہل کتاب کو طیبات و خبائث سے متعلق خدا کے امر و نہی سے آگاہ کریں گے اور حلال و حرام کے باب میں ان تمام پابندیوں اور بیڑیوں سے ان کو آزاد کریں گے جو انھوں نے اپنے اوپر یا تو از خود عائد کر رکھی ہیں یا ان کی سرکشی کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کر دی ہیں۔ قرآن مجید نے ان تمام پیشین گوئیوں کا حوالہ سورۂ اعراف میں ان الفاظ میں دیا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ	جو لوگ اس رسول، نبی امی کی پیروی کریں گے جس کو
الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ	اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو انھیں
فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ	نیکی کا حکم دیتا ہے اور بدی سے روکتا ہے اور ان کے لیے
وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ	پاکیزہ چیزوں کو جائز کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہراتا
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ	ہے اور ان سے ان کے اس بوجھ اور ان پابندیوں کو دور
اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ	کرتا ہے جو ان پر تھیں تو جو لوگ اس پر ایمان لائیں گے،
فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ	اس کی تائید و نصرت کریں گے اور اس روشنی کی پیروی
وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ	کریں گے جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے وہی لوگ فلاح پانے
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الاعراف - ۷: ۱۵۷)	والے بنیں گے۔

یہ انہی باتوں کا حوالہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ظہور میں آنے والی تھیں چنانچہ آپ کے وجود باجود نے ان میں سے ایک ایک بات کی عملاً تصدیق فرما دی۔ آپ نے تمام طیب اور پاکیزہ چیزیں جائز کر دیں جن میں بعض یہود کے ہاں حرام تھیں، تمام خبیث چیزیں حرام ٹھہرائیں جن میں سے بعض یہود و نصاریٰ نے جائز بنا لی تھیں اور وہ تمام پابندیاں اور بیڑیاں ختم کر دیں جو انھوں نے یا تو از خود اپنے اوپر لادی تھیں یا ان کی ضد، سرکشی، اکڑبازی اور کٹ حجتی کے باعث اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عائد کر دی گئی تھیں[1]۔ اس مرحلے میں آ کر چونکہ یہ کام مکمل ہو چکا تھا اور یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ اہل کتاب نے جو خبیث چیزیں جائز بنا لی ہیں محض اپنی بدعت سے جائز بنائی ہیں اور جو طیب چیزیں ان پر حرام ہیں وہ محض ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر حرام ہیں، نبی امی کی بعثت کے بعد یہ پابندیاں ختم ہو گئیں تو مسلمانوں کو اجازت دے دی گئی کہ حرام و حلال اور خبیث و طیب کی اس وضاحت کے بعد اب تم اہل کتاب کا کھانا کھا سکتے ہو اس لیے کہ اب تمہارے لیے کسی خبیث سے آلودہ

---

[1] اس کی تفصیل سورۂ انعام آیت ۱۴۶ کے تحت آئے گی۔

ہو جانے کا اندیشہ نہیں رہا اور ساتھ ہی اس بات کا بھی اعلان کر دیا گیا کہ تمہارا کھانا اہل کتاب کے لیے جائز ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق نبی امی کی بعثت کے بعد اب وہ تمام پابندیاں ختم ہو گئیں جو ان پر عائد تھیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہود منتظر کب تھے کہ قرآن ان کے لیے مسلمانوں کے کھانے کے جائز ہونے کا اعلان کرے، پھر اس کا فائدہ کیا؟ یہ تو مفت کرم داشتن کے قسم کی بات ہوئی! اس کا جواب یہ ہے کہ یہود منتظر تو تھے اور منتظر ہوتے کیوں نہ جب کہ ان کے اپنے صحیفوں میں آخری نبی کی پیشین گوئی اس تصریح کے ساتھ موجود تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو تمام اصر و اغلال سے نجات دیں گے، لیکن اس نبی کی بعثت چونکہ ان کے حریفوں یعنی بنی اسمٰعیل کے اندر ہوئی اس وجہ سے جان بوجھ کر جیسا کہ بقرہ اور آل عمران میں وضاحت ہو چکی ہے، وہ اس کی مخالفت کے درپے ہو گئے اور حسد میں انھوں نے اپنے آپ کو ان تمام رحمتوں اور برکتوں سے محروم کر لیا جن کے سب سے پہلے حقدار وہی تھے اگر وہ نبی امی پر ایمان لاتے۔

پھر فرض کیجیے، بنی اسرائیل اس کے منتظر نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ ان سے فرمایا تھا اس کو تو پورا ہونا تھا۔ ان سے جب یہ وعدہ تھا کہ آخری نبی کے ذریعے سے کھانے پینے کے معاملے میں وہ تمام پابندیاں ان سے اٹھالی جائیں گی جو ان کی سرکشی کے سبب سے عائد ہوئی ہیں تو جب اس وعدے کے پورا کرنے کا وقت آیا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا کھانا ان کے لیے جائز کر کے یہ وعدہ پورا کر دیا۔ رہی یہ بات کہ انھوں نے اس کی قدر نہیں کی، تو یہ ان کی اپنی محرومی و بدقسمتی ہے۔ ان کی نالائقی کی وجہ سے آخر خدا اپنے وعدے کو کیوں فراموش کرتا؟ سورج چمکتا ہے خواہ کوئی اپنی آنکھیں بند رکھے یا کھلی رکھے، نسیم صبح اپنی عطر بیزیوں سے ہر مشامِ جان کو معطر کرنا چاہتی ہے اور اس کے فیض عام کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ہر ایک کو فیض یاب کرے لیکن جو محروم القسمت اپنی ناک اور اپنے منہ بند کر لیتے ہیں وہ اس سے محروم ہی رہتے ہیں۔ اسی طرح رب کریم نے جو سفرۂ نعمت اس امت کے ذریعے سے تمام دنیا کے آگے بچھانا چاہا تھا وہ بچھا دیا اور اس سے متمتع ہونے کی دعوت اہل کتاب کو بھی دے دی۔ انھوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا تو یہ ان کی اپنی بدقسمتی ہے۔

اہل کتاب کا کھانا اسلامی حدود حلت و حرمت کی پابندی کے ساتھ جائز ہے

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مسلمانوں کو اہل کتاب کے کھانے پینے کی چیزوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت جو دی گئی ہے وہ اس وقت دی گئی ہے جب ان کو اس باب کی آخری ہدایات سے آگاہ کیا جا چکا ہے، جب حلال و حرام دونوں اچھی طرح واضح کر دیے گئے ہیں، جب اہل کتاب اور مشرکین دونوں کی بدعات کی تفصیل ان کو سنا دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سارے اہتمام کا مقصد مسلمانوں کو یہ بتانا تھا کہ تم دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ معاشرتی تعلقات رکھو لیکن حلت و حرمت کے ان

حدود کی پابندی کے ساتھ جو تمھارے لیے قائم کر دیے گئے ہیں۔ اس آیت میں 'الیوم' کا لفظ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اب تمھیں خبیث و طیب کا پورا امتیاز حاصل ہو چکا ہے اس وجہ سے تمھیں یہ اجازت دی جا رہی ہے، یہ خطرہ نہیں رہا کہ تم ان کے دسترخوان پر بیٹھ کر کسی حرام یا مشتبہ میں مبتلا ہو جاؤ گے[۱]۔

کتابیات سے جواز نکاح کی شرط

اس کے بعد فرمایا کہ جس طرح تمھارے لیے شریف اور پاک دامن مسلمان عورتوں سے نکاح جائز ہے اسی طرح شریف اور پاک دامن کتابیات سے بھی نکاح جائز ہے۔ یہاں لفظ 'مُحْصَنٰت' استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ قرآن میں تین معنوں میں آیا ہے، اور ہم اس کے تینوں معنوں کی وضاحت دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد با عزت، شریف اور اچھے اخلاق کی عورتیں ہیں۔ یعنی یہ اجازت مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ یہ عورتیں بدچلن، پیشہ ور، آوارہ اور بدقوارہ نہ ہوں۔ جس طرح تمھارے لیے ان کے دسترخوان کی صرف طیبات جائز ہیں اسی طرح ان کی عورتوں میں سے صرف محصنات جائز ہیں۔

ہمارے سلف صالحین میں سے ایک گروہ نے دارالحرب اور دارالکفر میں کتابیات سے نکاح کو مکروہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اس کے جواز کے لیے دارالاسلام ہونا بھی ایک شرط ہے۔ مجھے یہ قول بہت ہی قوی معلوم ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات انھوں نے فحوائے کلام سے مستنبط کی ہے۔ میں اس کے ماخذ کے لیے لفظ 'اَلْیَوْمَ' کی طرف پھر توجہ دلاتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجازت میں وقت کے حالات کو بھی دخل ہے۔ اوپر 'اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا' اور 'اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ' والی آیات بھی گزر چکی ہیں اور 'فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ' بھی ارشاد ہو چکا ہے، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس دور میں کفار کا دبدبہ ختم ہو چکا تھا اور مسلمان ایک ناقابل شکست طاقت بن چکے تھے۔ یہ اندیشہ نہیں تھا کہ ان کو کتابیات سے نکاح کی اجازت دی گئی تو وہ کسی احساس کمتری میں مبتلا ہو کر تہذیب اور معاشرت اور اعمال و اخلاق میں ان سے متاثر ہوں گے۔ بلکہ توقع تھی کہ مسلمان ان سے نکاح کریں گے تو ان کو متاثر کریں گے اور اس راہ سے ان کتابیات کے عقائد و اعمال میں خوشگوار تبدیلی ہوگی اور عجب نہیں کہ ان میں بہت سی ایمان و اسلام سے مشرف ہو جائیں۔

علاوہ ازیں یہ پہلو بھی قابل لحاظ ہے کہ کتابیات سے نکاح کی اجازت بہرحال علی سبیل التنزل دی گئی ہے۔ اس میں آدمی کے خود اپنے اور اس کے آل و اولاد اور خاندان کے دین و ایمان کے لیے جو خطرہ ہے، وہ مخفی نہیں ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلمان مردوں کو تو کتابیات سے نکاح کی اجازت دی گئی

---

[۱] اہل کتاب کے ذبیحہ کے جواز کے لیے بھی کوئی نئی چیز پہلی بار بیان ہوئی ہے بلکہ اصلاً زیر بحث، جیسا کہ سیاق کلام سے واضح ہے، ذبیحہ ہی سے متعلق ہے۔

لیکن مسلمان عورت کو کسی صورت میں بھی کسی غیر مسلم سے نکاح کی اجازت نہیں دی گئی خواہ کتابی ہو یا غیر کتابی۔ یہ چیز اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اجازت صرف ایک اجازت ہے، یہ کوئی مستحسن چیز نہیں ہے۔ اگر ماحول اسلامی تہذیب و معاشرت کا ہو اور آدمی کسی نیک چال چلن کی کتابیہ سے نکاح کر لے تو اس میں مضائقہ نہیں لیکن کافرانہ ماحول میں جہاں کفر اور اہل کفر کا غلبہ ہو اس قسم کا نکاح چاہے اس آیت کے الفاظ کے خلاف نہ ہو لیکن اس کے فحویٰ، اس کی روح اور اس کے موقع و محل کے خلاف ضرور ہے۔

یہ بات یہاں چنداں یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام کے بہت سے قوانین دارالاسلام کی شرط کے ساتھ مشروط ہیں۔ اسی طرح بعض رخصتیں اور اجازتیں بھی خاص ماحول اور خاص حالات کے ساتھ مشروط ہیں۔ آگے اس سلسلے کی بعض اہم باتیں بیان ہوں گی۔

'مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ' پر ہم تفصیل کے ساتھ سورۂ نساء کی آیات ۲۴-۲۵ کے تحت بحث کر چکے ہیں۔

'کفر بالایمان' کا مطلب

'وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ' کفر بالایمان کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدا اور رسول کو ماننے کا دعویٰ بھی کرے اور ساتھ ہی خدا اور رسول کے احکام کے صریح خلاف محض اپنی خواہشات کی اتباع میں قانون و شریعت ایجاد کر کے اس پر عمل پیرا بھی ہو۔ یہ وہی ایمان ہے جس کو قرآن نے 'نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ' سے تعبیر کیا ہے۔ کفر و ایمان دونوں کے اس ملغوبہ کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایمان صرف وہ معتبر ہے جو اللہ تعالیٰ کے شرائط پر ہے۔ جو لوگ اپنے شرائط پر ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان ان مدعیان ایمان کے منہ پر پھینک مارا جائے گا اور اس قسم کے ایمان کے تحت کیے ہوئے سارے اعمال خدا کے ہاں ڈھے جائیں گے۔ اس پر پیچھے بھی بحث گزر چکی ہے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــــ آیات ۶-۱۱

اوپر طعام و نکاح کے باب کے طیبات و خبائث کا ذکر فرما کر ان کی تطہیر فرمائی۔ اب نماز کی طہارت کا بیان آ رہا ہے۔ نماز کی طہارت وضو ہے اور بصورت جنابت غسل۔ اسی ذیل میں پانی نہ ملنے یا کسی عذر کی صورت میں تیمم کی اجازت مرحمت فرمائی جو اس امت پر اتمام نعمت ہے اور یہ اس باب کا تکمیلی حکم ہے۔

اس کے بعد اس سلسلے میں جو اتمام نعمت فرمایا ہے اس کی یاد دہانی کرتے ہوئے آگاہ فرمایا کہ تم 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کہہ کر خدا کے ساتھ جس عہد میں شریک ہوئے ہو اس کو برابر یاد رکھنا۔ اللہ سے ڈرتے رہنا۔ خدا سے کوئی بات بھی ڈھکی چھپی رہنے والی نہیں ہے۔ وہ دلوں کے بھیدوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے۔

اس کے بعد قیام بالقسط اور شہادت علی الناس کے جس منصب پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مامور فرمایا ہے اس کی یاد دہانی فرما دی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اب اس دنیا میں حق و عدل کی میزان وہی ہیں۔ اگر انھوں نے انحراف اختیار کیا تو ہر چیز تلپٹ ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں انحراف کے اس سب سے بڑے محرک

کا بھی حوالہ دیا جو پچھلی امتوں کے لیے مزلۂ قدم ثابت ہو چکا ہے تاکہ یہ امت اس سے اچھی طرح ہوشیار رہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا کہ اگر تم موافق و مخالف سب کے لیے حق و عدل پر قائم رہنے والے ثابت ہوئے تو آخرت کا اجرِ عظیم بھی تمہارے لیے ہے اور دنیا میں بھی تم ہی کامیاب و بامراد رہو گے تمہارے دشمن تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶ - ۱۱

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ
وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى
الْكَعْبَيْنِ ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ
سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا
مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ مِنْهُ ۚ
مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَٰكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ
لِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٦﴾ وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ
عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ
وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٧﴾ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ
شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَ
اتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٨﴾ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۙ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٩﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا
وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١٠﴾ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ
فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١١﴾ ع

ترجمۂ آیات ۶-۱۱

اے ایمان والو، جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھوؤ اور اگر حالتِ جنابت میں ہو تو غسل کر لو، اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آیا ہو یا عورتوں سے ملاقات کی ہو، پھر پانی نہ پاؤ تو پاک جگہ دیکھ کر اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر اس سے مسح کر لو، اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم اس کے شکر گزار رہو۔ ۶

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا، جب کہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سینوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔ اے ایمان والو، عدل کے علم بردار بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو۔ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ اے ایمان والو، اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو جب کہ ایک قوم نے ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کرے تو اللہ نے تم سے ان کے ہاتھ کو روک دیا اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ ہی پر چاہیے کہ اہلِ ایمان بھروسہ کریں۔ ۷-۱۱

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا

بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ۚ وَإِن كُنتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا ۚ وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ ۚ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَلَٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۶)

وضو سے طہارت حاصل کرنے کا طریقہ

'إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ'، 'قام' کے بعد جب 'الی' آتا ہے تو اس کے معنی قصد کرنے کے ہوتے ہیں۔ یعنی جب تم نماز کا قصد کرو تو اس کے لیے طہارت حاصل کر لو۔ پھر اس طہارت کا طریقہ بتایا ہے جس پر ہم خود بھی پیچھے بحث کر چکے ہیں اور اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بھی ثابت ہے اور عقل و فطرت بھی گواہی دیتی ہے کہ ایک مرتبہ کی حاصل کردہ طہارت اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کوئی ناقض حالت پیش نہ آجائے۔ اس وجہ سے یہ ہدایت اس حالت کے لیے ہے جب آدمی کا وضو باقی نہ ہو۔ اگر باقی ہو تو تازہ وضو کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص نشاطِ خاطر حاصل کرنے کے لیے تازہ وضو کرلے تو یہ فضیلت تو ضرور ہے لیکن شریعت کا مطالبہ نہیں ہے۔

رہے یہ سوالات کہ دھونے کا طریقہ کیا ہے۔ مذکورہ اعضا ایک ایک بار دھوئے جائیں یا دو دو تین تین بار، کل کے کل دھوئے جائیں یا صرف پانی بہا لیا جائے۔ کنپٹی، داڑھی اور کہنیوں کے معاملے میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے تو ان کا تعلق احکام سے نہیں بلکہ آداب سے ہے اور آداب سیکھنے کا بہترین ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ آپ کی سنت سے جو باتیں ثابت ہوں خواہ اس کی شکلیں مختلف ہوں، سب میں خیر و برکت ہے۔

'وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ' مسح کے معنی ہاتھ پھیرنے کے ہیں اور حرف 'ب' اس طرح کے مواقع میں احاطہ کے مفہوم پر دلیل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے مجھے ان لوگوں کا مسلک قوی معلوم ہوتا ہے جو پورے سر کے مسح کے قائل ہیں۔ اگرچہ عمامہ وغیرہ کی صورت میں رفعِ زحمت کے پہلو سے سر کے جزوی حصے کا مسح بھی کافی ہے۔

'وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ' اس کا عطف 'أَيْدِيَكُمْ' پر ہے۔ اس وجہ سے یہ ان اعضا کے تحت داخل ہے جن کے لیے دھونے کا حکم ہے۔ وضو میں اعضا کی ترتیب واضح کرنے کے لیے اس کو مؤخر کر دیا گیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ ترتیب فطری بھی ہے اور شرعی بھی۔ بعض لوگوں نے اس کو مسح کے تحت داخل کیا ہے لیکن یہ قول متواتر قراءت اور متواتر سنت کے بھی خلاف ہے اور عربیت کے بھی۔ اگر پاؤں کا مسح ہوتا تو اس کے ساتھ 'إِلَى الْكَعْبَيْنِ' کی قید بالکل غیر ضروری تھی۔ چنانچہ دیکھیے، وضو میں ہاتھ دھونے کے لیے 'إِلَى الْمَرَافِقِ' کی قید لگائی ہے لیکن تیمم میں جہاں مسح کا حکم دیا ہے 'إِلَى الْمَرَافِقِ' کی پابندی اڑا دی اس لیے کہ مسح میں اس قسم کی پابندی ایک بالکل غیر مفید بات تھی۔

'وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا (الاٰیۃ)' یہ ٹکڑا معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ سورۂ نساء آیت ۴۳ میں بھی گزر چکا ہے وہاں ہم تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

وضو اور تیمم کے احکام کی علت و حکمت

'مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ (الاٰیۃ)' اب یہ اس حکم کی علت و حکمت بیان ہو رہی ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے ان پابندیوں کو سخت محسوس کیا ہو تو ان پر ان کی افادیت واضح ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غیر عادی طبائع پر غسل اور وضو کی یہ پابندی ہے بڑی شاق اور بڑی آزمائش کی چیز لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی بندوں کو مشقت میں ڈالنے کے لیے نہیں عائد کی ہے۔ اگر مشقت مقصود ہوتی تو بیماری اور سفر وغیرہ کی حالت میں تیمم کی اجازت کیوں مرحمت ہوتی؟ بلکہ یہ بندوں کو پاکیزہ بنانے کے لیے عائد کی گئی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ خدا اور اس کے قدوسیوں کا قرب حاصل کرنے کے اہل ہو سکیں۔ اصلاً تو پاکیزگی باطن کی مطلوب ہے اور نماز باطن ہی کی پاکیزگی کے لیے فرض کی گئی ہے لیکن ظاہر اور باطن میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ظاہر کا اثر باطن پر اور باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے نماز کے لیے وضو کا حکم دیا ہے اور ناپاکی کی حالت ہو تو غسل کا۔ یہ چیز اس باطنی طہارت کے حصول میں معین ہے جو نماز کا اصل مقصود ہے۔

'وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نماز کے باب میں وضو اور تیمم کے ان احکام کے بعد اللہ کی نعمت تم پر تمام کی گئی۔ سورۂ نساء میں تیمم پر بحث کرتے ہوئے ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ یہود کے ہاں طہارت کے معاملے میں بڑی سخت قیدیں اور پابندیاں تھیں۔ اول تو ان کی شریعت کے احکام تھے ہی سخت، پھر ان پر مزید اضافہ ان کے فقہا کے تشددات نے کر دیا تھا۔ تیمم کا ان کے ہاں کوئی تصور ہی نہیں تھا اور یہ بات ان کے ہاں انتہائی بد دینی کی تھی کہ کوئی شخص حدث و جنابت کی حالت میں خواہ کیسی ہی معذوری و مجبوری ہو، مجرد تیمم پر اکتفا کر کے نماز پڑھ لے۔ چنانچہ قرآن میں جب تیمم کی اجازت نازل ہوئی تو اس کا انھوں نے نہ صرف مذاق اڑایا بلکہ اس کو دلیل بنا کر یہاں تک کہنے لگے کہ ان مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ تو مکہ کے مشرکین ہیں۔ یہود کے یہ تشددات بھی منجملہ ان اصر و اغلال کے تھے جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دور ہونے والے تھے چنانچہ تیمم کی اجازت نے طہارت کے باب میں اللہ کی نعمت کا اتمام فرمایا اور اس اتمام نعمت سے اس امت کو جو سہولتیں اور برکتیں حاصل ہوئیں ان پر ہر آن شکر واجب ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۷)

اب یہ اس اتمام نعمت کا حق بتایا ہے کہ اللہ نے اپنی آخری اور کامل شریعت تم پر نازل کر کے جو فضل و انعام فرمایا ہے اور تم کو جو عزت و سرفرازی بخشی ہے، یہود کی طرح اس کو بھول نہ جانا بلکہ اس کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ 'یاد رکھنا' اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی ظاہراً و باطناً ہر پہلو سے اس کا حق ادا کرنا۔ اس کے بعد

اس ذمہ داری کی نوعیت واضح فرمادی کہ یہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ایک مضبوط میثاق کی حیثیت رکھتی ہے جو خدا نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے تم سے لیا ہے اور تم نے پیغمبر کے سامنے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہہ کر اس میثاق کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ خدا نے تمہارے لیے دنیا و آخرت کی کامرانیوں کے جو وعدے فرمائے ہیں وہ اسی میثاق پر منحصر ہیں۔ اگر تم نے اس کو توڑا تو اس کی سزا بڑی ہی سخت ہے۔ اس لیے اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ بات یاد رکھو کہ خدا دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۸)

میثاقِ شریعت کی ذمہ داری امت مسلمہ پر

'كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ' تھوڑے سے تغیر الفاظ کے ساتھ یہ ٹکڑا سورۂ نساء کی آیت ۱۳۵ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہ اسی میثاق کی اجتماعی ذمہ داری واضح کی گئی ہے کہ مسلمانوں پر بحیثیت امت مسلمہ یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس حق و عدل کے علم بردار بنیں جو اس آخری شریعت کی شکل میں ان کو عطا ہوا ہے۔ خود اپنے اندر اس کو قائم کریں اور اسی کی شہادت دنیا کے سامنے دیں۔

'وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ' یہ ٹکڑا اسی سورہ کی آیت ۲ میں گزر چکا ہے۔ یہ حق و عدل کی راہ کے سب سے بڑے فتنے سے آگاہ کیا گیا ہے کہ کسی قوم کی دشمنی اور اس کا غلط سے غلط رویہ بھی تمہیں اس حق و عدل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شیطان نے راہِ حق سے گمراہ کرنے میں سب سے زیادہ جس حربے سے کام لیا وہ یہی ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کا حربہ ہے۔ یہود نے محض بنی اسمٰعیل اور مسلمانوں کی دشمنی میں اس تمام عہد و پیمان کو خاک میں ملا دیا جس کے وہ گواہ اور ذمہ دار بنائے گئے تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ شیطان کے اس فتنے سے بچ کے رہیں۔ دوستوں اور دشمنوں دونوں کے لیے ان کے پاس بس ایک ہی باٹ اور ایک ہی ترازو ہو۔

'اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى' یہی عدل، تقویٰ سے اقرب ہے۔ یعنی تقویٰ جو تمام دین و شریعت کی روح اور اہل ایمان کے ہر قول و فعل کے لیے کسوٹی ہے اس سے موافقت رکھنے والا طرزِ عمل یہی ہے کہ دشمن کی دشمنی کے باوجود اس کے ساتھ کوئی معاملہ عدل و حق سے ہٹ کر نہ کیا جائے۔ اس سے دین میں تقویٰ کا مقام واضح ہوا کہ تمام نیکیاں درحقیقت اسی کی جڑ سے ہیں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۹-۱۰)

یہ مذکورہ بالا میثاق پر عمل کرنے اور نہ کرنے دونوں کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جو لوگ اس میثاق پر قائم رہیں گے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے اور جو اس کو توڑیں گے ان کے لیے جہنم ہے۔ اس سے ایک اور یہ بات نکلی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہم پر اس میثاق کی ذمہ داری ڈالی ہے، اسی طرح اپنے

اور پھر اس کے جواب میں ایک عہد کی ذمہ داری لی ہے۔ اس کا اظہار وَعَدَ اللّٰہُ کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یہ رب کریم کی کتنی بڑی بندہ نوازی ہے کہ وہ اپنی ہی پیدا کی ہوئی اور اپنی ہی پروردہ مخلوق کے ساتھ ایک معاہدے میں شریک ہوا اور جواب میں اپنی ذات پر بھی ایک عہد کی ذمہ داری اٹھائے۔ انسان کو یہ وہ شرف بخشا گیا ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔ دوسری بات یہ نکلی کہ ایمان و عمل صالح کی تعبیر ایک جامع تعبیر ہے جس میں وہ سب کچھ شامل ہے جو پروردگار نے اپنی شریعت کی شکل میں ہمیں عطا فرمایا ہے اور جس کی پابندی کا ہم نے اقرار لیا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ ھَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْٓا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَھُمْ فَکَفَّ اَیْدِیَھُمْ عَنْکُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ۭ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۱)

اوپر آیت ۸ میں مسلمانوں سے ہر حالت میں حق و عدل پر قائم رہنے اور مخالفین کے علی الرغم اس کو نباہنے اور اس کی شہادت دینے کا جو عہد لیا ہے اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اب تمہیں مخالفوں کی مخالفت کی پروا نہیں کرنی ہے۔ اگر تم اس عہد پر جمے رہے تو خدا کی مدد و نصرت ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارے دشمن تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ بعینہٖ یہی مضمون فَلَا تَخْشَوْھُمْ وَاخْشَوْنِ میں گزر چکا ہے۔ اب یہ اسی بات کی تائید میں واقعاتی شہادت پیش کر دی ہے کہ دیکھ لو، ایک قوم نے اس راہ میں تمہاری مزاحمت کی کوشش کی لیکن وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ خدا نے اس کے ہاتھ باندھ دیے۔ اسی طرح اگر تم اپنے رب کے عہد و پیمان پر قائم رہے تو خدا ہر اس قوم کے مقابل میں تمہاری مدد فرمائے گا جو تمہارے مقابل میں سر اٹھائے گی۔ تم جب خدا پر ایمان لائے ہو تو تمہارے اس ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ تم اپنے رب پر بھروسہ کرو۔

اس آیت میں قوم سے اشارہ میرے نزدیک قریش کی طرف ہے۔ اوپر آیت ۲ اور آیت ۸ میں بھی اشارہ انہی کی طرف ہے۔ لفظ کی تنکیر تحقیر شان کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے اور اس سے یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ متکلم کے پیش نظر ایک حقیقت کا بیان و اظہار ہے نہ کہ کسی خاص قوم کا، تاہم اشارے کی حد تک، جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس سے مراد قریش ہی ہیں۔ اس سورہ کے مطالب سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس دور کی سورت ہے جب مسلمان ایک سیاسی قوت بن چکے ہیں۔ ہجرت کے چھٹے ساتویں سال تک ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ قریش متعدد زور آزمائیاں کر کے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے اور یہود بھی اپنی درپردہ سازشوں کی ناکامیوں کے نہایت تلخ تجربات کر کے ہمت ہار چکے تھے۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۲-۱۴

یہود و نصاریٰ سے جو عہد لیا گیا تھا آگے اس کا ذکر فرمایا ہے اور اس عہد کو توڑ کر وہ جن نتائج

سے بعد چار ہے ہیں بالاجمال ان کی طرف بھی اشارہ ہے۔ مقصود اس سے مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ اب تم سے جو عہد لیا جا رہا ہے یہ بھی اسی نوعیت کا عہد ہے، اور اگر تم نے بھی اس عہد کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو تمہارے سامنے بھی وہی نتیجہ آئے گا جو ان کے سامنے آیا ___ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۲-۱۴ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ
عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ
اٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ
قَرْضًا حَسَـنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ
ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ۝ ۱۲ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا
قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا
حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰي خَاۗىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا
قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ۱۳
وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا
مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰي يَوْمِ
الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۲-۱۴ اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیب مامور کیے اور اللہ نے ان سے وعدہ کیا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز کا اہتمام رکھو گے، زکوٰۃ دیتے رہو گے، میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے، ان کی مدد کرتے رہو گے اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہو گے تو میں تم سے تمہارے گناہ دور کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل

کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پس جو اس کے بعد بھی تم میں سے کفر کرے گا تو وہ اصل شاہراہ سے بھٹک گیا۔ پس ان کے اپنے عہد کو توڑ دینے کے سبب سے ہم نے ان پر لعنت کر دی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ وہ کلام کو اس کے موقع و محل سے ہٹاتے ہیں اور جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے اور تم برابر ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہو گے۔ پس تھوڑے سے ان میں سے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ پس ان کو معاف کرو اور ان سے درگزر کرو۔ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ۱۲-۱۳

اور جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان سے بھی عہد لیا تو جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاد دہانی کی گئی وہ اس کا ایک حصہ بھلا بیٹھے تو ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکا دی اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں عنقریب اللہ اس سے ان کو آگاہ کرے گا۔ ۱۴

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۱۲)

نقیب کا مفہوم

نَقِيْب کے معنی ہیں کھوج لگانے والا، معاملات کی تہ میں پہنچنے والا، لوگوں کے حالات کی جستجو کرنے والا۔ یہیں سے یہ قوم اور قبیلہ کے سردار، نگران، ذمہ دار افسر اور مانیٹر کے معنی میں استعمال ہوا۔ اس لیے کہ نگرانوں اور مانیٹروں کا اصل کام لوگوں کے حالات کی نگرانی اور ان کی حفاظت ہی ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے شریعت کی پابندی اور اس کی حفاظت

کا عہد لینے کے بعد بنی اسرائیل کے ہر قبیلے پر ایک ایک نقیب اس مقصد سے مقرر کیا کہ وہ لوگوں کی نگرانی رکھے کہ وہ شریعت کے حدود و قیود کی پابندی کریں اور کوئی ایسی چیز ان کے اندر گھسنے نہ پائے جو ان کو اللہ کے عہد سے روگرداں کرے۔ بنی اسرائیل کے قبیلے چونکہ بارہ تھے اس وجہ سے نقیب بھی بارہ مقرر ہوئے۔ ان کا تقرر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت کیا تھا اس وجہ سے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا۔

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ الاية یہ اس عہد میثاق کا بیان ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا اس میں نماز کے اہتمام، زکوٰۃ کی ادائیگی، آئندہ آنے والے رسولوں پر ایمان اور ان کی تائید اور خدا کی راہ میں انفاق کا عہد لیا گیا ہے اور اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی معیت، ان کی عام لغزشوں سے درگزر اور ان کے لیے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ — بنی اسرائیل سے میثاق

'وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ' ایک جامع تعبیر ہے، خدا کی تائید و نصرت کے وعدے کی۔ ظاہر ہے کہ جن کے ساتھ خدا ہو ان کے ساتھ خدا کی پوری کائنات ہے۔

'لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ' سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح امت مسلمہ کے میثاق میں نماز اور زکوٰۃ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اسی طرح بنی اسرائیل کے میثاق میں بھی ان کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ شریعت الٰہی میں حکمت دین کے پہلو سے ان دونوں چیزوں کا جو درجہ ابتدا سے ہے، اس پر پوری تفصیل کے ساتھ تفسیر سورۂ بقرہ کے آغاز میں ہم بحث کر چکے ہیں۔

'وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ' میں یوں تو بعد میں آنے والے تمام انبیاء کی طرف اشارہ ہے لیکن اس میں خاص اشارہ نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جن کا ذکر تورات میں نہایت نمایاں علامات کے ساتھ ہوا ہے۔ بقرہ میں بعض حوالے گزر چکے ہیں۔ اعراف میں اس پر مزید بحث آئے گی۔

'وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا' میں جس انفاق کا ذکر ہے یہ زکوٰۃ کے مقررہ نصاب سے الگ ہے۔ اس سے مراد وہ انفاق ہے جو جہاد فی سبیل اللہ اور اس قسم کے کسی اور دینی و ملی و اجتماعی مقصد کے لیے کیا جائے۔ اس کو قرض سے تعبیر کرنے کی وجہ اور اس کے قرض حسن ہونے کے شرائط پر پوری تفصیل کے ساتھ ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔

'لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ' میں سیئات سے مراد لغزشیں اور کوتاہیاں ہیں، اگر دین کی بنیادی باتوں کا اہتمام کیا جائے تو بندے سے جو چھوٹی موٹی غلطیاں صادر ہو جاتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دیتا ہے۔ اس مسئلہ پر بھی بحث گزر چکی ہے۔

'فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ الاية' یہ ٹکڑا بھی معاہدے کا جزو ہے یعنی اس عہد اور اس عہد کی حفاظت کے اس اہتمام کے باوجود جس کا ذکر ہوا اگر کسی نے اس معاہدے سے انحراف اختیار کیا تو وہ خدا کی شاہراہ سے

بھٹک گیا۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اس عہد سے انحراف کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً ۖ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ ۙ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۱۳)

یہود کی عہد شکنی کے نتائج

یہود پر لعنت، ان کی قساوت اور ان کی تحریفات پر تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گفتگو ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ معاہدہ کر کے اس کو جس درجے کی عزت و سرفرازی بخشتا ہے، معاہدہ توڑ دینے کی صورت میں وہ اس کو اسی درجے کی ذلت کے ساتھ دھتکار بھی دیتا ہے۔ اس دھتکارنے کے لیے جامع تعبیر لعنت ہے۔ یعنی کسی کو راندۂ درگاہ قرار دے دینا۔ راندۂ درگاہ ہونے کا پہلا اثر جو اس قوم پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے خدا کی خشیت، جو دل کی زندگی کی ضامن ہے، ختم ہو جاتی ہے اور دل پتھر ہو کر توبہ و انابت کی روئیدگی کے لیے بالکل بنجر ہو جاتا ہے۔ یہ حالت پیدا تو ہوتی ہے عہد شکن قوم کے اپنے عمل کے نتیجہ کے طور پر لیکن چونکہ واقع ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی مقررہ سنت کے مطابق اس وجہ سے اس کو منسوب اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمایا ہے۔ یہ قساوت عہد شکن قوم کے اندر جسارت پیدا کرتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ میثاقِ الٰہی کی خلاف ورزی ہی پر بس نہیں کرتی بلکہ وہ اس معاہدے کو اپنی خواہشات کے مطابق بنانے کے لیے اس کے الفاظ و کلمات کی تحریف بھی کرتی ہے۔ یہ تحریف یہود نے جن جن شکلوں میں کی ہے اس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ، اور وہ بھلا بیٹھے اس چیز کا ایک حصہ جس کے ذریعے سے ان کو یاددہانی کی گئی تھی: جس کے ذریعے سے یاددہانی کی گئی تھی، سے مراد ہمارے نزدیک تورات ہے اس لیے کہ اسی کے اندر میثاقِ الٰہی کا سارا ریکارڈ محفوظ کیا گیا تھا اور وہ اسی لیے محفوظ کیا گیا تھا کہ بنی اسرائیل اور ان کی آئندہ نسلوں کے لیے ایک قابلِ اعتماد یادداشت کا کام دے۔ لیکن جب وہ اس یادداشت ہی کا ایک حصہ بھلا بیٹھے تو اب ان کے پاس ایسی کیا چیز رہ گئی تھی جو ان کو یاددہانی کرا سکتی۔ گھر کا چراغ ہی ہوتا ہے جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، اگر اسی کو بجھا دیا جائے یا چھپا دیا جائے تو اب دوسری کون سی چیز اجالا کرے گی۔

یہ فراموش کر دینا قدرتی نتیجہ ہے تحریف اور اخفا کا۔ یہود تورات کی بعض چیزیں، جیسا کہ بقرہ کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں، عام لوگوں سے چھپاتے تھے، اسی طرح تورات کی جو پیشین گوئیاں ان کے منشا کے خلاف تھیں ان میں انھوں نے لفظی تحریفیں کر کے ان کا مفہوم بدل دیا۔ تاویل کے ذریعے سے بھی انھوں نے حقائق کی قلبِ ماہیت کی۔ پھر ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ تورات حضرت موسیٰ کے زمانے میں مرتب نہیں ہوئی بلکہ ان کی وفات کے لمبے وقفوں کے بعد اس کی ترتیب عمل میں آئی جب کسی کو یہ علم بھی نہیں رہا تھا

کہ ان کی قبر کہاں ہے۔ اس کے مرتبین کا نام بھی معلوم نہیں کہ وہ کون اور کن صفات کے لوگ تھے۔ استثنا باب ۳۴ کے آخر میں ہے کہ "پر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں۔" اسی طرح یہ الفاظ بھی اس میں ہیں "اور اس وقت سے اب تک کوئی نبی موسیٰ کے مانند جس سے خداوند نے روبرو باتیں کیں، نہیں پیدا ہوا۔" ظاہر ہے کہ جو کتاب اپنے لانے والے کی وفات کے اتنے طویل عرصہ کے بعد مرتب ہوئی کہ لوگ اس کی قبر بھی بھول چکے تھے اس کی تعلیمات کو محفوظ رکھنا ان کے لیے کس طرح ممکن تھا چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تورات کی بہت سی باتیں بھول گئے۔ پھر جو باتیں مرتب بھی ہوئیں وہ بھی اصل الفاظ میں محفوظ نہیں رہیں بلکہ ان کے پاس اصل تورات کے بجائے صرف اس کے ترجمے رہ گئے اور یہ ترجمے بدلتے بدلتے اصل سے اتنے مختلف ہوگئے کہ یہ تمیز کرنا ناممکن ہوگیا کہ اس میں اصل بات کتنی ہے اور کتنی جامعین اور مترجمین کی حاشیہ آرائی ہے۔ اس طرح تورات کا ایک بہت بڑا حصہ اس کے حاملین نے ضائع کر دیا۔

'وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ' خائنۃ کے معنی خیانت کے ہیں جس طرح لائمۃ کے معنی ملامت کے۔ خیانت، بدعہدی اور عہد شکنی کے لیے عربی میں نہایت معروف ہے۔ قرآن نے یہود کی بہت سی بدعہدیوں اور ان کی تحریفات سے پردہ اٹھایا ہے جن کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے اور آگے ان کی مزید مثالیں آ رہی ہیں۔ قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ان کی صرف انہی تحریفات سے تعرض کیا ہے جن سے تعرض تجدید شریعت کے نقطۂ نظر سے ضروری تھا، جن سے تعرض ضروری نہیں تھا ان کو نظر انداز کر دیا ہے اور ان کی مقدار بھی کم نہیں ہے، بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ آگے آیت ۱۵ میں ارشاد ہے 'يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ' (وہ تمہارے لیے ظاہر کر رہا ہے بہت سی وہ چیزیں تورات کی جن کو تم چھپاتے تھے اور بہت سی چیزیں نظر انداز کر رہا ہے)

'اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ' سے یہود کے اس مختصر گروہ کی طرف اشارہ ہے جو نقض عہد اور اس کے مذکورۂ بالا نتائج سے محفوظ رہا ہے۔ اگرچہ یہ گروہ نہ تو اپنی قوم کو فتنوں سے بچا سکا نہ تورات کو شریروں کی دستبرد سے۔ تاہم یہ لوگ اپنے علم کی حد تک اصل شریعت پر قائم اور اس کی گواہی دیتے رہے۔ صالحین کا یہی گروہ ہے جس نے اسلام کا بھی خیر مقدم کیا۔

'فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ' میں عفو و صفح سے مراد دل سے معاف کرنا نہیں بلکہ محض درگزر کرنا ہے۔ عفو کے اس معنی کے لیے نظیر آیت ۱۵ کے اس ٹکڑے میں بھی ہے جو اوپر ہم نے نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی ان کو نظر انداز کرو اور برداشت کرو۔ ان سے نمٹنے کا زمانہ آگے آئے گا۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۴)

یہود کے نقض عہد کے بعد اب یہ نصاریٰ کے نقض عہد کا ذکر ہو رہا ہے اور ان کے ذکر کی تمہید بھی اس

انداز سے اٹھائی ہے جس سے مترشح ہو رہا ہے کہ یہ نصاریٰ قرآن کے نزدیک نصاریٰ نہیں بلکہ صرف نصاریٰ ہونے کے مدعی ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ پال کے متبعین کو نہ صرف یہ کہ اصل نصرانیت سے کوئی علاقہ نہیں ہے بلکہ انھوں نے تو اپنا نام بھی بدل لیا۔ بقرہ میں، نصاریٰ پر مفصل بحث گزر چکی ہے۔ مزید بحث اسی سورہ کی آیات ۸۲-۸۵ کے تحت آرہی ہے۔

فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ، یہ نتیجہ بیان ہوا ہے کتاب الٰہی میں تحریف اور اس کے ایک حصے کو ضائع کر دینے کا۔ ملت کی شیرازہ بندی اللہ کے میثاق اور اس کی کتاب ہی سے ہوتی ہے۔ اگر اسی میں فساد و اختلال پیدا ہو جائے تو پھر ملت کو فساد و اختلال اور خون خرابے سے کیا چیز بچا سکتی ہے۔ یہ صورت حال عہد شکنی کا قدرتی نتیجہ بھی ہے اور اس جرم کی سزا بھی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ نصاریٰ کے لیے اس سے نجات کی واحد شکل یہ تھی کہ قرآن کی رہنمائی میں ان تاریکیوں سے نکل کر ہدایت کی روشنی اور امن و سلامتی کی شاہراہ پر آجاتے لیکن ان کے تعصب نے ان کو یہ سیدھی راہ اختیار نہ کرنے دی۔ اب نہ کوئی کتاب آنی ہے اور نہ کوئی رسول، اس وجہ سے اس جنگ و جدل سے نکلنے کا اب ان کے لیے قیامت تک کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا۔

وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ، یہ دھمکی ہے۔ یعنی عنقریب وہ وقت آئے گا جب اللہ ان کی یہ تمام کارستانیاں ان کے سامنے رکھ دے گا اور وہ اپنی ان تمام شرارتوں کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

یہ ملحوظ رہے کہ نقض عہد کی یہ تاریخ مسلمانوں کو محض ماضی کی ایک سرگزشت کی حیثیت سے نہیں سنائی جا رہی ہے بلکہ اس لیے سنائی جا رہی ہے کہ مسلمان اس سے سبق لیں اور یاد رکھیں کہ اگر انھوں نے بھی اپنے میثاق کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو یہود و نصاریٰ کا ہوا۔

۶- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۵-۱۹

یہود اور نصاریٰ کے لیے نجات کی راہ

آگے یہود اور نصاریٰ دونوں کو بانداز تنبیہ توجہ دلائی ہے کہ تم اللہ کے عہد کو توڑ کر اور اس کی کتابیں ضائع کر کے جس تاریکی اور جس مذہبی جنگ و جدل میں پھنس گئے ہو اس سے نکالنے اور سلامتی کی راہ پر لانے کے لیے اللہ نے تمھیں پھر روشنی دکھائی ہے اور ایک واضح کتاب بھیجی ہے۔ اب اس کتاب اور اس رسول کے بعد تمھارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اگر اس اتمام حجت کے بعد بھی تم اسی تاریکی میں پڑے رہے تو یاد رکھو، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کی گرفت سے باہر کوئی نہیں نکل سکتا۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۵-۱۹

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ ۚ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ

نُورٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٥﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ
سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ
وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٦﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ
اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا
اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى
الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ
يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٧﴾ وَقَالَتِ
الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ
بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ
وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا
بَيْنَهُمَا ؗ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿١٨﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا
يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ
بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ؗ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٩﴾ ع ۳

ترجمۂ آیات ۱۵-۱۹

اے اہل کتاب، تمہارے پاس ہمارا رسول وہ بہت سی باتیں ظاہر کرتا ہوا آگیا ہے جو تم کتاب کی چھپاتے رہے ہو اور وہ بہت سی باتیں نظر انداز بھی کر رہا ہے۔ اب تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک واضح کرنے والی کتاب آگئی۔ اس کے ذریعے سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی خوشنودی کے طالب ہیں سلامتی کی راہیں دکھا رہا

ہے اور اپنی توفیق بخشی سے ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لا رہا ہے اور ایک صراطِ مستقیم کی طرف ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ ۱۵-۱۶

بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے۔ پوچھو کون اللہ سے کچھ اختیار رکھتا ہے اگر وہ چاہے کہ ہلاک کر دے مسیح ابن مریم کو، اس کی ماں کو اور جو زمین میں ہیں ان سب کو۔ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کی بادشاہی۔ وہ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۷

اور یہود اور نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ پھر وہ تمھیں تمھارے جرموں پر سزا کیوں دیتا رہا ہے؟ بلکہ تم بھی اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق ہی میں سے بشر ہو۔ وہ جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کی بادشاہی اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔ ۱۸

اے اہل کتاب، تمھارے پاس ہمارا رسول، رسولوں کے ایک وقفے کے بعد، تمھارے لیے دین کو واضح کرتا ہوا آ گیا ہے۔ مبادا تم کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ہوشیار کرنے والا تو آیا ہی نہیں۔ دیکھ لو، ایک بشیر و نذیر تمھارے پاس آ گیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۹

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ كَثِیْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَیَعْفُوْا

عَنْ كَثِيْرٍ ۬ؕ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۵-۱۶)

لفظ اخفا تحریف کی ایک جامع تعبیر ہے

يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ، تحریف خواہ تبدیلِ الفاظ کی نوعیت کی ہو یا تبدیلِ معنی کی نوعیت کی، اس کا اصل مقصد حقیقت پر پردہ ڈالنا اور خلق کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہوتا ہے اس وجہ سے قرآن نے اس کے لیے جامع لفظ 'اخفا' کا استعمال کیا ہے جس کے تحت ان کی لفظی و معنوی تحریفیں بھی آگئیں اور ان کی کتابوں کی وہ آیتیں بھی جن کو اہل کتاب کے علماء اس اندیشے سے عام لوگوں سے چھپاتے تھے کہ ان کے خلاف شریعت اقدامات کی پردہ دری نہ ہو یا ان کی بنا پر آخری بعثت کے باب میں ان پر کوئی حجت نہ قائم ہو سکے۔ فرمایا کہ یہ رسول تمہاری بہت سی تحریفات بے نقاب کر رہا ہے اور ایسی بھی بہت سی ہیں جن کو نظر انداز کر رہا ہے اس لیے کہ مقصود اصل حقیقت کو ظاہر کرنا اور شریعت الٰہی کی تجدید و تکمیل ہے نہ کہ تمہاری تذلیل و تفضیح۔

'نور' اور 'کتاب مبین' سے مراد

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ، نور سے مراد قرآن مجید ہے اور 'کتاب مبین' کا لفظ بطور تفسیر ہے۔ قرآن مجید حکمت اور شریعت دونوں کا مجموعہ ہے۔ وہ ذہنی تاریکیوں سے بھی نکالتا ہے اور زندگی کے لیے عمل کی صحیح شاہراہ بھی متعین کرتا ہے اس وجہ سے وہ نور بھی ہے اور کتاب مبین بھی۔ اہل کتاب کو اللہ تعالیٰ نے جو روشنی عطا فرمائی تھی اس کو ضائع کر کے وہ پھر تاریکیوں میں گھر گئے تھے اصل حقیقت گم تھی اور شاہراہ ناپید، اس وجہ سے ان کے درمیان جنگ و جدل کی وہ آگ بھڑک اٹھی تھی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

ہدایت کے لیے طلب و جستجو شرط ہے

'يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ الاٰية' یہ اس کتاب کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ نے یہ کتاب اس لیے اتاری ہے کہ تم اس پر ایمان لاؤ تو یہ تم کو اس جنگ و جدل سے نجات دے کر امن و سلامتی کی راہ پر، تاریکی سے نکال کر روشنی میں، کج روی اور ضلالت کی وادیوں سے نکال کر خدا کی صراط مستقیم پر لائے گی، بشرطیکہ تمہارے اندر خدا کی خوشنودی کی طلب ہو اور تم اپنے تعصبات کی پٹیاں اپنی آنکھوں سے کھول کر اس روشنی کو دیکھو اور اس کی قدر کرو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے اندر رضائے الٰہی کی جستجو نہ ہو بلکہ وہ اپنی خواہشات کے پرستار بنے رہیں، ان کے لیے توفیق کا دروازہ نہیں کھلتا۔ 'بِاِذْنِهٖ' کے لفظ سے اسی سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی یہ سعادت خدا کے اذن سے حاصل ہوتی ہے اور یہ اذن ان کے لیے ہوتا ہے جن کے اندر رضائے الٰہی کی جستجو ہو۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (۱۷)

پال کے عقیدے کی اصل روح

اب یہ نصاریٰ کے نقضِ عہد کی ایک مثال بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے تمام عہد و میثاق کی جو جڑ ہے یعنی توحید، اسی پر کلہاڑا رکھ دیا اور اللہ تعالیٰ کے بجائے مسیح ابن مریم کو خدا بنا بیٹھے۔ موجودہ مسیحیت جس کا بانی پال ہے، اصلاً تو حلول و اتحاد کے عقیدے پر مبنی ہے یعنی پال کے نزدیک مسیح کی شکل میں خدا ہی نے ظہور کیا ہے لیکن بعض اعتراضات سے بچنے کے لیے، جیسا کہ ہم نے سورۂ نساء کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے، اس کو اس نے اس چیستاں کی شکل میں پیش کیا ہے، جس کو تثلیث کہتے ہیں۔ گویا حلول اس عقیدے کی روح ہے اور تثلیث اس کی تعبیر۔ قرآن نے کہیں اس گمراہی کی روح کو واضح کیا ہے، کہیں اس کی معروف تعبیر سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پال کا اصل مقصود مسیح کو خدا ثابت کرنا تھا۔ اس کے لیے اس نے ان کی خارقِ عادت ولادت اور ان کے کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہونے سے مواد فراہم کیا لیکن انجیلوں میں چونکہ باپ اور روح القدس کا بھی ذکر تھا اس وجہ سے اسے یہ محنت کرنی پڑی کہ الوہیت کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے کوئی ایسی تعبیر اختیار کرے کہ ان سب کے لیے اس میں کوئی نہ کوئی جگہ نکل آئے۔ لیکن یہ سارا گورکھ دھندا تو بس چند بال کی کھال ادھیڑنے والوں کے ذہن میں یا چند چیستاں قسم کی کتابوں کے اندر بند رہتا ہے، عام ذہن تو خلاصہ پسند ہوتا ہے، وہ ان موشگافیوں میں کہاں پڑتا ہے چنانچہ عوام نے اس سارے افسانے میں سے صرف اتنی بات اپنے ذہن میں راسخ کر لی کہ مسیح خدا ہیں[1]۔ یہی حال عربوں کا ہوا۔ انھوں نے بھی خدا کے ساتھ دوسروں کو جو شریک کیا تو اپنے ایک مزعومہ فلسفے کے تحت کیا لیکن پھر مورتیں اور مورتیں خدا بن گئیں اور خدا یا تو بالکل غائب ہو گیا یا اس طرح پس منظر میں چھپا دیا گیا کہ اس کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہو گیا۔ اس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ مکی سورتوں میں آئے گی۔

نصاریٰ پر اظہارِ غضب

فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے ارادے میں کوئی حائل و مانع نہیں ہو سکتا مثلاً لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ (الممتحنۃ ۴) (میں آپ کے لیے خدا سے مغفرت مانگوں گا، لیکن میں آپ کے معاملے میں خدا کے کسی فیصلے میں کوئی دخل نہیں رکھتا) یہ مسیح کو خدا بنانے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اظہارِ غضب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نادانو، یہ کس قسم کی باتیں کرتے ہو، کیا مسیح، کیا ان کی ماں اور کیا یہ ساری مخلوق، خدا سب سے بے نیاز اور مستغنی ہے۔ سب کو وجود اسی نے بخشا ہے اور اگر وہ ان سب کو فنا کر دینا چاہے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے۔ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب خدا ہی کی ملکیت ہے۔ کوئی نہیں ہے جو اس میں اس کا شریک ہو۔ وہ جو چاہے، جس طرح چاہے اور جتنی مقدار میں چاہے پیدا کرتا اور پیدا کر سکتا ہے۔ کسی کا بن باپ کے پیدا ہو جانا اس بات کی دلیل نہیں ہو جاتا کہ وہ خدا بن گیا یا خدائی میں شریک ہو گیا۔ خدا کسی

---

[1] اس مسئلے پر ہم نے اپنی کتاب حقیقتِ شرک و توحید میں بھی بحث کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

کو چاہے تو بن باپ کے بھی پیدا کر سکتا ہے بلکہ ماں اور باپ دونوں کے بغیر بھی پیدا کر سکتا ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم ۖ بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ (۱۸)

اہل کتاب کا محبوبِ خدا ہونے کا زعم باطل

نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ، اس ٹکڑے پر تفصیل کے ساتھ پچھلی سورتوں میں بحث گزر چکی ہے۔ اہل کتاب کا یہی زعم باطل تھا جس نے ان کو عہد الٰہی کی ذمہ داریوں سے سب سے زیادہ بے پروا بنایا۔ انھوں نے گمان کیا کہ وہ خدا کے محبوبوں اور برگزیدوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے عمل و اطاعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہیں۔ جنت ان کا پیدائشی حق ہے۔ دوزخ میں اول تو وہ ڈالے نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو بس یونہی چند دنوں کے لیے۔ اس فتنے کے اصل بانی تو یہود ہوئے لیکن آخر نصاریٰ ان کو جنت کا واحد اجارہ دار کیوں بننے دیتے۔ چنانچہ یہاں قرآن نے اس کو دونوں ہی کے مشترک عقیدے کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔

زعم باطل کی تردید خود ان کی اپنی تاریخ سے

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم، یہ ان کے اس زعم باطل کی تردید خود ان کی اپنی تاریخ سے کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کے محبوب اور چہیتے ہونے کے سبب سے تم خدا کے مواخذے اور عذاب سے بری ہو تو تمہاری یہ محبوبیت اور تمہارا یہ چہیتا پن اس دنیا میں تمہارے کچھ کام کیوں نہ آیا؟ یہاں تو تمہاری پوری تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جب جب تم نے خدا سے سرکشی کی ہے اس نے تمہیں نہایت عبرت انگیز سزائیں بھی دی ہیں۔ ایسی عبرت انگیز کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں ایسی سزاؤں کی مثال نہیں مل سکتی۔ پوری قوم کی غلامی، پوری قوم کی صحرا گردی، پوری قوم کی جلا وطنی، متعدد بار پوری قوم کا قتل عام اور بیت المقدس کی عبرت انگیز تباہی، یہ سارے واقعات خود تورات میں موجود ہیں۔ اگر ابراہیمؑ و اسحٰقؑ کی اولاد ہونے کی وجہ سے تمہیں خدا کی طرف سے کوئی برأت نامہ حاصل ہے تو اس برأت نامے نے تمہیں ان عذابوں سے کیوں نہ بچایا؟

اصل حقیقت کا اظہار

بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ، یہ اصل حقیقت کا اظہار ہے کہ أَبْنَاءُ اللَّهِ اور أَحِبَّاءُ اللَّهِ ہونے کے خبط سے نکلو، جس طرح خدا کی ساری مخلوق ہے اسی طرح تم بھی اس کی مخلوق ہو اور جس طرح سب کو خدا سے نسبت ایمان و عمل صالح کے توسط سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح تمہیں بھی خدا سے کوئی نسبت حاصل ہوگی تو ایمان و عمل صالح ہی کے واسطے سے حاصل ہوگی۔

يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ، یعنی مغفرت اور عذاب خدا ہی کے اختیار میں ہے وہ جن کو مغفرت کا مستحق پائے گا ان کی مغفرت فرمائے گا، جن کو سزا کا مستحق پائے گا ان کو سزا دے گا۔ اگر کسی نے بزرگوں سے

خاندانی نسبت یا ان کی موہوم شفاعتوں پر بھروسہ کرکے خدا کے عہد ہی کو توڑ دیا ہے تو اس کو خدا کے عذاب سے بچانے والا کوئی بھی نہیں بن سکے گا۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ الاٰیۃ یہ اوپر والے مضمون کی تاکید ہے کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب خدا ہی کی ملک ہے اور سب کو خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ نہ اس کائنات میں کسی کی حصہ داری ہے نہ خدا کے سوا کسی اور کے ہاں پیشی ہونی ہے کہ اس سے کوئی امید باندھی جائے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ
بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۡ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۹)

'فترة' کا مفہوم

'فَتْرَة' اس وقفہ کو کہتے ہیں جو ایک چیز کے ظہور کے بعد اس کے دوسرے ظہور سے پہلے واقع ہوتا ہے۔ مثلاً باری کے بخار کے دو حملوں کے درمیان جو وقفہ ہوگا اس کو 'فترہ' کہیں گے۔ آیت میں اس سے مراد وہ وقفہ ہے جو دو نبیوں کی بعثت کے درمیان ہوتا ہے۔

اہل کتاب کو تنبیہ

یہ اہل کتاب کو تنبیہ ہے کہ اپنی کتاب کی جن چیزوں کو تم نے چھپایا یا ضائع کر دیا ان سب کو واضح اور خدا کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہوا ہمارا رسول تمہارے پاس آگیا ہے۔ اب تمہارے پاس اپنی گمراہی پر جمے رہنے کے لیے یہ عذر بھی باقی نہیں رہا کہ پہلے رسولوں کی بعثت پر ایک زمانہ گزر چکا تھا اور تم ایک نذیر و بشیر کے محتاج تھے۔ تمہارے اس عذر کو بھی ختم کرنے کے لیے ہم نے نذیر و بشیر بھیج دیا۔ اب اس اتمام حجت کے بعد بھی تم نے اپنی روش نہ بدلی تو خدا کو بے بس ہستی نہ سمجھنا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اہل کتاب کا یہ عذر کوئی قابل لحاظ عذر نہیں تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی لحاظ فرمایا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان پر آخری درجے میں حجت تمام کر دی گئی۔

۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۰-۲۶

بنی اسرائیل کو تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی یاددہانی

اب آگے یہود کی ابتدائی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی یاددہانی فرمائی ہے جس سے ایک طرف تو یہ حقیقت روشنی میں آتی ہے کہ یہ قوم ابتداء ہی سے خدا کے عہد اور اس کے حقوق و فرائض کے معاملے میں نہایت بودی اور نکمی رہی ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا نے ابتداء ہی سے اس کی بدعہدیوں اور نالائقیوں پر اس کو سزا بھی ہمیشہ نہایت عبرت انگیز دی ہے لیکن اس کے باوجود اب تک یہ یہی خواب دیکھے جا رہی ہے کہ یہ خدا کی محبوب اور لاڈلی ہے اس وجہ سے آخرت کے عذاب سے محفوظ ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۰-۲۶

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ
اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۰ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ
كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۲۱
قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى
يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝۲۲ قَالَ رَجُلٰنِ
مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ
الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۲۳ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا
مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا
قٰعِدُوْنَ ۝۲۴ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ
بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۵ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ
اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ
الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۶ ع ۸

ترجمۂ آیات ۲۰-۲۶

اور یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا، اے میرے ہم قومو! اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو کہ اس نے تم میں نبی اٹھائے اور تم کو بادشاہ بنایا، اور تم کو وہ کچھ بخشا جو دنیا والوں میں سے کسی کو نہیں بخشا۔ اے میرے ہم قومو! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور پیٹھ پیچھے نہ پھرو ورنہ نامرادوں میں سے ہو کر رہ جاؤ گے۔ وہ بولے کہ اس میں تو بڑے زور آور لوگ ہیں۔ ہم اس میں نہیں

داخل ہونے کے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم داخل ہوں گے۔ دو شخصوں نے، جو تھے تو انھی ڈرنے والوں ہی میں سے، پر خدا کا ان پر فضل تھا، للکارا کہ تم ان پر چڑھائی کر کے شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤ۔ جب تم اس میں گھس جاؤ گے تو تمھی غالب رہو گے اور اللہ پر بھروسہ کرو، اگر تم مومن ہو۔ وہ بولے کہ اے موسٰی، ہم اس میں ہرگز نہیں داخل ہونے کے جب تک وہ اس میں موجود ہیں تو تم اور تمہارا خداوند جا کر لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ ۲۰-۲۴

موسٰی نے دعا کی اے میرے پروردگار، میرا اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر کچھ زور نہیں۔ پس تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان علیحدگی کر دے۔ فرمایا تو یہ سرزمین ان پر چالیس سال کے لیے حرام ٹھہری، یہ لوگ زمین میں بھٹکتے پھریں گے پس تو ان نافرمان لوگوں کا غم نہ کھا۔ ۲۵-۲۶

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ۝ يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ (۲۰-۲۱)

یہود کا ایک درق — 'إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ'، سورۂ نسا کی آیت ۵۴ کے تحت ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالٰی کے وعدے جو مستقبل سے متعلق ہوتے ہیں، بعض اوقات ماضی کے صیغے سے تعبیر کیے جاتے ہیں ـــ یہ وعدوں کی قطعیت کے اظہار کا ایک بلیغ اسلوب ہے جو قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے۔ گویا یہ وعدے محض وعدے نہیں بلکہ واقعات ہیں جو واقع ہو چکے۔ حضرت موسٰیؑ سے پہلے اگرچہ بنی اسرائیل میں بعض انبیاء مبعوث ہو چکے تھے لیکن نبوت کا غیر منقطع سلسلہ آپ ہی کے بعد شروع ہوا جو حضرت مسیحؑ کی بعثت تک جاری رہا۔ بادشاہوں کے سلسلے کا تعلق تمام تر حضرت موسٰیؑ کے بعد ہی

کے دور سے ہے۔ اس سے پہلے خاندان کے بزرگوں کو ایک قسم کی سیادت اور پدرسری (PATRIARCHY) تو حاصل رہی لیکن اس کو بادشاہی نہیں کہہ سکتے۔ تورات میں بھی اس کو بادشاہی سے تعبیر نہیں کیا گیا ہے۔

ایک سیاسی نکتہ — یہاں اسلوب کا ایک اور فرق بھی قابل لحاظ ہے۔ سلسلۂ نبوت کی تعبیر کے لیے تو فرمایا جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْۢبِیَآءَ (تم میں انبیا بنائے) لیکن سلسلۂ بادشاہی کی تعبیر کے لیے وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا (اور تم کو بادشاہ بنایا) کی تعبیر اختیار فرمائی۔ ان دونوں اسلوبوں کے فرق سے یہ بات نکلتی ہے کہ نبوت ایک مرتبہ اختصاص ہے جو صرف اسی سے مخصوص ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس منصب پر فائز فرماتا ہے دوسرے اس میں شریک نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس بادشاہی ایک منصب اجتماعی ہے جس میں بادشاہ کے ساتھ اس کی پوری قوم حصہ دار ہوتی ہے۔ اگر کسی بادشاہی میں قوم شریک نہ ہو تو وہ استبداد اور مطلق العنانی ہے۔

وَاٰتٰىکُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ سے مراد وہ منصب امامت و شہادت حق ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مامور فرمایا تھا اور جو امت مسلمہ کے ظہور میں آنے سے پہلے ان کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔

ارض مقدس سے مراد کنعان اور فلسطین ہے — اَلْاَرْضَ الْمُقَدَّسَۃَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ ارض مقدس سے مراد کنعان اور فلسطین کا علاقہ ہے۔ اس کو مقدس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی علاقہ ہے جہاں حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام نے اللہ کے دین کی دعوت کا آغاز کیا۔ یہ علاقہ اگرچہ بعد میں کافروں اور بت پرستوں کے قبضے میں آگیا تھا لیکن توحید اور خدا پرستی کی اذان چونکہ سب سے پہلے اسی علاقے میں گونجی تھی، اس وجہ سے اس کو ارض مقدس سے تعبیر فرمایا۔ مصر سے نکلنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسی علاقے کو بنی اسرائیل کی میراث ٹھہرایا اور تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر ان سے وعدہ کیا کہ میں نے یہ علاقہ تم کو دیا۔ ملاحظہ ہو گنتی باب ۱۴۔

حضرت موسیٰ کی ایک تقریر — یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس تقریر کا حوالہ ہے جو انھوں نے دشت فاران میں اس موقع پر فرمائی جب بنی اسرائیل کو فلسطین پر حملہ کے لیے ابھارا ہے۔ تورات کی کتاب گنتی باب ۱۳-۱۴ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد تمام منازل سفر طے کرتے ہوئے، جب حضرت موسیٰؑ دشت فاران میں پہنچے اور فلسطین کا علاقہ قریب آیا تو چونکہ یہی علاقہ منزل مقصود تھا اس وجہ سے آپ نے ۱۲ سرداروں کی ایک پارٹی علاقے کے حالات دریافت کرنے کے لیے بھیجی۔ یہ پارٹی اپنی مہم سے فارغ ہو کر جب واپس آئی تو اس نے علاقے کی زرخیزی و شادابی سے متعلق تو نہایت شوق انگیز رپورٹ دی لیکن ملک پر قابض باشندوں کے قد و قامت اور ان کی زور آوری سے متعلق اس نے جو بیان دیا وہ بنی اسرائیل کے لیے نہایت حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ چنانچہ یہ بیان سنتے ہی انھوں نے واویلا شروع کر دیا اور جس ملک پر قبضہ کرنے کی اُمنگیں لیے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے اس پر قبضہ کرنا تو درکنار، مصر واپس جانے کی باتیں کرنے لگے۔

اور یہ بات انھیں یاد بھی نہیں رہی کہ خدا نے ان کو اس ملک کی میراث دینے کا قسم کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے۔ تفتیشی مہم کے ارکان میں سے دو شخصوں نے، جن کے نام تورات میں یوشع اور کالب بتائے گئے ہیں، ان کی ہمت بندھانے کی بڑی کوشش کی اور اللہ کے وعدوں اور عزم وہمت کے ثمرات وبرکات کا بہترا حوالہ دیا لیکن بنی اسرائیل فلسطین پر حملہ کرنے کی ہمت و حوصلہ کرنے کی بجائے ان دونوں حوصلہ مندوں کو سنگسار کر دینے کے درپے ہو گئے۔

یہی موقع ہے جب حضرت موسیٰؑ نے یہ تقریر فرمائی ہے۔ قرآن نے اگرچہ تقریر کا صرف خلاصہ دیا ہے اس لیے کہ مقصود بالاجمال واقعہ کی طرف صرف اشارہ کر دینا تھا، تاہم وہ سارے پہلو اس میں موجود ہیں جو اس موقع پر حوصلے کو بحال کرنے اور پست حوصلگی کے انجام بد سے آگاہ کرنے کے لیے ضروری تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے ان افضال و عنایات کا حوالہ دیا جو مصر سے خروج کے وقت سے لے کر اب تک برابر سایہ کی طرح بنی اسرائیل کے ساتھ رہے، ان قطعی اور حتمی وعدوں کا حوالہ دیا جو سلسلۂ نبوت کے اجرا اور بنی اسرائیل کو ایک عظیم حکمران قوم بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمائے۔ اس میراث کا حوالہ دیا جو ایک شاداب و زرخیز علاقہ کی شکل میں ان کو ملنے والی تھی اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے لکھ دیا تھا۔ ان تمام وعدوں اور یقین دہانیوں کے ساتھ ان کو ارض مقدس پر حملہ کی دعوت دی اور ساتھ ہی بزدلی اور پست حوصلگی کے انجام بد سے بھی آگاہ کر دیا کہ قدم پیچھے ہٹایا تو بالکل ہی نامراد ہو کر رہ جاؤ گے۔ پیچھے مصر کی غلامی ہے اور آگے کے لیے ہمت نہ کی تو یہ صحرا گردی ہے جس میں مرکھپ کر فنا ہو جاؤ گے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (۲۲)

بنی اسرائیل کی مرعوبیت

'قَوْمًا جَبَّارِيْنَ'، جبار کے معنی قد آور، زور آور، جھگڑالو اور طاقت ور کے ہیں۔ عربی میں جبّار کھجور کے ان درختوں کو بھی کہتے ہیں جو بہت اونچے ہوں۔ تورات میں ان کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔

> وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اس میں سے گزرے ایک ایسا ملک ہے جو اپنے باشندوں کو کھا جاتا ہے اور وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے وہ سب قد آور ہیں اور وہاں ہم نے بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبار ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈے ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے۔ گنتی ۱۳: ۳۳

۱؎ یہاں غالباً 'قد آوروں' کے الفاظ ہوں گے۔

یہ اس رپورٹ کے الفاظ ہیں جو تفتیشی مہم کے ارکان نے فلسطین کے باشندوں سے متعلق دی۔ اس میں بنی عناق کے لیے 'جبار' ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ لفظ اسی زمانے سے چلا آرہا ہے جو بعینہٖ قرآن میں بھی استعمال ہوا۔ عربی اور عبرانی دونوں قریب المخرج زبانیں ہیں۔ اس وجہ سے دونوں میں بہت سے مادے اور الفاظ مشترک ہیں۔

یہ حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا جو اوپر مذکور ہوئی، بنی اسرائیل کی طرف سے جواب ہے کہ جب اس ملک پر ایسے جبار اور تنومند لوگ قابض ہیں تو ہم ان کی تلواروں کا لقمہ بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ البتہ اگر قدرت کے کسی ایسے معجزے کے ذریعے سے، جیسے معجزے تم اب تک دکھاتے رہے ہو، یہ اس علاقے سے نکل جائیں تو بے شک ہم اس علاقے پر قابض ہونے کے لیے تیار ہیں۔

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۲۳)

یوشع اور کالب کا شاندار کردار

'رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا'، 'رَجُلٰنِ' سے مراد، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، یوشع اور کالب ہیں جو اس مہم کے ارکان میں تھے جو فلسطین کے حالات کی تفتیش کے لیے بھیجی گئی تھی۔ 'اَلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ' میں عام طور پر لوگوں نے 'يَخَافُوْنَ' کے مفعول کو محذوف مانا ہے یعنی 'يَخَافُوْنَ اللّٰهَ' وہ اللہ سے ڈرنے والوں میں سے تھے۔ اگرچہ میرے استاذ رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے لیکن دو وجہ سے اس تاویل پر میرا دل نہیں جمتا۔ ایک تو یہ کہ یہ موقع مفعول کے اظہار کا تھا نہ کہ اس کے حذف کا، اس لیے کہ یہاں التباس پیدا ہو سکتا ہے اور التباس کے مواقع میں اظہار مستحسن ہے نہ کہ حذف۔ دوسری یہ کہ اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت خدا سے ڈرنے والوں کی ایک جماعت موجود تھی جن کے اندر یوشع اور کالب بھی تھے۔ اگر یہ بات ہے تو انعامِ الٰہی کی تخصیص انہی دو حضرات کے لیے کیوں ہوتی، پھر تو 'اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا' کی جگہ 'اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ' ہونا تھا۔ علاوہ ازیں تورات اور قرآن دونوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس وقت بنی عناق کے خوف سے پوری قوم کا دل بیٹھ گیا تھا، صرف یہ دو اللہ کے بندے پوری قوم میں ایسے نکلے جو خوف زدہ نہیں ہوئے بلکہ اللہ کے عہد پر استوار رہے۔

اس وجہ سے قرین صواب تاویل میرے نزدیک یہ ہے کہ ہر چند یوشع اور کالب تھے تو اسی قوم میں سے جس پر خوف اور بزدلی کی موت طاری تھی لیکن اللہ کا ان پر فضل و انعام تھا کہ وہ اس وبائے عام میں مرنے پر راضی نہیں ہوئے بلکہ ایمان اور عزم پر استوار رہنے کی انھوں نے توفیق پائی۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب پوری قوم کی قوم اس طرح ہمت ہار بیٹھے جس طرح بنی اسرائیل ہار بیٹھے تو بہادر سے بہادر آدمی کے اعصاب بھی جواب دے جاتے ہیں۔ بڑا ہی باوفا اور صداقت شعار ہوتا ہے وہ مردِ حق جو ایسے نازک موقع پر بھی اپنی وفاداری اور صداقت شعاری نباہ لے جائے۔ یوشع اور کالب کے کردار کا یہی پہلو ہے

جس کے سبب سے عہد و میثاق کی اس سورہ میں قرآن نے ان کا ذکر کر کے ان کو زندہ جاوید بنا دیا تاکہ جو لوگ خدا کی راہ پر چلنے کا ارادہ کریں وہ ان کے اس مثالی کردار سے یہ سبق لیں کہ جب سب سو جائیں تو جاگنے والے کس طرح جاگتے ہیں۔ اور جب سب مر جاتے ہیں تو زندہ رہنے والے کس طرح زندہ رہتے ہیں قرآن نے یہاں بزدلوں کے اندر کے بہادروں اور مُردوں کے اندر کے زندوں کو اس لیے نمایاں کیا ہے کہ بہادروں کے اندر بہادر اور زندوں کے اندر زندہ تو بہت نظر آ جائیں گے لیکن وہ زندگی بخش ہستیاں بہت کمیاب ہیں جو مُردوں کو زندگی بخشتی ہیں اگرچہ اسی راہ میں انھیں خود اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔

یوشع اور کالب کی تقریر

'اُدْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ' یہ ان دونوں مردانِ حق کی تقریر ہے جو انھوں نے اپنی ہمت ہاری ہوئی قوم کا حوصلہ بحال کرنے کے لیے کی۔ انھوں نے للکارا کہ شہر کے پھاٹک سے ان پر چڑھائی کرو، جب تم یہ اقدام کر گزرو گے تو تمہی غالب رہو گے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ بندے جب اپنا فرض ادا کرنے کے لیے ان کے اپنے پاس جو طاقت و قوت موجود ہے اس کو میدان میں ڈال دیتے ہیں تب وہ اپنی مدد و نصرت سے ان کو نوازتا ہے، گھروں میں بیٹھے رہنے والوں کے لیے اس کی آسمانی تائید نہیں اترا کرتی۔ تورات میں ان کی یہ تقریر ان الفاظ میں ہے۔

"اور نون کا بیٹا یشوع اور یفنہ کا بیٹا کالب، جو اس ملک کا حال دریافت کرنے والوں میں سے تھے، اپنے اپنے کپڑے پھاڑ کر بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہنے لگے کہ وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اس میں سے گزرے نہایت اچھا ملک ہے۔ اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا اور وہی ملک جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے ہم کو دے گا فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو، وہ تو ہماری خوراک ہیں، ان کی پناہ ان کے سر پر سے جاتی رہی ہے اور ہمارے ساتھ خداوند ہے۔ سو ان کا خوف نہ کرو۔ تب ساری جماعت بول اٹھی کہ ان کو سنگسار کرو۔ گنتی باب ۱۴: ۶-۱۰)

'وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ' یعنی اگر خدا پر ایمان ہے تو خدا نے تو قسم کے ساتھ اس ملک کی میراث تم کو دینے کا وعدہ فرمایا ہے، پھر خدا پر بھروسہ رکھو، اس کے حکم کی تعمیل کا عزم کرو۔ جب تم اپنا فرض ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہو گے تو وہ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۲۴)

یہ بنی اسرائیل کی طرف سے آخری جواب تھا۔ تورات میں یہ جواب ان لفظوں میں تو موجود نہیں ہے لیکن بنی اسرائیل کے گریہ و ماتم کا ذکر ہے۔

بنی اسرائیل کا ماتم

"تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی اور وہ لوگ اس رات روتے ہی رہے اور کل بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون کی شکایت کرنے لگے اور ساری جماعت ان سے کہنے لگی ہائے کاش

> ہم مصر ہی میں مر جاتے! یا کاش اس بیابان ہی میں مرتے! خداوند کیوں ہم کو اس ملک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے۔ گنتی ۱۴ : ۱ - ۳

ظاہر ہے کہ جن کی بزدلی اور دہشت زدگی کا یہ عالم ہو ان کے لیے حضرت موسیٰؑ اور یوشع و کالب کی یہ یقین دہانی کہ خدا ہمارے ساتھ ہے، تم ان کا خوف نہ کرو، بالکل بے سود تھی۔ انھوں نے یقیناً اس یقین دہانی کے جواب میں یہی کہا ہوگا کہ اگر خداوند ساتھ ہے تو تم اور تمھارا خداوند جا کر لڑو، ہم تو یہیں بیٹھتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ (۲۵)

حضرت موسیٰؑ کی درخواست بارگاہ الٰہی میں

بنی اسرائیل کے مذکورہ بالا جواب کے بعد ان سے کسی خیر کی آخری امید بھی ختم ہوگئی اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے نہایت غم اور صدمے کے ساتھ اپنے پروردگار سے دعا کی کہ اے میرے رب! میرا اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر کوئی زور نہیں، اس وجہ سے اب تو ہمارے اور اس بدعہد قوم کے درمیان علیحدگی کر دے۔ ’علیحدگی کر دینے‘ کا منشا ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ اب ان کی قیادت و اصلاح کے بارِ عظیم سے ان کو سبکدوش کر دیا جائے۔ اتنی طویل جد و جہد اور اتنے بے شمار خوارق و عجائب کے بعد بھی جن کی بے یقینی کا یہ عالم ہے کہ ایک شخص بھی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے تو اب میں ان پتھروں میں کیا جونک لگا سکوں گا۔ اب تو میرے اور ان کے درمیان فیصلہ ہی فرما دے۔

حضرت ہارونؑ چونکہ خود خدا کے مقرر کردہ وزیر تھے اور انھوں نے ہر مرحلے میں اپنی وفاداری کا شایانِ شان ثبوت دیا تھا اس وجہ سے ان پر اعتماد تو ایک امر بدیہی تھا لیکن باقی پوری قوم، اللہ کے ان دو بندوں کے سوا جن کا ذکر اوپر ہوا، بالکل مردہ نکلی۔

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۚ يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ (۲۶)

بنی اسرائیل کو صحرا گردی کی سزا

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی علیحدگی کی درخواست تو منظور نہیں فرمائی، اس لیے کہ پیغمبر قوم کے لیے بمنزلۂ روح ہوتا ہے۔ قوم سے اس کی علیحدگی، اور وہ بھی اعلانِ براءت کے ساتھ، پوری قوم کے لیے پیغامِ ہلاکت ہوتی ہے۔ لیکن بنی اسرائیل کی اس ناقدری اور بے یقینی کی سزا ان کو یہ دی کہ چالیس سال کے لیے سرزمینِ مقدس کو ان کے لیے حرام کر دیا اور یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ مدت یہ اسی صحرا گردی میں گزاریں گے۔ تورات میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

> اور خداوند نے موسیٰؑ اور ہارونؑ سے کہا، میں کب تک اس خبیث گروہ کی جو میری شکایت کرتی رہتی ہے برداشت کروں؟ بنی اسرائیل جو میرے برخلاف شکایتیں کرتے رہتے ہیں میں نے وہ سب شکایتیں سنی ہیں، سو تم ان سے کہہ دو، خداوند کہتا ہے مجھے اپنی حیات کی قسم ہے کہ جیسے تم نے میرے سنتے کہا ہے میں تم سے ضرور ویسا ہی کروں گا، تمھاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمھاری ساری تعداد میں سے یعنی بیس برس سے لے کر اس سے اوپر اوپر

کی عمر کے تم سب جتنے گنے گئے اور مجھ پر شکایت کرتے رہے ان میں سے کوئی اس ملک میں جس کی بابت میں نے قسم کھائی تھی کہ تم کو وہاں بساؤں گا، جانے نہ پائے گا۔ سوائے یفنہ کے بیٹے کالب اور نون کے بیٹے یشوع کے۔ اور تمہارے بال بچے جن کی بابت تم نے یہ کہا کہ وہ تو لوٹ کا مال ٹھہریں گے ان کو میں وہاں پہنچاؤں گا اور جس ملک کو تم نے حقیر جانا وہ اس کی حقیقت پہچانیں گے اور تمہارا یہ حال ہو گا کہ تمہاری لاشیں اس بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمہارے لڑکے بالے چالیس برس تک بیابان میں پھرتے اور تمہاری زناکاریوں[1] کا پھل پاتے رہیں گے۔ گنتی باب ۱۴: ۲۷-۲۴

اجتماعیات کا ایک اہم سبق

اس صحرا گردی کے دوران میں بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کی قیادت سے بھی محروم ہو گئے اور ان کی وہ پوری نسل بھی ختم ہو گئی جس نے قبطیوں کی غلامی کے زیر سایہ پرورش پائی تھی البتہ وہ نسل باقی رہی جو اس صحرا کی فضا میں پلی اور جوان ہوئی۔ اسی نے بعد میں یوشع کی قیادت میں موعودہ سرزمین کو فتح کیا۔ اس سے ہمارے بعض علمائے اجتماعیات نے یہ نتیجہ نکالا ہے اور صحیح نتیجہ نکالا ہے کہ آزادی و حکمرانی کی ذمہ داریوں کے لیے خود اعتمادی اور اولوالعزمی ضروری ہے۔ مصر کی غلامی نے یہ چیز بنی اسرائیل کے اندر سے ختم کر دی تھی قدرت نے ان کو صحرا کی بھٹی میں تپا کر از سرنو ان کے اندر یہ جوہر پیدا کیا تب وہ اس قابل ہو سکے کہ کسی ملک کو فتح اور اس پر حکومت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے ضابطے اور قاعدے بنائے ہیں اور یہ ضابطے اور قاعدے بالکل بے لاگ ہیں۔ قدرت نے اجتماعی ترقی کے لیے جو زینے ٹھہرا دیے ہیں ان کو طے کیے بغیر کوئی قوم بام ترقی پر نہیں پہنچ سکتی، اگرچہ وہ حضرت ابراہیمؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر کی نسل ہی سے کیوں نہ ہو۔ تاریخ بنی اسرائیل کے اس واقعے نے ان کے اس زعم کی پوری پوری تردید کر دی جس کا حوالہ اوپر گزرا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے محبوب اور چہیتے سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے عمل و اطاعت کی ذمہ داریوں سے اپنے کو بری خیال کیے بیٹھے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا یہ گمان کچھ حقیقت رکھتا ہے تو موسیٰ کی موجودگی میں تو تم اور بھی زیادہ چہیتے تھے، پھر اس وقت ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے ڈگ ڈال دیے تھے تو خدا خود تمہیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جاتا اور فلسطین کا بادشاہ بنا دیتا۔ پھر خدا کی جنت کو تم یونہی مفت میں حاصل کرنے کے خبط میں کیوں مبتلا ہو!

۱۰- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۷-۳۱

قصۂ ہابیل و قابیل کی تعلیم

آگے آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بیان ہوا ہے۔ یہ قصہ یوں مذکور تو تورات میں بھی ہے لیکن تورات کے عام انداز کے مطابق، اس کی نوعیت بس نسل آدم کی ابتدائی تاریخ کے ایک قصے کی ہے۔ اس سے یہ

---

[1] یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ زناکاری کا لفظ تورات میں خدا کے ساتھ بدعہدی اور بے وفائی کے لیے بکثرت استعمال ہوا ہے۔

واضح نہیں ہوتا کہ اس کے اندر وہ کیا حکمت و موعظت ہے جس کے لیے یہ قصہ بیان ہوا ہے۔ قرآن نے اس کو اس کی حکمت و موعظت کے ساتھ بیان فرمایا اور اس کے ان حصوں کو بھی واضح کیا جو تورات کے راویوں نے ضائع کر دیے تھے حالانکہ وہ سبق آموزی کے لیے نہایت ضروری تھے۔ یہ قصہ یہاں قرآن میں جن حقائق کو واضح کرنے کے لیے بیان ہوا ہے ان کی تفصیل تو آیات کی تفسیر کے ضمن میں آئے گی لیکن چند اصولی باتوں کی طرف ہم یہاں بھی اشارہ کیے دیتے ہیں تاکہ سلسلۂ کلام سمجھ میں آجائے۔

سب سے پہلے تو یہ حقیقت اس سے واضح ہوتی ہے کہ عہد الٰہی پر قائم رہنے کے لیے مقدم شے یہ ہے کہ آدمی کے اندر خدا کا ایسا خوف ہو جو سخت سے سخت آزمائش کے موقع پر بھی اس کے قدم راہ حق پر استوار رکھے۔

دوسری یہ کہ نقض عہد کا باعث وہ فاسد جذبات ہیں جو شیطان کی انگیخت سے پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر وہ انسان کو ایسے جرائم پر آمادہ کر دیتے ہیں جو عہد الٰہی کے بالکل منافی ہوتے ہیں۔

تیسری یہ کہ جس طرح اللہ کے نیک بندے یوشع اور کالب، عام فساد اخلاق و کردار کے باوجود اللہ کے عہد پر استوار رہے، انھوں نے اپنی جان کی پروا نہیں کی، اسی طرح اللہ کے نیک بندے ——— ہابیل ——— نے اپنے بھائی قابیل کے ظلم و تعدی کے مقابل میں اپنے آپ کو حق و عدل پر استوار رکھا اور قابیل کی دشمنی اس کو حق و عدل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ اسی حق و عدل کی حفاظت میں انھوں نے اپنی جان قربان کر دی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى اور كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ کے علمبرداروں کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ اس راہ کا سب سے پہلا شہید آدمؑ کا بیٹا ہابیل ہے جس نے اپنے عمل سے بعد کی نسلوں کے لیے یہ زندۂ جاوید مثال قائم کی کہ حق پر مر جانا باطل پر زندہ رہنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

چوتھی یہ کہ خدا پر ایمان، خدا کی عبادت، عبادت کے لیے اخلاص و تقویٰ کی شرط، عدل کا تصور، قتل نفس کا جرم ہونا، جنت اور دوزخ کا عقیدہ یہ سب چیزیں انسان کی ابتدائے آفرینش ہی سے اس کو تعلیم ہوتی ہیں۔ ان کا عہد جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی اور اس کی امت سے لیا ہے اسی طرح آدمؑ اور ان کی ذریت سے بھی لیا تھا۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائی انسان حق و عدل کے ان تصورات سے بالکل خالی تھا جو اب اس کے اندر پائے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان ایک طویل فکری و اخلاقی سفر ارتقا کے بعد ان تصورات تک پہنچا ہے، پہلے وہ ان چیزوں سے بالکل محروم تھا۔ ہم اس خیال کے باطل ہونے پر دوسرے مقام میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں[1]۔ اس

---

[1] ملاحظہ ہوں ہماری کتاب حقیقت شرک و توحید کے حصہ اول کے آخری مباحث اور اسلامی قانون کی تدوین کا پہلا باب۔

روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

قع آیات ۲۷-۳۱ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ
مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا
النصف يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ
مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْۗاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ
مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ
قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا
يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ
يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ
مع فقرہ ۵ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

ترجمۂ آیات ۲۷-۳۱ اور ان کو آدم کے دو بیٹوں کی سرگزشت اس کی حکمت کے ساتھ سناؤ جب کہ ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قربانی قبول نہیں ہوئی۔ وہ بولا کہ میں تجھے قتل کر کے رہوں گا۔ اس نے جواب دیا کہ اللہ تو صرف اپنے متقی بندوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔ اگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے مجھ پر دست درازی کرو گے تو میں تم کو قتل کرنے کے لیے تم پر دست درازی کرنے والا نہیں۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا گناہ اور اپنا گناہ دونوں تمہی لے کر لوٹو اور جہنم والوں میں سے بنو، یہی سزا ہے ظالموں کی۔ ۲۷-۲۹

بالآخر اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر لیا اور وہ اس کو قتل کر

کے نامرادوں میں سے ہو گیا۔ پھر خدا نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین میں کریدتا تھا تاکہ وہ اس کو دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح چھپائے۔ وہ بولا کہ ہائے میری کم بختی! کیا میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو ڈھانک دیتا۔ سو وہ اس پر شرمسار ہوا۔ ۳۰-۳۱

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۲۷)

'وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ' 'عَلَيْهِمْ' میں ضمیر کا مرجع اہل کتاب بالخصوص یہود ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ اگرچہ واقعے میں جو موعظت و نصیحت ہے وہ عام ہے، وہ جس طرح یہود کے لیے سبق آموز ہے اسی طرح اس امت کے لیے بھی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے بھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم کے دونوں بیٹوں کا واقعہ اس امت کے لیے بطور مثال بیان ہوا ہے تو ان میں سے اچھے کی مثال کی پیروی کرو۔ تاہم اس کا براہ راست خطاب یہود ہی سے ہے کیونکہ یہود نے اس امت کے معاملے میں بالکل وہی روش اختیار کی جو قابیل نے ہابیل کے معاملے میں اختیار کی۔ جس طرح ہابیل کی عند اللہ مقبولیت سے قابیل پر حسد کا بخار جو چڑھا تو وہ حق و عدل کا خون کر کے اترا، اسی طرح یہود نے جب اس امت پر رب کی نوازش دیکھی تو وہ حسد کے جنون میں ایسے باؤلے ہو گئے کہ بدبختی و شقاوت کی آخری حد کو پہنچ گئے۔

خدا کی زمین پر عدل اور ظلم کی پہلی کشمکش

'نَبَا' کسی اہم حادثے اور واقعے کی خبر کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ واقعہ اس آسمان کے نیچے، عدل و ظلم، وفاداری و عہد شکنی، خدا خوفی اور تعدّی کی کشمکش کا سب سے پہلا واقعہ ہے اور بالکل پہلی بار خدا کی اس زمین پر حق کی راہ میں ایک حق پرست کا خونِ ناحق بہا، اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'نبا' سے تعبیر فرمایا تاکہ اس کی اہمیت واضح ہو سکے۔

بالحق کا مفہوم

'بِالْحَقِّ' سے مقصود، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، ٹھیک ٹھیک اور حکمت و موعظت کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے سنانا ہے۔ واقعات اگر محض داستان سرائی کے لیے بیان کیے جائیں تو یہ ایک کار عبث ہے۔ ان کے بیان کا نفع صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب وہ اس حکمت و موعظت

کے ساتھ بیان کیے جائیں جو ان کے اندر مضمر ہے اور ٹھیک ٹھیک بیان کیے جائیں۔ تورات میں یہ عیب ہے کہ نہ تو واقعات ٹھیک ٹھیک بیان ہوئے ہیں اور نہ ان سے وہ حکمت و نصیحت ہی واضح ہوتی ہے جو واضح ہونی چاہیے۔ یہی حال ہماری بیشتر تاریخ کی کتابوں کا ہے جس کے سبب سے تاریخ کا فن ایک بالکل بیکار فن بن کے رہ گیا ہے۔ ہم مذکورہ واقعہ یہاں تورات سے نقل کرتے ہیں۔ اس کو پڑھیے اور پھر قرآن کے بیان سے مقابلہ کرکے دیکھیے تو اس سے خود اندازہ ہو جائے گا کہ 'بالحق' بیان کرنے کا مقصد کیا ہے۔ تورات میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے۔

ہابیل وقابیل کا قصہ تورات میں

> اور آدم اپنی بیوی حوا کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور اس کے قائن پیدا ہوا۔ تب اس نے کہا مجھے خداوند سے ایک مرد ملا۔ پھر قائن کا بھائی ہابل پیدا ہوا۔ اور ہابل بھیڑ بکریوں کا چرواہا اور قائن کسان تھا۔ چند روز کے بعد یوں ہوا کہ قائن اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل اور اس کے ہدیے کو منظور کیا۔ پر قائن کو اور اس کے ہدیے کو منظور نہ کیا۔ اس لیے قائن نہایت غضب ناک ہوا اور اس کا منہ بگڑا اور خداوند نے قائن سے کہا تو کیوں غضب ناک ہوا؟ اور تیرا منہ کیوں بگڑا ہوا ہے؟ اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا؟ اور اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازے پر دبکا بیٹھا ہے اور تیرا مشتاق ہے پر تو اس پر غالب آ۔ اور قائن نے اپنے بھائی ہابل کو کچھ کہا اور جب وہ دونوں کھیت میں تھے تو یوں ہوا کہ قائن نے اپنے بھائی ہابل پر حملہ کیا اور اسے قتل کر ڈالا۔ تب خداوند نے قائن سے کہا کہ تیرا بھائی ہابل کہاں ہے؟ اس نے کہا مجھے معلوم نہیں، کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں؟ پھر اس نے کہا تو نے یہ کیا کیا؟ تیرے بھائی کا خون زمین سے مجھ کو پکارتا ہے۔ اور اب تو زمین کی طرف سے لعنتی ہوا جس نے اپنا منہ پسارا کہ تیرے ہاتھ سے تیرے بھائی کا خون لے۔ جب تو زمین کو جوتے گا تو اب وہ تجھے اپنی پیداوار نہ دے گی اور زمین پر تو خانہ خراب اور آوارہ ہوگا۔ (کتاب پیدائش باب ۴: ۱-۱۲)

قرآن اور تورات کے بیان میں واضح فرق

یہ بیان قرآن کے بیان سے یوں تو کئی پہلوؤں سے مختلف ہے، اگر ہمیں اپنے دائرۂ بحث سے ہٹ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم ان کی طرف اشارہ کرتے لیکن ایک چیز تو ایسی واضح ہے کہ بالکل پہلی ہی نظر میں سامنے آتی ہے، تورات میں ہابیل کے کردار کے وہ سارے پہلو غائب ہیں جو اس سرگزشت کی جان اور تمام عالم انسانی کے لیے نمونہ اور مثال ہیں۔ قرآن نے چونکہ اس سرگزشت کو 'بالحق' پیش کیا ہے اس وجہ سے ان پہلوؤں کو اس نے اچھی طرح نمایاں کیا ہے اور ہر انصاف پسند اعتراف کرے گا کہ ان کے نمایاں ہونے سے ہابیل کی سرگزشت نے 'قَآئِمِیْنَ بِالْقِسْطِ' کے سلسلۃ الذہب کی بالکل پہلی کڑی کی حیثیت

حاصل کر لی۔ قابیل کا کردار بھی تورات میں بالکل ادھورا پیش کیا گیا ہے۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے اس کے کردار کے بعض ایسے گوشے بے نقاب کیے ہیں جو شریعت الٰہی کے بعض احکام کی حکمت و مصلحت سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہی باتیں جو تورات کے ذخیرے میں بالکل خزف ریزوں کی شکل میں ہیں قرآن میں آکر جواہرات کی طرح چمک اٹھی ہیں۔

قابیل کی قربانی کی عدم قبولیت

'اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ' 'قربان' کا لفظ صدقہ اور قربانی دونوں کے لیے آتا ہے۔ جو چیز بھی اللہ کے حضور بقصد قرب الٰہی پیش کی جائے وہ قربان ہے۔ یہاں قرآن نے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ ہابیل اور قابیل کو قبولیت اور عدم قبولیت کا پتہ کس طرح چلا اس لیے کہ یہ وضاحت قرآن کے پیش نظر مقصد کے لحاظ سے غیر ضروری تھی۔ لیکن تورات کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خبر خداوند نے دی تھی۔ خداوند کی بات سننے اور جاننے کا ایک ذریعہ ہاتف غیب بھی ہے۔ تورات میں اس کا ذکر بہت سے مقامات میں آیا ہے۔

قابیل پر حسد کا دورہ

'قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ' قابیل کو یہ جان کر کہ اس کی قربانی قبول نہیں ہوئی بجائے اس کے کہ اپنی نیت کے کھوٹ کی طرف توجہ ہوتی، غصہ ہابیل پر آیا کہ اس کی قربانی کیوں قبول ہوئی۔ حالانکہ اس کی قربانی قبول نہ ہونے میں ہابیل کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ اس میں سارا قصور خود اس کا اپنا تھا لیکن جب آدمی پر حسد کا دورہ پڑتا ہے تو اس کو اپنی نالائقیاں نظر نہیں آتیں بلکہ وہ اپنی تمام ناکامیوں کے اسباب دوسروں کے اندر ڈھونڈتا ہے اور اس غصے میں ان کے درپے انتقام و آزار ہو جاتا ہے۔ افراد میں اس بدبختانہ کردار کی سب سے پہلی مثال قابیل نے پیش کی ہے اور اقوام میں یہود نے۔ اسی وجہ سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ سرگزشت یہود کو سنائی گئی ہے کہ اس آئینے میں وہ ذرا اپنے منہ دیکھ لیں کہ آج بھی ہابیل و قابیل کا وہی قصہ دہرایا جا رہا ہے جو بہت پہلے پیش آچکا ہے اور جس کی روایت بھی دنیا کو یہود ہی کے واسطے سے پہنچی ہے۔

ہابیل کی زبان سے فلسفۂ قربانی کا بیان

'اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ' یہ ہابیل کی زبان سے وہی حکمت بیان ہوئی ہے جو قرآن میں لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (۳۷-حج) کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔ یہ بات ہابیل نے قابیل کو اصل حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے کہی۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس غصے میں کہ تمہاری قربانی قبول نہیں ہوئی میرے قتل کے درپے ہو گئے ہو حالانکہ اس میں نہ قصور میرا ہے، نہ خداوند کا ہے بلکہ سراسر قصور تمہارا اور تمہاری قربانی کا ہے۔ خداوند کے ہاں قربانی درخور قبول وہ ٹھہرتی ہے جو خدا سے ڈرنے والے بندے قربانی کے آداب و شرائط کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ ضابطہ جس طرح تمہارے لیے ہے اسی طرح میرے لیے بھی ہے تو قربانی رد ہونے کا غم و غصہ ہے تو فکر تقویٰ کی کرو، نہ کہ میرے قتل کرنے کی۔ میرے قتل کرنے سے تمہاری قربانی کی قبولیت کی راہ کس طرح کھلے گی۔

لَئِنْ بَسَطْتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِيَ إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ ۖ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ (۲۸)

قابیل کے ارادۂ قتل کے مقابل میں ہابیل کا مومنانہ رویہ

'بسطِ ید' کے معنی ہاتھ بڑھانے اور دست درازی کرنے کے ہیں۔ یہاں بارادۂ قتل ہاتھ بڑھانے کا ذکر ہے اس وجہ سے اس کے معنی اقدامِ قتل کے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم جیسا کہ دھمکی دے رہے ہو، میرے قتل کے لیے اقدام کرنا چاہتے ہو تو میں یہ فرض کر کے کہ تم میرے قتل کے درپے ہو، تمہارے قتل کے لیے پہل کرنے والا نہیں ہوں۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں جس نے مجھ کو اور تم کو دونوں کو پیدا کیا ہے، اور جس نے ایک دوسرے کے جان و مال کے احترام کی ہدایت فرمائی ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہاں کھلے ہوئے دینی دشمن کے ساتھ میدانِ جنگ میں مقابلے کی صورت نہیں بلکہ بھائی اور بھائی کا معاملہ ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کو قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔ اس صورت میں صحیح مومنانہ رویہ یہی ہے کہ آدمی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا کوئی بھائی اس کے قتل کے درپے ہے اس کے قتل کے لیے پہل نہ کرے۔ لیکن 'پہل نہ کرے' یہ نہیں کہ اپنا بچاؤ بھی نہ کرے۔ ہابیل نے پہل کرنے کی نفی کی ہے، بچاؤ کی نفی نہیں کی ہے۔ اپنی جان یا اپنے مال کی مدافعت کرنا خوفِ خدا کے منافی بات نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ایک شخص اگر مجھ سے میرا مال چھیننا چاہتا ہے تو میں اس کے ساتھ کیا معاملہ کروں؟ ارشاد ہوا اس کو خدا کا خوف دلاؤ۔ سائل نے کہا، اگر وہ خدا کا خوف نہ مانے، ارشاد ہوا اپنے گرد و پیش کے مسلمانوں سے اس کے مقابلے کے لیے مدد چاہو۔ سائل نے کہا اگر میرے گرد و پیش ایسے لوگ نہ ہوں۔ ارشاد ہوا پھر حکومت سے مدد چاہو۔ سائل نے کہا اگر حکومت کے ذمہ دار بھی دور ہوں، ارشاد ہوا اپنے مال کی حفاظت کے لیے لڑو تا آنکہ اپنے مال کو بچا لو یا شہید ہو جاؤ۔

إِنِّي أُرِيدُ أَنْ تَبُوءَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ فَتَكُونَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ (۲۹)

'باثمی و اثمک' کا مفہوم

'بِاِثْمِیْ وَاِثْمِکَ' دونوں میں مضاف محذوف ہے یعنی میں تمہارے قتل میں پہل اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ میں کوئی بارِ گناہ اپنے سر لیے ہوئے اپنے رب کی طرف پلٹنا نہیں چاہتا۔ اگر تم اس جرم کے لیے پہل کرنا چاہتے ہو تو کرو۔ اگر تم مجھے قتل کر دو گے تو میرے قتل کا بارِ گناہ بھی تمہارے سر ہوگا اور میری طرف سے مدافعت کے نتیجے میں اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا یا تم قتل ہو گئے تو اس کا بارِ گناہ بھی تمہارے ہی سر ہوگا، اس لیے کہ اس کا سبب میں نہیں بلکہ تم ہی ہو گے۔ یہ اس اصولِ عدل کی طرف اشارہ ہے جو ایک حدیث میں 'فعلی البادی مالم یعتد المظلوم' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے یعنی اگر مظلوم نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے تو جو کچھ اسے اپنی عزت کی حفاظت کے لیے کرنا پڑے اس کا بارِ گناہ پہل کرنے والے پر ہے۔ 'باثمی' کے ساتھ 'باثمک' مشاکلت کے اس اصول پر فرمایا ہے جو عربی زبان میں نہایت معروف ہے، مثلاً 'دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوا'، یا 'جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا'۔

فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ، قتلِ مومن، جب کہ عمداً ہو، کی سزا جہنم ہے۔ قتلِ مومن
اس مسئلے پر سورۂ نساء کی آیت ۹۳ کے تحت تفصیل سے ہم لکھ چکے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جرم کی سزا جہنم
کی سزا ابتدا سے شریعتِ الٰہی میں یہی معروف ہے۔

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ ۭ قَالَ یٰوَیْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ ۝ (۳۰-۳۱)

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ، کے معنی ہوں گے اس کے نفس نے اس کو بالآخر اپنے بھائی کے قابیل کی
قتل پر آمادہ کر ہی لیا۔ اس اسلوبِ بیان سے اس اندرونی کشمکش کا اظہار ہو رہا ہے جو اول اول اس نامرادی
ارادۂ قتل سے اس کے اندر پیدا ہوئی۔ انسان کے اندر قدرت نے ایک نفسِ لوامہ ودیعت فرمایا ہے جو اس
وقت تک کسی ارادۂ جرم کے خلاف احتجاج کرتا ہے جب تک مختلف تاویلوں اور بہانوں سے آدمی اس
کی زبان بند نہ کر دے۔ قابیل کو بھی اس مرحلے سے گزرنا پڑا لیکن بالآخر اس کے حسد نے اس کو اس ہولناک
جرم پر آمادہ کر ہی لیا۔ ابتداءً ہر مجرم کو یہ جھجک پیش آتی ہے لیکن جب وہ جرم پر جرم کیے چلا جاتا ہے تو اس کا
نفسِ لوامہ یا بالفاظِ دیگر اس کا ضمیر بالکل مردہ ہو جاتا ہے اور وہ جرائم کے لیے بالکل بے باک ہو جاتا ہے۔

فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ، میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کی ہر کشمکش انسان کے سامنے
آزمائش کا ایک میدان کھول دیتی ہے جس میں اس کے لیے نامرادی اور فتحمندی دونوں کا امکان موجود ہوتا ہے
اگر انسان اس کشمکش میں اپنے نفس کو زیر کر لے تو وہ فتحمند رہتا ہے اور اس کا نفس شکست کھا جاتا ہے
اور اگر نفس اس کو زیر کر لے تو اس کا نفس فتحمند رہتا ہے اور وہ خود نامراد ہو جاتا ہے۔ قابیل پر اس کا نفس
غالب آ گیا اس وجہ سے وہ نامراد ہوا۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا الایۃ۔ قتل کے بعد قابیل نے، معلوم ہوتا ہے، اپنے بھائی کی لاش یوں ہی شیطان کتے
پڑی چھوڑ دی تھی، اس کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اتنے میں ایک کوا نمودار ہوا۔ کوا جیسا کہ معلوم ہوتا ہے کے بھیس میں
اس کی عادت ہے کہ جب وہ کوئی کھانے کی چیز اچکتا ہے اور بروقت اس کو کھانا نہیں چاہتا تو زمین کرید
کر یا کسی چیز کے نیچے اس کو ضرورت کے وقت کے لیے چھپا رکھتا ہے۔ اس کوے نے بھی قابیل کے سامنے
یہی نمائش کی اور اس طرح گویا اس کو یہ سجھائی دی کہ وہ بھی اسی طرح اپنے بھائی کی لاش چھپا دے کہ دوسروں
کی نظر نہ پڑے اور اس کا جرم افشا نہ ہو۔ کوے کے اس سیانے پن کو دیکھ کر قابیل نے اپنا سر پیٹ لیا کہ لٹے
میری بدبختی کہ میں کوے سے بھی گیا گزرا ثابت ہوا کہ یہ تدبیر مجھے نہ سوجھی کہ میں بھی اسی طرح بھائی کی لاش کو
ڈھانک دیتا۔ چنانچہ اپنی اس بے وقوفی پر اس کو بڑی ندامت ہوئی۔

قرآن نے اس ٹکڑے سے یہ نمایاں کیا ہے کہ جو خدا سے نہیں ڈرتے وہ خلق سے ڈرتے ہیں اور جو خدا کے حکم

اور ضمیر کی آواز کی پروا نہیں کرتے وہ کوّے سے الہام حاصل کرتے اور جرم کرنے کے بعد اعتراف اور ندامت کے بجائے اس کو چھپانے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کوا شیطان کی تمثال ہے۔ شیطان نے پہلے تو قابیل کے نفس کے اندر وسوسہ اندازی کر کے اس کو بھائی کے قتل پر آمادہ کیا اور جب وہ یہ جرم کر گزرا تو کوّے کے واسطے سے اس کو جرم کے چھپانے کی تدبیر سجھائی اور اس طرح اولادِ آدمؑ کو گمراہ کرنے کی جو قسم اس نے کھائی تھی اس کی تکمیل کی راہ میں ایک نہایت کامیاب قدم اس نے اٹھایا۔

ایک سنتِ الٰہی

یہاں کوّے کو بھیجنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو فرمائی ہے یہ درحقیقت اس سنت اللہ کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے جس کے تحت یہ فعل ظہور میں آیا۔ اس کی متعدد مثالیں پچھلے صفحات میں بیان ہو چکی ہیں۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص اللہ کی آیات، اس کے احکام اور اس کی تنبیہات سے اپنے کان اور اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتا ہے جو اس کا ساتھی بن کر اس کو اس کی خواہشات کی وادیوں میں ٹھوکر کھلاتا پھرتا ہے۔ سورۂ زخرف میں اس سنت اللہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (۳۶) (جو خدائے رحمان کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے، ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو اس کا شب و روز کا ساتھی بن جاتا ہے) سورۂ فصلت میں ہے۔ وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (اور ہم نے ان کے لیے برے ساتھی مقرر کر دیے جنھوں نے ان کے پیش و عقب کو خوب مزین کر کے دکھایا) اوپر گزر چکا ہے کہ ہابیل نے قابیل کو بڑی مؤثر اور دل نشین نصیحتیں بھی کیں اور اپنے قول کی صداقت روز روشن کی طرح ثابت بھی کر دی لیکن اس کا دل ذرا نہ پسیجا۔ ایک ایسے سنگدل کا خدا کی مذکورہ سنت کی زد میں آ جانا ایک امر بدیہی ہے۔

عام طور پر مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ کوّا قابیل کو یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح دفن کرے۔ وہ مدتوں اپنے بھائی کی لاش اپنی کمر پر لادے لادے پھرا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ اس کو کیا کرے۔ بالآخر جب لاش سڑ گئی تب خدا نے ایک کوّے کو بھیجا جس نے ایک دوسرے کوّے کو قتل کر کے زمین میں دفنایا تب قابیل کو بھائی کی لاش ٹھکانے لگانے کا طریقہ معلوم ہوا۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے اس کے بعد اس عجیب و غریب بات کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ـــــــ آیات ۳۲-۳۴

انسانیت کی بنیاد

آگے فرمایا کہ چونکہ انسان اپنی سرشت کے لحاظ سے ایک ایسی مخلوق ہے جس کے اندر ہابیل جیسے خدا ترس اور حق و عدل پر قائم رہنے والے بھی ہیں اور قابیل جیسے سنگ دل اور خونی بھی۔ اس وجہ سے

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی شریعت میں قصاص کو ایک جماعتی فرض قرار دیا کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل اور ایک کا بچانے والا سب کا بچانے والا ٹھہرے گا۔ پھر اس قانون کی تجدید و یاد دہانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر اپنے نبی و رسول بھی بھیجے لیکن اس سارے اہتمام کی بنی اسرائیل نے کوئی پروا نہ کی بلکہ وہ برابر قابیل کی سنت بد کی پیروی میں خدا کی زمین میں فساد و خوں ریزی برپا کیے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد ان لوگوں کی سزا بیان کی ہے جو ایک اسلامی حکومت علاقہ کے اندر رہتے ہوئے اس کے قانون عدل و قسط کو درہم برہم کرنے اور ملک میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، عام اس سے کہ یہ کوشش نام کے مسلمانوں کی طرف سے ہو یا غیر مسلموں کی طرف سے، علانیہ ہو یا در پردہ سازشوں کی شکل میں، جتھہ بندی کر کے ہو، یا غنڈا گردی کی شکل میں۔ جو مفسدانہ سرگرمی بھی ملک کے سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی نظام کے لیے خطرہ بن جائے اور اس سے قانون اور نظم کا مسئلہ پیدا ہو جائے اس کے استیصال اور اس کے مجرموں کی سرکوبی کے لیے حکومت کے ارباب حل و عقد کو وسیع اختیارات دیے گئے ہیں تاکہ قیام عدل کا جو فریضہ ان پر عاید ہوتا ہے وہ اس سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم
آیات ۳۲-۳۴

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ
نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ
جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ
جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ
فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا
اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ
الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ
فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾ ع ۵

ترجمۂ آیات ۳۲-۳۴

اس وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ فرض کیا کہ جس کسی نے کسی کو قتل کیا بغیر

اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سب کو قتل کیا اور جس نے اس کو بچایا تو گویا سب کو بچایا اور ہمارے رسول ان کے پاس واضح احکام لے کر آئے لیکن اس کے باوجود ان میں بہت سے ہیں جو زیادتیاں کرتے ہیں۔ ۳۲

ان لوگوں کی سزا، جو اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کرتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں، بس یہ ہے کہ عبرت ناک طور پر قتل کیے جائیں یا سولی پر لٹکائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے باہر نکال دیے جائیں۔ یہ ان کے لیے اس دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ایک عذاب عظیم ہے مگر جو لوگ تمھارے قابو پانے سے پہلے ہی توبہ کرلیں تو سمجھ لو کہ اللہ مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے۔ ۳۳-۳۴

۱۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ (۳۲)

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ کا مفہوم

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بعینہٖ یہ واقعہ حکم قصاص کی فرضیت کا باعث ہوا۔ یہ واقعہ تو جیسا کہ واضح ہوا، بنی اسرائیل کی تاریخ سے بہت پہلے کا ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جان کے بدلے جان کا قانون، کچھ بنی اسرائیل کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ یہ قانون ہر ملت میں ابتدا سے موجود رہا ہے۔ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی ملت میں بھی یہ قانون موجود تھا۔ حضرت نوحؑ اور ان کی ذریت کو اس باب میں جو ہدایت ہوئی تھی وہ تورات میں یوں مذکور ہے۔

آدمی کی جان کا بدلہ آدمی سے اور اس کے بھائی بند سے لوں گا۔ جو آدمی کا خون کرے گا اس کا

خون آدمی سے ہوگا، کیونکہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ پیدائش باب ۹: ۶

اس وجہ سے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ بعینہٖ یہ واقعہ بنی اسرائیل پر حکم قصاص کے وجوب کا باعث ہوا۔ یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ یہاں مقصود حکم قصاص کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ بنی اسرائیل اللہ کے میثاق کے معاملے میں اتنے جری اور بے باک ہیں کہ یہ جاننے کے باوجود کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل اور ایک کی حفاظت سب کی حفاظت ہے، برابر خدا کی زمین میں فساد برپا کیے چلے جا رہے ہیں۔ یہی روش ان کی پہلے بھی رہی اور یہی روش ان کی آج بھی ہے۔

اس روشنی میں مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ کا اشارہ نفس واقعہ کی طرف نہیں بلکہ شر و فساد کی اس ذہنیت کی طرف ہوگا جس کا قابیل نے اظہار کیا اور جس کا اظہار ان لوگوں کی طرف سے برابر ہوتا رہتا ہے جو اس کی سنتِ بد کی پیروی کرتے ہیں۔ یعنی کینہ، جذبات اور شیطانی محرکات کے تحت اللہ کے بندوں کا خون بہاتے ہیں اور پھر اعتراف و اقرار اور توبہ و ندامت کے بجائے اپنی ساری ذہانت اس جرم کو چھپانے میں صرف کرتے ہیں۔ ان کو اپنے جرم پر افسوس بھی ہوتا ہے تو اس پہلو سے نہیں ہوتا کہ ان کے ہاتھوں خدا کے بندوں کا سب سے بڑا حق تلف ہوا بلکہ جرم پوشی کی تدبیریں اگر ان سے کوئی کوتاہی ہو جاتی ہے تو اس پر انھیں افسوس ہوتا ہے۔

قانونِ قصاص کی حکمت و علت

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ یہ اس اصل حکم کا بیان نہیں ہے جو قصاص کے باب میں یہود کو دیا گیا۔ بلکہ اس کی دلیل اور اس کی حکمت و علت بیان ہوئی ہے۔ "جان کے بدلے جان" کا قانون تورات میں بھی ہے اور اس کا حوالہ اس سورہ میں بھی آگے آ رہا ہے۔ یہاں چونکہ مقصود یہود کی شرارت و شقاوت کو نمایاں کرنا ہے اس وجہ سے قانون قصاص کا اصل فلسفہ بیان فرمایا کہ یہود پر قتل نفس کی سنگینی واضح کرنے کے لیے ان کو یہ حکم اس تصریح کے ساتھ دیا گیا تھا کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل اور ایک کا بچانے والا سب کا بچانے والا ٹھہرے گا لیکن پھر بھی وہ قتل اور فساد فی الارض کے معاملے میں بالکل بے باک ہو گئے۔

قانونِ قصاص کی ذمہ داریاں

جو قانون قصاص کی حامل اس فلسفہ کے ساتھ بنائی گئی ہو جس کا ذکر اوپر ہوا، اس پر چند ذمہ داریاں لازماً عاید ہوتی ہیں جس کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

ہر فرد قتل پر

ایک یہ کہ ہر حادثۂ قتل پوری قوم میں ایک ہلچل پیدا کر دے۔ جب تک اس کا قصاص نہ لے لیا جائے ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ اس تحفظ سے محروم ہو گیا ہے جو اس کو اب تک حاصل تھا۔ قانون ہی سب کا محافظ ہوتا ہے۔ اگر قانون ہدم ہو گیا تو صرف مقتول ہی قتل نہیں ہوا بلکہ ہر شخص قتل کی زد میں ہے۔

دوسری یہ کہ قاتل کا کھوج لگانا صرف مقتول کے وارثوں ہی کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ پوری جماعت کی ذمہ داری ہے، اس لیے کہ قاتل نے صرف مقتول ہی کو قتل نہیں کیا بلکہ سب کو قتل کیا ہے۔

تیسری یہ کہ کوئی شخص اگر کسی کو خطرے میں دیکھے تو اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر نظر انداز کرنا اس کے

لیے جائز نہیں ہے بلکہ اس کی حفاظت و حمایت تا بہ حدِ امکان اس کے لیے ضروری ہے، اگرچہ اس کے لیے اسے خود جوکھم برداشت کرنی پڑے۔ اس لیے کہ جو شخص کسی مظلوم کی حمایت و مدافعت میں سینہ سپر ہوتا ہے وہ صرف مظلوم ہی کی حمایت میں سینہ سپر نہیں ہوتا بلکہ تمام خلق کی حمایت میں سینہ سپر ہوتا ہے جس میں وہ خود بھی شامل ہے۔

چوتھی یہ کہ اگر کوئی شخص کسی قتل کو چھپاتا ہے یا قاتل کے حق میں جھوٹی گواہی دیتا ہے یا قاتل کا ضامن بنتا ہے، یا قاتل کو پناہ دیتا ہے، یا قاتل کی دانستہ وکالت کرتا ہے یا دانستہ اس کو جرم سے بری کرتا ہے وہ گویا خود اپنے اور اپنے باپ، بھائی، بیٹے کے قاتل کے لیے یہ سب کچھ کرتا ہے کیونکہ ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے۔

پانچویں یہ کہ کسی مقتول کے قصاص کے معاملے میں مقتول کے وارثوں یا حکام کی مدد کرنا بھی درحقیقت مقتول کو زندگی بخشنا ہے اس لیے کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ قصاص میں زندگی ہے۔

ہم نے یہ اس اصول سے برآمد ہونے والی چند موٹی موٹی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مزید غور کیجیے تو اس کی مزید حکمتیں واضح ہوں گی۔ پھر کس قدر قابلِ ماتم ہے اس قوم کا حال جو اس اصول سے باخبر ہوتے ہوئے قتل و خوں ریزی اور فساد فی الارض میں بالکل بے باک ہو گئی۔

قانون کے ساتھ تنبیہ و تذکیر کا اہتمام — 'وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ'۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کو یہ فرض بتا دینے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اتمامِ حجت کے لیے برابر ان کے اندر خدا کے رسول بھی آتے رہے جو نہایت واضح احکام و ہدایات اور نہایت بلیغ اور پرزور تعلیمات و تنبیہات کے ذریعے سے ان کو جگاتے اور جھنجھوڑتے رہے کہ اللہ کے عہد و میثاق کی ذمہ داریوں سے یہ غافل نہ ہو جائیں لیکن اس سارے اہتمام کے باوجود یہ برابر خدا کی زمین میں مختلف قسم کی زیادتیوں کے مرتکب ہوتے رہے۔

فساد اور اسراف کا مفہوم — 'افساد فی الارض' اور 'اسراف فی الارض' دونوں میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ زمین کا امن اور نظم اس قانونِ عدل و قسط پر منحصر ہے جو خدا نے اس کے لیے اتارا ہے۔ جس طرح کائنات کے نظامِ تکوینی میں کوئی خلل پیدا ہو جائے تو سارا نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے، اسی طرح اگر اس نظامِ تشریعی میں، جو اس کے خالق نے اس کے لیے پسند فرمایا ہے، کوئی خلل پیدا کر دیا جائے تو اس کا اجتماعی و معاشرتی اور سیاسی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، پھر نہ تو نظامِ تکوینی کے ساتھ اس کے نظامِ سیاسی کی ہم آہنگی ہی باقی رہ جاتی ہے اور نہ اس کے نظامِ اجتماعی و سیاسی میں ہی کوئی ربط قائم رہ جاتا ہے۔ اسی صورتِ حال کو یہاں افساد اور اسراف سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس اصولی حقیقت کے ساتھ ساتھ اس تاریخی حقیقت کو یاد رکھنا بھی یہاں ضروری ہے جس کا تجربہ ان آیات کے نزول کے زمانے میں مسلسل مسلمانوں کو یہود کی طرف سے ہو رہا تھا۔ یہود کے متعدد قبائل مثلاً بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع مدینہ کے حوالی میں آباد تھے۔ انھوں نے یوں تو مسلمانوں کے ساتھ امن و صلح اور

باہمی حمایت و مدافعت کے معاہدے کر رکھے تھے لیکن ایک دن بھی انھوں نے ان معاہدوں کا کوئی احترام نہیں کیا بلکہ ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور مدینہ سے ان کے قدم اکھاڑ دینے کی سازشیں کرتے رہے۔ قریش نے مسلمانوں پر جتنے بھی حملے کیے سب میں درپردہ یہود شریک رہے۔ انصار اور مہاجرین کے درمیان پھوٹ ڈلوانے کی بھی انھوں نے بارہا کوشش کی۔ صحابہؓ بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی بھی انھوں نے بارہا تدبیریں کیں۔ اگرچہ ان کی یہ چالیں بیشتر ناکام رہیں لیکن متعدد نہایت اندوہناک واقعات پیش بھی آئے۔ عورتوں اور بچوں کے اغوا اور قتل میں بھی یہ نہایت شاطر اور سنگ دل تھے۔ مسلمانوں کو ہر وقت یہود کی طرف سے اپنی جان اور عزت کے معاملے میں کھٹکا لگا رہتا تھا۔ حد یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو وہ کسی قضیے کے طے کرانے اور کسی معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے بلاتے تھے ان کے بھی ہلاک کرنے کی سازش پہلے سے تیار کر رکھتے۔ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ، میں اس ساری صورت حال کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

محاربہ کا مفہوم

'يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا' اللہ اور رسول سے محاربہ یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ یا جتھہ جرأت و جسارت، ڈھٹائی اور بیباکی کے ساتھ اس نظام حق و عدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اللہ اور رسول نے قائم فرمایا ہے۔ اس طرح کی کوشش اگر بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہو تو اس کے مقابلے کے لیے جنگ و جہاد کے احکام تفصیل کے ساتھ الگ بیان ہوئے ہیں۔ یہاں بیرونی دشمنوں کے بجائے اسلامی حکومت کے ان اندرونی دشمنوں کی سرکوبی کے لیے تعزیرات کا ضابطہ بیان ہو رہا ہے جو اسلامی حکومت کی رعایا ہوتے ہوئے، عام اس سے کہ وہ مسلم ہیں یا غیر مسلم، اس کے قانون اور نظم کو چیلنج کریں۔ قانون کی خلاف ورزی کی ایک شکل تو یہ ہے کہ کسی شخص سے کوئی جرم صادر ہو جائے۔ اس صورت میں اس کے ساتھ شریعت کے عام ضابطۂ حدود و تعزیرات کے تحت کارروائی کی جائے گی، دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کی کوشش کرے۔ اپنے شر و فساد سے علاقے کے امن و نظم کو درہم برہم کر دے، لوگ اس کے ہاتھوں اپنی جان، مال، عزت، آبرو کی طرف سے ہر وقت خطرے میں مبتلا رہیں۔ قتل، ڈکیتی، رہزنی، آتش زنی، اغوا، زنا، تخریب، ترہیب اور اس نوع کے سنگین جرائم حکومت کے لیے لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں۔ ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے عام ضابطۂ حدود و تعزیرات کے بجائے اسلامی حکومت مندرجہ ذیل اقدامات کرنے کی مجاز ہے۔

'اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا' یہ کہ فساد فی الارض کے یہ مجرمین قتل کر دیے جائیں۔ یہاں لفظ قتل کے بجائے تقتیل،

محاربین کے لیے ضابطہ تعزیرات

باب تفعیل سے استعمال ہوا ہے۔ باب تفعیل معنی کی شدت اور کثرت پر دلیل ہوتا ہے اس وجہ سے تقتیل نہ تقتیل کے معنی پر دلیل ہوگا۔ اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ ان کو عبرت انگیز اور سبق آموز طریقہ پر قتل کیا جائے جس سے دوسروں کو سبق ملے۔ صرف وہ طریقۂ قتل اس سے مستثنیٰ ہوگا جو شریعت میں ممنوع ہے مثلاً آگ میں جلانا، اس کے ماسوا دوسرے طریقے جو گنڈوں اور بدمعاشوں کو عبرت دلانے، ان کو دہشت زدہ کرنے اور لوگوں کے اندر قانون و نظم کا احترام پیدا کرنے کے لیے ضروری سمجھے جائیں، حکومت ان سب کو اختیار کر سکتی ہے۔ رجم یعنی سنگسار کرنا بھی ہمارے نزدیک 'تقتیل' کے تحت داخل ہے۔ اس وجہ سے وہ گنڈے اور بدمعاش جو شریفوں کے عزت و ناموس کے لیے خطرہ بن جائیں، جو اغوا اور زنا کو پیشہ بنائیں، جو دن دہاڑے لوگوں کی عزت و آبرو پر ڈاکے ڈالیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوں ان کے لیے رجم کی سزا اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔ رجم کے باب میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے درمیان ہماری فقہ میں جو فرق کیا گیا ہے اس پر انشاءاللہ ہم سورۂ نور کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

'اَوْ يُصَلَّبُوْٓا' یہ کہ ایسے لوگوں کو سولی دے دی جائے۔ سولی دینے کے لیے یہاں 'صلب' کے بجائے 'تصلیب' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ سولی اور پھانسی کے وہ طریقے بھی اختیار کیے جا سکتے جو زیادہ دردناک اور زیادہ عبرت انگیز ہوں۔ اس زمانے میں بعض طریقے جو ایجاد ہوئے ہیں ہمارے نزدیک وہ بھی اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

'اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ' یہ کہ ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دیے جائیں۔ یہ بے ترتیب کاٹنے کی ہدایت بھی عبرت انگیزی اور درد انگیزی ہی کے نقطۂ نظر سے ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اگر اس قسم کے کسی شریر کی جان بخشی بھی جائے تو اس طرح کہ اس کی شر انگیزی اور افساد کے تمام سلاح بے کار کر دیے جائیں۔

'اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ' یہ کہ ان کو ملک سے جلاوطن کر دیا جائے۔ نفی کا لغوی مفہوم جلاوطن کرنا ہے۔ حبس اور قید اس کا لغوی مفہوم نہیں ہے البتہ اس کے مفہوم میں شامل ضرور ہے، اگر ایسے مجرموں کی جلاوطنی دشوار یا دینی و سیاسی نقطۂ نظر سے خلاف مصلحت ہو تو ان کو محبوس یا کسی خاص علاقہ میں پابند اور نظر بند کیا جا سکتا ہے۔ یہ چیز اس لفظ کے مفہوم کے خلاف نہیں ہوگی۔

حالات کی نوعیت کے لحاظ سے حکومت کو تمام اقدام کا اختیار

قرآن کے الفاظ صاف اس بات پر دلیل ہیں کہ حالات کی نوعیت اور بدامنی اور قانون شکنی کے موجود اور متوقع اثرات کے لحاظ سے حکومت ان میں سے جو اقدام بھی مناسب سمجھے، کر سکتی ہے۔ عربی زبان میں 'او' کا استعمال اسی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ اس وجہ سے مجھے ان لوگوں کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے جو حکومت کو اختیار دیتے ہیں کہ قیام امن و قانون اور استیصال فتنہ کے نقطۂ نظر سے ان میں سے جو شکل بھی اس کو مفید و موثر اور مطابق مصلحت نظر آئے اس کو اختیار کر سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات میں

صرف اسی امر کو ملحوظ نہیں رکھنا پڑتا ہے کہ جرم کرنے والے جتھے نے صرف مال کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر زمانہ، مقام اور جتھہ بندی کرنے والے مجرموں کے عزائم اور ارادوں کے اثرات پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ مثلاً زمانہ جنگ یا بدامنی کا ہو تو اس میں لازماً سخت اقدام کی ضرورت ہوگی، اسی طرح مقام سرحدی یا دشمن کی سازشوں کا آماجگاہ ہو تب بھی موثر کارروائی ضروری ہوگی، اگر شرارت کا سرغنہ کوئی بڑا خطرناک آدمی ہو اور اندیشہ ہو کہ اس کو ڈھیل ملی تو بستیوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو خطرہ پیش آجائے گا تب بھی حالات کے لحاظ سے مؤثر قدم اٹھانا پڑے گا۔ غرض اس میں اصل اہمیت جزوی واقعات کی نہیں بلکہ بغاوت کے مجموعی اثرات اور ملک و ملت کے مصالح کی ہے۔

سزا جماعتی حیثیت سے دی جائے گی

اس طرح کے حالات میں سزا بھی انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ گروہی حیثیت سے دی جائے گی۔ اگر قتل، اغوا، زنا، آتش زنی، تخریب کے واقعات پیش آئے ہیں تو یہ جستجو نہیں کی جائے گی کہ متعین طور پر ان جرائم کا ارتکاب کن ہاتھوں سے ہوا ہے بلکہ ان کی ذمہ داری میں باغی گروہ کا ہر فرد شریک سمجھا جائے گا اور اسی حیثیت سے ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا، اس لیے کہ ہر جرم کے ارتکاب میں سب کے مجموعی اثر نے کام کیا ہے۔

اس قانون کے استعمال کی بعض مثالیں

عکل اور عرینہ والوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال کے اونٹوں کو ہنکالے جانے اور ان کے چرواہوں کو قتل کرنے کے جرم میں جو عبرت انگیز سزا دی، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اسی آیت کے تحت لیا ہے۔ بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع کے ساتھ جو معاملہ حضورؐ نے کیا، ہمارے نزدیک وہ بھی اسی حکمِ الٰہی کے تحت کیا۔ سیدنا ابوبکرؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کی جو سرکوبی کی وہ بھی ہمارے نزدیک اسی حکم کے تحت کی۔ مسیلمہ کذاب کا فتنہ بھی اسی محاربۂ اللہ و رسول کے تحت آتا ہے اور اس کی سرکوبی بھی اسی قانونِ الٰہی کے تحت ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں یہود کو عرب سے جو آخری بار نکالا وہ بھی اسی حکمِ خداوندی کی تعمیل تھی۔

جرم اور مجرمین کے جدید فلسفہ پر بحث

'ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا الاية' یہ ان کے لیے اس دنیا میں رسوائی ہے، یہ اس شبہے کا ازالہ ہے جو مذکورۂ بالا سزاؤں سے متعلق ان لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا یا پیدا ہو سکتا ہے جو اللہ و رسول کو چیلنج کرنے کے جرم کی سنگینی کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے۔ اس کائنات میں حقیقی عزت اللہ اور رسول کے لیے ہے۔ 'وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهٖ' اس وجہ سے جو لوگ خدا اور رسول کے مقابل میں جرأت و جسارت کا اظہار اور بغاوت کا اعلان کریں وہ مستحق ہیں کہ اس دنیا میں بھی رسوا ہوں اور آخرت میں بھی وہ دردناک عذاب سے دوچار ہوں۔ دنیا میں ان کی یہ رسوائی دوسروں کے لیے ذریعۂ عبرت و نصیحت ہوگی اور اس کے اثر سے ان لوگوں کے اندر بھی قانون کا ڈر اور احترام پیدا ہوگا جو یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ مجرد قانون کی افادیت و عظمت کی بنا پر اس کا احترام کریں۔ موجودہ زمانے میں جرم اور مجرمین کے لیے فلسفہ کے نام سے جو بیہودہ اور جرم نواز نظریات پیدا ہو گئے ہیں یہ انہی کی برکت ہے کہ انسان بظاہر جتنا ہی ترقی کرتا جاتا ہے دنیا اتنی ہی جہنم بنتی جا رہی ہے۔ اسلام اس قسم کے مہمل نظریات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ اس کا قانون ہوائی نظریات پر نہیں

بلکہ انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔

مغلوب ہونے سے پہلے اصلاح کرلینے والوں کا حکم

۳۴- "اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْہِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" یعنی یہ خاص اختیارات صرف ان باغیوں کے خلاف استعمال کیے جائیں گے جو حکومت کے حالات پر قابو پانے سے پہلے تک اپنی شرارت پر اڑے رہے ہوں، اور حکومت نے اپنی طاقت سے ان کو مغلوب و مقہور کیا ہو۔ جو لوگ حکومت کے ایکشن سے پہلے ہی توبہ کر کے اپنے رویہ کی اصلاح کر چکے ہوں ان کے خلاف ان کے سابق رویہ کی بنا پر اس قسم کا کوئی اقدام جائز نہیں ہوگا بلکہ اب ان کے ساتھ عام قانون کے تحت معاملہ ہوگا۔ اگر ان کے ہاتھوں عام شہریوں کے حقوق تلف ہوئے ہیں تو حتی الامکان ان کی تلافی کرا دی جائے گی۔

آیت میں "فَاعْلَمُوْٓا" کے لفظ کے زور کو اگر ذہن میں رکھیے تو یہ بات صاف نکلتی ہے کہ قابو میں آنے سے پہلے ہی توبہ و اصلاح کر لینے والوں کے معاملے میں حکومت کے لیے کوئی انتقامی کارروائی جائز نہیں ہے۔ خدا غفور اور رحیم ہے۔ جب وہ پکڑ سے پہلے توبہ و اصلاح کر لینے والوں کو معاف کر دیتا ہے تو اس کے بندوں کا رویہ اس سے الگ کیوں ہو؟

۱۴- آگے کا مضمون ___ آیات ۳۵-۴۰

آگے مسلمانوں کو پہلے اللہ کے حدود و قیود کی پابندی کرتے رہنے، اللہ ہی کا تقرب ڈھونڈنے اور اسی کی راہ میں برابر سرگرمِ کار رہنے کی تاکید فرمائی کہ دراصل یہی چیزیں ہیں جو خدا کے ہاں کام آنے والی اور آخرت کی پکڑ سے بچانے والی ہیں، جو لوگ ان چیزوں سے محروم ہوں گے ان کو دوسری کوئی چیز بھی دوزخ کے عذاب سے نہ بچا سکے گی۔

اس کے بعد چوری کی سزا کا قانون اور اس کی حکمت بیان فرمائی اور اس کے ساتھ یہ تنبیہ فرمائی کہ جو لوگ خدا کے قانون سے گریز اختیار کرنے یا اپنی دراندازیوں، سفارشوں، رشوتوں اور کوششوں سے اس کو بے اثر بنانے کی کوشش کریں گے وہ یاد رکھیں کہ اس قسم کی تدبیریں کچھ کارگر ہو سکیں گی تو بس اسی دنیا کی زندگی میں کارگر ہو سکیں گی۔ آخرت میں تمام جزا و سزا صرف خدا ہی کے اختیار میں ہوگی۔ وہاں کسی کا نہ زور و اثر کام کر سکے گا، نہ کسی کی سعی و سفارش کچھ کام آسکے گی۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۵-۴۰

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَ
جَاہِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۳۵ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا
لَوْ اَنَّ لَہُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّمِثْلَہٗ مَعَہٗ لِیَفْتَدُوْا بِہٖ

مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۳۶﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ
مِنْهَا ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۷﴾ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا
اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ
يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ
وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾

ترجمۂ آیات ۳۵-۴۰

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرتے رہو اور اسی کے تقرب کے طالب بنو اور اس کی راہ میں برابر سرگرم کار رہو تاکہ فلاح پاؤ۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ہے اگر انھیں وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اس کے برابر اور بھی تاکہ وہ اس کو فدیہ میں دے کر روز قیامت کے عذاب سے چھوٹ سکیں تو بھی ان کا یہ فدیہ قبول نہ ہوگا، ان کے لیے بس ایک دردناک عذاب ہی ہے۔ وہ ندہ لگائیں گے کہ آگ سے نکل بھاگیں لیکن اس سے کبھی نکل نہ پائیں گے، ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہوگا۔ ۳۵-۳۷۔

اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، ان کے کیے کی پاداش اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا کے طور پر، اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ پس جس نے اپنے اس ظلم کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی تو اللہ اس پر عنایت کی نظر فرمائے گا،

بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ کیا تمھیں علم نہیں ہے کہ اللہ ہی ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، وہی جس کو چاہے گا سزا دے گا اور جس کو چاہے گا بخشے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۳۸-۴۰

۱۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳۵)

'تقویٰ' کا مفہوم ہم مختلف مقامات میں ظاہر کر چکے ہیں کہ خدا کے حدود و احکام کی پوری مستعدی کے ساتھ نگہداشت اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرتے رہنا ہے۔

وسیلہ کا مفہوم 'وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ' وسیلہ کے معنی قربت کے ہیں اور 'اِلَیْهِ' کی تقدیم سے حصر کا مضمون پیدا ہو گیا ہے یعنی خدا ہی کا قرب اور اسی کا تقرب ڈھونڈو، جس کا طریقہ یہ ہے کہ خدا کے احکام و حدود کی پوری پوری پابندی کرو، اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرتے رہو۔ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ، جیسا کہ آیت 'وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ' الآیة کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں، کتاب اللہ اور شریعت ہی ہے۔ اس وجہ سے کتاب اللہ اور شریعت کو مضبوطی سے تھامنا ہی خدا سے قربت کا واسطہ ہے۔ گویا آیت میں تنبیہ ہے کہ جن لوگوں نے خدا اور اس کی شریعت سے بے پروا ہو کر دوسروں کا تقرب ڈھونڈا اور ان کو اپنی نجات و فلاح کا ضامن سمجھے بیٹھے ہیں وہ بڑی غلط امیدوں اور بڑے ہی غلط سہاروں پر جی رہے ہیں۔ فوز و فلاح کی راہ یہ ہے کہ خدا ہی سے ڈرو اور اسی کا قرب ڈھونڈو۔ قرآن میں دوسری جگہ اس بات کی بھی تصریح ہے کہ فرشتے جن کو نادانوں نے خدا کی قربت کا ذریعہ سمجھ کر معبود بنایا وہ خود ہر لحظہ خدا کے قرب کے لیے ساعی و سرگرم اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۵۷ (اسراء) (وہ لوگ جن کو یہ مشرکین پکارتے ہیں خود اپنے رب کے قرب کے حصول کے لیے ساعی رہتے ہیں کہ کون زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرتا ہے اور اس کی رحمت کی امید کرتے اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں، بے شک تیرے رب کا عذاب ڈرنے ہی کی چیز ہے)

لفظ 'جہاد' اپنے وسیع مفہوم میں 'وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ' لفظ 'جہاد' یہاں وسیع معنوں میں ہے۔ اس سے مراد ہر وہ سعی و سرگرمی اور ہر وہ محنت و کوشش ہے جو خدا کے احکام کی پابندی، اس کے دین کے قیام اور اس کی رضا طلبی کی راہ میں کی جائے۔ عام اس سے کہ وہ تلوار کے ذریعے سے ہو یا اپنی دوسری قوتوں، صلاحیتوں اور دوسرے

اسباب و وسائل سے ۔ یہ گویا وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ کا عملی ثبوت ہے۔ یعنی خدا سے قربت کا طالب اس کی راہ میں برابر سرگرم کار رہتا ہے۔

نظم کے پہلو سے یہ اوپر کے تعزیری احکام اور آگے چور کی سزا کے حکم کے بیچ میں مسلمانوں کو تنبیہ و تذکیر ہے کہ خدا کے احکام و حدود کی پابندی کے معاملے میں دوسری امتوں کی طرح تم ڈھیلے نہ پڑنا۔ خدا سے تعلق اس کی شریعت ہی کے واسطے سے قائم ہوتا ہے۔ اس کے سوا فلاح کی کوئی اور راہ نہیں ہے۔ اگر خدا کی شریعت کو چھوڑ کر تم یہود و نصاریٰ کی طرح دوسرے سہاروں پر اعتماد کر بیٹھے تو یہ سہارے نافع ہونے کے بجائے صرف موجب وبال ہوں گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِیَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ
یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ
بِخٰرِجِیْنَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ (۳۶-۳۷)

خدا کے سوا دوسرے سہاروں پر اعتماد کرنے والوں کا انجام

'اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا' سیاق و سباق دلیل ہے کہ یہاں اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے فلاح کی اس راہ سے الگ راہ اختیار کی جو اوپر والی آیت میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی انھوں نے خدا ہی سے ڈرنے، خدا ہی کا قرب تلاش کرنے اور اسی کی راہ میں سرگرم رہنے کے بجائے بے بنیاد سہاروں اور خیالی سفارشوں کے اعتماد پر زندگی گزاری اور یہ توقع کیے بیٹھے رہے کہ آخرت کی تمام کامرانیاں انھی کا حصہ ہیں۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ زمین کے تمام خزانے اور اس کے ساتھ انھی کے برابر مزید خزانوں کے مالک بن جائیں اور ان سب کو عذاب آخرت سے چھوٹنے کے لیے فدیہ میں دیں جب بھی ان کا فدیہ قبول نہیں ہوگا۔ وہ دوزخ سے نکلنے کے لیے کتنا ہی ہاتھ پاؤں ماریں گے لیکن وہ اس سے نکل نہیں پائیں گے، ان کے لیے ابدی اور دائمی عذاب ہوگا۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ
حَكِیْمٌ ۝ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۳۸-۳۹)

چور کی سزا

'وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ' کا عطف محاربین پر ہے جن کا ذکر اوپر گزرا۔ بیچ میں جو دو آیتیں آ گئی ہیں یہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، تعزیرات و حدود کے بیان کے سلسلے میں بطور تنبیہ و تذکیر ہیں۔

'سارق' اور 'سارقہ' چونکہ صفت کے صیغے ہیں اس وجہ سے ان سے اشارہ نکلتا ہے کہ ارتکاب فعل کی نوعیت ایسی ہو کہ اس کے ارتکاب پر چوری اور اس کے مرتکب پر چور کا اطلاق ہو سکے۔ اگر کوئی ناتربیت یافتہ شخص راہ چلتے کسی کے درخت سے چند پھل توڑ لیتا ہے یا کسی کے کھیت سے کچھ سبزیاں لے لیتا ہے یا کسی کی ٹال سے چند لکڑیاں اٹھا لیتا ہے، یا کسی کے باورچی خانے سے کوئی کھانے پینے کی چیز لے لیتا ہے تو گو یہ افعال ناشائستہ ہیں اور ان پر وہ تنبیہ و تادیب کا بھی سزاوار ہے

لیکن یہ وہ چوری نہیں ہے جس پر اس کو قطع ید کی سزا دی جائے۔ اس وجہ سے ہمارے فقہا نے اس جرم کے تعین اور اس کی سزا کے نفاذ پر چند شرطیں عائد کی ہیں جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ ہمارے لیے یہاں ان تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ تاہم چند باتوں کی طرف ہم اشارہ کریں گے تاکہ مسئلے کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے۔

قطع ید کی سزا کے لیے شرطیں

فقہا نے چوری پر قطع ید کی سزا نافذ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل قیدیں عائد کی ہیں۔

۱۔ چوری کسی قدر و قیمت رکھنے والی چیز کی کی گئی ہو، بے قیمت یا کسی چھوٹی موٹی چیز کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کسی کو معمولی چیزوں کی چوری پر یہ سزا نہیں دی گئی۔ قدر و قیمت کے اندازے کے باب میں فقہا کا اختلاف ہے اور یہ اختلاف اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ایک دینار سے کم قیمت کی چیز پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔

۲۔ چوری محفوظ کیے ہوئے مال کی کی گئی ہو۔ اگر کسی نے اپنا مال یوں ہی کہیں ڈال دیا یا اپنے مویشی یوں ہی جنگل میں آوارہ چھوڑ دیے تو ان کی چوری اس قانون کے تحت نہیں آئے گی۔

۳۔ جس مال میں چوری کرنے والے کا اشتراک ہو یا وہ مال اس کی حفاظت یا امانت میں ہو اس کی چوری بھی اس قانون کے دائرے سے باہر ہے۔

۴۔ مجنون اور نابالغ کی چوری پر بھی اس قانون کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۵۔ کسی کے بیوی بچے اور اس کے گھریلو ملازم اگر اس کے مال میں سے کچھ چوری کر لیں تو یہ چیز بھی اس قانون کے دائرے سے الگ ہے۔

۶۔ اضطرار کا شائبہ ہو جب بھی یہ سزا نافذ نہیں کی جائے گی۔ مشہور ہے کہ حضرت عمرؓ نے عام الرمادہ کے قحط کے موقع پر قطع ید کی سزا روک دی تھی۔

۷۔ اس سزا کے نفاذ کے لیے دارالاسلام ہونا بھی شرط ہے۔ حدود و تعزیرات کا تعلق اول تو بااختیار حکومت سے ہے، ثانیاً ان کا تعلق دارالکفر یا دارالحرب سے نہیں بلکہ دارالاسلام سے ہے اس لیے کہ یہ احکام و حدود ایک مجموعی نظام کا جزو ہیں، اس نظام سے الگ کر کے ان کو نافذ کرنا ایسا ہی ہے جیسے گول خانے میں ایک چوکھٹی چیز۔ ان احکام کا زمانۂ نزول خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے نفاذ کے لیے دارالاسلام شرط ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ احکام نازل بھی اس وقت فرمائے جب دارالاسلام عملاً قائم ہو چکا۔

قطع ید کی علتیں

فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۔ میں قطع ید کے دو سبب بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مجرم کے جرم کی سزا ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ 'نکال' ہے۔ 'نکال' کے معنی کسی کو ایسی سزا دینے کے ہیں

جس سے دوسرے عبرت پکڑیں۔ ان دونوں کے درمیان حرفِ عطف کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں باتیں اس سزا میں بیک وقت مطلوب ہیں۔ یعنی یہ پاداشِ عمل بھی ہے اور دوسروں کے لیے سامانِ عبرت بھی۔ جو لوگ اس کے ان دونوں ہی پہلوؤں پر بیک وقت نظر نہیں ڈالتے وہ بسا اوقات اس خلجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جرم کے اعتبار سے سزا زیادہ سخت ہے حالانکہ اس سزا میں متعین اس جرم ہی کی سزا نہیں ہے جو مجرم سے واقع ہوا بلکہ ان بہت سے جرائم کی روک تھام بھی اس میں شامل ہے جن کا وہ اپنے فعل سے محرک بن سکتا ہے اگر اس کو ایسی سزا نہ دی جائے جو دوسروں کے حوصلے پست کر دے۔ جنس کی طرح مال کی بھوک بھی انسان کے اندر بڑی ہی شدید ہے۔ اگر اس حرص کو ذرا ڈھیل مل جائے تو پھر اس کے نتائج کیا کچھ نکل سکتے ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لیے موجودہ زمانہ کے حالات میں کافی سامانِ بصیرت موجود ہے بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھیں موجود ہوں۔ اس زمانے کے کسی متمدن سے متمدن ملک کے صرف ایک سال کے وہ ہولناک جرائم جمع کر لیے جائیں جو محض چوری کی وجہ سے پیش آئے تو وہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں لیکن تہذیبِ جدید کے مارے ہوئے انسان کی پیشانی یہ سن کر تو عرق آلود ہو جاتی ہے کہ چور کا پر کسی کا ہاتھ کٹ جائے لیکن ان ہزاروں دل ہلا دینے والے واقعات سے اس کا دل نہیں پسیجتا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ چوری کی راہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ چوری کوئی مفرد جرم نہیں ہے بلکہ یہ مجموعۂ جرائم ہے جس سے طرح طرح کے ہولناک جرائم ظہور میں آتے ہیں۔ اگر چوری کی راہ مسدود ہو جائے تو یہ یا تو بالکل ہی ناپید ہو جائیں گے یا کم از کم یہ کہ انتہائی حد تک کم ہو جائیں گے۔ چنانچہ تجربہ گواہ ہے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا سے نہ صرف چوری کے واقعات انتہائی حد تک کم ہو گئے بلکہ دوسرے جرائم میں بھی انتہائی کمی ہو گئی۔ پھر اگر چند ہاتھ کٹ جانے سے ہزاروں سر، ہزاروں گھر، ہزاروں آبروئیں محفوظ ہو جائیں، ظلم و شقاوت اور حرث و نسل کی بربادی کے بہت سے ابواب کا خاتمہ ہو جائے تو عقلِ سلیم تو یہی کہتی ہے کہ یہ مہنگا سودا نہیں ہے بلکہ نہایت بابرکت سودا ہے، لیکن موجودہ زمانے کے دانش فروشوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔

'وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ' یہ اس قانونِ الٰہی کی قوت اور حکمت دونوں ہی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام قوانین و احکام اس کی صفات کا عکس ہیں۔ وہ عزیز اور غالب ہے اس وجہ سے اس کو حق ہے کہ وہ جو چاہے حکم دے اور حکیم ہے اس وجہ سے اس کا ہر حکم حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اس کے بندوں کے لیے نہ تو اس کے حکم سے سرتابی جائز ہے اور نہ ان کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ اس کے کسی حکم کو خلافِ حکمت و مصلحت قرار دیں۔

'فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ الاٰیۃ'، 'مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ'، میں لفظ 'ظلم'، اپنے فاعل کی طرف بھی مضاف ہو سکتا ہے اور اپنے مفعول کی طرف بھی۔ مفعول کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں اس

کے معنی ہوں گے' اپنے اس ظلم کے بعد جس کا اس نے ارتکاب کیا، اگرچہ قرآن میں لفظ اپنے پہلے مفہوم کے لیے بھی موجود ہیں اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ کسی انسان کا، جب کہ وہ مسلمان بھی ہو، چوری جیسے ذلیل جرم کا مرتکب ہونا خود اپنے نفس پر بہت بڑا ظلم ہے، اس فعل کے ارتکاب سے جتنی حق تلفی وہ دوسروں کی کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ خود اپنے نفس کی کرتا ہے، لیکن میں دوسرے معنی کو ترجیح دیتا ہوں اس لیے کہ اس میں وہ ظلم بھی آجاتا ہے جو ایک چوری کرنے والا اپنے نفس پر کرتا ہے اور وہ ظلم بھی آجاتا ہے جو وہ اس پر کرتا ہے جس کا مال چراتا ہے۔

توبہ کے ساتھ اصلاح کی شرط

توبہ کے ساتھ اصلاح کا ذکر درحقیقت توبہ کی ایک لازمی شرط کی حیثیت سے ہے۔ بندہ جب کوئی اس طرح کا جرم کرتا ہے تو ایک تو وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے دوسرے وہ اپنے نفس کی یا دوسروں کی حق تلفی کرتا ہے۔ خدا سے معاملہ درست کرنے کے لیے تا حدِ امکان اپنے رویہ کی اصلاح اور اپنے ظلم کی تلافی ناگزیر ہے۔ بغیر اس دو طرفہ عمل کے توبہ بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ توبہ اور اصلاح سے بندے کا آخرت کا معاملہ صاف ہو جاتا ہے لیکن قانون کی گرفت میں آچکنے کے بعد توبہ کے سبب سے شریعت کی کوئی حد ساقط نہیں ہو سکتی۔ وہ بہرحال نافذ ہو گی۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔ (۴۰)

ایک عظیم تنبیہ

'اَلَمْ تَعْلَمْ' کا خطاب عام ہے، یہ عام خطاب کے ساتھ تنبیہ ہے کہ آسمان و زمین میں سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہی جس کو چاہے سزا دے گا جس کو چاہے بخشے گا، کسی دوسرے کے لیے اس میں کسی چون و چرا اور کسی مداخلت کی کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔ اس وجہ سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے قانون کے تابع اور اس کے حوالے کرے، نہ کوئی اس سے بھاگنے کی کوشش کرے، نہ کوئی اس سے دوسروں کو بچانے کی تدبیریں سوچے اور نہ کسی کے زور و اثر اور کسی کی سعی و سفارش پر بھروسہ کر کے خدا اور اس کی شریعت سے بے پروا ہو۔ یہ تنبیہ اس وجہ سے ضروری تھی کہ درحقیقت یہ سارے احکام جو قتل، قصاص، رہزنی اور چوری وغیرہ سے متعلق اس سورہ میں بیان ہو رہے ہیں، یہ سب دوسری امتوں کے لیے مزلۂ قدم ثابت ہوئے۔ انھوں نے ان سے بچنے کے لیے بہت سے چور دروازے نکال لیے، یہاں تک کہ یہ تمام قوانین بالکل بے اثر ہو کر رہ گئے۔ اگر اس کی علت کا سراغ لگایا جائے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ ان قوموں نے توحید کی وہ حقیقت مستحضر نہیں رکھی جس کی اس آیت میں یاد دہانی کی گئی ہے۔

۱۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۱۔ ۵۰

آگے چند آیات میں پہلے منافقین اور یہود کی اس ملی بھگت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو انھوں نے شرعی احکام و قوانین، بالخصوص تعزیرات و حدود کی گرفت سے بچنے اور ایک دوسرے کو ان سے بچانے کے لیے باہم کر رکھی تھی۔ ان آیات کے زمانۂ نزول تک مدینہ اور اس کے اطراف میں اگرچہ اسلام کو سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تھا لیکن ابھی یہ اقتدار کمل نہیں تھا، آس پاس یہود کی جو بستیاں تھیں جو اپنے حدود میں قبائلی نوعیت کا اقتدار رکھتی تھیں اور ان کے حکام ان لوگوں کے معاملات و نزاعات کا فیصلہ کرتے تھے جو ان کے دائرۂ اثر میں تھے یا ان کی طرف رجوع کرتے۔ لیکن یہ عدالتیں قیام عدل و انصاف کے نقطۂ نظر سے بالکل بے جان اور بے مصرف ہو چکی تھیں۔ اول تو یہود نے خود قانون ہی کو اپنے اغراض کے تحت مسخ کر کے بالکل بے اثر کر دیا تھا، دوسرے جھوٹ اور رشوت کا ان کے ہاں اتنا زور تھا کہ کسی معاملے میں نہ گواہوں کی گواہی کا کوئی وزن باقی رہ گیا تھا نہ عدالتوں کے انصاف کا۔ بڑی آسانی سے گواہوں اور حکام دونوں کو رشوت کے ذریعے سے خریدا اور ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اقتدار کی یہ دو عملی اور یہودی عدالتوں کی یہ انصاف فروشی ان لوگوں کے لیے ایک چور دروازہ فراہم کرتی تھی جو قانون کے تقاضوں سے فرار اختیار کرنا چاہتے۔ چنانچہ منافقین اور یہود اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ شرارت کرتے کہ جن معاملات میں ان کو توقع ہوتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے فیصلہ ان کے حسب منشا ہو جائے گا ان کے لیے آنحضرت صلعم سے رجوع کرتے لیکن جن میں اپنے حسب منشا فیصلہ ہونے کی توقع نہ ہوتی ان کے لیے یہودی عدالتوں کی طرف رجوع کرتے تاکہ جھوٹے گواہوں اور رشوت کے ذریعے سے اپنے حسب منشا فیصلے حاصل کر سکیں۔ قرآن نے ان کی اس بدبختانہ روش پر افسوس کیا ہے اور آنحضرت صلعم کو یہ ہدایت فرمائی کہ اگر اس قسم کے اشرار اپنے معاملات آپ کی عدالت میں لائیں تو آپ کو اختیار ہے کہ آپ ان کے مقدمے لیں یا نہ لیں۔ البتہ اگر لیں تو فیصلہ اسی قانون عدل کے مطابق کریں جو اللہ نے اتارا ہے۔

اس کے بعد یہود کی حالت پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ فلاں معاملے میں تورات کا حکم کیا ہے تمھیں حکم بناتے ہیں پھر تم جو فیصلہ کرتے ہو اس سے مکر جاتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا ایمان کسی چیز پر بھی نہیں ہے۔ وہ صرف اپنی خواہشوں کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد پہلے تورات و انجیل کا حوالہ دیا ہے کہ اللہ نے یہ صحیفے ہدایت اور روشنی بنا کر اتارے ان کے ذریعے سے لوگوں کو اپنے احکام و قوانین سے آگاہ کیا، ان کے حاملوں کو ان کا گواہ اور امین بنایا اور ساتھ ہی انھیں اس امر سے آگاہ فرمایا کہ جو لوگ معاملات کے فیصلے ان کتابوں کے احکام کے خلاف کریں گے

وہ کافر، ظالم اور فاسق ٹھہریں گے لیکن یہود و نصاریٰ نے ان کتابوں کو بالائے طاق رکھ دیا اور اپنی خواہشات و بدعات کے پیرو بن گئے۔ پھر قرآن کا ذکر فرمایا کہ اب اللہ نے یہ کتاب اتاری ہے جو تمام اختلافات کے درمیان قولِ فیصل اور سابق صحیفوں کے لیے معیار اور کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے تو اب تم ہر معاملے کا فیصلہ اسی کی روشنی میں کرو، یہود و نصاریٰ کی بدعات کی پروا نہ کرو۔ یہ یہود و نصاریٰ حق کے طالب نہیں ہیں اس وجہ سے یہ وہی لکیر پیٹتے رہیں گے جس کو پیٹتے رہے ہیں۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ حق کی راہ حق کے طالبوں کو ملتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا سب کو ایک ہی راہ پر کر دیتا لیکن اس نے لوگوں کو اختیار کی نعمت بخشی کہ ان کا امتحان کرے کہ کون حق کی راہ اختیار کرتا ہے، کون باطل کی۔ تو ان کے پیچھے اپنی راہ کھوٹی کرنے کے بجائے تم فلاح و سعادت کی راہ میں سبقت کرو۔ کل سب کا معاملہ خدا کی عدالت میں پیش ہوگا، وہاں سارے اختلافات کا فیصلہ ہو جائے گا۔

آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید تاکید فرمائی کہ خواہ یہود و نصاریٰ کتنا ہی زور صرف کریں تم کسی حال میں بھی کتاب الٰہی کے بالمقابل ان کی بدعات و خواہشات کی پروا نہ کرنا۔ اگر وہ کتاب الٰہی سے انحراف کی اسی روش پر اڑے رہے تو سمجھ لو کہ وقت آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بعض شرارتوں کی سزا ان کو اسی دنیا میں دے ——— اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۱-۵۰

يَآيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ مِنَ
الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَ
مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ
اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ
يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ
وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ
اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِي
الدُّنْيَا خِزْيٌ ښ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۴۱) سَمّٰعُوْنَ
لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ فَاِنْ جَاۗءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ

عَنْهُمْ ۚ وَإِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَضُرُّوكَ شَيْئًا ۖ وَإِنْ حَكَمْتَ
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿٤٢﴾ وَكَيْفَ
يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ
مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٣﴾ إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ ع
فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ
هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ
اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ
وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ
اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴿٤٤﴾ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا
أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَ
الْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ
تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ ۚ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ
اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٤٥﴾ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِعِيسَى
ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ
الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ﴿٤٦﴾ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ
الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۚ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٤٧﴾ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا

لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ
بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ
لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ
اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ
اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾
وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ
وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ
ذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ
يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع ۱۱

ترجمۂ آیات
اے پیغمبر، ان لوگوں کی روش تمھیں غم میں نہ ڈالے جو کفر کی راہ میں سبقت
کر رہے ہیں، ان لوگوں میں سے جو زبان سے تو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ۴۱-۵۰
ہیں حالانکہ ان کے دلوں نے ایمان قبول نہیں کیا ہے اور ان لوگوں میں سے جنھوں
نے یہودیت اختیار کی ہے۔ یہ جھوٹ کے رسیا اور دوسروں کی باتیں ماننے والے
ہیں، جو خود تمھارے پاس نہیں آتے۔ وہ کلام کو اس کا موقع و محل معین ہونے کے
باوجود اس کے محل سے ہٹا دیتے ہیں، کہتے ہیں اگر تمھارے معاملے کا فیصلہ یہ ہو تب
تو قبول کر لینا اور اگر یہ نہ ہو تو اس سے بچ کے رہنا۔ اور جس کو اللہ فتنہ میں ڈالنا
چاہے تو تم اللہ کے مقابل اس کے معاملے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ یہی لوگ ہیں جن کے

دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہیں چاہا، ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ یہ جھوٹ کے رسیا اور پکے حرام خور ہیں۔ اگر یہ تمھارے پاس آئیں تو تمھیں اختیار ہے، خواہ ان کے معاملے کا فیصلہ کر دو یا ان کو ٹال دو۔ اگر تم ان کو ٹال دو گے تو یہ تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اگر تم فیصلہ کرو تو ان کے درمیان قانون عدل کے مطابق فیصلہ کرو، اللہ قانون عدل پر عمل کرنے والوں ہی کو دوست رکھتا ہے اور یہ تمھیں حکم کس طرح بناتے ہیں جب کہ تورات ان کے پاس موجود ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے، پھر حکم بنانے کے بعد برگشتہ ہو جاتے ہیں! یہ ہرگز باایمان لوگ نہیں ہیں۔ ۴۱-۴۳

بے شک ہم ہی نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق خدا کے فرمانبردار انبیاء، ربانی علما اور فقہا یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے، بوجہ اس کے کہ وہ کتاب الٰہی کے امین اور اس کے گواہ ٹھہرائے گئے تھے کہ لوگوں سے نہ ڈریو، مجھی سے ڈریو اور میرے احکام کو دنیا کی متاع حقیر کے عوض نہ فروخت کیجیو اور جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں تو یہی لوگ کافر ہیں اور ہم نے اس میں ان پر فرض کیا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور اسی طرح دوسرے زخموں کا بھی قصاص ہے۔ سو جس نے اس کو معاف کر دیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں گے تو وہی لوگ ہیں جو ظالم ٹھہریں گے۔ ۴۴-۴۵

اور ہم نے ان کے پیچھے، انہی کے نقش قدم پر عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا مصداق پیشتر سے موجود تورات کے اور ہم نے اس کو عطا کی انجیل، ہدایت اور روشنی پر مشتمل۔ مصداق اپنے سے پیشتر موجود تورات کی اور ہدایت و نصیحت خدا ترسوں کے لیے اور واجب ہے کہ اہل انجیل بھی فیصلہ کریں اس کے مطابق جو اللہ نے اس میں اتارا اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔ ۴۶-۴۷

اور ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری حق کے ساتھ، مصداق اس سے پیشتر سے موجود کتاب کی اور اس کے لیے کسوٹی بنا کر، تو ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا اور اس حق سے ہٹ کر، جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ضابطہ اور ایک طریقہ ٹھہرایا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس نے چاہا کہ اس چیز میں تمہاری آزمائش کرے جو اس نے تم کو بخشی، تو بھلائیوں کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کا پلٹنا ہے تو وہ تمہیں آگاہ کرے گا اس چیز سے جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ ۴۸

اور یہ کہ ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور ان سے ہوشیار رہو کہ مبادا وہ تمہیں اس چیز کی کسی بات سے پھسلا دیں جو اللہ نے تمہاری طرف اتاری ہے پس اگر وہ اعراض کریں تو سمجھ لو کہ اللہ ان کو ان کے بعض گناہوں کی سزا دینا چاہتا ہے اور بے شک ان لوگوں میں سے

بیشتر نافرمان ہی ہیں۔ کیا یہ جاہلیت کے فیصلہ کے طالب ہیں اور اللہ سے بڑھ کر کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین کرنا چاہیں۔ ۴۹-۵۰

۱۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ لَا يَحْزُنكَ ٱلَّذِينَ يُسَٰرِعُونَ فِى ٱلْكُفْرِ مِنَ ٱلَّذِينَ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا بِأَفْوَٰهِهِمْ
وَلَمْ تُؤْمِن قُلُوبُهُمْ ۛ وَمِنَ ٱلَّذِينَ هَادُوا۟ ۛ سَمَّٰعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّٰعُونَ لِقَوْمٍ ءَاخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ ۖ
يُحَرِّفُونَ ٱلْكَلِمَ مِنۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهِۦ ۖ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِن لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَٱحْذَرُوا۟ ۚ
وَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ فِتْنَتَهُۥ فَلَن تَمْلِكَ لَهُۥ مِنَ ٱللَّهِ شَيْـًٔا ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ لَمْ يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يُطَهِّرَ
قُلُوبَهُمْ ۚ لَهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا خِزْىٌ ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۴۱)

رسول کی ذمہ داری

'يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ' لفظ 'رسول' سے خطاب یہاں اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ رسول کی اصل ذمہ داری صرف اللہ کے دین کی تبلیغ اور انذار و تبشیر کے فریضہ کی ادائیگی ہے۔ اس امر کی کوئی ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ لوگ اس کی دعوت کے معاملے میں رویہ کیا اختیار کرتے ہیں۔ اگر رسول نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا ہے تو وہ عنداللہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا، لوگ اگر کفر کی راہ میں سبقت کرتے ہیں تو اس کی پرسش رسول سے نہیں ہوتی ہے بلکہ خود لوگوں سے ہوتی ہے، پھر جو بات دوسروں سے متعلق ہے اس کا غم رسول کیوں کرے؟ یہاں چونکہ مقصود آنحضرت صلعم کو منافقین اور یہود کی مخالفانہ اور سازشانہ روش پر تسلی دینا اور اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ جن کا فتنہ میں پڑنا سنتِ الٰہی کے بموجب مقدر ہو چکا ہے وہ فتنہ میں پڑ کے رہیں گے اس وجہ سے 'يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ' کے خطاب سے آپ کو مخاطب کرنا موزوں ہوا تاکہ خطاب ہی سے آپ کی ذمہ داری کی حد آپ پر واضح ہو جائے۔ آگے خطاب کی یہی مضمر حقیقت الفاظ میں یوں واضح فرما دی گئی ہے مَن يُرِدِ ٱللَّهُ فِتْنَتَهُۥ فَلَن تَمْلِكَ لَهُۥ مِنَ ٱللَّهِ شَيْـًٔا اس پر مزید بحث آیت ۴۱ کے تحت بھی آئے گی۔

منافقین کی یہود دوستی

'يُسَٰرِعُونَ فِى ٱلْكُفْرِ' کفر میں سبقت سے اشارہ یہاں منافقین کی یہود دوستی کی طرف ہے کہ یہ لوگ خدا و رسول کی شریعت سے فرار کے لیے یہود کو ملجا و ماویٰ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ زبان سے دعویٰ ایمان کا کرتے ہیں لیکن جب کوئی معاملہ اور قضیہ پیش آتا ہے تو ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو آنحضرت صلعم کی عدالت میں پیش کرنے کے بجائے یہود کی عدالت میں لے جائیں تاکہ وہاں سے حسب منشا فیصلہ حاصل کر سکیں۔ حالانکہ اللہ و رسول کی عدالت کے ہوتے ہوئے کسی اور کی عدالت کی طرف رجوع کرنا ایمان و اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف رجوع کرنا ہے۔

منافقین کا من بھاتا کھاجا

"سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ" 'سمع' کے معنی جس طرح سننے کے آتے ہیں اسی طرح قبول کرنے کے بھی آتے ہیں اور 'ل' یہاں اضافت کے مفہوم کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہ منافقین کی وہ صفت بیان ہوئی جس سے ان کی سبقت الی الکفر کی توجیہ ہو رہی ہے کہ ان کا من بھاتا کھاجا جھوٹ ہے، یہ جھوٹ کے رسیا اور جھوٹ کے گاہک ہیں، انھیں جھوٹی گواہی، جھوٹی عدالت اور جھوٹا فیصلہ چاہیے۔ اس وجہ سے یہ پیغمبر کی عدالت سے گھبراتے ہیں اور یہود کی طرف بھاگتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ جس جنس کے خریدار ہیں اس کی فراوانی اسی بازار میں ہے۔

منافقین یہود کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی

"سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ لَمْ یَاْتُوْکَ" یہ ان منافقین کی دوسری صفت ہے اور چونکہ بعینہٖ پہلی صفت ہی کا پرتو ہے اس وجہ سے حرف عطف کے بغیر مذکور ہوئی۔ یعنی یہ منافقین اگر آپ کے پاس آتے ہیں تو اپنے ذوق و شوق سے اور حق و انصاف کے لیے نہیں آتے بلکہ دوسروں کے بھیجے ہوئے اور ان کے سکھائے پڑھائے ہوئے آتے ہیں۔ اشارہ یہود کے علما اور لیڈروں کی طرف ہے جن کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ خود سامنے نہیں آتے بلکہ پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے ان کٹھ پتلیوں کو نچاتے ہیں اور یہ ان کے اشاروں پر ناچتے ہیں، جو کچھ وہ کہتے ہیں یہ اسی کو مانتے ہیں اور جو کچھ ان کا ایما ہوتا ہے یہ اسی کی تعمیل کرتے ہیں۔

کلام کو اس کے مواضع و محل سے ہٹانا تحریف دین ہے

"یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا" یہ ان یہود کی پس پردہ سازشوں سے پردہ اٹھایا اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ منافقین جن کے مرید ہیں اور جن سے یہ الہام حاصل کرتے ہیں ان کی کارستانیاں کیا ہیں اور وہ ان کو کیا سبق پڑھا کر آپ کے پاس بھیجتے ہیں۔ ان کی ایک کارستانی تو یہ بتائی کہ 'یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ' اس کا ذکر آیت ۱۳ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ وہاں 'یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ' ہے اور یہاں 'مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ' ہے۔ بات اگرچہ اصل حقیقت کے لحاظ سے دونوں جگہ ایک ہی ہے لیکن اس دوسرے اسلوب نے آیت کے مفہوم کو نسبتاً زیادہ واضح کر دیا ہے۔ جملہ میں ایک مضاف عربیت کے عام قاعدے کے مطابق محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے کلام اور اس کے احکام کا موقع و محل اور اس کا محل و مصداق متعین ہو جانے کے باوجود اس کو اس کے موقع و محل سے ہٹا دیتے ہیں جس سے حکم کا مقصد بالکل فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر کسی حکم کا موقع و محل اور محل و مصداق واضح نہ ہو جس کے سبب سے قاضی و مفتی تطبیق میں غلطی کر جائیں تو ان کو معذور ٹھہرایا جا سکتا ہے، لیکن محل و مصداق کے تعین کے باوجود اس حکم کو اس کے موقع و محل سے ہٹانا صریح تحریف دین ہے اور ہم تفسیر سورۂ بقرہ میں واضح کر چکے ہیں کہ یہود اپنے صحیفوں میں جس طرح تحریف لفظی کے مرتکب ہوئے ہیں اسی طرح اس انطباقی تحریف کے بھی مرتکب ہوئے۔ خاص طور پر تعزیرات و حدود کے باب میں تو انھوں نے اس قسم تحریف کو اس

بے دردی کے ساتھ استعمال کیا کہ شریعت کی کوئی حد و تعزیر بھی اس سے سلامت نہ رہ سکی۔ اور افسوس ہے کہ تحریف کی اس قسم کے ارتکاب میں یہ امت بھی یہود سے کچھ پیچھے نہیں رہی۔

ان کی دوسری کارستانی یہ بتائی کہ یہ ان منافقین کو یہ سکھا کر آپ کے پاس بھیجتے ہیں کہ اگر تمہارے قضیے کا فیصلہ یہ ہو تب تو قبول کر لینا اور اگر یہ فیصلہ نہ ہو تو اس کو قبول نہ کرنا۔ گویا اول تو وہ خود ہی تحریف کے چور دروازے سے مجرم کے لیے فرار کی راہ نکال دیتے ہیں اور اگر اس میں کچھ زحمت محسوس ہوتی ہے تو آنحضرت صلعم کی عدالت میں معاملہ کو بھیج دیتے ہیں لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ فیصلہ حسب منشا ہو تب تو قبول کر لینا ورنہ اس سے کترا جانا۔ مطلب قرآن کا اس ساری پردہ دری سے یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح کے فتنہ کاروں کے ہتھے چڑھے ہوئے ہیں اور خود بھی فتنہ پسند ہیں ان کو ان کی قسمت پر چھوڑو، ان کی اس حالت پر غم نہ کرو۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۔ یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں اس سنت الٰہی کا بیان ہے جس کی تفصیل سورۂ بقرہ کے شروع اور دوسرے متعدد مقامات میں بیان ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت اور انسان کو اختیار کی نعمت دے کر اس کو دونوں طرح کے حالات سے آزمایا، اس کے سامنے نفس اور شیطان کی طرف سے شر و باطل بھی آتا ہے اور فطرت اور خدائے رحمان کی طرف سے خیر اور حق بھی۔ اس طرح اس کے عقل و ارادے کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ خیر اور حق کو اختیار کرتا ہے یا شر و باطل کو۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ جانتے بوجھتے اور دیکھتے سنتے شر کو خیر پر اور باطل کو حق پر ترجیح دیتے ہیں، نہ خدا کی تنبیہات سے سبق حاصل کرتے نہ اہل حق کی نصیحتوں سے، وہ آہستہ آہستہ اپنے ضمیر اور اپنے عقل و ارادے کو اس درجہ کند اور بے حس بنا لیتے ہیں کہ ان کے اندر حق کی طرف بڑھنے کا کوئی عزم و حوصلہ سرے سے باقی رہ ہی نہیں جاتا، باطل ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے۔ ان کو کتنا ہی جھنجھوڑیے اور جگائیے لیکن وہ یہ بستر چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ یہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس فتنہ ہی میں اوندھے منہ پڑے چھوڑ دیتا ہے جس میں وہ پڑ چکے ہوتے ہیں۔ پیغمبر اپنی دل سوزی اور محبت حق کی وجہ سے اپنا پورا زور لگاتا ہے کہ ان کو جگائے اور جب یہ نہیں جاگتے تو بعض اوقات اس کو یہ غم ہوتا ہے کہ مبادا ان کا یہ نہ جاگنا خود اس کی کسی کوتاہی کا نتیجہ ہو۔ اسی طرح کا احساس رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ کفر کی راہ میں ان لوگوں کی بھاگ دوڑ اس بات کا نتیجہ ہے کہ یہ سنت الٰہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں اور جب یہ سنت الٰہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں تو بھلا کس کے امکان میں ہے کہ ان کو باطل سے موڑ کر حق کی راہ پر لا سکے۔

تطہیر قلوب کا مرحلہ

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۔ یہ اشارہ ہے اس سنت الٰہی کی طرف

جو قرآن میں 'ختم قلوب'، 'ران'، کے الفاظ سے تعبیر ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دلوں کی تطہیر اور ان کے تزکیہ کے لیے، اللہ کے ہاں ایک خاص ضابطہ ہے۔ جو لوگ نیکی اور تقویٰ کی راہ پر چلتے ہیں اگر اثنائے راہ میں ان کو کوئی ٹھوکر لگ جاتی ہے، وہ گر پڑتے ہیں، لیکن گرنے کے بعد پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور توبہ و اصلاح کے ذریعہ سے دامن جھاڑ کے پھر چل کھڑے ہوتے ہیں تو خواہ ہزار بار گریں اور اٹھیں لیکن ان کے دامن دل پر میل جمنے نہیں پاتا، اللہ ان کی توبہ و اصلاح کو ان کے لیے کفارہ سیئات بناتا رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ برائی اور نافرمانی ہی کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں اور گناہوں کی کیچڑ ہی میں لت پت رہتے ہیں اسی میں راحت محسوس کرتے ہیں، آہستہ آہستہ ان کے دلوں پر اتنی سیاہی جم جاتی ہے کہ ان پر کوئی صیقل بھی کارگر نہیں ہوتا، پھر خدا انھیں جہنم کی بھٹی ہی کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

اجزائے کلام کو سمجھ لینے کے بعد نظم کے پہلو سے پھر ایک بار یہ بات ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ میثاق الٰہی کی ان دفعات کو بیان کرنے کے بعد جو دوسری ملتوں کے لیے مزلّۂ قدم ہوئیں، اب یہ ان چور دروازوں کی نشان دہی کی جا رہی ہے جن سے انھوں نے پہلے بھی فرار کی راہیں اختیار کیں اور اب بھی ان کو استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ ان چور دروازوں کی نشان دہی سے مقصود، جیسا کہ فحوائے کلام سے واضح ہے، اس امت کو یہ آگاہی دینا ہے کہ تم بھی پچھلی امتوں کی طرح خدا کے میثاق سے فرار اختیار کرنے والے نہ بن جانا بلکہ ہر حالت میں اس پر قائم و استوار رہنا۔ ورنہ جس طرح ان کے لیے دنیا کی رسوائی اور آخرت کا عذاب عظیم ہے اسی طرح تم بھی اس کے مستحق ٹھہرو گے۔ خدا کا قانون سب کے لیے یکساں اور بے لاگ ہے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ فَاِنْ جَاۗءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَـيْــــًٔا ۭ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۴۲)

سحت کا مفہوم

'اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ'، 'سُحت' کے معنی کسب حرام کے ہیں۔ کسب حرام کی یوں تو مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں لیکن اس لفظ کا غالب استعمال رشوت کے لیے ہے۔ اسی معنی میں یہ یہاں بھی استعمال ہوا ہے اور قرآن میں جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے اسی معنی میں ہوا ہے۔

جھوٹ اور رشوت علماء کو ختم کر دیتے ہیں

یہ اس گروہ منافقین و یہود کی، جن کا ذکر اوپر ہوا، مزید صفت بیان ہوئی کہ یہ جھوٹ کے رسیا اور پکے رشوت خور ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'سمّاع' اور 'اکّال' اول تو مبالغہ کے صیغے ہیں پھر یہ پورے گروہ کی صفت کے طور پر وارد ہوئے ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دونوں بیماریاں یہود اور ان کے ہم مشربوں پر وبا کی طرح مسلط ہو گئی تھیں اور ان کی پوری قوم ان میں مبتلا تھی۔ جھوٹ اور رشوت یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو کسی قوم میں پھیل جائیں تو اس کے اندر سے حق و عدل کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حق و عدل کا قیام، جیسا کہ 'کُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ' والی آیت میں بیان ہوا ہے دو چیزوں پر مبنی

ہے۔ ایک اس چیز پر کہ حق کی بے لاگ شہادت دینے والے موجود ہوں، دوسری یہ کہ قانون عدل و قسط کے مطابق بے لاگ فیصلہ کرنے والے موجود ہوں۔ یہ دونوں چیزیں نظام حق و انصاف اور قیام عدل و قسط کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اور جھوٹ اور رشوت ان دونوں کا استیصال کر دیتی ہیں۔ لفظ سحت، جو یہاں رشوت کے لیے استعمال ہوا ہے عربی لغت میں اصلاً استیصال کے مفہوم کے لیے استعمال ہوتا ہے، مجھے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ رشوت کے مفہوم کے لیے اسی لیے استعمال ہوا ہو کہ یہ چیز تمام حق و عدل کی بنیاد ہی ڈھا دیتی ہے۔

حامل شریعت امت کا اصلی فریضہ

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ اور قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ پر سب سے بڑا خدائی فرض یہی عائد ہوتا ہے کہ وہ حق کی گواہی دینے والے، حق پر قائم رہنے والے اور حق کے مطابق بے لاگ فیصلہ کرنے والے بنیں۔ یہی اس عہد و میثاق کے قیام و استحکام کی بنیاد ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر اس امت سے لیا ہے جس کو اپنی کتاب و شریعت سے نوازا ہے لیکن اس فرض کی ادائیگی اسی وقت تک ممکن ہے جب تک جھوٹ اور رشوت کی چاٹ لوگوں کو نہ لگے۔ جب جھوٹ کی چاٹ لگ جائے، جب جھوٹی گواہی دینا بہتوں کا پیشہ بن جائے، جب گواہی کو بیچنے والے، جھوٹی گواہی کی تعلیم دینے والے، جھوٹ کو فن بنا دینے والے اور جھوٹ کی وکالت کرنے والے سوسائٹی کے ہر طبقہ میں نہ صرف یہ کہ پیدا ہو جائیں بلکہ ان کو عزت کی نگاہوں سے دیکھا اور نہایت معزز القاب سے خطاب کیا جانے لگے، نیز رشوت خوری عام ہو جائے، اختیار رکھنے والے اور معاملات کا فیصلہ کرنے والے، اپنے اختیار و انصاف کو خریدنی و فروختنی شے بنا دیں، جو شخص ان کو خرید سکے، خواہ ظالم ہو یا مظلوم، ان کے اختیار و اقتدار اور ان کے زبان و قلم کو اپنے حق میں استعمال کر سکے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قوم کے اندر سے حق و انصاف کا جنازہ نکل گیا اور عہد الٰہی کی اس نے دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

یہود کی ایک چال اور اس کا توڑ

فَإِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ وَإِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا۔ فرمایا کہ یہ لوگ جو دوسروں کے بھیجے ہوئے تمھارے پاس آتے ہیں اور دل میں یہ ارادہ لے کر آتے ہیں کہ فیصلہ ان کے حسب منشا ہوگا تب تو قبول کریں گے ورنہ رد کر دیں گے تو ایسے لوگوں کے بارے میں تمھیں اختیار ہے کہ تم ان کے مقدمے کے فیصلے کی ذمہ داری لو یا نہ لو۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے اوپر قیام عدل و قسط کی ذمہ داری اصلاً صرف انہی لوگوں سے متعلق ہے جو تمھارے دائرۂ اقتدار و اطاعت کے اندر ہیں۔ جو اس سے باہر ہیں، جن کی وفاداری ابھی تقسیم ہے، جو تمھارے پاس بھی آتے ہیں اور دوسروں سے بھی ساز باز رکھتے ہیں، ان کی ذمہ داری شرعاً تم پر نہیں ہے، مصلحت دیکھو تو ان کے مقدمے لو، مصلحت نہ دیکھو تو رد کر دو۔ فرمایا کہ تم ان کو رد کر دوگے تو یہ تمھیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ یہ اطمینان اس لیے دلایا گیا کہ یہود اس طرح کے معاملات و مقدمات آنحضرت صلعم کے پاس بھیجتے یا لاتے تو اس میں ان کی کوئی نہ کوئی مفسدانہ غرض

ضرور پوشیدہ ہوتی، وہ اس سے آپ کے خلاف سیاسی خانہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلا دیا کہ تم ان کا معاملہ لو تو بہرحال اس کا فیصلہ اسی قانون عدل و قسط کے مطابق کرو جو اللہ نے تم پر نازل فرمایا ہے اور اگر ان کو رد کر دو تو اس کا بھی تمہیں اختیار ہے، یہ تم کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے، حق پر قائم رہنے والے کی اللہ حفاظت کرتا ہے۔

امت کو ہر حال میں حق پر قائم رہنے کی ہدایت

'وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ' یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطے سے پوری امت سے گویا عہد لیا گیا ہے کہ فیصلہ اپنوں کے کسی معاملے کا ہو یا غیروں کے، بہرحال بے لاگ بے لپیٹ، قانون عدل و قسط کے مطابق ہو۔ 'قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ' کا فریضہ منصبی یہی ہے اور اسی کی خاطر اللہ نے پچھلی امتوں کو معزول کر کے اس امت کو برپا کیا ہے۔ 'اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی محبت کسی نسل و خاندان کے ساتھ نہیں بلکہ عدل و قسط قائم کرنے والوں کے ساتھ ہے، جو گروہ جب تک اس پر قائم رہے گا اور اس کو قائم کرے گا اللہ اس کو دوست رکھے گا اور جس کو اللہ دوست رکھے وہی دنیا اور آخرت دونوں میں بہرہ مند اور فلاح یاب ہوگا۔

شریعت سے فرار کے لیے یہود کی دہری شرارت

'وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ' (۴۳) یہ تعجب کا اظہار اس بات پر نہیں ہے کہ وہ تورات رکھتے ہوئے اپنے معاملات کے فیصلے کے لیے آپ کو حکم کس طرح بناتے ہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ آپ کو حکم بنا کر آپ کے فیصلے سے مکرتے کس طرح ہیں جب کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کے فیصلے شریعت الٰہی کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اول تو احکام، بالخصوص تعزیرات و حدود، بنیادی طور پر تورات و قرآن دونوں میں یکساں ہیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جن امور میں قرآن کی کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہوتی ان میں آپ فیصلہ احکامِ تورات کے مطابق فرماتے اور ان یہود کو اچھی طرح علم ہوتا کہ آپ کا فیصلہ تورات کے قانون کے مطابق ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیسی بے حیائی اور ڈھٹائی کی بات تھی کہ آپ کو حکم بھی بنایا جائے اور آپ کا فیصلہ اس قانون الٰہی کے مطابق بھی ہو جس پر ایمان کا دعویٰ ہے لیکن پھر اس فیصلہ سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ تفسیر کی کتابوں میں زنا کے ایک مقدمے کا ذکر ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بالکل تورات کے قانون کے مطابق تھا لیکن علمائے یہود نے اس طرح کے معاملات میں امیر اور غریب کے لیے چونکہ الگ الگ ضابطے بنا رکھے تھے اس وجہ سے وہ تورات کے اصل قوانین کو چھپاتے تھے۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی انھوں نے یہی کوشش کی لیکن بالآخر ان کو اصل حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا۔ ظاہر ہے کہ یہ روش ہر پہلو سے دعوائے ایمان کے منافی ہے۔ اول تو آپ کی عدالت میں مقدمہ کو لے جانا ہی اس خواہش کے ساتھ تھا کہ تورات کے قانون سے فرار کی شاید کوئی شکل نکل آئے، لیکن جب وہاں سے کوئی شکل نہیں نکلی تو یہ جانتے بوجھتے کہ آپ کا فیصلہ بالکل تورات کے حکم کے مطابق ہے اس سے

گریز کی کوشش کی۔ فرمایا کہ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ یہ لوگ کسی چیز پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا
وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ
اخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۚ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝
وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ
وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۴۴-۴۵)

تورات کا مرتبہ

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ یہ تورات کی قدر و قیمت واضح فرمائی گئی کہ اللہ نے اس کو اتارا تھا تو بازیچۂ اطفال بنانے کے لیے نہیں اتارا تھا بلکہ زندگی کے اعلیٰ اقدار کے تحفظ کا وسیلہ، خدا اور اس کے نبیوں کے بتائے ہوئے طریقوں کی طرف رہنمائی کا ذریعہ، صراطِ مستقیم کی ہدایت اور خواہشات و بدعات کی تاریکیوں سے نکالنے والی روشنی بنا کر اتارا تھا۔

تورات کے بارے میں اس کے مخلص حاملین کی روش

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ تورات کے سچے اور مخلص حاملین کی روش بیان ہوئی ہے کہ کس طرح اللہ کے فرمانبردار نبیوں اور مخلص علما و فقہا نے خود اس کی اطاعت کی اور اس کے قوانین و احکام کے مطابق وہ یہودیوں کے معاملات و مقدمات کے فیصلے کرتے رہے اور اپنے اندر برابر اس احساس ذمہ داری کو زندہ رکھا کہ وہ خدا کی طرف سے اس کے امین و محافظ اور اس کے گواہ بنائے گئے ہیں اس وجہ سے نہ تو اس میں ان کے لیے کوئی خیانت جائز ہے اور نہ اس کے اظہار و اعلان میں کوئی کوتاہی روا ہے۔ یہ اللہ کا عہد و میثاق ہے جو بہر حال انھیں پورا کرنا ہے ـــ یہ آئینہ وقت کے یہود کے سامنے اس غرض سے رکھا گیا ہے کہ وہ اس میں دیکھیں کہ تورات سے متعلق ان پر کیا ذمہ داریاں عائد تھیں، ان کے صالح اسلاف نے ان ذمہ داریوں کو کس طرح نبھایا اور اب انھوں نے کس طرح اس عہد الٰہی کو بچوں کا کھیل بنا رکھا ہے۔

کتاب الٰہی کا حقیقی مقصد

'يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ' میں مضارع سے پہلے عربیت کے عام قاعدے کے مطابق 'كَانَ' کا صیغہ محذوف ہے یعنی كَانَ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ (انبیاء اس کے ذریعہ سے یہود کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے) حکم کے لفظ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ کتاب الٰہی کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی کے معاملات و نزاعات میں امر و حکم اور فیصلہ و قضا کا ذریعہ بنے اور تمام اجتماعی و سیاسی اور قانونی معاملات اسی کی ہدایات کے مطابق اور اسی کی روشنی میں انجام پائیں۔ اگر اس کی یہ حیثیت باقی نہ رہے بلکہ وہ صرف تبرک بنا کے رکھ چھوڑی جائے، یا اس کے الفاظ کی تلاوت کر لی جائے یا اس کو صرف مردے بخشوانے کا وسیلہ سمجھ لیا جائے، زندگی کے معاملات و مسائل سے نہ صرف یہ کہ اس کا کوئی تعلق باقی نہ رہے بلکہ ہر جا

اس کے احکام کے خلاف احکام و قوانین بنائے جائیں تو یہ اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق ہے۔

یہود پر ایک لطیف تعریض

انبیاء کے لیے ’اَلَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا‘ کی صفت سے اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے کہ یہ انبیاء جو تورات کے احکام کے مطابق یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے، صرف دوسروں ہی کے لیے تورات کو واجب العمل نہیں سمجھتے تھے بلکہ خود بھی خدا کے فرمانبردار اور تورات کے احکام و قوانین کے پابند تھے۔ اس میں ایک لطیف تعریض ہے ان علمائے یہود پر جنھوں نے اول تو تورات کو زندگی کے معاملات سے بالکل بے دخل کر رکھا تھا اور اگر کسی دائرے میں اس کو جگہ دی بھی تھی تو اس کی نوعیت یہ تھی کہ دوسروں کو تو اس کا حکم دیتے تھے لیکن خود اپنے آپ کو اس کا مخاطب نہیں سمجھتے تھے۔ قرآن مجید نے ’اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ‘ کے الفاظ سے ان کی اسی حالت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

یہود کو ایک یاد دہانی

’ربانی‘ اور ’احبار‘ عربی زبان میں اہل کتاب سے آئے ہوئے الفاظ ہیں۔ ’ربانی‘ سے مراد علما ہیں اور ’احبار‘ کا غالب استعمال فقہا اور قضاۃ کے لیے ہے۔ یہ دونوں الفاظ یہاں اپنے حقیقی مفہوم یعنی علمائے حقانی اور دیانت دار و راست باز فقہا و قضاۃ کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح خدا کے فرماں بردار انبیاء ٹھیک تورات کے مطابق لوگوں کے فیصلے کرتے رہے ہیں اسی طرح حق پرست علماء اور راست باز فقہا بھی اپنے فتوے اور فیصلے اس کی روشنی میں صادر کرتے رہے ہیں۔ یہاں بھی وقت کے علمائے یہود اور ان کے فقہاء کو نہایت لطیف طریقے پر توجہ دلائی ہے کہ تم جن اسلاف کے اخلاف ہو ان میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو تمھاری طرح خدا کی کتاب کے معاملے میں چور اور بددیانت نہیں تھے۔

عہد الٰہی کی پاسبان خشیت الٰہی ہے

’بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ‘ میں اس ذمہ داری کا بیان ہے جس کے وہ حامل بنائے گئے تھے اور جس کے صحیح احساس ہی نے ان کی عناں گیری کی جس کے سبب سے ان کو کتاب اللہ کا حق ادا کرنے کی توفیق ملی۔ وہ یہ کہ اللہ نے ان کو اپنی کتاب کا محافظ و امین اور خلق کے سامنے اس کا شاہد اور گواہ بنایا تھا اور ہر گروہ جو اللہ کی کتاب کا حامل بنایا جاتا ہے وہ درحقیقت اس کا محافظ اور گواہ ہی ہوتا ہے۔ یہ الفاظ بھی وقت کے یہود اور ان کے علماء و فقہا کو یاد دہانی کر رہے ہیں کہ وہ ذرا اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ پاسبان ہو کر انھوں نے خدا کے حرم میں کس طرح نقب لگائی ہے اور گواہ ہو کر کس طرح کتمانِ شریعت میں مہارت دکھائی ہے۔

’فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا‘ عام طور پر مفسرین نے اس ٹکڑے کو اوپر کے سیاق و سباق سے الگ کر کے وقت کے یہود سے خطاب کے مفہوم میں لیا ہے۔ اگرچہ الفاظ میں یہ مفہوم لینے کی بھی گنجائش ہے لیکن میرا رجحان اس طرف ہے کہ اس کا تعلق بھی اوپر کے ٹکڑے ہی سے ہے البتہ قرآن کے معروف طریقے کے مطابق یہاں اسلوب غائب کے بجائے حاضر کا ہو گیا ہے

قرآن مجید میں اس کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں کہ بات غائب کے صیغہ سے کہتے کہتے اچانک اسلوب حاضر کا آجاتا ہے۔ یہ تبدیلی کلام میں تنوع بھی پیدا کر دیتی ہے اور صورت حال کا نقشہ سامنے آجانے کے سبب سے قاری اور سامع پر اس کا اثر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً سورہ انعام میں ہے وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِنَ الْإِنْسِ (اور جس دن جن وانس سب کو اکٹھا کرے گا، اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنے دام میں پھنسا لیا) پھر آگے ہے وَكَذَٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۔۱۳۰ (اور اسی طرح ہم ظالموں میں سے ایک کو دوسرے پر ان کے اعمال کی پاداش میں مسلط کر دیتے ہیں، اے جنوں اور انسانوں کے گروہ .....) یہی اسلوب سورۂ بقرہ کی آیت وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۔۱۲۵ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اس کے محل میں ہم نے اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہی اسلوب مائدہ کی اس آیت میں بھی ہے۔ یعنی یہ بات ان شہداء سے خطاب کر کے کہی گئی تھی جن کا ذکر پہلے گزرا لیکن اس کو غائب کے صیغہ سے بیان کرنے کے بجائے حاضر کے صیغہ میں فرمایا تاکہ کلام زیادہ مؤثر ہو جائے۔

یہ ملحوظ رہے کہ تورات میں جہاں جہاں یہود سے پابندی احکام شریعت کے عہد لینے کا ذکر آیا ہے وہاں حضرت موسیٰؑ کی طرف سے ان باتوں کی تاکید ضرور آتی ہے جن کی طرف قرآن کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ یعنی خداوند خدا ہی سے ڈرنا، اس کے حکموں کے معاملے میں کسی کی پروا نہ کرنا، اس کی شریعت کو دنیا کے حقیر فوائد پر قربان نہ کرنا۔ غور کیجیے تو یہ باتیں اس امانت اور شہادت کا لازمی تقاضا ہیں جن کا بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ، میں ذکر آیا ہے۔ جو گروہ کتاب الٰہی کا گواہ بنایا گیا ہے اس کے لیے واجب ہے کہ وہ صرف خدا ہی سے ڈرے، دوسروں کا خوف و رعب اپنے سینے سے نکال دے۔ اس کے بغیر ہر طرح کے حالات میں اس کے لیے کتاب الٰہی کی شہادت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح جو جماعت کتاب الٰہی کی امین بنائی گئی ہے اس پر حرام ہے کہ وہ اپنے دنیوی مفادات و اغراض کی خاطر خدا کی اس امانت میں خیانت کرے اور کتاب الٰہی پر تاویل و تحریف کی قینچی چلائے۔ مزید غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی واضح ہو گی کہ میثاق الٰہی کی انھی تنبیہات کو فراموش کر دینے کی وجہ سے یہود 'شُہَدَآءَ لِلّٰہِ' اور 'اُمَنَاءَ اللّٰہ' ہونے کے بجائے سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ اور اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ بن کر رہ گئے جس کے سبب سے خدا نے ان پر لعنت کر دی۔

حقیقی کافر وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ، اس ٹکڑے کا عطف چونکہ اوپر والے ٹکڑے ہی پر ہے اس وجہ سے جو حکم اس کا ہے وہی حکم اس کا بھی ہے۔ یعنی یہ تنبیہ بھی اس تنبیہ کا ایک حصہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جن کو شریعت کا امین اور گواہ بنایا ہے اگر انہی کے معاملات کے فیصلے شریعت کے مطابق نہ ہوئے تو حقیقی کافر وہی ہیں۔ اس تاکید

اور زور کے ساتھ ان کے کافر قرار دینے کی وجہ وہ اہتمام ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی شریعت اور کتاب کی تعلیم دینے، اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے اور اس راہ کے خطرات سے متنبہ کرنے کے لیے فرمایا۔ جو لوگ اس سارے اہتمام کے بعد بھی راہِ حق سے بھٹک گئے انھوں نے گویا پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی اس وجہ سے یہ تمام اندھوں سے بڑھ کر اندھے ہیں۔ یہ آیت اگرچہ ہے تو یہود سے متعلق لیکن بعینہٖ یہی جرم اگر مسلمانوں کے کسی گروہ سے صادر ہو کہ وہ اختیار و آزادی رکھتے ہوئے کتابِ الٰہی کے مطابق معاملے کا فیصلہ نہ کریں، بلکہ علی الاعلان اس سے انحراف اختیار کریں تو ان کا حکم بھی یہی ہوگا اور یہی ہونا چاہیے۔ آگے اس کی وضاحت آئے گی۔

'وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ الاٰیۃ' یہ تورات کے اس قانون کا حوالہ ہے جو خروج ۲۱: ۲۳-۲۵، احبار ۲۴: ۲۰-۱۷، استثنا ۱۹: ۲۱ میں مذکور ہے۔ یہ حوالہ اس بات کی تصدیق کے لیے دیا گیا ہے جو اوپر آیت ۴۳ میں مذکور ہوئی ہے کہ تورات میں حدود و تعزیرات کے واضح احکام کی موجودگی میں آخر یہ یہود کس طرح تمھیں حکم بنا کر تمھارے فیصلہ سے گریز کرتے ہیں اور اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ درحقیقت یہ حدود ہی کے معاملات تھے جو یہود کے لیے سب سے زیادہ مزلۂ قدم ثابت ہوئے۔ اول تو انھوں نے تحریف کر کے ان کا حلیہ ہی بگاڑ دیا۔ پھر جو احکام تحریف کی دستبرد سے بچ رہے ان سے بھی فرار کے لیے انھوں نے مختلف قسم کے حیلے نکال لیے۔

'فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ' میں 'لَہٗ' کے مرجع کے بارے میں اصحابِ تاویل کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک اس کا مرجع شخص مجروح ہے۔ یعنی اگر مجروح اپنے مجرم کو بخش دے اس سے بدلہ نہ لے، تو اس کی یہ نیکی اللہ کے گناہوں کے لیے کفارہ بنے گی، گویا یہ ٹکڑا مجروح کے لیے ترغیب ہے کہ وہ مجرم کو معاف کر دے تو یہ بہتر ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک جس میں ابن عباس، مجاہد اور ابراہیم و شعبی جیسے اکابرِ تفسیر شامل ہیں، اس کا مرجع جارح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مجروح (اور بصورتِ قتل، اولیائے مقتول) مجرم کو معاف کر دے تو یہ معافی مجرم کے لیے کفارہ بن جائے گی، حکومت اس پر کوئی گرفت نہیں کرے گی اور اگر مجرم توبہ کرے گا تو عنداللہ بھی یہ معافی اس کے لیے کفارہ بن جائے گی۔ میرا رجحان اسی دوسری تاویل کی طرف ہے۔ قرآن کے الفاظ سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

معنی ظالم 'وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ' اوپر یہی مضمون بیان کرتے ہوئے کافرون کا لفظ آیا ہے۔ یہاں ظٰلِمُوْن کا لفظ ہے۔ لفظ ظلم ہلکے معنی میں نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ قرآن میں خدا اور بندوں کے سب سے بڑے حقوق کے تلف کرنے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے چنانچہ شرک کو ظلم سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ اللہ کی کتاب اور اس پر عمل کی آزادی رکھتے ہوئے اس کے قانون کو نظر انداز کرتے ہیں وہ خدا کا بھی سب سے بڑا حق تلف کرتے اور خود اپنے نفس اور اللہ کے دوسرے بندوں کا بھی

سب سے بڑا حق تلف کرتے ہیں اور درحقیقت اصلی ظالم یہی لوگ ہیں۔ یہ آیت بھی اگرچہ یہود کے جرائم کے بیان کے سیاق میں ہے۔ لیکن یہی جرم مسلمانوں سے صادر ہو رہا ہے جس کی شہادت ہر مسلمان ملک میں موجود ہے۔ تو میں نہیں سمجھتا کہ اس کا حکم اس سے الگ کس بنیاد پر ہوگا۔ خدا کا قانون تو سب کے لیے ایک ہی ہے۔

آیت کا حکم ہے یا منسوخ

یہ آیت قصاص، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، تورات کے ایک حکم کے حوالہ کے طور پر وارد ہوئی ہے لیکن کوئی اشارہ چونکہ اس کے منسوخ ہونے کا موجود نہیں ہے بلکہ انداز بیان اس کے محکم ہونے پر دلیل ہے اس وجہ سے یہی قانون اس امت کے لیے بھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے عمل سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں لفظ قصاص پر بحث کرتے ہوئے ہم لکھ چکے ہیں کہ اپنے عام استعمال میں یہ لفظ قصاص جانی و مالی دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اگر دیت پر راضی نامہ ہو جائے یا دیت ہی تقاضائے انصاف قرار پائے تو دیت ہی قصاص سمجھی جائے گی۔ تفصیلات اس کی فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۶-۴۷)

انبیاء کی باہمی مماثلت ایک علامت شناخت ہے

'وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ'۔ 'قَفَّيْتُ عَلٰى اثرہ بفلان' کے معنی ہوں گے، میں نے اس کو اس کے پیچھے بھیجا۔ مطلب یہ ہے کہ انھی انبیاء کے نقش قدم پر جن کا ذکر اوپر گزرا ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو بعینہٖ اسی مقصد کے ساتھ آئے جس مقصد کے لیے ان کے پیشرو انبیا آئے تھے۔ 'عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ' کے لفظ سے انبیاء کی دعوت، ان کے مقصد، ان کے مزاج، کردار اور طریق کار کی یکسانی اور ان کی باہمی مشابہت کا اظہار ہو رہا ہے۔ یہ چیز منجملہ علامات نبوت کے ہے۔ جس طرح ایک ہی شجرہ طیبہ کے برگ و بار میں مماثلت ہوتی ہے اسی طرح اس مقدس گروہ کے افراد میں مماثلت ہوتی ہے کہ جو ان میں سے ایک کو پہچان گیا وہ گویا سب کو پہچان گیا۔ ان کی شناخت کے معاملے میں التباس انھی کو پیش آتا ہے جو یا تو اندھے ہوتے ہیں یا اندھے بن جاتے ہیں، جن کے اندر بصیرت ہوتی ہے وہ کبھی دھوکا نہیں کھاتے۔

نبی اپنی دعوت سے کوئی الگ چیز نہیں

'وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ'۔ 'فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ' کا جملہ چونکہ حال واقع ہوا ہے اس وجہ سے 'مُصَدِّقًا' کا عطف اس پر موزوں ہوا۔ یہاں حضرت مسیح اور انجیل دونوں کی شان میں فرمایا ہے کہ 'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ'۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ نبی اپنی دعوت و رسالت سے کوئی الگ چیز نہیں ہوتا، دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت مسیح کی پیشینگوئی ان کے پیشرو انبیا کے صحیفوں میں موجود تھی جس کی آپ کی بعثت سے تصدیق ہوئی تھی اور یہ

چیز منجملہ آپ کے دلائل نبوت کے تھی، تیسری یہ کہ انجیل نے، جہاں تک شریعت کا تعلق ہے، کوئی نئی شریعت نہیں دی ہے بلکہ یہود کی بعض بدعات کی اصلاح کے ساتھ پوری سابق شریعت کی تصدیق کر دی ہے۔

انجیل دیتے وقت اہل انجیل کو ہدایت

'وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ' اوپر ہم نے جو محل فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ والے جملہ کا قرار دیا ہے وہی محل ہمارے نزدیک یہاں اس جملے کا ہے یعنی اہل انجیل کو انجیل دیتے وقت یہ ہدایت دی گئی کہ وہ اپنے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کریں گے، ورنہ وہ فاسق ٹھہریں گے۔ مقصود اس کا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ واضح کرنا ہے کہ خدا نے اپنی جو کتاب بھی اتاری اسی مقصد سے اتاری کہ زندگی کے معاملات و نزاعات میں لوگ اس کو حکم بنائیں، نہ اس لیے کہ جزدان میں لپیٹ کر بالائے طاق رکھ دیں اور آپس میں جو قضیے پیدا ہوں ان کو طاغوت کے پاس لے جائیں یا ان کو طے کرنے کے لیے من مانے طریقے ایجاد کریں۔ بعض لوگوں نے 'وَلِيَحْكُمْ' کو 'لِيَحْكُمْ' بھی پڑھا ہے۔ ہمارے نزدیک قرأت کے اس قسم کے سارے اختلافات تاویل کے اختلاف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی اس قرأت سے بھی یہی بات سمجھانی چاہی ہے کہ اہل انجیل کو بھی انجیل اس لیے دی گئی تھی کہ یہ اس کی روشنی میں اپنے معاملات کے فیصلے کریں۔

اصلی فاسق

'فَاسِق' کا لفظ یہاں فقہی مفہوم میں نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم مختلف مقامات میں واضح کرتے آئے ہیں، خدا سے غداری، عہد شکنی اور سرکشی کے مفہوم میں ہے۔ گویا جو لوگ جانتے بوجھتے اور آزادی و اختیار رکھتے ہوئے اللہ کے احکام و قوانین کے خلاف فیصلے کرتے اور کراتے ہیں وہ کافر، ظالم اور فاسق ٹھہریں گے۔ یہ تنبیہ اس میثاق الٰہی کا ہمیشہ سے ایک جزو لاینفک رہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے ان کو کتاب حوالہ کرتے وقت باندھا۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۴۸-۵۰)

حاملین قرآن کی ذمہ داری

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ بعینہٖ انہی ذمہ داریوں اور اسی عہد و میثاق کے ساتھ یہ کتاب تمہارے حوالے کی جا رہی ہے تو تم ان کے درمیان بہر حال اللہ کی اس کتاب کے مطابق ہی فیصلہ کرو۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس سیاق میں 'بالحق' کے معنی قول فیصل کے ہوتے ہیں۔ اہل کتاب نے اپنے

صحیفوں کو تحریفات کے ذریعے سے حق و باطل دونوں کا مجموعہ بنا دیا تھا۔ قرآن نے اللہ کا دین تمام آمیزشوں اور تحریفات سے پاک کر کے بالکل ٹھیک ٹھیک پیش کر دیا۔ 'مُصَدِّقًا' کی تاویل مختلف مقامات میں گزر چکی ہے۔

'مہیمن' کا مفہوم

'مُهَيْمِن' اصل میں 'مُؤَأْمِن' ہے۔ دوسرا ہمزہ ی سے اور پہلا ہ سے بدل گیا ہے۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے (۲۳۔ حشر) اور قرآن کی صفت کے طور پر بھی۔ هيمن الطائر علی فراخه کا مطلب یہ ہوگا کہ پرندہ اپنے بچوں کے اوپر پر پھیلائے ہوئے منڈلا رہا ہے، گویا ان کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہے۔ هَيْمَنَ فلان علی کذا، فلاں اس چیز کا محافظ اور نگران بن گیا۔ اپنے سے سابق صحیفوں پر قرآن کے 'مُهَيْمِن' ہونے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن اصل معتمد نسخہ کتاب الٰہی کا ہے اس لیے وہ دوسرے صحیفوں کے حق و باطل میں امتیاز کے لیے کسوٹی ہے۔ جو بات اس کسوٹی پر کھری ثابت ہوگی وہ کھری ہے، جو اس پر کھوٹی ثابت ہوگی وہ محرّف ہے۔ یہاں 'الکتاب' کا لفظ واحد استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن سے پہلے اصل شریعت کے اعتبار سے کتاب الٰہی کی حیثیت درحقیقت تورات ہی کو حاصل ہے، بقیہ صحائف اس کے اجزا و فروع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

'فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ'، قرآن سے متعلق یہ اسی طرح کا عہد و میثاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطے سے آپ کی امت سے لیا گیا ہے جس طرح کا عہد تورات اور انجیل سے متعلق ان کے حاملین سے لیا گیا اور جس کا ذکر اوپر گزرا۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہی کتاب حق و باطل کی کسوٹی اور احکام الٰہی کا قابل اعتماد مجموعہ ہے تو تم لوگوں کے درمیان اسی کے مطابق فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آ چکا ہے، ہرگز اس سے منحرف ہو کر ان منافقین اور یہود کی خواہشات و بدعات کی پیروی نہ کرنا جو اپنی خواہشوں کے مطابق فیصلے حاصل کرنے کے لیے تمہارے پاس آتے ہیں۔ یہ بات یہاں بغیر کسی اظہار کے ظاہر ہے کہ اس حق کو چھوڑ کر کسی باطل کے مطابق معاملات کے فیصلے کرنا اسی طرح کفر، ظلم اور فسق ہے جس طرح اوپر تورات و انجیل سے متعلق مذکور ہوا۔

'لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ' اس ٹکڑے کے صحیح موقع و محل اور اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لیے بقرہ کی مندرجہ ذیل آیات پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہ دونوں بالکل ایک ہی موقع و محل کی آیات ہیں اور ایک ہی حقیقت کو واضح کر رہی ہیں۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا

اور اگر تم ان اہل کتاب کے پاس ہر قسم کی نشانیاں لا کر رکھ دو جب بھی تمہارے قبلہ کی یہ پیروی نہیں کریں گے اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرنے کے، اور نہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے کا۔

جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۘ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۔ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

(البقرۃ ۲: ۱۴۵-۱۴۸)

اور اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے بعد اس کے کہ تمہارے پاس علم حق آ چکا ہے تو تم اپنے نفس پر ظلم کرنے والوں میں سے بن جاؤ گے۔ جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ البتہ ان میں سے ایک گروہ حق کو جانتے بوجھتے چھپاتا ہے۔ یہی حق ہے تیرے رب کی جانب سے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے، وہ اسی کی طرف رخ کرے گا تو تم بھلائیوں کی سمت میں سبقت کرو۔ جہاں کہیں بھی تم ہوگے اللہ تم سب کو اکٹھا کرے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

جس طرح یہاں سیاق و سباق دلیل ہے کہ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ کا ٹکڑا، جیسا کہ ہم اپنی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، اہل کتاب کے ساتھ رواداری کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ ان کے رویہ سے بیزاری کے اظہار کے لیے ہے اسی طرح مائدہ کی زیر بحث آیت میں لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا کا ٹکڑا بھی اہل کتاب کے ساتھ اظہار رواداری کے لیے نہیں بلکہ ان کے رویہ سے اظہار بیزاری اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے تسکین و تسلی اور راہ حق میں سبقت کی دعوت کے لیے ہے اسی طرح سورۂ حج میں ارشاد ہوا ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۔ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۔

(۶۷-۶۹ - حج)

ہم نے ہر امت کے لیے ایک طریقۂ عبادت ٹھہرایا وہ اسی پر چلیں گے تو وہ تم سے جھگڑنے کی کوئی راہ اس معاملے میں نہ پائیں اور تم اپنے رب کی طرف بلاتے رہو اور اگر وہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔ اللہ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن اس چیز میں جس میں تم اختلاف کر رہے ہو۔

آیت زیر بحث میں 'لِكُلٍّ' سے مراد وہی تینوں گروہ مراد ہیں جن کا اوپر ذکر گزرا یعنی یہود و نصاریٰ اور مسلمان۔ فرمایا کہ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ شرعۃ اور منہاج مقرر کیا ہے۔ شرعۃ اور منہاج سے مراد شریعت کا وہ ظاہری ڈھانچہ اور قالب ہے جو دین کے حقائق کو بروئے کار لانے کے لیے ہر مذہب میں اختیار کیا گیا ہے۔ مثلاً عبادتِ الٰہی ایک حقیقت ہے جس کو مختلف مذاہب میں نماز،

قربانی اور حج کو مختلف شکلوں صورتوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ بعض حقائق کے لیے قالب خود اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے۔ بعض کے لیے اللہ تعالیٰ کے اذن سے نبیوں نے مقرر فرمایا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے یہاں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ پہلے کے لیے 'شرعۃ' کا لفظ استعمال ہوا ہے، دوسرے کے لیے منہاج کا۔

مختلف امتوں کی شریعت کے اختلاف کی حکمت

جہاں تک دین کے حقائق کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے غیر متغیر ہیں اور غیر متغیر ہی رہیں گے لیکن شریعت کے ظواہر و رسوم ہر امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے الگ الگ مقرر فرمائے تاکہ یہ چیز امتوں کے امتحان کا ذریعہ بنے اور وہ دیکھے کہ کون ظواہر و رسوم کے تعصب میں گرفتار ہو کر حقائق سے منہ موڑ لیتا ہے اور کون حقیقت کا طالب بنتا ہے، اور اس کو ہر اس شکل میں قبول کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے جس میں وہ خدا اور اس کے رسول کی طرف سے اس کے سامنے آتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں، قبلہ کی بحث میں اس امتحان کا ذکر اس طرح فرمایا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ	اور ہم نے اس قبلہ کو، جس پر تم تھے، نہیں جائز رکھا
عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ	تھا مگر اس لیے کہ ہم چھانٹ کر الگ کر دیں ان لوگوں کو
الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ	جو رسول کی پیروی کرتے ہیں ان لوگوں سے جو پیٹھ
وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى	پیچھے پھر جاتے ہیں، اگرچہ یہ بہت بھاری بات تھی مگر
الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا	ان لوگوں کے لیے جن کو اللہ نے ہدایت کی توفیق بخشی
كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ إِنَّ	اور اللہ کا یہ ارادہ نہیں تھا کہ وہ تمھارے ایمان کو برباد
اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ۝	کرے، اللہ لوگوں پر بڑی رافت و رحمت رکھنے
(البقرۃ-۲: ۱۴۳)	والا ہے۔

یہ حکمت واضح فرمائی گئی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اول اول اہل کتاب کے قبلہ پر باقی رکھا، پھر کچھ عرصہ کے بعد اس کو چھوڑ کر بیت اللہ کو قبلہ بنانے کا حکم دیا؛ ایسا کیوں نہ ہوا کہ پہلے ہی روز سے بیت اللہ ہی کو قبلہ قرار دے دیا جاتا؛ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ یہ تبدیلی مخلصین و منافقین کے درمیان امتیاز کا ایک ذریعہ بنے۔ اس امتحان کے ذریعہ سے اس نے حق کے طالبوں اور رسول کے مخلص پیرووں کو ان لوگوں سے الگ کر دیا جو محض ظاہر دارانہ طور پر رسول کے ساتھ ہو گئے تھے، فی الحقیقت انھوں نے کوئی تبدیلی قبول نہیں کی تھی بلکہ بدستور اپنے پچھلے رسوم و قیود میں گرفتار تھے۔

اسی طرح آیت زیر بحث میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ منافقین اور یہود جو تم سے اور تمھاری لائی ہوئی شریعت سے بدکتے ہیں تو تم ان کی پروا نہ کرو۔ یہ اپنے پچھلے رسوم و قیود میں گرفتار ہیں، ان کا تعصب ان کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ ان سے آزاد ہو کر اس حق کو شرح صدر کے ساتھ اپنا لیں جو تم نے ان کے

سامنے پیش کیا ہے۔ اللہ نے ہدایت کے لیے شریعت اور منہاج الگ الگ بنائے ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی منہاج دیتا لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ منہاج کی اس تبدیلی کو لوگوں کے امتحان کا ذریعہ بنائے اور دیکھے کہ کون حق کا طالب بنتا ہے اور کون صرف لکیر کا فقیر اور رسوم و ظواہر کا غلام بن کے رہ جاتا ہے۔ اللہ عقل، اختیار اور شریعت کی جو نعمت دیتا ہے اس میں وہ لوگوں کا امتحان کرتا رہتا ہے کہ کون ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے، ان کی قدر کر رہا ہے، ان کے مغز اور قشر میں امتیاز رکھتا ہے اور کون بالکل اندھا بہرا بن کر محض رسم کا پجاری بن کر رہ گیا ہے تو تم ان اندھوں بہروں کو ان کے حال پر چھوڑو اور پیغمبر نے تمہارے سامنے حصول قرب الٰہی کا جو میدان کھولا ہے اس میں ایک دوسرے سے گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ یہاں 'یَاأَیُّهَا الرَّسُولُ لَا یَحْزُنْكَ الَّذِینَ یُسَارِعُونَ فِی الْكُفْرِ' والے ٹکڑے کو پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر منافقین اور ان کے مرشد یہود کفر کی راہ میں مسابقت کر رہے ہیں تو ان کی اس بدبختی پر غم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اہل ایمان، ایمان کے میدان میں بازی جیتنے کی کوشش کریں۔

'إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیعًا الآیة' یعنی اس دنیا میں تو بہرحال آزادی حاصل ہے، کوئی شخص چاہے کفر کی راہ اختیار کرے، چاہے ایمان کی لیکن منزل ہر شخص کی ایک ہی ہے، لوٹنا سب کو خدا ہی کی طرف ہے، ایک دن یہ سارا اختلاف اسی کے سامنے پیش ہوگا اور وہ اس اختلاف کا فیصلہ فرمائے گا۔

'وَأَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ الآیة' مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ اس ٹکڑے کا تعلق اوپر 'فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ' والے ٹکڑے پر ہے۔ بیچ میں 'لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً الآیة' والا ٹکڑا بطور ایک جملہ معترضہ کے آگیا ہے۔ جملہ معترضہ کے ختم ہونے کے بعد سلسلہ کی اصل بات کا از سر نو حوالہ دے کر مزید تنبیہ فرمائی کہ 'وَاحْذَرْهُمْ أَنْ یَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَیْكَ' ہوشیار رہو کہ مبادا وہ تمہیں فتنہ میں ڈال کر خدا کی اتاری ہوئی کسی بات سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس مزید تنبیہ کی ضرورت اس لیے تھی کہ یہ مرحلہ کوئی آسان مرحلہ نہیں تھا۔ مخالف قوتیں آسانی سے سپر انداز ہونے والی نہیں تھیں۔ فتنہ کا لفظ خود اشارہ کر رہا ہے کہ وہ پیغمبر اور مسلمانوں کو میثاق الٰہی سے ہٹانے کے لیے اپنا پورا زور لگا دیں گی۔ اس خطرے سے بچانے کے لیے آگاہ فرما دیا کہ وہ خواہ کتنا ہی زور لگائیں اور کتنا ہی دباؤ ڈالیں تمہیں بہرحال اللہ کی اتاری ہوئی شریعت ہی کی پیروی کرنی ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشات و بدعات کی پیروی نہیں کرنی ہے۔

مخالفین کو تہدید

'فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ الآیة' مطلب یہ ہے کہ تم موقف حق پر جمے رہو، اگر شریعت الٰہی کو چھوڑ کر یہ شریعت جاہلیت ہی کی پیروی پر اڑے رہے تو سمجھ لو کہ ان کی شامت آئی ہوئی ہے اور وقت آگیا ہے کہ ان کے بعض جرائم کی سزا میں ان پر خدا کا عذاب آدھمکے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ قوموں کے اجتماعی جرائم کی سزا اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں دے دیتا ہے، آخرت میں لوگ اپنی انفرادی حیثیتوں میں اپنے اعمال

کے لیے جواب دہ ہوں گے۔ وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ۔ یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں یہ اس بات کے سزاوار ہیں کہ ان پر اللہ کا عذاب آدھمکے۔ فرمایا کہ اس لیے کہ ان کی اکثریت خدا کی باغی اور نافرمان ہے۔

اَفَحُکْمَ الْجَاهِلِیَّةِ یَبْغُوْنَ الآیۃ یعنی خدا کی اتاری ہوئی شریعت کو چھوڑ کر اگر یہ کہیں اور سے فیصلہ چاہتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی شریعت پر جاہلیت کے قانون کو ترجیح دیتے ہیں اور کسی مدعی شریعت گروہ کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ جو لوگ خدا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں ان کے لیے خدا کے قانون اور خدا کے فیصلے سے بڑھ کر کس کا قانون اور کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اگر ان کے نزدیک کوئی اور قانون خدا کے قانون سے بڑھ کر ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو خدا اور آخرت کسی چیز پر بھی یقین نہیں ہے۔

خدا کے قانون کے خلاف ہر قانون، قانون جاہلیت ہے

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ 'حُکْمَ الْجَاهِلِیَّةِ' کا لفظ 'مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ' کے بالمقابل استعمال ہوا ہے اس وجہ سے ہر وہ قانون جو خدا کے اتارے ہوئے قانون کے خلاف ہے وہ جاہلیت کا قانون ہے، خواہ وہ قرونِ مظلمہ کی تاریکی میں وجود پذیر ہوا ہو یا بیسویں صدی کی روشنی میں۔

۱۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۵۱-۶۶

آگے مسلمانوں کو پہلے عام طور پر اور منافقین کو خاص طور پر آگاہ فرمایا کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا معتمد اور دوست نہ بناؤ، جو لوگ ان کو اپنا معتمد اور دوست بنائیں گے وہ ادعائے ایمان کے باوجود انہی میں شامل ہوں گے اور ان کا حشر انہی کے ساتھ ہوگا۔ پھر ان منافقین کے باطن سے پردہ اٹھایا اور بتایا ہے کہ یہ کفر کی راہ میں جو سبقت کر رہے ہیں اس کے محرکات کیا ہیں اور بالآخر اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ ان کی یہ روش ارتداد کی روش ہے اور اگر یہ ارتداد اختیار کرنا چاہتے ہیں تو کریں، خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر یہ مرتد ہو جائیں گے تو اللہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لائے گا جو ایمان و اخلاص کے تمام اوصاف سے متصف ہوں گے، خدا ان سے محبت کرے گا، وہ خدا سے محبت کریں گے، وہ اللہ کی پارٹی بنیں گے اور یہی پارٹی بالآخر غالب ہوگی۔

اس کے بعد ان منافقین کو غیرت دلائی ہے کہ آخر تم ان لوگوں کو کس طرح اپنا دوست اور معتمد بناتے ہو جو علانیہ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے اور اس کی تحقیر کرتے ہیں۔ پھر اہل کتاب کو ان کی ان شرارتوں پر سرزنش فرمائی اور ان کے اس انجام سے ان کو آگاہ فرمایا جس کے وہ اپنی بدبختیوں کے سبب سے سزاوار ٹھہرے۔ اسی ضمن میں ان کے علماء اور فقہا کو بھی سرزنش فرمائی کہ اگر وہ ان کو ان بے ہودگیوں و حرام خوریوں سے نہیں روکتے تو آخر وہ کس مرض کی دوا ہیں۔ آخر میں یہ واضح فرمایا کہ یہ تمام شرارتیں جو یہ دین حق کے خلاف کر رہے ہیں، اللہ ان میں سے کسی کو بھی کامیاب نہ ہونے دے گا بلکہ یہ ہر قدم پر

منہ کی کھائیں گے۔ بہتر ہوتا کہ یہ اچھی روش اختیار کرتے اور اللہ کے انعام کے سزاوار بنتے لیکن ان
پر ان کی شامت مسلط ہو چکی ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ
آیات بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ
۵۱-۶۶ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَى
الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ
نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ
بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِىْۤ
اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰٓؤُلَآءِ
الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ
حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ
يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ
لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ
يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾
وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ
ع هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ

اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ
قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿٥٧﴾
وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۚ ذٰلِكَ
بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ ﴿٥٨﴾ قُلْ يٰأَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُونَ
مِنَّآ إِلَّآ أَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ
وَأَنَّ أَكْثَرَكُمْ فٰسِقُونَ ﴿٥٩﴾ قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ
ذٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ
وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ۚ
أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيلِ ﴿٦٠﴾ وَإِذَا
جَآءُوكُمْ قَالُوٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا
بِهٖ ۚ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ﴿٦١﴾ وَتَرٰى كَثِيرًا
مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ
لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٢﴾ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ
عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا
يَصْنَعُونَ ﴿٦٣﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ
أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ تعفلازم
يَشَآءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ مَّآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ
طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ إِلٰى

يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَ
يَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾
وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَـكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ
وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ
وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ
وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ
سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ ع ٩ ١٣

ترجمہ آیات ٥١-٦٦

اے ایمان والو، تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ایک
دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست بنائے گا تو وہ انھی
میں سے ہے۔ اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ تم ان لوگوں کو، جن کے
دلوں میں روگ ہے، دیکھتے ہو کہ وہ ان کی طرف پینگیں بڑھا رہے ہیں، کہتے ہیں کہ
ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ تو بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح
یا اپنی طرف سے کوئی خاص بات دکھائے اور انھیں اس چیز پر جو یہ اپنے دلوں میں
چھپائے ہوئے ہیں، نادم ہونا پڑے۔ اور اس وقت اہل ایمان کہیں گے کہ کیا یہ وہی
لوگ ہیں جو بڑے زور و شور سے اللہ کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے تھے کہ وہ تمہارے
ساتھ ہیں۔ ان کے سارے اعمال ڈھے گئے اور وہ نامراد ہوئے۔ ۵۱-۵۲

اے ایمان والو، جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا، تو اللہ کو کوئی پروا
نہیں، وہ جلد ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت

کریں گے، وہ مسلمانوں کے لیے نرم مزاج اور کافروں کے مقابل میں سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جس کو چاہے بخشے گا اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے۔ ۵۴

تمہارے دوست اور معتمد تو بس اللہ، اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں فروتنی کے ساتھ۔ اور جو اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کو دوست بناتے ہیں تو وہ اللہ کی پارٹی ہیں اور اللہ ہی کی پارٹی ہے جو غالب رہنے والی ہے۔ ۵۵-۵۶

اے ایمان والو، ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنھوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنا لیا ہے، ان لوگوں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی، اور نہ کفار کو۔ اور اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو اور جب تم نماز کے لیے منادی کرتے ہو تو یہ اس کو مذاق اور کھیل بنا لیتے ہیں، یہ اس وجہ سے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔ ان سے کہو کہ اے اہل کتاب، تم ہم پر بس اس بات کا غصہ نکال رہے ہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس چیز پر جو ہماری طرف بھیجی گئی اور اس چیز پر جو پہلے اتاری گئی اور تم میں اکثر نافرمان ہیں۔ کہو کیا میں تمہیں باعتبار انجام اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برے لوگوں کا پتہ دوں؟ یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر اس کا غضب ہوا اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور سور بنائے اور جنھوں نے طاغوت کی پرستش کی، یہ ٹھکانے کے لحاظ سے بدتر اور اصل شاہراہ سے بعید تر ہیں۔ ۵۷-۶۰

اور جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں حالانکہ وہ

کفر کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ نکلتے ہیں، اور اللہ خوب واقف ہے اس چیز سے جس کو وہ چھپا رہے ہیں۔ تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ حق تلفی، زیادتی اور حرام خوری کی راہ میں گرم رو ہیں۔ کیا ہی برا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ ان کے علما اور فقہا ان کو گناہ کی بات کہنے اور ان کو حرام کھانے سے روکتے کیوں نہیں؟ کتنی بری ہے یہ حرکت جو یہ کر رہے ہیں۔ ۶۱-۶۳

اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہاتھ ان کے بندھ جائیں اور ان کی اس بات کے سبب سے ان پر لعنت ہو بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور ان کے کفر کو وہ چیز بڑھا رہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے تیری طرف اتاری گئی ہے اور ہم نے ان کے اندر دشمنی اور کینہ قیامت تک کے لیے ڈال دیا ہے۔ جب جب یہ لڑائی کی کوئی آگ بھڑکائیں گے اللہ اس کو بجھا دے گا۔ یہ زمین میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں اور اللہ فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۶۴

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ جھاڑ دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ تورات اور انجیل اور اس چیز کو قائم کرتے جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے اتاری گئی تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے خدا کا رزق و فضل پاتے۔ ان میں ایک راست رو جماعت بھی ہے لیکن زیادہ ان میں سے ایسے ہیں جن کے عمل بہت برے ہیں۔ ۶۵-۶۶

۱۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡیَہُوۡدَ وَ النَّصٰرٰۤی اَوۡلِیَآءَ ۘؔ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ وَ مَنۡ یَّتَوَلَّہُمۡ مِّنۡکُمۡ فَاِنَّہٗ مِنۡہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ (۵۱)

منافقین سے خطاب

خطاب اگرچہ مسلمانوں سے عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ روئے سخن ان منافقین ہی کی طرف ہے جن کا ذکر آیت ۴۱ سے چلا آ رہا ہے۔ اور جن کی صفت 'الَّذِیۡنَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡکُفۡرِ' بیان ہوئی ہے۔ یہ لوگ، جیسا کہ ہم 'سَمّٰعُوۡنَ لِقَوۡمٍ اٰخَرِیۡنَ' کے تحت واضح کر چکے ہیں، یہود کے زیرِ اثر تھے، اور دعویٰ اگرچہ ایمان کا کرتے تھے لیکن عملاً یہود کی مقصد برآریوں میں ان کے آلۂ کار اور ان کے ایجنٹ تھے۔ ان کو یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا معتمد اور کارساز نہ بناؤ۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ دوست بنانے کی یہ ممانعت 'مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ' کی قید کے ساتھ وارد ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے مقابل میں ان کو دوست نہ بناؤ۔ اگر یہ موالات اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے ہو یا کم از کم یہ کہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نہ ہو تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔

یہود و نصاریٰ کے ساتھ ترکِ موالات کا حکم

'بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس معاملے میں انفرادی مصالح اور انفرادی مراسم کو کوئی وزن نہیں دینا چاہیے، ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان یہود و نصاریٰ میں سے کسی فرد یا گروہ کو اچھا سمجھے یا اس کے ساتھ اس کی کوئی ضرورت وابستہ ہو یا سابق رشتہ داری ہو اور اس چیز کو وہ ان کے ساتھ ربط و ضبط قائم رکھنے کے لیے عذر بنائے لیکن یہ چیز صحیح نہیں ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کو اپنے لیے ایک مشترک خطرہ سمجھتے ہیں اور اس خطرہ سے نمٹنے کے لیے باہم ایک دوسرے کے دوست اور معاون ہیں اس لیے مسلمانوں کا رویہ ان کے ساتھ انفرادی بنیاد پر نہیں بلکہ جماعتی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ جس طرح وہ مسلمانوں کے خلاف بحیثیت جماعت ملّتِ واحدہ ہیں اسی طرح مسلمان ان کے مقابل میں ملّتِ واحدہ بنیں، ملت سے الگ ہو کر مسلمانوں کا کوئی گروہ ان کے کسی گروہ کے ساتھ اپنے ذاتی اغراض و مصالح یا ذاتی تعلقات و مراسم کی بنا پر اعتماد و دوستی کا ربط و ضبط نہ بڑھائے۔

یہود و نصاریٰ کے ساتھ معاملہ جماعتی حیثیت سے

'وَ مَنۡ یَّتَوَلَّہُمۡ مِّنۡکُمۡ فَاِنَّہٗ مِنۡہُمۡ' یعنی جو جماعت سے الگ ہو کر ان کو اپنا دوست اور معتمد بنائے گا، اس کا شمار انہی میں ہوگا۔ اس کا دعوائے اسلام بالکل بے حقیقت ہو کر رہ جائے گا۔

'اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ' ہدایت سے یہاں مراد، جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں، منزلِ مقصود کی طرف ہدایت ہے اور 'ظالمین' سے مراد اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ یعنی جو لوگ اسلام اور اہلِ ایمان کے مقابل میں ایمان و اسلام کے دشمنوں کو اپنا دوست و معتمد بنائیں گے وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں اور ایسے لوگ راہ یاب نہیں ہوں گے اس لیے کہ انھوں نے

سواء السبیل پر چلنے والے قافلے کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَن تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ ۚ فَعَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنفُسِهِمْ نَادِمِينَ ۝ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۚ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَأَصْبَحُوا خَاسِرِينَ (۵۲-۵۳)

منافقین کے مسلک کا چور

'فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ' ف' یہاں تفصیل کے لیے ہے اور خطاب، عام مسلمانوں سے ہے۔ اوپر کی آیت میں جو بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی تھی اور پردے میں تھی اب پردہ اٹھا کر اس کی تفصیل فرمائی جا رہی ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو ان سے پینگیں بڑھا رہے ہیں، ان کا مدعا کیا ہے اور بالآخر ان کا انجام کیا ہونا ہے۔ فرمایا کہ جن کے دلوں میں مرض ہے وہ ان کے ساتھ دوستی گانٹھنے کے لیے بے قرار ہیں 'مرض' کے لفظ پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اس سے مراد قرینہ دلیل ہے کہ نفاق ہے۔ نفاق کے لیے مرض کا لفظ استعمال کر کے قرآن نے یہ واضح فرما دیا کہ ان لوگوں کی یہ حرکت دل کی بیماری اور اس کے فساد کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ یہ اس کو اپنی بڑی دانش مندی اور دور اندیشی سمجھتے ہیں۔

'يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَن تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ' 'قول' کا لفظ جی میں کوئی بات کہنے کے لیے بھی قرآن میں متعدد مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن نے آگے اس کو کھول بھی دیا ہے اس لیے کہ فرمایا ہے 'فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنفُسِهِمْ نَادِمِينَ' (یعنی وہ جو کچھ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اس پر نادم ہوں گے) ظاہر ہے کہ یہ اشارہ اسی بات کی طرف ہے جس کا ذکر 'نَخْشَىٰ أَن تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ 'دائرۃ' کے معنی گردش، آفت اور مصیبت کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان منافقین کے دل میں یہ ڈر سمایا ہوا ہے کہ اس وقت مسلمانوں اور ان کے مخالفین میں جو کشمکش برپا ہے معلوم نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے، ہو سکتا ہے کہ بالآخر فتح مخالفین ہی کی ہو۔ ایسی صورت میں اگر ہم مسلمانوں ہی کے ہو کے رہ گئے تو سخت مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ دونوں سے راہ و رسم باقی رکھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، اس زمانے تک جیسا کہ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں، مسلمان اگرچہ ایک سیاسی طاقت بن چکے تھے لیکن ابھی ان کو کلی اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا، اپنے اپنے دائروں میں یہود اور قریش بھی با اقتدار تھے، اگرچہ یہ اقتدار روبہ زوال تھا لیکن منافقین کا قلبی رشتہ چونکہ ان مخالف اسلام طاقتوں ہی کے ساتھ تھا اس وجہ سے وہ آسانی کے ساتھ یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ اسلام کے مقابل میں اب ان کے ٹک سکنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

'فَعَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنفُسِهِمْ نَادِمِينَ' 'عسیٰ' اگرچہ اصلاً امکان غالب اور ظن غالب ہی کے اظہار کے لیے آتا ہے لیکن موقع دلیل ہو تو، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں اشارہ کر چکے ہیں، یہ وعدے کی تعبیر کے لیے بھی ایک لطیف اسلوب ہے۔ یہاں یہ اسی

مفہوم میں ہے۔ 'بالفتح' سے مراد وہ آخری اور مکمل فتح ہے، جس کے بعد دشمن کی قوت بالکلیہ ختم ہو جائے۔ 'اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ' سے ایسی کوئی صورت مراد ہے جس سے منافقین کا سارا بھانڈا پھوٹ جائے اور ان کے لیے کہیں منہ چھپانے کی جگہ باقی نہ رہ جائے۔ سورۂ توبہ میں اس کی ایک شکل یہ بیان ہوئی ہے۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۶۴۔ توبہ (منافقین ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے باب میں کوئی ایسی سورہ نہ نازل ہو جائے جو ان کے دلوں کے سارے راز ان پر آشکارا کر دے، کہہ دو، مذاق کر لو، اللہ ظاہر کرنے والا ہے جس کا تم اندیشہ رکھتے ہو)

فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ۔ میں ان کے اسی خیال کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر گزرا کہ یہ اسلام کی طرف یکسو ہو جانے میں اپنے مستقبل کی طرف سے اندیشہ ناک ہیں کہ اگر فتح یہود اور مشرکین کی ہوئی تو یہ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔

'وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا الاية' یہ مسلمانوں کی طرف سے ان منافقین کے حال پر اس وقت کا اظہار تعجب نقل ہوا ہے جب ان کا سارا راز فاش ہو جائے گا، اس وقت مسلمان آپس میں کہیں گے، اے، کیا یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے زور و شور سے قسمیں کھا کھا کر ہمیں یقین دلاتے تھے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں! مقصود اس صورت حال کی تصویر سے منافقین کو جھنجھوڑنا ہے کہ کب تک چھپنے اور چھپانے کی کوشش کرو گے، بالآخر ایک دن برسر عام رسوائی ہونی ہے۔

'حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ' مسلمانوں کے قول کا ایک حصہ بھی ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان منافقین کے انجام کا بیان بھی۔ ہمارا رجحان اس دوسرے پہلو کی طرف ہے۔ 'حبط عمل' کی حقیقت پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ اعمال کے مثمر ہونے کا انحصار تمام تر ایمان و اخلاص پر ہے۔ نفاق کے ساتھ دینداری کی جو نمائش کی جاتی ہے وہ محض نمائش ہوتی ہے، حقیقت کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۵۴)

خطاب بظاہر عام مسلمانوں سے ہے لیکن روئے سخن ان منافقین ہی کی طرف ہے جن کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ فرمایا کہ تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ اپنے دین کی خدمت کے لیے ایسے ایسے لوگوں کو کھڑا کرے گا جو...... اس سے یہ حقیقت آپ سے آپ ظاہر ہو گئی کہ ان کی یہ روش دین سے ارتداد کی روش ہے۔ اگر اس تنبیہ کے بعد بھی اس سے باز نہیں آنا چاہتے تو جائیں مرتد ہو جائیں، خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں۔ اس طرح کے جملوں میں عربیت کے عام قاعدے کے مطابق جواب شرط محذوف ہوتا ہے جو سیاق کلام

منافقین کی روش ارتداد کی روش ہے

سے واضح ہوتا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اس حذف کو کھول دیا ہے۔

منافقین کے سامنے ایک آئینہ

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ۔ ان صفات کے بیان سے مقصود ایک تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ زمین میں اپنے دین کا گواہ اور علم بردار بنا کر کھڑا کرتا ہے ان کی صفات کیا ہوتی ہیں یا کیا ہونی چاہئیں۔ دوسرا یہ کہ یہ منافقین ان صفات کے بالکل برعکس صفات کے حامل ہیں۔ گویا براہِ راست ان کے عیوب گنانے کے بجائے ان کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھ دیا گیا ہے جس میں وہ اپنے سارے عیوب خود دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اظہارِ حقیقت کا ایک نہایت بلیغ اسلوب ہے جو قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے۔

دین کے علم برداروں کی پسندیدہ صفات

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (ان سے خدا محبت کرے گا اور وہ خدا سے محبت کریں گے) اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو گئی کہ ان منافقین سے نہ خدا محبت کرتا نہ یہ خدا سے محبت کرتے بلکہ خدا ان سے نفرت کرتا ہے اور یہ خدا سے بیزار و بے پروا ہیں۔ خدا کی محبت کسی کے نام و نسب، شکل و صورت اور مال و جاہ سے نہیں بلکہ ایمان و عمل اور اخلاق و کردار سے ہوتی ہے۔ جب اس اعتبار سے یہ نہ صرف صفر بلکہ خدا کی پسندیدہ صفات کے بالکل برعکس صفات سے متصف ہیں تو یہ خدا کی محبت کے حقدار کیسے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح خدا سے محبت کی شہادت یہ ہے کہ یہ خدا کے احکام و ہدایات اور اس کے نبی کے طریقہ اور فیصلہ کے پابند ہوں لیکن جب یہ اللہ کے فیصلہ کو چھوڑ کر جاہلیت کے فیصلہ کے طالب اور اللہ و رسولؐ اور اہل ایمان کو دوست بنانے کے بجائے اللہ و رسولؐ کے مخالفین یہود و نصاریٰ اور کفار سے دوستی کی پینگیں بڑھاتے ہیں تو خدا سے بیزار ہونے کی اس سے بڑی شہادت کیا ہو سکتی ہے۔ اس مسئلہ پر آل عمران آیت ۳۱ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ، اَذِلَّةٍ، ذَلِيْل کی جمع ہے۔ عربی میں یہ لفظ، جیسا کہ آل عمران کی آیت ۱۲۳ کے تحت ہم بتا چکے ہیں، اچھے اور برے دونوں معنوں میں آتا ہے۔ جب یہ اچھے معنوں میں آتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے تو اس کے معنی نرم خو، نرم مزاج، فرمانبردار، متواضع اور سہل الانقیاد کے ہوتے ہیں۔ 'ذلول' کا لفظ بھی اسی معنی میں آتا ہے۔ فرمانبردار اونٹنی کو ناقہ ذلول کہتے ہیں۔

اَعِزَّةٍ عزیز کی جمع ہے۔ یہ لفظ بالکل 'ذلیل' کے مقابل لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے معنی ہیں سخت، مشکل، بھاری، ناقابل شکست، ناقابل عبور، عسیر الانقیاد۔ اگر کسی چیز کے متعلق کہیں کہ هُوَ عَزِيْزٌ عَلَيَّ تو اس کے معنی ہوں گے کہ وہ چیز مجھ پر بھاری اور مشکل ہے۔ اس کو رام کرنا اور قابو میں کرنا میرے لیے دشوار ہے۔ یہی مفہوم شَقَّ عَلَيَّ کا بھی ہوتا ہے کسی حماسی کا نہایت عمدہ شعر ہے۔

اذا المرء اعيته المروة ناشئا فمطلبها كهلا عليه شديد

اگر آدمی جوانی میں اولوالعزمی پیدا کرنے سے آدمی قاصر رہ جاتا ہے تو ادھیڑ پن میں اس کا حاصل

کرنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے تو وہ نہایت نرم خو، بھولے بھالے اور ہر پہلو سے لچک قبول کرنے والے اور ہر سانچے میں ڈھل جانے والے ہوں گے لیکن کافروں کے لیے وہ پتھر کی چٹان ہوں گے۔ وہ اگر اپنے اغراض و مقاصد کے لیے ان کو استعمال کرنا چاہیں گے تو کہیں سے انگلی دھنسانے کی جگہ نہ پا سکیں گے۔ مسلمانوں کی یہی تعریف ایک حدیث میں بھی وارد ہے۔ المومن غر کریم مومن اپنے دوسرے بھائی کے لیے بھولا بھالا اور شریف و کریم ہوتا ہے۔ سیدنا مسیح نے اپنے شاگردوں کو ہدایت فرمائی تھی کہ کبوتر کے مانند بے آزار اور سانپ کے مانند ہوشیار بنو، اس میں بھی یہی دونوں پہلو ملحوظ ہیں۔

ان صفات کے بیان سے بھی مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، منافقین کے کردار پر عکس ڈالنا ہے جو بالکل اس کے برعکس واقع ہوا تھا یعنی وہ مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے تو بڑے ہوشیار اور گھاگھ تھے، مٹھی پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے تھے لیکن یہود اور مشرکین کے ہاتھوں میں موم کی ناک اور کٹھ پتلی تھے، وہ جس طرف چاہتے ان کو موڑ دیتے اور جس طرح چاہتے ان کو نچاتے۔ اس مضمون پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۂ فتح کی آیت مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ (محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابل میں سخت اور آپس میں مہربان و نرم دل ہیں) کے تحت آئے گی۔

'یُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَۃَ لَآئِمٍ' جہاد سے مطلب یہاں صرف قتال ہی نہیں ہے بلکہ ہر وہ جدوجہد ہے جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے دین کو قائم کرنے کے لیے کی جائے۔ اس میدان میں اترنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام دوسرے مفادات اور دوسری دلچسپیوں سے منہ موڑ کر اور دوسروں کی نصیحتوں اور ملامتوں سے کان بالکل بند کر کے اترے۔ جو شخص ہر کام پر پیچھے مڑ مڑ کے بھی دیکھے گا اور اپنے ناصحوں اور ملامت گروں کی نصیحتوں اور ملامتوں کو بھی اہمیت دے گا وہ اگر ایک قدم آگے بڑھائے گا تو دو قدم پیچھے ہٹائے گا۔ عرب شعراء جب اولو العزمی، بہادری اور فیاضی کا مضمون باندھتے ہیں تو اس کی تمہید میں ملامت کرنے والیوں کی ملامت کا ذکر ضرور کرتے ہیں اس لیے کہ اس راہ کی یہ سب سے پرانی اور ناگزیر آفت ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ آدمی کوئی عزم و جزم کا کام کرنے اٹھے اور دہنے بائیں سے کچھ ناصح اور کچھ ملامت گر دامن گیر نہ ہو جائیں۔ یہ اس راہ کی پہلی آزمائش ہوتی ہے اگر کوئی آدمی ان جھٹکوں کے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو تو اکثر وہ اس پہلے ہی مرحلے میں مار کھا جاتا ہے۔

اس صفت کے بیان کرنے سے بھی مقصود منافقین کے کردار پر عکس ڈالنا ہے کہ مدعی تو یہ بنے ہیں ایمان کے اور قدم رکھا ہے انھوں نے عشق کے کوچے میں لیکن پیچھے کے مفادات بھی دامن گیر ہیں۔ مستقبل کے خطرات سے بھی ہوش اڑے جا رہے ہیں اور پوری فراخدلی اور نیازمندی کے ساتھ ان ہمدردوں اور

ملامت گروں کی نصیحتوں کا احترام بھی انھیں ملحوظ ہے جن کے پھندوں میں گرو شیطان نے لگائی ہے اور جن سے بچ کے نکل جانا بڑے ہی صاحب توفیق کا کام ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ یعنی اللہ کا اصل فضل یہی ہے جس کے سزاوار وہ بنتے ہیں جن کو وہ چاہتا ہے۔ 'جن کو وہ چاہتا ہے' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی ٹھہرائی ہوئی سنت کے مطابق اس کے اہل ٹھہرتے ہیں۔ یہ بات ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ خدا کی مشیت اس کی کامل قدرت اور اس کے کامل علم و حکمت کے ساتھ ہے اور جہاں مشیت کامل قدرت اور کامل علم و حکمت کے ساتھ ہو وہاں کسی حق تلفی و ناانصافی کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ مشیت کے بیان کے ساتھ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ کی صفات کا حوالہ دینے سے مقصود اسی حقیقت کا اظہار ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ آخر اس وقت مسلمانوں کے اندر ان صفات کے حامل بھی تو موجود تھے بلکہ اکثریت ان صفات کے حاملین ہی کی تھی تو قرآن نے یہ کیوں کہا کہ 'خدا ایسے لوگ کو لائے گا' ان لوگوں کا حوالہ کیوں نہ دیا جو موجود تھے اور ان صفات کے بہترین حامل تھے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان آیات میں خطاب اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے عام ہے لیکن روئے سخن اصلاً منافقین ہی کی طرف ہے۔ ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر تم مرتد ہو گئے تو خدا کا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا، خدا تمھاری جگہ اپنے دوسرے بندوں کو کھڑا کرے گا جو ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لیے تمام اعلیٰ صفات سے متصف ہوں گے۔ گویا یہ فرما کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین مخلصین کے اس غم کو دور کیا گیا ہے جس کا ذکر اوپر لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ والی آیت میں ہوا ہے کہ پیغمبر اور اہل ایمان ان منافقین کی کفر دوستی سے غمگین نہ ہوں، اگر یہ نکل گئے تو ان کے نکل جانے سے اللہ کے دین کا کچھ نہیں بگڑے گا، ان کی جگہ اللہ اپنے دین کی خدمت کے لیے دوسری تازہ دم فوج لے آئے گا جو ان تمام کمزوریوں اور بیماریوں سے پاک ہوگی جو ان کے اندر موجود ہیں۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۵۵-۵۶)

آیت ۵۱ میں جو بات منفی اسلوب سے فرمائی گئی تھی وہی بات اب مثبت پہلو سے کہی جا رہی ہے یعنی یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست اور معتمد نہ بناؤ بلکہ اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا دوست اور معتمد بناؤ۔ تمھارا ایمان (اگر وہ موجود ہے) تم کو ان سے جوڑتا ہے نہ کہ اُن سے۔ 'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی مومنین مخلصین۔

ایمان کی عملی تعبیر نماز اور زکوٰۃ ہے

'اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ' یہ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے بدل ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ایمان کی عملی تعبیر اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ عطف کے بجائے بدلیت

کے اسلوب سے اس کو تعبیر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حکمت شریعت کے پہلو سے ایمان اور نماز و زکوٰۃ میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ دونوں بالکل لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں ایمان موجود ہے نماز اور زکوٰۃ لازماً موجود ہوں گی۔ اگر یہ غائب ہیں تو یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ ایمان بھی غائب ہے۔ اگر اس کا دعویٰ ہے تو یہ محض دعویٰ ہے جس کا حقیقت کی میزان میں کوئی وزن نہیں ہے۔

نماز اور زکوٰۃ کی اصلی روح

وَهُمْ رٰكِعُوْنَ، 'رکوع' یہاں اپنے اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ اپنے عام لغوی مفہوم میں ہے۔ 'رکع الرجل' کے معنی ہوتے ہیں 'افتقر و انحطت حالہ' اس وجہ سے فروتنی، افتقار، نیازمندی، عاجزی اور دل شکستگی اس لفظ کی اصل روح ہے۔ نماز میں رکوع، درحقیقت آدمی کے دل کی اسی حالت کی تعبیر کی ایک عملی شکل ہے۔ یہاں اس قید کے لگانے سے مقصود نماز اور زکوٰۃ کی اصل روح کی طرف اشارہ کرنا ہے اس لیے کہ جس طرح نماز اور زکوٰۃ کے بغیر ایمان بے معنی اور بے روح ہو کے رہ جاتا ہے اسی طرح دل کی فروتنی اور خشیت کے بغیر نماز اور زکوٰۃ بالکل بے مقصد ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اسلام کے دور اول میں منافقین کو نماز بھی پڑھنی پڑتی تھی اور زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوتی تھی۔ اس کے بغیر اس عہد مبارک میں کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرا ہی نہیں سکتا تھا لیکن سورۂ نساء میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے کہ ان کی نمازیں مارے باندھے کی ہوتی تھیں، قرآن میں ان کے لیے 'کسالیٰ' کا لفظ آیا ہے، اسی طرح ان کا انفاق محض نمائش کے لیے ہوتا تھا 'وَهُمْ رٰكِعُوْنَ' کی قید نے یہ واضح کیا کہ دین میں جو نماز و زکوٰۃ مطلوب ہے وہ دل کی خشیت اور فروتنی کے ساتھ مطلوب ہے، ریا، تکبر اور کراہت کے ساتھ نہیں۔

'حزب اللہ' سے مراد

'وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ' میں ایجاز کلام کے تقاضے سے ایک ٹکڑا محذوف ہے۔ پوری بات گویا یوں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا دوست بناتے ہیں وہ اللہ کی جماعت ہیں اور اللہ ہی کی جماعت ہے جو غالب ہونے والی ہے۔ چونکہ آخر کا ٹکڑا خود محذوف پر دلیل تھا اس وجہ سے پہلے کو حذف کر دیا۔ اوپر فرمایا تھا کہ جو لوگ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست بنا رہے ہیں وہ ایک دن اپنے کیے پر پچھتائیں گے، ان کے اعمال ڈھے جائیں گے، وہ نامراد ہوں گے۔ اب یہ اللہ و رسول اور اہل ایمان کو دوست بنانے والوں کے روشن انجام کو واضح فرما دیا اور ان کو 'حزب اللہ' کے لقب سے ملقب کر کے یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ یہ منافقین جو یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست بنا رہے ہیں یہ حزب الشیطان ہیں اور شیطان کا کید چونکہ ضعیف اور بودا ہوتا ہے اس وجہ سے ان کی ناکامی و نامرادی ان کی تعبیر ہی کے اندر مضمر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (۵۷-۵۸)

دین کا مذاق اڑانے والوں سے دوستی غیرت و حمیت کے خلاف ہے

اب یہ ان کے جذبۂ غیرت و حمیت کو ابھارا ہے کہ جو اہلِ کتاب اور کفار تمہارے دین کا مذاق اڑاتے اور تمہارے شعائر دین کو کھیل تماشہ بناتے ہیں حیف ہے اگر تم ان کو اپنا دوست بناؤ۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ جو چیز اس کی طرف منسوب ہو یا جس کی طرف وہ منسوب ہو اس کی توہین و تذلیل وہ برداشت نہیں کرتا، اگر کوئی اس کو گوارا کر لے تو یہ اس کی بے حمیتی کی دلیل ہے۔ عرب کے لوگ اس معاملے میں بڑے حساس تھے۔ دین تو بڑی چیز ہے وہ اپنے خاندان یا اس کے کسی فرد کی توہین و تذلیل پر بھی آگ بگولہ ہو جاتے اور تلواریں سونت لیتے۔ اس انسانی فطرت کے پہلو سے قرآن نے ان کو ملامت کی ہے کہ جو لوگ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں آخر کس دل و جگر سے تم ان کو دوست بناتے ہو۔ اس کے بعد نہایت سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی کہ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو، یعنی اگر تم سچ مچ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو کہ اس بے حمیتی پر تمہارا ایمان نہ سلب ہو جائے اور خدا کا غضب نہ نازل ہو جائے۔

وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ الاٰیۃ۔ ذکر ہے اس چیز کا جس کا یہ مذاق اڑاتے ہیں۔ اشارہ اذان کی طرف ہے۔ یہودی اشرار جس طرح مجالسِ نبویؐ میں مختلف قسم کی بدتمیزیاں کرتے تھے جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اسی طرح ان کے اراذل و اشرار اذان کی بھی بھونڈے طریقے پر نقلیں کرتے اور اس پر ہنستے ہنساتے۔ اذان، اللہ کی بندگی کی دعوت ہے۔ اس کا مذاق اڑانا بالخصوص ان لوگوں کی طرف سے جو کتابِ الٰہی کے حامل بنائے گئے ہوں، خود خدا کی تحقیر اور اس کا مذاق اڑانے کے ہم معنی ہے۔ ایسے لوگ ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ کوئی مسلمان ان سے دوستی رکھے، اگر کوئی شخص ان سے دوستی رکھتا ہے اور ایمان کا مدعی بھی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ غیرتِ ایمانی سے خالی ہے اور غیرتِ ایمانی سے خالی شخص اپنے ایمان کی کبھی حفاظت نہ کر سکے گا۔ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ نیکی اور بھلائی کا احترام انسان کے ذی عقل ہستی ہونے کا تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے محروم ہے تو وہ صرف دینداری ہی سے محروم نہیں ہے بلکہ عقل سے بھی محروم ہے۔

اذان شعائر الٰہی میں سے ہے

اس آیت سے اذان کے عظیم شعائر الٰہی میں سے ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ اذان کا آغاز ملت میں کس طرح ہوا؟ اس سوال کے جواب میں، بربنائے اختلافِ روایات، اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ لیکن اس امر میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ جس شکل میں وہ موجود ہے اس کو امت کے تواترِ قولی و عملی کے ساتھ اللہ اور اس کی کتاب کی تصدیق و تصویب بھی حاصل ہے۔ اس وجہ سے اس کو کسی اور شکل میں بدلنے کی کوشش دین میں ایک بہت بڑی جسارت ہے۔ شعائر کا معاملہ دین میں بڑا اہم ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔ خاص اذان کے مسئلہ پر اختلاف

سورۂ جمعہ کی تفسیر میں ہم مزید بحث کریں گے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ هَلْ تَنْقِمُونَ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَأَنَّ أَكْثَرَكُمْ فَاسِقُونَ ۝ قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِنْ ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللَّهِ مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضَلُّ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ (۵۹-۶۰)

'نقم' کے معنی انتقام لینے، بدلہ لینے اور کسی پر غصہ نکالنے کے ہیں۔

یہود کی تازہ خانی

اوپر یہود کی جو شرارت بیان ہوئی ہے اس کے تعلق سے اب کلام کا رخ یہود کی طرف مڑ گیا۔ ان کو مسلمانوں کی طرف سے کہلایا جا رہا ہے کہ ہمارے ساتھ تمہاری اس ساری دشمنی اور شرانگیزی کی علت اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ ہماری نیکی تمہارے نزدیک بدی بن گئی ہے۔ آخر ہمارا کیا جرم ہے؟ یہی نا کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، اس کتاب پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی اور ان کتابوں پر بھی ایمان لائے جو پہلے اتاری گئیں، برعکس اس کے تمہارا حال یہ ہے کہ تم میں سے اکثر فاسق ہیں، نہ اس کتاب ہی پر ایمان رکھتے ہو جو تمہاری طرف اتاری گئی اور نہ اس کتاب ہی پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو جو ہم کو عطا ہوئی! فرمایا کہ ان سے کہو کہ تمہارے نزدیک تو اس دنیا میں ہم سب سے برے ہیں اور اس کے سبب سے تم ہمارے درپے آزار و انتقام ہو لیکن کچھ پتہ ہے کہ آخرت میں اللہ کے نزدیک اپنے انجام کے لحاظ سے سب سے برا کون ہے؟ یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر اللہ کا غضب ہوا اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور خنزیر بنائے اور جنھوں نے طاغوت کی پرستش کی ــــ یہ ٹھکانے کے لحاظ سے سب سے برے اور شاہراہِ حق سے بعید تر ہیں۔

'مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ' میں ہمارے نزدیک مضاف محذوف ہے جس طرح 'وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ' میں ہے۔ یعنی مَثُوبَةُ مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ۔

انسان کے لباس میں بندر اور سؤر

'اَلْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ'، اصحاب السبت کی لعنت کے سلسلہ میں 'قِرَدَةً' پر بحث گزر چکی ہے۔ انسان کی خواہش اور اس کے عمل کے درمیان سے جب عقل و ارادہ کی کڑی غائب ہو جائے اور وہ یکسر اپنی خواہشوں کا غلام بن کے رہ جائے تو پھر اس کے اور حیوانات کے درمیان کوئی جوہری فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ یہ چیز اس کے باطن کو بالکل مسخ کر دیتی ہے اور باطن کے مسخ ہو جانے کے بعد ظاہر بھی بالتدریج مسخ ہو کے رہتا ہے۔ جو نگاہیں حقیقت بین ہوتی ہیں وہ سیرت کا عکس صورت میں بھی دیکھ لیتی ہیں اگرچہ اس کو غازہ اور پوڈر سے کتنا ہی چھپانے کی کوشش کی جائے۔ انسان اپنی مادی خلقت کے اعتبار سے گوشت پوست سے بنا ہوا ایک حیوان ہی ہے۔ بعض حیوان دو ٹانگوں پر چلتے ہیں، بعض چار پر۔ انسان کو انسانیت کا جمال اس شعلۂ نورانی سے حاصل ہوتا ہے جس کو قرآن نے 'نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي' سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ شعلۂ یزدانی بجھ جائے تو پھر انسان کو بھی دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور سمجھیے

جو اپنی سرشت کے اعتبار سے بندر اور خنزیر بھی ہو سکتا ہے، کتا اور گدھا بھی۔ چنانچہ یہود کی مثال قرآن میں کتے اور گدھے سے بھی دی گئی ہے۔ اس معاملے میں نگاہ اور نگاہ کے درمیان بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ جن نگاہوں کی رسائی صرف صورت اور لباس ہی تک ہے ان کے لیے آدمی اور غیر آدمی میں فرق کرنا ناممکن ہے لیکن جو نگاہیں باطن میں گھسنے کی عادی ہیں وہ بادنیٰ تامل اندازہ کر لیتی ہیں کہ فلاں صورت کے اندر بندر چھپا ہوا ہے یا خنزیر، کتا چھپا ہوا ہے یا گدھا۔ انبیاء اور عارفین کے ملکوتی مشاہدات میں ایسی بہت سی چیزیں ملتی ہیں جن سے اس بات کی تائید ہوتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم بعض مثالیں یہاں پیش کرتے۔

'وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ' کا عطف اوپر 'مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ' الایۃ پر ہے اور یہ اشارہ ہم کر چکے ہیں کہ 'مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ' کا مضاف محذوف ہے یعنی مَثُوبَةً مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ۔ اس وجہ سے یہاں بھی مضاف محذوف ہوگا یعنی مثوبۃ من عبد الطاغوت۔ مطلب یہ ہوگا کہ جنھوں نے طاغوت کی پرستش کی وہ اپنے انجام کے لحاظ سے بدتر ہوں گے۔ یہاں سزا کے بجائے مجرم کا ذکر اس کی خاص اہمیت کی وجہ سے ہے فرمایا کہ جنھوں نے اہل کتاب ہو کر طاغوت کی پرستش کی ہے وہ اپنے انجام کی فکر کریں، ہم پر دانت پیسنے سے کیا حاصل۔

'أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضَلُّ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ' اس میں پہلا ٹکڑا آخرت میں ان کے انجام کو ظاہر کر رہا ہے اور دوسرا ٹکڑا اس دنیا میں ان کی روش کو۔ گویا دوسرا ٹکڑا پہلے ٹکڑے کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ دین کی شاہراہ سے بعید تر ہیں اس وجہ سے انجام کے اعتبار سے بدتر ٹھہریں گے۔ 'سَوَاء' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ اس کے معنی کسی شے کے وسط کے آتے ہیں۔ 'سبیل' سے مراد وہ صراط مستقیم ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کی ہدایت کے لیے کھولی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اصل شاہراہ کو چھوڑ کر اس سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔

وَإِذَا جَاءُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَقَدْ دَخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِ ۚ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ۝ وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۶۱-۶۳)

یہود کا ایک منافق گروہ

ان آیات کے تمام مشکل الفاظ پیچھے زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہ بھی یہود ہی کا ذکر ہے لیکن یہ یہود کا وہ گروہ ہے جس کا ذکر بقرہ کی آیات ۷۶-۷۸ میں ہوا ہے۔ وہاں ہم تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ یہود میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو مسلمانوں کی مجالس میں آتے تو کہتے کہ مومن تو ہم بھی ہیں، خدا اور رسول اور خدا کی کتاب پر ہمارا بھی ایمان ہے، پھر مسلمان ہمیں مومن کیوں نہیں تسلیم کرتے۔ یہ بات وہ اس ذہنی تحفظ کے ساتھ کہتے کہ اگر ہم محمد اور ان کی پیش کردہ کتاب کو نہیں مانتے تو اس سے کیا فرق پیدا ہوتا ہے آخر ہمارے

پیغمبر اور ہماری کتاب بھی تو خدا ہی کے بھیجے ہوئے ہیں۔ عام مسلمان ان کی اس طرح کی باتوں سے دھوکے میں پڑتے اور ان سے ایک قسم کے حسن ظن میں مبتلا ہو جاتے چنانچہ اسی بنا پر قرآن نے ان کی اس بات کو 'مداہنت' سے تعبیر کیا ہے۔ جب ان سے یہ کہا جاتا کہ اگر مومن ہو تو سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح کیوں ایمان نہیں لاتے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا اقرار کیوں نہیں کرتے تو اس پر برہم ہو جاتے اور کہتے ہم بیوقوفوں کی طرح کی حرکت نہیں کرتے، ہم ملک میں صلح و امن چاہتے ہیں اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ مسلمان اگر کسی کو پیغمبر ماننا چاہتے ہیں تو مانیں لیکن ہمارے لیے اس کا ماننا ضروری نہ قرار دیں۔ اس کو مانے بغیر ہمارا دینی مقام و مرتبہ تسلیم کریں۔ اگر مسلمان اپنے سوا سب کو کافر قرار دیں گے تو اس سے ملک میں فساد برپا ہوگا جس میں سب کا نقصان ہے۔ بقرہ کی مذکورہ بالا آیات کے تحت ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ اشتراک ایمان کا یہ وہی نظریہ ہے جو وحدت ادیان کے عنوان سے تقسیم ہند سے پہلے ہمارے ملک میں بھی پیش ہو چکا ہے اور اب بھی وقتاً فوقتاً اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہتی ہے۔ زیر بحث آیات میں یہود کے اسی گروہ کا ذکر ہے، فرمایا کہ جب یہ تمہاری مجالس میں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی مسلمان ہیں، حالانکہ جس کفر کے ساتھ وہ آتے ہیں اسی کفر کے ساتھ وہ واپس جاتے ہیں، ایمان نہ داخل ہوتے وقت ان کے ساتھ ہوتا ہے نہ نکلتے وقت، بس تمہارے سامنے دعویٰ کر کے تمہیں دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ دلوں میں ان کے جو کچھ ہے وہ اللہ کو خوب معلوم ہے۔ بقرہ کی محولہ بالا آیات میں قرآن نے ان کے دلوں کے اس بھید کو کھول بھی دیا ہے۔ اس وجہ سے ہماری تفسیر کی روشنی میں ان آیات پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

یہود کے دعوائے ایمان کی پردہ دری | وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ الاٰیۃ یہ قرآن نے ان کے دعوائے ایمان کی قلعی کھولی ہے کہ ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن حال یہ ہے کہ دن رات ان کی بھاگ دوڑ حق تلفی، تعدی اور حرام خوری کی راہ میں ہے۔ یہاں 'یسارعون' کا لفظ خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ایمان کے ساتھ کسی ظلم و زیادتی کا صادر ہو جانا یا کسی حرام سے آلودہ ہو جانا تو بعید نہیں ہے لیکن حرام خوری ہی کسی کا اوڑھنا بچھونا بن جائے اور اس کی ہر وقت کی تگ و دو ظلم و زیادتی ہی کی راہ میں ہو تو بہت ہی کڑا عمل ہے یہ جو ایمان کے دعوے کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس بات کو دوسرے مقام میں یوں بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر ان کا ایمان انھی باتوں کا حکم دے رہا ہے تو بہت ہی بری باتوں کا حکم دے رہا ہے۔

یہود کے علماء اور فقہاء کو سرزنش | لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ الاٰیۃ یہ ان کے علماء اور فقہاء کو سرزنش ہے کہ آخر وہ ان برائیوں اور حرام خوریوں سے ان کو روکتے کیوں نہیں؟ اس سے علماء کے فریضۂ منصبی کی وضاحت بھی ہو رہی ہے اور یہود کی سوسائٹی اس وقت زوال کی جس آخری حد کو پہنچ چکی تھی اس پر بھی روشنی پڑ رہی ہے جب مریض مرض کے آخری مرحلہ میں داخل ہو جائے اور طبیب مرض ہی کو شفا سمجھنے لگ جائیں تو اس مریض کی ہلاکت میں کیا شبہ رہا؟ 'قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ' سے مراد وہ گناہ کی باتیں بھی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر اوپر

گویا اور بعض کا آگے آ رہا ہے۔ اور وہ جھوٹی شہادت بھی ہے جس نے یہود کے اندر ایک کاروبار کی شکل اختیار کر لی تھی، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و عدل کے گواہ بنائے گئے تھے۔ علمائے یہود کی جس اخلاقی و ایمانی موت پر یہاں ملامت فرمائی ہے، آیت کا سیاق دلیل ہے کہ ان کے اوپر یہ موت اس وجہ سے طاری ہوئی کہ وہ خود ان افعال کے مرتکب ہوئے جن میں ان کی قوم کی اکثریت مبتلا تھی۔ ایسی حالت میں ان کی زبانیں ان برائیوں کے خلاف کس طرح کھل سکتی تھیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (۶۴)

یہود کی گستاخی شانِ الٰہی میں

'وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ' ۔ پیچھے دین اور شعائر دین کے ساتھ ان کے مذاق کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب یہ اسی قسم کی ایک اور گستاخی (قول اثم) کا ذکر ہو رہا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ "ہاتھ بندھے ہوئے ہیں" یعنی تنگ ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۸۱ میں گزر چکی ہے۔ 'لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ' (اللہ نے ان لوگوں کی بات سن رکھی ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ غریب ہے اور ہم امیر ہیں) وہاں ہم نے بتایا ہے کہ قرآن نے جب مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت دی اور اس دعوت کے لیے یہ مؤثر اسلوب اختیار کیا کہ کوئی ہے جو آج اللہ کو قرضِ حسن دے، تو یہود نے اسلام اور قرآن کی تحقیر اور مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے اس دعوت کو مذاق بنا لیا کہ آج کل مسلمانوں کے اللہ میاں بہت غریب ہو رہے ہیں، بندوں سے قرض مانگنے کی نوبت آ گئی ہے، اللہ میاں غریب اور ہم بندے امیر ہیں۔ بعینہٖ اسی موقع کی بات یہاں نقل ہوئی ہے۔ یہود کہتے ہیں کہ ان دنوں اللہ میاں کا ہاتھ بہت تنگ ہو رہا ہے، نوبت بندوں سے قرض مانگنے تک پہنچ گئی ہے۔

'غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا' یہ جملہ معترضہ کے طور پر، ان کی اس گستاخی پر لعنت اور پھٹکار ہے۔ اس فوری لعنت اور پھٹکار کی وجہ یہ ہے کہ یہود نہ تو اللہ اور اس کی شان سے بے خبر تھے اور نہ دعوتِ انفاق کے اس بلیغ انداز سے۔ وہ ہر چیز سے اچھی طرح واقف تھے لیکن قرآن اور پیغمبر کی عداوت میں ایسے اندھے بہرے ہو گئے تھے کہ تحقیر و استہزا کا جو موقع بھی مل جاتا اس سے فوراً فائدہ اٹھاتے، اس امر کی مطلق پروا نہ کرتے کہ بات کہاں تک پہنچے گی۔

یہود کی [illegible] عداوت

'بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ' الآیۃ۔ یہ ان کی بات کی تردید کے ساتھ ساتھ اس گستاخانہ رویہ کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ یہ کتاب جو تمھاری طرف اتری ہے اس کے حسد نے ان کو اس طرح

بے ضبط بنا دیا ہے کہ جو منہ میں آجاتا ہے وہ بک ڈالتے ہیں۔ قرآن کے سبب سے بنی اسرائیل کے اندر مسلمانوں کے خلاف بغض و حسد کے بھڑک اٹھنے پر تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ اور آل عمران میں بھی بحث ہو چکی ہے اور اس سورہ میں بھی بعض نہایت اہم اشارات گزرے ہیں۔ یہود اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ عربوں کو قرآن کا ملنا صرف قرآن ہی کا ملنا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ امامت و سیادت بھی اب ان کی طرف منتقل ہو رہی ہے جس کے تنہا اجارہ دار اب تک وہ خود بنے بیٹھے تھے۔ اس حسد نے ان کو خدا کا بھی باغی بنا دیا اور اس کے سبب سے ان کے اندر مسلمانوں کے خلاف بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عداوت اور کینہ کا بیج پڑ گیا۔

مسلمانوں کو تسلی کہ یہود کی کوئی شرارت کامیاب نہیں ہوگی۔

كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ یہ مسلمانوں کو تسکین و تسلی ہے کہ اگرچہ اس عداوت اور حسد کے جوش میں یہ برابر تمہارے خلاف جنگ کی آگ بھڑکائیں گے لیکن اللہ ان کی کسی سعیِ فساد کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ بلکہ جب بھی یہ جنگ کی آگ بھڑکائیں گے خدا اس کو بجھا دیا کرے گا۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ کفار نے مسلمانوں پر جب جب بھی چڑھائی کی ہے اس میں یہود کی سازش اور انگیخت کو ضرور دخل رہا ہے۔ اس بات کی طرف ہم پیچھے بھی اشارہ کر چکے ہیں اور آگے سورۂ انفال میں بھی انشاء اللہ ہم اس پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

اس دنیا میں فساد مشیتِ الٰہی کے خلاف ہے۔

وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ، یہ اوپر کی بات کی وہ دلیل بیان ہوئی ہے جو صفاتِ الٰہی کا مقتضیٰ ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ تمام فساد فی الارض کی اصل قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی اور اس کی مخالفت ہے۔ اس سے کائنات کے تکوینی اور تشریعی نظام میں تصادم واقع ہوتا ہے جس سے اس زمین کی برکتیں اٹھ جاتی ہیں اور اس سے ان فتنوں کو راہ ملتی ہے جن کے سبب سے دنیا شیطان کی بازی گاہ بن جاتی ہے۔ خالقِ کائنات، جس نے یہ دنیا بنائی ہے، اس کو اس کی صلاح و فلاح مطلوب ہے اس وجہ سے وہ ان مفسدانہ کوششوں کو اسی حد تک مہلت دیتا ہے جہاں تک اس کی حکمتِ ابتلا کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس حد سے آگے ان کو بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کو پسند ان لوگوں کی جدوجہد ہے جو اس دنیا میں نظامِ حق و عدل کے علمبردار ہیں۔ یہی چیز اس کائنات کے مجموعی نظام سے ہم آہنگ اور فطرۃ اللہ کے موافق ہے۔ اس وجہ سے وہ ان کی، اگر وہ حق و عدل کی شہادت کے تقاضے پورے کرتے ہیں، مدد فرماتا ہے اور مفسدین کی مخالفتوں، ریشہ دوانیوں اور جنگ آزمائیوں کے علی الرغم ان کو برومند اور فتحیاب کرتا ہے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم ۚ مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ (۶۵-۶۶)

"وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا" سیاق وسباق دلیل ہے کہ یہاں ایمان سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہے۔ یعنی یہ اہل کتاب حسد وعناد کی اس روش کے بجائے جو انھوں نے اختیار کر رکھی ہے، اگر ایمان وتقویٰ کی روش اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کے پچھلے گناہوں کو معاف فرما دیتا اور ان کو اپنی نعمت کے باغوں میں داخل کرتا۔

"وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ الاية" اخروی انعام کے بعد یہ اس ایمان کی دنیوی برکات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اہل کتاب سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی تو وہ اس سیادت وقیادت سے جو اب تک ان کو حاصل رہی ہے، محروم ہو جائیں گے حالانکہ یہ محض ان کی حماقت وبلادت ہے اگر یہ اس کو قبول کرتے تو آسمان اور زمین دونوں کی برکتوں کے دروازے ان کے لیے کھل جاتے لیکن ان میں معقول اور راست رو تھوڑے نکلے، زیادہ فاسق وبدعمل ہی ہیں۔

"وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ" سے ظاہر ہے کہ قرآن مراد ہے۔ اس کے قائم کرنے کے ساتھ ساتھ تورات اور انجیل کے قائم کرنے کے حوالے سے مقصود ایک تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس چیز کا قائم کرنا صرف اسی کو قائم نہیں کرنا ہے بلکہ یہ درحقیقت تورات وانجیل کو بھی قائم کرنا ہے۔ اس لیے کہ تورات و انجیل دونوں کی اپنی پیشینگوئیوں کے مطابق اب یہی چیز ہے جو تورات اور انجیل سب کی تکمیل کرنے والی اور سب کی محافظ ونگران ہے۔ دوسرا یہ کہ اہل کتاب نے محض دنیا کی متاع حقیر کے لیے، جیسا کہ اسی سورہ کی آیات ۱۲-۱۵ میں بیان ہوا ہے، اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو توڑا اور تورات وانجیل کو برباد کیا اور اب اسی دنیا کی محبت انھیں اس قرآن کے قبول کرنے سے مانع ہے حالانکہ ان چیزوں کے قبول کرنے کے معنی اس دنیا سے محروم ہونے کے نہیں تھے، اگر یہ تورات وانجیل کو قائم کرتے اور اب اللہ کی اس آخری کتاب کو قبول کرتے اور اس کو قائم کرنے کی جد وجہد میں شریک بنتے تو آسمان وزمین دونوں ان کے لیے اپنے خزانے اگلتے۔ سورۂ اعراف میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے "وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۹۶" (اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے)

"قائم کرنے" سے مراد زندگی کے معاملات سے ان کا تعلق قائم کرنا ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب اس لیے عطا فرماتا ہے کہ ہم اپنی انفرادی واجتماعی زندگی اس کے احکام وقوانین کے مطابق بسر کریں۔ اگر زندگی کتاب الٰہی سے بے تعلق ہو جائے تو خواہ زبان سے کتاب الٰہی کی مدح میں کتنی ہی قصیدہ خوانی کی جائے نہ یہ کتاب الٰہی کا قائم کرنا ہے اور نہ اس قصیدہ خوانی سے کسی کو "قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ" کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے بلکہ یہ کھلم کھلا نقض میثاق اور شریعت الٰہی کا ہدم ہے۔

"مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ" "قصد" کے معنی سیدھی راہ کے ہیں "هُوَ عَلٰى قَصْدٍ" وہ رشد وہدایت پر ہے

اسی سے مِّنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۚ وَكَثِيرٌ ہے وہ اپنے معاملہ میں راہ راست پر ہے، یہ اہل کتاب کے اس قلیل التعداد گروہ کا ذکر ہے جو حالات کے اس ہمہ گیر بگاڑ کے باوجود جس کی تفصیلات اوپر گزریں اپنے امکان کے حد تک حق پر قائم رہا اور بالآخر اسلام سے مشرف ہوا۔

۲۰۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۶۷-۸۶

پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے تاکید فرمائی کہ ان اہل کتاب کی تم مطلق پروا نہ کرو جو اپنی برتری اور پیشوائی کے گھمنڈ میں سرمست ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کا یہ مزعومہ مقام و مرتبہ تسلیم کرو۔ تمہاری ذمہ داری بحیثیت رسول کے بےخوف لومتہ لائم اس حق کا اظہار و اعلان ہے جو تم پر خدا کی طرف سے نازل کیا جا رہا ہے۔ یہ تمہاری اپنی بات نہیں ہے کہ کسی کی رورعایت سے تم اس میں کوئی کمی بیشی کر سکو۔ یہ خدا کا پیغام ہے اور تم اس پیغام ہی کو اس کے مخاطبوں تک پہنچانے کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہو۔ اگر اس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی ہوئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی کی۔ اگر اس کے سبب سے وہ تمہارے دشمن ہو جاتے ہیں تو ہو جائیں تم اس کی پروا نہ کرو۔ اللہ تمہاری حفاظت فرمائے گا اور تمہارے خلاف ان کی کسی چال کو کامیاب نہ ہونے دے گا۔

اس کے بعد نہایت آشکارا الفاظ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے، اہل کتاب کو مخاطب کر کے اعلان کر دیا ہے کہ جب تک تم تورات و انجیل اور قرآن کو قائم نہ کرو تمہاری کوئی دینی حیثیت خدا کے ہاں نہیں ہے، خدا کے ساتھ کسی کو کوئی نسبت کسی گروہ کے ساتھ نسبت کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی بلکہ اللہ اور آخرت پر ایمان اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔

پھر یہود اور نصاریٰ دونوں کے کفر اور ان کے کفریہ اعمال و عقاید کی تصریح کی ہے اور یہود پر ان کے کفر کے سبب سے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ نے جو لعنت کی ہے اس کا حوالہ دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان کے کفر کا مسئلہ آج نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ یہ پرانی حکایت ہے۔

آخر میں نصاریٰ کے اس گروہ کی نہایت شاندار الفاظ میں تحسین فرمائی ہے جو حق پر قائم رہا۔ چنانچہ اس نے قرآن کی دعوت کو اپنے دل کی آواز سمجھا اور دلی جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھ کر اس نے اس کو لبیک کہا ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۷-۸۶ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰي

شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ
رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا
وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ
هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَقَدْ
اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ۭ كُلَّمَا
جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ
فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا
ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ۭ وَ
اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ
هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا
اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ
الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾ لَقَدْ
كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ وقف لازم
اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ
خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ

اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۷۵ قُلْ
اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۭ
وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۷۶ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ
دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَاۗءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ
وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَاۗءِ السَّبِيْلِ ۝۷۷ لُعِنَ الَّذِيْنَ ع ۱۱ ۱۴
كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝۷۸ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ
مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۷۹ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ
يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ
سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝۸۰ وَلَوْ كَانُوْا
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ
وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸۱ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً
لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ
مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ
قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۸۲ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ الجزء ۷
اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓي اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا
مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۸۳ وَمَا
لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَاۗءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا

رَبَّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾
ع ۹ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾

ترجمۂ آیات ۶۷-۸۶

اے رسول، تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔ اللہ کافروں کو ہرگز راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۶۷

کہہ دو، اے اہل کتاب، تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے جب تک تم تورات، انجیل اور اس چیز کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے لیکن وہ چیز جو تیری طرف تیرے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور ان کے کفر میں اضافہ کرے گی تو تم اس کافر قوم پر غم نہ کرو۔ بے شک جو ایمان لائے، جو یہودی ہوئے اور صابی اور نصاریٰ، جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۶۸-۶۹

ہم نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے۔ جب جب آیا ان کے پاس کوئی رسول ایسی بات لے کر جو ان کی خواہش کے خلاف ہوئی تو ایک گروہ کی انھوں نے تکذیب کی اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے اور انھوں نے گمان کیا کہ کوئی پکڑ نہیں ہوگی، پس اندھے اور بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے ان پر رحمت کی نگاہ کی، پھر ان میں سے بہت سے اندھے بہرے بن گئے اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ ۷۰-۷۱

بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا کہ خدا تو وہی مسیح ابن مریم ہے اور حال

یہ ہے کہ مسیح نے کہا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے۔ جو کوئی اللہ کا شریک ٹھہرائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ان لوگوں نے بھی کفر کیا جنھوں نے کہا کہ اللہ تین کا تیسرا ہے۔ حالانکہ نہیں ہے کوئی معبود مگر ایک ہی معبود اور اگر یہ باز نہ آئے ان باتوں سے جو یہ کہہ رہے ہیں تو ان میں سے جنھوں نے کفر کیا ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا۔ کیا یہ اللہ کی طرف رجوع اور اس سے مغفرت طلب نہیں کرتے اور اللہ مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے۔ مسیح ابن مریم تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے ہیں اور ان کی ماں ایک صداقت شعار بندی تھیں۔ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو، کس طرح ہم ان کے سامنے اپنی آیتیں کھول کر بیان کر رہے ہیں۔ پھر دیکھو کہ وہ کس طرح اوندھے ہوئے جا رہے ہیں۔ کہو کیا تم اللہ کے سوا اس چیز کی بندگی کرتے ہو جو تمھارے لیے کسی نقصان اور نفع پر اختیار نہیں رکھتی اور سننے والا اور جاننے والا تو بس اللہ ہی ہے۔ کہہ دو، اے اہل کتاب اپنے دین میں بے جا غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی بدعات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہوئے اور جنھوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور جو راہ راست سے بھٹک گئے۔ ۷۲-۷۷

بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت ہوئی۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔ جس برائی کو اختیار کر لیتے اس سے باز نہ آتے۔ نہایت ہی بری بات تھی جو یہ کرتے تھے تم ان میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں۔ نہایت برا توشہ ہے جو انھوں

نے اپنے لیے بھیجا کہ خدا کا ان پر غضب ہوا اور عذاب میں وہ ہمیشہ رہنے والے بنے۔ اگر یہ اللہ پر، نبی پر اور اس پر جو اس کی طرف اترا، ایمان رکھنے والے ہوتے تو ان کفار کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے تو اکثر نافرمان ہیں۔ ۸۰-۸۱

تم ایمان والوں کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے، اور اہل ایمان کی دوستی سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان کے اندر عالم اور راہب ہیں اور یہ تکبر نہیں کرتے اور جب یہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھو گے کہ حق کو پہچان لینے کے سبب سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے تو ہمیں اس کی گواہی دینے والوں میں لکھ۔ اور آخر ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہم کو پہنچا ایمان کیوں نہ لائیں جب کہ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیکو کاروں کے زمرے میں شامل کرے گا تو اللہ ان کے اس قول کے صلے میں ان کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسے باغ عطا فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور خوب کاروں کا یہی صلہ ہے اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہ دوزخ میں پڑنے والے ہیں۔ ۸۲-۸۶

۲۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُۥ ۚ وَٱللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ ٱلنَّاسِ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْكَٰفِرِينَ (۶۷)

اہل کتاب کے لیے ایک اہم پیغام — يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ۔ یہ آیت تمہید ہے اس عظیم پیغام کی جو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا جا رہا ہے کہ آپ بے کم و کاست یہود و نصاریٰ کو وہ سنا دیں۔ یہ پیغام آگے آیت ۶۸ سے لے کر آیت ۸۶ تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں نہایت واضح طور پر ان دونوں گروہوں کو

یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک تم تورات و انجیل اور اللہ کی اس آخری کتاب قرآن کو قائم نہ کرو تمھاری کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔ خدا کے ساتھ کسی کو کوئی نسبت کسی گروہ سے نسبت کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایمان اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتی ہے اور اس سے تم بالکل محروم ہو چکے ہو۔ یہود نے اللہ کے میثاق کو توڑا، اس کے رسولوں کی تکذیب کی اُن کو قتل کیا اور ڈھیٹ ہو کر اندھے بہرے بن گئے۔ نصاریٰ نے مسیح کی تعلیمات کے بالکل خلاف بت پرستوں کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کو اپنا دین بنا لیا اور کفر و شرک میں مبتلا ہو گئے۔ یہ پیغام بڑا اہم تھا۔ یہود و نصاریٰ دونوں کی دینی حیثیت پر یہ آخری ضرب لگائی جا رہی تھی اور عین اس وقت لگائی جا رہی تھی جب کہ وہ پورا زور اس بات کے لیے لگا رہے تھے کہ مسلمان ان کی دینی حیثیت تسلیم کر لیں، اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر رسول کے لفظ سے خطاب کر کے یہ پیغام آپ کے حوالے کیا گیا جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول خدا کا پیغامبر ہوتا ہے اس وجہ سے یہ اس کا فرض منصبی ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ اس پر اتارا جائے وہ بے کم و کاست اس کے مخاطبوں تک پہنچا دے، قطع نظر اس سے کہ اس پیغام سے ان کے اندر کیا ہلچل برپا ہوتی ہے اور وہ پیغام اور پیغامبر کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔

'وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ' یہ تاکید مزید ہے کہ اگر مخاطبوں کی رو رعایت یا اس کے متوقع ردعمل کے اندیشے سے اس میں کوئی کوتاہی ہوئی تو یہ کوتاہی عین اس فریضۂ منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگی جس کی ادائیگی ہی کے لیے اللہ کسی کو اپنا رسول مقرر کرتا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اس تاکید مزید میں جو شدت ہے اگرچہ اس کا خطاب ظاہر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے لیکن حقیقت میں اس کا رُخ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خطاب کرنا پسند نہیں فرمایا اس وجہ سے پیغمبر کو خطاب کر کے یہ واضح فرما دیا کہ اس پیغام کی اہمیت کیا ہے اور کس قطعیت اور کس حتمی فیصلہ کے ساتھ اس کا بھیجا جانا منظور ہے۔

'وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ' میں النّاس اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مراد اہل کتاب بالخصوص یہود ہیں۔ یوں تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف برابر سازشوں میں مصروف رہتے تھے لیکن آگے آنے والے اعلان کے بعد وہ کسی سمجھوتے کی توقع سے آخری درجے میں مایوس ہو کر اپنی آخری بازی بھی کھیل جانے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلایا کہ تم ان کی مخالفت و عداوت کی کوئی پروا نہ کرو۔ ان شیاطین کے ہر شر سے خدا تمھیں محفوظ رکھے گا۔ 'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ' اللہ ان کی کسی چال کو بھی تمھارے خلاف بامراد نہیں ہونے دے گا۔ 'هدای يهدی' کا لفظ ہم دوسرے مقام میں تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ کسی کو اس کی کوششوں اور تدبیروں میں بامراد کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اوپر آیت 'كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ'

أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ میں یہی مضمون دوسرے الفاظ میں گزر چکا ہے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۶۸ - ۶۹)

پیغام کا متن

یہ وہ پیغام ہے جو اہل کتاب کو، عام اس سے کہ وہ یہود ہیں یا نصاریٰ، سنانے کا آنحضرتؐ کو حکم تھا۔ وہ یہ ہے کہ جب تک تم تورات، انجیل اور اس چیز کو، جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے، قائم نہ کرو اس وقت تک تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے۔ تم اپنے آپ کو ایک برگزیدہ امت، خدا کے محبوب اور چہیتے، برگزیدوں اور چہیتوں کی اولاد، آخرت کی سزا سے محفوظ، خداوند کا نام گھرانا اور معلوم نہیں کیا کیا بنائے بیٹھے ہو لیکن یہ سب جھوٹی آرزوئیں اور خواب کی باتیں ہیں، جب آنکھ کھلے گی تو دیکھو گے کہ تم ہوا میں اڑتے اور خیالی محل آراستہ کرتے رہے ہو۔ تورات اور انجیل اور خدا کی اتاری ہوئی چیز کو قائم کرنے کا مطلب ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ زندگی کے معاملات و مسائل سے عملاً ان کا ربط قائم کرنا ہے۔ اس سورہ میں تفصیل کے ساتھ یہ بحث گزر چکی ہے کہ یہ خدا کے عہد و میثاق کے صحیفے ہیں۔ ان میں خدا نے اپنے احکام و قوانین دیے اور یہ عہد لیا کہ انہی کے مطابق زندگی گزاری جائے اور انہی کے مطابق باہمی نزاعات کے فیصلے کیے جائیں۔ اسی ذمہ داری کے لیے ان کے حاملین کو قوامین بالقسط اور شُھَدَاءَ لِلّٰہ کا لقب عطا ہوا۔ اگر اس عہد کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں اور زندگی سے عملاً ان کا کوئی تعلق یا تو سرے سے باقی ہی نہیں رہا ہے یا باقی ہے تو صرف اس حد تک جس حد تک اپنی خواہشوں کی سند اس سے حاصل ہو سکے تو آخر دینی پیشوائی، مذہبی تقدس اور خدا رسیدگی کے یہ بھارے دعوے کس بنیاد پر ہیں؟ ایسے لوگوں کو خدا سے کیا تعلق اور خدا کو ایسے لوگوں سے کیا واسطہ؟

'وما انزل الیکم' سے مراد قرآن ہے

'وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ' سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید کے سوا کوئی اور چیز مراد لینے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ آگے فوراً ہی اس چیز کو مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ کے الفاظ سے تعبیر کر کے بالکل واضح بھی کر دیا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہی ہے۔ یہاں قرآن کی تعبیر وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ کے الفاظ سے کرنے میں اہل کتاب پر اتمام حجت کا ایک پہلو ہے۔ وہ یہ کہ تورات اور انجیل دونوں میں اہل کتاب سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لیا تھا کہ تمہارے پاس ان ان صفات کا پیغمبر خدا کا آخری اور کامل صحیفہ لے کر آئے گا تو تم اس پر ایمان لانا، اس کی پیروی کرنا، اس کی مدد کرنا اور اس کی گواہی دینا۔ اسی پہلو کی طرف یہاں اشارہ ہے اور اس موقع پر جبکہ قرآن ان تمام صفات کے مطابق جو

سابق صحیفوں میں اس کی بیان ہوئیں نازل ہو چکا تو تورات اور انجیل کا قائم کرنا یہی ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی اس چیز کو اہل کتاب قائم کریں۔ اس کا قائم ہونا ہی تورات اور انجیل سب کا قائم ہونا ہے۔

قرآن نے یہود کے دبے ہوئے حسد کو بھڑکا دیا

'وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم الاية' یعنی ہونا تو یہ تھا کہ یہ اس کتاب کے علمبردار بنتے اور اس طرح تورات و انجیل کے قائم کرنے والے بنتے جن کے قائم کرنے کا ان سے عہد لیا گیا تھا اور اپنے عہد و میثاق کی ذمہ داری سے سبکدوش اور عند اللہ و عند الناس سرخرو ہوتے لیکن ہو یہ رہا ہے کہ اس کتاب نے ان کی سرکشی اور ان کے کفر میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ آگے یہود کی سرکشی اور نصاریٰ کے کفر و شرک کی تفصیل آ رہی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جو حسد دبا ہوا ہوتا ہے جب اس کا اصل محرک سامنے آتا ہے تو وہ حسد پوری شدت کے ساتھ بھڑک اٹھتا ہے۔ اہل کتاب کو بنی اسمٰعیل پر غصہ تو پہلے سے تھا کہ آخری رسول کی بعثت ان کے اندر ہونے والی ہے لیکن یہ غصہ دبا ہوا تھا، جب انھوں نے دیکھا کہ یہ چیز واقعہ کی صورت میں ظاہر ہو گئی تو ان کے حسد کی آگ پوری طرح بھڑک اٹھی۔ حالانکہ ان کو سوچنا تھا کہ اگر وہ قرآن کو قبول کرتے اور اس کو قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تو کسی دوسرے کا کام نہ کرتے بلکہ خود اپنی ہی ذمہ داری ادا کرتے۔ قرآن کو قائم کرنا، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، صرف قرآن ہی کو قائم کرنا نہیں بلکہ تورات و انجیل کو بھی قائم کرنا تھا اس لیے کہ یہ انھی کی پیشین گوئیوں کی تعمیل ہو رہی تھی لیکن جب کسی قوم کی مت ماری جاتی ہے تو وہ اسی طرح اندھی ہو جاتی ہے چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ ان لوگوں کے حال پر غم نہ کرو۔ انھوں نے اپنی ہلاکت کو خود دعوت دی ہے۔

'إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا الاية' یہ آیت بعینہٖ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۶۲۔ بس دونوں میں صرف یہ فرق ہے کہ وہاں صابئین ہے اور یہاں صابئون۔ وہاں نصاریٰ کا لفظ صابئین پر مقدم ہے یہاں مؤخر۔ یہ محض اسلوب کا تنوع ہے۔ صابئون یہاں محل پر عطف ہونے کی وجہ سے حالت رفع میں ہو گیا ہے۔ اس آیت کے تمام الفاظ بقرہ کی تفسیر میں زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہ جس سیاق و سباق میں وہاں وارد ہوئی ہے اسی سیاق و سباق میں یہاں بھی ہے۔ یہ درحقیقت اوپر اہل کتاب کو مخاطب کر کے جو بات ارشاد ہوئی ہے اس کی مزید وضاحت ہوئی ہے کہ خدا کے ہاں کسی کو کوئی درجہ و مرتبہ کسی گروہ کے ساتھ نسبت کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا، جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے سمجھ رکھا ہے، بلکہ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ چیز حاصل نہ ہو تو ہر چند کوئی شخص مسلمانوں ہی کے گروہ سے وابستہ ہونے کا مدعی ہو، خدا کے ہاں اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اگر یہ چیز حاصل ہے تو وہ صابئین کے گروہ سے سہی اللہ کے ہاں وہ اپنے ایمان کے اعتبار سے مرتبہ پائے گا۔ مقصود اس آیت کا، جیسا کہ بقرہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے محض گروہی فخر و غرور کا ابطال ہے نہ کہ اجزائے ایمان کی تفصیل۔ یہاں 'إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا' سے مراد مسلمان بحیثیت

گروہ کے ہیں جس سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ اگر مسلمان بھی ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور عمل صالح سے بے نیاز ہو کر اپنی گروہی نسبت ہی کو نجات کا ضامن سمجھ بیٹھیں تو ان کے لیے بھی یہی حکم ہے بلکہ سرفہرست ان ہی کا نام ہے۔

لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَأَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا ۖ كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ۝ وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِّنْهُمْ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ (۷۰-۷۱)

یہود کا جرم

اب یہ اس بات کی دلیل بیان ہو رہی ہے کہ کیوں اہل کتاب کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔ فرمایا کہ ان سے جس کتاب و شریعت کی پابندی کا عہد لیا گیا تھا اور جس کی تجدید اور یاددہانی کے لیے اللہ نے یکے بعد دیگرے اپنے بہت سے رسول اور نبی بھی بھیجے، اس عہد کو انھوں نے توڑ دیا اور جو رسول اس کی تجدید اور یاددہانی کے لیے آئے ان کی باتوں کو اپنی خواہشات کے خلاف پا کر یا تو ان کی تکذیب کر دی یا ان کو قتل کر دیا۔ اس قتل اور تکذیب کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

خدا کی رعایت سے جسارت میں اضافہ

وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ، اور یہ 'فتنۃ' کے معنی آزمائش و ابتلا کے ہیں۔ آزمائش چونکہ پکڑ کی شکل میں بھی ہوتی ہے اور یہاں موقع اسی کا ہے۔ اس وجہ سے ہم نے اس کے معنی پکڑ کے لیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے رسولوں کی تکذیب اور ان کے قتل کے جو جرائم کیے ان پر ان کی فوری پکڑ نہیں ہوئی تو وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اب کوئی پکڑ ہوگی ہی نہیں۔ حالانکہ اللہ کی سنت یہ نہیں ہے کہ وہ لازماً ہر جرم کی سزا فوراً ہی دے۔ بلکہ وہ مجرموں کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ توبہ و اصلاح کر لیں اگر چاہیں ورنہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں۔ بنی اسرائیل نے اس ڈھیل کو اپنے لیے لیسنس سمجھ لیا اور اندھے بہرے بن گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے ان کو پکڑا۔ پھر انھوں نے توبہ و اصلاح کی تو اللہ نے ان پر رحمت کی نگاہ کی لیکن اس کے بعد وہ پھر اندھے بہرے بن گئے۔ لیکن وہ اندھے بہرے بن گئے ہیں تو بن جائیں خدا تو بصیر ہے وہ ان کی ساری کرتوت دیکھ رہا ہے اور جب دیکھ رہا ہے تو لازماً وہ ان کو سزا دیے بغیر بھی نہیں رہے گا۔[1]

یہود پر دو بڑی تباہیاں

آیت میں بنی اسرائیل کے دو مرتبہ اندھے بہرے بن جانے اور پھر ان پر گرفت ہونے کا ذکر ہے۔ یہاں حذف کا یہ اسلوب ملحوظ رہے کہ ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ سے پہلے یہ مضمون محذوف ہے کہ اللہ نے ان کو پکڑا تو انھوں نے توبہ و اصلاح کی، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ پہلی پکڑ کے بعد تو انھوں نے توبہ و اصلاح کی لیکن دوسری پکڑ کے بعد وہ بدستور اندھے بہرے بنے ہوئے ہیں۔ قرآن نے ان کو توبہ و اصلاح کی جو دعوت دی ہے اس سے اپنی شامت اعمال کے سبب سے گریز کر رہے ہیں۔ اس مقام پر میرا ذہن بار

---

[1] اس آیت کے اشارات کو سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو، یسعیاہ ۹: ۲۴-۳۰

بار اس طرف جاتا ہے کہ یہ ان کی تاریخ کی ان دو بڑی تباہیوں کی طرف اشارہ ہے جن میں وہ اپنی بداعمالیوں کے سبب سے شاہ اسور سلمنسر اور شاہ بابل بنوکد نضر کے ہاتھوں مبتلا ہوئے۔ سورۂ بنی اسرائیل آیات ۴-۸ میں ان حوادث کی طرف اشارہ ہے۔ وہاں ہم انشاء اللہ ان کی تفصیل کریں گے اور دکھائیں گے کہ بنی اسرائیل نے قرآن کا انکار کر کے کس طرح نہ صرف خدا کی دوسری پکڑ سے نجات حاصل کرنے کا راستہ اپنے اوپر بند کر لیا بلکہ ہمیشہ ہمیش کے لیے اپنے اوپر اس کی رحمت کے دروازے بند کر لیے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۷۲)

نصاریٰ کا جرم

یہود کے بعد اب یہ نصاریٰ کے کفر و شرک کا بیان ہوا تاکہ ان کی حقیقت بھی واضح ہو جائے کہ دین کے پلڑے میں ان کا کیا وزن ہے۔ ان کا ذکر آل عمران ۴۲-۶۲ اور نساء ۱۷۱-۱۷۲ میں بھی ہو چکا ہے۔ وہاں بہت سی باتوں کی وضاحت ہو چکی ہے۔ نساء کی متعلقہ آیات کے تحت ہم نے واضح کیا ہے کہ نصاریٰ حلول اور تثلیث دونوں ہی کے قائل تھے اور یہ دونوں ہی باتیں کفر ہیں۔ یہاں حلول کا کفر ہونا بیان فرمایا ہے۔ آگے والی آیت میں عقیدۂ تثلیث کے کفر ہونے کی تصریح ہے۔ اُعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ پر انجیلوں کے حوالے، دوسرے مقامات میں، نقل ہو چکے ہیں۔ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ الآیۃ حضرت مسیح کے کلام کا جزو نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصاریٰ کو تنبیہ ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۔ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۭ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۷۳-۷۶)

'ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ' عقیدۂ تثلیث کی حقیقت پر آل عمران اور نساء میں بحث گزر چکی ہے۔ اس اسلوب میں اس عقیدے کو تعبیر کرنے سے اس کا گھنونا پن واضح ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ کائنات کا خالق و مالک تو اللہ وحدہ لاشریک ہے لیکن ان ظالموں نے اس کی خدائی کو تین میں تقسیم کر کے اس کو تین کے تیسرے کا درجہ دے رکھا ہے۔

'لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ' یہاں مِنْهُمْ کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگرچہ عقیدۂ تثلیث، کفر ہے اور اس کے ماننے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے لیکن ان کے لیے توبہ و اصلاح کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے جو ان میں سے قرآن کی دعوت قبول کر کے اپنی اصلاح کر لیں گے۔

وہ اپنے آپ کو اس عذاب سے بچا لیں گے لیکن جواب بھی باز نہ آئے تو وہ لازماً اس عذاب سے دوچار ہوں گے چنانچہ اسی مضمون کو واضح کرنے کے لیے اس کے ساتھ أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ الآیۃ کا ٹکڑا ملایا ہے۔

سیدنا مسیحؑ کی بشریت کی دلیل

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ الآیۃ، یعنی مسیح ابن مریم کو تم نے خدا بنا کے رکھ دیا حالانکہ وہ اللہ کے رسولوں میں سے بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بے شمار رسول گزر چکے ہیں۔ جس طرح وہ خدا کے رسول تھے اسی طرح یہ بھی خدا کے رسول تھے۔ مزاج، کردار، دعوت، عبدیت، خشیت اور بشریت ہر چیز میں مشترک اور ایک دوسرے سے مشابہ۔ پھر اسی زمرے کے ایک فرد کو خدائی میں شریک کر دینے کے کیا معنی؟ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ان کی ماں جنھوں نے ان کو جنا، خدا کی نہایت وفادار اور صداقت شعار بندی تھیں، مومنہ، عابدہ، قانتہ۔ مزید براں یہ کہ یہ ماں بیٹے دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے یہ اسی طرح غذا اور پانی کے محتاج تھے جس طرح ہر انسان ان کا محتاج ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کی دلیل خود انجیلوں میں موجود ہے۔ آخر غذا، پانی اور تمام انسانی ضروریات کی محتاج مخلوق کو خدا یا خدائی میں شریک کس طرح مان بیٹھے ہو؟

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ غذا اور پانی کی احتیاج یوں تو بشریت کی دلیل ہے ہی لیکن اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کے ہاں تو یہ ایک مسلم دلیل بشریت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جب فرشتے بیٹے کی ولادت کی بشارت اور قوم لوط کے لیے عذاب لے کر آئے تو حضرت ابراہیمؑ نے ان کو اول اول بشر سمجھا اور ان کی ضیافت کے لیے ان کے سامنے بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت پیش کیا لیکن جب انھوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تو حضرت ابراہیم فوراً تاڑ گئے کہ یہ بشر نہیں بلکہ خدا کے فرشتے ہیں۔

اسی طرح انجیلوں میں خود حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ جب ان کے شاگرد ان کو ایک روح سمجھ کر ان سے ڈرے تو انھوں نے بھنی ہوئی مچھلی کا ایک قتلہ ان کے سامنے کھا کر ان کو اطمینان دلایا کہ وہ کوئی روح نہیں بلکہ آدمی ہیں۔ لوقا میں ہے۔

> 'وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ یسوع آپ ان کے بیچ میں آکھڑا ہوا اور ان سے کہا تمھاری سلامتی ہو مگر انھوں نے گھبرا کر اور خوف کھا کر یہ سمجھا کہ کسی روح کو دیکھتے ہیں۔ اس نے ان سے کہا تم کیوں گھبراتے ہو اور کس واسطے تمھارے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں؟ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں دیکھو کہ میں ہی ہوں۔ مجھے چھو کر دیکھو کیونکہ روح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی، جیسا مجھ میں دیکھتے ہو اور یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے۔ جب مارے خوشی کے ان کو یقین نہ آیا اور تعجب کرتے تھے تو اس نے ان سے کہا کیا یہاں تمھارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انھوں نے اسے بھنی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا۔ اس نے لے کر ان کے

روبرو کھایا۔ لوقا ۲۴: ۳۶-۴۳

اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ الاٰیۃ۔ 'اُنْظُرْ'، اظہار تعجب کے مفہوم میں ہے۔ یہاں بات چونکہ اتنی وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ صرف انتہائی غبی یا انتہائی ہٹ دھرم ہی اس کو سمجھنے سے قاصر رہ سکتا ہے اس لیے فرمایا کہ اس وضاحت کے باوجود ان کی کج فہمی اور ہٹ دھرمی دیکھو کہ کس طرح ان کی عقل الٹ کے رہ گئی ہے۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ الاٰیۃ، مطلب یہ ہے کہ انسان کو عبادت تو صرف اس ذات کی کرنی چاہیے جو حقیقی معنوں میں نافع و ضار ہے۔ ایسی ذات صرف خدا کی ذات ہے، وہی نافع و ضار بھی ہے اور وہی سمیع و علیم بھی ہے۔ دوسروں کی عبادت سے کیا حاصل جو نہ نافع و ضار ہیں نہ سمیع و علیم۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (۷۷)

نصاریٰ کا غلو

خطاب اگرچہ ظاہر میں عام اہل کتاب سے ہے لیکن اس کا رخ نصاریٰ ہی کی طرف ہے۔ ان کے غلو پر سورۂ نساء کی آیت ۱۷۱ کے تحت مفصل بحث ہو چکی ہے۔ جس طرح یہود کی عام بیماری دین کے معاملے میں تفریط کی رہی ہے اسی طرح نصاریٰ کی عام بیماری افراط اور غلو کی رہی ہے اور یہ افراط و تفریط دونوں ہی چیزیں دین کو برباد کرنے والی ہیں۔ اسی غلو کا کرشمہ ہے کہ نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ کو رسول سے خدا بنا ڈالا پھر ان کی ماں اور روح القدس کو بھی خدائی میں شریک کر دیا۔ رہبانیت کا نظام جو انھوں نے کھڑا کیا، اس کے متعلق بھی قرآن نے تصریح فرمائی ہے کہ یہ ان کے غلو ہی کا کرشمہ ہے۔

نصرانیت تمام تر بت پرست قوموں کی نقالی ہے

وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا، 'اَهْوَآء' سے مراد بدعات ہیں۔ بدعات جس قدر بھی ہیں سب خواہشوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ انسان جب اپنی کسی خواہش کو دین بنانا چاہتا ہے تو اس کے لیے کوئی بدعت ایجاد کرتا ہے اور اس پر دین کا ملمع چڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بدعات کے لیے اس لفظ کو استعمال کر کے قرآن نے ان کے اصل منبع کا پتہ دے دیا۔ 'قوم' سے اشارہ یہاں پال اور اس کے ساتھیوں کی طرف ہے جنھوں نے نصرانیت کا حلیہ بگاڑا اور بت پرست قوموں کی نقالی میں تثلیث وغیرہ کا ڈھونگ رچایا۔ 'قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ' سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان تمام بدعات کا مواد انھوں نے اپنی سابق ضلالتوں سے لیا ہے۔ نصرانیت میں داخل ہونے سے قبل وہ جن گمراہیوں میں مبتلا رہے تھے انہی گمراہیوں پر انھوں نے نصرانیت کا ملمع چڑھانے کی کوشش کی اور اس طرح وہ خود بھی شاہراہ حق سے بھٹکے اور دوسروں کو بھی انھوں نے گمراہ کیا۔ اس اسلوب بیان میں درپردہ نصاریٰ کے لیے یہ تلقین ہے کہ آج جس چیز کو تم نصرانیت سمجھ رہے ہو یہ تمہارے اپنے گھر کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر بت پرست قوموں سے برآمد کردہ چیز ہے جو تم پر لاد دی گئی ہے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا
عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۔ تَرٰى
كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ
فِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۔ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ
اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۷۸-۸۱)

یہود پر انبیاء کی لعنت

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الایۃ۔ یہ بنی اسرائیل کے ذکر کو پھر لے لیا کہ آج تو انھوں نے اپنی پاک دامنی اور برگزیدگی کی حکایت اتنی بڑھا رکھی ہے لیکن ان کا حال یہ رہا ہے کہ داؤدؑ سے لے کر عیسیٰ ابن مریم تک ہر نبی نے ان کی حالت پر نوحہ کیا ہے۔ زبور کے مزامیر میں جگہ جگہ ایسی چیزیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی بدعہدیوں سے حضرت داؤدؑ کا دل نہایت زخمی تھا اور اپنی دعاؤں اور مناجاتوں میں انھوں نے بار بار ان پر لعنت کی ہے۔ ملاحظہ ہو زبور باب ۱۲: ۱-۳۔ باب ۵۳: ۲-۳ باب ۵۰: ۴-۱۰-۱۷ باب ۸۹: ۱-۴ باب ۱۰۹، باب ۱۴۰: ۹-۱۱۔ باب ۹ کے متعلق بھی شارحین کی تصریح ہے کہ اس میں بنی اسرائیل ہی پر لعنت ہے۔ ان مناجاتوں کا جو انداز ہے اس کی مثال کے لیے ایک مناجات کا ایک ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے۔

لیکن خدا شریر سے کہتا ہے
تجھے میرے آئین بیان کرنے سے کیا واسطہ
اور تو میرے عہد کو اپنی زبان پر کیوں لاتا ہے؟
جب کہ تجھے تربیت سے عداوت ہے۔
اور میری باتوں کو پیٹھ پیچھے پھینک دیتا ہے۔
تو چور کو دیکھ کر اس سے مل گیا۔
اور زانیوں کا شریک رہا ہے
تیرے منہ سے بدی نکلتی ہے۔
اور تیری زبان فریب گھڑتی ہے
تو بیٹھا بیٹھا اپنے بھائی کی غیبت کرتا ہے۔
اور اپنی ماں کے بیٹے پر تہمت لگاتا ہے۔
تو نے یہ کام کئے اور میں خاموش رہا۔
تو نے گمان کیا کہ میں بالکل تجھ ہی سا ہوں۔
لیکن میں تجھے ملامت کر کے ان کو تیری آنکھوں کے سامنے ترتیب دوں گا۔

اب اے خدا کو بھولنے والو! اسے سوچ لو۔
ایسا نہ ہو کہ میں تم کو پھاڑ ڈالوں اور کوئی چھڑانے والا نہ ہو۔‘‘ زبور - ۵۰ : ۱۶-۲۲

سیدنا مسیحؑ کی لعنت

اسی طرح سیدنا مسیحؑ نے بھی ان پر بار بار لعنت کی ہے جس کی مثالیں انجیلوں میں موجود ہیں۔ ہم بخیال اختصار صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل کو خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

’’اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس! تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھے ہو اور دکھاوے کے لیے نماز کو طول دیتے ہو کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتانے والو تم پر افسوس! جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔

اے احمقو اور اندھو، کون سا بڑا ہے، سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا اور پھر کہتے ہو کہ اگر کوئی قربان گاہ کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن جو نذر اس پر چڑھی ہو اگر اس کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے اندھو، کون سی بڑی ہے نذر یا قربان گاہ جو نذر کو مقدس کرتی ہے ...

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس! کہ پودینہ اور سونف اور زیرے پر تو دہ یکی دیتے ہو پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔

اے اندھے راہ بتانے والو، مچھر کو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس! کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں۔ اے اندھے فریسی! پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کر تاکہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوب صورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس! کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادا کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو۔ غرض اپنے باپ دادا کا پیمانہ بھر دو۔

اے سانپو، اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے؟ اس لیے دیکھو میں نبیوں اور

دانائوں اور فقیہوں کو تمھارے پاس بھیجتا ہوں، ان میں سے تم بعض کو قتل کروگے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھروگے تاکہ سب راست بازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راست باز ہابل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانہ کے لوگوں پر آئے گا۔

اے یروشلم! اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتی اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتی ہے! کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں مگر تم نے نہ چاہا۔ دیکھو، تمھارا گھر تمھارے لیے ویران چھوڑا جاتا ہے، کیوں کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب سے مجھے پھر ہرگز نہ دیکھو گے جب تک نہ کہو گے کہ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔ متی ۲۳: ۱۴-۳۹

نبیوں کا حوالہ پوری تاریخ کا حوالہ ہے

یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ یہاں ذکر تو صرف حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی لعنت کا ہے لیکن تورات کے صحیفوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی نے بنی اسرائیل پر لعنت کی ہے۔ بعض نبیوں کے الفاظ تو ان سے بھی کہیں سخت ہیں جو زبور اور انجیل سے اوپر نقل ہوئے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ دو نبیوں کا ذکر صرف ابتدا اور انتہا کو واضح کرنے کے لیے ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ داؤدؑ سے لے کر مسیحؑ تک ہر نبی نے اس بدبخت قوم پر لعنت کی ہے۔ حضرت داؤدؑ سے بنی اسرائیل کی سیاسی عظمت کی ابتدا ہوئی ہے، یہود کو ان پر بڑا فخر رہا ہے اور حضرت مسیحؑ اسرائیلی سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں اس وجہ سے ان دونوں ناموں کے ذکر سے گویا پوری تاریخ سامنے آگئی۔

جرم اور جرم پر اصرار موجب لعنت ہے

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ یہ ان کا جرم بیان ہوا ہے۔ بِمَا عَصَوْا میں وہ تمام جرائم آگئے جو خدا اور اس کی شریعت کے حقوق سے تعلق رکھتے ہیں اور وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ میں بندوں کے تمام حقوق آگئے جو ان کے ہاتھوں پامال ہوئے۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ، یہ ٹکڑا ان جرائم کی سنگینی کو واضح کر رہا ہے۔ کہ انھوں نے نہ صرف جرائم کیے بلکہ ان کے نبیوں اور راست بازوں نے ان جرائم سے ان کو روکنے کی کوشش کی تو ان کو بھی خاطر میں نہ لاتے بلکہ ان کے دشمن بن گئے۔ کسی قوم کی اخلاقی و ایمانی تباہی کی یہی وہ حد ہے جس پر پہنچ کر وہ اللہ کی سنت کے بموجب لعنت کی مستحق بنتی ہے۔

یہود کی ذہنی پستی کی انتہا

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ یہود ایک طرف تو اپنی برگزیدگی پر اتنے نازاں تھے کہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے، دوسری طرف ان کی ذہنی پستی کا یہ عالم تھا کہ مشرکین مکہ تک سے دوستی و اعتماد کے نہایت گہرے تعلقات رکھتے تھے اور ان کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دیتے۔ سورۂ نساء میں ان کی اس حالت پر اظہار تعجب بھی

فرمایا ہے اور ان کی اس حرکت کی بنا پر ان پر لعنت بھی کی ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝ (۵۱-۵۲ نساء) (کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا اور وہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کفار کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت پر ہیں۔ یہی ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو ان کا تم کوئی مددگار نہیں پا سکتے) ٹھیک اسی طرح یہاں بھی ان پر لعنت کے ذکر کے بعد اس لعنت کے اسباب میں سے ان کی اس کفر دوستی کا بھی ذکر فرمایا۔

لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ الآیۃ، 'ان سخط اللہ' بیان ہے 'مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ' کا۔ گویا عمل کی جگہ اس کا نتیجہ سامنے رکھ دیا کہ وہ دیکھ لیں کہ جو کچھ انھوں نے کیا ہے اس کا کیا نتیجہ سامنے آنے والا ہے۔

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ الآیۃ۔ 'یؤمنون'، اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ 'نبی' سے مراد حضرت موسیٰ اور 'ما انزل الیہ' سے مراد تورات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ اور موسیٰ اور تورات پر ایمان کا جو دعویٰ کرتے ہیں یہ اپنے اس دعوے میں بالکل جھوٹے ہیں۔ اگر یہ فی الواقع اللہ پر اور اپنے نبی اور اپنی کتاب پر ایمان رکھتے ہوتے تو کبھی کفار و مشرکین کو اپنا دوست نہ بناتے۔ ان میں سے اکثر نافرمان ہیں اور ان کا یہ فعل ہی ان کی نافرمانی پر سب سے بڑی شہادت ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۸۲)

'قسیس' اور 'رہبان' سے مراد

'قسیس' اور 'رہبان' کے الفاظ عرب کے نصاریٰ اپنے علماء اور زاہدوں کے لیے بولتے تھے جس طرح یہود اپنے علماء اور فقہاء کے لیے 'ربی' 'ربانی' اور 'احبار' استعمال کرتے تھے۔ یہ الفاظ اہل کتاب ہی کے واسطہ سے عربی میں آئے۔ چونکہ عرب کے یہود و نصاریٰ کی عام زبان عربی تھی، ان میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب تھے، اس وجہ سے ان کی یہ دینی اصطلاحیں عربی ادب میں معروف و مقبول ہو گئیں۔

یہود اسلام دشمنی میں مشرکین کے ہم پلہ

اس آیت میں یہود کو اسلام دشمنی کے اعتبار سے مشرکین مکہ کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور یہ گویا اوپر والی بات 'تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' کی تصریح مزید ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ اسلام دشمنی کے معاملے میں ان دونوں گروہوں کی ہم مشربی و ہم آہنگی کو نمایاں کیا ہے اور مقصود اس سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہود کے زعم برتری و تقدس کی تردید ہے کہ دیکھو جن کو اپنی برتری کا یہ دعویٰ ہے وہ کس گڑھے میں جا کے گرے ہیں اور اسلام دشمنی کے جوش میں کن سے یارانہ انھوں نے گانٹھا ہے، حامل کتاب ہو کر

مکہ کے بت پرستوں سے یارانہ، وہ بھی اسلام کی دشمنی میں، ایمانی و اخلاقی انحطاط کی آخری حد ہے۔

سیدنا مسیح کے خلیفہ راشد شمعون کے پیرو نصاریٰ

ان کے مقابل میں نصاریٰ کی تعریف فرمائی ہے کہ وہ مسلمانوں سے قریب ہیں۔ یہاں قرائن دلیل ہیں کہ اس سے مراد یہ عام مسیحی نہیں ہیں جو پال کی ایجاد کردہ مسیحیت کے پیرو، تثلیث و کفارہ وغیرہ کے قائل اور اسلام دشمنی میں تمام اعدائے اسلام کے سرخیل ہیں بلکہ اس سے مراد سیدنا مسیح کے خلیفہ راشد شمعون صفا کے پیرو ہیں جو پال کی تمام بدعات سے بالکل الگ حضرت مسیح کی اصل تعلیم پر قائم رہے اور جن کے باقیات صالحات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ کی دعوت پر اسلام لائے۔ نجاشی وغیرہ اسی باایمان گروہ سے تعلق رکھنے والے تھے۔ یہاں جو قرائن ہمارے اس نظریے کی تائید میں ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔

پال کے پیرو لفظ نصاریٰ سے بیزار

ایک یہ کہ ان کی نسبت فرمایا ہے کہ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى (جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقہ کو اس وقت تک نہ صرف یہ کہ اپنے اس نام کی اہمیت و معنویت کا احساس تھا بلکہ ان کو اس پر فخر بھی تھا۔ یہ فرقہ، جیسا کہ نصاریٰ کی تاریخ سے ثابت ہے، صرف شمعون صفا کے پیروؤں کا تھا، پال کے ماننے والوں کی نسبت ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان کر آئے ہیں کہ وہ اپنے کو نصاریٰ کہلانا حقیر سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے اس کو بدل کر 'مسیحی' نام اختیار کر لیا تھا۔ ولیم بلیکی اپنی بائبل ہسٹری میں لکھتا ہے

"بارنباس اور پال انطاکیہ میں ایک سال تک غیر خدا پرستوں کو نصرانی بنانے میں مصروف رہے۔

معلوم ہوتا ہے اسی سال (۴۳ء میں) پہلی بار نصرانیت اختیار کرنے والوں کو مسیحی (CHRISTIAN) کا نیا اور شاندار نام دیا گیا۔" بائبل ہسٹری - ولیم بلیکی ص ۴۹۷

اس عبارت میں "مسیحی کا نیا اور شاندار نام" کے الفاظ نگاہ میں رہیں۔ اس سے صاف واضح ہے کہ پال اور اس کے پیرو 'نصاریٰ' کے لفظ کو اپنے لیے حقیر خیال کرتے تھے اور موجودہ مسیحیت تمام تر اسی پال کی ایجاد ہے۔

دوسرا یہ کہ اس گروہ کی صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ ان میں علماء اور زہاد ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ صفت موجودہ عیسائیوں پر صادق نہیں آتی۔ علماء اور زہاد کے الفاظ یہاں نہایت اچھے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ موجودہ کلیسائی نظام کے پروہتوں کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں ہیں۔ پھر ان کے باب میں فرمایا ہے کہ "وہ تکبر نہیں کرتے" مجھے بار بار خیال ہوتا ہے کہ یہ سیدنا مسیح کی اس بات کی طرف اشارہ ہے جو انجیلوں میں ہے کہ "مبارک ہیں وے جو دل کے غریب ہیں، آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے" موجودہ مسیحی جن کی رعونت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے اصلی نام کو بھی حقیر سمجھتے ہیں اور اس کی جگہ انھوں نے اپنے لیے ایک نیا نام پسند کیا ہے وہ اس صفت کے مصداق کس طرح قرار دیے جا سکتے ہیں۔

تیسرا یہ کہ اس گروہ کے متعلق آگے کی آیات میں صاف تصریح ہے کہ یہ سب لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دلی جوش و خروش کے ساتھ ایمان لائے اور قرآن کا انھوں نے اس طرح والہانہ خیر مقدم کیا گویا وہ مدتوں سے

اس کے لیے سراپا شوق و انتظار تھے۔

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ﴿﴾ فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ (۸۳-۸۶)

قرآن کے بارے میں نصاریٰ کا طرزِ عمل

اس گروہ نے جس والہانہ انداز میں قرآن اور پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا خیر مقدم کیا یہ اس کی تصویر ہے۔ اس تصویر میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ حضرت عیسیٰ نے انجیلوں میں جس تسلی دینے والے اور جس نجات دہندہ کی بشارت دی تھی اور اس کی جو علامتیں بتائی تھیں وہ ان میں سے ایک ایک چیز کو محفوظ کیے ہوئے اس آنے والے کی راہ دیکھتے رہے تھے۔ یہ آنے والا نہایت محبوب تھا اس لیے کہ ان کی تمام امیدیں، دنیا اور آخرت دونوں میں، اب اسی سے وابستہ تھیں، اس کی آمد سے ان کی، ان کے صحیفوں کی اور ان کے نبیوں کی صداقت ثابت ہونے والی تھی اس لیے کہ سب نے اس کی منادی کی تھی، ان کو اس کے ہراول دستہ میں شامل ہونے کی سرفرازیاں حاصل ہونے والی تھیں اس لیے کہ وہ پہلے سے دنیا کے سامنے اس کے گواہ اور اس کے تعارف کرانے والے ٹھہرائے گئے تھے۔ اس کا ظہور خدا کی زمین میں اس آسمانی بادشاہی کا ظہور تھا جس کی مسیح نے بشارت دی تھی اور جس میں اللہ کے وہ سارے بندے حصہ پانے والے تھے جن کے دل غرور اور گھمنڈ کی آلائشوں سے پاک اور خشیتِ الٰہی کے نور سے معمور تھے۔ چنانچہ ان کا حال یہ ہے کہ جب وہ قرآن پاک کی آیات سنتے اور ان کے اندر اس حق کی کرنیں جلوہ گر دیکھتے ہیں جس کے انتظار میں بے قراری کی طویل راتیں کاٹ چکے ہیں تو جوشِ مسرت سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں اور وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے رب! ہم اس کتاب پر اور اس کے لانے والے پر ایمان لائے، تو ہمیں اس کی گواہی دینے والوں کے زمرے میں لکھ۔ "گواہی دینے والوں کے زمرے میں لکھ" اس قدیم عہد کا اقرار ہے جس کے وہ پچھلے نبیوں کی امانتوں اور ان کی سپرد کردہ ذمہ داریوں کے حامل ہونے کی وجہ سے پابند تھے۔ وہ عہد جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ تھا کہ جب آخری نبی، آخری کتاب کے ساتھ آئیں تو تم آگے بڑھ کر خلق کے سامنے گواہی دینا کہ یہی ہیں وہ جن کی ہمارے صحیفوں میں پیشین گوئی تھی۔ اور پھر اس پر خود بھی ایمان لانا اور دوسروں کو بھی اس پر ایمان لانے کی دعوت دینا۔

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ الآیۃ۔ یہ ان کی طرف سے از خود اپنے اس اقدام کی تائید میں دلیل ہے کہ جب ہم یہ توقع لیے بیٹھے ہیں کہ خدا ہمیں زمرۂ صالحین میں داخل کرے گا تو آخر اللہ اور اس حق پر جو ہمارے پاس آیا ہے، ایمان لائے بغیر ہمیں یہ توقع کرنے کا کیا حق ہے۔

اور فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ اور پھر وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ میں

ان یہود و نصاریٰ پر نہایت لطیف تعریض بھی ہے جو اپنا سارا زور لگا صرف کر رہے تھے اس رسول کی مخالفت پر جس کی گواہی دینے پر مامور کیے گئے تھے لیکن توقع بلکہ دعویٰ یہ رکھتے تھے کہ آخرت کی کامیابیاں اور جملہ سرفرازیاں تنہا انہی کا حصہ ہیں۔

۲۲- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۸۷-۱۲۰

آگے کا حصہ، آخر سورہ تک، خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انھی باتوں سے متعلق، جو اس سورہ کے شروع میں بیان ہوئی ہیں یا ان سے تعلق رکھتی ہیں بعض جو سوالات پیدا ہوئے ہیں یا پیدا ہو سکتے تھے، ان کے جوابات دیے گئے ہیں اور یہ اشارہ بھی فرما دیا گیا ہے کہ یہ توضیحی آیات ہیں۔ ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی ہے کہ جو سوالات مفید تھے ان کے جوابات دے دیے گئے ہیں، رہے غیر ضروری سوالات تو اس قسم کے سوالات نزولِ قرآن کے دوران نہ پوچھو ــــ غیر ضروری سوالات پوچھ پوچھ کر یہود نے اپنے اوپر بہت سی قیدیں اور پابندیاں عائد کرا لیں، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان کو نباہ نہ سکے اور بالآخر کفر میں مبتلا ہوئے۔

آخر میں قیام عدل و قسط اور شہادتِ حق کی اس عظیم ذمہ داری کے تعلق سے، جو اس سورہ میں مرکزی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کا ذکر آیت ۸ میں ہوا ہے، اس شہادت کی تفصیل بیان ہوئی ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں دیں گے کہ انھوں نے اپنی اپنی امتوں کو بے کم و کاست وہ حق پہنچا دیا تھا جس کے پہنچا دینے کی ان پر ذمہ داری ڈالی گئی تھی۔ رہی یہ بات کہ ان کی امتوں نے اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا تو یہ ان امتوں کی ذمہ داری ہے۔ اس تفصیل سے مقصود یہود و نصاریٰ کو عموماً اور اس امت کو خصوصاً یہ بتانا مقصود ہے کہ اسی شہادت کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر امت پر حجت تمام کرے گا اور جس امت نے نبی کی تعلیم و شہادت کے خلاف اللہ کے دین میں کوئی ردّ و بدل کیا ہو گا وہ اس کی ذمہ دار ٹھہرے گی۔ یہاں اگرچہ مثال صرف حضرت عیسیٰؑ کی شہادت کی پیش کی گئی ہے، اور اس کے کچھ وجوہ ہیں جن کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی، لیکن مقصود یہ بتانا ہے کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام انبیاء سے شہادت لے گا۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح شہادت دیں گے اور اسی شہادت کی بنا پر آپ کی اُمت پر حجت تمام ہو گی۔ یہ گویا تنبیہ ہے اس امر کے لیے کہ جو لوگ اب قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ بنائے جا رہے ہیں اور جن سے شریعتِ الٰہی پر قائم رہنے اور اس کو قائم کرنے کا عہد لیا جا رہا ہے وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے آخرت کی اس شہادت کو یاد رکھیں۔ گویا سورہ کے شروع میں اسی امت سے جو میثاق لیا گیا ہے، سورہ کے آخر میں اس کی اخروی ذمہ داریوں کی یاد دہانی کر دی گئی۔

یہ آگے کے مضامین کے نظم کو سمجھنے کے لیے چند نشانات کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے۔ تفصیل آیات کی تفسیر کے تحت آئے گی۔ اس روشنی میں اب آیات کی تلاوت فرمائیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا آیات
تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ ٨٧ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ ۸۷-۹۳
اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ ٨٨
لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ
بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ
مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ
اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ
اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ٨٩ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ
وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ
فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ٩٠ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ
بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ
ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ ٩١ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ
وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰي
رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ ٩٢ لَيْسَ عَلَي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ
الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ٩٣ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ ع

الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ
فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٩٤﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا
فَجَزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ
هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا
لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ۭ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ
مِنْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿٩٥﴾ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ
مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۭ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٩٦﴾ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ
الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَاۗىِٕدَ ۭ ذٰلِكَ
لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ
اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٩٧﴾ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ
اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩٨﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿٩٩﴾ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ
وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٠﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْــَٔـلُوْا عَنْ اَشْيَاۗءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ ع
تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْــَٔـلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ
عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٠١﴾ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ

ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كٰفِرِينَ ﴿١٠٢﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ
وَّلَا وَصِيلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ
الْكَذِبَ ۖ وَأَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٠٣﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى
مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۚ
أَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٠٤﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ
اٰمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى اللّٰهِ
مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٠٥﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ
اٰمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ
اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ أَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ
فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ ۚ تَحْبِسُونَهُمَا مِنْ بَعْدِ
الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِينَ ﴿١٠٦﴾ فَإِنْ
عُثِرَ عَلٰٓى أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ إِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُومٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ
الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْأَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ أَحَقُّ
مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ ۖ إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِينَ ﴿١٠٧﴾ ذٰلِكَ
أَدْنٰٓى أَنْ يَّأْتُوا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ أَوْ يَخَافُوٓا أَنْ تُرَدَّ أَيْمَانٌۢ
بَعْدَ أَيْمَانِهِمْ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوا ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْفٰسِقِينَ ﴿١٠٨﴾ ع يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَآ أُجِبْتُمْ ۖ قَالُوا ع ١٤ ٢

لَا عِلْمَ لَنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿١٠٩﴾ إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ
مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ وقف لازم
الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَ
الْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ۖ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ
بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي ۖ وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ
بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنكَ
إِذْ جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ
مُّبِينٌ ﴿١١٠﴾ وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي ۖ
قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ ﴿١١١﴾ إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى
ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَن يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ
السَّمَاءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١١٢﴾ قَالُوا نُرِيدُ أَن
نَّأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَن قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ
عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿١١٣﴾ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنزِلْ الربع
عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَ
آيَةً مِّنكَ ۖ وَارْزُقْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿١١٤﴾ قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا
عَلَيْكُمْ ۖ فَمَن يَكْفُرْ بَعْدُ مِنكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ
أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ﴿١١٥﴾ وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ ع ۱۵ ۵
قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَانَكَ

مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۚ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۚ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم
تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَآ أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ
الْغُيُوبِ ﴿١١٦﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَآ أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ
رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي
كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿١١٧﴾ إِنْ
تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ ﴿١١٨﴾ قَالَ اللَّهُ هَٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ
جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ
وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١١٩﴾ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَ
الْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٢٠﴾ ع ۱۶ ۵ ۶

ترجمۂ آیات ۸۷-۱۲۰

اے ایمان والو، ان پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ جو خدا نے تمھارے لیے جائز کی ہیں اور نہ حدود سے تجاوز کرو۔ اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ خدا نے تمھیں جو حلال و طیب چیزیں بخشی ہیں ان کو برتو اور اس سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔ تمھاری قسموں میں جو غیر ارادی ہیں ان پر تو اللہ تم سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جن قسموں کو تم نے پختہ کیا ہے ان پر مواخذہ کرے گا۔ سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ اس معیار کا جو تم عام طور پر اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے پہنانا یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے جو اس کی مقدرت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھ دے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے

جب کہ تم قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم اس کے شکرگزار رہو۔ ۸۸ - ۸۹

اے ایمان والو، شراب، جُوا، تھان اور پانسے کے تیر بالکل نجس شیطانی کاموں میں سے ہیں تو ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ تمہیں شراب اور جوئے میں لگا کر تمہارے درمیان دشمنی اور کینہ ڈالے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روکے تو بتاؤ کیا اب تم ان سے باز آتے ہو! اور اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور بچتے رہو۔ اگر تم اعراض کرو گے تو جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے۔ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں پر اس چیز کے باب میں کوئی گناہ نہیں جو انھوں نے کھائی جب کہ انھوں نے تقویٰ اختیار کیا، ایمان لائے اور عمل صالح کیا، پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے، پھر تقویٰ اختیار کیا اور خوبی کے ساتھ اس کا حق ادا کیا اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔ ۹۰ - ۹۳

اے ایمان والو! اللہ تمہاری کسی ایسے شکار سے آزمائش کرے گا جو تمہارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں آجائے گا تاکہ اللہ دیکھے کہ کون اس سے غیب میں ڈرتا ہے اور جس نے اس کے بعد حدود سے تجاوز کیا تو اس کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اے ایمان والو! حالت احرام میں شکار نہ کیجیو، اور جو تم میں سے اس کو قصداً مارے گا تو اس کا بدلہ اسی طرح کا جانور ہے جیسا کہ اس نے مارا ہے، جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر کریں گے۔ یہ نیاز کی حیثیت سے خانہ کعبہ کو پہنچایا جائے

یا کفارہ دینا ہوگا، مسکینوں کو کھانا یا اسی کے برابر روزے رکھنے ہوں گے تاکہ وہ اپنے کیے کا وبال چکھے۔ جو ہو چکا اللہ نے اس سے درگزر کیا۔ لیکن جو کوئی پھر کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ غالب اور انتقام والا ہے۔ اور تمہارے لیے دریا کا شکار اور اس کا کھانا جائز کیا گیا، تمہارے اور قافلوں کے زادِ راہ کے لیے۔ اور خشکی کا شکار جب تک تم احرام میں ہو، تم پر حرام کیا گیا۔ اس اللہ سے ڈرتے رہو جس کے حضور میں سب حاضر کیے جاؤ گے۔ اللہ نے کعبہ، حرمت والے گھر کو، لوگوں کے لیے مرکز بنایا اور حرمت کے مہینوں، قربانی کے جانوروں اور گلے میں پٹے پڑے جانوروں کو شعیرہ ٹھہرایا۔ یہ اس لیے کہ تم جانو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ جان رکھو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا بھی ہے اور بڑا بخشنے والا اور مہربان بھی۔ رسول پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔ کہہ دو کہ ناپاک اور پاک دونوں یکساں نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاک کی کثرت تمہیں فریفتہ کرنے والی ہو، پس اللہ سے ڈرتے رہو اے اہلِ عقل تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۹۴-۱۰۰

اے ایمان والو! ایسی باتوں سے متعلق سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں گراں گزریں اور اگر تم ان کی بابت ایسے زمانے میں سوال کرو گے جب قرآن اُتر رہا ہے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ نے ان سے درگزر فرمایا۔ اللہ بخشنے والا اور بُردبار ہے۔ اسی طرح کی باتیں تم سے پہلے ایک قوم نے پوچھیں تو وہ ان کے منکر ہو کے رہ گئے۔ اللہ نے تو نہ بحیرہ مشروع کیا، نہ سائبہ، نہ وصیلہ، نہ حام۔ جنھوں نے کفر

کیا ہے وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف آؤ تو جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ جانتے رہے ہوں نہ ہدایت پر رہے ہوں؟ اے ایمان والو! تم اپنی فکر رکھو، اگر تم ہدایت پر ہو تو جو گمراہ ہوا وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کا پلٹنا ہے، وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ ۱۰۱-۱۰۵

اے ایمان والو، تمھارے درمیان گواہی بوقت وصیت جب کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچا ہو اس طرح ہے کہ دو معتبر آدمی تم میں سے گواہ ہوں یا دو دوسرے تمھارے غیروں میں سے اگر تم سفر میں ہو اور وہیں تمھیں موت کی مصیبت آپہنچے۔ تم ان کو نماز کے بعد روک لو۔ پس وہ اللہ کی قسم کھائیں اگر تمھیں شک ہو کہ ہم اس کے بدلے میں کوئی قیمت قبول نہیں کریں گے اگرچہ کوئی قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہم اللہ کی گواہی کو چھپائیں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بے شک ہم گنہگار ٹھہریں۔ پس اگر پتہ چلے کہ یہ دونوں کسی حق تلفی کے مرتکب ہوئے ہیں تو ان کی جگہ دوسرے دو ان میں سے کھڑے ہوں جن کی مقدم گواہوں نے حق تلفی کی ہے پس وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ راست ہے اور ہم نے کوئی تجاوز نہیں کیا ہے، اگر ہم نے ایسا کیا ہے تو ہم ظالم ٹھہریں۔ یہ طریقہ اس امر کے قرین ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں یا اس بات سے ڈریں کہ ان کی گواہی کے بعد ان کی گواہی رد ہو جائے گی اور اللہ

سے ڈرو اور سنو۔ اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ۱۰۶ - ۱۰۸

اس دن کو یاد رکھو جس دن اللہ سب رسولوں کو جمع کرے گا پھر پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب ملا، وہ کہیں گے ہمیں کچھ علم نہیں، غیب کی باتوں کا جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔ جب کہ اللہ کہے گا، اے عیسیٰ ابن مریم! میرے اس فضل کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کیا۔ جب کہ میں نے روح القدس سے تمہاری تائید کی۔ تم لوگوں سے کلام کرتے تھے گہوارے میں بھی اور ادھیڑ ہو کر بھی۔ اور یاد کرو جب کہ میں نے تمہیں کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دی۔ اور یاد کرو جب کہ تم مٹی سے ایک صورت پرندے کی صورت کی مانند میرے حکم سے بناتے تھے پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی اور تم اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے۔ اور یاد کرو جب کہ تم مُردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتے تھے۔ اور یاد کرو جب کہ بنی اسرائیل کے شر کو میں نے تم سے دُور رکھا جب کہ تم ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے تو ان کے کافروں نے کہا کہ یہ تو بس صریح جادو ہے۔ اور یاد کرو جب کہ میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسُول پر ایمان لاؤ تو وہ بولے کہ ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔ یاد کرو جب کہ حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تمہارا رب یہ کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک خوان اتارے۔ اس نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم سچے مومن ہو۔ وہ بولے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہم یہ جان لیں کہ تو نے سچ کہا اور ہم اس کی گواہی دینے والے بنیں۔ عیسیٰ ابنِ مریم نے دعا کی، اے اللہ، ہمارے پروردگار، تو ہم پر آسمان سے ایک

خوان اتار جو ہمارے لیے ایک یادگار بن جاتے، ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے اور تیری طرف سے ایک نشانی ٹھہرے، عطا فرما تو بہترین عطا فرمانے والا ہے۔ اللہ نے فرمایا، میں یہ خوان ضرور تم پر اتاروں گا لیکن اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا تو میں اس کو سزا بھی وہ دوں گا جو جہان والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا اور یاد کرو جب کہ اللہ پوچھے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بناؤ۔ وہ جواب دے گا تو پاک ہے، میرے لیے کیسے روا تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے یہ کہی تو تو اسے جانتا ہے۔ تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے، پر میں نہیں جانتا جو تیرے دل میں ہے۔ غیب کی باتوں کا جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔ میں نے ان سے وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی اور میں ان پر گواہ رہا جب تک ان میں موجود رہا۔ پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگران رہا اور تو تو ہر چیز پر گواہ ہے ہی۔ اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔ اللہ فرمائے گا آج سچوں کو ان کی سچائی کے نفع پہنچانے کا دن ہے۔ ان کے لیے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۰۹-۱۲۰

۲۴- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ

وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (۸۷-۸۸)

طیبات کی وضاحت

'طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ' اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں ہمارے لیے حلال ٹھہرائی ہیں اگرچہ وہ سب طیبات کے حکم میں ہیں اس وجہ سے یہاں اس لفظ کے اضافہ کی بظاہر ضرورت نہیں معلوم ہوتی لیکن اس کا ایک خاص فائدہ ہے۔ وہ یہ کہ بعض اوقات چیز تو فی الاصل جائز ہوتی ہے لیکن کسی خارجی سبب سے اس کو خباثت لاحق ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک جانور حلال ہے لیکن اس کو ذبح نہیں کیا گیا یا ذبح تو کیا گیا لیکن اس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا یا اس کو کسی تھان یا استھان کی نذر کیا گیا تو ان صورتوں میں وہ جانور جائز ہونے کے باوجود طیب و پاکیزہ نہیں رہے گا۔ اس وجہ سے وہ ناجائز قرار پائے گا۔

'اعتداء' کا مفہوم

'لَا تَعْتَدُوْا' یہاں 'لَا تُحَرِّمُوْا' کا مقابل ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کی جائز کردہ چیزوں میں سے طیبات کو حرام ٹھہرانا جائز نہیں ہے اسی طرح اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال بنا لینا بھی جائز نہیں ہے۔ یہ اعتداء یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ساری چیزیں ہمارے لیے پیدا کی ہیں، ہمیں ان کے کھانے پینے اور برتنے کی اجازت ہے۔ گنتی کی چند چیزیں ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں۔ ان کی حیثیت اللہ کے حدود کی ہے اور حدود کو لانگنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ان حدود سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتا ہے تو وہ محارم الٰہی کے حدود میں مداخلت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسے گستاخوں اور بے دقوفوں کو پسند نہیں کرتا۔ 'پسند نہیں کرتا' یعنی ان سے نفرت کرتا ہے۔ لفظ اعتداء کا یہی مفہوم آگے آیت ۹۴ میں بھی ہے۔

بعض سوالوں کے جواب

ہم اوپر تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ کے شروع میں جو احکام بیان ہوئے ہیں ان سے متعلق جو سوالات بعد میں پیدا ہوئے یا پیدا ہو سکتے تھے اب آخر میں ان کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ پیچھے مڑ کر سورہ کی آیات ۱-۲ پر نظر ڈال لیجیے۔ عہد و پیمان کی پابندی کی تمہید کے بعد یہ بتایا ہے کہ تمہارے لیے تمام چوپائے جائز ٹھہرائے گئے ہیں بجز چند مستثنیات کے جو یہ ہیں۔ اب ان سے متعلق کئی سوالات ہیں جو ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر اللہ کے نام پر باندھے ہوئے عہد و پیمان کی پابندی کی اہمیت دین میں اس درجہ ہے تو کوئی شخص اگر شریعت الٰہی کے خلاف کسی چیز کو اپنے اوپر حرام یا حلال ٹھہرانے کی قسم کھا بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے یا کوئی شخص اپنی کھائی ہوئی قسم کو توڑ دے تو اس کے باب میں کیا ہدایت ہے؟ اگر شعائر الٰہی، ہدی اور قلائد وغیرہ کی حرمت کی اس درجہ تاکید ہے تو جو جانور قدیم زمانے سے مذہبی رسوم ہی کی بنا پر محترم چلے آ رہے ہیں، مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام، ان کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ یہ اور ان کے علاوہ دوسرے متعدد سوالات ابتدا میں بیان کردہ احکام سے متعلق پیدا ہوئے۔ اب یہ قرآن نے ان سوالوں کو لیا ہے اور آگے کی آیات میں ان کے جواب دیے ہیں۔

تحریم کا مفہوم

سب سے پہلے یہ جامع اور اصولی بات فرمائی کہ خدا کی شریعت نے جو چیز جائز ٹھہرائی ہے اس کو نہ تو حرام قرار دو اور نہ جن چیزوں سے روکا ہے ان کو جائز بناؤ۔ 'حرام ٹھہرانے' سے مراد کسی شے کو اس حیثیت سے اپنے لیے یا دوسروں کے لیے ممنوع ٹھہرانا ہے کہ اس کے متعلق وہ یہ گمان یا دعویٰ کرے کہ یہ خدا کا حکم ہے، یا اس پر عذاب و ثواب مترتب ہوتا ہے یا یہ نیکی اور فضیلت میں داخل ہے۔ اگر اس قسم کی کوئی بات نہ ہو بلکہ بوجہ ذوق یا باقتضائے صحت یا بربنائے احتیاط و کفایت کسی چیز کا استعمال کوئی شخص ترک کر دے تو یہ چیز تحریم میں داخل نہیں ہے۔

اپنے جی سے تحریم و تحلیل حدود الٰہی میں مداخلت ہے

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ یہ تحریم و تحلیل حاکمیت الٰہی کے حدود میں مداخلت اور نقض میثاق کا نہایت وسیع دروازہ ہے۔ یہ مداخلت جس طرح حرام کو حلال کرنے کی راہ سے ہوتی ہے اسی طرح حلال کو حرام قرار دینے کی راہ سے بھی ہوتی ہے۔ حرام کو حلال کرنے کی راہ تو زیادہ تر خواہشات نفس کی تحریک سے کھلی ہے لیکن حلال کو حرام ٹھہرانے کے معاملہ میں زیادہ دخل مشرکانہ عقائد و اوہام کو رہا ہے چنانچہ مشرکین عرب نے اپنے مشرکانہ تصورات کے تحت بہت سی چیزیں اپنے اوپر حرام کر لی تھیں۔ آگے آیت ۱۰۳ میں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کا ذکر آ رہا ہے۔ مزید تفصیل سورۂ انعام میں یوں آئی ہے۔ وَقَالُوا هَٰذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءً عَلَيْهِ ۚ سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِنْ يَكُنْ مَيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۱۳۸ - ۱۳۹ (اور وہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چوپائے اور فلاں فلاں قسم کی زمینی پیداوار حرام ہے، ان کو نہیں کھا سکتے مگر وہی جن کو ہم بتائیں، ان کا یہ دعویٰ محض اٹکل پچو ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر سواری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ پر خدا کا نام نہیں لیتے خدا پر جھوٹ باندھتے ہوئے، اللہ ان کے اس افترا کا ان کو جلد بدلہ دے گا اور وہ کہتے ہیں کہ جو بچے فلاں ماداؤں کے پیٹ میں ہیں وہ خاص مردوں ہی کے لیے جائز ہیں، عورتوں کے لیے وہ حرام ہیں اور اگر وہ مردہ پیدا ہوں تو مرد اور عورت دونوں ان کو کھا سکتے ہیں، اللہ ان کے اس فتوے کی ان کو جلد سزا دے گا، وہ حکیم و علیم ہے) اسی طرح یہود کے متعلق بھی قرآن میں بیان ہوا ہے کہ بہت سی چیزیں انھوں نے اپنے من گھڑت فتووں، اپنے لایعنی سوالات اور اپنے مشرکانہ اوہام کی بنا پر اپنے اوپر حرام کر لیں۔ قرآن نے اس قسم کی خود مختارانہ تحریم و تحلیل کو توحید اور ایمان کے منافی قرار دیا۔ فرمایا کہ تمام حلال و طیب چیزیں جو خدا نے تمھیں بخشی ہیں ان کو کھاؤ پیو اور برتو، اپنے زمانۂ جاہلیت کے توہمات کی بنا پر ان سے احتراز نہ کرو اور اس اللہ سے ڈرو جس پر ایمان لائے ہو۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۸۹)

شریعتِ الٰہی میں قسم کی اہمیت

'لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ' اس ٹکڑے میں جو مضمون بیان ہوا ہے، یہی مضمون، معمولی لفظی اختلاف کے ساتھ، سورۂ بقرہ آیات ۲۲۴ - ۲۲۵ میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ وہاں مسئلہ ایلاء کے تعلق سے قسم کی اہمیت کا ذکر ہوا تھا یہاں اوپر کی بیان کردہ تحریم و تحلیل کے تعلق سے اس کا ذکر ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی غیر ارادی قسموں پر تو کوئی مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جو قسمیں دل کے عزم و ارادہ سے ظہور میں آئیں گی جن کے ذریعہ سے کوئی عہد و پیمان بندھے گا، جس سے حقوق و فرائض پر کوئی اثر مترتب ہو گا، جو کسی پہلو سے شریعت کی تحریم و تحلیل پر اثر انداز ہوں گی، ان پر اللہ ضرور مواخذہ فرمائے گا۔ اللہ کے نام کو، جیسا کہ بقرہ میں فرمایا ہے، خلافِ شرع یا جھوٹی قسموں کا ہدف بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ قسم قول و قرار، شہادت اور عہد و پیمان کی بنیاد ہے اور عہد و پیمان نہ صرف تمام معاشرتی، اجتماعی اور سیاسی حقوق و فرائض کی اساس ہے بلکہ، جیسا کہ ہم اس سورہ کی پہلی آیت 'يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ' الآیۃ کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر آئے ہیں، اس عہد و میثاق کی بھی اساس ہے جو ہم نے اپنے رب کے ساتھ باندھا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ آدمی قسم کے معاملہ میں نہایت محتاط رہے، کوئی قسم بے ضرورت یا خلافِ شرع نہ کھائے، جو قسم کھائے اگر خلافِ شرع نہ ہو تو وہ پوری کرے، اگر کوئی قسم کھانے کے بعد توڑے تو اس کا کفارہ ادا کرے تاکہ وہ قسم کے معاملے میں سہل انگار، بے پروا اور بالکل غیر ثقہ اور ناقابلِ اعتبار آدمی بن کے نہ رہ جائے، اس لیے کہ اس قسم کا آدمی نہ معاشرے کی ذمہ داریوں کا اہل ہے نہ میثاقِ الٰہی کی ذمہ داریوں کا۔

قسم کا کفارہ

'فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ' الآیۃ' اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو اس معیار کا کھانا کھلائے جس معیار کا کھانا وہ اپنے اہل و عیال کو کھلاتا ہے یا ان کو کپڑے پہنائے یا ایک غلام آزاد کرے اگر اس کی مقدرت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھ دے۔

قرآن میں توضیحی آیات کا مفہوم

'كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ' یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ توضیحی آیات ہیں جو بعد میں پیدا ہونے والے سوالات کے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، جواب میں نازل ہوئیں۔ شریعت و ہدایت تمام تر اللہ تعالیٰ کے بندوں پر فضل و احسان ہے اور اگر اس کے کسی اجمال کی وضاحت خود اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہو جائے تو یہ اس کا مزید احسان ہے، پھر اس توضیح میں اگر بندوں کے لیے سہولت کے بھی بہت سے پہلو ملحوظ ہوں، جیسا کہ غیر ارادی قسموں اور کفارہ کے معاملہ میں یہاں ملحوظ ہیں، تو گویا احسان

کے گونا گوں پہلو جمع ہو گئے۔ اس کا فطری تقاضا یہی ہو سکتا ہے کہ بندے اپنے پروردگار کے زیادہ سے زیادہ شکرگزار بنیں۔ اگر اس ساری توضیح و تفصیل کے بعد بھی انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو یہ انتہائی کفرانِ نعمت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۹۰-۹۱)

ہر نشہ آور چیز خمر ہے

خمر اور میسر پر بقرہ ۲۱۹ میں اور انصاب و ازلام پر مائدہ ۳ میں بحث گزر چکی ہے۔ شراب اور جوا، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم بیان کر آئے ہیں، دونوں توام بیماریاں ہیں۔ کم از کم عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں ان کی حیثیت یہی تھی۔ خمر کے متعلق یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ اس کا اطلاق صرف انگوری شراب ہی پر ہوتا ہے۔ کلام عرب سے اس کی تائید نہیں ہوتی اور پھر بھی تو شراب کی حرمت کی اصل علت، جیسا کہ نساء کی آیت ۴۳ سے واضح ہے، اس کے اندر نشہ کا پایا جانا ہے۔ اس وجہ سے ہر نشہ آور چیز کا حکم یہی ہوگا، خواہ وہ انگوری ہو یا غیر انگوری۔ اور شریعت کے اس حکیمانہ اصول کے مطابق کہ جس کی مقدار کثیر حرام ہے اس کی مقدار قلیل بھی حرام ہے، اس کی ہر مقدار حرام ہوگی تاکہ فتنہ کا دروازہ کلیۃً بند ہو جائے۔

جوا اور شراب شیطانی ایجادات سے ہیں

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ، 'رجس' اور 'نجس' پر دوسرے مقام میں ہم بحث کر چکے ہیں۔ معناً ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ یعنی یہ شیطان کی ایجادات اور اس کی کارستانیوں میں سے ہیں اور یہ حربے اس نے اس لیے ایجاد کیے ہیں کہ بنی آدم کو شریعت کی صراط مستقیم سے بہکانے کا جو عہد اس نے کر رکھا ہے اس کو پورا کر سکے۔ ان کے اندر اگر کوئی پہلو نفع کا نظر آتا ہے تو یہ محض ایک نظر فریب ملمع ہے۔ ان کا ضرر ان کے نفع کے مقابل میں، جیسا کہ بقرہ کی تفسیر میں واضح ہو چکا ہے، اتنا زیادہ ہے کہ اس کے سامنے اس حقیر نفع کی کوئی قیمت نہیں۔

جوئے اور شراب کے اثرات معاشرے پر

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ، فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ میں 'فی' اشتغال و انہماک کے مضمون پر دلیل ہے۔ یعنی شیطان نے یہ فتنے اس لیے ایجاد کیے ہیں کہ تمھیں ان میں لگا کر تمھارے درمیان برابر دشمنی اور انتقام کی آگ بھڑکاتا رہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جس معاشرے میں یہ وبا پھیل جائے اس میں پاسِ عفت، عزت، ناموس اور وفا و حیا کا احساس مٹ جائے گا، جیسا کہ مغرب زدہ سوسائٹی میں آج مشاہدہ ہو رہا ہے اور یہ بجائے خود ایک عظیم حادثہ ہے اور اگر ان کی کوئی رمق باقی رہے گی تو ناگزیر ہے کہ آئے دن ان کی بدولت تلواریں کھنچی رہیں۔ عرب عفت و عصمت، خودداری اور غیرت کے معاملے میں بڑے حساس تھے اور یہ ان کی بہت بڑی خوبی تھی لیکن ساتھ ہی شراب اور جوئے کے بھی رسیا تھے اس وجہ سے جام و سنداں کی یہ بازی ان

کے لیے بڑی مہنگی پڑ رہی تھی۔ جہاں کسی نے شراب کی بدمستی میں کسی کے عزت و ناموس پر حملہ کیا، کسی کی تحقیر کی، کسی کو چھیڑا یا جوئے میں کوئی چھینٹ کی (اور یہ چیزیں جوئے اور شراب کے لوازم میں سے ہیں) وہیں فریقین تلواریں سونت لیتے اور افراد کی یہ لڑائی چشم زدن میں قوموں اور قبیلوں کی جنگ بن جاتی اور انتقام در انتقام کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا کہ صرف مہینے اور سال نہیں بلکہ پوری صدی گزار کر بھی یہ آگ ٹھنڈی نہ پڑتی۔ چنانچہ عرب کی تاریخ میں ایسی جنگیں موجود ہیں جن کی آگ جوئے یا شراب خانہ خراب ہی نے بھڑکائی اور پوری ایک صدی تک وہ آگ نہ بجھی۔ بہرحال یہ چیز یا تو دیوث بناتی ہے یا خانہ خراب اور ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کو کوئی سلیم الفطرت معاشرہ گوارا کر سکے۔

خدا سے غفلت زندگی کے حقائق سے غفلت ہے

'وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ' 'ذِكْرُ اللّٰه' کے بعد 'صَلٰوة' کا ذکر عام کے بعد خاص کا ذکر ہے جس سے ان دونوں کا ربط واضح ہوتا ہے۔ اسلام نے زندگی کی تمام رفعت و عظمت ذکر الٰہی کے ساتھ وابستہ کی ہے۔ جو شخص خدا سے غافل ہوا وہ خود اپنی قدر و قیمت سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے 'نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ کی یاد کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو زندگی کی اصل حقیقتوں سے کبھی بے پروا نہیں ہونے دیتی جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کبھی راہ سے بے راہ نہیں ہوتا۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو خدا کی یاد اس کو سنبھال لیتی ہے۔ برعکس اس کے شراب کا اصل اثر جو انسان پر پڑتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ اس کو زندگی کی اصل حقیقتوں سے ہٹا کر ایک خیالی دنیا میں لے جا کر پھینک دیتی ہے اور اس خیالی دنیا کا وہ ایسا دیوانہ ہو جاتا ہے کہ پھر جس طرح سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا ہے اسی طرح وہ زندگی کی اصل حقیقت سے ڈرنے لگتا ہے۔ کبھی اس سے رو در رو ہونے کی جرأت نہیں کرتا اور اسی حال میں ایک دن اس کی زندگی کا قصہ تمام ہو جاتا ہے ——— اب ذرا اس انسان کی بدبختی پر غور کیجیے جو زندگی بھر خواب دیکھتا رہا اور کبھی اس کو جاگنے اور زندگی کے انجام پر غور کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

عربی میں استفہام کے مختلف مفہوم

'فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ' استفہام عربی زبان میں جیسا کہ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اسالیب القرآن میں وضاحت فرمائی ہے، تاکید، اقرار، تنبیہ، انکار، زجر، امر اور تحقیر کے مفہوم کے لیے آتا ہے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ امر کے مفہوم میں ہے، جس طرح سورۂ ہود آیت ۱۴ میں 'فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ' (تو کیا اب تم مسلمان بنتے ہو) ہے۔ اس اسلوب میں امر کے ساتھ زجر، موعظت، تاکید، تنبیہ اور اتمام حجت کا مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں غور کیجیے تو اسلوب کلام اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ شراب اور جوئے کے مفاسد کی تفصیل اتنے مختلف مواقع پر اور اتنے مختلف پہلوؤں سے تمہارے سامنے آ چکی ہے کہ اب اس معاملے میں کسی کے لیے بھی کسی اشتباہ کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے تو بتاؤ اب بھی اس سے باز آتے ہو یا نہیں؛ ظاہر ہے کہ امر کے سادہ اسلوب میں یہ سارا مضمون نہیں سما سکتا تھا۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۹۲)

یہ اوپر والی تنبیہ کی مزید تاکید ہے کہ شیطان کے پھیلائے ہوئے جال سے نکل کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں داخل ہو جاؤ اور نافرمانی و سرکشی سے بچو۔ اگر اس توضیح و تنبیہ کے بعد بھی تم نے اعراض کیا تو ذمہ داری تمھاری ہوگی، رسول کی ذمہ داری تو صرف خدا کے امر و نہی سے واضح طور پر آگاہ کر دینا ہے اور یہ فرض رسول نے ادا کر دیا جس کے بعد تم پر اللہ کی طرف سے حجت پوری ہو چکی۔ اس اتمام حجت کے بعد اب جو بے راہ روی اختیار کریں وہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو کر کریں۔ اس لیے کہ اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۹۳)

شریعت الٰہی کا مطالبہ

اوپر فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ کے اسلوب میں جو زجر و توبیخ مضمر ہے اس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں اسلوب بیان کی اس شدت نے ان لوگوں کو متاثر کیا ہوگا جو شراب کے معاملے میں اس رخصت سے اب تک فائدہ اٹھاتے رہے تھے جو انھیں حاصل تھی۔ انھوں نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ شراب کے باب میں بالکل پہلی ہی تنبیہ پر دوسرے بہت سے محتاط اور پیش بیں صحابہؓ کی طرح انھوں نے بھی شراب سے یکقلم توبہ کر لی ہوتی تو خوب ہوتا، ممکن ہے یہ تاخیر جو ان سے ہوئی آخرت میں ان کی کوتاہی میں محسوب ہو اور اس پر کوئی گرفت ہو جائے۔ خاص طور پر اس دوران میں جو لوگ وفات پا چکے ہوں گے ان کے باب میں محتاط لوگوں کے اندر تشویش پیدا ہوئی ہوگی کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ آیت زیر بحث نے اس قسم کے سارے شبہات دور کر دیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پرسش کسی ایسی چیز کے کھانے پینے پر نہیں ہوگی جس کے بارے میں کسی صریح ممانعت کی خلاف ورزی کا ارتکاب نہیں ہوا ہے۔ شریعت الٰہی کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ جس چیز کے باب میں جو حد جب متعین ہو گئی لوگ اس حد کا احترام کریں، پھر اگر اس حد میں کچھ اضافہ شریعت کی رو سے ہو جائے تو اس کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کر لیں اور اگر اس پر مزید اضافہ ہو جائے تو اس کو بھی اختیار کر لیں اور پھر پوری خوبی، پوری احتیاط اور پورے اخلاص کے ساتھ اس کو نباہیں۔

شریعت میں تدریج بندوں کی سہولت کے لیے ہے

اس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ شریعت الٰہی میں احکام کا نزول بالتدریج ہوا ہے اور یہ تدریج بندوں کی سہولت کے پہلو سے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں پر وہ گرفت نہیں فرمائے گا جنھوں نے اس کی بخشی ہوئی سہولت سے فائدہ اٹھایا ہے، اگرچہ ان لوگوں کو سبقت الی الخیر کا درجہ ملے گا جنھوں نے کسی باب میں ہوا کا رخ پہچان کر اس کے پہلے ہی مرحلہ میں احتیاط اور تقویٰ کا آخری قدم اٹھا دیا۔ مثلاً شراب کی حرمت کا حکم بالتدریج نازل ہوا لیکن دین کے معاملے میں جن کی حس زیادہ تیز تھی وہ پہلے ہی مرحلہ میں اس سے تائب ہو گئے۔ یہ ان کے کمال درجہ فطرت اسلام پر ہونے کی دلیل ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر بھی رحم فرمائے گا جنھیں اگرچہ یہ درجۂ کمال تو حاصل نہ ہو سکا

لیکن انھوں نے کسی مرحلہ میں حدودِ الٰہی سے تجاوز نہیں کیا۔

تدریج کے مراحل

دوسری بات آیت کے الفاظ سے یہ نکلتی ہے کہ اس تدریج کے تین مدارج ہیں۔ یہ بات ایک کلیہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ عمومیت کے لحاظ سے ہے۔ بعض معاملات میں قطعی اور آخری حکم پہلی ہی مرتبہ میں آگیا ہے، بعض میں دوسری مرتبہ میں اور بعض میں حکم کی تکمیل تیسری بار میں ہوئی ہے۔ مثلاً کھانے پینے کے سلسلہ کی حرمتوں کا اجمالی ذکر سورۂ انعام میں بھی ہوا ہے، جو ایک مکی سورہ ہے، اس کے بعد اس کی تفصیل اس سورہ (مائدہ) کے آغاز میں آئی ہے جس سے انعام کے بعض اجمالات کی وضاحت ہوتی ہے پھر اس سلسلہ میں کچھ مزید سوالات پیدا ہوئے ہیں جن کی تقریب سے بعض چیزوں کی حرمت، جیسا کہ واضح ہوگا، یہاں اس سورہ کے خاتمہ میں بیان ہوئی اور یہ سورہ، جیسا کہ ہم واضح کرچکے ہیں، احکامِ شریعت کے باب میں آخری سورہ ہے۔ اس وجہ سے گویا اس تیسرے مرحلہ میں کھانے پینے سے متعلق احکام کی تکمیل ہوگئی۔ یہ آیت یہ واضح کر رہی ہے کہ جو لوگ ان تینوں مرحلوں میں اللہ کے نازل شدہ احکام و حدود کی پیروی کرتے آئے ہیں ان سے ان چیزوں کے کھانے پر کوئی گرفت نہیں ہوگی جو انھوں نے اس وقت کھائی ہیں جب ان کی صریح حرمت نازل نہیں ہوئی تھی۔

تقویٰ، ایمان اور احسان

تیسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ آیت میں تین بار تقویٰ کا ذکر ہوا ہے۔ پہلی بار تقویٰ کے ساتھ ایمان و عمل صالح کا ذکر ہے، دوسری بار ایمان کا ذکر ہے، تیسری بار احسان کا ذکر ہے۔ تقویٰ کا مفہوم ہم دوسرے مقام میں واضح کرچکے ہیں کہ اصلاً یہ لفظ حدودِ الٰہی کی نگہداشت کے لیے آتا ہے۔ یہاں تین بار اس کا حوالہ احکام کے ان تدریجی مراتب کے لحاظ سے ہوا ہے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ رہا تقویٰ کے ساتھ ایمان و عمل صالح کا حوالہ تو وہ اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر صرف کسی چیز سے بچنا نہیں بلکہ وہ بچنا معتبر ہے جو ایمان و عمل صالح کے ساتھ ہو۔ اس قید کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ بہت سی چیزوں سے بچنے کے معاملے میں (بالخصوص کھانے پینے کی چیزوں کے معاملے میں) بہت سے لوگ بڑے محتاط اور متقشف ہوتے ہیں حالانکہ ایمان و عمل صالح سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جوگیوں، سنیاسیوں اور راہبوں سے قطع نظر جو لوگ اعمالِ سفلیہ کے دلدادہ ہوتے ہیں وہ بھی اپنے اوپر بہت سی پابندیاں عاید کر رکھتے ہیں اور بڑی سختی کے ساتھ ان کی نگہداشت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس چیز کا دین میں کوئی اعتبار نہیں۔ اعتبار صرف اس احتیاط کا ہے جو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ہو۔ آخر میں تقویٰ کے ساتھ احسان کی جو شرط ہے وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ دین میں جو تقویٰ مطلوب و مقبول ہے وہ صرف ظاہرداری اور رسوم کی خانہ پری سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے آخری شرط احسان ہے۔ احسان کا مدعا یہ ہے کہ آدمی اللہ کے حدود کی خلاف ورزی سے اس طرح بچے جس طرح اس سے بچنے کا حق ہے، وہ ہر حکم کی تعمیل اس طرح کرے گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے اور

اس یقین سے اپنے باطن کو منور رکھے کہ اگر وہ خدا کو نہیں دیکھ رہا ہے تو خدا تو بہرحال اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہی احسان تقویٰ کی اصل روح اور حدود الٰہی کا اصل پاسبان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان تقویٰ اور پرہیزگاری کی نمائش کرتے ہوئے حدود الٰہی کے توڑنے کے لیے ہزار چور دروازے پیدا کر سکتا ہے۔ آخر یہود نے دینداری کے مظاہرے کے ساتھ خدا کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو جائز کرنے کی کتنی راہیں کھول لیں۔ سبت کے لیے جو حیلۂ شرعی انھوں نے ایجاد کیا اس کی طرف یہاں بھی آگے اشارہ آ رہا ہے۔ یہی صورت اس امت میں بھی پیش آئی۔ یہاں تک کہ کتاب الحیل ہماری فقہ کا ایک جزو بن گئی۔ ایسے دین یا دینداری یا تقویٰ کی خدا کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو احسان کی صفت سے متصف ہوں۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّکُمُ اللّٰہُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُہٗٓ اَیْدِیْکُمْ وَرِمَاحُکُمْ لِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّخَافُہٗ بِالْغَیْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَہٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَہٗ مِنْکُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ یَحْکُمُ بِہٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ ھَدْیًۢا بٰلِغَ الْکَعْبَۃِ اَوْ کَفَّارَۃٌ طَعَامُ مَسٰکِیْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِکَ صِیَامًا لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِہٖ ۭ عَفَا اللّٰہُ عَمَّا سَلَفَ ۭ وَمَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰہُ مِنْہُ ۭ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝ اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُہٗ مَتَاعًا لَّکُمْ وَلِلسَّیَّارَۃِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَیْکُمْ صَیْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۭ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْٓ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ (۹۴-۹۶)

سورہ کے شروع، آیت ۱ میں حالت احرام میں شکار کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے اس سے متعلق بعض تفصیلات اور بعض سوالوں کے جواب جو بعد میں نازل ہوئے وہ یہاں بیان ہو رہے ہیں۔

پیش آنے والی آزمائش سے آگاہی

لَیَبْلُوَنَّکُمُ اللّٰہُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُہٗٓ اَیْدِیْکُمْ وَرِمَاحُکُمْ، یہ اس آزمائش سے آگاہ فرمایا جا رہا ہے جو حالتِ احرام میں وحشی شکار نظر آ جانے کی وجہ سے پیش آ سکتی ہے چونکہ یہ ممانعت اصلاً کی ہی اس لیے گئی ہے کہ لوگوں کے ایمان و تقویٰ کو جانچا جائے اس لیے پہلے سے خبردار کر دیا گیا کہ ایسے مواقع پیش آئیں گے کہ تم احرام باندھے ہوئے ہو گے اور تمھیں نظر آئے گا کہ ہرنوں یا نیل گائے کی پوری ڈار کی ڈار ہے جو بالکل تمھارے نیزوں کی زد میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آزمائش کے ان مواقع پر اپنے عزم و ایمان کی حفاظت کرنا، اس طرح پھسل نہ جانا جس طرح بنی اسرائیل سبت کے معاملے میں پھسل گئے۔

اس تنبیہ کی اہمیت

اس تنبیہ کی اہمیت اچھی طرح سمجھنے کے لیے چند باتیں ذہن میں مستحضر کر لیجیے۔ ایک تو یہ کہ شکار بجائے خود بڑی رغبت کی چیز ہے بالخصوص اہل عرب کے لیے جن کی تفریح اور معاش دونوں چیزوں کا انحصار بڑی حد تک اس زمانے میں شکار ہی پر تھا۔ دوسری یہ کہ جب کسی مرغوب چیز پر کوئی پابندی عائد ہو جاتی ہے تو اس کی رغبت اور بڑھ جاتی ہے۔ عربی میں مثل ہے الانسان حریص علی ما منع انسان جس

چیز سے روک دیا جائے اس کا بڑا حریص ہو جایا کرتا ہے۔ اس حرص کا نفسیاتی اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جس طرح ساون کے اندھے کو ہر جگہ ہرا ہرا نظر آتا ہے، اسی طرح اس کو بھی ہر جگہ وہی چیز نظر آتی ہے جس سے وہ اپنے کو محروم پاتا ہے۔ تیسری یہ کہ یہ منابی جب اصلاً امتحان کے لیے ہوتی ہے تو بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پیدا فرمائے کہ اس امتحان کا مقصد پورا ہو۔

بنی اسرائیل اور امت مسلمہ کے امتحان کی مماثلت

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ اس اُمت کے لیے یہ امتحان بنی اسرائیل کے اِس امتحان سے مشابہ ہے جو ان کو سبت کے معاملے میں پیش آیا۔ قرآن میں اس کا ذکر اس طرح ہوا۔

إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَٰلِكَ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ (الاعراف - ۱۶۳)	اور یاد کرو جبکہ وہ سبت کے معاملے میں حدود الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے، جب کہ ان کی مچھلیاں ان کے سبت کے دن منہ اٹھائے ہوئے نمودار ہوتی تھیں اور جب سبت کا دن نہ ہوتا تو مچھلیاں نمودار نہ ہوتیں۔ اسی طرح ہم ان کو آزمائش میں ڈالتے تھے بوجہ اس کے کہ وہ بھی نافرمانی کرتے تھے۔

ان دونوں مقامات پر غور کیجیے تو دونوں کی مماثلت بالکل واضح ہو جائے گی۔ بنی اسرائیل کی آزمائش کی نوعیت یہ تھی کہ جو دن ان کے سبت کا ہوتا اس دن مچھلیاں منہ اٹھائے ہوئے سطح آب پر نظر آتیں لیکن جو دن سبت کا نہ ہوتا اس دن وہ نظر نہ آتیں۔ اس چیز نے ان کو اس فتنے میں ڈال دیا کہ انھوں نے سبت کے دن شکار کے لیے ایک حیلہ ایجاد کر لیا۔ اسی طرح اس امت کے امتحان کے بارے میں فرمایا ہے کہ حالتِ احرام میں بسا اوقات تمھیں ایسا نظر آئے گا کہ شکار بالکل تمھارے ہاتھوں اور تمھارے بھالوں کے نیچے ہے۔ مبادا یہ چیز تمھیں اسی طرح کے کسی فتنہ میں مبتلا کر دے جس طرح کے فتنہ میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے۔

یہاں بِشَیْءٍ کے لفظ، بالخصوص اس کی تنکیر، سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ ہر چند یہ آزمائش پیش تو آئے گی لیکن یہ بہت سخت نہیں بلکہ ہلکی ہوگی۔ یہ چیز اس آخری شریعت کے مزاج کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے ہر پہلو میں انسانی فطرت کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہے۔

ابتلا کا اصل مقصد

لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَن يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ، یہ اس آزمائش کا مقصد بیان ہوا ہے۔ عَلِمَ یَعْلَمُ کے معنی ہم دوسری جگہ بیان کر چکے ہیں کہ تمیز کرنے کے بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ امتحان اللہ تعالیٰ نے اس لیے رکھا ہے کہ وہ ان لوگوں کو تمیز کرے جو غیب میں رہتے خدا سے ڈرتے ہیں۔ یہاں مقابل کا جملہ محذوف ہے یعنی ان لوگوں سے تمیز کرے جو غیب میں رہتے خدا سے نہیں ڈرتے۔ ابتلائی احکام سے متعلق ہم یہ حقیقت اس سورہ کے آغاز میں واضح کر چکے ہیں کہ ان کا اصل مقصود خدا کے ساتھ بندوں کی وفاداری کا امتحان ہوتا ہے۔ بظاہر وہ بندوں کے مصالح کے نقطۂ نظر سے ایک عام آدمی کو بے حکمت نظر آتے ہیں لیکن

حقیقت میں ایمان بالغیب اور خشیت بالغیب کے جانچنے کے لیے وہی اصلی کسوٹی ہوتے ہیں۔

فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ کا زور اس تنبیہ و تذکیر پر ہے جو یہاں کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت کے بعد یہ آگاہی بھی تمھیں سنا دی گئی ہے کہ اس راہ میں تمھیں اس طرح کی آزمائشیں بھی پیش آئی ہیں جس طرح کی تم سے پہلی امت کو پیش آئی ہیں تو جس نے اس آگاہی کے بعد بھی حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی کی اس کے لیے عذاب دردناک ہے۔

حالتِ احرام میں عمداً شکار کا کفارہ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا الآیۃ اب یہ اس سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ کوئی شخص حالتِ احرام میں ہونے کے باوجود عمداً اس گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے۔ ارشاد ہوا کہ ایسا شخص کفارہ ادا کرے جس کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح کا جانور اس نے شکار کیا ہے اسی قبیل کا جانور گھریلو چوپایوں میں سے کفارہ کی قربانی کے لیے خانہ کعبہ بھیجے۔ اگر یہ متعذر ہو تو اس جانور کی قیمت کی نسبت سے مسکینوں کو کھانا کھلائے، اگر یہ اس کے لیے دشوار ہو تو آخری درجے میں اتنے روزے رکھ دے جتنے مسکینوں کو کھانا کھلانا اس پر واجب ہوتا ہے۔ رہا اس امر کا فیصلہ کہ شکار کردہ جانور کا مثل اور بدل پالتو چوپایوں میں سے کون چوپایہ ہو سکتا ہے تو اس کا فیصلہ اور اس کے متعذر ہونے کی صورت میں اس کی قیمت یا مساکین یا روزوں کی تعداد کا فیصلہ تو یہ کام مسلمانوں میں سے دو ثقہ آدمی کریں گے تاکہ جرم کے مرتکب کے لیے اپنے نفس کی جانبداری کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

خطا کی صورت میں حکم اور بعض متعلق مسائل

قرآن کے الفاظ سے مجھے یہی بات قوی معلوم ہوتی ہے۔ اکثر لوگ اس معاملے میں خطا اور عمد کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ مجھے الفاظِ قرآن کی روشنی میں سعید بن جبیر کا مذہب مضبوط معلوم ہوتا ہے جو خطا کی صورت میں کفارہ کے قائل نہیں۔ اس کی تائید میں ایک قول حضرت حسنؓ کا بھی ہے۔ اسی طرح جو لوگ شکار کردہ جانور کی مثلیت کا فیصلہ ہر شکل قیمت ہی کے ذریعہ سے کرنے کے قائل ہیں، اس کے بعد وہ اختیار دے دیتے ہیں کہ چاہے کوئی شخص اس قیمت کے جانور کی قربانی دے، چاہے اسی نسبت سے مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا روزے رکھ دے تو یہ بات بھی کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتی۔ جب واضح طور پر پالتو جانوروں میں شکار کے جانوروں کے بدل موجود ہیں مثلاً ہرن کی جگہ بکری، دنبہ، مینڈھا وغیرہ، نیل گاؤ اور گورخر کی جگہ گائے وغیرہ تو مثلیت کے فیصلہ کے لیے قیمت ہی کیوں معیار قرار پائے۔ شکار کردہ جانور کا بدل موجود نہ ہو تب تو بلاشبہ قیمت ہی اس کا بدل ہو سکتی ہے لیکن ہر حالت میں اسی کو معیار قرار دینا الفاظِ قرآن کے خلاف ہے۔ یہ بات بھی کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتی کہ کفارہ کی مذکورہ تینوں شکلوں میں کفارہ دینے والے کو یکساں اختیار ہے، چاہے روزے رکھ دے چاہے مسکینوں کو کھانا کھلا دے، چاہے قربانی کر دے بلکہ ان میں ترتیب معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات کہ 'او' تخییر کے لیے آتا ہے اگرچہ صحیح ہے لیکن قرینہ موجود ہو تو یہ ترتیب کو بھی مستلزم ہے جیسا کہ اسی سورہ کی آیت ۱۰۶ میں ہے۔ اس وجہ سے میں امام محمد

او[illegible] کے مذہب کو قوی سمجھتا ہوں جو یہاں ترتیب کے قائل ہیں۔

ایک سخت تنبیہ

'وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ' اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ اوپر والی آیت میں فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کے الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔ یہ تنبیہ بہت سخت ہے اور اس سختی کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ اسی طرح کا امتحان ہے جس طرح کا امتحان سبت کے معاملے میں بنی اسرائیل کا ہوا اور جس میں فیل ہونے پر ان کو نہایت عبرت انگیز سزا ملی۔ یہ کفارہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ جوڑ رکھا ہے تو یہ نافع اسی شکل میں ہے جب اس کے ساتھ مخلصانہ توبہ پائی جائے۔ اگر دل کا رجوع اس کے ساتھ شامل نہ ہو بلکہ آدمی یہ خیال کر کے نافرمانی کرتا ہے کہ گرفت ہوئی تو کفارہ دے دیں گے تو ایسے لوگ خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے۔

'اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا الاية

بنی اسرائیل اور امت مسلمہ کا امتحان یہ فرق

مذکورہ بالا نہی سے جو شکار مستثنیٰ ہے، یہ اس کا بیان ہے۔ یہود کے لیے جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا سبت کے دن دریائی شکار بھی ممنوع تھا، اس امت کے لیے حالتِ احرام میں خشکی کا شکار ممنوع ہوا لیکن دریائی شکار مباح رہا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ فرق اس بنیاد پر ہو کہ اہلِ عرب کے لیے زیادہ کشش خشکی کے شکار میں تھی اور یہود کے لیے، ان کے جائے وقوع کے لحاظ سے، دریائی شکار میں۔ یہ ایک امتحان ہے اور امتحان میں اگر یہ پہلو ملحوظ ہو تو یہ اس کے مزاج سے مناسبت رکھنے والی بات ہے۔

'صَيْدُ' کا لفظ جس طرح غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ میں مصدری معنی میں ہے چنانچہ وہاں 'وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا' کہہ کر اس کے مصدری معنی میں ہونے کو واضح بھی کر دیا ہے، اسی طرح ہمارے نزدیک یہاں بھی مصدری معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک خشکی کا تعلق ہے اس کا شکار کرنا تو محرم کے لیے ممنوع ہے لیکن کسی غیر محرم کا کیا ہوا شکار کھانا، اگر کسی پہلو سے اس شکار میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے، اس کے لیے ممنوع نہیں ہے۔ رہا دریا کا شکار تو اس کا شکار کرنا اور دوسرے کا کیا ہوا شکار کھانا دونوں محرم کے لیے جائز ہے۔ یہ رخصت اللہ تعالیٰ نے اس لیے عطا فرمائی ہے کہ محرمین اور اہلِ قافلہ کو زادِ راہ کے معاملے میں آسانی ہو۔ خشکی کے سفر میں اگر زادِ راہ ختم ہو جائے تو اس کے حاصل کرنے کی راہیں کھلی رہتی ہیں۔ دریائی سفر میں اگر یہ زحمت پیش آ جائے تو شکار کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ جاتی۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہود کو جو شکار کی ممانعت تھی وہ صرف ہفتہ میں ایک دن کے لیے تھی۔ اس وجہ سے کسی ناقابلِ حل زحمت کے پیش آنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اس امت کو یہ ممانعت پورے دورانِ احرام کے لیے ہوئی۔ دریائی سفر کرنے والے قافلوں کو بعض حالات میں ناقابلِ حل مشکل پیش آ سکتی تھی اس وجہ سے دریائی شکار کے معاملے میں یہ رعایت ہوئی۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَاۗىِٕدَ ۭ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا

اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ
اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝ قُلْ لَّا يَسْتَوِي
الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۹۷-۱۰۰)

تمام شعائر کے احترام کی تاکید

اوپر والی بات اصلاً شعائرِ الٰہی کے احترام سے تعلق رکھنے والی بات ہے اس وجہ سے اس کے بعد دوسرے معروف شعائر، بیت اللہ، شہرِ حرام اور ہدی اور قلائد کی بھی یاد دہانی فرما دی کہ ان کے احترام سے متعلق بھی جو ہدایات دی گئی ہیں ان کو بھی حرزِ جان بناؤ، کسی پہلو سے ان کی حرمت میں کوئی فرق نہ آئے۔ کعبہ کی وضاحت بیت الحرام کے لفظ سے یہاں اسی پہلو کی طرف توجہ دلانے کے لیے کی گئی ہے کہ یہ خدا کا محترم ٹھہرایا ہوا گھر ہے، اس کے احترام کے حدود و قیود مقرر ہیں، ان حدود و قیود کی ہر حال میں نگہداشت رہے۔ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا کے تحت ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ ذریتِ ابراہیم کی تمام دینی، سیاسی اور معاشی شیرازہ بندی اسی گھر کی بدولت تھی اور بعثتِ نبوی کے بعد یہی گھر ہے جو تمام امت کا قبلہ اور مرکز ہے۔ اَلشَّهْرَ الْحَرَامَ سے مراد یہاں کوئی مخصوص مہینہ نہیں بلکہ تمام اشہرِ حرم کے لیے یہ بطور اسم جنس کے استعمال ہوا ہے۔ ان مہینوں کی دینی و دنیوی برکات پر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گفتگو کر چکے ہیں۔ ہدی اور قلائد کی وضاحت اسی سورہ کے آغاز میں ہو چکی ہے۔ ہمارے نزدیک تقدیرِ کلام یوں ہے۔ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ شَعَآئِرَ یعنی اللہ نے کعبہ بیت محترم کو لوگوں کے لیے مرکز اور شہرِ حرام، ہدی اور قلائد کو شعائر کا درجہ دیا۔ چونکہ یہ بات سیاقِ کلام سے بالکل واضح تھی اس وجہ سے لفظ شعائر کو حذف کر دیا۔

شعائر کی حکمت

ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ الاية، ذٰلِكَ کا اشارہ مذکورہ بالا شعائر کی طرف ہے اور یہ حکمت بیان ہوئی ہے ان شعائر کے مقرر کیے جانے کی کہ اللہ نے یہ اس لیے مقرر فرمائے ہیں کہ تمہارے اندر خدا کے فعلاً و صفتاً علیم و خبیر ہونے کا عقیدہ پوری طرح راسخ ہو جائے۔ ہم اوپر آیت ۹۴ میں لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ کے تحت اشارہ کر چکے ہیں کہ شعائر درحقیقت ابتلاء و امتحان کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے امتحان کرتا ہے کہ کون اس سے غیب میں رہتے ڈرتے ہیں، کون نہیں ڈرتے۔ ظاہر ہے کہ اس امتحان میں پورے وہی اترتے ہیں اور وہی اتر سکتے ہیں جن کے اندر یہ علم راسخ ہوتا ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب کو خدا جانتا ہے۔ جن کے اندر یہ عقیدہ پختہ ہوتا ہے وہی بالغیب میں رہتے اور خدا سے ڈرتے ہیں اور یہی غیب میں رہتے خدا سے ڈرنا تمام خشیت و تقویٰ اور سارے اسلام و ایمان کی روح ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کو فعلاً بھی بیان کیا ہے اور صفتاً بھی اس لیے کہ خدا کا علم ماضی، حاضر، مستقبل، ظاہر، باطن، غائب، موجود، مضمر سب پر محیط ہے اور انسان کا خدا کے علم کے متعلق یہی عقیدہ ہے جو اس کے اندر خشیت بالغیب پیدا کرتا ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ، یہ تنبیہ اور بشارت دونوں ساتھ ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا سے بے خوف ہو کر اس کے شعائر کی بے حرمتی کریں گے اللہ ان کو سخت سزا دے گا اور جو لوگ غیب میں رہتے اس سے ڈرتے رہیں گے اور اس کے شعائر کا کما حقہ احترام کریں گے ان کے لیے وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ — تنبیہ اور بشارت

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الایۃ یہ دوسری تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے رسول پر ذمہ داری صرف واضح طور پر ہماری ہدایات کو پہنچا دینے کی ہے۔ یہ فرض رسول نے ادا کر دیا۔ اب آگے ذمہ داری تمہاری ہے۔ تم مانو یا نہ مانو۔ مانو گے تو اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے، نہ مانو گے تو اس کا انجام خود دیکھو گے۔ یاد رکھو کہ جو تم ظاہر کرتے ہو خدا اس کو بھی جانتا ہے اور جو چھپاتے ہو اس سے بھی باخبر ہے۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یہ بھی اسی سلسلے کی ایک تنبیہ ہے اور بہت بڑی تنبیہ ہے۔ خبیث اور طیب پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ ان کا اطلاق بری اور اچھی اشیا پر بھی ہوتا ہے اور برے اور اچھے اشخاص پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ان اشیا پر بھی ہوتا ہے جو مادی اعتبار سے بری اور اچھی ہوتی ہیں اور ان اشیا پر بھی جو عقلی اور اخلاقی اعتبار سے اچھی یا بری ہوتی ہیں۔ یہاں پیش نظر اشیا اور اشخاص دونوں ہیں لیکن جہاں تک اچھائی اور برائی کا تعلق ہے وہ صرف اخلاقی پہلو سے زیر بحث ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے نزدیک خیر و شر، نیکی اور بدی، فسق اور تقویٰ، نیکوکار اور بدکار دونوں یکساں نہیں ہیں۔ خدا خیر مطلق اور سراپا حق و عدل ہے۔ اس وجہ سے وہ صرف خیر کو پسند کرتا ہے، شر کو پسند نہیں کرتا، وہ صرف طیب کو قبول فرمائے گا، خبیث کے لیے اس کے ہاں جہنم کی آگ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کی نافرمانی اور اس کے شعائر کی توہین کر کے اپنے آپ کو خبیث بنا لیں گے، یاد رکھیں کہ خدا ان کو دوزخ میں جھونک دے گا، فوز و فلاح صرف ان کو حاصل ہوگی جو خدا سے ڈرتے رہیں گے۔ اس کے احکام و شعائر کا احترام کریں گے اور اپنے آپ کو طیب پاکیزہ بنائیں گے گویا یہ اوپر والے مضمون اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ کی تکمیل ہے۔ اس کے بعد وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ کہہ کر اس راہ کے سب سے بڑے فتنہ سے آگاہ فرما دیا۔ وہ یہ کہ بہت سے نادانوں کے لیے کسی برائی کی کثرت نہ صرف اس کی تقلید کے لیے محرک بلکہ اس کے جواز و استحسان کی ایک دلیل بن جاتی ہے۔ جو فتنہ عام ہو جاتا ہے اور جو بدی فیشن میں داخل ہو جاتی ہے وہ اپنے دروازے بھی اس کے لیے چوپٹ کھول دیتے ہیں۔ اول تو ان کا ضمیر اس سے کوئی انقباض محسوس ہی نہیں کرتا اور اگر شرما شرمی میں کچھ محسوس کرتا بھی ہے تو وہ اس کو اس طفل تسلی سے مطمئن کر لیتے ہیں کہ بھلا اس زمانے میں کوئی اپنے آپ کو اس چیز سے کس طرح الگ رکھ سکتا ہے! نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو حمام میں ننگا دیکھ کر وہ خود بھی ننگے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ پورا معاشرہ ننگوں کا معاشرہ بن جاتا ہے اور پھر

کسی برائی کی کثرت اس کے جواز کی دلیل نہیں ہے

حالت یہ ہو جاتی ہے کہ شریف اور مہذب وہ نہیں کہلاتا جو کپڑے پہن کر نکلتا ہے بلکہ وہ کہلاتے ہیں جو اپنی عریانی کی نمائش کرتے یا کرتی ہیں۔ اگر ان سے ان کے اس رویہ کے جواز کی دلیل پوچھیے تو وہ اس کے حق میں جو سخن سازی بھی کریں اس کی تہ میں صرف یہ چیز نکلے گی کہ کیا کیا جائے، یہی زمانہ کا چلن اور یہی وقت کا فتویٰ ہے یعنی اکثریت کا عمل ان کے لیے دلیل راہ بن جاتا ہے اور دانش فروشی کی تمام لن ترانیوں کے ساتھ جس ڈگر پر سارا گلہ چل رہا ہوتا ہے وہ بھی اس پر چل پڑتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ سے یہاں یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اگرچہ کسی برائی کا غلبہ اور خبیث کی کثرت اپنے اندر کشش تو رکھتی ہے لیکن اس کشش سے مغلوب ہو کر جو اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں وہ سب سفہا اور حمقا میں داخل ہیں، اولوا الالباب اور اہل عقل وہ ہیں جو اس وبائے عام میں بھی اس کے اثرات سے محفوظ اور تقویٰ کی راہ پر گامزن رہتے ہیں یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں اس لیے کہ خدا کے ہاں نہ خبیث و طیب دونوں یکساں ہوں گے اور نہ خبیث اس لیے طیب بن جائے گا کہ اس کی مقدار بہت زیادہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔـلُوْا عَنْ اَشْيَاۗءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔـلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ (۱۰۱-۱۰۲)

غیر ضروری سوالوں کی ممانعت

یہ بھی برموقع ایک تنبیہ ہے۔ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اوپر ان سوالوں کے جواب دیے گئے ہیں جو ابتدائے سورہ میں بیان کردہ احکام سے متعلق پیدا ہوئے یا پیدا ہو سکتے تھے۔ اب یہ تنبیہ فرمائی کہ جو مفید سوال تھے ان کے جواب دے دیے گئے لیکن ایسے سوال نہ کرو جن کے جواب اگر دے دیے جائیں تو تمھارے مزاج اور تمھاری خواہش کے خلاف پڑنے کے سبب سے وہ تمھیں برے لگیں گے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ یہ زمانہ نزول قرآن کا زمانہ ہے یہ زمانہ بارش کے ایام سے مشابہ ہے۔ بارش کے زمانہ میں جس طرح ہر بیج اگ پڑتا ہے اسی طرح اس زمانے میں جو سوال بھی کرو گے اس کا جواب نازل ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے سوچ سمجھ کر وہی سوالات کرو جو دنیا اور آخرت میں تمھارے لیے نافع اور علم شریعت میں اضافہ کے موجب ہوں۔ غیر ضروری سوالات اٹھا کر اپنی پابندیوں میں اضافہ کی راہ نہ کھولو۔ خدا بخشنے والا اور بردبار ہے۔ اسی وجہ سے اس نے تمھارے بے ضرورت سوالات نظر انداز کر دیے ہیں۔ اگر ان کے بھی جواب دے دیے جاتے تو ہو سکتا ہے کہ تم ان کو نباہ نہ پاتے اور اس طرح اپنے ہی ہاتھوں اپنی راہ میں کانٹے بونے والے اور خدا کے غضب کو دعوت دینے والے بنتے۔

اس کے بعد بطور مثال ایک قوم کا حوالہ دیا ہے۔ مراد اس سے بالبداہت یہود ہیں لیکن ان کا نام نہیں لیا ہے بلکہ ان کا ذکر نکرہ کے ساتھ کیا ہے جس سے فی الجملہ اعراض اور نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ انھوں نے بھی اپنے نبی سے اسی طرح کے سوالات و مطالبات کیے لیکن

جب ان کو جواب دے دیے گئے تو وہ ان کے منکر بن بیٹھے۔ ان کے سوالوں کی نوعیت سورۂ بقرہ میں گائے کے قصہ سے واضح ہو چکی ہے اور پچھلی سورتوں میں یہ بات بھی ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ درحقیقت ان کے اسی طرح کے سوالات تھے جن سے انھوں نے اپنی ان قیدوں اور پابندیوں میں اضافہ کرایا جن کو قرآن نے 'اصر و اغلال' سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ اس نے غیر ضروری سوالوں کو نظر انداز فرما کر ہمیں اصر و اغلال سے بچایا ہے اور ان معاملات کو ہمارے عقل و اجتہاد پر چھوڑ دیا جن میں ہماری عقل و فطرت ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ اس میں یہ حکمت بھی تھی کہ یہ شریعت آخری اور کامل شریعت ہے، اس میں کوئی بات بھی معیار سے مختلف نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں تھا جو اس کو معیار پر لاتا۔ اس کے برخلاف یہود کی شریعت ایک وقتی شریعت تھی، اس میں اگر اصر و اغلال تھے تو وہ، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، آخری پیغمبر کے ذریعہ سے دور ہو گئے۔

'قد سالہا' میں ضمیر کا مرجع مذکورہ سوال ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انھوں نے بعینہٖ وہی سوالات کیے جن کی طرف اوپر اشارہ ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس نوعیت کے سوالات کیے۔ عربی میں ضمیروں کا استعمال اس طرح بھی ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ ہم مناسب محل میں اس پر مفصل گفتگو کریں گے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (١٠٣-١٠٥)

غیر مشروع شعائر سے اجتناب کی ہدایت

اوپر آیت ۹۷ میں ان چیزوں کا ذکر ہوا ہے جن کو اللہ نے شعائر کا درجہ دے کر محترم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد چند مناسب موقع تنبیہات آ گئیں۔ اب یہ ان مشرکانہ چیزوں کا ذکر ہو رہا ہے جن کو مشرکین نے شعائر کا درجہ دے کر مذہبی تقدس کا جامہ پہنا رکھا تھا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں سے کسی چیز کو بھی مشروع نہیں کیا تھا۔ مشرکین نے محض من گھڑت طور پر ان کو ایجاد کیا، ان کے احترام کی روایت قائم کی اور پھر اپنی ان بدعات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا کہ اس نے ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔ گویا مشروع کے بیان کے بعد اس کے مقابل کی غیر مشروع چیزوں کا بھی ذکر فرما دیا تاکہ مسلمان ان سے اجتناب کریں۔

'ما جعل اللہ'، جعل، یہاں مشروع کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ نے یہ چیزیں مشروع نہیں فرمائی ہیں۔

'بحیرۃ' اس اونٹنی کو کہتے جس سے پانچ بچے پیدا ہو چکے ہوتے اور ان میں آخری نر ہوتا۔ ایسی

اونٹنی کے کان چیر کر اس کو آزاد چھوڑ دیتے، نہ اس پر سواری کرتے نہ اس کا دودھ دوہتے۔

'سَائِبَۃ' اس اونٹنی کو کہتے جس کے متعلق اس کا مالک اپنی کسی بیماری میں یہ منت مانتا کہ اگر اس کو شفا ہو گئی تو وہ اس کو آزاد چھوڑ دے گا نہ اس پر سواری کرے گا نہ اس کا دودھ دوہے گا۔

'وَصِیلَۃ' بکری اگر مادہ جنتی تو اس کو اپنا حصہ سمجھتے، نر جنتی تو اس کو اپنے معبودوں کا حصہ سمجھتے اور اگر نر و مادہ دونوں ایک ساتھ جنتی تو اس کو وصیلہ کہتے اور ایسے نر کو بتوں کی نذر کے قابل نہ سمجھتے۔

'حَام' اس سانڈ اونٹ کو کہتے جس کی صلب سے کئی پشتیں پیدا ہو چکی ہوتیں۔ ایسے سانڈ کو بھی آزاد چھوڑ دیتے۔ نہ اس پر سواری کرتے، نہ بوجھ لادتے۔

یہ سب عرب جاہلیت کی تدیمی اور منتیں تھیں۔ اس قسم کے جانور آزاد چھوٹے پھرتے، جس گھاٹ سے چاہتے پانی پیتے اور جس کی چراگاہ میں چاہتے چرتے۔ نہ ان کو کوئی روک سکتا نہ چھیڑ سکتا۔ ان کو مذہبی تقدس کا ایسا درجہ حاصل تھا کہ ہر شخص ان کے چھیڑنے کے وبال سے لرزہ براندام رہتا۔ قرآن نے واضح فرما دیا کہ ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ شرعی حیثیت صرف ہدی کے جانور و قلائد کی ہے۔ یہ چیزیں صرف اوہام کی ایجاد ہیں، جن کو شریعت کی طرف منسوب کرنا اللہ اور اس کی شریعت پر صریح اتہام ہے۔ جو لوگ عقل سے عاری ہیں انھوں نے ان احمقانہ چیزوں کو اللہ سے نسبت دے رکھی ہے۔

اندھی روایت پرستی کی مذمت — وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ الایۃ اوپر والی آیت میں یہ جو فرمایا ہے کہ 'وَأَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ' (ان میں سے اکثر ناسمجھ ہیں) یہ اس کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ ان لایعنی باتوں کو چھوڑ کر اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کی طرف آؤ تو بڑے غرے سے جواب دیتے ہیں کہ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ہم نے اپنے باپ دادا کو جس طریقے پر پایا ہے ہمارے لیے وہی کافی ہے۔ فرمایا کہ کیا اس صورت میں بھی وہ باپ دادا ہی کی روایت کو حجت بنائیں گے جب کہ ان کے باپ دادا کو نہ تو کچھ علم رہا ہو اور نہ وہ ہدایت کی راہ پر رہے ہوں؟ یعنی کسی طریقہ کی صحت کی دلیل مجرد یہ چیز تو نہیں بن سکتی کہ وہ باپ دادا سے چلا آ رہا ہے، اس کے متعلق یہ معلوم کرنا بھی تو ضروری ہے کہ باپ دادا نے اس کو کسی علم اور کسی دلیل پر اختیار کیا تھا یا یوں ہی اختیار کر لیا تھا۔ اگر یہ تمیز غیر ضروری ہو جائے تو پھر تو یہ عقل، جو انسانیت کا وصف امتیازی ہے، بالکل فالتو چیز بن کے رہ جائے۔

مسلمانوں کو تسلی کہ تمہاری ذمہ داری حق کو پہنچا دینے کی ہے — يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ، اوپر آیت ۹۹ میں جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی تھی کہ رسول کی ذمہ داری صرف واضح طور پر حق پہنچا دینے کی ہے، اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے۔ جو لوگ قبول نہ کریں گے اس کی پرسش خود ان سے ہونی ہے نہ کہ رسول سے۔ اسی طرح اس آیت

میں مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ جو لوگ اپنی عقل بیچ کر باپ دادا کی اندھی تقلید پر اڑ گئے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، تم نے کلمۂ حق پہنچا دیا، اگر وہ نہیں مانتے تو اپنا بگاڑیں گے، تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ جو گمراہی کی راہ اختیار کرتا ہے وہ خود اپنی ہرزہ گردی کا انجام دیکھتا ہے۔ اس سے صحیح راہ بتانے والے کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ تم نے ان کو سنبھالنے کی کوشش کر دی، اگر وہ نہیں سنبھلتے تو تم اپنی فکر کرو، ان کے غم میں پریشان نہ ہو۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ انعام کی آیات ۱۵، ۴۸، ۵۱، ۵۲، ۶۹ کے تحت ہم اس پر مزید بحث کریں گے۔

بعض لوگوں کو اس سے یہ شبہ ہوا کہ مسلمانوں کو دوسروں کی ہدایت و ضلالت سے کوئی سروکار نہیں ہے، انھیں بس اپنے نفس کی فکر کرنی چاہیے لیکن یہ خیال قطع نظر اس سے کہ مسلمانوں کے فریضۂ منصبی — شہادت علی الناس کے خلاف ہے، خود اس آیت سے بھی بالکل بے جوڑ ہے۔ اس آیت سے جو بات نکلتی ہے وہ تو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح آپ کے صحابہؓ بھی کفار کی حق بیزاری دیکھ کر کبھی کبھی یہ خیال فرمانے لگتے کہ کہیں یہ چیز اس امر کا نتیجہ نہ ہو کہ جو فرض ابلاغ ان پر عائد ہوتا ہے اس میں کوئی کوتاہی ہو رہی ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے اسی طرح صحابہؓ کو بھی تسلی دی کہ اس میں قصور تمہارا نہیں بلکہ یہ ان کے اپنے مزاج کا فساد ہے۔ تم نے اپنا فرض بخوبی انجام دے دیا، اب ان کے کفر و ایمان کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اس باب میں کوئی پرسش تم سے نہیں ہونی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ۭ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ (۱۰۶)

تمام ابواب شہادت پر میثاق — یہ بھی ایک تکمیلی و اتمامی حکم ہے جس کی نوعیت ابتدائے سورہ میں بیان کردہ بعض احکام کی وضاحت کی ہے۔ سورہ کے شروع، آیت ۸ میں، مسلمانوں کو یہ ہدایت ہوئی ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ وہاں، جیسا کہ ہم اس آیت کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں اس عمومی شہادت کا بیان ہے جس کی ذمہ داری اس امت پر تمام خلق سے متعلق ڈالی گئی ہے۔ اب یہ اس شہادت کا عمل مسلمانوں کے آپس کے ایک جزوی معاملہ میں بیان کر کے اس باب کی گویا تکمیل فرمائی ہے اور اس آیت کو اس شہادت کبریٰ کے بیان کے ساتھ جوڑ دیا ہے جس کا ذکر آیت ۱۰۹ سے آ رہا ہے اور جو اس عظیم سورہ کا آخری مضمون ہے جس پر یہ سورہ ختم ہوئی ہے۔ اس آیت کا اس مقام میں جگہ پانا ایک تو اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ جب اس تکمیلی حکم پر میثاق لے لیا گیا تو گویا تمام ابواب شہادت پر میثاق لے لیا گیا، دوسرے اس امر

کرنا پڑ رہا ہے کہ ہر چند یہ حکم ایک جزوی حکم ہے لیکن باعتبار اپنی اصل کے یہ بھی اسی شہادتِ کبریٰ کا ایک جزو ہے جس پر انبیاء علیہم السلام مامور ہوئے اور جس کو انھوں نے اس دنیا میں بھی انجام دیا اور جس کے لیے اللہ تعالیٰ انھیں آخرت میں بھی کھڑا کرے گا۔

شہادتِ وصیت سے متعلق ہدایات

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اور حِيْنَ الْوَصِيَّةِ یہ دونوں ظرف شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ سے تعلق رکھتے ہیں اور اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اسے اپنے مال سے متعلق کوئی وصیت بھی کرنی ہے تو اس کے لیے وہ مسلمانوں میں سے دو ثقہ آدمیوں کو گواہ بنا لے۔

اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ اگر کوئی شخص سفر میں ہے اور سفر ہی میں اس کو موت کا مرحلہ پیش آ جاتا ہے اور گواہ بنانے کے لیے اسے دو مسلمان نہیں مل رہے ہیں تو بدرجۂ مجبوری غیر مسلموں ہی میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنا سکتا ہے۔

تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ۔ یہ ہدایت اصل حکم اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ سے متعلق ہے۔ یعنی اپنوں میں سے جن دو معتبر گواہوں کو گواہی کے لیے منتخب کرو، اگر اندیشہ ہو کہ وہ اپنی گواہی کسی کی جانب داری کے لیے کہیں بدل نہ دیں تو اس کو مؤکد کرنے کے لیے یہ تدبیر کر سکتے ہو کہ کسی نماز کے بعد مسجد میں انھیں روک لو اور ان سے اللہ کے نام پر قسم لے لو کہ وہ اپنی گواہی کسی نفع دنیوی کی خاطر اور کسی کی جانبداری میں، خواہ وہ ان کا عزیز ہی کیوں نہ ہو، بدلیں گے نہیں اور اگر وہ اس کو بدلیں تو وہ گنہگار ٹھہریں۔

مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ میں صَلٰوة سے مراد کوئی مخصوص نماز نہیں بلکہ یہ لفظ اسم جنس کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جس نماز کے بعد بھی وصیت کرنے والے کو موقع میسر آ جائے، یہ کام کر سکتا ہے۔ نماز کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ جو قول و قرار اور جو شہادت و قسم نماز کے بعد اور مسجد میں نمازیوں کی موجودگی میں انجام پاتے ایک صاحبِ ایمان سے توقع یہی کی جاتی ہے کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہے گا۔ کسی ترغیب و تحریص سے اس کو بدلے گا نہیں۔ چنانچہ قسموں اور معاہدوں کے باب میں زمانۂ قدیم سے یہ رواج رہا ہے کہ ان کی تکمیل بالعموم معبدوں کے سامنے ہوتی۔ چونکہ اس چیز کی اثر انگیزی ایک فطری چیز ہے اس وجہ سے اسلام نے بھی اس کو اہمیت دی ہے۔ یہاں ایک شرط بھی مذکور ہے، وہ یہ کہ اگر گواہوں کے بارے میں کوئی شک ہو، تب یہ قسم لی جائے۔ اگر کوئی اندیشہ نہ ہو، گواہ ثقاہت و عدالت کے اعتبار سے ایسے مرتبہ کے ہوں کہ ان کے بارے میں کسی سوءِ ظن کا احتمال نہیں ہے تو خواہ مخواہ ان سے قسم لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ میں اس گواہی کو شَهَادَةَ اللّٰهِ سے تعبیر کر کے اس کی عظمت واضح فرمائی ہے۔ اس لیے کہ مومن کی

ہر گواہی چھوٹی ہو یا بڑی کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ کی رو سے اس عظیم دینی منصبی کا ایک جزو ہے جس پر اللہ نے اس کو مامور فرمایا ہے، اگر اس میں ادنیٰ خیانت بھی اس سے صادر ہو تو وہ صرف بندوں ہی کا خائن نہیں بنتا ہے بلکہ اپنے رب کا بھی خائن بن جاتا ہے۔

ہم نے اس قسم کو اصل حکم یعنی اس صورت سے متعلق مانا ہے جب گواہ اپنوں، مسلمانوں، میں سے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کے لیے نماز، مسجد، اللہ کے نام پر قسم اور وہ بھی ان الفاظ میں کہ وَلَا نَکْتُمُ شَھَادَۃَ اللّٰہِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ (ہم اس شہادتِ الٰہی کو چھپائیں گے نہیں، اگر ہم ایسا کریں تو ہم گنہگاروں میں سے ٹھہریں) بالکل غیر موثر چیزیں ہیں۔ اول تو وہ اپنے مذہبی جذبات کے خلاف ان باتوں کو گوارا کیوں کریں گے اور کر بھی لیں تو اس کا اثر ان پر کیا ہوگا؟ ان کی گواہی تو ایک مجبوری کی صورت میں گوارا کی گئی ہے اور ایک ثانوی حالت سے متعلق ہے۔ اس وجہ سے ان کی گواہی کی حفاظت کے لیے یہ اہتمام ایک بالکل بے جوڑ سی چیز ہے۔

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓی اَنَّھُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ یَقُوْمٰنِ مَقَامَھُمَا مِنَ الَّذِیْنَ اسْتَحَقَّ عَلَیْھِمُ الْاَوْلَیٰنِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰہِ لَشَھَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَھَادَتِھِمَا وَمَا اعْتَدَیْنَآ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ (۱۰۷)

عثر عثرا وعثورا علی السر کے معنی ہیں وہ راز سے آگاہ ہوا۔

اولیان، اولیٰ کا تثنیہ ہے جس کے معنی احق کے ہیں اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰھِیْمَ، الاولیان یعنی الاولیان بالشہادۃ شہادت کے زیادہ حق دار۔ ان سے مراد وہ دونوں گواہ ہیں جو میت کے ابتدائی گواہ بنائے گئے۔ چونکہ اپنے منصب کے اعتبار سے گواہی کے اصل حق دار وہی ہیں اس وجہ سے ان کو 'اولیان' کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ یہاں اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ جب وہ اولیٰ بالشہادۃ ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اس منصب کی لاج رکھیں اور کسی ایسی بدعنوانی کے مرتکب نہ ہوں کہ اولیٰ بالشہادۃ ہوتے ہوئے بھی ان کی شہادت دوسروں کی قسم سے باطل ہو جائے۔

یہ ان گواہوں پر ایک مزید احتساب اور چیک ([illegible]) ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ بات علم میں آئے کہ انھوں نے وصیت کرنے والے کی وصیت کے خلاف کسی کی جانب داری یا کسی کی حق تلفی کی ہے تو جن کی حق تلفی ہوئی ہے ان میں سے دو آدمی اٹھ کر قسم کھائیں گے کہ ہماری گواہی ان دونوں اولیٰ بالشہادت گواہوں کی گواہی سے زیادہ سچی ہے، ہم نے خود بھی حق سے تجاوز نہیں کیا ہے، اگر ہم نے ایسا کیا ہو تو ہم ظالموں میں سے ٹھہریں۔

ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّھَادَۃِ عَلٰی وَجْھِھَآ اَوْ یَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌۢ بَعْدَ اَیْمَانِھِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ (۱۰۸)

یہ اس احتساب کا فائدہ بتایا ہے کہ توقع ہے کہ اس احتساب کے خیال سے وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں ورنہ انھیں ڈر ہوگا کہ اگر ان سے کوئی بدعنوانی صادر ہوئی تو ان کی قسمیں دوسروں کی قسموں سے باطل ہو جائیں گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن کی حق تلفی ہوئی ہے اگر وہ مذکورہ قسم کھا لیں گے تو وصیت کے اصل گواہوں کی گواہی ان

کے اولیٰ بالشہادت ہونے کے باوجود رد ہو جانے کی۔ تشریح اَیْمَانٌ بَعْدَ اَیْمَانِھِمْ میں اَیمان کی تنکیر اسی طرح کی ہے جس طرح نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَنًا میں ہے جس پر گفتگو ہو چکی۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ یعنی اللہ سے ڈرو، پیغمبر کی بات مانو، جو اللہ سے نہیں ڈرتے اور پیغمبر کی بات نہیں سنتے وہ نافرمان ہیں اور اللہ ایسے نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرے گا، وہ دنیا میں بھٹکتے رہیں گے اور آخرت میں اپنے انجام بد سے دوچار ہوں گے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (۱۰۹)

میثاق الٰہی کی ذمہ داری دنیا اور آخرت دونوں میں

یہاں سے اس سورہ کا بالکل آخری ٹکڑا شروع ہو رہا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام انبیاء کو جمع کر کے ان سے پوچھے گا کہ انھوں نے اپنی اپنی امتوں کو کیا تعلیم دی تھی اور ان کی امتوں نے اس تعلیم کے باب میں کیا رویہ اختیار کیا؟ یہ سورہ کے آخر میں گویا اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ میثاق الٰہی کی ذمہ داری نبی اور امت دونوں پر عائد ہوتی ہے اور قیامت کے دن اس کے بارے میں دونوں سے سوال ہوگا۔ آگے ذکر اگرچہ صرف سیدنا مسیح سے سوال و جواب کا ہے لیکن آنجناب کا ذکر بطور مثال ہے۔ اس مثال سے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اسی طرح کے سوال و جواب ہر نبی سے اس کی امت کے بارے میں ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ہر امت پر اس کے نبی کی موجودگی میں واضح فرما دے گا کہ اس نے اللہ کے عہد کے معاملے میں اپنے نبی کی تعلیم کی کیا کیا خلاف ورزیاں کی ہیں۔ مثال کے طور پر سیدنا مسیح کے انتخاب کی حکمت یہ ہے کہ وہ اسرائیلی سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ ان کی شہادت یہود و نصاریٰ کے لیے بھی سبق آموز ہو سکتی تھی اور اس امت کے لیے بھی۔ آنحضرتؐ کی شہادت اس مرحلہ میں اس لیے ذکر نہیں کی گئی کہ آپ کی امت ابھی دورِ تشکیل میں تھی۔ اس کا پورا کردار ابھی سامنے نہیں آیا تھا۔

انبیاء سے سوال ان کی امتوں کے رویہ سے متعلق

مَاذَآ اُجِبْتُمْ کے سوال کا صحیح مفہوم موقع و محل سے واضح ہوتا ہے۔ انبیاء سے یہ سوال جو یہاں مذکور ہے ان کے منکروں سے متعلق نہیں کیا جائے گا بلکہ، جیسا کہ واضح ہوا، ان کی امتوں سے متعلق کیا جائے گا کہ جن لوگوں کو تم نے اللہ کے عہد و میثاق میں داخل کیا ان کا رویہ اور ردعمل کیا رہا؟ انبیاء علیہم السلام پر سوال کی حقیقت چونکہ واضح ہوگی اس وجہ سے وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے کیونکہ ان کا علم صرف دنیا میں اپنی موجودگی کے زمانے تک ہی محدود ہوگا اور اس سوال کے صحیح جواب کا انحصار اس امر پر ہے کہ انھیں اپنی امتوں کی بعد کی تبدیلیوں کا بھی علم ہو۔ چونکہ بعد کی تبدیلیوں کا انھیں علم نہیں ہوگا اس وجہ سے وہ اس جواب کے معاملے کو خدا ہی کی طرف تفویض کریں گے۔ آگے حضرت عیسیٰ کا ارشاد مذکور ہے كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (میں جب تک ان میں رہا ان پر گواہ رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ان پر نگران رہا اور تو ہر چیز پر نگران ہے)

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰي وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُ

تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ۖ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي ۖ وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنكَ إِذْ جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ (۱۱۰)

یہاں حضرت عیسیٰ کے جو معجزات مذکور ہیں یہ سب سورۂ آل عمران میں بھی بیان ہو چکے ہیں ہم بالتفصیل ان کی وضاحت کر چکے ہیں۔

وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنكَ اشارہ بنی اسرائیل کی ان سازشوں کی طرف ہے جو انھوں نے سیدنا مسیح کے قتل اور سولی کے لیے کیں۔

سوالات نصاریٰ کی فضیحت کے لیے

یہ تمام باتیں قیامت کے دن حضرت عیسیٰ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نصاریٰ پر حجت تمام کرنے کے لیے فرمائے گا۔ گویا حضرت عیسیٰ کی موجودگی میں نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے گی کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ پر جو انعام بھی ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا، انھوں نے جو معجزے بھی دکھائے سب اللہ کے اذن و حکم سے دکھائے اور یہودیوں نے ان کو جن خطرات میں ڈالا ان سے ان کو اللہ تعالیٰ ہی نے نکالا۔ پھر جب یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے کیا اور اس کے سب سے بڑے گواہ خود عیسیٰ ہیں تو نصاریٰ بتائیں کہ انھوں نے کس کے کہنے سے ان کو خدا بنا ڈالا۔ یہاں بِإِذْنِي (میرے حکم سے) کی تکرار نہایت بلیغ ہے۔ ایک ایک بات پر اللہ تعالیٰ اس کو دہرائے گا اور ان میں سے ہر بات پر سیدنا مسیح آمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہیں گے تو ظاہر ہے کہ جن معجزات کے بل پر نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کو خدا بنایا جب وہ سب خدا کے اذن سے ہوئے اور اس کا اعتراف خود معجزات کا دکھانے والا ہی کرے گا تو نصاریٰ کے حصے میں فضیحت اور رسوائی کے سوا اور کیا باقی رہ جائے گا۔

وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ ۝ إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَن يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ قَالُوا نُرِيدُ أَن نَّأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَن قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنكَ ۖ وَارْزُقْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝ قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۖ فَمَن يَكْفُرْ بَعْدُ مِنكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ (۱۱۱-۱۱۵)

حواریین کو وحی کی بحث و نے کی حکمت

'وحی' کا لفظ یہاں اصطلاحی معنوں میں نہیں، بلکہ لغوی معنی میں ہے۔ یعنی دل میں کوئی ارادہ ڈالنا۔ 'حواری' کے لفظ پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔ یہی حواریین ہیں جو پوری قوم کے اندر سے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے، انھی نے دعوت کے کام میں آپ کی مدد کی اور انھی کو آنجناب کے خلفا کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان کی

اس اہمیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے سامنے بھی وہ حقائق پیش کرے گا جن سے نصاریٰ پر حجت پوری ہوگی۔ اس اتمامِ حجت کے چند پہلو یہاں ذکر کیے جاتے ہیں۔

ایک یہ کہ حواریین نے جس دین کو قبول کیا وہ نصرانیت و مجوسیت نہیں بلکہ اسلام ہے۔

دوسرا یہ کہ حواریین حضرت عیسیٰؑ کو عیسیٰ بن مریم کہتے تھے، ان کی الوہیت کا کوئی تصور ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کو حضرت عیسیٰ اور تمام کائنات کا رب مانتے تھے۔

طلبِ مائدہ کی دعا کا مقصد — تیسرا یہ کہ وہ حضرت عیسیٰ کو بالذات معجزات کا دکھانے والا نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو صرف ان کے ظہور کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے مائدہ کے اتارے جانے کے لیے جو درخواست کی وہ حضرت عیسیٰؑ سے نہیں کی کہ آپ ہمارے لیے مائدہ اتاریں بلکہ یہ درخواست کی کہ اگر یہ بات آپ کے خداوند کی حکمت کے خلاف نہ ہو تو آپ اس سے درخواست کیجیے کہ وہ ہمارے لیے مائدہ اتارے تاکہ اس سے ہمارے دلوں کو طمانیت حاصل ہو۔

جب یہ ساری باتیں سیدنا مسیح، حواریین اور نصاریٰ کی موجودگی میں سامنے آئیں گی تو اس وقت وہ سارے جھوٹ آشکارا ہو جائیں گے جو مسیحیوں نے حضرت مسیحؑ یا حواریین پر باندھے ہیں اور جن کے ذریعہ سے اپنی بدعات میں ان کو ملوث کیا ہے۔

سوالِ خدا کی قدرت سے متعلق نہیں، اُس کی حکمت سے متعلق ہے — ھَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّکَ کے سوال کے باب میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حواریین کا سوال خدا کی قدرت سے متعلق نہیں بلکہ اس کی حکمت سے متعلق تھا کہ اس قسم کی کھلی ہوئی نشانی دکھانا اس کی حکمت کے مطابق بھی ہوگا یا نہیں؟ حواریین با ایمان لوگ تھے، وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ ان کی یہ درخواست مشابہ ہے اس مطالبہ سے جو بنی اسرائیل نے خدا کو دیکھنے کے لیے کیا تھا جس کے نتیجہ میں ان کو کڑک نے آدبوچا تھا۔ معجزات ہر چند خارقِ عادت ہوتے ہیں تاہم وہ اسباب کے پردے ہی میں ظاہر ہوتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ تمام پردے اٹھا دیے جائیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے مطالبات کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی جن میں خواہش ان حدود سے متجاوز ہو جائے جو معجزات کے ظہور کے لیے سنت اللہ میں مقرر ہیں۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ نے بھی اس سے روکا اور جب حواریین کی دوبارہ درخواست پر اس کے لیے درخواست فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے اس درخواست کو پسند نہیں فرمایا بلکہ ارشاد ہوا کہ اتارنے کو تو میں مائدہ اتار دوں گا لیکن یاد رکھو کہ جو لوگ اتنی کھلی نشانیاں دیکھنے کے بعد کفر میں مبتلا ہوں گے ان کو سزا بھی وہ دوں گا جو کسی اور کو نہ دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے اس کے بعد حواریین اپنی اس درخواست سے باز آگئے۔ اہلِ تاویل علماء سے بھی ایک گروہ کا یہی خیال ہے کہ اس کا نزول نہیں ہوا۔ انجیلوں میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ
سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ

اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ
رَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۱۱۶-۱۱۸)

نصاریٰ کی رسوائی آخرت میں

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ الاية اوپر جو باتیں مذکور ہوئی ہیں مقصود ان کے ذکر سے بھی اگرچہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نصاریٰ کی تفضیح ہے لیکن وہ تفضیح بالواسطہ ہے۔ اب یہ اس سوال کا ذکر آ رہا ہے جو اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے نصاریٰ کی اصل گمراہی کے بارے میں پوچھے گا کہ کیا تم نے نصاریٰ کو یہ تعلیم دی تھی کہ اللہ کے سوا مجھ کو اور میری ماں کو بھی معبود بناؤ۔ حضرت عیسیٰ جواب میں فرمائیں گے کہ بھلا میں ایسی بات زبان سے کس طرح نکال سکتا تھا جس کا مجھے کوئی حق نہیں تھا، نہ تو تو نے یہ کہنے کا مجھے مجاز کیا تھا، نہ دنیا کی خلق و تدبیر میں میری کوئی حصہ داری تھی کہ میں اس کا مدعی بنتا۔ مقصود اس سوال و جواب سے یہ ہوگا کہ نصاریٰ جنھوں نے حضرت مسیح اور ان کی والدہ کو خدا کا شریک بنایا، بھرے مجمع میں پوری طرح رسوا ہوں۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ کے ٹکڑے پر آل عمران کی تفسیر میں ہم گفتگو کر چکے ہیں کہ یہ دراصل مسیحی تعبیر ہے سیدنا مسیح کے ارشاد 'میرا باپ اور تمہارا باپ' کی۔ اس کو وہاں دیکھیے۔

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ، 'شہید' یہاں نگران کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں جب تک ان میں موجود رہا، اس وقت تک تو میں دیکھتا رہا کہ وہ کیا بنا رہے ہیں لیکن جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو مجھے کچھ پتہ نہیں کہ انھوں نے کیا بنایا اور کیا بگاڑا ——— اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ مَاذَآ اُجِبْتُمْ کے سوال کا یہی پہلو ہے جس کی بنا پر انبیاء علیہم السلام اپنی لاعلمی کا اظہار فرمائیں گے۔

نصاریٰ کی شفاعت سے سیدنا مسیح کی براءت

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ الاية سیدنا مسیح کے اس فقرے کی بلاغت کی تعبیر نہیں ہو سکتی۔ بظاہر دل چاہتا ہے کہ فقرہ یوں ہوتا اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ لیکن اگر یوں ہوتا تو یہ نہایت واضح الفاظ میں نصاریٰ کے لیے شفاعت بن جاتا اور انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ مشرکین کے لیے سفارش نہیں فرمائیں گے۔ اس وجہ سے سیدنا مسیح بات ایسے اسلوب میں فرمائیں گے کہ بات سچی بھی ہو، دربار الٰہی کے شایان شان بھی ہو، دردمندانہ بھی ہو اور ان پر اس سے مشرکین و محرفین دین کی سفارش کی کوئی ذمہ داری بھی عائد نہ ہو۔ چنانچہ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ کے الفاظ پر غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ اس فقرے میں وہ تمام خوبیاں بھی موجود ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا اور ساتھ ہی یہ پہلو بھی موجود ہے کہ سیدنا مسیح اپنے آپ کو ان کی شفاعت کی ذمہ داری سے بری کر لیں گے۔

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝
(۱۱۹-۱۲۰)

صدقہ کے لفظ پر ہم آل عمران آیت ۱۷ کی تفسیر میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں ضمناً متعین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے اپنے قول و قرار اور عہد و میثاق میں پورے راست باز ثابت ہوئے، انہوں نے اس میں کوئی تبدیلی اور تحریف نہیں کی، زندگی کے تمام نشیب و فراز میں حرم و جرم کے ساتھ اللہ کی شریعت پر قائم رہے۔ من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ (اور اہل ایمان میں وہ مردان کار بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے باندھے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا)۔

راست بازوں کی کامرانی کا دن

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آج کا دن تو راست بازوں کی فتح مندیوں اور کامرانیوں کے ظہور کا دن ہے۔ بدعہدوں، خائنوں اور جعلی اصطلاحوں میں زندگی گزارنے والوں کے لیے آج حسرت و نامرادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جنھوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد اخلاص و سچائی کے ساتھ پورے کیے ہیں ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یعنی ان کے رب نے جو کچھ ان سے چاہا انھوں نے اس کی رضا کے مطابق وہ پورا کر دکھایا اور انھوں نے اپنے رب سے جو امیدیں کیں ان کی توقعات اور ان کے تصورات سے ہزاروں لاکھوں درجہ اوپر وہ پوری ہو گئیں۔ فرمایا کہ اصلی بڑی کامیابی یہی ہے۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے سب کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ اس سورہ کی تفسیر کی آخری سطریں ہیں جو سپرد قرطاس ہوئیں۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

لاھور

۲۰ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ

۱۱ر دسمبر ۱۹۷۰ء

فہرست مضامین

فہرست مضامین

تفسیر سورۃ آل عمران-۳

تفسیر سورۃ المآئدۃ - ۵

خطاطی ــــــ عبدالغفور کیلانی

افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

الانعام ٦ — التوبة ٩

تدبرِ قرآن

جلد سوم

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبّرِ قرآن

جلد سوم

تفاسیر

سورۂ انعام (۶) ـــــ تا ـــــ سورۂ توبہ (۹)

امین احسن اصلاحی

فاران فاؤنڈیشن

لاہور ـــــ پاکستان

اہتمام — حسن خاور

مطبع — کیو۔ وائی پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت — نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ — فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

تدبرِ قرآن

٦

الانعام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورتوں کے دوسرے گروپ پر ایک اجمالی نظر

سورۂ مائدہ پر، جیسا کہ ہم مقدمے میں واضح کر چکے ہیں، سورتوں کا پہلا گروپ تمام ہوا۔ اب یہ انعام سے دوسرا گروپ شروع ہو رہا ہے۔ اس میں چار سورتیں ہیں۔ انعام، اعراف، انفال، برأت۔ انعام اور اعراف کی ہیں، انفال اور برأت مدنی۔ انعام و اعراف دونوں میں خطاب اہلِ مکہ سے ہے۔ انعام میں توحید، معاد اور رسالت کے بنیادی مسائل زیرِ بحث آئے ہیں اور اصل دینِ ابراہیم کی وضاحت کی گئی ہے۔ بنائے استدلال تمام تر عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے شواہد پر ہے یا پھر ان مسلمات پر جن کو اہلِ عرب تسلیم بھی کرتے تھے اور جو صحیح بھی تھے۔

اعراف میں انذار کا پہلو غالب ہے۔ اس میں قریش پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ کسی قوم کے اندر ایک رسول کی بعثت کے مقتضیات و تضمنات کیا ہوتے ہیں، اس باب میں اللہ تعالیٰ کے قاعدے اور ضابطے کیا ہیں، اگر کوئی قوم اپنے رسول کی تکذیب پر جم جاتی ہے تو اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں، اس معاملے میں تاریخ کی شہادت کیا ہے اور اگر وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی اس روش سے باز نہ آئے تو اسے اپنے لیے کس روزِ بد کا انتظار کرنا چاہیے۔

انفال میں مسلمانوں کو اپنی کمزوریاں دُور کر کے اللہ اور رسول کی اطاعت پر مجتمع ہونے اور کفارِ قریش سے جہاد پر اُبھارا ہے۔ قریش کے متعلق صاف صاف یہ اعلان فرمایا ہے کہ ان کو بیت اللہ پر قابض رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس وراثتِ ابراہیمی کے حق دار مسلمان ہیں نہ کہ قریش۔ مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ تم ان سے مرعوب نہ ہو، اب ان کے لیے ذلت اور عذاب کا وقت آچکا ہے۔ اگر یہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو منہ کی کھائیں گے اور دنیا و آخرت دونوں میں کوئی بھی ان کو پناہ دینے والا نہیں ہوگا۔

سورۂ برأت میں کھلم کھلا قریش کو الٹی میٹم ہے۔ ان کے لیے صرف دو راہیں کھلی چھوڑی گئی ہیں۔ اسلام یا تلوار۔ مسلمانوں کو ان سے ہر قسم کے روابط قطع کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جو مسلمان رشتہ و قرابت کی بنا پر ان سے درپردہ تعلق رکھتے تھے ان کو سخت سرزنش کی گئی ہے اور ان کے سامنے بھی واضح طور پر دو شکلیں رکھ دی گئی ہیں، یا تو اپنے آپ کو نفاق کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے سچے اور پکے مسلمان بن جائیں یا پھر اسی انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار ہو جائیں جو اللہ و رسول کے ان دشمنوں کا ہونے والا ہے۔

اس روشنی میں اگر تدبر کے ساتھ آپ اس گروپ کی تلاوت کریں گے تو معلوم ہو گا کہ ان چاروں سورتوں میں نہایت گہری حکیمانہ ترتیب ہے۔ انعام میں قریش پر اتمام حجت ہے، اعراف میں ان کو انذار ہے، انفال میں مسلمانوں کو جہاد کی تیاری کی ہدایت اور بیت اللہ کی تولیت سے قریش کی معزولی کا فیصلہ ہے۔ برائت میں قریش کو الٹی میٹم اور منافقین کو آخری تہدید ہے۔

پہلے گروپ میں اصل بحث اہل کتاب سے تھی، قریش سے اگر کہیں خطاب ہوا تھا تو ضمناً۔ برعکس اس کے اس گروپ میں اصل خطاب قریش سے ہے۔ اہل کتاب کا اس میں ذکر آیا ہے تو ضمناً۔ مواد استدلال میں بھی مخاطب کے اختلاف کے لحاظ سے بنیادی فرق ہے۔ اس گروپ میں بیشتر استدلال عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے شواہد سے ہے اور پہلے گروپ میں اہل کتاب کے تعلق سے وہ ساری چیزیں استدلال کے طور پر استعمال ہوئی ہیں جن کو اہل کتاب مانتے تھے۔ پہلے گروپ میں اہل کتاب کو امامت کے منصب سے معزول کیا گیا ہے اور ان کی جگہ مسلمانوں کو دی گئی ہے۔ اس گروپ میں قریش کو بیت اللہ کی تولیت سے معزول کیا گیا ہے اور اس کی خدمت امت مسلمہ کے سپرد کی گئی ہے۔

یہ پورے گروپ پر ایک اجمالی تبصرہ ہوا۔ اب ہم اس کی ایک ایک سورہ کو الگ الگ لے کر اس کی تفسیر کریں گے۔ گروپ کی پہلی سورہ انعام ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر اس کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وبیدہ اللہ التوفیق۔

ب - سورہ کا عمود

سورۂ انعام میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مخاطب قریش ہیں۔ ان کے سامنے توحید، معاد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے دلائل واضح کرتے ہوئے ان کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ ہے کہ اگر انھوں نے یہ دعوت قبول نہ کی تو اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے ان کو تیار رہنا چاہیے جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کو دوچار ہونا پڑا۔ اہل عرب چونکہ حضرت ابراہیم کی اولاد تھے اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ جس مذہب پر وہ ہیں یہ ان کو حضرت ابراہیم ہی سے وراثت میں ملا ہے اس وجہ سے اس سورہ میں اس حجت کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی تاکہ قریش پر یہ واضح ہو جائے کہ اصل ملت ابراہیم کیا ہے اور اس کے حقیقی پیرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ ہیں یا قریش —— سورہ کے اس عمود کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ایک اجمالی نظر سورہ کے مطالب پر ڈال لیجیے۔

ج - سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۵) توحید اور معاد کے بعض واضح دلائل کی طرف اشارہ۔ بالکل بدیہی حقائق سے اعراض پر اظہار تعجب۔ قرآن کی تکذیب ایک امر حق کی تکذیب ہے جس کا خمیازہ یہ بھگتیں گے۔ قرآن انھیں جن نتائج کی خبر دے رہا ہے وہ سب پیش آکے رہیں گے۔

(۶-۷) رسولوں کی تکذیب کرنے والے عذاب الٰہی میں پکڑے گئے۔ عرب کی پچھلی تاریخ کی طرف اشارہ۔

(۸-۱۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان جھٹلانے والوں کو قائل نہیں کر سکتا۔ جو معجزہ یہ مانگتے ہیں وہ بھی ان کو دکھا دو گے جب بھی یہ اپنے انکار سے باز نہیں آئیں گے۔ تم سے پہلے جو رسول آئے اس

قماش کے لوگوں نے ان کا بھی مذاق اڑایا بالآخر وہ اس عذاب میں مبتلا ہو کے رہے جس کا انھوں نے مذاق اڑایا۔ ان کو ان کے ملک کی تاریخ کی طرف توجہ دلاؤ۔

(۱۲-۱۳) آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کی ملکیت ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ جزا اور سزا کا دن لائے۔

(۱۴-۱۸) شرک سے اظہار برأت۔ خیر و شر سب خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ علیم و خبیر ہے۔

(۱۹-۲۴) توحید اور شرک کے باب میں فیصلہ کن شہادت اللہ کی ہے اور اللہ کی شہادت توحید کے حق میں ہے۔ یہ قرآن اسی شہادت کے ساتھ اترا ہے۔ پچھلے اہل کتاب بھی اس سے آشنا ہیں، صرف بدبخت ہی ہیں جو اس پر ایمان لانے سے محروم رہیں گے۔ جو لوگ شرک کے مدعی ہیں وہ خدا پر جھوٹ افترا کر رہے ہیں۔ ایسے ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔ قیامت کے دن جب ان سے سوال ہوگا کہ تمھارے شرکاء کہاں ہیں تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے۔

(۲۵-۳۲) یہ لوگ اگر سنتے بھی ہیں تو سمجھنے اور ماننے کے لیے نہیں بلکہ کٹ حجتی کے لیے سنتے ہیں، قرآن ان کو پچھلے مکذبین کی جو سرگزشتیں سناتا ہے ان سے سبق حاصل کرنے کے بجائے یہ ان کو اگلوں کا فسانہ کہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں تو اسی وقت کھلیں گی جب یہ دوزخ کے کنارے کھڑے ہوں گے۔ اس وقت یہ اپنی بدبختی پر ماتم اور حسرت کریں گے کہ کاش پھر دنیا میں جانا ہوتا کہ ایمان لاتے۔ آج ان کے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے جس دن یہ اپنے رب کے حضور پیش کیے جائیں گے اس دن حسرت سے کہیں گے ہائے ہماری بدبختی ہم نے اپنی زندگی کس طرح برباد کی۔

(۳۳-۳۹) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ نشانیٔ عذاب کا مطالبہ پورا نہ کیے جانے پر یہ جو تمھارا مذاق اڑا رہے ہیں، یہ چیز تمھارے لیے غم کا باعث نہ بنے۔ یہ تمھارا مذاق نہیں بلکہ خدا کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس معاملے کو خدا پر چھوڑ دو۔ تم سے پہلے جو انبیاء گزرے ہیں ان کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا تو انھوں نے صبر کیا۔ اس کے بعد اللہ کی نصرت ظاہر ہوئی۔ یہی سنت اللہ ہے اور سنت اللہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تمھیں اس معاملے میں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ایمان تو وہی لائیں گے جن کے اندر کچھ صلاحیت ہے، جن کے دل بالکل مردہ ہو چکے ہیں وہ بڑی سے بڑی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ خدا کے آسمان و زمین نشانیوں سے بھرے پڑے ہیں لیکن جو اندھے ہو چکے ہیں ان کو ان نشانیوں سے کیا فائدہ؟

(۴۰-۵۰) یہ عذاب کی نشانی مانگتے ہیں، ان سے پوچھو کہ اگر خدا کا عذاب آیا تو اس سے بچاؤ کا کیا سامان انھوں نے کر رکھا ہے؟ پچھلی قوموں کا حوالہ کہ انھوں نے بھی اپنے رسولوں سے نشانیاں مانگیں تو اللہ نے ان کو مختلف مصیبتوں میں مبتلا کیا لیکن خدا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے ان کے دل اور سخت ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے ان کی جڑ ہی کاٹ دی۔ پیغمبر کی طرف سے یہ اظہار و اعلان کہ میں خدا کے خزانوں کا مالک اور غیب کا عالم ہونے کا مدعی نہیں ہوں میں تو بس وحی الٰہی کا پیرو ہوں۔

(۵۱-۵۵) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ جن کے اندر خدا اور آخرت کا خوف موجود ہے وہی اس قرآن

سے فائدہ اٹھائیں گے۔ سو ان کو اس کے ذریعہ سے جگاؤ۔ رہے وہ جو معجزات کے طالب ہیں تو ان کو نظر انداز کرو۔ جو غریب لوگ اللہ کی خوشنودی کے طالب اور تمہاری باتوں کے سننے والے ہیں ان کو ان متکبرین کے مطالبہ پر اپنے سے دور نہ کرو۔ اگر یہ متکبرین اس وجہ سے تمہارے پاس نہیں آتے کہ تمہاری مجلس میں غربا ہوتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ تم ان کے ایمان و اسلام کے ذمہ دار نہیں ہو۔ ان کے لیے غریبوں کی غریبی اور ان کی اپنی امیری فتنہ بن گئی ہے۔ تم ان غربائے مسلمین کا برملا خیر مقدم کرو اور ان کو بشارت دو۔

(۵۶-۶۷) شرک سے اعلانِ بیزاری کی ہدایت اس لیے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں۔ پیغمبر ایک واضح شہادت اپنے پاس رکھتا ہے اور یہ مکذبین اس شہادت کو جھٹلاتے ہیں اور نشانی عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عذاب کا لانا پیغمبر کے اختیار میں نہیں، خدا کے اختیار میں ہے۔ ہر جان خدا کی مٹھی میں ہے۔ اللہ جب چاہے اور جہاں سے چاہے عذاب بھیج سکتا ہے۔ ہر بات کا ایک وقت مقرر ہے۔ یہ جھٹلانے والے عنقریب جان لیں گے۔

(۶۸-۷۰) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ جب دیکھو کہ ان مکذبین کو اعتراض و مخالفت کا بخار چڑھ گیا ہے تو ان سے بحث میں نہ الجھو، بلکہ کنارہ کش ہو جاؤ۔ تمہارا کام تذکیر و موعظت ہے جب دیکھو کہ وہ سننا نہیں چاہتے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ خود بھگتیں گے۔ تم ان کے ایمان و اسلام کے ذمہ دار نہیں ہو۔

(۷۱-۷۳) ان سے کہہ دو کہ حق واضح ہو جانے اور اللہ کی ہدایت آ جانے کے بعد کیا ہماری مت ماری ہوئی ہے کہ ہم صحرا میں گم کردہ راہ قافلے کی طرح بھٹکتے پھریں؟ ہم تو اب اسی راہ پر چلیں گے جو خدا نے ہمارے لیے کھولی ہے۔

(۷۴-۸۳) توحید کے ثبوت میں حضرت ابراہیمؑ نے جو دلیل اپنی قوم پر قائم کی اس کا بیان۔

(۸۴-۹۰) حضرت ابراہیمؑ سے پہلے اور ان کے بعد ان کی ذریت میں جو انبیاء و رسل اس دینِ توحید کے حامل اٹھے ان کی طرف ایک سرسری اشارہ اور اس بات کی تاکید کہ اصل ہدایت کی راہ یہی ہے جو ان پیغمبروں نے بتائی ہے تو اس پر مضبوطی سے استوار رہو۔ اگر کفار قریش اس کا انکار کرنا چاہتے ہیں تو ان کی پروا نہ کرو۔ اللہ دوسروں کو اس کی تائید و حمایت میں کھڑا کر دے گا۔

(۹۱-۹۲) یہود کا اٹھایا ہوا ایک اعتراض اور اس کا جواب۔

(۹۳-۹۴) ان بدد ماغوں کی تردید جو دعویٰ کرتے تھے کہ اگر وہ چاہیں تو وہ بھی اسی طرح کا کلام پیش کر سکتے ہیں جس قسم کا کلام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کی طرف منسوب کر کے پیش کرتے ہیں، انھیں بھی وحی کا تجربہ ہوتا ہے۔

(۹۵-۹۹) توحید کے آفاقی دلائل۔

(۱۰۰-۱۰۵) شرک کی تردید اور تنبیہ کہ ہدایت تمہارے پاس آ گئی، اب جو گمراہی اختیار کرے گا تو ذمہ داری خود اس پر ہے۔

(۱۰۶-۱۰۸) پیغمبر کو مضبوطی سے وحی الٰہی کے اتباع پر جمے رہنے اور مشرکین سے اعراض کی ہدایت اور مسلمانوں کو یہ نصیحت کہ مشرکین کے بتوں اور معبودوں کی بے ضرورت تحقیر و تذلیل نہ کی جائے کہ وہ مشتعل ہو کر تمہارے خدا کو برا بھلا کہنے لگیں۔

(۱۰۹-۱۱۱) کفار کی اس قسم کی تردید کہ اگر ان کی طلب کے مطابق ان کو معجزہ دکھا دیا جائے تو وہ ضرور ایمان لائیں گے۔

فرمایا کہ اگر ان کو دنیا جہان کے معجزے دکھا دیے جائیں جب بھی جو ایمان لانے والے نہیں ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

(۱۱۲-۱۱۷) اس سنت اللہ کا بیان کہ جب نبی کی دعوت بلند ہوتی ہے تو شیاطین جن و انس کو بھی یہ مہلت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے باطل کو ملمع کر کے لوگوں کے سامنے پیش کریں تاکہ جن کو ان کی راہ اختیار کرنی ہے وہ ان کی راہ اختیار کریں پیغمبر کو یہ ہدایت کہ تم ان الجھنے والوں کو بتا دو کہ جب میرے پاس خدا کی کتاب آچکی ہے تو میں اس کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں۔

(۱۱۸-۱۲۳) مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ تم ورغلانے والوں کی باتوں سے ہوشیار رہو۔ انھوں نے اپنے مشرکانہ عقاید کے تحت جو چیزیں حرام کر رکھی ہیں ان کے باب میں تم ان کی بدعات کی پروا نہ کرو بلکہ وہ چیزیں کھاؤ جن کی حرمت کی کوئی دلیل نہ ملت ابراہیم میں موجود ہے نہ قرآن نے ان کے حرام ہونے کی خبر دی ہے۔ اب خدا نے تمھیں تاریکی سے روشنی میں لا کھڑا کیا ہے تو تم ان لوگوں کی بدعات اور کج بحثیوں کی پروا نہ کرو جو کفر و شرک کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

(۱۲۴-۱۲۷) ان مغروروں کی تردید جو قرآن پر ایمان لانے کی شرط یہ ٹھہراتے تھے کہ جب تک ان پر بھی اسی طرح وحی نہ آئے جس طرح پیغمبر پر آتی ہے اس وقت تک وہ اس پر ایمان نہ لائیں گے۔ فرمایا کہ نبوت کے مرتبۂ بلند کا سزاوار ہر شخص نہیں ہوتا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون اس کا اہل ہے، کون نہیں۔ جو لوگ کبر نفس میں مبتلا ہو کر دنیا اور آخرت دونوں کی سرفرازیوں کا اجارہ دار صرف اپنے کو سمجھتے ہیں وہ اپنے اس غرور کی سزا پائیں گے۔ رہا ایمان لانے اور نہ لانے کا معاملہ تو یہ اللہ کی توفیق پر منحصر ہے اور اس توفیق کے لیے ایک مخصوص سنت الٰہی ہے۔

(۱۲۸-۱۳۵) آخرت میں جنوں اور انسانوں کے گمراہ لوگ اعتراف کریں گے کہ وہ اتمام حجت کے باوجود محض اپنی شامت اعمال سے اس انجام کو پہنچے۔ قریش کو دھمکی کہ سنبھلنا چاہتے ہو تو اب بھی سنبھل جاؤ ورنہ جس عذاب کی دھمکی تمھیں سنائی جا رہی ہے وہ آکے رہے گا اور کوئی اس سے بچ نہ سکے گا۔

(۱۳۶-۱۴۴) مشرکین نے اپنے مشرکانہ عقائد کے تحت کھیتی اور چوپایوں میں سے جن چیزوں کو حرام ٹھہرا لیا تھا یا اپنے دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے انسانی جانوں کی جو قربانیاں پیش کرتے تھے ان کی تردید و مذمت کہ یہ سب باتیں بے سروپا اوہام پر مبنی ہیں، عقل، فطرت اور ملت ابراہیمؑ میں ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔

(۱۴۵-۱۵۴) ملت ابراہیم اور ملت موسیٰ میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئیں ان کی طرف ایک اشارہ۔ مشرکین کے اس عذر کی تردید کہ وہ جس راستہ پر ہیں، خدا ہی کے چلانے سے اس پر ہیں۔ اگر اللہ کو یہ راستہ پسند نہیں ہے تو وہ ان کو صحیح راستہ پر کیوں نہیں چلا دیتا۔

(۱۵۵-۱۶۵) اس قرآن کے ذریعہ سے جو اتمام حجت ہوا ہے اس کا بیان۔ اب اس کے بعد بھی اگر لوگ کسی نشانی کے ظہور کے منتظر ہیں تو وہ انتظار کریں، اس قسم کی نشانی دکھانا پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہے۔ پیغمبر کی طرف سے یہ اعلان کہ خدا نے مجھے ملت ابراہیم کی ہدایت بخشی ہے اور میں اس پر چل کھڑا ہوا ہوں۔ اب جس کا جی چاہے اس صراط مستقیم پر آئے اور جس کا جی چاہے بھٹکتا پھرے۔ اللہ کے ہاں ہر ایک اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ (٦)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ١٦٥

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

آیات ١ - ١١ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ
وَالنُّوْرَ ۥ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿١﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ
مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ۭ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ
تَمْتَرُوْنَ ﴿٢﴾ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ
وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ﴿٣﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ
مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿٤﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْا
بِالْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۭ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰۗؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ
يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٥﴾ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ
فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَاۗءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۠
وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ
اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿٦﴾ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا
فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا

سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝٧ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا
مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝٨ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ
رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝٩ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ
مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝١٠ ع ۱
قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝١١

ترجمۂ آیات ۱-۱۱

شکر کا سزاوار اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا تاریکیوں اور روشنی کو، پھر تعجب ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ہم سر ٹھہراتے ہیں۔ وہی ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک مدت ٹھہرائی اور مدت مقررہ اسی کے علم میں ہے، پھر تعجب ہے کہ تم کج بحثیاں کرتے ہو! اور وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور وہی زمین میں بھی۔ وہ تمھارے خفیہ اور علانیہ کو جانتا ہے اور جو کمائی تم کر رہے ہو اسے بھی جانتا ہے۔ اور نہیں آتی ان کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی مگر یہ اس سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔ سو انھوں نے واضح حق کو بھی جھٹلا دیا جب کہ وہ ان کے پاس آیا تو عنقریب اس چیز کی خبریں ان کے پاس آئیں گی جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے ہیں۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا جن کو ہم نے ملک میں وہ قوت و سطوت دے رکھی تھی جو تم کو نہیں دی اور ہم نے ان پر خوب مینہ برسائے اور نہریں جاری کیں جو ان کے نیچے بہتی تھیں، پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں۔ ۱-۶

اور اگر ہم تم پر کوئی ایسی کتاب اتارتے جو کاغذ میں لکھی ہوئی ہوتی اور یہ اس کو اپنے

ہاتھوں سے چھو بھی لیتے جب بھی یہ کفر کرنے والے یہی کہتے کہ یہ تو بس ایک کھلا ہوا جادو ہے اور یہ کہتے ہیں کہ اس پر علانیہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں اترتا اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو بس معاملے کا فیصلہ ہی ہو جاتا۔ پھر ان کو ذرا مہلت نہ ملتی۔ اور اگر ہم اس کو کوئی فرشتہ بناتے جب بھی آدمی ہی کی شکل میں بناتے تو جو گھپلا وہ پیدا کر رہے ہیں ہم اسی میں ان کو ڈال دیتے اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو جن لوگوں نے ان میں سے مذاق اڑایا ان کو اس چیز نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ کہو، ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔ ۷ - ۱۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ (۱)

توحید کی دلیل عرب کے مسلمات سے

لفظ حمد کی تحقیق تفسیر سورۂ فاتحہ میں گزر چکی ہے اور یہ بات بھی اس کتاب میں بار بار بیان ہو چکی ہے کہ مشرکینِ عرب آسمان و زمین اور نور و ظلمت سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ یہاں قرآن نے ان کے اسی مسلمہ پر توحید کی دلیل قائم کی ہے کہ جب یہ تسلیم ہے کہ آسمانوں اور زمین اور نور و ظلمت کا خالق اللہ ہی ہے تو پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یہ کفار دوسروں کو خدا کا ہمسر اور شریک ٹھہراتے ہیں۔ ثُمَّ اظہارِ تعجب کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں اور آگے والی آیت میں بھی، اظہارِ تعجب ہی کے مفہوم میں ہے۔ شرک پر اظہارِ تعجب کا ایک پہلو تو یہی ہے کہ جب ساری چیزوں کا خالق خدا ہی ہے تو پھر شرک کی گنجائش کہاں سے نکلی؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کائنات کی چیزوں میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے مثلاً زمین اور آسمان، روشنی اور تاریکی، سردی اور گرمی، تو اس تضاد کے اندر اس کائنات کے مجموعی مقصد کے لیے ایسی حیرت انگیز سازگاری بھی ہے کہ کوئی عاقل تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کے خالق و مالک الگ الگ ہیں۔ بلکہ ہر صاحبِ نظر یہ ماننے پر مجبور ہے کہ پوری کائنات ایک ہی کارفرما کے ارادے اور مشیت کے تحت حرکت کر رہی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝ وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ (۲-۳)

"خَلَقَكُم مِّن طِينٍ" سے مقصود انسان کی ابتدائی خلقت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ فرمایا وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ ۔السجدہ ۷ (اور انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا) تمام ارضی مخلوقات کی زندگی کا آغاز مٹی ہی سے ہوا ہے ۔ اس مضمون کو قرآن نے بار بار مختلف شکلوں سے بیان کیا ہے اور اس سے عام طور پر دو حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی ہے ، ایک تو انسان کی بے حقیقتی کی طرف کہ مٹی سے پیدا ہونے والی مخلوق کو اپنی ہستی پر زیادہ مغرور نہیں ہونا چاہیے ، دوسرے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کیے جانے پر کہ جب انسان کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا اور اس پیدا کرنے میں اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تو اب دوبارہ اس کے پیدا کرنے سے وہ کیوں عاجز رہے گا۔ یہاں اسی دوسری حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اس کا ذکر ہوا ہے ۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وَإِن تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۔ ۵۔الرعد (اور اگر تم تعجب کرنا چاہو تو نہایت ہی عجیب ہے ان کی یہ بات کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا دوبارہ نئی خلقت میں آئیں گے !) كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ ۱۰۴۔ انبیاء (جس طرح ہم نے پہلی بار مٹی سے بنایا اسی طرح مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ اس کو پیدا کر دیں گے، یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے، یہ ہم کر کے رہیں گے) وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۔ ۲۷۔ روم (اور وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ اس کے لیے سہل ہے)

اجل کے مختلف مفہوم

ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا ، اجل کے معنی مدت مقررہ کے ہیں۔ اجل یا أَجَلٌ مُّسَمًّى کا لفظ فرد یا اقوام کے تعلق سے مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ ایک تو اس مدت حیات کے لیے جو ہر فرد کو تقدیر کی طرف سے ملی ہے؛ دوسرے اس روز بعث کے لیے استعمال ہوا ہے جو خلق کے اٹھائے جانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے ، تیسرے اس مقررہ پیمانہ کے لیے استعمال ہوا ہے جو کسی قوم کی ہلاکت کے لیے مقرر ہے ۔ پہلے معنی کے لیے نظیر آیت زیر بحث میں بھی ہے اور اسی سورہ کی آیت ۶۰ میں بھی ۔ فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۶۰ (اور وہی خدا ہے جو تمہیں وفات دیتا ہے شب میں اور وہ جانتا ہوتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہوتا ہے ، پھر وہ تم کو دوسرے دن میں اٹھاتا ہے تاکہ تمہاری مقررہ مدت پوری کی جائے ، پھر اسی کی طرف تمہارا لوٹنا ہوگا ، پھر وہ تم کو آگاہ کرے گا ان سارے کاموں سے جو تم کرتے رہے ہو) دوسرے معنی کے لیے نظیر آیت زیر بحث میں ہے ۔ اس میں اجل کا ذکر دو مرتبہ ہے ۔ ایک اجل تو ظاہر ہے کہ وہی ہے جو ہر فرد کی مدت حیات کے طور پر مقرر ہے ، دوسری اجل جس کے ساتھ مُّسَمًّى کی صفت لگی ہوئی ہے قرینہ دلیل ہے کہ اس سے وہ مدت مقررہ مراد ہے جو خلق کے اٹھائے جانے کے لیے مقرر ہے ۔ تیسرے معنی کے لیے نظیر آیت لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۳۴۔ اعراف ، اور اس مضمون کی دوسری آیات میں ہے ۔ اس اجل سے ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ، وہ مقررہ پیمانہ مراد ہے جو کسی قوم کے

اخلاقی زوال کی اس آخری حد کی خبر دیتا ہے جب قانونِ الٰہی اس کو تباہ کر دیتا ہے ۔ یہ پیمانہ افراد کی مدتِ حیات کی طرح نہیں ہے کہ کوئی نیک ہو یا بد جو مدتِ حیات اس کے لیے مقرر ہے اس کے ختم ہو جانے پر وہ لازماً مرجاتا ہے بلکہ یہ اخلاقی قوانین کے تابع ہے ، جب تک کوئی قوم اپنے ایمان و کردار کو محفوظ رکھے گی خدا اس کو قائم رکھے گا ، یہاں تک کہ وہ اجل مسمّیٰ آجائے جو اس پوری کائنات کے لیے خدا کی طرف سے مقرر ہے۔ اس پیمانہ کے اخلاقی ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک قوم کا پیمانہ لبریز ہونے کی آخری حد پر پہنچ رہا ہو اور اس کی اجل مسمّیٰ آئی کھڑی ہو لیکن سوئی کے آخری نقطہ پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ قوم توبہ اور اصلاح کے ذریعہ سے اپنے زندہ رہنے کا حق پھر بحال کر لے ۔ یہاں ہم اشارے پر کفایت کرتے ہیں ــــ انشاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں اس نکتہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے ۔

'امتراء'، 'مری' سے ہے جس کے معنی ہیں تھنے ، مسلنے ، نچوڑنے کے ہیں' امتری اللبن' کے معنی ہوں گے اس نے تھن سے دودھ نچوڑا ۔ یہیں سے یہ لفظ اس بحث و جدال کے لیے استعمال ہوا جس میں کوئی کٹ حجتی کرنے والا مناظر اس بات میں سے بھی شک و اعتراض کا کوئی پہلو نکال ہی لے جس میں اعتراض و بحث کی کوئی گنجائش نہ ہو ۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہی خدا ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تمھیں بھی انکار نہیں ۔ پھر ہر ایک کے لیے اس نے زندگی کی ایک مدت ٹھہرا دی ۔ یہ نہیں ہے کہ جو پیدا ہوتا ہو وہ غیر فانی ہو کر پیدا ہوتا ہو ، پھر اس میں کیا شک کی گنجائش ہے کہ جس خدا نے تمھیں مٹی سے بنایا وہ تمھیں دوبارہ اسی مٹی سے اٹھا کھڑا کرے گا ۔ اس کے لیے اس نے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے جس کا علم صرف اسی کو ہے ۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جس میں کسی بحث و جدال کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن تم ہر بات میں کٹ حجتی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتے ہو ۔

'وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ' الایۃ یعنی زمین و آسمان میں الگ الگ الٰہ نہیں ہیں بلکہ وہی اللہ آسمان و زمین دونوں کا مالک ہے اور دونوں میں اسی کا حکم چل رہا ہے ۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۸۴ ۔ زخرف (وہی ہے جو آسمان کا بھی معبود ہے اور وہی زمین کا بھی معبود ہے اور وہ علیم و حکیم ہے) آسمان و زمین دونوں کا قیام و بقا ہی اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ ان دونوں کے اندر ایک ہی خدا کا ارادہ کارفرما ہے ۔ اگر ان کے اندر الگ الگ ارادے کارفرما ہوتے تو جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے 'دونوں درہم برہم ہو جاتے' ۔ یہ مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ آسمان و زمین کا خالق تو خدا ہی ہے لیکن چونکہ زمین اس کی مملکت کا دور دراز حصہ ہے اس وجہ سے اس نے اس کا انتظام و انصرام اپنے دوسرے کارندوں کے سپرد کر رکھا ہے ۔ فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے ۔ آسمان و زمین سب براہِ راست اسی کے کنٹرول میں ہیں اور اس کا علم تمھارے ظاہر و باطن اور تمھارے قول و فعل ہر چیز پر محیط ہے اس وجہ سے اس کو اپنی اس

مملکت میں کسی مددگار کی احتیاج بھی نہیں ہے۔

توحید اور معاد کا باہمی تعلق

توحید کا یہ مضمون اوپر قیامت والے مضمون کی تاکید ہے۔ یہ حقیقت قرآن میں بار بار واضح کی گئی ہے کہ قیامت کا ماننا اس لیے ضروری ہے کہ قیامت کو مانے بغیر یہ سارا کارخانہ ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتا ہے اور یہی بات اس صورت میں بھی لازم آتی ہے جب قیامت کے ساتھ شرک اور شفاعت باطل کی گنجائش تسلیم کرلی جائے۔ اس لیے کہ جب شرکا اپنے پرستاروں کو بہر صورت بخشوا لیں گے، جیسا کہ مشرکین کا دعویٰ ہے، خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں تو پھر قیامت کا آنا نہ آنا دونوں یکساں ہی رہا۔

تکذیب حق کا انجام اور تاریخ کی شہادت

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۴-۵) یعنی توحید اور قیامت کی ان باتوں کی تکذیب کی کوئی گنجائش تو نہیں ہے لیکن یہ لوگ اللہ کی آیات سے اعراض کر رہے ہیں اور اس طرح انھوں نے اس حق کو جھٹلایا ہے جو اللہ کی طرف سے ان کے پاس آیا ہے، تو عنقریب اس چیز کی خبریں ان کے پاس آئیں گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہاں 'حق' سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن پیغمبر کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب سے ڈرا رہا تھا لوگ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ فرمایا کہ جس عذاب کا مذاق اڑا رہے ہیں اس کے آثار کے ظہور میں زیادہ دیر نہیں ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ (۶)

یہ تاریخ کی شہادت پیش کی گئی ہے اوپر والے دعوے پر۔ مطلب یہ ہے کہ قریش کو یہ غرہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کو بڑی قوت و شوکت حاصل ہے، ان کو ہلایا نہیں جا سکتا۔ ان سے پہلے کتنی قومیں گزری ہیں جن کو ان سے زیادہ اقتدار حاصل ہوا، ان کو رزق و فضل میں سے بھی ان سے کہیں زیادہ حصہ ملا لیکن جب انھوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو خدا نے ان کو ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ان کی جگہ دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں۔ یہاں تاریخ کا یہ حوالہ اجمال کے ساتھ آیا ہے۔ اس کی پوری تفصیل اعراف میں آئے گی جو اس سورہ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'سماء' کا لفظ بادلوں کے لیے بھی آتا ہے۔ 'مِدْرَارًا' کے اندر مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے اور بارش کی کثرت رزق و فضل کی کثرت کی تعبیر ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ ہود آیت ۵۲ اور سورہ نوح آیت ۱۱۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝ وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنْزَلْنَا مَلَكًا لَقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا

لَجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ (۷-۹)

نمونے بدرا بہانہ بسیار

اوپر آیت ۴ میں قرآن سے ان کے اعراض کا جو ذکر فرمایا تو یہ ان کے ان مطالبات و اعتراضات کا جواب بھی دے دیا جو وہ اس اعراض کے لیے بطور بہانہ کے پیش کرتے تھے۔ مقصود اس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ یہ نہ خیال کرو کہ ان کے اعراض کے لیے فی الواقع کوئی عذر ہے، جو دور ہو جائے تو یہ قرآن کو مان لیں گے۔ نہیں بات وہیں رہے گی جہاں اب ہے۔ یہ کوئی نہ کوئی نیا بہانہ تراش لیں گے اس لیے کہ نہ ماننے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھیں معجزے نہیں دکھائے گئے بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کے خلاف کوئی بات ماننے کے لیے یہ تیار نہیں ہیں۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ الاٰية۔ یہ اس مطالبے کا جواب ہے جو اہل کتاب کی زبانی سورۂ نساء آیت ۱۵۳ میں نقل ہوا ہے۔ وہاں اس کا وہ جواب دیا ہے جو اہل کتاب کے لیے موزوں تھا۔ یہاں فرمایا کہ ان کے مطالبہ کے مطابق اگر فی الواقع ان پر لکھی لکھائی ما بین الدفتین کتاب بھی اتار دی جاتی جب بھی یہ ایمان نہ لاتے بلکہ کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

معیارِ ایمان کی شرط

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ الاٰية۔ یہ ان کا ایک دوسرا مطالبہ اور اس کا جواب ہے۔ یہ مطالبہ بھی قرآن میں دوسری جگہ نقل ہوا ہے۔ یہ مطالبہ یہ تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر فرشتہ آتا ہے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے تو وہ فرشتہ یوں کیوں آتا ہے کہ صرف انھی کو نظر آتا ہے، کھلم کھلا ان کی نبوت کی منادی کرتا ہوا کیوں نظر نہیں آتا کہ سب دیکھیں اور سب سنیں۔ اس کا جواب یہ دیا کہ جب بات یہاں تک پہنچ جائے گی کہ فرشتے علانیہ اترنے لگیں تو پھر اللہ کا عذاب آ دھمکے گا۔ پھر ان کو مہلت نہیں دی جائے گی۔ یہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ ایمان وہ معتبر ہے جو غیب میں رہتے، آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے ان دلائل کی بنیاد پر لایا جائے، جن کی انبیاء دعوت دیتے ہیں نہ کہ وہ جو کشفِ حجاب اور حقائق کا بچشم سر مشاہدہ کر لینے کے بعد لایا جائے۔

فرشتوں کو رسول بنا کر نہ بھیجنے کی مصلحت

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا الاٰية۔ یہ ایک تیسرے مطالبے کا جواب ہے اور یہ بھی قرآن میں دوسری جگہ نقل ہوا ہے۔ مثلاً وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۹۴-اسراء (اور ہدایت الٰہی کے آجانے کے بعد لوگوں کو ایمان سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ انھوں نے اعتراض کیا کہ کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا) فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۶-تغابن (پس وہ بولے کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے، پس انھوں نے انکار کر دیا اور پیٹھ پھیر لی اور اللہ بھی ان سے بے نیاز ہو گیا) اس کا جواب یہ دیا کہ اگر رسول بالفرض فرشتہ ہی بھیجا جاتا جب بھی لازماً وہ آدمی ہی کی شکل و صورت میں ہوتا تو پھر وہی گھپلا پیش آ جاتا جو اب پیش آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی فرشتے کو رسول بنا کر نہ بھیجنا اس بنا پر نہیں ہے کہ خدا کے لیے یہ ناممکن تھا بلکہ اس بنا پر ہے کہ انسان فرشتوں کو فرشتوں کی شکل میں نہیں بلکہ

انسانوں ہی کی شکل میں دیکھ سکتے اور اسی صورت میں ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو جب وہ انسان ہی کے روپ میں آتا تو یہ پھر وہی اعتراض اٹھاتے جواب اٹھا رہے ہیں۔ مَایَلۡبِسُوۡنَ سے یہاں یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ فی الواقع یہ شبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ لوگ یہ شبہ پیدا کر رہے ہیں تاکہ اس طرح اپنے سادہ لوح پیرووں کو گھپلے میں ڈالیں۔ لَبَسۡنَا میں فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا ہے تو یہ نسبت اسی طرح کی ہے جس طرح کی نسبت فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰہُ میں ہے۔

وَلَقَدِ اسۡتُهۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيۡنَ سَخِرُوۡا مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝ قُلۡ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ ثُمَّ انْظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ (۱۰-۱۱)

حَاقَ يَحِيۡقُ حَيۡقًا بِهٖ کے معنی ہیں احاطہ کر لینا، گھیر لینا اور چھا جانا۔

اوپر آیت ۵ میں قریش کو یہ دھمکی جو دی ہے کہ وہ ایک امر حق کا مذاق اڑا رہے ہیں جو شدنی اور اٹل ہے، وہ عنقریب اس عذاب کے آثار دیکھ لیں گے جس کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ اب یہ اس امر واقعی کی ان شہادتوں اور مثالوں کی طرف اشارہ فرمایا جو خود ان کی تاریخ اور ان کے ملک کے آثار میں موجود ہیں کہ تم سے پہلے جو رسول آئے انھوں نے بھی اپنی اپنی قوموں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا تو ان کا بھی اسی طرح مذاق اڑایا گیا بالآخر اس عذاب نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور وہ تباہ ہو گئیں۔

قُلۡ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ الاٰية یہ اشارہ ہے خود ملک عرب کی طرف کہ اگر اس نگاہ سے اپنے ملک کے حالات و آثار کا مشاہدہ کرو تو تمھیں اس میں رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کی تباہی کے بہت سے آثار ملیں گے۔ یہاں صرف اجمالی اشارہ فرمایا ہے۔ بعد والی سورہ میں اس اجمال کی تفصیل آئے گی۔ وہاں قوم نوح، عاد، ثمود، مدین، قوم لوط وغیرہ کی سرگزشتیں سنائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قوموں نے بھی اپنے اپنے رسولوں کے انذار کا مذاق اڑایا اور اس عذاب کو انھوں نے محض خالی خولی دھمکی سمجھا جس کی رسول نے خبر دی۔ بالآخر وہ واقعہ کی شکل میں نمودار ہو گیا اور مذاق اڑانے والوں کا بیڑا غرق ہو گیا۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــــ آیات ۱۲-۳۲

آگے توحید، معاد اور رسالت کے وہی مطالب جو اوپر گزرے اپنے بعض نئے پہلوؤں اور نئے اسلوب سے آ رہے ہیں۔ ارشاد ہے۔

آیات ۱۲-۳۲

قُلۡ لِّمَنۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ قُلْ لِّلّٰهِ‌ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ‌ؕ لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ‌ؕ اَلَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۲﴾ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِى الَّيۡلِ

وَالنَّهَارِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣﴾ قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا
فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۗ قُلْ إِنِّي
أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ ۖ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٤﴾ قُلْ
إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾ مَنْ يُصْرَفْ
عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿١٦﴾ وَإِنْ يَمْسَسْكَ
اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِنْ يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٧﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ
الْخَبِيرُ ﴿١٨﴾ قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً ۖ قُلِ اللَّهُ ۖ شَهِيدٌ
بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۚ وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ
بَلَغَ ۚ أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَىٰ ۚ قُلْ لَا أَشْهَدُ ۚ
قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنَّنِي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ ﴿١٩﴾ وقف لازم
الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمُ ۘ باختلاف وقف لازم
الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ ع ٢ ١٠ ٨
افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٢١﴾
وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ
الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَ
اللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ﴿٢٣﴾ انْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ ۚ وَ
ضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾ وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۚ

وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَ
اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ
يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَهُمْ
يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْــَٔــوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا
يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَي النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا
نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷﴾ بَلْ
بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا
نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا
وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۭ قَالَ
اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ
بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ ع ۳ ۱۰ ۹
حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰي مَا فَرَّطْنَا
فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰي ظُهُوْرِهِمْ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا
يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ
الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمۂ آیات ۱۲-۳۲

ان سے پوچھو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہہ دو اللہ ہی کا ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ وہ تم کو جمع کر کے ضرور لے جائے گا قیامت کے دن کی طرف جس میں ذرا شبہ نہیں۔ جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا

وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے جو چیز شب میں ساکن ہوتی ہے اور جو دن میں متحرک ہوتی ہے اور وہ سمیع و علیم ہے۔ ۱۲-۱۳

کہو کیا میں اللہ کے سوا، جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، کسی اور کو اپنا کارساز بناؤں اور وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں، کہہ دو مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں اور تم ہرگز مشرکوں میں سے نہ بنو۔ کہہ دو کہ اگر میں نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی تو میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ جو شخص اس دن اس سے دور رکھا گیا درحقیقت وہی ہے جس پر خدا نے رحم فرمایا اور یہی کھلی کامیابی ہے۔ ۱۴-۱۶

اور اگر اللہ تجھ کو کسی دکھ میں مبتلا کرے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس کا دور کرنے والا بن سکے اور اگر کسی خیر سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔ پوچھو شہادت کے لیے سب سے بڑا کون ہے؟ کہو، اللہ، وہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس کے ذریعہ سے تم کو ڈراؤں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔ کیا تم اس بات کے گواہ بنتے ہو کہ خدا کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں؟ کہہ دو، میں اس کی گواہی نہیں دیتا۔ کہہ دو وہ تو بس ایک ہی معبود ہے اور میں ان سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔ ۱۷-۱۹

جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا یا اس کی آیات کی تکذیب کی۔ بیشک یہ ظالم فلاح پانے والے نہیں۔ یاد کرو اس دن کو جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے پھر

پوچھیں گے ان شریک ٹھہرانے والوں سے کہ تمہارے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم ہمارا شریک گمان کرتے تھے ؟ پھر ان کے فریب کا پردہ چاک ہو جائے گا مگر یہ کہ وہ کہیں گے کہ اللہ اپنے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھو، یہ کس طرح اپنے آپ پر جھوٹ بولے اور ان کا سارا افترا ہوا ہو گیا۔ ۲۰-۲۴

اور ان میں ایسے بھی ہیں جو تمہاری بات پر کان لگاتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ ان کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرا پن پیدا کر دیا ہے کہ اس کو نہ سن سکیں اور اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں گے تو بھی ان پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں تک کہ جب یہ تمہارے پاس حجت کرتے آئیں گے تو یہ کافر کہیں گے کہ یہ تو بس اگلوں کا فسانہ ہے اور یہ اس سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی گریز کرتے ہیں اور یہ درحقیقت اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں لیکن احساس نہیں کر رہے ہیں۔ اور اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب یہ دوزخ کے کنارے پہ کھڑے کیے جائیں گے، پس کہیں گے کہ کاش ہم پھر واپس کیے جائیں کہ مانیں اور اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کریں اور ایمان والوں میں سے بنیں۔ بلکہ یہ تو ان پر وہی حقیقت ظاہر ہوئی ہے جو اس سے پہلے اپنے دل میں چھپاتے تھے۔ اور اگر یہ لوٹائے بھی جائیں تو وہی کریں گے جس سے روکے گئے، یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۲۵-۲۸

کہتے ہیں کہ زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اور مرنے کے بعد ہم اٹھائے نہیں جانے کے۔ اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب یہ اپنے رب کے حضور کھڑے کیے جائیں گے، وہ ان سے پوچھے گا، کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے؟ وہ جواب دیں گے، ہاں، ہمارے رب کی قسم، یہ امر واقعہ ہے! فرمائے گا پس چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں۔ گھاٹے میں رہے وہ لوگ

جنھوں نے اللہ سے ملاقات کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی اچانک آ پہنچے گی وہ کہیں گے کہ ہائے افسوس ہماری اس کوتاہی پر جو اس باب میں ہم سے ہوئی! اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ جان رکھو کہ نہایت ہی برا ہو گا وہ بوجھ جو یہ اٹھائیں گے اور یہ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے۔ البتہ دار آخرت ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ رکھتے ہیں۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں! ۲۹-۳۲

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَیَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ؕ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِی الَّیْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۱۲-۱۳)

سوال و جواب کا ایک خاص اسلوب

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، قُلْ لِّلّٰهِ، قرآن میں جہاں جہاں سوال کر کے مخاطب کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود اس کا جواب دیا ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مواقع میں اصل جواب سے مخاطب کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر اس کا کوئی عقیدہ یا عمل اس کے خلاف ہے تو وہ خود اس کے اپنے مسلّمہ کے خلاف ہے۔ جواب میں سبقت سے اس امر کا بھی اظہار ہو جاتا ہے کہ بہر حال اصل حقیقت کا اظہار کر دیا جائے قطع نظر اس سے کہ مخاطب اس کے جواب میں کیا ہٹ دھرمی اختیار کرتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود آسمان و زمین کا خالق و مالک خدا ہی کو مانتے تھے۔ اس کی وضاحت دلائل کے ساتھ ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔

قیامت خدا کی صفت رحمت کا لازمی تقاضا ہے

كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ، یہ اللہ تعالیٰ کے صفت رحمت سے کامل درجہ متصف ہونے کی تعبیر بھی ہے اور اس امر کا اظہار بھی کہ ہر وہ بات جو اس صفت کا مقتضیٰ ہے اس کا ظہور میں آنا قطعی اور اٹل ہے، کوئی چیز اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکے گی۔

لَیَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ، میں عربیت کا جو اسلوب ہے اس پر سورۂ نساء کی آیت ۸۷ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ یہاں جو بات نگاہ میں رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کا آنا خدا کی صفت رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر قیامت نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات کا خالق رحمان و رحیم نہیں ہے۔ اس کے نزدیک نعوذ باللہ عدل و ظلم، نیکی اور بدی، خیر اور شر دونوں یکساں ہیں، یہ ایک کھلنڈرے کا کھیل اور ایک اندھیر نگری ہے۔ یہ باتیں چونکہ بالبداہت باطل ہیں، رحمان و رحیم خدا کی شان کے بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے غایت و بے مقصد کام کرے، اس وجہ سے لازمی ہے کہ ایک ایسا دن وہ لائے جس میں اس کی رحمت کاملہ کا ظہور ہو، اپنے نیک بندوں کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور جو بدکار و نابکار ہیں وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔

اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ قیامت کا اصل مقصود مجرموں کو سزا دینا نہیں بلکہ نیکوکاروں کو جزا دینا ہے۔ مجرموں کی سزا درحقیقت نیکوکاروں کی جزا کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ آگے آیت ۵۲ کے تحت۔ اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

اصل حرمان ۔ اَلَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ فَہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ کے مضمون کی وضاحت آگے آیت ۳۱ میں فرمادی ہے۔ قَدۡ خَسِرَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ اللّٰہِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتۡہُمُ السَّاعَۃُ بَغۡتَۃً قَالُوۡا یٰحَسۡرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطۡنَا فِیۡہَا ۙ وَ ہُمۡ یَحۡمِلُوۡنَ اَوۡزَارَہُمۡ عَلٰی ظُہُوۡرِہِمۡ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوۡنَ (گھاٹے میں پڑے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی اچانک آدھمکے گی تو کہیں گے ہائے افسوس ہماری اس کوتاہی پر جو ہم سے اس بارے میں ہوئی اور وہ اس دن اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے اور آگاہ، نہایت برا بوجھ ہوگا جو وہ اٹھائے ہوئے ہوں گے)

حذف کا ایک اسلوب ۔ وَلَہٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ یہاں لیل و نہار دونوں کے ذکر کا تقاضا یہ ہے کہ سَکَنَ کے بالمقابل کوئی ایسا فعل محذوف مانا جائے جو لفظ نہار کے ساتھ مناسبت رکھنے والا ہو۔ چنانچہ ہم نے تحرک محذوف مانا ہے اور ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے اور آگے اسی سورہ میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں آرہی ہیں۔

آیات کا مطلب یہ ہوا کہ اگر یہ اپنی موجودہ دنیوی کامیابیوں کے غرے میں آخرت اور جزا و سزا کو جھٹلا رہے اور تمھارا اور قرآن کا مذاق اڑا رہے ہیں تو ان سے پوچھو کہ یہ آسمان و زمین کس کے ہیں؟ ظاہر ہے کہ خدا ہی کے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انھیں بھی مجال انکار نہیں۔ پھر انھیں بتا دو کہ خدا نے اپنے اوپر رحمت لازم کرلی ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تمھیں پیدا کرکے اور پرورش کے تمام اسباب فراہم کرکے یونہی شتر بے مہار بنا کے نہ چھوڑ دے بلکہ ضروری ہے کہ وہ تم سب کو کشاں کشاں روز قیامت کی طرف لے جائے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے تو آج جو لوگ اکڑتے اور اس کا مذاق اڑاتے اور اپنی دنیوی خود فراموشیوں میں مگن ہیں اس دن اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے کہ ہائے ہم نے چند روزہ عیش دنیا کی خاطر اس زندگی کو فراموش رکھا اور اپنے لیے ابدی نامرادی کا سامان کیا۔ پھر فرمایا کہ یہ لوگ یاد رکھیں کہ شب کی تاریکیوں میں جو چیز ساکن ہوتی ہے اور دن کی روشنی میں جو چیز بھی متحرک ہوتی ہے سب خدا ہی کے اختیار، اسی کے قبضۂ قدرت اور اسی کے کنٹرول میں ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکے اور اس کے اذن کے بغیر اپنی جگہ سے سرک سکے۔ رات کی تاریکی اور دن کی روشنی دونوں اس کے لیے یکساں ہے اور وہ ہر جگہ سے سب کو اکٹھا کرلے گا اور جس طرح اس کی قدرت سب کو محیط ہے اسی طرح اس کا علم بھی ہر چیز پر حاوی ہے اس لیے کہ وہ سمیع و علیم ہے۔ آگے یہی مضمون بڑی تفصیل کے ساتھ آیات ۵۹-۶۲ میں آرہا ہے۔

قُلۡ اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ ہُوَ یُطۡعِمُ وَ لَا یُطۡعَمُ ؕ قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ

اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○
مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (۱۴-۱۶)

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، یہ اس مسلمہ حقیقت کا، جو اوپر مذکور ہوئی، دوسرا لازمی نتیجہ بیان کیا جا رہا ہے کہ جب سب کچھ خدا ہی کا ہے، آسمان و زمین سب کا خالق وہی ہے تو تم خواہ کتنا ہی زور لگاؤ، لیکن میرے لیے یہ کس طرح روا ہے کہ خدائے فاطر السموات والارض کے سوا کسی اور کو اپنا مولیٰ و مرجع بناؤں۔

بتوں پر ایک لطیف تعریض

وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ، یہ خدا کی ربوبیت اور پروردگاری کی طرف اشارہ بھی ہے اور مشرکین کے بتوں پر ایک نہایت لطیف تعریض بھی۔ مطلب یہ ہے کہ مولیٰ و مرجع بنائے جانے کا سزاوار تو وہ ہے جو آسمان و زمین کا عدم سے وجود میں لانے والا بھی ہے اور جس کے فضل و کرم سے سب کو روزی بھی مل رہی ہے نہ کہ تمھارے وہ اصنام خیالی جن کے متعلق تمھیں خود یہ تسلیم ہے کہ وہ خالق و موجد کسی چیز کے بھی نہیں، رہی ان کی پروردگاری تو اس کا بھانڈا پھوڑ دینے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ ان کے آگے حلوے مانڈے تم پیش کرتے ہو تب وہ راضی و آسودہ ہوتے ہیں۔ یہاں یہ امر پیش نظر ہے کہ مشرکین اپنے بتوں کے آگے جو کچھ پیش کرتے ہیں اس تصور کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ یہ ان کی پسندیدہ اور مرغوب غذائیں ہیں جن کو وہ نوش کرتے اور جن کی خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ایک خدا پرست خدا کے نام پر جو کچھ پیش کرتا ہے اس کا کوئی حصہ، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، خدا کو نہیں پہنچتا بلکہ سب کا سب خدا کے حقدار بندوں کو پہنچتا ہے۔

نبی کا عزم دوسروں سے بے نیاز ہوتا ہے

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ، یعنی اگر تم مدعی ہو کہ خدا نے تمھارے ان مزعومہ بتوں کو اپنی خدائی میں شریک بنایا ہے اور تمھیں ان کی عبادت کا حکم دیا ہے تو تم جانو، مجھے تو جو حکم ملا ہے وہ یہ ہے کہ میں سب سے پہلا اسلام لانے والا اور اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دینے والا بنوں۔ سو میں تو اسی حکم کی تعمیل کرنے والا ہوں، تم میں سے کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے۔ اس اسلوب بیان سے، جیسا کہ ہم دوسری جگہ تصریح کر چکے ہیں، جہاں یہ بات نکلتی ہے کہ نبی جس بات کی تعلیم دنیا کو دیتا ہے اس پر پہلا عمل کرنے والا وہ خود بنتا ہے، وہیں یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس امر سے اس کی اس یکسوئی اور اس کے عزم میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا کہ جن کو اس نے پکارا ان میں سے کسی نے اس کا ساتھ دیا یا نہیں دیا۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، کا عطف اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ، پر نہیں ہے بلکہ یہ مستقل بات ہے یعنی تم ان کو بتا دو کہ مجھے یہ حکم ملا ہے اور تم مشرکین میں سے نہ بنو۔ اس طرح کی نہی میں اگرچہ بظاہر خطاب آنحضرت صلعم سے ہوتا ہے لیکن اس میں زجر کا جو پہلو نکلتا ہے اس کا رخ ان لوگوں کی طرف ہوتا ہے جن

کا رویہ زیر بحث ہوتا ہے۔

قُلۡ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ الآیۃ۔ یعنی جب مجھے حکم یہ ملا ہے کہ میں سب سے پہلا اسلام لانے والا بنوں تو میرے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اپنے رب کے اس حکم کی نافرمانی کروں ؟ اگر میں نافرمانی کروں تو میں اس ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں جس سے ہر نافرمانی کرنے والے کو سابقہ پیش آنا ہے۔

ڈرنے کی اصل چیز اور چاہنے کی اصل چیز

مَنۡ یُّصۡرَفۡ عَنۡہُ یَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمَہٗ، یعنی ڈرنے کی اصل چیز یہ خوفناک دن اور اس کا عذاب ہی ہے ، جو اس سے محفوظ رہا ، درحقیقت وہی ہے جس پر خدا کا رحم ہوا اور چاہنے کی اصل چیز اس دن کی رحمت ہی ہے اس لیے کہ جو اس رحمت کا سزاوار قرار پایا درحقیقت وہی ہے جس نے اصل کامیابی حاصل کی ۔ اس میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ بھی ہے کہ جو لوگ اس دنیا کی کامیابیوں ہی کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور ان کے پیچھے آخرت کی 'فوز مبین' کو بھول بیٹھے ہیں انھیں اپنی بدبختی اور محرومی کا اندازہ کل ہوگا۔

وَاِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ہُوَ ؕ وَاِنۡ یَّمۡسَسۡکَ بِخَیۡرٍ فَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۷﴾ وَہُوَ الۡقَاہِرُ فَوۡقَ عِبَادِہٖ ؕ وَہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۸﴾ ۱۷-۱۸

نفع و ضرر صرف خدا کے اختیار میں ہے۔

'وَاِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ' میں خطاب اگرچہ لفظاً بصیغہ واحد ہے لیکن مراد عام ہے اور یہ بات اوپر والی بات ہی کی توضیح مزید کی حیثیت رکھتی ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ نفع و ضرر دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہیں ۔ اگر وہ کسی کو کسی دکھ میں مبتلا کرے تو کوئی نہیں ہے جو اس کو دور کر سکے ۔ اسی طرح اگر وہ کسی کو کسی خیر سے بہرہ مند کرے تو جس خیر سے چاہے بہرہ مند کر دے ، کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کے ارادے میں مزاحم ہو سکے ۔ پھر کسی اور کو مولیٰ و مرجع بنانے اور کسی اور سے دعا و استمداد کی ضرورت کیا باقی رہی ؟

لفظ قہر کا مفہوم

'وَہُوَ الۡقَاہِرُ فَوۡقَ عِبَادِہٖ' ، 'قہر' کا لفظ عربی میں اس معنی میں بالکل نہیں آتا جس معنی میں اردو میں آتا ہے بلکہ اس کے معنی اختیار اور قابو ، حکومت اور تسلط میں رکھنے کے آتے ہیں ۔ انگریزی میں لفظ (Control) کا جو مفہوم ہے وہی مفہوم عربی میں اس لفظ کا ہے ۔ اسی سے لفظ 'قہار' مبالغہ کا صیغہ ہے جو اسمائے حسنیٰ میں سے ہے جس کے معنی (Controller) کے ہیں ۔ یعنی تمام جہان اور اس کے تمام بندے ہر آن اس کی مٹھی اور اس کے قابو میں ہیں ، وہ ان کو قابو میں رکھنے کے لیے نہ کسی مددگار کا محتاج ہے اور نہ اس امر کا اندیشہ ہے کہ جب وہ ان کو پکڑنا چاہے یا اکٹھا کرنا چاہے تو کوئی اس کی گرفت سے باہر نکل سکے ۔ آگے اس مضمون کی وضاحت بھی ہوگئی ہے ۔ 'وَہُوَ الۡقَاہِرُ فَوۡقَ عِبَادِہٖ وَیُرۡسِلُ عَلَیۡکُمۡ حَفَظَۃً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡہُ رُسُلُنَا وَہُمۡ لَا یُفَرِّطُوۡنَ ۔ ۶۱' (اور وہ اپنے تمام بندوں پر اپنا قابو جمائے ہوئے ہے اور وہ تم پر اپنے نگران بھیجتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو اس کو ہمارے فرستادے ہی قبض کرتے ہیں اور وہ اس کام میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے)

صفات حکیم و خبیر کے لوازم

'وَہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ' خدا کا حکیم و خبیر ہونا ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ کتنی باتوں کو مستلزم

ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک روز جزا و سزا کو لائے اس لیے کہ اس کے بغیر یہ دنیا بالکل بے مقصد ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس کے ہاں کسی ایسی شفاعت کی گنجائش نہ ہو جو حق کو باطل اور باطل کو حق بنا سکے اس لیے کہ یہ اس کی حکمت کے بھی منافی ہے اور اس کے خبیر ہونے کے بھی۔

قُلۡ اَیُّ شَیۡءٍ اَکۡبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۟ۙ شَهِیۡدٌۢ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَكُمۡ ۟ وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمۡ لَتَشۡهَدُوۡنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخۡرٰی ؕ قُلۡ لَّاۤ اَشۡهَدُ ۚ قُلۡ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۹﴾

'وَمَنۡۢ بَلَغَ' کا عطف — 'لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ' عام طور پر مفسرین نے وَ مَنۡۢ بَلَغَ کو ضمیر منصوب پر معطوف مانا ہے یعنی یہ قرآن اس لیے مجھ پر وحی کیا گیا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے تم کو اور ان سب کو بیدار و ہوشیار کروں جن تک یہ پہنچے۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ ضمیر متکلم پر معطوف ہے یعنی میں اس کے ذریعے سے تم کو خبردار کروں اور جن کو یہ پہنچے وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر دوسروں کو اس کے ذریعے سے خبردار کریں۔ یہ گویا اس ذمہ داری کی یاددہانی ہے جس کا ذکر دوسرے مقام میں یوں ہوا ہے فَلَوۡلَا نَفَرَ مِنۡ كُلِّ فِرۡقَةٍ مِّنۡهُمۡ طَآئِفَةٌ لِّیَتَفَقَّهُوۡا فِی الدِّیۡنِ وَ لِیُنۡذِرُوۡا قَوۡمَهُمۡ اِذَا رَجَعُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ - ۱۲۲ التوبہ (پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت دین کا علم حاصل کرنے کے لیے اٹھتی اور تاکہ وہ اپنی قوم کو خبردار کرتی جبکہ ان کی طرف واپس آتی) یہی حقیقت احادیث میں بھی واضح کی گئی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام صحابہ پر انذار و تبلیغ کی ذمہ داری ڈالی اور فرمایا فلیبلغ الشاھد الغائب پس چاہیے کہ جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔ لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡكُمۡ شَهِیۡدًا میں اس امت کا جو فریضۂ منصبی بیان ہوا ہے اور جس کی وضاحت ہم اس کے مقام میں کر چکے ہیں، اس سے بھی اسی مفہوم کی تائید نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

توحید اور شرک کے معاملے میں فیصلہ کن گواہی خدا کی ہے — آیت کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں، اس معاملے میں فیصلہ کن گواہی خود خدا ہی کی ہو سکتی ہے وہی بتا سکتا ہے کہ اس نے اپنی خدائی میں کسی کو شریک بنایا ہے یا نہیں اور بنایا ہے تو وہ کون کون ہیں اور وہ کس نوعیت کے شریک ہیں۔ اگر اس نے کسی کا شریک ہونا تسلیم نہیں کیا ہے تو تم کو یا کسی کو کیا حق ہے کہ کسی کو اس کی خدائی میں حصہ دار بناتے۔ اب آؤ، میں اس نزاع کے فیصلے کے لیے اپنے اور تمہارے درمیان خدا ہی کو گواہ مانتا ہوں۔ اس نے میرے اوپر یہ قرآن اسی گواہی کے لیے نازل کیا ہے کہ میں تم کو خبردار کر دوں کہ کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور جن جن کو یہ پہنچے وہ بھی دوسروں کو خبردار کریں کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اب اس کے بعد بھی اگر تم مدعی ہو کہ دوسرے معبود خدا کے شریک ہیں تو میں اس بے دلیل گواہی کے لیے تیار نہیں۔ مجھے خدا کا حکم یہی ہے کہ میں اعلان کروں کہ وہ ایک ہی معبود ہے اور میں ان تمام چیزوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں جن کو تم خدا کا شریک

گردانتے ہو۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۰-۲۱)

'اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ' اس ٹکڑے پر تفصیلی بحث بقرہ کی تفسیر میں آیت ۴۶ اسکے تحت گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے بتایا ہے کہ اس سے مراد صالحین اہل کتاب ہیں۔ قرآن میں اچھے اہل کتاب کا ذکر بالعموم بصیغۂ معروف ہی ہوا ہے۔ 'یَعْرِفُوْنَهٗ' میں ضمیر منصوب کا مرجع قرآن ہے جس کا ذکر اوپر 'وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ' میں گزر چکا ہے۔ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مراد لیا گیا ہے لیکن چونکہ یہاں سیاق کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کا ہے اس وجہ سے آپ کے لیے ضمیر غائب موزوں نہیں ہے ویسے باعتبار مدعا کوئی فرق واقع نہیں ہوگا اس لیے کہ نبی اور قرآن دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایسے لازم و ملزوم کہ قرآن میں، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کریں گے، ایک دوسرے سے بدل پڑے ہوئے ہیں۔ بقرہ میں ہم 'اَبْنَآءَهُمْ' کی تشبیہ پر بھی بحث کر چکے ہیں کہ جس طرح ایک مہجور باپ کا اپنے موعود و منتظر بیٹے کا انتظار ہوتا ہے اور جب وہ آتا ہے تو دور سے اس کے پیراہن کی خوشبو اس کے لیے نوید مسرت لاتی ہے اسی طرح صالحین اہل کتاب کو قرآن اور پیغمبرؐ کا انتظار تھا اور اسی جذبے کے ساتھ جیسا کہ 'وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ' الآیۃ کے تحت گزر چکا ہے، انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔

صالحین اہل کتاب کی گواہی اب یہ قرآن کی گواہی کو مزید موثق کرنے کے لیے فرمایا کہ یہ کوئی غیر معروف گواہی نہیں ہے بلکہ جانی پہچانی ہوئی گواہی ہے۔ اس کا ذکر پچھلے آسمانی صحیفوں میں بھی موجود ہے۔ تم سے پہلے جن کو کتاب عطا ہوئی وہ اس کو پہچانتے ہیں اور جو ان میں اہل ایمان ہیں وہ اس کے منتظر و مشتاق رہے ہیں۔ اس پر ایمان لانے سے محروم تو صرف وہ رہیں گے جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا۔ فرمایا جب خدا کی گواہی یہ ہے تو ان سے بڑھ کر بدقسمت ظالم اور نامراد کون ہو سکتا ہے جو اس گواہی کے خلاف خدا پر یہ جھوٹ باندھیں کہ اس نے فلاں اور فلاں کو اپنا شریک بنایا ہے یا اس کی آیات کی تکذیب کریں جب کہ وہ توحید کی واضح تعلیم کے ساتھ ان کے پاس آگئی۔ ایسے ظالم کبھی فلاح پانے والے نہیں بن سکتے۔

یہ سورہ اگرچہ مکی ہے لیکن یہ اس دور کی سورہ ہے جب مدینہ کے اہل کتاب اس دعوت سے غیر متعلق نہیں رہے تھے بلکہ ان کے اشرار اس کی مخالفت کو شہ دے رہے تھے اور جو اچھے لوگ تھے وہ اس کو سابق صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی تصدیق سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے قرآن کا یہ اشارہ یہاں بڑا معنی خیز ہے۔ اس سے انبیاء کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی اور ساتھ ہی ان لوگوں پر ایک چوٹ بھی لگا دی گئی جو جان کر انجان بن رہے تھے اس مضمون کی مزید تفصیل اسی سورہ میں آگے آیت ۱۱۴ کے تحت آئے گی۔

وَیَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ اَشْرَكُوْٓا اَیْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ

تَزْعُمُوْنَ ۝ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۲-۲۴)

جمیعاً کی تاکید کا فائدہ

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا میں جمیعاً کی تاکید نے ان تمام گروہوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا۔ یعنی ان کو بھی جنھوں نے خدا پر جھوٹ گھڑ کے اس کے لیے شرکا ایجاد کیے ان کو بھی جنھوں نے مرنے کے بعد اٹھائے جانے اور جزا و سزا کا انکار کیا اور ان کو بھی جنھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی۔ اگرچہ یہ تمام جرائم ان تمام مشرکین کے مشترک جرائم تھے تاہم ان کے ذوقی رجحانات کچھ الگ الگ بھی تھے اس وجہ سے پچھلی آیات میں ان کا الگ الگ بھی ذکر ہوا اور ان سب پر ان کے جرائم کی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے ضرب لگائی گئی ہے۔

فتنۃ کا مفہوم

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ لفظ فتنہ کی تحقیق دوسرے مقام میں گزر چکی ہے اگر اس کو اس معنی میں لیا جائے جس معنی میں مال و اولاد، دنیا و زخارف دنیا کو قرآن میں فتنہ کہا گیا ہے تب تو یہ اپنے مفعول کی طرف مضاف ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ جس فتنۂ شرک اور جن جھوٹی اور موہوم آرزوؤں میں آج یہ مبتلا ہیں اس کے پردے اٹھ جائیں گے اور ان کو نظر آ جائے گا کہ جن سہاروں پر وہ جی رہے ہیں وہ محض فریب تھے۔ اس وقت ان کو اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آئے گا کہ جس طرح آج خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہیں اسی طرح اپنے اوپر جھوٹ بولیں۔ اور اگر اس لفظ کو ظلم و تشدد سے دین سے پھیرنے کے معنی میں لیا جائے تو یہ اپنے فاعل کی طرف مضاف ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ آج جس فتنہ میں یہ کمزور مسلمانوں کو محض انکارِ شرک، مبتلا کر رہے ہیں وہ ختم ہو جائے گا، اور وہ خود ایسی آفتوں میں مبتلا ہو جائیں گے کہ آج جس شرک کی حمایت میں وہ مسلمانوں کو مظالم کا ہدف بنائے ہوئے ہیں خدا کی پکڑ میں آتے ہی اس سے برات کا اعلان کریں گے اور جھوٹ بولیں گے۔ ان دونوں میں سے جو مفہوم بھی لیا جائے دونوں ہی صورتوں میں انداز کلام طنزیہ ہوگا اور استثنا منقطع۔ میرا غالب رجحان پہلے مفہوم کی طرف ہے اور ترجمہ میں اسی کا میں نے لحاظ رکھا ہے۔

مشرکین کا جھوٹ دنیا اور آخرت میں

اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ میں اُنْظُرْ تصویرِ حال کے لیے ہے تاکہ مستقبل کا ایک ماجرا چشمِ تصور کے سامنے آ جائے کَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ کے معنی ہیں انھوں نے اپنے اوپر جھوٹی گواہی دی، یعنی دنیا میں جس شرک کی حمایت میں لڑتے مرتے رہے آخرت میں پہلے ہی قدم پر قسم کھا کر اس کا انکار کریں گے۔ اس میں یہ لطیف تعریض بھی ہے کہ دنیا میں یہ خدا کے خلاف جھوٹی گواہی دیتے رہے، جیسا کہ آیت ۱۹ میں مذکور ہے: اور آخرت میں اپنے اوپر جھوٹی گواہی دیں گے وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہوگا کہ دنیا میں خدا پر جھوٹ باندھ کر جن کو شرکا و شفعا کا درجہ دیا گیا تھا اور جن سے تمام امیدیں باندھی گئی تھیں وہ سب ہوا ہو گئے، ان میں سے کوئی کام نہ آیا۔

ایک سوال کا جواب اجزا کی تشریح سے آیات کا مدعا خود بخود واضح ہوگیا ہے، مزید تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ البتہ ایک سوال ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں پیدا ہو۔ وہ یہ کہ قرآن کے بعض مقامات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز مشرکین اپنے شرک کا اقرار کریں گے بلکہ اپنے شرکا کو پکاریں گے بھی اور آیت زیر بحث میں یہ تصریح ہے کہ وہ قسم کھا کے شرک سے اپنی برأت کا اعلان کریں گے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ احوال روز قیامت کے مختلف مراحل کے بیان ہوئے ہیں۔ اس روز مشرکین کو جس حیرانی و پریشانی سے سابقہ پیش آئے گا وہ ایسی ہوگی کہ اس میں ان کو نجات کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے گی اس وجہ سے جس مرحلے میں جو بات بنتی نظر آئے گی وہ بنانے کی کوشش کریں گے لیکن۔ ع

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـــَٔـوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓي اِذْ وُقِفُوْا عَلَي النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۲۵-۲۸)

ایک سنت الٰہی کا بیان وَجَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا، اکنۃ، کِنّ اور کِنان کی جمع ہے اس کے معنی پردہ اور ڈھکنے کے ہیں۔ وَقر، بوجھ، ثقل اور گرانی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے وہ گرانی مراد ہے جو کانوں کو بہرہ کر دے۔ یہ جس حجاب اور جس بہرے پن کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ معنوی اور روحانی حجاب اور گرانی ہے جو دلوں اور کانوں کو سننے اور سمجھنے کی اس صلاحیت سے محروم کر دے جو انسانیت کا اصلی خاصہ ہے، جس سے محروم ہو کر انسان چوپایہ بلکہ چوپائے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ انسان پر یہ محرومی اس کی اپنی شامت اعمال کے نتیجہ میں مسلط ہوتی ہے جس کا ایک مخصوص ضابطہ ہے۔ اس ضابطہ یا بالفاظ دیگر اس سنت اللہ کی پوری تفصیل ہم بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔ چونکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی ٹھہرائی ہوئی ایک خاص سنت کے تحت واقع ہوتی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف منسوب فرماتا ہے۔ بقرہ میں ختم قلوب کی بحث پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس آیت میں اَنْ يَّفْقَهُوْهُ کا مقابل فعل جو لفظ اٰذان کے ساتھ مناسبت رکھنے والا ہو، محذوف ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔

ایک حقیقت نفس الامری وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا، یہ محض مبالغہ کا ایک اسلوب بیان نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کے سامنے عجائب اور کرشمے ظاہر نہیں ہوتے۔ آخر یہ ساری کائنات، آسمان و زمین، سورج، چاند، دریا، پہاڑ، ابر، ہوا، رات، دن کیا ہیں؟ کیا یہ کرشمے اور عجائب نہیں ہیں؟ ساری کائنات کرشموں اور عجائب سے بھری پڑی ہے لیکن

جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہی نہ ہوں، ان کا کیا علاج؛ جس طرح ان سارے عجائب اور کرشموں سے ان کی آنکھیں بند ہیں اگر اور کرشمے بھی ان کو دکھا دیے جائیں جب بھی یہ کوئی نہ کوئی بات بنا ہی لیں گے اور اپنی ہٹ پر جمے ہی رہیں گے۔ ان کا علاج تو یہ ہے کہ یہ اپنی آنکھوں کی پٹیاں کھولیں اور گوش دل سے پیغمبر کی باتیں اور قرآن کی دعوت سنیں۔ یہ وہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو معجزوں اور کرشموں سے ان کو کیا نفع پہنچے گا۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ: 'اساطیر'، 'سطر' کے مادے سے 'اسطورۃ' اور 'اسطیرۃ' کی جمع ہے اس کے معنی ہیں بے سروپا داستان، بے اصل قصہ، فسانہ۔

قوموں کے عروج وزوال سے متعلق عربوں کا نظریہ اور اس کی تردید

قرآن نے اپنی دعوت کے سلسلہ میں بعض قوموں کی تاریخ جو پیش کی ہے وہ اس پہلو سے پیش کی ہے جو تاریخ کا اصلی مفید پہلو ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قوموں کا ابھرنا اور فنا ہونا اتفاقی واقعات کے طور پر ظہور میں نہیں آتا بلکہ اس میں اصل دخل اخلاقی عوامل کو ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم زندگی کے اخلاقی عناصر سے خالی ہو جاتی ہے تو قدرت کا قانون اس کو فنا کر دیتا ہے اور کوئی دوسری قوم اس کی جگہ اٹھا کھڑی کرتا ہے جو کردار و اخلاق میں اس سے بہتر ہوتی ہے اور پھر اس کی آزمائش کرتا ہے کہ وہ اقتدار پا کر کیا رویہ اختیار کرتی ہے۔ اگر اس کا رویہ بھی بگڑ جاتا ہے تو پھر اس کو بھی فنا کر دیتا ہے اور اس کی جگہ کسی دوسری قوم کو لاتا ہے۔ عروج و زوال کے اس اصول کو بنیاد قرار دے کر قرآن نے عربوں کے سامنے خود ان کے ملک اور ان کے گرد و پیش کی تاریخ رکھی کہ عاد، ثمود، مدین، سبا، قوم لوط اور قوم فرعون وغیرہ کے فنا ہونے کے واقعات اتفاقی واقعات نہیں ہیں بلکہ یہ عروج و زوال کے اس خدائی ضابطے کے تحت ظہور میں آئے ہیں جو قوموں کی زندگی اور موت کے لیے خدا نے مقرر فرمائے ہیں۔ یہ قومیں اخلاقی و روحانی بیماریوں میں مبتلا ہوئیں تو اللہ نے ان کی اصلاح اور ان کے علاج کے لیے روحانی و اخلاقی طبیب یعنی انبیا بھیجے۔ ان انبیاء نے سر توڑ کوشش کی کہ اپنی قوم کی بیماریاں دور کریں لیکن ان کی قوموں نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فنا کر دیا۔ یہ تاریخ سنا کر قرآن نے عربوں کو متنبہ کیا کہ اس وقت تمہارے سامنے بھی زندگی اور موت کا یہی مرحلہ ہے۔ تمہارے اندر بھی خدا کا رسول آگیا ہے اور اگر تم نے اس کی بات نہ سنی تو تم بھی اسی طرح فنا کر دیے جاؤ گے جس طرح تمہاری پیشرو قومیں فنا کر دی گئیں۔ اہل عرب کے پندار پر قرآن کے اس انذار سے سخت چوٹ پڑتی تھی۔ اول تو ان پر یہی بات شاق گزرتی تھی کہ وہ کسی اخلاقی و روحانی بیماری میں مبتلا ہیں جس کے نتیجے میں ان پر عذاب الٰہی آنے والا ہے، دوسری یہ کہ وہ اس بات کو بالکل بعید از عقل سمجھتے تھے کہ قوموں کے عروج و زوال میں اخلاقی عوامل کو کوئی دخل ہوتا ہے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ قومیں بھی افراد و اشیا کی طرح جیتی اور مرتی ہیں، جس طرح ایک

فرد یا ایک درخت پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، بوڑھا ہوتا ہے پھر مر جاتا ہے یا سوکھ جاتا ہے اسی طرح قومیں بھی پیدا ہوتی، جوان ہوتی اور فنا ہو جاتی ہیں۔ اس چیز کو کردار و ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اہل عرب کا یہ قول جو قرآن میں نقل ہوا ہے کہ 'وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ' (ہمیں نہیں تباہ کرتی مگر گردش روزگار) وہ بھی قرآن اور پیغمبر کے اسی انذار کے جواب میں کہتے تھے کہ یہ غلط ہے کہ قومیں اخلاق و ایمان کی بنا پر تباہ ہوتی ہیں، ایمان و اخلاق کو اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب گردش روزگار کے کرشمے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ان کا نظریہ یہ تھا تو قرآن کے اس تاریخی نقطۂ نظر پر ان کو غصہ آنا ہی تھا اور ان کا یہ غصہ اور بھی بڑھ جاتا تھا جب وہ یہ دیکھتے کہ بہت سے لوگ اس تاریخی حقیقت سے اثر پذیر ہو کر یہ اندیشہ بھی کرنے لگے ہیں کہ اگر انھوں نے پیغمبر اور قرآن کی بات نہ مانی تو وہ عذاب کی گرفت میں آجائیں گے۔ اس جھلاہٹ میں وہ یہ کہتے کہ 'اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ' یہ قرآن ہے کیا، بس اس میں پچھلی قوموں کے کچھ لیے سروپا افسانے ہیں جن کو نعوذ باللہ ایک سرپھرا سناتا پھر رہا ہے۔ اس پر پچھلی کی آیت ۴۴ کے تحت مزید بحث آئے گی۔

حذف کا ایک اسلوب

'فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا' یہاں تمنی کا جواب 'فنصدق' یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے اور 'وَلَا نُكَذِّبَ' اسی محذوف پر معطوف ہے اس وجہ سے مضارع منصوب کی شکل میں آیا ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں اس سے پہلے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔ مثالیں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، چونکہ مذکورہ بالا تمنا کے جواب میں فنصدق یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا آنا بالکل واضح تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا اور 'ولا نکذب' میں جو حرف عطف ہے اس کے ذریعہ سے محذوف کا پتا دے دیا۔ 'ولا نکذب' کے اظہار میں جو بلاغت ہے وہ یہ ہے کہ اس سے ان کی حسرت کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور اعتراف جرم کا بھی۔ یعنی آج تو یہ اکڑ رہے ہیں اور قرآن کو ایک داستان پارینہ قرار دے رہے ہیں لیکن کل حسرت کریں گے کہ کاش ہم پھر دنیا میں جائیں کہ اپنے رب کی آیات کی تصدیق کریں اور ان کی تکذیب نہ کریں۔

اجزائے کلام کی وضاحت کے بعد ایک اجمالی نظر ان آیات پر پھر ڈال لیجیے۔

قرآن کی تکذیب کرنے والے سرہنگوں کا انجام

اوپر آیات ۲۱-۲۴ میں شرک کے سرغنوں کا انجام واضح کیا گیا تھا، زیر بحث آیات میں قرآن کی تکذیب کرنے والے سرہنگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ ان کے کچھ اشرار تمھاری باتیں اور تمھارا پیش کردہ کلام سنتے تو ہیں لیکن سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے نہیں بلکہ بحث و جدال کے لیے کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس کو بہانہ بنا کر تم سے کٹ حجتی کر سکیں۔ ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر ان کی بداعمالیوں کے سبب سے مہر ہو چکی ہے اس وجہ سے اب یہ اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ نہ خیال کرو کہ ان کی طلب کے مطابق اگر ان کو معجزہ دکھا دیا جائے تو اس کو مان لیں گے اور پھر اس قرآن پر ایمان لائیں گے۔ نہیں، اگر یہ دنیا جہان کے

معجزے بھی دیکھ لیں گے جب بھی یہ اسی طرح کٹ حجتی کریں گے اس لیے کہ ان کے انکار اور ان کی تکذیب کی اصل علت جب بھی باقی رہے گی۔ ان کے اندر بات کے سننے اور سمجھنے کا کوئی ارادہ ہی موجود نہیں ہے چنانچہ سب کچھ سن کر تمھارے پاس جھگڑنے کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں اس قرآن میں رکھا ہی کیا ہے، اگلوں کی داستانیں اور پچھلوں کے فسانے!! فرمایا کہ اس طرح یہ دوسروں کو بھی اس سے روک رہے ہیں اور خود بھی اس سے متکبرانہ اعراض کر رہے ہیں لیکن اطمینان رکھو، نہ یہ خدا کا کچھ بگاڑ رہے ہیں نہ تمھارا، بلکہ یہ اپنے آپ ہی کو ہلاکت کے گڑھے میں جھونک رہے ہیں لیکن ابھی چونکہ وہ انجام ان کے سامنے نہیں آیا ہے جس سے ان کو خبردار کیا جا رہا ہے اس وجہ سے ان کو اس کا احساس نہیں ہے۔ اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب یہ اپنے انجام سے دوچار ہوں گے تو دیکھتے کہ جب یہ دوزخ کے کنارے پر کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے، اے کاش ہم پھر دنیا میں لوٹائے جائیں کہ قرآن کی تصدیق کریں اور اپنے رب کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں اور اہل ایمان میں سے بنیں۔ فرمایا کہ وہ اپنے اس اعتراف میں بھی جھوٹے ہیں۔ اگر وہ پھر لوٹائے جائیں تو وہی کریں گے جس سے وہ روکے گئے ہیں اس لیے کہ ان کی تکذیب کی علت یہ نہیں تھی کہ اصل حقیقت ان پر واضح نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ پیغمبر سچا ہے، قرآن حق ہے، جزا و سزا شدنی ہے لیکن حُبِّ دنیا، غرور اور حسد کے حجابات نے ان کی آنکھیں کھلنے نہ دیں۔ اب اگر دنیا میں جائیں گے تو جس طرح دل کی شہادت کے خلاف پہلے حق کو جھٹلاتے رہے ہیں اسی طرح پھر اس کو جھٹلائیں گے اور اس مشاہدے کو بھی زیادہ سے زیادہ ایک ڈراؤنا خواب قرار دے لیں گے۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ؕ
قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ قَدْ
خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا
فَرَّطْنَا فِیْهَا ۙ وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ۝ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ
لَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۹-۳۲)

قیامت کو جھٹلانے والوں کا انجام

ان آیات میں کوئی ادبی یا نحوی اشکال نہیں ہے۔ مکذبین قرآن کے بعد اب یہ مکذبین قیامت کا انجام بیان کیا جا رہا ہے جو اس دنیا کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے تھے اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے یا تو قائل ہی نہ تھے یا اس کو بہت ہی بعید از قیاس و امکان چیز سمجھتے تھے۔ فرمایا کہ اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے تو دیکھتے کہ ایک دن یہ سب اپنے رب کے حضور لا کھڑے کیے جائیں گے اور ان سے سوال ہوگا کہ کیوں یہ دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اور قیامت کا آنا ایک امر واقعہ ثابت ہوا یا نہیں؟ اس وقت وہ کہیں گے ہاں ہمارے رب کی قسم! یہ تو ایک امر واقعہ ہے۔ حکم ہوگا کہ پھر اب اس دن کے انکار کی پاداش میں چکھو مزا عذاب کا۔ اس کے بعد مکذبین کو تنبیہ کے ساتھ اہل ایمان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ جن شامت زدوں نے

اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا وہ سخت گھاٹے میں پڑے، جب قیامت کی گھڑی اچانک آ دھمکے گی تو یہ حسرت سے اپنے سر پیٹیں گے اور کہیں گے ہم نے دنیا کی زندگی پر ریجھ کر اس دن کی تیاریوں میں جو کوتاہی کی اس پر افسوس! فرمایا کہ اس دن ان کی تصویر یہ ہوگی کہ سب اپنے اپنے گناہوں کے بوجھ اپنی اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوں گے۔ نہ ان کے ساتھ ان کے اعوان و انصار ہوں گے نہ شرکا و شفعا۔ نفسی نفسی کا عالم۔ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (کوئی جان بھی کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہ بنے گی) پھر آگاہی دیتے ہوئے فرمایا کہ کیا ہی برا ہوگا وہ بوجھ جس کو یہ اٹھائے ہوئے ہوں گے اس لیے کہ یہ بوجھ ان کے سروں سے پھر کبھی اترنے والا نہیں۔ اس کے بعد آخرت سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرنے والوں کے لیے تسلی کا پہلو اور زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ فرمایا کہ دنیا کی زندگی جس نے انھیں آخرت سے غافل کر دیا ہے کیا ہے؟ محض بے نتیجہ لہو و لعب، چند روزہ دل کا بہلاوا! اصل شے تو دار آخرت اور اس کی زندگی ہے جو آخرت سے ڈرنے والوں کے لیے اس دنیا کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ پس کیا تم سمجھتے نہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۳-۵۰

پیغمبر صلعم کو تسلی

اوپر کا مجموعہ آیات، جیسا کہ آپ نے دیکھا، تسلی کے مضمون پر ختم ہوا ہے۔ اب وہی تسلی کا مضمون آگے بڑھ رہا ہے البتہ اس تسلی میں کچھ تیزی بھی آگئی ہے، اگرچہ یہ تیزی، جہاں تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا تعلق ہے، اپنے اندر نہایت دلنواز ٹھنڈک رکھتی ہے اس لیے کہ اس میں عتاب و غضب کا جو پہلو ہے اس کا رخ تمام تر ان ہٹ دھرم منکرین کی طرف ہے جو در پے تھے کہ پیغمبر کوئی معجزہ دکھائیں تب وہ مانیں گے کہ یہ پیغمبر ہیں اور جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں یہ خدا کا کلام و پیغام ہے۔ قدرتی طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اور عام مسلمانوں پر بھی ان کے اس مطالبے کا اثر پڑتا تھا۔ خاص طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو سراپا رافت و رحمت تھے اور اپنی قوم کے ایمان کے لیے اپنے اندر نہایت گہری تڑپ رکھتے تھے اس مطالبے سے متاثر ہو کر اس بات کے خواہش مند ہو جاتے تھے کہ ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ ظاہر ہو جائے، شاید یہ اس طرح ایمان لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی کہ ان کا یہ مطالبہ تمھارے لیے وجہ پریشانی نہ بنے۔ یہ تمھاری تکذیب نہیں بلکہ آیات الٰہی کی تکذیب ہو رہی ہے تو جب خدا سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے اور ان کا مطالبہ پورا کرنے کی قدرت کے باوجود، پورا نہیں کر رہا ہے تو تم کیوں پریشان ہو۔ تم سے پہلے جو انبیا آئے ان کی بھی اسی طرح تکذیب ہوئی، انھوں نے برداشت کیا اسی طرح تم بھی برداشت کرو۔ سنت الٰہی یہی ہے۔

اس کے بعد نہایت تیکھے انداز میں فرمایا کہ اگر اللہ جبر و زور ان کو ایمان کی راہ پر لانا چاہتا تو سب

کو آن کے آن میں مومن و مسلم بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے یہی پسند فرمایا کہ لوگ اپنی عقل و فہم سے کام لیں اور اپنے اختیار و ارادہ سے ایمان کی راہ اختیار کریں تو تم ان کے ایمان کی خواہش سے مغلوب ہو کر کیوں اس بات کے لیے بے قرار ہوتے ہو کہ لازماً کوئی ایسا معجزہ ظاہر ہو ہی جائے جو ان کو قائل کر کے خدا کے آگے جھکا ہی دے۔ خدا تو یہ بات نہیں چاہتا۔ تم اگر چاہتے ہو تو آسمان و زمین جہاں سے ہو سکے اس طرح کا معجزہ لا کر دکھا دو۔

اس کے بعد بتایا کہ کن صفات کے لوگ ایمان لائیں گے، کن صفات کے لوگ معجزے ہی مانگتے رہیں گے۔ پھر ان کے مطالبہ کے مطابق معجزہ نہ بھیجنے کی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا اور اس کائنات میں قدرت کے جو بے شمار معجزات ہیں اور اللہ نے اپنی کتاب میں جو دلائل و براہین بیان فرمائے ہیں ان کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ جو لوگ ان چیزوں سے آنکھیں بند کیے ہوتے ہیں وہ گونگے بہرے اور اندھے ہیں۔ ان کی آنکھیں کوئی چیز بھی نہیں کھول سکتی۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر یہ لوگ کوئی نشانیٔ عذاب مانگتے ہیں تو ان سے پوچھو کہ اگر کوئی عذاب آیا یا قیامت ہی آگئی تو اس سے بچاؤ کا کیا سامان انھوں نے کر رکھا ہے؟ اس وقت تو خدا خدا ہی پکاریں گے۔ اس سلسلے میں انبیاء اور ان کی قوموں کی تاریخ کی طرف اشارہ فرمایا کہ ان قوموں کو ہم نے اپنی اس طرح کی نشانیاں دکھائیں لیکن انھوں نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تباہ کر دی گئیں۔ اسی طرح اگر یہ کسی ظاہری یا باطنی پکڑ میں آگئے تو اس سے ان کو خدا کے سوا کون بچانے والا بنے گا؟

آخر میں انبیاء کا فریضۂ منصبی بتا دیا کہ ان کا کام انذار و تبشیر ہے نہ کہ معجزے اور عذاب کی نشانیاں دکھانا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرا دیا کہ نہ میں خدا کے خزانوں کا مالک ہوں، نہ غیب جانتا ہوں، نہ فرشتہ ہونے کا مدعی ہوں، بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو خدا کی طرف سے مجھ پر آتی ہے جس کا جی چاہے اس کو مانے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر بہر حال ثابت ہے کہ خدا کے ہاں اندھے اور ڈھٹیارے دونوں ایک درجہ میں نہیں ہوں گے ــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۳۳-۵۰

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ
وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ
رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ
نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی

الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٣٤﴾ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ
اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ
النصف وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٣٥﴾
وقف غفران اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ
وقف منزل اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ
عند البعض لا يسمعون رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ
بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ
ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ
بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ
عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٣٩﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ
اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٤٠﴾
بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ
ع ١١ ١٠ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿٤٠﴾ ع وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ
بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿٤٢﴾ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ
بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٤٣﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ
اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً

فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ وَالْحَمْدُ
لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ
اَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ۭ
اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ
اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ
فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾
وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾
قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ
لَكُمْ اِنِّىْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي
٥ ع ٩ ١١ الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾

ترجمۂ آیات ۳۳-۵۰

ہم آگاہ رہے ہیں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے تم کو غم ہوتا ہے تو صبر کرو، یہ تو تمھیں نہیں جھٹلا رہے ہیں بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا تو انھوں نے جھٹلائے جانے اور ایذا دیے جانے پر صبر کیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آگئی۔ اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور پیغمبروں کی کچھ سرگزشتیں تو تمھیں پہنچ ہی چکی ہیں۔ ۳۳-۳۴

اور اگر ان کا اعراض تم پر گراں گزر رہا ہے تو اگر تم زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی زینہ ڈھونڈ سکو کہ ان کے پاس کوئی نشانی لا دو تو کر دیکھو۔ اگر اللہ چاہتا تو

ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا تو تم جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔ بات تو وہی مانیں گے جو سنتے سمجھتے ہیں، رہے یہ مُردے تو اللہ ان کو اٹھائے گا پھر یہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ ۳۵-۳۶

اور یہ کہتے ہیں، اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی نشانی اتار دے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور کوئی جانور نہیں جو زمین پر چلتا ہو اور کوئی پرندہ نہیں جو فضا میں اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتا ہو مگر یہ سب تمہاری ہی طرح اُمتیں ہیں۔ اور ہم نے اپنی کتاب میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے پروردگار کے حضور اکٹھے کیے جائیں گے۔ اور جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا یہ بہرے اور گونگے تاریکیوں میں پڑے ہُوئے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔ ۳۷-۳۹

کہہ دو، بتاؤ، اگر تم پر اللہ کا عذاب آجائے یا قیامت آدھمکے تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو؟ بلکہ اسی کو پکارو گے تو وہ دُور کر دیتا ہے اس مصیبت کو جس کے لیے تم اس کو پکارتے ہو اگر چاہتا ہے اور جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ان کو بھول جاتے ہو۔ ۴۰-۴۱

اور ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سی اُمتوں کے پاس اپنے رسول بھیجے پس ان کو مالی اور جسمانی تکالیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ خدا کے آگے جھکیں تو کیوں جب ہماری پکڑ آئی وہ خدا کی طرف نہ جھکے بلکہ ان کے دِل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کی نگاہوں

ہیں اسی عمل کو کھبا دیا جو وہ کرتے رہے تھے تو جب انھوں نے فراموش کر دیا اس چیز کو جس سے ان کو یاددہانی کی گئی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے یہاں تک کہ جب وہ اس چیز پر اترانے لگے جو انھیں دی گئی تو ہم نے ان کو دفعۃً پکڑ لیا، وہ بالکل ہک دک رہ گئے۔ پس ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کا ارتکاب کیا۔ اور شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے تمام عالم کا رب! ۴۵

کہو، بتاؤ، اگر اللہ تمھارے سمع و بصر کو سلب کر لے اور تمھارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو اس کو واپس لا دے، دیکھو کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں، پھر بھی وہ اعراض کر رہے ہیں۔ پوچھو، بتاؤ کہ اگر اللہ کا عذاب تم پر بے خبری میں اچانک آ دھمکے یا ڈنکے کی چوٹ آئے تو ظالموں کے سوا اور کون ہلاک ہوگا؟ اور ہم رسولوں کو تو صرف خوش خبری دینے والے اور خبردار کرنے والے ہی بنا کر بھیجتے ہیں تو جو ایمان لائے اور جنھوں نے اصلاح کر لی تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم ہوگا۔ اور جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ان کی نافرمانی کی پاداش میں ان کو عذاب پکڑے گا۔ ۴۶-۴۹

کہہ دو، میں تمھارے سامنے یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں. اور نہ میں غیب جانتا اور نہ یہ دعویٰ کرتا کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ کہہ دو، کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟ ۵۰

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ۝ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَإِ الْمُرْسَلِينَ (۳۳-۳۴)

زبان کا ایک اسلوب — کفار کے مطالبات سے بے اعتنائی کی حکمت

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ، بقرہ کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ جب مضارع پر اس طرح قد آتا ہے تو وہ پتہ دیتا ہے کہ یہاں فعل ناقص محذوف ہے۔ گویا قَدْ نَعْلَمُ اصل میں قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ ہے جس سے مضمون میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ یہ بات برابر خدا کے علم میں رہی ہے اور ہے۔ وہ اس سے کبھی بے خبر نہیں ہوا کہ جو کچھ یہ ہٹ دھرم منکرین و مکذبین کہتے ہیں اس سے تمھیں غم پہنچتا ہے۔ 'جو کچھ کہتے ہیں' سے مراد اسی طرح کی باتیں ہیں جن کی طرف آیت ۸ میں اشارہ گزر چکا ہے یا آگے آیات ۳۷، ۵۰ میں آ رہا ہے کہ اگر یہ خدا کے فرستادہ ہیں تو یہ کوئی معجزہ کیوں نہیں دکھاتے، ان پر ان کی صداقت کی منادی کے لیے کوئی فرشتہ کیوں نہیں اترتا، یہ آسمان سے براہ راست کوئی کتاب ما بین الدفتین اترتی کیوں نہیں دکھاتے، یہ کسی خزانے کے مالک کیوں نہ ہوئے، جس عذاب کے ڈراوے سنا رہے ہیں اس کا کوئی نمونہ کیوں نہیں دکھاتے، وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا کہ یہ سب باتیں ہم جانتے، دیکھتے، سنتے رہے ہیں تو پھر علم اور قدرت کے باوجود اگر ہم نے ان کا کوئی نوٹس نہیں لیا تو اطمینان رکھو ہم نے اسی میں حکمت اور بہتری سمجھی۔

نبی کے لیے تسلی کا ایک دلنواز پیرایہ

فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ' یہ تسکین و تسلی کا نہایت دلنواز جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے علم و قدرت کے باوجود ان کی ان خرافات کا کوئی نوٹس نہیں لیا تو تم بھی صبر کرو، یہ تمھاری تکذیب تو نہیں ہو رہی ہے بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس تمام خاکبازی اور اس تمام استہزا کے ہدف تنہا تمھی تو نہیں ہو، اصل ہدف تو ہم اور ہماری کتاب ہے، پھر تم اپنے دل کو آزردہ کیوں کرو، معاملے کو ہم پر چھوڑ دو۔ ساتھ ہی ان کے لیے 'ظالمین' کا لفظ استعمال کر کے یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ اس سے نقصان کسے پہنچ رہا ہے؟ خدا ہی کو؟ یہ بدقسمت اور نامراد لوگ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں، نہ تمھارا کچھ بگاڑ رہے ہیں، نہ خدا کا۔

نصرت الٰہی کے ظہور کے لیے سنت الٰہی

'وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ' یہ اسی تسکین و تسلی کے مضمون کی تائید و تقویت کے لیے اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور ان کی امتوں کے امتحان کے لیے پسند فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ کی براہ راست مدد سے ہمکنار ہونے کے لیے ابتلا و امتحان کے ایک طویل اور صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر خدا کی نصرت ظاہر نہیں

ہوتی۔ اس دوران میں ان انبیاء کی قوموں کی طرف سے برابر ان کی تکذیب ہوتی ہے۔ ان کو ہر قسم کی ایذائیں دی جاتی ہیں اور ہر پہلو سے ان کو زچ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طرح جو کچھ حق کے مخالفین کے اندر ہوتا ہے وہ بھی اُبھر کر باہر آجاتا ہے اور جو جوہر نبی اور اس کے ساتھیوں کے اندر ہوتا ہے وہ بھی نکھر کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ منکرینِ حق پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور نبی اور ان کے ساتھی سزاوار ہوتے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی مدد ظاہر ہو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی سنت ہے اور اللہ کی سنت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ تمام رسولوں کی سرگزشتیں اس سنت اللہ پر شاہد ہیں اور تمھیں ان سرگزشتوں کا کچھ حصہ سنایا بھی جا چکا ہے جس سے تم پر اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ جس طرح کے حالات سے انھیں گزرنا پڑا اسی طرح کے حالات سے تمھیں بھی گزرنا ہے۔

وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ ۚ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ۘ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (۳۵-۳۶)

'وَإِنْ كَانَ .... فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ' اس جملہ میں جواب شرط محذوف ہے اور فصیح عربی میں جواب شرط کا حذف ایک معروف بات ہے۔ قرآن میں اس کی نظیریں بہت ہیں۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔

نبی ہر پہلو سے کسوٹی ہوتا ہے

جہل کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں تفصیل کے ساتھ بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ عربی میں یہ لفظ علم اور حلم دونوں کے ضد کی حیثیت سے آتا ہے بلکہ اس کا غالب استعمال 'حلم' کے ضد کی حیثیت ہی سے ہے اسی وجہ سے اس کے معنی ہوتے ہیں جذبات سے مغلوب ہو جانا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی طہارتِ فطرت کے سبب سے جذباتِ نفس اور خواہشاتِ نفس سے تو کبھی مغلوب نہیں ہوتے لیکن جذباتِ خیر میں سے کسی جذبہ کا غلبہ ان پر بھی کبھی کبھی اتنا ہو جاتا ہے جو حدِ مطلوب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بجائے خود نہایت اعلیٰ بات ہے لیکن حضرات انبیا چونکہ معیار اور کسوٹی ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس پہلو میں بھی ان کو حدِ مطلوب سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ نبی کے اندر اس بات کی شدید آرزو ہوتی ہے کہ اس کی قوم ایمان لائے تاکہ وہ عذابِ الٰہی سے بچ جائے۔ یہ جذبہ نبی کی رافت و رحمت کی دلیل اور اس کی غیرتِ حق کی شہادت ہے لیکن یہ جذبہ بھی مطلوب اسی حد تک ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ کی اس سنت سے ہم آہنگ ہے جو لوگوں کے کفر و ایمان کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کی طرف آیت ۳۴ میں اشارہ گزرا۔ اگر اس حد سے اس کے آگے بڑھنے کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو اس سے روک دیتا ہے۔

'إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ وَالْمَوْتَىٰ ....' 'يَسْمَعُونَ' یہاں اپنے حقیقی معنی میں ہے یعنی جو سنتے

اور سمجھتے ہیں۔ جو سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں ان کا سننا اور نہ سننا دونوں برابر ہے۔ 'موتیٰ' سے مراد یہاں عقل اور دل کے مردے ہیں اس لیے کہ زندگی درحقیقت عقل اور دل ہی کی زندگی ہے۔ ع مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔

نبیؐ کے لیے محبت آمیز عتاب

ان آیات میں بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب ہے لیکن یہ عتاب بڑا محبت آمیز عتاب ہے اور اگر اس میں کوئی تلخی اور ترشی ہے تو اس کا رخ تمام تر ان ضدیوں اور ہٹ دھرموں کی طرف ہے جن کے ایمان کی آرزو پیغمبرؐ کے اندر اتنی شدید تھی کہ آپ ان میں سے کسی کو بھی ایمان سے محروم دیکھنے پر راضی نہ تھے اور چاہتے تھے کہ ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی نہ کوئی معجزہ دکھا ہی دیا جائے کہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ فرمایا کہ اگر ان کا ایمان نہ لانا تم پر اتنا ہی شاق گزر رہا ہے تو تم زمین کے اندر کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی تلاش کر کے ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ لا سکو تو لا دو۔ ہم تو معجزوں کے بل پر دلوں کے اندر ایمان اتارنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہم نے تو ایمان کے لیے جو راہ پسند کی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے کان، آنکھ اور عقل و ادراک کو استعمال کریں، آفاق و انفس کے دلائل پر غور کریں، پیغمبر کی باتیں سنیں، سوچیں اور سمجھیں اور اپنے اختیار و ارادہ سے ایمان کی راہ اختیار کریں۔ اگر جبر اور بزور لوگوں کو ہدایت پر جمع کر دینا ہوتا تو ہمارے لیے یہ کیا مشکل کام تھا۔ ہم چشم زدن میں سب کو ایمان و ہدایت کی راہ پر چلا دیتے۔ تو تم ان کے ایمان کی آرزو میں اتنے جذبات سے مغلوب نہ ہو جاؤ کہ اس باب میں جو اللہ کی حکمت اور سنت ہے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

اس کے بعد فرمایا کہ تمہاری دعوت تو وہی قبول کریں گے جو سننے سمجھنے والے ہیں اور جن کے دل زندہ ہیں، جو گونگے بہرے ہیں اور جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں ان کو بس اللہ کے حوالے کرو، جب یہ قیامت کو اٹھیں گے تو ان پر سارے حقائق کھل جائیں گے۔ ان کے پیچھے تم اپنے کو مبتلائے غم نہ کرو۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳۷-۳۹)

نشانی عذاب کا مطالبہ اور اس کا جواب

'وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ'، اس سے مراد یوں تو ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی بھی ہو سکتی ہے جن کا کفار کی طرف سے مطالبہ تھا لیکن قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان لوگوں کو جواب دیا جا رہا ہے جو کسی ایسی نشانی عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے جو یہ ثابت کر دے کہ اگر انھوں نے پیغمبر کی تکذیب کی تو ان پر عذاب آ جائے گا۔ آگے کی آیات سے بالتدریج یہ قرینہ خود بخود ابھر کر

سامنے آجائے گا اس وجہ سے دلائل کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سورہ میں بھی اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی کفار کا یہ مطالبہ اپنے اپنے زمانے کے پیغمبروں سے نقل ہوا ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ہم نے تمھاری تکذیب کی تو ہم پر عذاب آجائے گا تو اس عذاب کا کوئی نمونہ ہمیں دکھا دو جس کی دھمکی سنا رہے ہو بس اسی سے ہمارے اور تمھارے جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے گا۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ فرمایا کہ خدا تو اس طرح کا کوئی نشان دکھا دینے پر ہر وقت قادر ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں۔ "اکثر لوگ جانتے نہیں" بظاہر نہایت مجمل جواب ہے لیکن اس اجمال کے اندر بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ اس سے ایک تو یہ بات نکلتی ہے کہ یہ نادان اور مغرور لوگ اس طرح کی نشانی کے ظہور کے نتائج سے آگاہ نہیں۔ ان کے نزدیک یہ محض ایک کھیل تماشہ ہے حالانکہ یہ نشانی اگر ظاہر ہو گئی تو سب کی کمر توڑ کر رکھ دے گی۔ دوسری یہ کہ یہ خدا کی اس حکمت اور سنت سے واقف نہیں ہیں جو انبیا اور ان کے مکذبین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو فوراً پکڑ لے بلکہ وہ ان کو ایک خاص مدت تک مہلت دیتا ہے جس میں ان پر ہر پہلو سے خدا کی حجت پوری کر دی جاتی ہے۔ جب یہ حجت پوری ہو چکتی ہے تب خدا ان کو پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو پھر ان کو کوئی چھڑا نہیں سکتا۔ تیسری یہ کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ پیغمبر کی دھمکی جھوٹی ہے یا خدا کے ہاتھ ہی بے بس ہیں حالانکہ خدا سرکشوں کو جو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے تو اس وجہ سے کہ اس کی تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے۔ وہ رسی کتنی ہی دراز کر دے لیکن اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے قابو سے باہر نکل سکے۔ چوتھی یہ کہ یہ بدقسمت لوگ اس رحمت سے ناآشنا ہیں جو اس مہلت کے اندر مضمر ہے بشرطیکہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ رحمت میں سبقت کرتا ہے، غضب میں سبقت نہیں کرتا۔ وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ وہ توبہ اور اصلاح کے دروازے اس وقت تک کھلے رکھتا ہے جب تک بندے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے خود ان کو اپنے اوپر بند نہ کر لیں۔

حذف کے بعض اسلوب — وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ۔ اس ٹکڑے میں حذف کا وہی اصول ملحوظ ہے جو سورۂ نسار کی آیت ۴۱ میں ہے۔ یعنی جملے میں متقابل کے بعض الفاظ حذف ہو گئے ہیں اس لیے کہ مذکور محذوف پر خود دلیل بن گیا ہے۔ مثلاً جملہ کے پہلے حصہ میں فِی الْاَرْضِ کا لفظ ہے تو دوسرے حصے میں فِی السَّمَآءِ کا لفظ حذف ہو گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے حصے میں یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ کے الفاظ ہیں تو پہلے حصے میں تَدِبُّ عَلٰی رِجْلَیْهَا یا عَلٰٓی اَرْجُلِهَا کے الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ فصیح عربی میں اس طرح کا حذف معروف ہے لیکن اردو میں یہ اسلوب نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک اس طرح کے مواقع میں محذوف کو کھول دینا زیادہ بہتر ہے ورنہ بات تو پوری بات ادا نہیں ہو پاتی یا جملہ کا

درد ولیت ٹھیک نہیں ہوتا چنانچہ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔

آفاق کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ کے الفاظ تو بظاہر نہایت مجمل ہیں لیکن غور کیجیے تو ان میں بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ نشانیاں مانگنے والوں کو یہ آفاق کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم کوئی ایک نشانی مانگتے ہو، خدا کی تو یہ پوری کائنات نشانیوں سے بھری پڑی ہے، زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور فضا میں اڑنے والا ہر پرندہ خدا کی ایک نشانی ہے۔ غور کرو تو تم دیکھ سکتے ہو کہ جس طرح تمھارے انفرادی اور اجتماعی وجود کے اندر خدا کی قدرت، حکمت، ربوبیت کی بے شمار نشانیاں ہیں جو تم پر توحید، جزا و سزا اور پیغمبر کی دعوت کی صداقت کی گواہی دے رہی ہیں اسی طرح اس کائنات کی دوسری مخلوقات کے اندر بھی خالق کی قدرت حکمت اور ربوبیت کے دلائل موجود ہیں، جس طرح تم ایک نوع ہو اسی طرح یہ بھی الگ الگ نوعیں ہیں، جس طرح تم ایک فطرت رکھتے ہو، اسی طرح یہ بھی اپنی ایک مخصوص جبلت رکھتے ہیں، جس طرح تم شعور، ادراک اور جذبات رکھتے ہو اسی طرح اپنے جبلی تقاضوں اور اپنے منشائے تخلیق کے اعتبار سے یہ بھی اپنے اندر شعور، ادراک اور جذبات رکھتے ہیں، جس طرح تمھارے اجتماعی شعور نے تمھیں اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ تم اپنے آپ کو ایک سیاسی نظام کے اندر باندھ کر رکھو اسی طرح ان کی ہر نوع کے اندر بھی اپنی اجتماعی ہستی کا ایک شعور ہے جو انھیں آمادہ کرتا ہے کہ یہ ایک وحدت کے اجزا کی طرح اپنے اجتماعی وجود کے بقا و تحفظ کا سامان کریں اور اپنے نوعی مقصد تخلیق کی تکمیل میں ان کا ہر فرد اپنا حصہ ادا کرے۔

سورۂ نحل میں قرآن نے اسی حقیقت کے ثبوت میں، جس کی طرف یہاں اشارہ ہے، شہد کی مکھی کا ذکر فرمایا ہے اور اس کے نوعی نظام میں خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے جو آثار نمایاں ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آج سائنس نے حیوانات کی مختلف انواع کے جبلی خصائص و عجائب سے جو پردے اٹھائے ہیں یوں تو ان میں سے ہر انکشاف انسان کو حیران کر دینے کے لیے کافی ہے لیکن نہایت حقیر اور چھوٹی چیزوں میں سے شہد کی مکھی اور چیونٹی ہی کو لیجیے اور ان کا مشاہدہ کیجیے تو آپ کی عقل دنگ رہ جائے گی۔ ان کے اندر اولاد کی پرورش کا کیسا انتظام ہے، خطرات سے بچاؤ کے لیے کیسی بیداری ہے، مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیسی پیش بینی ہے، جماعتی فرائض کا کیسا شدید احساس ہے، کیسی اعلیٰ تقسیم کار ہے، کس درجہ مضبوط نظام امر و طاعت ہے، ضروریات کی فراہمی کے لیے کیسی انتھک سرگرمی ہے، رہائش اور اپنے ذخائر کی حفاظت کے لیے تعمیر کا کیسا کمال فن ہے، تلاش و جستجو کا کیسا عمیق جذبہ اور حصولِ مطلوب کے لیے کیسی زیرکی و ہوشیاری اور پھر کتنی جان بازی و قربانی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ وجود میں آگیا ہے اور اپنے ہی بل پر چل رہا ہے یا اس کے پیچھے کوئی خالق و مدبر ہے؟ اگر اس کے پیچھے کوئی خالق و مدبر ہے تو کیا وہ سب کچھ بنا کر ایک گوشہ میں بے تعلق ہو کر بیٹھ گیا ہے یا براہِ راست اس پوری کائنات کی حفاظت فرما رہا ہے، کیا یہ

سب کچھ کسی اندھی بہری قوت قاہرہ کا ظہور ہے یا کسی قادر و قیوم، علیم و حکیم اور رحمان و رحیم ہستی کی قدرت و رحمت کا فیضان ہے؟ کیا یہ مختلف ارادوں، متضاد قوتوں اور بے شمار دیویوں، دیوتاؤں کی ایک رزم گاہ ہے یا ایک ہی خدائے وحدہٗ لاشریک کی قدرت و حکمت اور اس کی رحمت و ربوبیت کی ایک جلوہ گاہ ہے؟ کیا یہ سارا کارخانہ بالکل بے مقصد، بے غایت اور بے انجام نظر آتا ہے یا اس کی ایک ایک چیز پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ اس کے پیچھے ایک عظیم غایت ہے جس کا ظہور قطعی اور یقینی ہے؟ کیا اس کے ظاہر و باطن سے یہ شہادت مل رہی ہے کہ انسان اس کے اندر شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ کھائے پیے، عیش کرے اور ایک دن ختم ہو جائے یا اس سے یہ شہادت مل رہی ہے کہ جس قادر نے یہ دنیا بنائی ہے، جس حکیم نے اس کے ایک ایک ذرے میں اپنی حکمت کی شان دکھائی ہے، جس رحیم نے اپنی ربوبیت و رحمت کے یہ خوانِ نعمت بچھائے ہیں وہ ایک دن سب کو ضرور اکٹھا کرے گا اور ہر ایک کی نیکی بدی کو ضرور تولے گا اور پھر اس کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرے گا۔

انسان کی فطرت اگر مسخ اور اس کی عقل اگر مفلوج نہ ہو گئی ہو تو وہ اس اعتراف پر مجبور ہے کہ ان سب باتوں میں سے دوسری ہی بات صحیح ہے۔ اگر یہی بات صحیح ہے اور بدیہی طور پر یہی صحیح ہے تو قرآن اسی کو ماننے کی دعوت دے رہا ہے۔ پھر اس کو ماننے کے لیے کسی معجزے کی کیا ضرورت ہے؟ اس حقیقت کی شہادت تو اس کائنات کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے۔ زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور فضا میں اڑنے والا ہر پرندہ اس کا گواہ ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کے اندر کی شہادتوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے تو باہر کی ان نشانیوں ہی کو آنکھیں کھول کر دیکھ لے جو نیچے بھی موجود ہیں اور اوپر بھی۔

قرآن دلائل کا خزانہ ہے

'مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ' میں عام طور پر لوگوں نے 'کتاب' سے وہ خدائی رجسٹر مراد لیا ہے جس میں سب کچھ مندرج ہے۔ اگرچہ یہ مفہوم لینے کی بھی گنجائش ہے لیکن سیاق و سباق کی روشنی میں ہمارا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ یہاں 'اَلْکِتٰب' سے مراد قرآن مجید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ کائنات ان نشانیوں سے مملو ہے جو پیغمبر کی دعوت کی حقانیت کی شاہد ہیں اسی طرح ہم نے قرآن میں بھی اپنے دلائل و براہین بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ایک ایک دعوے کو ایسے ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت کیا ہے اور اتنے مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے حجت قائم کی ہے کہ صرف عقل و دل کے اندھے اور بہرے ہی ان کے سمجھنے سے قاصر رہ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ 'ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ' کے الفاظ میں یہ لطیف تعریض ہے کہ جہاں تک نشانیوں اور دلائل کا تعلق ہے ان سے تو یہ صحیفہ کائنات بھی مملو ہے اور یہ صحیفۂ قرآن بھی معمور ہے لیکن جو کسی بات کو سمجھنا ہی نہ چاہیں ان کا کیا علاج؟ یہ تو اب اپنے رب کے سامنے جب حاضر کیے جائیں گے تب ہی آنکھیں کھولیں گے اور مانیں گے۔

قرآن کو جھٹلانے والوں کی مثال

'وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّبُکْمٌ فِی الظُّلُمٰتِ'، 'بِاٰیٰتِنَا' میں 'آیات' سے مراد

قرآن مجید کی آیات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کو جھٹلا رہے ہیں ان کی مثال ایسے گونگے اور بہرے لوگوں کی ہے جو گونگے بہرے ہونے کے ساتھ تاریکی میں گھرے ہوئے بھی ہیں، نہ سن سکتے ہیں نہ کسی کو پکار سکتے، نہ کسی پکارنے والے کی بات کا جواب دے سکتے، نہ کسی کے اشارے کو دیکھ سکتے، نہ کسی نشانی سے رہنمائی حاصل کر سکتے۔ ایسے اندھے بہرے لوگوں کا کیا علاج؟

ہدایت اس کو ملتی ہے جو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں

مَنْ يَشَإِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ الاية میں جیسا کہ ہم مختلف مواقع میں واضح کر چکے ہیں، اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت کسی کو ہدایت کی توفیق ملتی ہے اور کوئی گمراہی کا سزاوار قرار پاتا ہے۔ اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جو لوگ اپنی آنکھیں اور اپنے کان نہیں کھولتے خدا ان کے اندر زبردستی اپنی ہدایت نہیں اتارتا۔ خدا کی توفیق صرف ان کو سہارا دیتی ہے جو راہِ حق پر چلنے کا خود ارادہ کرتے ہیں اور خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں۔

اجزا کی اس تشریح سے آیات کا مفہوم اور نظم خود بخود واضح ہو گیا ہے۔ سورہ نحل میں یہ مضمون مختلف پہلوؤں سے زیر بحث آئے گا۔ اس وجہ سے ہم یہاں اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

قُلْ أَرَءَيْتَكُمْ إِنْ أَتَىٰكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُونَ ۚ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ۝ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ (۴۰-۴۱)

أَرَءَيْتُمْ اور أَرَءَيْتَكُمْ کا محل استعمال اور مفہوم ایک ہی ہے۔ چنانچہ آگے آیت ۴۶ میں بالکل اسی محل میں أَرَءَيْتُمْ آیا ہے۔

توحید کی ایک نفسی دلیل

یہ مطالبۂ نشانیِ عذاب کا جواب بھی ہے اور انسانی فطرت کے ایک خاص پہلو سے توحید کی ایک ناقابلِ تردید انفسی دلیل بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے کہو کہ اس طنطنہ کے ساتھ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اس کے مقابلہ یا اس سے بچاؤ کا کیا سامان کر رکھا ہے؟ کون سی ناقابلِ تسخیر دفاعی لائن تم نے بنا لی ہے کہ اس زعم کے ساتھ خدا کو چیلنج کر رہے ہو؟ فرض کرو جس عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو خدا وہی بھیج دیتا ہے یا جس قیامت سے تمھیں خبردار کیا جا رہا ہے وہی آدھمکتی ہے تو کون ہے جس کو اپنی مدد کے لیے پکارو گے؟ کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے جس کو پکارو گے اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ اس کے کچھ دوسرے شریک بھی ہیں؟ فرمایا کہ تمھارا یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔ اگر ایسا وقت آ گیا تو تم خدا کے سوا سب کو بھول جاؤ گے اور صرف اسی کو پکارو گے اور وہی ہے جو اس مصیبت کو اگر چاہے گا تو دور کرے گا۔

اوپر والی آیات میں جیسا کہ ہم نے بیان کیا، توحید کے آفاقی دلائل کی طرف اشارہ تھا، یہاں توحید کی اس انفسی دلیل کی طرف اشارہ ہے جو قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ اس دلیل کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ انسان کی اصل فطرت میں چونکہ ایک ہی خدا کی شہادت موجود ہے، دوسرے اصنام و الٰہ، جن کو وہ مانتا ہے، ان کی کوئی شہادت اس کی فطرت کے باطن میں موجود نہیں ہوتی بلکہ وہ محض خیالی

ہوتے ہیں، اس وجہ سے جب اس کی زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ آ جاتا ہے جو اصل آزمائش کا ہوتا ہے تو انسان اپنے ان تمام فرضی سہاروں کو بھول جاتا ہے، صرف اسی خدا کو پکارتا ہے جس کی شہادت وہ اپنی فطرت میں پاتا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو نہایت دل آویز تمثیلوں اور نہایت حقیقت افروز دلائل سے واضح کیا ہے۔ آگے یہ ساری چیزیں زیر بحث آئیں گی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔[۱]

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ ۝ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم
بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ
فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ ۝ فَقُطِعَ
دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۴۲-۴۵)

کسی قوم پر عذاب بھیجنے کے معاملہ میں سنت الٰہی

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ ... الآیۃ۔ تضرع کے معنی تذلل کے ہیں یعنی خضوع و خشوع اور احساس عجز و فروتنی کے ساتھ کسی کی طرف جھکنا۔ یہاں یہ لفظ دل کی خشیت اور احساس عبدیت و انابت کے ساتھ خدا کی طرف جھکنے کے لیے آیا ہے۔ اس کا مقابل لفظ 'قساوت' استعمال ہوا ہے جو دل کی سختی، بے خوفی اور رعونت کی تعبیر کے لیے قرآن کا معروف لفظ ہے۔

اب یہ ایک سنت اللہ بیان ہوتی ہے جس سے ایک طرف تو یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ کسی قوم پر جس میں اللہ تعالیٰ اپنا رسول بھیجتا ہے، عذاب بھیجنے کے معاملے میں وہ کیا طریقہ اختیار فرماتا ہے، دوسرے اس تاریخی شہادت کو سامنے لانا ہے کہ جس قوم نے بھی ایمان لانے کی شرط نشانیٔ عذاب کو ٹھہرایا اس کو ایمان کی سعادت حاصل نہیں ہوئی بلکہ بالآخر عذاب ہی کے ذریعہ سے اس کی جڑ کاٹ دی گئی۔ فرمایا کہ تم سے پہلے (خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) ہم نے بہت سی قوموں کے پاس اپنے رسول بھیجے تو ان کو مختلف قسم کی مالی و جسمانی مصیبتوں میں مبتلا کیا تاکہ ان کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہو اور وہ سوچیں کہ اگر انھوں نے نبی کی بات نہ مانی تو بالآخر خدا کی فیصلہ کن پکڑ آ جائے گی اور وہ تباہ کر دیے جائیں گے لیکن دیکھو تاریخ شاہد ہے کہ بجائے اس کے کہ ان خدائی تنبیہات سے ان کے دل کچھ نرم پڑتے وہ اور زیادہ سخت ہو گئے اور جن بداعمالیوں میں وہ مبتلا تھے شیطان نے ان کو ان کی نگاہوں میں اس طرح کھبا دیا کہ وہ ان سے باز آنے کے بجائے ان میں کچھ اور دلیر ہو گئے۔

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ، مَا ذُكِّرُوا بِهِ کے معنی ہوں گے جس چیز کے ذریعے ان کو یاددہانی کی گئی۔ یہاں اس سے اشارہ اسی باساء و ضراء یعنی مالی و جسمانی مصائب کی طرف ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اس لیے مبتلا کیا کہ وہ چونکیں کہ اگر انھوں نے پیغمبر کی بات نہ مانی تو ان تنبیہات کے بعد

۱؎ تفصیل کے طالب ہماری کتاب 'حقیقت شرک و توحید' حصہ توحید میں 'توحید کے نفسی دلائل' کا باب پڑھیں۔

اب آگے فیصلہ کن عذاب ہی کا مرحلہ ہے لیکن ان سے یہ سبق لینے کے بجائے انھوں نے ان کے گزر جانے کے بعد ان کو نظر انداز کر دیا کہ قوموں کی زندگی میں اس طرح کے حوادث تو پیش آیا ہی کرتے ہیں، قحط، سیلاب، طوفان، وبا اور امراض سے کس قوم کو سابقہ نہیں پیش آیا ہے۔ قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ اس طرح کے نرم و گرم حالات تو ہمارے اگلوں کو بھی پیش آ چکے ہیں۔ پھر یہ کیوں فرض کیا جائے کہ یہ کسی شخص کی تکذیب کا نتیجہ ہے۔

فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً۔ اب یہ مذکورہ بالا سنۃ اللہ کا آگے کا مرحلہ بیان ہو رہا ہے جس کو قرآن کے دوسرے مقامات میں 'امہال' یعنی ڈھیل دینے سے تعبیر فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب پیغمبر کی تکذیب کرنے والے خدا کی تنبیہات کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو خدا ان کی رسی دراز کر دیتا ہے، ان کی تمام مطلوبات کے دروازے ان پر کھول دیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنی کامیابیوں پر مگن ہونے، اترانے اور اکڑنے لگتے ہیں۔ یہ وقت ان کے پیمانہ کے لبریز ہو جانے کا ہوتا ہے۔ اس وقت خدا دفعۃً ان کو پکڑتا ہے پھر وہ بالکل مایوس اور ششدر ہو کے رہ جاتے ہیں۔ 'ابلاس' کے لفظ پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔

کسی قوم کی جڑ کب کٹتی ہے؟

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، 'دابر' کے معنی اصل اور جڑ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب مکذبین رسول اپنی بدبختی کی اس حد کو پہنچ جاتے ہیں تب ایسے ظالموں کی خدا جڑ کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے کہ اس سے پہلے اس طرح کے مجرموں پر ابتلا کے جو جھونکے آتے ہیں ان سے ان کے شجر ہستی کے صرف برگ و بار متاثر ہوتے ہیں اور وہ بھی وقتی طور پر، ان کی جڑ محفوظ رہتی ہے لیکن جب یہ وقت آ جاتا ہے تو خدا ان پر عذاب بھیجتا ہے جو ان کے وجود قومی ہی کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے پھینک دیتا ہے اس لیے کہ جو درخت زہریلا ہو چکا اور اب صرف زہریلے ہی پھل دے رہا ہے اس کا باقی رہنا اس دنیا کی مصلحت کے خلاف ہے جو اس کے رحمان و رحیم خالق و مالک نے اپنی رحمت اور اپنے عدل کے ظہور کے لیے بالحق پیدا کی ہے۔ وہ عالم کا رب ہے۔ رب کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے چمن میں ایک ایسے درخت کو جگہ گھیرے رکھنے کے لیے چھوڑ دے جس کی زہریلی ہوا اور جس کے مسموم برگ و بار پورے چمن کو غارت کر کے رکھ دیں۔ پس حمد و شکر کا سزاوار ہے وہ رب العالمین جو ایسی نابکار قوموں کی جڑ کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔

اجزا کی تشریح کے ذیل میں آیات کا نظم اور مدعا واضح ہو گیا ہے البتہ جس سنت اللہ کا یہاں حوالہ ہے اس کی تاریخی شہادت کی طرف یہاں صرف اشارہ ہے، اس کی تفصیل نہیں آئی ہے۔ یہ تفصیل آگے والی سورہ — اعراف — میں آئے گی جو اس سورہ کے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں عرب کی پچھلی معذب قوموں کی تاریخ بیان ہوئی ہے جس سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان قوموں نے بھی

اپنے اپنے رسولوں سے عذاب کی نشانیوں کا مطالبہ کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو نرم کرنے اور ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ان کو مختلف مالی و جسمانی آزمائشوں میں مبتلا کیا لیکن انھوں نے ان سے سبق لینے کے بجائے ان کو اتفاقی حوادث پر محمول کر کے بالکل نظر انداز کر دیا۔ ان کی اس سرکشی کے بعد خدا نے ان کو پوری ڈھیل دے دی۔ ہر راہ میں ان کو کامیابی ہی کامیابی نظر آنے لگی۔ شیطان نے ان کو پٹی پڑھائی کہ جس راہ پر چل رہے ہو یہی کامیابی کی راہ ہے، شاباش، آگے بڑھے چلو۔ بالآخر جب ان کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آنے لگا اور کامیابیوں کے نشہ نے ان کو بدمست کر دیا تو دفعۃً خدا کے عذاب نے ان کو آ دبوچا اور ان کا سارا نشہ ہرن ہو گیا ـــــ مطلب یہ ہے کہ یہی مرحلہ تمھارے جھٹلانے والوں اور تم سے عذاب کی نشانی مانگنے والوں کو بھی درپیش ہے۔ اگر انھوں نے حالات سے سبق نہ لیا تو وہی تاریخ یہ بھی دہرائیں گے تم مطمئن رہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ (۴۶-۴۷)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ الاية، صَدَفَ يَصْدِفُ، صدفٌ کے معنی کسی چیز سے اعراض و انحراف اختیار کرنے اور اس سے رک رہنے کے ہیں۔

مطالبۂ عذاب کا جواب ایک اور پہلو سے

یہ اسی مطالبۂ عذاب کا جواب ایک دوسرے پہلو سے ہے۔ اوپر فرمایا تھا کہ اگر خدا تم پر کوئی ارضی یا سماوی آفت بھیج دے تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ اب ارشاد ہوا کہ اگر خدا تمھیں کسی عقلی، باطنی اور روحانی عذاب میں گرفتار کر دے تو بھی تمھیں کوئی بچانے والا نہیں۔ ابھی تو تمھارے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوتیں زندہ ہیں لیکن تم ان سے کام نہیں لے رہے ہو۔ اگر خدا تمھارے سمع و بصر کو سلب کر لے اور تمھارے دل پر ٹھپہ لگا دے تو بتاؤ اللہ کے سوا کون ہے جو تمھاری ان صلاحیتوں اور قوتوں کو پھر بحال کر سکے؟ پھر فرمایا، یہ تو ایک نشانی مانگ رہے ہیں۔ دیکھو ہم اپنی آیتیں کتنے گوناگوں پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں لیکن یہ سننے اور سمجھنے کے بجائے بدستور اعراض ہی کیے جا رہے ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً الاية، بَغْتَةً کے معنی کسی چیز کے اچانک، دفعۃً، بغیر کسی نوٹس کے، بالکل بے خبری میں آ جانے کے ہیں۔ جَهْرَةً کے معنی ہیں کھلم کھلا، ڈنکے کی چوٹ، دن دہاڑے۔ مطلب یہ ہے کہ نشانی عذاب کا مطالبہ تو یہ کر رہے ہیں، ان سے پوچھو کہ خدا کا عذاب چپکے سے یا کھلم کھلا دن دہاڑے آنے، اول تو اس کو روکے گا کون، پھر ان سے یہ پوچھو کہ یہ بجلی گری تو کن پر گرے گی، انھی ظالموں پر تو گرے گی جو اپنی شامت سے اس کو دعوت دے رہے ہیں اور جو اپنی بداعمالیوں سے اس کے سزاوار ہیں یا کسی اور پر؟

فیصلہ کن عذاب کے بارے میں سنت الٰہی

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ اس سے مراد وہ عذاب ہے جو انبیاء کی تکذیب کرنے والی قوم پر اتمام حجت کے بعد آتا ہے۔ اس عذاب کے معاملے میں سنت اللہ یہ ہے کہ نبی کے جھٹلانے والے ہلاک کر دیے جاتے ہیں اور اہل ایمان بچا لیے جاتے ہیں۔ رہی وہ آزمائشیں اور تکلیفیں جو تنبیہ و تذکیر کے لیے آتی ہیں، جن کا ذکر اوپر بَاْسَاء اور ضَرَّاء کے الفاظ سے گزرا ہے تو وہ اس امتیاز کے ساتھ نہیں آتیں بلکہ ان میں سب حصہ پاتے ہیں۔ البتہ اہل ایمان ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اہل کفر بدستور اپنی شرارت پر جمے ہی رہ جاتے ہیں بلکہ، جیسا کہ اوپر گزرا، اس سے کچھ اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۖ فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (۴۸-۴۹)

رسولوں کی بعثت کی اصل غایت

اب یہ اسی مطالبہ کے تعلق سے رسولوں کی بعثت کا اصل مقصد واضح فرما دیا کہ وہ عذاب کی نشانیاں دکھانے یا عذاب لانے یا خوارق و عجائب کی نمائش کرنے کے لیے نہیں بھیجے جاتے بلکہ وہ خدا کی رحمت کی خوش خبری دینے والے اور بصورت تکذیب و نافرمانی اس کے عذاب سے خبردار کر دینے والے بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔ خوش خبری کی وضاحت یوں فرما دی کہ فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (جو ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے رویہ کی اصلاح کر لی نہ ان کے لیے مستقبل میں کوئی اندیشہ ہے اور نہ ماضی کا کوئی غم) اور انذار کی تفصیل یوں فرمائی کہ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں گے ان کو ان کی نافرمانی کی پاداش میں خدا کا عذاب پکڑے گا) اس سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ اللہ کے رسول خدا کی رحمت کے مظہر ہوتے ہیں، عذاب ان کی بعثت کے مقاصد میں سے نہیں بلکہ ان کی تکذیب کے لوازم و نتائج میں سے ہے۔ دوسری یہ کہ رسولوں سے لوگوں کو چاہیے وہ چیز چاہیں جس کے لیے وہ آتے ہیں یعنی ایمان اور عمل صالح کی ہدایت نہ کہ وہ چیز جس سے وہ لوگوں کو بچانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ تیسری یہ کہ یہ خوارق و عجائب نہ رسولوں کے خصائص میں سے ہیں اور نہ ان کی تعلیم و دعوت کے لوازم میں سے بلکہ ان کا ظہور اگر ہوتا ہے تو محض اتمام حجت کے طور پر ہوتا ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ چوتھی یہ کہ اس میں رسول کے لیے پیام تسکین ہے کہ وہ اپنا تعلق اپنے اصل مقصد بعثت — بشارت اور انذار — سے رکھے، جو باتیں اس کے فرائض سے غیر متعلق ہیں ان کو خدا پر چھوڑے، بلا وجہ ان کے لیے پریشان نہ ہو۔

قُل لَّا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۚ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۚ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ (۵۰)

فیصلہ کن اعلان

اب یہ پیغمبر کی زبان سے اس باب میں ایک آخری اور فیصلہ کن اعلان کرا دیا کہ مجھ سے بحث کرنی ہے تو اس چیز پر کرو جو میں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں اور جس کا داعی ہوں۔ ان چیزوں پر کیوں جھگڑتے

ہو جن کا میں نے سرے سے کوئی دعویٰ ہی نہیں کیا؟ اگر میرے پاس خزانے نہیں ہیں تو میں نے کب کہا کہ میرے پاس خزانے ہیں؟ اگر میں یہ نہیں بتا سکتا کہ تم پر عذاب کب آئے گا یا قیامت کب آئے گی تو میں نے کب دعویٰ کیا کہ میں غیب جانتا ہوں؟ اگر میں فرشتہ نہیں ہوں تو میری زبان سے کب نکلا کہ میں فرشتہ ہوں؟ میں تو اس وحی کی پیروی کر رہا ہوں جو مجھ پر آئی ہے اور اسی کی دعوت تمہیں دے رہا ہوں۔ آخر میں ارشاد ہوا کہ ان سے پوچھو کہ اگر یہ ذرا بھی سوچنے سمجھنے والے ہیں تو یہ بتائیں کہ کیا خدا کے ہاں اندھے اور بینا یعنی آنکھیں کھول کر چلنے والے اور اپنی خواہشوں کے پیچھے اندھے ہو کر چلنے والے یکساں ہو جائیں گے؟ کیا اپنی عقل و بصیرت سے کام لینے والے اور اپنی عقلوں پر پٹی باندھ کر زندگی گزارنے والے برابر ہو جائیں گے؟ کیا نیکوکار اور بدکار دونوں کا انجام ایک ہی ہوگا؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور بالبداہت نفی ہی ہے تو یہی سورج سے زیادہ بدیہی حقیقت وہ وحی تمہارے سامنے پیش کر رہی ہے جس کی میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں تو اس پر تمہارا یہ معارضہ کیا معنی رکھتا ہے کہ میں تمہیں کوئی نشانی عذاب کیوں نہیں دکھاتا؟ میں آج تمہیں عذاب کی کوئی نشانی نہیں دکھاتا تو کیا اس سے جزا اور سزا کا وہ قانون باطل ہو گیا جس کی میں منادی کر رہا ہوں۔ خدا کے بندو، تم اس پر غور نہیں کرتے؟

۶۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۵۱-۵۵

آگے فرمایا کہ جو لوگ نشانیوں اور عذاب کے طالب و منتظر ہیں، ان کو تو تم (خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) ان کے حال پر چھوڑو۔ البتہ جن لوگوں کے اندر خوف خدا اور خوف آخرت ہے ان کو اس کتاب کے ذریعہ سے ڈراؤ جو تم پر وحی کی جا رہی ہے۔

پھر فرمایا کہ تمہاری شفقت و تربیت اور تمہاری توجہ و عنایت کے اصلی مستحق تو یہ غربائے مسلمین ہیں جو خدا کی رضا کے طالب ہیں اور جن کو دین کی طلب نے تمہارے ارد گرد جمع کر دیا ہے۔ رہے یہ مغرور و متمرد لوگ جو تم سے نشانیاں اور معجزے مانگتے اور اکڑتے پھر رہے ہیں تو تم نہ ان کی پروا کرو، نہ ان کے پیچھے اصلی حقداروں کے حقوق میں غفلت کرو اور نہ ان کے لیے تم غریب مسلمانوں کو اپنے سے دور کرو۔ یہ لوگ اس بات میں اپنی ہتک سمجھتے ہیں کہ ان غریبوں کے پہلو بہ پہلو تمہاری مجلس میں بیٹھیں یا تمہاری بات سنیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اگر تم ان کو اپنے سے قریب کرنا چاہتے ہو تو پہلے ان لوگوں کو اپنے سے دور کرو جو ان کے ہم سر نہیں ہیں اور جن کے پاس آنے میں ان کی سبکی ہے۔ تم ان کی اس رعونت کی ذرا حوصلہ افزائی نہ کرو۔ اگر وہ اپنے اس غرور کے سبب سے ایمان سے محروم رہتے ہیں تو اس کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ ان کی پرسش خدا کے ہاں تم سے نہیں ہونی ہے۔ اسی طرح جو مسئولیت تم پر ہے اس کا کوئی حصہ قیامت کے دن یہ اٹھانے والے نہیں بنیں گے کہ ان کے مطالبے پر تم اہل ایمان

کو اپنے سے دور کر کے اپنے سر ایک ظلم عظیم کی ذمہ داری لو۔

پھر فرمایا کہ ان مغروروں کے لیے ان کا مال و جاہ اور ان کا حسب و نسب ایک حجاب بن گیا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جب دنیا کی ساری سرفرازیاں ہمارا حصہ ہیں تو اگر یہ نیا دین اپنے اندر کوئی خیر کا پہلو رکھتا ہوتا تو کیا اس کے لیے خدا کو یہی لوگ ملے جن کو دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو صحیح سالم کپڑے بھی نصیب نہیں۔ ان ظالموں کو یہ پتہ نہیں کہ اس دنیا کے خزف ریزے تو خدا اہلوں اور نا اہلوں دونوں ہی کو دے دیتا ہے لیکن دین کی دولت گرانمایہ صرف اس کے شکر گزار بندوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

اس کے بعد ان غربائے مسلمین کی دلداری فرمائی تاکہ ان مغروروں کے اس طعن سے اگر ان کی کچھ دل شکنی ہوئی ہو تو اس کا اندمال ہو جائے۔ اس دلداری کے لیے خود خدائے رب العزت کی طرف سے جو سلام و پیام ان غریبوں کے نام آیا ہے اس کا ایک ایک حرف اپنے اندر زندگی جاوید کی خوش خبری اور دو عالم کون و مکان کی سرفرازی رکھتا ہے ــــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۱-۵۵ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ
دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ
حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ
فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ
لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ
بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ
عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ
سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ
ع ۶ ۱۲ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾ ع

ترجمۂ آیات ۵۱-۵۵

اور تم اسی کے ذریعہ سے خبردار کرو ان لوگوں کو جو ڈر رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ اپنے رب کے پاس اکٹھے کیے جائیں گے اس حال میں کہ اس کے سامنے نہ ان کا کوئی حامی ہو گا نہ شفیع، تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ ۵۱

اور تم ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کیجیو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی خوشنودی چاہتے ہوئے۔ ان کی ذمہ داری کا کوئی حصہ تم پر نہیں اور نہ تمہاری ذمہ داری کا کوئی حصہ ان پر ہے کہ تم ان کو اپنے سے دور کر کے ظالموں میں سے بن جاؤ۔ اور اسی طرح ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے سے آزمایا ہے کہ وہ کہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہمارے درمیان سے اپنے فضل کے لیے چنا ؟ کیا اللہ شکرگزاروں سے اچھی طرح واقف نہیں ؟ اور جب تمہارے پاس وہ لوگ آیا کریں جو ہماری آیات پر ایمان لائے تو تم ان کو کہو کہ تم پر سلامتی ہو۔ تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ جو کوئی تم میں سے نادانی سے کوئی برائی کر بیٹھے گا پھر وہ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لے گا تو وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں تاکہ اہلِ ایمان کی روش بھی واضح ہو جائے اور مجرموں کا رویہ بھی بے نقاب ہو جائے۔ ۵۲-۵۵

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰى رَبِّهِمۡ لَـيۡسَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ (۵۱)

پیغمبر کو اپنی حقیقت کی طرف متوجہ ہونے کی ہدایت

اوپر کے پیرے میں یہ اعلان پیغمبر کی زبان سے کرا دیا گیا کہ نہ میں خزانوں کا مالک ہوں، نہ غیب

جانتا ہوں نہ فرشتہ ہونے کا مدعی ہوں، میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ اب یہ ارشاد ہوا کہ جو لوگ کسی نشانیٔ عذاب کے منتظر ہیں ان کو تو ان کے حال پر چھوڑ دو، البتہ جو عقل و فکر سے کام لینے والے ہیں اور جو اپنے دلوں کے اندر یہ اندیشہ رکھتے ہیں کہ ایک دن بہرحال خدا کے حضور حاضر ہونا ہے اور اس طرح حاضر ہونا ہے کہ ان کا کوئی حامی و شفیع ایسا نہ ہوگا جو ان کو خدا کی پکڑ سے بچا سکے، ان کو اس کتاب کے ذریعہ سے جو تم پر وحی کی جا رہی ہے بیدار اور خبردار کرو۔ جن لوگوں کے اندر یہ ڈر موجود ہوگا وہی اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے اور وہی تقویٰ اختیار کر کے اپنے اعمال کی اصلاح کریں گے۔ جن کے اندر آخرت کا کوئی اندیشہ ہی نہیں یا جو نہر کا دو شفعا بنائے بیٹھے ہیں جن کی نسبت ان کا گمان ہے کہ خواہ کچھ ہی ہو وہ ان کو خدا سے چھڑا ہی لیں گے، وہ دنیا جہان کی نشانیاں دیکھ کر بھی اسی طرح ایمان سے محروم رہیں گے۔

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوئیں۔

ایک یہ کہ انذار کے لیے فطری اور عقلی چیز یہ قرآن ہے نہ کہ عذاب کی نشانیاں۔

دوسری یہ کہ یہ قرآن بھی نافع ان لوگوں کے لیے ہے جن کے اندر فطرت کی صلاحیتیں زندہ ہیں۔ جن کی فطری صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہیں ان کو قرآن سے بھی نفع نہیں پہنچے گا۔

تیسری یہ کہ تقویٰ اور خدا ترسی کے لیے سب سے بڑا حجاب شفاعت باطل کا عقیدہ ہے۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۲)

سرداران قریش کے غرور پر ضرب

اوپر کی آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ پیغمبر کو کن لوگوں کے ساتھ مشغول ہونا چاہیے اور کن لوگوں سے بے پروا ہو جانا چاہیے۔ اب یہ اس بات کی مزید وضاحت ہو رہی ہے کہ جو شامت زدہ لوگ اپنے غرور مال و جاہ میں مست ہیں، تمھیں کوئی اہمیت نہیں دیتے کہ تم خزانوں کے مالک نہیں، تمھارے ساتھیوں کو اس وجہ سے حقیر سمجھتے ہیں کہ وہ بے نوا، غریب، مفلس اور عزت و جاہ سے محروم لوگ ہیں، ان کے پیچھے اپنا وقت ضائع نہ کرو اور ان کے ایمان کی فکر میں ان لوگوں کے حقوق میں غفلت نہ ہو جو اللہ کی آیات پر ایمان لائے اور صبح و شام اس کی عبادت و طاعت میں سرگرم ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قریش کے اکابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت کے جہاں وہ بہانے پیدا کرتے تھے جن کی طرف اوپر اشارہ ہوا وہیں یہ دلیل بھی لاتے تھے کہ آپ کے ساتھی بالکل غربا اور عوام کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں غلام اور لونڈیاں بھی شامل ہیں۔ اوّل تو یہ دین، اگر اللہ کا دین ہوتا، تو کیا اللہ اپنے دین کے لیے (نعوذ باللہ) انھی اراذل و انفار کو منتخب کرتا اور اگر یہی لوگ اس کے حامل قرار پاتے ہیں تو پھر کسی شریف کے لیے کہاں گنجائش باقی رہی کہ ان کے اندر شامل ہو کر اپنی

عزت خاک میں ملا ئے، ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ہدایت فرمائی کہ ان کو اپنے سے کے لیے تم اپنوں کو کھونے کی غلطی نہ کرنا کھوئی ہوئی آوارہ بھیڑوں کی جستجو میں اپنے اصلی گلہ سے غفلت نہ ہونے پائے۔ تم نے ان کو اللہ کی دعوت پہنچا دی۔ اب اگر یہ اپنی گمراہی میں پڑے رہے تو اس کی پرسش خدا کے ہاں بہرحال تم سے نہیں ہوگی۔ اب مواخذہ انھی سے ہونا ہے۔ ان کے حساب کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے اور اگر ان کے پیچھے تم نے ان اللہ کے بندوں سے بے پروائی کی تو کل کو تمھاری طرف سے یہ جواب دہ بننے والے نہیں ہیں کہ تم ان کی خاطر اپنے کو ظالموں میں شامل کر لو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ آپ سے یہ اندیشہ تھا کہ آپ اپنے ان ساتھیوں کو نظر انداز فرما دیں گے یا ان کو اپنے پاس سے الگ کر دیں گے، بلکہ یہ سرداران قریش کے غرور پر ضرب لگائی گئی ہے لیکن بات ان کو مخاطب کر کے کہنے کے بجائے پیغمبر کو مخاطب کر کے کہی گئی ہے تاکہ ان پر یہ واضح ہو جائے کہ ان کی یہ بات اس قابل بھی نہیں ہے کہ ان کو براہ راست مخاطب کر کے اس کا جواب دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو بکواس کرتے ہیں کرنے دو۔ اگر یہ چیز ان کے لیے اسلام کی طرف بڑھنے میں رکاوٹ ہے تو وہ جس جہنم میں چاہیں گریں، تم پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں، جو خدا کے طالب بن کر تمھارے پاس آتے ہیں تم ان کو اپنے پاس سے کس طرح دھتکار سکتے ہو، تمھاری ذمہ داریاں تم پر ہیں۔ کل کو یہ تو تمھاری طرف سے ذمہ دار نہیں ہوں گے کہ تم ان کی خاطر ان لوگوں کے حقوق تلف کرو جو تمھاری توجہ اور شفقت کے اصلی حقدار ہیں۔ یہاں طرد کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ اپنے معنی کے اعتبار سے سخت ضرور ہے اس لیے کہ اس کے معنی کسی کو دھتکارنے اور دور دفع کرنے کے ہیں لیکن یہ لفظ سرداران قریش کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر استعمال ہوا ہے اس لیے کہ ان کی خواہش یہی تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کو اپنے پاس سے دھتکار دیں تب ہم بات کرنے کے روادار ہوں گے۔

انبیاء کا کردار کا ایک پہلو

حضرات انبیاء علیہم السلام کے کردار کا یہ پہلو بھی یہاں نگاہ میں رہے کہ وہ اپنی قوم کے ایمان کے جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، نہایت حریص ہوتے ہیں۔ سیدنا مسیح نے اس باب میں ایک تمثیل بھی بیان فرمائی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ جب تم میں سے کسی کی کوئی بھیڑ کھو جاتی ہے تو وہ اس کی تلاش میں ندیوں نالوں اور جنگلوں میں پریشان پھرتا ہے اور اپنے اصلی گلہ کو بھول جاتا ہے۔ پھر جب وہ مل جاتی ہے تو اس کو اپنے کندھے پر اٹھا کر لاتا ہے اور اپنے لوگوں میں آکر کہتا ہے، اے لوگو، میرے ساتھ خوشی مناؤ، اس لیے کہ میری کھوئی ہوئی بھیڑ مجھے مل گئی۔ یہ تمثیل جس طرح اللہ تعالیٰ کی اس رافت کو ظاہر کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کے لیے رکھتا ہے جو گمراہی کے بعد ہدایت کی طرف رجوع کرتے ہیں اسی طرح حضرات انبیاء کی اس بیقراری کو بھی ظاہر کرتی ہے جو ان کے اندر اپنی قوم کے گمراہوں کے ایمان اور ان کی اصلاح کے لیے ہوتی ہے۔ حضرات انبیاء کی اس صفت میں اللہ تعالیٰ کی صفت کا ایک عکس

ہے اس وجہ سے یہ ایک محبوب اور پسندیدہ صفت ہے۔ لیکن یہ صفت بھی اپنے کچھ حدود و قیود رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں پسند فرماتا کہ پیغمبر کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں اتنا سرگرداں رہے کہ اپنے اصل گلے کی دیکھ بھال میں غفلت ہو جائے جو سرکش اور آوارہ بھیڑ قابو میں نہیں آتی وہ کسی بھیڑیے ہی کا حصہ ہے۔ اسی طرح بیان فرمایا کہ یہ مغرور لوگ اگر اپنی نازبرداری اس حد تک چاہتے ہیں کہ تم ان کی خاطر ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا دو جو صبح و شام رضائے الٰہی کی طلب میں سرگرم ہیں تو یہ کرنے کے تم مجاز نہیں ہو۔ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اس مضمون کو سورۂ عبس کی تفسیر میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے اور اس کے بعض نہایت اہم پہلو ہم بھی مناسب مواقع پر ظاہر کریں گے۔

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ (۵۳)

'لِيَقُوْلُوْا' میں حرف 'ل' لام عاقبت ہے جو علت کو نہیں بلکہ نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک سنت بیان فرمائی ہے کہ ہم نے دنیا میں کسی کو دولت جو دی ہے تو اس بنا پر نہیں دی ہے کہ وہ اسی کا حقدار تھا۔ اسی طرح کسی کو غربت دی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اسی کا سزاوار تھا بلکہ ایک کو دولت اور دوسرے کو غربت دے کر دونوں کا امتحان کیا ہے۔ وہ جن کو مال و جاہ دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ وہ دیکھے کہ وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمت پا کر اس کے شکرگزار، متواضع اور فرمانبردار بندے بنتے ہیں یا مغرور و متکبر ہو کر اکڑنے والے، اترانے والے، غریبوں کو دھتکارنے والے اور خدائی نعمتوں کے اجارہ دار بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی طرح جن کو غربت دیتا ہے تو یہ دیکھنے کے لیے دیتا ہے کہ وہ اپنی غربت پر صابر، حاصل نعمتوں اور اپنی نانِ جویں پہ قانع، اپنی تقدیر پر راضی اور اپنے فقر میں خوددار رہتے ہیں یا مایوس و دل شکستہ ہو کر پست ہمت، بے حوصلہ، تقدیر سے شاکی، خدا سے برہم اور ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اسی امتحان میں ہم نے ان کو ڈالا ہے۔ ہم نے ان کو اپنے فضل سے نوازا تاکہ یہ ہمارے شکرگزار بندے بنیں۔ لیکن ان کی کج فہمی کے باعث ہماری نعمت ان کے لیے فتنہ بن گئی۔ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہی ساری نعمتوں کے پیدائشی حق دار اور ہر عزت و جاہ کے خاندانی اجارہ دار ہیں۔ نتیجہ اس کج فہمی کا یہ نکلا کہ اب وہ یہ کہنے لگے کہ اسلام اگر کوئی فضیلت کی چیز ہوتی تو کیا اس سے سرفراز کرنے کے لیے خدا کو یہی اراذل و اجلاف اور یہی حقیر و نادار لوگ مل سکے؟ آخر ہم اشراف و اعیان، سردارانِ قریش اور رؤسائے طائف کہاں مر گئے تھے کہ آسمان سے یہ نعمت اتری تو ہمارا پتہ اس کو نہ مل سکا اور وہ ان پر جا کر نازل ہو گئی! سردارانِ قریش کے اس غرور کا حوالہ قرآن نے بعض دوسرے مقامات میں بھی دیا ہے۔ مثلاً وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ (۱۱- احقاف) (اور ان کافروں نے ایمان لانے والوں کے باب میں کہا کہ اگر یہ دین کوئی خیر والی چیز ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم

اس دنیا میں دولت و غربت دونوں امتحان کے لیے ہیں

سے سبقت نہیں لے جا سکتے تھے) دوسری جگہ ہے وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْٓ اَعْیُنُكُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا ۳۱ ھود (اور میں ان لوگوں کے بارے میں جو تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں یہ کہنے کے لیے تیار نہیں کہ خدا کبھی ان کو کوئی نعمت دے ہی نہیں سکتا) ایمان و اسلام تو درکنار نبوّت کو بھی یہ لوگ اپنا اجارہ سمجھتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ اگر خدا کسی کو نبی بنانے والا ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو بناتا، اس منصب کے لیے یہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو ملے تھے۔

دین کی نعمت کے اصلی حق دار

قرآن نے ان کے اس تمرد کے جواب میں فرمایا کہ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِیْنَ (کیا اللہ اپنے شکرگزار بندوں کو نہیں جانتا) مطلب یہ ہے کہ خدا کا دین سونا اور چاندی، ریشم اور مخمل نہیں ہے جس کی کاٹھی اور جس کے جھول گدھوں اور خچروں، گھوڑوں اور اونٹوں پر بھی نظر آ جاتے ہیں۔ یہ تو آسمانی نعمت اور یزدانی رحمت ہے جو صرف ان کا حصہ ہے جو ہر حال میں اپنے رب کے شکرگزار رہے، جنھوں نے خدا کی نعمتوں کی قدر کی، جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کا حق ادا کیا، جنھوں نے اپنے کان کھلے رکھے، جنھوں نے اپنی آنکھوں پر غرور کی پٹی نہیں باندھی اور جنھوں نے اپنے دلوں کو مردہ نہیں ہونے دیا۔ رہے وہ نابکار و ناشکرے لوگ جنھوں نے خدا کی بخشی ہوئی تمام ظاہری و باطنی نعمتوں کو خدا ہی کے خلاف استعمال کیا ان کے لیے اس نعمت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ دنیا نیک و بد دونوں کو مل جاتی ہے لیکن دین کی نعمت صرف انھی کو ملتی ہے جو خدا کے شکرگزار ہوتے ہیں۔

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۵۴)۔

سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ، جس طرح ملاقات یا رخصت کا کلمہ ہے اسی طرح خیر مقدم کا کلمہ بھی ہے۔ مثلاً فرشتے توحید پر ثابت قدم رہنے والوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہیں گے سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۳۲ نحل (تم پر سلامتی ہو، جنت میں داخل ہو جاؤ اپنے اعمال کے صلے میں)

غربائے مسلمین کے خیر مقدم کی ہدایت

اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان غربائے مسلمین کے ساتھ بالکل اس کے ضد طرز عمل اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی گئی جس کا مطالبہ سرداران قریش کرتے تھے۔ سرداران قریش تو، جیسا کہ بیان ہوا، یہ چاہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کو اپنے پاس سے دھتکار دیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ جب ہماری آیتوں پر ایمان لانے والے ہمارے یہ بندے تمہارے پاس آیا کریں تو تم سلامتی اور رحمت کی دعا کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا کرو اور ہماری طرف سے ان کو بشارت دو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے باایمان بندوں کے لیے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ وہ تم کو اپنی رحمت سے ضرور نوازے گا۔ اگر تم میں سے کسی سے نادانی کے سبب کوئی غلطی صادر ہو جائے گی اور اس کے بعد وہ توبہ و اصلاح کر لے گا تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اہل ایمان کی مطلوبات

یہاں اللہ تعالیٰ نے جو بشارت دی ہے وہ صرف رحمت و مغفرت کی ہے۔ اس کے ساتھ کسی دنیوی مال و جاہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے اللہ کے ان غریب، لیکن دنیا اور سر و سامانِ دنیا سے بے نیاز، بندوں کے باطن پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ سر و سامانِ دنیا سے محروم ہونے کے باوجود اپنے دل میں اس دنیا کا کوئی ارمان نہیں رکھتے تھے۔ ان کے دل کو اگر لگن تھی تو اس بات کی تھی کہ ان کو اپنے خالق و مالک کی رضا حاصل ہو۔ اوپر ان کی صفت بھی یہی بیان ہوئی ہے يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهٗ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس باطنی آرزو کے لحاظ سے ان کو اسی چیز کی بشارت دی جس کے وہ سب سے زیادہ طلب گار تھے۔ اس سے اشارۃً یہ بات بھی نکلی کہ دنیا کے پرستار جن چیزوں پر مرتے ہیں، اللہ کے باایمان بندوں کی نگاہوں میں ان کی قدر و قیمت بالِ مگس کے برابر بھی نہیں، نہ اس دنیا میں نہ آخرت میں۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (۵۵)

یہاں وَلِتَسْتَبِيْنَ کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اگر پوری بات کھول دی جائے تو یوں ہو گی وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں گزر چکی ہیں۔ اوپر تفصیل سے بیان ہوا کہ جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کی روش کیا ہوتی ہے اور جو ایمان لاتے ہیں ان کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ آخر میں یہ اشارہ فرما دیا کہ یہ ساری تفصیل ہم نے اسی لیے سنائی ہے کہ تم پر دونوں کی روش اور دونوں کا اندازِ فکر واضح ہو جائے تاکہ بلا سبب کوئی چیز وجہِ پریشانی نہ بنے۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۵۶-۶۷

آگے وہی مضمون جو اوپر سے چلا آ رہا ہے نئے انداز اور نئے پہلوؤں سے بیان ہوا ہے۔

پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ تم خدا کے شریک ٹھہراتے ہو اور اس شرک کی حمایت میں مجھ سے لڑتے ہو لیکن مجھے ان شریکوں کی عبادت سے میرے رب نے روک دیا ہے۔ اس وجہ سے میرے لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ میں تمھاری بدعتوں کی پیروی کروں۔ یہ بات کہ خدا نے مجھے یہ بات بتائی ایک دیا ہے۔ ایک واضح دلیل اور ایک قطعی حجت پر مبنی ہے۔ اس باب میں میرے رب کی شہادت اس وحی کی صورت میں موجود ہے جو مجھ پر آتی ہے لیکن تم اس وحی کو جھٹلاتے ہو اور اس وقت تک اس کی تصدیق کے لیے تیار نہیں ہو جب تک تم کو خدا کا عذاب نہ دکھا دیا جائے۔ یہ چیز میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اس کا اختیار خدا ہی کو ہے۔ اگر یہ چیز میرے اختیار میں ہوتی تو اس جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا رب اس جھگڑے کا فیصلہ فرمائے گا لیکن کب اور کس طرح؟ اس کا جواب صرف اسی کے پاس ہے جو اپنی اس کائنات کے تمام رازوں اور بھیدوں کو جاننے والا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ بات کہ مرنے کے بعد ایک روز اٹھنا ہے اور اٹھنے کے بعد ایک ہی خدا کے

آگے حاضر ہونا ہے پھر سب کو اپنے مولائے حقیقی کے آگے جواب دہی کرنی ہے، ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ریہرسل (REHEARSAL) اس دنیا کے سٹیج پر ہر روز ہو رہا ہے لیکن جو لوگ آنکھیں بند کیے ہوئے ہوں ان کا کیا علاج!

اس کے بعد انسان کی اس نفسیاتی بیماری کی طرف توجہ دلائی کہ جب کسی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے تب تو خدا خدا پکارتا ہے اور اس کے سوا سب کو بھول جاتا ہے لیکن اس آزمائش سے خدا جب اس کو نجات دے دیتا ہے تو چھوٹتے ہی اپنی پچھلی سرمستیوں اور حماقتوں میں پھر کھو جاتا ہے، گویا کوئی بات سرے سے ہوئی ہی نہیں اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اب وہ خدا کے قابو سے بالکل باہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسی بیماری میں یہ لوگ مبتلا ہیں جو آج عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ہر بات کے لیے خدا کے ہاں ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت آجائے گا تو دیکھ لو گے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۵۶-۶۷ قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ
لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ﴿۵۶﴾
قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا
تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ
الْفٰصِلِیْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ
بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۸﴾ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ
لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ
اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ
اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿۵۹﴾ وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا
جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤی اَجَلٌ مُّسَمًّی ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ
ع ۷ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ

عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ
الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۟ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ
مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا
مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ
كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ
عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا
وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ
يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ
بِوَكِيْلٍ ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۫ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

ترجمۂ آیات ۵۶-۶۷

کہہ دو کہ مجھے تو ان کی عبادت سے روکا گیا ہے جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ کہہ دو میں تمہاری خواہشوں کے پیچھے نہیں چل سکتا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو جاؤں گا اور پھر راہ پانے والوں میں سے نہ بن سکوں گا۔ کہہ دو میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے، وہ چیز میرے پاس نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو۔ اس کا فیصلہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے، وہی حق کو واضح کرے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اگر وہ چیز میرے پاس ہوتی جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالموں سے خوب باخبر ہے۔ اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ اس کے سوا

ان کو کوئی نہیں جانتا۔ بر و بحر میں جو کچھ ہے اس سے وہ واقف ہے۔ کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کو جانتا ہے اور نہ زمین کی تہوں میں کوئی دانہ گرتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز ہے مگر وہ ایک روشن کتاب میں مندرج ہے۔ ۵۷-۵۹

اور وہی ہے جو تمھیں رات میں وفات دیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے، پھر تمھیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ مدت معین پوری کی جائے۔ پھر اسی طرف تمھارا لوٹنا ہے، پھر وہ تمھیں باخبر کرے گا اس چیز سے جو تم کرتے رہے ہو اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور وہ تم پر اپنے نگران مقرر رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو ہمارے فرستادے ہی اس کی روح قبض کرتے ہیں اور وہ اس کام میں کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر وہ سب اللہ، اپنے مولائے حقیقی، ہی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ آگاہ کہ فیصلہ کا سارا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ سب سے زیادہ تیز حساب چکانے والا ہے۔ ۶۰-۶۲

ان سے پوچھو، خشکی اور تری کی تاریکیوں سے تم کو کون نجات دیتا ہے جبکہ اسی کو تم پکارتے ہو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے کہ اگر اس نے ہم کو نجات دے دی اس مصیبت سے تو ہم اس کے شکر گزار بندوں میں سے بن جائیں گے؟ کہہ دو اللہ ہی تم کو نجات دیتا ہے اس مصیبت سے بھی اور دوسری ہر تکلیف سے لیکن تم پھر شرک کرنے لگتے ہو۔ کہہ دو، خدا قادر ہے اس بات پر کہ تم پر تمھارے اوپر سے کوئی عذاب بھیج دے یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب اٹھا دے یا تم کو گروہ در گروہ کر کے آپس ہی میں گتھم گتھا کر دے اور ایک کو دوسرے کے تشدد کا مزا اچھی طرح چکھا دے۔ دیکھو، کس کس طرح

ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔ ۶۲ - ۶۵

اور تمھاری قوم نے اس کی تکذیب کر دی حالانکہ وہ بالکل حق ہے۔ کہہ دو میں تمھارے اوپر کوئی داروغہ نہیں مقرر ہوا ہوں۔ ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم عنقریب جان لوگے۔ ۶۶ - ۶۷

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ (۵۶)

لفظ 'قل' کا عام محل استعمال — لفظ 'قل' اس آیت میں بھی ہے اور بعد کی آیات میں بھی بار بار آیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ سب باتیں ان شبہات، اعتراضات، سوالات اور مطالبات کے جواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلائی گئی ہیں جو اس وقت بحث کی گرماگرمی میں کفار کی طرف سے پیش کیے گئے۔ ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان کے پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے اس لیے کہ قرآن میں یہ وضاحت ہر جگہ موجود نہیں ہوتی کہ فلاں بات کفار کی کس بات کے جواب میں کہلائی گئی۔

شرک کی بنیاد خواہش پر ہے — اوپر آیت ۱۴ میں ارشاد ہوا ہے کہ مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں اور مشرکوں میں سے نہ بنوں۔ اس کے بعد یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اس باب میں کہ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں، سب سے بڑی شہادت تو خدا ہی کی ہو سکتی ہے اور خدا کی شہادت جو بشکل قرآن مجھ پر نازل ہوئی ہے وہ تو یہی ہے کہ وہ خدائے لاشریک ہے۔ اس وجہ سے میں اس شہادت کے خلاف کسی کو اس کا شریک ٹھہرانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یہاں اسی اعلان کو منفی پہلو سے دہرایا کہ تم جن چیزوں کو اللہ کے سوا پکارتے ہو مجھے ان کی بندگی سے منع کیا گیا ہے۔ یہاں پکارنے سے مراد ظاہر ہے کہ وہ پکارنا ہے جو دعا اور استغاثہ کی نوعیت کا ہو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو پکارنا درحقیقت اس کی عبادت ہے اور یہ چیز شرک ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم اعلان کر دو کہ میں تمھاری خواہشوں کی پیروی نہیں کر سکتا۔ 'خواہشوں' سے مراد مشرکانہ بدعات ہیں اور 'اھوا' کے لفظ سے تعبیر کر کے قرآن نے ان کے بے بنیاد ہونے کو واضح فرمایا ہے کہ ان کے شریک خدا ہونے کی کوئی شہادت نہ تو عقل و فطرت کے اندر موجود ہے نہ خدا کے کلام و الہام میں محض اپنے جی سے تم نے یہ چیزیں گھڑی ہیں اور چونکہ ان کی موہوم شفاعت کی امید نے تمھیں ایمان و عمل اور فکر آخرت کی تمام

ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا ہے، اس وجہ سے یہ تمھارے نفس کو بہت پسند ہیں۔ بہرحال تمھیں پسند ہیں تو ہوں لیکن حقیقت اور خواہش میں بڑا فرق ہے، میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں حقیقت کو نظر انداز کر کے تمھاری جھوٹی آرزوؤں، باطل خواہشوں اور بے سند بدعات کی پیروی کروں۔ فرمایا کہ اگر میں ایسا کروں تو میں راہِ ہدایت سے بھٹک جاؤں گا اور پھر کبھی راہِ ہدایت پانے والا نہ بن سکوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ اول تو شرک کی ضلالت ہے ہی ایسی ضلالت کہ آدمی صراطِ مستقیم سے ہٹ کر ایسی کج پیچ کی پگڈنڈیوں میں گم ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے اصل راہ پر آنا ناممکن ہو جاتا ہے، دوسرے خدا کی صریح ممانعت کے بعد اگر میں نے یہ غلطی کی تو پھر کون ہے جس کی توفیق بخشی میرا سہارا بنے گی اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر صحیح راہ پر لائے گا؟

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَكَذَّبْتُم بِهِ ۚ مَا عِندِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ يَقُصُّ الْحَقَّ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ ۝ قُل لَّوْ أَنَّ عِندِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ لَقُضِيَ الْأَمْرُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ (۵۷-۵۸)

بَیِّنَۃ سے مراد قرآن ہے

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَكَذَّبْتُم بِهِ، بَيِّنَة سے مراد قرآن مجید ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے بطورِ شہادت اتارا ہے کہ اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔ اس شہادت کا ذکر پیچھے آیت 19 میں گزر چکا ہے۔ آگے آیت ۱۵۷ میں قرآن کے لیے یہی لفظ استعمال ہوا ہے أَوْ تَقُولُوا لَوْ أَنَّا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْكِتَابُ لَكُنَّا أَهْدَىٰ مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَاءَكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ (یا کہیں تم یہ کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے، سو دیکھ لو تمھارے پاس بھی تمھارے رب کی جانب سے ایک واضح شہادت اور ہدایت و رحمت آگئی) وَكَذَّبْتُم بِهِ میں ضمیر کا مرجع 'بَيِّنَة' ہے، لیکن لحاظ مفہوم کا ہے اس وجہ سے ضمیر مذکر آئی ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب بہت استعمال ہوا ہے کہ ضمیر لفظ کے ظاہر کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے مفہوم کے لحاظ سے استعمال ہوتی ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے اپنی کتابوں میں اس اسلوب پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ مناسب مواقع پر ہم اس کی بلاغت پر بحث کریں گے۔ یہاں قرآن کے لیے 'بینۃ' کا لفظ استعمال کر کے اس کا ایک حجتِ قاطع اور شہادتِ واضح ہونا ظاہر کر دیا ہے پھر ضمیر اس کے لیے مذکر کی استعمال کر کے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اس سے مراد قرآن ہے۔

قرآن ایک حجتِ قاطع ہے

مطلب آیت کا یہ ہے کہ تم تو محض ہوا میں تیر چلا رہے ہو اور اپنی خواہشوں کی پرستش کر رہے ہو۔ تمھارے پاس اپنے ان فرضی معبودوں کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے جس سے تم یہ ثابت کر سکو کہ خدا نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے۔ اس کے برعکس میں خدا کی طرف سے ایک حجت، ایک برہان اور ایک قطعی شہادت پر ہوں اور اسی کو تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ خدا نے یہ 'بینۃ' خود مجھ پر اتاری ہے اور یہ ایسی واضح ہے کہ اس کی تکذیب کی گنجائش نہیں ہے لیکن تم اس کی تکذیب کرتے ہو اور بجائے اس کے کہ اس کو سمجھو اور مانو مجھ سے مطالبہ کرتے ہو کہ میں تمھیں خدا کا عذاب دکھا دوں تو تم اس کتاب کی صداقت تسلیم کرو گے۔ ما

عندی ما تستعجلون بہٖ' سو یہ عذاب، جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو میرے پاس نہیں ہے۔ اس معاملہ کا فیصلہ کرنا خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ حق کو واضح اور اس نزاع کا فیصلہ کرے گا اور نہایت بہتر طریقہ پر فیصلہ کرے گا۔ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر وہ چیز جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو میرے اختیار میں ہوتی تو میرے اور تمھارے درمیان جھگڑے کا فیصلہ ہو جاتا۔

'وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِالظّٰلِمِيۡنَ' میں دو پہلو ہیں۔ ایک تو ان کفار کے لیے دھمکی ہے کہ خدا ان ظالموں سے خوب باخبر ہے چنانچہ وہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔ دوسرا پہلو اس میں تفویض کا ہے کہ خدا ان ظالموں سے خوب واقف ہے، پس ان کا معاملہ اسی کے حوالے ہے۔ یہاں ظلم سے مراد اپنی جان پر ظلم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ خدا ان کو اپنی رحمت دے رہا ہے لیکن یہ اس کے عذاب کے طالب ہیں۔ ان کو روٹی دی جا رہی ہے لیکن یہ پتھر مانگتے ہیں۔ ان کو مچھلی عنایت ہوئی ہے مگر یہ سانپ پکڑنے کے درپے ہیں۔

وَعِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ لَا يَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعۡلَمُ مَا فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ ؕ وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعۡلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ (۵۹)

خدا کا علم محیط کل ہے

'مفاتح'، 'مفتح' کی جمع ہے جس کے معنی کنجی کے ہیں۔ یعنی غیب کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کا علم کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہی مضمون دوسرے الفاظ میں یوں بیان ہوا ہے لَهٗ مَقَالِيۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ (۱۲ شوریٰ) (اسی کے قبضہ میں ہیں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں، وہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے) 'بر و بحر' اور 'رطب و یابس' وغیرہ الفاظ احاطہ کے مضمون کو ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ 'ظلمات الارض' سے مراد زمین کی تہیں اور اس کے طبقات ہیں۔

علم الٰہی اور توحید و آخرت کا باہمی ربط

یہ اوپر والے مضمون کی مزید توضیح ہے۔ جب فرمایا کہ 'میرے اختیار میں وہ چیز نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو، اس امر میں فیصلہ کا اختیار صرف خدا کو ہے' تو علم الٰہی کی وسعت اور اس کے احاطہ کے بیان کے لیے ایک نہایت موزوں تقریب پیدا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے علم کی اس وسعت کا اعتقاد ہی ہے جو اہل ایمان کے اندر کامل تفویض، کامل اعتماد اور کامل رضا بالقضا کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اس میں معمولی غلط فہمی بھی شرک کی راہیں کھول دیتی ہے۔ یہی چیز آخرت پر سچے اور پکے ایمان کی بنیاد ہے اور اسی کے صحیح تصور و تذکر سے انسان کے اندر وہ خشیت بھی پیدا ہوتی ہے جو زندگی میں اس کو صحیح روش اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ قرآن کے اس بیان سے ان لوگوں کی بھی پوری پوری تردید ہو گئی جو خدا کو صرف کلیات کا عالم مانتے ہیں۔ خدا صرف کلیات ہی کا نہیں بلکہ تمام جزئیات کا بھی عالم ہے۔ درخت سے جو پتا

گرتا ہے، زمین کی تہوں میں جو دانہ ڈالا جاتا ہے، سب اس کے علم میں ہوتا ہے اور ہر خشک و تر اس کے رجسٹر میں درج ہے اور یہ رجسٹر ایسا نہیں ہے جس میں اس کو کوئی چیز ڈھونڈنی پڑتی ہو بلکہ اس کی ہر چیز ہر آن بالکل واضح ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے محیط کل علم کی ایک تعبیر ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؈ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ؈ ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ (۶۰ - ۶۲)

موت، برزخ اور حشر کا تمثیلی شاہدہ

علم الٰہی کے اس بیان نے موت کے بعد زندگی، اس زندگی کے بعد حساب کتاب اور جزا سزا کی یاددہانی کے لیے اس طرح تقریب پیدا کر دی گویا بات ہی سے بات نکل آئی ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ آخرت کے باب میں بڑا مغالطہ لوگوں کو علم الٰہی کے صحیح تصور کے فقدان ہی سے پیدا ہوا ہے۔ کم فہم انسان سمجھتا ہے کہ اتنی بے شمار مخلوق کے مرنے اور جینے اور اس کے قول و فعل کے ایک ایک جزئیہ کا علم بھلا کس کو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے، ان کو جمع کرے اور پھر ان کا حساب کرنے بیٹھے۔ قرآن نے اسی استبعاد اور اسی مغالطہ کو یہاں دور فرمایا ہے۔

پہلے فرمایا کہ وہی خدا جو درخت سے گرنے والے ہر پتے اور زمین میں دفن ہونے والے ہر دانے کو جانتا ہے تمہیں مرنے کے بعد پھر اٹھائے گا اور جو کچھ تم نے اس دنیا میں کیا ہو گا اس سے تمہیں آگاہ کرے گا۔ اس بات کی تمہید اس طرح اٹھائی ہے کہ یہ مرنا اور مرنے کے بعد از سر نو اٹھنا اور اپنے سارے کیے دھرے سے آگاہ کیا جانا کوئی بہت بعید از قیاس چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ریہرسل ہر شب و روز تمہاری اپنی نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ ہر شب میں خدا تمہیں وفات دیتا ہے اور جب وفات دیتا ہے تو وہ سب کچھ اس کے علم میں ہوتا ہے جو دن میں تم نے کیا ہوتا ہے۔ پھر دوسرے دن میں خدا تم کو اٹھاتا ہے اور اس طرح تمہاری وہ مدت حیات اور اجل معین پوری ہوتی ہے جو خدا نے تم میں سے ہر ایک کے لیے مقرر کی ہوئی ہے گویا زندگی، موت، برزخ اور موت کے بعد اٹھائے جانے کا تمثیلی مشاہدہ تم میں سے ہر شخص کو ہر روز کرایا جا رہا ہے، خدا نے یہ دنیا بنائی ہی اس طرح ہے کہ وہ اپنی رات اور دن کی گردشوں سے ان تمام حقائق کا درس دے رہی ہے جن کی تمہیں دعوت دی جا رہی ہے بشرطیکہ تمہارے پاس دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھنے والے دل ہوں۔ قرآن نے یہاں ہر شب میں سونے کو 'وفات' سے اور ہر صبح کے اٹھنے کو 'بعث' سے تعبیر کر کے توجہ دلائی ہے کہ مرنا اور اٹھنا تو ہر روز ہو رہا ہے، جس طرح تمہارا سونا اور جاگنا ہے اسی طرح تمہارا مرنا اور اٹھنا ہے اور جس طرح تم میں سے کسی سونے والے کے دن کے اعمال سے خدا لاعلم نہیں ہوتا اسی طرح جب تم موت کی نیند سو و گے تو خدا تمہاری زندگی کے اعمال بھول نہیں جائے گا اور جس طرح تمہاری ہر شب کی نیند

کے بعد صبح ہوتی ہے اور تم آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھتے ہو اسی طرح موت کی نیند کے بعد قیامت کی صبح آئے گی اور تم ایسا محسوس کروگے کہ یہ جو کچھ ہوا سب صبح و شام کا قصہ ہے۔

ہرجان پر وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ الآیۃ۔ لفظ 'قہر' کا مفہوم آیت ۱۸ اور 'تفریط' کا مفہوم آیت ۳۸
خداکی نگرانی کے تحت بیان ہو چکا ہے۔ 'حَفَظَة' 'حافظ' کی جمع ہے جس کے معنی کسی شے کی نگرانی کے ذمہ دار کے ہیں۔
ہے اس سے مراد یہاں وہ خدائی پہرہ دار ہیں جو ہر جان پر خدا کی طرف سے برابر مقرر رہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ خیال کرے کہ خدا اپنی مخلوق کے کسی فرد اور اپنے گلے کی کسی بھیڑ سے کبھی غافل ہوتا ہے، سب ہر وقت اسی کے کنٹرول میں ہیں۔ وہ برابر اپنے نگران فرشتوں کو ان پر مقرر رکھتا ہے جو ایک پل کے لیے بھی ان کی نگرانی سے غافل نہیں ہوتے۔ پھر جب کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو فرمایا ہمارے فرستادہ فرشتے ہی اس کی روح قبض کرتے ہیں اور مجال نہیں ہے کہ وہ اس کام میں کوئی کوتاہی کریں: نہ ان کے قابو سے کوئی باہر نکل سکتا، نہ کسی کو وہ فراموش کر سکتے، نہ کسی کی موت ایک لمحہ کے لیے بھی آگے پیچھے ہو سکتی۔

ثُمَّ رُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ پھر سب اللہ ہی کی طرف، جو سب کا مولائے حقیقی ہے لوٹائے جائیں گے یعنی مرنے کے بعد سابقہ ہر ایک کو خدا ہی سے پیش آنا ہے اس لیے کہ مولائے حقیقی وہی ہے۔ دوسرے شرکاء و شفعاء جو لوگوں نے گھڑ رکھے ہیں وہ کچھ کام نہیں آئیں گے۔ أَلَا لَهُ الْحُكْمُ اور کان کھول کر سن لو کہ فیصلہ کا سارا اختیار تنہا اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی اس کے سامنے زبان نہ کھول سکے گا۔ وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ لیعنی یہ نہ سمجھو کہ ساری خدائی کے اتنے لمبے چوڑے حساب میں اس کو کچھ زحمت پیش آئے گی یا اس میں زمانہ صرف ہو جائے گا۔ وہ سارا حساب ایک لمحہ میں سب کے سامنے رکھ دے گا۔ اس کی 'کتاب مبین' ہر شخص کے ہر چھوٹے بڑے عمل کا سارا ریکارڈ اس کے آگے پیش کر دے گی۔

قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً لَئِنْ أَنْجَانَا مِنْ هَٰذِهِ
لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ قُلِ اللَّهُ يُنَجِّيكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ تُشْرِكُونَ ۝ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ
عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ
بَأْسَ بَعْضٍ ۗ انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ۝ وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۚ قُلْ لَسْتُ
عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ۝ لِكُلِّ نَبَإٍ مُسْتَقَرٌّ ۚ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ (۶۳-۶۷)

ظلمات بحر و بر سے مراد — قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ 'ظُلُمَات' مصائب اور آفات کی تعبیر ہے۔ سمندر کی تاریکیوں کا ذکر قرآن نے سورۂ نور میں یوں فرمایا ہے۔ أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ۚ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا

۴۰- نور

(یا کسی گہرے سمندر کی تاریکیاں جس میں موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہو، اور اس کے اوپر بادل چھائے ہوئے ہوں، تاریکیوں کے اوپر تاریکی، جب اپنا ہاتھ نکالے تو وہ بھی اس کو سجھائی نہ دے) اسی طرح کے طوفانوں اور مصائب سے آدمی کو خشکی میں بھی سابقہ پیش آجاتا ہے۔

تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً۔ تَدْعُوْنَ، يُنَجِّيْكُمْ کی ضمیر مفعول سے حال پڑا ہوا ہے۔ لفظ کی تحقیق آیت ۴۲ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے بالمقابل 'خُفْيَة' کا لفظ ہے جس کے معنی چپکے چپکے کے ہیں۔ اس وجہ سے تضرع کے معنی گڑگڑانے اور آہ و زاری کے ساتھ التجا و فریاد کرنے کے ہوں گے۔ لَئِنْ اَنْجٰنَا الایۃ، اسی دعا کا بیان ہے جو اس طرح کے حالات میں ہر شخص کے دل اور زبان پر ہوتی ہے۔

اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا الایۃ، 'لبس' کے معنی خلط، یعنی ملانے اور گڈمڈ کرنے کے ہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ تم کو گروہ در گروہ کر کے آپس میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا کر دے۔

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ، 'بہ' میں ضمیر کا مرجع وہ عذاب بھی ہو سکتا ہے جس کا آیت ۶۵ میں ذکر ہے اور قرآن بھی ہو سکتا ہے جو اس عذاب کی خبر دے رہا ہے اور جس کی طرف آیت ۶۵ میں اشارہ ہے۔

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ، 'نبا' کسی اہم حادثہ کی خبر کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد اس عذاب کی خبر ہے جو قرآن دے رہا تھا، 'مستقر'، موضع استقرار اور وقت استقرار دونوں مفہوم میں ہو سکتا ہے۔ نیز مصدر کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے وقت استقرار کے مفہوم میں لیا ہے۔

انسان کی ایک نفسیاتی بیماری — توحید کی ایک نفسی دلیل

ان آیات میں انسان کی ایک نفسیاتی بیماری سے بھی پردہ اٹھایا ہے اور ساتھ ہی توحید کی ایک نفسیاتی دلیل کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ سیاق کلام وہی مطالبۂ عذاب کی تردید کا ہے جو اوپر سے چلا آرہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کا عجیب حال ہے کہ جب کسی آفت میں گرفتار ہوتا ہے تب تو گڑگڑا کر بھی اور دل میں چپکے چپکے بھی خدا ہی کو پکارتا ہے اور یہ عہد کرتا ہے کہ اس مصیبت سے خدا نے نجات دی تو اب اس کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بن کر زندگی گزاروں گا۔ لیکن جب اس سے نجات پا جاتا ہے تو پھر ناشکری و نافرمانی کی وہی زندگی اختیار کر لیتا ہے جس میں پہلے مبتلا تھا اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے گویا خدا کی خدائی سے باہر ہو گیا ہے اور اب کبھی خدا کی پکڑ میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اگر خدا کی پکڑ سے اس کو ڈرایا جاتا ہے تو ڈھیٹ ہو کر عذاب کا مطالبہ کرتا ہے کہ عذاب دکھا دو تو مانوں گا۔ فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ سمندر میں یا خشکی میں جب تم کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہو تو کون تم کو اس گرداب مصیبت سے نجات دیتا ہے جبکہ تم خدا ہی کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارتے ہو اور یہ عہد کرتے ہو کہ اگر خدا نے ہمیں آفت سے بچایا تو ہم اس کے شکر گزار بندے بن کر زندگی بسر کریں گے؛ پھر خود ہی اس کا جواب دلوایا کہ وہ خدا ہی ہے جو تمھیں اس آفت سے بھی نجات دیتا ہے اور دوسری تمام مصیبتوں سے بھی وہی نجات دیتا ہے، خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی اور خواہ تم ان کے لیے اس کو پکارو یا نہ پکارو، لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ اس کے بعد پھر تم شرک کرنے لگتے ہو۔

یہاں دو باتیں خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہیں۔ ایک توحید کی نفسیاتی دلیل جو ضمناً بیان ہوگئی ہے وہ یہ ہے کہ جب انسان کسی سخت مصیبت میں پھنستا ہے تو وہ خدا ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، دوسرے تمام سہارے اس کے نزدیک بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کی اصل فطرت کے اندر صرف خدا ہی کا اعتماد جاگزیں ہے، دوسری چیزیں محض بناوٹی ہیں جو آزمائش کی بھٹی میں پڑنے کے بعد جھوٹے ملمع کی طرح اڑ جاتی ہیں۔ یہ دلیل قرآن میں مختلف اسلوبوں سے نہایت موثر تمثیلوں میں بیان ہوئی ہے۔ ہم نے اس کی پوری وضاحت اپنی کتاب 'حقیقت توحید' میں مستقل عنوان سے کی ہے۔

دوسری یہ کہ یہاں شکر اور شرک کو دو متقابل چیزوں کی حیثیت سے رکھا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ شرک صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی بتوں کو پوجے بلکہ وہ استکبار بھی شرک ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان اللہ کی نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ اور اپنی تدبیر و قابلیت کا نتیجہ سمجھنے لگتا ہے اور پھر فخر و غرور کے نشہ میں اکڑتا، دندناتا، اتراتا اور من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ حالت شکر کی ضد ہے اور جس کے اندر یہ خناس سما جاتا ہے وہ خود اپنے آپ کو خدائی میں شریک سمجھنے لگتا ہے۔ قرآن نے اس ذہنیت کی تصویر سورہ کہف میں اس طرح کھینچی ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۝ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ۝ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝

اور ان کے لیے دو شخصوں کی تمثیل بیان کرو۔ ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ بنائے، ان کو کھجور کے درختوں سے گھیرا اور ان کے درمیان کھیتی اگائی۔ دونوں باغ خوب پھل لائے، کچھ کمی نہیں کی۔ ہم نے ان کے درمیان ایک نہر جاری کی۔ اس میں پھل آئے تو اس نے اپنے ساتھی سے کہا اور وہ اس سے مفاخرت کر رہا تھا کہ میں تم سے مال میں زیادہ اور جمعیت میں قوی ہوں اور وہ اپنے باغ میں آیا اور وہ اپنی جان پر آفت لا رہا تھا اور بولا میں نہیں سمجھتا کہ یہ باغ کبھی برباد ہو سکے گا اور میں قیامت کے ہونے کا بھی گمان نہیں رکھتا اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف جانا ہی ہوا تو اس سے بہتر ٹھکانا پاؤں گا۔ اس کے ساتھی نے جواب میں کہا کیا تم نے اس خدا کی ناشکری کی جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے، پھر ایک مرد بنا کر کھڑا کیا لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے، میں کسی کو اپنے

(کہف ۳۲-۳۸) رب کا شریک نہ بناؤں گا۔

'قُل ھوالقادر الایۃ' یعنی یہ نہ سمجھو کہ آج اگر امن و اطمینان کی زندگی حاصل ہے تو پھر کبھی خدا کی پکڑ میں آہی نہیں سکتے، خدا جب چاہے تمہارے اوپر سے پتھر برسا دے، بجلی گرا دے، گرد باد بھیج دے۔ اسی طرح جب چاہے، عین تمہارے پاؤں کے نیچے سے زلزلہ، سیلاب، یا کوئی اور آفت ارضی بھیج دے۔ یہ نہیں تو تمہیں آپس ہی میں قبیلہ قبیلہ، گروہ گروہ اور قوم قوم کو باہم دگر ٹکرا دے اور ایک دوسرے کے ظلم و تشدد کا مزا چکھا دے۔ ان میں سے ہر بات، ہر وقت خدا کی قدرت میں ہے۔ فرمایا، دیکھو کس طرح ہم اپنی قدرت کی نشانیاں اور اپنے اختیار و تصرف کی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے بیان کرتے ہیں کہ یہ سمجھیں لیکن یہ سمجھنے کے بجائے ہمارا عذاب ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

'وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ' یعنی قرآن نے ان کو جس عذاب کی دھمکی دی ہے وہ ایک امر واقعی اور شدنی ہے لیکن تمہاری قوم نے اس کی تکذیب کر دی ہے۔ اب ان کا معاملہ ہم پر چھوڑو اور ان سے کہہ دو کہ 'لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ' میں تم پر کوئی داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں کہ لازماً تمہیں ایمان و اسلام کی راہ پر چلا ہی دوں ورنہ مجھ سے پرسش ہو جائے گی۔ میرے اوپر تو ذمہ داری صرف انذار و تبلیغ کی تھی وہ میں نے ادا کر دی۔ میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا۔ اب اگر تم عذاب کے لیے مچلے ہوئے ہو تو 'لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ'، ہر بات کے ظہور کے لیے خدا کی تقویم میں ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت مقرر آجائے گا تم خود اس کو دیکھ لوگے۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۶۸-۷۳

آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف التفات ہے کہ جو ضدی اور ہٹ دھرم لوگ بات سننا چاہتے ہی نہیں ان کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے، جب دیکھو کہ یہ لوگ کج بحثیوں اور استہزا پر اتر آتے ہیں تو ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤ، صرف اسی وقت ان کے سامنے کوئی بات پیش کرو جب وہ کچھ سننے سمجھنے کے موڈ میں نظر آئیں، تمہاری ذمہ داری تبلیغ و تذکیر تک محدود ہے۔ تم ان کے ایمان کے ذمہ دار تو ہو نہیں کہ ان کے دلوں میں ایمان اتار ہی دو۔ ان کی نت نئی فرمائشوں کی بھی پروا نہ کرو۔ بس اسی قرآن کے ذریعہ سے حق نصیحت ادا کر دو کہ جس کو سنبھلنا ہو سنبھل جائے، اپنے عمل کی پاداش میں مارا نہ جائے۔ خدا کے ہاں نہ کسی کی حمایت و سفارش کام آنی ہے اور نہ کوئی معاوضہ پیش کرنے کی گنجائش ہوگی۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرا دیا گیا ہے کہ ہم اللہ کی ہدایت پا جانے کے بعد شرک کی حیرانی و سرگشتگی میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے حوالے

کرنے، اسی کی نماز پڑھنے اور اسی سے ڈرتے رہنے کی ہدایت ہوئی ہے، ہم نے اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دیا ہے۔ جس کا جی چاہے یہ راہ اختیار کرے، ورنہ جہاں چاہے بھٹکتا پھرے۔ مطلب یہ ہے کہ اب اس معاملے میں کسی بحث و جدال کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم اپنے مذہب و مسلک کا واضح طور پر اعلان کیے دیتے ہیں۔

آخر میں اس کارخانۂ کائنات کے 'بالحق' ہونے کی طرف اشارہ فرمایا جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قیامت لازماً آنی ہے۔ اس دن خدا ہی کے اختیار میں فیصلہ ہوگا۔ وہ حکیم و خبیر ہے۔ اس دن حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا سب پر واضح ہو جائے گا، اس وجہ سے یہ نہیں سنتے تو ان کا معاملہ اسی دن پر چھوڑو ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۸-۷۳ وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ
يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا
تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٦٨﴾ وَمَا عَلَى الَّذِينَ
يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَٰكِنْ ذِكْرَىٰ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٦٩﴾
وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا
وَذَكِّرْ بِهِ أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ
وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ ۚ وَإِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا ۖ لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ
بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٧٠﴾ قُلْ أَنَدْعُو مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا ع ۸ ۱۴
وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلَىٰ أَعْقَابِنَا بَعْدَ إِذْ هَدَانَا اللَّهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ
الشَّيَاطِينُ فِي الْأَرْضِ حَيْرَانَ لَهُ أَصْحَابٌ يَدْعُونَهُ إِلَى الْهُدَى
ائْتِنَا ۗ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۖ وَأُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ
الْعَالَمِينَ ﴿٧١﴾ وَأَنْ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَاتَّقُوهُ ۚ وَهُوَ الَّذِي إِلَيْهِ

تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ وَهُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ وَیَوۡمَ
یَقُوۡلُ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۬ؕ قَوۡلُہُ الۡحَقُّ ؕ وَلَہُ الۡمُلۡکُ یَوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ ؕ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَالشَّہَادَۃِ ؕ وَہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۷۳﴾ الثلثۃ

ترجمۂ آیات ۶۸-۷۳

اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں مین میکھ نکالتے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مصروف ہو جائیں۔ اور اگر شیطان تمھیں بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو۔ جو اللہ سے ڈرتے ہیں ان پر ان لوگوں کے حساب کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، بس یاددہانی کر دینا ہے تاکہ وہ بھی ڈریں۔ ان لوگوں کو چھوڑو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور اسی کے ذریعے سے یاددہانی کرو کہ نہ ہو کہ کوئی جان اپنے کیے کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کی جائے۔ اللہ کے آگے نہ اس کا کوئی کارساز ہوگا نہ سفارشی اور اگر وہ ہر معاوضہ بھی دے تو بھی اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے کیے کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کیے جائیں گے۔ ان کے لیے کھولتا پانی پینے کو اور ایک دردناک عذاب ہوگا ان کے کفر کی پاداش میں۔ ۶۸ - ۷۰

کہہ دو، کیا ہم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو پکاریں جو نہ تو ہمیں نفع پہنچاتی ہیں نہ نقصان اور ہم پیٹھ پیچھے پھینک دیے جائیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت بخشی ہے، اس شخص کے مانند جس کو شیطانوں نے بیابان میں سرگشتہ و حیران چھوڑ دیا ہو، اس کے ساتھی اسے سیدھی راہ کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہماری طرف آجا۔ کہہ دو اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اور ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم اپنے آپ کو عالم کے رب کے حوالہ کریں۔ اور یہ کہ نماز قائم

کرو اور اس سے ڈرتے رہو اور وہی ہے جس کے حضور تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے غایت کے ساتھ۔ جس دن کہے گا ہو جا تو ہو جائے گا۔ اس کی بات شدنی ہے اور اسی کی بادشاہی ہو گی جس دن صور پھونکا جائے گا۔ وہ غائب و حاضر سب کا علم رکھنے والا ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔ ۷۱-۷۳

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ڰ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ (۶۸-۷۰)

خوض کا مفہوم

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ الاية، 'خوض' کے معنی کسی چیز میں گھس جانے کے ہیں۔ خاض الماءَ وہ پانی میں گھس گیا۔ اسی سے 'خوض فی الحدیث' کا محاورہ نکلا ہے جس کے معنی ہیں بات میں سے بات نکالنا، بال کی کھال ادھیڑنا، کسی بات میں اعتراض، نکتہ چینی اور کٹ حجتی کے نت نئے پہلو پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔

قرآن کا مذاق اڑانے والوں کے پاس بیٹھنے کی ممانعت

قرآن میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اسی طرح کی سخن گستری کے لیے استعمال ہوا ہے جس کا مقصد کسی بات کو ہنسی دل لگی اور مذاق میں اڑا دینا ہو۔ مثلاً وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ۝ (اگر تم ان سے پوچھو تو جواب دیں گے ہم تو بس ذرا سخن گستری اور ٹھٹول کر رہے تھے) یہاں بھی آگے والی آیت وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا میں لفظ کی اس حقیقت کو کھول دیا ہے اس لیے کہ اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو آیات الٰہی میں خوض کرتے ہیں۔ گویا 'خوض' کے بعد اس کا مقصد واضح کر دیا گیا ہے۔ قرآن نے سورۂ نساء میں اس 'خوض' کی تفسیر بھی فرما دی ہے۔ چنانچہ اسی آیت کا حوالہ دے کر جیسا کہ ہم تفسیر سورۂ نساء میں واضح کر چکے ہیں، وہاں فرمایا ہے۔ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ (۱۴۰- نساء) (اور وہ قرآن میں تمھیں ہدایت دے چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا کفر کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ان کے پاس نہ بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری

بات میں لگ جائیں، یہاں اس غرض کی وضاحت اللہ کی آیات کے کفر اور ان کا مذاق اڑانے سے کی گئی ہے۔

خطاب اگرچہ بصیغۂ واحد ہے مگر عام ہے

یہاں خطاب اگرچہ واحد کے صیغہ سے ہے جس کا غالب قرینہ یہی ہے کہ خطاب آنحضرتؐ سے ہو لیکن یہ خطاب آنحضرتؐ کے واسطہ سے تمام مسلمانوں سے ہے۔ چنانچہ اشارۃً آگے بتا بھی دیا ہے کہ یہ خطاب معناً عام ہی ہے۔ چنانچہ بعد والی آیت میں یہ جو فرمایا کہ وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ کہ خدا سے ڈرنے والوں پر ان کافروں کے کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اس نے اس خطاب کے پہلو کو واضح کر دیا کہ خطاب بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں سے ہے۔ پھر سورۂ نساء کی اس آیت میں جس کا حوالہ اوپر گزرا ہے، صاف لفظوں میں بتا دیا کہ یہ خطاب عام ہی ہے۔ اس لیے کہ وہاں سورہ انعام کی اسی ہدایت کی بنا پر ان لوگوں پر گرفت فرمائی جنھوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔

اس ہدایت کے دو پہلو

اس ہدایت کے دو پہلو ہیں اور دونوں نہایت اہم ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ رویہ اس حکمتِ دعوت کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تبلیغ کے لیے پسند فرمائی ہے۔ جس وقت کسی گروہ پر کسی چیز کی مخالفت، اس کی تضحیک اور اس کی تردید کا بخار چڑھا ہوا ہو اور بخار کی شدت سے مریض کی کیفیت ہذیانی ہو رہی ہو عین اسی حالت میں اس کے سامنے اس چیز کو پیش کرنا گویا اس کے بخار اور ہذیان دونوں کو مزید بڑھا دینا ہے۔ اگر کوئی معالج مریض کی بیماری ہی میں اضافہ چاہتا ہو تو وہ تو آزاد ہے جو چاہے کرے لیکن کوئی مہربان طبیب جو مریض کی صحت کا خواہاں ہے وہ کبھی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ اسی رعایت احوال کے پیش نظر یہاں مسلمانوں کو ہدایت ہوتی کہ جب تم دیکھو کہ یہ اسلام کے مخالفین قرآن کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے، طنز و تضحیک کے ترکش سنبھالے ہوئے اور مخالفت کے لیے آستین چڑھائے ہوئے ہیں تو اس وقت طرح دے جاؤ اور کسی ایسے وقت کا انتظار کرو جب یہ بحرانی کیفیت ذرا دور ہو جائے تو اس وقت ان کو سنانے اور سمجھانے کی کوشش کرو۔

دوسرا یہ کہ یہ اس غیرتِ حق کے منافی ہے جو اہل ایمان کے اندر ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ علانیہ خدا اور رسول کے خلاف بکواس کرتا ہے تو اس سے لڑنا بھی ایک داعی کے لیے غلط، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اور خاموش رہنا بھی غلط، اس لیے کہ اس سے وہ حمیت حق مجروح ہوتی ہے جو علامت ایمان ہے اور جس کا ضعف بالآخر درجہ بدرجہ آدمی کو اس نفاق میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں مبتلا ہو جانے کے بعد اللہ، رسول، قرآن اور شریعت ہر چیز کی توہین و تذلیل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا ہے لیکن اس کو ایسا سانپ سونگھ جاتا ہے کہ زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

یہاں اس ہدایت کے اندر یہ دونوں ہی پہلو ملحوظ ہیں۔ پہلا تو سیاق کلام ہی سے واضح ہے اور دوسرے کو قرآن نے سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں واضح فرما دیا اس لیے کہ اسی ہدایت کا حوالہ دے کر وہاں منافقین پر گرفت فرمائی ہے کہ یہ لوگ مخالفین اسلام کی ان مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں جہاں اللہ کی آیات

کا علانیہ مذاق اڑایا جاتا ہے حالانکہ ان کو قرآن میں اس سے روکا جا چکا ہے۔

توہینِ کا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ بیٹھنا بے غیرتی

'آیات' سے مراد یہاں ظاہر ہے کہ قرآن کی آیات ہیں اس لیے کہ جن لوگوں کا حال یہ بیان ہو رہا ہے ان کے سامنے قرآن ہی پیش کیا جا رہا تھا اور وہ اسی کو مذاق بنا رہے تھے لیکن یہی حکم بعینہٖ ساری شریعت اور اس کے سارے احکام کا ہوگا۔ شریعت کا مذاق جہاں بھی اڑایا جائے وہاں بیٹھنا بے غیرتی اور اس پر راضی رہنا نفاق اور کفر ہے۔

اور اس پر مطمئن رہنا نفاق ہے

'وَاِمَّا یُنۡسِیَنَّکَ الشَّیۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّکۡرٰی مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ' یہ اوپر والی ہدایت کی تاکید مزید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی شیطان اس بات سے غافل ہی کر دے تو یاد آ جانے کے بعد ایسے ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو۔ اس تاکید کی ضرورت اس لیے تھی کہ بسا اوقات، آدمی کسی مجلس میں جا پہنچتا ہے اور وہاں بات بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ دین و شریعت کے استہزا تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے وقت میں آدمی محسوس تو کرتا ہے کہ اب یہ جگہ بیٹھنے کی نہیں رہی لیکن خیال کرتا ہے کہ بھری مجلس سے کس طرح اٹھ کر چلا جائے۔ یا اگر مناظر قسم کا ہوتا ہے تو یہ خیال کرتا ہے کہ اب میدان چھوڑ کر کس طرح وہاں سے ہٹ جائے، حریف کیا کہے گا۔ یہ دونوں ہی خیال آدمی کے لیے فتنہ ہیں۔ اگر مجلس کا پاس و لحاظ مانع ہے تو یہ قلت غیرت کی دلیل ہے۔ آدمی سوچے کہ اگر اس کے منہ پر اس کے ماں باپ کو گالی دی جائے تو کیا وہ اس کو خاموشی سے گوارا کرے گا تو خدا اور اس کی شریعت کا حق تو ماں باپ بلکہ تمام دنیا جہان سے بڑا ہے۔ اور اگر وہ بحث و مناظرہ کے لیے وہاں جما رہے گا تو گو اس کی نیت احقاق حق اور ابطال باطل ہی کی ہو لیکن جب ان لوگوں کے ذہن خراب ہو چکے ہیں جن کو بات سنانی ہے اور ان کو سنانا ان کو مزید اشتعال دلانے کے مترادف ہے تو اس کا ایسے لوگوں کے ساتھ الجھنا صرف مونچھ کی لڑائی بن کر رہ جائے گا۔ مقصدِ حق کو اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی تقویت نہیں پہنچے گی بلکہ الٹا اس سے شدید قسم کا نقصان پہنچے گا۔ اس وجہ سے صحیح روش یہی ہے کہ آدمی اس کو شیطان کا چکمہ سمجھے اور ایسی مجلس سے کان جھاڑ کے اٹھ آئے۔

یہ بات یہاں یاد رہے کہ 'اِمَّا یُنۡسِیَنَّکَ الشَّیۡطٰنُ' کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اگر کبھی شیطان کسی چکر میں ڈال کر ایسی صورت حال سے دوچار کرا ہی دے یا ایسے ظالموں سے بھڑا ہی دے تو تمہیں یہ رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اول تو آدمی برابر چوکنا رہے کہ شیطان اس کو اس طرح کے فتنہ میں ڈالنے نہ پائے لیکن اگر وہ کہیں اللہ کی اس ہدایت سے غافل کر کے کسی فتنے میں ڈال ہی دے تو آدمی متنبہ ہوتے ہی ایسی مجلس کو سلام کرے اور وہاں سے چل دے۔ اس لیے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کا مذاق اڑائیں وہ اپنی جانوں پر سب سے بڑا ظلم ڈھانے والے ہیں اور ان کی معیت معلوم نہیں خدا کے کس غضب میں مبتلا کر دے۔

'وَمَا عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ مِنۡ حِسَابِہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّلٰکِنۡ ذِکۡرٰی لَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ' یہ مسلمانوں کو تسلی اور

مسلمانوں کو تسلی اور حکمتِ تبلیغ کی تلقین

تبلیغِ دین کے معاملے میں اس نقطۂ اعتدال اور طریقۂ حکمت کو اختیار کرنے کی تلقین ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کے اوپر ان کافروں اور ظالموں سے متعلق جو ذمہ داری ہے وہ صرف اللہ کی دعوت اور اس کے دین کو پہنچا دینے کی ہے تاکہ جس طرح وہ خدا سے ڈرنے والے ہیں اسی طرح یہ کفار بھی خدا سے ڈرنے والے بن جائیں۔ ان کے کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہے۔ یہ اگر ایمان لائیں گے تو اس کا صلہ خود پائیں گے اور اگر کفر پر اڑے رہیں گے تو قیامت کو اللہ کے حضور جواب وہ خود نہیں گے۔ مسلمانوں سے جب کہ انھوں نے خدا سے ڈرتے رہنے کا حق ادا کیا، کوئی مواخذہ ان سرکشوں کے باب میں نہیں ہوگا کہ یہ لوگ خدا سے ڈرنے والے کیوں نہ بنے؛ خدا کے ہاں کوئی شخص کسی دوسرے کی ذمہ داریوں سے متعلق مسئول نہیں ہوگا۔ خدا سے ڈرنے والوں پر جو ذمہ داری دوسروں کے باب میں عائد ہوتی ہے وہ صرف تبلیغ و تذکیر کی ہے اور اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے یہ کافی ہے کہ اہلِ ایمان جب دیکھیں کہ کوئی سازگار موقع ان کے کانوں میں بھی بات ڈال دینے کا ہے تو ان کو اللہ کی بات پہنچا دیں۔ اپنے آپ کو ان کی ہدایت و ضلالت کا مسئول سمجھ کر ان کے تعاقب کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مضمون سورۂ مائدہ کی آیت ۱۰۵ يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ الاٰیۃ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔

اس آیت سے کئی باتیں واضح ہوئیں جو ذہن میں رکھنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ اوپر والی آیت میں خطاب اگرچہ بصیغۂ واحد تھا لیکن کلام کا رخ مسلمانوں کی طرف تھا۔ چنانچہ کلام کے تدریجی ارتقا سے یہ حقیقت خود واضح ہوگئی اور یہی قرآن کا معروف اسلوب ہے۔

دوسری یہ کہ اس سے اس جوشِ دعوت و تبلیغ کا اظہار ہو رہا ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندر پایا جاتا تھا۔ آیت سے صاف مترشح ہو رہا ہے کہ صحابہؓ کو شہادتِ حق کی ذمہ داری کا اتنا شدید احساس تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر لوگوں نے ہدایت نہ قبول کی تو شاید آخرت میں یہ ان کی کوتاہی خدمت میں محسوب ہو۔

تیسری یہ کہ اس سے دعوت و تبلیغ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس لیے کہ آیت سے صاف واضح ہے کہ اہلِ ایمان سے مواخذہ تو نہیں ہوگا کہ لوگوں نے ہدایت قبول کیوں نہیں کی لیکن۔ مواخذہ ان سے ہوگا کہ انھوں نے لوگوں کو تذکیر و تبلیغ کی یا نہیں۔

بازی بازی بارِیش بابا ہم بازی

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا۔ 'دین' سے مراد یہاں وہ دین ہے جو اللہ نے ان کے لیے اتارا تھا اور جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ ان لوگوں کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایسے شامت زدہ ہیں کہ جس چیز کو اللہ نے ان کے دین کی حیثیت سے اتارا ہے اس کا مذاق اڑاتے ہیں ان سے کس خیر کی امید رکھتے ہو؛ ان کو چھوڑو، ان کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں۔ بازی بازی بارِیش بابا ہم بازی! جو لوگ زندگی کے معاملے میں اتنے غیر سنجیدہ، اتنے بے فکرے اور ایسے لاابالی ہیں کہ دین کو بھی وہ اپنے مسخرا پن کا موضوع بنا لیں۔ ان کو مطمئن کرنے کے لیے فکر مند ہونے

کی ضرورت نہیں۔

منکرین کا اصل مغالطہ

وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا یہ ان کی اس ساری شرارت کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ اصل چیز جس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے وہ تو اس دنیا کی، ان کے زعم کے مطابق، وہ کامیاب زندگی ہے جو ان کو حاصل ہے اور جس میں وہ مگن ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کھا رہے ہیں، عیش کر رہے ہیں اور دندنا رہے ہیں، اور کہیں سے ان کے اطمینان میں کوئی رخنہ نہیں ہے۔ اگر ان کی زندگی غلط ہے، جیسا کہ قرآن کہہ رہا ہے، تو پھر وہ تباہ کیوں نہیں کر دیے جاتے، اور جب وہ یہاں مسلمانوں سے بہتر حالت میں ہیں تو بالفرض موت کے بعد اٹھنا ہی ہوا تو آخر وہ آخرت میں کیوں اچھے نہیں رہیں گے؟ ان کا اصلی مغالطہ یہی ہے کہ جب ہماری زندگی کامیاب ہے تو ہمارا رویہ بھی لازماً صحیح ہے۔ وہ اسی دنیا کی زندگی کو کل کی زندگی سمجھے بیٹھے ہیں اور یہ زندگی چونکہ جزا و سزا کے اصول پر نہیں چل رہی ہے بلکہ امتحان و آزمائش کے اصول پر چل رہی ہے، یہاں حق کے ساتھ خدا نے باطل کو بھی ڈھیل دے رکھی ہے، اس وجہ سے وہ اپنی خواہشوں کی پیروی میں باطل ہی کو اپنا دین بنا بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی زندگی اور یہی رویہ صحیح ہے اور قرآن ان کو جس انجام سے خبردار کر رہا ہے وہ محض ایک موہوم ڈراوا ہے۔

وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ 'بہ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے جس کا اوپر آیت ۷۰ میں ذکر ہے۔ 'ابسلہ'، اسلمہ للھلکۃ، اس کو ہلاکت کے حوالہ کیا۔ ابسل فلانا لعملہ وبہ وکلہ الیہ، فلاں کو اس کے عمل کے حوالہ کر دیا۔ 'ان' سے پہلے عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق مضاف لفظ 'مخافۃ' یا اس کے ہم معنی کوئی دوسرا لفظ محذوف ہے۔ اس کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس قرآن کے ذریعے سے تذکیر کرو، نہ ہو کہ کوئی جان اپنے عمل کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کی جائے۔ دوسرا یہ کہ اس قرآن کے ذریعے سے یاددہانی کرو، نہ ہو کہ کوئی جان اپنی کرتوت کے حوالہ کی جائے یا اپنی کرتوت کے بدلے رہن ہو کے رہ جائے۔ دونوں میں حقیقت کے اعتبار سے کچھ زیادہ فرق نہ ہوگا۔

تذکیر کے لیے قرآن کافی ہے

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دین کو مذاق بنائے ہوئے ہیں نہ زیادہ ان کے درپے ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ان کے نت نئے مطالبات کے لیے فکرمند ہونے کی، بس اسی قرآن کے ذریعہ سے اپنا فرض تذکیر و تبلیغ جو تم پر عائد ہوتا ہے، ادا کرتے رہو کہ کوئی جان اپنے عمل کی پاداش میں گرفتارِ عذاب نہ ہو۔

تمہارا فریضہ لوگوں کو اس خطرے سے آگاہ کر دینا ہے کہ آگے کی منزل میں ہر ایک کو اپنے عمل سے سابقہ پیش آنا ہے۔ عمل ہی ہلاک کرے گا اور عمل ہی نجات دے گا۔ نہ کوئی کسی کا حامی و مددگار ہوگا اور نہ کوئی شفیع و سفارشی اور نہ کسی کے پاس کوئی معاوضہ دینے کو ہوگا اور نہ کسی کا کوئی بڑے سے بڑا معاوضہ قبول ہوگا۔ اس خطرے سے آگاہ کر دینا ضروری ہے تاکہ کوئی بے خبری میں اپنے ہی عمل کی گرفت میں نہ آ جائے۔ اس آگاہی کے بعد اگر کوئی خود اپنی شامتِ اعمال میں گرفتار ہونا چاہتا ہے تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے۔

تم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو۔ جو لوگ اس آگاہی کی پروا نہیں کریں گے وہ اپنی کرتوتوں کے حوالے ہوں گے اور ان کے کفر کی پاداش میں ان کے لیے کھولتا پانی پینے کو اور عذاب دردناک ہوگا۔

اہل دوزخ کے لیے اولین سامان ضیافت

'کھولتے پانی' کا ذکر یہاں بطور 'نُزُل' یعنی اولین سامانِ ضیافت کے ہے جیسا کہ دوسری جگہ اس کی تصریح ہے وَاَمَّآ اِنْ کَانَ مِنَ الْمُکَذِّبِیْنَ الضَّآلِّیْنَ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِیْمٍ ۹۲ واقعہ (اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہوا تو اس کے لیے اولین سامان ضیافت کھولتا ہوا پانی ہوگا) یعنی وہاں اترتے ہی پہلی ضیافت تو ان کی ماءِ حمیم سے ہوگی پھر اس کے بعد ان کے لیے عذابِ الیم کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

'وَاِنْ تَعْدِلْ کُلَّ عَدْلٍ' کا صحیح زور سمجھنے کے لیے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قیامت کے دن مجرمین یہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ اپنی اولاد، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے خاندان اور ساری دنیا کو فدیہ میں دے کر اس عذاب سے چھوٹ جائیں لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوگی۔ ملاحظہ ہوں آیات ۱۱-۱۴ سورۂ معارج۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُنَا وَلَا یَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ ھَدٰنَا اللّٰہُ کَالَّذِی اسْتَھْوَتْہُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ ۠ لَہٗٓ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَہٗٓ اِلَی الْھُدَی ائْتِنَا ط قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی ط وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَاَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّقُوْہُ ط وَھُوَ الَّذِیْٓ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ ۝ وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط وَیَوْمَ یَقُوْلُ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ قَوْلُہُ الْحَقُّ ط وَلَہُ الْمُلْکُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ط عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ ط وَھُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ (۷۱-۷۳)

خدا کی بات آجانے کے بعد کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا

'قُلْ اَنَدْعُوْا ...... بَعْدَ اِذْ ھَدٰنَا اللّٰہُ'۔ اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا کہ یہ لوگ جو ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ تمہیں پھر اسی گمراہی میں پھنسائیں جس سے خدا نے تمہیں نکالا ہے تو تم ان کو صاف صاف سنا دو کہ کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ ہم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو پکاریں جن کو نہ ہمیں نفع پہنچانے پر کوئی اختیار نہ ضرر پہنچانے پر اور اس طرح ہم الٹے پاؤں پھر اسی گمراہی میں جا گریں جس سے خدا نے ہمیں نکلنے کی توفیق بخشی اور ہماری رہنمائی فرمائی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر پہلے ہم اس گمراہی میں مبتلا رہے تو اس کے لیے کچھ عذر تھا لیکن اب اگر ہم رجعت اختیار کریں گے تو ہمارے پاس کیا عذر ہوگا؟ 'مَا لَا یَنْفَعُنَا وَلَا یَضُرُّنَا' میں ان معبودوں کے لیے 'مَا' کا لفظ ان کی تحقیر پر دلیل ہے اور نفع و ضرر کی نفی اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے اس لیے کہ ان چیزوں میں سے اگر کسی چیز سے نفع و ضرر پہنچا ہے تو اللہ کے حکم سے پہنچا ہے نہ کہ ان میں سے کوئی چیز بذاتِ خود یا باختیارِ خود نافع و ضار ہے۔ 'بَعْدَ اِذْ ھَدٰنَا اللّٰہُ' مخاطبوں کے لیے نہایت موثر موعظت بھی ہے کہ اس آفتابِ ہدایت کے طلوع ہو جانے کے بعد بھی جو لوگ خود ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور دوسروں کو بھی ٹھوکریں کھلانا چاہتے ہیں وہ ذرا اپنے انجام پر غور کریں۔

کَالَّذِی اسْتَهْوَتْهُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَی الْهُدَی ائْتِنَا '

'استہواء' کے معنی کسی کی عقل گم کر دینا، ہوش اڑا دینا، حیران و درماندہ کر دینا۔ 'ارض' کے معنی یوں تو زمین کے ہیں لیکن یہاں گم گشتگی کی تمثیل بیان ہو رہی ہے اس وجہ سے قرینہ بتا رہا ہے کہ اس سے مراد صحرا اور بیابان ہے جہاں راہ بھٹکنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ فعل 'استہوا' کی نسبت شیاطین کی طرف اس مفہوم کے اعتبار سے ہے جو تمثیل میں مضمر ہے۔ یہ تمثیل ایمانی و اخلاقی گم گشتگی کی ہے جس میں زیادہ دخل شیاطین جن وانس کا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے فعل کی نسبت شیاطین کی طرف کر کے اصل حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا۔ 'ھدای' کے معنی تفسیر سورۂ بقرہ کے آغاز میں ہم بتا چکے ہیں کہ سیدھی راہ کے بھی آتے ہیں۔

مخالفین اسلام کی تمثیل

یہ اوپر والے ٹکڑے 'وَنُرَدُّ عَلٰۤی اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ' کی تمثیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت الٰہی کی شاہراہ پا جانے کے بعد اگر ہم تمہارے کہے پر چلے اور مڑ کے اس کفر و شرک میں پھر مبتلا ہو گئے جس سے خدا نے ہمیں نکالا ہے تو ہماری مثال بالکل اس شخص کی ہوگی جس کو شیاطین نے کسی صحرا میں بھٹکا دیا ہو، وہ حیران و درماندہ ادھر ادھر پھر رہا ہو، اس کے کچھ ساتھی اس کو پکار رہے ہوں کہ راستہ ادھر ہے، ہماری طرف آجاؤ لیکن اس کی عقل ایسی گم ہو کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو کہ کدھر جائے۔

اس تمثیل کا اسلوب اگرچہ بظاہر ایک عمومی تمثیل کا ہے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت یہ ان مخالفین اسلام کی تمثیل ہے جو یہاں زیر بحث ہیں۔ اس تمثیل میں ان کے سامنے یہ بات رکھی گئی ہے کہ تم صحرا میں بھٹکتے ہوئے مسافر کی مانند ہو، شیاطین اور گمراہ لیڈروں نے تمہاری مت ماردی ہے اور تمہارے کچھ راہ یاب ساتھی (اشارہ اہل ایمان کی طرف ہے) تمھیں اصل راہ کی طرف بلا رہے ہیں لیکن تم ان کی پکار نہیں سن رہے ہو ——— دیکھیے کس خوبی کے ساتھ ان کی پوری تصویر ان کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ حکایت بظاہر دوسروں کی لیکن بات ساری کی ساری ان کی۔

'قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی' یعنی ان کو بتا دو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے تو اللہ کی ہدایت پا جانے کے بعد اب ہم کسی اور طریقے کی پیروی کس طرح کر سکتے ہیں ؟

'وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' یہ مشرکین کی دعوت شرک کا جواب ہے کہ تم ہمیں ان چیزوں کی پرستش کی دعوت دے رہے ہو جو نہ ہمیں نفع پہنچا ئیں نہ نقصان پہنچا سکیں اور حکم ہمیں اللہ رب العالمین کے آگے سرافگندگی اور حوالگی کا ہوا ہے۔ یہاں لفظ 'امر' کے بعد 'لِ' اس امر کے موکد ہونے کو ظاہر کر رہا ہے اور 'رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' کی صفت اس امر موکد کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی تمام عالم کا رب ہے تو اس کے سوا کون حقدار ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے حوالہ کیا جائے۔

'وَاَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ وَهُوَ الَّذِیْۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ' یہ 'اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' کے تحت اور اسی کی عملی تصویر ہے لیکن اسلوب غائب سے بدل کر حاضر کا کر دیا گیا ہے جس سے

اس کے اندر براہِ راست خطاب کا زور پیدا ہوگیا ہے۔ نماز کا ذکر یہاں اس اسلام کے اولین عملی مظہر کی حیثیت سے ہوا ہے جس کا ذکر وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں ہے۔ 'تقویٰ' یہاں ان تمام حدود کی پابندی کے مفہوم میں ہے جن کی پابندی کا خدا نے حکم دیا ہے۔ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ میں آخرت اور توحید دونوں چیزیں جمع کردی گئی ہیں اور یہ اوپر والے احکام کی دلیل ہے کہ نماز کا قیام اور حدودِ الٰہی کا احترام اس لیے لازم ہے کہ ایک دن خدا کے آگے حاضر ہونا ہے اور صرف اسی کے آگے حاضر ہونا ہے۔ اس دن کوئی اور مرجع و مولیٰ نہیں ہوگا۔ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ الاٰيه ایک نہایت جامع آیت ہے جس میں نہایت مختصر الفاظ میں اوپر والے ٹکڑے وَهُوَ الَّذِيْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ کے ہر جزو کی دلیل بیان ہوگئی ہے۔

کارخانۂ کائنات کے 'بالحق' ہونے کا لازمی نتیجہ

آسمان و زمین میں خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے جو آثار و دلائل موجود ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ یہ کارخانہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے جو اس نے محض اپنا جی بہلانے کے لیے بنایا ہو بلکہ یہ ایک قدیر، علیم، حکیم اور رحمان و رحیم ذات کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اگر یہ یونہی چلتی رہے، اس کے اندر جو ظلم ہے اس کے انصاف کے لیے کوئی دن نہ آئے، جو عدل ہے اس کی داد کا کوئی وقت نہ آئے، اس کے اندر جو بُرے، شریر، بدنابکار ہیں ان کو کوئی سزا نہ ملے، جو نیک، حق شناس اور عدل شعار ہیں ان کو ان کی نیکیوں کی جزا نہ ملے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ سارا کارخانہ بالکل عبث، بے غایت اور باطل ہے جس کے بنانے والے کے نزدیک خیر اور شر، ظلم اور عدل، حق اور باطل میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ یہ بات انسان کی عقل و فطرت کسی طرح بھی قبول نہیں کرسکتی اس لیے کہ جس خالق کی خلقت کے ہر گوشے میں اس کی حکمت، قدرت، رحمت اور ربوبیت کے آثار موجود ہیں اور اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ انسان کسی طرح ان کا احاطہ نہیں کرسکتا اس کی نسبت وہ کس طرح یہ باور کرلے کہ اس کو ہماری نیکی بدی اور ہمارے عدل و ظلم سے کوئی بحث نہیں ہے۔ اگر بحث ہے اور ضرور بحث ہے اس لیے کہ یہ بحث نہ ہو تو یہ دنیا بالکل کھیل بلکہ نہایت ظالمانہ کھیل بن کے رہ جاتی ہے تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ اس دنیا کے لیے ایک یوم انصاف آئے جس میں خدا کی کامل رحمت اور اس کی کامل حکمت ظاہر ہو اور ہر نیکی اپنا صلہ پائے اور ہر بدی اپنی سزا۔

'وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ، قَوْلُهُ الْحَقُّ' یعنی کوئی اس وہم میں مبتلا نہ ہو کہ اس دن کے لانے میں خدا کو کوئی دشواری پیش آئے گی۔ جس نے یہ دنیا مجرد اپنے حکم 'کن' سے بنائی ہے وہ جب حشر برپا کرنا چاہے گا تو اسی کلمۂ 'کن' سے حشر بھی برپا کردے گا۔ آخر جب اس کو پہلی بار دنیا کے پیدا کردینے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئی تو دوبارہ کیوں پیش آئے گی؟ قَوْلُهُ الْحَقُّ میں 'حق' کے معنی شدنی کے ہیں یعنی خدا کی ہر بات ہو کے رہتی ہے۔ اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوسکتی۔

'وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ' یعنی جس دن حشر کے لیے صور پھونکا جائے گا اس دن سارا اختیار اور ساری بادشاہی صرف خدائے واحد و قہار ہی کی ہوگی۔ اس دن نہ کسی کا کوئی زور چلے گا'

نہ کسی کو کوئی اختیار حاصل ہوگا نہ کسی کی سعی و سفارش اللہ کے اذن کے بغیر کسی کو کچھ نفع پہنچا سکے گی۔ سب خدا کے آگے سرفگندہ ہوں گے صرف اسی کا حکم ناطق و نافذ ہوگا۔

'عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ' وہ سارے غائب و حاضر کا علم رکھنے والا ہے اس وجہ سے نہ کسی کی کوئی ظاہر یا پوشیدہ بات اس سے مخفی ہوگی، نہ وہ کسی سے کوئی بات پوچھنے کا محتاج ہوگا، نہ کوئی اس کے علم میں کوئی اضافہ کر سکے گا، نہ کوئی غلط فہمی کا عذر کر سکے گا۔

'وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ' وہ حکیم بھی ہے اور خبیر بھی۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کا ہر فیصلہ عدل و حکمت اور علم و خبر پر مبنی ہو۔ نہ اس کے عدل و حکمت میں کوئی نقص ہے کہ وہ کسی باطل کو حق اور حق کو باطل بنا دے۔ نہ اس کے علم و خبر میں کوئی خلا ہے کہ لاعلمی اور بے خبری کے سبب سے کسی مغالطے میں پڑ جائے یا کوئی اس کو مغالطہ میں ڈال کر حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دے۔

۱۱۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۷۴-۹۰

سورہ کے شروع سے جو بحث چلی آ رہی تھی یہاں آ کر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔ اب آگے حضرت ابراہیمؑ اور ان سے پہلے اور ان کے بعد پیدا ہونے والے تمام نبیوں کا حوالہ دے کر بتایا گیا ہے کہ ان سب کی دعوت یہی تھی جو یہ پیغمبر دے رہے ہیں۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم بہر شکل اسی ہدایت یافتہ گروہ کی ہدایت کی پیروی کرو۔ اگر تمہاری یہ قوم تمہاری بات نہیں سنتی تو اس کو اس کے حال پہ چھوڑ دو، تمہاری ذمہ داری صرف دعوت و تبلیغ کی ہے۔ ان کے دلوں میں ایمان و ہدایت اتار دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں خاص اہمیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعوتِ توحید کا ذکر فرمایا ہے جو بالکل ابتدا ہی میں انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو دی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی دعوت کے خاص طور پہ ذکر کی وجہ، جیسا کہ ہم تفسیر سورۂ بقرہ میں وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، یہ ہے کہ بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دونوں ہی ان کو مسلم طور پر اپنا خاندانی بزرگ اور روحانی پیشوا مانتے تھے اور مدعی تھے کہ جس دین پر وہ ہیں ان کو انہی سے وراثت میں ملا ہے اور اپنی تمام مشرکانہ بدعات میں انہی کے نام نامی کو بطور سند پیش کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی چونکہ ملتِ ابراہیمؑ پر ہوئی تھی اس وجہ سے ضروری ہوا کہ جس طرح بقرہ اور آل عمران میں بنی اسرائیل پر یہ واضح کر دیا گیا کہ ان کی ایجاد کردہ یہودیت و نصرانیت کو ملت ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسی طرح بنی اسمٰعیل پر بھی یہ واضح کر دیا جائے کہ انھوں نے جو دین شرک اختیار کر رکھا ہے یہ ان کی اپنی ایجاد ہے، حضرت ابراہیمؑ سے اس کو کوئی دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں حضرت ابراہیم کی دعوت اور ان کی زندگی کے ہر پہلو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو سبق حاصل ہو سکتے تھے وہ کسی اور طریقے سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ آپ اسی ملت بیضا کی تجدید و تکمیل کے لیے آئے تھے جس کی دعوت حضرت ابراہیمؑ نے دی تھی اور اسی قوم کے اندر آئے تھے جو حضرت ابراہیمؑ کی نام لیوا تھی۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ آیات ۷۴-۹۰
فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ
قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷۶﴾ فَلَمَّا رَاَ
الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ
رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ ﴿۷۷﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً
قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا
تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَحَاۗجَّهٗ قَوْمُهٗ ۭ
قَالَ اَتُحَاۗجُّوْۗنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ۭ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ
بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ رَبِّيْ شَيْـــًٔـا ۭ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ اَفَلَا
تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ
اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ۭ فَاَيُّ
الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وقف لازم
وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع ۹ ۱۴ ۱۵

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ
اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٨٣﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا
هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ
وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٨٤﴾
وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ
وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَمِنْ
اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٨٧﴾ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٨٨﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ
بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ
عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٠﴾ ع ١٠ ٨ ١٦

ترجمۂ آیات ۷۴-۹۰

اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا، کیا تم بتوں کو معبود بنائے بیٹھے ہو؟ میں تم کو اور تمھاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین میں ملکوت الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ اپنی قوم پر حجت قائم کرے اور کاملین یقین میں سے بنے۔ ۷۴-۷۵

بس یوں ہوا کہ جب رات نے اس کو ڈھانک لیا اس نے ایک تارے کو دیکھا،

بولا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا اس نے کہا میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر جب اس نے چاند کو چمکتے دیکھا بولا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ بھی ڈوب گیا اس نے کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو کر رہ جاؤں گا۔ پھر جب اس نے سورج کو چمکتے دیکھا بولا کہ یہ میرا رب ہے یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو اپنا رُخ بالکل یکسو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ ۷۶ - ۷۹

اور اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی۔ اس نے جواب دیا کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو، درآنحالیکہ اس نے میری رہنمائی فرمائی ہے۔ اور میں ان سے نہیں ڈرتا جن کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو مگر یہ کہ کوئی بات میرا رب ہی چاہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ تو کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے ؛ اور میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے جن کے باب میں اس نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری۔ تو ہم دونوں گروہوں میں سے امن واطمینان کا زیادہ سزاوار کون ہے، اگر تم جانتے ہو؟ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن و چین ہے اور وہی راہ یاب ہیں۔ ۸۰ - ۸۲

یہ ہے ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم پر قائم کرنے کے لیے بخشی۔ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں۔ بیشک تیرا رب حکیم و علیم ہے۔ اور ہم نے اس کو

اسحٰق اور یعقوب عطا کیے۔ ان میں سے ہر ایک کو ہدایت بخشی اور نوح کو بھی ہم نے ہدایت بخشی اس سے پہلے اور اس کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی، یہ سب نیکو کاروں میں سے تھے اور اسمٰعیل، الیسع، یونس اور لوط کو بھی اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے عالم والوں پر فضیلت بخشی۔ اور ان کے آباو اجداد، ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی ہم نے ہدایت یافتہ بنائے اور ان کو برگزیدہ کیا۔ اور ان کو ہم نے صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے اس سے وہ سرفراز فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا دھرا اکارت ہو کے رہ جاتا۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور قوتِ فیصلہ اور نبوت عطا فرمائی تو اگر یہ لوگ اس کا انکار کر دیں گے تو کچھ پروا نہیں ہم نے اس کے لیے ایسے لوگ مامور کر دیے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی تو تم بھی انہی کے طریقے کی پیروی کرو۔ اعلان کر دو، میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب نہیں۔ یہ تو بس عالم والوں کے لیے ایک یاد دہانی ہے۔ ۸۳-۹۰

۱۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۷۴)

آزر کے نام کے بارے میں روایات کا اختلاف

آزر، حضرت ابراہیم کے والد کا نام ہے۔ تورات کے عربی اور انگریزی ترجموں اور تالمود، سب میں اس کا تلفظ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ قرآن نے یہاں جس تصریح کے ساتھ اس نام کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں یہود کے ہاں روایات کا جو اختلاف ہے وہ اس کو رفع کرنا چاہتا ہے اور قرآن چونکہ قدیم صحیفوں کے لیے کسوٹی (مہیمن) کی حیثیت رکھتا ہے اور براہِ راست وحی الٰہی پر مبنی ہے اس وجہ سے ماننا چاہیے کہ یہی نام صحیح ہے۔

ابنیاؤں کا ایک نشان اسلوب

یہود کے مذہبی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزر صرف بت پرست ہی نہیں بلکہ بت گر اور بت فروش بھی تھے بلکہ عجب نہیں کہ بت خانے کے پروہت بھی رہے ہوں۔ ایسے حالات میں آزر کے گھر میں ابراہیمؑ کا پیدا ہونا اور باپ کے سارے کاروبار بت پرستی و بت فروشی پہ بیٹے ہی کے ہاتھوں یہ ضرب کاری لگنا قدرتِ الٰہی کا ایک کرشمہ ہے۔ حضرات انبیاء کی صداقت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ انھوں نے جس حق کی دعوت دنیا کو دی ہے اس کی اذان سب سے پہلے ان کے کانوں میں دی ہے جو ان کے سب سے زیادہ قریب بھی تھے اور ان کو سب سے زیادہ عزیز بھی۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کو جو دعوت دی ہے اس کی طرف یہاں صرف اجمالی اشارہ ہے۔ قرآن میں دوسرے مقامات میں اس کی تصریح بھی ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ	یاد کرو جب اس نے اپنے باپ سے کہا۔ اے میرے
مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ	باپ، آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنتی ہیں
شَيْـًٔا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ	نہ دیکھتی ہیں اور نہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں۔ اے
مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ	میرے باپ، میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے
اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ	پاس نہیں آیا تو میری پیروی کیجیے میں آپ کو سیدھی راہ
الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ	دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ شیطان کی بندگی نہ کیجیے۔
عَصِيًّا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ	شیطان خدائے رحمان کا بڑا نافرمان ہے۔ اے میرے
عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ	باپ میں ڈرتا ہوں کہ آپ کو خدائے رحمان کی طرف سے
وَلِيًّا ۝ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ	کوئی عذاب نہ آ پکڑے کہ آپ شیطان کے ساتھی بن کے
اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ	رہ جائیں۔ اس نے جواب دیا، ابراہیم! کیا تم میرے
تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ	معبودوں سے منحرف ہو رہے ہو۔ اگر تم باز نہ آئے تو میں
مَلِيًّا ۝	تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ اب تم میرے پاس سے لمبے دم
(۴۲ - ۴۶ سورۂ مریم)	دفع ہو جاؤ۔

اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً یعنی اپنے ہی ہاتھوں کے گھڑے ہوئے بت اور ان کو معبود بنا ڈالا ہے، یہ تو ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے جس میں آپ بھی مبتلا ہیں اور آپ کی قوم بھی! دوسری جگہ فرمایا ہے اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۹۵۔ صافات (کیا تم پوجتے ہو ان چیزوں کو جن کو خود اپنے ہی ہاتھوں گھڑتے ہو)

وَكَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۔ (۷۵)

'وَكَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ'، دوسرے مقام میں ہم اس اسلوب کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ دراصل کُنَّا نُرِیْ اِبْرٰهِیْمَ ہے۔ عربی زبان کے معروف اسلوب کے مطابق یہاں کُنَّا محذوف ہو گیا ہے۔

لفظ 'ملکوت' کی تحقیق

'مَلَکُوْت' جس طرح 'رَہبَۃ' سے 'رَہبوت' ہے اسی طرح 'مُلک' سے 'ملکوت' ہے۔ 'ملکوت' کا لغوی مفہوم تو عزت و اقتدار، بادشاہی اور سلطنت ہے لیکن قرآن میں یہ لفظ خدا کی اس تکوینی بادشاہی کے لیے استعمال ہوا ہے جو آسمان اور زمین بلکہ ہر چیز پر قائم و دائم ہے۔ اس 'ملکوت الٰہی' پر غور کرنے کی دعوت مختلف اسلوبوں سے قرآن میں بار بار دی گئی ہے اَوَلَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۱۸۵-اعراف (کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین میں خدا کی بادشاہی پر غور نہیں کیا) سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّاِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ۸۳-یٰس (پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی زمام ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے)

ملکوتِ الٰہی میں تفکر تمام علم کی کلید ہے

یہاں یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آسمان و زمین کے نظام پر غور کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق بخشی سے ان پر اپنی معرفت کے وہ اسرار و حقائق کھولے جو انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم پر واضح کیے۔ یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ اسی ملکوت پر غور کرنے سے وہ کلید ہاتھ آتی ہے جس سے صحیح فکر اور صحیح عمل کے دروازے کھلتے ہیں۔ اسی سے زندگی کا سرا بھی ہاتھ آتا ہے اور اسی سے اس کے منتہا کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس دنیا کا کوئی خالق ہے یا یہ خود ہی آ دھمکی ہے؟ اگر کوئی خالق ہے تو وہ یکہ و تنہا ہے یا اس کے اور بھی شریک و سہیم ہیں؟ یہ پیدا ہو کر کبھی ختم ہو گی یا اسی طرح ہمیشہ ہمیش چلتی رہے گی؟ اگر اس کا کوئی خالق و مالک ہے تو اس کی صفات و خصوصیات کیا ہیں اور کس لیے اس نے اتنا بڑا عالم کھڑا کر دیا ہے؟ اس دنیا میں حق و باطل کے لیے کوئی معیار ہے یا یہ کوئی اندھیر نگری ہے؟ انسان اپنے اقوال و افعال کے لیے مسئول اور جواب دہ ہے یا بالکل مطلق العنان اور شترِ بے مہار ہے؟ آسمانوں اور زمین میں ایک ہی قادر و قیوم کی تدبیر و حکمت کارفرما ہے یا ان کے اندر الگ الگ مشیتیں اور الگ الگ ارادے زور آزمائی کر رہے ہیں؟ یہ اور اس قبیل کے دوسرے بہت سے سوالات ہیں جن کے صحیح حل پر ہی صحیح فکر اور صحیح عمل کی بنیاد ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے آسمان و زمین کے اس نظام پر غور کرنے کی دعوت بھی دی ہے اور صحیح نتائج تک پہنچنے میں ہمارے فکر کی رہنمائی بھی فرمائی ہے۔

جہاں تک غور کرنے کا تعلق ہے اس ملکوت پر غور تو ایک سائنس دان بھی کرتا ہے لیکن وہ سارا غور و فکر اپنی ذات یا اپنے محدود ماحول کو محور بنا کر کرتا ہے۔ اس کی نگاہ صرف اپنے نفع عاجل پر ہوتی ہے اس وجہ سے وہ ان حقائق تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا جو اس کی نگاہ کو اس کے مطلوب نفع عاجل سے ہٹا دیں۔ وہ چمن میں کھلے ہوئے گلاب کو اس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اس سے گل قند یا اسی طرح کی کوئی اور چیز تیار ہو سکتی ہے جس سے فلاں فلاں فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس چکر میں نہیں پڑتا کہ اس پھول کے حسن و جمال، اس کی رعنائی و دلکشی، اس کی عطر بیزی و مشام نوازی میں اس کے صانع کی قدرت، کاریگری، حکمت، رحمت اور ربوبیت کے جلوے دیکھنے کی کوشش کرے اور ان جلووں سے بے خود

ہو کر پھول سے گزر کر پھول کے پیدا کرنے والے کے جمال و کمال کے مشاہدے میں غرق ہو جائے۔

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

حالانکہ ایک صاحبِ نظر کے لیے پھول کا یہی پہلو زیادہ جاذبِ نظر ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر پھول سے مقصود صرف گل قندہی ہوتا تو صرف اس مقصد کے لیے اس کی ایک ایک پنکھڑی پر قدرت کو اس فیاضی کے ساتھ گل کاری کی کیا ضرورت تھی؟ یہ گل کاری اور صنعت گری تو اسی لیے فرمائی گئی ہے کہ پھول کی ایک ایک پتی معرفتِ کردگار کے دفتر کا کام دے۔

نیوٹن نے سیب کے درخت سے ایک سیب زمین پر گرتے دیکھا۔ اس سے اس کا ذہن زمین کی کشش کے اصول کی طرف منتقل ہو گیا۔ پھر اس اصول سے بہت سے اصول دریافت ہو گئے جو علمی تحقیقات و انکشافات میں بہت کار آمد ثابت ہوئے لیکن نگاہ ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس اصول کی تمام کار فرمائیاں بس اسی دنیا کی تنگ نائے کے اندر محدود رہ گئیں۔ ورنہ یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے کائنات کی ایک ایک چیز کو خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، جذبِ وکشش کے اس قانون سے باندھ رکھا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا ایماندارانہ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ یہ سارا کارخانہ ایک غالب مقتدر اور ایک حکیم و علیم کا بنایا ہوا ہے لیکن اس سوال اور اس کے جواب سے چونکہ بہت بھاری ذمہ داریاں انسان پر عاید ہوتی ہیں اس وجہ سے ہمارے سائنس دان اس سے بھاگتے ہیں۔

حضراتِ انبیاء کی بلند نگاہی

زیرِ بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ "اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان و زمین میں ملکوتِ الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے" تو اس سے اسی بلند نگاہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی ہدایت سے حضراتِ انبیاء کرام کو بالخصوص حاصل ہوتی ہے اور بقدرِ استعداد اس توفیق میں سے وہ لوگ بھی حصہ پاتے ہیں جو ایماندارانہ اس کائنات پر غور کرتے ہیں اور اپنے غور و فکر کے نتائج سے گریز کے بجائے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا میں اسی گروہ کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

'وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ' یہاں عربی زبان کے اس معروف قاعدے کے مطابق جس کی ایک سے زیادہ مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں، معطوف علیہ محذوف ہے جس کا تعین قرینہ کرے گا۔ یہاں آگے وضاحت موجود ہے کہ اس مشاہدۂ ملکوت سے اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنی وحدانیت کی اس دلیل کی طرف رہنمائی فرمائی جو انھوں نے اپنی قوم پر تمام فرمائی۔ چنانچہ فرمایا ہے وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ (اور یہ ہے ہماری وہ دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابل میں عطا فرمائی) اس قرینہ کی روشنی میں اگر اس محذوف کو کھولا جائے تو پوری بات یوں ہوگی کہ "اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین میں ملکوتِ الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ اس کے ذریعہ سے اپنی قوم پر حجت قائم کرے اور تاکہ وہ اہل یقین میں سے بنے"

یقین کے مدارج

یہاں جس یقین کا ذکر ہے یہ وہ یقین ہے جو ایمان کے اوپر کا درجہ ہے جس کو حق الیقین سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایمان ایک عام چیز ہے جس کے لیے اگر فطرت سلیم ہو تو اندر کا وجدان بھی کافی ہوتا ہے لیکن یقین، فکر و نظر، تفکر و تدبر اور ملکوت الٰہی کے علم و مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے مراتب و مدارج کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے چنانچہ آگے نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ میں اسی کے مراتب عالیہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہی یقین جب ایمان کے اندر پیدا ہوتا ہے تب اس کا فیضان متعدی ہوتا ہے یہاں تک کہ بسا اوقات اس سے دشت و جبل گونج اٹھتے ہیں۔ حضرات انبیا چونکہ خلق کی ہدایت پر مامور ہوتے ہیں اس درجہ سے وہ اس میں سے حصہ وافر پاتے ہیں اور پھر ان کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہوتا ہے جو ان کے متبعین باحسان میں شامل ہوتے ہیں۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۷۶-۷۹)

ان آیات میں لغت یا اسلوب زبان کا کوئی اشکال نہیں ہے۔ نظم کے پہلو سے یہ اوپر والی آیات کے اجمال کی تفصیل ہے۔ پہلے حوالہ دیا کہ کس طرح ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے دین کے کھوکھلے پن کو ان کے سامنے بے نقاب کیا اور ان کی کھلی ہوئی گمراہی پر ان کو ملامت کی۔ پھر اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس طرح ہم ابراہیم (علیہ السلام) پر آسمان و زمین میں اپنی ملکوت کے اسرار و حقائق بے نقاب کرتے تھے تاکہ وہ اپنی قوم پر ہماری حجت قائم کرے اور تاکہ وہ کاملین یقین میں سے بنے۔ اس کے بعد اب یہ وضاحت ہو رہی ہے کہ ابراہیمؑ نے کس طرح اپنی قوم پر یہ واضح کیا کہ وہ اس کائنات کی جن چیزوں کو معبود سمجھ کر ان کی پرستش کر رہی ہے وہ ساری چیزیں خود اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہیں کہ وہ ملکوتِ الٰہی کے تابع اور اس کے احکام و قوانین کے تحت مسخر ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ سر مو ادھر ادھر ان سے تجاوز کر سکیں۔ اس وجہ سے عبادت کا اصلی مستحق وہ ہے جو ان سب کا خالق و فاطر ہے نہ کہ یہ جو محکوم و مقہور ہیں۔ اب ہم حضرت ابراہیمؑ کے اس استدلال کی وضاحت کریں گے لیکن اس وضاحت سے پہلے چند باتیں حضرت ابراہیمؑ کے طرزِ خطاب و استدلال سے متعلق سمجھ لینی ضروری ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے طرزِ استدلال کی بعض خصوصیات

حضرات انبیاء علیہم السلام یوں اپنی دعوت اور اپنے مقصد کے اعتبار سے تو بالکل یک رنگ و ہم آہنگ ہوتے ہیں لیکن اپنے مخاطبوں کے مزاج، ان کی افتادِ طبع اور ان کے ذوق کے اختلاف کے سبب سے ہر نبی کے طرزِ خطاب اور طریقۂ استدلال و بحث میں کچھ امتیازی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زیادہ تر تمثیلوں میں بات کرتے تھے۔ بعض انبیا میں موعظت کا رنگ غالب ہے بعض کے ہاں قانون کا انداز نمایاں ہے۔ یہ فرق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، زیادہ تر نتیجہ ہے مخاطبوں کے

ذوق و مزاج کے فرق و اختلاف کا، لیکن کچھ اس میں اس فطری رجحان کو بھی دخل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر طبیعت میں الگ الگ ودیعت فرمایا ہے۔

استدراج حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم، جیسا کہ قرآن میں بیان کردہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، بڑی مناظرہ باز اور حجت طراز قوم تھی۔ اول تو لوگ بات سننے کے لیے آسانی سے تیار ہی نہ ہوتے اور اگر کبھی سنانے کا کوئی موقع نکلتا بھی تو بڑی جلدی بدک جاتے اور مباحثہ و مناظرہ کے لیے آستینیں چڑھا لیتے۔ ان کے مزاج کی اس وحشت کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ بحث و خطاب میں استدراج کا طریقہ زیادہ اختیار فرماتے۔ استدراج کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب پر اس راہ سے درجہ بدرجہ گھیرے ڈالتے جدھر سے اس کو سان گمان بھی نہ ہوتا کہ وہ گھیرے میں آسکتا ہے۔ اس کی ایک مثال اس واقعہ میں موجود ہے جو سورۂ انبیاء میں بیان ہوا ہے۔ انھوں نے ایک دن موقع نکال کر قوم کے بت خانے کے سارے بت ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیے۔ صرف بڑے بت کو سلامت چھوڑ دیا۔ جب پوچھ گچھ شروع ہوئی اور حضرت ابراہیمؑ سے سوال ہوا کہ کیا یہ تمھارا فعل ہے، انھوں نے جھٹ جواب دیا کہ یہ تو اس بڑے بت کی کارستانی معلوم ہوتی ہے اور ٹوٹے ہوئے بتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے جن پر یہ مصیبت گزری ہے۔ اگر یہ بولتے ہیں تو اپنی مصیبت کی داستان خود ہی سنا دیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ بات سن کر پہلے تو سب پر شرم سے گھڑوں پانی پڑ گیا کہ فی الواقع ہم کتنے احمق ہیں کہ ایسی چیزوں کو معبود بنائے بیٹھے ہیں جو خود اپنی حفاظت سے بھی قاصر ہیں۔ جب یہ خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتیں تو بھلا ہماری حفاظت کیا کریں گی۔ اس طرح اندر سے ان کا اعتقاد متزلزل ہو گیا۔ لیکن پھر حمیت جاہلیت کے جوش میں حضرت ابراہیمؑ کی بات کا جواب دینے کی کوشش کی تو اس کوشش میں اپنی حماقت کا اعتراف بھی کر گئے۔ بولے کہ یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں۔ ان کے اس اعتراف پر حضرت ابراہیمؑ کو ایک نہایت عمدہ موقع ان کی حماقت پر توجہ دلانے کا مل گیا اور انھوں نے ایک نہایت مؤثر تقریر کی کہ تم پر افسوس ہے کہ تم ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو نہ کسی نفع پر قادر ہیں نہ کسی نقصان پر۔

توریہ اس طریقۂ استدراج کے تقاضے سے حضرت ابراہیمؑ کبھی کبھی توریہ سے بھی کام لیتے تھے۔ توریہ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی کوئی اسکیم پوری کرنے کے لیے حریف کے سامنے اپنی بات اس طرح پیش کرتے کہ بات تو بالکل صحیح ہوتی لیکن اس کے پیش کرنے کا انداز ایسا ہوتا کہ حریف اس سے مغالطہ میں پڑ جاتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ہوشیاری کے باوجود وہ اسکیم کے بروئے کار آجانے سے پہلے اس سے آگاہ نہ ہو پاتا۔ اس کی نہایت لطیف مثال سورۂ صافات میں ہے۔ انشاء اللہ ہم اس پر اس کے مقام میں گفتگو کریں گے اور وہیں بعض الفاظ کی وضاحت بھی کریں گے جن کے صحیح مفہوم سے بے خبری کے باعث بہت سے لوگ نہایت افسوسناک قسم کی غلط فہمیوں کے شکار ہو گئے۔

مزاح — اس استدراج اور اس توریہ میں کہیں کہیں پاکیزہ ظرافت بھی شامل ہو جاتی ہے جو کچھ تو اس استدراج اور توریہ کا فطری تقاضا ہوتی ہے اس لیے کہ ہر کام ایک مخصوص انداز اور مخصوص اسلوب کا طالب ہوتا ہے اور کچھ اس میں اس لطافتِ ذوق کی نمود بھی ہوتی ہے جو حضرت ابراہیم کے مزاج کی ایک خصوصیت ہے اس کی نہایت عمدہ مثالیں سورۂ انبیا اور سورۂ صافات میں آئیں گی۔

اس تمہید کے بعد اب زیرِ بحث آیات پر غور فرمائیے۔

'حجتِ ابراہیمی' کی وضاحت — ایک دن انھوں نے ایک ستارے کو چمکتے دیکھا (ہو سکتا ہے کہ یہ ستارہ زہرہ ہو جس کو ان کی قوم پوجتی تھی یا کوئی اور ستارہ ہو) تو بولے کہ "ہاں بھائی یہ میرا رب ہے"۔ قرینہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ بات انھوں نے خود اپنے آپ کو مخاطب کر کے اس طرح فرمائی ہوگی کہ دوسروں کے کان میں بھی پڑ جائے۔ سننے والوں نے جب ان کی زبان سے یہ بات سنی ہوگی تو انھوں نے اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ چلو یہ بھی غنیمت ہے۔ ایک ایسا شخص جو باپ دادا کے دین اور ہمارے معبودوں سے بالکل بیزار ہے جس حد تک بھی ہمارے ساتھ موافقت کر رہا ہے اسی پر قناعت کرو اور زیادہ اس کے درپے نہ ہو۔ حضرت ابراہیم یہ بات لوگوں کے کانوں میں ڈال کر خاموش ہو رہے۔ پھر جب ستارہ ڈوب گیا تو انھوں نے بالکل اسی انداز میں اپنے کو مخاطب اور دوسروں کو سناتے ہوئے کہا کہ میں ان ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ آس پاس والوں کا سابق اطمینان تو ان کی یہ بات سن کر رخصت ہو گیا ہوگا لیکن وہ اس سوچ میں ضرور پڑ گئے ہوں گے کہ اس نوجوان کا ہمارے معبودوں سے انحراف محض نوجوانی کی ترنگ اور بے قیدی و آزادی کی لاابالیانہ خواہش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کی سوچ نے اس کے عقیدے کو متزلزل کر دیا ہے۔ چونکہ بات ان کو براہِ راست مخاطب کر کے تحدی کے انداز میں نہیں کہی گئی تھی اس وجہ سے وہ زیادہ مشتعل بھی نہیں ہوئے ہوں گے بلکہ وہ اس فکر میں پڑ گئے ہوں گے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہماری بات ہی میں کوئی کمزوری ہے۔

کسی جمود کا اس حد تک ہل جانا بھی ایک بڑی کامیابی ہے۔ حضرت ابراہیم نے اس طرح ان کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ ان ستاروں کا طلوع ہونا اور چمکنا ہی کیوں دیکھتے ہو۔ طلوع ہونے کے بعد ان کا ڈوب جانا کیوں نہیں دیکھتے؟ جب طلوع کے ساتھ غروب اور آنے کے ساتھ جانا بھی ہے اور اس پابندی اور محکومی کے ساتھ کہ مجال نہیں ہے کہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی وقت یا سمت میں یا ہیئت اور شکل میں سرمو تغیر ہو جائے تو یہ گویا وہ خود زبانِ حال سے بتا رہے ہیں کہ ہم آتے نہیں بلکہ لائے گئے ہیں اور جاتے نہیں بلکہ لے جائے جاتے ہیں۔ ع

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اس حقیقت کے ساتھ ساتھ حضرت ابراہیم نے یہ بات بھی ان کے کانوں میں ڈال دی کہ خالق و مالک کے

ساتھ بندے کا تعلق محبت کی بنیاد پر ہے، نہ کہ مجرد خوف کی بنیاد پر۔ مجرد خوف ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی کا کوئی حق قائم ہو جائے اور حق بھی اس کی عبادت کا۔ مشرکین کے لیے یہ بات بھی ایک نئی رہنمائی دینے والی بات تھی اس لیے کہ شرک کی بنیاد تمام تر خوف پر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے گویا بتایا کہ میں مجرد خوف کی بنیاد پر کسی کی عبادت کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ محبت کی بنا پر عبادت کرتا ہوں اور محبت کی سزاوار یہ آنی جانی چیزیں نہیں بلکہ صرف وہ ہے جس کے حکم سے یہ چیزیں آتی جاتی ہیں۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا الایۃ اسی طرح کسی دن، پورے چاند کی پھیلی ہوئی چاندنی میں انھوں نے پھر اس تعلیم کے لیے موقع پیدا کر لیا اور بالکل اسی لب و لہجہ اور اسی انداز میں انھوں نے چاند کے متعلق وہی بات کہی جو پہلے ستارے کے متعلق کہی تھی۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو انھوں نے اسی طرح اپنے کو مخاطب کرتے ہوئے اور آس پاس والوں کو سناتے ہوئے فرمایا کہ لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ (اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا) غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہاں تعلیم کا قدم پہلے کی نسبت سے آگے ہے۔ یہاں صرف اتنی ہی بات نہیں ظاہر ہوئی کہ ڈوبنے والے سزاوار عبادت نہیں بلکہ یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ ان ڈوبنے والوں کو معبود بنانا کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ نیز یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ یہ ضلالت کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ بڑے حسرت و اندوہ کی چیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ ہدایت کا سرچشمہ صرف خدا ہے، وہ ہدایت نہ بخشے تو انسان ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کے درپے ہو جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں حضرت ابراہیمؑ نے چونکہ اپنے آپ سے کہیں اس وجہ سے سننے والوں میں سے جس کے کان میں پڑی ہوں گی اس کے لیے ان سے بچنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی بلکہ جس کے اندر کچھ بھی غور و فکر کی صلاحیت رہی ہو گی وہ اس سوچ میں پڑ گیا ہو گا کہ ایک یہ شخص ہے جو طلب ہدایت میں اس طرح بے قرار ہے اور ایک ہم ہیں کہ پتھر کی طرح اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔

ایک حقیقت کا اظہار

یہاں حضرت ابراہیمؑ نے جو یہ بات فرمائی کہ لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ تو یہ ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے۔ ہدایت ہمیشہ خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے، اگر وہ ہدایت نہ دے تو کسی کو بھی ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی۔ بعض لوگوں نے اس کو شرط فی الماضی کے مفہوم میں لیا ہے لیکن اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ ان کے یہ بات کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس سے پہلے گمراہی میں تھے یا اپنے کو گمراہی پر سمجھتے تھے بلکہ انھوں نے اپنی فطرت سلیم کا آئینہ دوسروں کے سامنے رکھا ہے کہ وہ لوگ اس آئینہ میں اپنے منہ دیکھیں۔ لیکن بس آئینہ رکھ دیا ہے خود ان کو مخاطب کر کے کچھ نہیں کہا ہے کہ وہ دہشت زدہ اور بدگمان نہ ہوں۔

اسی طرح ایک دن انھوں نے سورج کے طلوع و غروب کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنا لیا۔ سورج جب آب و تاب سے نکلا اور نصف النہار پر پہنچا تو اسی انداز میں جس کا ذکر اوپر گزرا، انھوں نے سورج کے متعلق بھی وہی بات فرمائی جو تارے اور چاند کے متعلق فرمائی تھی۔ البتہ اس کے ساتھ اتنا اضافہ بھی فرما دیا کہ هٰذَآ اَكْبَرُ (یہ

سب سے بڑا ہے؟ قرینہ صاف پتہ دے رہا ہے کہ یہ بات انھوں نے طنز، تحقیر اور استہزا کے طور پر فرمائی لیکن سننے والوں نے پھر اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ چلو! اس سرپھرے آدمی سے یہ بھی غنیمت ہے۔ زہرہ اور چاند کو نہیں مانتا نہ سہی، ہمارے بڑے دیوتا سورج کو تو مانتا ہے لیکن ان کا یہ اطمینان بھی زیادہ دیرپا نہ ثابت ہوا۔ آخر سورج کو بھی ڈوبنا ہی تھا، وہ بھی ڈوب گیا، جب وہ بھی ڈوب گیا تو حضرت ابراہیمؑ نے بالکل کھل کر اور سب کو مخاطب کر کے حق کا اعلان فرما دیا کہ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ اے میری قوم کے لوگو! تم جن چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے اپنے آپ کو بری کرتا ہوں۔ اب تک انھوں نے جو کچھ فرمایا تھا اس کی نوعیت خود اپنے اوپر اپنے تاثرات کے اظہار کی تھی اگرچہ اس سے مقصود بالواسطہ قوم کی عقل اور اس کے ضمیر کو بیدار کرنا ہی تھا لیکن قوم کو براہِ راست مخاطب نہیں فرمایا تھا۔ اب انھوں نے ان کو براہِ راست مخاطب کر کے ان کے دین اور ان کے معبودوں سے اپنی برأت کا اعلان فرما دیا۔

اعلانِ برأت اور توحید کا زندۂ جاوید کلمہ

اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ یہ اس اعلانِ برأت کی تعبیر اور اس کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تمام معبودانِ باطل سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنا رخ اس رب کی طرف کر لیا ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ 'لِلَّذِیۡ' کا 'لِ' اس بات پر دلیل ہے کہ 'وَجَّہۡتُ' کا لفظ 'اَسۡلَمۡتُ' کے مضمون پر بھی مشتمل ہے۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو بالکلیہ آسمان و زمین کے خالق و مالک کے حوالہ کر دیا۔ یہ توحید اور اسلام کی عظیم آیت اور ملتِ ابراہیمی کا کلمۂ جامعہ ہے اور ہم چونکہ اپنی نمازوں میں اسی حقیقت کا اظہار و اعتراف کرتے ہیں اس وجہ سے ان کا آغاز اسی کلمۂ جامعہ سے کرتے ہیں۔

وَ حَآجَّہٗ قَوۡمُہٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوۡٓنِّیۡ فِی اللّٰہِ وَ قَدۡ ہَدٰىنِ ؕ وَ لَاۤ اَخَافُ مَا تُشۡرِکُوۡنَ بِہٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ رَبِّیۡ شَیۡئًا ؕ وَسِعَ رَبِّیۡ کُلَّ شَیۡءٍ عِلۡمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿۸۰﴾ وَ کَیۡفَ اَخَافُ مَاۤ اَشۡرَکۡتُمۡ وَ لَا تَخَافُوۡنَ اَنَّکُمۡ اَشۡرَکۡتُمۡ بِاللّٰہِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِہٖ عَلَیۡکُمۡ سُلۡطٰنًا ؕ فَاَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ اَحَقُّ بِالۡاَمۡنِ ۚ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَہُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ الۡاَمۡنُ وَ ہُمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ ﴿۸۲﴾

(۸۰-۸۲)

قوم کی طرف سے ڈراوے اور حضرت ابراہیمؑ کا جواب

'وَ حَآجَّہٗ قَوۡمُہٗ' جب یہ بات یہاں تک پہنچ گئی، حضرت ابراہیمؑ نے صاف صاف نہ صرف توحید کا بلکہ شرک اور شرکاء سے اپنی برأت کا بھی اعلان کر دیا تو ان کی قوم ان سے بحث و جدال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور شرک کی بنیاد، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، چونکہ تمام تر خوف اور وہم پرستانہ اندیشوں پر ہوتی ہے اس وجہ سے قوم کے لوگوں نے طرح طرح سے ان کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ معبودوں سے نفرت و بغاوت کا اعلان کرتے ہو تو ان کی پکڑ میں آ جاؤ گے، اندھے ہو جاؤ گے، اپاہج ہو جاؤ گے، تم پر بجلی گرے گی، بری موت مرو گے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب میں فرمایا کہ تم خدا کے باب میں مجھ سے جھگڑتے ہو کہ میں تنہا اسی کو کیوں مانتا ہوں، اس کے شریک کیوں نہیں ٹھہراتا؟ اسی خدا نے تو مجھے یہ ہدایت بخشی ہے کہ اس کا کوئی شریک

نہیں ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم خدا کی منکر نہیں تھی بلکہ اس کے شریک ٹھہراتی تھی اور یہ بات صرف حضرت ابراہیمؑ کی قوم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کی کوئی قوم بھی خدا کی منکر نہیں ہوئی ہے جس نے بھی ٹھوکر کھائی ہے اس کی توحید کے باب میں ٹھوکر کھائی ہے۔ 'وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا' یہ قوم کے ڈراووں کا جواب ہے کہ میں تمہارے ان فرضی شریکوں سے ذرا نہیں ڈرتا، مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جب تک میرا رب مجھے کوئی نقصان نہ پہنچانا چاہے، نفع نقصان اسی کے اختیار میں ہے، اس کے اذن کے بغیر کسی کی مجال نہیں ہے کہ میرا بال بیکا کر سکے۔ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس وجہ سے مجھے یہ بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کوئی اس کی لاعلمی میں مجھے کوئی نقصان پہنچا دے گا۔ یہ تم لوگ کیسی باتیں کرتے ہو، کیا تم لوگ سوچتے نہیں؟ 'اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ' میں تفویض الی اللہ کا مضمون ہے جس سے اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے کہ میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں خدا کے اعتماد پر کہہ رہا ہوں۔ یہ مضمون حضرت شعیبؑ کی زبان سے سورۂ اعراف میں بھی آیا ہے 'قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ۭ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ۭ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا' (۸۹۔ اعراف) (اگر ہم تمہاری ملت میں پھر لوٹ گئے بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات بخشی تو یہ ہم اللہ پر جھوٹ تہمت باندھیں گے، یہ ہم سے تو ہوگا نہیں کہ ہم پھر اس میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ اللہ ہمارا رب چاہے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا) اس سے معلوم ہوا کہ پاک سے پاک ارادے اور سچے سے سچے عزم کی تکمیل بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق پر ہی منحصر ہے۔ اس وجہ سے بندے کو کوئی بات بھی مجرد اپنے اعتماد پر دعوے کے ساتھ نہیں کہنی چاہیے بلکہ خدا کے اعتماد پر کہنی چاہیے۔ اس لیے کہ ہر راہ میں اس کی آزمائشیں ہیں اور ان آزمائشوں میں پورا اترنا اس کی مدد اور توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔

اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

'وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ' یعنی ڈرنا تو تمہیں چاہیے خدا کے غضب اور اس کے قہر سے کہ تم نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے جن کے بارے میں تمہارے پاس خدا کی اتاری ہوئی کوئی سند اور دلیل نہیں ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے لیکن الٹے تم ڈرا مجھے رہے ہو۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو تم بھی مانتے ہو، میں بھی مانتا ہوں۔ یہ تو ایک مسلم بات ہوئی۔ اب خدا کے سوا کچھ اور بھی ہیں جو خدا کے شریک و سہیم ہیں تو اس کا بار ثبوت تم پر ہے۔ اگر تم بے ثبوت ان کو شریک خدا بنائے بیٹھے ہو تو تم خدا کے اقراری مجرم ہو۔ اور اگر وہ تم کو اس کی سزا دے تو تم سزا کے مستحق ہو۔ میں نے کس کا جرم کیا ہے جس سے ڈروں؟ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو تو بتاؤ کہ خدا کی امان کا حقدار میں ہوں یا تم؟ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ تم چور ہو کر الٹے کوتوال کو ڈانٹتے ہو۔

'اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ الاية' ظلم سے مراد، جیسا کہ ایک سے زیادہ

توحید کی اصل حقیقت

مقامات میں ہم واضح کر آئے ہیں، شرک ہے۔ اب یہ توحید کے باب میں اصل حقیقت کا بیان ہے کہ خدا کو ماننا صرف وہ معتبر ہے جو شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہو۔ جس ایمان کے اندر شرک کی ملاوٹ ہو وہ ایمان خدا کے ہاں معتبر نہیں۔ تم اس کا ضامن اپنے شرکا کو سمجھتے ہو اور خدا سے بے نیاز ہو حالانکہ اس کے سزاوار وہ ہیں جو ہر معاملے میں صرف خدا پر اعتماد رکھتے ہیں اور شرک سے بری ہیں۔ یہی لوگ ہدایت پر ہیں اس کے سوا ہر راہ گمراہی کی راہ ہے۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۸۳)

یہ ارتقائے فکر نہیں بلکہ ارتقائے دعوت ہے

'وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ' یہ اشارہ توحید کی اس دلیل کی طرف ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم پر قائم فرمائی اور جو اوپر تفصیل سے مذکور ہوئی۔ اس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ یہ ہے ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابل میں عطا فرمائی۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جو لوگ اس کو حضرت ابراہیمؑ کا فکری ارتقا سمجھتے ہیں ان کا خیال قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کے فکر کا ارتقا نہیں بلکہ اس کو کہہ سکتے ہیں تو ان کی دعوت کا ارتقا کہہ سکتے ہیں۔ اگر یہ حضرت ابراہیمؑ کے فکر کا ارتقاء بیان ہوا ہوتا تو 'عَلٰى قَوْمِهٖ' کے الفاظ کی ضرورت نہیں تھی۔

یہاں چند اور باتیں بھی ذہن میں رکھیے۔

انبیاء نبوت سے پہلے بھی فطرت سلیم پر ہوتے ہیں

ایک یہ کہ حضرات انبیا علیہم السلام فطرت سلیم پر پیدا ہوتے اور فطرت سلیم ہی پر پروان چڑھتے ہیں۔ نبوت سے پہلے بھی ان کو کبھی توحید و شرک کے معاملے میں اشتباہ پیش نہیں آتا۔ توحید تو عہد فطرت ہے جو خدا نے اولاد آدم سے ان کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی لیا ہے اور قرآن سے یہ ثابت ہے کہ اس عہد ہی کی بنا پر توحید کے معاملے میں ہر شخص عند اللہ مسئول ہو گا خواہ اسے کسی نبی کی دعوت پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ ایسی حالت میں کسی نبی کے متعلق یہ گمان کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ نبوت سے پہلے بھی کبھی کسی شرک سے آلودہ ہو سکتا ہے[1]۔ نبوت سے پہلے بھی حضرات انبیاء جہاں تک مبادی فطرت کا تعلق ہے بالکل فطرۃ اللہ پر ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ نخل فطرت کے بہترین ثمر ہوتے ہیں اس دور میں انھیں جو جستجو ہوتی ہے وہ خدا کی نہیں بلکہ خدا کی مرضیات اور اس کے احکام کی ہوتی ہے۔ یہ جستجو بھی درحقیقت ان کی فطرت سلیم ہی کی پیاس ہوتی ہے جو اپنے بلوغ پر بھڑکتی ہے اور سیرابی و آسودگی کی خواہاں ہوتی ہے۔ یہ سیرابی ان کو وحی کے ابر نیساں سے حاصل ہوتی ہے۔ انبیا کے لیے وحی کی حیثیت تاریکی کے اندر روشنی کی نہیں بلکہ روشنی

---

[1] اس مسئلہ پر مفصل بحث سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۲ کے تحت آئے گی۔ اپنی کتاب 'حقیقت شرک و توحید' میں بھی ایک فصل 'شرک کا اصل سبب' کے عنوان سے ہم نے اس مسئلہ پر لکھی ہے۔

کے اوپر روشنی کی ہوتی ہے نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ اس مسئلہ پر خدا نے چاہا تو ہم سورۂ نور کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کریں گے۔

یہ حجت حضرت ابراہیمؑ نے نبی ہونے کے بعد پیش کی ہے

دوسری یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کا ملکوتِ الٰہی سے جو استشہاد اوپر مذکور ہوا ہے وہ نبوت سے پہلے کا نہیں بلکہ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد کا ہے جب انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا ہے۔ پہلے انھوں نے اپنے باپ کو دعوت دی اور یہی حضرات انبیاء کی معروف سنت رہی ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اپنے سب سے زیادہ قریبی عزیزوں کو دعوت دی ہے۔ اس کے بعد اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے سامنے بالتدریج اس طرح اعلانِ حق فرمایا جس کی تفصیل اوپر بیان ہوئی۔ اس بات کی دلیل کہ یہ نبوت کے بعد کا واقعہ ہے آیات ۷۹، ۸۰ میں موجود ہے۔ ان آشکارا الفاظ میں یہ زندۂ جاوید کلمات ایک نبی کے سوا کون کہہ سکتا ہے۔

ترتیبِ واقعات شاہد ہے کہ یہ ارتقائے فکر نہیں ہے

تیسری یہ کہ اگر یہ حضرت ابراہیمؑ کا فکری ارتقا ہوتا تو واقعات کی یہ ترتیب بالکل خلافِ فطرت ماننی پڑے گی۔ آخر سب سے پہلے ان کو ایک چھوٹے سے تارے ہی نے کیوں اپنی طرف متوجہ کیا، ہر صبح کو اس کرّوفر سے طلوع ہونے والا سورج کہاں چلا گیا تھا؟ اس قسم کے خلافِ فطرت مشاہدے کے لیے پھر اس سے زیادہ خلافِ فطرت یہ روایت لوگوں کو گھڑنی پڑی کہ حضرت ابراہیمؑ کی ولادت ایک غار میں ہوئی تھی، اسی میں وہ پلے اور جوان ہوئے اور جب اس سے نکلے تو شب کا وقت تھا اور پہلی چیز جس کا انھوں نے اس کائنات کی جاذبِ نظر چیزوں میں سے مشاہدہ کیا وہ زہرہ ستارہ تھا۔

استدراجی طریقۂ استدلال کی ایک خصوصیت

چوتھی یہ کہ استدراجی طریقۂ استدلال میں متکلم اگر حریف کی کسی بات کو مانتا ہے تو ماننے کے لیے نہیں مانتا بلکہ وہ اس کو اسی داؤں پر شکست دینا چاہتا ہے جس کو حریف اپنا خاص داؤں سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیا کے مکذبین کے لیے اپنی جس سنتِ استدراج کا ذکر قرآن میں فرمایا ہے اس کی بھی خاص خصوصیت یہی بیان ہوئی کہ اللہ تعالیٰ وہیں سے ان کو دھر لیتا ہے جہاں سے ان کو اپنی کامیابی و فتح مندی کا غرّہ ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قوم اگر سورج، چاند، زہرہ کی پرستش کرتی تھی تو آخر اس کے نزدیک ان کی خدائی کی دلیل کیا تھی؟ یہی نا کہ وہ طلوع ہوتے اور چمکتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی کو پکڑ لیا کہ اگر طلوع ہونا اور چمکنا ہی ان کی الوہیت کی دلیل ہے تو آؤ ان کا ڈوبنا اور تاریک ہونا بھی دیکھ لو اور بتاؤ تمھاری وہ دلیل کہاں گئی! نفسیاتِ انسانی کا یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ جن کی خدائی کی دلیل ان کے ذہنی کرّوفر ہی سے اخذ کی گئی ہو ان کی بے ثباتی اور ناپائداری پر سب سے مؤثر تقریر کا وقت وہی ہوتا ہے جب ان کی لاش ان کے پرستاروں کے سامنے پڑی ہو۔

ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

پانچویں یہ کہ انبیا کے طریقۂ کار دعوت و خطاب و استدلال میں، استدراج، مزاح، طنز، توریہ اور تدریج وغیرہ کے انداز جو کہیں کہیں پائے جاتے ہیں، یہ سب انسانی فطرت کے مقتضیات پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر اسلوب کا ایک محل ہوتا ہے اور ہر انداز اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ بسا اوقات ایک فقرہ، جو بظاہر ٹھیرا ہوا ہوتا

ہے، سفر کی ہزاروں منزلیں طے کرا دیتا ہے اور ایک دل آویز طنز، جو بظاہر طنز ہوتا ہے، ہزاروں حجتوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔ خدا نے چاہا تو قرآن کے آخری گروپ میں دعوتِ انبیا کے یہ نفسیاتی پہلو تفصیل سے زیر بحث آئیں گے۔

حکمت الٰہی میں خلق کی رعایت

'نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ' 'درجات' جمع بھی ہے اور اس پر تنوین بھی ہے اس وجہ سے اس کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں۔ اوپر 'وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ' کے تحت ہم نے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اسی کی تعبیر یہ دوسرے الفاظ میں ہے کہ جو لوگ ملکوتِ الٰہی پر غور کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اسی طرح علم و معرفت اور ایمان و یقین میں ان کے مدارج بلند کرتا جاتا ہے۔ حکیم و علیم کی صفات کا یہاں حوالہ اسی سنت اللہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ نے اپنے اس چاہنے کے لیے مقرر فرمائی ہے۔ یعنی اس کا یہ 'چاہنا' اس کے علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنے قرب کے مدارج آنکھ بند کر کے نہیں بانٹتا بلکہ ان کو بخشتا ہے جو اس کے سزاوار ہوتے ہیں اور جو اس کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ اس میں نہایت لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ آدمی اگر عقل و فکر سے کام نہ لے تو اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو معبود بنا کر سجدے کرتا اور ان سے حاجت روائی کا امیدوار ہوتا ہے اور اگر عقل و فکر سے کام لے تو شمس و قمر اور زہرہ و مشتری سب اس کی راہ کی گرد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۙ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۙ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۙ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۙ (۸۴-۹۰)

اس دنیا میں حضرت ابراہیمؑ کے لیے رفع ذکر کی سرفرازی

اوپر کی آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کے ساتھ ان کے روحانی و ایمانی مدارج کا بیان ہوا۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس دنیا میں بھی اللہ نے ان کو اور ان کی دعوت کو رفع ذکر اور شہرت دوام کی عزت و سرفرازی عطا فرمائی۔ ان کی ذریت میں بڑے بڑے انبیاء اور بلند مرتبہ صالحین و مجددین اٹھے اور ان سب کا دین وہی دین توحید تھا جس کی دعوت ابراہیمؑ نے اور ان سے پہلے نوحؑ نے دی۔ مطلب یہ ہے کہ یہی دین تمام انبیاء کا مشترک دین ہے اور تم بھی اسی دین کی دعوت دے رہے ہو۔ اگر تمھاری قوم اس کو قبول نہیں کرنا چاہتی تو تم اس کی پروا نہ کرو۔ اللہ نے دوسروں کو کھڑا کر دیا ہے جو اس کے حامل بنیں گے۔ تمھیں ان کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر بہرحال انہی لوگوں کے دین کی پیروی کرنی ہے جن کو اللہ کی ہدایت نصیب ہوئی۔

تو تم انہی کی پیروی کرو اور ان مخالفوں سے صاف صاف کہہ دو کہ میں تم سے کسی عوض کا طالب تو ہوں نہیں کہ اگر تم نے میری دکان سے مال نہ خریدا تو میری دکان بیٹھ جائے گی بس تو تمھارے سامنے جو کچھ پیش کر رہا ہوں تمھارے لیے ایک یاددہانی ہے۔ اس کو قبول کرو تو تمھارا اپنا نفع ہے، نہ قبول کرو گے تو تم خود بھگتو گے میرا کچھ نہیں جائے گا۔

ایں قافلہ تمام آفتاب است

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ الآیہ حضرت اسحٰقؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے اور حضرت یعقوبؑ پوتے ہیں۔ فرمایا کہ كُلًّا هَدَيْنَا ان میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت بخشی یعنی اسی دین توحید اور اسی صراط مستقیم کی جس کی دعوت ابراہیمؑ نے دی۔ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ یہ حضرت ابراہیمؑ سے اوپر کے سلسلۂ ہدایت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ابراہیمؑ سے پہلے نوحؑ کو بھی ہم نے اسی راستے کی ہدایت کی تھی اور اس نے اسی کی دعوت دی۔ تالمود سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے حضرت ابراہیمؑ کی تربیت بھی فرمائی تھی۔ اس پہلو سے گویا اوپر اور نیچے دونوں کی کڑیاں مل گئیں۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ میں ضمیر حضرت ابراہیمؑ کی طرف لوٹتی ہے۔ فرمایا کہ اس کی ذریت میں سے ہم نے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی اسی صراط مستقیم کی ہدایت سے نوازا۔

انبیاء جن کو نبوت کے ساتھ سیاسی اقتدار بھی حاصل ہوا

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ سارے حضرات جلیل القدر انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ یہ خصوصیت بھی ان میں مشترک ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو بادشاہت یا کسی نہ کسی نوع کی سیاسی سیادت حاصل ہوئی۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انھیں یہ سیادت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ یہ خوب کار لوگ تھے، اللہ نے ان کو جو صلاحیتیں بخشیں ان کو انھوں نے صحیح استعمال کیا تو اللہ نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا۔ گویا اس کا کوئی تعلق خاندان کی وراثت سے نہیں بلکہ تمام تر صفات و اخلاق سے تھا۔

انبیاء جن کا مشترک وصف زہد و توکل ہے

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى الآیہ زکریاؑ، یحییٰؑ اور عیسیٰ علیہم السلام مشہور پیغمبروں میں سے ہیں۔ الیاسؑ سے مراد تورات کے ایلیا نبی ہیں۔ ان پیغمبروں کی نسبت بھی فرمایا کہ اللہ نے ان کو بھی اسی صراط مستقیم کی ہدایت بخشی جس کی ہدایت ابراہیمؑ اور دوسرے نبیوں کو بخشی۔ یہ بھی توحید اور اسلام ہی کے داعی تھے کسی اور دین کے داعی نہیں تھے۔ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ یہ سب کے سب زمرہ صالحین میں سے تھے۔ اس سے ایک تو وہی بات نکلی جس کی طرف اوپر اشارہ گزرا کہ یہ جو کچھ انھیں حاصل ہوا ان کے صلاح و تقویٰ کی بنا پر حاصل ہوا، دوسری بات یہ نکلی کہ یہ تھے بہرحال خدا کے صالح بندوں ہی میں سے، ان میں سے کسی کو خدائی کا مقام حاصل نہیں تھا جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق گمان کیا۔ جس طرح مذکورہ بالا انبیاء میں حکومت و سیادت مشترک وصف کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح ان انبیاء میں زہد، فقر اور تبتل کی شان مشترک ہے۔

'الیسع' کی تحقیق

وَاِسْمٰعِیْلَ وَالْیَسَعَ وَیُوْنُسَ وَلُوْطًا الآیۃ ان ناموں میں سے تین نام اسمٰعیلؑ، یونسؑ اور لوطؑ تو مشہور ہیں، قرآن میں بھی ان انبیا کی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں البتہ الیسع سے ملتے جلتے دو نبیوں کے نام ہیں۔ ایک الیشع جن کا زمانہ سنہ ۸۴۳ ق.م بتایا جاتا ہے، دوسرے یسعیاہ جن کا زمانہ سنہ ۷۲۲ ق.م بتایا گیا ہے۔ پہلا نام قرآن کے تلفظ سے قریب تر ہے۔ 'وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ' میں اسی منصبی فضیلت کی طرف اشارہ ہے جو ہر نبی کو اس کے منصب کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ نبی چونکہ خلق کی ہدایت پر مامور ہوتا ہے اس وجہ سے اس کو یہ فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ان انبیا کے لیے جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ تمام انبیا کی مشترک صفات ہیں۔ الگ الگ بیان کرنے سے مقصود ان کی تخصیص نہیں، محض تعدید ہے تاکہ ہر صفت پر قاری کی الگ الگ توجہ ہو جائے۔

'وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ' الآیۃ یعنی یہ ہدایت صرف ان نبیوں تک ہی محدود نہیں رہی، ان کے باپ دادوں، ان کی آل اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی کتنوں کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔ فرمایا کہ ہم نے انھیں بھی اپنی راہ دکھائی، انھیں برگزیدہ کیا اور ان کو صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ 'اجتباء' سے مراد یہاں وہ برگزیدگی ہے جو اللہ نے اپنی توحید اور ہدایت کی دعوت و اشاعت کے لیے ان کو بخشی۔ 'صراط مستقیم' سے مراد یہاں توحید کی راہ ہے۔ اور اس کی تنکیر یہاں تفخیم شان کے پہلو سے ہے۔

ہدایت وہ ہے جو اللہ کو حاصل ہوتی

'ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ' یعنی یہی ہدایت جو ان تمام نبیوں کو اور ان کی پیروی کرنے والوں کو حاصل ہوئی یہی اللہ کی ہدایت ہے۔ باقی اس کے سوا جتنی راہیں ہیں سب شیطان کی نکالی ہوئی ہیں۔ یہ راہ اللہ اپنے ان بندوں پر کھولتا ہے جن کے لیے چاہتا ہے۔ 'جن کے لیے چاہتا ہے' سے اشارہ اس سنت اللہ کی طرف ہے جو اس نے ایمان و ہدایت کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ اس کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ بھی، جن کو اللہ نے یہ مرتبے عطا فرمائے اگر کہیں شرک میں مبتلا ہو جاتے تو ان کا سارا کیا دھرا برباد ہو کے رہ جاتا۔ مجرد اس بنیاد پر ان کی برگزیدگی قائم نہ رہتی کہ یہ نوحؑ یا ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ یہ تنبیہ اہل عرب کے لیے بھی ہے اور بنی اسرائیل کے لیے بھی کہ توحید سے منحرف ہو کر جو لوگ مجرد اس نسبت پر برگزیدگی کے خواب دیکھ رہے ہیں جو انھیں ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کے سبب سے حاصل ہے وہ نری حماقت میں مبتلا ہیں۔ یہ تو در کنار اگر وہ بھی شرک میں آلودہ ہو جاتے تو خدا کے ہاں ان کا بھی کوئی وزن باقی نہ رہ جاتا۔

'حکم' اور 'حکمت' کی وضاحت

'اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ' الآیۃ کتاب کے ساتھ حکمت کا لفظ قرآن میں اکثر آیا ہے، یہاں حکم کا لفظ ہے۔ مولانا فراہیؒ اپنی کتاب مفردات القرآن میں لفظ حکم پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'حکم سے مراد صحیح فہم اور صحیح فہم کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ کرنا ہے۔ یہی چیز جب پختہ ہو کر ایک ملکہ راسخہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو اس کو حکمت کہتے ہیں۔' حکم اور حکمت کتاب الٰہی کے لوازم میں سے ہیں اس لیے کہ کتاب الٰہی کا اصل مقصد ہی زندگی کے معاملات میں رہنمائی دینا ہے، عام اس

سے کہ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی اور عام اس سے کہ پیش آمدہ صورتِ معاملہ صریحاً کتاب میں بیان ہوئی ہو یا اجتہاداً واستنباطاً اس کا حکم نکالنا پڑے۔ کتاب کی طرح یہ حکم بھی عطیۂ الٰہی ہے اور اسی سے کتابِ الٰہی زندگی کی ایک عملی حقیقت بنتی ہے۔ اگر حاملینِ کتاب اس چیز سے محروم ہو جائیں تو پھر کتاب زندگی کے معاملات و مسائل سے بے تعلق ہو کر محض ایک ایسی تاریخی دستاویز بن کے رہ جاتی ہے جو نوادرات کے کسی عجائب خانہ میں رکھی ہو۔

صحابہ کرامؓ کا عظیم رتبہ

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ (جن کا اوپر بیان ہوا) ہیں جن کو ہم نے کتاب، حکم اور نبوت کی نعمت سے سرفراز کیا اور انھوں نے اس نعمت کی قدر کی۔ اب انھی نعمتوں سے ہم نے تمھارے واسطہ سے (اشارہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے) ان لوگوں کو (اشارہ اہلِ مکہ کی طرف ہے) نوازنا چاہا ہے۔ حق تو یہ تھا کہ یہ اس نعمت کی قدر کرتے لیکن یہ لوگ اس نعمت کی اگر ناقدری کرتے ہیں تو تم ان کی پروا نہ کرو، ہم نے ایسے لوگوں کو اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے مقرر کر دیا ہے جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں۔ 'وَكَّلْنَا بِهَا' میں ذمہ دار بنائے جانے کے ساتھ ساتھ ضامن اور امین بنائے جانے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ 'بِ' اس پر دلیل ہے۔ 'قَوْمًا' سے مراد یہاں صحابہؓ کی وہ جماعت بھی ہے جو اس وقت تک داخلِ اسلام ہو چکی تھی اور وہ لوگ بھی ہیں جن کے لیے بعد میں اس کے حاملین میں داخل ہونا مقدر تھا، اگرچہ ان آیات کے نزول کے وقت تک وہ ان میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اس ٹکڑے میں صحابہؓ کی استقامت اور مستقبل میں امت کی کثرت کی پیشینگوئی ہے اور اس پہلو سے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عظیم بشارت ہے جو اس دور میں آپ کو دی گئی جب آپ مخالفتوں کے طوفان سے گزر رہے تھے۔ الفاظ سے تقدیرِ الٰہی کا وہ اٹل فیصلہ بھی مترشح ہو رہا ہے جو اس دعوت کو فتح مند کرنے کے لیے ہو چکا ہے اور یہ اشارہ بھی نکل رہا ہے کہ اللہ نے اپنے جن بندوں کو اس کے لیے کھڑا کر دیا ہے ان کی قلتِ تعداد پر نہ جاؤ، یہی لوگ اس دعوت کے علمبردار ہوں گے اور یہی قطرے ایک دن سمندر بنیں گے۔

یہ دعوت ہے نہ کہ تجارت

'اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ' 'اقتدہ' میں 'ہ' وقفہ اور سکتہ کی ہے۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے اپنی ہدایت سے سرفراز فرمایا تو تم انھی کے نقشِ قدم پر چلو اور انھی کی ہدایت کی پیروی کرو۔ رہے یہ لوگ جو مدعی تو ہیں ابراہیمؑ کے وارث ہونے کے لیکن پیروی کر رہے ہیں شیطان کی اور تمھاری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان سے کہہ دو کہ میں اس پر کوئی معاوضہ تو تم سے مانگ نہیں رہا ہوں کہ تم اس کا بوجھ محسوس کر رہے ہو، میں نے اپنے رب سے مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہا ہوں۔ اگر قبول کرو گے تو تمھارا ہی نفع ہے، رد کر دو گے تو خود محروم رہو گے۔ یہ اللہ کے دین کی دعوت ہے، یہ کوئی تجارت اور دکانداری نہیں ہے کہ تم گاہک نہ بنو گے تو میرا کاروبار بیٹھ جائے گا۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔

ذکریٰ کے دو مفہوم

'اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ' میں 'هُوَ' کا مرجع قرآن ہے اور یہ اسی مضمون کی مزید توضیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن تو محض لوگوں کے لیے ایک تذکیر اور ایک یاددہانی ہے۔ پیغمبر نے اگر یہ یاددہانی پہنچا دی تو وہ

اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا۔ اگر لوگ اس کو قبول نہیں کرتے تو اس کا انجام وہ خود دیکھیں گے۔ پیغمبر پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اس کو قبول ہی کرلیں۔ قرآن کے لیے 'ذکریٰ' کے لفظ سے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک تو اس حقیقت کی طرف کہ وہ جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ کوئی اوپری اور انوکھی بات نہیں ہے۔ بلکہ انہی حقائق کی یاد دہانی ہے جو انسانی فطرت کے اندر ودیعت ہیں لیکن لوگوں نے ان کو اپنی خواہشات و بدعات کے نیچے دبا دیا ہے۔ دوسرے اس حقیقت کی طرف کہ یہ اسی ہدایت الٰہی کی یاد دہانی کر رہا ہے جس کو نوحؑ، ابراہیمؑ اور تمام انبیاء لے کر آئے لیکن ان کے ساتھ نسبت کے مدعیوں نے اس ہدایت الٰہی کی جگہ مختلف ناموں سے مختلف ضلالتیں ایجاد کرلیں اور انہی ضلالتوں کو اپنے بزرگوں کا دین سمجھ بیٹھے۔ قرآن اپنی اس تذکیر سے تاریخ کے فراموش کردہ اوراق کو بھی یاد دلا رہا ہے اور فطرت کے فراموش کردہ اسباق کو بھی پس جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۹۱-۹۴

اوپر بیان ہوا کہ قرآن، توحید اور اسلام کی جو دعوت دے رہا ہے یہ تمام انبیا کی مشترک دعوت ہے۔ جو لوگ اس کی تکذیب کر رہے ہیں یہ ان کی اپنی محرومی و بدقسمتی ہے۔ اب آگے چند آیتوں میں ان تکذیب کرنے والوں کے رویہ پر تبصرہ فرمایا ہے اور ان کے اقوال کا حوالہ دے کر ان کی لغویت واضح کی ہے۔ ان تکذیب کرنے والوں میں پیش پیش تو قدرتی طور پر قریش کے لیڈر تھے لیکن ابتدا ہی سے یہود نے ان کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تھی اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے فروغ میں اصلی خطرہ وہ اپنے ہی لیے سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کے ذہن میں بات تو یہ بسی ہوئی تھی کہ نبوت و رسالت ان کے خاندان کا اجارہ ہے، اگر کوئی نبی آنے والا ہی ہے تو بنی اسرائیل میں آئے گا، اس خانوادہ سے باہر کیسے آسکتا ہے۔ اب جو یہ صورت حال ان کے سامنے آئی تو سخت کش مکش میں پڑ گئے کہ اس خطرے کو کیسے روکیں۔ غیر جانبدار بن کے بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا لیکن مخالفت کریں تو کس انداز سے کریں۔ اگر یہ بات کہیں کہ نبوت و رسالت ان کے خاندان کا حصہ ہے اور تورات کی موجودگی میں اب کسی اور قرآن و کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہی تو اندیشہ تھا کہ اس سے عربوں کی حمیت بھڑکے گی اور عجب نہیں کہ اس جوش میں وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس اندیشے کی بنا پر انھوں نے اپنے دل کی بات تو دل میں رکھی لیکن آنحضرت کے مخالفین کو شہ دینے کے لیے یوں کہنا شروع کر دیا کہ جو بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس پر خدا نے کوئی کتاب اتاری ہے بالکل بر خود غلط ہے، خدا نے کسی پر بھی کوئی چیز نہیں اتاری ہے۔ یہ بات وہ کہتے تو تھے اپنے مخصوص ذہنی تحفظ کے ساتھ ہی لیکن اس سیاسی مصلحت سے، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، وہ اس کو ایک عام کلیہ کے رنگ میں پیش کرتے تھے۔ قرآن نے یہاں ان کی یہ شرارت بھی بے نقاب کی اور قریش کے ان

منکرین کو بھی جواب دیا جو محض اپنے غرورِ سیادت میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان کے حلقے سے باہر بھی کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جس کو خدا کوئی شرف و عزت بخش سکتا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۱-۹۴ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ
شَيْءٍ ۭ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰي نُوْرًا وَّهُدًى
لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ
مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاۗؤُكُمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ
يَلْعَبُوْنَ ۝۹۱ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ
يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹۲ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ
افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّ
مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ تَرٰٓي اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ
غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ
اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ غَيْرَ
الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۹۳ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰي
كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰي
مَعَكُمْ شُفَعَاۗءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰۗؤُا ۭ لَقَدْ تَّقَطَّعَ
ع ۱۱/۱۲ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝۹۴

ترجمۂ آیات ۹۱-۹۴ اور انھوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی جب کہ یہ کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر بھی

کوئی چیز نہیں اتاری۔ ان سے پوچھو، وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ روشنی اور لوگوں کے لیے ہدایت کی حیثیت سے لے کر آئے، جس کو تم ورق ورق کرکے کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو، اور تم کو ان باتوں کی تعلیم دی گئی جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا، کہہ دو اللہ ہی نے، پھر ان کو ان کی کج بحثیوں میں چھوڑ دو، کھیلتے رہیں اور یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری بابرکت، تصدیق کرنے والی اپنے سے پہلے کی چیز کی (تاکہ تو خوش خبری دے) اور تاکہ ہوشیار کردے ام القریٰ اور اس کے ارد گرد والوں کو اور جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی اس پر ایمان لائیں گے اور وہی اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ ۹۱-۹۲

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھے یا دعوے کرے کہ مجھ پر وحی آئی ہے درآنحالیکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو اور اس سے جو دعوے کرے کہ جیسا کلام خدا نے اتارا ہے میں بھی اتار دوں گا اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب کہ یہ ظالم موت کی جانکنیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں حوالہ کرو، آج تم ذلت کا عذاب دیے جاؤ گے بوجہ اس کے کہ تم اللہ پر ناحق تہمت جوڑتے تھے اور تم متکبرانہ اس کی آیات سے اعراض کرتے تھے اور بالآخر تم آئے ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسا کہ ہم نے تم کو اول بار پیدا کیا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا سب تم نے پیچھے چھوڑا اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے بارے میں تمہارا گمان تھا کہ وہ تمہارے معاملہ میں ہمارے شریک ہیں۔ تمہارا رشتہ بالکل ٹوٹ گیا اور جو چیزیں تم گمان کیے بیٹھے تھے وہ سب ہوا ہو گئیں۔ ۹۳-۹۴

۱۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰي بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰي نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاۗؤُكُمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ (۹۱)

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰي بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ، اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ قول کہ "اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری ہے" یہود کا ہے۔ اگرچہ ان کے ذہن میں تو بات یہ رہی ہوگی کہ اب موسیٰ کی کتاب اور ان کی شریعت کے بعد کسی نئی کتاب و شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن یوں صاف صاف بات کہنے میں عربوں کی قومی حمیت کے بھڑکنے کا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اندیشہ تھا اس وجہ سے انھوں نے اس پہلو کو بچاتے ہوئے کہہ دیا کہ خدا نے کسی پر بھی کچھ نہیں اتارا ہے کہ اپنا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور کسی کو کوئی بدگمانی بھی نہ ہو۔ یہاں جواب میں ان کے قول کا ظاہری اور باطنی دونوں ہی پہلو ملحوظ ہے۔ *(یہود کی ایک شرارت)*

پہلے ان کے قول کے ظاہر الفاظ پر گرفت فرمائی اور اس کی تعبیروں اٹھائی کہ انھوں نے یہ بات کہہ کر خدا کی قدردانی کا کچھ اچھا ثبوت نہیں دیا۔ اگر یہ بات اُمّی عرب کہتے تو ان کے لیے کچھ عذر ہو سکتا تھا کہ کتاب و شریعت سے ناآشنا لوگ ہیں اس وجہ سے ایک عامیانہ بات کہہ گزرے۔ لیکن جب یہ بات ان لوگوں نے کہی جو تمام نبیوں اور رسولوں کے وارث اور تمام کتاب و شریعت کے حامل ہونے کے مدعی ہیں تو ثابت ہوا کہ خدا شناسی کے ان مدعیوں نے خدا کو بہت کم پہچانا ہے۔ ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ جس خدا نے انسان کے اندر ودیعت کردہ ہر طلب اور ہر تقاضے کا بہتر سے بہتر جواب مہیا کیا آخر وہ اس کے سب سے قوی داعیہ — طلب ہدایت — ہی کی تسکین و تسلی کا سامان کیوں نہ کرتا؟ اس نے ہمیں پیاس دی تو اس کی تسکین کے لیے زمین کے اندر بھی پانی کی سوتیں جاری کر دیں اور آسمان سے بھی اپنی رحمت کی گھٹائیں برسائیں پھر اس خدا کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے کسی پر اپنی ہدایت و شریعت نہیں اتاری، ایک ایسی بات ہے جو وہی کہہ سکتے ہیں جو نہ خدا کی صفتوں سے واقف ہوں اور نہ اس کے ان افضال و عنایات سے جن کے مورد پشتہا پشت سے وہ خود رہ چکے ہیں۔ *(خلق کی ہدایت کا سامان کرنا خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے)*

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰي نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ، تمہید کے بعد اب یہ ان سے سوال ہے کہ اگر خدا نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ بتائیں کہ وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ لے کر آئے اور جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت بن کر نازل ہوئی۔ اس کے بعد تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا (جس کو تم ورق ورق کر کے کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو) فرما کر *(یہود کو مسکت جواب)*

ان کی اس ناقدری کا بھی اظہار فرما دیا جو انھوں نے اس کتاب کی کی اور اس سے ضمناً ان کے مذکورہ بالا قول کے باطنی پہلو کا بھی ایک جواب ہو گیا کہ اگر انھوں نے یہ بات، یہ پیش نظر رکھ کر کہی ہے کہ اب موسیٰؑ کی کتاب کے بعد کسی اور کتاب و شریعت کی ضرورت نہیں ہے تو ان کو یہ کہنے کا بھی حق نہیں ہے اس لیے کہ انھوں نے اس کتاب کی جو قدر کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو ورق ورق کر رکھا ہے، اس کے کچھ حصہ کو تو یہ ظاہر کرتے ہیں اور زیادہ حصے کو چھپاتے ہیں تو جو چیز روشنی اور ہدایت بن کر آئی تھی اس کے ساتھ انھوں نے جب یہ سلوک کیا تو آخر خدا اپنی مخلوق کو تاریکی میں بھٹکنے کے لیے کس طرح چھوڑے رکھتا اور وہ روشنی و ہدایت ان کے لیے کیوں نہ نازل فرماتا جو ان کو تاریکی سے نکالے اور گمراہی سے نجات دے۔

یہود کی اخفائے کتاب کی سازش

'قراطیس'، قرطاس کی جمع ہے 'قرطاس'، لکھنے کے صحیفہ اور ورق کو کہتے ہیں، عام اس سے کہ وہ کسی چیز سے بھی بنایا گیا ہو۔ اس سے وہ تمام چیزیں مراد ہوں گی جو اس زمانے میں لکھنے کے کام آتی تھیں۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ یہود نے تورات اس شکل میں جمع نہیں کی تھی جس شکل میں مسلمانوں نے قرآن کو مابین الدفتین جمع کیا بلکہ انھوں نے اس کو مختلف اجزا میں تقسیم کر لیا تھا اور ہر جزو کو الگ الگ قلمبند کیا تھا اس طرح ان کو اس کی ان تعلیمات اور پیشین گوئیوں کے چھپانے کا آسانی سے موقع مل جاتا تھا جن کو وہ اپنی خواہشات اور مصالح کے خلاف پاتے۔ جب ایک کتاب کے اجزا الگ الگ کراسوں کی شکل میں ہوں اور اس پر اجارہ داری بھی مخصوص ایک گروہ کی ہو تو وہ بڑی آسانی سے یہ کر سکتا ہے کہ اس کے جس جزو کو چاہے اپنے مخصوص حلقے سے باہر کے لوگوں کے علم میں نہ آنے دے۔ قرآن نے یہود پر کتاب الٰہی کے اخفا کا جو جرم عاید کیا ہے اس کی ایک نہایت سنگین شکل یہی تھی اور قرآن کے اندازِ بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کتاب الٰہی کا زیادہ حصہ یہود نے چھپا لیا تھا، صرف اس کا تھوڑا حصہ وہ ظاہر کرتے تھے اس لیے کہ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جو حصہ چھپایا جاتا تھا وہ زیادہ تھا، اس کے معنی لازماً یہی ہوئے کہ جو حصہ ظاہر کیا جاتا تھا وہ تھوڑا تھا۔ اپنی روشنی اور ہدایت اللہ تعالیٰ اس لیے عطا فرماتا ہے کہ لوگ اس سے رہنمائی حاصل کریں نہ اس لیے کہ وہ ڈھانک کے رکھی جائے۔ حضرت مسیحؑ اور بعض دوسرے نبیوں نے بھی یہود کے اس اخفائے کتاب پر ان کی سرزنش کی ہے کہ تم کو چراغ اس لیے دیا گیا تھا کہ اس کو طاق پر رکھو کہ پورے گھر میں روشنی پھیلے لیکن تم نے اس کو پیمانے کے نیچے ڈھانک کے رکھا ہے۔

'وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ' یہ جملہ بھی معناً اوپر کے استفہامیہ جملہ ہی پر عطف ہے یعنی وہ کون ہے جس نے موسیٰ کو کتاب دی جس کے ذریعہ سے تم کو وہ باتیں بتائی اور سکھائی گئیں جن کا علم نہ تم کو تھا اور نہ تمھارے باپ دادا کو تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان تمام احسانات سے واقف ہوتے ہوئے اگر کہتے ہو کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ دیدہ دلیری کی آخری حد ہے۔

'قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ' یعنی اگر یہ بھول گئے ہیں تو انھیں یہ بتا دو کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کا کیا ہوا ہے اور بتا دینے کے بعد ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو کہ جس کھیل میں یہ لگے ہوئے ہیں وہ کھیل لیں تا آنکہ خدا ان کے باب میں اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۗ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۹۲)

قرآن کا مرتبہ و مقام

'وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ' اوپر کا جواب تو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان کے قول کے ظاہری پہلو کو سامنے رکھ کر تھا، اب یہ ان کے ذہن کے اندر چھپے ہوئے خیال کو سامنے رکھ کر جواب دیا جا رہا ہے کہ تورات کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب کیوں نازل فرمائی؟ اس کے نزول سے کیا کمی پوری ہوئی؟ اوپر والی آیت میں ضمناً یہ اشارہ ہو چکا ہے کہ تورات پر ناز کرنے والے مدعیوں نے تورات کے ساتھ کیا سلوک کیا لیکن وہ ایک ضمنی جواب تھا۔ اب یہ قرآن کی مستقل حیثیت اور مستقل ضرورت واضح فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو ان کے علم میں پہلی بار آئی ہو۔ یہ تو وہ کتاب مبارک ہے جس کی بشارت ابراہیم کو دی گئی اور جس کی پیشین گوئی موسیٰ اور مسیح سب نے کی ہے۔ یہ اسی بشارت براہیمی کا ظہور اور انہی پیشینگوئیوں کی تصدیق ہے جو پہلے سے موجود ہیں۔ یہاں قرآن کے لیے 'مبارک' اور 'مصدق' کے الفاظ اس سند کو ظاہر کر رہے ہیں جو پچھلے صحیفوں میں اس کی موجود ہے۔ ہم بقرہ اور آل عمران کی تفسیر میں حوالے نقل کر آئے ہیں۔ 'مبارک' کا لفظ اس عالم گیر برکت کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کی بشارت حضرت ابراہیم کو دی گئی تھی کہ اس کا ظہور حضرت اسمٰعیل کی نسل سے پیدا ہونے والے نبی خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعے سے ہوگا۔ پیدائش باب ۲۲ میں ہے۔

"خداوند فرماتا ہے، اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا اپنا اکلوتا ہی بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا .... اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔"

ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ یہاں زمین کی ساری قوموں کے لیے جس برکت کی بشارت ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کے نزول سے پوری ہوئی۔

'مصدق' کے لفظ پر ہم ایک سے زیادہ مقامات پر بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآن ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہے جو اس کے متعلق پچھلے صحیفوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ تثنیہ باب ۱۸ کے حوالہ سے حضرت موسیٰ کی پیشین گوئی اور یوحنا باب ۱۶ کے حوالہ سے حضرت عیسیٰ کی پیشینگوئی تفسیر سورہ بقرہ میں نقل ہو چکی ہے۔ ان پیشینگوئیوں سے اس کتاب کی خصوصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور وہ ضرورت بھی واضح ہوتی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے اتارنے کا پہلے سے وعدہ فرمایا۔

قرآن اہل عرب کے لیے انذار اور بشارت ہے

وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا۔ اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جو پہلے جملہ سے نکلتا ہے یعنی اس کریم نے ایک تو اس مقصد سے اتارا کہ یہ اس عالم گیر رحمت و برکت کی بشارت ہو جس کی پیشین گوئی پہلے سے آسمانی صحیفوں میں موجود ہے۔ دوسرے اس لیے کہ تم اس کے ذریعے سے ام القریٰ اور اس کے ارد گرد کے لوگوں پر اللہ کی حجت تمام اور انھیں اچھی طرح آگاہ کر دو کہ انھوں نے اس کتاب کو اور تمھاری رسالت کو اگر قبول نہ کیا تو وہ اللہ کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آجائیں گے۔

ام القریٰ کی دینی و سیاسی اہمیت

قرآن کی یہ ضرورت قریش کے تعلق سے واضح کی گئی ہے اور یہ ضرورت بھی ایک ایسی ضرورت تھی جس کا پورا ہونا ضروری تھا۔ قریش بنی اسمٰعیل کے سربراہ تھے اور ان کی مرکزی آبادی مکہ تھی۔ بنی اسمٰعیل کتاب و نبوت سے ناآشنا امی لوگ تھے۔ حضرت ابراہیم سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اسمٰعیل کی نسل سے وہ ایک رسول اٹھائے گا جس سے تمام دنیا کی قومیں برکت پائیں گی۔ آنحضرتؐ کی بعثت سے یہ وعدہ پورا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جس قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے وہ قوم اگر اس کو قبول کر لیتی ہے تو وہ قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز ہوتی ہے اور اگر اس کو رد کر دیتی ہے تو چونکہ اس پر اللہ کی حجت پوری ہو چکی ہے، وہ تباہ کر دی جاتی ہے۔ اس اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی اسمٰعیل کے اندر مبعوث فرمایا۔ رسولوں کے باب میں سنت اللہ یہ بھی ہے کہ وہ جس قوم کے اندر بھیجے جاتے ہیں خاندانی اعتبار سے اس کے اشراف میں سے ہوتے ہیں اور وہ اپنی دعوت و انذار میں اول مخاطب قوم کے اعیان و اکابر ہی کو بناتے ہیں۔ اسی وجہ سے آنحضرتؐ کی بعثت مکہ میں ہوئی جو اہل عرب کا دینی و سیاسی مرکز اور قریش کا مستقر تھا۔ اسی اعتبار سے اس کو یہاں ام القریٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صالحین اہل کتاب اور ان کی علامت

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ الاية۔ یہ اشارہ صالحین اہل کتاب کی طرف ہے مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے رہے وہ لوگ جن کے اندر سرے سے آخرت کا کوئی خوف ہی باقی نہیں رہ گیا ہے ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو۔ یہ لوگ اسی طرح کی کج بحثیوں میں پڑے رہیں گے جن میں پڑے ہوئے ہیں۔ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ، یہ خوف آخرت رکھنے والوں کی شناخت بتا دی کہ جن کے اندر آخرت کا خوف موجود ہے وہی ہیں جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہی مضمون بقرہ کے شروع میں بھی گزر چکا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا

خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۹۳-۹۴)

مشرکین مکہ کی ہفوات کا جواب

'وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا' اہل کتاب کے مفسدین کے بعد مشرکین مکہ کے لیڈروں کی طرف توجہ فرمائی اور جو ہفوات وہ قرآن کی نسبت بکتے تھے ان کا مختصراً حوالہ دینے کے بعد ان کے انجام کی طرف ان کو توجہ دلائی۔ ان کی باتیں چونکہ بالکل لاطائل محض ان کے کبر و غرور کا مظاہرہ تھیں اس وجہ سے ان باتوں کے جواب کے بجائے اصل ضرب ان کے کبر و غرور پر لگائی۔ ان کے ذکر کا آغاز ان کے سب سے بڑے ظلم یعنی شرک کے ذکر سے فرمایا، شرک کی نسبت ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس کا ارتکاب کر کے انسان اپنے رب کا بھی سب سے بڑا حق تلف کرتا ہے اور خود اپنے نفس کی بھی سب سے بڑی توہین کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ پھر مزید یہ کہ اللہ کے اوپر یہ جھوٹا افترا ہے اس لیے کہ مشرک محض اپنے جی سے کسی چیز کو خدا کا شریک ٹھہراتا ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ خدا نے اس کو اپنا شریک قرار دیا ہے حالانکہ اس دعوے کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

قریش کے لیڈروں کی ایک دھونس

'اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ' اس افترا پر مزید افترا یہ کہ قریش کے بعض اکابر یہ کہتے کہ جس وحی کا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دعویٰ کرتے ہیں اس طرح کی وحی تو ان پر بھی آتی ہے اگر وہ چاہیں تو اسی طرح کا کلام وہ بھی پیش کر سکتے ہیں اس سے ان کا مقصود محض اس اثر کو اپنے عوام کے دلوں سے زائل کرنا ہوتا جو ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات سے پڑتا کہ جو کلام آپ پیش کر رہے ہیں وہ آپ کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی وحی ہے جو وہ اپنے ایک فرشتے کے ذریعے سے آپ پر نازل فرماتا ہے۔ ان مفتریوں نے جواب میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا تجربہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کو ہوتا ہو، اس طرح کی وحی ہم پر بھی آتی ہے۔ ہم بھی چاہیں تو اپنی وحی پیش کر سکتے ہیں لیکن ہم چونکہ اس طرح کی چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اس وجہ سے کوئی دعویٰ لے کر نہیں اٹھے۔ دوسری جگہ ان کی یہی بات یوں نقل ہوئی ہے۔ 'وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ' ۳۱ انفال (اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، کہتے ہیں بس کرو، سن لیا، اگر ہم چاہتے تو ہم بھی اسی طرح کا کلام پیش کر دیتے، یہ ہے کیا، یہ تو بس اگلوں کا فسانہ ہے) یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی صداقت ظاہر ہوتی ہے تو جن لوگوں کے پندار پر اس کی زد پڑتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اس کے مقابل میں بے بس محسوس کرتے ہیں تو اسی طرح کی دھونس سے وہ اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کے دام فریب میں پھنسے ہوئے عوام ان کی صلاحیتوں سے مایوس ہو کر اس صداقت کو اختیار نہ کر لیں۔ لیکن اس قسم کی نمائشی اور ادعائی شہ زوری اصل حقیقت کے مقابل میں کیا کام دے سکتی ہے اور کتنے دن کام دے

سکتی ہے۔ بالآخر ان زبان کے سورماؤں کو میدان چھوڑ کے بھاگنا پڑتا ہے۔

رعونت کی پاداش میں ذلت کا عذاب

'وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ الاٰیۃ' شرط کا جواب، اس طرح کے مواقع میں حذف ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے حذف سے اس کی ہولناکی کی جو تصویر چشم تصور کے سامنے آتی ہے وہ اس کے اظہار کی صورت میں نہیں آسکتی۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قرآن کے متعلق یہ باتیں قریش کے متمردین کہتے تھے۔ فرمایا کہ آج یہ لوگ اللہ کی کتاب کے باب میں اس رعونت کا اظہار کر رہے ہیں لیکن وہ وقت بھی آنے والا ہے جب یہ موت کی سکرات میں گرفتار ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر ان سے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ لاؤ، اپنی جانیں حوالہ کرو، اب وقت آگیا کہ تم کو تمہارے افترا اور آیاتِ الٰہی سے تمہارے متکبرانہ اعراض کی پاداش میں تم کو ذلت کا عذاب چکھایا جائے۔ ذلت کا عذاب اس لیے کہ انھوں نے اللہ کے رسول اور اس کی کتاب کے مقابل میں رعونت اور تکبر کا اظہار کیا۔ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ سے ان کے قول 'اوحی الی' اور ان کے شرک کی طرف اشارہ ہے کُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِہٖ تَسْتَکْبِرُوْنَ میں استکبار کا لفظ اعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے اس وجہ سے یہاں اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آیا ہے۔ اللہ کی کتاب سے اعراض کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں سب سے زیادہ مہلک اعراض وہ ہے جو غرور اور رعونت کے سبب سے ہو۔ یہاں اسی اعراض کا ذکر ہے اور یہ ابلیس کی خاص وراثت ہے۔ قریش کے لیڈروں پر یہ بات بڑی شاق تھی کہ خدا کی طرف سے کوئی نعمت یا عزت ان کے سوا کسی اور کو حاصل ہو۔ اسی وجہ سے وہ کہتے تھے کہ اگر خدا کسی کو اپنا رسول بنانے والا ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی سردار کو بناتا۔ اسی غرور کا مظاہرہ ان کی ان باتوں سے بھی ہوا جو اوپر نقل ہوئی ہیں۔

'وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی الاٰیۃ' یہاں غائب کو حاضر کے اسلوب میں کر دیا ہے تاکہ 'وَلَوْ تَرٰۤی' میں ان کے جس انجام بد کا حوالہ دیا ہے اس کی ہولناکی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ گویا قیامت آگئی اور ان سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ دیکھ لو جس طرح تم دنیا میں بے سر و سامان گئے تھے اسی طرح بے سر و سامان آج ہمارے حضور میں حاضر ہو گئے، نہ تمہارے ساتھ وہ مال و متاع اور وہ لاؤ لشکر ہے جس کے بل پر تم اتراتے تھے اور نہ وہ شرکاء و شفعاء ہی ہیں جن کو تم ہمارا ساجھی گمان کیے بیٹھے تھے اور جن سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ہمارے مقابل میں تمہارے کام آئیں گے۔ 'خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو ایک مضغۂ گوشت اور عملاً تمام صلاحیتوں سے خالی ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی تمام صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے اور اس کو ان وسائل و ذرائع اور ان اموال و املاک کا مالک بناتا ہے جو اس کے لیے مقدر ہوتے ہیں تاکہ وہ دیکھے کہ خدا کی یہ نعمتیں پا کر وہ اس کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا اکڑنے والا اور اترانے والا بن جاتا ہے۔ پھر ایک دن آتا ہے کہ وہ اسی طرح خالی ہاتھ خدا کے حضور میں حاضر کیا جاتا ہے، ان چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی اس کے ساتھ نہیں جاتی جن کے ل

پردہ بیان اکڑتا تھا۔

لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ میں فاعل میرے نزدیک حذف ہے یعنی لَقَدْ تَّقَطَّعَ الْحَبْلُ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۔ اس میں اشارہ تنزکا، وشفعا کی طرف ہے یعنی یہ سب ہوا ہو جائیں گے۔

۱۵۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹۵-۱۰۸

اوپر کا مجموعۂ آیات توحید کے مضمون پر ختم ہوا تھا۔ اسی مضمون کے تعلق سے آگے توحید کے دلائل کی مزید وضاحت ہوئی۔ یہ دلائل توحید کے آفاقی دلائل ہیں جو بیان اس طرح ہوئے ہیں کہ ان سے معاد اور رسالت پر بھی روشنی پڑ رہی ہے۔ گویا وہ پورا مضمون ایک نئے اسلوب سے سامنے آگیا ہے جو اس سورہ میں زیر بحث ہے نیز کائنات کی نشانیوں پر غور کرنے کے لیے اس صحیح نقطۂ نظر کی طرف بھی اس سے رہنمائی ہو رہی ہے جو اوپر حجت ابراہیمی کے سلسلہ میں واضح ہوا ہے۔ پھر اسی تعلق سے قریش کو مخاطب کر کے ان کو مناسب حال تنبیہ کی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے آپ کو تسلی دی گئی ہے، مسلمانوں کو مخاطب کر کے مقتضائے وقت کے مناسب ہدایات دی گئی ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ شروع سے سورہ اسی انداز پر چل رہی ہے۔ مرکزی مضمون، توحید، معاد، رسالت، بار بار مختلف اسلوبوں سے سامنے آتا ہے اور بار بار مخاطبین کے اعتراضات اور ان کے رویے کے تعلق سے کلام تردید یا توضیح یا تسکین یا موعظت کی طرف مڑ جاتا ہے لیکن سررشتۂ کلام کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۵-۱۰۸ إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ
الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٩٥﴾ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ
وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ
الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿٩٦﴾ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا
فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٩٧﴾
وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ
قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ﴿٩٨﴾ وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ

السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا
نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ
وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ
اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٩٩﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ
بَنِيْنَ وَبَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿١٠٠﴾ بَدِيْعُ ع ١٢ ١٨
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ
وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١٠١﴾ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
وَّكِيْلٌ ﴿١٠٢﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ
اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿١٠٣﴾ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ
فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿١٠٤﴾ وَكَذٰلِكَ
نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿١٠٥﴾
اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ
الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٦﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ
حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٧﴾ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ
عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٨﴾

ترجمۂ آیات ۹۵ - ۱۰۸

بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ برآمد کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور وہی برآمد کرنے والا ہے مردہ کو زندہ سے، بس وہی اللہ ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو! وہی برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی اور سورج اور چاند اس نے ایک حساب سے رکھے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم ان سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کرو۔ ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو جاننا چاہیں اور وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے پھر ہر ایک کے لیے ایک مستقر اور ایک مدفن ہے، ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو سمجھیں۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے ہر چیز کے انکھوے نکالے، پھر ہم نے اس سے سرسبز شاخیں ابھاریں جن سے ہم تہ بہ تہ دانے پیدا کر دیتے ہیں اور کھجور کے گابھے سے لٹکتے ہوئے گچھے اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار، باہمدگر ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ہر ایک کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو جب وہ پکتا ہے۔ بے شک ان کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۹۵-۹۹

اور انھوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور اس کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں، وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے اولاد کہاں سے آئی جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ وہی

اللہ تمھارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کا خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو اور وہی ہر چیز پر نگران ہے۔ اس کو نگاہیں نہیں پاتیں لیکن وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے، وہ بڑا باریک بین اور بڑا باخبر ہے۔ ۱۰۰-۱۰۳

اب تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بصیرت بخش آیتیں آ چکی ہیں تو جو بصیرت سے کام لے گا اپنے ہی کو نفع پہنچائے گا اور جو اندھا بنا رہے گا اس کا وبال اسی پر آئے گا، اور میں تم پر کوئی نگران مقرر نہیں ہوں اور اسی طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور تاکہ وہ بول اٹھیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا اور تاکہ ہم اس کو اچھی طرح واضح کر دیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ ۱۰۴-۱۰۵

تم بس اس چیز کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جا رہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کر پاتے اور ہم نے تم کو ان پر نگران نہیں مقرر کیا ہے اور نہ تم ان کے ضامن ہو۔ ۱۰۶-۱۰۷

اور اللہ کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دیجیو کہ وہ تجاوز کر کے بے خبرانہ اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نگاہوں میں اس کا عمل کھبا رکھا ہے۔ پھر ان کے رب ہی کی طرف ان سب کا پلٹنا ہے تو وہ انھیں اس سے آگاہ کرے گا جو وہ کرتے رہے ہیں۔ ۱۰۸

۱۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ۝ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ

الْعَلِيْمِ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۹۵-۹۷)

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى، 'حَبّ' اور 'نویٰ' دانے اور گٹھلی کو کہتے ہیں۔ پہلے چھوٹی چیزوں سے آیاتِ الٰہی کے بیان کا آغاز کیا ہے، پھر کائنات کی بڑی چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فرمایا کہ ایک چھوٹے سے دانے اور چھوٹی سی گٹھلی پر بھی خدا کے سوا کسی اور کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ ان کو پھاڑ کر ان کے اندر سے انکھوے نکالے، پھر ان کو پودے اور درخت بنادے۔ یہ خدا ہی کی قدرت اور اس کی حکمت ہے کہ وہ ایک ایک بیج اور ایک ایک گٹھلی کے اندر صلاحیتیں ودیعت فرماتا ہے، پھر ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے زمین، آسمان، ابر، ہوا، گرمی اور سردی، خزاں اور بہار سب کو امر فرماتا ہے کہ سب مل کر اس کی پرورش میں اپنا اپنا حصہ ادا کریں۔ گویا اس زمین میں نشوونما پانے والا ایک ایک دانہ اپنے وجود سے اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اسی کے تصرف سے وہ وجود میں آیا ہے جس کے تصرف میں یہ پوری کائنات ہے۔ اگر اس کائنات کی خدائی مختلف خداؤں اور دیوتاؤں میں بٹی ہوئی ہوتی اور وہ سب اپنے اپنے دائروں اور علاقوں میں خود مختار ہوتے تو اس دنیا کا نظام چلنا تو الگ رہا رائی کا ایک دانہ بھی اپنی صلاحیتیں اجاگر نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ایک ذرہ توحید کا شاہد ہے

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ بعینہٖ یہی ٹکڑا معمولی فرق کے ساتھ آل عمران کی آیت ۲۷ میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم بقدر ضرورت اس کی شرح کر چکے ہیں۔ یہ بے جان چیزوں سے زندگی کے اظہار اور پھر زندگی کے اوپر موت اور فنا کے طاری ہونے کی ایک جامع تعبیر ہے جس کا مشاہدہ ہم اس کائنات کے ہر گوشے میں برابر کر رہے ہیں۔ آم کی بے جان گٹھلی اور گیہوں کے بے جان دانہ سے ہرا بھرا درخت اور لہلہاتا ہوا پودا پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اسی سبز و شاداب درخت اور لہلہاتے ہوئے پودے پر زردی، خشکی اور مردنی طاری ہونی شروع ہوتی ہے یہاں تک کہ ایک دن وہ ختم ہو جاتا ہے یہی مشاہدہ ہم انسانوں اور حیوانوں میں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ قوموں اور ملتوں کے اندر بھی موت اور زندگی، عروج اور زوال کی یہی داستان برابر دہرائی جا رہی ہے۔ ایک قوم پردۂ عدم سے نکلتی ہے ساری دنیا پر چھا جاتی ہے اور پھر وہی قوم ایک دن آتا ہے کہ پردۂ عدم میں جا چھپتی ہے۔ موت اور زندگی کے اس قانون سے کسی کے لیے مفر نہیں۔ اگر خدا کے سوا کسی اور کا بھی اس کائنات میں مالکانہ و خود مختارانہ تصرف ہے تو کسی ایک ہی گوشہ میں وہ اس قانون کو باطل کیوں نہیں کر دیتا اور اگر خدا سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ یہ سب کچھ مجرد مادے یا کسی اندھی بہری طاقت کا بروز ہے تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ بروز قائم و دائم رہے، نہ اس میں کبھی انقطاع ہو، نہ اس کے رخ میں کوئی تبدیلی واقع ہو، نہ اس پر کوئی تغیر طاری ہو۔ خدا کے قانون سے کوئی باہر نہیں

یہاں زبان کا ایک نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے۔ پہلے تو فرمایا يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ لیکن دوسرے زبان کا ایک نکتہ

ٹکڑے میں اسلوب بدل کر فرمایا مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ مردہ سے زندہ کو نکالنے کے لیے فعل استعمال فرمایا جو صرف تصویر حال کا فائدہ دیتا ہے لیکن زندہ سے مردہ کو برآمد کرنے کے لیے فاعل کا صیغہ استعمال فرمایا جس کے اندر عزم اور فیصلہ کا مفہوم بھی مضمر ہوتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ زندگی حاصل ہو جانے کے بعد کوئی جاندار بھی اپنی زندگی موت کے حوالے کرنے پر راضی نہیں ہوتا لیکن قدرت کا قانون ایسا اٹل ہے کہ وہ بہرحال اس کو موت میں تبدیل کر ہی کے رہتا ہے۔ یہ نہایت واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ خدا کے سوا اس کائنات میں کسی کا کوئی دخل نہیں۔ اگر ہے کسی کا تو وہ اپنی محبوب زندگی کو موت کے پنجہ سے کیوں نہیں بچا لیتا؟ یہی مضمون سورۂ واقعہ میں یوں بیان ہوا ہے فَلَوْلَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ...... (اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو تو اپنی حلق میں آئی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لوٹا لیتے، اگر تم سچے ہو)۔

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کو انڈے اور مرغی اور دانڈے کی حکایت تک محدود رکھا ہے لیکن اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ تعبیر ہے قدرت کے ان قوانین کی جو اس نے بے جان چیزوں کے اندر زندگی کے اور جاندار چیزوں کے اندر موت کے ودیعت کیے ہیں، جن کو صرف قدرت ہی بروئے کار لاتی ہے اور جن کی گرفت سے کوئی آزاد نہیں ہے۔

ایک قدم صحیح دوسرا قدم غلط　ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ آگے فرمایا ہے ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ (وہی اللہ تمہارا رب ہے) اگر اس جملے کی تفسیر اس دوسرے جملے کی روشنی میں کی جائے تو ماننا پڑے گا کہ یہاں خبر محذوف ہے اور اگر اسی کو پورا جملہ مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب اللہ ہی کا کرشمہ قدرت ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو؟ یہ واضح رہے کہ اہل عرب اللہ کو نہ صرف مانتے تھے بلکہ ہر چیز کا خالق بھی اسی کو مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ شرک میں بھی مبتلا تھے اس لیے فرمایا کہ فکر سلیم کے لیے سیدھی راہ تو یہ ہے کہ جب یہ سارا تصرف اللہ ہی کا ہے تو بندہ صرف اسی کی عبادت و اطاعت کرے لیکن تمہاری عقل کہاں اوندھی ہوئی جاتی ہے کہ ایک قدم صحیح اٹھا کر پھر دوسرے رخ پر مڑ جاتے ہو اور پائی ہوئی حقیقت کو گم کر دیتے ہو۔

ایک اشارہ دلیل معاد کی سمت میں　یہ آیت اگرچہ واضح طور پر تو بیانِ توحید ہی کے سیاق میں ہے لیکن اس میں ایک لطیف اشارہ معاد کی طرف بھی ہو گیا۔ اس لیے کہ جب ہم ہر قدم پر مردہ سے زندہ کو ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں تو اس بات پر تعجب کی کیا وجہ ہے کہ مرجانے اور گل سڑ جانے کے بعد خدا ہمیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا؟ گٹھلی اور دانہ زمین میں سڑ گل کر اگر از سر نو زندہ ہو سکتے ہیں تو ہم زمین میں دفن ہو جانے کے بعد آخر اللہ کے حکم سے دوبارہ کیوں نہیں زندہ ہو سکتے؟

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۹۶)

زمین کے بعد ایک نظر آسمان کی طرف

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا یعنی وہی خدا جس کی شانیں زمین کے اندر دفن ہونے والے دانہ اور گٹھلی کے اندر یوں نمایاں ہوتی ہیں ذرا نگاہ اٹھا کر اس کی شانیں آسمان میں بھی دیکھو۔ وہ جس طرح گٹھلی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے درخت پیدا کر دیتا ہے اسی طرح پردۂ شب کو چاک کر کے اس کے اندر سے صبح نمودار کر دیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اس نے شب کو تمہارے لیے سکون بخشنے والی اور تمہاری کلفت کو دور کرنے والی بنایا، تم اس میں دن کی ماندگی دور کر لیتے ہو اور تمہارے قوٰی اور اعصاب اس میں از سرِ نو میدانِ عمل میں اترنے کے لیے تازہ دم ہوتے ہیں۔ اس سے یہ اشارہ خود بخود نکل آیا کہ وہ رات کے بعد صبح اس لیے پیدا کرتا ہے کہ تم اس میں اپنی طلب و جستجو کی سرگرمیوں میں مصروف ہو سکو اور اپنی معاش کے لیے جدوجہد کر سکو۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ یوں بیان فرمایا وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (سورہ نبا ۹ - ۱۱) (اور ہم نے تمہاری نیند کو تمہارے لیے دافع کلفت بنایا، شب کو تمہارے لیے پردہ پوش بنایا اور دن کو حصولِ معاش کی سرگرمیوں کے لیے بنایا) مطلب یہ ہے کہ صبح اور شام، دن اور رات کی اس نوعیت پر غور کرو، تمہاری عقل یہ بات باور کرتی ہے کہ صبح کا لانے والا کوئی اور ہے، شام کا لانے والا کوئی اور، دن کا پیدا کرنے والا کوئی اور ہے، رات کا پیدا کرنے والا کوئی اور، یا یہ بات قبول کرتی ہے کہ صبح اور شام، رات اور دن سب اللہ ہی کے حکم سے آتے جاتے ہیں۔ اگر دن کا خالق کوئی اور، رات کا خالق کوئی اور ہوتا تو ان دونوں میں یہ موافقت و سازگاری کون پیدا کرتا کہ رات تمہارے لیے راحت کا بستر بچھاتی اور میٹھی نیند کے لیے سکون فراہم کرتی ہے اور دن تمہارے لیے سرگرمیوں کے میدان گرم کرتا اور معاش و معیشت کی راہیں کھولتا ہے۔

ایک اور مثال منصوبہ بندی کی

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ دن اور رات کے بعد اب یہ رات اور دن کے اندر ظاہر ہونے والی دو بڑی نشانیوں سورج اور چاند کو لیا۔ فرمایا کہ ان کو دیکھو، ان کے لیے قدرت کا ٹھہرایا ہوا ایک ضابطہ اور ایک نظام الاوقات ہے، مجال نہیں ہے کہ سرِ مو اس سے تجاوز کر سکیں۔ انہی سے دن، مہینے، سال معین ہوتے ہیں، انہی سے موسموں کا تغیر وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ ہیں تو آسمان میں لیکن پوری وفاداری اور پابندی کے ساتھ، بلا کسی تمنائے ستائش اور پروائے صلہ کے رات دن خدمت میں سرگرم ہیں زمین والوں کی۔

کائنات میں خدا کی شانیں

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۚ اوپر کی بیان کردہ نشانیوں سے جو حقیقت سامنے آتی ہے، یہ اسی کا بیان ہے اور انداز بیان ایسا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر اس شخص کے دل کی آواز ہے جو اس نظامِ کائنات پر عقلِ سلیم اور قلبِ سلیم سے غور کرتا ہے۔ جس کی عقل سلیم ہے وہ جب اس نظام اور اس کی بے پایاں برکات پر غور کرتا ہے تو بے تحاشا اس کی زبان سے یہ گواہی نکلتی ہے کہ یہ ساری منصوبہ بندی خدائے عزیز و علیم ہی کی ہے۔

کائنات میں توحید کے شواہد

اس چھوٹے سے فقرے کے اندر کئی حقیقتیں مضمر ہیں۔

ایک یہ کہ یہ سورج اور چاند خدائی میں کوئی دخل نہیں رکھتے بلکہ اس کارخانۂ کائنات میں ان کی حیثیت صرف کل پرزوں کی ہے جن کو ایک عزیز و علیم نے ان کے مقام میں فٹ کیا ہے اور یہ اپنی مفوضہ خدمت پوری پابندی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

دوسری یہ کہ یہ کارخانہ متضاد قوتوں اور مختلف دیوتاؤں کی کوئی رزمگاہ نہیں ہے بلکہ اس کے اضداد کے اندر حیرت انگیز سازگاری ہے اور ان کی یہ باہمی سازگاری اس بات کی شاہد ہے کہ ایک ہی خدائے قاہر و قیوم اور ایک ہی ربِ عزیز و علیم کا ارادہ اور اس کی مشیت اس پر کار فرما ہے اور اس کی ہر حرکت اور اس کا ہر سکون اسی کی مشیت کے تابع ہے۔

تیسری یہ کہ یہ کارخانہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ نہیں ہے بلکہ اس کے ہر گوشے سے اس کے صانع کی قدرت، حکمت اور اس کے علم کی شہادت مل رہی ہے جو اس بات کا ثبوت فراہم کر رہی ہے کہ اس کے پیچھے ایک عظیم غایت و مقصد ہے جس کا ظہور میں آنا لابدی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے بعد ایک روز جزا و سزا آئے جس میں اس کی حکمت واضح ہو۔

چوتھی یہ کہ یہ دنیا کسی کباڑیے کی دکان یا کوئی مال گودام نہیں ہے جس میں کسی چیز کا بھی کوئی قرینہ نہ ہو بلکہ اس میں نہایت حیرت انگیز پلاننگ ہے، ہر چیز کے لیے اس کی متعین جگہ ہے، ہر حرکت اور گردش کے لیے معین محور و مدار ہیں، ہر عمل کے ظہور کے لیے لگے بندھے ضابطے قاعدے ہیں، ہر آزادی اور ہر پابندی کے لیے معلوم و معروف حدود و قیود ہیں۔ اس سے صاف یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس جہان کے خالق کی مرضی انسانوں کے لیے بھی یہی ہے کہ وہ شتر بے مہار کی زندگی نہ گزاریں بلکہ اس کی ہدایات اور اس کے احکام کے تحت زندگی بسر کریں تاکہ ان کی زندگی اس پورے کارخانہ سے ہم آہنگ ہو۔ یہی راہ فلاح و سعادت کی راہ ہے۔ سورۂ رحمان میں ہم آیت وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ کے تحت اس نکتہ کی مزید وضاحت کریں گے۔ وہاں قرآن نے اسی آفاقی شہادت سے رسالت کی ضرورت پر استشہاد کیا ہے۔

لفظ 'تقدیر' کا مفہوم

اس آیت میں 'تقدیر' کا لفظ وہی مفہوم رکھتا ہے جو پلاننگ (PLANNING) کا مفہوم ہے۔ 'عزیز' کی صفت خدا کی بے نہایت قدرت اور سب پر اس کی بالاتری کو اور 'علیم' کی صفت اس کے محیط کل علم کے ساتھ ساتھ اس کی بے نہایت حکمت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس لیے کہ علم، حکمت کو بھی مقتضی ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ خدا اس نظام کائنات کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ وہ سب سے بالاتر ہے۔ اس کی قدرت، اس کا علم اور اس کی حکمت سب کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ

يَّعْلَمُوْنَ (۹۷)

ستاروں کی خدمت گزاری

سورج اور چاند کے بعد ستاروں کی طرف توجہ کیا کہ دیکھ لو، یہ خود اپنی خدمت گزاری سے شہادت دے رہے ہیں کہ خالق نے ان کو تمہاری خدمت پر مقرر کیا ہے۔ جب تم خشکی اور تری کا سفر کرتے ہو تو سمندروں اور بیابانوں میں یہ روشنی کے میناروں اور رہبروں کی طرح تمہاری کشتیوں اور تمہارے قافلوں کو سمتیں اور راستے بتاتے ہیں۔ اب یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے کہ وہ خود تو اپنے عمل سے بتا رہے ہیں کہ تمہارے خالق نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے اور تم ان کو خدا کی خدائی میں شریک مان کر ان کے بت کھڑے کر کے ان کی پرستش شروع کر دو۔ پھر یہ دیکھو کہ یہ ہیں تو آسمان میں لیکن شمع برداری کی خدمت وہ تم زمین والوں کی انجام دے رہے ہیں۔ سوچو کہ زمین کا خدا الگ ہوتا اور آسمانوں کے دیوتا الگ ہوتے تو آسمان کے ستاروں کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین والوں کو رستہ بتانے کے لیے ساری رات دیدبانوں میں کھڑے اپنی نیندیں خراب کرتے؟ یہ صورت حال تو صاف شہادت دے رہی ہے کہ زمین و آسمان سب پر ایک ہی خدا کی حکمرانی ہے اور اسی نے ان ستاروں کو تمہاری خدمت کے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم اپنے رب کے شکر گزار بنو اور اسی کی عبادت کرو۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ عرب شعرا اپنے بیابانی سفروں کی جو داستان بیان کرتے ہیں اس میں ستاروں کا ذکر ان کی رہنمائی کے پہلو سے بھی کرتے ہیں اور رات کے مختلف حصوں کے اوقات بتانے کے لیے بھی انہی کا حوالہ دیتے ہیں۔ گویا وہ ان سے گھڑیوں کا کام بھی لیتے تھے اور رہنما رہبروں کا بھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بعض ستاروں کی پرستش بھی کرتے تھے۔ 'شعریٰ' کا حوالہ تو قرآن میں بھی آیا ہے جو موسم بہار میں طلوع ہوتا تھا۔ اسی طرح دوسرے ستارے بھی جو نکھتروں سے تعلق رکھتے تھے، ان کے معبود تھے، بعض سعد سمجھے جاتے تھے، بعض نحس۔

حقیقت کے طالبوں کے لیے ہر قدم پر نشانیاں موجود ہیں

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ لفظ آیات کے مختلف معانی پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں یہ نشانی کے معنی میں ہے اور چونکہ ہر نشانی اس چیز کی دلیل ہوتی ہے جس کی وہ نشانی ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے معنی دلائل کے ہوں گے اور چونکہ یہاں زیر بحث خدا اور اس کی توحید اور ضمناً معاد و رسالت ہے اس وجہ سے یہاں مراد انہی کے دلائل ہوں گے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی اپنے اندر گوناگوں پہلو رکھتی ہے اس وجہ سے یہ تو بتا دیا ہے کہ ہم نے نشانیوں کی تفصیل کر دی ہے لیکن یہ نہیں واضح فرمایا کہ کس چیز کی نشانیاں واضح فرمائی ہیں۔ یہ چیز مخاطب کے فہم پر چھوڑ دی ہے کہ اس کے اندر علم کی طلب و جستجو ہوگی تو وہ ان میں اپنی ہر جستجو کا جواب پا جائے گا۔

یہاں لفظ 'آیات' کے استعمال میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے۔ منکرین قریش کے متعلق اوپر بھی بیان ہو چکا ہے اور اس مجموعۂ آیات کے خاتمہ پر بھی ذکر آئے گا کہ وہ قرآن پر ایمان لانے کے لیے یہ شرط

ٹھہراتے کہ پیغمبر کوئی نشانی دکھائیں تو وہ ایمان لائیں گے۔ نشانی سے مراد وہ کوئی محسوس معجزہ لیتے تھے۔ ان کی اسی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر فرمایا کہ اگر نشانیوں کی طلب ہے تو عقل و دل کو مطمئن کرنے والی نشانیاں یہ ہم نے بیان کر دی ہیں لیکن یہ کارآمد ان کے لیے ہیں جو علم کے طالب ہیں جن کے اندر علم کی طلب نہیں ہے وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔

فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں

'لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ' ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ فعل ارادۂ فعل کے لیے بھی آتا ہے اس وجہ سے 'لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ' کا مطلب یہ ہو گا کہ ان کے لیے جو جاننا چاہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ ہم اپنی زبان میں بھی جب بولتے ہیں 'ان کے لیے جو مانیں'، 'ان کے لیے جو سمجھیں'، 'ان کے لیے جو غور کریں'، تو فعل ارادۂ فعل ہی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (۹۸)

توحید کی دلیل خود انسان کی خلقت میں

خارجی عالم کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب یہ انسان کی خود اس کی خلقت اور اس کے اردگرد جو سامان معاش و معیشت فراہم فرمایا ہے، اس کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے تمھیں ایک ہی جان سے پیدا کیا اور نسل انسانی کا ایک وسیع گھرانا آباد کر دیا۔ یہاں 'انشاء' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف پیدا کرنے کے نہیں ہیں بلکہ اس کے اندر نشو و نما بخشنے، پروان چڑھانے اور فروغ دینے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ 'ایک ہی جان' سے مراد آدم ہیں جن کو تمام آسمانی مذاہب میں نسل انسانی کی اصل کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اہل عرب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے۔ فرمایا کہ یہ خدا ہی ہے جس نے تمھیں ایک ہی جان سے پیدا کیا، اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا، پھر مردوں اور عورتوں کی ایک دنیا پیدا کر دی۔ ان میں شکلوں، صورتوں، زبانوں، لہجوں کا اگرچہ اختلاف ہے، لیکن جبلی تقاضوں اور فطری داعیات کے لحاظ سے اتفاق ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ سب کا خالق اور پروردگار ایک ہی ہے جس نے ایک ہی درخت سے یہ سارے برگ و بار پیدا کیے ہیں۔ عورت اور مرد میں بظاہر تضاد و اختلاف ہے لیکن ان دونوں کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ سازگاری کے جو ظاہری و باطنی محرکات و اسباب جمع ہیں وہ زبان حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ دونوں کا خالق و مربی ایک ہی ہے جس نے ایک مشترک مقصد کے لیے ان کو وجود بخشا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غور کرو کیا یہ ایک ہی خدا کا پیدا کیا ہوا اور ایک ہی آدم و حوا کا گھرانا ہے یا مختلف خداؤں کی پیدا کی ہوئی منتشر بھیڑ جس کے ہر گروہ کے خدا بھی الگ الگ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا باوا آدم بھی جدا گانہ ہے۔

قرآن نے اسی وحدت الٰہ اور وحدت آدم کے عقیدے پر انسانی معاشرے کی بنیاد رکھی ہے اور ان لوگوں کو فساد فی الارض کا مجرم قرار دیا ہے جو معاشرے کی اس بنیاد کو ڈھانے کی کوشش کریں۔ اسا

مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ ہم سورۂ نساء کی تفسیر میں بحث کر آئے ہیں۔ اس کی پہلی آیت اس عقیدے کو دلیل پیش کرتی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ	اے لوگو، تم اپنے اس خداوند سے ڈرو جس نے تم کو
خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ	ایک ہی جان سے پیدا کیا، اور اسی کی جنس سے پیدا کیا
مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا	اس کے جوڑے کو اور پھر ان دونوں سے پھیلا دیے
کَثِیْرًا وَّنِسَآءً ج وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ	بے شمار مرد اور بے شمار عورتیں، اور اس اللہ سے ڈرو
تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ ط اِنَّ اللّٰہَ	جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالب مدد ہوتے
کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا (۱- نساء)	ہو اور رحمی رشتوں کا احترام کرو۔ بے شک اللہ تم پر نگران ہے

مستقر اور مستودع کا مفہوم

'فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ' 'مُسْتَقَرٌّ' کے معنی قرار و سکونت کی جگہ کے ہیں اور 'مُسْتَوْدَعٌ' اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز بطور ودیعت و امانت حفاظت سے رکھی جائے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں 'مستقر' سے مراد وہ جگہ ہے جہاں پیدا ہونے کے بعد انسان رہتا بستا ہے 'وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ' ۳۶- بقرہ (اور تمھارے لیے زمین میں ایک وقت خاص تک رہنے بسنے کی جگہ اور کھانا برتنا ہے) 'مستودع' سے مراد وہ جگہ ہے جہاں مرنے کے بعد وہ دفن کیا جاتا ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد انسان یہ دونوں ہی چیزیں پاتا ہے۔ جتنی زندگی اس کے لیے مقدر ہوتی ہے اتنے دن وہ گزارتا ہے اور جو رزق اس کے لیے مقدر ہوتا ہے اس سے متمتع ہوتا ہے اور اس کا یہ جینا اور خدا کے بخشے ہوئے رزق سے متمتع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی نگرانی اور اس کے علم میں ہے۔ پھر جب اس دنیا میں اس کی مدت حیات ختم ہو جاتی ہے تو وہ اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کرتا ہے اور جہاں کہیں بھی دفن ہوتا ہے خدا ہی کی زمین میں دفن ہوتا ہے اور جب خدا کا حکم ہو گا زمین اس امانت کو خدا کے حوالے کر دے گی۔ جس طرح ہر شخص کا 'مستقر' خدا کے علم میں ہوتا ہے، اسی طرح اس کا 'مستودع' بھی اس کے علم میں ہوتا ہے۔ خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں۔ قرآن مجید میں یہ مضمون دوسرے مقامات میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے مثلاً 'وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا وَیَعْلَمُ مُسْتَقَرَّھَا وَمُسْتَوْدَعَھَا کُلٌّ فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ' ۶- ھود (اور نہیں ہے زمین میں کوئی جاندار مگر اللہ ہی اس کو روزی دیتا ہے، اور خدا دنیا میں اس کے مستقر کو بھی جانتا ہے اور مر گئے پر اس کے سپرد کیے جانے کی جگہ کو بھی، ہر چیز ایک واضح رجسٹر میں درج ہے) مطلب یہ ہے کہ پیدا ہونے کے بعد زندگی، رزق اور اسباب و وسائل سب کچھ اسی سے حاصل ہوتا ہے تو کسی غیر کو انسان اپنی ابید کا مرجع کیوں بناتے؟ پھر مدفن کے لیے 'مستودع' کا لفظ استعمال کر کے ایک لطیف اشارہ مرنے کے بعد اٹھائے جانے کی طرف بھی فرما دیا کہ انسان جب مرتا ہے تو یہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ ختم ہو گیا، بلکہ وہ زمین کی تحویل میں

دے دیا جاتا ہے جہاں سے وہ پھر اٹھایا جائے گا تاکہ وہ اپنی شکر گزاری کا انعام پائے اگر خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کا اس نے حق پہچانا ہے اور اپنی ناشکری کی سزا بھگتے اگر اس نے خدا کی نعمتوں کی ناقدری کی ہے۔ یہ خدا کی رحمت و ربوبیت اور اس کے علم و حکمت کا لازمی تقاضا ہے۔

دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

'قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ' اس میں وہی بات فرمائی گئی ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اس کا اعادہ اس بات کی دلیل ہے کہ مخاطب نہایت ضدی ہیں جو بات تو سمجھنا نہیں چاہتے لیکن بہانہ یہ تراش رہے ہیں کہ ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا جا رہا ہے۔ 'علم' اور 'تفقہ' میں فرق یہ ہے کہ علم عقل و شعور کا فعل ہے اور تفقہ دل کا، چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ ارشاد ہوا ہے 'لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا' (ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں) یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انسان پر خدا کی نشانیاں اس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب وہ اپنی عقل اور دل کو استعمال کرتا ہے۔ جب تک وہ محسوسات کا غلام بنا رہتا ہے، اس وقت تک اس کی مثال گدھے کی ہے جو ڈنڈے کی زبان کے سوا دوسری کوئی زبان بھی نہیں سمجھتا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عقل اور دل بھی مشاہدۂ کائنات سے خدا تک اسی صورت میں پہنچتے ہیں جب ان کے اندر محسوسات سے آگے بڑھنے کی ہمت اور حوصلہ ہو۔ اگر وہ صرف محسوسات ہی پر قانع ہو جائیں اور ان کی ساری تگ و دو انہی چیزوں کے لیے رہ جائے جو اس حیات چند روزہ میں کام آنے والی ہیں تو بسا اوقات تل تو ان کو نظر آ جاتا ہے لیکن تل کی اوٹ کا پہاڑ ان سے اوجھل ہی رہتا ہے۔ یہ حب عاجلہ کی بیماری ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دیکھنے کو تو سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۹۹)

قدم قدم پر توحید اور معاد کے آثار و دلائل

اب یہ خدا کی رحمت، ربوبیت، قدرت، حکمت، توحید اور معاد کے ان آثار و دلائل کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جو ہر انسان کو قدم قدم پر نظر آ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ماننا چاہے۔

'وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ' لفظ 'سماء' پر ہم دوسری جگہ لکھ چکے ہیں کہ یہ بادلوں کے لیے بھی آتا ہے اور اس فضائے نیلگوں کے لیے بھی جس کو ہم آسمان کہتے ہیں۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جو آسمان سے بارش برساتا ہے اور اس سے ہر چیز کو روئیدگی بخشتا ہے۔ کلام کا آغاز غائب کے صیغہ سے فرمایا پھر اس کو 'فَاَخْرَجْنَا بِهٖ' متکلم کے صیغہ میں بدل دیا۔ اس میں رافت، عنایت اور ربوبیت کا اظہار بھی ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کہ آسمان و زمین اور ابر و ہوا سب پر ہماری ہی حکومت ہے، اگر آسمان پر کسی اور کی حکومت ہوتی، زمین پر کسی اور کی تو یہ توافق کہاں سے

ظہور میں آتا کہ آسمان سے پانی برستا اور زمین اپنے خزانے اُگل دیتی۔ پھر اس میں ایک لطیف تلمیح آخرت کی بھی ہے۔ قرآن میں اسی بارش اور اس کے اثر سے مردہ زمین کے از سر نو لہلہا اٹھنے کو متعدد مقامات میں معاد کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے کہ جب تم ہمیشہ دیکھتے ہو کہ زمین پر ایک تنکا بھی نہیں ہوتا لیکن بارش ہوتی ہے تو اس کے اندر کی دبی ہوئی ہر چیز جاگ پڑتی ہے اور گوشہ گوشہ سبزے سے معمور ہو جاتا ہے تو مرجانے کے بعد جی اٹھنے کو کیوں بعید سمجھتے ہو؟

فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا یہ ربوبیت عامہ کے بعد ربوبیت خاصہ کا بیان ہے جس کا تعلق انسانوں سے ہے۔ پہلے غلہ کا ذکر فرمایا جو عام ضرورت کی چیز بھی ہے اور اپنی پائیداری کے اعتبار سے ذخیرہ کیے جانے کے لائق بھی۔ فرمایا کہ انھی نباتات میں سے جن کے اندر ہم نے غلہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، سرسبز خوشے اور بالیاں نکالتے ہیں اور اپنی قدرت و حکمت سے ان پرتہ بہ تہ دانے جما دیتے ہیں اور اس طرح تمھارے بوئے ہوئے ایک دانے پر سینکڑوں دانوں کا اضافہ کر کے ہم تمھیں لوٹا دیتے ہیں۔ غور کرو کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے، کسی اندھی بہری قوت کا ظہور ہے، یا کسی حکیم و قدیر اور دانا و بصیر پروردگار کی پروردگاری ہے؟ اتنے اجزائے مختلفہ کو اتنی تدبیر، اتنی نظم اور اتنی حکمت سے استعمال کرنا اور ان کے حاصل کو تمھاری زندگی کے بقا کا ذریعہ بنا دینا ایک رب کریم و کارساز کے سوا اور کس کا کام ہو سکتا ہے؟

ربوبیت عامہ کے بعد بعض اشارات ربوبیت خاصہ کی طرف

وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ ان دونوں ٹکڑوں میں فعل محذوف ہے۔ پہلے میں مجہول، دوسرے میں معروف۔ غلہ کے بعد اب یہ پھلوں کا ذکر فرمایا اور پہلے کھجور کو لیا جس کو اہل عرب کے ہاں عام پھل کی حیثیت حاصل تھی۔ کھجور کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ اس کے درخت، اس درخت کے اندر گابھے کا پیدا ہونا اور پھر اس سے لٹکتے ہوئے بوجھل خوشوں کا ظہور میں آنا، ہر چیز کی طرف توجہ دلادی ہے تاکہ اس کاریگری پر انسان کی نظر پڑے جو اس کے ابتدائے ظہور سے لے کر اس کی تکمیل اور پختگی تک قدرت اس پر صرف کرتی ہے۔ اسی کاریگری اور صنعت پر غور کرنے سے انسان کو صانع کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کی قدرت و حکمت اور اس کی رحمت و ربوبیت کا کچھ اندازہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت کا منشا ان قدرتوں اور حکمتوں کے اظہار سے یہی ہے کہ انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو ورنہ جہاں تک کھجور کی ضرورت مجرد غذا کے لیے ہے اس کی فراہمی کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک چھوٹی سی گٹھلی سے درجہ بدرجہ ایک تناور درخت بنے، پھر ایک خاص مرحلہ میں پہنچ کر اس کے اندر گابھے اور خوشے پیدا ہوں، پھر ان کے اندر ننھی ننھی کیریاں بیٹھیں، پھر وہ درجہ بدرجہ پھل بنیں پھر پک کر اور بوجھل ہو کر ان کے خوشے زمین کی طرف لٹک آئیں اور انسان کو زبان حال سے دعوت شوق دیں۔ یہ سارا اہتمام دل گواہی دیتا ہے کہ اسی لیے ہے کہ انسان پر خدا کی قدرت، اس کی

ربوبیت اور اس کی حکمت کے اسرار ظاہر ہوں لیکن یہ سائنس کا عجیب اندھاپن ہے کہ اس کو حکمت تو نظر آتی ہے لیکن حکیم نظر نہیں آتا، ربوبیت تو اس کو دکھائی دیتی ہے لیکن رب کا سراغ اس کو کہیں نہیں ملتا۔ اور اس سے زیادہ عجیب معاملہ ان لوگوں کا ہے جو دیکھتے ہیں کہ کھجور کے درخت کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے پھولنے، پھلنے اور پکنے تک تمام عناصر کائنات نے اس کی دیکھ بھال اور غور و پرداخت میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا تب کہیں کھجور کا ایک خوشہ تیار ہوا ہے لیکن پھر بھی وہ اس سفاہت میں مبتلا ہیں کہ یہ کائنات مختلف ارادوں اور بے شمار دیوتاؤں کی ایک رزمگاہ ہے اور ان سے بھی زیادہ عجیب معاملہ ان سادہ لوحوں کا ہے جو ربوبیت اور پروردگاری کے یہ سارے سروسامان دیکھ رہے ہیں، ان سے متمتع اور محظوظ بھی ہو رہے ہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کے کھانے پینے، عیش کرنے کے لیے ہے۔ یہ سوال ان کے ذہن میں کبھی نہیں پیدا ہوتا کہ یہ سب کچھ مہیا کرنے والے کی طرف سے ان پر کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ ان نعمتوں کے باب میں کوئی پرسش کا دن بھی آنے والا ہے یا نہیں؟ گویا دینے والے نے حق تو ان کو سارے بخش دیے لیکن ذمہ داری ان کے اوپر کوئی بھی نہیں ڈالی۔

اشیاء میں تنوع کی حکمت 'وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ' کھجور کے بعد انگور، زیتون اور انار کا ذکر فرمایا۔ مقصود ان کے ذکر سے صرف انہی متعین پھلوں کا ذکر نہیں ہے، ان کا ذکر صرف اس پہلو سے ہوا کہ یہ اہل عرب کے معروف پھل تھے جو ان کو خود اپنے علاقے میں میسر تھے، اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ خدا نے تمہاری ربوبیت کا جو سامان کیا ہے تو اس میں صرف روٹی ہی نہیں بلکہ مختلف قسم کے فواکہ اور میوہ جات بھی ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ فواکہ بھی جو دیے تو اس میں بھی اپنی ربوبیت، اپنی رحمت، اپنی فیاضی اور اپنی قدرت و حکمت کی یہ شان دکھائی کہ ایک ایک چیز کی گوناگون اقسام و انواع، ایک دوسری سے ملتی جلتی بھی اور باہمدگر شکل، رنگ، قامت، ذائقہ میں مختلف بھی، تمہارے سامنے چن دیں۔ اب سوچو کہ جس نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ رحیم، قدیر، علیم، حکیم اور کریم پروردگار ہے یا نہیں۔ آخر تمہاری زندگی مجرد اپنے بقا کے لیے تو ان پھلوں اور ان تمام تنوعات کی محتاج نہ تھی، تم جینے کو تو خشک روٹی اور پانی سے بھی جی سکتے تھے، پھر اس نے ایسا کیوں کیا کہ تمہارے آگے اتنے گوناگوں پھلوں کے انبار لگا دیے جن کی خوشبو، ذائقہ، شکل ہر چیز دل کو لبھانے والی، آنکھوں کو فریفتہ کرنے والی اور دماغ کو مست کرنے والی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ان میں سے ہر چیز کے اندر انسان اپنے خالق کی صفات کا جلوہ دیکھے اور پھر انہی صفات کے آئینہ میں اپنے ظاہر و باطن کو سنوارے اور ان میں سے ہر نعمت اس کے اندر اس جذبۂ شکر و سپاس کو ابھارے جو خدا نے ہر انسان کے اندر ودیعت فرمایا ہے اور جو تمام دین و شریعت کی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، بنیاد ہے۔

'اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ'، 'اِلٰى ثَمَرِهٖ' میں ضمیر کا مرجع ہیں تو وہ ساری ہی چیزیں جن

کا اوپر ذکر گزرا لیکن ضمیر واحد اس وجہ سے ہے کہ متکلم چاہتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لے کر ان کے پیدا ہونے سے لے کر ان کے پکنے تک کے تمام مراحل پر غور کیا جائے۔ غور و فکر کا عمل فطری طور پر یہ تقاضا کرتا ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی چیز پر نگاہ جمائی جائے تاکہ قوتِ فکر منتشر نہ ہو گویا یہاں قرآن نے صرف غور و فکر کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ اس کا صحیح طریقہ بھی بتا دیا۔ یہ واضح رہے کہ اس اسلوب کی مثالیں قرآن میں بھی ہیں اور کلام عرب میں بھی۔

مجمع کے لیے ضمیر واحد اور اس کا فائدہ

'وَيَنْعِهٖ' کے بعد 'اِذَا يَنَعَ' ہمارے نزدیک حذف ہے۔ ہم دوسرے مقام میں عربی زبان کا یہ اسلوب واضح کر چکے ہیں کہ بعض اوقات ایسے مقابل الفاظ حذف کر دیے جاتے ہیں جن کی مذکورہ الفاظ کے بعد کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہاں چونکہ 'اِلٰى ثَمَرِهٖ' کے بعد 'اِذَآ اَثْمَرَ' موجود تھا اس وجہ سے 'وَيَنْعِهٖ' کے بعد 'اِذَا يَنَعَ' کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مذکور محذوف پر خود دلیل بن گیا۔

فرمایا کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو لے کر اس کے پھلنے سے لے کر اس کے پکنے کے مراحل تک ہر مرحلے کو دیکھو اور اس پر غور کرو تو خالق کی قدرت، حکمت، ربوبیت، صناعی، کاریگری، باریک بینی، فیض بخشی اور اس کے حسن و جمال کی اتنی نشانیاں اور اتنی شہادتیں تمہارے سامنے آئیں گی کہ تم ان کو شمار نہیں کر سکو گے تم ایک نشانی اور ایک معجزہ مانگتے ہو، آنکھیں ہوں تو ہر شاخ معجزہ، ہر پھول معجزہ، ہر پھل معجزہ۔ کوئی چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر قدرت کے اعجاز کے ہزاروں شاہکار جلوہ نما نہ ہوں۔ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ دنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام عجائب کی نمائش کی محتاج نہ تھی، یہ بالکل سادہ اور بے رنگ حالت میں بھی وجود میں آسکتی اور باقی رہ سکتی تھی لیکن خالقِ کائنات نے یہ پسند فرمایا کہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتی سے اس کی عظیم قدرت و حکمت اور اس کی بے نہایت رحمت و ربوبیت ظاہر ہو تاکہ انسان اس کی معرفت حاصل کرے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب بدقسمتی ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنی ذہانت کے مظاہرے کا اتنا شوقین ہے کہ اگر ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے مدفون کھنڈروں سے کوئی ٹوٹا ہوا مٹی کا برتن بھی اس کو ہاتھ آجائے تو اس پر کھنچی ہوئی آڑی ترچھی لکیروں سے وہ اس عہد کے آرٹ، اس عہد کے کلچر، اس عہد کی تہذیب، اس دور کے مذہب، اس دور کی سیاست، غرض ہر چیز پر ایک مزعومہ فلسفہ اور ایک فرضی تاریخ تیار کر دے گا، دوسری طرف اس کی بلادت اور بدذوقی کا یہ عالم ہے کہ خالقِ کائنات نے ایک ایک پتی پر اپنی حکمت کے جو دفاتر رقم فرمائے ہیں نہ ان کا کوئی حرف اس کی سمجھ میں آتا ہے نہ ان سے اسے کوئی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

ہر ورق معرفتِ کردگار کا دفتر ہے

'اِنَّ فِىۡ ذٰلِكُمۡ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ' فرمایا کہ جو لوگ ایمان لانا چاہیں ان کے لیے ان چیزوں کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ کسی حقیقت کے تسلیم کیے جانے کے لیے تنہا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ واضح اور ثابت ہے بلکہ اس کے لیے اوّل شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر اس کو قبول کرنے کا

ارادہ پایا جاتا ہو۔ دنیا کو گمراہی علم کے مخفی ہونے کے سبب سے زیادہ پیش نہیں آتی ہے بلکہ زیادہ تر عمل کا سچا اور مضبوط ارادہ مفقود ہونے سے پیش آتی ہے۔

آیت ۹۹ کے اندر بیان کردہ نشانیاں

اب آئیے ان نشانیوں پر غور کیجیے جن کی طرف آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

پہلی چیز تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اتنی حکمتوں سے یہ معمور دنیا نہ آپ سے آپ وجود میں آئی ہے، نہ یہ کسی اندھی بہری قوت کا کرشمہ ہے بلکہ اس کے ذرے ذرے کے اندر بے پایاں قدرت اور بے نہایت حکمت کی جو نشانیاں ہیں وہ زبان حال سے شہادت دے رہی ہیں کہ یہ ایک قادر و قیوم اور ایک علیم و حکیم کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔

دوسری چیز یہ نمایاں ہوتی ہے کہ آسمان و زمین، ابر و ہوا، سورج اور چاند، نور اور ظلمت، سردی اور گرمی، بہار اور خزاں ہر چیز پر تنہا اسی قادر و قیوم کی حکمرانی ہے اس لیے کہ ہر چیز اپنے وجود، اپنے نشوونما اور اپنے بلوغ و کمال میں تمام عناصر کائنات کی ایک خاص تناسب کے ساتھ خدمات حاصل کرتی ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ایک ہی بالاتر ارادہ تمام کائنات پر حاوی ہو اور وہ اپنے محیط کل علم و حکمت کے تحت ان تمام عناصر مختلفہ کے اندر ربط و ہم آہنگی پیدا کرے اور ان کو کائنات کے مجموعی مقصد کے لیے استعمال کرے۔

تیسری چیز یہ سمجھ میں آتی ہے کہ قدرت، علم اور حکمت سے یہ معمور کائنات اپنے ہر گوشے سے پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ نہیں ہے جو محض اس نے اپنا جی بہلانے کے لیے بنایا ہو، جس کے اندر نیکی اور بدی، خیر اور شر، عدل اور ظلم کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ اس قدرت، اس علم اور اس حکمت کا لازمی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اس کے خالق و مالک کا کامل عدل اور اس کی کامل رحمت ظاہر ہو۔

چوتھی چیز یہ سامنے آتی ہے کہ اس کے اندر رب کریم و رحیم نے ہمارے لیے بغیر ہمارے کسی استحقاق کے، محض اپنے فضل و رحمت سے جو نعمتیں اور لذتیں مہیا فرمائی ہیں اور جن سے ہم متمتع ہو رہے ہیں ا، ہم پر ہمارے رب کی شکر گزاری اور اسی کی عبادت و اطاعت کا حق واجب کرتی ہیں، جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اس حق کی بابت ہم سے پرسش ہو۔ جس نے یہ حق ادا کیا ہو وہ انعام پائے اور جس نے ناشکری کی ہو وہ اس کی سزا بھگتے۔

پانچویں حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جس پروردگار کی پروردگاری کا یہ عالم ہے کہ اس نے ہمارے اندر جو طلب اور جو داعیہ بھی ودیعت فرمایا اس کا ہمارے گرد و پیش میں بہتر سے بہتر جواب مہیا فرمایا، بھوک دی تو غذا مہیا فرمائی، پیاس دی تو پانی کے دریا بہا دیے، ذائقہ بخشا تو ذوق کی ضیافت کے نت نئے سامان کیے، ذوق نظر بخشا تو کائنات کے گوشے گوشے کو اپنی قدرت کی نیرنگیوں کی جلوہ گاہ بنا دیا۔ یہ

کس طرح ممکن ہے کہ ایسی فیض بخش اور بابرکت ذات جو ہماری مادی ضرورتوں کا اس سیر چشمی اور فیاضی سے اہتمام کرے، ہماری اس جستجو کا کوئی جواب نہ پیدا کرے جو اس نے ہماری روح اور ہمارے دل کے اندر اپنی ہدایت کے لیے ودیعت فرمائی ہے؟ یہ چیز لازم ٹھہراتی ہے کہ جس طرح اس نے ہماری جسمانی بھوک اور پیاس کے لیے غذا اور پانی کا انتظام فرمایا ہے اسی طرح ہماری اس روحانی تشنگی کے بجھانے کا بھی اہتمام فرمائے۔ یہ چیز رسالت کے سلسلۂ رشد و ہدایت کی ضرورت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۱۰۰-۱۰۳)

جنات کو خدائی میں شریک بنانے کا عقیدہ

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ، یعنی کائنات کی ایک ایک چیز تو خدا اور اس کی صفات سے متعلق وہ شہادتیں فراہم کر رہی ہے جو اوپر مذکور ہوئیں لیکن ان لوگوں کی خرد باختگی اور سفاہت کا یہ عالم ہے کہ یہ جنات کو بھی خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہیں۔ اہل عرب جن چیزوں کو خدا کا شریک مانتے تھے ان میں ملائکہ، جنات، کواکب سب ہی شامل تھے۔ لیکن یہاں سب سے پہلے جنات کا ذکر کر کے قرآن نے شرک کے انتہائی گھناؤنے پن کو واضح کیا ہے کہ کہاں خدا کی وہ شانیں جو بیان ہوئیں اور کہاں ان لوالفضولوں کی یہ لوالفضولی کہ پیپل تلے کی بھتنی اور شیطان کو بھی خدا کا شریک بنا دیا گیا ہے۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ اہل عرب جنات کی پرستش اسی قسم کے تصورات کے تحت کرتے تھے جس قسم کے تصورات کے تحت عام طور پر حال کی مشرک قومیں بھوت پریت کی پرستش کرتی ہیں۔ فلاں وادی کا جن، فلاں درخت کی بھتنی، فلاں ٹیلے کا بھوت، اس قسم کے توہمات ان کے اندر پھیلے ہوئے تھے اور عام طور پر ان کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے ان کو چڑھاوے، نذریں، قربانیاں پیش کی جاتیں اور ان کی جے پکاری جاتی۔ بعض جن تو اتنے خطرناک سمجھے جاتے کہ ان کو راضی رکھنے کے لیے، جیسا کہ آگے آیت ۱۳۷ کے تحت ذکر آئے گا، اولاد تک کی قربانی کی جاتی۔ غالباً یہ ظالمانہ حرکت وہ لوگ کرتے رہے ہوں گے جو اس وہم میں مبتلا ہوتے ہوں گے کہ اگر فلاں جن کو خوش کرنے کے لیے اپنے کسی بیٹے کی قربانی نہ دی تو وہ ان کی ساری اولاد کو تباہ کر دے گا۔ اس قسم کا وہم دنیا کی وحشی قوموں میں عام رہا ہے۔

شرک کی کوئی دلیل نہیں

وَخَلَقَهُمْ میں 'و' حالیہ ہے اور اس کی حیثیت کلام کے بیچ میں جملہ معترضہ کی ہے۔ یہ بات اتنی گھنونی تھی کہ بلا تاخیر اس کی تردید فرما دی کہ یہ لوگ جنوں کو خدا کا شریک بناتے ہیں حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا ہے۔ خدا ہی کی پیدا کی ہوئی کوئی چیز آخر اس کی خدائی میں شریک کیسے بن سکتی ہے؟ یہ واضح رہے کہ اہل عرب ساری کائنات کا خالق خدا ہی کو مانتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا یہ عقیدہ اصل عقیدے سے

صرف تضاد ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ یہ تضاد نہایت بھونڈے قسم کا تھا۔ آخر خدا اپنی دنیا پیدا کر کے اس کو اپنے ہی پیدا کیے ہوئے جنوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ اَلْخَرْقُ الْكَذِبَ کے معنی جھوٹ گھڑنے اور جھوٹ تراشنے کے ہیں۔ اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کا درجہ دیتے تھے اور اس وہم کی بنا پر ان کی مورتیں بنا کر دیویوں کی حیثیت سے ان کی پوجا کرتے تھے۔ اگرچہ یہاں اصلاً زیر بحث مشرکین عرب ہی کے توہمات ہیں لیکن بیٹیوں کے ساتھ بیٹوں کا ذکر کر کے قرآن نے کلام میں وسعت پیدا کر دی ہے اور اس طرح ان قوموں کے عقائد کی بھی تردید ہوگئی ہے جو خدا کے لیے بیٹے مانتی تھیں جن کی ایک مثال عیسائی ہیں۔ 'بِغَيْرِ عِلْمٍ' کا مطلب یہ ہے کہ یہ باتیں وہ بغیر کسی دلیل عقل و نقل کے مانتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے 'بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ' جہاں تک خدا کا تعلق ہے وہ تو عقل و فطرت کا بدیہی تقاضا ہے۔ خدا کو مانے بغیر نہ اس کائنات کا معمہ حل ہوتا نہ عقل و فطرت کو اطمینان حاصل ہوتا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے اور یہ موحد و مشرک دونوں کے ہاں مسلم ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کائنات میں کسی اور کی بھی حصہ داری ہے تو یہ چیز دلیل کی محتاج ہے اور یہ دلیل فراہم کرنا اس فریق کی ذمہ داری ہے جو اس کا مدعی ہے۔ یہ دلیل دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ یا تو خود خدا کی طرف سے کوئی قابل اطمینان شہادت موجود ہو کہ اس نے فلاں اور فلاں کے لیے اپنی اس کائنات میں حصہ داری تسلیم کی ہے یا ان کو وہ اپنے بیٹے یا بیٹیاں مانتا ہے یا عقل و فطرت کے اندر ان کے حق میں کوئی دلیل موجود ہو۔ اگر ان دونوں چیزوں میں سے کوئی چیز بھی موجود نہ ہو تو آخر کیا شامت آئی ہوئی ہے کہ مفت میں کسی کو خدا یا شریک خدا مان کر اس کی غلامی کا پٹا بھی اپنی گردن میں ڈال لیجیے۔ خدا کوئی تفریح کی چیز نہیں ہے۔ اس کو تو اس لیے مانا جاتا ہے کہ اس کے مانے بغیر چارہ نہیں۔ آخر دوسروں کے ماننے کے لیے کیا مجبوری ہے کہ ان کو مانیے۔ بلا دلیل تو آدمی اپنی گز بھر زمین میں کسی کی حصہ داری تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تو آخر خدا کی خدائی اور اس کے اختیار و اقتدار میں کسی کو کس طرح حصہ دار مان لے۔

خلاف شان صفات کی نفی

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ 'سُبْحٰنَهٗ' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہ تنزیہہ کا کلمہ ہے، یعنی خدا ان باتوں سے پاک، بری اور بالا ہے جو یہ مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ بظاہر تو صرف ایک تنزیہی کلمہ ہے لیکن غور کیجیے تو اس کے اندر توحید کی بہت بڑی دلیل بھی ہے۔ عقل و فطرت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ کسی چیز کی طرف کوئی ایسی صفت منسوب نہ کی جائے جو اس کی ثابت، مسلم اور بدیہی صفات کے ضد یا منافی ہو۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی مانی ہوئی ایک حقیقت اپنے ہی دوسرے مفروضہ سے باطل ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شخص بادشاہ ہے تو اس کی طرف غلامی کی صفات منسوب نہیں ہو سکتیں۔ فرشتہ ہے تو اس کو شیطان کی صفات سے ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جو ذات خالق، مالک، قدیر، علیم اور کریم و رحیم ہے اس کو ان صفات سے متصف کرنا جو مخلوق کی صفات ہیں اس کی

ان تمام صفات کی نفی کے ہم معنی ہے جن کا ماننا ازروئے عقل و فطرت واجب ہے اور جن کی نفی سے انسان ان تمام تاریکیوں میں پھر گھر جاتا ہے جن سے ان صفات کے علم کی روشنی ہی نے اس کو نکالا تھا۔ اگر خدا کو خدا ماننے کے بعد بھی جنات اور فرشتوں کو اس کا شریک قرار دے دیا گیا اور اس کو بیٹوں بیٹیوں کا باپ بنا دیا گیا تو پھر وہ خدا کہاں رہا؛ پھر تو اس کے کفو و ہمسر بھی پیدا ہو گئے، اس کی ذات برادری کے شریک بھی نکل آئے اور اس کے مدمقابل اور حریف بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

'بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ'، 'بدیع' کے معنی ہیں عدم سے وجود میں لانے والا۔ یعنی خدا آسمانوں اور زمین اور تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تب خدا تھا۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے تو کسی مخلوق کو بیٹوں بیٹیوں کا درجہ کس طرح حاصل ہوا؛ اور وہ خدا کی خدائی میں شریک کس راہ سے ہوئے؟

مشرکین کی حماقت در حماقت

'اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَکُنۡ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ'، یعنی خدا کے لیے اولاد ماننا ایک اس سے بھی بڑی حماقت کے لیے راہ کھولتا ہے۔ وہ یہ کہ خدا کے لیے (نعوذ باللہ) بیوی بھی مانی جائے۔ یہ خیریت تھی کہ مشرکین عرب اپنی تمام مشرکانہ خرافات کے باوجود خدا کے لیے کوئی بیوی نہیں مانتے تھے۔ قرآن نے اسی پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ جب خدا کے کوئی بیوی نہیں اور تم بھی اس کے لیے کسی بیوی کے قائل نہیں تو پھر یہ اس کے بیٹے بیٹیاں تم نے کہاں سے کھڑے کر دیے؛ پھر تو جو بھی ہوگا، فرشتے ہوں یا جنات یا انسان، سب خدا کی مخلوق ہوئے اور جب مخلوق ہوئے تو سب کو مخلوق ہی کے درجے میں رکھو، ان میں سے کسی کو بیٹے بیٹیاں قرار دے کر خدا کی ذات اور اس کی خدائی میں کیوں شریک بناتے دے رہے ہو۔

محیط کل علم شرک کے منافی ہے

'وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ وَھُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ' یہ شرک اور شرکاء کی کھلی نفی کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا ہی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے تو آخر وہ ضرورت کیا ہے جس کے لیے ان شرکاء کا سہارا ڈھونڈھا گیا ہے؛ یہ تصور کرنے کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا نے پیدا کرنے کو تو کر دیا لیکن اس کو ہر چیز اور ہر شخص کی خبر نہیں ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ لازماً ہر چیز کو جانتا بھی ہے۔ اسی بات کو دوسری جگہ فرمایا ہے 'اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ'، ملک ۱۴ (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا) یہاں یہ بات یاد رہے کہ اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر ان کی جو پوجا کرتے تھے تو اس لیے نہیں کہ وہ ان کو خالق مانتے تھے بلکہ صرف اس لیے کہ یہ خدا کے چہیتے ہیں اور یہ اپنے پرستاروں کی ضروریات، ان کے مسائل اور ان کی آرزوؤں سے خدا کو باخبر کرتے اور اس سے منواتے ہیں۔ فرمایا کہ اس نے پیدا کیا ہے تو وہ اپنی مخلوق کی ہر چیز سے واقف بھی ہے تو اس کو چھوڑ کر کسی اور کے دروازے پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔

'ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الایۃ' فرمایا کہ وہی خدا جس نے تمہیں پیدا کیا ہے وہی تمہارا رب بھی ہے

پھر اس کا کیا تک ہے کہ خالق تو اس کو مانو اور رب دوسروں کو بناؤ۔ وہی خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے تو امید ہو یا بیم دونوں کا مرجع اسی کو بناؤ۔

خدا کے لیے پیکر محسوس تراشنے کی ممانعت

'لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ' یعنی اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ خدا نظر تو نہیں آتا تو یہ چیز مایوس ہونے کی نہیں۔ تمہاری نگاہیں تو بے شک اس کو پکڑنے سے قاصر ہیں لیکن وہ تمہاری نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ جو اسے دیکھنا چاہتا ہے وہ تو اگرچہ اس کو نہیں دیکھ پاتا لیکن وہ ڈھونڈنے والے کو دیکھ لیتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اعبد ربك كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك (اپنے رب کی بندگی اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ بہرحال تمہیں دیکھ رہا ہے)

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شرک و بت پرستی کے محرکات میں سے ایک اہم محرک ابتدا سے یہ بھی رہا ہے کہ نادانوں نے خدا کو کسی پیکر محسوس میں دیکھنا چاہا ہے۔ اسی چیز نے انسان اور خدا کے درمیان واسطوں اور وسیلوں کو جنم دیا۔ جب خدا کہیں آنکھوں سے نظر نہیں آیا تو ناسمجھ لوگوں نے ان چیزوں کے پیکر تراش کر ان کی پرستش شروع کر دی جن کو وہ خدا کی ذات یا صفات کا مظہر یا اس کا اوتار سمجھے۔ چنانچہ زمانۂ حال کے ہندو فلسفی بت پرستی کے جواز کی نئی توجیہ اب یہی پیش کرتے ہیں اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں جن صوفیوں نے تصور شیخ کی بدعت اختیار کی ہے وہ بھی اپنی اس بدعت کی تائید میں یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ انسان چونکہ پیکر محسوس کا خوگر ہے اس وجہ سے تصور شیخ، تصور الٰہی کا ذریعہ ہے۔ قرآن نے یہاں یہی غلط فہمی رفع فرمائی ہے کہ خدا دیکھنے اور چھونے کی چیز نہیں ہے۔ اس سے قرب و بُعد دل کے واسطہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان اس کو یاد رکھے تو وہ خدا سے قریب ہوتا ہے اگر بھول جائے تو دور ہو جاتا ہے۔ اگر آدمی کی نگاہ اس کو نہیں دیکھتی تو اس سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس کی نگاہیں آدمی کو ہر جگہ اور ہر وقت دیکھتی ہیں اور انسان کے اعتماد کے لیے یہ بس ہے۔

'وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ' یہ اوپر کی بات کی دلیل صفات الٰہی سے بیان فرمائی کہ وہ بڑا باریک بین اور بڑی خبر رکھنے والا ہے۔ کوئی چیز کتنے ہی پردوں میں ہو اس کی نگاہیں اس تک پہنچ جاتی ہیں اور کوئی چیز کتنی ہی مخفی ہو وہ اس سے ہر آن و ہر لحظہ باخبر ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس کے لیے ان مزعومہ وسائط و وسائل کی ضرورت نہیں۔ تم اس کے طالب ہو تو وہ خود تمہیں پا لے گا۔ تمہاری نگاہیں بے شک اس کو پانے سے قاصر ہیں لیکن اس کی نگاہیں تمہاری نگاہوں کو پا لینے سے قاصر نہیں ہیں۔ وہ ہر جگہ سے ان کو پا لیتی ہیں۔

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ۝ وَكَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۱۰۴-۱۰۵)

'قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ' لفظ 'بصيرة' قرآن میں سوجھ بوجھ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے

اور سوجھ بوجھ پیدا کرنے والے دلائل و براہین کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ اسی دوسرے معنی میں ہے اور مراد اس سے قرآن حکیم اور اس کی آیات ہیں جو آنکھوں کے پردے ہٹا دینے والی ہیں بشرطیکہ کوئی آنکھیں کھولنا چاہے۔

'فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ' یعنی ان سے فائدہ اٹھا کر جو اپنی بصیرت کی آنکھیں کھولے گا تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جو بدستور اندھا بنا رہے گا تو اس کا خمیازہ خود ہی بھگتے گا، اس کی کوئی ذمہ داری پیغمبر پر نہیں ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود — آیت کے آخری الفاظ 'وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ' اس بات پر دلیل ہیں کہ اس آیت کی وحی براہِ راست لسانِ نبوت پر ہے۔ یوں ارشاد نہیں ہوا کہ ان لوگوں سے کہہ دو بلکہ کہنے کی بات پیغمبر نے خود براہِ راست فرما دی۔ وحی کی یہ قسم روحِ نبوت کے غایت قرب و اتصال کی دلیل ہوتی ہے گویا منبع فیض کا فیضان خود زبان رسالت سے چھلک پڑتا ہے۔ 'گفتۂ او گفتۂ اللہ بود' شاید اسی حقیقت کی تعبیر ہے۔ وحی کی اقسام و انواع پر انشاء اللہ ہم کسی دوسرے مقام پر بحث کریں گے۔ مولانا فراہیؒ نے اس پر اپنے مقدمۂ تفسیر میں ایک نہایت لطیف بحث فرمائی ہے۔

'وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ' 'تصریفِ آیات' کی وضاحت مختلف مقامات میں ہو چکی ہے یعنی اللہ کی نشانیوں کو مختلف پہلوؤں اور گوناگون اسلوبوں سے واضح کرنا۔ یہاں 'كَذٰلِكَ' کا اشارہ توحید، معاد اور رسالت کے انہی دلائل کی طرف ہے جو اوپر تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

لفظ درس کی تحقیق — 'وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ' 'درس' کے اصل معنی تو گھسنے اور مٹانے کے ہیں۔ 'دَرَسَ الرَّسْمُ' کے معنی ہوں گے نشان کو مٹا دیا۔ آدمی جب کسی چیز کو کثرت سے بار بار پڑھتا ہے، بالخصوص جب اس پر انگلی رکھ کے ایک ایک حرف کو متعین کرتے ہوئے پڑھتا ہے، جیسا کہ مذہبی صحیفوں کی تلاوت کے لیے رواج ہے تو بالعموم وہ نسخے گھس جاتے ہیں۔ اس وجہ سے لفظ درس کسی کتاب کو اچھی طرح بار بار قرات و مرات پڑھنے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ لغت میں اس بات کو یوں تعبیر کرتے ہیں 'دَرَسَ الْكِتٰبَ' اقبل علیہ یحفظہ۔

کسی کتاب کو پڑھنا خود اپنے لیے بھی ہو سکتا ہے اور دوسروں کو سنانے کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں قرأت اور تلاوت کے الفاظ بھی ان دونوں ہی مفہوموں میں استعمال ہوئے ہیں۔ 'وَلِیَقُوْلُوْا' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنی آیتیں مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ سمجھنا چاہیں تو سمجھیں اور اگر اپنی روش پر اڑے رہنا چاہیں تو کم از کم اس بات کے تو وہ قائل ہو جائیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کے سنا دیا، نیز اس لیے ہم ان کی اچھی طرح وضاحت کر رہے ہیں کہ جو علم کے طالب ہیں وہ ان سے علم حاصل

کریں۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنا کوئی رسول بھیجتا ہے تو اس کے ذریعے سے وہ مخاطب قوم پر اپنی حجت تمام کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دل پکار اٹھتے ہیں کہ رسول نے احقاقِ حق کا حق ادا کر دیا، زبان سے وہ اس کا اقرار کریں یا نہ کریں۔ یہاں وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ سے یہی دل کا اقرار مراد ہے۔ دل کے اقرار کے باوجود زبان و عمل سے جو قوم رسول کی تکذیب پر اڑی رہتی ہے، سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ قوم ہلاک کر دی جاتی ہے۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (۱۰۶-۱۰۷)

پیغمبر کی طرف التفات

یہ پیغمبر کی طرف التفات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم وحی الٰہی پر جمے اور اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور ان مشرکین کی مخالفت کی کوئی پروا نہ کرو۔ ان سے اعراض کرو اور یہ بات یاد رکھو کہ اگر اللہ اپنے دین کے معاملہ میں جبر کو پسند کرتا ہوتا تو ان میں سے کوئی بھی شرک پر قائم نہ رہ سکتا۔ وہ سب کو توحید و اسلام کی صراطِ مستقیم پر چلا دیتا لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ لوگوں کو اس معاملے میں اختیار دے کر آزمائے کہ کون توحید کی راہ اختیار کرتا ہے، کون شرک کی؟ جب حکمتِ الٰہی نے یہ چاہا ہے تو تم ان کے معاملے میں کیوں پریشان ہو، تمہاری ذمہ داری حق کو واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے اور یہ فرض تم انجام دے رہے ہو۔ تم ان کے ایمان کے ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو کہ یہ ایمان نہ لائے تو اس کی پرسش تم سے ہو اور نہ تم ان کے ایمان کے ضامن بنے ہو کہ کل کو ان کے باب میں خدا کے ہاں جواب دہی کرنی ہے۔ تم اپنا فرض انجام دو۔ جو ان کی ذمہ داری ہے وہ ان پر چھوڑ دو، اگر وہ اپنی ذمہ داری ادا نہ کریں گے تو اس کا خمیازہ خود بھگتیں گے۔

لفظ وکیل کے مختلف معانی پر ہم دوسرے مقام پر گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں یہ ضامن کے مفہوم میں ہے۔ یعنی نہ خدا نے تم کو ان پر داروغہ مقرر کیا، نہ تم ان کے ضامن بنے تو تم کیوں پریشان ہو؟

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۰۸)

مسلمانوں کو مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ، یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی ایک برمحل ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت سورۂ نساء کی آیت ۸۶ اور ۱۴۸ میں گزر چکی ہے جس طرح مذکورہ آیات سے اوپر منافقین کے رویہ پر شدت کے ساتھ تنقید ہوئی تو ساتھ ہی مسلمانوں کو ان سے سلام کلام قطع کرنے اور تعیین اشخاص کے ساتھ ان کو برا بھلا کہنے کی ممانعت کر دی گئی کہ مبادا یہ بات اصول کے حدود سے نکل کر ذاتیات کے دائرے میں داخل ہو جائے، اسی طرح یہاں اوپر شرک اور مشرکین پر جو سخت تنقید ہوئی ہے اس کا تقاضا یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ہدایت کر دی جائے کہ شرک کی تردید یہ رنگ نہ اختیار کرنے پائے

کہ زیادہ پرجوش مسلمان ان چیزوں کو سخت سست کہنا شروع کر دیں جن کو یہ مشرکین پوجتے ہیں۔ یہ ہدایت اس وجہ سے ضروری تھی کہ یہ دَور، جیسا کہ آیات سے واضح ہے، بحث کی گرما گرمی کا تھا اور بحث کی گرما گرمی میں حدود کا احترام بالعموم ملحوظ نہیں رہتا در آنحالیکہ مسلمانوں پر، جیسا کہ سورۂ مائدہ آیت ۸ سے واضح ہے، واجب ہے کہ وہ دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرنے میں سرِ مُو حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اس ہدایت کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ دعوت کے نقطۂ نظر سے بابرکت اور نتیجہ خیز طریقہ یہی ہے کہ بات اصول و عقائد ہی تک محدود رہے تاکہ مخاطب کے اندر کسی بیجا عصبیت کا جذبۂ جاہلی ابھرنے نہ پائے۔ اگر توحید کا تقاضائے عقل و فطرت ہونا اور شرک کا بالکل بے ثبات و بے بنیاد ہونا ثابت ہو جائے تو ان مزعومہ معبودوں کی خدائی آپ سے آپ ختم ہو جاتی ہے، ان کو سب و شتم کا ہدف بنانے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ برعکس اس کے اگر بحث کے جوش میں ان چیزوں کو لوگ بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے، جن کی عقیدت پشتہا پشت سے مشرکین کے دلوں میں رچی بسی ہوئی تھی تو اس کا نفسیاتی اثر ان پر یہی پڑ سکتا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر نعوذ باللہ خدا کو گالیاں دینے لگتے اور پھر کوئی بات بھی سننے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ عَدۡوًۢا بِغَيۡرِ عِلۡمٍ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہرچند مشرکین، خدا کو خدا مانتے ہیں لیکن اشتعال میں حدود کا ہوش کسے رہتا ہے؟ وہ اندھے ہو کر سارے حدود توڑ کے رکھ دیں گے بالخصوص جب کہ انھیں خدا کی صفات اور اس کے حقوق کا کوئی علم بھی نہیں ہے۔

یوں بھی غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا کہنے کا کوئی تُک نہیں ہے۔ اگر وہ محض خیالی اور وہمی چیزیں ہیں تو سایہ سے لڑنے کا کیا فائدہ؟ اور اگر وہ فرشتوں، نبیوں اور بزرگوں کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہیں تو ان کو بُرا بھلا کہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ الغرض یہ چیز دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی غلط، عقل و انصاف کے پہلو سے بھی غلط اور سب سے زیادہ اس پہلو سے غلط ہے کہ مشرکین کے جھوٹے خداؤں کو گالیاں دینے والے درحقیقت اپنے سچے خدا کو گالیاں دلوانے کی راہ کھولتے ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن میں بتوں کی بے حقیقتی، ان کی ناطاقتی اور ان کی بے بسی کی تصویر جو قرآن میں کہیں کہیں کھینچی گئی ہے وہ اس کے تحت نہیں آتی۔ اول تو روکا جس چیز سے گیا ہے وہ سب و شتم ہے نہ کہ تنقید و توضیح، دوسرے یہاں آیت میں پیش نظر وہ فرضی یا واقعی ہستیاں ہیں جن کو مشرکین معبود مان کر پکارتے تھے۔ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ کے الفاظ سے یہ بات خود ہی نکل رہی ہے۔

كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمۡ مطلب یہ ہے کہ ہر قوم کو اپنی روایات، اپنے رسوم اور اپنے معتقدات عزیز ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کی علانیہ تحقیر و توہین سے وہ مشتعل ہوتی ہے۔ اس طرح کی کسی چیز پر تنقید کرتے ہوئے ناقد کو لازماً یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ معاملے کے وہی پہلو زیر بحث آئیں جو آنے چاہئیں اور اسی انداز میں آئیں جو شائستہ بحث و تنقید کے شایانِ شان ہے۔ وہ انداز نہیں ہونا چاہیے جو

جذبات کو مجروح کرنے والا اور دلوں کو دکھانے والا ہو۔

فطری تقاضوں کے جائز حدود کی رعایت

یہاں تزئین کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قوم کے اندر اپنی مالوفات سے دل بستگی اور اپنی روایات ملی و اجتماعی کے لیے یہ عصبیت ایک حد تک فطری چیز ہے۔ یہ نہ ہو تو قومی و ملی وحدت وجود ہی میں نہیں آسکتی۔ خاندانوں، قوموں، وطنوں کی شیرازہ بندی اسی چیز سے ہوتی ہے۔ یہ معدوم ہو جائیں تو افراد ہوا میں اڑتے ہوئے پتوں کے مانند ہو جائیں۔ اس وجہ سے اس چیز کا ایک مقام ہے جو تقاضائے فطرت ہے اور اس کی رعایت ملحوظ ہونی چاہیے۔ اس سے تعرض اسی حد تک ہونا چاہیے جس حد تک یہ حق کے خلاف ہے اور اس انداز میں ہونا چاہیے جس سے خود اس کا واجبی حق مجروح نہ ہو۔ یاد ہوگا، ہم دوسرے مقام میں بحث کر آئے ہیں کہ قرآن نے باپ دادا کے طریقہ کی بھی اہمیت تسلیم کی ہے۔ بس یہ مطالبہ کیا ہے کہ اس کو ان چیزوں سے پاک کر کے اختیار کیا جائے جو اس میں عقل و فطرت اور تعلیم الٰہی کے خلاف گھس آئی ہوں۔ اسی طرح یہاں مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ قوم کے عقائد و اعمال کی تطہیر تو ضروری ہے لیکن یہ کام نہایت حکمت و دانش کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ہر قوم کو اپنی روایات سے گہری وابستگی ہوتی ہے اور یہ چیز اس فطرت کے تقاضوں میں سے ہے جو خود خدا نے انسان کے اندر ودیعت کی ہے اس وجہ سے یہ تو ضروری ہے کہ جو خلافِ فطرت چیز فطرت کے اندر گھس آئی ہے وہ اس سے دور کی جائے لیکن خود فطرت پر کوئی جارحانہ حملہ کرنے کی غلطی نہ کی جائے ورنہ اس سے کام بننے کے بجائے اور بگڑ جایا کرتا ہے۔

ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ الاٰیۃ، پوری آیت سامنے رکھ کر اس فقرے پر غور کیجیے تو مطلب یہ نکلے گا کہ مسلمانوں کو دعوت کے جوش میں اپنے حدود سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ اگر لوگ حق واضح ہو جانے کے باوجود اپنی غلطیوں ہی پر مُصر رہیں گے تو مجرم وہ ٹھہریں گے اور قیامت کے دن خدا کے آگے جوابدہی ان کو کرنی ہوگی، اہل ایمان پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی، پھر وہ کیوں ضرورت سے زیادہ مضطرب اور اپنی ذمہ داری کے حدود سے متجاوز ہوں؟ یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی تسکین و تسلی ہے جس طرح کی تسکین و تسلی اوپر والی آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔

۱۷- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰۹-۱۱۷

اوپر کے مجموعۂ آیات میں، جیسا کہ واضح ہوا، تفصیل کے ساتھ توحید، معاد اور رسالت کے عقلی و فطری دلائل بیان ہوئے ہیں۔ اب آگے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان سارے دلائل کے بعد بھی ان کا مطالبہ یہی ہے کہ تم کوئی معجزہ دکھاؤ تو وہ ایمان لائیں گے۔ فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ یہ چیز میرے اختیار کی نہیں ہے، صرف خدا کے اختیار کی ہے۔ اس کے پاس معجزات کی کمی نہیں ہے۔ وہ ایک سے ایک بڑھ کر معجزے دکھا سکتا

ہے لیکن تم دنیا جہان کے معجزے دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاؤ گے اس لیے کہ ایمان نہ لانے کی اصل علت یہ نہیں ہے کہ نشانیاں اور معجزات موجود نہیں ہیں بلکہ یہ ہے کہ تمہارے دل اور تمہاری آنکھیں الٹ گئی ہیں۔ جس طرح اس کائنات کی بے شمار نشانیاں دیکھ کر تم اندھے ہی بنے رہے اسی طرح اگر اور بہت سے معجزے بھی تمہیں دکھا دیے گئے جب بھی تم اندھے ہی بنے رہو گے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اس دنیا میں جاری ہے اور جس سے ہر نبی اور ہر داعیٔ حق کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ جب کسی نبی یا کسی داعیٔ حق کی دعوتِ حق بلند ہوتی ہے تو اس کی مخالفت کے لیے شیاطین انس و جن بھی لازماً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس سے ایک طرف تو اہلِ حق کی آزمائش اور ان کے کھرے کھوٹے میں تمیز ہوتی ہے، دوسری طرف اہلِ باطل کو ڈھیل ملتی ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں اور جو کمائی انھیں کرنی ہے کر لیں۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ میرے لیے تو اس قضیہ میں خدا کے سوا کسی اور کو حکم ماننے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس نے ایک کتاب اتار کر حق اور باطل کے درمیان واضح فیصلہ کر دیا ہے۔ جو اہلِ کتاب ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خدائی کتاب ہے۔ اب جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ شیطان کی پیروی کر رہے ہیں، اور ان کے باب میں خدا کی وہ بات پوری ہو کے رہے گی جو اس نے شیطان کے جواب میں فرمائی تھی کہ جو تیری پیروی کریں گے میں ان سب کو جہنم میں جھونک دوں گا۔

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہنے کی تاکید اور معاملے کو خدا کے حوالے کرنے کی تلقین ہے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰۹-۱۲۰
وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ
قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا
ربع الجزء ۱۹ بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ
اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا
مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِیْ

بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ۚ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا
فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿١١٢﴾ وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ
لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُمْ مُقْتَرِفُونَ ﴿١١٣﴾
أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ
مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِنْ
رَبِّكَ بِالْحَقِّ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿١١٤﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ
رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١١٥﴾
وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنْ
يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿١١٦﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ
مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١١٧﴾

ترجمۂ آیات ١٠٩-١١٧ اور وہ اللہ کی پکی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔ اور تمھیں کیا پتہ کہ جب وہ آجائے گی تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور ہم اُن کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو اُلٹ دیں گے جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے، اور ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیں گے۔ اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے بھی اتار دیتے اور مُردے بھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور ساری چیزیں ان کے آگے گروہ در گروہ اکٹھی کر دی جاتیں جب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے الا آنکہ اللہ چاہے لیکن ان کی اکثریت مبتلائے جہل ہے۔ ١٠٩-١١١

اور اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں کے اشرار کو ہر نبی کا دشمن بنایا۔ وہ ایک دوسرے کو پُر فریب باتیں القا کرتے ہیں دھوکا دینے کے لیے۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کر پاتے۔ تو تم ان کو ان کی انہی افترا پردازیوں میں پڑے رہنے دو اور ایسا اس لیے ہے کہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل جھکیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور تاکہ وہ اس کو پسند کریں اور تاکہ جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کر لیں۔ ۱۱۲-۱۱۳

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حکم ڈھونڈوں دراں حالیکہ وہی ہے جس نے تمھاری طرف کتاب اتاری مفصل۔ اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ جانتے ہیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے حق کے ساتھ تو تم شک میں پڑنے والوں میں سے نہ ہو جیو۔ اور تمھارے رب کی بات پوری ہوئی ٹھیک ٹھیک اور عدل کے ساتھ اور کوئی نہیں جو اس کی باتوں کو بدل سکے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اور اس زمین والوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ اگر تم نے ان کی بات مانی تو وہ تمھیں خدا کے راستہ سے گمراہ کر کے چھوڑیں گے۔ یہ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں۔ بے شک تیرا رب خوب جانتا ہے ان کو جو اس کے رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں اور خوب جانتا ہے ان کو جو ہدایت یاب ہیں۔ ۱۱۴-۱۱۷

۱۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفْـــِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى

وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ ۝

آنحضرتؐ کے خلاف کفار کا ایک پروپیگنڈا

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لَيُؤْمِنُنَّ بِهَا، جہد کے معنی طاقت، کوشش، بھرپور جدوجہد کے ہیں۔ بذل جہدہ اس نے اپنی پوری کوشش صرف کر دی۔ پورا زور لگا دیا۔ 'اَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ' یعنی وہ اللہ کی قسمیں کھا کھا کر پیغمبر کو اور مسلمانوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو وہ ضرور مان لیں گے کہ یہ معجزہ خدا کی طرف سے، اس کا دکھانے والا خدا کا رسول اور اس کی پیش کی ہوئی کتاب خدا کی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زور شور کے ساتھ قسمیں کھا کھا کے یقین دلانے سے اصل مقصود ان کا وہ تو تھا نہیں جو وہ ظاہر کرتے تھے بلکہ یہ ان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک پراپیگنڈا تھا۔ وہ اس سے ایک طرف تو اپنے ان ہم قوموں کو مطمئن کرنا چاہتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت سے متاثر ہو رہے تھے کہ ہم نے ایک شرط بدی ہے جو نہایت معقول ہے، اگر یہ شرط محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پوری کر دیں تو ہم ایمان لانے کے لیے تیار ہیں۔ دوسری طرف وہ نیک دل مسلمانوں کے دل پر یہ اثر ڈالنا چاہتے تھے کہ جب یہ سچے رسول ہیں تو آخر اس شرط کے مان لینے میں کیا مانع ہے، کیوں نہیں اس کو مان کر میدان جیت لیتے؟

کفار کو جواب اور مسلمانوں کو تسلی سنت الٰہی کی روشنی میں

'قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ' یہ جواب ہے ان کی بدی ہوئی شرط کا اور دیکھیے کتنا نازک موقع ہے لیکن جواب وہی دیا گیا جو بالکل صحیح جواب ہے۔ ذرا بھی اس میں اس اندیشے کا دخل نہیں ہے کہ اس کو سن کر حریف تالی پیٹ دے گا کہ یہ تو فتح ہماری رہی۔ خود پیغمبر کی زبان مبارک سے اعلان کرایا کہ جس قسم کے معجزات کا تم مطالبہ کر رہے ہو، یہ معجزات تو خدا ہی کے پاس ہیں، وہ چاہے تو ظاہر فرمائے، نہ چاہے تو نہ ظاہر فرمائے۔ اس معاملے میں مجھے کوئی اختیار نہیں۔ یہ ٹھیک ٹھیک امر واقعی کا بیان ہے۔ پیغمبر کا اصلی فریضہ انذار و تبشیر ہے۔ لوگوں کی طلب کے مطابق معجزے دکھانا نہ اس کے اختیار میں ہے، نہ اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

'وَمَا يُشْعِرُكُمْ' میں ضمیر خطاب جمع کی ہے اور روئے سخن عام مسلمانوں کی طرف ہے۔ قدرتی طور پر بحث کی اس گرماگرمی کے دور میں ان کے اندر یہ شدید خواہش پیدا ہوئی ہوگی کہ جب بات اسی شرط پر آ کر ٹکی ہے کہ ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مان لیں گے تو ان کو کوئی معجزہ دکھا ہی دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھیں کیا معلوم کہ ان کے ایمان نہ لانے کا اصل سبب کیا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ان کو کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو یہ مان لیں گے حالانکہ اس وقت بھی یہ نہیں مانیں گے بلکہ بدستور اپنی ضد پر اڑے ہی رہیں گے اس لیے کہ ان کے ایمان نہ لانے کی جو اصل علت ہے وہ بدستور اس معجزے کے دیکھ لینے کے بعد بھی باقی رہے گی۔

نشانیوں سے ہدایت پانے کے بارے میں سنت الٰہی

'وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ' یہ اس سنت اللہ کا بیان ہے جس کے

تحت کسی کو ایمان نصیب ہوتا ہے اور کوئی اس سے محروم رہتا ہے۔ اس سنت اللہ کی وضاحت اس کتاب میں مختلف مقامات میں ہو چکی ہے۔ اس کائنات میں بھی اور انسان کے اپنے وجود کے اندر بھی خالق کائنات نے اپنی جو اَن گنت نشانیاں پھیلا دی ہیں جو لوگ ان پر غور کرتے اور اس غور و فکر سے جو بدیہی نتائج ان کے سامنے آتے ہیں ان کو حرزِ جاں بناتے ہیں، ان کو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ بیتمام نشانیاں دیکھنے کے باوجود اندھے بہرے بنے اور اپنی خود پرستیوں میں گم رہتے ہیں، قرآن اور پیغمبر کی بار بار تذکیر کے بعد بھی اپنی آنکھیں نہیں کھولتے، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو اُلٹ دیا کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح فکر و نظر کی صلاحیت سے محروم ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر بڑی سے بڑی نشانی اور بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ سیدھے دیکھنے کے بجائے اُلٹے دیکھتے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کے بجائے الٹی راہ چلتے ہیں ان کے دل اور ان کی فکر بھی کج کر دی جاتی ہے۔ پھر وہ احول کی طرح ہر چیز کو بس اپنے مخصوص زاویہ ہی سے دیکھتے ہیں۔ اسی سنت اللہ کی طرف فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہاں اسی معروف سنت اللہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ کیسے باور کرتے ہو کہ اگر ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مومن بن جائیں گے۔ آخر وہ تمام نشانیاں جو آفاق و انفس میں موجود ہیں، جن کی طرف قرآن نے انگلی اٹھا اٹھا کر اشارہ کیا اور ان کے مضمرات و دلائل واضح کیے جب ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کے زاویے کو درست کرنے میں کارگر نہ ہو سکی تو آخر کوئی نئی نشانی کس طرح ان کی کایا کلپ کر دے گی؟ جو حجاب آج ہے وہ کل کس طرح دُور ہو جائے گا اور جو اندھاپن آج دیکھنے سے مانع ہے وہ اس نشانی کے ظہور کے وقت کہاں چلا جائے گا؟ جس طرح آج تک وہ ساری نشانیوں کو جھٹلاتے رہے ہیں اسی طرح اس نشانی کو بھی جھٹلا دیں گے اور جو قلب ماہیت ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کی آج دیکھتے ہو وہ قلب ماہیت اس وقت بھی اپنا عمل کرے گی۔ یہ قلب ماہیت چونکہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت کے نتیجہ کے طور پر ظہور میں آتی ہے اس وجہ سے جس طرح بعض مواقع میں فعل 'اضلال' کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اسی طرح یہاں تقلیب قلوب و ابصار کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ 'بِهٖٓ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔

'وَنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ' اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز جو ان کے ایمان نہ لانے کا سبب ہے وہ ان کا طغیان اور ان کی سرکشی ہے۔ وہ اللہ کی نعمتوں کو اپنی قوت و قابلیت کا کرشمہ سمجھے بیٹھے ہیں اور پیغمبر کی دعوت ان کے غرورِ نفس اور ان کے پندارِ سیادت پر شاق گزر رہی ہے۔ ان کے اس غرور کی سزا ان کو یہ ملی ہے کہ ان کے دل اور ان کی آنکھیں خدا نے اُلٹ دی ہیں اور ان کو اسی غرور میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا قُبُلًا   قُبُل کی تحقیق

مصدر بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی کسی شے کو سامنے سے آتے دیکھنے کے ہیں اور قبیل کی جمع بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی گروہ اور جماعت کے ہیں۔ قرآن میں ان دونوں معنوں کے لیے نظیر موجود ہے۔ پہلے معنی کے لیے نظیر سورہ کہف میں ہے۔ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۵۵ (ہدایت آچکنے کے بعد لوگوں کو ایمان لانے اور اپنے رب سے مغفرت چاہنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ ان کے بارے میں بھی خدا کی وہی سنت ظاہر ہو جائے جو اگلوں کے بارے میں ظاہر ہو چکی ہے یا یہ کہ ان پر عذاب سامنے سے دراتا ہوا آ جائے) دوسرے معنی کے لیے نظیر سورۂ بنی اسرائیل میں ہے اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۹۲ (یا تم لاؤ اللہ کو اور فرشتوں کو گروہ در گروہ) زیر بحث آیت میں اگرچہ بنتے دونوں معنی ہیں لیکن میں نے حشرنا اور کل شیء کی رعایت سے ترجمے میں ترجیح دوسرے معنی کو دی ہے۔

ایمان کے لیے اصلی حجاب

یہ اوپر والے مضمون ہی کی تاکید ہے۔ فرمایا کہ اگر ہم ان پر فرشتے اتار دیتے، جیسا کہ یہ کہتے ہیں، یا قبروں سے مردے نکل کر ان سے باتیں کرنے لگتے، جیسا کہ یہ مطالبہ کرتے ہیں، یا پردۂ غیب کی ساری ہی چیزیں ان کے سامنے گروہ در گروہ لا کھڑی کرتے جب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے اس لیے کہ وہ طغیان جس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے جب بھی باقی رہتا۔

ایمان کے باب میں سنت الٰہی

اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ان کے ایمان لانے کی شکل صرف یہ ہے کہ اللہ یہ چاہے کہ ان کو ایمان و ہدایت بخشے اور اللہ کا کوئی چاہنا بھی اس کی ٹھہرائی ہوئی اور اس کی پسند کی ہوئی حکمت کے خلاف نہیں ہوتا۔ وہ ایمان و اسلام کسی کے دل میں زبردستی نہیں ٹھونستا۔ یہ نعمت وہ ان کو بخشتا ہے جو اس کے قدردان ہوتے ہیں اور اس کے لیے اپنی وہ صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں جو خدا نے ان کے اپنے اندر ودیعت فرمائی ہیں۔ جب وہ ان کو استعمال کرتے ہیں تو اللہ کی طرف سے ان کو مزید توفیق ارزانی ہوتی ہے۔ رہے یہ جو معجزے دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہیں تو یہ اپنی خواہشات و جذبات کے غلبہ سے اندھے ہو رہے ہیں۔ ان کے لیے یہ راہ کیسے کھل سکتی ہے!

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۱۱۲ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ (۱۱۲-۱۱۳)

اللہ تعالیٰ کی سنت ابتلاء

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ، كَذٰلِكَ کا اشارہ اس مخالفانہ شورش کی طرف ہے جو اس دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے قریش کے لیڈروں اور ان کے ہمنواؤں نے برپا کر رکھی تھی۔ فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ اس صورت حال سے تنہا تمہی کو سابقہ پیش آیا ہے۔ تم سے پہلے جو انبیا گزرے ہیں ان کو بھی اپنے اپنے زمانوں کے شیاطین جن و انس کے ہاتھوں یہی دکھ جھیلنے پڑے ہیں۔

یہ اللہ کی سنت ابتلا ہے جس سے اس کے تمام نبیوں اور رسولوں کو گزرنا پڑا ہے۔ اسی سے راست بازوں کی راست بازی کا امتحان ہوتا ہے اور ان کے جوہر نکھرتے ہیں اور اسی سے اہل باطل کو وہ مہلت ملتی ہے جس میں ان کے اندر کا فساد ظہور میں آتا ہے اور وہ اپنے اوپر اللہ کی حجت تمام کرتے ہیں۔ اسی مضمون کو آگے اسی سورہ میں یوں ادا فرمایا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۱۲۳ (اور اسی طرح ہم نے ہر بستی کے اکابر مجرمین کو مہلت دی کہ وہ جو چالیں اس میں چلنا چاہتے ہیں چل لیں، اور وہ نہیں چلتے تھے کوئی چال مگر اپنے ہی ساتھ لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہوا) اہل ایمان کی یہ آزمائش اور اہل کفر کے لیے یہ ڈھیل چونکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ ابتلا کے تحت ظہور میں آتی ہے اور انسان کو اس نے اختیار و ارادہ کی جو آزادی بخشی ہے یہ اسی کا ایک لازمی حصہ ہے اس وجہ سے اس کو اللہ تعالیٰ نے منسوب اپنی طرف فرمایا ہے۔

بدعات کا فریب

يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ زخرف کے معنی ملمع کی ہوئی بات، جھوٹی اور باطل چیز جس پر حق کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہ صفت ہے جو اپنے موصوف کی طرف مضاف ہوگئی ہے۔ اس سے مراد وہ مشرکانہ بدعات ہیں جو ہر دور کے شیاطین جن وانس نے باہمی گٹھ جوڑ سے ایجاد کیں، پھر ان کے اوپر شریعت الٰہی کا لیبل لگا کر ان کو رواج دیا اور جب انبیاء و مصلحین نے ان کی اصلاح کی دعوت دی تو ان کی مخالفت میں بحث و جدال کا بازار گرم کیا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی یہی ہوا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت دی اور ان کے بتوں اور مشرکانہ عقائد کے تحت ان کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کی بے حقیقتی واضح فرمائی تو شرک کے یہ ائمہ آستینیں چڑھا چڑھا کے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جس پر ان کا زور چلا اس کو اپنے دامِ فریب میں پھنسانے اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو ہمارے باپ دادا کے دین اور ابراہیمؑ کی ملت سے ہٹا رہے ہیں۔

یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ شرک اور باطل کا جتنا نظام بھی ہے وہ تمام تر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، شیاطین جن و انس کے باہمی گٹھ جوڑ سے قائم ہے۔ یہ بات تفصیل سے اپنے مقام میں واضح ہو چکی ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ کد عقیدۂ توحید سے ہے اس وجہ سے وہ اس پر ضرب لگانے کے لیے برابر نت نئے حربے اور نئے نئے ڈھنگ ایجاد کرتا رہتا ہے اور انسانوں میں سے جو اس کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں ان کے اندر غلط عقائد القا کر کے ان کے واسطے سے خلقِ خدا کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آگے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓي اَوْلِيٰۗـِٕــهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۱۲۱ (انعام) (اور شیاطین اپنے ایجنٹوں کو القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کی بات مانو گے تو تم بھی مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے) اس گٹھ جوڑ کی مزید وضاحت آگے کی ایک اور آیت سے بھی ہو رہی ہے۔ فرمایا۔ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰۗؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ

بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِیْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۱۲۸- انعام (اور جس دن خدا ان سب کو جمع کرے گا اور کہے گا اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو ہتھیا لیا اور جو انسانوں میں سے ان کے ساتھی بنے ہوں گے وہ بولیں گے کہ ہم میں سے ہر ایک نے ایک دوسرے کو استعمال کیا یہاں تک کہ ہم پہنچ گئے اس مدت کو جو تو نے ہمارے لیے ٹھہرائی ہوئی تھی)

اللہ تعالیٰ کا قانونِ امتحان و آزمائش اور اس کی حکمت

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے خدا کی مشیت اور اس کے قانونِ امتحان و آزمائش کے تحت ہو رہا ہے۔ اس نے انسانوں اور جنوں کو نیکی اور بدی دونوں میں سے کسی کو اختیار کرنے کی آزادی بخشی ہے۔ اگر وہ سب کو نیکی ہی کی راہ پر چلانا چاہتا تو یہ بھی کر سکتا تھا لیکن اس کی حکمت نے یہی پسند فرمایا کہ وہ اس معاملے میں جبر کے بجائے لوگوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی دے کر ان کا امتحان کرے اور دیکھے کہ کون خدا کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون شیطان کی۔ اس قانون کے تحت باطل کے علمبرداروں، شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو بھی، اس حیاتِ چند روزہ میں مہلت ملی ہوئی ہے کہ وہ اپنی اس انتخاب کی ہوئی راہ پر چلیں۔ تو تم اپنی راہ چلو اور لوگوں کو اسی راہ کی دعوت دو اور ان لوگوں کو جو تمھاری بات سننا نہیں چاہتے ان کی من گھڑت بدعات میں پڑے رہنے دو۔ یہ اپنا انجام خود دیکھ لیں گے۔ لفظ 'افترا' پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں بحث کر کے واضح کر چکے ہیں کہ قرآن میں اس سے شرک اور مشرکانہ بدعات مراد ہوتی ہیں۔

وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ۔ اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جو اوپر والے جملے سے نکلتا ہے۔ یعنی ہم نے شیاطین جن و انس کو انبیاء و صالحین کی مخالفت اور بدعات و خرافات کے القا کی یہ مہلت جو اس دنیا میں دی ہے یہ اس لیے دی ہے کہ اس سے ایک طرف حق پرستوں کی حق پرستی کا امتحان ہوتا ہے دوسری طرف باطل پرستوں کو ڈھیل ملتی ہے اور وہ ان شیاطین و اشرار کے ہاتھوں اپنا من بھاتا کھاجا پا کر اس کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس کو پسند کرتے ہیں اور اس دنیا میں جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کر لیتے ہیں۔ یہ ڈھیل اس اختیار کا لازمی نتیجہ ہے جو انسان کو بخشا گیا ہے اس وجہ سے یہ سنتِ الٰہی کے تحت ہے۔ ان لوگوں کی صفت یہاں اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ بتائی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیاطین و اشرار کی یہ دعوت انہی لوگوں کو اپیل کرتی ہے جو آخرت کے اعتقاد سے خالی ہوتے ہیں جن کو مطلوب صرف یہ دنیا اور اس کا عیش ہوتا ہے اور اس کی سند ان شیاطین کے ہاتھوں ان کو مل جاتی ہے۔ 'اقتراف' کے معنی کمائی کرنے کے آتے ہیں۔ قرآن میں یہ اچھے اور برے دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں بری کمائی کرنے کے معنی میں ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا

وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ
وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۱۱۴-۱۱۷)

اصل حکم اللہ اور اس کی کتاب ہے

'اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا' یہ مشرکین کے مجادلہ کا پیغمبر کی طرف سے جواب ہے کہ تم مجھ سے شرک و توحید اور حلال و حرام کے بارے میں جھگڑ رہے ہو سوال یہ ہے کہ اس جھگڑے میں کہ خدا کی خدائی میں کچھ اور بھی شریک ہیں یا وہی تنہا حکمران ہے، اس نے کیا چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں، کیا جائز رکھی ہیں، آخر حکم بننے کا حق کس کو حاصل ہے؟ خدا ہی کو یا کسی اور کو؟ اگر خدا ہی کو یہ حق حاصل ہے اور لاریب اسی کو حاصل ہے تو میرے لیے یہ بات کس طرح جائز ہے کہ میں اس کے سوا کسی اور کو اس معاملے میں حکم مانوں جب کہ اس نے اس جھگڑے کے چکانے کے لیے ایک کتاب بھی تمھاری طرف اتاری ہے جس میں تفصیل کے ساتھ اس نے ہر چیز کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ اب ایک طرف یہ مفصل خدائی کتاب ہے، دوسری طرف تمھاری بے سند بدعات ہیں، ان میں سے کس کی بات ماننے جانے کے لائق ہے۔

صالحین اہل کتاب کی شہادت

'وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ'، اس سے میرے نزدیک مراد، جیسا کہ بقرہ ۱۴۶ اور انعام ۲۰ کے تحت واضح کر چکا ہوں، صالحین اہل کتاب ہیں اور یہ بات بطور ایک شہادت حق کے نقل ہوئی ہے کہ یہ جہلا اگر اس کتاب کے مخالف ہیں تو ان کی پروا نہ کرو جو سچے اہل علم اور حق پسند حامل کتاب ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے اُتری ہے اور یہ حق کے ساتھ اتری ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہے کہ اس کے ذریعہ سے حق و باطل کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ 'فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ' میں خطاب باعتبار الفاظ اگرچہ آنحضرتؐ سے ہے لیکن ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ اس طرح کے مواقع میں روئے سخن دوسروں کی طرف ہوتا ہے۔ صالحین اہل کتاب کی اس شہادت کا ذکر سورۂ قصص میں بھی ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ۵۲-۵۳ (اور جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب عطا فرمائی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جب یہ ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم پہلے سے مسلم ہیں) یہ نکتہ یہاں ملحوظ رہے کہ جب کوئی حقیقت اول اول بگڑی ہوئی خلق کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ سب لوگ احسنت و مرحبا کہتے ہوئے اس کے خیر مقدم کے لیے اٹھ کھڑے ہوں بلکہ اس کے برعکس اکثریت اس کی مخالفت کے درپے ہو جاتی ہے۔ سوسائٹی کے لیڈر اور قوم کے اشرار تو اس لیے اس کی مخالفت کرتے ہیں کہ اس سے ان کو اپنا مفاد خطرے میں نظر آتا ہے، رہے عوام تو وہ اپنے رسوم و رواج اور اپنے طریقۂ آبا کے بندے ہوتے ہیں اس وجہ سے ہر وہ بات ان کو بری لگتی ہے جو ان کی مالوفات کے خلاف ہو اگرچہ وہ کتنی ہی بڑی حقیقت ہو اور اپنی تائید و تصدیق

میں اپنی پشت پر کتنی ہی واضح حجتیں رکھتی ہو۔ اکثریت کا یہ رویہ بسا اوقات ان لوگوں کو بھی اس حقیقت سے متعلق تذبذب میں ڈال دیتا ہے جو اگرچہ نیک نیت ہوتے ہیں لیکن ابھی ان کی فکر و نظر اتنی پختہ نہیں ہوئی ہوتی ہے کہ مخالفت کی آندھیوں اور اکثریت کے طوفانوں کا مقابلہ کر سکے۔ ایسے ہی لوگوں کی رہنمائی اور دلدہی کے لیے اس آیت میں اشارۃً اور آگے والی آیت میں تصریحاً یہ بات بتائی گئی ہے کہ کسی صداقت کی صداقت خود اس کی اپنی کسوٹی پر جانچی جاتی ہے اور اگر اس کے حق میں خارجی شہادت ہی مطلوب ہو تو یہ کافی ہے کہ سنجیدہ، ذی علم اور صاحب کردار لوگ اس کے حق میں شہادت دیں اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو۔ سقراط کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے بعض ناصحوں نے اس سے کہا کہ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ سارا ایتھنز تمہارے خیالات سے برہم ہے، تم کو ان کی کچھ پروا نہیں ہے؟ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ مجھے صرف اس ایک انسان کی پروا ہے جو دانش مند ہو۔ اکثریت و اقلیت کی یہ بحث آگے آ رہی ہے۔ یہاں یہ اشارہ کافی ہے۔

ایک سنت الٰہی کا ظہور

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ آج یہ تم تمام شیاطین جن و انس کو جو اپنی اور اپنی دعوت کی مخالفت میں متحد پا رہے ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک وہی صورت حال ہے جو شیطان اور آدم کے ماجرے میں بیان ہو چکی ہے۔ شیطان نے اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کے لیے مہلت مانگی خدا نے اس کو مہلت دی، شیطان نے دھمکی دی کہ میں ذریت آدم کی اکثریت کو شرک و بت پرستی میں مبتلا کر کے چھوڑوں گا۔ خدا نے فرمایا کہ اگر تو ایسا کرے گا تو میں تجھ کو اور تیرے سارے پیروؤں کو جہنم میں بھر دوں گا۔ بقرہ کی آیت ۱۶۸ کے تحت اس مضمون کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں اس کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ ان لوگوں نے شیطان کے پھندے میں پھنس کر اپنے باب میں اس کی پیشین گوئی پوری کر دی ہے اور اللہ نے ایسے لوگوں کے باب میں شیطان کو اپنا جو فیصلہ سنایا تھا وہ پورا ہو گیا اور یہ فیصلہ سچائی اور عدل دونوں معیاروں پر پورا ہے۔ خدا نے جو بات فرمائی وہ سچی بھی ہے اور مبنی بر عدل بھی۔ اس لیے کہ خدا نے ان پر اپنی حجت پوری کر دی ہے۔ اس کے باوجود اگر یہ ہدایت الٰہی کی جگہ القائے شیطانی ہی کی پیروی پر بضد ہیں تو یہ اسی انجام کے سزاوار ہیں جس کی خدا نے ان کو خبر دی ہے۔ خدا کے فیصلے اس کی مقررہ سنت کے تحت ہوتے ہیں، ان کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اللہ سمیع و علیم ہے، نہ اس کی کوئی بات بے خبری پر مبنی ہوتی، نہ اس میں کسی خطا یا ناانصافی کا امکان ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ بات مشرکین کے لیے بطور تہدید و وعید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بطور تسلی ارشاد ہوئی ہے لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ پر اسی انعام کی آیت ۳۴ کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

اکثریت کا غوغا اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، اوپر آیت ۱۱۵ میں جس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا تھا، یہ اس کی تصریح ہے اور خطاب اگرچہ بصیغۂ واحد ہے لیکن معناً خطاب عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت جو غوغا تم عام دعوتِ توحید کی مخالفت اور مشرکانہ بدعات کی حمایت میں برپا ہے اس کی مطلق پروا

نہ کرو۔ یہ کسی دلیل و سند اور کسی علم و حجت پر مبنی نہیں ہے بلکہ تمام تر ظن و گمان کی پیروی پر مبنی ہے۔ یہ محض اٹکل کے تیر تکے چلائے جا رہے ہیں اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ ھُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ یہ دعویٰ جو کیا جاتا ہے کہ جس طریقہ کی پیروی کر رہے ہیں یہ خدا کا بتایا ہوا اور ابراہیمؑ کی وراثت ہے محض ان کا افترا ہے۔ اللہ اور ملت ابراہیم سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مغالطہ بھی کسی کو نہیں ہونا چاہیے کہ اکثریت اس فتنہ کے ساتھ ہے۔ وہ اکثریت جو علم سے عاری ہو اور محض گمان کے پیچھے بھاگ رہی ہو اس کی بات جو لوگ مانیں گے وہ خدا کی راہ سے بھٹک کے رہیں گے۔ اکثریت کا غوغا اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعۡلَمُ مَنۡ یَّضِلُّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ وَھُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُھۡتَدِیۡنَ یہ خطاب بھی عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس بھیڑ کو دیکھ کر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ یہ پتہ اللہ کو ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور کون ہدایت یاب ہیں۔ پس جن کو خدا راہ یاب قرار دے رہا ہے ان کی راہ اختیار کرو اور جن کو خدا گمراہ قرار دے رہا ہے ان کی روش سے بچو۔ یہ ہدایت یافتہ گروہ کے لیے بشارت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے لیے تہدید بھی ہے جو گمراہی کی راہ پر چل رہے ہیں اس لیے کہ جب اللہ ان دونوں گروہوں سے اچھی طرح باخبر ہے تو ان کے ساتھ معاملہ بھی اپنے علم کے مطابق ہی کرے گا۔ ان لوگوں کے دعوے کچھ کام نہیں آئیں گے جو ہیں تو گمراہ لیکن علم بردار بنے ہوئے ہیں ہدایت کے۔

۱۹۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۱۸-۱۴۰

آگے ان مشرکانہ بدعات کی تردید آ رہی ہے جو مشرکین نے اختیار تو کی تھیں شیطان کے القا سے لیکن دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ سے ان کو وراثت میں ملی ہیں۔ قرآن نے ان بدعات کو بے سند اور بے بنیاد قرار دے کر ان کے تحت حرام کردہ چیزیں جائز قرار دے دیں تو انھوں نے یہ ہنگامہ کھڑا کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ چیزیں بھی جائز کر دی ہیں جو ہمارے بزرگوں ــ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے زمانے سے حرام چلی آ رہی تھیں۔ یہ پروپیگنڈا قدرتی طور پر کمزور طبائع پر اثر انداز ہوا۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں آیات ۱۶۸-۱۷۲ کے تحت تفصیل سے بیان کر آئے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزوں کے معاملے میں اول تو طبیعتیں یوں ہی بڑی حساس ہوتی ہیں اور اگر ان کا تعلق مشرکانہ مذہبی روایات سے ہو تو یہ حس تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے یہاں بڑی تفصیل کے ساتھ ان توہمات کی تردید بھی فرمائی اور اصل ملت ابراہیم کی وضاحت بھی فرمائی۔ یہ مضمون سورہ کے آخر تک چلا جائے گا۔ بیچ بیچ میں بعض باتیں بطور التفات یا کسی ذیلی شبہ کی تردید و توضیح کے طور پر بھی آئی ہیں لیکن سب بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی بحث سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ ان کا موقع و محل سلسلہ بیان سے خود واضح ہو جائے گا ــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

فَکُلُوۡا مِمَّا ذُکِرَ اسۡمُ اللّٰہِ عَلَیۡہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ بِاٰیٰتِہٖ مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا آیات ۱۱۸-۱۴۰

لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ
مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا لَّيُضِلُّونَ
بِأَهْوَائِهِم بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ﴿١١٩﴾ وَذَرُوا
ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ
بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ
اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ
لِيُجَادِلُوكُمْ ۖ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ﴿١٢١﴾ أَوَمَن ع ١٤ ١١ ١
كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي
النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۚ كَذَٰلِكَ
زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢٢﴾ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ
قَرْيَةٍ أَكَابِرَ مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا ۖ وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا بِأَنفُسِهِمْ
وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿١٢٣﴾ وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَن نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ
نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۘ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ وقف منزل وقف لازم
رِسَالَتَهُ ۗ سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِندَ اللَّهِ وَعَذَابٌ
شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٤﴾ فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ
يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ
ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ
الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾ وَهَٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿١٢٦﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٧﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ
جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ
اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ
اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا
مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿١٢٨﴾ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ
١٥ ع ٨ ٢ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٢٩﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ
اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ
لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿١٣٠﴾ ذٰلِكَ
اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿١٣١﴾ وَلِكُلٍّ
دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٢﴾ وَرَبُّكَ
الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ
مَّا يَشَاۗءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿١٣٣﴾ اِنَّ مَا
تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿١٣٤﴾ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا
عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ
الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿١٣٥﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ
الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا

لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا
كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿١٣٦﴾ وَ
كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ
لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوهُ
فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿١٣٧﴾ وَقَالُوا هٰذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ
لَّا يَطْعَمُهَآ إِلَّا مَن نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا
وَأَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۚ سَيَجْزِيهِم
بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿١٣٨﴾ وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هٰذِهِ الْأَنْعَامِ
خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِن يَكُن مَّيْتَةً
فَهُمْ فِيهِ شُرَكَآءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٣٩﴾
قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوٓا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا
مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۚ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا
ع ١٦ ١١ ٣ مُهْتَدِينَ ﴿١٤٠﴾

ترجمۂ آیات ١١٨-١٤٠

پس تم کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو، اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو اور تم کیوں نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو جب کہ اس نے تفصیل سے بیان کر دی ہیں وہ چیزیں جو تم پر حرام ٹھہرائی ہیں اس استثنا کے ساتھ جس کے لیے تم مجبور ہو جاؤ۔ اور بے شک بہتیرے ایسے ہی ہیں جو لوگوں کو کسی علم کے بغیر اپنی بدعات کے ذریعے سے گمراہ کر رہے ہیں۔ تیرا

رب خوب واقف ہے ان حد سے بڑھنے والوں سے۔ اور چھوڑو گناہ کے ظاہر کو بھی اور اس کے باطن کو بھی۔ بے شک جو لوگ گناہ کما رہے ہیں وہ عنقریب اپنی اس کمائی کا بدلہ پائیں گے۔ اور تم نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو بے شک یہ حکم عدولی ہے اور شیاطین القا کر رہے ہیں اپنے ایجنٹوں کو تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کا کہا مانو گے، تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔ ۱۱۸-۱۲۱

کیا وہ جو مردہ تھا تو ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو ایک روشنی بخشی جس کو لے کر وہ لوگوں میں چلتا ہے اس کے مانند ہو گا جو تاریکیوں میں پڑا ہُوا ہے، ان سے نکلنے والا نہیں ہے؟ اسی طرح کافروں کی نظر میں ان کے اعمال کھبا دیے گئے ہیں اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے سرغنوں کو ڈھیل دی کہ اس میں اپنی چالیں چل لیں۔ اور چال وہ اپنے ہی ساتھ چلتے تھے لیکن ان کو اس کا احساس نہیں تھا۔ اور جب ان کے پاس آتی کوئی آیت تو کہتے ہم تو ماننے کے نہیں جب تک ہم کو بھی وہی کچھ نہ ملے جو اللہ کے رسولوں کو ملا۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنا منصبِ رسالت کس کو بخشے۔ جو لوگ شرارت کر رہے ہیں اللہ کے ہاں ان کو ان کی اس چالبازی کی پاداش میں ذلت اور عذاب شدید نصیب ہو گا۔ اللہ جس کسی کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے گویا اسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہے۔ اسی طرح اللہ ناپاکی مسلط کر دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔ اور یہ تیرے رب کی راہ ہے سیدھی۔ ہم نے اپنی آیتیں تفصیل سے بیان

کر دی ہیں ان لوگوں کے لیے جو یاد دہانی حاصل کریں۔ ان کے لیے ان کے رب کے
پاس سکھ کا گھر ہے اور وہ ان کا کارساز ہے ان کے اعمال کے صلہ میں۔ ۱۲۱-۱۲۷

اور اس دن کا دھیان کرو جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا۔ کہے گا اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا لیا اور انسانوں میں سے ان کے ساتھی کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے ایک دوسرے کو استعمال کیا اور ہم پہنچ گئے اپنی اس مدت کو جو تو نے ہمارے لیے ٹھہرائی۔ فرمائے گا تمھارا ٹھکانا اب جہنم ہے ہمیشہ کے لیے اس میں رہو مگر جو اللہ چاہے۔ بے شک تیرا رب حکیم و علیم ہے اور اسی طرح ہم مسلط کر دیتے ہیں ظالموں کو ایک دوسرے پر بسبب ان کی کرتوتوں کے۔ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ کیا تمھارے پاس تمھیں میں سے رسول نہیں آئے جو تمھیں میری آیتیں سناتے اور تمھارے اس دن کی ملاقات سے تم کو ہوشیار کرتے ہوئے۔ وہ بولیں گے ہم خود اپنے خلاف شاہد ہیں اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ بے شک وہ کافر رہے۔ یہ اس وجہ سے کہ تیرا رب بستیوں کو ان کے ظلم کی پاداش میں اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں ہے کہ ان کے باشندے بے خبر ہوں۔ اور ہر ایک کے لیے درجے ہیں ان کے عمل کے اعتبار سے اور تیرا رب اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو وہ کرتے رہے ہیں اور تیرا رب بے نیاز، رحمت والا ہے۔ اگر وہ چاہے تم کو فنا کر دے اور تمھارے بعد تمھاری جگہ جس کو چاہے لائے جس طرح اس نے تم کو پیدا کیا دوسروں کی نسل سے۔ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ آ کر رہے گی اور تم ہمارے قابو سے باہر نہیں جا سکتے۔ کہہ دو، اے میرے ہم قومو، تم اپنے

طریقے پر چلو، میں اپنے طریقے پر چلتا ہوں، تم جلد جان لو گے کہ انجام کار کی کامیابی کس کا حصہ ہے۔ یقیناً ظالم فلاح پانے والے نہیں ہو سکتے۔ ۱۲۸-۱۳۵

اور خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے اس میں انھوں نے اللہ کا ایک حصّہ مقرر کیا ہے۔ پس کہتے ہیں یہ حصّہ تو اللہ کا ہے، ان کے گمان کے مطابق، اور یہ حصّہ ہمارے شرکاء کا ہے۔ تو جو حصّہ ان کے شرکاء کا ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچ سکتا اور جو حصّہ اللہ کا ہوتا ہے وہ ان کے شرکاء کو پہنچ سکتا ہے۔ کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کی نظر میں ان کے شرکاء نے ان کی اولاد کے قتل کو ایک مستحسن فعل بنا دیا ہے تاکہ ان کو تباہ کریں اور تاکہ ان کے دین کو ان کے لیے بالکل گھپلا کر دیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر پاتے تو ان کو چھوڑو اپنے اسی افترا میں پڑے رہیں۔ اور کہتے ہیں فلاں فلاں چوپائے اور فلاں فلاں کھیتی ممنوع ہے، ان کو نہیں کھا سکتے مگر وہی جن کو ہم چاہیں، اپنے گمان کے مطابق۔ اور کچھ چوپائے ہیں جن کی پیٹھیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں اور کچھ چوپائے ہیں جن پر خدا کا نام نہیں لیتے محض اللہ پر افترا کے طور پر۔ اللہ عنقریب ان کو اس افترا کا بدلہ دے گا۔ اور کہتے ہیں فلاں قسم کے چوپایوں کے پیٹ میں جو ہے وہ بس ہمارے مردوں کے لیے خاص ہے اور ہماری عورتوں کے لیے حرام ہے اور اگر وہ مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں۔ عنقریب اللہ ان کو ان کی اس تخصیص کی سزا دے گا۔ بے شک وہ حکیم و علیم ہے۔ وہ لوگ نامراد ہوئے جنھوں نے محض بے وقوفی سے، بغیر کسی علم کے، اپنی اولاد کو قتل کیا اور اللہ نے ان کو جو روزی بخشی اس کو اللہ پر افترا کر کے حرام ٹھہرایا۔ یہ گمراہ ہوئے اور ہدایت پانے والے نہ بنے۔
۱۳۶-۱۴۰

۲۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كُنتُم بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ○ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ
اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا لَّيُضِلُّونَ
بِأَهْوَائِهِم بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ○ وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ
يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ (۱۱۸-۱۲۰)

مشرکانہ توہمات کے تحت حرام سمجھے جانے والے چوپایوں کو کھانے کا حکم

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جب اسلام نے وہ تمام چوپائے حلال و طیب قرار دے دیے جن کو مشرکین نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت حرام قرار دے رکھا تھا تو اس کے خلاف انھوں نے بڑا ہنگامہ اٹھایا کہ یہ دیکھو، اس شخص نے اپنے پیرؤوں کے لیے وہ چیزیں بھی جائز کر دی ہیں جو ہمارے بزرگوں — ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ — کے زمانے سے حرام چلی آرہی تھیں۔ اس طرح کے معاملات ہیں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، عام ذہن بڑا حساس اور ضعیف الاعتقاد ہوتا ہے اس وجہ سے مخالفانہ پروپیگنڈے کا اثر آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ قرآن نے یہاں اسی اثر کو دور کرنے کے لیے فرمایا کہ حرام وہی چیزیں ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں تفصیل سے بیان کر دی ہیں تو ان مشرکین کی تحریم و تحلیل کی کوئی پروا نہ کرو۔ جو چیزیں شریعت الٰہی میں حلال ہیں ان کے باب میں اس کے سوا کوئی قید نہیں ہے کہ بوقت ذبح ان پر خدا کا نام لیا جائے۔ اگر خدا کا نام لیا گیا ہے تو ان کو بے تکلف کھاؤ اور ان مشرکین کے پروپیگنڈے کو کوئی اہمیت نہ دو۔

اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ۔ (اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو) تاکید اور تنبیہ بلکہ ایک قسم کی تہدید بھی ہے۔ یعنی اللہ کی آیات پر ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ خدا کے احکام کے مقابل میں مشرکوں کے بے بنیاد پروپیگنڈے کی کوئی پروا نہ کرو۔ تحریم و تحلیل کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اگر کسی اور کے لیے بھی یہ حق تسلیم کر لیا جائے تو یہ خدا کے حقوق میں دوسرے کو حصہ دار بنانا ہے اور یہ شرک ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مسئلہ صرف ایک چیز کے کھانے اور نہ کھانے کا نہیں ہے بلکہ جن چیزوں کو مشرکانہ توہمات کی بنا پر حرام ٹھہرایا گیا ہے اللہ کی طرف سے ان کی حلت کے اعلان کے باوجود ان سے اجتناب کرنا گویا بالواسطہ شرک کو تسلیم کرنا ہوا اس وجہ سے یہ مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ توحید کا تقاضا، جیسا کہ آگے بیان آرہا ہے، یہ ہے کہ آدمی شرک ظاہر اور شرک باطن دونوں سے اپنے آپ کو پاک رکھے۔

جائز چیزوں سے توہمات کی بنا پر احتراز فتنہ ہے

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا کی طرف سے وضاحت ہو چکی کہ حرام کیا کیا چیزیں ہیں تو اب خدا پر ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں کے لیے اس معاملے میں تذبذب کی کہاں گنجائش رہ گئی؟ تفصیل سے یہاں اشارہ اس تفصیل کی طرف بھی ہے جو اس سے پہلے کی سورتوں میں گزر چکی ہے، مثلاً سورۂ نحل کی آیات ۱۱۴-۱۱۶ میں اور

اس تفصیل کی طرف بھی ہے جو خود اس سورہ میں بیان ہوئی ہے۔ ہر چند یہاں زیر بحث مشرکانہ توہمات وعقائد کے تحت کسی چیز کو حرام سمجھنا ہے، نہ کہ مجرد ذوقی بنیاد پر کسی چیز سے احتراز ــــ لیکن اس تاکید کے ساتھ جو جائز چیزوں کے کھانے پر زور دیا جا رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شرک و توحید کا معاملہ دین میں اتنا اہم ہے کہ اس باب میں شریعت کسی ادنیٰ التباس کی بھی روادار نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی اس میں مسامحت برتی جاتی تو یہ بتوں کے اندر نفاق کی پرورش کے لیے ایک پردہ فراہم کر دیتی۔ یہ تاکید گویا ایک مخلص و منافق کے درمیان امتیاز کی ایک کسوٹی کے طور پر تھی۔ جو لوگ اس تاکید کے بعد بھی ان چیزوں کے کھانے سے محترز رہتے جن سے اب تک محترز رہے تھے تو ان کا یہ احتراز ان کے اندر شرک وجاہلیت کے جراثیم کی موجودگی کی شہادت دیتا۔ انبیاء و مصلحین کے طریقۂ کار میں اس فرق و امتیاز کی بنیادی اہمیت ہے اور عقل و فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

'اِلَّا مَا اضۡطُرِرۡتُمۡ اِلَیۡہِ' میں اس استثنا کا بیان ہے جو حرام چیزوں کی ممانعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ حرام چیزیں بھی اس حالت میں انسان کے لیے جائز ہو جاتی ہیں جب اس کو حالتِ اضطرار پیش آجائے۔ اس حالتِ اضطرار کے حدود و شرائط پر دوسرے مقام میں تفصیل سے ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ مشرکین اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزیں تو بے دھڑک بغیر کسی اضطرار کے بھی کھاتے تھے لیکن اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت جو چیزیں انھوں نے حرام قرار دے لی تھیں ان کو کسی حالت میں بھی ہاتھ نہیں لگاتے تھے، خواہ ان کی جان ہی پر کیوں نہ آ بنی ہو۔

کسی چیز کو بے سند شریعت قرار دینا بدعت ہے

'وَاِنَّ کَثِیۡرًا لَّیُضِلُّوۡنَ بِاَہۡوَآئِہِمۡ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ' 'ھوا' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ یوں تو اس کے معنی خواہشات کے ہیں لیکن جس سیاق میں یہ یہاں ہے اس سیاق میں اس سے مراد بدعتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ بدعتوں کی بنیاد تمام تر ظن وگمان اور خواہشوں پر ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کی تحریم یہ منسوب تو خدا کی طرف کرتے ہیں لیکن یہ تمام تر ان کی اپنی بدعات ہیں، خدا سے اس چیز کو کوئی تعلق نہیں۔ اس باب میں ان کے پاس خدا کی طرف سے کوئی ثبوت یا سند نہیں ہے، جس کو وہ پیش کر سکیں۔ 'کَثِیۡرًا' کے لفظ میں جو پہلو ملحوظ ہے اس کی طرف اوپر آیت ۱۱۶ میں اشارہ گزر چکا ہے۔ قرآن نے یہاں ان کے اس عمل کو 'بِغَیۡرِ عِلۡمٍ' جو قرار دیا ہے تو یہ ایک چیلنج بھی ہے کہ اگر ان کے پاس کوئی سند یا ثبوت ہے تو اس کو پیش کریں۔ دوسری طرف یہ ان سادہ لوحوں کی غلط فہمی کا ازالہ بھی ہے جو ہمیشہ اپنے بڑوں کی غلط سے غلط بات بھی اس حسن ظن پر مانتے رہتے ہیں کہ ان کے پاس ضرور اس بات کی کوئی نہایت مضبوط دلیل ہوگی، اگرچہ ہم اس سے واقف نہیں ہیں۔

'اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُعۡتَدِیۡنَ' اوپر آیت ۱۱۷ میں فرمایا 'وَہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ'، یہ ٹکڑا بالکل اس کے مقابل میں ہے۔ وہ تسلی کے لیے وارد ہوا ہے، یہ تہدید کے لیے۔

'وَذَرُوۡا ظَاہِرَ الۡاِثۡمِ وَبَاطِنَہٗ' یہ اوپر والی بات ہی کی تاکید ایک اور لطیف و دقیق پہلو سے ہے۔

شرک اور مظاہرِ شرک دونوں کو چھوڑنے کا حکم

ہر برائی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس کا باطنی پہلو، دوسرا اس کا ظاہری پہلو۔ اس بات کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو اس کی حقیقت ہوتی ہے جس کا مسکن انسان کا نفس اور اس کا دل ہوتا ہے، دوسرے اس کے وہ مظاہر و اشکال ہوتے ہیں جن میں انسانی زندگی کے اندر وہ نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً شرک کی ایک تو حقیقت ہے جو یہ ہے کہ خدا کی ذات یا صفات یا اس کے حقوق میں کسی کو شریک ماننا، دوسرے اس کے مظاہر و اشکال ہیں مثلاً اصنام، انصاب، ازلام، بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام اور اس نوع کی دوسری چیزیں جو کسی شرکیہ عقیدے یا تصور کا عملی مظہر اور نشان ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بڑا گہرا ربط ہوتا ہے، یہ ایک دوسرے کے سہارے سے پروان چڑھتی اور غذا و قوت حاصل کرتی ہیں۔ اس وجہ سے اگر کسی برائی کا استیصال مقصود ہو تو یہ ضروری ہوگا کہ اس برائی کی حقیقت اور اس کے مظاہر و اشکال دونوں کا استیصال کیا جائے۔ اس کے بغیر اس کا استیصال ناممکن ہے۔ اگر یہ خیال کر کے اشکال و مظاہر سے چشم پوشی برتی جائے کہ جب اصل برائی پر ضرب لگا دی گئی تو اشکال و مظاہر میں کیا رکھا ہوا ہے تو وہ برائی انھی اشکال میں پھر اپنا نشیمن بنا کر اس میں اپنے انڈوں بچوں کی پرورش شروع کر دیتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کا پورا کنبہ از سرِ نو آباد ہو جاتا ہے۔

یہاں زیرِ بحث آیت میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح شرک کو چھوڑنا ضروری ہے اسی طرح شرکیہ عقائد و تصورات کی بنا پر جن چیزوں کو مقدس مان کر حرام ٹھہرایا گیا ہے ان کے تقدس اور ان کی حرمت کو بھی ختم کرو اور عام جانوروں کی طرح ان کو بھی خدا کے نام پر ذبح کرو اور بے تکلف ان سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر ان کے باب میں کوئی جھجک طبیعت میں باقی رہتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی شرک کی جڑ دل کے اندر باقی ہے۔ اگر جڑ باقی نہیں ہے تو آخر یہ اس کی شاخوں کو غذا کہاں سے مل رہی ہے؟ اس حقیقت کی طرف آگے بھی اسی سورہ میں یوں توجہ دلائی ہے وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ (١٥١-انعام) (اور بے حیائی کی باتوں کے قریب نہ پھٹکو، خواہ ظاہری ہوں یا باطنی) اسی اصول کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد شرک کے تمام آثار و مظاہر کا یک قلم خاتمہ کر دیا۔ زیرِ بحث آیت میں لفظ 'اثم' اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مراد شرک ہی ہے۔

خیر اور مظاہرِ خیر دونوں کی نگہداشت

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جو حال برائیوں کا مذکور ہوا بعینہٖ وہی حال بھلائیوں کا بھی ہے۔ ان میں سے بھی ہر ایک کی ایک تو حقیقت ہوتی ہے اور کچھ اس کے اشکال و مظاہر ہوتے ہیں، اور جس طرح برائی کے استیصال کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ شجر کے ساتھ ساتھ بچہ شجر کا بھی خاتمہ کیا جائے ورنہ وہ برائی ختم نہیں ہوتی اسی طرح کسی بھلائی کے فروغ دینے کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی حقیقت کے ساتھ اس کے مظاہر و اشکال کو بھی فروغ دیا جائے۔ اگر مظاہر و اشکال کو فروغ نہ دیا جائے تو وہ بھلائی بھی دب دبا کر رہ جاتی ہے۔ اس کو نشوونما نہیں حاصل ہوتی۔ اس مسئلے پر ان شاء اللہ ہم اس کے محل میں گفتگو کریں گے۔ آگے اعراف

کی آیت ۴۳ کے تحت بھی یہ بحث آئے گی۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡسِبُوۡنَ الۡاِثۡمَ سَیُجۡزَوۡنَ بِمَا کَانُوۡا یَقۡتَرِفُوۡنَ ' یہ ان لوگوں کو دھمکی ہے جو ان بے اصل بدعات کی حمایت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے بحث و مجادلہ کر رہے تھے۔ فرمایا کہ تم ان تمام بدعات کے ظاہر و باطن دونوں سے اپنے کو پاک کرو۔ رہے یہ لوگ جو اس بس بھری فصل کی کاشت کر رہے ہیں وہ بہت جلد اس کا حاصل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

وَلَا تَاۡکُلُوۡا مِمَّا لَمۡ یُذۡکَرِ اسۡمُ اللّٰہِ عَلَیۡہِ وَاِنَّہٗ لَفِسۡقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ لَیُوۡحُوۡنَ اِلٰۤی اَوۡلِیٰٓئِہِمۡ لِیُجَادِلُوۡکُمۡ ۚ وَاِنۡ اَطَعۡتُمُوۡہُمۡ اِنَّکُمۡ لَمُشۡرِکُوۡنَ (۱۲۱)

ان مباح چیزوں کی تحریم جن پر اللہ کا نام بھی نہ لیا گیا ہو

اوپر والی آیت میں شرکیہ عقائد کے تحت حرام کی ہوئی چیزوں کو کھانے کا حکم دیا ہے جب کہ ان پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اس آیت میں اہلِ عرب کے عقیدے کی زد سے ان مباح چیزوں کو بھی کھانے کی ممانعت فرما دی جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ مشرکین نے اوپر والی علت کی طرح اس حرمت پر بھی ہنگامہ اٹھایا اس لیے کہ ان کے ہاں کسی ذبیحہ کی حلت و طہارت کے لیے یہ چیز ضروری نہیں تھی کہ لازماً اس پر اللہ کا نام بھی لیا جائے۔ جس چیز کو وہ حلال و طیب سمجھتے تھے اور ان کے باپ دادا بھی جس کو حلال سمجھتے تھے مسلمانوں کی طرف سے اس کی حرمت کے اعلان سے ان کے مذہبی پندار کو بڑی چوٹ لگی ہوگی اور انھوں نے اپنے عوام کے جذبات مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے یہ پروپیگنڈا شروع کیا ہوگا کہ یہ لو، یہ نئے دین والے تو ہم کو اور ہمارے باپ دادا سب کو حرام خور قرار دیتے ہیں اس لیے کہ ان کے ہاں وہ جانور جائز ہی نہیں جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ وَاِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ لَیُوۡحُوۡنَ اِلٰۤی اَوۡلِیٰٓئِہِمۡ لِیُجَادِلُوۡکُمۡ سے ہمارے نزدیک ان کے اسی غوغا کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن قرآن نے ان کے اوپر والے غوغا کی طرح ان کے اس غوغا کی بھی کوئی پروا نہیں کی بلکہ صاف فرمایا کہ اِنَّہٗ لَفِسۡقٌ کہ جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کو کھانا فسق ہے اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وَاِنۡ اَطَعۡتُمُوۡہُمۡ اِنَّکُمۡ لَمُشۡرِکُوۡنَ اگر تم نے ان کے غوغا سے متاثر ہو کر ان کی بات مانی تو تم بھی مشرک ہو کر رہ جاؤ گے۔

ذبح کے وقت اللہ کا نام لینے کی ضرورت

یہاں یہ سوال قابلِ غور ہے کہ کسی جانور کے ذبح کے وقت اس پر اللہ کا نام لینا اس قدر ضروری کیوں قرار دیا گیا کہ اس کے بغیر اس کا کھانا ہی حرام ہو جائے؟ اس کے بعض وجوہ بالکل واضح ہیں جن کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

اول یہ کہ اللہ کے نام اور اس کی تکبیر کے بغیر جو کام بھی کیا جاتا ہے وہ، جیسا کہ ہم آیت بسم اللہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، برکت سے خالی ہوتا ہے۔ خدا کی ہر نعمت سے، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، فائدہ اٹھاتے وقت ضروری ہے کہ اس پر اس کا نام لیا جائے تاکہ بندوں کی طرف سے اس کے انعام و احسان کا اعتراف و اقرار ہو۔ اس اعتراف و اقرار کے بغیر کوئی شخص کسی چیز پر تصرف کرتا ہے تو اس کا یہ تصرف

غاصبانہ ہے اور غصب سے کوئی حق قائم نہیں ہوتا بلکہ یہ جسارت اور ڈھٹائی ہے جو خدا کے ہاں مستوجب سزا ہے۔

دوم یہ کہ احترامِ جان کا یہ تقاضا ہے کہ کسی جانور کو ذبح کرتے وقت اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ جان کسی کی بھی ہو ایک محترم شے ہے۔ اگر خدا نے ہم کو اجازت نہ دی ہوتی تو ہمارے لیے کسی جانور کی بھی جان لینا جائز نہ ہوتا۔ یہ حق ہم کو صرف خدا کے اذن سے حاصل ہوا ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ جس وقت ہم ان میں سے کسی کی جان لیں صرف خدا کے نام پر لیں۔ اگر ان پر خدا کا نام نہ لیں، یا خدا کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام لے لیں یا کسی غیر اللہ کے نام پر ان کو ذبح کر دیں تو یہ ان کی جان کی بھی بے حرمتی ہے اور ساتھ ہی جان کے خالق کی بھی۔

سوم یہ کہ اس سے شرک کا ایک بہت وسیع دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ادیان کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جانوروں کی قربانی، ان کی نذر اور ان کے چڑھاوے کو ابتدائے تاریخ سے عبادات میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس اہمیت کے سبب سے مشرکانہ مذاہب میں بھی اس کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ جو قوم بھی کسی غیر اللہ کی عقیدت و نیازمندی میں مبتلا ہوئی اس نے مختلف شکلوں سے اس غیر اللہ کو راضی کرنے کے لیے جانوروں کی بھینٹ چڑھائی۔ قرآن میں شیطان کی جو دھمکی انسانوں کو گمراہ کرنے کے باب میں مذکور ہوئی ہے اس میں بھی، جیسا کہ ہم اس کے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اس ذریعۂ ضلالت کا شیطان نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اسلام نے شرک کے ان تمام راستوں کو بند کر دینے کے لیے جانوروں کی جانوں پر اللہ تعالیٰ کے نام کا قفل لگا دیا جس کو خدا کے نام کی کنجی کے سوا کسی اور کنجی سے کھولنا حرام قرار دے دیا گیا۔ اگر اس کنجی کے بغیر کسی اور کنجی سے اس کو کھولنے یا اس کو توڑنے کی کوشش کی گئی تو یہ کام بھی ناجائز اور جس جانور پر یہ ناجائز تصرف ہوا وہ جانور بھی حرام۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں صرف یہی چیز ناجائز نہیں ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا بلکہ یہ بھی ناجائز ہے کہ کسی جانور کو اللہ کا نام لیے بغیر ہی ذبح کر دیا جائے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ صورت ہو سکتی ہے جس میں بھول چوک کو دخل ہو۔ اور یہ بھول چوک بھی معاف صرف اہل ایمان کے لیے ہے اس لیے کہ ان کے دل اور ارادے میں اللہ کا ایمان اور اس کا نام موجود ہوتا ہے۔ صرف کسی وقتی غفلت سے اس کے اظہار میں سہو ہو جاتا ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۱۲۲-۱۲۳)

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا الاٰيَة۔ یہاں 'موت' سے مراد کفر کی زندگی اور 'حیات' سے مراد ایمان کی

زندگی ہے۔ نور سے مراد وہ کتاب ہے جس کا ذکر آیت ۱۱۴، ۱۱۹ میں گزرا جو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے درمیان امتیاز اور حرام و حلال کی تفصیل کے لیے اتاری۔ 'ظلمات' سے مراد وہ ظنون و اوہام اور وہ خواہشات و بدعات ہیں جن کی طرف آیات ۱۱۶ و ۱۱۹ میں اشارہ فرمایا ہے۔

اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کی تمثیل

یہ اہلِ ایمان اور ان مشرکین کی تمثیل بیان ہوئی ہے کہ اہلِ ایمان کو اللہ نے کفر کی موت کے بعد ایمان کی زندگی بخشی ہے اور ان کو اپنی کتاب کی شکل میں ایک نورِ مبین عطا فرمایا ہے جس سے وہ خود بھی روشنی حاصل کر رہے ہیں، دوسروں کو بھی راہ دکھا رہے ہیں۔ کیا یہ لوگ ان لوگوں کے مانند ہو جائیں گے جن کی تمثیل یہ ہے کہ یہ اپنے سابق اوہام اور اپنی بدعات کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور ان سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ اس تمثیل کے پیش کرنے سے مقصود مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ اب تم ان شیاطین جن و انس کی غوغا آرائیوں کی پروا نہ کرو۔ تم کو خدا نے زندگی بخشی ہے تو زندگی کا پیام لے کر آگے بڑھو تمھیں روشنی عطا ہوئی ہے تو اس روشنی میں خود بھی چلو اور دوسروں کو بھی روشنی دکھاؤ۔ اب تمھارے لیے یہ زیبا نہیں کہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے والوں کی خرافات پر کان دھرو۔

روشنی کا حق

'یَمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو روشنی ملے تو اس کا حق یہ ہے کہ اس سے خود بھی رہنمائی حاصل کرے اور لوگوں میں بھی اس کو لے کر نکلے تاکہ جن کے اندر صلاحیت ہو وہ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ روشنی چھپا کر رکھنے کی چیز نہیں ہوتی بلکہ اونچی جگہ سرِراہ رکھنے کی چیز ہوتی ہے۔ سیدنا مسیحؑ نے اسی حکمت کو یوں سمجھایا ہے کہ جس کے پاس چراغ ہوتا ہے وہ پیمانہ کے نیچے ڈھانپ کے نہیں رکھتا بلکہ اونچی جگہ رکھتا ہے تاکہ اس کا اپنا گھر بھی روشن ہو اور دوسرے بھی اس سے راستہ پائیں۔

اہلِ کفر پر کفر کے مسلط ہونے کے بارے میں سنتِ الٰہی

'كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ' یعنی یہ اس تاریکی ہی میں پڑے رہنے پر جو بضد ہیں اور تمھاری دکھائی ہوئی روشنی سے وحشت زدہ ہو رہے ہیں اس سے تم دل برداشتہ نہ ہو، قانونِ قدرت یہی ہے کہ جو لوگ جس چیز کو پسند کرتے ہیں ان پر وہی چیز مسلط کر دی جاتی ہے۔ اس مضمون کو آگے آیت ۱۲۵ میں یوں واضح فرمایا ہے 'كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ' (اسی طرح اللہ ناپاکی مسلط کر دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے) اس قانونِ الٰہی پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم ختمِ قلوب کی بحث میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

اس سنتِ الٰہی کی مزید وضاحت

'وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا' 'جَعَلْنَا' یہاں 'اَمْهَلْنَا' کے مفہوم میں ہے اور 'كَذٰلِكَ' کا اشارہ اس صورتِ حال کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۱۲۱ میں فرمایا ہے۔ یہ اسی سنت اللہ کا بیان کسی قدر مختلف انداز میں ہوا ہے جو اوپر آیت ۱۱۲ میں بیان ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ شیاطین جن و انس اس دعوت کی مخالفت میں جو ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے

ہیں یہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے۔ کسی بستی میں جب دعوتِ حق بلند ہوتی ہے تو وہاں جو باطل کے علمبردار ہوتے ہیں اور جن کا اس باطل سے مفاد وابستہ ہوتا ہے اسی طرح اپنی تمام چالوں کے ساتھ اس کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق ان کو بھی ایک خاص وقت تک ڈھیل دیتا ہے تاکہ جو کمائی وہ کرنا چاہتے ہیں کرلیں۔

وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ، یہاں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے یعنی وہ تو چالیں حق کے خلاف چلتے تھے لیکن یہ چالیں انھیں کے خلاف پڑیں۔ حق کی مخالفت کرنے والے حق کو نہیں بلکہ خود اپنے کو تباہ کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کے سامنے ان کا انجام نہیں ہوتا اسی وجہ سے ان کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ یہی حال قریش کے اکابر مجرمین کا ہے۔ یہ بھی انھی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور بالآخر انھی کے انجام کو پہنچیں گے لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ (۱۲۴)

قریش کی ایک چال اور منصب نبوت کا استحقاق

یہ اس چال کی ایک مثال ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ جب ان کے پاس اللہ کی کوئی آیت، عام اس سے کہ وہ کوئی نشانی ہو یا کوئی ہدایت و تنبیہ، آتی تو وہ یہ کہتے کہ ہم تو اس وقت تک ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک ہمیں بھی وہ رسالت نہ ملے جس کے مدعی یہ رسول لوگ ہیں، آخر ان کو کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے کہ انھیں خدا نے اپنا رسول بنایا اور ہمیں نظر انداز کر دیا، درآنحالیکہ پشتہا پشت سے قیادت و سیادت اور دولت و امارت ہمارا حصہ ہے؟ ٹھیک یہی بات، جیسا کہ قرآن میں تفصیل سے بیان ہوئی، قریش کے اکابر کہتے تھے۔ ان کو بھی وہی گھمنڈ تھا جو ان کے پیشرو متکبرین اور مکذبین انبیاء کو تھا کہ اگر خدا کسی کو رسالت ہی دینے والا تھا تو کیا اس تاج کے لیے اس کو انھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا سر موزوں نظر آیا، آخر مکّہ یا طائف کے کسی سردار پر اس کی نظر کیوں نہ پڑی؟ ظاہر ہے کہ یہ بات جو وہ کہتے تھے تو محض چالبازی کے طور پر کہتے تھے، اس سے مقصود ان کا محض اپنی انانیت اور خود فریبی کے لیے ایک پردہ فراہم کرنا اور اپنے عوام کو بے وقوف بنانا ہوتا تھا۔ سادہ لوح عوام دنیوی اسباب و وسائل کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ جن کو دنیا میں بڑا دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ خدا کے نزدیک بھی یہی بڑے ہوں گے۔ اس ذہن کے لوگ آسانی سے اس قسم کے چکروں میں آ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس بات کو مکر سے تعبیر کیا ہے یعنی یہ ایک سیاسی اشتعال تھا۔

قریش کو منہ توڑ جواب

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ، یہ ان متکبرین کو جواب ہے اور گو لفظاً سخت نہیں ہے لیکن معناً بہت سخت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ منصب رسالت ایسی چیز نہیں ہے جس کا اہل ہر کس و ناکس بن جائے

یہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ یہ تاج وہ کس کے سر پر رکھے۔ یہ مخمل اور زربفت کی جھول نہیں ہے جو بسا اوقات گدھوں پر بھی نظر آ جاتی ہے بلکہ یہ خلعتِ الٰہی اور تشریفِ آسمانی ہے جو انھیں کو نصیب ہوتی ہے جن کا انتخاب اللہ تعالیٰ فرمائے۔

منصبِ نبوت اور نبی کا مقام

اس ٹکڑے سے جہاں یہ بات نکلتی ہے کہ نبوت و رسالت ایک موہبتِ ربانی اور ایک عطیۂ الٰہی ہے جو صرف اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کے لیے انتخاب فرمائے وہیں یہ بات بھی اس سے نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے انتخاب انھی کو فرماتا ہے جو اپنی اکتسابی صلاحیتوں اور خوبیوں کے اعتبار سے نوعِ انسانی کے گُلِ سرسبد، نخلِ فطرت کے بہترین ثمر اور کمالِ انسانیت کے مظہرِ اتم ہوتے ہیں۔

'سَیُصِیۡبُ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا صَغَارٌ عِنۡدَ اللّٰہِ وَعَذَابٌ شَدِیۡدٌۢ بِمَا کَانُوۡا یَمۡکُرُوۡنَ'۔ 'اَجۡرَمُوۡا' میں اگرچہ ان کے وہ تمام جرائم اور ان کی وہ ساری چال بازیاں شامل ہیں جن کے وہ مرتکب ہوئے لیکن یہاں اس سے ان کے اس استکبار کی طرف خاص اشارہ ہو رہا ہے جس کا اظہار انھوں نے لَنۡ نُّؤۡمِنَ حَتّٰی نُؤۡتٰی مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ رُسُلُ اللّٰہِ میں کیا۔ اسی استکبار کے تعلق سے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلت بھی ہے اور عذابِ شدید بھی۔

فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یَّہۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَمَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّہٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ ؕ کَذٰلِکَ یَجۡعَلُ اللّٰہُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۰ وَہٰذَا صِرَاطُ رَبِّکَ مُسۡتَقِیۡمًا ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ ۰ لَہُمۡ دَارُ السَّلٰمِ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ وَہُوَ وَلِیُّہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (۱۲۵-۱۲۷)

فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ الآیۃ۔ 'حَرَجٌ' جھاڑیوں سے بھری ہوئی تنگ جگہ کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ 'ضیّق' کے بعد اس کی تاکید مزید کے طور پر آیا ہے۔ 'تصعّد' تکلف اور بہ مشقت کسی بلندی پر چڑھنے کے لیے معروف ہے۔ لفظ 'سما' جس طرح آسمان اور بادلوں کے لیے آتا ہے اسی طرح فضا اور اس کی بلندی کے لیے بھی آتا ہے مثلاً کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصۡلُہَا ثَابِتٌ وَّفَرۡعُہَا فِی السَّمَآءِ ۲۴ ابراہیم (کلمہ طیبہ کی مثال ایک بارآور درخت کی ہے جس کی جڑ زمین میں گہری اتری ہوئی ہو اور اس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں)۔

ایمان سے گریز کی اصل علت

اب یہ اصل علت بیان ہو رہی ہے ان کے ایمان نہ لانے کی۔ وہ یہ ہے کہ یہ اللہ کی توفیقِ ہدایت سے محروم ہو گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری سخن سازیاں اور تمام چالبازیاں تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اصل چیز جو ان کے لیے قبولِ اسلام میں مانع ہے کفر و شرک کی وہ نجاست ہے جس کے ردے پر ردے ان کے دلوں پر جم گئے ہیں، جس کے سبب سے ان کو اسلام کا راستہ ایک کٹھن چڑھائی معلوم ہوتا ہے، جس کے تصور سے ان کا سینہ بھنچتا اور دم اکھڑتا ہے گویا ان کو ایک بلند چڑھائی چڑھنی پڑ رہی ہے۔ جن کے دلوں پر یہ نجاست جم جاتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے سینے اسلام کے لیے تنگ کر دیتا ہے، جیسا کہ اوپر کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۱۲۲ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا۔ اسلام کے لیے سینے کھلتے ان کے ہیں جن کے سینے اس قسم کے جھاڑ جھنکاڑ سے صاف ہوتے ہیں۔

یہ چیز چونکہ بالکل سنت الٰہی کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوب اپنی طرف فرمایا ہے۔ اس کو اس روشنی میں سمجھنا چاہیے جس روشنی میں اس کی وضاحت ہم اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔

هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا ط الایۃ۔ چونکہ اشارہ کے اندر فعل کے معنی پائے جاتے ہیں اس وجہ سے 'مُسْتَقِيمًا' یہاں 'صراط' سے حال پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اسلام ہے تو خدا کی کھولی ہوئی سیدھی راہ، فطرت کی صراط مستقیم، نہ اس میں پیچ و خم ہیں، نہ چڑھائیاں اور گھاٹیاں لیکن جنھوں نے اپنے اوپر اپنی غیر فطری نجاستیں لاد رکھی ہوں ان کو یہ راہ دشوار گزار معلوم ہو رہی ہے۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ یعنی اس کے دین فطرت اور ملتِ ابراہیم ہونے کے سارے دلائل تفصیل سے ہم نے بیان کر دیے ہیں لیکن دلائل کارآمد ان کے لیے ہوتے ہیں جن کے اندر یاددہانی حاصل کرنے اور سوچنے سمجھنے کا ارادہ پایا جاتا ہے۔

'لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ' یہ صلہ بیان ہوا ہے ان لوگوں کا جن کے سینے اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے کھولتا ہے۔ فرمایا کہ ان کے لیے اس اسلام کے صلہ میں دار السلام، سکھ اور چین کا گھر ہوگا اور اللہ ان کا ساتھی ہوگا جب کہ اسلام کے معاندین کے لیے ذلت اور عذاب کا گھر ہوگا اور ان کے ساتھی وہ شیاطین جن و انس ہوں گے جن کے القائے شیطانی کو قبول کر کے یہ گمراہ ہوئے۔ یہ ٹکڑا اوپر والے ٹکڑے 'سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا' کے بالکل بالمقابل ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ج يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ج وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ط قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ط قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ط وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ (۱۲۸-۱۳۲)

ذریتِ ابلیس کی عیاری اور ذریتِ آدم کی سادہ لوحی

'وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا' 'هُمْ' سے مراد وہی اکابر مجرمین ہیں جن کا ذکر آیات ۱۲۳-۱۲۴ میں گزرا اور 'جَمِيْعًا' کی تاکید اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ شیاطین الانس کے ساتھ ساتھ وہ شیاطین الجن بھی جمع کیے جائیں گے جن کے القا و الہام کی انھوں نے پیروی کی، جیسا کہ اوپر آیت ۱۱۲ سے ان کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ ان سب کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جمع کر کے شیاطین الجن کو مخاطب کر کے فرمائے گا کہ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ (اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا) ظاہر ہے کہ یہاں جنوں کے گروہ' سے مراد جنوں کی پوری امت نہیں ہے بلکہ ان کے اندر کا وہی گروہ مخاطب ہے جس نے اپنے مرشد و پیشوا ابلیس

کی پیروی کی جو خود بھی، جیسا کہ قرآن سے ثابت ہے، جنوں ہی میں سے تھا اور جس نے آدم کو دھوکا دیا اور سجدے کے حکم کی تعمیل سے انکار کرتے ہوئے بڑے فخر سے دعویٰ کیا تھا کہ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا (۶۲ بنی اسرائیل) (بھلا یہ ہے وہ جس کو تو نے میرے اوپر فضیلت بخشی ہے، اگر تو نے مجھے قیامت تک کے لیے مہلت دی تو میں اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا صرف تھوڑے ہی مجھ سے بچ رہیں گے) دوسرے مقام میں ہے لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (۱۶-۱۷ اعراف) (میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے، ان کے دہنے سے، ان کے بائیں سے ان کی راہ ماروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا) یہاں اصحاب ذوق آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ 'اسْتَكْثَرْتُمْ' کے لفظ میں نہایت لطیف تلمیح ہے ابلیس کے قول وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ اور لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا کی طرف۔ یعنی اللہ تعالیٰ ابلیس کے ان فرزندان معنوی کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ تم نے تو اپنے پیشوا ابلیس کا منشا بڑی کامیابی سے پورا کیا کہ ذریت آدم میں سے بہتوں کو اپنے فتراک ضلالت کا نخچیر بنا لیا اور بڑی سعادت مندی کی یہ اولاد آدم کہ اس سادہ لوحی کے ساتھ تمھارے دام فریب میں پھنس گئی۔

شیطان کے پیروؤں کا اعتراف آخرت میں

قَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْۤ اَجَّلْتَ لَنَا، انسانوں میں سے جو لوگ ان شیاطین جن کے ساتھی بنے ہوں گے وہ اس پر بولیں گے کہ اے ہمارے پروردگار، ہم نے ایک دوسرے کی معیت و رفاقت سے دنیا میں خوب حظ اٹھایا یہاں تک کہ اس یوم الحساب کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا۔ 'حظ اٹھانے' سے مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے آلۂ کار بنے، ہم نے ان کی پوجا کی، ان کے تھانوں پر نذریں اور قربانیاں پیش کیں اور ان کے کہنے پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنایا، اسی طرح ہمارے کاہنوں، ساحروں اور دیانوں نے ان کو اپنے مقاصد مزعومہ کے لیے طرح طرح سے استعمال کیا، یہاں تک کہ یہ دن آ گیا اور ہمیں اپنے اس عمل کے انجام پر غور کرنے کی توفیق نہ ملی۔ یہ واضح رہے کہ عرب جاہلیت میں جنوں کو عربوں کی مذہبی اور سماجی زندگی میں بڑا دخل ہو گیا تھا، کہانت اور ساحری کی ساری گرم بازاری تو ان کے دم قدم سے تھی ہی، شاعری تک کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ یہ جنات الہام کرتے ہیں اور ہر بڑے شاعر کے ساتھ کوئی نہ کوئی جن ضرور ہوتا ہے۔ اسی بنا پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہ کہتے تھے کہ ان کے ساتھ کوئی جن ہے۔ ہر وادی کے الگ الگ جن مانے جاتے تھے اور سفر، حضر، جنگ، صلح اور فتح کے معاملات میں ان کے تصرفات کا بڑا دخل سمجھا جاتا تھا۔

بلاغت کا ایک نکتہ

یہاں بلاغت کلام کا ایک نکتہ قابل لحاظ ہے۔ شیاطین انس یہ بات بطور اعتراف جرم اور بقصد اظہار ندامت کہیں گے اور یہ تمہید باندھ کر وہ اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرنا چاہیں گے لیکن اسلوب کلام صاف شہادت دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بات تمہید پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دے گا اور

ان کو معذرت اور درخواست معافی کا موقع دیے بغیر ہی اپنا فیصلہ سنا دے گا کہ اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ، بس اب تمھارا ٹھکانا یہی دوزخ ہے جس میں تمھیں ہمیشہ رہنا ہے، اب باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو، عذر، معافی، توبہ اور اصلاح سب کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔

آخرت کا خلود مقید بمشیتِ الٰہی ہوگا

یہاں ایک اور چیز بھی قابلِ غور ہے وہ یہ کہ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ کے بعد اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کے الفاظ بھی ہیں جس سے بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ خلود مقید بمشیتِ الٰہی ہے۔ اسی طرح کا اسلوب سورۂ ہود میں بھی ہے۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ، (ہود) (وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں، مگر جو تیرا رب چاہے) اس استثنا کے باب میں ہمارے اربابِ تاویل کو تردد پیش آیا ہے اس لیے کہ اس سے بظاہر یہ بات نکلتی ہے کہ یہ خلود اس معنی میں خلود نہیں ہے جس معنی میں ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی کوئی نہایت ہی نہیں ہے بلکہ وہ طولِ مدت کے مفہوم میں ہے، اگرچہ یہ مدت کتنی ہی طویل ہو۔ بعض لوگوں نے اس سے بچنے کے خیال سے 'مَا' کو 'مَنْ' کے معنی میں لیا ہے لیکن اوّل تو یہ عربیت کے خلاف ہے ثانیاً اس سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ یہ استثنا بہرحال انہی متحققین خلود ہی میں سے ہوگا جن کا ذکر ہے تو پھر فرق کیا ہوا، خلود تو پھر بھی غیر منتہی خلود کے معنی میں نہیں رہا، اگرچہ انہی کے حد تک سہی جن کو مشیتِ الٰہی اس سے مستثنیٰ قرار دے؛ میرے نزدیک مَا شَآءَ اللّٰهُ اور مَا شَآءَ رَبُّكَ کی قید یہاں اس خلود کے منتہی ہونے کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ ان مجرمین کے لیے اس عذابِ نار میں گرفتار ہو جانے کے بعد امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے، کسی کی سعی، کسی کی سفارش، کسی کا زور، کسی کی فریاد کچھ کارگر نہ ہوگی، اختیار و ارادے کی ساری حدیں ختم ہو جائیں گی، توبہ اور اصلاح اور حسرت و ندامت کی مہلتیں گزر جائیں گی۔ واحد چیز جو کارفرما ہوگی وہ خدا کی مشیت ہے اور اپنی مشیت کے بھیدوں کو وہی جانتا ہے۔ وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ، اور حکیم و علیم ہے۔ قرآن سے جو بات نکلتی ہے وہ تو اسی حد تک ہے۔ جن لوگوں نے اس حد سے آگے بڑھ کر اس سے کچھ اور نتائج نکالنے کی کوشش کی ہے ان کے نتائج کو ان کے دلائل کی کسوٹی پر جانچیے۔ قرآن پر ان کی ذمہ داری ڈالنا صحیح نہیں ہے۔ ویسے یہ امر یاد رہے کہ خلود اور ابدیت کے مسائل ایسے نہیں ہیں جن کا احاطہ انسان کا محدود علم کر سکے۔ اگر انسان ان چیزوں کے چکر میں پڑے تو بات متشابہات کے حدود میں نکل جاتی ہے جن میں پڑنے سے ہم کو روکا گیا ہے۔ اس وجہ سے سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ جتنی بات خدا نے بتا دی ہے اس کو مانیے اور اس کے آگے کے مراحل کو خدا کے علم کے حوالے کیجیے۔

شیاطین کے تسلط کی علت

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا الآیۃ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف جو اوپر يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ کے ٹکڑے میں مذکور ہوئی اور وَلّٰی، تولیۃ فلانا الامر، کے معنی ہیں فلاں کو اس پر حاکم، والی اور قابض بنا دیا اور اس پر مسلط کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو شیاطین جن نے بے شمار انسانوں پر اپنا تسلط جما لیا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان شیاطین کو انسانوں پر اختیار ملا ہوا تھا بلکہ اس کا سبب خود

ان کے اعمال ہوئے ہیں۔ انھوں نے خدا کی ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہشات و بدعات کی پیروی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شیطان کے پیرو بن گئے اور اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو لوگ شیاطین کے پیرو بن جاتے ہیں ان پر وہ شیاطین کو مسلط کر دیتا ہے۔ ظالمین سے مراد یہاں کفر و شرک کی راہ اختیار کرنے والے ہیں۔ یہ مضمون پوری تفصیل سے پیچھے بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی مختلف شکلوں میں بیان ہوگا۔

سوال بطور قطع عذر — یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ یَقُصُّوۡنَ عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ وَیُنۡذِرُوۡنَکُمۡ لِقَآءَ یَوۡمِکُمۡ ھٰذَا الایۃ سوال ان سے بطور قطع عذر کے ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ شامت زدو، کیا تمھارے پاس تمھی میں سے میری آیتیں سناتے اور اس دن کی آمد سے ہوشیار کرتے ہوئے رسول نہیں آئے؟ پھر تم نے آخر اپنی یہ شامت کیوں بلائی؟ رسول نہ آئے ہوتے تو تم کوئی عذر پیش کر سکتے تھے، اب کیا عذر پیش کر سکتے ہو؟ تم نے تو سب کچھ سن اور سمجھ کے اپنی آنکھیں اور اپنے کان بند رکھے۔

جنوں کے رسول انھی کے اندر سے ہوتے ہیں — 'رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ' سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر انسانوں ہی میں سے رسول بھیجے اسی طرح جنوں کے اندر جنوں میں سے رسول بھیجے۔ انبیا و رسل کے باب میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے اور جو تفصیل سے قرآن میں بیان ہوئی ہے اس کا لازمی اقتضا بھی یہی ہے کہ جنوں کے اندر انھی کے اندر سے رسول آئیں جو ان کی بولی بولیں، ان کی ضروریات و حالات کے مطابق ان پر اللہ کی حجت تمام کریں۔ اتمام حجت انبیاء و رسل کی بعثت کا اصل مقصد ہوتا ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ہر گروہ کے اندر ان کی فطرت کے مطابق رسول آئیں۔ انسان اور جن دو مختلف نوعیں ہیں۔ دونوں کے مسائل اگر کل نہیں تو بیشتر الگ الگ ہیں۔ اشتراک ہو سکتا ہے تو عقائد اور اخلاق کے بعض اصولوں میں ہو سکتا ہے، شریعت، قانون، معاشرت کے مسائل تو لازماً الگ الگ ہوں گے۔ پھر رسول جو اسوہ اور نمونہ بن کر آتے ہیں اگر ان کے اندر سے نہ ہوئے تو وہ ان کے لیے اسوہ اور نمونہ کیسے بن سکتے ہیں؟ جب ہم انسانوں کے لیے جنات میں سے کوئی رسول اسوہ نہیں بن سکتا تو انسانوں میں سے کوئی رسول جنوں کے لیے کیسے اسوہ بن سکتا ہے! ہر قوم کا رسول ان کے اندر سے ہونے کا خاص پہلو، اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے یہی ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ گویا اس قوم پر خود اس کی زبان، خود اس کے ضمیر، خود اس کے ایک بھائی اور خود اسی کے ایک فرد کامل کے ذریعے سے اس پر حجت قائم کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جنات قیامت کے روز اس سوال کے جواب میں یہ عذر کر سکتے تھے کہ اے رب ہم جنات کے لیے کسی غیر جن کا قول و عمل کس طرح حجت ہو سکتا تھا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جس طرح جنوں کے اشرار (شیاطین) اور انسانوں کے اشرار و شیاطین میں حق کی مخالفت کے لیے سنگٹھن ہو جایا کرتا ہے، جیسا کہ اوپر کی آیات میں بیان ہوا، اسی طرح بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ جنوں کے اندر جو ابرار و صالحین ہیں ان کی طرف سے اس حق کی بھی تائید ہوتی ہے جو انسانوں کے انبیاء و صالحین کے ذریعے سے ظاہر ہوا ہے اس لیے کہ حق، اصولی حیثیت سے نہ صرف انسانوں اور جنوں کے درمیان ایک متاع مشترک

کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ تمام کائنات کی متاع مشترک ہے۔ اس مسئلے پر انشاءاللہ تفصیل کے ساتھ ہم سورۂ جن میں بحث کریں گے۔ یہاں اس اشارے پر کفایت کیجیے۔

یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ میں ممکن ہے کسی کو یَقُصُّ کا لفظ آیات سنانے کے لیے کھٹکے اس لیے کہ اس لفظ کا معروف استعمال سرگزشتیں سنانے ہی کے لیے ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں یہ لفظ اس وجہ سے استعمال ہوا ہے کہ آیات سے یہاں مراد آیات انذار ہیں جن کا غالب حصہ مکذبین و منکرین کے انجام اور ان کی سرگزشتوں کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے، یہاں موقع و محل اسی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے جو سوال فرمائے گا اس کا مطلب یہی ہوگا کہ کیا تمھیں میرے رسولوں نے جھٹلانے والوں کے انجام اور اس دن کی آمد سے خبردار نہیں کیا تھا کہ تم نے اپنے آپ کو اس ابدی ہلاکت میں ڈالا۔

اپنی گواہی قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ
خود اپنے كَانُوْا كٰفِرِيْنَ۔ بعینہٖ یہی بات سورۂ ملک میں یوں بیان ہوئی ہے۔ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ
خلاف خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ‎o قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ‎o وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ‎o فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ‎o ۔ ۱۱ ملک (جب جب اس میں جھونکی جائے گی کوئی پارٹی، دوزخ کے داروغے اس سے سوال کریں گے، کیا تمھارے پاس کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں، بے شک ہمارے پاس آگاہ کر دینے والا آیا تھا لیکن ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہا کہ خدا نے کوئی چیز نہیں اتاری ہے، تم لوگ تو ایک بڑی گمراہی میں مبتلا ہو۔ اور وہ کہیں گے اگر ہم سننے اور سمجھنے والے لوگ ہوتے تو دوزخ میں پڑنے والے نہ بنتے۔ پس وہ اپنے جرم کا اعتراف کر لیں گے، پس دفع ہوں یہ دوزخ والے) آیت کے بیچ میں غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا کے الفاظ بطور جملہ معترضہ کے اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ جس بات کا آج اس جسارت سے انکار کر رہے ہیں، کل اس بے بسی کے ساتھ اس کا اعتراف کریں گے اور اپنے خلاف خود گواہ بنیں گے کیونکہ آج ان کے انکار کی بنیاد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس دنیا کی ظاہر فریبی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ اس دنیا کا کارخانہ چونکہ جزا و سزا کے اصول پر نہیں چل رہا ہے بلکہ ابتلا کے اصول پر چل رہا ہے، جس میں حق کے ساتھ باطل کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے اس وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جزا و سزا ہے ہی نہیں اور نبی جو کچھ کہتے ہیں یہ محض ہوائی باتیں ہیں۔

عذاب سے ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ۔ یہ وجہ بیان فرمائی ہے اس
پہلے اتمام بات کی کہ کیوں یہ اہتمام کیا گیا کہ ہر قوم کے اندر، خواہ انسان ہوں یا جن، انھی کے اندر سے رسول
حجت آئیں۔ فرمایا کہ ایسا اس لیے ہوا کہ تیرے رب کی رحمت سے یہ بات بعید تھی کہ وہ کسی قوم کو اس کے کفر و شرک پر، اس کے نتائج و عواقب سے آگاہ کیے بغیر، ان پر عذاب بھیج دے، وہ کسی کو سزا

دیتا ہے تو اس سے پہلے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیتا ہے تاکہ وہ توبہ و اصلاح کرنا چاہیں تو توبہ و اصلاح کر لیں اور اگر نہ کرنا چاہیں تو اپنی ذمہ داری پر اس کے نتائج بھگتیں۔

دوزخ میں جرائم کے اعتبار سے درجہ بندی

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ لفظ 'کل' پر ہم مختلف مقامات میں لکھ چکے ہیں کہ جب یہ اس طرح آتا ہے تو اس سے مراد وہی اشخاص یا پارٹیاں ہوتی ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد جنوں اور انسانوں کے وہی گروہ ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا۔ فرمایا کہ انھوں نے جو کچھ کیا، جان بوجھ کر، خدا کی طرف سے اتمام حجت کے بعد کیا، اس وجہ سے حق ہے کہ وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں اور جن کے جس درجے کے جرائم ہیں اسی اعتبار سے وہ دوزخ میں اپنا مقام پائیں۔ چونکہ اللہ ان کے اعمال سے جو یہ کرتے رہے ہیں یا کرتے ہیں اچھی طرح باخبر ہے اس وجہ سے اس کو ان کی درجہ بندی میں کوئی زحمت نہیں پیش آئے گی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سزاوار ہوگا۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاۗءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ
ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۝ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ
اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۳۳-۱۳۵)

قریش کو براہ راست دھمکی

اوپر جو باتیں بیان ہوئی تھیں اگرچہ واضح طور پر ان کا رخ قریش ہی کی طرف تھا لیکن ان کی نوعیت اصولی باتوں کی تھی۔ اب یہ صاف صاف قریش کو مخاطب کر کے دھمکی دی کہ جہاں تک اتمام حجت کا تعلق ہے اس کا سامان خدا نے تمھارے لیے بھی کر دیا ہے۔ اب تمھاری قسمت بھی میزان میں ہے۔ اگر تم نے اپنے آپ کو نہ سنبھالا تو خدا کی پکڑ میں آ جاؤ گے اور جب اس کی پکڑ میں آ جاؤ گے تو پھر اس کے قابو سے باہر نہ نکل سکو گے۔

اتمام حجت کا اہتمام خدا کی رحمت کا تقاضا ہے

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ فرمایا کہ تمھارا خداوند غنی اور بے نیاز بھی ہے اور رحمت والا بھی ہے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ صفات جب اس طرح حرف عطف کے بغیر بیان ہوتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ صفتیں موصوف میں بیک وقت موجود ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں غنی بھی ہے اور رحمت والا بھی۔ اپنی صفت غنا کی وجہ سے اس کو کسی کی پروا نہیں۔ وہ سب سے بے نیاز، سب سے مستغنی اور سب سے بے پروا ہے۔ سب اس کا انکار کر دیں تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ سب اس کی حمد کے ترانے گائیں تو اس کا کچھ نہیں بنتا۔ وہ اگر اپنے رسول بھیجتا ہے، کتاب اتارتا ہے، ایمان و اسلام کی دعوت دیتا ہے تو اس لیے نہیں کہ لوگوں کے ایمان و اسلام کے بغیر اس کا کوئی کام اٹکا ہوا ہے بلکہ یہ سب کچھ اس لیے کرتا ہے کہ بے نیاز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ رحمت والا بھی ہے۔ اس کی اس رحمت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ لوگوں پر اپنی حجت تمام کیے بغیر ان کو نہیں پکڑتا بلکہ ان پر حجت تمام کرنے کے لیے سارے جتن کرتا ہے اور اس وقت

تک وہ لوگوں کو مہلت دیتا ہے جب تک وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر نہ لیں۔ یہ تمہید ہے اس بات کی جو آگے آ رہی ہے۔

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا یَشَآءُ كَمَاۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّیَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری ان تمام سرکشیوں کے باوجود جو تمہاری پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ خدا پکڑ نہیں سکتا یا تمہارے فنا ہو جانے سے اس کی دنیا اجڑ جائے گی اور پھر اس کے آباد کرنے والے نہیں ملیں گے بلکہ اس کا واحد سبب اس کی رحمت ہے۔ ورنہ اگر وہ تم کو فنا کرنا چاہے تو جب چاہے فنا کر دے اور تمہاری جگہ جس چیز کو چاہے دے دے۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تمہارے قیاس سے بالاتر ہو۔ آخر تم بھی تو اس زمین پر روزِ ازل سے نہیں ہو۔ تم سے پہلے اسی ملک میں دوسری قومیں آباد تھیں جن کی تاریخ تمہیں سنائی جا چکی ہے اور جن کے آثار اس ملک میں موجود ہیں۔ تمہاری ہی طرح خدا نے ان کی طرف بھی رسول بھیجے لیکن انھوں نے سرکشی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فنا کر دیے گئے اور بالآخر تم ان کے وارث ہوئے تو جس خدا نے ان کو مٹا کر تمہیں ان کا وارث بنایا، اگر وہ تمہیں مٹا کر دوسروں کو تمہارا وارث بنا دے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے۔ تمہاری تو اپنی ہی تاریخ تمہارے اوپر حجت ہے۔

زبان کا ایک نکتہ

اس آیت میں زبان کا ایک نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ فرمایا کہ وَیَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا یَشَآءُ حالانکہ بظاہر مَنْ یَّشَآءُ ہونا تھا اس لیے کہ 'ما' کا غالب استعمال بے جان چیزوں ہی کے لیے ہے۔ میرے نزدیک 'من' کی جگہ 'ما' کا استعمال اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل قدرت کے اظہار اور قریش کے غرور پر ضرب لگانے کے لیے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی قوت و سطوت پر کیا اترا رہے ہو، خدا کی قدرت تو وہ ہے کہ وہ تمہارے اس صحرا کی جس چیز کو چاہے تمہاری جگہ لینے کے لیے اٹھا کھڑی کرے۔ سیدنا مسیحؑ نے بھی ایک جگہ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم اس بات پر گھمنڈ نہ کرو کہ تم ابراہیم کی اولاد ہو، میرا خدا اگر چاہے تو ریگستان کے ذروں سے ابراہیم کے لیے اولاد کھڑی کر دے۔ بعینہٖ یہی زور قرآن کے اس اسلوب میں مضمر ہے بلکہ قرآن کا اسلوب اپنی تعمیم کے پہلو سے زیادہ زوردار ہے۔

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ۔ 'تُوْعَدُوْنَ' میں وہ عذاب بھی داخل ہے جس کی، رسول کی تکذیب کی صورت میں، ان کو دھمکی سنا دی گئی تھی اور وہ یوم الحساب بھی جو اس کائنات کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ فرمایا کہ یہ دونوں باتیں شدنی ہیں اور جب ان کا ظہور ہوگا تو تم خدا کے قابو سے کسی طرح باہر نہ نکل سکو گے۔ 'اعجزہ الشئی، فاتہ ولم یقدر علیہ'۔ 'اعجزہ الشئی' کے معنی ہوں گے کہ فلاں چیز اس کے قبضہ سے نکل گئی، وہ اس پر قابو نہ پا سکا۔ اس دھمکی میں یہ بات مضمر ہے کہ عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ، اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو یہ چیز تو آ کے رہے گی۔

پیغمبر کی طرف سے اعلانِ برأت اور دھمکی

قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ۔ اس میں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق ایک مقابل محذوف ہے۔ یعنی اِنِّیْ عَامِلٌ عَلٰی مَكَانَتِیْ۔ 'مَكَانَة' کے معنی جگہ، منزلت اور مقام کے ہیں۔ قرآن میں یہ جگہ ہی

کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ ۶۷ - یس (اگر ہم چاہتے ان کی جگہ ہی پر ان کو مسخ کر دیتے) طریقہ کا مفہوم اس لفظ کے لوازم میں سے ہے۔ جب ہم کہیں گے تم اپنی جگہ کام کرو، میں اپنی جگہ کام کرتا ہوں تو طریقہ کا مفہوم اس کے اندر آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم اپنے مقام کفر اور موقف مخالفت حق سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہو تو کر دجو کرنا چاہتے ہو۔ میں بھی اپنے موقف سے انچ برابر ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اعملوا کے مقابل میں اِنِّیْ عَامِلٌ میں زیادہ زور دیا ہے اس لیے کہ صفت اور فاعل کے صیغے فعل کے بالمقابل دوام، استمرار، استقلال اور عزم و جزم کو ظاہر کرتے ہیں۔ الفاظ کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ یہ پیغمبر کی طرف سے صاف صاف برأت کا اعلان اور نہایت واضح الفاظ میں دھمکی ہے۔

اصل دھمکی

'فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ' یہ اصل دھمکی ہے۔ یعنی تم بہت جلد دیکھ لو گے کہ انجام کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوتی ہے۔ 'عاقبۃ' کا لفظ یوں تو انجام کے معنی میں معروف ہے ہی خواہ نیک انجام ہو یا بد لیکن بعض اوقات یہ مخصوص طور پر انجام خیر و فلاح ہی کے معنی میں آتا ہے۔ یہ گویا لفظ کا استعمال اس کے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے ہوتا ہے اس لیے کہ قابل ذکر انجام تو وہی ہے جو اس فلاح و سعادت پر منتہی ہو جو اصل غایت ہے اس کائنات کی تخلیق کی نہ کہ نامرادی و خسران کا انجام جو اس غایت سے انحراف کا لازمہ ہے۔ چنانچہ یہ لفظ فلاح و سعادت کے مفہوم میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِیْنَ ۴۹ (پس ثابت قدم رہو، عاقبت کار کی کامیابی اہل تقویٰ ہی کے لیے ہے) وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ۱۳۲ طٰہٰ (اور انجام کار کامیابی تقویٰ کے لیے ہے) 'الدار' سے مراد، دار آخرت ہے۔ اس لیے کہ اصل نتائج کے ظہور کی جگہ وہی ہے۔ اہل ایمان دنیا میں جو جدوجہد کرتے ہیں وہ اسی کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ اہل ایمان کو دنیا میں جو کامیابی حاصل ہوتی ہے اگرچہ کامیابی وہ بھی ہے لیکن وہ فیصلہ کن نہیں ہے۔ اس لیے کہ اصل گول یہ دنیا نہیں ہے۔ اصل گول آخرت ہے۔ جب تک وہ گول نہ جیتا جائے اس وقت تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کس کی جیت رہی اور کون ہارا۔ اس میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ اس دنیا میں مخالفین حق کو جو دندنانے کا موقع دیا جاتا ہے یہ اترانے کی چیز نہیں ہے، یہ عارضی ڈھیل ہے۔ کل انھیں پتہ چلے گا کہ اصل کامیابی کس کو حاصل ہوتی۔

انجام کار کی کامیابی صرف اہل ایمان کا حصہ ہے

'اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ' اوپر والے ٹکڑے میں جو بات مبہم رہ گئی تھی وہ اس ٹکڑے میں صاف کر دی گئی۔ اوپر یہ فرمایا تھا کہ تم دیکھ لو گے کہ عاقبت کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوتی ہے۔ اب یہ بتا دیا کہ انجام کار کی کامیابی میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جو کافر و مشرک اور حق تلف و ناسپاس ہوں گے۔ یہ بات جس حقیقت پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کائنات اپنے وجود سے شہادت دیتی ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکیم و علیم اور عادل و رحیم کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ انجام کار کی کامیابی ان لوگوں کو بخشے جو ظلم و شرک کے مرتکب ہوئے۔

بات بالکل اصول کے رنگ میں

یہاں یہ پہلو خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ بات بالکل اصول کے رنگ میں فرمائی، من و تو کے انداز میں نہیں فرمائی۔ یہ نہیں فرمایا کہ انجام کار کی کامیابی ہمارا حصہ ہے یا آخرت میں فلاح ہم پائیں گے بلکہ صرف یہ فرمایا کہ آخرت کی فلاح میں ظالموں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ اسلوب بیان حکمت و دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت مؤثر ہے اور یہ اس خشیت و توکل پر بھی دلیل ہے جو انبیاء و صالحین کے اندر ہوتی ہے۔ جو چیز پردۂ غیب میں ہے، جس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے، جس کی راہ میں ابھی معلوم نہیں کتنی دشوار گزار گھاٹیاں پار کرنی اور کتنی پرخطر وادیاں قطع کرنی ہیں اس کے باب میں جو بات کہی جا سکتی ہے وہ اسی حد تک کہی جا سکتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر کوئی دعویٰ کرنا بندگی اور خشیت الٰہی کے خلاف ہے۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖۗ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (۱۳۶-۱۴۰)

مشرکین کی بعض بدعات کی تفصیل

اس سلسلۂ بحث کا آغاز، جیسا کہ آیات ۱۱۸-۱۲۱ سے معلوم ہوا، مشرکین مکہ کی ان بدعات کی تردید سے ہوا تھا جو اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت انھوں نے تحریم و تحلیل کی نوعیت کی ایجاد کی تھیں۔ اس تردید کے جواب میں انھوں نے جو ہنگامۂ بحث و جدال کھڑا کیا اس کے تقاضے سے بیچ میں بعض مناسب حالات ہدایات مسلمانوں کو دی گئیں اور بعض ضروری تنبیہات مشرکین کو سنائی گئیں۔ اب یہ ان بدعات کی تفصیل آ رہی ہے تاکہ مسلمان اپنے آپ کو ان نجاستوں سے محفوظ رکھیں۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا، یعنی باغ، کھیتی، چوپائے سب پیدا تو کیے خدا نے لیکن ان ظالموں نے ان میں سے خدا کا جو حصہ نکالا تو اس طرح کہ دوسرے شریکوں کے ساتھ ایک حصہ خدا کے لیے بھی الگ کر دیا۔ هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا، یہ اسی تقسیم کی تفصیل ہے کہ اس میں سے اتنا حصہ تو اللہ کا ہے اور اتنا حصہ ہمارے شریکوں اور معبودوں کا ہے۔ اس تقسیم کے متعلق فرمایا کہ بِزَعْمِهِمْ، یہ تمام تر ان کے وہم و گمان پر مبنی ہے لیکن دعویٰ یہ ہے کہ یہ شریعت ابراہیمی کا حکم ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ مشرکین عرب نہ صرف خدا کو مانتے تھے بلکہ ہر چیز کا خالق بھی خدا ہی کو تسلیم کرتے تھے اور اس کے نام کا ایک حصہ اپنی زمینی پیداوار میں سے بھی اور اپنے گلوں میں سے بھی خو

اور نذر و نیاز کے لیے الگ کرتے تھے۔ یہ چیز ان کے ہاں حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ چنانچہ حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق خود قرآن میں ہے وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۵۵ مریم (اور وہ اپنے اہل و عیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا) بعد میں جب ان کے اندر مشرکانہ بدعات پھیلیں تو جس طرح خدا کے دوسرے حقوق میں ان کے فرضی معبود شریک بن بیٹھے اسی طرح اس کے نام کی زکوٰۃ بھی انھوں نے اس کے فرضی شریکوں میں تقسیم کردی کہ اس میں سے اتنا حصہ فلاں کا اتنا فلاں کا۔

حماقت در حماقت

فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلٰى شُرَكَائِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ یہ ان کے ستم بالائے ستم یا ان کی حماقت در حماقت کا بیان ہے کہ اگر کوئی مجبوری یا مشکل پیش آ جائے تو خدا کا حصہ تو ان کے بتوں کی طرف منتقل ہو سکتا تھا لیکن مجال نہیں تھی کہ بتوں کا حصہ کسی حال میں خدا کی طرف منتقل ہو سکے۔ گویا حق مرجّح بتوں اور شریکوں ہی کا تھا۔ قرآن نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں اور شریکوں سے خدا کے بالمقابل زیادہ محبت کرتے ہیں۔ یہ چیز کچھ مشرکین مکہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تمام مشرک قوموں کی مشترک خصوصیت بلکہ خود شرک کی فطرت ہے۔ مشرکین جن چیزوں کو خدا کا شریک بناتے ہیں ظاہر ہے کہ اس خیال سے بناتے ہیں کہ ان کی تمام لقدضروریات انہی سے وابستہ ہیں اور اگر خدا سے کوئی ضرورت وابستہ ہے بھی تو بہر حال وہ بھی انہی کی وساطت سے پوری ہوتی ہے یہاں تک کہ اگر خدا نہ بھی پوری کرنی چاہے جب بھی اگر یہ چاہیں تو پوری کرا ہی لیتے ہیں۔ اس خیال کے ہوتے ظاہر ہے کہ خدا کی اہمیت کچھ باقی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ ان مشرکین کے نزدیک بھی خدا کی حیثیت نعوذ باللہ گھر کے ایک بڑے بوڑھے ناکارہ وجود سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ وہ اسی حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ بھی کرتے تھے۔ اس کے نام پر روایت کے تحت کچھ نکال تو دیتے لیکن اگر اتفاق سے کسی بت کے نام کی بکری مر گئی یا چوری ہو گئی یا اس کے نام کا غلہ چوہے کھا گئے تو اس کی تلافی لازمًا خدا کے حصے میں سے کر دی جاتی اور اگر اسی قسم کی کوئی آفت خدا کے نام پر نکالے ہوئے حصہ پر آ جاتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ اس کی تلافی معبودوں کے حصے کے مال سے کرنے کی جرأت کریں۔ فرمایا کہ کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں! اول تو سب کچھ بخشا ہوا خدا کا اور اس کے حصہ میں یہ من مانا بٹوارہ! پھر فرضی معبودوں کی یہ نازبرداری اور معبود حقیقی سے یہ بے پروائی اور اس کی یہ ناقدری۔

غضب کی بھوتوں کی خوشنودی کے لیے قتل اولاد

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ یعنی ان کے یہ شرکا صرف مالوں ہی میں حصہ دار نہیں ہیں بلکہ خدا کی بخشی ہوئی جانوں میں بھی حصہ دار بنا دیے گئے ہیں۔ بہت سے مشرکین ان کی خوشنودی کے لیے اپنی اولاد بھی ان کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ ہم آیت ۰۰ کے تحت بیان کر آئے ہیں کہ یہ سنگین جرم بعض مزعومہ سرکش جن بھوتوں کو راضی رکھنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ غالبًا سخت قسم کے جاہل مشرکین اس وہم کے تحت کہ فلاں دادی یا فلاں دیوتا کے جن کو انھوں نے اپنی کسی اولاد کی نذر دے کر راضی نہ رکھا تو وہ ان کی ساری اولاد یا ان کے سارے خاندان پر آفت لائے گا یہ حرکت کرتے تھے۔

اس قسم کے اوہام تمام مشرک اور وہم پرست قوموں کے اندر پہلے بھی موجود رہے ہیں اور زمانہ کی ترقی کے باوجود اب بھی بعض قوموں کے نچلے طبقات میں پائے جاتے ہیں۔ ان اوہام کے پختہ کرنے میں شیاطین جن کے ان ایجنٹوں کو بڑا دخل ہوتا ہے جو انسانوں میں سے ان کے مریدین جاتے ہیں۔ عرب جاہلیت میں جہاں جہاں بھوتوں کے تھان اور استھان تھے ان کے پروہت، کاہن اور مجاور اپنی طرف رجوع کرنے والے سادہ لوحوں کو ورغلاتے کہ فلاں جن تم پر بڑا غضب ناک ہے، اگر تم نے اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کی قربانی دے کر اس کو راضی نہ کیا تو وہ تمہارے سارے خاندان کو چٹ کر جائے گا۔ بے وقوف لوگ ان کے چکمے میں آکر یہ بیدردانہ اور سنگدلانہ جرم کر بیٹھتے اور اس طرح اپنے دین اور اپنی دنیا دونوں برباد کرتے۔

دین اور دنیا دونوں کی بربادی

لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ، ’دِيْنَهُمْ‘ (ان کے دین) سے مراد وہ دین ہے جو ان کو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ سے وراثت میں ملا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ شیاطین جن و انس نے سادہ لوحوں اور کم عقلوں کو اس جال میں پھنسا کر ان کو مادی و روحانی دونوں قسم کی ہلاکتوں میں مبتلا کیا۔ ایک طرف ان کو اولاد جیسی نعمت سے محروم کیا، دوسری طرف ابراہیمؑ کا سکھایا ہوا سیدھا سادا فطری دین ان کے لیے ایک گورکھ دھندا بن کے رہ گیا۔

ہدایت وضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ، یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ اگر یہ اپنی ان حماقتوں اور سنگدلانہ حرکتوں کی حمایت میں تم سے لڑتے جھگڑتے ہیں، تمہاری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے من گھڑت فتنوں میں پڑے رہنے دو۔ تمہارا کام کسی کو باندھ کر راہ پر لگانا نہیں ہے۔ اللہ نے اس دنیا میں باطل کو بھی مہلت دی ہے جو باطل پر جمے رہنا چاہتے ہیں خدا ان کو ان کے باطل ہی پر چھوڑ دیتا ہے۔ ہدایت وضلالت کے معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے۔ اگر وہ اپنی مشیت کے زور سے لوگوں کو ہدایت پر لانا چاہتا تو یہ سب ہدایت پر ہوتے، کوئی بھی اس گمراہی پر جما نہ رہ سکتا۔ جب یہ سنتِ الٰہی ہے تو تم ان کی اس ہٹ دھرمی سے کیوں پریشان ہو۔

پروہتوں کی من گھڑت شریعت

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ، ’حِجْرٌ‘ کے معنی ممنوع کے ہیں۔ لیکن یہ لفظ عرب جاہلیت کی ایک دینی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو کسی دینی رسم کے تحت ممنوع (TABOO) ہو۔ اسلامی اصطلاح اس کے لیے حرام کی ہے۔ یہ ان کے تھانوں اور استھانوں کے پروہتوں اور مجاوروں کے من گھڑت فتوے نقل ہو رہے ہیں۔ ان کے ہاں زمینی پیداوار اور چوپایوں کے جو چڑھاوے پیش ہوتے ان کے کھانے کے باب میں چڑھاوے کی نوعیت کے اعتبار سے بڑی بڑی قیدیں اور پابندیاں تھیں۔ مثلاً مرد کھا سکتے ہیں، عورتیں نہیں کھا سکتیں، یا بیوہ کھا سکتی ہے سہاگن یا کنواری نہیں ہاتھ لگا سکتی یا اس کے برعکس۔ اس قسم کی حماقتیں ہمارے ہاں بھی بدعتی گھرانوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ فتوے چونکہ تمام تر ان پروہتوں کی خود ساختہ شریعت پر مبنی تھے اور وہی اس کے عالم بھی تھے اس وجہ سے نہ کوئی دوسرا اس میں اپنا کوئی اتول لگا سکتا تھا نہ سرِمو اس

سے انحراف اختیار کر سکتا تھا۔ ان کے اسی تحکم کو اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ۔ بعض قسم کے جانوروں پر سواری کرنا ناجائز تھا۔ اس کی بعض مثالیں مائدہ آیت ۱۰۳ کے تحت گزر چکی ہیں۔ بعض قسم کی نذروں اور چڑھاوؤں پر ان کے ذبح کے وقت خدا کا نام نہیں لیتے تھے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اہل عرب ملت ابراہیم کی روایات کے زیر اثر ذبح کے صحیح طریقے سے آشنا تھے اور ذبح کے وقت وہ خدا کا نام بھی لیتے تھے لیکن مشرکانہ رسوم وعقائد کے غلبہ نے ان کو اس طریقہ سے ہٹا کر ایک بالکل غلط راہ پر ڈال دیا۔ ازاں جملہ یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ بعض قسم کے چوپایوں پر وہ خدا کا نام لینا اپنی مشرکانہ شریعت کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کی یہ ساری خرافات مبنی تو تھیں ان کے مشرکانہ اوہام پر لیکن جس طرح وہ اپنی ساری ہی حماقتوں کو اللہ کی تعلیم کی طرف منسوب کرتے اسی طرح ان حماقتوں کو بھی اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے اس وجہ سے قرآن نے اس کو افترا سے تعبیر فرمایا اور دھمکی دی کہ اللہ عنقریب ان کو اس افترا کی سزا دے گا۔

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ۔ یہ بھی انہی خانہ ساز فتووں کے قسم کی ایک بات ہے۔ بعض چوپایوں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچوں کے متعلق مشرکانہ توہمات کے تحت ان کا فتویٰ یہ تھا کہ مردوں کے لیے ان کا کھانا جائز ہے، عورتوں کے لیے ناجائز۔ ہاں اگر بچہ مردہ پیدا ہو تو اس کے کھانے میں مرد عورت دونوں شریک ہو سکتے ہیں۔ فرمایا کہ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ، یہ جو من مانے فتوے دیے جا رہے ہیں اللہ ان کو عنقریب اس کا بدلہ دے گا۔ اس کے علم وحکمت کے یہ بات منافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو سزا نہ دے جو اس جسارت کے ساتھ اس کے نام پر شریعت سازی کے کارخانے کھول لیں۔ اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ ان لوگوں سے نمٹنے میں جو دیر ہو رہی ہے یہ اس کے علم وحکمت پر مبنی ہے۔ خدا کے ہاں دیر ہے لیکن اندھیر نہیں۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ۔ یہ ان تمام حماقتوں پر جو اوپر مذکور ہوئیں اور ان کے مرتکبین کی بدانجامی پر اظہار افسوس ہے کہ بغیر کسی خدائی سند کے محض حماقت سے، اللہ پر افترا کر کے انھوں نے اپنی اولادوں کو قتل کیا اور اللہ کے بخشے ہوئے رزق کو اپنے اوپر حرام کیا۔ ان کی بدبختی و نامرادی میں کیا شبہ کی گنجائش ہے۔ یہ لوگ راہ حق سے بھٹکے اور اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے ان کو اپنی راہ دکھائی تو اپنی بدبختی کے سبب سے اس کو اختیار کرنے والے نہ بنے۔ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۔

۲۱۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۴۱-۱۶۵

آگے ان بدعات کی تردید فرمائی ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔ اس تردید کے کئی پہلو ہیں۔

اوّل یہ کہ زمین کی پیداوار ہو یا مال مویشی، سب خدا ہی نے پیدا کیے ہیں اور اسی کی عنایت سے تمھیں ملے ہیں۔ تو ان سے فائدہ اٹھاؤ، خدا کا شکر ادا کرو، ان میں سے خدا کا حق ادا کرو اور شیطان کی پیروی میں اپنے جی سے، مشرکانہ توہمات کے تحت، حلال و حرام نہ ٹھہراؤ، شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

دوسرا یہ کہ تمام چوپایوں میں سے نر و مادہ دونوں کو لے کر ایک ایک سے متعلق سوال کیا ہے کہ بتاؤ ان میں سے نر حرام ہے یا مادہ اور مطالبہ کیا کہ کسی سند سے یہ ثابت کرو کہ ان چوپایوں میں سے کوئی ایک بھی ملّتِ ابراہیمؑ میں حرام تھا۔ جب ان میں سے کسی کی حرمت تم کسی دلیل سے ثابت نہیں کر سکتے تو انہی کی نسل سے پیدا شدہ جانوروں میں سے کوئی حرام اور کوئی حلال کس طرح بن جائے گا؟ آخر ایک ہی درخت کے کچھ پھل جائز اور کچھ ناجائز ہونے کے کیا معنی؟

تیسرا یہ کہ ملّتِ ابراہیمؑ کے حلال و حرام سے متعلق جو وحی مجھ پر آئی ہے اس میں تو فلاں فلاں چیزوں کے سوا اور کسی چیز کی حرمت کا ذکر نہیں ہے۔ یہود پر جو چیزیں حرام ہوئیں وہ بھی وہی ہیں جو ملّتِ ابراہیمؑ میں حرام تھیں بجز ان چیزوں کے جو ان کی سرکشی کے نتیجے میں ان پر حرام کی گئیں۔

اس کے بعد ملّتِ ابراہیمؑ کی بنیادی تعلیمات کا حوالہ دیا اور فرمایا کہ اسی صراطِ مستقیم کی تمھیں دعوت دی جا رہی ہے تو اسی سے منحرف ہو کر گمراہی کی وادیوں میں نہ بھٹکو۔ اس کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کو جو شریعت عطا ہوئی اس کا حوالہ دیا کہ وہ بھی ان کے لیے، جنھوں نے اس کو صحیح طریقہ پر قبول کیا، اسی راہ کی طرف رہنمائی کرنے والی تھی۔

اس کے بعد اس احسانِ عظیم کا ذکر فرمایا جو اس قرآن کو نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب پر کیا اور یہ تنبیہ فرمائی کہ یہ کتاب اتار کر اللہ نے تم پر حجت تمام کر دی ہے۔ اب تمھارے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا ہے۔ اگر اس کو ماننے کے لیے عذاب کے منتظر ہو تو یاد رکھو کہ عذاب آ جانے پر جو ایمان لایا جاتا ہے وہ نافع نہیں ہوا کرتا۔

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا کہ خدا نے مجھے تو ملّتِ ابراہیمؑ کی ہدایت بخش دی۔ میری نماز، قربانی، زندگی اور موت سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ تم میں سے جو یہ راہ اختیار کرنی چاہے، اختیار کرے ورنہ خدا کے حضور جواب دہی کے لیے تیار رہے۔ وہاں ہر ایک کو اپنی جواب دہی خود کرنی ہے۔ کوئی دوسرا اس کے بوجھ کو اٹھانے والا نہ ہوگا۔ ساتھ ہی قریش کو تنبیہ فرمائی کہ تم پہلی قوم نہیں ہو جو دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہوئی ہو۔ تم سے پہلے بھی قومیں آ چکی ہیں اور اپنی سرکشیوں کے نتیجہ میں کیفرِ کردار کو پہنچ چکی ہیں۔ اگر ان کے جانشین ہو کر تم نے بھی وہی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمھارے معاملے میں سنّتِ الٰہی بدل جائے۔ تم بھی اسی انجام کو پہنچو گے جس کو وہ پہنچیں ــــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ آيات
وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ ۱۴۱ - ۱۶۵
غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ
حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ وَمِنَ
الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ
مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ
اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ
بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ
اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ
اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ
عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ ع ۱۷ ۴
اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ
دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ
لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ
وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ

أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿١٤٦﴾
فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ
الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٤٧﴾ سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا
أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ
مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ
فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ﴿١٤٨﴾
قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٤٩﴾
قُلْ هَلُمَّ شُهَدَاءَكُمُ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ اللَّهَ حَرَّمَ هَٰذَا ۖ
فَإِنْ شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ كَذَّبُوا
بِآيَاتِنَا وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ ﴿١٥٠﴾ ع ١٨ ٥
قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ ۖ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ
نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۖ
وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ
بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٥١﴾ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي
هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ
لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ

تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا
السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِیْۤ اَحْسَنَ
وَتَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ
یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ ۱۹ ع ۲
تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَیْنِ مِنْ
قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِیْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ
عَلَیْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ
وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِی الَّذِیْنَ یَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰیٰتِنَا سُوْٓءَ
الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا یَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ
تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ یَاْتِیَ رَبُّكَ اَوْ یَاْتِیَ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ ؕ یَوْمَ
یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ
مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِیْۤ اِیْمَانِهَا خَیْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْۤا اِنَّا
مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ
مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا
یَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ
بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ قُلْ اِنَّنِیْ

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ
وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ
وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ
شَیْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ
ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾
وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ
دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖ ۗ
ع ۲۰ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۶۵﴾

ترجمۂ آیات ۱۴۱-۱۶۵

اور وہی خدا ہے جس نے باغ پیدا کیے، کچھ ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں کچھ نہیں چڑھائے جاتے۔ اور کھجور اور کھیتی پیدا کی مختلف النوع پیداوار کی۔ اور زیتون اور انار باہمدگر ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ان کے پھلوں سے فائدہ اٹھاؤ جب وہ پھلیں اور اس کی کٹائی کے وقت اس کا حق ادا کرو اور اسراف نہ کرو۔ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور اس نے چوپایوں میں بڑے قد کے بھی پیدا کیے اور چھوٹے قد کے بھی تو اللہ نے جو کچھ تمھیں بخشا ہے ان سے فائدہ اٹھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ۱۴۱-۱۴۲

چوپایوں کی آٹھوں قسموں کو لو، بھیڑوں میں سے نر و مادہ دو اور بکریوں میں سے نر و مادہ دو، پھر ان سے پوچھو کہ ان دونوں کے نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادینوں

کو یا اس بچے کو جو ان مادینوں کے رحم میں ہے؟ اگر تم سچے ہو تو کسی سند کے ساتھ مجھے بتاؤ۔ اسی طرح لو اونٹوں میں سے نر و مادہ دو اور گائے بیل میں سے نر و مادہ دو، پھر پوچھو کہ ان دونوں کے نروں کو حرام ٹھہرایا ہے یا ان کی ماداؤں کو یا اس بچے کو جو ماداؤں کے پیٹ میں ہے؟ کیا تم اس وقت موجود تھے جب اللہ نے تمھیں اس کی ہدایت فرمائی؟ تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے بغیر کسی علم کے۔ بے شک اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۱۴۲-۱۴۴

کہہ دو، میں تو اس وحی میں جو مجھ پر آئی ہے کسی کھانے والے پر کوئی چیز جس کو وہ کھائے حرام نہیں پاتا بجز اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت کہ یہ چیزیں بے شک ناپاک ہیں یا فسق کر کے اس کو غیر اللہ کے لیے نامزد کیا گیا ہو۔ اس پر بھی جو مجبور ہو جائے، نہ چاہنے والا بنے اور نہ حد سے بڑھنے والا تو تیرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ۱۴۵

اور جو یہودی ہوئے ان پر ہم نے سارے ناخن والے جانور حرام کیے اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے وابستہ یا کسی ہڈی سے لگی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی اور ہم بالکل سچے ہیں۔ پس اگر وہ تمھیں جھٹلائیں تو کہہ دو کہ تمھارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب مجرموں سے ٹالا نہ جا سکے گا۔ ۱۴۶-۱۴۷

جنھوں نے شرک کیا وہ کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کرتے۔ اسی طرح جھٹلایا ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے گزرے یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھا۔ پوچھو تمھارے پاس ہے اس کی کوئی

سند کہ تم اس کو ظاہر کر سکو۔ تم محض گمان کی پیروی کر رہے ہو اور محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہو۔ کہہ دو کہ اللہ کے لیے تو بس حجت ہے پہنچ جانے والی اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ کہو، لاؤ اپنے ان گواہوں کو جو شاہد ہیں کہ اللہ نے فلاں چیز حرام ٹھہرائی ہے۔ پس اگر وہ شہادت دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دیجیو اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیو جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں۔ ۱۴۸-۱۵۰

کہو، آؤ میں سناؤں جو چیزیں تم پر تمھارے رب نے حرام کی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ تم کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی، اور بے حیائی کے کاموں کے پاس نہ پھٹکو، خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ اور جس جان کو اللہ نے حرام ٹھہرایا اس کو قتل نہ کرو مگر حق پر۔ یہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمھیں ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم سمجھو اور یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو بجز اس طریقے کے جو اس کے لیے بہتر ہو یہاں تک کہ وہ سن رشد کو پہنچ جائے اور ناپ، تول انصاف کے ساتھ پوری رکھو۔ ہم کسی جان پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ اور جب تم بولو تو عدل کی بات بولو، خواہ کوئی تمھارا قرابت دار ہی ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جن کی اس نے تمھیں ہدایت فرمائی تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو اور یہ کہ یہی میرا راستہ سیدھا راستہ ہے تو اس کی پیروی کرو اور دوسری پگڈنڈیوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کی راہ سے الگ کر دیں۔ یہ باتیں ہیں جن کی تمھیں ہدایت فرمائی تاکہ اس کے غضب سے بچو۔ ۱۵۱-۱۵۳

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اپنی نعمت پوری کرنے کے لیے اس پر جو خوب کار
تھا اور ہر بات کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت تاکہ وہ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان
لائیں۔ ۱۵۴

اور یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے سراپا خیر و برکت، تو اس کی پیروی کرو اور ڈرو
تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ مبادا تم کہو کہ کتاب بس ان دو گروہوں پر اتاری گئی جو ہم سے
پہلے تھے اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر رہے یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری
جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ سو تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے
ایک واضح حجت اور ہدایت و رحمت آگئی تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات
کو جھٹلائیں اور ان سے دوسروں کو پھیریں۔ جو لوگ ہماری آیات سے اعراض اختیار کر رہے
ہیں ہم ان کو اس اعراض کی پاداش میں عنقریب نہایت برا عذاب دیں گے۔ وہ صرف اس بات کے
منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہو، جس
دن تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہوگی تو کسی ایسے کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا جو پہلے سے ایمان
نہ لایا ہو یا اس نے اپنے ایمان میں نیکی نہ کمائی ہو۔ کہہ دو تم انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہی ہیں۔
۱۵۵ - ۱۵۸

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ بن گئے تمھارا ان سے کوئی
سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ بس اللہ کے حوالہ ہے۔ وہی ان کو جمع کرے گا پھر انھیں بتائے گا
جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ جو نیکی لے کر آئے گا تو اس کو اس کا دس گنا بدلہ ملے گا اور جو برائی
لے کر آئے گا تو اس کو بس اسی کے مثل بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔ ۱۵۹ - ۱۶۰

کہہ دو، میرے رب نے میری رہنمائی ایک سیدھے رستے کی طرف فرما دی ہے۔ دین قیم

ابراہیم کی ملت کی طرف جو یکسو تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔ کہہ دو میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں اور مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں پہلا مسلم ہوں۔ پوچھو، کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بناؤں جب کہ وہی ہر چیز کا رب ہے اور ہر جان جو کمائی کرتی ہے وہ اسی کے کھاتے میں پڑتی ہے اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ پھر تمھارے رب ہی کی طرف تمھارا لوٹنا ہوگا پس وہ تمھیں بتائے گا وہ چیز جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کیے تاکہ جو کچھ اس نے تمھیں بخشا ہے اس میں تم کو آزمائے، بے شک تیرا رب جلد پاداش عمل دینے والا بھی ہے اور وہ بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔ ۱۶۱-۱۶۵

۲۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَهُوَ الَّذِیٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ ۖؗ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۝ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝ (۱۴۱-۱۴۲)

وَهُوَ الَّذِیٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ یعنی کھیتی اور باغ سب پیدا کیے ہوئے تو خدا کے ہیں تو ان میں تم نے دوسرے دیویوں، دیوتاؤں کو کس حق کی بنا پر شریک بنا ڈالا؟ 'مَعْرُوْشٰتٍ' سے مراد انگور وغیرہ ہیں جن کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں، 'غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ' سے وہ چیزیں مراد ہیں جو ٹٹیوں کی محتاج نہیں ہوتیں۔ انگور کی بیلوں کی مناسبت سے میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ 'غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ' وہ بیلیں ہیں جو زمین ہی پر پھیلتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔ مثلاً خربوزے، تربوز، ککڑیاں، کھیرے وغیرہ۔ سورہ عبس میں 'عِنَبًا' اور 'قَضْبًا' دو چیزوں کا جمع کیا ہے۔ 'عِنَب' انگور کو کہتے ہیں اور 'قَضْب' ان سبزیوں کے لیے معروف ہے جو تازہ حالت میں کھائی جاتی ہیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں باغوں اور کھیتیوں کی گوناگونی و بوقلمونی، ان کی پیداوار کے تنوع اور ان کے انواع و اقسام کے اختلاف و تعدد کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے جس سے مقصود بعض حقائق کی طرف توجہ دلانا ہے۔

اشیائے کائنات کی شہادت زبانِ حال سے

ایک یہ کہ جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے وہ بڑا ہی جواد و کریم، فیاض و مہربان، سخی اور بندہ نواز ہے۔ اس نے بندوں میں رزق کی احتیاج رکھی تو یہ نہیں کیا کہ جیسا تیسا پیٹ بھرنے کا سامان پیدا کر دیا ہو بلکہ الوانِ نعمت کے انبار لگا دیے۔ باغ اگائے تو گوناگون قسم کے، کھجوریں اور غلے پیدا کیے تو بے شمار اقسام کے، زیتون، انار اور دوسرے پھل پھول عنایت کیے تو نت نئے انواع کے۔ آخر محض زندگی باقی رکھنے کے لیے تو یہ تنوعات، یہ بوقلمونیاں، شکلوں، رنگوں، ذائقوں اور مزوں کی یہ رنگ آرائیاں و رعنائیاں ناگزیر نہیں تھیں لیکن اس دنیا کے خالق نے بغیر اس کے کہ اس کی کوئی ضرورت ہم سے وابستہ ہو ہمارے لیے اتنا وسیع دسترخوان بچھایا کہ ہم اس کے لذائذ کے انواع و اقسام گننا چاہیں تو گن نہیں سکتے۔ سوچنے والوں کے لیے سوچنے کی بات ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ انسان یہ جانے کہ اس کا رب منعم و کریم اور فیاض و مہربان ہے جس نے بلا کسی استحقاق کے اس کے لیے یہ سارے سامان مہیا فرمائے ہیں اور پھر اس کا فطری اثر اس کے دل پر یہ طاری ہو کہ وہ اس کا شکر گزار بندہ بنے اور اس کا حق پہچانے۔ یہی شکر گزاری کا جذبہ اور حق شناسی کا احساس ہے جو تمام دین و شریعت کی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، بنیاد ہے۔

دوسری یہ کہ پروردگاری اور ربوبیت کا یہ سارا ساز و سامان، جس سے ہم بلا استحقاق فائدہ اٹھا رہے ہیں، ہمارے اوپر ایک بہت بھاری ذمہ داری عاید کرتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم ان سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ جس نے یہ سب کچھ ہمارے لیے بنایا ہے ضرور ہے کہ وہ ایک دن ایسا بھی لائے جس میں ہم سے ایک ایک نعمت کے متعلق سوال کرے کہ جس کے خوانِ نعمت سے ہم نے یہ فائدے اٹھائے اس کی وفاداری کا حق ادا کیا یا نہیں اور پھر اسی کے لحاظ سے وہ ہم کو جزا یا سزا دے۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ ہر حق اور ہر تمتع کے ساتھ ذمہ داری اور ہر (PRIVILEGE) کے ساتھ (RESPONSIBILITY) لازمی ہے۔ ان دونوں کا لازم و ملزوم ہونا انسانی فطرت کے بدیہیات میں سے ہے۔ ہر حساس انسان اس کو تسلیم کرتا ہے۔ صرف لئیم، کمینہ اور بلید لوگ ہی ہو سکتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں سے فائدہ تو اٹھائیں لیکن ان کے جواب میں کوئی ذمہ داری محسوس نہ کریں۔

تیسری یہ کہ اس کائنات میں کثرت کے اندر وحدت، گوناگونی کے اندر ہم آہنگی، اختلاف کے اندر سازگاری، ہر گوشے میں نمایاں ہے۔ مٹی، پانی، ہوا ایک ہی لیکن اشیا گوناگون قسم کی، رنگ مختلف قسم کے، مزے، خوشبو، قد و قامت الگ الگ۔ پھر یہ سب انسان کے لیے نعمت و برکت، غذا اور لذت ہیں۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس خالق نے ہمارے جسم کے اندر گلوکوز اور فولاد کا تقاضا ودیعت کیا اسی نے انار اور انگور کے دانوں کے اندر رس بھرے۔ جس نے ہماری زبان کے اندر مختلف ذائقے ودیعت کیے اسی نے ان اشیا کے اندر مختلف مزے پیدا کیے۔ جس نے ہماری نگاہوں کو حسن و جمال کا ذوق بخشا اسی نے ہر چیز کو حسن و رعنائی، دلکشی و دلربائی کا پیکر بنا دیا۔ قرآن نے یہاں اشیا کے ظاہری تضاد و اختلاف کے اندر اسی وحدتِ مقصد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہ چیز اس کائنات کے خالق اور اس کے متصرف کی توحید کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ پیچھے آیات ۹۹-۱۰۱ کے تحت بھی بعض اشارے گزر چکے ہیں۔ مزید تفصیل کے طالب ہماری کتابیں 'حقیقتِ شرک' اور 'حقیقتِ توحید' پڑھیں۔ ان میں ہم نے ان مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ، یہ تعلیم تمام نعمتیں اپنی زبانِ حال سے بھی دے رہی ہیں اور یہی تعلیم خدا اور اس کے نبیوں اور رسولوں نے بھی دی ہے اور یہی ان نعمتوں کا وہ حق بھی ہے جس کی شہادت خود ہماری فطرت دیتی ہے بشرطیکہ وہ مسخ نہ ہو گئی ہو۔ یعنی اللہ کی بخشی ہوئی ان کھیتیوں اور ان باغوں سے خود فائدہ اٹھاؤ اور جب فصلوں کے کاٹنے اور پھلوں کے توڑنے کا وقت آئے تو ان کا حق ادا کرو۔ 'حَقَّهُ' میں ضمیر کا مرجع خدا بھی ہو سکتا ہے اور ثمر بھی لیکن دونوں صورتوں میں باعتبار مفہوم کچھ زیادہ فرق نہ ہوگا۔ ہر نعمت جو اللہ تعالیٰ عنایت فرماتا ہے اس کا ایک حق واجب یہ ہے کہ جس کو یہ نعمت ملی وہ اس میں ان لوگوں کو بھی شریک کرے جو اس سے محروم ہیں۔ یہ اس نعمت کی شکرگزاری کا حق ہے۔ یہی حق ہے جس کو اللہ تعالیٰ کا حق کہا جاتا ہے۔ اس حق کا شعور انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے جب سے انسان پایا جاتا ہے، تمام بھلے انسانوں کے اندر اس حق کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ حضرت آدم کا بیٹا ہابیل اپنی بھیڑوں بکریوں کا جو نذرانہ خداوند کے لیے لایا تھا وہ اسی حق کی ادائیگی کے لیے لایا تھا۔ یہی حق ہے جس کی ادائیگی کے لیے اسرائیلی شریعت میں بھی اور پھر اسلام میں بھی زکوٰۃ کا ایک باقاعدہ نظام قائم ہوا۔

حق زکوٰۃ پیداوار پر ہے۔

'يَوْمَ حَصَادِهِ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس حق کی ادائیگی فصل کے دِرَو کے وقت اس کے حاصل سے ہونی چاہیے۔ اس کی علت یہ ہے کہ یہ حق درحقیقت اس نعمت الٰہی کا شکرانہ ہے جو کسان کو حاصل ہوتی۔ اسی وجہ سے اسلام نے زکوٰۃ کا حق پیداوار پر رکھا ہے۔ یہی بات عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ اس زمانے میں دوسری قوموں کی نقالی میں مسلمانوں نے بھی ایک بالکل غیر اسلامی مالیاتی نظام اختیار کر لیا ہے اس وجہ سے مسلمان حکومتیں زکوٰۃ کے بجائے ٹیکس وصول کرتی ہیں۔ یہ چیز اس برکت اور اس عدل سے بالکل خالی ہے جو اسلام کے نظامِ زکوٰۃ میں ہے۔

'مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ' میں ضمیر ہرچند واحد ہے لیکن مراد وہ ساری ہی چیزیں ہیں جو مذکور ہوئیں۔ اس طرح

زکوٰۃ سے کوئی پیداوار مستثنیٰ نہیں

متعدد چیزیں ذکر کرنے کے بعد جب ضمیر یا فعل واحد لاتے ہیں تو مقصود ان میں سے ایک ایک چیز کا حکم فرداً فرداً بیان کرنا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ہر پیداوار پر خدا کا حق ہے، خواہ کوئی شے بھی ہو اس سے استثنا کسی شے کا نہیں بلکہ ایک خاص مقدار کا ہے۔ شریعت نے ایک خاص حد تک کی پیداوار، پیدا کرنے والے کی ضروریات کا لحاظ کر کے اس حق سے مستثنیٰ کر دی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ مقدار کیا ہے تو اس کا تعلق فقہ سے ہے اور یہ بات تفصیل طلب ہے جس کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے[1]۔

'اِذَآ اَثۡمَرَ' کا تعلق صرف 'کُلُوۡا' سے نہیں ہے بلکہ 'کُلُوۡا' اور 'اٰتُوۡا حَقَّہٗ' دونوں سے ہے۔ یعنی جس طرح پیداوار سے استمتاع منحصر ہے پیداوار حاصل ہونے پر اسی طرح اس کے حق شرعی کی ادائیگی واجب ہے اُس کے پیدا ہونے اور کھیت سے کھلیان تک پہنچنے پر۔ اس سے یہ حقیقت مزید مؤکد ہو گئی کہ اس حق کا اصل تعلق پیداوار سے ہے نہ کہ زمین سے۔ چنانچہ اسی اصول پر اسلام کا نظام زکوٰۃ ہے۔

ادائے حقوق کے لیے اسراف کی ممانعت

'وَلَا تُسۡرِفُوۡا اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ' یہ ادائے حق کے ساتھ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت سورۂ بنی اسرائیل میں بعینہٖ اسی سیاق میں وارد ہوئی ہے۔ فرمایا ہے وَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰی حَقَّہٗ وَالۡمِسۡکِیۡنَ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ وَلَا تُبَذِّرۡ تَبۡذِیۡرًا ہ اِنَّ الۡمُبَذِّرِیۡنَ کَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّیٰطِیۡنِ وَکَانَ الشَّیۡطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوۡرًا (۲۶-۲۷ بنی اسرائیل) (اور قرابت مند، مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو اور فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے) اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ حقوق کی ادائیگی کا انحصار اس امر پر ہے کہ آدمی اپنی ضروریات و خواہشات کے معاملے میں معتدل، کفایت شعار اور میانہ رو ہو۔ جو شخص مسرف اور فضول خرچ ہو اس کے اپنے ہی شوق پورے نہیں ہو پاتے، وہ دوسروں کے حقوق کیا ادا کرے گا۔ شیطان ارباب مال پر سب سے زیادہ حملہ اسی راہ سے کرتا ہے۔ وہ ان کو طرح طرح کی آرزوؤں اور خواہشوں میں پھنساتا ہے اور وہ ان خواہشات و تعیشات کے ایسے غلام ہو جاتے ہیں کہ ان کے نزدیک ان کا درجہ ضروریات سے بھی کچھ بڑھ کر ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بھلا کس طرح سوچ سکتے ہیں کہ جس مال میں ان کے یہ اللّے تللّے ہیں اس میں خدا کے دوسرے بندوں کے بھی حقوق ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے کُتّے، باز، شکرے تو آسودہ رہتے ہیں لیکن ان کے پڑوسی بھوکے سوتے ہیں۔

حمولۃ اور فرش کی تحقیق

'وَمِنَ الۡاَنۡعَامِ حَمُوۡلَۃً وَّفَرۡشًا' 'حَمُوۡلَۃ' رکوبہ، اور حلوبہ کے وزن پر ہے اور اس سے مراد وہ چوپائے ہیں جو سواری و بار برداری کے لیے موزوں ہیں۔ مثلاً اونٹ، گھوڑے، خچر وغیرہ۔ الابل التی تحمل وکل ما احتمل علیہ القوم من ابیر، حمار و نحوہا۔

---

[1] فقہا بعض چیزوں کو اموال زکوٰۃ میں شمار نہیں کرتے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر وہ شے نہایت محدود مقدار میں محض گھریلو استعمال کے حد تک پیدا کی جاتی ہو تب تو بے شک وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہونی چاہیے لیکن اگر انھی چیزوں میں سے کوئی چیز کوئی زمیندار بڑے پیمانہ پر کاشت کرے یا وہی چیز کسی علاقہ یا ملک کی عام پیداوار کی حیثیت رکھتی ہو یا حاصل کرے تو آخر وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ کیوں رہے گی؟

'الفرش' اس زمین کو بھی کہتے ہیں جہاں نباتات کی کثرت ہو۔ اس کھیتی کو بھی کہتے ہیں جو ابھی اپنے ڈنٹھلوں پر کھڑی نہ ہوئی ہو اور حیوانات کے تعلق سے یہ لفظ آئے تو اس سے مراد وہ چھوٹے جانور ہوتے ہیں جو سواری یا بار برداری کے لیے موزوں نہیں ہیں، صرف ذبح یا دوسری ضروریات ہی کے لیے موزوں ہیں، مثلاً بکریاں، بھیڑیں وغیرہ۔ قرینہ دلیل ہو تو اس میں چھوٹے اونٹ اور گائے بیل بھی شامل ہو جاتے ہیں لیکن یہاں یہ لفظ 'حَمُوْلَۃً' کے مقابل میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے لازماً یہاں چھوٹے چوپائے ہی مراد ہوں گے۔

اوپر والی آیت میں 'جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ' کا ذکر فرمایا ہے۔ اب یہ اس کے مقابل میں چوپایوں کا ذکر فرمایا تو ان کو بھی دو بڑی قسموں — 'حَمُوْلَۃً' اور 'فَرْشًا' — میں تقسیم فرما دیا۔ زبان کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں نہایت حسین قسم کا تقابل ہے۔ 'حَمُوْلَۃً'، 'مَعْرُوْشٰتٍ' کا مقابل ہے، 'فَرْشًا'، 'غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ' کا۔ گویا جس طرح نباتاتی کھیتیوں اور باغوں میں قدرت نے ایسی بیلیں بھی پیدا کی ہیں جو ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں اور ایسی بھی جو زمین ہی پر پھیلتی ہیں، اسی طرح چوپایوں میں 'حَمُوْلَۃً' بھی ہیں جن کو قدرت نے اونچے ڈھانچوں پر کھڑا کیا ہے اور 'فَرْشًا' بھی ہیں جو زمین سے لگے ہی ہوئے چرتے چگتے پروان چڑھتے ہیں اور انسان کو اپنے گوشت، کھال، اُون، دودھ ہر چیز سے فائدہ پہنچاتے ہیں۔

اس لفظی تجانس کے ساتھ ساتھ اس معنوی تجانس پر بھی نگاہ رکھیے جو دونوں آیتوں میں یکساں موجود ہے۔ اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو نعمتیں پیدا کی ہیں ان کا ایک خاص پہلو ان کی گوناگونی اور بوقلمونی بھی ہے جس سے خدا کی ربوبیت، عنایت اور رحمت کی شہادت ملتی ہے اور یہ شہادت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، توحید اور جزا و سزا کی نہایت اہم آفاقی و انفسی دلیل ہے۔ اسی دلیل کی طرف یہاں بھی چوپایوں کے تنوع کا حوالہ دے کر اشارہ فرما دیا ہے اور یہ اشارہ فکرِ انسانی کے لیے ایک مہمیز ہے بشرطیکہ انسان غور کرنا چاہے۔

شیطان کے دو کامیاب حربے

'كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ' جس طرح اوپر والی آیت میں نعمتوں کے ذکر کے بعد ان کا حق یہ بیان فرمایا کہ 'كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ' اسی طرح ان چوپایوں کی نعمت کا حق یہ بیان فرمایا کہ 'كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ' کہ اللہ نے یہ نعمتیں جو تمھیں بخشی ہیں جن جن پہلوؤں سے تمھارے لیے نافع ہیں ان کو برتو، اپنے منعم کا شکر ادا کرو اور ان کے اندر جو خدا کا حق ہے وہ ادا کرو۔ یہ باتیں چونکہ سیاقِ کلام سے ظاہر ہیں، نیز اوپر ان کا ذکر ہو چکا تھا اس وجہ سے ان کی تصریح کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ شیطان کے فتنوں سے آگاہ فرما دیا کہ اس کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کیجیو اس لیے کہ وہ کھلم کھلا پہلے ہی الٹی میٹم دے چکا ہے کہ وہ تم کو فتنوں میں ڈالے گا تو تم اُس کے کہے پر اپنے جی سے حرام و حلال ٹھہراؤ گے اور خدا کے بخشے ہوئے چوپایوں کو بتوں کے نام پر نیاز اور قربانی کے طور پر پیش کرو گے، چنانچہ فرمایا ہے۔ 'وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ' (النساء ۱۱۹) اور شیطان نے کہا

میں تیرے بندوں میں سے ایک متعین حصہ ہتھیا کے رہوں گا، اور میں ان کو گمراہ کروں گا، ان کو آرزوؤں کے سبز باغ دکھاؤں گا اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے) اوپر والی نعمتوں کے سلسلے میں شیطان کی رہزنی اسراف و تبذیر کے پہلو سے بیان ہوئی۔ یہاں اس کی مشرکانہ وسوسہ اندازیوں کا ذکر ہوا اور شیطان کے یہ دونوں ہی حربے اولادِ آدم پر بڑے کارگر ثابت ہوتے ہیں۔

اس آیت میں 'اکل' یا 'رزق' کے الفاظ ان محدود معنوں میں نہیں استعمال ہوئے ہیں جن معنوں میں عام طور پر ہم لیتے ہیں۔ 'اکل' برتنے اور فائدہ اٹھانے کے مفہوم میں ہے اور 'رزق' ایک جامع تعبیر ہے بخشش الٰہی کی۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۙ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (١٤٣-١٤٤)

'ثمٰنیۃ' فعل محذوف سے منصوب ہے۔ عام طور پر لوگوں نے فعل ماضی محذوف مانا ہے لیکن ہمارے نزدیک قرینہ یہاں فعل امر کے محذوف ماننے کا ہے۔ تجزیہ کی وضاحت سے اس قرینے کی وضاحت ہو جائے گی۔

'زوج' کا لفظ جس طرح جوڑے کے لیے آتا ہے اسی طرح جوڑے کے ایک فرد کے لیے بھی آتا ہے۔ عربی ادب اور قرآن دونوں میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔

لفظ انعام کا اطلاق کن چوپایوں پر ہوتا ہے

پالتو چوپایوں میں سے جو گوشت یا دودھ وغیرہ کے لیے عرب میں پالے جاتے تھے چار معروف تھے۔ چھوٹے چوپایوں میں بھیڑ بکری، بڑے چوپایوں میں اونٹ گائے[1]۔ انعام کا لفظ انہی کے لیے بولا جاتا ہے۔ جب اس کی طرف لفظ 'بھیمۃ' کی نسبت ہو جاتی ہے تو اس میں جیسا کہ سورۂ مائدہ کے شروع میں ہم اشارہ کر چکے ہیں، وہ وحشی چوپائے بھی شامل ہو جاتے ہیں جو اگرچہ پالتو نہیں لیکن شامل انعام ہی کی جنس میں ہیں۔ مثلاً ہرن، جنگلی بکرے، پاڑھے، نیل گائے، گورخر وغیرہ۔

چونکہ یہاں زیر بحث پالتو چوپایوں ہی کی حلت و حرمت ہے اس لیے کہ اہل عرب نے انہی کے اندر سے، جیسا کہ اوپر گزرا، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت بعض کو حلال، بعض کو حرام ٹھہرا رکھا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ ان میں سے ایک ایک کو فرداً فرداً لے کر ان سے پوچھو کہ ان میں سے کس کو خدا نے حرام ٹھہرایا ہے اور ان سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے سوال کا جواب کسی علمی یا عقلی دلیل سے دیں، محض اٹکل کے تیر تکے نہ چلائیں۔

---

[1] بھینس چونکہ گرم اور مرطوب ملکوں کا چوپایہ ہے اس وجہ سے یہ عرب میں نہ معروف تھی نہ ہے۔

یہ معروف چوپائے، جیساکہ ہم نے اشارہ کیا، چار تھے۔ بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے۔ ان کے جوڑے کے افراد نر اور مادہ دونوں کو الگ الگ گنیے تو یہ سب آٹھ ہو جائیں گے۔ فرمایا کہ ان آٹھوں کو لو اور ان میں سے ہر ایک کے نر و مادہ کو لے کر ان لال بجھکڑوں سے پوچھو کہ بتائیں، ان میں سے نر کو خدا نے حرام ٹھہرایا ہے یا مادہ کو یا مادہ کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کو؟ مطلب یہ ہے کہ جب اصلاً یہ جانور، ان کے نر و مادہ دونوں، پیٹ کے بچہ سمیت، حلال ہیں، ان میں سے کسی کی حرمت کا دعویٰ یہ نہیں کر سکتے تو پھر انہی کے بعض اجزا پر یہ حرمت کہاں سے طاری ہو جاتی ہے کہ بعض کا کھانا ناجائز ہو جاتا ہے، بعض پر سواری حرام ہو جاتی ہے، بعض کو صرف مرد ہی کھا سکتے ہیں اور بعض کو مخصوص حالات پیدا ہو جانے کے بعد دونوں کھا سکتے ہیں۔ عقل و فطرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر درخت مباح ہے تو اس کا پھل بھی مباح ہو۔ یہ کیا بے تکی بات ہے کہ درخت تو مباح ہے لیکن اس کی ایک شاخ کا پھل حرام ہے یا مردوں کے لیے تو یہ حلال ہے لیکن عورتوں کے لیے حرام ہے یا اتنے پھل دینے تک تو وہ حلال ہے لیکن اتنے پھل دے چکنے کے بعد اس پر حرمت طاری ہو جاتی ہے۔

بدعات پر قریش سے دلیل کا مطالبہ

نَبِّـُٔوۡنِیۡ بِعِلۡمٍ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ان میں سے بعض چیزیں دینِ ابراہیمی میں حرام تھیں تو اس پر کوئی علمی دلیل پیش کرو۔ علمی دلیل دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ دینِ ابراہیمؑ کی کوئی قابلِ اعتماد سند ہو جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ فلاں فلاں چیزیں دینِ ابراہیمیؑ میں حرام تھیں یا کوئی عقلی و فطری دلیل یا قرینہ ہو جس سے ان کے دعوے کی صحت پر اعتماد کیا جا سکے۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو پھر دا ہمہ پر اچھے بھلے جانوروں کو حرام کر دینے کے کیا معنی؟ یہ واضح رہے کہ اہلِ عرب اپنے جن مشرکانہ توہمات و رسوم کو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرتے تھے ان کے حق میں دلیل وہ صرف یہ پیش کرتے تھے کہ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَكۡنَا وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ شَیۡءٍ ۱۴۸ (اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کر سکتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے) ظاہر ہے کہ یہ کوئی دلیل عقلی ہے نہ نقلی۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو ہر احمق اپنی ہر حماقت کو اس دلیل سے ثواب ثابت کر سکتا ہے۔ باپ دادا کا کسی رسم کو اختیار کر لینا بھی اس کی صحت یا حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس کی نسبت کی کوئی دلیل نہیں۔ آخر یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ ان کے باپ دادا نے جو رسوم اختیار کیے کسی سند کی بنا پر اختیار کیے جب کہ خود اہلِ عرب کی روایات شاہد ہیں کہ جس طرح دینِ مسیحی کو پال نے بگاڑا اسی طرح عربوں میں شرک و بت پرستی کا رواج ایک شخص عمرو بن لحی نامی کے ذریعے سے ہوا۔ قرآن نے عربوں کے ان توہمات کی تردید کے لیے عقلی و نقلی دونوں قسم کے دلائل دیے۔ ایک طرف تو اس نے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا وہ سارا تحریری ریکارڈ پیش کیا جو تورات کے صحیفوں میں موجود تھا، جس کا ایک ایک حرف شاہد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو نہ صرف یہ کہ شرک اور مشرکانہ رسوم سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ انھوں نے اپنے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل سے شرک کے ایک ایک جرثومہ

کا قلع قمع کیا ہے۔ دوسری طرف توحید خالص کے حق میں وہ عقلی و فطری دلیلیں دیں جو ناقابلِ تردید بھی ہیں اور جو حضرت ابراہیم ہی کی، جیسا کہ اسی سورہ کے پچھلے مباحث سے واضح ہے، پیش کردہ ہیں۔ غور کیجیے کہ کہاں قرآن کے یہ سورج کی طرح روشن دلائل اور کہاں اہلِ عرب کی یہ بات کہ ہم نے اسی طریقہ پر اپنے باپ دادا کو پایا اس وجہ سے یہی اللہ کی شریعت اور یہی ابراہیم کی ملت ہے۔

اتمام حجت کا آخری قدم

'اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا' یہ اتمام حجت کا آخری قدم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک عقل و نقل کے دلائل کا تعلق ہے ان میں سے تو کوئی چیز تمھارے ساتھ ہے نہیں پھر آخر کس بنیاد پر تم اللہ پر یہ بہتان باندھ رہے ہو کہ خدا نے فلاں فلاں چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں، کیا جب اللہ نے ان چیزوں کی ہدایت فرمائی تم اس وقت موجود تھے؟ پھر بتاؤ کہ ان سے بڑھ کر محروم النعمت، بدبخت اور ظالم کون ہو سکتا ہے جو بغیر کسی سندِ علمی و دلیلِ عقلی کے محض جھوٹے بہتان کو لوگوں کے گمراہ کرنے کا ذریعہ بنائیں۔

'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ' 'ظالمین' سے مراد وہی لوگ ہیں جن کی طرف اوپر 'فَمَنْ اَظْلَمُ' میں اشارہ فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایسے ظالم ہیں کہ محض من گھڑت بہتان کو نہ صرف اپنی گمراہی کا بہانہ بنائے بیٹھے ہیں بلکہ اس کو دوسروں کو گمراہ کرنے کا بھی ذریعہ بنا رہے ہیں اللہ ایسے لوگوں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ "راہ یاب نہیں کرے گا" میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کی ہدایت سے بہرہ یاب نہیں ہوں گے (واضح رہے کہ یہاں جو لوگ زیرِ بحث ہیں یہ قریش کے وہ سادات ہیں جو ان کی مذہبی پیشوائی کر رہے تھے) دوسرا یہ کہ خلقِ خدا کو گمراہ کرنے کی جو مہم یہ چلا رہے ہیں محض بے بنیاد افترا اور جھوٹ پر مبنی ہے اس وجہ سے یہ منہ کی کھائیں گے۔ اس میں ان کو کامیابی نہیں حاصل ہوگی۔ یہ گویا نہایت لطیف انداز میں بشارت ہے دعوتِ اسلامی کی کامیابی کی۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۡ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۴۵-۱۴۷)

ملتِ ابراہیم میں چوپایوں میں سے کیا چیزیں حرام تھیں

'قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ' الآیہ۔ اب یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ ملتِ ابراہیم میں انعام میں سے کیا چیزیں حرام تھیں۔ اوپر کے مباحث سے یہ بات واضح ہے کہ یہاں مشرکین عرب کے ساتھ جو بحث چل رہی ہے وہ ملتِ ابراہیم ہی سے متعلق ہے اور یہ بحث بھی خاص کر چوپایوں سے متعلق ہے اس لیے کہ انہی میں سے بعض کو انھوں نے، جیسا کہ اوپر کے بیان سے واضح ہے، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت حرام ٹھہرا رکھا تھا۔ موقع و محل کی یہ خصوصیت مقتضی ہے کہ اس اعلان کو اس مخصوص زاویہ ہی سے دیکھا جائے یعنی

لوگوں نے اس کے نظم، موقع و محل سے ہٹا کر اس کو اسلام کے عام ضابطۂ حلت و حرمت کی حیثیت دے دی ہے وہ اپنی اس غلط فہمی کے سبب سے خود بھی الجھن میں پڑے ہیں اور دوسروں کو بھی الجھن میں ڈالنے کا سبب بنے ہیں اس لیے کہ اسلام میں صرف وہی چیزیں حرام نہیں ہیں جو آیت میں مذکور ہیں بلکہ ان کے علاوہ چیزیں بھی حرام ہیں۔ مثلاً درندے اور شکاری پرندے وغیرہ۔ اور اسلام ہی میں نہیں بلکہ خود ملتِ ابراہیمؑ میں بھی ان کے علاوہ چیزیں حرام تھیں لیکن یہاں چونکہ زیر بحث مسئلہ، جیسا کہ سیاق و سباق سے واضح ہے، انعام ہی کا تھا اس وجہ سے ان کے باب میں یہ وضاحت فرما دی کہ مشرکین نے جو چیزیں حرام ٹھہرا رکھی ہیں یہ نفس ان کی گھڑی ہوئی ہیں، ملتِ ابراہیمؑ میں چوپایوں کی حلت و حرمت سے متعلق جو وحی مجھ پر آئی ہے اس میں ان من گھڑت حرمتوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔

عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗ (کسی کھانے والے پر جو اس کو کھائے) کے اسلوب میں جو تعمیم ہے اس سے مشرکین کے ان توہمات کی تردید ہو رہی ہے جو بعض مخصوص قربانیوں اور جانوروں سے متعلق وہ رکھتے تھے کہ ان کو خاص خاص لوگ ہی کھا سکتے تھے۔ ہر شخص ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ بعض جانوروں کے گوشت مرد ہی کھا سکتے تھے، عورتوں کے لیے ان کا کھانا حرام تھا (ملاحظہ ہوں آیات ۱۳۸-۱۳۹) قرآن کے ان الفاظ نے یہ واضح فرما دیا کہ جس طرح ان کی یہ مشرکانہ قربانیاں بے اصل و بے سند ہیں اسی طرح ان کے کھانے کے بارے میں ان کی یہ تفریق و تقسیم بھی محض ان کے واہمہ کی خلاقی ہے، ملتِ ابراہیمؑ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

ملتِ ابراہیمؑ میں اشیاء کی حلت و حرمت کی بنیاد

اس آیت میں چار چیزوں کی حرمت کا ذکر ہے۔ مردار، بہایا ہوا خون، سور کا گوشت اور وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ ان میں سے سابق الذکر تین چیزوں کی حرمت ان کی ظاہری نجاست کی بنا پر ہے۔ ان کے ذکر کے بعد فرمایا ہے فَاِنَّهٗ رِجْسٌ، ہمارے نزدیک اس کا تعلق مذکورہ تینوں ہی چیزوں سے ہے۔ ضمیر جب اس طرح واحد آتی ہے تو بعض اوقات جیسا کہ ہم آیت ۹۹ کے تحت ذکر کر چکے ہیں، وہ سابق الذکر ساری ہی چیزوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ گویا وہ ایک ایک چیز کی طرف فرداً فرداً لوٹتی ہے۔ آخری چیز کی حرمت باطنی نجاست کی بنا پر ہے۔ غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا شرک ہے اور شرک عقائدی نجاست ہے۔ اس وجہ سے جس چیز کو شرک کی چھوت لگ جاتی ہے وہ بھی نجس ہو جاتی ہے۔ اس عقائدی نجاست کو یہاں 'فسق' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملتِ ابراہیمؑ میں اشیاء کی حلت و حرمت محض حکمی نہیں بلکہ فطری و عقلی بھی ہے۔ مذکورہ حرمتوں پر بھی اور اس کے ساتھ صورتِ اضطرار میں جو استثنا ہے اس پر بھی ہم ایک سے زیادہ مقامات میں بحث کر چکے ہیں اس وجہ سے یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

یہاں حلت و حرمت سے متعلق یہ بنیادی اصول ذہن میں رہے کہ ملتِ ابراہیمؑ میں تمام طیبات حلال تھیں، حرام صرف خبائث تھیں، عام اس سے کہ یہ خباثت ظاہری ہو یا باطنی۔ یہی بنیادی اصول اسلام میں بھی ملحوظ ہے اس لیے کہ اسلام، جیسا کہ پچھلی سورتوں میں واضح ہو چکا ہے، یہودیت و نصرانیت کے برعکس ملتِ ابراہیمؑ پر مبنی ہے۔ آگے ہم اسلام کے اصول حلت و حرمت کی وضاحت کریں گے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ الآیۃ ملتِ ابراہیمؑ کے بعد اب یہ ملتِ یہود کا ذکر فرمایا کہ ان کے اوپر بے شک بعض طیبات حرام کر دی گئی تھیں۔ مثلاً تمام ناخون والے جانور اور گائے بکری وغیرہ کی چربی لیکن یہ حرام کرنا اس لیے نہیں تھا کہ فی نفسہٖ یہ چیزیں قابلِ حرمت تھیں بلکہ یہ ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر ان پر حرام کی گئی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب ملتِ اسلام میں یہ حرمتیں باقی نہیں رہیں بلکہ تمام طیب چیزیں اس میں مباح کر دی گئیں اور یہود پر جو قیدیں اور پابندیاں (اصروا غلال) عاید کی گئی تھیں وہ، جیسا کہ ان سے وعدہ کیا گیا تھا، خاتم الانبیاء کی بعثت کے بعد اٹھالی گئیں۔ یہود پر بعض طیبات حرام ہونے کی وجہ

یہود پر ہر ناخون والے جانور اور چربی کی حرمت کا یہاں جو ذکر ہے اس کی وضاحت کے لیے ہم تورات کے بعض حوالے پیش کرتے ہیں۔ پہلے چربی کی حرمت کے مسئلہ کو لیجیے۔

> اور خداوند نے موسیٰ سے کہا بنی اسرائیل سے کہہ تم لوگ نہ تو بیل کی، نہ بھیڑ کی اور نہ بکری کی کچھ چربی کھانا۔ جو جانور خود بخود مر گیا ہو اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو ان کی چربی اور کام میں لاؤ تو لاؤ پر تم کسی حال میں نہ کھانا کیونکہ جو کوئی ایسے چوپائے کی چربی کھائے جسے لوگ آتشیں قربانی کے طور پر خداوند کے حضور چڑھاتے ہیں وہ کھانے والا آدمی اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے۔
>
> احبار باب ۷ ۲۲-۲۵

دوسرے مقام میں چربی کی ان تمام قسموں کی تفصیل بھی ہے جو اُن کے لیے حرام ٹھہرائی گئیں۔

> جس چربی سے انتڑیاں ڈھکی رہتی ہیں اور وہ سب چربی جو انتڑیوں پر لپٹی رہتی ہے اور دونوں گردے اور ان کے اوپر کی چربی جو کمر کے پاس رہتی ہے اور جگر پر کی جھلی گردوں سمیت ان سبھوں کو وہ الگ کرے اور کاہن ان کو مذبح پر جلائے۔ یہ اس آتشیں قربانی کی غذا ہے جو راحت انگیز خوشبو کے لیے ہوتی ہے، ساری چربی خداوند کی ہے۔ یہ تمھاری سب سکونت گاہوں میں نسل در نسل ایک دائمی قانون رہے گا کہ تم چربی یا خون مطلق نہ کھاؤ۔ احبار باب ۳ ۱۵-۱۷

قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چربی گوشت کے جزو کی حیثیت رکھتی ہو، کمر یا آنتوں یا ہڈیوں میں اس طرح شامل ہو کہ اس کو بآسانی الگ نہ کیا جا سکے اس کے سوا تمام چربی بنی اسرائیل پر حرام تھی۔ یہی بات عقل کے مطابق معلوم ہوتی ہے لیکن تورات کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ چربی مطلق حرام تھی۔ ہمارے نزدیک یہ تشدد یہود کے کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے اس تشدد پر ایک مزید اضافہ ہے

جو ان کی شریعت میں پہلے بھی کچھ کم نہ تھا۔ چربی تو در کنار خون بھی آخر کچھ نہ کچھ تو گوشت کے جزو کی حیثیت سے رہ ہی جاتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اوپر خون کی جو حرمت بیان ہوئی ہے اس کے ساتھ 'مسفوح' کی قید لگی ہوئی ہے کہ پابندی اسی حد تک رہے جس حد تک دائرہ فطرت کے اندر رہے اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

'کُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ' سے کیا مراد ہے؟ ظفر، یوں تو ناخون کو کہتے ہیں۔ لسان میں ہے 'الظفر یکون للانسان' ظفر انسان کے ناخون کو کہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ 'الظفر لما لا یصیدہ والمخلب لما یصید' جو جانور شکار نہیں کرتے ان کے ناخون کو ظفر کہتے ہیں، جو شکار کرتے ہیں ان کے پنجہ کو 'مخلب' کہتے ہیں۔

تورات کے مطالعہ سے حرام و حلال کی جو تفصیل سامنے آتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے ہاں چوپایوں میں سے صرف وہ چوپائے حلال تھے جن کے پاؤں چرے ہوئے ہیں اور وہ جگالی بھی کرتے ہیں۔ جن کے اندر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو وہ اُن کے ہاں حرام ہے۔ چنانچہ اونٹ، سافان اور خرگوش اور وہ تمام جانور جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں یہود کے ہاں حرام ہیں۔ اس روشنی میں 'ذِیْ ظُفُرٍ' کا مفہوم متعین کیا جائے تو اس سے مراد وہ جانور ہوں گے جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں بلکہ سُم کی شکل میں وہ بند اور ان کے سامنے کے حصہ پر ناخون ہیں۔ یہود پر اس طرح کے تمام جانور، جیسا کہ 'کُلّ' کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے علی الاطلاق حرام تھے اس وجہ سے ان پر بعض وہ جانور بھی حرام ہو گئے جو ملت ابراہیمؑ میں جائز تھے مثلاً اونٹ خرگوش وغیرہ۔

'ذٰلِکَ جَزَیْنٰھُمْ بِبَغْیِھِمْ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ' یعنی ناخون والے جانوروں اور چربی کی علی الاطلاق حرمت بنی اسرائیل پر اس وجہ سے نہیں تھی کہ فی نفسہٖ ان چیزوں کے اندر حرمت کی کوئی علت موجود ہے بلکہ ان کی حرمت میں اصل دخل بنی اسرائیل کے فساد مزاج کو تھا جس طرح ایک طبیب بسا اوقات کسی مریض کو ایک جائز و طیب چیز کے استعمال سے بھی روک دیتا ہے کہ اس سے اس کی صحت جسمانی کو ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اخلاقی فساد کے سبب سے، سزا کے طور پر، بہت سی جائز چیزیں بھی ان پر حرام ٹھہرا دیں۔ اس اخلاقی فساد کو قرآن نے 'بغی' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی سرکشی کے ہیں۔ بنی اسرائیل کی اس سرکشی کا ذکر تورات اور انبیا کے صحیفوں میں اس کثرت سے آیا ہے کہ آدمی پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے۔ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس کو انھوں نے بخوشی قبول کیا ہو۔ جو حکم بھی ان کو دیا گیا اول تو انھوں نے اپنے سوال در سوال کی کثرت ہی سے اس کو نہایت بوجھل بنا لیا، جس کی ایک مثال سورہ بقرہ میں گائے کے قصے میں گزر چکی ہے۔ پھر اس کو مانا بھی تو اس سے گریز و فرار کی اتنی راہیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے نکال لیں کہ عملاً وہ حکم اُن کے لیے بالکل بے اثر ہو کے رہ گیا۔ ان کے اس فرار پسندانہ اور باغیانہ مزاج کا اثر قدرتی طور پر ان کی شریعت پر بھی پڑا۔ جس طرح کسی سرکش جانور کا مالک اس کو سخت بندھنوں کے اندر رکھنے پر مجبور ہوتا ہے یا سرکش رعایا کا حکمران سخت قوانین نافذ کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان سرکشوں کو نہایت

سخت قوانین میں باندھا جن کو قرآن میں 'اصر و اغلال' یعنی بندھن اور طوق سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ تورات میں اسرائیلی شریعت کے احکام پڑھیے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دوسری چیزوں سے قطع نظر صرف طہارت ہی کے احکام پڑھیے اور دیکھیے کہ حیض، نفاس، جنابت اور بعض بیماریاں مثلاً جریان اور برص وغیرہ لاحق ہو جانے کی صورت میں ان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے تھے تو آدمی کا رواں رواں اس رب کا شکرگزار ہوتا ہے جس نے ہمیں ملتِ اسلام کی ہدایت بخشی جو ان تمام غیر فطری بندشوں اور پابندیوں سے پاک ہے۔ کھانے پینے کے باب میں بھی صرف وہی بندشیں نہیں تھیں جو بیان ہوئیں۔ یہ بندشیں تو صرف چوپایوں کی حلت و حرمت کے متعلق بیان ہوئی ہیں، اس سے زیادہ پابندی ان پر دریائی جانوروں کے معاملے میں تھی۔ احبار بابلا سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائی جانوروں میں سے جن کے پر اور چھلکے ہیں وہ ان کے ہاں جائز تھے باقی سب حرام تھے۔ اسی طرح پرندوں میں سے صرف شکاری پرندے ہی حرام نہیں تھے بلکہ قازیں لط اور بگلے وغیرہ بھی حرام تھے۔

ان چیزوں کے حرام کیے جانے کی علت جیسا کہ واضح ہوا، یہود کی سرکشی اور گردن کشی تھی اور اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ سورۂ مائدہ میں بیان ہو چکا ہے، یہود کو یہ احکام دیتے وقت ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ جب آخری نبی آئیں گے تو اگر تم ان پر ایمان لائے تو وہ یہ پابندیاں تم پر سے اٹھا دیں گے اس لیے کہ ان کی بعثت دینِ فطرت ملت ابراہیمؑ پر ہوگی جس میں اس قسم کی کوئی ناروا پابندی نہیں ہوگی۔

'وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ' کے الفاظ یہاں بہت بلیغ ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے ہونے پر جو اتنا زور دیا ہے تو مقصود صرف اپنے سچے ہونے کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس میں حریف کے جھوٹے ہونے کا اعلان بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ملت ابراہیمؑ اور شریعت بنی اسرائیل سے متعلق یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے ہم اس میں بالکل سچے ہیں اور جو ازخائی یہ قریش اور یہود کے مفسدین واشرار کر رہے ہیں یہ بالکل جھوٹے ہیں۔

'فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ' الآیہ۔ یہ قریش اور بنی اسرائیل دونوں کو دھمکی ہے۔ پیغمبر کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس ساری وضاحت کے بعد بھی اگر یہ تم پر ایمان نہ لائیں، بدستور تمہارے جھٹلانے ہی پر اڑے رہیں تو ان کو سنا دو کہ اللہ چونکہ بڑی وسیع رحمت والا ہے، وہ سرکشوں اور ہٹ دھرموں کو بڑی دور اور بڑی دیر تک ڈھیل دیتا ہے تاکہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے، اس وجہ سے وہ تمہیں ڈھیل پر ڈھیل دے رہا ہے۔ اس ڈھیل سے مغرور نہ ہو جاؤ۔ ڈھیل بہرحال ڈھیل ہے۔ اس سے اللہ کی پکڑ کچھ پیچھے تو بے شک ہو جاتی ہے لیکن اس سے اس کی وہ سنت باطل نہیں ہو جاتی جو مجرموں کی پکڑ کے لیے اس نے ٹھہرا رکھی ہے۔ جب اس کی اس سنت کے ظہور کا وقت آ جائے گا تو وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکے گی۔

اوپر ملت ابراہیمؑ اور شریعت بنی اسرائیل کی جو حرمتیں بیان ہوئی ہیں اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ مشرکین نے بلا سند بہت سی چیزیں جو حرام ٹھہرا رکھی تھیں ان کی حرمت کو ملت ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح یہود بہت سی چیزوں کی حرمت کے جو مدعی تھے قرآن کی حرمت اصلاً نہیں بلکہ ان کے فسادِ مزاج

کے سبب سے مسلط تھی اور وعدۂ الٰہی کے مطابق ان پابندیوں کو آخری بعثت کے ذریعے سے دُور ہونا تھا، چنانچہ وہ، جیساکہ سورۂ مائدہ میں بیان ہوا، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دُور کر دی گئیں۔ اب اس ملت میں حرام وہی چیزیں ہیں جو عقل و فطرت کی رُو سے حرام ہونی چاہئیں، مشرکین کی بدعات اور یہود کے تشددات سے اس ملت کا ضابطۂ حلت و حرمت پاک ہے۔

اسلام کا ضابطۂ حلت و حرمت ہم اختصار کے ساتھ یہاں اسلام کا وہ ضابطۂ حلت و حرمت بھی پیش کیے دیتے ہیں جو قرآن نے بیان فرمایا ہے۔

قرآن نے حلت و حرمت کی فطری بنیاد یہ بتائی ہے کہ جو طیبات ہیں وہ حلال ہیں، جو خبائث ہیں وہ حرام ہیں، چنانچہ قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعریف بیان ہوئی ہے۔

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ	وہ ان کو حکم دیتا ہے معروف کا اور روکتا ہے منکر
وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ	سے اور ان کے لیے جائز کرتا ہے پاکیزہ چیزیں اور
وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي	حرام ٹھہراتا ہے ناپاک چیزیں اور ان سے دُور کرتا
كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔ ۱۵۷ اعراف	ہے وہ بوجھ اور وہ پابندیاں جو ان پر اب تک تھیں

'طیبات' سے مراد، ظاہر ہے کہ وہ چیزیں ہیں جو اپنے مزاج، اپنی سرشت اور انسان کے اوپر اپنے اثرات کے اعتبار سے پاکیزہ، معتدل، صحت بخش اور نافع ہیں۔

'خبائث' سے مراد اس کے برعکس وہ چیزیں ہیں جو اپنے مزاج، اپنی جبلت اور انسان کے مزاج و طبیعت پر اپنے اثرات کے لحاظ سے مضر، انحراف انگیز اور مفسد ہیں۔

ان دونوں چیزوں کے اندر مذکورہ صفات کے اعتبار سے تفاوتِ درجات اور فرقِ مراتب ہوتا ہے، کوئی چیز زیادہ طیب ہوتی ہے، کوئی چیز کم، اسی طرح کوئی چیز زیادہ خبیث ہوتی ہے کوئی کم۔ اس فرقِ مراتب کا اثر لازماً اس سے متعلق حکم پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً ایک چیز حرام کر دی جاتی ہے، دوسری چیز کراہت کے درجے ہی میں رہتی ہے۔

اسی طرح بعض حالات میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز کے اندر بجائے خود تو کوئی خرابی نہیں ہوتی لیکن کسی خارجی سبب سے اس کو کوئی خرابی لاحق ہو جاتی ہے اور وہ خبیث بن جاتی ہے۔ مثلاً غیر اللہ یا کسی تھان اور استھان کا ذبیحہ، جوئے کے ذریعہ سے حاصل کیا ہوا گوشت یا بحالت احرام میں کیا ہوا شکار۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اشیا کے درمیان خبیث و طیب کا فرق محض ایک امر اضافی ہے۔ اس کی کوئی فطری یا عقلی و اخلاقی بنیاد نہیں ہے۔ ایک ہی چیز ایک قوم کے نزدیک حلال و طیب ہوتی ہے، وہی چیز دوسری قوم کے نزدیک خبیث و حرام قرار پاتی ہے۔ ایسا سمجھنا صریح سوفسطائیت ہے۔ یہ کہنا درحقیقت دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ حق و باطل، عدل و ظلم اور خیر و شر بھی محض اضافی امور ہیں۔ ان کی کوئی عقلی و فطری بنیاد

نہیں ہے۔ اس مغالطے پر انشاء اللہ ہم کسی موزوں مقام پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

اسی طیب و خبیث کو معیار بنا کر اسلام نے چوپایوں میں سے وہ تمام چوپائے حلال ٹھہرائے جو انعام میں سے ہیں یا وحشی جانوروں میں سے انعام کے حکم میں داخل ہیں۔ مائدہ کے شروع میں اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ کے الفاظ آئے ہیں اور وہاں ہم واضح کر چکے ہیں کہ انعام کا لفظ اونٹ، گائے، بھیڑ بکری کے لیے معروف تھا۔ اس کی طرف بَهِيمَة کی اضافت نے اس میں وسعت پیدا کر دی اور وہ سارے جانور بھی اس میں شامل ہو گئے جو انعام کی جنس سے تعلق رکھنے والے ہیں عام اس سے کہ وہ پالتو ہیں یا وحشی، مثلاً بھینس چھترے دنبے، نیل گاؤ، ہرن، چیتل، پاڑے وغیرہ۔ البتہ وہ جانور اس سے نکل جائیں گے جو درندوں کے حکم میں داخل ہیں اس لیے کہ وہ 'بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ' کے تحت نہیں آتے مثلاً شیر، ریچھ، بھیڑیے، کُتے وغیرہ۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے درندہ جانوروں کو حرام قرار دیا۔ اسی طرح مردار، خنزیر، بہایا ہوا خون اور غیر اللہ کے نام پا تھان اور استھان کا ذبیحہ بھی حرام ہے۔ اس لیے کہ ان میں نجاست و خباثت ہے۔ بعض کے اندر ظاہری نجاست ہے بعض کے اندر عقلی۔

یہی ضابطہ پرندوں پر بھی لاگو ہو گا۔ ان میں سے بھی جو درندوں کی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً چیل، باز، عقاب شکرے وغیرہ یا ان کے اندر کوئی اس نوع کی خباثت پائی جاتی ہے جو اوپر مذکور ہوئی وہ حرام ہیں باقی جائز

یہی ضابطہ دریائی جانوروں اور ہوام و حشرات پر بھی نافذ ہو گا۔ ان میں سے بھی خبیث و طیب کے اسی اصول کو سامنے رکھ کر فرق کیا جائے گا جو اوپر مذکور ہوا۔

اسی ضابطہ پر وہ چیزیں بھی پرکھی جائیں گی جو نباتات میں سے ہیں یا نباتات کی ترکیب و تحلیل سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً شراب خواہ کسی چیز سے تیار کی جائے حرام ہے اس لیے کہ اس میں عقلی و اخلاقی خباثت ہے۔

اسلام میں حلت و حرمت کا اصل ضابطہ یہی ہے۔ اس ضابطہ کی روشنی میں حلال بین اور حرام بین کا تعین کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے لیکن نہ دنیا میں چوپایوں کی کوئی حد ہے، نہ پرندوں کی اور نہ دریائی جانوروں کی، اس وجہ سے بہت سی چیزوں کے بارے میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے فقہا نے مختلف چیزوں کے بارے میں اختلاف کیا بھی ہے۔ یہ اختلاف فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہے۔ بعض لوگ بعض چیزوں کو درندوں میں داخل کرتے ہیں، بعض نہیں داخل کرتے، اسی طرح بعض چیزوں کو بعض فقہا خبیث قرار دیتے ہیں بعض ان کو خبیث نہیں قرار دیتے۔ ہمارے نزدیک اس باب میں حنفیہ کا مسلک قرآن کے بیان کردہ اصول حلت و حرمت سے زیادہ اوفق ہے لیکن اس طرح کے مسائل میں، جن کے اندر اختلاف کی گنجائش ہے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی ان کو متشابہات کے درجہ میں رکھے۔ یعنی ان سے احتراز کرے، اگر اس کے نزدیک احتراز کا پہلو راجح ہے لیکن دوسرے کو مرتکب حرام قرار نہ دے۔ حدیثوں میں گوہ کے باب میں حضورؐ کا جو ارشاد نقل ہے وہ اس طرح کے مسائل میں بہترین رہنمائی دیتا ہے۔

البتہ ایک تنبیہ یہاں ضروری ہے۔ بعض صحابہؓ کے متعلق بعض کتابوں میں یہ جو نقل ہوا ہے کہ وہ اسلام میں صرف وہی چار چیزیں حرام مانتے تھے جو اوپر قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ والی آیت میں مذکور ہیں، یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے نقل میں راویوں سے تسامح ہوا ہے۔ صحابہؓ میں سے کسی کی طرف اس بات کی نسبت بعید از عقل ہے۔ ان میں کسی نے اگر کہی ہوگی تو یہ بات کہی ہوگی کہ ملت ابراہیم میں بس یہی چار چیزیں چوپایوں میں سے حرام تھیں۔ یہ بات کہنے کا ایک محل ہے جس کی وضاحت ہم اوپر کر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اسی بات کو غلط فہمی کی بنا پر راوی نے یہ شکل دے دی کہ وہ اسلام میں بس یہی چار چیزیں حرام مانتے تھے۔

سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ ؕ کَذٰلِکَ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ حَتّٰی ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ ہَلْ عِنْدَکُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْہُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ قُلْ فَلِلّٰہِ الْحُجَّۃُ الْبَالِغَۃُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَہَدٰىکُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ قُلْ ہَلُمَّ شُہَدَآءَکُمُ الَّذِیْنَ یَشْہَدُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ ہٰذَا ۚ فَاِنْ شَہِدُوْا فَلَا تَشْہَدْ مَعَہُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَہْوَآءَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ وَہُمْ بِرَبِّہِمْ یَعْدِلُوْنَ (١٤٨-١٥٠)

مشرکین کا آخری معارضہ

سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا الاٰیۃ۔ اب یہ مشرکین کا آخری معارضہ نقل فرمایا ہے اور اس کا جواب دیا ہے۔ مشرکین جب ہر طرف سے بحث میں پسپا ہو جاتے تو آخری بات یہ کہتے کہ اگر ہم نے خدا کا شریک ٹھہرانے اور کسی چیز کو حرام قرار دینے کے معاملے میں خدا کی مرضی کی مخالفت کی ہے تو خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، اس نے اپنے اختیار سے ہم کو روک کیوں نہیں دیا؟ جب اس نے اپنے اختیار کے زور سے ہم کو نہیں روکا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ہم نے کیا اور کر رہے ہیں یہی اس کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ معارضہ ایک بالکل ہی احمقانہ معارضہ ہے۔ انسانوں کو کسی قول یا فعل کی آزادی ملنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ قول یا فعل عند اللہ بھی صحیح ہے۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو یہ دلیل ہر احمق اپنی حماقت کے جواز میں، ہر ظالم اپنے ظلم کی حمایت میں اور ہر بدمعاش اپنی بدمعاشیوں کے حق میں پیش کر سکتا ہے کہ جو کچھ اس نے کیا اور کر رہا ہے خدا کے حکم سے کیا اور کر رہا ہے۔ فرمایا کہ یہ معارضہ محض ان کی شرارت کی ایجاد اور اپنی ضد پر اڑے رہنے کا بہانہ ہے۔ یہی روش ان کے پچھلے ہم مشربوں نے اختیار کی یہاں تک کہ وہ خدا کے عذاب سے دوچار ہوئے۔ یہی انجام ان کا ہونا ہے تو تم ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔

قریش سے کسی علمی دلیل کا مطالبہ

قُلْ ہَلْ عِنْدَکُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْہُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ مطلب یہ ہے کہ ان سے کہو کہ خدا کی پسند یا ناپسند معلوم کرنے کا ذریعہ تمہاری اپنی زندگی اور تمہارے اپنے اعمال نہیں ہیں کہ تم جو کچھ کر گزرو وہ عند اللہ ثواب بن جائے۔ اس کے لیے کسی علمی سند کی ضرورت ہے، یا تو خدا نے تم کو اس کا حکم دیا ہو جس کا کوئی ثبوت موجود ہو یا عقل و فطرت کے اندر اس کے حق میں کوئی شہادت ہو جس کو تم پیش کر سکو۔ اس قسم کی کوئی چیز

تو تمھارے پاس سب یہ نہیں، محض اٹکل کے تیر تکے چلانے اور قیاس کے گھوڑے دوڑانے ہو۔ حالانکہ وہم و گمان علم کا بدل نہیں ہو سکتا۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ اب یہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی جو اصل سنت ہے وہ واضح فرمائی کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی مشیت کے زور سے جس کو چاہے ہدایت پر کر دے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو اس کی اس مشیت کو کوئی روک تو نہیں سکتا تھا، وہ تم سب کو بلکہ ساری خلق کو ہدایت پر کر دیتا لیکن اس معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے بلکہ دلیل و حجت کے ذریعہ سے وہ رہنمائی کرتا ہے اور لوگوں کو اس نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس رہنمائی کو قبول کریں اور چاہیں تو رد کریں۔ پس اللہ نے اپنی یہ حجت بالغہ اپنے رسول کے ذریعے سے تم کو پہنچا دی۔ تمھارے پاس تو محض ظن و گمان ہے مگر اللہ کے پاس عقل و دل میں اتر جانے والی دلیلیں ہیں بشرطیکہ تم ان کے سننے اور سمجھنے کے لیے اپنے کانوں اور اپنے دلوں کو کھولو۔ ہدایت حاصل کرنے کی راہ یہی ہے۔ خدا اپنی مشیت کے زور سے کسی کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ یہ تو حجت و دلیل اور عقل و دل کا سودا ہے۔

گواہی کے لیے دو بنیادیں

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا مطلب یہ ہے کہ محض اٹکل کے تیر تکے نہ چلاؤ، ہاں اگر تمھارے پاس ایسے گواہ ہوں جو یہ گواہی دے سکیں کہ جو چیزیں تم نے حرام ٹھہرا رکھی ہیں خدا نے وہ حرام ٹھہرائی ہیں تو ان گواہوں کو سامنے لاؤ۔ یہ واضح رہے کہ معقول گواہی صرف دو بنیادوں پر ہوتی ہے ایک تو ذاتی مشاہدہ اور شخصی علم و واقفیت پر، دوسری کسی عقلی یا فطری قرینہ پر جس کی مثال سورۂ یوسف کی آیت ۲۶-۲۷ میں موجود ہے۔ یہاں قرآن نے ان دونوں ہی قسم کے گواہوں اور گواہیوں کا مطالبہ کیا ہے کہ اس طرح کی کوئی گواہی بھی موجود ہو تو اس کو پیش کرو، ورنہ اس حجت بالغہ کو قبول کرو جو قرآن تمھارے آگے پیش کر رہا ہے۔

جن کے پاس دلیل نہیں وہ خواہشوں کے پیرو ہیں

فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا الاٰية یعنی اگر گواہی کی مذکورہ شرطوں کے بغیر ہی یہ گواہی دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو تمھیں ایسے لائینوں اور بیہودہ سراؤں کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی دعوت و شہادت پر جمے رہو۔ ان لوگوں کی خواہشات و بدعات کی پیروی نہ کرو۔ یہاں ان کی بدعات کو 'اَهْوَآء' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، اس لیے کہ جس چیز کے حق میں نہ کوئی نقلی دلیل ہو نہ عقلی، ظاہر ہے کہ وہ اس کے اختیار کرنے والوں کی خواہش ہی پر مبنی ہو سکتی ہے اور جن کی رہنما ان کی خواہش ہو ان کا انجام معلوم۔ یہاں ان لوگوں کی تین صفات کا حوالہ دیا ہے۔ ایک یہ کہ یہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں، دوسری یہ کہ یہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، تیسری یہ کہ یہ اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں۔ مقصود ان صفات کے حوالہ سے یہ ہے کہ جو لوگ اتنے نگ ٹٹ ہیں کہ خدا، آخرت اور آیاتِ الٰہی میں سے کوئی چیز بھی ان کے نزدیک درخورِ اعتنا نہیں، ایسے عنان گسیختہ لوگوں کی خواہشیں ان کو کہاں لے جائیں گی، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے!

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۵۱-۱۵۳)

اصل ملت ابراہیم کی تفصیل

'قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا' یہ اصل ملت ابراہیمی کا تفصیلی بیان ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلایا کہ تم نے تو محض اپنے ظن و گمان سے ملتِ ابراہیم کی بعض طیبٗ حلال چیزوں کو اپنے مشرکانہ توہمات کی بنا پر حرام ٹھہرا کر یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس کل ملتِ ابراہیم یہی ہے اور تم نے اس کا حق ادا کر دیا، حالانکہ ملت ابراہیم میں دوسری بہت سی باتیں، جو خدا اور بندوں کے حقوق و معاملات سے متعلق حرام ہیں، ان کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ تو آؤ، میں تمھیں سناتا ہوں کہ تمھارے رب نے تم پر کیا کیا چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں۔ فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جو تم پر حرام کی گئی وہ شرک ہے لیکن شرک کو تم نے اپنا دین بنا رکھا ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک

'وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا' خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔ اب یہ اس کا ذکر فرمایا۔ یہ ہے تو اسی اوپر والی بات ہی کے تحت لیکن اس کو منفی کے بجائے مثبت پہلو سے ذکر فرمایا۔ زیر بحث آیات میں اسلوب کی یہ ندرت قابلِ لحاظ ہے کہ بعض باتیں منفی پہلو سے بیان ہوئی ہیں، بعض مثبت پہلو سے۔ مثلاً شرک، قتلِ اولاد، فحشاء، قتلِ نفس اور اکلِ مالِ یتیم کا ذکر تو منفی پہلو سے ہے اور والدین کے ساتھ احسان، ایفائے کیل و میزان، قول و عمل میں اہتمام عدل اور ایفائے عہدِ الٰہی کا ذکر مثبت اسلوب سے ہے۔ بعینہٖ یہی اسلوب، بعینہٖ انہی امور کے بیان میں بنی اسرائیل کی آیات ۲۲-۳۸ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفی سے اثبات اور اثبات سے نفی کا انضباط ایک بدیہی چیز ہے۔ جب ایک شے کا اثباتی انداز میں حکم ہے تو اس کے لازمی معنی یہ ہیں کہ جو چیز اس کی ضد ہے اس کی لازماً ممانعت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ایک چیز کی ممانعت ہے تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اس کا مقابل پہلو مطلوب ہے۔ یعنی اگر شرک کی نہی ہے تو توحید مطلوب ہے، علیٰ ہذا القیاس اگر والدین کے حقوق کی ادائیگی کا حکم ہے تو ان کے ساتھ بدسلوکی اور ان کی نافرمانی حرام ہے۔ اس اسلوب کی روشنی میں وہ تمام باتیں جو بیان تو ہوئی ہیں اثبات کے الفاظ میں لیکن ہیں ظاہری تالیف کلام کے اعتبار سے حَرَّمَ ہی کے تحت ان سب کے ضد پہلو کو بھی مدنظر رکھیے۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ نہ والدین کو اُف کہو نہ جھڑکو بلکہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اس

اسلوب کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں جو پہلو زیادہ زور و قوت سے ظاہر کرنے کا ہے وہ تو الفاظ میں بیان ہو جاتا ہے اور اس کا ضد پہلو بغیر الفاظ کی مدد کے مجرد فحوائے کلام اور اقتضائے نظام سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ قرآن نے اس اسلوب کے مضمرات کہیں کہیں کھول بھی دیے ہیں۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ	اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ تم نہ عبادت کرو مگر
وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ	اسی کی اور والدین کے ساتھ احسان کرو جیسا کہ اس کا
عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ	حق ہے۔ اگر تمھارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں
كِلٰـهُمَا فَلَا تَـقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ	بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ ان سے اظہار بیزاری ہو،
وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا	نہ ان کو جھڑکنا، ان سے سعادت مندانہ بات کرنا اور
كَرِيْمًا ۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ	ان کے لیے مہر و وفا کے بازو جھکائے رکھنا اور دعا
مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا	کرنا کہ اے رب تو ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے
رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۲۳-۲۴ بنی اسرائیل	مجھے بچپن میں مہر کے ساتھ پالا۔

قتل اولاد فقر و فاقہ کے اندیشہ سے

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ 'املاق' کے معنی فقر و تنگ دستی کے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ کے الفاظ ہیں۔ یعنی اس اندیشہ سے کہ اولاد کیا کھائے گی، کہاں سے اس کی پرورش ہوگی، اس کو قتل نہ کرو۔ اہل عرب میں قتل اولاد کی ایک قسم تو وہ تھی جس کا تعلق مشرکانہ توہمات سے تھا، جس کا ذکر اسی سورہ میں پیچھے گزرا ہے، دوسری صورت بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی تھی جس کا سبب غیرت کا ظالمانہ حد تک غلو تھا۔ تیسری یہ فقر و فاقے کے اندیشے کی صورت تھی۔ بعض غریب لوگ تنگ دستی سے گھبرا کر یہ سنگ دلانہ حرکت کر بیٹھتے۔ اس قسم کی لرزہ خیز خبریں اب بھی کبھی کبھی ان ملکوں سے آجاتی ہیں جن میں غربت زیادہ ہے یا جہاں کسی ناگہانی آفت سے لوگ مصائب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس ظلم کا اصل باعث انسان کی یہ جہالت ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنا اور اپنی اولاد اور متعلقین کا روزی رساں سمجھ بیٹھتا ہے حالانکہ ہر شخص کو وجود اور رزق خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ انسان ان چیزوں میں واسطہ اور ذریعہ ہونے سے زیادہ دخل نہیں رکھتا۔ اگر کسی کو خدا نے اولاد بخشی ہے تو اولاد اس کی تحویل میں خدا کی امانت ہے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ عقل و فطرت اور شریعت کی رو سے اس امانت سے متعلق اس پر جو ذمہ داریاں اور جو فرائض عاید ہوتے ہیں وہ اپنے امکان کے حد تک ادا کرے۔ لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ خدا نے اس کو ان کا رزاق بنایا ہے اور جس رزق سے وہ پلتے ہیں یہ وہ ان کو فراہم کرتا ہے۔ ان کا رزق تو درکنار آدمی اپنا رزق بھی خدا ہی سے پاتا ہے۔ بچہ ماں کی چھاتی سے جو دودھ پیتا ہے یہ بھی ماں کا دیا ہوا نہیں بلکہ اپنے رب کا دیا ہوا پیتا ہے

تو جب بچہ اپنے رب کا دیا ہوا کھاتا پیتا ہے تو کسی دوسرے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کو اس اندیشہ سے قتل کرے کہ میں اس کی پرورش کہاں سے کروں گا؟ قرآن نے اسی حقیقت کو یوں سمجھایا ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی روزی دیتے ہیں)۔

خاندانی منصوبہ بندی

افراد کی طرح بعض اوقات حکومتیں بھی اپنے دائرۂ اختیار اور اپنے فطری و شرعی حدود کار سے متجاوز ہو کر ان حدود میں مداخلت کرنے لگتی ہیں جو قدرت کے حدود ہیں۔ اس تعدی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خلق کے لیے کوئی مفید کام کرنے کی جگہ وہ اپنی صلاحیتیں نظام قدرت سے زور آزمائی میں صرف کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک فرض شناس حکومت کے لیے یہ بات تو معقول ہے کہ وہ اپنے ملک کے وسائل معاش کو ترقی دینے کے لیے بر و بحر کے ایک ایک چپہ اور ایک ایک گوشے کو چھان ڈالے اور اس راہ کے کسی پتھر کو بھی الٹے بغیر نہ چھوڑے۔ یہ بات بھی اس کے فطری بلکہ شرعی فرائض میں سے ہے کہ وہ ملک کے عوام کو زندگی کے ہر شعبہ میں، خواہ وہ پبلک ہو یا پرائیویٹ، اجتماعی ہو یا خاندانی، احتیاط، اعتدال، کفایت شعاری، صحت، صفائی اور محنت کی تربیت دے لیکن یہ امر بالکل اس کے دائرۂ اختیار اور حدود کار سے باہر ہے کہ وہ یہ منصوبہ بندی کرے کہ اتنی مدت میں ہم اتنا غلّہ پیدا کریں گے اور اسی حساب سے اتنے بچوں کو پیدا ہونے دیں گے اور اگر کسی مزید ناخواندہ مہمان نے ہماری پکی روٹی اور گنی بوٹی میں حصہ دار بننے کی کوشش کی تو ہم اپنی سائنسی تدبیروں سے کام لے کر اس کا گلا گھونٹ دیں گے۔

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس معاملے میں جو غلط فہمی عرب جاہلیت کے سنگدلوں کو لاحق ہوئی تھی اسی غلط فہمی کا شکار اس زمانے کی متمدن حکومتیں ہو رہی ہیں۔ انھیں بھی خدا پر غصہ تھا کہ جب وہ بھرپور روٹی نہیں دے رہا ہے تو وہ دمبدم اولاد میں کیوں اضافہ کیے جا رہا ہے؟ یہ غصہ وہ اولاد کو قتل کر کے نکالتے تھے۔ اس زمانے کے متمدن انسان کو بھی یہ برہمی ہے کہ ابھی جب اپنے ہی معیار زندگی کو ہم اپنے مطلوبہ معیار پر نہ پہنچا سکے تو دوسروں کی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں پر کس طرح اٹھا لیں؟ اس برہمی یا گھبراہٹ میں انھوں نے خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیم بنا ڈالی۔ شکلیں ذرا بدلی ہوئی ہیں، عرب اجڈ اور گنوار تھے اس وجہ سے انھوں نے ایک ناتراشیدہ اور بھونڈی سی شکل اختیار کی، موجودہ زمانے کا انسان مہذب اور تعلیم یافتہ ہے اس وجہ سے اس نے ایک خوب صورت سی شکل اختیار کی ہے اور نام بھی اس کا اس نے پیارا سا ڈھونڈھ نکالا ہے لیکن فلسفہ دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ انھوں نے بھی رزّاق اپنے کو سمجھا اور یہ بھی رزّاق اپنے کو سمجھے بیٹھے ہیں حالانکہ رزّاق اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن نے عربوں پر تو ان کی غلطی واضح کر دی اور وہ یہ بات سمجھ بھی گئے، مان بھی گئے، لیکن اس زمانے کے پڑھے لکھے جنوں کو کون سمجھائے اور کون قائل کرے!!

زنا اور محرکات زنا

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۔ 'فَوَاحِش' کے معنی کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کے ہیں،

جن میں اولین درجہ زنا کو حاصل ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں اسی مضمون کو یوں ادا فرمایا ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلًا ۳۲ (اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو، یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت ہی بری راہ ہے) لَا تَقْرَبُوا کا لفظ ان برائیوں سے روکنے کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے جن کا پرچھاواں بھی انسان کے لیے مہلک ہے، جو خود ہی نہیں بلکہ جن کے دواعی و محرکات بھی نہایت خطرناک ہیں، جو بہت دور سے انسانوں پر اپنی کمند پھینکتی ہیں اور پھر اس طرح اس کو گرفتار کر لیتی ہیں کہ ان سے چھوٹنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی برائیوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے میں آدمی کو کامیابی صرف اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنی نگاہ، اپنی زبان، اپنے دل کی پوری پوری حفاظت کرے اور ہر اس رخنہ کو پوری ہوشیاری سے بند رکھے جس سے کوئی ترغیب اس کے اندر راہ پا سکتی ہو اور ہر ایسے مقام سے پرے پرے رہے جہاں کوئی لغزش ہو سکتی ہے۔ اسی 'لَا تَقْرَبُوا' کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے قرآن نے مردوں اور عورتوں دونوں پر بہت سی پابندیاں عاید کی ہیں جن کی تفصیل احزاب اور نور میں بیان ہوئی ہے۔ وہاں ہم انشاء اللہ اس کے سارے پہلوؤں پر بحث لائیں گے۔

نیکیوں اور بدیوں دونوں سے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کا اصل منبع انسان کا دل ہوتا ہے اس وجہ سے کوئی نیکی اس وقت تک فروغ نہیں پاتی جب تک دل کے اندر اس کی جڑ مضبوط نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس کوئی برائی اس وقت تک انسان کی جان نہیں چھوڑتی جب تک دل کے اندر سے اس کی جڑ اکھاڑ نہ دی جائے۔ اگر کوئی برائی دل کے اندر موجود رہے تو وہ کان، آنکھ، زبان، فکر اور خیال کی راہ سے برابر غذا حاصل کر کے موٹی ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ روحانی سرطان کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور گو اس کو زندگی میں ایک دن بھی عملاً بروئے کار آنے کا موقع نہ ملا ہو تاہم انسان کے قلب و دماغ پر اس کا اس طرح تسلط ہو جاتا ہے کہ پھر تزکیہ و اصلاح کا کوئی سخت سے سخت اپریشن بھی اس پر کارگر نہیں ہوتا۔ وہ بالآخر انسان کی اخلاقی و ایمانی موت ہی پر منتہی ہوتی ہے اس وجہ سے قرآن نے ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے فحشا سے دور دور رہنے کی تاکید فرمائی۔

قتلِ نفس 'وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ' ہر جان بجائے خود محترم ہے اس وجہ سے اس کی صفت اَلَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ (جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا) وارد ہوئی۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ جان ہے جو کسی حق شرعی یا بالفاظ دیگر قانون کے تحت مباح الدم قرار پا جائے۔ مثلاً کسی پر قصاص عاید ہو یا وہ اللہ و رسول کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑا ہو یا زنا کی اس شکل کا مرتکب ہوا ہو جس پر رجم کی سزا ہے۔ اس قسم کے حق شرعی و قانونی کے بغیر کسی کو قتل کرنا جائز نہیں۔

'ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ' یہ باتیں ہیں جن کی اللہ نے ملتِ ابراہیمؑ میں ہدایت فرمائی تھی۔ تم یہ باتیں تو چھوڑ بیٹھے، البتہ اپنے جی سے چند اچھے بھلے جانوروں کو حرام کر کے ملتِ ابراہیمؑ کے دعویدار

بنے پھرتے ہو۔ اب میں تمہیں از سرِ نو ملتِ ابراہیمؑ کے یہ احکام اس لیے سنا رہا ہوں کہ تم سوچو اور سمجھو کہ تم کہاں سے کہاں نکل گئے ہو اور دعویٰ یہ رکھتے ہو کہ تم ملتِ ابراہیم پر ہو۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کا اصلی زور سمجھنے کے لیے کلام کی تمہید قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ پیشِ نظر رکھیے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے یہ تفصیل اس لیے سنائی ہے کہ تم اپنے رویہ کا جائزہ لو اور حقیقتِ حال کو سمجھو۔

اکلِ مالِ یتیم

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اس کی پوری وضاحت سورۂ نساء کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ یتیم کا مال دوزخ کی آگ ہے اس وجہ سے کسی بُری نیت سے کسی کو اس کے پاس بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔ جو بھی اس کے پاس جائے صرف اچھی ہی راہ سے جائے، یعنی اس کو سنبھالنے اور حتی الامکان ترقی دینے کے لیے، تاآنکہ یتیم بالغ ہو جائے۔ جب بالغ ہو جائے پوری احتیاط کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں اس کا مال اس کے حوالہ کرے۔

ناپ تول میں عدل کا اہتمام

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ناپ تول کو ٹھیک ٹھیک عدل کے ساتھ پورا کرو۔ یہ بات بھی مثبت پہلو سے ارشاد ہوئی ہے اس وجہ سے اس کے ضد پہلو کو بھی، جیسا کہ اوپر ہم نے وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا کے تحت عرض کیا، پیشِ نظر رکھنا ہو گا۔ یعنی ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرو کہ اپنے لیے اور پیمانہ ہو، دوسروں کے لیے اور، لینے کے لیے کوئی باٹ ہو، دینے کے لیے کوئی۔ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ، الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ، وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (۱-۳ مطففین) (ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی تباہی ہے کہ لوگوں سے لیں تو پورا ناپ کر لیں اور جب ان کے لیے ناپیں یا تولیں تو اس میں کمی کریں) یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نظامِ کائنات جیسا کہ سورۂ آلِ عمران میں واضح ہوا، عدل و قسط پر قائم ہے اور اس کائنات کی ہر چیز شاہد ہے کہ اس کا خالق و مدبر قائم بالقسط ہے اس وجہ سے اس دنیا کی صلاح و فلاح کے لیے بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان اپنے دائرۂ اختیار میں بھی کانٹے کی تول عدل و قسط کو قائم کرے۔ اگر اس میں ذرا رخنہ پیدا ہوا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی اپنے مرکزِ ثقل سے منحرف ہو گئی اور اب سارے نظامِ تہذیب و تمدن میں فساد و اختلال رونما ہو کے رہے گا۔ عدل و قسط کی اس اہمیت کی وجہ سے یہ حکم ہوا کہ ناپ تول کو ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ سورہ بنی اسرائیل میں اس کی برکات کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ، ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۳۵ (اور ناپ کو پورا کرو جب ناپو، اور جب تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو، یہی نتیجہ اور مآلِ کار کے اعتبار سے بابرکت اور بہتر ہے) ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا کے الفاظ دنیا اور آخرت دونوں کے نتائج و برکات کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں۔ آخرت میں اس کی برکات تو واضح ہی ہیں، دنیا میں بھی باعتبارِ مآل، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی رویہ معاش و معیشت، کاروبار اور تجارت اور عادلانہ تمدن کے فروغ کے نقطۂ نظر سے بابرکت ہے۔ کوئی ڈنڈی مارنے والی قوم دنیا میں نہ فروغ پائی ہے، نہ پائے گی۔ یہ برائی کوئی منفرد برائی نہیں ہے بلکہ یہ بہت سی برائیوں کے پائے جانے کی ایک علامت

ہے۔ جس قوم کے اندر یہ برائی پائی جاتی ہے، خبر دیتی ہے کہ یہ قوم عدل و قسط کے تصور سے خالی ہے اس وجہ سے یہ کسی صالح تمدن کے قیام کی صلاحیتوں سے نہ صرف محروم ہے بلکہ یہ خدا کی زمین میں فساد کے بیج بونے والی ہے۔ چنانچہ سنت الٰہی کے مطابق ایسی قوم کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ اس مسئلہ پر انشاء اللہ سورۂ اعراف میں، قوم شعیب کے بیان میں، تفصیل سے بحث کریں گے۔

تمام اعمال کے لیے معیار

'لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا' یہ وہ معیار ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام اعمال کے لیے مقرر فرمایا ہے کہ وہ لوگوں پر ان کی برداشت اور ان کے امکان سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اس سے ایک تو یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ احکام جو دیے ہیں انسان کی فطرت اور اس کی صلاحیتوں کو تول کر دیے ہیں، ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کے تحمل سے باہر ہو۔ دوسری یہ کہ مطلوب جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص پوری دیانت و صداقت کے ساتھ ان احکام کی تعمیل ظاہراً و باطناً کرے اگر بلا ارادہ اس کے کسی پہلو میں کوئی بھول چوک یا کوتاہی ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ معیار مطلوب کی اس وضاحت سے احتیاط میں شدت و غلو کی نفی بھی مقصود ہے کہ لوگ خواہ مخواہ اپنے جی سے اس سے آگے بڑھ کر گولی باندھنے کی کوشش نہ کریں جو خدا نے مقرر کر دیا ہے۔ البتہ اس ٹکڑے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ یہ ہماری صواب دید پر منحصر ہے کہ ہم اپنی طاقت و استطاعت کی حد خود مقرر کریں اور پھر اس مزعومہ طاقت و استطاعت کے پیمانہ سے ناپ کر اپنے لیے خدا کے احکام و شرائع میں سے انتخاب کریں کہ اتنا ہم سے ہو سکتا ہے، یہ ہم کریں گے، باقی ہماری استطاعت سے باہر ہے اس وجہ سے ہم اس کے مکلف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کے باب میں یہ اختیار کسی کو نہیں بخشا ہے۔

حق و عدل کا اہتمام

'وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ' یہ یوں تو زبان سے نکلنے والی ہر بات کے لیے ایک عام اصول ہے کہ جو بات بھی منہ سے نکلے وہ حق و عدل کی کسوٹی پر پوری اترنے والی ہو چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے 'وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا' ۳۶ (اور اس بات کے درپے نہ ہو جس کے باب میں تمہیں کوئی علم نہیں۔ کان، آنکھ، دل ان میں سے ہر ایک سے متعلق پرسش ہونی ہے) لیکن یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ تمہاری کوئی شہادت اور تمہارا کوئی فیصلہ حق و عدل سے ہٹا ہوا نہ ہو بلکہ جب بھی دو آدمیوں کے درمیان کوئی شہادت دو یا کوئی فیصلہ کرو تو وہ حق و عدل کے مطابق ہو، اور اس معاملے میں اپنے کسی عزیز و قریب کے ساتھ بھی کوئی رو رعایت نہ ہو۔

ایفائے عہد

'وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا' اب یہ آخر میں ایک جامع بات فرما دی کہ اللہ کے ہر عہد کو پورا کرو۔ اس میں وہ تمام عہد بھی آ گئے جو اللہ نے بندوں سے لیے ہیں اور وہ عہد بھی آ گئے جو ہم آپس میں کسی مقصد صالح کے لیے کرتے ہیں۔ ہر عہد کی عند اللہ ذمہ داری ہے اس وجہ سے ہر عہد عہد اللہ ہے اگر وہ خدا کے حدود کے اندر ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں اس کو عام ہی رکھا ہے 'وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا' ۳۴ (اور عہد کو

پورا کرو، ہر عہد کی بابت پرسش ہونی ہے۔

تعقل، تذکر اور تقویٰ میں معنوی ربط

ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ اس ٹکڑے کو اس شرح کی روشنی میں سمجھیے جو اوپر ہم نے ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ کی کی ہے۔ البتہ یہ بات یہاں قابل توجہ ہے کہ اوپر تَعْقِلُوْنَ فرمایا ہے اور یہاں تَذَکَّرُوْنَ اور آگے والی آیت میں، بالکل اسی سیاق میں، لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ہے۔ تعقل، تذکر اور تقویٰ میں بڑا گہرا معنوی ربط ہے۔ انسان جب اندھی تقلید کی بیڑیوں سے آزاد ہو کر سنجیدگی سے ایک بات پر غور کرنے کا عزم کرتا ہے تو یہ تعقل ہے۔ اس تعقل سے وہ حقائق آشکارا ہوتے ہیں جو فطرتِ انسانی کے اندر ودیعت ہیں لیکن انسان کی غفلت کی وجہ سے ان پر دھول کا پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے۔ ان حقائق کا آشکارا ہونا تذکر ہے۔ یہ تذکر انسان کی رہنمائی تقویٰ کی منزل کی طرف کرتا ہے جو خلاصہ ہے تمام تعلیم و تزکیہ اور تمام قانونِ شریعت کا۔ ہم آگے کسی مناسب مقام میں واضح کریں گے کہ تمام شریعت کی بنیاد انسان کی فطرت پر ہے۔ اس وجہ سے جہاں تک دین کے مبادی اور اصول کا تعلق ہے وہ خارج سے نہیں آتے بلکہ انسان کی فطرت ہی سے برآمد ہوتے ہیں بشرطیکہ انسان خدا کی تذکیر سے بیدار ہو کر تذکر کرے۔ شریعت درحقیقت ہمارے ہی معدنِ فطرت کا برآمد شدہ خزانہ ہے جو ہماری گود میں ڈال دیا جاتا ہے بشرطیکہ ہم اس کی قدر کریں۔

حضرت ابراہیمؑ کی اصل راہ

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ۔ مُسْتَقِیْمًا یہاں هٰذَا سے حال پڑا ہوا ہے۔ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ اسم اشارہ کے اندر فعل کے معنی پائے جاتے ہیں اس وجہ سے وہ فعل کا عمل بھی کرتا ہے۔ اب یہ سلسلۂ بیان کی آخری بات ارشاد ہوئی ہے کہ یہ سیدھی راہ جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں بس اس کی پیروی کرو۔ خدا کی بتائی ہوئی راہ یہی ہے اور یہی ابراہیمؑ کی بتائی ہوئی راہ ہے جس پر چلنے کی انھوں نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی۔ اس راہ سے ہٹ کر جو پیچ کی راہیں نکال لی گئی ہیں ان سے بچو۔ وہ ساری راہیں اس صراط مستقیم سے دور اور ملتِ ابراہیم سے گمراہ کرنے والی ہیں۔ اسی راہ پر قائم رہنے کی، ابراہیمؑ کے واسطے سے، خدا نے تم کو ہدایت فرمائی تھی اور اب میرے واسطے سے خدا نے یہ از سرِ نو تمہارے لیے تازہ کی ہے تاکہ تم ہلاکت کی وادیوں میں بھٹکنے اور خدا کی پکڑ میں آنے سے بچو۔

ملت ابراہیم و ملت اسلام میں امر و نہی کی اساسات

یہاں یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جس طرح کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام کے درمیان امتیاز کی فطری کسوٹی طیبات اور خبائث کو ٹھہرایا گیا ہے، اسی طرح حقوق و فرائض اور کردار و اخلاق کے باب میں بھی فطری و عقلی اصول یہ ہے کہ جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے وہ تو سب عدل و احسان اور معروف کے منبع سے نکلی ہیں اور جن باتوں سے روکا گیا ہے وہ سب بغی، فحشا اور منکر کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ ملتِ ابراہیم اور ملتِ اسلام میں امر و نہی کی اساسات اللہ تعالیٰ نے انھی چیزوں کو بنایا ہے۔ اس مسئلہ پر ان شاء اللہ سورۂ نحل کی آیت ۹۰ کے تحت ہم تفصیل سے بحث کریں گے۔

ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ تَمَامًا عَلَی الَّذِیْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ

رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ (۱۵۴)

ملتِ موسوی اور ملتِ ابراہیمی میں اشتراک

'ثُمَّ' یہاں ترتیب کو ظاہر کرتا ہے۔ اوپر، جیسا کہ واضح ہوا، ملتِ ابراہیمؑ کا بیان تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد صاحب شریعت اور صاحب کتاب رسول سیدنا موسیٰؑ ہی ہیں۔ فرمایا کہ ابراہیمؑ کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تاکہ اپنے خوب کار بندے پر اپنی شریعت کی نعمت تمام کریں، اس میں ہر ضروری بات کی تفصیل کر دیں اور اس کو ہدایت و رحمت بنائیں تاکہ لوگ آخرت میں اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جو کتاب دی گئی اس میں بھی بنیادی احکام وہی ہیں جو ملتِ ابراہیمؑ کے باب میں بیان ہوئے ہیں۔ آپ کو سب سے پہلے جو احکام الواح میں لکھ کر دیے گئے' احکام عشرہ کے نام سے مشہور ہیں۔ تورات میں دیکھ لیجیے، الفاظ میں فرق ہو تو ہو لیکن باتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ تعداد میں بھی فرق نہیں ہے۔ اوپر ملتِ ابراہیمؑ کے جو احکام گنائے گئے ہیں وہ امر و نہی سب ملا کر دس بنتے ہیں۔ یہی دس احکام شریعت موسوی کی بھی بنیاد ہیں۔ ان پر اضافہ ہوا ہے تو تفصیلات کا اضافہ ہوا ہے جیسا کہ قرآن نے اشارہ کیا ہے اور بعینہٖ یہی احکام ابتدائی طور پر، جیسا کہ ہم سورۂ نحل اور سورۂ بنی اسرائیل میں واضح کریں گے، اس امت کو دیے گئے۔ گویا اصل دین بنیادی طور پر ایک ہی ہے، فرق ہے تو اجمال و تفصیل اور آغاز و تکمیل کا ہے۔ اس ملت میں دین کو اس کی اصل اساس یعنی ملتِ ابراہیمی پر لوٹا کر کامل اور ان قیود اور پابندیوں سے آزاد کر دیا گیا جو یہود پر، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، ان کی سرکشی کے سبب سے عاید ہوئی تھیں۔

یہود پر ایک تعریض

'تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ' سے مراد لوگوں نے جماعت بھی لی ہے لیکن میرے نزدیک اس سے مراد حضرت موسیٰؑ ہی ہیں۔ 'الَّذِیْ' کا معروف استعمال مفرد ہی کے لیے ہے اور جب واحد ہو تو اس سے کوئی خاص ذات ہی مراد لی جا سکتی ہے۔ قرآنی تمثیلات میں کہیں کہیں اس کا مصداق جماعت بھی ہے لیکن اس کے خاص قرائن اور خاص وجوہ ہیں جن کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔ حضرت موسیٰؑ کے لیے یہ صفت اسی طرح استعمال ہوئی ہے جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے لیے سورۂ نجم میں 'الَّذِیْ وَفّٰی' استعمال ہوئی ہے۔ مقصود اس صفت کے اظہار سے حضرت موسیٰؑ کا اس اتمامِ نعمت کا سزاوار ہونا ظاہر کرنا ہے کہ اللہ نے ان کو اس نعمت کا سزاوار اس لیے گردانا کہ وہ خوب کار تھے۔ اللہ نے ان کے ظاہر و باطن میں جو کچھ ان کو بخشا اس کا حق انھوں نے پہچانا اور یہ حق نہایت خوبی سے ادا کیا۔ ایسے ہی بندے اللہ کی نعمتوں کے سزاوار بنتے ہیں اور جب وہ کسی کو اپنے منصبِ نبوت کے لیے انتخاب فرمانا چاہتا ہے تو کسی ایسے ہی خوب کار کو چنتا ہے اور اس پر اپنی نعمت تمام کرتا ہے۔ یہ صفت یہود کو نہایت لطیف انداز میں یاد دہانی کر رہی ہے کہ وہ ذرا اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ جس سے انھوں نے دین کی وراثت حاصل کی وہ کیا تھا اور یہ کیا ہیں؟ اس کو اللہ نے اس لیے اس نعمت سے نوازا تھا کہ اس نے ہر نعمت کا حق پہچانا اور اس کو نہایت خوبی سے

ادا کیا۔ ان کا حال یہ ہے کہ انھوں نے ہر نعمت کی ناقدری کی، ہر ہدایت سے اعراض کیا، ہر حکم کا حلیہ لگاڑا لیکن مدعی ہیں کہ دنیا و آخرت کی تمام سعادتیں انہی کا حصہ ہیں۔

ہدایت اور رحمت

'تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ' میں 'کل شیء' سے مراد وہ مسائل ہیں جو دین کے دائرے میں آتے ہیں۔ دین کے اصول اور بنیادی مسائل تو وہی ہیں جو اوپر ملت ابراہیمؑ سے متعلق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بیان ہوئے لیکن ان میں سے ہر چیز کے تحت تفصیلات و جزئیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو جو کتاب عطا فرمائی اس میں یہ تمام تفصیلات و جزئیات بھی بیان فرمائیں۔ اس طرح یہ کتاب ہدایت اور رحمت کا مجموعہ بن گئی۔

'ہدایت' اور 'رحمت' کے الفاظ نہایت حکیمانہ ترتیب کے ساتھ اس مقصد کو ظاہر کرتے ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ بندوں پر اپنی کتاب اتارتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کتاب اس لیے اتارتا ہے کہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ بتائے جو آخرت میں بندوں کو اس کی رحمت کا سزاوار بنائے۔ اس پہلو سے کتاب اپنے مقصد کے اعتبار سے ہدایت اور اپنے ثمرہ اور انجام کے لحاظ سے رحمت ہوتی ہے۔ پھر زندگی کی اصل غایت تو آخرت ہے، اس دنیا کی زندگی تو فانی اور عارضی ہے۔ اس وجہ سے کتاب الٰہی کا اصل مقصد یہ ہوا کہ وہ اس دنیا کی زندگی کو وہ جلوہ دے کہ لوگ اللہ کی ملاقات پر ایمان لائیں اور اسی کو نصب العین بنا کر زندگی کا سفر طے کریں۔ اسی حقیقت کی طرف 'لَّعَلَّهُم بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ
الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا
الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا
كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ (۱۵۵-۱۵۷)

'وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ الاٰیۃ'۔ تورات کے بعد اب یہ قرآن کے اتارے جانے کا ذکر فرمایا اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے تمام خلق پر عموماً اور اہل عرب پر خصوصاً جو فضل فرمایا ہے پہلے اس کا حوالہ دیا پھر عربوں کو دھمکی سنائی کہ اس کتاب کے ذریعہ سے تم پر حجت پوری ہو چکی ہے۔ اب خدا کے سامنے تمھارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا اس وجہ سے اگر اس کو جھٹلاتے ہو تو اس جھٹلانے کے انجام کو سوچ لو۔

قرآن کی عظیم برکت

لفظ 'مُبٰرَكٌ' اس بارش کے لیے قرآن میں بار بار استعمال ہوا ہے جو زمین کی سیرابی، روئیدگی اور سرسبزی کا ذریعہ بنتی، اس کے خزانوں اور اس کی برکتوں کو ابھارتی اور اس کے مردہ اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد اس کو از سر نو حیات تازہ بخشتی ہے۔ قرآن کے لیے اس لفظ کے استعمال میں یہ استعارہ

ہے کہ یہ بھی دنیا کو اس کی روحانی موت کے بعد از سر نو حیات تازہ بخشنے اور شریعت و ہدایت کے خزاں رسیدہ چمن کو پھر سے بہار کی رونقوں سے معمور کرنے کے لیے نازل ہوا ہے۔ فرمایا کہ اس کی ناقدری نہ کرو بلکہ قبول کرو اور اس کی پیروی کرو، جس نے تم پر یہ رحمت نازل فرمائی ہے اس کے غضب سے بچو تاکہ اس کی رحمت کے سزاوار ٹھہرو۔

تقطیع عذر

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ۔ اَنْ تَقُوْلُوْٓا یعنی کراھۃ ان تقولوا، یہ اسلوب اور یہ مضمون مائدہ آیت ۱۹ میں بھی گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تم پر یہ رحمت اس لیے نازل فرمائی ہے کہ مبادا کل کو تم خدا کے سامنے یہ عذر کرو کہ جس طرح یہود و نصاریٰ کو کتاب عطا ہوئی آخر ہم کو اسی طرح کتاب کیوں نہیں عطا ہوئی، ان کا علم و مطالعہ ہمارے کیا کام آسکتا تھا، ہم تو ان کے علم و مطالعہ اور ان کے درس و تعلیم سے بے خبر ہی رہے۔

قرآن ایک حجت قاطع ہے

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ یا یہ عذر کرو کہ اگر ہم پر کتاب اترتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے بنتے، پھر ہم اس نعمت سے کیوں محروم رکھے گئے!

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ یعنی تمہارے یہ تمام عذرات ختم کر دینے کے لیے خدا نے تم پر ایک حجت قاطع اور ہدایت و رحمت اتار دی ہے، اب تم اس قسم کا کوئی عذر پیش نہیں کر سکتے۔ قرآن کے لیے یہاں 'بَيِّنَةٌ' اور 'ہدایت و رحمت' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'ہدایت و رحمت' کے الفاظ پر اوپر بحث گزر چکی ہے۔ 'بَيِّنَةٌ' کے معنی روشن دلیل اور حجت قاطع کے ہیں۔ قرآن کے لیے یہ لفظ دو پہلوؤں سے استعمال ہوا ہے۔ ایک یہ کہ اس نے عربوں کے ان تمام عذرات کا خاتمہ کر دیا جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، دوسرے یہ کہ قرآن بجائے خود حجت و برہان ہے، اس کا کتاب الٰہی ہونا کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں ہے، یہ ایک ایسا معجزہ ہے جس کے چیلنج کا، جیسا کہ قرآن کے متعدد مقامات سے واضح ہے، اہل عرب کوئی جواب نہ دے سکے۔ علاوہ ازیں یہ تورات کی طرح صرف احکام و ہدایات کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اپنے ہر دعوے اور ہر تعلیم کے دلائل و براہین بھی اپنے ساتھ لے کر نازل ہوا ہے اور وہ ایسے مضبوط و مستحکم اور ایسے عقلی و فطری ہیں کہ ان کے مقابل میں کٹ حجتی تو کی جا سکتی ہے لیکن ان کی تردید ممکن نہیں ہے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا الاٰیۃ 'صَدَفَ'، لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ یعنی کسی چیز سے اعراض کرنے اور منہ پھیرنے کے معنی میں بھی اور کسی کو اس سے پھیرنے اور موڑنے کے معنی میں بھی۔ جن لوگوں نے اس کو متعدی کے مفہوم میں لیا ہے ان کی بات قوی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے پہلے 'كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ' ہے، جس کے اندر اعراض اور کٹ حجتی کا مضمون خود آ گیا۔ اس کے بعد موزوں بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کو متعدی کے معنی میں لیا جائے۔ یعنی جنھوں نے آیات الٰہی کی تکذیب کی

اور دوسروں کو ان کے سننے سمجھنے سے روکا۔

فَمَنْ اَظْلَمُ یعنی ان سے بڑھ کر محروم القسمت اور بدبخت کون ہو سکتا ہے جن کے پاس ایسی کتاب آئے جو ان کے تمام عذرات کا خاتمہ کر دے، جو ان کے لیے حجت درمیان ہو، جو ابرِ رحمت بن کر برسے، جو رہنمائی کے لیے روشنی کا مینار اور آخرت میں رحمتِ الٰہی کی ضامن ہو، لیکن وہ اس کو خود بھی جھٹلائیں اور دوسروں کو بھی اس سے روکیں۔

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ ۗ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِن قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ انتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ (۱۵۸)

یعنی ان کے تمام عذرات ختم ہو گئے اور ہر پہلو سے ان پر حجت قائم کر دی گئی لیکن یہ دلیلوں اور حجتوں سے قائل ہونے والے اسامی نہیں، یہ تو منتظر ہیں کہ ان پر فرشتے اتریں، یا خدا خود ان کے لیے نمودار ہو، یہ نہیں تو عذابِ الٰہی کی نشانیوں میں سے کوئی فیصلہ کن نشانی ظاہر ہو۔ بقرہ ۲۱۰ اور انعام ۱۱۱ میں کفار کے مطالبات کا ذکر گزر چکا ہے۔ آگے کی سورتوں میں بھی اس کا ذکر آئے گا مثلاً هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرُ رَبِّكَ ۳۳ نحل (یہ نہیں منتظر ہیں مگر اس بات کے کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرے رب کا فیصلہ ظاہر ہو جائے) وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْمَلَائِكَةُ أَوْ نَرَىٰ رَبَّنَا ۗ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا ۲۱ فرقان (اور جو لوگ ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں کہتے ہیں آخر ہمارے اوپر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے یا ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھتے؟ انھوں نے اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھا اور بڑی اکڑ دکھائی)

يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ یعنی خدا اور فرشتوں کا اترنا تو الگ رہا جس فیصلہ عذاب کے یہ منتظر ہیں وہ بھی اگر ظاہر ہو جائے تو اس کو دیکھ کر کسی کا ایمان لانا کچھ سود مند نہیں۔ ایمان معتبر صرف وہ ہے جو آنکھ، کان، دل، دماغ اور عقل کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے لایا جائے نہ کہ عذابِ الٰہی کا ڈنڈا دیکھ کر۔ عذابِ الٰہی کے ظہور کے بعد کسی کا ایمان کچھ سود مند نہیں ہوگا، سود مند ایمان وہی ہوگا جو اس سے پہلے لایا جائے اور اس میں کچھ عمل صالح کی کمائی کر لی جائے۔

فیصلہ کا انتظار

قُلِ انتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے نشانیِ عذاب کے منتظر ہو تو انتظار کرو، اب ہم بھی تمہارے لیے اسی کے منتظر ہیں اس لیے کہ وہ ساری علامتیں جو کسی قوم کو مستحق عذاب بناتی ہیں تم میں نمایاں ہو چکی ہیں۔ سنتِ الٰہی کے مطابق اب ایک ہی چیز باقی رہ گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ باطل نابود ہو اور حق کا بول بالا ہو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی اور اس کے ساتھی جب اپنا حق ادا کر چکتے ہیں لیکن ضدی اور سرکش لوگ کسی طرح ان باتوں پر کان نہیں دھرتے تو انھیں بھی فیصلۂ الٰہی کا انتظار ہوتا ہے کیونکہ اسی فیصلہ کے ظہور کے ساتھ حق کا غلبہ وابستہ ہوتا ہے۔ اس انتظار میں اصلاً مخالفوں کی تباہی کی خواہش مضمر نہیں ہوتی بلکہ حق کی فتحمندی

کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں تزکیہ و اصلاح کے مشن پر آتے ہیں۔ وہ اس کام میں اپنی پوری قوت نچوڑ دیتے ہیں۔ جن کے اندر خیر کی ادنیٰ رمق بھی ہوتی ہے وہ اصلاح قبول کر لیتے ہیں جو بالکل اندھے بہرے بن جاتے ہیں وہ مردوں کے حکم میں داخل ہیں جو زمین پر پڑے رہیں تو عفونت اور فساد کے سوا کچھ نہیں پھیلا سکتے اس وجہ سے ان کے فنا ہو جانے ہی میں خلق کی بہبود ہوتی ہے۔ یہاں اس اشارے پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ سورۂ نوح میں انشاء اللہ یہ مسئلہ تفصیل سے زیر بحث آئے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝ قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۚ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (۱۵۹-۱۶۴)

پیغمبر کو آخری ہدایت

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ۔ اوپر آیت ۱۵۳ میں فرمایا تھا کہ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (اور یہ کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے تو اس کی پیروی کرو اور مختلف پگ ڈنڈیوں میں نہ بھٹکو کہ خدا کی راہ سے دور جا پڑو، یہ ہے جس کی تمھیں ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم خدا کے غضب سے بچو) ہم نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ اصل ملت ابراہیمؑ کا بیان ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی ذریت کی دونوں شاخوں ——— بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل ——— کو ودیعت ہوئی لیکن ان دونوں ہی شاخوں نے اس میں بدعتیں پیدا کر کے مختلف پگ ڈنڈیاں نکال لیں، عربوں نے شرک و بت پرستی کی راہ اختیار کر لی، یہود و نصاریٰ نے یہودیت و نصرانیت کے شاخسانے کھڑے کر لیے۔ اس طرح اصل شاہراہ گم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے یہ صراط مستقیم دنیا کے لیے پھر کھولی، اور جیسا کہ اس سورہ کے پچھلے مباحث سے واضح ہوا، اس کے دلائل تفصیل سے بیان فرمائے لیکن مذکورہ تمام گروہوں نے اس واضح حقیقت کی مخالفت اور اپنی ایجاد کردہ ضلالتوں ہی پر جمے رہنے کے لیے ضد کی۔ اب یہ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ جن لوگوں نے اس دین میں، جو اللہ نے ان کو عطا فرمایا تھا، تفرقہ پیدا کیا اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے تم کو ان سے کچھ سروکار نہیں، تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اب وہی ان کو بتائے گا کہ وہ کیا کرتوتیں انجام دے کے آئے ہیں۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ اب پیغمبر کے لیے ان سے

اعلان برأت کا وقت بہت قریب آ رہا ہے، چنانچہ سورہ برأت میں، جو اس گروپ کی آخری سورہ ہے یہ اعلان جیسا کہ واضح ہو گا، آ گیا۔

'مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا الایۃ' یہ 'ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ' کی وضاحت ہے۔ ان کے اعمال کی خبر دینے سے مقصود ظاہر ہے کہ مجرد ان کو رپورٹ سنانا نہیں ہے بلکہ اس کا لازم یعنی جزا اور سزا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں واضح فرما دیا کہ جو نیکی لے کر آئے گا وہ اس کا دس گنا صلہ پائے گا اور جو کوئی برائی لے کر آئے گا وہ ٹھیک ٹھیک اپنی برائی کے بقدر سزا پائے گا، نہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ کوئی کمی کی جائے گی، نہ برائی کرنے والوں کے ساتھ کوئی زیادتی۔ یہ ملحوظ رہے کہ آیت میں 'اَمْثَالِهَا' اور 'مِثْلَهَا' کے جو الفاظ ہیں ان سے مراد ان کا وہ مثل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ٹھہرا رکھا ہے۔ وہ مثل مراد نہیں ہے جو دنیا میں سمجھا جاتا یا سمجھا جا سکتا ہے۔ نیز یہاں نیکی کے صلہ کی جو مقدار بیان ہوئی ہے وہ کم سے کم ہے۔ اس سے اس فضل کی نفی نہیں ہوتی جو دوسرے مقامات میں مذکور ہے۔

پیغمبر کی زبان سے فیصلہ کن اعلان

'قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ڬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ'۔ 'دِيْنًا قِيَمًا' 'صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ' سے بدل ہے اور لحاظ اس کے موقع و محل کا ہے 'قِيَمٌ' اور 'قَيِّمٌ' دونوں ہم معنی ہیں یعنی سیدھا اور فطری دین جس میں کوئی کجی اور انحراف نہیں ہے۔ قرآن میں یہ لفظ ملت ابراہیمؑ اور ملت اسلام کے لیے استعمال ہوا ہے اور مقصود اس سے اس ملت کے اس پہلو کو واضح کرنا ہوتا ہے کہ یہ اس زیغ و انحراف سے بالکل پاک ہے جو مشرکین، یہود اور نصاریٰ نے اپنے دین میں پیدا کر لیا۔

یہ وہی اوپر والی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مثبت انداز میں کہلائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھیں مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی پیدا کردہ بدعات و خرافات سے کوئی سروکار نہیں۔ تم واضح الفاظ میں ان سب کو یہ اعلان سنا دو کہ مجھے تو میرے پروردگار نے صراط مستقیم —— دین قیم، ملت ابراہیم —— کی ہدایت بخشی ہے جو اپنے رب کی طرف یکسو تھے، مشرکین میں سے نہ تھے۔ گویا وہ بحث جو اس سورہ میں شروع سے چل رہی تھی اپنے آخری نتیجہ تک پہنچ گئی، آخر میں آنحضرتؐ نے اعلان فرما دیا کہ اصل ملتِ ابراہیمؑ یہ ہے جس پر میں ہوں، جس کو پیروی کرنی ہو اس کی پیروی کرے، اس کے سوا سب کج پیچ کی راہیں ہیں جن سے مجھے کوئی تعلق نہیں، میں ان سے بری ہوں۔

'قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ الایۃ'، 'نُسُك' کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں نسک کے معنی قربانی کے ہیں اور نماز کے ساتھ اس کا جوڑ اس مفہوم کے لیے قرینہ فراہم کرتا ہے۔ سورہ کوثر میں ارشاد ہے 'فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ' (پس اپنے رب ہی کی نماز پڑھ اور اسی کے لیے قربانی کر)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ملت ابراہیمؑ اور ملتِ اسلام کی اصل روح کی تعبیر کرائی گئی ہے

ملتِ ابراہیم وملتِ اسلام کی اصل روح

نماز اور قربانی، زندگی اور موت دونوں میں غور کیجیے نہایت حسین تقابل ہے۔ نماز کے مقابل میں زندگی اور قربانی کے مقابل میں موت ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ جو اس ملت پر ہے وہ جیتا ہے تو خدا کے لیے اور مرتا ہے تو خدا کے لیے۔ اس کی زندگی میں کوئی تقسیم نہیں ہے۔ یہ از ابتدا تا انتہا بالکل ہم رنگ اور ہم آہنگ ہے۔ خدا کا کوئی ساجھی نہیں، لَا شَرِیۡکَ لَہٗ اس وجہ سے بندے کی زندگی میں بھی کوئی ساجھی نہیں، یہ پوری کی پوری، بغیر کسی تقسیم و تجزیہ اور بغیر کسی تحفظ و استثنا کے صرف اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کے لیے ہے۔ فرمایا کہ وَبِذٰلِکَ اُمِرۡتُ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ یہی میری فطرت ہے اور اسی کی مجھے اوپر سے ہدایت آئی ہے، اس وجہ سے میں تو سب سے آگے بڑھ کر اس قلادہ کو اپنی گردن میں ڈالا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں تو اس راہ پر چل پڑا ہوں اب جس میں ہمت ہو اس راہ میں میرا ساتھ دے۔ میں اپنا سفر دوسروں کے انتظار میں ملتوی نہیں کر سکتا۔

قُلۡ اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡغِیۡ رَبًّا وَّہُوَ رَبُّ کُلِّ شَیۡءٍ الایۃ یہ اس اسلام اور اس سرنگندگی و سپردگی کی دلیل بیان ہوئی ہے جس کا اظہار اوپر والی آیت میں ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا رب ہے تو میں آخر کس طرح اس کے سوا کسی اور کو رب بناؤں اور اپنی زندگی میں کسی اور کی شرکت تسلیم کر لوں؟ ہر جان جو کمائی کرے گی اس کی ذمہ داری بہر حال اسی پر آتی ہے، کوئی دوسرا اس کے بوجھ کا اٹھانے والا نہیں بنے گا۔ خدا ہی کی طرف سب کا پلٹنا ہوگا، اور وہ ان سارے اختلافات کا فیصلہ سنائے گا جن میں آج تم مبتلا ہو۔

وَہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَکُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ وَرَفَعَ بَعۡضَکُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبۡلُوَکُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىکُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیۡعُ الۡعِقَابِ ۫ۖ وَاِنَّہٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (۱۶۵)

قریش کو آخری تنبیہ

یہ قریش کو آخری تنبیہ ہے کہ اس دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہونے والی تم پہلی قوم نہیں ہو۔ تم سے پہلے کتنی قومیں اس اسٹیج پر نمودار ہوئیں، پھر غائب ہو گئیں۔ یہاں تک کہ خدا نے ان کی جگہ تم کو دی۔ یہ خلافت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس دنیا کے مالک نے جس باٹ اور ترازو سے ان کو تولا اسی باٹ، اسی ترازو سے وہ تم کو بھی تولے گا اور اس کی میزان میں اگر تم پورے نہ اترے تو جس طرح اس نے دوسروں کو پھینک دیا اسی طرح تم کو بھی اٹھا پھینکے گا، خدا کی جو سنت دوسروں کے معاملہ میں رہی ہے، کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے معاملہ میں بدل جائے۔ یہاں یہ بات اختصار کے ساتھ فرمائی ہے۔ اس کی پوری تفصیل آگے والی سورہ — اعراف میں آ رہی ہے جو اس کی توام سورہ ہے۔

'وَرَفَعَ بَعۡضَکُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبۡلُوَکُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىکُمۡ' یہ اس مغالطے کو رفع فرمایا ہے جو اولاً کو بالعموم لاحق ہوتا ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی دنیا کی زندگی میں کامیاب ہیں اور دنیوی اسباب و وسائل ان کو ان لوگوں کی نسبت زیادہ ہی حاصل ہیں جو انھیں آخرت کے ڈراوے سنا رہے ہیں تو وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں

کہ ان کو ڈرانے سنانے والے بے وقوف ہیں، اگر ان کی زندگی غلط ہوتی تو ان کو یہ کامیابیاں کہاں سے حاصل ہوتیں؟ اس طرح وہ اپنی سرکشی میں اور زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اس مغالطے میں پڑ کر اپنے کو تباہ نہ کرو۔ یہ جو کچھ تمھیں ملا ہے، تمھاری خوبیوں اور قابلیتوں کا ثمرہ نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے تمھارا امتحان ہے کہ تم شکر گزار بنتے ہو یا ناشکرے۔ نیکیوں اور بدیوں کی جزا اور سزا کا دن آگے آنے والا ہے اور یہ نہ سمجھو کہ وہ بہت دور ہے۔ وہ جلد آنے والا ہے اور اس دن ہر شخص اپنی نیکی اور بدی دیکھ لے گا۔ جنھوں نے اپنے رب کی ناشکری کی ہوگی وہ اس ناشکری کی سزا بھگتیں گے، جنھوں نے اس کا حق پہچانا ہو گا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت اور رحمت سے نوازے گا۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس بے مایہ اور گنہگار کے قلم سے اس سورہ کی تفسیر میں رقم ہوئیں۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

لاھور
۱۱ - صفر ۱۳۸۸ھ
۱۰ - مئی ۱۹۶۸ء

تدبرِ قرآن

٧

الاعراف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سورۂ انعام میں، جیسا کہ تفصیل سے واضح ہوا، قریش کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ دعوت اس بنیاد پر دی گئی ہے کہ یہی اصل ملت ابراہیم ہے جس کی ابراہیم نے اپنی ذریت کو تلقین کی نہ کہ وہ مجموعۂ بدعات و اوہام جو تم لیے بیٹھے ہو۔ اللہ نے تم پر بڑا فضل فرمایا ہے کہ اس نے تمہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جس نے اللہ کی حجت تم پر پوری کر دی ہے۔ اب تمہارے لیے گمراہی پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد بھی اگر تم اپنی ضد پر اڑے رہ گئے تو یاد رکھو کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو خدا نے ہمیشہ تباہ کر دیا ہے۔ یہ تاریخ کی ایک معروف حقیقت ہے جس کی دلیل ڈھونڈنے کے لیے تمہیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس ملک میں تم آج بااقتدار ہو خود اسی کی تاریخ میں تمہارے لیے کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ تم اس سرزمین پر پہلے آنے والے نہیں ہو بلکہ تم سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں جو اسی طرح اقتدار کی مالک ہوئیں جس طرح تم۔ بلکہ بعض اپنے اقتدار و سطوت کے اعتبار سے تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ انہی کے وارث تم ہوئے ہو۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ قدرت کا قانون تمہارے ساتھ اس سے مختلف معاملہ کرے جو اس نے ان کے ساتھ کیا۔ ان کے جن جرائم کی بنا پر خدا نے ان کو ہلاک کر کے ان کی جگہ تم کو بخشی، انہی جرائم کے مرتکب تم ہوئے تو خدا تم کو دندناتے پھرنے کے لیے کیوں چھوڑے رکھے گا، خدا کا قانون تو سب کے لیے ایک ہی ہے۔

انعام کے بعد اعراف، انعام کی مثنیٰ سورہ ہے۔ اس میں دعوت کے بجائے انذار کا پہلو غالب ہے۔ اس میں صاف صاف قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو بس سمجھ لو کہ اب تم خدا کے عذاب کی زد میں ہو۔ اس میں پہلے ان کی فردِ قرارداد جرم کی طرف اجمالاً اشارہ کیا، اس کے بعد تفصیل کے ساتھ ان تمام پچھلی قوموں کی تاریخ سنائی جو اس ملک میں اقتدار پر آئیں اور پھر یکے بعد دیگرے اسی جرم میں کیفر کردار کو پہنچیں جس کے مرتکب قریش ہوئے۔ یہ تفصیل گویا انعام کی آخری آیت کے اجمال کی تفصیل ہے۔ اسی کے ساتھ یہود کو بھی لے لیا ہے اور ان کو بھی بالکل آخری تنبیہ فرمائی ہے۔ آخر میں عہدِ فطرت کو، جو تمام ذریتِ آدم سے لیا گیا ہے، بنیاد قرار دے کر انذار کے مضمون کو اس کے آخری نتائج تک پہنچا دیا ہے جس کے بعد برأت، ہجرت اور اعلانِ جنگ یا نزولِ عذاب کے مراحل

سامنے آجاتے ہیں۔

اب ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ پوری سورہ بیک نظر نگاہ کے سامنے آجائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ اس کتاب الٰہی سے متعلق تمھاری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہوشیار کر دو تاکہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔ تم پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اس کو قبول بھی کر لیں۔ اس سے فائدہ صرف اہل ایمان ہی اٹھائیں گے۔ قریش کو تنبیہ کہ اس کتاب کو قبول کرو ورنہ یاد رکھو کہ تم سے پہلے کتنی قومیں رسولوں کی تکذیب کے جرم میں ہلاک ہو چکی ہیں اور جب خدا کا عذاب ان پر آیا تو اس کے مقابل میں وہ کوئی بند نہ باندھ سکیں بلکہ انھوں نے خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور عذاب الٰہی کی پکڑ میں آگئیں۔ پھر تم پر ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس میں تم سے تمھاری ذمہ داریوں کے بابت پرسش ہونی ہے اور رسول سے اس کی ذمہ داری کے بابت۔ اس دن سارا کچا چٹھا ہم سب کے سامنے رکھ دیں گے۔ اس دن جو میزانِ عدل نصب ہوگی وہ ہر ایک کے اعمال تول کر بتا دے گی کہ کس کے پاس کتنا حق ہے، کتنا باطل۔ اس دن فلاح صرف وہی پائیں گے جن کے پلڑے بھاری ہوں گے۔ باقی سب نامراد ہوں گے۔

(۱۰-۲۵) قریش کو تنبیہ کہ اس ملک میں تمھیں جو اقتدار حاصل ہوا، خدا ہی کا بخشا ہوا ہے۔ اسی نے تمھارے لیے معاش و معیشت کی راہیں فراخ کیں لیکن شیطان نے تم پر حاوی ہو کر تم کو ناشکری کی راہ پر ڈال دیا۔ آدمؑ اور ابلیس کے ماجرے کا حوالہ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیطان نے ذریت آدم کو جو دھمکی دی تھی کہ وہ ان کو اپنی چالوں سے گمراہ کر کے چھوڑے گا، ان کی اکثریت خدا کی نافرمان و ناشکری بن جائے گی، اس نے اپنی وہ دھمکی تمھارے اوپر سچ کر دکھائی۔ جس طرح اس نے آدم و حوا کو دھوکا دے کر جنت سے نکلوایا اسی طرح اس نے اپنا فریب تم پر چلایا ہے تو تم شیطان کے چکموں میں آکر اس کی امیدیں برآنے کے سامان نہ کرو۔

(۲۶-۳۰) یہ تذکیر کہ تم نے آدم کی اولاد ہو کر شیطان کی اس دشمنی کو یاد نہ رکھا جو اس نے تمھارے باپ کے ساتھ کی۔ اس نے انھیں فتنہ میں ڈالا اور حلۂ جنت سے محروم کر کے جنت سے نکلوایا۔ وہی کھیل وہ تمھارے ساتھ کھیلا ہے۔ خدا نے تم کو ظاہر و باطن کے جس لباس سے مزین کرنا چاہا شیطان کی اطاعت میں تم نے وہ دونوں جامے اتار پھینکے۔ تقویٰ کا لباس بھی جو باطن کی زینت ہے، اتار کر پھینک دیا اور ظاہر کا لباس بھی اتار دیا چنانچہ عین حرم الٰہی میں۔ اس نے تمھیں عریاں طواف پر دلایا اور تم اس بے حیائی کو نہ صرف باپ دادا کی وراثت سمجھتے ہو بلکہ یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اس کا حکم تمھیں خدا نے دیا ہے۔ سوچو کہ خدا ایسی بے حیائی کا حکم کس طرح دے سکتا ہے؟ خدا نے تو ہر باب میں صرف حق و عدل کا حکم دیا ہے، صرف اپنی عبادت کا حکم دیا ہے، توحید کا حکم دیا ہے۔ تم نے شیطان کی پیروی میں اپنے آپ کو فتنوں میں مبتلا کیا اور دعویٰ کرتے ہو

کہ یہی راہ ہدایت کی راہ ہے۔ صرف تقویٰ سے لوگ اس فتنہ سے محفوظ رہ سکے۔

(۳۱-۳۴) قریش کو تنبیہ کہ اپنے جی سے تم نے یہ جو حرام و حلال بنا رکھا ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ خدا نے نہ تو زینت حرام کی ہے اور نہ کھانے پینے کی چیزیں حرام کی ہیں۔ یہ دنیا میں بھی اہل ایمان کے لیے مباح ہیں اور آخرت میں تو وہ ان کے بلا شرکت غیرے حق دار ہوں گے ہی۔ خدا نے حرام بے حیائی کو ٹھہرایا ہے خواہ ظاہری ہو یا باطنی، حق تلفی اور سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے جن کا کوئی جواز نہیں، شرک کو ٹھہرایا ہے جس کے حق میں کوئی دلیل نہیں اور اللہ کے اوپر افترا کو حرام ٹھہرایا ہے۔ لیکن تم ان ساری ہی باتوں کے مرتکب ہو رہے ہو۔ اگر اس کے باوجود تمہیں مہلت مل رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے ہاں ہر امت کی تباہی کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔

(۳۵-۴۳) اس امر کی یاددہانی کہ ذریت آدمؑ کو ابتدا ہی میں یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام سے آگاہ کرنے کے لیے اپنے رسول بھیجے گا تو جو لوگ ان رسولوں کی پیروی کریں گے وہ جنت حاصل کریں گے، جو ان کو جھٹلائیں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے۔ یہ دوزخ میں پڑنے والے سب ایک دوسرے کے اوپر لعنت بھیجیں گے اور ان کو کسی طرح دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ بس دوزخ کی آگ ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنے گی۔ البتہ جو اہل ایمان ہوں گے وہ جنت حاصل کریں گے اور وہ باہمدگر ایک دوسرے کی ملاقات سے مسرور اور اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں پر شکرگزار ہوں گے۔ وہ اعتراف کریں گے کہ یہ ہمیں جو کچھ خدا نے بخشا اپنے رسولوں کی پیروی کے طفیل بخشا۔ رسولوں نے جو کچھ فرمایا سب حرف حرف سچ ثابت ہوا۔

(۴۴-۵۳) اہل جنت کا اہل دوزخ سے خطاب کہ ہم سے تو ہمارے رب نے جو وعدے فرمائے تھے وہ سب حرف بحرف پورے ہوئے، تم بتاؤ کہ تم نے بھی وہ سب کچھ دیکھ لیا یا نہیں جس سے تمھیں آگاہ کیا گیا تھا؟ اہل دوزخ پر خدا کی طرف سے لعنت کا اعلان۔ اس امر کا بیان کہ مقامِ اعراف سے اہل ایمان کے ایک گروہ کو دوزخ اور جنت دونوں کا مشاہدہ کرایا جائے گا تاکہ وہ دیکھ لیں کہ خدا نے رسولوں کے ذریعے سے جن باتوں کی خبر دی تھی وہ سب پوری ہوئیں۔ اصحاب اعراف کی طرف سے اہل جنت کو مبارک باد اور اہل دوزخ کو ملامت۔ اہل دوزخ کی اہل جنت سے فریاد کہ وہ ان پر کچھ کرم کریں۔ اہل جنت کی طرف سے جواب کہ جنت کی نعمتیں کفار پر حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان کہ جنھوں نے دنیا میں خدا کی باتوں کو نظر انداز کیا آج خدا نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ کفار کی طرف سے اپنی محرومی و بدبختی پر اظہار حسرت۔

(۵۴-۵۸) کفار قریش کو تنبیہ کہ خلق و امر سب خدا ہی کے اختیار میں ہے تو امید و بیم ہر حالت میں اسی کو پکارو۔ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو۔ قیامت شدنی ہے۔ موت کے بعد زندگی کا مشاہدہ تم اس کائنات میں برابر کر رہے ہو۔ خدا نے ہر پہلو سے اپنی آیات واضح فرما دی ہیں۔

(۵۹-۹۳) قوم نوحؑ، قوم ہودؑ، قوم صالحؑ، قوم لوطؑ، قوم شعیبؑ کی سرگزشتیں، جو اس بات کا تاریخی ثبوت ہیں کہ جو قومیں فساد فی الارض کی مرتکب ہوتی اور اپنے رسول کی دعوت اصلاح کی تکذیب کر دیتی ہیں اللہ تعالیٰ ان

کو صفحۂ ارض سے مٹا دیتا ہے۔

(۹۴ - ۱۰۲) مذکورہ بالا سرگزشتوں پر ایک اجمالی تبصرہ۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ جو معاملہ کرتا ہے اس کے بعض بنیادی اصول اور بعض حکمتیں اور عبرتیں۔ قریش کو یہ تنبیہ کہ انہی کے خلف تم ہو۔ تو اگر تم دیدۂ عبرت سے دیکھتے تو تمہارے اپنے ملک کی تاریخ میں تمہارے لیے کافی سامان بصیرت موجود ہے لیکن جس طرح ان قوموں کے دلوں پر اللہ کی مہر لگ گئی تھی اسی طرح تمہارے دلوں پر بھی اللہ کی مہر لگ چکی ہے۔

(۱۰۳ - ۱۳۷) حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت جس سے واضح ہوتا ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ کو شکست دینے کے لیے تمام ہتھکنڈے، جو اس کے امکان میں تھے، استعمال کیے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بامراد کیا اور فرعون کو، تمام اسباب و وسائل کے علی الرغم شکست دی۔ مفسدین کا بیڑا غرق ہوا اور جو جماعت مظلوم و مقہور تھی خدا نے اس کو، اس کی استقامت کی بدولت، زمین میں اقتدار بخشا۔

(۱۳۸ - ۱۷۱) بنی اسرائیل کی تاریخ کے تمام ادوار پر ایک جامع تبصرہ جس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہمیشہ بڑے بڑے کرم فرمائے لیکن انھوں نے شروع سے لے کر اب تک ہمیشہ خدا کے انعامات کی ناقدری کی اور کسی تذکیر و تنبیہ سے بھی کوئی پائدار فائدہ نہیں اٹھایا اور اب بھی ان کی روش وہی ہے چنانچہ جس حق کی علمبرداری کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی تھی وہ اس کی مخالفت میں پیش پیش ہیں حالانکہ یہ موقع ان کے لیے آخری موقع ہے جس کو ضائع کر دینے کے بعد ان کے لیے دائمی ذلت کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں رہ جائے گی۔

(۱۷۲ - ۲۰۶) خاتمۂ سورہ جس میں قریش کو عہد فطرت کی یاددہانی کی گئی ہے اور بنی اسرائیل کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ پھر ان کو عذاب الٰہی کی دھمکی دی گئی ہے اور خبردار کیا گیا ہے کہ جب اللہ کی پکڑ میں آجاؤ گے تو تمہارے یہ اولیا و اصنام جو تم نے گھڑ رکھے ہیں کچھ کام نہیں آئیں گے۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر، اعراض اور ہر آن یاد الٰہی کے ساتھ وابستہ رہنے کی ہدایت۔

سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ (۷)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۲۰۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۹

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ
لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾
وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ
قَآئِلُوْنَ ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ
اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ
وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا
غَآئِبِيْنَ ﴿۷﴾ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۨالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ
فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ
الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ﴿۹﴾

ترجمۂ آیات ۱-۹

یہ الٓمّٓصٓ ہے۔ یہ کتاب ہے جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے تو اس کے باعث تمھارے دل میں کوئی پریشانی نہ ہو تاکہ تم اس کے ذریعے سے لوگوں کو ہوشیار کر دو اور یہ اہل ایمان کے لیے یاددہانی ہے۔ لوگو، جو چیز تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب

سے آتاری گئی ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے ماسوا سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ بہت کم ہی تم لوگ یاددہانی حاصل کرتے ہو! اور کتنی ہی بستیاں ہوئی ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا تو آیا ان پر ہمارا عذاب رات میں اچانک یا دن دھاڑے جب وہ دوپہر کے آرام میں تھے۔ تو جب ہمارا عذاب ان پر آیا اس کے سوا وہ کچھ نہ کہہ سکے کہ بلاشبہ ہم ہی ظالم تھے۔ سو یاد رکھو، ہم ان لوگوں سے پرسش کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور خود رسولوں سے بھی ہم استفسار کریں گے۔ پھر ہم ان کے سامنے سب بیان کریں گے پورے علم کے ساتھ اور ہم کہیں غایب نہیں رہے ہیں۔ اس دن وزن دار صرف حق ہوگا تو جن کے پلڑے بھاری ٹھہریں گے وہی لوگ فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوئے وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا بوجہ اس کے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار اور اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔ ۱-۹

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓصٓ ۝ کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِکَ حَرَجٌ مِّنْہُ لِتُنْذِرَ بِہٖ وَذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ (۱-۲)

'الٓمّٓصٓ' حروف مقطعات پر تفصیلی بحث بقرہ میں الٓمّٓ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں الف، لام، میم پر حرف ص کا اضافہ ہے۔ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ جن سورتوں کے نام کچھ مشترک سے ہیں ان کے مطالب میں بھی فی الجملہ اشتراک پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سورہ کو غور سے پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بہت سی باتیں بقرہ سے ملتی جلتی ہیں اگرچہ دونوں میں مکی و مدنی کا فرق بھی ہے اور دونوں کے مخاطب بھی الگ الگ ہیں۔

یہاں تالیف کلام کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ الٓمّٓصٓ کو بحذف مبتدا مستقل جملہ بھی قرار دے سکتے ہیں اور اس کو آگے سے ملانا چاہیں تو اس کو مبتدا اور 'کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ' کو اس کی خبر بھی مان سکتے ہیں۔ ہم نے پہلی شکل اختیار کی ہے اور 'کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ' میں بھی مبتدا کو محذوف مانا ہے۔ ویسے دونوں شکلوں میں باعتبار مفہوم کوئی فرق نہیں ہے۔

قریش کی مخالفت کے دورِ شباب میں آنحضرت صلعم کو تسلی اور آپ کی ذمہ داری کی حد

کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِکَ حَرَجٌ مِّنْہُ، 'حرج' کے معنی تنگی، ضیق اور پریشانی کے ہیں۔ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ یہ دور، جیسا کہ سورہ کے مطالب کی فہرست سے واضح ہے، قریش کی مخالفت کے شباب کا دور تھا۔ وہ ہر قسم کے اوچھے سے اوچھے ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے تھے۔ آپ کو زچ کرنے کے لیے روز نت نئے مطالبے وہ پیش کرتے۔ ایک طرف مخالفت کی یہ شدت تھی دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے فرضِ دعوت کا احساس اتنا شدید تھا کہ سارے جتن کرنے کے باوجود آپ کو یہ فکر دامن گیر رہتی کہ مبادا میری ہی کوئی کوتاہی ہو جس کے سبب سے یہ لوگ اتنی صاف اور واضح حقیقت کے قائل نہ ہو رہے ہوں۔ یہ دونوں چیزیں مل کر آپ کے دل پر ایک بھاری بوجھ بنی ہوئی تھیں۔ قرآن نے یہاں یہ دونوں بوجھ ہلکے کیے ہیں۔ قریش کی مخالفت سے بے پروا رہنے کی یوں تلقین فرمائی کہ یہ کتاب نہ تمہاری اپنی پیش کردہ ہے نہ خدا سے درخواست کر کے تم نے اپنے اوپر اتروائی ہے بلکہ یہ تمہاری طلب و تمنا کے بغیر خدا کی طرف سے تم پر اتاری گئی ہے تو تم اس کے مخالفوں کی مخالفت سے اپنے آپ کو ضیق و پریشانی میں کیوں مبتلا کرو؟ جس خدا نے یہ اتاری ہے وہی اس کی تائید و نصرت کے لیے کمک اور بدرقہ بھی فراہم کرے گا۔ نہ وہ کوئی کمزور ہستی ہے نہ حالات سے بے تعلق یا بے خبر ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ جو ذمہ داری اس نے تم پر ڈالی ہے اس کو کماحقہٗ ادا کرنے کے لیے تم کن چیزوں کے محتاج ہو اور راہ کے پتھروں کو ہٹانے کے لیے تمہیں کتنی قوت درکار ہے۔ وہ یہ ساری چیزیں فراہم کرے گا تو تم خاطر جمع رکھو اپنے آپ کو پریشانی میں مبتلا نہ کرو۔

'لِتُنْذِرَ بِہٖ وَذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ' یہ اس کتاب سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کی حد بتا دی گئی ہے کہ آپ کا فرض صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو تکذیبِ رسول کے نتائج اور قیامت کے احوال سے اچھی طرح ہوشیار کر دیں۔ یہ مانتے ہیں یا نہیں، یہ سوال آپ سے متعلق نہیں ہے۔ آپ پر ذمہ داری صرف انذار و بلاغ کی ہے۔ 'وَذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ' کا ٹکڑا معناً عطف تو 'لِتُنْذِرَ' ہی پر ہے لیکن یہ فعل کے بجائے اسم کی شکل میں ہے۔ اس کے اسم کی شکل میں لانے سے ایک امر واقعہ کا اظہار مقصود ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک انذار کا تعلق ہے وہ تو تم ان کفار کو کر دو لیکن اس سے یاد دہانی کا فائدہ صرف اہل ایمان ہی اٹھائیں گے یہ مضمون جگہ جگہ، قرآن میں مختلف سورتوں میں، بیان ہوا ہے۔ ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ طٰہٰ ۚ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی ۙ اِلَّا تَذْکِرَۃً لِّمَنْ یَّخْشٰی ۙ تَنْزِیْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی۔ طٰہٰ ۱-۴ (یہ سورہ طٰہٰ ہے، ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ تمہاری زندگی تمہارے لیے اجیرن ہو کے رہ جائے، یہ تو بس یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو ڈریں، یہ تو نہایت اہتمام سے اتارا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے زمین اور ان بلند آسمانوں کو پیدا کیا۔)

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ ۭ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ (۳)

کفارِ قریش کو عذاب کی دھمکی عام طور پر لوگوں نے اس آیت کا مخاطب مسلمانوں کو مانا ہے لیکن سیاق و سباق اور آیت کے الفاظ دلیل ہیں کہ خطاب کفار قریش سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اوپر والی آیت میں تسلی دینے کے بعد اب یہ قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ یہ چیز جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کی پیروی کرو اور خدا کے ماسوا دوسرے معبودوں اور شریکوں کی پیروی نہ کرو، یہ خیالی اولیاء و اصنام تمہارے کچھ کام آنے والے نہیں ہیں۔ اس کے بعد بانداز حسرت و افسوس فرمایا کہ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ کہ تم ایسے شامت زدہ لوگ ہو کہ مشکل ہی سے یاددہانی حاصل کرتے ہو۔

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۴-۵)

قریہ کا مفہوم 'قَرْيَةٍ' کا لفظ قریہ اور اہل قریہ دونوں پر حاوی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے ضمیریں، اشارات اور فعل وغیرہ استعمال کرنے میں، کبھی لفظ کا اعتبار کرتے ہیں، کبھی مفہوم کا۔ یہ اسلوب ہر زبان میں عام ہے۔

'قَآئِلُوْنَ' قیلولہ سے ہے۔ قیلولہ کے معنی دوپہر منانے کے ہیں، سونا اس کے لوازم میں سے نہیں ہے۔ عرب کا ملک، گرم ملک ہے اس وجہ سے وہاں دوپہر میں لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے مکانوں، ڈیروں، خیموں اور باغوں میں آرام کریں۔

اہل تاویل کی ایک غلط فہمی بعض اہل تاویل کو فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ کے الفاظ سے یہ خیال ہوا ہے کہ اللہ کا عذاب اس وقت آتا ہے جب لوگ رات میں یا دن میں سوئے ہوئے ہوتے ہیں لیکن یہ بات تاریخ کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے بیان کے بھی۔ سورہ انعام میں ہے۔ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ ۴۷ (کہو، بتاؤ اگر تم پر اللہ کا عذاب اچانک چپکے سے یا کھلم کھلا آدھمکے تو ظالموں کے سوا اور کون ہلاک ہوگا!) اسی سورہ اعراف میں معذب قوموں کی سرگزشیں سنانے کے بعد ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے۔ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۔ ۹۷-۹۸ (کیا یہ بستیوں والے مامون ہوگئے اس بات سے کہ ہمارا عذاب ان پر رات میں آدھمکے جب وہ سوتے ہوئے ہوں! کیا یہ بستیوں والے مامون رہے کہ ہمارا عذاب ان پر چاشت کے وقت آدھمکے جب کہ وہ لہو و لعب میں مشغول ہوں) ہمارے نزدیک فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ سے یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے کہ خدا کا عذاب اس وقت آیا کرتا ہے جب لوگ سوئے ہوتے ہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ خدا کا عذاب شب کی تاریکیوں میں چپ چپاتے بھی آیا اور ڈنکے کی چوٹ دن دہاڑے بھی۔ جس وقت بھی آیا آگیا، نہ کوئی اس کو روک سکا اور نہ کوئی اس سے اپنے کو بچا سکا۔ صرف وہ لوگ اس سے بچ سکے جن کو اللہ کی امان حاصل ہوئی۔

اصل انذار یہ وہ انذار ہے جس کا وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ میں اشارہ ہے۔ قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ کتنی قومیں اور بستیاں ہیں

جن پر رات میں یا دن میں جب خدا نے چاہا اپنا عذاب بھیج دیا اور وہ تباہ کر دی گئیں، ان میں سے کوئی بھی خدا کے مقابل میں کھڑی نہ ہو سکی بلکہ ہر قوم نے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے اپنے آپ کو عذاب الٰہی کے حوالہ کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے بھی اس چیز کی پیروی نہ کی جو خدا نے تم پر اتاری ہے تو یہی حشر تمہارا بھی ہونا ہے۔ آج اکڑتے ہو لیکن اس وقت سارے کس بل نکل جائیں گے اور تم خود اپنے منہ سے اپنے جرم کا اقرار کرو گے لیکن اس وقت یہ اقرار تمہارے لیے کچھ نافع نہیں ہوگا۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ٱلْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (۶-۹)

انذار کی تفصیل

"فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ" ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اللہ کے رسول دو چیزوں سے لوگوں کو ڈراتے ہیں۔ ایک اس عذاب سے جو رسول کی تکذیب کرنے والی قوم پر لازماً آتا ہے۔ دوسرے اس جزا و سزا سے جس سے آخرت میں ہر شخص کو لازماً دوچار ہونا ہے۔ اوپر والی آیت میں پہلی چیز سے ڈرایا ہے۔ اب آگے اس دوسری چیز سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ ایک دن آنے والا ہے جب ہم ان اُمتوں سے بھی پرسش کریں گے جن کی طرف ہم نے اپنے رسول بھیجے اور خود رسولوں سے بھی سوال کریں گے۔

اُمتوں سے جو پرسش ہونی ہے اس کی تفصیل قرآن میں یوں بیان ہوئی ہے۔

كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ۔ ملک ۸-۱۱

جب جب ان کی کوئی بھیڑ دوزخ میں جھونکی جائے گی اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے، کیا تمہارے پاس کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے، ہاں ہمارے پاس ایک ہوشیار کرنے والا آیا تو تھا پر ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ خدا نے کوئی چیز بھی نہیں اتاری ہے، تم لوگ ایک بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔ وہ اعتراف کریں گے کہ اگر ہم سنتے سمجھتے ہوتے تو جہنم میں پڑنے والے نہ بنتے۔ پس وہ اپنے جرم کا اقرار کریں گے تو لعنت ہو ان دوزخیوں پر۔

رسولوں سے جو سوال ہوگا اس کا حوالہ سورہ مائدہ میں یوں دیا گیا ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ۔ ۱۰۹- مائدہ ۵

جس دن اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا پھر پوچھے گا تمہیں کیا جواب ملا؟

"فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ" مطلب یہ ہے کہ اس دن ہم رسولوں اور ان کی قوموں کو ساری

گزری ہوئی روداد، پورے علم و خبر کے ساتھ سنا دیں گے کہ ہمارے رسولوں نے کس طرح حق بلاغ ادا کیا اور ان کی تکذیب کرنے والوں نے کس طرح جان بوجھ کر ان کی تکذیب کی۔ فرمایا کہ ہم ایک لمحہ کے لیے بھی ان حالات و واقعات سے بے تعلق یا بے خبر نہیں رہے ہیں۔ جو کچھ ہوا ہے ہمارے سامنے ہوا ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ سنانا قطع عذر کے لیے ہوگا تاکہ کسی کے لیے بھی لب کشائی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔

میزانِ قیامت میں وزن دار صرف حق ہوگا — وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ، مطلب یہ ہے کہ اس دن وزن رکھنے والی شے صرف حق ہوگا۔ باطل بالکل بے حقیقت ہے کوئی وزن ہی نہیں ہوگا۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ جو ترازو نصب فرمائے گا وہ ہر ایک کے اعمال تول کر بتا دے گی کہ اس میں حق کا حصہ کتنا ہے۔ پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے، یعنی حق کی مقدار ان کے ساتھ زیادہ ہوگی، وہ فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہ خائب و خاسر ہوں گے۔ اعمال کے باوزن اور بے وزن ہونے کے باب میں قرآن نے یہ اصول بھی بیان فرمایا ہے۔ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۱۰۳-۱۰۵۔ کہف (ہم تمہیں بتائیں گے کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے کون ہوں گے؟ وہ جن کی ساری سرگرمیاں طلب دنیا میں برباد ہوئیں اور وہ اس خوش گمانی میں رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں، وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور ملاقات کا انکار کیا تو ان کے اعمال ڈھے گئے، تو ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن نہیں قائم کریں گے) اس سے معلوم ہوا کہ میزان قیامت میں وزن دار اعمال وہی ہوں گے جو خدا کی رضا اور آخرت کے لیے انجام دیے جائیں۔ جو اعمال اس وصف سے خالی ہوں گے نہ وہ اعمالِ حق ہیں، نہ میزانِ الٰہی میں ان کا کوئی وزن ہوگا۔

زبان کا ایک اسلوب — وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ..... بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ، ہم ایک سے زیادہ مقامات میں زبان کے اس اسلوب کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ جب صلہ اور فعل میں مناسبت نہ ہو تو وہاں تضمین ہوتی ہے یعنی کوئی ایسا فعل وہاں محذوف مانیں گے جو موجود خلا کو بھر سکے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لفظ کم استعمال ہوتے ہیں، لیکن معنی میں بہت وسعت ہو جاتی ہے۔ یہاں تضمین کھول دی جائے تو پوری بات یوں ہوگی بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِنَا وَيَظْلِمُونَ أَنْفُسَهُمْ بوجہ اس کے وہ ہماری آیات کا انکار کرتے اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰-۲۵

پہلے قریش کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا احسان جتا کر ان کو ملامت کی کہ کس طرح اللہ نے تم کو اس سرزمین محترم میں قوت و شوکت دی، تم کو خوف سے بے خوف کیا اور تمہارے لیے معاش و معیشت کی راہیں

کھولیں لیکن تم خدا کے شکرگزار و فرمانبردار ہونے کے بجائے ناشکرے اور اس کے نافرمان ہو گئے۔

اس کے بعد آدمؑ و ابلیس کا وہ ماجرا جو بقرہ میں یہود کو سنایا گیا ہے بعض تفصیلات کے اضافہ کے ساتھ قریش کو سنایا کہ شیطان نے آدمؑ اور ان کی ذریت کی ابدی دشمنی کی جو قسم کھائی تھی وہ قسم جس طرح آدمؑ و حوا کو دھوکا دے کر اور جنت سے نکلوا کر اس نے ان پر پوری کی، اسی طرح اس نے اپنی وہ قسم تم پر بھی پوری کر لی ہے اور تم پوری طرح اس کے جال میں پھنس چکے ہو اور اس کا جو نتیجہ تمہارے حق میں نکل سکتا ہے وہ ظاہر ہے ـــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ۗ قَلِيلًا مَّا آیات ۱۰-۲۵
تَشْكُرُونَ ﴿۱۰﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ ع ۱۰ ۸
اسْجُدُوا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوٓا إِلَّآ إِبْلِيسَ ۗ لَمْ يَكُنْ مِّنَ
السّٰجِدِينَ ﴿۱۱﴾ قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ۗ قَالَ
أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِينٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ
فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ
الصّٰغِرِينَ ﴿۱۳﴾ قَالَ أَنْظِرْنِيٓ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿۱۴﴾ قَالَ إِنَّكَ
مِنَ الْمُنْظَرِينَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَآ أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ
الْمُسْتَقِيمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ
وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۗ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ
شٰكِرِينَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا ۗ لَمَنْ تَبِعَكَ
مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۱۸﴾ وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ
وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ
فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا

مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ
الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَ
قَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا
ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا
مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا
الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا
رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ
فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا
ع ۲ ۵ ۹ تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾

ترجمۂ آیات ۱۰-۲۵

اور ہم نے تمھیں اس ملک میں اقتدار بخشا اور تمھارے لیے معاش کی راہیں کھولیں، پر تم بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہو۔ ۱۰

اور ہم نے تمھارا خاکہ بنایا، پھر تمھاری صورت گری کی، پھر فرشتوں کو فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو، سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ فرمایا کہ جب میں نے تجھے حکم دیا تو تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا؟ بولا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ فرمایا، پھر تو یہاں سے اتر، تجھے یہ حق نہیں ہے کہ تو اس میں گھمنڈ کرے، تو نکل، یقیناً تو ذلیلوں میں سے ہے۔ بولا، اس دن تک کے لیے تو مجھے مہلت دے دے جس

دن لوگ اٹھائے جائیں گے، فرمایا، تو مہلت دے دیا گیا۔ بولا، چونکہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا ہے اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے، ان کے پیچھے، ان کے داہنے اور ان کے بائیں سے ان پر تاخت کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکرگزار نہ پائے گا۔ فرمایا، تو یہاں سے نکل خوار اور راندہ۔ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ ۱۱-۱۸

اور اے آدم، تم اور تمھاری بیوی رہو جنت میں اور کھاؤ پیو جہاں سے چاہو۔ بس اس درخت کے پاس نہ پھٹکیو کہ اپنے اوپر ظلم کرنے والوں میں سے بن جاؤ۔ پس شیطان نے ان کے اندر وسوسہ اندازی کی کہ عریاں کر دے ان کی وہ شرم کی جگہیں جو ان سے چھپائی گئی تھیں۔ اس نے ان سے کہا کہ تمھارے خداوند نے تو تمھیں اس درخت سے صرف اس وجہ سے روکا کہ تم کہیں فرشتے یا ہمیشہ زندہ رہنے والے بن جاؤ۔ اور ان سے قسمیں کھائیں کہ میں تمھارے خیر خواہوں میں ہوں۔ اس طرح اس نے فریب سے ان کو شیشے میں اتار لیا۔ پس جب انھوں نے درخت کا پھل چکھ لیا اور ان کی شرم کی جگہیں ان کے سامنے بے پردہ ہو گئیں اور وہ اپنے کو باغ کے پتوں سے ڈھانکنے لگے اور ان کے رب نے ان کو آواز دی کہ کیا میں نے تمھیں اس درخت سے روکا نہیں تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے؟ وہ بولے اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم نامرادوں میں سے ہو جائیں گے۔ فرمایا، اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہوا اور تمھارے لیے زمین میں ایک وقت خاص تک ٹھہرنا اور کھانا بلنا ہے۔ فرمایا، اسی میں تم جیو گے، اسی

میں مروگے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔ ۱۹ - ۲۵

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۱۰)

ارض سے مراد سرزمین حرم ہے

تمکین فی الارض سے مراد زمین میں اختیار و اقتدار بخشنا ہے۔ مثلاً وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۲۱- یوسف (اور اسی طرح ہم نے یوسف کو ملک مصر میں اختیار و اقتدار بخشا) ارض اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن خطاب چونکہ قریش سے ہے اس وجہ سے اس سے مراد یہاں سرزمین حرم ہے جس میں قریش کو اختیار و اقتدار حاصل تھا۔ معایش سے اشارہ ان معاشی سہولتوں اور برکتوں کی طرف ہے جو ایک وادی غیر ذی زرع میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے اہل عرب کو عموماً اور قریش کو خصوصاً حاصل ہوئیں۔ قرآن میں ان برکتوں اور نعمتوں کا جگہ جگہ ذکر ہوا ہے اور ہم تفصیل کے ساتھ بقرہ میں ان کا حوالہ دے چکے ہیں۔ سورہ قصص میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ۵۷۔ قصص (کیا ہم نے ان کو ایک پرامن حرم میں اقتدار نہیں بخشا جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں) قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ یہ وہ اصل بات ارشاد ہوئی ہے جس کے کہنے ہی کے لیے اوپر والی باتیں بطور تمہید بیان ہوئیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی دعاؤں اور بیت اللہ کے طفیل تمھیں اللہ تعالیٰ نے اس ملک میں اختیار و اقتدار کی نعمت بھی بخشی اور معاش و معیشت کی نہایت فراخ راہیں بھی کھولیں لیکن تم سخت ناشکرے نکلے کہ تم نے اپنے پروردگار کے بجائے شیطان کی، جیسا کہ آگے تفصیل آرہی ہے، پیروی کی اور اس نے جن جن فتنوں میں تم کو مبتلا کرنا چاہا ہے تم ان سب میں مبتلا ہو گئے۔

قریش کا اختیار و اقتدار سرزمین حرم میں

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۱ - ۱۸)

آدم و ابلیس کا ماجرا اور اس کے مضمرات

اب یہ آدمؑ اور ابلیس کا وہ ماجرا سنایا جا رہا ہے جس سے آدمؑ اور ان کی ذریت کے ساتھ ابلیس اور اس کے ساتھیوں کی دشمنی کی تاریخ بھی سامنے آتی ہے، اس کا اصل سبب بھی واضح ہوتا ہے اور قیامت

تک کے لیے اس کو باقی رکھنے اور اولادِ آدمؑ سے انتقام لینے کا شیطان نے جو عہد کر رکھا ہے، اس کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس قصے کو پڑھتے ہوئے وہ مقصد نگاہ سے اوجھل نہ ہو جس کے لیے یہ سنایا گیا ہے۔

شیطان کو آدمؑ اور ان کی ذریت سے دشمنی اس حسد کی بنا پر ہے جو آدمؑ کی تکریم کے حکم سے اس کو لاحق ہوا۔ اس حکم کی تعمیل سے اس نے نہایت تکبر کے ساتھ انکار کیا جس کے نتیجہ میں وہ نہایت ذلت کے ساتھ جنت سے نکالا گیا۔ بالآخر اس نے اس غصہ میں اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ اسے اٹھائے جانے کے دن تک کے لیے یہ مہلت دی جائے کہ وہ آدمؑ اور اولادِ آدمؑ پر اپنے چرتر آزمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ درخواست منظور کر لی۔ یہ درخواست منظور ہو جانے کے بعد شیطان نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کیا کہ میں ان کو توحید کی راہ سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر ڈالوں گا اور ان کو اپنی تدبیروں، چالوں اور اپنے پروپیگنڈوں سے اس طرح بدحواس کر دوں گا کہ ان کی اکثریت تیری توحید کی راہ سے ہٹ جائے گی اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ، جس کو تو نے میرے اوپر فضیلت بخشی، ہرگز کسی فضیلت کا سزاوار نہیں ہے۔

اس کے بین السطور پر غور کیجیے تو چند باتیں بالکل واضح طور پر سامنے آئیں گی۔

ایک یہ کہ شیطان کو اصلی کد انسان سے یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اس پر ترجیح کیوں دی؟ اس نے اسی ترجیح کو غلط ثابت کرنے کے لیے خدا سے مہلت مانگی ہے۔ اب یہ انسان کی کیسی بدبختی ہے کہ وہ اس معرکے میں، جو خود اسی کے خلاف شیطان نے برپا کیا ہے، شیطان کا دست و بازو بن جائے اور خود اپنے عمل سے شیطان کے حق میں گواہ بن کر یہ ثابت کر دے کہ خدا نے اس کو جس عزت کا اہل سمجھا درحقیقت وہ اس کا اہل نہیں تھا بلکہ اس کے باب میں شیطان ہی کا گمان صحیح تھا۔

دوسری یہ کہ انسان اس دنیا میں ایک کارزارِ امتحان میں ہے جہاں شیطان سے ہر قدم پر اس کا مقابلہ ہے۔ شیطان اپنے سارے داؤں، سارے فریب، سارے چرتر انسان پر استعمال کرنے کے لیے خدا سے مہلت لے چکا ہے۔ خدا نے اس کو، جہاں تک ورغلانے کا تعلق ہے، مہلت دے دی ہے اور یہ مہلت اس کو قیامت کے دن تک کے لیے حاصل ہے۔ قیامت کے دن یہ فیصلہ ہو گا کہ کون جیتا اور کون ہارا؟

تیسری یہ کہ شیطان کی اس ساری سعیٔ اغوا و اضلال میں اصل ہدف عقیدۂ توحید ہے۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر گھات لگانے اور شبخون مارنے کا اس نے الٹی میٹم دیا ہے کہ میں اس راہ سے انسان کو ہٹا کر چھوڑوں گا اور انسانوں کی اکثریت اس سے منحرف ہو کر خدا کی ناشکری کرنے والی بن جائے گی۔ اوپر قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ کے الفاظ سے اسی امرِ واقعی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ شیطان نے انسان کے بارے میں جو گمان ظاہر کیا تھا تم نے اس کو اپنی نالائقی سے حرف حرف سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ اس وجہ سے تم خود اسی انجامِ بد کے متوجب بن چکے ہو جس کی خبر شیطان کے الٹی میٹم کے جواب میں خدا نے سنا دی تھی کہ میں تجھ کو

اور تیری پیروی کرنے والوں کو جہنم میں بھر دوں گا۔

نظم کلام کے واضح ہو جانے کے بعد الفاظ و اجزائے کلام کی وضاحت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی۔ ان میں سے اکثر چیزیں سورۂ بقرہ کی تفسیر میں پوری وضاحت سے زیر بحث آچکی ہیں۔ ان کے دہرانے میں طوالت ہوگی۔ البتہ جو چیزیں وہاں زیر بحث نہیں آئی ہیں ان کی وضاحت ہم یہاں کیے دیتے ہیں۔

لفظ 'خلق' کا مفہوم — 'وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ' الایۃ۔ 'خلق' کا صحیح لغوی مفہوم، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، کسی چیز کا خاکہ (DESIGN) بنانا ہے۔ یہ لفظ قرآن میں تنہا بھی استعمال ہوا ہے اور بعض جگہ اپنے دوسرے لوازم و متعلقات مثلاً 'برء'، 'تسویہ'، 'ترکیب' اور 'تصویر' کے ساتھ بھی استعمال ہوا ہے۔ جہاں یہ تنہا استعمال ہوا ہے وہاں یہ اپنے تمام لوازم و متعلقات پر مشتمل ہے۔ لیکن جہاں اپنے دوسرے متعلقات کے ساتھ آیا ہے جیسے یہاں خَلَقْنٰكُمْ کے بعد صَوَّرْنٰكُمْ بھی ہے تو ایسے مواقع میں یہ اپنے اصل لغوی مفہوم ہی میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں 'خلق' اور 'تصویر' کے دو لفظوں نے تخلیق کی ابتدائی اور انتہائی دونوں حدیں واضح کر دیں۔ ہر مخلوق کا مرحلۂ ابتدائی تو یہ ہے کہ اس کا خاکہ بنا اور اس کا آخری و تکمیلی مرحلہ یہ ہے کہ اس کی صورت گری ہوئی اور اس کے ناک نقشے اور نوک پلک درست ہوئے۔

یہاں مخاطب، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، قریش ہیں، اور بیان ان کے سامنے نوع انسانی کی تخلیق اور ان آزمائشوں کا ہو رہا ہے جو انسان کے لیے مقدر کی گئی ہیں۔ حضرت آدمؑ تمام نسل انسانی کے باپ ہیں اس وجہ سے ان کی سرگزشت تنہا انہی کی سرگزشت نہیں ہے بلکہ پوری نسل انسانی کی سرگزشت ہے۔

شیطان کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے — 'ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ' سجدہ کے مفہوم، اس حکم کی مصلحت، جنات کے اس حکم میں شامل ہونے کی وجہ اور اس ذیل کے دوسرے اہم مسائل پر ہم بقرہ کی تفسیر میں گفتگو کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ 'ابلیس' اس جن کا لقب ہے جس نے بادا آدمؑ کو دھوکا دیا۔ یہ جنات میں سے تھا اور خدا کی نافرمانی کر کے سرکش بن گیا۔ جنوں اور انسانوں میں سے جو لوگ اس کے پیرو بن جاتے ہیں وہ سب اس کی معنوی ذریت ہیں۔ ایسے ہی جنوں اور انسانوں کے لیے قرآن میں شیطان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ شیطان، جیسا کہ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا، کوئی مستقل بالذات مخلوق نہیں ہے۔

عربیت کا ایک اسلوب — 'قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ' قرآن میں، دوسرے مقام میں، یہی بات یوں فرمائی گئی ہے قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (فرمایا، اے ابلیس تجھے اس چیز کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا) دونوں آیتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ایک جگہ 'مَا مَنَعَكَ' کے بعد 'لا' ہے دوسری جگہ نہیں ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ 'مَا مَنَعَكَ' میں چونکہ خود 'لا' کا مضمون موجود ہے اس وجہ سے اس کے بعد اس کا لانا ضروری نہیں ہے لیکن لائیں تو اس سے شدت نکیر کا مضمون پیدا ہوگا۔ چنانچہ اس فقرے میں شیطان کے عدم سجدہ کی شناعت پوری طرح نمایاں ہے۔ یہ اسلوب ہماری اپنی زبان

میں بھی ہے۔

آدمؑ بجائے خود سزاوار سجدہ نہیں تھے

'اِذْ اَمَرْتُكَ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدمؑ بجائے خود سزاوار سجدہ نہیں تھے بلکہ خدا کے حکم کی بنا پر اس کے سزاوار ہوئے تھے اور ان کو سجدہ اصلاً وحقیقۃً ان کو سجدہ نہیں تھا، بلکہ خود خدا کو سجدہ تھا اس لیے کہ یہ سجدہ اسی کے امتثال امر میں تھا۔

نسل و نسب کو بنائے شرف سمجھنا ابلیس کی وراثت ہے

'قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ'۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کی سرکشی کی بنیاد اس گھمنڈ پر تھی کہ شرف و عزت کا تعلق نسل و نسب سے ہے اور اس اعتبار سے وہ انسان سے اشرف ہے۔ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے، آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن نے یہاں یہ رہنمائی دی کہ شرف و عزت کو نسل و نسب سے متعلق سمجھنے کا فلسفہ ابلیس کی ایجادات میں سے ہے اور جہاں کہیں بھی یہ موجود ہے اسی کی وراثت کی حیثیت سے موجود ہے۔ اللہ کے ہاں جو چیز سبب عزت و سرخروئی ہے وہ صرف اللہ کے حکم کی اطاعت ہے اس کے سوا کوئی چیز بھی خدا کے ہاں عزت پانے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

تکبر شرک ہے

'قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا الاية'۔ جانتے بوجھتے خدا کے حکم سے سرکشی تکبر ہے۔ جو اس تکبر میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو خدا سے بڑا یا اس کا ہمسر ٹھہراتا ہے جو صریحاً شرک ہے۔ کبریائی صرف خدا کے لیے زیبا ہے۔ جو اس میں حصہ بٹانے کے مدعی بنتے ہیں ان پر خدا کی طرف سے ذلت کی مار پڑتی ہے۔ متکبر کے لیے خدا کی بہشت میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ بہشت صرف خاشعین و عابدین کی جگہ ہے اس وجہ سے ابلیس کو وہاں سے نکلنے کا حکم ہوا اور اس کے تکبر کے جرم میں اس کو دائمی ذلت کی سزا دی گئی۔ آگے اسی طرح کے متکبرین کے بارے میں فرمایا ہے کہ جس طرح اونٹ سوئی کے ناکے میں نہیں جا سکتا اسی طرح متکبرین خدا کی بہشت میں نہیں جا سکتے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ، ۴۰ (بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان سے اعراض کیا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو جائے) بعینہٖ یہی بات سیدنا مسیحؑ نے فرمائی ہے کہ جس طرح اونٹ سوئی کے ناکے میں نہیں جا سکتا اسی طرح دولت مند خدا کی بہشت میں نہیں جا سکتا۔ دونوں تعبیروں میں صرف یہ فرق ہے کہ قرآن نے اصل جرم استکبار کا حوالہ دیا ہے اور سیدنا مسیحؑ نے علت جرم یعنی دولت کا، جو بالعموم استکبار کا سبب بن جاتی ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ شیطان کا اصل جرم استکبار تھا جس کے سبب سے وہ جنت سے نکالا گیا۔ اس وجہ سے جو لوگ اس جرم میں اس کے ساتھی بنیں گے ان کے لیے خدا کی بہشت میں کوئی مقام نہیں ہے۔

انسان کے لیے اصل معرکۂ امتحان

'قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ، قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ' ابلیس کو چونکہ ذلت کے ساتھ جنت سے

نکل جانے کا حکم ہوا اس وجہ سے اس کو گمان ہوا کہ اب اس کے لیے سعی و عمل کی کوئی مہلت باقی نہیں رہی ہے۔ اس پر اس نے خدا سے درخواست کی کہ اسے مہلت عطا کی جائے کہ وہ ثابت کر سکے کہ انسان فی الواقع اس شرف کا سزاوار نہیں ہے جو اسے بخشا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مہلت دے دی۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے انسان کی زندگی کا دارِ امتحان میں داخل ہوتی ہے۔ شیطان نے، جیسا کہ آگے آرہا ہے، اپنا پورا زور اس بات کے لیے لگانے کا منصوبہ بنایا کہ وہ انسان کو نااہل و نالائق ثابت کر دے اور انسان کی سعادت و کامرانی اس بات میں ٹھہری کہ وہ یہ ثابت کرے کہ فی الواقع وہ اس کا اہل ہے۔

کامیابی و ناکامی کا فیصلہ قیامت پر

یہ مہلت سعی و عمل چونکہ انسان کو موت ہی تک حاصل ہے اس وجہ سے شیطان کو بھی ورغلانے اور بہکانے کا موقع صرف انسان کی موت ہی تک ہے۔ مرجانے کے بعد جس طرح انسان پر سعی و عمل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اسی طرح شیطان کے لیے اس پر زور آزمائی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہے لیکن یہ فیصلہ کہ کون جیتا کون ہارا، قیامت کے دن ہی ہوتا ہے اس وجہ سے ابلیس نے مہلت 'اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ' مانگی جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اپنی یہ درخواست منظور کرا کے انسان کے شرف و مزیت کے معاملہ کا فیصلہ قیامت پر ملتوی کرا دیا۔ اب وہیں یہ فیصلہ ہوگا کہ انسان اس تاجِ زریں کا سزاوار ہے یا نہیں ہے اگر وہ سزاوار ٹھہرا تو اس کے لیے جنت کی ابدی نعمتیں ہیں ورنہ جس طرح شیطان دوزخ میں ہوگا اسی طرح انسان بھی دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنائے گا۔

ابلیس کا چیلنج اللہ تعالیٰ کو

'قَالَ فَبِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاَقۡعُدَنَّ لَهُمۡ صِرَاطَكَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ' اپنی درخواست منظور کرا لینے کے بعد یہ چیلنج ابلیس نے اللہ تعالیٰ کو دیا۔ اس نے اپنا اصل حریف اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھا اس وجہ سے چیلنج بھی اللہ تعالیٰ ہی کو دیا۔ گویا اس کارزار میں شیطان کے نقطۂ نظر سے، اصل مقابلہ شیطان اور انسان کے درمیان نہیں بلکہ خدا اور شیطان کے درمیان ہے۔ 'بِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ' (بوجہ اس کے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے سجدہ نہ کرنے کے معاملہ میں اپنے رویہ کو بالکل صحیح سمجھا۔ اس کے نزدیک اس کی گمراہی خود کردہ نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) خدا کردہ ہے۔ گویا خدا نے اسے ڈالا ہی تھا ایسے امتحان میں جس سے وہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا اس وجہ سے وہ گمراہ ہوا تو اس گمراہی پر نعوذ باللہ خدا ہی نے اس کو مجبور کیا۔

شیطان کی اصل گھات

'صِرَاطَ مُسۡتَقِيۡمَ' سے مراد توحید کی راہ ہے۔ انسان کی فطرت اور خدا میں براہِ راست ربط ہے۔ فطرت کی راہ میں غیر فطری کج پیچ نہ پیدا کر دیے جائیں تو انسان توحید کے سوا کوئی اور راہ نہیں اختیار کر سکتا۔ اس وجہ سے توحید کو قرآن میں بھی اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بھی 'صِرَاطِ مُسۡتَقِيۡم' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جب تک انسان اس راہ پر قائم رہتا ہے اس وقت تک، وہ سست رو اور آبلہ پا ہو کر بھی رہ منزل رہتا ہے اس وجہ سے دیر سویر منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ برعکس اس کے، اگر وہ شرک کے کسی موڑ کی طرف مڑ جائے تو اصل منزل سے رو گرداں ہو جاتا ہے اور پھر جتنے قدم بھی وہ آگے بڑھتا ہے

اس کا سفر کسی منزل بے مقصد ہی کی راہ میں ہوتا ہے۔ یہ رمز ہے جس کے سبب سے شیطان کو انسان پر پوری فتح حاصل کرنے کا اس وقت تک موقع نہیں ملتا جب تک وہ اس کو توحید کی شاہراہ سے ہٹا کر شرک کی کسی پگڈنڈی پر نہ ڈال دے۔ چنانچہ اس نے اپنے چیلنج میں آشکارا الفاظ میں بتا دیا کہ وہ انسان کی گھات میں توحید کی راہ پر بیٹھے گا اور اس راہ سے اس کو بے راہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

شیطان کے ہر جہت حملے کا بیان

ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ۔ یہ بیان ہے شیطان کے حملہ کی قوت، وسعت اور ہمہ گیری کا خود اس کی زبان سے۔ وہ ہر جہت، ہر سمت، ہر پہلو سے انسان پر حملہ کرے گا۔ وہ اس کے مشاہدات، احساسات، جذبات، خواہشات ہر منفذ سے اس کے اندر گھسنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اس کے فکر، فلسفہ، علم، ادراک ہر چیز کو مسموم کرے گا۔ وہ اس کی تحقیق، تنقید، تصنیف، تالیف، ادب، آرٹ، شعر، ہر ہر چیز میں اپنا زہر گھولے گا۔ وہ اس کے تہذیب، تمدن، معیشت، معاشرت، فیشن، کلچر، سیاست اور مذہب ہر چیز کے اندر فساد برپا کرے گا۔ شیطان کا یہی چیلنج سورۂ بنی اسرائیل میں بدیں الفاظ نقل ہوا ہے۔ قَالَ اَرَءَیْتَکَ هٰذَا الَّذِیْ کَرَّمْتَ عَلَیَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا۔ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَکَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُکُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا۔ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِکَ وَاَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِکَ وَرَجِلِکَ وَشَارِکْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا ۶۲-۶۵ (ذرا دیکھ تو، یہی ہے وہ جس کو تو نے مجھ پر فضیلت بخشی ہے! اگر تو نے قیامت تک کے لیے مجھے مہلت بخشی تو تھوڑے قلیل کے سوا میں اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا۔ خدا نے فرمایا، چل دور ہو، جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے تو تمہارا بھرپور بدلہ جہنم ہے۔ تو ان میں سے جن کو اپنے شور و شغب سے اکھاڑ سکے اکھاڑ لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لے اور ان کے مال و اولاد میں ساجھی بن جا اور ان کو اپنے پرفریب وعدوں کے سبز باغ دکھا۔ شیطان کے سارے وعدے ان سے محض دھوکے کی ٹٹی ہیں — بے شک تجھ کو میرے خاص بندوں پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا اور تیرا رب اعتماد کے لیے کافی ہے)

اس آیت سے شیطان کے پروپیگنڈے کے زور اور اس کی وسعت کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور یہ بات بھی نکلتی ہے کہ وہ اپنے منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے سیاسی ہتھکنڈے بھی استعمال کرے گا۔ البتہ ایک پہلو اس میں تسلی کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو انسان پر یہ اختیار نہیں بخشا کہ وہ اس کے ارادے اور اختیار کو سلب کر سکے۔ انسان کا ارادہ و اختیار بہرحال باقی رہے گا۔ اس وجہ سے اللہ کے جو بندے صراط مستقیم پر قائم رہنے کا عزم کر لیں گے وہ شیطان کی تمام غوغا آرائیوں کے علی الرغم اس پر قائم رہیں گے، اگرچہ اس کے لیے انھیں جان کی بازی کھیلنی پڑے۔

توحید کی اصل روح

وَلَا تَجِدُ اَکْثَرَهُمْ شٰکِرِیْنَ، کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہے کہ تو ان کی اکثریت کو اپنا موحد نہیں پائے گا۔

اس لیے کہ توحید کی اصل حقیقت یہی ہے کہ بندہ اپنی ہر نعمت کو اللہ ہی کا عطیہ، اسی کا فضل جانے اور اسی کا شکر گزار رہے۔ اگر وہ اس کو غیر اللہ کی طرف منسوب کر دے تو یہ شرک ہے۔ اس مسئلہ پر پیچھے بھی بحثیں گزر چکی ہیں اور آگے بھی اسی سورہ میں اس کے بعض نہایت اہم پہلو سامنے آئیں گے۔ اوپر آیت ۱۰ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

خدا کا دو ٹوک فیصلہ — قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا لَمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ الآیۃ۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو وہ مہلت تو دے دی جو اس نے مانگی لیکن ساتھ ہی اس نے اس کو ذلیل و خوار کر کے جنت سے نکال بھی دیا اس لیے کہ جنت میں متمردین و متکبرین کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ان لوگوں کا انجام بھی واضح فرما دیا جو انسانوں اور جنوں میں سے اس کی پیروی کریں گے۔ فرمایا کہ میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔ الفاظ پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ جس طنطنہ اور زور کے ساتھ شیطان نے انسان کو گمراہ کرنے اور ان کی اکثریت کو جیت لینے کے عزم کا اظہار کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھی پوری شان بے نیازی اور جبروت کے ساتھ دیا ہے جس سے واضح ہے کہ خدا کا یہ فیصلہ دو ٹوک ہے، اس میں کسی رو رعایت کی گنجائش نہیں ہے۔

يَآدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّٰلِمِينَ ۝ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُۥرِيَ عَنْهُمَا مِن سَوْءَٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَىٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَٰذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّآ أَن تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَٰلِدِينَ ۝ وَقَاسَمَهُمَآ إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّٰصِحِينَ ۝ فَدَلَّىٰهُمَا بِغُرُورٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْءَٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ ۖ وَنَادَىٰهُمَا رَبُّهُمَآ أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَآ إِنَّ الشَّيْطَٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَٰسِرِينَ ۝ قَالَ اهْبِطُوا۟ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَٰعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ (۱۹ - ۲۵)

سرگزشت آدم و ابلیس کے چند مضمرات — یہ اسی سرگزشت کا آگے کا حصہ بیان ہو رہا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ شیطان کو جنت سے نکالنے کے بعد آدم و حوا کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی کہ تم یہیں سے جنت میں رہو، اس کی تمام نعمتوں سے آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھاؤ، بس اتنا خیال رکھنا کہ فلاں درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ تم خود اپنی جان پر ظلم ڈھاؤ گے اور اس جنت سے محروم ہو جاؤ گے۔ شیطان نے یہیں سے آدم پر حملہ کرنے کی راہ نکال لی۔ اس نے آدم و حوا کو یہ پٹی پڑھائی کہ اس باغ میں کوئی درخت فائدہ اٹھانے کا ہے تو وہی ہے جس سے تمھیں تمھارے رب نے روک رکھا ہے۔ اس سے تمھیں محض اس وجہ سے روکا گیا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمھاری زندگی ابدی نہ ہو جائے۔ شیطان نے قسمیں کھا کھا کے آدم و حوا کو اپنی خیر خواہی کا یقین دلا دیا۔ بالآخر انھیں اس درخت کا پھل کھا لینے پر آمادہ کر لیا۔ اس کا پھل چکھتے ہی وہ حلۂ جنت سے محروم ہو گئے اور اپنے آپ کو ڈھانکنے کے لیے انھوں نے اپنے اوپر پتے سینے شروع کر دیے۔ اس وقت خدا نے ان کو آواز دی

کہ میں نے تو تمہیں آگاہ کر دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ اپنی دشمنی کا کھلے بندوں اعلان کر چکا ہے۔ اس پر آدمؑ و حوا کو تنبہ ہوا۔ انھوں نے فوراً توبہ و استغفار کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول بھی فرمالی لیکن ساتھ ہی آدم و حوا اور ابلیس سب کو وہاں سے نکلنے کی ہدایت ہوئی کہ اب تمہارا مستقر زمین ہے، اس میں تم ایک دوسرے سے آزمائے جاؤ گے، پھر جو اس جنت کا اپنے آپ کو حق دار ثابت کرے گا وہ جنت پائے گا اور جو دوزخ کا سزاوار ٹھہرے گا وہ دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔

اس سرگزشت کے سنانے سے جن حقائق کا سراغ مقصود ہے ان پر تفصیل سے سورہ بقرہ کی تفسیر میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ البتہ جو باتیں وہاں زیر بحث نہیں آئی ہیں ان کی وضاحت ہم بیان کریں گے۔

یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ، 'شجرہ' پر بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ سے یہ بات نکلتی ہے کہ پوری جنت کی ہر چیز سے آدمؑ و حوا کو فائدہ اٹھانے کی آزادی حاصل تھی، صرف ایک درخت سے ان کو روکا گیا تھا لیکن وہی درخت ان کے لیے آزمائش بن گیا۔ شیطان نے اسی شجر ممنوعہ کے فوائد و برکات پر ایسی دلفریب تقریر کی کہ آدمؑ اللہ کے عہد پر قائم نہ رہ سکے۔ شیطان کی یہی تکنیک اولادِ آدمؑ کے ساتھ اس دنیا میں بھی ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز انسان کے لیے مباح ہے صرف گنتی کی چند چیزیں ہیں جو ممنوع ہیں۔ شیطان بس انہی چیزوں کو لے کر اپنی اور اپنے کارندوں کی وسوسہ اندازیوں سے لوگوں کو باور کراتا ہے کہ تمہاری ساری کامیابی و ترقی کا راز بس انہی چیزوں کے اندر مضمر ہے جن سے روک دیا گیا ہے۔

ابلیس کو جنت سے نکلنے کے بعد بھی آدمؑ تک رسائی حاصل تھی

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا الاٰية، ہر چند شیطان مردود قرار پا کر جنت سے نکالا جا چکا تھا لیکن اوپر گزر چکا ہے کہ اس نے آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو ورغلانے اور بہکانے کے لیے مہلت حاصل کر لی تھی۔ اس مہلت کے سبب سے معلوم ہوتا ہے، اس کو آدمؑ و حوا تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی چنانچہ اس سے اس نے فائدہ اٹھایا اور وسوسہ اندازی کے لیے آدمؑ کے پاس پہنچ گیا۔

لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُرِيَ عَنْهُمَا میں 'ل' عاقبت کا ہے۔ شیطان کی کوشش تو، جیسا کہ اس نے اپنے چیلنج میں ظاہر کیا ہے آدمؑ کو کفرانِ نعمت اور خدا کی نافرمانی میں مبتلا کرنے کی تھی لیکن اس کا انجام چونکہ اس شکل میں ظاہر ہوا کہ آدمؑ و حوا حلۂ جنت سے محروم ہو گئے، اس وجہ سے اس کو اس طرح فرمایا گیا ہے گویا شیطان کی کوشش تھی ہی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر۔ حلۂ جنت سے یہ محرومی اشارہ تھی اس بات کی طرف کہ اب آدمؑ کو اپنی ساری ضروریات اپنی سعی و محنت سے فراہم کرنی ہیں۔ اب تک ان کے لیے ہر چیز کا جو خدا ساز انتظام تھا وہ اس نافرمانی کے بعد ختم ہو گیا۔

آدمؑ کا تصور فرشتوں اور زندگی سے متعلق

مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ ابلیس نے آدمؑ کو لالچ دیا کہ اس درخت کا پھل کھانے سے یا تو وہ فرشتوں کے مرتبے میں آ جائیں گے یا انھیں ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے سجدہ سے مشرف ہونے کے باوجود آدمؑ فرشتوں کے مرتبہ کو اپنے سے اونچا سمجھتے تھے

بنزرہ یہ جانتے تھے کہ یہ زندگی جو ان کو حاصل ہوئی ہے ابدی زندگی نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شیطان ان کو ان دونوں چیزوں کے نام پر ورغلانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوتا۔

مفاعلت مبالغہ کے مفہوم کے لیے

'وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ'، مقاسمۃ، باب مفاعلت سے ہے جو عام طور پر تو مشارکت کے مفہوم کے لیے آتا ہے لیکن کبھی کبھی یہ صرف تکثیر اور مبالغہ کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں 'اقسم' کے بجائے 'تقاسم' کا لفظ جو استعمال ہوا ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ شیطان کو اپنا اعتماد جمانے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ بار بار قسمیں کھا کھا کے اسے یہ یقین دلانا پڑا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، محض برنبائے خیر خواہی کہہ رہا ہے اس میں کسی بدنیتی کو دخل نہیں ہے۔

'فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ'، یہ 'ادلاء الدلو' سے نکلا ہوا محاورہ ہے۔ 'دلّی فلانا بغرور' کے معنی 'اوقعہ فیما اراد من تغریرہ' اس نے اس کو جس فریب میں مبتلا کرنا چاہا اس میں مبتلا کر دیا، اس کو اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہو گیا، اس کو شیشہ میں اتار لیا۔

ستر پوشی انسان کی فطرت ہے

'فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ'۔ درخت چکھنے کے معنی درخت کا پھل چکھنے کے ہیں۔ عربی میں مضاف کے حذف کر دینے کا اسلوب بہت معروف ہے۔ 'خصف' کے معنی گانٹھنے، گو تھنے، جوڑنے کے ہیں۔ یہ درخت، جیسا کہ اوپر گزرا آدم پر حرام ٹھہرایا گیا تھا اس وجہ سے اس کا پھل کھا لینے کی سزا ان کو یہ ملی کہ وہ حلۂ جنت سے محروم ہو گئے۔ لباس کا بنیادی مقصد چونکہ ستر ہے اور اس سے اچانک محرومی کا اولین اثر انسان پر بے پردگی کے احساس کی شکل میں بطور ایک حادثہ کے پڑتا ہے۔ اس وجہ سے صورتِ واقعہ کی پوری تصویر سامنے لانے کے لیے اس کو 'بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔ 'وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ' کے اسلوب بیان سے اس گھبراہٹ اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا ہے جو اس اچانک حادثہ سے آدم و حوا پر طاری ہوئی۔ جوں ہی انھوں نے محسوس کیا کہ وہ ننگے ہو کر رہ گئے ہیں فوراً انھیں اپنی ستر کی فکر ہوئی اور جس چیز پر ہاتھ پڑ گیا اسی سے ڈھانکنے کی کوشش کی، چنانچہ کوئی چیز نہیں ملی تو باغ کے پتے ہی اپنے اوپر گانٹھنے گو تھنے لگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر کا احساس انسان کے اندر بالکل فطری ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں محض عادت کی پیداوار ہیں ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ جس طرح توحید فطرت ہے، شرک انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے، اسی طرح حیا فطرت ہے، بے حیائی انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث اپنے محل میں آئے گی۔

'وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَا اَلَمْ اَنْهَكُمَا الاية' یہ اشارہ ہے ان تنبیہات کی طرف جو اوپر آیات ۱۷-۱۹ میں گزر چکی ہیں۔ آدم پر شیطان کی دشمنی کی نوعیت بھی اچھی طرح واضح کر دی گئی تھی، اس کا اور اس کی پیروی کرنے والوں کا انجام بھی واضح کر دیا گیا تھا اور خاص اس درخت کی نشان دہی بھی تعین کے ساتھ کر دی گئی تھی جس سے ان کو خطرہ پیش آ سکتا تھا۔

توبہ سے آدمؑ نے ہاری ہوئی بازی پھر جیت لی

'قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا' یہ آدمؑ و حوّا کی وہ توبہ ہے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا تنبیہ کے بعد کی۔ اس توبہ کا ذکر سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے تفصیل سے اس پر بحث کی ہے۔ اس توبہ سے آدمؑ نے ہاری ہوئی بازی پھر جیت لی۔ ابلیس کے متعلق تو اوپر گزر چکا ہے کہ وہ خدا کی نافرمانی کر کے تنبیہ کے باوجود، اکڑ گیا لیکن آدمؑ و حوّا نے اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کیا، خدا سے معافی مانگی اور بقرہ میں تصریح گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور ان پر رحم فرمایا اور اس طرح آدمؑ نے اپنے عمل سے اپنی ذریت کے لیے مثال قائم کی کہ اگر شیطان کے ورغلانے سے انسان کوئی ٹھوکر کھا جائے تو اس کے نتائج سے بچنے کی راہ توبہ ہے۔

'قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ الاٰیۃ' اس آیت کے تمام پہلوؤں پر بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے آدمؑ و حوّا نے اگرچہ توبہ کر لی تھی اور ان کی توبہ اللہ تعالیٰ نے منظور بھی فرمائی تاہم حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوا کہ آدمؑ و حوّا جنت سے نکلیں اور اس دنیا میں رہ کر وہ اور ان کی ذریت شیطان اور اس کی ذریت سے مقابلہ کریں، پھر اس میدان میں جو شیطان سے بازی لے جائیں وہ جنت کے وارث ٹھہریں۔ گویا مقابلہ تو وہی رہا جو ربّ کا ابلیس نے چیلنج دیا تھا لیکن میدان مقابلہ جنت کے بجائے یہ دنیا بنا دی گئی اور جنت کو انعام قرار دے دیا گیا۔ اولادِ آدم میں سے ان خوش بختوں کے لیے جو شیطان کے مقابل میں سرخ رو ٹھہریں۔

آدمؑ اور ابلیس دو محارب فریق

'بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ' کے ٹکڑے پر تفصیل سے تفسیر بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اسلوب کلام دلیل ہے کہ اس میدان میں آدمؑ و ابلیس کو اتارا ہی دو محارب فریقوں کی حیثیت سے گیا ہے۔ شیطان کو یہ مہلت دی گئی ہے کہ وہ اولادِ آدم میں سے جن کو جیت سکتا ہے جیت لے اور اولادِ آدمؑ کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ جو جنت کی میراث حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ شیطان کو پچھاڑیں اور جنت جیت لیں۔

نصاریٰ کا مغالطہ

یہاں اس مغالطہ سے متنبہ رہنا ضروری ہے جو نصاریٰ کو پیش آیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان بھی اس دنیا میں شیطان کی طرح لعنتی ہو کر اترا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے کفارہ کا ایک خانہ ساز عقیدہ گھڑا ہے۔ قرآن نے بقرہ میں بھی اور یہاں بھی نہایت واضح رہنمائی دی ہے کہ آدمؑ توبہ کے بعد اپنی پچھلی غلطی کے خمیازہ سے بالکل پاک ہو کر اس دنیا میں آئے ہیں اور اس دنیا میں ان کا بھیجا جانا اس لیے ہوا کہ وہ اور ان کی ذریت شیطان کے مقابل میں اپنے عزم و ایمان سے اپنے آپ کو اس عزت کا حق دار ثابت کر دیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بخشی اور جو شیطان کے حسد کا باعث ہوئی۔

آدمؑ و اولادِ آدمؑ کے لیے امتحان کے مراحل

'قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ الاٰیۃ' یہ ان مراحل کا بیان ہے جن سے اس دنیا میں آدمؑ و اولادِ آدمؑ کو گزرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان تمام مراحل سے گزر کر تم ہمارے پاس لوٹو گے اور اس وقت ہم تمھیں بتائیں گے کہ تم نے کیا کھویا ہے، کیا پایا ہے اور اس میدانِ مقابلہ سے تم سرخرو ہو کر لوٹے ہو یا نامراد ہو کر۔

۴- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۶-۴۳

آگے کی آیات میں پہلے ان باتوں کی یاد دہانی کی گئی ہے جن سے، شیطان کی دشمنی کے پیش نظر، اولادِ آدمؑ کو شروع ہی میں آگاہ کر دیا گیا تھا اور جن کا اہتمام پیش آنے والے امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے ہر ابن آدمؑ کا فرض تھا تاکہ وہ اس افتاد سے محفوظ رہیں جو ان کے دشمن ازلی کے ہاتھوں ان کے باپ کو پیش آئی۔

اس کے بعد قریش کی طرف جو اس سورہ میں مخاطب ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے ان ہدایات کو نظر انداز کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان نے ان کو بھی ورغلا کر اسی طرح ان کے کپڑے اتروا لیے ہیں جس طرح ان کے ماں باپ ـــــ آدمؑ و حوّا ـــــ کے اتروا لیے تھے لیکن یہ اپنی حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بے حیائی انھوں نے شیطان کی پیروی میں نہیں بلکہ خدا کے حکم کی تعمیل میں اختیار کی ہے اور دلیل اس کی ان کے پاس صرف یہ ہے کہ یہ طریقہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے وراثت میں پایا ہے۔

اس کے بعد اس روح اور اصل الاصول کا حوالہ دیا جو تمام خدائی احکام میں لازماً ملحوظ ہے اور جو خدائی احکام اور شیطانی بدعات میں امتیاز کے لیے عقلی و فطری کسوٹی ہے۔ پھر اس کسوٹی پر پرکھ کر بتایا کہ آج جن ابلیسی بدعات کو قریش خدا کا دین بتا رہے ہیں ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ باتیں انھوں نے شیطان کی رہنمائی میں خود ایجاد کی ہیں اور منسوب ان کو خدا کی طرف کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی ان کو دھمکی دی کہ انھوں نے یہ روش نہ بدلی تو یہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے جن سے ان کی ہم مشرب قومیں دوچار ہو چکی ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کا حوالہ دیا جو آدمؑ کو اس رزم گاہ امتحان میں اتارتے وقت ان کی ذریت میں انبیا و رسل کا سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کرنے کے لیے فرمایا تھا اور یہ آگاہی دی تھی کہ جو ان انبیا کی پیروی کریں گے وہ شیطان کے فتنوں سے امان میں رہیں گے اور جو ان کو جھٹلائیں گے وہ اپنی مہلت حیات پوری کر کے دوزخ میں پڑیں گے۔

اس کے بعد مکذبین انبیا اور متبعین انبیا دونوں گروہوں کے احوال آخرت کی نہایت موثر تصویر کھینچی ہے۔ پہلے گروہ کے متعلق بتایا ہے کہ جب دوزخ میں سب اگلے پچھلے اکٹھے ہوں گے تو آپس میں جوتیوں میں دال بٹے گی اور ایک دوسرے پر لعنتیں بھیجیں گے۔ اخلاف جن بڑوں کی پیروی پر آج نازاں ہیں، کل ان کو گالیاں دیں گے کہ انھوں نے ہماری راہ ماری، یہ نہ گمراہ کرتے تو ہم ہدایت پر ہوتے۔ اکابر اخلاف کو گالیاں دیں گے کہ یہ خود شامت زدہ تھے کہ انھوں نے ہدایت کی راہ اختیار نہ کی، اس میں ہمارا کیا قصور۔ دوسرے گروہ کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ جنت میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے خوش خوش

بیٹھے ہوں گے، کسی نفرت و ملامت کا کہیں نام و نشان بھی نہ ہوگا، مبارک سلامت کے تحائف کے مبادلے ہو رہے ہوں گے اور ہر گوشے میں خدا کے ترانۂ حمد اور انبیاء کے احسانات کے اعتراف سے محفل گونج رہی ہوگی ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۶-۴۳

يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ قَدۡ أَنزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسٗا يُوَٰرِي سَوۡءَٰتِكُمۡ وَرِيشٗاۖ
وَلِبَاسُ ٱلتَّقۡوَىٰ ذَٰلِكَ خَيۡرٞۚ ذَٰلِكَ مِنۡ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ لَعَلَّهُمۡ يَذَّكَّرُونَ (۲۶)
يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ لَا يَفۡتِنَنَّكُمُ ٱلشَّيۡطَٰنُ كَمَآ أَخۡرَجَ أَبَوَيۡكُم مِّنَ ٱلۡجَنَّةِ
يَنزِعُ عَنۡهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوۡءَٰتِهِمَآۚ إِنَّهُۥ يَرَىٰكُمۡ هُوَ
وَقَبِيلُهُۥ مِنۡ حَيۡثُ لَا تَرَوۡنَهُمۡۗ إِنَّا جَعَلۡنَا ٱلشَّيَٰطِينَ أَوۡلِيَآءَ
لِلَّذِينَ لَا يُؤۡمِنُونَ (۲۷) وَإِذَا فَعَلُواْ فَٰحِشَةٗ قَالُواْ وَجَدۡنَا
عَلَيۡهَآ ءَابَآءَنَا وَٱللَّهُ أَمَرَنَا بِهَاۗ قُلۡ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَأۡمُرُ
بِٱلۡفَحۡشَآءِۖ أَتَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ مَا لَا تَعۡلَمُونَ (۲۸) قُلۡ أَمَرَ
رَبِّي بِٱلۡقِسۡطِۖ وَأَقِيمُواْ وُجُوهَكُمۡ عِندَ كُلِّ مَسۡجِدٖ وَٱدۡعُوهُ
مُخۡلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَۚ كَمَا بَدَأَكُمۡ تَعُودُونَ (۲۹) فَرِيقًا هَدَىٰ
وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيۡهِمُ ٱلضَّلَٰلَةُۚ إِنَّهُمُ ٱتَّخَذُواْ ٱلشَّيَٰطِينَ أَوۡلِيَآءَ
مِن دُونِ ٱللَّهِ وَيَحۡسَبُونَ أَنَّهُم مُّهۡتَدُونَ (۳۰) يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ
خُذُواْ زِينَتَكُمۡ عِندَ كُلِّ مَسۡجِدٖ وَكُلُواْ وَٱشۡرَبُواْ وَلَا تُسۡرِفُوٓاْۚ
إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلۡمُسۡرِفِينَ (۳۱) قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِينَةَ ٱللَّهِ ٱلَّتِيٓ ۳ ع ۱۰
أَخۡرَجَ لِعِبَادِهِۦ وَٱلطَّيِّبَٰتِ مِنَ ٱلرِّزۡقِۚ قُلۡ هِيَ لِلَّذِينَ ءَامَنُواْ فِي
ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا خَالِصَةٗ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِۗ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ ٱلۡأٓيَٰتِ

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا
وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا
لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾
وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً
وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ
يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ
نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ
قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا
وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ادْخُلُوْا
فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا
دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ
قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا
ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ڛ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَالَتْ
اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ
بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا ع

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ
الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ
مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا
اِلَّا وُسْعَهَآ ۫ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾
وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ
وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ
لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَنُوْدُوْٓا اَنْ
تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ الثلثة

ترجمۂ آیات ۲۶-۴۳

اے بنی آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمھارے لیے سترپوش بھی ہے اور زینت بھی۔ مزید برآں تقویٰ کا لباس ہے جو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ اللہ کی آیات میں سے ہے تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ اے بنی آدم! شیطان تمھیں فتنہ میں نہ ڈالنے پائے، جس طرح اس نے تمھارے باپ ماں کو جنت سے نکلوا چھوڑا اُن کے لباس اتروا کر کہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کر دے، وہ اور اس کا جتھہ تم کو وہاں سے تاڑتا ہے جہاں سے تم ان کو نہیں تاڑتے۔ ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا رفیق بنا دیا ہے جو ایمان سے محروم ہیں۔ ۲۶-۲۷

اور جب یہ لوگ کسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں، کہتے ہیں، ہم نے تو اسی طریق پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور خدا نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ کہہ دو، اللہ کبھی

بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم لوگ اللہ پر وہ تہمت جوڑتے ہو جس کے باب میں تم کو کوئی علم نہیں۔ کہہ دو، کہ اللہ نے تو ہر معاملے میں قسط کا حکم دیا ہے۔ اور یہ کہ ہر مسجد کے پاس اپنا رُخ اسی کی طرف کرو اور اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے جس طرح اس نے تمہارا آغاز کیا اسی طرح تم لوٹو گے۔ ایک گروہ کو اس نے ہدایت بخشی اور ایک گروہ پر گمراہی مسلط ہو گئی۔ انھوں نے اللہ کے ماسوا شیاطین کو اپنا رفیق بنایا اور گمان یہ رکھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ اے بنی آدم! ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنے لباس پہنو اور کھاؤ پیو البتہ اسراف نہ کرو۔ خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پوچھو کس نے حرام ٹھہرایا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو؟ کہہ دو کہ وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور آخرت میں تو وہ خاص انہی کا حصہ ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کر رہے ہیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ کہہ دو، خدا نے حرام تو بس بے حیائیوں کو ٹھہرایا ہے، خواہ کھلی ہوں خواہ پوشیدہ۔ اور حق تلفی، ناحق زیادتی اور اس بات کو حرام ٹھہرایا ہے کہ تم اللہ کا کسی چیز کو ساجھی ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر کسی ایسی بات کا بہتان لگاؤ جس کا تم علم نہیں رکھتے۔ اور ہر امت کے لیے ایک مقررہ مدت ہے تو جب ان کی مدت پوری ہو جائے گی تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے، نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ ۲۸-۳۴

اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں تم کو میری آیات سناتے تو جو ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اور جو میری آیات کو جھٹلائیں گے اور تکبر کر کے ان سے اعراض کریں گے وہی دوزخ والے ہیں، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھیں یا اس کی آیات کو جھٹلائیں۔ ان لوگوں کو ان کے نوشتہ کا حصہ پہنچے گا۔ یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے فرشتے ان کو قبض کرنے آئیں گے تو اُن سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے کہاں ہیں؟ وہ جواب دیں گے وہ تو سب ہم سے کھوئے گئے اور یہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ لاریب وہ کفر میں رہے۔ حکم ہو گا، جاؤ، پڑو دوزخ میں ان امتوں کے ساتھ جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے گزریں۔ جب جب کوئی امت داخل ہو گی اپنی ساتھی امت پر لعنت کرے گی یہاں تک کہ جب سب اس میں اکٹھے ہو لیں گے، ان کے پچھلے اگلوں کے بارے میں کہیں گے، اے ہمارے رب! یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہم کو گمراہ کیا تو ان کو دہرا عذاب نار دیجیو۔ ارشاد ہو گا تم سب کے لیے دہرا ہے، پر تم جانتے نہیں۔ اور ان کے اگلے اپنے پچھلوں سے کہیں گے، تم کو بھی تو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوئی تو تم بھی اپنے کیے کی پاداش میں عذاب چکھو۔ ۳۶-۳۹

بے شک جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان سے منہ موڑا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں نہیں داخل ہوں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ سما جائے۔ اور ہم مجرموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ ان کے لیے دوزخ ہی کا بچھونا اور اوپر سے اسی کا اوڑھنا ہو گا اور ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے — ہم کسی جان

پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے ـــــ وہی جنت والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ان کے سینے کی ہر خلش ہم کھینچ لیں گے۔ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور وہ کہیں گے شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس نے اس چیز کی ہم کو ہدایت بخشی اگر اللہ نے ہمیں ہدایت نہ بخشی ہوتی تو ہم تو ہدایت پانے والے نہ بنتے۔ ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے۔ اور ان کو پیغام دیا جائے گا کہ یہی وہ جنت ہے جس کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث ٹھہرائے گئے ہو۔ ۴۰-۴۳

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ
مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ
يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا
جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲۶-۲۷)

لباس سے سترپوشی اور زینت دونوں چیزیں مقصود ہیں

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ 'ریش' کا لفظ چڑیوں کے پروں کے لیے بھی آتا ہے اور اس سے زیب و زینت کا لباس بھی مراد ہوتا ہے۔ لباس کا اولین مقصد تو سترپوشی ہے لیکن زیب و زینت بھی اس کے مقاصد میں داخل ہے۔ قدرت نے جو چیز بھی بنائی ہے اس میں مختلف پہلو ملحوظ رکھے ہیں اور یہ سارے ہی پہلو ہماری فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ سترپوشی کے لیے تو بھگوا یا لنگوٹی بھی کافی تھی لیکن قدرت نے اتمامِ نعمت کے طور پر ہمارے لیے ایسے لباس کا انتظام فرمایا جو سترپوش بھی ہو، سردی اور گرمی سے بھی ہماری حفاظت کرے اور اس سے ہماری شخصیت، ہمارے وقار، ہمارے حُسن اور ہماری شان میں بھی اضافہ ہو۔ ان میں سے کوئی مقصد بھی بجائے خود معیوب نہیں ہے البتہ افراط یا تفریط سے جس طرح ہر چیز میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح اس میں بھی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن نے زینت کو مقاصدِ لباس میں داخل کر کے اس جوگیانہ تصور کی نفی کر دی جو لباس کو ایک لائش اور عریانی یا نیم عریانی کو مذہبی تقدس کا درجہ دیتا ہے۔

باطنی لباس تقویٰ ہے

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ یعنی ظاہری لباس کے ساتھ ساتھ ایک باطنی لباس بھی انسان کو عطا

ہوا ہے اور وہ تقویٰ کا لباس ہے جو اس ظاہری لباس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ در حقیقت یہ تقویٰ کا لباس ہی ہے جو ظاہری لباس کی بھی حقیقی افادیت کو نمایاں کرتا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو آدمی اس ظاہری لباس کو اختیار کرتا ہی ہے اپنے اسی باطنی لباس کی تحریک سے۔ اگر یہ نہ ہو تو آدمی کپڑے پہن کر بھی ننگا ہی رہتا ہے اور اس کے لباس سے اس کے وقار میں اضافہ ہونے کے بجائے یا تو اس کی رعونت میں اضافہ ہوتا ہے یا اس کی بدقوارگی میں۔ یہ لباس تقویٰ، حیا، خشیتِ الٰہی، اور احساس عبدیت سے بنتا ہے اور جس کے قامت پر اللہ اپنی عنایت کی یہ ردا ڈال دیتا ہے دیکھنے کے قابل وقار و جمال اسی کا ہوتا ہے۔ یہ انسانوں کے لباس میں مقدس فرشتہ ہوتا ہے جو بھی اس کو دیکھتا ہے بے تحاشا مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ پکار اٹھتا ہے۔

ان باتوں کی یاددہانی جن کی ہدایت ابتدا ہی میں آدم کو کی گئی تھی 'ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ' یہ اوپر والی بات جس کی یاد دہانی کی گئی ہے ان باتوں میں سے ہے جن کی ہدایت اولادِ آدم کو اسی وقت کر دی گئی تھی جب آدم کو اس دنیا میں بھیجا گیا تھا اور مقصود اس کے حوالے سے یہ ہے کہ قریش متنبہ ہوں کہ شیطان نے جس فتنے میں آدم کو مبتلا کیا اسی طرح کے فتنے میں اس نے انھیں بھی مبتلا کر دیا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ آدم کو اس دنیا میں بساتے وقت آدم اور اولادِ آدم کو جو ہدایات اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھیں ان میں سے بعض کا حوالہ قرآن نے دیا ہے۔ مثلاً بقرہ میں ہے قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸ (ہم نے کہا یہاں سے سب اترو تو اگر آئے تمھارے پاس میری کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے، نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم) بعینہٖ یہی مضمون آگے اسی سورہ میں آیت ۳۵ میں آ رہا ہے يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (اے بنی آدم اگر تمھارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں تمھیں میری آیات سناتے ہوئے تو جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کی، اُن پر نہ کوئی خوف ہوگا نہ ان کو غم لاحق ہوگا) ہمارے نزدیک یہاں بھی انھی باتوں کا حوالہ ہے جن کی ہدایت ابتدا ہی میں اولادِ آدم کو کی گئی تھی تاکہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں اپنے آپ کو شیطان کے اس قسم کے فتنوں سے محفوظ رکھ سکیں جس قسم کے فتنے میں اس نے آدم و حوا کو ڈال دیا۔ یہ انھی باتوں کی یاد دہانی اب قریش کو کی جا رہی ہے تاکہ انھیں خبردار کیا جائے کہ وہ بھی شیطان کے نرغے میں آئے ہوئے ہیں اور اس نے وہی داؤں ان پر بھی چلایا ہے جو آدم پر چلایا تھا۔

'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ' کے خطاب کی بلاغت 'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ' کے خطاب کی بلاغت پر بھی یہاں نظر رہے۔ باپ کی زندگی کے حوادث و تجربات اولاد کے لیے سب سے زیادہ سبق آموز ہوتے ہیں۔ اس کی سرگزشت کسی دوسرے کی کہانی نہیں بلکہ اپنی ہی حکایت ہوتی ہے۔ باپ کے دوستوں سے دوستی، اس کے دشمنوں سے دشمنی باوفا اولاد خاندان کی ناقابلِ فراموش روایت کی طرح محفوظ رکھتی ہے۔ اخلاف اس کو یاد رکھتے ہیں اور اپنے بعد والوں کی طرف اس کو منتقل کرتے اور برابر

منتقل کرتے رہنے کی وصیت کرتے ہیں، اہل عرب میں تو یہ روایت اتنی محبوب رہی ہے کہ اس میں حق و باطل کا امتیاز بھی باقی نہیں رہا تھا۔ باپ دادا کا دشمن بہرحال پشتہا پشت دشمن ہی سمجھا جاتا اگرچہ اس کی دشمنی برحق ہی کیوں نہ رہی ہو۔ پھر کس قدر حیف کی بات ہے کہ آدم کی اولاد اپنے باپ کے ساتھ شیطان اور اس کی ذریت کی اس دشمنی کو بھول جائے جو سراسر کینہ اور حسد پر مبنی تھی، جو مخفی نہیں بلکہ بالکل علانیہ تھی اور جو صرف مخصوص آدم و حوا کے ساتھ ہی نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ان کی تمام ذریت کے ساتھ تھی۔ پھر معاملہ صرف بھول جانے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اولاد کی ناخلفی، ناہنجاری اور نابکاری اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ کتنے ہیں جو اس دشمن اور اس کے ساتھیوں ہی کو اپنا دوست، خیرخواہ اور معتمد بنائے بیٹھے ہیں اور اس کے کہے پر ٹھیک ٹھیک اپنے لیے انہی تباہیوں کے گڑھے کھود رہے ہیں جن میں اس نے آدم کو گرانا چاہا تھا اور وہ اس میں گر چکے تھے، اگر اللہ کی رحمت نے ان کو بچا یا نہ ہوتا ـــــ قرآن کی بلاغت بیان کے قربان جایئے کہ صرف 'یا بنی آدم' کے خطاب کے دو لفظوں کے اندر اس نے یہ سارے مضمرات محفوظ کر دیے ہیں، آدم کا جو غیور و باوفا بیٹا اس خطاب کے ساتھ قرآن کی ان یاددہانیوں کو سنتا ہے اس کی رگ رگ شیطان کے خلاف جوش حمیت و غیرت سے پھڑک اٹھتی ہے۔ صرف بے غیرت اور ناخلف ہی ہیں جو اس خطاب کے بعد بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

تمدن میں فساد پیدا کرنے کے لیے شیطان کی ایک خاص چال

'یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ کَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْکُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِیُرِیَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا' بھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، انہی یاددہانیوں میں سے ہے جو ابتدا ہی میں اولاد آدم کو کی گئی تھیں اور اس کے اسلوب بیان سے شیطان کی اس چال کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو وہ بنی آدم کے تمدن کو برباد کرنے اور بالآخر ان کو خدا کی نعمت سے محروم کر کے ہلاکت کے گڑھے میں گرانے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے پہلے لوگوں کو اس لباس تقویٰ و خشیت سے محروم کرتا ہے جو اللہ نے بنی آدم کے لیے اس ظاہری لباس کے ساتھ ایک تشریف باطنی کی حیثیت سے اتارا ہے اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ جب یہ باطنی جامہ اتر جاتا ہے تو وہ حیا ختم ہو جاتی ہے جو اس ظاہری لباس کی اصل محرک ہے۔ پھر یہ ظاہری لباس ایک بوجھ معلوم ہونے لگتا ہے۔ بے حیائی صنفی اعضا میں، جن کا چھپانا تقاضائے فطرت ہے، عریاں ہونے کے لیے تڑپ پیدا کرتی ہے، پھر فیشن اس کو سہارا دیتا ہے اور وہ لباس کی تراش خراش میں نت نئی اختراعات سے ایسے ایسے اسلوب پیدا کرتا ہے کہ آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں کپڑے پہن کر بھی، لباس کے بنیادی مقصد یعنی ستر پوشی کے اعتبار سے، گویا ننگے ہی رہتے ہیں۔ پھر لباس میں صرف زینت اور آرائش کا پہلو باقی رہ جاتا ہے اور اس میں بھی اصل مدعا یہ ہوتا ہے کہ بے حیائی زیادہ سے زیادہ دلکش زاویہ سے نمایاں ہو۔ پھر آہستہ آہستہ عقل اس طرح ماؤف ہو جاتی ہے کہ عریانی تہذیب کا نام پاتی ہے اور ساتر لباس وحشت و دقیانوسیت کا۔ پھر پڑھے لکھے شیاطین اٹھتے ہیں اور تاریخ کی روشنی میں یہ فلسفہ پیدا

کرتے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت تو عریانی ہی ہے۔ لباس تو اس نے رسوم و رواج کی پابندیوں کے تحت اختیار کیا ہے۔ یہ مرحلہ ہے جب دیدوں کا پانی مر جاتا ہے اور پورا تمدن شہوانیت کے زہر سے مسموم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بے حیا معاشرہ سزاوار ہوتا ہے کہ قدرت اس کے وجود سے زمین کو پاک کر کے ان کی جگہ دوسروں کو لائے اور دیکھے کہ وہ کیسا عمل کرتے ہیں۔

شیطان کے بھیس اَن گنت اور اس کے چر ترب بے شمار ہیں

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ یہ شیطان اور اس کے جتھے کی چالاکی، کیادی اور فتنہ سامانی کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے حملے کے راستے اور ان کے ظہور کے بھیس اتنے بے شمار ہیں کہ تم ان سارے راستوں پر نہ پہرا بٹھا سکتے، نہ ہر بھیس میں ان کو پہچان ہی سکتے۔ اس کے لشکر میں جن بھی ہیں اور انسان بھی۔ وہ وہاں سے گھات لگائیں گے جہاں سے تم دیکھ نہیں سکو گے اور تمھارے لیے وہ وہ بہروپ بھریں گے کہ تم پہچان نہ سکو گے۔ تم انھیں دوست، ناصح، خیرسگال، مرشد، لیڈر اور نہ جانے کیا کیا سمجھو گے اور وہ تمھارے دین و ایمان کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں گے۔ تم گمان کرو گے کہ وہ تمھارے لیے تہذیب و ترقی کی راہیں کھول رہے ہیں لیکن وہ تم کو وہاں لے جا کر ماریں گے جہاں پانی بھی نہ پاؤ گے۔ ان کو تمھارے باطن کی ساری کمزور رگیں معلوم ہوں گی اور وہ اپنی اندرونی وسوسہ اندازیوں سے بھی تم کو شکار کرنے کی کوشش کریں گے اور اپنی ظاہری عشوہ گریوں سے بھی تم پر اپنے جال پھینکیں گے ـــــ مطلب یہ ہے کہ اس دشمن کو معمولی دشمن نہ سمجھنا، ہر وقت اس سے چوکتے رہنا۔

شیطان کے فتنوں سے واحد امان

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ یہ شیطان اور اس کے جتھے کے حملوں سے محفوظ رہنے کی تدبیر بتائی ہے، وہ تدبیر یہ ہے کہ ایمان پر مضبوطی سے جمے رہنا۔ ایمان سے مراد اللہ اور اس کی اتاری ہوئی ہدایت پر ایمان ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس دنیا میں اتارتے وقت شیطان کے حملوں سے محفوظ رہنے کی واحد تدبیر یہ بتائی تھی کہ جو میری بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے، قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸۔ بقرہ (ہم نے کہا کہ یہاں سے سب اترو تو اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے نہ ان کے لیے کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم) زیر بحث ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شیاطین کو مسلط ہونے کا موقع انہی پر دیتا ہے جو خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے دل خالی گھر کے مانند ہوتے ہیں اس وجہ سے شیطان ان میں ڈیرے جما لیتے ہیں، خانۂ خالی را دیو مے گیرد۔ اس کے برعکس جن کے دل خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے آباد ہوتے ہیں ان کے اندر شیاطین کو گھسنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہی بات دوسری جگہ اس طرح ارشاد ہوئی ہے وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۳۶۔ زخرف (اور جو خدائے رحمان کی یاد سے بے پروا ہو جاتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پھر وہی اس کا

ساتھی بن جاتا ہے)

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ
بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۖ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ
وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ۝ فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۗ
إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ (۲۸-۳۰)

قریش پر شیطان کا جال

ان یاددہانیوں کو سنانے کے بعد جو اولادِ آدم کو کی گئی تھیں اب یہ قریش اور عربوں کا حال سنایا جا رہا ہے کہ کس طرح شیطان نے ان کو چکمہ دے کر اپنے جال میں پھنسا لیا ہے اور وہ اس کو اپنا دوست بنائے بیٹھے ہیں حالانکہ اس نے ان کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ کیا ہے جس طرح کا معاملہ ان کے باپ ماں — آدمؑ و حواؑ کے ساتھ کیا تھا۔ آدم و حوا کے کپڑے اس نے جنت میں اتروا لیے تھے، آدم کے ان بیٹوں اور حوا کی ان بیٹیوں کے کپڑے اس نے حرمِ الٰہی میں اتروا لیے ہیں اور ستم یہ ہے کہ یہ اس کو اپنے باپ دادا کی روایت اور خدا کی ہدایت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ خدا کی ہدایت نہیں بلکہ شیطان کا فتنہ ہے اور اس طرح اس نے یہ چاہا ہے کہ جس طرح اس نے آدم کو جنت سے نکلوایا اسی طرح ان کو ننگا کر کے اس حرمِ پاک سے بے دخل کرائے[1]۔

طوافِ عریاں کا فلسفہ اور اس کے مہلک اثرات

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا، فاحشہ اس کھلی ہوئی بے حیائی کو کہتے ہیں جس کو اندھوں اور احمقوں کے سوا سب بے حیائی قرار دیں۔ ہمارے مفسرین نے یہاں اس سے وہ بدعت مراد لی ہے جو خانہ کعبہ کا ننگے ہو کر طواف کرنے کی عربِ جاہلیت میں رواج پا گئی تھی۔ مفسرین کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ عربِ جاہلیت کی بے حیائیوں میں سے یہی بے حیائی ہے جس کو وہ، جیسا کہ وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا کے الفاظ سے واضح ہے، حکمِ شریعت کا درجہ دیتے تھے۔ اگرچہ قریش خود تو اپنے آپ کو اس سے بالاتر رکھے ہوئے تھے لیکن دوسروں کے لیے، مرد ہوں یا عورتیں، انھوں نے اس عریانی کو عبادت قرار دے رکھا تھا۔ ان کا فتویٰ یہ تھا کہ قریش سے باہر کے عرب اپنے کپڑوں میں خانہ کعبہ کا طواف نہ کریں۔ یا تو وہ قریش میں سے کسی سے اس کام کے لیے کپڑے مستعار لیں ورنہ ننگے طواف کریں۔ گویا دوسروں کے کپڑے آلائشِ دنیا اور زینتِ دنیا میں داخل ہیں جس سے اس عبادت کی حرمت کو بٹہ لگ جاتا ہے۔ یہ اسی طرح کی عیاشی اور نفس پروری کی ایک مکروہ شکل تھی جس کی بے شمار مثالیں مندروں اور کلیساؤں کی تاریخ میں ملتی ہیں اور جو تمام تر ان کے پروہتوں اور پجاریوں کی شیطنت سے وجود میں آئیں لیکن ان کو مذہبی تقدس کا درجہ دے دیا گیا۔ مزارات کے مجاوروں نے بھی اس معاملے میں شیطان کا بہت ہاتھ بٹایا ہے۔ اس بدعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ طواف جیسی مقدس عبادت فساق و فجار

---

[1] یہ حقیقت یہاں پیش نظر رہے کہ بیت اللہ، جیسا کہ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب تفسیر سورۂ کوثر میں تفصیل سے ثابت کیا ہے، اس دنیا میں حوضِ کوثر کا مجاز ہے۔

کی نظر بازیوں اور شرارتوں کی جولاں گاہ بن گئی اور حرم کی نظر بازیوں کی لذیذ و رنگین داستانیں ان کی فاسقانہ شاعری میں بھی نمایاں ہوئیں جن کو پڑھیے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ شیطان نے حرم میں گھسنے کے لیے کیسا مقدس مذہبی لبادہ اختیار کیا، کس کامیابی کے ساتھ اس نے اللہ کی سب سے بڑی عبادت کو اپنی عبادت میں تبدیل کر دیا لیکن کسی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ ہے اس حقیقت کا ایک پہلو جو اوپر اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ میں بیان ہوئی ہے۔

خدا کے احکام کی شناخت کے لیے کسوٹی

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، یہ تردید ہے اوپر والی بات کی کہ تم اس بے حیائی اور بے شرمی کو خدا کا حکم قرار دیتے ہو، خدا کبھی بے حیائی و بے شرمی کا حکم نہیں دیتا۔ خدا کے احکام، اس کی صفات اور انسان کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ جب اس کی صفات میں کوئی صفت بھی ایسی نہیں جو اس بے حیائی کو گوارا کر سکے تو وہ اس کا حکم کس طرح دے سکتا ہے؟ پھر جب اس نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ بدو شعور سے لے کر مرتے دم تک وہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کے سامنے عریاں ہو تو وہ اسی انسان کو یہ حکم کس طرح دے سکتا ہے کہ وہ عین اس کے حرم میں ساری خدائی کے سامنے ننگا ہو جائے اور ننگے ہو کر اس کے آگے پھیرے لگائے! آخر خدا اور اس کی پاکیزہ صفات، انسان اور اس کی سلیم فطرت کے ساتھ اس بیہودہ حرکت کا کیا جوڑ ہے؟ خدا پر ایسی بے ہودہ تہمت کیوں لگاتے ہو؟ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی ایسی بات جو بالکل بے سند اور بے دلیل ہے۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ، لفظ قسط پر پوری تفصیل کے ساتھ، ہم سورۂ آل عمران کی تفسیر میں بحث کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ہے اس وجہ سے بندوں کو اس نے جو حکم بھی دیا ہے سراسر قسط پر مبنی ہے۔ قسط ایک جامع حقیقت ہے جو تمام شریعت الٰہی کی روح ہے۔ یعنی ہر چیز میں ٹھیک ٹھیک نقطۂ عدل و اعتدال کا اہتمام۔ اس کا تعلق زندگی کے کسی ایک ہی پہلو سے نہیں ہے بلکہ ہر پہلو سے ہے، عقائد میں، اعمال میں، عبادات میں، اخلاق میں، معیشت میں، معاشرت میں، قانون میں، سیاست میں، غرض ہر شعبۂ زندگی میں یہی وہ اصل الاصول ہے جس پر شریعت الٰہی مبنی ہے۔ موقع و محل کی تبدیلی سے اس کی تعبیریں بدل بدل جائیں گی لیکن اصل حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ مثلاً دیکھیے اسی قسط پر یہاں اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ کو مبنی کیا اس لیے کہ جب خالق و مالک خدا ہے تو یہ قسط کے خلاف ہے کہ عبادت کی پیشانی کسی اور کے سجدہ سے آلودہ ہو، اسی پر كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ کو مبنی کیا اس لیے کہ یہ قسط کا تقاضا ہے کہ جب اس نے پیدا کیا، پرورش کے اسباب و وسائل فراہم کیے، خیر و شر کا امتیاز بخشا تو وہ حساب و کتاب بھی کرے اور جزا و سزا بھی دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ قسط نہیں بلکہ ظلم و جور ہو گا۔ پھر دیکھیے آگے چل کر اسی پر خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ اور كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کو مبنی کیا۔ یعنی یہ بات قسط کے خلاف ہے کہ خدا کی عبادت کے لیے آدمی لباس کو ترک کر دے یا کھانے پینے کی لذات سے دستبردار ہو جائے۔

قسط یہ ہے کہ آدمی پہنے بھی، کھائے پیے بھی، البتہ کسی چیز میں اسراف نہ کرے، اسراف قسط کے خلاف ہے۔ الغرض یہ قسط ایک ایسی کسوٹی ہے کہ جو شخص حکمتِ دین سے آشنا ہو وہ اس پر پرکھ کے جان سکتا ہے کہ کون سی بات خدا کی ہے اور کون سی بات خدا کی نہیں ہے۔

مسجد اپنی فطرت ہی سے خدا کے لیے خاص ہوتی ہے

'وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ' 'قسط' ایک حقیقتِ جامعہ ہے، جیسا کہ اوپر گزرا، اور اس کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے حقوق میں کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے۔ عبادت صرف خدا کا حق ہے، کوئی اور عبادت کا سزاوار نہیں ہے اس وجہ سے نہ کسی غیر اللہ کے لیے مسجد بن سکتی ہے نہ کسی مسجد میں اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رخ کرنے کی نیت کی جا سکتی ہے۔ سجدہ خدا ہی کے لیے زیبا ہے اس وجہ سے مسجد اپنی فطرت کے اعتبار سے خدا ہی کے لیے خاص ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا ہے 'وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا' (جن: اور یہ کہ مسجدیں صرف اللہ ہی کے لیے ہیں تو تم ان میں اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پکارو) بعینہٖ یہی بات آیت زیر بحث میں فرمائی کہ ہر مسجد صرف اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے، اس وجہ سے اپنے رُخ اسی کی طرف کرو۔ 'أَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ' کے بعد 'إِلَى اللَّهِ وَحْدَهُ' یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں اس لیے کہ بعد کے الفاظ 'وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ' کے الفاظ اس محذوف کا حق بھی ادا کر رہے ہیں اور اس حقیقت کا بھی اظہار کر رہے ہیں کہ خدا کی عبادت صرف عبادت ہی کے اخلاص کی مقتضی نہیں ہے بلکہ وہ اطاعت کے اخلاص کو بھی مقتضی ہے۔

دوبارہ لوٹوگے

'كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ' یہ توحید کے مضمون کی تاکید و توثیق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہی کی عبادت اور خدا ہی کی اطاعت اس لیے کرو کہ جس خدا نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر اسی کی طرف لوٹنا ہے اور جس طرح اس دنیا میں تنہا آئے ہو اسی طرح تنہا ہی اس کی طرف لوٹو گے بھی، تمہارے مزعومہ شریکوں اور سفارشیوں میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں ہوگا۔ قرآن کی اس بلاغت کے قربان جایئے کہ کل دو لفظ ہیں اور دو لفظوں میں اس نے آخرت اور توحید دونوں کا تعلق بھی واضح کر دیا اور آخرت کی ایک نہایت واضح دلیل بھی بیان فرما دی۔

'فَرِيقًا هَدَى وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ' الآیۃ مطلب یہ ہے کہ اصل حقیقت تو وہ ہے جو اوپر بیان ہوئی اور اللہ نے ایک گروہ کو اس حقیقت پر ایمان لانے کی توفیق بھی دی ہے لیکن ایک گروہ پر گمراہی مسلط ہو گئی۔ اس نے شیاطین کو اپنا دوست بنا رکھا ہے اور یہ شیاطین ان کو انہی گمراہیوں میں پھنسائے ہوئے ہیں جن میں ابلیس نے ان کو پھنسانے کی دھمکی دی تھی لیکن اپنی شامتِ اعمال سے گمان یہ کیے بیٹھے ہیں کہ وہ راہ ہدایت پر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی اس جہالت سے باز نہ آئے تو لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو ایسے شامت زدوں کے لیے مقدر ہے۔

يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ

الْمُسْرِفِيْنَ ۝ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ
لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ
اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ
يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ
لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۳۱-۳۴)

'یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ الاٰیۃ'۔ 'یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ' کا خطاب قریش اور عربوں ہی سے ہے۔ اس میں آدمؑ کی طرف نسبت میں بلاغت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ اس سے آدمؑ و شیطان کی اس سرگزشت کی یاددہانی ہوتی ہے جو تمام نسل آدمؑ کی مشترک سرگزشت ہے اور جو ہر ابن آدم کو یہ سبق دیتی ہے کہ شیطان ان کا ابدی دشمن ہے جس کو دوست بنانا اور جس کے کہے پر چلنا اپنے اور اپنے باپ کے دشمن کو دوست بنانا ہے۔

اس جوگ کی نفی جو عریانی کو تقویٰ ٹھہرائے

'خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ' میں زینت سے مراد لباس فاخرہ نہیں بلکہ مجرد لباس ہے۔ لباس کو زینت کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ بیان یہ ہے کہ طواف میں عریانی اختیار کرنے کا فلسفہ یہی تراشا گیا تھا کہ لباس زیب و زینت میں داخل ہے اور زیب و زینت اس عبادت کے شایان شان نہیں ہے۔ حج اور احرام میں فی الجملہ زہد و درویشی تو حضرت ابراہیمؑ کے عہد ہی سے چلی آرہی ہے اور یہ حج کی خصوصیات میں سے ہے لیکن عربوں نے دور جاہلیت میں جہاں اور بہت سی بدعات ایجاد کیں وہیں یہ بدعت بھی ایجاد کر ڈالی کہ احرام کی سادگی اور درویشی کو عورتوں اور مردوں سب کے لیے عریانی کے حد تک پہنچا دیا۔ قرآن نے یہ اسی بدعت کی اصلاح کی۔ فرمایا کہ یہ عریانی بے حیائی ہے۔ اپنے لباس ہر مسجد کی حاضری کے وقت پہنو۔ جس طرح کوئی مسجد غیر اللہ کے لیے نہیں ہو سکتی اسی طرح کوئی مسجد ایسی نہیں ہو سکتی جس کی حاضری کے لیے یہ شرط ٹھہرا لی جائے کہ آدمی وہاں کپڑے اتار کر حاضر ہو۔ 'کُلِّ مَسْجِدٍ' فرما کر اس حکم کو عام کر دیا کہ حرم اور غیر حرم کی تخصیص نہ رہ جائے۔ یہ اس جوگ اور رہبانیت کی کلی نفی ہے جو عریانی کو تقرب الٰہی اور وصول الی اللہ کا ذریعہ ٹھہراتی ہے۔

افراط اور تفریط دونوں تقویٰ کے خلاف ہیں

'کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ'۔ جس طرح لباس تقویٰ اور دینداری کے خلاف نہیں ہے اسی طرح کھانا پینا اور اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا بھی دینداری کے خلاف نہیں ہے۔ دینداری اور تقویٰ کے خلاف جو چیز ہے وہ اسراف ہے۔ اس لیے کہ یہ چیز اس 'قسط' کے خلاف ہے جو تمام شریعت اور تمام احکام الٰہی کی، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، روح ہے۔ اللہ تعالیٰ 'قَآئِمٌۢ بِالْقِسْطِ' ہے اس وجہ سے وہ 'مُقْسِطِیْنَ' یعنی عدل و اعتدال پر قائم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے، 'مُسْرِفِیْنَ' یعنی عدل و اعتدال سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ بے اعتدالی افراط کی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے، تفریط کی نوعیت کی بھی، اور یہ دونوں ہی باتیں خدا کی پسند کے خلاف ہیں۔ نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ آدمی کھانے پینے پہننے ہی

کو مقصود بنا لے اور رات دن اسی کی سرگرمیوں میں مشغول رہے اور نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ ان چیزوں کو لاہوتی اور جوگیوں کی طرح تیاگ دے۔ تبذیر اور تفریط دونوں ہی شیطان کی نکالی ہوئی راہیں ہیں، خدا زندگی کے ہر پہلو میں عدل و اعتدال کو پسند فرماتا ہے۔

اصل نقطۂ اعتدال

یہ سوال کہ ان چیزوں میں نقطۂ عدل و اعتدال کیا ہے اور حد اسراف کیا ہے انسان کی عقل سلیم اور فطرت سلیم پر چھوڑا گیا ہے اس لیے کہ اس کی کوئی قانونی حد بندی ممکن نہیں ہے۔ اشخاص اور حالات کے اعتبار سے اس میں فرق بھی ہو سکتا ہے۔ ایک غنی اور ایک فقیر دونوں کے لیے کوئی ایک معیار مقرر نہیں ہو سکتا ہے۔ تاہم ہر غنی سے اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو مال ہے اس میں دوسروں کے بھی حقوق ہیں اس وجہ سے اس کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا تو مباح ہے لیکن اسراف و تبذیر جائز نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ مسرفین کو دوست نہیں رکھتا۔ 'دوست نہیں رکھتا' کے الفاظ معمولی نہیں ہیں اس لیے کہ خدا جن کو دوست نہیں رکھتا لازماً وہ اس کے نزدیک مبغوض ہیں۔

خدا کی نعمتوں پر کوئی پابندی خدا ہی عائد کر سکتا ہے

'قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ' یہ سوال تردید اور انکار کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے عطا کیے ہوئے لباس اور پاکیزہ رزق کو تم نے کس کے کہنے سے حرام ٹھہرایا ہے؟ ان چیزوں کا عطا کرنے والا تو خدا ہے تو ان کو حرام ٹھہرانے کا حق کسی دوسرے کو کہاں سے حاصل ہوا؟ 'اَلَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ' یہاں بطور دلیل وارد ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو خود زبانِ حال سے شہادت دے رہی ہیں کہ عطا کرنے والے نے یہ بندوں کے برتنے کے لیے عطا فرمائی ہیں تو ان پر کوئی ناروا پابندی عاید کرنے کے کیا معنی؟ ان پر کوئی پابندی تو ان کا عطا کرنے والا ہی عاید کر سکتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تمہارے پاس کوئی سند یا دلیل ہو۔

اللہ کی نعمتوں کے جائز حقدار اہل ایمان ہی ہیں

'قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ الاٰيہ' اس ٹکڑے میں حذف کا وہ اسلوب ملحوظ ہے جس کی ہم ایک سے زیادہ مقامات میں وضاحت کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ متقابل الفاظ حذف کر دیے جاتے ہیں اس لیے کہ مذکور خود محذوف پر دلیل ہو جاتا ہے۔ یہاں 'لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' اور 'خَالِصَةً' کے مقابل الفاظ حذف ہیں۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں اس دنیا میں بھی اصلاً اہلِ ایمان ہی کا حق ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں کافروں کو بھی شریک کر دیا ہے، رہا آخرت کا معاملہ تو وہاں یہ سو فی صدی اہلِ ایمان ہی کا حصہ ہوں گی، کافروں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، البتہ دنیا میں انھوں نے ان سے جو فائدہ اٹھایا اس کی جواب دہی انھیں کرنی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا ایمان اور دینداری کے منافی نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کی نعمتوں کو مایا کا جال سمجھتے ہیں اور ان سے دستبرداری کو تقرب الٰہی کی شرط ٹھہراتے ہیں یہ ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، اللہ کے شکر گزار رہو، اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو اور اللہ اور

اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتے رہو۔

'کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ' بطور امتنان اور 'لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ' میں فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔

'قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ الاٰیۃ' اب یہ بتایا کہ خدا نے حرام کیا چیزیں قرار دی ہیں اور ان کے بتانے کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ جو چیزیں خدا نے حرام ٹھہرائی ہیں وہ تو تم نے نہ صرف جائز بلکہ دین بنا رکھی ہیں اور اچھی بھلی جائز و طیب چیزوں کو حرام کر کے دینداری کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہو۔

ان حرام چیزوں میں 'فواحش' ہیں، عام اس سے کہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی۔ ظاہری اور باطنی کی وضاحت انعام آیت ۱۵۱ کے تحت ہو چکی ہے۔

اس کے بعد اثم و بغی ہے۔ ان دونوں لفظوں کی تحقیق بھی پیچھے گزر چکی ہے۔ 'بغی' کے معنی تعدّی اور سرکشی کے ہیں یعنی خدا کے حدود و احکام سے تعدّی و سرکشی۔ اس کے ساتھ 'بِغَیْرِ الْحَقِّ' کی قید کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی 'بغی' حق بھی ہوتی ہے بلکہ یہ 'بغی' کے گھنونے پن کو ظاہر کرتی ہے کہ ہر 'بغی' بجائے خود ناحق ہوتی ہے۔ یہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ خدا سے اکڑے اور اس کے حدود پر حملہ آور ہو۔ جس طرح قتل انبیا کے جرم کے ساتھ یہ لفظ استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں بھی استعمال ہوا ہے۔

'وَاَنْ تُشْرِکُوْا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا' یعنی جہاں تک خدا کو ماننے کا تعلق ہے وہ تو عقل و فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے اور مشرک بھی خدا کو مانتا ہے، رہی یہ بات کہ خدا کا کوئی شریک بھی ہے تو اس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے اور دلیل بھی ایسی جو 'برہان' یعنی ایک حجت قاطع کی حیثیت رکھتی ہو اس لیے کہ خدا کی خدائی میں یوں ہی کسی کو جوڑ دینا سارے نظام عقل و فطرت اور پورے نظام عدل و قسط کو درہم برہم کر دینا ہے۔ اتنی بڑی بات بغیر اس کے مان لینے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ خدا نے اس کی کوئی نقلی یا عقلی یا فطری دلیل اتاری ہو۔

'وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' 'قول علی اللہ' سے مراد 'افترا علی اللہ' ہے یعنی اپنے جی سے حلال و حرام ٹھہرانا، اپنی خواہشوں کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کرنا، من مانے طور پر شریعت تصنیف کرنا اور ان ساری چیزوں کو خدا کی طرف منسوب کرنا کہ خدا نے ان کا حکم دیا ہے۔ اس ٹکڑے سے نبوت و رسالت کی ضرورت کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ جب خدا کی طرف کوئی بات بے سند منسوب کرنا ناجائز ہے تو لازم ہے کہ اس کی طرف سے رسول آئیں اور ان کی پیروی کی جائے۔

فرد قرارداد جرم کے بعد انذار

'وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ الاٰیۃ' ہم سورہ کے تمہیدی مباحث میں عرض کر چکے ہیں کہ اصلاً یہ سورہ انذار کی سورہ ہے۔ یہ باتیں جو اوپر بیان ہوئیں محض فرد جرم یا اتمام حجت کی نوعیت کی ہیں۔ اس وجہ سے کلام بار بار اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتا ہے۔ اوپر آیت ۲۹ میں 'کَمَا بَدَاَکُمْ تَعُوْدُوْنَ' میں جس طرح آخرت کی یاددہانی

کی اسی طرح یہ آیت قریش کو اللہ تعالیٰ کی اس سنت کو یاد دلا رہی ہے کہ تمہاری ان تمام شرارتوں کے باوجود اگر تمہاری پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو یہ نہ سمجھو کہ پکڑ ہوگی ہی نہیں۔ یہ سنت اللہ جس طرح تمام سرکش و باغی قوموں کے باب میں، جیسا کہ آیت ۹۴ میں بیان ہوئی، پوری ہوئی تم پر بھی لازماً پوری ہوگی۔ یہ مہلت جو تمہیں ملی ہے اس وجہ سے ملی ہے کہ اللہ نے ہر امت کی تباہی کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے۔ جب وہ پوری ہو جائے گی تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہوگی نہ آگے بڑھے گی۔

افراد اور اقوام کے لیے اجل کے الگ الگ پیمانے

یہاں اس مقررہ مدت کے لیے 'اَجَل' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ افراد اور اقوام کے معاملے میں خدا نے 'اَجَل' کے پیمانے الگ الگ رکھے ہیں۔ افراد کے پیمانے تو سالوں، مہینوں، دنوں اور گھنٹوں منٹوں کے حساب سے پورے ہوتے ہیں، جب وہ پورے ہو جاتے ہیں، فرد ختم ہو جاتا ہے۔ قوموں اور امتوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان کا حساب ان کے ایمانی و اخلاقی زوال سے ہوتا ہے۔ اخلاقی زوال و فساد کی ایک خاص حد ہے جو کسی قوم کے پیمانہ کے بھر جانے کی نشانی ہے۔ جب قوم گرتے گرتے اس حد کو پہنچ جاتی ہے، اس کا سفینہ غرق ہو جاتا ہے۔ جس طرح افراد کی موت کا وقت اللہ کے سوا کسی کو نہیں معلوم، اسی طرح قوموں اور ملتوں کے فنا ہونے کے صحیح وقت کا علم بھی اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کب کوئی قوم اپنے زوال اخلاقی کے اعتبار سے اس آخری حد پر پہنچ گئی کہ اب اس کا صفحۂ ارض پر باقی رہنا حکمت الٰہی کے خلاف ہے۔ یہاں وہ سنت الٰہی یاد رکھنی چاہیے جس کی وضاحت ہم متعدد مقامات میں کر چکے ہیں کہ کسی قوم میں رسول کی بعثت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کی آخری شکل ہوتی ہے اس وجہ سے قوم جب اپنے رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو لازماً فنا کر دیتا ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۂ یونس کی تفسیر میں آئے گی۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (۳۵-۳۷)

شیطان کے فتنوں سے امان رسول کی پیروی ہی میں ہے

'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ' یہ اس وعدے کی یاد دہانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور ان کی ذریت کے لیے اس وقت فرمایا تھا جب آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کا واقعہ پیش آیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔ 'قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ' ۳۸-بقرہ (ہم نے کہا، یہاں سے اترو تم سب تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان پر نہ کوئی اندیشہ طاری ہوگا، نہ ان کو کسی بات کا غم ہوگا)

آدمؑ اور اولادِ آدم سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ ان کو شیطان اور اس کی ذریات کی فتنہ انگیزیوں سے بچانے کے لیے فرمایا تھا کہ اگر شیطان کے فتنوں سے محفوظ رہنا ہے تو میرے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی کرنا۔ آدمؑ و ابلیس کی جو سرگزشت اس سورہ میں اوپر بیان ہوئی ہے اس پر غور کیجیے تو اس کے اندر اس انتظام کی عقلی و فطری ضرورت موجود ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذریتِ آدم کے باب میں فرشتوں کے گمان کی تردید بھی اولادِ آدم میں پیدا ہونے والے انبیاء و مصلحین کے ناموں کے حوالہ ہی سے فرمائی تھی۔ یہی وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے نسلِ آدم میں انبیاء و رسل کا سلسلہ جاری کر کے پورا فرمایا۔ اسی کی یاد دہانی یہاں قریش کو کی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ تمھیں شیطان نے بالکل اپنے نرغے میں لے لیا ہے۔ اس کے فتنوں سے امان کی شکل وہی ہے جو شروع ہی میں بتادی گئی تھی کہ جو رسولوں کی پیروی کریں گے وہ شیطان کے شر سے محفوظ رہیں گے تو تم اگر شیطان کے فتنوں سے امان چاہتے ہو تو اس رسول کی پیروی کرو جو تمھیں اللہ کی آیات سناتا ہوا آگیا ہے۔

کفار کے انجام کا بیان

'وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ' استکبار کے بعد حرف 'عَنْ' اس بات پر دلیل ہے کہ لفظ استکبار یہاں اعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے رسول آیاتِ الٰہی سناتے آئیں گے تو جو لوگ ان کو جھٹلائیں گے اور متکبرانہ ان سے منہ موڑیں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے۔

'فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ الاٰیۃ' اوپر کی آیات ہیں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یاد دہانی ہے۔ اب یہ براہِ راست قریش کی نسبت ارشاد ہو رہا ہے کہ ان سے بڑھ کر ظالم اور بدقسمت کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھیں یا اس کی آیات کی تکذیب کریں 'اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ' اس دنیا میں زندگی کے جو دن نوشتۂ تقدیر میں لکھے ہوئے ہیں وہ یہ پورے کریں گے یہاں تک کہ ہمارے فرشتے ان کو موت دیں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے رہے ہو وہ کہاں گئے، اب ان کو پکارو۔ یہ اس 'اِفْتِرَاءٌ عَلَى اللّٰهِ' کی وضاحت ہو گئی جس کا ذکر اوپر گزرا۔ شرک کو 'اِفْتِرَاءٌ عَلَى اللّٰهِ' کہنے کی وجہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں۔ فرشتوں کے لیے 'رُسُل' کا لفظ قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات میں آیا ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ 'رَسُوْل' اور 'مَلَك' کے لغوی مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یہاں 'رُسُل' کا لفظ جمع لانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لفظ ملک الموت اور ان کے تمام عملہ پر حاوی ہے 'قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا' یہ ان کے اعتراف کی تعبیر ہے اور وہ اپنے اس اعتراف سے اپنے کفر کی شہادت خود اپنی زبان سے دیں گے۔ کسی اور کی گواہی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ڛ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ

لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ (۳۸-۴۱)

'قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ' یہ وہ انجام بیان ہو رہا ہے جو ان لوگوں کے سامنے آئے گا۔ 'قَالَ' کا فاعل جب اس طرح کے مواقع میں حذف کر دیا جاتا ہے تو یہ بے اعتنائی اور بے رخی پر دلیل ہوتا ہے۔

یہاں دو ظرف نکرہ آئے ہیں 'فِي أُمَمٍ' اور 'فِي النَّارِ'۔ پہلے سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ تمھارے ساتھی کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا، جاؤ، ان لوگوں کے شریک حال بنو جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے شیطان کی پیروی کر کے گمراہ ہوئے، دوسرے سے مستقر و مقام کا پتا دیا ہے کہ تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ گویا ساتھی بھی بدترین، جگہ بھی بدترین!

'كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعَنَتْ أُخْتَهَا حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا الآية' 'ادَّارَكُوا' اصل میں 'تَدَارَكُوا' ہے۔ عربی میں الفاظ کی ہیئت میں بعض اوقات اس طرح کی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ 'تدارك القوم' 'تلاحقوا ای لحق آخرهم اولهم' ('تدارك القوم' کے معنی ہیں قوم کے پچھلے اگلوں سے جا ملے) 'قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ' میں 'ل' 'في' کے معنی میں ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ یعنی پچھلے اپنے اگلوں کے بارے میں کہیں گے۔

'ضِعْف' کے معنی دوگنے کے بھی ہیں اور قرینہ موجود ہو تو اس سے زیادہ کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

اہل دوزخ کی باہمی جوتی بیزار کی تصویر

یہ تصویر ہے اس جوتی بیزار کی جو ان لوگوں کے اندر دوزخ کے باڑے میں اکٹھے ہو جانے کے بعد ہوگی۔ دنیا میں تو یہ ایک دوسرے کے تابع اور متبوع، لیڈر اور پیرو، ساتھی اور مددگار بنے رہے، ایک دوسرے کے گن گاتے اور جھنڈے اٹھائے پھرتے رہے، سلامیاں اور ایڈریس پیش کرتے رہے۔ لیکن وہاں دوزخ میں آمنے سامنے ہوتے ہی ہر گروہ دوسرے پر لعنت کے دونگڑے برسائے گا۔ تابعین متبوعین سے کہیں گے تم پر پھٹکار ہو، تمھیں نے ہمارا بیڑا غرق کیا! متبوعین کہیں گے تم خود شامت زدہ تھے کہ تم ہماری راہ چلے، اس میں ہمارا کیا قصور!

یہ صورت حال تو اس وقت کی بیان ہوئی ہے جب بالکل اول اول آمنے سامنے ہوں گے۔ اس کے بعد جب سب اکٹھے ہو لیں گے تو پچھلے اپنے اگلوں کے بارے میں خدا سے استغاثہ کریں گے کہ خداوندا ہم انھی کے ہاتھوں گمراہ ہوئے اس وجہ سے تو ان کو دونا عذاب دے۔ ارشاد ہوگا 'لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِنْ لَا تَعْلَمُونَ' تم میں سے ہر ایک کے لیے یعنی اگلوں اور پچھلوں دونوں ہی کے لیے دونا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نیکی ہو یا بدی دونوں ہی اپنی فطرت کے اعتبار سے متعدی چیزیں ہیں۔ یہ اپنے

کرنے والوں ہی کی ذات تک محدود نہیں رہتی ہیں بلکہ ان کے اثرات دوسروں تک بھی منتقل ہوتے ہیں یہاں تک کہ وراثت در وراثت ہو کر نیکی کا ایک ذرہ احد پہاڑ کے برابر ہو سکتا ہے اور بدی کا ایک تخم فساد ایک لق و دق جنگل کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ یہی اصول اس حدیث میں بیان ہوا ہے جس میں حضورؐ نے کوئی اچھی یا بری مثال قائم کرنے والوں کے نتائج اعمال کی وسعت و زیادت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ دنیا میں جو قتل بھی ہوتا ہے اس کے وبال کا ایک حصہ آدم کے بیٹے قابیل کے کھاتے میں جمع ہو رہا ہے جس نے ہابیل کو قتل کر کے قتل ناحق کی طرح ڈالی۔ یہاں زیر بحث ٹکڑے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ تم میں سے اگلے اور پچھلے دونوں ہی کے لیے اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ ان کے گناہوں میں سے بھی حصہ ملنے والا ہے جن کے لیے تم نے ان گناہوں کی مثال قائم کی۔ تم فریاد کر رہے ہو کہ تمہارے اگلوں نے تمہارے لیے بری مثال قائم کی اس وجہ سے ان کو زیادہ عذاب ہو۔ ان کو بے شک زیادہ عذاب ملے گا لیکن آخر تم نے جو بری مثال قائم کی یا اپنے بعد والوں کے لیے چھوڑی اس کے نتائج سے کس طرح بچ جاؤ گے؟ جو پیمانہ ان کے لیے ہے وہی پیمانہ تمہارے لیے ہے۔ اگر ان کی روش بد کے ساتھ ساتھ تم اپنی روش بد کے اثرات کا بھی علم اور اندازہ رکھتے تو تم جانتے کہ تم اور وہ دونوں یکساں مجرم ہو لیکن تمھیں اپنے بوئے ہوئے تخم فساد کی لہلہاتی فصل کی ہولناکیوں کا صحیح تخمینہ معلوم نہیں ہے۔ اب وہ تمہارے سامنے آئے گا۔

جیسے ہم ویسے تم

'وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ الآیۃ' یہ اگلوں کی طرف سے پچھلوں کی مذکورہ بالا بات کا جواب ہوگا کہ اگر ہم نے تمہارے لیے بری مثال قائم کی تو تم نے دوسروں کے لیے کون سی اچھی مثال قائم کی، بات تو جب تھی کہ تم نے کوئی اچھی مثال قائم کی ہوتی۔ اس صورت میں بے شک تم ہمارے مقابل میں ترجیح اور فضیلت کے سزاوار تھے لیکن جب تم بھی وہی کچھ کر کے آئے ہو جو ہم کر کے آئے ہیں تو ہم میں اور تم میں فرق کیا؟ جس طرح ہم اپنے کیے کا مزا چکھیں گے تم بھی اپنے کیے کا مزا چکھو۔

'إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا الآیۃ' لفظ 'استکبار' کے ساتھ 'عَنْ' کے صلہ کا فائدہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں۔

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ… الآیۃ کے دو مفہوم

'لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ' کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے لیے سما و جنت کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے، دوسرا یہ کہ اہل ایمان کی طرح آسمان میں ان کا خیر مقدم نہیں ہوگا بلکہ وہ نہایت ذلت و فضیحت کے ساتھ اپنا انجام بد دیکھنے کے لیے مجرموں اور بدمعاشوں کی طرح ہنکاتے ہوئے لے جائے جائیں گے۔ قاعدہ ہے کہ جن کا اعزاز و اکرام مقصود ہوتا ہے ان کے لیے نہایت اہتمام سے پھاٹک کھولے جاتے ہیں، پھاٹک پر ان کے خیر مقدم کے لیے ان کے خیر مقدم کرنے والے دو رویہ کھڑے ہوتے ہیں، وہ اہلاً و سہلاً، احسنت اور مرحبا، سلام اور تحیت کے نعروں سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جن کی تذلیل مد نظر ہوتی ہے وہ قیدیوں کی طرح جیل کے پھاٹک کی کھڑکی سے اس کے اندر ٹھونس دیے جاتے ہیں۔ گویا 'لَا تُفَتَّحُ'

سے مقصود نفس فعل کی نفی نہیں بلکہ اس کے لازم کی نفی ہے جس کی مثالیں کلام عرب میں بہت ملتی ہیں۔

مستکبر جنت میں نہیں داخل ہو سکتا

'وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ' یہ اس قسم کا اسلوب بیان ہے جس کو تعلیق بالمحال کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا محال ہے اسی طرح ان متکبرین کا جنت میں داخل ہونا محال ہے۔ تعبیر کا یہ اسلوب قدیم صحیفوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ انجیل میں ہے "اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو" متی ۱۹ : ۲۳-۲۴ - قرآن اور انجیل کی تعبیر میں بس یہ فرق ہے کہ سیدنا مسیح نے سبب استکبار یعنی دولت کا حوالہ دیا ہے اور قرآن نے اصل جرم یعنی استکبار کا۔ اوپر ہم آدم و ابلیس کے قصے میں استکبار کی حقیقت بھی واضح کر چکے ہیں اور یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ ابلیس کے جنت سے نکالے جانے کا اصل سبب استکبار ہوا اس وجہ سے جن کے اندر استکبار کا کوئی شائبہ ہوگا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھیں گے۔ سیدنا مسیح کا ارشاد ہے "مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے"۔

'لَهُم مِّن جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِن فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ' مہاد کے معنی بچھونے کے ہیں اور غواش 'غاشیہ' کی جمع ہے جس کے معنی ڈھانک لینے والی کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد اوڑھنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے اوپر اور نیچے سے جہنم ہی اوڑھنا بچھونا ہوگی۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ۖ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ ۖ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۖ وَنُودُوا أَن تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۴۲-۴۳)

اہل ایمان کا حال جنت میں

'وَالَّذِينَ آمَنُوا الآیۃ' اب یہ مقابلہ کے اصول پر اہل ایمان کا حال بیان ہو رہا ہے کہ وہ جنت میں کس طرح خوش و خرم، ایک دوسرے سے راضی و مطمئن اور اللہ کی توفیق ہدایت اور رسولوں کی رہنمائی پر کس طرح سراپا شکر و سپاس ہوں گے۔ آیت میں 'لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا' کا ٹکڑا بطور جملہ معترضہ ہے جس سے یہ اطمینان دلا دیا کہ یہ ذمہ داری اللہ نے اپنے بندوں پر ان کی حد وسع سے زیادہ نہیں ڈالی ہے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ایسا بوجھ ہے جو اٹھایا نہیں جا سکتا۔ یہ ذمہ داری بس اسی حد تک ہے جس حد تک بندوں کے امکان میں ہے۔

زبان کا ایک خاص اسلوب

'وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ' اس ٹکڑے میں زبان کا وہ اسلوب ملحوظ ہے جس کی ایک سے زیادہ مقامات میں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ بسا اوقات ایک لفظ استعمال ہوتا ہے اور مقصود اس سے اس کا لازم ہوتا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا ہے 'فَالْيَوْمَ نَنسَاهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَٰذَا' (پس آج ہم ان کو بھلا

دیں گے جس طرح انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا) ظاہر ہے کہ یہاں بھلا دینے سے اس کا لازم یعنی عدم التفات مراد ہے، ورنہ اللہ کے کسی چیز کو بھلا دینے کے کیا معنی! وہ تو کوئی چیز بھی کبھی نہیں بھلاتا۔ اسی طرح فرمایا: 'فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ' (پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا) میں تمھیں یاد رکھوں گا، یعنی میری نظر عنایت تم پر برابر رہے گی، ہر قدم پر تمھاری مدد کروں گا، اپنا ایک ایک وعدہ جو میں نے تم سے کیا ہے پورا کروں گا اور مزید برآں اپنے فضل ابدی سے نوازوں گا۔

اسی اسلوب پر یہاں 'وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ' سے مراد اس کا لازم ہے یعنی اہل ایمان جنت میں ایک دوسرے سے تپاک اور محبت سے ملیں گے، ایک دوسرے کا خیر مقدم کریں گے، آمنے سامنے بیٹھ کر آپس میں تبادلۂ مہر و محبت کریں گے، ان کے درمیان کسی رنجش و کدورت کا شائبہ نہ ہوگا۔ یہی مضمون دوسرے مقامات میں 'عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ' کے الفاظ سے ادا ہوا ہے۔ یعنی وہ آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے اس لیے کہ ان کے دل ایک دوسرے سے بالکل صاف ہوں گے۔ ایک دوسرے سے منہ پھیر کر بیٹھنا باہمی رنجش کی دلیل ہے اور آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بیٹھنا باہمی اعتماد و محبت کی۔ قرآن نے یہاں 'نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ' سے اہل جنت کی اسی حالت کا اظہار فرمایا ہے اور یہ بات ٹھیک ٹھیک اہل دوزخ کی اس حالت کے مقابل میں بیان ہوئی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ وہاں تو آپس میں لعنتوں کا تبادلہ ہوگا، جوتیوں میں دال بٹے گی اور یہاں مجلس مہر و محبت کی عطر بیزیوں سے معمور ہوگی۔

منزل پر پہنچنے کے بعد اہل جنت کا جذبۂ شکر و سپاس

'وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا' یہ وہ شکر ہے جو کسی طویل اور پرصعوبت سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچنے والا مسافر ادا کرتا ہے۔ 'هَدَانَا لِهَٰذَا' میں اللہ تعالیٰ کی اس توفیق بخشی کی طرف بھی اشارہ ہے جو طالبین حق کو ہر قدم پر حاصل ہوتی ہے اور اس رہنمائی کی طرف بھی جو اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ مہیا فرماتا ہے۔ 'وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ' میں اس سفر کے پرصعوبت ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس بات کی طرف بھی کہ اہل جنت کو جو کامیابی حاصل ہوگی وہ ان کی توقعات اور امیدوں، ان کے قیاسات اور اندازوں سے اتنی زیادہ ہوگی کہ وہ اس کو خدا کا فضل ہی فضل سمجھیں گے، اس میں اپنی سعی و تدبیر کے کسی دخل کا ان کو گمان بھی نہ ہوگا۔

'لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ' اللہ تعالیٰ کے شکر کے بعد یہ انبیا و رسل کی عظیم خدمات اور ان کی کہی ہوئی ہر بات کی صداقت کا اعتراف ہے۔ یعنی اہل جنت رسولوں کی دی ہوئی ہر خبر کو واقعہ کی شکل میں دیکھ کر پکار اٹھیں گے کہ انھوں نے جو کچھ کہا حرف حرف حقیقت ثابت ہوا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جن کی تکذیب اور جن کے استکبار کا اوپر ذکر ہوا۔

تکمیل نعمت کی معراج

'وَنُودُوا أَن تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ' یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل جنت کے لیے منادی عام ہوگی کہ اس جنت کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث بنائے گئے۔ اہل جنت کا خود اپنا احساس

تو اوپر یہ نقل ہوا ہے کہ وہ اس جنت کو اپنی سعی و عمل کے بجائے صرف خدا کے فضل و احسان کا ثمرہ سمجھیں گے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو ان کے سعی و عمل کا ثمرہ قرار دے گا۔ یہ تکمیل نعمت کی معراج ہے۔ بندوں کے اعمال کا درجہ اس آیت نے اتنا اونچا کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ اونچے درجے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں ہم جو کچھ پاتے ہیں خدا کے فضل ہی سے پاتے ہیں۔ آخرت میں بھی خدا کے فضل ہی سے پائیں گے لیکن رب کریم اس کو ہمارا حق اور ہماری محنت کا ثمرہ قرار دے گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس ابدی بادشاہی کا جس کے متعلق ہر شخص کا شعور یہ ہو گا کہ یہ اس نے اپنی کوششوں سے بنائی ہے اور یہ لازوال ہے! انسان صرف یہی نہیں چاہتا کہ اس کو نعمتیں حاصل ہوں بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ نعمتیں اس کی اپنی ہوں۔ اس احساس کے بغیر وہ کسی نعمت کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتا۔ اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی فطرت کا یہ تقاضا بھی پورا کر دے گا۔

ایک لطیف تلمیح — اس آیت میں وراثت کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس میں ایک لطیف تلمیح ہے اس ماجرے کی طرف جو اوپر آدم کے جنت سے نکالے جانے کا مذکور ہوا ہے۔ وہاں یہ ارشاد موجود ہے کہ اولادِ آدم میں سے وہی لوگ اپنے باپ کی اس جنت کے وارث ٹھہریں گے جو شیطان کی تمام فتنہ آرائیوں کے علی الرغم ایمان و عمل صالح کی صراطِ مستقیم پر قائم رہیں گے۔ یہاں اُورِثْتُمُوْهَا کا لفظ استعمال کر کے گویا شاباش دے دی کہ بے شک تم نے بازی جیت لی اور اب تم حقدار ہو کہ تم اس جنت کے وارث بنائے جاؤ۔

۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۴-۵۳

آگے وہ سوال و جواب مذکور ہوا ہے جس کا تبادلہ اہل جنت اور اہل دوزخ کے درمیان ہو گا۔ اہل جنت دوزخیوں سے پوچھیں گے کہ ہم سے تو ہمارے رب نے جو وعدے کیے تھے وہ ایک ایک کر کے سب پورے ہوئے، تم بتاؤ، تم نے بھی وہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا یا نہیں جس کی تمھیں خبر دی گئی تھی؟ وہ جواب دیں گے کہ ہاں، سب دیکھ لیا۔ اس کے بعد ایک منادی ان پر اللہ کی لعنت کا اعلان کرے گا۔

پھر یہ بیان ہوا کہ اعراف کی برجیوں سے رجالِ امت کے ایک گروہ کو جنت و دوزخ کے احوال کا مشاہدہ کرایا جائے گا کہ وہ دیکھ لیں کہ اللہ کے جن وعدوں کے لیے وہ جیے اور مرے وہ کس طرح پورے ہوئے۔ یہ اصحاب الاعراف اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کو ان کی علاماتِ امتیاز سے پہچانتے ہوں گے۔ وہ اہلِ جنت کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دیں گے اور اہلِ دوزخ کے قائدین کو پھٹکاریں گے کہ بتاؤ تمھاری ساری جمعیت اور تمھارا سارا غرہ کیا کام آیا، تم قسمیں کھا کھا کے جن کے باب میں یہ کہتے تھے کہ یہ کبھی کسی رحمت کے سزاوار نہیں ہو سکتے، وہ کہاں ہیں اور تم کہاں بھاڑ جھونک رہے ہو؟

اس کے بعد یہ بیان ہوا ہے کہ اہل دوزخ پانی کے لیے تراہ تراہ کر رہے ہوں گے اور اہلِ جنت

سے فریاد کریں گے کہ کچھ ادھر بھی نظرِ کرم کرو لیکن وہ جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ دوزخ کے لیے ان چیزوں کی مناہی کر رکھی ہے۔

آخر میں یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ جنت و دوزخ کا جو احوال سنایا جا رہا ہے، یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کو آگاہ کرنے کے لیے ایک کتاب اتاری جس میں اپنے علمِ قطعی کی روشنی میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کی تفصیل سنا دی ہے تاکہ جو ایمان لانا چاہیں وہ اس ہدایت کو اختیار کر کے اپنے آپ کو رحمت کا سزاوار بنا لیں لیکن یہ اپنی رعونت کے سبب سے منتظر ہیں کہ جب یہ ساری باتیں واقعات کی شکل میں ان کے سامنے آئیں گی تب ان کو مانیں گے لیکن وہ وقت ماننے کا نہیں ہو گا بلکہ سر پیٹنے کا ہو گا ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۴۴-۵۳

وَنَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ لَّعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَيَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ كٰفِرُوۡنَ ﴿۴۵﴾ وَبَيۡنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الۡاَعۡرَافِ رِجَالٌ يَّعۡرِفُوۡنَ كُلًّاۢ بِسِيۡمٰىهُمۡ ۚ وَنَادَوۡا اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ اَنۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ لَمۡ يَدۡخُلُوۡهَا وَهُمۡ يَطۡمَعُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتۡ اَبۡصَارُهُمۡ تِلۡقَآءَ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوۡا رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۷﴾ وَنَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا يَّعۡرِفُوۡنَهُمۡ بِسِيۡمٰىهُمۡ قَالُوۡا مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡكُمۡ جَمۡعُكُمۡ وَمَا كُنۡتُمۡ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰٓؤُلَاۤءِ الَّذِيۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحۡمَةٍ ؕ اُدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡكُمۡ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ﴿۴۹﴾ وَنَادٰۤی اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ اَنۡ اَفِيۡضُوۡا عَلَيۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوۡۤا

وقف لازم

ع ۵ / ۱۲

اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ
لَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ
يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ
بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ هَلْ
يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۚ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ
مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ
شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۚ
ع ۱۳ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

ترجمۂ آیات ۴۴-۵۳

اور جنت والے دوزخ والوں کو پکار کر پوچھیں گے کہ ہم سے تو جو کچھ ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا ہم نے اس کو بالکل سچا پایا، کیا تم نے بھی جو کچھ تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا اس کو سچا پایا؟ وہ جواب دیں گے، ہاں! پھر ایک منادی کرنے والا ان کے بیچ میں پکارے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر ــــ ان پر جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔ ۴۴-۴۵

اور ان کے درمیان پردے کی دیوار ہوگی اور دیوار کی برجیوں پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ اہلِ جنت کو پکار کر کہیں گے کہ آپ پر اللہ کی رحمت و سلامتی ہو ــــ وہ اس میں ابھی داخل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن متوقع ہوں گے۔ اور جب ان کو اہلِ دوزخ کی طرف توجہ دلائی جائے گی، وہ پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب ہمیں ان ظالموں کا ساتھی نہ بنائیو! اور برجیوں والے

کچھ اشخاص کو جن کو وہ ان کی علامت سے پہچانتے ہوں گے آواز دیں گے۔ کہیں گے، کیا کام آئی تمھارے تمھاری جمعیت اور تمھارا وہ سارا گھمنڈ جو تم کرتے تھے! کیا یہی ہیں وہ لوگ جن کے باب میں تم قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے کہ یہ کبھی اللہ کی کسی رحمت کے سزاوار نہیں ہو سکتے! داخل ہو جنت میں، اب نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تمھیں کوئی غم لاحق ہوگا۔ ۴۶-۴۹

اور دوزخ والے جنت والوں کو آواز دیں گے کہ پانی یا ان چیزوں میں سے، جو اللہ نے تمھیں بخش رکھی ہیں، کچھ ہم پر بھی کرم فرماؤ۔ وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں کے لیے حرام کر رکھی ہیں — ان کے لیے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنایا اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈالے رکھا، پس آج ہم ان کو نظرانداز کریں گے جس طرح انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا اور جیسا کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے — اور ہم نے ان کو ایک ایسی کتاب پہنچا دی ہے جس کی تفصیل ہم نے علمِ قطعی کی بنیاد پر کی ہے، ہدایت و رحمت بنا کر ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ یہ لوگ بس اس کی حقیقت کے مشاہدے کے منتظر ہیں۔ جس روز اس کی حقیقت سامنے آئے گی، وہ لوگ جنھوں نے اس کو پہلے نظرانداز کیے رکھا، بول اٹھیں گے کہ بے شک ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے تھے، تو ہیں کوئی ہمارے سفارشی کہ ہماری سفارش کریں یا ہے کوئی صورت کہ ہم دوبارہ لوٹائے جائیں کہ اس سے مختلف عمل کریں جو پہلے کرتے رہے ہیں!! انھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو کچھ وہ گھڑتے رہے تھے سب ہوا ہو گئے! ۵۰-۵۳

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۗ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۴۴)

جنت میں انسانی قوتوں کا عروج

یہ آیت ایک نہایت ہلکا سا تصور دیتی ہے اس انقلابِ حال کا جو جنت میں پہنچ کر انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کے اندر برپا ہوگا۔ اس دنیا میں تو ہمارے سمع و بصر اور ادراک و ابلاغ کی قوتیں نہایت محدود ہیں۔ معمولی معمولی چیزیں ہماری ان قوتوں کی راہ میں روک بنی ہوئی ہیں لیکن عالم آخرت میں یہ رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ جنت کے عالم سے جب چاہیں گے اہلِ جنت دوزخ والوں کو مخاطب کر کے ان سے سوال و جواب کر لیں گے۔

اس سائنسی دور کے انسان کے لیے یہ بات ذرا بھی حیران کرنے والی نہیں ہونی چاہیے۔ جب آج انسان نے قدرت کے محض چند ضمنی قوانین کا راز دریافت کر کے اپنے لیے ایسی دوربینیں ایجاد کر لی ہیں جن کی مدد سے ہزاروں میل کی مسافت پر جلنے والی شمع کی لَو کو دیکھ سکتا ہے، ایسے فون بنا لیے ہیں جن کی وساطت سے جب چاہے پاکستان کا پریسیڈنٹ امریکہ کے پریسیڈنٹ سے بات کر سکتا ہے، ایسے ٹیلی ویژن بنا لیے ہیں جن پر ایک ملک کے لوگ کسی دور دراز ملک کے کسی خطیب کو اپنے ملک کے کسی مجمع کے سامنے تقریر کرتے، مجمع کو تالیاں پیٹتے اور نعرے لگاتے دیکھ اور سن سکتے ہیں، ایسے آلات بنا لیے ہیں جو اس کو لاکھوں میل کی مسافت سے نبض کی حرکت اور دل کی دھڑکن سے آگاہ کر سکتے ہیں تو آخر اس عالم کی باتوں پر حیران ہونے کی کیا وجہ ہے جہاں یہ سارے نوامیس طبیعی، جو آج ہمیں جکڑے ہوئے ہیں بدل جائیں گے اور اس زمین و آسمان کی جگہ نئے آسمان و زمین پیدا ہو جائیں گے۔

اہلِ دوزخ کی تفضیح

اہلِ جنت کا یہ سوال اہلِ دوزخ سے جو یہاں نقل ہوا ہے، تبلیغ و تذکیر کے مقصد سے تو ظاہر ہے کہ ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ اس کا وقت تو گزر چکا ہوگا، اس کا مقصد محض اہلِ دوزخ کی تفضیح ہوگا۔ اس کے جواب میں اہلِ دوزخ کا اعتراف گویا مجرم کا وہ آخری اعتراف ہوگا جس کے بعد اس کے اور اس کی سزا کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں رہ جائے گی۔ چنانچہ ایک منادی ان ظالموں پر اللہ کی لعنت کا اعلان کرے گا اور یہ اعلان ہم معنی ہوگا اس کے کہ اب سزا اور عذاب کا باب شروع ہو گیا۔

ایک لطیف تضمین

'اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۴۵'۔ عام طور پر لوگوں نے اس ٹکڑے کو منادی کے اعلان ہی کا ایک حصہ سمجھا ہے لیکن میرے نزدیک منادی کا اعلان لفظ 'ظٰلِمِيْنَ' ہی پر تمام ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ٹکڑا بطور تضمین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت کے طور پر اس کے ساتھ

لگایا ہے تاکہ کلام محض مستقبل کی ایک حکایت بن کے نہ رہ جائے بلکہ حال پر بھی پوری طرح منطبق ہو جائے۔ اس تضمین سے گویا یہ وضاحت ہو گئی کہ ظالمین سے مراد کون لوگ ہوں گے۔ فرمایا کہ وہی لوگ جو آج اللہ کی راہ سے لوگوں کو روک رہے ہیں، جو اس میں کجی پیدا کرنے کے لیے ساعی ہیں اور آخرت کے منکر ہیں۔ اس وضاحت کے بعد آخرت میں ہونے والی منادی وقت کے قریش پر ٹھیک ٹھیک اس طرح چسپاں ہو گئی، گویا

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

اس قسم کی تضمینات قرآن مجید میں بہت ہیں۔ پیچھے بھی اس کی مثالیں گزر چکی ہیں، آگے بھی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ اس کی ایک مثال آیت ۵۱ میں بھی آ رہی ہے۔ انہی تضمینات سے بالعموم اصولی باتیں یا مستقبل کے ماجرے یا ماضی کی سرگزشتیں حاضر اور حال کا جامہ پہنتی ہیں۔ اس وجہ سے ان پر خاص طور پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے ورنہ نظم کلام درہم برہم ہو جاتا ہے اور تاویل میں ایسے تکلف سے کام لینا پڑتا ہے جس سے نہ صرف ذوق ابا کرتا ہے بلکہ زبان کے آداب و قواعد بھی اس کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہاں بھی جن لوگوں نے اس کو تضمین نہیں مانا انھیں وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ کے ٹکڑے کی تاویل میں تکلف کرنا پڑا۔ انھوں نے اس کو وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ کے معنی میں لیا حالانکہ یہ قرآن میں ایک قسم کا اضافہ ہے۔

'اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ' میں 'صدّ' کا لفظ لازم اور متعدی یعنی رکنے اور روکنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ ایسے الفاظ کے ترجمے میں مشکل پیش آتی ہے۔ میرے نزدیک ایسے الفاظ کے باب میں محتاط طریقہ یہ ہے کہ اگر قرینہ واضح ہو تب تو قرینہ کے تقاضے کے مطابق ترجمہ کرنا چاہیے ورنہ متعدی مفہوم کے اعتبار سے ترجمہ اولیٰ ہے اس لیے کہ متعدی کے اندر لازم کا مفہوم خود مضمر ہوتا ہے۔

'اَلَّذِيْنَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' میں عوج سے مراد تو اگرچہ وہ ساری کج رائیاں اور کج عملیاں ہو سکتی ہیں جو خدا کی راہ سے ہٹ کر انسان اختیار کرتا ہے لیکن نظائر قرآن کی روشنی میں میرے نزدیک اس کا مفہوم خدا کی صراط مستقیم یعنی توحید کی راہ میں کجی پیدا کر کے شرک کی پگڈنڈیاں نکالنا ہے۔ ان نظائر کی وضاحت کسی مناسب محل میں انشاء اللہ تفصیل سے آئے گی۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۣ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَاۗءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (۴۶-۴۹)

'وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰىهُمْ'۔ 'حجاب' سے مراد جیسا کہ خود قرآن کے دوسرے مقام سے واضح ہے، وہ دیوار ہے جو دوزخ اور جنت کے درمیان کھڑی کر دی جائے گی۔ سورہ حدید

حجاب سے مراد جنت اور دوزخ کے درمیان کی دیوار ہے

یں ہے۔ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ (۱۳۔ حدید یعنی ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی) ایک ایسی دیوار کے طول و عرض کا اندازہ کون کر سکتا ہے جو پورے عالمِ جنت اور سارے عالمِ دوزخ کے درمیان حدِ فاصل کا کام دے گا جب کہ صرف جنت کی وسعتوں کی تمثیل قرآن نے آسمانوں اور زمین کی وسعتوں سے دی ہے۔

'اعراف' کا مفہوم

'اَعْرَاف' 'عُرْف' کی جمع ہے۔ 'عرف' گھوڑے کی پیشانی کی چوٹی اور مرغ کی کلغی کو کہتے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ کسی مینارہ یا برجی یا دیدبان کے لیے استعمال ہوا جو کسی اونچی دیوار یا پہاڑی پر بنا دیا جائے، جہاں سے تمام اطراف و جوانب کا بیک نظر مشاہدہ ہو سکے۔ قرآن کے اسلوب بیان سے واضح ہے کہ جنت و دوزخ کے درمیان جو دیوار کھڑی کی جائے گی یہ اعراف یعنی مینارے اور برجیاں اسی دیوار پر ہوں گے جہاں سے جنت و دوزخ کے تمام مناظر کا مشاہدہ ہو سکے گا۔

'رجال' سے مراد

'رِجَال' کا لفظ یوں تو اپنے عام مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس سے بالعموم نمایاں اور ممتاز اشخاص مراد ہوتے ہیں۔ مثلاً رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (۳۷۔ نور) (ایسے رجال جن کو تجارت اور خرید و فروخت یادِ الٰہی سے غافل نہیں کرتی) مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (۲۳۔ احزاب) (اور اہل ایمان میں ایسے رجال ہیں جنھوں نے اس عہد کو سچ کر دکھایا جو خدا سے انھوں نے باندھا) یہیں آیت ۴۸ میں بھی یہ لفظ ائمۂ کفر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وَنَادٰٓی اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰی عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ (اور اعراف والے کچھ اشخاص کو جن کو وہ ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے پکاریں گے، کہیں گے بتاؤ کیا کام آئی تمھاری جمعیت اور کیا کام آیا تمھارا گھمنڈ؟)

'کُلًّا'۔ لفظ 'کل' ہم دوسرے مقام میں بتا چکے ہیں کہ جب یہ جماعتوں یا اشخاص کے ذکر کے بعد اس طرح آئے جس طرح یہاں آیا ہے تو یہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے معرفہ بن جاتا ہے۔ یعنی اس سے مراد وہی گروہ یا اشخاص ہوں گے جن کا ذکر اوپر گزرا۔ یہاں اوپر اہل جنت اور اہل دوزخ کا ذکر ہوا ہے چنانچہ اس سے مراد وہی دونوں گروہ بحیثیت گروہ ہیں۔

اہل جنت اور اہل دوزخ اپنی نمایاں علامتوں سے ممتاز ہوں گے

'سِيْمَا' کے معنی علامت اور نشان کے ہیں مثلاً سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔ قرآن مجید اور احادیث دونوں میں اس بات کے اشارات موجود ہیں کہ قیامت میں اہل ایمان اور اہل کفر دونوں اپنے اپنے اعمال کے اثرات سے ممتاز و ممیز ہوں گے۔ مسلم شریف میں ایک حدیث ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کی امت میں سے جو لوگ آپ کے بعد آئیں گے آپ ان کو کیسے پہچانیں گے؟ آپ نے فرمایا، اگر ایک شخص کے پنچ کلیان گھوڑے دوسرے گھوڑوں میں ملے ہوئے ہوں تو کیا وہ ان کو پہچان نہ لے گا؟ لوگوں نے کہا، یہ بات تو ٹھیک ہے یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا اسی طرح میری امت کے لوگ قیامت کے دن اپنے وضو کے آثار سے اس طرح نمایاں ہوں گے کہ ان کی پیشانیاں اور ان کے ہاتھ

پاؤں چمکتے ہوں گے۔ ابولہب کی بیوی کے متعلق خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن اس کے گلے میں اس طرح کی رسی پڑی ہوئی ہوگی جس طرح کی رسی ایندھن جمع کرنے والی لونڈیاں اپنے گلے میں ڈال کر لکڑیاں چننے کے لیے نکلا کرتی ہیں۔ اس نوع کے بعض اشارات معراج سے متعلق احادیث میں بھی موجود ہیں۔ غرض یہ بات واضح ہے کہ اہل ایمان ہوں یا اہل کفر دونوں گروہ اپنے اپنے محل میں اپنی نمایاں نشانیوں اور علامات کے ذریعے سے ممتاز ہوں گے اور اہل اعراف ان علامات کے واسطہ سے اہل جنت کے صدیقین، شہدا اور صالحین و ابرار کو بھی پہچان لیں گے اور اہل دوزخ کے لیڈروں اور اشرار و مفسدین کو بھی۔

اجزائے کلام کی تشریح کے بعد قابل غور سوال صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ اصحاب الاعراف کون لوگ ہوں گے؟ ابن جریرؒ نے اس سوال کے جواب میں چار قول نقل کیے ہیں۔ اصحاب الاعراف کون لوگ ہوں گے

ایک یہ کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں دونوں تول میں برابر برابر اتری ہوں گی، اس وجہ سے ان کا فیصلہ ابھی معلق ہوگا کہ دوزخ میں بھیجے جائیں یا جنت میں۔

دوسرا یہ کہ یہ علما اور فقہا کا گروہ ہوگا۔

تیسرا یہ کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنے ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد میں حصہ لیا ہوگا۔

چوتھا یہ کہ یہ ملائکہ ہوں گے۔

ان میں سے موخر الذکر دونوں قول تو بالکل ہی بے جان ہیں۔ ان کی تائید میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی قرآن میں موجود نہیں ہے اس وجہ سے ان پر کسی گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔

پہلا قول اگرچہ بہت مشہور ہے یہاں تک کہ مصرع "از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است" ہمارے لٹریچر میں ضرب المثل کی حیثیت حاصل کر گیا ہے لیکن کئی پہلوؤں سے یہ قول بھی ضعیف معلوم ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ یہاں ان کے لیے 'رجال' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، جب اس طرح آتا ہے جس طرح یہاں آیا ہے تو اس سے مراد نمایاں اشخاص و رجال ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا حال یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی نیکیاں اتنی بھی نہ ہوں گی کہ ان کی بدیوں پر بھاری ہو سکیں آخر ان کا ایسا نمایاں وصف کیا ہے جس کے سبب سے ان کا ذکر اس لفظ سے کیا گیا؟

دوسرا یہ کہ جن کی نیکیاں اور بدیاں دونوں برابر برابر ہوں گی ضروری نہیں کہ وہ سب مرد ہی ہوں، ان میں عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ پھر ان کے لیے رجال کا لفظ کیوں استعمال ہوا، کوئی ایسا لفظ کیوں نہ استعمال ہوا جو جامع نوعیت کا ہوتا مثلاً طائفہ یا امت یا ان کے ہم معنی کوئی لفظ؟

تیسرا یہ کہ یہاں کسی ایک لفظ سے بھی نہ تو یہ بات نکلتی کہ یہ ایک ایسے گروہ کا ماجرا بیان ہو رہا ہے جس کا معاملہ ابھی معلق ہے اور نہ یہ بات نکلتی کہ ان کو اعراف کی یہ سیر کرانے سے مقصود کیا ہے حالانکہ موقع ایسا ہے کہ یہ بات واضح ہونی چاہیے تھی۔

چوتھا یہ کہ یہ لوگ اہل جنت اور اہل دوزخ کو جس انداز میں مخاطب کریں گے، ان کو مخاطب کر کے جو جو باتیں فرمائیں گے اور ان کے ساتھ جس اعزاز و اکرام کا معاملہ مذکور ہوا ہے وہ سب اس امر کے خلاف ہے کہ یہ ایک ایسے گروہ کا ذکر ہو جس کی اپنی نجات کا معاملہ ابھی معلق اور جس کی اپنی کارگزاری کی نوعیت یہ ہو کہ نیکی اور بدی دونوں برابر برابر ہو کر رہ گئی ہوں۔ قرآن کے بیان سے واضح ہے کہ یہ لوگ اہل جنت کو مبارکباد دیں گے، اہل دوزخ کے لیڈروں کو سرزنش اور ملامت کریں گے کہ تم دنیا میں بہت اتراتے اور اکڑتے رہے ہو، بتاؤ تمہاری جمعیت اور تمہارا سارا سرمایہ غرور کہاں گیا؟ ان کو بتائیں گے کہ تم خدا کی ساری نعمتوں کا اجارہ دار تنہا اپنے آپ کو سمجھتے تھے، غریب مسلمانوں کو کسی فضل کا سزاوار نہیں سمجھتے تھے، اب دیکھو تم کہاں ہو اور وہ کہاں ہیں؟ آخر میں اہل جنت کو تمکن اور دوام و استمرار کی بشارت دیں گے۔ —— غور کیجیے کہ یہ ساری باتیں ایسے لوگوں کی زبان سے کس طرح نکل سکتی ہیں جنھیں خود اپنی نجات کی فکر پڑی ہو کہ معلوم نہیں مشیت غیب کیا فیصلہ کرتی ہے؟ نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہ یہ ممکن ہے کہ اس طرح کی باتیں کسی مذبذب و متردد گروہ کے منہ سے نکل سکیں اور نہ اخلاقی پہلو سے یہ ایسے لوگوں کی زبان سے زیب ہی دیتی ہیں جن کے اپنے کارنامے کچھ زیادہ وقیع نہ ہوں۔

ان وجوہ سے ہمارے نزدیک یہ قول اپنی شہرت کے باوجود کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ صحیح قول ہمارے نزدیک دوسرا ہے۔ ابن جریر نے یہ قول مجاہدؒ کی طرف منسوب کیا ہے جن کا مرتبہ تفسیر میں معلوم و معروف ہے۔ مجاہدؒ نے علماء اور صلحاء سے مراد ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو لیا ہے جو دنیا میں حق و باطل کی کشمکش میں حق کے علم بردار، خیر کے داعی اور منکر سے روکنے والے رہے ہیں۔ جنھوں نے حق کی حمایت میں اہل باطل کے چرکے سہے ہیں اور جو مظلوموں کی مدافعت میں سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوئے۔ ایسے علماء و فقہاء یا بالفاظ دیگر رجال امت بلا شبہ قیامت کے دن اس اعزاز کے سزاوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اعراف کی بلندیوں سے جنت اور دوزخ دونوں کا مشاہدہ کرائے تاکہ وہ حق و باطل دونوں کا آخری انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اپنی زبانوں سے رفقائے حق کو مبارکباد دیں اور دشمنان حق کو سرزنش کریں۔

وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ۔ یہ لوگ اعراف کی بلندیوں سے سب سے پہلے اہل جنت کو سلامتی و مبارکی کا پیغام دیں گے۔ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کو جنت میں بھیجنے سے پہلے ہی یہ مشاہدہ کرایا جائے گا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کی سچائی ہر پہلو سے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جنت میں داخل ہوں۔ وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ کے الفاظ سے ان کی تواضع جھلکتی ہے۔ باوجودیکہ یہ سارا اعزاز و اکرام صاف شہادت دے رہا ہوگا کہ اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ و مقام کیا ہے لیکن وہ اپنی تواضع و فروتنی کے سبب سے اپنے آپ کو امیدوار رحمت ہی کے درجے میں سمجھیں گے چنانچہ یہاں الفاظ ٹھیک ٹھیک ان کی ذہنی کیفیت کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ

ملحوظ رہے کہ جو لوگ اللہ کی شان جانتے ہیں وہ اپنے آپ کو امید اور طمع کے درجے سے اونچا کبھی نہیں لے جاتے، یہ تنگ ظرفوں کا شیوہ ہے کہ وہ بہت تھوڑے میں بہک جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبر فرماتے ہیں وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۸۲۔ شعراء (اور وہ کہ جس سے میں یہ امید رکھتا ہوں کہ وہ جزا و سزا کے دن میری غلطی معاف فرمائے گا) ہمارے حضورؐ نے ایک مرتبہ فرمایا، کوئی اپنے عمل سے جنت میں نہیں جائے گا، لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ آپ بھی؟ ارشاد ہوا ’ہاں میں بھی، اِلَّآ اَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ‘ میں بھی اسی وقت جنت میں جاؤں گا جب اللہ کی رحمت مجھے ڈھانک لے۔

’وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ الاٰیۃ‘ یہ اسلوب بیان اکرام و اعزاز پر دلیل ہے۔ پہلے وہ اہل جنت کی کامرانیوں کا مشاہدہ کریں گے اور اس کے مشاہدے میں بالکل محو ہو جائیں گے اس لیے کہ وہاں حال یہ ہوگا کہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

پھر اہل دوزخ کی طرف ان کو توجہ دلائی جائے گی کہ ذرا ایک نظر دشمنان حق کے انجام پر بھی ڈال لیجیے۔ یہ ان پر نظر پڑتے ہی ان کی زبان سے بے تحاشا تعوذ کی دعا نکلے گی ’رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ‘ (اے ہمارے رب ہمیں ظالموں کے ساتھ شامل نہ کیجیو) جس طرح اوپر ’وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ‘ کے الفاظ سے ان کی تواضع و فروتنی پر عکس پڑتا ہے اسی طرح یہ دعا ان کے کمال خشیت کی بھی دلیل ہے اور جہنم کے منظر کی ہولناکی کی بھی۔

اصحاب الاعراف کا خطاب کفار کے لیڈروں سے

’وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ‘۔ اصحاب اعراف کا یہ خطاب الفاظ سے واضح ہے کہ اہل دوزخ کے لیڈروں سے ہوگا اس لیے کہ اپنی جمعیت پر ناز اور اپنے مال و جاہ پر غرہ انہی کو تھا۔ دوزخ میں یہ لوگ اپنے نمایاں نشان سے ممتاز ہوں گے اس وجہ سے اہل اعراف پہچان جائیں گے کہ یہ ابولہب ہے، یہ ابوجہل، یہ فلاں اور یہ فلاں۔ ان کو مخاطب کر کے اہل اعراف ان سے یہ سوال بطور تفضیح کریں گے۔ ہر دور کے ائمہ کفر کا اپنے مال و اسباب اور اپنی تعداد و جمعیت پر غرہ قرآن میں تفصیل سے مذکور ہے۔ ہم نے یہاں ’ما‘ کو سوالیہ مفہوم میں لیا ہے۔ اس میں زور بھی زیادہ ہے اور قرآن کے نظائر سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ پھر بعد کا جملہ، جو اس سے متعلق ہے واضح طور پر سوالیہ ہے بھی۔ اگر اس کو بعد والے جملہ سے الگ مفہوم میں لیں گے تو کلام میں ہم آہنگی باقی نہیں رہے گی۔

’اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ‘ یہ سوال ان ائمہ کفر سے، اہل اعراف ساکنین جنت کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کریں گے کہ بتاؤ کیا یہی وہ لوگ نہیں ہیں جن کے باب میں تم قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے کہ یہ کبھی خدا کے کسی فضل کے سزاوار نہیں ہو سکتے؟ قرآن میں مذکور ہے کہ سادات قریش اسلام کے خلاف ایک بہت بڑی دلیل یہی لاتے تھے کہ اگر اس میں کوئی خیر کا پہلو ہوتا تو کیا اس کے پیرو یہی فقیر فاقہ کش اور غلام و نادار بنتے؟ خدا کی ساری نعمتوں کے سزاوار تو ہم بنائے گئے، پھر اس کے لیے ان کا انتخاب کیوں ہوا؟ اہل اعراف ان کے اسی غرور کو سامنے رکھ کر سوال کریں گے کہ فرماؤ، جن کو تم کسی فضل و رحمت کا سزاوار نہیں سمجھتے تھے وہ کہاں ہیں اور تم کہاں ہو؟

'اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ'۔ اوپر والا سوال تو اہل اعراف ائمہ کفر کو مخاطب کر کے کریں گے اور یہ بات وہ اہل جنت کو مخاطب کر کے ان سے بطور تہنیت و تبریک کہیں گے جس سے برسر موقع ان کی توہین کرنے والوں کی تفضیح بھی ہو جائے گی۔

فعل تمکن و استمرار کے مفہوم میں

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اہل جنت تو بالفعل جنت میں براجمان ہوں گے ہی پھر ان کو مخاطب کر کے 'اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ' (جنت میں داخل ہو) کہنے کے کیا معنی؟ غالباً اسی سوال سے بچنے کے لیے ارباب تاویل نے اس جملہ کے مخاطب اور اس کے قائل کے تعین میں بڑے تکلف سے کام لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ سارا تکلف انھیں اس وجہ سے کرنا پڑا کہ انھوں نے عربیت کے اس اسلوب کو ملحوظ نہیں رکھا کہ عربی زبان میں فعل ہر جگہ اپنے ابتدائی معنی ہی پر دلیل نہیں ہوا کرتا، بعض مواقع میں وہ تمکن و استمرار پر دلیل ہوتا ہے۔ مثلاً دیکھ لیجیے یہی 'اُدْخُلُوا' سورۂ یوسف میں استعمال ہوا ہے جو اپنے ابتدائی مفہوم میں نہیں بلکہ تبریک و تہنیت اور تمکن و استمرار کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (۹۹۔ یوسف)

پس جب وہ یوسف کی خدمت میں حاضر ہوئے اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں داخل ہو ان شاء اللہ امن کے ساتھ۔

یہ اس موقع کا ذکر ہے جب حضرت یوسفؑ کے سارے بھائی، ان کی ہدایت کے بموجب، اپنے والدین کو ساتھ لے کر، حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور حضرت یوسفؑ نے اپنے دربار میں ان کی پذیرائی فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ان لوگوں کے مصر میں داخل ہونے کا سوال نہیں تھا۔ وہ مصر میں نہ صرف داخل ہو چکے تھے بلکہ ان کے والدین حضرت یوسفؑ کے پہلو میں فروکش اور یہ تمام بھائی حضرت یوسفؑ کے دربار میں موجود تھے۔ اس وقت حضرت یوسفؑ کا یہ فرمانا کہ 'اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ' صریحاً تبریک و تہنیت اور بشارت تمکن کے مفہوم ہی میں ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ٹھیک اسی مفہوم میں اصحاب اعراف کا اہل جنت کو مخاطب کر کے 'اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ' فرمانا بھی ہے۔ یعنی مال و جاہ کے غرور کے متوالے تو تمھیں نہایت حقیر و ذلیل سمجھتے رہے ہیں لیکن اللہ نے ان کے علی الرغم تمھیں جنت کی سرفرازی بخشی

تم اس میں سرفراز رہو، اب نہ تمھارے لیے کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم۔

وَنَادٰٓی اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّۃِ اَنْ اَفِیْضُوْا عَلَیْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَہُمَا عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (۵۰)

لفظ تحریم کا ایک خاص مفہوم

'حَرَّمَہُمَا' میں جس تحریم کا ذکر ہے یہ شرعی حرمت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس معنی میں ہے جس معنی میں 'فَاِنَّہَا مُحَرَّمَۃٌ عَلَیْہِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً ۲۶- مائدہ' (پس یہ سرزمین ان پر چالیس سال کے لیے حرام کردی گئی) میں ہے۔ یعنی چالیس سال کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو حتمی طور پر اس سرزمین سے محروم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو کسی چیز سے حتمی طور پر محروم کر دے تو نہ وہ چیز کسی طرح اس کو پہنچ سکتی اور نہ وہ اس کو کسی طرح پا سکتا۔ اہل جنت کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سوال کے پورے کرنے میں تو کوئی عذر نہیں ہے، ان کے پاس ہر نعمت کی فراوانی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں سے اہل دوزخ کو محروم کر دیا ہے اس وجہ سے نہ یہ ان کو پہنچ سکتی ہیں نہ وہ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَہُمْ لَہْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْہُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا فَالْیَوْمَ نَنْسٰہُمْ کَمَا نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِہِمْ ھٰذَا وَمَا کَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ (۵۱)

ایک برمحل تضمین

یہ آیت بطور تضمین ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے جواب 'حَرَّمَہُمَا عَلَی الْکٰفِرِیْنَ' کی وضاحت اپنی طرف سے فرما دی کہ 'کافرین' سے کون لوگ مراد ہیں۔ اس تضمین سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا، گویا قریش پر یہ بات واضح کر دی گئی کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ صرف دوسروں کی حکایت ہے بلکہ یہ ان کی بھی حکایت ہے۔ اس قسم کی تضمین کی مثال اوپر آیت ۴۵ میں بھی گزر چکی ہے۔

'اَلَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَہُمْ لَہْوًا وَّلَعِبًا' یعنی اللہ نے جو چیز ان پر دین کی حیثیت سے اتاری اس کو انھوں نے ہنسی مسخری میں اڑایا۔ ہر چیز کا ایک محل و مقام ہوتا ہے۔ دین اس لیے آتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں صحیح نقطۂ نظر متعین کرے تاکہ لوگ ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے بجائے فلاح و سعادت کی راہ اختیار کریں۔ لیکن جن لوگوں نے زندگی کو بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا ہے وہ اپنی خواہشات کے پیچھے ایسے اندھے ہو جاتے ہیں کہ وہ خواہشات کے خلاف سنجیدہ سے سنجیدہ حقیقت کو بھی مذاق تصور کرتے اور مذاق ہی میں اس کو اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بازی بازی با ریش بابا ہم بازی!!

منکرین آخرت کا اصل دھوکا

'غَرَّتْہُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا' یہ اس لاابالیانہ طرز عمل کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ وہ کیوں زندگی کی نہایت سنجیدہ حقیقتوں سے اندھے بنے رہے۔ فرمایا کہ دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں رکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں، عیش کر رہے ہیں، دندنا رہے ہیں اور کوئی باز پرس ان سے نہیں ہو رہی ہے اس سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ بس دنیا اسی لیے پیدا ہوئی ہے۔ اگر کسی اللہ کے بندے نے ان کو توجہ دلائی کہ اس کے بعد ایک روز حساب کتاب بھی آنے والا ہے تو اس کے لتے لے ڈالے کہ یہ دیوانہ اور خبطی ہے۔ ہماری آزادی اور ہمارے عیش کو مکدر کر رہا ہے۔

'فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا' یہاں 'نَنْسٰهُمْ' نظر انداز کر دینے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور یہ فعل کا استعمال اس اسلوب پر ہے جس کو دوسری جگہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ استعمال بظاہر فعل ہوتا ہے لیکن مقصود اس سے اس کا لازم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو بھولتا نہیں۔ یہ بھولنا نظر انداز کرنے کی تعبیر ہے۔

'لِقَآء' قرآن کے نظائر سے واضح ہوتا ہے کہ کہیں اپنے مفعول کی طرف مضاف ہوا ہے، کہیں اپنے ظرف کی طرف لیکن مدعا دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ یعنی رب سے ملاقات آخرت میں۔ انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا، یعنی اس دن میں اپنے رب کی ملاقات کو بھلائے رکھا۔

'وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ' یہ جملہ چونکہ اوپر والے جملے ہی پر عطف ہے اس وجہ سے یہ دراصل 'كَمَا كَانُوْا' کے مفہوم میں ہے۔ 'کما' کے اندر تشبیہ و تمثیل کے ساتھ ساتھ سببیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ 'اور بسبب اس کے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے' تو یہ ترجمہ بالکل صحیح ہوگا۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۵۲-۵۳)

'وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ' 'ھم' کا مرجع قریش ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر اپنے اس احسان عظیم کا اظہار فرمایا ہے جو قرآن کی صورت میں ان پر فرمایا۔ اس کتاب کی صفت یہاں یہ بیان فرمائی ہے کہ اس میں ہم نے اپنے علم قطعی کی روشنی میں ان تمام امور کی تفصیل بیان کر دی ہے جن سے آگاہ ہونا دنیا و آخرت کی سعادت کے لیے ضروری ہے۔ اس تفصیل سے ان تفصیلات کی طرف بھی اشارہ ہے جو اوپر اہل جنت، اہل دوزخ اور اصحاب الاعراف سے متعلق بیان ہوئی ہیں۔ جو ہیں اگرچہ عالم آخرت سے متعلق لیکن کوئی ان کو محض ہوائی اور خیالی باتیں (۱۴، ۵، ۷، ۶، ۴) نہ سمجھے بلکہ یہ پیش آنے والے حقائق ہیں جو تمام تر 'عَلٰى عِلْمٍ' بیان ہوئے ہیں۔ یہاں لفظ 'علم' کی تنکیر موقع کلام دلیل ہے کہ تفخیم شان کے لیے ہے۔ یعنی یہ خدا کے علم وسیع، محیط کل علم پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر بات قطعی اور اٹل ہے۔ خدا قیامت کے روز کی باتیں بھی اسی طرح جانتا ہے جس طرح کل اور آج کی باتیں جانتا ہے۔ اس وجہ سے اگر کسی نے ان کو خیالی باتیں قرار دے کر ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو وہ سوچ لے کہ وہ دن دور نہیں جب وہ ایک ایک بات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور پکار اٹھے گا کہ اللہ کے رسول نے جن جن باتوں کی خبر دی تھی سب سچی ثابت ہوئیں۔

'هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' ہدایت و رحمت کے دو لفظوں نے آغاز و انجام اور دنیا و آخرت دونوں

کو سمیٹ لیا ہے۔ یعنی یہ کتاب لوگوں کے لیے دنیا میں ہدایت ہے اور اس ہدایت کو اختیار کرنے کا ثمرہ آخرت میں رحمت ہے۔ 'یُؤْمِنُوْنَ' فعل، جیسا کہ ہم دوسرے محل میں واضح کر چکے ہیں، ارادۂ فعل کے معنی میں ہے۔ اس کا ترجمہ یوں کیجیے۔ 'ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں'۔

'هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ' 'تاویل' کے لفظ پر ہم سورۂ آل عمران کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری باتیں جو قرآن سنا رہا ہے ہیں تو اٹل حقیقتیں لیکن چونکہ ابھی یہ واقعات کی صورت میں ظاہر نہیں ہوئی ہیں بلکہ مستقبل کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں اس وجہ سے منکرین ان کو خالی خولی دھمکی سمجھتے ہیں اور منتظر ہیں کہ یہ واقعات کی شکل میں ظاہر ہوں تو ان کو دیکھ کر یقین کریں گے۔

'يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِن قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ' مطلب یہ ہے کہ جب یہ باتیں واقعات کی شکل میں ظاہر ہوں گی تو آج جن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں ان کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ پکار اٹھیں گے کہ ہمارے رب کے رسولوں نے جن باتوں سے ہمیں آگاہ کیا تھا وہ سب حقیقت ثابت ہوئیں۔ اس وقت حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ ہے کوئی سفارشی جو ہماری سفارش کرے یا ہے کوئی صورت کہ ہم دنیا میں پھر جائیں اور کچھ نیکی کمائیں! لیکن ان کی یہ حسرت حسرت ہی رہے گی اس لیے کہ نیکی کی کمائی کا وقت نکل چکا ہوگا۔ جو وقت ان کو نیکی کمانے کے لیے ملا اس میں انھوں نے بدی کمائی اور جھوٹے سفارشیوں پر تکیہ کیے رہے۔ 'قَدْ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ' زندگی کی اصلی قیمت، جیسا کہ سورۂ العصر میں واضح فرمایا ہے، یہی ہے کہ اس میں نیکی کمائی جائے۔ جس نے نیکی نہ کمائی اس کی زندگی وبال بنی اور اس نے بڑے قیمتی سرمایہ سے اپنے لیے تباہی کا سودا کیا۔ 'ضَلَّ عَنْهُمْ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے فرضی معبود سب خواب و خیال ثابت ہوں گے اس لیے کہ ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ تھی ہی نہیں کہ انھوں نے اپنے جی سے گھڑ کے ان کو خدا کی طرف منسوب کر رکھا تھا کہ خدا نے ان کو اپنا شریک و شفیع بنایا ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۵۴-۵۸

اوپر بات شرک کی بے حقیقتی و بد انجامی پر ختم ہوئی تھی۔ آگے کی آیات میں توحید کے مضمون کی وضاحت فرما کر اس کی تکمیل کر دی کہ آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے اور وہ اس کائنات کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ اپنے عرش حکومت پر متمکن ہو کر تمام کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ دن اور رات، سورج، چاند، ستارے اور سیارے سب اسی کے احکام کی تعمیل میں شب و روز گردش میں ہیں۔ جس نے خلق کیا ہے اسی کا امر و حکم تمام کائنات پر جاری ہے اور خالق کائنات کے سوا دوسرا کوئی حق دار کس طرح ہو سکتا ہے کہ خدا کی خلق کی ہوئی کائنات میں اس کا حکم چلے؟ پھر یہ کائنات اپنے وجود سے شاہد ہے

کہ اس کو خلق کرنے والی ہستی بڑی ہی بافیض اور نہایت ہی بابرکت و رحمت ہستی ہے تو سرّاً و علانیۃً اسی کو پکارو اور امید و بیم ہر حال میں اسی سے لَو لگاؤ۔ خدا کی خدائی میں کسی اور کو شریک گردانا خدا سے بغاوت اور اس کی سرزمین میں فساد برپا کرنا ہے اور خدا ان لوگوں کو کبھی پسند نہیں کرتا جو اس سے سرتابی کریں اور اس کی زمین میں فساد مچائیں۔

اس کے بعد بارش کی ایک تمثیل پیش کی ہے جس سے بیک وقت تین حقیقتیں واضح فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ خدا کی رحمت اس کے نیکوکار بندوں سے بہت قریب ہے اس وجہ سے امید و بیم ہر حال میں خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، خدا اور اس کی رحمت کو دور سمجھ کر دوسروں کا سہارا نہیں پکڑنا چاہیے۔ یہ خدا ہی ہے جو زمین کے خشک ہو جانے اور تمھارے مایوس ہو جانے کے بعد اپنی رحمت کی گھٹائیں اٹھاتا اور تمام زمین کو جل تھل کر دیتا ہے۔

دوسری یہ کہ جس طرح تم زمین کو دیکھتے ہو کہ بالکل بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی اس کے ہر گوشے میں زندگی نمودار ہو جاتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ جب چاہے گا تمھارے مرکھپ جانے کے بعد تمھیں از سر نو زندہ اٹھا کھڑا کرے گا۔

تیسری یہ کہ جس طرح بارش کا اثر مختلف صلاحیت کی زمینوں پر مختلف شکل میں نمایاں ہوتا ہے، زرخیز زمین لہلہا اٹھتی ہے، بنجر زمین صرف خار و خس اگاتی ہے اسی طرح قرآن کی شکل میں ہدایت و رحمت کی جو بارش اس زمین پر نازل ہوئی ہے اس سے بھی مختلف صلاحیت کی طبیعتیں مختلف اثر لیں گی۔ جنھوں نے اپنی فطرت کو مسخ ہونے سے بچایا ہے وہ اس سے فیض پائیں گے اور ان کے دل نور ایمان سے جگمگا اٹھیں گے لیکن جن کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے ان کے اندر صرف کفر و عناد کی جھاڑیاں اگیں گی۔

آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۴-۵۸

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ
ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَّ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرٰتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ
تَبٰرَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعٰلَمِينَ ﴿٥٤﴾ اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ
إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٥٥﴾ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا
وَادْعُوهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ
اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ
فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ
الَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ
ع ۵ ۱۴ يَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾

ترجمۂ آیات ۵۴-۵۸ بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر متمکن ہُوا۔ ڈھانکتا ہے رات کو دن پر جو اس کا پوری سرگرمی سے تعاقب کرتی ہے اور اس نے سورج اور چاند اور ستارے پیدا کیے جو اس کے حکم سے مسخر ہیں۔ آگاہ کہ خلق اور امر اسی کے لیے خاص ہے۔ بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، عالم کا رب! اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، بے شک وہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ملک میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو اور اسی کو پکارو بیم و رجا دونوں حالتوں میں۔ بے شک اللہ کی رحمت نیکو کاروں سے قریب ہے۔ ۵۴-۵۶

اور وہی ہے جو اپنے ابرِ رحمت سے پہلے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بوجھل بادل کو اٹھا لیتی ہیں ہم اس کو ہانکتے ہیں کسی بے آب و گیاہ زمین کی طرف اور وہاں پانی برساتے ہیں اور پھر ہم اس سے پیدا کرتے ہیں ہر قسم کے پھل۔ اسی طرح ہم مردوں کو اٹھا کھڑا کریں گے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ اور زرخیز

زمین کی پیداوار تو خوب اپجتی ہے اس کے رب کے حکم سے پر جو زمین ناقص ہوتی ہے اس کی پیداوار کم ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم اپنی آیات مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو شکر گزار بننا چاہیں۔ ۵۴-۵۸

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (۵۴)

جو خالق ہے وہی سب ہے — 'إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ' ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اہل عرب آسمان و زمین اور تمام دوسری چیزوں کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن رب انھوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنا رکھے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا خلق کر کے اس کے انتظام و انصرام کے مختلف شعبے اپنے دوسرے کارندوں میں تقسیم کر دیے ہیں اور اب ان شعبوں کے اصلی کرتا دھرتا وہی ہیں اس وجہ سے ان کی عبادت ضروری ہے۔ وہی خدا کے قرب کا واسطہ ہیں اور رزق و فضل اور مال و اولاد کے خزانوں پر عملاً انہی کا تصرف ہے۔ اگر ان کو نہ راضی رکھا جائے تو اکیلے اللہ تعالیٰ سے کام نہیں چل سکتا۔ انہی کارندوں کو وہ ارباب، شرکاء اور شفعاء کا درجہ دیتے تھے اور گو نظری طور پر ان کی میتھالوجی میں خدا کو خالق کائنات اور رب الارباب کی حیثیت حاصل تھی لیکن عملاً ان کی ساری وابستگی رب الارباب سے نہیں بلکہ ان فرضی ارباب ہی سے رہ گئی تھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی اسی گمراہی پر ٹوکا ہے کہ جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے وہی رب بھی ہے، جب خالق وہ ہے اور اس سے تمھیں انکار نہیں تو دوسروں کو رب کس منطق سے بنائے بیٹھے ہو۔

تخلیق کائنات میں تدریج و ارتقا کی حکمتیں — 'فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ' میں ایام سے مراد یہ ہمارے چوبیس گھنٹے والے دن نہیں ہیں بلکہ اس سے خدائی دن مراد ہیں۔ خدا کی اسکیمیں اس کے اپنے دنوں کے حساب سے بروئے کار آتی ہیں جو ہمارے حساب سے، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، ہزار سال کے برابر بھی ہوتے ہیں اور پچاس ہزار سال کے برابر بھی۔ اس وجہ سے چھ دنوں سے مراد چھ ادوار ہیں۔ دنیا کا چھ ادوار میں پیدا ہونا تورات میں بھی مذکور ہے اور قرآن میں بھی بلکہ جہاں تک اس کے تدریجی ارتقا کا تعلق ہے فلسفۂ جدید بھی بڑے شد و مد سے اس کا مدعی ہے۔ اس وجہ سے بجائے خود اس کائنات کا ارتقا قدیم و جدید میں متنازع فیہ نہیں ہے البتہ نظریۂ ارتقاء کی تقریباً

کے عَلَم برداروں کی طرف سے جس انداز میں کی جاتی ہے اس میں بہت سے منطقی خلا ہیں جو اس وقت تک نہیں بھر سکتے جب تک ان عقلی و فطری اصولوں کو تسلیم نہ کیا جائے جو قرآن نے اس ارتقا کے بیان فرمائے ہیں۔ ہم انشاء اللہ اس کے محل میں اس مسئلہ پر گفتگو کریں گے۔

دلائلِ توحید

اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کو چھ دنوں، یا چھ ادوار میں پیدا کرنے کے بجائے اپنے ایک کلمۂ کُن سے آن کے آن میں بھی پیدا کر سکتا تھا۔ یہ بات اس کی قدرت سے بعید نہیں تھی۔ لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ یہ چھ ادوار میں پیدا ہو۔ خدا نے اپنے خلق و تدبیر کے ہر شعبے میں جس طرح اپنی قدرت نمایاں فرمائی ہے اسی طرح اپنی حکمت، ربوبیت اور رحمت کی شانیں بھی نمایاں فرمائی ہیں اور اس کی ان شانوں کا نمایاں ہونا بھی انسان کے کمالِ عقلی و روحانی کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح خدا کے کمالِ قدرت کا نمایاں ہونا ضروری ہے۔ ہم نے سورۂ انعام کی تفسیر میں واضح کیا ہے کہ خدا کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں تھی کہ ہماری غذا کے لیے براہِ راست آسمان سے روٹی برستی پھر یہ کیوں ضروری ہوا کہ ہوائیں چلیں، بادل اٹھیں، مینہ برسے، کھیتوں میں ہل چلیں، گندم بوئی جائے، انکھوے نکلیں، ڈنٹھل پیدا ہوں، اس میں برگ و بار نمایاں ہوں، فصل اپکے، خوشے نمودار ہوں، پھر ان میں دانے بیٹھیں، پھر گرم و خشک ہوائیں چلیں جو ان دانوں کو پکائیں اور اس طرح کہیں چھ مہینے کے گرم و سرد مراحل سے گزر کر گندم کا دانہ کھیت سے کسان کے کھتے تک پہنچے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اس طرح اس کائنات کی ایک ایک چیز خدا کی آیاتِ خلق و تدبیر اور اس کے عجائبِ قدرت و حکمت کا ایک دفتر بن گئی ہے۔ انسان اس کے جس گوشے پر بھی نظر ڈالتا ہے اگر آنکھیں کھلی ہوئی اور عقل بیدار ہو تو معرفتِ الٰہی کا ایک دلبستان کھل جاتا ہے۔ ایک ایک شے نہ جانے کتنے بھیس بدلتی اور کتنے جامے تبدیل کرتی ہے تاکہ وہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرے اور ہم ان کے اندر خدا کی نشانیوں کو دیکھیں اور ان سے سبق حاصل کریں۔ جو حال اس دنیا کے ذرے ذرے کا ہے وہی حال بحیثیت مجموعی اس دنیا کا ہے۔ یہ بھی ایک حادثہ کے طور پر یک بیک بن کر نہیں کھڑی ہو گئی ہے بلکہ اس کی تعمیر کرنے والے نے بڑی تدریج، حکمت اور بڑے اہتمام کے ساتھ مختلف مراحل میں اس کو تکمیل تک پہنچایا ہے یہاں تک کہ وہ انسان کے فرودکش ہونے کے لیے تمام ضروری لوازم سے آراستہ ہو گئی۔ یہ اہتمام و تدریج شاہد ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ یا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے بلکہ ایک باغایت و بامقصد کارخانہ ہے اور ضروری ہے کہ ایک دن وہ غایت و مقصد ظہور میں آئے۔ اس نکتہ پر مفصل بحث ہم سورۂ ہود کی آیت ۷ کے تحت کریں گے جہاں اسی اہتمام کے پہلو سے جزا و سزا پر استدلال کیا ہے۔

تخلیقِ کائنات میں جو اہتمام ہے اس کا بدیہی نتیجہ

'ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ' یہ اس شان و اہتمام کے ساتھ آسمان و زمین کو پیدا کرنے کا ایک بدیہی نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جس نے یہ سارا کارخانہ اس تدریج و اہتمام کے ساتھ بنایا سنوارا کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس کو پیدا کر کے اس کی تدبیر و انتظام سے بالکل بے تعلق ہو کر کسی گوشے میں جا بیٹھے۔ اس خلق کا بدیہی تقاضا یہ

ہے کہ وہ اس کو پیدا کرنے کے بعد اس کے تخت حکومت پر متمکن ہو کر اس کے تمام امور و معاملات کا انتظام بھی فرمائے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بعض جگہ 'استوٰی علی العرش' کے ساتھ 'یُدَبِّرُ الْاَمْرَ' بھی آیا ہے۔ خدا خلق تو کرے لیکن پھر اس کا انتظام نہ کرے یہ خدا پر نہایت ہی سفیہانہ تہمت ہے۔ ایک بادشاہ اگر بڑے اہتمام سے ملک حاصل کرے لیکن ملک حاصل کر کے کسی گوشے میں جا بیٹھے، اس میں امن و عدل کا اہتمام نہ کرے، مفسدین اس میں دھاندلی مچاتے پھریں تو ساری خلق اس کو نالائق بادشاہ کہے گی، پھر ایک معمولی بادشاہ کے لیے جو بات عیب میں داخل ہے آسمان و زمین کے خالق و مالک کے لیے وہ بات کس طرح باور کی جا سکتی ہے؟ یہ مشرکین کے اس مزعومہ کی تردید ہے کہ خدا خالق تو ہے لیکن آسمان و زمین کو خلق کر کے اس نے عالم کا انتظام و انصرام اپنے دوسرے شرکاء کے حوالے کر دیا ہے اور خود الگ تھلگ جا بیٹھا ہے۔ ساتھ ہی یہ ان کم سواد فلسفیوں کی بھی تردید ہے جو خدا کو صرف ایک گوشہ نشین علت العلل کا درجہ دیتے ہیں جس نے محرک اول کی حیثیت سے ایک حرکت تو پیدا کر دی لیکن پھر اس کو اس سے کچھ بحث نہیں رہی کہ اس کی اس حرکت کے کیا نتائج نکلتے ہیں اور اس کو کنٹرول کرنا کس کی ذمہ داری ہے؛ فرمایا کہ خدا کائنات کو پیدا کر کے عرش پر متمکن ہے اور کائنات کا انتظام فرما رہا ہے۔ عرش اقتدار کی تعبیر ہے اور 'استوٰی' کے بعد جب 'علیٰ' آتا ہے تو اس کے معنی تمکن کے ہو جاتے ہیں۔

'یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا'، 'حثیث' اور 'حثوث' کے معنی تیز اور سرگرم کے ہیں یہ اس تدبیر و انتظام کی وضاحت ہو رہی ہے جو 'استوٰی علی العرش' کے اندر مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نظام کائنات میں جو حرکت بھی ہو رہی ہے سب اس کے خالق ہی کی تدبیر و انتظام سے ہو رہی ہے۔ وہی ہے جو رات کو دن پر ڈھانکتا ہے اور اسی کے حکم سے اس سرگرمی سے وہ اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ 'وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ' وہی ہے جس نے سورج اور چاند اور دوسرے تمام نجوم و کواکب پیدا کیے۔ 'مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ' یعنی وہ اپنے اپنے معینہ فرائض اور اپنے اپنے معینہ حدود و قیود کے خدا کے حکم سے پابند ہیں اور پوری سرگرمی کے ساتھ شب و روز اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ ایک پل کے لیے بھی غافل ہوں یا بال برابر بھی اپنے حدود سے متجاوز۔

جو خالق ہے اسی کو حکومت کا حق ہے

'اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ' بیان واقعہ بھی ہے اور اظہار حق بھی۔ یعنی جس نے یہ کائنات خلق کی ہے اسی کا امر و حکم اس کے گوشہ گوشہ میں جاری ہے، ذرہ ذرہ شب و روز اسی کے احکام کی تعمیل میں پورے جوش و خروش کے ساتھ سرگرم کار ہے اور یہی حق بھی ہے کہ اسی کا امر و حکم اس کے ہر گوشے میں چلے اس لیے کہ جس نے خلق کیا ہے اس کے سوا کسی اور کا حکم اس میں چل کس استحقاق کی بنا پر سکتا ہے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ 'حَثِیْثًا' کے لفظ سے اس امر کا اظہار ہو رہا ہے کہ ہر چیز پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض انجام دے رہی ہے، کسی چیز سے بھی نیم دلی یا سرد مہری کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ

اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انسان کے لیے بھی خدا کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے یہی رویہ زیبا ہے کہ وہ اس کی بندگی اور اطاعت میں اسی طرح سرگرم ہو۔ دوسری بات یہ قابلِ لحاظ ہے کہ یہاں رات کی سرگرمی کا ذکر تو فرمایا لیکن دن کی سرگرمی کا ذکر نہیں فرمایا درآنحالیکہ دوسرے مقام میں رات کے ساتھ دن کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۶۲۔ الفرقان' اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں رات کے ذکر کے بعد سورج کا ذکر آگیا ہے جس سے متقابل پہلو خود بخود واضح ہو گیا۔

خدا اپنے جلال اور رحمت دونوں میں یکتا ہے

تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ، 'تفاعل' میں غایت درجہ مبالغہ کا مضمون پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے 'تبٰرک اللہ' کے معنی ہوں گے، بڑی ہی برکت و رحمت والی ہستی ہے اللہ۔ اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنے خلق و تدبیر کی جو شانیں واضح فرمائی ہیں ان سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، جس طرح خدا کی قدرت و عظمت کا اظہار ہو رہا ہے اسی طرح اس کی رحمت و ربوبیت، اس کے جود و نوال اور اس کی کرم نوازی و فیض بخشی کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ یہ خدا کے باب میں اس غلط فہمی کا ازالہ ہے جس میں مشرک قومیں بالعموم مبتلا ہوئیں کہ انھوں نے خدا کی عظمت و جبروت کا تصور اس قدر بڑھایا کہ اس کی صفات رحمت و برکت کا تصور اس کے نیچے بالکل دب کر رہ گیا۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بندوں کے لیے خدا سے براہ راست تعلق و توسل ناممکن سمجھ لیا گیا اور پھر ایسے وسائل و وسایط کی تلاش ہوئی جو خدا سے مقصد برآری کا ذریعہ بن سکیں۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ صفاتِ الٰہی کے باب میں یہ گمراہی شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل ہے۔ مشرکین نے بہت سے فرضی معبودوں کی پرستش، بالخصوص ملائکہ کی پرستش، اسی وجہ سے کرنی شروع کی کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں، یہ ہم سے راضی رہیں تو یہ اپنے باپ کو ہم سے راضی رکھیں گی اور پھر سارا جہان ہم پر مہربان ہو جائے گا۔ قرآن نے یہاں 'تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ' کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کائنات جس طرح اپنے خالق کی بے پایاں عظمت و جبروت پر شاہد ہے اسی طرح اس کی بے پایاں برکت و رحمت پر بھی گواہ ہے تو اس سے مانگنے کے لیے کسی واسطے اور وسیلے کی ضرورت نہیں۔ خوف اور طمع، امید و بیم ہر حال میں اسی کو پکارو اور اسی سے مانگو، جس طرح وہ اپنے جلال میں یکتا ہے اسی طرح اپنی رحمت میں بھی یکتا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۵-۵۶)

خدا سے دعا کے آداب

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۔ 'تضرع'، 'ضراعت' سے ہے۔ اس کے معنی عاجزی، خوشامد، لجاجت کے اظہار کے ہیں۔ یہ اظہار حرکات اور اداؤں سے بھی ہوتا ہے اور الفاظ و عبارات سے بھی۔ اس کی سب سے زیادہ موثر شکل وہ ہوتی ہے جب یہ الفاظ و حرکات دونوں میں کامل ہم آہنگی کے ساتھ نمایاں ہو جس کی بہترین شکل اسلام میں نماز ہے۔ باوضو ہو کر مودب کھڑا ہونا، ہاتھ باندھ لینا، سر نیہوڑا

دینا، گھٹنے ٹیک دینا، ناک اور پیشانی خاک پر رکھ دینا، یہ تضرع کی حرکات اور ادائیں ہیں اور ان مختلف حرکات اور اداؤں کے ساتھ جو دعائیں اور تسبیحات پڑھی جاتی ہیں، سب اسی تضرع کی معنوی تعبیریں ہیں۔

'خُفْيَةً' کے معنی 'چپکے' کے ہیں۔ یہ تضرع کے آداب میں سے ہے جو تضرع کے اخلاص کا بھی ضامن ہے اور اس کے وقار کا بھی۔ جو کام چپکے چپکے کیا جاتا ہے وہ ریا کے فتنہ سے محفوظ ہوتا ہے اور خدا چونکہ ہر چیز سنتا اور جانتا ہے اس وجہ سے اس کو سنانے اور اس سے فریاد کرنے کے لیے چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'خفیۃ' کا لفظ صرف ریا اور سوءِ ادب کے سدباب کے لیے ہے، اس سے اس جہر کی نفی نہیں ہوتی جو جماعتی دعاؤں یا بعض اوقات بندہ اپنی انفرادی مناجاتوں میں اختیار کرتا ہے۔ یہ جہر کی نفی نہیں بلکہ صرف اعتدال کی تاکید ہے۔ اس مضمون کی وضاحت انشاء اللہ بنی اسرائیل کی آیت 'وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا ۱۱۰' کے تحت آئے گی۔

انسان کو نظام کائنات کا درس

الفاظ کی وضاحت کے بعد اب آیت کے موقع و محل اور اس کے مفہوم پر غور فرمائیے۔ اوپر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا ہی آسمان و زمین کا خالق ہے، اسی کے حکم سے ستارے اور سیارے گردش کر رہے ہیں، خلق اور امر سب اسی کے اختیار میں ہے اور وہ بڑی ہی بافیض و بابرکت ہستی ہے۔ اب یہ 'اُدْعُوا رَبَّكُمْ' سے وہ حق اور فرض بیان ہو رہا ہے جو اس رب عظیم و کریم کا بندوں پر عاید ہوتا ہے۔ وہ حق و فرض یہ ہے کہ اپنے اسی رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ یعنی یہ استکبار اور یہ رعونت جس کا اظہار تمھاری طرف سے ہو رہا ہے یہ روش تمھارے لیے زیبا نہیں ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز خدا کے آگے سرنگندہ و سرنگوں اور اس کے حکم کی تعمیل میں سرگرم تگاپو ہے تو تمھاری کیا ہستی ہے کہ خدا کے آگے اکڑو اور سر اٹھاؤ۔ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ۔ خدا ان لوگوں کو کبھی پسند نہیں کرتا جو اس کے حدود سے تجاوز کریں۔ یہ نظام کائنات شاہد ہے کہ وہ کسی چیز کو اس کے حدود سے انحراف کی اجازت نہیں دیتا اور اس دنیا کی تاریخ بھی شاہد ہے کہ اس نے کبھی اکڑنے والوں اور حدود سے تجاوز کرنے والوں کو ایک حد خاص سے زیادہ مہلت نہیں دی۔

تکوینی توحید کی طرح تشریعی توحید بھی لازمی ہے

'وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا' یہ اوپر والے مضمون ہی کی تاکید و توثیق منفی پہلو سے ہے۔ یعنی اپنے رب سے انحراف اختیار کر کے اس زمین میں فساد برپا نہ کرو۔ قرآن میں مختلف پہلوؤں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کچھ اور الٰہ ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتے، یہ تو قائم ہی اس بنا پر ہیں کہ ان کے اندر اللہ کے ارادے کے سوا کسی اور ارادے کی کارفرمائی نہیں ہے۔ اس تکوینی توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندے اپنے دائرہ اختیار میں بھی صرف اسی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت و اطاعت کریں، کسی اور کو اس عبادت و اطاعت میں شریک نہ بنائیں ورنہ اس زمین کا سارا نظام عدل و شریعت درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اس کائنات کے قیام و بقا کے لیے جس طرح تکوینی توحید ناگزیر ہے اسی طرح اس

زمین کے امن و عدل کے لیے خدا کی تشریعی توحید بھی لازمی ہے۔ خدا کے ملک میں کسی اور کو الٰہ و معبود بنانا اس کے ملک میں فساد و بغاوت برپا کرنا ہے جس سے بڑا کوئی اور جرم نہیں۔

'لَا تُفْسِدُوْا' کے ساتھ 'بَعْدَ اِصْلَاحِهَا' کی قید اس فعل کی شناعت کے اظہار کے لیے ہے۔ یعنی ملک میں فساد پیدا کرنا بجائے خود سب سے بڑا جرم ہے لیکن یہ جرم سنگین سے سنگین تر ہو جاتا ہے جب یہ اصلاح کے بعد واقع ہو اس لیے کہ یہ بگڑی ہوئی چیز کو بگاڑنا نہیں بلکہ بنی ہوئی چیز کو بگاڑنا ہوا۔

کائنات کے صلاح و فساد کی بنیاد

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خالقِ کائنات نے جب اس دنیا کو بنایا تو اس کو بنا کر یوں ہی انتشار اور بدامنی کے حال میں چھوڑ نہیں دیا بلکہ آدمؑ اور ان کی ذریت کو اس دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی ان سے توحید یعنی اپنی ہی عبادت اور اپنی ہی اطاعت کا اقرار لیا۔ اس کا ذکر اسی سورہ کی آیات ۱۷۲، ۱۷۳ میں آگے آ رہا ہے۔ پھر ذریت آدم سے، جیسا کہ آیت ۳۵-۳۶ میں گزرا، یہ وعدہ فرمایا کہ تمھاری ہدایت کے لیے میں اپنے رسول بھیجوں گا، تم ان کی پیروی کرنا، جو ان کی پیروی کریں گے وہ فلاح پائیں گے، جو تکبر کر کے ان سے اعراض کریں گے وہ ہلاک ہوں گے۔ پھر اپنے اس وعدے کے بموجب اللہ تعالیٰ نے برابر اپنے رسول بھیجے جن کی تفصیل آگے آیت ۵۹ سے آیت ۹۲ تک آ رہی ہے۔ ان رسولوں کی سرگزشت ہیں، جیسا کہ آیات ۶۹، ۷۴، ۸۵، ۱۰۰، ۱۰۲ سے واضح ہوگا، یہ دکھایا ہے کہ اولادِ آدم کے مختلف گروہوں نے جب جب اللہ کی صراطِ مستقیم سے ہٹ کر اس دنیا میں فساد برپا کیا ہے خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے ان کو انذار کیا ہے اور جب انھوں نے اس انذار کی پروا نہیں کی ہے تو خدا نے ان کی جڑ کاٹ دی ہے اور ان کی خلافت دوسروں کو سونپی ہے کہ دیکھے وہ اس خلافت کا حق کس طرح ادا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ دنیا بار بار شیطان اور اس کی ذریات کی کوششوں سے بگڑی ہے اور بار بار انبیاء و مصلحین کے ذریعہ سے اس کی اصلاح ہوئی ہے۔ اس پہلو سے معاملہ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں جس قوم کو بھی اپنے پچھلوں کی خلافت ملی ہے ایک فساد کو مٹا کر اس کی اصلاح کی شکل میں ملی ہے اور اگر خلافت پانے والی قوم نے خلافت پا کر اس میں فساد برپا کیا ہے تو یہ اس نے ایک بگڑی ہوئی چیز کو نہیں بگاڑا ہے بلکہ ایک بنی ہوئی چیز کو بگاڑا ہے اور یہ چیز اس کے جرم کو سنگین سے سنگین تر بنا دیتی ہے۔

اجتماعی مصلحین کا ایک مغالطہ

جہاں تک رسولوں کا تعلق ہے ان کے اور ان کی امتوں کے باب میں مذکورہ بالا اصول بالکل اٹل ہے۔ ان کے ذریعہ سے حق سورج کی طرح چمکتا ہوا نمایاں ہوتا ہے اس وجہ سے ان کے ہاتھوں جو نظام مٹتا ہے وہ باطل ہوتا ہے، جو قائم ہوتا ہے وہ حق ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آج قوموں کے عروج و زوال کے معاملے میں قدرت کا قانون بدل گیا۔ آج بھی اگر کوئی قوم مٹتی ہے تو اتفاق سے نہیں مٹتی اور اگر کوئی قوم عروج پر آتی ہے تو اتفاق سے نہیں آ جاتی بلکہ ایک کے زوال اور دوسرے کے عروج میں اصلاً اخلاقی عوامل ہی کام کرتے ہیں لیکن کسی قوم کا چند زندگی بخش عوامل

اخلاقی کے سہارے عروج پر آ جانا ایک اور چیز ہے اور کسی نظام کا حق ہونا ایک دوسری چیز۔ کسی قوم کا عروج اس بات کی دلیل تو ضرور ہے کہ اس کے اندر مغلوب و مفتوح قوم کے مقابل میں زندگی بخش عوامل اخلاقی زیادہ ہیں لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ یہ قوم اور اس کا نظام سو فی صد حق ہے۔ ہمارے بہت سے اجتماعی مصلحین کو یہ اصول سمجھنے میں سخت مغالطہ پیش آیا ہے جس کے سبب سے وہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے۔ جو لوگ قومی تعصب میں مبتلا رہے انھوں نے ہمیشہ غالب قوم کے غلبہ کو اس کی چیرہ دستی اور کیادی پر محمول کیا، وہ اپنے تعصب کے سبب سے نہ تو اس اخلاقی برتری کو دیکھ سکے جو غالب قوم کے اندر موجود تھی اور نہ اس اخلاقی ضعف پر ان کی نظر پڑی جو ان کے اپنے اندر پایا جاتا تھا۔ اسی طرح جو لوگ مرعوب ذہن کے تھے انھوں نے ہر غالب کے غلبہ کو اس کے برحق ہونے کی دلیل سمجھا اور اس کے ہاتھوں جو فساد و باطل بھی دنیا میں برپا ہو گیا اسی کو نظامِ حق سمجھ کر اس کے گن گانے لگے۔ اس افراط و تفریط کا اثر قوموں کی تاریخ پر یہ پڑا کہ وہ بالکل غلط طریقہ پر مرتب ہو گئی جس سے صحیح نتائج نکالنا اور ان سے اجتماعی اصلاح میں فائدہ اٹھانا ناممکن ہو گیا۔ یہاں ہم اس اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔ انشاء اللہ سورۂ روم کی تفسیر میں ہم اس پر شرح و بسط سے بحث کریں گے۔

امید و بیم دونوں میں مرجع خدا ہی ہے

'وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ' یہ 'اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً' کا مقابل جملہ ہے۔ اس میں خدا کو پکارنے کی ہیئت بتائی تھی جو استکبار کی ضد ہے۔ اب یہ خدا کے پکارنے کے محرک کی وضاحت فرمائی جس سے شرک کے ہر جرثومہ کی جڑ کٹ گئی ہے۔ استکبار خدا سے بے پروا کرتا ہے۔ اگر اس کا سر کچل جائے تو انسان کے اندر فقر پیدا ہوتا ہے اور یہ فقر بندے کو خدا سے جوڑتا ہے۔ اس فقر کے دو پہلو ہیں۔ ایک خوف، دوسرا طمع، اپنے لفظوں میں ان کو امید و بیم سے تعبیر کر لیجیے۔ انسان کے اندرونی داعیات بھی انھی دو قسموں میں منقسم ہیں اور اس کے خارجی عوامل و محرکات کا بھی تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی یا تو بیم کے تحت آتے ہیں یا امید کے تحت۔ ہم بہت سی چیزیں، مادی اور معنوی دونوں قسم کی، چاہتے ہیں، ان کے ارمان رکھتے ہیں، ان کے آرزو مند ہیں، اسی طرح بہت سی چیزیں ہیں، مادی اور معنوی دونوں قسم کی، جن سے گریز کرنا چاہتے ہیں، جن سے اندیشہ رکھتے ہیں، جن کو دفع کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن ان دونوں ہی حالتوں کے لیے توحید کا تقاضا یہ بتاتا ہے کہ انسان صرف اللہ ہی کو اپنا مرجع و مولیٰ بنائے۔ جو کچھ چاہے اس کے لیے بھی خدا ہی سے رجوع کرے، جن سے اندیشہ محسوس کرے اس سے بچنے کے لیے بھی خدا ہی کی پناہ ڈھونڈے، اس لیے کہ دینے والا بھی وہی ہے، روکنے والا بھی وہی ہے، اس کے سوا نہ کوئی کسی خیر سے بہرہ مند کر سکتا، نہ کسی شر سے بچا سکتا۔ نیز خیر و شر کی معرفت کا حقیقی معیار بھی وہی ہے، امید و بیم دونوں میں اگر خدا ہی مرجع ہو اور اسی کی مرضی مطلوب ہو تو انسان کو یہ معین کرنے میں ذرا زحمت پیش نہیں آ سکتی کہ کیا چیز چاہنے کی ہے اور اسے کس طرح چاہنا چاہیے اور کیا چیز بچنے کی ہے اور اس سے

کس طرح بچنا چاہیے ۔۔۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ خوف اور طمع یہ دونوں ہی گھاٹیاں بڑی خطرناک ہیں۔ شیطان ان دونوں ہی سے انسان پر شب خون مارتا ہے اور کسی نہ کسی شرک جلی یا خفی میں لوگوں کو مبتلا کرکے رہتا ہے۔

'اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ' کے اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ اپنی امید و بیم دونوں کا مرجع اپنے رب کو بنا لیں وہ درحقیقت مُحسن یعنی خوب کار ہیں اور اللہ کی رحمت ایسے خوب کاروں سے بہت قریب ہے۔ معلوم ہوا کہ مقام احسان پر فائز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان بیم و رجا دونوں حالتوں میں اپنے رب کی طرف یکسو ہو۔ اگر یہ یکسوئی حاصل نہ ہو تو وہ مقام احسان سے دور ہے اور جو مقام احسان سے دور ہے وہ خدا کی رحمت سے بھی دور ہے۔ خدا کی رحمت قریب محسنین سے ہے۔ وہ جب کسی امید یا بیم میں اس کو پکارتے ہیں وہ اپنی رحمت سے ان کو بہرہ مند فرماتا ہے۔ یہاں زبان کا یہ قاعدہ ملحوظ رہے کہ لفظ رحمت کی تانیث چونکہ غیر حقیقی ہے اس وجہ سے خبر کو مؤنث لانا ضروری نہیں ہوا۔ نیز فعیل کا وزن بعض حالات میں مذکر و مونث دونوں کے لیے یکساں آتا ہے۔ (حقیقی خوب کار)

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ (۵۷-۵۸)

'وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ' 'رَحْمَت' سے مراد یہاں بارش ہے۔ قرآن میں بارش کے لیے یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ یہ تمثیل ہے اس بات کی کہ خوف و طمع دونوں ہی حالتوں میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے اس لیے کہ رحمت ہمیشہ اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔ بارش، جس پر تمام دنیا کی زندگی کا انحصار ہے، ممکن نہیں ہے کہ کوئی ایک قطرہ اس کا اس زمین پر ٹپکا دے۔ یہ خدا ہی ہے جو پہلے مانسون لانے والی ہوائیں چلاتا ہے جو بوجھل بادلوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیتی ہیں، پھر خدا ان کو بے آب و گیاہ علاقوں کی طرف ہانک دیتا ہے اور وہاں ان سے پانی برسا دیتا ہے جس سے ہر قسم کے پھل اور ہر قسم کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۲۸۔ شوریٰ (اور وہی ہے جو بارش اتارتا ہے بعد اس کے کہ لوگ مایوس ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے) حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ۔ 'اقلال' کے معنی کسی چیز کو اس طرح اٹھا لینا ہے گویا اس میں کوئی وزن ہے ہی نہیں۔ 'سَحَاب' 'سَحَابَة' کی جمع ہے لیکن صورۃً واحد ہے اسی وجہ سے لفظ کے لحاظ سے 'سُقْنٰهُ' میں ضمیر اس کے لیے واحد لائے۔ 'فَاَنْزَلْنَا بِهٖ' میں 'ب' میرے نزدیک ظرفیہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دیکھو کس طرح ہوائیں بوجھل بادلوں (امید و بیم دونوں میں خدا ہی کو رجوع بلانے کی تمثیل بارش سے)

کو اُٹھا لیتی ہیں گویا وہ روئی کے گالے ہیں اور پھر یہ ہم ہی ہیں کہ جدھر چاہتے ہیں ان کو ہانک کر لے جاتے ہیں اور جس جگہ چاہتے ہیں جل تھل کر دیتے ہیں، کسی کی طاقت نہیں کہ ان کو اپنے پسند کردہ رخ پر موڑ سکے۔ پس امید و بیم ہر حال میں اسی سے لو لگاؤ، اس کے سوا کوئی اور متصرف اس کائنات میں نہیں ہے۔

قیامت کی یاد دہانی بارش کی تمثیل سے

'کَذٰلِکَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ': یہ اسی بارش کی تمثیل سے ایک اور حقیقت کی طرف توجہ دلادی ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح دیکھتے ہو کہ بارش بھیج کر ایک بالکل مردہ اور بے آب و گیاہ زمین کو ہم ازسرنو زندہ کر دیتے ہیں اسی طرح ایک دن ہم تمام مُردوں کو زندہ کر دیں گے۔ جس خدا کی قدرت کی یہ شانیں روز دیکھ رہے ہو، مُردوں کو زندہ کر دینا اس کی قدرت سے کیوں بعید سمجھتے ہو؟ ہم نے تو یہ نشانیاں اس زمین میں نمایاں کی ہی اس لیے ہیں کہ ان آثار سے تم آخرت کے لیے یاد دہانی حاصل کرو۔ 'لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ' میں غایت بیان ہوئی ہے اس توجہ دہانی کی جو 'کَذٰلِکَ' کے اشارے میں مضمر ہے۔

'وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا': ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'طیب' اور 'خبیث' کے الفاظ جس طرح معنوی و اخلاقی اعتبار سے خبیث و طیب کے لیے آتے ہیں اسی طرح مادی اعتبار سے خبیث و طیب کے لیے بھی آتے ہیں۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ 'بَلَد طَیِّب' سے مراد زرخیز اور ذی صلاحیت زمین اور 'وَالَّذِیْ خَبُثَ' سے بنجر اور شور زمین ہے۔ پھر اس میں تقابل کے اصول پر جملہ کے پہلے حصہ میں 'نکد' کا مقابل لفظ محذوف ہے۔ 'نکد' کے معنی ناقص اور قلیل کے ہیں اس وجہ سے جملہ کے پہلے حصہ میں طیب اور کثیر کا مضمون محذوف ہے۔

مذکورہ تمثیل سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ

اب دیکھیے اسی بارش کی تمثیل سے ایک تیسری حقیقت کی طرف توجہ دلادی کہ خدا کا ابر کرم تو خشک و تر ہر جگہ یکساں برستا ہے لیکن فیض بقدر استعداد پہنچتا ہے۔ جس طرح دیکھتے ہو کہ بارش ہوتی ہے تو زرخیز زمین لہلہا اٹھتی ہے لیکن بنجر اور شور زمین یا تو کچھ اگاتی ہی نہیں یا اگاتی ہے تو بس یوں ہی کچھ خار و خس۔ اسی طرح قرآن کی صورت میں جو رحمت آسمان سے برس رہی ہے اس کا فیض بھی ہر شخص کو یکساں نہیں پہنچے گا بلکہ استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے پہنچے گا۔ جن کی فطری صلاحیتیں زندہ ہیں وہ تو باغ و چمن کی طرح لہلہا اٹھیں گے لیکن جنھوں نے اپنی صلاحیتیں ضائع کر دی ہیں ان سے عناد و عداوت کے خار و خس کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہ رکھو۔ یہی حقیقت ایک حدیث میں اس طرح واضح کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم و ہدایت دے کر بھیجا ہے اس کی تمثیل یہ ہے کہ کسی خطۂ زمین پر بارش ہو تو جو ٹکڑا زرخیز ہوتا ہے وہ پانی کو قبول کر لیتا ہے اور خوب سبزہ اور نباتات اگاتا ہے۔ اسی طرح کوئی ٹکڑا ہوتا ہے جو پانی کو روک لیتا ہے تو اللہ اس سے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے، لوگ اس سے پیتے ہیں، کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں اور اپنی فصلیں بوتے ہیں۔ اسی طرح کوئی ٹکڑا ہوتا ہے جو محض چٹیل ہوتا ہے، نہ پانی کو روکتا نہ سبزہ اگاتا، یہ تمثیل ہے ان لوگوں کی جو دین کی سمجھ حاصل کریں اور

ان کو نفع پہنچے اس چیز سے جو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے، پس وہ سیکھیں اور سکھائیں اور ان لوگوں کی جو اس کی طرف توجہ نہ کریں اور اس ہدایت کو قبول نہ کریں جس کو لے کر میں آیا ہوں۔ (بخاری و مسلم)

دیکھا آپ نے، ایک ہی بارش کی تمثیل سے کتنے حقائق آشکارا ہو گئے! توحید کی دلیل بھی سامنے آگئی، امکان معاد اور وقوع قیامت کی نظیر بھی مل گئی اور ہدایت و ضلالت کے باب میں جو سنت اللہ مقرر ہے وہ بھی نمایاں ہو گئی۔ گویا سورہ کے آغاز سے یہاں تک جو مسائل زیر بحث آئے تھے اصولاً وہ سب ہی بے نقاب ہو گئے۔ ہم کہیں ذکر کر آئے ہیں کہ یہ کائنات پروردگار نے بنائی ہی ایسی شکل میں ہے کہ اگر انسان دیدۂ بینا رکھتا ہو تو پتا پتا، بوٹا بوٹا ان حقائق کی شہادت دے رہا ہے جن کی دعوت قرآن دے رہا ہے لیکن دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان کہاں ہیں!!

'كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ' 'تصریف' کے معنی گردش دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ ہواؤں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وہی لفظ یہاں قرآن نے آیات کے لیے استعمال فرمایا ہے۔ جس طرح ہواؤں کی گردش سے اس کائنات میں قدرت و حکمت اور رحمت و نعمت کے گوناگون پہلو ظہور میں آتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعے سے اپنی نشانیاں گوناگوں پہلوؤں سے نمایاں کرتا ہے تاکہ لوگ ان کو سمجھیں، پہچانیں اور ان کی قدر کریں۔ 'لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تصریف آیات، بہت بڑا احسان ہے بشرطیکہ اس کی قدر کرنے والے لوگ ہوں۔ لفظ 'شکر' کی اصل حقیقت ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ قدر دانی ہے۔ اسی قدردانی پر ہر نعمت کی افادیت کا انحصار ہے۔ اگر یہ قدردانی موجود نہ ہو تو جس طرح بھینس کے آگے بین بجانا لاحاصل اسی طرح ایسے بیلوں کے آگے ایک پھول کے سو سو رنگ سے مضمون باندھنا لاحاصل!

۱۰- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۵۹-۹۳

اب آگے وہی انداز کا مضمون، جو اوپر سے چلا آ رہا ہے، تاریخی دلائل سے واضح کیا گیا ہے اور عرب کی پچھلی قوموں میں سے ایک ایک کو لے کر دکھایا ہے کہ کس طرح اللہ نے ان کو اس سرزمین میں اقتدار بخشا لیکن انھوں نے اقتدار پا کر ناشکری کی روش اختیار کی، زمین میں اصلاح کے بعد فساد برپا کیا، عدل و قسط کو درہم برہم کیا، بالآخر اللہ نے ان کے اندر اپنا رسول بھیجا جس نے ان کو توحید اور عدل و قسط کے قیام کی دعوت دی لیکن انھوں نے اپنے غرور اور گھمنڈ کے سبب سے نہ صرف یہ کہ رسول کی بات مانی نہیں بلکہ اس کے درپے آزار ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اس قوم کو تباہ کر دیا۔ قریش کو یہ ساری تاریخ سنانے سے مقصود یہ ہے کہ اب ان کا معاملہ بھی اسی عدالت میں ہے جس میں ان تمام قوموں کے مقدمے پیش ہو کر فیصل ہوئے اور وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر انھوں نے

بھی وہی روش اختیار کی جو ان قوموں نے اختیار کی تو اس بے لاگ عدالت کا فیصلہ ان کے لیے کچھ مختلف ہو۔ خدا کا قانون سب کے لیے ایک ہے۔ خدا جب کسی قوم میں اپنا رسول بھیج دیتا ہے تو اس قوم کے لیے دو ہی راہیں باقی رہ جاتی ہیں یا تو وہ اصلاح قبول کرے یا ہلاکت، اس کے سوا کوئی راہ باقی نہیں رہ جاتی۔

یہ واضح رہے کہ آگے جن قوموں کی سرگزشتیں آ رہی ہیں اہل عرب ان سے واقف تھے لیکن یہ واقفیت دھندلی دھندلی مبہم روایات کی شکل میں تھی، خاص کر ان کا اخلاقی پہلو تو بالکل ہی مبہم تھا۔ قرآن نے ہی ابہام کا پردہ اٹھا کر تاریخ کو از سر نو زندہ کیا اور ان کو دعوت دی کہ کان کھول کر ان سرگزشتوں کو سنیں اور ان سے عبرت حاصل کریں، یہ دوسروں ہی کی حکایت نہیں ہے بلکہ یہ خود ان کی اپنی حکایت بھی ہے ——— اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۹-۹۳ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ
اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ
الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ
بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ
رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَوَعَجِبْتُمْ
اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَ
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي
الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا
ع ۱۵ عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا
لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾
قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾

أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ
جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ
جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ
فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ
وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ
كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ
رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ
وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ
مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ
قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَاِلٰى ع ۹ ۱۶
ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ وقف لازم
اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ
اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ
بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ
الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾
قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ
اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا

بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ
اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ
وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾
فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى
عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ
لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ
مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ
شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَمَا كَانَ
جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ
يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ كَانَتْ مِنَ
الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
ع ۱۰ ۱۲ ۱۷ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا
فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾
وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ
وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاِنْ كَانَ طَاۗىِٕفَةٌ

مِّنكُمْ ءَامَنُوا بِالَّذِىٓ أُرْسِلْتُ بِهِۦ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا
الجزء ۹ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَٰكِمِينَ ﴿٨٧﴾ قَالَ الْمَلَأُ
الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِۦ لَنُخْرِجَنَّكَ يَٰشُعَيْبُ وَالَّذِينَ ءَامَنُوا
مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَآ أَوْ لَتَعُودُنَّ فِى مِلَّتِنَا ۚ قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَٰرِهِينَ ﴿٨٨﴾
قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِى مِلَّتِكُم بَعْدَ إِذْ نَجَّىٰنَا
اللَّهُ مِنْهَا ۚ وَمَا يَكُونُ لَنَآ أَن نَّعُودَ فِيهَآ إِلَّآ أَن يَشَآءَ اللَّهُ رَبُّنَا ۚ
وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا ۚ عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ
بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفَٰتِحِينَ ﴿٨٩﴾ وَقَالَ الْمَلَأُ
الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِۦ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَٰسِرُونَ ﴿٩٠﴾
مع فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِى دَارِهِمْ جَٰثِمِينَ ﴿٩١﴾ الَّذِينَ كَذَّبُوا
شُعَيْبًا كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۚ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ
الْخَٰسِرِينَ ﴿٩٢﴾ فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَٰقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَٰلَٰتِ رَبِّى
ع ۱۱ / ۱ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۖ فَكَيْفَ ءَاسَىٰ عَلَىٰ قَوْمٍ كَٰفِرِينَ ﴿٩٣﴾

ترجمۂ آیات ۵۹-۹۳

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا، اس نے ان کو دعوت دی اے میرے ہم قومو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں۔ میں تم پر ایک ہولناک دن کے عذاب کے تسلط سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے بڑوں نے جواب دیا کہ ہم تو تم کو ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ اس نے کہا۔ اے میرے ہم قومو، مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے بلکہ میں تمام عالم کے رب کا رسول ہوں، تمہیں اپنے

رب کے پیغام پہنچا رہا ہوں اور تمھاری خیر خواہی کر رہا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ کیا تمھیں یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی یاد دہانی تمھیں میں سے ایک شخص کے ذریعہ سے آئی تاکہ وہ تمھیں باخبر کرے اور تاکہ تم ڈرو اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے! پس ان لوگوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ہم نے اس کو اور جو لوگ کشتی میں اس کے ساتھ تھے ان کو نجات دی اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔ بیشک یہ لوگ اندھے تھے۔ ۵۹-۶۴

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی اور معبود نہیں، تو کیا تم ڈرتے نہیں ؟ اس کی قوم کے بڑوں نے، جنھوں نے کفر کیا، جواب دیا کہ ہم تو تم کو ایک کھلی ہوئی حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہم تم کو جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں۔ اس نے کہا اے میرے ہم قومو! مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے بلکہ میں خداوند عالم کا رسول ہوں۔ تمھیں اپنے رب کے پیام پہنچا رہا ہوں اور تمھارا دیانت دار ناصح ہوں۔ کیا تمھیں یہ بات عجیب لگی کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی یاد دہانی تمھی میں سے ایک شخص کے واسطہ سے پہنچی تاکہ وہ تمھیں ہوشیار کرے۔ اور یاد کرو جب کہ اس نے تمھیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا اور جسمانی اعتبار سے تمھیں وسعت و کشادگی عطا فرمائی تو اللہ کی شانوں کو یاد رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ وہ بولے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم تنہا اللہ ہی کی عبادت کریں اور ان کو چھوڑ بیٹھیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ؟ تو تم جس عذاب کی ہم کو دھمکی سنا رہے ہو اس کو لاؤ اگر تم سچے ہو۔

اس نے کہا تم پر تمہارے رب کی جانب سے ناپاکی اور قہر مسلط ہو چکے ہیں۔ کیا تم مجھ سے کچھ فرضی ناموں کے بارے میں جھگڑ رہے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں۔ جن کی خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری! سو تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ پس ہم نے اس کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے اپنے فضل سے نجات دی اور ان لوگوں کی ہم نے جڑ کاٹ دی جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور یہ ایمان لانے والے لوگ نہیں تھے۔ ۶۵-۷۲

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایک واضح نشانی آ گئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی ہے کہ تمہارے لیے ایک نشانی ہو پس اس کو چھوڑ دو کہ یہ اللہ کی زمین میں چرے پھرے اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچائیو ورنہ تمھیں ایک دردناک عذاب آ پکڑے گا۔ اور یاد کرو جب کہ خدا نے قوم عاد کے بعد تم کو ان کا جانشین بنایا اور ملک میں تم کو تمکن بخشا، تم اس کے میدانوں میں محل تعمیر کرتے اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو تو اللہ کی شانوں کو یاد کرو اور ملک میں اودھم مچاتے نہ پھرو۔ اس کی قوم کے ان بڑوں نے جنھوں نے گھمنڈ کیا، ان زیردستوں سے کہا جو ان میں سے ایمان لائے، کیا تم سمجھتے ہو کہ صالح اپنے رب کا فرستادہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو اس پیام پر جو وہ دے کر بھیجے گئے ہیں ایمان رکھتے ہیں۔ منکروں نے کہا کہ ہم تو اس چیز کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو انھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی اور بولے کہ اے صالح، اگر تم خدا

کے فرستادہ ہو تو وہ عذاب ہم پر لاؤ جس کی دھمکی دے رہے ہو۔ پس ان کو کپکپی نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ تو وہ ان کو چھوڑ کر یہ کہہ کر چل دیا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں نے تمھیں اپنے رب کا پیام پہنچا دیا اور تمھاری خیر خواہی کر دی لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔ ۷۷-۷۹

اور ہم نے لوط کو بھیجا۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا۔ کیا تم کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو! تم سے پہلے دنیا کے کسی نے بھی اس کا ارتکاب نہیں کیا۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو۔ بڑی ہی اوندھی عقل کے بلکہ حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ اس پر اس کی قوم والوں نے جواب دیا تو یہ دیا کہ ان کو اپنی بستی سے نکالو، یہ بڑے پارسا بنتے ہیں۔ تو ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو، اس کی بیوی کے سوا جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے بنی، نجات دی اور ان پر اچھی طرح پتھراؤ کر دیا تو دیکھو، مجرموں کا کیا انجام ہوا۔ ۸۰-۸۴

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی تمھارا معبود نہیں۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے واضح حجت آچکی ہے تو ناپ تول پوری کرو، لوگوں کی چیزوں میں کوئی کمی نہ کرو اور زمین میں، اس کی اصلاح کے بعد، فساد نہ برپا کرو۔ یہی تمھارے حق میں بہتر ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ اور ہر راہ میں دھمکیاں دیتے، اہل ایمان کو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس راہ کو کج کرتے نہ بیٹھو۔ یاد کرو جب کہ تم تھوڑے تھے تو تم کو خدا نے زیادہ کیا اور دیکھو فساد برپا کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا! اور جب کہ

تم میں سے ایک گروہ اس چیز پر ایمان لایا ہے جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا ہے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ فرما دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور اس کی قوم کے بڑوں نے، جنھوں نے تکبر کیا، کہا کہ اے شعیب، ہم تم کو اور جو تمھارے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال کے رہیں گے یا تم ہماری ملت میں پھر آ جاؤ۔ اس نے کہا کیا جب کہ ہم اس سے نفرت کرنے ہوں تب بھی!۔ ہم اللہ پر جھوٹ تہمت باندھنے والے ٹھہریں گے اگر ہم تمھاری ملت میں لوٹ آئیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی۔ یہ ہم سے تو ہونے کا نہیں کہ ہم اس ملت میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ اللہ ہمارے رب ہی کی مشیت ہو تو اور بات ہے۔ ہمارے رب کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ ہم نے اپنے رب پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے اور ان بڑوں نے جنھوں نے اس کی قوم میں سے کفر کیا، کہا کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تو بڑے خسارے میں پڑو گے تو ان کو کپکپی نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ جنھوں نے شعیب کی تکذیب کی گویا کبھی اس بستی میں بسے ہی نہیں، جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی نامراد ہوئے۔ تو وہ ان کو یہ کہہ کر چھوڑ کر چل دیا کہ اے میرے ہم قومو، میں نے تمھیں اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے، تمھاری خیر خواہی کر دی تو اب میں کفر کرنے والوں کا غم کیوں کروں!! ۸۵-۹۳

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حضرت نوحؑ اور ان کی دعوت

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ الاٰیۃ: اس سورہ میں چونکہ قریش کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس وجہ سے

پہلے انہی قوموں کو لیا ہے جو عرب کے شمال یا جنوب یا شمال مغرب میں نامور ہوئیں اور جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں کیفرِ کردار کو پہنچیں۔ ترتیبِ بیان بالکل تاریخی ہے اس وجہ سے قوم نوح کو سب سے پہلے لیا۔ ہر قوم کی سرگزشت میں سے صرف اتنا ہی حصہ نمایاں کیا ہے جتنا انذار کے مقصد کے لحاظ سے ضروری تھا۔

انبیاؑ کی دعوت کی مشترک حقیقت — فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ: اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ تمام فساد فی الارض کی جڑ شرک ہے۔ کسی قوم کے شرک میں مبتلا ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ نظریات و عقائد اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اعمال و اخلاق ہر چیز میں فطرت کی صراطِ مستقیم سے منحرف ہو گئی اور اب زمین میں اس کا بڑھنا کسی خیر و صلاح کا بڑھنا نہیں بلکہ شر و فساد کا بڑھنا ہے اور جب تک یہ قوم باقی رہے گی اس کے ہاتھوں انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں فساد ہی کو فروغ حاصل ہوگا۔ اس وجہ سے اللہ کے رسول اپنی اصلاح کی دعوت اسی اصل نقطہ سے شروع کرتے ہیں اور یہ چیز انبیاء و رسل کی دعوت کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی نبی کی دعوت بغیر اس خصوصیت کے پائی جائے۔

منذر کے رسول دو عذابوں سے ڈراتے ہیں — اِنِّيْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ: یہ وہ اصل انذار ہے جو حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو سنایا کہ اگر تم شرک سے تائب ہو کر خالص اللہ ہی کی عبادت و اطاعت کی راہ پر نہ آ گئے تو بس سمجھ لو کہ تم پر ایک ہولناک دن کا عذاب نازل ہوا ہی چاہتا ہے۔ ہولناک دن سے مراد یہاں دنیوی عذاب کا ہولناک دن ہے۔ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ اللہ کے رسول اپنی اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈراتے ہیں۔ ایک اس عذاب سے جو رسول کی تکذیب کے لازمی نتیجہ کے طور پر دنیا میں آتا ہے اور دوسرے اس عذاب سے جس سے جزا و سزا کے فیصلہ کے دن آخرت میں لازماً دوچار ہونا پڑے گا۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ عذابِ دنیا کی طرف اشارہ ہے۔ اس کو ہولناک دن سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ رسول کی تکذیب کے نتیجے کے طور پر جو عذاب آتا ہے وہ تذکیر و تنبیہ کی نوعیت کا عذاب نہیں ہوتا بلکہ یہ عذاب اس قوم کی جڑ کاٹ دیا کرتا ہے جس کے بعد قومی حیثیت سے اس کا نشان ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جایا کرتا ہے۔ سورۂ شعراء میں حضرت ہودؑ کی زبان سے نقل ہوا ہے۔ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۱۳۵ شعراء پھر ان کی قوم کا جواب اور اس جواب کی پاداش میں ان پر دنیا میں عذاب کا آنا یوں بیان ہوا ہے۔ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۱۳۸-۱۳۹ (اور ہم پر ہرگز عذاب نہیں آئے گا، تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ پس ہم نے ان کو ہلاک کر چھوڑا اور بے شک اس میں بہت بڑی نشانی ہے)

حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا سوال و جواب — قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖ الاٰیۃ: 'ملأ' کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: یعنی تمہاری ان باتوں کی بنا پر ہم تم کو کھلی گمراہی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ اول تو تم نے باپ دادا کے دین کی تحقیر کی کہ جن معبودوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ان کا تم انکار کر

رہے ہو، پھر ستم یہ ہے کہ ہمارے اوپر عذاب الٰہی نازل ہونے کی دھمکی بھی سنا رہے ہو درآنحالیکہ ہمارے حالات تم سے اور تمہارے نام لیواؤں کے حالات سے ہر اعتبار سے اچھے ہیں۔

'قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَۃٌ وَّلٰـکِنِّیْ الایۃ' حضرت نوحؑ نے جواب میں فرمایا کہ مجھے کوئی سرپھرا اور بھٹکا ہوا آدمی نہ سمجھو، میں تمام عالم کے رب کی طرف سے تمہارے پاس پیغمبر کی حیثیت سے آیا ہوں اور جو کچھ تمہیں سنا رہا ہوں وہ بے کم و کاست خدا ہی کی طرف سے سنا رہا ہوں، کوئی بات اپنی طرف سے نہیں سنا رہا ہوں۔

'اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَکُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' یہ خدا کا پیغام بھی ہے اور میری طرف سے تمہارے حق میں انتہائی خیر خواہی بھی کہ تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی، ناقدری و دل آزاری، دشمنی و بیزاری کے باوجود تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہوں اور تمہارے ہاتھوں سب کچھ جھیل رہا ہوں۔ جذبۂ ہمدردی و خیر خواہی کے سوا کسی اور جذبے کا میری اس تمام تگ و دو میں کوئی شائبہ نہیں۔ بس یہ اندیشہ اور یہ غم ہے کہ تم کہیں خدا کی آخری پکڑ میں نہ آجاؤ۔ تم صرف ظاہر کو دیکھتے ہو اس وجہ سے تمہیں عذاب کا ڈراوا عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن میں خدا کی طرف سے وہ بات بھی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ تم اپنے ظاہر کی چمک دمک کے ساتھ اگر اپنے ان روگوں سے بھی باخبر ہوتے جو تم نے اپنے سفید کپڑوں کے نیچے چھپا رکھے ہیں تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ میں کتنی سچی بات کہہ رہا ہوں۔

'اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَکُمْ ذِکْرٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ الایۃ' یعنی کیا میری بات ماننے میں یہ چیز تمہیں مانع ہو رہی ہے کہ اللہ نے تمہیں میں سے ایک شخص پر تمہارے لیے یاد دہانی اتاری تاکہ وہ سامنے کے خطرے سے تمہیں آگاہ کر دے، تاکہ تم اللہ سے ڈرو اور اس کی رحمت کے سزاوار ہو۔ یہاں سوال اٹھا کر بات چھوڑ دی ہے، جواب نہیں دیا ہے، اس لیے کہ انداز کلام اظہار حسرت و افسوس کا ہے۔ اس اسلوب بیان میں یہ بات مضمر ہے کہ اگر تم سوچتے، غرور و انانیت کو راہ نہ دیتے، تو یہ چیز تمہارے لیے تعجب اور استکبار کے بجائے ممنونیت اور شکرگزاری کا باعث ہوتی کہ خدا نے تمہارے ہی اندر سے ایک شخص کو تمہیں نجات کی راہ دکھانے کے لیے اٹھایا۔ میں تمہارے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں، میرا ماضی و حاضر اور میرا اخلاق و کردار سب تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میری زبان تمہاری زبان اور میرا دل تمہاری اپنی فطرت کا ترجمان ہے تو کیا یہ بہتر ہوتا کہ تم پر اتمام حجت کے لیے آسمان سے کوئی فرشتہ اترتا یا یہ بہتر ہے کہ تمہاری اپنی ہی زبان اور تمہارا اپنا ہی درد آشنا دل تم پر گواہی دے؟ اسلوب کلام میں یہ ساری داستان مضمر ہے اور یہ اضمار ہی اس محل میں تقاضائے بلاغت ہے۔ آخر ان لوگوں کو غم دل سنانے سے کیا حاصل جو سننے سے پہلے ہی اعتراض و نکتہ چینی کے لیے پر تولے ہوئے ہوں۔

'لِیُنْذِرَکُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ' سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کے انذار کا اصل مقصد لوگوں کے اندر خشیت و تقویٰ پیدا کرنا ہوتا ہے اور یہی خشیت و تقویٰ ہے جو دنیا اور آخرت میں لوگوں کو رحمت الٰہی

کا سزاوار بناتی ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ نشانی عذاب اور فرشتوں کے مشاہدے کے منتظر ہوتے ہیں وہ درحقیقت اپنے لیے عذاب الٰہی کو دعوت دیتے ہیں۔

'فَكَذَّبُوهُ فَأَنجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ الآیۃ' یعنی بالآخر وہ بات ہو کے رہی جس سے حضرت نوحؑ نے ڈرایا تھا۔ جب قوم نے تکذیب کر دی اور حضرت نوحؑ کی طویل جد و جہد کے بعد بھی اپنے رویے کی اصلاح پر آمادہ نہ ہوئی تو ان لوگوں کے سوا جنھوں نے حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں پناہ لی سب کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔ اس طوفان کی نوعیت پر ہم اس مقام میں بحث کریں گے جہاں قرآن نے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ یہاں صرف یہ بات یاد رکھیے کہ غرق صرف وہ لوگ کیے گئے جو پیغمبر اور آیات الٰہی کی تکذیب پر اڑے رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ پیغمبر کی تکذیب کے نتیجے میں جو عذاب آتا ہے وہ انھی لوگوں پر آتا ہے جن پر پیغمبر اپنی حجت پوری کر دیتا ہے۔ حضرت نوحؑ کی قوم دجلہ و فرات کے دوآبہ میں آباد تھی۔ اس علاقہ کے سوا اس زمانے میں کہیں اور انسانی آبادی تھی یا نہیں؟ یہ سوال تاریخ کے ایک ایسے دور سے متعلق ہے جس کا تعلق حقائق سے زیادہ قیاسات اور تخمینوں سے ہے۔ ہم یہاں اس سوال پر کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ یہ بات سنتِ الٰہی کی اٹل حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ عذاب صرف انھی لوگوں پر آیا جنھوں نے حضرت نوحؑ کی تکذیب کی۔

عذاب اور ابتلا میں فرق

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عذاب اور ابتلا میں فرق ہوتا ہے۔ ایک تو یہ شکل ہوتی ہے کہ کسی قوم پر کوئی مصیبت، قحط، وبا، زلزلہ، طوفان وغیرہ کے قسم کی اللہ تعالیٰ اس لیے بھیجتا ہے کہ اہل غفلت اپنی غفلت کی نیند سے بیدار ہوں۔ اس قسم کے ابتلائی مصائب جب نازل ہوتے ہیں تو ان میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان کی آفت صرف مجرموں ہی تک محدود رہے بلکہ اچھے برے سب ان کی لپیٹ میں آتے ہیں۔ دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم پر اس کے اعمال کی پاداش میں، اتمام حجت کے بعد، کوئی فیصلہ کن عذاب بھیجتا ہے۔ اس صورت میں عذاب کی زد سے وہ لوگ بچا لیے جاتے ہیں جو اصلاح کرنے والے یا اصلاح کرنے والوں کے پیرو ہوتے ہیں۔

عقل اور دل کے اندھوں کے ساتھ خدا کا معاملہ

'إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ' 'عمین' 'عمون' 'عمی' کی جمع ہے۔ یہ لفظ آنکھ کے اندھوں کے لیے بھی آتا ہے اور عقل و دل کے اندھوں کے لیے بھی۔ یہاں یہ عقل و دل کے اندھوں کے لیے آیا ہے۔ یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا بیڑا غرق کر دیا؟ فرمایا کہ اس وجہ سے کہ یہ عقل و دل کے اندھے تھے۔ اللہ کا رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ اس ذریعہ کے بروئے کار آ جانے کے بعد قانونِ الٰہی میں کوئی اور چیز ایسی باقی نہیں رہ جاتی جس کا اتمام حجت کے لیے بروئے کار آنا ضروری ہو۔ اس وجہ سے رسول کے انذار کے بعد بھی جو لوگ آنکھیں نہیں کھولتے وہ دنیا میں اپنے وجود کی خود نفی کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو قدرت کیوں باقی رکھے جن کے دل کی آنکھیں چپاٹ ہو چکی ہیں۔

قوم عاد کی سرگزشت اور حضرت ہودؑ کی دعوت

'وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا ..... اَفَلَا تَتَّقُوْنَ' - عاد عرب کی قدیم اقوام میں سے ہیں۔ ان کا تعلق سامی نسل سے ہے۔ ان کا مسکن جنوبی عرب میں احقاف کا علاقہ تھا۔ قرآن کے الفاظ 'جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ' سے مترشح ہوتا ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد اس قوم کے پیشرووں میں سے کچھ لوگوں نے جنوبی عرب کی طرف ہجرت کی اور وہاں رفتہ رفتہ بڑی قوت و شوکت حاصل کر لی۔ عرب کے لٹریچر میں یہ اپنی قدامت کے لیے بھی ضرب المثل ہیں اور اپنے دبدبہ اور صولت کے لیے بھی۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے حضرت ہودؑ کو مبعوث فرمایا۔ 'اَخَاھُمْ' کے لفظ سے اللہ تعالیٰ نے اس احسان کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کی طرف دوسرے مقامات میں 'رَسُوْلًا مِّنْھُمْ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ 'رسول' کا اپنی قوم کے اندر سے ہونا اتمامِ حجت کے نقطۂ نظر سے اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان ہے۔ اس کی طرف ہم نے اوپر بھی اشارہ کیا ہے اور سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بھی اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اگرچہ ہر احسان کی طرح قوموں نے اس احسان کی بھی ہمیشہ ناقدری ہی کی ہے۔

'اَفَلَا تَتَّقُوْنَ' یعنی کیا تم خدا کے غضب اور اس کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔ بالکل اسی محل میں حضرت نوحؑ نے 'اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ' فرمایا ہے۔

'قَالَ الْمَلَاُ ..... اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیْ سَفَاھَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ' یعنی یہ جو تم ہم کو قہر و عذاب سے ڈراتے ہو یہ محض تمہاری خرد باختگی ہے۔ ہماری یہ ترقیاں ہمارے مستحقِ عذاب ہونے کی علامت ہیں، یا منظورِ نظر اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی۔ 'وَاِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ' یعنی یہ جو تم دعویٰ کر رہے ہو کہ خدا کے فرستادہ ہو اور ہمارے پاس تم کو خدا نے پیغامبر بنا کر بھیجا ہے، یہ محض تمہاری ڈھونس ہے اور ہم تم کو بالکل جھوٹا آدمی سمجھتے ہیں۔

'اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ' ناصح کے ساتھ 'امین' کی صفت یہاں اسی طرح آئی ہے جس طرح سورۂ شعرا میں ہے۔ 'اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ' ۱۴۳۔ شعرا۔ امانت، خیانت کا ضد ہے۔ رسول کی ایک بڑی نمایاں صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ امین ہوتا ہے۔ یعنی جو پیغام اس کے حوالہ کیا جاتا ہے وہ پوری امانت داری کے ساتھ اس کو پہنچاتا ہے۔ اس میں سرِمو کمی بیشی نہیں کرتا۔

'وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ' قومِ نوحؑ کے بعد عاد کو خلافت دیے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کو بعینہٖ اسی علاقے میں اقتدار حاصل ہوا جس میں قومِ نوحؑ کو حاصل ہوا۔ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ قومِ نوحؑ بالکل شمال میں تھی اور عاد کا علاقہ عرب کا جنوبی علاقہ تھا۔ اس خلافت کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس طرح قومِ نوحؑ کو اقتدار و تمکن حاصل ہوا اسی طرح ان کے بعد تم کو حاصل ہوا۔ اس یاددہانی میں حضرت ہودؑ نے قوم کو اللہ تعالیٰ کا احسان بھی یاد دلایا ہے اور ان کو تنبیہ بھی فرمائی ہے۔ احسان تو واضح ہے کہ جو تمکن و اقتدار قومِ نوحؑ کو حاصل تھا وہ ان کو حاصل ہوا اور تنبیہ یہ ہے کہ جب تم قومِ نوحؑ کے اقتدار کے وارث

ٹھہرائے گئے ہو تو ان کی سرگزشت اور ان کے انجام کو بھی یاد رکھو۔ اگر تم نے انہی کی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جس انجام سے وہ دوچار ہوئے تم اس انجام سے بچ جاؤ۔ خدا کا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔

'وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً'۔ 'خلق' کے معنی یہاں ساخت کے ہیں مثلاً وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۱۱۹۔ نساء (میں ان کو سجھاؤں گا پس وہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کو مسخ کریں گے)۔ 'ساخت' سے مراد ظاہر ہے کہ باطنی اور ظاہری دونوں ہی ساخت ہے اس لیے کہ شیطان کے ایما سے مشرکوں نے اپنی فطرت کو بھی مسخ کیا اور اپنے بتوں کی خوشنودی کے لیے، جیسا کہ قرآن مجید میں اشارہ ہے، چوپایوں کے کان بھی کاٹے۔ 'بَسْطَةً' اور 'بَصْطَةً' دونوں ایک ہی لفظ ہے۔ اس کے معنی کشادگی، وسعت اور پھیلاؤ کے ہیں۔ ظاہری اور باطنی دونوں ساختوں میں پھیلاؤ اور کشادگی زیادہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم کو خدا نے جسمانی اور عقلی دونوں اعتبار سے تفوق و برتری عطا فرمائی۔ عرب کی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد صحتِ جسمانی کے اعتبار سے بھی نمایاں تھی اور اپنے عقلی کارناموں کے اعتبار سے بھی اس کی بڑی دھاک تھی۔ بقرہ میں طالوت کے متعلق فرمایا ہے 'وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ' وہی بات یہاں 'زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً' سے تعبیر ہوئی۔

'فَاذْكُرُوْا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ'۔ 'اٰلَآءَ' جمع ہے اِلی، اِلیٰ، اَلی کی۔ اس کے معنی عام طور پر اہلِ لغت نے نعمت کے لیے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے معنی کرشمہ، شان، کارنامہ اور عجوبہ کے ہیں۔ ہمارے استاد مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'مفردات القرآن' میں اس لفظ کی تحقیق بیان کی ہے۔ انھوں نے مشہور شعرائے جاہلیت کے دس شعر نقل کیے ہیں جن سے وہی معانی نکلتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔

حضرت ہودؑ کی یہ بات بھی اپنے اندر امتنان اور تنبیہ دونوں ہی کے پہلو رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے تمہیں جن جسمانی و عقلی قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے ان کی قدر کرو، ان کا شکر ادا کرو، ان کے سبب سے فتنے میں نہ پڑو۔ خدا کی شانوں، عظمتوں اور قدرتوں کو یاد رکھو۔ یہی راستہ فلاح کا راستہ ہے۔ اگر تم نے اکڑ دکھائی تو یاد رکھو، خدا کی پکڑ بھی بڑی ہی سخت ہے۔

'قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا'۔ اس فقرے میں قوم کا غصہ اور طنز دونوں مضمر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم رسالت کے مدعی ہو کر اس لیے تشریف لائے ہو کہ ہم تمہاری دھونس میں آ کر ان معبودوں کو چھوڑ بیٹھیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے آئے؟ اس میں اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ تم سے توقع تو اس بات کی تھی کہ دینِ آبائی اور قوم کی عزت بڑھاؤ گے لیکن تم سب کے دشمن بن کر اٹھے۔

'فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ' تو سن رکھو کہ تمہاری عذاب کی ان دھمکیوں سے ڈر کر ہم اپنے بزرگوں کے دین سے دستبردار ہونے والے نہیں ہیں۔ اگر اس جرم میں ہم پر عذاب آنے والا ہے تو وہ

عذاب لاؤ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

'قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ'۔ 'قَدْ وَقَعَ' اسی طرح کا اسلوب بیان ہے جیسے 'اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ' ہے یعنی اب یہ چیز لازم ہو گئی، واجب ہو گئی، تم اس کے مستحق ہو گئے، بس صرف انتظار باقی رہ گیا ہے۔ 'رِجْسٌ' کے معنی گندگی اور ناپاکی کے ہیں اور اس سے مراد یہاں کفر و شرک اور اعمال و عقائد کی گندگی و ناپاکی ہے۔ 'رِجْسٌ' اور 'غَضَبٌ' میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اب اس میں دیر نہیں ہے، اس کو آیا ہی سمجھو، اس لیے کہ جس ناپاکی و گندگی سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے اس کی بہت بڑی کھیپ تم نے اپنے اوپر لاد لی ہے۔ 'رِجْس' کا اتنا بڑا انبار جمع کر لینے کے بعد اب خدا کے صاعقۂ عذاب کو دور نہ سمجھو۔

'اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ' یہ قوم کی اس بات کا جواب ہے کہ بھلا ہم اپنے ان معبودوں کو کس طرح چھوڑ سکتے ہیں جن کو ہم باپ دادا کے زمانے سے پوجتے آئے ہیں؟ فرمایا کہ تمھاری یہ حجت بالکل بے بنیاد ہے۔ تم جن چیزوں کو پوجتے ہو ان کے نام تو بے شک تم نے کچھ رکھ چھوڑے ہیں لیکن ان ناموں کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں ہے۔ ان کے شریک خدا ہونے کی کوئی دلیل نہ عقل و فطرت کے اندر موجود ہے نہ خدا نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے کہیں یہ خبر دی ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا۔ پھر وہ کیا چیز ہے جس کی بنا پر تم ان کو معبود بنائے بیٹھے ہو اور ان کی حمایت میں مجھ سے لڑ رہے ہو؟ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو تم مانتے ہی ہو، وہ نزاعی چیز نہیں ہے، اس کی دلیل تمھارے پاس بھی موجود ہے، رہے تمھارے یہ اصنام خیالی تو ان کے حق میں کیا دلیل ہے جو تم پیش کر سکتے ہو۔

'فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ'۔ مطلب یہ ہے کہ اب اگر عذاب دیکھ کر ہی ماننا ہے تو عذاب کا انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ جہاں تک اس کے اسباب کا تعلق ہے وہ تو تم نے سب فراہم کر چھوڑے ہیں اس وجہ سے اس کا آنا تو امر قطعی ہے۔ لیکن عذاب لانا میرا کام نہیں ہے، خدا کا کام ہے۔ تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کر رہا ہوں۔

'فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ'۔ یہ اس سنت الٰہی کا بیان ہے جو رسول کے ذریعے سے قوم پر حجت تمام کر دینے کے بعد لازماً ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول اور اس کے ساتھیوں کو اپنے فضل خاص سے، اپنی حفاظت میں لے کر علاقۂ عذاب سے نکال دیتا ہے اور رسول کے تمام جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ یہ فیصلہ کن عذاب ہوتا ہے جو اس وقت نازل ہوتا ہے جب مخاطب قوم اپنی ہٹ اور ضد سے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ اس کے اندر صلاحیت ایمان کی کوئی رمق بھی باقی نہیں رہی ہے۔ 'وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ' سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

قوم ثمود اور حضرت صالحؑ کی سرگزشت

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ' ثمود، عاد کے بقایا میں سے ہے۔ ان کو عاد ثانی کہتے بھی ہیں۔ ان کا مسکن عرب کے شمال مغرب میں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ قوم عاد کی تباہی کے وقت جو لوگ عذاب سے محفوظ رہے ہوں، انھوں نے جنوب سے شمال مغرب کی طرف ہجرت کی ہو اور پھر حجر میں سکونت اختیار کر لی ہو۔ عاد و ثمود کے اوصاف قرآن میں بھی اور عرب کی روایات میں بھی تقریباً ایک ہی سے بیان ہوئے ہیں۔ بعض شاعر تو ان دونوں قوموں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں، گویا ان کے درمیان کوئی فرق سرے سے ہے ہی نہیں۔ دونوں کے لیڈر ــ قیل اور قدار ــ جن کے ہاتھوں ان قوموں پر تباہی آئی، عربی ادب میں ضرب المثل ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بالکل ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔

' قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ' یہ حضرت صالحؑ کی طرف سے قوم کے مطالبۂ عذاب کا جواب ہے۔ حضرت صالحؑ نے قوم کو بار بار خدا کے عذاب سے ڈرایا کہ یہ نہ سمجھو کہ آج جس عیش و آرام میں مگن ہو، جن باغوں اور چشموں میں عیش کر رہے ہو، جن کھیتوں اور فصلوں کی بہاریں لوٹ رہے ہو، جن تعمیرات اور ترقیوں میں گم ہو، یہی لیل و نہار ہمیشہ رہیں گے۔ خدا کی پکڑ سے بچو، میری بات مانو اور اپنے بے لگام اور بگٹٹ لیڈروں کی پیروی میں جو خدا کی زمین میں فساد برپا کر رہے ہیں، اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں نہ جھونکو۔ قوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ تم تو ہمیں ایک سحر زدہ اور خبطی آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ہم تمھاری یہ لن ترانیاں کس طرح مان لیں جب کہ تم ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو۔ ہم تو تمھاری بات اس وقت باور کریں گے جب تم اس عذاب کی کوئی نشانی لاؤ جس کے تم ہمیں ڈراوے سنا رہے ہو۔ ان کے اس مطالبہ کے جواب میں حضرت صالحؑ نے ایک اونٹنی نامزد کر دی کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ یہ تمھارے لیے عذاب الٰہی کی نشانی ہے، اگر تم نے اس کو کوئی گزند پہنچایا تو بس سمجھ لو کہ تم پر عذاب آ دھمکے گا۔ اس کو عذاب کے بند کی دیوار سمجھو، اگر تم نے اس دیوار کو توڑا تو تم کو قہر الٰہی کے سیلاب سے کوئی چیز نہ بچا سکے گی۔

اس اونٹنی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے سے مقصود اللہ کے لیے اس کی تخصیص کی طرف اشارہ کرنا تھا کہ یہ خدا کی نذر اور اس کے لیے نامزد ہے۔ یہ تخصیص اور نامزدگی اسی نوعیت کی تھی جس طرح کی تخصیص اور نامزدگی ہمارے ہاں ہدی اور قلائد کے جانوروں کی ہوتی ہے۔ جس طرح اسلام میں ہدی و قلائد پر حملہ کرنا ایک عظیم جرم ہے اسی طرح حضرت صالحؑ نے اس اونٹنی کے بابت فرمایا کہ اس سے کوئی تعرض نہ کرے، یہ امان کی دیوار ہے، اگر تم نے اس کو کوئی گزند پہنچایا تو میں جس عذاب سے تم کو آگاہ کر رہا ہوں وہ تم پر ٹوٹ پڑے گا۔

اونٹنی کو نامزد کرنے کی مصلحت

اس اونٹنی کو حضرت صالحؑ نے ایک احساس پیما آلہ (FEELER) کی حیثیت سے نامزد کیا تھا کہ اس تاکید و تنبیہ کے باوجود اگر انھوں نے اس کو ہلاک کر دیا تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہوگا کہ اب یہ ظالم

لوگ ان کو بھی نعوذ باللہ جھوٹا سمجھ کر قتل کرنے کی جسارت کر گزریں گے۔ سنت الٰہی کے تحت کسی قوم کی جرأت و جسارت کا یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں رسول کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے اور قوم پر عذاب آتا ہے۔

قرآن کے الفاظ سے یہ بات کہیں نہیں نکلتی کہ یہ اونٹنی اپنی خلقت کی اعجوبگی کے پہلو سے کوئی نشانی تھی بلکہ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ سے صاف واضح ہے کہ وہ گزند پہنچائے جانے کے انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے نشانی تھی۔ جہاں تک علم ہے اس اونٹنی کا کسی پہاڑ یا پہاڑی سے پیدا ہونا کسی صحیح حدیث میں بھی نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان تفسیری روایات کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے جن میں بیان ہوا ہے کہ یہ اونٹنی ایک پہاڑ سے پیدا ہوئی تھی۔ آیت کے معنی نشانی اور علامت کے ہیں۔ یہ اونٹنی قوم کے مطالبۂ عذاب کے جواب میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ایک نشانِ عذاب کی حیثیت سے نامزد کی گئی تھی چنانچہ قرآن میں تصریح ہے کہ جب ثمود کے لیڈر نے اس کی کونچیں کاٹ دیں تو اس کے تیسرے دن عذابِ الٰہی آ دھمکا۔ یہ واقعہ قرآن میں جستہ جستہ مختلف سورتوں میں بیان ہوا ہے۔ ہم یہاں تقریبِ فہم کے لیے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ۝ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۝ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَلَا تَمَسُّوْهَا

ثمود نے بھی رسولوں کی تکذیب کی، جب کہ ان کے بھائی صالح نے کہا کہ کیا تم لوگ ڈرتے نہیں؟ میں تمہاری طرف خدا کا ایک رسول ہوں امانت دار تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور میں اس پر تم سے کسی صلے کا طالب نہیں ہوں۔ میرا صلہ تو بس عالم کے رب ہی کے ذمہ ہے۔ کیا تم جس عیش و تنعم میں یہاں ہو اس میں چھوڑے رکھے جاؤ گے؟ باغوں اور چشموں میں، کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے گچھے بوجھ سے ٹوٹے پڑ رہے ہیں؟ اور تم پہاڑوں میں خوش خوش گھر تراشتے رہو گے؟ تو اللہ سے ڈرو، اور میری بات مانو، اور ان بے قیدوں اور مطلق العنانوں کے کہے میں نہ آؤ جو ملک میں فساد مچاتے ہیں اور کوئی اصلاح کرنے پر آمادہ نہیں۔ انھوں نے جواب دیا تم پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے، تم تو ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو تو اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی دکھاؤ۔ اس نے کہا یہ اونٹنی ہے ایک دن پانی کی باری اس کی اور ایک روز مقررہ کی باری

بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابُ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِیْنَ ○ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○

(۱۴۱-۱۵۸ شعراء)

تمھاری اعلاس کو کوئی گزند نہ پہنچانا ورنہ ایک ہولناک دن کا عذاب تم کو آ پکڑے گا۔ تو انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں، پھر انھیں پچھتانا پڑا۔ ان کو عذاب نے آ پکڑا۔ بے شک اس کے اندر نشانی ہے اور ان کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں تھی۔

مطالبۂ عذاب کے جواب میں عذاب کے بجائے ایک نشانِ عذاب کی نامزدگی اللہ تعالیٰ کی رحمت و رافت کی دلیل تھی۔ وہ تھہرا دھیما اور رحمت میں جلدی کرنے والا ہے اس وجہ سے اس نے یہ پسند فرمایا کہ لوگوں کو مزید مہلت دے کہ اب بھی وہ متنبہ ہونا چاہیں تو متنبہ ہو جائیں لیکن انھوں نے متنبہ ہونے کے بجائے جسارت کا آخری قدم اٹھا دیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اس کے بعد اگرچہ کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی تاہم قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ خطرے کی حدود لانگ جانے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو تین دن کی مہلت دی کہ اب بھی اگر وہ توبہ کرنا چاہیں تو کر لیں۔

اونٹنی سے متعلق حضرت صالحؑ نے یہ ہدایت جو فرمائی کہ یہ پورے علاقے میں چھوٹی پھرے، کوئی اس سے تعرض نہ کرے اور چشمے پر اس کے پانی پینے کا دن بالکل الگ ہو، اس دن دوسرے لوگ اپنے جانوروں کو گھاٹ پر نہ لے جائیں، یہ ہدایت قوم کی آزمائش کے لیے تھی کہ ان کے اندر جو کھوٹ اور عناد ہے ابھر کر سامنے آ جائے۔ کوئی چیز ڈھکی چھپی نہ رہ جائے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ - اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یہ لوگ عاد کے بقایا میں سے تھے اور ان کا علاقہ عرب کے شمال مغرب میں حجر کا علاقہ تھا۔ ان لوگوں کو وہاں بڑا عروج و اقتدار حاصل ہوا۔ ان کی بہت سی تعمیری یادگاریں آج بھی موجود ہیں۔ قریش کے قافلے اپنے شام کے سفر میں ان کی بستیوں پر سے گزرتے تھے اس وجہ سے ان کی سرگزشت ان کے لیے شنیدہ بھی تھی اور دیدہ بھی۔ حضرت صالحؑ نے ان کو جو عاد کی خلافت یاد دلائی اس کا مقصد، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ان کو متنبہ کرنا تھا کہ اپنے اقتدار کے نشہ میں خدا کے اقتدار کو نہ بھولو، اس نے جو معاملہ عاد کے ساتھ کیا، وہی تمھارے ساتھ کرے گا۔ وہ ایک ہی ترازو سے سب کے لیے تولتا ہے۔

تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا ۔ 'سَهل' اور 'جَبل'، دونوں متقابل الفاظ ہیں 'سہل' پہاڑی علاقے کے مقابل میں میدانی علاقہ کو کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے تمدنی اور تعمیری اعتبار سے اپنے زمانے میں بڑی ترقی کی۔ میدانی علاقوں میں بھی انھوں نے عالیشان محل تعمیر کیے اور پہاڑی علاقوں میں بھی پہاڑوں کو تراش تراش کر گھر بنائے۔ ان کے دور کے بعض تعمیری آثار آج بھی موجود ہیں جو فن تعمیر میں ان کے کمال کی شہادت دیتے ہیں۔ حضرت صالحؑ نے ان کے ان تمام تعمیری ولولوں پر عین ان کے دورِ عروج

میں ماتم کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عالیشان اور لق و دق عمارتیں بنانا قوم کے عروج کی نہیں بلکہ تمدن کے فساد اور قوم کے زوال کی نشانی ہے۔ یہی فلک بوس عمارتیں بالآخر اس کے عروج و کمال کے مقبرے اور مدفن بنتی ہیں اور ایک دن زاغ و زغن ان میں اپنے آشیانے بناتے ہیں۔ حضرت صالحؑ نے ان کو یاد دلایا کہ لوگو، خدا کی شانوں اور اس کی عظیم قدرتوں کو یاد کرو اور خدا کی زمین میں مفسد بن کر سر نہ اٹھاؤ۔ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ۔ 'مُسْتَضْعَف' کے معنی ہیں زیردست، دبائے ہوئے، بے اثر، مظلوم۔ انبیاء کی دعوت قبول کرنے میں ہمیشہ غریبوں اور کمزوروں ہی نے سبقت کی ہے اس لیے کہ وہ استکبار کے حجاب سے پاک ہوتے ہیں اور استکبار ہی وہ چیز ہے جو قبولِ حق میں سب سے بڑا مانع ہے۔ ابلیس کی سرگزشت میں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

'اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ'۔ اہل ایمان سے متکبرین کا یہ سوال استنکار کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم لوگ اس شخص کو خدا کا رسول سمجھ بیٹھے ہو تو بڑے ہی کم عقل اور بدھو ہو۔ اہل ایمان کا جواب کہ "ہم تو اس پیغام پر ایمان رکھتے ہیں جو وہ دے کر بھیجے گئے ہیں" سوال کے اصل جواب سے ایک قدم آگے ہے۔ انھوں نے حضرت صالحؑ کی صرف رسالت کے اقرار ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی اصل دعوت کی صحت و صداقت پر اپنے کامل ایمان اور اس ایمان پر اپنے پختہ عزم و جزم کا اظہار بھی کیا۔ ظاہر ہے کہ متکبرین کو اصل چڑ حضرت صالحؑ سے نہیں بلکہ ان کی دعوت اور ان کے پیغام ہی سے تھی۔ چنانچہ اہل ایمان نے کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر ان کے اندر کے چھپے ہوئے اس خناس ہی پر ضرب لگائی اور یہ گویا اینٹ کے جواب میں پتھر تھا جس نے ثابت کر دیا کہ اب تک جو لوگ دبے ہوئے یا دبائے ہوئے تھے اب وہ اس حق کے معاملے میں کسی سے دبنے والے نہیں۔

اس سے یہ بات بھی نکلی کہ رسولوں پر ایمان لانے والے اگرچہ ابتداءً غریب اور کمزور لوگ ہی ہوتے ہیں لیکن جو چیز ان کو اپیل کرتی ہے وہ نبی کی دعوت کی قوت و حجت ہوتی ہے نہ کہ معجزے اور کرشمے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنی بڑائی اور ذہانت و فطانت کے مدعی ہوتے ہیں وہ آخر تک نشانیوں اور معجزوں ہی کے چکر میں پھنسے رہ جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب اللہ کا عذاب ان کی کمر توڑ دیتا ہے۔

'قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا الاٰية' یہ متکبرین کی طرف سے آخری جھنجھلاہٹ کا اظہار ہے کہ تم نے صالح کو مان لیا ہے تو مانو ہم تو اس شخص کو ہرگز ماننے والے نہیں ہیں، ہم اس کا صاف انکار کرتے ہیں۔

'فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ'

'عَقَرَ' کے معنی اونٹ یا اونٹنی کی کونچیں کاٹ دینے کے ہیں۔ 'عتو' کا صلہ جب 'عن' کے ساتھ آئے تو یہ سرکشی

اور نافرمانی دونوں کے مفہوم پر متضمن ہوتا ہے۔ یہ قوم کے متمردین کی طرف سے تمرد کا آخری قدم تھا۔ انھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور حضرت صالحؑ کو چیلنج کیا کہ لو ہم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، تم نے دھمکی دی تھی کہ ہم نے اس کو گزند پہنچایا تو ہم پر عذاب آجائے گا تو اگر تم خدا کے فرستادہ ہو تو عذاب لاؤ۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ یہ قوم کی طرف سے حضرت صالحؑ کی تکذیب کا گویا آخری اور حتمی عملی اعلان تھا۔ اس کے بعد اگر ان کو مزید مہلت ملتی تو اب ان کا حملہ حضرت صالحؑ ہی پر ہوتا اس وجہ سے تیسرے دن ان پر عذاب آگیا۔ اونٹنی کو ہلاک کرنے کا جرم اگرچہ، جیسا کہ سورۂ شمس میں تصریح ہے، ثمود کے سرکش لیڈر نے کیا تھا لیکن تمام متمردین اس کے اس فعل پر راضی رہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوب سب ہی کی طرف کیا۔

قوم ثمود کے عذاب کی نوعیت

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ۔ 'رَجْفَةٌ' کے معنی شدت کی حرکت، کپکپی، اور تھرتھراہٹ کے ہیں۔ یہ اس عذاب کی تعبیر ہے جو قوم ثمود پر آیا۔ قرآن نے اس عذاب کو دوسری جگہ 'صَيْحَةٌ' سے بھی تعبیر کیا ہے جس کے معنی ڈانٹ کے ہیں، بعض جگہ 'صَاعِقَةٌ' سے بھی تعبیر کیا ہے (مثل صاعقۃ عاد وثمود) جس کے معنی کڑکے کے ہیں، سورۂ حاقہ میں 'طَاغِيَةٌ' سے تعبیر کیا ہے (فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ) جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی کے ہیں۔ مولانا فراہیؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں عاد وثمود دونوں قوموں کے عذاب کی نوعیت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ آخر میں خلاصۂ بحث ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔

> "اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے سرمائی بادلوں، تند ہوا اور ہولناک کڑک کا عذاب بھیجا۔ چونکہ اصل تباہی زیادہ تر ہوا کے تصرفات سے واقع ہوئی اس وجہ سے اگر آثار سے موثر پر استدلال کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ثمود پر اللہ تعالیٰ نے سرما کے دھاریوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ہولناک کڑک اور بہری کر دینے چیخ بھی چھپی ہوئی تھی جس طرح کہ قوم عاد پر رعد و برق والے بادل بھیجے۔"

بہرحال 'رَجْفَة' کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ زلزلہ کا عذاب تھا۔ 'رجفہ' مجرد عذاب کی تعبیر ہے۔ معلوم ہوتا ہے شمال کی باد تند، جس کو صرصر کہتے ہیں، چلی اور وہ اتنی سخت و شدید ہوگئی کہ اس نے ہر چیز کو ہلا کر رکھ دیا۔ کڑکے کی شدت ایسی بے پناہ ہوئی کہ لوگ اوندھے منہ زمین پر پڑے رہے اور اسی حال میں ہلاک ہوگئے۔

'دَار' کا لفظ یہاں 'دِيَار' کے معنی ہی میں ہے۔ چنانچہ سورۂ ہود آیت ۶۵ میں لفظ 'دار' استعمال ہوا، پھر انہی ثمود کے ذکر میں آیت ۶۷ میں 'دیار' استعمال ہوا۔ یہ قرآن نے گویا خود لفظ کی تفسیر کر دی۔

'فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ'۔

یہ قوم سے حضرت صالحؑ کا آخری خطاب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انھوں نے عذاب آنے سے پہلے اس وقت فرمایا ہے جب قوم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ کر عذاب کے بند کو گویا توڑ دیا ہے۔ یہی وداعی فقرہ کہہ کر

انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت فرمائی ہوگی۔ اس لیے کہ رسولوں کے باب میں سنت الٰہی یہ ہے کہ عذاب آنے سے پہلے، اللہ کے حکم سے، وہ علاقۂ عذاب سے ہجرت کرجاتے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ تصریح ہے کہ اونٹنی کے قتل کے بعد صرف تین دن کی قوم کو مہلت ملی۔ اس تین دن کی مہلت میں جہاں بعض دوسری مصلحتیں تھیں وہاں یہ مصلحت بھی ہوگی کہ اس اثنا میں حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھی علاقہ سے اتنے دور نکل جائیں کہ عذاب کا کوئی جھونکا ان کو نہ چھو سکے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترتیب بیان میں اس بات کو عذاب کے ذکر کے بعد کیوں کردیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ترتیب میں یہ تقدیم و تاخیر تقاضائے بلاغت سے ہوئی ہے۔ ارتکاب جرم اور اس کے نتیجہ کے فوری ظہور کو نمایاں کرنے کے لیے یہاں عذاب کو قتلِ ناقہ کے ساتھ متصل کردیا اور حضرت صالحؑ کی ہجرت کے ذکر کو پیچھے کردیا۔ گویا جوں ہی انھوں نے ناقہ کو گزند پہنچا کر خدا کو چیلنج کیا عذاب آدھمکا۔ عذاب کی یہ سبقت و مبادرت اچھی طرح ظاہر نہ ہوسکتی اگر اس بیچ میں کوئی اور بات ذکر میں آجاتی۔ قرآن میں اس اسلوب مبادرت کی مثالیں بہت ہیں۔ آگے قوم شعیبؑ کی سرگزشت میں بھی اس کی مثال ہے۔ سورۂ ہود میں، حضرت نوحؑ کی سرگزشت کے سلسلہ میں آیات ۴۲-۴۵ ملاحظہ ہوں، نہایت واضح اور بلیغ مثال اس اسلوب کی موجود ہے۔

'یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ الایۃ' سے ایک حقیقت یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ ان انبیاء کے خطاب میں 'یاقوم' 'یاقوم' کا لفظ جو بار بار آتا ہے یہ محض دلداری اور استمالت کی نوع کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ جس طرح ہر شخص پر اس کے اپنے وجود، اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندان کا ایک حق ہوتا ہے اسی طرح اپنی قوم اور اپنے وطن کا بھی اس پر ایک حق ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ پورے اخلاص، پوری دل سوزی اور پوری جاں بازی کے ساتھ اس کی خیر خواہی کرے۔ اس کے بغیر کوئی شخص اپنی قوم کے حق سے سبکدوش نہیں ہوتا۔ جو شخص یہ حق ادا کر چکتا ہے وہ اللہ کے نزدیک سرخ رو ہے، اس سے اس باب میں کوئی پرسش نہیں ہوگی کہ قوم تباہی کی راہ پر کیوں گئی، ہدایت کی راہ پر کیوں نہ چلی؛ لیکن جنھوں نے یہ حق ادا نہیں کیا ہے وہ اس حق کے باب میں عند اللہ لازماً مسئول ہوں گے۔

'وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ' محض اظہارِ حسرت کا کلمہ نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے۔ قوم کے قومی مزاج کے بگاڑ کا ایک درجہ و مرحلہ وہ بھی ہوتا ہے جب تمام پیمانے اس طرح تلپٹ اور تمام اقدار اس درجہ متغیر ہوجاتے ہیں کہ خیر خواہی کا کلمہ کہنا جان جوکھوں کا کام بن جاتا ہے۔ جو لوگ عذاب الٰہی کے بند کو توڑتے ہیں وہ قوم کے لیڈر اور ہیرو بن جاتے ہیں اور جو اس عذاب سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں وہ بدخواہ، غدار اور قوم کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ قومی فساد مزاج کی یہی وہ حد ہے جہاں پہنچ کر لازماً قوم تباہی سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ جب کسی مریض کا یہ حال ہوجائے کہ اسے معالجوں اور طبیبوں سے دشمنی ہوجائے اور صرف انہی کے مشورے اسے پسند آئیں جو اس کے مرض میں اضافہ کے خواہشمند ہوں تو موت کے سوا

اب اس کے لیے اور کیا چیز باقی رہ گئی ہے۔

قوم لوط اور حضرت لوطؑ کی سرگزشت

'وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ' حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے ہیں۔ یہ جس قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے وہ شام کے جنوبی علاقہ میں دریائے اردن کے اردگرد آباد تھی۔ ان کے ذکر میں اسلوب بیان اس سے ذرا مختلف ہے جو حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کے ذکر میں ہے۔ ان دونوں حضرات کو 'اَخَاهُمْ هُوْدًا' اور 'اَخَاهُمْ صٰلِحًا' کے الفاظ سے ان کی قوموں کی طرف منسوب فرمایا لیکن حضرت لوطؑ کی قوم کو ان کی قوم تو کہا لیکن ان کو ان کے بھائی کی حیثیت سے ان کی طرف منسوب نہیں فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کے اعتبار سے تو یہ لوگ ان کی قوم تھے لیکن باعتبار نسب اور قبیلہ حضرت لوطؑ ان سے الگ تھے۔ قرآن نے اس معمولی فرق کو بھی اپنے اسلوب بیان سے واضح فرما دیا۔ رسولوں کے باب میں عام سنت الٰہی یہ ہے کہ وہ اسی قوم کے اندر سے ہوتے ہیں جس کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ قوم ان کے ماضی و حاضر، ان کے اخلاق و کردار اور ان کی زبان سے اچھی طرح آشنا ہو تاکہ اجنبیت و غیریت موجب وحشت نہ بنے۔ یہ چیز جس طرح نسبی تعلق سے حاصل ہو سکتی ہے اسی طرح کسی قوم کے اندر طویل قیام سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ حضرت لوطؑ چونکہ اسی قوم کے اندر رہ بس گئے تھے بلکہ قرینہ شاہد ہے کہ انھوں نے انہی کے اندر شادی بھی کر لی تھی اس وجہ سے وہ قوم کے لیے بمنزلہ ایک فرد قوم کے تھے۔ ان کی تربیت، جیسا کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے فرمائی تھی۔ ان کی ان خوبیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ یہ بعینہٖ وہی صورت حال ہے جو حضرت موسیٰؑ کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں۔ باوجودیکہ حضرت موسیٰؑ قوم فرعون کے اندر سے نہیں تھے لیکن ایک طویل مدت تک ان کے اندر رہے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو قوم فرعون کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

'اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ' - 'اَلْفَاحِشَةَ' کھلی ہوئی بدکاری و بے حیائی کو کہتے ہیں اور استفہام یہاں اظہار نفرت و کراہت کے مفہوم میں ہے۔ اس 'فَاحِشَةَ' کا یہاں نام نہیں لیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ بے حیائی وقت کی سوسائٹی میں اس درجہ عام تھی کہ نام لیے بغیر بھی ہر شخص سمجھتا تھا کہ اس سے مراد کیا ہے۔

'مَا سَبَقَكُمْ بِهَا' 'فَاحِشَةَ' کی صفت نہیں ہے۔ اگر یہ صفت ہوتا تو معروف قاعدہ زبان کے مطابق 'فَاحِشَةَ' کو نکرہ ہونا تھا۔ میرے نزدیک یہ الگ جملہ ہے۔ حضرت لوطؑ نے یہاں درحقیقت دو مختلف پہلوؤں سے اس برائی پر اظہار نفرت فرمایا ہے۔ پہلے تو فرمایا کہ ایسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو، جس کا بے حیائی ہونا ہر عقل سلیم پر واضح ہے! پھر فرمایا کہ یہ حرکت شنیع تو تم سے پہلے کسی قوم نے نہیں کی۔

'مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ' سے یہ بات لازم نہیں آتی ہے کہ قوم لوطؑ سے پہلے یہ حرکت شنیع کسی ایک فرد سے بھی صادر نہ ہوئی ہو۔ ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ لفظ 'اَحَدٌ' جمع کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ مثلاً

نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ، یا کُنْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ۔ اس وجہ سے اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم سے پہلے کوئی شامت زدہ سوسائٹی ایسی نہیں گزری جس نے اس غلاظت کو تمھاری طرح اوڑھنا بچھونا بنایا ہو۔

عمل قوم لوط کی سنگینی

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اوپر جن رسولوں کی دعوت کا ذکر ہوا ہے ان میں سے ہر ایک کی دعوت کا آغاز توحید سے ہوا ہے لیکن حضرت لوطؑ نے توحید کی دعوت سے آغاز کرنے کے بجائے سب سے پہلے قوم کی اس بے حیائی کو موضوع بحث بنایا۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت لوطؑ کی قوم کے اندر شرک کی برائی موجود نہیں تھی؟ اگر موجود تھی تو حضرت لوطؑ نے اس کو کیوں نظر انداز فرمایا؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ برائی اور برائی میں فرق ہوتا ہے۔ ایک برائی تو وہ ہوتی ہے، جو خواہ کتنی ہی سنگین ہو، لیکن وہ انسانی عوارض میں سے ہے اور انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے یا پائی جا سکتی ہے، دوسری برائی وہ ہے جس کا گھنونا پن اس قدر واضح ہے کہ کسی انسان کے اندر عادت کی حیثیت سے اور کسی سوسائٹی کے اندر فیشن کی حیثیت سے اس کا پایا جانا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اس انسان یا اس سوسائٹی کی فطرت بالکل مسخ ہو گئی ہو۔ جہاں اس طرح کے لوگوں سے سابقہ ہو وہاں اصل قابل توجہ چیز دہی برائی ہوتی ہے، دوسری باتیں خواہ کتنی ہی اہمیت رکھنے والی ہوں، سب ثانوی درجے میں آجاتی ہیں۔ آپ ایک شخص کے پاس اس کی اصلاح کی غرض سے جائیں اور دیکھیں کہ وہ کھڑا ہوا غلیظ کھا رہا ہے تو آپ اس کو ایمان و اسلام کی تلقین کریں گے یا سب سے پہلے اس کی یہ عبرت انگیز حالت آپ کو متوجہ کرے گی؟ حضرت لوطؑ کو اسی صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ ان کی قوم کے اندر شرک و کفر کی برائی بھی موجود تھی، اور دوسری تمام برائیاں بھی، جو شرک و کفر کے لوازم میں سے ہیں، موجود تھیں لیکن جن کی فطرت اتنی اوندھی ہو گئی ہو کہ مرد مردوں ہی کو شہوت رانی کا محل بنائے ہوئے ہوں ان کو تو سب سے پہلے اس غلاظت کی دلدل سے نکالنے کی ضرورت تھی، ان سے کوئی دوسری بات کرنے کا مرحلہ تو بہر حال اس کے بعد ہی آسکتا تھا۔

اس سے اندازہ کیجیے کہ قرآن کی نگاہ میں عمل قوم لوط کی سنگینی کا کیا حال ہے اور پھر ذرا یاد کیجیے اس واقعہ کو کہ برطانوی پارلیمنٹ نے پچھلے دنوں اپنے ایک قانون کے ذریعہ سے اپنی قوم کے لیے اس ملعون فعل کو بالکل مباح کر دیا ہے۔ اللہ کے حلم کی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ مہلت دیتا ہے تو بڑی طویل مہلت دیتا ہے لیکن برطانوی پارلیمنٹ نے یہ قانون پاس کر کے خدا کے عذاب کے لیے اپنے دروازے چوپٹ کھول دیے ہیں۔ اب دیکھیے یہ مدت مہلت کتنی دراز ہوتی ہے۔

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔ یہ اظہارِ نفرت کا تیسرا پہلو ہے۔ یعنی تم نے تو فطرت کو بالکل ہی الٹ کر رکھ دیا ہے۔ جملہ میں جو تاکید ہے وہ نفرت اور تعجب کی شدت کو ظاہر کر رہی ہے۔ 'رِجَال' کا لفظ بھی یہاں معنی خیز ہے اس لیے کہ 'رِجَال' پختہ سن و سال

کے مردوں کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے ایک تو اس فعل کے گھنونے پن کا اظہار ہو رہا ہے۔ دوسرا اس سے اس دیوثیت کا اظہار ہو رہا ہے جو کسی قوم میں اس مرض خبیث کے عام ہو جانے کی صورت میں لازماً پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے عام ہو جانے کی صورت میں سن و سال کی تمیز بالکل اٹھ جاتی ہے۔ پھر ہر عمر کے دیوث قوم میں پھیل جاتے ہیں اور ان کے لیے یہ لعنت عادت اور پیشہ بن جاتی ہے۔ 'مِنْ دُوْنِ النِّسَآءِ' کے الفاظ اس قلب ماہیت کو ظاہر کر رہے ہیں جو اس فساد طبیعت کا لازمی نتیجہ ہے کہ ساری تخلیقی قوت بالکل غلط بد پر برباد ہوتی ہے۔ بنجر سیراب ہوتے ہیں، کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں جس کا انجام حرث و نسل کی تباہی اور آخرت کی روسیاہی ہے۔ 'بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ' فطرت سے بغاوت کی تعبیر ہے اور فطرت سے بغاوت کا انجام ظاہر ہے۔

'وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ' اسلوب بیان سے واضح ہے کہ حضرت لوطؑ کا ایک ایک فقرہ آنکھیں کھول دینے والا اور فطرت کو جھنجھوڑ دینے والا تھا لیکن جن کی مت ماری گئی ہو اور جن کی فطرت مسخ ہو چکی ہو ان پر یہ وعظ کیا کارگر ہو سکتا تھا؟ وہ یہ سب سن کر بولے تو یہ بولے کہ ان کو بستی سے نکالو، یہ بڑے پارسا بنتے ہیں! یہ کسی معاشرے کے بگاڑ کی آخری حد ہے۔ معاشرہ بگڑتے بگڑتے اس حد تک بگڑ جاتا ہے کہ ایک وقت آتا ہے جب سب اپنی ناک کٹوا بیٹھتے ہیں اور نکٹا ہونا ہی تہذیب اور فیشن کا تقاضا بن جاتا ہے۔ اس وقت چہرے پر ناک کا نہ ہونا عیب نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کا ہونا ایک اچنبھا گنا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کو، اگر ظالموں کا بس چلتا ہے تو نکو بنا کر برادری سے باہر کر دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ 'يَتَطَهَّرُوْنَ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو گندگی میں آلودہ اور حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو پاکیزہ سمجھتے تھے لیکن ان کی یہ پاکیزگی پسندیدہ ہونے کے بجائے ان کے دل پر شاق تھی کہ آخر یہ کیوں بچے پھرتے ہیں، ہم جس چہ بچہ میں ڈبکیاں لگا رہے ہیں، یہ کیوں نہیں اس میں اترتے ؟

'فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ' اوپر 'اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ' سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ کچھ لوگ تھے جو حضرت لوطؑ پر ایمان لائے تھے لیکن اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اہل و عیال کے سوا کوئی اور ان پر ایمان لانے والا نہ بنا۔ اگر کچھ لوگ ایمان لائے ہوتے تو نجات پانے والوں میں ان کا ذکر بھی ہوتا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ایک قلیل گروہ، جیسا کہ لفظ 'اُنَاسٌ' سے ظاہر ہوتا ہے ان پر ایمان تو لایا لیکن یہ لوگ سب ان کے متعلقین ہی میں سے تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کو لفظ 'اہل' ہی سے تعبیر فرمایا۔

اس 'اہل' میں سے بھی حضرت لوطؑ کی بیوی خارج ہو گئی۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ اس کی طبیعت کا فساد ہوا۔ اس فساد طبیعت کو اس بات سے بھی تقویت ملی ہوگی کہ اس کا تعلق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا،

اسی ناہنجار قوم سے تھا۔ خاندان اور قوم کی عصبیت اکثر حق کی راہ میں رکاوٹ بنی ہے۔ اس زنجیر کو توڑنے میں صرف وہی لوگ کامیاب ہوئے ہیں جن کے اندر خدا کی لگن اتنی شدید ہوئی کہ وہ ہر مخالف جذبہ پر غالب آگئی۔ قرآن نے اس سورت کا ذکر خاص طور پر اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے فرمایا کہ نجات کی راہ صرف ان کے لیے کھلتی ہے جو خود اس کے طالب ہوں اور دوسری چاہتوں کو جو اس میں روک بنیں قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر یہ عشقِ حق اور اس کے لیے قربانی کا یہ جذبہ کسی میں نہ ہو تو ایک پیغمبر کی بیوی، ایک پیغمبر کا بیٹا، ایک پیغمبر کا باپ یا چچا ہونا بھی آدمی کے لیے ذرا نافع نہیں ہوتا۔ حضرت لوطؑ کی بیوی، حضرت نوحؑ کے بیٹے، حضرت ابراہیمؑ کے باپ اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا انجام اس حقیقت کی ناقابلِ تردید شہادت ہے۔

قوم لوط کا عذاب

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا الآیۃ' یہاں بارش سے مراد پانی کی بارش نہیں ہے بلکہ کنکروں اور پتھروں ... آیا تھا جو صحراؤں سے اٹھتی ہے اور قافلے کے قافلے اور بستیوں کی بستیاں ... اٹھائی ہوئی ریت اور جس کے برسائے ہوئے کنکروں اور پتھروں کے نیچے دب کر ... جاتی ہیں۔ عربی میں اس کو 'حاصب' یعنی کنکر پتھر برسانے والی آندھی کہتے ہیں۔ مولانا فراہیؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں اس عذاب کی نوعیت یہ بیان فرمائی ہے۔

"قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے ایک آندھی بھیجی جو سخت ہو کر بالآخر 'حاصب' (کنکر پتھر برسانے والی آندھی) بن گئی۔ اس سے اول اول تو ان کے اوپر کنکروں اور پتھروں کی بارش ہوئی، پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے۔ چنانچہ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے 'فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا' ۴۰ عنکبوت (ان میں سے بعض قوموں پر ہم نے کنکر پتھر برسانے والی آندھی بھیجی) نیز فرمایا ہے 'فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ مَّنْضُودٍ' ۸۲ ہود (پس ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر تہ بہ تہ سنگ گل کے پتھروں کی بارش کی، یعنی ایسی تند آندھی چلی کہ ان کے مکانات زمین کے برابر ہو گئے اور اوپر سے کنکر اور ریت نے ان کو ڈھانک لیا۔ جیسا کہ فرمایا ہے 'وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى' ۵۳ نجم (اور الٹی ہوئی بستیاں جن کو الٹ دیا اور پھر ان کو ڈھانک دیا جس چیز نے ڈھانک دیا)"

آگے مولاناؒ نے تورات کے ترجموں پر تنقید کر کے یہ واضح فرمایا ہے کہ ترجمہ میں غلطی کر کے کس طرح انھوں نے صورت واقعہ کچھ سے کچھ بنا دی۔ پھر خلاصۂ بحث ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں۔

"اس سے معلوم ہوا کہ قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے سنگ ریزے برسانے والی آندھی کا عذاب بھیجا جس نے ان کو اور ان کے مکانوں کو ڈھانک لیا اور اگر اس کے ساتھ تورات کا بیان بھی ملا لیا جائے تو اس پر اتنا اضافہ ہو جائے گا کہ ان پر بجلی اور کڑکے کا عذاب بھی آیا۔"

اہلِ مدین اور حضرت شعیبؑ کی سرگزشت

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قوم مدین کا مسکن بحرِ احمر کے ساحل پر کوہ طور کے جنوب و مشرق میں تھا۔ ان کے پیغمبر حضرت شعیبؑ ہوئے۔ یہ وہی حضرت شعیبؑ ہیں جنھوں نے اپنی ایک صاحب زادی کا نکاح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ کیا تھا اور حضرت موسیٰؑ نے ایک طویل عرصہ تک ان کے پاس قیام کیا اور ان کی بکریاں چرائیں۔ یہ پوری سرگزشت سورۂ قصص میں بیان ہوئی ہے اور اللہ کے پاکیزہ خصائل بندوں کی نہایت پاکیزہ اور موثر سرگزشت ہے۔

مدین کے لوگ چونکہ ایک اہم تجارتی گزرگاہ پر تھے اس وجہ سے انھوں نے تجارت میں بہت ترقی کی اور پھر ان کے اندر عقائدی خرابیوں کے ساتھ ساتھ وہ برائیاں بھی پیدا ہوگئیں جو تجارت پیشہ قوموں میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ آگے حضرت شعیبؑ کی دعوت میں ان لوگوں کی ان برائیوں کا ذکر ہے۔

قَالَ يَا قَوْمِ ... قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ یہاں جس 'بَيِّنَة' کا ذکر ہے اس کی کوئی تفصیل قرآن یا تورات میں مذکور نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد کوئی حسی معجزہ ہو جو عام سنتِ الٰہی کے مطابق، دوسرے رسولوں کی طرح ان کو بھی عطا ہوا لیکن قرآن نے اس کی طرف صرف اشارہ کر دیا، اس کی نوعیت واضح کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد خود ان کی اپنی ذات اور اپنی دعوت ہو اس لیے کہ رسول خود اپنی ذات میں ایک کامل بینہ اور کامل حجت ہوتا ہے۔ وہ ہر پہلو سے حق کو اس طرح واضح اور مبرہن کر دیتا ہے کہ ہٹ دھرم اور ضدی لوگوں کے سوا کسی کے لیے بھی اس سے اعراض کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ معجزہ نبوت کے شرائط میں سے نہیں بلکہ ضروریات اور لوازم میں سے ہے۔ کوئی قوم اگر مطالبہ کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اگر چاہتا ہے، اتمامِ حجت کے طور پر، نبی کے ذریعہ سے معجزہ بھی صادر کرا دیتا ہے۔ نبی کی اصل دعوت ان بینات پر مبنی ہوتی ہے جو عقل و فطرت کے اندر ودیعت ہیں اور اس کی زندگی ان بینات کا مظہرِ کامل ہوتی ہے۔ وہ اپنی قوم کے اندر خدا کا ایک چلتا پھرتا نور ہوتا ہے۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر کلمہ، اس کا ہر اشارہ اور اس کا ہر عمل اس کی صداقت، اس کی حکمت اور اس کے سفیرِ الٰہی ہونے کی ایسی گواہی ہوتا ہے کہ اس کی تکذیب صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے دل کی گواہی کے خلاف اس کی تکذیب کرنا چاہتے ہیں۔

معاملات میں دیانت اور راست بازی

فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا

تجارتی کاروبار اور لین دین میں چونکہ اشیا عام طور پر ناپی یا تولی جاتی ہیں اس غالب پہلو کے سبب سے ناپ تول ہی کا ذکر ہوا۔ اصل مقصود معاملات میں دیانت اور راست بازی کی تعلیم ہے۔ ناپ تول میں کمی کرنا کوئی منفرد برائی نہیں ہے بلکہ یہ کسی قوم کے اندر بہت سی برائیوں کے جمع ہو جانے کی علامت ہے۔ یہ درحقیقت عدل و قسط کے تصور کے ختم ہو جانے اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کے عقیدے کے مردہ ہو جانے کی نشانی ہے جس کا فساد لازماً زندگی کے ہر پہلو میں سرایت کرتا ہے لیکن سرطانی پھوڑے کی طرح اس کا ظہور کسی کے اندر کسی پہلو سے ہوتا ہے، دوسرے کے اندر کسی اور پہلو سے۔ مدین کے لوگ چونکہ

تجارت پیشہ تھے اس وجہ سے ان کے اندر یہ ناپ تول کی خیانت کی شکل میں ظاہر ہوا لیکن تھا یہ ان کے پورے نظامِ تمدن و معاشرت میں سرایت کیے ہوئے اس وجہ سے قرآن نے ایفائے کیل و میزان کی تاکید کے ساتھ منفی پہلو سے بھی واضح فرما دیا کہ ملک میں فساد نہ مچاؤ یعنی یہ ناپ تول کی کمی ملک کے پورے نظامِ معاشرت و معیشت کے درہم برہم کر دینے کے ہم معنی ہے۔ اگر تمھاری یہ روش نہ بدلی تو بالآخر تمدن کی عمارت کی کوئی اینٹ بھی اپنے مقام پر قائم نہ رہ سکے گی اس لیے کہ خدا نے آسمان و زمین کو ایک میزان پر قائم کیا ہے۔ اگر یہ میزان ایک پل کے لیے بھی مختل ہو جائے تو آسمان و زمین درہم برہم ہو جائیں۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ بندے اپنے دائرۂ اختیار میں بھی ملک کے نظام کو اسی وقت تک قائم رکھ سکیں گے جب تک وزن و قسط کو قائم رکھیں گے، اگر وزن و قسط کو انھوں نے درہم برہم کیا تو پھر پورے نظام کی ایک ایک چول ہل جائے گی۔ سورۂ رحمان میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے: 'وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ'۔ (وہ رحمان) اور آسمان کو بلند کیا اور اس میں ایک میزان رکھی، کہ تم بھی میزان میں حدود سے نہ ہٹو اور وزن بالکل ٹھیک ٹھیک قائم کرو اور میزان میں کمی نہ کرو)

تمدن کے فساد کا ایک سبب

'بَعْدَ إِصْلَاحِهَا' کی قید کے اندر جو زور ہے اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ یہاں اوپر کی ساری تقریر کے بعد اس کا مفہوم مزید واضح ہو گیا ہے۔ اوپر آپ نے دیکھا کہ قوموں نے اپنی سرکشی کے سبب سے بار بار نظامِ حق و عدل کو درہم برہم کیا ہے اور قدرت کے ہاتھوں نے ہر بار اس کو درست کیا ہے۔ حضرت نوحؑ کی سرگزشت سے لے کر حضرت شعیبؑ کی سرگزشت تک ہر قوم اور ہر رسول کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے۔ اہلِ مدین کو بھی جو اقتدار حاصل ہوا تھا ایک فاسد اقتدار کو مٹا کر حاصل ہوا تھا۔ یہ لوگ دین و شریعت سے ناآشنا لوگ نہ تھے بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان سے نسبت رکھنے والے اور پچھلے نبیوں کی تعلیم کے حامل ہونے کے مدعی تھے لیکن دوسری قوموں کی طرح اُنھوں نے بھی اس تعلیم کو اپنی خواہشاتِ نفس کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر حضرت شعیبؑ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ 'ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ' اگر تمھیں ایمان کا دعویٰ ہے تو اس دعوے کی صداقت کے لیے ضروری ہے کہ اس فساد کی روش کو چھوڑ کر اصلاح کی وہ روش اختیار کرو جس کی دعوت میں دے رہا ہوں۔ یہی روش اس ایمان کا مقتضیٰ ہے جس کے تم مدعی ہو۔

'وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا'۔ یہ قوم کے سرکشوں کی ان سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ حضرت شعیبؑ کے ساتھیوں کو ہراساں اور خوف زدہ کرنے اور ایمان کی راہ سے ہٹانے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے جگہ جگہ ہر ناکہ پر گنڈے سرِ راہ بیٹھ جاتے اور جہاں کوئی مسلمان مل جاتا اس کے درپے آزار ہو جاتے۔ اس کو ڈراتے دھمکاتے کہ وہ حضرت شعیبؑ

کا ساتھ اور ایمان کی راہ چھوڑ کر پھر ان کے طریقہ پر آ جائے۔ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا کی وضاحت ہم دوسری جگہ کر چکے ہیں۔ خدا تک پہنچنے کی راہ توحید ہے۔ اس راہ میں کجی کرنے کے معنی اس کو شرک کی پگڈنڈیوں کی طرف موڑنے اور لوگوں کو توحید سے ہٹا کر گمراہی کے راستوں پر ڈالنے کے ہیں۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ۔ پہلے جملے میں شکر کی دعوت اور دوسرے جملے میں کفرانِ نعمت کے انجام کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم چھوٹے سے خاندان کی شکل میں اس علاقے میں آ کر بسے تھے، پھر خدا نے تم کو ایک طاقتور قوم بنا دیا۔ تمہاری تعداد کی کثرت کے ساتھ ساتھ تمہارے اسبابِ معیشت و تمدن میں بھی اضافہ ہوا یہاں تک کہ اسباب و وسائل کے اعتبار سے تم اس درجے کو پہنچے جو آج تمھیں حاصل ہے۔ یہ سب اللہ کی دین ہے اور اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ خدا کے شکر گزار بنو اور زندگی کی وہ روش اختیار کرو جو خدا کو پسند ہے۔ لیکن تم نے اس کے برخلاف کفرانِ نعمت اور سرکشی کی راہ اختیار کی اور خدا کی زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مچا رہے ہو تو مفسدین کے انجام کو نہ بھولو۔ تمہارے دائیں بائیں ثمود اور قوم لوط کے آثارِ تباہی موجود ہیں۔ ان کے انجام سے سبق حاصل کرو۔

وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ۔ اوپر مفسدین کے جس انجام سے ڈرایا ہے یہ اسی سے متعلق ایک شبہ کا ازالہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مفسدین کا یہ انجام تو قطعی اور یقینی ہے۔ تمھیں جو مہلت مل رہی ہے اس سے یہ نہ سمجھو کہ میری بات جھوٹی ہے۔ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ خدا نے اب تک جو تمھیں مہلت دے رکھی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں سے ایک گروہ میری بات پر ایمان لایا ہے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم میں سے اور بھی جن کے اندر کچھ صلاحیت ہے وہ چھٹ کر علیحدہ ہو جائیں۔ پس ان کی خاطر تمھیں یہ مہلت مل رہی ہے۔ اس مہلت تک انتظار کرو۔ اس کے بعد خدا ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے گا اور وہ بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔

مفسدین کی مہلت کا قانون

یہ حضرت شعیبؑ نے ایک سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ قوم کی غالب اکثریت رسول کی دعوت کا انکار کر دیتی ہے اور اس انکار پر اڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات جلد واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہ قوم ایمان کی صلاحیت سے بالکل خالی ہے۔ پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس پر عذاب بھی جلد آ جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ قوم کے اندر سے ایک گروہ ایمان لاتا ہے، دوسرا گروہ اس کی مخالفت کرتا ہے۔ یہ صورت اس بات کا قرینہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے اندر کچھ صلاحیت موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو مزید بلویا جائے تو اس کے اندر سے کچھ مزید مکھن نکلے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان اور فہر کرنے میں بہت دھیما ہے اس وجہ سے وہ ایسی صورت میں قوم کو مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ نبی اور صالحین اپنی پوری قوم کو اپنے چھاج میں اچھی طرح پھٹک لیتے ہیں۔ اس عمل کے پورے ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس قوم کا فیصلہ فرما دیتا ہے۔ اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکلتا

ہے کہ قوم کو یہ مہلت ان صالحین کی برکت سے ملتی ہے جو اس کے اندر سے رسول کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ 'فَاصْبِرُوا' یہاں انتظار کے معنی میں ہے اور 'خَیْرُ الْحٰکِمِیْنَ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہرحال اس کا فیصلہ بالکل حق و عدل پر مبنی ہوگا اور ٹھیک اس وقت ہوگا جب کہ اس کو ہونا چاہیے۔

'قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ الآیہ' یہ قوم کے متکبرین کی طرف سے حضرت شعیبؑ اور ان کے ساتھیوں کو آخری دھمکی ہے کہ یا تو تم ہماری ملت میں واپس آجاؤ ورنہ ہم تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال چھوڑیں گے۔ اس پر حضرت شعیبؑ نے فرمایا 'اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ' یعنی کیا تم اپنی ملت میں لوٹنے پر ہماری خواہش اور ارادہ کے علی الرغم ہمیں مجبور کرو گے؟ حضرت شعیبؑ کے اس ارشاد سے یہ بات صاف نمایاں ہے کہ انھوں نے وطن سے نکالے جانے کی دھمکی کو تو یک قلم نظر انداز کر دیا لیکن ان کی دوسری دھمکی کا نوٹس لیا اور اس کا جواب بڑے واضح اور قطعی لفظوں میں دیا جس کی تفصیل آگے والی آیت میں ہے۔

'قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا' یہ بڑا ہی فیصلہ کن جواب ہے۔ اس میں ایمان پر غیر متزلزل عزم کا اظہار بھی ہے اور ملتِ کفر سے انتہائی بیزاری کا اعلان بھی۔ حضرت شعیبؑ نے اول تو اس ملت کو افترا علی اللہ قرار دیا گویا سراسر جھوٹ کا مجموعہ جس کو بالکل بے سند خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ دوسرے فرمایا کہ جب اللہ نے اپنے فضل و رحمت سے اس لعنت سے ہمیں نجات دی تو ہمارے لیے اس میں دوبارہ مبتلا ہونے کا کیا سوال ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ جواب حضرت شعیبؑ اپنے ان ساتھیوں کی طرف سے بھی دے رہے ہیں جو حضرت شعیبؑ پر ایمان لانے سے پہلے قوم کی عام گمراہی میں مبتلا رہ چکے تھے اس وجہ سے انھوں نے "بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی" کے الفاظ فرمائے ورنہ جہاں تک حضرات انبیاء کا تعلق ہے وہ لعنت سے پہلے بھی ہدایت فطرت پر ہوتے ہیں۔ ان کا دامن شرک سے کبھی آلودہ نہیں ہوتا۔

تفویض الی اللہ توحید کی حقیقت ہے

'وَمَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا' اس فقرے کے پہلے ٹکڑے میں اپنے عزم کا اظہار اور دوسرے میں تفویض الی اللہ ہے، اور یہی عزم اور تفویض توحید کی حقیقت ہے۔ ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ صاف سن لو کہ اب تمہاری ملت میں واپس آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن اللہ کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے۔ اس کی آزمائشوں میں کامیاب اترنا اسی کی بخشی ہوئی توفیق پر منحصر ہے۔ یہ صرف اسی کو علم ہے کہ کس کے لیے کیا مقدر ہے اور کس کا انجام کیا ہونا ہے (وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا) بس ہمارا بھروسہ صرف اللہ ہی پر ہے۔ اسی نے ہماری اس راہ کی طرف رہنمائی فرمائی ہے اور اسی سے یہ امید ہے کہ وہ ہمیں ٹھکانے لگائے گا (عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا) پس ہماری اسی سے یہ دعا ہے کہ اے ہمارے رب، ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔ 'رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ'۔ بعینہٖ یہی بات سیدنا ابراہیمؑ نے فرمائی تھی جو سورۂ انعام میں گزر چکی ہے۔ 'قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْــًٔا وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا' (کیا تم اللہ کے بارے

ہیں مجھ سے جھگڑتے ہو اور حال یہ ہے کہ اس نے مجھے ہدایت بخشی، اور میں ان چیزوں سے نہیں ڈرتا جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو مگر یہ کہ میرا رب ہی کوئی بات چاہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے)

'وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ' حضرت شعیبؑ کے مذکورہ بالا فیصلہ کن جواب کے لیے اب ان سے تو ان متمردین کے لیے کچھ کہنے سننے کی گنجائش باقی نہیں رہی لیکن چلتے چلاتے انھوں نے ایک آخری دھمکی ان غریب مسلمانوں کو اور سنادی جو حضرت شعیبؑ پر ایمان لائے تھے کہ اگر تم لوگوں نے اس شخص کا ساتھ نہ چھوڑا تو یاد رکھو کہ بڑے ہی خسارے میں رہو گے۔ اس خسارے کی انھوں نے کوئی وضاحت نہیں کی اس لیے کہ اس کے ابہام میں ہی سب کچھ چھپا ہوا ہے اور اس لفظ کے استعمال میں ہمدردی کی نمائش بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو نیک و بد تمھیں سمجھا دیا ہے لیکن اپنی بہبود کی یہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو اس کے نتائج خود بھگتو گے۔

قوم شعیب کا عذاب

'فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ' بعینہٖ یہی آیت اوپر قوم صالحؑ کی سرگزشت میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے ذکر کیا ہے کہ یہ مجرد عذاب کی تعبیر ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس عذاب کی نوعیت کیا تھی تو اس سوال کی وضاحت اس لفظ سے نہیں ہوتی۔ اس عذاب کی تعبیر سورۂ ہود آیت ۹۴ میں لفظ 'صَیْحَة' سے کی گئی ہے جس کے معنی ڈانٹ اور کڑک کے ہیں۔ پھر اسی کی تعبیر سورۂ شعراء آیت ۱۸۹ میں 'عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ' سے کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب دور سے دیکھنے میں غبار یا دھوئیں کے ایک ستون یا پہاڑ کی شکل میں نظر آیا۔ یہ قرینہ، جیسا کہ ہم قوم لوط کی سرگزشت میں بیان کر چکے ہیں، حاصب کے عذاب کا ہے۔ حاصب کے عذاب میں رجفہ، صیحہ اور ظلہ، سب جمع ہو جاتے ہیں۔ اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ قرآن کے ایک اور مقام سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ان پر قوم لوط ہی والا عذاب نازل ہوا تھا۔ سورۂ ہود میں حضرت شعیبؑ کی زبان سے قوم کو مخاطب کر کے یہ دھمکی نقل ہوئی ہے۔ 'یٰقَوْمِ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِیْۤ اَنْ یُّصِیْبَكُمْ مِّثْلُ مَاۤ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِیْدٍ' ۸۹۔ ہود (اے میرے ہم قومو، میری مخالفت تمھارے لیے کہیں اس بات کا باعث نہ بن جائے کہ تم پر بھی اسی طرح کا عذاب آدھمکے جس طرح کا عذاب قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر آیا اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور بھی نہیں) اس آیت کے آخری فقرے پر غور کیجیے تو اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ یہ بھی اسی حاصب کی زد میں آئے جس کی زد میں ان کی پیشرو پڑوسی قوم لوط کے لوگ آ چکے تھے۔

'الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ۛۚ اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ'۔ یہ اس عذاب کا نتیجہ بیان ہوا ہے اور اس کے دونوں فقروں میں ان دونوں دھمکیوں کی طرف تلمیح ہے جو قوم شعیبؑ کے کفار نے حضرت شعیبؑ اور ان کے ساتھیوں کو دی تھیں۔ انھوں نے دھمکی دی تھی کہ ہم تم کو اپنی بستی سے نکال کر چھوڑیں گے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ خود اس دیار سے اس طرح مٹے ع گویا کہ ان تلوں میں کبھی تیل ہی نہ تھا

انھوں نے حضرت شعیبؑ کے ساتھیوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم اس شخص کی پیروی سے دست کش نہ ہوئے تو بڑے خسارے میں پڑو گے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی خسارے میں پڑے۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ۔ یہی آیت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ اوپر قوم صالحؑ کی سرگزشت میں گزر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۷۹۔ وہاں ہم نے اس کے موقع و محل کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ حضرت شعیبؑ نے یہ بات درحقیقت اس وقت فرمائی ہے جب انھوں نے خدا کی طرف سے حکم ہجرت مل جانے کے بعد اعلان برأت کر کے ہجرت فرمائی ہے لیکن عذاب کی مبادرت دکھانے کے لیے اس کا ذکر عذاب کے ذکر کے بعد ہوا۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن میں ایک سے ایک بڑھ کر لطیف موجود ہیں جو پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔

فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ۔ یہ مجرد افسوس کی نفی نہیں بلکہ ہمدردانہ افسوس کی نفی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تمھیں خدا کا پیغام پہنچا دیا اور تمھاری خیر خواہی میں اپنے دن رات ایک کر دیے۔ اس سب کے باوجود بھی اگر تم اپنا بیڑا غرق کرنے پر تلے بیٹھے ہو تو اب میرے لیے تمھارے اس انجام پر ترس کھانے کا کیا موقع باقی رہا!!

۱۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹۴-۱۰۲

اوپر کی تمام سرگزشتیں سنانے سے مقصود قریش کو آگاہ کرنا تھا کہ جس کسوٹی پر یہ قومیں پرکھی گئیں وہی کسوٹی اب تمھارے سامنے ہے اور تم بھی، اگر تم نے اپنے رسول کی تکذیب کر دی، وہی انجام دیکھو گے جو انھوں نے دیکھا اس وجہ سے آگے کی آیات میں وہ اصول و ضوابط بھی نگاہوں کے سامنے کر دیے ہیں جو مذکورہ بالا تاریخ سے سامنے آتے ہیں تاکہ قریش جو قدم بھی اٹھائیں نتائج سے اچھی طرح آگاہ ہو کر اٹھائیں۔

آیات ۹۴-۱۰۲

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ
حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ
بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا
عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٩٦﴾ أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا
وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿٩٧﴾ أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا
ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿٩٨﴾ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ
ع ١٢ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٩٩﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ
بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ
قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿١٠٠﴾ تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ
أَنْبَائِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا
بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿١٠١﴾
وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ۖ وَإِنْ وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ
لَفَاسِقِينَ ﴿١٠٢﴾

ترجمۂ آیات ۹۴-۱۰۲

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی رسول بھیجا، اس کے باشندوں کو مالی اور جسمانی مصائب سے آزمایا کہ وہ رجوع کریں۔ پھر ہم نے دکھ کو سکھ سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ دکھ اور سکھ تو ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچے ہیں۔ پھر ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اس کا کوئی گمان نہیں رکھتے تھے۔ اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انھوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔ ۹۴-۹۶

تو کیا بستیوں والے نچنت رہ سکے اس بات سے کہ آ دھمکے ان پر ہمارا عذاب راتوں رات اور وہ سوئے پڑے ہوں۔ اور کیا بستیوں والے نچنت رہ سکے اس

بات سے کہاں پر آدھمکے ہمارا عذاب دن دہاڑے اور وہ کھیل کود میں ہوں۔ تو کیا وہ اللہ کی تدبیر سے بچ سکے۔ تو یاد رکھو کہ خدا کی تدبیر سے وہی لوگ نچنت ہوتے ہیں جو نامراد ہونے والے ہوں۔ کیا سبق نہیں ملا ان کو جو ملک کے وارث بنے ہیں اس کے اگلے باشندوں کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ابھی آپکڑیں اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیں تو وہ سننے سمجھنے سے رہ جائیں! یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتوں کا کچھ حصہ ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔ ان کے پاس ہمارے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ ایمان لانے والے نہ بنے بوجہ اس کے کہ وہ پہلے سے جھٹلاتے رہے تھے۔ اسی طرح اللہ ٹھپہ لگا دیا کرتا ہے کافروں کے دلوں پر۔ اور ہم نے ان میں سے اکثر میں عہد کی استواری نہیں پائی۔ ان میں سے اکثر بدعہد ہی نکلے۔ ۹۷-۱۰۲

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ۝ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰی عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (۹۴-۹۵)

'باساء' اور 'ضراء' کا مفہوم — 'باسآء' اور 'ضرّاء' کی تحقیق ۴۲ سالانعام کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ یہ دونوں لفظ، جب ایک دوسرے کے بالمقابل استعمال ہوتے ہیں تو پہلے سے مالی آفتیں مراد ہوتی ہیں۔ مثلاً قحط، گرانی، کساد بازاری وغیرہ اور دوسرے سے جسمانی آفتیں مثلاً بیماریاں اور وبائیں وغیرہ۔ لیکن جب 'ضراء' کا لفظ 'سراء' کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو یہ دونوں الفاظ ہر قسم کی بدحالی و خوش حالی کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔

'عفا الشئی'، 'کثر و طال'۔ فلاں چیز خوب بڑھی، خوب اُگی۔ 'عفت الارض'، 'غطاها النبات'، زمین سبزہ اور نباتات سے ڈھک گئی۔

نبیوں کی منادی توبہ کی بازگشت ہوتی ہیں — یہ اس سنت الٰہی کا بیان ہے جو انبیاء کی بعثت کے ساتھ لازماً ظاہر ہوتی ہے اور ان تمام انبیا کے زمانوں میں ظاہر ہوئی جن کی سرگزشتیں اوپر بیان ہوئیں۔ وہ سنت یہ ہے کہ جب نبی توبہ و استغفار اور جزا و سزا

کی منادی شروع کرتا ہے تو اس کے محرکات و مؤیدات اس کائنات میں بھی ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ ایک طرف پیغمبر لوگوں کو غفلت و خدافراموشی کے انجام، فساد فی الارض کے نتائج اور دنیا اور آخرت میں خدا کی پکڑ سے ڈراتا ہے، دوسری طرف اللہ تعالیٰ لوگوں کو سیلاب، قحط، وبا، طوفان کی آزمائشوں میں بھی مبتلا کرتا ہے تاکہ لوگ آنکھوں سے بھی، اگر ان کے پاس دیدۂ عبرت نگاہ ہو، دیکھیں کہ اس طرح اللہ جب چاہے اور جہاں سے چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے اور پھر خدا کے سوا کوئی ان کو بچانے والا نہیں بن سکتا۔ اس طرح گویا دعوت کے ساتھ واقعات کی تائید اور عقل و فطرت کی شہادت کے ساتھ مشاہدہ کی اثرانگیزی بھی جمع ہو جاتی ہے۔ نبی جو کچھ کہتا ہے، آسمان و زمین دونوں مل کر اپنے اسٹیج پر گویا اس کے مناظر دکھا بھی دیتے ہیں تاکہ جن کے اندر اثر پذیری کی کچھ بھی رمق ہو وہ خدا کے آگے جھکیں اور توبہ و اصلاح کریں۔

آزمائش کی ایک اور کروٹ

جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں اور اثر قبول کرنے والے دل ہوتے ہیں وہ ان آزمائشوں سے فائدہ اٹھاتے اور خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ان کو گویا نبی کی دعوت کی بازگشت تمام عناصر کائنات سے سنائی دیتی ہے اور وہ صرف کانوں سے سنتے ہی نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھتے بھی ہیں لیکن جن کے دل پتھر اور کان بہرے ہو چکے ہیں ان کے لیے یہ سنت الٰہی ایک دوسری شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہ یہ کہ پھر اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دے دیتا ہے۔ بدحالی کی جگہ خوش حالی آ جاتی ہے، دنیوی اسباب و وسائل کے ہر گوشے میں ترقی و فراخی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، آزمائشوں اور تکلیفوں کے دن ذہنوں سے نکل جاتے ہیں۔ پھر سرکش لوگ چہکنا اور نبی اور اس کے ساتھیوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں کہ نعوذ باللہ یہ عقل کے کوتاہ لوگ، پچھلے قحط یا گزشتہ سیلاب یا فلاں آفت کو ہمارے اعمال و عقاید کی خرابی پر خدا کی تنبیہ سمجھتے تھے اور اپنے وعظوں میں طرح طرح سے ہم کو ڈراتے اور پست ہمت کرتے رہے۔ حالانکہ ان باتوں کو ایمان و اخلاق سے کیا تعلق، اس قسم کی گردشیں قوموں کی زندگی میں آیا ہی کرتی ہیں۔ ایسے دن کچھ ہمارے ہی اوپر تو نہیں گزرے ہیں۔ ہمارے باپ دادوں پر بھی گزرے ہیں جو بڑے اچھے اور نیک نہاد لوگ تھے۔ یہ تو زمانے کے اتفاقات ہیں۔ کبھی تنگی ہے کبھی فراخی، کبھی فصل اچھی ہوئی، کبھی ماری گئی، کبھی سیلاب آ گیا، کبھی قحط پڑ گیا، ان چیزوں کو اعمال و اخلاق سے باندھ دینا محض خرد باختگی اور وہمی پن ہے۔

جس طرح آفات و مصائب کے ظہور کا مقصد لوگوں کو جھنجھوڑنا اور بیدار کرنا بتایا گیا ہے (لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ) اسی طرح اس امہال اور ڈھیل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان تنبیہات سے نہیں جاگے ہیں وہ بدمست ہو کر گہری نیند سو جائیں تاکہ خدا کا عذاب ان کو ایسی حالت میں دبوچے کہ ان کو خبر نہ ہو کہ کب آیا اور کہاں سے آیا۔ فَأَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔[1]

---

[1] اس سنت الٰہی کی وضاحت ہم انعام کی آیات ۴۲-۴۹ کے تحت بھی کر چکے ہیں۔ نیز اعراف کی آیت ۱۳۰ کے تحت بھی اس کے بعض پہلو واضح ہوں گے۔

نیک و بد کے لیے مشترک تنبیہی آفتیں

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ جو آزمائشیں اور آفتیں لوگوں کے اندر رجوع الی اللہ یا قرآن کے الفاظ میں تضرع پیدا کرنے کے لیے آتی ہیں وہ عام اور مشترک ہوتی ہیں۔ ان میں نیک و بد دونوں ہی تپائے جاتے ہیں۔ یہ صورت حال نادانوں اور سرکشوں کے لیے ایک وجہ فتنہ و مغالطہ بن جاتی ہے۔ وہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جب اس قحط یا وبا نے عقیدہ اور عقیدہ، کردار اور کردار میں کوئی فرق نہیں کیا، اس کا نشانہ جس طرح ہم بنے اسی طرح ہمارے ملامت گر اور ناصح بھی بنے تو یہ کس طرح تسلیم کیا جائے کہ اس کا کوئی رشتہ کفر و ایمان اور عقائد و اعمال سے ہے، یہ بات تو اس صورت میں صحیح ہوتی جب نبی اور اس کے ساتھی اس قحط یا آفت سے اس طرح بچا لیے گئے ہوتے کہ ان کے لیے تو آسمان سے من و سلویٰ اترتا ہوتا اور ہم سوکھے چمڑے چاٹتے ہوتے۔ جب یوں نہیں ہوا بلکہ ہم اور وہ دونوں اپنی اپنی جگہ گرفتار مصائب رہے تو یہ کس طرح مانا جائے کہ ان مصائب کا کوئی علاقہ لوگوں کی نیکی و بدی سے ہے۔ درحقیقت یہی مغالطہ ہے جو انبیا کے مخالفین کی طرح آج کے بدبختوں کو بھی اندھا بنائے ہوئے ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ سائیکلون اٹھا وہ بلا امتیاز نیک و بد سب کو بہا لے گیا۔ زلزلہ آیا اس نے مندر، مسجد، کلیسا سب ڈھا دیے، قحط آیا اور اس کی زد میں نمازی اور غیر نمازی، فاسق اور مومن سب آئے۔ یہ چیز ان کے لیے فتنہ بن جاتی ہے۔ اوّل تو وہ ان چیزوں سے کوئی صحیح اثر لیتے ہی نہیں اور اگر وقتی طور پر دلوں میں کچھ گداز پیدا ہوتا بھی ہے تو اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ بہت جلد خواہشیں ان کو اسی غفلت و سرمستی میں مبتلا کر دیتی ہیں جس میں وہ اب تک مبتلا رہے تھے اور ان کا مرشد شیطان ان کو وہی جاہلی فلسفہ از سر نو پڑھا دیتا ہے جس کا ذکر اوپر گزرا کہ قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ۔ اس قسم کے سرد گرم دن تو قوموں پر آتے ہی رہتے ہیں۔ اس ابلیسی مغالطہ سے محفوظ رہنے کے لیے اس حقیقت کو ہمیشہ مستحضر رکھنا چاہیے کہ تنبیہی مصائب میں اگرچہ ظاہر کے اعتبار سے نیک و بد میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا اس لیے کہ ان کا مقصود سزا دینا نہیں بلکہ لوگوں میں تضرع پیدا کرنا ہوتا ہے لیکن نتائج کے اعتبار سے بڑا فرق ہوتا ہے۔ اہل ایمان اگر ان مصائب میں کوئی حصہ پاتے ہیں تو اس سے ان کے تضرع میں مزید اضافہ ہوتا ہے جس سے ان کی کوتاہیوں کی تلافی اور ان کے مراتب و مدارج میں ترقی ہوتی ہے۔ برعکس اس کے جن لوگوں کے اندر ان سے تضرع پیدا نہیں ہوتا ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور اس کے بعد جب ان پر فیصلہ کن عذاب آتا ہے تو وہ ان کا استیصال کر دیتا ہے۔ پھر اس کی زد سے ان کے اندر کے وہی لوگ بچتے ہیں جو اصلاح منکر کا فرض ادا کرنے والے ہوتے ہیں۔

دو اہم حقیقتیں

'وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا الاٰیۃ'۔ 'اَهْلَ الْقُرٰٓى' سے مراد وہی قومیں ہیں جن کی تکذیب کی داستان اوپر بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ یہ معاملہ نہ کرتا کہ ایک مہلت دینے کے بعد ان کو عذاب میں پکڑ لیتا بلکہ ان کے لیے آسمان و زمین دونوں طرف سے اپنی بے پایاں برکتوں کے دروازے کھول دیتا۔ یہاں دو حقیقتیں واضح

ہوتیں۔ ایک تو یہ کہ کسی قوم کو ڈھیل کے طور پر اسباب و مال کی جو فراخی حاصل ہوتی ہے وہ خدا کی رحمت و برکت نہیں ہوتی بلکہ اس کی نوعیت مریض کے آخری سنبھالے کی ہوتی ہے جس کے بعد ایک آخری ہچکی کی کسر باقی رہ جاتی ہے جو مریض کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ جس طرح شمع بجھنے سے پہلے ایک مرتبہ بھڑکتی ہے پھر بجھ جاتی ہے اسی طرح یہ قوم آخری بار بھڑک کر بجھ جاتی ہے۔

دوسری یہ کہ ایمان و تقویٰ کی زندگی جس طرح آخرت میں خدا کی رحمتوں کی ضامن ہے اسی طرح دُنیا میں بھی اگر کوئی قوم اس کو اختیار کرے تو یہ آسمان و زمین کی تمام برکتوں اور فیروز مندیوں کی کلید ہے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ دُنیا کی کامیابیوں کی راہ میں خدا پرستی اور خدا ترسی کوئی رکاوٹ ہے۔

أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ ۝ أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۝ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ (۹۷-۹۹)

خدا کی پکڑ بے امان ہوتی ہے

'اَهْلُ الْقُرٰی' سے اشارہ انہی قوموں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر گزرا۔ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قریش کو توجہ دلائی کہ بتاؤ وہ خدا کے عذاب کے مقابل میں اپنے بچاؤ کے لیے کوئی بند باندھ سکے؟ ہمارا عذاب ان پر رات کی تاریکیوں میں دبے پاؤں بھی آیا جب کہ وہ سو رہے تھے اور دن دہاڑے ڈنکے کی چوٹ بھی آیا جب کہ وہ اپنی دلچسپیوں اور سرگرمیوں میں مصروف تھے لیکن نہ رات میں وہ اس سے اپنے آپ کو بچا سکے نہ دن میں۔ خدا کی تدبیر بے امان ہے۔ کسی کی طاقت نہیں کہ اس سے اپنے کو بچا سکے۔ اس وجہ سے کسی کے لیے جائز نہیں کہ اس سے بےخوف اور بے خوف رہے۔ اس سے بےخوف اور بے خوف صرف وہی رہتے ہیں جن کی شامت آئی ہوئی ہو اور وہ نامراد ہونے والے ہوں۔ مکر جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں، خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں۔ خفیہ تدبیر کا مطلب یہ ہے کہ خدا وہاں سے پکڑتا ہے جہاں سے کسی کو پکڑے جانے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ اوپر تنبیہ کے بعد ڈھیل کی جو سنت بیان ہوئی وہ اس خفیہ تدبیر الٰہی کی ایک مثال ہے۔ قوم تو سمجھتی ہے کہ اب اُس نے پالا مار لیا لیکن درحقیقت وہیں اس کی ہلاکت کا کھڈ ہوتا ہے۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِن بَعْدِ أَهْلِهَا أَن لَّوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ (۱۰۰)

'اَلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ' سے مراد یہاں قریش ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ انھیں قوموں کے بعد جن کا ذکر اوپر گزرا اس ملک میں حکومت و اقتدار کے وارث ہوئے ہیں آخر وہ اپنے موروثوں کی تاریخ سے سبق کیوں نہیں لیتے؟ خدا نے جس ترازو اور جس باٹ سے ان کو تولا وہ اسی باٹ اور ترازو سے ان کو کیوں نہیں تولے گا؟ فرمایا کہ آخر وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جس طرح ہم نے ان کو ان کے جرموں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اسی طرح، جب چاہیں، ان کو بھی ہلاک کر دیں۔

دلوں پر مہر [illegible] تنبیہ ہے

'وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ' بالکل اسی محل میں ہے جس محل میں سورۂ انعام میں فرمایا ہے 'قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ - ۴۶' (ان سے پوچھو

اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں سلب کر لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون ہے جو تمہیں یہ چیزیں واپس دے سکے) یہ امر ملحوظ رہے کہ دلوں پر مہر عذاب الٰہی کا مقدمہ ہے۔ کسی قوم پر عذاب الٰہی نازل ہونے سے پہلے اس کے دلوں پر مہر لگتی ہے۔ اس باب میں خدا کا جو قانون ہے اس کی وضاحت ہم متعدد مقامات میں کر چکے ہیں۔ اسی کی دھمکی یہاں قریش کو دی ہے کہ ابھی تو ہم نے ان کے دلوں پر مہر نہیں کی ہے لیکن یہ ضد اور ہٹ دھرمی کی جس روش پر بڑھتے چلے جا رہے ہیں وہ وقت دور نہیں کہ ہم ان کے دلوں پر مہر کر دیں اور یہ سننے سمجھنے سے بالکل ہی رہ جائیں۔ یہ ہمارے عذاب کا مقدمہ ہو گا جس کے بعد لازماً ہمارا فیصلہ کن عذاب نازل ہو جائے گا۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۰۱)

دلوں پر مہر کب لگتی ہے؟

دلوں پر مہر کب لگتی ہے؟ کس طرح کے لوگوں کے دلوں پر لگتی ہے اور بالآخر اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اس آیت میں ان سوالوں کا جواب ہے۔ فرمایا کہ ہم نے قوموں کی جو سرگزشت تمہیں سنائی ہے لوگوں کو چاہیے کہ اس سے سبق لیں۔ فرمایا کہ ان کے پاس خدا کے رسول نہایت واضح نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ ان پر ایمان لانے والے نہ بنے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے خدا کی آیتوں اور نشانیوں کو جھٹلاتے رہے تھے۔ آدمی کا قاعدہ ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی عام آیات سے روگردانی کا عادی ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کا دل ایسا پتھر ہو جاتا ہے کہ رسولوں کے ذریعہ سے خاص نشانیاں بھی ظاہر ہوتی ہیں تو وہ بھی اس پر کارگر نہیں ہوتیں۔ فرمایا کہ یہ طریقہ ہے ہمارے ہاں دلوں پر مہر لگانے کا۔ دل کا کام عبرت پذیری، تفکر اور تعقل ہے۔ اگر کوئی گروہ اس طرح اپنی خواہشوں کا اندھا بہرا مرید بن جاتا ہے کہ تذکیر و تنبیہ کے بعد بھی وہ دل کی آنکھیں نہیں کھولتا تو ایسے لوگوں کے دل بالآخر بالکل چپاٹ ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'بِمَا كَذَّبُوْا' یہاں 'يُؤْمِنُوْا' کا مفعول نہیں ہے بلکہ 'ب' بیان سبب کے لیے ہے۔

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ (۱۰۲)

یہ دلوں پر مہر لگنے کا نتیجہ اور اثر بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی گروہ کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے تو ان کی مت اس طرح ماری جاتی ہے کہ کوئی نشانی بھی ان کو دکھاؤ وہ اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام نہیں لیتے۔ بار بار قسمیں کھا کھا کے عہد کریں گے کہ اگر فلاں معجزہ دکھا دو تو ہم مان لیں گے لیکن وہ معجزہ بھی دکھا دیا جائے تو پھر کسی نئے معجزے کا مطالبہ شروع کر دیں گے اور اپنے پہلے عہد سے پھر جائیں گے۔ لفظ 'فسق' یہاں عہد شکنی کے مفہوم میں ہے۔ یہی مضمون زیادہ وضاحت سے سورہ انعام میں یوں بیان ہوا ہے۔ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۚ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۱۰۹-۱۱۰

(اور وہ بڑی پکی قسمیں کھا کے یقین دلاتے ہیں کہ اگر کوئی معجزہ ان کو دکھایا جائے تو وہ ضرور اس پر ایمان لے آئیں گے۔ کہہ دو کہ معجزے تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔ اور تمھیں کیا پتہ کہ اگر معجزہ بھی آجائے گا جب بھی وہ ایمان لانے والے نہیں اور ہم ان کے دلوں اور ان کی بصیرتوں کو اسی طرح اُلٹ دیں گے جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے اور ان کی سرکشی میں ان کو بھٹکتا چھوڑ دیں گے) آگے حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت میں بھی یہی حقیقت ان الفاظ میں واضح کی گئی ہے وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يٰمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ؁ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلٰٓى أَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ (۱۳۴-۱۳۵) (جب ان پر کوئی آفت آتی وہ کہتے، اے موسیٰ، ہمارے واسطے اپنے رب سے، اس وعدے کی بنا پر جو اس نے تم سے کر رکھا ہے، دعا کرو۔ اگر تم نے یہ بلا ہمارے سر سے ٹال دی تو ہم تمھاری بات ضرور مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ جانے دیں گے۔ پھر جب ہم اس آفت کو کچھ دیر کے لیے، جس تک لازماً ان کو پہنچنا ہوتا، ٹال دیتے تو وہ دفعتہً اپنا عہد توڑ دیتے)

۱۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰۳-۱۷۱

آگے حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کے دینی و سیاسی عروج و زوال کی پوری تاریخ، اجمال مگر نہایت جامعیت کے ساتھ سامنے رکھ دی گئی ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ ان سرگزشتوں کا تکملہ اور تتمہ ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ اوپر کی سرگزشتیں حضرت شعیبؑ کی سرگزشت پر تمام ہوئی تھیں۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کی بعثت کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے جو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں ایک طرف تو فرعون اور اس کی قوم پر اللہ کی حجت تمام ہوئی اور ان کی تکذیب کے نتیجے میں فرعون اور اس کی قوم کا وہی انجام ہوا جو اوپر قوم نوحؑ سے لے کر قوم شعیبؑ تک کا بیان ہوا۔ دوسری طرف بنی اسرائیل ایک قوم کی حیثیت سے نمایاں ہوئے اور پھر بتدریج اللہ تعالیٰ نے ان کو مذہبی پیشوائی کا منصب بھی بخشا اور سیاسی دبدبہ اور اقتدار بھی عطا فرمایا لیکن انھوں نے اس منصب اور اقتدار کی قدر نہیں کی بلکہ آہستہ آہستہ ان برائیوں سے بھی زیادہ سنگین برائیوں میں مبتلا ہوئے جن میں پچھلی قومیں مبتلا ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جس طرح قریش کی قسمت خدا کی میزانِ عدل میں آگئی، اسی طرح بنی اسرائیل کی قسمت بھی کسوٹی پر رکھ دی گئی۔ اب ان کے فیصلہ کا وقت آگیا تھا کہ اگر اللہ سے باندھے ہوئے عہد کے مطابق اس نبی امیؐ پر یہ ایمان نہیں لاتے جس پر تورات اور تمام پچھلے صحیفوں اور انبیاء کے ذریعہ سے ان سے اقرار لیا گیا تھا تو وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں جس سے پچھلی قومیں دوچار ہوئیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰۳-۱۷۱ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنۢ بَعْدِهِمْ مُّوسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوا

بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى
يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ
اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ
مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ
اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ قَالَ ۱۴ ع ۹ ۳
الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ
مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ
فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَجَآءَ
السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾
قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ
تُلْقِىَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا
سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾
وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا
يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا
هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَاُلْقِىَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا
اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ
اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ

لِتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿١٢٣﴾ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَ
أَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٢٤﴾ قَالُوا إِنَّا إِلَىٰ
رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ ﴿١٢٥﴾ وَمَا تَنقِمُ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِآيَاتِ رَبِّنَا لَمَّا
جَاءَتْنَا ۚ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ﴿١٢٦﴾ وَقَالَ ع ١٤ ٤
الْمَلَأُ مِن قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي
الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ ۚ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي
نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿١٢٧﴾ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ
اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَاءُ
مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٢٨﴾ قَالُوا أُوذِينَا مِن قَبْلِ
أَن تَأْتِيَنَا وَمِن بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُهْلِكَ
عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٢٩﴾ ع ١٥ ٥
وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٣٠﴾ فَإِذَا جَاءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَٰذِهِ ۖ
وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُ ۗ أَلَا إِنَّمَا
طَائِرُهُمْ عِندَ اللَّهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٣١﴾ وَقَالُوا
مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ
بِمُؤْمِنِينَ ﴿١٣٢﴾ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَ
الضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا

مُّجْرِمِينَ ﴿١٣٣﴾ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يَا مُوسَى ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۖ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ
وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿١٣٤﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ
إِلَىٰ أَجَلٍ هُمْ بَالِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ﴿١٣٥﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ
فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا
غَافِلِينَ ﴿١٣٦﴾ وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ
الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ۖ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ
الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا ۖ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ
يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ﴿١٣٧﴾ وَجَاوَزْنَا الربع
بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰ أَصْنَامٍ
لَهُمْ ۚ قَالُوا يَا مُوسَى اجْعَلْ لَنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ ۚ قَالَ
إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿١٣٨﴾ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَا هُمْ فِيهِ وَبَاطِلٌ
مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٩﴾ قَالَ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِيكُمْ إِلَٰهًا وَهُوَ
فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿١٤٠﴾ وَإِذْ أَنْجَيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ
يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۖ يُقَتِّلُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ
نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿١٤١﴾ وَوَاعَدْنَا مُوسَىٰ ع ١٦ ١٢ ٦
ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتْمَمْنَاهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ۚ
وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ

سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٤٢﴾ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ
قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ
فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ
جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ
اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٤٣﴾ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ
عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ
الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٤﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ
تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا
بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٤٥﴾ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ
الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا
يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ
وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٤٦﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ
الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٧﴾ ع
وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ
خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وقف لازم
وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿١٤٨﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ
ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ

الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ
بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ
وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ
اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَكَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۖؗ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَلَا
تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا
فِیْ رَحْمَتِكَ ۖؗ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۱۵۱﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا ع ۱۸ ۴ ۸
الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ
وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا
مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْۤا ۫ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَ
لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖۚ وَفِیْ نُسْخَتِهَا
هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ یَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَاخْتَارَ مُوْسٰى
قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ
رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِیَّایَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا
فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ
تَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ
الْغٰفِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ
اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَیْكَ ؕ قَالَ عَذَابِیْۤ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِیْ
وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٥٦﴾ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ
الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ
يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ
يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ
كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ
الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٥٧﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ع ١٩ ٩
اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَۨا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ
الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ﴿١٥٨﴾ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ
يَعْدِلُوْنَ ﴿١٥٩﴾ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۭ وَاَوْحَيْنَآ
اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ
فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ
وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٠﴾ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا
حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ
خَطِيْۗـٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٦١﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ

قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا
كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ ع ۵ ۲۰ ۱۰
الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ وقف لازم
شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا معانقة
يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ النصف
مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى
رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا
الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ
بَـِٔيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ
قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ
عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ
لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ښ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ
مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ
السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا
الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ
وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ
الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَ
الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيْنَ

يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾
وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ
خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ ع ۲۱ ۹ ۱۱

ترجمۂ آیات ۱۰۳-۱۷۱

پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان کے پاس رسول بنا کر بھیجا تو اُنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم اور نشانیوں کا انکار کیا۔ تو دیکھو ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا! اور موسیٰ نے کہا، اے فرعون، میں خداوند عالم کا فرستادہ ہوں۔ سزاوار اور حریص ہوں کہ اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی اور بات منسوب نہ کروں۔ میں تمھارے پاس تمھارے خداوند کی جانب سے کھلی ہوئی نشانی لے کر آیا ہوں تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دو۔ اس نے جواب دیا کہ اگر تم کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اس کو پیش کرو، اگر تم سچے ہو۔ تو اس نے اپنی لٹھیا ڈال دی وہ یکایک ایک سچ مچ کا اژدہا بن گئی۔ اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچا تو وہ دفعتہً دیکھنے والوں کے لیے چمکتا ہوا نکلا۔ قومِ فرعون کے اعیان نے کہا۔ یہ تو بڑا ماہر جادوگر ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں تمھارے ملک سے نکال دے تو تم کیا رائے دیتے ہو؟ بولے ابھی اس کو اور اس کے بھائی کو ٹالو اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیجو جو تمام ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے تمھارے پاس لائیں۔ جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوئے۔ بولے بڑا صلہ ملے گا ہمیں، اگر ہم ہی غالب رہے! فرعون نے کہا، ہاں بے شک، اور تم ہمارے مقربین میں بھی داخل ہو گے۔

۱۰۳-۱۱۴

بولے اے موسیٰ، یا تو پہلے تم پیش کرو یا ہمیں پیش کرنے والے بنتے ہیں۔ اس نے کہا تمھی پیش کرو۔ تو جب انھوں نے پیش کیا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان

پر دہشت طاری کر دی اور بہت بڑا کرتب دکھایا۔ اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ تم اپنی لٹھیا ڈال دو، تو وہ دفعۃً نگلنے لگی اس کو جو وہ گھڑتے تھے تو حق ظاہر ہو گیا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے وہ سب نابود ہوا۔ تو اس وقت وہ مغلوب ہوئے اور ذلیل ہو کر رہ گئے، اور ساحر سجدے میں گر پڑے۔ بولے ہم عالم کے خداوند موسیٰؑ اور ہارون کے خداوند پر ایمان لائے!! ۱۱۵ - ۱۲۲

فرعون نے کہا تم لوگ میری اجازت کے بغیر اس پر ایمان لائے۔ یہ ایک سازش ہے جو تم نے شہر میں اس غرض سے کی ہے کہ اس کے باشندوں کو یہاں سے نکالو، تو تم عنقریب جان لو گے۔ میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا پھر تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔ وہ بولے، ہم اپنے رب ہی کی طرف تو لوٹیں گے! تم ہمارے درپے آزار صرف اس غصہ میں ہو رہے ہو کہ ہم اپنے رب کی نشانیوں پر جب کہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لائے۔ اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمیں وفات اسلام پر دے۔ ۱۲۳-۱۲۶

اور قوم فرعون کے اعیان نے فرعون سے کہا کیا تو اسی طرح موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑے رکھے گا کہ وہ ملک میں بدامنی پھیلائیں اور تجھ کو اور تیری مورتوں کو ٹھکرائیں؟ اس نے کہا کہ ہم ان کے ذکور کو قتل کریں گے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھیں گے اور ہم ان پہ پوری طرح حاوی ہیں۔ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا۔ اللہ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو۔ زمین اللہ کی ہے، وہ جس کو اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے اس کو اس کا وارث بناتا ہے اور انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔ وہ بولے ہم تو تمہارے آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور تمہارے آنے کے بعد بھی۔ اس نے

کہا توقع ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو پامال کرے گا اور تم کو ملک کا وارث بنائے گا کہ دیکھے تم کیا روش اختیار کرتے ہو! ۱۲۷-۱۲۹

اور ہم نے آلِ فرعون کو قحط سالی اور پیداوار کی کمی میں مبتلا کیا تاکہ ان کو تنبیہ ہو۔ تو جب خوش حالی آتی، کہتے، یہ تو ہے ہی ہمارا حصہ اور اگر ان پر کوئی آفت آتی تو اس کو موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے۔ سن رکھو کہ ان کی قسمت اللہ ہی کے پاس ہے لیکن ان میں کے اکثر نہیں جانتے۔ اور کہتے ہیں کہ خواہ تم کیسی ہی نشانی ہمیں مسحور کرنے کے لیے لاؤ ہم تو تمہاری بات باور کرنے کے نہیں۔ تو ہم نے ان پر بھیجے طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک اور خون، تفصیل کی ہوئی نشانیاں، تو انھوں نے تکبر کیا اور یہ مجرم لوگ تھے۔ اور جب آتی ان پر کوئی آفت تو درخواست کرتے کہ اے موسیٰؑ تم اپنے رب سے، اس عہد کے واسطہ سے جو اس نے تم سے کر رکھا ہے، ہمارے لیے دعا کرو۔ اگر تم نے ہم سے یہ آفت دور کر دی تو ہم تمہاری بات ضرور مان لیں گے اور تمہارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے۔ تو جب ہم ان سے دور کر دیتے آفت کو کچھ مدت کے لیے جس تک وہ پہنچنے والے ہوتے تو وہ دفعتہً عہد توڑ دیتے۔ تو ہم نے ان کو کیفرِ کردار کو پہنچا دیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا بوجہ اس کے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروا بنے رہے۔ اور جو لوگ دبا کے رکھے گئے تھے ہم نے ان کو اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث ٹھہرایا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں اور تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہوا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کی ساری تعمیرات اور ان کے سارے باغ و چمن ملیامیٹ

کر دیے۔ ۱۲۰-۱۲۷

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا تو ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے کچھ بتوں کی پرستش میں لگی ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا، اے موسیٰ جس طرح ان کے دیوتا ہیں اسی طرح کا ایک دیوتا تم ہمارے لیے بھی بنا دو۔ اس نے کہا تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو۔ ان لوگوں کا یہ سب کچھ جس میں یہ لگے ہوئے ہیں برباد اور جو کچھ کر رہے ہیں نابود ہونے والا ہے! اس نے کہا۔ کیا میں تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی اور معبود ڈھونڈوں درآنحالیکہ وہی ہے جس نے تم کو اہلِ عالم پر فضیلت بخشی ؟ اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم کو آلِ فرعون سے نجات دی جو تمھیں نہایت برے عذاب چکھاتے تھے، وہ تمھارے بیٹوں کو بے دردی سے قتل کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بڑی ہی آزمائش تھی۔ اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا دس مزید راتوں سے تو اس کے رب کی مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی۔ اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا، میری قوم میں میری جانشینی کرنا، اصلاح کرتے رہنا اور مفسدوں کی روش کی پیروی نہ کرنا۔ اور جب موسیٰ ہماری مقررہ مدت پر حاضر ہوا اور اس سے اس کے رب نے کلام کیا تو اس نے درخواست کی کہ اے میرے رب مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھ لوں۔ فرمایا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ سکے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ تو جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے، بولے تو پاک ہے، میں نے تیری طرف رجوع کیا

اور میں پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں ۔ فرمایا، اے موسیٰ میں نے تم کو لوگوں پر اپنے پیغام اور اپنے کلام سے سرفراز کیا تو میں نے جو کچھ تم کو دیا اس کو لو اور شکر گزاروں میں سے بنو اور ہم نے اس کے لیے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی لیں اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو ہدایت کرو کہ اس کے بہتر طریقہ کو اپنائیں۔ میں تم کو عنقریب نافرمانوں کا ٹھکانا دکھاؤں گا ۔ میں ان لوگوں کو جو زمین میں ناحق گھمنڈ کرتے ہیں اپنی نشانیوں سے برگشتہ کروں گا اور اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں بھی دیکھ لیں گے تو بھی ان پر ایمان نہ لائیں گے ۔ اگر ہدایت کی راہ دیکھیں گے تو اسے تو نہ اپنائیں گے اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں گے تو اسے اپنائیں گے ۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروا بنے رہے ۔ اور جنھوں نے ہماری نشانیوں اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے اعمال ڈھے گئے اور وہ بدلے میں وہی پائیں گے جو وہ کرتے رہے ۔ ۱۴۸-۱۴۷

اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنا لیا ۔ ایک دھڑ جس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی ۔ کیا انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ نہ وہ ان سے بات کر سکتا ہے اور نہ ان کو کوئی راہ دکھا سکتا ہے! اس کو وہ بنا بیٹھے اور وہ اپنے اوپر بڑے ظلم ڈھانے والے تھے! اور جب ان کو تنبہ ہوا اور انھوں نے دیکھا کہ وہ تو گمراہ ہو گئے تو بولے کہ اگر ہمارے پروردگار نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہمارا قصور معاف نہ کیا تو ہم نامرادوں میں سے ہو جائیں گے ۔ اور جب موسیٰ رنج اور غصہ سے بھرے ہوئے اپنی قوم کی طرف لوٹے، بولے تم نے میرے پیچھے میری بہت بری جانشینی کی ۔ کیا تم نے

خدا کے حکم سے پہلے ہی جلد بازی کر دی ؟ اور اس نے تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اس کو اپنی طرف گھسیٹنے لگا ۔ وہ بولا اے میرے ماں جائے ! قوم کے لوگوں نے مجھے دبا لیا، قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتے تو میرے اوپر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع نہ دے اور میرا شمار ظالموں کے ساتھ نہ کر۔ موسیٰ نے دعا کی، اے میرے پروردگار مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر، ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، تو ارحم الراحمین ہے۔ ۱۴۸-۱۵۱

بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ان کو ان کے رب کی طرف سے غضب لاحق ہو گا اور ذلت، دنیا کی زندگی میں اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم بہتان باندھنے والوں کو۔ پر جنھوں نے بُرے کام کیے، پھر اس کے بعد انھوں نے توبہ کر لی اور ایمان لائے تو اس کے بعد تیرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ۱۵۲-۱۵۳

اور جب موسیٰ کا غصہ فرو ہُوا اس نے تختیاں اٹھائیں اور اس کے نوشتہ میں ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہوں۔ اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمی چنے ہمارے وقت مقرر کے لیے تو جب ان کو زلزلہ نے آ پکڑا تو موسیٰ نے کہا اے رب اگر تو چاہتا ان کو ہلاک کر چھوڑتا پہلے ہی اور مجھ کو بھی۔ کیا تو ہمیں ایک ایسے جرم کی پاداش میں ہلاک کر دے گا جس کا ارتکاب ہمارے اندر کے بے وقوفوں نے کیا۔ یہ تو بس تیری ایک آزمائش تھی۔ تو اس سے جس کو چاہے گمراہی میں ڈال دے اور جس کو چاہے ہدایت دے۔ تو ہی ہمارا کارساز ہے تو ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین بخشنے والا ہے۔ اور تو ہمارے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی۔ ہم نے تو تیری طرف رجوع کیا۔ فرمایا، میں اپنے عذاب میں تو اسی کو مبتلا کرتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور

میری رحمت ہر چیز کو عام ہے۔ سو میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے ـــــ جو پیروی کریں گے اس نبی امّی رسول کی جسے وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے، بُرائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں جائز ٹھہراتا ہے اور خبیث چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں اتارتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں۔ تو جو اس پر ایمان لائے، جنھوں نے اس کی عزت کی، اس کی مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۱۵۴-۱۵۷

کہہ دو اے لوگو، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس اللہ کا جس کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔ وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے نبی امی رسول پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ یاب ہو۔ ۱۵۸

اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہوا جو حق کے مطابق رہنمائی کرتے اور اسی کے مطابق انصاف کرتے اور ہم نے ان کو بارہ خاندانوں میں الگ الگ امتیں بنا دیا اور ہم نے موسیٰ کی طرف، جب اس کی قوم نے پانی طلب کیا، وحی کی کہ اپنی لٹھیا پتھر پر مارو تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ معین کر لیا اور ہم نے ان پر بدلیوں کا سایہ کیا اور ان پر من اور سلویٰ اتارا۔ کھاؤ ہماری بخشی ہوئی پاکیزہ چیزوں میں سے۔ اور انھوں نے کچھ ہمارا نہیں بگاڑا بلکہ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔
(۱۵۹-۱۶۰)

اور یاد کرو، جب ان سے کہا گیا، اس بستی میں رہو بسو، اس میں جہاں سے چاہو کھاؤ پیو اور توبہ استغفار کرتے رہو اور دروازے میں سرفگندہ داخل ہو تو ہم تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے۔ خوب کاروں کو ہم مزید نوازیں گے۔ تو ان میں سے ان لوگوں نے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اس کو بدل دیا کہی ہوئی بات سے مختلف بات سے، تو ہم نے ان پر ایک آفت سماوی بھیجی بوجہ اس کے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ ۱۶۱-۱۶۲

اور ان سے اس بستی کا حال دریافت کرو جو دریا کے کنارے تھی جب کہ وہ سبت کے معاملے میں حدودِ الٰہی سے تجاوز کرتے تھے۔ جب سبت کا دن ہوتا تو ان کی مچھلیاں منہ اٹھائے ہوئے ان کے سامنے نمایاں ہوتیں اور جب سبت کا دن نہ ہوتا تو وہ ظاہر نہ ہوتیں۔ اسی طرح ہم ان کو آزماتے تھے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ اور یاد کرو جب کہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کیے جا رہے ہو جنھیں یا تو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انھیں ایک سخت عذاب دینے والا ہے۔ وہ بولے کہ یہ اس لیے کہ یہ تمھارے رب کے سامنے ہماری طرف سے عذر بن سکے اور تاکہ یہ خدا کے غضب سے بچیں۔ تو جب انھوں نے بھلا دی وہ چیز جس سے ان کو یاد دہانی کی گئی تو ہم نے ان لوگوں کو تو نجات دی جو برائی سے روکنے والے تھے اور ان لوگوں کو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے رہتے تھے۔ تو جب وہ سرکشی کر کے اس چیز سے باز نہ آئے جس سے روکے گئے تو ہم نے ان سے کہا جاؤ ذلیل بندر بن جاؤ۔ ۱۶۳-۱۶۶

اور یاد کرو جب تیرے رب نے فیصلہ کیا کہ وہ روزِ قیامت تک ان پر ایسے لوگوں

کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت برے عذاب چکھاتے رہیں گے۔ بے شک تیرا رب جلد پاداش دینے والا اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ہم نے ان کو زمین میں منتشر کر دیا گروہ گروہ کر کے۔ ان میں کچھ نیک بھی ہیں اور کچھ اس سے مختلف بھی۔ اور ہم نے ان کو خوشحالیوں اور بدحالیوں سے آزمایا تاکہ وہ رجوع کریں تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین وارث کتاب ہوئے جو اس دنیا کی متاع اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے لیے سب معاف کر دیا جائے گا اور اگر اسی طرح کی کوئی اور متاع ان کو مل جائے تو اسے بھی ہتھیا لیں گے۔ کیا ان سے در باب کتاب یہ میثاق نہیں لیا گیا کہ وہ اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ جوڑیں اور انھوں نے جو کچھ اس میں ہے اس کو اچھی طرح پڑھا بھی۔ اور دار آخرت بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں، تو کیا تم سمجھتے نہیں؟ اور جو لوگ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز قائم کرتے ہیں تو ہم مصلحین کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ اور یاد کرو جب ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو معلق کر دیا گویا وہ سائبان ہے اور انھوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر گرا ہی چاہتا ہے، پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی سے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم خدا کے غضب سے محفوظ رہو۔ ۱۶۷-۱۷۱

۱۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۰۳)

مِنْۢ بَعْدِهِمْ میں ضمیر کا مرجع وہ رسول اور ان کی قومیں ہیں جن کا ذکر اوپر آیت ۵۹ سے آیت ۹۲ تک گزرا۔

حضرت موسیٰ کی دعوت دوسرے انبیاء کی دعوت کے ہم رنگ تھی

بِاٰیٰتِنَآ 'آیات' سے مراد وہ معجزات بھی ہیں جو حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو دکھائے اور توحید قیامت اور رسالت کے وہ فطری اور عقلی دلائل بھی جو حضرت موسیٰ اور ہارونؑ نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کیے۔ یہ دلائل قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئے ہیں۔ ہم انشاءاللہ سورہ طٰہٰ کی تفسیر میں ان پر روشنی ڈالیں گے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت اصلاً عقل و فطرت کے بینات پر مبنی ہوتی ہے۔ حسی معجزات نبوت کے لوازم میں سے نہیں بلکہ اس کے عوارض میں سے ہیں۔ ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں پر حجت تمام کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو حسی معجزات بھی عطا فرماتا ہے۔ آگے ہم مناسب موقع پر واضح کریں گے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اس وجہ سے ان کی ذمہ داری صرف اسی قدر نہیں تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ سے آزاد کرالیں بلکہ یہ ذمہ داری بھی ان پر تھی کہ اس کو ایمان و اسلام کی دعوت دیں۔ چنانچہ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ انھوں نے یہ فریضۂ رسالت انجام دیا اگرچہ فرعون اور اس کی قوم کے لوگ ایمان نہ لائے۔ صرف تھوڑے لوگ ایمان لائے اور انھوں نے حضرت موسیٰ کے ساتھ ہجرت بھی کی۔ یہاں اس اجمالی اشارہ پر قناعت کیجیے تفصیلات آگے کی سورتوں میں آئیں گی۔ تورات میں، اس کے مرتبوں کی مخصوص ذہنیتوں کی وجہ سے، حضرت موسیٰ کی سرگزشت ایک قوم پرست لیڈر کی سرگزشت بن گئی ہے حالانکہ حضرت موسیٰؑ ایک جلیل القدر نبی اور رسول تھے۔ ان کی دعوت دوسرے انبیا کی دعوت اور ان کا طریقۂ کار دوسرے رسولوں کے طریقۂ کار سے بالکل مختلف کس طرح ہو سکتا ہے!

'فَظَلَمُوْا بِهَا' ظَلَمُوْا کے ساتھ قرآن میں جہاں جہاں 'ب' کا صلہ آیا ہے وہاں یہ لفظ 'کَفَرُوْا' اور 'جَحَدُوْا' وغیرہ کے معنی پر متضمن ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم اور اللہ کی آیات کا انکار کیا۔ عربیت کے اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقامات میں گزر چکی ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس اسلوب کے مضمر مضمون کو کھول دیا ہے۔

سرگزشت موسیٰ اور فرعون کی تفصیل کی حکمت

اوپر اقوام عرب کی جو سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں اب ان کی تکمیل یہ حضرت موسیٰ، قوم فرعون اور بنی اسرائیل کی سرگزشت سے کی جا رہی ہے۔ یہ سرگزشت، جیسا کہ آپ نے دیکھا، نسبتہً تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ یہ سرگزشت ماضی کی کوئی بھولی بسری داستان نہیں تھی بلکہ اس کا تاریخی ریکارڈ (تحریف و تغیر کے ساتھ سہی) تورات میں موجود تھا اور بنی اسرائیل جو اس کے حامل ہونے کے مدعی تھے وہ بھی سامنے موجود تھے۔ دوسری یہ کہ یہ بنی اسرائیل ہی تھے جن سے خدا نے اپنے دین و شریعت کی امانت واپس لی اور یہ امانت اس امت کے حوالہ کی اس وجہ سے اس سرگزشت کا ہر حصہ اپنے اندر درس موعظت رکھتا ہے، اس امت کے لیے بھی اور بنی اسرائیل کے لیے بھی۔

'فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ'۔ اس سرگزشت کے سنانے کی جو اصل غایت ہے، یہ اس

کی طرف اشارہ ہے تاکہ قاری کی توجہ اصل ہدف سے ہٹنے نہ پائے۔ اس سورہ کے عمود کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس میں قریش کو، تاریخ کی روشنی میں، یہ آگاہی دی جا رہی ہے کہ تمہارے اندر ایک رسول کی بعثت نے اب تمہیں خدا کی میزانِ عدل میں لا کھڑا کیا ہے۔ اگر تم نے اس رسول کی تکذیب کر دی تو تم خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے والے ٹھہرو گے اور تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو تم سے پہلے دوسرے مفسدین کا ہو چکا ہے۔ یہ بات یہاں واضح رہنی چاہیے کہ صلاح و فلاح کا تمام منبع نبی کی دعوت ہوتی ہے۔ رسول جو نظامِ زندگی پیش کرتا ہے وہی نظام سب کی اصلاح کا ضامن ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی تکذیب اور مخالفت خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے کے ہم معنی ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ (۱۰۴-۱۰۵)

حقیق علیٰ کا مفہوم

'حَقِیْقٌ'، 'حَقَّ' اور 'حُقَّ' سے فعیل کا وزن ہے اور معنی میں مفعول کے آتا ہے۔ اس کے معنی لائق، اہل اور سزاوار کے ہیں۔ مثلاً کہیں گے 'ھو حقیق بہ' وہ اس کا اہل اور سزاوار ہے 'ھو حقیق ان یفعل کذا' وہ اہل ہے کہ فلاں کام سرانجام دے۔ اگر اس کے ساتھ 'علیٰ' آئے، جیسا کہ یہاں ہے تو، جیسا کہ صاحب اقرب الموارد نے تصریح کی ہے، اس کے معنی 'حریص' کے ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک اس کے ساتھ 'علیٰ' سے اس کے اصل مفہوم کے اندر یہ ایک اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ اضافہ اسی قاعدۂ تضمین کے تحت ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر 'ظَلَمُوْا بِھَا' میں گزرا۔ اس وضاحت کی روشنی میں 'حقیق علی ان لا اقول علی اللہ الا الحق' کا ترجمہ میرے نزدیک یہ ہو گا کہ میں اہل اور حریص ہوں اس بات کا کہ خدا پر نہ لگاؤں مگر وہی بات جو حق ہے۔ ظاہر ہے کہ جو خدا کا رسول اور سفیر ہو وہی سب سے زیادہ اہل اس بات کا ہو سکتا ہے کہ خدا کی صحیح صحیح ترجمانی کرے، اس پر کوئی من گھڑت بات نہ لگائے اس لیے کہ اس کا علم ظن و قیاس پر نہیں بلکہ براہِ راست خدا کی وحی اور خطاب پر مبنی ہوتا ہے اور اپنے منصب کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے وہ اس بات کا نہایت حریص بھی ہوتا ہے کہ اس کی زبان سے کوئی کلمہ حق کے خلاف نہ نکلے اس لیے کہ جس پرسش کا خوف اسے ہوتا یا ہو سکتا ہے، کسی دوسرے کو نہ ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔

معجزات کے باب میں حضرت موسیٰ کے ساتھ خاص معاملہ

قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ 'بینۃ' سے مراد یہاں 'عصا' اور 'ید بیضا' کا وہ معجزہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو مسلح کر کے فرعون کے پاس بھیجا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ چونکہ فرعون کی سرکشی اور اس کے تمرد سے اچھی طرح باخبر تھے۔ اس وجہ سے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا تو وہ اس بارِ گراں سے بہت مضطرب ہوئے۔ انھوں نے عرض کی کہ فرعون اور اس کے درباری میری بات سننے والے نہیں ہیں، وہ میری بات تب سنیں گے جب مجھے کوئی ایسی کھلی ہوئی نشانی عطا ہو جو ان کو مرعوب کر سکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس خاص حالت کے سبب سے شروع ہی میں حضرت موسیٰ کو یہ

معجزے عطا فرمائے اور چونکہ حضرت موسیٰ فرعون اور اس کے درباریوں کی ذہنیت سے آگاہ تھے اس وجہ سے انھوں نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے ان معجزات کا اظہار بھی کر دیا تاکہ فرعونیوں کے کبر پر کچھ ضرب لگے اور وہ ان کی بات سننے پر آمادہ ہوں۔

بنی اسرائیل کو لے جانے کے مطالبہ کی نوعیت

'فَاَرۡسِلۡ مَعِیَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ' (میرے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے) یہاں دو سوال ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے کوئی دعوت نہیں پیش کی، بس بلا تمہید یہ مطالبہ ہی ان کے سامنے رکھ دیا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے؟ دوسرا یہ کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں انبیا اور اقوام کی جو سرگزشتیں بیان ہوتی ہیں وہ مختلف سورتوں میں، سورتوں کے عمود و مضمون کے اعتبار سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیان ہوئی ہیں۔ ہر سورہ میں سرگزشت کا اتنا ہی حصہ زیر بحث آیا ہے جتنے کے لیے سورہ کا مزاج مقتضی ہوا ہے۔ یہ سورہ، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، صرف انبیا کے مکذبین کے انجام کو ظاہر کر رہی ہے اس وجہ سے اس میں حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت کا صرف وہی حصہ نمایاں ہوا ہے جو سورہ کے موضوع کو اجاگر کرنے والا ہے، اس کے بقیہ اجزا دوسری سورتوں میں اپنے اپنے مواقع کی مناسبت سے آئے ہیں۔ چنانچہ دوسری سورتوں میں خشیت اور تذکر کی اس دعوت کا بھی ذکر ہے جو حضرات انبیا علیہم السلام کی عام سنت کے مطابق حضرت موسیٰ نے فرعون کو دی اور توحید و معاد سے متعلق اس مناظرے کا بھی ذکر ہے جو فرعون اور حضرت موسیٰ کے درمیان ہوا۔ انشاء اللہ سورۂ طٰہٰ یا کسی اور مناسب محل میں، یہ چیزیں زیر بحث آئیں گی۔

دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ قرآن میں اس بات کی کوئی وضاحت نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے۔ تورات کی کتاب خروج کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے ابتداءً یہ مطالبہ فرعون کے سامنے اس شکل میں رکھا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ عبادت کے لیے جانے دے۔ فرعون نے اس مطالبہ کو ماننے سے صاف انکار کر دیا بلکہ غصہ میں آکر بنی اسرائیل کی بیگار اور مشقت میں اس نے مزید اضافہ کرنے کے احکام جاری کر دیے کہ یہ کاہل اور کام چور ہو گئے ہیں اسی وجہ سے عبادت وغیرہ کے بہانے تلاش کر رہے ہیں۔ پھر حضرت موسیٰ کے معجزوں سے زچ ہو کر جب وہ ذرا نرم پڑا تو اس نے دریافت کیا کہ تم کہاں عبادت کے لیے جانا چاہتے ہو، یہ عبادت اسی شہر میں کیوں نہیں کر لیتے؟ حضرت موسیٰ نے جواب میں فرمایا کہ ہم اس عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جائیں گے، یہاں ہم یہ عبادت اس لیے نہیں کر سکتے کہ ہم جس چیز کی قربانی کرنا چاہتے ہیں اس کی قربانی اگر ہم نے یہاں کی تو یہ مصری ہمیں سنگسار کر دیں گے۔ یہ جھگڑا عرصہ تک حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان چلتا رہا۔ بالآخر ان آفتوں سے تنگ آکر جو حضرت موسیٰ کے معجزوں سے ظاہر ہوئیں، درباریوں نے فرعون کو مجبور کیا کہ وہ بنی اسرائیل کو جہاں جانا چاہتے ہیں جانے دے ورنہ

موسیٰ کے ہاتھوں مصر تباہ ہو جائے گا۔ فرعون نے مجبور ہو کر اجازت تو دے دی لیکن جب حضرت موسیٰ اپنی پوری قوم کو زن و فرزند، مال مویشی اور جملہ اسباب و سامان کے ساتھ لے کر نکلے تو اس کو احساس ہوا کہ یہ اجازت دینے میں اس نے غلطی کی۔ چنانچہ اس نے اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا کہ مجبور کر کے ان کو واپس لائے لیکن یہ تعاقب اس نتیجہ پر منتہی ہوا کہ فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے اپنی پوری اسکیم واضح نہیں فرمائی تھی۔ صرف اتنا ظاہر کیا کہ وہ تین دن کی راہ بیابان میں جا کر خدا کی عبادت اور قربانی کرنا چاہتے ہیں اور قربانی بھی خاص طور پر گائے کی کرنا چاہتے ہیں جس سے قبطیوں نے بنی اسرائیل کو اسی طرح محروم کر رکھا تھا جس طرح بھارت میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو محروم کر رکھا ہے۔ حضرت موسیٰ نے چاہا کہ مصر کے غلامانہ ماحول سے الگ لے جا کر بنی اسرائیل کو منظم اور ان کے اندر ان تمام دینی روایات کو از سر نو زندہ کریں جو مصر کی محکومانہ زندگی میں بالکل مردہ ہو چکی تھیں۔ ہمارا قیاس ہے کہ اس مقصد کے لیے وہ سینا کے اسی علاقے میں جانا چاہتے ہوں گے جہاں انھوں نے مدین سے واپسی کے موقع پر خدا کی تجلی دیکھی تھی اور پھر جہاں ان کو اس ہجرت کے سفر میں احکام عشرہ کی الواح عطا ہوئیں۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مطالبہ کے منوانے میں حضرت موسیٰ کے کئی سال صرف ہو گئے۔ اس مدت میں انھوں نے اپنے گوناگوں معجزات اور اپنے داعیانہ دلائل سے ایک طرف تو فرعون اور مصریوں پر اللہ کی حجت تمام کر دی، دوسری طرف بنی اسرائیل کو آزمائش کی مختلف بھٹیوں سے گزار کر اس قابل کیا کہ وہ از سر نو شریعت الٰہی کی امانت کے حامل بن سکیں۔ اس طرح بالآخر رسولوں کی معروف سنت کے مطابق ان کے لیے وقت آ گیا کہ وہ ہجرت فرمائیں۔ چنانچہ انھوں نے ہجرت فرمائی اور اس ہجرت سے ان کے اور ان کے باایمان ساتھیوں کے لیے نجات و فلاح کی راہ کھلی اور ان کے دشمن عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔ ہجرت کے باب میں، جیسا کہ ہم مختلف مقامات میں واضح کر چکے ہیں، سنت الٰہی یہی ہے اور یہ سنت جس طرح تمام رسولوں کے معاملے میں ظاہر ہوئی اسی طرح حضرت موسیٰ کے معاملے میں بھی ظاہر ہوئی۔

یہاں زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ جو لوگ مزید تفصیل کے طالب ہوں وہ ہمارے مجموعۂ مضامین میں وہ مضمون پڑھیں جو ہم نے خاص اسی موضوع پر لکھا ہے[۱]۔ اس میں ہم نے دکھایا ہے کہ حضرت موسیٰ کی جدوجہد ہر پہلو سے ٹھیک ٹھیک انبیاء و رسل کے معروف طریقہ کے مطابق تھی۔ جن لوگوں نے ان کو نعوذ باللہ ایک قوم پرست لیڈر کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے 'اَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ' کا مطلب غلط سمجھا ہے۔

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ٥ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ٥ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ (۱۰۶-۱۰۸)

---

[۱] ملاحظہ ہو ہماری کتاب 'تنقیدات'۔

معجزات کے باب میں سنت الٰہی

فرعون کے لیے یہ بات نہایت عجیب تھی کہ ایک شخص، وہ بھی اس کی رعیت میں سے، اس کے پاس خدا کا رسول ہو کر آئے۔ وہ خود، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں تصریح کر چکے ہیں، اپنے آپ کو سب سے بڑے دیوتا یعنی سورج کا اوتار اور لوگوں کا رب اعلیٰ بنائے بیٹھا تھا اس وجہ سے اس نے سنتے ہی کہا، اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ تم خدا کے رسول ہو کر آئے ہو تو اپنے رسول ہونے کی کوئی نشانی دکھاؤ۔ حضرت موسیٰؑ نے اس کے مطالبے پر 'عصا' اور 'ید بیضا' کے معجزے دکھائے۔ معجزات کے باب میں سنت الٰہی یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ قوموں کے مذاق اور رجحانات کی رعایت سے دیے جاتے ہیں تاکہ ان پر حجت ہو سکیں۔ مصر میں، تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں سحر و شعبدہ کا بڑا زور اور سوسائٹی میں ساحروں کو بڑا مقام حاصل تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ایسے معجزے دیے جن سے ساحروں کے طلسم کو باطل کیا جا سکے۔ عربوں میں اس کے برعکس، سب سے زیادہ قدر و عظمت فصاحت و بلاغت کو حاصل تھی اور سوسائٹی پر دھاک خطیبوں اور شاعروں کی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے ہمارے حضورؐ کو قرآن کا معجزہ عطا ہوا جس کی فصاحت و بلاغت نے سارے فصیحوں بلیغوں کو عاجز و درماندہ کر دیا۔ یہاں 'ثُعْبَانٌ' کے ساتھ 'مُّبِيْنٌ' کی صفت آئی ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ لٹھیا سچ مچ کا اژدہا بن گئی، ایسا کھلا اژدہا کہ کسی کے لیے ذرا شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہ بات نہیں تھی کہ ایک چیز محض رینگنے لگ گئی ہو یا اس کے اندر سر اور دم نمایاں ہو گئی ہو بلکہ عین عین اژدہا اپنی تمام خصوصیات و صفات کے ساتھ۔ اسی طرح 'بَيْضَاءُ لِلنّٰظِرِيْنَ' میں ناظرین کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہاتھ میں جو چمک ظاہر ہوتی تھی وہ محض فریب نظر کی نوعیت کی نہیں تھی بلکہ غور و تامل سے دیکھنے والوں کو اس کی تابانی بالکل اصلی و حقیقی معلوم ہوتی۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'نظر' کا لفظ اصلاً عربی میں غور و تامل سے دیکھنے کے لیے آتا ہے۔

معجزہ اور سحر کا تباین

یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ معجزہ اور سحر و شعبدہ میں امتیاز منطقی تعریف کے ذریعہ سے نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان کا اصلی فرق دو چیزوں سے نمایاں ہوتا ہے۔ اول تو باہمی تقابل سے جس طرح مس خام اور کندن کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو دونوں کا فرق صاف نمایاں ہو جائے گا اسی طرح جب ایک شخص معجزہ اور سحر کو ایک دوسرے کے مقابل میں دیکھتا ہے تو معجزے کی سطوت و جلالت، اس کے ظہور کا انداز، باطل پر اس کا غلبہ اور اس کی قہرمانیت پکار کر شہادت دیتی ہے کہ یہ کمہاروں کی مٹی سے بنا ہوا کھلونا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق کہیں اور ہی سے ہے۔

بو ہر جام جم از کانِ جہانِ دگر است

دوسری چیز پیش کرنے والے کی شخصیت اور کردار ہوتی ہے۔ سحر و شعبدے دکھانے والے ہمیشہ سوسائٹی کے اراذل و انفار ہوتے ہیں، جن کی ذلت و نکبت، جن کے اخلاق کی پستی اور طبیعت کی دناءت و رذالت ہمیشہ ضرب المثل رہی ہے۔ برعکس اس کے معجزے ان لوگوں کے ہاتھوں ظاہر ہوتے ہیں جو انسانیت کے گل سر سبد

مانے گئے ہیں، جن سے دنیا نے علم و عمل اور حکمت و معرفت کے سبق سیکھے ہیں، جن کی زندگی کا ہر دور اور جن کا ہر قول و فعل اسوہ اور نمونہ قرار پایا ہے، جو زندگی کی سخت سے سخت آزمائشوں میں بھی ہمیشہ سو فی صدی کھرے پائے گئے ہیں۔ یہاں ان اشارات پر کفایت کیجیے، آگے مناسب مواقع سے ان کی تفصیل آئے گی۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۝ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝ ۱۰۹-۱۱۲

'قَالَ الْمَلَاُ الاية' یہ وہ مشورت ہے جو فرعون کے درباریوں نے حضرت موسیٰ کے معجزے دیکھ کر پہلے آپس میں کی، پھر اپنی طے شدہ رائے فرعون کی خدمت میں پیش کی۔ انھوں نے رائے یہ قائم کی کہ یہ شخص کچھ ایسا ویسا جادوگر نہیں ہے بلکہ بڑا ماہر جادوگر ہے اور اس کے پیش نظر صرف وہی نہیں ہے جو یہ ظاہر کر رہا ہے بلکہ یہ بنی اسرائیل کو منظم کر کے یہ چاہتا ہے کہ ہم کو ہمارے ملک سے بے دخل کر دے۔

فرعون اور اس کے درباریوں کا سیاسی سٹنٹ

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ فی الواقع ان کے دل میں بھی وہی بات رہی ہو جو زبان پر آئی۔ وہ حضرت موسیٰ اور ہارونؑ سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے ماضی و حاضر اور ان کے اخلاق و کردار کو سامنے رکھ کر وہ آسانی سے فیصلہ کر سکتے تھے کہ حضرت موسیٰ نہ تو کوئی جادوگر ہو سکتے اور نہ اصلاح کے سوا ان کے سامنے کوئی اور مقصد ہو سکتا لیکن ارباب اقتدار کا ہمیشہ یہ شیوہ رہا ہے کہ جب ان کے مقابل میں کوئی اصلاحی دعوت اٹھی ہے تو انھوں نے اپنے عوام کو اس سے برگشتہ کرنے کے لیے اس کے اندر کوئی نہ کوئی خطرناک سیاسی معنی و مفہوم پیدا کرنے کی ضرور کوشش کی ہے۔ یہی حرکت فرعون کے درباریوں نے کی۔ انھوں نے حضرت موسیٰ کی اس خالص اصلاحی دعوت اور جدوجہد کو متہم کرنے کے لیے یہ اشغلا چھوڑا کہ یہ درحقیقت ارسٹوکریسی کو اس ملک سے بے دخل کرنے کی ایک سازش ہے۔

فرعون کے درباریوں کا یہ اسٹنٹ وقت کے حالات کے لحاظ سے ایک موثر اور کارگر اسٹنٹ تھا۔ یہ مصر کے جس دور کی سرگزشت بیان ہو رہی ہے اس دور کی تاریخ تورات میں پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں فرعون اور اس کے اعیان اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ بنی اسرائیل کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ طاقت پکڑ جائیں اور ایک دن ہمیں اس ملک سے نکال چھوڑیں۔ تورات کی کتاب خروج سے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اور اسرائیل کی آل اولاد برومند اور کثیر التعداد اور فراواں اور نہایت زور آور ہوگئی اور وہ ملک ان سے بھر گیا۔

تب مصر میں ایک نیا بادشاہ پیدا ہوا جو یوسف کو نہیں جانتا تھا اور اس نے اپنی قوم کے لوگوں کو کہا دیکھو اسرائیلی ہم سے زیادہ اور قوی ہو گئے ہیں سو آؤ ہم ان کے ساتھ حکمت سے پیش آئیں تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور اس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور ملک سے

نکل جائیں۔ اس لیے انھوں نے ان پر بے گار لینے والے مقرر کیے جو ان سے سخت کام لے لے کر ان کو ستائیں .... پر انھوں نے جتنا ان کو ستایا وہ اتنا ہی زیادہ بڑھتے اور پھیلتے گئے اس لیے وہ لوگ بنی اسرائیل کی طرف سے فکرمند ہو گئے ...... تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائیوں سے کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے تم بچہ جناؤ .... تو اگر بیٹا ہو تو اسے مار ڈالنا اور اگر بیٹی ہو تو وہ جیتی رہے ..... اور فرعون نے اپنی قوم کے سب لوگوں کو تاکیداً کہا کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم اسے دریا میں ڈال دینا اور جو بیٹی ہو اسے جیتی چھوڑنا۔

(خروج باب ۱ — ۲۲)

یہ طویل اقتباس ہم نے محض اس لیے پیش کیا ہے کہ اندازہ ہو سکے کہ مصر کی ارسٹوکریسی بنی اسرائیل کی تعداد اور ان کی قوت سے اس زمانے میں کس درجہ تشویش میں مبتلا تھی اسی زمانے میں حضرت موسیٰؑ کی دعوت بلند ہوتی ہے اور وہ بھی اس انداز سے کہ وہ تمام بنی اسرائیل کو تین دن کی راہ بیابان میں عید قربان منانے کے لیے لے جانے کا مطالبہ پیش کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں فرعون کے اعیان کے پاس اپنی قوم کو حضرت موسیٰؑ اور ان کی دعوت سے وحشت زدہ کرنے کے لیے اس سے زیادہ کارگر حربہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ یہ شگوفہ چھوڑیں کہ اب وہ خطرہ سامنے آگیا ہے جس کا ڈر لگا ہوا تھا یعنی یہ شخص بنی اسرائیل کو منظم کر کے اب تمہیں اس ملک سے بے دخل کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے تو تم اپنا تحفظ چاہتے ہو تو اس کے مقابلے کے لیے کمریں کس لو۔

'قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ' یہ وہ مشورہ ہے جو پورے اتفاق رائے کے ساتھ درباریوں کی طرف سے فرعون کو پیش کیا گیا۔ وہ یہ کہ موسیٰؑ اور ہارونؑ کے معاملے میں کوئی عاجلانہ کارروائی مناسب نہیں ہوگی۔ تقاضائے مصلحت یہ ہے کہ ابھی ان کو ٹالیے اور مملکت کے تمام حصوں میں ہرکارے بھیج کر ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو جمع کیجیے تاکہ وہ کسی پبلک اجتماع میں اپنے فن سے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو ایسی شکست دیں کہ ان کی ہوا اکھڑ جائے۔ اگر عام جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرایا گیا تو اندیشہ ہے کہ وہ اس مقابلہ میں شکست کھا جائیں گے اور الٹے ہماری ہوا خیزی ہوگی۔

'اَرْجِهْ' اصل میں 'اَرْجِئْهُ' ہے۔ 'اِرْجَاء' کے معنی ٹالنے، کسی معاملے کو کسی دوسرے وقت پر محول کرنے، کسی کو منتظر بنانے کے ہیں۔ قرآن میں اس کے مختلف صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں یہ ہمزہ کے حذف اور 'ہ' کے سکون کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ تلفظ کا یہ اسلوب اہل عرب کے قاعدے کے مطابق ہے۔ بعض مرتبہ وہ لفظ کو ہلکا کرنے کے لیے اس طرح کا تصرف کر دیتے ہیں۔ صاحب لسان نے اس کی بعض واضح مثالیں نقل کی ہیں۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۱۱۳ - ۱۱۴)

یہاں قرآن نے اپنے معروف طریقہ کے مطابق سرگزشت کا غیر ضروری حصہ نظر انداز کر دیا ہے یعنی درباریوں کی اس صلاح کے بموجب فرعون نے مملکت کے تمام شہروں کو ہرکارے دوڑائے جو ہر جگہ سے ماہر فن جادوگروں کو جمع کر کے لائے اور ان کو فرعون کے دربار میں حاضر کیا۔ چونکہ یہ بات موقع کلام سے خود واضح تھی اس وجہ سے اس کو

نظر انداز کر کے آگے کی بات لے لی کہ ساحروں نے سامنے آتے ہی پیشہ وروں کے عام طریقہ کے مطابق خوشامدانہ انداز میں اپنے اس ارمان اور توقع کا اظہار کیا کہ اگر ہم نے بازی جیتی تو سرکار سے بڑا انعام ملے گا۔ فرعون نے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا، انعام تو جو ملنا ہے ملے گا ہی، تم پر مزید نوازش یہ ہوگی کہ تم خاص مقربین میں شامل کیے جاؤ گے۔

ساحروں کی اخلاقی پستی ایمان لانے سے پہلے

قرآن نے ساحروں کی اس حرص و طمع کا اظہار خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ واضح ہو جائے کہ ساحروں اور شعبدہ بازوں کی اخلاقی پستی اور دنائت کا کیا حال ہوتا ہے۔ پھر آگے چل کر انہی ساحروں کا وہ انقلاب حال نمایاں کیا ہے جو ایمان کی دولت نصیب ہوتے ہی ان کے اندر پیدا ہوا کہ مال و زر کی طمع تو درکنار ان کو اپنی جان کی بھی کوئی پروا نہیں رہی اور فرعون کی دھمکی کے جواب میں انھوں نے صاف سنا دیا کہ جو کرنا ہے کر گزرو ہمیں کوئی پروا نہیں ہے۔ 'اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ'۔

قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِیَ وَاِمَّاۤ اَنۡ نَّکُوۡنَ نَحۡنُ الۡمُلۡقِیۡنَ ۔ قَالَ اَلۡقُوۡا ۚ فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا سَحَرُوۡۤا اَعۡیُنَ النَّاسِ وَاسۡتَرۡہَبُوۡہُمۡ وَجَآءُوۡ بِسِحۡرٍ عَظِیۡمٍ (۱۱۵-۱۱۶)

حضرت موسیٰ کا اعتماد اللہ پر

ساحروں نے اپنے پیشہ ورانہ اخلاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگرچہ پیش کش تو حضرت موسیٰ کو کی کہ وہ چاہیں تو پہلے اپنا فن دکھائیں لیکن دبی زبان سے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا کہ وہ پہل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ حضرت موسیٰ نے پہلے انہی کو موقع دیا کہ وہ اپنا ہنر دکھائیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت موسیٰ کو پورا اعتماد تھا کہ انھیں خدا کی تائید حاصل ہے اس وجہ سے یہ ساحر کتنا ہی بڑا جادو دکھائیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سحر کو باطل کر کے رہے گا۔

'سَحَرُوۡۤا اَعۡیُنَ النَّاسِ وَاسۡتَرۡہَبُوۡہُمۡ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ جادو خواہ کتنا ہی بڑا ہو لیکن اس سے کسی شے کی حقیقت و ماہیت نہیں بدلتی بلکہ دیکھنے والوں کی آنکھوں اور ان کی قوت متخیلہ پر اس کا اثر پڑتا ہے جس سے آدمی ایک شے کو اس شکل میں دیکھنے لگتا ہے جس شکل میں ساحر اس کو دکھانا چاہتا ہے۔

'اِلۡقَآء' کا لفظ یہاں پیش کرنے اور دکھانے کے مفہوم میں ہے۔ جس طرح پانسے اور جوئے کے تیر پھینکے جاتے ہیں اسی طرح ساحر بھی کوئی چیز ناظرین کے سامنے پھینکتے ہیں اور اس پر اپنا جادو دکھاتے ہیں۔ اس مناسبت سے اس کے لیے لفظ 'اِلۡقَآء' کا استعمال موزوں ہوا۔

وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنۡ اَلۡقِ عَصَاکَ ۚ فَاِذَا ہِیَ تَلۡقَفُ مَا یَاۡفِکُوۡنَ ۔ فَوَقَعَ الۡحَقُّ وَبَطَلَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۔ فَغُلِبُوۡا ہُنَالِکَ وَانۡقَلَبُوۡا صٰغِرِیۡنَ ۔ وَاُلۡقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیۡنَ ۔ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۔ رَبِّ مُوۡسٰی وَہٰرُوۡنَ (۱۱۷-۱۲۲)

سحر اور معجزہ میں ایک فرق

'لقف' کے معنی کسی چیز کو جلدی جلدی نگلنے اور 'افک' یا 'افک' کے معنی جھوٹی اور خلاف واقعہ بات کہنے یا کرنے کے ہیں۔ اوپر گزرا کہ سحر سے کسی شے کی حقیقت یا ماہیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ اس کا تمام تر تعلق

دیکھنے والوں کی نگاہ اور ان کی قوت متخیلہ کے تاثر سے ہوتا ہے اس وجہ سے سحر سے جو کرشمہ ظاہر ہوتا ہے وہ یکسر باطل، جھوٹ اور فریب نظر و تخیل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس معجزہ یکسر حقیقت ہوتا ہے۔ فرمایا کہ جب ساحروں نے اپنا سحر دکھایا اور اس کے اثر سے ان کی رسیاں سانپوں کی طرح رینگتی نظر آئیں تو ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ تم اپنا عصا پھینکو وہ اژدہا بن کر ان کے تمام نمائشی سانپوں سپنولیوں کو ہڑپ کر جائے گا۔

کرمکِ شب اور خورشید جہاں تاب

'فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ' یہ بالکل ویسی ہی بات ہے کہ کرمکِ شب کے مقابلہ میں خورشید جہاں تاب نکل آئے۔ ظاہر ہے کہ ہزاروں مصنوعی چاند سورج ہوں جب بھی حقیقی سورج کے نکلتے ہی ان کی چمک دمک ملمع کی طرح غائب ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ کے معجزہ کے ظاہر ہوتے ہی ساحروں کا سارا طلسم غائب ہو گیا۔ اوپر ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ معجزہ اور سحر کا حقیقی فرق میدانِ مقابلہ میں نمایاں ہوتا ہے جب دونوں کا تصادم ہوتا ہے تو حق لازماً غالب ہوتا ہے اور باطل لازماً شکست کھاتا ہے۔

'فَغُلِبُوا هُنَالِكَ' یہ بات صرف ساحروں سے متعلق نہیں بلکہ فرعون اور اس کے تمام اعیان و انصار سے متعلق ارشاد ہوئی ہے کہ وہ میدان مقابلہ سے ذلیل و خوار ہو کر لوٹے۔ قرآن میں دوسری جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ یہ مقابلہ ایک خاص میلہ کے دن، کھلے میدان میں ہوا تھا اور فرعون کی طرف سے اس امر کا خاص اہتمام کیا گیا تھا کہ اپنے آدمی زیادہ سے زیادہ تعداد میں اکٹھے ہوں تاکہ اپنی فتح کا ڈنکا پوری دھوم سے بجایا جائے لیکن ایسی رسوائی ہوئی کہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

'وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ' ساحر حضرت موسیٰ کے معجزے کی قہرمانیت سے اتنے متاثر و مرعوب ہوئے کہ بے تحاشا سجدے میں گر پڑے۔ مجہول کا صیغہ ان کے جذبۂ تعظیم و اکرام سے مغلوبیت کی تعبیر کے لیے ہے۔ تعظیم و اکرام کے لیے سجدہ کا رواج مصریوں، عربوں، اسرائیلیوں سب میں رہا ہے اگرچہ اکثر حالات میں اس کی حد وہی ہوتی تھی جو ہمارے ہاں نماز میں رکوع کی ہوتی ہے۔

ساحر سحر اور معجزے کے فرق کو سب سے زیادہ جانتا ہے

اس سے واضح ہوا کہ سحر اور معجزے میں امتیاز کی سب سے زیادہ صلاحیت خود ساحر کے اندر ہوتی ہے بشرطیکہ اس کے اندر اعتراف حق کے لیے اخلاقی جرأت ہو۔ ساحر اپنے علم کی حقیقت اور اپنے مبلغ سے اچھی طرح آشنا ہوتا ہے اس وجہ سے جب اس کو معجزہ سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ دیکھتے ہی تاڑ جاتا ہے کہ یہ چیز اس کے فن سے ماوراء ہے۔ چنانچہ فرعون کے ان ساحروں نے بھی دیکھتے ہی اپنی بے بسی اور حضرت موسیٰ کی فاتحیت کا اعتراف کر لیا اور ان کی تعظیم میں سر جھکا دیے۔

ساحروں کے اندر حق پسندی کی رمق موجود تھی

'قَالُوا آمَنَّا الآية' ساحروں نے حضرت موسیٰ کی تعظیم ہی پر بس نہیں کیا بلکہ صاف صاف اپنے ایمان کا اعلان بھی کر دیا اور وہ بھی اس تصریح کے ساتھ کہ ہم عالم کے رب، موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لائے جس کے صاف معنی یہ بھی تھے کہ انھیں فرعون کی خدائی سے انکار ہے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس اعلان کا سارے مجمع پر کیا اثر پڑا ہو گا اور فرعون اور اس کے درباریوں کی کیسی رسوائی ہوئی ہو گی! یہاں یہ بات

رکھنی چاہیے کہ ہرچند یہ لوگ جادوگر تھے اور ان کے اندر اس پیشہ کی بعض خصوصیات بھی، جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، پیدا ہوگئی تھیں تاہم حق پسندی کی کچھ رمق ان کے اندر موجود تھی۔ چنانچہ سورۂ طٰہٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقابلہ کے لیے وہ خوش دلی سے نہیں آئے تھے بلکہ مجبور کر کے لائے گئے تھے۔ خود ان کا قول نقل ہوا ہے کہ إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطَايَانَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ (۷۳ طٰہٰ) (ہم اپنے رب پر ایمان لائے کہ وہ ہماری خطاؤں اور اس سحر کو معاف کرے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا) ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے اندازہ رکھتے ہوں کہ حضرت موسیٰ کوئی ساحر نہیں ہیں اور نہ انھوں نے جو چیز پیش کی ہے وہ سحر ہے۔ اس وجہ سے وہ ان کے مقابلہ سے گریز کرنا چاہتے رہے ہوں لیکن فرعون اور اس کے کارندوں کے ڈر سے انھیں مجبوراً یہ کام کرنا پڑا ہو۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اندر حق پسندی کی ایک روشنی دبی دبائی موجود تھی جو حضرت موسیٰ کے اس معجزے کی جلالت سے بھڑک اٹھی۔ سعادت کا کوئی شمہ بھی انسان کے اندر موجود ہو تو بتوفیق الٰہی وہ اپنا اثر دکھا ہی جاتا ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ آمَنتُم بِهِ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ ۖ إِنَّ هَٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوهُ فِي الْمَدِينَةِ لِتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ (۱۲۳-۱۲۴)

فرعون ایک کائیاں سیاسی تھا

یہ بڑا ہی نازک موقع تھا۔ فرعون اور اس کے درباریوں بلکہ اس کی پوری قوم کی ہوا بالکل اکھڑ چکی تھی لیکن یہ فرعون بھی بڑا ہی کائیاں سیاسی تھا۔ اس نے بگڑتے ہوئے حالات سنبھالنے کے لیے فوراً یہ اشتلا چھوڑا کہ یہ ان ساحروں اور موسیٰ کی ملی بھگت ہے۔ یہ ساحر ہم کو یہاں سے بے دخل کرنے کی سازش میں موسیٰ کے ساتھ شریک ہیں۔ انھوں نے پہلے سے آپس میں یہ مشورت کر رکھی تھی کہ ہم عین موقع پر اپنی شکست مان کر اپنے ایمان کا اعلان کر دیں گے جس سے موسیٰ کی دھاک سب پر بیٹھ جائے گی اور اس طرح ہم موجودہ برسر اقتدار گروہ کا اقتدار ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس نے ان پر سازش اور بغاوت کا الزام رکھ کر ان کے لیے اس سزا کا بھی اعلان کر دیا جو ریاست کے باغیوں کے لیے ملک کے قانون میں موجود تھی۔ یعنی پہلے ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے جائیں پھر برسرعام سولی دی جائے۔

فرعون کے قول آمَنتُم بِهِ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس کی حکومت میں مذہبی آزادی کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور ہو بھی کیسے سکتی تھی جب کہ بادشاہ خود اپنے آپ کو لوگوں کا رب اعلیٰ بنائے بیٹھا تھا۔ اس صورت میں تو جو بھی اس کے سوا کسی اور کو رب مانتا وہ لازماً فرعون کا باغی قرار پاتا۔

قَالُوا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ ۝ وَمَا تَنقِمُ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِآيَاتِ رَبِّنَا لَمَّا جَاءَتْنَا ۚ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ (۱۲۵-۱۲۶)

ایمان باللہ کا کرشمہ

ایمان باللہ کا کرشمہ دیکھیے۔ یہ وہی جادوگر ہیں جن کی دنائت اور پست ہمتی کا ابھی چند منٹ پہلے یہ حال تھا کہ اپنے کرتب دکھانے کے لیے فرعون کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو بھانڈوں، نقالوں اور مسخروں کی طرح

اپنے فن کے مظاہرہ پر بھرپور انعام کی التجائیں کرتے ہیں یا ایمان کی روشنی دل میں داخل ہوتے ہی ان کے باطن کا ہر گوشہ اس طرح جگمگا اٹھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے تاریکی کی کوئی پرچھائیں ان کے دلوں پر کبھی پڑی ہی نہیں تھی۔ اور یہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان نہیں بلکہ یہ عزیمت و استقامت کے پہاڑ اور پاکیزگی و قدوسیت کے ملائکہ صفت پیکر ہیں۔ غور کیجیے، فرعون نے کتنی بڑی دھمکی ان کو دی! لیکن انھوں نے اس کے جواب میں فرمایا تو یہ فرمایا کہ کچھ غم نہیں، اگر تم نے ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سولی دے دی تو ہم کہیں اور نہیں جائیں گے اپنے رب ہی کے پاس جائیں گے اور جب تیرا سارا غضب ہمارے اوپر اس جرم میں ہے کہ ہم اپنے رب کی آیات پر، جب کہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لائے تو جو کچھ تو کر سکتا ہے وہ کر گزر، اگر اس جرم کی یہ سزا ہے تو ہم اس سزا کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ایمان باللہ کے نتیجہ میں انقلاب حال

اس انقلابِ حال کے سبب پر غور کیجیے تو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ اگر انسان ایمان سے خالی ہے تو اس سے زیادہ حقیر کوئی شے نہیں اور اگر وہ ایمان سے بہرہ مند ہے تو اس سے زیادہ بلند کوئی شے نہیں۔

'رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ' یہ آگے پیش آنے والے حالات میں صبر و استقامت کی توفیق بخشے جانے کی دعا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ایمان کا اعلان کر دیا ہے اور فرعون نے اپنی سزا اعلان کی۔ اب ہمارا سارا بھروسا اے رب، تیرے اوپر ہے۔ تو ہمارے اوپر صبر کے ڈونگرے برسا اور تمام آزمائشوں کے علی الرغم موت ایمان و اسلام پر عطا فرمایا۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۭ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ (۱۲۷)

فرعون کے درباریوں کی بوکھلاہٹ

اس کھلے مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ کی کامیابی نے فرعون اور اس کے درباریوں کو بالکل بوکھلا دیا۔ درباریوں نے فرعون سے باصرار یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب موسیٰؑ اور ان کی قوم کو مزید ڈھیل دینے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اگر ان کو مزید موقع دیا گیا تو یہ آپ کو اور آپ کے بتوں کو چھوڑ بیٹھیں گے اور ملک میں بغاوت کرا دیں گے۔ فرعون نے ان کو اطمینان دلایا کہ گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہمارا اقتدار پوری طرح ان کے اوپر مستحکم ہے۔ ہم ان کے ذکور کو قتل کرتے رہیں گے، ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ہمارے قابو میں ہیں اگر ہم ان کو زور پکڑنے دینا نہ چاہیں تو یہ کیا کر سکتے ہیں۔

لڑکوں کے قتل کی سکیم

اوپر لڑکوں کے قتل اور لڑکیوں کے زندہ رکھنے کی ظالمانہ اسکیم کا ذکر گزر چکا ہے۔ یہ اسکیم اسی لیے اختیار کی گئی تھی کہ بنی اسرائیل کی تعداد ملک میں اتنی زیادہ نہ ہو جائے کہ وہ ارسٹوکریسی کے لیے خطرہ بن جائیں۔ اول اول تو یہ اسکیم دائیوں کے عدم تعاون کی وجہ سے ناکام ہو گئی لیکن فرعون اس ناکامی سے مایوس نہیں ہوا بلکہ اس نے عام لوگوں کو یہ حکم دے دیا کہ وہ بنی اسرائیل کے بچوں کو دریا میں پھینک دیا کریں۔ یہاں فرعون نے اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم بہرحال ان کو اپنے لیے خطرہ نہیں بننے دیں گے۔ اگر ضرورت

محسوس ہوئی تو ہم اسی اسکیم کو مزید قوت و شدت کے ساتھ چلائیں گے۔

دو طرفہ خطرہ

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگرچہ فرعونی اسرائیلیوں سے اس درجہ خائف تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھے کہ وہ مصر سے یک قلم نکل جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصر کی تمام رفاہیت و خوش حالی انہی غلاموں کی رہین احسان تھی۔ اوپلے تھاپنے، اینٹیں بنانے سے لے کر زراعت اور تعمیرات کے سارے کام انہی کی مشقت سے انجام پاتے تھے۔ فرعون اور اس کی قوم کے لوگوں کا کام صرف عیش کرنا اور ان اسرائیلیوں پر حکومت کرنا اور ان سے بیگار لینا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں نہ تو فرعونیوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اسرائیلیوں کو بڑھنے اور پنپنے کا موقع دیں، نہ یہ ممکن تھا کہ ان کو یک قلم مصر سے نکل جانے دیں۔ اس دو طرفہ خطرے سے بچنے کے لیے فرعون اور اس کے لال بجھکڑوں نے یہ پالیسی بنائی کہ ان کی نرینہ اولاد کو قتل کر کے ان کی تعداد کو قابو میں رکھا جائے۔ آدمی جب اپنے حدود سے تجاوز کر کے خدائی حدود میں مداخلت شروع کر دیتا ہے تو اس کی عقل اسی طرح ماری جاتی ہے۔

فرعون کے دعوائے الوہیت کی نوعیت

'وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ' کی تاویل میں ہمارے علما اور مفسرین کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ اس میں اشکال یہ ہے کہ 'اٰلِهَتَكَ' کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے دیوی دیوتا بھی مصر میں تھے جن کی پرستش خود فرعون بھی کرتا تھا۔ اگر یہ بات صحیح مان لی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے رب اعلیٰ ہونے کے دعوے کی توجیہ کیا ہو گی؟ جو خود رب اعلیٰ ہونے کا مدعی ہو وہ کسی دوسرے دیوی دیوتا کو ماننے والا یا ان کی پرستش کرنے والا کیسے ہو سکتا ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ فرعون اپنے زعم کے مطابق اپنے آپ کو مصریوں کے سب سے بڑے دیوتا — سورج — کا اوتار سمجھتا تھا۔ اس طرح اس کی حیثیت اوتار بادشاہ (GOD KING) کی تھی۔ گویا وہ بیک وقت مصریوں کا بادشاہ بھی تھا اور ان کے سب سے بڑے دیوتا کا مظہر اور اوتار ہونے کے سبب سے ان کا رب اعلیٰ بھی۔ اس نے اپنے بے شمار اسٹیچو اور بت بنوا کر اپنی مملکت میں جگہ جگہ نصب کرا دیے تھے اور اس کی رعایا ان کے درشن اور ان کے آگے نذر و نذورات کرتی تھی۔ اس طرح بادشاہ کو بیک وقت رعایا پر خدائی اور شاہی دونوں کے اختیارات حاصل تھے۔ یہاں 'اٰلِهَتَكَ' کے لفظ سے اس کے انہی اسٹیچوؤں اور بتوں کی طرف اشارہ ہے جو اس کی ذات کی نمائندگی کرتے تھے۔ مصر کے قدیم مندروں کے جو آثار ملے ہیں ان سے بھی اسی بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۭ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۲۸-۱۲۹)

تفسیر سورۂ بقرہ کی فصل ۳۲ میں ہم اقامت دین کی جدوجہد میں صبر اور نماز کی اہمیت پر بحث کر چکے ہیں۔ وہ حقیقت

اقامت دین کی جدوجہد میں وسیلۂ ظفر صبر اور نماز

اس جہاد میں یہی دو چیزیں وسیلۂ ظفر ہیں۔ قرآن میں مشکلات راہ کے مقابلہ کے لیے ہر جگہ انھی دو ہتھیاروں سے مدد حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہاں اگرچہ بظاہر لفظ اللہ وارد ہوا ہے لیکن اس سے مراد نماز ہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے استعانت کا ذریعہ نماز ہی ہے۔ فرعون نے اس شکست سے گھبرا کر بنی اسرائیل کو دبانے اور ان کی نسل کو تباہ کرنے کا جو عزم ظاہر کیا اس سے قدرتی طور پر بنی اسرائیل کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ ان کی اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے حضرت موسیٰؑ نے ان کو نماز اور صبر کی تلقین کی۔ فتنوں اور آزمائشوں میں استقامت بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ کام اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے کہ 'وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ' (اور تمھیں صبر نہیں حاصل ہو سکتا مگر اللہ ہی کی مدد سے) اللہ کی یہ مدد حاصل کرنے کا واسطہ نماز ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس نماز سے مراد صرف عام نماز نہیں ہے بلکہ وہ خاص نماز بھی ہے جس کی تاکید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو مکی زندگی کے ابتدائی پُرمحن دور میں کی گئی تھی۔ اسی چیز کی تاکید حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی کی گئی۔ سورہ یونس کی آیت ۸۷ کے تحت انشاء اللہ ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

رسول کے لیے غلبہ لازمی ہے

'اِنَّ الۡاَرۡضَ لِلّٰهِ الایۃ' یہ فرعون کے اس غرور کی جو 'اِنَّا فَوۡقَهُمۡ قٰهِرُوۡنَ' کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے، تردید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے منہ سے اپنے متعلق جو چاہے قاہر و مقتدر ہونے کا دعویٰ کرتا رہے لیکن زمین کا اصل مالک اللہ ہے، وہی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور عاقبت کی کامیابی بہر حال خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔ رسولوں سے متعلق اس سنت الٰہی کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو لازماً ان کے دشمنوں پر غلبہ عطا فرماتا ہے۔ عام اس سے کہ یہ غلبہ ان کی زندگی ہی میں حاصل ہو یا ان کی زندگی کے بعد ان کے پیرووں کو حاصل ہو اور قطع نظر اس سے کہ وہ اسی سرزمین پر قابض ہوں جس میں انھوں نے اپنی دعوت بلند کی یا اللہ تعالیٰ ان کو اس علاقے سے ہجرت کا حکم دے اور ان کی برومندی کے لیے زمین کے کسی اور خطے کا انتخاب فرمائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دشمن پر غلبہ تو ان کی زندگی ہی میں بلکہ مذکورہ بالا واقعات کے پیش آنے کے بہت تھوڑے عرصے کے بعد ہی حاصل ہو گیا لیکن ان کی امت کو حکومت عطا ہوئی فلسطین کی سرزمین کی اور یہ کام تکمیل کو پہنچا ان کی وفات کے بعد۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مصر میں بھی اس عذاب کے بعد، جو فرعون اور اس کی قوم پر آیا، وہ اریسٹوکریسی بالکل تباہ ہو گئی جو مصر پر قابض تھی اور ان کی جگہ دوسرے لوگ قابض ہو گئے جو خاندان اور روایات میں بالکل مختلف تھے اور ان کے ساتھ سابق حکمرانوں کی سیاسی رقابتیں بھی تھیں اور ان کی طرف سے یہ اندیشہ بھی فرعونیوں کو تھا کہ یہ بنی اسرائیل کے ساتھ سازباز کر کے کہیں ملک کے حکمران نہ بن بیٹھیں۔ یہ مسئلہ چونکہ تاریخ کا ہے اور براہ راست ہم سے متعلق نہیں ہے اس وجہ سے ہم صرف اشارے پر کفایت کرتے ہیں، تفصیل کے طالب اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔

بنی اسرائیل کی بے اعتقادی

'قَالُوۡۤا اُوۡذِيۡنَا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَاۡتِيَنَا الایۃ' بنی اسرائیل پر، ان کی بے یقینی اور ضعیف الاعتقادی کے سبب سے

حضرت موسیٰ کی یہ تلقین بے اثر ہی رہی۔ وہ بولے کہ ہمارے دن تو سخت سے سخت ہی ہوتے جا رہے ہیں۔ تمھارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے اور اب تمھارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ جب حالات و واقعات یہ ہیں جو پیش آئے یا پیش آ رہے ہیں تو تمھارے ان وعدوں اور تمھاری ان طفل تسلیوں پر کون جی سکتا ہے۔ تم تو رحمت کے بجائے ہمارے لیے زحمت ہی زحمت بنتے جا رہے ہو! اوپر تورات کے حوالے سے ہم بیان کر آئے ہیں کہ مصر پر قابض ارسٹوکریسی بنی اسرائیل کی روز افزوں تعداد سے بہت گھبراتی ہوئی تھی اور اس کی روک تھام کے لیے اس نے ان کی نسل کشی کی مہم چلا رکھی تھی۔ بعد میں جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی تنظیم و اصلاح کی دعوت لے کر اٹھے تو ارباب اقتدار کی یہ گھبراہٹ اور زیادہ بڑھ گئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کو ایک طاقتور لیڈر مل گیا ہے اور اب جلد وہ ایک منظم قوت بن کر ہمارے اقتدار کو چیلنج کر دیں گے۔ اس گھبراہٹ میں فرعون نے ایک طرف تو ان کی نسل کشی کی مہم کو مزید قوت و شدت کے ساتھ چلانے کے احکام جاری کر دیے، دوسری طرف اپنے کارندوں، تحصیلداروں اور عمال کو یہ ہدایت کی کہ بنی اسرائیل سے جو بیگار لی جا رہی ہے وہ سخت سے سخت تر کر دی جائے۔ اینٹیں بنانے کے لیے جو بھس ان کو دیا جاتا رہا ہے وہ بند کر دیا جائے اور ان کو حکم دیا جائے کہ بھس بھی وہی بٹوریں اور اینٹیں بھی لازماً ہر شخص سے روزانہ اتنی ہی بنوائی جائیں جتنی اب تک وہ بناتے رہے ہیں۔ اس طرح عذاب کا وہ شکنجہ جو پہلے بھی کچھ کم سخت نہ تھا حضرت موسیٰ کے بعد اور بھی سخت ہو گیا۔ بنی اسرائیل نے یہ سب کچھ حضرت موسیٰ کے کھاتے میں ڈال دیا کہ یہ سب تمھاری برکتیں ہیں!

حضرت موسیٰ کی طرف سے تسلی　'قَالَ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ الاٰیة' بنی اسرائیل کی مایوسی و بددلی دور کرنے کے لیے حضرت موسیٰ نے پھر ان کو تسلی دی کہ مایوس اور ہراساں نہ ہو، اللہ تعالیٰ تمھارے دشمنوں کو ہلاک کرے گا اور زمین میں تمھیں خلافت عطا فرمائے گا۔ یہاں زمین سے مراد مصر کی سرزمین نہیں ہے بلکہ جیسا کہ آگے آیت ۱۳۷ میں اس کی وضاحت ہوتی ہے اس سے مراد فلسطین کا علاقہ ہے۔ فرمایا 'وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا' (اور جو قوم دبا کے رکھی گئی تھی ہم نے اس کو اس سرزمین کے شرق و غرب کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے بڑی برکتیں رکھی تھیں، اور تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہوا بسبب اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے) ظاہر ہے کہ 'بٰرَكْنَا فِیْهَا' سے جس علاقہ کی طرف اشارہ ہے وہ فلسطین ہی کا علاقہ ہے اور اس آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ اسی علاقہ کی حکومت دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے وہ وعدہ پورا کیا جو آیت زیر بحث میں حضرت موسیٰ کی زبانی مذکور ہے۔

استخلاف کا اصل مقصد　'فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ' یہ استخلاف فی الارض کے اصل مقصد کی یاد دہانی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو مٹاتا اور دوسری کو عروج و اقبال بخشتا ہے تو صرف یہ دیکھنے کے لیے کرتا ہے کہ اقتدار کی وراثت پا کر یہ قوم کیا رویہ اختیار کرتی ہے، یہ بھی پچھلی قوم کی طرح بدمست ہو کر زمین میں فساد مچاتی ہے یا اس خلافت و وراثت کا حق

پہچانتی اور اس کو ادا کرتی ہے۔ اگر یہ بھی اسی روش پر چل نکلتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی ایک خاص مدت تک مہلت دے کر فنا کر دیتا ہے اور ان کی جگہ دوسروں کو دے کر ان کو آزماتا ہے۔ امتحان کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا ہے اور جب تک یہ دنیا قائم ہے، برابر جاری رہے گا۔ اس وجہ سے کسی قوم کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ جب وہ ایک مرتبہ خدا کی محبوب بن گئی تو ہمیشہ محبوب ہی بنی رہے گی، خواہ اس کے اعمال و عقائد میں کتنی ہی خرابیاں پیدا ہو جائیں۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۱۳۰)

'سِنِيْن'، سنۃ کی جمع ہے۔ اس کے عام معنی تو سال کے ہیں لیکن یہ قحط اور مصیبت کے سال کے لیے بھی معروف ہے اور اسی مفہوم میں یہاں یہ استعمال ہوا ہے۔

سنتِ الٰہی کا ظہور

اوپر آیت ۹۴-۹۵ کے تحت ہم اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جب وہ اپنا کوئی رسول بھیجتا ہے تو اس کی دعوت کے مویدات، مختلف قسم کی آزمائشوں کی شکل میں، وہ آفاق و انفس میں بھی ظاہر فرماتا ہے تاکہ لوگوں کے کان رسول کی دعوت کے لیے کھلیں، وہ عبرت پکڑیں اور اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ اسی سنتِ الٰہی کی طرف یہاں اشارہ فرمایا کہ ایک طرف موسیٰ نے اپنی دعوت بلند کی اور اپنے معجزات سے فرعونیوں کو جھنجھوڑا، دوسری طرف ہم نے قومِ فرعون کو قحط اور پیداوار کی کمی کی آزمائشوں میں مبتلا کیا تاکہ ان کے اندر خدا کا خوف اور اس کی یاد بیدار ہو۔

فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۳۱-۱۳۲)

'طیر' کا مفہوم

'تطیر'، 'طیر' سے ہے۔ 'طیر' چڑیوں اور پرندوں کو کہتے ہیں۔ چونکہ توہم پرستوں میں چڑیوں کے اڑنے سے فال لینے کا عام رواج ہے اس وجہ سے 'تطیر' کا لفظ فال لینے کے معنی میں استعمال ہوا۔ پھر اس کا غالب استعمال فالِ نحس کے معنی میں ہو گیا۔ اسی مادے سے 'طائر' کا لفظ بھی ہے جو اس چیز کے لیے استعمال ہوا جس سے کوئی نیک یا بد فال لی جائے اور پھر اسی مفہوم سے ترقی کر کے حظ، قسمت اور نصیبہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

آفات پر فرعونیوں کا ردِ عمل

اب یہ بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو آزمائشیں فرعونیوں کو جھنجھوڑنے اور جگانے کے لیے بھیجیں کہ وہ حضرت موسیٰ کی دعوت کی طرف متوجہ ہوں انھوں نے ان کو حضرت موسیٰ کی نحوست کا نتیجہ قرار دیا۔ جب حالات سازگار ہوتے تو اس کو اپنی خوش بختی، بلند اقبالی اور اپنے استحقاق کی برکت قرار دیتے لیکن جب کسی ارضی و سماوی آفت سے دوچار ہوتے تو کہتے کہ یہ موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست ہے۔ یہ جو بے دینی و بے عقیدگی پھیلا رہے ہیں اس سے ارضی و سماوی دیوتا ناخوش ہو گئے ہیں جس کا نتیجہ ان آفتوں کی شکل میں سامنے

آرہا ہے۔ فرمایا کہ ان کا طائرِ قسمت و نحوست ہے تو خدا کے پاس اور یہ پیدا ہوا ہے ان کی اپنی ہی بداعمالیوں سے لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت سے ناواقف ہے اس وجہ سے وہ اپنی نحوست دوسروں کے طالع میں ڈھونڈھ رہے ہیں۔

'وَقَالُوا مَهْمَا تَأْتِنَا' یہ ان کا حتمی جواب نقل ہوا ہے کہ خواہ ہم پر جادو چلانے کے لیے تم کتنی ہی نشانیاں دکھاؤ ان چیزوں سے مرعوب ہو کر ہم تمھاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ۝ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يَا مُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِندَكَ ۖ لَئِن كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُم بَالِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ (۱۳۳-۱۳۵)

حضرت موسیٰ کے معجزات

اوپر آیت ۱۳۰ میں جن آزمائشوں کا ذکر ہوا ہے، یہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس عام سنتِ الٰہی کے تحت ظہور میں آئیں جو ہر رسول کی دعوت کی تائید و تقویت اور لوگوں کے اندر تضرع اور تذکر پیدا کرنے کے لیے رحمتِ الٰہی کا مقتضیٰ ہیں لیکن جب فرعونی ان سے اثر پذیر نہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ہاتھوں نہایت اہم معجزات دکھائے جن میں سے چند کی طرف یہاں اشارہ فرمایا ہے۔ ہم تورات کی روشنی میں اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

طوفان

'طُوفَان'۔ تورات میں اس طوفان کی تفصیل اس طرح آئی ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا تاکہ سب ملکِ مصر میں انسان اور حیوان اور کھیت کی سبزی پر جو ملکِ مصر میں ہے اولے گریں اور موسیٰ نے اپنی لاٹھی آسمان کی طرف اٹھائی اور خداوند نے رعد اور اولے بھیجے اور آگ زمین تک آنے لگی اور خداوند نے ملکِ مصر پر اولے برسائے پس اولے گرے اور اولوں کے ساتھ آگ ملی ہوئی تھی اور وہ اولے ایسے بھاری تھے کہ جب سے مصری قوم آباد ہوئی ایسے اولے ملک میں کبھی نہیں پڑے تھے اور اولوں نے سارے ملکِ مصر میں ان کو جو میدان میں تھے، کیا انسان کیا حیوان، سب کو مارا اور کھیتوں کی ساری سبزی کو بھی اولے مار گئے اور میدان کے سب درختوں کو توڑ ڈالا۔" خروج باب ۹: ۲۲-۲۵

اس سے معلوم ہوا کہ یہ طوفان رعد، گرج، کڑک اور اولوں کا طوفان تھا۔ بارش اور ہوائے تند بھی اکثر اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس میں آگ کا جو ذکر ہے یہ تورات کے مترجموں کی غلطی ہے۔ اس سے مراد ہماری عام آگ نہیں ہے بلکہ یہ وہ بجلی ہے جو اس طرح کے طوفان کے لوازم میں سے ہے۔

ٹڈیاں

جراد: جراد ٹڈی کو کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل تورات میں یوں آئی ہے۔

"تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ملکِ مصر پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ ٹڈیاں ملکِ مصر پر آئیں اور ہر قسم کی

سبزی کو جو اس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہے چٹ کر جائیں ۔ پس موسیٰ نے ملک مصر پر اپنی لاٹھی بڑھائی اور خداوند نے اس سارے دن اور ساری رات پروا آندھی چلائی اور صبح ہوتے ہوتے پروا آندھی ٹڈیاں لے آئی اور ٹڈیاں سارے ملک مصر پر چھا گئیں اور وہیں مصر کی حدود میں بسیرا کیا اور ان کا دل ایسا بھاری تھا کہ نہ تو ان سے پہلے ایسی ٹڈیاں کبھی آئیں اور نہ ان کے بعد پھر آئیں گی کیونکہ انھوں نے تمام روئے زمین کو ڈھانک لیا، ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور انھوں نے اس ملک کی ایک ایک سبزی کو اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے چٹ کر لیا اور ملک مصر میں نہ تو کسی درخت کی نہ کھیت کی کسی سبزی کی ہریالی باقی رہی۔" خروج باب ۱۰ : ۱۲ - ۱۵

جوئیں 'قمل' کے معنی ہیں جوئیں۔ یہ آفت جس شکل میں ظاہر ہوئی اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے۔

"تب خداوند نے موسیٰ سے کہا، ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی بڑھا کر زمین کی گرد کو مار تاکہ وہ تمام ملک مصر میں جوئیں بن جائے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور زمین کی گرد کو مارا اور انسان اور حیوان پر جوئیں ہو گئیں اور تمام ملک مصر میں زمین کی ساری گرد جوئیں بن گئی۔" خروج باب ۸ : ۱۶ - ۱۷

مینڈک 'اَلضَّفَادِعَ' 'ضفادع' ضفدع کی جمع ہے۔ 'ضفدع' مینڈک کو کہتے ہیں۔ اس عذاب کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے۔

"پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ فرعون کے پاس جا اور اس سے کہہ کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے کہ میری عبادت کریں۔ اور اگر تو ان کو جانے نہ دے گا تو دیکھ میں تیرے ملک کو مینڈکوں سے ماروں گا اور دریا بے شمار مینڈکوں سے بھر جائے گا اور وہ آ کر تیرے گھر میں اور تیری آرام گاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیرے تنوروں اور تیرے آٹا گوندھنے کے لگنوں میں گھستے پھریں گے اور تجھ پر اور تیری رعیت اور تیرے نوکروں پر چڑھ جائیں گے اور خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں پر بڑھا اور مینڈکوں کو ملک مصر پر چڑھا لا۔ چنانچہ جتنا پانی مصر میں تھا اس پر ہارون نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مینڈک چڑھ آئے اور ملک مصر کو ڈھانک لیا۔" خروج باب ۸ : ۱ - ۶

خون 'دَم' کے معنی خون کے ہیں۔ اس کے ظہور کی شکل اس طرح مذکور ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے اور مصر میں جتنا پانی ہے یعنی دریاؤں، اور نہروں اور جھیلوں اور تالابوں پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ وہ خون بن جائیں اور سارے ملک مصر میں پتھر اور لکڑی کے برتنوں میں بھی خون ہی خون ہوگا اور موسیٰ اور ہارون نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا۔ اس نے لاٹھی اٹھا کر اسے فرعون اور اس کے خادموں کے سامنے دریا کے پانی پر مارا اور دریا کا

پانی سب خون ہو گیا اور دریا کی مچھلیاں مر گئیں اور دریا سے تعفن اٹھنے لگا اور مصری دریا کا پانی نہ پی سکے اور تمام ملک مصر میں خون ہی خون ہو گیا۔" خروج ۷: ۱۹-۲۱

'اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ' یعنی یہ تمام نشانیاں تفصیل سے مذکور ہیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ 'مُفَصَّلٰتٍ' کا ظرف یہاں محذوف ہے۔ یعنی ان کی تفصیل تورات میں موجود ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ اسی ذیل کے چند اور معجزات بھی تمام جزئیات کی تفصیلات کے ساتھ تورات میں بیان ہوئے ہیں۔ قرآن نے ان کی طرف چونکہ صرف اشارہ کیا ہے اس وجہ سے ان کی تفصیلات کے لیے حوالہ تورات کا دے دیا ہے۔

'فَاسْتَکْبَرُوْا وَکَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ' یعنی بجائے اس کے کہ ان سے ان کے اندر تضرع اور تذکر پیدا ہوتا ان کے غرور اور تکبر میں اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مجرم لوگ تھے اور اللہ تعالیٰ مجرموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ان کے لیے نشانیاں ہدایت کے بجائے صرف اتمام حجت اور قساوت قلب کا باعث بنتی ہیں۔

بار بار عہد اور بار بار عہد شکنی — 'وَلَمَّا وَقَعَ عَلَیْهِمُ الرِّجْزُ الاٰیة' ۔ 'لَمَّا'، 'کُلَّمَا' کے معنی میں بھی آتا ہے۔ خاص طور پر ان مواقع میں جہاں مد نظر تصویر حال ہو۔ آگے آیت ۱۸۹ میں اس کی نظیر موجود ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب جب وہ عذاب کی گرفت میں آتے حضرت موسیٰ کی منت سماجت کرنے لگتے کہ اس قرب و تعلق کی بنا پر جو تمھیں اپنے رب سے ہے، ہمارے لیے دعا اور سفارش کرو کہ یہ عذاب ہمارے سر سے ٹل جائے، اگر تم نے اس کو ٹال دیا تو ہم ضرور تمھاری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ جانے دیں گے لیکن جب عذاب ٹل جاتا تو اپنے وعدے سے پھر مکر جاتے۔ تورات میں اس کا ذکر یوں ہے۔

"تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلا کر کہا کہ خداوند سے شفاعت کرو کہ مینڈکوں کو مجھ سے اور میری رعیت سے دفع کر دے اور میں ان لوگوں کو جانے دوں گا تا کہ وہ خداوند کے لیے قربانی کریں۔"

(خروج ۸: ۸)

"فرعون نے کہا میں تم کو جانے دوں گا تا کہ تم خداوند اپنے خدا کے لیے بیابان میں قربانی کرو لیکن تم دور مت جانا اور میرے لیے شفاعت کرنا ...... پر فرعون نے اس بار بھی اپنا دل سخت کر لیا اور ان لوگوں کو جانے نہ دیا۔"		(خروج ۸: ۲۸-۳۲)

'رَبَّکَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَکَ' کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ چونکہ خدا تمھاری بات سنتا اور تمھاری دعا کی حرمت قائم رکھتا ہے اس وجہ سے ہمارے لیے دعا کرو۔

'اِلٰٓی اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ' کے سے مقصود ان کی بے ضمیری اور ان کے سفلہ پن کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ ان کے فریب اور جھوٹ پر زیادہ دیر تک پردہ نہ پڑا رہ سکے گا وہ محض اس خیال سے جھوٹا عہد کر لیتے کہ اس سے جتنی دیر کے لیے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اٹھا لیا جائے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ ۝ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ (۱۳۶-۱۳۷)

'فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ الآیۃ'۔ اس انتقام سے مراد ان جرائم کا انتقام ہے جن پر پورے پورے اتمام حجت کے باوجود وہ جمے رہے۔ اللہ کی آیات سے اول تو وہ بے پروا اور غافل رہے اور جب وہ کھلے ہوئے چیلنج کے ساتھ ان کے سامنے ظاہر ہوئیں تو انھوں نے ان کی تکذیب کردی کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ سحر و شعبدہ کا کرشمہ ہیں۔ اس کی پاداش میں وہ سمندر میں غرق کردیے گئے۔ اس واقعۂ غرق کی تفصیلات کے لیے موزوں مقام ہماری اس کتاب میں آگے آئیں گے۔

بنی اسرائیل کو ان کے صبر کا صلہ

'وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ الآیۃ'۔ 'یُسْتَضْعَفُوْنَ' سے اشارہ ان مظالم و شدائد کی طرف ہے جو بنی اسرائیل کو دبائے رکھنے کے لیے فرعونیوں کے ہاتھوں ان پر ڈھائے گئے اور جن میں سے بعض چیزوں کی طرف اوپر اشارہ گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ وہی قوم جو غلامی و محکومی کے نہایت سخت شکنجوں میں کسی ہوئی تھی اللہ نے اس کو رفعت بخشی اور اس کو سرزمین فلسطین کی حکومت عطا فرمائی۔ اس حکومت بخشنے کے لیے یہاں 'ایراث' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس میں یہ مضمون مضمر ہے کہ ان کے سابق حکمرانوں کو اللہ نے وہاں سے ہٹایا اور ان کو ان کی وراثت دلائی۔ اس سرزمین کی تعریف میں 'الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا' کے جو الفاظ وارد ہیں اول تو وہ یہ متعین کرتے ہیں کہ اس سے مراد فلسطین ہی کی سرزمین ہے اس لیے کہ قرآن میں اس صفت کے ساتھ اسی سرزمین کا ذکر ہوا ہے۔ دوسرے یہ الفاظ اس سرزمین کی روحانی اور مادی دونوں قسم کی برکتوں کو ظاہر کر رہے ہیں اس لیے کہ عربی میں 'برکت' کا لفظ ان دونوں ہی مفہوموں کا حامل ہے۔

'مَشَارِقَ' اور 'مَغَارِبَ' کے الفاظ سے اس حکومت کے وسیع الاطراف ہونے کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ عربی میں بعض مرتبہ کسی لفظ کی جمع اس کے اطراف کی وسعت کے لحاظ سے بھی آتی ہے۔ پیچھے لفظ 'اعراف' پر بحث کرتے ہوئے ہم اس بات کی طرف اشارہ کرچکے ہیں۔

'وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ' سے اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر آیات ۱۲۸-۱۲۹ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے آبا و اجداد سے کیا تھا اور جس کی تجدید بالآخر موسیٰ سے فرمائی وہ وعدہ بالآخر پورا ہوا۔

'بِمَا صَبَرُوْا' سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو انعامات ہوتے ہیں وہ بہرحال اوصاف و کردار پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ مجرد خاندان و نسب کسی کو خدا کا چہیتا بنا دے۔

قوم فرعون کی تباہی

'وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ' یعنی فرعون اور اس کی قوم کی تمام شاندار تعمیرات بھی ہم نے برباد کردیں اور ان کے سرسبز و شاداب باغات بھی اجاڑ دیے۔ یہاں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں 'مَا كَانَ یَصْنَعُ' اور 'مَا

کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ' میرے نزدیک پہلے سے تعمیرات کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے سے باغات کی طرف جس فرعون کا یہاں ذکر ہے اس کو تعمیرات سے خاص ذوق رہا ہے اور بنی اسرائیل زیادہ تر انہی تعمیرات کی خاطر دن رات بیگار میں جتے رہتے تھے۔ 'مَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ' سے اصلاً تو انگور کے باغ مراد ہیں اس لیے کہ انہی کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں، جیسا کہ قرآن میں 'جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ' کی ترکیب موجود ہے، لیکن بسا اوقات کسی چیز کی تعبیر اس کے جزو غالب سے کی جاتی ہے جو باعتبار لفظ تو خاص ہوتی ہے لیکن مراد اس سے عام ہوتی ہے۔ مصر کو، کم از کم اس دور میں انگور کی پیداوار میں امتیاز حاصل رہا ہے۔ سورۂ یوسف کے بعض مقامات سے بھی اس کا اشارہ نکلتا ہے۔

اس ٹکڑے سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ قوم فرعون پر غرق کے علاوہ بھی تباہی آئی جس سے ان کے شہر اور باغ سب اجڑ گئے۔ ان کے باغ تو، جیسا کہ اوپر گزرا، پہلے ہی اولوں اور ٹڈیوں سے تباہ ہو چکے تھے معلوم ہوتا ہے کوئی زلزلہ بھی اسی دوران میں آیا جس سے ان کی عمارتیں بھی منہدم ہو گئیں اور جو کچھ پچھلی آفتوں سے بچ رہا تھا وہ بھی برباد ہو گیا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۱۳۸-۱۴۰)

'وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ' اس اسلوب میں جو بلاغت ہے اور بنی اسرائیل کے لیے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہتمام و عنایت کی جو شان ہے اس کی طرف ہم بقرہ آیت ۵۰ کی تفسیر میں اشارہ کر چکے ہیں۔

بنی اسرائیل کی سرگزشت سمندر سے نکلنے کے بعد

یہاں تک بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ بیان ہوا جو مصر اور فرعون سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی جو شانیں ظاہر ہوئی ہیں اور اس نے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی جس طرح مدد فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو جس طرح ہلاک کیا وہ سب سامنے آگیا اور اس پہلو سے یہ سرگزشت ان سرگزشتوں کا تکملہ اور تتمہ بن گئی جو اس سورہ میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اب آگے بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ بیان ہو رہا ہے جو مصر سے نکلنے اور دریا پار کر لینے کے بعد کا ہے۔ اس حصہ سے یہ حقیقت نمایاں ہو گی کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے قدم قدم پر بنی اسرائیل کی مدد کی اور ان کی رہنمائی فرمائی لیکن بنی اسرائیل نے ہر قدم پر ناشکری کی اور ٹھوکر کھائی۔

'فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ' یہاں لفظ 'قَوْمٍ' سے ان قوموں میں سے کوئی قوم مراد ہے جن سے بنی اسرائیل کو دریا سے نکلنے کے بعد سابقہ پیش آیا ہے۔ ان میں سے ہر قوم بت پرست تھی 'یَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ' کا اسلوب بیان فی الجملہ ان کی تحقیر کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ یعنی وہ ایسے ناسمجھ اور احمق تھے کہ خدائے رحمان و رحیم کو چھوڑ کر اپنے ہی ہاتھوں کے تراشے ہوئے بتوں سے چمٹے ہوئے اور ان کی بندگی اور پوجا میں سرگرم تھے۔ لفظ 'عُكُوْف' جب 'عَلٰی' کے ساتھ آئے تو اس کے معنی کسی شے پر جم جانے اور اس سے اپنے آپ کو وابستہ

کر لینے کے آتے ہیں۔

بنی اسرائیل کی پہلی ٹھوکر

قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا، لیکن ان سے زیادہ احمق بنی اسرائیل نکلے کہ یہ تماشا دیکھتے ہی اس پر ریجھ گئے اور حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ شروع کر دیا کہ جیسے دیوتا ان کے پاس ہیں ویسا ہی ایک دیوتا ہمارے لیے بھی بنا دے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر کی طویل غلامی نے بنی اسرائیل کی ذہنی و اخلاقی سطح اتنی پست کر دی تھی کہ خدا کے جمال و جلال کی اتنی شانیں دیکھنے کے بعد بھی وہ گویا ابھی مصر کی ظلمات ہی میں تھے۔ قدیم مالوفات سے وابستگی آسانی سے نہیں جاتی۔ شاید یہی نکتہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد تمام آثار شرک یک قلم مٹا دینے کے احکام جاری فرما دیے کہ عام اور کمزور لوگوں کے لیے یہ چیزیں فتنہ نہ بن سکیں۔

قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ، حضرت موسیٰؑ نے مطالبہ کے جواب میں فرمایا کہ تم لوگ بڑے ہی بے عقل، وہمی اور جذباتی ہو۔ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ، یہ تو جو کچھ یہ کر رہے ہیں سب خدا کے ہاں بالکل برباد و پامال کر دیا جائے گا اس لیے کہ یہ یکسر باطل ہے۔ سوچو کہ اپنی ہدایت و شریعت کے لیے تمہارا انتخاب کر کے تمہیں ساری دنیا پر فضیلت و سرفرازی تو اللہ نے بخشی تو کیا اب میں اس کو چھوڑ کر تمہارے لیے کوئی اور معبود ڈھونڈنے نکلوں۔ اس سے بڑی ناشکری و ناسپاسی اور کیا ہو گی۔!!

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ!

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ، يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ، وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ۔ اس آیت کی تفسیر بقرہ میں بھی گزر چکی ہے اور اس سورہ میں بھی۔ یہاں جو چیز قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت سے لے کر آگے آیت ۱۴۵ تک اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اہتمام کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے بنی اسرائیل کو اپنی ہدایت و شریعت سے مشرف فرمانے کے لیے کیا لیکن اس سارے اہتمام کی بنی اسرائیل نے یہ قدر کی کہ ادھر حضرت موسیٰؑ طور پر اللہ کی شریعت لینے گئے ادھر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی تمام نصیحتوں اور ان کے خلیفہ حضرت ہارونؑ کی تمام کوششوں کے علی الرغم وہی بت ڈھال کر تیار کر دیا جس کے لیے حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰؑ نے ان کو وہ تنبیہ و ملامت فرمائی تھی جس کا ذکر اوپر گزرا۔ مقصود اس ساری تفصیل سے یہ دکھانا ہے کہ جو قوم آج اپنے شرف و تقدس پر اتنی نازاں ہے عین اپنے نبی کی موجودگی میں، اور اس کے عظیم معجزات کو دیکھتے ہوئے، کیا حرکتیں کر چکی ہے۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً، وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۴۲)

انبیاءؑ کی لغزش کی نوعیت

اس آیت کی وضاحت بقرہ کے تحت ہو چکی ہے۔ یہ اس اہتمام کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی شریعت دینے کے لیے فرمایا۔ ان کو ہدایت ہوئی کہ وہ ۳۰ دن کے لیے کوہ طور کے ایک مخصوص مقام پر حاضر ہوں۔ حضرت موسیٰؑ، جیسا کہ ظاہر آیت ۸۴ کے تحت بحث آئے گی، وقت مقررہ سے پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ ہر چند حضرت موسیٰؑ کی یہ سبقت رضائے الٰہی کی طلب کی راہ میں تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس

عجلت وسبقت پر گرفت فرمائی اور اس کی حکمت تربیت مقتضی ہوئی کہ ۳۰ دن کی مقررہ مدت بڑھا کر ۴۰ دن کر دی جائے۔ ہم آگے کسی مناسب موقع پر یہ واضح کریں گے کہ انبیاء علیہم السلام اتباع ہوا سے مغلوب ہو کر کبھی غلطی نہیں کرتے لیکن اتباع رضائے الٰہی کے جوش میں اگر کبھی کوئی قدم ان کا حدود سے ذرا متجاوز اٹھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بھی ان کو روک دیتا ہے اس لیے کہ وہ حق کی میزان ہوتے ہیں اور میزان کا ہر پہلو سے ٹھیک ہونا اور سو فی صدی ٹھیک ہونا ضروری ہے۔

حضرت موسیٰ کی ہدایت حضرت ہارون کو

'وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ' یہ اس اہتمام کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسیٰ نے اپنی وقتی غیبت کے دوران بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے فرمایا۔ انھوں نے اپنی غیر حاضری کے زمانے کے لیے حضرت ہارون کو اپنا خلیفہ بنایا اور ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ تم قوم کے اندر کوئی خرابی، کوئی بگاڑ اور کوئی بدعت و ضلالت نہ پیدا ہونے دینا۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز رونما ہو تو اس کی اصلاح کرتے رہنا اور ہر گز ہر گز بگاڑ پیدا کرنے والوں کی روش کی پیروی نہ کرنا۔ 'وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ' کے الفاظ سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ قوم کے اندر جو عناصر فسادی تھے حضرت موسیٰ ان سے آگاہ تھے اور ان کی طرف سے ان کی پچھلی کارستانیوں کے سبب سے ان کو اندیشہ بھی تھا اس وجہ سے انھوں نے حضرت ہارون کو خاص تاکید کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اگر یہ عناصر کوئی فتنہ اٹھانے کی کوشش کریں تو اس کو چلنے نہ دینا ـــــ یہ ملحوظ رہے کہ یہ سارا اہتمام اس لیے بیان ہو رہا ہے تاکہ واضح ہو سکے کہ بنی اسرائیل نے اسی دوران میں گوسالہ پرستی کی جو لعنت اختیار کی تو اس سارے اہتمام کے علی الرغم اختیار کی۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۴۳)

'مِيْقَات' کے معنی وقت مقررہ کے ہیں۔ یہاں 'مِيْقَات' سے مراد وہ وقت خاص ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنے خطاب و کلام سے مشرف کرنے کے لیے مقرر فرمایا۔

انسان ناسوتی آنکھوں سے خدا کو نہیں دیکھ سکتا

'قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ' کلام سے مشرف ہونے کے بعد حضرت موسیٰ کو شوق ہوا کہ جس کا کلام سامع نواز ہوا ہے اس کا دیدار بھی باصرہ نواز ہو۔ چنانچہ انھوں نے نہایت ادب سے یہ درخواست کی کہ اے رب تو مجھے اپنے آپ کو دکھا کہ میں تجھے دیکھ لوں، یہ شوق ایک فطری شوق ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اس پر ملامت نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ انسان ان ناسوتی آنکھوں سے خدا کی ذات کو نہیں دیکھ سکتا، صرف اس کی صفات کے مظاہر ہی کو دیکھ سکتا ہے۔

'وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ' یہ مشاہدہ حضرت موسیٰ کی اطمینان دہانی کے لیے کرایا گیا کہ خدا کی تجلی ذات کی تاب تو کوہ و جبل بھی نہیں لا سکتے جو جامد اور ٹھوس ہونے کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر ہیں تو تم انسان ضعیف البنیان ہو کر کس طرح لا سکو گے۔ انسان کی قوت برداشت

محدود ہے۔ اس کی نگاہیں روشنی کو دیکھتی ہیں لیکن یہ روشنی ایک حدِ خاص سے متجاوز ہو جائے تو آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات بینائی ہی سلب ہو جاتی ہے۔ اس کے کان آواز کو سنتے ہیں لیکن ان کے سننے کی تاب بھی بس ایک مقررہ حد ہی تک ہے، بجلی کا کڑکا ہی ذرا حد سے متجاوز ہو جائے تو سرے سے کان کے پردے ہی بے کار ہو جائیں۔ آفتاب اس کی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے مگر اس کی روشنی اور حرارت اسی وقت تک اس کے لیے حیات بخش ہے جب تک وہ نہایت ہی طویل فاصلے سے، نہ جانے کتنے فضائی پردوں کی اوٹ سے اور کتنی چھلنیوں سے گزار کر اپنی روشنی اور حرارت اس کو پہنچا رہا ہے۔ اگر کسی دن ذرا کرۂ ارض سے قریب آکر اس پر ایک نظر ڈال دے تو سارے جاندار جل بھن کر خاک اور راکھ ہو جائیں تو جب اس کائنات کی مخلوق کے مقابل میں انسان کی قوت برداشت اتنی ناتواں ہے تو وہ خدا کی ذات بحت کی تاب کس طرح لا سکتی ہے جو نور مطلق اور تمام چون و چگوں سے ماوراء اور بالاتر ہے۔ فرمایا کہ تم میری ذات کو نہیں دیکھ سکتے، البتہ تم سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھو، میں اس پر اپنی تجلی ڈالتا ہوں۔ اگر وہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ جائے تو تم سمجھنا کہ تم مجھے دیکھ سکتے ہو، اگر نہ ٹکا رہ سکے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز تمہاری برداشت سے بدرجہا اولیٰ بالاتر ہے۔

'فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا' دک الحائط، ھدمہ حتی سواہ بالارض۔ 'دلق الارض' سوی صعودھا و ھبوطھا۔ 'دک الحائط' 'دک الارض' کے معنی ہوں گے دیوار کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا یا زمین کے تمام نشیب و فراز برابر کر دیے۔

'جبل' سے مراد یہاں پورا پہاڑ اور پورا سلسلۂ کوہ نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی خاص حصہ یا حضرت موسیٰ کے سامنے کی کوئی مخصوص چوٹی ہے۔ کُل بول کر جزء مراد لیا ہے۔ جیسا کہ ہر زبان میں معروف ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے جب پہاڑ کے مخصوص حصے پر اپنی تجلی ڈالی تو پہاڑ پاش پاش ہو کر منہدم ہو گیا۔ واضح رہے کہ یہ تجلی ذات کا محض ایک پرتو اور ایک شمہ ہی رہا ہو گا لیکن پہاڑ جیسی جامد چیز بھی اس کی تاب نہ لا سکی اور حضرت موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

'فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ' جب حضرت موسیٰ ہوش میں آئے تو بولے کہ 'سُبْحٰنَكَ' تو اس سے ارفع و منزہ ہے کہ تجھے ناسوتی آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ 'تُبْتُ اِلَيْكَ' میں نے یہ جسارت کی کہ تجھے دیکھنے کی خواہش کی۔ میں اس سے توبہ کرتا ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں 'وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ' اور میں سب سے پہلا اس بات پر ایمان لانے والا بنتا ہوں کہ تیری ذات ہماری آنکھوں کے مشاہدے سے بالاتر ہے۔

بنی اسرائیل کی محسوس پرستی کا علاج

اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر حضرت موسیٰ کو یہ سب کچھ بنی اسرائیل کی ایک شدید عقلی بیماری کو دور کرنے کے لیے دکھایا۔ تورات میں متعدد مواقع پر یہ مذکور ہے کہ بنی اسرائیل نے بار بار حضرت موسیٰ سے خدا کو دیکھنے کا مطالبہ کیا۔ وہ کہتے کہ خدا جب تم سے بات کرتا ہے تو ہم سے بھی رو در رو ہو کر بات کرے اور ہم اس کو دیکھیں

اللہ تعالیٰ کی وہ تمام نشانیاں جو انھوں نے اب تک دیکھی تھیں وہ ان کے دلوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہوئیں۔ ایک ان دیکھے خدا پر کسی طرح ان کا دل جمتا ہی نہ تھا۔ اوپر اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ کا جو مطالبہ ان کی طرف سے مذکور ہے وہ بھی ان کی اسی خواہش کا مظہر ہے کہ وہ خدا کو ایک پیکر محسوس میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی اس محسوس پرستی کی بیماری کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مرحلہ میں حضرت موسیٰؑ کو واضح طور پر بتا اور دکھا دیا کہ خدا آنکھوں سے دیکھنے اور ہاتھوں سے چھونے کی چیز نہیں ہے، صرف عقل سے سمجھنے اور دل سے ماننے کی چیز ہے۔ آنکھیں صرف اس کی صفات کے جلوے دیکھ سکتی ہیں، اس سے آگے ان کی رسائی نہیں ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے یہ ساری باتیں بنی اسرائیل کو سمجھائیں لیکن یہ کھٹک ان کے دلوں سے گئی نہیں چنانچہ اس کی وجہ سے وہ خدا کے عتاب میں بھی آئے جس کا ذکر بقرہ میں بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی آئے گا۔

اس مقام سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جن جوگیوں اور صوفیوں نے مشاہدہ ذاتِ الٰہی کو معرفت کا درجۂ کمال قرار دیا ہے اور اس کو اپنا نصب العین بنایا ہے انھوں نے اپنا گول اپنی رسائی کے حد سے بہت آگے بڑھ کر باندھا ہے اور اس کا حاصل خیرگی اور تحیر کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ مگس شہباز کے شکار کے لیے نکلے۔ ہم سورۂ نجم کی تفسیر میں انشاء اللہ بتائیں گے کہ اوروں کا کیا ذکر سب سے زیادہ عالی مقام اور صاحب قرب حضرت جبرئیل ہیں لیکن ان کی رسائی کی بھی ایک حد مقرر ہے، وہیں سے وہ انوار و تجلیات سے بہرہ یاب ہوتے ہیں، اگر ذرا اس سے آگے قدم بڑھائیں تو

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (۱۴۴)

جو بخشا گیا اسی پر قناعت کرو

مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے پیغام اور اپنے کلام سے تم کو لوگوں پر جو برگزیدگی بخشی ہے تمھارے شرف کے لیے یہی بس ہے، میں نے جو تعلیم و ہدایت تمھیں عطا فرمائی ہے اس کو مضبوطی سے پکڑو اور برابر میرے شکر گزار رہو۔ یعنی اس کا حق ادا کرو، خود بھی دل و جان سے اس کی قدر کرو، دوسروں کو بھی یہ بتاؤ اور سکھاؤ۔ انداز کلام سے یہ بات بھی نہایت لطیف طریقہ سے نکلتی ہے کہ جو عطا ہوا ہے تمھارے لیے یہی بہت ہے اس پر قناعت کرو۔ میرے دیدار کی خواہش نہ کرو۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۚ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ (۱۴۵)

الواح سے متعلق تورات کی دو مختلف روایتیں

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ، تختیوں پر اللہ تعالیٰ نے خود لکھا یا اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت موسیٰ علیہ السلام نے لکھا؟ تورات سے دونوں باتیں نکلتی ہیں۔

"اور موسیٰ نے لوگوں کے پاس جا کر خداوند کی سب باتیں اور احکام ان کو بتا دیے اور سب لوگوں نے ہم آواز ہو کر جواب دیا کہ جتنی باتیں خداوند نے فرمائی ہیں ہم ان سب کو مانیں گے اور موسیٰ نے خداوند کی سب باتیں لکھ لیں۔" (خروج ۲۴: ۳-۴)

دوسرے مقام میں اس طرح ہے۔

"اور موسیٰ شہادت کی دونوں لوحیں لیے ہوئے الٹا پھرا اور پہاڑ سے نیچے اترا اور وہ لوحیں ادھر سے اور ادھر سے دونوں طرف سے لکھی ہوئی تھیں اور وہ لوحیں خدا ہی کی بنائی ہوئی تھیں اور جو لکھا ہوا تھا وہ بھی خدا ہی کا لکھا ہوا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا" خروج ۳۲: ۱۵-۱۶

قرآن کے الفاظ دونوں معنوں کو محتمل ہیں اور اصلاً دونوں میں کوئی فرق ہے بھی نہیں۔ جب حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت لکھا تو یہ اللہ تعالیٰ ہی نے لکھا۔ ایک پل کی تعمیر ایک انجینیر کرتا ہے لیکن بادشاہ یا حکومت کے حکم اور اس کے منصوبہ اور نقشہ کے تحت کرتا ہے۔ اس لیے کہا یہ جاتا ہے کہ بادشاہ یا حکومت نے پل بنایا۔ قرآن کی حفاظت کا تمام اہتمام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے ہاتھوں عمل میں آیا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تحت عمل میں آیا اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ 'وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ' اور ہم ہی ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔

بنی اسرائیل کے لیے تعلیم بالقلم کا اہتمام

یہ الفاظ اس اہتمام و عنایت خاص کو ظاہر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو شریعت دینے کے معاملے میں فرمائی۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے انھوں نے اپنی اپنی امتوں کو زبانی تعلیم دی لیکن بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے تعلیم بالقلم کا اہتمام فرمایا۔ ان کے پیغمبر نے صرف قول و عمل ہی سے ان کو نہیں بتایا اور سکھایا بلکہ ان کے لیے سب کچھ قلم بند بھی کر دیا کہ اللہ کی شریعت ان کو سب سے زیادہ محفوظ و مامون شکل میں ملے لیکن اس اہتمام کی جو قدر انھوں نے کی اس کی تفصیلات البقرہ میں بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آ رہی ہیں۔

الواح میں مندرج تفصیلات کی نوعیت

'مِنْ کُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَۃً وَّتَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ' یعنی ان الواح میں ہر قسم کی ضروری ہدایات بھی تھیں اور تمام ضروری تفصیلات بھی۔ 'مِنْ کُلِّ شَیْءٍ' اور 'لِکُلِّ شَیْءٍ' اس طرح کے سیاق و سباق میں جب آتا ہے تو اس کا تعلق پیش نظر مقصد و موضوع ہی سے ہوتا ہے۔ یعنی اس مرحلہ میں دین و شریعت کی جو باتیں بتانی مدنظر تھیں وہ ساری باتیں بھی بتائی گئیں اور جماعتی تنظیم و تشکیل سے متعلق جو تفصیلات درکار تھیں وہ بھی درج الواح ہوئیں۔ عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ الواح میں صرف مشہور احکام عشرہ ہی درج ہوئے لیکن یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اوپر ہم نے کتاب خروج سے جو حوالے نقل کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تختیاں دو تھیں اور دونوں اپنے دونوں جانب سے بھری ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں تورات کے مذکورہ مقام پر بہت سی دوسری تفصیلات بھی ہیں جو جماعتی تنظیم و تشکیل سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی نوعیت ایسی ہے کہ اس مرحلہ میں بنی اسرائیل

کو ان سے آگاہ ہونا ضروری تھا۔ پھر یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے تورات کی طرح صرف دو ہی تختیوں کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ 'اَلْوَاح' کا لفظ استعمال کیا ہے جو جمع کے لیے آتا ہے اور عربی میں جمع کا اطلاق دو سے زیادہ پر ہوتا ہے۔

صیغۂ تفضیل کا ایک خاص عمل

'فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا' اس کو مضبوطی سے پکڑو یعنی پورے عزم و جزم کے ساتھ اس کو اختیار کرو اور ہر طرح کے حالات میں، خواہ نرم ہوں یا سخت، اس کی ہدایات پر جمے رہو اور اپنی قوم کو بھی ہدایت کرو کہ دوسری جاہل قوموں کی ریس میں ان کے جیسے بتوں کی فرمائش نہ کرے اور نہ ان کے طور طریقے اختیار کرے بلکہ اس سے بہتر طریقے کو اپنائے جو اس نوشتہ میں بتایا گیا ہے۔ 'بِاَحْسَنِهَا' میں جو تقابل و تفاضل ہے وہ نوشتۂ الواح کی مختلف ہدایات میں نہیں ہے اس لیے کہ وہ تو ساری کی ساری احسن ہی تھیں اور سب بلا استثناء انتخاب اختیار کرنے کے لیے بھی تھیں بلکہ یہ ترجیح مشرک قوموں کے اس طور طریقے کے مقابل میں ہے جن سے بنی اسرائیل کو دریا پار کرنے کے بعد سابقہ پیش آیا اور جن سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ کے سامنے وہ مطالبہ پیش کر دیا جس کا ذکر اوپر آیت ۱۳۸ میں گزرا۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو کہو کہ بت پرست قوموں کی خرافات پر نہ ریجھیں بلکہ اس پاکیزہ اور اعلیٰ و احسن طریقہ کو اپنائیں جو ان الواح میں ان کو بتایا گیا ہے۔ تفضیل کا صیغہ اس مفہوم کے لیے قرآن میں بعض دوسرے مواقع میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً سورۂ زمر آیت ۵۵ میں۔ انشاء اللہ کسی موزوں مقام میں ہم اس کی مزید تفصیل بیان کریں گے۔

آگے کے مراحل کے لیے بدرقہ

'سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ' یہ آگے کے مراحل کی طرف اشارہ ہے کہ ان تعلیمات و ہدایات کو مضبوطی سے پکڑنا تمھارے اور تمھاری قوم کے لیے، اس واسطے بھی ضروری ہے کہ آگے تمھیں کفار و فساق کے علاقوں سے گزرنا اور ان سے سابقہ پیش آنا ہے۔ کفر و فساد کے ان علاقوں میں یہی چیزیں تمھارے لیے بدرقہ اور زادِ راہ کا کام دیں گی اور انہی کے ذریعہ سے تم غالب اور فتح مند رہو گے۔ ان سے مسلح رہے بغیر تمھاری قوم کے لیے ہر قدم پر فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۴۶-۱۴۷)

ایک برسر موقع تنبیہ

یہ برسر موقع ایک جامع تنبیہ و تذکیر ہے کہ کون لوگ ان تعلیمات کی قدر کریں گے، ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور کون ان سے منہ موڑیں گے اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی محرومی سے دوچار ہوں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی زمین میں رہتے بستے اپنے آپ کو خدا سے بے نیاز، اس کے امر و حکم سے اپنے آپ کو بالاتر، اور اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنا استحقاق ذاتی سمجھیں گے، اللہ ان کو ان ہدایات کی طرف مائل ہونے کی توفیق نہیں دے گا

ایسے لوگوں کے اندر خیر اور ہدایت کی رغبت مردہ ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے اگر ان کو ہدایت کی راہ دکھائی جائے تو وہ اس سے بھاگتے ہیں اور اگر گمراہی کی راہ کی دعوت دی جائے تو اس پر فوراً چل پڑتے ہیں۔ ان کی یہ حالت نتیجہ ہوتی ہے اس بات کا کہ وہ خدا کی نشانیوں سے بے پروا زندگی گزارتے ہیں اور واضح سے واضح بات بھی ان کے سامنے آئے تو اس کو جھٹلا دیتے ہیں۔ ایسے لوگ جو اللہ کی آیات اور آخرت کی ملاقات کے جھٹلانے والے ہیں، ان کے سارے اعمال اکارت اور بے ثمر ہو کے رہ جائیں گے۔ آخرت میں صرف اس عمل کی قدر و قیمت ہے جو خدا کی رضا کے لیے آخرت کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُوَارٌ ۚ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۘ اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ (۱۴۸)

اس سارے اہتمام کی بنی اسرائیل کی طرف سے قدردانی

یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ان کی ہدایت کے لیے یہ کچھ جتن کیے جو مذکور ہوئے لیکن انھوں نے اس کی قدر یہ کی کہ حضرت موسیٰ کے جانے کے بعد ایک بچھڑے کی مورت بنا کر اس کی پوجا پاٹ میں لگ گئے۔

'مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُوَارٌ' اس مورت کو بنانے کے لیے تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اپنے سونے کے زیورات چندہ میں دیے۔ انھی زیورات سے بچھڑے کی ایک مورت بنائی گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ صنعت گری یہ کی گئی کہ اس میں سے جب ہوا گزرتی تو جس طرح بچھڑے ڈکرتے ہیں اس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی۔ 'خُوَارٌ' عربی میں بیل کے ڈکرنے کی آواز کو کہتے ہیں۔

قرآن نے یہ ساری تصریح بنی اسرائیل کی بلادت، عقل بے مایگی اور ساتھ ہی ان کی ناقدری و ناسپاسی ظاہر کرنے کے لیے کی ہے کہ جس خدائے بے ہمتا و بے مثال نے ان کو اپنے جلال و جمال کی وہ شانیں دکھائیں جو اوپر مذکور ہوئیں اس کی قدر انھوں نے یہ کی کہ اپنے ہی زیوروں سے ایک بچھڑا بنایا، بچھڑا بھی کوئی سچ مچ کا نہیں بلکہ صرف ایک جسد، ایک قالب، ایک دھڑ، جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی اور اس کے متعلق یہ باور کر لیا کہ یہی وہ خداوند خدا ہے جو بنی اسرائیل کو مصریوں کی غلامی سے چھڑا کر لایا اور یہی اپنی رہنمائی میں بنی اسرائیل کو ارض موعود کی بادشاہی دلائے گا!! اس طرح انھوں نے اپنا وہ شوق پورا کر لیا جس کا اظہار انھوں نے حضرت موسیٰ کے سامنے ان کے طور پر جانے سے پہلے کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰ نے ان کو ڈانٹ بتائی تھی۔

سامری کا فتنہ

تورات والوں نے تو یہ سارا فتنہ حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا ہے لیکن قرآن نے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اس کی شدت کے ساتھ تردید کی ہے اور اس سارے فساد کا ذمہ دار، جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں آئے گا، سامری کو قرار دیا ہے جو بڑا ہی شاطر اور عیار منافق تھا اور محض اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے حضرت موسیٰ کی جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو مصر وغیرہ کی بت پرستی اور صنعت گری سے واقف ہو ایک ایسا بچھڑا ڈھال لینا کچھ مشکل نہ تھا جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلے۔ مندروں کے پجاریوں

اور پروہتوں نے عوام فریبی کے لیے ہر دور میں، ایسے ایسے عجائب اور کمالات دکھائے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس سے بھی کہیں زیادہ عجیب چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ جہاں بت پرستی ہو قدرتی طور پر وہاں بت گری کا فن بھی بہت ترقی کر جاتا ہے۔ مصر کے اسوان بند کی تعمیر کے سلسلہ میں ابوسمبل کا قدیم اور عظیم مندر جو بین الاقوامی اہتمام میں اپنی جگہ سے منتقل کیا گیا ہے، ایک انگریزی مجلے میں اس کی تفصیلات کے مطالعے کا مجھے موقع ملا۔ میں یہ پڑھ کر حیران رہ گیا کہ مندر میں بادشاہ (فرعون) اور ملکہ کے اسٹیچو ایسے زاویے سے نصب کیے گئے تھے کہ سال میں جو تاریخ بادشاہ کی ولادت کی ہوتی اس دن سورج کی پہلی کرنیں بادشاہ کی پیشانی پر پڑتیں۔ اب غور کیجیے کہ جو بادشاہ سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا ہو عوام کالانعام کے دلوں میں اس کی خدائی کا سکہ جمانے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی تھی!

الغرض سامری کے لیے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس طرح کا کوئی بچھڑا بنا لینا کوئی مشکل کام نہ تھا، جس سے بچھڑے کی سی آواز نکلے لیکن اس نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ عوام فریبی کے لیے اس نے ایک مکاشفہ اور ایک خاص کرامت کا بھی ڈھونگ رچایا جس سے اس کا رنگ عوام پر خوب جم گیا۔ یہاں اتنے پر کفایت کیجیے، سورہ طٰہٰ کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کی تفصیل آئے گی۔

معبود کی ضرورت

'اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا' یہ بات کے بیچ میں جملہ معترضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یہ ذرا نہ سوچا کہ جو نہ بات کر سکتا نہ رہنمائی کر سکتا آخر وہ کس مرض کی دوا ہے کہ اس کو معبود مان کر اس کی پرستش کی جائے۔ معبود کوئی کھلونا نہیں ہے بلکہ اس سے زندگی کی سب سے بڑی ضرورت وابستہ ہے کہ وہ رہنمائی کرتا ہے۔ اگر اس پہلو سے ایک چیز کا وجود بے معنی ہے تو اس کو معبود کیوں مانیے اور اس کی عبادت کیوں کیجیے۔

'اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ' یہ اصل بات کا حصہ ہے۔ یعنی وہ بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (١٤٩)

بعد از وقت تنبیہ

'سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ' عربی زبان کا محاورہ ہے جس کے معنی عام طور پر نادم اور خجل ہونے کے کیے گئے ہیں لیکن ندامت و خجالت کا لازم چونکہ غلطی پر متنبہ ہونا بھی ہے اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ متنبہ ہونا کیا جائے تو میرے نزدیک غلط نہ ہوگا۔ اس محاورے کی اصل کیا ہے؟ اس بارے میں اہل لغت کا اختلاف ہے اور یہ اختلاف قدرتی نتیجہ ہے اس بات کا کہ ہر محاورے کی اصل کی تحقیق ہے بڑا مشکل کام۔ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ کسی چیز کا ہاتھ میں گرایا جانا گویا اس کا سامنے آجانا ہے ایسی حالت میں ایک غبی بھی اس پر متنبہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ ہاتھ کنگن کے لیے آرسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر یہ توجیہ صحیح مان لی جائے تو مطلب یہ ہوا کہ سامری اور

اس کے ساتھیوں کے پروپیگنڈے سے مسحور ہو کر بنی اسرائیل یہ حماقت کرنے کو تو کر بیٹھے لیکن سامنے جب بھاں بھاں کرتا ہوا بچھڑا نظر آیا اور معلوم ہوا کہ یہ بنی اسرائیل کا خدا برآمد ہوا ہے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ان کو اپنی حماقت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آئی اور اپنی گمراہی کا احساس ہوا اور بولے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہمارے اس جرم کو معاف نہ کیا تو ہم تو نامراد ہوئے۔

قرینہ دلیل ہے کہ یہ احساس ان لوگوں کو ہوا جن کے اندر کچھ سُوجھ بُوجھ موجود تھی۔ عوامی جوش کے بحران میں تو وہ صحیح صورت حال کا اندازہ نہ کر سکے لیکن جب نتیجہ سامنے آگیا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے دیکھا کہ یہ تو معاملہ بہت ہی خراب ہو گیا ہے۔ اجتماعی زندگی میں اس طرح کے مواقع بڑی ہی آزمائش کے اور بڑے ہی خطرناک ہوتے ہیں۔ کوئی ایک شیطان اٹھتا ہے اور جذباتی عوام کی بھیڑ اپنے ارد گرد جمع کر کے کوئی ایسا فتنہ اٹھا دیتا ہے جس سے پوری جماعت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور بسا اوقات سمجھ دار اور ذمہ دار لوگ بھی اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِنْ بَعْدِي ۖ أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۖ وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ ۚ قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (۱۵۰-۱۵۱)

حضرت موسیٰؑ پر حمیت حق کا غلبہ

تورات اور قرآن دونوں ہی سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو پہاڑ ہی پر اس حادثہ کی اطلاع مل چکی تھی بلکہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خبر اللہ تعالیٰ ہی نے حضرت موسیٰؑ کو دی تھی چنانچہ جب وہ پلٹے ہیں تو نہایت غصہ اور غم و افسوس کی حالت میں پلٹے ہیں۔ غصہ ان کو مفسدین کی اس کامیاب شرارت پر تھا اور غم و افسوس اپنی قوم کی نادانی و جہالت پر۔ آتے ہی انھوں نے سب سے پہلے ان لوگوں کی خبر لی جن پر ان کی غیر موجودگی میں قوم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری عاید ہوتی تھی، فرمایا کہ تم لوگوں نے میرے بعد میری بہت بری جانشینی کی کہ قوم کو اس برے راستے پر ڈالا یا جانے دیا۔

'أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ' یعنی قبل اس کے خدا یہ بتائے کہ اس کی عبادت کا کیا طریقہ ہے کیا (اور یہی بتانے کے لیے اس نے مجھے پہاڑ پر بلایا) تم نے سبقت کر کے خود عبادت کا ایک طریقہ ایجاد کر لیا حالانکہ یہ چیز تمھارے ایجاد کرنے کی نہیں بلکہ خدا ہی کے بتانے کی تھی۔ استفہام یہاں سرزنش اور ملامت کے لیے ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ بت پرستی دراصل عقیدۂ حلول کے تحت وجود میں آئی ہے۔ مشرکین سمجھتے ہیں کہ خدا ان صورتوں اور مورتوں میں حلول کر جاتا ہے اس وجہ سے ان کی عبادت خدا کی عبادت کے ہم معنی ہے۔ آگے اسی سورہ میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث آئے گی۔

'وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ' یہ ان کے غلبۂ حال اور جوشِ حمیت کی تصویر ہے کہ تختیاں تو انھوں نے

ایک طرف ڈال دیں اور حضرت ہارونؑ کا سر اور شانہ پکڑ کر ان کو جھنجھوڑنے لگے، مطلب یہ کہ یہ کیا ہوا؟ تم نے اس فتنہ کو کیوں سر اٹھانے دیا؟ چونکہ اصل ذمہ داری حضرت ہارونؑ ہی پر تھی اور ان پر پورا پورا اعتماد بھی تھا اس وجہ سے وہ سب سے زیادہ عتاب کی زد میں آئے۔ اللہ کے معاملے میں یہ جوش و جذبہ غیرتِ ایمانی کا بھی تقاضا ہے اور حضرت ہارونؑ کے ساتھ قلبی محبت کا بھی۔

حضرت ہارونؑ کی طرف سے صفائی

"قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ" یہ حضرت ہارونؑ نے اپنی صفائی پیش فرمائی ہے اور اندازِ خطاب بہت پیارا ہے۔ 'یا اخی' نہیں کہا بلکہ 'ابن ام' اے میرے ماں جائے، کہا جس سے شفقت اور استمالت دونوں چیزیں نمایاں ہو رہی ہیں۔ حضرت ہارونؑ نے صفائی میں فرمایا کہ قوم نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ لوگ مجھے قتل کر دیں۔ اس سے واضح ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس فتنہ سے لوگوں کو روکا بلکہ اس کے لیے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی لیکن قوم کی بھاری اکثریت سامری کے چکمے میں آگئی اور خود ان کے ساتھ اتنی قلیل تعداد رہ گئی کہ طاقت کے زور سے ان کے لیے اس کو روکنا ممکن نہیں رہا۔ اس وجہ سے انھوں نے، جیسا کہ دوسری جگہ بیان آئے گا مصلحت اسی میں دیکھی کہ حضرت موسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کریں مبادا ان کا کوئی اقدام کسی مزید مضرت کا باعث ہو جائے چنانچہ قرآن میں ان کا یہ قول نقل ہوا ہے۔ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ (طٰہٰ: ۹۴) (میں ڈرا کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا لحاظ نہ کیا)

"فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ الاٰیۃ" یعنی دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور مجھے ان ظالموں میں شمار نہ کر، یہ سارا فتنہ شریروں کا اٹھایا ہوا ہے، میں اس سے بالکل بری ہوں لیکن جب وہ دیکھیں گے کہ سارا عتاب مجھ پر ہوا تو وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوں گے کہ فتنہ تو انھوں نے اٹھایا اور ذمہ داری ساری مجھ پر آئی۔

حضرت ہارونؑ پر مرتبین تورات کے جھوٹ کی تردید

اس سے مرتبین تورات کے اس جھوٹ کی پوری پوری تردید ہو گئی جو انھوں نے حضرت ہارونؑ پر لگایا ہے کہ گوسالہ سازی کا یہ سارا کام حضرت ہارونؑ کے اہتمام میں انجام پایا۔ قرآن نے نہ صرف حضرت ہارونؑ کو اس ذلیل تہمت سے بری کیا بلکہ اس فتنہ کے اصل بانی کی بھی نشان دہی کی اور اس کے اس سارے ڈھونگ کو بھی بے نقاب کیا جو عوام فریبی کے لیے اس نے رچایا۔ اس کے موقع پر اس کی پوری تفصیل ان شاء اللہ آئے گی۔

"قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ الاٰیۃ" حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کے اس عذر کو قبول کر لیا۔ حضرت ہارونؑ پر یہ شبہ تو کسی طرح ہو سکتا ہی نہیں تھا کہ خدانخواستہ وہ اس فتنہ کے بانیوں میں ہوں گے البتہ یہ شبہ حضرت موسیٰؑ کو ہوا ہو گا کہ انھوں نے اس کے روکنے کے لیے اپنی ذمہ داری کما حقہٗ ادا نہیں کی۔ حضرت ہارونؑ کے مذکورہ بالا جواب سے یہ شبہ دور ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر حالات ایسے ہو گئے تھے کہ وہ اپنا سر دے کر بھی اس فتنہ کو روک نہیں سکتے تھے تو ان کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اس سے اپنے آپ کو الگ رکھیں اور حضرت موسیٰؑ کا انتظار کریں۔ صورت معاملہ واضح ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ نے اپنے اور اپنے بھائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگی اور پہلے اپنے لیے مغفرت مانگی اس لیے کہ دعائے مغفرت میں صحیح ادب یہی ہے اور اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے

کہ حمیت حق کے جوش میں بھائی کے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ
وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۵۲-۱۵۳)

گوسالہ پرستوں پر غضب الٰہی

یہ وہ وعید ہے جو اس موقع پر بنی اسرائیل کو سنائی گئی کہ جن لوگوں نے یہ گوسالہ سازی کی ہے ان پر آخرت سے پہلے دنیا کی زندگی میں بھی خدا کا غضب اور ذلت کی مار ہوگی، اس لیے کہ یہ اللہ پر افترا کیا گیا ہے اور اللہ پر افترا کی سزا یہی ہے۔ البتہ جو لوگ توبہ کرکے اپنے ایمان کی تجدید کرلیں گے اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ غضب جس شکل میں ظاہر ہوا اس کی تفصیل سورۂ بقرہ آیت ۵۴ کے تحت ہم پیش کر چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے ہر قبیلہ کے مومنین مخلصین کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کے ان مجرمین کو قتل کر دیں جو فتنہ میں شریک رہے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ صرف وہ لوگ قتل سے بچے جنھوں نے توبہ کرلی۔ شرک کو اللہ پر افترا قرار دینے کی وجہ دوسری جگہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

یہاں توبہ کے ساتھ ایمان کی شرط مذکور ہے۔ 'ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا' اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جن سے آدمی کا ایمان ہی سلب ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کا یہ گناہ انھی گناہوں میں سے تھا اس وجہ سے توبہ کے ساتھ تجدید ایمان کی شرط لگائی گئی۔ اگر گناہ کی نوعیت یہ نہ ہو تو توبہ کے ساتھ رویے کی اصلاح توبہ کو مکمل کر دیتی ہے۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَن مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ (۱۵۴)

'سَكَتَ' کے بعد 'عَنْ' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ 'ذَالَ' یا اس کے کسی ہم معنی لفظ کے مفہوم پر متضمن ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب حضرت موسیٰ خاموش ہوئے اور ان کا غصہ دور ہوا۔

تورات کی ایک غلط روایت کی تردید

'أَخَذَ الْأَلْوَاحَ' انھوں نے وہ تختیاں، جو ایک طرف ڈال دی تھیں، پھر اٹھا لیں۔ اس سے ضمناً تورات کی اس غلط روایت کی تردید ہوگئی کہ تختیاں پھینکنے سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ یہ واضح رہے کہ ان تختیوں کو اس طرح ڈال دینے میں ان کی ناقدری کا کوئی پہلو نہیں تھا بلکہ بنی اسرائیل نے اس نعمت گراں مایہ کی جو ناقدری کی تھی اس پر اظہار غم و غصہ تھا کہ تمھارے رب نے تو تمھارے لیے یہ توقیع سیادت و امامت بھیجا اور تم ہو کہ تم نے اس طرح اپنی ناک کٹوائی۔

'وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ' 'نُسْخَة' کسی تحریر کی حرف بحرف نقل کو بھی کہتے ہیں۔ اصل تورات چونکہ انھی الواح کی نقل تھی اس وجہ سے تورات کو ان کے نسخہ سے تعبیر فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ اس میں ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈریں۔ یہ دوسرے لفظوں میں وہی بات ہے جو قرآن سے متعلق 'هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ' کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ ہدایت و رحمت سے متعلق ہم دوسرے مقام میں عرض کر چکے ہیں کہ جب یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ آئیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے لحاظ سے رحمت۔ دنیا کی زندگی میں یہ

رہنما ہوگی اور آخرت میں خدا کی رحمت کا وسیلہ۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۝ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۵۵-۱۵۶)

کوہِ سینا پر حاضری توبہ کے لیے تھی

یہ حضرت موسیٰ کے دوبارہ کوہِ سینا پر جانے کا ذکر ہے جب وہ گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد توبہ کے لیے گئے ہیں۔ تورات کے راویوں نے اس واقعہ کو پہلے واقعہ کے ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ اس وجہ سے بات گھپلا ہو کر رہ گئی ہے۔ قرآن نے ان دونوں واقعات کو الگ الگ بیان کیا ہے اس لیے کہ یہ واقعہ بجائے خود بنی اسرائیل کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھنے والا واقعہ ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص وقت مقرر کیا اور حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر آدمی منتخب فرمائے تاکہ جس نوعیت کا اجتماعی جرم صادر ہوا ہے اسی نوعیت کی اجتماعی توبہ بھی ہو۔ نیز جو کچھ پیش آئے وہ قوم کے تمام ممتاز آدمیوں کے سامنے پیش آئے کہ وہ قوم کے سامنے اس کی گواہی دیں۔

'فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ' اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنا جلال ظاہر فرمایا تاکہ بنی اسرائیل کے لیڈروں کو پھر یاددہانی ہو جائے کہ جس خداوند کے ساتھ ان کا معاملہ ہے اس کے جلال و جبروت کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے۔ تورات میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔

> 'جب تیسرا دن آیا تو صبح ہوتے ہی بادل گرجنے اور بجلی چمکنے لگی اور پہاڑ پر کالی گھٹا چھا گئی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی اور سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے ...... اور کوہِ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا ...... اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا۔' خروج باب ۱۹ - ۱۸ - ۱۹

اگرچہ تورات میں یہ ذکر اس موقع کا ہے جب بنی اسرائیل کو مشہور احکام عشرہ دیے گئے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہی صورت حال اس توبہ کے موقع پر بھی پیش آئی ہے جس کا ذکر قرآن نے 'اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ' سے کیا ہے۔

'قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ' اب یہ حضرت موسیٰ کی گریہ و زاری اور ان کی دعا و فریاد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ جلال تیرے غضب کا مظہر ہے اور تو نے ہمارے ہلاک کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے تو یہ کام تو اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی کر دیتا لیکن اب جب کہ تو نے ہمیں باریابی کا موقع عنایت فرمایا اور ہم یہاں حاضر ہو بھی گئے تو یہ تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو ہمیں ہلاک کرے۔

'اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ' مطلب یہ کہ یہ جو کچھ ہوا جماعت کے اندر کے نادانوں کی بدبختی سے ہوا اور یہ تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو نادانوں کے کسی جرم کی پاداش میں سب کو ہلاک کر دے۔

'اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ الاية' مطلب یہ کہ یہ تو تیری ایک آزمائش تھی اور تیری آزمائش سے عہدہ برآ ہونا

ہوتے ہیں جن کو تیری توفیق حاصل ہو۔ تو ہی جن کو توفیق بخشتا ہے تیرے امتحان میں کامیاب ہوتے اور ہدایت پاتے ہیں، اور جن کو اپنی توفیق سے محروم کر دیتا ہے وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہاں حضرت موسیٰ نے اسی سنت اللہ کا حوالہ دیا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کا ذکر بار بار قرآن میں ہو چکا ہے لیکن ساتھ ہی نہایت ہی ادب کے ساتھ اور نہایت ہی لطیف طریقہ پر اس میں معاملے کی نزاکت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ تیرے امتحانوں میں پورا اترنا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ یہ تیرے فضل اور تیری توفیق بخشی ہی پر منحصر ہے۔ تو ہی ہمارا ولی اور کارساز ہے تو ہمیں بخش، ہم پر رحم فرما تو بہترین بخشنے والا ہے۔

خدا کی آزمائش سے عہدہ برآ ہونا آسان بازی نہیں ہے

'وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً الاٰیۃ' اس دنیا میں بھی تو ہمارے لیے بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی بھلائی لکھ دے۔ آخرت کے ساتھ لفظ 'حَسَنَةً' کو حذف کر دیا اس لیے کہ مذکور محذوف پر خود دلیل ہے۔ لفظ 'هُدْنَا' پر دوسری جگہ ہم بحث کر چکے ہیں۔ اس کے معنی رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں۔ اس لفظ میں یہود کے لیے ایک لطیف یاد دہانی بھی ہے کہ اگر ان میں کچھ حیا ہے تو اپنے نام کی لاج رکھیں۔

'قَالَ عَذَابِيٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ الاٰیۃ' حضرت موسیٰ کی دعا مطلق تھی اور قوم کے ساتھ ان کو جو محبت تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اسی تعمیم کے ساتھ قوم کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی دعا مانگیں۔ تورات میں بھی اس موقع کی دعا اسی تعمیم کے ساتھ مذکور ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں اپنے عذاب و رحمت کا اصل ضابطہ بیان فرما دیا۔ فرمایا کہ جہاں تک میرے عذاب کا تعلق ہے وہ تو میں انہی پر نازل کرتا ہوں جن پر چاہتا ہوں۔ "جن پر چاہتا ہوں" کا مطلب بار بار ہم واضح کر چکے ہیں کہ خدا کا ہر چاہنا اس کی حکمت اور اس کے عدل کے تحت ہے اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں اپنا عذاب صرف ان پر نازل کرتا ہوں جو میرے قانون عدل کے تحت اس کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ رہی میری رحمت تو وہ اس دنیا میں تو ہر چیز کو عام ہے جس کو بھی وجود کی نعمت ملی ہے میرے ہی فضل سے ملی ہے، جس کو بھی رزق پہنچ رہا ہے میرے ہی خوان کرم سے پہنچ رہا ہے، امیر و غریب، شاہ و گدا اور کافر و مومن جس کے پاس بھی جو کچھ ہے سب میرا ہی عطا کردہ ہے لیکن وہ رحمت جو آخرت سے متعلق ہے اس کو میں ان لوگوں کے لیے خاص رکھوں گا جو اس دنیا کی زندگی میں مجھ سے ڈرتے رہیں گے، زکوٰۃ ادا کرتے رہیں گے اور خاص کر ان کے لیے جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔

خدا کی رحمت اور نقمت کا ضابطہ

'وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ' کا ٹکڑا یہاں خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ یوں نہیں فرمایا کہ 'يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا' بلکہ اسلوب بدل کر فرمایا 'وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ'۔ اسلوب کی اس تبدیلی سے مبتدا پر خاص طور پر زور دینا مقصود ہے کہ خاص کر وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ جو لوگ قرآن کے نظائر پر نگاہ رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اس عہد و میثاق کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے آئندہ آنے والے انبیا پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا اور جس کی وضاحت مائدہ کی مندرجہ ذیل آیت میں ہے۔

ایک توجہ طلب ٹکڑا

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۱۲ - مائدہ ۵

اور اللہ نے فرمایا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کا اہتمام قائم رکھو گے، زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی تائید کرو گے اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہو گے۔ اگر تم یہ کرو گے تو میں تمہارے گناہ تم سے دور کردوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ پس جو اس کے بعد تم میں سے کفر کرے گا تو وہ اصل شاہراہ سے بھٹک گیا۔

یہ عہد یوں تو ان تمام نبیوں اور رسولوں پر مشتمل تھا جو حضرت موسیٰ کے بعد آئے لیکن اس میں خاص اشارہ اس نبی امی کی طرف تھا جس کی بعثت کی پیشین گوئی خود سیدنا موسیٰ نے، جیسا کہ بقرہ میں گزر چکا ہے، بڑی تصریح کے ساتھ فرمائی تھی۔ آل عمران میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ ۸۱ - آل عمران

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے نبیوں کے باب میں میثاق لیا کہ ہم نے تم کو کتاب اور حکمت سے نوازا، پھر آئے گا تمہارے پاس ایک رسول تصدیق کرتا ہوا ان پیشین گوئیوں کی جو تمہارے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ پوچھا کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس باب میں میری سونپی ہوئی ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ بولے ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو اس پر گواہ رہو، میں بھی تمہارے ساتھ اس کے گواہوں میں سے ہوں۔

یہی عہد و میثاق ہے جس کی طرف 'وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ' کے الفاظ میں اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ کی درخواست کے جواب میں یہ تصریح فرما دی کہ میری ابدی اخروی رحمت کے سزاوار صرف وہ لوگ ٹھہریں گے جو میرے عہد شریعت پر قائم رہیں گے، آگے آنے والے نبیوں اور رسولوں کی تائید کریں گے اور ان میں سے جن کو میرے آخری رسول کی بعثت نصیب ہوگی وہ اس پر ایمان لائیں گے اور اس کے مددگار و خدمت گزار بنیں گے۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو قرآن نے برسبیل تضمین و تفسیر وضاحت فرما دی کہ آج اس 'وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ' کے مصداق کون لوگ ہوں گے۔ فرمایا۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ

وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ ۙ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۷)

ایک ابہام کی وضاحت

یعنی وہ لوگ جو اس نبی امی کی پیروی کریں جس کی پیشین گوئیاں خود ان کی اپنی کتابوں، تورات و انجیل میں موجود ہیں۔ نبی امی سے مراد ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رسول، نبی، امی، یہ تینوں الفاظ یہاں آپ کی تعریف اور تعارف کے طور پر وارد ہوئے ہیں۔ نبی اور رسول کے فرق کی طرف مختلف مقامات میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ رسول اپنی قوم کے لیے کامل حجت اور کامل عدالت کی حیثیت سے آتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے قوم پر اللہ کی حجت پوری کر دی جاتی ہے اس وجہ سے اگر وہ قوم ایمان نہیں لاتی تو لازماً تباہ کر دی جاتی ہے اور رسول اور اس کے ساتھیوں کو لازماً مخالفین پر غلبہ حاصل ہوتا ہے، عام اس سے کہ یہ نبی کی زندگی ہی میں ہو یا اس کی وفات کے بعد۔ نبی کے لیے ان خصوصیات کا حامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس پہلو سے ہر رسول نبی لازماً ہوتا ہے لیکن ہر نبی لازماً رسول نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی اور رسول دونوں حیثیات کے جامع تھے۔

بنی اسمٰعیل کے لیے 'امیین' کا لقب

لفظ 'امی' پر ہم آل عمران کی آیت ۲۰ کے تحت بحث کر آئے ہیں۔ یہ لفظ بنی اسمٰعیل کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کو ظاہر کرتا ہے۔ بنی اسمٰعیل چونکہ تعلیم و تعلم اور کتاب و شریعت سے ناآشنا لوگ تھے، اس پورے دور میں جو ان کے بزرگ خاندان حضرت اسمٰعیل کے بعد گزرا ان کے ہاں کسی نبی یا رسول کی بعثت نہیں ہوئی تھی جب کہ اسی دوران میں بنی اسرائیل کے اندر بے شمار نبی پیدا ہوئے جن میں سے حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح نبی اور رسول دونوں حیثیات کے جامع تھے اس وجہ سے بنی اسرائیل بنی اسمٰعیل کو 'امیین' کہتے تھے۔ اگرچہ بنی اسرائیل اس لفظ کو بنی اسمٰعیل کے صرف ایک وصف امتیازی ہی کو پیش نظر رکھ کر نہیں استعمال کرتے تھے بلکہ اپنے مقابل میں ان کی تحقیر کا پہلو بھی ان کے ذہن میں ہوتا تھا لیکن امیت و بدویت اور کتاب و شریعت سے بیگانگی چونکہ بطور ایک امر واقعہ کے ان کے اندر موجود تھی اس وجہ سے قرآن نے، جیسا کہ سورۂ جمعہ میں ہم واضح کریں گے، اس لفظ کو ان کے لیے بطور ایک امتیازی لقب کے استعمال کیا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کیا اور صحابہؓ بھی اس کو بلا کسی احساس کہتری کے استعمال کرتے تھے گویا بنی اسرائیل کے بالمقابل ان کے لیے یہ ایک امتیازی لقب تھا۔

نبی امی کی پیشینگوئیاں پچھلے صحیفوں میں

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تورات و انجیل کی جن پیشین گوئیوں کا حوالہ ہے ان میں سے بعض کا، جو موجودہ تورات و انجیل میں بھی موجود ہیں، ذکر پچھلی سورتوں کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ محض بطور یاد دہانی ان کا حوالہ یہاں ہم پھر دیے دیتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اہل کتاب، بنی اسمٰعیل کے اندر ایک صاحب رسالت نبی کی بعثت سے پہلے سے واقف تھے اور اس کا چرچا ان کے ہاں برابر قائم رہا ہے۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا

کرے گا، تم اس کی سننا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں ۔ میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا ۔ استثنا ۱۸ ۔ ۱۵ ۔ ۱۹

اس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر خود حضرت موسیٰؑ ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ آنے والا نبی بنی اسمٰعیل یعنی امیوں میں پیدا ہوگا اس لیے کہ اس سیاق میں تیرے بھائیوں میں سے " یا " انہی کے بھائیوں میں سے " کا مطلب اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا ، یہ حضرت موسیٰؑ کی زبان مبارک سے گویا اسی بشارت کا اعادہ تھا جو سیدنا ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے ایک رسول کی بعثت کی دی تھی تفصیلات اس کی بقرہ میں گزر چکی ہیں ۔

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ وہ صرف نبی نہیں ہوگا بلکہ رسول بھی ہوگا اس لیے کہ " میری مانند " اور " تیری مانند " سے مراد حضرت موسیٰؑ کے مانند ہے اور حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے جن کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو نجات حاصل ہوئی اور فرعون اور اس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے تباہ کر دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح اپنی قوم قریش اور اہل عرب کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ۔

" خدا سینا سے آیا ، اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا ، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا ، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی " ۔ استثنا ۳۳ ۲

آتشی شریعت سے میرے نزدیک اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو سیدنا مسیحؑ نے ظاہر فرمائی ہے کہ اس کے ہاتھ میں اس کا چھاج ہوگا ، وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا ، دانے کو بھس سے الگ کرے گا ، پھر دانے کو محفوظ کرے گا اور بھس کو جلا دے گا ۔ یہ ٹھیک ٹھیک رسول کی وہ خصوصیت بیان ہوئی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ وہ اپنی قوم کے لیے عدالت بن کر آتا ہے اور حق و باطل کے درمیان اس کے ذریعے سے فیصلہ ہو جاتا ہے ۔

یسعیاہ نبی کی پیشینگوئی ان الفاظ میں مذکور ہے ۔

" دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا ، بڑا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے ۔ میں نے اپنی روح اس پر رکھی ، وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا ، اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا " یسعیاہ ۴۲ ا ۔ ۴

سیدنا مسیحؑ کی پیشینگوئی ملاحظہ ہو ۔

" یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا ۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے ۔ اس لیے میں

تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔" متی باب ۲۱: ۴۲-۴۴

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔" یوحنا باب ۱۴: ۱۶

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" یوحنا باب ۱۴: ۳۱

ان پیشینگوئیوں پر غور کیجیے۔ حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل میں آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی بنی اسرائیل میں نہیں آیا۔ پھر ان پیشینگوئیوں کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ آخر وہ پتھر کون ہو سکتا ہے جس کو معماروں نے تو رد کر دیا تھا لیکن بالآخر وہی کونے کے سرے کا پتھر بن گیا؟ یہ کس کی شان ہے کہ جو اس پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور جس پر وہ گرے گا اس کو پیس ڈالے گا؟ یہ کس کا مرتبہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا کا سردار ہے جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا اور وہ باتیں بتائے گا جو حضرت مسیح بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ضد اور مکابرت کی بات اور ہے لیکن جو شخص بھی ان پیشینگوئیوں پر انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ اگر کسی پر راست آسکتی ہیں تو صرف نبی امی اور رسول خاتم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی راست آسکتی ہیں۔ نبی امی کے سوا اور کوئی ان کا مصداق نہیں ہو سکتا۔

آنحضرت صلعم کا تعارف

یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ الاٰية۔ ان باتوں کا حوالہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور تعارف ہی کے طور پر دیا گیا ہے۔ یہود نے اپنے اوپر بہت سی خود ساختہ پابندیاں بھی لاد رکھی تھیں اور بعض پابندیاں ان کی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر عاید کر دی گئی تھیں۔ ان ساری چیزوں کے دور ہونے کا انحصار آخری رسول کی بعثت پر تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے ان کی یہ ساری زنجیریں کاٹ دیں لیکن انھوں نے اپنی شامتِ اعمال کے سبب سے اس نعمت کی قدر نہ کی۔ اس مسئلہ پر آل عمران آیت ۹۳ - مائدہ آیت ۵ کے تحت بھی ہم لکھ چکے ہیں اور سورہ انعام کی تفسیر میں بھی اس پر وضاحت سے بحث ہوئی ہے اس وجہ سے یہاں اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

اہل کتاب کی نجات کا انحصار نبی امی پر ایمان لانے پر ہے

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ الاٰية۔ یہ اہل کتاب کو دعوت ایمان ہے کہ جو لوگ اس رسول کے باب میں سابق پیشینگوئیوں کے امین ہیں اور جن کو اس کی بعثت سے یہ سعادت حاصل ہونے والی ہے کہ تمام غیر فطری بندھنوں اور پابندیوں سے آزاد ہو جائیں گے سب سے پہلے انہی کا حق ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں، لوگوں میں اس کا تعارف کرائیں، مخالفوں کے مقابل میں اس کی حمایت کریں اور اس روشنی یعنی قرآن کی پیروی کریں جو اللہ

کی طرف سے دے کر وہ بھیجا گیا۔ فرمایا کہ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پانے والے بنیں گے باقی سب محروم و نامراد ہوں گے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۱۵۸)

آنحضرتؐ کی بعثت تمام عالم کے لیے ہوئی

جب بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر تک پہنچ گئی تو برسرِ موقع آپ کی زبانِ مبارک سے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی دعوت بھی دلوا دی گئی کہ اے لوگو، میں تم سب لوگوں کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ "سب لوگوں کی طرف" یعنی بنی اسمٰعیل و بنی اسرائیل، عرب اور غیر عرب سب کی طرف۔ اوپر کی پیشینگوئیوں میں بھی تصریح ہے کہ اگرچہ آپ کی بعثت بنی اسمٰعیل میں ہوگی لیکن آپ کی رسالت سب کی طرف ہوگی اور دنیا کی سب قومیں آپ کی برکات میں سے حصہ پائیں گی۔ اہلِ عرب پر، عام اس سے کہ وہ بنی اسمٰعیل ہوں یا بنی اسرائیل، آپ نے اللہ کی حجت براہِ راست تمام کی اور وقت کے ملوک و سلاطین کو بھی آپ نے دعوت دی اور آپ کے بعد اس دعوت و شہادت کی ذمہ داری قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت پر ڈالی جس کو 'شہداء اللہ فی الارض' کے منصب عالی پر سرفراز فرمایا۔

'اَلَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' یعنی آسمان و زمین کی بادشاہی خدا ہی کی ہے جس کا میں رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ اسی کے اختیار میں تو لوگوں کا عزل و نصب ہے تو کسی بے جا عصبیت، کسی غلط اعتماد اور کسی بے بنیاد غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اللہ اور اس کے نبی امی رسول پر، جس کی پیشینگوئیاں تمھاری اپنی کتابوں میں موجود ہیں ایمان لانے سے گریز نہ اختیار کرو۔

'اَلَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے جو اوپر حضرت موسیٰؑ کی پیشینگوئی میں مذکور ہوئی ہے کہ 'میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہ وہی لوگوں سے کہے گا'، مطلب یہ ہوا کہ نبی کے اس دعوائے نبوت اور اس کی اس دعوت کو کسی وہم، کسی خیال اور دوسروں پر برتری اور سیادت حاصل کرنے کی کسی خواہش پر مبنی نہ سمجھو۔ یہ تو وہی کچھ تمھیں سنایا جا رہا ہے جو اللہ کی طرف سے آ رہا ہے۔ پیغمبر خود اللہ پر اور اس کی ان باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اسی ایمان کی دعوت تمھیں دے رہا ہے۔ یہ اس کی اپنی کوئی ایجاد نہیں ہے۔ دوسرے اس میں وہ دھمکی بھی مضمر ہے جو اوپر والی پیشینگوئی میں مذکور ہے کہ چونکہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی چیز ہے اس وجہ سے اس میں پیغمبر کی طرف سے کسی کمی بیشی، کسی حذف و اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر پیغمبر نے اس کی تبلیغ میں کوئی مداہنت برتی تو خدا اس سے اس کا مواخذہ فرمائے گا اور اگر لوگوں نے اس سارے اہتمام کے باوجود اس کا حق نہ پہچانا تو ان سے مواخذہ ہوگا۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰٓ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (۱۵۹)

صالحین اہل کتاب کی حوصلہ افزائی

ہم پیچھے ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ قرآن نے جہاں جہاں بنی اسرائیل کی عہد شکنیوں اور بداعمالیوں پر شدت کے ساتھ سرزنش کی ہے وہاں ان کے اندر کے اس گروہ قلیل کی تحسین بھی فرمائی ہے جو حق و عدل پر قائم رہا ہے اور جس کی بدولت بنی اسرائیل کو ان کے جرائم کے باوجود مہلت ملتی رہی ہے۔ یہاں بھی اسی گروہ کی طرف اشارہ ہے اور لفظ 'اُمَّةٌ' کی تنکیر اس کی قلت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ 'يَهْدُونَ' اور 'يَعْدِلُونَ' مضارع کے صیغے استمرار کو ظاہر کر رہے ہیں اس لیے کہ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں فعل ناقص محذوف ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ جہاں موسیٰ کی قوم میں اس طرح کے ناب کار و ناہنجار پیدا ہوتے ہیں، جن کا ذکر اوپر گزرا، وہیں ان کے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی برابر رہا ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور عدل کے مطابق لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے رہے ہیں۔ یعنی علما اور قضاۃ دونوں ہی گروہوں میں اچھے لوگ بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح کا ایک گروہ، قلیل تعداد میں سہی، ان آیات کے نزول کے زمانے میں بھی موجود تھا اور یہی لوگ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ ان کے یہاں ذکر سے مقصود ان کی حوصلہ افزائی ہے اور اس میں اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے کہ پیغمبرؐ نے یہ اہل کتاب کو جو دعوت دی ہے وہ اس طرح کے صالحین پر اثر انداز ہوگی اور وہ نبی امی پر ایمان لائیں گے۔

اس آیت پر وہ تضمین یا تخلیص جو 'الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ' سے شروع ہوئی تھی ختم ہوئی اور آگے سلسلۂ کلام پھر بنی اسرائیل کی اسی سرگزشت سے جڑ گیا جو بیان ہو رہی تھی۔

وَقَطَّعْنَاهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَمًا ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهُۥٓ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۚ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۚ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوٓا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ اسْكُنُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيٓـَٔاتِكُمْ ۚ سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ (۱۶۰-۱۶۲)

ناشکری کے باوجود بنی اسرائیل پر احسان

معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ یہ آیتیں بقرہ میں بھی گزر چکی ہیں۔ وہاں پوری تفصیل سے ان کی تفسیر بیان ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات ۵۷-۶۰ بقرہ۔ لفظ 'اسباط' پر بھی بقرہ کی آیت ۱۳۶ کے تحت گفتگو ہو چکی ہے۔ لفظ 'تقطیع' یہاں اچھے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایک ہی باپ کی اولاد بارہ خاندانوں کی شکل میں پھیلی پھولی، اور ہم نے ہر خاندان کو امتوں اور قوموں کی شکل میں بڑھایا اور پھیلایا اور اسی اعتبار سے ان کو اپنی نعمتوں اور رحمتوں سے بھی نوازا لیکن انھوں نے ہر نعمت کی ناقدری کی۔

وَاسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ

يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْۗءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَـيِٕيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ (۱۶۳-۱۶۶)

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الآیہ، یہ جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کا ذکر بقرہ آیات ۶۵-۶۶ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف ان چیزوں پر روشنی ڈالیں گے جو وہاں بیان نہیں ہوئی ہیں۔

بنی اسرائیل کو ان کی پچھلی کارستانیوں کی یاد دہانی

وَسْـَٔلْهُمْ کا اسلوب زجر و توبیخ کو ظاہر کر رہا ہے۔ 'ھُمْ' سے مراد یہود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی ان تمام کرتوتوں کے باوجود جو بیان ہوئیں اپنی پاکی و برتری کے زعم سے باز نہیں آتے اور اپنے آپ کو خدا کا چہیتا اور لاڈلا بنائے بیٹھے ہیں تو ذرا ان سے اس قریہ کا ماجرا پوچھو جس نے سبت کی بے حرمتی کی اور اس کی سزا میں خدا نے اس کو نمونۂ عبرت بنا دیا۔ قرآن نے اس قریہ کی اس سے زیادہ تصریح نہیں فرمائی کہ یہ سمندر کے کنارے تھا۔ تورات میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن قرآن کا انداز بیان ظاہر کرتا ہے کہ زمانۂ نزول قرآن کے یہود اپنی تاریخ کی ایک مشہور روایت کی حیثیت سے اس کو جانتے تھے۔ چنانچہ بقرہ میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے (وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ اور ان کو تو تم جانتے ہی ہو جنھوں نے تم ہی سے سبت کے معاملے میں حدودِ الٰہی سے تجاوز کیا) ظاہر ہے کہ یہود کے رو در رو اس اسلوب میں وہی بات کہی جا سکتی ہے جو ان کے درمیان شہرت رکھتی ہو ورنہ وہ قرآن کے اس بیان کی ضرور تردید کرتے۔ بعض لوگوں نے اس کو ایلہ اور عقبہ کے پاس کا کوئی شہر بتایا ہے۔ یہ بات صحیح ہو سکتی ہے۔ سمندروں کے کنارے کے شہر، اگر جائے وقوع مناسب ہو تو تجارتی مرکز بن جاتے ہیں اور بہت ترقی کر جاتے ہیں۔ عقبہ کے علاقے کو بنی اسرائیل کی تاریخ میں قدیم زمانے سے شہرت حاصل ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے بحری بیڑے کا مرکز بھی یہی تھا۔ لفظ 'قریہ' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ عربی میں یہ لفظ صرف چھوٹی بستیوں ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ اس کا اطلاق بڑی بڑی مرکزی آبادیوں پر بھی ہوتا ہے۔

لفظ شُرَّع کی تحقیق اور مچھلیوں کے ابھرنے کی نوعیت اور حکمت

اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا، شُرَّع، شَارِعَة کی جمع ہے۔ جب یہ لفظ نیزوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد سیدھے اٹھائے ہوئے نیزے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ مچھلیوں کے لیے آیا ہے تو اس سے منہ اٹھائے ہوئے مچھلیاں مراد ہیں۔ پلی ہوئی مچھلیوں کے تالاب کے کنارے ان کے ابھرنے کے اوقات میں کھڑے ہو جائیے تو یہ دلکش منظر نظر آئے گا کہ مچھلیاں اپنے سر سطح پر اس طرح ابھارے ہوئے نظر آئیں گی گویا وہ اپنے نیزے سیدھے کیے ہوئے ہیں۔ سمندروں کے کنارے جو شکارگاہیں ہوتی ہیں ان میں یہ منظر اور

بھی دلفریب اور طمع انگیز ہوتا ہوگا۔ یہود کی شریعت میں سبت یعنی ہفتہ کے دن کام کاج اور سیر و شکار وغیرہ کی ممانعت تھی لیکن وہ صبر نہ کر سکے۔ انھوں نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار کے لیے مختلف قسم کے حیلے ایجاد کر لیے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی نافرمانی میں اصرار کے حد تک بڑھ جاتی ہے اور اچھوں کے سمجھانے سے بھی باز نہیں آتی تو اس معاملے میں اس کی آزمائش سخت سے سخت تر ہو جاتی ہے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی صورتِ حال بنی اسرائیل کے لیے پیدا کر دی۔ عام دنوں میں تو یہ مچھلیاں نظر نہ آتیں یا بہت ہی کم نظر آتیں لیکن سبت کے دن معلوم ہوتا کہ ان کے ہاں بارات اتری ہوئی ہے۔ یہ چیز ان کی حرص کو اور بھڑکا دیتی۔ مشہور ہے کہ آدمی جس چیز سے روک دیا جائے اس کی خواہش اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور خواہش وہ بلا ہے کہ اس کے اثر سے بسا اوقات آدمی کی نگاہ بھی بدل جاتی ہے۔ خواہش نہ ہونے کی صورت میں جو چیز چھٹانک بھر نظر آتی ہے، خواہش کے غلبہ کی حالت میں وہی سیر بھر نظر آنے لگتی ہے۔ مشہور ہے کہ حُسن کا اندازہ کرنے میں حسن سے زیادہ حسنِ نظر کو دخل ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل اپنی شامتِ اعمال سے اس ذہنی فتنے میں مبتلا ہو گئے اور پھر اس حد تک خراب ہوئے کہ نیکوں کی تلقین و موعظت تو درکنار خدا کے عذاب سے بھی ان کو تنبیہ نہیں ہوئی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی۔

بنی اسرائیل اور امت مسلمہ کے امتحان میں مشابہت — سورۂ مائدہ آیت ۹۴ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ جس طرح بنی اسرائیل کو سبت کے دن شکار کی ممانعت تھی اسی طرح ہمارے لیے حالتِ احرام میں خشکی کے شکار کی ممانعت ہوئی اور ہم کو بھی اس طرح کی آزمائش سے بچتے رہنے کی تاکید کی گئی جس میں بنی اسرائیل مبتلا ہو کر اپنے کو تباہ کر بیٹھے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّکُمُ اللّٰہُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُہٗٓ اَیْدِیْکُمْ وَرِمَاحُکُمْ لِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّخَافُہٗ بِالْغَیْبِ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَہٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۹۴ مائدہ) (اے ایمان والو، اللہ تمھیں کسی ایسے شکار سے آزمائے گا کہ تم خیال کرو گے کہ تمھارے ہاتھ اور نیزے ان کو پا لیں گے تاکہ اللہ ان لوگوں کو ممیز کرے جو اس سے غیب میں ڈرتے ہیں۔ جو اس کے بعد حدود سے تجاوز کریں گے ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے)۔ تَاْتِیْھِمْ حِیْتَانُھُمْ یَوْمَ سَبْتِھِمْ شُرَّعًا اور تَنَالُہٗٓ اَیْدِیْکُمْ وَرِمَاحُکُمْ کے الفاظ پر ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کر غور کیجیے تو دونوں کی مشابہت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔

حقِ نصیحت آخری دم تک — وَاِذْ قَالَتْ اُمَّۃٌ مِّنْھُمْ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس بستی کے لوگوں نے تفاوت کی یہ راہ سمجھانے بجھانے والوں کے علی الرغم اختیار کی۔ یہ نہیں تھا کہ ان کو کوئی آگاہ کرنے والا نہیں تھا، اللہ کے ایسے بندے وہاں تھے جنھوں نے ان کو نہ صرف اس جرم سے روکنے کی کوشش کی بلکہ اس حد تک کوشش کی کہ ان کے اپنے ساتھیوں میں سے ایک جماعت نے اب مزید سمجھانے کو بالکل غیر مفید سمجھا اور یہ کہا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے سے کیا حاصل جو اب یا تو ہلاک ہونے والے ہیں یا کم از کم یہ کہ کسی شدید عذاب کی پکڑ میں آنے والے ہیں۔ لیکن اللہ کے ان بندوں نے اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو یہ جواب دیا کہ ہمارا سمجھانے

کا کام جاری رہنا چاہیے۔ اگر یہ لوگ نہ مانے تو ہم اللہ کے ہاں اپنے فرض سے سبکدوش ٹھہریں گے اور کیا عجب کہ مان ہی جائیں، سو اگر مان گئے تو یہی مطلوب ہے۔

نہی عن المنکر کے بارے میں ذمہ داری کی حد

اس سے اس ذمہ داری کی حد معین ہوتی ہے جو ہر مومن پر دوسروں کو برائی سے روکنے اور بھلائی کی دعوت دینے کی عاید ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس میں کوئی مرحلہ ایسا نہیں آتا جب داعی اور ناصح یہ فرض کر لیں کہ اب دعوت و نصیحت کا فرض ادا ہو گیا اس لیے نہ ماننے والوں کو عذاب الٰہی کے لیے چھوڑ دینا چاہیے بلکہ یہ کام زندگی کے آخری لمحے تک کرتے رہنا چاہیے اگرچہ ایک شخص بھی نصیحت کا قدر کرنے والا نہ نکلے۔ عنداللہ ایسے ہی لوگ اپنے فرض سے سبکدوش قرار پائیں گے۔ وہ لوگ اللہ کے ہاں بری نہیں ہوں گے جو خود اگرچہ برائی میں مبتلا نہ ہوں لیکن دوسروں کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق ہو کر زندگی گزاریں۔ اس مضمون پر مفصل بحث انفال آیت ۲۵ کے تحت آئے گی۔

خدا کی پکڑ سے صرف وعظ و نصیحت ادا کرنے والے ہی بچتے ہیں

'فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ' یعنی جب وہ تنبیہات جو انھیں کی گئی تھیں وہ بھلا بیٹھے اور کسی طرح سوچنے سمجھنے پر راضی نہ ہوئے تو اللہ نے ان کی اس نافرمانی و عہد شکنی کی پاداش میں ان پر ایک سخت عذاب بھیجا جس سے صرف وہ لوگ محفوظ رہے جو لوگوں کو برائی سے روکنے والے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کی اجتماعی نافرمانیوں پر جب اللہ کا کوئی فیصلہ کن عذاب نازل ہوتا ہے تو اس کی پکڑ سے صرف وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو برائی سے روکنے والے ہوتے ہیں۔

لعنت بدترین عذاب ہے

'فَلَمَّا عَتَوْا عَن مَّا نُهُوا عَنْهُ' الآیۃ یہ اس لعنت کا ذکر ہے جو ان نافرمانوں پر ہوئی اور جس کا ذکر بقرہ ۶۵ اور مائدہ ۶۰ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔ کسی قوم پر اللہ کی لعنت اس عذاب سے بھی سخت تر چیز ہے جو کسی قوم کو فنا کر دیتا ہے اس لیے کہ لعنت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم بظاہر زندہ رہتی ہے لیکن اس کی زندگی صرف ذلت و خواری کی ایک داستانِ عبرت ہوتی ہے۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ اس بستی پر اللہ کی ایسی لعنت ہوئی کہ وہ دیکھنے والوں کے لیے ایک نمونۂ عبرت بن کر رہ گئی۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۗ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۶۷)

یہود پر ابدی لعنت ہے

'تاذن' کا صحیح مفہوم کسی فیصلۂ قطعی سے لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کی اس طرح کی بد عہدیوں کی بنا پر ان کو ان کے نبیوں کے ذریعہ سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر ایسے لوگوں کو قیامت تک مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت سخت عذابوں میں مبتلا کرتے رہیں گے۔ اس طرح کی تنبیہ ان کو حضرت موسیٰ نے بار بار فرمائی اور بعد کے نبیوں نے بھی نہایت آشکارا الفاظ میں اس سے آگاہ کیا۔ احبار میں ہے۔ "اگر تم میرے سننے والے نہ ہو اور ان سب حکموں پر عمل نہ کرو۔ ..... اور مجھ سے عہد شکنی کرو تو میں بھی تم سے ایسا ہی کروں گا ..... اور میرا چہرہ تمہارے برخلاف ہو گا اور تم دشمنوں کے سامنے قتل کیے جاؤ گے اور

جو تمہارا کینہ رکھتے ہیں تم پر حکومت کریں گے۔" احبار باب ۲۶ ۱۴-۱۷۔ اسی طرح کتاب استثنا میں ہے "تیرے بیٹے اور عزیز بیٹیاں دوسری قوم کو دی جائیں گی اور تیری آنکھیں دیکھیں گی اور سارے دن ان کی راہ تکتے تکتے تھک جائیں گی اور تیرے ہاتھ میں کچھ زور نہ ہوگا۔ استثنا باب ۲۸-۳۲۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی عملی تصدیق تاریخ کے صفحات میں مرقوم ہے۔ اس کے لیے بوخذ نصر اور ٹیٹس سے لے کر جرمنی کے ہٹلر تک کی تاریخ پڑھ جائیے، ہر دور میں آپ کو اس قوم کی ذلت و بربادی کی نہایت لرزہ خیز داستان مل جائے گی۔ یہ ملحوظ رہے کہ بیچ بیچ میں مہلت کا کوئی وقفہ مل جانے سے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی نفی نہیں ہوتی ہے۔ قرآن کا اسلوب بیان خود شاہد ہے کہ ان کو وقفے بھی ملتے رہیں گے لیکن ہر وقفہ ان کے لیے کسی تازہ مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ آج ارض مقدس میں ان کا جو اجتماع ہو رہا ہے یہ آشیاں بندی بھی ایک نئے طوفان کی دعوت ہے جس کے بعد ان کی پوری مجتمعہ قوت انشاء اللہ یک قلم ختم ہو جائے گی۔ یہاں اشارہ پر کفایت کیجیے۔ اس کی وضاحت سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں آئے گی۔

'اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ' میں اس فیصلہ الٰہی کی حقیقت صفات الٰہی کے آئینہ میں دکھائی گئی ہے کہ کوئی خدا کو اس دنیا کے معاملات سے بے تعلق یا الگ تھلگ نہ خیال کرے۔ جو لوگ اس کی راہ سے بے راہ ہوتے ہیں ان کو وہ سزا بھی بڑی ہی سخت دیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کے لیے وہ بڑا بخشنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔ 'عِقَاب' کے ساتھ 'سَرِیْع' کی صفت ان لوگوں کی بلادت پر ضرب لگانے کے لیے ہے جو خدا کی دیر کو اندھیر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ کوئی اس کی بخشی ہوئی مہلت سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ وہ جب پکڑتا ہے تو آناً فاناً پکڑتا ہے اور جن کو پکڑتا ہے وہ بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہ صبح کی شام بھی نہیں ہونے پائی کہ دھر لیے گئے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۖ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (۱۶۸)

بنی اسرائیل کا انتشار

'وَقَطَّعْنٰهُمْ' اوپر آیت ۱۶۰ میں بھی گزر چکا ہے، وہاں جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا اچھے مفہوم میں ہے۔ یہاں یہ لفظ اس کے برعکس ان کی پراگندگی اور انتشار کے دور کے حالات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کی جو تنظیم کی وہ اپنے پورے شباب پر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے دور میں پہنچی۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد اس تنظیم میں ضعف پیدا ہونا شروع ہوا اور پھر بتدریج حالات ایسے خراب ہوتے گئے کہ یہود اپنے مرکز میں بھی محکوم ہو گئے۔ یہاں تک کہ گروہ گروہ ہو کر دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے۔ اگرچہ انفرادی حیثیت سے ان میں نیک بھی تھے اور بد بھی لیکن اجتماعی حیثیت سے وہ ان اوصاف سے محروم ہو چکے تھے جو ایک ملت کی حیثیت سے ان کو دنیا میں سربلند رکھنے کے لیے ضروری تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ان کو اچھے اور برے ہر طرح کے حالات سے آزمایا تاکہ وہ اپنے رب کی

طرف رجوع کریں لیکن ان کی خواہشیں اس طرح ان پر غالب آگئی تھیں کہ ان کے آگے ان کی قوت ارادی بالکل مسلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ یہ احساس رکھتے ہوئے بھی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں غلط ہے وہی کام کیے جاتے اور اپنے ضمیر کو یہ دھوکا دیتے کہ ہم خدا کے چہیتوں اور محبوبوں کی اولاد ہیں خدا ہمیں معاف ہی کر دے گا۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۶۹)

برے اخلاف — عربی میں جب لفظ خَلْف، سکون لام کے ساتھ آتا ہے تو برے جانشینوں کے معنی میں آتا ہے۔ یہ یہود کے

زوال — تدریجی زوال کی طرف اشارہ ہے کہ دن بدن ان کے اخلاقی حالات بد سے بدتر ہی ہوتے گئے یہاں تک کہ ایسے برے لوگ کتاب (تورات) کے وارث ہوئے جو ایک طرف کتاب الٰہی کے وارث ہونے کے مدعی ہیں دوسری طرف پست ہمتی اور دناءت کا یہ عالم ہے کہ جو لقمۂ حرام بھی ملتا نظر آئے اس کو چھوڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ کتاب الٰہی کے نام لیوا ہونے کے سبب سے اگر ضمیر میں کوئی خلش پیدا ہوتی بھی ہے تو ان جھوٹی آرزوؤں سے اس کو بہلا لیتے ہیں جو انھوں نے بالکل بے دلیل و سند اپنے دلوں میں پال رکھی ہیں کہ ہم برگزیدہ امت ہیں، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب جیسے نبیوں کی اولاد ہیں، دوزخ کی آگ ہم پر حرام ہے، اپنے محبوب بندوں کے صدقے میں اللہ ہمیں معاف ہی کر دے گا۔ اس طرح انھوں نے اپنے ضمیر اور ایمان کو اس طرح گندہ بنا دیا ہے کہ ایک حرام کے بعد اگر اسی طرح کی حرام خوری کا کوئی اور موقع نکل آئے تو اس پر بھی پھسل پڑتے ہیں۔ ان کی اسی دناءت کی وجہ سے آگے چل کر ان کی مثال کتے سے دی ہے جو ہر وقت اپنی زبان نکالے رکھتا ہے خواہ اسے چمکاریے یا جھڑکیے۔

سارا زور — اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ الایۃ۔ یعنی کتاب کے باب میں تو، جیسا کہ آیت ۱۴۵ میں گزرا اور تورات

عہد برباد — میں بھی بار بار ذکر ہوا ہے، ان سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ جو ہدایات اس کتاب میں دی جا رہی ہیں ان کو مضبوطی سے پکڑیں، بال برابر بھی اِدھر اُدھر نہ ہوں، کوئی بات حق کے خلاف خدا پر نہ لگائیں، تو پھر انھوں نے حرام خوری اور حرام کاری کی یہ راہ کس طرح کھول لی اور اس کے حق میں شریعت کی سند کہاں سے فراہم کر دی؟

وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ یعنی انھوں نے اچھی طرح اس کتاب کو پڑھا بھی ہے، یہ نہیں کہ اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ دَرَسُوْا کے لفظ پر ہم انعام آیت ۱۰۵ کے تحت بحث کر آئے ہیں کہ اس کے اصل معنی گھسنے کے ہیں جب کتاب بار بار پڑھی جائے، اور وہ بھی انگلی رکھ کے تو ورق گھس جایا کرتا ہے اس وجہ سے اس کے معنی اچھی طرح پڑھنے کے آنے لگے۔ یہاں یہ لفظ یہود کے لیے بطور تعریض استعمال ہوا ہے کہ کتاب کو تو پڑھتے پڑھتے انھوں نے گھس ڈالا لیکن حال وہی رہا کہ ساری زلیخا پڑھ جانے کے بعد بھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ زلیخا زن بود کہ مرد! وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ یعنی یہ سگانِ دنیا جو کتاب و شریعت سب کو بالائے طاق رکھ کے

اس طرح دنیا کے پیچھے پڑ گئے، انھیں آخرت کی نعمتوں اور کامرانیوں کا کوئی اندازہ نہیں، حالانکہ چاہنے کی اصل چیز وہی ہے لیکن ان بے وقوف لوگوں میں وہ عقل کہاں؟

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (۱۷۰)

مصلحین اہل کتاب کی حوصلہ افزائی

"تمسیک" اور "تمسک" دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنا یا تھامنا۔

آیت کا مطلب اوپر کی آیت کی روشنی میں یہ ہے کہ یہ بدقسمت لوگ تو اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے چل کھڑے ہوئے حالانکہ جو لوگ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں وہ لوگ خلق کی اصلاح کرنے والے بنتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے مصلحین کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ اقامت نماز، یہاں تمسک بالکتاب کی علامت کی حیثیت سے بھی مذکور ہے اور یہ چیز درحقیقت ہر عہد الٰہی کی جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں، محافظ بھی ہے۔ آیت میں بقاعدۂ ایجاز ایک ٹکڑا محذوف ہے۔ پوری بات گویا یوں ہے "اور جو کتاب کو مضبوطی سے تھامتے ہیں اور جنھوں نے نماز کا اہتمام کیا وہی لوگ اصلاح کرنے والے ہیں اور بے شک ہم اصلاح کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔" میرے نزدیک اس آیت میں اہل کتاب کے اس قلیل التعداد گروہ کی حوصلہ افزائی بھی ہے جو قوم کے عام بگاڑ کے باوجود حق پر قائم رہا اور جو بالآخر مشرف باسلام ہوا۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۷۱)

اس آیت کی تفسیر بقرہ آیت ۶۳ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہ اس میثاق کی طرف اشارہ ہے جو پہاڑ کے دامن کوہ میں کتاب پر مضبوطی سے قائم رہنے کے لیے لیا گیا تھا اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے جلال و جبروت کا بھی ان کو مشاہدہ کرایا تھا تاکہ وہ یاد رکھیں کہ جس خدا سے وہ عہد کر رہے ہیں وہ بے پناہ قوت و قدرت والا ہے لیکن انھوں نے اپنی خواہشات کے پیچھے ہر چیز کو بھلا دیا۔

۱۶- آگے کا مضمون ___ آیات ۱۷۲-۲۰۶

آگے کا مضمون خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم تمہید میں عرض کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں مخاطب اصلاً قریش ہیں۔ ان کو پہلے خود ان کے اپنے ملک کی ان قوموں کے حالات سنائے گئے جو ماضی میں گزر چکی تھیں پھر بنی اسرائیل کی بھی پوری تاریخ تفصیل سے سنا دی گئی جو سامنے موجود تھے۔ مقصود ان قوموں کی تاریخ سنانے سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اپنی اس دنیا کے احوال و معاملات سے بے تعلق اور کنارہ کش نہیں ہے۔ وہ خلق کی اصلاح و ہدایت کے لیے ہمیشہ اپنے رسول بھیجتا رہا ہے اور وہ رسول جب بھی آئے ہیں عزل و نصب کی میزان بن کر آئے ہیں۔ جن قوموں نے ان کی تکذیب

کہ خدا نے ان کو مٹا دیا اور جن لوگوں نے ان کی تصدیق کی وہ برومند ہوئے۔ یہی فیصلہ کن مرحلہ اب قریش کے سامنے ہے۔

آیت ۱۱۱ پر تاریخی سرگزشتوں کا یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اب آگے قریش کو مخاطب کر کے پہلے ان کو اس عہد فطرت کی یاد دہانی کی ہے جو تمام بنی آدمؑ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید و ربوبیت کا لیا ہے اور اس کو بنیاد قرار دے کر ان پر حجت قائم کی ہے کہ کل کو خدا کے حضور میں تم یہ عذر نہیں کر سکتے کہ تم اس چیز سے بے خبر تھے۔ اس کے لیے خدا نے تم سے عہد بھی لیا ہے اور اب اس کی یاد دہانی کے لیے اپنا رسول بھی تمہارے پاس بھیج دیا ہے۔ یہ واضح رہے کہ اہل عرب کتاب و شریعت سے نا آشنا امی تھے اس وجہ سے ان سے بحث کی بنیاد یا تو ان کی جانی پہچانی ہوئی تاریخ پر قائم ہو سکتی تھی یا پھر فطرت اور عقل کی بدیہیات پر۔ چنانچہ پہلے ان کے سامنے تاریخ کے واقعات صحیح زاویے سے پیش کیے، پھر عہد فطرت کی اساس پر آگے گفتگو بڑھائی۔

عہد فطرت کی یاد دہانی کے بعد ان کے سامنے بنی اسرائیل کی تمثیل پیش کی ہے کہ تم اس قوم کی طرح خدا کی نعمت کے ناقدرے اور ناشکرے نہ بنو۔ اللہ نے اس قوم پر بڑا احسان کیا لیکن یہ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، نہایت بے تمیز قوم نکلی۔ اللہ نے اس کو ہمیشہ بلند کرنا چاہا لیکن یہ برابر پستی ہی کی طرف جھکی رہی۔ جس طرح کتے کو پیار کرو تو زبان نکالے رہتا ہے، جھڑکو تو زبان نکالے رہتا ہے اسی طرح ان کے لیے تنبیہ اور احسان دونوں یکساں ہیں۔

اس کے بعد آنکھ کان اور دل و دماغ کی نعمتوں کی قدر کرنے اور ان سے صحیح کام لینے کی دعوت دی کہ دین کے معاملے میں لکیر کے فقیر بن کر نہ چلو کہ جن کو باپ دادا پوجتے آئے ہیں بے سمجھے بوجھے تم بھی انہی کو پوجتے رہو۔ یاد رکھو کہ جو لوگ اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں اور اپنے سمع و بصر کی قوتوں سے کام نہ لیں گے اور تذکیر و تنبیہ کے باوجود ٹھوکریں کھاتے پھریں گے اللہ ان سب کو جہنم میں جھونک دے گا۔

اس کے بعد پیغمبر کی طرف توجہ دلائی کہ جو شخص آج تمہیں آنے والے عظیم خطرے سے آگاہ کر رہا ہے یہ کوئی دیوانہ یا خبطی نہیں ہے۔ نظام کائنات پر غور کرو گے تو خود تمہاری عقل گواہی دے گی کہ یہ دنیا کوئی کھیل تماشا نہیں ہے، اس کے پیچھے عظیم حکمت و غایت ہے اس وجہ سے کچھ عجب نہیں کہ تمہارے اس فیصلہ کا وقت قریب آ لگا ہو جس سے یہ پیغمبر تمہیں ہوشیار کر رہا ہے۔ اس امر سے اس حقیقت کے ایک اٹل حقیقت ہونے میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا کہ پیغمبر تمہیں اس کا معین وقت نہیں بتا سکتا۔ پیغمبر کوئی غیب دان نہیں ہوتا، وہ صرف ایک بشیر و نذیر ہوتا ہے۔

اس کے بعد انسان کی اس بدقسمتی پر اظہار افسوس ہے کہ وہ نعمتیں تو سب خدا سے پاتا ہے لیکن گن دوسروں کے گاتا ہے اور ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بناتا ہے جو نہ تو اس کو نفع پہنچا سکتی ہیں نہ کوئی ضرر۔

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفوں کی بے ہودہ بکواسوں اور ان کے لایعنی اعتراضات پر صبر و استقامت کی تلقین فرمائی اور اس صبر کے حصول کے لیے جو چیز واسطہ اور وسیلہ ہے اس کی طرف رہنمائی فرمائی۔ اب اس روشنی میں

آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۷۲-۲۰۶ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ
معانقہ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ
اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا
بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ
مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا
لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ
كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ
ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ
لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَاۗءَ مَثَلَا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ
الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾ وَلَقَدْ
ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۡ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا
يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا
يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ
الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۠ وَذَرُوا الَّذِيْنَ

يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَمِمَّنْ
ع ۲۲ ۱۰ ۱۲ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾
وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ
مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ
يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾
مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ
يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ
وقف منزل اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ؔ ثَقُلَتْ فِي وقف لازم
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ
حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ
معانقه اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚۛ وَمَا
ع ۲۳ ۷ ۱۳ مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚۛ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا
لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ
اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ

الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ج
فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا
وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ
يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ
عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ
يَّبْطِشُوْنَ بِهَا ۫ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ
يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾
اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَ
الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ
يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىهُمْ
يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ
وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ
نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا
مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ ج
وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ وَاِذَا لَمْ
تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى

إِلَيَّ مِن رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ
يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠٣﴾ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٢٠٤﴾ وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً
وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ
الْغَافِلِينَ ﴿٢٠٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَ
يُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ ۩ ﴿٢٠٦﴾ ع ۲۴ ۱۸ ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۷۲-۲۰۶

اور یاد کرو، جب نکالا تمھارے رب نے بنی آدم سے ـــ ان کی پیٹھوں سے ـــ ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ بولے ہاں تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔ یا عذر کرو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے سے شرک کیا اور ہم ان کے بعد ان کے خلف ہوئے تو کیا باطل پرستوں کے عمل کی پاداش میں تو ہم کو ہلاک کرے گا؟ اور ہم اسی طرح اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور تاکہ وہ رجوع کریں۔ ۱۷۲-۱۷۴

اور ان کو اس کی سرگزشت سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا، پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کے ذریعہ سے سربلند کرتے لیکن وہ زمین ہی کی طرف جھکا اور اپنی خواہشوں ہی کا پیرو بنا رہا۔ تو اس کی تمثیل کتے کی ہے اگر تم اس کو دھتکارو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے یا چھوڑ دو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔ یہ تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔

تو ان کو سرگزشت سناؤ تاکہ وہ غور کریں۔ کیا ہی بری تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور خود اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتی رہی۔ جسے اللہ ہدایت بخشے وہی ہدایت پانے والا بنتا ہے اور جنھیں وہ گمراہ کر دے وہی ہیں جو نامراد ہوتے ہیں۔ (۱۷۵-۱۷۸)

اور ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سُنتے نہیں۔ یہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں اور اللہ کے لیے تو صرف اچھی ہی صفتیں ہیں تو انہی سے اس کو پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑو جو اس کی صفات کے باب میں کجروی اختیار کر رہے ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، عنقریب اس کا بدلہ پائیں گے۔ اور جن کو ہم نے پیدا کیا ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی رہا ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور اس کے مطابق فیصلے کرتے رہے ہیں۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہم ان کو وہاں سے داؤں پر لے جا رہے ہیں جہاں سے انھیں علم نہیں اور میں انھیں ڈھیل دیے جا رہا ہوں کیونکہ میری تدبیر بہت ہی محکم ہے۔ ۱۷۹-۱۸۳

کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے وہ تو بس ایک کھلا ہوا ہوشیار کرنے والا ہے۔ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کے نظام اور ان چیزوں پر نگاہ نہیں کی جو خدا نے پیدا کی ہیں اور اس بات پر کہ کیا عجب کہ ان کی مدت قریب آ لگی ہو تو اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ جن کو خدا گمراہ کر دے ان کے لیے کوئی ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ ان کو وہ ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا

چھوڑ دیتا ہے۔ وہ تم سے قیامت کے باب میں سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ کہہ دو کہ اس کا علم تو بس میرے رب ہی کے پاس ہے۔ وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ آسمان و زمین اس سے بوجھل ہیں، وہ تم پر بس اچانک ہی آدھمکے گی۔ وہ تم سے پوچھتے ہیں گویا تم اس کی تحقیق کیے بیٹھے ہو۔ کہہ دو، اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ کہہ دو، میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع و نقصان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند نہ پہنچ پاتا۔ میں تو بس ان لوگوں کے لیے ایک ہوشیار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں جو ایمان لائیں۔ ۱۸۴-۱۸۸

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا کہ وہ اس سے تسکین پائے تو جب وہ اس کو چھا لیتا ہے تو وہ اٹھا لیتی ہے ایک ہلکا سا حمل، پھر وہ اس کو لیے کچھ وقت گزارتی ہے تو جب بوجھل ہوتی ہے دونوں اللہ اپنے رب سے دعا کرتے ہیں، اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد بخشی ہم تیرے شکرگزاروں میں سے ہوں گے۔ تو جب اللہ ان کو تندرست اولاد دے دیتا ہے تو اس کی بخشی ہوئی چیز میں وہ اس کے لیے دوسرے شریک ٹھہراتے ہیں۔ اللہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ کیا وہ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور وہ نہ ان کی کسی قسم کی مدد کر سکتی ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتی ہیں۔ اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو وہ تمہارے ساتھ نہ لگیں گے، یکساں ہے خواہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو۔ جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو یہ تو تمہارے ہی جیسے بندے

ہیں۔ پس ان کو پکار دیکھو، وہ تمھیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔ کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں، کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں، کیا ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں، کیا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں؟ کہہ دو، تم اپنے شریکوں کو بلاؤ، میرے خلاف چالیں چل دیکھو اور مجھے مہلت نہ دو۔ میرا کارساز اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور وہ نیکوکاروں کی کارسازی فرماتا ہے اور جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو نہ وہ تمھاری ہی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو وہ تمھاری بات نہ سنیں گے اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ تمھاری طرف تاک رہے ہیں لیکن انھیں سوجھتا کچھ بھی نہیں۔ درگزر کرو، نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔ اور اگر تمھیں کوئی وسوسۂ شیطانی لاحق ہونے لگے تو اللہ کی پناہ چاہو، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی شیطانی چھوت لاحق ہونے لگتی ہے وہ خدا کا دھیان کرتے ہیں اور دفعتہً ان کے دل روشن ہو جاتے ہیں۔ اور جو ان ناخدا ترسوں کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں بڑھاتے ہیں پھر کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ۱۸۹-۲۰۲

اور جب تم ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے کہتے ہیں کہ اسے کیوں نہ گھڑ لائے! کہہ دو، میں تو بس اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے آنکھیں کھولنے والی آیات اور ہدایت و رحمت ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ اور جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۲۰۳-۲۰۴

اور اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اور پست آواز سے اور غافلوں میں سے نہ بنو۔ بے شک جو تیرے رب کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی کرنے سے نہیں اکڑتے، وہ اس کی تسبیح کرتے اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ ۲۰۵-۲۰۶

۱۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۙ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۱۷۲-۱۷۴)

اِذْ اور واحد کے خطاب کے مواقع استعمال

'وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ' ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اِذْ کے ذریعہ سے کسی ایسے امر واقعی کی یاد دہانی بھی کی جاتی ہے جو متکلم کے نزدیک ایک حقیقت ہو، قطع نظر اس سے کہ مخاطب اس کو فراموش کیے ہوئے ہوں یا اس سے منحرف ہوں۔ اسی طرح واحد کے خطاب کے متعلق بھی واضح کر چکے ہیں کہ قرینہ دلیل ہو تو یہ جمع کے مفہوم میں بھی ہوتا ہے اور اس صورت میں گویا مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مخاطب ہوتا ہے۔

مِنْ ظُهُوْرِهِمْ کی قید کا فائدہ

'مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ' میں 'مِنْ ظُهُوْرِهِمْ'، 'مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ' سے بدل واقع ہے اور اس بدل کے لانے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ بنی آدم سے متعلق یہاں جو حقیقت بیان ہو رہی ہے وہ کسی خاص دور ہی کے بنی آدم سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ قیام قیامت تک جتنے بھی بنی آدم پیدا ہونے والے ہیں سب ہی سے متعلق ہے۔

تمام بنی آدم سے خدا نے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا

'وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰي شَهِدْنَا' یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا ہے اور وہ اس طرح کہ اس نے ان سے یہ سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، اس کے جواب میں سب نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہاں بے شک تو ہمارا رب ہے اور ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ یہ اقرار اللہ تعالیٰ نے صرف اس بات کا نہیں لیا کہ وہ اللہ ہے بلکہ اس بات کا لیا کہ وہی رب بھی ہے۔ یہ ملحوظ رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ اہل عرب کو اللہ کے اللہ ہونے سے انکار نہیں تھا لیکن رب انھوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنا لیے تھے حالانکہ عہد فطرت میں اقرار صرف اللہ ہی کی ربوبیت کا ہے۔

توحید بدیہیات فطرت میں سے ہے

اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ، 'اَنْ' سے پہلے 'کراہۃ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ مبادا تم قیامت کے دن عذر کرو۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک توحید اور بدیہیاتِ فطرت کا تعلق ہے ان کے باب میں قیامت کے دن مواخذہ ہر شخص سے مجرد اس اقرار کی بنا پر ہوگا جو مذکور ہوا، قطع نظر اس سے کہ اس کو کسی نبی کی دعوت پہنچی یا نہیں۔ اگر کسی نبی کی دعوت اس کو پہنچی ہے تو یہ گویا ایک مزید حجت اس پر قائم ہوگئی کہ اس کی مسئولیت دوچند ہوگئی لیکن نبی کی دعوت اگر نہیں پہنچی تو یہ بدیہیاتِ فطرت کے معاملے میں کوئی عذر نہیں بن سکے گی۔ ان پر مواخذہ کے لیے فطرت کا یہ عہد کافی ہے۔

'اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا الاٰیۃ' اسی طرح لوگوں کا یہ عذر بھی کچھ کام نہ آئے گا کہ ہمارے باپ دادا مشرک تھے، ہم انہی کے ہاں پیدا ہوئے اور پھر قدرتی طور پر ہم نے انہی کے طریقے کی پیروی کی اس وجہ سے یہ جرم ہمارا نہیں بلکہ ان کا ہے، اس کی سزا ان کو ملنی چاہیے نہ کہ ہم کو۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ اقرار توحید انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے اس وجہ سے اس باطنی شہادت سے انحراف کے لیے خارجی اثرات کا عذر بھی کسی کا خدا کے ہاں مسموع نہیں ہوگا۔

'وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ الاٰیۃ' اس آیت میں قرینہ دلیل ہے کہ 'وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اگر اس کو کھول دیا جائے تو ہمارے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل اس لیے کر رہے ہیں تاکہ ہم لوگوں پر اپنی حجت اس طرح قائم کر دیں کہ ان کے لیے کوئی ادنیٰ عذر بھی باقی نہ رہ جائے اور تاکہ اس وضاحت کے بعد ان میں سے جو شرک سے تائب ہو کر اپنے رب کی طرف رجوع کرنا چاہیں وہ رجوع کر لیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان سے مذکورہ عہد لینے کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و احسان ہے کہ اس نے اس عہد و میثاق کی پوری تفصیل بھی سنا دی تاکہ جو اپنی غلطی سے توبہ کرنا چاہیں وہ توبہ کر لیں اور جو اپنی ضد پر اڑے رہنا چاہیں وہ اس کے نتائج کا ذمہ دار اپنے ہی کو سمجھیں، کسی اور کی گردن پر اس کا بار الزام ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔

عہد فطرت سے متعلق بعض سوال اور ان کے جواب

اس عہد کا ذکر قرآن نے ایک امر واقعہ کی حیثیت سے کیا ہے اور اس کی اہمیت یہ بتائی ہے کہ جہاں تک خدا کی ربوبیت کا تعلق ہے ہر شخص مجرد اسی عہد کی بنا پر عنداللہ مسئول ہوگا۔ اس کی اس اہمیت کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عالم غیب کے کسی ایسے ماجرے کی یادداشت انسان کے ذہن میں محفوظ ہے جس کا بیان ذکر ہوا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ کس طرح باور کیا جائے کہ فی الواقع انسان نے اس طرح کا کوئی اقرار کیا ہے اور اس کی بنیاد پر وہ توحید کے معاملے میں عنداللہ مسئول ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک اس اقرار کا تعلق ہے وہ تو ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے، رہا اس کا موقع و محل اور اس کی تاریخ تو وہ اگر یاد نہیں رہی تو اس سے نفس اقرار کی صحت و صداقت

پرکوئی اثر نہیں پڑتا، زیادہ سے زیادہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اقرار تو مجھے یاد ہے البتہ اس کا موقع و محل یاد نہیں ہے، سو اللہ تعالیٰ نے اس کا موقع و محل بتا دیا کہ یہ اقرار انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی عالم غیب میں خدا نے اس سے لیا ہے اور یہ بات خدا ہی بتا سکتا تھا اس لیے کہ غیب کا علم صرف اسی کے پاس ہے۔ انسان پر حجت قائم ہونے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اس اقرار کی یادداشت اس کے اندر موجود ہے۔

دین کا نقطۂ آغاز

لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کے اندر ابتدا ہی سے یہ اقرار موجود ہے تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ انسان وجود میں آنے کے بعد دین کا آغاز خالص خدا پرستی اور توحید سے کرتا لیکن ہمارے نئے فلسفی تو یہ بیان کرتے ہیں کہ انسان نے دین کا آغاز شرک سے کیا ہے۔ دنیا میں گوناگوں حوادث کے ظہور نے اس کے اندر مختلف ان دیکھی طاقتوں کا خوف پیدا کیا، اس خوف نے اس کے اندر ان دیکھی طاقتوں کی پرستش کا خیال پیدا کیا، چنانچہ اس نے ان کی پرستش شروع کی، پھر آہستہ آہستہ اس کے علم میں جتنی ترقی ہوتی گئی ان وہمی معبودوں سے چھوٹ کر وہ اقرار توحید کی منزل تک پہنچا۔ ہم نے نئے فلسفیوں کے اس واہمہ کی تردید سورہ فاتحہ کی تفسیر میں بھی کی ہے اور اس سے زیادہ تفصیل اپنی کتاب حقیقت شرک میں کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تقریر بالکل غیر منطقی ہے۔ ہم نے مذکورہ کتابوں میں واضح کیا ہے کہ خوف نام ہے کسی ایسی چیز کے زائل ہونے یا چھن جانے کے اندیشہ کا جو انسان کو حاصل بھی ہو اور جو عزیز و محبوب بھی ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ نعمت، منعم، اور اس کی شکرگزاری کا شعور اور جذبہ، خوف کے جذبہ اور اس کے عوامل پر مقدم ہے اس وجہ سے انسان نے خوف سے دین کا آغاز نہیں کیا بلکہ اپنے منعم پروردگار کی شکرگزاری اور اس کی عبادت سے دین کا آغاز کیا لیکن پھر مختلف اسباب کے تحت، جن کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب حقیقتِ شرک میں کی ہے، وہ اس جادۂ مستقیم سے ہٹ کر مختلف پگڈنڈیوں پر نکل گیا ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی فطرت بالکل ایک لوح سادہ ہوتی ہے، اس پر جتنے نقوش بھی ابھرتے ہیں بعد میں ادراک و شعور پیدا ہونے کے بعد محض ماحول کے اثر سے ابھرتے ہیں لیکن یہ خیال محض مغالطہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ماحول اپنے اندر نئے آنے والوں پر جو اثرات ڈالتا ہے وہ خود اس نے کہاں سے لیے ہیں، ماحول کے پاس رطب و یابس روایات کا جو اندوختہ بھی ہے وہ سب اس کی فطرت ہی کے بناؤ یا بگاڑ کا کرشمہ ہے جو باتیں اس کی فطرت کے اصل منبع سے ابھری ہیں وہ خیر، عدل اور معروف ہیں اور جن پر ان کی خواہشات کی بے اعتدالیاں غالب آگئی ہیں وہ شر اور ظلم بن گئی ہیں۔ خدا کے معاملے میں بھی یہی بے اعتدالی اس سے صادر ہوئی ہے۔ اس کی اصل فطرت کے اندر صرف ایک خدائے وحدہ لاشریک ہی کا اقرار مضمر ہے۔ اتنے پر دنیا کے مشرک اور موحد سب متفق ہیں اس وجہ سے یہ چیز کسی دلیل کے قیام کی محتاج نہیں ہے البتہ شرک کے مدعیوں پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ اس ایک پر جو دوسرے معبودوں کا اضافہ کرتے ہیں ان کی وہ دلیل پیش کریں چنانچہ قرآن نے ان سے جگہ جگہ یہی مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ شریکوں

کے حق میں کوئی دلیل لائیں۔

قرآن کا سارا فلسفہ درحقیقت انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ جن عقائد و اعمال اور جن اچھائیوں اور نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے اور جن برائیوں سے روکتا ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی انسان کے خارج سے اس پر لادی نہیں جا رہی ہے بلکہ اس کو انہی باتوں کی یاددہانی کی جا رہی ہے جو اس کی اپنی فطرت کے اندر ودیعت ہیں لیکن اس نے اپنی لذات عاجلہ کے پیچھے پڑ جانے کے سبب سے ان کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ قرآن نے اس وجہ سے اپنے آپ کو 'ذکر' اور 'ذکریٰ' کہا ہے جن کے معنی یاددہانی کے ہیں اور اپنی تعلیم و دعوت کو 'تذکیر' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی فراموش کردہ یا نظر انداز کردہ حقائق کے یاد دلانے کے ہیں۔

یہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے لیکن اس زمانے کے نئے تعلیم یافتہ لوگوں پر مارکس اور فرائڈ کا جادو چلا ہوا ہے۔ ان ظالموں کی خاکبازیوں نے لوگوں کو اس طرح اندھا بنا دیا ہے کہ اب لوگوں کو انسان کے اندر بطن اور فرج کے سوا اور کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ ان کے نزدیک انسان کا سارا فکر و فلسفہ بس انہی دو محوروں پر گھوم رہا ہے۔ اس روایتی چوہے کی طرح جسے ہلدی کی ایک گرہ مل گئی تو اس نے پنساری کی ایک دکان کھول لی، مارکس اور فرائڈ نے بھی بطن و فرج پر سارے فکر و فلسفہ اور تمام مذہب و اخلاق کو ڈھا دیا اور اس طرح ان لوگوں کو جو پہلے ہی بطن و فرج کے غلام تھے دو ایسے مرشد بھی مل گئے جن کا وہ فخر کے ساتھ حوالہ دیتے ہیں کہ وہ بے پیرے نہیں ہیں بلکہ انھیں بھی شرف نسبت و ارادت حاصل ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ
وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ
اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ
الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ سَآءَ مَثَلَا ۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝
مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِیْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۷۵-۱۷۸)

'وَاتْلُ عَلَيْهِمْ' الاٰیۃ۔ 'هُمْ' سے مراد قریش ہیں جن کو اوپر والی آیات میں مخاطب کر کے عہد فطرت کی یاددہانی کی گئی ہے۔

یہود کی تمثیل

'اَلَّذِیْ' اگرچہ اصلاً معرفہ کے لیے آتا ہے لیکن تمثیلات میں یہ لازم نہیں ہے کہ اس سے کوئی معین شخص ہی مراد ہو جو خارج میں بھی موجود ہو بلکہ متکلم جس کی تمثیل پیش کرنا چاہتا ہے اس کو نگاہ میں رکھ کر اس کا ایک ایسا سراپا آراستہ کر دیتا ہے جو اس پر پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ چونکہ پیش نظر صرف واقعہ کی تصویر کشی ہوتی ہے اس وجہ سے تقاضائے بلاغت یہ ہوتا ہے کہ اس کو نکرہ کے بجائے معرفہ کے لفظوں میں ذکر کیا جائے تاکہ تمثیل ایک خاص شخص کی صورت میں متمثل ہو کر اس طرح سامع کے سامنے آجائے

کہ گویا اس نے اس کی سرگزشت صرف سُنی ہی نہیں بلکہ خود اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ یہاں اس 'الَّذِیْ' سے مراد یہود من حیث القوم ہیں جن کی تمثیل ایک ایسے شخص سے دی گئی ہے جس کو خدا نے اپنی آیتوں سے نوازا لیکن اس نے ان کی قدر نہ کی بلکہ یہ خلعت اس نے اتار پھینکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سنتِ الٰہی کے مطابق جو سورۂ زخرف آیت ۳۶ میں بیان ہوئی ہے کہ 'وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَہٗ شَیْطٰنًا فَھُوَ لَہٗ قَرِیْنٌ' (جو خدائے رحمان کی یاد دہانی سے منہ پھیرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پس وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے)، شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے بن گیا۔ یہ بات کہ یہ کسی معین شخص کا ذکر نہیں بلکہ خدا کی آیات کی تکذیب کرنے والی ایک قوم کی تمثیل ہے خود قرآن کے الفاظ ہی سے واضح ہے چنانچہ اس کے بعد فرمایا 'ذٰلِکَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا' (یہ اس قوم کی تمثیل ہے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی) اس وجہ سے ہمارے نزدیک 'الَّذِیْ' سے کسی بلعام بن باعور کو مراد لینے کی ضرورت نہیں۔ یہود میں کوئی ایک ہی بلعام بن باعور نہیں تھا جس کی مثال دی جائے۔ اوپر یہود کی تفصیل کے ساتھ جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس سے خود واضح ہے کہ یہ پوری قوم کی قوم ہی شروع سے ہی بلعام بن باعور بنی رہی ہے۔ 'انسلاخ' کے معنی کپڑے اتار کر ننگے ہو جانے کے ہیں۔ 'اِنْسَلَخَ مِنْ ثِیَابِہٖ، تجرد' یعنی اللہ تعالیٰ نے توان کو اپنی کتاب کی تشریف و خلعت سے نوازا لیکن انھوں نے یہ اتار پھینکی اور بالکل ننگے الف بن کر رہ گئے۔

'وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰہُ بِھَا وَلٰکِنَّہٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ ھَوٰىہُ'، 'اَخْلَدَ اِلَی الشَّیْءِ' کے معنی کسی شے کی طرف اس طرح جھک جانے اور مائل ہو جانے کے ہوتے ہیں کہ آدمی بس اسی کا ہو کر رہ جائے۔ یہ اس سنتِ الٰہی کا بیان ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں پسند فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو اپنی آیات سے نوازتا ہے اگر وہ ان کی قدر کرتے ہیں تو وہ ان کے ذریعہ سے ان کو دین و دنیا دونوں کی سرفرازی عطا فرماتا ہے، ان کی عقل کو ان سے رفعت اور ان کی روح کو ان سے معراج حاصل ہوتی ہے، لیکن جو لوگ ان آیات کے پانے کے بعد بھی اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے اور کُتّے کی طرح زمین کو سونگھتے ہی ہوئے چلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ان کی خواہشوں ہی کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

یہود کی تمثیل کُتّے سے

'فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ الْکَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْہِ یَلْھَثْ اَوْ تَتْرُکْہُ یَلْھَثْ' اب یہ ان کے برابر پستی کی طرف جھکے رہنے اور خواہشات کے پیچھے چلنے کی تمثیل بیان ہوئی ہے اور دیکھیے کیسی دلنشین اور مطابقِ واقعہ تمثیل ہے۔ اوپر آیات ۱۶۸-۱۶۹ میں ان کا حال یہ بیان ہوا تھا کہ خدا نے اپنے انعامات اور اپنی تنبیہات دونوں سے ان کو آزمایا (بَلَوْنٰھُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ) لیکن یہ اپنی خواہشوں کے ہاتھوں ایسے بے بس رہے کہ نہ انعامات سے ذرا متاثر ہوئے نہ تنبیہات سے بلکہ ہر طمع نے ان کو ٹھوکر کھلائی

اور ہر خواہش کے آگے انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے (یَأْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ) ان کی اس حالت کی تمثیل کتے سے دی ہے ۔ کتے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ کبھی بخطِ مستقیم گردن اٹھا کر نہیں چلتا بلکہ ہمیشہ زمین کو سونگھتا ہوا اور ہر پاک و ناپاک چیز کا اپنی ناک سے جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے کہ شاید کوئی چیز کھانے کی مل جائے ۔ اس کی رہنما اس کی آنکھ نہیں بلکہ ناک ہوتی ہے جو اس کی خواہشوں کی سراغ رساں ہے۔ پھر اس کی یہ بھی خصلت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان نکالے ہوئے رہتا ہے، چمکاریے، پیار کیجیے جب بھی اس کی یہی حالت رہے گی، دھتکاریے، جھڑکیے جب بھی اس کا یہی انداز رہے گا ۔ یہ اس کی حرص اور دنائت ہے جو اس کی جبلت پر اس طرح غالب ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے جدا نہیں ہوتی ۔ بھوکا رہے گا جب بھی اس کو آپ اسی حال میں پائیں گے، پیٹ بھر کے کھلا دیجیے جب بھی اسی ہیئت میں دیکھیں گے ۔ صاحبوں کے کتے مخملیں جھول، ریشمی پٹوں اور چاندی کے گھنگرووں سے آراستہ ہوتے ہیں، پیٹ بھر گوشت کھاتے اور دودھ پیتے ہیں لیکن کار کے اندر صاحب کی بغل میں بیٹھے ہوئے بھی زبان نکالے ہوئے ہی رہیں گے اور پارک کے اندر سیر کرتے ہوئے بھی زمین میں تلاش کرتے، سونگھتے اپنی ناک کے پیچھے پیچھے چلیں گے ۔ فرمایا کہ بالکل یہی حال یہود کا ہے ۔ ان کو اپنے نفس پر ذرا قابو نہیں رہا ہے ۔ ان کی قوتِ ارادہ بالکل معطل ہو چکی ہے ۔ اب یہ اپنی خواہشوں کے غلام اور اپنی حرص کے بندے ہیں اور حرص دنیا ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے ۔ ان کی شکلیں آدمیوں کی ہیں لیکن ان کی فطرت کتوں کی جبلت کے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔

آیت میں تَحْمِلْ عَلَيْهِ میرے نزدیک تَحْمِلِ الْعَصَا عَلَيْهِ یا تَحْمِلِ الْحَجَرَ عَلَيْهِ کے معنی میں ہے یعنی لکڑی ہلاؤ یا اس پر پتھر پھینکو اس کا حال ایک ہی رہے گا ۔ 'لَهَثَ' کے معنی زبان نکالنے کے ہیں اور اس کا غالب استعمال کتے کے لیے ہے۔

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا الاٰيَۃ اس ٹکڑے سے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ بات منح ہوئی کہ یہ تمثیل کسی شخص کی تمثیل نہیں بلکہ اس قوم کی تمثیل ہے جس نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی ۔ اور اس سے مراد، جیسا کہ ہم نے واضح کیا، یہود ہیں ۔ سورۂ نحل آیات ۹۱-۹۲ کے تحت انشاء اللہ ہم تمثیل کے اس پہلو پر مزید بحث کریں گے۔

یہود کی یہ تمثیل، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، قریش کو سنائی گئی ہے اور مقصود اس سے قریش کو اس نعمت کی قدر کرنے کے لیے ابھارنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری شریعت کی شکل میں ان کو مل رہی تھی لیکن وہ اس کی قدر کرنے کے بجائے اس سے بدک رہے تھے ۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ ان کو آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرنے والی قوم کا حال سنا دو کہ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی آیات سے نوازنا ہے اور ان کو وہ ان آیات کے ذریعہ سے زمین و آسمان دونوں کی سرفرازیاں عطا فرمانا چاہتا ہے بشرطیکہ وہ

ان کی قدر کریں، ان کو اپنائیں اور زندگی میں ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ اگر وہ قدر نہیں کرتے بلکہ اپنی خواہشات ہی کے غلام بنے رہتے ہیں تو ان کا حال وہی ہوتا ہے جو یہود کا ہوا۔

'سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ' مطلب یہ ہے کہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرنے والی قوم اپنی خواہشات کی غلامی کے سبب سے بالکل بیزن کے رہ جاتی ہے۔ اس کی مثال، جیسی کہ اوپر بیان ہوئی، نہایت ہی مکروہ اور گھنونی ہے۔ سو یہ راہ تم نہ اختیار کرو۔ جو لوگ یہ راہ اختیار کرتے ہیں وہ اللہ کی آیات کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ خود اپنا ہی بگاڑتے ہیں۔ وہ ان آیات کی ناقدری کر کے خود اپنے ہاتھوں عزت کے تاج کے بجائے اپنے لیے ذلت کا طوق اختیار کرتے ہیں۔

'مَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ' یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور قریش کے لیے تہدید و وعید بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت وہی پائیں گے جن کو خدا ہدایت کی توفیق بخشے اور خدا کی توفیق انہی کو حاصل ہوتی ہے جو ہدایت کے طالب ہوں اور خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کو استعمال کریں۔ جو لوگ اپنی آنکھوں اور اپنے دل و دماغ پر خواہشات کی پٹی باندھ کر زندگی گزارتے ہیں خدا انھیں گمراہی کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور اصلی نامراد اور بدقسمت لوگ وہی ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۗ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۱۷۹)

ہدایت سے محروم رہنے والے

اب یہ بتایا کہ کون لوگ ہیں جو ہدایت سے محروم رہتے ہیں اور بالآخر وہ جہنم کے ایندھن بنتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ جنوں اور انسانوں میں سے وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے دل تو دیے ہیں لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، ان کو آنکھیں تو بخشیں لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، ان کو کان تو عنایت فرمائے لیکن وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ سمجھنا، دیکھنا اور سننا اپنے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں بس اپنی خواہشات کی تابعداری میں لگا رکھی ہیں۔ ان سے ہٹ کر کسی چیز کو سننے سمجھنے اور اس کو اختیار کرنے کا ان کے اندر دم داعیہ نہیں پایا جاتا۔ فرمایا کہ یہ لوگ چوپایوں کے مانند بلکہ ان سے بھی زیادہ بے عقل ہیں۔ چوپایوں کے مانند اس وجہ سے ہیں کہ جس طرح چوپایوں کی طلب و جستجو بس اپنے پیٹ اور تن کی مطلوبات ہی تک محدود ہوتی ہے اسی طرح ان کی تگ و دو بھی اپنی مادی ضروریات و خواہشات ہی تک محدود ہے اور چوپایوں سے زیادہ بے عقل اس وجہ سے ہیں کہ چوپائے بہرحال اپنی جبلت کی تمام صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس میں وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے لیکن انسان کی فطرت کے اندر قدرت نے جو اعلیٰ صلاحیتیں رکھی ہیں ان سے نہ صرف یہ کہ وہ حقیقی فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ بسا اوقات اس سے ایسی حرکتیں صادر ہوتی ہیں جو ایک بیل یا گدھے سے کبھی صادر نہیں ہوتیں۔ مثلاً انسان انسان ہو کر اتنا بے عقل اور کج فہم بن جاتا ہے کہ درختوں، پتھروں اور جانوروں کی پرستش شروع کر دیتا ہے لیکن ایک

گدھا یا بیل ایسی بے عقلی کبھی نہیں کرسکتا۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو اصلی اور حقیقی بے خبر ہیں اس لیے کہ یہ بے خبری چوپایوں میں بھی نہیں ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ جو فرمایا ہے کہ ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کو ان کی ماؤں کے پیٹ سے جہنم کے لیے پیدا کیا۔ ماؤں کے پیٹ سے تو اللہ تعالیٰ نے دل، دماغ، سمع، بصر کی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن ضابطہ یہ بنا دیا ہے کہ جو ان صلاحیتوں سے صحیح فائدہ اٹھائیں گے اللہ ان کی رہنمائی جنت کی طرف فرمائے گا اور جو ان سے فائدہ نہ اٹھائیں گے ان کو جہنم میں جھونک دے گا۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہ دھمکی قریش کے لیے ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۸۰)

اللہ تعالیٰ صرف اچھی صفتوں سے متصف ہے

یہ آیت، اوپر آیت ۱۷۲ میں توحید کا عہدِ فطرت ہونا جو بیان ہوا ہے، اس سے متعلق ہے۔ بیچ میں ان لوگوں کا ذکر آگیا تھا جنھوں نے اللہ کی آیات کی قدر نہیں کی اور خدا کی طرف سے نہایت اعلیٰ صلاحیتیں پاکر اندھے بہرے بن گئے۔ اب یہ فرمایا کہ اللہ کے لیے صرف اچھی ہی صفتیں اور اچھے ہی نام ہیں تو اس کو انھیں صفتوں سے پکارو اور ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑو۔ جو صفاتِ الٰہی کے باب میں گمراہی کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں، اس کے شریک ٹھہراتے ہیں یا اس کے بیٹے بیٹیاں مانتے ہیں۔ یہ باتیں خدا کی صفاتِ الوہیت، اس کی شانِ یکتائی، اس کی قدرت، اس کی بے نیازی اور اس کے علم کی نفی کرنے والی ہیں۔ خدا کو صرف انہی صفات سے متصف کرنا چاہیے جن کا اس کی الوہیت اور اس کی بے ہمگی و بے ہمتائی کے ساتھ جوڑ ہو سکے، کوئی ایسی صفت اس کی طرف منسوب نہیں کرنی چاہیے جو خالق کو مخلوقات کی صف میں لاکر کھڑا کردے۔ 'الحاد' کا لفظ یہاں صفاتِ الٰہی کی بے حرمتی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ عربی میں اگر کہیں 'فلان الحد فی الحرم' تو اس کے معنی ہوں گے 'استحل حرمته وانتهكها'۔ 'يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ' کے معنی ہوئے جو خدا کی صفات کی بے حرمتی و بے توقیری کرتے ہیں یعنی اس کے ساتھ ایسی صفات کا جوڑ لگاتے ہیں جو اس کی ذات و صفات کی اہانت کرنے والی ہیں اور جن سے وہ پاک و برتر ہے۔ یہ جو فرمایا کہ 'ان کو چھوڑو' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اگر نہیں مانتے تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ 'سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کی سزا عنقریب خود بھگتیں گے۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (۱۸۱)

مُردوں کے اندر زندہ بھی ہیں

یعنی خدا کی مخلوق میں سب ایک ہی طرح کے نہیں ہیں۔ اگر ایک طرف وہ اندھے بہرے ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا تو کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں، حق کو پہچانتے ہیں، اسی کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور معاملات کے فیصلے کرتے ہیں۔ اوپر آیت ۱۵۹ میں جس طرح بنی اسرائیل کے اندر کے اچھے لوگوں کا ذکر کرکے ان کی حوصلہ افزائی کی ہے اسی طرح یہاں 'لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ الآیہ' کے مرگِ انبوہ کے ذکر کے بعد ان زندہ روحوں کی طرف اشارہ کردیا جن کی فطرت اس وبائے عام اور اس مرگِ انبوہ کے اندر بھی زندہ رہی اور جو بالآخر اسلام

کے نور سے منور ہوئے۔

وَالَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَنَسۡتَدۡرِجُهُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۚ وَاُمۡلِیۡ لَهُمۡ ؕ اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ (۱۸۲-۱۸۳)

خدا کی ڈھیل ہلاکت کا پھندا ہے

اوپر آیت ۱۸۰ میں آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کو جو دھمکی دی گئی ہے یہ اسی کی مزید وضاحت ہے کہ جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلانے کے باوجود دندنا رہے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ خدا کی پکڑ سے باہر ہیں۔ ہم ان کو وہاں سے اپنے ہدف پر لا رہے ہیں جہاں سے ان کو کسی خطرے کا سان گمان بھی نہیں ہے۔ ہم نے ان کو جو ڈھیل دی ہے اس کو یہ اپنی جیت سمجھے ہیں حالانکہ یہی ڈھیل ان کی ہلاکت کا پھندا ہے۔ ہم نے یہ ڈھیل اس لیے دی ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں کہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ جب شکاری کو اپنی ڈور پر پورا اعتماد ہوتا ہے تو وہ مچھلی کو آخری حد تک ڈھیل دیتا ہے، مچھلی سمجھتی ہے کہ اب اس نے بازی مار لی حالانکہ شکاری اس لیے اس کو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ کتنا ہی زور لگائے لیکن وہ اس کے قابو سے باہر نہیں جا سکتی۔ اس کی بھاگ دوڑ اس کے لیے نجات کی راہ نہیں کھولے گی بلکہ اس کو تھکا کر اتنا چور کر دے گی کہ بالآخر وہ بے جان ہو کر خود بخود کھنچتی ہوئی کنارے پر آ لگے گی۔ یہی حال خدا کی تدبیر کا ہے۔ اس کی تدبیر نہایت محکم اور اس کی گرفت نہایت شدید ہوتی ہے۔ کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا اس وجہ سے وہ لوگوں کو ان کی سرکشی کے باوجود ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے۔ اس ڈھیل کو سرکش اپنی کامیابی سمجھتے ہیں حالانکہ وہ جتنی ہی زور آزمائی کرتے ہیں اتنے ہی اپنی ہلاکت کے گڑھے سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ جلد بازی وہ کرتا ہے جس کو اپنی تدبیر کے ناکام ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ جس کا تیر بے خطا اور جس کا وار بے پناہ ہو اس کو جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔

'اِسۡتِدۡرَاج' کے معنی ہیں دعاہ من درجۃ الی درجۃ 'خدعہ' اس کو آہستہ آہستہ، درجہ بدرجہ چڑھا لایا، اس کو چکمہ دے دیا، یہ اللہ تعالیٰ کے فتنوں میں سب سے زیادہ خطرناک فتنہ ہے جس میں اس کے باغی مبتلا کیے جاتے ہیں۔

اَوَلَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا ٜ مَا بِصَاحِبِهِمۡ مِّنۡ جِنَّةٍ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۚ اَوَلَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَیۡءٍ ۙ وَّاَنۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ اَجَلُهُمۡ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَهٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ۚ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ ؕ وَیَذَرُهُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِهِمۡ یَعۡمَهُوۡنَ (۱۸۴-۱۸۶)

آنحضرت صلعم پر جنون کا الزام

'صَاحِبِهِمۡ' سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے قریش کو اس امر واقعہ کی طرف توجہ دلانا ہے کہ یہ پیغمبر ان کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں بلکہ ان کے دن رات کے ساتھی ہیں، ان کا بچپن ان کی جوانی سب انہی کے اندر اور انہی کے ساتھ گزری ہے۔ ہر دور اور ہر مرحلہ میں انھوں نے ان کو دیکھا اور آزمایا اور ہر طرح کے حالات میں ان کو جانچا اور پرکھا ہے۔ پھر آخر یہ اس امر پر کیوں نہیں غور کرتے کہ جو شخص ہمیشہ اپنی سلامت روی، اپنی صداقت شعاری، اپنی بے غرضی، اپنی پاکبازی، اپنی فکر و رائے کی

اصابت اور اپنی دانش و بینش کی پختگی کے اعتبار سے ساری قوم میں گل سرسید رہا دفعۃً وہ اب خبطی اور دیوانہ کیسے بن گیا؟ آخر ان میں دیوانوں اور خبطیوں کی سی کون سی بات ان کو نظر آئی؟ یہ دیوانے اور خبطی نہیں ہیں بلکہ جس طرح ایک نذیر عریاں، خطرے کے دیدبان سے اپنی قوم کو دشمن کے حملہ سے ہوشیار کرتا ہے اسی طرح یہ خدا کے نذیر مبین ہیں جو آنے والے وقت اور تم پر نازل ہونے والے عذاب سے تم کو ڈرا رہے ہیں۔ ان کے اندر تمھیں ہوشیار و بیدار کرنے کے لیے جو بے قراری و بے چینی ہے اور انھوں نے تمھارے پیچھے اپنے رات دن جو ایک کر رکھے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے دماغ میں کوئی خلل ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس عظیم خطرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو تمھارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور جو تمھیں بے بصیرتی کے سبب سے نظر نہیں آرہا ہے۔ یہ جنون نہیں بلکہ حقیقت کا سچا احساس اور اپنی قوم کی محبت کا بے پایاں جذبہ ہے جو انھیں ہلکان کیے ہوئے ہے۔ یہ تمھاری انتہائی بلادت، ناسپاسی اور سنگ دلی ہے کہ تم اس کو خبط اور جنون قرار دیتے ہو۔

یہ واضح رہے کہ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مجنون کہتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ فی الواقع آپ کو کوئی مجنون سمجھتے تھے۔ آخر قریش کے ذہین لوگ اتنے کودن کیسے ہو سکتے تھے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے پیکر متانت و رزانت کو مجنون کہیں؟ پھر وہ کہتے تو ان کی بات کو لائق اعتنا کون مانتا؟ اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رات دن جو اس بات کی لگن تھی کہ اپنی قوم کو اس آنے والے عذاب سے ڈرائیں جو سنت الٰہی کے بموجب، رسول کی تکذیب کی صورت میں، لازماً ان پر آدھمکتا، یہ چیز قریش کے لیڈروں کو بہت عجیب معلوم ہوتی، ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی تھی کہ آخر ان پر عذاب کدھر سے آجائے گا اور کیوں آجائے گا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے صاحب کردار شخص کا اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر، رات دن ان کو اس عذاب سے ڈرانا اور اس جزم و یقین کے ساتھ ڈرانا کہ گویا آنے والے طوفان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، ایسی صورت حال نہیں تھی جس کو قریش کے لیڈر نظر انداز کر سکیں۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس کی کوئی توجیہ تلاش کریں۔ اس کی کوئی توجیہ تلاش کرنا یا گھڑنا ان کی سیاسی مصلحت کا بھی تقاضا تھا اس لیے کہ ان کے اندر جو لوگ خالی الذہن تھے، کسی پندار یا کسی خود غرضی میں مبتلا نہ تھے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے لوثی اور دردمندی سے متاثر ہوتے تھے۔ ان کو اس اثر سے بچانے اور اپنی سیادت کی دھاک قائم رکھنے کے لیے انھوں نے یہ اشغلا چھوڑا کہ جس طرح بھلے چنگے آدمی کو بھی بسا اوقات کسی چیز کا خبط اور سودا ہو جایا کرتا ہے، رات دن اس پر وہی دھن سوار رہتی اور اٹھتے بیٹھتے ہر جگہ اسے وہی چیز نظر آتی ہے اسی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی نعوذ باللہ عذاب اور قیامت کا سودا لاحق ہو گیا ہے، ان کی یہ چیز پروا کرنے کی نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں قریش کی اسی طفل تسلی کی تردید کی ہے کہ جس شخص کو تم مدت العمر کے تجربہ سے جانتے ہو کہ توازن فکر و عمل اور اعتدال ذہن و مزاج کے اعتبار سے تمھاری پوری قوم میں کوئی اس کا

ثانی نہ ہوا آج تم اس کو خبطی اور دیوانہ قرار دیتے ہو جب وہ سن و سال اور رشد و کمال دونوں کی پختگی کا ایک پیکر قدسی ہے۔ نادانو، یہ دیوانہ نہیں بلکہ ایک کھلا ہوا ہوشیار کرنے والا اور ڈرانے والا ہے جو آنے والے طوفان کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ تو ع

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

پیغمبر کی تائید میں آفاق کی شہادت

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ، مطلب یہ ہے کہ اگر یہ آسمان و زمین کے نظام اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات پر غور کرتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ انھیں جو عذاب اور قیامت سے ڈرا رہا ہے وہ دیوانہ اور خبطی نہیں ہے بلکہ یہ خود اندھے اور بہرے ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی صدا اس کائنات کے گوشے گوشے سے اٹھ رہی ہے۔ جو شخص بھی اس کائنات کے نظام پر غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ کائنات عبث اور بے غایت و بے مقصد نہیں ہے بلکہ یہ لازماً ایک روز جزا و سزا پر منتہی ہونے والی ہے جس میں فلاح صرف وہی لوگ پائیں گے جو راستی و پاکبازی کی زندگی بسر کریں گے، جو لوگ اس راہ سے ہٹ کر چلیں گے وہ جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ یہ اس مجموعی نظام کائنات کی ایسی شہادت ہے جس کو صرف وہی لوگ جھٹلا سکتے ہیں جو عقل و شعور کے کان اور آنکھ بند کیے بیٹھے ہوں۔ پھر اس مجموعی کائنات کا ایک ایک جزو بھی اسی حقیقت نفس الامری کی شہادت پکار پکار کر دے رہا ہے۔ خدا نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ اس کی قدرت، حکمت، رحمت اور ربوبیت کا مظہر ہے اور اس نے اس کے لیے ایک مدت بھی ٹھہرائی ہے۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ جس حکیم و قدیر ذات کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہے وہ اس دنیا کو یوں ہی چھوڑے رکھے، اس کے خیر و شر میں کوئی امتیاز نہ کرے اور جس نے ہر چیز کے لیے ایک اجل معین کی وہ اس مجموعی دنیا اور اس کی قوموں کے لیے کوئی اجل معین نہ کرے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ آسمان و زمین کے نظام میں غور جس نتیجہ تک آدمی کو پہنچاتا ہے اس کے ایک حصہ کو، جو واضح ہے، یہاں حذف کر دیا ہے۔ اگر اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ کیا انھوں نے آسمان و زمین کے نظام اور اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں غور نہیں کیا کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ اللہ نے یہ کارخانہ عبث نہیں پیدا کیا؟ بعض جگہ اس محذوف کو واضح کر دیا ہے، مثلاً وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ - ۱۹۱ - آل عمران (اور وہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور کرتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ اے رب تو نے یہ کارخانہ عبث نہیں بنایا، تو پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو)

وَاَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ، یہ اسی محذوف پر عطف ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ یعنی اگر یہ آسمان و زمین کے نظام اور مخلوقاتِ الٰہی کی حکمتوں پر غور کرتے تو ان پر اس کائنات کا مقصد اور ایک اجل معین کے لیے ہونا بھی واضح ہو جاتا اور ان پر یہ بات بھی کھل جاتی کہ کیا عجب کہ

اب ان کی وہ اجل بھی قریب آ گئی ہو، جس سے پیغمبر ان کو ہوشیار کر رہے ہیں اس لیے کہ جب اس دنیا کو خدا نے کھیل تماشہ نہیں بنایا ہے تو آخر وہ ان کو شتر بے مہار کی طرح کیوں چھوڑے رکھے گا، جس طرح دوسری قوموں کو، جن کی تاریخ اوپر بیان ہوئی، اللہ نے پکڑا اب انھیں بھی پکڑے تو کیا بعید ہے! ___ یہ گویا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں آفاقی شہادت کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کو خبط پر محمول نہ کرو بلکہ اپنی بلادت اور سرگشتگی پر ماتم کرو۔

وقت گزر جانے کے بعد ایمان بے فائدہ ہے۔

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ 'بَعْدَہٗ' کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں دو قول ہو سکتے ہیں، ایک اجل، جس کا ذکر اوپر گزرا، اور دوسرے قرآن جس کی آیات کی تکذیب کا یہ سارا نتیجہ ظاہر ہو رہا ہے۔ استاذ رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان دوسرے قول کی طرف معلوم ہوتا ہے لیکن میرا رجحان غالب پہلے قول کی طرف ہے کہ جب وہ اجل آ دھمکے گی تو پھر کس بات پر ایمان لائیں گے۔ ایمان لانے کا وقت تو اب ہے لیکن یہ منتظر ہیں کہ پیغمبر جس انجام کی دھمکی سنا رہے ہیں اس کو دیکھ لیں گے تب ایمان لائیں گے لیکن ان بدبختوں سے کوئی پوچھے کہ پھر ایمان لانے کے لیے کون سی بات باقی رہ جائے گی جس پر وہ ایمان لائیں گے؟ پھر تو سارا قصہ ہی ختم ہو جائے گا، جھگڑا جس چیز کے ماننے نہ ماننے کا ہے وہ تو اسی وقت تک ہے جب تک اس کا ظہور نہیں ہوتا، جب وہ ظاہر ہو گئی تو مانا تو کیا، انکار کیا تو کیا، پھر تو نتیجہ بھگتنا ہے نہ کہ کوئی چیز ماننے کے لیے باقی رہ جائے گی جس پر ان سے ایمان لانے کے لیے کہا جائے گا۔

'مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ' الایۃ' اوپر والا ٹکڑا، جیسا کہ واضح ہے، حسرت کے انداز میں ہے۔ اسی مضمون کی یہ تاکید مزید ہے کہ جن لوگوں کی سمجھ میں اتنی واضح بات نہیں آ رہی ہے درحقیقت وہ سنت الٰہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں اور جو لوگ سنت الٰہی کی زد میں آ چکے ہوں ان کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ ایسے لوگ اپنی سرکشی میں بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔

یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ اَیَّانَ مُرْسٰىہَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُہَا عِنْدَ رَبِّیْ ۚ لَا یُجَلِّیْہَا لِوَقْتِہَآ اِلَّا ہُوَ ؕ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِیْکُمْ اِلَّا بَغْتَۃً ؕ یَسْـَٔلُوْنَکَ کَاَنَّکَ حَفِیٌّ عَنْہَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُہَا عِنْدَ اللّٰہِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۸۷)

سوال بطور استہزاء

یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ اَیَّانَ مُرْسٰىہَا، سوال، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، مذاق اور استہزا کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ اسی نوعیت کا سوال مراد ہے۔ 'ساعۃ' کے معنی وقت اور گھڑی کے ہیں یہاں مراد اس عذاب اور قیامت کی گھڑی ہے جس کے دفعۃً آ دھمکنے کا ڈراوا ان کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سنا رہے تھے۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ ہر پیغمبر اپنی قوم کو دو عذابوں سے ڈراتا ہے۔ ایک اس عذاب سے جو اسی دنیا میں ظاہر ہوتا ہے اگر اس کی قوم اس کی تکذیب کر دیتی ہے اور دوسرے اس عذاب سے جس سے کفار قیامت میں دوچار ہوں گے۔ 'السَّاعَۃ' کا لفظ دونوں ہی پر حاوی

ہے اس لیے کہ پیغمبروں کو جھٹلانے والے ان دونوں ہی کا مذاق اڑاتے رہے ہیں۔ 'ایان' وقت سے متعلق سوال کے لیے آتا ہے۔ جس طرح 'متیٰ' آتا ہے۔ لیکن یہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کسی چیز سے متعلق استغراب واستنکار کے لب ولہجہ میں سوال کیا جائے۔ 'مُرْسٰی' جہاز وغیرہ کے لنگر انداز ہونے کو کہتے ہیں (مثلاً بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا) مطلب یہ ہوا کہ وہ تم سے استہزاء اور طنز کے انداز میں سوال کرتے ہیں کہ اس عذاب یا قیامت کی گھڑی کب نمودار ہوگی جس کے اتنے دنوں سے ڈراوے سنا رہے ہو، آخر یہ جہاز چلا تو کہاں اٹک کے رہ گیا، یہ ساحل پر کب لنگر انداز ہوگا۔

'قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ' فرمایا کہ کہہ دو کہ اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے، وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا، نہ مجھے اس کے وقت کا پتہ ہے اور نہ میں اس کے لا سکنے پر قادر ہوں۔

ایک اعلیٰ تلمیح

'ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً' اس کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ یہ آسمان وزمین میں ایک بھاری حادثہ ہوگا۔ اگرچہ یہ بات بجائے خود صحیح ہے لیکن اسلوب بیان ایک اور معنی کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ وہ گھڑی آسمان وزمین میں ایک بوجھ بنی ہوئی ہے۔ اس میں اس حقیقت کی طرف ایک تلمیح ہے کہ جس طرح ایک حاملہ عورت، ولادت کے قریب بار حمل سے گرانبار ہوتی ہے، اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ولادت کا صحیح وقت کیا ہے لیکن ہر آنکھیں رکھنے والا دیکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ یہ عورت جنے گی اور بہت جلد جنے گی وہی حال قیامت اور عذاب کے معاملے میں آسمان وزمین میں غور کرنے والے ارباب بصیرت کا ہے وہ آسمانوں اور زمین کو اس بوجھ سے گرانبار دیکھتے ہیں اور اگرچہ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس بوجھ سے کب سبکدوش ہوں گے لیکن جس طرح ایک حاملہ اپنے آخری مرحلہ میں اپنے بوجھ سے سبکدوش ہونے کے لیے مضطر اور بے قرار ہوتی ہے، وہی بے قراری آسمان وزمین کے اندر نمایاں ہے۔ اس میں اس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو آسمان وزمین کے اندر قیامت اور عذاب کی نشانیاں نظر نہیں آرہی ہیں ان کو گویا آخری مرحلہ میں پہنچی ہوئی حاملہ کا حمل نظر نہیں آرہا ہے 'لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً' یعنی اس کے علامات وآثار دیکھو اور انہی کو دیکھ کر اس کے آنے کا یقین کرو اور اس کے لیے تیاری کرو، اس کا ظہور جب بھی ہوگا، اچانک ہوگا، اس کے صحیح وقت کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن اس کے وقت کے نہ جاننے سے اس کے واقع ہونے کی نفی نہیں ہو جاتی۔ ایک حاملہ کے متعلق ہر شخص یقین رکھتا ہے کہ وہ جنے گی اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس وقت جنے گی۔

'حفی' کا مفہوم

'یَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِیٌّ عَنْهَا' 'حفی' اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی شخص یا کسی چیز کی کھوج کرید، دریافت، جستجو اور اہتمام کے درپے رہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ تم سے اس گھڑی کے وقت کے ظہور کے متعلق اس طرح سوال کر رہے ہیں گویا تم رات دن اسی کے وقت ہی کی دریافت کے درپے رہتے ہو اور تم نے

منٹ اور سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ ساری معلومات اس کے متعلق جمع کر رکھی ہیں حالانکہ کوئی عاقل نہ کسی ایسی جستجو کے درپے ہوتا نہ اس کو ہونا چاہیے جو اس کے حدود علم و تحقیق سے ماورا ہو۔

انسان کی عجیب بدبختی

'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ' لیکن اکثر لوگ اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ کیا چیز ان کے جاننے کی ہے جس کے انھیں درپے ہونا چاہیے اور کیا چیز ان کے حدود علم سے ماورا ہے جس کے پیچھے پڑنا محض اوقات کی اضاعت اور اپنے آپ کو فتنوں میں مبتلا کرنا ہے۔ انسان کی یہ عجیب بدبختی ہے کہ وہ زیادہ تر ان چیزوں کے پیچھے پڑتا ہے جن کو نہ تو وہ جان سکتا ہے نہ وہ اس کے جاننے کی ہیں اور پھر ان کو بہانہ بنا کر ان حقائق سے منہ موڑ لیتا ہے جن کو جاننا اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کے لیے ضروری ہے۔ جو لوگ متشابہات کے پیچھے پڑ کر محکمات کا انکار کرتے ہیں ان کی بھی اصلی بیماری یہی ہے۔ اس پر ہم نے آل عمران کی تفسیر میں مفصل بحث کی ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۸۸)

پیغمبر غیب کا عالم نہیں ہوتا

یعنی ان کو بتا دو کہ میں جو اللہ کا رسول ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں سارے غیب کا عالم ہو گیا ہوں اور مجھے اس بات کا اختیار مل گیا ہے کہ میں اپنے آپ کو جس نفع سے چاہوں بہرہ ور کر لوں اور جس نقصان سے بچانا چاہوں بچا لوں۔ غیب کا عالم اور حقیقی نافع و ضار صرف اللہ ہی ہے۔ دوسروں کی طرح میرے معاملات میں بھی اصلی کارفرما خدا کی مشیت ہی ہے۔ میں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے نہ کہ خدائی کا تو مجھ سے ان چیزوں کا مطالبہ نہ کرو جن کا تعلق صرف خدا کے ارادے اور اختیار میں ہے۔ مجھے وحی عطا ہوئی ہے، علم غیب کی کنجیاں مجھے نہیں ملی ہیں۔ اگر مجھے غیب کا علم مل گیا ہوتا تو میں خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند بھی نہ پہنچ پاتا لیکن تم دیکھتے ہو کہ مجھے مختلف قسم کے گزند بھی پہنچتے ہیں اور خیر کی راہوں میں بھی میری سبقت اسی حد تک ہے جس حد تک مجھے رب کی رضیات کا علم ہے۔ 'لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ' کے ٹکڑے میں جس خیر کی زیادہ سے زیادہ مقدار جمع کر لینے کی تمنا کا اظہار ہے وہ پیغمبر کے ظرف اور اس کی طلب کے اعتبار سے ہے۔ پیغمبر اپنے حوصلہ اور اپنے ارمان کے اعتبار سے اس مقام بلند پر ہوتا ہے کہ وہ خیر کی کسی وادی کو نا طے کردہ نہیں چھوڑنا چاہتا لیکن وہ خیر سے واقف اسی حد تک ہوتا ہے جس حد تک اس کو وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اگر اس کو پورا غیب معلوم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے اپنے امکان کے حد تک تو اس کی کوشش یہی ہوگی کہ خیر کی راہ کے کسی پتھر کو بھی الٹے بغیر نہ چھوڑے۔ لیکن دائرہ وحی سے باہر اسے بھی دوسروں کی طرح اپنی صواب دید ہی پر کام کرنا اور اپنی عقل ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جس میں کامیابی اور ناکامی دونوں کے امکانات مضمر ہوتے ہیں۔

'اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ میں نہ

عالم الغیب ہوں نہ صاحب اختیار مطلق۔ میں تو صرف ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ میرے اختیار میں یہ بھی نہیں ہے کہ کسی کے دل میں ایمان اتار دوں، یہ چیز بھی لوگوں کے اپنے ارادے اور اللہ کی توفیق بخشی ہی پر منحصر ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ فَلَمَّا أَثْقَلَتْ دَعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۱۸۹-۱۹۰)

اضداد کی باہمی سازگاری توحید کی دلیل ہے

'هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا' اس ٹکڑے کے مضمرات پر ہم سورۂ نساء آیت ۱ کے تحت بحث کر آئے ہیں۔ یہاں 'جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ مرد اور عورت کا باہمی تعلق کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی فطری مناسبت تو نہ ہو، محض اتفاق سے وہ ایک دوسرے کے لیے سازگار، ہم جنس، سرمایۂ تسکین، راحت جان و دل اور ذریعۂ اولاد و احفاد بن گئے ہوں بلکہ سورج کی طرح یہ چیز روشن نظر آتی ہے کہ خالق کائنات نے مرد کے اندر عورت کے لیے اضطراب اور تڑپ پیدا کی ہے اور پھر اس کے اس اضطراب اور اس کی اس تڑپ کی تسکین ہی کے لیے اسی کی جنس سے عورت کو وجود بخشا ہے۔ ان دونوں میں ان کے فطری داعیات اور ان کی داخلی اور خارجی ساخت کے اعتبار سے ایسی گہری سازگاری ہے کہ ایک ہٹ دھرم کے سوا کوئی نہیں یہ کہہ سکتا کہ یہ سازگاری کسی اندھے بہرے مادے کی پیدا کردہ ہے یا یہ کہ ان کا ارتقا آپ سے آپ خود رو درختوں کی طرح ہوا پھر دونوں اپنے اپنے طور پر بھٹکتے ہوئے کہیں راستے میں مل گئے تو اچانک تڑپ کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے اور پھر اس طرح باہم دگر جان و تن بن گئے۔ ع

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

پھر یہ سازگاری، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اس حقیقت کا بھی پتہ دیتی ہے کہ اس کائنات کے اندر ایک ہی حکیم و علیم کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر اس میں مختلف ارادے کارفرما ہوتے تو اس کے اضداد کے اندر وہ سازگاری کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں۔ عورت اور مرد دونوں متضاد خصوصیات سے متصف ہیں لیکن مدبر کائنات نے ان دونوں کے درمیان اس طرح جوڑ ملایا ہے کہ ایک نے درد اور دوسری نے دوا کی شکل اختیار کر لی ہے۔

سائنس کا ایک انکشاف

'جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا' پر غور کرتے ہوئے جدید سائنس کے اس انکشاف کو بھی ذہن میں رکھیے کہ زندگی کے آغاز میں جسد انسان کی اولین صورت ایک جونک کی طرح ایک ہی خلیہ پر مشتمل تھی اور ایک خلیہ کے جانداروں کے توالد کا طریق یہ ہے کہ وہ بڑھ کر خود بخود دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے جن میں سے ہر ایک حصہ ایک مکمل جاندار ہوتا ہے۔ پھر بدنی ارتقا کے اگلے مراحل پر ایک حصہ مادہ کے فرائض کے لیے اور دوسرا حصہ

نر کے فرائض کے لیے موزوں بن جاتا ہے[1]۔

فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ' آیات ۴ ۱۱-۵ ۱۳ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ تصویر حال کے مواقع میں لَمَّا، كُلَّمَا اور اِذَا کی جگہ پر بھی استعمال ہوتا ہے اس وجہ سے یہاں کسی خاص شخص کا حال یا واقعہ بیان نہیں ہو رہا ہے بلکہ عام انسانوں کا حال بیان ہو رہا ہے کہ باوجودیکہ مرد اور عورت دونوں کو خدا ہی نے بنایا اور ان کی باہمی سازگاری دلیل ہے کہ ایک خدا کے سوا ان کے بنانے میں کسی اور کا ہاتھ نہیں ہے لیکن انسان کی یہ عجیب خود باختگی ہے کہ جب اولاد پیدا ہونے والی ہوتی ہے تب تو میاں بیوی دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں بھلی چنگی اولاد عطا فرما لیکن جب اللہ ان کو بھلی چنگی اولاد دے دیتا ہے تو اس کو منسوب کسی درگاہ و خانقاہ اور کسی بزرگ یا کسی بت کی طرف کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ فلاں کی توجہ اور فلاں کی برکت و عنایت کا کرشمہ ہے۔ بعض لوگوں نے لَمَّا " کی وجہ سے اس کو ایک معیّن واقعہ سمجھا اور جب معین واقع سمجھا تو ضروری ہوا کہ اس کو کسی خاص شخص کی طرف منسوب کریں چنانچہ انھوں نے اس کو حضرت آدمؑ اور حوا کی طرف نسبت دے دی اور اس کے لیے ایک بے بنیاد واقعہ بھی گھڑ کر تفسیروں میں شامل کر دیا حالانکہ قطع نظر اس سے کہ حضرت آدمؑ پیغمبر ہیں، اس مہمل روایت کی تردید کے لیے یہی بات کافی ہے کہ یہ بات یہاں اس عہد فطرت کی خلاف ورزی کی مثال کے طور پر بیان ہو رہی ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۱۷۲ میں گزرا۔ ظاہر ہے کہ اس عہد میں تمام نسل انسانی کے باپ کی حیثیت سے حضرت آدمؑ سب سے پہلے شریک ہیں تو نعوذ باللہ اگر وہی اس عہد میں بودے ثابت ہو جاتے تو پھر دوسروں سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

ایک عام انسانی کردار کا بیان

فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ۔ صَالِح ' کا لفظ عربی میں بھلے چنگے، تندرست، ذی صلاحیت کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب عورت پوری طرح بوجھل ہو جاتی ہے اور وضع حمل کا وقت قریب آتا ہے تو بیوی اور میاں دونوں پر ایک اندیشے کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس اندیشہ میں وہ خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور چونکہ اصل فطرت کے اندر صرف خدا ہی کا نقش ہے، کسی اور کا نقش نہیں ہے اس وجہ سے یہ توجہ خدا کی طرف بلا شرکت غیرے ہوتی ہے۔ وہ اسی سے دعا کرتے ہیں کہ خدا بھلی چنگی، تندرست و خوب صورت اور ذی صلاحیت اولاد بخشے لیکن جب خدا اولاد دے دیتا ہے تو نہ جانے کن کن کو وہ اس میں شریک بنا بیٹھتے ہیں۔

قرآن میں انسانی فطرت کا یہ خاص پہلو جگہ جگہ بیان ہوا ہے کہ انسان اپنی اصل ضرورت اور اصل احتیاج کے وقت تو اپنے رب ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن جب وہ احتیاج پوری ہو جاتی ہے تو اس کو دوسرے

---

[1] یہ بات محترم ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم کی کتاب 'قرآن اور علم جدید' میں میری نظر سے گزری تھی۔ میں خود بدقسمتی سے سائنس کا کبھی طالب علم نہیں رہا۔

اسباب و وسائل کا کرشمہ قرار دینے لگتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کا تجربہ ہر شخص خود اپنے اندر کر سکتا ہے۔ انسان کی عام حالت یہی ہے اور یہاں عام حالت ہی بیان ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ ایسے بلید بھی پائے جاتے ہوں جو کسی حال میں بھی خدا کی طرف متوجہ نہ ہوتے ہوں لیکن فرعون تک کا حال قرآن میں بیان ہوا ہے کہ ڈوبتے وقت اسے بھی خدا یاد آیا۔ بہرحال مستثنیات سے یہ کلیہ ٹوٹ نہیں جاتا۔ آدمی پر جب حقیقی افتقار کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ دل ہی دل میں یا زبان اور دل دونوں ہی سے خدا کو پکارتا ہے اور یہ عہد بھی کرتا ہے کہ اگر اس مرحلہ یا اس بھنور سے وہ گزر گیا تو آئندہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن کر زندگی گزارے گا لیکن جونہی اس مرحلہ سے گزر جاتا ہے، وہ یہ سارا عہد و پیمان بھلا کر انہی خود فراموشیوں میں پھر گم ہو جاتا ہے جن میں پہلے کھویا ہوا تھا۔ اس مسئلہ پر ہم نے اپنی کتابوں میں سے 'حقیقت شرک' اور 'حقیقت توحید' میں بھی بحث کی ہے، تفصیل کے طالب ان کو پڑھیں۔

نظم کے پہلو سے یہ آیات اس مضمون سے تعلق رکھتی ہیں جو اوپر ۱۷۲-۱۷۴ میں عہد فطرت کا بیان ہوا ہے۔ بیچ میں کچھ آیتیں تنبیہ و تذکیر اور انذار کی نوعیت کی آگئی ہیں۔ اب یہ پھر اسی مضمون کو لے لیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ انسان کی فطرت کی اصل صدا کیا ہے اور انسان (یہاں خاص اشارہ قریش کی طرف ہے) اپنی فطرت کی اس صدا سے کان بند کر کے کس طرح مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔

'فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ' میں ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ خدا کی صفات کے ساتھ ایسی صفات کا جوڑ ملانا جو اس کی بنیادی صفات کو باطل کر دیں بالکل خلاف عقل ہے۔ شرک، جس نوعیت کا بھی ہو، تمام صفات کمال کی نفی کر دیتا ہے اس وجہ سے خدا ایسی تمام نسبتوں اور شرکتوں سے منزہ اور ارفع ہے۔

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (۱۹۱-۱۹۲)

خدا کے مزعومہ شرکاء کی بے حیثیتی

یہ 'تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ' کے مضمون کی وضاحت ہے کہ خدا ہی سب کا خالق اور سب کا ناصر ہے تو ان چیزوں کو خدا کی خدائی میں شریک بنانے کا کیا تک ہے جو کسی چیز کو بھی خلق نہیں کرتی ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں اور جو نہ تو ان کی کوئی مدد کر سکنے پر قادر ہیں اور نہ اپنی ہی کوئی مدد کر سکتی ہیں؟

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۹۳-۱۹۴)

مشرکوں کو چیلنج

'اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ' مطلب یہ ہے کہ معبود سے عابد کی سب سے بڑی احتیاج تو یہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر مرحلہ میں رہنمائی فرماتا ہے لیکن تم جن معبودوں کو پوجتے ہو اگر تم ان کو زندگی کے کسی موڑ پر پکارو کہ وہ تمہاری رہنمائی کریں تو نہ وہ سنیں گے اور نہ تمہاری رہنمائی کے لیے تمہارے ساتھ لگیں گے۔ لفظ 'اتباع' یہاں اپنے ابتدائی لغوی مفہوم میں ہو گا۔ 'اتبعہ' مشی خلفہ۔ مضی معہ، لحقہ

اس کے پیچھے چلا، اس کے ساتھ ہولیا، اس کو جا پہنچا۔ آگے اس مضمون کی وضاحت یوں ہوئی ہے وَإِن تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَسْمَعُوا ۖ وَتَرَاهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے۔ تم خیال کرتے ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں حالانکہ انھیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے) أَدَعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنتُمْ صَامِتُونَ یعنی رووو، چیخو، فریاد کرو یا خاموش رہو، ان کے لیے دونوں یکساں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ ‌الآیۃ یعنی یہ خود تمہاری ہی طرح خدا کی مخلوق ہیں تو یہ تمہاری مدد یا رہنمائی کیا کر سکتے ہیں اور اگر تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ تمہاری مدد اور رہنمائی کر سکتے ہیں تو ان کو پکارو، یہ تمہاری مدد کریں۔ یہ مشرکین کو اسی طرح کا چیلنج ہے جس طرح کا چیلنج وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (اور بلالو اپنے شریکوں کو بھی جن کو تم اللہ کے سوا مانتے ہو، اگر تم سچے ہو) میں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اب تک تو تم نے اپنے ان خیالی معبودوں کو جو چاہا مانا اور جو چاہا منوایا لیکن اب پیغمبر اور قرآن نے ان سب کی خدائی کو چیلنج کر دیا ہے۔ اب وقت ہے کہ وہ تمہاری مدد اور رہنمائی کے لیے پہنچیں اور تم کو بھی اور خود اپنے آپ کو بھی سنبھالیں۔ اگر انھوں نے اپنی خدائی بچالی تو بے شک معلوم ہوگا کہ تم سچے ہو۔ یہ بات واضح رہے کہ اہل عرب جن بتوں کو پوجتے تھے وہ ان کے گمان کے مطابق فرشتوں، جنات اور کواکب کے بت تھے اس وجہ سے ان کو عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فرمایا ہے۔ تفصیل اس کی ہماری کتاب 'حقیقت شرک' میں ملاحظہ فرمائیے۔

أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ
آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۗ قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُونِ فَلَا تُنظِرُونِ (۱۹۵)

بت پرستی کی تردید اس کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے

بت پرستی دو جزوں سے مرکب ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ذوات ہیں جن کو بت پرست اپنے زعم کے مطابق خدائی میں شریک مانتے اور ان کو الٰہ قرار دیتے ہیں۔ دوسرے وہ پتھر اور سونے یا چاندی کی مورتیں ہیں جن کو وہ ان ذوات کے پیکر اور قالب کی حیثیت سے ڈھالتے یا تراشتے ہیں اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ ان مظاہر کے اندر ان کے مزعومہ دیوتا حلول کر جاتے ہیں اور ان مظاہر کی پرستش ان آلہہ کی پرستش کا واسطہ اور ذریعہ ہے۔ نظریہ کے اعتبار سے تو بت پرستی کے حامی اس کی حمایت میں یہی بات کہتے ہیں لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ عوام کالانعام سب کچھ ان مورتوں ہی کو سمجھتے ہیں جن کے آگے وہ ڈنڈوت کرتے اور نذر و قربانی پیش کرتے ہیں۔ قرآن نے یہاں بت پرستی کی اس کے دونوں ہی پہلو سامنے رکھ کر تردید کی ہے۔ اوپر کی آیات میں ذوات کو پیش نظر رکھ کر تردید فرمائی، اب یہ ان کے مظاہر کو پیش نظر رکھ کر اس کی تردید ہو رہی ہے کہ دیکھ لو ان کے جو ہاتھ پاؤں، کان، آنکھ تم نے بنائے ہیں سب نمائشی اور دکھاوے کے ہیں، یہ اپنے چہرے سے مکھی بھی نہیں ہٹا سکتے اور اپنے سامنے رکھے ہوئے دودھ اور حلوے کی بھی کتوں اور بلیوں سے حفاظت نہیں کر سکتے تو یہ بھلا تمہاری کیا مدد کر سکیں گے جو تم نے ان کو اپنا ملجا و ماویٰ اور ولی و کارساز بنا رکھا ہے۔

بعینہٖ یہی حقیقت زبور میں بدیں الفاظ واضح فرمائی گئی ہے۔

ان کے بت چاندی اور سونا ہیں۔
یعنی آدمی کی دست کاری۔
ان کے منہ ہیں، پر وہ بولتے نہیں۔
آنکھیں ہیں، پر وہ دیکھتے نہیں۔
ان کے کان ہیں، پر وہ سنتے نہیں۔
ناک ہیں، پر وہ سونگھتے نہیں۔
ان کے ہاتھ ہیں، پر وہ چھوتے نہیں۔
پاؤں ہیں، پر وہ چلتے نہیں۔
اور ان کے گلے سے آواز نہیں نکلتی۔
ان کے بنانے والے انھیں کے مانند ہو جائیں گے۔
بلکہ وہ سب جو ان پر بھروسہ رکھتے ہیں۔
زبور باب ۱۱۵ ۳-۸

'قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ' یہ مشرکین کی دھمکیوں کا جواب ہے کہ تم ان بے جان اور بے حرکت مورتوں سے مجھے ڈراتے ہو کہ ان کی مذمت و مخالفت کے نتیجہ میں ان کا غضب مجھ پر بھڑکے گا۔ اگر تم یہ گمان رکھتے ہو تو تم اپنے ان سب دیویوں دیوتاؤں کو اپنی مدد کے لیے پکارو اور میرے خلاف جو تدبیر کر سکتے ہو کر گزرو، ذرا بھی رعایت نہ برتو اور ایک دن کے لیے بھی مجھے مہلت نہ دو۔

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ۝ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَسْمَعُوْا ۖ وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۱۹۶-۱۹۸)

اللہ تعالیٰ کی شان

'اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الاٰیۃ'۔ 'وَلِیّ' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، حامی و ناصر اور مرجع و کارساز کے آتے ہیں۔ اوپر آیات ۱۹۲-۱۹۴ میں گزر چکا ہے کہ یہ بت جن کو یہ مشرکین پوجتے ہیں ان کی تو کیا مدد کریں گے خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور اگر یہ ان کو مدد و نصرت اور حمایت و ہدایت کے لیے پکاریں تو ان کا پکارنا اور نہ پکارنا دونوں یکساں ہے، وہ ان کی مدد و رہنمائی کے لیے کبھی نہیں پہنچیں گے۔ اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی شان بیان ہو رہی ہے کہ میرا حامی و ناصر وہ اللہ ہے جس نے میری اور خلق کی ہدایت کے لیے نہایت اہتمام کے ساتھ کتاب اتاری ہے اور جو اپنے نیکوکار اور صالح بندوں کو دوست رکھتا اور ہر مرحلہ میں ان کی مدد اور رہنمائی فرماتا ہے۔ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'نَزَّلَ' میں اہتمام کا مضمون پایا جاتا ہے۔ یعنی اس نے نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے بندوں

کی رہنمائی کے لیے کتاب اتاری ہے۔ یوں تو بندہ ہر چیز کے لیے اپنے رب ہی کا محتاج ہے لیکن اس کی سب سے بڑی احتیاج ہدایت کے لیے ہے جس کا اہتمام خدا ہی نے فرمایا ہے تو آخر یہ اصنام و آلہہ کس مرض کی دوا ہیں اور کس احتیاج کے لیے ان کی پوجا ہو رہی ہے۔

'وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ الایۃ' یہ اوپر آیت ۱۹۲ کا مضمون کسی قدر اسلوب کی تبدیلی کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

'وَاِنْ تَدْعُوْھُمْ اِلَی الْھُدٰی لَا یَسْمَعُوْا' یہ اوپر آیت ۱۹۲ کے مضمون کی وضاحت ہے یہاں 'لَا یَسْمَعُوْا' کا لفظ 'لَا یَتَّبِعُوْکُمْ' کے صحیح مفہوم پر روشنی ڈال رہا ہے۔ 'وَتَرٰھُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ' اس ٹکڑے میں 'رویت'، 'نظر' اور 'ابصار' کے الفاظ اس خوبی سے استعمال ہوئے ہیں کہ بس قرآن کا اعجاز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے بصرو، تم تو یہ خیال کر رہے ہو کہ یہ تمھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں لیکن انھیں سوجھتا سمجھتا کچھ بھی نہیں۔

ایجاز بیان کی ایک مثال

'وَتَرٰھُمْ' میں واحد کا خطاب، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، جمع کے مفہوم میں ہے اور مخاطب مشرکین ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰھِلِیْنَ ۝ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ وَاِخْوَانُھُمْ یَمُدُّوْنَھُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ (۱۹۹-۲۰۲)

'خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ' اب یہ سورہ کے آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطہ سے مسلمانوں کو بعض مناسب وقت ہدایات دی گئی ہیں۔ لفظ 'عفو' جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے، اس طرح کے سیاق و سباق میں جب آتا ہے تو دل سے معاف کر دینے کے معنی میں نہیں بلکہ مجرد درگزر کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ 'عُرْف' ایسی بات کو کہتے ہیں جو عقل اور فطرت اور معقول لوگوں کے نزدیک جانی پہچانی ہوئی ہو۔ یہاں اس سے مراد توحید و معاد اور نیکی و عدل کی وہی باتیں ہیں جن کی اس دور میں اہل عرب کو دعوت دی جا رہی تھی اور جو کہ سر عقل و فطرت کی شہادت پر مبنی اور سلیم الفطرت طبائع کے لیے ان کے دل کی آواز تھیں۔ فرمایا کہ تم توحید اور معاد، نیکی اور عدل کی جو دعوت دے رہے ہو اس پر جمے رہو اور ان جاہلوں کی نواتر خائیوں سے ابھی درگزر کرو۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے جب یہ اپنی ان بوالفضولیوں کا نتیجہ خود دیکھ لیں گے۔

پیغمبر اور مسلمانوں کو بعض ہدایات

'وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ الایۃ' 'نَزْغ' کے معنی چرکا لگانا، کچوکا لگانا، زخم پہنچانا۔ یہ تدبیر بیان ہوئی ہے روش عفو پر قائم رہنے اور جاہلوں کی روش سے اعراض اور ان کے کچوکوں اور طعنوں کے صدمات سے اپنے دل کو محفوظ رکھنے کی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان شیاطین جن و انس کی ہرزہ سرائیوں اور خاکبازیوں سے دل کو کوئی صدمہ پہنچے تو اپنے رب کی پناہ ڈھونڈو۔ تمھارا رب سمیع و علیم ہے، تم جب بھی اس کی طرف رجوع کرتے ہو وہ تمھاری دعائیں اور فریادیں سنتا، تمھارے حالات اور پریشانیوں کو جانتا

ہے اور شیاطین کی فتنہ انگیزیوں اور چیرہ دستیوں سے بھی وہ اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ تمہارے ہر غم کو دور فرمائے گا۔

'إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا' اور 'يَنزَغَنَّكَ' میں خطاب اگرچہ لفظاً واحد سے ہے لیکن یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے تمام مسلمانوں سے ہے چنانچہ اس آیت میں جمع کے اسلوب نے اس مخفی حقیقت کو واضح کر دیا۔ فرمایا کہ جو لوگ جہالت کے بجائے تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں جب کبھی ان کو جاہلوں کی جہالت اور شیاطین کی شیطنت کا کوئی جھٹکا لگتا ہے تو وہ اپنے رب کو یاد کرتے ہیں جس سے فوراً ان کا باطن روشن ہو جاتا ہے اور اشرار و معاندین کی ساری خاکبازی کے باوجود ان کی راہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتی۔ یہ گویا اس 'استعاذہ' کا طریقہ اور فائدہ بتا دیا گیا جس کی اوپر والی آیت میں ہدایت ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ میں داخل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے رب کو یاد کرے یہ چیز دل کے اندر ایسی بصیرت اور ایسی قوت و ہمت پیدا کر دے گی کہ دفعتہً آنکھوں کے آگے کا سارا غبار چھٹ جائے گا۔

'وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ'۔ 'هُمْ' کا مرجع وہ 'جاہلین' ہیں جن کا ذکر اوپر آیت ۱۹۹ میں گزرا۔ 'اخوان' سے ان کے وہ ساتھی مراد ہیں جن کے ہاتھوں میں ان کی باگ ہے، عام اس سے کہ وہ شیاطین انس میں سے ہوں یا شیاطین جن میں سے۔ فرمایا کہ اہل ایمان کو تو خدا کی یاد سنبھال لیتی ہے لیکن جاہلین کو ان کے شیاطین گمراہی کی وادیوں میں بھٹکاتے بھٹکاتے آخری منزل پر پہنچا دیتے ہیں، ذرا بھی کسر نہیں اٹھا رکھتے کہ بازگشت کا کوئی امکان باقی رہے۔

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِم بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۞ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۲۰۳ - ۲۰۴)

شیطانی طعنے اور ان کا مقابلہ

یہ ان شیطانی طعنوں اور نزغات کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جن سے کفار کے ہاتھوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت سابقہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم ان کے مطالبہ پر ان کے انتخاب کے مطابق معجزہ نہیں دکھاتے تو یہ تمہیں طعنہ دیتے ہیں کہ یہ کہیں سے کیوں نہیں چھانٹ لائے؟ اس قول سے ظالموں کا مطلب یہ ہوتا کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کا معاملہ تو بہت آسان ہے۔ ادھر ادھر سے جو باتیں اگلوں کے واقعات اور کاہنوں اور اہل کتاب کی روایات پر مشتمل کانوں میں پڑیں ان میں سے جو باتیں دل کو بھا گئیں ان کو جوڑ جاڑ کر کچھ کلام بنایا اور اس کو لا کر ہمیں اس دعوے کے ساتھ سنا دیا کہ یہ اللہ نے اپنے خاص فرشتے کے ذریعہ سے وحی بھیجی ہے لیکن اب ہم نے مطالبہ جو معجزے کا رکھ دیا ہے تو تمہاری کچھ پیش نہیں جاتی اس لیے کہ ادھر ادھر سے باتیں چھانٹ لینا اور چیز ہے، معجزہ دکھانا اور چیز ہے۔ یہ چھانٹ لینے کی چیز نہیں تھی کہ کہیں سے چھانٹ کر لاتے اور ہمیں دکھا دیتے کہ یہ لو تمہارا مطالبہ

پورا کردیا۔ گویا اس طعنہ میں صرف معجزہ نہ دکھا سکنے ہی کا طعنہ نہیں بلکہ اس سے زیادہ زہر آلود طعنہ اس کے اندر یہ مضمر ہے کہ نعوذ باللہ قرآن ایک من گھڑت چیز ہے جو ادھر ادھر سے اپنے ذوق کے مطابق چھانٹی ہوئی چیزوں کا مجموعہ ہے۔

'اِجْتِبَاء' کا اصل لغوی مفہوم تو مجموعہ میں سے کسی چیز کو انتخاب کر لینا اور چھانٹ لینا ہے لیکن جب طنز کے سیاق و سباق میں یہ لفظ استعمال ہو، جیسا کہ یہاں ہے تو اس کے معنی گھڑنے اور بنا لینے کے ہو جائیں گے اسی وجہ سے فراء نے اس کی تفسیر 'اِخْتَلَقْتَهَا اِفْتَرَيْتَهَا' سے کی ہے اور یہ تفسیر ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ طنزیہ اسلوب میں الفاظ کے مفہوم بدل جایا کرتے ہیں۔

طنز کا باوقار اور بھرپور جواب

'قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ الاية' یہ پیغمبر کی طرف سے کفار کے مذکورہ بالا طنز کا جواب ہے اور دیکھیے کیسا باوقار اور بھرپور جواب ہے۔ فرمایا کہ دو تم جو چاہو سمجھو اور جو چاہو کہو، میں تو بس اسی وحی کی پیروی کر رہا ہوں جو میرے اوپر میرے رب کی جانب سے آتی ہے۔ اوپر جاہلوں کی جہالت سے اعراض کی جو ہدایت ہوئی تھی، یہ جواب اس ہدایت کی تعمیل کی بہترین مثال ہے۔ ان کی جاہلانہ بات کا سرے سے نوٹس ہی نہیں لیا، صرف اصل حقیقت نہایت سادہ مگر نہایت باعظمت اسلوب میں ظاہر فرما دی 'هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ' یعنی تم اس چیز کو میری گھڑی ہوئی چیز کہتے ہو لیکن یہ تمہارے رب کی جانب سے آنکھوں اور دلوں کے پردے اٹھا دینے والی آیتیں اور تمہارے لیے ہدایت و رحمت ہیں۔ ہدایت اپنے آغاز کے اعتبار سے اور رحمت اپنے انجام کے لحاظ سے۔ لیکن یہ ان کے لیے نافع ہیں جو ایمان لائیں۔ 'لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' میں یہ لطیف تلمیح بھی مضمر ہے کہ میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اصل خرابی تمہارے اپنے دلوں کے اندر ہے کہ تم حقیقت کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔

قرآن سے مستفید ہونے کا طریقہ

'وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ الاية' اب یہ بتایا ہے کہ قرآن کی ہدایت و بصیرت سے مستفید ہونے کا طریقہ کیا ہے، فرمایا کہ جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموشی سے اس پر کان لگاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو رحمت الٰہی تمہاری طرف متوجہ ہو گی اور اس پر ایمان لانے کے لیے تمہارے دل کھلیں گے 'انصات' کے معنی خاموشی سے کسی کی بات سننے کے لیے کان لگانا ہے۔ اس میں کفار کے اس غلط رویہ کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے قرآن کے معاملہ میں اختیار کر رکھا تھا۔ سورہ فصلت میں ہے۔ 'وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ ۲۶' (اور کافر کہتے ہیں کہ اس قرآن کو مت سنو اور جب سنایا جائے تو اس میں گھپلا ڈالو) فرمایا کہ یہ روش جہالت کی روش ہے جس کا نتیجہ رحمت سے محرومی ہے۔ صحیح روش اس کے بالکل برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کو سنو اور شور و شغب کے بجائے خاموشی سے کان لگا کر سنو۔ یہ طریقہ اس رحمت سے مستفید ہونے کا ہے۔

اس آیت کو ہمارے فقہا کے ایک گروہ نے امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کی ایک دلیل کا بھی ماخذ بنایا

ہے۔ لیکن یہ آیت، جیساکہ واضح ہے، اس سیاق و سباق کی آیت نہیں ہے اور اگر سیاق و سباق سے قطع نظر کر کے کوئی اس طرح کا استنباط آیت سے کرنا ہی چاہے تو بات ان لوگوں کے حق میں نہیں جاتی جو امام کے پیچھے یک قلم فاتحہ پڑھنے کے مخالف ہیں بلکہ ان لوگوں کے حق میں جاتی ہے جو جہری نمازوں میں تو فاتحہ پڑھنے سے روکتے ہیں لیکن سری میں نہیں روکتے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ (۲۰۵-۲۰۶)

خدا کو یاد کرنے کا طریقہ — 'وَاذْكُرْ رَّبَّكَ ... الایۃ' اوپر خدا کی پناہ میں آنے کا طریقہ خدا کو یاد کرنا بتایا ہے۔ اب خدا کو یاد کرنے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ اس کے لیے تین باتیں ارشاد ہوئیں۔

ایک یہ کہ یہ فروتنی، مسکنت، لجاجت اور خوف کے ساتھ دل دل ہی میں ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناز، تدلل اور احساس استحقاق و استکبار اس کے منافی ہے۔

دوسری یہ کہ اگر قول سے ذکر ہو تو دون الجہر ہو یعنی بہت زیادہ بلند آواز سے نہ ہو۔ اس بات کی وضاحت سورہ بنی اسرائیل میں یوں ہوئی ہے 'وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا۔ بنی اسرائیل ۱۱۰' (اور اپنی دعا نہ بہت بلند آواز سے کرو، نہ بہت پست آواز سے، ان کے درمیان کی راہ اختیار کرو) یہ ہدایت مشرکین کے طریقہ سے بچانے کے لیے بھی ہوئی اور اس لیے بھی کہ ہمارا پروردگار سمیع و علیم ہے، نعوذ باللہ بہرا نہیں ہے۔ یاد ہوگا کہ ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زیادہ بلند آواز سے ذکر کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا تھا۔ علاوہ ازیں اس میں ریا، شہرت اور نمائش کا بھی زیادہ امکان ہے جو اخلاص کے بالکل منافی چیزیں ہیں۔

تیسری یہ کہ اللہ کی یاد ہر وقت رہنی چاہیے۔ 'بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ' کے الفاظ، جیساکہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، احاطہ کے مفہوم پر دلیل ہوتے ہیں جس طرح ہم صبح و شام کے الفاظ بولتے ہیں اسی طرح عربی میں یہ الفاظ ہیں۔ 'وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ' اسی مفہوم کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی خدا کی یاد سے کسی وقت بھی غفلت نہ ہو۔ جس طرح جسم کی زندگی کے لیے سانس کی آمد و شد ضروری ہے، اسی طرح روح کی زندگی کے لیے ذکر الٰہی ضروری ہے۔ شیطان ہر وقت حملہ کی گھات میں رہتا ہے، کسی وقت بھی اس کام سے غافل نہیں ہوتا اس وجہ سے اس سے پناہ حاصل کرنے کے لیے جو حرز ہے آدمی کو اس سے بھی کسی وقت غفلت نہیں ہونی چاہیے۔ اس ذکر کی شکلیں اور صورتیں حالات، ضروریات مقتضیات اور اوقات کی تبدیلی سے بدل بدل جاتی ہیں لیکن اس سے غفلت کسی وقت بھی جائز نہیں۔ انسان جہاں غافل ہوا شیطان کسی نہ کسی راہ سے حملہ آور ہو جائے گا —— اس امر کی یاددہانی کی یہاں ضرورت نہیں ہے کہ خطاب اگرچہ بصیغہ واحد ہے لیکن اس کی نوعیت وہی ہے جو اوپر آیت ۱۹۹ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔

"اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ الاٰية" جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں، سے اشارہ فرشتوں کی طرف ہے۔ ان کے بابت فرمایا کہ وہ خدا کی بندگی سے کسی وقت سرتابی نہیں کرتے، برابر اس کی تسبیح میں لگے رہتے اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہ آیت ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں برابر سرگرم رہنے والوں کے زمرہ کو بتاتی ہے کہ جو لوگ خدا کو ہر وقت یاد رکھتے ہیں گو وہ رہتے بستے زمین میں ہیں لیکن ان کا تعلق فرشتوں کی بزم قدس سے ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ جس طرح وہ ہر وقت زمزمہ سنج تسبیح و تہلیل رہتے ہیں، یہ بھی اسی طرح مصروفِ یادِ الٰہی رہتے ہیں۔ دوسری طرف اس میں مشرکین پر تعریض بھی ہے کہ یہ تو فرشتوں ہی کی سفارش کے بل پر اکڑتے پھرتے ہیں، نہ خدا کو خاطر میں لاتے ہیں نہ رسول کو لیکن خود فرشتوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہر وقت خدا کے آگے تسبیح و سجود میں لگے رہتے ہیں۔

سورۂ اعراف کی تفسیر کی یہ آخری سطریں ہیں جو قلم بند ہوئیں۔ جو باتیں صحیح قلم سے نکلی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نکلی ہیں۔ جو غلط نکلی ہیں وہ میری کم علمی کا نتیجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ضرر سے مجھ کو اور اس کتاب کے پڑھنے والوں کو محفوظ رکھے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

لاہور

۲۱ شعبان ۱۳۸۸ھ

۱۳ نومبر ۱۹۶۸ء

تدبرِ قرآن

٨

الانفال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود

سورۂ انفال دوسرے گروپ کی تیسری سورہ ہے۔ یہ مدنی ہے۔ اس میں مسلمانوں کو تقویٰ، باہمی اخوت و ہمدردی اور اللہ و رسول کی اطاعت کی اساس پر منظم اور جہاد کے لیے تیار ہونے کی دعوت دی گئی ہے تاکہ وہ اس ملت ابراہیمیؑ اور مرکز ملت ابراہیمیؑ۔ بیت اللہ۔ کی امانت و تولیت کے اہل ہو سکیں جو اب قریش کی جگہ ان کی تحویل میں دی جانے والی ہے۔

پچھلی دونوں سورتوں۔ انعام اور اعراف۔ میں آپ نے دیکھا کہ قریش کو عقائد، اعمال اور اخلاق ہر پہلو سے اس امانت کے لیے نااہل ثابت کر دیا ہے۔ اب اس سورہ میں مسلمانوں کی تطہیر و تنظیم، ان کی اصلاح اور تزکیہ کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے کہ غزوۂ بدر کے دوران میں بعض کمزور مسلمانوں کی طرف سے جو کمزوریاں، اللہ و رسول کی اطاعت اور ایمان و توکل کے منافی، صادر ہوئی تھیں، ان پر پہلے گرفت فرمائی ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو ان کمزوریوں سے پاک کریں۔ پھر ان غیبی تائیدات کی طرف اشارہ فرمایا جو غزوۂ بدر کے دوران میں ظاہر ہوئیں تاکہ مسلمانوں کا اعتماد اللہ پر مضبوط ہو اور جو لوگ ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوئے ہیں وہ یکسو ہو کر آگے کے مراحل کے تقاضے پورے کرنے کے اہل ہو سکیں۔ پھر مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جہاد پر ابھارا ہے اور یہ وعدہ فرمایا ہے کہ اگر انھوں نے کمزوری نہ دکھائی تو جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ حریف کی سازشوں کے سارے تار و پود بکھر جائیں گے۔ بیچ بیچ میں قریش کو بھی تنبیہ فرمائی ہے کہ بدر کے واقعہ میں تمہارے لیے بڑا سبق ہے، تمہارے لیے اب بہتر یہی ہے کہ اس سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ یاد رکھو کہ اگر تم نے مزید کوئی شرارت کی تو پھر منہ کی کھاؤ گے، اب تک تمہارے ساتھ جو رعایت ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ رسولؐ تمہارے اندر موجود تھا۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ جب تک رسولؐ قوم کے اندر موجود رہتا ہے اس وقت تک قوم پر عذاب نہیں آتا لیکن اب جب کہ رسول تمہارے اندر سے ہجرت کر چکا ہے، تمہاری امان اٹھ چکی ہے اور تم ہر وقت عذاب الٰہی کی زد میں ہو۔ تمہارا یہ غرہ بالکل بے جا ہے کہ تم بیت اللہ کے متولی اور مجاور ہو، بیت اللہ کے متولی ہونے کے اہل تم نہیں ہو،

تم نے ابراہیمؑ کے بنائے ہوئے اس گھر کا مقصد بالکل برباد کر کے رکھ دیا بلکہ اس کی حرمت کو بٹہ لگایا، تم جس نماز اور عبادت کے مدعی ہو یہ نماز عبادت نہیں بلکہ محض مذاق ہے، تمہارے لیے سلامتی کی راہ یہ ہے کہ تم توبہ اور اصلاح کی روش اختیار کرو ورنہ یاد رکھو کہ اب اس حرم کی سرزمین پر نہ اہلِ ایمان پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کا کوئی موقع باقی چھوڑا جائے گا اور نہ اللہ کے دین کے سوا یہاں کوئی اور دین باقی رہنے دیا جائے گا۔

آگے بدر کے واقعات ہی کی روشنی میں مسلمانوں کی حوصلہ افزائی اور کفار کو تنبیہ کرتے ہوئے بات ان اعتراضات کے جواب تک پہنچ گئی ہے جو قریش نے بدر میں شکست کھانے کے بعد لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے کے لیے اٹھائے۔ بدر سے پہلے تک تو وہ مسلمانوں کی کمزوری و مجبوری کو اسلام کے خلاف دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے لیکن بدر میں انہی کمزور مسلمانوں کے ہاتھوں جب پٹ گئے تو یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر کس طرح ہو سکتے ہیں، بھلا پیغمبر کا کہیں یہ کام ہوتا ہے کہ اپنی ہی قوم کو باہم لڑا دے۔ اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرائے، پھر ان کو قید کرے، ان سے فدیہ وصول کرے اور ان کا مال و اسباب غنیمت بنا کر کھائے اور کھلائے؟ اس اعتراض سے بھی کمزور قسم کے لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہو سکتے تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کو بھی صاف کیا اور آخر میں انصار اور مہاجرین کو باہمی اخوت کی تعلیم و تلقین فرمائی کہ دونوں مل کر کفر کے مقابلہ میں بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہوں۔

اگرچہ سورہ کا نظام سمجھنے کے لیے یہ اجمالی نظر بھی کافی ہے لیکن ہم مزید وضاحت کے لیے سورہ کے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) مالِ غنیمت کی تقسیم سے متعلق بعض کمزور قسم کے مسلمانوں کی طرف سے معترضانہ نوعیت کے سوال کا حوالہ اور اس کا اجمالی جواب۔ اس اعتراض کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو اس امر کی ہدایت کہ اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرتے رہو، اپنے آپس کے تعلقات رشک و رقابت سے پاک رکھو، اللہ و رسول کی ہر معاملے میں اطاعت کرو۔ سچے اور پکے اہلِ ایمان کی خصوصیات کا بالاجمال حوالہ اور ان کے لیے اللہ کے ہاں اجرِ عظیم کا وعدہ۔

(۵-۸) کمزور قسم کے مسلمانوں کی ایک اور کمزوری کی طرف اشارہ جو جنگِ بدر کے لیے نکلتے ہوئے ان سے صادر ہوئی کہ باوجودیکہ ان پر یہ بات واضح تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نکلنا قریش کی اس فوج کے مقابلہ کے لیے ہے جو تجارتی قافلہ کی حفاظت کا بہانہ بنا کر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتی ہے لیکن وہ فوج کے مقابلہ سے ڈرتے رہے اور انھوں نے پورا زور اس بات پر لگایا کہ آنحضرت تجارتی قافلہ کا رخ کریں تاکہ بغیر کسی خطرہ کے لقمۂ تر ہاتھ آئے حالانکہ اللہ و رسول کا منشا یہ تھا کہ حق کا بول بالا ہو اور باطل کا زور ٹوٹے جو اسی صورت میں متصور تھا جب قریش کی عسکری قوت مجروح ہو نہ کہ ایک غیر مسلح تجارتی قافلہ۔

(۹-۱۴) مسلمانوں کی تقویت اور حوصلہ افزائی کے لیے ان غیبی تائیدات کا حوالہ جو بدر کے موقع پر ظاہر ہوئیں۔ مسلمانوں کی دعا کے جواب میں بروقت ہزار فرشتوں کی مدد کا وعدہ۔ برسر موقع میدان جنگ میں اطمینان کی نیند اور بارش کے نزول سے مساعد حالات کا ظہور۔ امدادی فرشتوں کو یہ ہدایت خداوندی کہ مسلمانوں کا حوصلہ بحال رکھو، کفار کو مرعوب کر دو اور ان کے پرخچے اڑا دو۔

(۱۵-۱۸) مذکورہ تائیدات غیبی کی روشنی میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ کفار سے جب مقابلہ ہو تو کبھی پیٹھ نہ دکھاؤ، منظم فوج کشی کی صورت میں پیٹھ دکھانے والے خدا کے غضب اور جہنم کے عذاب کے سزاوار ٹھہریں گے۔ مسلمان جب خدا کی راہ میں لڑتے ہیں تو صرف وہی نہیں لڑتے بلکہ ان کی طرف سے خدا بھی لڑتا ہے اور اہل ایمان کے لیے جوہر دکھانے کے مواقع فراہم کرتا ہے، بدر میں اس حقیقت کا مشاہدہ تم کر چکے ہو۔ اور یہ جو کچھ ہوا ہے اس پر بس نہ سمجھو، آئندہ اللہ ان کفار کی ساری چالیں بے کار کر دے گا۔

(۱۹) قریش کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برسر موقع تنبیہ کہ تم کہتے تھے کہ اس جنگ میں جس کو فتح حاصل ہوگی وہ برسر حق سمجھا جائے گا تو دیکھ لو فتح ظاہر ہو گئی۔ اب بہتر ہے کہ کسی مزید شرارت کی جرأت نہ کرو۔ اگر تم باز نہ آئے، پھر شرارت کی تو یاد رکھو ہم کہیں چلے نہیں گئے ہیں، ہم بھی اپنی شان پھر دکھائیں گے اور یہ اچھی طرح یاد رکھو کہ تمہارے لاؤ لشکر کی کثرت کچھ کام نہ آئے گی، مسلمانوں کے پہلو پر ہم ہیں۔

(۲۰-۲۳) مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ پوری وفاداری کے ساتھ اللہ و رسول کی اطاعت کرو، رسول کی عین موجودگی میں اس سے انحراف نہ اختیار کرو۔ یہ روش ان یہود کی ہے جو کہتے تھے کہ ہم نے مانا لیکن مانتے نہیں تھے۔ اللہ کے نزدیک سب سے بدتر جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو سوچنے سمجھنے سے عاری ہیں۔ اللہ نے ان میں کوئی صلاحیت نہیں پائی۔ اس وجہ سے ان کو قبول حق سے محروم کر دیا۔ توفیق الٰہی انہی لوگوں پر کارگر ہوتی ہے جو اپنے اندر اثر پذیری اور قبول حق کی صلاحیت زندہ رکھتے ہیں۔

(۲۴-۲۶) مسلمانوں کو تنبیہ کہ رسول کی دعوت تمہارے لیے روح و قلب کی زندگی کی دعوت ہے تو اس دعوت کی قدر کرو اور اس پر لبیک کہو۔ اگر تم نے کمزوری دکھائی اور تذبذب کے شکار رہے تو یاد رکھو کہ آدمی اور اس کی قوت ارادی کے درمیان سنت الٰہی حائل ہو جاتی ہے۔ پھر وہ خیر کی توفیق سے محروم ہو جاتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں جو خرابیاں کچھ مخصوص لوگوں کی طرف سے ظاہر ہوتی ہیں اگر دوسرے ان کی اصلاح کی کوشش نہ کریں تو ان کے برے نتائج کی لپیٹ میں اچھے برے سب آ جاتے ہیں۔ اسلام کے مستقبل کی طرف سے کسی تذبذب اور اندیشے میں مبتلا نہ ہو۔ تم اس ملک میں تھوڑے تھے۔ خدا نے تمہیں زیادہ کیا اور اپنی تائید و نصرت سے تمہیں نوازا۔ اسی خدا پر بھروسہ رکھو وہ آگے کے مراحل میں بھی تمہارا کارساز ہے۔

(۲۷-۲۹) کمزور قسم کے مسلمانوں کو تنبیہ کہ اللہ و رسول سے عہد اطاعت و وفاداری کر چکنے کے بعد بے وفائی نہ کرو۔ مال و اولاد کی محبت اللہ و رسول کی محبت کے تقاضوں میں مانع نہ ہو۔ یہ چیزیں فتنہ ہیں۔ ان

فتنوں میں پڑ کر اس اجرِ عظیم کو ضائع نہ کرو جو اللہ کے پاس اس کے وفادار بندوں کے لیے محفوظ ہے۔ جو لوگ محبت دنیا کو اپنے اوپر غالب نہ ہونے دیں گے اللہ ان کے آگے سے باطل کے تمام حجابات چاک کر دے گا اور ان کو اپنی مغفرت سے نوازے گا۔

(۳۰-۳۷) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ان تائیدات ربانی کی یاد دہانی جو قریش کی مسلسل سازشوں کے مقابل میں ظاہر ہوئیں اور جن سے ان کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے، ان کی ساری چالیں شکست کھا گئیں اور خدا کی تدبیر غالب رہی۔ وہ قرآن کو اگلوں کا فسانہ کہتے تھے لیکن اس کا انذار ان کے لیے واقعہ ثابت ہوا۔ وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اگر تم پیغمبر برحق ہو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسیں یا کوئی اور عذاب آئے تو ہم مانیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس وجہ سے ان پر عذاب نہیں بھیجا کہ تم ان کے اندر موجود تھے لیکن اب جب کہ تم ان کے اندر سے نکل چکے ہو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ عذاب سے محفوظ رہیں۔ وہ اپنے آپ کو مسجد حرام کا متولی سمجھتے ہیں لیکن وہ اس کے متولی کہاں سے ہوئے؟ اس کے متولی تو صرف خدا سے ڈرنے والے بندے ہی ہو سکتے ہیں۔ ان مدعیوں کو اللہ کے اس گھر کی اصل تاریخ اور اس کے مقاصد تعمیر کا کوئی علم نہیں، تالی پیٹنا اور سیٹی بجانا ان کی نماز ہے، بھلا اس مسخرا پن کو نماز ابراہیمی سے کیا علاقہ؟ یہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنے اور اسلام کو شکست دینے کے لیے بڑی دلیری سے جو اپنے مال خرچ کر رہے ہیں اس کا کچھ حاصل نہیں۔ یہ سارا خرچ ان کے لیے موجب حسرت واندوہ بنے گا۔ اب ان کے آگے صرف جہنم ہے۔ خدا اس سارے ذخیرۂ خبیث کو اکٹھا کر کے دوزخ کی آگ میں جھونک دے گا۔

(۳۸-۴۰) کفار قریش کو تنبیہ کہ اگر وہ اپنی شرارتوں سے باز آجائیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے اگر انھوں نے اپنے رویے کی اصلاح کر لی تو ان کی پچھلی غلطیاں معاف کر دی جائیں گی اور اگر وہ باز نہ آئے تو یاد رکھیں کہ ان کا بھی وہی حشر ہونا ہے جو ان سے پہلے انبیاء کو جھٹلانے والی قوموں کا ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ کمزور مسلمانوں پر ان کے جبر و ظلم کا خاتمہ ہو جائے اور اس سرزمین پر اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین باقی نہ رہ جائے۔ اگر یہ باز آگئے تو ان کے لیے بہتر ہے، اگر باز نہ آئے تو خدا تمھارا مددگار ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔

(۴۱-۴۴) مال غنیمت کی تقسیم سے متعلق سوال مذکورہ آیت ۱ کا تفصیلی جواب اور مسلمانوں کو یہ تنبیہ کہ اس تقسیم کو خوش دلی سے قبول کریں۔ اللہ و رسول کے فیصلہ پر راضی رہنا ہی سچے ایمان کی علامت اور اس کا تقاضا ہے۔ یہ یاد رکھو کہ بدر کے دن تمھیں جو کامیابی حاصل ہوئی یہ تمھاری اپنی تدبیر اور تمھارے اپنے تدبر کا کرشمہ نہیں تھی بلکہ یہ ساری اسکیم اللہ کی بنائی ہوئی تھی۔ یہ اسی کی کارسازی تھی اور اس نے ٹھیک اس وقت تمھاری فوج کو اس وادی کے ایک سرے پر پہنچا دیا جس کے دوسرے سرے پر دشمن کی فوجیں پہنچی تھیں

اگر تم ایک دوسرے کو الٹی میٹم دے کر نکلتے تو تمہارا یہین وقت پر دشمن کے مقابلہ کے لیے پہنچ جانا ممکن نہ تھا۔ یہ اللہ کی اسکیم تھی جو پوری ہوئی۔ اس نے یہ چاہا کہ تمہارے اور قریش کے درمیان ایک ایسا معرکہ ہو جائے جو حق و باطل کے درمیان ایک امتیاز پیدا کر دے تاکہ اس کے بعد جو کفر پر جمے رہنا چاہیں ان پر حجت قائم ہو جائے اور جو اسلام کو اختیار کریں ان کو ایک روشن دلیل مل جائے۔ یہی رمز تھا کہ خدا نے کفار کی فوج کو پیغمبر کی رویا میں کم دکھایا تاکہ مسلمانوں میں ہراس نہ پیدا ہو اور وہ ان سے ٹکر لینے کے لیے پُرحوصلہ رہیں اور پھر یہی رمز تھا کہ جب تمہاری اور ان کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو تمہاری نگاہوں میں خدا نے ان کو حقیر دکھایا اور ان کی نگاہوں میں تم کو کم دکھایا تاکہ ٹکر لینے سے کوئی بھی نہ جھجکے اور وہ معرکہ واقع ہو ہی جائے جو حق و باطل کے درمیان ایک فرق بن کر نمایاں ہو۔ یاد رکھو کہ سارے معاملات کا سررشتہ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔

(۴۵-۴۶) مسلمانوں کو آئندہ کے لیے نصیحت کہ بدر کی اس جنگ میں تم نے دیکھ لیا کہ اصل کارساز خدا ہے تو جب کفار کے کسی گروہ سے تمہاری ٹکر ہو جائے تو پورے جماؤ اور پوری ثابت قدمی سے لڑو اور اپنے مرجع حقیقی خدا کو زیادہ سے زیادہ یاد کرو۔ یہی فلاح کا راستہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی پوری اطاعت کرو، کسی امر میں اختلاف نہ کرو ورنہ ہزیمت اٹھاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ دوسری چیز جو اطاعت کے ساتھ مطلوب ہے وہ ثابت قدمی اور پامردی ہے۔ خدا انہی کے ساتھ ہوتا ہے جو اس کی راہ میں ثابت قدمی دکھاتے ہیں۔

(۴۷-۴۹) ان کفار کی روش سے بچتے رہنے کی ہدایت جو اکڑتے، اتراتے اور اپنے کروفر کی نمائش کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں اترے تھے اور مقصود جن کا لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنا تھا، ان لوگوں کو پتہ نہیں کہ خدا کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی، سب کا زور و زر اور سب کا کروفر اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ ان لوگوں کو شیطان نے پٹی پڑھاتی تھی کہ آج تمہارا کوئی مدمقابل نہیں اور میں تمہارا ساتھی ہوں لیکن جب اس نے میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھا تو اپنی روایت کے مطابق دُم دبا کر بھاگا کہ میں تو اللہ رب العلمین سے ڈرتا ہوں (یہاں ایک لطیف تعریض یہود کی طرف بھی ہے، تفسیر میں اس کی وضاحت آگے آئے گی) منافقین اور حاسدوں کے اس طعنہ کا جواب جو وہ مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کے لیے دیتے تھے کہ ان کو ان کے دین کے غرّے نے نتائج و عواقب سے بے پروا کر دیا ہے، یہ ہاتھیوں سے گنّے کھانے چلے ہیں۔ ان منافقین کو پتا نہیں تھا کہ خدا کا بھروسہ بڑی چیز ہے، خدا عزیز و حکیم ہے۔

(۵۰-۵۴) قریش کو تہدید کہ یہ بدر میں جو کچھ پیش آیا ہے یہ تو محض نقد عاجل ہے، مرنے کے بعد جو کچھ تمہارے سامنے آنے والا ہے وہ بڑی ہی سخت چیز ہے اور یہ جو کچھ ہوا ہے یا جو کچھ ہوگا یہ تم پر کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ تمہارے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ اپنے

رویے کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنا رویہ نہ بدل لے۔ تم سے پہلے قوم فرعون اور دوسری قوموں کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ نے یہی معاملہ کیا۔ جب انھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی خدا نے ان کو تنبیہ کی۔ پھر جب اس تنبیہ کے بعد بھی وہ سرکشی سے باز نہ آئے تو خدا نے ان کو اپنے عذاب میں دھر لیا اور وہ فنا کر دیے گئے۔ اسی طرح بدر کا واقعہ تمھارے لیے ایک تنبیہ ہے۔ اگر اس سے تم نے سبق نہ لیا تو تمھارے سامنے بھی وہی انجام آجائے گا جو فرعون اور اس کی قوم کے سامنے آیا۔

(۵۵-۶۲) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ جن گروہوں نے تم سے معاہدہ کر رکھا ہے لیکن وہ اس کا احترام نہیں کر رہے ہیں بلکہ جب کوئی موقع ان کو ہاتھ آجاتا ہے معاہدے کو توڑ دیتے ہیں، ان کے ساتھ ذرا رعایت نہ کرو۔ اگر کسی جنگ میں وہ تمھارے مقابل میں آئیں تو ان کو ایسا سبق دو کہ جو ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں ان کے بھی ہوش درست ہو جائیں۔ یہ لوگ تمھارے قابو سے باہر نہیں نکل سکتے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے مقدور بھر اپنی فوجی قوت بڑھائیں تاکہ اللہ کے اور اپنے ان دشمنوں کو مرعوب رکھ سکیں جن میں سے بعض ظاہر ہیں اور بعض ابھی پس پردہ ہیں۔ مسلمان اس مقصد کے لیے جو بھی خرچ کریں گے خدا کے ہاں سب پورا کر دیا جائے گا کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ہاں اگر یہ صلح کے خواہشمند ہوں تو تم بھی صلح سے گریز نہ کرو۔ اللہ پر بھروسا کر کے ان سے صلح کر لو۔ اگر اس مصالحت سے ان کا مقصد تم کو دھوکا دینا ہو تو تمھارے لیے وہ اللہ کافی ہے جس نے اپنی تائید خاص اور مسلمانوں کے ذریعے سے تمھاری مدد فرمائی۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہوا ہے کہ اس نے اہل ایمان کے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا ہے ورنہ یہ کام تو دنیا جہان کی دولت بھی تم لٹا دیتے جب بھی ہونا ممکن نہیں تھا۔

(۶۳-۶۵) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دہانی کہ تم اپنے ساتھیوں کی افرادی قوت کی کمی سے کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہو، تمھارے لیے اللہ اور مومنین کی یہی مختصر سی جماعت کافی ہے۔ تم انہی مسلمانوں کو جہاد پر ابھارو۔ تمھارے بیس ثابت قدم جانباز کفار کے دو سو آدمیوں پر بھاری رہیں گے اور تمھارے سو مجاہد حریف کے ایک ہزار کے لشکر کو شکست دیں گے۔ جنگ، عزم و ایمان سے لڑی جاتی ہے۔ ان ناسمجھ کفار کے اندر یہ جوہر کہاں!

(۶۶) ایک آیت تخفیف جو بعد میں اس زمانہ میں نازل ہوئی جب لوگ اسلام کے اندر فوج در فوج داخل ہونے لگے۔ چونکہ ان مسلمانوں کے اندر وہ پختہ کاری نہیں تھی جو سابقون الاولون کے اندر تھی۔ اس وجہ سے وہ عددی نسبت گھٹا دی گئی جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی۔ اب نسبت صرف ایک اور دو کی رہ گئی۔ وضاحت آیت کی تفسیر کے تحت آئے گی۔

(۶۷-۶۹) کفار کے اس طعنہ کا جواب جو بدر میں شکست کھانے کے بعد انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کہ بھلا یہ پیغمبر کس طرح ہو سکتے ہیں، پیغمبر کا کہیں یہ کام ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہی قوم سے جنگ کرے، اس کا

خون بہائے، اس کے اندر سے قیدی پکڑے، ان سے فدیہ وصول کرے، اور قوم کے مال کو مال غنیمت قرار دے کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کرے اور کھائے کھلائے؟ اس طعنہ سے ان کا مقصود بدر میں مسلمانوں کی فتح کے ان اثرات کو مٹانا تھا جو قدرتی طور پر عام لوگوں کے دلوں پر پڑتے نظر آئے۔ چونکہ قریش کے لیڈروں نے خود اس جنگ کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بنا دیا تھا، اس وجہ سے انھیں بدر میں منہ کی کھانے کے بعد اپنے پروپیگنڈے کا رخ بدل دینا پڑا۔ اب انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ نعوذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اقتدار اور حکومت کے خواہاں ہیں۔ اور اس مقصد کی خاطر انھوں نے اپنی ہی قوم کو آپس میں ٹکرا دیا ہے جو ایک پیغمبر کا کام کبھی نہیں ہوتا۔ قرآن نے ان کو یہ جواب دیا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے پیغمبر کی وجہ سے نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے باعث تم خود ہوئے ہو۔ دنیا کے طالب تم ہو، اللہ و رسول دنیا کے طالب نہیں ہیں۔ تم نے اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کی سازش کر کے جو اقدام کیا تھا وہ ایسا سنگین مجرمانہ اقدام تھا کہ حق تھا کہ تم پر خدا کی طرف سے عذاب عظیم آ جاتا جو تمہارا فیصلہ ہی کر دیتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے لیے جو مہلت لکھ رکھی ہے وہ تم کو ملی اور تم عذاب سے تباہ کر دیے جانے کے بجائے صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیے گئے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو خطاب کر کے ان کو اطمینان دلایا کہ یہ تمہارے مال غنیمت پر جو اعتراض کر رہے ہیں تم اس کی کوئی پروا نہ کرو۔ اس کو کھاؤ برتو، یہ تمہارے لیے حلال طیب ہے۔

(۷۰) اسی سلسلہ میں بدر کے قیدیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے یہ کہلوایا کہ اگر اللہ نے ان کے دلوں میں کوئی بھلائی پائی، انھوں نے اس احسان کی قدر کی کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تو ان کے لیے مزید بھلائی کی راہیں کھلیں گی۔ اور اگر انھوں نے بے وفائی اور بدعہدی کی اور پھر خدا سے لڑنے کے لیے نکلے تو یاد رکھیں کہ خدا ان پر پھر تم کو اسی طرح قابو دے دے گا جس طرح اس نے بدر میں ان کو تمہارے قابو میں دے دیا۔

(۷۱-۷۵) مہاجرین اور انصار کے درمیان اخوت کی تاسیس۔ اس اخوت میں وہ تمام مسلمان شریک ہیں جو کفر کے علاقوں سے ہجرت کر کے اس میں آ شامل ہوں۔ جو مسلمان ہجرت نہ کریں، دارالاسلام کے مسلمانوں پر ان کی نصرت و حمایت کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اگر اپنے دین و ایمان کے تحفظ کے لیے وہ کسی مدد کے طالب ہوں تو ان کی مدد کی جائے بشرطیکہ یہ مدد مسلمانوں کے کسی معاہد گروہ کے خلاف یا اس کے مقابل میں نہ ہو۔ اب حقوق و فرائض اور حمایت و نصرت کی ذمہ داری ایمان و ہجرت کی بنیاد پر ہوگی۔ پچھلے خاندانی اور قبائلی تعلقات کی بنیاد پر نہیں ہوگی۔ البتہ مسلمانوں کے آپس کے حقوق کی بنیاد انہی رحمی رشتوں کے تحت ہوگی جو اللہ کی کتاب میں بیان ہوئے ہیں۔

سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ (۸)

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۷۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا آیات ۱-۸
اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ
وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰي
رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۚ (۲) الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
يُنْفِقُوْنَ (۳) اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۴) كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ
بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (۵) يُجَادِلُوْنَكَ
فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ
يَنْظُرُوْنَ (۶) وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّاۗىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ
وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ
يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (۷) لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ

يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ⑧

ترجمۂ آیات ۱-۸ وہ تم سے غنیمتوں کے بابت سوال کرتے ہیں، ان کو بتا دو کہ غنیمتیں اللہ اور رسول کے لیے ہیں، پس اللہ سے ڈرتے رہو، اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم سچے مومن ہو۔ مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں ان کو سنائی جائیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کریں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھیں۔ جو نماز کا اہتمام کریں اور اس مال میں سے، جو ہم نے ان کو بخشا ہے، خرچ کریں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس درجے اور مغفرت اور باعزت روزی ہے۔ ۱-۴

اسی طرح کی بات اس وقت ظاہر ہوئی جب تمہارے رب نے ایک مقصد کے ساتھ تم کو گھر سے نکلنے کا حکم دیا اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو یہ بات ناگوار تھی۔ وہ تم سے امر حق میں جھگڑتے رہے باوجودیکہ حق ان پر اچھی طرح واضح تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اور وہ اس کو دیکھ رہے ہیں۔ یاد کرو جب کہ اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمہارا لقمہ بنے گا اور تم یہ چاہ رہے تھے کہ غیر مسلح گروہ تمہارا لقمہ بنے اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے کلمات سے حق کا بول بالا کرے اور کافروں کی جڑ کاٹے تاکہ مجرموں کے علی الرغم وہ حق کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دے اور باطل کو نابود کرے۔ ۵-۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۔

لفظ انفال کی تحقیق

انفال، نفل کی جمع ہے، اس کے معنی اضافہ اور زیادتی کے ہیں۔ جو چیز کسی کو اس کے حق سے زیادہ دی جائے تو جتنی حق سے زیادہ دی گئی وہ نفل ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے حق واجب سے زیادہ ادا کیا تو اس حصہ مزید کو نفل کہیں گے۔ یہاں انفال سے اس مال غنیمت کو تعبیر کیا گیا ہے جو راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کو مفتوح دشمن سے میدان جنگ میں حاصل ہوتا ہے۔ اس تعبیر میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے دشمن سے جو مال غنیمت حاصل کرتے ہیں اس کی حیثیت ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نفل مزید اور انعام مزید کی ہے اس لیے کہ جہاد کا جو اجر ہے وہ اس سے بالکل الگ مستقلاً اللہ کے ہاں دائمی اور بے پایاں اجر کی شکل میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

غنیمت سے متعلق سوال کی نوعیت

سوال، جیسا کہ ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، بعض اوقات اعتراض کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے، خواہ وہ الفاظ سے ظاہر ہو یا اس کے اندر مضمر ہو۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اسی نوعیت کے سوال کا حوالہ ہے۔ یہ سوال، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، غزوۂ بدر میں حاصل شدہ مال غنیمت سے متعلق ہے۔ اس سے پہلے مسلمانوں کو کفار سے نہ تو کوئی منظم جنگ پیش آئی تھی نہ مال غنیمت اور اس کی تقسیم کا سوال پیدا ہوا تھا۔ ۲ھ میں یہ جنگ پیش آئی جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح بھی شاندار عطا فرمائی اور مال غنیمت بھی ان کو کافی مقدار میں حاصل ہوا۔ جاہلیت میں تو دستور یہ تھا کہ جو جتنا مال جنگ میں لوٹے وہ اس کا حقدار ہے۔ اسی دستور کی بنا پر بعض لوگوں نے، خاص طور پر کمزور قسم کے مسلمانوں نے ایسے سوالات اٹھائے جن سے یہ بات نمایاں ہوئی کہ تقویٰ، باہمی خیر خواہی، اطاعت اللہ و رسول کی وہ روح جو سچے ایمان کا تقاضا ہے ابھی ایک گروہ کے اندر اچھی طرح پختہ نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ سوال، جیسا کہ قرآن سے واضح ہے، کچھ خاص افراد ہی کی طرف سے اٹھایا گیا لیکن اسلامی معاشرہ کے اندر اس سے ایک بڑی خامی کی نشان دہی ہوئی تھی اس وجہ سے قرآن نے مسلمانوں کی تطہیر و تنظیم کی اس سورہ کا آغاز اسی واقعہ سے کیا کہ

سر چشمہ شاید گرفتن بہ بیل		چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل

اور اس کا ذکر بھی عام صیغہ سے کیا تاکہ کسی خاص گروہ کی پردہ دری نہ ہو بلکہ تمام مسلمان بحیثیت مجموعی اس تعلیم کو قبول کریں اور اپنے اندر کسی ایسے رجحان کو نشو و نما نہ پانے دیں جو تقویٰ و توکل، باہمی ہمدردی اور اطاعت اللہ و رسول کے خلاف ہو۔

جس قسم کے سوال کی طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل تاریخ و سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ ابن ہشام میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے فارغ ہونے کے بعد حکم دیا کہ فوج

کے لوگوں نے جتنا مالِ غنیمت جمع کیا ہے سب اکٹھا کیا جائے چنانچہ وہ سب اکٹھا کیا گیا۔ اب لوگوں میں اختلاف ہوا کہ یہ کس کا حق ہے؛ جن لوگوں نے جمع کیا تھا وہ مدعی ہوئے کہ یہ ہمارا حق ہے، اگر ہم نہ ہوتے تو یہ مال حاصل نہ ہوتا، ہم نے دشمن کو مار بھگایا اس وجہ سے یہ ہاتھ لگا۔ اسی طرح جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر تھے انھوں نے کہا کہ ہم بھی سب کچھ کر سکتے تھے، لڑ بھی سکتے تھے، غنیمت بھی جمع کر سکتے تھے لیکن ہم نے رسول اللہ کی حفاظت کے کام کو دوسرے تمام کاموں پر مقدم رکھا اس وجہ سے مالِ غنیمت میں دوسرے لوگ ہم سے زیادہ حق دار نہیں ہو سکتے۔ غرض مختلف سوالات اٹھ کھڑے ہوئے جن سے لوگوں کے اندر دبی ہوئی بعض کمزوریاں سامنے آ گئیں اور حکمتِ الٰہی مقتضی ہوئی کہ ان کمزوریوں کا بر سر موقع علاج ہو جائے تاکہ یہ مزید بڑھنے نہ پائیں۔

سوالات کا اصولی جواب قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔ یہ ان تمام سوالات کا جامع اور اصولی جواب ہے کہ ان کو بتا دو کہ اموال غنیمت اللہ اور رسول کی ملک ہیں۔ 'اللہ و رسول کی ملک'، قرآن میں اجتماعی ملکیت کی تعبیر ہے۔ اس اصولی جواب نے اموال غنیمت کے باب میں اس جاہلی دستور کا خاتمہ کر دیا جو اب تک رائج تھا اور جس کی بنا پر ہی وہ سوالات پیدا ہوئے تھے جو اوپر مذکور ہوئے۔ گویا اموال غنیمت میں استحقاق کی بنیاد یہ نہیں ہوگی کہ کس نے جمع کیا، کس نے بالفعل جنگ کی، کس نے پہرہ دیا بلکہ اس میں سب مجاہدین، بلا لحاظ اس کے کہ کس کی خدمت کی نوعیت کیا رہی ہے، شریک ہوں گے اور دوسرے مسلمانوں کا بھی اس میں حصہ ہوگا۔ یہاں یہی اصولی جواب دے کر کلام کا رخ ان خامیوں کی اصلاح کی طرف مڑ گیا ہے جو اس واقعہ سے نمایاں ہوئی تھیں۔ پھر آگے چل کر آیت ۴۱ میں اس اجمال کی تفصیل بھی فرما دی کہ اس کا کتنا حصہ مجاہدین پر تقسیم ہوگا اور کتنا حصہ دوسرے مسلمانوں کے حق کی حیثیت سے بیت المال میں جمع ہوگا۔

مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی کی بنیاد فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ۔ جس طرح تقویٰ اور پاسِ رحم کو سورۂ نساء میں تمام خاندانی و معاشرتی صلاح و فلاح کی اساس ٹھہرایا ہے۔ اسی طرح یہاں تقویٰ اور اصلاح ذات البین کو مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اموال غنیمت اصلاً اللہ اور رسول کی ملکیت ہیں تو اللہ و رسول جس طرح ان کو تقسیم کریں پوری خوش دلی اور رضا مندی سے اس تقسیم کو قبول کرو۔ نہ اللہ کے حکم سے متعلق دل میں کوئی بدگمانی یا رنجش پیدا ہو اور نہ اپنے دینی بھائیوں کے خلاف کوئی رشک و حسد کا جذبہ ابھرے کہ فلاں اور فلاں کو اس مال میں کیوں شریک بنا دیا گیا؛ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کے باہمی تعلقات کی بنیاد اخوت، رحم اور محبت پر ہے۔ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا گروہ ہے، ان کے اندر حسد، رقابت، خود غرضی اور نفسانفسی کی حالت اس ایمان اور تقویٰ کے منافی ہے جس کو انھوں نے اختیار کیا ہے۔ جن کے اندر ابھی کوئی کانٹا اپنے دینی بھائیوں کے خلاف موجود ہے وہ اس کو نکال ڈالیں اور اپنے دامنِ دل کو ہر قسم کے غبار سے پاک و صاف کر لیں۔

فَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ یہ ایمان باللہ کا اصل تقاضا بیان ہوا کہ جو لوگ اللہ و رسول پر ایمان کے مدعی ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ اللہ و رسول کے ہر حکم کی اطاعت کریں۔ یہ بات ایمان کے منافی ہے کہ اللہ و رسول کا کوئی حکم اپنی خواہشات نفس کے خلاف ہو تو اس کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرے یا اس سے متعلق دل میں کوئی رنجش یا بدگمانی جگہ پا جائے۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں وہ ایمان کی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جنھوں نے ایمان کی یہ حقیقت نہیں سمجھی ہے ان کا دعوائے ایمان بالکل بے حقیقت ہے۔ — ایمان باللہ کا لازمی تقاضا

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ (۲-۴)

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ .... اب یہ حقیقی ایمان اور سچے اہل ایمان کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں۔ گویا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کے الفاظ میں جن کمزور قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ تھا ان کے سامنے سچے اہل ایمان کی تصویر رکھ دی گئی کہ اگر ایمان کا دعویٰ ہے تو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرو۔ ان صفات کے بدون یہ دعویٰ کسی کو زیب نہیں دیتا۔ — سچے اہل ایمان کے اوصاف

اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ۔ ان کی پہلی علامت یہ بتائی کہ ان کے اندر خدا کی عظمت و کبریائی اور اس کی جلالت کا شعور ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ خدا سے برابر ڈرتے رہتے ہیں، جب ان کے سامنے خدا کا نام آجائے، جب ان کو اس کی یاد دہانی کی جائے، جب ان کے سامنے کوئی بات خدا کی بات کی حیثیت سے پیش کی جائے، وہ اس کو خوف و خشیت کے گہرے احساس کے ساتھ سنتے ہیں۔ گویا ایمان کا پہلا تقاضا خدا کا خوف ہے جو اس کی عظمت و جلالت اور اس کی صفات عدل و حکمت و ربوبیت و رحمت کے صحیح تصور سے پیدا ہوتا ہے اور اسی سے وہ تقویٰ وجود میں آتا ہے جس کی اوپر وَاتَّقُوا اللّٰهَ کے الفاظ سے ہدایت فرمائی گئی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خدا کی رحمت و ربوبیت بھی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، خدا کے عدل اور اس کے روز جزا کو مستلزم ہیں، اس وجہ سے ان صفات کا صحیح تصور بھی بندے کو خدا سے بے خوف نہیں بناتا بلکہ اس کے خوف کو بڑھاتا ہے اور اس خوف کی بنیاد خدا کی محبت پر ہوتی ہے۔ — ایمان کی پہلی علامت

دوسری علامت یہ بتائی کہ جب اللہ کی آیات ان کو سنائی جاتی ہیں یہ ان کے ایمان کو بڑھاتی ہیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں آیات سے مراد خدا کے احکام اور اس کے قوانین ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا پر ایمان کے بعد ان کو سب سے زیادہ مرغوب و مطلوب خدا کی پسند و ناپسند اور اس کی مرضیات و احکام کا علم ہوتا ہے اور یہ علم ان کی دولت ایمان میں اضافہ کرتا ہے۔ ایمان کی مثال جڑ کی ہے اور آداب و احکام — ایمان کی دوسری علامت

اور قوانین و شرائع کی حیثیت اس جڑ سے پھوٹی ہوئی شاخوں اور ان سے ظہور میں آئے ہوئے برگ و بار کی۔ گویا پوری شریعت، ایمان ہی کا مظہر اور اسی کے مضمرات کی تفصیل ہوئی۔

'زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن کے اندر ایمان موجود ہوتا ہے جب ان کے سامنے ایمان کے مقتضیات و مطالبات آتے ہیں تو وہ پوری بشاشت سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ ان مقتضیات و مطالبات کو اپنے ہی لگائے ہوئے درخت کا پھل اور اپنی ہی بوئی ہوئی کھیتی کا حاصل سمجھتے ہیں اور جس طرح ہر کسان اپنی کھیتی کے حاصل اور اپنے درخت کے پھلوں میں افزونی دیکھ کر باغ باغ ہوتا ہے اسی طرح یہ اہلِ ایمان بھی اپنے ایمان کی یہ افزائش دیکھ کر شادمان ہوتے ہیں۔ یہ گویا ان مدعیانِ ایمان پر ایک لطیف تعریض ہوئی جو ایمان کا دعوےٰ کرنے کو تو کر بیٹھے لیکن جب اس کے مطالبے سامنے آئے تو ان سے خوش ہونے کی بجائے ان کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے کہ یہ کیا بلا نازل ہو گئی۔

ایک نکتہ

یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ ایمان کے اقرار کے بعد اس کے مطالبات میں سے بڑا یا چھوٹا جو مطالبہ بھی اہلِ ایمان کے سامنے آتا ہے وہ ان کے لیے آزمائش و امتحان کا ایک میدان کھولتا ہے اور جو سچے اہلِ ایمان ہوتے ہیں وہ اس امتحان سے گھبرانے کی بجائے اس میں بازی جیتنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کوشش ان کی مومنانہ غیرت کا ایک فطری تقاضا ہوتی ہے۔ جس کے بروئے کار آنے سے ان کے لیے ہر امتحان فتح مندی کا ایک نیا دروازہ کھولتا ہے جس سے ان کا ایمان قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ احزاب میں یوں اشارہ فرمایا گیا ہے وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۲۲-احزاب (اور جب مومنوں نے پارٹیوں کے ہجوم کو دیکھا تو بولے، یہ تو وہی صورتِ حال سامنے آئی ہے جس سے اللہ اور رسول نے پہلے ہی ہمیں خبردار کر دیا تھا، اور اس چیز نے ان کے ایمان و اطاعت میں اضافہ ہی کیا)

ایمان کی تیسری علامت

'وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ' یہ ان کی تیسری علامت بیان ہوئی ہے کہ وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں ایمان کے مطالبے، خواہ سخت ہوں یا نرم، ان سے دنیوی مفادات کو نقصان پہنچے یا نفع، ان کی خاطر تعلقات ٹوٹیں یا جڑیں وہ بہر حال دین و دنیا کی فلاح اپنے رب کے احکام کی تعمیل ہی میں سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایمان کی راہ میں انھیں اپنے سر بھی کٹوانے پڑ جاتے ہیں تو وہ یہی یقین رکھتے ہیں کہ حیاتِ جاوداں کے حصول کی راہ یہی ہے۔ ان کو اپنے رب پر پورا بھروسہ ہوتا ہے کہ اس نے جو حکم بھی ان کو دیا ہے اور جس آزمائش میں بھی ان کو ڈالا ہے اس میں سر تا سر انہی کی فلاح ہے۔ اپنے بندوں کے ساتھ خدا کا کوئی معاملہ بھی حکمت و مصلحت اور رحمت و برکت سے خالی نہیں۔ اس مکڑے میں بھی ان

خام کاروں پر تعریض ہے جو دین کے مطالبات کو اپنے مفادات کی میزان میں تولنے کے خواہش مند تھے اور وہ باتیں ان کو بالکل بے مصلحت نظر آتی تھیں جن کو وہ اپنی خواہشات کے خلاف پاتے تھے۔

ایمان کی چوتھی علامت، اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ یہ چوتھی علامت بیان ہوئی اور اس کی حیثیت، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، رأس الصفات کی ہے اس لیے کہ انہی دو چیزوں۔ اہتمام نماز اور انفاق۔ سے ان تمام اوصاف کی شیرازہ بندی ہوتی ہے جن سے ایمان اہل ایمان کو سنوارتا ہے۔ گویا اوپر ان چند خاص اوصاف کو بیان کرنے کے بعد جن کا بیان کرنا پیش نظر گروہ کی خامیوں کی اصلاح کے لیے ضروری ہوا، آخر میں ان دو چیزوں کا ذکر فرمایا جو سب کی جامع بھی ہیں اور سب کی محافظ بھی۔

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ یعنی جن کے اندر یہ اوصاف ہیں سچے مومن وہی ہیں، رہے وہ لوگ جو اہل ایمان کی صفوں میں آ تو گھسے ہیں لیکن ان اوصاف سے عاری ہیں، وہ محض مدعی ایمان ہیں سچے مومن نہیں ہیں۔ گویا اوپر اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ کے الفاظ میں جو بات اشارۃً فرمائی گئی تھی اب وہ پوری طرح واضح ہو کر سامنے آگئی۔

لَھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَمَغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے ہاں جو درجے اور مرتبے ہیں وہ ہر مدعی ایمان کے لیے نہیں ہیں بلکہ انہی لوگوں کے لیے ہیں جو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس سیاق میں 'مغفرۃ' کا لفظ بڑا بلیغ اور بشارت انگیز ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہر چند مطلوب و مطبوع تو یہی اوصاف ہیں اور مراتب انہی کے اعتبار سے قائم ہوں گے لیکن اللہ رحیم و کریم ہے، وہ اپنے بندوں کی کمزوریوں سے بھی واقف ہے اس وجہ سے ان غلطیوں اور کوتاہیوں کے لیے اس کی مغفرت کا دامن بھی ہے جو انسان کی بشریت کے لوازم میں سے ہیں۔

'رزق' کا لفظ، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں ایک جامع لفظ ہے اور کریم کی صفت اس کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اگرچہ بندوں کو سارا رزق و فضل رب کی عنایت ہی سے ملے گا لیکن اس کے ساتھ بندوں کے لیے عزت کی یہ سرفرازی بھی ہوگی کہ یہ سب کچھ ان کے حق کی حیثیت سے ان کو عطا ہوگا۔

ایمان کے گھٹنے اور بڑھنے کی نوعیت

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ایمان کوئی ٹھونٹھ درخت نہیں ہے بلکہ یہ جڑ بھی رکھتا ہے اور شاخیں اور برگ و بار بھی۔ قرآن میں اس کی تمثیل یوں بیان ہوئی ہے کہ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ اس کی مثال ایک ایسے درخت کی ہے جس کی جڑیں پاتال میں اتری ہوئی ہوں اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں۔ یہ جس طرح عقائد پر مبنی ہے اسی طرح احکام و شرائع پر بھی مشتمل ہے اور جس طرح ایک شاداب درخت اپنی جڑوں سے بھی غذا حاصل کرتا ہے اور اپنی شاخوں اور پتوں سے بھی، اسی طرح یہ عقائد کی معرفت اور اعمال کی بجا آوری دونوں سے غذا اور قوت

حاصل کرتا ہے۔ اگر عقائد میں کھوکھلا پن پیدا ہو جائے جب بھی یہ سوکھ جاتا ہے اور اگر اس کی شاخوں کو کوئی روگ لگ جائے جب بھی یہ مضمحل ہو جاتا ہے۔ اس کے صحیح نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جڑ اور اس کی شاخوں دونوں کی دیکھ بھال ہوتی رہے۔ اس دیکھ بھال سے یہ بڑھتا، پھیلتا اور پھلتا پھولتا ہے اور اس کے مفقود ہو جانے سے وہ گھٹتا، سکڑتا اور مردہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن و حدیث دونوں سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ ہمارے فقہاء اور متکلمین میں سے جن لوگوں نے ایمان کے گھٹنے بڑھنے سے انکار کیا ہے ان کی بات کا کوئی صحیح محمل اگر ہو سکتا ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو قانونی ایمان سے متعلق مانا جائے۔ قانون چونکہ صرف ظاہری حالات سے تعلق رکھتا ہے، باطن اس کی دسترس سے باہر ہے اس وجہ سے اس کی نظر میں ایک مخلص اور ایک منافق کے ایمان میں کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حقیقت کی نگاہ میں بھی دونوں کا ایمان یکساں ہے۔ یہاں اس اجمالی اشارے پر قناعت کیجیے۔ اس پر تفصیلی بحث اپنے محل میں آئے گی۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ
يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۭ وَ
اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّاۗىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ
لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۙ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۚ (۵-۸)

کَمَا کے مواقعِ استعمال

'کَمَا' عربی زبان میں 'کَذٰلِکَ'، 'کَمَا اَنَّکَ' اور 'کَمَا' بسا اوقات واقعہ واقعہ کی مماثلت ظاہر کرنے کے لیے بھی آتے ہیں۔ ایسی صورت میں متعین الفاظ کے اندر ان کا مشبہ اور مشبہ بہ نہیں ہوتا بلکہ بحیثیت مجموعی واقعہ کے اندر ہوتا ہے۔ 'کَذٰلِکَ' بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں اسی نوعیت سے آیا ہے۔ امرأ القیس نے اپنے مشہور قصیدہ میں پہلے اپنی ایک سرگزشت عشق بیان کی اس کے بعد 'کَدَابِکَ من ام الحویرث قبلھا' کہہ کر اپنی اسی طرح کی دوسری سرگزشتوں کا ذکر شروع کر دیا کہ اسی طرح کا ماجرا اس کو فلاں اور فلاں کے ساتھ بھی پیش آ چکا ہے۔ بقرہ آیت ۱۵۰ سے اوپر تحویل قبلہ کا ذکر ہوا پھر بدون کسی تقریب و تمہید کے ارشاد ہوا 'کَمَا اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ' یہ بھی اسی طرح کا اسلوب بیان ہے یعنی تمہارے قبلہ کو اہل کتاب کے قبلہ سے الگ کر کے خدا نے تم کو ایک علیحدہ امت کی حیثیت سے ممتاز کر دیا۔ اسی طرح کا 'کَمَا' یہ زیر بحث آیت میں بھی ہے۔ اوپر جیسا کہ مذکور ہوا، ان کمزور قسم کے مسلمانوں کے رویہ پر گرفت فرمائی ہے جو بدر میں حاصل شدہ مال غنیمت کی تقسیم پر معترض ہوئے تھے۔ جب ان کی یہ کمزوری زیر بحث آ گئی تو تعلیم و تربیت کا تقاضا یہ ہوا کہ ان لوگوں کی ایک اور کمزوری کی طرف بھی توجہ دلا دی جائے جو اس سے پہلے ان سے اس وقت ظاہر ہوئی جب آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے بدر کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا ہے۔ گویا اس وقت تو ان کی غلطی نظر انداز فرما دی گئی کہ حکمت کا تقاضا یہی تھا لیکن جب اسی طرح کی غلطی ان سے پھر صادر ہوئی تو اس پر گرفت فرمائی گئی اور ساتھ ہی سابق غلطی کی طرف بھی اشارہ فرما دیا گیا کہ لوگ متنبہ ہو جائیں کہ یہ بیماری کہاں سے چلی ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ ہوئی تو کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔

بدر کے لیے مسلمانوں کا نکلنا ایمائے الٰہی سے ہوا

'اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ'۔ 'اَخْرَجَكَ رَبُّكَ' کے الفاظ اس امر پر نہایت واضح دلیل ہیں کہ بدر کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکلنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا تھا۔ آگے آیت ۴۳-۴۴ میں یہ اشارہ موجود ہے کہ آپ کو رویا میں شام کی طرف سے قافلۂ قریش کی واپسی اور مکہ کی طرف سے فوج قریش کی آمد کا مشاہدہ کرا دیا گیا تھا اور حملہ آور فوج کی حقیقت بھی واضح کر دی گئی تھی کہ معنوی اعتبار سے وہ کچھ زیادہ وزنی نہیں ہوگی بلکہ مسلمانوں سے مغلوب ہو جائے گی۔ بلکہ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسی رویا میں حضورؐ کو قریش کے خاص خاص لیڈروں کے قتل ہونے کی جگہیں بھی دکھا دی گئیں۔ اسی رویا کی ہدایت کے بموجب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اس وجہ سے اس کو 'اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ' کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آگے آیت ۴۲ سے یہ بات بھی واضح ہوگی کہ اسی خدائی رہنمائی کی برکت تھی کہ مسلمان بالکل ٹھیک اس وقت قریش کی فوج کے مقابلہ کے لیے بدر کے مقام پر پہنچ گئے جب کہ وادی کے ایک سرے پر ان کی فوج تھی اور نیچے سے قافلہ گزر رہا تھا۔

بدر کے لیے نکلنے کا اصل مقصد

'بِالْحَقِّ' یعنی اللہ تعالیٰ نے نکلنے کا یہ حکم ایک مقصد حق کے لیے دیا تھا۔ اس مقصد حق کی وضاحت آگے یوں فرمادی ہے 'يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ' (اللہ تعالیٰ اپنے حکموں سے یہ چاہتا ہے کہ حق کا بول بالا کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے) 'لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ' (تاکہ حق کا بول بالا کرے اور باطل کو نابود کرے مجرموں کے علی الرغم) اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکلنا ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ایک مقصد حق کے لیے تھا اور وہ مقصد حق یہ تھا کہ دین کا بول بالا ہو اور کفر کی جڑ کٹے۔ ظاہر ہے کہ کفر کی جڑ کٹ سکتی تھی تو قریش کی ہزیمت سے کٹ سکتی تھی نہ کہ ان کے کسی تجارتی قافلہ کو لوٹ لینے سے اس وجہ سے سیرت و مغازی کی کتابوں کی وہ روایت قرآن کے الفاظ کے صریحاً خلاف ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے اس تجارتی قافلے پر حملہ کرنا چاہتے تھے جو ابو سفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آرہا تھا۔

مسلمانوں کے اندر کے ایک کمزور گروہ کی طرف اشارہ

'وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ'۔ 'فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ' سے کمزور قسم کے مسلمانوں کی وہ ٹولی مراد ہے جس کا کردار ابتدائے سورہ ہی سے زیر بحث ہے اور جس نے مال غنیمت سے متعلق بعد میں وہ سوالات بھی اٹھائے جن پر اوپر کی آیات میں تبصرہ ہوا ہے۔ 'فَرِيْقًا' کے لفظ سے یہ بات بھی نکلتی ہے

کہ ان لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی، بس ایک مختصر سی جماعت تھی۔ ان لوگوں نے جب یہ سنا ہو گا کہ کفار کی دو جماعتیں آرہی ہیں جن میں سے ایک سے مقابلہ درپیش ہے تو یہ بات تو وہ فوراً تاڑ گئے ہوں گے کہ یہ مقابلہ بہر حال فوج سے ہونا ہے نہ کہ تجارتی قافلہ سے اس وجہ سے ان لوگوں پر وحشت طاری ہوتی اور یہ وحشت ان کے اس ضعف اعتماد علی اللہ کا نتیجہ تھی جس کی طرف اوپر آیت ۲ میں اشارہ ہوا ہے

کمزوروں کی کمزوری پر گرفت

يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنظُرُونَ لفظ مُجَادلہ کے معنی بیاں، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں اس کی تحقیق بیان کر چکے ہیں، باصرار و بلطائف الحیل مخاطب سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ اب یہ وضاحت ہو رہی ہے اس بات کی کہ جب ان کو خطرہ لاحق ہوگا کہ مقابلہ فوج سے درپیش ہے تو اس سے فرار کی انھوں نے کیا راہ نکالنی چاہی۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باصرار اور بلطائف الحیل اپنی چرب زبانی سے اس رخ پر لانا چاہا کہ آپ تجارتی قافلے کا قصد کریں۔ بظاہر تو انھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہوگی کہ یہ مشورہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی میں دے رہے ہیں کہ قافلہ کو لوٹ لینے سے قریش کی کمر اقتصادی اعتبار سے ٹوٹ جائے گی اس لیے کہ ان کے سرمایہ کا بڑا حصہ اس قافلے کے ساتھ ہے جس سے مسلمانوں کی موجودہ کمزور مالی حالت کو درست کرنے میں بڑی مدد ملے گی لیکن اس مشورہ کی تہ میں ان کا وہی خوف بیٹھا ہوا تھا جس کو قرآن نے بے نقاب کر دیا ہے کہ گویا وہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہوں اور وہ موت کو سامنے دیکھ رہے ہوں۔ اس مشورے کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ تھا کہ ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا، جیسا کہ قرآن کے الفاظ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ سے ثابت ہے، اچھی طرح واضح تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی بات منوانے کے لیے تمام حربے استعمال کیے۔ ہر چند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرحلے تک، جیسا کہ آگے والی آیت میں اشارہ آرہا ہے، بعض خاص اسباب سے، جن کی تفصیل آگے آئے گی، اپنا منشا واضح الفاظ میں ظاہر نہیں فرمایا تھا لیکن یہ لوگ اتنے غبی نہیں تھے کہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ جب ایک طرف تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف سے فوج آرہی ہے تو آنحضرتؐ کا یہ نکلنا کس سے نمٹنے کے لیے ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ دل کے بودے ضرور تھے لیکن عقل کے اتنے غریب نہیں تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج، اسلام کے مقصد، احقاق حق کے تقاضوں سے اتنے نابلد ہوں کہ یہ موٹی سی بات بھی نہ سمجھ سکیں کہ کسی تجارتی قافلہ کو تاخت و تاراج کرنا ایسا کیا کام ہو سکتا ہے جس کے لیے خدا کا رسول اپنے جاں نثاروں کے ساتھ یوں سر بکف ہو کر نکلے! چنانچہ آگے تفصیل آئے گی کہ نہ مہاجرین کے لیڈروں کو آنحضرتؐ کا منشا سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آیا نہ انصار کے جاں نثاروں کو۔ سب نے پہلے ہی مرحلے میں تاڑ لیا کہ حضورؐ کا منشا کیا ہے اور اس منشا کی تکمیل کے لیے وہ سر بکف ہو گئے۔ صرف ایک گروہ موت کے ڈر سے آخر وقت تک سخن سازی کرتا رہا اس وجہ سے اس کا رویہ قرآن میں زیر بحث آیا تاکہ آئندہ کے

مراحل میں مسلمان ان داخلی فتنوں سے ہوشیار رہیں۔

وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ۔

جماعت کے وصلا کا اندازہ کرنے کے لیے ایک حکیمانہ طریقہ

وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ کے اسلوب بیان میں جو ابہام ہے وہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکلتے وقت انصار و مہاجرین سے جب اس مہم کے باب میں استمزاج فرمایا تو بات کھل کر یوں نہیں فرمائی کہ تجارتی قافلہ کی حفاظت کا بہانہ بنا کر قریش نے ہم پر حملہ کرنے کے لیے اپنی فوج بھیج دی ہے بلکہ مبہم انداز میں یوں فرمایا کہ کفار کی دو جماعتیں آ رہی ہیں جن میں سے ایک کو اللہ تعالیٰ ہمارے قابو میں کر دے گا۔ یہ مبہم انداز بیان حضورؐ نے کیوں ارشاد فرمایا؟ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اہم مہم پر روانہ ہونے سے پہلے حضورؐ نے چاہا کہ ہر گروہ کا جائزہ لے لیا جائے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ اگر مسئلہ کو بالکل دو ٹوک انداز میں لوگوں کے سامنے رکھ دیتے تو مخلص و منافق سب کو آمنا و صدقنا کہتے ہی بن پڑتی۔ پھر نہ تو کسی کو اس سے اختلاف کی جرأت ہوتی اور نہ کسی کی کمزوری ظاہر ہو سکتی۔ یاد ہوگا، یہی طریقہ آپ نے جنگ احد کے موقع پر بھی اختیار فرمایا۔ اس وقت آپ نے لوگوں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ جنگ شہر سے باہر نکل کر کی جائے یا شہر میں محصور ہو کر اور خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرمائی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جاں نثاروں نے شہر سے باہر نکل کر جنگ کرنے کی رائے دی اور کمزور قسم کے لوگوں نے شہر میں محصور ہو کر۔ اس طرح آپ کو جماعت کے قوی و ضعیف اور مخلص و منافق سب کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا[1]۔ اسی حکمت و مصلحت سے حضورؐ نے اس موقع پر بھی بات مبہم انداز میں فرمائی کہ لوگوں کے جواب سے اندازہ ہو جائے کہ کون کس طرز پر سوچ رہا ہے چنانچہ پہلے آپ نے مہاجرین کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ وہ صاف سمجھ گئے کہ حضورؐ کا منشا کیا ہے۔ چنانچہ ان میں سے مقداد بن عمرؓ نے اٹھ کر ایک ایسی تقریر کی جس کی گونج اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ انہوں نے فرمایا:

> "اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ کو جس بات کا حکم دیا ہے آپ اس کے لیے اقدام کیجیے۔ آپ جہاں کے لیے نکلیں گے ہم آپ کے ہم رکاب ہیں۔ ہم آپ سے وہ بات کہنے والے نہیں ہیں جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہی تھی کہ تم اور تمہارا رب دونوں جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں بلکہ ہمارا قول یہ ہے کہ آپ اور آپ کا رب دونوں جنگ کے لیے نکلیں، جب تک کہ ایک آنکھ بھی ہم میں گردش کرتی ہے ہم سر کٹانے کے لیے حاضر ہیں۔"

کیا یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان الفاظ میں جن لوگوں کی ترجمانی کی گئی ہے ان کے کسی فرد میں بھی کسی

---

[1] اس مسئلہ پر تفصیلی بحث آل عمران کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

تجارتی قافلے پر حملے کا کوئی مرہوم وسوسہ بھی ہو سکتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد اپنے وہی الفاظ جو اوپر مذکور ہوئے پھر دہرائے۔ انصار سمجھ گئے کہ اب حضورؐ ہمارا عندیہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انصار کے لیڈر سعد بن معاذ اٹھے اور انھوں نے عرض کیا کہ حضور کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ پھر انھوں نے وہ تقریر کی جس کا ایک ایک لفظ میدان جہاد کا رجز ہے اور جس کی حرارت ایمانی تیرہ سو سال گزرنے پر بھی ٹھنڈی نہیں پڑی ہے۔ انھوں نے فرمایا۔

"ہم آپ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپ کی تصدیق کی ہے ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ جو دین آپ لے کر آئے ہیں وہی حق ہے۔ ہم نے آپ سے سمع و طاعت کا عہد و میثاق کیا ہے۔ پس اے اللہ کے رسول، آپ نے جو ارادہ فرمایا ہے وہ پورا کیجیے۔ اس خدا کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہمیں اس سمندر کے کنارے لے جا کر اس میں کود پڑیں گے تو آپ کے ساتھ ہم بھی اس میں کود پڑیں گے اور ایک شخص بھی ہم میں سے پیچھے رہنے والا نہیں ہوگا۔ ہم اس بات سے نہیں گھبراتے کہ کل آپ ہمیں ہمارے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے لے جا کر کھڑا کریں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے۔ مقابلہ کے وقت ہم راست باز ثابت ہوں گے اور کیا عجب کہ اللہ ہمارے ہاتھوں وہ کچھ دکھائے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں تو اللہ کا نام لے کر آپ ہمیں ہم رکابی کا شرف بخشیے۔"

غور کیجیے کہ کیا یہ تقریریں ان لوگوں کی ہو سکتی ہیں جو ایک غیر مسلح قافلہ پر، جس کی جمعیت شاید کل چالیس آدمیوں پر منحصر تھی، حملہ کی سکیمیں سوچ رہے ہوں اور پھر اس امر پر غور کیجیے کہ کیا لفظ لفظ سے یہ بات واضح نہیں ہو رہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کے اس ابہام کے باوجود، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، انصار و مہاجرین دونوں گروہوں پر یہ بات سورج کی طرح روشن تھی کہ آپؐ کا منشا کیا ہے اور آپؐ کا رخ کدھر کو ہے۔ البتہ ایک گروہ، جیسا کہ قرآن کے الفاظ سے واضح ہے، ضعیف الایمانوں کا ایسا تھا جو حقیقت کی وضاحت کے باوجود محض اپنی بزدلی کے سبب سے یہ چاہتا تھا کہ حملہ قافلہ پر کیا جائے جو غیر مسلح ہے تاکہ خطرہ کوئی نہ پیش آئے اور لقمہ تر ہاتھ آئے۔ انہی کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ (تم چاہتے تھے کہ غیر مسلح گروہ تمہارا لقمہ بنے) شوکۃ اور شوکۃ عربی میں کانٹے کو کہتے ہیں یہیں سے لفظ شوکۃ ہتھیار اور پھر قوت اور دبدبہ کے معنی میں استعمال ہوا۔ چونکہ تجارتی قافلہ غیر مسلح تھا اس وجہ سے اس کے لیے غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ کا لفظ استعمال ہوا۔

خدا کی احکام کا منشا سمجھنے کے لیے ایک عقلی کسوٹی

وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ' اب یہ اللہ کے ارادے اور منشا کو سمجھنے اور جانچنے کے لیے ایک عقلی اور فطری معیار بتایا گیا ہے کہ اللہ کا ہر حکم لازماً

احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے مقصد کے لیے ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی باتوں کا منشا، اگرچہ وہ مجمل ہوں، متعین کرنے میں اس اصول کو نظر انداز کرنا جائز نہیں ہے۔ جن لوگوں نے قافلہ پر حملہ کرنے کا ارمان کیا انھوں نے اس بات کا خیال نہ کیا کہ خدا ایک ایسی بات کیسے چاہ سکتا ہے جس سے نہ حق کا بول بالا ہو نہ کفر اور اہلِ کفر کی جڑ کٹے۔ 'کلمات' کا لفظ، جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں تصریح کر چکے ہیں، ایک قسم کے ابہام کا حامل ہے۔ چونکہ اس موقع پر بات، جیسا کہ ہم اوپر وضاحت کر چکے ہیں، لوگوں کے سامنے مبہم طور پر رکھی گئی تھی اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'کلمات' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ جن باتوں کے اندر کوئی اجمال یا ابہام ہوتا ہے درحقیقت وہی باتیں ہوتی ہیں جن کے منشا کے تعین کا کام دشوار ہوتا ہے۔ ایسے مواقع میں اہلِ ایمان کی روش یہ ہونی چاہیے کہ بات کا وہ پہلو اختیار کریں جو اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی شان سے موافقت رکھنے والا ہو نہ کہ ان کے منافی۔ 'یَقۡطَعَ دَابِرَ الۡکٰفِرِیۡنَ' کے الفاظ سے قرآن نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ سارے کفر کی جڑ تو قریش کی جمعیت تھی، کاٹنے کی چیز تو وہ تھی اور اللہ چاہ سکتا تھا تو اس کا کاٹنا چاہ سکتا تھا لیکن ایک گروہ نے تجارتی قافلہ ہی پر وار کر کے تیس مار خاں بننے کی کوشش کی۔

'لِیُحِقَّ الۡحَقَّ وَیُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ' یہ ٹکڑا 'یَقۡطَعَ دَابِرَ الۡکٰفِرِیۡنَ' کی غایت واضح کر رہا ہے کہ اللہ نے ان کافروں کی جڑ کاٹنے کا جو ارادہ فرمایا ہے تو اس کا مقصد حق کا بول بالا کرنا اور باطل کو مٹانا ہے۔ خدا کو کسی سے پرخاش نہیں ہے البتہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل اس کی صفات کا مقتضیٰ ہے اور اس کا فیصلہ اب خدا نے فرما لیا ہے اور یہ کام ہو کر رہے گا اور ان مجرموں کے علی الرغم ہو کر رہے گا۔

قرآنی اشارات کی روشنی میں غزوۂ بدر کی اصل تصویر

اوپر قرآن نے جو اشارات کیے ہیں ان کی روشنی میں غزوہ بدر کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو سیرت و مغازی کی کتابوں میں پیش کی گئی ہے اور جس میں رنگ آمیزی کر کے مستشرقین نے اس کو اور زیادہ بھیانک شکل دے دی ہے۔

قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا مسلمانوں کے ذہن میں قریش کے قافلۂ تجارت سے تعرض کرنے کا کوئی خیال موجود نہیں تھا۔ مدینہ پر حملہ کی ساری اسکیم قریش نے بنائی اور اس کے لیے قافلۂ تجارت کی حفاظت کا بہانہ تراشا۔ قریش مدینہ میں مسلمانوں کے جڑ پکڑنے سے بہت خائف تھے۔ مذہبی عناد کے علاوہ انہیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ اب مکہ اور شام کی تجارتی شاہراہ ان کے لیے محفوظ نہیں رہ گئی ہے۔ اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ہی وہ اس فکر میں تھے کہ کوئی عذر تلاش کر کے مسلمانوں کو ایک قوت بننے سے پہلے ہی ختم کر دیں۔ اب یا تو قافلۂ تجارت کے سالار ابوسفیان نے واپسی کے موقع پر کوئی وہمی خطرہ مسلمانوں کے حملے کا محسوس کیا ہو کہ آدمی بھیج کر قریش کو حملہ کی خبر بھیج

دی یا اس کے لیے بھی پہلے سے قریش کے لیڈروں میں کوئی سازش رہی ہو۔ بہر حال ابوسفیان کی اطلاع پر مکہ سے ایک بھاری بھرکم لشکر مدینہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ یہ مرحلہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رویا کے ذریعے سے یہ اطلاع ہوتی ہے کہ قریش کی دو جماعتیں آ رہی ہیں جن میں سے ایک سے مسلمانوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد مدینہ سے بدر کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا اور مسلمانوں کے حوصلہ کا اندازہ کرنے کے لیے صورت حال مبہم انداز میں ان کے سامنے رکھی کہ کفار کی دو جماعتیں آ رہی ہیں جن میں سے ایک سے ہمارا مقابلہ ہوگا۔ اور وہ ہم سے شکست کھائے گی۔ مسئلہ کے سامنے آتے ہی مہاجرین و انصار سب سمجھ گئے کہ قریش کی فوج آ رہی ہے اور اس سے معاملہ درپیش ہے۔ چنانچہ ان کے لیڈروں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وفاداری اور اسلام کے لیے اپنی جاں نثاری کا یقین دلایا۔ البتہ ایک مختصر سی ٹولی ان میں ایسی بھی تھی جس نے اپنا زور اس بات کے لیے لگایا کہ قریش کی فوج کے بجائے قافلۂ تجارت کا رخ کیا جائے تاکہ بغیر ایک قطرۂ خون بہائے بھاری غنیمت ہاتھ آ سکے۔ اسی گروہ کو بے نقاب کرنے کے لیے حضور نے اپنی بات مبہم انداز میں پیش کی تھی تاکہ جن لوگوں کے اندر کوئی کمزوری چھپی ہوئی ہے وہ اپنی کمزوری ظاہر کردیں اور مخلص و منافق میں مرحلۂ جنگ پیش آنے سے پہلے ہی امتیاز ہو جائے۔

آگے اسی سورہ کی بعض آیات کی روشنی میں ہم انشاء اللہ یہ بھی دکھائیں گے کہ اس جنگ کے لیے یہود نے بھی قریش کی پیٹھ ٹھونکی تھی لیکن میدان جنگ کا نقشہ دیکھ کر وہ اپنی عادت کے مطابق دبک گئے۔

۲- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۹-۱۹

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنی ان غیبی تائیدات کا حوالہ دیا ہے جو اس موقع پر مسلمانوں کی مدد اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ظاہر ہوئیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور اسلام کے مستقبل پر ان کا ایمان و اعتماد مضبوط ہو۔ اوپر کے ٹکڑے میں جن کمزور لوگوں کا ذکر آیا تھا ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں کی جماعتی اصلاح ہی کے نقطۂ نظر سے آیا تھا، اب گویا اسی مقصد کے تحت ان باتوں کی یاد دہانی کی جا رہی ہے جن کی یادداشت آگے کے مراحل میں کام آنے والی تھی۔ مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ کفار قریش کو بھی مخاطب کر کے تنبیہ کردی گئی کہ یہ چپت جو تمہیں لگی ہے یہ تو تمہید ہے، تمہاری روش اگر یہی رہی تو آگے اس سے سخت دنوں کا انتظار کرو، تم نے اس جنگ کے نتیجے کو حق و باطل کا معیار ٹھہرایا تھا تو اس کا نتیجہ تمہارے سامنے آگیا، اب بھی تمہاری آنکھیں نہ کھلیں، تم نے پھر

شرارت کی تو یاد رکھو ہم کہیں چلے نہیں گئے ہیں۔ کثرت تعداد و وسائل کا سارا گھمنڈ دھرا رہ جائے گا اور تم پھر منہ کی کھاؤ گے۔ اہل ایمان کے پہلو پر ہم ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ آیات
الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ﴿٩﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ ۹-۱۹
بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ
حَكِيمٌ ﴿١٠﴾ إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم ع ۱ ۱۰ ۱۵
مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ
الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ﴿١١﴾ إِذْ
يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ
سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ
الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿١٢﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا
اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَن يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ
شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١٣﴾ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ
النَّارِ ﴿١٤﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا
زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ﴿١٥﴾ وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ
دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ
بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٦﴾ فَلَمْ
تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ
اللَّهَ رَمَىٰ ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾
اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ
لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا
وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ ع ۹ ۱۶

ترجمۂ آیات ۹ - ۱۹

اور یاد کرو جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری فریاد سنی کہ میں ایک ہزار فرشتے تمہاری کمک پر بھیجنے والا ہوں جن کے پرے کے بعد پرے نمودار ہوں گے اور یہ صرف اس لیے کیا کہ تمہارے لیے خوش خبری ہو اور اس سے تمہارے دل مطمئن ہوں اور مدد تو خدا ہی کے پاس سے آتی ہے۔ بے شک اللہ عزیز و حکیم ہے۔ یاد کرو جب کہ وہ تم کو چین دینے کے لیے اپنی طرف سے تم پر نیند طاری کر دیتا ہے اور تم پر آسمان سے پانی برسا دیتا ہے تاکہ اس سے تم کو پاکیزگی بخشے اور تم سے شیطان کے وسوسے کو دفع کرے اور تاکہ اس سے تمہارے دلوں کو مضبوط کرے اور قدموں کو جمائے۔ یاد کرو جب تمہارا رب فرشتوں کو وحی کرتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم ایمان والوں کو جمائے رکھو۔ میں کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا تو مارو ان کی گردنوں پر اور مارو ان کے پور پور پر۔ یہ اس سبب سے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ کو اٹھے ہیں اور جو اللہ و رسول کے مقابلہ کو اٹھتے ہیں تو اللہ ان کے لیے سخت پاداش والا ہے۔ سو یہ تو نقد چکھو اور کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔ ۹ - ۱۴

اے ایمان والو، جب تمہارا کفار سے مقابلہ ہو فوج کشی کی صورت میں تو ان

کو پیٹھ نہ دکھائی ہو اور جو ان کو اس وقت پیٹھ دکھائے گا، بجز اس کے کہ جنگ کے لیے پینترا بدلنا چاہتا ہو یا کسی جماعت کی طرف سمٹ رہا ہو، تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت ہی برا ٹھکانا ہے۔ پس تم لوگوں نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور جب تو نے ان پر خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی کہ اللہ اپنی شانیں دکھائے اور اپنی طرف سے اہل ایمان کے جوہر نمایاں کرے۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ جو کچھ ہوا سامنے ہے اور اللہ کافروں کے سارے داؤں بے کار کر کے رہے گا۔ اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو تمہارے سامنے فیصلہ آگیا اور اگر تم باز آجاؤ تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم پھر یہی کرو گے تو ہم بھی یہی کریں گے اور تمہاری جمعیت تمہارے کچھ کام نہ آئے گی خواہ کتنی ہی زیادہ ہو اور بے شک اللہ مومنین کے ساتھ ہے۔ ۱۵-۱۹

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ٥ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۹-۱۰)

غزوۂ بدر میں تائیدات الٰہی

'اَنِّیْ مُمِدُّکُمْ'، 'فَاسْتَجَابَ لَکُمْ' کی تفصیل ہے اور فاعل کا صیغہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کی قطعیت کے اظہار کے لیے ہے۔ 'اِرْدَاف' کے معنی توالی یعنی یکے بعد دیگرے ظاہر ہونے کے ہیں۔

اس سلسلہ کی پہلی تائید الٰہی

یہ اس سب سے پہلی تائید الٰہی کا بیان ہے جو اس موقع پر ظاہر ہوئی۔ مسلمانوں کی تعداد اس جنگ میں بہت تھوڑی تھی یعنی کل ۳۱۳ اور وہ بے سروسامان بھی تھے۔ ادھر کفار ایک ہزار کے قریب تھے اور ہر قسم کے اسلحہ سے لیس اور سروسامان سے بھرپور۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کو واحد سہارا خدا کی تائید ہی کا ہو سکتا تھا چنانچہ ایک ایک شخص سراپا عجز و نیاز اور یکسر دعا و فریاد بنا ہوا تھا۔ ان دعاؤں کی نوعیت

کا اندازہ کرنے کے لیے خود سرور عالم کی اس دعا کو پڑھ لینا کافی ہے جس کے الفاظ احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب نہتے مسلمانوں نے اپنے دل نکال کر اپنے رب کے سامنے رکھ دیے ہوں گے تو یہ دعائیں قبولیت سے کیسے محروم رہ سکتی تھیں۔ چنانچہ یہ قبول ہوئیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت نازل ہوئی کہ تم ہراساں نہ ہو، میں تمہاری کمک کے لیے ہزار فرشتے نازل کرنے والا ہوں مطلب یہ کہ تم ہزار کافروں کی کیا پروا کرتے ہو، تمہارے جلو میں تو ہزار فرشتے ہوں گے۔ ان فرشتوں کے ظہور کی شکل یہ بتائی کہ ان کے دستے کے بعد دستے اور پرے کے بعد پرے نمایاں ہوں گے۔ میدان جنگ میں لڑنے والوں کی یہ سائیکالوجی ملحوظ رہے کہ جن کی حمایت میں کمک کے بعد کمک آ رہی ہو ان کا حوصلہ ہر کمک پر دونا ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے حریف کے اعصاب ڈھیلے پڑتے جاتے ہیں۔ یہ مضمون آل عمران کی آیات ۱۲۵ - ۱۲۶ میں بھی گزر چکا ہے۔ ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

اہل ایمان کے لیے ابدی بشارت

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ضمیر مفعول کا مرجع وہی وعدۂ نصرت ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر تمہارے رب نے یہ صریح الفاظ میں تمہاری مدد کا پہلے سے جو وعدہ فرمایا تو محض اس لیے کہ تم ہراساں تھے، تمہاری ڈھارس بندھ جائے اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا کہ خدا کی یہ مدد اسی موقع کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ جب بھی اللہ کے مومن بندے اس کی راہ میں جہاد کے لیے نکلیں گے اور ایمان و اخلاص کے ساتھ اس سے طالب مدد ہوں گے، وہ ان کی مدد فرمائے گا خواہ اس مدد کے لیے پہلے سے ان کو بشارت ملی ہو یا نہ ملی ہو۔ اس وضاحت کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ صریح الفاظ میں بر سر موقع وعدۂ نصرت تو نبی کے ذریعہ ہی سے اور اس کی موجودگی ہی میں ہو سکتا ہے تو نبی کی غیر موجودگی میں یا اس کے زمانہ کے بعد کے لوگ کس طرح اطمینانِ قلب حاصل کر سکتے تھے۔ اس شبہ کے ازالے کے لیے یہ فرما دیا کہ یہ وعدہ اسی موقع کے لیے نہیں تھا بلکہ اہل ایمان کے لیے ابدی ہے۔

کم سوادوں کی بے بصیرتی

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ' اس لیے کہ مدد تو جب بھی آتی ہے یا آئے گی اللہ ہی کے پاس سے آتی ہے یا آئے گی۔ پس خدا پر بھروسہ کرنے والے ہمیشہ خدا پر بھروسہ کریں وہ ہمیشہ ان کی مدد فرمائے گا۔ خدا عزیز اور غالب ہے، کسی کی مجال نہیں کہ اس کے ہاتھ پکڑ سکے لیکن ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اگر کبھی اہل ایمان کو کوئی افتاد پیش آ جاتی ہے تو اس میں بھی کوئی حکمت کارفرما اور اس کی تہ میں بھی بندوں ہی کی کوئی مصلحت مضمر ہوتی ہے۔ یہ مضمون سورۂ آل عمران میں احد کی شکست کے اسباب کے ذیل میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔

اس زمانے کے بعض کم سوادوں نے اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا کہ فرشتوں کی فوج اتارنے کا وعدہ محض مسلمانوں کو ذرا بڑھاوا دینے کے لیے تھا تاکہ وہ ہمت کر کے کفار سے بھڑ جائیں۔ ان کے

خیال میں قرآن نے جنگ کے بعد خود یہ راز کھول دیا کہ یہ بات محض تمھاری تسلی کے لیے کہہ دی گئی تھی، اس کی حقیقت کچھ نہیں تھی۔ گویا نعوذ باللہ پہلے تو اللہ میاں نے مسلمانوں کو چکمہ دیا اور پھر خود ہی اپنا بھانڈا پھوڑ دیا کہ اب کے تو میں نے تم کو چکمہ دے کر لڑا دیا، آئندہ میرے بھرے میں نہ آنا، فرشتوں ورشتوں کی بات محض ایک جھرہی تھی۔ شاید یہ حضرات اللہ میاں کو اپنے برابر بھی عقلمند نہیں سمجھتے۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۱۱)

اس سلسلہ کی دوسری تائید الٰہی نیند کے ذریعہ تائید

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ، یہ اس جنگ کے سلسلہ کی دوسری تائید الٰہی کا بیان ہے اور ذکر اس شب کا ہے جس کی صبح کو جنگ واقع ہوئی۔ تصویر حال کے مقصد سے صیغہ مضارع کا استعمال ہوا ہے جس کا استعمال تصویر حال کے لیے معروف ہے۔ فرمایا کہ یہ بات بھی خاص اللہ کی طرف سے ہوئی کہ شب میں اس نے تم پر نیند طاری کر دی کہ تمھارے اعصاب و دماغ کو سکون مل گیا اور تم صبح کو جنگ کے لیے چاق و چوبند ہو گئے۔ اس نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اس لیے کہ عین میدانِ جنگ میں ان لوگوں کا جن کی مٹھی بھر جماعت کو صبح ایک دل بادل فوج سے لڑنا ہے تھوڑا سا سو لینا بھی فی الواقع خدا کی تائید ہی کا مظہر ہے۔ نیند تو تھوڑی سی پریشانی سے بھی اچاٹ ہو جاتی ہے چہ جائیکہ ایک ایسی پریشانی میں جیسی کہ اس موقع پر مسلمانوں کو لاحق رہی ہو گی لیکن جن کو خدا کی طمانیت بخشیوں کی تھپکیاں حاصل ہوں وہ تختہ دار پر بھی سو سکتے ہیں۔ چنانچہ شب میں مسلمان سو لیے اور اس سے ان کے اعصاب اور دل و دماغ کو اتنا سکون حاصل ہو گیا کہ وہ جنگ کے لیے تازہ دم ہو گئے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۵۴ کے تحت ہم لکھ آئے ہیں کہ میدانِ جنگ میں فوج کے لیے سو لینے کا موقع مل جانا ہی اول تو بڑی نعمت ہے لیکن اس سے بڑی نعمت اس موقع سے صحیح فائدہ اٹھا سکنا ہے اس لیے کہ نیند کے لیے موقع مل جانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا اصل انحصار دل و دماغ کی حالت پر ہے اور یہ چیز ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی، انہی کو حاصل ہوتی ہے جن پر خدائے مقلب القلوب اپنے فضل خاص سے یہ سکینت طاری کر دے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ اونگھ کی یہ حالت مسلمانوں پر عین اس وقت طاری ہوئی جب زور و شور کا معرکہ گرم تھا اور حالت یہ ہوئی کہ لوگوں کے ہاتھوں سے تلواریں چھوٹ کر گری پڑتی تھیں۔ لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ اول تو یہی بات بڑی عجیب سی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی حالت کو اپنے انعام کے طور پر گنائے جس کا فائدہ سر تا سر کفار کے حق میں جاتا ہے۔ ان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا تائید ہو سکتی تھی کہ مسلمان عین لڑائی کے وقت اونگھنے لگ جائیں خواہ وہ کتنے ہی قلیل وقت کے لیے ہو۔ دوسرے یہ بات قرآن کے صریح الفاظ کے بھی بالکل خلاف ہے اس

طرح کی نیند کا ذکر قرآن میں دو جگہ آیا ہے۔ ایک آل عمران آیت ۱۵۴ میں، دوسرے یہاں۔ آل عمران کے الفاظ یہ ہیں: ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ (پھر اللہ نے تم پر غم کے بعد سکون اتارا یعنی نیند جس نے تم میں سے ایک گروہ کو ڈھانک لیا اور ایک گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی رہی) اس آیت میں ظاہر ہے کہ غم سے وہی غم مراد ہے جو مسلمانوں کو احد کی شکست سے پیش آیا تو جب نیند کے اتارے جانے کا واقعہ اس غم کے پیش آنے کے بعد پیش آیا تو اس کا تعلق وقت جنگ سے کیسے ہو سکتا ہے، یہ تو لازماً جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد ہی کا واقعہ ہو سکتا ہے۔ اس نیند کے موقع اور اس کی اہمیت کی تفصیل ہم آل عمران کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

انفال کی زیر بحث آیت میں اس نیند کا ذکر ان تائیدات کے بیان کے ذیل میں ہوا ہے جو جیسے بالفعل جنگ شروع ہونے سے پہلے ظہور میں آئی ہیں۔ اس کے اوپر آپ نے دیکھا کہ فرشتوں کی فوج اتار جانے کی بشارت کا حوالہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بشارت جنگ سے پہلے دی گئی ہے۔ بعد کی آیت میں بارش کے نزول کا ذکر ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ یہ واقعہ بھی جنگ سے پہلے ہوا ہے۔ پھر ان دونوں کے بیچ میں ایک ایسی بات کیسے آسکتی ہے جس کا تعلق معرکۂ کارزار سے ہو؟ قرآن نے اپنی ترتیب بیان ہی سے واقعہ کا موقع و محل نہایت خوبی سے واضح کر دیا ہے لیکن آفت یہ ہے کہ لوگ قرآن پر غور ہی نہیں کرتے۔

ممکن ہے یہاں کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ قرآن نے یہاں 'نُعَاس' کا لفظ استعمال کیا ہے جو عربی میں ابتدائی نیند یعنی اونگھ اور جھپکی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگر مقصود اطمینان کی نیند کا بیان کرنا ہوتا تو 'نوم' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ استعمال ہوتا۔ ہمارے نزدیک یہ شبہ کچھ وزن نہیں رکھتا۔ اول تو یہ خیال کیجیے کہ شدید پریشانی میں آدمی جس چیز سے محروم ہو جاتا ہے وہ ابتدائی نیند ہی ہے، وہ اگر کسی طرح آجائے اور ذرا آنکھ لگ جائے تو آدمی کچھ سو ہی لیتا ہے۔ خدا نے اپنے فضل خاص سے یہ چیز مسلمانوں پر اڑھا دی، جیسا کہ 'يُغَشِّيْكُمُ' کے لفظ سے عیاں ہے اسی وجہ سے مسلمان سو لیے۔ دوسری بات یہ کہ سفر یا میدان جنگ میں گھوڑے بیچ کر اور مردوں سے شرط باندھ کر تو کوئی ذی ہوش بھی نہیں سوتا، جو بھی سوتا ہے وہ جھپکی والی نیند ہی سوتا ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک قرآن نے یہ لفظ نہایت برمحل اور بلیغ استعمال کیا ہے۔

اس سلسلہ کی تیسری تائید الٰہی

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ۔

یہ تیسری تائید الٰہی کا حوالہ ہے کہ عین موقع پر اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسمان سے پانی برسا دیتا ہے۔ یہاں 'مِنَ السَّمَآءِ' کے الفاظ بڑے بامعنی ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے پہلے

بارش کے ذریعے تائید

پہنچ کر پانی کے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وجہ سے پانی کے باب میں مسلمانوں کو بڑی تشویش تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مِنَ السَّمَآءِ کے الفاظ سے گویا اپنے اس التفات خاص کی طرف مسلمانوں کی توجہ دلائی کہ کفار نے جب تمھیں زمین کے پانی سے محروم کرنے کی تدبیر کی تو وہ تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکے، تمھارے رب نے تمھارے لیے آسمان سے پانی بھیج دیا۔

'لِيُطَهِّرَكُمْ' میں پانی کا جو فائدہ بتایا ہے اس سے صحابہؓ کے ذوق و رجحان پر روشنی پڑتی ہے کہ ایمان و اسلام نے ان کے اقدار و پیمانے کس قدر بدل دیے تھے۔ پانی کا یہ فائدہ کہ پیا جاتا ہے، ہر آدمی کو معلوم ہے بلکہ بیل اور گدھے بھی اس سے واقف ہیں۔ مومن کی نگاہ میں پانی کا اصلی فائدہ اور اس کی حقیقی قدر و قیمت اس بات میں ہے کہ وہ پاکیزگی اور طہارت کا ذریعہ اور شیطانی وسوسوں کے دور کرنے کا واسطہ ہے اور یہ چیز اللہ کو بہت محبوب ہے۔ صحابہؓ نے اس موقع پر پانی کے مسئلہ پر غور کیا ہوگا تو ان کے سامنے پینے کی ضرورت سے زیادہ اہمیت کے ساتھ یہ بات آئی ہوگی کہ وضو کیسے ہوگا، طہارت کے لیے کیا بنے گا، غسل کی ضرورت پیش آئی تو کیا صورت ہوگی؟ ان کی اس مخصوص پریشانی کی وجہ سے، جو ان کے جوش ایمان کا مظہر تھی، اللہ تعالیٰ نے پانی کی ان روحانی برکات کا خاص طور پر ذکر فرمایا اور اس کے عام حیوانی فوائد سے صرف نظر فرمایا کہ وہ تو سبھی کے علم میں ہیں۔

'رجز الشیطٰن' سے مراد

'رِجْزَ الشَّيْطٰنِ' سے مراد شیطانی وساوس ہیں۔ اس کے ذکر کا بھی ایک خاص محل ہے۔ آدمی جب ناپاکی کی حالت میں ہو تو جس طرح گندی چیزوں پر مکھیوں کا زیادہ ہجوم ہوتا ہے، اسی طرح گندگی کی حالت میں شیطانی وساوس کا بھی آدمی پر زیادہ غلبہ ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بعض احادیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔ علاوہ بریں یہ بات بھی ہے کہ اگر پانی جیسی ناگزیر شے کی نایابی کا سوال پیدا ہو جائے اور وہ بھی عین جنگ کی حالت میں تو شیطان اس کی آڑ میں ایسی بد دلی اور مایوسی پھیلا سکتا ہے کہ بہتوں کا ایمان متزلزل ہو جائے۔

نیند کے فوائد کی تفصیل

وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۱۱) ربط اللہ علی قلبہ: قوّاہ و صبّرہ۔ خدا نے اس کے دل کو مضبوط کر دیا، اس کو ثبات قلب بخشا، اس کو تھام لیا۔ عام طور پر لوگوں نے اس اثبات قلب اور ثبات قدم کو بھی مذکورہ بارش ہی کے تحت شمار کیا اور اس پہلو سے اس ٹکڑے کی تاویل کی ہے لیکن میرا رجحان یہ ہے کہ یہ اس نیند کے فوائد کی تفصیل ہے جس کا اوپر ذکر ہے۔ میرے رجحان کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

اول یہ کہ 'لِيَرْبِطَ' میں 'لِ' کا اعادہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ لِيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ کے تحت نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو بغیر اعادہ 'ل' کے آتا جس طرح 'وَيُذْهِبَ' ہے۔ فصیح عربی میں اسلوب بیان یہی ہے۔ کلام عرب اور قرآن کے نظائر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کتاب

میں اس کی ایک سے زیادہ مثالیں گزر چکی ہیں۔ بقرہ میں ہے۔ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۸۵- بقرہ) اور اللہ تمھارے لیے سہولت چاہتا ہے، تنگی نہیں چاہتا اور تاکہ تم تعداد پوری کرو اور تاکہ تم اس ہدایت پر جو اس نے تم کو بخشی ہے اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم شکر گزار رہو) ہم نے اس آیت کے تحت وضاحت کی ہے کہ یہ اوپر کے بیان کردہ احکام کی الگ الگ علتیں واضح کی گئی ہیں اس وجہ سے ہر ایک کے ساتھ ل کا اعادہ کیا گیا۔ وہ ترتیب بیان نزولی نہیں بلکہ صعودی ہے یعنی نیچے سے اوپر کو چڑھتے ہوئے ایک ایک حکم کی غایت واضح کی گئی ہے۔ بالکل اسی اصول پر یہاں بھی ترتیب صعودی ہے۔ پانی کا ذکر سب سے آخر میں ہے، پہلے اس کا فائدہ بیان کیا گیا ہے۔ پھر نیند کا فائدہ بیان ہوا جس کا ذکر اوپر تھا اور ل کا اعادہ کر کے یہ اشارہ فرما دیا کہ اس کا تعلق قریبی شے سے نہیں ہے بلکہ دوسری چیز سے ہے۔

دوم یہ کہ ثباتِ قلب، سکون دماغ اور ثبات قدم کا واضح تعلق نیند ہی سے ہے اسی وجہ سے قرآن نے اس کو امنۃ سے تعبیر فرمایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر رات بے خوابی اور پریشانی میں گزری ہو تو دماغ اڑا اڑا پھرتا ہے، دل پراگندہ اور پریشان رہتا ہے۔ آدمی قدم رکھتا کہیں ہے، پڑتے کہیں ہیں۔ ایسی ذہنی اور قلبی پریشانی میں آدمی کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی سلیقہ سے نہیں کر پاتا چہ جائیکہ دشمن سے مقابلہ اور وہ بھی اس دور کی جنگ میں جس میں کامیابی کا انحصار مشینوں کی قوت پر نہیں بلکہ لڑنے والوں کے اپنے اعصاب کی چستی اور قوت پر تھا۔ یہ بات بھی یہاں ملحوظ رہے کہ متعدد عرب شعراء نے اپنے جنگی کارناموں کی تفصیل کرتے ہوئے یہ بات بیان کی ہے کہ ہم نے رات میں اپنے دشمن کو سونے نہیں دیا جس کے سبب سے صبح کو ان کے دل ایسے اکھڑے ہوتے تھے کہ ہمارے سامنے ان کے قدم نہ جم سکے

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۞ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۞ ذٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكٰفِرِينَ عَذَابَ النَّارِ (۱۲-۱۴)

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ، یہاں ملائکہ سے مراد ملائکہ کی وہی فوج ہے جس کی اوپر بشارت دی گئی۔ یہ فوج براہ راست رب الافواج کی کمان میں تھی اس وجہ سے اس کو احکام بھی براہ راست اسی کی طرف سے ملتے تھے اور ان احکام کا ذریعہ وحی الٰہی تھی اس لیے کہ فرشتے بھی باایں علو مرتبت خدا تک براہ راست رسائی نہیں رکھتے۔

خدا کی شان ابتلا کے پردے سے ظاہر ہوئی

أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا، یہ پہلا حکم ہے جو اس فوج کو ملا۔ ارشاد ہوا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں تو تم مسلمانوں کو ثابت قدم رکھو۔ اس سے ایک بات تو یہ نکلی کہ خدا کی معیت کے بغیر فرشتے

بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسری یہ کہ فرشتوں کا کام بھی بہر حال یہ نہیں تھا کہ وہ مسلمانوں سے یہ کہہ دیں کہ تم الگ ہو کر بیٹھو، ہم لڑ کر تمھارے لیے میدان جیتے دیتے ہیں بلکہ ان کا فریضۂ منصبی مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنا تھا۔ گویا اصلی چیز مسلمانوں کی خود اپنی شجاعت اور ثابت قدمی تھی۔ مسلمان اپنا یہ جوہر دکھائیں تو خدا کی مدد ان کے ساتھ ہے۔ سنت الٰہی یہی ہے کہ خدا کے ہاتھ ہمیشہ اسباب کے اوٹ سے کام کرتے ہیں۔

اصل طاقت حوصلہ ہے

'سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ' مطلب یہ کہ اہل ایمان اپنی ثابت قدمی کا ثبوت دے دیں پھر زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ میں کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دوں گا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ فوج کی اصلی قوت اس کے حوصلہ (MORALE) میں ہوتی ہے۔ اگر حوصلہ بحال رہے تو سپاہی بے تیغ و تفنگ بھی لڑتا ہے اور اگر حوصلہ ٹوٹ جائے تو اسلحہ کے بڑے بڑے ذخیرے غنیم کے لیے چھوڑ کر فوج بھاگ کھڑی ہوتی ہے تو یہ جو فرمایا کہ میں ان کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہوئی بلکہ یہ تعبیر ہوئی ان کی کمر توڑ دینے کی۔

'فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ' یہ ان کی مرعوبیت کے نتیجہ کی نہایت حقیقت افروز تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب ان کا حوصلہ ٹوٹ جائے گا تو ان کو بھیڑوں بکریوں بلکہ گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈال دو۔ ان کی گردنوں کے اوپر مارو، ان کے ایک ایک پور پر مارو۔ یہ تصویر ہے مرعوبیت کے باعث ان کی بے بسی کی۔ حریف میں جب تک دم خم ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اس بات کا موقع وہ مشکل ہی سے دیتا ہے کہ آپ جہاں چاہیں اس کے ماردیں لیکن جب اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تو پکڑ کر اس کی چند یا پر جوتے لگا دیجیے، وہ چوں بھی نہ کر سکے گا۔ تعیین محل کے ساتھ جب کسی کو مارنے کے لیے کہا جائے تو اس میں اس کی تحقیر و تذلیل بھی مدنظر ہوتی ہے اور اس سے اس کی بے بسی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔

'ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ' یہ وجہ بیان ہوئی اس بات کی کہ کیوں خدا ان کے دلوں میں رعب ڈال دے گا اور کیوں یہ مسلمانوں کے ہاتھوں گاجر مولی کی طرح کاٹے جائیں گے؟ فرمایا کہ اس لیے کہ یہ اللہ و رسول کے مقابلہ کے لیے اٹھے ہیں اور جو لوگ اللہ و رسول سے مقابلہ کے لیے اٹھتے ہیں اللہ ان کو شدید پاداش سے دوچار کرتا ہے۔ انسانی فطرت کے اندر خدا اور خدا کے رسول سے لڑنے کے لیے کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ لڑائی کا جواز وہاں ہوتا ہے جہاں کسی حق کی حفاظت مدنظر ہو اور اسی صورت میں لڑائی کا حوصلہ بھی ابھرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کے مقابل میں کسی حق کا سوال پیدا نہیں ہوتا اس وجہ سے اس قسم کی جہالت کے لیے جو لوگ اٹھتے ہیں وہ اٹھیں چاہے طوفان کی طرح لیکن مقابلہ پیش آجائے تو بیٹھ جاتے ہیں بلبلے کی طرح، اس لیے کہ ان کے حوصلہ کی بنیاد کسی حق پر نہیں ہوتی۔

'ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ' اوپر خطاب مسلمانوں سے تھا، یہ اثنائے کلام میں ایک بات قریش کو مخاطب کر کے فرما دی کہ یہ جو کچھ بدر میں تمھارے سامنے پیش آیا ہے یہ نقد عاجل ہے اس کو چکھو اور دوزخ کے عذاب کا انتظار کرو۔ یہ گویا 'اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ' کی وضاحت ہوئی کہ خدا کی طرف سے جو پاداش تمھارے لیے مقرر ہے اس کو اسی پر ختم نہ سمجھو، اصل پاداش کی جگہ دوزخ ہے۔ اس کا انتظار کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۵-۱۶)

'زحف' کا مفہوم — 'اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا' زحف کے اصل معنی گھسل گھسل کر یا گھٹنوں پر چلنے کے ہیں۔ یہیں سے یہ کسی بھاری بھرکم، سازوسامان سے لدے پھندے لشکر کے جنگ کے لیے نکلنے کے معنی میں استعمال ہوا اس لیے کہ وہ بھی آہستہ آہستہ ہی مارچ کرتا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ لفظ کا یہ استعمال اس مشینی دور کا نہیں بلکہ اس دور کا ہے جب فوج کی نقل و حرکت گھوڑوں، گدھوں اور اونٹ وغیرہ کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔

عرب میں جنگ کے دو معروف طریقے — عرب میں جنگ کے دو طریقے معروف تھے۔ ایک منظم فوج کشی کا، دوسرا وہ جس کو اس زمانے میں گوریلا وار فیر کہتے تھے۔ گوریلا وار فیر کا اصول یہ تھا کہ حملہ کرو، لوٹو اور بھاگ جاؤ۔ اس کو کہتے بھی کر و فر کی جنگ تھے۔ اس کے لیے چھوٹے چھوٹے دستے نکلتے اور چھاپہ مار کر اپنی جا پناہوں میں چھپ جاتے تھے۔ اس کا کوئی مخصوص ضابطہ نہیں تھا بس جس طرح کامیاب چھاپہ مارا جا سکے اور اپنے کو بچایا جا سکے وہی اس کا اصلی ہنر تھا۔

منظم فوج کشی کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے لیے ایک ضابطہ تھا جس کی پابندی اہل لشکر کو بھی کرنی پڑتی تھی اور فریقین جنگ بھی، جو آپس میں لڑتے تھے، اس کا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ یہاں آیت میں زیر بحث وہی منظم فوج کشی والی صورت ہے چنانچہ اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے 'زَحْفًا' کا لفظ استعمال ہوا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس حکم کا تعلق گوریلا وار فیر کی صورت سے نہیں ہے۔

آئندہ کی جنگوں سے متعلق ضروری ہدایت — اب یہ مسلمانوں کو آئندہ پیش آنے والی جنگوں سے متعلق ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب منظم فوج کشی کی شکل میں دشمن سے تمھارا مقابلہ ہو تو پیٹھ نہ دکھانا۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی انہی تائیدات پر مبنی ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہیں کہ جن کی پشت پر خدا اور اس کے فرشتے یوں مدد و نصرت کے لیے کھڑے ہوں ان کے لیے حرام ہے کہ وہ اپنی پیٹھ دشمن کو دکھائیں۔

جنگ میں پیٹھ دکھانے کے جرم کی شدت — 'وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ' الآیہ ایسی صورت میں جو لوگ دشمن کو پیٹھ دکھائیں گے فرمایا کہ وہ خدا کا غضب لے کر لوٹیں گے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ جرم کفر و ارتداد کے

بھاگ رہا ہے۔ اس جرم کی یہ شدت ظاہر ہے کہ اسی بنیاد پر ہے کہ جو شخص میدان جنگ سے بھاگتا ہے وہ اپنی اس بزدلی سے بسا اوقات پوری فوج بلکہ پوری ملت کے لیے ایک شدید خطرہ پیدا کر دیتا ہے۔

'اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ' یعنی اس سے مستثنیٰ وہ شکلیں ہیں جو کوئی سپاہی کسی جنگی تدبیر کے لیے اختیار کرتا ہے یا کوئی ایسی صورت اس کے سامنے آ گئی ہے کہ وہ اپنے ایک مورچہ سے ہٹ کر اپنے ہی کسی دوسرے مورچے کی طرف سمٹنا چاہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حرام جو چیز ہے وہ فرار کی نوعیت کا پیٹھ دکھانا ہے، وہ پیچھے ہٹنا اس سے مستثنیٰ ہے جو تدبیر جنگ کی نوعیت کا ہو۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی ۚ وَلِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَیْدِ الْكٰفِرِیْنَ (۱۷-۱۸)

پیغمبر صلعم کی آستین سے دست غیب کے کارنامے

'فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ' میں خطاب تمام مسلمانوں سے ہے اور 'وَمَا رَمَیْتَ' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اس وجہ سے دونوں میں جمع اور واحد کا فرق ہے۔ 'رمی' تیر مارنے، کنکر پتھر پھینکنے، خاک اور راکھ جھونکنے سبھی کے لیے آتا ہے۔ روایات میں ہے کہ جب کفار کی فوجیں سامنے ہوئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر خاک زمین سے اٹھائی اور 'شاهت الوجوہ' کہہ کر کفار کی طرف پھینکی۔ 'شاهت الوجوہ' عربی میں لعنت کا فقرہ ہے اور کسی کے اوپر خاک جھونکنا نہایت قدیم زمانہ سے لعنت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ تورات میں بھی اس کا ذکر آتا ہے اور عرب کی روایات سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ سورۂ فیل کی تفسیر میں مولانا فراہی نے اس کے حوالے دیے ہیں۔

یہاں زبان کا یہ اسلوب بھی نگاہ میں رہے کہ بعض مرتبہ فعل کی نفی سے مقصود نفس فعل کی نفی نہیں ہوتی بلکہ اس فعل کے ساتھ ان شاندار نتائج کی نسبت کی نفی ہوتی ہے جو اس فعل کے پردے میں ظاہر ہوئے۔ مٹھی بھر نہتے مسلمانوں کا قریش کی دل بادل غرق آہن فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈال دینا یا آنحضرت کے دست مبارک سے پھینکی ہوئی چٹکی بھر خاک کا ایک ایسا طوفان بن جانا کہ تمام کفار کو اپنی اپنی آنکھوں کی پڑ جائے، یہ مسلمانوں کی چھتھڑوں میں لپٹی ہوئی تلواروں یا پیغمبر کی رمی کے کارنامے نہیں تھے۔ بلکہ اس دست غیب کے کارنامے تھے جو مسلمانوں کی میانوں اور پیغمبر عالم کی آستینوں میں چھپا ہوا تھا۔

'اَبْلٰی فُلَانٌ فِی الْحَرْبِ بَلَآءً حَسَنًا' کے معنی ہوں گے اس نے میدان جنگ میں خوب خوب اپنی بہادری کے جوہر دکھائے یہاں تک کہ سب نے اس کا لوہا مان لیا۔ 'اَبْلَی اللّٰهُ عِبَادَهٗ بَلَآءً حَسَنًا' کے معنی ہوں گے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے اچھے جوہر نمایاں کیے۔ 'وَلِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ' کا معطوف علیہ یہاں عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق محذوف ہے، اس لیے کہ اوپر کے الفاظ سے وہ خود بخود واضح ہے۔ اس محذوف کو کھول دیجیے تو گویا پوری بات یوں ہوگی "تاکہ اللہ اپنی نصرت کی شانیں دکھائے اور مسلمانوں کے جوہر اچھی

طرح نمایاں کردے۔

"اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ" اللہ تعالیٰ کی صفات سمع و علم کے حوالے سے یہاں مقصود مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا ہے کہ خدا کسی بات سے بھی بے خبر نہیں رہتا۔ وہ اپنے بندوں کی دعائیں اور فریادیں ہر وقت سنتا اور ان کی ضرورتیں اور حاجتیں ہر لمحہ جانتا ہے۔ بدر میں اس کی تائیدات کا بروقت ظہور اس کی تازہ شہادت ہے۔

"ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ" ذٰلِكُمْ جب اس طرح آتا ہے تو یہ پورے جملے کا قائم مقام ہوتا ہے اور اس کے بعد جو حرفِ ربط آتا ہے اس کا تعلق اس مخفی مضمون سے ہوتا ہے جو اس کے اندر مضمر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا کی تائید و نصرت کی یہ شانیں جو ظاہر ہوئیں یہ تمہارے لیے نقد ہیں اور مزید براں یہ ہے کہ خدا کفار کی ساری چالیں جو وہ ہمارے خلاف چلیں گے بودی ثابت کرتا رہے گا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ جملہ ٹھیک ٹھیک اوپر کے جملہ "ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ" کا متقابل جملہ ہے یعنی کفار کے لیے یہ چپت نقد ہے جو ان کو بدر میں لگی اور تمہارے لیے یہ فتح عظیم نقد ہے جو تمہیں حاصل ہوئی اب آگے ان کے لیے دوزخ ہے اور تمہارے لیے یہ بشارت کہ کفار کی سازشوں کے تمام تار و پود بکھر جائیں گے اور دین حق کا بول بالا ہوگا۔

جنگ بدر کفار کی ایک سازش تھی

"كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ" کے الفاظ سے وہ بات صاف نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے پیچھے اشارہ کیا ہے کہ یہ جنگ قریش کے لیڈروں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے قافلۂ تجارت کی حفاظت کا بہانہ تراش کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ آگے آیت ۴۲ کے تحت واضح ہوگا، بروقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سازش سے باخبر کر دیا اور مسلمان مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کو "کید" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی چال اور سازش کے ہیں۔ آگے آیت ۴۸ سے انشاءاللہ یہ بات بھی ثابت ہو جائے گی کہ اس سازش میں یہود بھی شریک تھے۔

اجزا کی وضاحت کے بعد آیت کے سیاق و سباق پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اوپر کی آیات میں مسلمانوں کو جس جاں بازی و سرفروشی کی دعوت دی گئی ہے یہ اسی کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ تم کیوں جان چراؤ اور کیوں پیٹھ دکھاؤ جب کہ تم نہیں لڑتے بلکہ تمہاری طرف سے خدا لڑتا ہے۔ لڑتا دراصل خدا ہے البتہ وہ تمہارے لیے میدان فراہم کرتا ہے کہ تمہارے جوہر نمایاں ہوں اور تم دین و دنیا دونوں کی سرفرازی حاصل کرو۔

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ
وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۹)

جنگ بدر فیصلہ کی میزان

اس آیت میں براہ راست قریش کو مخاطب کر لیا گیا ہے کہ بولو، اب کیا کہتے ہو؟ تم ہی تو کہتے تھے کہ اس جنگ میں جو جیتیا وہ حق پر سمجھا جائے گا تو فتح تمہارے سامنے آ گئی۔ یہ بات بھی یہاں ملحوظ رہے کہ قریش کے لیڈروں نے اپنی کثرتِ تعداد کے نشہ میں اس موقع پر خوب بڑھ بڑھ کے تقریریں کیں۔ چونکہ

ان کو اپنی فتح کا سو فی صدی یقین تھا اس وجہ سے انھوں نے اس جنگ کو فیصلہ کی میزان ٹھہرا لیا کہ یہ میزان جو فیصلہ کر دے گی وہ اس کو بے چون و چرا تسلیم کر لیں گے۔ ابوجہل اس جنگ کے برپا کرنے میں سب سے زیادہ سرگرم تھا۔ اس کی یہ دعا کتابوں میں مذکور ہے کہ اللّٰھم اقطعنا للرحم فاحنہ الغداۃ (اے اللہ فریقین میں سے جو سب سے زیادہ قطع رحم کا مجرم ہوا ہے تو کل اس کو کچل دیجیو) قرآن نے قریش کی انھی لن ترانیوں کو سامنے رکھ کر کہا کہ اگر اس جنگ کی فتح پر فیصلہ کا انحصار تھا تو اس قاضی کا فیصلہ تو صادر ہو گیا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ غزوۂ بدر کی اسی خاص نوعیت کی بنا پر قرآن نے اس کو یوم الفرقان سے تعبیر فرمایا ہے یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والی جنگ۔ آگے آیت ۳۲ کے تحت یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ قریش علانیہ بڑی ڈھٹائی سے یہ کہتے تھے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت حق ہے تو خدا ہم پر پتھر برسا دے یا کوئی اور عذاب ہم پر آ جائے تب ہم مان لیں گے۔

نصیحت اور فضیحت دونوں وَإِن تَنتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ میں نصیحت بھی ہے، فضیحت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ بہتر ہے کہ اس سے سبق لو اور اگر سبق نہ لیا تو یاد رکھو کہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑو گے اپنی ہی شامت بلاؤ گے۔ وَإِن تَعُودُوا نَعُدْ میں کھلی ہوئی دھمکی ہے کہ اگر تم نے اس قسم کی شرارت پھر کی تو یاد رکھو کہ ہم کہیں چلے نہیں جائیں گے، تمھارا سر کچلنے کے لیے اسی طرح ہم پھر آ موجود ہوں گے۔ وَلَن تُغْنِيَ عَنكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ اور تمھاری جمعیت تمھارے کچھ کام نہ آسکے گی، خواہ کتنی ہی زیادہ ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ واحد چیز جو تم کر سکتے ہو وہ یہی ہے کہ آیندہ مزید قوت و شوکت کے ساتھ حملہ کرو، سو یہ چیز بھی تمھارے کچھ کام آنے والی نہیں۔ بس یہ ہو گا کہ ہماری بھٹی کے لیے کچھ اور ایندھن فراہم کر کے لاؤ گے۔ وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ، یہ ٹکڑا ساری آیت کی جان ہے اور اس کے دو لفظوں میں کفار کے لیے دھمکیوں کا اور اہل ایمان کے لیے بشارتوں کا ایک جہان ہے۔ فرمایا کہ اب آئے جس کو آنا ہو اور لڑے جس کو لڑنا ہو اور جمع کرے وہ جتنی جمعیت جمع کر سکتا ہو، اہل ایمان کے ساتھ ہم ہیں ہم!! سبحان اللہ

کیا غم ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۰-۲۸

مسلمانوں کی تربیت و اصلاح اور تطہیر و تنظیم کا وہی مضمون جو اوپر سے چلا آ رہا ہے اپنے تدریجی انکشافات کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور جن لوگوں کی کمزوریاں اس تقریر کی محرک ہوئی ہیں ان کو کچھ کھلی ہوئی دھمکیاں بھی دی گئی ہیں اور مجموعی طور پر مسلم معاشرہ کو بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ اپنے پیش و عقب سے آگاہ رہو، معاشرے کی برائیاں اور بھلائیاں دونوں مشترک ہوتی ہیں۔ اگر کچھ لوگوں نے کوئی فتنہ برپا

کرنے کی کوشش کی اور دوسروں نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہ کی تو بالآخر وہ فتنہ نیک و بد سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اللہ و رسولؐ کی اطاعت پر جم جاؤ، ان یہود کی روش سے بچو جو اپنے رسول کے سامنے تو دعوے کرتے کہ ہم نے مانا لیکن وہ مانتے نہیں تھے۔ پیغمبرؐ کی دعوت حقیقی زندگی کی دعوت ہے اس پر دل و جان سے لبیک کہو۔ جو لوگ پیغمبرؐ کی دعوت سن اور سمجھ کر بھی اس کے لیے اپنے دلوں کے دروازے نہیں کھولتے، ان کے اور ان کے دلوں کے درمیان خدا کا قانون حائل ہو جاتا ہے اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۰-۲۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ
وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ
هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ
الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ
وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا
اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾
وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ
قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ
النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ
وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ ع ۳ ۹ ۱۷

ترجمۂ آیات ۲۰ - ۲۸

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو جب کہ تم سن رہے ہو اور ان لوگوں کی روش نہ اختیار کرو جو دعویٰ تو کرتے کہ ہم نے سنا لیکن سنتے سناتے کچھ نہیں تھے۔ اللہ کے نزدیک بدترین جانور یہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ اور اگر اللہ ان میں کوئی صلاحیت دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق دیتا اور اگر صلاحیت بدوں ان کو سنواتا تو وہ اعراض کرتے ہوئے منہ پھیرتے۔ ۲۰ - ۲۳

اے ایمان والو! اللہ و رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب کہ رسول تمھیں اس چیز کی دعوت دے رہا ہے جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جایا کرتا ہے اور یاد رکھو کہ اسی کی طرف تمھارا اکٹھا ہونا ہے اور بچتے رہو اس فتنہ سے جو مخصوص طور پر انہی لوگوں کو نہیں لاحق ہو گا جنھوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہو گا اور جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۲۴ - ۲۵

اور یاد کرو جب کہ تم تھوڑے اور ملک میں دبے ہوئے تھے، ڈرتے تھے کہ لوگ تمھیں اچک نہ لیں تو خدا نے تمھیں پناہ دی اور اپنی نصرت سے نوازا اور تم کو پاکیزہ روزی دی تاکہ شکرگزار رہو۔ اے ایمان والو، اللہ و رسول سے بے وفائی اور اپنی امانتوں میں خیانت جانتے بوجھتے نہ کرو اور جان رکھو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد فتنہ ہیں اور یہ کہ اللہ ہی کے پاس اجرِ عظیم ہے۔ ۲۶ - ۲۸

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۝ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعْرِضُونَ (۲۰-۲۳)

'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا' خطاب اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن روئے سخن انہی کمزور اور منافق لوگوں کی طرف ہے جن کا ذکر شروع سے چلا آ رہا ہے۔ قرآن کا عام انداز یہی ہے کہ کمزوروں اور منافقوں کی غلطیوں پر گرفت بھی فرماتا ہے تو ان کا ذکر بصیغۂ عام ہی کرتا ہے کہ ان کا فضیحتا نہ ہو اور اگر وہ اصلاح قبول کرنا چاہیں تو قبول کر لیں۔ رہے اچھے لوگ تو وہ بہرحال اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ گویا دوسروں کی غلطیاں ان کے اپنے علم و عمل کو پختہ کرنے کے لیے مزید اسباب فراہم کر دیتی ہیں۔

خطاب عام لیکن روئے سخن خاص لوگوں کی طرف

'اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ' میں فعل اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی اللہ و رسول کی اطاعت اس طرح کرو جس طرح ایمان کا تقاضا ہے۔ 'وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ' یعنی رسول کی عین موجودگی میں، جب کہ دونوں کانوں سے اس کی دعوت سن رہے ہو، اس سے اعراض نہ کرو۔ 'وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ' کے الفاظ اس رویہ کی شناعت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ جب تم رسول کی موجودگی میں ٹھوکر کھاؤ گے تو کل کو تمہارا کیا حال ہو گا؟ جو لوگ پورے دن کی روشنی میں گرتے ہیں ان کے پاس ان کے گرنے کے لیے کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ 'عَنْهُ' کی ضمیر رسول کی طرف لوٹتی ہے حالانکہ اوپر ذکر اللہ و رسول دونوں کا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رسول سے اعراض اللہ سے اعراض کے ہم معنی ہے جس نے رسول سے منہ موڑ لیا اس نے خدا سے منہ موڑ لیا۔ خدا سے تعلق اور اس کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس کا رسول ہی ہے۔

رسول سے اعراض اللہ سے اعراض کے ہم معنی ہے

'وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ' یعنی ان لوگوں کے مانند نہ بنو جو دعویٰ تو 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا کرتے لیکن عمل ان کا 'سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا' پر ہوتا۔ بات اگرچہ اشاروں میں کہی گئی ہے لیکن قرآن کا ہر ذوق رکھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ یہ اشارہ یہود کی طرف ہے۔ قرآن نے بڑی وضاحت سے سورۂ بقرہ میں بتایا ہے کہ یہود کہتے تو 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' ہیں لیکن عمل ان کا 'سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا' پر ہوتا ہے اور اس بات کی بھی قرآن نے تصریح کی ہے کہ ان کا یہ رویہ اس کے رسول کی عین موجودگی میں رہا ہے۔ گویا در پردہ ان منافق قسم کے مسلمانوں کو یہ بتا دیا گیا کہ تمہارا یہ طرز عمل اتباع رسول نہیں بلکہ اتباع یہود ہے۔ ایمان کا دعویٰ ہے تو اس مغضوب قوم کے نقش قدم پر نہ چلو۔

ایک اشارہ یہود کی طرف

'اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ' - اگرچہ لہجہ کی درشتی اوپر والے ٹکڑے میں جھلک رہی تھی لیکن اس ٹکڑے میں بالکل نمایاں ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ خدا کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ مطلب یہ کہ اگر تم سب کچھ

خدا کے نزدیک بدترین جانور

سن کر اسی طرح بہرے گونگے بنے اور رسول کی سنی ان سنی کرتے رہے۔ عقل و فہم سے تم نے کام نہ لیا تو تم خدا کے نزدیک بدترین جانور رہو۔ قرآن نے جگہ جگہ یہود اور مشرکین کو بدترین جانور کہا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ انھوں نے سننے سمجھنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جو گروہ بھی ان کی روش اختیار کرے گا وہ انھی میں سے ہے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ انسان کا اصلی وصف امتیازی اس کا سننا سمجھنا ہی ہے۔ اس وصف سے یہ اپنے کو محروم کرے تو بس یہ دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہی ہے اور جانور بھی بدترین جانور۔ بدترین اس لیے کہ جانور خواہ کتنا ہی برا ہو وہ اپنی جبلت پر قائم رہتا ہے اور اپنے محل میں اس کی ایک قیمت اور اس کی ایک افادیت ہے لیکن انسان اپنی خصوصیت نوعی سے محروم ہو جائے تو اس کے آگے شیطان بھی اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ یہ عقل و بصیرت سے کام لے تو جس طرح اس کے عروج کی کوئی حد نہیں اسی طرح عقل و بصیرت سے محروم ہو جانے کی صورت میں اس کی پستی کی بھی کوئی انتہا نہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ — وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ یہ ایک دفع دخل مقدر یعنی ایک پیدا ہونے والے شبہے کا برسر موقع جواب ہے۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب سننے سمجھنے ہی پر انسان کی انسانیت کا انحصار ہے اور اس سے محرومی خدا کو اس درجہ ناپسند ہے کہ اس سے محروم ہو کر انسان اس کے نزدیک بدترین جانور بن جاتا ہے تو وہ اپنی قدرت سے ان کے کان کھول کیوں نہیں دیتا اور ان کی عقل پر پڑے ہوئے پردے ہٹا کیوں نہیں دیتا؟ اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ اللہ اگر ایسے لوگوں کے اندر کوئی صلاحیت پاتا تو ان کو سننے سمجھنے کی توفیق دیتا۔ یہ صلاحیت ان کے اندر اس نے نہیں پائی اس وجہ سے ان کو توفیق نہیں بخشی۔ یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت ہم بار بار کر چکے ہیں کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں خدا کا قانون یہ ہے کہ اس نے ہر انسان کے اندر خیر و شر کے امتیاز کی صلاحیت بخشی ہے جو لوگ اس کو زندہ رکھتے اور اس سے کام لیتے ہیں ان کو مزید ہدایت ملتی ہے اور وہ درجہ بدرجہ علم و عمل میں ترقی کرتے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ان لوگوں کا حال ہوتا ہے جو خدا کی اس ودیعت کردہ فطری صلاحیت کو ضائع کر بیٹھتے ہیں ان کو مزید ہدایت ملنا تو الگ رہا، قانون الٰہی یہ ہے کہ ان کو جو ہدایت فطرت سے ملی ہوئی ہوتی ہے وہ بھی سلب ہو جاتی ہے۔ سیدنا مسیح نے اس حقیقت کو نہایت بلیغ پیرایہ میں یوں سمجھایا ہے کہ جو غلام ایک پیسہ میں چور ثابت ہوا اس کو اس کا مالک ایک لاکھ کی امانت کیسے سونپے گا؟

ہدایت و ضلالت کے باب میں — وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ یعنی اگر بدون اس صلاحیت کے خدا ان کے اندر ہدایت ڈالنا تو ٹھونسنے کو تو وہ ڈال دیتا لیکن وہ ان کے اندر جڑ نہ پکڑتی، ان کی طبیعتیں اس سے اباء کرتیں

بالآخر وہ اس کو اگل دیتے۔ غذا کتنی ہی صالح ہو لیکن معدہ فاسد ہو چکا ہو تو وہ اس کو قبول نہیں کرتا۔ آدمی لقمہ حلق سے اتار تو لیتا ہے لیکن بڑی جلدی قے کر دیتا ہے۔ ایک پودے کی صحیح نشوونما کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ذات سے تندرست ہو بلکہ اس کے لیے زمین کی زرخیزی بھی مطلوب ہوتی ہے۔ ایک مالی اگر ایک بنجر زمین میں عمدہ سے عمدہ پودا لگا دے تو لگانے کو تو وہ لگا دے گا اور چند روز وہ پودا اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل پر زندہ بھی رہے گا لیکن جب زمین کے اندر سے اس کے مزاج کے مطابق اس کو مطلوب غذا نہیں ملے گی تو بالآخر وہ سوکھ جائے گا۔ ٹھیک یہی حال نیکی اور ہدایت کے بیج کا بھی ہے۔ یہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق نشوونما صالح فطرت کی زمین کے اندر پاتا ہے۔ اگر کسی شخص کی فطرت کی زمین شور ہو چکی ہو تو یہ بیج ڈالنے کو تو قدرت اس کے اندر بھی ڈال سکتی ہے لیکن قدرت ہی کا قانون یہ ہے کہ وہ اس کے اندر نشوونما نہ پا سکے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۲۴)

اللہ و رسول کی دعوت حقیقی زندگی کی دعوت ہے

اوپر گزر چکا ہے کہ انسان کی انسانیت کا انحصار اس کی عقل و بصیرت پر ہے اور اس کی زندگی عبارت ہے اس کی روح اور اس کے دل کی زندگی سے۔ اگر وہ صحیح بات سوچنے سمجھنے سے عاری اور کلمۂ حق سننے اور ماننے سے محروم ہو جائے تو درحقیقت وہ اپنے منشائے تخلیق کے اعتبار سے مردہ ہے، چنانچہ قرآن نے کفار کو جگہ جگہ مردہ کہا ہے۔ اللہ و رسول کی دعوت حقیقی زندگی کی دعوت ہوتی ہے اسی کو قبول کرنے سے بصارت کو بصیرت نصیب ہوتی ہے۔ اسی سے عقل کو وہ نور حاصل ہوتا ہے جو آفاق و انفس کے اسرار و حقائق سے اس کے لیے پردے اٹھاتا ہے۔ اسی سے دل کو وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جو اس کو ایک مضغۂ گوشت سے تجلیات و انوار الٰہی کا ایک آئینہ بنا دیتی ہے۔ فرمایا کہ اللہ و رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو اس لیے کہ اسی سے تم کو حقیقی اور جاوداں زندگی حاصل ہو گی۔ سیدنا مسیحؑ نے اس حقیقت کو یوں واضح فرمایا کہ انسان روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے اس مضمون کی وضاحت انعام کی آیت ۱۲۲۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ الآیہ کے تحت ہو چکی ہے۔

ایک نہایت سخت تنبیہ

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ یہ تنبیہ ہے اور بڑی ہی سخت تنبیہ ہے ان لوگوں کے لیے جو کسی دعوت خیر بالخصوص پیغمبر کی حیات بخش دعوت کی قدر نہیں کرتے بلکہ گونگے بہرے بن جاتے ہیں۔ فرمایا کہ یاد رکھو، جو لوگ یہ روش اختیار کرتے ہیں ان کے اور ان کے دلوں کے درمیان خدا حائل ہو جایا کرتا ہے۔ خدا کے حائل ہونے سے مراد یہاں خدا کے قانون کا حائل ہو جانا ہے۔ اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جو باتیں خدا کے قانون اور اس کی مقررہ سنت کے تحت ظہور میں آتی ہیں، بسا اوقات اللہ تعالیٰ نے ان کو

براہ راست اپنے فعل کی حیثیت سے تعبیر فرماتا ہے۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ کے تحت یہ بحث تفصیل سے گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دل پھر ایسے عنان گسیختہ اور بے قابو ہو جاتے ہیں کہ وہ ان کو کسی طرح بھی قابو میں نہیں لا سکتے۔ انسان کا دل جب برائیوں کے پیچھے لگتا ہے تو ایک خاص حد تک تو اس کا حال یہ رہتا ہے کہ انسان اگر متنبہ ہو جائے اور اس کو روکنا چاہے تو روک سکتا ہے اور اس کو اصلاح کی راہ پر لگا سکتا ہے لیکن جب اس حد سے دل آگے بڑھ گیا اور انسان کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس کو لگام دے تو پھر نہ آدمی کا ہاتھ باگ پر رہ جاتا ہے اور نہ پاؤں رکاب میں بلکہ وہ دل کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔ نبی کی دعوت، جیسا کہ اوپر گزرا، آنکھوں، کانوں اور دلوں کو کھولنے کے لیے سب سے زیادہ مؤثر دعوت ہوتی ہے اس وجہ سے جو لوگ اس دعوت سے اپنے کان بند کر لیں وہ خدا کے اس قانون کی زد میں آجاتے ہیں۔ جس کو قرآن نے 'ختم قلوب' یا 'رین' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہاں قرآن نے کمزور اور منافق قسم کے لوگوں کو اسی چیز سے ڈرایا ہے کہ ابھی فرصت باقی ہے، سنبھلنا چاہو تو سنبھل سکتے ہو، نہ سنبھلے، اسی طرح اپنی بیماریوں کی پرورش کرتے رہے تو پھر تمہارے دل اسی طرح مسخ اور مختوم ہو جائیں گے کہ کوئی صیقل بھی ان پر کارگر نہ ہو سکے گا۔ مزید برآں یہ بات بھی یاد رکھو کہ معاملہ یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ آگے خدا کے حضور میں بھی حاضر ہونا ہے۔ اس دن کے احوال و نتائج کو بھی سوچ لو۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

ہر شخص پر معاشرے کی اصلاح کی بھی ذمہ داری ہے

یہ خطاب پورے معاشرے سے عموماً اور ان لوگوں سے خصوصاً ہے جن پر انفرادی اصلاح کا رجحان غالب تھا اور اس رجحان کے سبب سے انھیں اس امر سے کچھ زیادہ تعلق خاطر نہ تھا کہ دوسرے لوگ کیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جھنجھوڑنے کے لیے فرمایا کہ اپنے معاشرے کے اندر ابھرنے والی خرابیوں سے بے تعلق نہ رہو بلکہ اپنے امکان اور اپنی صلاحیت کے حد تک اس کی اصلاح کی کوشش کرو اس لیے کہ معاشرے میں اگر کوئی خرابی جڑ پکڑ لے تو وہ بالتدریج ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور جب وبائے عام کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اس کے برے اثرات و نتائج انہی لوگوں کی حد تک محدود نہیں رہتے جو بالفعل ان برائیوں میں ملوث ہوتے ہیں بلکہ ان خرابیوں پر راضی یا خاموش رہنے والے بھی ان کی زد میں آجاتے ہیں اگرچہ وہ عملاً ان میں مبتلا نہ ہوں۔

اس حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کشتی کے مسافروں کی تمثیل سے سمجھایا ہے کہ اگر کچھ لوگ ایک کشتی میں سفر کریں، کچھ اس کے اوپر کے حصے میں، کچھ نیچے والے حصے میں، نیچے والے یہ محسوس کر کے کہ انھیں پانی کے لیے اوپر جانے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے، یہ فیصلہ کریں کہ ہم کیوں نہ کشتی کے نیچے کے حصے میں سوراخ کر لیں اور اوپر والے یہ خیال کر کے کہ وہ اپنے حصے میں سوراخ کر رہے ہیں ہمیں اس سے کیا سروکار، اس پر خاموش رہیں تو نیچے والوں کے اس فعل کے نتیجہ میں جب کشتی ڈوبے گی تو اوپر والوں اور

پیچھے والوں دونوں کو لے کر ڈوبے گی۔

اس بنیاد پر اسلام نے ہر شخص پر دوسروں کو برائی سے روکنے رہنے کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے جو شخص بھی کوئی برائی دیکھے، اگر ہاتھ سے اس کو روک سکتا ہو تو ہاتھ سے روکے، اگر ہاتھ سے نہ روک سکتا ہو تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے۔ اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دل سے اس کو برا سمجھے۔ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

یہ آیت جس سیاق میں آئی ہے اگر اس سیاق پر نظر ڈالیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو حق کو ماننے کا زبان سے تو مدعی ہے لیکن اس کے مطالبات پورے کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ ان کو قرآن نے اس بات سے ڈرایا ہے کہ ایسے لوگ اگر اپنے رویے کی اصلاح نہیں کرتے تو خدا کا قانون ان کے اور ان کے دلوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو حق کو مانتے ہیں لیکن اس حق سے انھیں اتنا لگاؤ نہیں ہوتا کہ وہ اس کی خاطر دوسروں کی ناراضگی مول لینے کے لیے تیار ہوں، ان لوگوں کو اس بات سے ڈرایا کہ اگر معاشرے میں کوئی برائی پھیل گئی تو اس کے نتائج بد سے یہ لوگ بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ محفوظ صرف وہ لوگ رہیں گے جو اپنی صلاحیت کی حد تک اپنا حق نصیحت ادا کرتے رہیں گے۔ قطع نظر اس سے کہ کوئی ان کی بات سنتا ہے یا نہیں اور خوش ہوتا ہے یا ناخوش۔

'وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ' یہ پاداش عمل کے قانون کے بے لچک اور بے رو رعایت ہونے کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے قوانین جس طرح جسمانیات و مادیات میں بے لچک ہیں اسی طرح اخلاقیات میں بھی بے لچک ہیں۔ فاسد آب و ہوا میں سانس لینے والا جس طرح آب و ہوا کے فساد سے لازماً متاثر ہوتا ہے اگر وہ ضروری احتیاطیں نہ کرے، اسی طرح بُرے ماحول میں زندگی گزارنے والا اس کے برے عواقب کی زد میں آجاتا ہے، اگر وہ شرطیں وہ ملحوظ نہ رکھے جو اوپر مذکور ہوئیں۔ اس معاملے میں قانون الٰہی کسی کی رعایت اور کسی کی جانبداری نہیں کرتا۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲۶)

ابتدائے اسلام میں مسلمانوں پر ... کے انعامات

اطاعت اللہ اور اطاعت رسولؐ کے جس مطالبہ سے یہ کلام چلا ہے اس کو مؤکد کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اپنے انعامات گنائے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اللہ و رسولؐ نے جس راہ کی تمھیں دعوت دی ہے اب تک تم نے دیکھا کہ اس راہ میں ہر قدم پر اس نے تمھیں سہارا دیا ہے۔ تم تھوڑے تھے، کمزور اور دبے ہوئے تھے، ڈرتے تھے کہ قریش تمھیں اچک نہ لیں تو خدا نے تمھیں مدینہ میں پناہ دی، بدر میں اپنی خاص نصرت سے تمھیں نوازا، تمھارے لیے پاکیزہ معاش و معیشت کی راہیں کھولیں۔ یہ سب باتیں مقتضی ہیں کہ تم خدا کے شکر گزار اور اس کے دین کے کارگزار بندے بنو۔ اس اندیشے میں مبتلا نہ ہو کہ

اس راہ پر چل کر تم کسی خطرے میں پھنس جاؤ گے۔ جس نے اب تک تمہارے ساتھ اتنا اچھا معاملہ کیا ہے، یہ گمان نہ کرو کہ وہ آیندہ تمہارے ساتھ کوئی برا معاملہ کرے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۲۷-۲۸)

ہر عہد ایک امانت ہے

یہ آیت ٹھیک آیت ۲۶ کے مقابل میں ہے۔ اس میں جس بات کا مطالبہ کیا گیا ہے اس کے ضد سے اس میں روکا گیا ہے۔ 'لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ' میں جس شکر گزاری کا حق یاد دلایا گیا ہے اس کے منافی رویہ سے اس میں باز رہنے کی تاکید ہے۔ ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ شکر کی اصلی حقیقت خدا کا حق پہچاننا، اس کا اعتراف کرنا اور خلوص کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے۔ اس کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ آدمی اللہ و رسول سے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا اقرار کر کے بے وفائی اور غداری نہ کرے بلکہ ہر حال میں اس عہد کو پورا کرے۔ ہر عہد ایک امانت ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی خلاف ورزی خفیہ ہو یا علانیہ، خیانت ہے۔

لفظ امانت کا وسیع مفہوم

'وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' یہ اسی طرح کا اسلوب بیان ہے جو بقرہ ۴۲ 'وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم بیان کر چکے ہیں کہ لائے نفی کا اعادہ نہ کرنا اس بات کا قرینہ ہے کہ حق اور باطل کو گڈمڈ کرنا اخفائے حق کو مستلزم ہے۔ اسی طرح یہاں ہر چند یہ جملہ 'لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ' کے تحت ہی ہے لیکن صرف نہی کا اعادہ نہیں فرمایا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ و رسول سے خیانت ہی ہے جو لوگوں کے لیے اپنی امانتوں اور ذمہ داریوں میں خیانت کے لیے راہ کھولتی ہے۔ لفظ 'امانت' پر ہم نساء آیت ۵۸ کے تحت تفصیل سے بحث کر آئے ہیں کہ قرآن میں یہ لفظ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ تمام حقوق اور ذمہ داریاں خواہ وہ کسی عہد و اقرار کے تحت عائد ہوتی ہوں یا حق اور ذمہ داری کے معروف فطری قانون کے تحت سمجھی اور مانی جاتی ہوں یا وہ صلاحیتیں اور نعمتیں ہوں جو انسان کو ودیعت ہوتی ہیں، سب اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ فرمایا کہ جانتے بوجھتے ان امانتوں میں کوئی خیانت نہ کرو۔ 'وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' کا ٹکڑا یہاں جس سیاق میں ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ لوگ، جن کی طرف اشارہ ہے جانتے بوجھتے یہ حرکت کر رہے تھے اور مقصود اس ٹکڑے کے لانے سے ان کی مذمت ہے لیکن بجائے خود یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ شریعت میں کوئی فعل جرم اسی وقت بنتا ہے جب اس کا ارتکاب علم اور ارادے کے ساتھ کیا جائے۔

اصل بیماری

'وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ' یہ اصل بیماری کا پتہ دیا ہے کہ جو لوگ خدا اور رسول کی محبت و اطاعت میں کمزور ہیں وہ درحقیقت مال و اولاد کی محبت میں گرفتار ہیں۔ مال و اولاد کی محبت جب اس درجہ غالب آ جائے کہ آدمی ان کے پیچھے خود اس کے حقوق و فرائض سے جی چرانے لگے

جس کے فضل سے مال و اولاد ملے ہیں تو پھر مال و اولاد فتنہ بن جاتے ہیں۔ خدا اور رسول سے بے وفائی ہو یا دوسروں کے حقوق میں خیانت، اگر اس کے اسباب کا سراغ لگایا جائے تو اس کی تہ میں انہی دونوں چیزوں کی حد سے بڑھی ہوئی محبت نکلے گی۔ اس اعتبار سے یہ نفاق کا سب سے بڑا دروازہ ہیں اور اسی پہلو سے ان کو فتنہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس فتنہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اس اجر عظیم کو یاد رکھے جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے محفوظ کیا ہے جو مال یا اولاد کی محبت میں خدا اور رسول سے بے وفائی نہیں کرتے بلکہ جب ان کے سامنے کوئی ایسی آزمائش آتی ہے جس میں ایک طرف خدا اور رسول کی خوشنودی ہو، دوسری طرف مال و اولاد کی محبت تو وہ ہمیشہ خدا اور رسول کی طرف جھکتے ہیں، فرمایا کہ ایسے باوفاؤں کے لیے اللہ کے ہاں بڑا اجر ہے۔

۶۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۹-۴۰

آگے پہلے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ اگر تم اللہ کے عہد و پیمان پر مضبوطی سے قائم رہے، مال و اولاد کی محبت میں پھنس کر تم نے کمزوری نہ دکھائی تو جلد وہ وقت آ جائے گا کہ وہ تمہارے لیے فرقان نمایاں کرے گا اور وہ سارے حجابات چاک ہو جائیں گے جو آج حق کے پوری طرح نمایاں ہونے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد اپنی اس بہترین تدبیر کی طرف اشارہ فرمایا جو اس نے اپنے رسول کو کفار کی متفقہ سازش سے بچانے اور اس کے لیے ہجرت کی راہ کھولنے کے لیے اختیار فرمائی۔ یہ ہجرت غلبۂ اسلام کا دیباچہ اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کی تمہید ہوئی۔ اب تک کفار قرآن کے انذار کا مذاق اڑاتے رہے تھے، وہ کہتے تھے اگر یہ دعوت حق ہے تو اللہ ہم پر کوئی عذاب کیوں نہیں بھیج دیتا؟ لیکن اللہ نے ان پر عذاب نہیں بھیجا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی قوم پر فیصلہ کن عذاب نہیں بھیجتا جب تک پیغمبر ان کے اندر موجود رہتا ہے لیکن اب جب کہ پیغمبر اور مومنین ہجرت کر چکے ہیں عذاب کے آنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی ہے۔

پھر کفار کے مستحق عذاب ہونے کے وجوہ بیان ہوئے ہیں۔ بیت اللہ کی تولیت اور دینداری کے جو دعوے وہ کیے بیٹھے تھے اور جو یہ گمان کیے بیٹھے تھے کہ وہ خدا کے دین کو تھامے ہوئے ہیں، فرمایا کہ اب یہ غلط فہمی ختم ہو جانے کا وقت آگیا ہے۔ اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین سے روکنے اور اس دین کو شکست دینے کے لیے وہ جو زر پاشیاں کر رہے ہیں یہ ان کے لیے عنقریب سرمایۂ حسرت بنیں گی۔ وہ دنیا میں شکست کھائیں گے اور آخرت میں اللہ ان سب کو اکٹھا کر کے جہنم میں جھونک دے گا۔

آخر میں قریش کو دھمکی ہے کہ بہتر ہے کہ وہ اپنی روش بدلیں اور اس دعوت کو قبول کر لیں، ورنہ یاد

رکھیں کہ ان کے سامنے بھی وہی انجام آنے والا ہے جو رسولوں کی تکذیب کرنے والی پچھلی قوموں کے سامنے آچکا ہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ ہدایت ہے کہ ان سے جنگ جاری رکھو تا آنکہ فتنہ کا قلع قمع ہو جائے اور اس سرزمین پر اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین باقی نہ رہے۔ اللہ تمہارا یاور و ناصر ہے ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۰-۲۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ
عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۹
وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ
وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۳۰ وَاِذَا تُتْلٰى
عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاۗءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ
اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۳۱ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ
كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً
مِّنَ السَّمَاۗءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳۲ وَمَا كَانَ اللّٰهُ
لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ
يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝۳۳ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ
عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَاۗءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَاۗؤُهٗٓ اِلَّا
الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۴ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ
عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاۗءً وَّتَصْدِيَةً ۭ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا
كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۳۵ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ

يُغْلَبُوْنَ ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿٣٦﴾ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ
مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ
جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٣٧﴾ قُلْ ع ٩ ١٦
لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا
فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٨﴾ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ
فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٣٩﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ
نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿٤٠﴾

ترجمۂ آیات ٢٩-٤٠

اے ایمان لانے والو، اگر تم اللہ سے ڈرتے رہے تو وہ تمھارے لیے فرقان نمایاں کرے گا اور تم سے تمھارے گناہ جھاڑ دے گا اور تمھاری مغفرت فرمائے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ خیال کرو جبکہ کفار تمھارے باب میں سازش کر رہے تھے کہ تم کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ سازش کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر فرما رہا تھا اللہ بہترین تدبیر فرمانے والا ہے۔ ٢٩-٣٠

اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتیں، کہتے، بس سن لیا۔ اگر ہم چاہیں ہم بھی ایسا ہی کلام پیش کر دیں۔ یہ تو بس اگلوں کے فسانے ہیں اور یاد کرو جب انھوں نے کہا کہ اے اللہ اگر یہی حق ہے تیرے پاس سے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب لا۔ اور اللہ ان کو عذاب دینے کا روادار نہ تھا جب کہ تم ان میں موجود تھے اور اللہ ان کو عذاب دینے کا روادار نہیں ہو سکتا جب کہ وہ مغفرت کے طلب گار ہوں۔ اور ان کو کیوں نہ عذاب دے گا جب کہ وہ مسجد حرام سے

روکتے ہیں درآنحالیکہ وہ اس کے متولی نہیں، اس کے متولی تو صرف خدا سے ڈرنے والے ہو سکتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت سے واقف نہیں اور بیت اللہ کے سامنے ان کی نماز سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کے سوا کچھ نہیں۔ تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں۔ ۳۱-۳۵

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے وہ اپنے مال اللہ کی راہ سے روکنے کے لیے خرچ کر رہے ہیں۔ وہ اس کو خرچ کریں گے، پھر یہ ان کے لیے سرمایۂ حسرت بنے گا، پھر یہ مغلوب ہوں گے اور یہ کافر جمع کر کے جہنم کی طرف ہنکائے جائیں گے تاکہ اللہ خبیث کو طیب سے چھانٹ کر الگ کرے اور خبیث کو ایک دوسرے پر ڈھیر کرے، پھر اس کو جہنم میں جھونک دے۔ یہی لوگ نامراد ہونے والے ہیں۔ ۳۶-۳۷

ان کفر کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر یہ باز آ جائیں تو جو کچھ ہو چکا ہے وہ معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہ پھر یہی کریں گے تو اگلوں کے باب میں سنت الٰہی گزر چکی ہے اور ان سے جنگ کرو تاآنکہ فتنہ کا قلع قمع ہو جائے اور سارا دین اللہ کا ہو جائے۔ پس اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر انھوں نے اعراض کیا تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا مولیٰ و مرجع ہے۔ کیا ہی خوب مولیٰ اور کیا ہی اچھا مددگار!! ۳۸-۴۰

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّکُمۡ فُرۡقَانًا وَّ یُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ (۲۹)

'فُرْقَان' کا مفہوم

'فُرْقَان' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو حق و باطل کے درمیان امتیاز کر دے۔ یہ امتیاز پیدا کرنے والی شے داخلی بھی ہو سکتی ہے، خارجی بھی، علمی اور عقلی بھی ہو سکتی ہے، عملی اور واقعاتی بھی۔ قرآن نے دلائل

براہین کو فرقان کہا ہے جیسا کہ بقرہ آیت ۱۸۵ میں ہے، اس لیے کہ ان سے حق و باطل میں امتیاز ہوتا ہے۔ خود قرآن بلکہ اصل تورات کے لیے بھی ایک سے زیادہ مقامات میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس لیے کہ اللہ نے یہ کتابیں حق و باطل کے درمیان امتیاز کے لیے اتاریں۔ اسی طرح اس سورہ کی آیت ۴۱ میں غزوۂ بدر کو فرقان سے تعبیر فرمایا ہے، اس لیے کہ اس جنگ نے واقعات کی دنیا میں یہ دکھا دیا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔

مسلمانوں سے غلبہ کا وعدہ

اس آیت میں مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا جا رہا ہے کہ اگر تم تقویٰ پر مضبوطی سے جمے رہے، یعنی اللہ و رسول کے ساتھ بدعہدی و بے وفائی کے مرتکب نہ ہوئے تو اللہ جلد وہ وقت لائے گا کہ مطلع پر جو غبار نظر آرہا ہے یہ سب چھٹ جائے گا اور حق اس طرح غالب ہو کر چمکے گا کہ دشمنوں کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جائیں گی۔ قرینہ بتا رہا ہے کہ یہاں یہ لفظ اسلام اور مسلمانوں کے کامل غلبہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اگرچہ ایک فرقان کا ظہور معرکۂ بدر میں بھی ہو چکا تھا جس کو مسلمان دیکھ چکے تھے تاہم ابھی باطل دہنے بائیں ہر طرف سے مسلمانوں کو گھیرے ہوئے تھا اس وجہ سے ایک گروہ تذبذب کی حالت میں مبتلا تھا اور یہی تذبذب اس کو ان کمزوریوں میں مبتلا کر دیتا تھا جو اوپر زیر بحث آئی ہیں۔ اس طرح کے مذبذب لوگوں کو حق پر جمانے کے لیے فرمایا کہ وہ وقت دور نہیں ہے جب باطل کی یہ ساری گھٹائیں چھٹ جائیں گی اور آفتاب حق اپنی پوری تابانی سے تمہارے سامنے آجائے گا۔ بس یہ شرط ہے کہ تم اللہ و رسول کی اطاعت اور تقویٰ پر جمے رہو۔

وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ الآیۃ یہاں 'سیّات' سے مراد وہ چھوٹی موٹی غلطیاں اور کوتاہیاں ہیں جو بشر کی بشریت کا لازمہ ہیں۔ فرمایا کہ اگر بڑے جرموں سے تم بچتے رہے تو اللہ تعالیٰ فروگزاشتوں اور کوتاہیوں پر تمہیں نہیں پکڑے گا، وہ بڑے فضل والا ہے۔ کبائر سے بچنے والوں کے صغائر معاف ہو جاتے ہیں۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (۳۰)

'اثبات' کا اصل لغوی مفہوم پابند کر دینا، روک دینا ہے، جس میں قید کر دینا بھی شامل ہے۔

قریش کی سازشوں کی طرف اشارہ

یہ دارالندوہ کی اس سازش کی طرف اشارہ ہے جو قریش کے لیڈروں نے آپ کی دعوت حق کو یک قلم ختم کر دینے کے لیے کی۔ اس کے لیے مختلف لیڈروں کی طرف سے مختلف تجویزیں پیش ہوئیں۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غور و بحث کے بعد قتل کی تجویز پر اتفاق ہوا اور قتل کی یہ تدبیر سوچی گئی کہ قریش کے تمام بڑے خاندان اس میں شریک ہوں تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لوگ قصاص کا مطالبہ کرنے کی ہمت نہ کر سکیں۔

خیر الماکرین کا مفہوم

'وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ' لفظ 'مکر' پر آل عمران آیت ۵۴ کے تحت

بحث گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی طرف جب اس کی نسبت ہوتی ہے تو اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ خدا کی تدبیر دوسروں کی سازشوں پر ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ بظاہر اس تدبیر کو دشمن اپنی ہی فتح مندی کیوں نہ تصور کرے لیکن بالآخر وہ حق کی فتح مندی کے نہایت وسیع دروازے کھول دیتی ہے۔ اس کی بہترین مثال خود یہ واقعۂ ہجرت ہے۔ قریش نے آنحضرت کی ہجرت کے بعد اطمینان کا سانس لیا کہ چلو پہلو کا کانٹا نکل گیا لیکن جلد ہی حالات نے ثابت کر دیا کہ کانٹا نہیں نکلا بلکہ ان کے جسد قومی کی روح نکل گئی۔ اس کے بعد اسلام کو نشوونما کے لیے آزاد فضا مل گئی اور قریش مکہ میں، جیسا کہ تفصیل آگے آ رہی ہے، اپنی قضائے مبرم کے انتظار کے لیے رہ گئے۔

وعدۂ فرقان کی تاکید مزید

یہاں اس واقعہ کو یاد دلانے سے مقصود اسی وعدۂ فرقان کو مؤکد کرنا ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ دیکھنا چاہو کہ خدا اپنی تدبیر و کارسازی سے کس طرح ناموافق حالات کو موافق اور مخالف ہواؤں کو سازگار بنا دیتا ہے تو اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے پیغمبر کی زندگی خود اس کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ ایک وقت تھا جب اسلام کی قسمت صرف پیغمبر کے وجود اقدس اور چند بے یار و مددگار نفوس کے ساتھ وابستہ تھی۔ قریش نے فیصلہ کیا کہ پیغمبر کو قتل کر دیں کہ سارا قصہ ہی تمام ہو جائے۔ اس کے لیے سب نے متفق ہو کر سازش کی لیکن اللہ نے ایسی تدبیر فرمائی کہ پیغمبر اپنے خونی دشمنوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر نکل آئے اور کوئی ان کا بال بیکا نہ کر سکا۔ پھر صرف یہی نہیں ہوا کہ پیغمبر نکل آئے بلکہ واقعات نے ثابت کر دیا کہ سورج گہن سے نکل آیا۔ قریش سمجھے کہ جب پیغمبر اپنی قوم سے جلا وطن ہو کر کسی غیر قوم میں چلے جائیں گے تو ان کی دعوت ایک اجنبی ماحول میں خود بخود مر جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کارسازی سے دکھا دیا کہ اسلام کے پودے کی نشوونما کے لیے سب سے زیادہ زرخیز اور مہر پرور سرزمین یثرب ہی کی سرزمین تھی جس کی طرف کفار نے خود اسلام کو دھکیل کر بھیجا۔ خدا اپنی اسکیمیں اسی طرح بردے کار لاتا ہے۔ دشمن سمجھتا ہے کہ بازی اس نے جیتی، لیکن حقیقت میں داؤں خدا کا کامیاب ہوتا ہے۔ وہ حق کے دشمنوں ہی کے ہاتھوں جب چاہتا ہے وہ کام کرا دیتا ہے جس میں حق کی فتح مندی اور خود دشمن کی موت مضمر ہوتی ہے تو موجودہ نامساعد حالات سے ہراساں نہ ہو۔ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ خدا پر بھروسہ رکھو۔ انہی تاریکیوں کے پردے سے بہت جلد نیر فرقان برآمد ہونے والا ہے۔

خطاب کی ایک بلاغت

اس آیت کا خطاب، جیسا کہ وَاِذۡ یَمۡکُرُ بِکَ سے واضح ہے اگرچہ آنحضرتؐ سے ہے لیکن یہ اپنے موقع و محل اور اپنے مدعا کے اعتبار سے دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک پہلو سے یہ اوپر کے مضمون سے جڑتی ہے، دوسرے پہلو سے آگے آنے والے مضمون کی تمہید ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

خطاب کرکے یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ اب تک قریش جو عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے اور ہم طرح دیے جا رہے تھے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم بے بس تھے بلکہ یہ تھی کہ تم ان کے اندر موجود تھے لیکن اب جب کہ تم ان کے اندر سے نکل گئے تو اب کون سی چیز ہے جو ان کو ہمارے تازیانۂ عذاب سے بچا سکتی ہے؟ اب تو امان کی سپر سے انھوں نے خود اپنے کو محروم کر لیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ اس نازک موقع پر وہ اپنے پیغمبر پر یہ واضح فرما دے کہ اس کا مرتبہ و مقام اللہ کی نظروں میں کیا ہے، اس وجہ سے تقاضائے بلاغت یہ ہوا کہ یہاں اسی کو براہِ راست مخاطب کرکے یہ بات کہہ دی جائے کہ غم نہ کرو کہ انھوں نے تم کو نکال دیا ہے، یہ تو تمھارے ہی صدقے میں جی رہے تھے، اب یہ دیکھ لیں گے کہ ہم ان کی کیسی مرمت کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اس سے اس فرقان کے ظہور کی بشارت بھی امت کو دے دی گئی جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَا ۙ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٣١﴾ وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِن كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِندِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۳۱-۳۲)

قریش کے مطالبہ کا واضح جواب

یہ مضمون اُمّ آیت ۶۹ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہاں یہ آیتیں یہ واضح کرنے کے لیے آئی ہیں کہ قریش کی طرف سے برابر خدا کو کس کس طرح کے چیلنج پر چیلنج دیے جا رہے تھے اور پیغمبر کو زچ کرنے کے لیے کیا کیا شیخیاں بگھاری جا رہی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے چیلنج کے جواب میں ان پر عذاب نہیں بھیجا جس سے ان کی جسارت بڑھتی گئی اور وہ اپنے باطل کو حق باور کرانے کے لیے اور بھی زیادہ دلیر ہو گئے۔ وہ اپنی رعونت کے باعث یہ نہ سمجھ سکے کہ ان کے اس پیہم مطالبہ کے باوجود کہ إِن كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ، ہم نے اب تک ان کو کیوں ڈھیل دی؟ آج وہ سوال کا واضح جواب سن لیں۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ (۳۳)

عذابِ الٰہی کے باب میں سنتِ الٰہی

یہ جواب ہے اس سوال کا جو اوپر مذکور ہوا اور چونکہ مقصود اس موقع پر خاص طور پر پیغمبر کی دل نوازی ہے اس وجہ سے خطاب پیغمبر سے ہوا۔ فرمایا کہ اللہ اس بات کا روادار نہیں ہو سکتا تھا کہ ان پر عذاب نازل فرمائے درآنحالیکہ تم ان کے اندر موجود ہو۔ یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی قوم پر عذاب بھیجنے کے معاملے میں مقرر فرمائی ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ نبی جب تک اپنی قوم کے اندر موجود رہتا ہے وہ قوم کے اندر بمنزلۂ دل کے ہوتا ہے۔ وہ قوم کے لیے اپنے رب سے مغفرت بھی مانگتا رہتا ہے اور قوم کو استغفار کی دعوت بھی دیتا رہتا ہے۔ قوم کے اندر اس کا وجود اس بات کا شاہد ہے کہ ابھی قوم میں زندگی کی رمق باقی ہے۔ اس کی دعوت سے ان لوگوں کو زندگی ملتی ہے

جن کے اندر رجحاناتِ ایمانی قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور ان کا استغفار بھی قوم کے لیے سپر بن جاتا ہے۔ قوم کے اشرار خواہ کتنی ہی شرارتیں اور خدا اور رسول کو کتنا ہی چیلنج کریں، لیکن اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرماتا ہے اور اگر ان کو کسی آفت میں مبتلا کرتا بھی ہے تو اس کی نوعیت ایک تنبیہ کی ہوتی ہے نہ کہ فیصلہ کن عذاب کی۔ لیکن جب قوم اپنی سرکشی میں اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ نبی کے قتل کے منصوبے بنانے لگتی ہے اور اپنے اندر کے صالحین پر زندگی دشوار کر دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ نبی اور اس کے ساتھیوں کو ہجرت کا حکم دے دیتا ہے جس کے بعد قوم اس امان سے محروم ہو جاتی ہے جو نبی اور صالحین کی برکت سے اسے حاصل رہی ہوتی ہے۔ پھر دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت لازماً پیش آ کے رہتی ہے۔ اگر نبی کے اوپر ایمان لانے والے صرف گنتی کے چند نفوس ہی ہوتے ہیں تو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد قوم پر عذابِ الٰہی آ جاتا ہے جو خدا کی زمین کو اس کے ناپاک وجود سے پاک کر دیتا ہے اس لیے کہ باطل محض کی پرورش اس کائنات کی فطرت اور فاطرِ کائنات کی حکمت کے خلاف ہے اور اگر نبی پر ایمان لانے والوں کی تعداد بھی معتدبہ ہوتی ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں ہوا تو اہلِ حق اور اہلِ باطل میں کشمکش شروع ہوتی ہے اور باطل حق سے ٹکرا ٹکرا کر بالآخر ایک دن پاش پاش ہو کر نابود ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرقانِ حق کو پوری طرح نمایاں کر دیتا ہے۔ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ یعنی ہرچند نبی کی ہجرت کے بعد اب ان سے امان اٹھ چکی ہے۔ اب کوئی چیز ان کو عذاب سے بچانے والی نہیں رہ گئی ہے لیکن وہ استغفار کرنے والے بنیں تو خدا انھیں عذاب سے بچائے رکھے گا۔ گویا اوپر والے ٹکڑے میں جو شدید قسم کی تہدید ہے اس ٹکڑے نے اس کو ذرا نرم کر دیا ہے کہ اب بھی ان کے لیے موقع ہے کہ چاہیں تو اپنی روش بدلیں، خدا سے معافی مانگیں اور اپنے آپ کو اس کی پکڑ سے بچا لیں۔ یوں سمجھیے کہ تہدید کے بعد یہ قریش کو دعوتِ استغفار ہے۔ آگے یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔ قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَنْتَهُوا يُغْفَرْ لَهُمْ مَا قَدْ سَلَفَ (ان کفر کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر وہ باز آ گئے تو جو کچھ ہو چکا ہے اس کو معاف کر دیا جائے گا)۔

وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (۳۴ - ۳۵)

وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ ۔ اردو میں اس اسلوب کا مدعا یہ ہوگا کہ آخر ان کو ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ خدا ان کو عذاب نہیں دے گا! یہ قریش کے اس غرورِ باطل پر ضرب لگائی گئی ہے جو خانہ کعبہ کی تولیت اور اس سے متعلق بعض رسوم و خدمات کی ادائیگی کی بنا پر ان کو تھا۔ قوموں کی یہ عجیب قریش کی غلط فہمی

مشترک بدقسمتی رہی ہے کہ انھوں نے اللہ کے دین کو ہمیشہ اپنی خواہشات و بدعات کے سانچہ میں ڈھال کر مسخ کیا لیکن انہی مسخ شدہ رسوم کی پرستش کو اتنی اہمیت دی کہ اپنے آپ کو دین کی محسن، خدا کی چہیتی اور محبوب بنا بیٹھیں اور یہ گمان کیا کہ جب ان کے ہاتھوں خدمتِ دین کے یہ کارنامے انجام پا رہے ہیں تو خدا ان پر کس طرح ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ اسی فتنہ میں یہود مبتلا ہوئے، اسی میں نصاریٰ ہلاک ہوئے، یہی گمراہی قریش کو پیش آئی اور بڑے غم سے کہنا پڑتا ہے کہ اسی فتنہ میں شیطان نے اس امت کو بھی ڈال دیا۔ قریش کو یہ زعم تھا کہ وہ خانۂ کعبہ کے متولی، رفادہ اور سقایا کی خدمتیں انجام دینے والے اور حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ اتنے سارے نسبی و حسبی امتیازات کے بعد خدا کے ہاں مقرب و محترم ہونے کے لیے اور کیا چاہیے۔ اس غرور کے سبب سے پیغمبر کی طرف سے عذاب کے ڈراوے ان پر بڑے شاق گزرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو خانہ کعبہ کا پاسبان سمجھے بیٹھے تھے اور ساتھ ہی یہ زعم بھی ان کو تھا کہ خانہ کعبہ بھی ان کا پاسبان ہے۔

'وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ' فرمایا کہ مسجد حرام کی تولیت کا یہ زعم باطل ان کو کس طرح عذاب سے بچا سکتا ہے۔ جب کہ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ یہ اللہ کے ان بندوں کو اس گھر سے روکتے ہیں جو اس کے سب سے زیادہ حق دار ہیں، جو اصل دینِ ابراہیمی کے حامل ہیں اور جو اس گھر کو توحید کی اذان اور خدائے واحد کی عبادت سے از سرِ نو معمور کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اشارہ مسلمانوں کی طرف ہے جو صرف اس گھر ہی سے نہیں بلکہ اس شہر سے بھی نکالے جا رہے تھے جس میں یہ گھر واقع تھا۔

قریش کے دعوائے تولیتِ بیت اللہ کی نفی

'وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ' یہ ان کے دعوائے تولیت کی نفی کر دی کہ یہ اس گھر کے متولی کہاں سے ہوئے؟ اس کے متولی تو صرف اللہ کے متقی بندے ہی ہو سکتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہ خائن، غدار اور اس گھر کے مقصدِ تعمیر اور اس کی حرمت کے برباد کرنے والے ہیں اس وجہ سے نہ انھیں اس پر مسلط رہنے کا کوئی حق ہے، نہ ان کے نام پر انھیں خدا سے کسی رعایت کی امید کرنی چاہیے۔ اس گھر کی تولیت کے اصلی حقدار ہمارے وہ متقی بندے ہیں جو ان ظالموں کے ہاتھوں اس سے روک دیے گئے ہیں۔

اس مقام پر وہ بات یاد رکھنی چاہیے جو بقرہ ۱۲۴ میں گزر چکی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک عظیم امت کی امامت کے منصب پر سرفراز کرنے کا وعدہ فرمایا تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ کیا یہ منصب میری ذریت کو بھی حاصل رہے گا؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ 'لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ' میرا یہ عہد تمھاری ذریت کے صالحین کے لیے ہے 'ظّٰلِمِيْنَ' اس میں شامل نہیں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس امامت کا مرکز (مثابہ) بیت اللہ قرار پایا اس وجہ سے آپ کی اس دعا اور اللہ تعالیٰ کی تصریح کے بموجب اس گھر کی تعمیر ہی کے وقت یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ اس کی تولیت اور ذریت ابراہیم کی قیادت و امامت کے اصلی وارث صرف وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی توحید پر قائم رہنے والے، اس کے

حدود و قیود کی پابندی کرنے والے اور اس کے عہد و میثاق کا احترام کرنے والے ہوں گے نہ کہ وہ جنھوں نے ملتِ ابراہیمؑ اور بیت اللہ الحرام سب کی آبرو مٹا کر رکھ دی ہے۔ یہاں سیدنا مسیحؑ کے وہ الفاظ بھی یاد رکھیے جو اسی طرح کے موقع پر آنجناب نے بیت المقدس کی تولیت کے مدعی فقیہوں اور پروہتوں کو مخاطب کرکے فرمائے تھے کہ تم نے میرے باپ کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا ڈالا ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ، میں اس عام جہالت و بے خبری کی طرف اشارہ ہے جس میں اہلِ عرب اس وقت مبتلا تھے۔ ایک طویل مدت تک جاہلیت کی تاریکی میں زندگی گزارنے کی وجہ سے وہ اپنی اصل تاریخ بالکل بھلا بیٹھے تھے۔ انھیں قومی تفاخر کے طور پر اتنی بات تو یاد رہی کہ وہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں لیکن اس سے آگے انھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ حضرت ابراہیمؑ اس سرزمین پر کیوں تشریف لائے، ان کی دعوت کیا تھی، وہ جس ملت کے داعی ہوئے اس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں، حضرت اسماعیلؑ کو انھوں نے یہاں کیوں بسایا، خانۂ کعبہ کی تعمیر کس مقصد کے لیے ہوئی اور اس گھر کے تعلق سے ذریتِ اسمٰعیل کو اللہ کے دین کی کیا کیا امانتیں اور کیا ذمہ داریاں سپرد ہوئیں۔ چند معاشرتی رسوم اور حج کے کچھ مناسک جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے چلے آرہے تھے ان میں بھی اتنی تبدیلیاں ہو گئی تھیں کہ اصلی اور ملاوٹ میں امتیاز مشکل ہو گیا تھا۔ خانۂ کعبہ کو انھوں نے اپنا قومی معبد بنا لیا تھا جس کی کلید برداری اور اس کے مختلف شعبوں کی سربراہی وراثت کے طور پر مختلف خاندانوں میں منتقل ہوتی رہتی۔ جن پر آبائی جاگیر کی طرح ان کو فخر بھی ہوتا اور اسی حیثیت سے وہ ان پر متصرف بھی ہوتے۔ قرآن نے ان کی اسی جہالت کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے کہ یہ خانۂ کعبہ کی تولیت کے مدعی تو ہیں لیکن انھیں کچھ خبر نہیں کہ یہ خانۂ کعبہ ہے کیا چیز اور اس کی تولیت کے شرائط کیا ہیں؟

خانۂ کعبہ کی تعمیر کا اصل مقصد

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ۭ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ـــــ یہ ایک مثال بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ نہ یہ خانۂ کعبہ کی تولیت کے اہل ہیں نہ انھیں اس گھر کے مقصدِ تعمیر کا کچھ پتا ہے۔ خانۂ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ نے جس مقصد کے لیے کی تھی اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ یہاں سورۂ ابراہیم کی مندرجہ ذیل آیات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا	اور یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی: اے میرے رب!
الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ	اس سرزمین کو پرامن سرزمین بنا دے اور مجھ کو
نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ	اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے محفوظ رکھ۔
كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ	اے میرے رب! ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کر رکھا ہے
فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ	سو جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (ابراہیم-۱۴: ۳۷)

نافرمانی کرے تو تو غفور رحیم ہے۔ اے ہمارے رب، میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو تیرے محترم گھر کے پاس ایک بن کھیتی کی سرزمین میں بسایا ہے۔ اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں۔ پس لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرے شکرگزار رہیں۔

خانہ کعبہ کے مقصد کی بربادی

اس دعا کے الفاظ پر غور کیجیے تو اس سے واضح ہو جائے گا کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ میں کیوں بسایا تھا، اپنی ذریت کے لیے انھوں نے کیا دعا فرمائی، بیت اللہ کی تعمیر کا مقصد کیا تھا اور ذریت اسمٰعیل کو اس گھر کے جوار میں بسانے سے ان کے پیش نظر کیا مدعا تھا؟ خاص طور پر رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے الفاظ شاہد ہیں کہ جس طرح بیت اللہ اللہ کی عبادت کا مرکز بنایا گیا تھا اسی طرح ذریت اسمٰعیل کو اس گھر کے جوار میں بسانے سے اصل مدعا نماز کا اہتمام و قیام تھا۔ لیکن قریش نے جس طرح بیت اللہ کو شرک و بت پرستی کا ایک گڑھ بنا کے رکھ دیا اسی طرح نماز کی بھی، جس کی خاطر ہی انھیں یہاں بسایا گیا تھا، بالکل آبرو مٹا کر رکھ دی۔ فرمایا کہ ان کی نماز کیا ہے، سیٹی بجانا اور تالی پیٹنا۔ مُکاء، بمکو، مکاءٌ کے معنی شسکارنے اور منہ سے سیٹی بجانے کے ہیں۔ تصدیہ کے معنی تالی پیٹنے کے ہیں۔ قرآن نے نہایت بلاغت سے ان کی عبادت کی ظاہری ہیئت ہی سے نمایاں کر دیا کہ بھلا اس مسخرا پن کو نماز سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ صورت بین حالت مپرس۔ ہم کسی دوسرے مقام میں اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ جانچنے کے لیے کہ کیا بات دین کی ہے اور کیا نہیں ہے جہاں باطنی کسوٹیاں ہیں وہیں ظاہری کسوٹیاں بھی ہیں۔ اگر کوئی شخص دین کا ذوق رکھتا ہو تو بہت سی بدعتوں کو ان کی ظاہری ہیئت ہی سے پہچان جاتا ہے کہ ان خرافات کو دین سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ تعزیہ داری کے رسوم مزاروں پر ہونے والی خرافات اور متصوفین کی مجالس کی حرکتیں، ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کی لغویت کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی علمی کاوش کی ضرورت ہو۔ ہر صاحب ذوق بیک نظر دیکھ کر فیصلہ کر لیتا ہے کہ ان چیزوں کو دین سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں ہو سکتا۔ دین کی ہر بات میں وقار، متانت، فروتنی، خشیت اور پاکیزگی کی جھلک اور معرفت، حکمت، دانش اور روحانیت کی مہک ہوتی ہے۔ جس کی آنکھوں میں کچھ بصیرت اور جس کی روحانی قوت شامہ میں ذرا بھی زندگی ہو تو وہ صرف دیکھ اور سونگھ ہی کر جان جاتا ہے کہ فلاں چیز دین کی نہیں ہے۔ علمی تحقیق و کاوش کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے اور اس کے وسائل و ذرائع الگ ہیں۔ یہاں قرآن نے یہی دکھایا ہے کہ یہ ان مدعیان تولیت کعبہ کی نماز ہے جس کی صورت ہی گواہی دیتی ہے کہ یہ شیطان کی ایجاد ہے۔ اس میں اس نماز کی ادنیٰ جھلک بھی نہیں ہے جس کے

اہتمام و قیام کے لیے یہ یہاں بسائے گئے تھے اور جس کی خاطر خدا کا یہ گھر ان کی تحویل میں دیا گیا تھا۔

مشرکانہ عبادت کے اجزاء

یہ شتنکارنا، سیٹی بجانا، سنکھ بجانا، ناقوس بجانا سب ایک ہی نوع کی چیزیں ہیں۔ یہ چیزیں شروع سے مشرکانہ عبادت کے اجزا میں سے ہیں۔ یہ تحقیق مشکل ہے کہ ان کے پیچھے کیا تصور کارفرما رہا ہے، ممکن ہے یہ حرکتیں بھوت بھگانے کے لیے اختیار کی گئی ہوں۔ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ قریش نے سارے عرب پر اپنی مذہبی سیادت جمانے کے لیے یہ چالاکی کی تھی کہ تمام قبیلوں کے بت خانہ کعبہ اور اس کے جوار میں جمع کر دیے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ بت آئے تو ان کے ساتھ ان کی پرستش کے آداب و رسوم بھی آئے۔ بالآخر بات یہاں تک پہنچی کہ ابراہیمی نماز تو حرم سے بالکل خارج کر دی گئی، یہاں تک کہ اس کے جاننے والے بھی باقی نہیں رہ گئے، البتہ سیٹی اور تالی بجانے کی حماقتیں باقی رہ گئیں۔

قریش کو تہدید

فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ اوپر وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ سے جو بات بصیغۂ غائب شروع ہوئی تھی، قریش کے مذکورہ جرائم گنانے کے بعد وہی بات قریش کو مخاطب کر کے کہہ دی گئی اور اس خطاب میں تہدید کے پہلو سے جو بلاغت ہے وہ واضح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خبط ذہن سے نکالو کہ تم خانہ کعبہ کے متولی اور اس کے پاسبان ہو۔ اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنو۔ تمہارے کفر اور تمہاری خیانت و بدعہدی کی ایک پوری تاریخ بن چکی ہے تو اب اس کی پاداش میں خدا کا عذاب چکھو۔ اس میں اشارہ اس چپت کی طرف بھی ہے جو بدر میں ان کو لگی اور آئندہ جو طمانچے لگنے والے ہیں ان کی دھمکی بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب خدا کی مار پڑنی شروع ہو گئی ہے تو یکے بعد دیگرے چکھتے جاؤ اور گنتے جاؤ۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ۝ لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (۳۶-۳۷)

خدا کا انتقام بے پ

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ الآية اب یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ اس وقت قریش کے لیڈروں میں اسلام کے مٹانے کے لیے جو جوش و خروش ہے اور اس جوش میں وہ بڑی فیاضی سے جو اپنی دولت لٹا رہے ہیں، یہ چیز بھی اس فرقان حق کے نمایاں ہونے میں مانع نہ ہو سکے گی جس کا اہل ایمان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے تھی کہ فی الواقع قریش کے لیڈروں نے بدر کے موقع پر بڑی دریا دلی دکھائی تھی، جنگ کا سامان اور فوج کی رسد فراہم کرنے میں ہر سردار نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ کمزور قسم کے مسلمانوں پر یہ چیز بھی اثر انداز ہوئی کہ قریش کے پاس تعداد اور سامان جنگ کی کثرت بھی ہے، مال کی بہتات بھی ہے اور خرچ کرنے کے لیے جوش و خروش بھی ہے، بھلا ایسے لوگوں سے تھوڑے سے بے سر و سامان مسلمان کیا مقابلہ کر

سکیں گے؛ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ راہِ حق سے روکنے کے لیے یہ زرپاشیاں جو ہو رہی ہیں ان سے مرعوب نہ ہو۔ ان خزف ریزوں اور ٹنکوں سے اس سیلاب کے مقابل میں بند نہیں باندھا جا سکے گا جو آ رہا ہے۔ بے شک انھوں نے بڑی فیاضی سے خرچ کیا ہے اور ابھی اور بھی یہ خرچ کریں گے لیکن ان تمام زرپاشیوں کا حاصل کفِ افسوس ملنے کے سوا اور کچھ نہ نکلے گا۔ یہ بہت جلد منہ کی کھائیں گے۔ دنیا میں ان کے لیے شکست مقدر ہو چکی ہے اور آخرت میں یہ جہنم کی طرف ہانک کے لے جائے جائیں گے 'یُحْشَرُوْنَ' کے ساتھ 'اِلٰی' کے صلہ نے اس کے اندر ہانک کرلے جائے جانے کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کا لحاظ رکھا ہے۔

'لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ' الآیۃ یہ اس فرقان کا بیان ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا۔ وہاں اللہ تعالیٰ سارے خبیث کو طیب سے بالکل الگ کر دے گا۔ پھر خبیث کو ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ڈھیر کر دے گا، پھر اس پورے ڈھیر کو جہنم میں جھونک دے گا۔ 'رکم' کے معنی کسی شے کو ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ڈھیر کرنے کے ہیں۔ کوڑے کرکٹ کو جلانا ہو تو اس کے لیے طریقہ یہی اختیار کیا جاتا ہے، سب کو جمع کر کے تہ بہ تہ ڈھیر کیا جاتا ہے پھر اس کو آگ دکھا دی جاتی ہے۔ تہ بہ تہ جمع کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آگ زیادہ مقدار میں ایندھن پا کر پورے زور سے بھڑکتی ہے اور جمع شدہ انبار کا ہر حصہ دوسرے حصہ کو جلانے میں مددگار بن جاتا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہل کفر جس طرح اس دنیا میں تائیدِ کفر میں ایک دوسرے کے پشت پناہ ہیں، اسی طرح جہنم میں ایک دوسرے کو جلانے کے لیے باہم دگر ایندھن کا کام دیں گے۔

'اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ' فرمایا کہ اصلی نامراد یہی ہیں۔ اس لیے کہ دنیا میں ان کا انجام یہ ہوگا کہ یہ اپنے مال برباد کریں گے، کفِ افسوس ملیں گے، ذلت کے ساتھ شکست کھائیں گے اور آخرت میں یہ ہوگا کہ کوڑے کرکٹ کے انبار کی طرح اکٹھا کر کے جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ ۳۸-۴۰

قریش کو دعوتِ استغفار — 'قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ' اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ قریش کو دعوتِ استغفار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اس عذاب سے بچنا چاہتے ہیں جس کی انھیں خبر دی جا رہی ہے تو وہ اس روش سے باز آئیں۔ توبہ اور اصلاح کریں، رسول کی دعوت پر لبیک کہیں۔ اگر انھوں نے اپنی روش بدل لی تو جو شرارتیں اور جو ظلم وہ اب تک کر چکے ہیں اللہ ان کو معاف کر دے گا، ان کی بنا پر وہ کسی عذاب میں نہیں پکڑے جائیں گے۔

ترغیب کے بعد ترہیب — 'وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ' یہ ترغیب کے بعد ترہیب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ

باز نہ آئے، اسی طرح شرارتیں کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ وہ بھی اسی سنت الٰہی سے دوچار ہوں گے جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی پچھلی قومیں دوچار ہو چکی ہیں۔ یہ اشارہ ہے عاد، ثمود، مدین اور قوم لوط وغیرہ کی طرف جن کی تاریخ تفصیل سے اعراف میں قریش کو سنائی جا چکی ہے۔ یہ بات ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں کہ جس قوم میں رسول کی بعثت ہوتی ہے اس پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے وہ قوم اگر اپنے کفر پر اڑی رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو لازماً ہلاک کر دیتا ہے۔ خواہ وہ قہر الٰہی سے ہلاک ہو یا اہلِ ایمان کی تلوار سے۔ رسول اتمام حجت کا سب سے بڑا بلکہ آخری ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے بعد اس کی قوم کو مہلت نہیں ملتی۔

مسلمانوں کو جہاد کا حکم

'وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ' یہ مسلمانوں کو قریش سے جنگ کرنے کا حکم ہے اور اس جنگ کے پیش نظر مقصد دو بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ فتنہ کا خاتمہ ہو جائے اور دوسرا یہ کہ دین تمام تر اللہ کا ہو جائے۔

فتنہ کا مفہوم

'فتنہ' کا لفظ جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، یہاں (PERSECUTION) کے مفہوم میں ہے۔ یعنی مسلمانوں کو بجبر و ظلم دین حق سے روکنے کا وہ سلسلہ جو قریش اور ان کے اعوان نے جاری کر رکھا تھا فرمایا کہ ان سے جنگ کرو اور یہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ اس سرزمین سے اس فتنہ کا استیصال ہو جائے۔ کسی کے لیے اس کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے کہ وہ کسی مسلمان کو اسلام لانے کی بنا پر ستا سکے، عام اس سے کہ وہ امیر ہو یا غریب، آزاد ہو یا غلام۔

سرزمین حرم میں دین الٰہی کا قیام

'دین تمام تر اللہ کا ہو جائے'، یعنی حرم کی سرزمین پر اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین باقی نہ رہے۔ اور یہ ہم وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ بیت اللہ کی تعمیر ملت ابراہیمؑ کے مرکز اور اس کے قبلہ کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ یہ گھر اللہ واحد کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا اور اس کی تولیت کے حق دار وہ لوگ ٹھہرائے گئے جو ملتِ ابراہیمؑ کے حامل اور نماز کے قائم کرنے والے ہوں۔ قریش نے، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، اس گھر کے تمام مقاصد برباد کر کے اس کو ایک بت خانہ بنا ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے مطابق جب اپنا آخری نبی اس قوم میں بھیجا اور اس نے لوگوں کو اصل ملت ابراہیم کی دعوت دی تو قریش کے مفاد پرست لیڈر نبی اور اس کے ساتھیوں کے دشمن ہو گئے اور ان کو اس گھر سے روک دیا حالانکہ اس گھر کی تولیت کے اصلی حق دار وہی تھے نہ کہ قریش جنھوں نے ملت ابراہیمؑ چھوڑ کر دین شرک اختیار کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان غاصبوں اور خائنوں سے جنگ کرو اور یہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ سرزمین حرم پر اللہ کے دین یعنی اسلام کے سوا جو ابراہیمؑ کا دین تھا کوئی اور دین باقی نہ رہ جائے۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں مؤکد فرمایا کہ اس سرزمین پر دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔ اصلاً تو یہ حکم سرزمین حرم کے لیے ہے لیکن کفر و شرک کے اثرات سے اس کی

حفاظت بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ پورا علاقہ کفر و شرک کی مداخلت سے پاک رہے جس میں حرم واقع ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جس طرح مکہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے محترم ہے اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو محترم قرار دیا جس سے اس حکم کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ اس تمام علاقے سے غیر مسلم عناصر بے دخل کر دیے جائیں جس میں حرمین واقع ہیں، چنانچہ اس پورے علاقے سے کفار قریش کا تسلط بھی ختم کر دیا گیا اور پھر بالتدریج یہود اور نصاریٰ بھی یہاں سے نکال دیے گئے۔

قریش کے ساتھ مسلمانوں کی نزاع کی نوعیت

اس سے معلوم ہوا کہ قریش کے ساتھ مسلمانوں کی نزاع کسی جزوی معاملے کے لیے نہیں تھی کہ وہ طے ہو جائے تو نزاع ختم ہو جائے بلکہ اصلاً اس بات کے لیے تھی کہ خانہ کعبہ روزِ اوّل سے ملتِ ابراہیمؑ کا مرکز ہے۔ اس ملت کے سوا کسی اور ملت کے لیے اس سرزمین پر گنجائش نہیں ہے، اس ملت کی تجدید اور بیت اللہ کی تطہیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے قریش ہی کے اندر اپنے آخری رسول کو مبعوث فرمایا تاکہ اس کے ہاتھوں اللہ کا دین کامل ہو اور یہ گھر، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی تھی، تمام عالم کے لیے ہدایت و برکت کا سرچشمہ بنے۔ یہاں ان اشارات پر اکتفا فرمائیے۔ ان شاء اللہ اس کی تفصیل سورۂ برأت اور سورۂ حج کی تفسیر میں آئے گی۔

'فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ'۔ اس 'انتھو' کا مفہوم بھی وہی ہے جو اوپر والی آیت کے تحت بیان ہو چکا ہے۔ یعنی اگر انھوں نے اپنی روش کی اصلاح کر لی تو اللہ تعالیٰ ان کی ماضی کی غلطیوں کو نہیں دیکھے گا بلکہ ان کے مستقبل کے اعمال کو دیکھے گا، اگر انھوں نے اخلاص کا ثبوت دیا تو اس کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کرے گا۔

مسلمانوں سے نصرت کا وعدہ

'وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ' اور اگر انھوں نے اعراض کیا، اپنی اسی ضد اور ہٹ پر جمے رہے تو تمہارا مولا و مرجع اللہ ہے۔ تم ان کی کثرتِ تعداد اور ان کے سرو سامان کی بہتات سے ہراساں نہ ہو۔ خدا نے اپنی شانیں جس طرح اب تک دکھائی ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی شانیں آیندہ بھی دکھائے گا۔ وہ بہترین مولیٰ ہے، اپنی مشکلات میں جو اس سے رجوع کرتے ہیں وہ ان کو کبھی مایوس نہیں کرتا، وہ بہترین مددگار ہے، جن کی مدد کے لیے وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے وہ کبھی شکست نہیں کھاتے۔

۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۱-۴۹

یاد ہو گا اس سورہ کا آغاز انفالِ غنیمت سے متعلق لوگوں کے سوال سے ہوا تھا۔ وہاں سوال کا ایک اصولی جواب دے کر کلام کا رخ مسلمانوں کے ایک گروہ کی ان کمزوریوں کی اصلاح کی طرف مڑ گیا تھا جو اس سوال اور اسی نوعیت کے بعض دوسرے معاملات کی وجہ سے سامنے آئی تھیں۔ اب سوال کے تعلق سے

اموالِ غنیمت کی تقسیم کا ضابطہ بیان فرمایا اور مسلمانوں کو تاکید کی کہ اللہ کی اس تقسیم کو راضی خوشی قبول کرو اس لیے کہ جو کچھ تمھیں حاصل ہوا خدا کی تدبیر اور کارسازی سے حاصل ہوا اور آئندہ جو کچھ حاصل ہوگا اسی کی تدبیر و کارسازی سے حاصل ہوگا۔ یہ نہ خیال کرو کہ یہ سب کچھ تمھاری کارفرمائی ہوتی ہے بلکہ اصل چیز خدا کی تدبیر ہے جس کو وہ تمھارے واسطہ سے بروئے کار لاتا ہے۔

اس کے بعد آئندہ پیش آنے والی جنگوں سے متعلق کچھ ہدایات دی ہیں جو جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بھی ناگزیر ہیں اور جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنے والوں کو دوسرے جنگ آزماؤں سے ممتاز بھی کرتی ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے اور اس امر کو برابر ملحوظ رکھیے کہ اس پوری سورہ میں خطاب اگرچہ بظاہر الفاظ عام ہے لیکن روئے سخن مسلمانوں کے اس گروہ کی طرف خاص طور سے ہے جو ابھی اچھی طرح پختہ نہیں ہوا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۴۱-۴۹

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ
وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ
اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى
الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ
الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ
وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا
كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ
عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ
مَنَامِكَ قَلِيْلًا وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ
فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾
وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ
فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا وَاِلَى اللّٰهِ

ع ۵ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ
رَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا
اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ
دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ
جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَ
قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ
ع ۶ ۲ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ
فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾

ترجمۂ آیات ۴۱ - ۴۹

اور جان رکھو کہ جو کچھ تم غنیمت حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری فیصلہ کے دن، جس دن دونوں جماعتوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۴۱

خیال کرو جب تم وادی کے قریبی کنارے پر تھے اور وہ دور کے کنارے پر اور قافلہ تم سے نیچے تھا اور اگر تم باہم میعاد ٹھہرا کر نکلتے تو میعاد پر پہنچنے میں ضرور تم مختلف

ہو جاتے لیکن اللہ نے فرق نہ ہونے دیا تاکہ اللہ اس امر کا فیصلہ فرمادے جس کا ہونا طے ہو چکا تھا، تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے حجت دیکھ کر ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے۔ بے شک اللہ سمیع و علیم ہے۔ یاد کرو جب اللہ تیری رویا میں ان کو کم دکھاتا ہے، اور اگر زیادہ دکھا دیتا تو تم پست ہمت ہو جاتے اور معاملے میں اختلاف کرتے لیکن اللہ نے بچا لیا، بے شک وہ دلوں کے حال سے باخبر ہے اور خیال کرو جب کہ تمھاری مڈبھیڑ کے وقت ان کو تمھاری نظروں میں کم دکھاتا ہے اور تم کو ان کی نظروں میں کم دکھاتا ہے تاکہ اس امر کا فیصلہ فرمادے جس کا ہونا طے شدہ تھا اور سارے معاملات اللہ ہی طرف لوٹتے ہیں۔ ۴۲-۴۴

اے وہ جو ایمان لائے ہو، جب تمھارا کسی جماعت سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو زیادہ یاد کرو تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں اختلاف نہ کرو کہ تم پست ہمت ہو جاؤ اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے اور ثابت قدم رہو۔ بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے اور ان لوگوں کی مانند نہ بننا جو اپنے گھروں سے اکڑتے اور لوگوں کے آگے اپنی نمائش کرتے نکلے اور جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، حالانکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور یاد کرو جب کہ شیطان نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیئے اور کہا کہ آج لوگوں میں کوئی نہیں کہ تم پر غالب آسکے اور میں تمھارا پشت پناہ ہوں تو جب دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور بولا کہ میں تم سے بری ہوں، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت پاداش والا ہے۔ یاد کرو

جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہتے تھے، ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکے میں ڈال دیا ہے اور جو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں تو اللہ عزیز و حکیم ہے۔ ۴۵-۴۹

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۴۱)

'واعلموا' کا محل

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ 'اِعْلَمُوْا' کا لفظ یہاں جس سیاق میں ہے اس سے اس حکم کی قطعیت اور عظمت واضح ہو رہی ہے جو یہاں بیان ہوا ہے۔ چونکہ اموالِ غنیمت سے متعلق، جیسا کہ سورہ کے شروع میں معلوم ہو چکا ہے، کچھ لوگوں نے نارواقسم کے سوال اٹھا دیے تھے اس وجہ سے پہلے توان کی کمزوریوں پر تفصیل سے تبصرہ کیا، پھر جب ان کے سوال کا جواب دیا تو اس کا آغاز ایک تنبیہی کلمہ سے فرمایا کہ لوگ گوش ہوش سے سنیں اور بادشاہ کائنات کے فرمان کی حیثیت سے بے چون وچرا اور بلا اختلاف و نزاع اس کی تعمیل کریں۔

اموالِ غنیمت کی حیثیت

'غَنِمَ الشَّیْءَ' کے معنی ہیں 'فَازَبِهٖ وَنَالَهٗ بِلَا بَدَلٍ' فلاں چیز بلا کسی عوض کے حاصل کر لی۔ اسی سے 'غنیمت' ہے جس سے مراد وہ مال واسباب ہوتا ہے جو میدانِ جنگ میں کفار سے مسلمان مجاہدین کو حاصل ہوتا ہے۔ میدانِ جنگ میں حاصل شدہ مال واسباب کو 'نفل' یا 'غنیمت' کے الفاظ سے تعبیر کر کے قرآن نے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ یہ جہاد و قتال کا کوئی معاوضہ نہیں ہے بلکہ ایک ضمنی اور زائد فائدہ ہے جو ایک مجاہد کو حاصل ہوتا ہے۔ مجاہد، اللہ کی راہ میں جو جہاد کرتا ہے وہ ایک فرض ادا کرتا ہے اور اس کا اجر اس کو اللہ کے ہاں ملتا ہے جو اس کی ابدی زندگی کے لیے محفوظ ہو گیا۔ رہی یہ چیزیں جو اسے سر راہے حاصل ہو جاتی ہیں تو یہ زوائد ہیں۔ حاصل ہو جائیں تو غنیمت، نہ حاصل ہوں تو نہ ان کی طمع کرے نہ غم۔ قرآن نے یہ تصور دے کر اس جاہلی تصور کی اصلاح کی ہے جس میں اہل عرب اب تک مبتلا رہے تھے کہ وہ جنگ کا اصلی حاصل لوٹ کے مال کو سمجھتے تھے اور اسی چیز سے وہ اس کے نفع و نقصان کا اندازہ لگاتے تھے۔ اس تصور کا کچھ اثر مسلمانوں کے ایک گروہ کے اندر بھی باقی تھا جو بدر کے موقع پر ظاہر ہوا اور قرآن نے اس کی اصلاح فرمائی۔ 'فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ' یہ اس مجمل جواب کی تفصیل ہے جو آیت ۱ میں 'قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ

لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ، کے الفاظ سے دیا گیا ہے۔ وہاں ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ اجمالی جواب دے کر کہ اموالِ غنیمت کی حیثیت انفرادی ملکیت کی نہیں ہے، جیسا کہ جاہلیت میں دستور رہا ہے بلکہ اجتماعی ملکیت کی ہے، کلام کا رُخ اس ذہنیت کی اصلاح کی طرف مڑ گیا تھا جس کا اظہار مسلمانوں کے ایک مخصوص گروہ کی طرف سے ہوا تھا۔ اب یہ اس اجتماعی ملکیت کی تقسیم کا طریقہ بیان فرما دیا۔

اموالِ غنیمت کی تقسیم

فرمایا کہ اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ یعنی جاہلیت کا یہ دستور کہ جو شخص جو مال واسباب لوٹے وہ اس کا ہے، ختم ہوا۔ اب سارا مالِ غنیمت اکٹھا کیا جائے گا اور اس میں سے پانچواں حصہ اللہ و رسول کا حق نکال کر بقیہ مال مجاہدین میں تقسیم ہوگا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں سرداران قبائل لوٹے ہوئے مال میں سے چوتھا لیتے تھے جس کو مِرباع کہتے تھے، اور یہ مال ان کے ذاتی تصرف میں آتا تھا۔ اسلام نے مالِ غنیمت میں سے اللہ و رسول کا حق صرف پانچواں حصہ رکھا اور یہ بھی، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، تمام تر معاشرہ کی اجتماعی بہبود کے کاموں کے لیے معاشرہ کو لوٹا دیا۔

اللہ کا حق اور اس کا مصرف

اس پانچویں حصہ کے مصارف کی تفصیل میں سب سے پہلے اللہ کا حق بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ظاہر ہے کہ ہر چیز سے بے نیاز اور غنی ہے۔ اس کے حق کا اصلی مصرف وہ کام ہوں جو اعلائے کلمۃ اللہ، اقامتِ دین اور حفاظت و مدافعتِ ملت کی نوعیت کے ہوں گے۔ زمانہ اور حالات کی تبدیلی سے ان کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن ہر شکل میں اعلائے کلمۃ اللہ کے نصب العین کو مدِنظر رکھنا لازمی ہوگا۔

رسول کا حق اور اس کی نوعیت

دوسرا حق رسول کا بتایا گیا ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات بار بار آتی ہے کہ رسول کا یہ حق بحیثیتِ رسول کے نہیں بلکہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے بیان ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول بھی تھے اور آپ کے ہاتھوں مدینہ منورہ میں جو اسلامی حکومت قائم ہوئی اس کے قائد و سربراہ بھی۔ جہاں تک فریضۂ رسالت کا تعلق ہے اس پر آپ کو اللہ تعالیٰ نے مامور فرمایا تھا اور قرآن میں اس بات کی تصریح ہے کہ اس نے اپنے رسول کی ساری ذمہ داریاں براہِ راست اپنے ہی اوپر لی تھیں لیکن ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے جب کہ آپ کے مبارک اوقات کا لمحہ لمحہ اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں صرف ہو رہا تھا یہ ضروری ہوا کہ اس مال میں آپ کا حق بھی رکھا جائے۔ یہ حق درحقیقت ریاست کے سربراہ کا حق تھا جو حضورؐ کے وصال کے بعد آپ سے آپ حضورؐ کے خلفا اور جانشین کی طرف منتقل ہو گیا۔

ذوی القربیٰ کا حق اور اس کی نوعیت

تیسرا حق 'ذِی الْقُرْبٰی' کا بیان ہوا ہے۔ 'ذِی الْقُرْبٰی' سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار مراد ہیں اور قرابت دار بھی ظاہر ہے کہ وہ قرابت دار ہوں گے جن کی کفالت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ عام اس سے کہ یہ ذمہ داری عرفی و شرعی نوعیت کی ہو یا اخلاقی نوعیت کی جو ہر کریم النفس سربراہِ خاندان پر خاندان کے غریبوں، محتاجوں اور معذوروں کے متعلق اخلاقاً عائد

ہوتی ہے۔ یہ بات اس وسعت و عمومیت سے نکلتی ہے جو ذوی القربیٰ کے لفظ میں ہے اور یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ذِی الْقُرْبیٰ کا یہ حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی قائم رہنے والا تھا۔ اگر یہ آپؐ کی حیاتِ مبارک ہی تک محدود ہوتا تو اس کے مستقل ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

یتیموں اور مسکینوں کا حق اور اس کی نوعیت

چوتھا حق یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا ہے۔ ان کا حق بیان کرتے ہوئے اس 'لِ' کا اعادہ نہیں فرمایا جو اوپر 'اللہ'، 'رسول' اور 'ذوی القربیٰ' تینوں کے ساتھ الگ الگ لگا ہوا ہے بلکہ ان کا ذکر ذوی القربیٰ کے تحت ہی کر دیا ہے۔ اس سے مقصود اس طبقہ کی تشریف اور عزت افزائی ہے کہ گویا یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوی القربیٰ ہی کے تحت ہیں۔ جو لوگ اسلامی نظام کے مزاج سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ یتیموں اور مسکینوں کی حیثیت ایک صحیح اسلامی نظام میں سربراہ ریاست کے کنبے کی ہے۔ سربراہ حکومت کو جس طرح اپنے کنبہ کی فکر کرنی پڑتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کو یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل اس کی ناقابلِ تردید اور زندۂ جاوید شہادت ہے۔ حضرت عمرؓ نے تو کہیں فرمایا بھی ہے کہ ریاست کے مال میں سے میرا حق بس اتنا ہی ہے جتنا ایک یتیم کے متولی کا حق یتیم کے مال میں سے ہے۔ اس حقیقت کا بھی انھوں نے بار بار اظہار فرمایا کہ مملکت کے ہر یتیم و مسکین اور مسافر کی ذمہ داری براہِ راست مجھ پر ہے۔ جس مملکت میں یتیم دھکے کھائیں، مسکین بھوکے سوئیں، مسافر کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو اس مملکت کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے خواہ وہ اسلام کے کتنے ہی بلند بانگ دعاوی کرے۔

غرباء و فقراء کے کاموں کا اجتماعی مقصد

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جو لوگ 'لِ' کو لامِ تملیک کے معنی میں لے کر غرباء، فقراء، یتامیٰ اور مساکین کی اجتماعی بہبود کے کاموں پر ان کے حصہ کے مال کو خرچ کرنے سے روکتے ہیں، ان کی بات عربیت کے پہلو سے کچھ زیادہ وزن دار نہیں ہے۔ حرف 'لِ' عربی میں تملیک ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ متعدد معانی کے لیے آتا ہے جن میں سے ایک معروف مفہوم نفع رسانی اور بہبود کا بھی ہے۔ ہم نے اس پر مفصل بحث اپنے ایک مستقل مقالے میں کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بالکل جائز ہے کہ اسلامی حکومت جن کاموں کو غرباء اور فقراء کی اجتماعی بہبود کے نقطۂ نظر سے مفید پائے ان پر بھی ان کے حصہ کی رقوم جو اس کی تاویل میں آئیں، خرچ کرے۔ انفرادی تملیک ہر حال میں لازمی نہیں ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۔

غزوہ بدر جانچ کی کسوٹی

'یَوْمَ الْفُرْقَانِ' سے مراد غزوۂ بدر کا دن ہے۔ 'یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ' کے الفاظ سے اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔ اس لیے کہ وہی پہلا دن تھا جب مسلمانوں اور کفار کے درمیان جماعتی حیثیت سے تصادم ہوا ہے۔ غزوۂ بدر کو یوم الفرقان سے تعبیر کرنے کی وجہ کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ قریش کے لیڈروں نے خود اس جنگ کو ایک کسوٹی کی حیثیت دے دی تھی کہ جو اس جنگ میں ہارا وہ باطل پر سمجھا

جائے گا، جو جیتا وہ حق پر مانا جائے گا۔ اس طرح خود انہی کی انتخاب کردہ کسوٹی نے حق و باطل کا فیصلہ کر دیا۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ اس جنگ میں تائید الٰہی گوناگوں شکلوں میں اس طرح بے نقاب ہوئی کہ گویا ہر شخص نے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حق کس کے ساتھ ہے اور خدا کس کے پہلو پر ہے۔ 'وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا' سے اسی نصرت الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔

یہ ٹکڑا اوپر والے مضمون ہی کو مؤکد کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تقسیم غنیمت کے باب میں یہ حکم جو تمھیں دیا ہے بے چون و چرا اس کی تعمیل کرو، اگر اللہ پر اور اس نصرت الٰہی پر تمھارا ایمان ہے جو ہم نے حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والی جنگ میں اپنے بندوں پر اتاری۔ چونکہ روئے سخن ان نکتہ چینوں کی طرف خاص طور سے ہے جنھوں نے اموال غنیمت سے متعلق سوال اٹھائے تھے، اس وجہ سے فرمایا کہ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس قسم کے سوالات غمازی کرتے ہیں کہ ابھی تمھارے اندر ایمان راسخ نہیں ہوا ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یوں نہیں فرمایا کہ اگر تم اس نصرت الٰہی پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے تم پر اتاری بلکہ یوں فرمایا کہ 'اپنے بندے پر اتاری' جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ کسی گروہ کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ کامیابی جو حاصل ہوئی ہے یہ اس کا کارنامہ ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے اللہ کی کارسازی اور اس رسول کی برکت سے ہوا ہے جس کی مدد کے لیے اللہ نے اپنی غیبی فوج بھیجی۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ نہ اللہ کسی کا محتاج ہے اور نہ اس کا رسول کسی کا دست نگر ہے۔ اللہ جب چاہے گا اپنے رسول کی مدد کے لیے اپنی افواج قاہرہ بھیج دے گا۔

اِذۡ اَنۡتُمۡ بِالۡعُدۡوَةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ بِالۡعُدۡوَةِ الۡقُصۡوٰى وَالرَّكۡبُ اَسۡفَلَ مِنۡكُمۡ ؕ وَلَوۡ تَوَاعَدۡتُّمۡ لَاخۡتَلَفۡتُمۡ فِى الۡمِيۡعٰدِ ۙ وَلٰكِنۡ لِّيَقۡضِىَ اللّٰهُ اَمۡرًا كَانَ مَفۡعُوۡلًا ۙ لِّيَهۡلِكَ مَنۡ هَلَكَ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحۡيٰى مَنۡ حَىَّ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ (۴۲)

غزوۂ بدر میں خدا کی کارسازی

یہ اللہ تعالیٰ کی اس تدبیر و کارسازی کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہوا ہے کہ کس طرح اللہ نے تم کو ٹھیک وقت پر دشمن کے مقابلہ کے لیے محاذ جنگ پر پہنچا دیا کہ وادی کے ایک سرے پر تم پہنچے، دوسرے سرے پر قریش تھے اور تجارتی قافلہ نیچے ساحل سمندر کی طرف سے گزر رہا تھا۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی فوج اور قافلہ کی آمد کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے رویا میں دکھا دیا تھا۔ اسی رویا کی رہنمائی کے مطابق آپ مدینہ سے نکلے اور ٹھیک اس وقت آپ وادی بدر میں پہنچ گئے جب قریش کی فوج قافلہ کی حفاظت کے بہانے وادی کے دوسرے کنارے پر پہنچی۔ فوج کا دشمن کے مقابلہ کے لیے ٹھیک وقت پر اپنے موقع و محل پر پہنچ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ جنگ کا بہت کچھ انحصار اسی پر ہوتا ہے۔ معمولی تاخیر بھی بسا اوقات شکست کے مترادف بن جاتی ہے۔ پھر وقت سے بہت پہلے پہنچنا بھی خطرات اور نقصانات سے خالی

نہیں، اور کچھ نہیں تو مسلمانوں کے لیے رسد کا مسئلہ ہی بڑا مشکل تھا بالخصوص اس زمانے میں جب کہ مسلمان نہتے بھی تھے اور نہایت غریب بھی۔ فریقین اس معاملے میں چالیں بھی بہت سی چلتے ہیں جن سے ان کا مقصود ایک دوسرے کو دھوکہ دینا ہوتا ہے۔ منصوبے کچھ ہوتے ہیں، اعلانِ جنگ اور الٹی میٹم میں ظاہر کچھ کیے جاتے ہیں۔ نشانہ کوئی ہوتا ہے، اشارہ کسی طرف کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس قسم کی تمام چالوں سے محفوظ رکھا اور خاص اپنی رہنمائی میں، ٹھیک وقت پر دشمن کے مقابلہ کے لیے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں ان کا پہنچنا ضروری تھا۔ فرمایا کہ یہ حسن اتفاق خدا ساز تھا۔ اگر تم ایک دوسرے کو اعلان اور الٹی میٹم دے کر نکلتے تو یہ اجتماع اس شکل میں آسان نہ ہوتا۔

'وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا'۔ 'لِيَقْضِيَ' سے پہلے فعل محذوف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی تدبیر و کارسازی سے تم کو اور تمہارے دشمنوں کو اس طرح ایک دوسرے کے آمنے سامنے اس لیے لا کھڑا کیا کہ وہ بات واقع ہو جائے جس کا واقع ہونا اس کی اسکیم میں طے پا چکا تھا۔

خدا کی اسکیم کے فوائد و مصالح

'لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ' یہ وضاحت ہو رہی ہے خدا کی اسکیم اور اس کے فوائد و مصالح کی۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے چاہا کہ قریش اور مسلمانوں میں ایک ٹکر ہو اور وہ فرقان نمایاں ہو جائے جو حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح کر دے تاکہ اس کے بعد جو ہلاکت کی راہ اختیار کریں وہ بھی اتمام حجت کے ساتھ یہ راہ اختیار کریں، جو زندگی کی راہ اختیار کریں وہ بھی ایک روشن دلیل دیکھ کر اختیار کریں۔ ہلاکت اور زندگی سے مراد، ظاہر ہے کہ یہاں روحانی و معنوی ہلاکت اور زندگی ہے۔ حرف 'عن' عربی میں کسی چیز کے منبع و مصدر اور مولد و منشا کا بھی سراغ دیتا ہے۔ بدر کے معرکہ نے اہلِ کفر اور اہلِ ایمان دونوں گروہوں کے سامنے ایک ایسی واضح برہان رکھ دی کہ نہ اہلِ کفر کے لیے کوئی عذر باقی رہ گیا نہ اہلِ ایمان کے لیے کوئی ابہام۔ ان کے لیے ان کا کفر بالکل عریاں ہو کر سامنے آ گیا اور اہلِ ایمان کے لیے ان کا ایمان سورج کی طرح چمک اٹھا۔

'وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ' ان صفات کا حوالہ اس پوری اسکیم کے تعلق سے یہاں آیا ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ کہاں تم، کہاں قریش اور کہاں قافلہ لیکن اللہ تعالیٰ نے سب کے بھید معلوم کر لیے، سب کی سرگوشیاں سن لیں اور سب کے ارادے تاڑ لیے اور پھر سب کو اس طرح جمع کر کے وہ بات پوری کر کے دکھا دی جو اس نے طے کر لی تھی اس لیے کہ وہ سمیع و علیم ہے۔

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۴۳)

پیغمبر کو رویا میں صورتِ حال کا مشاہدہ

یہ دوسری مثال بیان ہو رہی ہے اللہ تعالیٰ کی کارسازی کی کہ اس نے پیغمبر کو رویا میں کفار کی فوج کی تعداد تھوڑی دکھائی اور پیغمبر نے ایک قلیل التعداد جماعت ہی کی حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے اس

کا ذکر بھی کیا، بلکہ جیسا کہ آیت ، میں گزر چکا ہے یہ بھی خوش خبری دے دی کہ یہ قلیل التعداد گروہ مسلمانوں سے مغلوب ہو جائے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے کیا کہ اگر ان کو کثیر تعداد میں دکھایا جاتا جتنے کہ وہ فی الواقع تھے تو پیغمبرؐ لازماً اسی شکل میں مسلمانوں سے ان کا ذکر بھی کرتے جس کا اثر کمزور مسلمانوں پر یہ پڑتا کہ وہ ہمت ہار بیٹھتے اور جنگ کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں مختلف الرائے ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ دلوں کی کمزوریوں سے اچھی طرح باخبر ہے اس وجہ سے اس نے یہ تدبیر اختیار فرمائی تاکہ مسلمانوں کا حوصلہ قائم رہے اور وہ کسی کمزوری کے اظہار سے محفوظ رہیں۔

ایک غلط خیال کی تردید

بعض لوگوں نے یہاں سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کبھی کبھی حضرات انبیاء کو بھی رویا میں کوئی چیز خلاف واقعہ دکھا دی جاتی ہے۔ چنانچہ قریش کی فوج تعداد میں بہت زیادہ تھی لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ تھوڑی دکھائی گئی۔ ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔ رویا وحی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اس وجہ سے پیغمبر کی رویا خلاف واقعہ نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ ہوتا ہے کہ رویا میں کبھی کوئی حقیقت مجاز کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی کسی شے کے ظاہر کے بجائے اس کی معنوی حقیقت کسی پیرایہ میں دکھائی جاتی ہے۔ یہاں یہی صورت حال ہے۔ کفار کی فوج تعداد میں ہر چند بہت زیادہ تھی لیکن معنوی اور اخلاقی اعتبار سے اس کی حیثیت بہت کم تھی۔ ان کی یہی معنوی قلت رویا میں قلت تعداد کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ رویا کا یہی پہلو ہے جس کے سبب سے اس میں تاویل کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس کی تاویل میں کبھی کبھی خود نبی کو بھی، وقتی طور پر، کوئی تردد پیش آجاتا ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ نبی کی رویا کبھی کبھی خلاف واقعہ ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ قرآن نے 'قلیل' کا لفظ بہت جنچا تلا استعمال کیا ہے عربی میں لفظ 'قلیل' صرف عددی اور مقداری اعتبار ہی سے قلیل کے لیے نہیں آتا بلکہ معنوی اعتبار سے بے وزن و بے حقیقت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کسی حماسی کا یہ شعر بہت معروف ہے۔

فان اکُ فی شرارکم قلیلا		فانی فی خیارکم کثیر

(اگر میں تمہارے اشرار کی نگاہوں میں کم رتبہ ہوں تو کچھ غم نہیں۔ تمہارے اخیار کی نگاہوں میں میرا بڑا رتبہ ہے)

یہاں ہم اس اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔ کسی مناسب مقام پر ہم 'رویا' پر انشاء اللہ مفصل بحث کریں گے۔

خطاب کی ایک خاص نوعیت

'فَشِلْتُمْ اور تَنَازَعْتُمْ' میں خطاب اگرچہ عام ہے لیکن اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ یہ مسلمانوں کے پورے گروہ سے متعلق ہے بلکہ یہ قرآن کے معروف اسلوب بیان کے مطابق عام الفاظ میں مسلمانوں کے اس مخصوص گروہ کے کردار کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر سورہ کے آغاز سے چلا آ رہا ہے۔ آیت ۵ کے تحت جس گروہ کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ یہ جانتے بوجھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نکلنا قریش کی فوج سے مقابلہ

کے لیے ہے، وہ کوشش کرتا رہا کہ آپ قافلہ کا رخ کریں اور آنحضرتؐ کی طرف سے اس بشارت کے باوجود کہ جس سے مقابلہ ہونا ہے وہ ہم سے شکست کھائے گا، وہ اس طرح لرزہ براندام رہا کہ گویا اسے موت کے منہ میں لے جایا جا رہا ہے۔ اسی گروہ کی طرف کلام کا رخ یہاں بھی ہے۔ جن کے حوصلہ کا یہ حال ہو، ظاہر ہے کہ اگر وہ پہلے سے کہیں یہ سن پاتے کہ مقابلہ لشکر سے ہے اور وہ بھی ایک کثیر التعداد لشکر سے تو ان کے تو دل ہی بیٹھ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں لوگوں کی رعایت سے دشمن کی فوج کی عددی حیثیت کی بجائے اس کی معنوی حیثیت ان کے سامنے رکھی۔

اس امر پر بھی یہاں نگاہ رہے کہ 'یُرِیْکَهُمْ'، 'مَنَامِکَ'، 'اَرٰىكَهُمْ'، سب میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لیے ہے کہ رویا میں جو کچھ دکھایا گیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دکھایا گیا۔ نبی اہل ایمان کے لیے بمنزلۂ دل اور آنکھ کے ہوتا ہے اس وجہ سے دیکھتا تو وہی ہے لیکن وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس کا تعلق سب سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جہاں تک دیکھنے کا تعلق ہے اس کو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی تک محدود رکھا ہے لیکن اس کے ردعمل کے ذکر میں تمام مسلمانوں کو شامل کر لیا ہے۔

وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ (۴۴)

اللہ تعالیٰ کی ایک اور کارسازی

یہ اللہ تعالیٰ اسی سلسلہ کی اپنی ایک اور کارسازی بیان فرما رہا ہے کہ جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل میں ہوئیں تو ابتدائی مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نظروں میں کفار کے لشکر کو کم کر کے دکھایا اور کفار کی نظروں میں مسلمانوں کو کم کر کے دکھایا تاکہ دونوں میں سے کوئی فریق بھی ٹکر لینے میں خوف نہ کھائے اور وہ معرکہ ہو کے رہے جو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دے اور جس کا واقع ہونا اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں طے ہو چکا ہے۔

کفار کی نگاہوں میں مسلمانوں کا کم نظر آنا تو اس لیے تھا کہ ان کی ظاہر بین آنکھوں کو مسلمانوں کی صرف عددی حیثیت نظر آئی، اس کی معنوی و اخلاقی قوت و حیثیت ان کی نگاہوں سے اوجھل رہی۔ حالانکہ یہی قلیل التعداد فوج بعد کے مرحلہ میں، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، معرکۂ کارزار گرم ہو جانے کے بعد، ان کو ایک طوفان کی شکل میں نظر آئی اس لیے کہ اس وقت مسلمانوں کی معنوی و روحانی حیثیت پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آگئی۔

جنگ کے دوران کی ایک نفسیاتی حقیقت

مسلمانوں کی نگاہوں میں کفار کے ان کی عددی اکثریت کے باوجود کم نظر آنے کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ان کی معنوی و اخلاقی حیثیت بے نقاب کر دی۔ نگاہ بہت بڑی حد تک دل کے تابع ہوتی ہے۔ اگر دل میں حوصلہ اور امنگ ہو، ایمان و اعتماد ہو، جزم و یقین ہو، مقصد کی صداقت اور اس کے لیے مرمٹنے کا جذبۂ صادق ہو تو سامنے پہاڑ بھی ہو تو ایک تودۂ ریگ کی شکل میں نظر آتا ہے اور اگر دل ان چیزوں سے

خالی ہو تو آدمی گلہری کو پہاڑ اور بکری کو شیر سمجھنے لگتا ہے۔ آدمی سے زیادہ طاقت ور اور آدمی سے زیادہ ناتوان، کوئی بھی نہیں ہے اور اس طاقت اور ناتوانی دونوں کا سرچشمہ خارج میں نہیں بلکہ اس کے باطن ہی میں ہے۔ مادیت کے اس دور میں لوگوں کو یہ باور کرانا آسان نہیں کہ سو مسلمان اپنے آپ کو کسی زمانہ میں ہزار کفار پر بھاری سمجھتے تھے لیکن ہے یہ واقعہ اور تاریخ اس پر شاہد ہے اور آج بھی ہر شخص اس کا تجربہ کر سکتا ہے اگر وہ ایمان کی حلاوت سے آشنا ہو جائے۔

وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سررشتہ سارے معاملات کا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کم دکھانا اور زیادہ دکھانا، جتانا اور ہرانا، بڑھانا یا گھٹانا جو کچھ بھی ہوتا ہے اصلاً خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے، باقی سب خدا پر چھوڑے۔ اس غلط فہمی میں کبھی مبتلا نہ ہو کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر بھی کچھ بنا یا بگاڑ سکتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (۴۵-۴۶)

جنگ کے باب میں مومنین کو ہدایات

یہ آگے کے مراحل کے لیے ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب تمہارا کفار کے کسی گروہ سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ۔ ثابت قدمی اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی نصرت ہمیشہ اسباب کے پردے سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دنیا بندوں کے لیے امتحان گاہ ہے۔ جب بندے اپنی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہیں تو اس کے پردے میں اللہ کی نصرت ظاہر ہوتی ہے۔ بندوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی طرح خدا کا امتحان کریں کہ خود تو گھروں میں بیٹھے رہیں اور خدا سے یہ امید کریں کہ وہ فتح کر کے کنجیاں ان کے حوالے کر دے، تب وہ شہر میں داخل ہوں گے۔

ثابت قدمی کا ذریعہ اللہ کا یاد ہے

اللہ کا ذکر ثابت قدمی کا ذریعہ ہے۔ اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اصل قوت دل کی قوت ہے اور دل کو قوت ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ایمان سرسبز و شاداب، ذکرِ الٰہی کی جھڑی سے رہتا ہے۔ یہ ذکرِ الٰہی یوں تو سانس کی طرح ہر وقت ایمانی زندگی کے لیے ضروری ہے اس لیے کہ انسان ہر وقت شیطان سے نبرد آزما ہے لیکن حالات زیادہ صبر آزما ہوں تو یہ ذکر بھی زیادہ مقدار میں مطلوب ہو گا۔ اسی وجہ سے یہاں کثیرًا کی قید لگی ہوئی ہے۔

حصولِ فلاح کا ذریعہ

لفظ 'فلاح' ایک جامع لفظ ہے۔ یہ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی پر مشتمل ہے۔ مجرد غلبہ تو ہو سکتا ہے کہ بغیر ذکرِ الٰہی کے بھی حاصل ہو جائے لیکن وہ فلاح کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ فلاح اسی غلبہ سے حاصل ہو گی جس کا دروازہ ذکرِ الٰہی کی مدد سے کھلے اور جس میں غلبہ حاصل کرنے والوں کو خدا کی معیت حاصل ہو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کسی فوج کی ثابت قدمی میں اصلی عامل کی حیثیت ہمیشہ اس کے حوصلہ ہی کو حاصل ہوتی

ہے۔ اس چیز کی اہمیت جس طرح پہلے تسلیم کی گئی ہے اسی طرح آج بھی تسلیم کی جاتی ہے۔ اسلام نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے حوصلہ برقرار رکھنے کا ذریعہ ذکر الٰہی کو بتایا ہے اور حق یہ ہے کہ مومن کے اندر عزم اور حوصلہ کا سرچشمہ یہی چیز ہے۔

اطاعت اللہ و رسول کا ایک خاص مفہوم

'وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ' یہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کے عام مفہوم کے سوا اس کا ایک خاص مفہوم بھی پیش نظر ہے۔ یعنی دشمن کے مقابل میں کامل نظم اور کامل ڈسپلن کا ثبوت دو۔ جو حکم اللہ نے دیے ہیں ان کی بھی پوری اطاعت کرو اور جو حکم رسول دے اس کی بھی بے چون و چرا تعمیل کرو۔ جس طرح دل ذکر الٰہی سے محروم ہو تو اس میں انتشار برپا ہو جاتا ہے اسی طرح جماعت اگر اطاعت میں ڈھیلی ہو تو جماعت کا نظم درہم برہم ہو جاتا ہے اور پھر اس کی ہوا اکھڑ جاتی ہے۔

نظم اور ڈسپلن کی پابندی

'وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ' اسی بات کو منفی پہلو سے واضح فرمایا کہ اللہ و رسول کے دیے ہوئے احکام سے اختلاف نہ کرنا ورنہ جماعت میں انتشار برپا ہوگا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ یہی وہ ہدایت ہے جس کی غزوہ احد کے موقع پر ایک جماعت نے خلاف ورزی کی اور اس کا تلخ نتیجہ پوری جماعت کو بھگتنا پڑا۔ قرآن نے آل عمران میں اسی کا حوالہ دیا ہے۔ حَتّٰۤی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۱۵۲ (یہاں تک کہ جب تم حوصلہ ہار بیٹھے اور تم نے نبی کے حکم میں اختلاف کیا اور تم نے نافرمانی کی بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھا دی تھی جس کو تم عزیز رکھتے تھے)

خدا کی معیت حاصل ہونے کی شرط

'وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ' وہی بات جو اوپر 'فَاثْبُتُوْا' کے لفظ سے فرمائی ہے یہاں 'وَاصْبِرُوْا' کے لفظ سے فرمائی ہے۔ البتہ اوپر والی بات افراد کو پیش نظر رکھ کر فرمائی گئی ہے اور یہ جماعت کو پیش نظر رکھ کر ارشاد ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی مدد و نصرت اور اس کی معیت کے طالب ہو تو اپنے جماعتی کردار سے اس کا استحقاق پیدا کرو۔ خدا منتشر بھیڑ کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ ان لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جو اس کی راہ میں جہاد کے لیے بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہوں۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ۝ وَاِذْ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ (۴۷-۴۸)

'وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ'

بطر کا مفہوم

'بطر' کے معنی حق سے اکڑنے اور اس سے متکبرانہ منہ موڑنے کے ہیں۔ قرآن نے اس سے اس بدمستی اور سرکشی کو تعبیر فرمایا ہے جو اللہ کی نعمتیں پا کر کسی شخص یا گروہ پر طاری ہو جاتی ہے اور وہ شکر اور

تواضع کے بجائے غرور اور طغیان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۵۸ (اور کتنی بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جو اپنے وسائل معیشت کی فراوانی پر اکڑنے لگی تھیں)

اہل ایمان کی جنگ بھی عبادت ہے

یہ قرآن نے اس روش کے منافی روش سے مسلمانوں کو روکا ہے جس کی تعلیم اوپر والی آیت میں 'وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا' کے الفاظ سے دی ہے۔ 'كَالَّذِينَ' سے اشارہ قریش کی طرف ہے جو جنگ بدر کے لیے، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، اپنی کثرت تعداد اور اسباب و وسائل کی بہتات کے گھمنڈ میں بڑے طنطنہ اور بڑے طمطراق سے نکلے تھے۔ فرمایا کہ کسی مرحلے میں بھی ان لوگوں کی روش تم نہ اختیار کرنا۔ تم خدا کی بندگی و اطاعت کی رسم دنیا میں قائم کرنے اٹھے ہو تو بندگی کی تواضع اور عبدیت کی فروتنی ہر جگہ تم پر نمایاں رہے۔ خواہ بزم میں ہو یا رزم میں۔ اگرچہ مقصود یہاں مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ تمہاری جنگ جنگ نہیں بلکہ خدا کی عبادت ہے، اس کی شان عبادت ہر جگہ قائم رہے لیکن اس سے یہ بات بھی سامنے آگئی کہ آئندہ مسلمانوں کے سامنے ایسے حالات آنے والے ہیں کہ اگر وہ چوکنے نہ رہے تو وہ بھی اس قسم کے فتنوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ گویا یہ ایک بشارت بھی ہے اور ساتھ ہی تنبیہ بھی کہ ہمیشہ خدا ہی سے وابستہ رہنا، تعداد اور سامان کی فراوانی جب حاصل ہو جائے تو اس کے غرے میں اترانے نہ لگنا۔ اصل چیز سر و سامان نہیں بلکہ خدا کی کارسازی اور اس کی معیت ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح 'وَلَا تَنَازَعُوا' کی ہدایت کی ایک گروہ نے خلاف ورزی کر کے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، جنگ احد میں پوری جماعت کے لیے ایک سخت آزمائش پیدا کر دی۔ اسی طرح جنگ حنین کے موقع پر کثرت تعداد کے اعتماد نے مسلمانوں کو ایک سخت آزمائش سے دوچار کر دیا جس کی طرف قرآن نے یوں اشارہ فرمایا ہے وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ۲۵- توبہ (اور حنین کے دن جب کہ تمہاری کثرت نے تمہیں غرہ میں مبتلا کیا تو وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ پیچھے بھاگے)

ریا اور نمائش سے احتراز کی ہدایت

'رِئَاءَ النَّاسِ' سے قریش کے اس جذبۂ نمائش کی طرف اشارہ ہے جس سے ایک ایک سردار بدر کے موقع پر سرشار تھا۔ اس کا ضد اللہ کے لیے اخلاص ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو کچھ کرنا ہمیشہ اللہ کے لیے کرنا اس لیے کہ تمہیں اپنے کسی عمل کی داد دنیا سے نہیں لینی ہے بلکہ آخرت میں اپنے رب سے لینی ہے۔

'وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ' یعنی ان کا یہ سارا طمطراق اور سارا جوش و خروش اس لیے تھا کہ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی راہ سے روکیں۔ ان نادانوں کو پتہ نہیں کہ انسان خواہ کتنی وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ اپنے جال پھیلائے اور اپنی ترکتازیوں کے کتنے ہی مظاہرے دکھائے، اس کی ہر چیز ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہے۔ اس کی ساری جولانیوں کے اردگرد خدا نے باڑ لگا رکھی ہے

وَاِذْ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ الآیۃ۔ یعنی قریش کے اس بطر و ریا کے مظاہرے میں تعداد اور وسائل کی کثرت کو تو دخل تھا ہی، شیطان نے بھی جس کو اللہ کی راہ مارنے کے کام ہی کے لیے مہلت ملی ہوئی ہے، ان کو پٹی پڑھائی کہ شاباش، آگے بڑھو، بھلا آج کس میں دم ہے کہ تمھارا مقابلہ کر سکے، میں تمھارا ساتھی اور مددگار رہوں لیکن وہ اس وقت تک تو ان کی پیٹھ ٹھونکتا رہا جب تک دونوں فوجیں آمنے سامنے نہیں ہوئیں لیکن جب فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو وہ دم دبا کر پیچھے کھسک گیا کہ میں تم سے بری، میں کچھ اور دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو مجھے اللہ سے ڈر لگتا ہے۔

جنگ بدر میں یہود کی ریشہ دوانیاں

شیطان کے متعلق ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی یہاں ہمارا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ اس سے اشارہ یہود کی طرف ہے۔ سیرت و مغازی کی کتابوں سے بھی اور قرآن کے اشارات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہود شروع ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے خائف تھے۔ ابھی آپ مکہ ہی میں تھے کہ انھوں نے طرح طرح سے آپ کے خلاف قریش کو اکسانا شروع کر دیا، مدینہ ہجرت فرمانے اور آپ کو انصار کی حمایت حاصل ہو جانے کے بعد تو خاص طور پر انھوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ان کے سینہ پر یہ ایک بھاری سل رکھ دی گئی ہے۔ مستقبل کے سیاسی اندیشوں کے علاوہ وہ خود اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر بھی ڈرتے تھے کہ مبادا یہ وہی پیغمبر ہوں جس کا ذکر ان کے ہاں پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ وہ اپنی قوم سے باہر کسی نبوت و رسالت کو تسلیم کرنے کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھے لیکن اپنی بزدلی کے سبب سے وہ آپ کے خلاف براہ راست کوئی اقدام کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ در پردہ وہ قریش کے لیڈروں کو بھی برابر اکساتے رہے اور مدینہ میں اوس و خزرج کے اندر بھی ساز باز کرتے رہے۔ ایسے حالات میں یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ قریش نے قافلہ کی حفاظت کے بہانے جب مدینہ پر حملہ کی اسکیم بنائی تو اس میں یہود کا مشورہ بھی شامل رہا ہو اور انھوں نے قریش کو ورغلایا ہو کہ اول تو تمھاری بھاری جمعیت خود ہی مٹھی بھر مسلمانوں کو کچل دینے کے لیے کافی ہے لیکن ضرورت ہوئی تو ہم بھی تمھاری مدد کو حاضر ہیں۔ اگرچہ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک معاہدے میں بھی شریک تھے لیکن آگے اسی سورہ کی آیات ۵۶-۵۷ کے تحت یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انھوں نے اس کا کبھی پاس و لحاظ نہیں رکھا بلکہ برابر ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے۔ البتہ اپنی روایتی بزدلی کے سبب سے انھوں نے سامنے آنے کی جرأت کبھی نہیں کی۔ اس موقع پر بھی انھوں نے قریش کو بڑھاوے تو بہت دیے لیکن جب دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابل میں آ گئے اور انھوں نے مسلمانوں کے حوصلہ کو دیکھا تو دم سادھ کر بیٹھ رہے۔ اس موقع پر ان کے اندر سمایا ہوا وہ خوف بھی نمایاں ہوا ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے متعلق وہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے اور جن کی نسبت ان کے صحیفوں کے ذریعے سے ان کے کانوں میں یہ بات پڑی ہوئی تھی

کہ ان کے جلو میں ملائکہ اور کروبیوں کی فوجیں ہوں گی۔ وہ بات بھی یہاں یاد رکھیے جس کا ذکر ہم سورۂ بقرہ میں کر آئے ہیں کہ بدر کی لڑائی، اپنے نقشۂ جنگ، اپنی تعداد اور مقصد کے اعتبار سے بنی اسرائیل کی اس جنگ سے مشابہ تھی جو سموئیل نبی کے عہد میں، طالوت کی زیر قیادت جالوت سے لڑی گئی تھی۔

منافقین کی فریب کاریاں

قرآن نے یہاں جو تمثیل یہود کی دی ہے بعینہٖ یہی تمثیل ان منافقین کے لیے بھی استعمال کی ہے جو یہود ہی کے اندر کے تھے بھی اور مسلمانوں کے اندر گھس کر یہود سے ساز باز بھی رکھتے تھے۔ یہ ان کو اطمینان دلاتے تھے کہ اگر مسلمانوں نے ان کے خلاف کوئی اقدام کیا تو وہ مسلمانوں کے بجائے ان کا ساتھ دیں گے لیکن قرآن نے واضح کیا کہ یہ ویسا ہی فریب ہے جیسا شیطان ان لوگوں کو دیا کرتا ہے جو اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ چونکہ ان دونوں تمثیلات میں بڑی مشابہت ہے اس وجہ سے ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں زیر بحث تمثیل اچھی طرح واضح ہو جائے۔ سورۂ حشر میں منافقین کے ایک گروہ کا، جو یہود میں سے تھا، یہ کردار بیان ہوا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ
لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ
الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ
مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا
وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللَّهُ
يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ لَئِنْ
أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ ۚ
وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ
وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ
ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ - ۱۱-۱۲ حشر

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو منافق ہیں، وہ اپنے ان بھائیوں سے جنھوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا، کہتے ہیں کہ اگر تم نکالے گئے تو ہم بھی تمھارے ساتھ نکلیں گے اور تمھارے بارے میں ہم کسی کی بھی کوئی بات نہیں مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمھاری مدد کریں گے۔ اللہ شاہد ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے جنگ ہوئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے۔ اور اگر مدد کریں گے تو منہ کی کھائیں گے۔ پھر ان کی مدد کہیں سے نہیں ہوگی۔

پھر ان منافقین کی تمثیل ان الفاظ میں دی ہے۔

كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ
اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِنْكَ
إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝ فَكَانَ
عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا
وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ۝ (۱۶-۱۷ حشر)

ان منافقین کی مثال شیطان کی ہے جو انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر، پھر جب وہ کفر کر بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں، میں اللہ، عالم کے خداوند سے ڈرتا ہوں۔ تو ان دونوں کا انجام یہ ہے کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی ظالموں کی سزا ہے۔

جس طرح یہاں یہودی منافقین کی تمثیل شیطان سے دی ہے اسی طرح زیر بحث آیت میں اگرچہ ذکر

شیطان کا ہے لیکن اشارہ یہود کی طرف ہے۔ تمثیل کے بجائے اشارہ وکنایہ کی صورت اس لیے اختیار فرمائی کہ یہود کی یہ ساری کارستانیاں ابھی پردے میں تھیں اس وجہ سے قرآن نے بھی یہ چاہا کہ ابھی بات پردے ہی میں رہے لیکن اشاروں کنایوں میں نقاب کے بعض گوشے اٹھا بھی دیے کہ یہود بھی جان لیں کہ اللہ ان کے کارناموں سے بے خبر نہیں ہے اور مسلمان بھی متنبہ ہو جائیں کہ اس پردے میں کون چھپا ہوا ہے۔ یہاں خاص طور پر لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ' اور بعض دوسرے فقروں پر غور فرمائیے تو اصل حقیقت واضح ہو جائے گی۔

یہود کے باطن کی تعبیر — شیطان کے متعلق یہ بات جو بیان ہوئی ہے کہ وہ انسان کو کفر پر اکسا کر خود یہ کہہ کر کنارہ کش ہو جاتا ہے کہ 'میں تم سے بری ہوں' میں اللہ رب العلمین سے ڈرتا ہوں، یہ اس کے رویہ اور اس کے باطن کی تعبیر ہے، یہ بات شیطان زبان سے کسی کفر کرنے والے سے نہیں کہتا۔ اسی طرح یہاں یہود کے متعلق جو یہ بات بیان ہوئی ہے کہ وَقَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكُمْ، إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ، یہ ان کے رویے اور ان کے ذہن کی تعبیر ہے، یہ نہیں ہے کہ انھوں نے یہ بات قریش سے الفاظ میں کہی ہو۔ قرآن نے جگہ جگہ قَالَ کا لفظ اس بات کے لیے بھی استعمال کیا ہے جو آدمی اپنے دل میں کہتا ہے۔ یہود اپنے جوش حسد سے اندھے ہو کر یہ تو دل سے چاہتے تھے کہ قریش محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ختم کر دیں لیکن دل میں چونکہ یہ چور بھی تھا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، ان سے ٹکرانا پہاڑ سے ٹکرانا اور اپنے آپ کو تباہ کرنا ہے اس وجہ سے خود سامنے آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چاہتے تھے کہ یہ خطرہ کوئی اور مول لے۔

یہود کا شیطانی تقویٰ — یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہوتی کہ دوسروں کو کسی جرم پر آمادہ کر دینا اور خود مجرموں کے ساتھ اس جرم کے لیے اس اندیشے سے نہ نکلنا کہ کسی لپیٹ میں نہ آ جائیں یہ شیطانی تقویٰ ہے۔ قرآن نے اوپر واضح فرما دیا کہ جو جرم کے لیے دوسروں کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں لیکن خود اس میں اس خوف سے شریک نہیں ہوتے کہ خدا کی پکڑ میں نہ آ جائیں ان کا یہ خوف ان کو خدا کے عذاب سے نہیں بچائے گا بلکہ جس طرح جرم کے اکھاڑے میں اترنے والے جہنم میں جھونک دیے جائیں گے اسی طرح اکھاڑے کے کنارے بیٹھ کر داؤں پیچ بتانے والے بھی جہنم میں جھونک دیے جائیں گے اگرچہ بزعم خود وہ خدا کے ڈر ہی سے اکھاڑے میں نہیں اترے۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی ہے جو دوسروں کو تو چوری اور بدمعاشی کی تربیت دیتا ہے لیکن خود اپنے تربیت دیے ہوئے چوروں اور بدمعاشوں کے ساتھ چوری اور بدمعاشی کے لیے اس ڈر سے نہیں نکلتا کہ کہیں پولیس کی گرفت میں نہ آ جائے۔ ظاہر ہے کہ قانون کے ایسے احترام کرنے والوں کو کوئی قانون نہیں بخشتا بلکہ جب یہ زد میں آ جاتے ہیں تو یہ بھی اپنے مریدوں ہی کے انجام سے دوچار ہوتے ہیں بلکہ ان پر کچھ زیادہ مار پڑتی ہے۔ یہی بات قرآن نے فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا' والی آیت میں فرمائی ہے جو سورۂ حشر کے حوالے سے ہم نے اوپر نقل کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہود بھی مسلمانوں کے معاملے میں اسی شیطانی تقویٰ

میں مبتلا تھے۔ وہ یہ تو دل سے چاہتے تھے کہ مسلمان تباہ کر دیے جائیں، اس مقصد کے لیے وہ قریش کو چڑھا بھی لائے لیکن خود قریش کے ساتھ میدانِ جنگ میں اترنے کے لیے تیار نہ ہوئے اس لیے کہ اس خدائی فوج اور پولیس کا بھی ان کو ڈر لگا ہوا تھا جس کا اشارہ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ سے نکلتا ہے۔

اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ؕ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ (۴۹)

منافقین کے طعنے — سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ لفظ 'مَرَض' جب نفاق کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد حسد ہوتا ہے۔ یہود کی ریشہ دوانیوں کے بعد اب یہ منافقین اور حاسدین کی حوصلہ شکنیوں کا ذکر فرمایا کہ انھوں نے بھی اس موقع پر مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے یہ کہنا شروع کیا کہ ان لوگوں کو ان کے دین نے خبط میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہیں تو مٹھی بھر، مقابلہ کرنے اٹھے ہیں قریش کی دل بادل فوج سے۔ یہ ہاتھی سے گنا کھانے چلے ہیں۔ مذہب کے خبط نے ان کو ہوش و خرد سے عاری کر دیا ہے۔ اس قسم کے فقرے اور طعنے بالخصوص جب کہ اپنے اندر ہی کے لوگوں کی زبان سے نکلیں اور حالات بھی بے سروسامانی اور قلت تعداد کے اعتبار سے وہ ہوں جو بدر کے موقع پر تھے تو ان کے اثرات بہت خطرناک ہو سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے زہر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھا۔

وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ، مطلب یہ ہے کہ ان منافقین و حاسدین کے علی الرغم جو لوگ اللہ پر بھروسہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا غالب اور حکیم ہے۔ وہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کا خود ساتھی بنتا ہے، اس کی قوت کو کوئی شکست نہیں دے سکتا، وہ ان کے لیے خود تدبیر فرماتا ہے اور اس کی تدبیر کے مقابل میں کسی کی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۵۰-۵۸

آگے یہ واضح فرمایا کہ یہ مار جو ان پر پڑی اسی پر بس نہیں ہے۔ اصل سزا جو انھیں ملنی ہے اس کا مرحلہ تو آگے آنے والا ہے جب یہ موت سے دوچار ہوں گے۔ یہ مار تو محض بطور تنبیہ ہے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اپنی بخشی ہوئی نعمتوں سے محروم نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنی روش بگاڑ نہ لے۔ جب کوئی قوم اپنی روش بگاڑ لیتی ہے تو پہلے اللہ اس کو تنبیہ فرماتا ہے۔ جب وہ تنبیہ سے کوئی سبق نہیں لیتی بلکہ اپنی سرکشی میں بڑھتی جاتی ہے تو پھر اس پر خدا کا فیصلہ کن عذاب آ جاتا ہے۔ قوم فرعون کے ساتھ اللہ نے جو معاملہ کیا وہ ان کے لیے مثال ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کو مختلف آزمائشوں میں پکڑا کہ وہ آنکھیں کھولیں لیکن جب انھوں نے آنکھیں نہیں کھولیں تو خدا نے ان کا بیڑا غرق کر دیا۔

اس کے بعد یہ واضح فرمایا کہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ ناپاک وجود ان لوگوں کا ہے جو کفر پر اڑ

گئے ہیں اور ایمان لانے والے نہیں ہیں جو تم سے معاہدہ کرکے بار بار اپنے معاہدہ کو توڑتے ہیں۔ اگر یہ کسی جنگ میں تمہارے مقابل میں آئیں تو ان کو ایسی مار مارو کہ جو ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں ان کو بھی سبق مل جائے اور ان میں سے جس کی طرف سے بھی اب معاہدہ کی خلاف ورزی کا اندیشہ ہو اس کا معاہدہ اس کے منہ پر پھینک مارو، خدا ایسے بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۰-۵۸ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ
وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾ كَدَاْبِ اٰلِ
فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ
اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِكَ
بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا
مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ
وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ
وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَاۗبِّ
عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ
مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾
فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ
يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ
عَلٰي سَوَاۗءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَاۗىِٕنِيْنَ ﴿۵۸﴾ ع ۱۰ ۴

ترجمۂ آیات ۵۰-۵۸ اور اگر تم دیکھ پاتے جب فرشتے ان کفر کرنے والوں کی روحیں قبض کرتے ہیں مارتے

ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر، اور یہ کہتے ہوئے کہ اب چکھو مزا جلنے کے عذاب کا، یہ تمھارے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت ہے اور اللہ بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ ۵۰-۵۱

ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوا جو قوم فرعون اور ان لوگوں کے ساتھ ہوا جو ان سے پہلے گزرے۔ انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا۔ بے شک اللہ قوی، سخت پاداش والا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ اس انعام کو جو وہ کسی قوم پر کرتا ہے اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اس چیز کو نہ بدل ڈالے جس کا تعلق خود اس سے ہے اور بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ان کے سامنے وہی معاملہ ہے جو آل فرعون اور ان لوگوں کو پیش آیا جو ان سے پہلے گزرے۔ انھوں نے اپنے رب کی آیتوں کی تکذیب کر دی تو ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور آل فرعون کو غرق کر دیا اور یہ سارے کے سارے ظالم تھے۔ ۵۲-۵۴

بے شک بدترین جانور اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور وہ ایمان نہیں لاتے، جن سے تم نے عہد لیا، پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ ڈرتے نہیں۔ پس اگر تم انھیں جنگ میں پا جاؤ تو انھیں ایسی مار مارو کہ جو ان کے پیچھے ہیں ان کو بھی تتر بتر کر دو تاکہ ان کے ہوش ٹھکانے ہوں اور اگر تمھیں کسی قوم سے بدعہدی کا خطرہ ہو تو تم بھی اسی طرح ان کا عہد ان پر پھینک مارو۔ اللہ بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۵۵-۵۸

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۵۰-۵۱)

جوابِ شرط کے حذف کا ایک خاص محل

'وَلَوْ تَرٰٓى' جوابِ شرط یہاں محذوف ہے اور اس طرح کے مواقع ہیں، جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم ذکر کر چکے ہیں، جوابِ شرط کا محذوف ہونا ہی تقاضائے بلاغت ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ جس منظر کے دیکھنے کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کی ہولناکی ناقابلِ بیان ہے۔

مبالغہ فی النفی کا اسلوب

'لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ' میں بھی عربی زبان کا ایک خاص اسلوب ہے۔ عربی میں مبالغہ پر جب نفی آتی ہے تو اس سے مبالغہ فی النفی کا مضمون پیدا ہوتا ہے۔ یعنی خدا بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ امرؤ القیس نے 'لَيْسَ بِفَعَّالٍ' اور 'لَيْسَ بِقَتَّالٍ' کے قسم کی ترکیبیں استعمال کی ہیں یعنی فلاں میں کچھ بھی کرنے کی صلاحیت نہیں، فلاں میں لڑنے کا ذرا دم خم نہیں، بس باتوں کا غازی ہے، کردار کا غازی نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کفار کو بدر میں جو مار پڑی یہ کیا ہے، اصل مار تو وہ ہے جو فرشتوں کے ہاتھوں ان کی موت کے وقت ان پر پڑتی ہے۔ اگر کہیں اس کو دیکھ پاتے تو کچھ اندازہ ہوتا کہ ان کی کیا درگت بننے والی ہے۔ پھر اس کے بعد عذابِ دوزخ کا مرحلہ ہے جس کا آج کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہر ایک کے آگے اس کے اپنے اعمال پیش ہوں گے

'ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ' یعنی ان کے سامنے یہ انھی کے ہاتھوں کی کرتوت رکھی جائے گی۔ جو بِس بھری فصل انھوں نے دنیا میں بوئی، سینچی اور پروان چڑھائی اسی کا حاصل ان کے سامنے آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کوئی ظلم و ناانصافی نہیں کرے گا۔ وہ اپنے بندوں کے ساتھ رتی بھر ظلم کا بھی روادار نہیں۔ اس کا قانون اور عدل بے لاگ ہے۔ ہر شخص جو کرے گا وہی بھرے گا۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (۵۲-۵۴)

'آل' کا مفہوم

'كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ' 'آل' پر دوسری جگہ ہم تفصیل سے بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ یہ صرف اولاد کے معنی میں نہیں آتا بلکہ اس کا اطلاق قوم اور اتباع سب پر ہوتا ہے۔

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ قریش کو یہ افتاد جو پیش آئی ہے یہ اسی طرح کا معاملہ ہے جیسا کہ قومِ فرعون اور اس سے پہلے کی قوموں کو پیش آیا کہ انھوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری، اس کی نشانیوں کی ناقدری اور اس کی آیات کی تکذیب کی تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا اس لیے کہ خدا قوی اور اپنے

قانون پاداش عمل کے اجراء و نفاذ میں بے لاگ ہے۔

عذاب بطور تنبیہ — قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوبِهِمْ سے اس نوعیت کی پکڑ کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ قوموں کو بطور تنبیہ مبتلا کرتا ہے۔ نبی کی بعثت کے دور میں اس طرح کی تنبیہات کا خاص طور پر ظہور ہوتا ہے۔ اس سنت الٰہی کی تفصیل کے لیے اعراف ۹۴، انعام ۴۲۔ بقرہ ۱۵۵ ملاحظہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ افتاد جو قریش کو پیش آئی ہے اس سے مقصود ان کو جھنجھوڑنا اور جگانا ہے۔ یہ بات سنت الٰہی کے مطابق ظہور میں آئی ہے اور اس کی مثالیں پچھلی قوموں کی تاریخ میں بھی گزر چکی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قریش اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں یا اپنی پیشرو قوموں کی تقلید میں اللہ کی آیات اور نبی کی دعوت کی تکذیب پر اڑے جاتے ہیں۔ اگر یہ تکذیب پر اڑ گئے تو پھر اللہ ان کو بھی اسی طرح ہلاک کر دے گا جس طرح آلِ فرعون اور دوسری قوموں کو اس نے ہلاک کیا۔

یہاں كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ دو مرتبہ آیا ہے یہ تکرار نہیں ہے بلکہ دونوں جگہ دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ پہلے یہ بتایا کہ یہ اسی نوع کی تنبیہ ہے جس نوع کی تنبیہ فرعون اور دوسری قوموں کو کی گئی۔ پھر یہ بتایا کہ اگر اس تنبیہ سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو بالآخر ان پر بھی اسی طرح فیصلہ کن عذاب آجائے گا جس طرح ان قوموں پر آیا۔

تذکیر و تنبیہ کا مقصد — ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ یہ حکمت بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کیوں فرمایا کہ قوموں کو تذکیر و تنبیہ ہوتی رہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر انعام فرماتا ہے تو یوں ہی نہیں فرماتا بلکہ وہ انعام کچھ صفات و کردار پر مبنی ہوتا ہے، اسی طرح جب وہ کسی قوم کو اپنے اس انعام سے محروم کرتا ہے تو یوں ہی محروم نہیں کر دیتا بلکہ وہ یہ دیکھ کر کرتا ہے کہ قوم نے اپنے آپ کو ان صفات و اخلاق سے محروم کر لیا جن کی بنا پر وہ مستحق انعام ٹھہری تھی، یہ چیز مقتضی ہوئی کہ جب کوئی انعام یافتہ قوم خرابیوں میں مبتلا ہو تو خدا تذکیر و تنبیہ کے ذریعہ سے اس پر حجت تمام کردے۔ اس تذکیر و تنبیہ سے اگر قوم بیدار ہو گئی تو اس کا استحقاق باقی رہتا ہے۔ اگر نہ بیدار ہوئی تو وہ اللہ کی نعمت سے اتمام حجت کے بعد محروم ہو جاتی ہے اور ساری ذمہ داری خود اسی پر ہوتی ہے، خدا اس سے کوئی ناانصافی نہیں کرتا۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ ابھی موقع باقی ہے اس سے فائدہ اٹھا لو، خدا نے تم پر جو انعام فرمایا تھا وہ تم سے زبردستی نہیں چھیننا چاہتا بلکہ تمہارے عقائد و اعمال کے بگاڑ نے اس کے اسباب پیدا کیے ہیں، تم اپنے آپ کو بدل کر اور اصلاح کر کے پھر اپنے استحقاق کو بحال کر سکتے ہو۔

خدا کا معاملہ صحیح علم پر مبنی ہوتا ہے — وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ یعنی قوموں کے عزل و نصب میں اللہ تعالیٰ کا معاملہ اندھے کی لاٹھی کی طرح نہیں ہے بلکہ تمام تر سمع و علم پر مبنی ہے۔ وہ قوموں کو اختیار و اقتدار اور اسباب و وسائل دے کر برابر ہر چیز کو دیکھتا، سنتا اور جانتا رہتا ہے کہ وہ کیا بنا رہی ہیں اور کس راہ پر جا رہی ہیں اور اس کا معاملہ ان کے ساتھ اسی بے خطا سمع و علم پر مبنی ہوتا ہے۔

تنبیہات سے فائدہ نہ اٹھانے والوں کا انجام — كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ یہ وہ انجام بیان ہو رہا ہے جو آگے قریش کا ہوگا، اگر انھوں نے ان تنبیہات

سے سبق حاصل نہ کیا جو ان کو دی جا رہی ہیں۔ یعنی پھر وہ تنبیہات کے بجائے خدا کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آ جائیں گے۔ ان دونوں آیتوں میں الفاظ اور لہجہ کا جو فرق ہے اس کو نگاہ میں رکھیے۔ اوپر والی آیت میں فرمایا ہے کَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اس میں ہے كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ۔ اوپر ہے فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ، یہاں ہے فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ۔ اس فرق کو ملحوظ رکھے بغیر دونوں آیتوں کا موقع و محل واضح نہیں ہوگا۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (۵۵-۵۸)

یہود کی وعدہ خلافیاں

اب یہ یہود اور ان قبائل کے باب میں ہدایت دی جا رہی ہے جن سے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ناطرفداری کے معاہدے کر لیے تھے مثلاً جہنیہ، بنی ضمرہ، بنی مدلج وغیرہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کیے ہوئے معاہدے کا برابر احترام باقی رکھا لیکن یہود نے ایک دن بھی اس کا احترام نہیں کیا اور یہ قبائل بھی یہود کی انگیخت یا قریش کے دباؤ سے برابر معاہدے کی خفیہ یا علانیہ خلاف ورزیاں کرتے رہے۔

شَرَّ الدَّوَآبِّ کا مفہوم

'اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ' کے اسلوب میں جو زور اور شدت ہے اس کی وضاحت آیت ۲۲ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہ اسلوب ان لوگوں کے وجود و بقا کے جواز کی نفی کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے کسی گروہ کی قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک ان میں کوئی رمق سوچنے سمجھنے کی باقی ہے۔ جن کے اندر یہ رمق ختم ہو گئی، نہ وہ پہلے ایمان لائے، نہ آیندہ ایمان لانے والے ہیں، اب وہ صرف گندگی کے ایک ڈھیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب خدا کی زمین پر ان کے باقی رہنے میں کوئی خیر و برکت نہیں ہے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ جن کی آنکھوں کے پردے رسول کے بعد بھی نہیں اٹھتے ان کا اندھا پن لاعلاج ہوتا ہے اور زمین پر ان کا باقی رہنا بالکل بے مقصد ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو جینے کی جو مہلت دیتا ہے صرف جینے کے لیے نہیں دیتا بلکہ سوچنے سمجھنے اور زندگی سنوارنے سدھارنے کے لیے دیتا ہے۔

مذکورہ گروہ کی اخلاقی پستی

'اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ' یہ انہی لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے۔ 'مِنْهُمْ' یعنی مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ اوپر ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ ان لوگوں نے معاہدہ تو کر لیا لیکن اس کو وفاداری کے ساتھ نبھایا ایک دن بھی نہیں۔ جب کوئی موقع امتحان کا آتا وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے باز نہ آتے۔ ان کی ہمدردیاں برابر قریش کے ساتھ رہیں۔ معاہدہ کر لینے کے

بعد بار بار نقضِ عہد کا ارتکاب یہ ان کے دل کی سختی، کردار کی پستی اور ان کے احساسِ غیرت وحمیت سے خالی ہونے کی دلیل تھی۔ 'فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ' سے مطلب یہ ہے کہ جس طرح کے حالات کے لیے معاہدہ وجود میں آیا تھا اس طرح کی کوئی آزمائش جب کبھی پیش آتی تو یہ معاہدہ کا احترام نہ کرتے بلکہ اس کی خلاف ورزی کر گزرتے۔ 'لَا يَتَّقُوْنَ' سے یہاں مطلب یہ ہے کہ نقضِ عہد اور اس کے نتائج سے نہیں بچتے حالانکہ عہد کی پاسداری اور حرمت دنیا کے معروف میں بھی مسلّم ہے اور اللہ کے ہاں بھی اس کی پرسش ہونی ہے۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۔

'ثقف' کے معنی پالینے کے ہیں اور 'تشرید' کے معنی پراگندہ کر دینے، تتر بتر کر دینے کے۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تو یہ جو کچھ کر رہے ہیں پردے میں کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی سامنے آنے کی جرأت نہیں کر رہا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی گروہ سامنے آنے کی جرأت کرے اور جنگ کے میدان میں تمھیں مل جائے تو انھیں ایسی مار مارو کہ ان کے بھی پرخچے اڑ جائیں اور جو ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے پر تول رہے ہیں ان کے پر و بال بھی جھڑ جائیں۔

'لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ' یعنی ان کا انجام دیکھ کر ان کو بھی سبق حاصل ہو کہ اگر انھوں نے بھی یہی حرکت کی تو ان کا بھی یہی انجام ہونا ہے۔

معاہدات سے متعلق ضروری ہدایت

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۔ یہ مذکورہ قسم کے تمام معاہدوں سے متعلق عام ہدایت دے دی کہ ان کی ذمہ داری تم پر یک طرفہ نہیں ہے صرف اسی صورت میں ہے جب دوسرا فریق بھی ان کا احترام کرے۔ اگر وہ احترام نہیں کرتا تو تم بھی اس معاہدہ کو ان کے منہ پر پھینک مارو۔ 'علٰی سواء' کا مفہوم یہ ہے کہ انہی کے برابر کا اقدام تم بھی کرنے کے مجاز ہو۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دینا چاہیے بلکہ جواب ہم وزن ہونا چاہیے۔ بعض لوگوں نے اس سے یہ لازم قرار دیا ہے کہ ختم معاہدہ کی اطلاع فریقِ ثانی کو دے دینی چاہیے۔ ان کی اس بات کی کوئی دلیل ان الفاظ میں مجھے نظر نہیں آتی۔ البتہ یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ محض فرضی اندیشہ کسی معاہدے کو کالعدم قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ عملاً اس کی خلاف ورزی کا اظہار ہوا ہو۔ اول تو یہاں 'تَخَافَنَّ' کا جو فعل استعمال ہوا ہے اس میں خود تاکید ہے۔ دوسرے 'عَلٰی سَوَآءٍ' کی قید بھی ان کو نمایاں کر رہی ہے۔

بدعہدوں سے اظہارِ برأت

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ یہ اظہارِ برأت کا کلمہ ہے۔ یعنی اللہ کا ایسے بدعہدوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور جب اللہ کا ان سے کوئی تعلق نہیں تو اہلِ ایمان کوئی تعلق ایسے لوگوں سے کیسے رکھ سکتے ہیں۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اہلِ ایمان ان سے نباہیں تو گویا وہ ان سے نباہیں گے جن سے خدا کو نفرت ہے۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۵۹-۶۶

آگے مسلمانوں کو جہاد کے لیے برابر تیار رہنے اور اس کے لیے اسلحہ اور قوت فراہم کرنے پر ابھارا ہے۔ اس لیے کہ بدر میں قریش کو جو شکست ہوئی اس نے قریش میں بھی آگ لگا دی اور یہود بھی جو اب بک یہ توقع لیے بیٹھے تھے کہ وہ قریش کے ہاتھوں مسلمانوں کو ختم کرا دیں گے۔ اپنی اس توقع میں ناکام ہو کر نئے منصوبے بنانے میں پوری طرح سرگرم ہو گئے۔ ان حالات سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو بھی ہدایت ہوئی کہ اب پوری سرگرمی سے جہاد کے لیے تیاری کرو۔

اس ضمن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان بھی دلایا گیا کہ اگر یہ معاندین کوئی مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کا رجحان ظاہر کریں تو تم بھی مصالحت سے گریز نہ کرنا۔ اگر اس مصالحت کے پردے میں انھوں نے کوئی چال چلنے کی کوشش کی تو جس خدا نے اپنی نصرت اور انہی تھوڑے سے مسلمانوں کے ذریعہ سے بدر میں تمھیں فتح دلائی ہے وہ اب بھی تمھارے ساتھ ہے۔

پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی گئی کہ تم مسلمانوں کی تعداد کی کمی سے مطلق ہراساں نہ ہو۔ تمھارے لیے اللہ اور انہی تھوڑے سے مسلمانوں کی رفاقت کافی ہے۔ یہی قطرے سیلاب بنیں گے۔ مسلمانوں کو اطمینان دلاؤ کہ ان کے دس آدمی کفار کے سو آدمیوں پر بھاری ہوں گے۔ اصلی طاقت دلوں کی طاقت ہوتی ہے نہ کہ محض گنتی کی۔ جو لوگ تمھارے مقابل میں ہیں وہ محض کھوکھلے دل والے ہیں۔

اس مجموعہ کی آخری آیت ۶۶ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں، مسلمانوں کی کثرت کے دور میں نازل ہوئی ہے۔ اس نے مسلمانوں پر سے وہ ذمہ داری کچھ ہلکی کر دی جو اوپر والی آیت میں ان پر عائد ہوئی تھی۔ چونکہ اس کا تعلق اسی مضمون سے تھا اس وجہ سے اس کو یہاں جگہ دی گئی۔ آگے اس کی وضاحت آئے گی۔

آیات ۵۹-۶۶

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ﴿٥٩﴾ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿٦٠﴾ وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦١﴾ وَإِن

يُرِيدُوٓا أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ ٱللَّهُ ۚ هُوَ ٱلَّذِىٓ أَيَّدَكَ
بِنَصْرِهِۦ وَبِٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٢﴾ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ
مَا فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا مَّآ أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ
أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّهُۥ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٦٣﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ حَسْبُكَ ٱللَّهُ
وَمَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٤﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ حَرِّضِ ٱلْمُؤْمِنِينَ ع ۸
عَلَى ٱلْقِتَالِ ۚ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَٰبِرُونَ يَغْلِبُوا مِا۟ئَتَيْنِ ۚ
وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّا۟ئَةٌ يَغْلِبُوٓا أَلْفًا مِّنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ
قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ﴿٦٥﴾ ٱلْـَٰٔنَ خَفَّفَ ٱللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ
ضَعْفًا ۚ فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّا۟ئَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا
مِا۟ئَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوٓا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۗ
وَٱللَّهُ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿٦٦﴾

ترجمۂ آیات ۵۹-۶۶

اور یہ کافر یہ گمان نہ کریں کہ وہ نکل بھاگیں گے، وہ ہمارے قابو سے باہر نہیں جا سکیں گے۔ اور ان کے لیے جس حد تک کر سکو فوج اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جس سے اللہ کے اور تمہارے ان دشمنوں پر تمہاری ہیبت رہے اور ان کے علاوہ کچھ دوسروں پر بھی جنھیں تم نہیں جانتے ہو، اللہ انھیں جانتا ہے اور جو کچھ بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا کر دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ۵۹-۶۰

اور اگر وہ مصالحت کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کے لیے جھک جاؤ اور اللہ

پر بھروسہ رکھیو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں گے تو اللہ تمھارے لیے کافی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی نصرت سے اور مومنین کے ذریعے سے تمھاری امداد کی۔ اور ان کے دلوں کو باہم جوڑا۔ اور اگر تم زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر ڈالتے تو بھی ان کے دلوں کو باہم نہ جوڑ سکتے لیکن اللہ نے ان کو جوڑ دیا۔ بے شک وہ غالب اور حکیم ہے۔ ۶۱-۶۳

اے نبی تمھارے لیے اللہ اور یہی مومنین جنھوں نے تمھاری پیروی اختیار کی ہے کافی ہیں۔ اے نبی مومنین کو جہاد پر ابھارو۔ اگر تمھارے بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تمھارے سو ہوں گے تو ہزار کافروں پر بھاری ہوں گے یہ اس وجہ سے کہ یہ لوگ بصیرت سے محروم ہیں۔ ۶۴-۶۵

اب اللہ نے تمھاری ذمہ داری ہلکی کر دی اور اس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کمزوری ہے۔ سو تمھارے سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر بھاری ہوں گے اور اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ ۶۶

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ (۵۹)

اوپر کی آیات میں کفار کو جو دھمکی دی ہے اور خاص طور پر یہ بات جو فرمائی ہے کہ ان کی ساری دوا دوش اور ان کی تمام جولانیوں کا خدا احاطہ کیے ہوئے ہے یہ اسی مضمون کی تاکید مزید ہے۔ فرمایا کہ اب ہم نے ان کا تعاقب شروع کر دیا ہے۔ اب یہ اس غلط فہمی کو ذہن سے نکال دیں کہ یہ ہم سے بچ کے نکل جائیں گے۔ یہ ہمارے قابو سے باہر نہیں جا سکتے۔ 'اعجزہ الصید' کے معنی ہوں گے فاتہ ولم یقدر علیہ شکار قابو سے باہر نکل گیا۔ پکڑا نہ جا سکا۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ ۚ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (۶۰)

لفظ 'قوۃ' کا مفہوم

'وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ'، لفظ 'قوۃ' قرآن میں، جیسا کہ ۶۹۔ توبہ، ۸۰ ہود، ۹۵ کہف، ۱۵ فصلت اور دوسری آیات سے واضح ہے، عددی قوت اور (MAN POWER) کے لیے بھی آتا ہے۔

'رباط الخیل' سے مراد

'رباط الخیل' سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو خاص جنگ کے لیے تربیت دیے جائیں اور اسی غرض کے لیے محفوظ اور تیار رکھے جائیں۔ جنگ میں ہر قسم کے گھوڑے کام نہیں آتے۔ اس زمانے کی جنگ میں گھوڑوں ہی کی اصل اہمیت بھی تھی اور عرب کی مخصوص آب و ہوا کے لحاظ سے ان کے ہاں گھوڑوں کی تربیت کا خاص اہتمام بھی تھا۔ اسی چیز کی ہدایت یہاں مسلمانوں کو کی گئی ہے کہ جہاد کے لیے قابلِ جہاد لوگوں کو بھی منظم کرو اور تربیت دیے ہوئے گھوڑے بھی تیار رکھو۔ اب تک تو جب کسی جنگی مہم کی صورت پیش آتی عرب کے عام دستور کے مطابق یہ ہوتا کہ ہر سپاہی، جو سامان اس کو میسر ہوتا اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا لیکن اس آیت میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ اپنی فوجی قوت نفری کے اعتبار سے بھی اور اسلحہ و اسباب جنگ کے اعتبار سے بھی زیادہ سے زیادہ بڑھائیں۔ اس زمانے کی جنگ میں گھوڑوں کو وہی اہمیت حاصل تھی جو اس زمانے میں ٹینک اور ہوائی جہاز کو حاصل ہے جنگ بدر میں مسلمانوں کے ساتھ گھوڑے بہت کم تھے۔ آگے کے مراحل کے لیے ان کی تعداد زیادہ کرنے کی ہدایت ہوئی۔

مسلمانوں کو جنگی تیاریوں کا حکم

مسلمانوں کے دشمن اللہ کے دشمن

'تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ' یہ اس تیاری کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ کے اور تمہارے دشمنوں پر تمہاری دھاک اور ہیبت قائم رہے کہ تمہیں نرم چارہ سمجھ کر وہ تم پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کریں۔ یہاں مسلمانوں کے تمام دشمنوں کو اللہ کا دشمن ٹھہرایا ہے اس لیے کہ مسلمانوں کی جنگ جس سے بھی تھی، اللہ کے دین کے لیے تھی، اس میں کسی اور چیز کا کوئی دخل نہیں تھا۔

مسلمانوں کے پس پردہ دشمنوں کی طرف ایک اشارہ

'وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ' اللہ اور مسلمانوں کے یہ دشمن دو قسم کے تھے۔ ایک تو وہ جو سامنے آ چکے تھے۔ مثلاً قریش جو روز اول سے دشمن تھے۔ دوسرے وہ جو ابھی پردے میں تھے۔ مثلاً یہود جن کی خفیہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ نیز وہ قبائل جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدۂ غیر جانبداری تھا لیکن، یہود اور قریش کی تحریک سے وہ بھی پر تولنے لگ گئے تھے۔ علاوہ ازیں وہ منافقین جو منافقت میں بڑے مشاق تھے اور برابر دشمنوں کی مقصد برآری کے لیے مصروف سازش رہتے تھے۔ قرآن نے سورۂ توبہ میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ (۱۰۱ توبہ)	اور تمہارے اردگرد جو اعراب ہیں ان میں بہتیرے منافق ہیں اور اہل مدینہ میں بھی منافق ہیں۔ یہ اپنے نفاق میں بڑے مشاق ہیں۔ تم ان کو نہیں جانتے۔ ہم ان کو جانتے ہیں۔ ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے پھر یہ ایک عظیم عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے۔

علاوہ ازیں بیرونی طاقتیں مثلاً رومی، غسانی، ایرانی وغیرہ بھی تھیں جو بعد میں اس وقت سامنے آئیں جب اسلام نے پورے عرب کو زیرنگیں کر لیا۔ قرآن نے یہاں مسلمانوں کو حاضر سے متعلق ہدایت دیتے ہوئے ان دشمنوں کی طرف بھی ایک اشارہ کر دیا جو مستقبل قریب یا مستقبل بعید کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں تاکہ مسلمان دور تک نگاہ رکھ کر منصوبہ بندی کریں، یہ نہ خیال کریں کہ محض ایک وقتی جھونکا تھا، جو آیا اور اب گزر گیا ہے۔

جنگی تیاریوں کے لیے انفاق

وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الاٰیۃ، جنگی تیاریوں کے سلسلہ میں انفاق کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے کہ اس مقصد کے لیے جو کچھ بھی خرچ کرو گے تمہارا کوئی دھیلا پیسہ بھی ضائع جانے والا نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں تمہارا پائی پائی کا حساب موجود رہے گا اور وہ سب تمہیں پورا کر دیا جائے گا۔ اس میں ذرا کمی نہیں ہوگی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ پورا کیا جانا، اسی اصول کے مطابق ہوگا جو نیکیوں کے اجر کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اور جو قرآن میں دوسرے مقام میں مذکور ہے۔

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ وَإِن يُرِيدُوا أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ ۚ هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ ۝ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۶۱-۶۳)

صلح جوئی کی اجازت

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ، سَلْمٌ، سِلْمٌ، صلح اور مصالحت کے معنی میں آتا ہے اور یہ مؤنث بھی استعمال ہوتا ہے۔

اجتماعی اصول عدل کا احترام

اوپر جنگ کا جو حکم دیا ہے وہ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ کی تصریح کے ساتھ ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ قریش کے ساتھ یہ جنگ اس وقت تک ختم ہونے والی نہیں ہے جب تک فتنہ کا اور سرزمین حرم سے ہر شائبہ شرک و کفر کا استیصال نہ ہو جائے۔ یہاں یہ واضح فرمایا کہ یہ حکم اس بات کے منافی نہیں ہے کہ کسی مرحلے میں قریش اگر صلح کے خواہاں ہوں تو ان سے صلح کر لی جائے۔ ان کی صلح کی پیشکش کو قبول کرنے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دے دی گئی۔ اس وقت تک قریش کے لیڈروں نے جس عناد کا اظہار کیا تھا اس کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کوئی مصالحت نیک نیتی

سے کریں گے بلکہ اندیشہ تھا کہ شرارت کرنے اور دھوکہ دینے ہی کے لیے کریں گے اس وجہ سے ان پر اعتماد کرنے کا مسئلہ بڑا مشکل تھا۔ تاہم چونکہ اجتماعی اصول عدل اسی بات کا مقتضی تھا کہ حریف کی صلح کی پیشکش ٹھکرائی نہ جائے اس وجہ سے آنحضرتؐ کو ہدایت ہوئی کہ اس اندیشے کے باوجود مصالحت قبول کر لینا اور اللہ پر بھروسا رکھنا۔ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اگر اس کے اعتماد پر تم ایک مقصد خیر کی خاطر خطرہ مول لو گے تو اللہ تمھاری مدد فرمائے گا اور حریف اس سے کوئی غلط فائدہ اٹھانے میں کامیاب نہ ہو گا۔

بین الاقوامی حالات میں اللہ کا احترام — 'وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ' یعنی زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا یہی تو کہ وہ تمھیں دھوکہ دینے کی کوشش کریں گے تو اس کی پروانہ کرنا، اللہ تمھارے لیے کافی ہے۔ 'اللہ تمھارے لیے کافی ہے' کے اجمال میں جو کچھ مضمر ہے قلم اس کی تعبیر سے اگرچہ قاصر ہے لیکن وہ بغیر کسی اظہار کے بھی ظاہر ہے۔ یہاں خاص طور پر غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام حق و انصاف کے جس اصول کی تلقین انسان کو اس کی انفرادی زندگی کے لیے کرتا ہے اسی کی تلقین اس کی اجتماعی زندگی کے لیے کرتا ہے اور اسی کی تلقین اس کی بین الاقوامی زندگی کے لیے بھی کرتا ہے اور اس تصریح کے ساتھ کرتا ہے کہ اگر اس میں کچھ خطرہ اور اندیشہ بھی ہو جب بھی کسی خیر کی پیشکش ٹھکرائی نہ جائے۔ بلکہ اللہ پر بھروسہ کر کے وہ قبول کر لی جائے۔ یہ توکل علی اللہ یہاں خاص طور پر نگاہ میں رہے۔ معلوم ہوا کہ توکل صرف مسجد کی چاردیواری تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ میدان جنگ میں بھی اہل ایمان کی قوت اور بین الاقوامی معاملات میں بھی اہل ایمان کی پشت پناہ ہے۔

'هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ' یہ اس 'حَسْبُكَ اللَّهُ' کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ جس خدا نے بدر میں اپنے فرشتوں کی فوج سے تمھاری مدد کی اور مٹھی بھر مسلمانوں سے کفار کی دل بادل فوج کچلوا دی وہ خدا تمھاری اس وقت بھی مدد فرمائے گا جب تمھارے یہ حریف صلح کے پردے میں تمھارے خلاف جنگ کی اسکیمیں بنائیں گے اور تمھاری نیکی سے کوئی غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔

خدا سازی بات — 'وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ' اوپر جو یہ اشارہ ہوا ہے کہ اللہ نے مومنین کے ذریعہ سے تمھاری مدد فرمائی، یہ اس کی وضاحت ہے کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ خاص تائید غیبی ہی کا یہ کرشمہ ہے۔ کسی شیطانی مقصد کے لیے کسی بھیڑ کا اکٹھا کر لینا تو مشکل نہیں ہوتا۔ ہر نعرہ باز یہ کام کر سکتا ہے لیکن خاص اللہ کے کام کے لیے جس میں خدا کی خوشنودی اور آخرت کی طلب کے سوا کسی بھی دوسری چیز کا کوئی ادنیٰ شائبہ نہ ہو، کلمۂ حق کے جاں نثاروں کی ایک جمعیت کا فراہم ہو جانا بغیر اس کے ممکن نہیں ہوا کہ اللہ نے تائید کی اور اس کی توفیق بخشی نے رہنمائی فرمائی۔ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمع ہوئے تھے، اپنی یہ نئی زندگی اختیار کرنے سے پہلے، دور جاہلیت کی تمام برائیوں میں آلودہ تھے، ان کے قبیلے جدا جدا تھے اور ان میں شدید قسم کے تعصبات تھے، ان کے دیوتا الگ الگ تھے اور یہ آنکھیں بند کر کے ان کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے مفادات باہم متصادم تھے اور یہ ان کے

حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز اور عدل و ظلم کے تمام حدود و قیود سے آزاد تھے۔ اس طرح کے لوگوں کو ان کے تمام تعصبات و مفادات اور تمام رسوم و عادات سے چھڑا کر بالکل ایک نئے سانچہ میں ڈھال دینا اور اس سانچے کو ان کی نگاہوں میں اتنا محبوب بنا دینا کہ اس کی خاطر وہ قوم، وطن، خاندان، جائداد اور بیوی بچے سب کو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوں، یہ خدا ہی کے لیے ممکن ہے۔ کوئی انسان یہ کام نہیں انجام دے سکتا، اگرچہ وہ دنیا جہان کے سارے وسائل اس پر صرف کر ڈالے۔

اللہ عزیز و حکیم ہے۔ وہ جو کام کرنا چاہتا ہے کر ڈالتا ہے اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ اشارہ ہے ہدایت و ضلالت کے اس قانون کی طرف جس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۚ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ (۶۴-۶۵)

مسلمانوں کو جہاد پر ابھارنے کی ہدایت

'يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ' یہ آیت تمہید ہے اس حکم کی جو بعد والی آیت میں مسلمانوں کو جہاد پر ابھارنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے اللہ کی مدد اور ان تھوڑے سے مسلمانوں ہی کی رفاقت کافی ہے تو تم کفار کی کثرت اور اپنے ساتھیوں کی قلت کی فکر نہ کرو۔ گویا وہی بات جو اوپر 'فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ' کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے، یہاں دوسرے اسلوب سے کہی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ 'وَمَنِ اتَّبَعَكَ' کا عطف 'اللہ' پر ماننے سے شرک کا پہلو پیدا ہوتا ہے لیکن یہ خیال کلام کے سیاق و سباق پر غور نہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے جو تاویل کی ہے وہ بالکل واضح، قرآن کے نظائر کے مطابق اور شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔

مسلمانوں اور کافروں کی قوت کا تناسب

'يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ' یہ اسی اوپر والے مضمون کی وضاحت ہے کہ ہر چند تمہارے ساتھیوں کی تعداد باعتبار کمیت تھوڑی ہے لیکن باعتبار کیفیت بہت ہے۔ تمہارے بیس ثابت قدم مسلمان کفار کے دو سو آدمیوں پر اور تمہارے سو آدمی ان کے ہزار آدمیوں پر بھاری ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے ساتھیوں کو اللہ نے بصیرت ایمانی سے نوازا ہے اور تمہارے حریف اس بصیرت سے محروم ہیں۔

مسلمان کی اصل قوت

'لَا يَفْقَهُونَ' میں 'فقہ' سے مراد بصیرت ایمانی ہے۔ یہی بصیرت انسان کا اصل جوہر ہے۔ اس بصیرت کے ساتھ جب مومن میدان جنگ میں نکلتا ہے تو وہ اپنے تنہا وجود کے اندر ایک لشکر کی قوت محسوس کرتا ہے، اس کو اپنے دہنے بائیں خدا کی نصرت نظر آتی ہے، موت اس کو زندگی سے زیادہ عزیز و محبوب ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس کی بصیرت اس کے سامنے اس منزل کو روشن کر کے دکھا دیتی ہے جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہی بصیرت اس کے اندر وہ صبر و ثبات پیدا کرتی ہے جو اس

کو تنہا اس بصیرت سے محروم دس آدمیوں پر بھاری کر دیتی ہے۔

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۶۶)

مسلمانوں کی ذمہ داری میں تخفیف

'اَلْئٰنَ' کا لفظ یہاں اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ آیت اوپر کی آیات کے بہت بعد اس دور میں نازل ہوئی ہے جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ چنانچہ دونوں میں تقابل کی نسبت بھی مختلف ہے۔ اوپر والی آیت میں بیس اور دو سو، سو اور ہزار کا تقابل ہے اور اس میں سو اور دو سو، ہزار اور دو ہزار کا تقابل ہے۔ یہ بھی قرینہ ہے کہ یہ مسلمانوں کی کثرت کے دور کی آیت ہے۔ اس کا تعلق چونکہ اسی مضمون سے تھا اس وجہ سے ترتیب میں اس کو یہیں جگہ ملی۔ قرآن میں نظم کے اعتبار کی ایک دلیل یہ بھی ہے۔

یہ بات کہ دس مسلمان سو پر بھاری رہیں گے وارد تو ہوئی ہے بشارت کے بیان میں لیکن اس بشارت کے ساتھ اس نے مسلمانوں پر ایک بھاری ذمہ داری بھی ڈال دی تھی کہ بیس مسلمان دو سو کافروں کا اور سو مسلمان ہزار کافروں کا اپنے آپ کو مقابل سمجھیں اور اگر کہیں اسی نسبت کے ساتھ ان سے مقابلہ کی نوبت آن پڑے تو قلت تعداد کے عذر پر ان کو پیٹھ نہ دکھائیں۔ چونکہ پیٹھ دکھانے کا گناہ، جیسا کہ آیت ۱۶ میں بیان ہوا، بہت سخت ہے اس وجہ سے قدرتی طور پر مسلمانوں نے اس ذمہ داری کو ایک بھاری ذمہ داری محسوس کیا ہوگا اور اسی احساس کے ساتھ اس کو ادا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ بعد میں جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو یہ بوجھ اللہ تعالیٰ نے ہلکا کر دیا اور سابق نسبت بدل کر سو اور دو سو، ہزار اور دو ہزار کی نسبت قائم کر دی گئی۔

تخفیف کے دو سبب

آیت کے الفاظ سے اس نسبت کی تبدیلی کی دو وجہیں سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو اس نے یہ پسند فرمایا کہ سابقون الاولون کے کندھوں پر جو زیادہ بوجھ ہے وہ ہلکا کر کے دوسرے بعد میں آنے والے مسلمانوں پر ڈال دیا جائے۔

دوسری یہ ہے کہ بعد میں جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے وہ بصیرت و عزیمت کے اعتبار سے سابقون الاولون کے ہم پایہ نہیں تھے۔ بحیثیت مجموعی ان کا درجہ کم ہی تھا اس وجہ سے ان کی کمزوری کا لحاظ کر کے ان کی ذمہ داری بھی کم رکھی۔ اس کا اشارہ 'عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا' سے نکلتا ہے۔ 'ضعف' کا لفظ جسمانی اور مادی کمزوری کے لیے نہیں آتا بلکہ عزم و ارادہ اور معرفت و بصیرت کے ضعف کے لیے بھی آتا ہے۔

ان آیات پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو ایک تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی نصرت کا استحقاق اپنے اندر صفت صبر پیدا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ بغیر اس صفت کے پیدا کیے کسی گروہ کو اللہ کی

مدد حاصل نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ اسباب و وسائل جس رفتار سے بڑھتے جاتے ہیں خدا کی براہِ راست مدد اسی نسبت سے کم ہوتی جاتی ہے۔ تیسری حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ اصل قوت ایمان کی قوت ہے۔ دوسری چیزیں سب اس کے توابع میں سے ہیں۔ چوتھی بات یہ نکلتی ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اصل اعتماد اللہ پر ہونا چاہیے نہ کہ اسباب پر۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۶۷-۷۱

آگے قریش کے اس پراپیگنڈے کا جواب دیا ہے جو انھوں نے بدر میں شکست کھانے کے بعد اسلام، مسلمانوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف شروع کیا۔ جنگِ بدر سے پہلے تک تو، جیسا کہ پیچھے تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے، وہ اسلام اور مسلمانوں کی کمزوری کو اسلام کے خلاف بطور ایک دلیل کے پیش کرتے تھے۔ کہتے کہ یہ دین اگر حق ہوتا تو کیا اس کو ایسے ہی کمزور و ناتوان حامل ملتے، اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے پیغمبر ہوتے تو کیا وہ ایسے ہی بے وسیلہ و ذریعہ اور بے حامی و مددگار ہوتے، اگر اسلام حق ہوتا تو کیا ہم پر کوئی عذاب نہ آجاتا، مختصر یہ کہ وہ اپنے غلبہ اور اسلام کی مغلوبیت کو اسلام کے باطل ہونے اور اپنے برحق ہونے کی دلیل ٹھہراتے۔ یہاں تک کہ غزوۂ بدر کو انھوں نے خود فیصلہ کی ایک کسوٹی کا درجہ دے دیا اور ان کے لیڈروں نے علانیہ یہ کہا کہ اس جنگ میں جو جیتے گا وہ حق پر سمجھا جائے گا، جو ہارے گا وہ باطل پر سمجھا جائے گا۔ بالآخر جب جنگ کا نتیجہ ان کے خلاف نکلا اور وہ خود اپنی ہی انتخاب کردہ کسوٹی پر کھوٹے ثابت ہو گئے تو انھیں اپنی قوم کو سنبھالنے اور بدر کی شکست کے اثرات سے اس کو بچانے کے لیے اپنے پروپیگنڈے کے رخ کو بدلنا پڑا۔ اب انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ کہیں کسی پیغمبر کے بھی یہ کام ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ہی قوم کو یوں باہم لڑا دے، ملک میں خونریزی کرائے، اپنے ہی بھائی بندوں کو قیدی بنائے، ان سے فدیہ وصول کرے، ان کا مال لوٹے اور اس کو اپنے ساتھیوں کو بانٹ کر کھائے کھلائے؟ ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ سارے کام تو اقتدار و سلطنت کے طالبوں اور دنیا داروں کے ہیں تو یہ پیغمبر کہاں سے ہوئے اور ان کو خدا سے کیا واسطہ؟

قریش نے اپنے پروپیگنڈے سے ایک طرف تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اپنی قوم کو بدر کی شکست کے اثرات سے بچانا چاہا کہ مبادا مسلمانوں کی اس فتحِ مبین سے وہ اسلام اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حقانیت کا کوئی تصور قبول کرے، دوسری طرف نہایت ہوشیاری سے مسلمانوں کے اس جوشِ جہاد پر ضرب لگانی چاہی جو بدر کے بعد قدرتی طور پر بہت نمایاں ہو گیا تھا اور جس پر، اوپر کی آیات میں مسلمانوں کو ابھارا گیا ہے۔ یہ صورتِ حال متقضی ہوئی کہ اس سلسلہ میں ان کے اس پروپیگنڈے کا جواب دے دیا جائے کہ کم از کم مسلمانوں پر اس کا کوئی برا اثر نہ پڑنے پائے۔ چنانچہ یہاں تمام متعلق گروہوں کو مخاطب

کرکے اس کا جواب دیا گیا۔

پہلے قریش کے لیڈروں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ یہ جو کچھ پیش آیا اس کی ذمہ داری نبی پر نہیں بلکہ خود تم پر ہے۔ کوئی نبی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ وہ قیدی پکڑے، فدیہ وصول کرے اور مال غنیمت لوٹنے کے لیے زمین میں خونریزی تک نوبت پہنچا دے۔ ان چیزوں کے طالب تم ہو، خدا ان چیزوں کا طالب نہیں ہے۔ شکر کرو کہ ابھی بات یہیں تک رہ گئی۔ ورنہ تم نے جو شرارت کی تھی اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم پر خدا کا کوئی سخت عذاب آجاتا لیکن اللہ نے ہر چیز کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اس وجہ سے تمھیں کچھ مہلت دے دی گئی۔

اس کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تم ان شریر لوگوں کے پروپیگنڈے سے ذرا بھی متاثر نہ ہو۔ جو مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے وہ تمھارے لیے بالکل حلال طیب ہے۔

اسی سلسلہ میں جنگ بدر کے ان قیدیوں کو جنھیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا، یہ پیغام دلایا کہ وہ یہ فدیہ لیے جانے سے دل گرفتہ نہ ہوں۔ یہ ان کے اوپر ایک احسان کیا گیا ہے اور اگر انھوں نے اس احسان کی قدر کی تو بہت ممکن ہے کہ اللہ ان کو اپنے مزید احسان سے نوازے اور اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی بلکہ پھر اسلام کے مقابل میں جنگ کے لیے آئے تو یاد رکھیں کہ اس سے بھی سخت دن دیکھیں گے۔
اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۷-۷۱
مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ
تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ
حَكِيمٌ ﴿٦٧﴾ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ
عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٦٨﴾ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا
اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٦٩﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي ع ۹ ۵
أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ
خَيْرًا مِمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٧٠﴾
وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ

مِّنْهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٧١﴾

ترجمۂ آیات ۶۷-۷۱ کوئی نبی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ اس کو قیدی ہاتھ آئیں یہاں تک کہ وہ اس کے لیے ملک میں خونریزی برپا کر دے۔ یہ تم ہو جو دنیا کے سروسامان کے طالب ہو، اللہ تو آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو روش تم نے اختیار کی اس کے باعث تم پر ایک عذاب عظیم آدھمکتا۔ ۶۷-۶۸

پس جو مال غنیمت تم نے حاصل کیا اس کو حلال و طیب سمجھ کر کھاؤ برتو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے (۶۹)

اے نبی تمہارے قبضہ میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی پائے گا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر تم کو وہ عطا فرمائے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اگر یہ تم سے بدعہدی کریں گے تو اس سے پہلے انھوں نے خدا سے بدعہدی کی تو خدا نے تم کو ان پر قابو دے دیا اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۷۰-۷۱

۱۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۶۷-۶۸)

'ما کان' کا اسلوب بیان لفع الزام کے لیے 'مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ'، 'ماکان' کا اسلوب بیان الزام اور رفع الزام دونوں کے لیے آسکتا ہے اور قرآن میں دونوں ہی قسم کے مواقع میں یہ اسلوب استعمال

ہوا ہے۔ اس امر کا تعین کہ یہ الزام کے لیے ہے یا رفع الزام کے لیے موقع و محل، سیاق و سباق، قرینہ اور مخاطب کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی اسلوب بیان آل عمران ۱۶۱ میں ہے۔ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اور جو خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن اپنی خیانت کے ساتھ حاضر ہوگا) ظاہر ہے کہ یہ آیت الزام کے لیے نہیں بلکہ رفع الزام اور نبی کی تنزیہ شان کے لیے ہے۔ اس آیت کے بارے میں تمام اہل تاویل کا اتفاق ہے کہ منافقین کو مخاطب کر کے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ تم نبی پر خیانت کی جو تہمت دھرتے ہو یہ سورج پر تھوکنے کی کوشش کے مترادف ہے، کوئی نبی بھی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ وہ خیانت اور بے ذمگی کا مرتکب ہو۔ ٹھیک اسی اسلوب پر آیت زیر بحث میں قریش کی تردید کی گئی ہے کہ تم نبی پر یہ الزام جو لگاتے ہو کہ یہ ہوس اقتدار میں مبتلا ہیں، اپنی قوم میں انھوں نے خونریزی کرائی، اپنے بھائیوں کو قید کیا، ان کا مال لوٹا، ان سے فدیہ وصول کیا، یہ ساری باتیں تمھاری اپنی کھسیاہٹ مٹانے کے لیے ہیں۔ کوئی نبی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ وہ قیدی پکڑتے، فدیہ وصول کرتے اور مال غنیمت لوٹنے کے شوق میں ملک میں خوں ریزی برپا کر دے۔ یہ باتیں تم اس لیے کہتے ہو کہ تم نبی کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہو۔ تمھاری چاہتیں چونکہ یہی کچھ ہیں اس لیے تم سمجھتے ہو کہ نبی بھی یہی کچھ چاہتا ہے۔

خطاب قریش سے

تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ یہ خطاب قریش سے ہے۔ قرآن میں خطاب کا انداز، جیسا کہ ہم بار بار واضح بھی کر چکے ہیں، بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے جو ایک اعلیٰ خطیب تقریر میں اختیار کرتا ہے۔ جتنی پارٹیاں سامنے ہوتی ہیں، بیک وقت، سب کی طرف رخ بدل بدل کر ان کے ذہن کے لحاظ سے بات کہتا چلا جاتا ہے۔ خود بات ہی واضح کر دیتی ہے کہ مخاطب کون ہے اور اس کے کس شبہ یا اعتراض کا کیا جواب دیا گیا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ اس آیت کا مخاطب مسلمانوں کو اور وہ بھی سید عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صدیق اکبرؓ کو ماننے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے اور بالفرض اس آیت کا مخاطب دل پر جبر کر کے نبیؐ اور صدیقؓ کو تھوڑی دیر کے لیے کوئی مان بھی لے تو اس کے بعد جو آیت آرہی ہے اس کا مخاطب نبیؐ اور صدیقؓ کو ماننے کے لیے کوئی دل و جگر کہاں سے لائے۔

اسلوب بیان کی بلاغت

بہر حال ہمارے نزدیک یہ خطاب قریش سے ہے اور یہ ان کے اس پروپیگنڈے کا جواب دیا جا رہا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ فرمایا کہ اس قسم کی دنیا طلبی تمھارا ہی شیوہ ہے۔ اللہ تو آخرت کو چاہتا ہے۔ یہاں اسلوب بیان کی یہ بلاغت ملحوظ رہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ نبی اور اہل ایمان آخرت کے طلب گار ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ اللہ آخرت کو چاہتا ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ نبی اور اہل ایمان کے ہاتھوں جو کچھ یہ ہو رہا ہے یہ ان کی اپنی مرضی سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ اللہ کی مرضی اور اللہ کے حکم سے ہو رہا ہے، نبی اور اہل ایمان کی حیثیت اس سارے کام میں محض آلہ اور واسطہ کی ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں

یہی عین اللہ کا ارادہ اور اس کی مرضی ہے۔ اللہ کی مرضی اپنے بندوں کے لیے یہ ہے کہ وہ ہر کام آخرت کو اپنا نصب العین بنا کر کریں تو نبی اور اس کے ساتھیوں کا کوئی اقدام اللہ کی مرضی کے خلاف کس طرح ہو سکتا ہے مگر یا بدر اور اس سلسلہ کے تمام اقدامات کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ عزیز و حکیم ہے۔ وہ جو ارادہ فرماتا ہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور اس کا ہر ارادہ عدل و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اب تم جو تدارکِ خاتی کرنا چاہتے ہو کر تے رہو۔

آگے کے لیے ایک تنبیہ

'لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ' یعنی تم نے اتنے ہی پر یہ واویلا برپا کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہ تو صرف ایک چرکا ہے جو تمھیں لگا ہے، تم نے جو شرارت اس موقع پر کی تھی اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس پر تمھیں ایک عذابِ عظیم آپکڑتا لیکن اللہ نے چونکہ ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، جس سے پہلے کسی قوم کا فیصلہ نہیں ہوتا اس وجہ سے اس نے تمھیں مہلت دے دی۔ مطلب یہ ہے کہ اس شور و غوغا کے بجائے بہتر یہ ہے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاؤ اور اس فیصلہ کن گھڑی کے آنے سے پہلے پہلے اپنی روش کی اصلاح کر لو۔

'فِيْمَآ اَخَذْتُمْ' میں 'ما' کے ابہام کی بیان کوئی وضاحت موجود نہیں ہے اور 'اخذ' کا لفظ لینے، پکڑنے، اختیار کرنے، کسی ڈھب کو اپنانے، کسی کام کو شروع کرنے سب کے لیے آتا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے 'وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ' ۵۰ (اور اگر تمھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ منافق کہتے ہیں خوب ہوا ہم نے اپنا بچاؤ پہلے ہی کر لیا تھا) یہاں یہ مطلب ہو گا کہ جو طریقہ تم نے اختیار کیا اس کی بنا پر تم سزاوار تو تھے ایک عذابِ عظیم کے لیکن اللہ کے قانون کے تحت تمھیں کچھ مہلت مل گئی۔

مفسرین کی ایک الجھن کا ازالہ

ہمارے مفسرین کو ان آیات کی تاویل میں بڑی الجھن پیش آتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین پر عتاب ہے کہ وہ زمین میں خوں ریزی کیے بغیر بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے پر کیوں راضی ہو گئے۔ صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اب اس بات کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی تاہم چند باتیں ذہن میں رکھیے۔

ایک یہ کہ فدیہ قبول کرنے کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے بالفرض غلطی ہوتی بھی تو یہ کسی سابق ممانعت کی خلاف ورزی کی نوعیت کی غلطی نہیں تھی بلکہ صرف اجتہادی غلطی تھی۔ اجتہاد کی غلطی ایسی چیز نہیں ہے جس پر ایسی سخت وعید وارد ہو۔ بالخصوص ایک ایسا اجتہاد جس کی تصدیق فوراً ہی خود اللہ تعالیٰ نے کر دی ہو۔

دوسری بات یہ کہ یہ اجتہاد کی غلطی بھی نہیں تھی۔ جنگ کے قیدیوں سے متعلق یہ قانون سورۂ محمد میں پہلے بیان ہو چکا تھا کہ وہ قتل بھی کیے جا سکتے ہیں، فدیہ لے کر بھی چھوڑے جا سکتے ہیں اور بغیر فدیہ لیے

محض احساناً بھی چھوڑے جا سکتے ہیں۔

تیسری یہ کہ جہاں تک خون ریزی کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے بھی بدر میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ قریش کے ستر آدمی، جن میں بڑے بڑے سردار بھی تھے، مارے گئے، کم و بیش اتنے ہی آدمی قید ہوئے۔ باقی فوج بھاگ کھڑی ہوئی تو آخر لڑائی کس سے جاری رکھی جاتی؟

چوتھی یہ کہ یہاں عتاب کے جو الفاظ ہیں وہ قرآن کے مخصوص الفاظ ہیں۔ جو شخص قرآن کے انداز بیان سے آشنا ہے وہ جانتا ہے کہ ان لفظوں میں قرآن نے کفار و منافقین کے سوا اور کسی پر عتاب نہیں کیا ہے۔ نقل کرنے میں طوالت ہوگی، جس کو تردد ہو وہ قرآن میں ان تمام مواقع پر ایک نظر ڈال لے جہاں 'لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ' الآیۃ کے الفاظ سے کسی پر عتاب ہوا ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۶۹)

مال غنیمت کے حلال ہونے کی یقین دہانی — اب یہ مسلمانوں کی طرف رخ کرکے انھیں اطمینان دلایا کہ تم ان لوگوں کی ان ہفوات کی مطلق پروا نہ کرو، جو مال غنیمت یا فدیہ تمھیں حاصل ہوا ہے اسے کھاؤ برتو، یہ تمھارے لیے حلال و طیب ہے۔ چونکہ یہ بات بعینہٖ اسی بات کا ایک حصہ ہے جو اوپر والی آیات میں مسلمانوں کے دفاع میں کہی گئی ہے اس وجہ سے 'ف' کے واسطہ سے اسی پر عطف کردی گئی ہے۔ بس اتنا فرق ہوا ہے کہ اوپر کی بات قریش کو مخاطب کرکے کہی گئی ہے اس لیے کہ وہ انہی سے کہنے کی تھی اور اس دوسری بات کا رخ مسلمانوں کی طرف ہوگیا ہے اس لیے کہ یہ انہی کو جتانے کی تھی۔ خطاب میں اس طرح کی جو لطیف تبدیلیاں ہوتی ہیں اس کی متعدد مثالیں خود اس سورہ میں بھی گزر چکی ہیں۔ ایک نہایت عمدہ مثال سورۂ یوسف میں موجود ہے۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ (۲۹- یوسف)

یوسف، تم اس سے اعراض کرو، اور تم اپنے گناہ کی معذرت چاہو بے شک تو ہی خطا کاروں میں سے ہے۔

دیکھیے، ایک ہی سانس میں عزیز مصر نے حضرت یوسفؑ کو بھی خطاب کیا ہے اور اپنی بیوی کو بھی اور رخ کی تبدیلی اور بات کی نوعیت سے خطاب کا فرق بغیر کسی التباس کے نمایاں ہوگیا۔

یہاں مسلمانوں کو مال غنیمت کے حلال و طیب ہونے سے متعلق جو اطمینان دلایا گیا وہ درحقیقت قریش کے جواب میں ہے۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ واقعۂ بدر کے بعد قریش نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ مسلمان مذہبی بن کر تو اٹھے ہیں دینداری کے لیکن ان کے کام بالکل دنیا داروں کے ہیں۔ بھلا دین داروں کے یہی کام ہوتے ہیں کہ ملک میں خونریزی کریں، مال غنیمت لوٹیں، فدیہ وصول کریں اور اس کو مزے سے کھائیں؟ یہ تو یہی شیوہ ہے جو ہمیشہ سے دنیا داروں کا شیوہ ہے۔ قرآن نے یہ بتایا کہ تم ان مفتیوں کے فتوے کی ذرا پروا نہ کرو۔ ان کے نزدیک تو تم ہر شکل گنہگار ہو۔ اگر تم اس جنگ میں ہار جاتے تو تمھارا ہار جانا ان کے نزدیک تمھارے باطل ہونے کی دلیل تھا اب جب کہ جیت گئے ہو تو تمھارا قیدی پکڑنا، مال غنیمت پانا

اور فدیہ وصول کرنا اور اس کو کھانا ان کے نزدیک تمہارے باطل پر ہونے کی دلیل ہے۔ ان لوگوں سے عہدہ برآ ہونے کی شکل بس یہ ہے کہ ان کی پروا نہ کرو اور اللہ نے جو فتوح تمہیں بخشی ہیں ان سے فائدہ اٹھاؤ۔ یہ تمہارے لیے حلال طیب ہیں۔

یہ امر یہاں ذہن میں رکھیے کہ اس زمانے میں عام طور پر مذہب کے رہبانی تصور کا غلبہ تھا اس وجہ سے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے نیک دل لوگ قریش کے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو جائیں جس کا اثر مسلمانوں کے اس ولولۂ جہاد پر پڑے جس کی اس سورہ میں دعوت دی جا رہی ہے۔ قرآن نے ان کی تردید کر کے اس امکان کا سد باب کر دیا۔

'وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ' مطلب یہ ہے کہ جو چیز جائز اور طیب ہے اس کو تو کھاؤ پر تو البتہ اللہ سے ڈرتے رہو کہ کسی ایسی چیز میں آلودہ نہ ہو جاؤ جس سے خدا نے منع فرمایا ہے۔ اگر تم حدود الٰہی کے تجاوز سے بچتے رہے تو وہ تمہاری چھوٹی موٹی غلطیوں اور کوتاہیوں پر گرفت نہیں فرمائے گا، وہ غفور رحیم ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۷۰-۷۱)

جنگ بدر کے قیدیوں سے خطاب

اب یہ بدر کے قیدیوں کے لیے ایک پیغام بھی ہے اور ساتھ ہی ایک دھمکی بھی۔ پیغام تو یہ ہے کہ تم سے جو فدیہ لیا گیا ہے اس سے دل گرفتہ ہونے کے بجائے تمہیں اللہ اور رسول کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ قتل کرنے کے بجائے تمہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ یہ تمہارے اوپر اللہ اور رسول کا بہت بڑا احسان ہے اور اس احسان کا حق یہ ہے کہ تم ٹھنڈے دل سے اپنے رویہ کا از سر نو جائزہ لو اور سارے معاملہ پر جذبات کے بجائے عقل و انصاف کی روشنی میں غور کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تم احسان کی قدر کرنے والے ہو گے اور تمہاری یہ سعادت اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی توفیق کو تمہاری طرف متوجہ کرے گی اور اس فدیہ سے جو تم سے لیا گیا ہے، کہیں بڑھ کر وہ تمہیں اسلام کی نعمت سے بخش دے گا اور تمہاری مغفرت فرمائے گا۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ الایۃ۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور بدر کے قیدیوں کو دھمکی ہے۔ پیغمبر کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر انھوں نے بے وفائی کی اور تم نے ان پر جو احسان کیا ہے اس کی قدر نہ پہچانی، پھر لڑنے کے لیے آئے تو یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے، اپنی ہی شامت بلائیں گے۔ اس سے پہلے انھوں نے خدا سے بے وفائی و بدعہدی کی تو اس کا مزا انھوں نے چکھا کہ خدا نے ان کو تمہارے ہاتھ میں دے دیا۔ اگر یہی حرکت انھوں نے پھر کی تو خدا پھر انھیں قابو میں دے دے گا اور یہ اپنی اس بدعہدی کی سزا بھگتیں گے۔ یہاں جس بدعہدی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے

کہ اللہ نے ان کو اپنے حرم کا پاسبان بنایا اور ان کو ملت ابراہیم کی وراثت سپرد کی تو انھوں نے حرم کی حرمت برباد کی اور ملت ابراہیم کو مسخ کیا جس کے نتائج ان کے آگے آ رہے ہیں۔ اگر اپنے اس جرم پر یہ کچھ اور اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ شوق بھی کرلیں، اس کے پھل بھی یہ چکھیں گے۔

ان دونوں آیتوں پر غور کیجیے تو یہ بات واضح ہوگی کہ آنحضرتؐ نے بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر جو چھوڑ دیا تو نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ اس نے اس کو پسند فرمایا اور ان قیدیوں کو یہ پیغام بھجوایا کہ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اگر انھوں نے اس احسان کی قدر کی تو اس سے ان کے لیے قبول اسلام اور مغفرت کی راہیں کھلیں گی۔ غور کیجیے کہ کہاں یہ بات اور کہاں وہ جو محض بعض تفسیری روایات کی بنا پر مفسرین نے اختیار فرمائی کہ آنحضرتؐ پر اس بات کے لیے عتاب ہوا کہ اچھی طرح خون بہائے بغیر تم نے قیدی کیوں پکڑے اور فدیہ کیوں قبول کیا۔

۱۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۷۲-۷۵

اب آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ مسلمانوں کو ایمان و ہجرت کی اساس پر منظم ہو جانے اور ایمان و ہجرت ہی کو باہمی تعاضد و تناصر کی بنیاد قرار دینے کا حکم ہوا۔ جاہلیت کے خاندانی تعلقات اور ان کی ذمہ داریاں یک قلم ختم کر دی گئیں۔ حکم ہوا کہ جو لوگ ایمان لائیں، ہجرت کر کے مدینہ میں آ بسیں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر اہل کفر سے جہاد کریں وہ ایک ملت اور باہم دگر ایک دوسرے کے بھائی اور اولیاء ہیں۔ گویا اسلامی معاشرہ کو اس کی مخصوص اساسات پر منظم اور مستحکم کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ ملت کفر کے مقابلہ کے لیے انصار و مہاجرین ایک بنیان مرصوص کی طرح کھڑے ہو سکیں۔ اور مسلمانوں کو جہاد پر جو ابھارا گیا ہے یہ اس جہاد کی تیاری بھی ہے اور آگے والی سورہ میں کفار سے جو اعلان براءت ہونے والا ہے اس کی تمہید بھی۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ آیات
فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ ۷۲-۷۵
أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن
وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ
فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم

مِّيْثَاقٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۗ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِى الْاَرْضِ وَفَسَادٌ
كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ
هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۗ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ
بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾ ع

ترجمۂ آیات ۷۲-۷۵

وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ باہم دگر ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لائے لیکن انھوں نے ہجرت نہیں کی تمہارا ان سے کوئی رشتۂ ولایت نہیں تا آنکہ وہ ہجرت کریں۔ اور اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے طالب مدد ہوں تو تم پر مدد واجب ہے الا آنکہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے مقابلے میں ہو جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھ رہا ہے اور جنھوں نے کفر کیا وہ آپس میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار ہیں تو اگر تم یہ نہ کرو گے تو ملک میں ظلم اور بڑا فساد ہوگا۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی، یہی لوگ پکے مومن ہیں۔ ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔ اور جو ایمان لائیں اس

سے کے بعد ایمان لائیں اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ جہاد میں شریک ہوں، یہ بھی تمہی میں سے ہیں اور رحمی رشتے والے اللہ کے قانون میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۷۲-۷۵

۱۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۷۲)

اسلام میں حمایت ونصرت کی بنیاد ایمان پر ہے

اسلام سے پہلے باہمی حمایت ونصرت کی بنیاد خاندانی و قبائلی عصبیت پر تھی۔ کوئی شخص یا خاندان کسی خطرے یا کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا تو اس کا خاندان یا قبیلہ اس کی حمایت و مدافعت میں سرکف ہوتا۔ اسلام نے مدینہ میں جو نیا معاشرہ قائم کیا اس میں حمایت ونصرت کی بنیاد ایمان اور ہجرت پر رکھی۔ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے، جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے مال و جان سے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہ باہم دگر ایک دوسرے کے یاور، ناصر اور حامی و مددگار ہیں۔ 'اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا' سے ظاہر ہے کہ مہاجرین مراد ہیں اور 'اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا' سے انصار۔ ان دونوں گروہوں کا ذکر ان کے اسماء و اعلام کے بجائے ان کی صفات اور ان کی دینی خدمات سے کیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس نئی سوسائٹی میں خاندان و نسب کی عصبیت کے بجائے اعتبار صرف ایمان و اسلام اور ہجرت و جہاد کا ہوگا۔ یہ ایک دوسرے کے ولی یعنی حامی و ناصر ہیں۔ ظاہر ہے کہ حمایت و نصرت اہل کفر کے مقابل میں ہے۔ یہ بات اگرچہ بیان واقعہ کے اسلوب میں ہوئی ہے لیکن اس کے اندر امر کا مضمون بھی مضمر ہے یعنی یہ حکم ہے کہ اہل کفر کے مقابل میں اہل ایمان ایک دوسرے کے حامی و مددگار بن کر کھڑے ہوں اور جب ضرورت پیش آئے ایک دوسرے کی حمایت و مدافعت کریں۔

ہجرت کے بعض وقتی مصالح

'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا' ان لوگوں کو جو اسلام تو لا چکے تھے لیکن ابھی انھوں نے دارالکفر سے دارالاسلام مدینہ کو ہجرت نہیں کی تھی اس رشتۂ ولایت سے الگ رکھا یعنی دارالاسلام والوں پر ان کی حمایت و نصرت اور حفاظت و مدافعت

کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس ذمہ داری کے نہ اٹھانے کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ عملاً یہ ناممکن بھی تھی اور اس سے بہت سی بین الاقوامی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو سکتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس وقت مصلحت بھی تھی اور حکم بھی یہی تھا کہ تمام وہ لوگ جو اسلام لا چکے ہیں دارالکفر کے علاقوں سے نکل کر مدینہ میں مجتمع ہوں تاکہ اہل کفر سے نمٹنے اور بیت اللہ کی آزادی کے لیے منظم جدوجہد عمل میں آسکے۔

معاہدہ کا احترام

وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ۔ یعنی ہر چند دارالاسلام والوں پر ان مسلمانوں کی حمایت و مدافعت کی ذمہ داری نہیں ہے جنھوں نے دارالکفر سے ہجرت نہیں کی ہے تاہم اگر وہ دین کے معاملے میں طالب مدد ہوں تو ان کو ممکن مدد بہم پہنچائی جائے بشرطیکہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے مقابل میں نہ ہو جس سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو۔ معاہدہ کا احترام مقدم ہے۔ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔ یہ معاہدہ کے احترام کو مؤکد کرنے کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معاہدہ کے احترام کے منافی خفیہ یا علانیہ جو قدم بھی تم اٹھاؤ گے خدا اس سے بے خبر نہیں رہے گا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ (۷۳)

دین میں دارالکفر کے مسلمانوں کی امداد کی وجہ

یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ خاص دین کے باب میں دارالکفر کے مسلمانوں کی مدد کرنا کیوں ضروری ہے۔ فرمایا کہ جہاں تک اسلام اور مسلمانوں کی عداوت کا تعلق ہے اس معاملے میں تمام کفار ایک دوسرے کے دست و بازو بن گئے ہیں۔ جو اللہ کا بندہ اسلام قبول کر لیتا ہے اس کی تعذیب و ایذا رسانی سب کے نزدیک کارِ ثواب ہے۔ یہاں تک کہ ظالموں کے ظلم سے اس کو بچانے کے لیے اس کے اپنے بھائی بندوں کی حمیت بھی مردہ ہو چکی ہے۔ اس کا مال اور اس کی جان سب مباح ہیں۔ ایسی حالت میں اگر تم بھی ان مظلوموں کی مدد نہ کرو گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دین سے پھرنے کے لیے سارے ملک میں ظلم و فساد عام ہو جائے گا۔ فتنہ کا لفظ یہاں (PERSECUTION) کے مفہوم میں ہے اور اِلَّا تَفْعَلُوهُ، میں ضمیر مفعول کا مرجع وہی نصرت ہے جس کا ذکر فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ میں آیا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (۷۴)

دارالکفر کے مسلمانوں کے لیے ہجرت صداقت کی کسوٹی ہے

اس آیت میں ہجرت کو دارالکفر کے مسلمانوں کے لیے صداقت کی کسوٹی قرار دیا ہے۔ جب یہ فرمایا کہ سچے اور پکے مسلمان وہی ہیں جنھوں نے ہجرت اور جہاد کیا اور جنھوں نے مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ اسلام کی اصل دولت مہاجرین و انصار ہی سے ہے وہ لوگ جو ایمان تو لا چکے ہیں لیکن ابھی انھوں نے دارالکفر سے ہجرت نہیں کی ہے، انھیں اپنے ایمان کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دارالکفر سے نکل کر دارالاسلام میں آئیں اور مہاجرین و انصار کے دوش بدوش جہاد میں شریک ہوں۔ اس سے ہجرت کی وہ غایت بھی واضح ہوئی جس

کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ اس کا اہم مقصد مسلمانوں کو جہاد کے لیے منظم کرنا تھا، دوسرے یہ اشارہ بھی نکلا کہ یہ ایمان و نفاق کے جانچنے کی کسوٹی بھی ہے۔ چنانچہ بعد والی سورہ ۔ سورہ توبہ ۔ میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جن لوگوں نے ایمان کے دعوے کے باوجود، آخر تک بلا کسی عذر معقول کے ہجرت سے گریز اختیار کیا، ان کا شمار منافقین کے زمرے میں ہوا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ ۚ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۷۵)

دارالکفر کے مسلمانوں کو ترغیب اور دارالاسلام کے مسلمانوں کو تنبیہ

یہ دارالکفر کے مسلمانوں کو ہجرت کی ترغیب و تشویق بھی ہے کہ تمہارے لیے بھی اسلامی معاشرہ کا یہ دروازہ کھلا ہوا ہے اس کی طرف سبقت کرو اور اس میں اپنا مقام حاصل کرو اور دارالاسلام کے مسلمانوں کو تاکید بھی کہ بعد میں ایمان لانے والوں اور ہجرت کرنے والوں کے لیے بھی اپنے دلوں کے دروازے کھلے رکھو وہ بھی تمہارے ہی بھائی بند اور تمہارے ہی وجود ملی کے اجزا ہیں۔ نہ ان کے مقابل میں تمہارے اندر کوئی احساس برتری پیدا ہو، نہ دلوں میں کوئی تنگی۔

اولوالارحام کے شرعی حقوق مقدم ہیں

'وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ' یہ اخوت و نصرت کے اس عام ضابطہ کے ساتھ جو اوپر مذکور ہوا، حقوق اور وراثت کے اس خاص قانون کی یاددہانی کر دی گئی ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رحمی رشتوں کی بنا پر جو حقوق اللہ تعالیٰ نے قائم فرمائے ہیں وہ بدستور قائم رہیں گے۔ یہ اخوت اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گی۔ رحمی رشتوں کے حقوق کے ساتھ 'فِي كِتَابِ اللَّهِ' کی قید یہ بات واضح کرتی ہے کہ یہاں حقوق سے مراد رحم اور قرابت کے وہ حقوق ہیں جو اللہ کے قانون میں بیان ہوئے ہیں، وہ رسوم اس سے خارج ہیں جو جاہلیت میں رائج رہے ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی جہاں مسلمانوں کو اپنے دینی و اسلامی بھائیوں اور اولیاء کے ساتھ حسن سلوک اور نصرت و اعانت کی تاکید کی گئی ہے وہاں یہ تنبیہ کر دی گئی ہے کہ اولوالارحام کے شرعی حقوق مقدم رہیں گے۔ سورۂ احزاب میں ہے 'وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَن تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُم مَّعْرُوفًا ۚ كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا' ۶-احزاب (اور مومنین و مہاجرین میں رحمی رشتے والے ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، اللہ کے قانون میں، مگر یہ کہ تم اپنے اولیاء کے ساتھ کوئی حسن سلوک کرو، یہ چیز کتاب میں لکھی ہوئی ہے)۔

'إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ' مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ہر بات اس کے بے خطا علم پر مبنی ہے اور ہر چیز کا اس نے ایک محل و مقام مخصوص کیا ہے۔ دینی اخوت و ولایت کا اپنا دائرہ ہے اور رحمی قربت و قرابت کا اپنا مقام ہے۔ اپنے اپنے محل میں دونوں کا احترام کرو اور خدا نے ان کے جو حقوق ٹھہرائے ہیں ان کو ادا کرو۔

اسلامی سیاست کے چند اصول

اس مجموعۂ آیات پر تدبر کی نظر ڈالیے تو ان سے اسلامی سیاست کے چند اصول سامنے آئیں گے جو بین الملی بھی ہیں اور بین الاقوامی بھی۔ ہم اختصار کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کریں گے۔

۱- ایک یہ کہ انصار و مہاجرین ایک دوسرے کے اولیاء ہیں ان کے درمیان ایمان اور ہجرت کا رابطہ اور اسی کی اساس پر اخوت اور حمایت و نصرت کے حقوق و فرائض ہیں پچھلی خاندانی و قبائلی عصبیتیں ختم ہوئیں اور باہمی تعاضد و تناصر اور حمیت و حمایت کی اساس اسلامی اخوت پر استوار ہوئی۔

۲- جو لوگ ایمان لائے لیکن انھوں نے دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی وہ اس نئے اسلامی معاشرہ کے حقوق حمایت و نصرت میں شریک نہیں ہیں تا آنکہ وہ ہجرت کریں۔

۳- یہ دارالکفر میں پڑے ہوئے مسلمان اگر اسلام لانے کے جرم میں کہیں ستائے جا رہے ہوں تو ان کو ظلم سے بچانے کے لیے ان کی مدد کی جائے بشرطیکہ اس کے لیے کسی معاہد قوم سے جنگ نہ کرنی پڑے۔

۴- ہجرت ہر مسلمان پر واجب قرار دی گئی تاکہ مسلمان کفر کی طاقتوں سے مقابلہ کے لیے ایک مرکز میں مجتمع اور منظم ہو سکیں۔

۵- نسبی رشتوں کی بنا پر قرآن نے جو حقوق قائم کیے ہیں اسلامی اخوت کے حقوق ان پر اثر انداز نہ ہوں گے۔ وہ بہر حال مقدم رہیں گے۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی ہے۔ و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

لاہور

۱۹ر فروری ۱۹۶۹ء

تدبرِ قرآن

۹

التوبة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور اس پر بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ

یہ سورہ، جیسا کہ گروپ کی تمہید میں ہم عرض کر چکے ہیں، سورتوں کے دوسرے گروپ کی آخری سورہ ہے۔ اس میں اور انفال میں بالکل اسی نوع کا تعلق ہے جس نوع کا تعلق متن اور شرح یا تمہید اور اصل مقصد میں ہوتا ہے۔ سورہ انفال میں مسلمانوں کو جس جہاد کے لیے ظاہراً و باطناً منظم کیا گیا ہے اس سورہ میں اس کا اعلان فرما دیا۔ مصحف کی ترتیب میں اس سورہ پر بسم اللہ نہیں لکھی ہوئی ہے اور روایات سے ثابت ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی سے چلی آرہی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس پر بسم اللہ کا نہ لکھا جانا ایمائے الٰہی سے ہوا ہے۔ علمائے تفسیر نے اس کی مختلف توجیہیں کی ہیں۔ سب سے زیادہ قابلِ قبول توجیہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں میں عمود و مضمون کے لحاظ سے نہایت گہرا اتصال بھی ہے اور مقصد و غایت کے اعتبار سے فی الجملہ انفصال بھی۔ ایک کا رخ بالکلیہ مسلمانوں کی طرف ہے اور دوسری کا رخ اصلاً مشرکین، اہلِ کتاب اور منافقین کی طرف۔ ایک کی نوعیت تیاری کی ہے اور دوسری کی، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، الٹی میٹم اور اعلانِ جنگ کی۔ اشتراک و انفصال کے ان دونوں پہلوؤں کو ممیز کرنے کے لیے حکمتِ الٰہی مقتضی ہوئی کہ یہ سورہ سابق سورہ سے بالکل الگ بھی نہ ہو لیکن فی الجملہ نمایاں اور ممتاز بھی رہے۔ بسم اللہ نہ لکھے جانے سے یہ دونوں پہلو بیک وقت نمایاں ہو گئے۔ بسم اللہ، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، دو سورتوں کے درمیان علامت فصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس علامتِ فصل کے نہ ہونے سے دونوں کا معنوی اتصال نمایاں ہو گیا اور ساتھ ہی اس کے علیحدہ وجود نے اس کو علیحدہ نام دے دیا جس سے اس کی امتیازی خصوصیت بھی سامنے آگئی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

اس سورہ میں مطالب کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے ان تمام مشرکین سے اعلان برأت کیا ہے

جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امن و صلح کے معاہدے کیے لیکن ان کی خلاف ورزیاں کر کے وہ ان کو کالعدم کر چکے تھے۔ جنھوں نے اپنے معاہدے قائم رکھے تھے ان کے متعلق یہ اعلان فرمایا کہ مدت پوری ہو جانے کے بعد یہ معاہدے بھی ختم کر دیے جائیں اور ان سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک یہ اسلام نہ قبول کریں۔

اس کے بعد اہل کتاب کے متعلق یہ اعلان فرمایا کہ ان سے بھی جنگ کرو تا آنکہ یہ تمہاری ماتحتی قبول کرنے اور تمہیں جزیہ ادا کرنے پر مجبور ہوں۔

اس کے بعد آخر سورۃ تک بڑی تفصیل کے ساتھ منافقین کا تعاقب کیا ہے اور ان کے باب میں بھی یہ ہدایت دی ہے کہ اب ان کا سختی سے محاسبہ کیا جائے، ان کے ساتھ کوئی نرمی نہ برتی جائے تا آنکہ یہ یا تو سچے اور اچھے مسلمان بن جائیں یا پھر مشرکین اور اہل کتاب میں سے، جن کے ساتھ بھی ان کی وابستگی ہے، ان کے انجام میں یہ بھی شریک ہو جائیں۔

یہی تین گروہ اس وقت مسلمانوں کے کھلے یا چھپے دشمن تھے۔ ان تینوں کا ذکر پچھلی سورہ میں بھی آیا تھا لیکن ان کے باب میں قطعی پالیسی واضح نہیں ہوئی تھی۔ اس سورہ میں بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی۔

اگرچہ سورہ کے نظام کو سمجھنے کے لیے یہ اجمالی نظر بھی کافی ہے تاہم سورہ کے مطالب کا تفصیلی تجزیہ بھی ہم لیے دیتے ہیں۔

(۱-۴) جن مشرکین نے معاہدہ کر کے در پردہ یا علانیہ اپنے معاہدے توڑ دیے تھے ان سے برأت ذمہ کا اعلان۔ ان کو چار مہینے کی مہلت اور مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ حج کے موقع پر یہ منادی کر دی جائے کہ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ اب ان کے معاہدوں کی ذمہ داری سے بری ہیں۔ اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔ اگر انھوں نے توبہ نہ کی تو یاد رکھیں کہ وہ خدا کے قابو سے باہر نہیں جا سکتے۔ صرف وہ مشرکین اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جنھوں نے نہ تو اپنے معاہدے کی کوئی خلاف ورزی کی ہے نہ مسلمانوں کے خلاف ان کے دشمنوں کی کوئی مدد کی ہے۔ یہ معاہدے قرار دادہ مدت تک باقی رکھے جائیں۔

(۵-۶) مسلمانوں کو یہ حکم کہ محترم مہینوں کے گزرنے کے بعد ان کے خلاف جنگی کارروائی کرو۔ ان کو پکڑو، گھیرو اور مارو اور اس وقت تک ان کا پیچھا نہ چھوڑو جب تک یہ توبہ کر کے نماز نہ قائم کریں اور زکوٰۃ نہ ادا کریں۔ البتہ ان میں اگر کوئی شخص پناہ کا طالب ہو تو اس کو اتنی مہلت دو کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سن لے اور پھر اس کو اس کے مأمن میں پہنچا دو۔ یہ رعایت ان کو اس لیے دی جائے کہ یہ امی لوگ رہے ہیں، ممکن ہے ان کو خدا کا کلام نہ پہنچا ہو۔

(۷-۱۶) مشرکین کے ساتھ آیندہ کوئی معاہدہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے وجوہ کی تفصیل۔ مسجد حرام

کے پاس قریش سے جو معاہدہ ہوا ہے وہ بھی اسی وقت تک باقی رکھا جائے جب تک وہ اس کو نباہتے ہیں۔ اگر وہ اس کو توڑ دیتے ہیں تو تم ان ائمہ کفر سے بھی جنگ کرو۔ قریش کے بعض سنگین جرائم کی طرف اشارہ۔ مسلمانوں کو بشارت کہ تم ان سے ڈرو نہیں، اٹھو، تمہارے ہاتھوں اللہ ان مظلوم مسلمانوں کے کلیجے ٹھنڈے کرے گا جو ان ظالموں کی قساوت کا ہدف بنے۔

(۱۷-۲۲) مشرکین قریش کو بیت اللہ اور مساجد الٰہی پر قابض رہنے کا کوئی حق نہیں۔ مساجد الٰہی کے متولی اور منتظم وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے، نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ حاجیوں کو پانی پلا دینا اور حرم کی کچھ دیکھ بھال کر دینا نیکی کے کام سہی لیکن یہ نیکیاں اللہ اور آخرت پر ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کا بدل نہیں ہو سکتیں۔

(۲۳-۲۸) مسلمانوں کو تنبیہ کہ ان لوگوں سے جنگ کرنے میں رشتہ و قرابت کا پاس و لحاظ مانع نہ ہو جو لوگ ایمان کے تقاضوں پر ان چیزوں کو ترجیح دیں گے ان کا شمار انہی لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ اللہ اور رسولؐ کی محبت ہر چیز پر مقدم ہے۔ جنگ حنین اور پچھلے غزوات سے مسلمانوں کو سبق کہ اصل شے خدا کی مدد و نصرت ہے، پس اصلی بھروسہ خدا ہی پر ہونا چاہیے۔ یہ اعلان کہ مشرکین نجس ہیں۔ اس وجہ سے ان کو اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس پھٹکنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ مسلمانوں کو یہ اطمینان دہانی کہ اس کا جو اثر تجارت اور معاشی حالات پر پڑے گا اللہ اپنے خزانہ جود سے اس کی تلافی فرمائے گا۔

(۲۹-۳۵) اہل کتاب سے جہاد اور ان کو ذمی بنا کر جزیہ وصول کرنے کا حکم۔ ان کے فساد عقائد اور فساد اخلاق کی طرف بعض اشارات۔ ان کے علماء اور صوفیا کے فاسد کردار اور ان کی اسلام دشمنی کا حوالہ۔

(۳۶-۳۷) مسلمانوں کو یہ تاکید کہ یہ جنگ و جہاد اگرچہ تمام مشرکین سے من حیث القوم ہو، کسی گروہ کے ساتھ رعایت نہ کی جائے، تاہم محترم مہینوں کا احترام ہر حال میں ملحوظ رہے۔ یہ محترم مہینے بحساب سال قمری ملت ابراہیمؑ کی یادگار ہیں۔ اگر تم نے ان کی حرمت کو بٹہ لگایا تو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنو گے۔ نسیئ کی بدعت کی طرف اشارہ کہ اس بدعت نے ان مہینوں کو ان کے اصل مقام سے ہٹا کر موسموں کے ساتھ باندھ دیا اور یہ کفر میں ایک اضافہ ہے۔ تمہیں قمری مہینوں کے حساب پر، جو روز اول سے خدا کے مقرر کیے ہوئے مہینے ہیں، ان چار محترم مہینوں کی حرمت کو برقرار رکھنا ہے۔

(۳۸-۴۲) منافقین کو تنبیہ کہ تم جہاد سے جی چراتے ہو، یاد رکھو کہ اگر تم اسی طرح جی چراتے رہے تو تم خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے، اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنو گے۔ خدا تمہاری جگہ اپنے دین کی نصرت کے لیے دوسروں کو اٹھا کھڑا کرے گا۔ یاد کرو کہ ایک دن وہ بھی گزرا ہے جب ہمارا رسول

ایک غار میں پناہ گیر تھا اور اس کے ایک ساتھی کے سوا اور کوئی بھی اس کے ساتھ نہ تھا لیکن پروردگار کی نصرت بھی آیا کہ خدا نے اپنی طرف سے اس پر سکینت نازل فرمائی۔ غیبی فوجوں سے اس کی مدد فرمائی کفر کا سر نیچا اور اللہ کا کلمہ بلند ہوا۔ پس یہ خدا کی ضرورت نہیں بلکہ تمہاری اپنی سعادت ہے کہ جو سروسامان بھی میسر ہو اس کے ساتھ جہاد کے لیے اٹھو۔ منافقین کے جہاد سے جی چرانے اور جھوٹی قسموں کے بل پر بہانہ سازی کی ایک مثال۔

(۴۳ - ۴۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو محبت آمیز عتاب کہ جہاد سے جی چرانے والوں کے جھوٹے عذرات تم قبول کر لیتے ہو حالانکہ یہ منافق لوگ ہیں۔ اگر یہ چاہیں تو جہاد کے لیے نکلنے کا سامان مہیا کر سکتے ہیں لیکن یہ جھوٹے بہانے بنا کر تمہاری نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

(۴۷ - ۵۲) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی کہ جہاد کے لیے تمہارے ساتھ ان منافقین کے نہ نکلنے میں ہی خیر ہے۔ اگر یہ نکلتے تو کوئی نہ کوئی فساد ہی برپا کرتے۔ ان کے دلوں میں خیر خواہی کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ یہ تو ہر پہلو سے تمہارے لیے کسی مصیبت کے متمنی ہیں۔

(۵۳ - ۵۷) منافقین بادل ناخواستہ دین کے نام پر جو کچھ خرچ کرتے ہیں اللہ کے ہاں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ یہ اللہ و رسولؐ کے منکر ہیں اور ان کا انفاق اور ان کی نماز سب محض نمائش ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ ان کے مال کو کوئی وقعت نہ دو اور ان کی رفاقت کی ذرا پروا نہ کرو۔ یہ بزدل اور ڈرپوک تمہارے ساتھی نہیں بن سکتے۔

(۵۸ - ۶۰) منافقین کے اس گروہ کی طرف اشارہ جو محض صدقات کے مال میں حصہ بٹانے کی حد تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھی تھا۔ اگر خواہش کے مطابق پا جاتے تو راضی ورنہ پیغمبرؐ کے خلاف طرح طرح کی باتیں بناتے۔ صدقات کے اصل حق داروں کی تفصیل۔

(۶۱ - ۶۶) ان شریر منافقین کی طرف اشارہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈا کرتے کہ آپؐ کان کے کچے ہیں، لوگوں میں آپ کی رائے اور معاملہ فہمی کا مذاق اڑاتے، جب کسی بات پر گرفت ہوتی تو جھوٹی قسمیں کھاتے اور لایعنی صفائی پیش کرتے۔

(۶۷ - ۷۰) منافق مردوں اور منافق عورتوں کا کردار اور ان کا انجام دنیا اور آخرت میں۔

(۷۱ - ۷۲) مومنین اور مومنات کا کردار اور ان کی فوز و فلاح آخرت میں۔

(۷۳ - ۸۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ کفار کی طرح ان منافقین کے معاملے میں بھی اب سخت رویہ اختیار کرو کہ تمہاری نرمی سے فائدہ اٹھا کر یہ اسلام کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔ یہ جھوٹی قسموں کے پردے میں اپنے کفر کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اللہ کے فضل اور رسول کی کریم النفسی نے ان کو اسلام دشمنی میں اور زیادہ دلیر بنا دیا ہے۔ انھوں نے وعدے کچھ کیے اور ان کا عمل اس

کے بالکل خلاف ہوا اور اس چیز نے ان کے نفاق کو پختہ سے پختہ تر کر دیا۔

(۷۹-۸۴) منافقین کی اس شرارت کا بیان کہ خود تو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور اگر اللہ کے مخلص اور غریب بندے اپنی گاڑھی کمائی میں سے خرچ کرتے ہیں تو ان کا مذاق اڑاتے اور ان کی دل شکنی کرتے ہیں۔ اسی طرح خود تو جہاد میں نکلنے کے بجائے گھروں میں بیٹھ رہتے ہیں اور جو اللہ کے بندے نکلتے ہیں ان کو گرمی اور سردی کے ڈراوے سنا سنا کر بٹھا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان اشرار کے بارے میں وعید الٰہی کا بیان اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لیے دعا و استغفار کرنے کی شدید ممانعت۔

(۸۵-۹۶) دین کے مطالبات سے جی چرانے والوں کے جھوٹے عذرات کی طرف اشارہ پچھے اہل ایمان کے کردار کا بیان۔ ان معذورین کی تفصیل جن کا عذر قابل قبول ہے۔ عذر تراشوں اور بہانہ بازوں کو یہ دھمکی کہ اگر تم پیغمبر اور مومنین کو اپنے خانہ ساز عذرات سے دھوکا دینے میں کامیاب بھی ہو جاؤ جب بھی یہ چیز تمہارے لیے کچھ سود مند نہیں، خدائے علام الغیوب کو تم بہرحال ان بہانہ سازیوں سے فریب نہیں دے سکتے۔

(۹۷-۱۰۱) اعراب یعنی اہل بدو میں جو منافقین تھے ان کی طرف اشارہ اور ان کے اندر جو مخلصین تھے ان کی حوصلہ افزائی۔ سابقون الاولون اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کی تحسین، منافقین اعراب اور منافقین مدینہ دونوں کو دھمکی۔

(۱۰۲-۱۰۶) ان لوگوں کو قبولیت توبہ کی بشارت جنھوں نے ان تنبیہات سے متاثر ہو کر اپنے رویہ میں تبدیلی کر لی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی مزید تربیت اور ان کے لیے دعا کی ہدایت۔ اس گروہ کے بعض افراد کی قبولیتِ توبہ کے معاملہ کا التوا۔

(۱۰۷-۱۱۰) مسجد ضرار کے بانیوں کو نہایت تند الفاظ میں وعید۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مسجد میں نماز پڑھنے کی ممانعت۔

(۱۱۱-۱۱۳) اہل ایمان اور اللہ کے درمیان جو عہد و میثاق ہے اس کی نوعیت کی وضاحت اور اس کے حقیقی مقتضیات کا بیان۔

(۱۱۴-۱۱۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو شرک پر مرنے والوں کے لیے دعائے استغفار کرنے کی ممانعت اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنے باپ کے لیے دعا کی اس کی نوعیت۔

(۱۱۷-۱۱۸) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مخلص مہاجرین و انصار کے لیے عام قبولیت توبہ کی بشارت۔ جن لوگوں کی توبہ کی قبولیت کا معاملہ آیت ۱۰۶ میں ملتوی کیا گیا تھا، رجوع کامل کے بعد ان کی

توبہ کی قبولیت کا اعلان۔

(۱۱۹ - ۱۲۲) اہلِ مدینہ اور اعراب کو راست بازی اور کامل وفاداری کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جاں نثاری کی تلقین۔ اس جاں نثاری کی راہ میں چھوٹی یا بڑی جو تکلیف بھی اہلِ ایمان اٹھائیں گے اس کے اجرِ عظیم کا بیان۔ اہلِ بدو کو یہ ہدایت کہ ان میں سے ہر گروہ کے لوگ اپنے منتخب آدمی حصولِ تربیت کے لیے مجلسِ نبوی میں بھیجتے رہیں تاکہ یہ لوگ وہاں سے کسبِ فیض کرکے اپنی قوم کی تربیت کر سکیں۔

(۱۲۳ - ۱۲۹) مسلمانوں کو یہ عام ہدایت کہ ہر جگہ کے مسلمان اپنے اپنے علاقہ کے کفار سے مصروفِ جہاد ہوں۔ ان لوگوں کی طرف اشارہ جو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مواجہہ سے گریز کرتے تھے۔ پیغمبرؐ کے وجودِ قدسی کی صورت میں دنیا پر اللہ کی جو عظیم رحمت نازل ہوئی تھی اس کی قدر کرنے کی تلقین۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ناقدروں سے بے پروا ہو کر صرف اللہ پر بھروسہ کرنے کی ہدایت۔

اس فہرستِ مطالب پر ایک سرسری نظر ڈال کر بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سورہ کا ہر جزو نہایت مربوط و منظم ہے اور آغاز سے لے کر انتہا تک باہم دگر ایک فطری تسلسل کے ساتھ وابستہ و پیوستہ۔ اب ہم توفیقِ الٰہی کے اعتماد پر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

سُوْرَةُ التَّوْبَةِ (٩)

مَدَنِيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ١٢٩

آيات ١ - ٢٨

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ۝١ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا
اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝٢ وَ
اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ
اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ
خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ
وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٣ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ
مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ
اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُتَّقِيْنَ ۝٤ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ
حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا
لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٥ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ

الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ
ع ۱ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ كَيْفَ يَكُوْنُ
لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ
عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷﴾ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا
فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ
وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸﴾ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا
عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹﴾ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ
مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ﴿۱۰﴾ فَاِنْ تَابُوْا
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَ
نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ
بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ
اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا
نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ
اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ
وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَ
يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَ
لَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ مَا ع ۱۰
كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ
بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِى النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾
اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ
اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ
وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَجٰهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ وقف لازم
سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ
وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ
اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا
تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ
عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾
قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ

وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ
مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي
سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
ع ۲ ۹ الْفٰسِقِينَ ﴿۲۴﴾ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۙ وَيَوْمَ
حُنَيْنٍ ۙ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ
عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ أَنْزَلَ
اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلٰى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ
تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَذٰلِكَ جَزَاءُ الْكٰفِرِينَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ
يَتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۲۷﴾
يٰأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا
الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً
فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ
حَكِيمٌ ﴿۲۸﴾

ترجمۂ آیات ۱-۲۸ ان مشرکین سے اللہ اور رسول کی طرف سے اعلانِ برأت ہے جن سے تم نے
معاہدے کیے تھے۔ سو اب ملک میں چار ماہ چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کے
قابو سے باہر نہیں جا سکتے اور اللہ کافروں کو رسوا کر کے رہے گا۔ اور اللہ و رسول کی
طرف سے بڑے حج کے دن لوگوں میں منادی کر دی جائے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں
سے بری الذمہ ہیں۔ تو اگر تم توبہ کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر رو گردانی کرو گے

تو جان رکھو کہ تم اللہ سے بھاگ نہیں سکتے اور کافروں کو ایک دردناک عذاب کی
خوش خبری پہنچا دو۔ وہ مشرکین اس سے مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے معاہدہ کیا اور انھوں
نے اس میں نہ تم سے کوئی خیانت کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی سو ان کے معاہدے
ان کی قرارداد مدت تک پورے کرو، اللہ نقض عہد سے بچنے والوں کو دوست رکھتا ہے
۵ سو جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان مشرکین کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو، ان کو
پکڑو، ان کو گھیرو، اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک لگاؤ۔ پس اگر یہ توبہ کر لیں، نماز قائم
کریں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تب ان کی جان چھوڑ دو بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان
ہے۔ اور اگر ان مشرکین میں سے کوئی تم سے امان کا طالب ہو تو اس کو امان دے دو
تاکہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اس کو اس کے امان کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لیے کہ یہ ایسے
لوگ ہیں جنھیں اللہ کی باتوں کا علم نہیں۔ ۱-۶

مشرکین کے کسی عہد کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول پر کس طرح باقی رہ سکتی
ہے؟ —— ہاں جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا ہے تو جب تک وہ قائم رہیں
تم بھی ان کے لیے معاہدے پر قائم رہو، اللہ نقض عہد سے بچنے والوں کو دوست رکھتا
ہے —— کس طرح باقی رہ سکتی ہے جب کہ حال یہ ہے کہ اگر وہ کہیں تمھیں دبا پائیں تو نہ
تمھارے بارے میں کسی قرابت کا پاس کریں نہ عہد کا۔ وہ تمھیں باتوں سے مطمئن کرنا چاہتے
ہیں، پر ان کے دل انکار کر رہے ہیں اور ان کی اکثریت بدعہد ہے۔ انھوں نے اللہ
کی آیات کے عوض میں ایک نہایت حقیر قیمت اختیار کر لی ہے۔ اور اس طرح وہ اللہ
کی راہ سے رک گئے ہیں، بے شک بہت ہی برا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں کسی صاحبِ ایمان

کے معاملے میں نہ ان کو کسی قرابت کا پاس ہے اور نہ کسی عہد کا۔ اور یہی لوگ ہیں جو حدود کو توڑنے والے ہیں۔ پس اگر وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور ہم آیات کی تفصیل کیے دے رہے ہیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ ۷-۱۱

اور اگر عہد کر چکنے کے بعد یہ اپنے قول و قرار توڑ دیں اور تمہارے دین پر نیش زنی کریں تو تم کفر کے ان سرخیلوں سے بھی لڑو۔ ان کے کسی قول و قرار کا کوئی وزن نہیں تاکہ یہ اپنی حرکتوں سے باز آئیں۔ بھلا تم ایسے لوگوں سے نہ لڑو گے جنھوں نے اپنے قول و قرار توڑ دیے، اور رسول کو نکالنے کی جسارت کی، اور وہی ہیں جنھوں نے تم سے جنگ چھیڑنے میں پہل کی! کیا تم ان سے ڈرو گے؟ اصلی حق دار تو اللہ ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم واقعی مومن ہو۔ تم ان سے لڑو، اللہ تمہارے ہاتھوں ان کو سزا دے گا، ان کو رسوا کرے گا، تم کو ان پر غلبہ دے گا، اہلِ ایمان کے ایک گروہ کے کلیجے ٹھنڈے کرے گا اور ان کے دلوں کا غم و غصہ دور فرمائے گا اور جن کو چاہے گا اللہ توبہ کی توفیق دے گا۔ اللہ علم و حکمت والا ہے۔ ۱۲-۱۵

کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یوں ہی چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو چھانٹا ہی نہیں جنھوں نے جہاد کیے اور اللہ و رسول اور مومنین کے سوا کسی کو جنھوں نے دوست نہیں بنایا اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ مشرکین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مساجدِ الٰہی کا انتظام کریں درآنحالیکہ وہ خود اپنے کفر کے گواہ ہیں۔ ان لوگوں کے سارے اعمال ڈھے گئے اور دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے

تو یہی ہیں۔ مساجدِ الٰہی کے انتظام کرنے والے تو بس وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور
روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، نماز قائم کرتے ہوں، زکوٰۃ دیتے ہوں اور اللہ کے سوا
کسی سے نہ ڈرتے ہوں، یہ لوگ توقع ہے کہ راہ یاب ہونے والے بنیں۔ کیا تم نے حاجیوں
کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے انتظام کو ان لوگوں کے عمل کے ہم رتبہ کر دیا ہے جو اللہ اور
آخرت پر ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیے۔ اللہ کے نزدیک یہ دونوں
برابر نہیں ہوں گے۔ خدا ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ جو ایمان لائے، جنھوں نے
ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جنھوں نے اپنے جان و مال سے جہاد کیا، ان کا درجہ اللہ کے
ہاں بڑا ہے اور وہی لوگ فائز المرام ہونے والے ہیں۔ ان کا رب ان کو خوش خبری دیتا
ہے، اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسے باغوں کی جن میں ان کے لیے ابدی نعمت ہے۔
اے ایمان والو، تم اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو اپنا ولی نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر
کو ترجیح دیں۔ اور تم میں سے جو لوگ ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی لوگ اپنے اوپر ظلم
کرنے والے ٹھہریں گے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے
بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمایا، وہ تجارت جس کی
کساد بازاری کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جو تمھیں پسند ہیں اگر تمھیں اللہ، اس کے
رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ
صادر فرما دے اور اللہ بدعہدوں کو بامراد نہیں کرتا۔ بے شک اللہ نے بہت سے
موقعوں پر تمھاری مدد فرمائی ہے۔ اور حنین کے دن بھی جب کہ تمھاری کثرت نے تمھیں غرہ
میں مبتلا کر دیا تو وہ کثرت تمھارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ

ہو گئی پھر تم پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بالآخر اللہ نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور ایسی فوجیں اتاریں جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو سزا دی اور یہی کافروں کا بدلہ ہے۔ پھر اللہ اس کے بعد جس کو چاہتا ہے توبہ کی توفیق دے دیتا ہے اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ۱۶-۲۷

اے ایمان والو، یہ مشرکین بالکل نجس ہیں تو یہ اپنے اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ پھٹکنے پائیں اور اگر تمھیں معاشی بدحالی کا اندیشہ ہو تو اللہ اگر چاہے گا تو اپنے فضل سے تم کو مستغنی کر دے گا۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۲۸

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ (۱-۲)

لفظ 'براءۃ' کا مفہوم — 'بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ الاية'۔ 'براءۃ' کے معنی کسی ذمہ داری سے دستبردار اور بری الذمہ ہونے کے ہیں۔ یہاں یہ ان معاہدات کی ذمہ داری سے دستکش ہونے کے معنی میں ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد مشرکین عرب کے مختلف قبائل سے موقت اور غیر موقت نوعیت کے کر لیے تھے۔ 'مشرکین' سے یہاں بھی اور قرآن میں جہاں جہاں بھی یہ لفظ بشکل علم استعمال ہوا ہے مشرکین بنی اسمٰعیل یا بالفاظ دیگر مشرکین عرب مراد ہیں۔ ان کے معاہدات کی ذمہ داری سے اس اعلان براءت کی وجہ آگے آیت ۴ سے واضح ہوتی ہے کہ بہت سے قبائل نے معاہدات کرنے کو تو کر لیے تھے لیکن ان کو وفاداری اور راستبازی کے ساتھ نباہ نہیں رہے تھے اس وجہ سے اس قسم کے معاہدوں کے کالعدم ہونے کا اعلان کر دیا گیا، صرف ان قبائل کے معاہدے باقی رکھے گئے جنھوں نے کوئی غداری یا عہد شکنی نہیں کی تھی اور وہ بھی صرف ان کی قرار دادہ مدت تک کے لیے۔ لفظ 'بَرَآءَةٌ' کے بعد حرف 'الیٰ' جو آیا ہے یہ دلیل ہے اس بات پر کہ یہاں 'ابلاغ' کا مفہوم بھی مضمر ہے۔ یعنی اس دستبرداری کی اطلاع تمام معاہدین مشرکین کو پہنچا دی جائے چنانچہ بعد والی آیت میں اس کی تصریح بھی آ رہی ہے۔

(ایک قابلِ توجہ نکتہ)

یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ جہاں تک معاہدہ کرنے کا تعلق ہے اس کی ذمہ داری تو اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ عٰهَدْتُّمْ کے لفظ سے واضح ہے تمام مسلمانوں پر ڈالی ہے اس لیے کہ پیغمبر کی اٹھائی ہوئی ذمہ داری تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے لیکن براءت ذمہ کے معاملے میں مسلمانوں کی ذمہ داری معین نہیں فرمائی ہے کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ اس سے اس اعلانِ براءت کی شدت ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ و رسول تو ان بودے معاہدوں سے بری ہوئے، اب اہلِ ایمان خود فیصلہ کریں کہ انھیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؛ اللہ و رسول کا ساتھ دے کر اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہے یا عزیزداری، برادری اور خاندان و قبیلہ کی پاسداری میں نفاق کی روش اختیار کرنی ہے۔ بات کے اس انداز سے کہنے میں مصلحت یہ تھی کہ پس منظر میں، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے، منافقین بھی تھے جو ابھی اپنے خاندانی و قبائلی بندھنوں سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے تھے۔ ان لوگوں پر اس اسلوب سے یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ اللہ اور رسول کی طرف سے یہ فیصلہ قطعی ہے، اس میں کسی لچک کا امکان نہیں ہے، جس کو اس کا ساتھ دینا ہو، ساتھ دے ورنہ اپنی راہ اور اپنی منزل کا خود فیصلہ کرے۔

(براہِ راست مشرکین سے خطاب)

فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ الاٰیۃ اوپر والی آیت کا خطاب مسلمانوں سے تھا، اس آیت میں خطاب کا رخ براہِ راست مشرکین کی طرف ہو گیا ہے۔ خطاب کی یہ تبدیلی اس دھمکی کی شدت اور اس کے فیصلہ کن ہونے کی دلیل ہے۔ مسلمانوں کو خطاب کر کے یوں نہیں فرمایا کہ دھمکی مشرکین کو سنا دو بلکہ جس طرح اعلانِ براءت خود فرما دیا اسی طرح براہِ راست مشرکین کو خطاب کر کے فرمایا کہ بس اب چار ماہ کی مہلت تمھیں اور حاصل ہے، اس کے بعد ان لوگوں کے معاہدات کی اللہ و رسول پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے جو اپنے معاہدوں کی خلاف ورزیاں کر چکے ہیں بلکہ ہر قدم پر ان کی دار و گیر شروع ہو جائے گی۔

([illegible] براءت میں چار ماہ کی مہلت کی مصلحتیں)

چار ماہ کی مہلت میں کئی مصلحتیں مدنظر ہو سکتی ہیں۔ یہ مصلحت بھی ہو سکتی ہے کہ معاہدے کے باوجود جو لوگ شرارتیں کر رہے تھے وہ اپنے رویے پر نظرِ ثانی کرنا چاہیں تو نظرِ ثانی کر لیں، یہ مصلحت بھی ہو سکتی ہے کہ اس دوران میں مسلمان اپنے اس اہم اقدام سے پوری طرح یکسو، منظم اور تیار ہو جائیں۔ علاوہ ازیں آیت ۵ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آگے اشہرِ حرم آ رہے تھے جن کا احترام کسی جنگی اقدام سے مانع تھا۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ کی وضاحت انفال آیت ۵۹ کے تحت گزر چکی ہے۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳)

(حج کے موقع پر اعلانِ براءت کی عام منادی)

'اَذَان' یہاں اپنے لغوی مفہوم یعنی اعلان و منادی کے معنی میں ہے۔ ہدایت ہوئی کہ حج اکبر کے

دن یہ منادی کرادی جائے کہ اللہ و رسول اس قسم کے معاہدوں سے بری الذمہ ہیں، اب جو توبہ کرلے گا اس کی خیر ہے اور جو روگردانی کریں گے وہ اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکیں گے۔ حج کے موقع پر منادی کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ عرب میں حج ہی کا اجتماع ایک ایسا اجتماع ہوتا تھا جس میں ملک کے گوشے گوشے سے لوگ جمع ہوتے جس کے سبب سے ہر وہ بات جو وہاں پھیل جائے پورے ملک میں پھیل جاتی تھی۔ خاص طور پر ۹ھ کے حج تک چونکہ صورت یہ تھی کہ مشرکین بھی حج کو جاتے تھے اس وجہ سے وہاں کا ہر اعلان سب کے کانوں تک پہنچ جاتا تھا، خواہ مسلمان ہوں یا کفار۔ اسی وجہ سے آیت میں لفظ بھی 'الی الناس' استعمال ہوا ہے جو عام ہے۔

حج اکبر سے کیا مراد ہے!

'حج اکبر' سے کیا مراد ہے اور یہ کس سن کے حج کی طرف اشارہ ہے؟ اس سوال کا جواب مفسرین نے یہ دیا ہے کہ اس سے مراد ۹ھ کا حج ہے جو حضرت ابوبکرؓ صدیق کی امارت میں ہوا۔ ہمارے نزدیک یہ بات ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ یہی پہلا موقع ہے جب مسلمانوں کو باقاعدہ حج کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے انھیں دو تین مواقع جو ملے ان میں وہ صرف عمرہ کر سکے تھے۔ عمرہ کو حج اصغر (چھوٹا حج) بھی کہتے ہیں۔ اس نسبت سے پورے حج کے لیے 'حج اکبر' (بڑا حج) کا لفظ استعمال ہوا جس میں گویا مسلمانوں کو پہلے سے یہ بشارت بھی دے دی گئی کہ اب تک وہ صرف چھوٹے حج ہی کی سعادت حاصل کر سکے ہیں، آگے ان کو بڑے حج سے بھی سعادت اندوز ہونے کا موقع ملنے والا ہے۔

سورۂ توبہ کا زمانۂ نزول

یہیں سے عام طور پر لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس سورہ کا نزول ۹ھ میں ہوا ہے لیکن اس نتیجہ کے قبول کرنے میں مجھے تردد ہے اس لیے کہ آگے جو آیات آرہی ہیں ان سے، جیسا کہ آپ دیکھیں گے، صاف واضح ہے کہ کم از کم یہ اور آگے کی آیات معاہدہ حدیبیہ کے خاتمہ اور فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی ہیں لیکن اعلانِ براءت کی منادیٔ عام چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ کے حج کے موقع پر ہی کرائی اس لیے بعض لوگوں کو یہ گمان گزرا کہ ان آیات کا نزول بھی اسی موقع پر ہوا۔ حالانکہ یہ ایک پیشگی ہدایت تھی اس بات کی کہ جب حج اکبر کی سعادت حاصل کرنے کا موقع آئے تو اس موقع پر اس فیصلہ کی منادیٔ عام بھی کرادی جائے۔ اس سے ضمناً مسلمانوں کو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، حج سے مشرف ہونے کی بشارت بھی حاصل ہو گئی۔

میرے لیے ان آیات کا زمانۂ نزول ٹھیک ٹھیک متعین کرنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ عرب میں حجۃ الوداع سے پہلے تک دو جنتریاں رائج رہی ہیں، ایک سادہ قمری حساب پر مبنی تھی دوسری نسی کے اس قاعدے پر مبنی تھی جس کی طرف آگے اسی سورہ میں اشارہ آئے گا۔ اگر کوئی شخص اس فرق کو معلوم کر سکے جو نسی کے قاعدے نے اصل قمری مہینوں میں پیدا کر دیا تھا تو وہ ان چار مہینوں کو بھی متعین کر سکے گا جو آیت نمبر ۲ میں مذکور ہیں اور ان محترم مہینوں کو بھی ٹھیک ٹھیک بتا سکے گا جن کا حوالہ آیت ۵

میں ہے۔ اس تحقیق میں اس مسلم حقیقت سے بڑی رہنمائی مل سکتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۱۰ھ میں جو حج کیا وہ قمری حساب سے بھی ٹھیک ۱۰ ذی الحجہ کو پڑا تھا اور شمسی کے حساب سے بھی اس کی تاریخ یہی تھی، گویا دونوں جنتریوں کا قران ہو گیا تھا۔ استدار الزمان کھیئتہ یوم خلق السموت والارض میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ میں حساب کتاب کے میدان کا مرد نہیں ہوں اس وجہ سے اس باب میں عزم و جزم سے کچھ کہنا میرے لیے مشکل ہے لیکن قرآن کے الفاظ اور اس کے نظم کی روشنی میں اس بات پر میں مطمئن ہوں کہ یہ آیات معاہدہ حدیبیہ کے خاتمہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی ہیں۔ دلائل و قرائن کی تفصیل آگے آئے گی۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ثُمَّ لَمۡ یَنۡقُصُوۡكُمۡ شَیۡـًٔا وَّلَمۡ یُظَاهِرُوۡا عَلَیۡكُمۡ اَحَدًا فَاَتِمُّوۡۤا اِلَیۡهِمۡ عَهۡدَهُمۡ اِلٰی مُدَّتِهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُتَّقِیۡنَ (۴)

اعلان براءت سے مستثنیٰ مشرکین — یہ ان مشرکین کا بیان ہے جو مذکورہ اعلان سے مستثنیٰ تھے۔ یہ وہ قبائل ہیں جو اپنے عہد پر قائم رہے، نہ خود معاہدے کے خلاف کوئی چھوٹا یا بڑا اقدام کیا، نہ مسلمانوں کے خلاف بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی مدد کی۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مذکورہ بالا اعلان ناقضین عہد ہی سے متعلق تھا لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس سے واضح ہوتی ہے کہ یہ معاہدے بھی صرف ان کی قرار دادہ مدت ہی تک باقی رکھنے کی اجازت ہوئی۔ مدت گزر جانے کے بعد یہ بھی کالعدم۔ آگے کے لیے ان سے کسی نئے معاہدے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چنانچہ اس اعلان براءت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے کسی گروہ سے کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مشرکین سے جو معاہدے کیے گئے تھے وہ صرف دعوت و تبلیغ اور اتمام حجت کی مصلحت سے کیے گئے تھے۔ مقصود ان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے نباہ کرنا نہ تھا۔ یہ سنت الٰہی ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ جس قوم کی طرف براہ راست رسول کی بعثت ہوتی ہے اگر وہ تبلیغ و دعوت اور اتمام حجت کے بعد بھی رسول کی تکذیب پر اڑی رہتی ہے تو وہ لازماً ختم کر دی جاتی ہے۔ خواہ اس کا خاتمہ خدا کے کسی براہ راست عذاب سے ہو یا اہل ایمان کی تلوار سے۔ مشرکین عرب کا معاملہ اسی نوعیت کا تھا۔ اب تبلیغ و دعوت اور اتمام حجت کا دور ان کے لیے ختم ہو رہا تھا اس وجہ سے اب ان کے کسی گروہ کے ساتھ کسی معاہدے کا سوال خارج از بحث تھا۔

اجتماعی تقویٰ کی وضاحت — 'اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُتَّقِیۡنَ' میں جس تقویٰ کا ذکر ہے، یہ انفرادی تقویٰ نہیں بلکہ اجتماعی و سیاسی تقویٰ ہے۔ اسلام جس طرح ہر شخص سے انفرادی تقویٰ کا مطالبہ بھی کرتا ہے اسی طرح مسلمانوں سے من حیث الجماعت اجتماعی اور سیاسی تقویٰ کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ یعنی مسلمان دوسری قوموں سے جو معاملات اور معاہدات کریں ان میں راست باز، صداقت شعار اور وفادار رہیں، کسی عہد اور قول و قرار کی کوئی ادنیٰ خلاف ورزی بھی نہ کریں۔ خدا ایسے ہی متقیوں کو دوست رکھتا ہے اور خدا جن کو دوست رکھتا ہے

وہی دنیا اور آخرت میں برومند اور فائز المرام ہونے والے ہیں۔

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ
وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا
سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۵)

اشہر حرم سے مراد

'اَشْهُرُ حُرُم' سے مراد ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب کے مہینے ہیں۔ 'اَشْهُرُ حُرُم' ان مہینوں کے لیے بطور اسم وعلم استعمال ہوتا ہے۔ ان کے سوا کوئی اور مہینہ اس لفظ سے مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ مہینے زمانہ جاہلیت بلکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے محترم چلے آرہے تھے۔ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ حج وعمرہ کے مہینے بھی تھے اور اہل عرب کی بیشتر تجارتی کاروباری نقل و حرکت انہی مہینوں میں ہوتی تھی۔ ان میں لڑنا بھڑنا شرعاً ممنوع تھا اور اہل عرب اپنی جنگ جویانہ طبیعت کے باوجود ان کا احترام برابر ملحوظ رکھتے تھے۔ اوپر آیت ۲ میں جو چار ماہ کی مہلت مذکور ہوئی ہے ان میں تین مہینے حرمت والے تھے۔ تین مہینے اس وجہ سے کہ حرمت کے چاروں مہینے یکجا نہیں ہیں۔ تین ایک سلسلہ میں ہیں، رجب الگ ہے۔ اگرچہ نسی کے قاعدے کے تحت یہ اپنے اصل مقام سے ہٹے ہوئے تھے تاہم اگر ان تین حرمت والے مہینوں سے پہلے وقت کے مہینوں میں سے شوال کو ملا دیا جائے تو یہ چار مہینے بن جاتے ہیں۔ فرمایا کہ جب محترم مہینے گزر جائیں تو ان ناقض عہد مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ 'جہاں پاؤ' سے مراد، جیسا کہ سورہ بقرہ کی تفسیر میں وضاحت گزر چکی ہے، یہ ہے کہ حدود حرم میں بھی ان سے جنگ و قتال مباح ہے۔

مشرکین عرب کی دار و گیر

'وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ' یعنی ان کے خلاف ہر قسم کی جنگی کارروائی کی جائے اور ہر پہلو سے ان کا ناطقہ بند کیا جائے۔ اس شدت کے ساتھ ان کی دار و گیر کے اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ اس کی نوعیت محض ایک دشمن کے خلاف اقدام کی نہیں تھی بلکہ یہ مشرکین عرب کے لیے اس سنت الٰہی کا ظہور تھا جو رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کے لیے ہمیشہ ظاہر ہوتی ہے اور جس کی تفصیلات سورۂ اعراف میں بیان ہوئی ہیں۔

مشرکین عرب کے لیے دو راہیں: اسلام یا تلوار

'فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ' مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ دار و گیر اس وقت تک بند نہ کی جائے جب تک یہ اپنے کفر و شرک سے تائب ہو کر نماز نہ قائم کریں اور زکوٰۃ نہ ادا کرنے لگ جائیں۔ نماز اور زکوٰۃ ایک جامع تعبیر ہے اسلام کے نظام عبادت و اطاعت میں داخل ہونے کی۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام کے بغیر نہ ان کے لیے ذمی یا معاہد بن کر اسلامی نظام میں باقی رہنے کی گنجائش رہی نہ لونڈی غلام بن کر۔ ان کے لیے صرف دو راہیں باقی رہیں یا تو اسلام قبول کریں یا تلوار۔

مشرکین عرب کے ساتھ خاص معاملہ کی وجہ

مشرکین عرب کے ساتھ یہ خاص معاملہ کرنے کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول بھیجا، انہی کی زبان میں ان پر اپنی کتاب اتاری، انہی کی ملت کی ان کو دعوت دی گئی جس کے وہ مدعی تھے۔ رسول نے مسلسل ۲۳ سال تک ان کو جھنجھوڑا اور جگایا، ان کی ہر مجلس اور ہر بزم میں وہ پہنچا، ان کے ایک ایک دروازے پر اس نے دستک دی۔ ان کے ایک ایک شبہ اور ایک ایک اعتراض کا جواب دیا، ان کی تمام الزام تراشیوں، تہمتوں اور عداوتوں کا مقابلہ کیا۔ ان کے مطالبہ پر معجزے بھی دکھائے اور ان کی منتخب کی ہوئی کسوٹیوں پر بھی اپنے کو کھرا اور سچا ثابت کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کے اندر جو اچھے لوگ تھے وہ اس کے ساتھی بھی بن گئے تو اس سارے اہتمام کے بعد بھی جو لوگ قبولِ حق پر آمادہ نہیں ہوئے آخر وہ کس لیے باقی رکھے جاتے۔ رسول اتمام حجت کا کامل اور آخری ذریعہ ہوتا ہے، جو لوگ اس کے جگانے سے بھی نہیں جاگتے وہ مردہ ہیں اور مردوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ دفن کر دیے جائیں۔

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ (٦)

اتمام حجت کی خاطر آخری رعایت

اوپر والی آیت میں مشرکین کی داروگیر کا جو حکم ہوا ہے، اتمام حجت کی خاطر یہ اس میں آخری رعایت ہے۔ فرمایا کہ اس داروگیر کے دوران میں اگر کوئی شخص امان کا طالب ہو تو اس کو امان دے دو۔ اور اس کو اللہ و رسول کی دعوت اور اس کا مقصد اچھی طرح سنا سمجھا کر اس کی امان کی جگہ پر پہنچا دو تاکہ وہ ٹھنڈے دل سے اپنے معاملہ پر غور کر کے فیصلہ کر سکے کہ وہ اسلام قبول کرتا ہے یا تلوار۔ یہ امان بخشی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، محض اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے تھی۔ اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ وہ اس داروگیر کے حکم سے امان پا گیا۔ اگر وہ ایمان نہ قبول کرے گا تو اس کے لیے وہی حکم باقی رہے گا جو اوپر بیان ہوا ہے اور جب وہ دوبارہ زد میں آئے گا تو نہ یہ امان اس کے لیے نافع ہو گی، نہ از سرِ نو طلب امان کی اس کے لیے کوئی گنجائش ہی باقی رہے گی۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ۔ یہ اس رعایت کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ چونکہ یہ امی لوگ رہے ہیں، دین و شریعت سے بے خبر اور نبوت و رسالت سے ناآشنا، اس وجہ سے اس کا امکان ہے کہ اتنے طویل سلسلۂ تبلیغ و دعوت کے بعد بھی، کسی کے معاملہ میں اتمام حجت کے پہلو سے کوئی کسر رہ گئی ہو اور چونکہ اس داروگیر کا حکم، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اتمام حجت ہی کی بنیاد پر تھا اس وجہ سے ہدایت ہوئی کہ اگر کوئی شخص طالب رعایت ہو تو اس کو رعایت دے دی جائے۔ ہر چند اس میں یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی شخص اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر جاسوسی کرے یا دوبارہ حریف بن کر سامنے آئے۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِندَ اللَّهِ وَعِندَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ كَيْفَ وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ يُرْضُونَكُم بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ (۷-۸)

اعلانِ براءت کے وجوہ

یہ اعلانِ براءت کے وجوہ اور دلائل بیان ہو رہے ہیں۔ خطاب اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن روئے سخن ان مسلمانوں کی طرف خاص طور سے ہے جو مشرکین کے اندر اپنے تعلقات اور عزیزداریوں کے باعث اس اعلان سے تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس اعلان سے اتنی بات تو ہر شخص کے سامنے آگئی کہ اب حدیبیہ کے اس معاہدے کے دن بھی قریب آگئے ہیں جس نے مسلمانوں اور قریش کے درمیان ایک دوسرے سے ملنے جلنے کی راہ کھول دی تھی۔ جو لوگ ضعیف الایمان تھے قدرتی طور پر ان کا ایمان ایک سخت آزمائش میں پڑ گیا۔ قریش میں گھر گھر ان کی عزیزداریاں تھیں اور وہ توقع لیے بیٹھے تھے کہ ملنے جلنے کا یہ دروازہ کھلا رہے گا اور وہ کفر اور اسلام دونوں کے ساتھ نباہ کرتے رہیں گے۔ اس اعلان نے نہ صرف اس توقع کا ہمیشہ کے لیے یک قلم خاتمہ کر دیا بلکہ انھوں نے دیکھا کہ اب وہ وقت سر پر آرہا ہے کہ انھیں اپنے ان تمام عزیزوں اور رشتہ داروں کے خلاف تلوار سونتنی پڑے گی۔ اس ذہن کے لوگوں کو سامنے رکھ کر فرمایا جا رہا ہے کہ بھلا ان مشرکین کے کسی عہد و پیمان کی کوئی ذمہ داری اللہ و رسول پر کیسے ہو سکتی ہے جن کا حال یہ ہے کہ اگر تم پر کہیں ان کا زور چل جائے تو نہ قرابت کا پاس کریں نہ کسی عہد کا۔ باتوں سے وہ تمھیں خوش کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے دل تمھارے اوپر غم و غصہ سے کھول رہے ہیں۔ ان کی اکثریت بدعہدوں پر مشتمل ہے۔

آیات ۷-۸ کا دروبست

اس آیت کا دروبست ذرا قابلِ غور ہے اس کو سمجھ لیجیے۔ کلام کا آغاز تو فرمایا کَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِندَ اللَّهِ وَعِندَ رَسُولِهِ ' سے لیکن بات پوری کرنے سے پہلے ایک استثنا کا ذکر بطور جملہ معترضہ کر دیا کہ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ' پھر اس بات کو جو اس جملہ معترضہ کے سبب سے ادھوری رہ گئی تھی از سر نو لیا اور اس کو بعینہٖ اسی تمہید سے شروع کر کے اس کی تکمیل کی۔ فرمایا كَيْفَ وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۔ الآیۃ

معاشرتی و سیاسی تعلقات کی بنیادیں

تعلقات کی بنیاد دو ہی چیزوں پر ہوتی ہے۔ معاشرتی تعلقات کی بنیاد رشتۂ رحم و قرابت کے پاس و لحاظ پر اور سیاسی روابط کی بنیاد باہمی معاہدات کی عائد کردہ ذمہ داریوں کے احترام پر۔ پہلی کو اِلّ سے تعبیر فرمایا ہے جو ان حقوق کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ایک اصل و نسل، ایک جوہر و معدن سے ہونے یا قرابت اور پڑوس کی بنا پر ایک دوسرے پر آپ سے آپ قائم ہو جاتے ہیں۔ دوسری کو

'ذمہ' سے تعبیر فرمایا ہے جو ان ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کسی معاہدہ میں شریک ہونے والی پارٹیوں پر ازروئے معاہدہ عائد ہوتی ہیں۔ فرمایا کہ اس اعلان براءت سے تم میں سے کوئی اس تشویش میں مبتلا نہ ہو کہ اب ان لوگوں کے ساتھ تمام معاشرتی اور اجتماعی تعلقات ختم ہو رہے ہیں۔ یہ ختم ہو رہے ہیں تو اب ان کو ختم ہی ہونا تھا۔ تعلقات کبھی بھی یک طرفہ قائم نہیں رہتے۔ تم میں سے جو لوگ ان کے تعلقات کو عزیز رکھتے ہیں انھیں یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیے کہ وہ اگر تم پر کبھی قابو پا جائیں گے تو نہ قرابت مندی کا لحاظ رکھیں گے نہ کسی معاہدے کا۔ ملاقاتوں میں یہ جو چکنی چپڑی باتیں کہتے ہیں وہ محض زبانی ہمدردی کی نمائش اور تمھیں بے وقوف بنانے کی ایک کوشش ہے ورنہ حقیقت میں ان کے دل ان کی زبان سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ان کے دلوں کے اندر تمھارے اور تمھارے دین کے خلاف عناد بھرا ہوا ہے۔

فسق کا مفہوم

'وَاَکۡثَرُهُمۡ فٰسِقُوۡنَ' یعنی جس طرح ان کی قرابت داری محض زبانی اور نمائشی ہے اسی طرح اپنے عہد و پیمان کے معاملے میں بھی یہ بالکل جھوٹے اور غدار ہیں۔ ان کی اکثریت عہد شکن ہے۔ 'فسق' کا لفظ یہاں غداری اور عہد شکنی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور قرآن میں اس لفظ کا استعمال اس معنی میں معروف ہے۔ جس طرح اوپر 'تقویٰ' کا لفظ پاس عہد کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں 'فسق' کا لفظ نقض عہد کے لیے استعمال ہوا ہے۔

معاہدۂ حدیبیہ کی طرف اشارہ

'اِلَّا الَّذِیۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ فَمَا اسۡتَقَامُوۡا لَكُمۡ فَاسۡتَقِيۡمُوۡا لَهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ' ہمارے نزدیک یہ اشارہ اس معاہدہ کی طرف ہے جو قریش کے ساتھ صلح حدیبیہ کے موقع پر ہوا تھا۔ اس رائے کے دلائل تو آگے واضح ہوں گے لیکن ایک قرینہ یہاں قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ اس کا تعارف 'الَّذِیۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ' سے کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی معاہدے ہجرت کے بعد مشرکین کے ساتھ کیے ان میں سے اگر کوئی معاہدہ مسجد حرام کی نسبت کے ساتھ تعارف کا سزاوار ہو سکتا ہے تو وہ صرف حدیبیہ کا معاہدہ ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہی معاہدہ مسجد حرام کے قرب و جوار میں طے پایا تھا۔ اس نسبت کے اظہار سے ایک طرف تو معاہدے کا تعارف ہو گیا، دوسری طرف اس سے اس کی غیر معمولی حرمت بھی واضح ہوئی کہ کوئی ایسا ویسا معاہدہ نہیں ہے بلکہ اس کی تکمیل جوار حرم میں ہوئی ہے جس سے زیادہ کوئی دوسری جگہ مقدس و محترم نہیں ہو سکتی۔ ہم کسی دوسرے مقام میں اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اہل عرب بالعموم اپنے معاہدات اپنے معبدوں اور استھانوں کے سامنے کرتے تھے تاکہ فریقین کے اندر معاہدات کے احترام کا جذبہ پیدا ہو۔

معاہدۂ حدیبیہ کی پابندی کی ہدایت

فرمایا کہ 'فَمَا اسۡتَقَامُوۡا لَكُمۡ فَاسۡتَقِيۡمُوۡا لَهُمۡ' یعنی جب تک قریش اس معاہدے پر قائم رہیں تم بھی اس پر قائم رہو۔ اگر وہ اس کو توڑ دیں تم بھی اس کو توڑ دو۔ کوئی معاہدہ یک طرفہ قائم نہیں رہتا۔

دونوں پارٹیاں مل کر اس کو قائم رکھتی ہیں۔ یہی تقاضائے عدل ہے اور اسلام اسی کا تعین حکم دیتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ ایسے ہی عدل پسندوں کو دوست رکھتا ہے۔

معاہدات سے متعلق تین باتیں

اوپر کی آیات سے اس وقت تک کے ان تمام معاہدات کے بارے میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین کی مختلف پارٹیوں کے درمیان طے پائے تھے تین باتیں واضح ہوئیں۔

۱- جن مشرکین نے اپنے معاہدات کی خلاف ورزیاں کی تھیں ان سے اعلان برأت اور چار ماہ کی مہلت کے بعد ان سے جنگ۔

۲- جنھوں نے اپنے معاہدات پوری وفاداری سے نباہے تھے اور ان کے معاہدات موقت تھے، اختتام مدت کے بعد یہ معاہدات بھی ختم۔

معاہدۂ حدیبیہ کی خاص نوعیت

۳- معاہدۂ حدیبیہ کو اس وقت تک قائم رکھنے کی ہدایت جب تک قریش اس کو قائم رکھیں۔ یہ یاد رہے کہ معاہدۂ حدیبیہ غیر موقت تھا اور ان آیات کے نزول کے وقت تک معلوم ہوتا ہے قریش لشتم پشتم اس کو نباہ رہے تھے اس وجہ سے قدرتی طور پر اس کے متعلق بہت سے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا ہوگا کہ چار ماہ کی مذکورہ مدت گزرنے کے بعد اس کا کیا انجام ہوگا؟ یہ اسی سوال کا جواب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی دوران میں قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف بنی خزاعہ کے خلاف اپنے حلیف بنی بکر کی مدد کرکے اس معاہدہ کی بھی خلاف ورزی کی جس کے نتیجہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر فوج کشی کی اور اس کو فتح کر لیا۔

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۹-۱۱)

اعلان برأت کے وجوہ کی مزید وضاحت

یہ اعلان برأت کے وجوہ کی مزید وضاحت ہے کہ ان مشرکین کا معاملہ خالق اور خلق کسی کے ساتھ بھی درست نہیں۔ ان کے لیے اللہ کی ہدایت اتری تو انھوں نے اس کے مقابل میں اس دنیا کی متاع حقیر کو ترجیح دی، خود بھی اس سے منہ موڑا اور دوسروں کو بھی، جن پر ان کا بس چلا، اس سے روکا۔ خلق کے ساتھ ان کے معاملے کی نوعیت یہ ہے کہ کسی مسلمان کے معاملے میں ان کو نہ رحم اور قرابت کا پاس ہے نہ عہد و ذمہ کا۔ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ یعنی حقوق تلف کرنے اور حدود توڑنے میں انہی نے سبقت کی ہے تو ایسے بدعہدوں اور ایسے ظالموں کے ساتھ اللہ و رسول کا کوئی عہد کیسے رہ سکتا ہے۔ اب ان کے لیے بس یہی راہ ہے کہ توبہ کریں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں تو تمھارے دینی بھائی بن جائیں گے۔ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ میں فی الجملہ تنبیہ کا مضمون ہے مسلمانوں اور کفار دونوں کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جاننا اور سمجھنا چاہیں ان کے لیے اس باب میں اللہ کے احکام کی پوری وضاحت کر دی گئی ہے۔ کوئی ابہام باقی نہیں رہا ہے۔ اب اگر مسلمانوں میں سے کسی نے ان مشرکین کے ساتھ اس سے الگ ہو کر کوئی معاملہ کرنا چاہا تو اس کی ذمہ داری

خود اسی پر ہے، اسی طرح مشرکین میں سے اگر کسی نے اس سے کچھ الگ امید باندھی تو اس کی ذمہ داری بھی خود اسی پر ہے۔

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۲-۱۵)

قریش کے بارے میں ہدایت

'وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ' یہ اوپر آیت ۴ سے متعلق ہے۔ وہاں فرمایا تھا کہ جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا ہے جب تک یہ لوگ اس پر قائم رہیں تم بھی اس پر قائم رہو۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر قریش بھی اپنا معاہدہ توڑ دیں تو تم ان ائمۂ کفر سے بھی لڑو۔ 'ائمۂ کفر' کا اطلاق عرب میں ظاہر ہے کہ قریش کے سوا کسی اور پر نہیں ہو سکتا تھا۔ دین کے معاملہ میں سارا عرب انہی کے تابع تھا۔ پیشوائی اور سرداری کا مقام انہی کو حاصل تھا۔ قریش کے لیے اس لقب کے استعمال میں ان کے خلاف جہاد کی ایک مضبوط دلیل بھی ہے کہ سارے کفر کے امام و سرغنہ جب یہ ہیں تو ان سے نہ لڑو گے تو کس سے لڑو گے۔ اسلام کے خلاف طعن و طنز اور استخفاف و استہزا کے جتنے تیر و نشتر اور جتنے پروپیگنڈے اور اشتعال ایجاد ہوتے تھے سب انہی کے کارخانے میں ڈھلتے تھے، پھر انہی سے دوسروں میں پھیلتے تھے۔ اسی چیز کی طرف 'وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ' میں اشارہ ہے۔

'اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ' بطور جملہ معترضہ ہے اور 'لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ' اصل سلسلۂ کلام سے مربوط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے عہد و پیمان کا کوئی وزن نہیں۔ یہ زیادہ دیر اس کو نباہ نہ سکیں گے۔ آج نہیں تو کل یہ اس کو توڑ دیں گے تو جب بھی اس کو توڑ دیں تم ان سے جنگ کرو تاکہ یہ اپنی شرارتوں سے باز آئیں۔ ان کے باز آنے کا مفہوم وہی ہے جو اوپر کی آیات سے واضح ہو چکا ہے کہ توبہ کریں اور اسلام لائیں۔

نقض عہد کے بعد قریش سے قتال کی ہدایت

'اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ' یہ قریش کے خلاف مسلمانوں کو جنگ پر ابھارا ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ آیت کچھ فصل سے نازل ہوئی ہے اوپر والی آیت میں 'وَاِنْ نَّكَثُوْٓا' کے الفاظ تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی معاہدہ کم از کم رسمی طور پر باقی تھا لیکن اس آیت میں 'نَكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ' کے الفاظ آئے ہیں جو بتلاتے ہیں کہ انھوں نے معاہدہ توڑ دیا۔ اس معاہدہ کے توڑنے کی شکل، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہوئی کہ قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیفوں کے خلاف اپنے حلیفوں کی مدد کی۔

قریش کے جرائم

'وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ' نقض عہد کے جرم کے ساتھ ان کے بعض پچھلے جرائم کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔

خاص طور پر ان جرائم کی طرف جو انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف کیے۔ ان میں سب سے زیادہ سنگین جرم اللہ کے رسول کو جلاوطن کرنے کا جرم تھا۔ یہ جرم ایک ایسا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب پر، جیسا کہ پچھلی سورتوں میں وضاحت ہو چکی ہے، فیصلہ کن عذاب آجایا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ سنت الٰہی کے مطابق عذاب کے مستحق ہیں، کیا تم ان سے جنگ کرنے سے جی چراؤ گے؟ اس جرم کا ذکر 'هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ' کے الفاظ سے فرمایا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا اصل جرم یہ ہے کہ انھوں نے رسول کے جلاوطن کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ جسارت ہی بجائے خود ایک جرم عظیم ہے۔ رہا رسول کا نکلنا تو وہ تمام تر اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی حکمت و مشیت کے تحت ہوتا ہے۔ 'وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ' یعنی صرف رسول کے جلاوطن کرنے کی جسارت ہی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کے بعد جنگ چھیڑنے میں بھی پہل انہی نے کی۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ جنگ بدر کی طرف ہے جس پر تفصیلی بحث انفال میں گزر چکی ہے۔ ان الفاظ سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے جو ہم پیچھے واضح کر چکے ہیں کہ جنگ بدر کے لیے پیش قدمی تمام تر قریش کی طرف سے ہوئی۔ قافلۂ تجارت کی حفاظت کا انھوں نے محض ایک بہانہ پیدا کیا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مذکورہ جرائم اصلاً قریش ہی کے جرائم تھے اس وجہ سے ان آیات کا تعلق قریش ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جو پیچھے ہم نے اس سورہ کے زمانۂ نزول سے متعلق ظاہر کیا ہے۔

کمزور قسم کے مسلمانوں کو تنبیہ

'اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ' خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن خاص طور پر کمزوروں اور منافق قسم کے لوگوں کی طرف ہے۔ یہ لوگ، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں اور آگے تفصیل آرہی ہے، قریش کے ساتھ جنگ کے معاملے میں بہت ہراساں تھے اور اس کی وجہ جنگ سے زیادہ یہ تھی کہ یہ لوگ اپنے پچھلے تعلقات و روابط کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ان کے دل کسی طرح اس بات پر راضی نہیں ہوتے تھے کہ یہ تعلقات یک قلم ختم ہو کے رہ جائیں۔ فرمایا کہ تم ان لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ ڈرنے کا زیادہ حق دار اللہ ہے۔ اگر ایمان کے مدعی ہو تو تمھیں دوسروں کے تعلقات سے زیادہ اپنے اس تعلق کا اہتمام ہونا چاہیے جو تم اللہ سے رکھنے کا دعویٰ کرتے ہو۔

مقابلے میں دشمن کی رسوائی کی بشارت

'قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ' یہ مسلمانوں کی عموماً اور کمزور مسلمانوں کی خصوصاً حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ تم ان ائمۂ کفر سے جنگ کرنے میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے تمھارے ہاتھوں ان کو عذاب دینے اور ان کو رسوا کرنے کا فیصلہ فرما لیا ہے۔ ہم پیچھے اس سنت الٰہی کا ذکر کر چکے ہیں کہ جو قوم اپنے رسول کی تکذیب پر اڑ جاتی ہے، رسول کی ہجرت کے بعد اس پر لازماً عذاب آجاتا ہے۔ اگر رسول پر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے تو یہ عذاب براہ راست خدا کی طرف سے آتا ہے۔ اور اگر ایمان لانے والوں کی تعداد معتد بہ ہوتی ہے تو پھر انہی اہل ایمان کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ

اس قوم کو عذاب دیتا اور ان کو رسوا کرتا ہے۔ یہ رسوائی بھی اس عذاب کا خاص حصہ ہوتی ہے، اس لیے کہ تکذیب رسول کا اصل محرک، جیسا کہ اپنے مقام میں واضح ہو چکا ہے، استکبار ہے اور استکبار کی سزا رسوائی ہے۔

مظلوم مسلمانوں کی دلداری

وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ میں ان مسلمانوں کی دلداری ہے جو بے بسی و بے کسی ہونے کے سبب سے قریش کے شریروں اور سنگ دلوں کے ہاتھوں مکہ میں سنگ دلانہ مظالم کے ہدف بنے تھے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں ان سنگ دلوں کو اس طرح ذلیل و خوار کرے گا کہ ان کے اس عبرت انگیز انجام کو دیکھ کر ان لوگوں کے کلیجے ٹھنڈے ہو جائیں گے جو اسلام لانے کے جرم میں ان اشقیاء کے ہاتھوں ستائے گئے تھے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اعدائے حق کے خلاف دل میں غم و غصہ کا پایا جانا اور ان کی بربادی پر خوش ہونا ان لوگوں کے لیے بالکل روا ہے جو ان پر حق کی حجت تمام کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہوں۔

بعض افراد کے ایمان کے آرزومند مسلمانوں کے لیے بشارت

وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ میں ایک لطیف اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ان لوگوں کے اندر سے ابھی کچھ لوگوں کو توبہ کی توفیق نصیب ہوگی اور وہ ایمان سے مشرف ہوں گے۔ یہ ایک قسم کی خوش خبری ہے ان مسلمانوں کے لیے جو اپنے عزیزوں اور قریبوں کے ایمان کے آرزومند تھے۔ فرمایا کہ مطمئن رہو۔ اگر اس گھورے میں رلے ملے کچھ اور جواہر ریزے بھی ہوئے تو اللہ ان کو بھی چن لے گا۔ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ اور وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ سے اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ فرمادیا ہے جو توفیق توبہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کی وضاحت اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۚ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۶)

وَلِيْجَةً، بطانة الانسان و خاصة او من يتخذه معتمدا عليه من غير اهله۔ یعنی محرم راز، دوست اور معتمد۔

اعلان براءت مومنین کی تطہیر کے لیے ایک کسوٹی

اوپر ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ ہر چند یہاں خطاب باعتبار الفاظ عام ہے لیکن روئے سخن ان مسلمانوں ہی کی طرف ہے جو ابھی اپنے سابق روابط و تعلقات کے بندھنوں سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے تھے اس وجہ سے ان کے لیے یہ اعلان براءت ایک سخت آزمائش بن گیا۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ اعلان ایک کسوٹی ہے جو تمہارے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کر دے گی کہ کون لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور ایسے بے لاگ ہیں کہ انہیں اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کے سوا کسی کی دوستی اور قرابت کی کوئی پروا نہیں ہے اور کون لوگ دوسروں کی خاطر اللہ و رسول اور اہل ایمان کو نظر انداز کر دینے والے ہیں۔ یہ امتحان

ایک سنت الٰہی ہے جس سے ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کو لازماً گزرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے لیکن اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ امتحان کی کسوٹی پر پرکھ کے غث وسمین کو نمایاں اور اہل ایمان کی تطہیر کرتا رہتا ہے۔ اگر تمہارا گمان یہ تھا کہ تم ایمان کا دعویٰ کر کے یوں ہی چھوڑ دیے جاؤ گے تو یہ خیال غلط تھا۔ اب تمہاری جانچ کا مرحلہ آگیا کہ تم میں کون اللہ و رسول اور اہل ایمان کا وفادار ہے اور کون محض جھوٹا مدعی ہے۔

اہل ایمان کا دشمن اللہ و رسول کا دشمن ہے۔

یہاں یہ بات خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ اللہ اور رسول اور اہل ایمان کا ذکر ایک ہی ساتھ ہوا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اس میں تقسیم کی گنجائش نہیں ہے۔ جو شخص اللہ کا وفادار ہونے کا مدعی ہے اس پر واجب ہے کہ وہ اس کے رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کا بھی اپنے آپ کو وفادار ثابت کرے۔ اگر کوئی شخص اہل ایمان کے مقابل میں کسی اور کو اپنا دوست اور معتمد بناتا ہے تو وہ خدا اور رسول کا بھی ساتھی نہیں ہے اگرچہ وہ کتنی ہی بلند آہنگی سے اس کا دعویٰ کرے۔ یہ مضمون نہایت وضاحت سے آگے آیات ۲۳-۲۴ میں بھی آرہا ہے۔

لفظ 'ولیجۃ' کے مفہوم پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰۗىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاۗجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۱۷-۲۲)

جزوی نیکی اصل مقصود کی قائم مقام نہیں ہو سکتی

اوپر کے پیرے میں مشرکین قریش کے ان جرائم کی طرف اشارے کیے گئے ہیں جو ان کو اعلان برأت اور جنگ کا سزاوار قرار دیتے ہیں۔ اب یہ تولیت بیت اللہ کے سلسلہ میں ان کی بعض خدمات کا حوالہ دے کر یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ ان کی یہ خدمات بالکل بے حقیقت اور بے وزن ہیں۔ ان کی بنیاد پر یہ ہرگز اس بات کے سزاوار نہیں ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی رعایت کی جائے۔ کوئی خدمت اور نیکی اس وقت معتبر ہوتی ہے جب وہ اصل مقصود کے تحفظ کے ساتھ ہو۔ اگر اصل مقصد برباد ہو جائے تو کوئی جزوی نیکی اصل مقصود کی قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ ایک مسجد کا متولی اگر مسجد کو بت خانہ بنا دے تو محض اس بنا پر وہ کسی کریڈٹ کا سزاوار نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس نے مسجد میں پانی اور لوٹے کا انتظام کر رکھا ہے۔ مسجد میں پانی اور لوٹے

کا انتظام بجائے خود ایک اچھا کام ہے۔ لیکن ایسا کام نہیں ہے کہ اس کی خاطر کسی کے اس حق کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ مسجد کو بت خانہ بنائے رکھے اور اس کا متولی بنا رہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قریش بھی اپنی ان خدمات پر نازاں تھے اور ان کے دوسرے ہمدرد بھی ان کے ان کاموں کو قابلِ لحاظ سمجھتے تھے۔ خاص طور پر جب ان کے خلاف اعلانِ جنگ ہوا تو وہ مسلمان بھی، جو ابھی اچھی طرح یکسو نہیں ہوئے تھے، یہ سوچنے لگ گئے کہ یہ لوگ خانہ کعبہ کے متولی ہیں، اس کی خدمت کرتے ہیں، حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اس وجہ سے یہ رعایت کے حق دار ہیں، ان کے ساتھ اتنا سخت معاملہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے آگے یہ دوٹوک فیصلہ رکھ دیا جائے کہ اسلام قبول کریں یا تلوار۔ یہ ذہنیت ایک فاسد ذہنیت تھی جو ایک طرف تو مکذبینِ رسول کے لیے ایک عذر فراہم کرتی تھی، دوسری طرف اس سے ایک نہایت مکروہ قسم کے نفاق کے پرورش پانے کا امکان تھا اس وجہ سے قرآن نے اس فساد کی اصلاح کی تاکہ ایک غلط تصورِ دین مسلمانوں کے اندر جڑ نہ پکڑنے پائے۔

'مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ'

قریش کی تولیت بیت اللہ سے معزولی

"عَمَرَ يَعْمُرُ" مکان بنانے، کسی زمین کو آباد کرنے، کسی گھر کو بسانے اور اس کا انتظام کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

'مشرکین' کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن یہاں اس عام سے مراد قریش ہیں جو بیت اللہ کی تولیت کے مدعی تھے۔ نام کی بجائے وصف سے ان کے ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ یہ حکم عام ہو جائے اور اس کی علت بھی واضح ہو جائے۔

'مَسٰجِدَ اللّٰهِ' سے مراد اگرچہ مسجد حرام ہی ہے، چنانچہ آیت ۱۹ میں اس کی وضاحت بھی ہو گئی ہے لیکن اس کو جمع کے لفظ سے تعبیر فرمایا اس لیے کہ مسجد حرام کا معاملہ تنہا مسجد حرام ہی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ تمام مساجدِ الٰہی کا معاملہ ہے۔ یہی تمام مساجد کی اصل، سب کا مرکز و محور اور سب کا قبلہ ہے۔ اس کے انتظام و انصرام، اس کے مقصد اور اس کی دعوت میں کوئی فساد پیدا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام ہدایت و سعادت اور ساری خیر و برکت کا مرکز ہی درہم برہم ہو گیا۔

فرمایا کہ مشرکین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مسجد حرام کے، جو تمام مساجدِ الٰہی کا مرکز اور قبلہ ہے، منتظم بنے رہیں جب کہ وہ خود اپنے کفر کے گواہ ہیں۔ کفر سے مراد یہاں ان کا شرک ہی ہے۔ شرک کو کفر سے تعبیر کر کے دین کی یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ شرک کے ساتھ خدا کو ماننا بالکل اس کے نہ ماننے کے ہم معنی ہے۔ خدا کا ماننا صرف وہ معتبر ہے جو توحید کے ساتھ ہو بالخصوص اس شرک کے ساتھ تو ایمان باللہ کے جمع ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے جس کا کھلم کھلا اقرار و اظہار ہو۔ مشرکینِ عرب کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کے ہاں شرک کی نوعیت یہ نہیں تھی کہ ان کے کسی قول یا عمل سے شرک ایک لازمی

نتیجے کے طور پر پیدا ہوتا ہو بلکہ شرک کو بطور دین اور عقیدہ کے انھوں نے اختیار کیا تھا۔ یہ ان کے تصورِ الٰہیت کا ایک غیر منفک حصہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس کفر کے علم بردار ہوں ان کو یہ حق کسی طرح نہیں پہنچتا کہ وہ اس گھر کی تولیت پر، جو دنیا میں توحید اور خالص خدا پرستی کا سب سے پہلا گھر اور تمام مساجد الٰہی کا قبلہ ہے، قابض رہیں۔ ان کا اس گھر کا متنظم بنے رہنا کوئی نیکی نہیں ہے جو ان کے حق میں سفارش بنے بلکہ ایک بہت بڑی بدی ہے جس سے اس گھر کو پاک کرنا اہلِ ایمان کا اولین فریضہ ہے۔

شرک کے ساتھ ہر نیکی برباد

'اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ' اعمال سے یہاں ان کے وہی اعمال مراد ہیں جن کو لوگ نیکی اور خدمتِ دین کے کام شمار کرتے تھے۔ فرمایا کہ ان کے یہ سارے اعمال ڈھے جائیں گے اور یہ لوگ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ شرک کے ساتھ کوئی نیکی بھی نیکی نہیں رہ جاتی۔ خدا کے ہاں صرف وہی نیکی باقی رہتی ہے جو توحید کے ساتھ ہو۔ مذہبی صحیفوں میں مشرک کو زانیہ عورت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح ایک عورت کا اپنے شوہر کے ساتھ سارا چاؤ پیار بیکار ہے اگر وہ بدکار ہے اسی طرح بندے کا سارا کیا دھرا برباد ہے اگر وہ اپنے رب کا کسی کو شریک ٹھہراتا ہے۔

مساجد الٰہی کی تولیت کے اصلی حق دار

'اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ' اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ بیت اللہ اور مساجد الٰہی کی تولیت کے اصل حق دار کون لوگ ہیں۔ فرمایا کہ صرف وہ لوگ اس کے حق دار ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، جو نماز قائم کریں اور جو زکوٰۃ ادا کریں۔ ظاہر ہے ان تمام صفات کے حامل اگر تھے تو مسلمان تھے نہ کہ مشرکین۔ لیکن مسلمانوں کا نام لینے کے بجائے صرف ان صفات کا ذکر فرمایا جو منصبِ تولیت کے لیے بنیادی شرائط کی حیثیت رکھتی تھیں تاکہ یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو جائے کہ یہ منصب کسی گروہ یا خاندان کا اجارہ نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر چند صفات اور فرائض کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر یہ صفات مفقود ہوں تو کوئی گروہ اس منصب کا دعوے دار نہیں ہو سکتا۔ 'وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ' شرک کی نفی کے لیے ہے یعنی ان کے اندر کسی غیر اللہ کا خوف نہ پایا جاتا ہو۔ ظاہر ہے یہاں خوف سے مراد وہ خوف ہے جو کسی غیر اللہ کو بذاتِ خود نافع و ضار ماننے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ خوف شرک ہے۔ یہاں شرک کی نفی اس کے اصل محرک کی نفی سے کی ہے۔ ہم اپنی کتاب 'حقیقتِ شرک' میں یہ بات وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ شرک کا اصل سبب یہ خوف ہی ہوتا ہے۔

نائز المرام گروہ

'فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ' 'اِهْتِدَاء' کا لفظ یہاں ہدایتِ منزل کے مفہوم میں ہے۔ یعنی جو مذکورہ صفات کے حامل ہوں گے انھی کے باب میں یہ توقع ہے کہ وہ منزل پر پہنچیں اور بامراد و فائز المرام ہوں۔ لفظ کے اس مفہوم کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ اس بات کو 'عَسٰى' کے لفظ سے تعبیر کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ یہ راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے۔ اس میں قدم قدم

پرمشکلات اور آزمائشیں ہیں۔ صرف وہی لوگ جادۂ مستقیم پر استوار رہ سکتے ہیں جن کے پاس توفیق الٰہی کا زادِ راہ ہو اور جن کو خدا سے استعانت کا سہارا حاصل ہو۔

مشرکین کی خدمتِ بیت اللہ بے ثمر

'اَجَعَلْتُمْ سِقَایَۃَ الْحَآجِّ وَعِمَارَۃَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰھَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ'، 'کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ' میں مضاف محذوف ہے جس طرح 'وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ' میں محذوف ہے۔ مخاطب وہی لوگ ہیں جو حرم کی تولیت اور اس سے متعلق بعض خدمات، مثلاً حجاج کے لیے پانی کے انتظام کی خدمت، کی بنا پر مشرکین قریش کو دوسروں کے مقابل میں ایک امتیاز کا درجہ دے کر ان کو مستحق رعایت خیال کرتے تھے۔ فرمایا کیا حاجیوں کو پانی پلا دینا اور مسجد حرام کا الٹا سیدھا کچھ انتظام کر دینا ایمان باللہ والآخرۃ اور جہاد فی سبیل اللہ کا قائم مقام ہو سکتا ہے؟ 'لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰہِ' اگر تم ان کاموں کو یکساں سمجھتے ہو تو سمجھو لیکن خدا کے ہاں یہ دونوں قسم کے لوگ یکساں نہیں ہوں گے۔ 'وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ' خدا ان مشرکوں کو بامراد نہیں کرے گا۔ ظلم سے مراد یہاں شرک ہے اور 'ہدایت' سے مراد مطلوب و مقصود کی ہدایت ہے۔ اور ہم واضح کر چکے ہیں کہ شرک کے ساتھ جو کام نیکی کے لیے جاتے ہیں وہ نقش برآب ہوتے ہیں۔ خدا کے ہاں وہ بالکل لاحاصل ہو کر رہ جائیں گے اور ان کی بنا پر جو امیدیں باندھی جائیں گی ان سب کا نتیجہ نامرادی کی شکل میں نکلے گا۔

فائز المرام صرف اہل ایمان ہوں گے

'اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ لا اَعْظَمُ دَرَجَۃً' 'اَعْظَمُ دَرَجَۃً' یہاں تقابل کے لیے نہیں بلکہ تفخیم شان کے لیے ہے۔ یعنی ایمان، ہجرت اور جہاد والوں کا مرتبہ اللہ کے ہاں بہت اونچا ہے۔ جس طرح سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے 'وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ' ۲۱۲ (جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے قیامت کے دن ان پر بالا ہوں گے) اس اسلوب میں یہاں اہل ایمان کے درجے کی عظمت کفار کے درجے سے قطع نظر کر کے بتائی گئی ہے۔ کفار کا جو حال ہو گا وہ 'اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ وَفِی النَّارِ ھُمْ خٰلِدُوْنَ' سے واضح ہو ہی چکا ہے۔ 'وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ' بالکل 'وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ' کے مقابل میں ہے یعنی کفار و مشرکین تو آخرت میں بالکل نامراد رہیں گے البتہ اہل ایمان فائز المرام اور بامراد ہوں گے۔

'یُبَشِّرُھُمْ رَبُّھُمْ بِرَحْمَۃٍ مِّنْہُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّھُمْ فِیْھَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ لا خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ' یہ اوپر والے ٹکڑے 'وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ' کی تفسیر ہے کہ ان کو ان کے ایمان اور ہجرت و جہاد کے صلہ میں ان کے رب کی طرف سے رحمت، رضوان اور ابدی نعمت کے باغوں کی بشارت ہے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ دنیا کی نعمتوں کی طرح ان نعمتوں کے لیے زوال نہیں ہے۔

'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَکُمْ وَاِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ

عَلَى الْإِيمَانِ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۞ قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (۲۳-۲۴)

سچے اہل ایمان کی صفات

اوپر آیت ۱۶ میں یہ مضمون گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ پسند نہیں کرتا کہ اہل ایمان کے اندر وہ لوگ بھی رلے ملے رہیں جو ایمان کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں اور کفار و مشرکین سے دوستی بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے صرف وہی لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جہاد کریں اور اللہ و رسول اور اہل ایمان کے مقابل میں کسی اور کو اپنا دوست اور معتمد نہ بنائیں۔ اب یہ اسی مضمون کو دوسرے اسلوب سے نہایت واضح اور فیصلہ کن لب و لہجہ میں، تمام مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا ہے تاکہ ہر شخص اپنی راہ اور اپنی منزل کا انتخاب کر لے۔

فرمایا کہ تمہارے درمیان تعلق، دوستی اور اعتماد کی بنیاد نسب اور خاندان پر نہیں بلکہ ایمان پر ہے۔ اگر تم میں سے کسی کے باپ اور بھائی ایمان پر کفر کو ترجیح دیں تو تم ان کو اپنا معتمد اور دوست نہ بناؤ۔ جو ایسا کرے گا تو یاد رکھے کہ وہ خود اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا بنے گا۔ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ یعنی اس کے نتیجہ میں جو وبال اس پر دنیا اور آخرت دونوں میں آئے گا اس کی ذمہ داری خود اسی پر ہوگی۔ اس میں کسی دوسرے کی کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ الآیۃ نہایت فیصلہ کن انداز میں اس باب کی آخری تنبیہ ہے۔ انسان کی تمام محبوبات میں سے ایک ایک چیز کو گنا کر فرمایا کہ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی کسی کو اللہ اور رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز و محبوب ہے تو وہ اللہ کے فیصلے کا انتظار کرے۔

اللہ و رسول کے محبوب رکھنے کا مطلب

کسی چیز کا اللہ اور رسول سے زیادہ عزیز و محبوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے سامنے جب دو بالکل متضاد مطالبے آئیں، ایک طرف اللہ و رسول کا مطالبہ ہو، دوسری طرف مذکورہ چیزوں میں کسی چیز کی محبت کا مطالبہ اور آدمی خدا اور رسول کے مطالبے کو نظر انداز کر کے دوسری چیز کے مطالبہ کو ترجیح دے دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ اور رسول سے زیادہ اس کو وہ چیز محبوب ہے اور اگر اس کے برعکس وہ اس چیز کے مطالبہ پر اللہ و رسول کے مطالبہ کو مقدم رکھے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اللہ و رسول کی محبت کو ترجیح دی۔ اللہ و رسول سے یہ محبت ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ اس کے بغیر کسی کا دعوائے ایمان معتبر نہیں ہے اور یہ محبت ہی کے جانچنے کے لیے ایک ایسی کسوٹی ہے جس سے ہر شخص اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنے ایمان اور اپنی محبت کو جانچ سکتا ہے۔

مرغوباتِ نفس اور ایمان کا تقاضا

یہاں جن محبوبات و مرغوبات کی فہرست گنائی ہے اس میں نہایت لطیف نفسیاتی ترتیب ہے جو بجائے خود واضح ہے۔ پہلے باپ، بیٹے، بھائی، بیوی اور خاندان کو لیا ہے جن کی محبت یا عصبیت آدمی کے لیے حق کی راہ میں حجاب اور آزمائش بنتی ہے پھر اموال، کاروبار اور مکانات کا ذکر کیا ہے جو اصلاً مذکورہ متعلقین ہی کے تعلق سے مطلوب و مرغوب ہوتے ہیں اور آدمی صاحبِ توفیق نہ ہو تو اس کے لیے یہ فتنہ بن جاتے ہیں۔ اموال کے ساتھ 'اقترفتموھا' کی قید ہے۔ 'اقتراف' کے معنی اکتساب کے ہیں یہ قید اس مال کے محبوب ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جس مال کو آدمی نے خود کمایا اور بڑھایا ہو وہ اس کو زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ اسی طرح 'تجارۃ' کے ساتھ 'تخشون کسادھا' کی قید اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ وہ تجارت کامیاب اور چلتی ہوئی تجارت ہے اس لیے کہ کامیاب اور چلتی ہوئی تجارت ہی وہ چیز ہے جس کے متعلق تاجر کو ہر وقت یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ اس پر کساد بازاری کا جھونکا نہ آجائے اور اس خطرے سے اس کو بچائے رکھنے کے لیے وہ سارے جتن کرتا ہے یہاں تک کہ وہی اس کی معبود بن جاتی ہے۔ پھر نہ تو اسے حلال و حرام کی تمیز باقی رہ جاتی ہے اور نہ ہجرت، جہاد اور اللہ کی راہ میں قطعِ علائق کی آزمائشیں اسے گوارا ہوتی ہیں۔ فرمایا کہ ان میں سے ہر چیز ایک بت ہے اور جب تک بندہ اللہ کی خاطر ان میں سے ہر بت کو توڑنے کے لیے تیار نہ ہو جائے وہ ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔

جھوٹے مدعیانِ ایمان کا انجام

'فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ' دھمکی ہے اور نہایت سخت دھمکی۔ اس کے ابہام کے اندر بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ اوپر مکذبین رسول کا انجام بیان ہو چکا ہے۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو انجام مکذبین رسول کے لیے مقدر ہو چکا ہے اسی انجامِ بد سے دوچار ہونے کے لیے وہ مدعیانِ ایمان بھی تیار رہیں جو کفر اور ایمان دونوں کی کشتی پر بیک وقت سوار رہنا چاہتے ہیں۔

'وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ' جس طرح اوپر مشرکین کی بابت فرمایا تھا کہ 'وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ' اللہ مشرکوں کو بامراد نہیں کرے گا اسی طرح یہاں کفر و اسلام دونوں کے درمیان ڈانواں ڈول لوگوں کی بابت ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کے فاسقوں کو بامراد نہیں کرے گا۔ 'فسق' کا لفظ خروج عن الایمان کے مفہوم میں ہے جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ اللہ و رسولؐ کے مقابل میں اہلِ کفر کو اپنا دوست اور معتمد بناتے ہیں وہ ایمان کے دعوے کے باوجود ایمان سے نکل جاتے ہیں۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۲۵-۲۷)

کمزوروں کی ہمت افزائی

'لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ' یہ بات انہی مذبذبین کی ہمت افزائی کے لیے فرمائی گئی ہے

کہ ان سے جنگ کرنے میں ہچکچاؤ نہیں، جس خدا نے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد فرمائی ہے اس کی مدد اب بھی تمہارے شامل حال ہے۔ ہجرت کے بعد سے فتح مکہ تک متعدد جنگیں مشرکین کے ساتھ ہو چکی تھیں جن میں سے ایک آدھ کے سوا سب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عنایت فرمائی۔ اب ان سب کا حوالہ دے کر فرمایا کہ جس خدا کی نصرت ہمیشہ تمہارے ہمرکاب رہی ہے اس پر بھروسہ رکھو، وہ تمہیں اپنی مدد سے محروم نہیں کرے گا۔

غزوۂ حنین کی مثال سے کمزوروں کی ہمت افزائی

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا، یہ ایک شبہ کا، جو مذکورہ وعدۂ نصرت سے متعلق کمزور ذہنوں میں پیدا ہو سکتا تھا، برسرموقع ازالہ ہے۔ اس سے کچھ ہی پہلے جنگ حنین میں مسلمانوں کو اول اول شکست کی افتاد سے سابقہ پیش آ چکا تھا۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس حادثہ کی اصلی نوعیت واضح کر دی جائے۔ فرمایا کہ حنین کے دن بھی اللہ نے تمہاری مدد فرمائی البتہ یہ ہوا کہ شروع شروع میں تمہاری کثرت تعداد نے تمہارے اندر غلط قسم کی خود اعتمادی اور بے پروائی پیدا کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمہیں شکست سے سابقہ پیش آیا اور تم میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور مومنین مخلصین پر عزم و حوصلہ اتارا اور تمہاری مدد کے لیے اپنی غیبی فوجیں بھیجیں اور کفار کو تمہارے ہاتھوں پامال کروایا۔

غزوۂ حنین میں ابتدائی شکست کی وجہ

مطلب یہ کہ فتح تو اللہ نے تمہیں اس جنگ میں بھی دی البتہ تمہاری غلطی پر تمہیں تنبیہ کرنے کے بعد دی۔ غزوۂ حنین میں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا لشکر ۱۲ ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا۔ مسلمان اس سے پہلے بارہا قلیل تعداد اور معمولی اسلحہ سے کفار کی بڑی بڑی فوجوں کو شکست دے چکے تھے۔ وہ جب پہلی بار ایک لشکر جرار کی شکل میں نکلے تو یہ خیال تو ان کے دل میں پیدا ہونا ہی تھا کہ بھلا آج ہمارے مقابل میں کون ٹک سکتا ہے؟ اس غلط خود اعتمادی سے قدرتی طور پر ان کے اندر بے پروائی پیدا ہو گئی۔ بہتوں کے اندر نہ اللہ کی طرف وہ توجہ ہی باقی رہ گئی جس کی ہدایت سورۂ انفال کی آیت ۴۵ میں فرمائی گئی تھی کہ إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (جب تمہارا کسی گروہ سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ کامیابی حاصل کرو) اور نہ نظم اور ڈسپلن، اطاعت اور اخلاص و انابت کا وہ اہتمام ہی باقی رہا جس کی تاکید آیت ۴۶-۴۷ میں فرمائی گئی ہے وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ (اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اختلاف رائے نہ پیدا ہونے دو ورنہ ہمت ہار بیٹھو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، ثابت قدم رہو کیونکہ اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہوتا ہے اور ان لوگوں کی مانند نہ ہونا جو اپنے گھروں سے اتراتے اور نمائش کرتے نکلے) اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح پیغمبر کی حکم عدولی اور تنازع فی الامر نے احد میں

شکست سے دوچار کیا اسی طرح کثرت تعداد کے عجب و غرور نے حنین میں خطرے سے دوچار کیا اس لیے کہ اس غرے میں اس بطر و رئا کی جھلک تھی جو اللہ کو ناپسند ہے اور جس سے اس نے اپنی راہ میں جہاد کے لیے نکلنے والوں کو روکا ہے۔ اس قسم کا غرہ آدمی کا اعتماد اللہ کے بجائے اسباب و وسائل پر جما دیتا ہے درآنحالیکہ مومن کا اعتماد ہر حال میں اللہ ہی پر ہونا چاہیے۔ اگر اللہ کا بھروسہ کمزور ہو جائے تو بڑی سے بڑی تعداد اور زیادہ سے زیادہ اسباب و وسائل سب خس و خاشاک بن کے رہ جاتے ہیں اور جن لوگوں کو یہ گھمنڈ ہوتا ہے کہ کوئی ہمارے مقابل میں ٹک نہیں سکتا ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ زمین اپنی تمام وسعتوں اور پہنائیوں کے باوجود ان پر اس طرح تنگ ہو جاتی ہے کہ انھیں کوئی راہ فرار سجھائی نہیں دیتی۔ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ میں اسی صورت حال کی تصویر ہے۔

غزوہ حنین میں شکست کے بعد فتح

ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ۔ اسلوب بیان اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا محض بطور تنبیہ و تذکیر پیش آیا۔ اس تنبیہ کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم جما دیے اور وہ اس طرح کہ اس نے اپنے پیغمبر اور اس کے مخلص جاں نثاروں پر سکینت نازل فرمائی اور ان کی سکینت دوسروں کے اندر سکینت پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔ اس جنگ کے جو حالات سیرت و مغازی کی کتابوں میں مذکور ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب فوج میں بھگدڑ مچ گئی تو صرف سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑے سے جاں نثاروں کے ساتھ اپنی جگہ پر جمے رہے۔ بالآخر آپ ہی کی عزیمت و استقامت نے دوسروں کے اندر روح پھونکی اور منتشر شیرازہ از سر نو مجتمع ہوا اور اللہ نے شکست کے بعد فتح سے نوازا اور مومنین کے ہاتھوں کفار کو وہ سزا ملی جو ان کے لیے مقدر ہو چکی تھی۔ سکینت سے مراد جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، قرار، عزم اور حوصلہ ہے۔ اور جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا سے اشارہ ملائکہ کی غیبی افواج کی طرف ہے جو ہر جگہ اہل ایمان کی ہم رکاب ہوتی ہیں گو وہ ناسوتی نگاہوں سے نظر نہیں آتیں۔

اپنے کافر عزیزوں کے باب میں تشویش میں مبتلا لوگوں کے لیے بشارت

ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ ... الآیۃ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان سب واقعات کے بعد بھی اللہ ان لوگوں کو توبہ کی توفیق دے گا جن کے اندر صلاحیت کی کوئی رمق باقی ہے۔ یہ گویا ایک قسم کی بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے کافر عزیزوں کے باب میں تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ مضمون آیت ۵ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہ بشارت نہایت واضح الفاظ میں سورۂ نصر میں بھی وارد ہوئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۲۸)

اعلانِ براءت کے سلسلہ کی آخری ہدایت: مشرکین کو مسجد حرام کے پاس آنے کی ممانعت

یہ اس اعلانِ براءت کے سلسلہ کی آخری ہدایت ہے جس کا ذکر شروع سے چلا آ رہا ہے۔ فرمایا کہ یہ مشرکین نجس ہیں اس وجہ سے اس سال کے بعد سے یہ مسجد حرام کے پاس پھٹکنے نہ پائیں۔ نجاست سے مراد ظاہر ہے کہ یہاں وہ عقائدی نجاست مراد ہے جس کی تفصیلات دوسرے مقامات میں بیان ہو چکی ہیں۔ فتح مکہ کے بعد بیت اللہ پر سے مشرکین کا تسلط تو ختم ہو چکا تھا لیکن ۹ھ کے حج تک ان کو یہ مہلت حاصل رہی کہ وہ حج کے لیے آتے اور اپنے جاہلی طریقے کے مطابق حج کے مراسم بھی ادا کرتے اور تجارتی خرید و فروخت بھی کرتے لیکن اسی حج کے موقع پر اعلانِ براءت کی عام منادی کے ساتھ ساتھ اس حکم کے بموجب یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ آئندہ سے مشرکین حج کے لیے نہ آئیں۔ یہ گویا حجۃ الوداع کی تیاریوں کی تمہید تھی کہ ۱۰ھ میں جب خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حج ادا فرمائیں تو مرکزِ ابراہیمؑ شرک و کفر کی ہر آلائش سے بالکل پاک ہو۔

تجارتی کساد بازاری کے اندیشے کا ازالہ

وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ الآیۃ۔ 'عیلۃ' کے معنی فقر و مفلسی کے ہیں۔ یہاں یہ معاشی اور تجارتی نقصان کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

ہم دوسرے مقام میں تفصیل سے بیان کر آئے ہیں کہ حج کو جس طرح ایک بہت بڑی مذہبی عبادت کی حیثیت حاصل تھی اسی طرح تجارتی اور کاروباری پہلو سے بھی اس کی بڑی اہمیت تھی۔ اس موسم میں باہر کا مال مکہ میں پہنچتا اور مکہ کی چیزیں باہر کے تاجر خریدتے۔ زمانۂ جاہلیت میں اس کے کاروباری پہلو کو اتنی اہمیت حاصل ہو گئی تھی کہ قریش نے نسیٔ کا قاعدہ ایجاد کر کے حج کو ایک خاص موسم میں کر دیا تھا تاکہ موسموں کا تغیر تجارتی چہل پہل پر اثر انداز نہ ہو۔ اب اسلام کے دور میں آ کر جب یہ اعلان ہوا کہ آئندہ مشرکین حج کے لیے نہیں آ سکتے تو ان لوگوں کو تشویش لاحق ہوئی جو کاروباری زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے خیال کیا کہ مشرکین کو روک دینے سے کاروبار اور تجارت پر بڑا اثر پڑے گا جس سے مسلمانوں کی معاشی حالت خراب سے خراب تر ہو جائے گی۔ ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے فرمایا کہ معاشی بدحالی کا غم نہ کرو۔ اللہ اگر چاہے گا تو اپنے فضل سے تمھیں غنی کر دے گا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ یہ وعدہ پورا ہوا اور اس طرح پورا ہوا کہ ایک دن کے لیے بھی مکہ کی تجارت اس بندش سے متاثر نہ ہوئی اور کچھ عرصہ بعد تو یہ حال ہوا کہ مصر و شام اور روم و ایران کے خزانے بھی اونٹوں پر لد لد کر اسلام کے بیت المال میں پہنچنے لگے اور اللہ نے اپنے فضل سے مسلمانوں کو اس طرح غنی کر دیا کہ لوگ اپنی زکوٰۃ کا مال مدینہ کی گلیوں میں لیے پھرتے تھے لیکن اس کا کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔

اصل تدبیر تقویتِ ایمانی اعتماد کی ہے

إِنْ شَاءَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ چیز بہرحال اللہ ہی کی مشیت پر منحصر ہے اور اللہ کی مشیت اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ تنگی یا کشادگی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں، اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اس وجہ سے اصل بھروسہ اللہ ہی پر ہونا چاہیے جس کا ہر کام

علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام میں اصلی قدر و قیمت روحانی و ایمانی اقدار کی ہے۔ سیاسی اور معاشی مصالح ان کے تحت ہیں۔ ایمانی اقدار کے لیے معاشی مصالح قربان کیے جا سکتے ہیں لیکن پیٹ اور نفس کے مفاد پر ایمان کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۹-۳۵

آگے اہل کتاب ـــ یہود و نصاریٰ ـــ سے جہاد کا حکم دیا ہے اور اوپر جس طرح مشرکین کے باب میں ایک واضح اور قطعی پالیسی سامنے رکھ دی ہے اسی طرح ان کے باب میں بھی ایک واضح اور قطعی پالیسی کا اعلان کر دیا ہے کہ اب یہ اسلامی حکومت میں رہنا چاہتے ہیں تو صرف ذمی بن کر رہ سکتے ہیں۔ ان کے نقض عہد اور ان کی سازشوں کی تفصیل انفال میں گزر چکی ہے۔ یہاں بھی ان کے عقائد اور ان کے کردار کے ان پہلوؤں کی طرف بعض اشارات فرما دیے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے اب ان کا وجود نہ صرف ایک ناکارہ وجود ہے بلکہ یہ سزاوار ہیں کہ اپنی کرتوتوں کی سزا بھگتیں ـــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۹-۳۵

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ یُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰی یُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَیَاْبَی اللّٰهُ

ع ۵ / ۱۰

إِلَّآ أَن يُتِمَّ نُورَهُۥ وَلَوْ كَرِهَ ٱلْكَٰفِرُونَ ﴿٣٢﴾ هُوَ ٱلَّذِىٓ أَرْسَلَ
رَسُولَهُۥ بِٱلْهُدَىٰ وَدِينِ ٱلْحَقِّ لِيُظْهِرَهُۥ عَلَى ٱلدِّينِ كُلِّهِۦ
النصف وَلَوْ كَرِهَ ٱلْمُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ
ٱلْأَحْبَارِ وَٱلرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَٰلَ ٱلنَّاسِ بِٱلْبَٰطِلِ وَيَصُدُّونَ
عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ۗ وَٱلَّذِينَ يَكْنِزُونَ ٱلذَّهَبَ وَٱلْفِضَّةَ وَلَا
يُنفِقُونَهَا فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ
يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِى نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ
وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا۟ مَا كُنتُمْ
تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾

ترجمۂ آیات ۲۹-۳۵

ان اہل کتاب سے جو نہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے، نہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام ٹھہرائے ہوئے کو حرام ٹھہراتے اور نہ دین حق کی پیروی کرتے، جنگ کرو تا آنکہ وہ مغلوب ہو کر جزیہ ادا کریں اور ماتحت بن کر زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں۔ ۲۹

اور یہود عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور نصاریٰ مسیح کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں یہ سب ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ یہ ان لوگوں کی بات کی نقل کر رہے ہیں جو ان سے پہلے مبتلائے کفر ہوئے۔ اللہ ان کو غارت کرے کہاں ان کی عقل الٹی ہوئی جا رہی ہے۔ انھوں نے اللہ کے سوا اپنے فقیہوں اور راہبوں کو رب بنا ڈالا اور مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ انھیں صرف ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی معبود

نہیں، وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ وہ کافروں کے علی الرغم اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ اس کو سارے دین پر غالب کر دے ان مشرکوں کے علی الرغم۔ ۳۰ - ۳۳

اے ایمان والو، ان فقیہوں اور راہبوں میں بہتیرے ایسے ہیں جو لوگوں کا مال باطل طریقوں سے ہڑپ کرتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی ڈھیر کر رہے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہیں ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ اس دن جس دن دوزخ میں اس پر آگ دہکائی جائے گی پھر اس سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی۔ یہ ہے وہ جو تم نے اپنے لیے ذخیرہ کیا۔ تو اب چکھو جو تم جمع کرتے رہے ہو۔ ۳۴ - ۳۵

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ لَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ وَ لَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ عَنۡ یَّدٍ وَّ ہُمۡ صٰغِرُوۡنَ (۲۹)

اہل کتاب کے جرائم اور ان کے بارے میں حکم

اہل کتاب کے مذہبی اور سیاسی جرائم کی تفصیل بقرہ، آل عمران، مائدہ اور انفال سب میں بیان ہو چکی ہے۔ اگرچہ یہ لوگ نہ صرف ایمان کے مدعی تھے بلکہ اپنے آپ کو دین و شریعت کا تنہا اجارہ دار سمجھے بیٹھے تھے لیکن مذکورہ سورتوں میں پوری وضاحت سے ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ، آخرت اور شریعت کسی چیز پر بھی یہ ایمان نہیں رکھتے تھے۔ ایمان کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اللہ کے شرائط کے تحت ہو لیکن ان کا ایمان اپنی خواہشوں اور بدعات کے تحت تھا۔ مشرکانہ عقائد ایجاد کر کے انھوں نے خدا کی نفی کر دی، اپنے آپ کو چہیتی اور معزز امت قرار دے کر آخرت کا ابطال کر دیا اور اللہ اور رسول کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو جائز بنا کر شریعت کو کالعدم کر دیا۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کیا کہ اللہ نے اپنے آخری

رسول کے ذریعے سے، اپنے وعدے کے مطابق، جو دینِ حق بھیجا تو اس کو نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کیا بلکہ اس کی مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کر دیا اور اس کے خلاف برابر سازشوں میں سرگرم رہے۔ فرمایا کہ اب، یہ مفسدین کسی مزید مہلت کے حقدار باقی نہیں رہ گئے ہیں۔ ان سے بھی جنگ کرو یہاں تک کہ یہ مغلوب ہو کر جزیہ دیں اور ماتحت بن کر زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں۔

'عَنْ یَدٍ' کا مفہوم

حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّ ھُمْ صٰغِرُوْنَ۔ 'ید' کے اصل معنی تو ہاتھ کے ہیں لیکن یہ غلبہ، تسلط اور اختیار و اقتدار کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یعنی ان کی طرف سے یہ ادائیگی جزیہ تمہارے اقتدار و غلبہ کے نتیجہ میں ہو۔ ان سے جنگ کر کے ان کے کس بل اس طرح نکال دو کہ یہ تمہارے آگے گھٹنے ٹیک دیں اور ہاتھ باندھ کر جزیہ دینے پر راضی ہوں۔ 'وَھُمْ صٰغِرُوْنَ' یعنی تمہاری ماتحتی و محکومی قبول کریں اور اس کو غنیمت جانیں۔

جزیہ کی حیثیت

یہ جزیہ ایک ٹیکس ہے جو تمام بالغ اور کمائو افراد پر اس امان کے معاوضہ کے طور پر لگایا گیا جو ان کے جان و مال اور زن و فرزند کو اسلامی حکومت کے اندر حاصل ہوتی۔ اس کی مقدار افراد کی حیثیت اور صلاحیت کے اعتبار سے مختلف ہوتی تھی جس میں چھوٹ اور رعایت کی بھی بڑی گنجائش رکھی گئی تھی۔ تفصیلات اس کی ہماری کتاب اسلامی ریاست میں، غیر مسلموں کے حقوق کے باب میں ملے گی۔

اہل کتاب اور مشرکین میں فرق کی وجہ

یہاں ایک بات بہت نمایاں طور پر محسوس ہو گی کہ اہل کتاب کے ساتھ جو معاملہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے وہ اس سے مختلف ہے جس کی ہدایت اوپر مشرکین کے باب میں کی گئی ہے۔ مشرکین کے باب میں تو یہ حکم ہوا کہ جب تک یہ کفر سے توبہ کر کے اسلام نہ اختیار کر لیں اس وقت تک ان کا پیچھا نہ چھوڑو لیکن ان اہل کتاب کو جزیہ کی ادائیگی پر امان دے دینے کی ہدایت ہوئی۔ اس فرق کی وجہ وہی ہے جس کی وضاحت ہم پیچھے کر چکے ہیں کہ مشرکین عرب کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت براہِ راست تھی، آپؐ انہی کے اندر سے اٹھائے گئے، انہی کی زبان میں آپؐ پر اللہ کا کلام اترا اور انہی کو آپؐ نے اپنی دعوت کا مخاطبِ اول بنایا اور ہر پہلو سے انہی کے معروف و منکر اور انہی کے مطالبات کے مطابق آپ نے ان پر اتمامِ حجت کیا۔ اس اہتمام کے بعد ان کے لیے کسی مزید مہلت کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ چنانچہ مشرکین بنی اسمٰعیل ذمی نہیں بنائے جا سکتے تھے لیکن دوسرے غیر مسلموں کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ اسلامی حکومت میں ذمی بن کر رہ سکتے ہیں۔

دوسرے غیر مسلموں کا حکم

اصلاً تو یہاں جو حکم بیان ہوا ہے وہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے متعلق ہے لیکن صحابہؓ کے زمانہ ہی میں یہ مسئلہ بھی طے پا چکا تھا کہ یہی حکم دوسرے غیر مسلموں کا بھی ہے۔ چنانچہ مجوس کے ساتھ، ان کو مشابہ اہل کتاب قرار دے کر، یہی معاملہ کیا گیا جس کی ہدایت یہاں اہل کتاب کے باب میں ہوئی

ہے۔ اس باب میں فقہا میں کوئی اختلاف رائے ہے تو وہ فروعی نوعیت کا ہے جس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

مفتوح اور معاہد اہل ذمہ کا حکم

یہ بات یہاں خاص طور پر ذہن میں رکھنے کی ہے کہ آیت میں جو حکم بیان ہوا ہے وہ مفتوح اہل ذمہ کا ہے یعنی جنھوں نے اسلامی حکومت سے جنگ کی ہو اور شکست کھا کر اس کی اطاعت پر مجبور ہوئے ہوں۔ وہ اہل ذمہ اس سے الگ ہیں جن کو فقہا نے معاہد یا اہل صلح سے تعبیر کیا ہے۔ معاہد اہل ذمہ سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے بغیر کسی جنگ و قتال کے بطور خود اپنی مرضی سے اسلامی حکومت کی رعیت بن کر رہنا اختیار کیا ہو۔ ان لوگوں کے ساتھ حکومتِ اسلامی اس عہد نامے کے مطابق معاملہ کرے گی جو ان کے اور حکومت کے مابین طے پا چکا ہو۔ یہاں تک کہ اگر وہ اس بات پر مصر ہوں کہ ان پر بھی اسی طرح کے مالی واجبات عائد کیے جائیں جو مسلمانوں پر عائد ہیں تو حکومت ان سے اپنی صواب دید کے مطابق اس شرط پر بھی معاہدہ کر سکتی ہے، دوسرے لفظوں میں اس فرق کو یوں سمجھیے کہ اگر جزیہ کی ادائیگی میں وہ عار اور ذلت محسوس کریں تو ان کو اس سے مستثنیٰ کر کے ان کے لیے کوئی اور مناسب شکل اختیار کی جا سکتی ہے۔ ان لوگوں سے جو معاہدہ بھی طے پا جائے بلا کسی سبب معقول کے اس کو توڑنے کی اسلام میں سخت ممانعت آئی ہے۔ ہم نے اہل ذمہ کی ان دونوں قسموں پر اپنی کتاب اسلامی ریاست میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ جو لوگ مسئلہ کو دلائل کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہوں وہ اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۚ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۝ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۳۰-۳۱)

'وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ'۔

عزیر کا زمانہ

'عزیر' کا نام تورات میں 'عزرا' آیا ہے۔ ان کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ بخت نصر کے ہاتھوں یہود پر جو تباہی آئی اس میں تورات کے صحیفے بھی بالکل ناپید ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہی عزرا ہیں جنھوں نے اپنی یادداشت سے از سر نو تورات کو مرتب کیا۔ عجب نہیں کہ ان کے اسی کارنامے کی بنا پر یہود نے ان کو ابن اللہ بنا دیا ہو تا کہ اس دعوے سے ان کی مرتب کی ہوئی تورات کو درجۂ استناد حاصل ہو سکے اور اگر کوئی اس پر شبہ وارد کرے تو اس کو یہ جواب دے کر چپ کیا جا سکے کہ یہ وہی تورات ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، اس کی گم شدگی کے بعد اللہ نے اپنے بیٹے عزرا کے ذریعے سے اس کو از سر نو مرتب کرایا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اس دور کے مشرکانہ ماحول میں اس قسم کا کوئی اشتلاب بہت کارآمد ہو سکتا تھا۔ مجھے یہود کے لٹریچر میں، یہود کے اس واہمہ کی کوئی

تفصیل نہیں مل سکی۔ لیکن قرآن کا اندازِ بیان شاہد ہے کہ یہود کے ہاں یہ ایک جانی پہچانی ہوئی بات تھی۔ اگر یہ جانی پہچانی ہوئی بات نہ ہوتی تو وہ قرآن کے اس بیان کے خلاف ضرور اعتراض اٹھاتے۔ چنانچہ قرآن نے اس ذیل میں یہ جو فرمایا ہے کہ انھوں نے اپنے احبار اور رہبان کو رب بنالیا ہے تو بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سوال اٹھایا کہ ہم احبار اور رہبان کو رب تو نہیں مانتے۔ آنحضرتؐ نے ان کے اس سوال کا ان کو مسکت جواب دیا تب وہ مطمئن ہوئے۔ اسی طرح اگر قرآن کی اس بات پر کسی کو شبہ یا اعتراض ہوتا تو وہ ضرور سوال اٹھاتا لیکن اس طرح کا کوئی اعتراض یا شبہ کہیں نقل نہیں ہے۔

حضرت مسیحؑ کے ابن اللہ بنانے کی بحث پوری تفصیل سے آل عمران کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ اس کو اس کے محل میں دیکھیے۔

اہل کتاب کے عدم ایمان کے دلائل

اوپر والی آیت میں یہود و نصاریٰ کے متعلق یہ بات جو بیان ہوئی ہے کہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اب یہ اس کے دلائل بیان ہو رہے ہیں کہ یہود نے عزیر کو خدا کا بیٹا بنایا اور نصاریٰ نے مسیح کو۔ اس شرک کے بعد خدا پر ان کا ایمان معتبر نہیں۔ خدا پر ایمان کی یہ بنیادی شرط ہے کہ اس کی ذات، صفات اور اس کے حقوق میں کسی کو ساجھی نہ قرار دیا جائے۔

'ذٰلِکَ قَوۡلُهُمۡ بِاَفۡوَاهِهِمۡ' یعنی یہ ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں جو انھوں نے خود گھڑی ہیں۔ خدا نے کہیں یہ نہیں کہا ہے کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں یا مسیح خدا کے فرزند ہیں۔

اہل کتاب میں اگلوں کی عامیانہ تقلید

'یُضَاهِـُٔوۡنَ قَوۡلَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ'، 'مضاہات' کے معنی مشابہت و مشاکلت کے ہیں۔ یعنی ان سے پہلے جن لوگوں نے یہ کلمۂ کفر ایجاد کیا یہ بے سمجھے بوجھے طوطے کی طرح اس کی نقل کیے جا رہے ہیں۔ سورۂ آل عمران کی تفسیر میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ یہود اور نصاریٰ نے اپنی بدعات میں نقل تو اڑائی ہے ہم عصر مشرک قوموں کی لیکن ان پر رنگ چڑھایا ہے اپنے ہاں کے متشابہ الفاظ و کلمات کا۔ مثلاً پال نے مسیحیت کو رومیوں اور یونانیوں میں مقبول بنانے کے لیے ان کے عقائد اور مشرکانہ تصورات سے مواد اخذ کیا اور پھر لفظ کلمہ 'اب' 'ابن' وغیرہ کی مدد سے، جو انجیلوں میں خدا اور مسیح کے لیے استعمال ہوئے تھے، ایک پوری متھالوجی تیار کردی۔ لفظ 'اب' اور 'ابن' جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، عبرانی میں باپ اور رب، بیٹے اور بندے کے معنوں میں استعمال ہوتے تھے اور اپنے محل میں یہ اپنے مفہوم کو بے تکلف واضح کرتے تھے لیکن جب عبرانی زبان ایک متروک زبان بن گئی اور مسیحیوں کے ہاتھوں میں صرف انجیلوں کے ترجمے رہ گئے تو ان الفاظ کے وہی مفہوم اصلی مفہوم بن گئے جو ترجمہ کی زبان میں معتبر تھے۔ مثلاً عرب کے عیسائی 'اب' اور 'ابن' کے الفاظ ٹھیٹھ باپ اور بیٹے کے معنی میں لینے لگے اس لیے کہ عربی میں ان کے یہی مفہوم معتبر تھے۔ یہی صورتِ حال دوسرے

مقامات میں بھی پیش آئی کہ عقائد کا ماخذ اصل کتاب نہیں رہ گئی بلکہ ترجمہ کی زبان بن گئی۔ قرآن نے یہاں اسی گمراہی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے پیشرو گمراہوں نے ان کے لیے جو گورکھ دھندا کفر و ضلالت کا تیار کر دیا ہے یہ آنکھ بند کر کے اسی کی تقلید کیے جا رہے ہیں اور اصل حقیقت کی طرف توجہ دلانے والوں کی بات پر کان نہیں دھرتے۔

قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ، 'قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ' عربی میں لعنت کا کلمہ ہے۔ جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں خدا ان کو غارت کرے۔ 'اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ' تعجب اور حسرت و افسوس دونوں کا حامل ہے اور اس موقع کے لیے موزوں ہے جب کوئی شخص بالکل بدیہی حقائق کے خلاف کوئی روش اختیار کرے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ۔

اوپر فرمایا تھا 'وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ' اب یہ اس کی دلیل بیان ہو رہی ہے کہ انھوں نے اپنے فقیہوں اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے۔ 'احبار'، 'حبر' کی جمع ہے جس کا غالب استعمال یہود کے فقہا کے لیے ہوا ہے۔ 'رہبان'، 'راہب' کی جمع ہے۔ یہ نصاریٰ کے مشائخ اور صوفیوں کے لیے معروف ہے۔ ان کو رب بنانے کی حقیقت عدی بن حاتم کی ایک مشہور روایت سے واضح ہوتی ہے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یہود و نصاریٰ اپنے احبار و رہبان کو رب تو نہیں مانتے۔ حضورؐ نے فرمایا، کیا یہ بات نہیں ہے کہ جو وہ حرام کر دیں اس کو وہ حرام مان لیتے ہیں اور جس چیز کو جائز کر دیں اس کو وہ جائز مان لیتے ہیں؟ بولے یہ بات تو ہے۔ حضورؐ نے فرمایا یہی ان کو رب بنانا اور یہی ان کی عبادت کرنا ہے۔ احبار و رہبان کو رب بنانے کا مفہوم

وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ، اسی سیاق میں فرمایا کہ نصاریٰ نے مسیح ابن مریم کو رب بنا لیا لیکن ان کا علٰحدہ امتیاز پیدا کرنے کے لیے ان کا ذکر الگ کر دیا تاکہ ان تمام مزعومات کی طرف اشارہ ہو جائے جو نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ سے متعلق ایجاد کیے۔ وہ رب تو بنائے ہی گئے لیکن مزید برآں یہ ہوا کہ ان کو خدا کا بیٹا بلکہ عین خدا بنا دیا گیا۔ مسیح ابن مریم کے بارے میں مزعومات

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ یعنی یہ شرک انھوں نے اس کے باوجود اختیار کیا کہ تورات اور انجیل دونوں میں نہایت تاکید اور وضاحت کے ساتھ صرف اللہ واحد کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس سے متعلق ضروری حوالے ہم تفسیر سورہ آل عمران میں نقل کر آئے ہیں۔[1]

'سُبْحٰنَهٗ' کا لفظ تنزیہ کے لیے آتا ہے لیکن اس کے اندر توحید کی نہایت واضح منطقی دلیل بھی ہے۔ وہ یوں کہ کسی چیز کی مسلّم اور بنیادی صفات سے بالکل متناقض صفات کا اس کے ساتھ 'سُبْحٰنَهٗ' کا مفہوم

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن جلد دوم: ص ۱۱۳

جو بدلاتا بالبداہت خلافِ عقل ہے۔ اس اصول کے مطابق خدا کا کسی کو شریک ٹھہرانا اس کی شان اور اس کے منافی ہے کیونکہ اس سے اس کی مسلّمہ صفات کی نفی لازم آتی ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیل بحث اپنے مقام میں گزر چکی ہے۔

يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۳۲-۳۳)

حق کی مخالفت منہ کی باتوں سے

'يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا' اوپر آیات ۲۹-۳۰ میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اللہ نے ان کو گمراہی سے نکالنے کے لیے اپنا دین حق بھیجا ہے لیکن یہ اس کی پیروی پر آمادہ نہیں ہیں اور ان باتوں کی آڑ لے کر اس کی مخالفت کر رہے ہیں جو محض ان کے منہ کی باتیں ہیں، نہ ان کے لیے ان کے پاس خدا کی کوئی سند ہے، نہ عقل و فطرت ہی کے اندر ان کی کوئی شہادت ہے۔ اب یہ اسی حقیقت کو ایک تمثیلی رنگ میں نمایاں کیا جا رہا ہے کہ اللہ کے دین حق کی اپنی منہ زبانی باتوں کی سند پر مخالفت کرنا ایسا ہی ہے کہ کوئی سورج کو مٹی کا دیا سمجھ کر اس کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ تو یہ کوشش کر رہے ہیں لیکن اللہ نے یہ فیصلہ فرما لیا ہے کہ وہ اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا اور وہ افق سے خورشید جہاں تاب بن کر چمکے گا اور اللہ کا یہ فیصلہ ان کافروں کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم پورا ہو گا۔ یہ آیت سورہ صف میں بھی زیر بحث آئے گی وہاں ہم اس کے بعض خاص پہلو نمایاں کریں گے۔

دین حق کے غلبہ کی بشارت

'هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ' اس آیت کے مضمون کی وضاحت بقرہ آیت ۱۹۲ اور انفال آیت ۳۹ کے تحت بھی ہو چکی ہے۔ وہاں ہم نے بتایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ سرزمین حرم کفر و شرک کی ہر آلائش سے پاک ہو جائے اور دین حق کے سوا کوئی اور دین یہاں دین غالب کی حیثیت سے باقی نہ رہے تاکہ دعوت ابراہیمی کا یہ مرکز، دعائے ابراہیمی کے بموجب، تمام عالم کے لیے ہدایت اور روشنی کا سرچشمہ بن جائے۔ وہی بات یہاں فرمائی گئی کہ جس طرح یہ اہل کتاب اپنی پھونکوں سے خدا کے چراغ کو گل نہ کر سکیں گے اسی طرح مشرکین عرب کی کوششیں بھی اس دین کو مغلوب نہ کر سکیں گی بلکہ یہ ان کی تمام کوششوں کے علی الرغم اس سرزمین کے ہر دین پر غالب ہو کے رہے گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ (۳۴-۳۵)

اہل کتاب کے جرائم خلق کے باب میں

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ' اوپر اہل کتاب کے وہ جرائم بیان ہوئے ہیں جن کے مرتکب وہ خالق کے حقوق کے باب میں ہوئے، اب یہاں ان کے وہ جرائم بیان ہو رہے ہیں جن کے مرتکب وہ خلق کے باب میں ہوئے ہیں تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ کسی پہلو سے بھی اب ان کی کوئی افادیت باقی نہیں رہی ہے بلکہ ہر اعتبار سے یہ خدا کی زمین کے لیے ایک بوجھ بن چکے ہیں، اور سزاوار ہیں کہ ان کے لعنتی وجود سے خلق خدا کو نجات ملے۔ یہ خاص پہلو بھی ملحوظ رہے کہ عوام کے کردار کے بجائے یہاں علماء اور مشائخ کے کردار کو بے نقاب کیا ہے تاکہ یہ حقیقت سامنے آجائے کہ جن کے علماء اور مشائخ کا کردار اس درجہ فاسد ہو چکا ہے ان کے عوام کا کیا ذکر اور اب ان کی اصلاح کی کیا توقع! اصلاح کا یہ ذریعہ علماء و مشائخ ہی ہو سکتے تھے۔ جب وہی مال و دولت کے پجاری بن کر رہ گئے ہیں تو اصلاح کن کے ہاتھوں ہوگی۔

علمائے اہل کتاب کی زرپرستی

یہود کے ہاں قضا اور افتاء وغیرہ کے تمام مناصب ان کے علماء اور فقہا ہی کے ہاتھ میں تھے۔ اور عیسائیوں کے پادری تو لوگوں کو نجات کے پروانے تک بانٹنے کے مجاز تھے پھر اس پر مستزاد یہ کہ ان لوگوں نے صدقات و زکوٰۃ وغیرہ کی آمدنیوں کا مصرف اپنے آپ کو قرار دے لیا تھا اس وجہ سے ان کے لیے ناجائز ذرائع سے دولت سمیٹنے کے نہایت وسیع دروازے کھلے ہوئے تھے۔ سودی کاروبار بھی انھوں نے کھلے بندوں اختیار کر رکھا تھا۔ قرآن میں یہ اشارہ بھی ہے کہ غیر اسرائیلیوں کے مال کو یہ شیر مادر سمجھتے تھے۔ سیدنا مسیح نے ان لوگوں کی زرپرستی پر نہایت سخت الفاظ میں ملامت فرمائی۔ ہیکل کی انتظامیہ اور اس کے کارپردازوں کا جو حال تھا اس کو دیکھ کر حضرت مسیح نے فرمایا کہ تم نے میرے باپ (رب) کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا دیا ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ تم اوروں کو تو زیرے اور سونف پر بھی عشر کا حساب بتاتے ہو لیکن خود دوسروں کا مال ہڑپ کر جاتے ہو۔

رہزن اور بٹ مار علماء

'وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان علماء نے اپنے فرائض منصبی کے بالکل برعکس طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ علماء و مشائخ پر اللہ کی طرف سے تو یہ فریضہ عاید کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کا راستہ دکھائیں لیکن یہ اپنی ساری قابلیت لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے پر صرف کر رہے ہیں اور ہادی و مرشد بننے کے بجائے سیدنا مسیح کے الفاظ میں رہزن اور بٹ مار بن گئے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں علمائے یہود کی ان مفسدانہ کوششوں کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے جو انھوں نے لوگوں کو اسلام سے روکنے کے لیے کیں۔

انفاق کی حقیقت اور اس کی برکات

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ

اگرچہ اس ٹکڑے میں اشارہ انہی زرپرستوں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر گزرا لیکن اس کا اسلوب بیان عام تعلیم

کا ہے کہ جو لوگ بھی دولت جمع کریں گے اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کریں گے ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ اس تعلیم کا واضح مدعا یہی ہے کہ دولت جمع کرنے کے لیے نہیں بلکہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ہے۔ 'خدا کی راہ' سے مراد، جیسا کہ دوسرے مقام میں وضاحت ہو چکی ہے، وہ تمام مصارفِ خیر ہیں جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں یا بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کے تحت آتے ہیں۔ یہ بات یہاں پیشِ نظر رکھنے کی ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ جو لوگ مالک نصاب ہوتے زکوٰۃ نہیں دیں گے ان کے لیے یہ وعید ہے بلکہ یہ فرمایا کہ جو لوگ مال و دولت ذخیرہ کریں گے اور اس کو راہِ خدا میں خرچ نہیں کریں گے ان کے لیے یہ وعید ہے۔

قانونی اور اختیاری انفاق

انفاق فی سبیل اللہ ایتائے زکوٰۃ سے الگ چیز ہے۔ ہر صاحب مال سے اللہ تعالیٰ کے دو مطالبے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے، دوسرا یہ کہ وہ اپنا مال سینت کر رکھنے کی بجائے اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ پہلا مطالبہ قانونی ہے اور ایک اسلامی حکومت کو یہ اختیار ہے کہ وہ ہر شہری سے زکوٰۃ، اگر محسوس کرے، بجبر و بزور وصول کرے۔ دوسرا مطالبہ اگرچہ جبر و زور کے ذریعہ سے پورا نہیں کرایا جا سکتا بلکہ یہ صاحب مال کے اختیار پر چھوڑا گیا ہے لیکن اللہ کے ہاں آدمی کے درجہ و مرتبہ کا اصلی انحصار اسی آزادانہ اور رضاکارانہ انفاق پر ہے۔ اسی انفاق سے آدمی کے ایمان کو، جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں واضح کر آئے ہیں، ثبات و استحکام حاصل ہوتا ہے، یہی انفاق حکمت کا خزانہ بخشتا ہے، اسی سے نورِ قلب میں افزونی ہوتی ہے۔ اگر مال کے ڈھیر رکھتے ہوئے کوئی شخص اپنے پاس پڑوس کے یتیموں، بے کسوں، ناداروں سے بے پروا رہے یا دعوتِ دین، اقامتِ دین، تعلیمِ دین اور جہاد فی سبیل اللہ کے دوسرے کاموں سے بے تعلق ہو جائے تو وہ عند اللہ مواخذہ اور مسئولیت سے بری نہیں ہو سکتا اگرچہ اس نے اپنے مال کا قانونی مطالبہ پورا کر دیا ہو۔ آگے اسی سورہ میں ان منافقین کا بیان آئے گا جو مال رکھتے ہوئے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کو تاوان سمجھتے تھے۔ قرآن نے ان کی اس زر پرستی کو ان کے نفاق کی دلیل قرار دیا ہے اور نہایت ہی سخت الفاظ میں ان کو وعید سنائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وعید ان کو زکوٰۃ نہ ادا کرنے پر نہیں سنائی گئی ہے۔ زکوٰۃ تو وہ طوعاً و کرہاً بہر حال ادا کرتے ہی تھے۔ نہ ادا کرتے تو تلوار کے زور سے ادا کرتے۔ ان کا اصلی جرم یہی تھا کہ وہ مال دار ہونے کے باوجود جہاد کے لیے انفاق سے جی چراتے تھے اور جہاد کے لیے انفاق سے جی چرانا علاماتِ نفاق میں سے ہے بلکہ بعض حالات میں تو یہ نہایت غلیظ قسم کا نفاق بن جاتا ہے جس کے ساتھ ایمان جمع ہو ہی نہیں سکتا۔

صحابہ کرامؓ کی دولت مندی کی نوعیت

بعض لوگ بعض صحابہؓ کی دولت مندی کو مثال میں پیش کر کے اس سے استدلال کرتے ہیں کہ ادائیگی زکوٰۃ کے ساتھ دولت جمع کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ صحابہؓ میں جو لوگ دولت مند تھے ان کی دولت مندی کاروباری اور تجارتی نوعیت کی تھی۔ جائز کاروبار

اور تجارت میں سرمایہ لگانا اور اس کو بڑھانا کنز نہیں بلکہ اکتساب دولت ہے اور اسلام میں کوئی مذموم فعل نہیں بلکہ ایک محمود فعل ہے۔ اگر ایک شخص ایک جائز کاروبار میں سرمایہ لگائے، حلال راستوں سے روپیہ کمائے، اسراف اور بخل دونوں سے پرہیز کرتا ہوا اپنی ضروریات پر خرچ کرے، اپنے مال کی زکوٰۃ نکالے اور اپنی فاضل دولت سرًا اور علانیۃً اللہ کی راہ میں اپنی مرضی سے خرچ کرے تو وہ اسلامی معاشرہ کا ایک سچا خدمت گزار اور آخرت میں اللہ کا مقبول بندہ ہے۔ صحابہ میں سیدنا عثمان غنیؓ ایسے ہی دولت مند تھے اور دوسرے اصحاب کی دولت مندی بھی اسی نوعیت کی تھی۔ عثمان غنیؓ کی دولت سے مسلمانوں کو جو فائدے پہنچے اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟ پھر یہ بات کس طرح باور کی جا سکتی ہے کہ یہ غنیؓ دریا دل اپنی زندگی کے آخری دور میں اپنی انفاق کی عادت مستمرہ کے خلاف دولت جمع کرنے کی فکر میں لگ گیا ہوگا۔

زکوٰۃ اور انفاق میں فرق

لیکن یہ خوب یاد رکھیے کہ یہ انفاق زکوٰۃ کی طرح کوئی قانونی اور جبری چیز نہیں بلکہ اختیاری چیز ہے۔ اور اس کے اس اختیاری ہونے ہی میں اس کی ساری برکتیں ہیں۔ ایک اسلامی معاشرہ میں یہ چیز ہر صاحبِ مال سے مطلوب ہے لیکن بالجبر نہیں بلکہ بالرضا۔ یہ حکومت کے فرائض میں ہے کہ وہ معاشرہ کے اندر لوگوں کے اندر دولت کی ذخیرہ اندوزی کی بیماری نہ پھیلنے دے بلکہ برابر اپنے تمام ترغیبی و تعلیمی ذرائع سے لوگوں کے جذبۂ انفاق کو ابھارتی اور اکساتی رہے۔ اس کا سب سے زیادہ کارگر اور موثر طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ اولوالامر کے درجہ پر فائز ہوں وہ خود معیارِ زندگی متوسطانہ رکھیں اور دوسروں کو بھی اسی کی تعلیم دیں بلکہ ان رجحانات کی شدت سے حوصلہ شکنی کریں جو لوگوں کو معیارِ زندگی اونچا کرنے کے تنافس میں مبتلا کرنے والے ہوں۔

جمع مال کا انجام

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ الاٰية یعنی راہ خدا سے بچا اور چرا کر جو دولت جمع کی جاتی ہے وہ قیامت کے دن پیشانی کا داغ اور پہلو اور پیٹھ کا زخم بنے گی۔ دولت جمع کرنے کی سرگردانی میں بڑا دخل دو چیزوں کو ہوتا ہے۔ ایک ہم چشموں میں اپنا سر اونچا رکھنے کی خواہش دوسری اپنے ذاتی آرام و راحت کی طلب۔ فرمایا کہ جو لوگ دنیا میں سربلندی اور فخر کی خاطر دولت جمع کریں گے ان کی دولت بروزِ قیامت ان کی پیشانی پر داغ لگائے گی۔ اسی طرح جو لوگ نرم پشمین و مخملیں گدوں، غالیچوں، قالینوں اور صوفوں کے درپے ہو کر انفاق کی سعادت سے محروم رہیں گے ان کی یہ بچائی ہوئی دولت ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو زخمی کرے گی۔

۱۳۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۶-۳۷

اوپر کی آیات میں مشرکین اور اہلِ کتاب دونوں گروہوں سے جنگ کا حکم دینے کے بعد آگے کی

دو آیتوں میں چاروں محترم مہینوں کا احترام باقی رکھنے کی تاکید کردی۔ یہ اسی ہدایت کی تاکید مزید ہے جو آیت ۵ میں گزر چکی ہے کہ جب محترم مہینے گزر جائیں تب ان سے جنگ شروع کرو۔ اس احترام کی تاکید کے ساتھ ان مہینوں کے باب میں نسئی کی اس بدعت کی اصلاح بھی فرما دی جو مشرکین عرب نے اہل کتاب سے اخذ کی تھی۔ پیچھے ہم ذکر کر آئے ہیں کہ عربوں نے اپنے تجارتی مقاصد کے پیش نظر رکھ کر کبیسہ کے قاعدے پر ایک ایسی جنتری بنالی تھی کہ اشہر حرم برابر ایک ہی موسم میں پڑتے تھے۔ اس بدعت نے قمری مہینوں کو ان کی اصل جگہ سے ہٹا دیا تھا۔ چونکہ قمری مہینے ہی اصل خدائی مہینے ہیں اور سیدنا ابراہیم کے وقت سے یہی مہینے حج و عمرہ کی ادائیگی کے لیے قرار پائے تھے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اب جب کہ ملت ابراہیم کی تجدید کا کام اپنے آخری مرحلہ میں داخل ہو رہا ہے۔ مشرکین کی اس بدعت کی بھی اصلاح کردی جائے تاکہ اشہر حرم اور مناسک حج سب اپنی اصلی جگہ پر آجائیں۔ چنانچہ حجۃ الوداع ٹھیک اس تاریخ کو ہوا جو قمری حساب سے اس کی اصلی تاریخ تھی ــــــ اس روشنی میں آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۶-۳۷

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٦﴾ إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٧﴾ ع ۱۱

ترجمۂ آیات ۳۶-۳۷

بے شک مہینوں کی تعداد، اللہ کے ہاں، نوشتۂ الٰہی میں، جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، بارہ مہینے ہیں جن میں چار حرمت والے ہیں یہی دین قیم

ہے تو تم ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ ڈھانا - اور مشرکوں سے جنگ کرو من حیث الجماعت، جس طرح وہ تم سے جنگ کرتے ہیں من حیث الجماعت - اور جان رکھو کہ اللہ خدا ترسوں کے ساتھ ہے۔ یہ نسئی کفر میں ایک اضافہ ہے جو کافروں کی گمراہی کا ایک ذریعہ بنائی گئی۔ کسی سال اس کو حلال ٹھہرا دیتے ہیں کسی سال حرام کہ خدا کے حرام کیے ہوئے کی گنتی پوری کرکے اس کے حرام کیے ہوئے کو جائز بنا لیں - ان کی نگاہوں میں ان کے برے اعمال کھبا دیے گئے ہیں اور اللہ کافروں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۳۶-۳۷

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڏ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۗفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۳۶)

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۔ خدائی تقویم

یہ بطور تمہید قمری مہینوں کی عظمت و اہمیت واضح کی گئی ہے کہ یہی مہینے کائناتی، آفاقی اور خدائی مہینے ہیں اس لیے کہ ان کے تعین کے لیے قدرت نے خود، کائنات کے نظام میں ایک نہایت محکم انتظام کر دیا ہے جو پوری باقاعدگی سے سال اور مہینوں کا حساب ایک عامی سے عامی آدمی کے لیے بھی واضح کرتا رہتا ہے وَالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۔ وہ یونس ۵ اور چاند کو روشنی بنایا اور اس کے لیے منزلیں ٹھہرائیں تاکہ تم سالوں کی تعداد اور حساب کا تعین کر سکو) یہی خدائی تقویم ہے جو نوشتۂ الٰہی میں موجود اور اس دن سے جاری و نافذ ہے جس دن خالق کائنات نے اس آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کی کوئی کائناتی شہادت ان تقویموں میں سے کسی بھی تقویم کے حق میں موجود نہیں ہے۔ جو انسانوں نے بنائی ہیں۔ یہ خدائی کیلنڈر ہر مہینے میں افق پر نمایاں ہو کر، اپنے ہر بتدریج بدلنے والے نمایاں اور چمکدار نشانوں کے ذریعہ سے دنوں، مہینوں اور سالوں کا حساب بتاتا رہتا ہے۔ اور کبھی اس میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ یعنی اس خدائی کتاب میں، جس میں

اس کائنات سے متعلق تمام احکام و قوانین مندرج ہوئے، یہ حکم بھی مندرج ہوا کہ اس میں قمری مہینوں کے حساب سے ۱۲ مہینوں کا سال ہوگا جن میں سے چار مہینے حرمت والے قرار پائیں گے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان بارہ مہینوں میں کوئی کمی یا بیشی کرنا یا ان کو آگے یا پیچھے ہٹانا اس خدائی کیلنڈر میں خلل پیدا کرنا ہے جو کائنات کے خالق کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔

اصل دینی جنتری

'ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ' یعنی یہی صحیح، فطری اور کائناتی دینی تقویم ہے۔ جس طرح اسلام دین قیم ہے اس لیے کہ اس کی شہادت آفاق و انفس میں موجود ہے اسی طرح یہ قمری جنتری اصل دینی جنتری ہے اس لیے کہ اس کی شہادت آفاق میں موجود ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جس طرح ہماری کھیتی باڑی میں فصلوں اور موسموں کا اعتبار ہے اسی طرح دینی امور میں بھی اوقات، ایام اور سالوں کا اعتبار ہے۔ جس طرح بے وقت اور بے موسم کی زراعت لاحاصل اور بے برکت ہو کے رہ جاتی ہے اسی طرح بے وقت کی نماز، بے وقت کا روزہ اور بے وقت کا حج بھی لاحاصل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ اس جنتری کو بھی شرعی اور دینی حیثیت حاصل ہو جس کے تحت دین کی عبادات اور اس کے احکام و مناسک منضبط ہوتے ہیں۔ اسی پہلو سے اس تقویم کو دین قیم کہا ہے اس لیے کہ یہ بھی دین ہی کا ایک حصہ اور نہایت ہی اہم حصہ ہے۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل کرنا دین میں تحریف کے ہم معنی ہے۔[1]

محترم مہینوں کا احترام

'فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ' یعنی نہ تو ان مہینوں میں ان کی حرمت کے خلاف کوئی کام کرو، نہ ان میں کسی قسم کا ردو بدل کرو۔ اگر تم نے خود پہل کر کے ان میں کوئی جنگ چھیڑی تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے بلکہ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھاؤ گے اس لیے کہ خدا نے ان مہینوں کو جو محترم ٹھہرایا ہے تو تمہارے ہی مفاد کے لیے ٹھہرایا ہے، اسی طرح اگر تم ان میں کوئی ردو بدل کرو گے تو یہ بھی تم اپنے ہی کو نقصان پہنچاؤ گے اس لیے کہ ان کے اندر خدا نے جو برکتیں رکھی ہیں تم ان سے محروم ہو جاؤ گے۔

مشرکین سے من حیث الجماعت جنگ کا حکم

'وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ' مطلب یہ ہے کہ ان مہینوں کے حدود حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے تم ان مشرکین سے جنگ کرو اور یہ جنگ ان مشرکین سے من حیث الجماعت ہو۔ اس بنیاد پر ان کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہ کیا جائے کہ ان میں سے کسی کے ساتھ رشتہ و قرابت یا دوستی کا کوئی تعلق ہے یا خاندان اور قبیلہ کی بنا پر کسی قبیلہ سے ہمدردی ہے یا ان کے کسی گروہ سے کوئی سیاسی یا تجارتی یا معاشی مفاد وابستہ ہے۔ اس قسم کے

---

[1] یہ سوال ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے کہ مسلمان قمری تقویم کے سوا کوئی اور تقویم استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں۔ ہماری گزارش کا منشا صرف یہ ہے کہ دینی امور میں صرف یہی تقویم معتبر ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل جائز نہیں۔

تمام تعلقات و مفادات بالائے طاق رکھ کے تمام مشرکین کے خلاف بلا استثنا اعلان جنگ کرو اس لیے کہ خود ان کا رویہ تمہارے ساتھ عملاً یہی ہے۔ وہ تمہارے دشمن من حیث الجماعت ہیں۔ لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّۃً (وہ کسی مسلمان کے باب میں نہ کسی قرابت کا پاس رکھنے کے لیے تیار ہیں، نہ کسی عہد کا) اسی طرح تم ان کے دشمن من حیث الجماعت ہو اور جس کو پاؤ اس کو قتل کرو۔ البتہ محترم مہینوں کا لحاظ رکھو، ان میں کوئی جنگ پہل کر کے نہ چھیڑو، البتہ دفاعی جنگ، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں تفصیل گزر چکی ہے، ان میں بھی جائز ہے۔ یہ بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ اپنے انہی بندوں کے ساتھ ہے جو اس کے حدود و قیود کا پاس و لحاظ رکھنے والے ہیں۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ عربوں میں خاندانوں اور خاندانوں کے مابین بھی لبسا اوقات حلف اور ولا کی بنیاد پر بڑے گہرے تعلقات ہوتے تھے جن کی ذمہ داریوں کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ یہاں اس عام اعلان برأت کے بعد جو اوپر مذکور ہوا مسلمانوں کو ہدایت ہوئی کہ مشرکین کے خلاف جہادِ عام میں اس قسم کی کسی پابندی کو حائل نہ ہونے دیں بلکہ تمام مشرکین کو بلا استثنا اعلان جنگ دے دیں۔

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُحِلُّوْنَہٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُوْنَہٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّۃَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰہُ ؕ زُیِّنَ لَہُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِہِمْ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ (۳۷)

نسی کی نوعیت

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔ 'نسأ' کے معنی مؤخر کرنے اور پیچھے ہٹانے کے ہیں۔ اسی سے 'نسأ البعیر دفعہ عن الحوض' ہے جس کے معنی ہیں اونٹ کو پانی کے گھاٹ پہنچنے سے روک دیا۔ 'نسأ الراعی فی ظمء الابل' چرواہے نے اونٹوں کے پانی پلانے کو چند دن پیچھے ہٹا دیا۔ اسی سے 'نسئ' کا اسم بنا لیا گیا ہے جس سے عرب جاہلیت کی اصطلاح میں وہ مہینہ مراد ہوتا ہے جس کو چند دن پیچھے ہٹا کر اس کے دنوں میں اضافہ کر دیتے تھے۔ شمسی سال قمری سال سے تقریباً گیارہ دن زیادہ ہوتا ہے۔ قمری سال کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اہل عرب یہ کرتے کہ اس میں کمی کے بقدر اضافہ کر دیتے تھے جس کی عملی شکل یہ تھی کہ ہر آٹھ سالوں میں تین ماہ بڑھائے جاتے گویا ہر دوسرے یا تیسرے سال کے خاتمہ پر ایک ماہ کبیسہ کا ہوتا۔ اس طرح اپنے زعم کے مطابق انھوں نے قمری مہینوں بالخصوص اشہر حرم کا احترام بھی قائم رکھا تھا اور اپنے تجارتی فوائد و مصالح کے نقطۂ نظر سے اس کو شمسی بھی بنا لیا تھا۔ اہل عرب نے تو یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس تخیل کے تحت کیا کہ اس طرح اشہر حرم کی تعداد بھی پوری ہو جاتی ہے جو دینداری کا مقتضی ہے اور ان کا کاروباری مفاد بھی محفوظ ہو جاتا ہے لیکن قرآن نے ان کی اس دینداری کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کو ان کے کفر میں ایک اضافہ قرار دیا جو راہ راست اور دین قیم ملت ابراہیم سے ان کے مزید انحراف کا موجب ہوا۔

'یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ' نسی کے
یہ دلیل ارشاد ہوئی کہ کیوں یہ چیز کفر میں ایک اضافہ ہے۔ فرمایا کہ اس وجہ سے کہ اس طرح خدا کے محترم کیے ہوئے مہینوں کی گنتی تو منہ در پوری ہو جاتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اللہ کے محترم قرار دیے ہوئے مہینے شمسی سال کے اس چکر میں آ کر کبھی محترم بن جاتے ہیں کبھی غیر محترم۔ حالانکہ اللہ نے جن مہینوں کو محترم قرار دیا محترم وہی ہیں، نہ یہ کسی دوسرے مہینے سے تبدیل ہو سکتے نہ ان کا احترام کسی دوسرے مہینے کی طرف منتقل ہو سکتا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس طرح قمری سال کو شمسی سال میں تبدیل کرنے کی جو کارروائی عمل میں آتی اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ موسم حج اور اشہر حرم سب ۳۳ سال کے لیے اپنی جگہ سے ہٹ جاتے۔ ۳۳ سال کی گردش کے بعد پھر یہ اپنی جگہ پر ایک مرتبہ کے لیے واپس آتے۔ تقدیر الٰہی نے یہ انتظام کیا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر، جب سرورِ عالم نے حج ادا فرمایا، اپنی گردش پوری کر کے حج ٹھیک اس تاریخ کو پڑا جو اس کی اصل خدائی اور ابراہیمی تاریخ تھی۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا کہ ان الزمان استدار کھیئتہ یوم خلق السمٰوت والارض (زمانہ گردش کر کے اپنی اصلی ہیئت پر آ گیا ہے جو ہیئت اس کی اس دن قرار پائی تھی جس دن اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا) اسی دن سے آپ نے اس خدائی تقویم کے نفاذ کا اعلان فرما دیا اور نسی کی تقویم ختم کر دی۔ حضورؐ کے الفاظ میں صاف اس آیت کی جھلک ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ۔

'زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ' یعنی یہ کفر و اسلام دونوں کا جوڑ ملا کر اشہر حرم کی گنتی پوری کرنے کی جو نمائش کی گئی یہ دین داری نہیں ان کی بدعملی ہے جو ان کی نگاہوں میں کھبا دی گئی ہے جس کو یہ دین سمجھ بیٹھے ہیں۔ اللہ ایسے کافروں کو بامراد نہیں کرے گا۔ اس طرح کی دینداری قیامت میں اکارت ہو کے رہ جائے گی۔

۶۔ آگے کا مضمون ـــــــ آیات ۳۸-۴۲

اوپر مشرکین اور اہل کتاب کے خلاف اعلانِ جہاد کر دینے کے بعد آگے کلام کا رخ منافقین کی طرف مڑ گیا ہے اور آخر سورہ تک انہی کا تعاقب فرمایا ہے۔ گویا کھلے ہوئے دشمنوں کے بعد اب یہ اسلام اور مسلمانوں کے چھپے ہوئے دشمنوں کی طرف توجہ فرمائی گئی ہے اور پوری تفصیل سے ان کی ایک ایک کمزوری اور ایک ایک شرارت بے نقاب کر کے رکھ دی گئی ہے تاکہ مسلمان ان سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں اور ان کے اٹھائے ہوئے فتنوں میں مبتلا نہ ہوں۔ اس سے پہلے منافقین کے رویہ پر جو تنقید بھی ہوئی اس کا لب و لہجہ نرم رہا ہے لیکن اس سورہ میں جس طرح مشرکین اور اہل کتاب کے

باب میں آخری فیصلہ کا اعلان کر دیا گیا ہے اسی طرح منافقین کے بارے میں بھی ایک قطعی فیصلہ
سنا دیا گیا ہے تاکہ ان میں سے جن کے اندر توبہ اور اصلاح کی کوئی صلاحیت باقی ہے وہ توبہ اور
اصلاح کر کے اسلامی معاشرہ کے صالح جزو بن جائیں اور جو بالکل مردہ ہو چکے ہیں وہ خس و خاشاک
کے اس ڈھیر میں شامل ہو جائیں جس کے صاف کر دینے کا آخری فیصلہ قدرت کی طرف سے ہو چکا ہے
——— آیات کی تلاوت فرمائیے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ ٱنفِرُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ آیات ۳۸-۴۲
ٱثَّاقَلْتُمْ إِلَى ٱلْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُم بِٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا مِنَ ٱلْءَاخِرَةِ ۚ
فَمَا مَتَٰعُ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فِى ٱلْءَاخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٣٨﴾ إِلَّا
تَنفِرُوا۟ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۙ وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا
تَضُرُّوهُ شَيْـًٔا ۗ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ إِلَّا تَنصُرُوهُ
فَقَدْ نَصَرَهُ ٱللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ثَانِىَ ٱثْنَيْنِ إِذْ هُمَا
فِى ٱلْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَٰحِبِهِۦ لَا تَحْزَنْ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنزَلَ
ٱللَّهُ سَكِينَتَهُۥ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُۥ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ
ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ٱلسُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ ٱللَّهِ هِىَ ٱلْعُلْيَا ۗ وَٱللَّهُ عَزِيزٌ
حَكِيمٌ ﴿٤٠﴾ ٱنفِرُوا۟ خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَٰهِدُوا۟ بِأَمْوَٰلِكُمْ وَ
أَنفُسِكُمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾
لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا لَّٱتَّبَعُوكَ وَلَٰكِنۢ بَعُدَتْ
عَلَيْهِمُ ٱلشُّقَّةُ ۚ وَسَيَحْلِفُونَ بِٱللَّهِ لَوِ ٱسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ع ۵ ۶ ۱۲
يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَٰذِبُونَ ﴿٤٢﴾

ترجمۂ آیات ۳۸-۴۲

اے ایمان والو، تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو تم زمین پر ڈھئے پڑتے ہو۔ کیا تم آخرت کے مقابل میں دنیا کی زندگی پر قانع ہو بیٹھے ہو؟ آخرت کے مقابلے میں یہ دنیا کی زندگی تو نہایت ہی حقیر ہے۔ اگر تم نہ اٹھو گے تو خدا تمھیں دردناک عذاب دے گا اور تمھاری جگہ دوسری قوم لائے گا اور تم اس کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکو گے اور اللہ ہر بات پر قادر ہے۔ اگر تم اس کی مدد نہ کرو گے تو کچھ پروا نہیں۔ اس کی مدد تو اللہ نے اس وقت فرمائی جب کہ کافروں نے اس کو اس حال میں نکالا کہ وہ صرف دو کا دوسرا تھا جب کہ وہ دونوں غار میں تھے، جب کہ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ تم غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور اس کی مدد ایسی فوجوں کے ذریعے سے کی جو تمھیں نظر نہیں آئیں۔ اور اس نے کافروں کی بات پست کی اور اللہ ہی کا کلمہ بلند رہا۔ اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۳۸-۴۰

اٹھو، معمولی سامان کے ساتھ بھی اور بھاری سامان کے ساتھ بھی، اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اگر نقد ترہوتا اور سفر آسان تو یہ تمھارے پیچھے ضرور لگ جاتے لیکن ان پر یہ منزل کٹھن ہو گئی اور اب یہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم نکل سکتے تو تمھارے ساتھ ضرور نکلتے یہ خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۴۱-۴۲

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (۳۸)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ

'نفار' 'نفور' 'نفیر' کے معنی جنگ یا اسی نوع کے کسی اور مقصد کے لیے نکلنے اور اٹھنے کے ہیں۔

'تثاقل' اور 'اثاقل' ایک ہی لفظ ہے۔ معنی اس کے کسی شے کو بوجھ محسوس کرنا اور لدھڑ بن جانا ہے۔ اس کے ساتھ 'الی الارض' کے اضافہ نے مضمون کو بالکل مصور کر دیا ہے کہ تمہیں جنگ کے واسطے اُٹھنے کو کہا جاتا ہے اور تم لدھڑ بن کر زمین پر ڈھیر پڑ رہے ہو۔

منافقین سے خطاب — آیت میں خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن ان منافقین ہی کی طرف ہے جو اپنی تن آسانیوں اور مفاد پرستیوں کے سبب سے، جہاد کی منادیٔ عام کے باوجود اس سے جی چرا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایمان کے مدعی ہو اور اس کے لیے بدیہی مطالبہ کے معاملے میں تمہارا حال یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بھاری بوجھ نے تمہاری کمریں توڑ کے رکھ دی ہیں اور تمہارے لیے اٹھنا پہاڑ ہو رہا ہے۔

منافقین کی اصل بیماری محبتِ دنیا — اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ' یہ استفہام کے اسلوب میں ان کی اصل بیماری کا پتہ دیا گیا ہے کہ یہ آخرت سے صرف نظر کر کے صرف دنیا کی زندگی اور اس کی لذتوں اور راحتوں پر قانع ہو گئے ہیں۔ یہی دنیا ان کے لیے سب کچھ ہے۔ وہ اس عیشِ نقد کو کسی نسیہ کی خاطر منغص کرنا نہیں چاہتے حالانکہ آخرت میں جب حقیقت کھلے گی تب معلوم ہو گا کیسی حقیر چیز کے لیے کیسی لازوال بادشاہی انھوں نے کھو دی۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

منافقین کو دھمکی — یہ ان منافقین کو دھمکی ہے کہ اگر تم خدا کی راہ میں جہاد کے لیے نہ اٹھے تو خدا کے دردناک عذاب کی پکڑ میں آ جاؤ گے اور یہ نہ خیال کرو کہ اس نہ اٹھنے سے خدا کا کوئی کام بگڑ جائے گا۔ تمہارا اُٹھنا خود تمہارے لیے موجبِ سعادت دنیا و آخرت ہے۔ ورنہ خدا کا کوئی کام تمہارے اوپر منحصر نہیں ہے۔ وہ اپنے دین کی حمایت و نصرت کے لیے اپنے دوسرے بندے اٹھا کھڑا کرے گا جو تمہاری طرح تن آسان، پست ہمت اور مفاد پرست نہیں ہوں گے۔ سورۂ محمد میں یہی مضمون اس

طرح بیان ہوا ہے وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۳۸)

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ بیک وقت کئی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ایک یہ کہ خدا تمھیں عذاب دینے پر قادر ہے، دوسری یہ کہ تمھاری جگہ دوسروں کو اٹھا کھڑا کرنے پر قادر ہے، تیسری یہ کہ وہ اپنی ہر اسکیم بروئے کار لانے پر قادر ہے، اپنے کسی بھی ارادے کی تکمیل میں وہ کسی کا محتاج نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بے نیازی

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلَیْهِ وَاَیَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (۴۰)

پیغمبر کے ساتھ خدا کی مدد

'تَنْصُرُوْهُ' میں ضمیر مفعول، آگے کے قرائن دلیل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹتی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نمایندے کی حیثیت سے آپؐ نے لوگوں کو اس جہاد کی دعوت دی تھی۔ اوپر والی آیت میں منافقین سے جس بے نیازی کا اظہار فرمایا ہے اسی بے نیازی کی یہ دلائل کی روشنی میں مزید وضاحت ہے۔ فرمایا کہ پیغمبر جس اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اٹھے ہیں اگر اس کام میں تم نے ان کا ساتھ نہ دیا تو یہ نہ سمجھو کہ یہ کام رک جائے گا۔ جس خدا نے ہجرت سے لے کر اب تک ہر قدم پر اس کی مدد فرمائی ہے وہ اب بھی اس کی مدد کو موجود ہے۔ یاد کرو کہ ایک دن وہ تھا جب کفار نے اس حال میں اس کو گھر سے نکالا کہ وہ صرف دو کا دوسرا تھا، کوئی تیسرا اس کے ساتھ نہ تھا (یہ اشارہ ہے سفر ہجرت کی طرف جس میں صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ آپؐ کے ساتھ تھے اور سارا قریش آپؐ کے خون کا پیاسا تھا لیکن آپؐ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل آئے اور کوئی آپؐ کا بال بیکا نہ کر سکا) پھر یاد کرو اس وقت کو جب نبیؐ اور صدیقؓ دونوں غار ثور میں پناہ گیر تھے اور دشمن تعاقب میں نقش قدم کی ٹوہ لگاتے ہوئے غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ نبیؐ کے واحد ساتھی کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اب ہم دشمن کے نرغے میں ہیں اور خدانخواستہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے لیے آخری خطرہ سامنے آگیا ہے لیکن پیغمبرؐ نے اپنے ساتھی کو تسلی دی کہ تم ذرا غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے، وہ ہماری حفاظت فرمائے گا چنانچہ اللہ نے اس پر اپنی جانب سے سکینت و طمانیت نازل فرمائی۔ پھر یاد کرو کہ کتنی جنگیں ان کفار کے ساتھ ہو چکی ہیں جن میں خدا کی غیر مرئی فوجیں پیغمبرؐ کی مدد و نصرت کے لیے اس کے ہم رکاب رہی ہیں یہاں تک کہ کفر سرنگوں اور دین کا بول بالا ہو گیا۔ غور کرو کہ کیا یہ پیغمبرؐ جس کی نصرت کے لیے خدا کی یہ شانیں ظاہر ہوئی ہیں وہ تم جیسے لوگوں کی مدد کا محتاج ہو سکتا ہے! اس کا خدا عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔ وہ جس کام کو کرنا چاہے کسی کی طاقت نہیں کہ کوئی اس میں مزاحم ہو سکے اور اس کے ہر کام میں ایسی حکمت ہوتی ہے کہ کوئی اس حکمت کو پا نہیں سکتا۔

جہاد میں سروسامان کی کمی کوئی عذر نہیں ہے

انْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۴۱)

'خفاف'، 'خفیف' کی اور 'ثقال'، 'ثقیل' کی جمع ہے۔ یہاں 'خفیف' کا لفظ اس شخص کے لیے استعمال ہوا ہے جس کے پاس عسرت کے سبب سے زیادہ سروسامان جنگ اور زادِ سفر نہ ہو۔

'ثقیل'، جس کا حال اس کے برعکس ہو یعنی وہ سروسامان سے بھرپور اور اسلحہ سے لیس ہو۔

مطلب یہ ہے کہ سروسامان کی کمی کو، جیسا کہ آگے آرہا ہے، جہاد سے غیر حاضری کے لیے عذر اور بہانہ نہ بناؤ۔ جو سروسامان بھی میسر آسکے (کم یا زیادہ)، اس کو فراہم کر کے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہو، یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ اس کی سعادتوں اور برکتوں کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے اور بصورتِ محرومی اس کے خسران کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۴۲)

غزوۂ تبوک میں منافقین کی کمزوری

'شُقَّةٌ'، اس مسافت کو کہتے ہیں جو ایک مسافر طے کرتا ہے۔ 'بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں کہ ان آیات میں منافقین کی ان کمزوریوں پر ان کو تنبیہ کی جا رہی ہے جو غزوۂ تبوک کے موقع پر ظاہر ہوئیں اس لیے کہ یہی غزوہ ہے جس میں موسم کی ناسازگاری کے ساتھ طولِ مسافت کی آزمائش سے بھی مجاہدین کو سابقہ پیش آیا۔ یہ غزوہ رجب ۹ھ میں پیش آیا۔ موسم گرم تھا۔ فصل پک کر تیار تھی۔ مسافت طویل تھی پھر مقابلہ بھی ایک منظم اور کثیر التعداد فوج سے تھا اس وجہ سے منافقین کی کمزوری اس موقع پر بالکل ہی بے نقاب ہو گئی۔ انھوں نے بے سروسامانی کا عذر اور دوسرے جھوٹے بہانے تراش کر اس جنگ کے لیے نکلنے سے گریز کیا۔ اگرچہ ان لوگوں کی بہانہ بازی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی نہیں تھی لیکن آپ نے اپنی کریم النفسی کے سبب سے ان سے اغماض فرمایا۔ آپ نے تو اغماض فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں سے نقاب الٹ دی تاکہ جو اپنی اصلاح کرنا چاہیں وہ اصلاح کر لیں ورنہ کم از کم مسلمان ان کی جمعیت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ فرمایا کہ اگر ان کو توقع ہوتی کہ صعوبتِ سفر اور کسی خطرے کے بغیر مالِ غنیمت ہاتھ آجائے گا تو تمہارے ساتھ ہو لیتے لیکن سامنے کٹھن منزل تھی اس وجہ سے ان کی ہمتیں پست ہو گئیں لیکن یہ اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے کے بجائے ایک ایک کر قسمیں کھا کھا کے اطمینان دلانے کی کوشش کریں گے کہ اس جہاد میں ان کی عدم شرکت کا باعث بزدلی نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ اس کے لیے سامان نہیں کر پائے۔ اگر سامان کر پاتے تو پیچھے رہنے والے نہیں تھے۔ فرمایا کہ 'يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ' ان جھوٹے عذرات سے وہ اپنے آپ کو اپنی دانست میں بچانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن

حقیقت میں وہ اپنے کو بچا نہیں رہے ہیں بلکہ ہلاکت کے گڑھے میں جھونک رہے ہیں۔ اس لیے کہ نفیر عام کی صورت میں جہاد سے فرار کی سزا بڑی ہی سخت ہے۔ بقرہ آیت ۱۹۵ کے تحت ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ خدا کے فرائض سے فرار درحقیقت ہلاکت کی طرف فرار ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۴۲-۶۰

آگے کی آیات میں پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت دلنواز انداز میں آپ کی اس نرمی پر ٹوکا ہے جو آپ بربنائے کریم النفسی منافقین کے تراشیدہ عذرات قبول کر لینے میں ظاہر فرماتے تھے۔ پھر آپ کے سامنے منافق اور مخلص کے درمیان امتیاز کے لیے ایک کسوٹی رکھ دی گئی ہے کہ سچے اور پکے مسلمان کبھی تمہارے سامنے جہاد سے معذرت پیش کرنے کے لیے نہیں آئیں گے۔ معذرت پیش کرنے کے لیے وہی آتے ہیں جن کے دلوں میں نفاق کا چور چھپا ہوا ہوتا ہے اور ان کے اس نفاق کے سبب سے اللہ نے ان کے لیے یہی چاہا ہے کہ وہ اس سعادت سے محروم ہی رہیں۔

پھر مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ اگر یہ منافقین جہاد کے لیے نہیں نکلے تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہی ہوا اس لیے کہ اگر یہ نکلتے تو مسلمانوں کے اندر اسی طرح کی فتنہ انگیزیاں کرتے جس کے تجربے پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ یہ بظاہر ہیں تو تمہارے ساتھ لیکن یہ ایجنٹ دوسروں کے ہیں۔

اس کے بعد بعض ایسے منافقین کی طرف اشارہ فرمایا ہے جنھوں نے عذر تراشنے میں کچھ دینداری کی بھی نمائش کی تھی کہ گویا وہ اپنے دین و اخلاق کو فتنہ سے محفوظ رکھنے کے لیے اس جنگ میں نہیں جا رہے ہیں۔ ان کی اس جھوٹی دینداری پر برسرِ موقع گرفت فرمائی اور اچھی طرح ان کی قلعی کھول کر دکھا دیا کہ ان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کیا بغض بھرا ہوا ہے۔

پھر منافقین کو دھمکی دی کہ تمہارا کوئی انفاق بھی خدا کے ہاں مقبول نہیں اس لیے کہ تم ایمان سے عاری ہو۔ تمہارا انفاق مجبورانہ اور تمہاری نماز ریاکارانہ ہے۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ ان لوگوں کو ذرا وقعت نہ دو۔ ان لوگوں کا مال دین کے کام آنے والا نہیں۔ یہ ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں موجب وبال بننے والا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر یہ تمہارے ساتھ بندھے ہوئے ہیں تو اس کا سبب یا تو ڈر ہے یا طمع۔ چونکہ ان کے سامنے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہی ہے اس وجہ سے یہ تمہارے اندر گھسے ہوئے ہیں۔ ان کی طمع کا حال اس سے ظاہر ہے کہ تم پر الزام لگاتے ہیں کہ تم صدقات کی مد سے ان کو بھرپور نہیں دیتے۔ اس کے ساتھ ہی صدقات کے مصارف کی وضاحت فرما دی تاکہ کوئی شخص صدقات کی حرص میں ناخواندہ مہمان بننے کی کوشش نہ کرے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ
صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ آیات ۴۳-۶۰
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ
اَنْفُسِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ
فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ
عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا
مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا
وَّلَاْاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ
لَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ
وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ
كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۚ اَلَا فِي
الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۚ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ اِنْ
تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَا
اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ
لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ
بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۚ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ
اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ

مُتَرَبِّصُونَ ﴿٥٢﴾ قُلْ أَنفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَّن يُتَقَبَّلَ مِنكُمْ ۖ إِنَّكُمْ
كُنتُمْ قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴿٥٣﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ
إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ
كُسَالَىٰ وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ ﴿٥٤﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ
وَلَا أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿٥٥﴾ وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ
لَمِنكُمْ وَمَا هُم مِّنكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ﴿٥٦﴾ لَوْ يَجِدُونَ
مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ﴿٥٧﴾ وَ
مِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِن
لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ﴿٥٨﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا
آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ
مِن فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ ﴿٥٩﴾ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ ع ۱۴
لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَ
فِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً
مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦٠﴾

ترجمۂ آیات ۴۳-۶۰

اللہ نے تمھیں معاف کیا، تم نے ان کو اجازت کیوں دے دی، یہاں تک کہ جو راستباز ہیں وہ بھی تم پر ظاہر ہو جاتے اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔ جو اللہ اور آخرت پر سچا ایمان رکھتے ہیں وہ کبھی مال و جان سے جہاد کرنے کی تم سے رخصت

مانگنے نہیں آئیں گے۔ اللہ اپنے متقی بندوں سے خوب باخبر ہے۔ رخصت مانگنے کے لیے تو وہی آتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دل شک میں مبتلا ہیں، اور وہ اپنے شک میں ڈانواڈول ہیں۔ اور اگر وہ نکلنا چاہتے تو کچھ سامان کر ہی لیتے لیکن اللہ نے ان کے اٹھنے کو پسند نہیں کیا تو ان کو بٹھا دیا اور کہہ دیا گیا کہ جاؤ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھو۔ ۴۳-۴۶

اگر یہ لوگ تم میں مل کر نکلتے تو تمہارے لیے خرابی ہی بڑھانے کے باعث بنتے اور تمہارے درمیان ان کی ساری بھاگ دوڑ فتنہ انگیزی کے لیے ہوتی۔ اور تم میں ان کی سننے والے ہیں اور اللہ ظالموں سے خوب باخبر ہے۔ یہ پہلے بھی فتنہ انگیزی کی کوشش کر چکے ہیں اور انھوں نے واقعات کی صورت تمہارے سامنے بدلی یہاں تک کہ ان کے علی الرغم حق آگیا اور اللہ کا حکم ظاہر ہوا۔ ۴۷-۴۸

اور ان میں وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے رخصت دے دیجیے اور فتنہ میں مبتلا نہ کیجیے سن لو یہ فتنہ میں گر چکے۔ اور بے شک جہنم کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو انھیں دکھ ہوتا ہے اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں خوب ہوا ہم نے پہلے ہی اپنا بچاؤ کر لیا تھا اور مگن ہو کر لوٹتے ہیں۔ ان کو بتا دو کہ ہمیں صرف وہی چیز پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ رکھی ہے۔ وہ ہمارا مولیٰ ہے۔ اور اللہ ہی پر اہلِ ایمان کے لیے بھروسہ کرنا زیبا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ تم تو بہر حال ہمارے لیے دو بھلائیوں ہی میں سے کسی ایک کے متوقع ہو۔ لیکن ہم تمہارے باب میں اس امر کے متوقع ہیں کہ اللہ یا تو تم پر اپنے پاس سے عذاب بھیجے گا یا ہمارے

ہاتھوں۔ تو تم بھی متوقع رہو، ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں شامل ہیں۔ ۴۹-۵۲

ان سے کہہ دو تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے، تمہارا کوئی انفاق قبول نہیں ہوگا، تم بدعہد لوگ ہو۔ یہ اپنے انفاق کی قبولیت سے صرف اس وجہ سے محروم ہوئے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا کفر کیا اور نماز کے لیے جو آتے ہیں تو ہارے باندھے آتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں تو بادلِ ناخواستہ۔ تو تم ان کے مال و اولاد کو کچھ وقعت نہ دو۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ یہ چیزیں ان کے لیے اس دنیا کی زندگی میں موجب عذاب بنیں اور ان کی جانیں حالتِ کفر میں نکلیں۔ ۵۳-۵۵

اور یہ اللہ کی قسمیں کھا کھا کے اطمینان دلاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں، حالانکہ وہ تم میں سے نہیں۔ بلکہ یہ ڈرپوک لوگ ہیں۔ اگر یہ کوئی ٹھکانا، کوئی غار یا کوئی گھس بیٹھنے کی جگہ پا جاتے تو رسی تڑا کر ادھر کو بھاگ کھڑے ہوتے۔ اور ان میں وہ بھی ہیں جو تم پر صدقات کے بارے میں عیب لگاتے ہیں۔ اگر اس میں سے پاتے ہیں تو راضی رہتے ہیں اور اگر نہیں پاتے تو برہم ہو جاتے ہیں اور اگر وہ اس پر قانع رہتے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے کہ ہمارے لیے اللہ ہی بس ہے، اللہ اپنے فضل سے ہمیں نوازے گا اور اس کا رسول بھی، ہم تو اللہ ہی کے تمنائی ہیں تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا۔ صدقات تو بس محتاجوں، مسکینوں، عاملینِ صدقات اور تالیفِ قلوب کے سزاواروں کے لیے ہیں اور اس لیے کہ یہ گردنوں کے چھڑانے، تاوان زدوں کے سنبھالنے، اللہ کی راہ اور مسافروں کی امداد میں خرچ کیے جائیں۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۵۶-۶۰

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (۴۳)

آنحضرتؐ کی کریم النفسی سے منافقین کی کوشش

چشم پوشی اور سماحت کریم النفسی کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح تمام اعلیٰ صفاتِ انسانی کے مظہر تھے اسی طرح آپؐ میں چشم پوشی کی صفت بھی کمال درجہ موجود تھی۔ منافقین آپؐ کی اس کریم النفسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ فرائض دینی بالخصوص فریضۂ جہاد سے فرار کے لیے وہ مختلف قسم کے جھوٹے عذرات تراشتے اور آپؐ کی خدمت میں پیش کر کے گھر بیٹھ رہنے کی اجازت مانگتے۔ حضورؐ ان کے ان بناوٹی عذرات سے اچھی طرح واقف ہوتے لیکن بربنائے کریم النفسی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، درگزر فرما جاتے اور ان کو اجازت دے دیتے۔ حضورؐ کی اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر چونکہ ان کو اپنے نفاق پر پردہ ڈالنے کا ایک موقع مل جاتا جس سے ان کی فریب کاری پختہ ہوتی جا رہی تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متنبہ فرمایا۔ لیکن متنبہ فرمانے کا انداز بہت دلنواز ہے۔ بات کا آغاز ہی عفو کے اعلان سے فرمایا کہ واضح ہو جائے کہ مقصود سرزنش اور عتاب نہیں بلکہ توجہ دلا دینا ہے کہ منافقین تمہاری کریم النفسی سے بہت غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تم اپنی چشم پوشی کی وجہ سے ان کے عذرات کو لاطائل سمجھنے کے باوجود ان کو اجازت دے دیتے ہو جس سے وہ دلیر ہوتے جاتے ہیں کہ ان کی مکاری کامیاب ہو گئی حالانکہ اگر تم اجازت نہ دیتے تو ان کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ ان کے جھوٹوں اور سچوں میں امتیاز ہو جاتا۔ تمہاری اجازت کے بغیر جو گھر میں بیٹھ رہتے ہر شخص پہچان جاتا کہ یہ منافق ہیں لیکن وہ تمہاری اجازت کو اپنے چہرے کی نقاب بنا لیتے ہیں۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۔ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ (۴۴-۴۵)

باخلاص مومنین اور منافقین کے درمیان واضح فرق

یہ ایک نمایاں فرق واضح فرما دیا ہے مخلصین اور منافقین کے درمیان کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر سچا اور پکا ایمان رکھتے ہیں وہ تمہارے پاس جہاد سے رخصت کی درخواستیں لے کر نہیں آتے۔ اللہ اپنے متقی بندوں سے خوب باخبر ہے۔ یہ رخصت کی درخواستیں وہی لوگ لے کر آتے ہیں جن کا اللہ اور آخرت پر سچا ایمان نہیں ہے بلکہ ان کے دلوں سے شک کا روگ چمٹا ہوا ہے جس کے سبب سے وہ زبان سے تو اللہ اور رسول کے ساتھی بنے ہوئے ہیں لیکن ان کے دل ڈانواں ڈول ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث وہی لوگ ہیں جو خود تو جھوٹے عذرات کی آڑ لے کر اپنے کو معذور

ٹھہراتے ہیں لیکن کسی دوسرے کو اپنے ان عذرات پر مطمئن نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ جہاد کے لیے جو چیزیں عذر بن سکتی ہیں وہ ایسی نہیں ہیں کہ دوسروں سے مخفی رہ سکیں۔ جو لوگ واقعی معذور ہوتے ہیں ان کا عذر بدیہی ہوتا ہے اور ہر شخص ان کو معذور ٹھہراتا ہے چنانچہ اسی سورہ میں آگے ان حقیقی معذورین کی تفصیل بھی بیان فرمادی ہے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَىٰ وَلَا عَلَى الَّذِينَ يَجِدُونَ مَا يُنفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِن سَبِيلٍ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنفِقُونَ (۹۱-۹۲)

کمزوروں، مریضوں اور ان لوگوں پر کوئی حرج نہیں ہے جن کو زاد و راحلہ میسر نہیں ہے جب کہ وہ اللہ اور رسول کے خیرخواہ رہیں۔ خوب کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے۔ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے اور ان لوگوں پر بھی کوئی الزام نہیں ہے جو تمہارے پاس آتے ہیں کہ تم ان کے لیے کوئی سواری کا انتظام کر دو اور تم ان کو جواب دیتے ہو کہ میرے پاس تمہارے لیے سواری کا کوئی بندوبست نہیں ہے تو وہ تمہارے پاس سے اس حال میں لوٹتے ہیں کہ شدت غم سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتی ہیں کہ افسوس ان کے پاس مصارف کا انتظام نہیں۔

میرا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ میں ایسے ہی بااخلاص معذورین کی طرف اشارہ ہے۔

وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَلَٰكِن كَرِهَ اللَّهُ انبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ (۴۶)

توفیق باندازۂ ہمت

یعنی ان کے سارے عذرات محض بناوٹی ہیں۔ اگر ان کے اندر جہاد کے لیے اٹھنے کا ارادہ موجود ہوتا تو کچھ نہ کچھ سامان تو یہ کر ہی لیتے۔ اگر بھرپور نہیں تو معمولی سامان، بقدر ضرورت مہیا کر لینا تو ان کے لیے کچھ دشوار نہ ہوتا لیکن ان کے اندر ارادہ ہی موجود نہیں تھا اور سنت الٰہی ازل سے یہ مقرر ہے کہ جو لوگ نیکی کمانے کے لیے خود اپنے ارادے کو حرکت میں نہیں لائیں گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو توفیق بھی ارزانی نہیں ہوگی۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے

انھوں نے اپنے لیے بچوں اور عورتوں، بوڑھوں اور مریضوں کی طرح گھر میں بیٹھے رہنا پسند کیا تو خدا نے بھی ان کو عزم و حوصلہ سے محروم کر دیا۔

توفیق کے باب میں سنت الٰہی

"تثبیط" کے معنی کسی کو کسی کام سے روک دینے اور ہٹا دینے کے ہیں۔ یہ توفیق کے باب میں سنت الٰہی کا بیان ہے جس کی وضاحت ہم متعدد مقامات میں کر چکے ہیں۔ اُقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ میں اسلوب طنز کا ہے کہ جب میدان میں نکلنے کی ہمت سے عاری ہو تو جاؤ گھروں میں بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھو۔ آگے کی بعض آیات میں یہ طنز اور بھی تیز ہو گیا ہے۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَ۠اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۔ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَاۗءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (۴۷-۴۸)

"لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا۔ الآیۃ" 'خبال' کے معنی خرابی اور فساد کے اور ایضاع کے معنی بھاگ دوڑ کرنے کے ہیں۔

منافقین کی فتنہ انگیزیاں

مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ جنگ کے لیے نہیں نکلے تو مصلحت الٰہی یہی تھی کہ یہ نہ نکلیں۔ اگر یہ تمھارے ساتھ ہو کر نکلتے تو تمھارے لیے یہ مفید بننے کے بجائے الٹے مصیبت بنتے، ان کی ساری بھاگ دوڑ تمھارے درمیان کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھانے کی راہ میں ہوتی۔

"وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ" یعنی تمھاری اپنی صفوں کے اندر بھی ان منافقین کی باتیں سننے اور ماننے والے موجود ہیں۔ یہ اشارہ ان سادہ لوح مسلمانوں کی طرف ہے جو اگرچہ منافق نہیں تھے لیکن اپنی سادہ لوحی کے سبب سے بسا اوقات ان منافقین کے چکمے میں آ جاتے تھے۔ ان دو لفظوں میں نہایت لطیف طریقے سے ان کی طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ مسلمان اپنے اندر کے ان لوگوں سے بھی بے خبر نہ رہیں جو فتنہ پردازوں کے فتنوں سے متاثر ہونے کے معاملے میں بڑے حساس اور بڑی آسانی سے آگ پکڑ لینے والے ہیں۔ 'سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ' کی لغوی تحقیق مائدہ کی آیت ۴۱ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ دھمکی کے موقع میں ہے۔ یعنی اللہ ان ظالموں سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ایک دن یہ کیفر کردار کو پہنچیں گے۔

منافقین کی پچھلی شرارتوں کی طرف اشارہ

"لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ ... الآیۃ" یہ اس گروہ منافقین کی بعض پچھلی شرارتوں کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور ان کے درمیان فساد برپا کرنے کے لیے کیں۔

یعنی معاملہ کچھ اور تھا، انھوں نے اپنی ملمع سازی اور فتنہ پردازی سے اس کو کچھ کا کچھ بنا دینے کی کوشش کی۔ قرآن نے صرف اجمالی اشارے پر اکتفا کیا ہے اس لیے کہ یہ باتیں مسلمانوں سے مخفی نہیں تھیں۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے جنگ بدر کے موقع پر، جیسا کہ تفصیل گزری، اللہ اور رسول کا منشا واضح ہونے کے باوجود مسلمانوں کو قافلۂ تجارت پر حملہ کرنے کی راہ سجھانے کی کوشش کی، انھی لوگوں نے جنگ احد کے موقع پر پہلے تو شہر میں محصور ہو کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا پھر جب ان کا مشورہ قبول نہیں ہوا تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر عین موقع پر الگ ہو گیا پھر جنگ کے بعد

اسی کے ہم خیالوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا کہ نعوذ باللہ آپؐ قوم کے بدخواہ ہیں کہ خیر خواہوں کے مشورے کے خلاف ایک غلط مقام پر لے جا کر ہمارے بھائیوں کو کٹوا دیا اور شکست کا سبب بنے۔ پھر یہی لوگ تھے جنھوں نے جنگ مریسیع کے موقع پر اپنی فتنہ انگیزی سے ایسی صورت پیدا کر دی کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان تلوار چلتے چلتے رہ گئی۔ اسی سلسلے میں ان کی ایک نہایت سنگین شرارت واقعۂ افک کی شکل میں ظاہر ہوئی جو بات کا بتنگڑ بنانے کی ایک نہایت گھنونی مثال ہے۔ حنین کے موقع پر تقسیم غنیمت کے معاملے میں انھوں نے اپنی بدطینتی سے دلوں میں سخت کدورت پیدا کر دینے کی کوشش کی۔ غرض جو موقع بھی ان کے ہاتھ آیا اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی مفسدانہ سرگرمیوں کے علی الرغم ان کے فتنوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (۴۹)

نفاق تقویٰ کے بھیس میں

یہ بعض ایسے منافقین کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے جنگ تبوک میں عدم شرکت کے لیے یہ متقیانہ قسم کا بہانہ پیش کیا تھا کہ وہ عورت کے معاملے میں چونکہ بہت بے صبر ہیں اس وجہ سے انھیں اس جنگ کی شرکت سے معاف رکھا جائے مبادا وہ رومی عورتوں کے حسن و جمال سے کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائیں۔ اگرچہ یہ عذر پیش تو ایک آدھ احمقوں نے ہی کیا ہو گا لیکن یہ عذر کی ایک ایسی قسم تھی جس پر تقویٰ اور دین داری کا ملمع چڑھانے کی کوشش کی گئی تھی اس وجہ سے قرآن نے اس کا خاص طور پر ذکر فرمایا تاکہ مسلمانوں کو شیطان کے ایک خاص حربے سے آگاہ کر دیا جائے کہ کبھی کبھی وہ تقویٰ کے بھیس میں بھی حملہ آور ہوتا ہے۔ یہ عذر اسی قسم کا عذر ہے جیسا کہ بعض مدعیان تقویٰ نماز باجماعت کی حاضری سے متعلق پیدا کر لیتے ہیں اور اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ مسجدوں کی حاضری سے اس لیے بچتے ہیں کہ اپنے آپ کو ریا کے فتنہ سے محفوظ رکھیں۔

'اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا' نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ یعنی تبوک پہنچ کر فتنہ میں مبتلا ہونا تو ابھی دور کی بات تھی، یہ تو گھر بیٹھے ہی فتنہ میں اوندھے منہ گر پڑے۔ اس لیے کہ فرائض دینی سے فرار کے لیے اس قسم کا عذر تراشنا بجائے خود ایک ایسا فتنہ ہے جس کے بعد ان کی خانہ ویرانی کے لیے کسی اور فتنہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ان کی ایمانی و اخلاقی موت کے لیے رومی حسیناؤں کے چہرے سے زیادہ ان کا یہ اپنا ہی چہرہ مہلک ہے۔

'وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ' سے ایک بات تو یہ نکلی کہ اس قسم کے سارے بہانہ باز کافر ہیں۔ دوسری بات یہ نکلی کہ یہ خدا سے فرار کے لیے جتنے بہانے چاہیں ڈھونڈ نکالیں لیکن خدا کی جہنم ان کا ہر طرف سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ اس سے نہیں بھاگ سکتے۔

إِن تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۖ وَإِن تُصِبْكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِن قَبْلُ وَيَتَوَلَّوا
وَّهُمْ فَرِحُونَ (۵۰)

منافقین کا اصل باطن

یہ ان کے اصل باطن سے پردہ اٹھایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عذرات اور بہانے تو محض اوپر کا پردہ ہیں۔ ان کے دلوں کے اندر تو صرف تمھاری بدخواہی بھری ہوئی ہے جب تمھیں کسی مہم میں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو بڑا دکھ ہوتا ہے اور اگر تمھیں کوئی افتاد پیش آجاتی ہے تو بہت خوش ہو کر لوٹتے ہیں کہ خوب ہوا کہ ہم نے اپنا بچاؤ پہلے ہی کر لیا تھا۔ قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا کی تاویل بعض لوگوں نے قَدْ أَخَذْنَا حِذْرَنَا سے کی ہے ہمارے نزدیک یہ تاویل صحیح ہے۔

قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۔ قُلْ
هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۖ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَن يُصِيبَكُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ
مِّنْ عِندِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا ۖ فَتَرَبَّصُوا إِنَّا مَعَكُم مُّتَرَبِّصُونَ (۵۱-۵۲)

مومنین کے لیے مصیبت اور راحت دونوں میں خیر ہے

یہ جواب ہے اوپر والی بات کا کہ اگر یہ تمھیں کسی افتاد کے پیش آنے سے خوش ہوتے ہیں تو انھیں بتا دو کہ ہمیں وہی کچھ پیش آئے گا جو خدا نے ہمارے لیے لکھ رکھا ہے، وہ ہمارا مولیٰ ہے اور ہمیں اس پر پورا بھروسہ ہے کہ اس نے جو کچھ ہمارے لیے لکھ رکھا ہے اسی میں ہماری دنیا اور آخرت کی بہبود ہے۔ اگر تم ہمارے لیے کسی مصیبت کے خواہاں ہو تو ہمارا یہ ایمان ہے کہ وہ تمھارے کہنے سے نہیں آئے گی بلکہ ہمارے رب ہی کے چاہنے سے آئے گی اور اسی میں ہمارے لیے بہتری ہوگی۔ اہل ایمان کے لیے مصیبت اور راحت، دکھ اور سکھ، موت اور زندگی دونوں ہی میں خیر ہے۔ ایک سے مومن کو صبر، کمزوریوں کی اصلاح اور توبہ و انابت کی تربیت ملتی ہے، دوسری سے شکر نعمت، ادائے حقوق اور احسان کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے۔ مومن اللہ کی راہ میں لڑتا ہے تو غازی ہے مرتا ہے تو شہید ہوتا ہے۔ البتہ تمھارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تم نے جو روش اختیار کی ہے اس کی بنا پر ہم تمھارے لیے دو باتوں میں سے کسی ایک کی توقع رکھتے ہیں۔ یا تو اللہ تعالیٰ تم پر اپنے پاس سے کوئی عذاب بھیجے گا یا ہمارے ہی ہاتھوں تم کو سزا دلائے گا اور ان میں سے کسی میں بھی تمھارے لیے خیر نہیں۔ تو تم ہمارے لیے جس چیز کا انتظار کر رہے ہو اس کا انتظار کرو، ہم بھی اب تمھارے لیے دونوں باتوں میں سے کسی ایک کے ظہور کے منتظر ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کامل اتمام حجت کے بعد کسی کے باب میں اس طرح کا انتظار تنگ دلی کی دلیل نہیں بلکہ یہ حالات و واقعات کے قدرتی نتیجہ کا انتظار ہے۔ ان شاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں اس پر مفصل بحث آئے گی۔

قُلْ أَنفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَّن يُتَقَبَّلَ مِنكُمْ ۖ إِنَّكُمْ كُنتُمْ قَوْمًا فَاسِقِينَ ۔ وَمَا
مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا

وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ (۵۳-۵۴)

نفاق کے ساتھ کوئی انفاق بھی قبول نہیں

یہ ان منافقین سے اظہارِ نفرت و کراہت ہے۔ فرمایا کہ ان کو سنا دو کہ تمہارا کوئی انفاق بھی، خواہ طوعاً ہو یا کرہاً، خدا کے ہاں قبول نہیں۔ انفاق ان کا قبول ہوتا ہے جو خدا کے وفادار ہوں۔ جو بدعہد اور غدار ہیں اور محض مارے باندھے یا دکھاوے اور نمائش کے لیے خرچ کرتے ہیں ان کے انفاق کی خدا کے ہاں کوئی وقعت نہیں۔ خدا کسی کے مال کا محتاج نہیں کہ جس طرح بھی کوئی اٹھا کر دے دے وہ اس کو قبول کرے۔ وہ صرف انہی کے انفاق قبول کرتا ہے جو سچے ایمان اور پورے جذبۂ اخلاص کے ساتھ اس کے دین کی خدمت کرتے ہیں۔

'وَمَا مَنَعَهُمْ ... الآیۃ' یہ وضاحت ہے 'إِنَّكُمْ كُنتُمْ قَوْمًا فَاسِقِينَ' کی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ و رسول کے منکر ہیں۔ اس لیے کہ اللہ و رسول پر ایمان کے جو تقاضے ہیں ان میں سے یہ کسی تقاضے کو بھی پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ اگر نمازوں میں آتے ہیں تو مارے باندھے محض دکھاوے کے لیے آتے ہیں اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر نمازوں میں شامل نہ ہوں تو مسلمانوں کے اندر اپنے آپ کو شامل رکھنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے، اسی طرح اگر وہ دینی کاموں میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو خدمتِ دین کے لیے نہیں بلکہ بادلِ ناخواستہ محض اس خیال سے کہ مسلمانوں کے اندر شمار کیے جاتے رہیں اور اگر طوعاً بھی خرچ کرتے ہیں تو اس لیے کہ ان کی مالداری اور فیاضی کا مظاہرہ ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جس طرح نمائش کی نماز مجبورانہ دوسروں کو دکھانے کے لیے ہوتی ہے اسی طرح نمائش کا انفاق بھی محض دوسروں کو دکھانے ہی کے لیے ہوتا ہے اور خدا کے ہاں اس طرح کا کوئی عمل بھی مقبول نہیں ہوتا۔ سورۂ نساء آیت ۱۴۲ 'وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہاں ہم نے واضح کیا ہے کہ منافقین کی نماز، نماز نہیں ہوتی تھی بلکہ مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے ایک قسم کی ایکٹنگ ہوتی تھی تاکہ مسلمان ان کو اپنے اندر شامل سمجھیں۔ ظاہر ہے اس مقصد سے جو نماز پڑھی جائے گی وہ کسالی ہی ہو گی، اس میں نشاطِ خاطر، جوش و جذبہ اور خضوع و خشوع کہاں سے آئے گا!

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ (۵۵)

مال و اولاد کی قدر و قیمت ایمان کے ساتھ ہے

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ مال بھی بخشے اور اولاد سے بھی نوازے وہ ملت کے لیے بڑی دولت ہیں اگر ان کو ایمان و اخلاص بھی نصیب ہو جائے۔ ہر بہی خواہِ ملت ایسے لوگوں کو قدر و وقعت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اس لیے کہ جان و مال دونوں سے اسلام کی جو خدمت ان کے امکان میں ہوتی ہے، دوسروں کے امکان میں نہیں ہوتی۔ ان منافقین میں بھی ایسے صاحبِ مال و اولاد موجود تھے جو اسلام کی بڑی خدمت اور آخرت میں بڑے مراتب حاصل کر سکتے تھے۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے لیے دل سے متمنی تھے کہ یہ ایمان و اخلاص سے بہرہ ور ہوں کہ اپنی ان نعمتوں کا حق ادا کر کے خدا کے ہاں مراتب عالیہ حاصل کریں لیکن سارے جتن کرنے کے بعد بھی جب یہ لوگ پھسڈی ہی ثابت ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرما دیا کہ ان بدبختوں کے مال و اولاد کو تم ذرا وقعت نہ دو، یہ ان کے لیے ترقی و عروج کی کمندیں نہیں بلکہ غلامی کے پھندے ہیں۔ یہ ان کی بدولت دنیا میں بھی اللہ کے عذاب میں مبتلا ہوں گے اور ان کی موت بھی حالت کفر ہی میں ہوگی۔

مال و اولاد کا پھندا

یہاں دنیا میں ان کے لیے جس عذاب کا حوالہ ہے اس سے مراد وہ عذاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکذبین کے لیے مقدر ہو چکا تھا اور جس کی تفصیلات پیچھے گزر چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ منافقین بھی وہی روش اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے تو ان کا انجام بھی وہی ہونا تھا جو اس روش کے اختیار کرنے والے دوسرے لوگوں کا بیان ہوا۔ 'تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ دنیا کے مال و اسباب کو اپنے لیے پھندا بنا لیتے ہیں ان کی جانیں گھٹ گھٹ کر نکلتی ہیں اور یہ پھندا اس طرح ان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ اس سے چھوٹ کر ان کے لیے ایمان کی راہ پر آنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ 'اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ' میں اس سنت الٰہی کا بیان ہے جس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہم کر چکے ہیں۔

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ۭ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۝ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ (۵۶-۵۷)

منافقین کی نفسیاتی بیماری

'وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ' لفظ 'حلف' بالعموم اچھے معنوں میں نہیں آتا۔ ہم دوسرے مقام میں یہ نفسیاتی حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ جن لوگوں کے پاس کردار کی حجت نہیں ہوتی وہ اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کے لیے اکثر جھوٹی قسموں کا سہارا لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے منافقین کے متعلق جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ یہ اپنے اخلاقی خلا کو جھوٹی قسموں سے پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو مطمئن رکھنے کے لیے ان کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے کہ ہم آپ ہی لوگوں میں سے ہیں، ہمارے باب میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن نے فرمایا کہ یہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ محض ڈر کے سبب سے تمہارے ساتھ بندھے ہوئے ہیں! اب ان کے سامنے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہی ہے۔ کفار و مشرکین کا حشر یہ دیکھ چکے ہیں، یہود و نصاریٰ کا انجام بھی ان کے سامنے ہے۔ اب جائیں تو کہاں جائیں؟ ملک چھوڑ کر باہر جائیں تو مفادات دامن گیر ہوتے ہیں۔ چاروناچار تمہارے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ 'فَرِقَ يَفْرَقُ فَرَقًا' کے معنی ڈرنے اور گھبرانے کے ہیں۔ 'فَرُوْقَة' بزدل اور ڈرپوک کو کہتے ہیں۔

منافقین کی مجبوری

'لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً ... الاية' یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے۔ مطلب یہ ہے

کہ ان کو آج اگر کوئی جائے پناہ، کوئی غار یا کوئی گھس بیٹھنے کی جگہ مل جائے، جہاں اپنے مفادات کے ساتھ یہ اپنے کو محفوظ کر سکیں تو ایک دن بھی یہ تمہارے ساتھ رہنا پسند نہ کریں بلکہ رسی تڑا کر یہ بھاگیں گے۔ جَمَحَ الْفَرَسُ کے معنی ہیں تَغَلَّبَ عَلٰی رَاكِبِهٖ وَ ذَهَبَ بِهٖ وَلَا يَنْثَنِیْ (گھوڑا سوار کے قابو سے باہر ہو گیا اور اس کو لے کر سرپٹ بھاگا) یعنی تم سنبھالتے ہی رہ جاتے لیکن یہ بھاگ کھڑے ہوتے مگر وہ تو خیریت ہے کہ کوئی ٹھکانا ان کو نہیں مل رہا ہے اس وجہ سے خوف اور بزدلی نے ان کو تمہارے ساتھ باندھ رکھا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِی الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ (۵۸-۵۹)

غیرمالدار منافقین کا حال

اوپر کی آیات میں مالدار منافقین کا حال بیان ہوا تھا۔ اب یہ غیر مالدار منافقین کا حال بیان ہو رہا ہے کہ جس طرح ان کو خوف نے مسلمانوں کے ساتھ باندھ رکھا ہے اسی طرح ان کو طمع نے باندھ رکھا ہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تم (خطاب پیغمبرؐ سے ہے) ان کو صدقات کی مد سے خوب دیتے رہو تو یہ راضی رہتے ہیں اور اگر ذرا کمی کر دو تو روٹھ کر تمہاری عیب چینی شروع کر دیتے ہیں کہ دوسروں کو تو فیاضی سے دیا جا رہا ہے لیکن ان کو ان کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے۔

صحیح مومنانہ روش

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا ... الاٰیۃ یہ ان کو صحیح روش یعنی اللہ اور رسول پر اعتماد اور قناعت کی تعلیم دی گئی ہے کہ اہل ایمان کی رغبت مال کی طرف نہیں بلکہ اللہ کی طرف ہونی چاہیے۔ فرمایا کہ جو کچھ اللہ نے ان کو اپنے خزانۂ جود سے بخشا اور رسولؐ نے جتنا کچھ صدقات میں سے ان کو عطا فرمایا، اگر یہ اس پر قناعت کرتے، اللہ پر پورا بھروسا کرتے اور اس سے مزید فضل اور رسول کی طرف سے مزید عنایت کی امید رکھتے، عیب چینی، بدگمانی اور شکوہ و شکایت کے بجائے حسن ظن سے کام لیتے تو یہ چیز ان کے حق میں بہتر ہوتی۔ اس سے ان کے لیے اللہ کے فضل کے مزید دروازے کھلتے اور رسول کی شفقت و عنایت بھی ان کو مزید حاصل ہوتی لیکن ان کی بدبختی پر افسوس ہے کہ انھوں نے یہ مومنانہ اور غیرت مندانہ روش اختیار کرنے کے بجائے رسولؐ کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم شروع کر دی —— ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ فصیح عربی میں اس قسم کے شرطیہ جملوں میں بالعموم جزا محذوف ہو جایا کرتی ہے جس سے کلام میں شدت پیدا ہو جاتی ہے اگر موقع شدت کا ہو، اور حسرت، ملامت، زجر، شفقت، عنایت کے پہلو بھی زیادہ نمایاں ہو کر مخاطب کے سامنے آتے ہیں اگر موقع و محل ان کا ہو۔ ترجمہ میں ہم نے اس محذوف کو کھول دیا ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِی الرِّقَابِ

وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۶۰)

صدقات کے اصل مستحقین

اب یہ صدقات کے مستحقین کی تفصیل بیان فرما دی گئی ہے تاکہ منافقین میں سے جو غیر مستحق محض حرص مال کے سبب سے صدقات میں حصہ بٹانا چاہتے تھے ان پر واضح ہو جائے کہ کون لوگ اس مال میں حق دار ہیں، کون نہیں۔ اس سے یہ لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ منافقین جو صدقات سے اپنی خواہش کے مطابق نہ پانے کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نکتہ چینی شروع کر دیتے تھے ان کی حیثیت زیادہ تر ناخواندہ مہمانوں کی تھی جو بغیر کسی استحقاق کے اس مال میں شریک بننا چاہتے تھے۔

صدقہ اور زکوٰۃ میں فرق

'صدقات'، زکوٰۃ کی نسبت عام ہے۔ اس میں وہ تمام عطایا شامل ہیں جو بہ نیت اجر و ثواب دیے جائیں۔ عام اس سے کہ وہ زکوٰۃ کا مال ہو یا انفاق و تبرع کی نوعیت کا کوئی اور مال۔ چونکہ اسی انفاق سے آدمی کے ایمان کی صداقت اور پختگی واضح ہوتی ہے اس وجہ سے اس کو صدقہ کہتے ہیں جس کی اصل 'صدق' ہے جس کی روح قول و فعل کی کامل مطابقت اور رسوخ و استحکام ہے۔

ان صدقات کے مندرجہ ذیل مستحقین اور مصارف یہاں بتائے گئے ہیں۔

فقراء اور مساکین سے مراد

'فُقَرَاء' اور 'مَسَاكِيْن' یہ دونوں لفظ اس اعتبار سے تو بالکل مشترک ہیں کہ دونوں کا اطلاق محتاجوں اور ناداروں پر ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں یہ دونوں ایک دوسرے کے محل میں استعمال بھی ہوئے ہیں لیکن ان کے درمیان فی الجملہ فرق بھی ہے۔ 'فقیر' 'غنی' کا مقابل ہے مثلاً اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا (۱۳۵ - نساء)۔ اس وجہ سے ہر وہ شخص جو غنی نہیں بلکہ محتاج ہے وہ فقیر ہے عام اس سے کہ وہ سوال کرتا ہے یا اپنی خودداری کی شرم رکھتے ہوئے سوال سے احتراز کرتا ہے۔ چنانچہ بقرہ ۲۷۳ میں ان خوددار محتاجوں کے لیے 'فقراء' ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

'مسکین' کا لفظ اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنے فقر و مسکنت یا فقدانِ عزم و حوصلہ کے سبب سے زندگی کی جد و جہد میں حصہ لینے سے عاجز ہو، صرف دوسروں کی امداد ہی اس کا سہارا ہو۔ گویا فقر کے ساتھ اس کے اوپر مسکنت اور بے بسی کا بھی غلبہ ہو۔ اس اعتبار سے یہ لفظ 'فقیر' کے مقابل میں سخت ہے۔

'عاملین' سے مراد

'وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا' سے مراد وہ لوگ ہیں جو صدقات کی وصولی اور ان کے حساب کتاب پر حکومت کی طرف سے مامور ہوں۔ ان کی تنخواہیں اور ان کے دفاتر کے مصارف بھی اسی مد سے ادا ہوں گے۔

'مؤلفۃ القلوب' سے مراد

'وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ'، مؤلفۃ القلوب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی اسلامی حکومت کے مصالح کے تحت دل داری پیش نظر ہو۔ بسا اوقات حکومت کو بعض ایسے ذی اثر لوگوں سے معاملہ کرنا پڑتا ہے جو حکومت کی پوری رعیت نہیں ہوتے بلکہ ایسی پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ اگر ان کو بزور قابو میں رکھنے

کی کوشش کی جائے تو ڈر ہوتا ہے کہ وہ دشمن سے مل کر مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں۔ خاص طور پر سرحدی علاقوں میں اس طرح کے لوگوں سے بڑے خطرے پہنچ سکتے ہیں اگر یہ دشمن بنے رہیں یا دشمن ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ اس طرح کے لوگوں کو اپنی حمایت میں رکھنا اسلامی حکومت کے مصالح کا تقاضا ہوتا ہے اور اس کی شکل یہی ہوتی ہے کہ ان کی کچھ مالی سرپرستی کی جاتی رہے تاکہ ان کی ہمدردیاں اسلام کے دشمنوں کی بجائے اسلامی حکومت کے ساتھ رہیں۔ یہ ایک پولیٹیکل مصرف ہے جس پر حکومت اپنی دوسری مدوں سے بھی خرچ کر سکتی ہے اور اگر ضرورت محسوس کرے تو اس پر صدقات کی مد سے بھی خرچ کر سکتی ہے۔ یہ مؤلفۃ القلوب غیر مسلم بھی ہو سکتے ہیں اور نام کے مسلمان بھی۔ اس تالیف قلب سے ایک فائدہ یہ بھی متوقع ہوتا ہے کہ یہ غیر مسلم یا نام کے مسلمان مسلمانوں سے وابستہ رہنے کے سبب سے اسلام سے قریب تر ہو جائیں۔

ہمارے فقہاء کا ایک گروہ اس مصرف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات یا بالفاظ دیگر اسلام کے غلبہ کے بعد ساقط قرار دیتا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ بات کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔ یہ مصرف جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک پولیٹیکل مصرف ہے جو حالات کے تابع ہے جس کی ضرورت کبھی پیش آتی ہے کبھی نہیں۔ ایک مضبوط سے مضبوط حکومت بھی بعض اوقات دفع شر کے اس طریقے کا اختیار کرتی ہے اس لیے کہ جبر اور طاقت کا ذریعہ اختیار کرنے میں نہایت پیچیدہ بین الاقوامی جھگڑے اٹھ کھڑے ہونے کے اندیشے ہوتے ہیں۔ جن میں بروقت الجھنا حکومت کے مصالح کے خلاف ہوتا ہے۔

فک رقبہ کی وضاحت

'وَفِي الرِّقَابِ' میں مضاف محذوف ہے یعنی 'فِي فَكِّ الرِّقَابِ' غلاموں کو طوق غلامی سے نجات دلانا بھی ان مقاصد میں سے ہے جن پر صدقات کی رقم خرچ کی جا سکتی ہے۔ یہاں حرف 'فِي' کے استعمال سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ان کی بہبود و ترقی کے لیے کام بھی صدقات سے کیے جا سکتے ہیں جو ان کی رفاہیت اور حصولِ آزادی میں معین ہوں۔

غارمین سے مراد

'وَالْغَارِمِينَ': 'غَرِمَ فِي التِّجَارَةِ' کے معنی ہوتے ہیں فلاں نے اپنی تجارت میں گھاٹا اٹھایا۔ 'غَرَامَة' اور 'غُرْم' تاوان، نقصان اور جرمانہ کو کہتے ہیں۔ 'غارم' اس شخص کو کہیں گے جو اپنے کاروبار میں نقصان یا کسی اور سبب سے ایسے بار اور قرضے کے نیچے آگیا ہو کہ اس کے لیے تنہا اپنے ذرائع سے اپنے آپ کو سنبھالنا ناممکن ہو رہا ہو۔ ایسے اشخاص کے قرضے اتارنے اور ان کو سہارا دینے پر بھی صدقات کی رقم صرف ہو سکتی ہے تاکہ وہ از سرِ نو سنبھل کر معاشرے کو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہنچا سکیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اسلامی حکومت میں اکتساب کے تمام ناجائز ذرائع اور اسراف کے تمام حرام راستوں پر قدغن ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ غارم کسی خلافِ شریعت طریقے کے اختیار کرنے کے سبب سے 'غارم' ہوا ہے یا اس کو یہ افتاد ناجائز راستے میں پیش آئی ہے۔ کلام کا موقع و محل خود شاہد ہے کہ یہاں غارم سے مراد کوئی مجرم نہیں بلکہ وہ شخص ہے جس نے اپنی جائز

معاشی جدوجہد کی راہ میں ٹھوکر کھائی ہو یا کسی سبب سے تاوان میں پڑ گیا ہو۔

'وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ' یہ ایک جامع اصطلاح ہے جس کے تحت جہاد سے لے کر دعوتِ دین اور تعلیم دین کے سارے کام آتے ہیں۔ وقت اور حالات کے لحاظ سے کسی کام کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جائے گی کسی کو کم لیکن جس کام سے بھی اللہ کے دین کی کوئی خدمت ہو وہ 'فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ' کے حکم میں داخل ہے۔

'ابن السبیل' سے مراد

'وَابْنِ السَّبِیْلِ' اس کا مستقل ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ مسافر، مجرد مسافر ہونے کی بنا پر اس بات کا حق دار ہوتا ہے کہ صدقات سے اس کو فائدہ پہنچایا جائے۔ مسافرت اس کو ایسی حالت میں ڈال دیتی ہے کہ قانونی اور اصطلاحی اعتبار سے فقیر نہ ہونے کے باوجود بھی وہ ایک اجنبی جگہ میں اپنی بعض ضروریات کے لیے ایسا محتاج ہوتا ہے کہ اگر اس کی دست گیری نہ کی جائے تو وہ اپنے ذاتی ذرائع سے غریب الوطنی میں ان کا کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے سرائیں، مسافر خانے، قیام و طعام اور رہنمائی کے مراکز قائم کرنا بھی ان کاموں میں شمار ہے جن پر صدقات سے خرچ کیا جا سکتا ہے، یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ بھی 'فی' کے تحت بیان ہوا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ مسافروں کی سہولت اور آسائش کے تمام ضروری کام اس میں شامل ہیں۔

صدقات کے لیے تملیک ذاتی ضروری نہیں

ہمارے فقہا کا ایک گروہ 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ' کے 'ل' کو تملیکِ ذاتی کے مفہوم کے لیے خاص کرتا ہے اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکال لیتا ہے کہ صدقات و زکوٰۃ کی رقوم فقرا و مساکین کی کسی ایسی اجتماعی بہبود پر صرف نہیں ہو سکتیں جس سے ملکیت ذاتی تو کسی کی بھی قائم نہ ہو لیکن اس کا فائدہ بحیثیت مجموعی سب کو پہنچے۔ ہمارے نزدیک یہ رائے کسی مضبوط دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ اول تو 'ل' کچھ تملیک ہی کے معنی کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ یہ متعدد معانی کے لیے آتا ہے اور ان سب معانی کے لیے یہ خود قرآن میں استعمال ہوا ہے، تملیک ذاتی ہی کے معنی کے لیے اس کو خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آخر بہبود، نفع رسانی اور استحقاق کے معانی کے لیے بھی جب اس کا استعمال معروف ہے تو ان معانی میں یہ کیوں نہ لیا جائے؟ پھر آیت میں آپ نے دیکھا کہ بعض چیزیں 'فی' کے تحت بیان ہوئی ہیں اور 'فی' کا متبادر مفہوم تملیک نہیں بلکہ خدمت، مصرف، رفاہیت اور بہبود ہی ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر بدیہی ہے کہ صرف تملیکِ ذاتی کی صورت میں غربا کو جتنا فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ نفع ان کو بعض حالات میں اس صورت میں پہنچایا جا سکتا ہے جب کہ ان کی اجتماعی بہبود کے لیے بڑے بڑے کام کیے جائیں پھر تملیک ذاتی کے ساتھ اس کو خاص کر کے اس نفع کو محدود کیوں کیا جائے؟ یہاں ہم ان اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ مسئلہ تملیک پر مفصل بحث ہم نے اپنے ایک مستقل مقالے میں کی ہے۔

'فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ' اس اسلوب کے فوائد پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔ اس میں اس حکم کے مؤکد اور واجب التعمیل ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے اور مبنی بر علم و حکمت ہونے کی طرف بھی۔

۱۰- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۶۱-۷۲

آگے کی آیات میں پہلے انہی منافقین کی بعض شرارتوں اور ایذا رسانیوں کا ذکر اور ان کو تہدید و وعید ہے۔ پھر منافقین و منافقات اور مومنین و مومنات دونوں کے کردار و صفات کا تقابل کیا ہے تاکہ ایمان و نفاق دونوں واضح ہو کر ہر شخص کے سامنے آ جائیں۔ یہ تقابل حقائق کو نمایاں کرنے میں بھی سب سے زیادہ مددگار رہتا ہے اور اس سے مقصد اصلاح کو بھی بڑی مدد ملتی ہے اگر اس سے صحیح فائدہ اٹھایا جائے ـــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۱-۷۲ وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ
خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿٦١﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ
الثلثة اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ
مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا
ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٣﴾ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ
سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا اِنَّ اللّٰهَ
مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا
نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ
تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٦٥﴾ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اِنْ

نَعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا
مُجْرِمِيْنَ ﴿۶۶﴾ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ع ۱۴
يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ
نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَعَدَ اللّٰهُ
الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا
هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾ كَالَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا
فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا
اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ
عَادٍ وَّثَمُوْدَ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ
اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ
كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ وقف لازم
يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ وَعَدَ اللّٰهُ
الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ
ع ۱۵ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۟ؑ ﴿۷۲﴾

ترجمۂ آیات ۶۱-۷۲ اور انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو نبی کو ایذا پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں وہ تو بس کان ہی کان ہیں۔ کہہ دو وہ سراپا گوش تمھاری بھلائی کے باب میں ہے۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اہلِ ایمان کی بات باور کرتا ہے اور تم میں سے جو ایمان لائے ان کے لیے رحمت ہے اور جو اللہ کے رسول کو ایذا پہنچا رہے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ وہ تمھارے آگے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ تمھیں مطمئن کریں، حالانکہ اگر وہ مومن ہیں تو اللہ اور اس کا رسول اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہ اس کو راضی کریں۔ کیا انھیں علم نہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔ ۶۱-۶۳

منافقین کو اندیشہ ہے کہ مبادا ان پر کوئی ایسی سورہ اتار دی جائے جو ان کو ان کے دلوں کے بھیدوں سے آگاہ کر دے۔ کہہ دو مذاق اڑا لو، اللہ ظاہر کر کے رہے گا جس سے تم ڈرتے ہو۔ اور اگر تم ان سے پوچھو گے تو جواب دیں گے کہ ہم تو محض سخن گستری اور جی بہلانے کی باتیں کر رہے تھے۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ہنسی مسخری کر رہے تھے؟ باتیں نہ بناؤ، تم نے ایمان کے بعد کفر کیا ہے۔ اگر ہم تمھاری کسی جماعت سے درگزر بھی کر لیں تو دوسری کسی جماعت کو ضرور سزا دیں گے بوجہ اس کے کہ وہ مجرم ہیں۔ ۶۴-۶۶

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک ہی چٹے کے بٹے ہیں۔ یہ برائی کا حکم دیتے

اور بھلائی سے روکتے اور ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔ انھوں نے اللہ کو بھلا رکھا ہے تو اللہ نے بھی ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ منافق بڑے ہی بدعہد ہیں۔ منافق مردوں، منافق عورتوں اور کفار سے اللہ نے جہنم کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہی ان کے لیے کافی ہے اور ان پر اللہ کی لعنت اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ ان لوگوں کی مانند جو تم سے پہلے ہو گزرے۔ وہ قوت و شوکت میں تم سے زیادہ اور مال و اولاد میں تم سے بڑھ چڑھ کر تھے تو انھوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا اور تم نے بھی اپنے حصے سے فائدہ اٹھا لیا جیسا کہ تمھارے اگلوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا اور تم نے بھی اسی طرح بکواس کی جس طرح انھوں نے کی۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ڈھے گئے اور یہی لوگ نامراد ہونے والے ہیں۔ کیا انھیں ان لوگوں کی سرگزشت نہیں پہنچی جو ان سے پہلے گزرے۔ قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم ابراہیم، اصحاب مدین اور الٹی ہوئی بستیوں کی۔ ان کے پاس ہمارے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ تو اللہ ان کے اوپر ظلم کرنے والا نہیں بنا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ ۶۷-۷۰

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یہ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہیں کہ اللہ ان کو اپنی رحمت سے نوازے گا۔ اللہ عزیز و حکیم ہے۔ مومن مردوں اور مومن عورتوں سے اللہ کا وعدہ ایسے باغوں کے لیے ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور پاکیزہ مکانوں کے لیے ابد کے باغوں

ہیں اور اللہ کی خوشنودی بھی جو سب سے بڑھ کر ہے بڑی کامیابی یہ ہے۔ ۷۱-۷۲

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۚ قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ ۚ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۶۱)

'اذن' کا مفہوم

'وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ' 'اذن' کے معنی کان کے ہیں، جب یہ کسی شخص کے لیے بطور استعارہ استعمال کیا جائے تو اس کے اندر ہجو ملیح کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی بس وہ نرا کان ہی کان ہے، ہر ایک کی بات سن لیتا اور اس کو باور کر لیتا ہے۔ ہم نے اس کو ہجو ملیح اس لیے قرار دیا ہے کہ عموماً یہ الزام بڑے لوگوں پر ان کے حاسدین یا منافقین لگاتے ہیں کہ ہے تو بڑا آدمی، اس میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں لیکن کان کا کچا ہے۔ ہر ایرے غیرے کی بات سن لیتا اور مان لیتا ہے۔ ہجو ملیح کا مضمون اس میں یہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ ہر ایک کی بات سن لینا جہاں آدمی کی شرافت اور کرم النفسی کی دلیل ہے وہیں یہاں اس کی سادگی، بھولے پن اور بے بصیرتی کی بھی دلیل ہے۔

آنحضرت صلعم کے لیے منافقین کی ہجو

منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ لفظ اس کے اصلی مفہوم کو پیش نظر رکھ کر استعمال کرتے۔ وہ اپنی نجی مجلسوں میں اللہ، اس کے رسول اور آیات الٰہی کا مذاق اڑاتے۔ جب آنحضرتؐ تک کسی ذریعہ سے اس کی خبر پہنچتی اور آپ اس پر کچھ خفگی یا ناراضی کا اظہار فرماتے تو منافقین اپنی صفائی میں لوگوں سے یہ کہتے کہ یہ نیک آدمی ہیں جو بات کوئی شخص کان میں ڈال جاتا ہے اس کو سچ جان لیتے ہیں اور اس کی بنا پر ہم جیسے وفا شعاروں اور اطاعت گزاروں سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ ورنہ بھلا ہماری زبانوں سے اللہ و رسول کی شان میں کوئی توہین کا کلمہ قصداً نکل سکتا ہے جو از راہ سخن گستری، مذاقاً اور تفریحاً بلا ارادہ تحقیر کوئی لفظ زبان سے نکل گیا ہو تو اس کی بات اور ہے۔

منافقین کو جواب

'قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ' یہ منافقین کی بات کا جواب دلوایا ہے کہ اگر تم نبیؐ کو سراپا کان سمجھتے ہو تو اس کا وہ پہلو جو تمہارے ذہن میں ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ وہ سراپا گوش تمہاری بھلائی کے باب میں ہے۔ ان کے کان ہر وقت اس تمنا میں کھلے رہتے ہیں کہ کان میں تمہاری اچھی باتوں، اچھے کاموں، اچھے ارادوں کی خبریں پڑیں اور ان سے وہ مسرور ہوں۔ وہ تمہاری بری خبریں اور بری سرگوشیاں سننے کے لیے کان نہیں لگائے رہتے ہیں کہ کوئی آئے اور تمہاری کسی بری حرکت کی خبر سنا جائے اور وہ اس کو قیمتی سوغات سمجھ کر اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیں۔ باپ اپنے بیٹوں کے لیے جتنا شفیق ہوتا ہے نبی اس سے کہیں

زیادہ اپنی امت کے لیے شفیق و رحیم ہوتا ہے۔ وہ ان کی خرابیوں کی ٹوہ میں نہیں بلکہ بھلائیوں کی ٹوہ میں رہتا ہے اور ہر آن وہ یہی چاہتا ہے کہ اس کے کانوں میں کوئی نہ کوئی اچھی ہی بات ان کی بابت پڑے۔ پس اگر تم اس کو سراپا کان سمجھتے ہو تو اس پہلو سے بے شک وہ تمہارے لیے سراپا کان ہی ہے اور یہ چیز تمہارے لیے مبارک ہے نہ کوئی ایسی چیز جس کو تم ہجو اور تحقیر کا موضوع بناؤ

نبی کا اعتماد اللہ اور اہل ایمان پر

'یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَیُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ' یعنی پیغمبر کے متعلق تمہارا یہ گمان بھی بالکل غلط ہے کہ وہ ہر ایرے غیرے کی بات سن لیتے اور اس کو باور کر لیتے ہیں۔ ان کا ایمان اللہ پر ہے اور وہ صرف وہ بات باور کرتے ہیں جو سچے اور پکے اہل ایمان کے ذریعہ سے ان کو پہنچتی ہے۔ اللہ اگر تمہارے باب میں کوئی خبر دے تو اس سے سچی اور پکی خبر اور کیا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اگر اہل ایمان تمہارے باب میں نبی کو کوئی اطلاع پہنچائیں تو آخر نبی اس کو کیوں نہ باور کرے؟ مطلب یہ کہ تمہارے باب میں نبی کے ذرائع اطلاع نہ تو ہوائی ہیں اور نہ پیغمبر ایسے بھولے بھالے ہیں کہ وہ ہوائی باتوں پر رائے قائم کرتے اور بدگمان ہوتے چلیں۔ وہ خدا کی رہنمائی میں چلتے اور اہل ایمان کی باتوں پر کان دھرتے ہیں۔ یہ بات ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ ایمان کا صلہ جب 'ل' کے ساتھ آئے تو وہ صرف کسی کی بات کو ماننے اور باور کرنے کے مفہوم میں ہوتا ہے۔

نبی سراپا رحمت

'وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ' یعنی تم میں سے جو لوگ صحیح ایمان کی روش اختیار کریں پیغمبر ان کے لیے سراپا شفقت و رحمت ہیں۔ وہ تمہارے بدخواہ نہیں ہیں کہ وہ اپنے کان تمہارے بدخواہوں کے لیے کھول دیں۔ وہ تمہاری اصلاح اور فلاح چاہتے ہیں اور تمہاری دنیا اور آخرت دونوں کی کامرانی اس بات میں ہے کہ تم صحیح ایمان کی روش اختیار کر کے پیغمبر کی رحمت و شفقت کے سزاوار بنو۔ فعل 'اٰمنوا' یہاں اپنے حقیقی اور کامل معنوں میں ہے یعنی ان لوگوں کے لیے جو محض زبانی مدعی ایمان ہونے کے بجائے سچے اور پکے مومن بن جائیں۔ رہے وہ لوگ جو محض زبانی جمع خرچ کے اعتماد پر مومن بنے رہنا چاہتے ہیں اور اپنی باتوں اور حرکتوں سے پیغمبر کو دکھ پہنچا رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِیُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۶۲)

عذر گناہ بدتر از گناہ

خطاب مسلمانوں سے ہے کہ منافقین اپنے ایمان کے بارے میں تم کو اطمینان دلانے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں حالانکہ ان کے اندر اگر ایمان ہوتا تو تمہارے اطمینان سے زیادہ ان کو اللہ اور اس کے رسول کو راضی کرنے کی فکر ہوتی۔ یہ بڑی ہی برمحل گرفت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حرکت جو یہ اپنے ایمان کو معتبر ثابت کرنے کے لیے کر رہے ہیں بجائے خود ان کی بے ایمانی کی ایک واضح دلیل ہے۔ یہ اسی طرح کی گرفت ہے جس کی نہایت بلیغ مثال 'اَلَا فِی الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا' میں گزر چکی ہے۔ سیاق آیات

آدمی کا عذر گناہ بدتر از گناہ بن جاتا ہے۔ منافقین نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے جو روش اختیار کی وہ ان کو اور زیادہ مجرم ثابت کرنے والی بن گئی۔ وہ راست بازہوتے تو اللہ اور رسول کو راضی کرنے کی کوشش کرتے نہ کہ جھوٹی قسموں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے سامنے اپنے کو معصوم اور پیغمبر کو کان کا کچا ثابت کرنے میں لگ جاتے۔ یہ تو پیغمبر کے خلاف پروپیگنڈے کی نہایت عیارانہ مہم ہوئی۔

یہاں 'یُرْضُوْہُ' میں واحد کی ضمیر بھی قابل لحاظ ہے۔ چونکہ اللہ اور رسول کی رضا ایک ہی ہے اس وجہ سے ضمیر واحد آئی ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّہٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاَنَّ لَہٗ نَارَ جَہَنَّمَ خَالِدًا فِیْہَا ذٰلِکَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ (۶۳)

'مُحَادَّۃ' کے معنی کسی کے مقابل میں دشمن بن کر اٹھنے کے ہیں۔ 'فَاَنَّ' کا عطف 'اَنَّہٗ' پر ہے۔

منافقین کو عذاب کی دھمکی

یہ منافقین کے مذکورہ بالا پروپیگنڈے پر ان کو دھمکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے جرم پر اللہ سے معافی مانگنے اور رسول کو راضی کرنے کی جگہ انھوں نے جھوٹی قسموں کے بل پر مسلمانوں کے اندر اپنی معصومیت کی جو مہم چلا رکھی ہے اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے خلاف جو پارٹی انھوں نے بنائی ہے اس کو مزید مستحکم کریں تاکہ اپنا کام زیادہ مؤثر طریقے پر کر سکیں۔ کیا اتنی طویل تذکیر و تبلیغ کے بعد بھی ان پر یہ حقیقت واضح نہ ہو سکی کہ جو لوگ اللہ اور رسول کے حریف بن کر کھڑے ہوتے ہیں ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ بہت بڑی رسوائی ہے۔ 'ذٰلِکَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ' میں لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ آج کی رسوائی سے اپنے کو بچانے کے لیے جو کھیل یہ کھیل رہے ہیں بالفرض یہ اس میں کامیاب بھی ہو جائیں تو آخر اس سب سے بڑی رسوائی سے اپنے کو بچانے کی کیا تدبیر کریں گے۔

یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَیْہِمْ سُوْرَۃٌ تُنَبِّئُہُمْ بِمَا فِیْ قُلُوْبِہِمْ ط قُلِ اسْتَہْزِءُوْا اِنَّ اللّٰہَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ (۶۴)

'حَذِرَ یَحْذَرُ' کے معنی خائف اور چوکنے ہونے کے ہیں۔ 'تُنَزَّلَ عَلَیْہِمْ'، 'تُقْرَءَ عَلَیْہِمْ' کے مفہوم میں ہے یعنی انھیں پڑھ کر سنا دی جائے۔

منافقین کو پردہ دری کا اندیشہ

منافقین نے مسلمانوں کے سامنے صفائی پیش کرنے کی جو مہم شروع کی تھی یہ اس کا پس منظر سامنے لایا جا رہا ہے کہ اب تک قرآن کے رویہ پر جو تنقید ہوئی تھی وہ اشارات کے انداز میں تھی کہ ان کا زیادہ فضیحتا نہ ہوا اور یہ اصلاح کرنا چاہیں تو اصلاح کر لیں لیکن اس سورہ میں ان کو لب و لہجہ بدلا ہوا جو نظر آیا ہے اور ان کی نجی کی مجلسوں کے بعض اسرار جو زیر بحث آئے ہیں تو وہ گھبرا اٹھے ہیں کہ مبادا کوئی ایسی سورہ نازل ہو جائے جو ان کے سارے اسرار و دروں پردہ بے نقاب کر کے رکھ دے۔ چنانچہ

اسی اندیشے کے پیش نظر جھوٹی قسموں کے سہارے انھوں نے یہ اپنی صفائی کی مہم چلائی ہے۔ فرمایا کہ ان کو خبردار کردو کہ اب تمھاری یہ پیش بندی کچھ کارگر ہونے والی نہیں۔ اللہ و رسول اور اللہ کی آیات کا جتنا مذاق اڑانا ہے اڑا لو۔ اب وقت آگیا ہے کہ جن چیزوں کے بے نقاب ہونے سے تم ڈر رہے ہو اللہ ان سب کو بے نقاب کر کے رہے گا۔ یہ امر واضح رہے کہ یہ سورہ جس طرح مشرکین اور اہل کتاب کے باب میں خاتمۂ بحث کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح منافقین کے باب میں بھی یہ فیصلہ کن سورہ ہے۔ اس میں، جیسا کہ آگے کے مباحث سے واضح ہو جائے گا، ان کو پوری طرح ننگا کر دیا گیا ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ (۶۵)

خوض کا مفہوم

'خوض' کے اصل معنی تو دریا وغیرہ میں گھسنے کے ہیں لیکن بات کے تعلق سے یہ آئے تو اس کا مفہوم بال کی کھال ادھیڑنا بھی ہو سکتا ہے اور ایک بات سے دوسری اور دوسری سے تیسری بات نکالتے ہوئے کہیں سے کہیں جا نکلنا بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے ترجمہ میں سخن گستری کا لفظ اختیار کیا ہے۔

ایک اور عذر گناہ بدتر از گناہ

یہ منافقین کے ایک اور عذر گناہ بدتر از گناہ کی مثال پیش کی گئی ہے کہ اگر تم ان سے اس استہزا کی بابت دریافت کرو گے جو وہ اپنی مجالس میں اللہ اور رسول کا کرتے ہیں تو جھٹ جواب دیں گے معاذ اللہ استہزا! ہم تو بس کچھ ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے! قرآن نے ان کو یہیں سے دھر لیا کہ 'أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ' کیا اب تمھاری ہنسی دل لگی اور مشق سخن گستری کے لیے اللہ، اس کی آیتیں اور اس کا رسول ہی رہ گئے ہیں، بازی بازی با ریش بابا ہم بازی!

لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ۚ إِن نَّعْفُ عَن طَائِفَةٍ مِّنكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ (۶۶)

آیات الٰہی کا استہزا کفر ہے

یعنی باتیں نہ بناؤ۔ تمھارا یہ عذر گناہ تمھارے گناہ سے بھی بدتر ہے۔ اگر کوئی گروہ اللہ اور اس کی آیات کو ہنسی دل لگی کا کھلونا بنا لے تو اس کے مجرم ہونے کے لیے اور کیا چاہیے؟ یہ تو صریحاً ایمان کے اظہار کے بعد کفر کا اعلان ہے۔ تم نے ایمان کا دعویٰ کیا تھا تو اس کا حق تو یہ تھا کہ اپنے عمل سے اس کا ثبوت فراہم کرتے لیکن عمل سے تم نے ثبوت فراہم کیا ہے کفر کا اس لیے کہ اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کا استہزا کفر ہے۔ انعام آیت ، ، کے تحت اس مسئلہ پر گفتگو ہو چکی ہے۔

منافقین کی بعض خطرناک ٹولیاں

'إِن نَّعْفُ عَن طَائِفَةٍ .... الآیۃ' اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ منافقین کی بہت سی ٹولیاں تھیں جن کے نفاق کی نوعیتیں اور ان کے شر و فساد کے درجے مختلف تھے۔ ان کی بعض ٹولیاں، جیسا کہ آگے اسی سورہ میں واضح ہو گا، نہایت خطرناک تھیں۔ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان

پہنچانے کے لیے ایسی ایسی چالیں چلیں کہ ان میں سے ایک چال بھی اگر کامیاب ہو جاتی تو کھلے معاندین کی تمام چالوں پر بھاری ہوتی۔ ایسی ہی بعض ٹولیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر ہم نے تمھاری بعض ٹولیوں سے اس دنیا میں درگزر بھی کر لیا اور ان کے معاملے کو آخرت ہی پر اٹھا رکھا تو بعض ٹولیاں تو لازماً اسی دنیا میں ہمارے عذاب کی زد میں آئیں گی اور ہم ان کے جرائم کی پاداش میں ان کی بیخ کنی کر کے رہیں گے۔ چنانچہ آگے اسی سورہ میں مسجد ضرار کے بانیوں اور بعض دوسرے گروہوں کا ذکر آئے گا۔ اور ان کا جو حشر ہوا وہ بھی بیان ہوگا۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۶۷-۷۰)

اسلامی معاشرہ کی تطہیر منافقین سے

اب تک منافقین اپنے دعوائے ایمان کے سبب سے مسلمانوں کے ساتھ رلے ملے ہوئے تھے۔ یہ پہلی بار ان کی علامتیں بتا کر ان کو اہل ایمان سے چھانٹ کر الگ اور دنیا اور آخرت دونوں ہی اعتبار سے ان کو مسلمانوں کے بجائے کفار و مشرکین کا شریک و سہیم قرار دیا گیا ہے۔ یہ منافقین کو بھی تنبیہ ہے کہ وہ اپنے کو مسلمانوں کے اندر گھسائے رکھنے کی کوشش نہ کریں۔ اور مسلمانوں کو بھی آگاہی ہے کہ وہ اس رنگ کی بھیڑوں کو اپنے گلے میں شامل نہ ہونے دیں۔ یہ گویا اسلامی معاشرہ کی غیر مطلوب عناصر سے تطہیر کی راہ میں پہلا قدم ہے اور یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح مسلمانوں نے کفار و مشرکین اور اہل کتاب سے اعلان براءت کر دیا ہے اسی طرح اپنے اندر کے ان نام نہاد مسلمانوں کو بھی چھانٹ کر الگ کریں جو اپنے اعمال و اخلاق میں انہی کفار و مشرکین کے ہم رنگ ہیں۔

منافقین اور منافقات دونوں کا ایک ہی انجام

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ، یہاں منافقین کے ساتھ منافقات کا بھی ذکر تصریح کے ساتھ فرمایا ہے اور دونوں کو برابر کا شریک جرم قرار دیا ہے تاکہ ان کو بھی تنبیہ ہو کہ جو انجام ان کے مردوں کا ہونے والا ہے وہ بھی اس سے بچنے والی نہیں ہیں اگر انھوں نے اپنے کو خدا کے غضب سے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ دین کے معاملے میں تبعیت اور ماتحتی کوئی عذر نہیں ہے بلکہ اپنی نجات کے لیے جدوجہد ہر نفس کی، مرد ہو یا عورت، خود اپنی ذمہ داری ہے۔ اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے

کہ اس نفاق کے کھیل میں عورتوں کا بھی نمایاں حصہ تھا خاص طور پر اس پہلو سے کہ جان اور مال کی محبت نفاق کے اولین اسباب میں سے ہے اور اس محبت کو مردوں پر مستولی کرنے میں سب سے زیادہ ہاتھ عورتوں کا ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ بیوی بچے آدمی کو بخیل اور بزدل بنا چھوڑتے ہیں۔ اوپر جن منافقین کا ذکر گزرا ہے ان کی اصل بیماری یہی بتائی گئی ہے کہ مال و اولاد کی محبت دین کے تقاضوں کے مقابل میں ان پر غالب آگئی ہے۔

منافقین کی ہر بات دین کے برعکس

يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ۔ یعنی ان کی ہر بات دین کے برعکس ہے۔ جن چیزوں کے لیے لوگوں کو ابھارنا چاہیے ان سے یہ لوگوں کو روکتے ہیں اور جن چیزوں سے روکنا چاہیے ان کے لیے لوگوں کو ورغلاتے ہیں۔ بخل کے سبب سے خود اپنی مٹھیاں بھی بھینچے رہتے ہیں اور اللہ کے جو بندے اپنی گاڑھی کمائی میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان پر بھی فقرے اور پھبتیاں چست کر کے ان کی دل شکنی کرتے ہیں۔

منافقین کی بے توفیقی کا اصلی سبب

نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ۔ یہ ان کی اس بے توفیقی اور محرومی کا سبب بیان ہوا ہے کہ یہ الٹی چال یہ اس لیے چل رہے ہیں کہ یہ خدا کو بھلا بیٹھے ہیں اور سنت الٰہی، جیسا کہ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ... الآیۃ والی آیت میں بیان ہوئی ہے، یہ ہے کہ جو لوگ خدا کو بھلا بیٹھتے ہیں ان پر ایک شیطان مسلط ہو جاتا ہے جو ان کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ پھر ایسے لوگوں کو خدا بھی بھلا دیتا ہے۔ "بھلا دیتا ہے" یعنی ان کو نظر انداز اور توفیقِ خیر سے محروم کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور رہنمائی انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اس کو یاد رکھتے ہیں۔

اصلی غدار

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ فاسق یہاں بدعہد اور نافرمان کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ان منافقوں کو ان کے اظہارِ اسلام کی بنا پر کوئی یہ نہ خیال کرے کہ یہ تو بہر حال یہ اسلام کے نام لیوا۔ یہ اسلام کے نام لیوا نہیں بلکہ اصلی عہد شکن اور غدار یہی ہیں۔ انھوں نے سمع و طاعت کا عہد کر کے اس کو توڑا ہے اور اسلام کا کلمہ پڑھ کر اس کی بیخ کنی کی کوشش کی ہے۔ اس وجہ سے بدعہدی اور غداری میں جو درجہ ان کا ہے کسی کا بھی نہیں۔

غداروں کا انجام

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا۔ یہ ان کا آخرت میں انجام بیان ہوا ہے کہ یہ اسلام کے مدعی ہونے کے سبب سے کسی رعایت کے مستحق نہیں ہوں گے بلکہ جس طرح کھلے ہوئے کفار جہنم میں ہمیشہ کے لیے جھونک دیے جائیں گے اسی طرح اسلام کے یہ غدار جہنم میں ہمیشہ کے لیے جھونک دیے جائیں گے۔ هِيَ حَسْبُهُمْ۔ یعنی یہ جہنم ہی ان کا کچومر نکال دینے کے لیے کافی ہوگی۔ مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ۔ یعنی اللہ کی طرف سے ان پر لعنت ہو جائے گی جس کے نتیجے میں

امید کے سارے دروازے ان پر بند ہو جائیں گے۔ ایک دائمی عذاب ان پر مسلط ہو گا جس سے کبھی بھی ان کو رہائی نصیب نہیں ہو گی۔

منافقین کو براہ راست دھمکی

'کَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ' یہ دھمکی ہے جو منافقین کو براہ راست مخاطب کر کے دی گئی ہے جس سے اس میں زیادہ شدت پیدا ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ مال و اولاد کی کثرت جو تمہارے حصہ میں آئی ہے اس سے یہ غرہ نہ ہو کہ خدا کی نظروں میں تمہارا رویہ مبغوض نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس نے تم کو یہ کچھ دے رکھا ہے۔ تم سے پہلے جو قومیں گزری ہیں ان کو تم سے بھی زیادہ اللہ نے دے رکھا تھا۔ لیکن کیا ہوا؟ ان کے لیے اس دنیا سے جتنا فائدہ اٹھانا مقدر تھا جب انھوں نے اتنا فائدہ اس سے اٹھا لیا تو خدا نے ان کو ہلاک کر دیا۔ انہی کی طرح تم نے بھی اپنے حصہ سے فائدہ اٹھا لیا اور انہی کی طرح کی موشگافیاں اور لاالفضولیاں بھی کر چکے تو تمہاری تباہی کی ساعت بھی آئی کھڑی ہے۔ جس طرح ان کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ڈھے گئے اور وہ نامراد ہوئے اسی طرح تمہارے اعمال بھی دنیا اور آخرت میں ڈھے جائیں گے اور تم بھی نامراد ہو گے۔ مطلب یہ کہ مال و اولاد کو نہیں، اپنے اعمال کو دیکھو۔ مال و اولاد تو خدا شریروں اور بدبختوں کو بھی دے دیتا ہے۔ اس کے فیصلے اعمال و کردار پر صادر ہوتے ہیں۔

اقوام ہالکہ کے انجام کا حوالہ

'اَلَمْ یَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ..... الایۃ' یہ اوپر والی آیت کے اجمال کی تفصیل ہے۔ جن قوموں کی طرف اشارہ فرمایا تھا ان کا حوالہ دے دیا۔ ان تمام اقوام کی سرگزشتیں سورۂ اعراف میں بیان ہو چکی ہیں۔ قوم ابراہیم سے مراد ان کی وہ قوم ہے جس کو انھوں نے توحید کی دعوت دی، پھر ان سے مایوس ہو کر اللہ کے حکم سے انھوں نے ہجرت فرمائی۔ 'مُؤْتَفِکٰت' سے مراد قوم لوط کی بستیاں ہیں۔ اس لفظ سے ان بستیوں کی تعبیر کی وجہ دوسرے مقام میں واضح ہو چکی ہے۔ فرمایا کہ یہ قومیں جو تباہ ہوئیں تو اس وجہ سے نہیں کہ اللہ نے ان پر کوئی ظلم کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ اللہ نے ان پر حجت تمام کرنے کے لیے اپنے رسول بھیجے لیکن انھوں نے ان کو جھٹلایا اور اپنی سرکشی پر اڑی رہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے ان کو تباہ کر دیا۔ مطلب یہ کہ اس سرگزشت کا اعادہ تمہارے ذریعہ سے ہونے والا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۘ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَیُطِیْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِکَ سَیَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَمَسٰکِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَکْبَرُ ؕ ذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۷۱-۷۲)

منافقین اور منافقات کا کردار واضح کرنے کے بعد اب یہ مومنین اور مومنات کا کردار واضح کیا جا رہا ہے۔ ان کی بابت فرمایا تھا کہ ان کے مرد اور عورتیں سب ایک ہی چٹے کے بٹے ہیں، نفاق کی پرورش میں دونوں کی سرگرمیاں یکساں ہیں۔ ان کی بابت فرمایا کہ یہ ایمان کے مقتضیات و مطالبات کی تعمیل و تکمیل میں ایک دوسرے کے ساتھی، دست و بازو اور ہمدرد و غم گسار ہیں۔ مومن بندے جب اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کے لیے نکلتے ہیں تو مومنہ بندیاں ان کے پاؤں کی زنجیر اور گلے کا پھندا بننے کی کوشش نہیں کرتیں بلکہ سچے دل سے ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور اپنے ایثار، اپنی دعاؤں اور اپنی بے لوث وفاداری اور امانت داری سے ان کے جہاد میں تعاون کرتی ہیں اور اس طرح خود بھی اجر و ثواب میں شریک بنتی ہیں۔

مومنین اور مومنات کا کردار

منافقین اور منافقات کا حال یہ ہے کہ منکر کا حکم دیتے اور معروف سے روکتے ہیں، برعکس ان کے مومنین اور مومنات معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہیں۔

منافقین اور منافقات انفاق سے اپنے ہاتھ روکے ہوئے ہیں اور اللہ کو انھوں نے بھلا رکھا ہے لیکن مومنین اور مومنات کا حال یہ ہے کہ 'يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ' وہ نماز کا اہتمام کرتے ہیں جو ذکر الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے 'وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ' زکوٰۃ ادا کرتے ہیں جو آدمی کے ہاتھ کو راہ خدا میں انفاق کے لیے کھولتی اور اس کے بخل کو دور کرتی ہے۔

منافقین اور منافقات کا حال یہ ہے کہ وہ بدعہد اور غدار ہیں 'اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ' برعکس اس کے مومنین اور مومنات کا حال یہ ہے کہ 'يُطِيعُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ' اللہ اور رسول سے سمع و طاعت کا جو عہد انھوں نے باندھا ہے ہر مرحلہ میں پوری راستبازی اور کامل وفاداری سے اس کو نباہ رہے ہیں۔

'سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ' ظاہر ہے کہ جب اللہ کے ساتھ دونوں کا معاملہ الگ الگ ہے تو اللہ کا معاملہ بھی دونوں کے ساتھ مختلف ہے۔ منافقین اور منافقات کے لیے اوپر لعنت مذکور ہوئی ہے، اس کے مقابل میں مومنین اور مومنات کے لیے اللہ کی رحمت ہے۔ خدا عزیز اور حکیم ہے۔ اس کی قدرت اور حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا ہر معاملہ عدل اور رحمت پر مبنی ہو۔ حرف 'س' اس رحمت کے ظہور کی قربت کی بشارت ہے کہ اب اس میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ ظاہر ہی ہوا چاہتی ہے۔

'وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ ... الاٰية' یہ آیت اوپر کی آیت ۶۸ کے مقابل میں ہے۔ اس میں وعید منافقین اور منافقات کے لیے مذکور ہوئی۔ اس میں اللہ کا وعدہ مومنین اور مومنات کے لیے بیان ہوا ہے۔ لفظ 'رضوان' اور لفظ 'عدن' پر دوسرے مقام میں بحث گزر چکی ہے۔ یہاں یہ اس لعنت کے مقابل میں ہے جو اوپر منافقین کے لیے مذکور ہے۔ جس طرح لعنت تمام نقمتوں اور ابدی محرومیوں کی ایک جامع

مومنین اور مومنات کے لیے اللہ کا وعدہ

تعبیر ہے، اسی طرح 'رضوان' تمام رحمتوں اور لازوال و بے پایاں نعمتوں اور مسرتوں کی ایک جامع تعبیر ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ یہ بہت بڑی چیز اور بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس آیت کو پڑھتے ہوئے اوپر 'اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ' کے ٹکڑے کو پیش نظر رکھیے۔ تقابل نظم کے کھولنے اور حقائق کی توضیح میں بہت معین ہوتا ہے۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۷۳-۸۰

آگے کی آیات میں پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ یہ منافقین تمہاری نرمی، کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ چھیڑتے ہوتے ہیں۔ اب ان کے بارے میں اپنا رویہ سخت کرو تاکہ درست ہونا ہو تو یہ درست ہوں ورنہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔ یہ اپنی مجلسوں میں کفریہ کلمات بکتے اور جھوٹی قسموں سے تم کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے ارادے نہایت خطرناک تھے لیکن اللہ نے وہ پورے نہیں ہونے دیے۔ اب ان کو مزید مہلت دینے کی گنجائش نہیں۔ اللہ اور رسول نے ان کو اپنے فضل سے جو نوازا تو یہ چیز ان کے لیے شکر گزاری اور ممنونیت کی بجائے شرارت اور اسلام دشمنی کا باعث بن گئی۔ یہ اظہار تو یہ کرتے تھے کہ اللہ نے انھیں مال دیا تو وہ پوری فیاضی سے خدا کی راہ میں خرچ کریں گے لیکن جب اللہ نے انھیں مال دیا تو انھوں نے اللہ اور رسول سے منہ پھیرا اور ان کے اس رویہ نے ان کے دلوں میں نفاق کی جڑیں اتنی مضبوط جما دی ہیں کہ اب وہ اکھڑ نہیں سکتیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہی نہیں کہ یہ خود بخیل بن بیٹھے ہیں بلکہ اللہ کے جو مخلص بندے اپنی گاڑھی کمائی میں سے، خوش دلی اور نیاز مندی سے خرچ کرتے ہیں یہ ان کا بھی مذاق اڑاتے اور ان کی دل شکنی کرتے ہیں تاکہ وہ بھی خرچ کرنے سے رک جائیں۔ ساتھ ہی نہایت شدت کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لیے استغفار کرنے سے روک دیا ہے کہ اب یہ تمہاری طرف سے اس رأفت و رحمت کے سزاوار نہیں رہے بلکہ ہر پہلو سے شدت ہی کے سزاوار ہیں ـــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات
۸۰-۷۳
يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ
قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا
لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ

فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ
اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِى الْاَرْضِ
مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٧٤﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ
فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ
مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٧٦﴾ فَاَعْقَبَهُمْ
نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا
وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿٧٧﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ
سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿٧٨﴾ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ
الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِى الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ
اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿٧٩﴾ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ
سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٨٠﴾ ع ١٠ ٨ ١٦

ترجمۂ آیات ۷۳-۸۰ اے نبی کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان پر سخت بن جاؤ۔ اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت ہی برا ٹھکانا ہے۔ یہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے نہیں کہا حالانکہ انھوں نے کفر کا کلمہ کہا اور اپنے اسلام کے اظہار کے بعد کفر کا ارتکاب کیا اور انھوں نے وہ چاہا جو وہ نہ پا سکے۔ ان کا یہ عناد صلہ ہے صرف اس بات کا کہ اللہ اور اس کے رسول نے ان کو اپنے فضل سے غنی کیا۔ اگر یہ توبہ کرلیں تو ان کے

لیے بہتر ہے اور اگر یہ اعراض کریں گے تو خدا ان کو دردناک عذاب دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور زمین میں نہ کوئی ان کا یار ہو گا نہ مددگار۔ ۷۳-۷۴

اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل سے نوازا تو ہم خوب صدقہ کریں گے اور خوب نیکیاں کرنے والوں میں سے ہوں گے تو اللہ نے جب ان کو اپنے فضل میں سے عطا فرمایا تو وہ اس میں بخیل بن بیٹھے اور برگشتہ ہو کر منہ پھیر لیا۔ تو اس کی پاداش میں خدا نے ان کے دلوں میں اس دن تک کے لیے نفاق جما دیا جس دن وہ اس سے ملیں گے بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کی اور بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے۔ کیا انھیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ ان کے راز اور ان کی سرگوشی کو جانتا ہے اور اللہ تمام غیب کو جاننے والا ہے۔ ان لوگوں کی سرگوشیوں کو جو خوش دلی سے انفاق کرنے والے اہل ایمان پر ان کے صدقات کے باب میں نکتہ چینی کرتے ہیں اور جو غریب صرف اپنی محنت مزدوری ہی سے انفاق کرتے ہیں تو ان پر پھبتیاں چست کرتے ہیں۔ اللہ نے ان کا مذاق اڑایا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو۔ اگر تم ان کے لیے ستر بار بھی مغفرت چاہو گے تو بھی اللہ ان کو بخشنے والا نہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اللہ بدعہدوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ۷۵-۸۰

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ‎(۷۳)

اصلاً تو یہاں مقصود صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی تاکید ہے کہ آپ اپنا رویہ منافقین کے باب میں یکسر تبدیل کرلیں اور شدت کے ساتھ ان کا احتساب کریں لیکن ساتھ ہی کفار کا بھی حوالہ دے دیا ہے جس سے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اب یہ منافقین مسلمانوں کے زمرہ کے لوگ نہیں ہیں بلکہ یہ بھی کفار ہی کے زمرہ میں شامل ہیں۔ جہاد کا لفظ قتال اور شدت احتساب و دار و گیر سب پر حاوی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کے ساتھ اس نوعیت کا جہاد کرو جس کا تمہیں اعلانِ براءت کے تحت تفصیل سے حکم دیا جا چکا ہے اور ان منافقین کے ساتھ احتساب اور دار و گیر کا جہاد کرو۔ 'وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ' اسی احتساب اور دار و گیر کی وضاحت ہے۔ یعنی اب تک تم نے ان کے ساتھ نرمی اور رأفت کا جو رویہ رکھا اس کی قدر انھوں نے نہیں پہچانی۔ یہ تمہاری کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر اپنی شرارتوں میں اور دلیر ہوتے چلے گئے۔ جھوٹے بہانوں اور جھوٹی قسموں کو انھوں نے اپنے لیے سپر بنا رکھا ہے اور تم اپنی طبیعت کی نرمی کے سبب سے ان کی چالوں سے آگاہ ہونے کے باوجود طرح دے جاتے ہو۔ اب اس کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اب ان کو اچھی طرح کسو اور ہر معاملے میں سخت کسوٹی پر پرکھو تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ جھوٹ اور فریب کی نقاب ان کے چہروں پر باقی رہنے والی نہیں ہے۔ اب یا تو انھیں مسلمانوں کی طرح مسلمان بن کر رہنا ہوگا یا اس انجام سے دوچار ہونا پڑے گا جو کفار کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ آیت ۴۳ 'عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ..... الاٰية' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے اس لیے کہ یہ ہدایت اسی کی توضیح مزید ہے۔

'وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ' یعنی اس دنیا میں یہ تمہاری اور اہل ایمان کی سختی اور سخت گیری کے سزاوار ہیں اور اس کے بعد ان کا ٹھکانا جہنم ہے جو نہایت برا ٹھکانا ہے۔ اس لیے کہ اس پر ایسے سخت گیر ملائکہ مامور ہیں جو ذرا بھی نرمی نہیں برتیں گے بلکہ ان کے باب میں خدا کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ (التحریم-۶)

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۷۴)

منافقین کا جھوٹ اور کفر غلیظ

'يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا'۔ اوپر آیت ۶۵ میں گزر چکا ہے کہ منافقین اپنی مجالس میں اللہ کا، اس کی آیات کا اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے لیکن جب ان سے پوچھ گچھ ہوتی تو اصل بات گول کر جاتے اور قسم کھا کر اطمینان دلاتے کہ ہم نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کہی، ہم تو محض ہنسی دل لگی کر

رہے تھے۔ فرمایا کہ ان کی یہ قسمیں جھوٹی ہیں۔ یہ کفر کا کلمہ بکتے ہیں اور پوچھ گچھ ہوتی ہے تو مکر جاتے ہیں ـــــ اوپر والی آیت میں ان کو زمرۂ کفار میں جو شامل کیا ہے یہ گویا اس کی دلیل بیان ہوئی ہے۔

وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ۔ یہ ان کے جرم کی سنگینی کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اظہار تو اسلام کا کیا لیکن اپنے اس استہزا سے ارتکاب کفر کا کیا۔ یہ امر واضح رہے کہ دعویٰ اسلام کا کرنا اور عمل سے اثبات کفر کا کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک صریح کفر سے زیادہ مبغوض ہے اس لیے کہ اس میں کفر کے ساتھ اللہ اور رسول اور اہل ایمان کے ساتھ دھوکا بازی بھی شامل ہو جاتی ہے جو کھلے ہوئے کفر میں نہیں ہوتی اسی حقیقت کی طرف سورۂ صف میں یوں اشارہ فرمایا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (اے ایمان والو، تم اس چیز کا دعویٰ کیوں کرتے ہو جو کرتے نہیں، اللہ کے نزدیک یہ بات زیادہ مبغوض ہے کہ تم جو کرتے نہیں اس کا دعویٰ کرو) اسی بنا پر منافقین، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے

منافقین سب سے نیچے

دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔

منصوبوں میں ان کی نامرادی

وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا۔ یہ دو لفظوں میں نہایت بلاغت کے ساتھ ان کے تمام خبیثانہ منصوبوں اور ساتھ ہی ان کی محرومیوں اور ناکامیوں کی طرف اشارہ فرما دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا بس چلتا تو انھوں نے تو وہ منصوبے بنائے تھے کہ اسلام کی جڑ ہی اکھاڑ کے پھینک دیتے لیکن اللہ نے ان کے ارادوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ آیت ۶۵ کے تحت ہم منافقین کی بعض فتنہ پردازیوں اور شرارتوں کا ذکر کر چکے ہیں اور آگے ان کی مزید شرارتوں کا ذکر آئے گا لیکن ہر موقع پر انھوں نے منہ کی کھائی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر موقع پر ان کا راز فاش کر دیا۔

منافقین کی کمینگی اور ناسپاسی

وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ۔ یہ ان کی تنگ ظرفی اور کمینگی کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ و رسول نے تو ان پر احسان فرمایا لیکن انھوں نے اس احسان کا یہ حق ادا کیا کہ اللہ اور رسول کا مذاق اڑاتے اور رات دن اسلام کی بیخ کنی کی سازش کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مدینہ کے عام لوگ اسلام سے پہلے بیشتر نہایت غریب تھے۔ اسلام کے بعد جب فتوحات کے دروازے کھلے تو یوں تو بحیثیت مجموعی سب ہی کے حالات بدل گئے لیکن خاص طور پر منافقین کے تو دن پھر گئے۔ اول تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دلداری کے خیال سے ان کو دیتے بھی زیادہ تھے، دوسرے وہ [illegible] کے سبب سے لیتے بھی سو بہانوں سے تھے۔ مزید براں ان کے پاس صرف لینے ہی والے ہاتھ تھے دینے والے ہاتھ سرے سے تھے ہی نہیں۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کوئی موقع آیا تو، اوپر بھی ذکر ہوا اور آگے بھی تفصیل آ رہی ہے، صاف کترا جاتے۔ اس طرح یہ لوگ مال دار بن گئے، اور اس مال داری کا صلہ اسلام کو، جس کے نام پر وہ مال دار بنے، انھوں نے یہ دیا کہ [illegible] کے خلاف سازشیں اور ریشہ دوانیاں

کرتے رہے۔

فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ..... الاٰیۃ یہ ان کو دھمکی ہے کہ اگر یہ توبہ کر لیں تو انہی کے حق میں بہتر ہے ورنہ یاد رکھیں کہ خدا انھیں دنیا میں بھی عذاب دے گا اور آخرت میں بھی۔ یہ دنیا میں اس عذاب میں حصہ دار ہوں گے جو کفار و مشرکین کے لیے مقدر ہو چکا ہے اور آخرت میں بھی انہی کے ساتھی ہوں گے اور یہ بھی اچھی طرح یاد رکھیں کہ اس سرزمین پر ان کا کوئی یار ہوگا نہ مددگار۔ جن کے ساتھ ان کا ساز باز ہے ان سب پر عنقریب نفسی نفسی کا وہ وقت آنے والا ہے کہ وہ خود اپنی مدد نہیں کر سکیں گے تو ان کی مدد وہ کیا کریں گے۔

منافقین کو دھمکی

وَمِنْهُم مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِن فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰىهُم مِّن فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعْرِضُوْنَ ۝ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (۷۵-۷۷)

وَمِنْهُم مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِن فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰىهُم مِّن فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعْرِضُوْنَ۔ یہ انہی اسلام کی بدولت مال دار بنے ہوئے کچھ لوگوں کی طرف اشارہ ہے کہ جب یہ غریب تھے تو اس وقت ان کا حال یہ تھا کہ ہر جگہ یہ اپنے اس شوق اور اس تمنا کا اظہار کرتے پھرتے تھے کہ اگر ہمارے حالات بھی اللہ نے سدھار دیے تو ہم بھی خدا کی راہ میں خوب خرچ کریں گے اور دین کی بڑی بڑی خدمتیں کر کے صالحین میں اپنا نام روشن کریں گے لیکن جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کی تمنا پوری کر دی اور دینے کا وقت آیا تو اس طرح منہ پھیر کر چل دیے ہیں گویا اللہ اور رسول سے کبھی ان کا کوئی قول و قرار تھا ہی نہیں۔ چل دینا کبھی اس نوعیت کا ہوتا ہے جس کے بعد مڑ کے آنے کی توقع ہوتی ہے لیکن یہاں تَوَلَّوا کے بعد وَّهُم مُّعْرِضُوْنَ کی قید نے یہ واضح کر دیا کہ انفاق کا نام سن کر وہ اس طرح چل دیتے ہیں کہ پھر مڑ کے دیکھتے بھی نہیں۔

اسلام کی بدولت مال دار بننے والوں کی کمزوری

یہ انسان کی عجیب کمزوری ہے کہ جب تک ایک چیز اس کو حاصل نہیں ہوتی اس وقت تک تو یہ تمنا کرتا ہے کہ اگر مجھے یہ حاصل ہو جائے تو دوسروں کی طرح اس کو کسی غلط مصرف میں ضائع نہیں کروں گا بلکہ اس کو فلاں اور فلاں اعلیٰ مقاصد میں صرف کر کے نیکی اور عدل کی ایک نظیر قائم کر دوں گا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ اس کو وہ چیز دے دیتا ہے تو اسے یہ بات یاد بھی نہیں رہتی کہ اسی چیز کے لیے اس نے اپنے رب سے دل میں کیا کیا قول قرار کیے ہیں اور کس کس طرح اپنی تمناؤں کا اظہار کیا ہے بلکہ اس کو اپنی قابلیت اور اپنے استحقاق کا ثمرہ سمجھ کر وہ اس کا مالک بن بیٹھتا ہے اور خدا سے زیادہ اس کو شیطان کے لیے استعمال کرتا ہے۔ بہت کم خوش قسمت ایسے نکلتے ہیں جو نعمت پا کر منعم کا حق پہچانیں اور اس کو صحیح صحیح استعمال کریں۔

فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ' - اعقاب' کے معنی ایک شے کے بعد دوسری چیز کو اس کے ثمرہ اور نتیجے کے طور پر ظہور میں لانا ہے۔

نفاق کی جڑ جمانے والا عمل

یعنی جن لوگوں نے اللہ سے اپنے کیے ہوئے وعدے کی اس طرح خلاف ورزی کی اور برابر جھوٹ بولتے رہے۔ خدا نے ان کے اس عمل کی پاداش میں ان کے دلوں کے اندر نفاق کی ایسی جڑ جما دی ہے جو خدا کی ملاقات کے دن تک اسی طرح جمی رہے گی اور اسی وقت اکھڑے گی جب جزائے اعمال کا مرحلہ بالکل سامنے ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے نفاق کی رضاعت و پرورش پر ایک مدت صرف کر دی ہے۔ یہ چیز اتفاقاً ان کے اندر نہیں گھس آئی ہے بلکہ ان کے ایک دانستہ نقض عہد اور طویل جھوٹ اور فریب کا مولود فساد ہے جس سے ان کی جان اب مر کے ہی چھوٹے گی۔ یہ توقع نہ رکھو کہ ان کو توبہ اور اصلاح کی توفیق ہوگی۔ اب تو ان کے دلوں کا یہ کثیف پردہ اسی وقت ہٹے گا جب یہ اصل حقیقت کو سورج کی طرح سامنے دیکھ لیں گے۔ اسی سے ملتی جلتی بات آگے مسجد ضرار کے بانیوں سے متعلق فرمائی ہے۔ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَن تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ - ۱۱۰ (یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ان کے دلوں میں ہمیشہ شک کی تعمیر بن کر جمی رہے گی۔ الا آنکہ ان کے دل پارہ پارہ ہو جائیں اور اللہ علیم و حکیم ہے)۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَأَنَّ اللَّهَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۷۸-۷۹)

منافقین کی بلادت

'أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ' یہ اسلوب کلام استعجاب اور حسرت کے اظہار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اتنی طویل تعلیم و تربیت، ایسی مسلسل سعی تطہیر و تزکیہ اور اتنے بے شمار حقائق کے انکشاف کے بعد بھی کیا یہ لوگ اتنے کند اور غبی ہیں کہ اتنی موٹی سی بات بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ خدا ان کے سارے راز اور ساری سرگوشیوں کو جانتا ہے اور اللہ تمام غیب کا عالم ہے۔ یہ بات ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ خدا ہر چیز کو فعلاً بھی جانتا ہے اور صفۃً بھی، اسی وجہ سے یہاں اور اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ قرآن کے دوسرے مقامات میں، خدا کے احاطہ علم کو فعل کے صیغہ سے بھی واضح کیا گیا ہے اور صفت کے صیغہ سے بھی۔ باعتبار نظم یہ آیت آگے والی آیت کی تمہید ہے جس میں ان منافقین کی ان نکتہ چینیوں اور سرگوشیوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے جو وہ مومنین مخلصین کی حوصلہ شکنی کے لیے اپنے حلقوں میں کرتے رہتے تھے۔

'الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ' - 'الَّذِينَ' یہاں میرے نزدیک مجموعاً 'ہم' 'هُمْ'

سے بدل ہے۔ اگرچہ مجھے اس پر پورا جزم نہیں ہے لیکن میں نے ترجمہ میں اسی کا لحاظ رکھا ہے۔ کشاف میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

'مُتَطَوِّع' اور 'مُطَّوِّع' دونوں ایک ہی لفظ ہیں۔ 'مُطَّوِّع' اس کو کہتے ہیں جو صرف فرائض و واجبات ہی ادا کر لینے پر قناعت نہ کرے بلکہ اپنی خوشی اور حوصلہ مندی سے نفلی نیکیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔

'مُطَّوِّع' کا مفہوم

لمز کے معنی عیب لگانا، ہجو کرنا، مذمت کرنا۔

منافقین کا ہمز و لمز

اوپر کی آیات میں یہ بیان ہوا تھا کہ منافقین اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ خود خرچ نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو بھی خدا کی راہ میں خرچ کرتے دیکھ نہیں سکتے۔ جس کو خرچ کرتے دیکھتے ہیں اس کو اپنے ہمز و لمز کا نشانہ بنا لیتے ہیں جو فیاض اور مخلص مسلمان فیاضی اور خوش دلی سے خدا کی راہ میں دیتے ہیں ان کو تو کہتے ہیں کہ یہ ریاکار اور شہرت پسند ہے، اپنی دینداری اور سخاوت کی دھونس جمانے کے لیے ایسا کرتا ہے۔ جو غریب بے چارے کچھ رکھتے ہی نہیں، اپنی محنت مزدوری کی گاڑھی کمائی ہی میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کی حوصلہ شکنی کے لیے ان کا یہ مذاق اڑاتے اور ان پر پھبتیاں چست کرتے ہیں کہ لو آج یہ بھی اٹھے ہیں کہ حاتم کا نام دنیا سے مٹا کر رکھ دیں۔

بخیلوں کی نفسیات کا ایک خاص پہلو

بخیلوں اور کنجوسوں کی نفسیات کا یہ پہلو ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اپنی بخالت پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے ان کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ دوسرے بھی بخیل بنے رہیں۔ نکٹا دوسروں کو بھی نکٹا ہی دیکھنا چاہتا ہے تاکہ اسے کوئی نکٹا کہنے والا باقی نہ رہے۔ یہی نفسیات ان منافقین کی بھی تھی۔ پھر اس سے ان کے اسلام دشمنی کے جذبے کو تسکین ہوتی تھی۔ وہ خود اسلام کے لیے کوڑی خرچ کرنا چاہتے تھے نہ اس پر راضی تھے کہ کوئی دوسرا خرچ کرے۔ اپنی اس خواہش کے برخلاف وہ دوسروں کو جب دیکھتے کہ وہ اسلام کے لیے سب کچھ اس دریا دلی سے لٹا رہے ہیں گویا اپنے ہی گھر بھر رہے ہیں، یہاں تک کہ مزدور اپنی مزدوری ہی میں سے، بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر، اس خوشی سے دیتا ہے گویا اپنی سیر آدھ سیر کھجور یا جو کے عوض دولت کونین خرید رہا ہے تو ان منافقین کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ وہ غصہ سے کھولتے اور حسد سے جلتے، پھر اپنے دل کا بخار طعن و تشنیع، طنز اور پھبتی سے نکالتے۔

اللہ کی ڈھیل

'سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ' اسی طرح کا فقرہ ہے جس طرح بقرہ میں فرمایا ہے 'اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ' یعنی یہ تو اہل ایمان کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن اللہ ان کا مذاق اڑا رہا ہے کہ ان کی رسی دراز کیے جا رہا ہے کہ یہ خوب کھل کھیلیں کرلیں تب ان کو وہاں سے پکڑے جہاں سے پکڑے جانے کا ان کو سان گمان بھی نہ ہو۔

اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِیۡنَ مَرَّۃً فَلَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَهُمۡ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ کَفَرُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِهٖ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ (۸۰)

یہ اسی سختی اور سخت گیری کی تاکید پر مبنی ہے جس کی ہدایت 'وَاغۡلُظۡ عَلَیۡهِمۡ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سراپا رحمت و شفقت تھے اس وجہ سے ان منافقین کی تمام شرارتوں اور فتنہ انگیزیوں کے باوجود ان کی اصلاح اور نجات، آپ کو اس قدر عزیز تھی کہ جس طرح آپ اپنی تمام امت کے لیے برابر خدا سے مغفرت چاہتے رہتے تھے اسی طرح ان کے لیے بھی برابر نجات کی دعا کرتے رہتے لیکن ان کی شقاوت اس درجہ بڑھ گئی کہ یہ اس بات کو بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ کوئی دوسرا اسلام کی کوئی خیر خواہی کرے بلکہ ہر خیر خواہ کے حوصلہ کو پست کرنا انھوں نے اپنا پیشہ ٹھہرا لیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان اشقیا کے لیے استغفار سے روک دیا اور اس شدت و قطعیت کے ساتھ کہ اگر تم ستر بار بھی ان کے لیے استغفار کرو گے جب بھی اللہ ان کو معاف نہیں کرنے کا۔ ظاہر ہے کہ یہاں ستر کا عدد گنتی کو نہیں بلکہ کثرت کو ظاہر کرتا ہے۔ کثرت اور بے پایاں کثرت کے اظہار کے لیے یہ اسلوب عربی میں بھی معروف ہے اور ہماری زبان اردو میں بھی۔

منافقین کے باب میں سخت گیری کی سخت تاکید اور ان کے لیے استغفار کی ممانعت

'ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ کَفَرُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِهٖ' یہ سبب بیان ہوا اس شدت و قطعیت کے ساتھ مغفرت سے محروم ہونے کا۔ یعنی مغفرت تو ان کے لیے ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو ماننے والے ہوں۔ یہ اللہ اور رسول کے ماننے والے کب ہیں کہ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ یہ واضح رہے کہ یہ ان لوگوں کے عدم ایمان کا اعلان ہو رہا ہے جو نہ صرف اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ کرتے تھے بلکہ جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، دکھاوے کی نمازیں بھی پڑھ لیتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی انھیں کرتوتوں کی بنا پر جو اوپر مذکور ہوئیں ان کے ایمان کو تسلیم نہیں کیا۔

منافقین کے کفر کا اعلان

'وَاللّٰہُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ' ہدایت یہاں غایت و مقصد کی ہدایت کے مفہوم میں ہے۔ اس کی وضاحت دوسرے مقام میں ہم تفصیل سے کر چکے ہیں۔ 'فاسق' یہاں بدعہد اور غدار کے مفہوم میں ہے۔ اوپر آیت ۷۴ میں 'کَفَرُوۡا بَعۡدَ اِسۡلَامِهِمۡ' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۸۱-۸۹

غزوہ تبوک کے موقع پر جو منافقین بہانے بنا کر گھروں میں بیٹھ رہے اپنی اس فریب کاری پر بہت خوش تھے۔ ان کے باب میں یہ آیات عین میدان جنگ میں نازل ہوئیں۔ سیاق و سباق بالکل واضح ہے۔

آیات ٨١-٨٩

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا
اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا
لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا
يَفْقَهُوْنَ ﴿٨١﴾ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا
كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَاۗىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ
فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ
تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ۭ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ
فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓي اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ
اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰي قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا
وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا
يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ
وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٨٥﴾ وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ
جَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَ

قَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿٨٦﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ
الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨٧﴾ لٰكِنِ
الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ
وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٨٨﴾
اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ

ع ۱۱ ۱۷ فِيهَا ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٨٩﴾

ترجمۂ آیات ۸۱-۸۹

جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے وہ اللہ کے رسول سے پیچھے بیٹھ رہنے پر بہت مگن ہوئے اور انھوں نے برا جانا کہ وہ اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور انھوں نے کہا کہ اس گرمی میں نہ نکلو۔ کہہ دو دوزخ کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔ کاش وہ سمجھتے ہوتے۔ پس وہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ اپنے کیے کی پاداش میں۔ پس اگر اللہ تم کو ان میں سے کسی گروہ کی طرف پلٹائے اور وہ تم سے جہاد کے لیے نکلنے کی اجازت مانگیں تو کہہ دیجیو کہ تم میرے ساتھ کبھی نہیں نکل سکتے اور میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے نہیں لڑ سکتے تم پہلے بیٹھ رہنے پر راضی ہوئے تو اب بھی پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھو۔ ۸۲-۸۳

اور نہ تم ان میں سے کسی پر جو مرے کبھی جنازے کی نماز پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور وہ بدعہدی کے حال میں مرے اور تم ان کے مال اور اولاد کو کچھ وقعت نہ دو۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ ان چیزوں کے سبب سے ان کو دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں کفر کے حال میں نکلیں۔ اور جب کوئی سورہ اترتی ہے کہ اللہ پر ایمان کا حق ادا کرو اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کے لیے نکلو تو ان میں کے جو مقدرت والے ہیں وہ بھی تمھارے پاس رخصت مانگنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجیے ہم بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ رہیں گے۔ انھوں نے اس بات کو پسند کیا کہ پیچھے رہ جانے والیوں کے ساتھی بنیں۔ اور ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی ہے تو اب وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ البتہ رسول اور جو لوگ

اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں انھوں نے اپنے مال و جان سے جہاد کیا اور یہی ہیں جن کے لیے رحمتیں اور برکتیں ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ان کے لیے اللہ نے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ بڑی کامیابی یہی ہے۔ ۸۴-۸۹

۱۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (۸۱)

'مُخَلَّفُوْنَ' سے مراد

'مُخَلَّف' کے معنی ہیں وہ جو پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ 'مُخَلَّفُوْنَ' سے یہاں ان لوگوں کو مراد لیا گیا ہے جو جھوٹے عذرات پیش کر کے تبوک کی مہم میں شریک ہونے سے گریز کر گئے۔ یہاں قرآن نے ان کے لیے 'مُخَلَّفُوْنَ' کا لفظ استعمال کر کے ان کی اصل حیثیت واضح کر دی ہے کہ بظاہر تو وہ اپنے زعم میں رسول سے رخصت حاصل کیے ہوئے ہیں لیکن حقیقت ہیں وہ پیچھے چھوڑے اور نظر انداز کیے ہوئے لوگ ہیں، ان کے باطن کو بھانپ کر اللہ کے رسول نے، ان کے عذرات لایعنی ہونے کے باوجود، صرف اس وجہ سے ان کی رخصت منظور کر لی کہ ایسے بزدل اور مفسد لوگ اپنے گھروں ہی میں بیٹھیں تو خیر ہے۔ جنگ کے لیے نکلیں گے تو معلوم نہیں کیا کیا فساد مچائیں۔

'خلاف' کا مفہوم

لفظ 'خلاف' قرآن میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک بے ترتیب کے معنی میں مثلاً اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ (۳۳ مائدہ) (یا ان کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ دیے جائیں) دوسرے بعد اور پیچھے کے معنی میں مثلاً وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا (۷۶- اسراء) (تو تیرے پیچھے یہ بھی کچھ زیادہ دیر تک نہ ٹک سکیں گے) یہاں یہ اسی دوسرے معنی میں ہے۔ یعنی یہ لوگ اس بات پر بہت خوش ہیں کہ اللہ کا رسول تو اپنے جان نثاروں کے ساتھ میدانِ جنگ کے لیے روانہ ہوا اور یہ بہانے بنا کر گھروں میں بیٹھے رہنے میں کامیاب ہوئے حالانکہ یہ کوئی خوشی کی بات نہیں بلکہ سوچیں تو ان کی شامت کی دلیل ہے۔ جو بھیڑ گلے یا چرواہے سے پیچھے رہ جاتی ہے شیطان بھیڑیا بن کر اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔

'وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا' الخ، 'فرح' کا ضد ہے۔ یعنی جو بات خوش ہونے کی تھی وہ تو ان کو ناگوار ہوئی

اور جو چیز تمام کرنے کی تھی اس پر پورے نہیں سماتے۔

وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ: یعنی صرف اپنے ہی بیٹھ رہنے پر قانع نہیں ہوئے بلکہ موسم کی شدت کے ڈراوے سنا سنا کر دوسروں کو بھی ورغلانے کی کوشش کی کہ گرمی کا شباب ہے، اس آگ میں اس سفر کے لیے نہ نکلو۔ یہ واضح رہے کہ تبوک کی مہم نہایت گرم موسم میں پیش آئی تھی۔

قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ، یعنی انھیں بتا دو کہ ایسے تن آسانوں عافیت کوشوں کے لیے آگے جہنم کی آگ ہے جس کی گرمی سے اس گرمی کو کوئی نسبت نہیں ہے۔ یہ گرمی سے بھاگ کر جہنم کی آگ میں کودے ہیں۔ کاش یہ اس حقیقت کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے!

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۸۲)

عمل اور جزا دونوں سامنے

یعنی جب یہ موسم کی گرمی سے بھاگ کر جہنم کی آگ میں کودے ہیں تو اپنی اس کرتوت کی پاداش میں حق یہ ہے کہ یہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ لیکن جیسا کہ اوپر والی آیت میں گزرا، یہ فہم و بصیرت سے عاری ہو چکے ہیں اس وجہ سے اپنی اس شامت اور بدبختی پر خوش ہیں گویا انھوں نے کوئی بڑا تیر مارا ہے۔ عام طور پر مفسرین نے یہاں انشاء کو خبر کے معنی میں لیا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ یہاں عمل اور جزا دونوں کو نگاہوں کے سامنے مستحضر کر دیا گیا ہے اس لیے کہ جس کے اندر بصیرت ہو وہ اس دنیا میں اپنے عمل کے آئینے میں اپنی جزا کو بھی دیکھ لیتا ہے اور اس پر اس کا اثر بھی وہی پڑتا ہے جو پڑنا چاہیے البتہ اندھے بہرے لوگ اس سے محروم رہتے ہیں۔

فَإِنْ رَجَعَكَ اللَّهُ إِلَىٰ طَائِفَةٍ مِنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَنْ تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا ۖ إِنَّكُمْ رَضِيتُمْ بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ الْخَالِفِينَ (۸۳)

ان آیات کا موقع نزول اور ان کے اشارات

رَجَعَ لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ اس آیت کے اسلوب بیان سے ایک تو یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ آیتیں تبوک کے سفر کے دوران ہی نازل ہوئی ہیں اس لیے کہ فرمایا ہے کہ اگر تمھیں خدا لوٹائے جو واضح قرینہ اسی بات کا ہے کہ اس سفر سے لوٹائے۔

دوسرا اشارہ یہ نکلتا ہے کہ منافقین کی ان حرکتوں کے سبب سے جو اوپر بیان ہوئی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس درجہ بیزار اور متنفر ہو گئے تھے کہ ان کے منہ دیکھنے کے روادار نہیں رہ گئے تھے۔ حضور کی یہ بیزاری عین اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم ہی کے تحت تھی۔ اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ ہر چند یہ لوگ اس قابل نہیں رہ گئے ہیں کہ تم ان کی شکل دیکھو لیکن اگر اللہ تقدیر سے ان کی کسی ٹولی سے، اس سفر سے واپسی پر، ملا ہی دے اور یہ اپنی کھسیاہٹ مٹانے اور اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے تم سے کسی آیندہ جنگ میں شرکت کی درخواست کریں تو تم ان کی درخواست سختی سے رد کر دینا۔ یہ گویا اس حکم کا ایک پہلو واضح فرمایا گیا ہے جو اوپر آیت ۸۰ میں ان کے ساتھ سخت

رویہ اختیار کرنے کی بابت دیا گیا ہے۔

تیسرا اشارہ اس میں منافقین کے اس گمان کی طرف ہے جو وہ اس موقع پر اپنے دلوں میں رکھتے تھے ان کا گمان یہ تھا کہ اب کے رومیوں کی منظم اور کثیر التعداد فوج سے مقابلہ ہے اس وجہ سے مسلمانوں کو گھر پلٹنا نصیب نہ ہوگا۔ ان کے اسی گمان کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ اگر ان کے گمان اور ان کی خواہش کے علی الرغم خدا تم کو ان کی طرف پلٹا ہی دے۔ اسی قسم کا گمان منافقین کو حدیبیہ کے موقع پر بھی تھا جس کی طرف سورہ فتح کی آیت ۱۲ میں اشارہ ہے۔ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓی اَهْلِیْهِمْ اَبَدًا ...... الآیۃ (بلکہ تم نے گمان کیا کہ رسول اور مسلمانوں کو اپنے اہل و عیال میں پلٹنا نصیب ہوگا)۔

اجتماعی خدمات سے منافقین کی محرومی

فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا ۭ اِنَّكُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ: یعنی ان کو صاف بتا دینا کہ نہ اب تم کسی سفر میں میرے ساتھی بن سکتے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے جنگ کر سکتے۔ تم جس طرح پہلے گھروں میں بیٹھ رہے اسی طرح جاؤ پیچھے بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ بیٹھو۔ یہ گویا سب سے بڑی جماعتی خدمت سے ان کو علانیہ روک دینے کی شکل اختیار کرنے کی ہدایت ہوئی تاکہ یہ رسوا ہوں اور اب تک عذرات اور بہانوں کے پردے میں وہ مسلمانوں کے اندر جو گھسے ہوئے تھے یہ قصہ ختم ہو۔ اب تک تو وہ جہاد سے بچنے کے لیے رخصتیں مانگتے تھے، اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہوئی کہ اگر یہ جہاد میں شرکت کی اجازت مانگیں تو انھیں اجازت نہ دیجیو۔ اس لیے کہ انھیں تنبیہ، جیسا کہ سورۂ فتح آیت ۱۵ سے واضح ہے، بہت پہلے کر دی گئی تھی۔ یہ اسلوب بیان توفیق کی نفی کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور ممانعت کے لیے بھی۔ میرے نزدیک سورۂ فتح والی آیت تو نفی توفیق کے مفہوم میں ہے لیکن آیت زیر بحث ممانعت کے سیاق میں ہے۔ والعلم عند اللہ۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸۴)

منافقین کی نماز جنازہ اور دعائے استغفار کی ممانعت

یہ جماعت سے ان کو کاٹ پھینکنے کی ایک اور سخت تر بلکہ آخری صورت اختیار کرنے کی ہدایت ہوئی۔ اوپر آیت ۸۰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لیے استغفار کی ممانعت ہو چکی ہے۔ اب یہاں کے جنازے کی نماز پڑھنے اور ان کی قبروں پر دعائے استغفار کے لیے کھڑے ہونے کی بھی ممانعت فرما دی گئی۔ گویا زندگی اور موت دونوں میں ان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا گیا۔ جماعتی زندگی سے آدمی کا آخری رشتہ یہی ہوتا ہے کہ مرنے پر اپنے جماعتی بھائیوں کے ہاتھوں دفن ہوتا اور ان کی دعاؤں کا زاد راہ لے کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ اس ممانعت نے پیغمبر اور اہل ایمان کے ساتھ ان کا یہ آخری رشتہ

بھی کاٹ دیا۔

'إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ' یہ اس ممانعت کی علت بیان ہوئی ہے کہ ان کی موت ایمان پر نہیں بلکہ کفر پر ہوئی۔ 'فسق' یہاں بدعہدی اور غداری کے معنی میں ہے یعنی اگرچہ یہ ایمان کے مدعی اور دکھاوے کے لیے اسلام کے بعض رسوم بھی ادا کرتے رہے لیکن اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ انھوں نے جو عہد باندھا تھا اس کو یہ توڑ چکے ہیں۔ اس کے شاہد ان کے وہ اعمال ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔

وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ (۸۵)

اس آیت کی وضاحت اسی سورہ میں پیچھے گزر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۵۵۔

وَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ آمِنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُو الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُن مَّعَ الْقَاعِدِينَ ۝ رَضُوا بِأَن يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ (۸۶ - ۸۷)

لفظ سورۃ کا مفہوم

جس طرح لفظ 'کتاب' یا 'قرآن' بعض مقامات میں قرآن کے کسی حکم یا اس کے کسی حصہ کے لیے خود قرآن میں استعمال ہوا ہے، اسی طرح لفظ 'سورۃ' یہاں اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ اس کے کسی حصہ یا ٹکڑے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

فعل اٰمنوا اپنے کامل معنی میں

'أَنْ آمِنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ' فعل 'آمِنُوا' یہاں اپنے حقیقی اور کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی اپنے ایمان باللہ کا ثبوت دو جو یہ ہے کہ اللہ کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کے لیے نکلو۔

منافقین کی بہانہ بازیاں

'اسْتَأْذَنَكَ أُولُو الطَّوْلِ مِنْهُمْ' 'طول' کے معنی قدرت اور غنا کے ہیں۔ یعنی جب ان سے اللہ کی راہ میں جہاد کا مطالبہ ہوتا ہے تو یہ اپنے دعوائے ایمان میں بالکل پھسڈی ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے غربا اور مسکینوں کا تو کیا ذکر، ان میں جو مقدرت اور مال والے ہیں، تندرست جسم بھی رکھتے ہیں اور سامان جنگ فراہم کرنے کا وافر ذریعہ بھی، ان تک کا حال یہ ہے کہ کوئی عذر تلاش کر کے پیغمبر کے پاس رخصت مانگنے آکھڑے ہوتے ہیں۔

ما فی الذہن کی تعبیر قول سے

'وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُن مَّعَ الْقَاعِدِينَ' میرے نزدیک یہ ان کے ما فی الذہن کو ان کے قول سے تعبیر فرمایا ہے۔ قرآن میں بعض جگہ یہود کا قول نقل ہوا ہے 'وَقَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' ہر چند وہ کہتے تو تھے 'سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا' لیکن چونکہ ان کے دل کی آواز یہی ہوتی تھی کہ 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' اور اپنے عمل سے بھی انھوں نے اسی کی گواہی دی اس وجہ سے قرآن نے ان کے دل کی شہادت کو ان کے قول سے تعبیر فرمایا، گویا انھوں نے 'سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا' نہیں بلکہ 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' ہی کہا تھا۔ اس طرح ان منافقین نے اگرچہ پیش تو کیے عذرات اور کچھ مجبوریاں لیکن ان سب کے باطن میں مضمر

بھی محض تن آسانی اور بزدلی۔ وہ نکلنے والے غازیوں کے ساتھی نہیں بلکہ بیٹھ رہنے والے بندوں، ناکاروں اور معذوروں کے ساتھی بننا چاہتے تھے۔ ان کے عذرات اور بہانوں کی اسی مضمر حقیقت کو قرآن نے ان کے قول سے تعبیر کر دیا ہے جس میں ایک نہایت لطیف قسم کا طنز پیدا ہو گیا ہے جس کی ایک سے زیادہ نظیریں قرآن میں موجود ہیں۔ یہی طنز آگے والی آیت میں ذرا تیز ہو گیا ہے۔

مرد ہو کر عورتوں کے ساتھی

رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۔ خوالف عورتوں کو کہتے ہیں اس لیے کہ مرد جنگ و جہاد اور دوسرے مردانہ کاموں کے لیے گھر سے باہر نکلتے ہیں اور یہ بچوں اور گھروں کی دیکھ بھال کے لیے گھروں میں بیٹھتی ہیں۔ فرمایا کہ انھوں نے مرد ہو کر غازیوں کی ہم سفری اور ہم رکابی کی بجائے اپنے لیے یہی پسند کیا کہ عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھیں۔ ان کی اس ایمانی اور اخلاقی موت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا گیا، نہ اب وہ کوئی صحیح بات سوچتے ہیں۔ نہ کسی عزم و ہمت کے کام کے لیے ان کے اندر حوصلہ ہی پیدا ہوتا ہے۔

سچے اہل ایمان کا کردار

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۸۸-۸۹)

اب یہ سچے اور پکے اہل ایمان کا کردار اور ان کا انجام بیان ہو رہا ہے اور مقصود اس سے ان مخلصین کی تحسین بھی ہے اور ان منافقین کو غیرت دلانا بھی کہ رسول کے جو سچے ساتھی ہیں وہ جب حکم جہاد ہوتا ہے تو ان منافقین کی طرح رخصت کی عرضیاں لے کر نہیں دوڑتے بلکہ اپنے مال اور سر لے کر رسول کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ اصلاً انھی کے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

۱۶- آگے کا مضمون ــــ آیات ۹۰-۹۹

اوپر زیادہ تر بحث شہری منافقین سے تھی جو مدینہ اور اس کے آس پاس آباد تھے۔ آگے ان منافقین کا ذکر آ رہا ہے جو دیہاتوں میں رہائش رکھتے تھے۔ بیماریاں دونوں کی ایک ہی قسم کی ہیں اس وجہ سے حکم بھی دونوں کا ایک ہی سا بیان ہوا ہے۔ اسی ضمن میں حقیقی معذورین کی تفصیل بھی بیان کر دی ہے تاکہ بہانہ بازوں اور حقیقی معذوروں کے امتیاز میں کوئی گھپلا پیش نہ آئے۔ منافقین کے باب میں چونکہ یہ فیصلہ کن بحث تھی، اندیشہ تھا کہ کوئی بے گناہ زد میں آ جائے، اس وجہ سے دونوں کے درمیان ایک خط واضح کھینچنا ضروری ہوا۔ آیات ملاحظہ فرمائیے۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ آیات ۹۰-۹۹
كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿٩٠﴾ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا
يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى
الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩١﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ
اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ
تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا
يُنْفِقُوْنَ ؕ ﴿٩٢﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ
وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٩٣﴾ يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا
رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا
اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ
تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٤﴾ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ
لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۫ وَّمَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٩٥﴾ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ
لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ
الْفٰسِقِيْنَ ﴿٩٦﴾ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا

حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۹۷﴾ وَمِنَ
الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّیَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآىِٕرَ ؕ
عَلَیْهِمْ دَآىِٕرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۹۸﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ
مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ
اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَیُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ
فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹۹﴾

ع ۱۲ / ۱۰ / ۱

ترجمۂ آیات ۹۰-۹۹

اور دیہاتیوں میں سے بھی بہانہ باز لوگ آئے کہ انھیں رخصت دی جائے اور جو اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولے وہ بیٹھ رہے۔ ان میں سے جنھوں نے کفر کیا ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا۔ ۹۰

کمزوروں، بیماروں اور ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں جنھیں خرچ کرنے کی مقدرت نہیں ہے جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کرتے رہیں۔ خوب کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ غفور رحیم ہے۔ اور نہ ان لوگوں پر کوئی الزام ہے جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ تمھارے پاس آتے ہیں کہ ان کے لیے کسی سواری کا انتظام کر دو، تم کہتے ہو میرے پاس تمھاری سواری کا کوئی بندوبست نہیں تو وہ اس حال میں واپس ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے اس غم میں آنسو رواں ہوتے ہیں کہ افسوس کہ وہ خرچ کرنے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ الزام تو بس ان پر ہے جو تم سے رخصت مانگتے ہیں حالانکہ وہ مالدار ہیں۔ یہ لوگ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ بیٹھے رہنے پر راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔ پس وہ علم سے محروم ہو گئے۔ ۹۱-۹۲

جب تم لوگ ان کی طرف پلٹو گے تو یہ تمہارے سامنے باتیں بنائیں گے۔ کہہ دیجیو کہ باتیں نہ بناؤ۔ ہم تمہاری باتیں باور کرنے والے نہیں۔ اللہ نے ہمیں تمہارے حالات سے اچھی طرح باخبر کر دیا ہے۔ اب اللہ اور اس کا رسول تمہارے عمل کو دیکھیں گے، پھر تم غائب و حاضر کے جاننے والے کے آگے پیش کیے جاؤ گے اور وہ تمہیں تمہاری ساری کرتوت سے آگاہ کرے گا۔ یہ لوگ تمہاری واپسی پر تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے چشم پوشی برتو۔ سو تم ان سے اعراض برتو۔ یہ یکسر ناپاک ہیں اور ان کی کرتوت کی پاداش میں ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ ان بدعہد لوگوں سے راضی ہونے والا نہیں۔ یہ دیہاتی کفر و نفاق میں زیادہ سخت اور زیادہ لائق ہیں اس بات کے کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو کچھ اتارا ہے اس کے حدود سے بے خبر رہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۹۴-۹۷

اور ان دیہاتیوں میں سے وہ بھی ہیں جو راہِ خدا میں اپنے خرچ کو ایک تاوان سمجھتے ہیں اور تمہارے لیے گردشوں کے متمنی ہیں۔ بری گردش انہی پر ہے اور اللہ سمیع و علیم ہے۔ اور ان میں وہ بھی ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو اور رسول کی دعاؤں کو حصولِ قربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ سو بے شک یہ ان کے لیے واسطۂ قربت ہی ہے۔ اللہ ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ بے شک اللہ غفور رحیم ہے ۹۷-۹۹

۱۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۹۰)

'معذّر' کا مفہوم

'معذّر' کے معنی ہیں جھوٹا اور بالکل بے سروپا عذرات تراشنے والا بہانہ باز جو ہر ذمہ داری سے بچنے کے لیے کوئی نہ کوئی عذر گھڑ لیتا ہو۔ معذّر اور معتذر میں یہ فرق ہے کہ معتذر کا عذر جھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور بعض حالات میں سچا بھی، لیکن معذّر کہتے ہی اس کو ہیں جو نرا بہانہ باز ہو۔

'اعراب' سے مراد

'اعراب'، 'اعرابی' کی جمع ہے۔ 'اعراب' 'سکان البادیہ' یعنی بدوی اور دیہاتی عربوں کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ اطراف مدینہ اور صحرائی علاقوں کے ان بادیہ نشینوں کے لیے استعمال ہوا ہے جن کی اکثریت نے اگرچہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اس کی سیاسی سیادت تسلیم کر لی تھی لیکن اسلام ان کے اندر رچا بسا نہیں تھا۔ اول تو یہ لوگ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اسلام کی طرف اس کی روحانیت کی جاذبیت سے زیادہ اس کی ابھرتی ہوئی طاقت سے متاثر ہو کر آئے تھے۔ ثانیاً مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے ان کی تعلیم و تربیت کا کما حقہ، انتظام نہ تو ممکن ہی تھا اور نہ یہ اپنی کھیتی باڑی اور مال مویشی کے دھندوں سے کچھ وقت اس مقصد کے لیے نکالنے پر آمادہ ہی ہوتے تھے کہ مرکز میں آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی بابرکت صحبت سے فائدہ اٹھائیں۔ ان میں جو لوگ اپنے اندر صلاحیت رکھتے تھے وہ اگر چاہتے تو بجائے خود بھی اپنی اصلاح و تربیت کی کوشش کرتے اور وقتاً فوقتاً مدینہ آکر نبیؐ اور صحابہؓ کی صحبت سے بھی فائدہ اٹھاتے لیکن اکثریت ایسے ہی لوگوں پر مشتمل تھی جو اسلام کا نام تو لیتے تھے لیکن اسلام کی حدود و قیود سے بالکل بے خبر، اجڈ اور گنوار تھے۔ یہی لوگ بعد میں اس فتنۂ ارتداد کی آگ کا ایندھن بنے جس کو بجھانے کے لیے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو سردھڑ کی بازی لگا دینی پڑی۔

بہانہ ساز اور جھوٹے

'وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ' یعنی ان کے اندر کے کچھ بہانہ باز آئے تو عذر پیش کرنے اور رخصت مانگنے کے لیے آئے اور کچھ جو اللہ اور رسول سے سمع و طاعت کا عہد کرنے میں بالکل ہی جھوٹے تھے انھوں نے کوئی جھوٹا سچا عذر پیش کرنے کی بھی زحمت نہیں اٹھائی بلکہ دعوتِ جہاد کی پروا کیے بغیر یوں ہی گھر میں بیٹھ رہے۔

بہانہ باز اور حقیقی

'سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ'۔ 'مِنْهُمْ' یعنی من الاعراب۔ چونکہ ان اعراب میں، جیسا کہ آگے تصریح آئے گی، ایک گروہ مومنین و مخلصین کا بھی تھا جو سچے دل سے اسلام لائے تھے اور دین کے ہر موقع پر ایثار و قربانی میں پیش پیش تھے، اس وجہ سے فرمایا کہ ان اعراب میں

معذورین میں فرق

سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے یعنی اظہارِ اسلام کے باوجود اس کے واجبات و فرائض سے جھوٹے بہانے بنا کر یا ان کو دیدہ دلیری سے نظر انداز کر کے گھروں میں بیٹھے رہے ہیں، ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا صرف وہ لوگ اس سے مستثنیٰ رہیں گے جو اللہ رسول سے کیے ہوئے عہد پر قائم رہے ہیں یا وہ واقعی معذور و مجبور تھے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاۗءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ مَا عَلَي الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ وَّلَا عَلَي الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۭ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَي الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَاۗءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۹۱-۹۳)

اب یہ 'مُعَذِّرِیْنَ' اور حقیقی معذورین کے درمیان فرق واضح کر دیا گیا ہے تاکہ نہ تو ہر بہانہ باز اپنے کو معذور ٹھہرا سکے نہ کسی واقعی معذور پر نفاق کی تہمت عائد کی جا سکے۔

حقیقی معذورین — لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاۗءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ مَا عَلَي الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ یعنی کمزور، مریض اور تنگ حال جو اپنے لیے زاد راہ اور سواری

جو جہاد کے لیے تو بے قرار ہیں لیکن اپنی ناداری کے سبب سے کسی سواری کا بندوبست خود کر سکنے پر قادر نہیں ہیں اور جب تمہارے پاس کسی سواری کے لیے درخواست لے کر آتے ہیں تو تم بھی معذرت کا انتظام نہیں کر سکتے وہ حقیقی معذورین میں ہیں۔ یہ جہاد میں شامل نہ ہو سکیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ یہ اللہ کے دین اور اس کے رسول کے خیر خواہ رہیں۔ یہ قید نہایت اہم ہے اس لیے کہ بہت سے مریض اور غریب ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو گھر بیٹھے بیٹھے اپنی ریشہ دوانیوں اور فتنہ پردازیوں سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس قسم کے لوگ گناہ سے بری نہیں ہوں گے گناہ سے بری صرف وہی ہوں گے جو اپنی کمزوری، بیماری یا غربت کے سبب سے اگر میدان جنگ میں نہ پہنچ سکیں تو جہاں ہیں وہیں اپنے امکان کے حد تک اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کریں اور اگر کچھ نہیں کر سکتے تو اپنے اپنے بستروں پر اور گھروں میں صدق دل سے اسلام اور مسلمانوں کی فتح مندی کی دعائیں اور اپنی محرومی پر غم کریں کہ افسوس ہے کہ وہ جہاد کے اہل نہیں رہے۔ فرمایا کہ جو لوگ ایسے ہوں گے وہی 'محسن' یعنی خوب کار ٹھہریں گے اور ایسے خوب کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے۔ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

حقیقی معذورین کی معذوری کی شہادت ہر — وَّلَا عَلَي الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ

بُن مو سے تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ؕ اسی طرح ان لوگوں پر بھی کوئی الزام نہیں ہے

کر دیتے ہو کہ ان کے لیے کسی سواری کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ اس حالت میں تمہارے پاس سے لوٹتے ہیں کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتی ہیں کہ افسوس وہ اس قابل نہیں کہ اپنے خرچ سے شرکت جہاد کا بندوبست کر سکیں ۔۔۔ اگرچہ اس طرح کے لوگوں کا حکم اوپر والی آیت میں بھی موجود تھا لیکن ان کا ذکر خاص طور پر یہ ظاہر کرنے کے لیے فرمایا کہ جن لوگوں کے لیے مانع صرف غربت و ناداری ہو، ایمان کی کمزوری نہ ہو، ان کی صداقت کا شاہد ان کا وہ جذبہ ہوتا ہے جو ایسے موقعوں پر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو ایسے مواقع پر یہ خیال کر کے مطمئن ہو بیٹھتے ہیں کہ ہم تو نادار ہیں، ہمارے پاس نہ ہتھیار، نہ سواری، نہ زاد راہ، ہمیں تو جنگ و جہاد کی ذمہ داری سے اللہ ہی نے فارغ کر رکھا ہے، دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو آسانی سے اس سعادت سے محروم رہنے پر راضی نہیں ہوتے بلکہ جہاں سے بھی امید ہوتی ہے کہ ان کے لیے بھی کچھ بندوبست ہو جائے گا وہ اس کے لیے کوشش کرتے ہیں اور اگر ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو ان کے دل اپنی محرومی پر تڑپ اٹھتے ہیں اور ان کی اس تڑپ اور اس بے قراری کی گواہ ان کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں ہوتی ہیں ۔۔۔ گویا غریبوں کے لیے بھی ان کی ناداری اسی صورت میں سچا عذر ہے جب ان کا ہر بن مو ان کے جوش و جذبے کا شاہد ہو۔

اصلی مجرم

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ — اصل مجرم یہ ہیں جو مال رکھتے ہیں، اسباب رکھتے ہیں، اسلحہ رکھتے ہیں، سواری رکھتے ہیں لیکن جب جہاد کا موقع آتا ہے تو رخصت کے طلب گار بن کر آن کھڑے ہوتے ہیں۔ جن کی بے حمیتی و بے غیرتی اس حد کو پہنچ گئی کہ عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھ رہنے پر راضی ہیں۔ ان کی اس اخلاقی و ایمانی موت کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے اور اب ان کا حال یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے کہ وہ کس انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۹۴)

'اِعْتِذَار' یہاں باتیں بنانے اور جھوٹے عذر تراشنے کے معنی میں ہے۔ یعنی جب تم اس سفر سے (اشارہ سفر تبوک کی طرف ہے) پلٹو گے تو یہ منافقین اپنے رویہ کے باب میں تم کو (خطاب مسلمانوں سے ہے) مطمئن کرنے کے لیے اپنے گھڑے ہوئے عذرات کی داستان سنائیں گے۔

سفر کے بعد

تمام اہل ایمان

کی ترجمانی

قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ — قُلْ یہاں واحد ہے درآنحالیکہ اوپر والے ٹکڑے میں خطاب جمع سے ہے اور بعد میں بھی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ اور نَبَّاَنَا اللّٰهُ، جمع ہی کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سب مسلمانوں

کی طرف سے منافقین کو جواب دلوا دیا گیا ہے گویا پیغمبر کی زبان تمام مومنین مخلصین کے دلوں کی ترجمان ہے۔ پیغمبر اور امت کے درمیان جو اعتماد، جو حسن ظن اور جو کامل ہم آہنگی تھی یہ اسلوب اس کو بھی نہایت لطیف طریقہ سے ظاہر کر رہا ہے اور اس میں منافقین پر تعریض کا جو پہلو ہے وہ بھی نمایاں ہو رہا ہے۔

'لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ' یعنی چونکہ خود اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے حالات سے باخبر کر دیا ہے اس وجہ سے اب ہم تمہارے ان لاطائل عذرات کو باور کرنے والے نہیں ہیں، ہمارے سامنے باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان منافقین کے تمام عذرات جو نا قابلِ قبول ٹھہرے اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کا پردہ خود اللہ تعالیٰ نے اٹھا دیا تھا جو تمام غائب و حاضر کو جاننے والا ہے۔ رسول کے سوا چونکہ دوسروں کا یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ کسی کے باب میں اللہ کے بتائے ہوئے علم غیب کا دعوے کر سکیں اس وجہ سے وہ اس طرح کے معاملات میں صرف ظاہر حالات اور شرعی دلائل کی بنا پر ہی کوئی حکم لگائیں گے۔ اگر کسی کے عذر، کسی کے دعوے اور کسی کے بیان کی تردید کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں ہے تو وہ بہر حال تسلیم کیا جائے گا اگرچہ وہ فی الحقیقت بالکل بے سروپا ہو۔ ہم ہر اس شخص کو مسلمان تسلیم کریں گے جو ایمان و اسلام کا دعویٰ کرتا ہے اگر ہمارے پاس اس کے ایمان و اسلام کے انکار کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، اگرچہ وہ اپنے باطن میں کٹر کافر یا منافق ہو۔

معاملہ میں ظاہری حالات کا اعتبار

'وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ..... الآیۃ' یعنی عذرات، بہانوں اور جھوٹی قسموں کو سپر بنانے کی بجائے اپنے عمل سے راست بازی اور وفاداری کا ثبوت دو۔ اللہ و رسول تمہارے عمل کو دیکھیں گے۔ یہ لاطائل بہانے کام آنے والے نہیں اور یہ بھی یاد رکھو کہ ایک دن تمہاری پیشی غائب و حاضر اور ظاہر و باطن سب کے جاننے والے کے آگے ہونے والی ہے وہ تمہارا سارا کیا دھرا تمہارے سامنے رکھ دے گا اور جس عمل کے اندر جتنا اخلاص یا جتنا کھوٹ ہو گا وہ بھی تمہیں دکھا دے گا۔

اصل شہادت عمل کی شہادت ہے

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۡ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۹۵)

اس آیت میں ایک ہی لفظ 'اعراض' پہلو بہ پہلو نہایت بلاغت سے دو مختلف بلکہ متضاد معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ 'اعراض' کا ایک مفہوم تو کسی سے منہ پھیر لینا ہے۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آپ کسی کے عذر کو قبول کر کے اس سے درگزر کر لیں اور اس سے راضی ہو جائیں۔ فرمایا کہ تمہاری واپسی پر تمہیں کھا کھا کے قسمیں راضی اور مطمئن کرنے کی کوشش کریں گے کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کو نظر انداز کر دو، سو ٹھیک ہے اب ان سے اعراض ہی کرو کیونکہ یہ گندے اور نجس ہیں اور نجاست سے اعراض ہی بہتر ہے۔ اس گندگی کے ڈھیر کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ اپنے اعمال کی پاداش میں اسی کے حوالہ ہوں گے۔

جھوٹی قسمیں کھانے والوں سے اعراض کی ہدایت

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (۹۶)

لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ سے اعراب کے اس مفہوم کی وضاحت ہو رہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا یعنی یہ قسموں کے ذریعے سے تمہیں (خطاب مسلمانوں سے ہے) خوش کرنا چاہیں گے۔ اگر تم ان سے خوش بھی ہو گئے تو یاد رکھو کہ اللہ ان بدعہدوں سے راضی ہونے والا نہیں ہے۔ اللہ تو اسی وقت راضی ہوگا جب یہ اپنی توبہ اور اصلاح اور اپنے اعمال سے اس کو راضی کریں۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹۷)

خدا کے غضب کا سبب : کفر و نفاق

یہ سبب بیان ہوا ہے اس بات کا کہ کیوں یہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق قرار پائے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو یہ راضی بھی کر لیں جب بھی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہونے والا نہیں ہے۔ فرمایا کہ یہ ہرگز کسی رعایت و نرمی کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ اپنے کفر و نفاق میں دوسروں کی نسبت سخت تر ہیں۔ نہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صالحین کی صحبت اٹھائی اور نہ کتاب الٰہی کے حدود حرام و حلال سے آگاہ ہونے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفر و نفاق کی بیماری کا حملہ سب سے زیادہ سخت ان پر ہوا۔ اگر انھیں ایمان عزیز ہوتا تو یہ اپنی اصلاح و تربیت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صالحین سے ربط رکھتے اور اپنے ایمان اور علم کو برابر ترقی دیتے رہتے لیکن یہ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا کا عذر کر کے ہمیشہ اپنی تربیت کے کام کو ٹالتے رہے۔ آگے اسی سورہ میں ان لوگوں کی دین سے بے رغبتی اور مرکز سے بے تعلقی کا ذکر یوں آیا ہے۔ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَاۗفَّةً ۭ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَاۗىِٕفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۱۲۲ (سارے مسلمانوں کا علم و تفقہ کے لیے نکلنا تو ممکن نہ تھا لیکن ایسا کیوں نہ ہوا کہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت دین کا علم و فہم حاصل کرنے کے لیے اٹھتی تاکہ جب علم حاصل کر کے لوٹتی تو اپنی قوم کو بھی آگاہ کرتی تاکہ دوسرے بھی ڈرنے والے بنتے) مطلب یہ ہے کہ ان کا دیہاتی ہونا ان کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔ اگر یہ دیہاتی ہیں تو انھیں اپنی تعلیم و تربیت کی راہ میں سرگرم ہونا تھا لیکن یہ تو اسلام کا دعویٰ کر کے برابر اپنے کفر و نفاق ہی کی پرورش میں لگے رہے تو جو جہل و نفاق ان کے اندر پروان چڑھا وہ اسی کے سزاوار تھے۔ اللہ علیم و حکیم ہے۔ اس کا معاملہ ہر ایک کے ساتھ علم و حکمت پر مبنی ہے۔ وہ دین اور علم دین کسی کے سر نہیں منڈھتا بلکہ ہر ایک کو وہی دیتا ہے جس کا وہ اپنے کو سزاوار ثابت کرتا ہے۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَاۗىِٕرَ ۭ عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹۸)

اعراب کی اسلام دشمنی و بدخواہی

یعنی اسلام کے ساتھ ان کی بدخواہی کا حال یہ ہے کہ اول تو یہ اس کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہی نہیں اور اگر حالات سے مجبور ہو کر کچھ خرچ کرنا ہی پڑ جاتا ہے تو یہ اس کو گراں محسوس کرتے ہیں، گویا ان کو جرمانہ بھرنا

پڑ رہا ہے۔ ان کی ہر وقت تمنا یہ ہے کہ تم پر کوئی گردش آئے تاکہ کسی طرح تم سے ان کی جان چھوٹے۔ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ' یعنی یہ تمہارے لیے گردش کا انتظار کر رہے ہیں حالانکہ گردش خود انہی پر ہے اور گردش بھی نہایت بری گردش۔ اللہ سمیع و علیم ہے۔ اس سے کوئی راز اور بھید مخفی نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بتا رہا ہے سب سمع و علم پر مبنی ہے اور جو کچھ ان کے ساتھ معاملہ کرے گا وہ بھی سمع و علم پر مبنی ہوگا۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹۹)

"قربات" "قربۃ" کی جمع ہے۔ اس سے مراد بر و تقویٰ اور احسان و انفاق کے وہ کام ہیں جو خدا کے تقرب کا وسیلہ و ذریعہ بنتے ہیں۔

اعراب میں مخلص اور راستباز اعراب میں جو مخلص اور راستباز مسلمان تھے یہ ان کا بیان ہے۔ فرمایا کہ ان اعراب میں سچے اور پکے مسلمان بھی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر مضبوط ایمان رکھتے ہیں۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کو منافقین کی طرح جرمانہ نہیں سمجھتے بلکہ اپنے انفاق کو اور رسول کی دعاؤں کو خدا کے تقرب کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اوپر آیت ۸۰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے لیے استغفار سے اور آیت ۸۴ میں ان کی نماز جنازہ سے روک دیا گیا ہے لیکن مخلصین کو یہ دونوں چیزیں حاصل تھیں۔ اس لیے فرمایا کہ وہ اپنے انفاق اور رسول کی دعاؤں کو تقرب الٰہی کا ذریعہ بناتے جب کہ منافقین ان دونوں ہی چیزوں سے محروم ہیں۔ 'اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ' میں ضمیر مؤنث ہر چند واحد ہے لیکن یہ سابق الذکر دونوں ہی چیزوں کی طرف لوٹے گی۔ اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقام میں تفصیل سے ہم کر چکے ہیں۔

عام طور پر مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ وہ اپنے انفاق کو نبی کی دعاؤں کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں لیکن مجھے اس مطلب کے قبول کرنے میں تردد ہے۔ یہ مطلب لینے کے لیے کلام میں ایسے محذوفات ماننے پڑیں گے جن کے لیے کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ مولانا فراہیؒ کی تاویل بھی یہی ہے جو میں نے اختیار کی ہے۔ یہ مجھے زبان اور نظم کلام دونوں پہلوؤں سے صحیح معلوم ہوتی ہے۔

۱۸- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰۰-۱۱۲

آگے کی آیات میں پہلے ان لوگوں کی تحسین فرمائی ہے جو اسلام کی طرف سب سے پہلے سبقت کرنے والے بنے یا جنھوں نے کمال اخلاص کے ساتھ ان کے نقش قدم کی پیروی کی۔ اسلامی معاشرہ کے اصل اجزائے ترکیبی یہی ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی اور فوز عظیم کی بشارت دی۔

پھر مدینہ اور دیہاتی علاقوں کے منافقین کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کو دنیا اور برزخ اور آخرت تینوں ہی میں عذاب عظیم کی دھمکی دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ ان کو اسلام

اور اسلامی معاشرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پھر ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جن کو اس عظیم سرزنش نے جھنجوڑ کر اپنے گناہوں کے اعتراف اور توبہ استغفار کے لیے بے چین کر دیا تھا۔ ان کو قبولیت توبہ کی نوید سنائی گئی اور ان کی اصلاح و تربیت کے باب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض ہدایات دی گئیں۔ نیز بعض لوگوں کے بارے میں یہ ہدایت ہوئی کہ ان کی قبولیت توبہ کا معاملہ آئندہ پر ملتوی کیا جاتا ہے، وہ فیصلۂ الٰہی کا انتظار کریں۔

اس کے بعد مسجد ضرار اور اس کے بانیوں کے معاملہ کو لیا ہے اور ان کے باب میں اپنے فیصلہ کا اعلان فرمایا ہے۔

آگے مسلمانوں اور اللہ کے مابین جو عہد و پیمان ہے اس کا حوالہ دیا ہے اور اس عہد و پیمان کے بموجب مسلمانوں کو جن اوصاف کا حامل ہونا چاہیے اس کی وضاحت فرمائی ہے تاکہ مسلم معاشرہ ہر قسم کے غیر مطلوب عناصر سے پاک صاف ہو کر اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہو جائے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰۰-۱۱۲

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ
بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١٠٠﴾ وَمِمَّنْ
حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۚ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ڀ مَرَدُوْا
عَلَى النِّفَاقِ ۣ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ
يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿١٠١﴾ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا
عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ
بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٣﴾
اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ

الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى
اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ
وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ
لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾
وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ
اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ
لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ
فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾
اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ
مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ
جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ
الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ع ۱۳ ۲
حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ
بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ
وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى
بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ
ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ

السّٰٓائِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ
النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور مہاجرین و انصار میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور پھر
ترجمۂ آیات ۱۰۰-۱۱۲ جن لوگوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی ہے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس
سے راضی ہوئے۔ اور اس نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے
نہریں بہتی ہوں گی، ان میں یہ ہمیشہ رہیں گے اور بڑی کامیابی یہی ہے۔ ۱۰۰
اور تمہارے اردگرد جو دیہاتی ہیں ان میں منافق ہیں اور مدینہ والوں میں بھی منافق
ہیں۔ یہ اپنے نفاق میں منجھ گئے ہیں۔ تم ان کو نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں ہم انھیں
دوبار سزا دیں گے۔ پھر وہ ایک عذاب عظیم کی طرف دھکیلے جائیں گے۔ ۱۰۱
اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ انھوں
نے کچھ نیکیاں اور کچھ بدیاں ساتھ ہی دونوں کمائی ہیں۔ امید ہے کہ اللہ ان پر رحمت کی نظر
کرے۔ اللہ غفور رحیم ہے۔ تم ان کے مالوں کا صدقہ قبول کر لو اس سے تم ان کو پاکیزہ
بناؤ گے اور ان کا تزکیہ کرو گے اور ان کے لیے دعا کرو بے شک تمہاری دعا ان کے
لیے سرمایۂ تسکین ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی
ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا اور صدقات کی پذیرائی فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ ہی توبہ
قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ان سے کہہ دو، عمل کرو، اب اللہ اور اس کا
رسول اور اہل ایمان تمہارے عمل کو دیکھیں گے اور تم عنقریب غائب و حاضر کے جاننے
والے کے حضور پیش کیے جاؤ گے۔ وہ تمہارے سارے کیے دھرے سے تم کو آگاہ کرے گا۔
۱۰۳-۱۰۵

اور کچھ دوسرے بھی ہیں جن کا معاملہ اللہ کے فیصلہ تک ملتوی کیا جاتا ہے۔ یا تو ان کو سزا دے گا یا ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۱۰۶

اور جنھوں نے ایک مسجد بنائی ہے اسلام کو نقصان پہنچانے، کفر کو تقویت دینے، اہل ایمان کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور ان لوگوں کے واسطے ایک اڈا فراہم کرنے کی غرض سے جو اللہ اور اس کے رسول سے پہلے جنگ کر چکے ہیں اور یہ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے یہ کام صرف بھلائی کی غرض سے کیا ہے اور اللہ شاہد ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ تم اس میں کبھی کھڑے نہ ہوجیو۔ وہ مسجد جس کی بنیاد روز اول سے تقویٰ پر پڑی ہے وہ حق دار ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاکیزگی کو عزیز رکھتے ہیں اور اللہ پاکیزگی کو عزیز رکھنے والوں ہی کو عزیز رکھتا ہے۔ کیا وہ بہتر ہے جس نے اپنی تعمیر کی بنیاد اللہ کے تقویٰ اور اس کی خوشنودی پر رکھی یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک کھوکھلی گرتی ہوئی کگر پہ اٹھائی پس وہ اس کے سمیت دوزخ میں بیٹھ گئی؟ اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا اور یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ان کے دلوں میں شک کی بنیاد بن کر جمی رہے گی الا آنکہ ان کے دل ہی پاش پاش ہو جائیں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۱۰۷-۱۱۰

بے شک اللہ نے اہل ایمان سے ان کے جان و مال ان کے لیے جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ یہ اللہ کے ذمہ ایک سچا وعدہ ہے تورات، انجیل اور قرآن میں۔ اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ سو تم اس سودے پر جو تم نے اس کے ساتھ کیا ہے خوشی مناؤ۔ اور یہی در اصل بڑی کامیابی ہے۔ توبہ کرتے رہنے والے، عبادت گزار،

شکر گزار، ریاضت کرنے والے، رکوع سجدہ کرتے رہنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی نگہداشت رکھنے والے اصلی مومن ہیں اور مومنوں کو خوش خبری سنا دو۔ ۱۱۱-۱۱۲

۱۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۱۰۰)

اسلامی معاشرہ کے گل سرسبد لوگ

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اسلامی معاشرہ کے گل سرسبد اور اصل سرمایہ کون لوگ ہیں۔ یہ بتانے سے مقصود ایک طرف تو عام مسلمانوں کے سامنے ان لوگوں کو پیش کر دینا ہے جن کے عمل ان کے لیے مثال اور نمونہ ہیں اور جن کی انھیں پیروی اور تقلید کرنی ہے، دوسری طرف منافقین پر یہ واضح کر دینا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قدسیوں کی اس جماعت میں گھسائے رکھنے کی اب کوشش نہ کریں۔ اس جماعت میں شامل رہنا ہے تو ان کے رنگ ڈھنگ اختیار کریں ورنہ اپنے انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیں۔ فرمایا کہ اس امت کا ہراول دستہ مہاجرین و انصار میں سے وہ سابقون اولون ہیں جنھوں نے سب سے پہلے نبی کی دعوت پر لبیک کہی، جو اس وقت اسلام کی طرف بڑھے جب ایک قدم بھی اس کی طرف بڑھنا گوناگوں مزاحمتوں کا مقابلہ کیے بغیر ممکن نہ تھا اور جو اس وقت نبی کی حمایت و مدافعت کے لیے اٹھے جب اس کی حمایت و مدافعت تمام احمر و اسود سے لڑائی مول لینے کے ہم معنی تھی۔

اسلامی معاشرہ میں دوسرے درجہ کے لوگ

دوسرے درجے پر وہ لوگ ہیں جو اگرچہ اولیت و اسبقیت کا درجہ تو حاصل نہ کر سکے تاہم انھوں نے پورے اخلاص اور پوری راست بازی سے سابقین اولین کے نقش قدم کی پیروی کی۔ اس پیروی میں انھوں نے کسی نمائش، کسی مصلحت، کسی غرض یا کسی نوع کے تذبذب اور نفاق کو دخیل نہیں ہونے دیا۔ ایک مرتبہ بڑھ کر انھوں نے پیچھے مڑنے کا نام نہیں لیا۔ جن سے کٹنا تھا ان کو کاٹا تو اس طرح کہ کوئی تسمہ لگا نہیں رہنے دیا اور جن سے جڑے تو اس طرح نہیں کہ ع

منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

بلکہ اس طرح جڑے کہ ع

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اسی خلوص و صداقت اور ظاہر و باطن کی اسی کامل ہم آہنگی اور ہم رنگی کو یہاں 'احسان' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ 'احسان' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ کسی کام کو کمال حسن و خوبی سے انجام دینے کے بھی ہیں۔

رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کی عظیم بشارت

'رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ' یہ ان سابقین اولین کے لیے عظیم بشارت بھی ہے اور ان کی بڑی سے بڑی تعریف بھی جو اس دنیا میں انسانوں کے کسی گروہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہو سکتی ہے۔ فرمایا کہ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ ان سے اس لیے راضی ہوا کہ وہ اپنے بندوں سے حق کی راہ میں جو صبر و ثبات، جو عزیمت و استقامت، جو جانبازی و سرفروشی چاہتا ہے اس کا انھوں نے حق ادا کر دیا اور انھوں نے اللہ اور رسول سے جو عہد باندھا زندگی کے تمام نشیب و فراز میں، تمام مزاحمتوں اور مخالفتوں کے علی الرغم، پوری خوبی سے اس کو نبھایا۔ ان کے رب نے ان کو جو قوتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائیں ان کو انھوں نے درجہ کمال تک پروان چڑھایا اور ان کو اپنے رب ہی کی رضا طلبی میں صرف کیا۔ شیطان کو ان میں ساجھی بننے کا، اپنے امکان کی حد تک کوئی موقع نہیں دیا۔

نفس مطمئنہ کا مطلب

اللہ سے ان کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کو ہر رنگ میں انھوں نے اس کے عدل، اس کی حکمت اور اس کی رحمت پر محمول کیا۔ ان کو اگر کوئی افتاد پیش آئی تو اس کو انھوں نے اپنی کسی خامی کا علاج سمجھا، کوئی مشکل پیش آئی تو اس کو صبر و عزیمت کا امتحان جانا، سکھ ملا تو دل و جان سے اس کے شکر گزار رہے، دکھ ملا تو صابر و مطمئن رہے۔ کسی حال میں بھی اپنی امید کے چراغ کو انھوں نے گل نہیں ہونے دیا۔ طوفان اٹھے، بجلیاں چمکیں بلکہ کبھی کبھی برق خرمن سوز سارے خرمن کو جلا کر خاکستر بھی کر گئی لیکن ان کے نفس مطمئنہ کو کوئی چیز بھی ہلا نہ سکی وہ بدستور 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کی چٹان پر جما رہا اور بالآخر اس نے 'فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ' کی ابدی بشارت حاصل کی۔

اصل کامیابی

'وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ'۔ یہ صلہ بیان ہوا ہے اس رضا و اطمینان پر فائز ہونے کا۔ فرمایا، اصل کامیابی یہ ہے، جس کو بازی کھیلنی ہو اس کے لیے بازی کھیلے۔ اس چند روزہ دنیا کے پیچھے، جس کی ہر چیز فانی ہے، زندگی برباد کرنا اپنے آپ کو ابدی خسران و نامرادی کے حوالہ کرنا ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (۱۰۱)

منافقین کی نشان دہی

یہ منافقین کی نشان دہی ہے۔ فرمایا کہ بدوؤں میں بھی بہت سے منافق ہیں اور اسی طرح اہل مدینہ میں بھی ایک گروہ منافقوں کا ہے۔ یہ لوگ محض اپنے اغراض و مفاد کے لیے مسلمانوں میں گھسے

ہوگئے ہیں اور نفاق میں یہ اتنے منجھے ہوئے ہیں کہ تمھارے لیے ان کا پہچاننا مشکل ہے۔ اللہ ہی ان سب سے واقف ہے۔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ، مَرَنَ وَاسْتَمَرَّ عَلَيْهِ، یعنی یہ نفاق میں نہایت شاطر، مشاق اور پختہ کار ہوگئے ہیں اور اس مہارت سے انھوں نے اپنے اوپر اسلام کا نمائشی رنگ چڑھایا ہے کہ مسلمانوں کو بڑی کامیابی سے دھوکا دے دیتے ہیں۔ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ، میں مسلمانوں کو بھی تنبیہ ہے اور ان منافقین کو بھی۔ مسلمانوں کو تنبیہ یہ ہے کہ ان کے معاملے میں بڑی زیرکی و ہوشیاری سے کام لو اور برابر چوکنے رہو، یہ ایسا بھگل بناتے ہیں کہ ہر شخص ان کو تاڑ نہیں سکتا۔ منافقین کو یہ تنبیہ ہے کہ خواہ تم کیسا ہی بھگل بناؤ، دوسرے تمھیں پہچانتے میں دھوکا کھا سکتے ہیں، لیکن اللہ تم کو اچھی طرح جانتا ہے اور وہ تم میں سے ہر ایک کو کیفر کردار کو پہنچائے گا۔ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ میں ایک تو اس سزا کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں ان کو ملنے والی ہے۔ دوسرے اس عذاب کی طرف جس سے یہ عالم برزخ میں دوچار ہوں گے۔ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ، یہ عذاب آخرت کی طرف اشارہ ہے جو سب سے زیادہ سخت ہوگا۔ اوپر اہل ایمان کے لیے فَوْزٌ عَظِيْمٌ کی بشارت گزری ہے۔ ان منافقین کے لیے یہ عذاب عظیم ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۰۲-۱۰۵)

اپنے گناہوں کا اعتراف کر لینے والے

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ ۔۔۔ الاية، یہ ان لوگوں کا بیان ہے جو اگرچہ کمزوریوں میں مبتلا رہے تھے اور تبوک کے موقع پر بھی ان سے کمزوری صادر ہوگئی تھی لیکن ایمان کی رمق ان کے اندر باقی تھی جب اس سورہ نے منافقین کو اچھی طرح جھنجھوڑا اور ان کے علم میں یہ باتیں آئیں تو ان کی آنکھیں کھل گئیں، انھوں نے باتیں بنانے کی کوشش کے بجائے صدق دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور نہایت بے چینی کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ اور رسول کے آگے ڈال دیا۔ روایات میں آتا ہے کہ بعض لوگوں نے یہ تک کیا کہ اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ دیا کہ نہ کچھ کھائیں گے نہ پئیں گے اور نہ اس وقت تک یہاں سے ٹلیں گے جب تک اللہ و رسول کی طرف سے معافی نہ ملے۔ بسا اوقات اپنے گناہوں پر بندے کی شرمساری اور توبہ کے لیے یہی بے قراری اللہ تعالیٰ کو اس کی نیکی سے بھی زیادہ پسند آتی ہے چنانچہ ان کا اعتراف گناہ اللہ تعالیٰ کو پسند آیا اور جیسا کہ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ کے الفاظ سے واضح ہے ان کو قبولیت توبہ کی امید دلا دی گئی۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ جب قرآن دنیا میں آیا ہے تو اس

کے الفاظ و کلمات کا دلوں پر کیا اثر پڑتا تھا اور اب ہمارے دلوں پر اس کی تاثیر کا کیا حال ہے؟ قرآن فہمی کا ہے اور نفاق کی بھی بدتر سے بدتر قسمیں ہمارے اندر موجود ہیں لیکن قلوب وہ نہیں ہیں جو قرآن کی آیتیں پڑھ کر یہ اثر لیں کہ اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیں۔ اس زمانے میں اپنی تنخواہوں میں چند روپے کے اضافہ کے لیے فاقہ کرنے والے بہتیرے مل جائیں گے لیکن اپنے گناہوں کے غم میں اپنی ایک رات کی نیند بھی قربان کرنے والے شاید کم ہی ملیں۔

نیکیوں کی برکت

'خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا' جو چیز ان کے حق میں سفارش بنی ہے، یہ اس کا بیان ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ نفاق ہی پر نہیں پلے اور بڑھے بلکہ بدلیوں کے ساتھ انھوں نے نیکیاں بھی کمائی ہیں، نیکی کی راہ پر چلتے چلتے انھوں نے ٹھوکریں بھی کھائیں لیکن اس طرح نہیں کہ گر کر پھر اٹھنے کا نام ہی نہ لیا ہو، بلکہ گرنے کے بعد اٹھتے اور سنبھلتے بھی رہے ہیں۔ یہی چیز ان کے لیے اعتراف گناہ اور توبہ کا باعث ہوئی ہے اس وجہ سے یہ نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں بلکہ اللہ کی نظر عنایت کے سزاوار ہیں۔

قبولیت توبہ کی شرط بشارت

'عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ' یہ ان کے لیے قبولیت توبہ اور رحمت کی بشارت ہے لیکن اسلوب بیان قطعی وعدے کا نہیں بلکہ لفظ 'عسٰی' ظاہر کر رہا ہے کہ یہ بشارت مشروط ہے۔ چنانچہ آگے والی آیت میں اس شرط کی طرف اشارہ بھی فرما دیا ہے۔ 'وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ...... الاٰیۃ' یعنی ان سے کہہ دو کہ اب تم اپنے عمل سے ثابت کرو کہ تم اپنی توبہ میں راسخ ہو، اللہ اور رسولؐ اور اہلِ ایمان تمھارے رویہ کو دیکھیں گے اور اسی رویہ پر تمھارے باب میں آخری فیصلہ کا انحصار ہے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ بروقت تو ان لوگوں کو معافی دے دی گئی لیکن اس شرط پر کہ وہ اپنے رویہ کو آیندہ زیادہ سے زیادہ اللہ اور رسولؐ اور اہل ایمان کی پسند کے مطابق بنانے کی کوشش کریں۔ یہ گویا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان پر احتساب ابھی قائم رہے گا تاآنکہ یہ اپنے عمل سے اپنے آپ کو پورے اعتماد کے لائق ثابت کر دیں۔

صدقہ ذریعہ تزکیہ ہے

'خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ' پیچھے آیات ۵۳-۵۴ سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس مرحلہ میں اکثر منافقین کے صدقات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل بے پروائی برتنے کی ہدایت فرما دی گئی تھی چنانچہ بعض کے صدقات آپ رد بھی فرما دیتے تھے۔ اسی طرح آیت ۸۴ میں آپ کو ان کے لیے دعا و استغفار سے بھی منع فرما دیا گیا تھا۔ لیکن جن لوگوں کو معافی دے دی گئی ان کے ساتھ ہی برکت و رحمت کے یہ دونوں دروازے بھی کھول دیے گئے۔ فرمایا کہ 'خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ' ان لوگوں کے پیش کردہ صدقات قبول کر لیا کرو اس لیے کہ اسی سے تم ان کو رذائل سے پاک اور فضائل

سے آراستہ کرو گے اور ان کے لیے دعا بھی کرتے رہو اس لیے کہ تمھاری دعا ہی ہے جو ان کے لیے سرمایۂ سکینت بنے گی۔

تطہیر و تزکیہ کا فرق

یہاں تطہیر اور تزکیہ کے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن میں ان دونوں کے مواقع استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ 'تطہیر' میں غالب پہلو ظاہری اور باطنی نجاستوں اور رذائل سے پاک کرنے کا ہے اور 'تزکیہ' میں رذائل سے پاک کرنے کے ساتھ ساتھ صلاحیتوں اور خوبیوں کو نشو و نما دینے اور فضائل اخلاق سے آراستہ کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔

مرض نفاق کا مؤثر علاج۔ انفاق

اس ٹکڑے سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ نفاق کی بیماری کا سب سے زیادہ مؤثر علاج اللہ کی راہ میں انفاق ہے۔ یہ بیماری اصلاً محبت دنیا سے پیدا ہوتی ہے جو ان تمام رذائل کے پیدا ہونے کا سبب ہے جن کے مجموعے کا نام نفاق ہے۔ انفاق سے اس بیماری کی جڑ کٹتی ہے اور جب اس کی جڑ کٹ جاتی ہے تو ایک طرف رذائل مضمحل ہو جاتے ہیں دوسری طرف مکارم و فضائل پروان چڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

انفاق کا اصل فائدہ انفاق کرنے والے کو ہوتا ہے

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں وہ اللہ اور رسول پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ اصل احسان اللہ اور رسول کا ہے کہ ان کے انفاق کو قبول فرماتے ہیں۔ اس لیے کہ اس سے جو تطہیر و تزکیہ حاصل ہوتا ہے اس کے محتاج اللہ اور رسول نہیں ہیں بلکہ وہی لوگ ہیں جن کو انفاق کی دعوت دی جاتی ہے۔

معافی یافتہ لوگوں کے ساتھ مزید رعایت

'صَلِّ عَلَیۡہِمۡ' میں عام دعا و استغفار کے ساتھ ساتھ نماز جنازہ بھی شامل ہے۔ منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے کی جو ممانعت آیت ۸۴ میں وارد ہے، ان معافی یافتہ لوگوں کے باب میں وہ ممانعت اٹھا دی گئی۔

تسلی اور تنبیہ

'وَاللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ' میں تسلی بھی ہے اور تنبیہ بھی۔ اس کی وضاحت ایک سے زیادہ مواقع میں ہو چکی ہے۔

توبہ اور انفاق کی ترغیب

'اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ .... الایۃ' اوپر والی آیت میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا۔ آپ کو یہ ہدایت فرمائی گئی تھی کہ جب انھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے تو ان کو اپنی تربیت میں از سر نو لے لو، ساتھ ہی جو چیز ان کی تربیت و اصلاح میں سب سے زیادہ مؤثر ہو سکتی تھی اس کی طرف بھی رہنمائی فرما دی۔ اس آیت میں خود ان لوگوں کو توبہ اور انفاق میں سرگرم ہونے پر ابھارا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی توبہ اور ان کے صدقات قبول فرماتا ہے، وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور جو خدا کی رضا اور قرب کے طالب ہوں انھیں چاہیے کہ وہ خدا کی پسند کے یہ کام زیادہ سے زیادہ کریں۔ اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ توبہ اور اصلاح کا کام کوئی وقتی کام نہیں ہے

بلکہ اس میں دوام اور استمرار مطلوب ہے۔

آئندہ کے لیے تنبیہ

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ۔ یہ ان لوگوں کو تنبیہ ہے کہ ہر چند اس وقت تمہیں معافی دے دی گئی ہے لیکن اس معافی پر مطمئن نہ ہو بیٹھنا بلکہ آئندہ اپنے عمل سے ثابت کرو کہ تم سچے دل سے خدا کی طرف رجوع ہوئے ہو۔ اللہ اور رسول اور اہلِ ایمان سب تمہارے رویہ پر نگاہ رکھیں گے۔ سَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، اگر تم رسول اور مومنین سے اپنی کوئی حرکت چھپا رکھنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو یاد رکھو کہ ایک دن تمہیں سارے غائب و حاضر کے علم رکھنے والے خدا کے سامنے بھی حاضر ہونا ہے، وہ تمہارا سارا کچا چٹھا تمہارے آگے رکھ دے گا۔

بے داغ ماضی رکھنے والے بعض لوگوں پر عتاب

وَآخَرُونَ مُرْجَوْنَ لِأَمْرِ اللَّهِ إِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَإِمَّا يَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۱۰۶)

'اِرْجَاء' کے معنی کسی معاملے کو مؤخر اور ملتوی کرنے کے ہیں۔

بعض لوگوں نے اگرچہ اپنے گناہ کا نہایت سچائی سے اعتراف کر لیا تھا لیکن ان کو اس وقت معافی نہیں ملی بلکہ ان کے معاملے کا فیصلہ آئندہ پر اٹھا رکھا گیا۔ آگے آیت ۱۱۸ میں ان کا حوالہ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین آدمی تھے۔ روایات میں ان کے نام کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع مذکور ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ حضرات نفاق میں متہم نہیں تھے بلکہ اسلام کے لیے قربانیاں پیش کرنے والے لوگوں میں سے تھے، پچھلے غزوات میں بھی شریک رہ چکے تھے، لیکن تبوک کے موقع پر ان سے کمزوری صادر ہو گئی اور بعض خاص وجوہ کی بنا پر، جن کی طرف ہم اشارہ کریں گے، دوسروں کے مقابل میں ان پر زیادہ سخت گرفت ہوئی۔ فرمایا کہ ان کا معاملہ خدا کے فیصلہ تک ملتوی کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ چاہے گا تو ان کو سزا دے گا، چاہے گا تو ان کی توبہ قبول فرمائے گا، اللہ علیم و حکیم ہے۔ ان کے باب میں اس کے علم و حکمت کا جو تقاضا ہو گا وہ اس کے مطابق فیصلہ نافذ فرمائے گا۔

شدتِ عتاب کے وجوہ — عتاب بقدرِ اعتماد

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر جب کہ بظاہر ان کا ماضی بے داغ بھی تھا، اس قدر عتاب کیوں ہوا؟ ہمارے نزدیک اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔

ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کسی پر عتاب اس نسبت سے ہوتا ہے جس نسبت سے اس پر اعتماد اور اس سے حسن ظن ہوتا ہے۔ دوسروں نے اگر غلطی کی تو ان کی کمزوریوں کی بنا پر ان سے بعید نہیں تھی لیکن ان لوگوں نے جو غلطی کی اس سے اپنے پچھلے بے داغ ریکارڈ کو بھی انھوں نے داغدار کیا اور پیغمبر کے اس اعتماد اور حسن ظن کو بھی ٹھیس پہنچائی جو ہر مومن کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔

احساس کی کمی

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں نے غالباً اس اعتماد کی بنا پر جو انھیں اپنی سابق خدمات پر رہا ہو گا، اپنی اس غلطی کا اس شدت کے ساتھ احساس بھی نہیں کیا جس شدت کے ساتھ انھیں اس کا احساس کرنا تھا چنانچہ آگے والی آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ اپنی کسی غلطی پر احساسِ ندامت کی

کی توبہ کی اصل روح کے منافی ہے اس وجہ سے حکمت تربیت مقتضی ہوئی کہ ان کی توبہ کی قبولیت لمبے عرصہ تک ملتوی رہے جب تک ان کے اندر وہ بے قراری اور دل کی وہ خستگی و شکستگی نہ پیدا ہو جائے جو توبہ کی قبولیت کے لیے اللہ کی بارگاہ میں سفارشی بنتی ہے۔

منافقانہ ذہنیت پر آخری ضرب

تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس مرحلہ میں، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، منافقانہ ذہنیت پر آخری ضرب لگائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ نفاق کے خلاف مسلمانوں کی حس اتنی بیدار ہو جائے کہ وہ اس کی کسی قسم کو بھی اپنے اندر گوارا کرنے پر راضی نہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے ایسے لوگوں پر گرفت سب سے زیادہ مؤثر ہو سکتی تھی جو اپنی اس غلطی سے پہلے معاشرہ کے بے داغ لوگوں میں شمار ہوتے رہے ہوں۔ اس واقعہ نے منافقین کی آنکھیں بھی کھول دی ہوں گی کہ جب اس قسم کے لوگوں پر ایسی گرفت ہو سکتی ہے تو تا بدیگراں چہ رسد۔ اور دوسرے مسلمانوں نے بھی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا کہ دین میں اصل معیار مطلوب کیا ہے جس کی کسوٹی پہ کسے جانے کے لیے ہر مسلمان کو تیار رہنا چاہیے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَي التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (۱۰۷-۱۰۸)

منافقین کا سب سے زیادہ شریر گروہ

یہ منافقین کے سب سے زیادہ شریر گروہ کا ذکر ہے۔ ان لوگوں کی جس شرارت کی طرف یہاں اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ مدینہ میں دو مسجدیں پہلے سے موجود تھیں، ایک مضافات شہر میں مسجد قبا، دوسری شہر کے اندر، مسجد نبوی۔ لیکن انھوں نے اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی ایک الگ مسجد بنائی۔ مقصود تو ان کا یہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں وہ کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے ایک اڈا مہیا کریں لیکن اس کو نام مسجد کا دیا تاکہ اس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر اپنی دینداری کی دھونس بھی جمائیں اور اپنے مقاصد بھی پورے کر سکیں۔ اس کو مسلمانوں کی نظروں میں مقبول اور مقدس بنانے کے لیے انھوں نے یہ کوشش بھی کی کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس میں ایک مرتبہ نماز پڑھ دیں تاکہ اس کو بھی لوگوں کی نگاہوں میں وہی احترام حاصل ہو جائے جو مسجد قبا کو حاصل ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اغراض مشئومہ بھانپ کر پہلے تو ان کو ٹال دیا پھر جب اس کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہو گئیں تو اس میں نماز پڑھنا تو الگ رہا آپ نے تبوک سے واپسی پر اس کو گروا بھی دیا۔

مسجد ضرار کی تعمیر کے مقاصد فاسدہ

اس نام نہاد مسجد کی تعمیر جن اغراض فاسدہ کے لیے ہوئی تھی قرآن نے ان سے پردہ اٹھایا ہے اس کی پہلی غرض یہ بتائی ہے کہ یہ ضرار کے لیے بنائی گئی ہے۔ یعنی اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے۔ مسجد، اقامت نماز اور اقامت دین کا مرکز ہوتی ہے۔ لیکن یہ دام ہمرنگ مسجد اس لیے

بچھایا گیا تھا کہ مسلمان اس میں پھنسیں اور پھر ان کے اندر آہستہ آہستہ نفاق کا زہر اتارا جائے۔

دوسرا مقصد اس کا کفر بتایا ہے۔ یعنی جو کفر ان کے اندر رچا بسا ہوا تھا اس کی پرورش اور اس کی تائید و تقویت کے لیے ایک پرورش گاہ بنائی گئی تھی۔ مسجد ایمان کی تربیت گاہ ہوتی ہے لیکن یہ نام نہاد مسجد اس کے بالکل برعکس کفر کی خدمت کے لیے تعمیر کی گئی۔

تیسرا مقصد اس کا تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ بتایا ہے یعنی یہ اس غرض سے بنائی گئی کہ مسلمانوں کے شیرازے کو پراگندہ کیا جائے۔ اسلام میں مسجد ہی ہے جو مسلمانوں کو ایک سلک میں پروتی اور ان کی اجتماعی زندگی میں وحدت و تالیف پیدا کرتی ہے۔ ان منافقین نے یہ چاہا کہ ایک مسجد بنا کر پہلے مسلمانوں کو اس کی طرف کھینچیں اور پھر اپنی وسوسہ اندازیوں سے ان کو ملت سے کاٹ دیں۔

چوتھا مقصد اس کا اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ بتایا گیا ہے۔ یعنی یہ ان لوگوں کے لیے ایک کمین گاہ کا کام دے جو اللہ اور رسول سے برسرپیکار رہ چکے ہیں۔ ان منافقین کے متعلق یہ بات پیچھے واضح ہو چکی ہے کہ ان کی تمام ہمدردیاں اسلام سے برسرپیکار طاقتوں کے ساتھ تھیں، یہ رات دن انہی کی کامیابی کے متمنی اور مسلمانوں کے اندر انہی کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اس مرحلے میں آ کر انھوں نے یہ سوچا کہ مسجد کے نام سے اپنا ایک اڈا بھی بنا لیں تاکہ ان کی معاندانہ سرگرمیوں پر پردہ بھی پڑا رہے اور اس پردے میں وہ مسلمانوں کے عین مستقر میں اسلام کے دشمنوں کے لیے ایک کمین گاہ بھی فراہم کر دیں۔

منافقین کی جھوٹی قسمیں

وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنٰى ۚ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ یعنی اس نام نہاد مسجد کی تعمیر سے مقاصد تو وہ پیش نظر ہیں جو مذکور ہوئے لیکن یہ منافقین قسمیں کھا کھا کے اطمینان دلانے کی کوشش کریں گے کہ یہ کام انھوں نے محض اسلام اور مسلمانوں کی بہبود پیش نظر رکھ کر کیا ہے کہ عبادت کے لیے ایک مسجد کا اضافہ ہو جائے، اللہ کے ذکر اور اس کی بندگی کا ایک گھر تعمیر ہو جائے، جو مسلمان اندھیری راتوں یا سردی اور بارش میں، مسجد قبا کی دوری کے سبب سے، جماعت کی حاضری سے محروم رہ جاتے ہیں، ثواب جماعت سے محروم نہ رہیں۔ فرمایا کہ یہ قسمیں کھا کھا کے تمھیں یقین دلائیں گے لیکن اللہ بھی قسم کھاتا ہے کہ یہ منافق بالکل جھوٹے ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ کے الفاظ قسم کے مفہوم میں آتے ہیں۔

حذف خبر کی ایک مثال

اس آیت سے متعلق ایک شبہ بھی ہے کہ اس میں خبر مذکور نہیں ہے۔ مفسرین نے عام طور پر تاویل یہ کی ہے کہ اوپر جن منافقین کا ذکر ہوا ہے انھیں منافقین کے زمرے میں یہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے مسجد ضرار بنائی لیکن اس بات سے صرف حرف عطف کی توجیہ سامنے آتی ہے خبر کا مسئلہ اس سے حل نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک یہاں خبر محذوف ہے۔ عربی زبان میں بعض اوقات شدت غضب کے مواقع میں خبر محذوف

ہو جاتی ہے گویا متکلم کی شدت لہجہ خود خبر کی قائم مقام بن جاتی ہے۔ اس کی نہایت عمدہ مثالیں ان شاء اللہ آخری گروپ کی سورتوں کی تفسیر میں آئیں گی۔

منافقین کی سازش کی ناکامی

‘لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا .... الآیۃ’ منافقین نے یہ فتنہ کھڑا کرنے کو تو کھڑا کر لیا لیکن اس کی کامیابی کا انحصار اس امر پر تھا کہ اس کے افتتاح کے لیے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو لانے میں کامیاب ہو جاتے لیکن اس کوشش میں، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ پہلے تو حضورؐ نے ان کی بات ٹال دی؛ بعد میں سفر تبوک کے دوران ہی میں یہ آیتیں اتریں جن سے ان کی سازش بے نقاب ہو گئی اور آپ کو اس نام نہاد مسجد میں نماز تو درکنار کھڑے ہونے سے بھی روک دیا گیا۔ اگرچہ شدت لہجہ کا رخ حضورؐ کی طرف نہیں بلکہ بالواسطہ منافقین کی طرف ہے۔

مسجد قبا اور اس کے نمازیوں کی تعریف

‘لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى’ سے مراد، قرینہ دلیل ہے، مسجد قبا ہے۔ اس لیے کہ مسجد ضرار اسی کے توڑ پر بنائی گئی تھی۔ منافقین نے تو اس کا توڑ کرنا چاہا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی اس تعریف سے اس کو اور اس کے نمازیوں کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ فرمایا کہ وہ مسجد جس کی بنیاد روز اول سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے تمہارے قیام کی اصلی حق دار وہ ہے۔ نہ کہ وہ جس کی بنیاد ضرار، کفر، تفریق ملت اور سازش پر رکھی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس کے نمازیوں کی تعریف فرمائی کہ وہ ظاہر و باطن کی پاکیزگی کو عزیز رکھتے ہیں اور اللہ ایسے ہی پاکیزہ لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ اس میں مسجد قبا کے نمازیوں کی تعریف کے ساتھ مسجد ضرار کے مفسدین پر تعریض بھی ہے کہ ان کا ظاہر و باطن دونوں گندا ہے اور جب اللہ کے نزدیک وہ مبغوض ہیں تو تمہارا ان سے اور ان کی اس نام نہاد مسجد سے کیا تعلق۔

’افعل‘ کا مجرد استعمال

یہاں ’اَحَقُّ‘ کا لفظ ہے جس سے گمان ترجیح و تفضیل کی طرف جاتا ہے لیکن کلام عرب اور قرآن میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ’اَفْعَلُ‘ بعض مرتبہ نسبت اور تقابل سے مجرد ہو کر بھی استعمال ہوتا ہے۔ کسی موزوں مقام پر ہم اس کی مثالیں پیش کریں گے۔

مسجد کی بنیاد تقویٰ پر ہوتی ہے

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ مسجد کی بنیاد دراصل زمین پر نہیں بلکہ بانیوں کے دلوں پر قائم ہوتی ہے۔ اگر بانیوں کے دلوں میں تقویٰ ہو اور وہ اس تقویٰ پر مسجد کی بنیاد رکھیں تب تو وہ مسجد ہے۔ اگر دلوں میں شر و فساد ہو تو وہ مسجد نہیں بلکہ بت خانہ ہے جو اپنے بانیوں اور پجاریوں سمیت، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہو گا، ایک دن جہنم میں جا گرے گا۔

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَى مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمْ مَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (۱۰۹)

’شفا‘ کا مفہوم

‘شَفَا’ کسی چیز کے کنارے اور اس کی دھار کو کہتے ہیں۔

’جرف‘ کا مفہوم

‘جُرُف’ ندیوں، نالوں اور وادیوں میں دیکھا ہو گا کہ بعض اوقات پانی کا زور کسی کنارے کے نیچے

سے مٹی بہا لے جاتا ہے اور چھجے کی طرح صرف کنارہ لٹکا رہ جاتا ہے۔ اس طرح کی کھوکھلی اور بے ثبات گگر کو عربی میں جُرُف کہتے ہیں۔

هَارٍ، هَارَ، يَهُوْرُ، هَوْرًا سے ہے۔ هَارَ الْبِنَاءُ کے معنی عمارت پھٹ کر مائل بہ سقوط ہے، اس کا فاعل هَائِرٌ بھی آتا ہے اور مقلوب ہو کر هَارٍ بھی آتا ہے جس طرح شَائِكُ السِّلَاحِ اور شَاكِي السِّلَاحِ دونوں آتا ہے۔

یہ تمثیل بیان ہوئی ہے ان لوگوں کی جو اپنے عمل کی بنیاد تقویٰ اور رضائے الٰہی کے بجائے کسی غرض فاسد پر رکھتے ہیں۔ فرمایا کہ ان کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص اپنی عمارت ایک کھوکھلی، گرتی ہوئی گگر پر بنائے جو بالآخر اس کے سمیت جہنم میں جا گرے۔ ثبات و قرار اور اخروی فوز و فلاح صرف اسی عمل کے حصہ میں ہے جو اللہ کی خوشنودی کے لیے اللہ کے احکام کے مطابق کیا جائے۔

غرض فاسد پر مبنی عمل کی تمثیل

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ ہدایت یہاں غایت و مقصود کی ہدایت کے معنی میں ہے یعنی اپنی جانوں پر اس طرح ظلم کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بامراد و فائز المرام نہیں کرے گا۔ یہ نامراد ہی رہیں گے۔

ہدایت کا مفہوم

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۱۰)

یعنی یہ نام نہاد مسجد بنا کر ان منافقین نے اپنے اندر نفاق کی جڑ اتنی مستحکم کر دی ہے کہ اب یہ ان کے دلوں کے ساتھ ہے۔ ان کا نفاق اس طرح ایک ایک رگ میں جڑ جما چکا ہے کہ اب اس کو اکھاڑنا دلوں کے پاش پاش ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ جس طرح ہم اپنے محاورے میں کہتے ہیں یہ داغ تو اب کپڑے کے ساتھ ہی جائے گا، اسی طرح اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ تعلیق بالمحال کا ایک خوب صورت پیرایۂ بیان ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمل عمل کے اثرات و نتائج میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یوں تو نفاق کا ہر عمل اپنے اندر زہریلے اثرات رکھتا ہے لیکن مسجد ضرار جیسا فتنہ کھڑا کر دینا ایک ایسا عمل ہے جس کے نتائج و اثرات سے جان چھڑانے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ یہ رگ و پے میں جاری و ساری ہو جاتا ہے۔

دلوں کے ساتھ چھوٹ جانے والا روگ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰي مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ
فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۱۱)

اب یہ حقیقت واضح کی جا رہی ہے اس بیعت کی جو نبی کے ہاتھ پر کی جاتی ہے اور جس میں ہر مسلمان 'لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ' کا اقرار کر کے شامل ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے اظہار سے یہاں مقصود اس بیعت کے مقتضیات کو ہر مسلمان کے سامنے رکھ دینا ہے تاکہ ہر شخص اس کی روشنی میں خود فیصلہ کر سکے کہ اس عہد کے تقاضے کیا ہیں اور کون سا رویہ اس کے منافی ہے جو نفاق اور کفر میں داخل ہے۔

نبی کے ہاتھ پر بیعت کے مقتضیات

اللہ اور اہل ایمان کے مابین بیع و شرا کا معاہدہ

فرمایا کہ یہ بیعت اللہ اور اہل ایمان کے درمیان بیع و شرا کا ایک معاہدہ ہے جس میں اہل ایمان اپنے مال اور اپنی جان اللہ کے حوالے کرنے کا اقرار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کے عوض میں ان کے لیے جنت کا وعدہ فرماتا ہے۔ ہم دوسرے مقام میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ انسان کو سب سے بڑا شرف جو حاصل ہے وہ یہی ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق ہونے کے باوجود یہ درجہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بیع و شرا کا ایک معاہدہ کرتا ہے جس میں وہ اپنے اوپر بھی اسی طرح کی ایک ذمہ داری لیتا ہے جس طرح بندوں پر ایک ذمہ داری ڈالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا یہ شرف مبنی ہے اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص دائرے کے اندر اس کو اختیار بخشا ہے اور یہ چاہا ہے کہ انسان اپنی مرضی سے اپنے مال و جان پر اللہ کے حق کو تسلیم کرے اور پھر اس کے عوض میں جنت کا ابدی مقام حاصل کرے۔

جان اور مال، دونوں سے جہاد

يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ - یعنی اس معاہدۂ بیع و شرا کے بعد کوئی راست باز مسلمان اپنے مال یا اپنی جان کو خدا سے چرانے کا روادار نہیں ہو سکتا چنانچہ وہ اللہ کی راہ میں مال اور جان دونوں سے جہاد کرتے ہیں اور اس راہ میں مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ اگر مارتے ہیں تو غازی اور مجاہد کا درجہ حاصل کرتے ہیں اور مرتے ہیں تو شہید کا مقام پاتے ہیں۔

قربانی کے عوض جنت کا وعدہ

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ، یعنی جان و مال کی قربانی کے عوض جنت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے اور اس کا اظہار و اقرار تورات، انجیل اور قرآن سب میں ہے۔ یہ تمام آسمانی مذاہب اور خدائی صحیفوں کی ایک مسلمہ اور مشترک حقیقت ہے۔ مثلاً تورات میں ہے۔

"سن اے اسرائیل، خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنے سارے جی اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا کو دوست رکھ۔" استثنا ۶: ۴-۵

انجیل میں ہے:-

"جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا۔" متی ۱۹: ۲۹

انجیلوں میں جنت کی تعبیر بالعموم آسمانی بادشاہت سے کی گئی ہے۔ تورات میں یہود نے حرص دنیا کے سبب سے تمام اخروی انعامات کو دنیوی انعامات سے بدل لیا ہے تاہم انبیاء کی تعلیمات میں بکثرت ابدی زندگی کے ابدی انعامات کا ذکر موجود ہے۔

حیات چند روزہ کے بدلے ابدی زندگی کی بادشاہی

وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ - یہ ابھارا گیا ہے اللہ کی راہ میں بے خوف و خطر جان و مال کی قربانیاں پیش کرنے پر۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے تو جو سودا تم اس کے ساتھ کر چکے ہو اس پر تمہیں باغ باغ ہونا چاہیے۔ خدا کے ہاتھ جو بیچ چکے ہو وہ اس کی طلب پر اس کے حوالے کرو اور جو کچھ اس کے عوض میں تمہیں

ملنا ہے اس کے لیے تیار رہو۔ اللہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔ خدا کی جنت بڑی چیز ہے، یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ چند روزہ حیات کے بدلے ابدی زندگی کی بادشاہی ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۱۲)

سچے اہل ایمان کی صفات

اوپر آیت ۷۱ میں جس طرح خبر محذوف ہے اسی طرح اس آیت میں بھی محذوف ہے۔ زجاج کی رائے یہی ہے اور یہ رائے مجھے نری معلوم ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ زور کلام خبر کو خود ظاہر کر دیتا ہے اگرچہ وہ لفظوں میں ظاہر نہیں ہوتی۔ یہاں موقع کلام یہ ظاہر کرتا ہے کہ جن کی صفات یہ ہیں وہی لوگ سچے مومن ہیں، ان مومنین کو خوش خبری پہنچا دو۔

سیاحت کا مفہوم

اس آیت میں جو الفاظ آئے ہیں 'سَآئِحُوْنَ' کے سوا ان میں سے ہر لفظ کی تحقیق اپنے اپنے محل میں بیان ہو چکی ہے 'سَآئِحُوْنَ' کے ترجمے میں مجھے بڑی مشکل پیش آئی ہے۔ 'سَاحَ يَسِيْحُ' کے معروف معنی تو زمین پر چلنے پھرنے کے ہیں چنانچہ اسی سورہ کی دوسری ہی آیت میں فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ آیا ہے۔ لیکن یہاں جس سیاق وسباق میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لغوی سیاحت کے مفہوم میں نہیں بلکہ اصطلاحی سیاحت کے مفہوم میں آیا ہے۔ لفظ 'سیاحت' قدیم زمانے سے اہل دین کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم صاحب لسان نے یوں ادا کیا ہے اَلذَّهَابُ فِى الْاَرْضِ لِلْعِبَادَةِ وَالتَّرَهُّبِ 'عبادت و ریاضت کے لیے کسی سمت کو نکل کھڑے ہونا'۔ اسلام سے پہلے اکثر مذاہب میں عبادت کے پہلو سے اس بات کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے کہ آدمی گھر در، بیوی بچوں اور دنیا کے ہنگاموں سے الگ ہو کر جنگلوں، پہاڑوں اور سنسان جگہوں میں نکل جائے، اپنا سارا وقت دھیان گیان، ذکر و عبادت، چلہ کشی اور ریاضت میں گزارے۔ قوت لایموت پر قناعت کرے۔ بھوک پیاس ستائے تو جنگل کے پھل پھلاری اور ندیوں چشموں کے پانی پر گزارہ کرے عیسائیوں کے راہبوں، گوتم بدھ کے بھکشوؤں اور ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کا محبوب طریقۂ عبادت یہی رہا ہے۔ یہ لوگ اگر خلق کی طرف توجہ بھی کرتے تھے تو اس طرح کہ صبح کسی بستی میں اور شام کسی بستی میں۔ جہاں پہنچے نیکی اور پرہیزگاری کے چند کلمے لوگوں کے کانوں میں ڈالے اور وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ اسی درویشانہ اور راہبانہ زندگی کے لیے قدیم اصطلاح سیاحت کی ہے۔

اسلام میں سیاحت کی حد

اس سیاحت کا جتنا حصہ رہبانیت کے حکم میں داخل ہے وہ تو اسلام میں ممنوع ہے اس لیے کہ اسلام دین فطرت ہے اور رہبانیت فطرت کے خلاف ہے لیکن اس کا جو حصہ زہد و توکل، ذکر و فکر، خلوت و تبتل، ریاضت و مجاہدہ، جستجوئے حقیقت، طلب علم اور دعوت الی اللہ و جہاد فی سبیل اللہ سے تعلق رکھتا ہے وہ اسلام میں بھی مطلوب و مطبوع ہے اور اس کو اسلام نے روزہ، اعتکاف، عمرہ و حج اور جہاد میں سمو دیا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے ہاں سیاحت کے باب میں نفی اور اثبات دونوں طرح کی باتیں ملتی ہیں۔ ایک طرف یہ ارشاد ملتا ہے

کہ لَا سِیَاحَۃَ فِی الْاِسْلَامِ (اسلام میں سیاحت نہیں ہے) دوسری طرف یہ چیز بھی ملتی ہے کہ سیاحۃ ھذہ الامۃ الصیام ولزوم المساجد (اس امت کے لیے سیاحت روزے اور مسجدوں کے ساتھ وابستگی ہے۔ ابوداؤد میں روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیاحت اختیار کرنے کی اجازت مانگی۔ آپ نے فرمایا سیاحۃ امتی الجہاد فی سبیل اللہ (میری امت کی سیاحت اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلنا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ سیاحت کا جو حصہ رہبانیت کی تعریف میں آتا ہے وہ تو اسلام نے اپنے نصاب سے خارج کر دیا ہے لیکن اصل مقصد سیاحت اسلام میں بھی باقی ہے اور روزہ، اعتکاف، ہجرت، جہاد، دعوت و تبلیغ اور طلب علم و حصول تربیت کے لیے سفر، یہ سب چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ یہ سیاحت جس طرح مردوں کے لیے ہے اسی طرح، جیسا کہ سورہ تحریم کے لفظ 'سَائِحَات' سے واضح ہے، عورتوں کے لیے بھی ہے۔ البتہ عورتیں ان چیزوں سے مستثنیٰ رہیں گی جن سے شریعت نے ان کو مستثنیٰ رکھا ہے مثلاً قتال وغیرہ۔

عام طور پر ہمارے مترجموں نے اس کا ترجمہ 'روزہ رکھنے والے' یا 'راہ خدا میں پھرنے والے'، یا 'بے تعلق رہنے والے' کیا ہے۔ لیکن ان ترجموں سے سیاحت کا صرف ایک ایک پہلو سامنے آتا ہے۔ درآنحالیکہ اس کے متعدد پہلو ہیں۔ میں نے 'ریاضت کرنے والے' ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ میں اس پر پوری طرح مطمئن تو نہیں ہوں لیکن میرے نزدیک یہ ترجمہ نسبتۃً لفظ کی روح سے قریب تر اور اس کے کل نہیں تو اکثر اطراف کا جامع ہے۔ وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللہِ۔

منافقین کے سامنے ایک آئینہ — اوپر والی آیت میں بیعت ایمان و اسلام کی حقیقت واضح فرمائی تھی۔ اس آیت میں اہل ایمان کا اصلی کردار پیش کیا جا رہا ہے اور مقصود اس سے منافقین کے سامنے ایک آئینہ رکھ دینا ہے تاکہ وہ چاہیں تو اس آئینہ کو سامنے رکھ کر اپنے کو سنوار سکیں۔

توبہ — یہاں اہل ایمان کے کردار کے جو اجزا بیان ہوئے ہیں ان میں سب سے پہلے توبہ کا ذکر ہے۔ توبہ کے معنی رجوع الی اللہ کے ہیں۔ خدا کی بندگی اور اطاعت کی راہ میں بندے کا پہلا قدم یہی ہے کہ وہ شیطانی راہوں میں ہرزہ گردی چھوڑ کر اپنے رب کی طرف لوٹتا ہے اور اس کی صراط مستقیم پر چلنے کا عزم کرتا ہے۔ پھر یہی توبہ ہے جو ہر گام پر اس کو سنبھالتی ہے، جب کبھی اس کا کوئی قدم راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے یہ توبہ اس کی دست گیری کرتی اور اس کو راہ پر لگاتی ہے۔

عبادت — توبہ کے بعد عبادت کا ذکر ہے۔ یہ خدا کے سب سے بڑے حق کا حوالہ ہے۔ جو بندہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اس پر خدا کا اولین حق اس کی عبادت کا عائد ہوتا ہے اور چونکہ خدا کے سوا کوئی اور اس حق میں ساجھی نہیں ہے اس وجہ سے اس کا بلا شرکت غیرے ہونا اس کی صفت لازمی ہے اور ساتھ ہی اطاعت بھی چونکہ اس کا بدیہی تقاضا ہے اس وجہ سے وہ بھی اس کا جزو لاینفک ہے۔

حمد — عبادت کے ساتھ حمد کا ذکر ہے جو تمام عبادات کی روح ہے اس لیے کہ نماز اور زکوٰۃ وغیرہ جیسا کہ

اپنے مقام پر واضح ہو چکا ہے، سب خدا کی شکر گزاری اور اس کی نعمتوں کے اعتراف کے مظاہر ہیں۔ اگر بندے کے اندر شکر گزاری اور اعتراف نعمت کا جذبہ بطور ایک صفت کے راسخ نہ ہو تو نہ تو وہ عبادت کا حق ادا کرنے پر آمادہ ہی ہوتا ہے اور نہ اس کی عبادت کے اندر کوئی روح ہی ہوتی ہے۔

سیاحت

اس کے بعد سیاحت کا ذکر ہے۔ اس کی وضاحت ہم اوپر کر چکے ہیں۔ یہ ان تمام سرگرمیوں، مشقتوں اور ریاضتوں کی ایک جامع تعبیر ہے جو آدمی اپنے ظاہر و باطن کی تربیت و اصلاح، دین کو سمجھنے اور سمجھانے، اس کو پھیلانے اور بڑھانے کے لیے والہانہ اور سرفروشانہ اختیار کرتا ہے اور جن کی راہ میں اپنی زندگی کی لذتیں، راحتیں، امنگیں اور خوشیاں بے دریغ قربان کرتا ہے۔

خلوت کی نمازیں

پھر نماز کا ذکر ہے جس کے لیے اَلرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ نماز کا ذکر قرآن میں جہاں جہاں اس اسلوب سے ہوا ہے۔ وہاں صرف فرض نمازیں مراد نہیں ہیں بلکہ خلوت کی نمازیں مراد ہیں۔ یہی نمازیں ان تمام چیزوں کی محافظ بھی ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور یہی اس ریاضت کو بھی زندگی اور نشو و نما بخشتی ہیں جو سیاحت کے لفظ سے تعبیر کی گئی۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

اس کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر ہے۔ اوپر جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کا بیشتر تعلق فرد کی اپنی اصلاح و تربیت سے ہے۔ اب یہ ان کا تعلق قوم اور جماعت کے ساتھ واضح کیا جا رہا ہے کہ وہ نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے ہیں۔ وہ دوسروں کے خیر و شر سے بے تعلق رہ کر زندگی نہیں گزارتے بلکہ دوسروں کی اصلاح و تربیت کے لیے بھی اپنے اندر تڑپ رکھتے ہیں اور اپنی طاقت و صلاحیت کے مطابق اصلاح منکر کا فرض انجام دیتے ہیں۔

حفاظت حدود اللہ

آخر میں حفظ حدود اللہ کا ذکر ہے۔ یہ درحقیقت تقویٰ کی تعبیر ہے اور خاتمہ پر ایک ایسی صفت کا حوالہ دے دیا گیا ہے جو سب سے زیادہ جامع ہے۔ یعنی وہ زندگی کے تمام مراحل میں برابر چوکنے رہتے ہیں کہ خدا نے جو حدود قائم فرمائے ہیں ان میں سے کوئی حد ٹوٹنے نہ پائے۔ نہ وہ خود کسی حد کو توڑنے کی جسارت کرتے ہیں اور نہ اپنے امکان کی حد تک کسی دوسرے کو اس کے توڑنے کی اجازت دیتے ہیں۔

اہل ایمان کے کردار کے یہ پہلو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہاں اس لیے بیان ہوتے ہیں کہ منافقین کے سامنے سچے اہل ایمان کی تصویر آجائے کہ مومن ان صفات کے حامل ہوتے ہیں نہ کہ ہر مدعی ایمان جو کردار و اعمال میں تو اس کے بالکل برعکس ہے لیکن اپنا نام اہل ایمان کے رجسٹر میں لکھوانا چاہتا ہے۔

۲۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۱۳-۱۲۹

خاتمہ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ خطاب براہ راست مسلمانوں سے ہے۔ تمام عناصر فاسدہ سے ان کو پاک کر دینے کے بعد آخر میں یہ بعض ہدایات اور بشارتیں دی جا رہی ہیں۔

پہلی یہ ہدایت فرمائی کہ پیغمبرؐ یا اہل ایمان کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے خدا سے استغفار کریں اگرچہ وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لیے جو استغفار کیا، اس کا صحیح پہلو واضح فرما دیا تاکہ یہ واقعہ کسی کے لیے غلط فہمی کا سبب نہ بنے۔ اس ہدایت سے مقصود مسلمانوں کو باطل کے ہر لوث اور ہر شائبہ سے بالکل پاک کر کے صرف حق کے لیے جینے اور مرنے کے نصب العین پر قائم کرنا ہے۔ اگر حق کے سوا کسی اور حمیت کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی آدمی کے اندر باقی رہے تو یہیں سے نفاق اور کفر کی راہیں کھلتی ہیں اس وجہ سے پوری شدت کے ساتھ اس دروازے کو بند کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ان تمام مسلمانوں کو قبولیت توبہ کی بشارت سنائی گئی ہے جو ان تنبیہات کے بعد، جو اس سورہ میں وارد ہوئی ہیں، اپنی کمزوریوں کی اصلاح کے لیے بے چین و بے قرار ہو گئے تھے اور توبہ و استغفار میں سرگرم تھے۔

پھر اہل مدینہ اور اعراب کے تائبین کو یہ نصیحت فرمائی کہ اپنے آپ کو ہمیشہ راست بازوں اور صداقت شعاروں کے ساتھ وابستہ رکھو تاکہ ان کی صحبت و معیت تمہاری کمزوریوں کی اصلاح کا ذریعہ بنے، نیز اس عظیم اجر کو یاد رکھو جو اللہ نے اپنی راہ کی ہر چھوٹی بڑی نیکی کے عوض دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ علاوہ ازیں خاص طور پر اہل بادیہ کو یہ نصیحت فرمائی کہ ان کی جماعتیں برابر مرکز سے وابستہ رہیں تاکہ صحبت نبویؐ کی برکتوں سے وہ خود بھی مستفید ہو سکیں اور اپنی قوم کو بھی مستفید کر سکیں۔

آگے مسلمانوں کو اپنے اپنے گرد و پیش کے کفار سے جنگ کرنے اور ان کے مقابل میں سخت ہونے کی تاکید فرمائی۔ اور ان تمام تنبیہات کے بعد بھی جو لوگ ابھی نفاق کی آلودگیوں میں لتھڑے ہوئے تھے ان کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا۔

آخر میں مسلمانوں کو خطاب کر کے یہ واضح فرمایا کہ کیسی عظیم نعمت و رحمت ہے جو اس پیغمبرؐ کی صورت میں تمہیں نصیب ہوئی ہے تو صدق دل سے اس کی قدر کرو اور اعراض کرنے والوں سے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے، کہلوایا ہے کہ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے میرے لیے اللہ کافی ہے۔ میرا بھروسہ اسی پر ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١١٣﴾ وَمَا

آیات ۱۱۳ - ۱۲۹

كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿١١٤﴾ وَمَا

كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ
اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١١٥﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١١٦﴾ لَقَدْ
تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ
الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ
عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٧﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا
حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ
اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ
لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١١٨﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا ع ١٣ ٣
اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١١٩﴾ مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ
حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا
بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ
وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ
وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا
كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢١﴾ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ
مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ

إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿۱۲۲﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا ۱۵ ع ۴
الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ
اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿۱۲۳﴾ وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ أَيُّكُمْ الربع
زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ
يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۱۲۴﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا
إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿۱۲۵﴾ أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ
فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿۱۲۶﴾ وَ
إِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ نَظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ هَلْ يَرَاكُمْ مِنْ أَحَدٍ
ثُمَّ انْصَرَفُوا ۚ صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿۱۲۷﴾ لَقَدْ
جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ
بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ
إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿۱۲۹﴾

نبی اور مومنین کے لیے روا نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت مانگیں اگرچہ وہ قرابت دار ۱۶ ع ۵
ہی کیوں نہ ہوں جب کہ یہ ظاہر ہو چکا کہ یہ جہنم میں جانے والے لوگ ہیں اور ابراہیمؑ کا اپنے باپ ترجمۂ آیات
کے لیے مغفرت مانگنا صرف اس وعدے کے سبب سے تھا جو اس نے اس سے کر لیا تھا پھر ۱۱۳-۱۲۹
جب اس پر واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس سے اعلانِ برأت کر دیا بے شک
ابراہیمؑ بڑا ہی رقیق القلب اور بردبار تھا۔ اور اللہ کسی قوم کو، اس کو ہدایت دینے کے بعد
گمراہ نہیں کرتا جب تک وہ وضاحت کے ساتھ ان کو وہ چیزیں بتا نہ دے جن سے ان کو بچنا

ہے بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ اللہ ہی ہے جس کی آسمانوں اور زمین پر بادشاہی ہے۔ وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ کے سوا نہ تمھارا کوئی دوست ہے نہ مددگار۔ ۱۱۴-۱۱۶

اللہ نے نبی اور ان مہاجرین وانصار پر رحمت کی نظر کی جنھوں نے نبی کا ساتھ تنگی کے وقت میں دیا، بعد اس کے کہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے پھر اللہ نے ان پر رحمت کی نگاہ کی۔ بے شک وہ ان پر نہایت مہربان اور رحیم ہے اور ان تینوں پر بھی رحمت کی نگاہ کی جن کا معاملہ اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں ضیق میں پڑ گئیں اور انھوں نے اندازہ کر لیا کہ خدا سے خدا کے سوا کہیں مفر نہیں۔ پھر اللہ نے ان پر عنایت کی نظر کی تاکہ وہ توبہ کریں۔ بے شک اللہ ہی ہے جو توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۱۷-۱۱۸

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرتے رہو اور راست بازوں کی معیت اختیار کرو۔ اہل مدینہ اور اس کے گرد و نواح کے اعراب کے لیے روا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر پیچھے بیٹھ رہیں اور نہ یہ کہ اپنی جان کو اس کی جان سے عزیز رکھیں۔ یہ اس لیے کہ جو پیاس، تکان اور بھوک بھی خدا کی راہ میں ان کو لاحق ہوتی ہے، اور جو قدم بھی وہ کفار کو رنج پہنچانے والا اٹھاتے ہیں اور جو چرکا بھی وہ کسی دشمن کو لگاتے ہیں، ان سب کے بدلے میں ان کے لیے ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ اللہ خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ اور جو کوئی چھوٹا یا بڑا انفاق وہ کرتے ہیں اور جو وادی بھی وہ قطع کرتے ہیں، سب ان کے لیے لکھا جاتا ہے تاکہ اللہ ان کے عمل کا اچھے سے اچھا بدلہ دے۔ یہ تو نہ تھا کہ سب ہی مسلمان اٹھتے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ کچھ لوگ نکلتے تاکہ دین میں بصیرت حاصل کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو بھی آگاہ کرتے جب کہ

وہ ان کی طرف لوٹتے کہ وہ بھی احتیاط کرنے والے بنتے۔ ۱۱۹-۱۲۲

اے ایمان والو، تمہارے گرد و پیش جو کفار ہیں ان سے لڑو اور چاہیے کہ وہ تمہارے رویے میں سختی محسوس کریں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔ اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جو پوچھتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا؟ سو جو سچ مچ ایمان لائے ہیں وہ ان کے لیے ایمان میں اضافہ کرتی ہے اور وہ اس سے بشارت حاصل کرتے ہیں۔ رہے وہ جن کے دلوں میں روگ ہے تو وہ ان کی نجاست پر ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیتی ہے اور وہ کفر ہی کی حالت میں مرتے ہیں۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر بھی نہ تو توبہ کرتے نہ یاددہانی ہی حاصل کرتے۔ اور جب کوئی سورہ اتاری جاتی ہے تو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے پھر کھسک جاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے بوجہ اس کے کہ یہ سمجھ سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں۔ ۱۲۳-۱۲۷

تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آچکا ہے جس پر تمہارا ہلاکت میں پڑنا بہت شاق ہے، وہ تمہارے ایمان کا حریص اور اہل ایمان کے لیے سراپا شفقت و رحمت ہے پس اگر وہ روگردانی کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ کافی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔ ۱۲۸-۱۲۹

۲۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ (۱۱۳-۱۱۴)

مشرکین کے لیے استغفار کی ممانعت

’مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ ...... الآیۃ‘ یہ مسلمانوں کو ایک نہایت خفی شائبۂ شرک سے، جو نفاق کا ایک چور دروازہ ہے، پرہیز کرنے کی ہدایت ہے۔ وہ یہ کہ جن لوگوں پر حق پوری طرح واضح کیا جا چکا ہے اور جن سے اتمام حجت کے بعد اعلان برأت ہو چکا ہے، پھر بھی وہ ایمان نہ لائے، ان کے لیے اہل ایمان مغفرت نہ مانگیں اس لیے کہ اس قسم کے معاندین، خدا کے غضب کے مستحق ہیں۔ ان کے لیے رشتۂ قرابت یا کسی اور رابطۂ محبت کی بنا پر رحمت کی دعا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حمیت قرابت، حمیت حق پر غالب ہے۔ آیت میں مشرکین کا لفظ یہاں مشرکین عرب کے لیے ہے جن سے اس سورہ میں، جیسا کہ آپ پیچھے تفصیل سے پڑھ آئے ہیں، نہایت آشکارا الفاظ میں اللہ اور رسول کی طرف سے اعلان برأت ہو چکا ہے اور منافقین کی بڑی کمزوریوں میں سے یہ کمزوری بتائی گئی ہے کہ وہ ان سے اپنی قرابت اور دوستی کے روابط کاٹنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ تمام روابط ختم کر دینے کے بعد اہل ایمان کو یہ ہدایت ہوئی کہ ان کے لیے مغفرت کی دعا بھی نہ کی جائے۔ یاد ہو گا کہ اوپر یہی ممانعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار منافقین کے باب میں بھی ہوئی ہے کہ آپ نہ ان کے لیے استغفار کریں نہ ان کی نماز جنازہ پڑھیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں ایک مرحلہ آتا ہے جب ان کو اور اہل ایمان کو کفار کے لیے ہدایت و مغفرت کی دعا سے بھی روک دیا جاتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر وہ وقت بھی آتا ہے جب کہ ’رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا‘ کے الفاظ بھی ان کی زبان سے ان کفار کے حق میں نکلتے ہیں۔ یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اہل باطل کے ساتھ کوئی تسمہ بھی اہل حق کا لگا رہنے نہیں دینا چاہتا تاکہ جو عذاب ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے وہ اس کو بھگتنے کے لیے ہر امان سے محفوظ ہو جائیں۔ سورۂ انفال میں ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ نبی اور اہل ایمان کی دعائیں ان کی قوم کے لیے امان کا کام دیتی ہیں۔ یہاں نبی اور اہل ایمان کو استغفار سے روک کر اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو گویا آخری امان سے بھی محروم کر دیا۔

’وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ‘ کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ نبی کے ساتھ بھی کسی کی رشتہ داری ایمان کے بغیر خدا کے ہاں کچھ کام آنے والی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد دوسرے رشتوں ناتوں کی کیا اہمیت باقی رہی۔

ممانعت کے حدود

’مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ‘ کے الفاظ سے یہ بات تو واضح طور پر نکلتی ہے کہ جن کا جہنمی ہونا قطعی طور پر معلوم ہو چکا ہو ان کے لیے اہل ایمان کو استغفار کرنا جائز نہیں ہے لیکن اس سے کسی کافر کے لیے ہدایت کی دعا کرنے کی ممانعت نہیں نکلتی اس لیے کہ آیت میں جن مشرکین کا ذکر ہے ان کا جہنمی ہونا خود اللہ تعالیٰ نے بتا دیا تھا۔ رسول کے بعد، کسی کے باب میں قطعی طور پر اس بات کے معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ ہدایت نہیں اختیار کرے گا، لازمی جہنمی ہی ہو گا۔ اس وجہ سے ایسے لوگوں کی ہدایت کی دعا کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص کفر ہی پر مرا ہے تو اس کے

لیے نجات کی دعا نہیں کرنی چاہیے اس لیے کہ اس سے ایمان کی بے توقیری اور خدا کے قانون عدل کی نفی ہوتی ہے جس سے احتراز اہل ایمان کے لیے لازمی ہے۔

حضرت ابراہیم کے استغفار کی توجیہ

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ ...... الآية' یہ ایک غلط فہمی کا ازالہ ہے یعنی کوئی یہ نہ خیال کرے کہ جب حضرت ابراہیم نے اپنے کافر باپ کے لیے مغفرت کی دعا کی تو آخر وہ اپنے کافر عزیزوں کے لیے استغفار کیوں نہیں کر سکتا؟ فرمایا کہ ابراہیم نے جو کچھ کیا وہ محض ایک وعدے کا ایفا تھا جو وہ اپنے باپ سے کر چکے تھے۔ پھر یہ اس وقت کا معاملہ ہے جب ان پر یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوئی تھی کہ باپ فی الحقیقت اللہ کا دشمن ہے جب ان پر یہ بات واضح ہوگئی، انھوں نے اس سے اعلان برأت کر دیا۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں واضح ہونے سے مراد یہ ہے کہ اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو آگاہ فرما دیا کہ بس اب اس کا پیچھا چھوڑو یہ ایمان لانے والا نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم کا اپنے باپ سے وعدہ

حضرت ابراہیم کے جس وعدے کا یہاں حوالہ ہے وہ قرآن میں کئی جگہ مذکور ہے۔ سورہ مریم میں ہے۔

قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا (۴۷-مریم)

اس نے کہا اچھا۔ السلام علیکم، میں آپ کے لیے اپنے رب سے مغفرت مانگوں گا۔ وہ میرے حال پر بڑا مہربان ہے۔

اس سے وعدے کی غایت درجہ اہمیت واضح ہوتی ہے۔ آدمی اگر کسی سے وعدہ کر بیٹھے، خاص طور پر دعا و استغفار کا، تو حد جواز و امکان کے اندر اس کو ضرور پورا کرے۔

حضرت ابراہیم کی تعریف

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ - 'اَوَّاہٌ' کے معنی کثیر التَّأَوُّہ' یعنی درد مند، غم خوار اور رقیق القلب کے ہیں اور حلیم کے معنی بردبار کے ہیں۔ یہاں ان الفاظ سے حضرت ابراہیم کی تعریف دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی باپ کے معاملے میں دردمندی اور بردباری بہت پسند آئی۔ اوپر سورۂ مریم کی جس آیت کا حوالہ ہم نے دیا ہے اس کے پیش و عقب کو قرآن میں پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ آذر نے اس موقع پر حضرت ابراہیم کے ساتھ نہایت سنگدلانہ برتاؤ کیا تھا لیکن سعادت مند بیٹے نے حلم و بردباری سے نہ صرف باپ کی جھڑکی اور دھمکی برداشت کی بلکہ نہایت دردمندی کے ساتھ اس کے لیے دعا و استغفار کا وعدہ بھی کر لیا۔ غور کیجیے کہ ایک ایسے دردمند اور حلیم بیٹے نے جب باپ سے اعلان برأت کیا ہوگا تو جگر پر کتنا بھاری پتھر رکھ کر کیا ہوگا؟ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ بندہ اس کی محبت میں موم بھی بنے اور پتھر بھی اس وجہ سے حضرت ابراہیم نے اپنے دل کے یہ دونوں پہلو نمایاں کیے اور یہی صحیح نمونہ ہے دین کے خدمت گزاروں کے لیے۔ جب تک ان کے سینہ میں دردمند دل نہ ہو خلق کی ہدایت کے لیے ان کا اٹھنا بے سود اور جب تک عزم میں لوہے کی صلابت اور پہاڑ کی استقامت نہ ہو دین کے لیے ان کا وجود بالکل ناکارہ!

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّىٰ يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۱۱۵)

مسلمانوں کو ایک تنبیہ

"وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ..... الاية" یہ آیت یوں تو اس عام سنت الٰہی کا بیان بھی ہو سکتی ہے جو قرآن میں بار بار مذکور ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو بھی گمراہی کے حوالہ کرتا ہے اتمام حجت اور توضیح حق کے بعد ہی کرتا ہے اس وجہ سے اس طرح کے لوگ اس ہمدردی کے سزاوار نہیں ہیں کہ ان کے لیے استغفار کیا جائے لیکن میرا ذہن 'بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ' کے الفاظ سے بار بار اس طرف جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ خدا نے تمھیں صراط مستقیم کی ہدایت دینے کے بعد اس راہ کے مسافر کو جن خطرات سے ہوشیار رہنا چاہیے، ان سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔ اب یہ تمھارا فرض ہے کہ تم ان خطرات سے بچو۔ اگر تم نہ بچے تو راہ پا کر اس سے بھٹکنے کی ذمہ داری خود تم پر ہوگی۔ اللہ ایسے لوگوں کو گمراہی کے لیے چھوڑ دیا کرتا ہے۔ گویا یہ اس ممانعت کی تاکید ہوئی جو مشرکین کے لیے استغفار کے باب میں مسلمانوں کو، اوپر والی آیت میں کی گئی ہے۔ یہ بات ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ جن کی حق دشمنی واضح ہو چکی ہے ان کے ساتھ کوئی ذہنی اور قلبی لگاؤ بسا اوقات آدمی کے لیے فتنہ بن جایا کرتا ہے۔ یہی لگاؤ بالتدریج ترقی کرتے کرتے بالآخر اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اصول و عقائد نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور خون و نسب کا تعلق تمام حقائق پر غالب آجاتا ہے۔ آج جو لوگ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے کے باوجود 'نَحْنُ اَبْنَآءُ اَنْفُسِنَا' کا نعرہ لگاتے ہیں یا محمد بن قاسم کی بجائے راجہ داہر پر فخر کرتے ہیں وہ اسی فتنہ کا شکار ہوئے ہیں۔

'اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ' بھی اسی تنبیہ کا جزو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ظاہر و باطن ہر چیز سے آگاہ ہے جس کے اندر بھی شرک و کفر کے ساتھ کوئی لوث اور لگاؤ ہوگا وہ خدا سے مخفی نہیں رہے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۱۱۶)

یہ توحید کی آیت ہے اور یہ اوپر والے مضمون ہی کی تاکید ہے۔ یہ تاکید در تاکید اس لیے ہے کہ شرک کا ہر شائبہ مسلمانوں کے اندر سے یک قلم ختم ہو جائے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۱۷)

'تاب علی' کا مفہوم

'تَابَ، يَتُوْبُ، تَوْبَۃً' کے معنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے ہیں لیکن جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور صلہ 'علیٰ' کے ساتھ آئے تو، جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں، یہ رحمت کے مضمون پر بھی متضمن ہوتا ہے اس وجہ سے اس کا مفہوم کسی پر رحمت کی نظر کرنے کا ہو جاتا ہے جس کے لازم معنی بندے کی توبہ قبول کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔

قبولیت توبہ کی عام بشارت

اب یہ قبولیت توبہ کی اس عام بشارت کا اعلان ہو رہا ہے جو اس سورہ کی تنبیہات و تحذیرات کے بعد رحمت کی گھٹا بن کر ان لوگوں کے لیے برسی جنھوں نے اپنے آپ کو اس کا سزاوار ثابت کیا۔ ہم پیچھے اشارہ کر آئے

ہیں کہ اس سورہ نے وقت کے پورے اسلامی معاشرہ کو چھاج میں پھٹک کر اس کو خس و خاشاک سے بالکل پاک صاف کر دیا۔ اس تطہیر و تنقید کے بعد تمام عناصر فاسدہ چھٹ کر الگ ہو گئے۔ صرف وہ لوگ بچ رہے جو زرِ خالص کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے اگر کسی کے دل پر وقتی طور پر کوئی غبار آ گیا تھا تو اس کو بھی، توبہ کی اس منادیٔ عام سے بیدار ہو کر، لوگوں نے دعا و استغفار کے آنسوؤں سے دھو لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی توبہ کی قبولیت کی بشارت سنا دی۔

نبی صلعم کے ذکر کی نوعیت

اس فہرست میں سرفہرست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے اس لیے کہ اس پاکیزہ معاشرہ کے گل سرسبد حضورؐ ہی تھے۔ اس سیاق میں آپؐ کے ذکر کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ سے کوئی اس طرح کی غلطی صادر ہوئی تھی جس طرح کی غلطی بعض دوسرے لوگوں سے صادر ہوئی بلکہ حضورؐ اپنی طبعی رأفت و رحمت کی بنا پر، اب تک منافقین کے باب میں جو نرمی و چشم پوشی برتتے تھے، جس کی طرف عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَہُمْ ... الآیۃ اور بعض دوسری آیتوں میں اشارہ گزرا، یہ اس طرح کی چشم پوشیوں کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے دامن عفو و رحمت میں جگہ دی۔ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ حق و عدل کی کسوٹی ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی ان مسامحتوں پر بھی گرفت اور ان کی اصلاح فرماتا ہے جو اگرچہ ظہور میں تو آتی ہیں جذبۂ خیر سے لیکن وہ اس معیار مطلوب سے متجاوز ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے لیے پسند فرمایا ہے۔

اسلامی معاشرہ میں فرقِ مراتب کی ترتیب

دوسرے درجہ پر اس میں مہاجرین اور پھر انصار کا ذکر آیا ہے۔ اس سے ایک طرف تو اسلامی معاشرہ میں فرقِ مراتب کی ترتیب واضح ہوتی ہے کہ اس معاشرہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے اونچا درجہ مہاجرین کا ہے، اس کے بعد انصار کا ہے، دوسری طرف اَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ فِیْ سَاعَۃِ الْعُسْرَۃِ کے الفاظ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں فرقِ مراتب کی بنیاد خاندان، نسب یا مال و جاہ پر نہیں بلکہ تمام تر اتباعِ رسول اور خدمتِ اسلام پر ہے۔ جو لوگ اس وصف خاص میں سب سے اونچے ہوئے وہ معاشرہ میں سب سے اونچے قرار پائے قطع نظر اس سے کہ وہ کس خاندان اور گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور دنیوی اسباب و وسائل کے اعتبار سے ان کا حال کیا ہے اور کیا رہا ہے۔

مہاجرین اور انصار کے ایمان کی خصوصیت

سَاعَۃِ الْعُسْرَۃِ کے الفاظ سے اصلاً تو تبوک کی مہم کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ وہ، جیسا کہ سیرت و مغازی کی کتابوں سے واضح ہے، نہایت مشکل حالات میں پیش آئی تھی لیکن اس میں ایک جامع اشارہ ان مشکلات و مصائب کی طرف بھی ہے جن سے مہاجرین و انصار کو شروع سے لے کر اب تک برابر گزرنا پڑا تھا۔ ان الفاظ کا حوالہ ایک تو اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ اصل ایمان ان کا ایمان ہے جو مصائب و شدائد کی کسوٹیوں پر جانچے اور پرکھے جا چکے ہوں۔ دوسری بات اس سے یہ نکلی کہ دراصل مہاجرین و انصار کے ایمان کی یہی خصوصیت ہے جو ان کے لیے سفارش بنی کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت کی نظر اور ان کی توبہ قبول

فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وفادار و جاں نثار بندوں کو توفیقِ خیر سے محروم نہیں فرماتا۔ جب ان سے کوئی کمزوری صادر ہو جاتی ہے، ان کے دل میں وہ توبہ کی بے قراری پیدا کرتا ہے، پھر وہ توبہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نظر انداز صرف ان کو کرتا ہے جو صرف زبان سے عشق کا دعویٰ کرتے ہیں، اس راہ میں چوٹ کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

'مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ' کے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ مہاجرین و انصار کا سوادِ اعظم ہر قسم کے مصائب و شدائد کے باوجود ہر دور میں حق پر ثابت قدم اور استوار رہا۔ ان میں سے صرف ایک چھوٹے سے گروہ سے تبوک کے موقع پر کچھ کمزوری صادر ہوئی لیکن تنبیہ کے بعد وہ بھی متنبہ ہو گئے۔ پھر انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی بھی توبہ قبول فرمائی۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۱۱۸)

ان تین معتوبین کو بشارت جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا۔

'وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا' قبولیتِ توبہ کی اس عام بشارت کے بعد، جو اوپر مذکور ہوئی، یہ ان تین آدمیوں کی قبولیتِ توبہ کی بشارت ہے جن کا معاملہ آیت ۱۰۶ میں آیندہ کے لیے ملتوی کر دیا گیا تھا۔

معتوبین کے ساتھ معاشرہ کا برتاؤ

'حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ' یعنی جب توبہ کے لیے ان کے اندر دل کی وہ خستگی اور بے قراری پیدا ہو گئی جو رحمتِ الٰہی کو متوجہ کرتی ہے اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ بھی قبول فرمائی۔ 'ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ' سے ان حالات کی طرف اشارہ ہے جو ان لوگوں کو پیش آئے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پورے پچاس دن ان لوگوں پر ایسے گزرے کہ ہر شخص نے ان سے آنکھیں پھیر لیں، یگانے بیگانے بن گئے۔ عزیزوں، رشتہ داروں اور بچپن کے ساتھیوں تک نے اس طرح بے رخی اختیار کر لی گویا کبھی آشنا ہی نہ تھے، یہاں تک کہ بیوی بچے بھی بالکل غیر بن کے رہ گئے۔ مدینہ وہی تھا، اس کی وسعتیں اور برکتیں بھی وہی تھیں، دلوں میں اسلام نے مہر و محبت اور اخوت و ہمدردی کی جو تخم ریزی کی تھی اس کی فصل بھی شباب پر تھی، لوگ آپس میں ملتے جلتے، کھاتے پیتے، ایک دوسرے کے لیے جاں نثاریاں اور غم گساریاں کرتے، صرف یہ تین شخص ایسے تھے جن کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا اس لیے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے معتوب تھے۔ خدا کی زمین میں آدمی کے لیے بڑی وسعت ہے بشرطیکہ لوگوں کے دلوں کے دروازے اس کے لیے کھلے ہوئے ہوں۔ لیکن جب لوگوں کے دلوں ہی کے دروازے اس کے لیے بند ہو جائیں تو زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود اس کے لیے ایک زندان بن کے رہ جاتی ہے۔ ان تینوں صاحبوں کے لیے مدینہ کی سرزمین کا یہی حال ہو گیا تھا اور یہ حالت دو دن نہیں بلکہ جیسا کہ اوپر گزرا، پورے پچاس دن قائم رہی۔

ان کے اپنے دلوں کا حال

'وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ' اوپر کے ٹکڑے میں اس حالت کی تصویر ہے جو ان لوگوں کو اپنے سے خارج کی دنیا میں پیش آئی۔ اس ٹکڑے سے خود ان کے باطن کا حال واضح ہو رہا ہے۔ جس طرح باہر کی

دنیا میں ان کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی اسی طرح خود ان کے اپنے باطن میں بھی ان کے لیے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہی تھی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ باہر کی فضا خواہ کتنی ہی گھٹی ہوئی ہو آدمی کا اپنا دل اپنے رویے پر مطمئن ہو تو وہ خلق کی بے مہری سے زیادہ برداشتہ خاطر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے باطن میں امن و سکون کا کوئی گوشہ تلاش کر ہی لیتا ہے۔ لیکن یہ لوگ خدا اور رسولؐ کی ناراضگی پر ایک لمحہ کے لیے بھی صبر کرنے والے نہیں تھے چہ جائیکہ پورے پچاس دن اس حالت میں ان پر گزر جائیں کہ مدینہ کے در و دیوار شاہد ہوں کہ اللہ اور رسولؐ ان سے ناراض ہیں۔ جن کے دلوں میں ایمان ہو ان کے لیے اس سے بڑے غم و اندوہ کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کا حال یہ ہوا کہ باہر کی دنیا ان سے جتنی بیزار تھی اس سے زیادہ یہ لوگ خود اپنے وجود سے بیزار تھے۔ اندازہ کیجیے کہ کیا حال ہوا ہوگا ان لوگوں کی دل شکستگی کا جن کو نہ تو باہر سے کوئی امید کی کرن نظر آ رہی ہو اور نہ خود اپنا ہی دل کسی طرح تسلی قبول کرنے کے لیے تیار ہو۔

خدا کی گرفت سے خدا ہی کی پناہ

وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰہِ اِلَّآ اِلَیْہِ۔ یہ ان لوگوں کے دل کی حالت کی ٹھیک ٹھیک تعبیر ہے کہ جتنی ہی شدت کے ساتھ ان لوگوں پر عتاب ہوا اتنی ہی بے قراری کے ساتھ ان لوگوں نے اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دیا کہ جب گرفت خدا کی طرف سے ہے تو اس سے پناہ صرف وہی دے سکتا ہے چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین میں سے دو صاحبوں نے تو بالکل ہی خانہ نشینی اختیار کر لی، رات دن گریہ و زاری اور توبہ و استغفار کے سوا ان کا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا۔ تیسرے صاحب اگرچہ کسی کسی وقت باہر نکلتے لیکن صرف اس امید میں کہ شاید کسی گوشے سے خدا اور رسولؐ کی رضا کی کوئی جھلک آ جائے۔ اگر ان کے اندر نفاق کا کوئی جرثومہ ہوتا تو جب یہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے پھینکے گئے تھے، کسی اور کی پناہ ڈھونڈھنے کی کوشش کرتے لیکن یہ راسخ الایمان لوگ تھے اس وجہ سے ٹھیک اس بچے کی طرح جو ماں کی جھڑکی سے سہم کر خود ماں ہی سے چمٹتا ہے، یہ خدا کے عذاب سے بچنے کے لیے خدا ہی کی طرف بھاگے، نہ کوئی جھوٹا عذر پیش کیا، نہ دوسروں سے مل کر کوئی ساز باز کرنے کی کوئی کوشش کی۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک صاحب ــ کعب بن مالکؓ ــ کے پاس انہی دنوں شاہ غسان کا قاصد خط لے کر آیا کہ "ہم نے سنا ہے کہ تمہارے صاحب نے تم پر ستم توڑ رکھا ہے، تم کوئی حقیر اور ضائع کیے جانے کے لائق آدمی نہیں ہو، تم ہمارے پاس آ جاؤ، ہم تمہاری قدر کریں گے" تو انھوں نے اس خط کو چاک کر کے چولہے میں جھونک دیا۔ اس لیے کہ کعب بن مالکؓ اس حقیقت پر ایمان رکھتے تھے کہ خدا کی گرفت سے بندہ صرف خدا ہی کی رحمت سے چھوٹ سکتا ہے، شاہ غسان اس سے نجات نہیں دلا سکتا۔ درحقیقت یہی عقیدہ روح ایمان اور مغز توحید ہے۔ بندہ اس عقیدے کے ساتھ، خدا کی کسی گرفت پر، اپنے آپ کو خدا ہی کے آگے ڈال دیتا ہے تو اس کی رحمت پہلے سے بڑھ کر اس کے لیے جوش میں آتی ہے۔

پچھلا توبہ کے لیے پچھلا بے قرار کم

ثُمَّ تَابَ عَلَیْہِمْ لِیَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔ یعنی جب ہجر و فراق کی یہ سختیاں جھیل کر

ان کے دل اچھی طرح گداز ہو گئے، تب اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کی نظر فرمائی اور ان کو سچی اور خالص توبہ کی توفیق بخشی۔ لِيَتُوبُوْا فعل یہاں اپنے حقیقی اور کامل معنی میں ہے۔ جہاں تک اعتراف گناہ کا تعلق ہے وہ تو، جیسا کہ پیچھے گزرا، ان لوگوں نے پہلے بھی کر لیا تھا لیکن اس وقت ان کی توبہ قبول نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان حضرات کو اپنی سابقہ دینی خدمات پر اعتماد تھا۔ اس وجہ سے ان کو نہ تو اپنی غلطی کی سنگینی کا صحیح صحیح اندازہ ہی ہو سکا اور نہ ان کے اندر وہ سچی تڑپ اور بے قراری ہی پیدا ہو سکی جو ان کے مرتبہ کے شایانِ شان تھی۔ آدمی سے توقع اس کے درجے اور مقام کے اعتبار سے کی جاتی ہے، ہر ایک کی وفاداری ایک ہی پیمانے سے نہیں ناپی جاتی۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمائش کے ایک سخت کورس سے گزارا تاکہ ان کو بھی اور ان کے واسطے سے دوسرے اہل ایمان کو بھی یہ تربیت حاصل ہو کہ سچی توبہ کے لیے دل کی کس درجے کی خستگی اور کس نوعیت کی بے قراری اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

توبہ کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے

تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوْا سے ایک اور حقیقت بھی واضح ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ توبہ کی ابتدا اصلاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہی پہلے بندے کے دل میں رجوع الی اللہ کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ پھر جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوبارہ اس پر رحمت کی نظر فرماتا اور اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ اگر اس کے اندر ایمان ہو تو ہر گناہ پر اس کا دل کڑھتا اور آزردہ ہوتا ہے اور ایک احساسِ ندامت کے ساتھ اس کے اندر اپنے رب کی طرف رجوع ہونے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اگر آدمی اپنے اس جذبے کے مطابق عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل اور زبان پر وہ الفاظ اور کلمات بھی جاری فرما دیتا ہے جو اس کو پسند ہیں اور جن کو وہ شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ اس سے محروم صرف وہ بدقسمت لوگ رہتے ہیں جن کا ضمیر گندا اور جن کا ایمان مردہ ہو جایا کرتا ہے۔ ایسے لوگ خدا سے بے پروا ہو جایا کرتے ہیں جس کی سزا ان کو یہ ملتی ہے کہ خدا بھی ان سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ آدمؑ و ابلیس کی سرگزشت، جو سورہ بقرہ میں بیان ہوئی ہے، وہ اس کی نہایت حقیقت افروز مثال ہے۔ آیت فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۔ ۳۷ - بقرہ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (۱۱۹)

راستبازوں کی صحبت اختیار کرنے کی ہدایت

تطہیر و تزکیہ کا غسل دینے کے بعد اب یہ مسلمانوں کو بعض ہدایات دی جا رہی ہیں جن پر عمل کر کے وہ آئندہ اپنے آپ کو کفر و نفاق کی آلودگیوں سے پاک صاف رکھ سکتے ہیں۔

پہلی ہدایت یہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور راستبازوں کی صحبت و معیت اور راسخ الایمان اور کامل الحیاء لوگوں کی رفاقت اختیار کرو۔ صحبت و معیت کو آدمی کے بناؤ اور بگاڑ میں بڑا دخل ہے۔ اگر آدمی

کا رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا، کافروں، منافقوں اور جاہلوں کے ساتھ ہو تو گو وہ تو در کنار بسا اوقات مضبوط آدمی بھی کچھ نہ کچھ ان کا اثر قبول کر ہی لیتا ہے۔ اسی طرح راسخ الایمان اور راسخ العمل لوگوں کے فیض صحبت سے کمزور آدمی کے اندر بھی اپنی کمزوریوں پر غالب آنے کا حوصلہ پیدا ہو جایا کرتا ہے اور وہ بالتدریج ان کے درجے کا آدمی بن جاتا ہے۔ صحبت اور معیت کی اسی اہمیت کے سبب سے ان لوگوں کو جو دار الکفر میں پڑے ہوئے تھے ہجرت کر کے دار الاسلام میں آنے کا حکم ہوا اور مسلمانوں کو جو مدینہ کے اطراف کے دیہاتوں میں آباد تھے یہ ہدایت ہوئی کہ ان کی جماعتیں برابر باری باری حصول تعلیم و تربیت کے لیے مدینہ آتی رہیں تاکہ ان کا ربط نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے ساتھ قائم رہے۔ پیچھے منافقین اور اعراب کے جو حالات بیان ہوئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روحانی و اخلاقی بیماریوں میں بڑا دخل ان کے خراب ماحول کا تھا۔ اس وجہ سے احتیاطی تدابیر میں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ یہ بات بیان ہوئی کہ لوگ اللہ سے ڈرتے رہیں اور راست بازوں کی صحبت و رفاقت کا التزام کریں۔ خدا کا خوف دل کا پاسبان ہے۔ وہ اندر سے انسان کی حفاظت کرتا ہے اور راست بازوں کی صحبت باہر سے اس کو شیطان کے مقابل میں کمک پہنچاتی ہے۔

'صٰدِقِیْنَ' کا لفظ یہاں خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کا ہے۔ ہم دوسرے مقام میں اس لفظ کی حقیقت واضح کر چکے ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے قول اور عمل میں پوری پوری مطابقت ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ یہ لفظ منافقین کا ضد ہے۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ وَلَا يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۲۰-۱۲۱)

اوپر کے مضمون کی تاکید مزید

یہ بھی اوپر والے مضمون ہی کی تاکید مزید یعنی صادقین کی رفاقت و معیت اختیار کرنے کے لیے کمزور مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ ہرچند اس راہ میں آزمائشیں، مشکلات اور خطرات ہیں لیکن حق کی راہ میں جس مشکل اور خطرے سے بھی بندہ گزرتا ہے، جو چوٹ بھی وہ کھاتا ہے، جو چرکا بھی وہ دشمن کو لگاتا ہے، ہر ایک کے بدلے میں اس کے کھاتے میں ایک عمل صالح درج ہوتا ہے اور جزا کے دن ہر شخص اپنے ہر عمل صالح کا بہتر سے بہتر صلہ پائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کا معاملہ اپنی راہ میں دکھ اٹھانے والوں کے ساتھ یوں ہے تو اہل مدینہ اور اعراب میں سے کسی کے لیے زیبا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کا ساتھ دینے سے ہچکچاتا اور اپنی جان کو ان کی جان کے مقابل میں اہمیت دیتا۔ اور نہ آیندہ یہ کسی کے لیے جائز ہے کہ راہ حق کے خطرات اور اندیشوں سے ڈر کر حق اور حق پرستوں کا ساتھ چھوڑ کر باطل اور باطل پرستوں کا ہم سفر بن جائے۔

اعمال کی مقبولیت کی شرط — احسان

'إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ' میں لفظ 'مُحْسِنِیْنَ' اس شرط کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ کے ہاں ان

اعمال کی مقبولیت کے لیے ضروری ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ یہ اعمال احسان، پوری خوبی کے ساتھ صرف اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے انجام دیے جائیں، کسی اور غرض کا کوئی شائبہ اس میں شامل نہ ہو۔

'وَلَا یَطَـُٔوۡنَ مَوۡطِئًا یَّغِیۡظُ الۡکُفَّارَ' سے مراد اس طرح کے اقدامات ہیں جو دشمن کے حوصلے کو پست کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ جن سے ان کے دل کو صدمہ پہنچتا ہے اور اہلِ حق کے حوصلے کی ان پر دھاک بیٹھتی ہے۔

وَمَا کَانَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لِیَنۡفِرُوۡا کَآفَّۃً ؕ فَلَوۡلَا نَفَرَ مِنۡ کُلِّ فِرۡقَۃٍ مِّنۡہُمۡ طَآئِفَۃٌ لِّیَتَفَقَّہُوۡا فِی الدِّیۡنِ وَلِیُنۡذِرُوۡا قَوۡمَہُمۡ اِذَا رَجَعُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ لَعَلَّہُمۡ یَحۡذَرُوۡنَ (۱۲۲)

نفاق کی بیماری کا علاج

یہ بات بھی صادقین کی معیت اور رفاقت ہی کے پہلو سے ارشاد ہوئی ہے۔ اوپر آیت ۹۷ میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اعراب نے نبیؐ اور صالحین کی صحبت بہت کم اٹھائی ہے۔ وہ حلال و حرام کی حدود سے بے خبر ہیں، اس وجہ سے کفر و نفاق کی بیماری کا حملہ ان پر آسانی سے ہو جاتا ہے۔ اب یہ ان کو اس کمزوری کے علاج کی طرف توجہ دلائی کہ ان لوگوں کو زیادہ سے زیادہ پیغمبرؐ اور صحابہؓ کی صحبت سے مستفید ہونے کی سبیل نکالنے کی کوشش کرنی تھی۔ اگر سب لوگ اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کر مجلس نبویؐ میں نہیں پہنچ سکتے تھے تو ایسا کیوں نہیں کیا گیا کہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت علم دین میں فہم و بصیرت حاصل کرنے کے لیے مجلس نبویؐ میں حاضر ہوتی تاکہ وہاں سے مستفید ہو کر اپنی قوم کو بھی اس سے مستفید کرتی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اب تک اس میں کوتاہی ہوئی ہے تو اب اس کا اہتمام کیا جائے اور ہر بستی سے لوگ باری باری مدینہ آئیں، دین سیکھیں اور سمجھیں اور پھر اپنی قوم میں واپس جا کر لوگوں کو بتائیں اور سکھائیں۔ اس طرح دیہات کے لوگ اپنے گھر در اور مال مویشی کی دیکھ بھال بھی کر سکیں گے اور نبیؐ اور صحابہؓ کے فیوض صحبت سے بھی مستفید ہو سکیں گے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ نے مجلس نبویؐ میں حاضری کے لیے باریاں مقرر کر رکھی تھیں۔ اس طرح وہ اپنے باہمی تعاون سے اپنے کام کاج بھی جاری رکھتے اور مجلسِ نبویؐ کے فیوض و برکات سے بھی فائدہ اٹھاتے۔

اسلام میں تعلیم کا اصل مقصد

آیت میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے 'تَفَقُّہٌ فِی الدِّیۡنِ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں دین میں فہم و بصیرت حاصل کرنا اور تعلیم دینے کے لیے 'اِنۡذَارٌ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ڈرانے ہوشیار کرنے اور خاص طور پر آخرت کی زندگی کی تیاریوں کے لیے بیدار کرنے کے ہیں۔ یہ دونوں لفظ اسلام میں تعلیم کا جو اصل مقصد ہے، اس کے لحاظ سے استعمال ہوتے ہیں۔ اسلام میں تعلیم و تعلم کا اصل مقصد دین میں بصیرت حاصل کرنا اور آخرت کی فلاح کے لیے اپنی اور دوسروں کی تربیت کرنا ہے۔ باقی چیزیں سب ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور اسی نصب العین کے تابع ہیں۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ یَلُوۡنَکُمۡ مِّنَ الۡکُفَّارِ وَلۡیَجِدُوۡا فِیۡکُمۡ غِلۡظَۃً ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۱۲۳)

آیت ۱۲۳ پوری سورہ کے اصل مضمون کا خلاصہ ہے

یہ آیت پوری سورہ کے اصل مضمون کا خلاصہ ہے۔ اس سورہ میں، جیسا کہ آپ نے دیکھا، کفار و مشرکین پر اتمام حجت ہو چکنے کے بعد ان سے اعلانِ برأت اور ان کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ آیات ۲۳-۲۴ کے تحت یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ منافقین اپنے پاس پڑوس کے کفار و مشرکین سے عزیزانہ و دوستانہ روابط اور دوسرے کاروباری مفادات وابستہ رکھنے کے سبب سے، اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان سے جنگ کریں یا اپنے تعلقات ان سے یک قلم ختم کر لیں۔ ان کی اس منافقت کی اچھی طرح قلعی کھول لینے اور ایمان، تقویٰ اور صداقت کے حقیقی مقتضیات تفصیل سے واضح کر دینے کے بعد اب یہ دین کا اصل مطالبہ ان کے سامنے پھر رکھ دیا گیا ہے۔ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ پتہ دے رہا ہے کہ روئے سخن ان ہی کی طرف ہے۔ فرمایا کہ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ یعنی جو کفار تمھارے پاس پڑوس اور گرد و پیش میں ہیں ان سے جنگ کرو۔ گرد و پیش کے کفار جس طرح تمھاری دعوتِ ایمان و ہدایت کے سب سے زیادہ حق دار تھے اسی طرح اب، اللہ اور رسول کی طرف سے اتمام حجت اور اعلانِ جنگ کے بعد، تمھاری تلواروں کے بھی سب سے زیادہ سزاوار یہی ہیں، جو لوگ قرابت داری، دوستی اور اپنے دنیوی مفاد کی خاطر ان کے معاملے میں مداہنت برتیں گے، وہ جیسا کہ آیت ۲۳ میں فرمایا ہے، اپنی جانوں پر سب سے زیادہ ظلم ڈھانے والے ٹھہریں گے اور انہی کے لیے آیت ۲۴ میں یہ وعید ہے کہ تم انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمھارے باب میں اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔ یہ حقیقت ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کی جا چکی ہے کہ ایمان و اخلاص کی اصل روح اس وقت بیدار ہوتی ہے جب اس کی خاطر اپنوں سے جنگ کرنی پڑے۔ 'يَلُوْنَكُمْ' کی قید اسی پہلو کو نمایاں کر رہی ہے۔

'وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً' یعنی اب وہ تمھارے طرزِ عمل سے یہ محسوس کر لیں کہ تمھارے اندر ان کے لیے موالات، دوستی اور محبت کی کوئی جگہ باقی نہیں رہ گئی ہے بلکہ جس طرح وہ من حیث القوم تمھارے اور تمھارے دین کے دشمن ہیں اسی طرح تم بھی من حیث الجماعت ان کے اور ان کے دین کے دشمن بنو۔ اب تک وہ تمھارے دل میں اپنے لیے بڑا نرم گوشہ پاتے تھے، اس وجہ سے ان کو توقع تھی کہ وہ اپنے مقاصد کے لیے تم کو برابر استعمال کرتے رہیں گے۔ اب یہ حالت یک قلم ختم ہو جانی چاہیے۔

'وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ' کے یہاں دو پہلو ہو سکتے ہیں۔

اہل ایمان کی حوصلہ افزائی

ایک تو یہ کہ اہل ایمان کی حوصلہ افزائی ہو۔ یعنی تم ان سے جنگ کرنے میں کوئی کمزوری دلپست ہمتی نہ دکھاؤ، اللہ کی معیت و نصرت اس کے متقی بندوں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر تم تقویٰ پر قائم رہے تو فتح و نصرت تمھاری ہی ہے، یہ لوگ ذلیل و خوار ہوں گے۔ یہ بات ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ خدا کی معیت اس کی نصرت کو بھی مستلزم ہے۔ اس وجہ سے خدا کے ساتھ ہونے کے معنی اس کی مدد و نصرت

کے ساتھ ہونے کے ہیں۔

مسلمانوں کو جنگ میں حدود و قیود کی پابندی کا حکم

دوسرا یہ کہ مسلمانوں کو تنبیہ ہو کہ تمہیں ان سے جنگ اور ان کے معاملے میں شدت اختیار کرنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے تو اس میں بھی تم خدا کے مقرر کردہ حدود و قیود کی پوری پابندی کرنا، کسی مرحلے میں بھی حدود الٰہی سے تجاوز نہ کرنا، اللہ صرف اپنے متقی بندوں ہی کا ساتھی ہے۔ پیچھے یہ ہدایات گزر چکی ہیں کہ جو کفار و مشرکین اپنے معاہدات پر قائم ہیں ان کے معاہدات کی مدت پوری کی جائے نیز محترم مہینوں کا احترام ملحوظ رکھا جائے۔ یہ انہی باتوں کی تاکید مزید ہے۔

وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِۦٓ إِيمَٰنًا ۚ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَزَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ كَٰفِرُونَ ۝ أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِى كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝ وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ هَلْ يَرَىٰكُم مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ ٱنصَرَفُوا۟ ۚ صَرَفَ ٱللَّهُ قُلُوبَهُم بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ (۱۲۴-۱۲۷)

کٹر منافقین کا طرز عمل

یہ ان منافقین کی طرف اشارہ ہے جو اس سورہ کی تمام تنبیہات و تحذیرات کے بعد بھی بدستور نہ صرف اپنے نفاق میں مبتلا رہے بلکہ درجہ بدرجہ ان کا نفاق سخت سے سخت تر ہی ہوتا چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی تنبیہ بھی ان کو توبہ کے لیے بیدار نہ کر سکی یہاں تک کہ اسی حالت میں ان کو موت آ گئی۔

قرآن پر طنز

'وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِۦٓ إِيمَٰنًا' 'سورہ' سے قرآن کی کوئی سورہ بھی مراد ہو سکتی ہے اور قرآن کا کوئی خاص حکم اور اس کا کوئی خاص ٹکڑا بھی۔

یہ منافقین مجلس نبوی میں مجبوراً محض دکھاوے اور مسلمانوں کو مطمئن رکھنے کے لیے جاتے تھے وہاں ان کو ہر روز قرآن کے نئے نئے مطالبات سے سابقہ پیش آتا، کبھی کوئی حکم سنایا جاتا، کبھی کوئی۔ یہ روز روز کے نئے نئے احکام ان پر بڑے شاق گزرتے۔ ان کے خلاف کھل کر کچھ کہنے کی جرأت تو ہوتی نہیں تھی البتہ کچھ طنزیہ فقرے چست کر کے وہ دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتے۔ مثلاً کہتے کہ ہاں، بھئی بتاؤ، اس نئے حکم سے کن کن لوگوں کا ایمان تازہ ہوا ہے، اس قسم کے طنز و تعریض سے ان کا مقصود اللہ اور رسول کے احکام کی تحقیر اور مخلص مسلمانوں کی حوصلہ شکنی ہوتا۔

اہل ایمان پر قرآن کا اثر

'فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَزَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ كَٰفِرُونَ' یہ ان کے اسی قسم کے زہر آلود طنزیہ فقرے کا جواب ہے کہ جو سچے اہل ایمان ہیں ان کے لیے تو قرآن کی ہر سورہ اور اس کا ہر حکم ان کے ایمان و اسلام میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے اور جب وہ سنتے ہیں کہ قرآن کا کوئی نیا ٹکڑا نازل ہوا ہے تو بجائے اس کے کہ اس سے ان کے دل بھنچیں وہ خوش ہوتے ہیں کہ رحمت الٰہی کی ایک اور گھٹا برسی، البتہ جن کے دلوں

میں نفاق کا روگ ہوتا ہے ان کی اس نجاست پر مزید نجاست کے ردے پر ردے چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کو زندگی کے کسی مرحلے میں بھی توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی یہاں تک کہ اسی حالت کفر میں ان کو ایک دن فرشتۂ اجل آ دبوچتا ہے۔

اہلِ نفاق پر قرآن کا اثر

قرآن کی آیات سے اہلِ ایمان کے ایمان میں درجہ بدرجہ زیادتی ہونا اور اہلِ نفاق کے نفاق کا غلیظ سے غلیظ تر ہونا محض استعارہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ قرآن کا ہر حکم اہلِ ایمان کے لیے ایک میدانِ مسابقت کھولتا ہے اور جب وہ اس میدان کی بازی جیت لیتے ہیں تو ان کی قوتِ ایمانی میں مزید دوسرے میدان جیتنے کے لیے عزم و حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ درجہ بدرجہ وہ سعادت کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ برعکس اس کے اہلِ نفاق ایک محرومی کے بعد دوسری محرومی اور ایک پسپائی کے بعد دوسری پسپائی کی ذلتیں سہتے سہتے عزم و ایمان کی آخری رمق سے بھی بالکل خالی ہو جاتے ہیں اور ان کے دلوں پر نفاق پر نفاق کی اتنی موٹی تہیں جم جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے انسان کے دل کے اندر جتنی صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، سب ان کے نیچے دب دبا کر مردہ ہو جاتی ہیں۔

'اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّهُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ یَذَّكَّرُوْنَ'۔ اوپر والی آیت میں ان لوگوں کے توفیقِ توبہ سے محروم ہو جانے کی طرف جو اشارہ ہے یہ اسی کی دلیل ہے کہ یہ لوگ غور کرتے تو انہیں خود اندازہ ہو جاتا کہ ان کی بیماری اب اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ ان کے لیے توبہ کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے ہر بندے پر رحمت کرنا چاہتا ہے اس وجہ سے اس نے اس دنیا کا نظام اس طرح رکھا ہے کہ ہر شخص، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا سال میں ایک دو بار ضرور کسی نہ کسی ایسی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے جو اس کو توبہ اور اصلاح پر ابھارے۔ جو صاحبِ توفیق ہوتے ہیں وہ ان آزمائشوں سے سبق حاصل کرتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن جو لوگ اپنے اعمال کی پاداش میں توفیق سے محروم ہو جاتے ہیں وہ ان آزمائشوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ چنانچہ یہ لوگ اب اسی حالت کو پہنچ چکے ہیں۔ اب کوئی ٹھوکر بھی ان کی آنکھیں کھولنے والی نہیں بنتی۔ 'ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ' میں ان کے دلوں کی قساوت کی طرف اشارہ ہے اور 'وَلَا هُمْ یَذَّكَّرُوْنَ' میں ان کی عقلوں کے کند ہونے کی طرف۔ اس لیے کہ 'توبہ' دل کا فعل ہے اور 'تذکر' عقل کا۔ گویا ان کے اعمال کی سیاہی نے ان کی ان دونوں ہی چیزوں کو تاریک کر دیا ہے۔

توفیقِ توبہ سے محروم

مجلس نبوی سے منافقین کا فرار

'وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ یَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا'۔ یہ تصویر ہے ان منافقین کے مجلسِ نبوی سے چپکے سے کھسک جانے کی۔ اہم اجتماعی مواقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مسلمانوں کو کسی نئی مہم کی تیاری اور اس سے متعلق قرآن کی تازہ ہدایات سے آگاہ کرنے کے لیے بلاتے تو آنے کو تو منافقین بھی شرما شرمی میں، محض دکھاوے کے لیے آ جاتے لیکن جب دیکھتے کہ کوئی مشکل مہم درپیش ہے، مجلس میں موجود رہے تو اس کی ذمہ داریوں میں حصہ لینا پڑے گا، تو آپس میں کن انکھیوں سے اشارے

شروع کر دیتے۔ مطلب یہ کہ اگر مسلمانوں میں سے کوئی دیکھ نہ رہا ہو تو یہاں سے کھسک چلو۔ پھر مسلمانوں کی نظریں بچا کر، ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے یکے بعد دیگرے وہاں سے سٹک جاتے۔ منافقین کی اس روش کی طرف اس سے زیادہ تفصیل سے سورۂ نور میں اشارہ ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ لَّا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضًا ۚ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (نور ۶۲-۶۳)

سچے مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور جب وہ کسی اجتماعی معاملے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں (تو) اس وقت تک وہاں سے نہیں ٹلتے جب تک وہ پیغمبر سے اجازت نہ حاصل کر لیں۔ جو لوگ تم سے اجازت لیتے ہیں وہی دراصل اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والے ہیں تو ایسے لوگ جب تم سے اجازت مانگیں اپنی کسی ضرورت کے لیے تو تم ان میں سے جس کو چاہو اجازت دے دیا کرو اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت چاہو۔ اللہ غفور رحیم ہے۔ لوگو! جب رسول تم کو بلائے تو اس کے بلانے کو اس طرح کا بلانا نہ سمجھو جیسا کہ تمہارا ایک دوسرے کو بلانا ہوتا ہے۔ اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا رہا ہے جو ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے کھسک جایا کرتے رہے ہیں تو جو لوگ نبی کے حکم سے اعراض کرتے رہے ہیں انھیں ڈرنا چاہیے کہ مبادا انھیں کوئی آزمائش پیش آ جائے یا وہ ایک دردناک عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔

اللہ سے فرار اختیار کرنے والوں پر لعنت

'صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُم بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ' یعنی جب انھوں نے اللہ اور رسول سے روگردانی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو پھیر دیا۔ یہ لعنت کی تعبیر ہے اور دوسرے الفاظ میں اس کا مدعا وہی ہے جو 'فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ' کا ہے۔ اس حالت کو پہنچ جانے کے بعد آدمی کے دل پر مہر ہو جایا کرتی ہے اور آیت سے واضح ہے کہ یہ مہر آدمی کے خود اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ 'بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ' یعنی جو لوگ اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں سے خدا کی تنبیہات کے بعد بھی کام نہیں لیتے ان کی ان صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ اس سمت میں موڑ دیتا ہے جس سمت کو وہ جانا چاہتے ہیں۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۔ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (۱۲۸-۱۲۹)

بعثت نبوی کے عظیم احسان کا بدلہ

یہ دونوں آیتیں آخری تنبیہ کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔ پہلے اس عظیم احسان کی طرف توجہ دلائی ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ذریعہ سے تمام خلق پر عموماً اور اہل عرب پر خصوصاً فرمایا ہے۔ خطاب اگرچہ

عام ہے لیکن سیاقِ کلام دلیل ہے کہ روئے سخن انھیں لوگوں کی طرف ہے جو اس عظیم نعمت کی قدر کرنے کے بجائے اس کو اپنے لیے ایک مصیبت سمجھ رہے ہیں۔ فرمایا کہ تمھارے پاس ایک رسول تمھی میں سے آچکا ہے۔ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ کے الفاظ میں اتمامِ حجت اور احسان کے جو پہلو مضمر ہیں ان کی طرف سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ یعنی تم میں سے شامت زدہ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ رسول ان کے لیے ایک مصیبت اور مصیبتوں کے دروازے کھولنے والا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو تم کو مصیبت اور ہلاکت میں مبتلا کرنے والی ہو اس کے دل پر نہایت شاق ہے۔ وہ تمھیں دنیا اور آخرت دونوں کی کلفتوں اور ہلاکتوں سے محفوظ اور دونوں کی سعادتوں سے بہرہ مند دیکھنا چاہتا ہے اور اس کی ساری بھاگ دوڑ اور تمام تعلیم و تبلیغ اسی مقصد کے لیے ہے۔ لیکن جو لوگ اسی دنیا کی زندگی کو کل زندگی سمجھے بیٹھے ہیں ان کو اس کی وہ باتیں بہت گراں گزر رہی ہیں جو ان کو اپنے دنیوی مفادات کے خلاف نظر آتی ہیں حالانکہ اگر وہ اس دنیا کے بعد کی زندگی کی اہمیت کو جانتے ہوتے تو ان کو اندازہ ہوتا کہ پیغمبر کی یہ ساری بے قراریاں اور بے چینیاں اپنے لیے نہیں بلکہ خود ان کو ہر کرب اور ہر دکھ سے محفوظ رکھنے کے لیے ہیں۔

خلق کے لیے نبی صلعم کے جذبات

حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ یعنی وہ جو اس درجہ تمھارے درپے ہے تو اس میں اس کی اپنی کوئی غرض شامل نہیں بلکہ یہ صرف اس سبب سے ہے کہ وہ تمھارے ایمان و اسلام اور تمھاری صلاح و فلاح کا نہایت حریص ہے۔ جس طرح ایک شفیق باپ اپنی اولاد کے لیے ہر خیر کا متمنی اور حریص ہوتا ہے، اس چیز سے کبھی اس کا دل نہیں بھرتا، اسی طرح اللہ کا رسول تمھارے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں ہر خیر کا حریص اور متمنی ہے۔ پس حیف ہے ان لوگوں پر جو ایسی شفیق اور مہربان ہستی کی قدر نہ کریں۔

بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ، رَءُوۡفٌ، اور رَحِیۡم کے فرق پر ہم دوسری جگہ روشنی ڈال چکے ہیں۔ ایک کے اندر دفعِ شر کا پہلو نمایاں ہے دوسرے کے اندر عطائے خیر اور پائداری رحمت کا۔ یہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنیٰ میں سے ہیں جو بعینہٖ یہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوئی ہیں جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ خلق کے ساتھ رأفت و رحمت کے معاملے میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بالکل صفاتِ الٰہی کے مظہر تھے۔ یہ ٹکڑا چونکہ بعینہٖ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ کی تفسیر و توضیح ہے اس وجہ سے حرفِ ربط یہاں نہیں ہے تاکہ کامل اتصال کا اظہار رہے۔

پیغمبر صلعم سے خطاب

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا ..... الایۃ، اس آیت میں خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمھاری بعثت کی شکل میں جو خیرِ عظیم ان کے لیے نازل فرمایا ہے اگر یہ ناقدرے اور ناشکرے لوگ اس کی قدر نہیں کرتے تو اس میں انھی کی تباہی ہے، تمھارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ تم ان کے ایمان و ہدایت کے حریص اور ان کی دنیا اور آخرت کی صلاح و فلاح کے لیے بے چین ہو اور اس میں تمھارا نہیں بلکہ سرتاسر انھی کا نفع ہے۔ اگر یہ تمھاری قدر کرتے تو اپنی ہی دنیا اور آخرت سنوارتے لیکن یہ حقیقت ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تو تم ان کی پروا نہ کرو بلکہ ان کو صاف صاف سنا دو کہ میرے لیے اللہ کافی ہے۔ یعنی میں تمھارا جو حریص ہوں

تو اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے ہی لیے ہوں۔ تم نہیں آتے تو یہ نہ سمجھو کہ میں تنہا اور بے یار و مددگار رہ جاؤں گا۔ میری پناہ، میرا سہارا اور میری قوت و جمعیت میرا اللہ ہے جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ میرا بھروسا اس پر ہے اور وہی اس عرش عظیم کا مالک اور خداوند ہے تو جس کا بھروسا اس عرش عظیم کے رب پر ہے اس کو دوسروں کی ناقدری اور بیزاری کی کیا پروا ہو سکتی ہے!

اس سورہ کی تفسیر میں یہ آخری سطریں ہیں جو آج بروز جمعہ ۹ بجے صبح حوالہ قرطاس ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

لاہور

۱۵ اگست ۱۹۶۹ء

فہرست مضامین

فہرست مضامین

تفسیر سورۃ الانعام - ۶

تفسیر سورۃ الاعراف - ۷

تفسیر سورۃ التوبۃ - ۹

خطاطی ——— عبدالغفور کیلانی

افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

یونس ۱۰ — مریم ۱۹

تدبر قرآن —— —————— جلد چہارم

ebooks.i360.pk

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبّرِ قرآن

جلد چہارم

تفاسیر

سورۂ یونس (۱۰) ـــــ تا ـــــ سورۂ مریم (۱۹)

امین احسن اصلاحی

فاران

فاران فاؤنڈیشن

لاہور ـــــ پاکستان

اہتمام — حسن خاور

مطبع — کیو۔وائی پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت — نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ — فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

تدبرِ قرآن

۱۰

یونس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورتوں کے تیسرے گروپ پر ایک اجمالی نظر

سورۂ توبہ پر سورتوں کا دوسرا گروپ، جیسا کہ ہم نے مقدمہ میں واضح کیا ہے، تمام ہوا اب سورۂ یونس سے تیسرا گروپ شروع ہو رہا ہے جو سورہ نور پر ختم ہوا ہے۔ اس میں ۱۴ سورتیں ــــ یونس، ہود، یوسف، رعد، ابراہیم، حجر، نحل، بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، انبیاء، حج اور مومنون مکی ہیں، آخر میں صرف سورہ نور مدنی ہے۔ سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے کا اصول، جس طرح پچھلے دونوں گروپوں میں آپ نے ملاحظہ فرمایا اسی طرح اس گروپ میں بھی ملحوظ ہے۔ گروپ کی پندرھویں سورہ ــــ سورۂ نور ــــ بظاہر الگ نظر آتی ہے لیکن اس کی حیثیت، جیسا کہ ہم سورہ کی تفسیر میں واضح کریں گے، سورۂ مومنون کے تکملہ اور تتمہ کی ہے۔ سورۂ مومنون میں اہل ایمان کو دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کی جو بشارت دی گئی ہے وہ اس خاص اخلاق و کردار کے ساتھ مشروط ہے جو ایمان کا لازمی مقتضیٰ ہے۔ سورۂ نور میں اخلاق و کردار کو مزید واضح فرمایا گیا ہے جس سے 'خبیثون' اور 'خبیثات' کے کافرانہ معاشرہ کے مقابل میں 'طیبون' اور 'طیبات' کا مومنانہ معاشرہ پوری آب و تاب کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آگیا ہے اور اس معاشرہ کے لیے اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ ہے وہ بھی اس میں نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

سورۂ نور کی حیثیت

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے عمل
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	صالح کیا ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	زمین میں خلافت بخشے گا جس طرح اس نے ان
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ	لوگوں کو خلافت بخشی جو ان سے پہلے گزرے اور
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ	ان کے اس دین کو ان کے لیے مستحکم کرے گا جس کو اس
لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ	نے پسند فرمایا اور ان کی اس خوف کی حالت کو امن
اَمْنًا (النور- ۵۵)	سے بدل دے گا۔

سورۂ حج مکی ہے

اس گروپ کی سورتوں میں سے سورۂ حج کو بعض لوگوں نے مدنی قرار دیا ہے لیکن یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ سورۂ حج گروپ کی آخری سورتیں چونکہ ہجرت کے بالکل قریب زمانے کی ہیں اس وجہ سے ان میں کہیں کہیں مدنی دور کی

جھلک آگئی ہے۔ لیکن یہ سورتیں اپنے مزاج اور مطالب کے اعتبار سے سب کی ہیں۔ سورہ حج کی بعض آیتیں مدنی دور سے تعلق رکھنے والی ضرور ہیں لیکن سورہ بحیثیت مجموعی، جیسا کہ ہم اس کی تفسیر میں واضح کریں گے، کی ہے۔ کسی کی سورہ میں مدنی دور کی بعض آیتیں بطور توضیح یا تکمیل آجانے سے پوری سورہ پر مدنی ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ایسی سورتیں قرآن میں بہت ہیں جن میں مدنی دور کی آیات شامل ہیں لیکن یہ سورتیں اپنے بنیادی مطالب اور اپنے مزاج کے اعتبار سے کی ہی قرار دی گئی ہیں۔

ان تمام سورتوں میں قدر مشترک

اس پورے گروپ کی تلاوت بار بار تدبر کے ساتھ کیجیے تو آپ نہایت واضح طور پر محسوس کریں گے کہ گروپ کی تمام سورتوں میں مشترک حقیقت، جو مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے واضح فرمائی گئی ہے، یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے حق و باطل کے درمیان جو کشمکش برپا ہو چکی ہے وہ بالآخر پیغمبرؐ اور اہل ایمان کی کامیابی و فتحمندی اور قریش کی ذلت و ہزیمت پر منتہی ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اس میں قریش کے لیے انذار اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے لیے بشارت ہے۔ قریش پر عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے دلائل اور تاریخ و نظام کائنات کے شواہد سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جو حق تمہارے پاس آچکا ہے، اگر اس کی مخالفت میں تمہاری یہی روش قائم رہی تو بہت جلد وہ وقت آرہا ہے جب تم اس کا انجام بد اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ دنیا میں تم سے پہلے جن قوموں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی ہے جو حشر ان کا ہوا ہے اور جن کے عبرت انگیز آثار تمہارے اپنے ملک میں موجود ہیں، وہی حشر تمہارا بھی ہونا ہے۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو صبر و استقامت اور تقویٰ کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ جس حق کو لے کر تم اٹھے ہو انجام کار کی کامیابی اور فیروزمندی اسی کا حصہ ہے۔ آفاق و انفس اور تاریخ اقوام و ملل کے دلائل و شواہد سب تمہارے ہی حق میں ہیں۔ البتہ سنت الٰہی یہ ہے کہ حق کو غلبہ اور کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے آزمائش کے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان مرحلوں سے لازماً تمہیں بھی گزرنا ہے۔ اگر یہ مرحلے تم نے عزیمت و استقامت کے ساتھ طے کر لیے تو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی تمہارا ہی حصہ ہے۔ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ۔ (ابراہیم - ۲۷)

سورہ کا عمود اور گروپ کی دوسری سورتوں میں اس کے مؤیدات

یہ پورے گروپ پر ایک اجمالی نظر ہوئی۔ اب ہم گروپ کی ایک ایک سورہ کو الگ الگ لے کر اس کی تفسیر کریں گے۔ گروپ کی پہلی سورہ، سورۂ یونس ہے۔ ہم اپنے طریقہ کے مطابق پہلے اس کا عمود متعین کر کے اس کے مطالب کا تجزیہ کریں گے، اس کے بعد ایک ایک آیت کی تفسیر کریں گے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

ب - سورہ کا عمود

اس سورہ کا عمود نہایت جامع الفاظ میں اس کی دوسری ہی آیت سے واضح ہو رہا ہے۔ فرمایا ہے۔

اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (۲- یونس)

کہ لوگوں کو آگاہ کر دو اور اہل ایمان کو بشارت پہنچا دو کہ ان کے رب کے پاس ان کے لیے بڑی پایگاہ ہے۔ کافروں نے کہا یہ تو کھلا ہوا جادوگر ہے۔

سورۂ ہود میں اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے:

فَاصْبِرْ ۭ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۴۹- ھود)

پس ثابت قدم رہو۔ انجام کار کی کامیابی متقین ہی کے لیے ہے۔

سورۂ یوسف میں ارشاد ہے:

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۹۰- یوسف)

بے شک جو تقویٰ اختیار کریں گے اور ثابت قدم رہیں گے تو اللہ ایسے خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔

سورۂ رعد میں اس صبر و تقویٰ کی کسی قدر تفصیل بھی آ گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۲۲- رعد)

اور جو لوگ اپنے رب کی رضا جوئی میں جمے رہے اور نماز کا اہتمام کیا اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق بخشا اس میں سے چھپے اور کھلے خرچ کیا اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے رہے وہی لوگ ہیں جن کے لیے دار آخرت کی کامیابی ہے۔

سورۂ ابراہیم میں اس کلمۂ توحید کی طرف بھی اشارہ ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں اہل ایمان کے ثبات قدم کا ضامن ہے:

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ (۲۷- ابراہیم)

اللہ اہل ایمان کو دنیا اور آخرت میں قول محکم کی بدولت ثبات قدم بخشے گا اور ظالموں کو نامراد کر دے گا۔

سورۂ نحل میں ہے:

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۭ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ (۳۰- نحل)

جن لوگوں نے خوب کاری اختیار کی ان کے لیے اس دنیا میں بھی اچھا صلہ ہے اور آخرت کا گھر اس سے کہیں بہتر ہے اور کیا ہی اچھا ہے متقین کا گھر۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ سیدھی راہ قرآن کی بتائی ہوئی راہ ہے اور جن لوگوں نے یہ راہ اختیار کر لی ہے، دنیا اور آخرت کی فلاح کی بشارت انہی کے لیے ہے۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ۝ وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۹-۱۰ بنی اسرائیل)

بے شک یہ قرآن اس رستہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان مومنین کو جو نیک عمل کر رہے ہیں ایک اجر عظیم کی بشارت دے رہا ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے لیے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

سورۂ انبیاء میں ہے :۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (۱۰۵-انبیاء)

اور ہم نے زبور میں یاددہانی کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

گروپ کی آخری سورہ — سورۂ نور — میں یہ بشارت واضح سے واضح تر ہو گئی ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا (۵۵-نور)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلافت عطا فرمائے گا جس طرح ان لوگوں کو خلافت عطا فرمائی جو ان سے پہلے گزرے اور ان کے اس دین کو مستحکم کرے گا جس کو ان کے لیے پسند فرمایا اور ان کی اس خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔

ان آیات کو نقل کرنے سے مقصود سورۂ یونس اور اس گروپ کی دوسری سورتوں کے عام مزاج سے فی الجملہ قارئین کو آشنا کر دینا ہے۔ ہر سورہ کا عمود اور بحث و استدلال میں اس کا صحیح رخ مطالب کے تجزیہ سے سامنے آئے گا۔ اب ہم سورۂ یونس کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ پوری سورہ بیک نظر سامنے آ جائے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۲) قریش کے حال پر اظہار افسوس کہ یہ پر حکمت کتاب کی آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک شخص پر اتاری ہیں، حق تھا کہ وہ اس کتاب کی قدر کرتے، یہ منکرین کو ان کے انجام بد سے آگاہ کرنے والی اور مومنین کو اللہ کے ہاں مرتبہ بلند کی بشارت دینے والی ہے لیکن ان منکرین پر یہ بات شاق گزر رہی ہے کہ انہی میں کا ایک آدمی ان کے پاس بشیر و نذیر بن کر آئے چنانچہ وہ اس کو جادوگر قرار دیتے ہیں۔

(۳-۴) اللہ ہی سب کا رب ہے۔ اسی نے آسمان و زمین بنائے۔ وہی تمام آسمان و زمین کا انتظام فرما رہا ہے۔ اس کے ہاں اس کے اذن کے بغیر کسی کے لیے سفارش کی گنجائش نہیں۔ سب اسی کی طرف لوٹیں گے

اور وہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کو عدل کے ساتھ بھرپور صلہ دے گا اور کفار کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔

(۵-۱۰) آفاق کی شہادت کہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ نہیں ہے جو غور کرنے والے ہیں وہ اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ اس کے بعد ایک روز عدل ظہور میں آنے والا ہے۔ صرف وہی لوگ اس حقیقت سے غافل ہیں جو اللہ کی نشانیوں پر غور نہیں کرتے اور اسی دنیا کی دلچسپیوں میں مگن ہیں۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اللہ ایمان اور عمل صالح والوں کو ان کے ایمان کی بدولت نعمت کے باغوں میں داخل کرے گا جہاں وہ اپنی کامیابی پر شاداں ایک دوسرے کو مبارک سلامت کا پیغام دیں گے اور اللہ کی نعمتوں کی تکمیل پر ان کی زبانوں پر حمد و شکر کے ترانے ہوں گے۔

(۱۱-۱۲) اللہ تعالیٰ سرکش لوگوں کو اس دنیا میں جو ڈھیل دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رحمت کرنے میں تو جلدی کرتا ہے لیکن قہر کرنے میں جلدی نہیں کرتا۔ اگر وہ رحمت کی طرح قہر کرنے میں بھی جلدی کرنے والا ہوتا تو ان سرکشوں کا قصہ کب کا تمام ہو چکا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے اس وجہ سے وہ ایسے لوگوں کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں اچھی طرح بھٹک لیں اور اپنے اوپر اللہ کی حجت تمام کرا لیں۔ ان لوگوں کی یہ سرکشی اور ان کی یہ اکڑ ان کے تھڑدلے پن کا ثبوت ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ ذرا ہم پکڑ میں تو لیٹے، بیٹھے، کھڑے ہمارا وظیفہ پڑھنا شروع کر دیتا ہے لیکن ذرا ڈھیل دے دیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ یہ کبھی ہماری پکڑ میں آیا تھا اور نہ کبھی اس نے ہمارے آگے کوئی فریاد کی تھی۔

(۱۳-۱۴) پچھلے رسولوں اور ان کی امتوں کا حوالہ کہ آخر یہ لوگ ان کے حالات سے سبق کیوں نہیں لیتے؟ اللہ تعالیٰ نے انہی کی جگہ ان کو دی اور اس لیے دی کہ دیکھے یہ کیسا عمل کرتے ہیں تو آخر ان کے ساتھ اس سے مختلف معاملہ کیوں ہو گا جو ان کے ساتھ ہوا۔

(۱۵-۱۹) توحید بیزاری کے سبب سے قریش کا یہ مطالبہ کہ اگر ہم کو سنانا ہے تو اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا کم از کم اس میں کوئی ایسی ترمیم کرو کہ یہ ہمارے لیے گوارا ہو سکے۔ پیغمبر کی طرف سے اس کا جواب کہ میں تو تمہارے سامنے اللہ کی وحی پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس میں کسی تبدیلی یا ترمیم کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں تمہارے اندر اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ گزار چکا ہوں اور اس دوران میں کوئی دعویٰ یا دعوت لے کر نہیں اٹھا۔ اب جو میں تمہارے سامنے آیا ہوں تو اپنی خواہش سے نہیں آیا ہوں بلکہ خدا کے حکم کی تعمیل میں آیا ہوں۔ اگر خدا کا حکم نہ ہوتا تو میں ہرگز تمہارے سامنے یہ چیز پیش نہ کرتا ـــــ ساتھ ہی ان کی توحید بیزاری پر یہ تنبیہ کہ یہ جن چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں اور سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ خدا سے ان کے لیے سفارش کرتی ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ سب ان کے ذہن کے مفروضات ہیں، خدا کے علم میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کی شرکتوں سے پاک اور ارفع ہے۔ اس نے لوگوں کو اپنی طرف سے ایک ہی دین توحید دیا

لیکن لوگوں نے اس میں اختلاف پیدا کیا اور اگر اللہ نے اپنے فیصلہ کا ایک دن نہ مقرر کیا ہوتا تو آج ہی اس جھگڑے کا فیصلہ ہو جاتا۔

(۲۰-۲۳) کفارِ قریش کی طرف سے نشانیِ عذاب کا مطالبہ اور اس کا جواب کہ نشانیِ عذاب دکھانا پیغمبر کا کام نہیں ہے، اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ صرف وہی جانتا ہے کہ کوئی نشانی ظاہر ہو گی یا نہیں اور ظاہر ہوگی تو کب ہوگی۔ یہ محض انسان کی رعونت ہے کہ وہ کسی عذاب کا مطالبہ کرتا ہے حالانکہ تھڑدلے پن کا حال یہ ہے کہ جب ذرا خدا کی گرفت میں آجاتا ہے تو اللہ اللہ پکارنے لگتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ اس آفت سے جان چھوٹ جائے تو زندگی اپنے رب کا شکرگزار بن کر گزاروں گا لیکن جب اللہ تعالیٰ اس کو نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ بغاوت اور نافرمانی کی وہی زندگی اختیار کر لیتا ہے۔

(۲۴-۲۷) اس دنیا کی زندگی کی بے ثباتی کی تمثیل کہ کفار کو اس وقت جو زور اور اقتدار حاصل ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی رخنہ کہاں سے پیدا ہو جائے گا۔ حالانکہ آئے دن اس دنیا میں یہ شاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بارش ہوتی ہے، زمین لہلہا اٹھتی ہے۔ باغ اور کھیت سب مالامال ہو جاتے ہیں، زمینوں اور باغوں کے مالک یہ سمجھتے ہیں کہ بھلا اب ہمیں ان سے کون محروم کر سکتا ہے کہ دفعتہً رات میں یا دن میں کسی وقت عذابِ الٰہی کا کوئی جھونکا آتا ہے اور وہ سب کو آناً فاناً بے نشان کر کے رکھ دیتا ہے۔ سلامتی کا گھر صرف اللہ کے پاس ہے اور وہ لوگوں کو اسی کی طرف دعوت دیتا ہے لیکن اس کی راہ صرف صاحبِ توفیق ہی اختیار کرتے ہیں اور یہی لوگ ہیں جن کے چہرے آخرت میں روشن ہوں گے۔ رہے یہ لوگ جو اسی دنیا کی زندگی میں مگن ہیں خدا سے ان کو کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور ان کے چہروں کا یہ حال ہوگا کہ گویا ان پر شب دیجور کا کوئی ٹکڑا اڑھا دیا گیا ہے۔

(۲۸-۳۶) کفار اپنے جن معبودوں پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں آخرت میں ان کے اور ان کے معبودوں کے درمیان جدائی ہو جائے گی۔ ان کے معبود ان سے اظہارِ بیزاری کریں گے کہ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ تم ہماری عبادت کر رہے تھے۔ اس دن ہر شخص کو صرف اپنے اعمال سے سابقہ پیش آئے گا اور ہر ایک کی پیشی معبودِ حقیقی کے سامنے ہوگی۔ کفار سے یہ مطالبہ کہ جب تم خالق، رازق، مالک اور زندگی اور موت پر اختیار رکھنے والا خدا ہی کو مانتے ہو تو اسی کو رب بھی مانو، اس واضح حق کے بعد اگر تم خدا کے سوا کسی اور کو بھی رب مانتے ہو تو یہ صریح ضلالت ہوئی آخر اس دنیا کی خلق و تدبیر اور تمہاری ہدایت و رہنمائی میں تمہارے ان فرضی معبودوں کا کیا حصہ ہے جس کی بنا پر تم ان کو خدا کے حقوق میں شریک بنا بیٹھے ہو، یہ تو محض تمہاری اٹکل پچو باتیں ہیں جو حق کے مقابل میں تمہارے کچھ کام آنے والی نہیں ہیں۔

(۳۷-۴۴) یہ قرآن کوئی من گھڑت چیز نہیں ہے۔ اس کی پیشین گوئیاں پچھلے صحیفوں میں موجود ہیں اور یہ انہی پیشین گوئیوں کا مصداق اور انہی اشارات کی تفصیل ہے۔ اس کے خدائی کتاب ہونے میں کسی شک کی

گنجائش نہیں ہے۔ اگر کفار کہتے ہیں کہ یہ تمہاری گھڑی ہوئی چیز ہے جس کو تم جھوٹ موٹ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہو تو ان سے کہو کہ یہ اس کی مانند کوئی ایک ہی سورہ لا کر دکھائیں اور اس کام میں اپنے معبودوں کی مدد بھی اگر حاصل کر سکیں تو وہ بھی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اصل یہ ہے کہ یہ ایک ایسی چیز کا انکار کر رہے ہیں جس کی حقیقت ان کے سامنے ابھی نہیں آئی ہے اور اس معاملے میں یہ پچھلے مکذبین کی روش کی تقلید کر رہے ہیں تو صبر کرو اور دیکھو کہ ان کا انجام کیا ہوتا ہے ___ پیغمبرؐ کو تسلی کہ جن کے اندر صلاحیت ہے وہ اس کتاب پر ایمان لا رہے ہیں، رہے وہ لوگ جو اندھے بہرے بن چکے ہیں تو نہ وہ تمہاری بات سنیں گے نہ تمہارے اوپر ان کی کوئی ذمہ داری ہے۔ تم ان سے اپنی برأت کا اعلان کر دو۔ یہ خود اپنے اعمال کی بدولت اس حالت کو پہنچے ہیں۔ خدا نے ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی ہے۔

(۴۵-۵۸) جس عذاب اور روزِ آخرت کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے اس کے لیے یہ جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ جب وہ آئے گا تو یہ محسوس کریں گے کہ زندگی کی مہلت ایک ساعت سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ یہ عذاب کب آئے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تمہاری موجودگی ہی میں ان کو دکھا دیا جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری وفات کے بعد یہ اس کا مزا چکھیں۔ لیکن یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جب کسی قوم کے پاس اس کا رسول آ جاتا ہے تو اس قوم کا فیصلہ لازماً ہو جایا کرتا ہے۔ اگر یہ تم سے اس دھمکی کے ظہور کا وقت پوچھتے ہیں تو تم کہہ دو کہ میرے پاس نہ غیب کا علم ہے اور نہ میں کسی نفع و ضرر پر اختیار رکھتا ہوں۔ بس یہ حقیقت جانتا ہوں کہ ہر امت کے لیے ایک پیمانہ مقرر ہے، جب وہ پیمانہ بھر جاتا ہے تو پھر اس کو ایک منٹ کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔ یہ اگر اتنی جلدی مچاتے ہوئے ہیں تو ان سے پوچھو کہ خدا کے عذاب کا مقابلہ کرنے کے لیے انھوں نے کیا سامان کر رکھا ہے؟ اس وقت تو ان کا ایمان لانا بھی بالکل بے سود ہوگا؟ اس وقت تو حال یہ ہوگا کہ ہر جان اس سے چھوٹنے کے لیے ساری دنیا بھی اس کے ہاتھ آ جائے تو اس کو فدیہ میں دینے کے لیے تیار ہو جائے گی تو آخر یہ اپنی شامت بلانے کے درپے کیوں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت و رحمت کو اختیار کیوں نہیں کرتے جو ان پر قرآن کی شکل میں نازل ہوئی ہے اور جس کے آگے اس دنیا کے تمام زخارف بالکل ہیچ ہیں۔

(۵۹-۷۰) جن لوگوں نے بے دلیل خدا کے شریک اور سفارشی بنا رکھے ہیں کیا ان کو خدا سے ناانصافی کا اندیشہ ہے؟ خدا تو اپنے بندوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ البتہ لوگ ناشکری کرتے اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو دوسروں کی نسبت سے حلال و حرام ٹھہراتے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو تسلی کہ خدا ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہے۔ جو اللہ کے اولیا ہیں ان کے لیے کوئی خوف اور غم نہیں ہے۔ دنیا کی زندگی میں بھی ان کے لیے بشارت ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے بشارت ہے اور خدا کے وعدے اٹل ہیں۔ عزت صرف اللہ کے لیے ہے، جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کی پوجا کرتے ہیں وہ صرف گمان کی پوجا

کر رہے ہیں۔ شب و روز سب اللہ ہی کے بنائے ہوئے ہیں اور زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ اللہ سب سے مستغنی ہے۔ اس کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں۔ جو لوگ اپنے جی سے خدا کے شریک ٹھہراتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ اور وہ آخرت میں عذاب شدید سے دوچار ہوں گے۔

(۷۱-۹۳) اوپر کے بیان کردہ حقائق کی تائید میں تاریخ کی شہادت۔ حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ تک کے انبیاء اور ان کی قوموں کی سرگزشت کا اجمالی حوالہ۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو یہ تلقین کہ جس طرح کے حالات تم سے پہلے انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو پیش آچکے ہیں اسی طرح کے حالات تمہاری قوم کی طرف سے تم کو پیش آ رہے ہیں۔ پس اگر تم نے صبر اور توکل کی وہی روش اختیار کی جو تمہارے پیش رو انبیاء اور ان کے صحابہؓ نے اختیار کی اور اس پر جمے رہے تو تمہیں اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں جہان میں سرخرو کرے گا اور تمہارے مخالفوں کا وہی حشر ہوگا جو نوحؑ اور موسیٰؑ کے مخالفوں کا ہو چکا ہے۔

(۹۴-۱۰۳) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے مسلمانوں کو یہ تلقین کہ مخالفوں کا غوغا تمہیں اس کتاب کے باب میں کسی شک میں نہ ڈالے جو تم پر اللہ نے اتاری ہے۔ یہ بالکل حق ہے اور جو اچھے اہل کتاب ہیں وہ بھی اس کے حق ہونے کے گواہ ہیں۔ جو لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں وہ اپنے اعمال کے سبب سے خدا کے قانون کی زد میں آچکے ہیں، ان کو خواہ کتنی ہی نشانیاں دکھا دی جائیں وہ اس وقت تک ایمان لانے والے نہیں ہیں جب تک فیصلہ کن عذاب نہ دیکھ لیں۔ کوئی قوم جب قانونِ الٰہی کی زد میں آ جاتی ہے تو اس کو ایمان نصیب نہیں ہوا کرتا۔ صرف قوم یونس ایک ایسی قوم ہے جو عذابِ الٰہی کی زد میں آتے آتے بچ گئی۔ عذاب بس آنے ہی کو تھا کہ وہ ایمان لائی اور اللہ نے اس کو بچا لیا۔ اہلِ ایمان کو یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ لوگ عقل اور سمجھ سے کام لے کر ایمان کی راہ اختیار کریں نہ کہ عذاب کی نشانیوں سے مجبور ہو کر۔ اگر اللہ کو مجبورانہ ایمان مطلوب ہوتا تو اس کے لیے کیا مشکل تھا کہ وہ سب کو ایمان کی ڈگر پر ہانک دیتا؟ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ ایمان کی توفیق صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ اپنے دلوں پر نجاست کے انبار جمع کر لیتے ہیں ان کے لیے ایمان کی راہ نہیں کھلتی۔ ایسے لوگوں کو بڑی سے بڑی نشانی بھی کچھ نفع نہیں پہنچاتی۔ یہ لوگ تو بس اس طرح کے فیصلہ کن دن کے انتظار میں ہیں جس طرح کے فیصلہ کن دن پچھلی قوموں کو پیش آچکے ہیں۔ ان سے کہو کہ اگر تم اسی کے انتظار میں ہو تو انتظار کرو میں بھی اب تمہارے لیے اسی کے انتظار میں ہوں۔

(۱۰۴-۱۰۹) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مخالفین کے سامنے ایک فیصلہ کن اعلان کہ اگر کسی کو میرے دین کے بارے میں شک ہو تو وہ اچھی طرح کان کھول کر سن لے کہ جن چیزوں کو تم پوجتے ہو میں ان کو نہیں پوجتا، میں صرف اللہ واحد کی عبادت کرتا ہوں۔ اسی توحید پر آپ کو جمے رہنے کی تاکید، اس لیے کہ نفع و ضرر صرف اللہ ہی کے اختیار میں ہے، دوسرا نہ کچھ بنا سکتا، نہ بگاڑ سکتا — پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی

زبان سے اعلان کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق آچکا ہے اور وہ میں نے لوگوں کو پہنچا دیا ہے۔ اب جو ہدایت اختیار کرے گا تو اس کا نفع اس کو پہنچے گا اور جو گمراہی کی راہ اختیار کرے گا تو اس کا انجام خود دیکھے گا میں کسی کے ایمان کا ذمہ دار نہیں ہوں ——— آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ وحی الٰہی کی پیروی کرو، اسی پر جمے رہو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ صادر فرما دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

سُوْرَةُ يُوْنُس (۱۰)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ۱۰۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۱ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ المنزل ۳ آیات
اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۱-۱۰
اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؔ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم
مُّبِيْنٌ ۝۲ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ
سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ
اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا
تَذَكَّرُوْنَ ۝۳ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا
الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا
يَكْفُرُوْنَ ۝۴ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ
مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ
اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۵ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ
الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

يَتَّقُوْنَ ۝٦ إِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝٧ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ
النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝٨ إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ
النَّعِيْمِ ۝٩ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ
ع وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١٠

ترجمۂ آیات ۱-۱۰ یہ الف، لام، را ہے۔ یہ پرحکمت کتاب کی آیات ہیں۔ کیا لوگوں کو اس بات پر حیرانی ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک شخص پر وحی کی کہ لوگوں کو ہوشیار کر دو اور اہل ایمان کو بشارت پہنچا دو کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑا مرتبہ ہے۔ کافروں نے کہا، بے شک یہ ایک کھلا ہوا جادوگر ہے۔ ۱-۲

بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں پیدا کیا، پھر وہ معاملات کا انتظام سنبھالے عرش پر متمکن ہوا۔ اس کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارشی نہیں۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے تو اسی کی بندگی کرو، کیا تم سوچتے نہیں! اسی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے۔ یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک وہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان کو عدل کے ساتھ بدلہ دے اور جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے ان کے کفر کی پاداش میں کھولتا پانی اور دردناک عذاب ہے۔ وہی ہے جس نے سورج کو تاباں اور چاند کو نور بنایا اور اس کے لیے منزلیں ٹھہرا دیں تاکہ تم سالوں کا شمار اور حساب معلوم کر سکو۔ اللہ نے یہ کارخانہ

بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ بے شک رات اور دن کی آمد و شد اور آسمانوں اور زمین کی مخلوقات میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ڈریں۔ جو لوگ ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں اور اسی دنیا کی زندگی پر قانع اور مطمئن ہیں اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، انہی لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے ان کے اعمال کی پاداش میں۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اللہ ان کے ایمان کی بدولت ان کو ان کی منزل پر پہنچائے گا، ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، نعمت کے باغوں میں۔ اس میں ان کا ترانہ ہو گا اے اللہ تو پاک ہے، اور اس میں ان کی آپس کی تحیت سلام ہو گی اور ان کا آخری کلمہ الحمد للہ رب العالمین (شکر ہے اللہ رب العالمین کے لیے) ہو گا۔ ۲-۱۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (۱-۲)

کتاب حکیم کا مفہوم

'الٓرٰ' اس سورہ کا قرآنی نام 'الٓرٰ' ہے اور 'تِلْكَ' کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔ یہ حروف مقطعات ہیں جن پر ایک جامع بحث ہم بقرہ کی تفسیر کے شروع میں کر آئے ہیں۔ کتاب کی صفت 'حکیم' اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ کتاب اپنے ہر دعوے پر دلیل و حجت سے اس طرح آراستہ ہے کہ اپنی صداقت کی کسوٹی خود اپنے ہی اندر رکھتی ہے، کسی خارجی شہادت کی محتاج نہیں ہے۔ جو لوگ اس کی صداقت کے ثبوت کے لیے کسی شہادت کے طلب گار ہیں وہ خارج کی بجائے خود اس کے اندر اتریں، اگر ان کی عقل سلیم اور فطرت مستقیم ہو گی تو اس کی حکمت خود ان کے ہر شبہے کو صاف کر دے گی۔

اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان

'اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا .... الاٰیۃ' 'النَّاس' سے مراد، قرینہ دلیل ہے کہ یہاں قریش ہیں۔ یعنی جب یہ کتاب بجائے خود حجت و برہان ہے تو مجرد یہ بات اس کے انکار کی کیا دلیل ہوئی کہ اس کی وحی انہی میں سے ایک شخص پر آئی؟ اپنے اندر کے کسی شخص پر اس وحی کا آنا کوئی انکار و استعجاب کی چیز نہیں بلکہ یہ سوچیں تو یہ

اللہ کا ان پر احسان عظیم ہے کہ اس نے ان پر انہی کے اندر کے ایک ایسے شخص کے ذریعہ سے یہ کتاب اتاری جس کے ماضی و حاضر اور جس کے کردار و اخلاق سے وہ اچھی طرح آگاہ بھی ہیں اور جس کے امین و راستباز ہونے کے وہ معترف بھی رہے ہیں؟ کیا یہ بات بہتر ہوتی کہ کوئی غیر ان پر اس حق کی گواہی دیتا یا یہ بہتر ہے کہ اللہ نے انہی کے ایک بہترین فرد کو اس حق کا گواہ بنایا اور اس طرح گویا انہی کی زبان اور انہی کے ضمیر نے ان پر حق کی حجت تمام کی۔ یہ بات بھی کسی پہلو سے معقول نہ ہوتی کہ اس کام کے لیے کوئی فرشتہ یا جن منتخب کیا جاتا۔ انسانوں کے لیے معلم و مرشد اور نمونہ و مثال انسان ہو سکتا ہے نہ کہ فرشتے اور جن۔

کتاب اور حاملِ کتاب کا اصل پیغام

اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ یہ اس کتاب یا حامل کتاب کا اصل پیغام نقل ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پیغام بھی کوئی استعجاب یا انکار کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ یہ دنیا کی زندگی یوں ہی ختم ہو جانے والی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد ایک ایسا دن آنے والا ہے جس میں سب کو خدا کی طرف لوٹنا ہے اور اس دن وہ لوگ خدا کے ہاں عزت و سرفرازی کا مقام پائیں گے جو اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور جو لوگ اس کو جھٹلائیں گے وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں پڑیں گے۔ اس حقیقت کے اظہار سے اگر قریش کے متکبرین کے دل کو چوٹ لگتی ہے تو لگے اور وہ حیران ہوتے ہیں تو حیران ہوں لیکن جو حقیقت ہے وہ اس وجہ سے غلط نہیں ہو جائے گی کہ اس سے کسی گروہ کے پندار پر ضرب پڑتی ہے۔

'قَدَمَ صِدْقٍ' کا مفہوم

'قَدَمَ صِدْقٍ' میں 'صِدْقٍ' کا لفظ، جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں، رسوخ، استحکام اور تمکن پر دلیل ہے اس وجہ سے 'قَدَمَ صِدْقٍ' کا مفہوم عزت کا مقام، مرتبہ بلند، اونچی پائگاہ اور لازوال سرفرازی ہوگا۔

اس آیت میں ایمان لانے والوں کے لیے جو بشارت ہے وہ تو واضح الفاظ میں مذکور ہے لیکن انذار کا پہلو مبہم چھوڑ دیا گیا ہے اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اس گروپ کی تمام سورتوں میں نمایاں پہلو اہل ایمان کے لیے بشارت ہی کا ہے۔ کفار کے انجام کا پہلو ان میں اصلاً نہیں بلکہ ضمناً اور تبعاً بیان ہوا ہے۔

کفار کے استعجاب و انکار کی تعبیر

'قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ' یہ کفار کے استعجاب و انکار کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس پر حکمت کتاب کی آیتیں ان کو سنائی جاتی ہیں تو بجائے اس کے کہ اس کی قدر کریں اور اس پر ایمان لائیں اس کے لانے والے کو یہ کھلا ہوا جادوگر قرار دیتے ہیں۔ یعنی اس کتاب کے زور، اس کے اثر اور اس کی فصاحت و بلاغت کا لوہا تو مانتے ہیں لیکن ان سب چیزوں کو محض الفاظ اور سجع و قافیہ کی صناعی اور پیغمبر کی فصاحت و بلاغت کی شعبدہ بازی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اپنے عوام کو یہ باور کراتے ہیں کہ اس کتاب اور اس کے لانے والے کے کلام میں جو تاثیر اور کشش محسوس کرتے ہو یہ نہ سمجھو کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ خدا کی طرف سے آئی ہے اور اس میں حکمت کا خزانہ ہے بلکہ جس طرح ایک شعبدہ باز اپنی شعبدہ بازی سے ایک شے کو کچھ سے کچھ بنا کر دکھاتا ہے اسی طرح یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) الفاظ کی شعبدہ گری کا ماہر ہے اور اپنی بات اس طرح پیش کرتا ہے کہ سادہ لوگ اس کے کلام سے مسحور ہو جاتے ہیں۔

انبیاء کو ساحر و کاہن کہنے کا ایک خاص پہلو

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو کفار جو ساحر قرار دیتے رہے ہیں تو صرف ان کے معجزات کی اہمیت گھٹانے کے لیے نہیں بلکہ یہی حربہ وہ ان کے کلام کو بے وقعت ٹھہرانے کے لیے بھی استعمال کرتے۔ جب دیکھتے کہ ان کے اندر کے سلیم الفطرت لوگ نبی کے پیش کیے ہوئے کلام سے متاثر ہو رہے ہیں تو یہ شگوفہ چھوڑتے کہ یہ تو محض الفاظ کی شعبدہ بازی اور زبان کی جادوگری ہے، اپنے آپ کو اس فریب سے بچاؤ۔ خود قرآن کو سحر کہنے میں بھی یہی مقصد ان کے پیش نظر ہوتا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کاہن بھی کہتے تھے اس سے بھی ان کا مقصد یہی ہوتا کہ اپنے عوام کی توجہ قرآن اور پیغمبر سے ہٹائیں کہ یہ کلام کوئی مافوق چیز اور اس کا پیش کرنے والا کوئی مافوق ہستی نہیں ہے۔ جس طرح ہمارے کاہن سجع اور قافیہ کے ساتھ مرصع اسلوب میں اپنا کلام پیش کرتے ہیں اور جس طرح کاہنوں کے کلام میں مستقبل سے متعلق کچھ پیشین گوئیوں کی جھلک ہوتی ہے اسی طرح کی جھلک ان کے کلام میں بھی ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ یہ ہماری جانی پہچانی ہوئی چیزیں ہیں۔ ان کو آسمانی اور خدائی مرتبہ دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ (۳-۴)

مذکورہ بالا انذار و بشارت کی دلیل

اوپر والے ٹکڑے میں جو انذار و بشارت ہے یہ اسی کی دلیل بیان ہو رہی ہے اور مقدمات کی ترتیب اس طرح ہے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور جس کا خالق ہونا تمھیں خود بھی تسلیم ہے، وہی تمھارا رب اور آقا و مولیٰ ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ خالق تو کوئی اور ہو، آقا و مولیٰ کوئی اور بن جائے، اگر تم نے کچھ اور رب بنا کر ان سے کچھ امیدیں باندھ رکھی ہیں تو یہ محض تمھاری حماقت ہے جو عقل و فطرت اور خود تمھارے اپنے مسلمہ کے خلاف ہے۔ پھر یہ کائنات کسی اتفاقی حادثے کے طور پر ظہور میں نہیں آگئی ہے بلکہ یہ خدائی دنوں کے حساب سے چھ دنوں یا بالفاظ دیگر چھ ادوار میں درجہ بدرجہ ارتقا پذیر ہوئی ہے۔ یہ تدریج و ترتیب اور یہ ارتقا خود شاہد ہے کہ نہ اس کا ظہور کوئی اتفاقی حادثہ ہے نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ ہے بلکہ یہ نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہوا ایک باغایت و بامقصد کارخانہ ہے اور اس کی مقصدیت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان جو اس کائنات میں خلیفہ کی حیثیت رکھتا ہے یوں ہی شتر بے مہار نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کے سامنے ایک ایسا دن آئے جس میں وہ لوگ پورے انصاف کے ساتھ اپنے اعمال کا صلہ پائیں جنھوں نے خالق کائنات کی پسند کے مطابق زندگی بسر کی اور وہ لوگ اپنے جرائم کی سزا بھگتیں جنھوں نے اس دنیا کو کھیل تماشہ سمجھا اور ساری زندگی بطالت میں گزاری۔

خدا عرش حکومت پر متمکن ہے

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ۔ یعنی یہ نہ سمجھو کہ خدا دنیا کو پیدا کر کے کسی گوشے میں ایک

خاموش علۃ العلل بن کر بیٹھ رہا ہے اور اس دنیا کا سارا انتظام و انصرام اس نے دوسروں کے حوالے کر دیا ہے بلکہ وہ خود عرشِ حکومت پر متمکن اور صرف ممکن ہی نہیں بلکہ بالفعل تمام معاملات کا انتظام فرما رہا ہے۔ زبور میں یہی حقیقت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:۔

"تو نے تخت پر بیٹھ کر صداقت سے انصاف کیا" ۹:۴

خدا کے ہاں کوئی سفارش اس کے اذن کے بغیر نہیں ہوگی

مَا مِنْ شَفِيْعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهٖ ' یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ خدا کے اس انصاف سے کسی کی سعی و سفارش کے ذریعے سے وہ اپنے آپ کو بچا لے جائے گا۔ خدا کے ہاں کوئی بھی نہ اس کے اذن کے بغیر سفارش کے لیے زبان کھول سکے گا اور نہ کوئی سفارش باطل کو حق یا حق کو باطل بنا سکے گی۔ اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

' ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ' یعنی یہی اللہ جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، جو عرش حکومت پر متمکن ہو کر عدل و انصاف کے ساتھ فرمانروائی کر رہا ہے، جس کے ہاں کوئی بڑے سے بڑا سفارشی بھی، اس کے اذن کے بغیر کسی کی سفارش کی جرأت نہ کر سکے گا، وہی اللہ تمہارا رب ہے تو اپنے اسی رب کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تم نے اور رب کہاں سے گھڑ لیے، تم اپنے مانے ہوئے مقدمات و مسلمات کو کس طرح نظر انداز کر جاتے ہو۔

سب کی پیشی خدا ہی کے آگے ہوگی

إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا۔ اسی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور مولیٰ و مرجع نہیں ہے۔ یہ اللہ کا شدنی وعدہ ہے۔ 'جَمِيْعًا' کی تاکید اس امر کے اظہار کے لیے ہے کہ تمہاری اور جن کو تم نے اپنے گمان کے مطابق خدا کا شریک و شفیع بنا رکھا ہے سب کی پیشی خدا ہی کے آگے ہونی ہے اس سے کوئی بھی نہ بچ سکے گا۔

آغاز و اعادہ خدا کے اختیار میں ہے

إِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ' یہ اس وعدے کے حق ہونے کی دلیل ہے کہ خدا خلق کا آغاز فرماتا ہے تو وہی دوبارہ اس کا اعادہ فرمائے گا جس نے پہلی مرتبہ اس کا آغاز کیا، آخر دوبارہ اس کا اعادہ کرنے میں اس کو کیوں دشواری پیش آئے گی؟ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جن کا نہ اس کائنات کے آغاز میں کوئی حصہ نہ اس کے اعادہ میں کوئی دخل آخر ان کو کس بنیاد پر تم نے مرجع و مولیٰ بنا رکھا ہے؟

قیامت کا اصل مقصد

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ۔ یہی اصل مقصد ہے قیامت کے آنے کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کا اصل مقصود درحقیقت اہل ایمان کو جزا دینا ہے، اہل کفر کو سزا اس کے لوازم اور توابع میں سے ہے۔ یہی وہ بشارت ہے جس کا آغاز میں ذکر ہوا ہے اس کی دلیل بیان کرنے کے بعد پھر اس کی طرف اشارہ فرما دیا۔

کفار کے لیے اولین سامان ضیافت

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ أَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ۔ کفار کو جو عذاب ہوگا یہ اس کا بیان ہے۔ 'شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ' کا ذکر جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں اشارہ کر چکے ہیں، اولین سامان ضیافت کی حیثیت

سے ہے یعنی ان کی اول تواضع تو ان کے اترتے ہی کھولتے پانی سے ہوگی۔ پھر ان کے لیے دردناک عذاب کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ
مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ
اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَّقُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ ۝ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ إِنَّ
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ ۖ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ
دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۚ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۵ - ۱۰)

جزا و سزا کے قطعی ہونے کی دلیل

توحید کے بعد اب یہ جزا اور سزا کے قطعی ہونے کی دلیل بیان ہو رہی ہے کہ اس کارخانۂ کائنات پر جو شخص بھی غور کرے گا اس کو یہ حقیقت نہایت نمایاں طور پر نظر آئے گی کہ یہ کسی کباڑیے کا مال گودام نہیں بلکہ اس کے ہر گوشے میں اس کے خالق کی عظیم قدرت اور اس کی بے پایاں رحمت و ربوبیت نمایاں ہے۔ اس کے اندر نہایت اعلیٰ اہتمام ہے۔ بے نظیر ترتیب و انتظام ہے، بے مثال اقلیدس و ریاضی ہے۔ سورج معین نظام اوقات کے ساتھ نکلتا اور اپنی تابانیوں سے سارے جہان کو روشن کرتا ہے۔ اس کے فیض سے گرمی، سردی، خزاں اور بہار کے مختلف موسم پیدا ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک ہماری دنیا کی زندگی اور اس کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ چاند اس سے کسب نور کر کے اپنی معین منزلیں طے کرتا اور ہماری تاریک راتوں میں مختلف زاویوں سے ہمارے لیے شمع برداری بھی کرتا ہے اور ہمارے مہینوں اور سالوں کی تقویم بھی بناتا ہے —— کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دنیا خیر و شر اور نیکی و بدی کے درمیان امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے گی یا یوں ہی ختم ہو جائے گی؟ اگر یہ مان لیا جائے تو یہ ساری قدرت و حکمت بے مقصد و بے غایت ہو جاتی ہے جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں جلوہ گر ہے۔ پھر تو یہ دنیا بالکل باطل اور ایک کھیل تماشا بن کے رہ جاتی ہے اور یہ ایک ایسی خلاف عقل، ایسی خلاف عدل اور ایسی خلاف فطرت بات ہے کہ کوئی سلیم العقل اور کوئی مستقیم الفطرت انسان ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو باور نہیں کر سکتا۔ کچھ اینٹیں ایک جگہ بکھری ہوئی پڑی ہوں تو ان کو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بے ترتیبی پڑی ہوئی ہیں لیکن کیا یہی گمان تاج محل، لال قلعہ اور لاہور و دلی کی جامع مسجدوں کے متعلق بھی کر سکتے ہیں؟

ؔ آیت میں سورج کے لیے ضیا (چمک اور تابانی) اور چاند کے لیے نور (خنک روشنی) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس فرق کی یہ توجیہ کی ہے کہ سورج کی روشنی اپنی ذاتی ہے اور چاند کی روشنی سورج سے حاصل کی ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ بات بجائے خود صحیح ہے لیکن میرے نزدیک 'ضیا' میں روشنی کے ساتھ تپش کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور 'نور' خنک روشنی کو کہتے ہیں۔ اور یہ ایک امر واقعہ ہے کہ سورج کی روشنی میں تپش ہوتی ہے اور چاند کی روشنی ٹھنڈی ہوتی ہے۔

صحیح انسانی فطرت کا اعتراف

"مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ" یہ صحیح انسانی فطرت کا اعتراف بیان ہوا ہے کہ جو عاقل اس نظامِ کائنات پر غور کرتا ہے وہ پکار اٹھتا ہے کہ یہ کارخانہ باطل اور بے مقصد نہیں بلکہ ایک عظیم غایت کے ساتھ وجود میں آیا ہے اور یہ غایت مقتضی ہے کہ یہ ایک ایسے انجام پر منتہی ہو جو حق اور باطل کے درمیان پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے۔

"يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ" فرمایا کہ اس جزا و سزا کی دلیلیں اور نشانیاں اس نظامِ کائنات کے اندر پھیلی ہوئی ہیں جو دیکھنے والی آنکھوں سے مخفی نہیں ہو سکتیں لیکن اگر کسی کے لیے یہ مخفی تھیں تو اب ہم نے ان لوگوں کے لیے جو جاننا اور سمجھنا چاہیں ان کی تفصیل بھی کر دی ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون آلِ عمران کی آیت ۱۹۱۔ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ میں بیان ہوا ہے۔ مزید تفصیل کے طالب اس آیت کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

گردشِ لیل و نہار کا درس

"اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ...... الاية" اختلافِ لیل و نہار سے اس تعاقب کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے جو وہ ایک دوسرے کا پوری سرگرمی سے کر رہے ہیں جس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ یہ گردش بے غایت و بے مقصد نہیں ہے بلکہ ایک عظیم نتیجہ پر منتہی ہونے والی ہے، دوسرے اس عظیم نظامِ ربوبیت کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے جو رات اور دن کے اختلافِ مزاج کے اندر مضمر ہے کہ دن انسان کے لیے معاش و معیشت کی سرگرمیوں کا میدان گرم کرتا ہے اور رات اس کے لیے راحت و سکون کا بستر بچھاتی ہے۔ اس نظام پر جو شخص بھی غور کرتا ہے وہ لازماً اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ اضداد کے اندر ایک مشترک مقصد کے لیے یہ حیرت انگیز توافق اسی شکل میں وجود میں آ سکتا ہے جب یہ مانا جائے کہ یہ سارا کارخانہ صرف ایک قادر و قیوم کے ارادے کے تحت کام کر رہا ہے اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس نے ربوبیت و پرورش کا یہ سارا نظام کھڑا کیا ہے اور اس کو اس اہتمام سے چلا رہا ہے وہ انسان کو مطلق العنان اور غیر مسئول نہیں چھوڑے گا بلکہ اس کے بعد ایک ایسا دن لازماً آنا ہے جس میں وہ اس ربوبیت کا حق پہچاننے والوں کو ان کی حق شناسی کا انعام دے گا اور اس سے بے پروا رہنے والوں کو جہنم میں جھونک دے گا۔ یہی نتیجہ اس کائنات کے تمام اجزا اور اس کے تمام اضداد پر غور کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور یہی حاصل ہے جو انسان کی رہنمائی آخرت اور اس جزا و سزا کی طرف کرتا ہے جس سے انسان کے اندر وہ حقیقی تقویٰ پیدا ہوتا ہے جس کی طرف آلِ عمران کی مذکورہ بالا آیت میں سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ کے الفاظ سے اشارہ ہوا ہے۔

ان لوگوں کا انجام جو نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں

"اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ ...... بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اس کائنات کی ان تمام نشانیوں کے باوجود اندھے بہرے بنے ہوئے ہیں اور اسی دنیا کی زندگی پر مطمئن ہیں، نہ انھیں خدا کی ملاقات کا اندیشہ ہے، نہ آخرت کا ڈر ہے۔ فرمایا کہ ان سب کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ لفظ رجا یہاں توقع اور اندیشہ کے معنی میں ہے اور یہی اس کا اصل لغوی مفہوم ہے۔

اہل ایمان کا انجام

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَھْدِیْھِمْ رَبُّھُمْ بِاِیْمَانِھِمْ ۔۔۔۔۔ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ ھدایت یہاں منزلِ مقصود کی ہدایت کے مفہوم میں ہے جو تمام کائنات کی تخلیق کی غایت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کی بدولت جنت میں ان کے حسب مراتب منازل و مقامات کی طرف ان کی رہنمائی فرمائے گا دَعْوٰىھُمْ فِیْھَا سُبْحٰنَكَ، یعنی جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ حق، حق ہو کے رہا اور باطل، باطل تو بے تحاشا ان کی زبان سے سُبْحٰنَكَ اللّٰھُمَّ کے الفاظ نکلیں گے کہ آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے ہمارا جو یہ گمان تھا کہ یہ کارخانۂ کائنات کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہو سکتا، اس عظیم خالق کی شان سے بعید ہے کہ وہ کوئی کارِ عبث کرے، تو ہمارا یہ گمان سچا ثابت ہوا۔ تَحِیَّتُھُمْ فِیْھَا سَلٰمٌ، یعنی ایک کامیاب اور فتح مند ٹیم کی طرح ان کے آپس میں مبارک سلامت کے تبادلے ہوں گے اور دوسری طرف کفار کے اندر جوتیوں میں دال بٹ رہی ہوگی اور ہر ایک دوسرے پر لعنت کر رہا ہوگا وَاٰخِرُ دَعْوٰىھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، یہ تکمیلِ نعمت پر اظہارِ شکر ہے کہ اہل جنت جب دیکھیں گے کہ ہر طرف نعمت ہی نعمت ہے تو بے تحاشا ان کی زبان سے یہ شکر کا کلمہ نکلے گا۔

۲۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۱۱-۱۹

آگے پہلے منکرین و مکذبین کے اس مطالبہ کا جواب دیا ہے جو وہ عذاب کے لیے کر رہے تھے کہ اگر جزا اور سزا ایسی ہی اٹل چیز ہے اور ہم اپنے اعمال کے باعث اس کے مستحق ہو ہی چکے ہیں تو اس عذاب کا کوئی نمونہ دکھا کیوں نہیں دیتے جس کی دھمکی سنا رہے ہو سو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کا حوالہ دیا کہ خدا رحمت میں سبقت کرتا ہے، قہر کرنے میں وہ بڑا دھیما ہے۔ اگر قہر کرنے میں بھی وہ ویسی ہی جلدی کرنے والا ہوتا، جیسا کہ فضل و رحمت کے معاملے میں ہے تو کب کا فیصلہ ہو چکا ہوتا پھر انسان کی اس جلد بازی کی حقیقت واضح کی ہے کہ وہ مطالبہ تو عذاب کا بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کرتا ہے لیکن جب ذرا خدا کی پکڑ میں آ جاتا ہے تو واویلا شروع کر دیتا ہے، پھر جوں ہی ذرا ڈھیل ملتی ہے اسی طرح اکڑنے لگتا ہے۔ ایسے لوگ ہدایت کسی صورت میں بھی قبول نہیں کرتے۔ پھر ان کو تاریخ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ پچھلی قوموں کی سرگزشت میں، جن کے تم جانشین ہوئے ہو، کافی سامان عبرت موجود ہے، آخر ان کے حالات سے کیوں سبق نہیں لیتے، یہ کیوں ضروری سمجھتے ہو کہ وہی انجام تمہارا بھی ہو جو ان قوموں کا ہوا۔

اس کے بعد ان کے اس مطالبہ کا جواب دیا ہے جو وہ قرآن کو یکسر بدل دینے یا کم از کم اس میں ایسی ترمیم کے لیے کر رہے تھے جس کے بعد وہ ان کے لیے گوارا ہو سکے۔ وہ توحید کی تعلیم اور جزا و سزا اور قہر و عذاب کی دھمکی سننے کے لیے تیار نہیں تھے اس وجہ سے کہتے تھے کہ اگر ہم سے منوانا ہے تو اس کتاب کی جگہ دوسری کتاب لاؤ یا اس میں تبدیلی کرو، بغیر اس کے ہم اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے جواب میں

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا کہ یہ میری بات نہیں ہے کہ میں اس میں کوئی ترمیم کروں۔ یہ تو خدا کی طرف سے ڈالی ہوئی ایک ذمہ داری ہے جو مجھے اٹھانی پڑی ہے۔ اگر اس کا کوئی امکان ہوتا کہ میں اس ذمہ داری سے بچ سکوں تو میں کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہونے دیتا۔ میں نے تمہارے اندر ایک طویل زندگی گزاری ہے اور تم جانتے ہو کہ میں سیادت و امارت کا طالب کبھی نہیں رہا تو اس عمر میں آکر آخر خدا پر ایک افترا کی ذمہ داری میں کس طرح لے سکتا ہوں۔

آخر میں عقیدۂ شرک کی لغویت واضح کی ہے اور مقصد یہ ہے کہ جس چیز کی حمیت وحمایت میں قرآن سے بیزاری ہے وہ محض ایک خیال باطل ہے جس کا وجود نہ کہیں آسمان میں ہے، نہ زمین میں ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱-۱۹

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ
فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِذَا
مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا
كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ
لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۭ
كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰۗىِٕفَ فِي
الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ
اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ
بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا
مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ قُلْ
لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ڮ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ
عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ

كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ
اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ
سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً
فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ
يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

ترجمۂ آیات ۱۱-۱۶

اگر اللہ لوگوں کے لیے عذاب کے معاملے میں ویسی ہی سبقت کرنے والا ہوتا جس طرح وہ ان کے ساتھ رحمت میں سبقت کرتا ہے تو ان کی مدت تمام کردی گئی ہوتی۔ تو ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں ان کی سرکشی میں بھٹکتے رہنے کے لیے ڈھیل دے دیتے ہیں۔ اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تب تو لیٹے، بیٹھے یا کھڑے ہم کو پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کردیتے ہیں تو اس طرح چل دیتا ہے گویا کسی تکلیف کے لیے، جو اس کو پہنچی، اس نے ہم کو پکارا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح حدود سے تجاوز کرنے والوں کی نگاہوں میں ان کے اعمال کھبا دیے گئے ہیں۔ ۱۱-۱۲

اور ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا جب کہ وہ ظلم کی مرتکب ہوئیں۔ اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور وہ ایمان لانے والے نہ بنے۔ ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں مجرم قوم کو۔ پھر ہم نے ان کے بعد تم کو ملک میں ان کا جانشین بنایا کہ دیکھیں تم کیسا عمل کرتے ہو۔ ۱۳-۱۴

اور جب ہماری کھلی ہوئی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات

کے متوقع نہیں ہیں، کہتے ہیں اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کرو۔ کہہ دو مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں اپنے جی سے ترمیم کر دوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہہ دو اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو نہ میں اس کو تمھیں سناتا اور نہ وہ اس سے تمھیں باخبر کرتا۔ میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر بسر کر چکا ہوں تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ بے شک مجرم فلاح پانے والے نہیں بنیں گے۔ ۱۵-۱۷

اور وہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچا سکیں نہ نفع اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں، کہہ دو، کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جس کا اس کو خود پتہ نہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں۔ وہ پاک اور ارفع ہے ان چیزوں سے جن کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور لوگ تو ایک ہی امت تھے۔ پھر انھوں نے اختلاف کیا۔ اور اگر تمھارے رب کی جانب سے ایک بات پہلے سے طے نہ پا چکی ہوتی تو ان کے درمیان اس امر میں فیصلہ کر دیا جاتا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ ۱۸-۱۹

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (۱۱)

عذاب کے لیے جلد بازی کا جواب

یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، جواب ہے عذاب کے لیے کفار کی جلد بازی کا۔ جب ان کو آیات تکذیب کے انجام سے ڈرایا جاتا تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے فوراً یہ مطالبہ کرتے اگر تم سچے رسول ہو اور تمھارے خیال کے مطابق تمھاری تکذیب متوجب عذاب ہے تو اس عذاب کے

ہیں تاخیر نہ کرو، ہم اس کے دیکھنے کے لیے بیقرار ہیں۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ سنت الٰہی یوں ہے کہ اللہ رحمت کرنے میں تو جلدی کرتا ہے لیکن عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں کرتا۔ 'اِسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ' میں استعمال ہمارے نزدیک اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا چونکہ اصلاً اپنی رحمت ہی کے لیے خلق فرمائی ہے اس لیے وہ لوگوں پر رحمت نازل بھی فرماتا ہے اور لوگوں سے یہ چاہتا بھی ہے کہ وہ فرصت ختم ہونے سے پہلے پہلے اس کی رحمت کے قدردان بنیں اور نیکی اور سعادت کی وہ راہ اختیار کریں جو دنیا اور آخرت دونوں میں ان کو خدا کے فضل و رحمت کا مستحق بنائے۔ اس سنت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان لوگوں پر عذاب بھیجنے میں جلدی نہ کرے جو اس کے آگے اکڑتے اور اس کے رسول کی تکذیب کرتے ہیں۔

'فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا..... الاية' یہ مذکورہ سنت الٰہی کا تقاضا بیان ہوا ہے کہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ نافرمانی اور طغیان کے باوجود لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مہلت اور ڈھیل دی جائے تاکہ کسی درجے میں بھی اصلاح حال کا کوئی امکان ہو تو لوگ اپنی اصلاح کر لیں اور اگر اصلاح نہ کریں تو ان پر اللہ کی حجت اس طرح تمام ہو جائے کہ روز آخرت کی پیشی کے وقت، جس سے وہ بالکل نچنت ہیں ان کے پاس پیش کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ
لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۲)

سرکشوں کی فطرت

'اِنْسَان' کا لفظ ہر چند عام ہے لیکن اس سے مراد وہی متمردین قریش ہیں جو عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان کو لائق خطاب نہیں سمجھا اس وجہ سے بات عام الفاظ میں فرما دی۔ یہ ان کی اس اکڑ پر ایک ضرب بھی ہے اور اس میں اشارہ اس حقیقت کی طرف بھی ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس قسم کے لوگوں کا مطالبۂ عذاب پورا کر دیا جائے تو وہ ایمان لائیں گے۔ اس قسم کے لوگ ایمان نہیں لاتے بلکہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب یہ کسی پکڑ میں آتے ہیں تب تو یہ خدا خدا پکارتے ہیں اور سو سو طرح سے توبہ کا عہد و پیمان باندھتے ہیں لیکن ذرا ڈھیل مل جاتی ہے تو وہی سرمستی ان پر پھر عود کر آتی ہے اور انھیں یاد بھی نہیں رہتا کہ کبھی پکڑ میں آئے تھے اور انھوں نے اس سے چھوٹنے کے لیے خدا کو پکارا بھی تھا۔ 'كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ' یعنی یہ جو کلیہ بیان ہوا ہے یہی ٹھیک ٹھیک ان سرکشوں اور حدود الٰہی سے ان تجاوز کرنے والوں پر منطبق ہوتا ہے۔ یہ جو بداعمالیاں کرتے رہے ہیں، سنت الٰہی کے تحت وہ ان کی نگاہوں میں اس طرح کھبا دی گئی ہیں کہ اگر ان کی طلب کے مطابق کوئی نشانی عذاب ان کو دکھا بھی دی جائے تو اس کی گرفت سے چھوٹتے ہی پھر یہ اسی کیچڑ میں لوٹیں گے جس میں لوٹ رہے ہیں۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ
كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۳-۱۴)

تاریخ کی شہادت

یہ جواب قریش کو مخاطب کرکے تاریخ کی روشنی میں دیا گیا ہے کہ آخر دوسروں کو جو کچھ اسی ملک کی تاریخ کے مختلف ادوار میں پیش آچکا ہے اس سے سبق کیوں نہیں لیتے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ وہی کچھ تم پر گزر جائے تب تمہاری سمجھ میں بات آئے کہ جو کچھ تم سے کہا گیا وہ ٹھیک ہے۔ یہاں حوالہ اجمالی ہے۔ اسی سورہ میں آگے بعض اہم تاریخی واقعات کی تفصیل بھی آرہی ہے۔ 'لَمَّا ظَلَمُوا' سے مراد یہاں ان قوموں کا وہ ظلم ہے جو انھوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کرکے خود اپنے اوپر ڈھایا۔ 'وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا' اسی ظلم کی تفصیل ہے۔ 'كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ' یعنی جو قومیں اپنے رسولوں کی تکذیب کرتی ہیں ہم ان کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہی جرم تم کرو گے تو آخر اس کی سزا سے کیسے بچ جاؤ گے۔

'ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ ...... الایۃ' یعنی جب تم انہی کے جانشین ہوئے ہو تو آخر تمہارے ساتھ اس سے مختلف معاملہ کیوں ہوگا جو ان کے ساتھ ہوا؟ ان کو ہٹا کر خدا نے تم کو ان کی جگہ تو اس لیے دی ہے کہ دیکھے تم کیا بناتے ہو؟

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۱۵)

مخالفین کی شکست خوردگی

یعنی توحید اور آخرت کی یہ باتیں، جو مذکور ہوئیں، نہایت واضح دلائل کے ساتھ ان کو سنائی جاتی ہیں تو یہ ان سے چڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا تو اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لاؤ یا کم از کم اس میں ایسی ترمیم کرو کہ ہمارے لیے گوارا ہو سکے۔ گویا قرآن ان کے نزدیک خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے کہ آپ اس میں ان کے مطالبے کے مطابق ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں۔ یہ مطالبہ مخالفین کی شکست خوردگی کی دلیل تھا۔ وہ یہ تو مان چکے تھے کہ قرآن سے اب پیچھا چھڑانا ممکن نہیں رہا۔ اب اگر کوئی شکل باقی ہے تو یہ ہے کہ اس کا مقام تسلیم کرتے ہوئے اس میں ایسی ترمیم کرانے کی کوشش کی جائے جس کے بعد ان کے لیے بھی وہ قابل قبول ہو سکے۔ جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلایا گیا کہ یہ میری کوئی اپنی تصنیف تھوڑے ہی ہے کہ میں اس میں اپنی جانب سے کوئی ترمیم و تنسیخ کر دوں۔ یہ کلام تو مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتا ہے اور میں بے چون و چرا اسی وحی کی پیروی کرتا ہوں۔ اگر میں اس میں اپنی طرف سے کوئی ردوبدل کر دوں تو کل کو خدا کے آگے کیا جواب دوں گا۔

قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ (۱۶-۱۷)

'أَدْرَاكُمْ'، 'دَرَىٰ يَدْرِي' سے باب افعال اور غائب کا صیغہ ہے۔ فاعل اس کا اللہ ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو 'مَا تَلَوْتُهُ' سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس کا ترجمہ متکلم کا کیا ہے لیکن یہ عربیت کے بالکل خلاف ہے۔

مسکت جواب

اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کفار کے مطالبے کے پہلے ٹکڑے کا جواب دلوایا ہے۔

یعنی اس بات کا کہ اس قرآن کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ۔ فرمایا کہ تم گمان کرتے ہو کہ میں نے یہ قرآن تمہارے سامنے اپنے شوق سے پیش کیا ہے اور اس رنگ میں میں نے تم پر اپنی سیادت اور نبوت جمانی چاہی ہے۔ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ میں نے اس بارگراں کا نہ کبھی ارمان کیا اور نہ اپنے شوق سے اس کو اٹھایا ہے۔ میں اس ذمہ داری کی گراں باریوں سے سب سے زیادہ بھاگنے والا رہا ہوں۔ لیکن مشیت الٰہی یہی ہوئی کہ میں یہ بوجھ اٹھاؤں۔ اگر خدا کی مشیت نہ ہوتی تو نہ میں اس چیز کو تمہارے سامنے پیش کرتا اور نہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے تم کو اعلام و انذار کرتا۔

پیغمبرؐ کی زندگی سے استدلال

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ یہ اوپر والی بات کی ایسی سادہ اور مسکت دلیل ہے کہ کوئی ایماندار آدمی اس کو جھٹلا نہیں سکتا۔ ارشاد ہوا کہ میں تم میں کوئی نو وارد آدمی نہیں ہوں جس کے نام حالات سے تم بے خبر ہو۔ میں تمہارے اندر زندگی کے چالیس سال گزار چکا ہوں۔ اس طویل مدت میں کب تم نے میری طرف سے کسی جھوٹ یا فریب کا تجربہ کیا ہے۔ کب تم نے میرے اندر سیادت و امارت کی بو محسوس کی ہے، کب تم نے پایا ہے کہ میں اونچے اونچے خواب دیکھتا ہوں اور اپنی بڑائی کی دھونس جمانے کا شوق رکھتا ہوں؟ آدمی کا مزاج راتوں رات نہیں بنتا اور نہ کردار ایسی چیز ہے جو اتنی طویل باہمی معاشرت کے باوجود نگاہوں سے مخفی رہے۔ جس شخص نے خلق میں سے کسی سے جھوٹ نہ بولا ہو آخر وہ خالق پر اتنا بڑا جھوٹ باندھنے کی جسارت کیسے کر سکتا ہے؟ آج تک تم مجھے صادق اور امین سمجھتے رہے تو اب میں راتوں رات بر خود غلط، خود نما، لپاٹیا اور مفتری کیسے بن گیا؟ خدا کے بندو عقل سے کام لو۔ انصاف سے غور کرو اور ضد و عناد میں اندھے نہ بن جاؤ ـــــ اس سے معلوم ہوا کہ حضرات انبیاءؑ کی زندگی شرف رسالت سے ممتاز ہونے سے پہلے بھی ایسی بے داغ ہوتی ہے کہ ان کے مخالفین اس پر انگلی رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں پاتے اور یہ چیز ان کے دعوے کی صداقت کی ایک بہت بڑی دلیل ہوتی ہے۔

رسول کے لیے غلبہ لازم ہے

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ ...... الآیہ۔ یعنی اگر میں خدا پر افترا کر رہا ہوں اور جھوٹا دعوائے نبوت لے کر اٹھا ہوں تو مجھ سے بڑا کوئی ظالم نہیں اور اگر میں سچا ہوں اور تم اللہ کی آیات کو جھٹلا رہے ہو تو تم سے بڑا کوئی ظالم نہیں۔ اب مستقبل فیصلہ کرے گا کہ ظالم تم ہو یا میں۔ یہ یاد رکھو کہ جو مجرم ہوں گے وہ فلاح نہیں پائیں گے ـــ یہاں وہ بات یاد رکھنے کی ہے جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ اللہ کے رسولوں اور ان کے مخالفین کے مابین حق و باطل کی جو کشمکش برپا ہوتی ہے وہ لازماً حق کے غلبہ پر منتہی ہوتی ہے اس لیے کہ رسول خدا کی عدالت ہوتا ہے اور اس کے لیے بفحوائے لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي آخرت سے پہلے اس دنیا میں بھی غلبہ لازمی ہے۔

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ وَمَا

كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۱۸ - ۱۹)

مشرکین مکہ کی اصل چڑ

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... الایۃ' یہ اس خاص چیز کا حوالہ بھی ہے جس کے سبب سے مشرکین مکہ قرآن سے چڑتے اور اس میں ترمیم کا مطالبہ کرتے تھے اور اللہ پر افترا کی ایک مثال بھی ہے جو دلیل ہے اس بات کی کہ عنداللہ سب سے بڑے ظالم یہی ہیں اس لیے کہ یہ ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں جو ان کو ضرر پہنچا سکیں نہ نفع اور ان کی نسبت یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہماری سفارشی ہیں، دنیا میں ہمیں آل و اولاد اور رزق و مال جو کچھ ملتا ہے انہی کی سفارش سے ملتا ہے اور اگر آخرت ہوئی تو وہاں بھی یہ ہمیں بخشوائیں گی۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ اہل عرب اپنے معبودوں کو نہ خدا کی ذات میں شریک مانتے تھے نہ کسی کو خالق و مالک کا درجہ دیتے تھے بلکہ صرف ان کو خدا کے چہیتوں کا درجہ دیتے اور ان کی سفارش کی امید پر ان کی پرستش کرتے تھے۔

عربیت کا ایک خاص اسلوب

قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ۔ یہ نفی الشیء بنفی لازمہ کے اسلوب پر ان فرضی سفارشیوں کی تردید ہے۔ یعنی ان کے ان فرضی سفارشیوں کا آسمان و زمین میں کوئی وجود ہوتا تو سب سے زیادہ ان سے باخبر تو خود اللہ تعالیٰ ہوتا جس کے وہ مقرب اور چہیتے ٹھہرائے جاتے ہیں۔ لیکن خدا کو تو ان کا کوئی پتا نہیں ہے، بس یہی لوگ ان کا سراغ بھی دے رہے ہیں اور یہی ان کو آسمان پر بھی چڑھا رہے ہیں۔ بعینہٖ یہی مضمون رعد آیت ۳۳ میں بھی ہے۔ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ۭ قُلْ سَمُّوْهُمْ ۭ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ (اور انھوں نے اللہ کے شریک ٹھہرائے ہیں، ان سے کہو کہ ذرا ان کے نام تو لو، کیا تم اس کو ایسی چیز کا پتہ دے رہے ہو جس کے زمین میں وجود کا اس کو خود علم نہیں یا یوں ہی ہوائی بات کر رہے ہو) عربیت کے اس اسلوب کی مثالیں کلام عرب میں موجود ہیں۔ امرءالقیس نے ایک صحرائی راستہ کی تعریف کی ہے کہ 'لا یھتدی بمنارہ' اس کی برجیوں سے رہنمائی نہیں حاصل کی جاتی۔ جس کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اس میں برجیاں اور مینارے سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو لازماً ان سے رہنمائی حاصل کی جاتی۔

تردید شرک کی ایک دلیل

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ صرف تنزیہ کا کلمہ نہیں ہے بلکہ رد شرک کی ایک بہت بڑی دلیل بھی ہے۔ وہ یوں کہ کسی شے کی بنیادی صفات کے ساتھ کسی ایسی صفت کا جوڑ ملانا خلاف عقل ہے جس سے بنیادی صفات میں سے کسی صفت کی نفی ہوتی ہو یا اس سے کوئی تضاد لازم آتا ہو۔ شرک ہر شکل میں یا تو خدا کی بنیادی مسلّم صفات میں سے کسی صفت کی نفی کرتا ہے یا اس سے تضاد لازم آتا ہے۔

توحید کے حق میں تاریخ کی شہادت

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا۔ یہ توحید کے حق میں تاریخی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

ہمیشہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں کو ایک ہی دین توحید کی تعلیم دی اور ایک ہی امت بنایا لیکن لوگوں نے بعد میں اس میں اختلاف پیدا کر کے کج پیچ کی بہت سی راہیں نکال لیں اور مختلف امتوں اور گروہوں میں بٹ گئے۔ مطلب یہ ہے کہ آج شرک و ضلالت کے مختلف طریقوں کی موجودگی سے کوئی یہ دلیل نہ پکڑے کہ یہ راستے بھی خدا اور رسول کے بتائے ہوئے ہیں۔ ان کو خدا سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ گمراہوں کی اپنی ایجاد سے ظہور میں آئے ہیں ـــــ ضمناً اس سے جدید فلسفیوں کے اس نظریہ کی بھی تردید ہو گئی کہ انسان نے دین کا آغاز شرک سے کیا پھر درجہ بدرجہ ارتقاء کرتے ہوئے توحید تک پہنچا۔ قرآن اس کے بالکل برعکس یہ کہتا ہے کہ خدا نے شروع ہی سے انسان کو توحید کی تعلیم دی لیکن گمراہوں نے اس میں اختلاف پیدا کر کے نئتنے کھڑے کر دیے۔ ہم نے فلسفۂ جدید کے اس باطل نظریہ کی تردید اپنی کتاب 'حقیقت توحید' میں تفصیل سے کی ہے۔

'وَلَوْلَا كَلِمَةٌ ...... الایۃ' یعنی اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے آخرت کا دن خدا کی طرف سے مقرر ہو چکا ہے۔ اگر یہ دن مقرر نہ ہو چکا ہوتا تو آج ہی ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۰-۲۷

آگے کفار کے مطالبۂ عذاب کا حوالہ دے کر اس کا جواب دیا ہے کہ یہ لوگ عذاب کی کوئی نشانی مانگتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ اس طرح کی کوئی نشانی ان کو دکھا دی گئی تو وہ ضرور ہی ایمان لائیں گے لیکن حالت یہ ہے کہ اس طرح کی کوئی نشانی ظاہر ہوتی ہے تو جب تک اس کی گرفت میں ہوتے ہیں اس وقت تک تو انھیں خدا یاد آتا ہے لیکن جوں ہی ذرا ڈھیل ملی تو پھر اپنی سرمستیوں میں اس طرح کھو جاتے ہیں گویا کوئی بات سرے سے پیش ہی نہیں آئی۔ ایسے لوگوں کو کوئی مزید نشانی دکھانے سے کیا حاصل؟

پھر کفار کا یہ مغالطہ دور فرمایا ہے کہ آج تمھارے حالات سازگار ہیں اور ہر طرف فراغت و رفاہیت کے سروسامان کی فراوانی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب تم خدا کی گرفت سے باہر ہو اور تمھیں کوئی گزند پہنچ ہی نہیں سکتا۔ خدا کے قہر کی بجلی تو اس وقت گرتی ہے جب مستحق عذاب قوم اپنے حالات میں اتنی مگن ہوتی ہے کہ وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اب آسمان یا زمین سے کوئی خطرہ اسے پیش آ ہی نہیں سکتا۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۰-۲۷

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ
فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾ وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ ع ۲
رَحْمَةً مِّن بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِي آيَاتِنَا ۚ قُلِ

اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿٢١﴾ هُوَ الَّذِيْ
يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ
بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ
مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ
لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٢٢﴾ فَلَمَّآ
اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا
بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ
فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٣﴾ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ
اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ
وَالْاَنْعَامُ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ
اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا
كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٤﴾
وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢٥﴾ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۭ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ
قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَ
الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَاۗءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا
لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ
مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٧﴾

ترجمۂ آیات ۲۰ - ۲۷

اور وہ کہتے ہیں ان پر ان کے رب کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری جاتی؟ تو تم جواب دے دو کہ غیب کا علم تو بس اللہ ہی کو ہے تو تم لوگ انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب کسی تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی ہو ہم اسے اپنے فضل سے نوازتے ہیں تو وہ ہماری نشانیوں کے باب میں چالیں چلنے لگتا ہے۔ کہہ دو، خدا اپنی تدبیروں میں کہیں زیادہ تیز ہے۔ جو چالیں تم چل رہے ہو ہمارے فرستادے ان کو نوٹ کر رہے ہیں۔ ۲۰ - ۲۱

وہی ہے جو تمھیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں ہوائے موافق سے چل رہی ہوتی ہیں اور وہ اس میں مگن ہوتے ہیں کہ دفعتہً ایک باد تند آتی ہے اور ان پر ہر جانب سے موجیں اٹھنے لگتی ہیں اور وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ہم ہلاک ہوئے تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں خالص اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہمیں اس آفت سے نجات دی تو ہم تیرے شکر گزار بندوں میں سے ہو کر رہیں گے تو جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے وہ نجات پاتے ہی زمین میں، بلا کسی حق کے، سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ لوگو، تمھاری سرکشی کا وبال تمھارے ہی اوپر آنے والا ہے۔ چند دن دنیا کی زندگی کا نفع اٹھا لو، پھر تمھاری واپسی ہماری ہی طرف ہے، پھر ہم تمھیں تمھاری کرتوتوں سے آگاہ کریں گے۔ اس دنیا کی زندگی کی تمثیل یوں ہے جیسے بارش کہ ہم نے اسے آسمان سے برسایا پس اس سے زمین کی نباتات خوب اگیں، وہ بھی جن کو لوگ کھاتے ہیں اور وہ بھی جن کو چوپائے کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا پورا بناؤ سنگھار کر لیا اور زمین والوں نے گمان کیا کہ اب معاملہ ہمارے قابو میں ہے تو دفعتہً اس پر ہمارا قہر رات کو یا دن کو آدھمکا اور ہم نے اس طرح

اس کا ستھراؤ کر دیا کہ گویا کل کچھ تھا ہی نہیں۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کی تفصیل کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کریں۔ ۲۲-۲۴

اور اللہ امن و سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ جن لوگوں نے اچھے کام کیے ان کے لیے اچھا بدلہ ہے اور اس پر مزید بھی اور ان کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی اور نہ ذلت۔ یہی جنت والے لوگ ہیں وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور جنھوں نے بدیاں کمائی ہوں گی تو برائی کا بدلہ اس کے مثل ہے اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، اللہ سے ان کو کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔ گویا ان کے چہرے شب دیجور کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیے گئے ہیں۔ یہی لوگ اہل دوزخ ہیں، یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۵-۲۷

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (۲۰)

مطالبۂ عذاب کا جواب

'آیت' سے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ نشانی عذاب مراد ہے۔ قرآن ان کو دو عذابوں کی خبر دیتا تھا، ایک رسول کی تکذیب کی صورت میں اس دنیا میں، دوسرا عدم ایمان کی صورت میں آخرت میں۔ سادات قریش کے پندار پر اس سے بڑی چوٹ پڑتی تھی اور یہ چیز بھی منجملہ ان چیزوں کے تھی جن کی وجہ سے وہ قرآن کے بدلنے یا اس میں ترمیم کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس باب میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے یہ کہتے کہ اگر یہ اپنی اس دھمکی میں سچے ہیں تو آخر یہ اس عذاب کا نمونہ دکھاتے کیوں نہیں جس کی اس شدومد سے منادی کرتے پھر رہے ہیں؟ جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا کہ عذاب لانا میرا کام نہیں ہے۔ عذاب کی خبر خدا نے دی ہے۔ میں تم کو اس سے خبردار کر رہا ہوں۔ رہی یہ بات کہ عذاب کب اور کس شکل میں آئے گا تو یہ امور غیب ہیں، ان کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ۔ اگر تم اس کے طلبگار ہو تو انتظار کرو، میں بھی خدا کی دی ہوئی خبر کی بنا پر اس کے انتظار میں ہوں۔ 'انتظار میں ہوں' سے یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ کو اپنی قوم کو مبتلائے عذاب الٰہی دیکھنے کا ارمان تھا۔ حضرات انبیا اپنی قوم کو عذاب سے بچانے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیتے ہیں لیکن جب قوم اپنی ضد کے سبب سے اپنے اندر وہ تمام

اسباب و علامات جمع کر لیتی ہیں جن کے بعد عذاب آیا کرتا ہے تو قدرتی طور پر نبی کے دل کو بھی ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے کہ اب مریض کا دم واپسیں ہے اور خدا کا حکم آیا ہی چاہتا ہے۔ اس انتظار میں تمنا کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ حسرت و اندوہ کے ساتھ ایک امر شدنی کا انتظار ہوتا ہے۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ (۲۱)

کفار کی پالیسی وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ۔ یہ حال تو قریش ہی کا بیان ہو رہا ہے لیکن بات عام خطاب کے اسلوب میں کہہ دی گئی ہے تاکہ ان سے بے التفاتی کا اظہار بھی ہو جائے اور یہ حقیقت بھی سامنے آجائے کہ اس باب خاص میں جو حال ان کا ہے وہی حال سب کا ہے، صرف صاحب توفیق ہی ہوتے ہیں جو اس سے الگ روش اختیار کرتے ہیں۔ فرمایا کہ اس قسم کی تنبیہی نشانیاں جو لوگوں کو دکھائی جاتی ہیں ان کا کچھ اثر بس اسی وقت تک رہتا ہے جب تک لوگ اس کی زد میں رہتے ہیں۔ جوں ہی حالات بدلے، محسوس ہوا کہ کشتی گرداب سے باہر نکل آئی، فوراً لیڈر اپنے عوام کے دلوں پر سے اس ابتلا کے تمام اثرات مٹانے کے لیے طرح طرح کے فلسفے بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں اور مختلف قسم کی چالوں سے خود بھی اپنی پچھلی سرمستیوں میں کھو جاتے ہیں اور اپنی قوم کو بھی اپنے ساتھ ہانک لے جاتے ہیں۔

اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا۔ لفظ مَکْر کی تحقیق آل عمران کی آیت مَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ مکر کے معنی خفیہ تدبیر اور چال بازی کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کے باب میں کفار نے جو چال بازی کی اس کی ایک مثال تو یہیں آگے والی آیت میں بیان ہو گئی ہے۔ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ہ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ (اگر تو نے ہم کو اس ہلاکت سے نجات دے دی تو ہم تیرے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے لیکن جب ان کو نجات دے دی تو پھر وہ زمین میں سرکشی کرنے لگے) دوسری مثال اس کی قَدْ مَسَّ اٰبَاۗءَنَا الضَّرَّاۗءُ وَالسَّرَّاۗءُ والی آیت میں بیان ہوئی ہے یعنی ان کے لیڈر اپنے کو تسلی دیتے اور اپنے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے اپنے منہ کے بالکل خلاف تاریخ کا یہ فلسفہ بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ اس قسم کے نرم گرم حالات تو قوموں کی زندگی میں پیش آیا ہی کرتے ہیں، ہمارے بزرگوں کو بھی پیش آئے۔ ہمیں بھی پیش آرہے ہیں۔ ان کو خواہ مخواہ یہ اہمیت کیوں دی جائے کہ یہ خدا کی طرف سے بطور تنبیہ پیش آئے ہیں یا ان کا کوئی تعلق ہمارے اعمال و عقائد سے ہے۔

قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا۔ مکر کی نسبت جب اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس کا مفہوم خفیہ تدبیر ہو جاتا ہے۔ ہم آل عمران کی مذکورہ بالا آیت کے تحت اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کر آئے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم چالیں چلنی چاہتے ہو تو خوب چل لو، خدا نے تم کو جو یہ ڈھیل دے رکھی ہے تو اس وجہ سے دے رکھی ہے کہ اس کو اپنی تدبیر کے بروئے کار لانے میں کوئی دقت صرف نہیں کرنا پڑتا ہے۔ اس کی تدبیر

...ا مروستے کا آتی ہے اور اتنی محکم ہوتی ہے کہ کوئی اس سے بچ کے نکل نہیں سکتا۔ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ سے یہاں مراد فرشتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری ایک ایک چال ہمارے فرشتے نوٹ کر رہے ہیں۔ کوئی چیز ہم سے مخفی نہیں۔ وقت آنے پر ہم اس کا نوٹس لیں گے پھر تمہاری ساری چالیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ ج وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنفُسِكُم لا مَّتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ز ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۲۲-۲۳)

يُسَيِّرُكُمْ 'تسییر' کے معنی چلانے کے ہیں۔ یہاں یہ سفر کرانے کے معنی میں آیا ہے۔ چونکہ تمام وسائل سفر خدا ہی کے پیدا کردہ ہیں اور وہ تدبیر و حکمت بھی خدا ہی کی عطا کردہ ہے جس سے کام لے کر انسان خشکی و تری کے سفر کے وسائل ایجاد کرتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اس وجہ سے فرمایا کہ وہی تمہیں خشکی و تری میں سفر کراتا ہے تاکہ انسان کی نگاہ اسباب و وسائل ہی میں اٹک کر نہ رہ جائے بلکہ اسباب و وسائل پیدا کرنے والے تک پہنچے۔

فِي الْفُلْكِ۔ 'فُلْک' کے معنی کشتی کے ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ مذکر، مونث، واحد جمع، سب کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ یہاں اس کے لیے فعل 'جَرَيْنَ' جمع استعمال ہوا ہے۔

وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ۔ 'رِيحٍ طَيِّبَةٍ' سے سازگار ہوا مراد ہے۔ اس کا متقابل لفظ 'رِيحٌ عَاصِفٌ' استعمال ہوا ہے جو طوفانی ہوا کے لیے آتا ہے۔ اوپر سے بات صیغۂ خطاب میں آ رہی ہے۔ یہاں سے اسلوب غائب کا ہو گیا۔ اس لیے کہ یہ تمثیل ہے اور تمثیل کے لیے اسلوب بیان عمومی ہی موزوں اور مؤثر ہوتا ہے۔

وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ 'بغی' استکبار کا نتیجہ ہوتی ہے اور استکبار صرف اس کے لیے روا ہے جس کا خلق و تدبیر میں کوئی حصہ ہو۔ جو خود مخلوق اور ہر چیز میں خالق کے رحم و کرم کا محتاج ہو، اس کے اکڑنے اور وہ بھی اپنے خالق کے سامنے کے کیا معنی! اس وجہ سے یہ بغی بغیر حق ہے۔

'يَا أَيُّهَا النَّاسُ' میں خطاب پھر قریش سے ہو گیا اور 'مَتَاعَ الْحَيَاةِ' میں لفظ 'متاع' فعل محذوف سے منصوب ہے۔

ایک حقیقت افروز تمثیل اجزا کی تشریح کے بعد اب نفس آیت کے مفہوم پر غور فرمایئے۔ یہ اوپر والی آیت میں بیان کردہ حقیقت کی تمثیل ہے۔ اوپر فرمایا تھا کہ انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اس کو کسی دکھ کے بعد سکھ پہنچاتے ہیں تو وہ ہماری نشانیوں سے صحیح فائدہ اٹھانے کے بجائے ہم سے چال بازیاں کرتا ہے۔ اسی حقیقت کو انسانی زندگی کے ایک عام اور روز مرہ واقعہ سے مثال دے کر سمجھایا ہے کہ جس طرح ایک کشتی کے مسافر سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو جب

ہوا موافق ہوتی ہے اور کشتی نہایت سکون سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتی ہے تو سب مگن ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب ان کی اس خوشی میں کوئی خلل انداز ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ کسی گوشے سے طوفانی ہوا اٹھتی ہے اور موجوں کے تھپیڑوں سے کشتی اس طرح ہچکولے کھانے لگتی ہے کہ ہر شخص یہ گمان کرنے لگتا ہے کہ اب ڈوبی کہ تب۔ اس نازک وقت میں سب خدا سے دعا و فریاد اور یہ عہد کرتے ہیں کہ اب اگر اس ورطۂ ہلاکت سے خدا نے نجات دے دی تو ہم آئندہ اس کے شکر گزار اور فرمانبردار بندے بن کر زندگی بسر کریں گے۔ لیکن جب خدا ان کو اس گردش سے نجات دے دیتا ہے تو اپنا یہ عہد بھول کر پھر اپنی پچھلی سرمستیوں اور شرارتوں میں کھو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہی حال اس وقت ان لوگوں کا ہے جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس وقت زندگی کا سفینہ نہایت سکون سے رواں ہے۔ حالات سازگار ہیں۔ اس وجہ سے اپنی شرارتوں میں مگن ہیں۔ پیغمبر ان کو خدا کی پکڑ سے ڈراتا ہے تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ عذاب کیوں آ جائے گا اور کدھر سے آ جائے گا۔ چنانچہ بڑی ڈھٹائی سے پیغمبر کو چیلنج کر رہے ہیں لیکن جب کسی گرفت میں آ جائیں گے تو توبہ توبہ پکاریں گے لیکن وہ اپنی اس توبہ پر صرف اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک گرفت میں رہیں گے۔ گرفت سے باہر ہوتے ہی پھر اسی طرح اکڑنے لگیں گے گویا خدا کی خدائی سے باہر ہو گئے۔ مدعا یہ کہ کوئی یہ نہ خیال کرے کہ اس طرح کے لوگوں کو کسی تنبیہ سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ان کے دلوں کا زنگ کسی رگڑے سے بھی دور نہیں ہوتا۔ اس طرح کے اشقیا صرف خدا کے فیصلہ کن عذاب ہی کے حوالہ ہوتے ہیں۔

قریش کو تہدید

'یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ' تمثیل کے بعد یہ قریش کو پھر خطاب کیا ہے اور یہ خطاب اپنے اندر نہایت سخت تہدید و وعید رکھتا ہے۔ 'اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ' یعنی تمہاری اس شرارت و سرکشی سے نہ خدا کا کچھ بگڑے گا نہ رسول کا۔ بگڑے گا تمہارا ہی۔ تمہاری ہر سرکشی تم پر خدا کی حجت پوری کرے گی اور تم جتنے قدم اس راہ میں بڑھو گے اتنے ہی خدا کے فیصلہ کن عذاب سے قریب تر ہو گے۔ 'مَتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا' یعنی اس دنیا کے جس سروسامان پر ریجھے ہوئے ہو اس سے کچھ دن فائدہ اٹھا لو لیکن یاد رکھو کہ واپسی ہماری ہی طرف ہے، کسی اور کی طرف نہیں ہے۔ اس وقت ہم تمہارا سارا کچا چٹھا تمہارے سامنے رکھ دیں گے اور تمہارا کوئی سفارشی تمہارے کچھ کام نہ آئے گا۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓی اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّیَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۲۴)

حیاتِ دنیا کی تمثیل

'اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا' یہ اس حیاتِ دنیا کی تمثیل ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں 'مَتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا' کے الفاظ سے ہوا ہے جس پر کفار ریجھے ہوئے ہیں اور اس کو اس قدر مامون سمجھے ہوئے تھے کہ اس میں کسی رخنے کا ان کو امکان ہی نظر نہیں آتا تھا۔

فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ۔ 'اختلاط' کے معنی کسی شے کے باہمدگر مل جانے اور گتھم گتھا ہو جانے کے ہیں۔ یہ فصلوں اور نباتات کے خوب اپجنے کی تعبیر ہے اس لیے کہ سازگار بارش سے جب فصل نشو و نما پاتی ہے تو وہ باہمدگر مل کر خوب گھنی ہو جاتی ہے۔ 'مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ' یعنی ہر نوع کی نباتات خوب اپجیں، وہ بھی جو انسانوں کے کام آتی ہیں اور وہ بھی جو مویشیوں کے مصرف کی ہوتی ہیں۔

اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ ۔ 'زخرف' حسن، زینت اور ملمع کو کہتے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ زمین کی گوناگوں و بوقلموں نباتات کے لیے بھی آتا ہے۔ 'ازّیّن' اور 'تزیّن' ایک ہی مفہوم کے لیے آتے ہیں۔

'وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ' یعنی جب فصل اپنے جوبن پر ہوتی ہے، ان کے مالکوں کے دل حوصلہ اور امنگ سے لبریز ہو جاتے ہیں کہ اب کیا اندیشہ ہے، اب تو بازی ہماری ہے۔

'اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ' 'امر' یہاں عذاب کے مفہوم میں ہے۔ 'لَيْلًا اَوْ نَهَارًا' یعنی رات یا دن میں جس وقت بھی ہم نے چاہا اپنا عذاب بھیج دیا، کوئی ہمارا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا۔ 'حَصِيْد' کاٹی ہوئی فصل کو کہتے ہیں۔ 'كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ' یعنی اس طرح ستھراؤ کر دیا کہ ع گویا کہ ان تلوں میں کبھی تیل ہی نہ تھا۔

خدا کی پکڑ دور عروج میں ہوتی ہے

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا کی زندگی جس کو تم بہت کامیاب اور مامون سمجھ رہے ہو، اس کے غرّے میں خدا کو چیلنج نہ کرو۔ جس طرح دیکھتے ہو کہ بارش ہوتی ہے۔ فصل اپجتی ہے۔ باغ پھلتے ہیں۔ ان کے مالک ان کو دیکھ کر پھولے نہیں سماتے کہ دفعتہً قہر الٰہی کا کوئی جھونکا آتا ہے اور سب کو خس و خاشاک کی طرح اڑا دیتا ہے اسی طرح جب ہمارا فیصلہ صادر ہو جائے گا ہم تمھیں، عین اسی حالت میں جس کو تم اپنی ترقی اور عروج کا دور خیال کیے بیٹھے ہو، دھر لیں گے اور تم ہمارے مقابلے میں کچھ نہ کر سکو گے۔ تم عذاب کی نشانی دیکھنا چاہتے ہو تو اس دنیا میں جو نشانیاں ہماری آئے دن ظاہر ہوتی رہتی ہیں ہم ان کی تفصیل تمھیں سنا رہے ہیں۔ جن کے اندر غور کرنے کی صلاحیت ہے وہ ان پر غور کریں۔ عاقل وہ ہے جو دوسروں کے حالات سے سبق لے، نہ کہ اس وقت آنکھ کھولے جب خود اپنے سر پر گزر جائے۔ سورۂ قلم کی آیات ۱۷-۲۹ میں باغ والوں کی جو تمثیل بیان ہوئی ہے اس میں بھی یہی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی کہ جن قوموں پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے ان کو وہ عین دور عروج میں پکڑ لیتا ہے۔ اس لیے کہ خدا کے ہاں اصلی اہمیت عقائد و اعمال کی ہے نہ کہ مادی اسباب و وسائل کی۔ اگر ایک قوم اخلاقی اعتبار سے گر چکی ہے تو اسباب و وسائل کی فراوانی اس کو سہارا دینے کے بجائے اس کے زوال کی رفتار کو اور تیز کر دیتی ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؀ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى
وَزِيَادَةٌ ۭ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ؀

وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۖ كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۲۵-۲۷)

'وَاللّٰهُ يَدْعُوا إِلٰى دَارِ السَّلَامِ' سلام کے معنی سکھ اور چین کے ہیں۔ اس سے مراد جنت ہے اس لیے کہ وہی ایسی جگہ ہے جہاں پہنچ جانے کے بعد آدمی کے لیے نہ ماضی کا غم ہوگا، نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ بلکہ دائمی سکھ اور ابدی چین کی زندگی ہوگی۔ اس لفظ کے استعمال میں یہاں ایک تلمیح ہے اس دنیا کی طرف سے جس پر کفار ریجھے ہوئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو جس زندگی پر فریفتہ ہو وہ ہر وقت خدا کی برق غضب کی زد میں ہے، البتہ خدا تمھیں جس گھر کی دعوت دے رہا ہے وہ ابدی امن و سلامتی کا گھر ہے۔

'وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ' لیکن اس گھر کی راہ اختیار کرنا ہر ایک کا نصیبہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس گھر کو جانے والی سیدھی راہ کی توفیق انہی کو دیتا ہے جن کو چاہتا ہے۔ 'جن کو چاہتا ہے' یعنی جو سنت الٰہی کے مطابق اس کے اہل ٹھہرتے ہیں۔ یہ سنت تمام تر عدل و حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں گزر چکی ہے۔

'لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ' یہ اس سکھ کے گھر میں لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے معاملے کی تفصیل ہے کہ جن لوگوں نے دنیا میں نیکی کمائی اور احسان کی روش اختیار کی ہوگی ان کے لیے ان کی نیکی کا بدلہ اچھا بھی ہوگا اور ان پر مزید فضل بھی ہوگا۔ یہاں اس مزید فضل کی وضاحت نہیں ہوئی ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی تفصیل یوں آئی ہے۔ 'مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ... ۱۶۰ انعام' (جو بھلائی لے کر حاضر ہوگا تو اس کے لیے اس کا دس گنا اجر ہے)

'وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ' 'رَهَق' کے معنی چھا جانے اور غالب آجانے کے ہیں اور 'قَتَر' غبار، کدورت اور سیاہی کو کہتے ہیں۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ وہ سیاہی مراد ہے جو شدت یاس کے نتیجہ میں چہرے پر چھا جاتی ہے۔ یہاں جن چیزوں کی نفی کی ہے، ان کی نفی سے مقصود ان کے ضد پہلو کا اثبات ہے یعنی ان کے چہرے اپنی کامیابیوں پر ہشاش بشاش ہوں گے اور ہر قدم پر ان کے ساتھ اعزاز و تکریم کا معاملہ ہو رہا ہوگا۔

'جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ' یہ بروں کا انجام بیان ہوا ہے کہ برائی کا بدلہ پورے انصاف کے ساتھ بالکل ہموزن ہوگا۔ ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ 'وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ' میں ذلت کے ساتھ 'قتر' کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی تفصیل 'كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا' کی تشبیہ میں آگئی اور اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ 'قتر' سے مراد مایوسی کی سیاہی ہے اور چونکہ یہ ابدی مایوسی کی سیاہی ہوگی اس وجہ سے ایسا معلوم ہوگا کہ گویا ان کے چہروں پر شب تاریک کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر ڈال دیے گئے ہیں۔ 'مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ' سلسلۂ کلام کے بیچ میں جملہ معترضہ کے محل میں ہے۔ یعنی اس ابدی

مایوسی اور ذلت سے ان کو وہاں چھڑانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ دنیا میں جن معبودوں سے سفارش اور مدد کی امیدیں باندھ کر ان کی پرستش کی ہوگی وہ سب ہوا ہو جائیں گے۔ ان میں سے کوئی کام آنے والا نہ بنے گا۔

۲- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۸-۳۶

اوپر مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ میں یہ اشارہ جو فرمایا تھا کہ ابدی مایوسی اور ذلت سے چھڑانے میں ان کے مزعومہ شرکاء اور شفعاء کچھ کام آنے والے نہیں، آگے اس اشارے کی تفصیل فرما دی کہ آخرت میں ان کا کیا حال ہوگا اور ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت فرما دی کہ مجرد ظن کی بنیاد پر آرزوؤں کے جو ہوائی قلعے تعمیر کیے جاتے ہیں وہ اسی طرح مسمار ہوتے ہیں۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸-۳۶

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَ
شُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ﴿٢٨﴾
فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾
هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَا أَسْلَفَتْ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ
ع ۳ نصف الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٣٠﴾ قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ
السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ
الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ
فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٣١﴾ فَذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ
إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ ﴿٣٢﴾ كَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ
فَسَقُوا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٣﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ
ثُمَّ يُعِيدُهُ قُلِ اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٣٤﴾
قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ قُلِ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ
أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَىٰ

فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿٣٥﴾ وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾

ترجمۂ آیات ۲۸-۳۶

اور یاد کرو اس دن کو جس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے پھر ہم شرک کرنے والوں کو حکم دیں گے کہ تم اور تمہارے شرکاء اپنی جگہ ٹھہرو۔ پھر ہم ان کے درمیان تفریق کریں گے اور ان کے شریک کہیں گے، تم ہم کو تو نہیں پوجتے تھے، اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے۔ ہم تمہاری عبادت سے بالکل ہی بے خبر رہے۔ اس وقت ہر شخص اپنے اس عمل سے دوچار ہوگا جو اس نے کیا ہوگا اور لوگ اپنے مولائے حقیقی کے حضور پیش ہوں گے اور افترا کر کے انھوں نے جو معبود بنائے تھے وہ سب ہوا ہو جائیں گے۔ ۲۸-۳۰

ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ یا کون ہے جو سمع اور بصر پر اختیار رکھتا ہے اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون ہے جو ساری کائنات کا انتظام فرماتا ہے، تو جواب دیں گے اللہ تو ان سے کہو کہ کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں؟ پس وہی اللہ تمہارا رب حقیقی ہے تو حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے تو کہاں تمہاری عقل الٹ جاتی ہے؟ اسی طرح تیرے رب کی بات ان لوگوں پر پوری ہو چکی ہے جنھوں نے نافرمانی کی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ۳۱-۳۳

پوچھو تمہارے شرکاء میں کوئی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہو پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا؟ کہہ دو اللہ ہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے۔ پھر وہ اس کا اعادہ فرمائے گا تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو؟ پوچھو، کیا تمہارے شرکاء میں کوئی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو، کہہ دو اللہ ہی ہے جو حق کی توفیق بخشتا ہے۔ تو کیا جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ پیروی کیے جانے کا مستحق

ہے یا وہ جو بغیر رہنمائی کے خود راہ نہیں پاتے؟ تو تمھیں کیا ہوگیا ہے تم کیسا فیصلہ کرتے ہو! اور ان میں سے اکثر محض گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور گمان حق کا بدل ذرا بھی نہیں ہو سکتا اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ ۳۲-۳۶

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ۝ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ (۲۸-۲۹)

مشرکین اور ان کے شرکا ساتھ ہیں۔

'وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا' میں 'جَمِيعًا' کی تاکید اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ مشرکین کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کے ان شریکوں اور شفیعوں کو بھی جمع کرے گا جن کو انھوں نے خدا کی خدائی میں شریک ٹھہرا کر ان کی عبادت کی اور ان کو اپنا سفارشی سمجھا۔

'ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ'۔ 'مَكَانَكُمْ' سے پہلے 'الزموا' یا 'قفوا' یا ان کے ہم معنی کوئی فعل محذوف ہے۔ یعنی بس اپنی جگہ پر ٹھہر جاؤ۔ عربی میں جب کسی فوری اور واجب التعمیل حکم کا موقع ہو تو ظرف یا مفعول سے پہلے اس طرح فعل کو حذف کر دیتے ہیں تاکہ مخاطب کی ساری توجہ اصل بات پر مرتکز ہو جائے۔ 'فَزَيَّلْنَا' یہ اس روکنے کے مقصد کی تفصیل ہے۔ 'تزییل' کے معنی تفریق اور جدائی ڈال دینے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات میں اس بات کی تصریح ہے کہ قیامت کے دن مشرکین اور ان کے معبودوں میں جدائی ڈال دی جائے گی اور معبود اپنے عابدوں سے اس دن اظہار براءت بھی کریں گے اور خدا کی قسم کھا کر یہ بھی ان کو بتائیں گے کہ ہمیں اصلاً خبر نہیں کہ دنیا میں تم ہماری عبادت کرتے رہے۔ بقرہ آیت ۱۶۶ اور ۱۶۷ اور انعام آیت ۹۴ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

شرکا کا اعلان براءت

'وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم ... الآیۃ' یہ مزعومہ شریکوں کا اعلان براءت ہے جو ساری خدائی کے آگے ان کے پرستاروں کو رسوا کرے گا۔ انھیں تو یہ امید ہوگی کہ ساری زندگی جن کی عبادت کی ہے اور جن کو نذریں اور قربانیاں پیش کی ہیں آج وہ ان کے کام آئیں گے اور خدا نے ان پر ہاتھ ڈالا تو یہ ان کو چھڑائیں گے لیکن قبل اس کے کہ یہ زبانیں کھولیں وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں گے کہ ہمیں خبر بھی نہیں کہ کچھ احمق لوگ ہماری عبادت کرتے رہے ہیں۔ 'فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا' قسم کے معنی میں ہے اور 'إِن كُنَّا' میں 'إن' مخففہ ہے جو 'إنّ' کے معنی میں ہوتا ہے اور اس کے بعد 'لغافلین' پر جو لام ہے وہ اس کا قرینہ ہے۔

هُنَالِكَ تَبْلُوا كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ (۳۰)

ہر شخص کی پیشی خدا کے آگے ہوگی

تَبْلُوا کے معنی تجربہ کرنے، جانچنے، آزمانے اور چکھنے کے ہیں۔ یعنی مشرکین تو اس امید میں ہیں کہ اگر قیامت ہوئی تو خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں، ان کے دیوی دیوتا ان کو چھڑا ہی لیں گے لیکن وہاں سابقہ ہر شخص کو اپنے ان اعمال سے پیش آئے گا جو اس نے کیے ہوں گے اور وہ انھیں کو بھگتے گا۔ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ یعنی یہ تو توقع لیے بیٹھے ہیں کہ قیامت ہوئی تو ان کے دیوی دیوتا وہاں ان کا خیر مقدم کریں گے لیکن وہاں ہوگا یہ کہ ان کے یہ سارے دیوی دیوتا جو انھوں نے خدا پر افترا کر کے گھڑے ہیں، سب غائب ہو جائیں گے اور سب کی روبکاری اللہ واحد کے حضور میں ہوگی جو ان کا اور سب کا مولائے حقیقی ہے۔ مولیٰ کا صحیح مفہوم مرجع ہے اور مولائے حق کا لفظ یہاں ان کے ان فرضی معبودوں کے مقابل میں استعمال ہوا ہے جو اللہ پر افترا کر کے گھڑے گئے تھے یعنی ان کے متعلق بالکل جھوٹ دعویٰ کیا گیا کہ خدا نے ان کو اپنا شریک بنا لیا ہے اور یہ ان کے سفارشی ہوں گے۔

قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَن يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَن يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۚ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۚ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ فَذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۖ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ (۳۱-۳۲)

مشرکین کا تضاد فکر

اس آیت کے تمام الفاظ اور فقروں کی تشریح دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے۔ اس کے مختلف ٹکڑوں میں جو ترتیب و تدریج ہے وہ بھی واضح ہے۔ اہل عرب کے متعلق یہ بات بھی ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ وہ کائنات کا خالق و مالک اور مدبر اصلاً اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن ساتھ ہی شرک میں بھی مبتلا تھے۔ وہ جن دیویوں دیوتاؤں کو پوجتے تھے ان کے متعلق ان کا عقیدہ یہ نہیں تھا کہ یہ آسمان و زمین کے خالق ہیں یا ابر و ہوا اور سورج اور چاند کے موجد ہیں یا زندگی اور موت پر متصرف ہیں یا نظام کائنات کا سررشتہ ان کے ہاتھ میں ہے بلکہ صرف یہ مانتے تھے کہ یہ خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں۔ خدا ان کی سنتا ہے۔ جو کام خدا سے کرانا چاہیں کرا سکتے ہیں۔ ان کو اگر راضی رکھا جائے تو یہ خدا سے سفارش کر کے دنیا کی نعمتیں بھی دلواتے ہیں اور اگر بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی ہوا اور حساب کتاب کی نوبت آئی تو اس وقت بھی یہ دستگیری کریں گے اور اپنی بندگی کرنے والوں کو نہ صرف بخشوا لیں گے بلکہ اونچے اونچے درجے دلوائیں گے ـــــ قرآن نے یہاں خدا سے متعلق ان کے انہی اصولی مسلمات کو بنیاد قرار دے کر ان کو متنبہ کیا ہے کہ جب تم ان ساری باتوں کو مانتے ہو تو نہ تمہارے لیے آخرت کے انکار کی گنجائش ہے اور نہ خدا کے شریک ٹھہرانے کا کوئی جواز ہے۔ جب خدا ہی مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو برآمد کرتا ہے اور تمام خلق و تدبیر اسی کے ہاتھ میں ہے تو وہ کسی کا محتاج کب ہے کہ اپنی خدائی میں کسی کو شریک بنائے اور اس کے لیے اس امر میں دشواری کیا ہے کہ وہ سب کو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرے؟ مطلب یہ کہ تمہاری یہ باتیں تمہارے اپنے مسلمات کے خلاف ہیں۔ اس طرح تم اپنے ہی منہ سے اپنے کو جھٹلاتے ہو۔

"اَفَلَا تَتَّقُوْنَ" یعنی جب تم یہ ساری باتیں مانتے ہو تو اس خدا کے قہر و جلال سے ڈرتے نہیں کہ اس کی طرف بے جوڑ باتیں منسوب کر کے اس کی تمام اعلیٰ صفات کی نفی کر دیتے ہو!!

"فَذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمُ الْحَقُّ" "ذٰلِکُمْ" کا اشارہ اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا صفات کی طرف ہے جن کا اہل عرب کو اعتراف بھی تھا اور جو صحیح بھی تھیں۔ ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وہی اللہ جس کے لیے یہ صفتیں مانتے ہو وہی تمہارا رب حقیقی بھی ہے، پھر اس کے علاوہ تم نے دوسرے ارباب کس دلیل سے بنا لیے ہیں، "فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ" یعنی تمہارے مذکورہ بالا اعتراف کا منطقی نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ جس اللہ کے لیے یہ صفتیں مانتے ہو اسی کو تنہا اپنا رب بھی تسلیم کرو، لیکن تم نے کیا یہ ہے کہ ان سب باتوں کو ماننے کے باوجود رب اور بھی بنا لیے ہیں تو حق کے معین ہو چکنے کے بعد اس کے خلاف کوئی بات ماننا صریح ضلالت ہوئی تو تم صحیح قدم اٹھا کر پھر غلط پگڈنڈیوں پر کس طرح مڑ جاتے ہو۔ "تُصْرَفُوْنَ" مجہول کا صیغہ ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جہاں تک عقل اور منطق کا تعلق ہے وہ تو تمہارا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ اب تم خود سوچو کہ تم نے اپنی نکیل کس کے ہاتھ میں دے رکھی ہے جو تم سے یہ ہرزہ گردی کرا رہا ہے۔

اہل عرب کے شرک کی نوعیت

اگرچہ آیات کی یہ تاویل واضح ہے لیکن چونکہ اہل عرب کے عقائد اور ان کے اصنام سے متعلق عام طور پر لوگوں کی معلومات بہت سرسری ہیں اس وجہ سے ممکن ہے بعض لوگوں کو ایک بات کھٹکے، ہم یہاں بالاختصار اس کی طرف اشارہ کر کے اس کی وضاحت کیے دیتے ہیں۔

اوپر اہل عرب کے جو اعترافات نقل ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو نہ صرف خالق و رازق، سمع و بصر کا مالک، زندگی اور موت کا منبع مانتے تھے بلکہ کائنات کا مدبر و منتظم بھی اسی کو تسلیم کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک اہل عرب کے عقائد سے متعلق یہی اصل حقیقت ہے۔ اہل عرب اپنے معبودوں کو کائنات کے نظم و انصرام کا اصل سرچشمہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح ایک بادشاہ اپنے مقربین کو کچھ اختیارات و فرائض سونپ دیتا ہے جو ہوتے تو ہیں تفویض کردہ لیکن غایت تقرب و اعتماد کے سبب سے وہ عملاً مقربین ہی کے حقوق و اختیارات بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کے کچھ اختیارات خاص طور پر، رزق اور اولاد وغیرہ سے متعلق، ان کے مزعومہ شرکاء کو بھی حاصل ہیں۔ قرآن نے جگہ جگہ ان کے اس تصور کی غلطیوں پر تنقید کی ہے جن کی تفصیل ہم نے اپنی کتابوں، حقیقت شرک اور حقیقت توحید، میں کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے زمانے کے مشرکین اور اہل عرب کے مشرکین میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ ہم لوگوں نے محض اپنے شرک کو توحید ثابت کرنے کے لیے اہل عرب کے شرک کو ہوّا بنا رکھا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ع

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۳۳)

"كَذٰلِكَ" کا اشارہ مشرکین کی اسی متضاد و متناقض روش کی طرف ہے جو اوپر مذکور ہوئی اور "کلمۂ رب"

سے مراد وہ سنت الٰہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر فرمائی ہے اور جس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان و ہدایت کی راہ انہی لوگوں پر کھولتا ہے جو اپنے عقل و دل کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جو لوگ عقل و فطرت کو ٹھکرا کر اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ایسے فاسقوں کے اوپر ان کی اختیار کردہ ضلالت ہی کو مسلط کر دیتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں پر بھی ان کی پسندیدہ ضلالت مسلط ہو چکی ہے اور اب یہ ایمان کی طرف آنے والے نہیں ہیں۔ دوسرے مقام میں 'وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ' کے الفاظ میں بھی یہی سنت الٰہی بیان ہوئی ہے ——— یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بطور التفات کے ہے۔ آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ ان لوگوں کی روش سے پریشان نہ ہو۔ یہ سنت الٰہی کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ ایسے لوگوں سے متعلق اتمام حجت کے بعد تمہاری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ قُلِ اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ (۳۴)

مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کی تردید

یہ مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ اگر قیامت ہوئی تو ان کے شرکاء و شفعاء ان کو اللہ کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ ہم مشرکین عرب سے متعلق دوسرے مقامات میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ آخرت کے معاملے میں ان کا موقف صریح اور حتمی انکار کا نہیں تھا بلکہ تذبذب اور تردد کا تھا۔ وہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے معاملے کو بہت مستبعد سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کا گمان یہ تھا کہ اول تو قیامت اور حشر نشر ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو ہمارا لوٹنا تو ہمارے شرکاء اور شفعاء کی طرف ہوگا، وہ ہمارے مددگار اور ہمارے سفارشی ہوں گے اللہ تعالیٰ نے ان کے اسی واہمہ کی بنا پر ان سے سوال کرایا ہے کہ کیا تمہارے مزعومہ شریکوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جس کی نسبت تمہارا دعویٰ ہو کہ اس نے خلق کا آغاز کیا ہے اور وہ اس کا اعادہ بھی کرے گا؟ ایسی ذات تو صرف اللہ کی ہے جس نے خلق کا آغاز کیا اور وہ اس کا اعادہ بھی فرمائے گا تو جب خلق کا اعادہ وہ فرمائے گا تو تمہارا لوٹنا اللہ ہی کی طرف ہوگا یا تمہارے ان فرضی معبودوں کی طرف جن کی نسبت تم خود بھی مانتے ہو کہ ان کا کوئی حصہ نہ ابدائے خلق میں ہے اور نہ اس کے اعادے میں۔ 'فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ' یعنی تم اپنے مسلمے کے موجب کہ جب تم خلق کا ابداء اور اعادہ صرف خدا ہی کی شان سمجھتے ہو تو لازم تھا کہ یہ بھی مانتے کہ جو اٹھائے گا وہی جزا اور سزا بھی دے گا لیکن تم ایک بات صحیح مان کر دوسری بات اس سے بالکل متناقض مان لیتے ہو۔ آخر تمہاری عقل کس طرح اوندھی ہو جاتی ہے!!

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ ۚ قُلِ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ ۗ أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَىٰ ۖ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ (۳۵)

شرکاء کا وجود ہدایت کے پہلو سے

یعنی آخرت کے معاملے میں تو تمہارے ان مزعومہ شرکاء کا وجود یوں بے کار ثابت ہوا کہ نہ ان کا کوئی دخل

خلق کے ابدار میں ہے نہ اعادے میں۔ اب سوچو کہ اس دنیا میں تمھیں ان سے کیا فیض پہنچتا ہے؟ مخلوق کی ایک بہت بڑی ضرورت خالق سے یہ وابستہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں رہنمائی فرماتا ہے کہ کیا حق ہے اور کیا باطل، کیا تم کہہ سکتے ہو کہ تمھارے ان معبودوں سے تمھیں اس طرح کی کوئی رہنمائی حاصل ہوتی ہے؟ کیا عقل جو تمھارے اندر رہنمائی کا چراغ ہے، یہ ان کی بخشی ہوئی تمھیں ملی ہے؟ کیا یہ تمھاری ہدایت کے لیے کوئی وحی بھیجتے ہیں۔ کیا انھوں نے تمھاری تربیت و تزکیہ کے لیے کوئی کتاب اتاری، کوئی رسول بھیجا، کوئی شریعت نازل کی؟ کوئی قانون اتارا؟ اگر ان کاموں میں کوئی کام بھی انھوں نے نہیں کیا، نہ کرتے ہیں نہ کریں گے تو آخر کس غرض کے لیے ان کے پیچھے لگے ہو؟ پیروی کا سزاوار وہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اس کی توفیق بخشتا ہے یا وہ جو خود رہنمائی اور دستگیری کے محتاج ہیں؟ تمھاری عقل کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے الٹے فیصلے کرتے ہو۔

'ہدایت' کا صلہ آیت میں 'الیٰ' کے ساتھ بھی آیا ہے اور 'لِ' کے ساتھ بھی۔ ہمارے نزدیک دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ جب 'الیٰ' آتا ہے تو اس سے مقصود صرف کسی چیز کی طرف رہنمائی کر دینا ہوتا ہے لیکن جب 'لِ' آتا ہے تو اس کے اندر رہنمائی کے ساتھ توفیق ہدایت کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ 'یَہِدِّیْ' دراصل 'یَھْتَدِیْ' ہے جو بقاعدۂ ادغام 'یَھِدِّیْ' ہو گیا ہے۔

وَمَا یَتَّبِعُ اَکْثَرُھُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ (۳۶)

محض گمان کی پیروی — لفظ 'ظن' 'علم' 'یقین' اور 'حق' تینوں کے ضد کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ علم ثابت و صحیح اور حق واضح و معروف کے بجائے محض اپنے گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور ظاہر ہے محض اٹکل کے تیر تکے حقیقت سے بے نیاز نہیں کر سکتے، حقیقت جب سامنے آئے گی تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے اپنی عمارت بالکل ریت پر بنائی۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ میں ان کے لیے دھمکی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ حقیقت سے آنکھیں بند کر کے یہ جو کر رہے ہیں کریں۔ وقت آرہا ہے جب اللہ تعالیٰ سب کچھ ان کے سامنے رکھ دے گا۔ یہ ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہ حال ان کی اکثریت کا بیان کیا ہے، سب کا حال یہی نہیں تھا بلکہ ان میں کچھ سوچنے سمجھنے والے بھی تھے جن کا ذکر آگے آیات ۴۲-۴۳ میں آرہا ہے۔

۸- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۷-۷۰

یاد ہوگا، بات کفار کے اس مطالبہ سے چلی تھی کہ یا تو اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ایسی ترمیم کر دو کہ ہمارے لیے وہ قابل قبول ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے کے بجائے قرآن کی ان باتوں کو مزید واضح اور مدلل کر دیا جن سے وہ چڑتے تھے۔ اب آگے اسی مضمون کو ایک نئے پہلو سے لیا اور قرآن کا کتاب الٰہی ہونا بھی ثابت کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو تسلی بھی دی اور

قرآن کے دعاوی کو مزید مبرہن کر دیا۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ آیات
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ ۳۷ - ۴۰
الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٧﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا
مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٣٨﴾ بَلْ كَذَّبُوْا
بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣٩﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ
بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٤٠﴾ وَاِنْ ع ۴ ۱۰ ۹
كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْۗـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَ
اَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٤١﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ
تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ
تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿٤٣﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ
شَيْـــًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٤٤﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ
لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ
الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰي
مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٤٦﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ
بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٤٨﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا

شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ
سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا
اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ
بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا
عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ
اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَلَوْ ع ۵ ۱۲
اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ
لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾
اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ
وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ
فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ
اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا
يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا ع ۶ ۱۱
تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا

يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ أَصْغَرَ
مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ ﴿۶۱﴾ أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۶۳﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُوَ
وقف لازم　الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۶۴﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا ۚ هُوَ
السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۶۵﴾ أَلَآ إِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ ۗ
وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ۚ إِنْ يَّتَّبِعُونَ إِلَّا
الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ
لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُونَ ﴿۶۷﴾
قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۖ هُوَ الْغَنِيُّ ۖ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ۚ أَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۶۸﴾ قُلْ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا
يُفْلِحُونَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيقُهُمُ
ع ۱۰ ۱۲　الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۷۰﴾

ترجمۂ آیات ۳۷-۷۰

اور یہ قرآن ایسی چیز نہیں ہے جو اللہ سے پرے پرے ہی گھڑ لیا گیا ہو بلکہ یہ تصدیق ہے ان پیشین گوئیوں کی جو اس کے پہلے سے موجود ہیں اور کتاب کی تفصیل ہے۔ اس کے خداوند عالم کی طرف سے ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو اس نے گھڑ لیا ہے؟ ان سے کہو تو تم لاؤ اس کے مانند کوئی سورہ اور بلا لو اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکو،

اگر تم سچے ہو۔ بلکہ یہ لوگ اس چیز کو جھٹلا رہے ہیں جو ان کے علم کے احاطے میں نہیں آئی اور جس کی حقیقت ابھی ان کے سامنے ظاہر نہیں ہوئی۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو ان سے پہلے گزرے تو دیکھو ظالموں کا انجام کیا ہوا! ۳۸-۳۹

اور ان میں ایسے بھی ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو ایمان نہیں لاتے اور تیرا رب مفسدوں سے خوب واقف ہے اور اگر وہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو کہہ دو میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل، تم بری ہو میرے عمل کی ذمہ داری سے اور میں بری ہوں تمھارے عمل کی ذمہ داریوں سے۔ اور ان میں وہ بھی ہیں جو تمھاری بات پر کان دھرتے ہیں تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے اگرچہ وہ کچھ سمجھتے بوجھتے نہ ہوں؟ اور ان میں ایسے بھی ہیں جو تمھاری طرف نظر کرتے ہیں تو اب کیا تم اندھوں کو راہ دکھاؤ گے اگرچہ وہ دیکھ نہ رہے ہوں؟ اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ ۴۰-۴۴

اور جس دن اللہ ان کو اکٹھا کرے گا اس دن وہ محسوس کریں گے کہ گویا بس وہ دن کی ایک گھڑی رہے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔ نامراد ہوئے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہدایت حاصل کرنے والے نہ بنے۔ یا ہم تم کو اس کا کوئی حصہ دکھا دیں گے جس کا ان سے وعدہ کر رہے ہیں یا تمھیں وفات دیں گے پس ان کی واپسی ہماری طرف ہوگی، پھر اللہ گواہ ہے اس چیز پر جو وہ کر رہے ہیں اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے تو جب ان کا رسول آجاتا ہے ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔ کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے معاملے میں بھی کسی نقصان اور نفع پر کوئی اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے۔ ہر امت کے لیے ایک وقت

مقرر ہے۔ جب ان کا وقت آجاتا ہے تو پھر نہ ایک گھڑی پیچھے ہوتے نہ آگے۔ ان سے کہو کہ بتاؤ کہ اگر اللہ کا عذاب تم پر رات میں آدھمکے یا دن میں تو کیا چیز ہے جس کے بل پر مجرمین جلدی مچائے ہوئے ہیں! پھر کیا جب آہی دھمکے گا تب اس کو مانو گے! اب ملنے، اسی کی تم جلدی مچائے ہوئے تھے!! پھر ان ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کا عذاب چکھو۔ یہ تمھاری اپنی کمائی کا تمھیں بدلہ مل رہا ہے۔ ۴۵-۵۲

اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات واقعی ہے؟ کہہ دو کہ ہاں میرے رب کی قسم یہ شدنی ہے اور تم قابو سے باہر نہیں نکل سکو گے۔ اور ہر جان جس نے ظلم کا ارتکاب کیا، اگر اس کو مل جائے وہ سب کچھ جو زمین میں ہے تو وہ اس کو فدیہ میں دے دینا چاہے گی اور وہ پشیمان ہوں گے جب عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ سن رکھو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔ سن رکھو کہ اللہ کا وعدہ شدنی ہے، لیکن ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۵۲-۵۶

اے لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے نصیحت، سینوں کے امراض کی شفا اور اہل ایمان کے لیے ہدایت و رحمت آگئی ہے۔ کہہ دو کہ یہ اللہ کے فضل و رحمت کا کرشمہ ہے تو چاہیے کہ اس پر شادماں ہوں، یہ اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کر رہے ہیں۔ ۵۷-۵۸

ان سے کہو، بتاؤ اللہ نے تمھارے لیے جو رزق اتارا تو تم نے اس میں سے کچھ کو حرام ٹھہرایا اور کچھ کو حلال۔ پوچھو، کیا اللہ نے تم کو اس کا حکم دیا یا تم اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہو؟ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہیں ان کا قیامت کے دن کیا گمان ہے؟ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے

لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے ۔ ۵۹ ۔ ۶۰

اور تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور کتاب میں سے جو حصہ بھی سنا رہے ہوتے ہو اور تم لوگ جو کام بھی کرتے ہو تو ہم جس وقت تم اس میں مشغول ہوتے ہو، تمھارے پاس موجود ہوتے ہیں اور تیرے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں، نہ زمین میں نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ سن لو کہ اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے۔ ان کے لیے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور تم کو ان کی بات غم میں نہ ڈالے۔ عزت تمام اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ سمیع و علیم ہے ۔ ۶۱ ۔ ۶۵

سن رکھو کہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب اللہ ہی کے ہیں اور جو لوگ اللہ کے ماسوا کو پکارتے ہیں یہ شریکوں کی پیروی نہیں کر رہے بلکہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں۔ وہی ہے جس نے رات کو تمھارے لیے پرسکون بنایا تاکہ تم اس میں آرام کرو۔ اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں معاش کے لیے جد و جہد کرو۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو بات کو سنتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہے۔ وہ ایسی باتوں سے پاک ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ تمھارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیا تم اللہ پر وہ بات لگاتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے؟ کہہ دو، جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ ان کے لیے بس دنیا میں چند روزہ فائدہ اٹھا لینا ہے۔ پھر ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہوگی، پھر ہم ان کے کفر کی پاداش میں ان کو سخت عذاب چکھائیں گے ۔ ۶۶ ۔ ۷۰

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ (۳۷ - ۳۹)

قرآن سابق پیشین گوئیوں کی تصدیق ہے

'وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ ...... الاٰیۃ' آیت ۱۵ میں قرآن کی صداقت کی دلیل حامل قرآن کے کردار کے پہلو سے پیش کی گئی تھی، اس کے بعد کلام کا رخ قرآن کے ان دعاوی کے اثبات کی طرف مڑ گیا تھا جو خاص طور پر مخالفین کی وحشت کا باعث تھے اور جن کی ترمیم یا تنسیخ کا وہ مطالبہ کر رہے تھے۔ اب پھر وہی بات ایک نئے پہلو سے سامنے آگئی۔ فرمایا کہ قرآن کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو خدا سے پرے ہی پرے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر دی گئی ہو بلکہ یہ ان پیشین گوئیوں کی تصدیق ہے جو اس کے باب میں پہلے سے آسمانی صحیفوں میں موجود ہیں۔ ان پیشین گوئیوں کا حوالہ ہم بقرہ اور آل عمران کی تفسیر میں نقل کر چکے ہیں۔

'تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ' میں 'کتاب' سے مراد ہمارے نزدیک تورات ہے۔ قرآن نے تورات کی ان پیشین گوئیوں کی بھی جو مجمل و مبہم صورت میں اپنے محمل و مصداق کی منتظر تھیں اور اس دین کی بھی توضیح و تکمیل کی جس کی توضیح و تکمیل کا کام آخری بعثت پر اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہ بات بھی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'الکتاب' کا لفظ تمام صحائف تورات کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے یہاں تک کہ انجیل بھی اس میں شامل ہے۔ بعض مرتبہ اجزا کے اعتبار سے لفظ 'کُتُب' استعمال ہوتا ہے بعض مرتبہ مجموعہ کو پیش نظر رکھ کر 'الکتاب'۔ نزول قرآن سے پہلے 'الکتب' کی حیثیت تورات ہی کو حاصل رہی ہے۔ بقیہ تمام صحائف کی حیثیت اس کے اجزا اور ابواب و فصول کی تھی۔

'لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ' کا مفہوم، جیسا کہ ہم بقرہ کی دوسری ہی آیت کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں یہ ہے کہ اس کے خداوند عالم کی طرف سے ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

قرآن کی عام تحدی

'اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ...... الاٰیۃ' یعنی اگر منکرین یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود تصنیف کر کے جھوٹ موٹ اس کو خدا کی طرف نسبت دے دی ہے تو ان سے کہو کہ پھر تو تمہارے لیے اس کا توڑ بہت آسان ہے، تم اس کی مانند ایک ہی سورہ بنا کر پیش کر دو اور اس کام میں ان سب کا تعاون بھی حاصل کر لو جن کا تعاون تم اپنے شاعروں، ادیبوں، ساحروں، کاہنوں، جنوں، شیطانوں اور اپنے ان معبودوں میں سے حاصل کر سکتے ہو جن کو تم خدا کا شریک سمجھتے ہو۔ اگر تم اپنے اس گمان میں سچے ہو تو ان سب کو اس کام کے لیے بلاؤ۔ آخر اس سے زیادہ نازک موقع ان کی مدد حاصل کرنے اور ان کی مدد کے لیے اٹھنے کا اب کب آئے گا جب کہ تمہارے دین آبائی کے ساتھ ساتھ ان کی خدائی بھی معرض خطر میں ہے۔

تکذیب قرآن کی اصل وجہ

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ ...... الایۃ: یہ اصل وجہ تکذیب کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کی مخالفت میں یہ جو کچھ کہتے ہیں یہ سب تو اوپر کی باتیں ہیں۔ اصل وجہ تکذیب یہ ہے کہ قرآن ان کو رسول کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب کی اس دنیا میں اور پھر اس کے بعد آخرت میں خبر دے رہا ہے وہ ان کے علم کی گرفت میں نہیں آرہی ہے اس لیے کہ اس کی حقیقت ان کے سامنے ابھی ظاہر نہیں ہوئی۔ یہ اس کو ماننے سے پہلے سر کی آنکھوں سے اس کی حقیقت دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس عذاب کا کوئی نمونہ یا اصل عذاب ہی آجائے تب وہ مان جائیں گے کہ قرآن سچی خبر دے رہا ہے اور یہ خدائی کتاب ہے۔ فرمایا کہ یہ بعینہٖ وہی روش ہے جو ان سے پہلے رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں نے اختیار کی تو جو انجام ان کا ہوا وہی انجام ان کا بھی ہونے والا ہے۔ لفظ 'تاویل' پر آل عمران کی تفسیر میں ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہاں یہ کسی خبر کے واقعاتی مصداق کے مفہوم میں ہے۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يُؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُمْ مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهِ ۚ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ ۝ وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ لِي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۖ أَنْتُمْ بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ ۝ وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۴۰-۴۴)

مکذبین کو مہلت دینے کی وجہ

وَمِنْهُمْ مَنْ يُؤْمِنُ بِهِ ...... الایۃ: یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور مکذبین قرآن کے لیے دھمکی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کے اندر سے ایسے لوگ نکل رہے ہیں جو قرآن پر ایمان لا رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ ان کے اندر کچھ ذی صلاحیت بھی ہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو اس حد تک بلو لیا جائے کہ ان کے اندر جتنا مکھن ہے وہ نکل آئے، صرف چھاچھ ہی رہ جائے۔ اسی حکمت کے تحت ان کے مطالبۂ عذاب کے باوجود ان کو مہلت دی جا رہی ہے کہ جو مفسدین ہیں وہ چھٹ کر بالکل سامنے آجائیں۔ تیرا رب ان سے خوب واقف ہے، ان کو وہ ان کی شرارتوں کا مزہ چکھائے گا۔

مکذبین سے اعلانِ براءت

وَإِنْ كَذَّبُوكَ ...... الایۃ: یہ ان مکذبین سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلانِ براءت کی ہدایت ہے کہ جو کسی طرح کوئی بات سننے سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے تھے۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ میں اپنے عمل کا ذمہ دار ہوں، تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو، تم میرے عمل کی ذمہ داری سے بری ہو اور میں تمہارے اعمال کی ذمہ داریوں سے بری ہوں۔ رسول کی طرف سے یہ اعلانِ براءت، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس کے جھٹلانے والوں کے لیے عذاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ رسول جب تک اپنی قوم کے اندر رہتا ہے وہ اس کے لیے امان اور سپر ہوتا ہے، جب وہ ان سے اعلانِ براءت کر دیتا ہے تو یہ امان جو اس کی بدولت قوم کو حاصل ہوتی ہے اٹھ جاتی ہے اور جب امان اٹھ گئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد عذاب ہر

وقت متوقع ہے۔ اسی وجہ سے رسول کی زبان سے براءت کا کلمہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ اس کی قوم کی زندگی میں یہی وقت سب سے زیادہ نازک وقت ہوتا ہے۔

آنحضرت صلعم کے لیے تسکین و تسلی — وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُوْنَ ..... الاٰیۃ۔ یہ بھی آیت ۴۰ ہی کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی ہے کہ تمہارے اطمینان کے لیے یہ چیز کافی ہونی چاہیے کہ ان کے اندر جو سننے سمجھنے اور فہم و بصیرت رکھنے والے لوگ ہیں وہ تمہاری بات پر کان دھرتے اور تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنی شامت اعمال سے گونگے بہرے اور اندھے بن چکے ہیں، وہ تو سننے سمجھنے سے رہے۔ اگر تمہارے دل کے اندر یہ ارمان ہے کہ یہ بھی تمہاری باتیں سنیں اور مانیں تو یہ ہونے سے رہا۔ ایمان و ہدایت کے باب میں اللہ کی جو سنت ہے وہ تبدیل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہدایت انہی کو بخشتا ہے جو اس کی عطا کی ہوئی صلاحیتوں کو زندہ رکھتے اور ان سے کام لیتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ..... الاٰیۃ۔ یہ بعینہٖ اوپر والی آیت کا مضمون ذرا مختلف اسلوب میں بیان ہوا ہے۔

ایک استدراک — اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ ..... الاٰیۃ یہ اوپر والی بات پر ایک قسم کا استدراک ہے۔ بادی النظر میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ آخر بہت سے لوگوں کا حال یہ کیوں ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے اندھے بہرے ہو جاتے ہیں کہ بالآخر وہ خدا کے ابدی عذاب کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اللہ نے ان پر کوئی ظلم کیا ہے، اللہ ذرا بھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ اللہ نے انسان کو بہترین صلاحیتوں سے مسلح کیا ہے۔ اگر وہ ان سے کام لے تو نبیوں اور رسولوں کی بات اس کو اپنے دل کی آواز معلوم ہو گی لیکن لوگ اپنی خواہشات کی پیروی میں اندھے بہرے بن جاتے ہیں جس کے سبب سے ان کو ہر صدائے حق اجنبی معلوم ہونے لگتی ہے اور وہ اس کو قبول کرنے کی بجائے اس سے بدکنے لگتے ہیں۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُھُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰي مَا يَفْعَلُوْنَ (۴۵-۴۶)

مکذبین کی جلد بازی کا جواب — یہ آخرت اور عذاب کے جھٹلانے والوں کی جلد بازی کا جواب ہے۔ فرمایا کہ آج تو ان کو آخرت بہت بعید معلوم ہوتی ہے لیکن جس دن وہ اکٹھا کیے جائیں گے اس دن ان کا احساس اس دنیا کی زندگی کے متعلق یہ ہو گا کہ گویا وہ اس میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ وہ ایک دوسرے کو اس طرح پہچانتے ہوں گے گویا ان کی ملاقات صبح و شام کا قصہ ہے۔ ہر بات ذہن میں اس طرح تازہ ہو گی گویا اس پر کوئی زمانہ گزرا ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ اصل شے تو وہ احساس ہے جو اس دنیا کی زندگی سے متعلق روز آخرت میں طاری

ہوگا تو انسان کی محرومی و نامرادی ہی ہے کہ وہ اس دنیا کی زندگی کو بہت طویل سمجھ کر آخرت سے بے پروا ہو بیٹھے اور جب اسے اس سے ڈرایا جائے تو یہ مطالبہ شروع کر دے کہ اگر وہ آنی ہے تو آ کیوں نہیں جاتی۔

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ .... الاٰیۃ خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس عذاب سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے اور یہ اس کے مؤخر ہونے کے سبب سے اس کو خالی خولی دھمکی سمجھ رہے ہیں اور تمھیں زچ کرنے کے لیے اس کی جلدی مچائے ہوئے ہیں، اگر حکمت الٰہی مقتضی ہوئی تو تمھاری زندگی ہی میں ان کو اس کا کچھ حصہ دکھا دیا جائے گا ورنہ اللہ تعالیٰ تمھیں وفات دے گا اور ان کی واپسی ہماری طرف ہوگی پھر اللہ ان کا سارا کچا چٹھا ان کے سامنے رکھ دے گا۔

قریش پر فیصلہ کن عذاب نہ آنے کی وجہ

یہاں اللہ تعالیٰ کی وہ سنت پیش نظر ہے جس کا حوالہ ہم دوسرے مقام میں دے چکے ہیں کہ اگر کسی رسول کی قوم نے بحیثیت مجموعی اس کی تکذیب کر کے اس کے قتل کا ارادہ کر لیا ہے تب تو اللہ تعالیٰ نے رسول اور اس کے ساتھیوں کو الگ کر کے قوم کو اپنے کسی عذاب کے ذریعہ سے تباہ کر دیا ہے اور اگر قوم کے اندر معتد بہ تعداد ایمان والوں کی بھی نکلی ہے تو اس قوم پر اس دنیا میں کوئی فیصلہ کن عذاب بھیجنے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اس کے مکذبین کا معاملہ آخرت کے عذاب پر اٹھا رکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کا بڑا حصہ چونکہ ایمان لایا اس وجہ سے اس پر اس طرح کا کوئی فیصلہ کن عذاب نہیں آیا جیسا کہ عاد و ثمود وغیرہ قوموں پر آیا بلکہ آپ کے مکذبین اہل ایمان کے ساتھ تصادم میں ختم ہو گئے اور آخرت میں ان کو اپنی جوابدہی خدا کی عدالت میں کرنی ہے۔ آیت میں اسی سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (٤٧)

رسول کی تکذیب کے باب میں سنت الٰہی

یہ قریش کو انذار ہے اس سنت الٰہی کی روشنی میں جس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حجت تمام کرنے کے لیے ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے، یہ رسول خدا کی عدالت بن کر آئے اور ان کے ذریعے سے اس قوم کے درمیان حق و باطل کا فیصلہ کر دیا گیا، جو لوگ رسول پر ایمان لائے ان کو نجات و فلاح حاصل ہوئی اور جو لوگ اس کی تکذیب پر اڑے رہ گئے ان کی جڑ کاٹ دی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہی مرحلہ قریش کے لیے بھی درپیش ہے۔ ان کے لیے بھی خدا کی میزان عدل نصب ہو چکی ہے اور اتمام حجت کے لیے خدا کا رسول آ چکا ہے۔ اگر انھوں نے تکذیب کر دی تو وہ بھی لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی ان کی پیشرو قومیں دوچار ہو چکی ہیں۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس معاملے میں خدا کی طرف سے کوئی بات عدل و انصاف کے خلاف نہیں ہوتی۔ خدا کا رسول ہر پہلو سے لوگوں پر اتمام حجت کر دیتا ہے اور لوگوں کو سوچنے سمجھنے، جانچنے اور دیکھنے کے لیے جتنا موقع ملنا چاہیے اتنا موقع بھی دیا جاتا ہے۔ یہ سارے جتن کرنے کے بعد بھی جو لوگ اپنی ضد پر اڑے ہی رہ جاتے ہیں بالآخر ان کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے ——— یہاں وہ فرق ملحوظ رہے جو نبی اور رسول کے

درمیان ہم متعدد مقامات میں واضح کر چکے ہیں۔ یہ سنت الٰہی رسولوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ انبیاء کے لیے اس کا ظہور ضروری نہیں ہے۔

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ہ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ط اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ (۴۸ - ۴۹)

جلد باز دں کو جواب — یعنی جب ان کو اس حقیقت نفس الامری سے آگاہ کیا جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ متنبہ ہوں اور خطرے سے بچنے کی راہ اختیار کریں اسس کا مذاق اڑاتے ہیں، پیغمبرؐ اور اس کے ساتھیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم اپنی اس بات میں سچے ہو تو آخر تمھاری یہ دھمکی واقعہ کی صورت میں کیوں نہیں ظاہر ہوتی؟ تم کب سے یہی رٹ لگائے ہوئے ہو، آخر یہ چیز کب واقع ہوگی؟ فرمایا کہ ان کو جواب دے دو کہ یہ خدا کی بات تھی جو میں نے تمھیں سنا دی۔ رہا یہ امر کہ یہ بات کب واقع ہوگی تو نہ میں غیب جانتا اور نہ خود اپنے معاملے میں کسی نقصان یا نفع پر اختیار رکھتا ہوں۔ یہ چیز تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے جب اس کی حکمت کا تقاضا ہوگا یہ ظاہر ہوگی اور جب ظاہر ہوگی تو کوئی اس کو دفع نہ کر سکے گا۔

ہلاکت کے لیے وقت مقرر ہے — 'لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ..... الایۃ' یہ اسی سوال کا اصولی جواب ہے کہ ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جب وہ وقت آجائے گا تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہوں گے نہ آگے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ قوموں کی ہلاکت کی اَجَل اخلاقی پیمانہ سے ناپ کر اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر قوم کو ڈھیل دیتا ہے یہاں تک کہ جب اس کا طغیان اس حد کو پہنچ جاتا ہے جو ہلاکت کے لیے مقرر ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کا بیڑا غرق کر دیتا ہے اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوتی کہ کب سوئی اپنے آخری نشان پر پہنچی۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا یَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ہ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ط آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ہ ثُمَّ قِیْلَ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ج هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (۵۰ - ۵۲)

جلد بازوں سے ایک سوال — ان کے سوال 'مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ' کا جواب تو اوپر کی آیات میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دلوا دیا لیکن ساتھ ہی ان کے سوال کے مقابل میں ایک سوال ان سے بھی کر دیا کہ ان سے پوچھو کہ اس طنطنہ سے جو خدا کے عذاب سے متعلق سوال کر رہے ہو تو آخر کس بل بوتے پر کر رہے ہو؟ اس کا عذاب چاہے رات کی تاریکی میں چپ چپاتے آجائے یا پورے دن کی روشنی میں ڈنکے کی چوٹ آدھمکے آخر ان مجرمین نے اس کے مقابلے کے لیے کیا سامان دفاع تیار کر رکھا ہے؟ یہاں 'مجرمون' کے لفظ میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ جو لوگ جرم سے بری ہیں اگر وہ اس طرح کا سوال کرتے تو اس کے لیے تو ایک جواز ہو سکتا تھا لیکن جو لوگ مجرم ہیں اور جن کے جرم ہی کی پاداش میں یہ برق خاطف گرنے والی ہے ان کی یہ ڈھٹائی

ان کی بدبختی اور شامت کے سوا اور کس چیز کی دلیل ہے!

'اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنۡتُمۡ بِہٖ' یعنی کیا اس لیے جلدی مچائے ہوئے ہو کہ جب وہ آجائے گا تب اس پر ایمان لاؤ گے کہ پیغمبر نے سچی خبر دی تھی اور وہ سچے تھے؟ لیکن اس وقت کا ایمان کیا نفع دے گا؟ اس وقت ایمان لائے تو تم سے کہا جائے گا 'آٰلۡـٰٔنَ وَقَدۡ کُنۡتُمۡ بِہٖ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ' کہ اب مانے حالانکہ یہی چیز ہے جس کے لیے تم اپنی رعونت کے سبب سے جلدی مچائے ہوئے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ محض بھبکی ہے۔

'ثُمَّ قِیۡلَ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا' یعنی مذکورہ عذاب عاجل کے بعد جب عذاب آخرت کا مرحلہ آئے گا تو ان ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب دائمی عذاب چکھو، یہ تمھاری اپنی ہی کرتوتوں کا ثمرہ ہے۔ یہاں ان لوگوں کو 'ظالم' اس وجہ سے کہا گیا کہ انھوں نے اپنے لیے یہ پس بھری فصل خود کاشت کی۔ خدا ان کے اوپر، جیسا کہ اوپر آیت ۴۴ میں ہے، کوئی ظلم نہیں کرے گا۔

وَیَسۡتَنۡۢبِـُٔوۡنَکَ اَحَقٌّ ہُوَ ؕ قُلۡ اِیۡ وَ رَبِّیۡۤ اِنَّہٗ لَحَقٌّ ؕ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ ﴿۵۳﴾ وَ لَوۡ اَنَّ لِکُلِّ نَفۡسٍ ظَلَمَتۡ مَا فِی الۡاَرۡضِ لَافۡتَدَتۡ بِہٖ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَۃَ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ ۚ وَ قُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡقِسۡطِ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۵۴﴾ (۵۳-۵۴)

عذاب کا مذاق اڑانے والوں کو جواب

'وَیَسۡتَنۡۢبِـُٔوۡنَکَ اَحَقٌّ ہُوَ' اوپر آیت ۴۸ میں کفار کا سوال 'مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ' نقل ہوا ہے یہ سوال بھی اسی نوعیت کا ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ اس میں انکار و استہزا کا پہلو ذرا مخفی ہے، اس میں وہ کھل کر سامنے آگیا ہے۔ سوال کرنے والوں کے مزاج مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ذرا رکھ رکھاؤ کے انداز میں اپنے دل کی بات کہتے ہیں۔ بعض منہ پھٹ ہوتے ہیں جو اپنی بات پھینک مارتے ہیں۔ اسی قسم کے لاابالیوں کی زبان سے یہ سوال نقل ہوا ہے کہ یہ پیغمبر سے پوچھتے ہیں کہ یہ جو عذاب اور جزا و سزا کی باتیں سنا رہے ہو یہ حقیقت ہے یا یوں ہی محض دھونس جمانے کے لیے ڈینگیں مار رہے ہو؟

'قُلۡ اِیۡ وَ رَبِّیۡۤ اِنَّہٗ لَحَقٌّ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ'۔ 'اِیۡ' حرف جواب ہے 'نَعَمۡ' کے معنی میں اور یہ صرف قسم سے پہلے آتا ہے۔ سوال کرنے والوں کی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر صرف سادہ جواب ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ قسم کے ساتھ جواب دیا کہ یہ چیز شدنی ہے اور ساتھ ہی 'وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ' کے الفاظ سے ان کی رعونت پر بھی ضرب کاری لگا دی کہ جب یہ چیز ظاہر ہوگی تو تم میرے رب کی گرفت سے بچ کے نکل نہ سکو گے۔

'وَ لَوۡ اَنَّ لِکُلِّ نَفۡسٍ ظَلَمَتۡ ...... الایۃ' یعنی آج تو بڑی رعونت سے تم اس کا مذاق اڑا رہے ہو۔ لیکن جب یہ چیز سامنے آئے گی تو ہر جان، جس نے اس دن سے غفلت برت کر اپنے اوپر ظلم ڈھایا ہوگا، اس کا حال یہ ہوگا کہ اگر زمین کی ساری دولت بھی اس کو ہاتھ آجائے اور اس کو فدیہ میں دے کر اس دن کی ہولناکی سے نجات پانا ممکن ہو تو وہ اس کو فدیہ میں دے کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرے گی۔ 'وَ اَسَرُّوا النَّدَامَۃَ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ' میں وہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے جو سورۂ انعام آیت ۳۱ میں بیان ہوئی ہے 'حَتّٰۤی اِذَا

جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا (یہاں تک کہ جب وہ گھڑی ان پر آدھمکے گی وہ کہیں گے ہائے افسوس اس کوتاہی پر جو اس معاملے میں ہم نے کی) چونکہ ندامت اور افسوس کا منبع انسان کا باطن ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے لفظ 'اسرّ' استعمال ہوا ہے جس طرح 'ابطن العداوۃ' کا محاورہ عربی میں معروف ہے۔ مقصود یہی بتانا ہے کہ آج تو یہ مذاق اڑا رہے ہیں لیکن کل وہ اپنی اس نالائقی پر نادم اور پشیمان ہوں گے وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ یعنی ان کے درمیان پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا، جو کچھ انھوں نے کمایا ہوگا وہی ان کے سامنے آئے گا۔ ان کے اوپر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ اس میں ایک اشارہ اس بات کی طرف بھی ہوگیا کہ انھوں نے اپنے مزعومہ شرکاء اور شفعاء سے جو امیدیں باندھ رکھی ہیں وہ سب بے حقیقت ثابت ہوں گی۔ کوئی چیز خدا کے انصاف پر اثر انداز نہ ہو سکے گی۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۵۵-۵۶)

یہ توحید کے مضمون سے اوپر کے مضمون کو مزید مؤکد کیا ہے اور 'اَلَآ' کے لفظ سے پوری طرح متنبہ بھی فرما دیا ہے کہ کان کھول کر اچھی طرح سن لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے، کسی کی بھی اس میں شرکت اور حصہ داری نہیں ہے۔ اس کا ہر وعدہ اور اس کی ہر وعید ایک امر واقعی اور شدنی ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ اس کا معاملہ اس کے مزعومہ شرکاء اور شفعاء سے متعلق ہوگا تو وہ اس خیال خام کی اصلاح کر لے، جن کو زندہ کرنے میں کوئی دخل نہیں، جن کو موت کے معاملے میں کوئی اختیار نہیں آخر وہ آخرت میں مولیٰ و مرجع کس طرح بن جائیں گے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ مجرد خبر کا جملہ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر افسوس اور حسرت کا مضمون مضمر ہے یعنی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ کا ہر وعدہ اور اس کی ہر وعید شدنی ہے اور اس وقت خدا کے آگے کسی کی بھی کچھ پیش نہیں جائے گی لیکن افسوس ہے کہ اکثر لوگ اس عظیم حقیقت سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ڏ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۵۷-۵۸)

قرآن کی چار صفتیں

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ...... الاٰیۃ' اوپر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے یہ سلسلۂ کلام آیت ۳۷ میں کفار کے اس خیال کی تردید سے چلا تھا کہ یہ قرآن کوئی من گھڑت چیز ہے۔ اس کے بعد کلام کا رخ ان باتوں کو ثابت کرنے کی طرف مڑ گیا تھا جو مخالفین کے ذہنوں میں الجھن پیدا کیے ہوئے تھیں اور جن کو نہ ماننے کی خواہش کے تحت وہ قرآن اور پیغمبر کی تکذیب کر رہے تھے۔ اب پھر بطور التفات قرآن کی قدر و قیمت واضح کر دی گئی کہ کتنی بڑی نعمت ہے جو لوگوں کو محض اللہ کے فضل سے حاصل ہوئی ہے، لیکن بدقسمت لوگ اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں۔ یہاں قرآن کی چار صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ تمھارے رب کی جانب سے موعظت ہے۔

یعنی جن خطرات و مہالک سے لوگوں کو بچنا چاہیے ان سے آگاہی اور جو لوگ آنکھ بند کیے ان کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں ان کو زجر و تنبیہ۔ دوسری یہ 'شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ' ہے یعنی دلوں کو جو روگ لگتے ہیں اور جن کے سبب سے انسان تمام انسانی اوصاف کھو کر مختوم القلب اور حیوانات سے بدترین بن جاتا ہے ان سب کا اس میں علاج ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن میں دل ہی کو تمام حکمت و بصیرت اور تمام عزائم و اعمال کا مرکز اور حقیقی زندگی کا منبع قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کے نزدیک زندہ صرف وہی لوگ ہیں جن کے دل زندہ ہیں، جن کے دل زندہ نہیں ہیں وہ مردہ ہیں۔ تیسری اور چوتھی یہ کہ یہ ہدایت و رحمت ہے۔ ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ یہ دونوں صفتیں آغاز و انجام دونوں پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ اس دنیا میں قرآن ہدایت ہے اور جو لوگ اس ہدایت کو قبول کر لیں گے ان کے لیے آخرت میں ابدی رحمت کی ضمانت ہے۔

'قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ ..... الایۃ' میرے نزدیک آیت میں فعل محذوف ہے یعنی قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ جَآءَ یہ قرآن اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کو لے کر نازل ہوا ہے 'فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا' تو جن کو خوش ہونا ہے وہ اس فضل و رحمت کو اختیار کریں اور اس پر خوش ہوں 'هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ' یہ ان خزف ریزوں سے کہیں بڑھ کر ہے جن کو دنیا کے پرستار جمع کر رہے ہیں اور جن کے عشق میں ایسے اندھے ہوئے ہیں کہ ابدی قدر و قیمت کے یہ جواہرات ان کو نظر نہیں آ رہے ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ (۵۹-۶۰)

اپنے جی کے تحریم و تحلیل اللہ پر افترا ہے

'قُلْ اَرَءَيْتُمْ ..... الایۃ' اوپر والی آیت میں قرآن کا ذکر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بطور التفات آ گیا تھا۔ اس کے بعد توحید اور قیامت کا وہی سلسلۂ بیان پھر لوٹ آیا جو قرآن اور پیغمبر کی صداقت ثابت کرنے کے لیے شروع سے چلا آ رہا ہے۔ فرمایا کہ ذرا تم اپنی اس عجیب و غریب حرکت پر غور کرو کہ رزق اتارا تو اللہ نے لیکن اس میں سے حرام اور حلال تم نے اپنے جی سے ٹھہرا لیے۔ شرک اور تحریم و تحلیل کے تعلق پر ایک سے زیادہ مقامات میں تفصیل سے بحث گزر چکی ہے۔ اول تو تحریم و تحلیل خدا کے حقوق میں مداخلت ہے جو بجائے خود شرک ہے۔ دوسرے مشرکین نے یہ تحریم و تحلیل، جیسا کہ سورۂ انعام میں تفصیل سے بحث گزر چکی ہے، اپنے مشرکانہ عقائد و تصورات کے تحت کی تھی۔ لیکن دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہی خدا کا حکم ہے ظاہر ہے کہ اپنی من گھڑت شریعت کو بے دلیل خدا کی طرف منسوب کرنا خدا پر افترا ہے جو شدید ترین جرائم میں سے ہے۔

'وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ' یہ افترا علی اللہ کے جرم کی انتہائی شناعت کا اظہار ہے۔ سوال کیا ہے کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہیں قیامت کے دن ان کا کیا گمان ہے؟ سوال کر کے جواب دیے بغیر بات

ختم کر دی ہے جو متکلم کے انتہائی غضب کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا یہ شامت زدہ لوگ اس جرم عظیم کو کوئی معمولی بات سمجھے بیٹھے ہیں، قیامت آئے گی تو انہیں پتہ چلے گا کہ اس جسارت کی ان کو کیا سزا ملتی ہے۔

'اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ ...... الایۃ' مطلب یہ ہے کہ ان کا یہ جرم تو ایسا گھنونا ہے کہ ابھی ان کا قصہ پاک کر دیا جاتا لیکن اللہ لوگوں پر بڑے فضل والا ہے کہ لوگوں کے بڑے بڑے جرائم کے باوجود ان کو مہلت بھی دیتا ہے اور ان کو اپنے رزق و فضل سے بھی محروم نہیں کرتا کہ اگر وہ اپنے جرم کی تلافی اور توبہ و اصلاح کرنا چاہیں تو کر لیں لیکن لوگوں کی اکثریت کا حال یہی ہے کہ وہ شکر گزار نہیں ہوتے بلکہ اس ڈھیل اور درگزر سے ان کی حماقت اور شرارت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (۶۱-۶۵)

پیغمبر صلعم اور صحابہؓ کو تسلی

'وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ ...... الایۃ' یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے بطور التفات تسلی اور بشارت ہے کہ مخالفوں کی ان غوغا آرائیوں کی ذرا پروا نہ کرو، تم جہاں کہیں اور جس حال میں بھی ہو عبادت و طاعت اور تذکیر و دعوت کی جس مہم میں بھی مصروف ہو، پورے انہماک اور پوری یکسوئی و دلجمعی کے ساتھ اس میں لگے رہو۔ ہم ہر جگہ تمہارے ساتھ ہیں، تمہارے ایک ایک عمل کو دیکھ رہے ہیں اور تمہاری حفاظت و نگرانی کر رہے ہیں۔ آسمان اور زمین کی کوئی چیز چھوٹی ہو یا بڑی خدا سے اوجھل نہیں ہے۔ ہر چیز ایک کھلی کتاب میں درج اور ہر وقت خدا کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ 'وَمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ' میں ضمیر مجرور کا مرجع کتاب الٰہی ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۵۷-۵۸ میں گزر چکا ہے اور 'قرآن' سے یہاں مراد کتاب الٰہی کا کوئی جزو اور حصہ ہے۔ اس معنی کے لیے نظائر قرآن میں موجود ہیں۔ 'وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ' میں خطاب جمع آپ کے جاں نثار ساتھیوں سے ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ پیام تسلی و بشارت پیغمبر ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ آپ کے ساتھیوں کے لیے بھی ہے جو اس وقت اللہ کے دین کی راہ میں جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ 'اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ'، 'افاض' کا صلہ جب 'فی' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی شے میں غایت درجہ انہماک کے ہوتے ہیں۔ یہاں اس قید سے ایک تو اس غیر معمولی انہماک پر بھی روشنی پڑی جو اقامت دین کی اس جدوجہد میں صحابہؓ کو تھا۔ دوسرے اس سے تسلی کے مضمون کی بلاغت بھی دوچند ہو گئی ہے اس لیے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تم اپنے تن، من، دھن ہر چیز سے بے پروا ہو کر خدا کے کلمہ کی سربلندی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہوتے ہو تو اس وقت ہم تمہارے پیچھے تمہاری حفاظت و نگرانی میں مصروف ہوتے ہیں۔

کیا غم ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ ...... الایۃ - اسلوب کلام سے بن کہے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہی گروہ اللہ کے دوستوں کا گروہ ہے اور ان کے لیے آخرت میں ایک ایسی زندگی کی بشارت ہے جس میں نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا ہو گا نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔

خدا کی دوستی ایمان و تقویٰ کی بنا پر

'اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ'، اس صفت کے یہاں لانے سے مقصود اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ اللہ کی دوستی اور محبت کا یہ مقام اور اس کا مذکورہ ثمرہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان کے ساتھ تقویٰ اور حدود الٰہی کی حفاظت پر قائم و دائم رہیں گے۔ یعنی یہ کسی گروہ کا اجارہ نہیں بلکہ صفات کے ساتھ مشروط ہے۔

'لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ... الایۃ' ان کے لیے دنیا کی زندگی میں غلبہ و تمکن اور آخرت میں جنت نعیم کی بشارت ہے۔ یہاں وہ بات ذہن میں رہے جو ہم رسولوں کے متعلق ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اس دنیا میں بھی لازماً غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اس غلبہ کے باب میں جو سنت الٰہی ہے اس کی وضاحت بھی اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ ان انبیا کا معاملہ جو صرف نبی تھے، رسول نہیں تھے، اس سے الگ ہے۔

'لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ' یہاں 'کَلِمٰتِ اللّٰہِ' سے مراد خدا کے وعدے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے وعدے اٹل ہیں۔ یہ پورے ہو کے رہیں گے اور اصلی اور بڑی کامیابی یہی ہے جس کا وعدہ اہل ایمان کے لیے کیا جا رہا ہے۔

'وَلَا یَحْزُنْکَ قَوْلُھُمْ اِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا' یہاں 'قَوْلُھُمْ' سے مراد کفار کے اس طرح کے طعن آمیز اقوال ہیں جن کی ایک مثال سورۂ ہود آیت ۱۲ میں یوں نقل ہوئی ہے فَلَعَلَّکَ تَارِکٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْکَ وَضَآئِقٌۢ بِہٖ صَدْرُکَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْہِ کَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَہٗ مَلَکٌ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِیْرٌ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ (تو شاید تم اس وحی کا جو تم پر کی جا رہی ہے، کچھ حصہ چھوڑ دینے والے ہو اور اس سے تمہارا سینہ بھنچ رہا ہے کہ وہ طعنہ دیں گے کہ اس کے اوپر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا جاتا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا، تم تو بس ایک ہوشیار کر دینے والے ہو، اللہ ہر چیز پر وکیل ہے) ان آیات کے نزول کے دور میں مسلمانوں کا جو حال تھا اس کے لحاظ سے تمکن اور غلبہ کی وہ بشارت جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی کفار کے لیے طنز و استہزا کا موضوع بن سکتی تھی۔ وہ کہہ سکتے تھے اور انھوں نے کہا بھی ہو گا کہ ذرا اس نئے دین کے سرپھروں کا حوصلہ دیکھو کہ کسی کو دو وقت کی قرینہ کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو سلیقہ کا لباس نصیب نہیں لیکن حکومت و سلطنت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اسی کو پیش نظر رکھ کر فرمایا کہ تمھیں مخالفین کی اس طرح کی باتیں غم میں نہ ڈالیں۔ تمہارے لیے جو بشارت ہے وہ حتمی اور قطعی ہے۔ عزت

کا مالک اللہ ہے، یہ چیز جس کو بھی ملتی ہے اللہ ہی کے دیے ملتی ہے۔ اب اللہ نے اگر یہ عزت تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو دینے کا فیصلہ فرما لیا ہے تو اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ کی صفات کے حوالہ سے مقصود یہاں پیغمبرؐ اور آپ کے ساتھیوں کو صبر اور توکل کی تعلیم دینا ہے کہ خدا ساری باتیں سنتا اور جانتا ہے۔ ان کی ہر بات کا جواب اپنے وقت پر ظاہر ہوگا۔ تم صبر کے ساتھ اپنے کام کیے جاؤ۔

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ
شُرَكَاءَ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا
فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ۝ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۗ سُبْحَانَهُ ۖ
هُوَ الْغَنِيُّ ۖ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنْ عِندَكُم مِّن سُلْطَانٍ بِهَٰذَا ۚ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ قُلْ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ۝ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ
إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ (٦٦-٧٠)

شرک کی بنا محض گمان پر ہے

'أَلَا إِنَّ لِلَّهِ ...... الآیۃ' اوپر والی آیت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بطور التفات تھی۔ اب توحید کے مضمون کو پھر لے لیا جو پیچھے سے چلا آرہا تھا۔ فرمایا کہ اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے، خواہ فرشتے یا جنات یا انسان، سب خدا ہی کی مخلوق اور اسی کے مملوک ہیں، ان میں سے کسی کا یہ درجہ نہیں کہ وہ خدا کی خدائی میں شریک و سہیم ہو تو جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں وہ فی الحقیقت خدا کے شریکوں کی پیروی نہیں کر رہے ہیں اس لیے کہ خدا کا تو کوئی شریک ہے ہی نہیں۔ بلکہ یہ لوگ محض اپنے گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہیں۔ 'ظن' کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں اس سے مراد وہ بات ہے جس کی بنیاد نہ علم صحیح پر ہے نہ عقل و فطرت پر بلکہ مجرد وہم و خیال اور اٹکل پچو اندازوں پر ہے۔

مقابل الفاظ کے حذف کا اسلوب

'هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ .... الآیۃ' اس آیت میں عربی زبان کا وہ اسلوب استعمال ہوا ہے جس میں مقابل الفاظ حذف کر دیے جاتے ہیں اور جس کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ اس حذف کو کھول دیا جائے تو پوری بات گویا یوں ہوگی۔ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ (مظلما) لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (لتعملوا فیہ)۔

فرمایا وہی خدا ہے جس نے تمھارے لیے شب کو تاریک اور خنک بنایا کہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں کام کرو۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ، یعنی رات اور دن اس نوعیت کے سننے اور سمجھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ یہاں نشانیوں کی وضاحت نہیں کی ہے لیکن قرآن کے دوسرے مقامات میں ان کی وضاحت موجود ہے۔ ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے۔

رات اور دن کی نشانیاں ردِ شرک کے لیے

سب سے پہلے تو اس بات پر نگاہ کیجیے جو رات اور دن کے اندر باوجودیکہ وہ دونوں ضدین کی نسبت رکھتے ہیں، پایا جاتا ہے کہ دونوں مل کر انسان کی خدمت کر رہے ہیں۔ رات اس کے لیے راحت کا بستر بچھاتی ہے اور دن اس کے لیے سرگرمیوں کا میدان کھولتا ہے۔ یہی حال اس کائنات کے تمام اضداد کا ہے کہ وہ پوری دمسازی اور سازگاری کے ساتھ اپنے سے بالاتر مقصد کی خدمت میں سرگرم ہیں اور اس سے ذرا انحراف اختیار نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ ایک بالاتر اور حکیم ارادہ اس کائنات کے پورے نظام پر حاوی اور قاہر ہو اور وہ اس کے اجزائے مختلفہ میں ربط و تعلق پیدا کر کے اس کو اپنی حکمت کے تحت چلا رہا ہو ـــــ یہ اس توحید کی دلیل ہوئی جن کا ذکر اوپر والی آیت میں ہے۔

دوسری چیز جو ظاہر ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کارخانۂ کائنات نہ کوئی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آ جانے والی شے ہے اور نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ ہے بلکہ اس کے ہر گوشے میں عظیم قدرت، حیرت انگیز حکمت اور نہایت گہری غایت و مصلحت پائی جاتی ہے۔ یہ چیز مقتضی ہے کہ یہ دنیا نہ یوں ہی چلتی رہے، نہ یوں ہی تمام ہو جائے بلکہ ضروری ہے کہ یہ کسی عظیم غایت پر منتہی ہو اور یہ غایت بغیر اس کے پوری نہیں ہو سکتی کہ اس کے بعد آخرت کو تسلیم کیا جائے۔

تیسری چیز وہ ربوبیت کا نظام ہے جو اس کے ہر گوشے میں جلوہ گر ہے۔ ربوبیت مسئولیت کو مقتضی ہے جس نے ہمارے لیے زندگی اور پرورش کا یہ سارا نظام قائم کیا ہے اس کا ہم پر فطری طور پر حق قائم ہوتا ہے اور لازم ہے کہ ایک دن اس حق کی بابت ہم سے پرسش ہو جنھوں نے اس حق کو پہچانا ہو وہ اس کا انعام پائیں اور جنھوں نے اس کی ناقدری کی ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔ اس اعتبار سے یہ جزا اور سزا کی دلیل ہوئی۔

یہاں جس طرح قرآن نے اشارے پر اکتفا کیا ہے اسی طرح ہم بھی اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔ دوسرے مقامات میں یہ سارے پہلو نہایت تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔

کی کا تردید

'قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ...... الایۃ' لفظ 'ولد'، مذکر، مونث، جمع، مثنیٰ سب کے لیے آتا ہے۔ جن لوگوں نے اس کو بیٹے کے معنی میں لیا ہے ان کی بات زبان اور عرب کے عقائد دونوں کے خلاف ہے۔ یہاں عقائد مشرکین عرب کے زیر بحث ہیں اور مشرکین عرب کسی کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے تھے۔ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔

'سُبۡحٰنَهٗ' یعنی یہ بات خدا کی صفات الوہیت کے منافی ہے کہ اس کے لیے اولاد مانی جائے اس لیے کہ جو اولاد ہوگی وہ خدا کی ذات کا ایک جزو اور اس کی مثیل و نظیر ہوگی اور یہ شرک فی الذات اور اس کی بے ہمگی اور بے ہمتائی کی نفی ہے۔

'هُوَ الۡغَنِىُّ' یعنی خدا اس بات سے مستغنی ہے کہ اس کے اولاد ہو۔ آدمی کو اولاد کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ وہ اس کی نسل کی بقا کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس کے کاروبار میں اس کی مددگار ہوتی ہے جب وہ

بڑھا ہوتا ہے تو اس کو سہارا دیتی ہے۔ خدا ان تمام ضروریات و حالات سے بالا و برتر، مستغنی اور بے نیاز ہے۔ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے تو اس کو اولاد کی کیا ضرورت ہے۔ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِهٰذَا سلطان کے معنی دلیل کے ہیں۔ یعنی تمہارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے بس یونہی خدا پر ایک تہمت جوڑ رہے ہو۔

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ ...... الاٰیۃ 'فلاح' کا لفظ قرآن میں عاقبت کار کی کامیابی و سرخروئی کے لیے آتا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ پر شرک کی تہمت جوڑ رہے ہیں وہ عاقبت کار کی کامیابی سے محروم ہیں۔

مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ .... الاٰیۃ یعنی ان کے لیے بس اس دنیا کی زندگی میں چند روزہ نفع اٹھا لینے کی مہلت ہے۔ پھر سب کی واپسی ہماری طرف ہو گی اور ہم ان کے کفر کی پاداش میں ان کو اپنے عذاب سخت کا مزہ چکھائیں گے۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۷۱-۹۳

آگے حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کسی قدر تفصیل کے ساتھ اور درمیان کے رسولوں کی اجمالاً مذکور ہوئی ہے۔ مقصود ان سرگزشتوں کے حوالہ سے انہی حقائق کو تاریخ کی روشنی میں واضح کرنا ہے جو اوپر عقل و فطرت کے دلائل سے مبرہن کیے گئے ہیں۔ ان میں پیغمبرؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے لیے سرمایۂ تسکین اور آپ کے معاندین و مخالفین کے لیے پورا پورا درس عبرت موجود ہے۔ فرق اگر ہے تو نام و مقام اور زمانے کا ہے۔ اصل داستان اس قدر باہمدگر مشابہ ہے کہ نام و مقام کے فرق کو نظر انداز کر دیجیے تو سرے سے کوئی فرق ہی نہیں رہ جاتا ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۱-۹۳

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ
مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ
فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً
ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ
اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾
فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰۗىِٕفَ وَاَغْرَقْنَا
الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا
كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِ
الْمُعْتَدِیْنَ ۝۷۴ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰی وَهٰرُوْنَ اِلٰی فِرْعَوْنَ
وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰیٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ۝۷۵ فَلَمَّا
جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝۷۶ قَالَ
مُوْسٰۤی اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝۷۷
قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا
الْكِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِیْنَ ۝۷۸ وَقَالَ فِرْعَوْنُ
ائْتُوْنِیْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِیْمٍ ۝۷۹ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤی
اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝۸۰ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰی مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ
السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَیُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝۸۱
وَیُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸۲ؒ فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤی ع ۱۲ ۱۳
اِلَّا ذُرِّیَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ یَّفْتِنَهُمْ ؕ
وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ ۝۸۳ وَقَالَ
مُوْسٰی یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ
مُّسْلِمِیْنَ ۝۸۴ فَقَالُوْا عَلَی اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ
الظّٰلِمِیْنَ ۝۸۵ۙ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۝۸۶ وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰی
مُوْسٰی وَاَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ

قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٧﴾ وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ
اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ
رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى
قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٨٨﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ
دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٨٩﴾ وَ
جٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّ
عَدْوًا ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ
اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٩٠﴾ اٰۗلْــٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ
قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٩١﴾ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ
لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿٩٢﴾ وَ ٩ ع ١٠ ١٤
لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ
فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَھُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٩٣﴾

ترجمۂ آیات ۷۱ - ۹۳

اور ان کو نوحؑ کی سرگزشت پڑھ کر سناؤ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، اگر تم پر تمہارے اندر میرا ٹکنا اور اللہ کی آیات کی یاد دہانی کرنا گراں ہو گیا ہے تو میں نے بس اللہ پر بھروسہ کیا۔ تم اپنی رائے مجتمع کر لو اور اپنے شرکاء کو بھی ملا لو پھر تمہارے فیصلہ میں کوئی تذبذب باقی نہ رہے اور میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو اور مجھے مہلت نہ دو۔ پس اگر تم اعراض کرو گے تو میں نے تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے۔ میرا اجر تو بس

اللہ ہی پر ہے اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے بنوں۔ تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ہم نے اس کو اور جو لوگ اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دی اور ان کو جانشین بنایا اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تو دیکھو کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جن کو ہوشیار کیا جا چکا تھا!! ۷۱-۷۳

پھر ہم نے اس کے بعد رسول بھیجے ان کی اپنی قوموں کی طرف تو وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ اس چیز پر ایمان لانے والے نہ بنے جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم حدود سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر کر دیا کرتے ہیں۔ ۷۴

پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا تو انھوں نے گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے پس جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو انھوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ موسیٰؑ نے کہا کہ کیا تم حق کو سحر کہتے ہو جب کہ وہ تمھارے پاس آچکا ہے۔ بھلا، یہ سحر ہے؟ اور ساحر کبھی فلاح نہیں پاتے۔ وہ بولے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمیں اس طریقہ سے ہٹا دو جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا اور ملک میں سیادت تم دونوں کو حاصل ہو جائے؟ اور ہم تو تم دونوں کی بات کبھی ماننے والے نہیں اور فرعون نے حکم دیا کہ میرے پاس سارے ماہر جادوگروں کو حاضر کرو۔ تو جب جادوگر آئے موسیٰؑ نے ان سے کہا جو کچھ تمھیں پیش کرنا ہے اس کو پیش کرو تو جب انھوں نے پیش کیا موسیٰ نے کہا یہ جو کچھ تم لائے ہو، یہ جادو ہے بے شک اللہ اس کو نیست کر دے گا، اللہ فساد برپا کرنے والوں کے عمل کو نتیجہ خیز نہیں ہونے دیتا اور اللہ مجرموں کے علی الرغم اپنے کلمات سے حق کا بول بالا کرتا ہے۔ تو موسیٰ کی بات نہ مانی مگر اس کی قوم کے

تھوڑے سے نوجوانوں نے ڈرتے ہوئے فرعون اور اپنے بڑوں سے کہ مبادا وہ ان کو کسی فتنہ میں ڈال دے۔ بے شک فرعون ملک میں نہایت سرکش اور حد سے بڑھ جانے والوں میں سے تھا اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر چکے ہو۔ وہ بولے کہ ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب ہمیں ظالموں کے ظلم کا آماجگاہ نہ بنا اور ہمیں اپنے فضل سے کافروں کے پنجۂ ستم سے چھڑا۔ ۸۵-۸۶

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھرا لو اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز کا اہتمام کرو اور ایمان لانے والوں کو خوش خبری دے دو۔ اور موسیٰ نے دعا کی، اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے اعیان کو دنیا کی زندگی میں شان و شوکت اور مال و اسباب سے بہرہ مند کیا، اے ہمارے رب کہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بے راہ کریں، اے ہمارے رب ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو بند کر دے کہ وہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو۔ فرمایا تمھاری دعا قبول ہوئی تو تم دونوں جمے رہو اور ان لوگوں کی راہ کی پیروی نہ کیجیو جو علم نہیں رکھتے۔ ۸۷-۸۹

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا تو ان کا پیچھا کیا فرعون اور اس کے فوجیوں نے سرکشی اور زیادتی سے۔ یہاں تک کہ جب وہ ڈوبنے کے لپیٹ میں آگیا بولا کہ میں ایمان لایا کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں اس کے فرمانبرداروں میں بنتا ہوں۔ کیا اب! حالانکہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تم فساد برپا کرنے والوں میں سے تھے۔ پس آج ہم تیرے جسم کو بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی بنے اور بے شک بہت سارے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہی رہتے ہیں۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو عزت

کا ٹھکانا دیا اور ان کو اچھا رزق بخشا اور انھوں نے نہیں اختلاف برپا کیا مگر اس وقت جبکہ ان کے پاس علم آگیا، تیرا رب ان چیزوں کے باب میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ ۹۰-۹۳

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا
تُنْظِرُوْنِ (۷۱)

حضرت نوحؑ کی سرگزشت سب سے قدیم سرگزشت ہے

پچھلی قوموں میں سے سب سے قدیم قوم، جس کی بربادی کی روایات عربوں میں مشہور تھیں، وہ نوحؑ کی قوم تھی۔ اس وجہ سے قرآن میں جب تاریخی ترتیب سے قوموں کی سرگزشت بیان ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی قوم کا ذکر آتا ہے۔ اعراف آیات ۵۹-۶۴ میں بھی اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کے محل وقوع اور اس کے تخمینی زمانہ کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ 'نَبَا' کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ اس سے مراد کوئی اہم واقعہ ہوتا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے یہاں پتہ چلتا ہے کہ مقصود نوحؑ اور قوم نوحؑ کی زندگی کے کسی اہم موڑ اور کسی فیصلہ کن واقعہ کی سرگزشت سنانا ہے، مؤرخوں کی طرز کی مجرد داستان سرائی پیش نظر نہیں ہے۔

اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ۔ مقام سے مراد اپنی قوم کے اندر وہ طویل قیام ہے جو حضرت نوحؑ کو حاصل ہوا۔ عنکبوت آیت ۱۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے اندر ایک مدت دراز تک تبلیغ و دعوت میں سرگرم رہے یہاں تک کہ ان کے معاندین و مخالفین ان کی دعوت سے، جیسا کہ ہود آیت ۳۲ سے واضح ہو رہا ہے، بالکل تنگ آ گئے۔ اسی مرحلہ میں حضرت نوحؑ نے یہ بات فرمائی ہے اور یہ درحقیقت تمہید ہے اس چیلنج کی جو آگے آ رہا ہے۔

حضرت نوحؑ کا چیلنج

فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ...... الاية 'امر' سے مراد رائے اور فیصلہ ہے۔ یعنی تم میرے باب میں اجتماعی طور پر ایک قطعی فیصلہ کر لو اور اپنے ان معبودوں کو بھی اس فیصلہ میں شریک کر لو جن کو تم خدا کی خدائی میں شریک گردانتے ہو۔ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً 'غُمَّة' کسی ڈھانک لینے والی چیز کو کہتے ہیں۔ لیکن محاورہ کلام میں جب کہیں گے هُوَ فِيْ غُمَّةٍ تو اس کے معنی ہوں گے، وہ حیرانی اور تردد میں ہے۔ مطلب یہ ہے

کہ ایسا قطعی فیصلہ کر لو کہ اس میں کوئی تردد و تذبذب باقی نہ رہے۔ ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ، اقْضُوْا کے بعد اِلٰی اقدام پر دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قطعی فیصلہ کر کے مجھ پر اقدام کرو اور پھر مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ اللہ پر ہے وہ میری حفاظت فرمائے گا۔

فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۷۲)

یعنی اگر تم غور و فکر کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے کہ اسی روش اعراض پر جمے رہنا ہے تو مجھے اب تمہاری کوئی پروا نہیں ہے۔ میں تمہیں جو تبلیغ و تذکیر کر رہا تھا اس کا میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں لے رہا تھا کہ اس سے محروم ہو جانے کا غم ہو۔ میری محنت کا اجر تو اللہ کے ذمے ہے۔ وہ مجھے محروم نہیں فرمائے گا۔ مجھ پر یہ ذمہ داری بھی نہیں ڈالی گئی تھی کہ لازماً تم کو مومن و مسلم ہی بنا لوں۔ مجھے تو یہ حکم ملا تھا کہ میں اپنے رب کے فرماں برداروں میں بنوں۔ سو میں اسی کا فرمانبردار ہوں۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّیْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓىِٕفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِیْنَ (۷۳)

قریش کو انذار

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ پہلے مکذبین کے غرق کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ حضرت نوحؑ اور ان کے باایمان ساتھیوں کی نجات کا ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ سنت الٰہی یہی ہے کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر جب عذاب آیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے اہل ایمان کی حفاظت کا اہتمام فرمایا ہے۔ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓىِٕفَ یعنی مکذبین کو غرق کر کے ان کی جگہ زمین کی وراثت حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو بخشی۔ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِیْنَ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس سرگزشت کے سنانے سے پیش نظر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اتمام حجت ہو چکنے کے بعد جس طرح قوم نوح کا بیڑا غرق ہو گیا اسی طرح قریش کا بھی قصہ پاک ہو جائے گا اگر انھوں نے تمہارے انذار سے آنکھیں نہ کھولیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ (۷۴)

بعد کے رسولوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ

یہ ان رسولوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے جو حضرت نوحؑ کے بعد آئے۔ یہاں ان کی تفصیل نہیں کی ہے بلکہ سرسری اشارہ کر کے بعد والی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت لے لی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل بعد والی سورہ ـــــ سورۂ ہود ـــــ میں آئی ہے جو اس سورہ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کا ذکر بھی مفصل ہوا ہے اور قوم نوح اور قوم موسیٰ کے حالات کے بھی بعض وہ گوشے روشنی میں آ گئے ہیں جو یہاں مخفی رہ گئے تھے۔ اجمال کے بعد تفصیل کا یہ اسلوب قرآن مجید میں بہت استعمال ہوا ہے۔

توفیق ایمان کے باب میں سنت الٰہی

فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا ..... الآیۃ، میں اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو توفیق ایمان کے باب میں

بار بار بیان ہوئی ہے اور جس کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں کہ جو لوگ عقل و فطرت کے بدیہیات اور یقینیات کو جھٹلا دیتے ہیں ان کو رسول کے انذار سے بھی کوئی نفع نہیں پہنچتا ہے۔ ایسے لوگوں پر رسول کے ذریعہ سے اتمام حجت ہوتا ہے اور اس اتمام حجت کے نتیجہ میں ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ 'اعتداء' کے معنی حدود الٰہی سے تجاوز کے ہیں۔ جو لوگ خدا کے مقرر کیے ہوئے تمام حدود توڑ تاڑ کے رکھ دیتے ہیں ان کے اندر حدود کے احترام کا احساس ہی مردہ ہو جاتا ہے اور اس احساس کے مردہ ہو جانے کے بعد ان سے کسی خیر کی امید عبث ہے۔ ایسے مردے کسی کے جھنجھوڑنے سے بھی نہیں جاگتے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۷۵)

حضرت موسیٰؑ کا اتمام حجت

لفظ 'ملاء' پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ 'آیات' سے مراد وہ آیات الٰہی بھی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے درباریوں کو سنائیں اور وہ نشانیاں بھی ہیں جو انھوں نے ان کو دکھائیں 'وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ' سے اسی فساد قلب و عقل کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے کہ چونکہ پہلے سے یہ اپنے دل اور عقل کی آنکھیں پھوڑ چکے تھے اس وجہ سے کسی چیز سے بھی انھوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ فرعون اور اس کے اعیان کے پاس رسول کی حیثیت سے گئے تھے اس وجہ سے انھوں نے لازماً ان کے اوپر اللہ کی حجت تمام کی۔ اس کے بغیر رسول کا مشن پورا نہیں ہوتا اس وجہ سے ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے ایک قوم پرست لیڈر کی طرح فرعون سے صرف بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا، اس سے آگے ایمان و اسلام کی کوئی دعوت نہیں پیش کی۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ (۷۶-۷۷)

حق اور سحر کا فرق

'حق' کے معنی ہیں ایک واضح، مبرہن اور مدلل حقیقت۔ یہاں اس سے مراد حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی کا فرعون اور اس کے اعیان کے سامنے نہایت کھلے ہوئے معجزات کے ساتھ یہ دعویٰ ہے کہ ہم تیرے رب کے رسول ہیں۔ اس دعوے کی تردید میں انھوں نے کہا کہ تمہارا یہ دعویٰ باطل ہے۔ جو نشانی تم دکھا رہے ہو یہ کوئی خدائی نشانی نہیں ہے بلکہ یہ صریح جادو ہے اور یہ چیز تم سے کہیں زیادہ ہمارے اپنے جادوگروں کے پاس ہے۔

'اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ' میں 'تَقُوْلُوْنَ' کا مفعول بتقاضائے بلاغت حذف ہے اور 'لِلْحَقِّ' میں 'ل' 'فی' کے معنی میں ہے یعنی تم ایک واضح حق کے باب میں کہتے ہو کہ یہ سحر ہے۔ لفظ سحر کو یہاں حذف کر دینے سے یہ بات نکلتی ہے کہ متکلم کو حق کے باب میں یہ نقل کفر بھی اس درجہ ناگوار ہے کہ وہ اپنی زبان کو اس سے آلودہ کرنا

پسند نہیں کرتا۔ کَمَا جَآءَکُمْ کی بلاغت بھی یہاں قابل لحاظ ہے۔ حق، جب تک نگاہوں سے اوجھل ہو اس وقت تک تو اس کی نسبت کوئی شخص اگر کوئی نظریاتی بحث اٹھائے تو اس کو کسی حد تک معذور قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب حق سامنے موجود ہو تو اس کے باب میں کٹ حجتی کرنا ویسا ہی ہے جس طرح کوئی نصف النہار کے سورج کے بارے میں تردد کا اظہار کرے۔ ہم سورۂ اعراف میں واضح کر چکے ہیں کہ سحر اور معجزہ کے درمیان جو فرق ہے وہ اصلاً منطق سے نمایاں نہیں ہوتا بلکہ دونوں کے ظہور کی نوعیت، اذہان و قلوب پر دونوں کے اثرات اور دونوں کے پیش کرنے والوں کے کردار سے نمایاں ہوتا ہے۔ وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ یعنی ساحر کبھی کسی پائدار کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتے۔ ان کے کرشموں اور شعبدوں کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے۔ بالخصوص جب وہ حق کے مقابل میں آتے ہیں تب تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی ٹک نہیں سکتے۔ معجزے کے آفتاب تاباں کے آگے ان کے دیے بالکل ماند پڑ جاتے ہیں۔ یہ جملہ حضرت موسیٰ کی طرف سے فرعونیوں کو ایک چیلنج بھی ہے کہ اگر اس کو سحر کہتے ہو تو جب تم اس کے مقابلے کے لیے اپنے ساحروں کو لاؤ گے تو ساری حقیقت تم پر کھل جائے گی کہ رسول کے معجزے اور ساحر کے سحر میں کیا فرق ہوتا ہے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِیْنَ (۷۸)

حضرت موسیٰؑ پر ایک سیاسی الزام

فرعونیوں کا یہ فقرہ نہایت زہر آلود ہے۔ انھوں نے اپنی قوم کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے خلاف بھڑکانے کے لیے ان پر آبائی دین اور ملک کی حکومت، دونوں کے خلاف بغاوت برپا کرنے کا الزام تھوپ دیا کہ تم ہمارے آبائی دین سے بھی ہم کو برگشتہ کرنا چاہتے ہو اور تمھاری یہ آرزو بھی ہے کہ اس ملک کا اقتدار تم دونوں کے ہاتھ آ جائے۔ ہم سورۂ اعراف کی تفسیر میں تورات کے حوالوں کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں کہ مصر میں اس وقت جو ارسٹوکریسی برسر اقتدار تھی وہ اسرائیلیوں کی روز افزوں ترقی پذیر تعداد سے بہت خائف تھی کہ مبادا ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے کہ یہ قبطیوں کو ہٹا کر خود اقتدار پر قابض ہو جائیں چنانچہ اسرائیلی بچوں کو قتل کر دینے کی جو سنگدلانہ اسکیم چلائی گئی تھی اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس طرح بنی اسرائیل کی تعداد کو کنٹرول میں رکھا جا سکے۔ چونکہ یہ خطرہ ذہنوں میں موجود تھا اس وجہ سے جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت بلند ہوئی تو اس کے خلاف یہ اشتعلہ بھی چھوڑ دیا گیا کہ یہ ملک میں اقتدار حاصل کرنے کے خواہاں ہیں تاکہ قبطی عصبیت پوری طرح ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو جائے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِیْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِیْمٍ ۝ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓی اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰی مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَیُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ وَیُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۷۹-۸۲)

حضرت موسیٰؑ اور جادوگروں کا مقابلہ

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ..... الاٰیۃ۔ فرعون اور اس کے درباریوں سے یہ حقیقت تو مخفی نہیں ہو سکتی تھی کہ نہ حضرت

موسیٰ ساحر ہیں اور نہ جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں، وہ سحر ہے لیکن چونکہ ان کی بات مان لینے کی صورت میں اس کو اپنی اور اپنی مزعومہ خدائی کی موت نظر آتی تھی۔ اس وجہ سے اس کو مفر کی شکل یہی نظر آئی کہ ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو بلا کر ان سے حضرت موسیٰ کا مقابلہ کرایا جائے کہ شاید اس طرح بات بن جائے۔ اگرچہ یہ ایک صریح حماقت تھی لیکن کسی حقیقت کو نہ ماننے کی خواہش ایک ایسی خواہش ہے جس کی خاطر انسان بہت سی حماقتیں کر گزرتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کا اعتماد علی اللہ

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ ..... الآیۃ: ساحروں سے حضرت موسیٰؑ کا یہ فرمانا کہ "جو کچھ تم پیش کرنا چاہتے ہو وہ پیش کرو" اپنے مشن پر غایت درجہ اعتماد کی دلیل ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ کے وعدۂ نصرت پر پورا بھروسہ تھا کہ خواہ جادوگر جتنا بڑا جادو بھی دکھائیں ان کے پاس اس کا توڑ موجود ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے کسی پیش بندی سے بے نیاز ہو کر انہی کو پہل کرنے کا موقع دیا اور یہ گویا میدان مقابلہ میں ان کی پہلی جیت تھی۔ اس لیے کہ اس کے بعد حریف کو جو شکست ہوئی وہ خود اس کے اپنے منتخب کیے ہوئے میدان میں ہوئی۔

باطل کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے

فَلَمَّا اَلْقَوْا ..... الآیۃ: جب حضرت موسیٰؑ نے ان کا جادو دیکھا تو فرمایا مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ کہ یہ جو کچھ تم نے دکھایا ہے، یہ جادو ہے۔ یہ فرعونیوں کے اس قول کا جواب ہے جو اوپر آیت ۷۶ میں گزرا، قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ، کہ انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے معجزے کو دیکھ کر کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ حضرت موسیٰ نے ان کے اسی قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میرے معجزے کو جادو کہتے تھے، جادو وہ نہیں تھا، جادو یہ ہے جو تم نے پیش کیا ہے اور تم اب حق کے مقابلہ میں اس کی بے حقیقتی اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ (اللہ اس کو نابود کر دے گا) اس لیے کہ باطل اپنی چمک دمک اسی وقت دکھاتا ہے جب تک حق سے اس کا مقابلہ نہیں ہوتا، جب حق ظاہر ہو جاتا ہے تو باطل جھاگ کی طرح بیٹھ جایا کرتا ہے۔ یہی حقیقت دوسرے مقام میں یوں واضح فرمائی گئی ہے۔ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (حق ظاہر ہو گیا اور باطل نابود ہوا، اس لیے کہ باطل نابود ہی ہونے والی چیز ہے)

حق غالب ہو کر رہتا ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ، لفظ 'اصلاح' یہاں بار آور اور نتیجہ خیز کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ سورۂ محمد آیات ۲-۵ میں بھی استعمال ہوا ہے یعنی مصلحین جو حق لے کر اٹھتے ہیں ان کے مقابل میں مفسدین کی مفسدانہ کوششیں کبھی بار آور نہیں ہوتیں۔ امتحان و آزمائش کا مرحلہ گزرنے کے بعد غلبہ بالآخر حق ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ ..... الآیۃ: یعنی مجرمین و مفسدین خواہ حق کو دبانے کی کتنی ہی کوششیں کریں لیکن جو لوگ اللہ کا کلمہ لے کر اٹھتے ہیں، اللہ اپنے کلمات کے ذریعہ سے حق کا بول بالا کرتا ہے۔[1]

---

[1] یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں حق و باطل کی وہ کشمکش زیر بحث ہے جو ایک رسول کی بعثت سے ظہور میں آتی ہے۔ رسول کے لیے، جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں، بالآخر غلبہ لازمی ہے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ (۸۳)

حضرت موسیٰؑ کے ابتدائی ساتھی

'ذُرِّيَّةٌ' کا لفظ صرف قلت تعداد کو ظاہر نہیں کرتا، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ پر ابتدائی ایمان لانے والے ان کی قوم کے اندر سے صرف تھوڑے سے نوجوان تھے۔ حضرات انبیاء کے معاملے میں سنت الٰہی یہی رہی ہے کہ شروع شروع میں ان کا ساتھ بالعموم نوجوانوں نے ہی دیا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ بھی اسی حقیقت کی شہادت دیتی ہے اور دوسرے انبیاء کی تاریخ بھی اگر تفصیل سے معلوم ہو سکے تو اس سے بھی یہی بات ثابت ہوگی۔ اس کی واضح نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء جس ہمہ گیر دعوتِ اسلام کو لے کر اٹھتے ہیں اس کو ابتدائی مراحل میں آگے بڑھ کر قبول کرنا بڑی بلند حوصلگی بلکہ بڑے جان جوکھم کا کام ہوتا ہے۔ اس کی ہمت وہ لوگ آسانی سے نہیں کر سکتے جو روایات و رسوم سے مرعوب اور حالات و مصالح کی رعایت کے خوگر ہوں۔ ایسے لوگوں کا حجاب آہستہ آہستہ ہی اٹھتا ہے۔ نوجوانوں میں اس قسم کی مرعوبیت و مغلوبیت کم ہوتی ہے اس وجہ سے ان کو جب دعوتِ حق اپیل کر لیتی ہے تو وہ اس کے لیے دنیوی عواقب سے بے پروا ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، نہ وہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کی سرزنش کی کچھ زیادہ پروا کرتے نہ وقت کے اربابِ اقتدار کی برہمی کو خاطر میں لاتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے معاملے میں حالات کا یہ خاص پہلو بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ملک میں جو ارسٹوکریسی برسرِ اقتدار تھی وہ نسلاً بھی حضرت موسیٰؑ کی قوم سے بالکل الگ تھی اور اس دور میں جو شخص تختِ حکومت پر تھا، وہ بھی، جیسا کہ آیت کے الفاظ سے واضح ہے، طبعاً نہایت جبار اور سرکش تھا۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ وہی لوگ ان کا ساتھ دینے کے لیے آگے بڑھ سکتے تھے جو اپنی حمیتِ حق کے جوش و جذبہ کو دبا سکنے پر قادر نہ ہوں۔

'اٰمَنَ لَہٗ' اور 'اٰمَنَ بِہٖ' کا فرق

ان نوجوانوں کے ایمان کو قرآن نے 'اٰمَنَ لَہٗ' سے تعبیر کیا ہے۔ عربی زبان کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ 'اٰمَنَ لَہٗ' اور 'اٰمَنَ بِہٖ' میں بڑا فرق ہے۔ 'اٰمَنَ لَہٗ'، تو یہ ہے کہ آپ کسی شخص کے دعوے یا اس کی خبر کو سچ مان لیں۔ اس کے لیے حوالگی، تفویض، تسلیم اور انقیاد و اطاعت شرط نہیں ہے لیکن 'اٰمَنَ بِہٖ' کا تقاضا پورا کرنے کے لیے یہ ساری چیزیں شرط ہیں۔ نبی اور رسول کے معاملے میں صرف 'اٰمَنَ لَہٗ' کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے 'اٰمَنَ بِہٖ' کے تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ اس مرحلے تک کچھ اسرائیلی نوجوانوں نے حضرت موسیٰؑ کے دعوے کی صداقت تو تسلیم کر لی تھی لیکن ابھی 'اٰمَنَ بِہٖ' کے مقام تک وہ نہیں پہنچے تھے اس وجہ سے ان کے اعتراف و قبولیت کو قرآن نے 'اٰمَنَ لَہٗ' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ حقیقت چونکہ حضرت موسیٰؑ پر واضح تھی اس وجہ سے انھوں نے ان نوجوانوں کو ایمان کی اصل حقیقت سمجھائی جس کا ذکر آگے والی آیت میں آ رہا ہے۔

بنی اسرائیل کے اکابر کا حال

'ملائہم' میں ضمیر کا مرجع ذریت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان نوجوانوں کو فرعون کی طرف سے بھی خطرہ تھا کہ وہ حمایت موسیٰ کے جرم میں ان کو کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے اور اپنی قوم اور ملک کے اعیان واکابر سے بھی اندیشہ تھا کہ اگر ان کو پتہ چل گیا کہ ہم حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہیں تو جھاڑ کے کانٹوں کی طرح پیچھے پڑ جائیں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس مرحلہ تک خود بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں کا رویہ بھی، حضرت موسیٰ کے ساتھ ہمدردی کے باوجود یہی تھا کہ وہ اپنے یا اپنی اولاد کے لیے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

'وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ' یعنی اول تو فرعون نہایت متکبر اور جبار تھا کہ اپنے آگے کسی کو سر اٹھاتے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ جب ظلم کرنے پر آتا تو اس کے ظلم کی کوئی حد نہ رہتی، بلکہ تمام حدود پھلانگ جاتا۔

وَقَالَ مُوْسٰی یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ ۝ فَقَالُوْا عَلَی اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ (۸۴-۸۶)

ایمان کی اصل حقیقت

'وَقَالَ مُوْسٰی ..... الاٰیۃ' یہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لوگوں کو ایمان باللہ کی حقیقت سمجھائی ہے کہ اگر ایمان کا اظہار کیا ہے تو اس ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی راہ میں کسی کا ڈر اور کسی کا لحاظ حائل نہیں ہونا چاہیے بلکہ سب سے بے نیاز و بے پروا ہو کر اللہ کی راہ میں بڑھنا چاہیے اور اللہ پر پورا بھروسہ رکھنا چاہیے کہ جس نے یہ راہ کھولی ہے وہی اس میں پیش آنے والی مشکلات میں یار و ناصر ہوگا۔ گویا ایمان کا لازمی تقاضا خدا پر توکل ہے اور اس توکل کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دے یہی چیز اصل اسلام ہے۔

توکل کی حقیقت

'فَقَالُوْا عَلَی اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ...... الاٰیۃ' حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں نے ان کی یہ تعلیم قبول کی اور چونکہ وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ اس توکل کے معنی گوشہ نشینی کے نہیں بلکہ اللہ کی راہ میں سرفروشی اور جان بازی کے ہیں اس وجہ سے عزم بالجزم کے اظہار کے ساتھ ہی انھوں نے دعا کی کہ اے رب ہمیں ظالموں کے لیے فتنہ نہ بنا۔ 'فتنہ' کے معنی یہاں ہدف اور نشانہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو اتنی ڈھیل نہ دے کہ وہ ہمیں ہمارے دین سے پھیرنے کے لیے ہم کو بالکل ہی مظالم کا آماجگاہ بنا لیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ پر توکل کے تقاضے پورے کرنے کے لیے جس طرح بندے کا عزم راسخ ضروری ہے اسی طرح ہر قدم پر خدا سے دعا و استعانت بھی ضروری ہے کہ وہ راہ کے فتنوں سے امان میں رکھے اور جو فتنے پیش آئیں ان سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق دے۔

'وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ ...... الاٰیۃ' چونکہ یہ بات ابتدائی مرحلے ہی میں واضح ہو چکی تھی کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو فرعونیوں کی غلامی سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے اس مقصد عزیز کے لیے بھی انھوں نے دعا کی۔ یہ دعا گویا ہجرت کی کامیابی کے لیے تھی۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۸۷)

صبر اور توکل کے حصول کی تدبیر نماز — یہ تدبیر ارشاد ہوئی اس صبر اور توکل کے حصول کی جس کی تعلیم اوپر کی آیات میں دی گئی ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو حکم ہوا کہ مصر کے مختلف حصوں میں کچھ مقام نماز باجماعت کے لیے مخصوص کر لو جن میں بنی اسرائیل معین اوقات پر نماز کے لیے جمع ہوا کریں اور تم اپنے گھروں کو قبلہ قرار دے کر نماز باجماعت کا اہتمام کرو۔ یہ بعینہٖ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کی پر مصائب زندگی میں دی گئی تھی۔ صبر و توکل اور نماز کے باہمی تعلق پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں بحث کر چکے ہیں۔

دینی تنظیم کا ابتدائی نقطہ — مصر کی غلامانہ زندگی میں بنی اسرائیل اپنی مذہبی تنظیم کی خصوصیات سے محروم ہو گئے تھے۔ از آں جملہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اجتماعی نماز و دعا کی بھی کوئی شکل باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اب جب کہ حضرت موسیٰؑ نے ان کے اندر تجدید کا کام شروع کیا تو ظاہر ہے کہ اس کا آغاز اسی نقطہ سے ہونا تھا جو دینی تنظیم کا ابتدائی نقطہ ہے۔ چنانچہ ان کو نماز کے قیام و اہتمام کا حکم ہوا اور اس کے لیے یہ ہدایت ہوئی کہ مصر کے مختلف حصوں میں کچھ مکانات مسجد کی حیثیت سے مخصوص کر لیے جائیں جن میں بنی اسرائیل اوقات نماز میں مجتمع ہو جایا کریں۔ یہ طریقہ اختیار کرنے کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ تمام بنی اسرائیل کا مصر کے مختلف حصوں سے ایک جگہ جمع ہونا ناممکن ہوتا۔

جب متعدد مسجدیں ہوئیں تو ان میں وحدت پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوا کہ کوئی مسجد سب کے قبلہ کی حیثیت سے معین ہو۔ اس لیے حکم ہوا۔ وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً (اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ)۔ میرا ذہن ان الفاظ سے اس طرف جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ گھر ہیں جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے اپنے اور اپنے متعلقین اور اپنے آس پاس کے بنی اسرائیل کی نماز کے لیے مخصوص فرمائے ہوں گے۔ چونکہ دعوت و ہدایت کے مرکز کی حیثیت انہی گھروں کو حاصل تھی اس وجہ سے اس عبوری دور میں انہی گھروں کو عارضی طور پر قبلہ کی حیثیت دے دی گئی۔ بعد میں جب بنی اسرائیل نے ہجرت کی تو اس کے بعد سے بیت المقدس کی تعمیر تک ان کے ہاں قبلہ کی حیثیت اس تابوت کو حاصل رہی جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

اہل ایمان کے لیے بشارت — وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ اہل ایمان کو بشارت ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں ثابت قدم رہیں گے، نماز کا اہتمام رکھیں گے، اللہ ان کو تمام آزمائشوں میں ثابت قدم رکھے گا اور ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں فوز و فلاح عطا فرمائے گا۔ اس بشارت کا ذکر آیت ۲ میں گزر چکا ہے۔ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ (اور ایمان لانے والوں کو بشارت دو کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس عزت کی پائگاہ ہے) اور خاص بنی اسرائیل کے لیے یہ بشارت جس شکل میں ظاہر ہوئی اس کا ذکر آگے آیت ۹۳ میں ہوا ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (۸۸)

رسولوں کے مکذبین کے باب میں سنت الٰہی

یہ دعا حضرت موسیٰؑ نے اس وقت فرمائی ہے جب سارے جتن کر چکنے کے بعد وہ فرعون اور اس کی قوم کے ایمان سے مایوس ہو چکے ہیں۔ یہی مرحلہ ہے جس میں حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کے معاندین کے لیے ان الفاظ میں دعا کی ہے۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا
مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا ۚ
وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۚ ......
وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ
اِلَّا ضَلٰلًا ...... وَقَالَ
نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ
الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۚ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ
يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا
فَاجِرًا كَفَّارًا (۲۱-۲۷ - نوح)

نوحؑ نے دعا کی، اے میرے رب انھوں نے میری بات
رد کر دی اور اس کی پیروی کی جس کے مال اور اولاد نے
اس کے خسارے ہی میں اضافہ کیا اور انھوں نے بڑی بڑی
چال چلی ...... اور انھوں نے بہتوں کو گمراہ کر ڈالا
اور تو ان ظالموں کی ضلالت ہی میں اضافہ کر ......
اور نوحؑ نے دعا کی اے میرے رب، تو زمین پر
کافروں میں سے کسی کو چلتا پھرتا نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو
چھوڑے گا یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف
نابکاروں اور ناشکروں کو جنم دیں گے۔

یہ بات ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے اتمام حجت کے بعد اگر کوئی قوم ایمان نہیں لاتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اندر قبول حق کی ادنیٰ صلاحیت بھی باقی نہیں رہی ہے۔ اب اگر وہ خدا کی زمین پر باقی رہے تو دوسروں کی گمراہی کا ذریعہ تو ہو سکتی ہے لیکن اس کے اندر سے کسی خیر کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس وجہ سے سنت الٰہی یہ رہی ہے کہ جن قوموں پر کسی رسول کے ذریعہ سے حجت تمام ہوتی اس کے مکذبین ایک خاص حد تک مہلت دیے جانے کے بعد لازماً تباہ کر دیے گئے ہیں۔ اس دنیا کے اندر زندگی کی جو مہلت قوموں کو ملتی ہے وہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ملتی ہے، شر محض کی پرورش اس کائنات کے مزاج کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے یہ دعا اس وقت کی ہے جب ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ ان سرکشوں کی آنکھوں کی پٹی عذاب الٰہی کے سوا اب کوئی دوسری چیز نہیں کھول سکتی۔

رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ، عربی میں 'لِ' بسا اوقات کسی چیز کے اس انجام اور نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے جو اس سے ظہور میں آتا ہے یعنی تو نے ان کو جو مال و اسباب عطا فرمائے وہ ان کے لیے شکر گزاری کے بجائے طغیان و فساد کا سبب بنے اس وجہ سے، اے ہمارے رب، اب تو ان کو مزید مہلت نہ دے کہ یہ تیری خلق کو گمراہ کریں۔ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اور ان کے دلوں پر وہ پٹی باندھ

جس کو تیرا عذاب ہی گھیر لے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ کے رسولوں کو جھٹلانے والوں نے رسول کے تمام دلائل اور تمام نشانیوں سے آنکھیں بند کر کے ہمیشہ اس بات پر اصرار کیا ہے کہ جب تک ان کو وہ عذاب نہ دکھا دیا جائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے اس وقت تک وہ ایمان نہیں لانے کے۔ یہی مطالبہ فرعون اور اس کی قوم کا بھی تھا۔ ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر، ان کے ایمان سے کلیتہً مایوس ہو جانے کے بعد، حضرت موسیٰؑ نے ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے اسی چیز کی درخواست کی جس کے لیے وہ بضد تھے۔

قَالَ قَدْ أُجِيبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعَآنِّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۸۹)

جو دعا صحیح طریقہ اور ٹھیک وقت پر کی جاتی ہے اس کی قبولیت میں دیر نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ پر دعوت و اصلاح اور انذار و تبلیغ کی جو ذمہ داری عائد ہوتی تھی چونکہ وہ کما حقہٗ ادا ہو چکی تھی اس وجہ سے ان کی دعا قبول ہو گئی اور ان کو یہ ہدایت ہوئی کہ اب آگے کے مرحلہ میں ان سرکشوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ جو معاملہ کرنے والا ہے اس کو جی کڑا کر کے دیکھنا۔ ان کی درگت دیکھ کر ان کے لیے دل میں نہ کوئی نرمی و رأفت پیدا ہو، نہ ان کے حق میں کوئی کلمۂ سفارش کہنا اور نہ کسی پہلو سے اب ان کی چھوت تم کو یا تمہارے ساتھیوں کو لگنے پائے۔ یہ بعینہٖ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت حضرت نوحؑ کو، ان کی قوم کے باب میں فیصلۂ عذاب ہو جانے کے بعد کی گئی تھی جس کا ذکر سورۂ ہود میں یوں ہوا ہے۔ مکذبین پر ہلاکت کی بددعا

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ مُّغْرَقُونَ (۳۷ - ھود)	اور کشتی بناؤ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق اور ان ظالموں کے باب میں اب ہم سے کچھ نہ کہیو۔ یہ لازماً غرق کیے جائیں گے۔

بعینہٖ اسی قسم کے سیاق و سباق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو یہ ہدایت کی گئی۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ (۱۱۲-۱۱۳ ھود)	پس جس طرح تمہیں حکم ملا ہے تم اور جن لوگوں نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے، جمے رہو اور سرکشی نہ کیجیو، بے شک وہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کو دیکھ رہا ہے اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہو جیو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ تم کو بھی دوزخ کا عذاب پکڑ لے اور تمہارے لیے اللہ کے مقابل میں کوئی مددگار نہ ہوگا، پھر تمہاری کوئی مدد نہ کی جائے گی۔

اس قسم کی تنبیہ کا مقصد درحقیقت اپنے گلے کے راعیوں کو ہوشیار و آگاہ کرنا ہوتا ہے کہ چوکنے رہو کہ تمہارے گلے کی کوئی بھیڑ اس گلے سے نہ جا ملے جس کی ہلاکت اب مقدر ہو چکی ہے اور جس پر اللہ کا عذاب بس آنے ہی والا ہے۔ اس قسم کے مواقع میں خطاب بظاہر پیغمبر سے ہوتا ہے لیکن کلام کا رخ، جیسا کہ دوسرے

مواقع میں ہم واضح کر چکے ہیں، دوسروں کی طرف ہوتا ہے چنانچہ ہود کی محولہ بالا آیات میں اس کی وضاحت بھی ہو گئی ہے کہ خطاب پہلے واحد سے ہوا، پھر صیغۂ جمع کا آگیا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ اٰۗلْــٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۔ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۹۰-۹۲)

بنی اسرائیل کی نجات کا خدائی اہتمام

'وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ ...... الاية' یہ خاص خدائی اہتمام میں بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دینے کی تعبیر ہے گویا کوئی کسی کو اپنے کندھے پر سوار کرا کے دریا پار کرا دے۔ اس کی شکل کیا ہوئی، یہ وال بحث طلب ہے۔ ہم اس سوال پر اس مقام میں بحث کریں گے جہاں قرآن نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ قدرت کے عجائب تصرفات میں سے ہے کہ جس مقام سے سمندر نے بنی اسرائیل کو خشک راستہ دیا اسی مقام سے گزرتے ہوئے فرعون اپنی فوجوں کے ساتھ غرق ہو گیا۔ فرعون کے اس تعاقب کو قرآن نے 'بغی' اور 'عدو' یعنی سرکشی اور تعدی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا یہ فعل یوں تو ہر پہلو سے سرکشی اور تعدی تھا لیکن اس کا یہ پہلو خاص طور پر یہاں قابل لحاظ ہے کہ ایک مدت کی کشمکش کے بعد فرعون نے خود بنی اسرائیل کو جانے کی اجازت دی تھی۔ اس اجازت کے بعد پیچھے سے ان پر فوجیں لے کر چڑھ دوڑنا ایک ایسی زیادتی تھی جو اس کی تمام زیادتیوں پر بازی لے گئی۔ ڈوبتے وقت فرعون کا اقرار توحید اس تصریح کے ساتھ کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ اس کی بے بسی کی کامل تصویر ہے جو فراعنہ اور متمردین پر اس وقت طاری ہوا کرتی ہے جب وہ خدا کی پکڑ میں آجاتے ہیں۔ اس وقت وہ ناک رگڑ رگڑ کے اس حقیقت کا اظہار و اعلان کرتے ہیں جس کا نام سننا بھی ان کو اس سے پہلے گوارا نہیں ہوتا۔

'اٰۗلْــٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ ..... الاية' یعنی اب ماننے جب ماننے کا وقت گزر گیا۔ اب مسلم بننے کا اقرار کرتے ہو درآنحالیکہ ساری زندگی فساد میں گزری! یہ ضروری نہیں کہ بات قولاً کہی گئی ہو بلکہ غالب یہ ہے کہ یہ صورت حال کی تصویر ہو۔

قدرت کے انتقام کی ایک نشانی

'فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ ... الاية' قدرت کے انتقام کی اس عظیم نشانی کے اندر ایک دوسری عظیم نشانی یہ ظاہر ہوئی کہ فرعون کی لاش کو سمندر نے قبول نہیں کیا بلکہ اس کو ایک نشان عبرت بنانے کے لیے باہر پھینک دیا اور یہ لاش بعد میں لوگوں کو مل بھی اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جو خدائی کا مدعی تھا اس کا انجام کیا ہوا ــــ مصر میں لاشوں کو ممی کر کے محفوظ کرنے کا رواج تھا اور ایک فرعون کی ممی کی ہوئی لاش قاہرہ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ اس لاش کے بارے میں اثریات کے ماہرین جا ہے اختلاف کریں کہ یہ اسی فرعون کی لاش ہے یا کسی اور کی۔ لیکن ان کے اٹکل پچو اندازوں کے

مقابل میں قرآن کا یہ چودہ سو سال پہلے کا بیان زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ اس طرح قدرت نے اس کی لاش کو عبرت کی ایک ایسی نشانی بنا دیا جو آج کے فرعونوں کے لیے بھی محفوظ ہے لیکن دیکھنے کے لیے آنکھوں کی ضرورت ہے اور اس دنیا میں عبرت پذیر آنکھوں سے زیادہ کم یاب کوئی شے بھی نہیں 'وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۹۳)

بنی اسرائیل پر اللہ کا انعام و احسان کی ناشکری

'تبویہ' کے معنی متمکن کرنے کے ہیں اور 'صدق' کی طرف اس کی اضافت اس کے اندر مزید قوت و استحکام کے اظہار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے دشمن کو پامال کیا اور بنی اسرائیل کو اپنے منتخب کردہ علاقے میں اقتدار و استحکام بخشا۔ یہ منتخب علاقہ، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں وضاحت ہو چکی ہے، اردن اور شام کا علاقہ ہے۔ 'وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ' سے علاقے کی زرخیزی و شادابی کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیلات تورات میں موجود ہیں اور قرآن نے بھی جگہ جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔

'فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ' اب یہ اس ناشکری اور ناسپاسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اتنے عظیم احسانات کے مورد ہونے کے بعد اللہ کے دین اور اس کی کتاب و شریعت کے معاملے میں یہود نے کی۔ انھوں نے اس کے اندر طرح طرح کے اختلافات پیدا کر کے پائی ہوئی حقیقت گم کر دی اور اسی سرگشتگی اور حیرانی میں پھر مبتلا ہو گئے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس اہتمام سے ان کو نکالا تھا۔ 'حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ' سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ وہ بدقسمت قوم ہے جس نے رات کی تاریکی میں نہیں بلکہ پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی اس وجہ سے سارا بارِ الزام اس کے اپنے ہی کندھوں پر ہے 'اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ ... الآیۃ' یہ دھمکی ہے یہود کو کہ آج انھوں نے اللہ کے دین کے معاملے میں جو دھاندلی مچائی ہے اور کتابِ الٰہی کی جن حقیقتوں پر پردہ ڈالا ہے سب کے فیصلے کے لیے اللہ نے ایک دن مقرر کر رکھا ہے۔ اس دن ان کا سارا کچا چٹھا ان کے سامنے آ جائے گا اور ہر شخص اپنے جرم کی نوعیت کے لحاظ سے اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے گا۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹۴-۱۰۹

خاتمۂ سورہ

آگے کا مضمون خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے مکذبین پر عتاب ہے کہ ان کی روش تمھیں کسی تردد میں نہ ڈالے۔ جو چیز تم پر اتاری گئی ہے اگر یہ لاخیرے قسم کے لوگ اس کی تکذیب کر رہے ہیں تو اس کا غم نہ کرو، ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو پہلے سے کتاب کے حامل رہے ہیں، ان سے پوچھو تو وہ اس حق کی تائید کریں گے۔

پیغمبر صلعم کو تسلی

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ یہ نہ خیال کرو کہ جو لوگ تمھاری تکذیب کر رہے ہیں اگر ان کو ان کے حسب منشا کوئی نشانی دکھا دی جائے تو یہ مومن بن جائیں گے۔ جو لوگ خدا کے قانون کی زد میں آئے ہوئے ہوں ان کو دنیا جہان کی نشانیاں دکھا دو پھر بھی وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ تاریخ میں صرف ایک مثال قوم یونس کی موجود ہے کہ وہ عذاب کے کنارے پہنچتے پہنچتے سنبھل گئی اور اس کے ایمان سے اس کو نفع پہنچا۔ اللہ تعالیٰ کو لوگوں کا ایمان لانا بہت محبوب ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنے ضمیر اور ارادے کی آزادی اور آفاق وانفس کی نشانیاں دیکھ کر ایمان لائیں۔ اس معاملے میں نہ وہ جبر کو پسند کرتا ہے اور نہ لوگوں کے مطالبۂ معجزات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جن کو نشانیاں مطلوب ہوں وہ آسمان وزمین کی نشانیوں پر غور کریں اور جن کو اس طرح کا کوئی عذاب مطلوب ہو جس طرح کے عذاب پچھلی قوموں پر آئے ان سے کہہ دو کہ اس کے لیے انتظار کرو میں بھی اس کا انتظار کر رہا ہوں۔

عقیدۂ توحید کا اعلان

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دو ٹوک الفاظ میں عقیدۂ توحید کا اعلان کرایا ہے اور یہ اعلان گویا دین کفر و شرک سے آخری برأت و بیزاری کا اعلان ہے تاکہ مشرکین آخری درجے میں سمجھوتے کی توقع سے مایوس ہو جائیں اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کر گزریں ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۴-۱۰۹

فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتٰبَ
مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٩٤﴾
وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخٰسِرِينَ ﴿٩٥﴾
إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ
كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٩٧﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ
فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ ۖ لَمَّا اٰمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ
الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ إِلٰى حِينٍ ﴿٩٨﴾ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ
لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۚ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُونُوا
مُؤْمِنِينَ ﴿٩٩﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَيَجْعَلُ
الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٠٠﴾ قُلِ انْظُرُوا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠١﴾ فَهَلْ
يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا
اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ
حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ع ۱۰ ۱۱ ۱۵
دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ
اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ښ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٤﴾ وَاَنْ اَقِمْ
وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٥﴾ وَلَا تَدْعُ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٦﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَ
اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَاۗدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ
عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٧﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَكُمُ الْحَقُّ
مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا
يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٨﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ
حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ښ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ ع ۱۱ ۲ ۱۶

ترجمۂ آیات ۹۴-۱۰۹

پس اگر تم شک میں ہو اس چیز کے باب میں جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے تو ان لوگوں سے پوچھو جو تم سے پہلے سے کتاب پڑھتے آ رہے ہیں۔ بے شک تم پر تمھارے رب کی طرف سے حق نازل ہوا ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو اور تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جیو جنھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی کہ تم بھی نامرادوں میں سے ہو جاؤ۔ بے شک جن لوگوں پر

تیرے رب کی بات پوری ہو چکی ہے وہ ایمان نہیں لانے کے خواہ ان کے پاس ساری ہی نشانیاں آجائیں جب تک وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ پس کیوں نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی کہ اس کا ایمان اس کو نفع دیتا بجز یونس کی قوم کے۔ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ان سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کے عذاب کو دور کر دیا اور ایک وقت تک ان کو کھانے بلسنے کا موقع دیا۔ ۹۸-۹۴

اور اگر تیرا رب چاہتا تو روئے زمین پر جتنے لوگ بھی ہیں سب ایمان قبول کر لیتے تو کیا تم لوگوں کو مجبور کر دگے کہ وہ مومن بن جائیں؟ اور کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ایمان لا سکے، مگر اللہ کے اذن سے۔ اور وہ گندگی لاد دیا کرتا ہے ان لوگوں پر جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۹۹-۱۰۰

ان سے کہو، آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ ہے اس کو دیکھو۔ اور نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو کچھ نفع نہیں پہنچاتے جو ایمان نہیں لانا چاہتے۔ یہ تو بس اس طرح کے دن کا انتظار کر رہے ہیں جس طرح کے دن لوگوں کو پیش آئے جو ان سے پہلے گزرے۔ کہہ دو، انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ پھر ہم نجات دے دیتے رہے ہیں اپنے رسولوں کو اور ایمان لانے والوں کو۔ ایسے ہی ہم پر حق ہے، ہم مومنوں کو نجات دیں گے۔ ۱۰۱-۱۰۳

کہہ دو، اے لوگو، اگر تم میرے دین کے باب میں شک میں ہو تو سن لو کہ میں ان کو نہیں پوجتا جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بلکہ میں اس اللہ کو پوجتا ہوں جو تم کو وفات دیتا ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں ایمان والوں میں سے بنوں۔ اور یہ کہ اپنا رخ یکسو ہو کر اطاعت کی طرف کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو۔ اور اللہ کے سوا ان چیزوں کو نہ پکارو جو نہ تم کو نفع پہنچاتیں نہ نقصان، اگر تم ایسا کرو گے تو بیشک تم ظالموں میں سے بن جاؤ گے۔ اور اگر اللہ تمھیں کسی تکلیف میں پکڑ لے تو اس

کے سوا کوئی نہیں جو اس کو دور کر سکے اور اگر وہ تمہارے لیے کوئی بھلائی چاہے تو کوئی اس کے فضل کو روکنے والا نہیں، وہ اس سے نوازتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے۔ اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۰۴-۱۰۷

کہہ دو، اے لوگو، تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس حق آگیا ہے تو جو ہدایت قبول کرے گا وہ اپنے ہی لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا تو اس کا وبال اسی پر آئے گا۔ اور میں تمہارے ایمان کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اور تم پیروی کرو اس چیز کی جو تم پر وحی کی جاتی ہے اور ثابت قدم رہو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ۱۰۸-۱۰۹

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكَ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۝ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۹۴-۹۵)

خطاب پیغمبر سے عتاب مکذبین پر

'فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ ...... الآیۃ' ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ خطاب بظاہر الفاظ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے لیکن اس میں جو عتاب مضمر ہوتا ہے اس کا رخ منکرین و مکذبین کی طرف ہوتا ہے، وہ اپنی ضد کے سبب سے چونکہ لائق خطاب نہیں رہ جاتے اس وجہ سے بات پیغمبر کو خطاب کر کے کہہ دی جاتی ہے۔ ایک سورج کی طرح واضح حق کی مخالفت پر بھی اگر یہود و نصاریٰ کے سارے ہی لوگ ایکا کر لیں تو اس بات کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک نیک نیت اور راستباز آدمی کے دل میں بھی وہ کچھ تردد پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے تردد سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ تنبیہ فرمادی گئی کہ ان مکذبین کا رویہ اس حق کے باب میں تمہیں کسی تردد میں نہ ڈالے جو اللہ نے تم پر اتارا ہے 'فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكَ' اگر یہ قرآن و کتاب سے ناآشنا لوگ اس نعمت کی ناقدری کر رہے ہیں تو اس کی پروا نہ کرو، جو لوگ پہلے سے کتاب کے حامل ہیں اور اس کو پڑھتے پڑھاتے ہیں ان سے پوچھو تو وہ اس کی تائید کریں گے۔ 'يَقْرَءُونَ' فعل یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اس سے اشارہ یہاں صالحین اہل کتاب کی طرف ہے جن کی تائید و تصدیق کا حوالہ قرآن نے جگہ جگہ دیا ہے۔ اس میں ان صالحین کی حوصلہ افزائی بھی ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اس حق کا لوگوں سے تعارف کرائیں،

جن سے وہ پہلے سے تعارف کی سعادت رکھتے ہیں۔

'فَلَا تَكُونَنَّ .... الایۃ' اس میں بھی خطاب پیغمبر سے ہے لیکن عتاب کا رخ جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کی طرف ہے۔

یہاں جس انداز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اسی انداز میں سورۂ ہود میں بھی تسلی دی گئی ہے۔ فرمایا ہے۔

أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ	کیا وہ جو اپنے رب کی بخشی ہوئی ایک واضح دلیل پر ہے،
شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ	اس کے بعد مزید برآں اس کی طرف سے ایک شاہد آتا ہے
إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ	اور اس کے پہلے سے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کی حیثیت
بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ	سے موجود ہے۔ یہی لوگ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور
فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ	جماعتوں میں سے جو بھی اس کا انکار کریں گے ان کا ٹھکانا جہنم
إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ	ہے تو تم اس کی طرف سے شک میں نہ پڑو۔ یہ تمھارے رب
لَا يُؤْمِنُونَ (۱۷ - ہود)	کی جانب سے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ (۹۶-۹۷)

ایک سنتِ الٰہی

'إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ ...... الایۃ' یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کا اشارہ پیچھے آیت ۳۳ میں گزر چکا ہے كَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (اسی طرح تیرے رب کی بات ان لوگوں پر پوری ہو چکی ہے جن لوگوں نے نافرمانی کی ہے، وہ ایمان نہیں لانے کے) یعنی جو لوگ حق واضح ہونے کے باوجود اندھے بہرے بنے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے جس کے بعد ان کو ایمان کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔

'وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ .... الایۃ' یعنی ایسے لوگوں کی آنکھیں کسی معجزے سے بھی نہیں کھلتیں خواہ انھیں کتنے ہی معجزے دکھا دیے جائیں۔ ایسے لوگ صرف اس عذاب کو دیکھ کر ایمان لاتے ہیں جو ان کا فیصلہ کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ ان پر نازل فرماتا ہے۔ لیکن عذاب کو دیکھ کر جو ایمان لایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر نہیں۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ (۹۸)

تاریخ کی روشنی میں پیغمبر صلعم کو تسلی

یہ تاریخ کی روشنی میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم سے پہلے جتنے بھی رسول آئے ان میں سے کسی رسول کی قوم کے لوگ بھی رسول پر اس وقت ایمان نہیں لائے جس وقت ایمان لانا نافع ہوا کرتا

ہے بلکہ اللہ کا عذاب دیکھ کر ایمان لائے جب ایمان لانا بے سود ہو جاتا ہے۔ صرف ایک مثال قوم یونس کی اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس قوم کے لوگ بے شک عذاب کی گرمی کے ظہور سے پہلے پہلے چوکنے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان لانے کی توفیق بخشی، یہ ایمان لائے اور ان کے ایمان سے ان کو نفع پہنچا کر اس عذاب سے یہ محفوظ رہے جس کے ظہور میں اب زیادہ دیر نہیں باقی رہ گئی تھی۔[1]

قریش کو ترہیب و ترغیب

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کے ساتھ اس میں قریش کے لیے بھی ترہیب و ترغیب ہے کہ اب تمہارا پیمانہ بھی لبریز ہوا چاہتا ہے۔ اگر تم جلد متنبہ نہ ہوئے تو وہی انجام دیکھو گے جو دنیا کی بہت سی قومیں دیکھ چکی ہیں۔ اب بھی موقع باقی ہے کہ تم ہلاکت کی اس عام راہ پر جانے کے بجائے قوم یونس کی روش اختیار کرو کہ تمہارا ایمان تمہارے لیے نافع ہو اور تم اس عذاب سے بچا لیے جاؤ جو تم پر منڈلا رہا ہے ـــــ

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم پر کوئی اس طرح کا فیصلہ کن عذاب نہیں آیا جس قسم کا عذاب عاد و ثمود وغیرہ قوموں پر آیا بلکہ آپ کی قوم کے وہ سارے لوگ آہستہ آہستہ داخلِ ایمان ہو گئے جن کے اندر کچھ صلاحیت تھی، صرف شریر قسم کے لوگ اس سے محروم رہے اور وہ مختلف قسم کے غزوات میں اہلِ حق کی تلواروں سے ختم ہو گئے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۹۹ - ۱۰۰)

پیغمبر صلعم کو مزید تسلی

'وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ ..... الاية' یہ بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ لوگوں کے ایمان نہ لانے سے تم پریشان نہ ہو، اللہ تعالیٰ کو لوگوں کا ایمان لانا بہت پسند ہے بشرطیکہ لوگ اپنی عقل اور اپنے ضمیر کی رہنمائی میں ایمان لائیں۔ اس معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے۔ اگر وہ جبر کو پسند فرماتا تو سارے ہی لوگوں کو مومن بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ تمہارا فرض صرف حق تبلیغ ادا کر دینا ہے۔ یہ کام تم نے کر دیا۔ اس کے بعد لوگ ایمان نہیں لاتے تو ذمہ داری تمہاری نہیں ہے، لوگوں کی اپنی ہے۔ اب خدا کے ہاں پرسش ان سے ہونی ہے نہ کہ تم سے۔ تمہارا کام یہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو لازماً ایمان کے راستہ پر چلا ہی دو۔

ایمان کے باب میں سنت الٰہی

'وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ ..... الاية' ایمان لانے اور نہ لانے کے باب میں جو سنت الٰہی ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ جو بھی ایمان لاتا ہے وہ اللہ کے حکم اور اس کی توفیق سے ایمان لاتا ہے اور یہ توفیق ان کو حاصل ہوتی ہے جو اللہ کی بخشی ہوئی عقل اور سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے ان کی بصیرت پر اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کی نجاست مسلط کر دیتا ہے جو ان کو بالکل اندھا بنا کر چھوڑ دیتی ہے اور وہ اپنی خواہشات نفس کے پیچھے ہی بھٹکتے پھرتے ہیں۔

---

[1] حضرت یونس علیہ السلام کے اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے جانے کے واقعہ کی طرف یہاں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہم بھی اس سے یہاں بحث نہیں کرتے۔ اس کے محل میں انشاء اللہ ہم اس کی نوعیت واضح کریں گے۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ۝
فَهَلْ یَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَیَّامِ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ۝
ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۰۱-۱۰۳)

مطالبۂ معجزات کا جواب

'قُلِ انْظُرُوْا ..... الاٰیۃ' یہ کفار کے مطالبۂ معجزات کا جواب دلوایا ہے کہ آسمان و زمین معجزات اور نشانیوں سے بھرے پڑے ہیں ان سے کہو کہ معجزات کی طلب ہے تو ان نشانیوں اور معجزات کو دیکھو، یہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔ اس کے بعد وضاحت فرما دی کہ نشانیاں اور ڈراوے انھی لوگوں کو نفع دیتے ہیں جن کے اندر ان سے نفع اٹھانے کا ارادہ پایا جاتا ہے۔ جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کو کوئی نشانی اور کوئی ڈراوا بھی نفع نہیں پہنچاتا۔ 'یُؤْمِنُوْنَ' فعل یہاں ارادۂ فعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور 'نُذُر' سے مراد خاص طور پر وہ نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ لوگوں کے اندر اپنا خوف پیدا کرنے کے لیے ظاہر فرماتا ہے۔

'فَهَلْ یَنْتَظِرُوْنَ ...... الاٰیۃ' یعنی آفاق و انفس کے اندر پھیلی ہوئی نشانیوں کے اندر انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ تو اس قسم کے کسی فیصلہ کن عذاب کے منتظر ہیں جس قسم کے فیصلہ کن عذاب عاد و ثمود وغیرہ قوموں پر آ چکے ہیں۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر اس قسم کے کسی عذاب کا انتظار ہے تو انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ یعنی اس قسم کے کسی عذاب کا لانا میرے اختیار کی بات نہیں ہے۔ یہ اللہ ہی کے اختیار کی بات ہے۔ البتہ اس کے قرائن و آثار تمھارے اندر جمع ہوتے دیکھ رہا ہوں اس وجہ سے تم بھی اس کا انتظار کرو، میں بھی اس کا انتظار کرتا ہوں۔

قریش کو تنبیہ

'ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ..... الاٰیۃ' اب یہ اس عذاب کا نتیجہ بتا دیا کہ کوئی اس کو بچوں کا کھیل نہ سمجھے، جب ہم اس قسم کا فیصلہ کن عذاب بھیجتے ہیں تو پھر اس سے نجات ہمارے رسول اور ان پر ایمان لانے والے ہی پاتے ہیں باقی سب اس کی لپیٹ میں آکر فنا ہو جاتے ہیں 'كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ' یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ یہ جو سنتِ الٰہی بیان ہوئی ہے اب اس کی زد میں تم بھی ہو، اسی طرح ہم پر حق ہے کہ ہم تمھارے معاملے میں بھی کریں اور ان لوگوں کو نجات دیں جو ایمان لائے ہیں۔

ہم دوسرے مقام میں یہ ذکر کر چکے ہیں کہ رسولوں کے مکذبین پر جب آخری فیصلہ کن عذاب آتا ہے تو اللہ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والے لازماً اس سے بچا لیے جاتے ہیں، صرف وہ لوگ اس کی زد میں آتے ہیں جو رسول کی تکذیب کرنے والے ہوتے ہیں۔ البتہ یہ یاد رہے کہ یہ ضابطہ صرف فیصلہ کن عذاب سے متعلق ہے۔ عام آزمائشیں جو محض تذکیر کے لیے ظاہر ہوتی ہیں وہ مومن و کافر سب کے لیے یکساں ہوتی ہیں البتہ مومن اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کافر ان سے اپنے اوپر صرف اللہ کی حجت تمام کراتے ہیں۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ

حَنِیْفًا ج وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ہ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ج فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ہ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ج وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ط يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ط وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۱۰۴-۱۰۷)

آخری فیصلہ کن اعلان

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ .... یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آخری فیصلہ کن اعلان کرایا جا رہا ہے تاکہ کفار کے ذہن کے کسی گوشے میں اگر کوئی طمع خام اس قسم کا ہو کہ دباؤ ڈال کر آپ کو کچھ نرم کیا جا سکتا ہے تو وہ اس کو اپنے ذہن سے نکال دیں اور جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں وہ کر گزریں۔ اس قسم کا اعلان آخری مرحلے میں تمام انبیاء سے ماثور ہے اور یہ درحقیقت قوم سے رسول کا اعلان براءت ہوتا ہے جس کے بعد ہجرت کا مرحلہ آجاتا ہے۔ اَلَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ کی صفت کا حوالہ یہاں بطور تنبیہ و تذکیر ہے یعنی وہی خدا جو تمھیں وفات دیتا ہے اور جس کے آگے جواب دہی کے لیے لازماً تمھیں حاضر ہونا ہے۔ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی مجھے جو حکم ملا ہے وہ یہی ہے کہ میں مومن و موحد بنوں اس سے قطع نظر کہ تم کیا روش اختیار کرتے ہو۔

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ ...... الاٰیۃ یہ اوپر والی بات ہی کی مزید وضاحت ہے۔ ایمان کی اصل خصوصیت اللہ واحد کی طرف یکسوئی اور شرک کے تمام شوائب سے پورا پورا اجتناب ہے۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ .... الاٰیۃ۔ یہ شرک کے باطل ہونے کی دلیل ہے کہ جب اذن الٰہی کے بغیر کوئی چیز نفع پہنچا سکتی ہے نہ ضرر تو اللہ کے سوا دوسری چیزوں کو پکارنا اپنے نفس پر بھی بہت بڑا ظلم ہے اور یہ خدا کے بھی سب سے بڑے حق کو تلف کرنا ہے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ ... الاٰیۃ۔ اوپر والی بات ہی کی وضاحت ایک دوسرے اسلوب سے جس سے ان تمام تصورات کی نفی ہو جاتی ہے جن کی بنا پر مشرکین شرکاء و شفعاء کو پوجتے تھے۔ آخر میں غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ کی صفات کے حوالے سے مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جب خدا خود مغفرت فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے تو بندے اسی کے دامن رحمت میں پناہ لیں، دوسروں کا سہارا کیوں ڈھونڈیں!

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ج فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ج وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ج وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ (۱۰۸)

آخری تنبیہ

خطاب ہر چند باعتبار الفاظ عام ہے لیکن روئے سخن قریش ہی کی طرف ہے جن سے اوپر سے خطاب چلا آرہا ہے۔ یہ گویا اس سلسلہ کی آخری تنبیہ ہے کہ یہ جو کچھ تمھارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے یہ تمھارے رب کی طرف سے ہے اور بالکل حق ہے۔ جو تعلیم تمھیں دی جا رہی ہے یہ بھی حق ہے اور دنیا اور آخرت میں اس کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب کی خبر دی جا رہی ہے وہ بھی شدنی ہے تو اچھی طرح کان کھول کے سن لو کہ جو اس حق کو قبول کرے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا، اور جو اس کے بعد بھی بھٹکتا رہے گا تو اس بھٹکنے کا وبال اسی کے سر پڑے گا۔ کسی دوسرے کے سر نہیں جائے گا۔ اور یہ بھی سن لو کہ میرے اوپر جو ذمہ داری ہے وہ بس اس حق

کو پہنچا دینے کی ہے۔ اس کو تم سے منوا لینے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ (۱۰۹)

پیغمبرؐ کو آخری ہدایت

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سلسلہ کی آخری ہدایت ہے کہ مخالفین کے رویہ سے قطع نظر کرکے اس وحی کی تم پیروی کرو جو تم پر کی جا رہی ہے اور یہ مخالفین خواہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو جائے۔ اس فیصلہ کی طرف اشارہ اوپر آیت ۱۰۳ میں گزر چکا ہے کہ بالآخر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں اور اہل ایمان کو کامیابی عطا فرماتا ہے اور ان کے مخالفین رسوا و نامراد ہوتے ہیں۔

اس سورہ کی تفسیر میں یہ آخری سطریں ہیں جو اس بے بضاعت کے قلم سے سپرد قرطاس ہوئیں۔ جو باتیں قلم سے صحیح نکلی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نکلی ہیں اور جو باتیں کمزور یا غلط ہیں وہ میری کم علمی کا نتیجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

لاہور

۱۴ر نومبر ۱۹۶۹ء

۴ر رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ

تدبّرِ قرآن

١١

هود

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس پورے گروپ کے عمود اور اس کے مطالب پر ایک جامع تبصرہ ہم سورہ یونس کی تمہید میں پیش کر چکے ہیں۔ یہ سورہ چونکہ ہمارے اصول سے سورۂ یونس ہی کا مثنیٰ ہے اس وجہ سے نفس عمود میں دونوں کے درمیان کچھ ایسا فرق نہیں ہے، البتہ اجمال و تفصیل اور بحث و استدلال کے اعتبار سے دونوں کا نہج الگ الگ ہے۔ سورۂ یونس میں جو باتیں بالاجمال بیان ہوئی تھیں، مثلاً پچھلی قوموں کی سرگزشتیں ـــــــ وہ اس سورہ میں تفصیل سے بیان ہوئی ہیں اور اس حقیقت کی طرف اس کی پہلی ہی آیت نے اشارہ بھی کر دیا ہے۔ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ (یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں، پھر خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی) ان دونوں کا قرآنی نام بھی ایک ہی یعنی 'الٓرٰ' ہے اور یہ بات ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ سورتوں کے نام میں اشتراک ان کے مطالب کے اشتراک پر دلیل ہے۔

عمود کے متعلق یہ اشارہ کافی ہے۔ اب ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں جس سے پوری سورہ بحیثیت مجموعی نگاہ کے سامنے آجائے گی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) پہلے بطور تمہید قرآن کی یہ خصوصیت واضح کی گئی ہے کہ لوگوں کی تربیت و تعلیم کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر اللہ تعالیٰ نے اس کو اس شکل میں اتارا ہے کہ پہلے صرف اصولی اور بنیادی باتیں، گٹھے ہوئے الفاظ میں اجمال و اختصار کے ساتھ، بیان ہوئیں، پھر بتدریج وہ تفصیل کے قالب میں آئیں۔ اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس کتاب کے پیغام کی وضاحت فرمائی کہ یہ اللہ واحد کی بندگی اور استغفار و توبہ کی دعوت ہے اور میں اللہ کی طرف سے بشیر و نذیر ہو کر آیا ہوں کہ جو لوگ استغفار کر کے اللہ واحد کی طرف رجوع کر لیں گے اللہ ایک مقررہ مدت تک ان کو زندگی کی نعمتوں سے بہرہ مند اور اپنے فضل سے متمتع کرے گا اور جو لوگ اس سے اعراض کریں گے ان کے لیے ایک بڑے عذاب کا دن سامنے ہے۔ دنیا میں بھی اور

آخرت میں بھی۔

(۵-۶) ان لوگوں کی حالت پر اظہار افسوس جن کے دل تو یہ گواہی دے رہے ہیں کہ پیغمبر کا ڈراوا بالکل حق ہے لیکن اس کے باوجود وہ حقیقت کا سامنا کرنے سے اس طرح گریز کر رہے ہیں گویا وہ اپنے آپ کو خدا سے چھپا رہے ہیں حالانکہ خدا سے کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہتی، وہ پوشیدہ و علانیہ ہر چیز سے باخبر اور سینوں کے بھیدوں سے بھی آگاہ ہے۔ وہی سب کو رزق پہنچاتا ہے۔ اس کو ہر ایک کے مستقر و مدفن کا پتہ ہے۔ ہر چیز اس کے رجسٹر میں درج ہے۔

(۷-۱۱) جزا و سزا کے منکرین اور عذاب کے مذاق اڑانے والوں کو تنبیہ کہ یہ دنیا بازیچۂ اطفال نہیں ہے۔ اللہ نے اس کو اس لیے بنایا ہے کہ وہ دیکھے کہ لوگ کیسا عمل کرتے ہیں۔ مجرموں کو جو مہلت وہ دیتا ہے اس سے دلیر ہو کر شریر لوگ پیغمبر کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں کہ اس نے محض دھونس جمانے کے لیے عذاب کی دھمکی دی تھی۔ انسان کا حال عجیب ہے کہ جب خدا کی پکڑ میں آجاتا ہے تب تو بالکل مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہے لیکن جب خدا اس کو ڈھیل دے دیتا ہے تو اکڑنے اور شیخی بگھارنے لگتا ہے۔ تھوڑے لوگ ایسے نکلتے ہیں جو مصیبت میں صبر کی اور نعمت میں شکر کی روش اختیار کرتے ہیں۔ انہی کے لیے خدا کے ہاں مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

(۱۲-۱۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حوصلہ افزائی کہ تم مخالفین کے استہزا اور مطالبۂ معجزات سے دل شکستہ نہ ہو۔ تم ایک منذر ہو۔ اپنا فرض انذار ادا کرو، خدا سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے۔ اگر یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن تمہارا گھڑا ہوا ہے تو ان سے کہو کہ وہ دس سورتیں ایسی ہی گھڑی ہوئی لا کر دکھا دیں اور اس کام میں وہ اپنے شریکوں کی مدد بھی حاصل کر لیں جن کو یہ خدا کے سوا پوجتے ہیں۔ اگر ان کے شرکا اس کام میں ان کی مدد نہ کر سکیں تو پھر یہ مانیں کہ یہ خدا کی اتاری ہوئی چیز ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ان لوگوں کو اگر یہ گھمنڈ ہے کہ دنیاوی اعتبار سے تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے مقابل میں ان کا حال بہتر ہے تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا کے طالبین کو اللہ سب کچھ اسی دنیا میں پورا کر دیتا ہے، آخرت میں ان کے لیے دوزخ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

(۱۷-۲۴) قرآن کی دعوت کو قبول کرنے والوں اور اس سے اعراض کرنے والوں کے ذہنی فرق و اختلاف کی وضاحت۔ ایمان صرف وہ لوگ لائیں گے جن کی فطرت مسخ ہونے سے محفوظ ہو۔ وہ قرآن کی آواز کو اپنے دل کی آواز سمجھیں گے۔ اس سے پہلے موسیٰ کو جو کتاب دی گئی وہ بھی ان کے لیے ایک تائید مزید فراہم کرے گی۔ رہے وہ لوگ جن کی اپنی فطرت کا نور بجھ چکا ہو وہ دوزخ کی آگ ہی دیکھ کر قائل ہوں گے تو ان کی مخالفت تمہیں اپنے موقف کے بارے میں کسی تردد میں نہ ڈالے۔ ان لوگوں سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جنھوں نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے اور اس جھوٹ کے ذریعہ سے لوگوں کو اللہ کے راستے

سے روک رہے ہیں، یہ خدا کے قابو سے باہر نہیں ہیں۔ لیکن خدا اس لیے انھیں ڈھیل دے رہا ہے کہ آخرت میں ساری کسر پوری ہو جائے گی۔ فلاح صرف ان لوگوں کو حاصل ہوگی جنھوں نے اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دیا اور ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کی۔ ان دونوں گروہوں کی تمثیل ایسی ہے کہ ایک گروہ اندھوں بہروں کا ہو اور دوسرا چشم و گوش رکھنے والوں کا۔ کیا یہ دونوں یکساں ہوں گے؟

(۲۵-۴۹) حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا ہے کہ جس بشارت و انذار کے ساتھ تم اپنی قوم کے پاس آئے ہو بعینہٖ اسی انذار و بشارت کے ساتھ اللہ نے نوحؑ کو ان کی قوم کے پاس بھیجا تھا۔ ان کی قوم کے سرغنوں نے بھی بعینہٖ اسی طرح کی باتیں بنائیں جس طرح کی باتیں تمھاری قوم کے لوگ بنا رہے ہیں۔ بالآخر ان پر اللہ کا عذاب آیا اور وہ غرق کر دیے گئے۔ آخر میں اس کا خلاصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان لفظوں میں رکھا گیا ہے۔ 'فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ' (پس جمے رہو، انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے) یعنی اگر تمھاری قوم کے لوگ بھی سرکشی سے باز نہ آئے تو اسی طرح کا روزِ بد یہ بھی دیکھیں گے۔ خدا تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو بہر حال سرخرو کرے گا، اگر تم تمام مخالفتوں کے علی الرغم اپنی دعوت میں ثابت قدم رہے۔

(۵۰-۶۰) قوم عاد کی سرگزشت۔ انھوں نے بھی اپنے پیغمبر ہودؑ کے ساتھ اسی قسم کی روش اختیار کی جس قسم کی روش قوم نوحؑ نے نوحؑ کے ساتھ اور قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اختیار کی۔ بالآخر یہ بھی اپنے کیفر کردار کو پہنچے اور ہود علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سرخرو کیا۔ اس سرگزشت کے سنانے سے بھی مقصود قریش کو تاریخ کے آئینہ میں ان کا انجام دکھا دینا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔

(۶۱-۶۸) قوم ثمود اور حضرت صالحؑ کی سرگزشت جس سے بعینہٖ وہی حقیقت واضح ہوتی ہے جو اوپر کی سرگزشتوں سے واضح ہوتی ہے۔

(۶۹-۸۳) قوم لوطؑ کی سرگزشت اسی مضمون کی تائید کے لیے جو اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ اس سے ضمناً یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قریش جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرشتے اتارنے کا مطالبہ کر رہے ہیں یہ اپنی شامت بلانے کا سامان کر رہے ہیں۔ فرشتوں کا آنا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتا، یہ جب آتے ہیں تو کسی عظیم خدائی مہم پر آتے ہیں۔ ان کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ جیسے عظیم پیغمبر نے جب یہ محسوس کیا کہ ان کے پاس فرشتے آئے ہیں تو ان کا دم خشک ہو گیا اور اس وقت تک انھوں نے اطمینان کا سانس نہیں لیا جب تک ان کی پیش نظر مہم کی نوعیت ان کے سامنے واضح نہیں ہو گئی۔

(۸۴-۹۵) اہل مدین اور حضرت شعیبؑ کی سرگزشت۔

(۹۶-۹۹) حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کی طرف سرسری اشارہ۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت پچھلی سورہ میں تفصیل سے گزر چکی تھی اس وجہ سے اس سورہ میں اس کی طرف صرف اشارہ فرما دیا۔

(۱۰۰-۱۲۳) خاتمۂ سورہ جس میں ان سرگزشتوں کو سنانے سے جو مقصد ہے اس کو واضح فرمایا ہے۔ پھر ان سے جو نتائج و حقائق نکلتے ہیں ان کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ضروری ہدایات دی ہیں۔ قریش کو اپنے ملک کی تاریخ سے سبق لینے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنے کے لیے تنبیہ فرمائی ہے۔

مضامین سورہ کے اس تجزیہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہو جائے گا کہ پوری سورہ ایک معین مقصد پر نہایت جامع اور مربوط خطبہ ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر، اپنے طریقہ کے مطابق، سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وماتوفیقی الا باللہ۔

سُوْرَةُ هُوْدٍ (١١)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ١٢٣

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۲۴

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝١
اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝٢ وَّاَنِ
اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا
اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ
اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝٣ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰي
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٤ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ۭ
اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ
اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝٥ وَمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا
عَلَي اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ
مُّبِيْنٍ ۝٦ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ
وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَي الْمَاۗءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَلَىِٕنْ قُلْتَ
اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ

إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۷﴾ وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ
لَّيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ
ع ۱ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿۸﴾ وَلَئِنْ أَذَقْنَا
الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ ۚ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ ﴿۹﴾
وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ
عَنِّي ۚ إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ ﴿۱۰﴾ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿۱۱﴾ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ
إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ كَنزٌ
أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ ۚ إِنَّمَا أَنتَ نَذِيرٌ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴿۱۲﴾
أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا
مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۳﴾ فَإِلَّمْ
يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا
هُوَ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿۱۴﴾ مَن كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا
نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ﴿۱۵﴾ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَ
بَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۶﴾ أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ
شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ
يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ

فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ أُولٰٓئِكَ
يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْأَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى
رَبِّهِمْ ۚ أَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ أُولٰٓئِكَ لَمْ
يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ۘ وقف لازم
يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا
يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا أَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾
إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَأَخْبَتُوْٓا إِلٰى رَبِّهِمْ ۙ أُولٰٓئِكَ
أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْأَعْمٰى
وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۚ أَفَلَا
تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ ع ۲ ۱۲ ۲

ترجمۂ آیات ۱-۲۴

یہ الٓرٰ ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ میں تمھارے لیے اس کی طرف سے ہوشیار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں، اور یہ کہ تم اپنے رب سے مغفرت چاہو، پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم کو ایک وقت معین تک اچھی طرح بہرہ مند کرے گا اور ہر مستحق فضل کو اپنے فضل سے نوازے گا۔ اور اگر تم منہ موڑو گے تو میں تم پر ایک

ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کا پلٹنا ہے اور وہ ہر
چیز پر قادر ہے۔ ۱-۴

ذرا دیکھو، یہ اپنے سینے موڑتے ہیں کہ اس سے چھپ جائیں۔ آگاہ ہو، یہ اس وقت بھی
اس کی نظر میں ہوتے ہیں جب اپنے اوپر کپڑے لپیٹتے ہیں۔ وہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں
اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ تو سینوں کے بھیدوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے۔ اور زمین کے ہر جاندار
کا رزق اللہ ہی کے ذمہ ہے۔ اور وہ جانتا ہے اس کے مستقر اور مدفن کو۔ ہر چیز ایک واضح رجسٹر
میں درج ہے۔ ۵-۶

اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں اور اس کا عرش پانی پر
تھا تاکہ تمھیں جانچے کہ کون اچھے عمل والا ہے اور اگر تم کہتے ہو کہ مرنے کے بعد تم لوگ اٹھائے
جاؤ گے تو یہ کافر کہتے ہیں کہ یہ تو بس کھلا ہوا جادو ہے اور اگر ہم ان سے عذاب کو کچھ مدت کے
لیے ٹالے دیتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ اس کو کیا چیز روکے ہوئے ہے! آگاہ کہ جس دن وہ ان پر آ
دھمکے گا تو ان سے ٹالا نہ جا سکے گا اور جس چیز کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں وہ ان کو آگھیرے گی۔
اور اگر ہم انسان کو اپنے کسی فضل سے نوازتے ہیں پھر اس سے اس کو محروم کر دیتے ہیں تو وہ
مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے اور اگر کسی تکلیف کے بعد، جو اس کو پہنچی اس کو نعمت سے نوازتے
ہیں تو کہتا ہے میری مصیبتیں دفع ہوئیں اور وہ اکڑنے والا اور شیخی بگھارنے والا بن جاتا ہے۔
صرف وہ اس سے مستثنیٰ ہیں جو صبر کرنے والے اور نیک عمل کرنے والے ہیں۔ انہی کے لیے
مغفرت اور بڑا اجر ہے۔ ۷-۱۱

شاید اس چیز کا کچھ حصہ تم چھوڑ دینے والے ہو جو تم پر وحی کی جا رہی ہے اور اس سے تمھارا

سینہ بھنچ رہا ہے کہ وہ کہیں گے کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا۔ تو تم بس ایک ہوشیار کر دینے والے ہو اور ہر چیز اللہ کے حوالے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ ان سے کہو کہ پھر تم ایسی ہی دس سورتیں گھڑی ہوئی لاؤ اور اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکو ان کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔ پس اگر وہ تمہاری مدد کو نہ پہنچیں تم سمجھ لو کہ یہ اللہ ہی کے علم سے اترا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو کیا اب تم مانتے ہو؟ ۱۲-۱۴

جو دنیا کی زندگی اور اس کے سر و سامان کے طالب ہوتے ہیں ہم ان کے اعمال کا بدلہ یہیں چکا دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور جو کچھ انھوں نے کیا کرایا ہے سب حبط ہو جائے گا اور باطل ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ ۱۵-۱۶

کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک برہان پر ہے، پھر اس کے بعد اس کی طرف سے ایک گواہ بھی آ جاتا ہے اور اس کے پہلے سے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کی حیثیت سے موجود ہے اور وہ جو نورِ بصیرت سے محروم ہیں، دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ اس پر ایمان تو وہی لوگ لائیں گے اور جماعتوں میں سے جو اس کا انکار کریں گے ان کا موعود ٹھکانا بس دوزخ ہے پس تم اس کے باب میں کسی شک میں نہ پڑو، یہی تمہارے رب کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں مانتے اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑیں۔ ان لوگوں کی پیشی ان کے رب کے سامنے ہوگی اور گواہ گواہی دیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب پر جھوٹ بولے ہیں۔ آگاہ کہ اللہ کی لعنت ہے ان ظالموں پر جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے

ہیں اور آخرت کے یہی لوگ منکر ہیں۔ یہ زمین میں خدا کے قابو سے باہر نہیں اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہے، ان پر دونا عذاب ہوگا۔ یہ نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھتے ہی تھے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو انھوں نے گھڑ رکھے تھے سب ہوا ہو جائیں گے۔ لازماً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں خسارے میں ہوں گے۔ باقی رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور جو اپنے رب کی طرف جھک پڑے تو وہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ دونوں فریقوں کی تمثیل ایسی ہے کہ ایک اندھا اور بہرا ہو اور ایک دیکھنے والا اور سننے والا۔ کیا دونوں کا حال ایک جیسا ہو جائے گا؟ کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے۔ ۱۷-۲۴

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِيْ
لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ اِلَى اللّٰهِ
مَرْجِعُكُمْ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱-۴)

آیاتِ قرآن میں اجمال اور تفصیل

'الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ...... الاية'۔ 'الٓرٰ' اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ یہی نام پچھلی سورہ کا بھی ہے اور یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ عمود و مضمون کے اعتبار سے دونوں سورتیں باہم ملتی جلتی ہیں چنانچہ آگے آپ دیکھیں گے کہ ان دونوں میں فرق صرف اجمال و تفصیل کا ہے۔ پچھلی سورہ میں جو پہلو مجمل رہ گئے تھے وہ اس میں وضاحت سے سامنے آگئے ہیں۔ یہ فرق یوں تو ہر پہلو میں نمایاں ہے لیکن خاص طور پر واقعات کے بیان میں یہ فرق بہت زیادہ نظر آئے گا۔ اجمال کے بعد تفصیل کا یہ طریقہ، جو قرآن نے اختیار کیا ہے، یہ صرف تنوع کی خاطر نہیں اختیار کیا ہے بلکہ تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے نقطۂ نظر سے یہی طریقہ مفید اور بابرکت ہے۔

'احکام' کا مفہوم

'احکام' کے معنی کسی چیز کو اچھی طرح گانٹھنے اور مضبوط کرنے کے ہیں۔ کپڑا خوب ٹھونک کر گف بنا جائے تو یہ لفظ اس کے لیے بھی آئے گا۔ قرآنی آیات کے لیے اس لفظ کے استعمال سے مقصود اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ قرآن کی تعلیمات پہلے گٹھے ہوئے، مختصر اور جامع جملوں کی شکل میں نازل ہوئیں، پھر بالتدریج وہ

واضح اور مفصل ہوتی گئیں۔ چنانچہ مکہ کے ابتدائی دور میں جو سورتیں نازل ہوئیں وہ اختصار، جامعیت اور اعجاز بیان کا کامل نمونہ ہیں۔ دین کی بنیادی باتیں مختصر گٹھے ہوئے جملوں میں دریا بکوزہ کی شان میں ہیں۔ بعد میں آہستہ آہستہ ان پر تفصیل کا رنگ آیا یہاں تک کہ مدنی دور میں آکر دین کی وہی بنیادی باتیں ایک جامع اور ہمہ گیر نظام زندگی کی شکل میں نمایاں ہوگئیں۔ اس چیز کا حوالہ دینے سے مقصود اس اہتمام خاص کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ہے جو ان کی تعلیم و تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں ملحوظ رکھا ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ تورات کے معاملے میں ترتیب و تدریج اور احکام و تفصیل کا یہ اہتمام نہیں ہوا بلکہ اس کا بیشتر حصہ یکدفعہ نازل ہوگیا۔ آخر میں حکیم و خبیر کی صفات کا حوالہ ہے اس لیے کہ خدائے حکیم ہی جان سکتا تھا کہ وہ حکمت کے خزانوں کو کس طرح مختصر لفظوں میں بند کرے اور پھر خدائے خبیر ہی کی یہ شان تھی کہ وہ کھول کر دکھانے کہ ایک کوزے میں کتنے دریا اور کتنے سمندر بند ہیں۔

قرآن کا بنیادی پیغام

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ...... الآیۃ۔ یہ اس کتاب کا بنیادی پیغام ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ یہی پیغام تمام دین و شریعت کی اصل ہے۔ اللہ کے رسول ہمیشہ اسی پیغام کے ساتھ بشیر و نذیر بن کر آئے۔ انھوں نے اس پیغام کے قبول کر لینے والوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کی بشارت دی اور جو لوگ اس سے اعراض کریں ان کو ایک ہولناک عذاب سے ڈرایا۔ چنانچہ انذار و بشارت کا یہی فریضہ اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہوا تھا۔

بشارت

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ، یہ بشارت کا پہلو مذکور ہوا ہے کہ اپنے رب سے مغفرت مانگو اور اس کی طرف رجوع کرو تو اللہ تعالیٰ ایک مدت معینہ تک اس دنیا میں تم کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کرے گا اور ہر مستحق فضل کو خاص اپنے فضل سے نوازے گا۔

انذار

وَاِنْ تَوَلَّوْا ...... الآیۃ۔ یہ انذار کا پہلو بیان ہوا ہے کہ اگر اس دعوت سے منہ موڑو گے تو ایک ہولناک دن کے عذاب سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہو۔ اس عذاب سے وہ عذاب مراد ہے جو رسول کی تکذیب کرنے والوں پر لازماً آتا ہے۔ رسول کے مان لینے والوں کو زندگی کی مہلت ملتی ہے اور کامیابی نصیب ہوتی ہے جو اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک لوگ صحیح راستہ پر استوار رہتے ہیں لیکن رسول کے مکذبین اتمام حجت کی مہلت گزر جانے پر کسی ہولناک عذاب کے ذریعے سے یک قلم ختم کر دیے جاتے ہیں۔

توبہ کے دو رکن

اس آیت سے توبہ کے متعلق بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس کے دو اہم رکن ہیں۔ ایک استغفار دوسرا توبہ۔ استغفار تو یہ ہے کہ آدمی اپنے جرم کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور اس سے آئندہ باز رہنے کا عہد کرے اور توبہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کرے اور اس صحیح راہ کو اختیار کرے جس کی طرف اللہ نے رہنمائی فرمائی ہے۔ اگر آدمی جرم سے باز نہ آئے اور صحیح روش اختیار نہ کرے تو زبان سے لاکھ توبہ توبہ کرے اس کی توبہ محض مذاق ہے۔

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ... الآیۃ۔ اوپر مکذبین رسول کے لیے جس عذاب کا ذکر ہے اس کا تعلق اس دنیا سے ہے۔ اب یہ آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے کہ اس کے بعد تمھاری واپسی خدا کی طرف ہونی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ 'وہ ہر چیز پر قادر ہے' کے ابہام کے اندر جو تخویف ہے وہ کسی تصریح کے اندر نہیں سما سکتی۔

اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ۭ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۵)

مکذبین کے تکبر کی تصویر

'ثنی' کے معنی پھیرنے، موڑنے اور لپیٹنے کے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ آدمی جب کسی بات کو غرور اور نفرت کے سبب سے سننا نہیں چاہتا تو مونڈھے جھٹک کر اور سینہ موڑ کر وہاں سے چل دیتا ہے۔ اسی حالت کو سورہ حج آیت ۹ میں 'ثانی عطفہ' سے تعبیر فرمایا ہے اور یہاں 'يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ' سے۔ اسی چیز کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ آدمی اپنی چادر سنبھالتا اور اپنے اوپر لپیٹتا اور چل دیتا ہے اس کو 'استغشاء ثیاب' سے تعبیر فرمایا ہے۔ مثلاً سورہ نوح آیت ۷ میں ہے 'وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا' (اور میں نے جب جب ان کو دعوت دی کہ تو ان کی مغفرت فرمائے انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنی چادریں لپیٹ لیں اور ضد کی اور نہایت گھمنڈ کیا)۔

اب اس آیت میں تصویر ہے اس رویے کی جو پیغمبر کے انذار کے جواب میں مکذبین قریش اختیار کرتے تھے کہ غرور سے سینہ موڑ کے وہاں سے چل دیتے اور اس طرح اپنے زعم میں گویا خدا اور اس کے انذار سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے۔ انسان کی حماقتوں میں سے ایک حماقت یہ بھی ہے کہ وہ ایک حقیقت کا مواجہہ کرنے سے گریز کرتا ہے اور سمجھ بیٹھتا ہے کہ اب وہ حقیقت حقیقت نہیں رہی۔ حالانکہ کسی کے گریز کرنے سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ شتر مرغ طوفان کا احساس کر کے اپنا سر ریت میں چھپا لیا کرتا ہے تو اس سے طوفان کا رخ تبدیل نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح اگر خدا انذار فرما رہا ہے تو اس سے چھپنے کی یہ تدبیر بالکل ہی احمقانہ ہے کہ اس کو سننے سے گریز کیا جائے۔ آخر خدا سے آدمی کہاں چھپ سکتا ہے، وہ تو اس وقت بھی لوگوں کو دیکھتا ہے جب لوگ اپنے اوپر اپنی چادریں لپیٹتے ہیں۔ وہ تو ظاہر سے بھی واقف ہوتا ہے اور پوشیدہ سے بھی اور سینوں کے تمام اسرار سے بھی۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۶)

خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے

'مُسْتَقَر' اور 'مُسْتَوْدَع' پر انعام آیت ۹۸ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ 'مُسْتَقَر' سے مراد وہ ٹھکانا ہے جہاں انسان زندگی کے دن گزارتا ہے اور 'مُسْتَوْدَع' سے مراد وہ جگہ ہے جہاں وہ مرنے کے بعد زمین کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں اسی مضمون کی مزید وضاحت ہے جو اوپر والی آیت میں گزرا کہ

خدا کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے کوئی اس سے بھاگ یا چھپ نہیں سکتا۔ فرمایا کہ وہ خدا ہی ہے جس کے ہاتھوں ہر جاندار کو روزی مل رہی ہے۔ مطلب یہ کہ جو ہر جاندار کو، وہ جہاں بھی ہو، پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا سمندروں کی تہوں میں، گھنے جنگلوں میں یا آباد شہروں میں، اس کا مقدر رزق پہنچا رہا ہے کیا اس سے کوئی چیز مخفی ہو سکتی ہے؟ پھر اس میں خدا سے چھپنے کی کوشش کرنے والوں کے لیے ایک مخفی ملامت بھی ہے کہ حیف ہے ان لوگوں پر جو اس کی بات سننے سے گریز کر رہے ہیں جس کے بخشے ہوئے رزق پر پل رہے ہیں۔

یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا وہ ہر ایک کے مستقر کو بھی جانتا ہے اور اس کے مدفن کو بھی جانتا ہے جہاں وہ مرنے کے بعد زمین کی امانت میں دیا جاتا ہے۔ مدفن کے لیے 'مُسْتَوْدَع' کا لفظ استعمال کرنے میں یہ بلیغ تذکیر ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب وہ مر گیا تو بس فنا ہو گیا۔ وہ فنا نہیں ہو جاتا بلکہ وہ زمین کی امانت میں دے دیا جاتا ہے اور ایک دن آئے گا جب زمین یہ امانت اپنے رب کے حوالے کرے گی کُلٌّ فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ' ہر چیز ایک واضح رجسٹر میں درج ہے، نہ کوئی چیز درج ہونے سے رہ گئی اور نہ کسی چیز کی تلاش کے لیے کوئی زحمت اٹھانی ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۷)

جزا اور سزا کی دلیل

یہ اس جزا و سزا کا بیان ہے جس سے ان کو ڈرایا جاتا تھا لیکن وہ اس کو تسلیم کر کے اس کے لیے تیاری کرنے کی بجائے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ فرمایا کہ وہی خدا جس کے رزق پر سب پل رہے ہیں وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس سے پہلے اس کی حکومت پانی پر تھی۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ چھ دنوں سے یہ ہمارے دن مراد نہیں ہیں بلکہ خدائی دن مراد ہیں جن میں سے ہر دن ہمارے ہزاروں سال کے برابر ہوتا ہے۔ ہم ان کو ادوار سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ دنیا کا چھ ادوار میں درجہ بدرجہ ظہور میں آنا اور اپنے نقطۂ کمال کو پہنچنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا ظہور کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ اس کے خالق نے ارادہ، اسکیم، ترتیب اور حکمت کے ساتھ اس کو وجود بخشا ہے۔ یہ ارادہ، اسکیم اور ترتیب و حکمت اس بات کی شہادت ہے کہ یہ کوئی بے غایت و بے مقصد کارخانہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم غایت ہے جس کا ظہور میں آنا لازمی ہے۔

وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ 'عرش' خدا کی حکومت کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کرۂ ارض کی خشکی نمودار ہونے سے پہلے پہلے یہ سارا کرہ مائی تھا اور اللہ کی حکومت اس پر تھی۔ پھر پانی سے خشکی نمودار ہوئی اور زندگی کی مختلف النوع انواع ظہور میں آئیں اور درجہ بدرجہ یہ پورا عالم ہستی آباد ہوا۔ یہی بات تورات میں بھی بیان ہوئی ہے اگرچہ اس کے مترجموں نے مطلب خبط کر دیا ہے۔ کتاب پیدائش کی پہلی ہی آیت میں یہ الفاظ ہیں "اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی"

یَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا - یعنی یہ سارا اہتمام و انتظام صاف اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال یا کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا نہیں ہے کہ یوں ہی پیدا ہوئی، یوں ہی تمام ہو جائے۔ انسان جو اس میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کے لیے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ساری چیزیں پیدا کی گئی ہیں کوئی شتر بے مہار نہیں چھوڑا گیا کہ کھائے پیے، عیش کرے اور ایک دن ختم ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دنیا کے خالق نے ایک عبث کام کیا درآنحالیکہ اس دنیا کے ایک ایک ذرہ سے اس کی قدرت، حکمت اور رحمت کی ایسی شہادتیں ملتی ہیں کہ ان کی موجودگی میں اس کی طرف کسی لہو و عبث کی نسبت بالکل خلاف عقل ہے۔ اگر اس کی طرف اس طرح کی کوئی نسبت خلاف عقل ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ انسان کو ارادے کی آزادی اور خیر و شر کا امتیاز دے کر یہ امتحان کر رہا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے خیر کی راہ اختیار کرتا ہے یا شر کی اور لازماً وہ اس کے لیے ایک دن اپنے رب کے آگے مسئول اور جواب دہ ہوگا اور اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا بھگتے گا۔ یاد ہوگا، عالم کے چھ دن میں پیدا کیے جانے کا ذکر سورۂ یونس میں بھی ہوا ہے۔ یہاں اس پر 'لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا' کا اضافہ ہے جس سے وہ حقیقت واضح ہوتی ہے جو اس اہتمام سے اس عالم کے پیدا کیے جانے میں مضمر ہے۔

وَلَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّکُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ...... الآیۃ - یعنی یہ بات تو بالکل بدیہی اور نہایت واضح معلوم ہوتی ہے لیکن اگر یہی بات تم ان لوگوں کو سمجھاتے ہو کہ مرنے کے بعد تم حساب کتاب اور جزا و سزا کے لیے اٹھائے جاؤ گے تو یہ تمہاری تقریر کے زور اور تمہارے حسن بیان کو صداقت کی دل نشینی قرار دینے کے بجائے الفاظ و بیان کی جادوگری قرار دیتے ہیں تاکہ یہ اپنے عوام کو دھوکا دے سکیں کہ وہ قرآن اور پیغمبر کی باتوں سے متاثر نہ ہوں۔

وَلَئِنۡ اَخَّرۡنَا عَنۡہُمُ الۡعَذَابَ اِلٰۤی اُمَّۃٍ مَّعۡدُوۡدَۃٍ لَّیَقُوۡلُنَّ مَا یَحۡبِسُہٗ ؕ اَلَا یَوۡمَ یَاۡتِیۡہِمۡ لَیۡسَ
مَصۡرُوۡفًا عَنۡہُمۡ وَحَاقَ بِہِمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ۞ وَلَئِنۡ اَذَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنَّا رَحۡمَۃً ثُمَّ نَزَعۡنٰہَا
مِنۡہُ ۚ اِنَّہٗ لَیَـُٔوۡسٌ کَفُوۡرٌ ۞ وَلَئِنۡ اَذَقۡنٰہُ نَعۡمَآءَ بَعۡدَ ضَرَّآءَ مَسَّتۡہُ لَیَقُوۡلَنَّ ذَہَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیۡ ؕ اِنَّہٗ
لَفَرِحٌ فَخُوۡرٌ ۞ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّاَجۡرٌ کَبِیۡرٌ ۞ ۸ - ۱۱

لفظ امۃ کا مفہوم

وَلَئِنۡ اَخَّرۡنَا عَنۡہُمُ الۡعَذَابَ اِلٰۤی اُمَّۃٍ ...... الآیۃ - لفظ 'امت' یہاں ٹھیک اپنے لغوی مفہوم یعنی مدت کے معنی میں ہے جس طرح سورۂ یوسف میں ہے وَقَالَ الَّذِیۡ نَجَا مِنۡہُمَا وَادَّکَرَ بَعۡدَ اُمَّۃٍ - ۴۵ (اور کہا اس نے جس نے ان دونوں میں سے رہائی پائی تھی اور ایک مدت کے بعد اس نے یاد کیا)۔

کفار کے استہزاء کا جواب

اوپر کی آیت میں ان کے اس مذاق کا ذکر ہے جو مرنے کے بعد اٹھائے جانے کی خبر کا وہ اڑا رہے تھے۔ اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہی مذاق کی روش ان کی اس عذاب کے بارے میں بھی ہے جس سے اس دنیا میں ان کو لازماً دوچار ہونا ہے اگر انھوں نے رسول کی تکذیب کر دی۔ فرمایا کہ جس عذاب کی ان کو خبر

دی جا رہی ہے اگر کچھ مدت کے لیے ہم اس کو ٹال رہے ہیں تو یہ ہماری عنایت ہے کہ ہم ان کو توبہ و اصلاح کی مہلت دے رہے ہیں لیکن یہ اپنی بدبختی سے اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ محض ایک دھونس ہے اور پیغمبر کا مذاق اڑاتے ہیں کہ عذاب آنے والا ہے تو آ کیوں نہیں جاتا، کس چیز نے اس کو باندھ رکھا ہے۔ فرمایا کہ ان کی اس جسارت اور بدبختی پر افسوس ہے۔ جس دن وہ عذاب ظاہر ہو گا، کسی کی یہ طاقت نہ ہو گی کہ وہ اس کو ان سے ہٹا سکے، نہ یہ خود اس کے رخ کو موڑ سکیں گے اور نہ ان کے شرکاء اور شفعاء اس وقت ان کی کچھ مدد کر سکیں گے، وہ عذاب ان کو اپنے گرداب میں لے لے گا جس کو یہ دل لگی سمجھتے اور جس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

ایک خاص اسلوبِ کلام

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ ..... اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ۔ یہاں لفظ انسان اگرچہ عام ہے لیکن اس سے مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اوپر سے آ رہا ہے۔ ضدی اور جھگڑالو مخاطب سے جب منہ پھیر لینا مقصود ہوتا ہے تو بسا اوقات یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ اس کو خطاب کر کے یا اس کی طرف اشارہ کر کے بات کہنے کے بجائے ایک کلیہ کے اسلوب میں بات کہہ دی جاتی ہے جس سے اعراض کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے اور بات بھی ایک کلیہ کا جامہ اختیار کر لینے کی وجہ سے زیادہ مؤثر اور جاندار ہو جاتی ہے۔ یہی اسلوب تقریر یہاں اختیار کیا گیا ہے اور اس کی نہایت بلیغ مثالیں آگے آئیں گی۔ اس اسلوب کے فوائد پر ان شاء اللہ ہم کسی موزوں مقام پر بحث کریں گے۔

پیغمبر کو صبر کی تلقین

مطلب یہ ہے کہ اس وقت اللہ نے ان کو جو اپنے رزق و فضل سے نواز رکھا ہے تو یہ اس کے شکر گزار ہونے کے بجائے بدمستی میں اس کی تذکیر و تنبیہ کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کو عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو ڈرنے کے بجائے ڈھیٹ ہو کر عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان کی اس حالت پر صبر کرو اور ان کو نظرانداز کرو۔ عام طور پر لوگوں کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب اللہ ان کو اپنے فضل سے نوازتا ہے تو وہ اس کے شکرگزار ہونے کے بجائے اکڑتے اور رونمائی کرتے ہیں اور جب ذرا خدا کی گرفت میں آ جاتے ہیں تو فوراً دل شکستہ اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ آج ان کے طنطنہ اور غرہ کا یہ حال ہے کہ اپنے آگے کسی کو خاطر ہی میں نہیں لا رہے ہیں۔ لیکن اس طنطنہ کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ قدرت ذرا سا جھنجھوڑ دے تو دیکھو کیسے بلبلا اٹھتے ہیں۔

خدا کے پسندیدہ بندوں کی روش

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ..... الآیۃ۔ یہ ان لوگوں کا بیان ہے جو مذکورہ عام کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی آزمائش اور مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو اللہ سے مایوس و دل شکستہ ہونے کے بجائے اس کی رحمت کی امید پر صابر و مطمئن رہتے ہیں اور جب اس کے فضل و نعمت سے نوازے جاتے ہیں تو اکڑنے اور مغرور ہونے کے بجائے اس کے شکر گزار ہوتے اور نیک عمل کرتے ہیں۔ مصیبت ان کی صبر کی صفت کو مستحکم کرتی ہے اور نعمت ان کے لیے شکر اور اعمال صالحہ کی راہیں کھولتی ہے۔ یہی لوگ انسانیت کے گل سرسبد ہیں اور ان کے لیے اللہ کے ہاں مغفرت اور اجر عظیم ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے مصائب سے مایوسی کا

اور نعمتوں سے غرور و تکبر کا اندوختہ فراہم کیا ہے تو یہ اپنے اس اندوختہ سمیت جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهِۦ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا۟ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ كَنزٌ أَوْ جَآءَ مَعَهُۥ مَلَكٌ ۚ إِنَّمَآ أَنتَ نَذِيرٌ ۚ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ وَكِيلٌ (۱۲)

پیغمبرؐ کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ تم ان لوگوں کے رویے سے برداشتہ خاطر ہو کر اپنے فرض کی ادائگی میں ذرا ڈھیلے نہ پڑنا۔ اگر یہ تمہیں خدا کا رسول ماننے کے لیے یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ تمہارے پاس بہت بڑا خزانہ ہو یا تمہارے ساتھ کوئی فرشتہ تمہاری رسالت کی گواہی دیتا پھرے تو اس قسم کے احمقانہ مطالبات تمہارے لیے وجہ پریشانی نہ ہوں۔ تم صرف ان کے لیے نذیر بنا کر بھیجے گئے ہو، ان پر داروغہ مقرر کر کے نہیں بھیجے گئے ہو کہ لازماً ان کو تم ہدایت کے راستہ پر کر ہی دو۔ انذار کا فرض ادا کر دینے کے بعد تمہاری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اگر لاطائل مطالبات کو بہانہ بنا کر یہ لوگ حقیقت سے گریز کرنا چاہتے ہیں تو معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ تمہاری جانفشانیاں بھی اس کے سامنے ہیں اور ان کی شرارتیں بھی۔ وہ ان کو جس چیز کا مستحق پائے گا وہی ان کے ساتھ کرے گا اور جب کرے گا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ بن سکے گا ——— یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس قسم کی ہدایات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دینے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ وحی الٰہی کے کسی حصہ کی تبلیغ سے ہچکچا رہے تھے یا اس کو چھوڑ دینا چاہتے تھے بلکہ یہ حالات کی شدت اور ان کے سبب سے آپ کی پریشانی کے پیش نظر آپ کو اپنے موقف پر استقامت کی تلقین اور اپنی ذمہ داری کو اس کے حدود ہی تک محدود رکھنے کی ہدایت ہے۔ اس قسم کے مواقع میں خطاب میں جو ذرا تیزی ہوتی ہے اس کا رخ، جیسا کہ ہم بار بار ظاہر کر چکے ہیں، اصلاً پیغمبر کی طرف نہیں ہوتا بلکہ ان معاندین کی طرف ہوتا ہے جن کا عناد اس ہدایت کا موجب ہوتا ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ ٱفْتَرَىٰهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا۟ بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِۦ مُفْتَرَيَٰتٍ وَٱدْعُوا۟ مَنِ ٱسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ (۱۳)

مخالفینِ قرآن کو متبادل کلام پیش کرنے کا چیلنج

یہ استفہام اظہارِ تعجب کی نوعیت کا ہے۔ اوپر کے اعتراضات تو سادہ اسلوب میں نقل کر دیے ہیں لیکن قرآن کو پیغمبر کی گھڑی ہوئی کتاب قرار دینا ایک نہایت عجیب بات تھی، بالخصوص ان لوگوں کی زبان سے جو کلام کے حسن و قبح کے نقاد اور اس کے اعجاز کے قدر دان بھی تھے اور موازنہ اور مقابلہ کے لیے ان کے پاس اپنے چوٹی کے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کا ایک دفتر بھی موجود تھا۔ اس وجہ سے اس کا ذکر تعجب کے اسلوب میں فرمایا کہ اگر یہ بے شرم ہو کر یہ بات کہتے ہیں تو اس کا فیصلہ نہایت آسانی سے یوں ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ایسی ہی دس سورتیں گھڑی ہوئی پیش کر دیں اور اگر یہ کام تنہا ان کے بس کا نہ ہو تو اپنے ان شرکاء اور شفعاء کو بھی اپنی مدد کے لیے بلا لیں جن کو یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں۔

'إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ' میں ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ جن کو تم پوجتے ہو یہ خدا کے شریک ہیں۔ اگر یہ خدا کے شریک ہیں تو یہ سب سے زیادہ اہم موقع ہے کہ وہ قرآن کی نظیر پیش کرنے میں تمہاری مدد کریں۔ اس لیے کہ اس قرآن کی بدولت سب سے زیادہ خطرے میں خود ان کی خدائی ہے۔

دوسرا مفہوم اس کے اندر یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس گمان میں سچے ہو کہ یہ قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اپنی تصنیف ہے جس کو وہ لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے جھوٹ موٹ خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ سورۂ طور میں ہے:

'أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ' ۳۳-۳۴ (کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو گھڑ لیا ہے بلکہ وہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اگر وہ اپنے اس گمان میں سچے ہیں تو اس کے مانند کوئی کلام خود پیش کر دیں) اس آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جو لوگ اس کو گھڑی ہوئی چیز قرار دیتے تھے یہ ان کے دل کی آواز نہیں تھی بلکہ یہ محض ایمان نہ لانے کا ایک بہانہ تراشا گیا تھا۔

تحدی کی نوعیت

اس سورہ میں ان سے دس سورتوں کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ سورۂ یونس آیت ۳۸ میں ایک ہی سورہ کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ بقرہ آیت ۲۳ میں بھی ایک ہی سورہ کا مطالبہ ہے۔ بنی اسرائیل آیت ۸۸ میں مثل قرآن کا مطالبہ ہے اور سورۂ طور کی مذکورہ بالا آیت میں 'بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ' کے الفاظ ہیں جس کا واضح مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد قرآن کی مانند کلام ہے۔ عام اس سے کہ وہ ایک سورہ کی شکل میں ہو یا دس سورتوں کی شکل میں، یا قرآن و کتاب کی شکل میں۔ عام طور پر لوگوں نے ان مختلف آیتوں کو سامنے رکھ کر اس تحدی کی ایک تدریج و ترتیب قائم کی ہے کہ پہلے ان سے مانند قرآن کتاب پیش کرنے کا مطالبہ کیا گیا، جب وہ اس سے عاجز رہے تو دس سورتوں کا مطالبہ کیا گیا، جب وہ اس سے بھی قاصر رہے تو ادنیٰ درجہ میں ان سے ایک ہی سورہ پیش کرنے کا مطالبہ کیا گیا، لیکن وہ اس کا بھی حوصلہ نہ کر سکے۔ اگرچہ یہ بات بظاہر اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی صحت کا انحصار اس امر پر ہے کہ جن سورتوں میں یہ تحدی مذکور ہوئی ہے ان کا زمانۂ نزول تعین کے ساتھ معلوم ہو۔ چونکہ یہ معاملہ مشکل ہے اس وجہ سے ہمارے نزدیک صائب رائے یہ ہے کہ قرآن نے شروع ہی میں، جیسا کہ سورۂ طور کی مذکورہ بالا آیت سے واضح ہوتا ہے، قرآن کے مانند کلام پیش کرنے کا مطالبہ کیا، خواہ وہ دس سورتوں کی شکل میں ہو یا ایک ہی سورہ کی شکل میں، بعد میں اسی اجمال کو حسب موقع مختلف الفاظ میں واضح فرمایا گیا۔ ہمارے نزدیک اس کو عام معنی میں تحدی سمجھنا بھی کچھ صحیح نہیں ہے۔ تحدی اور چیلنج کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں گمان ہو کہ حریف میدان مقابلہ میں اترنے اور قسمت آزمائی کا حوصلہ رکھتا ہے۔ جب یہ واضح ہو کہ حریف کی ساری مشیخت محض حقیقت سے گریز و فرار کے لیے ایک بہانہ ہے تو اس کو ایک خاص اہتمام کے ساتھ چیلنج کرنے کے بجائے یہ بہتر ہوتا ہے کہ پہلا ہی وار اس کے لیے بھرپور ہو۔

فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَنْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝۱۴

'اِسْتَجَابَ لَهُ' کے معنی ہیں: اس کے سوال کا جواب دیا، اس کی حاجت پوری کی۔ خدا کے تعلق سے یہ لفظ آئے تو اس کے معنی ہوں گے: اس کی دعا قبول کی۔

مخالفین قرآن پر اتمام حجت

اوپر والی آیت میں بات بالواسطہ کہی گئی تھی اس میں ان کو براہ راست خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تمہارے یہ شعراء و شرکاء قرآن کا جواب پیش کرنے کی مہم میں تمہاری حاجت روائی کے لیے نہ اٹھیں تو پھر یہ مان لو کہ یہ

کتاب علم الٰہی کا فیضان ہے جیسا کہ پیغمبر کہتے ہیں، نہ کہ ان کی گھڑی ہوئی، جیسا کہ تم الزام لگاتے ہو۔ اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ سے یہ بات واضح ہوتی کہ قرآن کے اعجاز کا اصل پہلو یہ ہے کہ وہ جس علم و معرفت کا خزانہ ہے وہ خزانہ خدا کے سوا کوئی اور بخش ہی نہیں سکتا۔ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، یہ دوسرا بدیہی نتیجہ ہے جو اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر رہنے کی صورت میں نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور تم جن کو معبود بنائے بیٹھے ہو، یہ محض خیالی چیزیں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر ان کی کوئی حقیقت ہے تو یہ وقت ہے کہ وہ تمھاری اور خود اپنی عزت بچانے کے لیے کچھ جوہر دکھائیں۔ اگر اس نازک موقع پر بھی ان کی غیرت جوش میں نہیں آتی تو پھر آخر وہ کس مرض کی دوا ہیں۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کے اسلوب بیان میں تشویق و ترغیب کا پہلو بھی ہے اور زجر و ملامت کا بھی۔ مطلب یہ ہے کہ تمھیں اپنی بات ثابت کرنے کے لیے پورا موقع حاصل ہے، تم اس کے لیے اپنے معبودوں کو بھی مدد کے لیے بلا سکتے ہو لیکن اس سب کے بعد بھی اگر تم کچھ نہ کر سکے تو بتاؤ اسلام لانے والے بنتے ہو؟

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۵-۱۶)

وسعت رزق کے مغالطہ کی تردید

اوپر آیت ۱۲ میں کفار کے اس طعنہ کا حوالہ گزر چکا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی بے سروسامانی کو آپ کی رسالت کے خلاف بطور دلیل پیش کرتے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ جب ہم دنیوی اسباب و وسائل کے اعتبار سے ان سے نہایت بہتر حالت میں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی نگاہوں میں بھی ہم ان سے بہتر ہیں، پھر ہم کو خدا کے غضب اور اس کے عذاب سے ڈرانے کے کیا معنی؟ اگر ہم خدا کے مبغوض و معتوب ہوتے تو کیا اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ یہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے اور ہم عیش کرتے؟ پھر تو یہ ہونا تھا کہ یہ خزانے لٹاتے اور ہم ان کی جوتیاں سیدھی کرتے۔ ان دونوں آیتوں میں ان کے اسی مغالطے کا جواب دیا ہے۔ فرمایا کہ یہ دنیا اور اس کی زینتیں نیک اعمال کے صلہ کے طور پر نہیں ملتیں کہ جو نیک اعمال نہ کریں وہ ان سے محروم رہیں۔ یہ دنیا تو نیک اور بد دونوں کو ملتی ہے البتہ جو دنیا ہی کے طالب ہوتے ہیں، آخرت کی جن کو کوئی پروا نہیں ہوتی ان کا سارا کمایا ہیں بے باق کر دیا جاتا ہے، آخرت میں ان کے لیے دوزخ کے سوا کچھ نہیں بچ رہتا۔ چونکہ وہ کوئی کام آخرت کو مقصود بنا کر نہیں کرتے اس وجہ سے آخرت میں ان کے سارے اعمال حبط ہو جائیں گے۔ دنیا آخرت کے بغیر مجرد باطل رہ جاتی ہے اور اس باطل کو مقصود قرار دے کر جو کچھ بھی کیا جاتا ہے سب باطل ہوتا ہے اگرچہ وہ بظاہر نیکی ہی کے کام کیوں نہ ہوں۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا

مَّدۡحُوۡرًا ۝ وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓـئِكَ كَانَ سَعۡيُهُمۡ مَّشۡكُوۡرًا ۝ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَۤاءِ وَهٰٓؤُلَۤاءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحۡظُوۡرًا (۱۸-۲۰) (جو دنیا ہی کے طالب ہوتے ہیں ہم ان کو یہیں دے دیتے ہیں جو دنیا چاہتے ہیں، پھر ہم نے ان کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں وہ ذلیل اور راندہ ہو کر پڑیں گے اور جو آخرت کے طالب بنتے ہیں اور ایمان و اخلاص کے ساتھ اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش بھی کرتے ہیں، وہی لوگ ہیں جن کی کوشش مقبول ہوگی، ہم تیرے رب کی بخشش سے دونوں کو فیض یاب کرتے ہیں، اُن کو بھی اور ان کو بھی اور تیرے رب کی بخشش کسی پر بھی بند نہیں ہے) ان آیات میں 'مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِيۡدُ' کے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ دنیا کے طالبوں کو بھی اتنا ہی ملتا ہے جتنا خدا چاہتا ہے اور انہی کو ملتا ہے جن کو خدا دینا چاہتا ہے، یہ نہیں کہ جو دنیا کا طالب بن جائے وہ جتنا چاہے سمیٹ لے۔ ان کے معاملے میں بھی جو کچھ ہوتا ہے خدا ہی کے اختیار اور اسی کی حکمت کے تحت ہوتا ہے۔ اسی طرح 'وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا وَهُوَ مُؤۡمِنٌ' کے الفاظ یہ حقیقت واضح کرتے ہیں کہ طلبِ آخرت بھی اللہ کے ہاں وہ معتبر ہے جو ایمان و اخلاص کے ساتھ ہو اور جس کے ساتھ آخرت کے شایانِ شان عملی جدوجہد بھی پائی جاتی ہو۔ اگر اس میں ریا اور شرک کی کوئی آلودگی شامل ہو، یا محض زبان کے بھاگ کے بل پر جنت کو جیتنے کے خواب دیکھے جا رہے ہوں تو ان لذیذ خوابوں کی خدا کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ وَيَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ وَمِنۡ قَبۡلِهٖ كِتٰبُ مُوۡسٰٓى اِمَامًا وَّرَحۡمَةً ؕ اُولٰٓـئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِهٖ مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡهُ ۚ اِنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ (۱۷)

مخالفینِ قرآن کی اصل بیماری

اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ جو لوگ قرآن سے گریز و فرار کے لیے یہ بہانے تراش رہے ہیں ان کی اصل بیماری یہ ہے کہ ان کی فطرت کا نور بجھ چکا ہے اور جن کی فطرت کا نور بجھ چکا ہو وہ قرآن پر ایمان لانے والے نہیں بن سکتے۔ اس پر ایمان لانے والے وہی بنیں گے جن کی فطرت مسخ ہونے سے محفوظ ہو۔ وہ بے شک پہلے سے بنیادی حقائق کے باب میں اپنے اندر ایک دلیل و برہان رکھتے ہیں، پھر جب اس کے بعد اوپر سے بھی قرآن کی شکل میں ان کے سامنے ایک شہادت آجاتی ہے تو وہ انھیں بعینہٖ اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ اپنے دل میں پا رہے ہیں اس کی تائید و تصدیق اس آسمانی شاہد کی زبان سے بھی ہو رہی ہے۔

اس طرح کے استفہامیہ جملوں میں بعض اوقات، مقابل جملہ حذف کر دیا جاتا ہے جو قرینہ سے سمجھا جاتا ہے۔ گویا پوری بات یوں ہوگی کہ کیا وہ لوگ جن کے سامنے یہ یہ روشنیاں ہیں اور وہ لوگ جو ان تمام روشنیوں سے محروم ہیں، قرآن پر ایمان لانے کے معاملے میں یکساں ہوں گے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ اس پر

ایمان وہی لوگ لائیں گے جو نورِ فطرت سے بہرہ مند ہیں اور اس امر سے بھی آشنا ہیں کہ اس سے پہلے اسی طرح کی کتاب ہدایت و رحمت بن کر موسیٰ پر بھی اتر چکی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے قرآن بے شک ایک مانوس چیز ہے۔ وہ جب اس کو سنتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ اپنے صحیفۂ فطرت میں پا رہے تھے اسی کی تصدیق و تائید خدا کی طرف سے ایک شاہد کے ذریعے سے بھی سامنے آگئی۔ چنانچہ ایسے ہی لوگ ہیں جو اس پر ایمان لائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس کی مخالفت میں طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں ان کی محرومی کے اسباب خود ان کے اندر موجود ہیں۔ ان کی دل کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں۔ ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو۔

بینۃ سے مراد نورِ فطرت ہے

'بَیِّنَۃ' کے معنی روشن دلیل اور واضح حجت کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وہ نورِ فطرت ہے جو حق و باطل اور خیر و شر کے مبادی کے امتیاز کے لیے خدا نے خود ہمارے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ جن کی فطرت خارج کے برے اثرات سے جتنی ہی محفوظ ہوتی ہے ان کے اندر یہ نور اتنا ہی قوی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرات انبیاؑ اس سے کامل طور پر بہرہ مند ہوتے ہیں۔ ان کا باطن وحی کے نور سے منور ہونے سے پہلے بھی اس نور سے نورانی ہوتا ہے۔ ان کے لیے وحی کی حیثیت تاریکی پر روشنی کی نہیں بلکہ جیسا کہ سورۂ نور میں ارشاد ہوا ہے 'نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ' یعنی روشنی پر روشنی کی ہوتی ہے۔ آگے اسی سورہ کی آیات ۲۸ - ۶۳ - ۸۸ میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے۔ عام لوگوں میں سے جو لوگ انبیاؑ کی دعوت قبول کرنے میں سبقت کرتے ہیں وہ بھی علیٰ فرق مراتب اس نور سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور جس کے اندر یہ نور جتنا ہی قوی ہوتا ہے وہ اسی اعتبار سے ان کی طرف سبقت بھی کرتا ہے اور اسی نسبت سے ان کا دست و بازو بھی بنتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو اپنی شامت اعمال سے اس نور کو بجھا کر 'ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ' کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔

ضمیر مذکر کے باب میں ایک خاص اسلوب

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اس طرح کے الفاظ کے معاملہ میں جن کی تانیث غیر حقیقی ہوتی ہے یہ ضروری نہیں ہوا کرتا کہ ان کے لیے ضمیر لانے میں لفظ کے ظاہر کا لحاظ کیا جائے بلکہ ضمیر مذکر بھی لا سکتے ہیں اگر لفظ کا اصل مصداق مذکر ہو۔ چنانچہ یہاں 'یَتْلُوْهُ' میں اس کے لیے ضمیر مذکر ہی آئی ہے اس لیے کہ اس سے مراد درحقیقت وہی چیز ہے جس کے لیے قرآن کے دوسرے مقامات میں 'نور'، 'برھان'، اور 'سلطان'، وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

'وَیَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ' 'تلا یتلو' کے معنی یہاں کسی چیز کے بعد اس کے پیچھے آنے کے ہیں اور 'مِنْهُ' میں ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے اپنے فضل سے پہلے تو ہماری فطرت کے اندر وہ سب کچھ ودیعت فرما دیا جس کی قرآن دعوت دیتا ہے پھر اپنے مزید فضل سے اس نے لسان غیب کے ذریعے سے اس سارے ریکارڈ کو ہمیں سنا بھی دیا تاکہ کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ 'شَاهِدٌ' سے مراد یہاں وہ وحی الٰہی

ہے جس کا مظہر قرآن ہے، جس کے لانے والے جبرائیل امین اور جس کے حامل پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے 'شَاهِدٌ' سے جبرائیل امین کو مراد لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بات صحیح ہے۔ وحی قرآن، جبرائیل اور پیغمبر میں فرق صرف تعبیر کا ہے۔ خدا کے شاہد ہونے کے اعتبار سے ان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن میں یہ لفظ ان سب کے لیے استعمال ہوا ہے۔

قرآن کے حق میں پہلے کی شہادت

'وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً' یعنی پہلے کی شہادتوں میں سے یہ شہادت بھی قرآن کی تصدیق و تائید کے لیے ان کے سامنے موجود ہے کہ اسی طرح کی ایک کتاب، اسی طرح کی تعلیمات و ہدایات بلکہ اس کی اور اس کے حامل کی پیشین گوئیوں کے ساتھ اس سے پہلے امام اور رحمت بن کر موسیٰ پر بھی اتر چکی ہے۔

'امام اور رحمت' کے الفاظ یہاں اسی طرح آئے ہیں جس طرح بعض دوسرے مقامات میں 'هُدًى' اور 'رحمت' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں 'هدی' کے مفہوم کو 'امام' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ رہنمائی کا مضمون دونوں لفظوں کے اندر یکساں موجود ہے۔ ہم نے دوسرے مقام میں ان دونوں لفظوں کی تشریح کی ہے کہ یہ آغاز و انجام کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی یہ کتاب اس دنیا میں صراط مستقیم کی ہدایت و رہنمائی ہے اور جو لوگ اس ہدایت و رہنمائی کو قبول کرلیں ان کے لیے آخرت میں ابدی فضل و رحمت کا پیش خیمہ ہے۔

یہود کی بدبختی کی طرف اشارہ

یہاں ایک لطیف اشارہ بھی قابل توجہ ہے۔ اس سورہ میں مخاطب چونکہ اصلاً قریش ہیں اس وجہ سے یہ گمان ہوتا ہے کہ ان کے لیے کتاب موسیٰ کی نظیر کچھ زیادہ مؤثر نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ قریش اول تو مذہبی علم و فضل کے اعتبار سے اہل کتاب کے معترف تھے ثانیاً یہاں قرآن ایک ہلکا سا اشارہ ان یہود کی طرف بھی کر دینا چاہتا ہے جن کو ایک 'امام و رحمت' کتاب کے حامل ہونے کے سبب سے قرآن کی طرف سب سے پہلے سبقت کرنے والا بننا تھا لیکن وہ سبقت کرنے کے بجائے اندر اندر اس کی مخالفت کے لیے سازشوں کی تیاریاں کر رہے تھے۔ قرآن نے ایک نہایت لطیف اشارے کی شکل میں ان کو توجہ دلادی کہ ان کے مرتبہ و مقام کا تقاضا کیا ہے اور اگر انھوں نے اس کے خلاف کیا تو وہ اپنے آپ کو کس گڑھے میں گرائیں گے۔

'اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ' میں حصر کا مضمون پایا جاتا ہے۔ یعنی یہی لوگ جن کی خصوصیات اوپر بیان ہوئیں قرآن پر ایمان لائیں گے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ قرآن کی مخالفت کر رہے ہیں ان خصوصیات سے محروم ہیں۔ چونکہ یہ بات کلام کے سیاق سے واضح تھی اس وجہ سے حذف کردی گئی۔

خطاب پیغمبر سے خطاب دوسروں سے

'وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ' 'احزاب' کے لفظ میں ذرا وسعت ہے۔ قرآن نے اپنے سامنے کے مخالفین کے ساتھ ساتھ ان مخالفین کی طرف بھی ہلکا سا اشارہ کردیا ہے جو ابھی اس مرحلے تک تو اگرچہ پردے کے پیچھے تھے لیکن بعد کے مراحل میں نہایت خطرناک دشمن بن کر سامنے آئے۔ یعنی اہل کتاب۔

'فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ' یہ خطاب اگرچہ عام بھی

ہو سکتا ہے لیکن ہمارے نزدیک خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے۔ البتہ اس طرح کے جملوں میں جو حتی ہوتا ہے اس کا رخ، جیسا کہ ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں، مخالفین کی طرف ہوتا ہے لیکن وہ لائق التفات نہیں رہ جاتے اس وجہ سے ان کو خطاب کر کے بات براہِ راست کہنے کی بجائے پیغمبر کو خطاب کر کے کہہ دی جاتی ہے۔ زجر و ملامت کا یہ اسلوب بسا اوقات براہ راست زجر و تنبیہ سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کی نہایت بلاغت آمیز مثالیں موجود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ شامت زدہ لوگ اس واضح حقیقت کو جھٹلا رہے ہیں تو جھٹلائیں، ان کی اس روش سے تم کسی الجھن میں نہ پڑو۔ یہی حقیقت ہے اور یہ تمہارے رب کی طرف سے ہے لیکن اکثر لوگ اپنی بدبختی کے سبب سے ایمان نہیں لائیں گے۔

یہ مضمون سورۂ رعد کی آیت ۱۹ میں بیان ہوا ہے۔ وہاں انشاء اللہ ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے۔ سورۂ یونس کی آیات ۹۴ - ۹۵ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ یُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ وَیَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۗؤُلَاۗءِ الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۸ - ۱۹)

مشرکین کی بدبختی پر اظہارِ افسوس

یہی مضمون بعینہٖ اسی سیاق و سباق کے ساتھ سورۂ یونس کی آیات ۱۷-۱۸ میں گزر چکا ہے۔ وہاں تصریح ہے کہ قریش کو قرآن سے سب سے زیادہ چڑ اس کی دعوت توحید سے ہے۔ وہ اپنے دیوتاؤں کی مذمت سن کر آگ بگولا ہو جاتے اور پھر اس کے خلاف جو کچھ منہ میں آ جاتا وہ بک ڈالتے۔ قرآن نے یہاں ان کے اسی اصل محرک مخالفت کو سامنے رکھ کر ان کی بدبختی اور محرومی پر افسوس کیا ہے کہ ان سے بڑھ کر بدقسمت اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والا کون ہو سکتا ہے جنھوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا، یعنی اللہ کے سوا دوسری چیزوں کی پرستش کی اور ان کے متعلق بالکل جھوٹ موٹ، بلا کسی سند اور دلیل کے، یہ دعویٰ کیا ہے کہ خدا نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے اور ان کی عبادت کا حکم دیا ہے۔ یہ سب سے بڑی بدقسمتی اس وجہ سے ہے کہ یہی چیز ان کی ابدی محرومی کا باعث ہوگی جب کہ قیامت کے دن ان کے سامنے یہ راز کھلے گا کہ جن کی انھوں نے زندگی بھر عبادت کی اور جن کی حمیت و حمایت میں اللہ کی کتاب کو جھٹلایا وہ سب ہوا ہو گئے اور معاملہ تنہا خدائے واحد و قہار سے پڑا۔

وَیَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۗؤُلَاۗءِ الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ۔ یہ شہادت انبیاء کی بھی ہو سکتی ہے، اس لیے کہ قرآن میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نبی سے اس کی امت پر قیامت کے دن گواہی دلوائے گا کہ اس نے ان کو کیا تعلیم دی تھی اور انھوں نے اس میں کیا بگاڑ پیدا کیا، ان ہستیوں کی بھی ہو سکتی ہے جن کو معبود بنا کر پوجا گیا حالانکہ نہ انھوں نے اس کا حکم دیا اور نہ انھیں اس کی خبر ہوئی اور ان فرشتوں کی بھی ہو سکتی ہے جو ہر شخص کے سارے اعمال کا ریکارڈ رکھتے ہیں اور قیامت کے دن یہ سارا ریکارڈ سامنے آئے گا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ۔ یہ وہ منادی ہے جو گواہوں کی گواہی کے بعد ان مشرکین پر لعنت

کے لیے کی جائے گی۔ اور یہ لعنت ان کے لیے تمام مصیبتوں کا فتح باب ہوگی۔

مشرکوں کے جرائم

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۔ یہ ان ظالمین کی مزید صفات بیان کر دی گئیں تاکہ کلام مطابق حال بھی ہو جائے اور ان کے وہ جرائم بھی سامنے آ جائیں جو اس لعنت کے موجب ہوں گے۔ ان کا ایک جرم تو یہ ہے کہ انھوں نے دیدہ و دانستہ، حقیقت کے واضح ہونے کے باوجود، لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا اور دوسرا جرم یہ ہے کہ اس راستہ کو کج کرنے کی کوشش کی۔ بندوں کے لیے خدا تک پہنچنے کی راہ بالکل ہموار و مستقیم ہے، اس میں کج پیچ اور پگڈنڈیاں نہیں ہیں۔ بندہ اس راہ پر چلے تو براہ راست اپنے رب سے تعلق پیدا کر لیتا ہے لیکن ان ظالموں نے اس راہ میں بہت سے اڑنگے ڈال دیے۔ قدم قدم پر انھوں نے اس کا رخ مختلف تھانوں، استھانوں، دیویوں اور دیوتاؤں کی طرف موڑ دیا اور اس طرح لوگوں کو اصل شاہراہ توحید سے ہٹا کر گلیوں اور کوچوں میں ڈال دیا۔

'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ' میں مبتدا کے اعادے سے مقصود اس پر زور دینا ہے۔ یعنی آخرت کے اصلی منکر یہی ہیں۔ اول تو انھوں نے خلق کو اللہ کے راستہ سے روکنے کی کوشش کی اور یہ جسارت آخرت سے بالکل بے پروا ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ دوسرے شرک بجائے خود آخرت کی نفی ہے اس لیے کہ شرکاء و شفعاء جب اپنے پجاریوں کو بہرحال بخشوا ہی لیں گے خواہ ان کے عقائد و اعمال کچھ ہی ہوں تو آخرت کا ہونا، نہ ہونا دونوں یکساں ہوا۔ آخرت کو صرف مان لینا مطلوب نہیں ہے بلکہ یہ ماننا ضروری ہے کہ وہ ہر ایک کے لیے بے لاگ انصاف کا دن ہوگا اور خدا کے آگے اس دن کسی کا زور نہیں چلے گا۔

أُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۭ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (٢٠)

یعنی دنیا میں اللہ نے ان کو جو مہلت دی تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ خدا کے قابو سے باہر تھے بلکہ یہ اس کی ڈھیل تھی کہ وہ توبہ اور اصلاح کرنا چاہیں تو توبہ اور اصلاح کر لیں ورنہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں۔ ان کا یہ زعم بھی بالکل بے حقیقت تھا کہ ان کے کچھ اولیاء اور مددگار ہیں جو خدا کی پکڑ سے ان کو بچا سکتے ہیں۔ اب سارے حقائق ان کے سامنے آ گئے۔ اب یہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے اور چونکہ یہ خدا کی راہ سے صرف خود ہی نہیں رکے بلکہ دوسروں کو بھی روکنے والے بنے اس وجہ سے یہ دوہرے عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔ 'مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ' یعنی نفرت اور بیزاری کی شدت کے سبب سے نہ تو یہ اللہ اور رسول کی باتیں سننے ہی کے لیے تیار ہوتے تھے اور نہ محبت دنیا کا پردہ اللہ کی نشانیاں دیکھنے کے لیے ان کی آنکھیں ہی کھلنے دیتا تھا۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (٢١-٢٢)

ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے اس طرح اپنی صلاحیتیں برباد کیں انھوں نے اپنے آپ

کو خود اپنے ہی ہاتھوں برباد کیا اور جن کی مدد اور شفاعت کے اعتماد پر یہ خطرناک کھیل کھیلے ان میں سے کوئی ان کے کام آنے والا نہ بنے گا اس لیے کہ خدا پر افترا کر کے محض اپنے ذہن سے جو خیالی معبود انھوں نے گھڑے وہ سب بے حقیقت ثابت ہوں گے ظاہر ہے کہ آخرت کی نامرادی ایسے ہی عقل و بصیرت سے محروم لوگوں کے حصے میں آئے گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۳)

اہل ایمان کے فضائل

اب یہ کفار و مشرکین کے مقابل گروہ یعنی اہل ایمان کے انجام کا ذکر ہے۔ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ کے معنی اِطْمَاَنُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَتَخَشَّعُوْا اَمَامَهٗ کے ہیں۔ یعنی ہر ایک سے کٹ کر اپنے رب کی طرف پوری دل جمعی اور کامل یکسوئی کے ساتھ وہ جھک پڑے۔ اوپر مشرکین کا حال تو یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے کبر و غرور کے سبب سے نہ اپنے کان ہی کھولنے کے لیے تیار ہوئے نہ اپنی آنکھیں ہی لیکن ان لوگوں نے ایمان و عمل صالح کی روش اختیار کی اور خلق خدا کو اللہ کی صراط مستقیم سے ہٹانے اور اس کو مختلف وادیوں میں ہرزہ گردی کرانے کے بجائے پوری یکسوئی و فروتنی کے ساتھ اپنے آپ کو اپنے خالق و پروردگار کے آگے ڈال دیا۔ فرمایا کہ یہی لوگ جنت کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے ایک مرتبہ اس میں داخل ہو جانے کے بعد پھر اس سے کبھی محروم نہیں ہوں گے۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۴)

اوپر کفار کی حالت بیان ہو چکی ہے کہ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ، کہ ان کے ہوش کے کان اور ان کی بصیرت کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں اس وجہ سے وہ قرآن کو سننے اور اللہ کی نشانیوں کے مشاہدہ سے محروم رہے۔ اس کے برعکس اہل ایمان نے اپنی آنکھیں بھی کھلی رکھیں اور اپنے کان بھی۔ فرمایا کہ ان دونوں گروہوں کی تمثیل یہ ہے کہ ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا بینا اور شنوا تو دونوں کا رویہ قرآن کے باب میں ایک سا کس طرح ہو سکتا ہے؟ قرآن کی دعوت سرتاسر عقل و بصیرت پر مبنی ہے، اس پر ایمان وہی لوگ لائیں گے جن کے کان اور دل کھلے ہوں اور جنھوں نے بخشی ہوئی فطری صلاحیتیں اپنی محفوظ رکھی ہوں۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۵-۹۹

آگے آیت ۹۹ تک ایک تاریخی ترتیب کے ساتھ پچھلے رسولوں اور ان کی قوموں کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں۔ ان کے سنانے سے مقصود ایک طرف تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دکھانا ہے کہ آج جو کچھ تمھیں پیش آرہا ہے بعینہٖ وہی کچھ تم سے پہلے آنے والے رسولوں کو بھی پیش آچکا ہے، تو تم ان کی زندگیوں سے رہنمائی حاصل کرو اور جس طرح انھوں نے صبر و عزیمت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اسی طرح تم بھی حالات کا مقابلہ کرو۔ دوسری طرف قریش کو یہ دکھانا ہے کہ تم نے جو روش اپنے رسول کے ساتھ اختیار کی ہے وہی

روش تمہاری پیش رو قوموں نے بھی اختیار کی تھی جس کے نتیجہ میں ایک خاص حد تک مہلت دیے جانے کے بعد وہ ہلاک کر دی گئیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جس طرح کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا اسی طرح کا معاملہ وہ تمہارے ساتھ نہ کرے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۵-۹۹

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ ﴿٢٥﴾ أَنْ لَا
تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ ﴿٢٦﴾ فَقَالَ
الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا
نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ
لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ﴿٢٧﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ
إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَآتَانِي رَحْمَةً مِنْ عِنْدِهِ فَعُمِّيَتْ
عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ ﴿٢٨﴾ وَيَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ
عَلَيْهِ مَالًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۚ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ إِنَّهُمْ
مُلَاقُو رَبِّهِمْ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ﴿٢٩﴾ وَيَا قَوْمِ مَنْ يَنْصُرُنِي
مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتُهُمْ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٣٠﴾ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي
خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ
تَزْدَرِي أَعْيُنُكُمْ لَنْ يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا ۖ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ ۖ
إِنِّي إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿٣١﴾ قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ
جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٣٢﴾ قَالَ إِنَّمَا
يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿٣٣﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ
نُصْحِي إِنْ أَرَدْتُ أَنْ أَنْصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ ۚ هُوَ

رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٣٤﴾ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ
فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ﴿٣٥﴾ وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ ع ۳ ۱۱ ۳
لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا
يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي
الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴿٣٧﴾ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ
مَلَأٌ مِّن قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ۚ قَالَ إِن تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ
مِنكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ﴿٣٨﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ
وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٣٩﴾ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ
قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ
الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ ۚ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٤٠﴾ وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا
بِسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا ۚ إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٤١﴾ وَهِيَ تَجْرِي (ترو حفص بفتح المیم وامالۃ الراء ۱۲)
بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يَا بُنَيَّ
ارْكَب مَّعَنَا وَلَا تَكُن مَّعَ الْكَافِرِينَ ﴿٤٢﴾ قَالَ سَآوِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي
مِنَ الْمَاءِ ۚ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَن رَّحِمَ ۚ وَحَالَ
بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ ﴿٤٣﴾ وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ
وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ
وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤٤﴾ وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ الربع
ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ﴿٤٥﴾ قَالَ

يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا
لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ
رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَ
تَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۴۷﴾ قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ
بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ
مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ
تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ
لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا
لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ
اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَيٰقَوْمِ
اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ
قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ
وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ
نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا
اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا
تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا
هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ
اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا

تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۵۷ وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا
نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ
عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۵۸ وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا
رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۵۹ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا
لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ
قَوْمِ هُوْدٍ ۶۰ وَاِلٰي ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ع ۵
مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا
فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۶۱ قَالُوْا
يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا
يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۶۲ قَالَ
يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً
فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۣ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۶۳
وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ
وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۶۴ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ
تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۶۵ فَلَمَّا
جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ
خِزْيِ يَوْمِىِٕذٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۶۶ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا
الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۶۷ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ

أَلَآ إِنَّ ثَمُودَا۟ كَفَرُوا۟ رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّثَمُودَ ۝٦٨ وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ ع
إِبْرَٰهِيمَ بِٱلْبُشْرَىٰ قَالُوا۟ سَلَٰمًا ۖ قَالَ سَلَٰمٌ ۖ فَمَا لَبِثَ أَن جَآءَ بِعِجْلٍ
حَنِيذٍ ۝٦٩ فَلَمَّا رَءَآ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۚ
قَالُوا۟ لَا تَخَفْ إِنَّآ أُرْسِلْنَآ إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ ۝٧٠ وَٱمْرَأَتُهُۥ قَآئِمَةٌ
فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَٰهَا بِإِسْحَٰقَ وَمِن وَرَآءِ إِسْحَٰقَ يَعْقُوبَ ۝٧١ قَالَتْ
يَٰوَيْلَتَىٰٓ ءَأَلِدُ وَأَنَا۠ عَجُوزٌ وَهَٰذَا بَعْلِى شَيْخًا ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيبٌ ۝٧٢
قَالُوٓا۟ أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ ٱللَّهِ ۖ رَحْمَتُ ٱللَّهِ وَبَرَكَٰتُهُۥ عَلَيْكُمْ أَهْلَ ٱلْبَيْتِ ۚ
إِنَّهُۥ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ ۝٧٣ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَٰهِيمَ ٱلرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ
ٱلْبُشْرَىٰ يُجَٰدِلُنَا فِى قَوْمِ لُوطٍ ۝٧٤ إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّٰهٌ مُّنِيبٌ ۝٧٥
يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَآ ۖ إِنَّهُۥ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ ءَاتِيهِمْ عَذَابٌ
غَيْرُ مَرْدُودٍ ۝٧٦ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِىٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ
ذَرْعًا وَقَالَ هَٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ۝٧٧ وَجَآءَهُۥ قَوْمُهُۥ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ
وَمِن قَبْلُ كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ ۚ قَالَ يَٰقَوْمِ هَٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِى هُنَّ
أَطْهَرُ لَكُمْ ۖ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ فِى ضَيْفِىٓ ۖ أَلَيْسَ مِنكُمْ رَجُلٌ
رَّشِيدٌ ۝٧٨ قَالُوا۟ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِى بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ
مَا نُرِيدُ ۝٧٩ قَالَ لَوْ أَنَّ لِى بِكُمْ قُوَّةً أَوْ ءَاوِىٓ إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ۝٨٠
قَالُوا۟ يَٰلُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَن يَصِلُوٓا۟ إِلَيْكَ ۖ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ
مِّنَ ٱلَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ إِلَّا ٱمْرَأَتَكَ ۖ إِنَّهُۥ مُصِيبُهَا

مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا
جَاۗءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ
سِجِّيْلٍ ڏ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ع
بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا
لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّىْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ
وَّاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ
وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ
مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ڬ وَمَآ اَنَا
عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا
يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰۗؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ
الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ
رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَـنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ
عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ
يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ
وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ
اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا
تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۡ وَمَآ

أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يٰقَوْمِ أَرَهْطِيْٓ أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۖ وَ
اتَّخَذْتُمُوهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٩٢﴾ وَ
يٰقَوْمِ اعْمَلُوا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ إِنِّيْ عَامِلٌ ۖ سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۙ مَنْ
يَّأْتِيهِ عَذَابٌ يُّخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوْٓا إِنِّيْ مَعَكُمْ
رَقِيبٌ ﴿٩٣﴾ وَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِينَ اٰمَنُوا مَعَهٗ
بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِيْ
دِيَارِهِمْ جٰثِمِينَ ﴿٩٤﴾ كَأَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ
ع ۸ ۱۲ ثَمُودُ ﴿٩٥﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٩٦﴾ إِلٰى فِرْعَوْنَ
وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا أَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ ﴿٩٧﴾ يَقْدُمُ
قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۖ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ ﴿٩٨﴾
وَأُتْبِعُوا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ ﴿٩٩﴾

ترجمۂ آیات ۲۵-۹۹

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے ان کو آگاہ کیا کہ میں تمہارے لیے ایک نذیر مبین ہو کر آیا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ میں تم پر ایک دردناک عذاب کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اس کی قوم کے ان سربراہوں نے جنھوں نے کفر کیا، جواب دیا کہ ہم تو تم کو بس اپنا ہی جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں اور ہم تمہاری پیروی کرنے والوں میں انھی کو پاتے ہیں جو ہمارے اندر کے ذلیل لوگ ہیں، بے سمجھے بوجھے تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں اور ہم تم لوگوں کے لیے اپنے مقابل میں کوئی خاص امتیاز بھی نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ ہم تم کو بالکل جھوٹا خیال کر رہے ہیں۔ ۲۵-۲۷

اس نے کہا، اے میرے ہم قومو! بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور پھر اس نے خاص اپنی رحمت سے بھی مجھے نوازا اور وہ تم سے پوشیدہ رہی تو کیا ہم اس کو تم پر چپکا دیں جب کہ تم اس سے بیزار بھی ہو! اور اے میرے ہم قومو، میں اس خدمت پر تم سے کسی مال کا طالب نہیں۔ میرا اجر تو بس اللہ ہی کے ذمہ ہے اور میں ان لوگوں کو ہرگز دھتکارنے والا نہیں جو ایمان لائے ہیں۔ یہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں بلکہ میں تو تم کو دیکھ رہا ہوں کہ تم جہالت میں مبتلا ہو۔ اور اے میرے ہم قومو، اگر میں ان کو دھتکار دوں تو خدا کے مقابل میں کون میری مدد کرے گا؟ کیا تم لوگ اس پہلو پر دھیان نہیں کرتے؟ اور میں تمھارے سامنے یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا اور نہ یہ دعویٰ کرتا کہ میں کوئی فرشتہ ہوں اور نہ میں ان لوگوں کے بارے میں، جن کو تمھاری نگاہیں حقیر دیکھتی ہیں، یہ کہہ سکتا کہ خدا ان کو کوئی خیر دے ہی نہیں سکتا۔ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کروں تو میں ہی ظالم ٹھہروں گا۔ وہ بولے کہ اے نوحؑ تم نے ہم سے بحث کر لی اور بہت بحث کر لی، اگر تم سچے ہو تو وہ چیز ہم پر لاؤ جس کی تم ہم کو برابر دھمکی سنا رہے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ اس کو تو تم پر اللہ ہی لائے گا اگر وہ چاہے گا اور تم اس کے قابو سے باہر نہ نکل سکو گے اور میری خیر خواہی تم پر کچھ کارگر نہیں ہو سکتی اگر میں تمھاری خیر خواہی کرنا چاہوں اگر اللہ تم کو گمراہ کرنا چاہتا ہو۔ وہی تمھارا رب ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹنا ہے۔ ۲۸-۳۴

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے، کہہ دو، کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو میرے جرم کا وبال میرے ہی اوپر ہے اور جو جرم تم کر رہے ہو میں اس سے بری ہوں۔ ۳۵

اور نوحؑ کو وحی کی گئی کہ تمھاری قوم میں سے جو ایمان لا چکے ان کے سوا اب کوئی اور ایمان

لانے والا نہیں تو جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں اس سے آزردہ خاطر نہ ہو اور تم کشتی بناؤ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق اور ان ظالموں کے باب میں اب ہم سے کچھ نہ کہیو، یہ تو غرق ہو کر رہیں گے۔ اور وہ کشتی بنانے لگا۔ اور جب جب اس کی قوم کے بڑوں کی کوئی جماعت اس کے پاس سے گزرتی تو اس کا مذاق اڑاتی۔ وہ ان کو جواب دیتا کہ اگر تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو تو جس طرح تم مذاق اڑا رہے ہو اسی طرح ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے۔ تم جلد جان لو گے کہ وہ کون ہیں جن پر وہ عذاب آتا ہے جو ان کو رسوا کر کے رکھ دیتا ہے اور وہ قہر نازل ہوتا ہے جو ٹِک کے رہ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور طوفان اُبل پڑا، ہم نے اس کو کہا کہ ہر چیز میں سے نر و مادہ دونوں کو اور اپنے اہل و عیال کو، بجز ان کے جن پر حکم نافذ ہو چکا ہے، اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، اس کشتی میں سوار کرا لو، اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کی تعداد تو بس تھوڑی ہی تھی۔ اور اس نے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا۔ میرا رب بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ ۳۶-۴۱

اور وہ کشتی پہاڑوں کی طرح اٹھتی موجوں کے درمیان ان کو لے کر چلنے لگی اور نوحؑ نے اپنے بیٹے کو، جو اس سے الگ تھا، آواز دی کہ اے میرے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور ان کافروں کا ساتھ نہ دے۔ وہ بولا کہ میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔ نوحؑ نے کہا، آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر وہی جس پر رحم فرمائے۔ اور ان دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی اور وہ بھی غرق ہونے والوں میں سے ہو کے رہا۔ اور حکم ہوا کہ اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا اور پانی اتار دیا گیا اور معاملے کا

فیصلہ ہوگیا اور کشتی کوہ جودی پر جا لگی اور اعلان کر دیا گیا کہ ظالموں پر خدا کی پھٹکار ہے۔

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے خداوند میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ پکا ہے اور تو تمام فیصلہ کرنے والوں سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والا ہے۔ فرمایا، اے نوح وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے، وہ نہایت نابکار ہے۔ مجھ سے اس چیز کے لیے درخواست نہ کرو جس کے باب میں تمھیں کچھ علم نہیں اور میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ بنو۔ اس نے کہا کہ اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے کسی ایسی چیز کی درخواست کروں جس کے باب میں مجھے کوئی علم نہیں اور اگر تو میری مغفرت نہ کرے گا اور مجھ پر رحم نہ فرمائے گا تو میں نامرادوں میں سے ہو جاؤں گا۔ ارشاد ہوا اے نوح اترو، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اپنے اوپر بھی اور ان امتوں پر بھی جو ان سے ظہور میں آئیں جو تمہارے ساتھ ہیں۔ اور ایسی امتیں بھی اٹھیں گی جن کو ہم بہرہ مند کریں گے پھر ان کو ہماری طرف سے ایک عذاب دردناک پکڑے گا۔ ۴۵-۴۸

یہ ماجرا غیب کی باتوں میں سے ہے جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے سنا رہے ہیں، اس سے پہلے نہ تم ہی اس کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم کے لوگ ہی، تو ثابت قدم رہو، انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کا حصہ ہے۔ ۴۹

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے ان کو دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ یہ تم محض افترا کر رہے ہو۔ اے میری قوم کے لوگو، میں اس پر تم سے کسی معاوضے کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو بس اسی کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا تو کیا تم سمجھتے نہیں؟ اور اے میری قوم کے لوگو،

اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم پر خوب خوب اپنا ابر کرم برسائے گا اور تمھاری قوت میں اضافہ پر اضافہ فرمائے گا اور مجرمانہ روگردانی کی روش اختیار نہ کرو۔ وہ بولے کہ اے ہود تم ہمارے پاس کوئی کھلی نشانی لے کر تو آئے نہیں اور ہم مجرد تمھارے کہنے سے تو اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور ہم ہرگز تمھیں ماننے والے نہیں۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ تم پر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑی ہے۔ اس نے کہا میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ اس کے سوا جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بالکل بری ہوں تو تم سب مل کر میرے خلاف چالیں چل دیکھو، پھر مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ میں نے اللہ، اپنے اور تمھارے رب پر بھروسہ کیا، جتنے بھی جاندار ہیں ان کی پیشانی اسی کی گرفت میں ہے بے شک میرا رب نہایت سیدھی راہ پر ہے۔ پس اگر تم اعراض کر رہے ہو تو میں نے تمھیں وہ پیغام پہنچا دیا جو دے کر مجھے تمھاری طرف بھیجا گیا ہے۔ اور میرا رب تمھاری جگہ اب تمھارے سوا کسی اور قوم کو لائے گا اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے۔ میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ اور جب ہمارا عذاب آدھمکا ہم نے ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے، اپنے فضل خاص سے نجات بخشی۔ اور ہم نے ان کو ایک نہایت ہی سخت عذاب سے بچا لیا۔ ۵۰-۵۸

اور یہ قوم عاد ہے۔ انھوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر جبار و سرکش کی بات کے پیچھے لگے اور اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے روز بھی۔ سن لو کہ عاد نے اپنے رب کا انکار کیا، سن لو کہ ہلاکی ہو ہود کی قوم عاد کے لیے!! ۵۹-۶۰

اور قوم ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے دعوت دی

اے میری قوم کے لوگو اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اسی نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس میں آباد کیا تو اس سے مغفرت مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ میرا رب قریب بھی ہے، قبول کرنے والا بھی۔ وہ بولے کہ صالح، اس سے پہلے تو ہمارے اندر تم بڑی امیدوں کے مرکز تھے۔ کیا تم ہمیں ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے! اور ہم تو اس چیز کے سبب سے جس کی تم ہمیں دعوت دے رہے ہو بڑی ہی سخت الجھن میں پڑ گئے ہیں۔ اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو، بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پہ ہوں اور اس نے اپنی جانب سے رحمت خاص سے بھی مجھے نوازا تو اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کی پکڑ کے وقت کون میرا مددگار ہوگا۔ سو تم میری بربادی ہی میں اضافہ کروگے۔ ۶۱-۶۳

اور اے میری قوم کے لوگو، یہ اللہ کی اونٹنی ہے تمہارے لیے ایک نشانی تو اس کو چھوڑ دو کہ یہ اللہ کی زمین میں چرے چگے اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچائیو ورنہ ایک قریبی عذاب تمہیں آ پکڑے گا تو انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں۔ تب اس نے کہا کہ اب تین دن اور اپنی بستی میں رس بس لو، یہ دھمکی جھوٹی نہیں ہونے کی۔ پس جب ہمارا حکم صادر ہوا تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنے خاص فضل سے اس عذاب اور اس دن کی رسوائی سے نجات بخشی۔ بے شک تمہارا رب ہی قوی اور غالب ہے اور ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا خدا کی ڈانٹ نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں زمین سے چمٹے پڑے رہ گئے۔ گویا کبھی ان میں بسے ہی نہیں۔ سن لو ثمود نے اپنے رب کی ناشکری کی۔ سن لو کہ بلا کی ہو ثمود کے لیے!! ۶۴-۶۸

اور ابراہیم کے پاس ہمارے فرستادے خوش خبری لے کر آئے۔ کہا سلامتی ہو۔ اس نے

بھی کہا سلامتی ہو۔ دیر نہیں گزری کہ اس نے ان کے آگے بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا۔ پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو اس نے ان میں اجنبیت پائی اور ان کی طرف سے ایک خدشہ محسوس کیا۔ وہ بولے کہ تم کوئی اندیشہ نہ کرو، ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اور اس کی بیوی پاس کھڑی تھی وہ ہنسی پس ہم نے اس کو اسحاق کی خوش خبری دی اور اسحاق کے آگے یعقوب کی۔ وہ بولی کہ ہائے شامت! کیا اب میں بچہ جنوں گی جب میں خود بھی ایک بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہیں! یہ تو ایک نہایت ہی عجیب بات ہوگی! وہ بولے، کیا خدا کی بات پر تعجب! اللہ کی رحمت اور برکتیں نازل ہوں آپ پر اے اہل بیت نبی بے شک وہ سزاوار حمد و بزرگ ہے!! ۶۹-۷۳

تو جب ابراہیم کا خوف دور ہوا اور اس کو بشارت ملی تو وہ ہم سے قوم لوط کے بارے میں بحث کرنے لگا۔ بے شک ابراہیم نہایت ہی بردبار، درد مند اور اپنے رب کی طرف دھیان رکھنے والا تھا۔ اے ابراہیم یہ بحث چھوڑو، اب تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور ان پر ایک ایسا عذاب آنے والا ہے جو ٹالے نہ ٹالا جا سکے اور جب ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے وہ ان کے سبب سے غمگین ہوا اور اس کا دل بھنچا اور بولا کہ یہ تو بہت ہی کٹھن دن ہے۔ ۷۴-۷۷

اور اس کی قوم کے لوگ جھپٹتے ہوئے اس کے پاس پہنچے اور یہ پہلے سے بدکاریوں میں مبتلا تھے۔ اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو، یہ میری بیٹیاں ہیں، وہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں تو اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے باب میں مجھے رسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی مرد معقول نہیں! وہ بولے کہ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ تمہاری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں اور تم خوب جانتے ہو جو کچھ ہم چاہتے ہیں۔ اس نے کہا کاش میرے پاس تم سے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں کسی طاقت ور

سہارے کی پناہ لے سکتا! فرستادوں نے کہا اے لوط ہم تو تمھارے رب کے فرستادے ہیں، یہ ہرگز تم تک پہنچ نہیں سکتے تو تم اپنے اہل و عیال کو لے کر کچھ رات رہے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی مڑ کے بھی نہ دیکھے۔ مگر تمھاری بیوی اس سے مستثنیٰ ہے، اس پر بھی وہی آفت آنی ہے جو ان پر مقدر ہو چکی ہے۔ ان کے عذاب کا وقت مقررہ صبح ہے، کیا صبح قریب نہیں! ۸۰-۸۱

پس جب آیا ہمارا عذاب تو ہم نے اس بستی کو یک قلم تلپٹ کر کے رکھ دیا اور اس پر سنگِ گل کی بارش کی، تہ بہ تہ، تمھارے رب کے پاس نشان لگائے ہوئے، اور وہ ان ظالموں سے کچھ دور نہیں۔ ۸۲-۸۳

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو۔ میں تمھیں فارغ البالی کی حالت میں دیکھ رہا ہوں اور تم پر ایک گھیر لینے والے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ اور تول کو پورا رکھو پورے عدل کے ساتھ اور لوگوں کی چیزوں میں ان کی حق تلفی نہ کرو اور زمین میں فساد پھیلانے والے بن کر نہ ابھرو۔ اللہ کا بخشا ہوا منافع ہی تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم سچے ایمان والے ہو۔ اور میں تم پر نگران نہیں ہوں۔ وہ بولے کہ اے شعیب، کیا تمھاری نماز تمھیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ بیٹھیں جن کی ہمارے باپ دادا پرستش کرتے آئے یا یہ کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں؟ بس تمھیں تو ایک دانشمند اور راست رو رہ گئے ہو! اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو، بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک واضح دلیل پر ہوں (اور اس نے مزید اپنی جانب سے مجھے رزقِ حسن سے بھی نوازا ہو (تو اس کے سوا میں تمھیں اور کس چیز کی دعوت دوں) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تمھاری مخالفت

کر کے وہی چیز خود اختیار کروں جس سے تمھیں روک رہا ہوں۔ میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جس حد تک کر سکوں۔ اور مجھے توفیق تو اللہ ہی کی مدد سے حاصل ہو گی۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ اور اے میری قوم کہیں میری ضد تمھارے لیے اس امر کا باعث نہ بن جائے کہ تم پر بھی اسی طرح کی آفت نازل ہو جس طرح کی آفت قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر نازل ہوئی اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور بھی نہیں۔ اور اپنے رب سے مغفرت مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ بے شک میرا رب نہایت مہربان اور بڑی محبت کرنے والا ہے۔ وہ بولے کہ اے شعیب، جو باتیں تم کہتے ہو اس کا بہت سا حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور ہم تو تم کو اپنے اندر ایک کمزور وجود خیال کرتے ہیں اور اگر تمھارا خاندان نہ ہوتا تو ہم تو تم کو سنگسار کر دیتے اور تم ہم پر کچھ بھاری نہیں۔ اس نے کہا اے میری قوم، کیا میرا خاندان تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے اور اس کو تو تم نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ میرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اے میری قوم کے لوگو تم اپنے طور پر کروجو کر رہے ہو، میں بھی اپنے طور پر کر رہا ہوں، تم عنقریب جان لو گے کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اس کو رسوا کر کے رکھ دیتا ہے اور کون ہے جو جھوٹا ہے اور انتظار کرو میں بھی تمھارے ساتھ منتظر ہوں۔ اور جب ہمارا عذاب آیا ہم نے شعیب کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنی رحمت سے نجات دی اور جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو ڈانٹ نے آپکڑا پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ گویا کبھی ان میں بسے ہی نہ تھے۔ ہاں، ہلاک ہوئے مدین جس طرح دفع ہوئے ثمود! ۸۴-۹۵

اور ہم نے موسیٰ کو فرعون اور اس کے اعیان کے پاس اپنی آیات اور ایک روشن نشانی کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا تو انھوں نے فرعون ہی کی بات مانی حالانکہ فرعون کی بات راست نہ تھی۔

وہ قیامت کے روز اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور ان کو دوزخ میں لے جا اتارے گا اور کیا ہی برا گھاٹ ہوگا جس پر یہ اتریں گے! اور اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ کیا ہی برا انعام ہے جو دیا گیا! ۹۶-۹۹

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۲۵)

'نذیر مبین' کا مفہوم

حضرت نوحؑ کی سرگزشت کی طرف اجمالی اشارہ پچھلی سورہ میں بھی ——— آیات ۷۱ - ۷۳ ——— گزر چکا ہے۔ اس سورہ میں اس اجمال کی تفصیل آ رہی ہے۔ 'مَنْذِیْرٌ مُّبِیْنٌ' (کھلا ڈرانے والا) میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ رسول جس قہر و عذاب سے ڈراتا ہے اس کی نوعیت قیاسات اور اندازوں پر مبنی اشارات و کنایات کی نہیں ہوتی بلکہ ایک واضح اور قطعی خبر اور اعلان کی ہوتی ہے اس لیے کہ اس کی بنیاد اول تو وحی الٰہی پر ہوتی ہے ثانیاً یہ اس سنت الٰہی کا تقاضا بھی ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً ظاہر ہوتی ہے۔ اس قطعیت کا اثر قدرتی طور پر اس کے الفاظ اور لب و لہجہ میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ وہ آنے والے خطرے کا اس طرح اعلان کرتا ہے گویا اپنی دونوں آنکھوں سے اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہاں لفظ 'مُبِیْن' میں ایک لطیف تلمیح بھی ہے اس کو بھی نگاہ میں رکھیے۔ عرب میں دستور رہا ہے کہ ہر قوم کے لوگ کسی بلند ٹیلہ یا پہاڑی پر دیدبان بناتے جہاں ہر وقت ایک نگران مقرر رہتا جس کا کام یہ ہوتا کہ جب وہ دیکھتا کہ کسی طرف سے حملہ آوروں کی کوئی جماعت اس کی قوم پر حملہ کیا چاہتی ہے تو وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر ننگا ہو جاتا اور 'یا صباحا!' کا نعرہ لگاتا۔ یہ پوری قوم کے لیے الارم ہوتا اور سب تلواریں سونت سونت کر مدافعت کے لیے باہر نکل آتے۔ اس کو 'نذیر عریاں' کہتے تھے۔ خدا کے رسول بھی اپنی قوم کو آنے والے عذاب سے آگاہ کرنے کے لیے آئے اور انھوں نے بالکل اس طرح لوگوں کو اس سے آگاہ کیا گویا وہ عقب سے نمودار ہی ہونے والا ہے اس وجہ سے قرآن میں ان کے لیے 'نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ' کے الفاظ استعمال ہوئے۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ (۲۶)

حضرت نوحؑ کی دعوت

یہ حضرت نوحؑ کی دعوت کا نقطۂ آغاز ہے۔ پیچھے مڑ کر اس سورہ کی آیت ۲ پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ بعینہٖ اسی نقطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی دعوت کا آغاز فرمایا۔ مزید آگے بڑھیے تو معلوم ہوگا کہ جس قسم کا معارضہ قوم نوحؑ نے حضرت نوحؑ کے ساتھ کیا اسی قسم کا معارضہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے آپ کے ساتھ کیا۔ حالات و واقعات کی یہ مطابقت ہی ہے جس

کر دکھانے کے لیے یہ سرگزشتیں سنائی جا رہی ہیں کہ نبی اور اس کی قوم دونوں کے سامنے ماضی کے آئینے میں ان کے حاضر اور مستقبل کا پورا نقشہ آجائے۔ تاریخ کی جو قدر و قیمت ہے وہ اسی پہلو سے ہے۔ اگر یہ پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو تاریخ کی حیثیت مجرد داستان سرائی کی رہ جاتی ہے۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ (۲۷)

قوم نوح کے تین معارضے

لفظ 'ملأ' کی تحقیق ہم دوسرے مقام میں بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد کسی قوم کے لیڈر، سرپنچ، سردار اور اکابر ہوتے ہیں۔ یہی بگڑی ہوئی قوم کے سارے فساد کی جڑ بھی ہوتے ہیں اس وجہ سے انبیاء کی دعوتِ اصلاح سے سب سے زیادہ یہی مخالفت کرتے ہیں۔ قوم نوح کے ان لیڈروں نے حضرت نوح کی دعوت کے جواب میں بیک وقت تین معارضے پیش کیے۔

ایک یہ کہ 'مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا' یعنی تم تو ہمارے ہی جیسے انسان ہو۔ اگر خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہی تھا تو وہ کسی فرشتے کو یا کسی اور برتر مخلوق کو رسول بنا کر بھیجتا، یا کم از کم یہ کہ کسی فرشتے کو تمہارے ساتھ گواہ بنا کر بھیجتا۔ ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو ہماری طرف رسول بنا کر بھیجنے کے کیا معنی؟ پیچھے آیت ۱۲ پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ بعینہٖ یہی بات قریش کے لیڈروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے جواب میں کہی۔

دوسرا یہ کہ 'وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ' یعنی تمہارے پیرو ہمارے اندر کے صرف وہ لوگ بنے ہیں جو رذالے اور ادنیٰ درجے کے لوگ ہیں، جن کی سوسائٹی میں کوئی عزت و وقعت نہیں، جو معاملات پر غور کرنے اور ان کے نتائج و عواقب کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بس تمہاری بات انھوں نے سنی اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے لگ گئے۔ 'بَادِيَ الرَّاْيِ' کو کشاف نے ظرف کے مفہوم میں لیا ہے اور اس کی وضاحت یوں کی ہے 'وقت حدوث اول رأيهم' یعنی جو بات دل میں باول وہلہ آگئی وہ کر گزرے، اس پر غور کرنے کی زحمت انھوں نے نہیں اٹھائی۔

تیسرا یہ کہ 'وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ' یعنی اگر تم خدا کے ایسے ہی چہیتے ہو کہ اس نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے تو یہ تھا کہ تم پر اور تمہارے ساتھیوں پر من برستا، تم خزانوں کے مالک ہوتے اور خدم و حشم تمہارے ہم رکاب چلتے لیکن ہم تو اپنے مقابل میں تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کو کسی پہلو سے مرجح نہیں دیکھتے بلکہ اس کے برعکس یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا حال تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے مقابل میں بدرجہا بہتر ہے۔ اس وجہ سے ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹ موٹ کی ہم پر دھونس جما رہے ہو۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ (۲۸)

معارضات کا جواب

اب اس آیت میں اور آگے کی آیات میں مذکورہ بالا معارضات میں سے ایک ایک کا جواب آرہا ہے۔ حضرت نوح نے پہلی بات تو یہ فرمائی کہ میں جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اس کی بنیاد دو چیزوں پر

ہے۔ ایک تو اس نور فطرت (بینہ) پر جو میرے اندر پہلے سے موجود تھا اور دوسرے اس وحی الٰہی (رحمت) پر جس سے میرے رب نے مجھے نوازا۔ اگر تمہارے اندر بھی فطرت کی وہ روشنی موجود ہوتی جو میرے اندر ہے تب تو میری یہ دعوت تمہیں خود اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی اور تم اس کو اللہ کی رحمت سمجھ کر قبول کرتے لیکن مشکل یہ ہے کہ تم نے اپنی ناشکریوں اور بداعمالیوں سے اپنی فطرت کے نور کو گل کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ قدرت کے قانون کے تحت تمہارے دل تاریک کر دیے گئے ہیں اور ان کے اندر کسی ہدایت کو قبول کرنے کی صلاحیت سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔ اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں تمہارے اوپر ایک ایسی چیز چپکا دوں جس کے چپکنے کے لیے تمہارے اندر سرے سے کوئی لوٹ باقی ہی نہیں رہ گیا ہے اور وہ بھی اس حال میں کہ تم اس کے نام سے بھی بیزار ہو۔ پچھلے آیت ۲ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (۲۹)

یہ حضرت نوحؑ کی طرف سے اپنی قوم کے سرداروں کی رعونت کا جواب ہے کہ اگر تم میری بات سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو تو اچھی طرح سمجھ لو کہ اس میں میرا نقصان کوئی نہیں ہے، سرتا سر تمہارا اپنا ہی نقصان ہے۔ میں جو کچھ تمہارے آگے پیش کر رہا ہوں اگر میں اس کے عوض میں تم سے کسی اجرت کا طالب ہوتا تب تو تمہاری اس بیزاری کی مجھے پروا ہوتی کہ تم نے میرے مال کی قدر نہیں کی اور میری دکان بیٹھ جائے گی۔ لیکن جب میں کوئی تجارت نہیں کر رہا ہوں بلکہ جس طرح مفت پایا ہے اسی طرح مفت بانٹ رہا ہوں تو تم اگر اس کو قبول نہ کرو گے تو خود ہی خسارہ میں رہو گے۔ مجھے تو اس کا جو اجر ملنا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور وہ مجھے مل کے رہے گا۔ تمہارے رد و قبول سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ میری دعوت جن لوگوں نے قبول کی ہے وہ تمہاری نگاہوں میں حقیر و رذیل لوگ ہیں اس وجہ سے تمہیں میرے قرب سے عار ہے تو میں تمہاری دلداری کے لیے ان کو اپنے پاس سے دھتکارنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ وہ اپنے رب پر ایمان لائے ہیں اور کل کو اپنے اسی ایمان کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ ملنے والے ہیں۔ اگر میں آج انھیں تمہاری خاطرداری میں اپنے پاس سے دھتکار دوں تو کل کو میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ شرافت اور رذالت کا اصلی فیصلہ تو خدا کے ہاں ہونا ہے۔ وہی بتائے گا کہ اس کی نگاہوں میں کون شریف ہے اور کون رذیل۔ میری نگاہوں میں تو تمہی لوگ جہالت میں مبتلا ہو۔

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۳۰)

یہ اوپر والی آیت کی مزید وضاحت ہے کہ اگر میں تمہاری نازبرداری میں اللہ پر ایمان لانے والے ان غریبوں کو دھتکار دوں تو کل کو خدا کی پکڑ سے مجھے کون بچانے والا بنے گا؟ 'اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ' یعنی مال و جاہ کے غرور میں تم ایسے پاگل ہو گئے ہو کہ تم میں سے کسی کو معاملے کے اس پہلو پر غور کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِىْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۳۱)

یہ مخالفین کے سارے معارضات کا اکٹھا جواب ہے کہ اگر تم مجھ میں کوئی بات مافوق بشریت نہیں پاتے تو میں نے بشریت سے بالاتر ہونے کا دعویٰ کب کیا ہے! میں نے کب کہا ہے کہ میرے پاس خدا کے خزانوں کی کنجیاں ہیں یا میں غیب دان ہوں یا کوئی فرشتہ ہوں؟ میں ان باتوں میں سے کسی بات کا بھی مدعی نہیں ہوں۔ میں تو صرف خدا کا رسول ہوں اور جس پیغام کے ساتھ اس نے مجھے تمھاری طرف بھیجا ہے وہ میں تمھیں سنا رہا ہوں۔ میرے ساتھی غریب و نادار لوگ ہیں اس وجہ سے تم ان کو حقیر سمجھتے ہو اور چونکہ تمھاری نگاہوں میں ساری قدر و قیمت دنیا اور اسباب دنیا ہی کی ہے جو تمھیں حاصل ہے، اس وجہ سے تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر اس دعوت میں، جو میں دے رہا ہوں، کوئی پہلو خیر کا ہوتا تو بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ سدا کے بھوکے ننگے لوگ تو اس سے فیض یاب ہو جاتے اور تم جو اپنے زعم میں سارے خیر و فضل کے وارث و مورث ہو اس سے محروم رہ جاتے! اگر تمھارا گھمنڈ یہ ہے کہ جب انھیں دنیا نہیں ملی تو خدا ان کو کوئی اور خیر و فضل کس طرح دے سکتا ہے تو میں تمھارے اس گھمنڈ کی تائید کرنے کے لیے تیار نہیں۔ دنیا تو ہر اہل و نااہل کو مل جاتی ہے لیکن دین کی نعمت ہمیشہ انھی کو نصیب ہوتی ہے جن کے دلوں میں اس کے لیے صلاحیت ہوتی ہے اور جن کی فطرت مسخ ہونے سے محفوظ ہوتی ہے۔ یہ دل اور فطرت کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس وجہ سے اگر میں ان کے باب میں تمھارے گمان کی تائید کردوں تو میں بھی اپنے آپ کو ظالموں کا ساتھی بنا لوں۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَاۗءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (۳۲-۳۳)

قوم نوح کا مطالبۂ عذاب

جب قوم نوح کے اعیان بحث و مناظرہ کے میدان میں بالکل پسپا ہو گئے، حضرت نوح نے ہر پہلو سے ان پر حجت تمام کر دی اور ان کے لیے کوئی راہ فرار باقی نہیں چھوڑی تو آخری دامن انھوں نے اپنے لیے یہ خیال کیا کہ ان سے اس عذاب کے لانے کا مطالبہ کریں جس کی وہ خبر دے رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ بحث و مناظرہ تو اے نوح! بہت ہو چکا، اب تو بس اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لاؤ جس کی دھمکی پر دھمکی سنا رہے ہو۔ حضرت نوح نے جواب میں فرمایا کہ عذاب کا لانا تو اللہ کے اختیار میں ہے، وہی جب چاہے گا لائے گا لیکن یہ یاد رکھو کہ اس طنطنہ کے ساتھ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو جب عذاب آ دھمکے گا اس وقت کوئی خدا کے قابو سے باہر نہ نکل سکے گا۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۳۴)

حضرت نوحؑ کا

دعوت و نصیحت اور تذکیر و موعظت کا آخری مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ رسول اپنا فرض ادا کر کے اپنی سبکدوشی کا اعلان کرتا ہے اور اپنے

جھٹلانے والوں کو ان کے اس انجام کے حوالے کر کے جو ان کے لیے خدا کی طرف سے مقدر ہو چکا ہو تب ہے یہ بات حضرت نوحؑ نے اسی مرحلہ میں فرمائی ہے کہ اب تم خدا کے قانون کی زد میں آ چکے ہو اور اپنے اعمال کے سبب سے سزاوار ہو کہ خدا تمہیں گمراہی کی راہ پر چلنے کے لیے چھوڑ دے تو میں لاکھ تمہیں نصیحت و موعظت، سناؤں میری نصیحت و موعظت کچھ کارگر نہیں ہو سکتی۔ اب تمہارا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، وہی تمہارا رب ہے اور اسی کے آگے تمہاری پیشی ہونی ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ (۳۵)

حضرت نوحؑ کا اعلان براءت

اس آیت میں بعض لوگوں نے مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھا ہے اور اس کو حضرت نوحؑ کی سرگزشت کے درمیان ایک التفات کی حیثیت دی ہے۔ اگرچہ اس کے التفات ہونے کا بھی ایک محل ہے لیکن ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ دعوت و موعظت کے آخری مرحلہ میں اعلان براءت کی آیت ہے۔ اس آیت میں حضرت نوحؑ کو ہدایت ہوئی کہ اگر تمہاری قوم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو کچھ تم انھیں بتا رہے ہو یہ سب تمہاری اپنی ہی گھڑی ہوئی باتیں ہیں جن کو تم جھوٹ موٹ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہو تو اب یہ بحث بند کر دو اور ان سے کہہ دو کہ اگر یہ سب کچھ میرا افترا ہے تو اس جرم کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اگر یہ حق ہے اور تم جان بوجھ کر اس سے بغاوت کر رہے ہو تو میں تمہارے اس جرم کی ذمہ داری سے اپنی براءت کا اعلان کرتا ہوں ـــ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ پیغمبر کے اعلان براءت کے بعد قوم کے لیے فیصلہ کن گھڑی آ جاتی ہے۔

وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ (۳۶-۳۷)

عدالت الٰہی کا ظہور

مذکورہ بالا اعلان براءت کے بعد حضرت نوحؑ کو وحی کے ذریعہ سے اطلاع دے دی گئی کہ تمہاری قوم میں جن لوگوں کے اندر دعوت ایمان قبول کرنے کی صلاحیت تھی وہ ایمان لا چکے اب کوئی اور ایمان لانے والا باقی نہیں رہا ہے۔ دودھ میں جتنا مکھن تھا وہ سب نکالا جا چکا ہے، اب جو بچ رہا ہے وہ صرف چھاچھ ہے، تو تم خاطر جمع رکھو، یہ جو کچھ اب تک کرتے رہے ہیں اس سے دل شکستہ اور ملول نہ ہو، اب سنت الٰہی کے مطابق ان کے لیے خدا کی عدالت کے ظہور کا وقت آ گیا ہے اور فیصلۂ الٰہی یہ ہے کہ یہ سب غرق کر دیے جائیں گے تو تم اپنے اور اپنے اہل ایمان ساتھیوں کے بچاؤ کے لیے ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایات کے تحت ایک کشتی بناؤ اور خبردار ان ظالموں کے باب میں اب ہم سے کچھ نہ کہیو، اب یہ لازماً غرق ہو کے رہیں گے۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّن قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ۚ قَالَ إِن تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ (۳۸)

کشتی پر قوم نوحؑ کی پھبتیاں

'وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ'، جَعَلَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ عربی زبان کے معروف اسلوب کے مطابق مضارع سے پہلے فعل ناقص حذف ہو گیا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق کشتی بنانی شروع کر دی۔ ان کی قوم کے متکبرین

جو عذاب کی دھمکی ہی کو سرے سے نعوذ باللہ لاف زنی سمجھتے تھے، انھوں نے جب دیکھا کہ عذاب سے بچاؤ کے لیے کشتی بھی بننی شروع ہو گئی ہے تو ظاہر ہے کہ انھوں نے اس کو خلل دماغ ہی پر محمول کیا ہوگا اور جب جب پاس سے گزرتے ہوں گے خوب خوب پھبتیاں چست کرتے رہے ہوں گے اور کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان پھبتیوں کا حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کے دلوں پر کیا اثر پڑتا رہا ہوگا۔ لیکن انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو اس طرح کے امتحانات سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس غیب سے وہ لوگوں کو ڈراتے ہیں اس پر ان کو کس درجے کا یقین ہوتا ہے۔ گویا وہ اس کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، اگرچہ اپنے مخالفوں کو اس کو دکھا نہیں سکتے۔

ایک خاص اسلوب بیان

'فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ' سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہم بھی اسی طرح کی مبتذل پھبتیاں تم پر چست کریں گے جس طرح کی پھبتیاں تم چست کر رہے ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ آج جس طرح ہمارا یہ فعل تمھاری نگاہوں میں سامان مضحکہ ہے اسی طرح کل تمھارا انجام ہمارے لیے موجب ازدیاد ایمان و اطمینان ہوگا۔ آج تم ہنس رہے ہو، کل کو تم رو گے اور ہم نصرت الٰہی کے ظہور پر مسرور و بشاش اور اپنے رب کے شکر گزار ہوں گے۔ بعض مرتبہ جملہ میں صوتی ہم آہنگی کے اقتضا سے لفظ ایک ہی استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم الگ الگ ہوتا ہے۔ جیسے کہ 'دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوْا' میں ہے۔ کسی کی مصیبت پر خوش ہونا عام حالات میں تو اچھی بات نہیں ہے لیکن جن لوگوں پر اس طرح حجت تمام ہو چکی ہو جس طرح حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم پر تمام کی ان پر عذاب الٰہی کا نزول حق کی فتح مندی اور باطل کی ہزیمت کا ایک یادگار واقعہ ہوتا ہے جس پر اہل ایمان کا خوش ہونا عین مقتضائے ایمان ہوتا ہے۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (۳۹)

'عذاب مقیم' کا مفہوم

یعنی ابھی تو تم جو مذاق اڑا رہے ہو اور ہماری اس تیاری کو خلل دماغ پر محمول کر رہے ہو لیکن عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب تم دیکھ لوگے کہ رسوا کر دینے والا اور ٹک جانے والا عذاب کن پر نازل ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عذاب دو قسموں کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہ عذاب ہوتا ہے جس کا مقصد غافلین و منکرین کو جگانا اور جھنجھوڑنا ہوتا ہے تاکہ وہ داعی کی بات پر کان دھریں اور جس خطرے سے وہ ان کو آگاہ کر رہا ہے اس کے آثار دیکھ کر اگر متنبہ ہونا چاہیں تو متنبہ ہو جائیں۔ دوسرا وہ عذاب ہوتا ہے جو کامل اتمام حجت کے بعد رسول کے جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دینے کے لیے نازل ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کن عذاب ہوتا ہے جو ان لوگوں کو ہمیشہ کے لیے رسوا کر کے رکھ دیتا ہے جو رسول کے انذار کا مذاق اڑاتے اور اس کی تنبیہات کو خلل دماغ پر محمول کرتے ہیں۔ یہ محض ایک جھونکا نہیں ہوتا جو آیا اور گزر گیا بلکہ جس قوم اور جس بستی پر نازل ہوتا ہے وہیں ڈیرے ڈال دیتا ہے اور اس کی عبرت انگیز سرگزشت آثار و کھنڈرات کی شکل میں بھی اور تاریخ کے صفحات میں بھی محفوظ ہو جاتی ہے تاکہ آنے والی نسلیں بھی ان کے انجام سے سبق حاصل کریں۔ نیز یہی عذاب دیباچہ بن جاتا ہے اس ابدی عذاب کا جس سے ان کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ (۴۰)

قوم نوح کے عذاب کی نوعیت

'فار یفور' کے معنی جوش مارنے کے ہیں۔ یہ لفظ پکتی ہوئی ہانڈی کے جوش مارنے اور ابلنے کے لیے بھی آتا ہے اور بھڑکتے ہوئے تنور کے جوش مارنے کے لیے بھی۔ یہاں 'فَارَ التَّنُّوْرُ' کا محاورہ بطریق استعارہ اس سائیکلونی طوفان کی تعبیر کے لیے استعمال ہوا ہے جو قوم نوح پر آیا، جس سے سخت بارش بھی ہوئی اور آس پاس کے سمندروں کا پانی بھی ابل پڑا۔ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ، سورۂ ذاریات کی تفسیر میں، قوم نوحؑ کے عذاب کی نوعیت واضح کرتے ہوئے آخر میں خلاصۂ بحث یوں تحریر فرماتے ہیں۔

"اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قوم نوح پر تند اور چکردار ہوا کا طوفان آیا جس سے سخت بارش ہوئی، پاس کے سمندر کا پانی ابل پڑا اور ہر طرف سے موجیں اچھلنے لگیں۔ اس طوفان کے اندر نوح علیہ السلام کا سفینہ کوہ جودی پر جا ٹکا۔" (تفسیر سورہ ذاریات از فراہی)

'امر' سے مراد اس آیت میں بھی اور آگے آیت ۴۳ میں بھی وہ عذاب ہے جو حکم الٰہی سے ظہور میں آیا۔ فرمایا کہ جب عذاب آیا اور طوفان ابل پڑا، ہم نے نوح کو حکم دیا کہ ہر چیز میں سے نر و مادہ دو دو کو اپنے اہل و عیال کو اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو اس کشتی میں سوار کرا لو۔

من کل کا مفہوم

'من کل' کی تعمیم سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ہوام و حشرات اور کیڑے مکوڑے سب اس میں شامل ہوں بلکہ یہ لفظ معہود ذہنی کو پیش نظر رکھ کر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی متعدد مثالوں کی طرف ہم پیچھے اشارہ کرتے آئے ہیں اس وجہ سے اس سے مراد وہ جانور ہیں جو اس وقت تک انسان کے تصرف میں آ چکے تھے اور اس کی مختلف ضروریات میں کام آ رہے تھے۔

'الا من سبق' کے استثناء کی نوعیت

'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' یعنی تمہارے اہل میں سے وہ لوگ اس میں شامل نہیں ہیں جن کے باب میں خدا کا فیصلہ پہلے ہی صادر ہو چکا ہے۔ اس فیصلہ سے مراد وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے شیطان کو روز اول ہی اس کے الٹی میٹم کے جواب میں سنا دیا تھا کہ جنوں اور انسانوں میں سے جو تیری پیروی کریں گے میں ان سب کو جہنم میں بھر دوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ جو اس حکم ازلی کی زد میں آ چکے ہیں وہ تو اس میں سوار ہونے سے محروم رہیں گے باقی کو اس میں سوار کرا لو۔

ایمان سے محروم اکثریت گندگی کا ڈھیر ہے

'وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہ ہولناک طوفان تمام موجود انسانوں کی عظیم اکثریت کو بہا لے گیا صرف تھوڑے سے لوگ، جو حضرت نوحؑ پر ایمان لاتے تھے، اس سے محفوظ رہے۔ اس سے اللہ جل شانہ کی بے نیازی کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اس کی نگاہوں میں وہ اکثریت گندگی کا ایک ڈھیر ہے جو ایمان سے محروم ہے، وہ اس گندگی سے اپنی زمین کو پاک ہی دیکھنا پسند کرتا ہے اور محض اس بنیاد پر کہ اس کی تعداد زیادہ ہے اپنی زمین کی پشت پر اس کو لادے رکھنا پسند نہیں کرتا۔ ساتھ ہی اہل ایمان

کے لیے اس کی بے پایاں رحمت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ ہر چند ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو، لیکن خدائے رؤف رحیم ان جاں بر ریزوں کی ہر حال میں اپنے دامن رحمت میں حفاظت فرماتا ہے یہاں تک کہ طوفان نوح بھی ان کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اس پہلو سے اس ٹکڑے میں قریش کی مغرور اکثریت کے لیے وعید بھی ہے اور ان کے اندر کے ان قلیل التعداد اور مظلوم مسلمانوں کے لیے عظیم پیغام تسلی بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے اور اس دور میں قریش کے ظلم و ستم کے ہدف بنے ہوئے تھے۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴۱)

مومن کا مرکز نگاہ

اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت نوحؑ نے اپنے ساتھیوں کو کشتی میں سوار ہو جانے کی دعوت دی اور یہ کلمہ جو اس موقع پر ان کی زبان سے نکلا وہ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ... الآیۃ ہے۔ یہ کلمہ اس حقیقت کی تعبیر ہے کہ اسباب و وسائل بجائے خود کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن مومن کا اصلی اعتماد اسباب و وسائل پر نہیں بلکہ خدائے رحمان و رحیم کی رحمت و عنایت پر ہوتا ہے۔ اس کی عنایت شامل حال ہو تو متلاطم سمندر کے اندر لکڑی کا ایک ٹوٹا ہوا تختہ بھی آدمی کے لیے سہارا بن جاتا ہے۔ اور اگر یہ عنایت شامل حال نہ ہو تو عظیم الشان ٹیٹینک (TITANIC) بھی چشم زدن میں موجوں کا لقمہ بن جاتا ہے اور سائنس کی ساری کارفرمائیاں بے حقیقت ثابت ہوتی ہیں۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کام کا آغاز بسم اللہ سے جو کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اس میں اصلی راز یہی ہے کہ ہماری نگاہ صرف اسباب پر ٹک کے نہ رہ جائے بلکہ اسباب کے پس پردہ جو مسبب الاسباب ہے وہ بھی نگاہ میں رہے اس لیے کہ اسباب اسی کے اذن سے کام کرتے ہیں۔ آخر میں غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ کی صفات کا حوالہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ جس طرح مجرد اسباب پر بھروسہ جائز نہیں ہے اسی طرح اپنے اعمال پر بھی، خواہ وہ کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں، غرہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اصل بھروسہ خدا کی مغفرت و رحمت ہی پر ہونا چاہیے۔ کون جانتا ہے کہ خدا کی میزان میں کس کے عمل کا کیا وزن ٹھہرتا ہے۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَنَادٰى نُوْحُ ِۨ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ (۴۲)

حضرت نوحؑ کی وفاداری کا آخری امتحان

کشتی متلاطم موجوں کے اندر چل رہی تھی۔ موجیں اس طرح اٹھ رہی تھیں گویا کالے پہاڑ اٹھ رہے ہیں (یہ صحیح تصویر ہے طوفانی سمندر کے اندر موجوں کے اٹھنے کی) اتنے میں حضرت نوحؑ نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ان کا بیٹا (تورات میں اس بیٹے کا نام کنعان آیا ہے) کھڑا ہے۔ اس کو دیکھ کر شفقت پدری جوش میں آگئی۔ اس کو آواز دے کر پکارا یٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ۔ اس پکار میں بیک وقت شفقت اور دعوت دونوں کی روح سموئی ہوئی ہے۔ 'یٰبُنَيَّ' باپ کی طرف سے بیٹے کے لیے نہایت پیار کا خطاب ہے اور 'وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ' میں گویا آخری دعوت ہے کہ لخت جگر اب بھی موقع ہے کہ ان کافروں کا ساتھ چھوڑ کر ہم میں شامل ہو جا۔

وَهِيَ تَجْرِيْ حال کا صیغہ تصویر حال کے لیے ہے۔ اسی طرح وَّكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ کے الفاظ بھی اسی لیے وارد ہوئے ہیں کہ پورا منظر قاری کی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ طوفانی ہوائیں چل رہی ہیں، موسلادھار بارش ہو رہی ہے، پہاڑوں کی طرح موجیں اٹھ رہی ہیں، ان موجوں کے تھپیڑوں سے حضرت نوحؑ کی کشتی نبرد آزما ہے کہ اتنے میں نگاہ جو اٹھتی ہے تو دیکھتے ہیں کہ کچھ فاصلے پر جوان سال بیٹا حالات سے ششدر و سراسیمہ کھڑا ہے۔ آخر یہ بھی ممکن تھا کہ یہ منظر ان کو نہ دکھایا جاتا، جس طرح دوسرے بہت سارے کفار ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ کر ڈوبے اسی طرح یہ بھی نگاہوں سے دور کہیں کسی موج کا لقمہ بن جاتا۔ لیکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت نوحؑ بیٹے کے ڈوبنے کا عبرت انگیز تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ یہ حضرت نوحؑ کی وفاداری کا آخری امتحان تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء کیسے کیسے امتحانوں سے گزارے جاتے ہیں لیکن اللہ کی توفیق سے وہ ہر امتحان میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ نیز اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا کا قانون کتنا بے لاگ ہے کہ نوحؑ کا بیٹا بھی نافرمان ہو تو وہ اس کی گردن بھی عین باپ کے سامنے دبا دیتا ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ۭ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ (۴۳)

ہولناک ٹریجڈی کا آخری منظر

بیٹا بھی بڑا ہی ہٹی تھا۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر بھی اس کی ہٹ دھرمی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ باپ کی اس شفقت بھری دعوت کے جواب میں بولا کہ کچھ پروا نہیں، میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا، وہ مجھے اس پانی سے بچا لے گا۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ یہ پانی نہیں بلکہ قہر الٰہی ہے جس سے آج کوئی بچانے والا نہیں بن سکتا۔ صرف وہی اس سے بچ سکے گا جس پر اللہ ہی رحم فرمائے۔ اتنے میں ایک موج باپ اور بیٹے کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ بھی غرق ہو کے رہا۔ یہ اس ہولناک ٹریجڈی کا آخری منظر تھا۔ اس کے سامنے آجانے کے بعد فوراً آسمان و زمین سب کو احکام صادر ہو گئے کہ بس اب کام پورا ہو چکا۔

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۴۴)

زمین کو حکم ہوا کہ اپنا پانی نگل لے۔ آسمان کو حکم ہوا کہ بس اب تھم جا۔

'اقلاع' کا مفہوم، 'غیض الماء' کا مفہوم

'اقلاع' کے معنی کسی کام سے رک جانے کے بھی ہیں۔ یا سماء اقلعی، ای امسکی عن المطر۔ 'وغیض الماء' یعنی چڑھا ہوا پانی اتر گیا۔ غاض یغیض، لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ غاض الماء پانی اتر گیا، غاض الماء پانی کو اتار دیا۔ یہاں متعدی استعمال ہوا ہے

'جودی' سے مراد

الجودی کوہستان اراراط کی ایک چوٹی کا نام ہے۔ تورات میں صرف اراراط کا ذکر ہے۔ قرآن نے خاص اس چوٹی کا ذکر کیا ہے جہاں کشتی جا کر ٹکی۔ اس سے طوفان کی ہولناکی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ چند دنوں میں پانی کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا۔ اگر کسی محدود علاقہ میں بارش اتنی زیادہ ہو کہ نکاس کے تمام راستے اس کے پانی کو باہر نکالنے سے قاصر رہ جائیں تو وہاں پانی کا چڑھ جانا امر لازمی ہے۔

'بُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ' اظہارِ نفرت ولعنت کا جملہ ہے۔ یعنی خس کم جہاں پاک! ان ظالموں پر لعنت ہو! ظلم سے یہاں اپنی جان پر ظلم مراد ہے یعنی اللہ نے تو ان کو نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا لیکن انھوں نے اپنی بداعمالیوں سے اپنے آپ کو خدا کی زمین پر غلاظت کا ایک ڈھیر بنا لیا جس کو صاف کرنے کے لیے خدا کو ایک طوفان بھیجنا پڑا۔

معذبین پر لعنت

وَنَادٰی نُوۡحٌ رَّبَّہٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَہۡلِیۡ وَاِنَّ وَعۡدَکَ الۡحَقُّ وَاَنۡتَ اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ (۴۵)

یہ دعا حضرت نوحؑ نے اس وقت فرمائی ہے جب بیٹے کو ڈوبتے دیکھا اس وجہ سے بظاہر اس کا حوالہ آیت ۴۳ کے ساتھ آنا تھا لیکن بلاغت کلام کے اقتضا سے اس کا ذکر مؤخر ہو گیا۔ گویا خدا کی نگاہوں میں یہ شخص، حضرت نوحؑ کا بیٹا ہونے کے باوجود، ایسا نابکار تھا کہ جب تک خدا نے اس کو غرق نہیں کر لیا، اس کے باب میں حضرت نوحؑ کی دعا کو زیر بحث لانا بھی پسند نہیں فرمایا۔ اس غضب کی وجہ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں اگر کسی انسان کو سب سے بڑی سعادت اور خوش بختی حاصل ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کسی پیغمبر کے گھر میں جنم دے لیکن یہی خوش بختی سب سے بڑی بدبختی بھی ہو سکتی ہے اگر وہ اس کی قدر نہ کرے اور رسول کے گھر میں شیطان بن کر اٹھے۔ چنانچہ کلام کی ترتیب ہی سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ اس شخص کو خدا نے سب سے زیادہ مبغوض قرار دیا۔ گویا سارے طوفان کا اصلی ہدف تھا ہی یہی کہ جب یہ ڈوب گیا تو معاً طوفان کے خاتمہ کا اعلان ہو گیا۔

بلاغت کلام کا ایک خاص پہلو

حضرت نوحؑ نے یہ دعا شفقتِ پدری سے مضطرب ہو کر محض 'اہل' کے اس لفظ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرمائی جو اوپر آیت ۴۰ میں گزرا ہے کہ حضرت نوحؑ کو حکم ہوا کہ اس کشتی میں ہر چیز کے نر و مادہ اور اپنے اہل وعیال کو بجز ان کے جن کے باب میں خدا کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے، سوار کرا لو۔ چونکہ اھل کے لفظ میں ان کا بیٹا کنعان بھی بظاہر لفظ میں شامل تھا اور یہ بات تعین کے ساتھ ان کے علم میں نہیں تھی کہ یہ خدا کے اس فیصلہ کی زد میں آ چکا ہے جس کا حوالہ ہم نے اوپر 'اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡہِ الۡقَوۡلُ' کی وضاحت کرتے ہوئے دیا ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے فریاد کی کہ اے رب، میرا یہ بیٹا بھی میرے اہل میں شامل ہے اور تیرا یہ وعدہ کہ تو میرے اہل کو اس کشتی کے ذریعہ سے نجات دے گا سچا وعدہ ہے اور تو سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے۔ مطلب یہ کہ جب یہ تیرا سچا وعدہ موجود ہے تو میرا یہ بیٹا غرق کیوں ہوا؟

حضرت نوحؑ کی شفقت پدری

قَالَ یٰنُوۡحُ اِنَّہٗ لَیۡسَ مِنۡ اَہۡلِکَ ۚ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ ٭۫ۖ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ اِنِّیۡۤ اَعِظُکَ اَنۡ تَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ (۴۶)

نبی کا گھرانہ ایمان و عمل صالح سے بنتا ہے

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ یہ بیٹا تمہارے اس اہل میں شامل نہیں جن کے لیے نجات کا وعدہ تھا۔ نجات کا وعدہ صرف اہل ایمان کے لیے تھا اور تمہارے اہل میں سے اس میں وہی شامل تھے جو ایمان کے رشتہ سے تمہارے ساتھ وابستہ تھے۔ 'اِنَّہٗ عَمَلٌ

غَيْرُ صَالِحٍ، یہ اسی طرح کا اسلوب بیان ہے جیسے کہیں 'زَيْدٌ عَدْلٌ' (زید سراپا عدل ہے) یعنی یہ شخص تمھارے اہل میں کیسے شمار ہو سکتا ہے، یہ تو بالکل ناکارہ و ناہنجار تھا۔ نبی کا گھرانا صرف نسب سے نہیں بنتا بلکہ ایمان و عمل صالح سے بنتا ہے۔ یہ تو ان لوگوں میں شامل تھا جن کے باب میں ہمارا فیصلہ صادر ہو چکا ہے کہ ہم ایسے تمام لوگوں کو جہنم میں بھر دیں گے تو تم ہم سے کسی ایسی بات کے لیے درخواست نہ کرو جس کے باب میں تمھیں کوئی علم نہیں۔ میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔ ہم دوسرے مقام میں لفظ 'جھل' کی تحقیق بیان کر چکے ہیں کہ عربی میں اس کا اصل مفہوم جذبات سے مغلوب ہو جانا ہے۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ ۖ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُنْ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۴۷)

حضرت نوح علیہ السلام نے اس تنبیہ کے بعد فوراً توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِمَّنْ مَعَكَ ۚ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ (۴۸)

حضرت نوحؑ کو برکات کی بشارت

طوفان گزر جانے کے بعد یہ حضرت نوحؑ کو ہدایت ہوئی کہ اب خدا کی طرف سے سلامتی اور برکتوں کے سایہ میں زمین پر اترو۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کسی معذب قوم کے اندر سے جو لوگ اپنے ایمان اور اپنی عزیمت کی بدولت نجات پاتے ہیں چونکہ وہ آزمائش کی بھٹیوں سے گزر کر ہر قسم کے غل و غش سے بالکل پاک ہو جاتے ہیں اس وجہ سے رحمت الٰہی ان کی طرف خاص طور سے متوجہ ہوتی ہے اور ان کو اپنی مخصوص برکات و افضال کے سایہ میں پروان چڑھاتی ہے۔ ان کی مثال نہایت صالح بیجوں کی ہوتی ہے جو صالح زمین اور سازگار آب و ہوا میں پروان چڑھتے ہیں۔ اس وجہ سے ہر چند ان کی تعداد تھوڑی ہو لیکن وہ بہت جلد تمام اکناف کو گھیر لیتے ہیں۔ 'وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِمَّنْ مَعَكَ' یعنی آج اگر بظاہر تمھارے ساتھ صرف چند نفوس ہیں لیکن چونکہ ان پر خدا کی رحمت و برکت ہے اس وجہ سے ان کے اندر بڑی بڑی قومیں بالقوہ مضمر ہیں جو بالآخر ظہور میں آئیں گی اور تمام روئے زمین پر چھا جائیں گی۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ طوفان نوح کے بعد یہی نفوس از سر نو آبادی کا ذریعہ بنے۔

ایک تنبیہ

'وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ'۔ ساتھ ہی اس امر واقعہ سے آگاہ فرمایا کہ آئندہ ان کی نسل سے جو قومیں اٹھیں گی ان میں سب مبارک ہی نہیں ہوں گی بلکہ ان میں ایسی قومیں بھی ہوں گی جو عروج پکڑیں گی اور ہم ان کو ایک خاص حد تک مہلت بھی دیں گے بالآخر ان کے اعمال کی پاداش میں ہم ان کو ایک دردناک عذاب میں پکڑیں گے۔

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ ۖ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَٰذَا ۖ فَاصْبِرْ ۖ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ (۴۹)

آنحضرت صلعم کی طرف التفات

یہ خاتمہ سرگزشت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات ہے کہ یہ سرگزشت نہ تمھارے علم میں تھی اور نہ تمھاری قوم ہی کے۔

یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ اس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے اس سے تم کو بھی آگاہ کیا اور تمہارے واسطہ سے تمہاری قوم کو بھی اس سے آگاہ ہونے کا سامان بہم پہنچایا۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہ سرگزشت اس واضح صورت میں، اپنے فوائد و نتائج کے ساتھ، پہلی مرتبہ قرآن ہی میں بیان ہوئی ہے۔ اس سے پہلے تورات میں اس کے بعض حصے بیان تو ضرور ہوئے تھے لیکن نہایت ہی پراگندہ اور مسخ شدہ شکل میں۔ پھر پچھلے صحیفوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ناواقف تھے اور آپ کی قوم کے لوگ بھی۔ یہ تو قرآن کا فیض ہے کہ اس نے تاریخ کے ان حقائق سے آگاہ کیا اور یہ حقائق جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے سبق آموز تھے اسی طرح آپ کی قوم اور آپ کے مخالفین کے لیے بھی۔ فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ یہ خلاصہ ہے اس سرگزشت کا۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی دعوت پر جمے رہو۔ انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ تمہارے مخالف ناکام و نامراد ہوں گے۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ (۵۰)

قوم عاد و حضرت ہود — رسولوں کے باب میں یہ سنت الٰہی رہی ہے کہ ہر قوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے رسول بھیجا تاکہ انہی کے اندر کا ایک بہترین آدمی، انہی کی زبان میں ان پر حجت تمام کرے اور قومی و لسانی اجنبیت بیچ میں حائل نہ ہونے پائے۔ اس طرح گویا اپنی ہی زبان اور اپنا ہی دل اپنے اوپر گواہی دیتا ہے اور خود اپنا ہی بھائی حق نصیحت ادا کرتا ہے جس کی ہر اس شخص کو قدر کرنی چاہیے جس کے اندر حق کی عزت ہے۔ 'اَخَاهُمْ' کے لفظ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ ہم نے عاد کی طرف کسی غیر کو نہیں بلکہ انہی کے ایک بھائی کو رسول بنا کر بھیجا لیکن حق دشمنی کے جوش میں اس چیز کو بھی، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی، انھوں نے اس کی مخالفت کا بہانہ بنا لیا۔ اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ یہی توحید کی دعوت شروع سے تمام انبیاء کی مشترک دعوت رہی ہے اور اسی کی دعوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بلند کی تھی۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ یعنی اگر تم یہ دعوے کرتے ہو کہ کچھ اور معبود بھی ہیں جن کو خدا نے اپنا شریک ٹھہرایا ہے تو تم یہ خدا پر تہمت اور بہتان لگا رہے ہو۔ خدا نے کہیں بھی یہ نہیں کہا ہے کہ اس نے کسی کو شریک بنایا ہے۔

يٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۵۱)

حضرت ہود کی بے قراری — یعنی میں اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر جو تمہیں سمجھا رہا ہوں تو اس لیے نہیں کہ اس کے عوض میں تم سے اپنا کوئی مفاد وابستہ رکھتا ہوں۔ یہ میں کوئی مال تجارت لے کر تمہارے پیچھے پیچھے نہیں پھر رہا ہوں اگر تم نے نہ خریدا تو میرا کاروبار بیٹھ جائے گا۔ یہ تو محض تمہاری صلاح و فلاح کی آرزو ہے جو تمہاری تمام ناقدریوں کے باوجود مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تو خدا را میری بات توجہ سے سنو تو سہی۔ آخر میں اس کا کوئی معاوضہ تو نہیں مانگ رہا ہوں کہ تم میری بات سننے کے بھی روادار نہیں۔ جہاں تک میرے اجر کا تعلق ہے وہ میرے اس رب کے ذمہ ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا ہے۔ میں تو تم کو کچھ دینا چاہتا ہوں، کچھ لینے کا خواہشمند نہیں ہوں۔ کیا اتنی واضح بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى

قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ (۵۲)

توبہ کی دعوت اور اس کی برکات

یہ قوم کو توبہ کی دعوت ہے کہ شرک اور نافرمانی سے تائب ہو کر خالص اپنے رب سے اپنے تعلق کو استوار کرو۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ توبہ کے دو رکن ہیں۔ ایک منفی دوسرا مثبت۔ منفی تو یہ ہے کہ آدمی نے جو غلط عقائد و اعمال اختیار کر رکھے ہیں ان سے دست بردار ہو، مثبت یہ ہے کہ ان کی جگہ صحیح عقائد و اعمال اختیار کرے۔ پہلے کے لیے استغفار کا لفظ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے ملتجی ہو کہ وہ اس کے گناہوں سے درگزر فرمائے اور ان پر اپنے عفو و کرم کا پردہ ڈالے۔ دوسرے کے لیے توبہ کا لفظ ہے جس کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ یعنی بندہ زندگی کی اس صراط مستقیم کی طرف رجوع کرے جو خدا نے اس کو بتائی ہے اور جو اس کو خدا تک پہنچانے والی ہے۔ ان میں سے پہلے کی بنیاد خشیت پر ہے اور دوسرے کی محبت پر۔ پھر شعور اور احساس ان کا لازمی جزو ہے۔ جب تک یہ تمام عناصر جمع نہ ہوں، مجرد توبہ توبہ یا استغفر اللہ کے ورد سے وہ توبہ وجود میں نہیں آتی جو خدا کے ہاں قبولیت کا درجہ پاتے ہے۔ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ۔ خوب خوب بارش برسانا رزق و فضل میں زیادتی کی تعبیر ہے اور يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ سے سیاسی قوت و شوکت میں اضافہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اجتماعی توبہ کی برکتیں بیان ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نہ خیال کرو کہ آسمان سے بارش تمہارے دیوتا برساتے ہیں اور میدان جنگ میں فتح تمہیں وہ دلاتے ہیں اس وجہ سے اگر تم نے ان کو چھوڑ دیا تو رزق سے بھی محروم ہو جاؤ گے اور تمہاری سیاسی جمعیت بھی پارہ پارہ ہو جائے گی۔ تمہارے یہ خیالات بالکل وہم پر مبنی ہیں۔ آسمان و زمین سب پر صرف خدا ہی کی بادشاہی ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی قوم اللہ کی طرف رجوع کرتی اور اس کی رسی مضبوطی سے پکڑ لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے آسمان و زمین سب کی برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے اور چہار دانگ عالم پر اس کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ استغفار و توبہ کی جو دعوت تمہیں ہمارا رسول دے رہا ہے اس کو فرمانبردارانہ قبول کرو، اس سے مجرمانہ منہ نہ موڑو۔ — اگرچہ یہاں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اجتماعی توبہ کی برکتیں بیان ہوئی ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انفرادی توبہ ان برکتوں سے خالی ہوتی ہے۔ جو بندہ گناہ کی زندگی سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اللہ تعالیٰ رزق طیب سے اس کی کفالت فرماتا اور اس کو سکینت و طمانیت کی لازوال بادشاہی بخشتا ہے۔

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۵۳)

قوم کی طرف سے معجزہ کا مطالبہ

بینۃ سے مراد یہاں کوئی کھلا ہوا حسی معجزہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارا اتنا بڑا دعویٰ کہ تم خدا کے رسول ہو کر ہمارے پاس آئے ہو اور اتنا بڑا مطالبہ کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں، مجرد تمہارے کہہ دینے سے کس طرح قبول کر لیں؟ ہم یہ دعویٰ اور مطالبہ تو صرف اس صورت میں مان سکتے تھے جب تم کوئی کھلا ہوا معجزہ دکھاتے۔ لیکن جب تم اس طرح کا کوئی معجزہ لے کر نہیں آئے تو ہم مجرد تمہارے کہے پر نہ اپنے معبودوں ہی کو چھوڑنے کے لیے تیار

ہیں اور نہ تمہارے اس دعوے ہی کی تصدیق کے لیے تیار ہیں کہ تم خدا کے رسول ہو۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ (۵۴-۵۵)

حضرت ہودؑ کی غیرت حق

'اعتراء' کے معنی پہنچنے اور لاحق ہونے کے ہیں۔ یعنی تمہارا یہ دعویٰ اور یہ مطالبہ تسلیم کرنا تو الگ رہا، ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ تم پر ہمارے معبودوں ہی میں سے کسی کی مار پڑی ہے جس کے اثر سے تم باؤلے ہو کر اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ ان کی یہ بات سنتے ہی حضرت ہودؑ کی غیرت توحید بھڑک اٹھی۔ انداز کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کی بات کاٹ کر فوراً پورے جوش کے ساتھ جواب دیا کہ میں اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ اللہ کے سوا تم جن چیزوں کو شریک مانتے ہو، میں ان سے بری ہوں۔ 'فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ' اعلان برأت کے ساتھ یہ چیلنج ہے کہ اگر تمہارا گمان یہ ہے کہ تمہارے یہ معبود مجھے کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں تو تم اور تمہارے یہ سارے معبود مل کر میرے ساتھ جو داؤ گھات کرنا چاہتے ہو کر ڈالو اور پھر مجھے ذرا مہلت نہ دو، یعنی اپنے ترکش کے آخری تیر بھی آزما دیکھو کہ دل میں کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے۔

اِنِّىْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّىْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّىْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۵۶)

مومن کی ڈھال: توکل

یہ ہے مومن و موحد کی وہ ڈھال جس کے بل پر حضرت ہودؑ نے مذکورہ بالا چیلنج دیا۔ فرمایا کہ میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا بھی۔ مجال نہیں ہے کہ اس کے اذن کے بغیر کسی کو کوئی گزند پہنچا سکے 'مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا' کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جو اس کے قبضۂ قدرت سے باہر ہو۔ سب کی پیشانی اس کی مٹھی میں ہے۔ وہ جس کو جدھر چاہے اس کی چوٹی پکڑ کر موڑ دے اور جہاں چاہے روک دے۔ 'اِنَّ رَبِّىْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ' اور یہ نہ سمجھو کہ مجھے اپنے رب تک پہنچنے کے لیے بہت سی کج پیچ کی راہوں سے گزرنے اور تمہارے عقیدے کے مطابق بہت سے واسطوں اور وسیلوں کی ضرورت ہو۔ بلکہ میری عقل اور میری فطرت کو اس سے براہ راست ربط ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے یہ کافی ہے کہ میں صدق دل سے اس کی طرف متوجہ ہو جاؤں۔ اگر میں متوجہ ہو جاؤں تو وہ بالکل سیدھی راہ پر میرے سامنے ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مشرکین کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا تک پہنچنے کا واسطہ ان کے اصنام ہی ہیں اس وجہ سے بغیر ان کی عبادت کے کوئی خدا کو نہیں پا سکتا۔ اپنے اسی عقیدے کو وہ یوں پیش کرتے تھے کہ 'مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى' (ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں) ان کے اسی عقیدے کی بنا پر قرآن نے ان کا جرم یہ بتایا ہے کہ وہ خدا تک پہنچنے کی سیدھی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس سیدھی راہ کو کج کرنا چاہتے ہیں (اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا، ۴۵ الاعراف) حضرت ہودؑ نے اسی عقیدۂ باطل کی تردید فرمائی ہے اور غور کیجیے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ جب تک آدمی کے اندر خدا کے قرب و اتصال کا وہ تصور موجود نہ ہو جو ایک

پیچھے موجود رہتا ہے اس وقت تک اس کو خدا پر وہ توکل نہیں ہو سکتا کہ حضرت ہودؑ کی طرح ساری خدائی کو چیلنج کر سکے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْــــًٔا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ (۵۷)

حضرت ہودؑ کی آخری تنبیہ

یہ حضرت ہودؑ کی طرف سے آخری تنبیہ ہے کہ اگر تم اسی اعراض کی روش پر اڑے رہنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو اب نتائج کی تمام ذمہ داری تمہارے ہی سر ہے، اس لیے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پیغام دے کر بھیجا گیا تھا وہ میں تمہیں واضح طور پر پہنچا چکا ہوں۔ اب آگے کا مرحلہ یہ ہے کہ میرا رب تمہاری جڑ کاٹ دے گا۔ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ اور تمہاری جگہ تمہارے سوا کسی اور قوم کو متمکن کر دے گا۔ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْــــًٔا: اور یہ نہ سمجھو کہ تمہارے اجڑ جانے سے خدا کی دنیا اجڑ جائے گی۔ تمہارا فنا ہو جانا اس کے یا اس کی دنیا کے لیے ذرا بھی ضرر رساں نہیں۔ وہ ہر چیز کا نگران اور محافظ ہے۔ جو چیز بگڑ جاتی ہے اس کو مٹا کر اس کی جگہ دوسری نئی چیز لا دیتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ ایک مرتبہ اس دنیا کو بنا کر پھر اس سے بے تعلق ہو کر بیٹھ رہا ہو بلکہ وہ برابر اس کی نگرانی بھی کر رہا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے حدود سے گزر جاتی ہے تو ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اس کو درست بھی کر دیتا ہے۔

وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ (۵۸)

قوم عاد کے عذاب کی نوعیت

'امر' سے مراد یہاں وہ عذاب ہے جو امر الٰہی کے تحت ظہور میں آیا۔ اس عذاب کی نوعیت کیا تھی؟ اس کی کوئی تفصیل یہاں نہیں ہے۔ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں اس کی نوعیت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس بحث کی تمہید مولانا نے یوں اٹھائی ہے۔

"قرآن مجید میں قوم عاد کی ہلاکت کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان پر جو شخص غور کرے گا اس سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی کہ وہ تند ہوا کے ذریعے سے ہلاک کیے گئے جس کے ساتھ ساتھ وہ بادل بھی تھے جو ہمیشہ رعد و برق کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ قرآن میں جہاں ان کی تباہی کا ذکر ہوا ہے ہوا کے ساتھ بادل سے خالی ہوا کہ صاعقہ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ سورۂ احقاف میں ہے۔ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ؀ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا (پس جب انھوں نے اس کو عذاب کی دیکھا ایک صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولے یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسنے والا ہے بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے باد تند جس کے اندر ایک دردناک عذاب ہے یہ اکھاڑ پھینکے گی ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے)

ظاہر ہے یہ تمام خصوصیات موسم سرما کی باد تند کی ہیں اس زمانے میں، عرب میں باد شمال صرصر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے اور قحط و خشکی کی ایک عام نحوست اور تباہ کاری ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ سورۂ قمر میں اسی چیز کی

طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (اور ہم نے ان پر باد صرصر چلا دی قائم رہنے والی نحوست کے زمانے میں) اسی طرح ہے فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ (پس ہم نے ان پر باد صرصر چلا دی نحوست کے زمانے میں) باد صرصر کے یہ طوفان، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، عرب میں جاڑوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہی زمانہ ان کے ہاں نحوست اور فاقہ کا سمجھا جاتا ہے۔ (تفسیر سورۂ ذاریات فراہیؒ۔ فصل ۱۰)

اہل ایمان پر اللہ کا فضل

جب یہ عذاب نازل ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق اپنے رسول حضرت ہودؑ اور ان کے باایمان ساتھیوں کو اپنے فضل خاص سے اس عذاب سے بچا لیا اور باقی سب کو فنا کر دیا۔ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا سے اس رحمت کی عظمت و شان ظاہر ہو رہی ہے اس لیے کہ جو عذاب پورے علاقہ پر آیا، اس سے تھوڑے سے مخصوص لوگوں کو اس طرح اپنی رحمت کے پردوں کے نیچے چھپا کر بچا لینا عنایت الٰہی کا ایک عظیم کرشمہ ہے۔ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ یعنی یہ نہ سمجھو کہ ہم نے انھیں کسی معمولی آفت سے چھڑایا بلکہ نہایت ہی سخت و شدید عذاب سے چھڑایا۔ اس سے عذاب کی ہولناکی کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور اس عظیم رحمت کا بھی جو حضرت ہودؑ اور ان کے ساتھیوں کے لیے ظاہر ہوئی۔ مفسرین نے عام طور پر اس سے عذاب آخرت مراد لیا ہے لیکن ہم نے جو اس کا خاص پہلو واضح کیا ہے وہ موقع و محل سے نہایت واضح مناسبت رکھتا ہے۔

وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝ (۵۹-۶۰)

قریش کو تنبیہ

'تِلْكَ' کا اشارہ مخاطب یعنی قریش کو اس سرگزشت کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے کہ ان کے انجام سے سبق لو اور عبرت پکڑو۔ یہ کسی دوسرے کی سرگزشت نہیں، تمہاری اپنی ہی سرزمین کا ماجرا ہے۔ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ انھوں نے بھی تمہاری ہی طرح اپنے رب کی نشانیوں کا دیدہ و دانستہ، جیسا کہ دوسری جگہ تصریح ہے، انکار کیا۔ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ، اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اگرچہ بظاہر انھوں نے نافرمانی ایک ہی رسول — حضرت ہودؑ — کی کی تھی لیکن لفظ جمع کا 'رُسُل' استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اعتبار اصل علت فعل کا ہوتا ہے نہ کہ مخصوص فعل کا۔ جس علت کی بنا پر انھوں نے حضرت ہودؑ کو جھٹلایا اس کی موجودگی کی صورت میں کسی رسول کے ساتھ بھی ان کا معاملہ اس سے مختلف نہیں ہو سکتا تھا۔ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ یعنی رسولوں کی تو انھوں نے نافرمانی کی اور سرکشوں اور ضدیوں کی بات مانی۔ انجام اس بدبختانہ روش کا یہ ہوا کہ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور آخرت میں بھی ان کے پیچھے یہ لعنت لگی رہے گی۔ یہ حقیقت بھی یہاں پیش نظر رہے کہ اس دنیا میں انسان کے لیے دو ہی راستے ہیں۔ ایک رحمان کا، دوسرا شیطان کا اور انہی میں سے کسی ایک کی پیروی اس کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر وہ رحمان کے ساتھ نہیں اختیار کرے گا تو لازماً شیطان

کی پیروی کرے گا۔ یہی کی کری اور راہ نہیں ہے۔ آخر میں نرمش کر پھر تنبیہ کیا کہ کان کھول کر سن لو کہ عاد نے اپنے رب کا انکار کیا اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ سن لو کہ ہود کی قوم عاد پر خدا کی مار!

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ (۶۱)

اور قوم ثمود کی سرگزشت

عاد کے بعد عرب کی قدیم اقوام میں ثمود نے اپنی تمدنی و تعمیری ترقیوں کے اعتبار سے بڑی شہرت حاصل کی۔ اعراف ۷۴، کے تحت ان کی تعمیری ترقیوں کا ذکر گزر چکا ہے۔ ان کی طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت صالحؑ کو رسول بنا کر بھیجا جو ان کے اپنے ہی بھائی بند تھے تاکہ قومی اجنبیت کسی وحشت و بیگانگی کا باعث نہ بنے۔ انھوں نے توحید کی دعوت کے ساتھ اپنی قوم کو اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی کہ یہ خدا ہی ہے جس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور تمھیں اس کی تعمیر و ترقی میں لگا دیا۔ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا۔ اِسْتَعْمَرَهٗ فِي الْمَكَانِ کے معنی ہیں اس کو اس کی اصلاح و تعمیر میں لگا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو تعمیر و تمدن میں جو ترقی نصیب ہوئی ہے تو یہ بھی خدا ہی کا عطیہ ہے، اسی کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کی بدولت تم یہ کارنامے انجام دینے کے قابل ہوئے تو ان کارناموں پر مغرور ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے والے نہ بنو بلکہ اپنے گناہوں کی معافی چاہو اور صدق دل سے اس کی طرف رجوع کرو۔ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ۔ میرا رب قریب بھی ہے اور دعاؤں اور التجاؤں کو قبول کرنے والا بھی۔ یعنی اس کو پانے کے لیے یہ کافی ہے کہ تم اخلاص کے ساتھ اس کی طرف توجہ کرو، تمھارے ان شفعاء و شرکاء کی مطلق ضرورت نہیں ہے جن کو تم اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے شرط لازم ٹھہراتے ہو۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (۶۲)

انبیاء [illegible] فتنہ [illegible]

'مَرْجُوٌّ' سے مراد وہ شخص ہے جس کی اٹھان ایسی اچھی رہی ہو کہ وہ قوم و قبیلہ کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بن جائے اور لوگ مستقبل میں اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرنے لگیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ نخل فطرت کے بہترین ثمر تھے اس وجہ سے منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے بھی وہ اپنی پوری قوم میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور اپنے پاکیزہ اخلاق و اوصاف کے اعتبار سے نہایت ممتاز ہوتے ہیں۔ ان کے اس وصف کا تقاضا تو یہ تھا کہ جب وہ نبوت کے دعوے کے ساتھ سامنے آتے تو لوگ سنجیدگی کے ساتھ ان کی بات پر غور کرتے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انبیاء کی قوموں کا معاملہ بالعموم اس کے برعکس رہا ہے۔ جس شخص کو وہ زندگی بھر صادق اور امین مانتے رہے جونہی اس نے اپنی نبوت کا اظہار کیا اس کو کذاب اور مفتری کہنے لگے اور اس کی جان کے درپے ہو گئے۔ صرف تھوڑے لوگ ایسے نکلے جنھوں نے معاملے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی توفیق پائی۔

حضرت صالحؑ پر قوم کے اعتراضات

حضرت صالحؑ کی قوم کو بھی پہلے ان سے بڑا حسن ظن تھا لیکن جب وہ نبی کی حیثیت سے سامنے آئے، توحید کی دعوت دی اور شرک سے روکا تو ان کا سارا حسن ظن غائب ہو گیا۔ وہ بولے کہ ہم تو تم سے بڑی بڑی امیدیں

وابستہ کیے ہوئے تھے کہ تم سے باپ دادا کا نام روشن اور دینِ آبائی کی عزت و عظمت میں اضافہ ہوگا لیکن تم اچھے نکلے کہ ہمیں ہمارے ان معبودوں کی عبادت سے روکنے اٹھ کھڑے ہوئے جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے۔

بھائی سچی بات تو یہ ہے کہ اس دعوت کے سبب جو تم ہمیں دے رہے ہو ہم سخت شک اور الجھن میں پڑ گئے ہیں۔ 'اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ' میں 'عن' محذوف ہوگیا ہے۔ اصل میں 'عَنْ اَنْ نَّعْبُدَ' ہے۔ 'مِمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ' سے حضرت صالحؑ کی دعوتِ توحید مراد ہے۔ 'شک' کے ساتھ 'مُرِيْب' کی صفت سے مضمون میں یہ اضافہ ہوگیا ہے کہ تمھاری اس دعوت سے ہماری امیدوں کو بڑا دھکا لگا ہے۔ ہم کیا توقعات لیے بیٹھے تھے اور تم کیا فتنہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ 'اَرَابَه' کے معنی لغت میں 'اَزْعَجَهٗ وَاَقْلَقَهٗ' کے ہیں۔ یعنی اس نے اس کو اضطراب اور الجھن میں ڈال دیا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ (۶۳)

حضرت صالحؑ کا جواب

'بینۃ' اور 'رحمۃ' پر آیت ۱۷ اور آیت ۲۸ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں تو جو دعوت دے رہا ہوں وہ میری فطرت کی آواز بھی ہے اور مزید برآں وحیِ الٰہی کی تعلیم بھی جو مجھے براہِ راست حاصل ہوئی تو اب اگر میں اس راہ سے ہٹ کر کوئی اور راہ اختیار کروں تو مجھے خدا کی پکڑ سے بچانے والا کون بنے گا؟ 'فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ'۔ یعنی اگر میں یہ راہ چھوڑ کر تمھاری وہ توقعات پوری کرنے میں لگ جاؤں تو تم میری بدبختی اور نامرادی ہی میں اضافہ کرو گے، خدا کے مقابل میں میری کوئی مدد نہیں کر سکو گے۔

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۔ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ (۶۵-۶۴)

ناقہ کا معجزہ

بعینہٖ یہی مضمون کم و بیش انھی الفاظ میں اعراف آیت ۷۳ میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس کے تمام اہم اجزا کی بھی تشریح کی ہے اور ناقہ کی نشانی کے ظہور کا موقع و محل اور اس کا مقصد بھی واضح کیا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ (۶۶)

'امر' سے مراد وہ عذاب ہے جو ثمود پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے آیا۔ اس عذاب کو لفظ 'امر' سے تعبیر کرنے میں یہ بلاغت ہے کہ جونہی حکم صادر ہوا معاً عذاب آدھمکا۔ گویا امر ہی کے اندر عذاب مضمر تھا۔ 'نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا'، یعنی ہم نے اپنے خاص فضل سے صالحؑ اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو نجات دی۔ ورنہ یہ آفت ایسی بے پناہ اور ہمہ گیر تھی کہ اللہ کی رحمت کے سوا اور کوئی چیز اس سے نجات دلانے والی نہیں بن سکتی تھی۔ 'وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ'

قریش کو تنبیہ

یعنی 'وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ'۔ جس طرح اوپر آیت ۵۸ میں ہے 'وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ' وہاں فعل کو ظاہر

آنحضرت صلعم کو ...

کر دیا ہے۔ یہاں قرینہ کی موجودگی کے سبب سے حذف کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ان کو کسی معمولی آفت

سے نجات بخشی بلکہ اس دن کی رسوائی سے نجات بخشی جس کی رسوائی معروف خواص و عوام ہے۔ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ رسول کی تکذیب کے نتیجہ میں جب کسی قوم پر عذاب آیا ہے تو وہ کامل تذکیر و تبلیغ اور کامل اتمام حجت کے بعد ان لوگوں پر آیا ہے جو اپنے غرور کے سبب سے کسی بات کو سننے اور سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے تھے اس وجہ سے اس کا نمایاں پہلو یہ بھی رہا ہے کہ اس نے ان کو صرف پامال ہی نہیں کیا بلکہ آخری درجہ میں ذلیل اور رسوا کر کے بھی رکھ دیا۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیام تسکین و تسلی ہے کہ قوت اور عزت کا اصل مالک تو تیرا رب ہی ہے۔ اگر اس میں سے کسی کو کوئی حصہ نصیب ہوتا ہے تو اسی کی عنایت سے نصیب ہوتا ہے تو تم مطمئن رہو جس طرح اس نے صالحؑ کے دشمنوں کو ذلیل و پامال کر کے رکھ دیا اسی طرح تمہارے دشمنوں کو بھی ایک دن رسوا کر دے گا اور کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں بن سکے گا۔

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ (۶۷ - ۶۸)

قوم ثمود پر عذاب کی نوعیت

صَيْحَة کے معنی ڈانٹ کے ہیں۔ اس سے مراد وہ عذاب ہے جو قوم ثمود پر آیا چونکہ لحاظ لفظ کا نہیں بلکہ مفہوم کا ہوا اس وجہ سے فعل اس کے لیے مذکر استعمال ہوا۔ اس قوم پر اللہ تعالیٰ نے سرا کی باد صرصر اور کڑک، دمک اولے اور زلزلے کا عذاب بھیجا۔ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے کے پڑے رہ گئے اور اس طرح بے نام و نشان ہو گئے گویا کبھی ان میں بسے ہی نہیں۔ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ، یہ اظہار نفرت و لعنت کا جملہ ہے۔ اس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ (۶۹)

حضرت لوطؑ اور قوم لوط کی سرگزشت

اب آگے حضرت لوطؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت آ رہی ہے۔ یہ آیت اس سرگزشت کی تمہید کے طور پر یہاں وارد ہوئی ہے اس لیے کہ جو فرشتے قوم لوط کے لیے عذاب لے کے آئے تھے وہی حضرت ابراہیمؑ کے لیے بیٹے اور پوتے کی بشارت بھی لے کے آئے تھے۔ رُسُل، سے مراد یہاں وہی فرشتے ہیں۔ بُشْرٰى، سے مراد جیسا کہ آگے آیت ۷۱ میں تصریح ہے، حضرت اسحٰقؑ اور پھر ان سے حضرت یعقوبؑ کی ولادت کی خوش خبری ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی میزبانی فرشتوں کے لیے

قَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ، یعنی انھوں نے صالح اور شائستہ لوگوں کی طرح حضرت ابراہیمؑ کو سلام کیا۔ اور حضرت ابراہیمؑ نے بھی ان کے سلام کا جواب دیا، اور چونکہ وہ انسانی بھیس میں تھے اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ فوراً ان کی میزبانی کی فکر میں لگ گئے۔ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ، اور زیادہ دیر نہیں گزری کہ انھوں نے ان کے آگے بھنا ہوا بچھڑا پیش کر دیا۔ اس سے حضرت ابراہیمؑ کی فیاضی اور مسافر نوازی کا اندازہ ہوتا ہے کہ چند آدمی دروازے پر آتے ہیں، جن سے دید و شنید کچھ بھی نہیں لیکن وہ بلا تاخیر ان کے لیے گلے سے بچھڑا ذبح کرا دیتے ہیں اور اس کا بھنا ہوا گوشت ان کے آگے پیش کر دیتے ہیں۔ عِجْل، کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ

مسلّم بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا گیا ہو بلکہ زبان کا یہ معروف اسلوب ہے کہ کبھی کل بول کر اس سے مراد جزو لیتے ہیں اس وجہ سے اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے آگے انھوں نے بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت پیش کیا ہو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بدویانہ دورِ زندگی میں یہ ضیافت نہایت فیاضانہ تھی کہ تین آدمیوں کی میزبانی کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے گلے کا ایک بچھڑا ذبح کرا دیا۔ ان کی اس فیاضی کو نمایاں کرنے کے لیے گوشت کے بجائے بچھڑے کا ذکر فرمایا۔

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۚ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ (۷۰)

حضرت ابراہیمؑ کی تشویش اور فرشتوں کی اطمینان دہانی

اب تک حضرت ابراہیمؑ کو یہ گمان تھا کہ قرب و جوار کے کسی علاقے کے چند شریف اور صالح آدمی ہیں لیکن ان کی اتنی محنت اور اتنے ذوق و شوق سے تیار کی ہوئی ضیافت کی طرف جب انھوں نے ہاتھ نہیں بڑھایا تو قدرتاً انھوں نے کچھ بیگانگی محسوس کی اور دل ہی دل میں کچھ ڈرے کہ یہ کیا بات ہے۔ انھوں نے ان کی ضیافت قبول نہیں کی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے ان کو آدمی سمجھا اور وہ فرشتے ہوں۔ اور اگر یہ فرشتے ہیں تو لازماً یہ کسی بڑی مہم پر نکلے ہوں گے اس لیے کہ فرشتوں کا ظہور کسی بڑی مہم ہی کے لیے ہوا کرتا ہے۔ اس موقع پر ان کے ذہن میں قدرتی طور پر قومِ لوطؑ کا بھی خیال آیا ہوگا جو پاس ہی حضرت لوطؑ کی جدوجہد کے علی الرغم اپنے طغیان کے اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی جس کے بعد لازماً خدا کا عذاب آیا کرتا ہے۔ فرشتوں نے یہ محسوس کر کے کہ حضرت ابراہیمؑ تشویش میں پڑ گئے ہیں ان کو تسلی دی کہ آپ کسی تشویش میں مبتلا نہ ہوں، ہم قومِ لوطؑ کی طرف بھیجے گئے ہیں اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر انھوں نے ان کو بیٹے کی بشارت سنائی۔

وَامْرَاَتُهٗ قَاۤئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَاۤءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ (۷۱-۷۲)

حضرت سارہ کی حیرت اور مسرت

سرگزشت کا آغاز جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى سے ہوا تھا لیکن مہمانوں کو دیکھتے ہی معاً حضرت ابراہیمؑ ان کی خاطر و مدارات کے اہتمام میں لگ گئے۔ اس وجہ سے بشارت کے سننے کی نوبت اب آئی اور اس وقت ان پر یہ انکشاف ہوا کہ جن کو وہ آدمی سمجھے تھے وہ آدمی نہیں بلکہ فرشتے ہیں۔ جس وقت فرشتوں نے بشارت سنائی حضرت ابراہیمؑ کی بیوی سارہ بھی دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ فَضَحِكَتْ یعنی یہ بشارت سن کر وہ ہنسیں۔ یہ ہنسی حیرت، تعجب اور مسرت کے گوناگوں جذبات کا مظہر تھی۔ اس تعجب کا اظہار انھوں نے جن لفظوں میں فرمایا اس کا حوالہ آگے آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے اس مسرت آمیز اظہارِ حیرت پر مزید جوش میں آگئی۔ چنانچہ ان کو براہِ راست مخاطب کر کے صرف بیٹے ہی کی نہیں بلکہ تعین نام کے ساتھ بیٹے اور اس سے آگے پوتے کی بھی بشارت دے دی گئی فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَاۤءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ۔ فَبَشَّرْنٰهَا میں عنایتِ خاص اور تکمیلِ مسرت کے جو گوناگوں پہلو ملحوظ ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں اور بیٹے کے ساتھ پوتے کی بشارت نے گویا یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ بیٹا زندہ

رہے گا، ابھی عمر پائے گا اور اس کی صلب سے نامور پوتا بھی پیدا ہوگا۔ قَالَتْ یٰوَیْلَتٰی ... الآیۃ' یہ حضرت سارہ کے اظہار تعجب کی تفصیل ہے جس کی طرف اوپر 'فَضَحِکَتْ' کے لفظ سے اشارہ فرمایا تھا۔ وہ خاص نسوانی انداز میں بولیں، ہائے شامت! کیا اب میں بچہ جنوں گی جب کہ بڑھیا بانجھ ہو چکی ہوں اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے ہیں، یہ تو نہایت ہی عجیب بات ہوگی!! بظاہر یہ فقرہ اظہار تعجب کا ہے لیکن اس کے لفظ لفظ کے اندر سے جو باطنی خوشی جھلک رہی ہے وہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔ حضرت سارہ کے اظہار تعجب کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس بشارت کے ظہور کی راہ میں جو ظاہری رکاوٹیں ہیں ان کا ذکر کر کے یہ اطمینان حاصل کر لیں کہ ان کے باوجود یہ پوری ہو کے رہے گی۔

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکٰتُہٗ عَلَیْکُمْ اَہْلَ الْبَیْتِ ؕ اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ (۷۳)

فرشتوں کی اطمینان دہانی

'اَتَعْجَبِیْنَ' کے لفظ سے صاف واضح ہے کہ فرشتوں نے حضرت سارہ کی ہنسی اور ان کے فقرے کو اس کے بالکل صحیح یعنی اظہار تعجب کے مفہوم میں لیا اور نہایت ادب و احترام کے انداز میں انہوں نے حضرت سارہ کو توجہ دلائی کہ اہل بیت نبی خدا کے کسی کام اور اس کے کسی ارادہ پر تعجب کی کہاں گنجائش ہے، پھر آپ پر تو اس کے خاص افضال اور اس کی خاص رحمتیں اور برکتیں ہیں، وہ بڑا ہی سزاوار حمد اور بڑا ہی بزرگ و برتر ہے ۔۔۔ 'رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکٰتُہٗ عَلَیْکُمْ اَہْلَ الْبَیْتِ' میں 'عَلَیْکُمْ' ضمیر مذکر جمع کا استعمال عربی زبان کے شائستہ انداز خطاب کی مثال ہے۔ عورتوں کے اس انداز خطاب میں پردہ داری اور احترام کی جو شان ہے وہ محتاج اظہار نہیں۔ قرآن مجید اور کلام عرب میں اس کی نہایت واضح اور لطیف مثالیں موجود ہیں۔ سورہ احزاب میں ہے۔

یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ	اللہ چاہتا ہے کہ تم سے دور کرے ناپاکی کو اے اہل بیت نبی
اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔	اور تم کو پاک کرے اچھی طرح۔

امراؤالقیس کا ایک شعر بھی قابل ذکر ہے:۔

فلوکان اھل اللہ اُرنیھا کعھدنا ۔۔۔ وجدت مقیلا عند ھود معرّسا

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰی یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ (۷۴)

قوم لوط کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی سفارش

'یُجَادِلُنَا' یعنی 'صَارَ یُجَادِلُنَا' مضارع سے پہلے فعل ناقص کے حذف کر دینے کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ آیت ۳۸ میں 'وَیَصْنَعُ الْفُلْکَ' بھی اسی اسلوب پر ہے۔ لفظ 'مجادلہ' یہاں مجادلہ حسن کے مفہوم میں ہے۔ یعنی حسن ادب اور محبت و اعتماد کے ساتھ کسی سے اپنی بات باصرار و الحاح منوانے کی کوشش کرنا۔ حضرت ابراہیمؑ پر جب تک فرشتوں کا اصل منصوبہ واضح نہیں ہوا تھا اس وقت تک تو وہ متردد اور فکرمند رہے لیکن جب ان کو بیٹے کی بشارت مل گئی اور خود اپنے باب میں اطمینان ہو گیا تو انہیں قوم لوط کی فکر ہوئی اور وہ ان کے باب میں اللہ تعالیٰ سے سفارش میں لگ گئے اور اپنی بات منوانے کے لیے سارے جتن کر ڈالے۔ ہم تورات سے اس مجادلہ کی تفصیل نقل کرتے ہیں تاکہ کچھ اندازہ ہو سکے کہ کس نوعیت کا مجادلہ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں پسندیدہ ہے۔

پر ابرہام خداوند کے حضور کھڑا ہی رہا۔ تب ابرہام نے نزدیک جا کر کہا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اس شہر میں پچاس راست باز ہوں۔ کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس راستبازوں کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راست باز ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔

تب ابرہام نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھئے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگرچہ میں راکھ اور خاک ہوں۔ شاید پچاس راست بازوں میں پانچ کم ہوں۔ کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کر دے گا؟ اس نے کہا اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا کہ شاید وہاں چالیس ملیں۔ تب اس نے کہا کہ میں ان چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا کہ خداوند ناراض نہ ہو تو میں کچھ اور عرض کروں۔ شاید وہاں تیس ملیں۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا دیکھیے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی۔ شاید وہاں بیس ملیں۔ اس نے کہا میں بیس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ تب اس نے کہا۔ خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں۔ شاید وہاں دس ملیں۔ اس نے کہا میں دس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔

(پیدائش باب ۱۸ : ۲۲-۳۲)

حضرت ابراہیم کا اپنے رب کے ساتھ یہ مجادلہ اپنے اندر محبت، اعتماد، ناز اور دردمندی و ہمدردی کے جو پہلو سمیٹے ہوئے ہے زبان قلم ان کی تعبیر و تشریح سے قاصر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس پر حضرت ابراہیم کی تحسین فرمائی۔

إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّٰهٌ مُّنِيبٌ (۷۵)

حضرت ابراہیم کی دردمندی

'اَوَّاہٌ' آہ سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا لغوی مفہوم ہے کثرت سے آہ آہ کرنے والا یعنی نہایت دردمند، نہایت غم خوار اور صاحب سوز دل۔ جب حضرت ابراہیمؑ قوم لوط جیسی ناہنجار قوم کی سفارش میں اس طرح اپنے دل کو نچوڑ کر رکھ دیتے ہیں تو ان کے حلم اور ان کی دردمندی میں کیا شک کی گنجائش رہی اور کمال انابت کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ بظاہر معلوم ہے کہ اب قوم لوط کا پیمانہ لبریز ہے لیکن وہ برابر دعا اور التجا میں سرگرم ہیں۔

يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَآ ۖ إِنَّهُۥ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ ءَاتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ (۷۶)

حضرت ابراہیم کو جواب

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی اس ہمدردی و دردمندی اور اس حالانہ التجا کی تو تعریف فرمائی لیکن ساتھ ہی آگاہ بھی فرما دیا کہ اب دعا و سفارش کا وقت گزر چکا ہے۔ 'إِنَّهُۥ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ' اب تیرے رب کا حکم یعنی حکم عذاب آ چکا ہے اور ان پر نہ ٹلنے والا عذاب اب آ کے رہے گا۔ 'عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ' سے ایک تو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ عذاب

کوئی تنبیہی نوعیت کا نہیں ہے کہ محض تنبیہ کر کے گزر جائے بلکہ فیصلہ کن عذاب ہے جو ان کی کمر توڑ کر رکھ دے گا۔ دوسرے اس بات کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے کہ یہ عذاب کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکے گا اس لیے کہ حکم الٰہی کے مقابلے کی طاقت کسی میں بھی نہیں ہے۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِیٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ (۷۷)

فرشتوں کی آمد پر حضرت لوطؑ کی تشویش

حضرت ابراہیمؑ کو بشارت پہنچانے اور قوم لوطؑ کے انجام سے باخبر کرنے کے بعد یہ فرشتے حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے۔ حضرت لوطؑ نے جب دیکھا کہ چند خوبرو نوجوان دروازے پر ہیں تو وہ سخت منقبض اور دل تنگ ہوئے۔ دل میں کہا کہ آج کا دن تو بڑا کٹھن دن ہوگا۔ اس انقباض و پریشانی کی وجہ ظاہر ہے کہ جب قوم کی قوم اس فساد اخلاق میں مبتلا ہو جس میں حضرت لوطؑ کی قوم مبتلا تھی تو ایسے خوش شکل نو واردوں کا دروازے پر آنا گویا شہر کے سارے غنڈوں کو دعوت دینے کے ہم معنی تھا۔

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ (۷۸)

حضرت لوطؑ کی فریاد

چنانچہ ان کا اندیشہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ جب اوباشوں نے دیکھا کہ حضرت لوطؑ کے دروازے پر چند خوبرو لڑکے آئے ہوئے ہیں تو جھپٹے ہوئے پہنچے۔ حضرت لوطؑ نے ان کے تیور دیکھے تو فرمایا: یٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ: یہ پیشکش نہیں بلکہ اپنی قوم کے ضمیر کو جگانے اور جھنجھوڑنے کے لیے گویا حضرت لوطؑ کی آخری جیتا! زیادتی کہ وہ سوچیں کہ ایک اللہ کا بندہ یہ ہے جو اپنے مہمانوں کی عزت کے معاملے میں اتنا حساس ہے کہ اس کے لیے اپنی عزیز سے عزیز شے کو قربان کرنے پر تیار ہے اور ایک ہم ہیں کہ اندھے ہو کر اس کے مہمانوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اللہ کا خوف بھی یاد دلایا اور آخر میں اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ کہہ کر گویا پوری طرح ان پر حجت تمام کر دی۔ اس لیے کہ کسی کے اندر اگر رائی برابر بھی حق کی حمیت و حمایت کا احساس ہوتا تو اس فقرے کے بعد تو اس کو ضرور حرکت میں آ جانا تھا لیکن جب اس کے بعد بھی کوئی ضمیر بیدار نہیں ہوا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کسی کے اندر حس انسانیت و شرافت سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ (۷۹)

قوم لوط کی ضد

وہ جواب میں بولے کہ زیادہ بات کو بڑھانے اور الجھانے سے کیا فائدہ۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمیں کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ ہم تمہاری لڑکیوں پر ہاتھ ڈالیں۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ تم سے مخفی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خواہ مخواہ ہماری اس خواہش میں مزاحم کیوں بنتے ہو؟ ہم جو کچھ چاہتے ہیں کر لینے دو۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ (۸۰)

حضرت لوطؑ کی طرف سے قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی آخری کوشش

حضرت لوطؑ کی زبان سے یہ فقرہ انتہائی اضطراب اور غنڈوں کے مقابلے سے آخری درجے میں مایوس ہو جانے کے بعد نکلا ہے۔ فرمایا کہ کاش میرے پاس یا تو خود اپنی اتنی قوت و جمعیت ہوتی کہ تم سے نبٹ سکتا یا کوئی ایسا صاحب حیثیت و با اثر شخص ہی ہوتا کہ میں اس کی پناہ لے

لے سکتا اور وہ مجھے تمہاری چیرہ دستیوں سے بچا سکتا۔ یہ آخری فقرہ بھی حضرت لوطؑ نے قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے فرمایا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عرب میں کسی مصیبت زدہ اور مظلوم کو پناہ دینا، جب کہ وہ طالب پناہ ہو، بڑے شرف کی بات سمجھی جاتی تھی اور اسی طرح کسی طالب پناہ کو پناہ نہ دینا انتہائی رذالت کی دلیل تھی۔ حضرت لوطؑ نے یہ فقرہ فرما کر گویا آخری حجت بھی تمام کر دی۔ اس حجت کے تمام ہو جانے کے بعد فرشتوں نے حقیقت سے پردہ اٹھا دیا اور بولے۔

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ (۸۱)

فرشتوں نے پردہ اٹھا دیا

بولے اے لوط! تم پریشان نہ ہو، ہم چھوکرے نہیں ہیں جیسا کہ یہ شیاطین سمجھے ہوئے ہیں، بلکہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں۔ یہ ہرگز تم تک نہیں پہنچ سکتے۔ تو یوں کرو کہ رات اس بستی سے اپنے اہل و عیال سمیت نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کے بھی نہ دیکھے۔ الّا تمہاری بیوی تمہارے اہل سے مستثنیٰ ہے۔ اس پر بھی وہی آفت آنی ہے جو پوری قوم کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔ ان کے لیے وقت موعود صبح کا وقت ہے۔ کیا صبح کا وقت قریب نہیں ہے؟

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ڏ مَّنْضُوْدٍ ؀ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ (۸۲-۸۳)

عذاب الٰہی

یعنی جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے ان پر ایسی تندی بھیجی کہ اس نے ان کے مکانوں کو بالکل تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ، 'سِجِّيْل' سنگ گل کا معرب ہے۔ یعنی ہم نے ان کی بستی پر خوب سنگ گل کی تہ بہ تہ بارش کر دی۔ مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ - وہ تیرے رب کے پاس نشان لگائے ہوئے یعنی خدا کے علم اور اس کی قدرت میں پہلے سے تعداد میں مقرر تھے۔ گویا ان کے چٹّے لگا کر پہلے سے ان پر نشان لگا دیا گیا تھا کہ یہ چٹّے قوم لوطؑ کی بستی پر برسانے کے لیے ہیں۔ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ۔ اور یہ سنگ گل کے چٹّے ان ظالموں سے کچھ دور بھی نہ تھے کہ ان کو وہاں سے اٹھا کر لانے میں کچھ وقت لگتا بلکہ یہ ان کے پاؤں کے نیچے ہی سے ہماری بھیجی ہوئی باد تند (حاصب) نے اٹھایا اور ان کے سروں پر برسا دیا۔

'ظالمین' سے مراد قریش ہیں

اس ٹکڑے کی تاویل میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ 'ھی' کا مرجع لوطؑ کی بستی کو سمجھا جائے اور 'ظالمین' سے قریش مراد لیے جائیں۔ مطلب یہ کہ لوطؑ کی بستی قریش سے کچھ دور بھی نہیں، وہ اپنے سفر شام میں اسی بستی پر سے گزرتے ہیں۔ اگر دیدۂ عبرت نگاہ رکھتے ہیں تو اس سے عبرت حاصل کریں۔ آگے آیت ۸۹ میں حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔ 'وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ'۔

قوم لوط کے عذاب کی نوعیت

قوم لوطؑ کے عذاب کے بارے میں مولانا فراہیؒ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے۔

"قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو سخت ہو کر باد حاصب (کنکر پتھر برسانے والی تند آندھی) بن گئی۔ اس سے اول تو ان کے اوپر کنکروں پتھروں کی بارش ہوئی۔ پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ

اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے۔ چنانچہ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِ حَاصِبًا (ان میں سے بعض قوموں پر ہم نے کنکر برسانے والی آندھی بھیجی) نیز فرمایا ہے فَجَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ مَّنْضُوْدٍ (پس ہم نے اس بستی کو تہ پٹ کر دیا اور ان کے اوپر تہ بہ تہ سنگ گل کے پتھروں کی بارش کی) یعنی ایسی تند ہوائیں چلیں کہ ان کے مکانات اور چھتیں سب زمین کے برابر ہوگئیں اور اوپر سے کنکریوں اور ریت نے ان کو ڈھانک لیا۔

(تفسیر سورۂ ذاریات فراہیؒ۔ فصل ۱۵)

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ۚ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ۚ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ بِخَیْرٍ وَّاِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ (۸۴)

قوم شعیب سے فساد کی نوعیت

اس امر کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے کہ ہر قوم کے اندر انہی میں سے انہی کے ایک بھائی کو رسول بنا کر مبعوث کرنے میں اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے کیا مصلحت ہے؛ اور یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ توحید کو تمام انبیاء کی دعوت میں مرکزی اور محوری نقطہ کی حیثیت حاصل ہے، اس سے انحراف تمام انحرافات کے دروازے کھولتا ہے اور اسی کی طرف بازگشت سے صراطِ مستقیم کی ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی نقطہ سے حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی دعوت کا آغاز فرمایا اور پھر اپنی قوم کی اس برائی کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی جو پوری قوم میں نہ صرف یہ کہ عام ہو چکی تھی بلکہ وہ برائی کے بجائے ہنر اور قابلیت اور حق و صواب سمجھی جانے لگی تھی۔ ان کی قوم۔ اہلِ مدین ـــــ تجارت پیشہ قوم تھی۔ اس وجہ سے ان کا فسادِ مزاج سب سے زیادہ اسی میدان میں ابھرا اور ناپ، تول میں کمی کرنے کو اپنا پیشہ ورانہ ہنر بنا لیا۔ اس فن کے ایک سے ایک بڑھ کر ماہر ان میں پیدا ہونے لگے اور کسی کے اندر اس امر کا احساس بھی باقی نہیں رہا کہ یہ ترقی و کامرانی کی راہ نہیں بلکہ فساد فی الارض کی راہ ہے۔ حضرت شعیبؑ نے ان کو اس کی اصلاح کی دعوت دی فرمایا وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ بِخَیْرٍ وَّاِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ لوگو، ناپ تول میں کمی نہ کرو، میں اس وقت تمہیں رفاہیت اور خوش حالی میں دیکھ رہا ہوں اور میں تم پر ایک ایسے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں جو تمہیں بالکل اپنے گھیرے میں لے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت تمہیں جو رفاہیت و خوش حالی حاصل ہے اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ اپنے رب کے شکر گزار اور اس کے قانونِ عدل و قسط کے فرمانبردار بنو۔ اللہ تعالیٰ رفاہیت و خوش حالی بخشتا ہی کسی قوم کو اس لیے ہے کہ دیکھے کہ وہ قوم خدا کی شکر گزار بنتی ہے یا ناشکری اور نافرمانی کی راہ اختیار کرتی ہے۔ اگر وہ یہ دوسری راہ اختیار کر لیتی ہے تو یہی خوش حالی و رفاہیت اس کے لیے ایک عذاب کا دیباچہ بن جاتی ہے جو اس طرح گھیر لیتا ہے کہ پھر کوئی بھی اس کے گھیرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ میں تمہارے موجودہ موٹاپے کے اندر اسی مرگِ ناگہانی کے آثار دیکھ رہا ہوں تو تم جلد سے جلد اپنی خبر لو۔

وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ (۸۵)

حضرت شعیب کی دعوت اصلاح

'قِسط' کے معنی عدل و انصاف کے ہیں۔ یعنی ناپ ہو یا تول دونوں میں پورے پورے عدل و انصاف کو مدِنظر رکھو۔ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ اور لوگوں کے ساتھ ان کی چیزوں کی ناپ تول میں کوئی ناانصافی اور کمی نہ کرو۔ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ یعنی زمین میں بڑھو تو خیر و صلاح اور عدل و قسط کے حامل اور علم بردار بن کر بڑھو، اس کے عدل و قسط کو درہم برہم کرنے والے اور اس میں فساد برپا کرنے والے بن کر نہ بڑھو۔ اس طرح کے بڑھنے کو اس زمین کا خالق و مالک بس ایک خاص حد ہی تک مہلت دیتا ہے۔ اس مہلت کے گزرتے ہی وہ ایسے مفسدین سے اپنی زمین کو پاک کر دیتا ہے۔

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (۸۶)

'بَقِيَّتُ اللّٰهِ' سے مراد جائز نفع ہے اگر ایک تاجر ناپ تول میں ٹھیک ٹھیک عدل کو ملحوظ رکھے، جھوٹ، فریب، ملاوٹ اور اس قسم کے دوسرے ہتھکنڈوں سے بچے، دوسروں کی ریس میں غلط راستے نہ اختیار کرے تو گو وہ اتنا زیادہ منافع نہ لوٹ سکے جتنا دوسرے لوٹ لیں جنھوں نے حرام و حلال کی تمیز اٹھا دی، لوٹا ہو لیکن اس کا حاصل کیا ہوا نفع 'بَقِيَّتُ اللّٰه' کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ قلیل بھی ہو تو دوسروں کے کثیر سے ہزار درجہ افضل ہے اس لیے کہ اس میں دنیا و آخرت دونوں میں برکت ہوگی۔ اس کے برعکس بے ایمانی کا حاصل کیا ہوا نفع دنیا میں بے برکت اور آخرت میں دہکتی ہوئی آگ بنے گا۔ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ، یعنی میں نے نیک و بد تمھیں اچھی طرح سمجھا دیا اور یہی میری ذمہ داری تھی۔ مانو گے تو اس میں تمھارا ہی فائدہ ہے۔ نہ مانو گے تو تم ہی اس کا انجام بد دیکھو گے۔ مجھے اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں تو صرف ایک منذر و مبشر ہوں، تم پر کوئی نگران اور داروغہ نہیں مقرر ہوا ہوں کہ تمھارے ایمان نہ لانے کی پرسش مجھ سے ہو۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ (۸۷)

حضرت شعیب پر قوم کا طنز

یہ پورا فقرہ طنزیہ انداز میں ہے۔ وہ بولے کہ کیا تمھاری نماز تمھیں یہی سکھاتی ہے کہ جن معبودوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہم ان کی عبادت ترک کر دیں اور اپنے مال میں اپنے صواب دید کے مطابق تصرف نہ کریں۔ تمھاری ان باتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری نگاہ میں سب اگلے پچھلے بے وقوف اور گمراہ تھے، بس تم ہی ایک دانا و بینا اور راہ یاب رہ گئے ہو۔ مطلب یہ کہ تم نماز وغیرہ پڑھتے تھے تو اس سے خیال تو یہ ہوتا تھا کہ تم سے باپ دادا کا نام بھی روشن ہوگا اور قوم کے لیے بھی کچھ کامیابی کی راہیں کھلیں گی مگر خوب نکلی تمھاری یہ نماز کہ وہ ماضی و حاضر سب کی بساط لپیٹ کر رکھ دینا چاہتی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت شعیب کی نیک اور پاکیزہ زندگی سے چونکہ مفسدین کو اندیشہ تھا کہ وہ لوگ متاثر ہوں گے جو بالطبع نیک ہیں اس وجہ سے انھوں نے ان کی نیکیوں ہی کو اپنے طنز کا ہدف بنا لیا گویا سارے فساد کی جڑ وہی ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ

أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (۸۸)

'بینۃ' اور 'رزق حسن' سے مراد

لفظ 'بَيِّنَةٍ' کی تحقیق اوپر آیت ۲۳ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس سے مراد وہ ایمان و اعتقاد ہے جو ہر فطرت سلیم کے اندر اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمایا ہے اور جو انسان کی رہنمائی صراط مستقیم کی طرف کرتا ہے بشرطیکہ انسان نے غلط ماحول کے اثرات سے متاثر ہو کر اپنی فطرت مسخ نہ کر لی ہو۔ 'وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا' 'رزق حسن' سے یہاں اسی چیز کو تعبیر فرمایا ہے جس کو مذکورہ بالا آیت ۲۳ میں 'رَحْمَةً' سے تعبیر فرمایا ہے یعنی وحی الٰہی۔ وحی الٰہی کو 'رزق حسن' سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح مادی رزق انسان کی مادی زندگی کے باقی رہنے کے لیے ضروری ہے اسی طرح 'وحی الٰہی' کا رزق حسن انسان کی روحانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ سیدنا مسیحؑ نے اسی حقیقت کو یوں تعبیر فرمایا ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔

پہلے جملہ میں جواب شرط محذوف ہے۔ اگر اس محذوف کو آیت ۲۳ کی روشنی میں، جو بعینہٖ اسی مضمون کی آیت ہے، کھول دیا جائے تو پوری بات گویا یوں ہوگی 'بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں، پھر اس نے مجھے اپنی جانب سے رزق حسن سے بھی نوازا تو اس کے بعد بھی اگر میں اس کی راہ سے ہٹ کر چلوں تو مجھے خدا کے غضب سے بچانے والا کون بنے گا؟' مطلب یہ کہ میں یہ جو کچھ تمہیں بتا رہا ہوں تم اس کو تصنع اور بناوٹ پر محمول کر کے مجھے طنز و تحقیر کا ہدف بنا رہے ہو، لیکن میں کیا کروں؟ یہی میری فطرت کی آواز پہلے سے تھی اور پھر اسی کو مدلل اور مبرہن کرتی ہوئی مجھ پر میرے رب نے وحی بھی اتاری تو اگر میں تمہارے سامنے یہ نہ پیش کروں تو اور کیا پیش کروں؟ 'وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ' یعنی یہ بدگمانی نہ کرو کہ میں جو تمہیں ناپ تول میں بے ایمانی سے روک رہا ہوں تو یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں اس سے روک کر یہی کام خود کروں اور اس طرح تمہیں بازار سے بے دخل کر کے خود بازار پر قابض بن بیٹھوں۔ ممکن ہے حضرت شعیبؑ اپنی معاش کے لیے کوئی چھوٹی موٹی تجارت خود بھی کرتے رہے ہوں۔ اس چیز سے شریروں نے فائدہ اٹھا کر یہ اشتعال چھوڑا ہو کہ یہ شخص جو اس شد و مد سے ناپ تول میں ایمانداری کا وعظ سنا رہا ہے اس سے اس کی غرض صرف یہ ہے کہ ہم تو ایمان داری کے ہو کے رہ جائیں اور یہ اپنی من مانی کر کے پورے بازار پر قبضہ کر لے۔ حضرت شعیبؑ نے ان کی یہ بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی کہ میں جس بات سے تمہیں روک رہا ہوں اس لیے نہیں روک رہا ہوں کہ اس پر تنہا خود قابض ہونا چاہتا ہوں۔ 'إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ' میں صرف اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک میرا بس چلے۔ 'وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ' اور اس جدوجہد میں توفیق و رہنمائی جس حد تک بھی حاصل ہوگی اللہ ہی کی عنایت سے حاصل ہوگی۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ (۸۹)

حضرت شعیبؑ کی تنبیہ

شقاق کے معنی ضد اور مخالفت کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ برائے شگون پرائی ناک نہ کٹوا بیٹھو۔ میری ضد میں تم نے جو روش اختیار کی ہے کہیں وہ تمہارے لیے اس بات کا سبب نہ بن جائے کہ تم پر کوئی اس طرح کا عذاب آدھمکے جس طرح کے عذاب قوم نوحؑ یا قوم ہودؑ یا قوم صالحؑ پر اس سے پہلے آچکے ہیں اور قوم لوطؑ تو تم سے کچھ دور بھی نہیں ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قوم لوطؑ زمانہ اور اپنے مسکن دونوں ہی اعتبار سے قوم شعیبؑ سے بہت قریب تھی۔ حضرت شعیبؑ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ میں تمہیں صرف ماضی بعید کے افسانے سنا رہا ہوں بلکہ تمہارے سامنے قریب اور تمہارے قرب وجوار کی شہادت بھی یہی ہے کہ تمہاری روش خدا کے عذاب کو دعوت دے رہی ہے۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ (۹۰)

یعنی خیریت چاہتے ہو تو میری بات سنو اور اپنے گناہوں کی اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف رجوع کرو۔ 'رجوع' سے یہ مراد ہے کہ اپنی موجودہ روش سے باز آکر وہ راہ اختیار کرو جو خدا کی پسندیدہ راہ ہے اور جس کی طرف میں تمہیں بلا رہا ہوں۔

یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ توبہ کے دو بنیادی رکن ہیں: ایک استغفار، دوسرا اصلاح۔ یعنی آدمی اپنے رب سے اپنے جرائم کی معافی بھی مانگے اور صحیح راہ اختیار کر کے عملاً اپنے رویہ کی اصلاح کا ثبوت بھی دے۔ اس کے بغیر کوئی توبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں درخور قبول نہیں ٹھہرتی۔

'اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ'۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات رحمت اور محبت کا حوالہ ہے۔ مقصود اس سے استغفار اور توبہ کی تشویق و ترغیب بھی ہے اور نہایت لطیف انداز میں قبولیتِ توبہ کی بشارت بھی۔ مدعا یہ ہے کہ تمہارے جرائم کتنے ہی سنگین ہوں، لیکن جب تم صدقِ دل سے اس کی طرف رجوع کرو گے تو وہ تمہیں ٹھکرائے گا نہیں بلکہ معاف کر کے اپنی رحمتوں سے نوازے گا۔ وہ نہایت مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ؗ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ (۹۱)

حضرت شعیبؑ کو سنگسار کرنے کی دھمکی

قوم نے حضرت شعیبؑ کی اس ساری موعظت کا جواب نہایت رعونت سے یہ دیا کہ اے شعیب! تمہاری بہت ساری باتیں کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ مطلب یہ کہ تمہاری یہ باتیں ہیں ہی نہایت مہمل اور دور از کار ورنہ معقول باتیں سمجھنے میں ہم سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے! اس کے بعد دھمکی بھی دے دی کہ تمہاری کوئی جمعیت و جماعت تو ہے نہیں جس کا ہمیں اندیشہ ہو، ہم تو تمہیں اپنے اندر نہایت کمزور اور بے بس دیکھ رہے ہیں۔ اگر تمہارے خاندان کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم تو تمہیں سنگسار کر دیتے۔ 'وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ' یعنی بجائے خود تم ہم پر ایسے گراں نہیں ہو کہ تم کو ٹھکانے لگا دینا ہمارے لیے کچھ مشکل ہو۔ البتہ تمہارے کنبہ اور قبیلہ کا خیال دامن گیر ہوتا ہے کہ اس سے کیوں

جگہ اصول ہیں۔ سنگسار کردینے کی دھمکی خاص طور پر اس لیے دی گئی کہ حضرت شعیبؑ قوم کے بتوں کی تحقیر کرتے تھے، یاد ہوگا بتوں کی تحقیر پر یہی دھمکی سیدنا ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء کو بھی دی گئی تھی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (۹۲)

حضرت شعیبؑ کا توکل علی اللہ

حضرت شعیبؑ نے اس دھمکی کے جواب میں فرمایا کہ اے میرے ہم قومو! کیا میرے کنبہ و قبیلہ کا خوف و لحاظ تمہیں اللہ سے زیادہ ہے کہ تم کنبہ و قبیلہ کو تو اہمیت دیتے ہو جب کہ خدا کو تم نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ، یاد رکھو میرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو یا کرنے والے ہو سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مجال نہیں ہے کہ تم کوئی قدم اس کے اذن کے بغیر اٹھا سکو۔ مطلب یہ کہ میرا بھروسہ میرے رب پر ہے، تم جو کرنا چاہتے ہو کرو۔

'ظِهْرِيّ' کے معنی ہیں وہ چیز جو پیچھے ڈال کر فراموش کر دی جائے۔

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ (۹۳)

'اِنِّیْ عَامِلٌ' یعنی اِنِّیْ عَامِلٌ عَلٰی مَکَانَتِیْ۔ 'مَکَانَۃ' کے معنی جگہ اور منزلت کے ہیں یعنی تم اپنی جگہ پر کام کرو، میں اپنی جگہ پر کام کرتا ہوں۔ تم میری ضد اور مخالفت میں جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر گزرو اور میں اپنے رب کی جانب سے انذار و تبشیر کے جس مشن پر مامور ہوں گا وہ کرتا رہوں گا۔ 'سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَمَنْ هُوَ کَاذِبٌ' جلد تم جان لوگے کہ کس پر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ 'وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّیْ مَعَکُمْ رَقِیْبٌ' تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ یعنی غیب کا علم تو مجھے بھی نہیں ہے کہ تعین کے ساتھ بتا سکوں کہ عذاب کس وقت آئے گا لیکن یہ واضح ہے کہ تم میں مستحق عذاب ہونے کی ساری علامتیں نمودار ہو چکی ہیں اس وجہ سے میں بھی اب اس کے ظہور ناگہانی کا منتظر ہوں۔

وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۙ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ (۹۴-۹۵)

کم و بیش انہی الفاظ میں یہی مضمون آیات ۶۶-۶۸ میں گزر چکا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۹۶)

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت

اب آگے کی چند آیات میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کی طرف اجمالاً اشارہ فرمایا ہے۔ یاد ہوگا، سورۂ یونس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت تو تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے لیکن دوسرے انبیاء کا صرف اجمالی حوالہ ہے اس کے برعکس اس سورہ میں حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کی طرف تو اجمالی اشارہ کر دیا ہے البتہ دوسرے انبیاء کی سرگزشتیں، جیسا کہ آپ نے دیکھا، تفصیل سے بیان ہوئی ہیں۔ اس طرح یہ دونوں سورتیں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور یہی حقیقت ہے سورتوں کے زوج زوج ہونے کی۔ متعدد کتاب

میں ہم اس مسئلہ پر گفتگو کر چکے ہیں۔

بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ۔ آیات سے مراد تو وہ عام نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں قدم قدم پر ظاہر ہوئیں اور سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ سے مراد خاص طور پر وہ نشانی ہے جس سے حضرت موسیٰؑ کو فرعون، اس کے درباریوں اور اس کے ساحروں پر کھلا ہوا غلبہ حاصل ہوا یعنی معجزۂ عصا۔ گویا یہاں عام کے بعد خاص کا ذکر ہے اور اس کو سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی حیثیت درحقیقت ایک حجت قاہرہ کی تھی جس کے بعد فرعون اور اس کے درباریوں کی ساری ساکھ خود اپنے آدمیوں کی نگاہ میں اکھڑ گئی۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ (۹۷)

یعنی ہم نے تو ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنا پیغمبر بھیجا لیکن ان شامت کے ماروں نے پیروی فرعون کی رائے اور اس کے حکم کی کی فرعون کی رہنمائی صائب نہ تھی۔ اس وجہ سے یہ اس کھڈ میں گرے جس میں اس طرح کے لیڈروں کی پیروی کرنے والے گرا کرتے ہیں۔

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ (۹۸)

'ورد' کے معنی کسی گھاٹ پر پانی پینے پلانے کے لیے اترنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ فرعون ان تمام لوگوں کا لیڈر ہوگا جنھوں نے اس جہان میں اس کی پیروی کی اور وہ ان کو دوزخ کے گھاٹ پر آتارے گا جس سے زیادہ برا کوئی گھاٹ نہیں۔

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ (۹۹)

'رِفد' کے معنی عطیہ اور انعام کے ہیں۔ یعنی اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی ہے اور آخرت میں بھی یہ لعنت ان کے پیچھے لگی رہے گی اور کیا ہی برا ہے یہ انعام جو ان کو عطا ہوا!!!

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۰۰-۱۲۳

خاتمۂ سورہ　اب آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ اس میں ان حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے جو ماضی کی سرگزشتوں کے اندر مضمر ہیں اور جن کو مخاطب کے سامنے لانے ہی کے لیے یہ سنائی گئی ہیں۔ ان کے اندر قریش کے لیے جو سبق ہیں ان کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو ان سے جو تعلیم ملتی ہے اس کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰۰-۱۲۳

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَاۗىِٕمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَاۗءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ

إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ﴿١٠٢﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِمَنْ خَافَ عَذَابَ
الْآخِرَةِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمٌ مَجْمُوعٌ لَهُ النَّاسُ وَذَٰلِكَ يَوْمٌ مَشْهُودٌ ﴿١٠٣﴾
وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مَعْدُودٍ ﴿١٠٤﴾ يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا
بِإِذْنِهِ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ﴿١٠٥﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ
فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ﴿١٠٦﴾ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ
إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ﴿١٠٧﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ
سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ
إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ ﴿١٠٨﴾ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِمَّا
يَعْبُدُ هَٰؤُلَاءِ ۚ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُمْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَإِنَّا ع ۹
لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوصٍ ﴿١٠٩﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ
فِيهِ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ
مِنْهُ مُرِيبٍ ﴿١١٠﴾ وَإِنَّ كُلًّا لَمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ ۚ إِنَّهُ بِمَا
يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿١١١﴾ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ
إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٢﴾ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ
النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ﴿١١٣﴾ وَأَقِمِ
الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِنَ اللَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ
السَّيِّئَاتِ ۚ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ ﴿١١٤﴾ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ
الْمُحْسِنِينَ ﴿١١٥﴾ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُو بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ

عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ
ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ
الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ﴿۱۱۷﴾ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ
أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ﴿۱۱۸﴾ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ
وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ
النَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۱۹﴾ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ
بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۲۰﴾
وَقُلْ لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوا ۚ
ع ۱۰ ۱۴ ۱۰ إِنَّا مُنْتَظِرُونَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ
الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۲۳﴾

ترجمۂ آیات ۱۰-۱۲۳

یہ بستیوں کی کچھ سرگزشتیں ہیں جو ہم تمھیں سنا رہے ہیں، ان میں سے کچھ تو قائم ہیں اور کچھ مٹ مٹا گئیں۔ اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ تو ان کے وہ دیوتا جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے، جب تیرے رب کا عذاب آیا، ان کے کچھ بھی کام نہ آئے اور انھوں نے ان کی بربادی کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کیا۔ اور تیرے رب کی پکڑ جب کہ وہ بستیوں کو ان کے ظلم میں پکڑتا ہے، اسی طرح ہوتی ہے۔ بے شک اس کی پکڑ بڑی ہی دردناک اور سخت ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو عذاب آخرت سے ڈریں۔ وہ ایک ایسا دن ہوگا جس کے لیے سارے ہی لوگ اکٹھے کیے جائیں گے اور وہ حاضری کا دن ہوگا اور ہم تو اس کو بس ایک گنتی کی مدت کے لیے ٹال رہے ہیں جب وہ دن آئے گا کوئی جان اس کے

اذن کے بغیر کلام نہ کر سکے گی۔ پس ان میں کچھ بدبخت ہوں گے، کچھ نیک بخت۔ تو جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے، اس میں ان کے لیے چلانا اور گھگیانا ہو گا، اسی میں پڑے رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے۔ بے شک تیرا رب جو چاہے کر گزرنے والا ہے اور رہے وہ جو نیک بخت ہیں تو وہ جنت میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے۔ غیر منقطع عطیۂ الٰہی۔ تو تم ان کے باب میں کسی تردد میں نہ پڑو جن کی یہ لوگ پوجا کر رہے ہیں۔ یہ اسی طرح پوج رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا پوجتے رہے اور ہم ان کا حصہ ان کو پورا پورا بغیر کسی کمی کے دے کے رہیں گے۔ ۱۰۰-۱۰۹

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تو اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی نہ طے ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور یہ لوگ اس کی طرف سے الجھا دینے والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یقیناً تیرا رب ہر ایک کو اس کے اعمال کا بدلہ پورا کر کے رہے گا۔ وہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس سے باخبر ہے۔ تو تم جمے رہو جیسا کہ تمھیں حکم ملا ہے اور وہ بھی جنھوں نے تمھارے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھنا، بے شک وہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہو جیو جنھوں نے ظلم کیا کہ تمھیں بھی دوزخ کی آگ پکڑے اور تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی حامی نہیں، پھر تمھاری مدد نہیں کی جائے گی اور نماز کا اہتمام کرو دن کے دونوں حصوں میں اور شب کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں بدیوں کو۔ یہ یاد دہانی ہے یاد دہانی حاصل کرنے والوں کے لیے اور ثابت قدم رہو، اللہ خوب کاروں کا اجر ضائع نہیں کرے گا۔ ۱۱۰-۱۱۵

پس کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کی امتوں میں سے ایسے حاملین حق ہوتے جو زمین میں فساد

برپا کرنے سے روکتے مگر تھوڑے ان میں سے جن کو ہم نے ان میں سے نجات بخشی اور جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا وہ اسی عیش میں پڑے رہے جس میں تھے اور وہ مجرم تھے۔ اور تیرا رب ایسا نہیں کہ وہ بستیوں کو ہلاک کر دے کسی ظلم کی پاداش میں جب کہ ان کے باشندے اصلاح میں سرگرم ہوں۔ ۱۱۶-۱۱۷

اور اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی امت بنا چھوڑتا اور وہ برابر اختلاف میں رہیں گے بجز ان کے جن پر تیرا رب رحم فرمائے اور اسی لیے ان کو اس نے پیدا کیا ہے اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔ ۱۱۸-۱۱۹

اور ہم رسولوں کی سرگزشتوں میں سے ہر ایک تمھیں سنا رہے ہیں جن سے تمھارے دل کو تقویت دیں، اور ان میں تمھارے پاس حق آیا ہے اور مومنوں کے لیے ان میں نصیحت اور یاد دہانی ہے۔ اور جو لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ تم اپنے ڈھرے پر چلو ہم اپنی روش پر چلتے رہیں گے اور تم بھی انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہیں۔ اور آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ ہی کے علم میں ہے اور وہی تمام امور کا مرجع ہے تو اسی کی بندگی کرو اور اسی پر بھروسہ کرو اور تیرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۱۲۰-۱۲۳

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّ حَصِيْدٌ (۱۰۰)

پچھلی سرگزشتوں کی طرف اشارہ — پیچھے جن قوموں کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں ان کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطہ سے آپ کی قوم کو توجہ دلائی کہ یہ سرگزشتیں ہم سنا رہے ہیں کہ ان سے تمھیں بھی قوت و حوصلہ حاصل ہو اور تمھاری قوم کے لوگ بھی ان سے سبق حاصل کریں۔ اس مضمون کو آگے آیت ۱۲۰ میں اچھی طرح واضح فرما دیا ہے۔

بستیوں میں نشانِ عبرت — مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّ حَصِيْدٌ، یعنی ان بستیوں میں سے بعض قائم ہیں جن کو دیکھ سکتے ہو اور بعض ان میں سے بالکل ملیا میٹ ہو گئیں۔ حَصِيْدٌ کٹی ہوئی فصل کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ ان بستیوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو عذابِ الٰہی

سے یکسر تعلق نیست و نابود ہو گئیں۔ 'قَآئِمٌ' کی ایک مثال مصر ہے جس کے اندر سے فرعون اور اس کی قوم کو خدا نے نکالا اور لے جا کر سمندر میں غرق کر دیا۔ مکان قائم رہ گئے، لیکن ناپید ہو گئے۔ 'حَصِيدٌ' سے مراد قوم ہود اور قوم لوط وغیرہ کی بستیاں ہیں جن کے مکان و مکین سب ناپید ہو گئے۔ صرف کسی کسی کے کچھ آثار اپنے مکینوں کی بدبختی کی داستان عبرت سنانے کے لیے رہ گئے۔ یہ بات قریش کو سنا کر اس لیے کہی گئی ہے کہ اگر وہ اپنی اس ضد کی روش پر قائم ہیں تو لازماً انھیں بھی ان دو فہرستوں میں سے کسی ایک میں اپنا نام لکھانا پڑے گا۔ ان کے اندر رسول کی بعثت کے بعد اب ان کا فیصلہ بھی لازماً ہونا ہے۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (۱۰۱)

یعنی یہ نہ سمجھو کہ ہم نے ان کو تباہ کر دیا تو ان کے اوپر ہم نے کوئی ظلم کیا۔ ہم نے ان کے اوپر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ اللہ نے ان کو جن اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا تھا وہ سب انھوں نے برباد کیں اور خدا اور اپنے رسول کے احکام کی نافرمانی کر کے خود اپنی تباہی کے اسباب فراہم کیے۔ 'فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ' اور جب خدا کا حکم عذاب آیا تو ان کے وہ سارے دیوی دیوتا جن کو وہ خدا کے سوا پوجتے تھے ان کے کچھ کام نہ آئے۔ اس لیے کہ وہ سب ان کے وہم کی ایجاد تھے اور وہم حقیقت کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتا۔ 'وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ' یعنی انھوں نے اضافہ کیا تو ان کی تباہی و بربادی ہی میں اضافہ کیا اس لیے کہ جھوٹے سہارے ضرورت کے وقت مصیبت اور محرومی ہی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اگر پیاسا سراب کو پانی سمجھ کر اس کی طرف بھاگے تو جس وقت اس کے سامنے اصل حقیقت واضح ہو گی اس وقت موت اس کے سامنے ہر طرف سے منہ کھولے ہوئے کھڑی ہو گی اور زندگی کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہوں گی حالانکہ اگر وہ اس مغالطے میں نہ مبتلا ہوا ہوتا تو ممکن تھا کہ زندگی بچا لینے کی کوئی نہ کوئی راہ اس کے لیے کھل ہی جاتی۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (۱۰۲)

قریش کو تنبیہ

یعنی جب خدا قوموں اور بستیوں کو ان کے ظلم، ان کی سرکشی اور ان کے طغیان کی سزا دیتا ہے تو اسی طرح دیتا ہے جس طرح ان قوموں کو دی جن کی سرگزشتیں اوپر بیان ہوئیں۔ اس وقت خدا کی پکڑ بڑی دردناک اور سخت ہوتی ہے۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے قریش کو سنائی گئی ہے کہ وہ متنبہ ہوں کہ اب ان کی قوم بھی اسی میزان میں ہے جس میں دوسری قومیں تولی جا چکی ہیں۔ خدا نے جو معاملہ ان قوموں کے ساتھ کیا ہے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے ساتھ اس سے کوئی مختلف معاملہ کرے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ (۱۰۳)

اس دنیا کی شہادت آخرت کے حق میں

یعنی قوموں کی یہ سرگزشتیں جس طرح نبیوں اور رسولوں کی تکذیب کا انجام ظاہر کرتی ہیں اسی طرح ان کے اندر عذاب آخرت سے ڈرنے والوں کے لیے بھی بہت بڑی نشانی ہے۔ ان واقعات سے اس دنیا کے خالق و

مالک کی صفات سامنے آتی ہیں اور اس کی پسند و ناپسند کا معیار معین ہوتا ہے کہ جب وہ اس دنیا میں سرکشوں اور باغیوں کو عبرتناک سزائیں دیتا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس نے اس مجموعی دنیا کے لیے کوئی روزِ جزا، سزا نہ رکھا ہو۔ پس ضروری ہے کہ ایک روزِ جزا و سزا آئے جس میں نیکوکار اپنی نیکیوں کا صلہ پائیں اور بدکار اپنی بدیوں کی سزا بھگتیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ تاریخ کے یہ واقعات شہادت دے رہے ہیں کہ یہ دنیا کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک عادل و حکیم خدا کی بنائی ہوئی دنیا ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں اس کا عدل کامل ظاہر ہو اور ہر نیک و بد اپنی نیکی و بدی کو اپنی آنکھوں دیکھ لے۔

سب کی حاضری کا دن

'ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ' یعنی یہ ایسا دن ہوگا کہ جس میں سب اکٹھے کیے جائیں گے، آگے جو گزرے وہ بھی اور پیچھے جو آئے وہ بھی، انبیاء بھی اور ان کی امتیں بھی، نیکی کی دعوت دینے والے بھی اور برائی کی راہیں دکھانے والے بھی، حاکم بھی اور محکوم بھی، شاہد بھی اور مشہود بھی تاکہ ہر متنفس اپنی نیکی کا صلہ پائے اگر اس نے نیکی کمائی ہے اور اپنی بدی کی سزا بھگتے اگر اس نے بدی کمائی ہے۔ 'وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ' یعنی یہ دن سب کی حاضری اور پیشی کا ہوگا تاکہ ہر معاملے کے سارے فریق سامنے موجود ہوں اور پورے انصاف کے ساتھ ان کا فیصلہ ہو سکے۔ یہ حقیقت قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی ظاہر کی گئی ہے۔ ہم بعض آیات کا حوالہ دیتے ہیں تاکہ ذہن میں اس کا صحیح تصور قائم ہو سکے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۙ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۙ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۙ (البروج ۸۵: ۱-۳)

برجوں والے آسمان کی قسم، وعدہ کیے ہوئے دن کی قسم اور شاہد و مشہود کی قسم۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۙ (۵۱ - غافر)

اور ہم اپنے رسولوں کی اور جو لوگ ان پر ایمان لائے ان کی، دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس دن بھی مدد کریں گے جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (نحل - ۸۹)

اور جس دن ہم ہر امت میں ایک گواہ اٹھائیں گے انھیں میں سے۔

يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ (نور - ۲۴)

اور جس دن کہ ان پر گواہی دیں گی ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان چیزوں کے باب میں جو وہ کرتے رہے ہیں۔

وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ (۱۰۴)

ایک حقیقت نفس الامری

یعنی یہ نہ سمجھو کہ اس دن کے آنے میں ابھی غیر محدود مدت باقی ہے کہ اس کے اندیشہ میں ابھی سے اپنا عیش مکدر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مدت غیر محدود نہیں، بلکہ شمار کی

بوئی مدت ہے۔ نہ شمار کی ہوئی مدت۔ نہ کوئی مبالغہ کا اسلوب بیان ہے اور نہ یہ بات علم الٰہی کے اعتبار سے ارشاد ہوئی ہے بلکہ یہ ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے اس لیے کہ جو شخص مرا گیا، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے، 'مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ' اس کی قیامت آگئی۔ برزخ میں جو مدت گزرے گی نفخ صور کے وقت اس کا کوئی احساس باقی نہیں رہے گا۔ ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ ابھی سوئے تھے ابھی اٹھ بیٹھے ہیں۔ جب اصل حقیقت یہ ہے تو اس میں کیا شبہ ہے کہ قیامت کے آنے میں بس اتنے ہی دن باقی ہیں جتنے دن زندگی کے باقی ہیں، زندگی ختم ہوئی، قیامت آن کھڑی ہوئی۔ رہی زندگی کی مدت تو اس کا 'اَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ' ہونا ایک امر بدیہی ہے۔

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ (۱۰۵)

جھوٹی شفاعت کی تردید

جب وہ گھڑی آئے گی تو کسی کی مجال نہ ہو گی کہ خدا کے اذن کے بغیر کوئی اس سے بات کرنے کے لیے زبان ہلا سکے۔ یہ مشرکین کے اس گمان کی تردید ہے کہ ان کے معبودوں کو خدا کے ہاں عزت و اعتماد کا وہ مقام حاصل ہے کہ خواہ ان کے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ اپنے پجاریوں کو بہر حال چھڑا ہی لیں گے اور خدا ان کی دلداری میں مجبور ہو گا کہ ان کی سفارش سنے اور ان کی بات مانے۔ فرشتوں کی نسبت ان کا گمان تھا کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں اور جس طرح چہیتی بیٹیاں ناز و تدلل سے اپنی ہر بات اپنے باپ سے منوالیتی ہیں اسی طرح یہ اپنے باپ یعنی خدا سے ان سارے لوگوں کو بخشوا لیں گی جو دنیا میں ان کی عبادت کرتے رہے۔ اس آیت نے ان تمام بے بنیاد اور خیالی توقعات کا خاتمہ کر دیا۔ خدا کا کسی کی ناز برداری کرنا تو درکنار اس کے آگے کوئی زبان ہی نہیں کھولے گا جب تک وہ اس کو اجازت نہ دے۔ دوسرے مقام میں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ جو خدا کی اجازت کے بعد زبان کھولے گا بھی وہ وہی بات کہے گا جو حق ہو گی۔ سر مو حق سے تجاوز نہ کر سکے گا۔ 'فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ' یعنی جو لوگ محشر میں جمع ہوں گے ان میں سے کچھ بدبخت اور محروم القسمت ہوں گے اور کچھ خوش بخت اور فائز المرام۔ پہلا گروہ دوزخ میں جائے گا اور دوسرا گروہ جنت سے نوازا جائے گا اور ان میں سے ہر ایک کی بدبختی یا خوش بختی اس کے اعمال پر مبنی ہو گی۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۱۰۶-۱۰۷)

دوزخیوں کے چیخنے چلانے کی تعبیر

جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے اور اس میں ان کا حال یہ ہو گا کہ 'لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ'۔ 'زَفِيْرٌ' اور 'شَهِيْقٌ' دونوں لفظ گدھے کی چیخ کے لیے آتے ہیں۔ جب وہ چیختا ہے تو جو سانس وہ باہر کی طرف نکالتا ہے اس کو 'زَفِيْر' کہتے ہیں اور جو سانس اندر کی طرف لے جاتا ہے اس کو 'شَهِيْق' کہتے ہیں۔ یہ دوزخیوں کے چیخنے چلانے اور رونے گڑگڑانے کی تعبیر ہے اور ان لفظوں میں جو حقارت کا پہلو ہے وہ بالکل واضح ہے۔

نیا آسمان نئی زمین

'خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ'۔ وہ اسی دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس آسمان و زمین سے یہ موجودہ آسمان و زمین مراد نہیں ہیں، یہ آسمان و زمین تو ظہور قیامت کے وقت ختم ہو چکے ہوں گے۔ بلکہ وہ آسمان و زمین مراد ہیں جو نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ

قیامِ قیامت کے وقت ظہور میں آئیں گے اور جن کی طرف آیت یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ میں اشارہ ہے۔

سب اختیار خدا کا ہے

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ، مگر جو تیرا رب چاہے۔ یعنی اس دائمی عذاب سے کوئی اور تو چھڑانے والا بن نہیں سکتا ہاں اگر تیرا رب ہی چاہے تو کسی کے عذاب میں تخفیف کر سکتا ہے یا کسی کو خاک اور راکھ بنا دے سکتا ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ۔ تیرا رب جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (۱۰۸)

خوب سے خوب تر کی طرف ترقی

جو نیک بخت ہوں گے جنت میں داخل ہوں گے اور اسی میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں مگر جو تیرا رب چاہے۔ مگر جو تیرا رب چاہے کے استثناء سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ان کے احوال و مراتب میں بھی تبدیلیاں ہوں گی لیکن یہ تبدیلیاں خیر سے شر کی طرف کی نوعیت کی نہیں بلکہ خوب سے خوب تر کی طرف کی نوعیت کی ہوں گی اس لیے کہ ان کے واسطے خدا کی بخشش میں کبھی انقطاع نہیں ہوگا۔ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ۔ ان کو جنت کبھی نہ منقطع ہونے والے عطیہ کی حیثیت سے ملے گی۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ (۱۰۹)

خطاب نبی سے عتاب مخالفین پر

ہم یہ اسلوب متعدد مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ خطاب بظاہر الفاظ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے لیکن اس کے اندر جو عتاب مضمر ہوتا ہے اس کا رخ مخالفین کی طرف ہوتا ہے۔ وہ چونکہ اپنی ضد کے سبب سے لائق خطاب نہیں رہ جاتے اس وجہ سے بات ان کو خطاب کر کے کہنے کے بجائے پیغمبر کو خطاب کر کے کہہ دی جاتی ہے۔ سورہ یونس کی آیات ۹۴-۹۵ میں اس کی مثال گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے شرک پر جمے رہنے سے تمہیں کہیں یہ غلط فہمی نہ لاحق ہو کہ ان کے پاس اس کے لیے کوئی دلیل موجود ہے بس جس طرح ان کے باپ دادا بے سمجھے بوجھے ان پتھروں اور خیالی دیویوں اور دیوتاؤں کو پوجتے آئے اسی طرح اپنی عقلوں پر پٹی باندھ کر یہ ان کو پوج رہے ہیں۔ عقل اور دلیل سے کام لینے کی زحمت نہ انھوں نے اٹھائی نہ یہ اٹھانا چاہتے ہیں وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ یعنی یہ جس جنت الحمقاء میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں گزاریں ہم تو ان کا حصہ پورا کر کے رہیں گے۔ اس میں ذرا کمی نہیں کریں گے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۱۱۰)

پیغمبر صلعم کو تسلی

یہ آیت جس سیاق و سباق میں یہاں ہے بعینہٖ اسی سیاق و سباق میں سورۂ حٰم السجدۃ میں بھی ہے، ملاحظہ ہو آیت ۴۳-۴۵ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ۭ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ۭ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ؕ (تم کو نہیں کہی جا رہی ہیں مگر وہی باتیں جو تم سے پہلے رسولوں کو کہی گئیں بیشک تمہارا رب مغفرت فرمانے والا بھی ہے اور سخت پاداش دینے والا بھی۔ اور اگر ہم اس قرآن کو عجمی قرآن بناتے تو یہ کہتے کہ اس کی آیات کھولی کیوں نہیں گئیں، کتاب عجمی اور مخاطب عربی! کہہ دو یہ ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں ان کے کانوں میں بہرا پن اور یہ ان کی آنکھوں پر پٹی ہے۔ یہ لوگ اب بہت دور کی جگہ سے پکارے جائیں گے۔ اور ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب دی تو اس کے باب میں بھی اختلاف کیا گیا ....) یہاں آیت زیر بحث تسلی کے مقام میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ جس طرح تمہاری قوم کے لوگ تمہارے اس کتاب کے پیش کرنے پر تمہارے پیچھے پڑ گئے ہیں اسی طرح موسیٰ کی قوم کے لوگوں نے بھی تورات کے معاملے میں ان سے قدم قدم پر جھگڑا اور اختلاف کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس صورت حال سے تمہیں سابقہ درپیش ہے اسی صورت حال سے تمہارے پیش رو نبیوں کو بھی سابقہ رہا ہے تو جس طرح انھوں نے صبر و استقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ اللہ نے ان کو کامیابی بخشی اسی طرح تم بھی صبر و استقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرو، اللہ تمہیں بھی تمہارے مخالفوں پر فتحمند کرے گا۔ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ یعنی اللہ نے ہر چیز کے لیے پہلے سے ایک وقت مقرر فرما لیا ہے۔ اس وجہ سے ہر بات اس کے مقررہ پروگرام کے مطابق ہوگی، تمہاری قوم کے لیے بھی مہلت کی ایک مدت مقرر ہے، جب وہ مدت پوری ہو جائے گی ان کا پیمانہ بھی لبریز ہو جائے گا اور ان کے درمیان بھی فیصلہ کر دیا جائے گا۔ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ یعنی یہ لوگ اس چیز کے باب میں جو تم پیش کر رہے ہو ایک الجھن میں ڈال دینے والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ 'مُرِيْب' کے معنی الجھن میں ڈال دینے والے کے ہیں۔ اس صفت کے لانے سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انکار کی یہ روش جو انھوں نے اختیار کر رکھی ہے یہ صرف نہ ماننے کی خواہش پر مبنی ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ جو کچھ تم پیش کر رہے ہو اس کی صحت واضح ہے لیکن وہ اس کو ماننا نہیں چاہتے۔ اس وجہ سے وہ ایک سخت الجھن میں گرفتار ہو کر رہ گئے ہیں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن!

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۱۱۱)

پیغمبر صلعم کو تسلی مخالفین کو تنبیہ

'لَمَّا' میں 'ل' تاکید اور قسم کا ہے اور 'مَا' زائد کبھی کبھی محض جملہ کے آہنگ اور صوت کو ٹھیک رکھنے کے لیے آتا ہے۔ مثلاً اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔ ۳۵ زخرف (بے شک یہ ساری چیزیں دنیوی زندگی کی متاع ہیں) اسی طرح سورۂ طارق میں ہے اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (بے شک ہر جان پر ایک نگران مقرر ہے)۔

لفظ 'کل' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں اس سے مراد وہی گروہ ہیں جو اوپر مذکور ہوئے یعنی مشرکین قریش اور یہود فرمایا کہ یہ لوگ دعوت حق کی مخالفت میں جو ایڑی چوٹی کا زور لگانا چاہتے ہیں لگا لیں، وہ وقت بھی آئے گا جب

تیرا رب ان کے سارے اعمال کا بھرپور بدلہ ان کو دے گا۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس سے وہ پوری طرح باخبر ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ دعوت کا جو مرحلہ یہاں زیر بحث ہے اس میں یہود نے بھی قریش کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تھی۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۱۱۲)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں کو جادۂ حق پر استوار رہنے کی تلقین ہے کہ مخالفتوں کے اس طوفان کے اندر اسی راہ پر پوری مضبوطی سے قائم رہو جو تمہارے رب نے تمہارے لیے کھول دی ہے۔ 'وَلَا تَطْغَوْا' یعنی حالات سے مرعوب ہو کر یا ترغیبات سے متاثر ہو کر ذرا اس راہ سے کج نہ ہونا۔ 'إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ' جو کچھ تم کر رہے ہو یا کرو گے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ مشکلات میں تمہاری رہنمائی فرمائے گا اور جب تم اس کی مدد کے محتاج ہو گے وہ تم کو سہارا دے گا۔

وَلَا تَرْكَنُوٓا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ (۱۱۳)

ایمان لانے والوں کو جادۂ حق پر استقامت کی تلقین

یہ آپ پر ایمان لانے والوں کو تنبیہ ہے کہ خوف یا طمع کسی چیز سے متاثر ہو کر ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہونا جنھوں نے ظلم یعنی شرک و کفر کا ارتکاب کیا ہے ورنہ وہی دوزخ کی آگ تمہیں بھی اپنی گرفت میں لے لے گی جو ان کے لیے مقدر ہے اور اس وقت خدا کے مقابل میں تمہارا کوئی مددگار نہ ہو گا۔ 'ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ' یعنی اگر تم ان کفار و مشرکین کی طرف ذرا بھی مائل ہوئے تو جس نصرت کا اس دنیا میں تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے اس سے محروم ہی رہو گے۔ یہ وعدہ استقامت کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس کے بغیر تم خدا کی نصرت کے سزاوار نہیں ہو سکتے۔

وَأَقِمِ الصَّلَوٰةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنَٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّـَٔاتِ ۚ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّٰكِرِينَ ۝ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (۱۱۴-۱۱۵)

نماز ذریعۂ استقامت ہے

یہ اس صبر و استقامت کے حصول کی تدبیر بیان ہوئی ہے جس کی اوپر والی آیات میں ہدایت فرمائی گئی ہے۔ قرآن میں یہ بات جگہ جگہ واضح کی گئی ہے کہ خدا کی راہ میں شیطان اور اس کے اعوان کی طرف سے جو مزاحمتیں پیش آتی ہیں ان کے مقابلہ کے لیے روحانی طاقت نماز ہی سے ہوتی ہے۔ یہی چیز بندے کو خدا سے جوڑتی ہے اور جب بندہ اپنے رب سے جڑ جاتا ہے تو اس پر انوار و برکات رحمانی کا فیضان ہوتا ہے، دل وسوسوں اور کمزوریوں سے پاک اور وہ پورے عزم و حوصلے سے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں صبر اور نماز کا یہ باہمی تعلق اس طرح واضح فرمایا گیا ہے۔

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۖ وَمِنْ ءَانَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ ۝ (طٰہٰ - ۱۳۰)	پس صبر کرو ان باتوں پر جو وہ کہتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے اور رات کے وقتوں میں بھی اس کی تسبیح کرو اور دن کے اطراف میں بھی تاکہ تم نہال ہو جاؤ۔

آیت زیر بحث میں اوقات نماز کی تفصیل نہیں ہے لیکن طٰہٰ کی مذکورہ بالا آیت پر غور کیجیے تو اس میں نہ صرف پانچ فرض نمازوں کے اوقات کی طرف اشارہ ہے بلکہ چاشت اور تہجد کے اوقات بھی اس میں مضمر ہیں لیکن یہاں ہم صرف صبر اور نماز کے باہمی تعلق کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ اوقات نماز کے مسئلہ پر انشاء اللہ اس کے محل میں بحث کریں گے۔

ایک جامع کلیہ

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ایک جامع کلیہ ہے۔ لفظ حسنات نے نماز اور اس کے خاندان کی دوسری تمام نیکیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ مطلب یہ ہے کہ ان بھلائیوں ہی میں زیادہ سے زیادہ سرگرم رہو اس لیے کہ یہی ان برائیوں کو مٹائیں گی جو اندر سے یا باہر سے سر اٹھا سکتی ہیں۔

ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۔ یہ اس ہدایت کی قدر و قیمت کی طرف توجہ دلا دی گئی ہے کہ اس کو معمولی بات نہ سمجھنا۔ یہ سننے اور سمجھنے والوں کے لیے بڑی گراں مایہ موعظت ہے۔ یہ تنبیہ اس پہلے ضروری تھی کہ ہر شخص کے لیے یہ سمجھنا آسان نہیں تھا کہ نماز راہ حق میں جہاد کا سب سے بڑا ہتھیار بھی ہے۔

خوب کاروں کا صبر

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ اسی صبر کو مستحکم اور غیر متزلزل بنانے کے لیے اوپر والی آیت میں جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نماز کا حکم ہے۔ نماز سے پہلے استقامت اور نماز کے بعد صبر کے ذکر میں ایک اشارہ اس حقیقت کی طرف بھی ہے کہ پامردی اور استقلال محمود اسی صورت میں ہے جب آدمی کا رخ صحیح سمت میں ہو۔ علاوہ ازیں ایک اور نکتہ بھی اس آیت میں ہے۔ وہ یہ کہ یوں نہیں فرمایا کہ 'صبر کرو اس لیے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا' بلکہ یوں فرمایا کہ صبر کرو اس لیے کہ اللہ خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ صبر بھی خدا کے ہاں عزیز و محبوب اور سزاوار اجر انہی لوگوں کا ہے جو اس طرح صبر کریں جس طرح صبر کرنے کا حق ہے۔ رو دھو کر اور گلے شکوے کر کے تو سب ہی صبر کر لیتے ہیں۔ خوب کاروں کا صبر یہ ہے کہ سروں پر آرے چل جائیں لیکن نہ دل گلہ مند ہو نہ پیشانی پر بل آنے پاتے۔ جو لوگ اس شان و وقار سے صبر کرتے ہیں ان کا اجر کبھی ضائع نہیں جاتا۔ لفظ 'احسان' پر دوسرے مقام میں بحث کر کے ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اس کے معنی کسی کام کو نہایت خوبی کے ساتھ کرنے کے بھی آتے ہیں۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۱۶)

'اولوا بقیۃ' کا مفہوم

یعنی اخیار و صالحین اور حامیان حق۔ عربی میں جب کہیں کہ فلان بقیۃ قومہ تو اس کے معنی ہوں گے کہ وہ اپنی قوم کے اخیار و صالحین میں سے ہے۔

مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ ۔ اترفہ المال کے معنی ہوں گے کہ مال و اسباب نے اس کو طغیان و فساد میں مبتلا کر دیا یعنی اسباب عیش و تنعم کی فراوانی نے ان کو جس سرمستی میں مبتلا کر دیا تھا اسی میں پڑے رہے۔

قریش کو تنبیہ

اب یہ ان معذب قوموں کی طرف، جن کا ذکر اوپر گزرا ہے، اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کیا چیز ان کی

تباہی کا باعث ہوئی اور مقصود اس سے قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ اگر وہی روش تم نے اختیار کرلی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمہارا انجام ان کے انجام سے مختلف ہو۔ فرمایا کہ ان میں ایسے لوگ باقی نہیں رہ گئے تھے جو لوگوں کو خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے۔ ان کی اکثریت ایسے ہی لوگوں پر مشتمل تھی جو اسی سرمستی میں مگن پڑے رہے جس میں مبتلا تھے۔ بس تھوڑے ہی لوگ ان میں ایسے نکلے جو خدا سے ڈرنے والے تھے۔ سو ان کو ہم نے نجات دی۔ باقی جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے وہ اپنی مرغوبات کے پیچھے پڑے رہے اور ہلاک ہوئے اس لیے کہ وہ مجرم تھے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ (۱۱۷)

قوموں کی ہلاکت کے باب میں سنتِ الٰہی

اب یہ قوموں کی ہلاکت کے باب میں سنتِ الٰہی واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ کسی قریہ کو ان کے کسی ظلم کی پاداش میں ہلاک کر دے جب کہ اس کے باشندے بحیثیتِ مجموعی اصلاح کرنے والے ہوں۔ مطلب یہ کہ خدا کا عذاب کسی قوم پر اس وقت آتا ہے جب قوم کا مزاج بحیثیتِ مجموعی بگڑ جاتا ہے۔ اصلاح کرنے والے یا تو اس میں باقی رہ ہی نہیں جاتے یا رہتے ہیں تو خال خال نہایت قلیل تعداد میں۔ لفظ 'قُرٰی' یہاں قوموں کے مفہوم میں ہے اور 'بِظُلْمٍ' کی تنکیر سے مقصود اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ انفرادی خرابیاں عذابِ الٰہی کا باعث نہیں ہوتیں۔ عذابِ الٰہی اسی وقت نازل ہوتا ہے جب مجموعہ کا مزاج فاسد ہو جاتا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ۝ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (۱۱۸-۱۱۹)

ہدایت وضلالت کے معاملہ میں قانونِ الٰہی

یعنی اللہ اگر سب کو ایک ہی امت بنا دینا چاہتا تو وہ ایسا کر سکتا تھا، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا لیکن اس نے ہدایت وضلالت کے معاملے میں اس جبر کو پسند نہیں فرمایا بلکہ اس نے نیکی اور بدی دونوں کو ان کے انجام کی تفصیل کے ساتھ لوگوں کے سامنے رکھ دیا ہے اور انھیں اختیار دیا ہے کہ وہ ان میں سے جس کو چاہیں اختیار کرلیں۔ اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کریں گے تو اس کا صلہ آخرت کی ابدی زندگی کی کامرانیاں ہیں اور اگر بدی کی راہ اختیار کریں گے تو آخرت میں اس کی سزا بھگتیں گے۔ 'وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ' یعنی جب اللہ نے اس معاملے میں جبر کو پسند نہیں فرمایا بلکہ لوگوں کو اختیار دیا ہے تو یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ ہر شخص نیکی ہی کی راہ اختیار کرے گا بلکہ بہتیرے ان میں سے ایسے بھی نکلتے رہیں گے جو تمام تعلیم و تذکیر کے باوجود اپنے نفس اور شیطان کی پیروی میں بدی ہی کی راہ اختیار کریں گے اور اسی پر جئیں گے، اسی پر مریں گے۔ 'إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ' یعنی بدی کی راہ اختیار کرنے سے وہی لوگ محفوظ رہیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہو۔ یہ بات یہاں سیاقِ کلام کے اندر مضمر ہے کہ رحمتِ خداوندی کے سزاوار وہی ہو سکتے ہیں جو اپنے سمع و بصر اور عقل و دل کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں اور آنکھیں رکھتے ہوئے ٹھوکریں کھائیں۔ 'وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ' یعنی اللہ نے تو لوگوں کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے انتخاب و اختیار سے اپنے آپ کو اپنے رب کے فضل و رحمت کا سزاوار بنائیں۔ یہ امتحان

انسان کی خلقت کا ایک لازمی جزو ہے۔ اس سے گزرے بغیر کوئی شخص رحمتِ خداوندی کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ "وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ" یعنی جو لوگ اس امتحان میں فیل ہو جائیں گے ان کے حق میں تیرے رب کی یہ بات پوری ہو کے رہے گی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا حوالہ ہے جو ابلیس کے جواب میں ارشاد ہوا تھا اور جس کی تفصیل دوسرے مقام میں ہے کہ ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ سے انکار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ میں ذریتِ آدم پر ایسے گھیرے ڈالوں گا کہ تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہیں پائے گا، اللہ تعالیٰ نے اس کی اس دھمکی کے جواب میں فرمایا کہ میں ایسے تمام جنوں اور تمام انسانوں سے جہنم کو بھر دوں گا۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ (۱۲۰)

سرگزشتیں سنانے سے مقصود

اوپر حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی جو سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سرگزشتیں ہم اس لیے سناتے ہیں کہ ان کے وہ پہلو تمہارے سامنے لائیں جو تمہارے دل کو مضبوط کریں تاکہ تم ان حالات کا پامردی اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کر سکو جو تمھیں پیش آ رہے ہیں یا آئندہ پیش آ سکتے ہیں۔

اور یہ اطمینان رکھو کہ ان واقعات سے حق کے غلبہ اور باطل کی شکست کی جو تاریخ تمہارے سامنے آئی ہے یہ تمام تر حقائق پر مبنی ہے۔ ایسا ہی ہوا ہے اور ایسا ہی ہوگا۔ یہ سنتِ الٰہی پر مبنی ہے اور سنتِ الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ "وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ" اور ان سرگزشتوں میں ان لوگوں کے لیے بھی موعظت اور یاد دہانی ہے جو تم پر ایمان لائے ہیں۔ مخالفتوں کے اس طوفان میں جن چیزوں سے انھیں بچنا ہے وہ بھی ان سے واضح ہوتی ہیں اور جو روش انھیں اختیار کرنی چاہیے وہ بھی سامنے آتی ہے۔

وَقُل لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ ﴿﴾ وَانتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ (۱۲۱-۱۲۲)

مخالفین کو فیصلہ کن جواب

اب یہ آخر میں ایک فیصلہ کن جواب ہے مخالفین کو کہ تم جو کچھ ہماری مخالفت میں کر رہے ہو یا کرنا چاہتے ہو کرو اور ہم بھی دعوتِ حق کے جس کام کو کر رہے ہیں تمہاری تمام مخالفتوں اور تمام تر زاژخائیوں کے علی الرغم کرتے رہیں گے۔ اگر تم عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اس کا انتظار کرو، ہم بھی اس کے منتظر ہی ہیں۔ اس لیے کہ وہ تمام علامتیں جو کسی قوم کو مستحقِ عذاب بناتی ہیں وہ تم میں ایک ایک کر کے نمایاں ہو رہی ہیں لیکن عذاب بھیجنا خدائے علام الغیوب کا کام ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کب تمہارا فیصلہ ہونا چاہیے۔

وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۱۲۳)

اللہ پر بھروسہ کرنے کی ہدایت

یہ آخر میں سارا معاملہ اللہ کے حوالہ کرنے، ہمہ تن اس کی عبادت میں سرگرم رہنے اور اس پر پورا پورا بھروسہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی کہ آسمانوں اور زمین کا سارا بھید اللہ ہی کے علم و اختیار میں ہے اور سارے معاملات فیصلہ کے لیے

اسی کے حضور میں پیش ہوتے ہیں تو تم اسی کی بندگی کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو۔ تمہارا رب جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے بے خبر نہیں ہے۔ وہ ہر منزل اور ہر گام پر تمہارے ساتھ ہے۔ وہ تمہاری رہنمائی فرمائے گا اور ہر مشکل میں تمہاری مدد کرے گا۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس سورہ کی تفسیر میں اس ہیچمیرز کو حوالۂ قرطاس کرنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

لاہور

۲ مئی ۱۹۷۰ء

۲۵ صفر ۱۳۹۰ھ

تدبّرِ قرآن

۱۲

یوسف

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ سورہ کا عمود

سورتوں کا یہ گروپ سورۂ یونس سے شروع ہوا ہے۔ ہم اس پورے گروپ کے عمود پر سورۂ یونس کی تفسیر کی تمہید میں ایک جامع تبصرہ کر چکے ہیں۔ یہاں ہم اس کا ضروری حصہ نقل کیے دیتے ہیں تاکہ ذہن میں بات تازہ ہو جائے۔ ہم نے لکھا ہے۔

"اس پورے گروپ کی تلاوت، تدبر کے ساتھ، بار بار کیجیے تو آپ نہایت واضح طور پر محسوس کریں گے کہ گروپ کی تمام سورتوں میں مشترک حقیقت جو مختلف پہلوؤں اور اسلوبوں سے واضح فرمائی گئی ہے، یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے حق و باطل کے درمیان جو کشمکش برپا ہو چکی ہے وہ بالآخر پیغمبرؐ اور اس پر ایمان لائے۔ ان کی کامیابی و فتح مندی اور قریش کی ذلت و ہزیمت پر منتہی ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اس میں قریش کے لیے انذار اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے لیے بشارت ہے۔ قریش پر عقل و فطرت، آفاق و انفس کے دلائل اور تاریخ و نظامِ کائنات کے شواہد سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جو حق تمہارے پاس آ چکا ہے اس کی مخالفت میں اگر تمہاری یہی روش قائم رہی تو بہت جلد وہ وقت آ رہا ہے جب تم اس کا انجام بد اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔

"اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو صبر و استقامت اور تقویٰ کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ جس حق کو لے کر تم اٹھے ہو انجام کار کی کامیابی و فیروزمندی اسی کا حصہ ہے۔ البتہ سنت الٰہی یہ ہے کہ حق کو غلبہ اور کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے آزمائش کے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان مرحلوں سے لازماً تمہیں بھی گزرنا ہے۔ اگر یہ مرحلے تم نے عزیمت و استقامت کے ساتھ طے کر لیے تو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی تمہارا ہی حصہ ہے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ

(ابراہیم - ۲۷)

اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے سورۂ یونس اور سورۂ ہود دونوں میں، جیسا کہ آپ نے دیکھا، حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی سرگزشتیں تفصیل سے سنائی گئی ہیں اور سورۂ ہود کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ان سرگزشتوں کے سنانے کا یہ مقصد بیان فرمایا گیا ہے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ
بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ

اور ہم رسولوں کی سرگزشتوں میں سے جو کچھ بھی وہ سب سنا
رہے ہیں جس سے تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ان میں

مَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ (ھود - ۱۲۰ - ۱۲۲)	تمھارے لیے بھی حق واضح ہوا ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے بھی ان میں موعظت اور یاددہانی ہے اور جو ایمان نہیں لارہے ہیں ان سے کہہ دو کہ تم اپنی جگہ پر کام کرو، ہم اپنی جگہ پر کام کر رہے ہیں اور تم بھی انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

بعینہٖ یہی مقصد اس سرگزشت کا بھی ہے جو سورۂ یوسف میں مذکور ہوئی ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ پچھلی سورتوں میں متعدد انبیاء کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں، اس میں ایک ہی سرگزشت نے پوری سورہ کو گھیر لیا ہے اور اس کو احسن القصص (بہترین سرگزشت) سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور آخر میں خلاصۂ سرگزشت ان الفاظ میں سامنے آیا ہے۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (یوسف - ۹۰)	بے شک جو تقویٰ اختیار کریں گے اور ثابت قدم رہیں گے تو اللہ ایسے خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔

گویا سورہ ہود کے بعد سورۂ یوسف اسی حقیقت کو مبرہن کرنے کے لیے ایک تاریخی شہادت ہے جو سورۂ ہود کی مندرجہ بالا آیت میں مذکور ہوئی ہے اور یہ شہادت ایک بہترین شہادت ہے جو ایک بہترین سرگزشت میں نمایاں ہوئی ہے۔

ج۔ قصۂ یوسف (علیہ السلام) کے احسن القصص ہونے کے بعض وجوہ

قصۂ یوسف کا احسن القصص ہونا اس پہلو سے تو نہایت واضح ہے کہ ہر پڑھنے والا اس کے اندر اپنے ایمان کے لیے غذا اور اپنی روح کے لیے لذت و حلاوت محسوس کرتا ہے لیکن اس کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم بھی یہاں اشارہ کیے دیتے ہیں تاکہ جو لوگ اس کے محاسن کو گرفت میں لینے کا شوق رکھتے ہوں ان کی کچھ رہنمائی ہو سکے۔

ہمارے نزدیک اس کے احسن القصص ہونے کے مندرجہ ذیل پہلو خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۔ یوں تو قرآن میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے درمیان کشمکش کے جتنے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں سب ہی عبرت و رہنمائی کے لیے بیان ہوئے ہیں کہ ماضی کی ان سرگزشتوں سے حاضر اور مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سبق حاصل کیے جائیں لیکن خاص طور پر حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی یہ سرگزشت تو گویا ایک آئینہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے وہ تمام حالات دکھا دیے گئے جو آپ کی قوم کے ہاتھوں آپ کو پیش آنے تھے۔

تفصیلات میں جانے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ چند نمایاں واقعات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔

دار الندوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے مشورے اور اس شر سے حضورؐ کا محفوظ رہنا ۔ غارِ ثور میں حضورؐ کا چھپنا اور پھر مدینہ کو ہجرت فرمانا ۔ مدینہ پہنچ کر آہستہ آہستہ آپؐ کو وہ وقار و اقتدار حاصل ہونا کہ چشمِ فلک نے اس کی نظیر نہیں دیکھی ۔ آپ کی قوم کے باایمان لوگوں کا مدینہ کو ہجرت کرنا اور وہاں ایک طاقتور حکومت کا قیام ۔ اس حکومت کا عروج اور اہل مکہ کا اس کی اطاعت میں داخل ہونا ۔ فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی قوم کے لوگوں سے یہ سوال کرنا کہ لوگو ، بتاؤ ، میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں ؟ وہ بولے کہ 'آپ شریف بھائی اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں ۔' ان کے اس جواب کے بعد آپ نے فرمایا 'میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی ، جاؤ تم آزاد ہو ، تم پر کوئی الزام نہیں ۔' .... ان تمام واقعات کو ذہن کے سامنے رکھتے ہوئے سورۂ یوسف کا تدبر کے ساتھ مطالعہ کیجیے تو یہ ساری سرگزشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر یوں منطبق ہوتی ہے کہ گویا

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

۲ - جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حاضر و مستقبل اس آئینہ میں بالکل مصور و متشکل دیکھ لیا اسی طرح آپؐ کے دشمنوں نے بھی ، کم از کم جو ذہین رہے ہوں گے ، اس قصہ کے پیرایہ میں اپنی عاقبت دیکھ لی ہوگی اور اس کا بھی امکان ہے کہ جن کے اندر صلاحیت رہی ہوگی وہ اس سے متاثر بھی ہوئے ہوں گے ۔ حالانکہ اگر یہی باتیں صریح الفاظ میں کہی جاتیں تو اس سے فائدہ پہنچنے کی بجائے الٹا نقصان پہنچتا ۔ ایک لطیف قصہ کے پردے میں لوگ جو کچھ ہضم کر جاتے ہیں وہ کھلے ہوئے وعظ کی شکل میں کبھی قبول نہیں کرتے ۔

۳ - عام طور پر لوگ ان قصوں سے بہت دلچسپی لیتے ہیں جن میں کچھ چاشنی حسن و عشق کی ہو لیکن ایسے قصے بالعموم اخلاق کو بگاڑنے والے ہوتے ہیں ۔ اس قصہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں حسن و عشق کی چاشنی بھی ہے اور پھر پوری سرگزشت ہر پہلو سے حضرت یوسفؑ کے اعلیٰ کردار و صفات کا ایک مرقع ہے ۔ جو مواقع خاص آزمائش کے آئے ہیں ان میں حضرت یوسفؑ نے اپنی اعلیٰ فطرت کے جو جوہر نمایاں کیے ہیں وہ ایسے شاندار ہیں کہ ہر پڑھنے والے کے اندر ان کی تقلید کا جذبہ ابھرتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ یہ تقلید ناممکن نہیں بلکہ ممکن محسوس ہوتی ہے ۔

۴ - یہ پہلو بھی اس سرگزشت کا نہایت دلکش ہے کہ باوجودیکہ جو واقعات و حالات پیش آئے وہ نہایت حیرت انگیز ہیں لیکن کوئی بات بے ربط اور رفتار حالات سے بے جوڑ نہیں معلوم ہوتی ۔ ذہن بے تکلف اس کو قبول کر لیتا ہے اور ان کی فطری صداقت سے ہر سننے والا اپنی صلاحیت کے مطابق متاثر ہوتا ہے ۔

۵ - حضرت یوسفؑ حسن ظاہر اور حسن باطن دونوں کے جامع تھے لیکن ان کا اصلی حسن ان آزمائشوں میں نمایاں ہوا ہے جو ان کی زندگی کے مختلف مراحل میں پیش آئی ہیں ۔ وہ بیک وقت ذہانت ، پاکیزگی ، نبوت ، بادشاہی ، پاکدامنی اور قدرت کے ساتھ عفو و درگزر کی ایک زندہ جاوید مثال ہیں ۔

یہ چند نمایاں پہلوؤں کی طرف یہاں ہم نے اشارہ کر دیا ہے ۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس قصہ کی حکمت بس

انھیں چند باتوں تک محدود ہے۔ آگے اشارے قصے میں کتنے زاور حکمت آئیں گے جن کی وضاحت ان کے محل ہی میں مناسب رہے گی۔ اس تمہیدی بحث کے بعد اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

سُوْرَةُ يُوْسُفَ (۱۲)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۱۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ① اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا
۱-۶ لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ② نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ③
اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ④ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ
رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ
عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ⑤ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ
الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا
ع عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑥

ترجمۂ آیات ۱-۶ یہ الف، لام، را ہے۔ یہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔ ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا

تاکہ تم سمجھو۔ ۱-۲

ہم تمھیں ایک بہترین سرگزشت سناتے ہیں اس قرآن کی بدولت جو ہم نے تمھاری طرف وحی

کیا۔ اس سے پہلے بے شک تم اس سے ناآشنا تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب یوسف نے

اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان! میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے، میں

نے ان کو دیکھا کہ وہ میرے آگے سربسجود ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ اے میرے بیٹے تم اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کو نہ سنانا کہ وہ تمہارے خلاف کسی سازش میں لگ جائیں، شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے اور اسی طرح تمہارا رب تمہیں برگزیدہ کرے گا اور تمہیں باتوں کی حقیقتوں تک پہنچنا سکھائے گا اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت تمام کرے گا جس طرح اس نے اس سے پہلے تمہارے اجداد ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر اپنی نعمت تمام کی بے شک تمہارا رب بڑا ہی علیم و حکیم ہے۔ ۶-۲

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱-۲)

سورہ کا قرآنی نام — 'الٓرٰ' یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ یہی نام سورۂ یونس اور سورۂ ہود کا بھی ہے۔ نام میں اصل مقصود تسمیہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کے معانی کی کھود کرید کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ ناموں کا اشتراک معانی و مطالب کے اشتراک کی دلیل ہوتا ہے۔ سو یہ چیز، جیسا کہ ہم پچھلی دونوں سورتوں کی تفسیر میں اشارہ کر آئے ہیں، ان سب سورتوں میں موجود ہے۔ ان میں اصل موضوع بحث ایک ہی ہے البتہ انداز بحث اور مواد استدلال ہر ایک میں الگ الگ ہے۔

'کتٰب مبین' کا مفہوم — 'تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ'۔ 'کتاب مبین' وہ کتاب جو اپنے بیان و استدلال میں بالکل واضح ہو، جس کی ہر بات ناقابلِ انکار دلائل سے مبرہن ہو، جس کا اندازِ بحث و نظر دل نشین، طمانیت بخش اور تمام الجھنوں کو دور کر دینے والا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کی صداقت کی گواہی کے لیے کسی خارجی معجزے یا نشانی کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ منکرین مطالبہ کر رہے ہیں، بلکہ اس کی حقانیت و صداقت کے سورج کی طرح روشن دلائل خود اس کے اندر ہی موجود ہیں بشرطیکہ لوگ کان کھول کر اس کو سنیں اور اس کے دلائل پر غور کریں۔

اہل عرب پر عظیم احسان — 'اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ'۔ خطاب اہلِ عرب سے عموماً اور قریش سے خاص طور پر ہے کہ اللہ کا تم پر عظیم احسان ہوا ہے کہ اللہ کی یہ سب سے بڑی نعمت تمہاری عربی زبان میں نازل ہوئی ہے تاکہ تم اس کو سمجھو، اس کی قدر کرو اور اس کو دوسروں تک پہنچاؤ اور ان کو سمجھاؤ۔ یہ اس کتاب کے کتاب مبین ہونے کا ایک پہلو ہے اور اس میں قریش کے لیے ایک دھمکی بھی ہے کہ اگر تم نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو تم سے بڑا بدقسمت بھی کوئی اور نہ ہوگا، یہ جتنی بڑی نعمت ہے اتنی ہی بڑی نعمت کے سزاوار ٹھہرو گے اگر تم نے اس کی قدر نہ کی۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْءَانَ ۖ وَإِن كُنتَ مِن قَبْلِهِۦ لَمِنَ الْغَٰفِلِينَ (۳)

'احسن القصص' کا مفہوم

'اَحْسَنَ الْقَصَصِ' میں 'قصص'، قصہ اور سرگزشت کے معنی میں ہے۔ مصدر یعنی قصہ بیان کرنے کے معنی میں نہیں ہے۔ اگر مصدر کے معنی میں ہوتا تو زبان کے معروف استعمال کے مطابق اس پر الف لام نہ آتا بلکہ 'احسن قصص' ہوتا۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تمھیں بہترین قصہ سناتے ہیں۔ یہ معنی اس کے صحیح نہیں ہیں کہ ہم تمھیں بہترین پیرایہ میں سناتے ہیں۔ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف میں ہے فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (پس ان کو سرگزشت سناؤ تاکہ وہ غور کریں) سورۂ قصص میں ہے فَلَمَّا جَآءَهُۥ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ (پس جب وہ اس کے پاس آیا اور اس کو سرگزشت سنائی) ہمارے نزدیک 'احسن القصص' اسی طرح کی تالیف کلام ہے جس کی نظیر قرآن میں 'اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ - ۲۳ زمر (اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے) ہے۔ یہ امر بھی یہاں قابلِ توجہ ہے کہ 'احسن القصص' کو مصدر کے معنی میں لینے کی صورت میں مفعول غائب ہو جاتا ہے درآنحالیکہ فعل اپنے مفعول کا متقضی ہے اور قرآن میں ہر جگہ یہ اپنے مفعول کے ساتھ ہی آیا ہے۔

یہ چند اشارات تالیف کلام سے متعلق ہیں۔ رہا یہ سوال کہ حضرت یوسفؑ کی اس سرگزشت کو 'احسن القصص' سے کیوں تعبیر فرمایا گیا ہے تو اس کے بعض پہلو ہم اپنے تمہیدی مباحث میں واضح کر چکے ہیں اور بعض کی طرف ہم آگے ان کے محل میں انشاء اللہ اشارہ کریں گے۔

ایک سرگزشت آنحضرت صلعم کے لیے بمنزلۂ آئینہ

اوپر کی آیات میں خطاب عام ہے اور اس کی نوعیت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، قریش کو تنبیہ کی تھی۔ اب اس آیت سے روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف براہِ راست ہو گیا ہے۔ آپؐ کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم تمھیں ایک بہترین سرگزشت سنا رہے ہیں اور یہ سرگزشت اس قرآن کی بے شمار برکتوں میں سے ایک برکت ہے جو ہم تمھاری طرف وحی کر رہے ہیں، اس سے پہلے تم اس سے بالکل ناآشنا تھے۔

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس سرگزشت کے دو نہایت اہم پہلو آپؐ کے سامنے واضح کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ احسن القصص ہے، دوسرا یہ کہ یہ آپؐ کی رسالت کی ایک نہایت واضح دلیل ہے۔ جہاں تک اس کے احسن القصص ہونے کا تعلق ہے اس کی وضاحت ہم پیچھے کر چکے ہیں۔ ایک سرگزشت اگر بجائے خود سچی بھی ہو اور جس کو سنائی جا رہی ہو اس کے لیے وہ بمنزلہ ایک آئینہ کے بھی بن جائے جس میں وہ اپنی زندگی کے تمام نشیب و فراز کامیابی کی آخری منزلوں تک، دیکھ لے تو اس سرگزشت سے زیادہ سبق آموز، بابرکت اور قیمتی سرگزشت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حضرت یوسفؑ کی سرگزشت کی نوعیت یہی تھی۔ اس میں آپؐ کو آپؐ کے حاضر اور مستقبل کا پورا نقشہ دکھا دیا گیا جس میں چند مقامات بہت سخت بھی تھے لیکن آخری منزل نہایت شاندار تھی۔ اس راہ میں اگرچہ غارِ ثور بھی آتا تھا لیکن غارِ ثور کی ظلمتوں سے مدینہ کی حکومت بھی نظر آ رہی تھی اور مکہ کی پرامن زندگی کے اندر اس دن کی جھلک بھی نمایاں تھی جب کہ مکہ کے متمردین گھٹنے ٹیک کر آپؐ سے عفو و کرم کی التجائیں کریں گے۔

سرگزشت کے دلیل رسالت ہونے کی نوعیت

رسالت کی دلیل یہ یوں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے۔ آپ نہ تو اس سرگزشت سے واقف ہی تھے نہ آپ کے پاس اس سے واقف ہونے کا ذریعہ ہی تھا۔ یہ قرآن کا فیض تھا کہ آپ اس سے واقف ہوئے اور اس صحت، وصداقت اور ایسی وسعت وتفصیل کے ساتھ واقف ہوئے کہ اہل کتاب بھی اس سے واقف نہ تھے۔ اس پہلو سے یہ آپ کی قوم کے لیے بھی آپ کی رسالت کی ایک دلیل تھی اور اہل کتاب کے لیے بھی، کہ اگر آپ وحی الٰہی سے مشرف نہیں ہیں تو یہ باتیں اس استقصا اور صحت وصداقت کے ساتھ آپ کو کیسے معلوم ہوئیں! مِنۡ قَبۡلِهٖ کے لفظ سے اس امر واقعی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اگر اس قرآن سے پہلے تمھیں اس سرگزشت کی کچھ بھی واقفیت ہوتی تو چالیس سال کی وسیع مدت میں کبھی تو بات زبان پر آتی۔ پھر تمھارے مخالفین کیوں نہیں سوچتے کہ اگر یہ وحی الٰہی کا فیضان نہیں ہے تو یہ چشمہ یکایک کہاں سے پھوٹ پڑا۔ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ تورات اور تالمود میں یہ سرگزشت ہے ضرور لیکن اول تو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا آپ کے پاس ان سے واقف ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، پھر ان کے بیان اور قرآن کے بیان میں قدم قدم پر اختلاف ہے اور اس اختلاف پر جو شخص بھی انصاف سے غور کرے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ قرآن کا بیان بالکل نیچرل ہے اور تورات کا بیان بالکل خلافِ عقل وفطرت اور شانِ نبوت کے منافی۔

اِذۡ قَالَ يُوۡسُفُ لِاَبِيۡهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّىۡ رَاَيۡتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوۡكَبًا وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ رَاَيۡتُهُمۡ لِىۡ سٰجِدِيۡنَ (۴)

حضرت یوسفؑ کا خواب

اب یہ اصل سرگزشت کی تمہید شروع ہوتی ہے۔ حضرت یوسفؑ نے ایک دن اپنے والد حضرت یعقوبؑ سے اپنا ایک خواب بیان کیا کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند میرے آگے سربسجود ہیں۔ حضرت یوسفؑ کا اس خواب کو سب سے پہلے اپنے والد کے علم میں لانا ان کی غیر معمولی سلیم الطبعی، نیک نیتی اور سعادت مندی کی دلیل ہے۔ اس طرح کا خواب اگر کوئی اوچھی طبیعت کا آدمی دیکھتا تو سب سے پہلے اپنی بڑائی کا ڈھول دوسروں میں پیٹتا لیکن حضرت یوسفؑ بچپن ہی سے نہایت رزین، متین اور سنجیدہ تھے۔ انھوں نے یہ خواب دیکھا تو انھیں یہ محسوس ہوا کہ یہ خواب خوابِ پریشاں کی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اہمیت رکھنے والا خواب ہے اس وجہ سے انھوں نے اس کو سب سے پہلے اپنے والد ماجد کے سامنے پیش کیا جن پر ہر پہلو سے ان کو سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ آیت کے الفاظ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی طبیعت کے اندر جو تواضع تھی وہ خواب کو پیش کرنے کے انداز میں بھی نمایاں ہے۔ حضرت یعقوبؑ کے سامنے جاتے ہی بے دھڑک یوں نہیں کہہ دیا کہ میں نے گیارہ ستاروں اور سورج چاند کو اپنے آگے سربسجود دیکھا بلکہ خواب کا ابتدائی حصہ کہ میں نے گیارہ ستاروں اور سورج چاند کو دیکھا، کہہ کر ٹھٹک گئے اس لیے کہ آگے کی بات میں ان کی بڑائی نمایاں تھی جس کے اظہار سے ان کی متواضع طبیعت جھجکتی تھی لیکن چونکہ اظہار ضروری تھا اس وجہ سے ذرا توقف کے بعد فرمایا کہ رَاَيۡتُهُمۡ لِىۡ سٰجِدِيۡنَ میں نے ان کو دیکھا کہ وہ میرے لیے سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ فعل رَاَيۡتُ کے اعادہ میں یہ بلاغت ہے کہ اس میں رویا کے بیان کرتے وقت خاص کر واقعۂ سجدہ کے بیان کرتے وقت، حضرت یوسفؑ پر جو

جھجک طاری رہی ہے وہ واضح ہے۔

قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاکَ عَلٰٓی اِخْوَتِکَ فَیَکِیْدُوْا لَکَ کَیْدًا ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (۵)

حضرت یعقوبؑ کی تعبیر اور حضرت یوسفؑ کو ہدایت

حضرت یعقوبؑ نے خواب سنتے ہی یہ اندازہ فرما لیا کہ یہ منصب نبوت پر سرفرازی کا اشارہ ہے لیکن اس بشارت سے پہلے انھوں نے حضرت یوسفؑ کو تاکید کے ساتھ منع فرمایا کہ یہ خواب اپنے بھائیوں کے آگے نہ بیان کرو تاکہ کہیں وہ حسد سے جل بھن کر تمھارے خلاف کسی سازش میں سرگرم ہو جائیں۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ حضرت یوسفؑ کے کل گیارہ بھائی تھے جن میں سے دس ان کی سوتیلی ماؤں سے تھے۔ صرف سب سے چھوٹے بھائی بن یامین ان کی اپنی ماں سے تھے۔ یہاں اشارہ انھیں دس سوتیلے بھائیوں کی طرف ہے۔ چونکہ ان بھائیوں کی پرخاش حضرت یوسفؑ کے ساتھ واضح تھی اس وجہ سے حضرت یعقوبؑ کو اندیشہ ہوا کہ اگر کہیں انھوں نے یوسفؑ کا خواب سن لیا تو ان کی حسد کی آگ اور بھڑک اٹھے گی اور عجب نہیں کہ وہ حسد سے اندھے ہو کر ان کو نقصان پہنچانے کی کوئی خطرناک سازش کر ڈالیں۔ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ یعنی کھلا ہوا دشمن شیطان تو موجود ہی ہے، وہ کہیں ان کو کسی فتنہ کی راہ پر نہ ڈال دے۔

وَکَذٰلِکَ یَجْتَبِیْکَ رَبُّکَ وَیُعَلِّمُکَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ وَیُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْکَ وَعَلٰٓی اٰلِ یَعْقُوْبَ کَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓی اَبَوَیْکَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّکَ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (۶)

حضرت یعقوبؑ نے جب خواب سنا تو چونکہ یہ بات ان کے علم میں تھی کہ نبوت کا آغاز رویائے صادقہ ہی سے ہوتا ہے اور اس خواب کا ظاہر ہی بتا رہا تھا کہ یہ سچا خواب ہے اور خواب دیکھنے والے کے لیے ایک شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کر رہا ہے اس وجہ سے انھوں نے فرمایا کہ یہ جو کچھ تم نے دیکھا ہے ٹھیک ہے جلد وہ وقت آنے والا ہے جب تمھارا رب تمھیں منصب نبوت کے لیے منتخب فرمائے گا۔

وَیُعَلِّمُکَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ، میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک تو اس بات کی طرف کہ اس رویا کی حقیقت اللہ تعالیٰ خود تم پر واضح فرما دے گا۔ چنانچہ جب اس کی حقیقت حضرت یوسفؑ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو فرمایا یٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِکُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ۔ رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ۔ (اے میرے باپ یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے دیکھا تھا میرے رب نے اس کو حقیقت کر دکھایا اور اس نے مجھ پر بڑا ہی کرم فرمایا جب کہ مجھے قید خانہ سے باہر نکالا اور آپ لوگوں کو بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال دیا تھا، دیہات سے یہاں لایا، میرا رب جو کچھ چاہتا ہے اس کو نہایت خوبی سے کر دکھاتا ہے، وہ بڑا ہی علیم و حکیم ہے۔ اے میرے رب تو نے مجھے حکومت بھی عطا فرمائی اور رویا کی تعبیر بھی بتائی)۔

تعبیر رؤیا کا علم — دوسری یہ کہ رویا چونکہ علوم نبوت کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اور رویا میں حقائق مجاز کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جن کو سمجھنا ایک خاص ذہنی مناسبت کا مقتضی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ حضرات انبیاء علیہم السلام کو تعبیر رویا کا ایک خاص ذوق اور ایک خاص علم بھی عطا فرماتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے جب محسوس فرمایا کہ اس رویا میں حضرت یوسفؑ کے لیے نبوت کی بشارت ہے تو ساتھ ہی ان پر یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اب حضرت یوسفؑ کو تعبیر رویا کا علم بھی عطا ہو گا تاکہ رویا کی شکل میں جو حقائق ان پر وارد ہوں ان کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر وہ منشائے خداوندی کی تعمیل کر سکیں۔ چنانچہ آگے اسی سورہ میں آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس علم میں ان کا درجہ اتنا بلند کیا کہ بالآخر یہی علم ان کے لیے مصر کی بادشاہی کے حصول کا ذریعہ بن گیا۔

اصل نعمت دین و شریعت ہے — 'یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ' ...... الایۃ: نعمت سے مراد دین و شریعت کی نعمت ہے۔ دنیا کی دوسری چیزوں کا نعمت ہونا ایک امر اضافی ہے۔ جب بندے کو دین و شریعت کی نعمت ملتی ہے تب ہی نعمت کامل ہوتی ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہارے اجداد ابراہیم اور اسحٰق کو اپنی نعمت سے نوازا اسی طرح وہ تم کو اور آل یعقوب کو بھی اس نعمت سے نوازے گا اور تم نے جو رویا دیکھی ہے وہ اسی اتمام نعمت کی بشارت ہے۔ اللہ بڑا ہی علیم و حکیم ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

۲ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۷-۲۲

حضرت یوسفؑ کی سرگزشت — اوپر کی تمہید کے بعد اب آگے حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کی اصل سرگزشت شروع ہوتی ہے چونکہ اس سرگزشت کے سنانے سے اصل مقصود داستان سرائی نہیں بلکہ ان بہت سے سوالوں کا جواب دینا تھا جو اس دور میں اپنوں اور بیگانوں دونوں ہی کے ذہنوں کے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوت سے متعلق پیدا ہو رہے تھے اس وجہ سے ابتدا ہی میں متنبہ کر دیا کہ لَقَدْ كَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآىٕلِیْنَ (یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کی سرگزشت میں سوال کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں) یعنی جو لوگ اس الجھن میں ہیں کہ آگے کیا ہو گا اور کس طرح ہو گا وہ اپنے اس طرح کے سوالوں کے جواب اس سرگزشت میں پا لیں گے۔ پھر بیرے کے آخر میں فرمایا کہ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ اللہ اپنی اسکیم کو بروئے کار لانے پر پوری طرح حاوی ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے ــــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷-۲۲

لَقَدْ كَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآىٕلِیْنَ ۞ اِذْ قَالُوْا لَیُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِیْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِ ۞ اقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ

أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ﴿٩﴾ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ
لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ
السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ﴿١٠﴾ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَىٰ
يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ ﴿١١﴾ أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ
وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿١٢﴾ قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَنْ تَذْهَبُوا بِهِ وَ
أَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ ﴿١٣﴾ قَالُوا لَئِنْ
أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا إِذًا لَخَاسِرُونَ ﴿١٤﴾ فَلَمَّا ذَهَبُوا
بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ
لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٥﴾ وَجَاءُوا أَبَاهُمْ
عِشَاءً يَبْكُونَ ﴿١٦﴾ قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا
يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۖ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا
وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ ﴿١٧﴾ وَجَاءُوا عَلَىٰ قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ ۚ قَالَ الثلثة
بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ
عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿١٨﴾ وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ
دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ
بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۚ وَ
كَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿٢٠﴾ وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ ع ۲ ۱۲ ۱۲
لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۚ وَ

كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۭ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓي اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢١﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٢٢﴾

ترجمۂ آیات ۷ - ۲۲

بے شک یوسف اور اس کے بھائیوں کی سرگزشت میں پوچھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ خیال کرو جب انھوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ بے شک ہمارا باپ ایک کھلی ہوئی غلطی میں مبتلا ہے۔ یوسف کو قتل کر دو یا اس کو کہیں پھینک دو تو تمھارے باپ کی ساری توجہ تمھاری ہی طرف ہو جائے گی اور اس کے بعد تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل تو نہ کرو، اگر تم کچھ کرنے ہی والے ہو تو اس کو کسی کنوئیں کی تہ میں پھینک دو، کوئی راہ چلتا قافلہ اس کو نکال لے جائے گا۔ ۷ - ۱۰

انھوں نے اپنے باپ سے کہا، اے ہمارے باپ، کیا بات ہے کہ یوسف کے معاملے میں آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے بڑے ہی خیر خواہ ہیں۔ کل اس کو ہمارے ساتھ جانے دیجیے ذرا چرے چگے اور کھیلے کودے اور ہم اس کی پوری حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس نے کہا مجھے غم میں یہ چیز ڈالتی ہے کہ تم اسے لے جاؤ اور ڈرتا ہوں کہ جب تم اس سے غافل ہو تو اس کو بھیڑیا کھا جائے۔ وہ بولے کہ اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا جب کہ ہم ایک پوری جماعت ہیں تو ہم تو اس صورت میں نہایت ہی نامراد ثابت ہوں گے۔ ۱۱ - ۱۴

پس جب وہ اس کو لے گئے اور یہ طے کر لیا کہ اس کو کنوئیں کی تہ میں پھینک دیں اور ہم نے اس کو وحی بھی کر دی کہ تم ان کو ان کی اس کارستانی سے آگاہ کرو گے جب کہ ان کو کچھ خیال بھی نہ ہوگا اور

وہ اپنے باپ کے پاس کچھ رات گئے روتے ہوئے آئے تو بولے کہ اے ہمارے باپ ہم ایک دوسرے سے دوڑ میں مقابلہ کرتے ہوئے دور نکل گئے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑا تو اس کو بھیڑیا کھا گیا ـــــ اور آپ تو ہماری بات باور کرنے والے ہیں نہیں اگرچہ ہم سچے ہی ہوں اور وہ اس کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے۔ اس نے کہا کہ بلکہ یہ تو تمہارے جی کی ایک گھڑی ہوئی بات ہے تو صبر جمیل کی توفیق ملے اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس میں خدا ہی سہارا ہے۔ ۱۵-۱۸

اور ایک قافلہ آیا تو انھوں نے اپنے سقہ کو بھیجا۔ اس نے ڈول ڈالا تو پکار اٹھا، خوشخبری ہو! یہ تو ایک لڑکا ہے! اور اس کو ایک پونجی سمجھ کر محفوظ کر لیا اور اللہ خوب باخبر تھا اس چیز سے جو وہ کر رہے تھے اور انھوں نے اس کو ایک حقیر قیمت، چند درم کے عوض، بیچ دیا اور وہ اس کے معاملے میں بالکل بے پروا تھے۔ ۱۹-۲۰

اور اہل مصر میں سے جس نے اس کو خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ ذرا اس کو خاطر سے رکھیو۔ امید ہے کہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا ہی بنا لیں اور اس طرح ہم نے یوسف کے لیے ملک میں زمین ہموار کی تاکہ ہم اس کو متمکن کریں اور اس کو باتوں کی تعبیر بتائیں اور اللہ اپنے ارادے کی تنفید پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا ہم نے اس کو حکومت اور علم عطا کیا اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ ۲۱-۲۲

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ (۷)

سرگزشت سے پہلے ایک تنبیہ

یہ آیت، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، اصل سرگزشت کے شروع کرنے سے پہلے ایک تنبیہ ہے کہ مخاطب اس کو محض ایک کہانی کی طرح نہ سنیں بلکہ اس میں ان بہت سے سوالوں کے جواب مضمر ہیں جو دعوت اسلامی کے اس دور میں مخالفین و موافقین دونوں ہی کے

غلبۂ حق اور ہزیمت باطل کی بشارت

ذہنوں میں ابھر رہے ہیں۔ اس گروپ کی پچھلی دونوں سورتوں میں حق کے غلبہ اور باطل کی ہزیمت کا مضمون مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے لیکن جس وقت یہ مضمون بیان ہوا ہے پورے ملک پر اس طرح کفر کی تاریکی چھائی ہوئی تھی کہ یہ تصور کرنا کچھ آسان نہ تھا کہ یہ تاریکی ایک دن بالکل کافور ہو جائے گی اور جو شخص آج اپنے چند نہایت مظلوم ساتھیوں کے ساتھ وقت کے متمردین کے ہاتھوں ہر قسم کے مصائب و مظالم کا ہدف ہے ایک دن آئے گا کہ یہ تمام متمردین اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اس سے رحم و کرم کی التجائیں کریں گے۔ قرآن نے اس تصور کو ذہنوں کے قریب لانے کے لیے یہ سرگزشت سنائی تاکہ اس امر سے متعلق ذہنوں میں جتنے بھی سوالات و شبہات موجود ہوں یا آئندہ پیدا ہو سکتے ہوں وہ دور ہو جائیں اور لوگوں کو اندازہ ہو جائے کہ خدا کی شانیں یوں ظاہر ہوتی ہیں اور اس کے ارادے اور منصوبے یوں بروئے کار آتے ہیں۔

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۸)

برادران یوسف کا غصہ

'عُصْبَۃ' کے معنی گروہ، جتھا اور جماعت کے ہیں، خاص طور پر وہ گروہ جس کے اندر خون کی عصبیت بھی موجود ہو۔ بدویانہ دور زندگی میں، جب منظم حکومتوں کا وجود نہیں تھا، حمایت و مدافعت کا تمام تر انحصار خاندان اور قبیلہ کی عصبیت ہی پر ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ باعزت اور با اثر وہ خاندان سمجھا جاتا جس کے اندر حمایت اور مدافعت کے لیے اٹھنے والے نوجوان سب سے زیادہ ہوں۔ اسی خاندان کو قوم و قبیلہ کی سربراہی حاصل ہوتی اور وہی حکومت کرتا۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے اسی امر کو مدنظر رکھ کر نعوذ باللہ اپنے باپ کی بے خردی اور ناعاقبت اندیشی پر آپس میں غصہ کا اظہار کیا کہ جتھہ اور گروہ کی حیثیت تو ہماری ہے، حمایت و مدافعت کا ذریعہ تو ہم بنیں گے، دوسروں پر دھاک تو ہمارے بل بوتے پر بیٹھے گی لیکن ہمارے باپ کا حال یہ ہے کہ اس کو محبت یوسف اور اس کے بھائی بنیامین سے ہے۔ اس سے بڑی غلطی اور گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے۔

اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ (۹)

لفظ صالح کا لغوی مفہوم

لفظ 'صالح' یہاں ٹھیک اپنے لغوی مفہوم میں ہے۔ عربی میں اگر کہیں صَلَحَتْ حَالُ فُلَانٍ تو اس کے معنی ہوں گے، اس کا حال بالکل ٹھیک ہو گیا، اس کی پریشانی دور ہو گئی، جو کانٹا اسے چبھ رہا تھا اس سے وہ نجات پا گیا۔

برادران یوسف کی مشورت

یہ وہ علاج ہے جو حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے اپنی پریشانی دور کرنے کے لیے سوچا۔ انھوں نے اسکیم یہ بنائی کہ یوسف کو یا تو قتل کر دیں یا کہیں دور دراز مقام میں لے جا کر پھینک دیں تاکہ ان کے باپ کی ساری توجہ انہی کی طرف ہو جائے اور یہ کانٹا جو انھیں چبھ رہا ہے نکل جائے۔

بعض لوگوں نے 'وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ' کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس جرم کے کر لینے کے بعد پھر نیک بن جانا لیکن یہ معنی اس جملہ کے کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر جملہ کی نحوی ترکیب ہی اس سے ابا کر رہی ہے ظاہر ہے کہ اس کا عطف سابق جواب امر پر ہے اس وجہ سے جو حکم اس کا ہوگا وہی حکم اس کا بھی ہوگا۔

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی اس مشورت سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ان کو اصلی کد حضرت یوسفؑ ہی سے تھی اور اس کدکی اصل وجہ صرف ان کے سوتیلے ہونے کو نہیں تھا بلکہ ان کی ان اعلیٰ صلاحیتوں کو تھا جو اسی عمر سے ان میں ابھرنے لگی تھیں اور جن کو دیکھ کر حضرت یعقوبؑ ان سے غیر معمولی طور پر محبت کرنے لگے تھے۔ اگر مجرد سوتیلے ہونے کے سبب سے کد ہوتی تو سوتیلے تو بنیامین بھی تھے آخر ان کو ٹھکانے لگانے کی انھوں نے کوئی اسکیم کیوں نہیں بنائی!

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ (۱۰)

'غَیَابَۃ' کنوئیں کی تہ کو اور 'جُبّ' کچے کنوئیں کو کہتے ہیں۔ صحرائی راستوں میں جن پر سے قافلے گزرتے ہیں اس طرح کے کنوئیں ہوتے تھے جو عام حالات میں تو یوں ہی پڑے رہتے لیکن کوئی قافلہ گزرتا تو ان پر رونق ہو جاتی۔ دس بھائیوں میں سے ایک کے دل میں معلوم ہوتا ہے حضرت یوسفؑ کے لیے کوئی نرم گوشہ تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو یہ کرو کہ قافلوں کے راستے کے کسی کنوئیں میں اس کو ڈال دو۔ کوئی قافلہ گزرے گا اس کو نکال لے گا۔ چونکہ اس زمانہ میں بردہ فروشی کا عام رواج تھا اس وجہ سے ممکن ہے یہ خیال بھی ہوا ہو کہ قافلے والے یا تو اس کو غلام بنا لیں گے یا کسی شہر میں لے جا کر اس کو بیچ دیں گے۔ اس طرح اس کی جان بھی بچ جائے گی اور تمھارے پہلو کا کانٹا بھی نکل جائے گا۔ بالآخر اسی مشورے پر سب کا اتفاق رائے ہو گیا۔

قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یَّرْتَعْ وَیَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۱-۱۲)

حضرت یعقوبؑ کو فریب

'یَرْتَعْ وَیَلْعَبْ' کا لغوی مفہوم تو یہ ہے کہ ذرا چرے چگے اور کھیلے کودے لیکن یہ نہایت خوب صورت تعبیر ہے پکنک منانے کی۔ بدویانہ زندگی میں جی بہلانے کے جو طریقے بہت مقبول و محبوب رہے ہیں ان میں پکنک کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ شعرائے جاہلیت اپنے قصائد میں بڑی دلچسپی سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے بھی مذکورہ بالا رائے پر اتفاق کر لینے کے بعد حضرت یعقوبؑ کو شیشہ میں اتارنے کے لیے ان کو بھی سبز باغ دکھانے کی کوشش کی۔ سب مل کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پہلے تو اپنا اعتماد جمانے کے لیے یہ کہا کہ کیا بات ہے کہ یوسفؑ کے معاملے میں آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ ہم تو اس کے بڑے ہی خیر خواہ اور محبت کرنے والے ہیں۔ پھر ان کے سامنے اپنا پکنک کا پروگرام پیش کیا کہ کل ہم نے تفریح کا پروگرام بنایا ہے اور ہماری دلی آرزو ہے کہ یوسفؑ بھی اس پروگرام میں شریک ہو، ذرا پھل پھلاری کھائے گا، ہمارے ساتھ کھیلے کودے گا اور آپ پوری طرح مطمئن رہیں کہ کسی بات کا اندیشہ نہیں ہے، اگر کوئی خطرہ ہوا تو ہم سب اس کی حفاظت کے لیے موجود ہیں۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۱۳-۱۴)

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ مجھے غم اور اندیشہ اگر ہے تو اس بات کا ہے کہ تم اس کو لے جاؤ اور تم اپنے کھیل کود، اپنی دلچسپیوں میں مصروف ہو جاؤ اور تمھاری غفلت میں اس کو کوئی بھیڑیا کھا جائے۔ معلوم ہوتا ہے اس علاقے میں بھیڑیوں کی کثرت تھی اور آدمیوں پر ان کے حملوں کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس اندیشے کو سن کر شہ تاڑ کے انھوں نے جواب دیا کہ ہماری پوری پارٹی کی موجودگی میں اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا تو ہم سے بڑھ کر بدقسمت اور نامراد کون ہوگا ـــــ معلوم ہوتا ہے حضرت یعقوبؑ نے ان کی اس یقین دہانی کے بعد طوعاً وکرہاً ہی سہی، حضرت یوسفؑ کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی اور ان کی سازش کا پہلا مرحلہ کامیابی سے طے ہو گیا۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَن يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُم بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ۝ قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِندَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۖ وَمَا أَنتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ (۱۵-۱۷)

تجویز جس پر عمل ہوا

ان آیات میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ لَمَّا کا جواب قَالُوا يَا أَبَانَا ..... الآیۃ' ہے۔ بات کو سمیٹنے کے لیے بیچ کی کئی باتوں کو لَمَّا ہی کے تحت کر دیا ہے۔ یعنی جب انھوں نے اس کو کنوئیں میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا اور یوسفؑ کو یہ خوش خبری بھی الہام کر دی گئی کہ تم اس آفت سے نجات پاؤ گے اور ایک دن آئے گا کہ تم ان کو ان کی اس کارستانی سے آگاہ کرو گے، اور وہ روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس رات میں آئے، تب انھوں نے یہ کہا کہ ہم تو یوسفؑ کو سامان کے پاس چھوڑ کر دوڑ لگاتے ہوئے دور نکل گئے اور یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔ اس ایجاز کا فائدہ یہ ہوا کہ سرگزشت کے تمام اجزا کی طرف اشارہ بھی ہو گیا اور اصل نقطہ سے مخاطب کی توجہ ہٹنے بھی نہ پائی۔

اب اس کے اجزا پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَن يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ۔ یعنی حضرت یعقوبؑ کو کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لیا اور یوسفؑ کو ساتھ لے گئے اور اس بات پر اتفاق کر لیا کہ اس کو کنوئیں میں ڈال دیں۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس امر میں اختلاف اگرچہ آخر تک موجود رہا کہ یوسفؑ کو قتل کریں یا کنوئیں میں ڈالیں لیکن بالآخر کنوئیں والی تجویز ہی پر سب کا اتفاق اور اسی پر عمل ہوا۔

حضرت یوسفؑ کو بشارت

وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُم بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ یہاں 'وحی' سے مراد اصطلاحی وحی نہیں ہے بلکہ مراد دل میں بات ڈال دینا ہے۔ صالحین کو ظالموں اور شریروں کے ہاتھوں جب کوئی آزمائش پیش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ جس وقت ظالموں کو ڈھیل دیتا ہے اسی وقت مظلوم کے دل پر بھی غیب سے سکینت و طمانیت، تسلی اور بشارت نازل فرماتا ہے۔ اس کا تجربہ کم و بیش ہر اس شخص کو ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں کوئی تکلیف اٹھانے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ یہ چیز آپ سے آپ دل پر نازل ہوتی ہے اور پھر دل کو اس طرح اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے کہ بڑی سے بڑی مصیبت کی اہمیت بھی پرکاہ کے برابر نہیں رہ جاتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات ڈال دی گئی کہ یہ آزمائش وقتی اور عارضی ہے۔ وہ وقت آئے گا کہ تم

ان لوگوں کو ان کی کارستانی سے آگاہ کرو گے اور تم اس وقت ایسے منصب بلند پر ہوگے کہ یہ گمان بھی نہ کر سکیں گے کہ یہ ان کا وہی بھائی ان سے بات کر رہا ہے جس کو انھوں نے اندھے کنوئیں میں پھینکا تھا۔ اس کی تفصیل آیت ۹۰ کے تحت آئے گی۔

بھائیوں کی سخن سازی

'وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ'۔ یعنی یہ کارستانی انجام دے کر کچھ رات گئے منہ بسورتے اور آنسو بہاتے باپ کے پاس آئے۔ کچھ رات گئے آنے میں ممکن ہے یہ مصلحت مدنظر رہی ہو کہ اگر باپ کے دل میں تلاش و تحقیق کا کوئی خیال پیدا ہو تو اس کا بھی کوئی امکان باقی نہ رہے۔

'قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ' یہ وہ اصل بات ہے جو انھوں نے اپنی صفائی میں پیش کی۔ 'اِسْتِبَاق' کے معنی دوڑنے، جھپٹنے اور ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے ہیں۔ اسی سورہ میں آگے 'وَاسْتَبَقَا الْبَابَ' آیا ہے یعنی وہ دونوں دروازے کی طرف جھپٹے۔ ان لوگوں نے اپنے لیے عذر تلاش کرنے میں کچھ زیادہ ذہانت کا ثبوت نہیں دیا۔ حضرت یعقوبؑ نے ان کے سامنے بھیڑیے کا جو اندیشہ ظاہر کیا تھا اسی سے انھوں نے بات بنالی کہ باپ کے ذہن میں بھیڑیے کا اندیشہ تو موجود ہی ہے تو کیوں نہ اس کی آڑ میں پناہ لی جائے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت یعقوبؑ ہی کی بات دہرا دی کہ ہم تو یوسفؑ کو سامان کے پاس چھوڑ کر دوڑ لگاتے ہوئے دور نکل گئے اور پھر بھیڑیا آیا اور یوسفؑ کو کھا گیا۔ یہ بات کہنے کو تو انھوں نے کہہ دی لیکن وہ خود بھی مطمئن نہیں تھے کہ حضرت یعقوبؑ ان کی بات باور کرلیں گے۔ چنانچہ ان کے دل کا چور ان کی زبان پر بھی آگیا اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ گزرے کہ 'وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ'۔ آپ ہماری بات ماننے والے تو ہیں نہیں اگرچہ ہم سچے ہی کیوں نہ ہوں۔

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ۭ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ (۱۸)

'سولت لہ نفسہ کذا، ای زینتہ لہ وسھلتہ لہ وھونتہ'۔ شیطان نے اس کی نگاہ میں فلاں بات کھبا دی اور آسان کر دی۔

'صبر جمیل' کا مفہوم

'فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ' مبتدا بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ نکرہ موصوفہ میں مبتدا بننے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور مبتدائے محذوف کی خبر بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے مبتدا مان کر ترجمہ کیا ہے اور خبر محذوف کو ترجمہ میں کھول دیا ہے۔ ایسے مواقع میں خبر کے محذوف ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بالکل واضح ہوتی ہے اور اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ساری توجہ اصل نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ 'صَبْرٌ جَمِيْلٌ' سے مراد وہ صبر ہے جو ہر قسم کے جزع فزع، گلے شکوے اور نوحہ و ماتم سے پاک ہو۔ اگر قرآن اور تورات کا فرق دیکھنا ہو تو صرف یہی ایک مقام تورات میں دیکھ لیجیے۔ قرآن تو ان کے صبر جمیل کی تعریف کرتا ہے اور تورات میں ہے کہ 'تب یعقوب نے اپنے کپڑے پھاڑے اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹا اور بہت دنوں تک اپنے بیٹے کا غم کیا'۔ پیدائش ۳۷: ۳۴

حضرت یعقوبؑ کو اپنی بات باور کرانے کے لیے ان لوگوں نے یہ تدبیر کی کہ حضرت یوسفؑ کے قمیص پر کسی چیز

کے خون کے دھبے بھی ڈال لائے لیکن حضرت یعقوبؑ نے ایک لمحہ کے لیے بھی ان کی بات باور نہیں کی۔ سنتے ہی فرمایا کہ یہ سب تمہارا من گھڑت قصہ ہے تو صبر جمیل کی توفیق ملے اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اللہ ہی مدد فرمائے تو اس کا عقدہ کھلے۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ (۱۹)

'وارد' کا مفہوم

'وارد' کے اصل معنی تو کسی گھاٹ یا چشمہ پر اترنے والے کے ہیں۔ عرب میں قافلے والے یوں کرتے کہ جس کنوئیں میں اترنا ہوتا ذرا پہلے اپنا ایک آدمی اس پر بھیج دیتے کہ وہ پانی وغیرہ کا انتظام کر رکھے۔ یہاں وارد سے وہی مراد ہے۔

خدائے کارساز کی کارسازی

برادرانِ یوسفؑ تو ان کو کنوئیں میں ڈال کر گھر کو سدھارے۔ ادھر رب کریم و کارساز نے یہ انتظام فرمایا کہ ایک قافلہ آنکلا اور اس نے اپنے پانی کے منتظم کو کنوئیں پر بھیجا۔ اس نے ڈول ڈالا تو دیکھتا ہے کہ کنوئیں میں ایک لڑکا ہے۔ وہ خوشی سے چلایا کہ خوش خبری ہو، اس میں تو ایک لڑکا ہے! اس دور میں بردہ فروشی کا رواج عام تھا انھوں نے سوچا کہ چلو ایک نفع کی چیز مل گئی، کہیں بیچ لیں گے اور اس خیال سے کہ کہیں واہنے بائیں کوئی مدعی نہ اٹھ کھڑا ہو اس واقعہ کو انھوں نے راز میں رکھنے کی کوشش کی، اس کی تشہیر نہیں ہونے دی۔ 'وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ' اور اللہ کو خوب پتہ تھا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔ وہ تو اپنی اسکیم پوری کر رہے تھے اور اللہ اپنی اسکیم پوری کر رہا تھا۔ انھیں تو ایک غلام ملا تھا، خوش تھے کہ اس کو بیچ کر کچھ پیسے حاصل کر لیں گے اور اللہ نے یہ چاہا کہ یوسفؑ کی یہ غلامی مصر کی بادشاہی کی تمہید ثابت ہو۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۚ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ (۲۰)

'بخس' اور 'زھد' کا مفہوم

'شَرٰی یَشْرِی' خریدنے اور بیچنے دونوں معنی میں آتا ہے۔ یہاں یہ اپنے دوسرے معنی میں آیا ہے 'بَخْس' کے معنی ناقص اور حقیر کے ہیں۔ 'زَھَدَ فِی الشَّیْءِ' ، 'رَغِبَ عَنْهُ وَ تَرَکَهٗ' یعنی وہ فلاں چیز سے بے رغبت ہو گیا، اس کو چھوڑ بیٹھا۔ تارکِ دنیا کو 'زاہد' اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دنیا اور اسبابِ دنیا سے بے رغبت و بے نیاز ہو جاتا ہے۔

حضرت یوسفؑ کی فروخت

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے مصر پہنچتے ہی اس کو نہایت حقیر قیمت، گنتی کے چند درہم کے عوض بیچ دیا۔ انھوں نے حضرت یوسفؑ کے حاصل کرنے پر کچھ دام تو خرچ نہیں کیے تھے کہ اپنے دام وصول کرنے اور اس پر کچھ مزید نفع حاصل کرنے کی فکر ہوتی۔ ایک چیز مفت ہاتھ آئی تھی وہ جس قیمت پر بھی بک گئی ان کے لیے نفع ہی نفع تھی۔ چنانچہ انھوں نے غالباً خریدار اول ہی کے ہاتھ، جو قیمت بھی اس کی زبان سے نکل گئی، اسی قیمت پر ان کو فروخت کر دیا۔ انھیں کیا پتہ تھا کہ وہ جس لڑکے کو بیچ رہے ہیں وہ خانوادۂ یعقوبی کا چشم و چراغ اور خدا کا پیغمبر ہے اور بہت جلد مصر کی پوری مملکت اس کے انگوٹھے کے نیچے آنے والی ہے۔ جب وہ ان باتوں میں سے کسی بات سے واقف ہی نہیں تھے تو ان کو بے پروا تو ہونا ہی تھا۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِن مِّصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۚ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۲۱)

ایک نحوی اشکال کی وضاحت

اس آیت میں ایک نحوی اشکال ہے وہ یہ کہ 'وَلِنُعَلِّمَهُ' کا معطوف علیہ موجود نہیں ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ کبھی معطوف علیہ کو غایت وضاحت کی وجہ سے حذف کر دیتے ہیں، اس کو قرینہ سے سمجھ لیتے ہیں اور اگر ترتیب مقتضی ہو تو وہ پوری بات وہاں محذوف مانی جا سکتی ہے جس سے موجود خلا بھر سکے۔ یہاں ہمارے نزدیک 'وَلِنُعَلِّمَهُ' سے پہلے 'لِنُجْتَبِيَهُ' محذوف ہے اور حرف عطف 'و' اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے یعنی پوری بات یوں ہے کہ اس طرح ہم نے یوسف کے لیے ملک میں زمین ہموار کی تاکہ ہم اس کو اپنے کام کے لیے برگزیدہ کریں اور تاکہ ہم اس کو باتوں کی تاویل و تعبیر سکھائیں۔

حضرت یوسفؑ کی زندگی کا ایک نیا موڑ

اب یہاں سے حضرت یوسفؑ کی زندگی ایک نیا موڑ مڑتی ہے۔ اہل مصر میں سے جس نے ان کو خرید اآیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکومت کا ایک معزز عہدہ دار غالباً شاہی باڈی گارڈ کا اعلیٰ افسر اور طبیعت کا نہایت شریف آدمی تھا۔ تورات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حضرت یوسفؑ کو دیکھتے ہی تاڑ لیا تھا کہ یہ کسی نہایت اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ہے جس کو یہ بیچنے والے کہیں سے پکڑ لائے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی کو ہدایت کی کہ اس کو غلام کی طرح نہیں بلکہ خاطر و مدارات سے رکھنا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت تک اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی اس وجہ سے اس نے سوچا ہو کہ اگر ہمارے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو ہم اس کو متبنیٰ کر لیں گے۔ اس طرح اس نے حضرت یوسفؑ کو اپنے پورے گھر کا، جیسا کہ تورات سے واضح ہوتا ہے، مالک و مختار بنا دیا۔

حضرت یوسفؑ کا نبوت کے لیے انتخاب

'وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ' یعنی اس طرح ہم نے یوسف کے لیے مصر میں زمین ہموار کی تاکہ جس کار نبوت کے لیے ہم اس کو منتخب کرنا چاہتے تھے اس کو منتخب کریں اور اس کو باتوں اور خوابوں کی وہ تاویل و تعبیر سکھائیں جو اس کے لیے بالآخر، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی، عملاً مصر کی بادشاہی کے لیے زمین ہموار کر دے۔

قریش کو تنبیہ

'وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ'۔ اوپر جتنی سرگزشت بیان ہوئی ہے یہ اس کا خلاصہ ہے کہ خدا کے ارادے اور اس کی اسکیمیں اسی طرح بروئے کار آتی ہیں لیکن جن لوگوں کی نظر صرف ظاہر پر ہوتی ہے وہ اس کو نہیں جانتے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ ساری سرگزشت قریش کو سنائی جا رہی ہے اور اس آخری فقرے میں انہی کی آنکھوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس سرگزشت میں اپنا مستقبل بھی دیکھ لیں اور اس پیغمبر کا مستقبل بھی دیکھ لیں جس کے خلاف وہ رات دن طرح طرح کی سازشوں میں مصروف ہیں۔

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۲۲)

حضرت یوسفؑ پر انعامِ الٰہی

یہ وہ انعام ہے جو اللہ تعالیٰ نے بعد میں حضرت یوسفؑ پر فرمایا اور جس کی طرف، اوپر والی آیت میں اشارہ

ہے۔ فرمایا کہ جب وہ عمر کی پختگی کو پہنچا ہم نے اس کو حکم اور علم سے نوازا اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ لفظ 'اشد' جوانی کے لیے بھی آتا ہے اور پختہ سن و سال کے لیے بھی آتا ہے مثلاً حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (یہاں تک کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا اور چالیس سال کا ہوا) حکم اور علم یہاں نبوت کی تعبیر ہے۔ 'حکم' سے مراد قوتِ فیصلہ بھی ہے اور حکومت بھی اور یہ دونوں ہی چیزیں حضرت یوسفؑ کو عطا ہوئیں۔ 'علم' سے مراد وہ علم ہے جو حضرات انبیاء کو وحی کے ذریعہ سے عطا ہوتا ہے۔ آخر میں یہ واضح فرمایا کہ یہ انعام جو یوسفؑ پر ہوا تو اس لیے ہوا کہ وہ خوب کار تھے۔ انھوں نے خدا کے حقوق و فرائض کو پہچانا اور ہر امتحان میں پورے اترے تو خدا نے ان کو اپنی نبوت کے لیے انتخاب فرمایا۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۳-۳۴

حضرت یوسفؑ کی آزمائش کا دوسرا مرحلہ

آزمائش کا پہلا مرحلہ ختم ہوا تو ساتھ ہی دوسرا مرحلہ شروع ہو گیا۔ پہلا مرحلہ بھائیوں کے حسد اور ان کی نفرت اور عداوت کا تھا جس کے نتیجہ میں انھیں ایک اندھے کنوئیں میں پھینکا گیا۔ یہ دوسرا مرحلہ عزیز مصر کی بیوی کی طرف سے عشق و محبت کی شکل میں نمودار ہوا جس کے نتیجہ میں حضرت یوسفؑ کو بے قصور جیل میں ڈالا گیا۔ لیکن جس طرح وہ پہلے امتحان میں کامیاب رہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس دوسرے امتحان میں بھی ان کو نہایت شاندار کامیابی بخشی ـــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۳-۳۴

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ
هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ
كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا
الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا
سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا
اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَ
شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ
فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ

دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٧﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ
مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿٢٨﴾ يُوْسُفُ
اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ
ع ٣ ١٣ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿٢٩﴾ وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ
فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٠﴾
فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ
كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ
اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ
اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿٣١﴾ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ
وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ
لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿٣٢﴾ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ
اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ
اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٣٣﴾ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ
كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٤﴾

ترجمۂ آیات ٢٣-٣٤

اور جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی اور اس نے دروازے بند کر لیے اور بولی کہ بس آ جاؤ۔ اس نے کہا معاذ اللہ! وہ میرا آقا ہے اس نے مجھے خاطر سے رکھا ہے حق تلفی کرنے والے ہرگز فلاح نہیں پاتے۔ اور عورت نے تو اس کا قصد کر ہی لیا تھا وہ بھی اس کا قصد کر لیتا اگر اس نے اپنے رب کی واضح نشانی نہ دیکھ لی ہوتی۔ ہم نے ایسا ہی کیا تاکہ ہم اس سے برائی

اور بے حیائی کو دور رکھیں بے شک وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھا (۲۲-۲۴)

اور وہ دونوں دروازے کی طرف جھپٹے اور اس نے یوسف کا کرتا پیچھے سے پھاڑ دیا اور دونوں نے اس کے شوہر کو دروازے پر پایا۔ وہ بولی کہ جو تیری بیوی کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ قید خانہ میں ڈالا جائے یا دردناک تکلیف بھگتے۔ اس نے کہا اسی نے مجھے پھسلانے کی کوشش کی اور عورت کے خاندان والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر اس کا کرتا آگے سے پھٹا ہوا ہو تو وہ سچی ہے اور وہ جھوٹا ہے اور اگر اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہو تو وہ جھوٹی اور یہ سچا ہے۔ تو جب اس نے اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا تو بول اٹھا کہ بے شک یہ تمہاری ہی چرتر ہے اور تمہارے چرتر بڑے ہی فتنہ ہوتے ہیں۔ یوسف اس کو چھوڑو اور تو اپنے گناہ کی معافی مانگ، بے شک تو ہی خطاوار ہے۔ ۲۵-۲۹

اور شہر میں کچھ عورتوں نے کہا کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ اس کے عشق میں دیوانی ہو گئی ہے۔ ہم تو اس کو کھلی حماقت میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ تو جب اس نے ان کے چرتر کا حال سنا تو اس نے انھیں بلا بھیجا اور ان کے لیے نشست گاہ آراستہ کی اور ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک چھری دی اور یوسف سے کہا کہ تم ان کے سامنے آؤ تو جب انھوں نے اس کو دیکھا اس کی عظمت سے مبہوت رہ گئیں اور انھوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے اور بولیں کہ حاشا للہ یہ آدمی نہیں۔ یہ تو کوئی فرشتہ یزدانی ہے۔ وہ بولی کہ یہی ہے وہ جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کر رہی تھیں بیشک میں نے اس پر ڈورے ڈالے لیکن یہ بچ رہا اگر اس نے وہ نہ کیا جو میں اسے کہہ رہی ہوں تو وہ ضرور قید کیا جائے گا اور ذلیل ہوگا۔ اس نے دعا کی اے میرے رب! قید خانہ مجھے اس چیز کے مقابل میں زیادہ محبوب ہے جس کی یہ مجھے دعوت دے رہی ہیں اور اگر تو نے ان کے چرتر کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کی طرف

مائل اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔ تو اس کے رب نے اس کی دعا قبول فرمائی اور ان کے چرتر کو اس سے دفع کر دیا۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۰-۳۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ
اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۚ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۳)

'مراودۃ' کا مفہوم

'رَاوَدَتْهُ عَنْ نَّفْسِهٖ' کے معنی ہیں چھل فریب کے ذریعہ سے اس نے اس کو بدکاری کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔

'ھیت لک' کا مفہوم

'هَيْتَ لَكَ' کے معنی ہیں 'هَلُمَّ لَكَ وَتَعَالَ' یعنی آ جاؤ۔

لفظ 'رب' کا مفہوم

'اِنَّهٗ رَبِّيْ' لفظ 'رب' یہاں اپنے عام لغوی مفہوم یعنی آقا اور مالک کے معنی میں ہے۔ آگے آیات ۴۱-۴۲ میں بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا (رہا تم میں سے ایک تو وہ اپنے آقا کو شراب پلائے گا) اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ (اپنے آقا کے پاس میرا ذکر کیجیو)۔

حضرت یوسفؑ کے لیے دام ہوس

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ یہاں سے حضرت یوسفؑ کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب تک وہ نفرت اور حسد کے شکار رہے، اس سے جان چھوٹی تو عشق و ہوس نے ان پر اپنے دام پھینکنے کی کوشش شروع کی اور یہ امتحان پہلے امتحان سے بھی کہیں زیادہ سخت ثابت ہوا۔ مصریوں میں سے جس نے ان کو خریدا تھا اس کی بیوی ان پر مرنے لگی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن اس نے اپنے دروازے بند کر لیے اور بولی کہ بس آ جاؤ۔ حضرت یوسفؑ نے ان کے شوہر کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ میرا آقا ہے اور اس نے مجھے نہایت اچھی طرح رکھا ہے، یہ بڑی بے وفائی اور نمک حرامی ہوگی اگر میں اس کی بیوی کے ساتھ اس طرح کی کوئی حرکت کروں۔ اس صورت میں میں ظالم ٹھہروں گا اور ظالم کبھی فلاح نہیں پائیں گے۔ حضرت یوسفؑ کے اس فقرے پر غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بڑی نفسیاتی بلاغت ہے۔ جذبات سے اندھی اور خدا اور آخرت سے ایک بے خبر عورت کے سامنے خدا اور آخرت کا وعظ ظاہر ہے کہ بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔ اس کے ہیجان کو اگر کچھ ٹھنڈا کیا جا سکتا تھا تو اسی فقرے سے کیا جا سکتا تھا جو حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔ اس میں اگر شرافت کی رمق بھی ہوتی تو وہ ضرور سوچتی کہ ایک یہ نوجوان ہے جو اپنے آقا کی معمولی سی مہربانی سے اتنا متاثر ہے اور اس کی آقائی کا اس کو اتنا اہتمام لحاظ ہے کہ میری بے محابا دعوت کے باوجود اس کے ساتھ کوئی بے وفائی کرنا اپنی دنیا اور عاقبت دونوں کی بربادی تصور کرتا ہے اور ایک میں ہوں کہ اس کی بیوی ہوں، میں نے اپنے آپ کو اس کی زوجیت میں دیا ہے، اپنی عصمت

کا اس کو مالک بنایا ہے، اس کے گھر کی ملکہ بنی بیٹھی ہوں، اس کے مال پر مالکانہ تصرف ہوں لیکن اس کے ساتھ وفاداری کا یہ حال ہے کہ اس کے زر خرید غلام کو اس طرح ہوس سے اندھی ہو کر دعوت عشق دے رہی ہوں۔

'اِنَّهٗ رَبِّیْ' میں ضمیر منصوب کا مرجع

بعض لوگوں نے 'اِنَّهٗ رَبِّیْ' میں ضمیر منصوب کا مرجع خدا کو مانا ہے لیکن یہ محض تکلف ہے۔ سیاق و سباق اس سے ابا کر رہا ہے۔ عربی میں رب المال، رب البیت اور رب الدار وغیرہ کی ترکیبیں موجود ہیں اور اوپر آپ نے دیکھا کہ خود حضرت یوسفؑ نے آقا کے لیے لفظ 'رب' کا استعمال فرمایا ہے۔ کتنے الفاظ زبان میں ایسے ہیں جو خدا کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور بندوں کے لیے بھی لیکن دونوں شکلوں میں ان کے مفہوم بالکل الگ الگ ہوتے ہیں۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۲۴)

'برہانِ رب' کا مفہوم

'برہانِ رب' سے مراد وہ نورِ یزدانی ہے جو اللہ تعالیٰ ہر انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرماتا ہے۔ جو خیر و شر میں امتیاز کا ذریعہ بھی ہے اور جو خیر پر ابھارتا بھی ہے اور برائی سے روکتا بھی ہے۔ یہ نور اللہ تعالیٰ بخشتا تو ہر ایک کو ہے لیکن سنت الٰہی یہ ہے کہ جو اس کی قدر کرتے اور اس کی رہنمائی قبول کرتے ہیں ان کے اندر تو یہ برابر قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ نہایت سخت آزمائش کے مواقع پر بھی وہ انسان کو نفس اور شیطان کے فتنوں میں مبتلا ہونے سے بچا لیتا ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے بلکہ برابر اس کی رہنمائی کو ٹھکراتے ہی رہتے ہیں ان کے اندر یہ آہستہ آہستہ، ضعیف ہوتے ہوتے بالکل بجھ جاتا ہے اور ان پر وہ سیاہی چھا جاتی ہے جو ان کو بصیرت سے بالکل ہی محروم اور اخلاقی اعتبار سے بالکل ہی اندھا بہرا بنا کر چھوڑ دیتی ہے۔ قرآن میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (ہرگز نہیں ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی سیاہی چھا گئی ہے)

باطن کا نورِ یزدانی

حضرت یوسفؑ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اس نور کی قدر کی۔ اس کا صلہ ان کو یہ ملا کہ اس نازک موقع پر جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے، اس نور نے ان کو نفس اور شیطان کی تاریکی میں گھر جانے سے بچا لیا۔ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ جہاں تک عورت کا تعلق ہے وہ تو بالکل اندھی بہری ہو کر پیچھے پڑ گئی تھی۔ حضرت یوسفؑ بھی اس وقت آخر جوان تھے۔ غالباً ۱۸، ۲۰ سال کی عمر ہوگی، کیا عجب تھا کہ ان کے قدم بھی لڑکھڑا جاتے۔ لیکن نہیں۔ ان کے اندر وہ نورِ یزدانی موجود تھا جس کی رہنمائی کو انھوں نے کبھی ٹھکرایا نہیں تھا۔ وہ اس موقع پر ان کے باطن میں چمکا اور دفعۃً آنکھوں کے سامنے سے ساری ظلمت کافور ہو گئی۔ فرمایا كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۔ یعنی چونکہ وہ ہمارے منتخب اور برگزیدہ بندوں میں سے تھا جس کو ہم نے اپنے کار خاص کے لیے منتخب کیا تھا اس وجہ سے ہم نے اس نازک موقع پر اپنی برہان سے اس کی رہنمائی فرمائی تاکہ اس کو برائی اور بے حیائی سے محفوظ رکھیں۔ 'برہان' واضح دلیل اور

مسکت حجت کو کہتے ہیں۔ اس دلیل سے زیادہ واضح اور مسکت دلیل اور کون ہو سکتی ہے جو خود اپنے باطن سے اذان دے!

عصمت انبیاء کے بعض پہلو

اس آیت سے عصمت انبیاء کے بعض پہلو بھی روشن ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو بعثت سے قبل بھی گناہوں کی آلودگی سے محفوظ رکھتا ہے۔ دوسرا یہ کہ نبی کے معصوم ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ کرنے کی قوت و صلاحیت سلب کر لی جاتی ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ برابر اپنے نور فطرت کی نگرانی کرتے ہیں اس وجہ سے بالتدریج وہ اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ سخت سے سخت آزمائش کے مواقع میں بھی وہ ان کو راہ سے بے راہ نہیں ہونے دیتا۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَّأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۚ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوْٓءًا إِلَّآ أَنْ يُّسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ (۲۵)

عورت کا فریب

'استباق' کے معنی ہیں دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرنا۔

حضرت یوسفؑ نے جب دیکھا کہ اس فتنہ سے جان بچانے کی کوئی شکل باقی نہیں رہی ہے تو وہ دروازے کی طرف جھپٹے کہ کھول کر باہر نکل جائیں پیچھے سے عورت نے تعاقب۔ ان کو تو پکڑ نہ سکی البتہ ان کا کرتہ اس کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کو جو زور سے اس نے کھینچا تو وہ پھٹ گیا اور ساتھ ہی یہ سانحہ پیش آیا کہ دروازہ جو کھلا تو دیکھا کہ شوہر دروازے سے لگا کھڑا ہے۔ اس کو دیکھتے ہی سارا نشۂ عشق ہرن ہو گیا۔ جھٹ بولی کہ تمہاری بیوی کے ساتھ جو برائی کا ارادہ کرے یا تو وہ جیل بھیجے جانے کا مستحق ہے یا یہ کہ اس کو کوئی دردناک سزا دی جائے۔ اس طرح اس نے شوہر کی نظروں میں اپنے کو بری اور حضرت یوسفؑ کو مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ۚ إِنْ كَانَ قَمِيْصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ وَإِنْ كَانَ قَمِيْصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ فَلَمَّا رَأٰ قَمِيْصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۖ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ (۲۶-۲۸)

قرآن کی شہادت

جب اس نے حضرت یوسفؑ کو متہم کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے مختصر الفاظ میں اصل حقیقت ظاہر کر دی کہ اس میں میرا قصور نہیں ہے بلکہ یہی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی خبر خاندان میں بھی پھیل گئی اور یہ بھی لوگوں کو علم ہو گیا کہ اس کشمکش میں یوسفؑ کا کرتا پھٹ گیا ہے۔ گویا ایک مقدمہ بن گیا۔ عورت کا بیان کچھ، یوسفؑ کا بیان کچھ۔ اب جھوٹا کون ہے اور سچا کون؟ اس کا فیصلہ کرنے میں اگر حالات و قرائن میں سے کوئی چیز مددگار ہو سکتی تھی تو کرتا پھٹنے کا واقعہ تھا۔ عورت کے خاندان کے لوگوں میں سے ایک شخص نے، جو غالباً خاندان کے بڑوں بوڑھوں میں سے رہا ہوگا، یہ رائے دی کہ اگر کرتا آگے سے پھٹا ہو تب تو عورت سچی ہے یوسف جھوٹے ہیں اور اگر کرتا پیچھے سے پھٹا ہو تو یوسف سچے ہیں، عورت جھوٹ بولتی ہے۔ یہ بات نہایت معقول تھی اس سے شوہر کو اس پر اطمینان ہو گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ یوسفؑ کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہے تو اس نے عورت کو ڈانٹا کہ یہ سب تمہارا فریب ہے اور تمہارا فریب بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے۔ 'مِنْ كَيْدِكُنَّ' میں جمع کی ضمیر مرد کے غصہ کی

تیزی اور شدت کو ظاہر کرتی ہے۔ گویا اس کے اس فعل نے تنہا اس کو نہیں بلکہ اس کی پوری جنس کو اس کی نگاہوں میں کینا و اور مبغوض بنا دیا۔

یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ ۚۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕیْنَ (۲۹)

بیوی کو شوہر کی ڈانٹ — صحیح صورت حال سامنے آجانے کے بعد اس نے حضرت یوسفؑ کو مخاطب کر کے تو اطمینان دلایا کہ تم اس کی بکواس کی کوئی پروا نہ کرو، اس سے اعراض کرو۔ اور خود بیوی کو خطاب کر کے ڈانٹا کہ تو ہی خطاوار ہے اس وجہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہ۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ توبہ اور استغفار کو مشرکانہ ادیان میں بھی ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے یہ الگ بات ہے کہ ان کا استغفار اپنے دیوتاؤں کے سامنے ہوتا ہے جن کی کوئی حقیقت نہیں۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۰)

عزیز کا مفہوم — 'عزیز' کے معنی غالب اور مقتدر کے ہیں، یہ لفظ بادشاہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اونچے درجہ کے با اختیار و با اقتدار افسروں اور عہدہ داروں کے لیے بھی۔ چونکہ یہ شخص شاہی باڈی گارڈ کا افسر اعلیٰ تھا اس وجہ سے عورتوں نے اس کے لیے 'عزیز' کا لفظ استعمال کیا۔

شہر کی عورتوں میں چرچا — حضرت یوسفؑ کے ساتھ عزیز کی بیوی کے اس عشق کا چرچا آہستہ آہستہ افسانۂ بزم و انجمن بن گیا۔ شہر کی کچھ عورتوں نے، جو ہو سکتا ہے اسی طبقہ کی رہی ہوں جس طبقہ کی عزیز کی بیوی تھی، یہ کہنا شروع کیا کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کے عشق میں دیوانی ہو رہی ہے، اس پر ڈورے ڈال رہی ہے لیکن کچھ نہیں کر پا رہی ہے، ہم تو اس کو ایک صریح غلطی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ ان کے اس آخری فقرے میں ملامت، شماتت اور ادعا کے بہت سے پہلو مضمر ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اول تو یہی بات بڑی عجیب ہے کہ ایک اعلیٰ عہدہ دار کی بیگم ہو کر اپنے غلام کے پیچھے اپنے کو خوار کرے پھر اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ کہ اس کو بھی رام نہ کر سکے۔ یہیں سے اس ملامت کے اندر یہ مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ عورت احمق ہے کہ بدنام بھی ہوئی اور نامراد بھی رہی، اگر کہیں ہم ہوتے تو ایک ہی غمزے میں یوسف کو ایسی پٹخنی دیتے کہ ان کی پارسائی کی ساری دھوم ختم ہو جاتی۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَیْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّیْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَیْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَیْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؗ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِیْمٌ (۳۱)

'فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ'، یعنی جب عزیز کی بیوی نے سنا کہ ان عورتوں کو اپنی عشوہ طرازیوں، دلربائیوں اور کافرمائیوں پر یہ ناز اور یہ غرہ ہے تو اس کے دل کو بڑی چوٹ لگی اور اس نے یہ چاہا کہ یہ بھی ذرا یوسفؑ پر اپنے ہنر آزما دیکھیں تاکہ انھیں بھی اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ان کی دعوت کا انتظام کیا، ان کے لیے مصر کی اس وقت کی تہذیب کے مطابق گاؤ تکیوں سے نشست گاہ آراستہ کی، اور جب وہ آئیں

تو پھل وغیرہ کھانے کے لیے ان کے ہاتھوں میں چھریاں بھی پکڑا دیں۔ یہ اہتمام کرنے کے بعد اس نے حضرت یوسفؑ سے کہا کہ ذرا ان کے سامنے آجاؤ۔

عورتوں کا فریب اور ان کی ناکامی

فَلَمَّا رَاَیْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِیْمٌ۔ 'اکبار' کے معنی ہیں کسی کو بہت بڑا سمجھنا اور دل میں اس کی عظمت اور بڑائی کا قائل ہو جانا یعنی جب حضرت یوسفؑ سامنے آئے تو ان کی نورانی صورت، ان کی تابناک پیشانی اور ان کا پاکیزہ چہرہ دیکھ کر عورتیں مبہوت رہ گئیں۔ سیرت و اخلاق کی پاکیزگی بجائے خود بڑی ہی دلربا چیز ہے اور جب ایک جوان رعنا کے اندر موجود ہو اور شکلاً بھی خوب صورت ہو تو اس کی دلربائی دوچند ہو جاتی ہے۔ یہی واردات ان عورتوں پر گزری۔ وہ ایک نوجوان غلام کا تصور رکھے کر اس پر اپنے چلتر آزمانے آئی تھیں۔ یہاں انھوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے پاکیزگی اور تقدس کا ایک پیکر قدسی کھڑا ہے۔ یہ دیکھ کر انھیں یہ اندازہ ہو گیا کہ اس فرشتہ صفت پر ان کے سارے تیر و نشتر بیکار رہیں لیکن چونکہ وہ بڑے دعوے اور طنطنے کے ساتھ آئی تھیں اس وجہ سے کچھ نہ کچھ کرنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ قرینہ بتاتا ہے اور شواہد قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ انھوں نے حضرت یوسفؑ کو اپنی باتوں سے کچھ رام کرنے کی کوشش کی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی باتیں ان پر ذرا کارگر نہیں ہو رہی ہیں تو ان کے دل کے اندر اپنے حق میں ہمدردی پیدا کرنے کے لیے خودکشی کی دھمکی بھی دے دی اور ان میں سے بعض نے اس دھمکی کو سچ ثابت کرنے کے لیے ابتدائی اقدام کے طور پر پھل کھانے کی چھریوں سے اپنے ہاتھ زخمی بھی کر لیے تاکہ حضرت یوسفؑ اس کو نری دھمکی ہی نہ سمجھیں بلکہ ڈر جائیں کہ اگر انھوں نے ان کی بات نہ مانی تو ان میں سے بعض ضرور اپنے آپ کو ہلاک کر کے رہیں گی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خودکشی کی دھمکی عورت کے نہایت کارگر ہتھیاروں میں سے ہے۔ جب وہ مرد پر اپنے عشوہ و غمزہ کے ہتھیار کارگر ہوتے نہیں دیکھتی تو آخری حربہ وہ یہی آزماتی ہے۔ ان عورتوں نے بھی یہی کیا۔

یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے، محض ہمارا قیاس نہیں ہے۔ خود اسی سورہ میں آگے اس امر کی تصریح موجود ہے کہ ان عورتوں نے اس موقع پر حضرت یوسفؑ کو بہلانے پھسلانے کی کوشش کی اور اس امر کی بھی تصریح ہے کہ یہ ہاتھوں کو زخمی کر لینے کا معاملہ ان عورتوں کا ایک کید (چال) تھا۔ ملاحظہ ہو۔

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی	پس جب اس کے پاس قاصد آیا اس نے اس کو جواب دیا
رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ	کہ تم اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو
قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ	کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ زخمی
عَلِیْمٌ ۔ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ	کر لیے تھے، بے شک میرا رب ان کی چال سے خوب
رَاوَدْتُّنَّ یُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ	واقف ہے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ تمھارا کیا ماجرا ہوا
(یوسف - ۵۱)	جب کہ یوسف کو تم نے پھسلانے کی کوشش کی۔

خودکشی کی دھمکی بطور حربہ

غور کیجیے اگر واقعہ کی نوعیت یہ ہوتی کہ عورتیں حضرت یوسفؑ کے حسن و جمال سے بے خود ہو کر اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں تو اس میں چال کا کیا پہلو تھا کہ حضرت یوسفؑ اس کو کید سے تعبیر فرماتے؟ اور اگر انھوں نے حضرت یوسفؑ کو اپنے دام میں پھنسانے کی کوئی کوشش نہ کی ہوتی تو ان سے یہ سوال کیوں ہوتا کہ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ (تمھارا کیا ماجرا ہوا جب کہ تم نے یوسف کو پھسلانے کی کوشش کی) ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر عورتوں نے حضرت یوسفؑ کا دل جیتنے کے لیے کچھ باتیں کی تھیں تو قرآن نے ان کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ اس سوال کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ اس قسم کی خرافات سے تعرض قرآن کے شایانِ شان نہیں ہے اس وجہ سے اس نے دو لفظوں میں یہ سارا دفتر سمیٹ دیا کہ انھوں نے حضرت یوسفؑ پر اپنے چلتر آزمائے تو انھیں اندازہ ہو گیا کہ باتوں سے ان کو شیشہ میں اتارنا مشکل ہے۔ بالآخر انھوں نے خودکشی کی دھمکی کی نمائش کی لیکن یہ دھمکی بھی بے اثر ہی رہی۔

کمزوروں کا آخری حربہ

خودکشی کی دھمکی کمزوروں کا آخری حربہ ہے۔ ایک مرتبہ میں بمبئی میں ایک کرم فرما کی دکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں ایک سائل آیا اور دکان کے سامنے سڑک کی پٹڑی پر بیٹھ گیا۔ صاحب دکان نے اس کے سامنے ایک دوفی یا چونی پھینک دی۔ اس نے کہا "سیٹھ پانچ روپے سے کم نہیں لوں گا"۔ سیٹھ صاحب نے اس کی بات کا خیال نہیں کیا۔ وہ بالکل بے پروا مجھ سے باتوں میں مشغول رہے۔ تھوڑی دیر اپنے فضل و کمال کی لاف زنیاں کرنے کے بعد اس نے پھر پانچ روپے کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی سنا دی کہ اگر پانچ روپے نہ دیے گئے تو وہ یہیں جل مرے گا۔ سیٹھ اس کی یہ دھمکی سن کر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بدستور مجھ سے باتوں میں لگے رہے۔ بالآخر میں نے دیکھا کہ اس نے دیا سلائی سے اپنے ایک پائنچہ میں آگ لگا لی اور وہ جلنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے تو پسینہ آنے لگا۔ میں نے چاہا کہ میں اپنے پاس سے اس کا مطالبہ پورا کر کے کسی طرح اس قصہ کو ختم کر دوں لیکن سیٹھ صاحب اس بات پر بھی راضی نہ ہوئے۔ جب اس کا پائنچہ گھٹنے کے قریب تک جل گیا اور اس نے سیٹھ کو پسیجتے نہیں دیکھا تو جلدی جلدی اپنے ہی ہاتھوں سے آگ بجھائی اور وہاں سے چلتا ہوا۔ سیٹھ صاحب نے کہا ہمیں ایسے مکاروں سے روز سابقہ رہتا ہے۔ میں نے کہا یہ سب زنانِ مصر کے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔

'حاش للہ' کا مفہوم

حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ۔ حَاشَ لِلّٰهِ۔ استثنا اور تنزیہ کا کلمہ ہے۔ یہ اس موقع پر بولا جاتا ہے جب اپنے آپ کو یا کسی اور کو کسی الزام سے بری ثابت کرنا ہو۔ مَا هٰذَا بَشَرًا میں 'ما' 'لیس' کے مفہوم میں ہے اس وجہ سے 'بشرًا' منصوب ہے۔ قرآن میں اس کی نظیر موجود ہے۔

بیگمات کا اعتراف

ان بیگمات کا یہ اعتراف حضرت یوسفؑ کی کمال درجہ تعریف بھی ہے اور اپنی شکست کے لیے ایک عذر بھی۔ اس کے اندر یہ مضمون بھی مضمر ہے کہ اگر ہم ان کو جیت نہ سکے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے فن یا ہمارے حسن و جمال میں کوئی نقص تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں مقابلہ ایک معزز فرشتہ سے کرنا پڑا جب کہ ہمارے سارے اسلحہ صرف انسانوں ہی پر کارگر ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَلَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ (۳۲)

زلیخا کی دھمکی

ان عورتوں کی شکست سے زلیخا کے دل سے اپنی شکست کا غم جاتا رہا۔ اس نے بڑے تیکھے انداز میں ان عورتوں سے کہا کہ یہی ہے وہ جس کے بارے میں تم نے مجھے طعن و طنز کا نشانہ بنا لیا تھا۔ اب تو تمھیں اندازہ ہوا کہ اس کو جیتنا کوئی آسان کام نہیں تھا! اس میں شبہ نہیں کہ میں نے اس کا دل مٹھی میں لینے کی پوری کوشش کی لیکن یہ اپنے کو بچا لے گیا۔ لیکن صاف کہے دیتی ہوں کہ اگر اس نے میرا کہا نہ کیا تو لازماً جیل جائے گا اور ذلیل ہوگا۔ مطلب یہ کہ اگر میں محبت سے اسے رام نہ کر سکی تو یہ نہ سمجھے کہ اس کی جان چھوٹ گئی۔ اب جیل کی ہوا کھائے گا اور ذلیل ہوگا۔ یہاں سے حضرت یوسفؑ کی آزمائش ایک نئی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہوس کی محبت اپنی ناکامی کا انتقام لینے پر آمادہ ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں غلاموں پر ان کے آقاؤں کو غیر محدود اختیار حاصل تھے۔ وہ ان سے ناراض ہونے کی صورت میں بے تکلف ان کو جیل بھجوا سکتے تھے۔ پھر یہاں تو معاملہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ دار کی بیگم صاحبہ کا تھا کس کی مجال تھی کہ ان کے ارادے میں مزاحم ہو سکے۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ (۳۳)

حضرت یوسفؑ کی دعا

یہ دھمکی تو زلیخا نے حضرت یوسفؑ کو مرعوب کرنے کے لیے دی تھی کہ اس سے ڈر کر وہ اس کی خواہش پوری کرنے پر آمادہ ہو ہی جائیں گے لیکن حضرت یوسفؑ نے ہوس کے ان پھندوں کے مقابل میں جیل کی بیڑیوں کو غنیمت جانا۔ انھوں نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے کہ پروردگار! ان کی دعوت ہوس کے مقابلے میں یہ جیل مجھے کہیں زیادہ عزیز و محبوب ہے اور ساتھ ہی ناز اور اعتماد کا یہ فقرہ بھی فرما گئے کہ اگر تو نے ان کے ان فتنوں سے اب مجھے نہ بچایا تو میں ان کی طرف مائل اور جذبات سے مغلوب ہو جاؤں گا۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۳۴)

دعا کی قبولیت

حضرت یوسفؑ کی زبان سے یہ دعا اس وقت نکلی ہے جب وہ اپنی پوری طاقت اپنے ایمان و اخلاق کی حفاظت کے لیے نچوڑ چکے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ان بیگمات کی پیدا کی ہوئی پرفتن زندگی کے مقابل میں جیل کی پرمحن زندگی کو قبول کرنے پر راضی ہیں۔ جب بندہ اس حد تک اپنی استقامت دکھا دینے کے بعد اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دیتا ہے اور اس سے مدد مانگتا ہے تو اس کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور فوراً قبول ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ کی دعا بھی قبول ہوئی اور شیطان کے ان نسوانی پھندوں سے انھوں نے نجات پائی۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ خدا سمیع و علیم ہے۔ وہ بندے کی دعائیں اور فریادیں سنتا اور دلوں کے احوال اور اسرار سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔

۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۵-۵۳

حضرت یوسفؑ کی آزمائش کا نیا دور

یہاں سے حضرت یوسفؑ کی آزمائش کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ عزیز پر بھی اور زلیخا کے عزیزوں اور رشتہ داروں پر بھی اصل حقیقت پوری طرح واضح تھی لیکن انھوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ کچھ دنوں کے لیے حضرت یوسفؑ کو جیل بھجوا دیں۔ انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ اس طرح لوگوں کی زبانیں بھی کچھ عرصہ کے بعد بند ہو جائیں گی اور نگاہوں سے دور ہو جانے کے سبب سے زلیخا کا خبط بھی جاتا رہے گا۔ جیل میں حضرت یوسفؑ کے دو ساتھی خواب دیکھتے ہیں۔ وہ خواب کی تعبیر حضرت یوسفؑ سے پوچھتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ اس خواب کی تعبیر بتاتے ہیں جو بالکل صحیح ثابت ہوتی ہے۔ بالآخر یہیں سے ان کے لیے بادشاہ وقت کے ایک خواب کی تعبیر بتانے کی راہ کھلتی ہے جس کے بعد بادشاہ ان کا ایسا گرویدہ ہو جاتا ہے کہ ملک کے تمام سفید و سیاہ کا ان کو مالک بنا دیتا ہے ـــــ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

ع ۱۴ ترجمۂ آیات ۳۵-۵۳

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾
وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ
خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ
الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾
قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ
اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْۤ
اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ
شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ
اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَا

اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا
لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٠﴾ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ
رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ
الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿٤١﴾ وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا
اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ
بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿٤٢﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ ع ٥ ١٥
سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ
اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿٤٣﴾ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ
اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿٤٤﴾ وَقَالَ الَّذِيْ
نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿٤٥﴾
يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ
سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى
النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٦﴾ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا
حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿٤٧﴾
ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ
اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿٤٨﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ
يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿٤٩﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ ع ٦ ١٦

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ
الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ﴿۵۰﴾ قَالَ مَا
خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا
عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ٝ
اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ
اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾
وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ
اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

ترجمۂ آیات ۳۵-۵۳

پھر نشانیاں دیکھ چکنے کے بعد انھیں مصلحت یہی معلوم ہوئی کہ اس کو کچھ مدت کے لیے قید کر دیں۔ اور اس کے ساتھ دو اور جوان بھی جیل خانہ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا کہ میں اپنے کو دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں کھا رہی ہیں۔ آپ ہمیں اس کی تعبیر بتائیے۔ ہم آپ کو خوب کاروں میں سے سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا جو کھانا تمھیں ملتا ہے وہ آئے گا نہیں کہ میں اس کے آنے سے پہلے پہلے تمھیں اس کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ اس علم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے۔ میں نے ان لوگوں کے مذہب کو چھوڑا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے یہی لوگ منکر ہیں۔ اور میں نے اپنے بزرگوں، ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کے مذہب کی پیروی کی۔ ہمیں حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا ہم پر اور لوگوں پر فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکرگزار نہیں ہوتے۔ اے میرے جیل کے

دونوں ساتھیو! کیا الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں، یا اکیلا اللہ ہی سب پر حاوی و غالب؟

تم اس کے سوا نہیں پوجتے ہو مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ اختیار و اقتدار صرف اللہ ہی کا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ یہی دین قیم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۳۹ - ۴۰

اے میرے زندان کے دونوں ساتھیو، تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلانے کی خدمت انجام دے گا۔ رہا دوسرا تو اس کو سولی دی جائے گی پھر پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ اس امر کا فیصلہ ہوا جس کے بارے میں تم پوچھ رہے تھے۔ ۴۱

اور جس کے بارے میں اس نے خیال کیا کہ وہ چھوٹ جانے والا ہے اس سے اس نے کہا کہ اپنے آقا کے پاس میرا ذکر کیجیو۔ تو شیطان نے اس کو اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا پس وہ جیل خانہ میں کئی سال پڑا رہا۔ ۴۲

اور بادشاہ نے کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیں ہیں جنھیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز بالیاں ہیں اور دوسری سات خشک۔ اے دربار یو، میرے رویا کی مجھے تعبیر بتاؤ اگر تم خواب کی تعبیر دیتے ہو۔ وہ بولے یہ خواب پریشان ہیں اور ہم پریشان خوابوں کی تعبیر کے عالم نہیں۔ اور ان دونوں میں سے جو چھوٹ گیا تھا اور ایک مدت کے بعد اسے یاد پڑا، وہ بولا کہ میں آپ لوگوں کو اس کی تعبیر بتاؤں گا، پس مجھے جانے دیجیے۔ ۴۳ - ۴۵

یوسف! اے راست باز! ہمیں سات فربہ گایوں کے بارے میں جنھیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز بالیوں اور دوسری سات خشک بالیوں کے بارے میں تعبیر بتا تا کہ میں

لوگوں کے پاس جاؤں تاکہ وہ بھی جانیں۔ اس نے کہا تم سات سال برابر کاشت کرو گے پس جو فصل کاٹو، اس قلیل مقدار کے سوا جو تم کھاؤ، اس کی بالیوں میں چھوڑ دیا کرو۔ پھر اس کے بعد سات سخت سال آئیں گے جو، بجز اس قلیل مقدار کے جو تم محفوظ کر لو گے اس کو چٹ کر جائیں گے جو تم نے ان کے لیے فراہم کیا ہوگا۔ پھر اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں کی فریاد رسی ہوگی اور لوگ اس میں انگور نچوڑیں گے۔ ۴۶-۴۹

اور بادشاہ نے کہا کہ اس کو میرے پاس لاؤ۔ پس جب قاصد اس کے پاس آیا اس نے کہا کہ تم اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے دریافت کرو کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے تھے؟ بے شک میرا رب ان کے کید سے خوب واقف ہے۔ اس نے پوچھا، تمھارا کیا ماجرا ہے جب تم نے یوسف کو پھسلانے کی کوشش کی؟ وہ بولیں کہ حاشا للہ ہم نے اس پر برائی کا کوئی بھی نقش نہیں پایا۔ عزیز کی بیوی بولی اب حق آشکارا ہوگیا۔ میں نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی۔ اور بے شک وہ راست بازوں میں سے ہے۔ ۵۰-۵۱

یہ اس لیے کہ وہ جان لے کہ میں نے پیٹھ پیچھے اس سے بے وفائی نہیں کی اور بے شک اللہ خائنوں کی چال کو چلنے نہیں دیتا۔ اور میں اپنے نفس کو بری نہیں قرار دیتا۔ نفس تو برائیوں ہی کی راہ سجھانے والا ہے مگر جب میرا رب رحم فرماتے۔ بے شک میرا رب بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے (۵۲-۵۳)

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ (۳۵)

قید و بند کی آزمائش کا دور

'آیات' سے مراد یہاں حضرت یوسفؑ کی براءت و بے گناہی کے دلائل و شواہد ہیں۔ یعنی عزیز اور اس کے رشتہ داروں پر اگرچہ یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ یوسفؑ بالکل بے گناہ ہیں، سارا قصور زلیخا ہی کا ہے لیکن

اپنی ناک بچانے کے لیے انھیں مصلحت اسی میں نظر آئی کہ کچھ عرصہ کے لیے حضرت یوسفؑ کو جیل بھجوا دیں۔ انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ اس طرح کچھ مدت کے بعد زلیخا کے دماغ سے یوسفؑ کا خبط بھی نکل جائے گا اور جو لوگ اس قصہ سے دلچسپی لے رہے ہیں ان کی توجہ بھی ہٹ جائے گی۔ لوگ خیال کریں گے قصور زلیخا کا نہیں بلکہ یوسفؑ ہی کا تھا چنانچہ اسی کو سزا ملی۔ اس زمانے میں مالکوں کو اپنے غلاموں پر جو غیر محدود اختیارات حاصل تھے ان کی موجودگی میں عزیز کے لیے حضرت یوسفؑ کو جیل بھجوا دینے میں اول تو کوئی زحمت رہی نہیں ہوگی اور اگر کچھ رہی بھی ہوگی تو ایک سرکاری عہدہ دار کے لیے، جو شاہی باڈی گارڈ کا افسر تھا، اس قسم کی کسی زحمت کو دور کر لینا کیا مشکل تھا۔ الغرض یہاں سے حضرت یوسفؑ کی آزمائش کا نیا دور شروع ہوگیا۔ یوں عام نگاہ میں تو آزمائش کا اصلی دور یہی ہے لیکن حضرت یوسفؑ کی نگاہ میں چونکہ اصل اہمیت اپنے ایمان و اخلاق کی تھی اس وجہ سے انھوں نے پچھلے دور کے مقابل میں، جیسا کہ آپ نے دیکھا، نہ صرف یہ کہ اس کی تمنا کی بلکہ اس کے لیے دعا بھی کی۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۳۶)

'فَتَيٰنِ' یعنی دو نوجوان۔ قرآن میں یہ تصریح نہیں ہے کہ دو نوجوان کون تھے۔ تورات کی روایت باور کیجیے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک بادشاہ کا ساقی تھا دوسرا نان پز۔

'اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا' عربی زبان میں یہ اسلوب موجود ہے کہ بعض اوقات کسی شے کو اس کی غایت کے اعتبار سے تعبیر کرتے ہیں۔ انگور نچوڑنے کا مقصد اگر اس سے شراب بنانا ہے تو اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں۔

دو قیدی نوجوانوں کے خواب

حضرت یوسفؑ کے ساتھ دو اور نوجوان بھی، جو خاص بادشاہ کے خدمت گار تھے، جیل خانے میں داخل ہوئے۔ ان دونوں نے خواب دیکھے۔ ایک نے یہ دیکھا کہ میں انگور نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے یہ دیکھا کہ میں سر پر روٹیوں کا ٹوکرا لیے ہوئے ہوں اور چڑیاں اس میں سے نوچ نوچ کر کھا رہی ہیں۔ یہ خواب چونکہ عام خوابوں سے بہت مختلف تھے، ان کو ان کی تعبیر معلوم کرنے کی فکر ہوئی۔ اس دوران میں ان کو حضرت یوسفؑ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع مل چکا تھا اور وہ ان کے علم و تقویٰ سے متاثر تھے۔ قدرتی طور پر اس کام کے لیے انھوں نے انھیں سے رجوع کیا اور نہایت ادب سے عرض کی کہ آپ چونکہ ہمیں نہایت خوب کار اور نیک آدمی معلوم ہوتے ہیں اس وجہ سے آپ ہی سے گزارش ہے کہ ہمیں ان خوابوں کی تعبیر بتائیے۔ لفظ 'محسن' یہاں خوب کار کے معنی میں ہے یعنی جس کام کو بھی کرتے ہیں اپنے رب کو حاضر ناظر جانتے ہوئے کرتے ہیں۔

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ۭ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۳۷)

خواب کی تعبیر اور دین کی دعوت

حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ کھانا تقسیم ہونے سے پہلے پہلے میں تم کو ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ جیل بالخصوص

اس زمانے کے جیل کی افسردہ اور یک رنگ زندگی میں کھانے کی تقسیم وغیرہ جیسے ایک آدھ واقعے ہی ایسے ہو سکتے ہیں جو زندگی میں ذرا تغیر کی علامت سمجھے جاتے ہوں گے اس وجہ سے حضرت یوسفؑ نے اسی کا حوالہ دے کر خوابوں کی تعبیر کے معاملے کو کچھ وقت کے لیے ٹال دیا۔ اس کا اثر تعبیر پوچھنے والوں پر تو یہ پڑا ہو گا کہ حضرت یوسفؑ نے ان کے خوابوں کو اہمیت دی ہے، وہ سرسری طور پر الٹی سیدھی کوئی بات بتا کر ان کو ٹالنا نہیں چاہتے بلکہ سوچ کر یا اپنے رب سے رجوع کرنے کے بعد ان کی تعبیر بتائیں گے اور ادھر خود حضرت یوسفؑ نے اس التوا سے اس حق کی تبلیغ کے لیے ایک نہایت اچھا موقع پیدا کر لیا جو ان کی زندگی کا سب سے زیادہ محبوب مقصد بن چکا تھا۔ انھوں نے جب دونوں کو اپنی طرف مائل دیکھا تو صرف ان کی اندھی بہری عقیدت ہی پر قانع نہیں ہو گئے بلکہ چاہا کہ ان کو اللہ کی بندگی کی وہ دعوت پہنچا دیں جو اگر وہ قبول کر لیں تو ان کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں۔ چنانچہ انھوں نے پہلی بات تو یہ فرمائی کہ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ' یہ خوابوں کی تعبیر کا علم ان علموں میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائے ہیں۔ مقصد یہ کہ اگر اس علم کو تم قدر و قیمت کی چیز سمجھتے ہو تو یہ یاد رکھو کہ اس کا منبع اور سرچشمہ میں نہیں ہوں بلکہ میرا رب ہے۔ اس نے مجھے جو علم بخشے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ اِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ یعنی مجھ پر میرے رب کا یہ فضل جو ہوا تو اس وجہ سے ہوا کہ میں نے ان لوگوں کے مذہب کو چھوڑا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے۔ تیسری بات یہ فرمائی هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ' یعنی یہی لوگ ہیں جو آخرت کے منکر ہیں اس لیے کہ جو لوگ سرے سے خدا ہی پر ایمان نہیں رکھتے ان کے آخرت کو ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ جوں ہی حضرت یوسفؑ نے محسوس فرمایا کہ ان نوجوانوں کے دلوں میں کچھ صلاحیت ہے انھوں نے دین کی تمام بنیادی باتوں کی ان کے اندر تخم ریزی کر دی اور ساتھ ہی یہ تاثر بھی ان کو دے دیا کہ اگر یہ راہ اختیار کرنے کا حوصلہ ہے تو اس کے لیے ان لوگوں کی ملت چھوڑنی پڑے گی جو خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

حضرت یوسفؑ کا یہ ارشاد کہ 'میں نے ان لوگوں کی ملت کو چھوڑا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے' اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انھوں نے اپنے باطن میں اچھی طرح تجزیہ اور تنقید کر کے حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا معین کر لیا ہے اور حق کو جو اختیار کیا ہے تو مجرد اس لیے نہیں کہ میراث آبا ہے بلکہ اس لیے کیا ہے کہ وہی اختیار کرنے کی چیز ہے، اسی طرح اگر باطل کو چھوڑا ہے تو اس وجہ سے چھوڑا ہے کہ اس کا باطل ہونا پوری طرح واضح ہو چکا ہے۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (۳۸)

اللہ پر ایمان نہ رکھنے والوں کی ملت کو چھوڑ کر جس ملت کو انھوں نے اختیار فرمایا، یہ اس کا بیان ہے۔ اس پورے سلسلۃ الذہب کی وضاحت اس وجہ سے ضروری تھی کہ مخاطب کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ حضرت یوسفؑ جس ملت کی ان کو دعوت دے رہے ہیں یہ ان کی کوئی نو ایجاد ملت ہے بلکہ ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ وہی ملت ہے جس کو حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام جیسے اکابر و مشاہیر

نے اختیار فرمایا۔ ان اکابر کے نام تمام اطراف و دیار میں پھیلے ہوئے تھے اور عجب نہیں کہ حضرت یوسفؑ کے یہ زندان کے ساتھی بھی ان ناموں سے آشنا رہے ہوں۔

'مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ' ملت توحید کی تاریخی عظمت و اہمیت واضح کرنے کے بعد حضرت یوسفؑ نے اس کی فطری اور عقلی عظمت واضح فرمائی ہے کہ یہ حقیقت تو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ ایک خالق ہے جس نے یہ دنیا بنائی ہے، جس نے ہم کو زندگی بخشی ہے، جو رزق دیتا ہے اور جس کے اختیار میں ہماری زندگی اور موت ہے لیکن اس بات کی ہمارے سامنے کوئی ادنیٰ شہادت بھی موجود نہیں ہے کہ کوئی اور بھی ان کاموں میں اس کا شریک و سہیم ہے۔ تو جب اس چیز کی کوئی ادنیٰ شہادت ہمارے پاس موجود نہیں ہے، نہ ہماری عقل میں، نہ ہماری فطرت میں، نہ آفاق میں، نہ انفس میں تو ہمیں یہ کس طرح حق پہنچتا ہے کہ ہم خواہ مخواہ کسی چیز کو اس کی خدائی میں شریک اور حصہ دار بنا کے رکھ دیں۔ ملتِ توحید کی تاریخی و فطری عظمت

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹-۴۰)

'يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ' کے خطاب میں جو بلاغت اور دل نوازی ہے وہ بالکل واضح ہے۔ بسا اوقات مصیبت کا اشتراک بھی شرکائے مصیبت کے دلوں میں ہمدردی، محبت، اخلاص اور باہمی خیر خواہی و خیر سگالی کے جذبات نہایت زور و قوت سے ابھار دیتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اس خطاب سے اپنے ان ساتھیوں کے انہی جذبات کو ابھارا ہے تاکہ وہ ان کی طرف متوجہ ہوں اور ان کی وہ بات جو سرتاسر انہی کے نفع کے لیے ہے، گوشِ دل سے سنیں۔ دعوتِ توحید

'ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ' لفظ قہار پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ اس کا صحیح مفہوم وہ ہے جو لفظ کنٹرولر (CONTROLLER) کا ہے یعنی سب پر حاوی اور غالب جس کے حیطۂ اقتدار سے نہ کوئی باہر ہو، نہ باہر نکل سکے۔ مطلب یہ کہ جہاں تک ایک خدا کا تعلق ہے وہ تو ایک بدیہی حقیقت بلکہ ابدہ البدیہیات ہے۔ مشرک اور موحد سب اس کو مانتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کے سوا اور بھی کچھ اس کے شریک ہیں تو یہ چیز نہایت مضبوط دلیل کی محتاج ہے۔ اگر اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے تو محض خواہش کی بنا پر کسی کو اپنے اوپر خدا بنا کر مسلط کر لینا کہاں کی دانشمندی ہے! ایک غلام کے سامنے اگر یہ سوال رکھا جائے کہ اسے بیک وقت ایک آقا کی غلامی پسند ہے یا کئی آقاؤں کی تو وہ متعدد آقاؤں کے مقابل میں ایک ہی آقا کی غلامی کو ترجیح دے گا۔ یہی انسان کی فطرت ہے۔ اسے اپنے اوپر کسی کو خدا بنا کر مسلط کرنے کا شوق نہیں ہے۔ وہ ایک خدا کو تو اس لیے مانتا ہے کہ اس کے ماننے پر اس کی عقل اور فطرت اس کو مجبور کرتی ہے۔ اس کے سوا دوسروں کو ماننے کے لیے کیا مجبوری ہے کہ وہ خواہ مخواہ ان کی غلامی کا پٹا بھی اپنی گردن میں ڈال لے۔ انسانی فطرت کی اسی حقیقت کی طرف قرآن نے سورۂ زمر کی اسی تمثیل میں اشارہ فرمایا ہے۔ 'ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ

شُرَكَاۗءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ ۲۹- زمر (اللہ تمثیل بیان کرتا ہے ایک ایسے غلام کی جس میں متعدد مختلف الاغراض شرکاء شریک ہیں اور ایک ایسے غلام کی جو پورا کا پورا ایک ہی آقا کی ملکیت ہے۔ کیا دونوں کی حیثیت ایک جیسی ہوگی) یہاں قہار کی صفت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جب خدا قہار بھی ہے یعنی سب پر حاوی و غالب اور یہ اس کی صفات کا لازمی تقاضا بھی ہے تو آخر وہ ضرورت کیا ہے جس کے لیے دوسروں کو اس کی خدائی میں شریک کیا جائے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَاۗءً، الآیۃ۔ یعنی یہ جن کو تم پوج رہے ہو یہ محض تمہارے وہم کے ایجاد کیے ہوئے نام ہیں، ان ناموں کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں ہے۔ تمہارے باپ دادا جس لکیر کو پیٹتے آئے اسی لکیر کو بے سمجھے تم بھی پیٹ رہے ہو۔ خدا نے تمہارے ان فرضی دیویوں اور دیوتاؤں کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حکم اور فیصلہ، امر اور قضا سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے اور اس نے صرف اپنی عبادت کا حکم دیا ہے اور یہی سیدھا مستقیم اور فطری دین ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی طریقے ہیں سب فطرتِ انسانی سے ہٹے ہوئے اور انسان کو پیچ کی راہوں میں گم کرنے والے ہیں لیکن لوگوں کی اکثریت اپنی شامتِ اعمال سے اس حقیقت سے بے خبر ہے۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ (۴۱)

خوابوں کی تعبیر

حضرات انبیاء علیہم السلام کے دل و دماغ پر سب سے زیادہ حاوی اور غالب چونکہ اللہ کے دین کی دعوت ہی ہوتی ہے اس وجہ سے جب کبھی اور جہاں کہیں بھی اس کا موقع ان کو ہاتھ آجاتا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ نے جب دیکھا کہ ان کے زندان کے ساتھی حسن ظن اور اعتماد کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوئے ہیں تو پہلے تو انھوں نے ان کو خدا کی توحید کی دعوت پہنچائی اس کے بعد انھیں ان کے خوابوں کی تعبیر بھی بتا دی فرمایا کہ تم میں سے ایک، جس نے شراب نچوڑنے کا خواب دیکھا ہے، وہ تو قید سے رہائی پائے گا اور اپنے آقا کی ساقی گری کی خدمت انجام دے گا۔ رہا دوسرا، جس نے اپنے سر پر روٹیوں کے ٹوکرے سے چڑیوں کو نوچ نوچ کر کھاتے دیکھا، اس کو پھانسی ہوگی اور چڑیاں اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھائیں گی۔ فرمایا کہ یہ ہے تمہارے ان خوابوں کی تعبیر جن کے باب میں تم نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ (۴۲)

جائز مقصد کے لیے جائز تدبیر

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۔ ان دونوں میں سے ایک سے، جس کی نسبت حضرت یوسفؑ کو اس کے خواب کی بنا پر گمان تھا کہ وہ جیل سے چھوٹ جائے گا، حضرت نے یہ خواہش کی کہ اگر کوئی مناسب موقع پیدا ہو تو اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا۔ آقا سے مراد یہاں بادشاہ ہے اس لیے کہ وہ، جیسا کہ اوپر گزرا، بادشاہ کا ساقی تھا۔ ذکر سے مراد ظاہر ہے کہ ان ہی باتوں کا ذکر ہے جو جیل کی اس معیت کے دوران میں اس کے اپنے علم و مشاہدہ

میں آئی تھیں۔ خاص طور پر خواب کی تعبیر کے معاملے کا ذکر جو ایک اہم واقعہ بھی تھا اور بادشاہوں کے درباروں میں اس طرح کے معاملات آئے دن پیش آتے بھی رہتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ نے اس خواہش کا اظہار اس توقع کی بنا پر کیا ہو گا کہ جہاں داد فریاد اور عدل و انصاف کے سارے دروازے بند ہیں، شاید اسی راہ سے اس ظالمانہ قید سے چھوٹنے کی کوئی شکل پیدا ہو۔ کسی جائز مقصد کے لیے جائز تدابیر و وسائل کا اختیار کرنا توکل اور اعتماد علی اللہ کے منافی نہیں ہے۔ توکل کے منافی یہ ہے کہ آدمی حالات سے دل شکستہ ہو کر نا جائز تدابیر کے اختیار کرنے پر اتر آئے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول بندہ وہ نہیں ہے جو توکل کے نام پر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے بلکہ وہ ہے جو کارزارِ حیات میں اترے، وسائل تدابیر سے کام لے، اسباب و ذرائع کو استعمال کرے لیکن ہر گام پر خدا کے حدود و قیود کا احترام پورا پورا ملحوظ رکھے۔ یہی وہ اصلی امتحان ہے جس کے لیے خدا نے خلق کو پیدا کیا ہے اور جو اس دنیا کے وجود کی غایت ہے۔

تقدیر الٰہی کا فیصلہ　'فَاَنۡسٰىهُ الشَّيۡطٰنُ ذِكۡرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِى السِّجۡنِ بِضۡعَ سِنِيۡنَ'۔ 'ذِكۡرَ رَبِّهٖ' میں اضافت کی نوعیت وہی ہے جو 'مَكۡرُ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ' وغیرہ میں ہے۔ یعنی جیل سے چھوٹنے والا غلام اپنے آقا یعنی بادشاہ کے سامنے حضرت یوسفؑ کا ذکر کرنا بھول گیا۔ اس بھول جانے کو شیطان کی طرف منسوب فرمایا ہے اس لیے کہ کسی نیکی کے کام سے غافل کرنا شیطان ہی کا کام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تدابیر و وسائل کو اختیار کرنا تو انسان کے فرائض میں سے ہے لیکن ان تدابیر و وسائل کا بروئے کار آنا اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کی حکمت پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ ابھی حضرت یوسفؑ کچھ سال اور جیل ہی میں گزاریں۔ چنانچہ یہ بات یوں پوری ہو گئی کہ حضرت یوسفؑ کا جیل سے چھوٹنے والا ساتھی جیل سے باہر آ کر بالکل یاد نہ رکھ سکا کہ زندان کے ساتھی نے اس سے کیا بات کہی۔

وَقَالَ الۡمَلِكُ اِنِّىۡۤ اَرٰى سَبۡعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاۡكُلُهُنَّ سَبۡعٌ عِجَافٌ وَّسَبۡعَ سُنۡۢبُلٰتٍ خُضۡرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍؕ يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَاُ اَفۡتُوۡنِىۡ فِىۡ رُءۡيَاىَ اِنۡ كُنۡتُمۡ لِلرُّءۡيَا تَعۡبُرُوۡنَ (۴۳)

بادشاہ کا خواب　جب اللہ تعالیٰ کسی بات کو چاہتا ہے تو خواہ وہ کتنی ہی بعید از قیاس ہو اس کے اسباب خود بخود پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دوران میں خود بادشاہ نے ایک خواب دیکھا کہ سات فربہ گائیں ہیں، سات دبلی، اور یہ دبلی گائیں فربہ گایوں کو نگلے جا رہی ہیں۔ اسی طرح سات سبز بالیاں ہیں اور دوسری سات خشک اور یہ سات خشک بالیاں ساتوں سبز بالیوں کو کھا رہی ہیں۔ بادشاہ کو یہ خواب بڑی اہمیت رکھنے والا محسوس ہوا چنانچہ اس نے اپنے درباریوں کو یہ خواب سنایا اور ان سے کہا کہ اگر آپ لوگ خوابوں کی تعبیر کرتے ہیں تو ذرا میرے اس خواب کی تعبیر بتلایئے۔ بادشاہ کے اس آخری فقرے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اس کی نظر میں اس خواب کی بڑی اہمیت تھی اور وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس کی تعبیر بتانا ان لال بجھکڑوں کے لیے کچھ آسان نہیں ہے۔

آیت میں 'وَاُخَرَ يٰبِسٰتٍ' کے بعد 'يَاۡكُلۡنَ' کا لفظ محذوف ہے۔ قرینہ کی موجودگی کے سبب سے اس کو حذف کر دیا گیا ہے۔ آگے آیت ۴۶ میں اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔

قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍۚ وَمَا نَحۡنُ بِتَاۡوِيۡلِ الۡاَحۡلَامِ بِعٰلِمِيۡنَ (۴۴)

درباریوں کا جواب

'ضِغث' خس و خاشاک کے گٹھے کو کہتے ہیں۔ اسی کی جمع 'اضغاث' ہے جو بے حقیقت باتوں اور جھوٹوں کے مجموعہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ پھر اسی سے 'اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ' کی ترکیب پیدا ہو گئی جس سے مراد وہ خواب پریشان ہوتے ہیں، جو بدہضمی، تبخیر معدی یا کسی اور باعث سے نظر آ جاتے ہیں، ان کے اندر کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

دربار کے معبّروں نے یہ فقرہ کہہ کر اول تو بادشاہ کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی کہ جہاں پناہ اس خواب کی زیادہ فکر نہ کریں، یہ خواب پریشان کی نوعیت کی چیز ہے، اس طرح کے خوابوں کے اندر کوئی تعبیر نہیں ہوتی اور ساتھ ہی اپنا بھرم بھی قائم رکھنے کی کوشش کی کہ ہمارا کام بامعنی خوابوں کی تعبیر بتانا ہے نہ کہ خواب ہائے پریشان کی۔

وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ (۴۵)

'اِدَّکَرَ'، 'اِذْدَکَرَ' اور 'اِذْدَکَرَ' تینوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور 'اُمّۃ' یہاں زمانہ اور مدت کے معنی میں ہے۔

شاہی ساقی کی پیشکش

اس خواب کی تعبیر سے درباری معبّروں کی بے بسی نے شاہی ساقی کو جو جیل سے چھوٹا تھا، ایک مدت کے بعد، اپنے خواب کا قصہ یاد دلایا جس کی تعبیر حضرت یوسفؑ نے بتائی تھی اور جو بالکل صحیح نکلی تھی۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کر عرض کی کہ اس خواب کی تعبیر آپ لوگوں کو میں بتاؤں گا، تو مجھے اس سے ملنے کے لیے جانے دیں جس سے اس مقصد کے لیے میں ملنا چاہتا ہوں۔

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۴۶)

حضرت یوسفؑ سے ساقی کی درخواست

یہاں اتنی بات قرینہ کی موجودگی کے سبب سے حذف کر دی گئی کہ بالآخر درباریوں نے ساقی کو حضرت یوسفؑ کے پاس جانے کی اجازت دے دی اور وہ جیل خانہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس نے جاتے ہی حضرت یوسفؑ کو 'اَیُّھَا الصِّدِّیْقُ' سے خطاب کیا جس کے معنی ہیں اے راست باز، اے پیکرِ صداقت، اے صدقِ مجسم! جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجرد اپنی خواب کی تعبیر کی بنا پر حضرت یوسفؑ کا معتقد نہیں ہو گیا تھا بلکہ ایک مدت تک جیل میں ان کی زندگی کی پاکبازی اور صداقت کا اس کو جو تجربہ ہوا تھا اس نے ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ اس نے ان کو، اے خوابوں کی تعبیر بتانے والا، سے خطاب کرنے کی بجائے 'اے مردِ راست باز' سے خطاب کیا جو تمام اوصافِ حسنہ سے متصف ہونے کی ایک جامع اور کامل تعبیر ہے۔

اس خطاب کے بعد اس نے خواب کا ذکر کیا کہ سات دبلی گائیں ہیں جو سات فربہ گایوں کو نگل رہی ہیں اور سات خشک بالیاں ہیں جو سات سرسبز بالیوں کو کھا رہی ہیں۔ خواب کی تعبیر پوچھنے کے ساتھ ساتھ اس نے اشارۃً اس بات کا بھی ذکر کر دیا کہ باہر لوگ اس خواب کی تعبیر کے باب میں پریشان ہیں اس وجہ سے آپ مجھے جتنی جلدی ممکن ہو اس خواب کی تعبیر بتائیے تاکہ میں باہر جا کر لوگوں کو بتا سکوں اور انھیں اطمینان ہو۔ 'لَعَلَّھُمْ یَعْلَمُوْنَ' میں ایک نہایت لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ لوگ تو یوں ہی اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہیں البتہ آپ جو

بات بتائیں گے وہ صحیح علم پر مبنی ہوگی اور اس سے لوگوں کو رہنمائی حاصل ہوگی۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ (۴۷-۴۹)

'تَزْرَعُوْنَ' ہے تو خبر کے اسلوب میں لیکن ہے یہ امر کے مفہوم میں۔ ہم دوسرے مقام میں یہ بتا چکے ہیں کہ جب موقع و محل رہنمائی، مشورہ اور ہدایت دینے کا ہو تو ایسے مواقع میں امر کی بجائے خبر کا اسلوب ہی موزوں رہتا ہے۔ قرآن میں اس کی نظیریں بہت ہیں۔

خواب کی تعبیر

یہ حضرت یوسفؑ نے خواب کی تعبیر بھی بتادی اور ساتھ ہی اس سات سالہ ہولناک قحط کے مقابلہ کی تدبیر کی طرف بھی رہنمائی فرمادی جس کی اس خواب نے خبر دی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ سات سال مسلسل کاشت کرتے جاؤ تو جو فصل کاٹو اس میں سے غذائی ضرورت کے بقدر الگ کر کے صاف کرو لیکن بقیہ سارا غلہ اس کی بالیوں میں چھوڑتے جاؤ تاکہ وہ محفوظ رہے۔ یہ بات یہاں ذہن میں رکھنے کی ہے کہ دانے جب تک بھس اور بالیوں کے اندر رہتے ہیں دیمک، سرسری اور کیڑوں مکوڑوں کی آفت سے بچے رہتے ہیں۔

اس کے بعد خواب کے دوسرے حصے کی تعبیر یہ بتائی کہ سات سال متواتر نہایت سخت قحط کے آئیں گے جو اس سارے ذخیرے کو چٹ کر جائیں گے جو تم قحط کے مقابلے کے لیے جمع کرو گے۔ اس محفوظ ذخیرے میں سے بہت تھوڑا حصہ تم بچا پاؤ گے۔ ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سنادی کہ اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں کی فریاد رسی ہوگی یعنی لوگوں کی چیخ و پکار اور دعا و فریاد کی خدا کے ہاں شنوائی ہوگی، اس کا ابر کرم برسے گا، انگوروں کی فصل خوب بارآور ہوگی اور لوگ خوب انگور نچوڑیں گے۔

'یُغَاثُ' کا مطلب بعض لوگوں نے بارش بھی لیا ہے لیکن میرے نزدیک بارش اس کا لغوی مفہوم نہیں ہے البتہ اس کے لازم معنی کی حیثیت سے اس کو اس کے مفہوم میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ لفظ کو اس کے لغوی مفہوم میں لینے کا ایک کھلا ہوا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ہمہ گیر اثر کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے کہ سارے ہی لوگ اس کے ہاتھ سے چیخ اٹھیں گے اور ہر شخص اپنے رب کے آگے روئے اور گڑگڑائے گا۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ جب حقیقی معنوں میں کوئی سخت وقت آپڑتا تو، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، کٹر سے کٹر کافر و مشرک بھی اکیلے خدا ہی کو پکارتے ہیں، اپنے دوسرے فرضی دیویوں اور دیوتاؤں کو بھول جاتے ہیں۔ پھر یہ زمانہ قحط تو، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی، پورا کا پورا اہل مصر نے حضرت یوسفؑ کی رہنمائی میں گزارا ہے جس میں بادشاہ سے لے کر عوام تک سب ان کے گرویدہ، تابع فرمان اور معتقد رہے ہیں۔

'یَعْصِرُوْنَ' کے لفظ سے بھی مقصود اس کے لازم کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ یعنی خوب بارش ہوگی۔ انگور کی بیلیں خوب پھلیں پھولیں گی، لوگ خوب انگور نچوڑیں گے۔ ساتھ ہی اس میں ایک لطیف تلمیح بھی پیدا ہوگئی ہے۔ وہ یہ کہ پوچھنے والا، جیسا کہ اوپر گزرا ہے، بادشاہ کا خاص ساقی تھا۔ اس مناسبت سے 'یَعْصِرُوْنَ' کے لفظ نے کلام میں

ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے جو اہلِ ذوق سے مخفی نہیں ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۚ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ (۵۰)

حضرت یوسفؑ کو بادشاہ کی دعوت اور ان کا جواب

یہاں بھی سرگزشت کا اتنا حصہ محذوف ہے جتنا سیاقِ کلام سے خود واضح تھا یعنی بادشاہ کے قاصد نے حضرت یوسفؑ کی بیان کردہ تعبیر بادشاہ کو جا کر سنائی۔ بادشاہ اپنے خواب کی تعبیر سن کر اتنا متاثر ہوا کہ اس نے فوراً حکم دیا کہ اس قیدی کو میرے پاس لاؤ۔ قاصد پھر حضرت یوسفؑ کے پاس گیا اور خوش خوش ان کو مژدہ سنایا کہ بادشاہ نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔ قاصد کو تو یہ توقع رہی ہوگی کہ ایک قیدی، جو برسوں سے جیل کی مشقتیں جھیل رہا ہے، اپنی رہائی کا یہ مژدہ سن کر پھولا نہ سمائے گا اور فوراً اس کے ساتھ ہو لے گا لیکن حضرت یوسفؑ نے اس کی توقع کے بالکل خلاف اس کو یہ جواب دیا کہ تم اپنے آقا (بادشاہ) کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ ان عورتوں کا کیا قصہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے تھے، مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ کی تحقیق ہونی چاہیے جس کو بہانہ بنا کر مجھے جیل بھیجا گیا تھا۔ یوں میرا رب تو ان کی سازش سے اچھی طرح واقف ہی ہے اور میرے اعتماد کے لیے اس کا واقف ہونا ہی کافی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری رہائی سے پہلے اس واقعہ کی تحقیق ہو جائے تاکہ بعد میں اس کے سبب سے کسی کو میرے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ ہو سکے۔ حضرت یوسفؑ کے اس ارشاد کی تہ میں اتر کر غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ انھوں نے مجرد بادشاہ کے وقتی حسنِ ظن سے فائدہ اٹھا کر اپنی رہائی اور بادشاہ کے تقرب کو پسند نہیں فرمایا بلکہ سب سے زیادہ اہمیت الزام سے براءت کو دی اور اپنی سچائی اور اپنے رب پر انھیں اس درجہ اعتماد تھا کہ اس بات کی ذرا پروا نہ ہوئی کہ فریقِ ثانی انھیں ملزم بنانے کے لیے کیا دروغ بافیاں کر سکتا ہے۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدتُّنَّ يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ ۚ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدتُّهُ عَن نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ (۵۱)

عورتوں کے واقعہ کی تحقیق

یہاں بھی قرینہ کی وضاحت کی بنا پر اتنا حصہ محذوف ہے کہ قاصد نے حضرت یوسفؑ کی بات بادشاہ کو پہنچا دی۔ چنانچہ بادشاہ نے ان عورتوں کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ تمھارا کیا ماجرا ہے جب کہ تم نے یوسفؑ کو پھسلانے کی کوشش کی؟ بادشاہ کے سوال کے الفاظ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ کم از کم اس مرحلے میں اس پر یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی تھی کہ یہ سارا چھل فریب ان عورتوں ہی کا تھا، یوسفؑ اس معاملے میں بالکل بے قصور تھے۔ اگر بادشاہ پر یہ حقیقت واضح نہ ہوتی تو سوال کا انداز اس سے مختلف ہوتا۔ یعنی وہ یوں پوچھتا کہ یہ کیا واقعہ ہے جو یوسفؑ کے ساتھ تمھیں پیش آیا؟ اصل یہ ہے کہ سچائی اپنے ظہور کے لیے صبر کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اس کو اختیار کر لے اور جو صبر اس کے لیے مطلوب ہے اس کا حق ادا کر دے تو وہ وقت لازماً آتا ہے جب اس کی صداقت کی صدائے بازگشت در و دیوار سے سنائی دینی ہے۔ یہاں تک کہ دشمن بھی جیسا کہ آپ دیکھیں گے، اس کی گواہی دیتے ہیں۔

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ: 'حاشا' اور 'حاش' استثنا اور تنزیہ کے کلمے ہیں جو اس وقت بولے جاتے ہیں جب کسی کو کسی الزام یا تہمت سے بری ثابت کرنا ہو۔

عورتوں کا اعترافِ حق

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کے عظیم صبر نے حالات کا رخ اس طرح بدل دیا تھا کہ کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں رہ گیا تھا کہ وہ ان کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ چنانچہ ان عورتوں نے بھی نہایت کھلے دل سے اعتراف کیا کہ ہم نے اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا لیکن ان پر برائی کا کوئی نقش نہیں پایا اور خود عزیز کی بیوی، جس نے یہ سارا فتنہ اٹھایا تھا، اعترافِ حق میں ان عورتوں سے بھی آگے نکل گئی۔ اس نے کہا، اب تو حق پوری طرح آشکارا ہو ہی گیا، اب چھپانے سے کیا حاصل، اصل یہ ہے کہ میں نے ہی ان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی لیکن یہ بالکل محفوظ رہے۔ بلاشبہ یہ راست بازوں میں سے ہیں۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۔ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۲-۵۳)

تحقیقات کے مطالبہ کی وجہ

اپنا دامن بے داغ ثابت ہو جانے کے بعد یہ حضرت یوسفؑ نے اس بات کی وجہ بھی بتا دی کہ انھوں نے اس قضیہ کو از سرِ نو چھیڑنا کیوں ضروری سمجھا جب کہ بادشاہ اس معاملے کو زیرِ بحث لائے بغیر ان کو رہا کر رہا تھا۔ فرمایا کہ ایسا میں نے اس لیے کیا کہ بادشاہ پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ مجھے بالکل بے گناہ جیل میں ڈالا گیا تھا۔ میں نے عزیز کے ساتھ اس کی پیٹھ پیچھے کوئی بے وفائی نہیں کی تھی اور یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ خائنوں اور بے وفاؤں کی چال کو کامیاب و بامراد نہیں کرتا بلکہ بالآخر وہ نامراد ہوتے ہیں اور جو لوگ سچائی اور وفاداری پر استوار رہتے ہیں وہی سرخرو اور بامراد ہوتے ہیں۔

ہمارے نزدیک 'لِيَعْلَمَ' کی ضمیر کا مرجع بادشاہ ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں نہایت واضح الفاظ میں ہوا ہے اور 'اَخُنْهُ' کی ضمیر کا مرجع عزیز ہے جس کے لیے واضح قرینہ موجود ہے۔ اگر قرائن موجود ہوں تو ضمیروں میں اس قسم کا انتشار کوئی عیب نہیں ہے۔

اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ کوئی میرے اس رویہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ اپنے نفس کو میں گناہوں سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ نفس میرے ساتھ بھی ہے اور وہ برائی کے لیے وسوسہ اندازیاں بھی کرتا رہتا ہے۔ اس کے فتنوں سے محفوظ تو آدمی اسی وقت تک رہتا ہے جب تک خدا کی رحمت اور اس کا فضل شاملِ حال رہے۔ سو میں اگر فتنوں سے محفوظ رہا تو اس وجہ سے نہیں کہ میں اپنے اندر نفس نہیں رکھتا تھا بلکہ صرف اس وجہ سے محفوظ رہا کہ میرے رب کی رحمت و عنایت نے میری دست گیری فرمائی۔ میرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے۔ 'اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ' میں 'مَا'، ہمارے نزدیک ظرفیہ ہے۔

ایک سنتِ الٰہی

یہاں یہ سنتِ الٰہی یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی اور بدی الہام فرما کر اس کو اختیار دیا ہے کہ وہ بدی کی راہ اختیار کرے یا نیکی کی۔ اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے اور اس راہ میں پیش آنے والی آزمائشوں کا پامردی

سے مقابلہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت و عنایت سے متوجہ ہوتا ہے اور اس کی راہ کو آسان کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے اور اگر کوئی شخص نیکی کی راہ چھوڑ کر بدی کی راہ اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اسی راہ میں بڑھنے کے لیے ڈھیل دے دیتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے نفس کے اعلیٰ داعیات کو اختیار فرمایا اور اس راہ کی تمام مزاحمتوں کا پوری پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ نفس کے سفلی داعیات ان کے آگے سپر انداز ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مرتبۂ بلند کی سرفرازی بخشی جو ان کے لیے مقدر تھا۔

۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۵۴-۱۰۱

حضرت یوسفؑ کی زندگی کا نیا دور

اب آگے حضرت یوسفؑ کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف جیل سے چھوٹتے ہیں بلکہ عملاً پورے مصر کی حکومت ان کے انگوٹھے کے نیچے آجاتی ہے۔ سات سالہ قحط کے مقابلہ کے لیے وہ حالات کو اس خوبی سے سنبھالتے ہیں کہ نہ صرف ملک کی غذائی ضروریات پوری کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں بلکہ پاس پڑوس کے ملکوں کی مشکلات حل کرنے میں بھی ان کی مدد کرتے ہیں۔ اپنے جن بھائیوں کی عنایت سے وہ عزیز مصر کی غلامی اور بالآخر جیل تک پہنچے تھے، اس دور اقتدار میں وہ بھی ان کی خدمت میں غلہ لینے کے لیے حاضر ہوتے ہیں اگرچہ انھیں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ یہ ان کا وہی بھائی ہے جس کو انھوں نے ایک اندھے کنوئیں میں پھینکا تھا۔ ان کی اس بے خبری میں حضرت یوسفؑ بعض لطیف طریقوں سے ان کا امتحان بھی کرتے ہیں کہ اندازہ ہو سکے کہ وہ سب کچھ کر گزرنے کے بعد، جو انھوں نے ان کے ساتھ کیا، ان کے باطن میں تبدیلی ہوئی یا نہیں۔ بالآخر وہ وقت آتا ہے کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس کے سامنے وہ سائلانہ حاضر ہیں یہ ان کا وہی بھائی ہے جس کو انھوں نے کنوئیں میں پھینکا تھا۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ اپنے تمام بھائیوں اور ماں باپ کو اپنے پاس بلواتے ہیں۔ وہ آتے ہیں تو حضرت یوسفؑ کے دربار میں ان کو سر جھکا کر تعظیم بجا لاتے ہیں اور اس طرح حضرت یوسفؑ کا وہ خواب سچا ثابت ہو جاتا ہے جو انھوں نے دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں ـــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۴-۱۰۱

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا

يَتَّقُونَ ﴿٥٧﴾ وَجَآءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ ع ۸
لَهُ مُنكِرُونَ ﴿٥٨﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم
مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴿٥٩﴾
فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿٦٠﴾ قَالُوا
سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿٦١﴾ وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا
بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٦٢﴾ فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ
مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا أَخَانَا نَكْتَلْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿٦٣﴾
قَالَ هَلْ آمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمِنتُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِن قَبْلُ ۖ
فَاللَّهُ خَيْرٌ حَافِظًا ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿٦٤﴾ وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ
وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ۖ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي ۖ هَٰذِهِ
بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا ۖ وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ
بَعِيرٍ ۖ ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ ﴿٦٥﴾ قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّىٰ تُؤْتُونِ
مَوْثِقًا مِّنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهِ إِلَّا أَن يُحَاطَ بِكُمْ ۖ فَلَمَّا آتَوْهُ
مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿٦٦﴾ وَقَالَ يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا
مِن بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۖ وَمَا أُغْنِي عَنكُم
مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ ۖ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿٦٧﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُم مَّا

كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ
قَضٰهَا ۭ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ ع ۸ ۱۱ ۲
وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا
تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ
فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا
وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ
جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ
مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا فَمَا جَزَاۗؤُهٗٓ
اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوْا جَزَاۗؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَاۗؤُهٗ
كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاۗءِ اَخِيْهِ
ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَاۗءِ اَخِيْهِ ۭ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۭ مَا كَانَ
لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ
وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾ قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ
مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ
شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ
اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾
قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ
اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا اسْتَيْــَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ ع ۹ ۱۱ ۳

تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا
فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ
اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ
ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿٨١﴾
وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٨٢﴾
قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ
يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿٨٣﴾ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ
قَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰي يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٨٤﴾
قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ
مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿٨٥﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ
مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٦﴾ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ
اَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا
الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٧﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا
وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ
عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿٨٨﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ
بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿٨٩﴾ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ۭ
قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ
يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٠﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ

أَثَرَكَ اللَّهُ عَلَيْنَا وَإِن كُنَّا لَخَاطِئِينَ ﴿٩١﴾ قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ
يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿٩٢﴾ اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَٰذَا
ع ۱۰ / ۱۴ / ۴ فَأَلْقُوهُ عَلَىٰ وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩٣﴾
وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَن
تُفَنِّدُونِ ﴿٩٤﴾ قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ﴿٩٥﴾ فَلَمَّا أَن الربع
جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ
إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾ قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا
ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ ﴿٩٧﴾ قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ
الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٩٨﴾ فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَبَوَيْهِ
وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ إِن شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ ﴿٩٩﴾ وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى
الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن
قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ
وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ مِن بَعْدِ أَن نَّزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي
إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿١٠٠﴾ رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي
مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَ
الْأَرْضِ أَنتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي
بِالصَّالِحِينَ ﴿١٠١﴾

ترجمۂ آیات ۵۴-۱۰۱ اور بادشاہ نے کہا، اس کو میرے پاس لاؤ، میں اس کو اپنا معتمد خاص بناؤں گا۔ پھر جب

اس سے بات چیت کی تو کہا اب تم ہمارے ہاں با اقتدار اور معتمد ہوئے۔ اس نے کہا مجھے ملک کے ذرائع آمدنی پر مامور کیجیے، میں متدین بھی ہوں اور باخبر بھی۔ ۵۴-۵۵

اور اس طرح ہم نے یوسف کو ملک میں اقتدار بخشا وہ اس میں جہاں چاہے متمکن ہو۔ ہم اپنے فضل سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں اور ہم خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے اور آخرت کا اجر اس سے کہیں بڑھ کر ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور تقویٰ پر قائم رہے۔ ۵۶-۵۷

اور یوسف کے بھائی آئے اور اس سے ملے۔ اس نے تو ان کو پہچان لیا پر وہ اس سے ناآشنا ہی رہے۔ اور جب اس نے ان کا سامان تیار کر دیا کہا کہ اب کے اپنے سوتیلے بھائی کو بھی میرے پاس لائیو۔ دیکھتے ہو نا کہ میں غلہ بھی پورے پیمانہ سے دیتا ہوں اور بہترین میزبانی کرنے والا بھی ہوں۔ اور اگر تم اس کو میرے پاس نہیں لاؤ گے تو نہ تمھارے لیے میرے پاس غلہ ہے اور نہ تم میرے پاس پھٹکنا۔ انھوں نے کہا ہم اس کے بارے میں اس کے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے اور ہم یہ ضرور کریں گے۔ ۵۸-۶۱

اور اس نے اپنے نوجوانوں کو حکم دیا کہ ان کا دیا ہوا مال ان کے کجاووں ہی میں ڈال دو کہ جب وہ اپنے اہل و عیال میں پہنچیں اس کو پہچانیں تاکہ وہ پھر آئیں۔ تو جب وہ اپنے باپ کے پاس لوٹے انھوں نے کہا کہ ابا جان! ہم آگے کو غلہ سے محروم کر دیے گئے ہیں تو ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھی جانے دیجیے کہ ہم غلہ لائیں اور ہم اس کی حفاظت کا عہد کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اس کے معاملے میں تم پر میرا اعتماد نہیں ہو گا مگر ویسا ہی جیسا کہ میں نے اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملے میں تم پر کیا۔ تو اللہ بہترین محافظ اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔ ۶۲-۶۴

اور جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کی پونجی بھی ان کو لوٹا دی گئی ہے۔ بولے ابا جان! اب ہمیں کیا چاہیے، یہ ہماری پونجی بھی ہمیں لوٹا دی گئی ہے، اب ہم جائیں گے، اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لائیں گے، اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے، ایک بارِ شتر غلہ زیادہ حاصل کریں گے! یہ غلہ تو تھوڑا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں اس کو تمھارے ساتھ ہرگز نہ بھیجوں گا جب تک تم مجھ سے خدا کے نام پر یہ عہد نہ کرو کہ تم اس کو میرے پاس ضرور واپس لاؤ گے الا آنکہ تم کہیں گھر ہی جاؤ۔ تو جب انھوں نے اس کو اپنا پکا قول دے دیا اس نے کہا جو قول و قرار ہم کر رہے ہیں اللہ اس پر نگہبان ہے۔ ۶۵ - ۶۶

اور اس نے ہدایت کی کہ اے میرے بیٹو، تم سب ایک ہی دروازے سے نہ داخل ہونا، الگ الگ مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔ اور میں اللہ کے مقابل میں تمھارے کچھ کام نہیں آسکتا اختیار تو بس اللہ ہی کا ہے۔ میرا بھروسا اسی پر ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پہ بھروسہ کرنا چاہیے۔ اور جب وہ داخل ہوئے جہاں سے ان کے باپ نے ان کو ہدایت کی تھی تو وہ اللہ کے مقابل میں ان کے کچھ کام آنے والا نہ تھا۔ بس یعقوب کے دل میں ایک خیال تھا جو اس نے پورا کر لیا اور وہ بے شک اس علم سے بہرہ ور تھا جو ہم نے اس کو سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔ ۶۷ - ۶۸

اور جب یہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے اس نے اپنے بھائی کو خاص اپنے پاس جگہ دی۔ بتایا کہ میں تمھارا بھائی ہوں تو جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں اس سے آزردہ خاطر نہ ہو جیو۔ پس جب ان کا سامان تیار کرا دیا کٹورا اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھوا دیا۔ پھر ایک منادی نے آواز دی کہ اے قافلہ والو تم لوگ چور ہو۔ انھوں نے ان کی طرف مڑ کر پوچھا، تمھاری کیا چیز کھوئی گئی ہے؟ انھوں نے کہا ہم

شاہی پیمانہ نہیں پا رہے ہیں۔ اور جو اس کو لائے گا اس کے لیے ایک بارِ شتر غلہ ہے اور میں اس کا ضامن ہوں انھوں نے کہا: خدا کی قسم! آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہم اس ملک میں اس لیے نہیں آئے کہ فساد برپا کریں اور ہم چوری کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو اس چوری کرنے والے کی کیا سزا ہے؟ وہ بولے اس کی سزا، جس کے کجاوے میں چیز ملے وہ اس کی سزا میں دھر لیا جائے۔ ہم ایسے ظالموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ پس اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے ان کے تھیلوں سے تفتیش کا آغاز کیا، پھر اس کو اپنے بھائی کے تھیلے سے برآمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر کی۔ وہ بادشاہ کے قانون کی رُو سے اپنے بھائی کو پکڑنے کا مجاز نہ تھا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے۔ ۶۹-۷۶

انھوں نے کہا اگر یہ چوری کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس سے پہلے اس کا ایک بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔ یوسف نے اس بات کو اپنے دل ہی میں رکھا، اس کو ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ دل میں کہا تم خود ہی بدقماش لوگ ہو۔ اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ انھوں نے کہا، اے عزیز! اس کا ایک باپ ہے جو بہت بوڑھا ہے تو آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو روک لیجیے۔ ہم آپ کو نہایت ہی محسن سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا، اللہ پناہ میں رکھے اس بات سے کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے۔ اس صورت میں ہم نہایت ظالم ٹھہریں گے۔ جب وہ اس سے مایوس ہو گئے تو آپس میں مشورہ کرنے الگ ہوئے۔ ان کے بڑے نے کہا کیا تم کو علم نہیں کہ تمھارے باپ نے اللہ کے نام پر تم سے مضبوط قول و قرار لیا ہے اور اس سے پہلے یوسف کے معاملے میں جو تقصیر تم سے سرزد ہو چکی ہے وہ بھی تمھارے علم میں ہے تو میں تو اس

سرزمین سے ٹلنے کا نہیں جب تک میرے باپ مجھے اجازت نہ دیں یا اللہ میرے لیے کوئی فیصلہ نہ فرمائے۔ اور وہی بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔ تم لوگ اپنے باپ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ اے ہمارے باپ! آپ کے بیٹے نے چوری کی اور ہم نے وہی بات کہی ہے جو ہمارے علم میں آئی؛ ہم غیب کے نگہبان نہیں ہیں۔ اور آپ اس بستی کے لوگوں سے بھی پوچھ لیجیے جس میں ہم رہے ہیں اور اس قافلے سے بھی پوچھ لیجیے جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں۔ اس نے کہا بلکہ تمہارے دل نے یہ بات گھڑلی ہے تو صبر جمیل ہی اولیٰ ہے۔ امید ہے اللہ ان سب کو میرے پاس لائے گا، بے شک وہی علیم و حکیم ہے۔ ۷۷-۸۳

اور اس نے ان سے منہ پھیرا اور کہا ہائے یوسف! اور غم سے اس کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور وہ گھٹا گھٹا رہنے لگا۔ وہ بولے کہ بخدا آپ یوسف ہی کی یاد میں رہیں گے یہاں تک کہ از کار رفتہ ہو کے رہ جائیں گے یا ہلاک ہی ہو جائیں گے۔ اس نے کہا میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ اللہ ہی سے کرتا ہوں اور میں اللہ کی جانب سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اے میرے بیٹو! جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کی ٹوہ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ کی رحمت سے مایوس تو بس کافر ہی ہوتے ہیں۔ ۸۴-۸۷

تو جب وہ اس کے پاس پہنچے، انھوں نے اس سے کہا کہ اے عزیز! ہم اور ہمارے اہل وعیال بڑی تکلیف میں مبتلا ہیں اور ہم تھوڑی سی پونجی لے کر حاضر ہوئے ہیں تو آپ ہمیں غلہ بھی پورا دیجیے اور ہم کو صدقہ بھی عنایت فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو بدلہ عنایت فرماتا ہے۔ اس نے کہا، تمہیں کچھ پتہ ہے کہ تم جہالت میں مبتلا ہو کر یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کچھ کر گزرے ہو! وہ بولے کہ کیا آپ واقعۃً یوسف ہی ہیں!! اس نے کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ

نے ہم پر اپنا فضل فرمایا۔ بے شک جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور ثابت قدم رہتے ہیں تو اللہ خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ وہ بولے کہ خدا کی قسم اللہ نے آپ کو ہم پر برتری بخشی اور بے شک ہم ہی غلطی پر تھے۔ اس نے کہا اب تم پر کچھ الزام نہیں۔ اللہ تم کو معاف کرے۔ وہ ارحم الراحمین ہے۔ تم میرا یہ کرتا لے جاؤ، میرے باپ کے چہرے پر ڈال دیجیو وہ دیکھنے لگیں گے۔ اور تم لوگ اپنے تمام اہل و عیال کے ساتھ میرے پاس آجاؤ۔ ۸۸-۸۹

اور جب قافلہ چلا ان کے باپ نے کہا کہ اگر تم لوگ مجھے خبطی نہ قرار دو تو میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ لوگ بولے کہ خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے پرانے خبط ہی میں مبتلا ہیں۔ پس جب یوں ہوا کہ خوش خبری دینے والا آیا اس نے کرتا اس کے چہرے پر ڈال دیا، اس کی بصارت عود کر آئی تو اس نے کہا، کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ انھوں نے درخواست کی کہ ہمارے باپ ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دعا کیجیے۔ بے شک ہم ہی قصوروار رہے۔ اس نے کہا میں جلد اپنے رب سے تمھارے لیے مغفرت کی دعا کروں گا، بے شک وہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ۹۴-۹۸

پس جب وہ یوسف کے پاس پہنچے اس نے اپنے والدین کو خاص اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں انشاء اللہ امن و چین سے رہیے اور اس نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے لیے سجدہ میں گر پڑے۔ اور اس نے کہا، اے میرے باپ! یہ ہے میرے پہلے کے خواب کی تعبیر۔ میرے رب نے اس کو سچ کر دکھایا۔ اور اس نے بڑے ہی کرم کے ساتھ میری خبر گیری فرمائی جب کہ مجھے قید خانے سے نکالا اور آپ لوگوں کو دیہات سے لایا بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوا دیا تھا۔ بے شک میرا رب جو کچھ چاہتا ہے اس کے لیے نہایت باریک بین اور

دقیقہ رس ہے، بے شک وہی علیم و حکیم ہے۔ اے میرے رب تو نے مجھے اقتدار میں سے بھی حصہ بخشا اور باتوں کی تعبیر کے علم میں سے بھی سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت دونوں میں میرا کارساز ہے، مجھے اسلام پر وفات دے اور نیکوکاروں کے زمرہ میں شامل کر۔ ۹۹-۱۰۱

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ (۵۴)

حضرت یوسفؑ کے ساتھ بادشاہ کی گرویدگی

بادشاہ اول تو حضرت یوسفؑ کا اسی بات سے گرویدہ ہو گیا کہ جس خواب کی تعبیر سے اس کے دربار کے تمام عقلاء و فضلاء قاصر رہے اس کی انھوں نے ایسی تعبیر بتا دی جو ہر شخص کے دل میں اتر گئی۔ پھر اس سے بڑھ کر اس کو متاثر کرنے والی بات یہ ہوئی کہ حضرت یوسفؑ نے خواب کی تعبیر کے ساتھ اس ہولناک قحط کے مقابلے کی تدبیر بھی بتا دی جس کے ظہور کی خواب نے خبر دی تھی۔

پھر ان دونوں باتوں سے بڑھ کر تیسری بات یہ ہوئی کہ جب بادشاہ نے ان کو جیل سے رہا کر کے اپنے پاس بلانا چاہا تو انھوں نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے اس وقت تک کے لیے انکار کر دیا جب تک ان الزامات کی تحقیق نہ ہو جائے جن کو بہانہ بنا کر انھیں جیل میں ڈالا گیا تھا۔ اس تحقیق کا نتیجہ بھی، جیسا کہ اوپر کی آیات سے معلوم ہو چکا، حضرت یوسفؑ کے حق میں نہایت شاندار نکلا۔

ان تینوں میں سے کوئی ایک بات بھی بادشاہ کو حضرت یوسفؑ کا گرویدہ بنا دینے کے لیے کافی ہو سکتی تھی لیکن جس شخص کے باب میں یہ تینوں باتیں اکٹھی بادشاہ کے علم میں آئیں آخر وہ اس کا نادیدہ عاشق نہ ہو جاتا تو اور کیا کرتا۔ چنانچہ اس نے فوراً حکم دیا کہ ان کو فوراً میرے پاس لایا جائے، میں ان کو اپنا معتمد خاص بناؤں گا۔ شخصی حکومتوں میں سارے اختیارات کا مرکز بادشاہ کی ذات ہوتی ہے اس وجہ سے اگر وہ کسی کو اپنا معتمد خاص بنا لے اور وہ بھی اس عقیدت اور گرویدگی کے ساتھ جو بادشاہ کے دل میں حضرت یوسفؑ کے لیے پیدا ہو گئی تھی، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ گویا بادشاہ نے زمام اختیار و اقتدار حضرت یوسفؑ کے حوالے کر دینے کے ارادے کا اعلان ان کی رہائی کے اعلان کے ساتھ ہی کر دیا۔

حضرت یوسفؑ کی طرف سے منصب کی پیشکش

'فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ'۔ اب تک بادشاہ اور حضرت یوسفؑ کے

درمیان دوسرے لوگ واسطہ تھے۔ اس کو براہ راست حضرت سے ملنے اور گفتگو کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ اب ملاقات ہوئی تو اس نے ان سے گفتگو بھی کی۔ قرآن نے اگرچہ اس گفتگو کا حوالہ اجمالاً ہی دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ گفتگو تفصیل سے ہوئی ہوگی۔ دینی اور اخلاقی مسائل بھی زیر بحث آئے ہوں گے اور ملک کے انتظامی اور معاشی مسائل پر بھی حضرت یوسفؑ نے اپنی رائے پیش کی ہوگی۔ آدمی کی شخصیت کا صحیح اندازہ ملاقات اور گفتگو ہی سے ہوتا ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ملاقات اور گفتگو نے بادشاہ کو حضرت یوسفؑ کا مزید گرویدہ بنا دیا اور اس نے ان سے کہہ دیا کہ اب آپ ہماری حکومت میں ایک با اقتدار معتمد ہیں۔ گویا بادشاہ نے ان کے سامنے اپنی حکومت میں بڑے سے بڑے منصب کی پیشکش کر دی اور اس امر کو حضرت یوسفؑ کی صواب دید پر چھوڑا کہ وہ اس پیشکش کو کس صورت میں قبول فرماتے ہیں۔

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ (۵۵)

حضرت یوسفؑ کی تجویز — 'اَلْاَرْض' سے مراد یہاں سرزمین مصر اور 'خزائن' سے مراد ملک کے ذرائع پیداوار ہیں۔ چونکہ اس وقت سب سے بڑی مہم ملک کو پیش آنے والے قحط میں سنبھالنے کی تھی اس وجہ سے حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ ملک کے تمام ذرائع پیداوار کا اہتمام و انصرام میرے سپرد کر دیجیے، میں پوری احتیاط سے ہر چیز کی حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لیے علم بھی رکھتا ہوں۔ یہ واضح رہے کہ حضرت یوسفؑ کی طرف سے کوئی درخواست نہیں تھی بلکہ خود بادشاہ کی پیشکش قبول کرنے اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے ان کو جو شکل مناسب معلوم ہوئی وہ انھوں نے اس کے سامنے رکھ دی اور ساتھ ہی یہ بات بھی ظاہر فرما دی کہ اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لیے جس دیانت اور علم کی ضرورت ہے وہ میں اپنے اندر پاتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اس وجہ سے توقع رکھتا ہوں کہ اس کام کو بحسن و خوبی انجام دے سکوں گا۔ حضرت یوسفؑ کی یہ تجویز عین بادشاہ کی آرزو کے مطابق تھی اس وجہ سے وہ منظور ہو گیا اور اس طرح مصر کی سلطنت گویا حضرت یوسفؑ کے انگوٹھے کے نیچے آگئی۔ تورات میں ہے کہ "پھر فرعون نے یوسفؑ سے کہا کہ دیکھ میں نے تجھے ساری زمین مصر پر حکومت بخشی اور فرعون نے اپنی انگشتری اپنے ہاتھ سے نکال کر یوسفؑ کے ہاتھ میں پہنا دی ۔۔۔ تب اس کے آگے منادی کی گئی، سب ادب سے رہو اور اس نے اسے مصر کی ساری مملکت پر حاکم کیا اور یوسفؑ کو کہا، میں فرعون ہوں اور تیرے حکم کے بغیر مصر کی ساری زمین میں کوئی انسان اپنا ہاتھ یا پاؤں نہ اٹھانے گا۔" (پیدائش ۴۱ - ۴۴)

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۚ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۵۶-۵۷)

حضرت یوسفؑ کا کامل اقتدار — اس طرح حضرت یوسفؑ کو پورے ملک مصر میں عملاً وہ تمام اختیار و اقتدار حاصل ہو گیا جو بادشاہ کو حاصل تھا۔ نام تو بادشاہ کا ضرور باقی رہا لیکن اپنے اختیارات اس نے سارے حضرت یوسفؑ کو تفویض کر دیے۔ 'یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ' یعنی وہ جہاں چاہیں فروکش ہوں، جس حصۂ ملک کا چاہیں دورہ کریں، جہاں جو نظم و نسق ضروری سمجھیں

اس کے لیے احکام صادر فرمائیں۔ حکومت کے عمال کا فرض تھا کہ بے چون وچرا ان کے احکام کی تعمیل کریں۔

اللہ کا معاملہ خوب کاروں کے ساتھ

نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ. میں دو حقیقتیں واضح فرمائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمام اختیار و اقتدار خدا ہی کو حاصل ہے۔ وہ اگر کسی کو اپنے فضل و رحمت سے نوازنا چاہے تو کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ وہ جب چاہے ایک قیدی کو زنداں سے نکالے اور اس کو ملک کے تختِ حکومت پر لا بٹھائے، یہ اس کی قدرت و مشیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ دوسری یہ کہ وہ محسنین یعنی خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ ان کو آزمائشیں ضرور پیش آتی ہیں، اگر وہ ان آزمائشوں میں خدا کی راہ پر استوار اور ثابت قدم رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اس دنیا میں بھی اس کا صلہ دیتا ہے اور آخرت میں بھی وہ اس کا صلہ پائیں گے وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ۔ یعنی آخرت کا اجر اس دنیا کے اجر سے کہیں بڑھ کر ہے جو اللہ نے ان لوگوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے جو ایمان پر ثابت قدم اور خدا کے حدود و قیود کی خلاف ورزی سے بچتے رہیں۔

وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ (۵۸)

برادرانِ یوسف کی حاضری

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا یہ آنا، جیسا کہ آگے کی آیت میں وضاحت ہے، غلہ لینے کی غرض سے تھا۔ لینی یہ سات سال بعد اس زمانے کی بات ہے جب مصر اور اس سے ملحقہ ممالک فلسطین و شام وغیرہ سب قحط کے لپیٹ میں آچکے ہیں۔ یہ قحط تو مصر میں بھی تھا لیکن حضرت یوسفؑ کی پیش بندی اور ان کے حسنِ انتظام کی بدولت مصر نہ صرف اپنی ضروریات پوری کرنے میں کامیاب رہا بلکہ وہاں پاس پڑوس کے ملکوں سے آنے والے ضرورت مندوں کو بھی ایک معین مقدار میں سرکاری ڈپو سے غلہ خریدنے کی اجازت تھی۔ چنانچہ غلہ ہی حاصل کرنے کی غرض سے حضرت یوسفؑ کے بھائی مصر آئے اور معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی ہونے کی وجہ سے انھیں خاص اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے حضرت یوسفؑ کے سامنے بھی حاضر ہونا پڑا۔ اس حاضری کے وقت حضرت یوسفؑ نے تو ان کو پہچان لیا لیکن یہ لوگ ان کو نہ پہچان سکے۔ نہ پہچان سکنے کی وجہ ظاہر ہے کہ اول تو انھوں نے جس وقت انھیں کنوئیں میں پھینکا تھا اس پر کم و بیش بیس اکیس سال کا زمانہ گزر چکا تھا، اتنے طویل عرصے میں آدمی کی شکل و صورت بہت کچھ تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر بالفرض چہرے بشرے میں انھوں نے کچھ جھلک محسوس بھی کی ہو، جیسا کہ آگے آیت ۹۰ سے اشارہ نکلتا ہے تو آخر وہ یہ گمان کس طرح کر سکتے تھے کہ جس بھائی کو انھوں نے اندھے کنوئیں میں ڈالا تھا وہ آج مصر کے تختِ حکومت پر متمکن ہے۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ (۵۹ - ۶۰)

بھائیوں کو حضرت یوسف کی ہدایت

ان کا سامان ٹھیک ٹھاک کرا دینے کے بعد حضرت یوسفؑ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ اب کے غلہ لینے آؤ تو اپنے سوتیلے بھائی کو بھی ساتھ لائیو۔ معلوم ہوتا ہے کہ راشننگ سسٹم نافذ ہونے کے سبب سے ہر ضرورت مند کو

غلہ بحساب افرادِ خاندان ملتا تھا اس وجہ سے انھیں یہ بتانا پڑا ہوگا کہ ہمارا ایک سوتیلا بھائی بھی گھر پہ ہے۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ اب کے آنا تو اس کو بھی ساتھ لانا۔ اس کے لیے انھیں ترغیب بھی دی اور ساتھ ہی دھمکی بھی۔ ترغیب یہ کہ دیکھو میں ہر فرد کے حصہ کا غلہ پورا پورا دیتا ہوں۔ 'کَیْل' کے معنی تو پیمانہ کے ہیں لیکن جس طرح ظرف بول کر کبھی مظروف مراد لیتے ہیں اسی طرح اس سے یہاں مراد غلہ ہے۔ مطلب یہ کہ اپنے بھائی کو لاؤ گے تو اس کے حصہ کا غلہ بھی پورا پورا پاؤ گے اور یہ تجربہ تم کر ہی چکے ہو کہ میں آنے والوں کی نہایت بہتر طریقہ پر میزبانی کرتا ہوں۔ دھمکی یہ دی کہ اگر تم اپنے بھائی کو نہ لائے تو نہ تمھارے لیے میرے پاس غلہ ہے اور نہ تم میرے پاس پھٹکنا۔

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ (۶۱)

بھائیوں کا جواب — 'مُرَاوَدَت' کے معنی بہلانے پھسلانے کے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کے بارے میں ہم اس کے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے اور جہاں تک اپنی کوشش کا تعلق ہے اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے —— ان کے اس جملے کے اندر یہ بات مضمر ہے کہ اگر ہم اس کو لانے میں کامیاب نہ ہو سکے تو اس میں ہمارا قصور نہ ہوگا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے باپ نے اس کی اجازت نہ دی اور یہ چیز ایسی ہے جس میں ہماری مجبوری واضح ہے۔ حضرت یوسفؑ کے ساتھ جو کچھ وہ کر چکے تھے اس کے سبب سے ان کے دل میں ایک چور تھا جو ان کے اس فقرے میں نمایاں ہے۔

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۶۲)

مزید احسان — حضرت یوسفؑ نے اس خیال سے کہ مالی مشکلات ان کے دوبارہ آنے میں مانع نہ ہوں یہ کیا کہ اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ جو نقدی انھوں نے غلہ کی قیمت کے طور پر ادا کی ہے وہ ان کے سامان میں ڈال دی جائے تاکہ جب وہ گھر پر جا کر اپنا سامان کھولیں تو وہ یہ محسوس کریں کہ یہ ان پر احسان کیا گیا ہے اور خوشی خوشی، حوصلہ کے ساتھ، دوبارہ غلہ لینے آئیں۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ٥ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۶۳-۶۴)

بیٹوں کی گزارش باپ سے اور باپ کا جواب — جب یہ لوگ گھر پہنچے تو باپ کو ساری روداد سنائی کہ آگے کو ہم غلہ سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ اب غلہ حاصل کرنے کی ایک ہی راہ ہے کہ ہم اپنے ساتھ اپنے بھائی بن یامین کو بھی لے جائیں اور اپنے آپ کو سچا ثابت کریں کہ ہمارا ایک گیارہواں بھائی بھی ہے تو آپ اس مرتبہ بن یامین کو ہمارے ساتھ جانے دیجیے تاکہ ہم سب کے حصہ کا غلہ لے سکیں اور ہم آپ کو یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ بن یامین کے معاملے میں اگر میں تم پر اعتماد کروں تو یہ اعتماد ویسا ہی ہوگا جیسا کہ میں اس سے پہلے یوسفؑ کے بارے میں تم پر کر چکا ہوں۔ تو اللہ ہی بہترین محافظ اور ارحم الراحمین ہے۔ حضرت یعقوبؑ کے آخری الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک تمھارے

اعتماد کا تعلق ہے اس کا تجربہ تو مجھے ہو چکا ہے البتہ اگر بن یامین کو تمھارے ساتھ بھیجنا ہی پڑا تو میں یہ کام اللہ کی حفاظت و رحمت کے بھروسہ پر کروں گا، تمھارے اعتماد پر نہیں کروں گا۔

وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ۖ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي ۖ هَٰذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا ۖ وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ۖ ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ (۶۵)

بیٹوں کی مسرت

جب ان لوگوں نے اپنا سامان کھولا اور یہ دیکھا کہ جو رقم انھوں نے غلہ کی قیمت کے طور پر ادا کی تھی وہ پوری کی پوری ان کی غلہ کی بوریوں میں موجود ہے تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ بولے کہ ابا جان! اب کیا چاہیے، یہ دیکھیے کہ ہماری رقم بھی ہم کو لوٹا دی گئی ہے، اب ہم جائیں گے، اپنے اہل و عیال کے لیے غلہ لائیں گے، اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے، ایک بار شتر غلہ ہم مزید حاصل کریں گے، یہ غلہ جو ہم لائے یہ تو تھوڑا ہے۔

قرآن کی بلاغت کے قربان جائیے کہ اس نے ان کی بات اس طرح نقل کی ہے کہ ان کی خوشی ان کے فقرے فقرے سے ابلی پڑتی ہے۔

'وَنَمِيرُ أَهْلَنَا' کا معطوف علیہ یہاں قرینہ کی وضاحت کے سبب سے محذوف ہے ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔ 'مَادَ، يَمِيدُ، مِيدٌ' کے معنی اپنے اہل و عیال کے لیے غلہ اور ضرورت کی چیزیں فراہم کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب رقم واپس مل جانے کے بعد ہماری راہ میں کیا رکاوٹ باقی رہی، اب تو ہم ضرور ہی جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے غلہ لائیں گے۔

'كَيْلَ بَعِيرٍ' سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرت یوسفؑ نے جو راشننگ سسٹم جاری کیا تھا اس میں بیرونی ضرورت مندوں کو ایک بار شتر غلہ حاصل کرنے کی اجازت تھی۔

قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّىٰ تُؤْتُونِ مَوْثِقًا مِّنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهِ إِلَّا أَن يُحَاطَ بِكُمْ ۖ فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ (۶۶)

حضرت یعقوبؑ کی مشروط اجازت

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ میں بن یامین کو صرف اس صورت میں تمھارے ساتھ جانے کی اجازت دوں گا جب تم اللہ کے نام پر مجھ سے یہ مضبوط عہد کرو کہ اس کو تم ضرور واپس لاؤ گے الا آنکہ تم خود ہی کسی آفت میں گھر جاؤ۔ تو جب انھوں نے قسم کھا کے ان سے عہد کیا تو حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ ہم جو قول و قرار کر رہے ہیں اس پر اللہ ضامن اور گواہ ہے۔

وَقَالَ يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِن بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۖ وَمَا أُغْنِي عَنكُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ ۖ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ (۶۷)

'مَا أُغْنِي عَنكُم' یعنی میں تمھارے کچھ کام نہیں آسکتا، تمھیں کچھ نفع نہیں پہنچا سکتا۔

ایک مصلحت آمیز ہدایت

چونکہ قحط کا زمانہ تھا جس میں چوری، ڈکیتی اور اس نوع کے دوسرے جرائم کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں اس وجہ سے حضرت یعقوبؑ نے ان کو رخصت کرتے وقت یہ ہدایت فرمائی کہ شہر میں جب داخل ہونا تو ایک ہی

دروازے سے نہ داخل ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔ یہ امر بیان ملحوظ رہے کہ قدیم زمانے میں بیرونی حملوں سے حفاظت کے لیے ہر قابلِ ذکر شہر کے گرداگرد فصیل اور ہر سمت سے داخل ہونے کے لیے معین دروازے ہوتے تھے۔ حضرت یعقوبؑ نے یہ ہدایت ممکن ہے اس اندیشہ سے فرمائی ہو کہ کہیں یہ لوگ شہر کے شریروں اور گنڈوں کی توجہ کا ہدف نہ بن جائیں۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی دروازے سے گیارہ ذی وجاہت، خوش شکل اور باوقار بھائیوں کا اپنے قافلہ سمیت شہر میں داخل ہونا ایک جالب توجہ چیز ہو سکتی تھی اور اس کا بھی امکان تھا کہ کچھ شریر لوگ ان کے پیچھے لگ جائیں کہ ان کے پاس مال زیادہ ہوگا اور اسی طمع میں وہ ان کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائیں۔

اس ہدایت کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ تنبیہ فرما دی کہ یہ ایک تدبیر ہے جس کو اپنی دانست میں بہتر سمجھ کر میں تمھیں اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہوں۔ اس تدبیر کو ہرگز ہرگز اس معنی میں نہ لینا کہ یہ تمھیں اس تقدیر سے بچا سکے گی جو خدا نے تمھارے لیے لکھ رکھی ہے۔ وہ اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ اصل اختیار خدا ہی کا ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُم مَّا كَانَ يُغْنِي عَنْهُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۶۸)

تقدیر اور تدبیر کا باہمی تعلق

اب یہ تدبیر اور تقدیر کے باہمی تعلق کو واضح فرما دیا گیا کہ بیٹوں نے شہر میں داخل ہونے کے باب میں باپ کے مشورے پر جو عمل کیا تو یہ محض حالات وقت کے پیش نظر ایک تدبیر تھی جس کی ضرورت کا احساس باپ کے دل میں پیدا ہوا اور اس نے انھیں اس کے اختیار کرنے کی ہدایت کی جو ان کے لیے مفید و بابرکت ثابت ہوئی۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اگر ان کی تقدیر میں کوئی آفت آئی لکھی ہوئی ہوتی تو اس تدبیر سے وہ اس سے بھی بچ جاتے۔ تقدیر بہرحال اٹل ہے جس کو کسی کی تدبیر نہیں بدل سکتی لیکن اس کے باوجود انسان کا فرض ہے کہ وہ حالات و مصالح کے مطابق تدابیر اختیار کرے۔ اسی میں اس کے ارادے اور سعی و عمل کا امتحان ہے اور اسی پر آخرت میں اس کے درجے اور مرتبے کا انحصار۔ اس وجہ سے کسی کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ تقدیر کے نام پر اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ رہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر تدابیر اختیار کرے، ان کو بروئے کار لانے کے لیے اپنے امکان بھر جدوجہد کرے اور ساتھ ہی یہ یقین رکھے کہ ہوگا وہی جو اللہ کی مشیت میں ہے۔ اللہ کے فیصلہ کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

'وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ ...... الآیۃ'، یہ حضرت یعقوبؑ کی تعریف و تحسین ہے کہ وہ تدبیر و تقدیر کے معاملے میں اس علم سے بہرہ مند تھے جو اللہ نے ان کو سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ ان کی حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ یا تو تدبیر ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں، تقدیر ان کے ہاں ایک واہمہ ہے، یا پھر تقدیر و توکل کے نام پر وہ بالکل اپاہج بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ ۖ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۶۹)

بھائی پر افشائے راز

جب یہ لوگ حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچے انھوں نے اپنے بھائی بنیامین کو تنہائی میں اپنے پاس بلا کر ان کو آگاہ کر دیا کہ میں تمھارا بھائی یوسف ہوں تو اب تک انھوں نے جو کچھ کیا ہے اس سے دل شکستہ اور آزردہ خاطر نہ ہو نا۔ اب یہ دور گزر چکا۔ قرینہ دلیل ہے کہ اس موقع پر حضرت یوسفؑ نے بھائی کو اپنی اس تدبیر سے بھی آگاہ فرما دیا ہوگا جو وہ ان کو اپنے پاس روکنے کے لیے اختیار فرمانے والے ہیں تاکہ آگے جو حالات پیش آنے والے ہیں ان میں وہ مطمئن رہیں۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ۝ قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ ۝ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ۝ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ ۝ قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِنْ كُنْتُمْ كَاذِبِينَ ۝ قَالُوا جَزَاؤُهُ مَنْ وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ۝ فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ أَخِيهِ ۚ كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۖ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ ۗ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ۝ (۷۰-۷۶)

بھائی کو روکنے کے لیے حضرت یوسفؑ کی تدبیر

جب ان کا سارا سامان ٹھیک ٹھاک کرا دیا تو پانی پینے کا کٹورا، جو غلہ ناپنے کے لیے شاہی پیمانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا، وہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھوا دیا۔ پھر ایک منادی نے پکارا کہ اے قافلے والو تم چور ہو۔ وہ جھپٹ کے ان کی طرف مڑے اور پوچھا کہ آپ لوگوں کی کیا چیز کھوئی گئی ہے؟ انھوں نے بتایا کہ شاہی پیمانہ کھو گیا ہے تو جو اس کو لاسئے گا اس کو ایک بارِ شتر غلہ انعام ملے گا اور میں اس کا ضامن ہوں۔ انھوں نے قسم کھا کر جواب دیا کہ آپ لوگوں کو اچھی طرح علم ہے کہ ہم اس ملک میں فساد برپا کرنے نہیں آئے اور ہم چوری کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ اگر تم لوگ جھوٹے ثابت ہوئے تو اس کی کیا سزا ہے؟ انھوں نے کہا کہ جس کے سامان میں کٹورا ملے وہی اس کے بدلے میں روک لیا جائے۔ ہم ایسے ظالموں کو یہی سزا دیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے ان کے سامان کی تلاشی لی اور تلاشی کا آغاز اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے ان کے تھیلوں سے کیا اور آخر میں اپنے بھائی کے تھیلے سے پیمانہ کو برآمد کر لیا۔ حضرت یوسفؑ کی اس تدبیر کی بابت اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ یہ تدبیر یوسفؑ کے لیے ہم نے کی۔ بادشاہ کے قانون کی رو سے وہ اپنے بھائی کو روکنے کے مجاز نہ تھے الا آنکہ اللہ چاہے۔ فرمایا کہ ہم ہی جس کے چاہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں اور ہر صاحب علم سے بڑھ کر ایک علم والا ہے۔

حضرت یوسفؑ کے طرزِ عمل پر شبہات کا ازالہ

مذکورہ بالا آیات کا یہ خلاصۂ مطلب ہے جو ہم نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اب ہم ایک ترتیب کے ساتھ چند اصولی باتیں عرض کریں گے تاکہ حضرت یوسفؑ کے اس طرزِ عمل سے متعلق جو شبہات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں وہ صاف ہو جائیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ ابھی اس مرحلے میں اپنے آپ کو اپنے بھائیوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کو اچھی طرح ٹٹول کر یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اتنا بڑا ظلم کر گزرنے کے بعد، جو انھوں نے ان کے ساتھ کیا، ان کے باطن میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے یا ابھی ان کے سوچنے کا انداز وہی ہے جو پہلے تھا۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے بھائی بنیامین کو پا جانے کے بعد اب کسی قیمت پر یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھے کہ اس کو ان ظالم لوگوں کے حوالہ کریں۔ انھوں نے خیال فرمایا ہو گا کہ لانے کو تو وہ اس طمع میں اس کو لائے کہ ان کو معلوم تھا کہ اس کے بغیر ان کو غلہ ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے لیکن اب واپسی میں ایسے لوگوں سے کیا بعید ہے کہ اس طرح کا کوئی اقدام اس کے ساتھ بھی کر گزریں جس طرح کا اقدام وہ خود ان کے ساتھ کر چکے ہیں۔ آخر حسد کا وہ جذبہ جو ان کے پہلے اقدام کا محرک ہوا وہ تو اس بھائی کے معاملے میں بھی موجود ہے۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ ان کو بہر حال ملک کے قانون کا رکھ رکھاؤ بھی مدنظر تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بادشاہ کی غیر معمولی عقیدت کی وجہ سے حضرت یوسفؑ کو، جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے، لیکن ان کے شایان شان بات یہی تھی کہ وہ جو قدم بھی اٹھائیں وہ قانون ملک کے مطابق ہو۔ بالخصوص جب کہ وہ قانون مبنی بر عدل بھی ہو۔

۴۔ چوتھی بات یہ کہ ان گوناگوں حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اگر کوئی طریقہ کارگر ہو سکتا تھا تو توریہ کا طریقہ ہی ہو سکتا تھا۔ توریہ اگر کسی باطل مقصد کے لیے ہو اور اس میں جھوٹ کی بھی ملاوٹ ہو تو وہ توریہ بلاشبہ حرام ہے لیکن اگر یہ کسی مقصد حق کے لیے ہو اور اس میں جھوٹ اور فریب کی آمیزش نہ ہو تو اس توریہ میں نہ صرف یہ کہ کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ بسا اوقات اس کا اختیار کرنا، بالخصوص دشمن کے مقابل میں، مصلحت حق کی خاطر ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کی بعض نہایت لطیف اور پاکیزہ مثالیں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی ملتی ہیں۔ اس قسم کے توریہ میں جو بات کہی یا کی جاتی ہے وہ بجائے خود سچی اور صحیح ہوتی ہے لیکن اس کے کہنے یا کرنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ مخاطب اس سے مغالطہ میں پڑ جاتا ہے۔

۵۔ حضرت یوسفؑ نے بھائی کے تھیلے میں پیمانہ رکھ کر یا رکھوا کر ایک منادی سے یہ اعلان جو کرایا کہ اے قافلہ والو تم چور ہو، تو منادی نے یہ اعلان حضرت یوسفؑ کے حکم کی تعمیل میں کیا اور حضرت یوسف نے یہ اعلان کراتے ہوئے جو بات پیش نظر رکھی وہ یہ نہیں تھی کہ اہل قافلہ نے شاہی پیمانہ چرایا ہے بلکہ انھوں نے خود اپنے واقعہ کو مدنظر رکھا کہ ان کو سیر و تفریح کے بہانے گھر سے لائے اور ایک کنوئیں میں پھینک کر شام کو جب گھر واپس ہوئے تو بوڑھے باپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔ چنانچہ دیکھ لیجیے کہ منادی کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ اے قافلہ والو تم نے شاہی پیمانہ چرایا

ہے، بلکہ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ 'اے قافلہ والو تم چور ہو'۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بجائے خود بالکل صحیح تھی البتہ اس سے اس موقع پر یہ مغالطہ ضرور پیدا ہو سکتا تھا کہ کسی خاص چیز کی چوری کو اس اعلان کی وجہ قرار دے لیں۔

۶۔ اس اعلان کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے سارے عملہ میں یہ بات پھیل گئی کہ شاہی پیمانہ گم ہے۔ یہ شاہی پیمانہ چونکہ پہلے پانی پینے کا شاہی کٹورا تھا اس وجہ سے لازماً قیمتی رہا ہوگا اس وجہ سے اس کا چرایا جانا بعید از قیاس نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کسی پہلو سے خود حضرت یوسفؑ نے اس موقع پر شاہی پیمانے کا ذکر چھیڑا ہو اور ان کے عملہ نے از خود رائے قائم کر لی ہو کہ قافلہ والوں پر جس چوری کا الزام ہے وہ شاہی پیمانہ ہی کی چوری ہے۔

۷۔ جب اہل قافلہ نے مڑ کر حضرت یوسفؑ کے آدمیوں سے پوچھا کہ آپ لوگوں کی کیا چیز کھوئی گئی ہے تو انھوں نے اپنے علم کے مطابق یہ جواب دیا کہ ہمارا شاہی پیمانہ کھو یا گیا ہے اور ساتھ ہی ان میں سے ایک نے یہ بھی کہا کہ جو شخص پیمانہ لائے گا اس کو ایک بارِ شتر غلہ انعام ملے گا اور میں اس کا ضامن بنتا ہوں۔ یہ آخری بات ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ کے ایما پر کہی گئی ہوگی اور اغلب ہے یہ بات اسی آدمی نے کہی ہو جس نے یہ منادی کی تھی کہ اے قافلہ والو تم چور ہو۔

۸۔ قافلہ والوں نے پہلے تو قسم کھا کے اپنی صفائی پیش کی کہ ہم اس ملک میں فساد برپا کرنے نہیں آئے تھے اور نہ ہم چوری کرنے والے لوگ ہیں، پھر جب ان سے یہ سوال ہوا کہ اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو چور کی کیا سزا؟ انھوں نے تھوڑے سے تردد کے ساتھ یہ جواب دیا کہ جس کے کجاوے سے چیز نکلے وہی اس کے بدلہ میں پکڑا جائے۔ ہم ایسے ظالموں کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں۔

۹۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے خود تلاشی لی اور تلاشی کا آغاز بن یامین کے بجائے دوسروں سے کیا تاکہ ان کو کوئی شبہ نہ ہو اور آخر میں بنیامین کے تھیلے سے شاہی پیمانہ برآمد کر لیا۔ اس طرح گویا اپنے بھائی کو روک لینے کے وہ ملک کے قانون کی رو سے بھی مجاز ہو گئے اور اپنے بھائیوں کے اقرار کی رو سے بھی۔

۱۰۔ اس تدبیر کو اللہ تعالیٰ نے 'کید' سے تعبیر اور اس 'کید' کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ 'کید' مخفی تدبیر کو کہتے ہیں۔ یہ مخفی تدبیر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو سجھائی جس کی بدولت وہ اس قابل ہوئے کہ اپنے بھائی کو بھی خطرے سے بچا سکیں اور ملک کے قانون کا احترام بھی باقی رہے۔

اس پوری تفصیل پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس ساری کارروائی میں نہ حضرت یوسفؑ کسی جھوٹ میں ملوث ہوئے ہیں نہ ان کے آدمی۔ البتہ وقتی طور پر بن یامین پر ایک الزام کا دھبہ لگا لیکن اول تو وہ اس سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، پہلے سے آگاہ کر دیے گئے تھے ثانیاً یہ جو کچھ کیا گیا انہی کو سوتیلے بھائیوں کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے کیا گیا۔

آخر میں نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ میں حضرت یوسفؑ کے مراتب بلند کی طرف اشارہ بھی ہے اور ان لوگوں پر ایک تعریض بھی جو اپنے علم کو آخری چیز سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ان کو دنیا جتنی نظر آتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ بس یہ کائنات کل اتنی ہی ہے اور اپنے اس نشہ میں ان بہت سی حقیقتوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو ان کے محدود علم سے باہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں بتایا کہ کسی کو بھی اپنے اندازوں اور قیاسوں پر مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ سب علم والوں سے بڑھ کر بھی ایک علم والا ہے اور اسی کا علم حقیقی ہے۔ اس میں قریش کو، جن کو یہ سرگزشت سنائی گئی ہے، ایک لطیف تنبیہ بھی ہے کہ آج وہ خدا کے رسول کو جن حالات میں دیکھ رہے ہیں ان سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ حالات کا حقیقی علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مستقبل کے پردوں میں کیا چھپا ہوا ہے۔ موجودہ تاریکیوں کے اندر سے کس طرح روشنی برآمد ہوگی اور اسلام اور پیغمبر اسلام کے لیے کس طرح راہیں ہموار ہوں گی۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ (۷۷)

بھائیوں کی ایک اور شرارت — جب برادران یوسفؑ نے دیکھا کہ وہ پکڑے گئے تو جھٹ اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے حضرت یوسفؑ پر ایک تہمت جڑ دی۔ بولے کہ اگر اس نے چوری کی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے اس کا ایک بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔ اس طرح انھوں نے گویا یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ ہمارا حقیقی بھائی نہیں بلکہ سوتیلا بھائی ہے اور چوری کی یہ خصلت یہ اپنی ماں کی طرف سے لایا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے جب ان کی یہ بات سنی تو ان پر اس کا جو قدرتی اثر پڑنا تھا وہ تو پڑا لیکن وہ اس کو پی گئے اس لیے کہ اس مرحلہ میں ابھی وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے بس دل میں یہ کہہ کے رہ گئے کہ تم بہت ہی برے لوگ ہو اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۷۸)

حضرت یوسفؑ کی خوشامد — جب انھوں نے دیکھا کہ بازی ہاری گئی تو فوراً خوشامد پر اتر آئے اور حضرت یوسفؑ کو خاص سرکاری خطاب 'عزیز' سے، جو مصر کے اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کے لیے مخصوص تھا، مخاطب کر کے نہایت لجاجت سے عرض کی کہ حضور! اس کا باپ بہت بڑھا ہو چکا ہے تو آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو روک لیجیے اور اس کو رہا کر دیجیے۔ ہم آپ کو ایک نہایت محسن آدمی سمجھتے ہیں، امید ہے کہ آپ ہمیں اپنے احسان سے محروم نہ فرمائیں گے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ (۷۹)

حضرت یوسفؑ کا جواب — حضرت یوسفؑ نے جواب دیا کہ اس بات سے اللہ کی پناہ کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس اپنی چیز پائی ہے۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہم نہایت ظالم ٹھہریں گے۔ یہاں حضرت یوسفؑ کی یہ احتیاط ملحوظ رہے کہ وہ یہ نہیں فرماتے کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس نے ہماری چیز چرائی ہے، بلکہ محتاط الفاظ میں یہ فرماتے ہیں کہ اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس اپنی چیز پائی ہے۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ

مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِیْ یُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰی یَاْذَنَ لِیْۤ اَبِیْۤ اَوْ یَحْكُمَ اللّٰهُ لِیْ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ (۸۰)

بھائیوں کی مشورت

حضرت یوسفؑ کے مذکورہ بالا جواب کے بعد وہ ان کی طرف سے تو مایوس ہو گئے کہ وہ چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟ اس سوال پر غور کرنے کے لیے سب بھائی لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر مشورہ کے لیے بیٹھے۔ بڑے نے کہا کہ یاد رکھو کہ تمھارے باپ نے اللہ کا واسطہ دلا کر تم سے عہد لیا ہے اور اس سے پہلے یوسف کے معاملے میں جو تقصیر تم سے ہو چکی ہے وہ معلوم ہی ہے تو میں تو یہاں سے ٹلنے کا نہیں جب تک میرے والد مجھے اجازت نہ دیں یا اللہ میرے لیے کوئی فیصلہ نہ فرمائے۔ اور وہی بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔

اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ 'کَبِیْرُ' سے کون بھائی مراد ہے۔ عمر میں بڑا روبیل یا عقل و رائے میں بڑا یہوداہ۔ ہمارے نزدیک لفظ 'کَبِیْرُ' جس طرح 'بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا' میں درجہ اور مرتبہ کی بڑائی کے لیے ہے اسی طرح یہاں بھی درجہ اور مرتبہ کی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اگر مجرد عمر کی بڑائی کا اظہار مقصود ہوتا تو اس کے لیے 'اَكْبَرُهُمْ' کا لفظ موزوں ہوتا۔ اس وجہ سے اگر اس سے 'یہوداہ' کو مراد لیا جائے تو یہ زیادہ اقرب ہے۔ تورات میں اسی کا نام آیا بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں حضرت یوسفؑ کے لیے کوئی نرم گوشہ تھا۔ غالباً اسی نے اس وقت جب حضرت یوسفؑ کے قتل کے مشورے ہو رہے تھے ان کو قتل کرنے کے بجائے کسی سرِ راہ کنوئیں میں ڈال دینے کا مشورہ دیا کہ کوئی راہ چلتا قافلہ اس کو نکال لے جائے گا، اس طرح ہم اس کے قتل کے گناہ سے بچ جائیں گے اور اس کو ٹھکانے لگانے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤی اَبِیْكُمْ فَقُوْلُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ ۰ وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِیْهَا وَالْعِیْرَ الَّتِیْۤ اَقْبَلْنَا فِیْهَا ۚ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۸۱-۸۲)

'وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ' میں مضاف محذوف ہے۔ یعنی وَسْـَٔلْ اَهْلَ الْقَرْیَةِ۔

یہوداہ نے بھائیوں کو یہ مشورہ دیا کہ میں تو یہاں سے کھسکتا نہیں البتہ تم لوگ اپنے باپ کے پاس جاؤ اور ان سے عرض کرو کہ آپ کے صاحبزادے نے چوری کی۔ جو کچھ ہمارے علم میں آیا ہے، ہم وہی کہہ رہے ہیں، ہم غیب کے عالم نہیں ہیں۔ ہم جس بستی میں ٹھہرے تھے اس کے لوگوں سے بھی پوچھ لیجیے اور جس قافلہ کے ساتھ ہم آئے ہیں اس سے بھی دریافت کر لیجیے، ہم اپنے بیان میں بالکل سچے ہیں۔

بھائیوں نے اسی مشورے پر عمل کیا اور آ کر باپ کو واقعہ کی رپورٹ دے دی۔ اب آگے حضرت یعقوبؑ کے تاثرات کا ذکر ہے۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِهِمْ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ (۸۳)

'تَسْوِیْلٌ' کے معنی تزیین اور تسہیل کے ہیں۔ سَوَّلَ لَهُ الشَّیْطٰنُ، شیطان نے اس کو گمراہ کیا اور اس

کی نگاہوں میں کھپایا کہ فلاں کام کر گزرے۔ 'سَوَّلَتْ لَہٗ نَفْسُہٗ کَذَا' اس کے نفس نے فلاں کام کو اس کے لیے آسان بنا دیا اور اس کی نگاہوں میں کھپا دیا۔

'فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ' نکرہ موصوف یہاں مبتدا کے محل میں ہے اور خبر اس کی محذوف ہے۔ یعنی صبر جمیل ہی اس حالت میں اولیٰ اور اختیار کے لائق ہے۔ 'صَبْرٌ جَمِیْلٌ' اس صبر کو کہتے ہیں جو اظہار غم کے اوچھے طریقوں سے پاک ہو۔ واویلا اور ماتم و سر کوبی کے بعد تو سب ہی صبر کر لیتے ہیں، صبر جمیل ان لوگوں کے صبر کو کہتے ہیں جو غم کو اس طرح برداشت کرتے ہیں کہ نہ ان کی زبان کسی حرف شکایت سے آلودہ ہوتی نہ ان کے ہاتھ پاؤں سے کسی خلاف وقار حرکت کا صدور ہوتا۔

دو بیٹوں سے محرومی پر حضرت یعقوبؑ کے تاثرات

'قَالَ' کا ظاہر مفہوم تو اگرچہ یہی ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے یہ بات بیٹوں کو خطاب کر کے فرمائی ہو لیکن یہ لفظ چونکہ دل میں کہنے کے لیے بھی آتا ہے اس وجہ سے میرا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کی زبانی یہ غم انگیز خبر سن کر یہ بات ان کو خطاب کر کے نہیں بلکہ اپنے دل میں کہی کہ سب تمہارے اپنے نفس کا گھڑا ہوا افسانہ ہے تو صبر جمیل ہی اولیٰ اور احق ہے کہ اس کو اختیار کیا جائے۔ ساتھ ہی ان کے قلب روشن میں یہ امید بڑے زوروں سے ابھری کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو میرے پاس جمع کر دے گا، علیم و حکیم تو وہی ہے۔ جس طرح اس کی شدت بارش کی امید کو بڑھاتی ہے اسی طرح آزمائش کی شدت اللہ کی رحمت کی امید کو غذا اور قوت بخشتی ہے۔ خاصان خدا اس رمز سے آگاہ ہوتے ہیں کہ اللہ اپنے بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ نہیں آزماتا اس وجہ سے جب وہ دیکھتے ہیں کہ اب معاملہ ان کی طاقت سے باہر ہو رہا ہے تو وہ منتظر ہو جاتے ہیں کہ اب فتح باب میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے جب دیکھا کہ یوسفؑ کے بعد وہ بن یامین اور یہوذا سے بھی محروم ہو گئے تو انھیں دفعۃً یہ روشنی نظر آئی کہ اب انشاء اللہ سب کے جمع ہو جانے کا وقت قریب آگیا ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ کیسے ہوگی تو اس کیسے کا جواب صرف اسی کے پاس ہے جو تمام علم و حکمت کا مالک ہے۔ بندے کو چاہیے کہ وہ اسی علیم و حکیم پر بھروسہ رکھے۔

وَتَوَلّٰی عَنْھُمْ وَقَالَ یٰٓاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ وَابْیَضَّتْ عَیْنٰہُ مِنَ الْحُزْنِ فَھُوَ کَظِیْمٌ (۸۴)

'وَتَوَلّٰی عَنْھُمْ' یعنی اس حادثہ کے بعد بیٹوں سے آزردہ اور الگ ہو کر وہ گوشہ میں بیٹھ گئے۔ اس تازہ حادثہ نے حضرت یوسفؑ کے غم کو مزید شدت سے تازہ کر دیا اور اس شدت غم میں ان کی زبان سے ہائے یوسفؑ! کے الفاظ بے ساختہ نکل گئے۔ شدتِ غم اور کثرت گریہ سے ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور ہر وقت سینہ میں غم دبائے رکھنے کے سبب سے وہ گھٹے گھٹے سے رہنے لگے۔ یہ واضح رہے کہ یہ ساری حالتیں ان کے تنہائی کے غم و الم کی بیان ہو رہی ہیں جس میں معاملہ تمام تر ان کے اور ان کے رب کے درمیان تھا۔ اس حقیقت کا انھوں نے اظہار بھی فرمایا ہے۔ 'اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' (میں اپنی پریشانی اور غم کا شکوہ اپنے اللہ ہی کے آگے کر رہا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے ان باتوں کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے) اپنے غم و الم کا اظہار اپنے رب کے آگے کرنا نہ صرف یہ کہ کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ نہایت اچھی بات ہے۔ اس غم و الم کا باعث

یاس نہیں بلکہ امید ہوتی ہے۔ بندہ یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ جتنا ہی اپنے رب کے آگے روئے گا اتنا ہی اس کا رونا اس کی رحمت کو جوش میں لائے گا۔ رونا دھونا وہ ممنوع ہے جو دوسروں کے آگے ہو، جو امید کے بجائے یاس کا مظہر ہو اور جس میں انسان اپنی بےصبری کا اظہار اس طرح کرے جس سے ایمان اور توکل کا وقار مجروح ہو۔

یہ بات کچھ عجیب نہیں کہ اس تازہ حادثہ نے بھی حضرت یعقوبؑ کے دل میں حضرت یوسفؑ ہی کے غم کو ہرا کیا۔ اول تو بن یامین کے حادثہ کی نوعیت وہ نہیں تھی جو حضرت یوسفؑ کے حادثہ کی تھی، ثانیاً حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ سے جو دلبستگی تھی وہ صرف بیٹے ہونے کے سبب سے نہیں تھی بلکہ اس میں اصلی دخل ان کی ان اعلیٰ صلاحیتوں کو تھا جن کی بنا پر حضرت یعقوبؑ ان سے اس درجہ محبت کرتے تھے کہ وہ اپنے تمام بھائیوں کے محسود بن گئے اور بالآخر اسی کے نتیجہ میں بھائیوں کے ہاتھوں انھیں نہایت زہرہ گداز آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔

غم والم کی شدت اور رونے دھونے سے آنکھوں کا سفید ہو جانا کوئی مبالغہ کا اسلوب بیان نہیں ہے بلکہ بیان حقیقت ہے۔ غم اور گریہ سے پلکوں اور پتلیوں کی سیاہی بھی متاثر ہوتی ہے اور آنکھوں کے سرخ ڈورے بھی آہستہ آہستہ غائب ہو جاتے ہیں۔ لفظ 'کَظِیْم' حضرت یعقوبؑ کے صبر کی تعریف کے لیے ہے کہ ہر وقت غم کو سینہ میں دبائے رکھنے کے سبب سے وہ گھٹے گھٹے سے رہتے۔ 'یَا اَسَفٰی' میں آخر کا الف یائے اضافت کا قائم مقام ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ (۸۵)

'تَاللّٰهِ' عربی میں 'وَ' کی طرح 'تَ' بھی قسم کے لیے آتی ہے۔ 'تَفْتَؤُا' لاتزال کے معنی میں ہے۔ 'حَرَضٌ' اس شخص کو کہتے ہیں جو ہلاکت کے قریب پہنچ جائے اور ازکار رفتہ ہو کے رہ جائے۔

باپ کو بیٹوں کی ملامت

سعادت مند بیٹوں نے یہ سب کچھ کر گزرنے کے بعد باپ کو نصیحت کرنی شروع کی کہ خدا کی قسم! آپ اسی طرح یوسفؑ کی یاد میں لگے رہیں گے یہاں تک کہ ازکار رفتہ ہو کر رہ جائیں گے یا ہلاک ہی ہو جائیں گے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اس نصیحت کا انداز اگرچہ بظاہر ہمدردانہ ہے لیکن در پردہ اس کے اندر بھی ان کا وہی جذبۂ حسد کارفرما ہے جو ان کے ان تمام اقدامات کا باعث ہوا جو اوپر مذکور ہوئے۔ انھوں نے تو حضرت یوسفؑ کو اس توقع پر ٹھکانے لگایا تھا کہ اس کے بعد باپ کی ساری توجہ ان پر مرکوز ہو کے رہے گی لیکن اب ان کو نظر آیا کہ ان کی اس سعی نامراد کا نتیجہ بالکل الٹا نکلا۔ اب تک باپ کی توجہ اور نظر التفات کا کوئی گوشہ ان کو حاصل تھا تو اب وہ اس سے بھی محروم ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ باپ کا اس کے سوا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا ہے کہ گوشۂ تنہائی میں یوسفؑ کو یاد کر کے روئیں اور اپنے رب سے استغاثہ اور فریاد کریں۔

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۸۶)

'بث' کا بالکل ٹھیک ترجمہ پریشانی ہے۔

باپ کا جواب

حضرت یعقوبؑ نے جواب میں فرمایا کہ میرے اس غم والم پر مجھے ملامت نہ کرو، میں اپنی پریشانی اور غم کا

شکوہ اپنے اللہ ہی سے کر رہا ہوں، کسی اور سے نہیں کر رہا ہوں۔ رونا دھونا وہ برا ہے جو خدا کے سوا کسی اور کے آگے ہو، اگر بندہ اپنے رب ہی کے آگے روتا ہے تو یہ کوئی برائی نہیں بلکہ یہ بھی عبادت ہے۔ اور یہ نہ سمجھو کہ میں یہ کوئی بے سود کام کر رہا ہوں۔ خدا کے معاملے میں تمہارا تجربہ اور ہے، میرا تجربہ کچھ اور ہے، میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جن سے تم آشنا نہیں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں اب رب کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔

یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَاَخِیْهِ وَلَا تَایْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (۸۷)

جب بات یہاں تک پہنچ گئی کہ حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کے سامنے اپنے دل کا یہ راز کھول دیا کہ وہ یوسفؑ کے باب میں اپنے رب کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں تو صاف لفظوں میں ان سے نہایت پیار کے انداز میں یہ بھی کہہ دیا کہ اے میرے بیٹو جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کی ٹوہ لگاؤ اور خدا کی مشکل کشائی اور اس کی تائید و رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ کی تائید و رحمت سے صرف کافر ہی مایوس ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جی جان کی بازی لگا کر یہ کام کرو گے تو رحمت الٰہی کا ایک ہی جھونکا تمام مشکلیں آسان کر دے گا۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَیْهِ قَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَیْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ (۸۸)

'ضر' کا مفہوم

'ضُرّ' اس تکلیف کو کہتے ہیں جو بھوک اور قحط وغیرہ کے سبب سے پہنچتی ہے۔

'بِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ' ایسی پونجی جس کو کوئی قبول نہ کرے، حقیر، غیر مطلوب۔ اس لفظ کے استعمال سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ وہ قیمت ادا کرنے کے لیے نقد کے بجائے کوئی ایسی جنس لے کر گئے تھے جس کی کوئی خاص مانگ نہیں تھی۔

حضرت یوسفؑ کی خدمت میں دوبارہ حاضری

یہ اندازہ تو یہاں سے نہیں ہوتا کہ باپ کی اپیل کا ان پر کیا اثر پڑا لیکن غلہ کی ضرورت نے انھیں پھر مصر جانے پر مجبور کیا۔ وہاں جب حضرت یوسفؑ کے سامنے ان کی پیشی ہوئی تو انھوں نے بڑے رقت انگیز انداز میں اپنی خستہ حالی اور پریشانی کا ذکر کیا۔ حضرت یوسفؑ کو ان کے سرکاری خطاب 'عزیز' سے مخاطب کیا اور بولے کہ حضور ہم اور ہمارے اہل و عیال قحط کے سبب سے سخت تکلیف میں ہیں، ہم اب کے پونجی بھی نہایت حقیر ہی لے کر آئے ہیں لیکن ہماری درخواست یہ ہے کہ غلہ بھی ہمیں پورا پورا دیجیے اور مزید برآں ہمیں صدقہ بھی عنایت فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ دینے والوں کو جزا عطا فرماتا ہے۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ وَاَخِیْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ (۸۹)

افشائے راز

حضرت یوسفؑ بھائی اور شریف بھائی تھے۔ بھائیوں کی اس بدحالی اور پریشانی اور ان کی اس لجاجت آمیز درخواست بالخصوص درخواست صدقہ نے ان کے دل کو ہلا دیا۔ یہ بڑے طنطنے کے لوگ تھے لیکن اب حالات نے اس طرح ان کے اعصاب ڈھیلے کر دیے تھے کہ صدقہ کے لیے درخواست کرنے میں بھی انھیں عار نہ تھا۔ حضرت

یوسفؑ اس صورتِ حال سے اس درجہ متاثر ہوتے کہ بیگانگی کا جو پردہ ان کے اور ان کے بھائیوں کے درمیان ایک حائل تھا اس کو مزید برقرار رکھنا انھوں نے مناسب نہیں خیال فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ اپنی جہالت کے زمانے میں جو کچھ کر چکے ہو وہ کچھ تمھیں یاد ہے؟ لفظ 'جھل' یہاں برے جذبات سے مغلوبیت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی تشریح ایک سے زائد مقامات میں ہم کر چکے ہیں۔

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ۭ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَھٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۹۰)

حضرت یوسفؑ کی زبان سے لفظ یوسف نکلنا تھا کہ یہ لوگ بول پڑے کہ اچھا! آپ یوسفؑ ہی ہیں! ان کے اس فقرے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اس سے پہلے کی ملاقاتوں میں بھی چہرے، بشرے، انداز، اطوار سے انھیں یہ بات کھٹکتی رہی تھی کہ کہیں یہ یوسف تو نہیں ہیں! لیکن کنعان کے اس کنوئیں میں، جس میں انھوں نے حضرت یوسفؑ کو ڈالا تھا، اور اس تختِ حکومت میں، جس پر حضرت یوسفؑ اب فروکش تھے، اتنا بعد تھا کہ وہ یہ گمان نہیں کر سکتے تھے کہ یوسفؑ وہاں سے یہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ جن لوگوں کی نگاہ صرف ظواہر تک محدود رہتی ہے وہ قدرتِ الٰہی اور رحمتِ ربانی کے ان عجائب کا تصور نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب جب ان کا ذہن اس طرف گیا کہ ان میں بہت سی جھلکیاں یوسفؑ کی ہیں تو اس کو وہ محض واہمہ کی کرشمہ سازی سمجھ کر دل سے نکالتے رہے لیکن اب جب کہ حضرت یوسفؑ کا مذکورہ بالا فقرہ کانوں میں پڑا تو وہ پکار اٹھے کہ اچھا آپ یوسف ہی ہیں!

حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ جی ہاں! میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا۔ جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور اس پر خوبی کے ساتھ ثابت قدم رہتے ہیں تو اللہ ایسے خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ دنیا میں بھی ان کو اپنے فضل سے نوازتا ہے اور آخرت میں بھی اس کا بھرپور صلہ عطا فرمائے گا۔

یہی حقیقت اس ساری سرگزشت کی روح ہے اور ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں کہ اسی کو اس سورہ کے عمود کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ 'احسان' کا لفظ یہاں تقویٰ اور صبر کی بنیادی شرط کی حیثیت سے مذکور ہوا ہے یعنی عند اللہ مقبول تقویٰ اور صبر وہ ہے جس کے اندر 'احسان' کی روح ہو یعنی بندہ اس طرح تقویٰ اور صبر کا حق ادا کرے گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے اور یہ یقین رکھے کہ اگر وہ خدا کو نہیں دیکھ رہا ہے تو خدا تو بہرحال اس کو دیکھ رہا ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِــِٕيْنَ (۹۱)

'ایثار' کے معنی ترجیح اور فضیلت دینے کے ہیں۔

اعترافِ حق — اس مرحلہ میں آکر انھوں نے خدا کی قسم کھا کر اقرار کیا کہ بے شک خدا نے آپ کو ہم پر فضیلت دی اور ہم غلطی پر تھے۔ یعنی ہم نے اس غم و غصہ میں یہ سارے پاپڑ بیلے کہ ہمارے باپ ہمارے مقابل میں کیوں آپ کو

خاص مہر و محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اب خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر کھلی ہوئی فضیلت دے کر ہم پر ہماری غلطی واضح فرما دی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کو جو فضیلت حاصل ہوئی آپ اس کے سزاوار تھے اور ہم نے جو کچھ کیا ہم اس میں غلطی پر تھے۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۹۲)

حضرت یوسفؑ کا عفو و کرم

'تَثْرِيْب' کے معنی کسی کو اس کے کسی قابل ملامت فعل پر ملامت کرنے کے ہیں۔ اگر سچے احساس ندامت کے ساتھ کوئی شخص اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا ہے تو ایک کریم بن کریم اس کو معاف ہی کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس کی معافی کی امید ہوتی ہے اس لیے کہ وہ تمام مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔ حضرت یوسفؑ نے جب یہ محسوس فرما لیا کہ یہ لوگ سچے دل سے اپنی غلطی کے معترف ہیں تو انھوں نے نہایت فیاضی سے ان کو معاف فرما دیا کہ اب آپ لوگوں پر کوئی الزام نہیں اور خدا کے ہاں بھی ان کو معافی کی امید دلائی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہی الفاظ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن قریش کے ان سرغنوں کو خطاب کر کے فرمائے جو برابر آپ کی دشمنی میں سرگرم رہے تھے۔ جب یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے سوال کیا کہ تم جانتے ہو کہ میں تمھارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ وہ بولے کہ آپ شریف بھائی اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں، آپ نے فرمایا کہ میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی، اب تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ تم آزاد ہو۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۹۳)

پیراہن یوسف کی کرامات

جس ضعف بصارت کا سبب غم و الم اور گریہ و زاری ہو، جیسا کہ آیت ۸۴ میں گزر چکا ہے، اس کا واحد علاج یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز سامنے آئے جو نہ صرف اس سارے غم و الم کو دھو کر صاف کر دے بلکہ اس کی لائی ہوئی خوشی رگ رگ میں ایک حیات تازہ دوڑا دے۔ حضرت یوسفؑ کو بنیامین کے ذریعہ سے باپ کا سارا حال معلوم ہو چکا تھا کہ روتے روتے ان کی آنکھیں سفید پڑ چکی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنا کرتا بھائیوں کو دیا کہ اس کو لے جاؤ، میرے باپ کے منہ پر اس کو ڈال دینا، اس سے ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے سامنے زندگی کا سب سے بڑا غم بھی پیراہن یوسف ہی کی شکل میں آیا تھا جب کہ بھائیوں نے اس پر خون لگا کر بوڑھے باپ کے سامنے پیش کیا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا اور اب زندگی کی سب سے بڑی خوشی بھی پیراہن یوسفؑ ہی کی شکل میں نمودار ہونے والی تھی۔

حضرت یوسفؑ نے اپنے جسم سے مس کیا ہوا کرتا ہی اپنی نشانی کے طور پر کیوں بھیجا؟ اور کرتے میں یہ اثر کہاں سے آیا کہ اس سے بصارت عود کر آئے؟ یہ سوالات نہ ہر شخص کے حل کرنے کے ہیں اور نہ اس کا حل ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ان چیزوں کا تعلق جذبات سے ہے اور جذبات بھی ایسے عالی مقام لوگوں کے کہ ایک طرف حضرت یعقوبؑ ہیں، دوسری طرف حضرت یوسفؑ۔ ہم عامی اس طرح کے معاملات میں اس سے

زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ جذبات کی تاثیر و تاثر کے کرشمے ایسی حیرت انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں کہ عقل ان کی توجیہ سے بالکل قاصر رہ جاتی ہے۔

وَاْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِیْنَ بھائیوں کو حضرت یوسفؑ نے یہ ہدایت بھی فرمائی کہ اپنے اہل و عیال سمیت سب یہاں آجاؤ۔ والدین کا ذکر غایت وضاحت کی وجہ سے حذف ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل مقصود تو انہی کو بلانا تھا۔ بقیہ سارے تو ان کے توابع کی حیثیت رکھتے تھے۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (۹۴)

'فَصَلَ فَصُوْلًا' کے معنی کسی جگہ سے چلنے اور نکلنے کے ہیں اور 'تَفْنِیْد' کے معنی ہیں کسی کو خرف اور بے وقوف سمجھ کر اس کی رائے اور بات کو بے وزن اور غلط قرار دینا۔

پیراہن یوسف کی خوشبو

ادھر قافلہ مصر سے روانہ ہوا ادھر حضرت یعقوبؑ نے اپنے گرد و پیش والوں سے فرمایا کہ اگر تم لوگ مجھے خبطی نہ قرار دو تو میں یہ کہوں کہ میں یوسفؑ کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ شدت تو عام حالات میں بھی آدمی کے حواس کی قوت میں بہت اضافہ کر دیتی ہے۔ یہاں تو معاملہ بھی خاص نوعیت کا ہے اور قوت حاسہ بھی حضرت یعقوبؑ جیسے پیغمبر کی ہے۔ اس وجہ سے اس بات پر ذرا تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ حضرت یعقوبؑ نے اتنی دور سے پیراہن یوسفؑ کی خوشبو محسوس کر لی۔ انبیاء کے قویٰ اور حواس کو اپنے قویٰ اور حواس پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ خاص ہوتا ہے۔

فلسفی کو منکر حنانہ است

از حواس انبیاء بیگانہ است

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ (۹۵)

اس پر سننے والوں نے وہی کہا جس کا حضرت یعقوبؑ نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ وہ بولے کہ آپ اب تک اپنے اسی خبط میں مبتلا ہیں جس میں پہلے مبتلا تھے۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۹۶)

'فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ' میں 'اَنْ' سے پہلے ایک فعل محذوف ہے۔ یعنی یہ بات واقع ہوئی کہ خوشخبری دینے والا پہنچا تو یوسفؑ کا کرتا اس نے حضرت یعقوبؑ کے چہرے پر ڈال دیا اور ان کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ انھوں نے فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے۔ یہ اس بات کا حوالہ ہے جو پیچھے آیت ۸۶ میں گزر چکی ہے۔ جو بات انھوں نے فرمائی تھی جب وہ واقعہ کی شکل میں ظہور میں آگئی تو انھوں نے اس پر اظہار مسرت بھی فرمایا اور بیٹوں کو یہ تعلیم بھی دی کہ وہ صرف ظاہر کے غلام بن کر زندگی نہ گزاریں بلکہ اس ظاہر کے اندر خدا کے مخفی ہاتھوں کی جو کار فرمائیاں ہیں ان پر بھی

ایمان رکھیں۔ اس کے بغیر خدا پر ایمان و توکل کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ (۹۷)

باپ سے استغفار کی درخواست

یہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد بیٹوں کو اپنی نادانیوں کا احساس ہوا اور انھوں نے جس طرح حضرت یوسفؑ کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، جس کا ذکر آیت ۹۱ میں گزر چکا ہے، اسی طرح باپ کے سامنے بھی غلطی کا اعتراف کیا اور ان سے درخواست کی کہ آپ ہمارے گناہوں کی معافی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۹۸)

حضرت یعقوبؑ نے ان کی یہ استدعا قبول فرمائی اور ان سے وعدہ کیا کہ میں عنقریب تمھارے لیے اپنے رب سے گناہوں کی معافی کے لیے دعا کروں گا۔ 'سوف' کا لفظ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے ان کے لیے خاص اہتمام کے ساتھ، خاص وقت میں، دعا کا وعدہ فرمایا۔ یہ کہہ کر ان کو ٹالنے کی کوشش نہیں کی کہ جاؤ، اللہ تمھیں معاف فرمائے۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ آدمی کا دل اگر خود اپنے گناہوں پر پشیمان ہو تو اس کو صالحین سے دعا کی درخواست بھی کرنی چاہیے اور اس کے حق میں صالحین کی دعا قبول بھی ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یوں تو بندہ ہر وقت اپنے رب سے دعا کر سکتا ہے لیکن خاص اہتمام، خاص وقت اور خاص جگہ بھی اس کی قبولیت کے معاملے میں ایک مؤثر چیز ہے۔

ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰي يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (۹۹)

حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضری

یہاں قرینہ کی موجودگی کے سبب سے اتنی بات محذوف ہے کہ یہ لوگ حضرت یوسفؑ کے ارشاد کی تعمیل میں اپنے والدین اور اہل و عیال سمیت مصر پہنچے۔ مصر پہنچ کر جب حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے اپنے والدین کو خاص اپنے پاس جگہ دی اور ان سب لوگوں کا خیر مقدم کیا۔ 'ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ' خیر مقدم کا جملہ ہے یعنی مصر میں داخل ہوجیے، یہ داخلہ انشاءاللہ امن و اطمینان کا موجب ہوگا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے شہر سے باہر نکل کر ان لوگوں کا خیر مقدم کیا اور اس شان سے ان لوگوں کو شہر میں لائے کہ ایک جشن کی صورت پیدا ہو گئی۔

'اَبَوَيْهِ'، کا لفظ یہاں علیٰ سبیل التغلیب استعمال ہوا ہے اس لیے کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی پرورش سوتیلی ماں نے کی تھی جو ان کی حقیقی خالہ بھی تھیں۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَي الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَاۗءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۱۰۰)

'عَرْش' سے مراد یہاں تختِ شاہی نہیں بلکہ وہ تخت ہے جس پر حضرت یوسفؑ فصلِ مقدمات وغیرہ کے لیے فروکش ہوا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے اس دور میں وزراء اور اعلیٰ حکام تخت ہی پر بیٹھتے تھے۔

'خَرَّ یَخِرُّ' کے معنی اوپر سے نیچے کی طرف گرنے اور 'سُجُوْد' کے معنی فرماں بردارانہ جھکنے کے ہیں پیشانی زمین پر ٹیکنا اس کے لیے لازم نہیں بلکہ یہ اس کی تکمیلی صورت ہے جب اس کے ساتھ 'خَرَّ' کا لفظ آئے تو اس کے معنی بے اختیارانہ جھک پڑنے کے ہوں گے۔ عام اس سے کہ یہ جھک پڑنا صرف جھک پڑنے کی حد تک ہو یا پیشانی زمین پر ٹیک دینے کی حد تک۔ جس عہد کا یہ واقعہ ہے تورات وغیرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بڑوں کی تعظیم کے لیے یہ طریقہ معروف رہا ہے لیکن اس کی صورت زمین پر پیشانی ٹیک دینے کی نہیں بلکہ جھک پڑنے کی تھی۔ اور اگر کوئی شخص اس سجود سے اصطلاحی سجدہ ہی مراد لے جب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ سجدہ بجائے خود شرک نہیں بلکہ شرک کے اشباہ و توالب میں سے ہے اور یہ اشباہ و توالب حتمی طور پر آخری اور کامل دین یعنی اسلام میں حرام ہوئے۔

حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کو تعظیماً تخت پر جگہ دی بقیہ لوگ حسبِ دستور عام لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھے ہوں گے۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے حضرت یوسفؑ نمودار ہوئے اور قاعدے کے مطابق ان کے خدم و حشم ان کی تعظیم کے لیے جھکے تو ماحول سے متاثر ہو کر یہ لوگ بھی بے اختیارانہ ان کی تعظیم کے لیے جھک پڑے۔

خواب کی تعبیر

'وَقَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا' 'یٰۤاَبَتِ' میں 'ت' 'ی' کی قائم مقام ہے۔ حضرت یوسفؑ نے یہ منظر دیکھا تو انھیں اپنا وہ خواب یاد آگیا جو انھوں نے پہلے دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے والد ماجد کو مخاطب کر کے فرمایا کہ والد ماجد! یہ ہے میرے اس خواب کی تعبیر جو میں نے پہلے دیکھا تھا، میرے رب نے اس کو سچ کر دکھایا۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اپنی جیل سے رہائی اور ایک مدت کی جدائی کے بعد ماں باپ اور بھائیوں کی یکجائی پر اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

'اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ' یعنی میرا رب جس کام کو کرنا چاہتا ہے اس کے لیے اپنے علم اور اپنی حکمت سے ایسی باریک راہیں نکال لیتا ہے کہ اس کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ حضرت یوسفؑ کی یہ پوری سرگزشت اس حقیقت کی ایک عظیم شہادت ہے۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (۱۰۱)

حضرت یوسفؑ کا دل یہ منظر دیکھ کر خدا کی حمد و سپاس میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہیں کہ حکومت بھی تو ہی نے مجھے عطا فرمائی اور خوابوں کی تعبیر کا علم بھی تو ہی نے بخشا، اے آسمانوں اور زمین کے خالق دنیا اور آخرت دونوں میں میرا کارساز اور مددگار تو ہی ہے۔ مجھے اسلام پر وفات دینا اور مجھے صالحین کے زمرے میں داخل کرنا۔

۱۰- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰۲-۱۱۱

خاتمۂ سورہ

اب یہ خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے آپ کو تسلی دی گئی ہے اور ساتھ ہی قریش کو دھمکی ہے کہ اگر انھوں نے قوموں کی تاریخ سے سبق نہ لیا تو اس انجام سے دوچار رہنے کے لیے تیار رہیں جس سے پچھلی قومیں دوچار ہو چکی ہیں ـــــ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۰۲-۱۱۱

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا
اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾
ع ۱۱ ۵ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ
اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾
وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ
تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ
وقف النبی علیہ السلام لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ
مَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا
مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي
الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ
خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ حَتّٰٓي اِذَا اسْتَيْــــَٔسَ الرُّسُلُ وَ
ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا
عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ
مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ
ع ۱۲ ۶ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

ترجمۂ آیات ۱۰۲ - ۱۱۱

یہ سرگزشت غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم تمھاری طرف وحی کر رہے ہیں اور تم ان کے پاس اس وقت موجود نہیں تھے جب کہ انھوں نے اپنی رائے پختہ کی اور وہ سازش کر رہے تھے۔ ۱۰۲

اور ان لوگوں میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں خواہ تم ان کے ایمان کی کتنی ہی حرص کرو۔ اور تم اس پر ان سے کوئی معاوضہ تو نہیں طلب کر رہے ہو۔ یہ تو بس دنیا والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔ اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ گزرتے ہیں تو ان سے منہ موڑے ہوئے اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس طرح کہ ساتھ ہی اس کے شریک بھی ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ کیا یہ لوگ اس بات سے نچنت ہیں کہ ان پر عذاب الٰہی کی کوئی آفت یا قیامت ہی اچانک آ دھمکے اور وہ اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ ۱۰۳-۱۰۷

کہہ دو، یہ میری راہ ہے۔ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت کے ساتھ، میں بھی اور وہ لوگ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ ۱۰۸

اور ہم نے تم سے پہلے بھی نہیں بھیجے مگر آدمی ہی انہی بستیوں والوں میں سے، ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے اور دار آخرت ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا تو کیا تم سمجھتے نہیں۔ یہاں تک کہ جب یہ نوبت آ گئی کہ رسول اپنی قوموں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے یہ گمان کیا کہ ان کو جھوٹے ڈراوے سنائے گئے تو ان کو ہماری مدد آ پہنچی۔ پس نجات ملی ان کو جن کو ہم نے چاہا اور مجرموں سے ہمارے عذاب کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ ان کی سرگزشتوں میں اہل عقل کے لیے بڑا سامان عبرت ہے۔ یہ کوئی گھڑی ہوئی چیز نہیں بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے اور تفصیل

ہے ہر چیز کی اور ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔ ۱۰۹-۱۱۱

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ (۱۰۲)

'ذٰلِكَ' کا اشارہ اسی سرگزشت کی طرف ہے جو سنائی گئی۔ فرمایا کہ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے یعنی یہ تمہارے علم و اطلاع سے بالکل باہر کی چیز ہے، نہ تمہیں اس کا کوئی علم تھا اور نہ اس کے معلوم کرنے کا تمہارے پاس کوئی ذریعہ ہی تھا۔ یہ صرف اللہ کا فضل ہے کہ اس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے تمہیں آگاہ فرمایا، ورنہ تم کہیں اس وقت یوسفؑ کے بھائیوں کے پاس موجود تو تھے نہیں جب وہ یوسفؑ کے خلاف سازش کر رہے تھے، کسی کی رائے کچھ تھی کسی کی کچھ، بالآخر اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا کہ ان کو کسی کنوئیں میں ڈال دیا جائے۔

یہ امر بیاں ملحوظ رہے کہ تورات میں حضرت یوسفؑ کا قصہ اگر ہے بھی تو آنحضرت صلعم کے لیے اس سے واقف ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اس لیے کہ آپ اُمّی تھے۔ پھر تورات کے بیان اور قرآن کے بیان میں قدم قدم پر اختلاف ہے اور ان تمام اختلافات پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن کا بیان بالکل عقل و فطرت کے مطابق ہے اس لیے کہ یہ براہِ راست وحی الٰہی پر مبنی ہے۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۰۳)

منکرین کے اعراض کی اصل علت

یعنی طبیعتوں میں اگر حق کو قبول کرنے کی رغبت اور صلاحیت ہو تو قرآن کے وحی الٰہی ثابت کر دینے کے لیے یہی ایک چیز کافی ہے۔ یہود و نصاریٰ کے لیے بھی اس میں حجت ہے اور قریش کے لیے بھی، لیکن ان لوگوں کے دلوں میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس وجہ سے خواہ تم ان کے ایمان و ہدایت کی طمع میں کچھ ہی کر ڈالو ان کی اکثریت ایمان سے محروم ہی رہے گی۔ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کے سامنے قرآن کا کتاب الٰہی ہونا واضح نہیں ہے بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ان کے اندر حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی مردہ ہو چکی ہے۔

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۰۴)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ اگر یہ لوگ نہیں مانتے تو ان کے پیچھے آخر اپنے آپ کو اتنا پریشان کیوں رکھو۔ تم یہ نعمت مفت بانٹ رہے تھے، اس کا کوئی معاوضہ تو ان سے طلب نہیں کر رہے تھے کہ انھوں نے اس کو قبول نہ کیا تو اس سے تمہارے معاوضے میں کوئی کمی ہو جائے گی۔ محرومی ہے تو ان کی نہ کہ تمہاری۔ یہ قرآن تو بس خلق کے لیے ایک یاد دہانی ہے، جو اس کو قبول کرے گا اس کا فائدہ اسی کے لیے ہے، جو نہ قبول کرے گا اس کا خمیازہ وہ خود بھگتے گا۔ تمہاری ذمہ داری بس لوگوں تک اس کو پہنچا دینے کی ہے، اس کے بعد تم سبکدوش ہو۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (۱۰۵)

نشانیوں کے مطالبہ کا جواب

یعنی ان کے ایمان نہ لانے میں اس چیز کو بھی کوئی دخل نہیں ہے کہ ان کے طلب کے مطابق ان کو کوئی نشانی نہیں دکھائی جاتی۔ اصل یہ ہے کہ نشانیوں کو دیکھنے اور ان سے عبرت حاصل کرنے والی آنکھیں ہی ان کے پاس موجود نہیں ہیں، ورنہ آسمان و زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ گزرتے ہیں، اگر ان کے پاس آنکھیں ہوتیں تو یہ ان کو دیکھتے اور ان سے عبرت حاصل کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی نہ قصور تمہارا ہے اور نہ قرآن کا بلکہ اصل بیماری خود ان کے اپنے اندر ہے کہ وہ آنکھیں کھول کر کسی چیز کو دیکھنے ہی کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن جب ان کو یہ خبر دیتا تھا کہ اگر وہ رسول پر ایمان نہ لائے تو ان پر اللہ کا عذاب آجائے گا تو اس کا جواب وہ یہ دیتے تھے کہ آخر اس عذاب کی کوئی نشانی ہمیں دکھا کیوں نہیں دی جاتی۔ یہ اسی کا جواب ہے کہ اگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو ان کے گرد و پیش میں اس کی بہت سی نشانیاں ہیں لیکن یہ تو اسی کو نشانی سمجھتے ہیں جو ان پر آدھمکے۔

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۰۶)

ایمان نہ لانے کی ایک اور وجہ

یہ ان کے قرآن پر ایمان نہ لانے کی ایک اور بڑی وجہ واضح کی گئی ہے کہ ان میں جو اللہ کو مانتے بھی ہیں وہ اللہ کے ساتھ بہت سے شرکاء اور شفعاء کو بھی مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر اللہ ان کی کسی بات پر گرفت کرنا چاہے گا بھی تو یہ شرکاء اور شفعاء ان کو خدا سے بچا لیں گے۔ اس ضلالت کی موجودگی میں قرآن کے ڈراوے ان پر کیا اثر کر سکتے ہیں۔

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۰۷)

یہ سوال انذار و تنبیہ کے لیے ہے کہ کیا وہ اپنے شرکاء اور شفعاء پر اعتماد کر کے اس بات سے نچنت ہو بیٹھے ہیں کہ ان پر عذاب الٰہی کی کوئی ایسی آفت آئے جو ان سب کو اپنے لپیٹ میں لے لے یا قیامت ہی اچانک آدھمکے اور ان کو اس کی کوئی خبر بھی نہ ہو؟ مطلب یہ کہ اگر یہ چیز ہے تو بس ان کی شامت ہی آئی ہوئی ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣعَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۰۸)

شرک سے اعلان براءت

ان کی تمام بیماریوں کی جڑ یہ شرک ہی تھا اس وجہ سے جب اس کا ذکر آگیا تو پیغمبر کی زبان سے پوری وضاحت کے ساتھ اس سے براءت کا اعلان کرا دیا گیا۔ فرمایا ان سے کہہ دو کہ میری راہ یہ ہے: میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت کے ساتھ، میں بھی اور وہ لوگ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے یعنی جس طرح میں اللہ ہی کی طرف بلاتا ہوں اسی طرح میرے پیرو بھی اللہ ہی کی طرف بلاتے ہیں اور ہم سب اس بات میں حجت و بصیرت

اور دلیل و برہان کی پوری روشنی اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس معاملے میں ہم سے کوئی یہ توقع نہ رکھے کہ ہم کسی قسم کی نرمی برتنے کے لیے تیار ہوں گے یا کوئی تذبذب گوارا کریں گے۔ اللہ شرک کی تمام آلائشوں سے پاک اور منزہ ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ یعنی ان سے اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰۹)

آدمی میں سے رسول بنانے پر اعتراض

یہ ان کے ایک اور اعتراض کو، جو وہ ایمان نہ لانے کے بہانے کے طور پر پیش کیا کرتے تھے، رفع فرمایا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم اپنے ہی اندر کے ایک آدمی کو، جو ہمارے ہی اندر پیدا ہوا، ہمارے ہی اندر رہا سہا اور جوان ہوا، اللہ کا رسول مان لیں۔ اگر اللہ کو کوئی رسول ہی بھیجنا ہوتا تو کسی برتر مخلوق یعنی کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے اس کا جواب دیا کہ تم سے پہلے بھی جو رسول بھیجے بلا استثنا وہ سب آدمیوں ہی میں سے بھیجے، فرشتوں یا جنات میں سے نہیں بھیجے، اور انہی بستیوں والوں میں سے بھیجے جن کو دعوت دینے پر وہ مامور کیے گئے، باہر والوں سے نہیں بھیجے۔ اگر ان کو کوئی امتیاز حاصل تھا تو یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی برتر یا انوکھی یا اجنبی مخلوق تھے بلکہ یہ تھا کہ وہ خدا کی وحی سے مشرف تھے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ..... الآیۃ یعنی اگر اپنے ہی ملک میں وہ آنکھیں کھول کر چلے پھرے ہوتے تو انھیں مذکورہ بالا حقیقت کا بھی ثبوت مل جاتا اور عاد، ثمود، مدین وغیرہ کے آثار سے یہ بات بھی ان پر واضح ہو جاتی کہ جن لوگوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی ان کا انجام کیا ہوا اور جو لوگ ان پر ایمان لائے ان کو اس کا کیا صلہ ملا اور اہل ایمان کے لیے صلہ کی اصلی جگہ تو آخرت ہے جو اس سے کہیں بڑھ کر ہے تو کیا تم لوگ سوچتے نہیں!

حَتّٰٓي اِذَا اسْتَيْــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۱۰)

عذاب الٰہی کے بارے میں سنت الٰہی

اب یہ کفار کی جلد بازی کے جواب میں کہ اگر پیغمبر ہم کو عذاب سے ڈراتے ہیں تو یہ عذاب آ کیوں نہیں جاتا، اللہ تعالیٰ نے اس باب میں اپنی سنت کی وضاحت فرما دی کہ اللہ عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں پر اپنی حجت پوری کرتا ہے۔ عذاب اس وقت آتا ہے جب اللہ کے رسول اپنی قوموں کے ایمان سے مایوس ہو جاتے ہیں اور ان کی قوم کے لوگ عذاب کی تاخیر کے سبب سے یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ان پر جھوٹ موٹ عذاب کی دھونس جمائی گئی تھی۔ فرمایا کہ اس وقت ہمارے رسولوں کے لیے ہماری مدد ظہور میں آتی ہے تو ہم جس کو چاہتے ہیں اس کو نجات ملتی ہے اور مجرموں سے ہمارے عذاب کو کوئی طاقت ٹال نہیں سکتی۔

لَقَدۡ كَانَ فِىۡ قَصَصِهِمۡ عِبۡرَةٌ لِّاُولِى الۡاَلۡبَابِ‌ؕ مَا كَانَ حَدِيۡثًا يُّفۡتَـرٰى وَلٰـكِنۡ تَصۡدِيۡقَ الَّذِىۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَتَفۡصِيۡلَ كُلِّ شَىۡءٍ وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ (۱۱۱)

قرآن کی اصلی حقیقت

یعنی پچھلے انبیاء اور ان کی قوموں کی سرگزشتوں میں اہلِ عقل کے لیے بڑا سامان عبرت موجود ہے بشرطیکہ یہ عقل سے کام لیں اور ان سرگزشتوں کو صرف دوسروں کی حکایت سمجھ کر نہ سنیں بلکہ ان سے خود اپنی زندگی کو درست کرنے کے لیے سبق حاصل کریں۔ یہ قرآن کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے بلکہ جو پیشینگوئیاں اور جو حقائق آسمانی کتابوں میں پہلے سے موجود ہیں یہ ان کی تصدیق، ہر متعلق چیز کی تفصیل، آغاز کے اعتبار سے رہنمائی اور انجام کے اعتبار سے رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس بے مایہ کو اس سورہ کی تفسیر میں لکھنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعۡوٰنَاۤ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ۔

لاہور

۱۷ر جون ۱۹۷۰ء

۲۱ر ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ

تدبرِ قرآن

١٣

الرعد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود

یہ سورہ سورۂ یوسفؑ کے توام اور اس کے جوڑے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ قرآن کے نزول نے حق و باطل کے درمیان جو کشمکش برپا کردی تھی، انجام کار کی کامیابی اس میں جس گروہ کو حاصل ہونے والی تھی اس کو اس میں نمایاں فرمایا ہے۔ یہی حقیقت سورۂ یوسف میں بھی واضح کی گئی ہے، البتہ دونوں سورتوں میں طریق استدلال الگ الگ ہے۔ سورۂ یوسف میں حضرت یوسف کی زندگی کے حالات و واقعات سے اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے اور اس سورہ میں عقل و فطرت کے دلائل سے۔ آیات ۱۷-۲۲ سے اس سورہ کے عمود پر روشنی پڑتی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

یہ سورہ اپنے مطالب کے اعتبار سے تمام تر مکی ہے۔ بعض مصاحف میں اس پر مدنی لکھا گیا ہے، جس کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمارے نزدیک پوری سورہ کا مدنی ہونا تو الگ رہا اس کی کوئی ایک آیت بھی مدنی نہیں ہے۔

اب ہم اختصار کے ساتھ سورہ کے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں تاکہ پوری سورہ پر ایک اجمالی نظر پڑ جائے۔

(۱) تمہید جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں، ہوائی باتیں نہیں ہیں، ان کی ہر بات ایک حقیقت ہے اور جن باتوں کی یہ خبر دے رہی ہیں وہ سب پوری ہو کر رہیں گی لیکن اکثر لوگ اپنی ضد پر اڑے ہی رہیں گے، اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔

(۲-۴) کائنات کی ان نشانیوں کی طرف اشارہ جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ پورا کارخانہ ایک ہی مدبر کی تدبیر و حکمت سے چل رہا ہے۔ اس میں ربوبیت کا وسیع نظام ہے جو اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اس کو بنانے والے نے کوئی کھیل تماشا نہیں بنایا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم مقصد ہے جو ظہور میں آ کے رہے گا۔ اس کے ہر گوشہ میں کثرت کے اندر وحدت اور اختلاف کے اندر سازگاری کی ایسی نشانیاں موجود ہیں جو صاف شہادت دے رہی ہیں کہ اس پورے کارخانہ پر ایک ہی خالق و مالک کا ارادہ اور تصرف کارفرما ہے۔

(۵-۶) منکرین قیامت کے اس تعجب پر تعجب کہ وہ مر جانے اور سڑ گل جانے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو نہایت عجیب بات سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ تعجب درحقیقت خدا کے انکار کے ہم معنی ہے۔ ان لوگوں کی گردنوں میں

طوق پڑے ہوئے ہیں۔ نہ یہ آسمان کی نشانیاں دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں اٹھا سکتے ہیں اور نہ یہ زمین کی نشانیاں دیکھنے کے لیے ان کو جھکا سکتے ہیں۔ یہ تو بہ سے پہلے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوتے ہیں حالانکہ تاریخ کے اندر ان کے لیے کافی سبق موجود ہے۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی سرکشی کے باوجود مہلت دیتا ہے لیکن وہ سخت پاداش والا بھی ہے، جب وہ پکڑے گا تو کوئی اس کی پکڑ سے نہ بچ سکے گا۔

(۷-۱۱) کفار کی طرف سے کسی نشانیِ عذاب کا مطالبہ اور اس کا جواب۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی کہ تم پر ذمہ داری صرف لوگوں کو عذاب سے ہوشیار کر دینے کی ہے، عذاب کا لانا یا اس کا وقت مقرر کرنا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قوم کی طرف انذار اور بشارت کے لیے اپنا ایک رسول بھیجتا ہے۔ اگر قوم اس کی تکذیب کر دیتی ہے تو وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ عذاب کب اور کس شکل میں آئے گا تو اس کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ ایک حاملہ یہ تو جانتی ہے کہ اس کے پیٹ میں بچہ ہے اور وہ اس کو جنے گی لیکن اس بات کا علم صرف اللہ ہی کو ہے وہ کب جنے گی اور کیا جنے گی۔

لوگوں کو مخاطب کر کے یہ دھمکی کہ تم میں سے ایک ایک کی ہر بات، خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ اور ہر شخص، خواہ وہ شب کے پردوں میں چھپا ہوا ہو یا روز روشن میں معروفِ عمل ہو، اللہ کے علم میں ہے۔ اللہ کے مقرر کیے ہوئے فرشتے اس کی نگرانی کر رہے ہیں، وہ ان کو جب چاہے گا اور جہاں سے چاہے گا پکڑ لے گا۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اپنی نظرِ عنایت سے محروم نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنی روش بگاڑ نہ لے۔ ہاں جب قوم اپنی روش بگاڑ لیتی ہے تو اللہ کی طرف سے اس پر وہ عذاب آتا ہے جس کو کوئی بھی دفع نہیں کر سکتا۔

(۱۲-۱۳) عذاب کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ جو آئے دن لوگوں کے مشاہدے میں آتی رہتی ہیں۔ مثلاً بجلی اور کڑک دعوتِ ایمانی۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے، ایک کڑک سے سب کو فنا کر دے۔ اس کی طاقت بے پناہ ہے۔

(۱۴-۱۶) خدا کے سوا کسی دوسرے کو پکارنا سراب کو پانی سمجھ کر اس کے پیچھے بھاگنا ہے۔ یہ خیالی شرکاء و شفعاء کہیں کام آنے والے نہیں ہیں۔ ان کو پکارنا محض صدا بصحرا ہے۔ اس کائنات میں ہر چیز اپنے وجود سے خدا کی توحید کی شہادت دے رہی ہے۔ جن کی گردنیں خدا سے اکڑی ہوتی رہتی ہیں ان کے جسموں کا بھی سایہ خدا ہی کے آگے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ ان کو پکارنے سے کچھ حاصل نہیں جو خود اپنے لیے کسی نفع و ضرر پر کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ شرک خدا کے عدل و حکمت کی نفی ہے۔ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہ ایک یکہ و تنہا سب کو اپنے کنٹرول میں رکھنے والا ہے۔

(۱۷) اس کائنات کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس کا خالق و صانع ہر گز شر میں نافع کو باقی رکھتا اور غیر نافع کو چھانٹتا رہتا ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ وہ حق و باطل کی اس کشمکش میں بھی جو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت اور قرآن کے نزول سے برپا ہوتی ہے باطل کو مٹا دے گا اور حق

کا بول بالا کرے گا۔

(۱۸-۲۵) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرکے اللہ کے راستہ پر چل کھڑے ہونے والوں کے لیے انجام کار کی کامیابی کی بشارت اور اس دعوت کی مخالفت و مزاحمت کرنے والوں پر اللہ کی لعنت۔

(۲۶) اس شبہ کا جواب کہ اگر اللہ کی تمام عنایتوں کے حق دار صرف اہل ایمان ہی ہیں تو وہ لوگ کیوں رزق و فضل کے مالک بنے بیٹھے ہیں جو رات دن اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت و مزاحمت میں سرگرم ہیں۔

(۲۷-۳۲) کفار کی طرف سے کسی معجزہ کا مطالبہ اور اس کا جواب۔ دلوں کو مطمئن کرنے والی چیز اللہ اور اس کی صفات کی یاد داشت اور اس میں غور و فکر ہے نہ کہ کوئی معجزہ۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تمھیں وہی کچھ پیش آ رہا ہے جو تم سے پہلے نبیوں اور رسولوں کو پیش آ چکا ہے تو تم خدا کی وحی کی ہوئی کتاب ان کو سنا دو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ مسلمانوں کو یہ تسلی کہ یہ خیال کرو کہ اگر ان کو کوئی معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مان لیں گے۔ اگر کوئی ایسا قرآن بھی ان کے لیے اتار دیا جائے جس سے پہاڑ چلنے لگیں، زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے یا مردے بولنے لگ جائیں جب بھی یہ اپنی ہٹ سے باز آنے والے نہیں ہیں۔ اہل ایمان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ نے ایمان کے معاملے میں جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے۔ اگر وہ جبر کو پسند کرتا تو سب کو ہدایت کے راستہ پر چلا دیتا۔ عذاب کی نشانیاں ان پر یا ان کے قرب و جوار میں ظاہر ہوتی رہیں گی یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ کن عذاب آ جائے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ جس طرح یہ لوگ تمھارا مذاق اڑا رہے ہیں اسی طرح تم سے پہلے آنے والے رسولوں کا بھی مذاق اڑایا گیا، بالآخر خدا کا عذاب نمودار ہوا اور ان مذاق اڑانے والوں کا فیصلہ کر دیا گیا۔

(۳۳-۳۵) شرک اور شرکاء کی نفی۔ شرکاء و شفعاء کا کوئی وجود نہیں۔ یہ محض من گھڑت باتیں ہیں۔ اس فریب نفس میں مبتلا ہو کر جنھوں نے اللہ کے راستہ سے منہ موڑا وہ اس دنیا میں بھی خدا کے عذاب سے دوچار ہوں گے اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں سخت ہوگا۔ کوئی شریک و شفیع وہاں ان کو بچانے کے لیے نہیں اٹھے گا۔ جنت کی ابدی نعمتیں صرف ان لوگوں کا حصہ ہوں گی جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

(۳۶-۳۷) اہل کتاب کے دو گروہوں کا حوالہ جن میں سے ایک حق پر قائم تھا اس وجہ سے اس نے قرآن کا پوری خوش دلی سے خیر مقدم کیا اور دوسرا اپنی ایجاد کردہ بدعات میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کا مخالف بن گیا۔ ان کے سامنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلان حق اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تنبیہ کہ حق کے واضح ہو چکنے کے بعد اگر تم نے ان کی بدعات کی پیروی کی تو تمھیں خدا کی پکڑ سے کوئی نہ بچا سکے گا۔

(۳۸-۴۳) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کے اعتراضات و مطالبات کے مقابل میں تسلی کہ تم سے پہلے جو رسول آئے وہ بھی کوئی فرشتے یا آسمانی مخلوق نہیں تھے بلکہ تمھاری ہی طرح بشر اور بیویاں رکھنے والے لوگ تھے۔ انھوں نے جو معجزے بھی دکھائے وہ اللہ کے حکم سے دکھائے، اپنے اختیار سے نہیں دکھائے۔ تم ان لوگوں کو

جن باتوں سے ڈرا رہے ہو ہو سکتا ہے کہ ہم تمھاری زندگی ہی میں ان میں سے بعض چیزوں کو دکھا دیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تمھیں وفات دیں اور اس کے بعد ان سے مواخذہ کریں۔ یہ لوگ اگر آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انھیں یہ چیز نظر آسکتی ہے کہ ہم ان کے اطراف سے بالتدریج ان کی طرف بڑھ رہے ہیں اور عنقریب ان کو اپنے گھیرے میں لیا چاہتے ہیں۔ اس وقت انھیں پتہ چل جائے گا کہ انجام کار کی کامیابی کس کا حصہ ہے۔ اگر یہ لوگ تمھیں رسول نہیں مانتے تو تم ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے اللہ اور اللہ کے وہ بندے کافی ہیں جن کے پاس اللہ کی کتاب کا علم ہے۔

سُوْرَةُ الرَّعْدِ (۱۳)

مَكِّيَّةٌ ———————— اٰيَاتُهَا ۴۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۳

الٓمّٓرٰ ۣ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ۭ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱) اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ
عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَي الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ
يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّكُمْ
تُوْقِنُوْنَ (۲) وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ۭ وَ
مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳) وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ
مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَاۗءٍ وَّاحِدٍ ۣ
وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰي بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّعْقِلُوْنَ (۴) وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ
خَلْقٍ جَدِيْدٍ ڛ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ
اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۵) وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ

بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۭ وَاِنَّ رَبَّكَ
لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ (۶) وَ
يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ
ع وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۷) اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ
الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۭ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ (۸) عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ
الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (۹) سَوَاۗءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ
جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ (۱۰) لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ
مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ
مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا
مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ (۱۱) هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ
خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۲) وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ
بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا
مَنْ يَّشَاۗءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ (۱۳)

ترجمۂ آیات ۱-۱۳

یہ الف، لام، میم، را ہے۔ یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں اور جو چیز تمھاری طرف تمھارے خداوند کی طرف سے اتاری گئی ہے حق ہے لیکن اکثر لوگ نہیں مان رہے ہیں۔ ۱

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ایسے ستونوں کے جو تمھیں نظر آئیں۔ پھر وہ اپنے عرش پر متمکن ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ان میں سے ہر ایک ایک وقت معین کے لیے گردش کرتا ہے۔ وہی کائنات کا انتظام فرماتا ہے اور اپنی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم اپنے

رب کی ملاقات کا یقین کرو۔ ۲

اور وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر قسم کے پھلوں کی دو دو قسمیں اس میں پیدا کیں۔ وہ رات کو دن پر اڑھا دیتا ہے۔ بے شک ان چیزوں کے اندر ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور کریں ۳

اور زمین میں پاس پاس کے قطعے ہیں، انگوروں کے باغ ہیں، کھیتی ہے اور کھجوریں ہیں۔ جڑواں بھی ہیں اور اکہرے بھی۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں لیکن ہم پیداوار میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔ ۴

اور اگر تم تعجب کرو تو تعجب کے قابل ان کی یہ بات ہے کہ، کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو ہم از سر نو وجود میں آئیں گے! یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کا انکار کیا، یہی لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوتے ہیں اور یہی لوگ اہل دوزخ ہیں، یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۵

اور یہ لوگ خیر سے پہلے شر کے لیے تم سے جلدی مچائے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان سے پہلے عقوبت کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ تمہارا رب لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود ان سے درگزر کرنے والا بھی ہے اور تیرا رب سخت سزا دینے والا بھی ہے۔ ۶

اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ تم تو بس ایک آگاہ کر دینے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے ہر مادہ کے حمل کو اور جو کچھ رحموں میں گھٹتا اور بڑھتا ہے اس کو بھی اور ہر چیز اس کے ہاں ایک اندازہ کے مطابق ہے۔ وہ غائب و حاضر سب کا جاننے والا، عظیم اور عالی شان ہے۔ اس کے علم میں یکساں ہیں تم میں سے وہ جو بات کو چپکے سے کہیں اور وہ جو بلند آواز سے کہیں اور جو شب کی تاریکی میں

پیچھے ہوئے ہوں اور جو دن کی روشنی میں نقل و حرکت کر رہے ہوں سب پر ان کے آگے اور پیچھے سے امر الٰہی کے موکل لگے رہتے ہیں جو باری باری سے ان کی نگرانی کرتے ہیں۔ اللہ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کرے اور جب اللہ کسی قوم پر کوئی آفت لانے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی اور ان کا اس کے مقابل میں کوئی بھی مددگار نہیں بن سکتا۔ ۷-۱۱

وہی دکھاتا ہے تمہیں بجلی جو خوف بھی پیدا کرتی ہے اور امید بھی اور ابھارتا ہے بوجھل بادلوں کو اور بجلی کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے اور فرشتے بھی اس کے ڈر سے اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ بھیجتا ہے بجلی کے کڑکے اور ان کو نازل کر دیتا ہے جن پر چاہتا ہے اور وہ خدا کے باب میں جھگڑتے ہی ہوتے ہیں اور وہ بڑی ہی زبردست قوت والا ہے۔ ۱۱-۱۳

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ۭ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱)

حروف مقطعات پر تفصیلی بحث بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ سورتوں کے نام ہیں۔ یہاں مبتدا محذوف ہے یعنی ھٰذِہٖ الٓمّٓرٰ، یہ الٓمّٓرٰ ہے۔

اظہار احسان اور انذار بیک وقت دونوں

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ لفظ اَلْكِتٰبُ پر تفصیلی بحث بقرہ کی پہلی آیات کے تحت گزر چکی ہے۔ اس سے مراد وہ موعود و منتظر کتاب الٰہی ہے جس کو آخری صحیفۂ ہدایت کی حیثیت سے اتارنے کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے وعدہ فرمایا تھا۔ تِلْكَ کا اشارہ الٓمّٓرٰ کی طرف ہے۔ یعنی یہ سورہ موعود و منتظر کتاب الٰہی کی آیات پر مشتمل ہے۔ اس فقرے میں بیک وقت اظہار احسان بھی ہے اور دھمکی بھی۔ احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ عظیم نعمت، جس کا اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے وعدہ فرمایا تھا، اتار دی ہے۔ اب یہ لوگوں کا فرض ہے کہ اس کی صدق دل سے قدر کریں اور اس کی برکتوں سے متمتع ہوں۔ دھمکی کا پہلو یہ ہے کہ یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں تو جو لوگ ان کی قدر کرنے کے بجائے ان کا مذاق اڑائیں گے اور ان

کی مخالفت میں اپنا زور صرف کریں گے وہ خود سوچ لیں کہ وہ اپنے لیے کس شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔

وَالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ الْحَقُّ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔

پیغمبر صلعم کو تسلی

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ کتاب جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کی ایک ایک بات حق ہے۔ اس کا ہر دعویٰ ثابت، مدلل اور مبرہن ہے اور اس کی ہر چیز شدنی ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے اختلاف کیا جا سکے، یہ لوگوں کی اپنی محرومی و بدقسمتی ہے کہ ان کی اکثریت اس کو قبول نہیں کر رہی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (۲)

خدا کی عظیم قدرت و حکمت کی طرف ایک اشارہ

رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا، عَمَد، عمود کی بھی جمع ہے اور عماد کی بھی اور تَرَوْنَهَا اس کی صفت ہے۔ یعنی خدا نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تمہیں نظر آئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس نے یہ عظیم شامیانہ جذب و کشش کے ایسے ستونوں پر کھڑا کیا ہے جن کو دیکھنے سے تمہاری نگاہیں قاصر ہیں۔

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ۔ یعنی وہ ان کو پیدا کر کے کہیں کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے جیسا کہ مشرکین گمان کرتے ہیں، بلکہ وہ اپنے عرش اقتدار پر متمکن ہے اور اس پوری کائنات پر فرماں روائی کر رہا ہے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی۔ یہ دو بڑی نشانیاں۔ سورج اور چاند۔ اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہیں کہ ہر چیز ہر وقت، خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اپنے معین مدار سے بال برابر ادھر ادھر ہو سکے۔ سورج اور چاند کے طلوع و غروب کے لیے جو اوقات مقرر کر دیے گئے ہیں وہ ٹھیک ٹھیک اسی نظام الاوقات کی پابندی کرتے ہیں، اس میں منٹ اور سکینڈ کا بھی کبھی کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ۔ یعنی ان نشانیوں سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ خدا ہی تمام کائنات کا انتظام فرما رہا ہے اور ساتھ ہی وہ ان نشانیوں سے تمام مضمرات بھی واضح فرما رہا ہے تاکہ تم اس بات کا یقین کرو کہ جس طرح ہر چیز کے لیے ایک اجل معین ہے اسی طرح تمہارے لیے بھی ایک اجل معین ہے۔ بالآخر تمہیں ایک دن خدا کی طرف لوٹنا اور اس سے ملنا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۳)

آسمان کے بعد زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ

آسمان کی نشانیوں کے بعد یہ زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ جس طرح آسمان کی نشانیوں سے اس کے خلق و تدبیر، اس کی قدرت و حکمت اور اس کی وحدت و یکتائی کی شانیں ظاہر ہوتی ہیں اسی طرح زمین کے چپے چپے

سے بھی اس کی ان صفات کی شہادت مل رہی ہے بشرطیکہ سوچنے والے دل اور غور کرنے والی عقلیں ہوں۔ دریا اور پہاڑ بظاہر اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں لیکن خدا نے اپنی قدرت و حکمت سے ان کے اندر ایسی سازگاری پیدا کر رکھی ہے کہ پتھروں کے اندر سے پانی کے چشمے جاری کر دیے ہیں۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ آپ سے آپ وجود میں آگئے ہیں اور ان پر الگ الگ دیوتاؤں کی خدائی ہے یا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک ہی قادر و توانا حکیم نے یہ تمام اضداد پیدا کیے اور پھر اپنی بے پایاں حکمت سے ان میں حیرت انگیز سازگاری پیدا کر دی کہ ان میں زوجین کا سا توافق پیدا ہو گیا ہے۔

آسمان و زمین کی نشانیوں کی شہادت

اس کائنات کے ہر گوشہ میں، ہر چیز، آسمان اور زمین، سورج اور چاند، شب اور روز کے اندر جس طرح کا تضاد اور پھر ساتھ ہی جس طرح کا توافق پایا جاتا ہے۔ وہ صاف صاف شہادت دے رہا ہے کہ یہ کائنات مختلف الاغراض دیوتاؤں کی رزم گاہ نہیں ہے بلکہ اس پر ایک ہی قادر و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے۔

تضاد اور توافق کے قانون کی ہمہ گیری

مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ کے الفاظ سے تضاد اور توافق کے اس قانون کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جس طرح شب اور روز کے اندر یہ قانون کارفرما ہے اسی طرح ایک ایک پھل اور ایک ایک دانے کے اندر کارفرما ہے، خواہ انسان کو اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ گندم کے ایک دانے کو بھی دیکھیے تو وہ بھی دو حصوں میں تقسیم نظر آتا ہے۔ تاہم دونوں میں پوری وابستگی اور پیوستگی پائی جاتی ہے ——— کائنات کے ہر گوشہ کی یہ شہادت اس امر کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ دنیا بھی تنہا نہیں ہے بلکہ اس کا بھی جوڑا ہے اور وہ ہے آخرت۔ اپنے اسی جوڑے کے ساتھ مل کر ہی یہ اپنی غایت کو پہنچتی ہے ورنہ اس کا وجود بالکل بے مقصد اور بے غایت ہو کے رہ جاتا ہے۔

نشانیاں صرف اہل حق کے لیے کارآمد ہیں

إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ یعنی ان چیزوں کے اندر خدا کے خلق و تدبیر، اس کی قدرت و حکمت، اس کی توحید اور آخرت کی بہت سی نشانیاں ہیں لیکن ان نشانیوں تک انہی لوگوں کی عقلیں پہنچتی ہیں جو ان پر غور کرتے ہیں اور ان سے جو رہنمائی حاصل ہوتی ہے اس کو حرز جاں بناتے ہیں بے فکرے اور لاابالی لوگ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۴)

زمین کی نشانیوں کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ

یہ زمین کی نشانیوں کے ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلائی کہ دیکھتے ہو کہ زمین کے بالکل پاس پاس کے قطعے ہیں، بعض میں انگور کے باغ ہیں، بعض میں کھیتیاں ہیں، بعض میں کھجوریں ہیں، جن میں بعض کے تنے اکہرے ہیں، بعض کے دوہرے۔ ٹکڑے پاس پاس کے ہیں، سیراب سب ایک ہی پانی سے ہوتے ہیں لیکن پیداوار کی مقدار میں فرق ہو جاتا ہے، کسی کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے کسی کی کم، مزے میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے، کسی کا مزا معیار پر ہوتا ہے کسی کا معیار سے اترا ہوا، درختوں کی نشوونما میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے، کہیں ایک

ہی جڑ سے کئی کئی تنے پھوٹ نکلے ہیں، کہیں ایک ہی تنہ نکلا ہے۔ یہ صورت حال اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے اور نیچر کا ایک اندھا بہرہ قانون سب پر مسلط ہے یا اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ ایک ہی خدائے علیم و حکیم اس پورے نظام کائنات کو اپنی نگرانی میں چلا رہا ہے اور سارے عالم اسباب پر تنہا اسی کی حکمرانی ہے اور وہ اپنی حکمت کے تحت اس کے ذرے ذرے پر تصرف فرما رہا ہے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۵)

تعجب کی اصل بات — یعنی خدا کی قدرت و حکمت اور اس کے خلق و تدبیر کی ان نشانیوں کی موجودگی میں جن کا ذکر اوپر ہوا، تعجب کرنے کی بات وہ نہیں ہے جس سے تم (خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) لوگوں کو آگاہ کر رہے ہو کہ مرنے کے بعد اٹھنا اور خدا کے حضور حساب کتاب کے لیے حاضر ہونا ہے بلکہ تعجب کے قابل خود ان لوگوں کا یہ تعجب ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ جب ہم سڑ گل کر خاک ہو جائیں گے تو کیا از سر نو زندہ کیے جائیں گے۔

خدا کو ماننے کا صحیح مفہوم — 'اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ' فرمایا کہ اپنے رب کے اصلی منکر درحقیقت یہ لوگ ہیں۔ خدا کو ماننے کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ کوئی شخص یہ مان لے کہ خدا ہے بلکہ اس کو اس کی صفات اور اس کے حقوق کے ساتھ ماننا ضروری ہے، اگر کوئی شخص خدا کا اقرار کرتا ہے لیکن اس کی بدیہی اور لازمی صفات یا ان سے عاید شدہ حقوق و لوازم کا منکر ہے تو وہ اپنے اقرار کے باوجود مومن نہیں بلکہ کافر ہے۔ خدا کی میزان میں اس کے اس اقرار کا کوئی وزن نہیں ہے۔ خدا کسی کے ماننے کا محتاج نہیں ہے بلکہ لوگ اس کے ماننے کے محتاج ہیں اور یہ چیز اس کو صحیح طور پر ماننے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

منکرین کے انکار کی اصل علت — 'اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ' مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی گردنوں میں کبر و انانیت، خود پرستی، تقلید اعمی اور جمود کے طوق پڑے ہوئے ہیں۔ یہ طوق نہ ان کی گردنیں اوپر کی طرف اٹھنے دیتے ہیں کہ یہ آسمان کی ان نشانیوں پر غور کر سکیں جن کی طرف قرآن نے آیت ۲ میں اشارہ فرمایا ہے اور نہ زمین کی ان نشانیوں کی طرف جھکنے دیتے جن کا حوالہ آیات ۳ - ۴ میں ہے۔ نتیجہ اس اندھے پن کا یہ ہے کہ یہ دوزخ میں پڑیں گے اور اسی میں ہمیشہ سڑیں گے۔ اس حقیقت کو سورۂ یٰسین میں یوں واضح فرمایا ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۸)

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۭ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ (۶)

عاقل وہ ہے جو دوسروں سے سبق حاصل کرے — 'مثلت'، 'مثلۃ' کی جمع ہے۔ اس کے معنی عقوبت اور عبرت انگیز عذاب کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ توبہ اور اصلاح سے پہلے کسی آفت اور عذاب کے منتظر ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب ہم اس عذاب کی کوئی نشانی دیکھ لیں گے جس سے پیغمبر ڈرا رہے ہیں، تب ہم ان کی بات مانیں گے۔ حالانکہ عاقل وہ ہے جو دوسروں سے سبق

قوموں کی تاریخ میں نشانِ عبرت

حاصل کرے۔ ان سے پہلے کتنی قومیں گزر چکی ہیں جنھوں نے انھیں کی طرح اپنے اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی اور بالآخر کیفرِ کردار کو پہنچیں۔ ان کی سرگزشتیں ان کو سنائی بھی جا رہی ہیں۔ کیا ان کے اندر ان کے لیے درسِ عبرت موجود نہیں ہے؟ یہ تو اللہ کی عنایت ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے کفر و شرک کے باوجود توبہ اور اصلاح کی طویل مہلت دیتا ہے لیکن اس مہلت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس کے گزر جانے کے بعد جب وہ پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ بھی بڑی ہی سخت ہوتی ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۷)

مطالبۂ عذاب کا جواب

'اٰیۃ' سے مراد یہاں کوئی نشانیِ عذاب ہے۔ اوپر والی آیت میں جس عذاب کے لیے عجلت کا ذکر ہے یہ اسی کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر ہمیں جس عذاب کے ڈراوے ہر وقت سنا رہے ہیں آخر اس کی کوئی نشانی یہ کیوں نہیں دکھاتے؟ فرمایا کہ تمھارا کام صرف لوگوں کو اس عذاب سے خبردار کر دینا ہے، اس کی کوئی نشانی دکھانا یا اس عذاب کو لا دینا تمھارا کام نہیں ہے۔ یہ ہمارا کام ہے۔ تم اپنا کام کرو اور ہمارا کام ہم پر چھوڑو۔ ان کی بکواسوں کی پروا مت کرو۔ 'وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ' میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو سزا دینے سے پہلے اس کو انذار و تنبیہ فرماتا ہے چنانچہ ان کے انذار کے لیے خدا نے تمھیں ہادی بنا کر بھیج دیا ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اگر انھوں نے تمھاری ہدایت قبول نہ کی تو اب اس کے بعد ان کے لیے عذاب ہی کا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے۔

اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنثَىٰ وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۖ وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ (۸)

یعنی ایک بات جو ایک امرِ واقعی اور شدنی ہے اس میں اس بنیاد پر کوئی شبہ قائم کرنا کہ تم اس کا وقت معین طور پر نہیں بتا سکتے یا ان کے مطالبے پر اس کو دکھا نہیں سکتے، کوئی معقول بات نہیں ہے۔ ایک عورت حاملہ ہوتی ہے، اس کے رحم میں لڑکا ہے یا لڑکی، اس کو صرف اللہ ہی جانتا ہے، اس میں در پردہ جو کمی بیشی واقع ہوتی ہے اس کو بھی اللہ ہی جانتا ہے، اس کے وضع کا ٹھیک ٹھیک وقت بھی اللہ ہی کے علم میں ہوتا ہے۔ ان باتوں کے نہ جاننے سے نہ تو نفسِ حمل کی نفی ہوتی اور نہ کوئی عاقل اس بنیاد پر ایک حاملہ کے حاملہ ہونے سے انکار کرتا ہے۔ یہی مثال ان ظالموں کے لیے عذابِ الٰہی کی ہے۔ انھوں نے اپنے عقاید و اعمال کے فساد کے باعث اس کا حمل قبول کر لیا ہے اور یہ حمل لازماً اپنی مدت کو پہنچ کر ظہور میں آئے گا لیکن کب آئے گا اور کس شکل و صورت میں آئے گا اس کا ٹھیک ٹھیک پتہ صرف اللہ ہی کو ہے، کسی دوسرے کو اس کا علم نہیں ہے۔ 'وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ' اللہ کے ہاں ہر چیز کے لگے بندھے ضابطے، معین پیمانے اور مقرر اوقات ہیں۔ لوگوں کی جلد بازی سے وہ سنتِ الٰہی متغیر نہیں ہوتی جو اس نے ہر چیز کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ (۹)

یہ اوپر والے مضمون کی مزید توضیح و تاکید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی باتوں، اس کے علم اور اس کے

منصوبوں کو اپنے محدود علم سے ناپنے کی کوشش نہ کرو۔ اس کا علم تمام غائب و حاضر کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ بڑی ہی عظیم ہستی ہے اور اس کی بارگاہ بہت بلند ہے۔ وہ اپنے ارادوں اور اپنی سکیموں کے بھیدوں کو خود ہی جانتا ہے، دوسرے اس میں سے اتنا ہی جان سکتے ہیں، جتنا وہ ظاہر کر دے۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ (۱۰)

مطلب یہ کہ دیر سویر کی فکر تو اس کو ہو جس کو اندیشہ ہو کہ ذرا تاخیر ہوئی تو وقت نکل جائے گا اور پھر حریف قابو میں نہ آسکے گا۔ جس کا علم اور جس کی قدرت ہر چیز اور ہر شخص کا اس طرح احاطہ کیے ہوئے ہو کہ اس کا پسَرَّ وَ عَلَانِيَة سب اس کے علم میں ہو اور اس کی شب اور اس کے روز کی ہر نقل و حرکت پر اس کو پورا اختیار حاصل ہو وہ پکڑنے میں جلد بازی کیوں کرے؛ وہ جب چاہے گا اور جہاں سے چاہے گا ہر ایک کو پکڑے گا۔ کس کی طاقت ہے کہ اس کے قابو سے باہر نکل سکے یا کہیں اس سے چھپ سکے۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ (۱۱)

'مُعَقِّبٰت'، یعنی اَرْوَاحٌ مُعَقِّبٰتٌ ' مراد اس سے وہ فرشتے ہیں جو باری باری ہر انسان پر خدا کی طرف سے نگرانی کے لیے مقرر ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ 'مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ' بیان کے لیے ہے جس طرح 'قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ' اور بعض دوسری آیات میں ہے۔ یعنی یہ فرشتے یا یہ ارواح اللہ کے امر میں سے ہیں۔

اوپر کے مضمون کی توضیح مزید

یہ آیت اوپر والی آیت کے مضمون کی توضیح مزید ہے۔ یعنی اللہ ہر شخص کے ظاہر و باطن اور اس کے شب و روز سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس نے ہر شخص پر اپنے فرشتے بطور پہرہ دار مقرر کر رکھے ہیں۔ یہ فرشتے اللہ کے امر میں سے ہیں جو ہر وقت ہر شخص کے ہر قول و فعل کی نگرانی کرتے ہیں۔

عذاب کے معاملے میں سنتِ الٰہی

'اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ'۔ اب یہ قوموں کے عذاب کے معاملے میں اصل سنت اللہ کی وضاحت فرما دی کہ اللہ تعالیٰ اپنا معاملہ کسی قوم کے ساتھ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کرلے۔ جب قوم خود اپنی روش بدل لیتی ہے اور تنبیہ و انذار کے باوجود متنبہ نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس پر وہ عذاب بھیجتا ہے جس کو کوئی طاقت بھی دفع نہیں کر سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب کی نشانیوں کا مطالبہ کرنے کے بجائے اس سنت الٰہی کی روشنی میں اپنے حالات کا جائزہ لو۔ اگر تم نے خود اپنی روش بدل لی ہے تو بس سمجھ لو کہ خدا کا تمھارے ساتھ جو معاملہ اب تک رہا ہے اب اس کے بدلنے میں بھی دیر نہیں ہے اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ جب خدا کسی قوم پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس قضائے مبرم کو ٹالنے کا یارا کسی میں نہیں ہوتا۔ تمھارے سارے اصنام خیالی اور سارے قلعے اور دمدمے ہوا ہو جائیں گے۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۚ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ

وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ (۱۲-۱۳)

آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ

اب یہ اسی مطالبۂ عذاب کے جواب میں جس کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے، آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ نشانیوں کی طلب ہے تو نشانیاں تو روز ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ بجلی چمکتی ہے جو اپنے اندر امید و بیم دونوں کے پہلو رکھتی ہے، وہی بارش کا پیغام بھی بن کر نمودار ہوتی ہے اور اگر اللہ چاہتا ہے تو اسی کو عذاب کا تازیانہ بھی بنا دیتا ہے۔ بادل اٹھتے ہیں جو رحمت کی گھٹا بن کر بھی برستے ہیں اور اگر اللہ چاہتا ہے تو انہی کے اندر سے طوفانِ نوح بھی ابل پڑتا ہے ـــــ ان نشانیوں کے بعد اب کن نشانیوں کے منتظر ہو؟

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ: میں حذف کا وہ اسلوب مضمر ہے جس کی طرف ہم ایک سے زیادہ مقامات میں اشارہ کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ تقابل الفاظ قرینہ کی وضاحت کی وجہ سے حذف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اسلوب کو کھول دیجیے تو پوری بات گویا یوں ہوگی: وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ مِنْ خِيْفَتِهٖ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ بِحَمْدِهٖ۔ یہ بات بھی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے اور حمد میں صفاتِ حسنیٰ کے اقرار و اعتراف کا۔

یہ اوپر والے مضمون ہی کی توضیح مزید ہے کہ منکرین اور مکذبین کی جسارت کا تو یہ عالم ہے کہ وہ عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور ادھر رعد و برق اور فرشتوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہر وقت خوفِ الٰہی سے اس کی تسبیح اور حمد میں مصروف رہتے ہیں کہ معلوم نہیں کس وقت کیا حکم صادر ہو۔ پھر خدا جن پر چاہتا ہے اپنا صاعقۂ عذاب بھیج دیتا ہے اور لوگ خدا کے بارے میں جھگڑنے ہی میں مصروف ہوتے ہیں۔ خدا شَدِيْدُ الْمِحَالِ یعنی بڑی طاقت والا ہے، کسی میں طاقت نہیں کہ اس کے وار کو روک سکے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۴-۱۶

آگے چند آیات میں یہ حقیقت واضح فرما دی کہ جو لوگ اپنے خیالی معبودوں کے اعتماد پر خدا کے عذاب کو دعوت دے رہے ہیں وہ محض اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔ خدا کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے، وہ وحدہٗ لا شریک ہے، نتیجہ خیز پکارنا صرف خدا ہی کو پکارنا ہے۔ اس کے سوا دوسروں کو پکارنا محض صدا بصحرا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۴-۱۶

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۗءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ

وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السجدة
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا
يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ
اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ
فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ
الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

ترجمۂ آیات ۱۴-۱۶

حقیقی پکارنا تو صرف اس کو پکارنا ہے۔ رہے وہ جن کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں تو وہ ان کی کوئی بھی داد رسی نہیں کر سکتے۔ ان کو پکارنا ایسا ہی ہے کہ کوئی اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف بڑھائے کہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے درآنحالیکہ وہ کسی طرح اس کے منہ تک پہنچنے والا نہ ہو۔ ان کافروں کی فریاد محض صدا بصحرا ہو گی۔ ۱۴

اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں، خواہ طوعاً خواہ کرہاً۔ اور ان کے سائے بھی صبح اور شام۔ ان سے پوچھو آسمانوں اور زمین کا مالک کون ہے؟ کہہ دو، اللہ! ان سے پوچھو تو کیا اس کے بعد تم نے اس کے سوا ایسے کارساز بنا رکھے ہیں جو خود اپنی ذات کے لیے بھی نہ کسی نفع پر کوئی اختیار رکھتے اور نہ کسی ضرر پر۔ ان سے پوچھو، کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہو جائیں گے! یا کیا روشنی اور تاریکی دونوں برابر ہو جائے گی! کیا انھوں نے خدا کے ایسے شریک ٹھہرائے ہیں جنھوں نے اسی کی طرح خلق کیا ہے جس کے سبب سے ان کو خلق میں اشتباہ لاحق ہو گیا ہے! بتا دو کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے اور وہ واحد اور سب پر حاوی ہے۔ ۱۵-۱۶

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۖ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۚ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (۱۴)

نتیجہ خیز پکارنا صرف خدا کو پکارنا ہے: 'لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ' یعنی نتیجہ خیز، نافع اور موجب خیر و برکت پکارنا تو صرف اللہ ہی کو پکارنا ہے اس لیے کہ تمام اختیار و اقتدار اور تمام زور و اثر تنہا اسی کے اختیار میں ہے۔ جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں سے آسرا لگائے بیٹھے ہیں، یہاں تک کہ ان کے بل پر خود خدا کو چیلنج کر رہے ہیں ان کو پکارنا محض صدا بصحرا ہے، اول تو ان کا کوئی وجود ہی نہیں اور اگر وجود ہے بھی تو وہ ان کی مدد کے معاملے میں بالکل بے بس ہیں۔

مشرکوں کی محرومی کی تمثیل: ان کی محرومی و نامرادی کی مثال ایک ایسے پیاسے سے دی ہے جو پیاس کی بے قراری میں اپنے دونوں ہاتھ ایسے پانی کی طرف بڑھائے جو اس کی پہنچ سے باہر ہو۔ جس طرح وہ پیاس سے تڑپتا اور پانی سے محروم رہتا ہے اسی طرح یہ اپنی محرومی پر اپنے سر پٹکیں گے۔ 'وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ' کا ٹھیک مفہوم وہی ہے جس کو ہم اپنے الفاظ میں 'صدا بصحرا' کہتے ہیں۔ یہ گویا 'لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ' کے مضمون کی تعبیر دوسرے اسلوب سے ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (۱۵)

ہر چیز کی تکوینی شہادت: یہ اوپر والے مضمون کی مزید تاکید ہر چیز کی تکوینی شہادت سے فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اپنے اصل وجود میں خدا ہی کی مطیع و منقاد ہے۔ جن کو کچھ اختیار ملا ہوا ہے اگر وہ اپنے اس اختیار سے غلط فائدہ اٹھا کر اکڑتے بھی ہیں تو وہ بھی اپنے تکوینی وجود میں خدا ہی کے آگے جھکنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ شہادت ہے اس بات کی کہ ہمارا وجود اپنی فطرت سے خدا ہی کا مطیع ہے۔ اگر ہم خدا سے اکڑتے ہیں تو یہ حالت درحقیقت ہماری اپنی اصل جبلت سے بغاوت ہے۔ اس حقیقت کو اس مثال سے واضح فرمایا ہے کہ دیکھو، ہر چیز کا سایہ صبح و شام خدا کے آگے بچھا رہتا ہے اور رات بھر وہ اپنے اس تکوینی سجدہ سے سر نہیں اٹھاتا۔ صبح کو وہ آہستہ آہستہ سر اٹھاتا ہے اور پھر سورج کے زوال کے ساتھ اس پر رکوع و سجود کی وہی حالت طاری ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ مضمون سورۂ نحل کی آیات ۴۸-۴۹ میں بھی بیان ہوا ہے۔ انشاءاللہ وہاں ہم اس کی مزید تفصیل کریں گے۔ یہ دلائل کی ایک خاص قسم ہے جس کو ہم اشارات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگرچہ منطق کی میزان ان دلائل کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے سے قاصر ہے لیکن انسانی فطرت کی میزان میں ان دلائل کا بڑا وزن ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۭ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ڏ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ

النُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۶)

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۭ لفظ 'قُلْ' کہو، پوچھو، سوال کرو، جواب دو، سب معنوں میں آتا ہے۔ موقع و محل کی مناسبت پیش نظر رکھ کر اس کا صحیح مفہوم متعین کرنا پڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا مالک اور کائنات کا رب کون ہے؟ پھر فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ ان سب کا مالک اور رب خدا ہی ہے۔ ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ اہل عرب آسمانوں اور زمین کا خالق و مالک اصلاً اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن اولیاء اور شرکاء انھوں نے اور بھی بنا لیے تھے جن کی نسبت ان کا گمان یہ تھا کہ یہ خدا کے بڑے چہیتے ہیں، ان کی عبادت خدا کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ انہی کی عنایت سے تمام دنیوی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں اور اگر آخرت کا کوئی مرحلہ بالفرض پیش آیا تو یہ ان کو بخشوا لیں گے۔

قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا یعنی جب آسمانوں اور زمین کا مالک وہی ہے تو ان سے پوچھو کہ کس منطق سے انھوں نے خدا کے دوسرے ولی اور کارساز بنا لیے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ یہ بے چارے دوسروں کو کوئی نفع پہنچانا یا ان سے کسی ضرر کو دفع کرنا تو الگ رہا خود اپنے کو کوئی نفع پہنچانے یا اپنے اوپر کسی آئی ہوئی مصیبت کو دور کرنے پر بھی قادر نہیں ہیں۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ڏ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ڬ

'اعمیٰ اور بصیر' کا مفہوم

'اَعْمٰی' اور 'بَصِیْر' کے الفاظ یہاں عقلی و اخلاقی اندھوں اور بیناؤں کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح 'ظُلُمٰت' سے مراد عقلی اور اخلاقی تاریکیاں ہیں اور 'نُوْر' سے مراد عقلی و ایمانی روشنی۔ 'ظُلُمٰت' کے جمع لانے میں، جب کہ لفظ مقابل 'نُوْر' واحد استعمال ہوا ہے، ایک لطیف نکتہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ عقلی یا اخلاقی مفاسد کے ظہور میں آنے کے راستے اور دروازے مختلف ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن عقلی و اخلاقی روشنی کا دروازہ ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ۔

'ظلمت اور نور' سے مراد

شرک کی جڑ پر کلہاڑا

اب یہ شرک کی جڑ پر کلہاڑا مارا گیا ہے کہ تم خدا کے شریک مانتے ہو جن کی نسبت تمہارا گمان یہ ہے کہ وہ اپنے پجاریوں کو، خواہ ان کے اعمال و افعال اور عقائد و نظریات کچھ ہوں، خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوتے کہ خدا کی نگاہ میں اندھے اور بصیر، اور تاریکی اور روشنی دونوں یکساں ہوگئے۔ اس طرح تم نے اس حق و عدل کی بنیاد ہی ڈھا دی جس پر یہ آسمان و زمین قائم ہیں اور جس کی نفی کے بعد یہ سارا عالم ایک اندھیر نگری یا کسی کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتا ہے۔

شرک کس دلیل کی بنا پر!

'اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ' یعنی آخر کس دلیل کی بنا پر انھوں نے خدا کے شریک بنائے ہیں۔ کیا مخلوقات میں کچھ ان کے مزعومہ شرکاء کی پیدا کی ہوئی مخلوقات بھی ہیں جن کے سبب سے ان کو یہ گھپلا پیش آگیا ہے کہ یہ متعین نہیں کر پا رہے ہیں کہ کس کو خدا کی مخلوق قرار دیں اور کس کو اپنے شرکاء کی۔ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ

شَیْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ مطلب یہ ہے کہ خالق تو ہر شے کا اللہ ہی ہے اور اس حقیقت سے تمہیں بھی انکار نہیں ہے تو پھر خدا کی خلق میں تم نے دوسروں کو کس دلیل سے شریک بنا کے رکھ دیا۔ لفظ 'قہار' پر دوسرے مقام میں ہم بحث کر چکے ہیں کہ اس کا صحیح مفہوم ہے 'سب کو اپنے کنٹرول میں رکھنے والا' مطلب یہ ہے کہ وہ خالق بھی ہے اور سب کو اپنے کنٹرول میں رکھنے پر قادر بھی ہے تو ضرورت کیا ہے جس کی بنا پر دوسرے شریکوں کو اس کی خدائی میں شریک مانا جائے۔

۴- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۷-۲۶

آگے اس حقیقت کی مزید وضاحت فرمائی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ گزرا کہ شرک سے اس تمام حق و عدل کی بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے جس پر اس عالم کا نظام قائم ہے اور جس کی شہادت خود اس کائنات کی فطرت دے رہی ہے۔ نیز اس حقیقت کی طرف بھی نہایت لطیف اشارہ فرمایا کہ قرآن کے نزول نے اس وقت حق و باطل میں جو کشمکش پیدا کر دی ہے وہ بالآخر حق کی فتح پر منتہی ہوگی اور باطل جھاگ کی مانند اڑ جائے گی اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ
۱۷-۲۶ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ
مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ
فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ
وقف النبی علیہ السلام يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿١٧﴾ لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَالَّذِينَ
لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ
لَافْتَدَوْا بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ
ع الْمِهَادُ ﴿١٨﴾ أَفَمَن يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ
أَعْمَىٰ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿١٩﴾ الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ
وَلَا يَنقُضُونَ الْمِيثَاقَ ﴿٢٠﴾ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿٢١﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ
وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً
وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٢﴾ جَنّٰتُ
عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ
وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿٢٣﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا
صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٤﴾ وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ
مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي
الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿٢٥﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا
فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿٢٦﴾ ع ٣ ٩

ترجمۂ آیات ۱۷-۲۶

اس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیاں اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہہ نکلیں۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھا لیا اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں کے اندر سے بھی ابھرتا ہے جن کو یہ زیور یا اسی قسم کی کوئی اور چیز بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کو ٹکراتا ہے تو جھاگ تو بے مصرف ہو کر اڑ جاتا ہے لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہوتی ہے وہ زمین میں ٹک جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تمثیلیں بیان کرتا ہے۔ جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت کو لبیک کہا ان کے لیے انجام کار کی فیروزمندی ہے اور جن لوگوں نے اس کی دعوت قبول نہیں کی اگر ان کو وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو زمین میں ہے اور اسی کے برابر اور بھی تو وہ فدیہ میں دے ڈالیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا حساب برا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ کیا ہی برا

ٹھکانا ہے۔ ۱۷-۱۸

تو کیا ہو جاتا ہے کہ جو کچھ تمھارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے وہ حق ہے وہ اس کے مانند ہو جائے گا جو اندھا ہے۔ یاد دہانی تو اہلِ عقل ہی حاصل کرتے ہیں۔ جو اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے پیمان کو توڑتے نہیں اور جو اس چیز کو جوڑتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے اور سخت حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کی رضا جوئی میں ثابت قدم رہے اور جنھوں نے نماز کا اہتمام رکھا اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا اس میں سے سرًا اور علانیۃً خرچ کیا اور جو بدی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں انجام کار کی کامیابی انھی کے لیے ہے۔ ابد کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بھی جو اس کے اہل بنیں گے ان کے آبا و اجداد، ان کی ازواج اور ان کی اولاد میں سے۔ اور فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس جائیں گے اور کہیں گے آپ لوگوں پر سلامتی ہو بوجہ اس کے کہ آپ لوگ ثابت قدم رہے پس کیا ہی خوب ہے انجام کار کی کامیابی۔ ۱۹-۲۴

اور جو لوگ اللہ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں وہی لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اور ان کے لیے برا انجام آخرت ہے۔ اللہ رزق کو کشادہ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور یہ دنیا کی زندگی پر مگن ہیں اور یہ دنیا کی زندگی آخرت کی زندگی کے مقابل میں محض ایک متاعِ حقیر ہے۔ ۲۵-۲۶

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَۃٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ وَمِمَّا یُوْقِدُوْنَ

عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ (۱۷)

اوپر آیت ۱۶ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا تھا کہ شرک اور شفاعتِ باطل کا سب سے زیادہ گھنونا پہلو یہ ہے کہ یہ اندھے اور بینا اور نور و ظلمت یا بالفاظِ دیگر حق و باطل سب کو ایک ہی درجے میں کر دیتا ہے جو بالبداہت عقل و انصاف کے خلاف ہے۔ اب ایک قدم بڑھ کر یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ یہ چیز اس کائنات کی فطرت کے بھی خلاف ہے اور اس سنتِ الٰہی کے بھی جو اس کائنات میں جاری و نافذ ہے۔

فطرتِ کائنات کی شہادت

اس کائنات کی فطرت کو یوں واضح فرمایا کہ تم دیکھتے ہو کہ آسمان سے بارش ہوتی ہے تو وادیاں اور نالے لبریز ہو کر بہہ نکلتے ہیں، پھر دیکھتے ہو کہ سیلاب جھاگ کو ابھار کر اوپر کر دیتا ہے، پھر جھاگ تو خس و خاشاک ہو کر ہوا میں اڑ جاتا ہے لیکن پانی جو زمین اور اہلِ زمین کے لیے نافع ہے زمین میں ٹھہر جاتا ہے۔

پھر اسی حقیقت کو ایک دوسری مثال سے سمجھایا کہ چاندی کو کوئی زیور یا کوئی اور چیز بنانے کے لیے کٹھالی میں پگھلاتے ہو تو اس کا میل کچیل تو اوپر آ کر اڑ جاتا ہے اور چاندی باقی رہ جاتی ہے۔

حق و باطل کی کشمکش میں بقائے نافع

ان دونوں مثالوں سے خدا کی بنائی ہوئی اس کائنات کا مزاج واضح ہو جاتا ہے کہ یہ درحقیقت نافع کو باقی رکھنا چاہتی ہے اور غیر نافع کو برابر چھانٹتی رہتی ہے۔ پھر اسی پر اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کو مبنی کیا ہے کہ وہ بھی اسی طرح حق اور باطل کو ٹکراتا ہے تو اس ٹکراؤ سے حق کے اوپر باطل کا جو جھاگ ابھرتا ہے وہ یوں ہی خس و خاشاک کی طرح اڑ جاتا ہے البتہ حق جو لوگوں کو نفع پہنچانے والی چیز ہے وہ باقی رہ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسی طرح اس وقت قرآن کی صورت میں جو بارش زمین پر ہوئی ہے اس نے بھی کچھ جھاگ ابھار کر اوپر کر دیے ہیں لیکن یہ سارے جھاگ فنا ہو جائیں گے اور قرآن اور اس کے حاملین باقی رہ جائیں گے۔

وَكَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ اس سے آگے کا ٹکڑا محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ یہ تمثیلیں اس لیے پیش کر رہا ہے کہ ان کے اندر وہ لوگ بھی اپنا مستقبل دیکھ لیں جو باطل کی حمایت میں آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں اور اہلِ ایمان بھی اپنا روشن مستقبل دیکھ لیں۔

لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (۱۸)

اصل حقیقت سادہ لفظوں میں

'الحسنٰی' کا موصوف یہاں بربنائے وضاحتِ قرینہ، محذوف ہے یعنی 'العاقبۃ الحسنٰی'۔ اوپر تمثیلی رنگ میں جو بات فرمائی گئی تھی وہی بات سادہ لفظوں میں کہہ دی گئی ہے کہ جو لوگ آج اس دعوت پر لبیک کہہ رہے ہیں جو اللہ کا رسول قرآن کی شکل میں پیش کر رہا ہے ان کا انجام تو بخیر ہے اور رہے وہ لوگ جو اس سے گریز

یا اس کی مخالفت کر رہے ہیں تو وہ یاد رکھیں کہ جب ان کے سامنے ان کا انجام آئے گا تو اس وقت ان کا یہ حال ہوگا کہ اگر ساری دنیا بھی ان کو ہاتھ آجائے اور اسی کے برابر مزید بھی تو وہ سب کچھ اس سے جان چھڑانے کے لیے فدیہ میں دے دینا چاہیں گے۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جن کے لیے برا حساب ہے، ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ 'سُوْٓءُ الْحِسَابِ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ ان کی ایک ایک چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی گرفت ہوگی، اور ان کا ہر قول و فعل اپنی اصلی بھیانک شکل میں سامنے آئے گا۔ اہل ایمان کے ساتھ تو ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں کے معاملے میں چشم پوشی برتی جائے گی لیکن ان اکڑنے والوں کی رائی بھی ہوگی تو وہ پہاڑ بن کر سامنے آئے گی۔

'لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا' سے ان کے اعراض و انکار کے اصل سبب پر روشنی پڑ رہی ہے کہ یہ اس دنیا اور متاع دنیا کی محبت ہے جو قرآن کی دعوت سے انھیں روک رہی ہے لیکن جس دنیا کا عشق آج ان سے یہ حرکت کرا رہا ہے جب اس کا انجام سامنے آئے گا تو یہ سارا عشق ہرن ہو جائے گا۔ اس وقت تو یہ چاہیں گے کہ یہ ساری دنیا اور اس کے برابر ایک اور دنیا بھی انھیں مل جائے تو وہ یہ سب کچھ فدیہ میں دے کر کسی طرح اس سے نجات حاصل کریں۔

اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰی ۭ اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱۹)

پیغمبر صلعم کو تسلی اور منکرین کو تہدید

'اَعْمٰی' کا لفظ، جیسا کہ آیت ۱۶ میں عقل و دل کے اندھوں کے لیے آیا ہے اسی طرح اس آیت میں بھی یہ عقل و دل کے اندھوں کے لیے وارد ہوا ہے۔ یہ آیت بطور التفات، پیغمبر صلعم کی تسلی کے لیے بھی ہے اور مکذبین و منکرین کی تہدید و وعید کے لیے بھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کا پہلو تو یہ ہے کہ تم قرآن کی شکل میں جو دعوت پیش کر رہے ہو اس کے بارے میں ہر ایک کا رویہ یکساں نہیں ہوگا۔ اس سے یاددہانی وہی حاصل کریں گے جو 'اُولُوا الْاَلْبَاب' یعنی عقل و دل رکھنے والے ہیں، جن کے دل مردہ اور جن کی عقلیں اندھی ہو چکی ہیں وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ مطلب یہ کہ تم ان کے رویہ سے بلا وجہ بددل اور پریشان نہ ہو۔

اس آیت کا اسلوب خود بول رہا ہے کہ لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کے لیے پیغمبر اور قرآن کی ہر بات خود اپنے دل کی آواز ہوتی ہے۔ وہ پیغمبر کی بات اور قرآن کی آیات سن کر یوں محسوس کرتے ہیں کہ

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ان کے لیے قرآن کی حیثیت ایک یاددہانی کی ہوتی ہے۔ وہ ان پر کوئی چیز اوپر سے لادتا نہیں بلکہ خود ان کی اپنی فطرت کے مدفون خزانوں کو ابھار کر ان کی نگاہوں کے سامنے کر دیتا ہے۔

منکرین و مکذبین کے لیے اس میں وعید یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس طرح کے اندھے لوگ ان لوگوں کے

ماتد ہو جائیں جن کے دل و دماغ روشن ہیں۔ لازم ہے کہ دونوں کا انجام ان کے اعمال کے اعتبار سے الگ الگ ہو۔

الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنقُضُونَ الْمِيثَاقَ (۲۰)

میثاق کا مفہوم

'میثاق' سے مراد یہاں میثاقِ فطرت ہے جو تمام اولادِ آدم سے لیا گیا ہے اور جس کا سب نے اقرار کیا ہے۔ اس پر مفصل بحث سورۂ اعراف آیت ۱۷۲ 'وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ' کے تحت گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس عہد کو یاد رکھے ہوئے ہیں اور جنھوں نے اس پیمان کو توڑا نہیں ہے وہی لوگ اس قرآن سے یاددہانی حاصل کریں گے رہے وہ لوگ جو اپنی فطرت کو مسخ اور اس میثاق کو توڑ چکے ہیں ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو۔[1]

وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ (۲۱)

رشتۂ رحم کا پاس و احترام

'مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ' سے مراد رشتۂ رحم کا پاس و احترام ہے۔ یعنی جس طرح وہ اللہ کے حقوق کا دل سے احترام کرتے ہیں اسی طرح بندوں کے جو حقوق ان پر بربنائے رشتۂ رحم عاید ہوتے ہیں ان کو بھی پوری فیاضی سے ادا کرتے ہیں، وہ رشتۂ رحم کو کاٹتے نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق اس کو جوڑتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ وہ کسی نمود و نمائش یا غرض کے لیے نہیں بلکہ خدا کے ڈر سے اور اس کی رضا جوئی کے لیے کرتے ہیں۔ سورہ دہر میں یہی حقیقت یوں واضح فرمائی گئی ہے 'وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا (۸-۱۰)'

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۲۲)

انہی کی مزید صفات بیان ہو رہی ہیں کہ اللہ اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کی راہ میں ان کو جو مشکلات و مصائب پیش آتے ہیں وہ ان کو اللہ کی رضا جوئی کی خاطر برداشت کرتے ہیں۔ 'أَقَامُوا الصَّلَاةَ' نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ نماز پڑھنے اور نماز کے اہتمام میں بڑا فرق ہے۔ اس کی تفصیل اس کے محل میں دیکھیے۔

سری انفاق کی اہمیت

'وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً' کی باقاعدہ شکل زکوٰۃ ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ زکوٰۃ کے حکم کے بعد انفاق کا حکم باقی نہیں رہا۔ زکوٰۃ تو گویا علانیہ انفاق کے تحت آگئی۔ سری انفاق جس پر اصل فضیلت کا انحصار ہے، وہ زکوٰۃ کے بعد بھی باقی رہا ہے اور تزکیۂ نفس کے پہلو سے اصل اہمیت اسی انفاق کی ہے۔ 'وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ' یعنی وہ برائی کو برائی سے نہیں بلکہ اس کو نیکی اور بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ یوں تو یہ ایک جامع کلیہ ہے لیکن اس کا ایک خاص محل بھی ہے۔ وہ یہ کہ مستحقین کے ساتھ سلوک کرنے

---

[1] اس عہدِ فطرت پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب 'حقیقتِ شرک و توحید' میں کی ہے۔ تفصیل کے طالب اسے پڑھیں۔

میں اس چیز کو نہیں دیکھتے کہ کس کا سلوک ان کے ساتھ کیسا ہے بلکہ وہ ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرتے ہیں جو ان کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں سے یہ بات ثابت ہے کہ اس نیکی کا اللہ تعالیٰ کی میزان میں بڑا وزن ہے۔

'اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ' دار سے مراد دارِ آخرت ہے۔ فرمایا کہ دارِ آخرت کا اصل صلہ اور اجر در حقیقت انہی لوگوں کے لیے ہے۔ مطلب یہ کہ ان لوگوں کا زعم بالکل باطل ہے جنھوں نے شرک اور شفاعت باطل کا عقیدہ ایجاد کر کے حق اور باطل، عدل اور ظلم دونوں کو یکساں کر دیا ہے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (۲۳-۲۴)

جنت میں جذبات کی رعایت

یہ اس 'عُقْبَى الدَّارِ' یعنی انجامِ خیر کی تفصیل ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں گزرا۔ فرمایا کہ ان کے لیے ابد کے باغ ہوں گے جن میں وہ اتریں گے اور ان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ان کے ساتھ ان کے باپ دادوں اور ان کی ازواج و اولاد میں سے ان لوگوں کو بھی جمع کر دیا جائے گا جو اپنے اعمال کی بدولت اس کے اہل قرار پائیں گے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی نعمت سے بہرہ مند ہوتا ہے تو اس کی یہ دلی آرزو ہوتی ہے کہ اس میں وہ لوگ بھی شریک ہوں جو اپنے عزیز رہے ہیں یا جنھوں نے اس کو عزیز رکھا ہے۔ اس کی اس فطرت کے تقاضے کا لحاظ کر کے اللہ تعالیٰ اس کے عزیزوں اور قریبوں کو بھی اس کے ساتھ جمع کر دے گا بایں شرط کہ وہ جنت میں جانے کے اہل ہوں۔ یہ شرط ایک بنیادی شرط ہے جو ملحوظ نہ رہے تو وہ نظامِ حق ہی متزلزل ہو جائے جو ان آیات میں زیرِ بحث ہے لیکن اس شرط سے اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی نفی نہیں ہوتی کہ وہ ان صالحین و ابرار کی مسرت کی تکمیل کے لیے ان کے ان اعزا و اقربا کو بھی ان کے ساتھ جمع کر دے جو اگرچہ باعتبار درجہ و مرتبہ ان سے فروتر ہوں لیکن ہوں وہ جنت کے حق داروں میں سے۔

'وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ الاية' اوپر والی بات تکمیلِ مسرت کی خاطر تھی اب یہاں ان کے اعزاز و اکرام کا پہلو نمایاں کیا جا رہا ہے کہ اس جنت کے بہت سے دروازے ہوں گے اور ہر دروازے سے فرشتے ان کے پاس سلام و تہنیت کے لیے پہنچیں گے اور ان کو ان کی ثابت قدمی پر مبارک باد دیں گے جس کے صلہ میں وہ اللہ کے اس فضل کے حق دار ٹھہرے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین

'فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ' کا ٹکڑا ہمارے نزدیک فرشتوں کے قولِ تہنیت کا جزو نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مرتبہ بلند کی تحسین ہے۔ اوپر آیت ۲۲ میں فرمایا تھا کہ 'اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ' اب جب اس 'عُقْبَى الدَّارِ' کی شان و عظمت واضح فرمائی تو بطورِ تحسین فرمایا کہ 'فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ' دیکھو کیا ہی خوب ہے یہ دارِ آخرت کی کامیابی!!

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۙ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ (۲۵)

مکذبین کی صفات

اب یہ بالکل متقابل گروہ کا بیان ہے۔ ان لوگوں کا جو عہدِ فطرت کو، اس کا اقرار کرنے اور اس کو باندھنے کے بعد توڑ رہے ہیں اور رشتۂ رحم جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور جس کو توڑنا تمام فساد فی الارض کی اصل ہے، اس کو کاٹ رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے اور انہی لوگوں کے لیے دارِ آخرت کی ذلت و رسوائی ہے۔ یہ حقیقت ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اسلام کا نظامِ حق و عدل دو بنیادی ستونوں پر قائم ہے۔ ایک وحدتِ الٰہ، دوسرا وحدتِ آدم۔ اگر یہ دونوں بنیادیں ڈھا دی جائیں تو پھر صالح معاشرہ اور صالح تمدن کا وجود میں آنا ناممکن ہے۔

اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ (۲۶)

اصل تقدیرِ کلام یوں ہے يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ لِمَنْ يَشَاءُ۔ قرینہ کی وضاحت کے سبب سے ایک جگہ لِمَنْ يَشَاءُ کو حذف کر دیا۔ قَدَرَ کے معنی تو اندازہ کرنے کے ہیں لیکن یہاں یہ تنگ کر دینے کے معنی میں ہے۔ لفظ 'متاع' کی تنکیر تقلیل کے مفہوم پر دلیل ہے۔

اصل سببِ انکار کی وضاحت

اب یہ ان منکرین کے اصل سببِ انکار و تکذیب کو واضح فرمایا جا رہا ہے کہ ان کو جو دنیا کی نعمتیں ملی ہیں ان کے سبب سے یہ غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے ہیں اور پیغمبر کی طرف سے آخرت کی یاد دہانی ان پر شاق گزر رہی ہے حالانکہ یہ اللہ ہی ہے جو جس کے لیے چاہتا ہے رزق کے دروازے کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ جس کے لیے وہ کشادہ کرتا ہے اس سے وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنے اور جس کے لیے تنگ کرتا ہے اس سے وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ صبر کرے۔ اسی صبر و شکر پر تمام دین کی عمارت قائم ہے۔ جو لوگ اس دنیا کے خزف ریزے پا کر اس کے غرہ میں آخرت کو بھول بیٹھے ہیں وہ جب روزِ آخرت میں شاکرین و صابرین کے اجر کو دیکھیں گے تب انھیں اندازہ ہو گا کہ نہایت ہی حقیر چیز کے لیے انھوں نے یہ ابدی بادشاہی کھو دی۔

۶- آگے کا مضمون ___ آیات ۲۷-۳۲

اب آگے یہ حقیقت واضح کی جا رہی ہے کہ آفاق و انفس کی یہ دلیلیں جو ان کو سنائی جا رہی ہیں ان سے ان کا اطمینان نہیں ہو رہا ہے۔ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کو کوئی حسی معجزہ دکھایا جائے تب وہ مانیں گے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں وہ حق ہے۔ ان کے اس مطالبے کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ ایمان و ہدایت کا راستہ اللہ کے کلام اور اس کے رسول کی باتوں پر غور کرنے سے کھلتا ہے۔ جو لوگ یہ راستہ نہیں اختیار کرتے وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔ آیات ملاحظہ ہوں۔

آیات ۲۷-۳۲ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ
يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ﴿٢٧﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَ
تَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿٢٨﴾
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ ﴿٢٩﴾
كَذَٰلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ لِتَتْلُوَ
عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَٰنِ ۚ قُلْ هُوَ
رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ﴿٣٠﴾ وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا
سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ ۗ
بَلْ لِلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا ۗ أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ
لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُمْ بِمَا صَنَعُوا
قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِنْ دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ ۚ إِنَّ
ع ۵ ۱۰ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿٣١﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِكَ
فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾

ترجمۂ آیات ۲۷-۳۲ اور جنھوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ کہہ دو کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور اپنی طرف رہنمائی ان لوگوں کی فرماتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو ایمان لاتے ہیں اور جن کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں، سن لو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے ان کے لیے خوش خبری ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔ ۲۷-۲۹

اسی طرح ہم نے تم کو بھیجا ہے ایک ایسی امت میں جس سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں تاکہ تم انھیں وہ چیز سنا دو جو ہم نے تم پر وحی کی ہے۔ ہر چند وہ خدائے رحمان کا انکار کر رہے ہیں۔ کہہ دو کہ وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا قرآن بھی اترتا جس سے پہاڑ حرکت میں آجاتے یا زمین پاش پاش ہو جاتی یا مردے بولنے لگ جاتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہیں تھے۔ بلکہ سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کیا ایمان لانے والوں کو اس بات سے اطمینان نہیں ہوا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب ہی کو ہدایت پر کر دیتا۔ اور ان کافروں کو برابر کوئی نہ کوئی آفت ان کے اعمال کی پاداش میں پہنچتی رہے گی یا ان کی بستی کے قریب نازل ہوتی رہے گی۔ یہاں تک کہ اللہ کے وعدے کے ظہور کا وقت آجائے، اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو میں نے کفر کرنے والوں کو ڈھیل دی، پھر میں نے ان کو پکڑا تو دیکھو کیسا ہوا میرا عذاب۔ ۳۰ - ۳۲

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ (۲۷)

ایمان کی رہنما آفاق وانفس کی نشانیاں ہیں

'ایۃ' سے مراد یہاں کوئی حسی معجزہ ہے۔ یعنی یہ لوگ آفاق وانفس کی ان نشانیوں سے تو آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں جو ہر طرف سے ان کو گھیرے ہوئے ہیں اور جن کی طرف قرآن ان کو توجہ دلا رہا ہے البتہ یہ مطالبہ کیے جا رہے ہیں کہ ان کو پیغمبر کوئی معجزہ دکھائیں تب وہ مانیں گے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی یہ سنت یاد دلائی کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت ان لوگوں کو نہیں بخشتا جو معجزوں اور کرشموں کے مطالبے کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں کو یہ نعمت بخشتا ہے جو آفاق وانفس کی نشانیوں کو دیکھ کر حقیقت کے طالب بنتے ہیں اور خدا کی طرف شرح صدر اور طمانیت قلب کے لیے متوجہ ہوتے ہیں۔ جن کے اندر یہ طلب پیدا ہو جاتی

ہے ان کے لیے

روئے و آوازِ پیمبر معجزہ است

رہے وہ لوگ جو عجائب اور کرشموں کے درپے رہتے ہیں ان کی زندگی ہمیشہ ٹھوکریں کھانے میں ہی گزرتی ہے۔ اللہ ایسے آنکھیں رکھ کر اندھے بن جانے والوں کے لیے یہی چاہتا ہے کہ وہ اپنی اسی ضلالت میں پڑے رہیں۔ خدا اگر جبر و زور اور معجزوں کے بل پر لوگوں کو مومن بنانا چاہتا تو اس کے پاس ایک سے ایک بڑھ کر معجزے موجود ہیں لیکن وہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی عقل و فکر سے کام لے کر اس کی طرف متوجہ ہوں۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۲۸)

یہ 'مَنْ اَنَابَ' کی تفصیل ہے اور 'ذِكْرِ اللّٰهِ' سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات، اور اس کے دلائل و حجج کا وہ بیان ہے جو قرآن میں موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف رہنمائی انہی لوگوں کو فرماتا ہے جن کے دل اللہ کی صفات اور اس کے دلائل و براہین سے طمانیت پاتے ہیں۔ جو لوگ یہ راہ نہیں اختیار کرتے وہ ہمیشہ ایمان سے محروم ہی اور معجزات کے مطالبے ہی کرتے رہتے ہیں۔

ذکر اللہ میں طمانیت قلب

'اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ' اب یہ اصل بات پورا زور دے کر فرمائی کہ کان کھول کر سن لو کہ اگر دلوں کی طمانیت اور ایمان و شرح صدر کی نعمت مطلوب ہے تو وہ معجزوں اور کرشموں سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ اللہ اور اس کی صفات جمال و کمال کے تذکر و تفکر سے حاصل ہوتی ہے تو اگر یہ چیز مطلوب ہے تو پیغمبر کی دعوت سنو اور اس پر غور کرو ورنہ جس وادی میں چاہو ٹھوکریں کھاتے پھرو۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ (۲۹)

مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ راہ اختیار کی اور اس کو اختیار کر کے ایمان و عمل صالح کی شاہراہ پر گامزن ہو گئے ان کے لیے تو مبارکباد اور خوش خبری ہے، ان کو اچھی منزل اور اچھا ٹھکانا نصیب ہوگا۔ رہے وہ لوگ جو معجزات کے منتظر ہیں تو وہ اسی انتظار میں ایک دن اپنے اس انجام سے دوچار ہو جائیں گے جو ایسے عقل کے اندھوں کے لیے مقدر ہے۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِیْۤ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَیْهِمُ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَهُمْ یَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ مَتَابِ (۳۰)

مطالبہ معجزات کا جواب ایک اور پہلو سے

یہ بھی اسی مطالبہ معجزات کا جواب ہے جس کا ذکر آیت ۲۷ میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تم دنیا میں پہلے نبی ہو اور نہ یہ (اہل عرب) دنیا میں پہلی امت ہیں۔ تم سے پہلے نبی اور رسول بھی گزر چکے ہیں اور ان سے پہلے قومیں اور امتیں بھی گزر چکی ہیں۔ تمہارے لیے اپنے پیشرو نبیوں اور رسولوں کی زندگی میں اسوہ اور نمونہ ہے اور ان کے لیے ان کے پیشرو قوموں کی زندگی نظیر اور مثال ہے۔ تو تم ان کے نت نئے مطالبات سے دل تنگ نہ ہو بلکہ ان کو اللہ کی وہ کتاب سناؤ جو تم پر وحی کی جا رہی ہے، ہر چند وہ خدائے رحمان کا انکار ہی کرتے رہیں۔ اور

ان کے مطالبات کے جواب میں ان کو سنا دو کہ اللہ ہی میرا رب ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، میرا اسی پر بھروسا ہے وہی میرا مرجع ہے۔ مجھے جو پیام دے کر اس نے بھیجا ہے وہ میں تمہیں سنا رہا ہوں۔ معجزے دکھانا میرا کام نہیں ہے۔ یہ اس کی حکمت و مشیت پر منحصر ہے، وہ چاہے گا، دکھائے گا، نہیں چاہے گا نہیں دکھائے گا۔

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ ۗ بَل لِّلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا ۗ أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (۳۱)

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا .... أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ: میں جواب شرط محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ معجزے کا مطالبہ کرتے تو ہیں اور اس سے ایک نیک نیت آدمی کو یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ کیا عجب یہ اپنی طلب کے مطابق معجزہ دیکھ کر ایمان ہی لائیں لیکن یہ گمان محض گمان ہے۔ اگر ان کے لیے کوئی ایسا قرآن بھی اتارا جاتا جس سے پہاڑ حرکت میں آجاتے یا زمین شق ہو جاتی یا مردے بولنے لگتے جب بھی یہ ایمان لانے والے نہیں تھے بلکہ اس وقت بھی یہ اپنے کفر پر اڑے رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا ہی لیتے۔ آخر ان کے پیشروؤں نے کتنے معجزے دیکھے لیکن وہ ان کو سحر اور شعبدہ بازی کہہ کر بدستور اپنے کفر پر اڑے ہی رہ گئے یہاں تک کہ بالآخر عذاب الٰہی نے ان کا فیصلہ کر دیا۔

بَل لِّلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا: مطلب یہ ہے کہ اس معاملے کو تم تمام تر اللہ پر چھوڑ دو۔ وہی جانتا ہے کہ یہ کس چیز کے مستحق ہیں اور ان کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں اس کی جو سنت ہے وہ اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کرے گا۔ ہدایت کی راہ وہ انہی لوگوں کے لیے کھولے گا جو اس کے قانون کے مطابق اس کے سزاوار ٹھہریں گے۔

مسلمانوں کو تسلی

أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا: یہ نیک دل مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہارے اندر خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ان کو ان کی طلب کے مطابق معجزہ دکھا ہی دیا جائے لیکن کیا تمہارے اطمینان کے لیے یہ چیز بس نہیں کرتی کہ اللہ اگر اپنے جبر و زور ہی کے ذریعے سے لوگوں کو ہدایت کی راہ پر لانا چاہتا تو آن کی آن میں سب کو مسلم و مومن بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی عقل و بصیرت سے کام لیں، آفاق و انفس کے دلائل پر غور کریں، پیغمبر کی باتوں کو سوچیں اور سمجھیں اور پھر اپنے اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ اس راہ حق کو اختیار کریں۔

تنبیہات کی طرف اشارہ

وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا ...... إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ: یعنی یہ بات بھی نہیں ہے کہ نشانیاں ظاہر نہ ہو رہی ہوں، وقتاً فوقتاً ان کی کرتوتوں کی پاداش میں خود ان پر یا ان کے قرب و جوار کے لوگوں پر تنبیہات نازل ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ان سے مقصود یہی ہوتا ہے کہ یہ لوگ جاگیں، آنکھیں کھولیں اور پیغمبر کی باتوں

کو سنیں بھیں لیکن ان سے یہ کوئی سبق نہیں لیتے بلکہ منتظر ہیں کہ عذاب الٰہی کا ڈنڈا خود ان کی کمر پر پڑے تب یہ مانیں گے، تو اس کا وقت بھی آ جائے گا۔ ان کو جس عذاب کی دھمکی دی جا رہی ہے اگر یہ اپنی ضد پر اڑے رہے تو وہ آ کے رہے گا۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

'حَتّٰی یَاْتِیَ وَعْدُ اللّٰہِ' میں 'وَعْدُ اللّٰہِ' سے مراد وہ عذاب الٰہی ہے جس کی خبر ہر رسول نے اپنی قوم کو دی کہ اگر اس نے رسول کی بات نہ مانی تو بالآخر اس پر عذاب الٰہی آئے گا جو اس کو یک قلم فنا کر دے گا۔ رسولوں کے دورِ بعثت سے متعلق ہم یہ بات بھی کہیں لکھ آئے ہیں کہ ان کے زمانے میں ایسی نشانیوں کے ظہور کی خاص طور پر کثرت ہوتی ہے جن سے غافلوں کے اندر بیداری پیدا ہو تاکہ رسول کی باتیں سننے کے لیے ان کے کان کھلیں۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ (۳۲)

تاخیر عذاب کی حکمت

اب یہ اس بات کی حکمت واضح فرما دی کہ ان کی ضد اور ان کے مطالبۂ عذاب کے باوجود ان پر جو عذاب نہیں آ رہا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ ان کو اتنی مہلت دے رہا ہے کہ ان پر اس کی حجت پوری ہو جائے۔ فرمایا کہ تم سے پہلے بھی رسولوں کا ان کی قوموں کی طرف سے مذاق اڑایا گیا لیکن ہم نے اس کے باوجود ان کو مہلت دی، پھر پکڑا تو دیکھو کیسا پکڑا اور ہمارا عذاب کیسا دردانگیز ہوا۔ یہی معاملہ ان کے ساتھ بھی ہو گا۔ 'عِقَابِ' اصل میں عقابی ہے۔ قافیہ کی رعایت سے 'ی' گر گئی۔ کسرہ اس کی یادگار ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ـــــــ آیات ۳۳-۳۷

آگے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اگر ان کی یہ جسارت اپنے ان فرضی معبودوں کے بل پر ہے جن کو انھوں نے بلا کسی دلیل کے خدا کا شریک اور اپنا حامی و ناصر گمان کر رکھا ہے تو ان کو بتا دو کہ ان معبودوں کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ محض خیالی باتیں ہیں۔ یہ لوگ دنیا میں بھی خدا کے عذاب سے دوچار ہوں گے اور آخرت میں ان کو جس عذاب سے سابقہ پیش آنے والا ہے وہ تو اس سے بھی کہیں سخت ہو گا۔ جنت کے حق دار صرف اس کے مومن اور موحد بندے ہوں گے۔ اگر یہ لوگ اس بدیہی حقیقت کو جھٹلا رہے ہیں تو تم اس کا غم نہ کرو۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ اچھے اور اپنی کتاب پر قائم ہیں وہ اس کتاب سے بہت خوش ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۳-۳۷

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ
قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ
مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ
الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ
تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ
الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ
قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ
مَاٰبِ ﴿۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ
بَعْدَ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ ع ۵ / ۱۱

ترجمۂ آیات ۳۳-۳۷

کیا وہ ذات جو ہر جان سے اس کے عمل پر محاسبہ کرنے والی ہے (اور وہ جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے یکساں ہیں) اور ان لوگوں نے اللہ کے شریک بنا لیے ہیں۔ ان سے کہو ان کے نام تو بتاؤ۔ کیا تم خدا کو ایسی چیزوں کی خبر دے رہے ہو جن کے زمین میں وجود سے وہ بے خبر ہے یا یوں ہی ہوائی بات کر رہے ہو۔ بلکہ ان کافروں کی نگاہ میں ان کی چال کھبا دی گئی ہے اور یہ راہِ حق سے روک دیے گئے ہیں اور جن کو اللہ گمراہ کر دے تو ان کو کوئی دوسرا ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں بھاری ہوگا۔ اور ان کو اللہ سے کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔ ۳۳-۳۴

اس جنت کی تمثیل جس کا متقیوں سے وعدہ ہے یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اس کا پھل بھی دائمی اور اس کا سایہ بھی دائمی۔ یہ انجام ہے ان لوگوں کا جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا اور کافروں کا انجام دوزخ ہے۔ ۳۵

اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس چیز پر خوش ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے اور ان جماعتوں میں سے ایسے بھی ہیں جو اس کے بعض حصوں کا انکار کرتے ہیں۔ تم کہہ دو کہ مجھے تو حکم ہوا ہے کہ میں اللہ ہی کی بندگی کروں اور اس کا کسی کو ساجھی نہ ٹھہراؤں۔ میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔ اور اسی طرح ہم نے یہ کتاب ایک فرمان کی حیثیت سے عربی میں اتاری ہے اور اگر تم اس علم صحیح کے آجانے کے بعد ان کی بدعتوں کی پیروی کرو گے تو نہ خدا کے مقابل میں تمہارا کوئی مددگار ہوگا نہ بچانے والا۔ ۳۶-۳۷

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ۭ قُلْ سَمُّوْهُمْ ۭ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۭ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۳)

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ، یعنی جو ہر جان کے ہر قول و فعل کی نگرانی بھی کر رہا ہے اور ہر قول و فعل کا محاسبہ بھی کرنے والا ہے۔

حذف بتقاضائے بلاغت

اس جملہ میں سوال کا آدھا حصہ بتقاضائے بلاغت حذف ہے۔ فرمانا یہ ہے کہ کیا وہ ذات جو ہر جان کے اعمال کی نگرانی بھی کر رہی ہے اور جو ہر ایک کے ہر قول و فعل کا محاسبہ بھی کرنے والی ہے اس کا شریک تم ایسی چیزوں کو بنائے ہوئے ہو جن کی نہ کوئی حقیقت نہ جن کا کوئی وجود اور نہ جن کے پاس کوئی علم نہ کوئی اختیار۔ اس حذف سے اس بے تکی بات سے متکلم کی نفرت و کراہت کا اظہار ہو رہا ہے۔ گویا اس بھونڈی بات کا ذکر بھی اسے گوارا نہیں۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ۭ قُلْ سَمُّوْهُمْ، یعنی انھوں نے اللہ کے شریک بنائے ہیں ان سے کہو کہ ذرا ان کے نام تو لیں جن کو یہ خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہیں۔ قُلْ سَمُّوْهُمْ، میں جو غصہ اور تحقیر مضمر ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ مشرکین اس کے جواب میں انہی بتوں کے نام لے سکتے تھے جن کو وہ پوجتے تھے۔ ہبل، لات، عزیٰ، نائلہ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر یک قلم ان کے وجود ہی کی نفی فرما دی گئی کہ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ، یہ تم خدا کو ایسی چیزوں کا پتہ دے رہے ہو جن کے زمین میں وجود سے وہ بے خبر ہے یا یوں ہی ہوائی

نفی الشی بنفی لازمہ کا اسلوب

باتیں کر رہے ہو۔ 'اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ' میں زبان کا وہ اسلوب ہے جس کو ہم دوسرے مقام میں نفی الشی و بنفی لازمہ کے عنوان سے ذکر کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ کسی شے کی نفی اس کے لوازم کی نفی سے کر دی جاتی ہے مثلاً یہ کہ اگر کوئی شے اس دنیا میں وجود رکھتی ہے تو لازم ہے کہ اس دنیا کے خالق کو اس کا پتہ ہو۔ اگر ایک چیز کا سرے سے خالق ہی کو پتہ نہیں تو اس کے وجود کے کیا معنی؟ اس اصول پر اللہ تعالیٰ نے مشرکین سے باندازِ طنز سوال فرمایا ہے کہ یہ خدا کی معلومات میں اضافہ کرنے اٹھے ہو یا یوں ہی ہوائی باتیں کر رہے ہو جن کا کوئی سر ہے نہ پیر۔

حمایتِ شرک دنیوی مفاد کے لیے

'بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ الاٰیۃ' آیت کے آخر میں اصل حقیقت واضح فرما دی کہ شرک کی حمایت میں جو لوگ آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں، یہ محض اپنے اقتدار اور اپنی پیشوائی کو بچائے رکھنے کی ایک چال ہے جو اس وقت انھیں بہت عزیز ہے۔ قرآن کے دلائل اور پیغمبر کی دعوت نے دینِ شرک کا پول اس طرح کھول دیا ہے کہ اب اس کے بڑے سے بڑے حامیوں کی نظر میں بھی اس کا کوئی وزن باقی نہیں رہ گیا ہے، سوال صرف مفاد کا ہے۔ پیشوائی کی موروثی گدی چھوڑی نہیں جاتی اس وجہ سے یہ جاننے کے باوجود کہ خدا کا راستہ وہی ہے جس کی طرف قرآن بلا رہا ہے یہ اپنی اس ضلالت پر اڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے لوگ جو جان بوجھ کر حق کو جھٹلاتے اور باطل کی حمایت کرتے ہیں خدا کے قانون کی زد میں آ جاتے ہیں اور جو خدا کے قانون کی زد میں آئے ہوئے ہوں کس کی طاقت ہے کہ ان کو ہدایت کی راہ پر لا سکے۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ (۳۴)

ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں بھی عذاب ہے اور دنیا کے عذاب سے کہیں بڑھ چڑھ کر آخرت کا عذاب ہے اور یہ لوگ اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء پر جو اعتماد کیے بیٹھے ہیں کہ وہ ان کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے تو ان میں سے کوئی ان کو بچانے والا نہ بن سکے گا۔ یہاں اس سنتِ الٰہی کو یاد رکھیے جس کا حوالہ ہم بار بار دے چکے ہیں کہ جس قوم پر رسول کے ذریعہ سے حجت تمام کر دی جاتی ہے اگر وہ ایمان نہیں لاتی تو لازماً ہلاک کر دی جاتی ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ (۳۵)

متقین کے انجام کا بیان

'اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا' میں 'ظِلُّهَا' کی خبر قرینہ کی وضاحت کے سبب سے محذوف ہے یعنی 'ظِلُّهَا دَاۗىِٕمٌ'۔ یہ مقابلہ کے اصول کے مطابق رسول کے مکذبین کا انجام بیان کرنے کے بعد ان لوگوں کا انجام بھی بیان فرما دیا جو اپنی خدا ترسی سے رسول پر ایمان لائے۔ فرمایا کہ وہ ایسے سدا بہار باغوں میں آباد ہوں گے جن کی پیداوار بھی دائمی اور جن کا سایہ بھی دائمی۔ یعنی وہ کبھی خزاں سے آشنا نہیں ہوں گے۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ

قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ (۳۶)

صالحین اہلِ کتاب کا رویہ

'وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ' سے اچھے اہلِ کتاب مراد ہیں، اہلِ کتاب بالخصوص نصاریٰ میں جیسا کہ مائدہ کی آیات ۸۳-۸۴ کے تحت تفصیل گزر چکی ہے، ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر رسول خاتم کے منتظر تھے۔ اس وجہ سے آپ کی دعوت اور آپ کی لائی ہوئی کتاب میں جب انھوں نے ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کے آثار دیکھے تو بڑے ذوق شوق سے انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اہلِ کتاب کے اس پاکیزہ گروہ کا ذکر قرآن میں جا بجا ہوا ہے اور بالعموم ان کا ذکر معروف ہی کے صیغہ سے ہوا ہے جس طرح یہاں ہوا ہے۔ ان لوگوں کے ذکر سے یہاں مقصود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا بھی ہے کہ اگر جاہل ہٹ دھرم لوگ تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں تم ان کی پروا کیوں کرو جب کہ حاملین کتاب کا ایک گروہ تمہارا خیر مقدم کر رہا ہے اور منکرین کو ترغیب دینا بھی ہے کہ جس کا اچھے اور پاکیزہ ذی علم لوگ خیر مقدم کر رہے ہیں حیف ہے اگر تم اس کی تکذیب کرو اور اس کی لائی ہوئی برکتوں سے محروم رہو۔

مخالفین کی طرف ایک اشارہ

'وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ' احزاب سے یہاں مراد مخالف پارٹیاں ہیں یعنی یہود، نصاریٰ اور مشرکین عرب۔ ان کی مخالفت کی نوعیت بھی بالعموم یہ نہیں تھی کہ قرآن کے ہر حصہ سے ان کو اختلاف ہو۔ آخر ہر حصہ سے اس کے لیے اختلاف کر بھی کس طرح سکتے تھے۔ قرآن کی تعلیمات اور تورات و انجیل کی تعلیمات میں اختلاف اصلاً تو انہی مواقع میں ہے جہاں اہلِ کتاب نے کوئی تحریف کر ڈالی ہے۔ مشرکین عرب کو بھی اصل اختلاف قرآن کی دعوتِ توحید سے تھا بقیہ چیزوں سے ان کے لیے بھی اختلاف کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ نصاریٰ میں سے پال کے معتقدین کا اختلاف بھی ان کے شرک ہی کی بنا پر تھا۔ قرآن نے ان کے اس اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ جن کے ساتھ بنائے اختلاف توحید ہے ان کو تم صاف لفظوں میں سنا دو کہ میں اللہ واحد ہی کی بندگی کرتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں مانتا، میری دعوت بھی اسی کی طرف اور میرا مرجع بھی اسی کی طرف ہے۔ یعنی میں اس وہم میں مبتلا نہیں ہوں کہ مجھے کسی اور حامی یا شفیع سے کوئی مدد مل سکے گی۔ یہ صاف صاف اعلان اسی لیے کرا دیا گیا کہ اگر ان پارٹیوں میں سے کسی کو یہ توقع ہو کہ وہ اپنا دباؤ ڈال کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نرم یا مرعوب کر سکے گی تو وہ اس طمع خام سے باز آجائے۔

'وَاِلَيْهِ مَاٰبِ' میں ترکیب کلام بعینہٖ وہی ہے جو 'وَيْ كَانَ عِقَابِ' میں گزر چکی ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ (۳۷)

یہ قرآن فرماں واجب الاذعان ہے

'وَكَذٰلِكَ' عربی میں ان معنوں میں بھی آتا ہے جن معنوں میں ہم 'چنانچہ' یا 'اسی لیے' کے الفاظ بولتے ہیں۔ یہاں یہ اسی 'سی لیے' کے مفہوم میں ہے۔ اوپر والی آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ہوا ہے کہ 'قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ' اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اسی امر و حکم کی

دعوت و اشاعت کے لیے ہم نے تم پر یہ کتاب اتاری ہے۔ 'حُكْمًا عَرَبِيًّا' یہ اس کتاب کی حیثیت واضح فرمائی ہے کہ یہ حکم ہے یعنی ایک فیصلہ ناطق اور فرمان واجب الاذعان، اور عربی میں ہے اس لیے ان تمام لوگوں پر جن کی زبان عربی ہے یہ احسان بھی ہے اور اتمام حجت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی درخواست اور التجا نہیں ہے بلکہ واجب الاطاعت فرمان ہے تمہارے لیے بھی اور اہل عرب کے لیے بھی۔ اگر اس کی تعمیل نہ کی گئی تو مہلت کی ایک مدت گزر جانے کے بعد ان سب لوگوں کو جو اس کی اطاعت سے انکار کریں گے، اسی انجام سے دوچار ہونا پڑے گا جس سے رسولوں کے مکذبین و مخالفین کو دوچار ہونا پڑا۔ یہ حقیقت ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ رسول جس قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے اس کے لیے وہ بمنزلہ عدالت الٰہی ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے پاس کوئی درخواست لے کر نہیں بلکہ خدا کا فرمان لے کر آتا ہے جس کی تعمیل واجب اور جس کی نافرمانی مستوجب سزا ہوتی ہے۔

خطاب پیغمبر سے، عتاب مشرکین پر

'وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ الآية' - 'أَهْوَاءَ' سے مراد، جیسا کہ ہم مختلف مقامات میں واضح کر چکے ہیں 'بدعتیں' ہیں اس لیے کہ بدعتوں کی بنیاد علم پر نہیں بلکہ خواہشوں ہی پر ہوتی ہے۔ یہاں خاص طور پر اہل عرب کی مشرکانہ بدعات کی طرف اشارہ ہے۔ 'الْعِلْمِ' سے مراد یہاں وہ صحیح علم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کی شکل میں نازل ہوا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس فرمان عربی اور اس علم صحیح کے نازل ہو جانے کے بعد اگر تم نے ان مشرکوں کی مشرکانہ بدعات کی پیروی کی تو تم کو خدا کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہ بن سکے گا۔ اس آیت میں باعتبار الفاظ اگرچہ خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں جو عتاب ہے اس کا رخ تمام مشرکین کی طرف ہے۔ پیغمبر کو مخاطب کر کے یہ بات کہنے میں جو بلاغت ہے وہ یہ ہے کہ سننے والے اچھی طرح متنبہ ہو جائیں کہ اس حکم کی خلاف ورزی کر کے جب پیغمبر بھی خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

۱۰۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۳۸-۴۳

خاتمۂ سورہ

آگے کی آیات خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان مخالفین کے نت نئے اعتراضات اور مطالبۂ معجزات سے تم پریشان نہ ہو۔ تم اپنا کام کیے جاؤ اور مطالبۂ معجزات کے معاملے کو ہمارے اوپر چھوڑ دو۔ ان لوگوں کو نظر نہیں آ رہا ہے لیکن غلبۂ حق کے آثار خود اس سرزمین میں بھی نمایاں ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ خدا کی بات شدنی ہے اور کوئی اس کے فیصلہ کو روک نہیں سکتا۔ جس طرح کی چالیں یہ چل رہے ہیں اس طرح کی چالیں چلنے والے پہلے بھی گزرے ہیں۔ خدا ان کی چالوں کے سامنے تار و پود بکھیر دے گا اور عنقریب ان پر واضح ہو جائے گا کہ انجام کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ تمہیں رسول نہیں مانتے تو کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ اور حاملین علم کتاب کی گواہی کافی ہے ___ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۸-۴۳ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً
وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ﴿٣٨﴾
يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ ﴿٣٩﴾ وَإِن مَّا
نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ
وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿٤٠﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ
وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٤١﴾ وَقَدْ
مَكَرَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ
نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٤٢﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ
كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ
ع ۱۲ عِندَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿٤٣﴾

ترجمۂ آیات ۳۸-۴۳ اور ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے اور ان کو بیویاں اور اولاد بھی عطا فرمائیں۔ اور کسی رسول کے اختیار میں یہ نہیں کہ وہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی لا سکے۔ ہر چیز کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک نوشتہ ہے۔ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔ ۳۸-۳۹

اور جس چیز کی ہم ان کو دھمکی دے رہے ہیں اس کا کچھ حصہ یا تو ہم تم کو دکھا دیں گے یا ہم تم کو وفات دے دیں گے۔ پس تمہارے اوپر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، حساب کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ کیا وہ یہ نہیں دیکھ رہے ہے کہ ہم سرزمین کی طرف اس کو اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔ فیصلہ اللہ کرتا ہے اور کوئی اس کے فیصلہ کو ہٹانے والا نہیں۔ اور وہ بہت جلد

حساب چکا دینے والا ہے۔ جو ان سے پہلے گزرے انھوں نے بھی چالیں چلیں لیکن چالیں سب
اللہ کے اختیار میں ہیں۔ ہر جان جو کچھ کرتی ہے اس کو وہ جانتا ہے اور یہ کافر جلد جان لیں گے کہ
دار آخرت کی کامیابی کس کے لیے ہے۔ ۴۰-۴۲

اور یہ کافر کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو۔ کہہ دو میرے اور تمہارے درمیان اللہ اور
وہ لوگ گواہی کے لیے کافی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم ہے۔ ۴۳

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ
يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۳۸)

دو اعتراضوں کے جواب

اس آیت میں مخالفین کے دو اعتراضوں کے بغیر ان کو نقل کیے جواب دیے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اللہ کے رسول ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، اگر اللہ کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کیا وہ ہمارے ہی جیسے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجتا؟ اس کے پاس فرشتوں کی اتنی بڑی فوج ہے آخر ان میں سے کسی کو اس منصب کے لیے اس نے کیوں نہ منتخب کیا؟ دوسرا یہ کہ یہ ہم کو دھمکی سنا رہے ہیں کہ اگر ہم نے ان کی بات نہ مانی تو ہم پر اللہ کا عذاب آجائے گا۔ اگر اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو آخر یہ ہم کو کوئی ایسی نشانی 'عذاب' کیوں نہیں دکھاتے جس سے ہم پر بھی یہ واضح ہو جائے کہ فی الواقع اگر ہم نے ان کی بات نہ مانی تو ہم پر قہر الٰہی ٹوٹ پڑے گا۔

ان میں سے پہلے اعتراض کا جواب یہ دیا کہ تم دنیا میں پہلے رسول نہیں ہو، تم سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں، وہ سب بشر ہی تھے ان میں کوئی بھی مافوق البشر نہیں تھا۔ سب بیوی بچے رکھتے تھے اور اسی طرح کھاتے پیتے تھے جس طرح تم کھاتے پیتے ہو۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ دیا کہ کوئی نشانی اور معجزہ دکھانا رسول کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ اس کا انحصار اللہ کے اذن اور اس کی حکمت پر ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے اپنی حکمت کے تحت ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اور ہر مقررہ ساعت کے لیے ایک نوشتہ ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ (۳۹)

وَيُثْبِتُ یعنی يُثْبِتُ مَا يَشَآءُ۔

اس نوشتہ پر تمام تر اختیار اللہ ہی کا ہے۔ اس میں ہر محو و اثبات اور ہر اخراج و اندراج صرف اسی کی

حکمت و مشیت کے تحت ہوتا ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے کسی دوسرے کی اس تک رسائی نہیں ہے۔

وَإِن مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۴۰)

عذاب کا وقت خدا کی مشیت و حکمت کے مطابق

یعنی جس عذاب کی ہم ان کو، تمہاری تکذیب کی صورت میں دھمکی سنا رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی نمونہ تمہاری زندگی ہی میں ہم دکھا دیں یا تم کو تو وفات دے دیں اور تمہاری وفات کے بعد ان کو اس کا مزہ چکھائیں۔ اس امر کا تمام تر انحصار ہماری مشیت و حکمت پر ہے۔ اس معاملے میں نہ تم کو کوئی دخل ہے اور نہ تمہیں اس کے لیے پریشان ہونا چاہیے۔ تم پر ذمہ داری صرف ان لوگوں کو ہماری بات پہنچا دینے کی ہے، ان سے مواخذہ و محاسبہ کرنا ہمارا کام ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۴۱)

'الارض' سے مراد مکہ ہے

دعوت اسلام کے تدریجی عروج میں نشانی

'اَلْاَرْضُ' سے مراد یہاں سرزمین مکہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو اسلام کے غلبہ اور خود ان کی اپنی ہزیمت کی کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو وہ اس امر واقعی کو کیوں نہیں دیکھتے کہ اسلام کی دعوت بالتدریج مکہ کے اطراف کو فتح کرتی ہوئی سرزمین مکہ کی طرف بڑھ رہی ہے اور وہ دن دور نہیں ہے جب وہ اس سرزمین کو بھی زیرنگین کرے گی۔ اسلام کے تدریجی عروج اور مکہ کے اطراف کے قبائل اور مدینہ میں اس کی اشاعت کو اللہ تعالیٰ نے مکہ کی طرف اپنے اقدام سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ تعبیر ایک حقیقت ہے۔ اسلام کی دعوت کا آغاز تو مکہ سے ہوا لیکن قریش پوری قوت اور ہر نوع کے ظلم و ستم سے اس کو دبا دینے پر تل گئے لیکن حق کی آواز دبتی نہیں۔ آہستہ آہستہ اطراف کے قبائل کے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے اور مدینہ میں تو اس کو وہ فروغ ہوا کہ بالآخر اسی شہر کو اللہ تعالیٰ نے دارالہجرت ہونے کا شرف عطا فرمایا۔ دعوت کے اس دور میں اہل کتاب میں سے بھی، جیسا کہ اوپر گزرا، اسلام کے حق میں کلمہ خیر کہنے والے پیدا ہو گئے تھے۔ الغرض اسلام خود اپنے گھر میں تو اس دور میں مظلوم رہا لیکن باہر اس کو فروغ حاصل ہو رہا تھا اور قبیلے کے قبیلے قریش کی سیادت اور ان کے دین شرک سے نکل کر اسلام اور پیغمبر اسلام کی اطاعت میں داخل ہو رہے تھے۔ اسی صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر کفار کو کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو وہ اس نشانی پر کیوں نہیں غور کرتے۔

'لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ' یعنی اسلام کا یہ غلبہ ایک فیصلہ الٰہی ہے، یہ ہو کے رہے گا اور کسی کی یہ طاقت نہیں کہ وہ اس قضائے مبرم کو ٹال سکے۔ اور مزید آنکہ اس میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ جلد وہ وقت آ رہا ہے جب یہ سارا حساب چکا دیا جائے گا۔

بعینہٖ یہی مضمون سورۂ انبیاء میں بھی بیان ہوا ہے۔ اس آیت کو بھی سامنے رکھ لیجیے۔ قریش کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۭ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (الانبیاء۔ ۴۴)

بلکہ ہوا یہ کہ ہم نے ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو بھی اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ اسی حال میں ان پر ایک طویل مدت گزر گئی (اس وجہ سے یہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ یہ اسی طرح ہمیشہ غالب و سربلند رہیں گے) کیا وہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ہم ان کی سرزمین کی طرف اس کو اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں (تو کیا یہ علامت اس بات کی ہے کہ) وہی غالب رہنے والے ہیں۔

اسلام کی دعوتی فتوحات

غالباً اسی آیت کی بنا پر بعض لوگوں نے اس سورہ کو مدنی قرار دیا ہے۔ ان کا ذہن اس طرف گیا کہ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا سے اشارہ مسلمانوں کی جہادی فتوحات کی طرف ہے اور جہادی فتوحات کا تعلق چونکہ مدنی دور ہی سے ہے اس وجہ سے یہ سورہ ان کے نزدیک مدنی ہوئی۔ لیکن ہمارے نزدیک اس سے اشارہ اسلام کی دعوتی فتوحات کی طرف ہے۔ پھر اوپر آپ نے دیکھا کہ بعینہٖ یہی آیت، تھوڑے سے تغیر الفاظ کے ساتھ، سورۂ انبیاء میں بھی ہے جو بالاتفاق مکی ہے۔ البتہ ان الفاظ سے یہ بات ضرور نکلتی ہے کہ یہ سورہ مکی زندگی کے اس دور سے تعلق رکھتی ہے جب مکہ کے اطراف کے قبائل اور مدینہ میں اسلام کی دعوت زور پکڑ رہی تھی اور قریش کی سیادت کی چولیں ڈھیلی ہو رہی تھیں بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور کمزور مسلمانوں پر ان کے مظالم نے ان کی اخلاقی ساکھ مکہ سے باہر والوں کی نظر میں بالکل ہی گرا دی تھی۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ۭ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۭ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ (۴۲)

اب یہ فرمایا کہ جس قسم کی چالیں اسلام اور پیغمبر کے خلاف یہ چل رہے ہیں اسی قسم کی چالیں ان سے پہلے کی قومیں اپنے اپنے پیغمبروں کے خلاف چل کے اس کا انجام دیکھ چکی ہیں۔ یہ بھی وہی انجام دیکھنے والے ہیں۔ ساری چالیں خدا کے اختیار میں ہیں، ہر جان جو کچھ کرتی ہے اللہ اس سے پوری طرح باخبر رہتا ہے۔ کوئی چیز بھی اس کے اختیار اور علم سے باہر نہیں۔

وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ یعنی دنیا میں تو ان کا جو انجام ہونا ہے وہ اوپر کی آیات میں بتا دیا گیا۔ آخرت میں جو انجام سامنے آنے والا ہے وہ بھی جلد جان لیں گے کہ آخرت کی فیروزمندی کس کو حاصل ہوتی ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (۴۳)

یعنی یہ سارے دلائل و شواہد سننے اور دیکھنے کے باوجود اگر یہ کفار یہی کہتے ہیں کہ تم فرستادۂ خدا نہیں ہو تو ان سے مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا کی گواہی کافی ہے اور ان لوگوں کی جو کتاب الٰہی کے علم کے سچے حامل ہیں۔ یہ اشارہ اہل کتاب میں سے ان علماء کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر آیت ۳۶ میں گزرا۔

اس سورہ کی تفسیر میں یہ آخری سطریں ہیں جو اس بے مایہ کے قلم سے حوالۂ قرطاس ہوئیں۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

تدبّرِ قرآن

14

ابرٰھیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود

سورۂ رعد کی آیات اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا الایہ میں قریش کو جو دھمکی اور مسلمانوں کو جو بشارت، اشارہ اور کنایہ کے انداز میں، دی گئی تھی اس سورہ میں وہ کھل کر سامنے آگئی ہے۔ قریش پر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ آج مکہ کی سرزمین پر حق و باطل میں جو کشمکش برپا ہے اس میں تم جس کلمۂ باطل کے علمبردار ہو اس کی کوئی بنیاد نہ زمین میں ہے نہ آسمان میں۔ اس کی مثال گھورے پر اُگے ہوئے ایک شجرۂ خبیثہ کی ہے جو ایک جنبش میں اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے۔ اگر یہ اب تک برقرار رہا تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ کوئی مضبوط جڑ رکھتا تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس کو اکھاڑنے والے ہاتھ موجود نہیں تھے۔ اب اللہ نے وہ ہاتھ نمودار کر دیے ہیں تو تم دیکھو گے کہ کتنی جلدی اس کا قصہ پاک ہوا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل اسلام کی دعوت کی تمثیل اس سدا بہار شجرۂ طیبہ سے دی گئی ہے جس کی جڑیں پاتال میں اتری ہوئی اور جس کی شاخیں فضائے آسمانی میں پھیلی ہوئی ہوں۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو دنیا میں بھی مضبوط و مستحکم کرے گا اور آخرت میں بھی ان کو سرخروئی بخشے گا بشرطیکہ وہ صبر و استقامت کے ساتھ اپنی دعوتِ حق پر جمے رہے اور اس راہ میں پیش آنے والی آزمائشوں کا انھوں نے اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے مقابلہ کیا۔

اس حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں واضح کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی سرگزشتوں کے ان پہلوؤں کی طرف اس میں اشارات ہیں جن سے اصل مدعا کی تائید ہوتی ہے۔ آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت کا حوالہ دے کر یہ واضح فرمایا ہے کہ وہ کس مقصد کے لیے اپنے وطن سے ہجرت کر کے اس وادیٔ غیر ذی زرع میں آئے تھے، اس سرزمین کے لیے انھوں نے کیا دعا کی تھی، اس میں اپنی اولاد کو بساتے ہوئے ان کے دل میں کیا ارمان تھے اور انھوں نے اپنے رب سے ان کے لیے کیا چاہا اور کیا مانگا تھا۔ یہ باتیں سنانے سے مقصود قریش کے سامنے ان کی اپنی تاریخ کا آئینہ رکھ دینا ہے تاکہ وہ اندازہ کر سکیں کہ ان کو کیا بننا تھا اور وہ کیا بن کے رہ گئے ہیں۔

اگرچہ سورہ کا نظام سمجھنے کے لیے یہ تمہید بھی کافی ہے لیکن اپنے طریقے کے مطابق ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے اس کتاب کو اتارنے کا مقصد واضح فرمایا گیا ہے کہ یہ اس لیے اتاری

گئی ہے کہ اس کے ذریعے سے تم لوگوں کو عقاید و اعمال کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان و عمل صالح کی روشنی میں لاؤ۔ پھر ان لوگوں کا انجام بتایا گیا ہے جو اس کا انکار کریں گے۔ قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ اس کتاب کو ان کی زبان میں اتار کر خدا نے ان پر اپنی حجت تمام کر دی ہے۔ پیغمبر صلعم کو یہ تسلی دی گئی ہے کہ لوگوں کا ایمان لانا یا نہ لانا خدا کی توفیق بخشی پر منحصر ہے وہ جس کو جس چیز کا مستحق پائے گا وہی دے گا۔ اس معاملے میں تمھاری ذمہ داری صرف بلاغ کی ہے۔

(۵-۱۷) حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیاء سابقین کا حوالہ کہ وہ بھی اسی مقصد کو لے کر آئے تھے اور انھیں اس راہ میں بڑے بڑے مصائب سے دوچار ہونا پڑا لیکن انھوں نے استقامت دکھائی جس کا صلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ ملا کہ وہ غالب رہے اور ان کے مخالفین کو اللہ نے تباہ کر دیا۔ مقصود ان سرگزشتوں کے حوالہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر یہ واضح کرنا ہے کہ اس کشمکش میں بھی بالآخر غلبہ انہی کو حاصل ہوگا لیکن ان ابتدائی مراحل میں صبر و استقامت اور آخری مرحلہ میں شکر نعمت لازمی ہے۔

(۱۸-۲۲) کفار و مشرکین کا آخرت میں جو حشر ہوگا اس کا بیان کہ ان کا سارا کیا کرایا خاک اور راکھ ہو کر اڑ جائے گا۔ لیڈر اور ان کے پیرو ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے۔ یہاں تک کہ شیطان بھی اپنی پیروی کرنے والوں سے اعلان برأت کر دے گا اور ان سے کہے گا کہ تم مجھے ملامت کرنے کے بجائے خود اپنے سر پیٹو، تم اپنی بدبختی کے ذمہ دار خود ہو۔

(۲۳-۲۷) اس کے مقابل میں اہل ایمان کا حال آخرت میں یہ ہوگا کہ آپس میں سلام و تحیت اور مبارک سلامت کے تبادلے ہو رہے ہوں گے۔ اللہ نے اپنے قول محکم کی بدولت جس طرح دنیا میں ان کو سرفرازی بخشی اسی طرح آخرت میں بھی ان کو سرفرازی بخشے گا۔

(۲۸-۳۴) قریش کے لیڈروں کو انذار و تنبیہ کہ انھوں نے اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو کفر و شرک کا ذریعہ بنایا اور اس طرح اپنی قوم کو جہنم کے گھاٹ پر اتارا۔ ضمناً مسلمانوں کو نصیحت کہ وہ نماز کا اہتمام رکھیں اور اپنے مال میں سے خدا کی راہ میں سرّاً و علانیۃً خرچ کریں۔ مقصود اس نصیحت سے مسلمانوں کو یہ رہنمائی دینا ہے کہ یہی چیز ان کے حریفوں کے مقابل میں عند اللہ ان کے حق کو مرجح کرنے والی اور حضرت ابراہیمؑ کے اس مقصد کو پورا کرنے والی ہوگی جس کے لیے انھوں نے اس وادی غیر ذی زرع میں، جیسا کہ آگے اس کا ذکر آ رہا ہے، اپنی ذریت کو بسایا تھا۔

(۳۵-۴۱) حضرت ابراہیمؑ کی ان دعاؤں کا حوالہ جو انھوں نے سرزمین مکہ کو اپنا دار الہجرت بنانے کے بعد اس سرزمین کے لیے اور اپنی اولاد کے لیے کیں۔ مقصود ان کے حوالے سے قریش پر یہ واضح کرنا ہے کہ ان کی ساری زندگی حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں اور تمناؤں کے بالکل برعکس ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے مقصد کو اگر پورا کر رہے ہیں تو یہ پیغمبر اور ان کی پیروی کرنے والے مسلمان لیکن قریش ان کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

(۴۲-۵۲) خاتمۂ سورہ جس میں تمام تر تنبیہ و انذار ہے۔

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ (۱۴)

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــــــ اٰيَاتُهَا ۵۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۴ الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ
بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۱ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۝۲
الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝۳ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ
رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ
مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۴

ترجمۂ آیات ۱-۴ یہ الٓرٰ ہے۔ یہ کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اس لیے اتاری ہے کہ تم لوگوں کو تاریکیوں
سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ۔ ان کے رب کے اذن سے۔ خدائے عزیز و حمید کے راستہ کی طرف۔
اس اللہ کے راستہ کی طرف جو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا مالک ہے اور کافروں کے لیے
ایک عذاب شدید کی تباہی ہے۔ ان کے لیے جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور اللہ
کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ بہت دور کی گمراہی میں ہیں۔ اور
ہم نے جو رسول بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ ان پر اچھی طرح واضح کر دے۔ پس اللہ
جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔ ۱-۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۱)

'الٓرٰ'۔ حروف مقطعات پر جامع بحث سورۂ بقرہ کے شروع میں ملاحظہ فرمائیے۔

'كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ'

ظلمات اور نور سے مراد

'ظُلُمٰت' سے مراد عقائد و اعمال کی تاریکیاں اور 'نور' سے مراد ایمان و عمل صالح کی روشنی ہے۔ گمراہی کے ہزاروں راستے ہیں لیکن ہدایت کی راہ ایک ہی ہے اس وجہ سے ظلمات جمع ہے اور نور واحد۔

ہدایت خدا کی توفیق بخشی پر منحصر ہے

'بِاِذْنِ رَبِّهِمْ' یعنی یہ تاریکیوں سے نکل کر روشنی کی طرف آنا جن کو بھی میسر ہوگا خدا کی توفیق بخشی ہی سے میسر ہوگا۔ وہی اپنی سنت کے مطابق جن کو ہدایت کا اہل پائے گا ان کو ہدایت بخشے گا اور جن کو اس کا اہل نہیں پائے گا ان کو ان کی گمراہی میں بھٹکتا چھوڑ دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی ذمہ داری اس معاملے میں صرف تبلیغ و دعوت کی ہے۔ لوگوں کو ہدایت کی راہ پر لا کھڑے کرنا اس کی ذمہ داری ہی نہیں ہے۔

'عزیز' اور 'حمید' کا مفہوم

'اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ' یہ 'نور' کی وضاحت فرما دی گئی ہے کہ اس سے مراد وہ راستہ ہے جو خدائے عزیز و حمید کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ 'عزیز' یعنی سب پر غالب و مقتدر، اس وجہ سے وہی سزاوار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ 'حمید' یعنی تمام جود و کرم کا منبع اس وجہ سے وہی حق دار ہے کہ اس کی حمد کی جائے اور اس سے امیدیں باندھی جائیں۔

اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ (۲-۳)

دنیوی مفادات ہدایت کے لیے حجاب

یعنی اس خدا کے راستہ کی طرف جو تنہا آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ آج اپنے مزعومہ شریکوں کے اعتماد پر اس صحیفہ ہدایت کا انکار کر رہے ہیں وہ اپنے لیے ایک عذاب شدید کی تباہی کو دعوت دے رہے ہیں۔

'الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ' یہ ان کے اصل سبب انکار سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ باتیں تو وہ جو چاہیں بنا لیں لیکن اصل چیز جو ان کے اور اس صحیفۂ ہدایت کے درمیان حجاب بنی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ آخرت کی خاطر اپنے دنیوی مفادات قربان کرنے کو تیار نہیں ہیں، 'وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' چنانچہ وہ خود بھی اللہ کی راہ سے روگردان ہیں اور دوسروں کو بھی، جہاں تک ان کا زور چلتا ہے، اس سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ 'وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' یعنی خدائے عزیز و حمید کی طرف لے جانے والی سیدھی راہ کو کج

کر کے اپنے مزعومہ معبودوں کی طرف موڑ رہے ہیں اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ خدا تک اگر پہنچا جا سکتا ہے تو انہی پر پیچ تنگ ڈنڈیوں سے ہو کر پہنچا جا سکتا ہے۔ اُولٰٓئِکَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ یعنی اپنی ان حرکتوں کے سبب سے وہ اصل شاہراہ سے بھٹک کر بہت دور نکل گئے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمْ ؕ فَیُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۴)

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس احسان کا اظہار فرمایا ہے جو اس صحیفۂ ہدایت کو عربی میں اور رسولؐ کو خود ان کی قوم کے اندر سے مبعوث فرما کر اس نے ان کے اوپر کیا ہے اور مقصود اس سے ان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ انھیں اللہ کی اس نعمت کی قدر کرنی چاہیے کہ اس نے انہی کے اندر کے ایک فرد کے ذریعہ سے انہی کی زبان میں اپنا صحیفہ اتارا تاکہ وہ اللہ کی ہدایت کو لوگوں پر اچھی طرح واضح کر دے۔ فَیُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔ یہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت واضح فرمائی ہے کہ وہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ تمہارا کام اللہ کی باتوں کو اچھی طرح واضح کر دینا ہے وہ تم نے کر دیا ہے اور کر رہے ہو، رہا لوگوں کا ایمان لانا یا نہ لانا تو یہ خدا کی مشیت پر منحصر ہے اور خدا عزیز و حکیم ہے۔ یعنی اس کی ہر مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے۔ جو لوگ اس کی حکمت کے تحت ہدایت پانے کے مستحق ٹھہریں گے وہ ہدایت پائیں گے اور جو لوگ اس کے مستحق نہیں ٹھہریں گے وہ اس سے محروم رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے اندر جو صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں اگر ایک شخص ان سے فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ مزید توفیق کا سزاوار قرار پاتا ہے اور اگر کوئی شخص ان کی قدر نہیں کرتا تو مزید پانا تو الگ رہا جو اس کو دی گئی ہوتی ہیں وہ بھی اس سے سلب ہو جاتی ہیں۔ اس سنت الٰہی کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۵-۸

آگے حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی مقصد سے مبعوث فرمایا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ کام کیا اور اللہ کی تائید و نصرت نے ان کو فرعونیوں کے پنجۂ ستم سے نجات دلائی اور ساتھ ہی ان کو خدا کے اس فیصلہ سے بھی آگاہ فرما دیا کہ اگر تم نے اپنے رب کی اس نعمت کی قدر کی اور اس کے شکرگزار رہے تو تم پر مزید فضل ہو گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو خدا کے سخت عذاب سے دوچار ہو گے۔ اس یاددہانی سے مقصود ان یہود کو متنبہ کرنا تھا جو اسلام کی مخالفت کے جوش میں اپنا سارا وزن قریش کے پلڑے میں ڈال رہے تھے اور جس طرح قریش حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات کو پس پشت ڈال چکے تھے اسی طرح یہود حضرت موسیٰؑ کی ان تنبیہات سے اپنے کان

بند کیے ہوئے تھے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵-۸

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى
النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ
شَكُوْرٍ ۝۵ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ
اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ
اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
ع ۱۲ عَظِيْمٌ ۝۶ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ
اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝۷ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي
الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۸

ترجمۂ آیات ۵-۸

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالو اور ان کو خدا کے یادگار ایام یاد دلاؤ، بے شک ان کے اندر ثابت قدم رہنے والوں اور شکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ ۵

اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے اوپر اللہ کے اس فضل کو یاد رکھو کہ اس نے تمھیں آلِ فرعون کے پنجہ سے نجات دی جو تمھیں نہایت برے عذاب چکھاتے تھے اور تمھارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور بے شک اس میں تمھارے رب کی جانب سے بہت بڑی آزمائش تھی۔ اور یاد کرو جب تمھارے رب نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم شکر گزار رہے تو میں تمھیں بڑھاؤں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہوگا۔ اور موسیٰ نے کہا کہ اگر تم اور وہ سارے لوگ جو روئے زمین پر ہیں ناشکری کرو گے تو خدا کا کچھ نہیں

بگاڑو گے اور وہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ ۸-۶

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (۵)

'بِآيَاتِنَا' یعنی عصا اور ید بیضا وغیرہ کی نشانیوں کے ساتھ جن کا دوسرے مختلف مقامات میں نہایت تفصیل سے ذکر ہوا ہے۔

'أَيَّامُ اللّٰهِ' سے مراد

'وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ' ایام کا لفظ جب اس طرح آتا ہے جس طرح یہاں آیا ہے تو اس سے خاص بڑے بڑے اہم تاریخی اور یادگار دن مراد ہوتے ہیں۔ مثلاً ایام العرب، کہیں تو اس سے عرب کی جنگیں مراد ہوں گی اسی طرح أَيَّامُ اللّٰهِ سے مراد وہ یادگار تاریخی دن ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے نافرمان قوموں پر عذاب نازل فرمائے اور اپنے باایمان بندوں کو ان کے ظلم و ستم سے نجات بخشی۔

'إِنَّ فِي ذَٰلِكَ' یعنی موسیٰ کی اس سرگزشت میں ثابت قدم رہنے والوں اور شکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جب دعوت حق بلند کی تو ان کو اور ان کی قوم کو فرعونیوں کے ہاتھوں بڑے بڑے مظالم سہنے پڑے لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کو غرق کر دیا اور بنی اسرائیل کو نجات بخشی۔ مطلب یہ ہے کہ اسی طرح مسلمانوں کے سامنے بھی اس وقت آزمائش کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے سے اگر وہ ثابت قدمی سے گزر گئے تو کامیابی ان کے قدم چومے گی اور وہ اپنے رب کے افضال و عنایات پر شکرگزار ہوں گے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنجَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ (۶)

'آل' سے مراد اتباع اور پیرو

حضرت موسیٰ کی ایک تقریر کا حوالہ

'آلِ فِرْعَوْنَ' ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ لفظ 'آل' سے مراد اتباع اور پیرو بھی ہوتے ہیں۔ یہ حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا حوالہ ہے جو انھوں نے اپنی قوم کے سامنے اس وقت فرمائی ہے جب ان کو اور ان کی قوم کو فرعونیوں کے چنگل سے نجات مل چکی ہے۔ اس تقریر سے حضرت موسیٰ کا مقصود اپنی قوم کو یہ یاد دلانا تھا کہ یہ بہت بڑی آزمائش تھی جس سے خدا نے محض اپنے فضل سے تمھیں نجات بخشی ہے۔ تو اس فضل کو یاد رکھنا، خدا کے برابر شکرگزار رہنا، اس کو بھول کر پھر کہیں اپنی سرمستیوں میں نہ کھو جانا جس کی سزا تمھیں فرعونیوں کے عذاب کی شکل میں ملی۔ حضرت موسیٰ کی اس تقریر کی یاد دہانی وقت کے بنی اسرائیل کو اس لیے کرائی گئی ہے کہ وہ متنبہ ہوں کہ وہ حضرت موسیٰ کی اس تلقین کو فراموش کر کے پھر شیطان کے راستہ پر چل پڑے ہیں اور اسلام کی مخالفت کر کے از سر نو اپنی شامت کو دعوت دینا چاہتے ہیں۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (۷)

وقت کے بنی اسرائیل کو یاددہانی

تَأَذَّنَ کے معنی باخبر اور آگاہ کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ موسیٰ نے تو وہ بات کہی تھی جو اوپر گزری اور ساتھ ہی تمھارے رب نے بھی تمھیں آگاہ کر دیا تھا کہ اگر تم میرے احکام و ارشادات کی پیروی کر کے میرے شکر گزار رہے تو میں تمھاری تعداد اور اپنے افضال و عنایات میں برابر اضافہ کروں گا اور اگر تم ناشکری اور نافرمانی کی راہ پر چل پڑے تو یاد رکھو کہ میرا عذاب بھی بڑا ہی سخت ہو گا ۔۔۔ یہ بات بھی وقت کے بنی اسرائیل کو یاددہانی کے لیے یہاں لائی گئی ہے اور رَبُّكُمْ کے خطاب سے واضح ہے کہ یہ ان کو براہ راست مخاطب کر کے فرمائی گئی ہے۔

وَقَالَ مُوسَىٰ إِن تَكْفُرُوا أَنتُمْ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ (۸)

شکر گزاروں پر عنایت میں اضافہ

یعنی ساتھ ہی موسیٰ نے یہ تنبیہ بھی کر دی تھی کہ خدا کی شکر گزاری کا یہ مطالبہ اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ اس کا محتاج ہے یا اس سے اس کی شان اور عظمت میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز اور ہر حال میں ستودہ صفات ہے۔ یہ شکر گزاری خود بندوں ہی کے لیے موجب خیر و برکت ہے اس لیے کہ اس سے، جیسا کہ اوپر والی آیت میں مذکور ہے، اللہ تعالیٰ بندوں پر اپنی نعمتوں اور برکتوں میں اضافہ فرماتا ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ۔۔۔ آیات ۹-۱۷

آگے خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن مسلمانوں ہی کی طرف ہے۔ ان کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ تمام رسولوں اور ان کی قوموں کی سرگزشت اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ہر چند راہ حق میں آزمائشیں بہت پیش آتی ہیں، یہاں تک کہ بسا اوقات اس راہ میں گھر در سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے لیکن آخر کار کامیابی اہل ایمان ہی کو حاصل ہوتی ہے ۔۔۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹-۱۷

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ
مِن بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا
أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ وَإِنَّا
الثلثة لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ﴿٩﴾ قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ
شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ
وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى قَالُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيدُونَ

أَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٠﴾ قَالَتْ
لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى
مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ
اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١١﴾ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَ
قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿١٢﴾ ع وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ ع ٢ ١٤
لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٣﴾
وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَ
خَافَ وَعِيْدِ ﴿١٤﴾ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿١٥﴾ مِّنْ
وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿١٦﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ
يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ
عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿١٧﴾

کیا تمھیں ان لوگوں کا حال نہیں پہنچا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، قوم نوح، عاد اور ثمود کا حال ترجمۂ آیات
اور ان کا جو ان کے بعد ہوئے ہیں۔ خدا کے سوا جن کو کوئی نہیں جانتا۔ ان کے رسول ان کے پاس ۹-۱۷
کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو انھوں نے ان کے منہ پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور بولے کہ جس پیغام
کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دے رہے ہو ہم
اس کے باب میں سخت الجھن میں ڈال دینے والے شک میں ہیں۔ ان کے رسولوں نے کہا کیا تمھیں
آسمانوں اور زمین کے وجود میں لانے والے اللہ کے بارے میں شک ہے؟ وہ تمھیں بلاتا ہے تاکہ

تمھارے گناہوں کو بخشے اور تمھیں ایک وقت معین تک مہلت دے۔ وہ بولے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہم کو ان چیزوں کی عبادت سے روک دو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے تو ہمارے پاس کوئی کھلا ہوا معجزہ لاؤ۔ ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں تو تمھارے ہی جیسے آدمی لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے اپنا فضل فرماتا ہے۔ اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں کہ ہم تمھارے پاس کوئی معجزہ لا دیں مگر اللہ کے حکم سے اور ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ رکھیں جب کہ اس نے ہمیں ہمارے راستوں کی ہدایت بخشی اور تم ہمیں جو ایذا بھی پہنچاؤ گے ہم اس پر صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ یا تو ہم تمھیں اپنی سرزمین سے نکال کر رہیں گے یا تمھیں ہماری ملت میں پھر واپس آنا پڑے گا تو ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں ہی کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تم کو زمین میں بسائیں گے، یہ ان کے لیے ہے جو میرے حضور پیشی سے ڈرے اور میری وعید سے ڈرے۔ ۹-۱۴

اور انھوں نے فیصلہ چاہا اور ہر سرکش ضدی نامراد ہوا۔ اس کے آگے جہنم ہے اور اس کو پیپ لہو پینے کو ملے گا۔ وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پینے کی کوشش کرے گا اور اس کو حلق سے نہ اتار سکے گا اور موت اس پر ہر جانب سے پلی پڑ رہی ہوگی اور وہ مرنے والا نہ بنے گا اور آگے ایک اور سخت عذاب اس کے لیے موجود ہوگا۔ ۱۵-۱۷

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَا

أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ (۹)

قوم نوح اور عاد کے بعد کی بعض قوموں کا حوالہ

وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ۔ یہ حوالہ ہے ان قوموں کا جو قوم نوح اور عاد اور ثمود کے بعد آئیں اور ان کے اندر اللہ نے اپنے رسول بھی بھیجے لیکن قرآن نے ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ تاریخوں میں بھی ان کا کوئی قابلِ اعتماد تذکرہ موجود نہیں ہے۔ صحیح علم ان کا صرف اللہ ہی کو ہے۔ دوسرے مقام میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ - ۷۸ المومن (اور ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے، ان میں سے کچھ کی سرگزشتیں ہم نے تم کو سنا دیں اور ان میں سے کچھ کی نہیں سنائیں)۔

رسولوں کے منہ بند کرنے کی کوشش

فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ، یعنی انھوں نے اپنے رسولوں کے منہ بند کر دینے کی کوشش کی۔ جب کوئی شخص کسی شخص کو بات کرنے سے، غصہ اور نفرت کے ساتھ، روکنا چاہتا ہے تو اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے کہ زبان بند کرو، مزید ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالو۔ 'رَدُّوا' یہاں 'جَعَلُوا' کے معنی میں ہے اور اس معنی میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ، یعنی جس پیغامِ انذار کے ساتھ تم خدا کی طرف سے بھیجے جانے کے مدعی ہو ہمیں اس سے صاف انکار ہے۔ نہ ہم تمھیں خدا کا رسول مانتے ہیں اور نہ تمھاری یہ دھمکی ماننے کے لیے تیار ہیں کہ اگر ہم نے تمھاری بات نہ مانی تو ہم تباہ کر دیے جائیں گے۔ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ الآیۃ اور یہ توحید اور قیامت پر ایمان لانے کی جو دعوت تم ہمیں دے رہے ہو تو اس باب میں بھی ہم سخت شک میں ہیں۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ
وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا
كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ (۱۰)

سوال استعجاب کی نوعیت کا

رسولوں کی طرف سے یہ سوال استعجاب کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تمھیں آسمانوں اور زمین کے وجود میں لانے والے خدا کے باب میں شک ہے؟ خدا کو تو تم مانتے ہی ہو اور اسی کو آسمانوں اور زمین کا خالق بھی مانتے ہو، اسی کی دعوت ہم تمھیں دے رہے ہیں تو اس کے بارے میں تو کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب رہے وہ جن کو تم نے خدا کا شریک بنا رکھا ہے تو ان سے ہم تم کو روکتے ہیں اس لیے کہ ان کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

دعوت رحمت کے لیے

يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى یعنی یہ دعوت، جو وہ ہمارے ذریعہ سے تمھیں دے رہا ہے، کوئی چڑنے اور برہم ہونے کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تمھارے حق میں ایک عظیم رحمت ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ اگر تم یہ دعوت قبول کر لو تو وہ تمھارے گناہوں کو بخشے، تمھیں زندگی کی مہلت عطا فرمائے اور اس عذاب کو تم سے ہٹا لے جس کو تم نے اپنی شامت اعمال سے دعوت دے رکھی ہے اور جو ہماری

تکذیب کی صورت میں لازماً تم پر آ دھمکے گا۔

بشریت پر اعتراض ۔ معجزہ کا مطالبہ

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا الاٰیۃ یعنی اپنے رسولوں کے ان ارشادات کو سن کر اگر وہ بولے تو یہ بولے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو اور اپنی ان تقریروں سے تم ہمیں ہمارے ان معبودوں کی عبادت سے روک دینا چاہتے ہو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے تو ایسی سنگین بات ہم اپنے ہی جیسے آدمیوں کی کس طرح مان سکتے ہیں؟ اگر تم اتنی بات منوانی چاہتے ہو تو کوئی ایسا معجزہ دکھاؤ جس کو دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھے کہ بے شک تم خدا کے فرستادہ ہو اور جو کچھ کہہ رہے ہو اسی کی طرف سے کہہ رہے ہو۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ۭ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۱۱-۱۲)

رسولوں کا جواب

یہ رسولوں کا جواب نقل ہوا ہے کہ اگر تم کو ہماری بشریت پر اعتراض ہے تو ہم کو یہ اعتراف ہے کہ بلاشبہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں۔ ہم کو مافوق البشر ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے انہی بندوں میں سے جو بشر ہوتے ہیں جن پر چاہتا ہے اپنا فضل فرماتا ہے اور ان کو نبوت و رسالت کے منصب پر سرفراز کر دیتا ہے۔ ہم پر یہی فضل ہوا ہے۔ اس کے سوا ہم اور کسی چیز کا دعویٰ نہیں رکھتے۔

ہم دوسرے مقام پر یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ خدا کی ہر مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے اس وجہ سے 'عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ' کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ جس کو چاہے پکڑ کے نبی اور رسول بنا دے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں میں سے جن کو اس منصب کے لیے اہل پاتا ہے ان میں سے جن کے لیے اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے اس کو اس کارِ عظیم کے لیے انتخاب فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ، یعنی اگر ہماری بشریت کی بنا پر ہمارے ہاتھوں کوئی واضح معجزہ دیکھے بغیر ہمیں رسول ماننے کے لیے تیار نہیں ہو تو یہ چیز ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ کوئی معجزہ تو ہم خدا ہی کے حکم سے دکھا سکتے ہیں۔ 'وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ' سو تمہارے اس مطالبہ کو ہم اللہ کے حوالے کرتے ہیں، اگر وہ چاہے گا تو کوئی معجزہ دکھا دے گا اور اگر نہ چاہے گا تو نہ دکھائے گا۔ اہل ایمان کے شایانِ شان بات یہی ہے کہ وہ اس طرح کے معاملات میں اللہ پر بھروسہ رکھیں۔

توکل کی بنیاد

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا الاٰیۃ یہ خدا پر بھروسہ کرنے کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ جن راستوں پر چلنے کی اس نے ہمیں خود ہدایت فرمائی ہے، ہمارا اعتماد ہے اور ہمیں اعتماد کرنا چاہیے کہ ان میں جو مزاحمتیں اور رکاوٹیں پیش آئیں گی ان کے دور کرنے میں وہ ہماری مدد اور رہنمائی فرمائے گا۔ انہی مزاحمتوں اور رکاوٹوں میں سے تمہارا یہ مطالبہ بھی ہے۔ ہم بھروسہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس معاملے میں بھی ہماری مدد فرمائے گا۔ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اس راستہ میں استقامت دکھائیں سو یہ عزم ہم رکھتے ہیں کہ تم جو ایذائیں ہمیں پہنچاؤ گے

ہم اس پر صبر کریں گے اور اللہ پر بھروسہ کریں گے۔ اس لیے کہ اللہ ہی کی ذات ایسی ہے جس پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِرُسُلِھِمْ لَنُخْرِجَنَّکُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ط فَاَوْحٰٓی اِلَیْھِمْ رَبُّھُمْ لَنُھْلِکَنَّ الظّٰلِمِیْنَ o وَلَنُسْکِنَنَّکُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِھِمْ ط ذٰلِکَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ (۱۳-۱۴)

رسولوں کو ان کی قوموں کی دھمکی

ہر رسول کی زندگی میں بالآخر یہ مرحلہ بھی پیش آیا ہے کہ اس کی دعوت سے تنگ آ کر اس کی قوم نے اس کو یہ نوٹس دے دیا کہ یا تو تم ہماری ملت میں واپس آ جاؤ ورنہ ہم تمھیں اپنی سرزمین سے جلاوطن کر دیں گے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی ہے تو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے رسولوں کو یہ بشارت دے دی ہے کہ ہم ان ظالموں ہی کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمھیں زمین میں بسائیں گے۔ ذٰلِکَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ یعنی یہ عظیم بشارت ان کے لیے ہے جو میرے حضور پیشی اور میری وعید سے ایسے خائف رہے کہ ان کے مقابل میں انھوں نے کسی مصیبت اور کسی دھمکی کی بھی پروا نہیں کی۔

اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا۔ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ کوئی رسول اپنی زندگی کے کسی دور میں ملت جاہلیت کا پیرو بھی رہا ہے۔ انبیاء بعثت سے پہلے بھی فطرۃ اللہ پر قائم رہے لیکن چونکہ دعوت سے پہلے کی زندگی میں قوم کے لیے ان کے ساتھ عناد کی کوئی وجہ نہیں تھی اس وجہ سے قوم کے لوگ ان کو اپنی ہی ملت پر گمان کرتے تھے بعد میں جب انھوں نے دعوت شروع کی تب قوم کے اشرار نے ان پر ملت سے انحراف کی بنا پر لعن طعن شروع کر دیا

رسولوں کے پیرؤں کے لیے تنبیہ

ذٰلِکَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ۔ میں رسولوں کے پیرؤں کے لیے تنبیہ اور استقامت کی تلقین ہے۔ آیت زیر بحث میں رسولوں کو جو بشارت دی گئی ہے اس میں چونکہ ان کے پیرو بھی شامل ہیں اس وجہ سے انھیں آگاہ کر دیا گیا کہ یہ بشارت ان کے لیے ہے جو ہر قسم کے مصائب کا مقابلہ کریں گے اور مخالفوں سے ڈر کر خدا کے خوف کو نظر انداز نہ کریں گے۔

ان آیات سے اس سورہ کے زمانۂ نزول پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں دعوت کے اس دور میں فرمائی گئی ہیں جب قریش نے اپنے ظلم و ستم سے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے ہجرت کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ گئی ہے۔

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ (۱۵)

رسولوں کی طرف سے فیصلۂ حق و باطل کی دعا

کفار تکذیب کے جوش میں بار بار اپنے رسولوں سے یہ مطالبہ کرتے رہتے تھے کہ جس عذاب کی تم ہمیں بار بار دھمکی سنا رہے ہو وہ لا دو تا کہ اس قضیہ کا فیصلہ ہو جائے لیکن اللہ کے رسول اپنی رأفت کے سبب سے ان کے لیے یہی دعا کرتے تھے کہ ان کو ایمان لانے کی سعادت نصیب ہو تاہم ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ بالآخر ایک مرحلہ وہ بھی آیا جب رسولوں نے بھی یہ دعا کی ہے کہ

رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ

وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ (اعراف - ۸۹) فیصلہ فرمادے اور تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔

اس مرحلے میں جب رسول نے فیصلہ کے لیے دعا کی ہے تو اللہ کا فیصلہ فوراً ہی صادر ہو گیا ہے اور عذاب الٰہی نے سرکشوں اور شریروں کی کمر توڑ دی ہے۔

مِنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۙ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ (۱۶ - ۱۷)

سرکشوں کے لیے آگے کا عذاب

یعنی ایسے سرکشوں اور جباروں کے لیے اسی عذاب دنیا پر بس نہیں ہے بلکہ ان کے لیے آگے جہنم بھی تیار کھڑی ہے جہاں ان کو پیپ لہو پینے کو ملے گا لیکن پیاس کا یہ عالم ہو گا کہ وہ اس کے گھونٹ بھریں گے اور اس کو حلق سے اتارنے کی کوشش کریں گے لیکن اس کو اتار نہ پائیں گے۔ ان پر موت ہر جانب سے پلی پڑ رہی ہو گی لیکن ان کو موت نصیب نہیں ہو گی کہ اس عذاب سے چھٹکارا ملے اور اسی پر بس نہیں، آگے ان کے لیے مزید سخت تر عذاب موجود ہو گا۔

۶- آگے کا مضمون ____ آیات ۱۸-۲۳

آگے کے احوال

آگے ان حالات کی تفصیل آرہی ہے جن سے ان کفار و مشرکین کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا۔ پیرو اپنے لیڈروں پر لعنت بھیجیں گے اور لیڈر اپنے پیروؤں پر یہاں تک کہ شیطان بھی اپنے پیچھے چلنے والوں کو صاف سنا دے گا کہ کوئی مجھے ملامت نہ کرے بلکہ جس نے میری پیروی کی ہے وہ آج اپنی بدبختی پر خود اپنا سر پیٹے۔ اس کے برعکس اہل ایمان کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ جنت میں براجمان ہوں گے اور ان کے درمیان مبارک سلامت کے تبادلے ہو رہے ہوں گے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۸-۲۳

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۱۸ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۱۹ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۲۰ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰۗؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ

اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ
اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٢١﴾ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا ع ۲ ۹ ۱۵
قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ
وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ
فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ
بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٢﴾ وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا
سَلٰمٌ ﴿٢٣﴾

ترجمۂ آیات ۱۸-۲۳

ان لوگوں کے اعمال کی تمثیل جنھوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا یہ ہے کہ جیسے راکھ ہو جس پر آندھی کے دن بادِ تند چل جائے۔ جو کچھ انھوں نے کمائی کی ہوگی اس میں سے کچھ بھی ان کے پلّے نہیں پڑے گی۔ یہی دور کی گمراہی ہے۔ کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو مقصدِ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم کو فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق کو لا بسائے۔ اور یہ اللہ کو ذرا مشکل نہیں۔ ۱۸-۲۰

اور سب اللہ کے حضور حاضر ہوں گے تو کمزور لوگ ان لوگوں سے جو بڑے بنے رہے کہیں گے کہ ہم تو تمھارے تابع رہے ہیں تو کیا اللہ کے اس عذاب میں سے کچھ تم ہمارا بوجھ ہلکا کرو گے؟ وہ جواب دیں گے کہ اگر اللہ نے ہم کو ہدایت دی ہوتی تو ہم بھی تمھیں ہدایت کی راہ دکھاتے۔ اب ہمارے لیے یکساں ہے چاہے ہم چلائیں یا صبر کریں، ہمارے لیے کوئی مفر نہیں۔ ۲۱

اور جب معاملے کا فیصلہ ہو چکے گا، شیطان بولے گا کہ بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو اس کی خلاف ورزی کی اور مجھے تم پر کوئی اختیار نہیں تھا بس میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے میری بات مان لی تو مجھے ملامت نہ کرنا، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو، نہ میں تمھاری فریاد رسی کر سکتا اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے۔ تم نے جو مجھے شریک بنایا تو میں نے اس کا پہلے سے انکار کر دیا۔ بے شک اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں ہی کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۲۲

اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے بھلے کام کیے ہوں گے وہ ایسے باغوں میں اتارے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، ان میں وہ اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے اور اس میں ان کی تحیت آپس میں ایک دوسرے پر سلام ہوگی۔ ۲۳

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۔ ۱۸

شرک باعتبار حقیقت کفر ہے

'الذین کفروا' سے مراد وہ مشرکین ہی ہیں جو یہاں مخاطب ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ شرک اپنی حقیقت کے اعتبار سے کفر ہی ہے۔ دین میں خدا کا صرف وہی ماننا معتبر ہے جو کامل توحید کے ساتھ ہو۔ اگر اس کی ذات یا صفات یا اس کے حقوق میں کسی اور کو شریک بنا کر اس کو مانا جائے تو یہ ماننا معتبر نہیں ہے۔ یہ اس کے انکار ہی کے ہم معنی ہے۔

مشرکین کے اعمال کی تمثیل

یہ ان مشرکین کے اعمال کی تمثیل ہے کہ قیامت کے دن اعمال کا یہ حال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اعمال سے مراد یہاں ان کے وہ اعمال ہیں جو اپنی دانست میں انھوں نے نیکی کے اعمال سمجھ کر انجام دیے۔ فرمایا کہ قیامت کے روز ان کے اعمال راکھ کے ایک ڈھیر کی مانند ہوں گے جس پر کسی آندھی والے دن میں تند ہوا چل جائے اور وہ سب کو اڑا لے جائے۔ 'لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ' یعنی اس ساری کمائی میں سے، جو شرک کے ساتھ انھوں نے کی ہوگی کچھ بھی ان کے پلے پڑنے والا نہیں، وہ ساری کی ساری خاک اور راکھ ہو کر اڑ جائے گی، صرف

اس کا وبال ان کے حصہ میں آئے گا ذٰلِکَ ھُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ یعنی ایک گم شدگی، گمراہی اور محرومی تو وہ ہوتی ہے جس کے بعد لوٹنے اور راستہ پانے کا بھی امکان باقی رہ جاتا ہے لیکن یہ وہ دور کی گم شدگی اور محرومی ہے جس کے بعد لوٹنے اور پانے کا سرے سے کوئی امکان ہی باقی نہیں رہے گا۔ یہاں اسی سورہ کی آیت ۳ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ اور اسی طرح کے لوگوں کے اعمال کی ایک نہایت اعلیٰ تمثیل سورۂ نور کی آیت ۳۹ میں بھی ہے

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۙ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ (۱۹-۲۰)

قریش کو دھمکی

یہ واضح الفاظ میں قریش کو دھمکی ہے کہ تم نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ یہ دنیا کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا نہیں ہے بلکہ اللہ نے اس کو غایت و مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے اور تمہارا وجود اس غایت و مقصد کے بالکل خلاف ہو کر رہ گیا ہے تو آخر وہ تم کو کس کام کے لیے اس زمین کی پشت پر لادے رکھے گا جب کہ اس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ اگر وہ چاہے تو ابھی چشم زدن میں تم سب کو فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق لا کھڑی کرے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ یعنی یہ نہ سمجھو کہ خدا کے لیے یہ کام کچھ مشکل ہے یا یہ اس پر کچھ گراں گزرے گا۔ اس کی قدرت کی بھی کوئی حد نہیں ہے اور رافت و رحمت کے ساتھ ساتھ وہ عدل و قسط کا قائم کرنے والا بھی ہے تو ان لوگوں کو فنا کر دینا اس پر کیوں گراں گزرے گا جنھوں نے ہر شعبۂ زندگی میں عدل و قسط کو بالکل مٹا کر رکھ دیا ہے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ (۲۱)

آخرت کی حضوری

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۔ بُرُوْز کے اصل معنی پردہ کی اوٹ سے باہر آنے کے ہیں۔ یہاں اس لفظ کے استعمال میں یہ بلاغت ہے کہ ایک وقت آئے گا جب وہ سارے لوگ جو اس دنیا میں اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کو اوٹ اور سپر بنائے ہوئے ہیں اور وہ لوگ بھی جو سرپرست اور سپر بنے ہوئے ہیں سب صرف خدائے واحد کے حضور حاضر ہوں گے اور وہاں کوئی کسی کا سرپرست، ساتھی اور مددگار نہ ہوگا۔ اس وقت چھوٹے اپنے بڑوں سے کہیں گے کہ دنیا میں ہم آپ لوگوں کے پیچھے چلنے والے رہے ہیں، جو کچھ آپ لوگوں نے حکم دیا ہم نے اس کی تعمیل کی جس کے نتیجہ میں یہ عذاب ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ تو کیا اس عذاب میں سے بھی آپ لوگ کچھ ہمارا بار ہلکا کریں گے؟ اَغْنَاهُ عَنْهُ کے معنی ہیں کَفَاهُ۔

لیڈروں کا جواب

قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ... الاٰیۃ بڑے اور لیڈر لوگ یہ جواب دیں گے کہ ہم جو کچھ خود تھے وہی ہم نے تم کو بھی بنایا۔ اگر ہم خود ہدایت پر ہوتے تو تمہیں بھی اس کی راہ دکھاتے۔ اب تو شکوہ شکایت کا وقت گزر چکا،

یہ تو سارے بھگتنے کا وقت ہے اور یہ ایسے اٹل ہیں کہ خواہ ہم چیخیں چلائیں یا صبر کریں نہ یہ ٹلنے والے ہیں اور نہ ہمارے لیے کوئی راہ فرار باقی رہی ہے۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۲)

شیطان کا جواب

'وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ' یعنی جب ائمۂ کفر اور ان کے پیروؤں کا قضیہ ختم ہو چکے گا اور شیطان دیکھے گا کہ ان کے ہاں کیا جوتیوں میں دال بٹی ہے تو اسے لازماً اندیشہ ہوگا کہ اب یہ دونوں فریق آپس کی جنگ سے فارغ ہو کر اس پر لعنت ملامت کے لیے پل پڑیں گے۔ چنانچہ وہ پیش قدمی کر کے پہلے ہی ان کو چپ کرنے کی کوشش کرے گا۔

پہلی بات وہ یہ کہے گا کہ خدا نے جو وعدہ جزا و سزا کا تم سے کیا تھا وہ سچا وعدہ تھا چنانچہ اس نے اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ اس کو پورا کر دکھایا البتہ میں نے جو سبز باغ تمہیں دکھائے تھے وہ محض جھوٹ اور فریب تھے چنانچہ میں نے ان میں سے کوئی وعدہ بھی پورا نہیں کیا۔

اس کی دوسری بات یہ ہوگی کہ 'وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ' کہ بہرحال مجھے تم کو گمراہی کے راستے پر ڈال دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا اگر کوئی اختیار حاصل تھا تو وہ صرف اس قدر تھا کہ میں تمہیں گمراہی کی دعوت اور ترغیب دے سکوں۔ اس گمراہی کو اگر تم نے اختیار کیا تو اپنی پسند اور اپنے اختیار سے کیا تو اس باب میں مجھے کوئی ملامت نہ کرنا بلکہ خود اپنے ہی کو ملامت کرنا۔

تیسری بات وہ یہ کہے گا کہ 'مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ' اب ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرنے سے کچھ حاصل نہیں، اب نہ میں تمہاری کوئی فریادرسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری کوئی فریادرسی کر سکتے ہو تو قبل اس کے کہ تم مجھے کوئی ملامت شروع کرو تم نے جو مجھے شریک خدا بنایا اور اطاعت میں مجھے اس کا شریک ٹھہرایا میں نے اس سے اپنی براءت کا اعلان کر دیا۔

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ (۲۳)

اہل ایمان کا انجام

اہل کفر و شرک کا انجام واضح کر دینے کے بعد یہ اہل ایمان کا انجام بیان ہوا کہ وہ جنت میں ہوں گے اور وہاں وہ ایک دوسرے کو اہلاً و سہلاً، احسنت و مرحبا اور سلام و رحمت کے ساتھ خیر مقدم کریں گے اس لیے کہ انھوں نے ایک دوسرے کو صحیح مشورے دیے جن کا انجام ان کے سامنے بہتر سے بہتر شکل میں موجود

ہوگا۔ اوپر کفار کی باہمی لعن طعن کے مقابل میں رکھ کے اس آیت کو پڑھیے تب اس کا اصل زور سامنے آئے گا۔

۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۴-۲۷

توحید اور شرک کی تمثیل

اوپر کی آیات میں شرکیہ و کفریہ اعمال کی تمثیل بیان ہوئی۔ اب آگے کی آیات میں شرکیہ عقائد و نظریات اور توحید اور اس پر مبنی عقائد و نظریات کی تمثیل بیان ہو رہی ہے۔ تاکہ واضح ہو سکے کہ شرک کی کوئی بنیاد نہ عقل و فطرت کے اندر ہے اور نہ خدا کے ہاں اس کی کوئی جڑ ہے اس وجہ سے اس پر مبنی اعمال سب ہوا میں اڑ جائیں گے۔ اس کے برعکس توحید کی بنیاد عقل و فطرت میں بھی ہے اور عند اللہ بھی اس کی بنیاد ہے، زمین میں بھی اس کی جڑیں گہری اتری ہوئی ہیں اور فضا میں بھی اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، اس وجہ سے جو لوگ توحید پر قائم ہیں اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں رسوخ قدم اور تمکن بخشے گا۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۴-۲۷

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا
ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ﴿٢٤﴾ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ
رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٥﴾
وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ
مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿٢٦﴾ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۚ وَيَفْعَلُ
اللَّهُ مَا يَشَاءُ ﴿٢٧﴾ ع

ترجمۂ آیات ۲۴-۲۷

کیا تم نے غور نہیں کیا، کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ نے کلمۂ طیبہ کی۔ وہ ایک شجرۂ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا رہتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے تمثیلیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ ۲۴-۲۵

اور کلمۂ خبیثہ کی تمثیل ایک شجرۂ خبیثہ کی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے، اسے ذرا ثبات حاصل نہ ہو۔ ۲۶

اللہ اہلِ ایمان کو قولِ محکم کی بدولت دنیا کی زندگی میں بھی ثبات عطا فرمائے گا اور آخرت میں بھی اور اللہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کے اعمال رائگاں کر دے گا اور اللہ جو چاہے کرتا ہے۔ ۲۷

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرۡعُهَا فِى السَّمَآءِ ۝ تُؤۡتِىۡۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيۡنٍۢ بِاِذۡنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ (۲۴-۲۵)

'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب — 'اَلَمْ تَرَ' اگرچہ لفظ واحد ہے لیکن اس کا خطاب عام ہے۔ گویا مخاطب گروہ کے ایک ایک شخص کو فرداً فرداً خطاب کر کے آگے آنے والی تمثیلات پر غور کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔

کلمۂ طیبہ سے مراد — 'کلمۂ طیبۃ' سے کلمۂ توحید اور اس پر مبنی عقائد و نظریات مراد ہیں۔

شجرۂ طیبہ سے مراد — 'شجرۃ طیبۃ' وہ درخت جو مثمر، سایہ دار، نفع بخش اور بابرکت ہو۔

متقابل الفاظ کا حذف — 'اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ' میں مذکورہ الفاظ کے مقابل الفاظ محذوف ہیں۔ مثلاً پہلے جملہ میں 'ثَابِتٌ' کا لفظ ظاہر فرمایا تو دوسرے ٹکڑے میں 'فَرْعُهَا' کے بعد اس کا متقابل لفظ 'عالی' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ حذف کر دیا۔ اسی طرح دوسرے جملے میں 'فِى السَّمَآءِ' کو ظاہر فرمایا تو پہلے ٹکڑے میں 'ثَابِتٌ' کے بعد 'فِى الْاَرْضِ' محذوف کر دیا۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں قرآن مجید اور عربی ادب میں بہت ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ الفاظ کم استعمال ہوتے ہیں اور معانی ان کے اندر زیادہ سما جاتے ہیں۔ ان محذوفات کو کھول کر اس کا ترجمہ کیجیے تو ترجمہ یہ ہوگا۔ اس کی جڑ زمین کی تہوں میں اتری ہوئی اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ لفظ 'سماء' جس طرح آسمان کے لیے آتا ہے اسی طرح فضا کے لیے بھی اس کا استعمال معروف ہے۔ درخت چونکہ زمین اور فضا دونوں سے غذا اور قوت حاصل کرتا ہے اس لیے فرمایا کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ یعنی زمین میں اس کی جڑیں اتری ہوئی ہونے کے سبب سے زمین سے بھی اسے پوری غذا مل رہی ہے اور شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہونے کی وجہ سے فضا بھی اس کی پرورش میں پورا پورا حصہ لے رہی ہے۔

کلمۂ توحید سدا بہار ہے

"تُؤْتِیْٓ اُکُلَهَا کُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا" یہ اس درخت کے سدا بہار ہونے کی تعبیر ہے۔ یعنی اس درخت پر کبھی خزاں نہیں آتی بلکہ یہ اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ پھل دیتا ہے۔

کلمۂ توحید کی تمثیل

کلمۂ توحید کی تمثیل ایک ایسے درخت سے دے کر قرآن نے ایک حقیقت تو یہ واضح فرمائی کہ اس کی جڑیں انسانی عقل و فطرت کے اندر بھی گہری اتری ہوئی ہیں اور عند اللہ بھی یہ سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھنے والی حقیقت ہے۔ گویا زمین و آسمان دونوں میں جو مقام اس کو حاصل ہے وہ کسی اور چیز کو حاصل نہیں۔

دوسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اس کو انسانی فطرت کے اندر سے بھی برابر غذا اور قوت حاصل ہوتی رہتی ہے اور اوپر سے بھی برابر ترشحات اس پر نازل ہوتے رہتے ہیں جو اس کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھتے ہیں۔

تیسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اس کی برکات ابدی اور دائمی ہیں۔ اس کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے جس کے سینہ میں یہ نور موجود ہے وہ ہمیشہ آسودہ اور شاد کام رہتا ہے۔

مخاطبوں کو تنبیہ اور احسان کی یاددہانی

"وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ" یہ اللہ تعالیٰ نے مخاطبوں یعنی قریش کو تنبیہ بھی فرمائی ہے اور ان کو اپنے احسان کی یاددہانی بھی فرمائی ہے کہ یہ تمثیلیں ہم ان کو اس لیے سنا رہے ہیں کہ وہ چیتیں اور سوچیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو کس مقام بلند کی سرفرازی بخشنا چاہتا ہے لیکن وہ ہیں کہ اسی جوہڑ میں پڑے رہنا چاہتے ہیں جس میں شیطان نے ان کو دھکیل رکھا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ تمثیلوں میں چونکہ حقائق مجاز کا جامہ اختیار کر لیتے ہیں اس وجہ سے تقریبِ فہم کے پہلو سے ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء اور داعیانِ حق نے اس سے بڑا کام لیا ہے لیکن افسوس ہے کہ نادانوں نے کبھی اس کی قدر نہیں کی۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (۲۶)

کلمۂ خبیثہ سے مراد

کلمۂ خبیثہ سے مراد کلمۂ شرک اور مبنی بر شرک و کفر عقائد و نظریات ہیں۔

شجرۂ خبیثہ سے مراد

"شَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ" جھاڑ جھنکاڑ کے قسم کا درخت جس میں نہ پھول نہ پھل، نہ سایہ نہ غذا۔ ہاتھ لگائیے تو اس کے کانٹے ہاتھوں کو زخمی کریں، چکھیے تو اس کی تلخی سے زبان اینٹھ جائے، پاس بیٹھیے تو اس کی بو سے قوتِ شامہ ماؤف ہو کے رہ جائے۔

"اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ" یعنی زمین میں اس کی کوئی جڑ نہیں۔ اکھاڑیے تو زمین کے اوپر ہی سے اس کو اکھاڑ لیجیے۔ اس میں ذرا ثبات نہیں اور جس کے لیے زمین میں ثبات نہیں اس کے لیے فضا میں پھیلنے کا کوئی امکان ہی نہیں۔

کلمۂ شرک کی تمثیل

پھر کلمۂ شرک کی تمثیل بیان ہوئی کہ اس کی مثال خودرو، خاردار، بدبودار، بےفیض و بےثمر جھاڑیوں کی ہے۔ نہ ان کی کوئی گہری جڑ ہوتی ہے نہ فضا میں ان کا کوئی پھیلاؤ ہوتا۔ کوئی اکھاڑنا چاہے تو اوپر ہی سے

ان کو اکھاڑ کے رکھ دے۔

اس تمثیل سے یہ بات واضح ہوتی کہ شرک کی کوئی بنیاد نہ عقل و فطرت کے اندر ہے نہ خدا کے اتارے ہوئے دین میں۔ یہ خودرو خبیث جھاڑیوں کی طرح جہاں جگہ پا جاتا ہے وہاں اگ پڑتا ہے۔ اگر اس کو اکھاڑنے والے ہاتھ موجود ہوں تو بڑی آسانی سے اس کو اکھاڑ کے پھینک سکتے ہیں لیکن اکھاڑنے والے ہاتھ موجود نہ ہوں تو پھر یہ بہت سی جگہ گھیر لیتا ہے۔

اہل ایمان کے لیے بشارت

اس میں اہل ایمان کے لیے یہ بشارت بھی ہے کہ ان کے اردگرد شرک و کفر کے جو جھاڑ جھنکار پھیلے ہوئے ہیں ان کی عمر اب زیادہ نہیں ہے۔ خدا نے وہ ہاتھ پیدا کر دیے ہیں جو ان ناپاک اور خبیث جھاڑیوں سے بہت جلد اس سرزمین کو پاک کر دیں گے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۲۷

قول ثابت سے مراد کلمۂ توحید ہے

'قَوْلِ ثَابِت' سے مراد یہی کلمۂ توحید ہے جس کی آسمان و زمین اور فطرت و کائنات دونوں میں پائداری و استواری کی تعریف اوپر گزر چکی ہے۔

'وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ' میں اضلال سے مراد کوششوں اور محنتوں کو رائیگاں کر دینا ہے جیسا کہ سورۂ محمد کی آیت ۱ میں ہے۔ 'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ' (جنھوں نے کفر کیا اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکا خدا نے ان کی کوششیں رائیگاں کر دیں) 'ظالمین' سے مراد مشرکین ہیں اس لیے کہ شرک، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، سب سے بڑا ظلم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ توحید کے کلمۂ ثابت و محکم کی بدولت اہل ایمان کو تو دنیا اور آخرت دونوں میں پائیداری و استواری بخشے گا۔ رہے مشرکین تو اللہ ان کے سارے اعمال کو، جیسا کہ اوپر گزرا، راکھ اور خاک کی طرح برباد کر دے گا۔ 'وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ' یعنی خدا جو چاہے گا کر ڈالے گا، نہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا بن سکے گا اور نہ کسی کی سعی و سفارش اس کے ہاں کچھ کام آئے گی۔ وہ بات یہاں پیش نظر رہے جس کا ذکر ہم بار بار کر چکے ہیں کہ خدا کی مشیت ہمیشہ اس کے عدل اور اس کی حکمت کے ساتھ ہے۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۸-۳۴

قریش کو وعید اور اہل ایمان کو بشارت

آگے نہایت صاف الفاظ میں پہلے قریش کو تہدید و وعید ہے کہ چونکہ انھی نے اپنی قوم کو اس ہلاکت کے گڑھے میں گرایا ہے اس وجہ سے ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو کامیابی کی بشارت ہے اور ساتھ ہی اس کامیابی کے لیے انھیں جو تیاری کرنی چاہیے اس کی طرف اشارہ ہے۔ اسی روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸-۳۴ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ
دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾ وَجَعَلُوا لِلَّهِ
أَندَادًا لِّيُضِلُّوا عَن سَبِيلِهِ ۗ قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى
النَّارِ ﴿٣٠﴾ قُل لِّعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنفِقُوا مِمَّا
رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا
خِلَالٌ ﴿٣١﴾ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ
مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ
لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ﴿٣٢﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿٣٣﴾ وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا
سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ
ع ۵ ۱۷ كَفَّارٌ ﴿٣٤﴾

ترجمۂ آیات ۲۸-۳۴ کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جنھوں نے اللہ کی نعمت کے عوض میں کفر کیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر — جہنم — میں لا اتارا۔ جس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے! اور انھوں نے اللہ کے شریک ٹھہرائے تاکہ اس کے راستہ سے لوگوں کو گمراہ کریں۔ ان سے کہہ دو چند دن عیش کر لو۔ بالآخر تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ۲۸-۳۰

میرے ان بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہہ دو کہ نماز کا اہتمام رکھیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ و علانیہ خرچ کریں پیشتر اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی۔ ۳۱

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور بادلوں سے پانی اتارا پھر اس سے مختلف قسم کے پھل تمہارے رزق کے لیے پیدا کیے اور کشتی کو تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور اس نے دریاؤں کو بھی تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا، اور سورج اور چاند کو بھی تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا، دونوں ایک ہی انداز پر گردش میں ہیں اور دن اور رات کو بھی۔ اور تم کو ہر اس چیز میں سے بخشا جس کے تم طالب بنے۔ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو گے تو ان کو شمار نہ کر پاؤ گے۔ بے شک انسان بڑا ہی حق تلف ناشکرا ہے۔ ۳۲-۳۴

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ کُفۡرًا وَّ اَحَلُّوۡا قَوۡمَہُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ ﴿ۙ﴾ جَہَنَّمَ ۚ یَصۡلَوۡنَہَا ؕ وَ بِئۡسَ الۡقَرَارُ ﴿﴾ وَ جَعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا لِّیُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ؕ قُلۡ تَمَتَّعُوۡا فَاِنَّ مَصِیۡرَکُمۡ اِلَی النَّارِ (۲۸-۳۰)

'اَلَمْ تَرَ' کے استعمال کا ایک خاص محل

'اَلَمْ تَرَ' کے خطاب میں فی الجملہ اظہار شان اور اظہار تعجب کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ یہاں سیاق و سباق دلیل ہے کہ موقع اظہار تعجب اور ملامت کا اور اشارہ قریش اور ان کے لیڈروں کی طرف ہے اس لیے کہ عرب میں انہی کا یہ مقام تھا کہ انھوں نے اپنی قوم کو جیسا کہ 'اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ' کے الفاظ سے واضح ہے، شرک اور کفر کے گڑھے میں دھکیلا اور اس طرح اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی جہنم کا سامان کیا۔

قریش کا کفران نعمت

'بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا' یعنی ان کو نعمتیں تو تمام اللہ کے فضل و رحمت اور حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی برکت سے، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے، ملیں۔ خدا نے ان کو حرم کی پاسبانی کی بدولت تمام عرب کی سیادت و قیادت بخشی، ان کو بدویانہ اور گلہ بانی کی غیر مطمئن زندگی کی جگہ شہری زندگی کا سکون بخشا، ایک وادی غیر ذی زرع میں رزق و فضل کے دروازے کھولے لیکن انھوں نے ان سب کی یہ قدر کی کہ کفر و شرک کی زندگی اختیار کر لی اور بہت سے شرکاء و شفعاء ایجاد کر کے خلق کو خدا سے موڑ کر ان کی طرف جھونک دیا۔

'قُلْ تَمَتَّعُوْا الاٰیۃ' یعنی ان کو سنا دو کہ چند دن عیش کر لو اس لیے کہ بالآخر تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے۔ خدا کے خوان کرم کی نعمتوں سے متمتع ہونا اور سر نیاز و عقیدت دوسروں کے آگے جھکانا زیادہ دیر چلنے والی بات نہیں، یہ چند روزہ مہلت ہے جو بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔

قُلۡ لِّعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً مِّنۡ قَبۡلِ

اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ (۳۱)

'خِلٰل' کے معنی دوستی اور دوستانہ تعلقات کے ہیں اور لفظ 'بَيْع' بعض مواقع میں خرید و فروخت دونوں معنوں میں آتا ہے، جب تبادلہ چیز کا چیز سے ہو تو معاملت کے دونوں فریق بائع بھی ہوتے ہیں اور مشتری بھی۔

مسلمانوں کو پیغام

قریش کو انذار کے بعد اب یہ پیغام مسلمانوں کے لیے ہے کہ ان سے کہہ دو کہ وہ نماز کا اہتمام کریں اور خدا کی راہ میں سرًّا و علانیۃً دونوں طرح خرچ کریں۔ سرًّا اس لیے کہ انفاق فی سبیل اللہ کی اصل روح اخلاص ہے اور یہ اسی انفاق میں پایا جاتا ہے جو درپردہ ہو اور علانیۃً اس لیے کہ ایک پہلو اس کا بھی باعث خیر و برکت ہے۔ وہ یہ کہ اس سے دوسروں کو انفاق کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے۔ سرًّا کی تقدیم سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس طرح کا انفاق اولیٰ و افضل ہے۔

انفاق کی اصل ضرورت

'لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ' میں اس انفاق کی اصل ضرورت کا اظہار ہے کہ اصلاً یہ دوسروں کے لیے مطلوب نہیں ہے بلکہ خود خرچ کرنے والے کی اپنی نجات و فلاح کے لیے یہ مطلوب ہے اس لیے کہ آگے ایک ایسا دور آنے والا ہے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی نہ دوستی اور رشتہ داری کام آئے گی۔ اگر کام آئے گا تو یہی انفاق جو کسی نے اللہ کی راہ میں کیا ہوگا۔

مسلمانوں کو مستقبل کی کامیابی کی بشارت

آیت کے الفاظ، اس کے اسلوب اور موقع و محل پر اچھی طرح غور کیجیے تو اس کے اندر مسلمانوں کے لیے مستقبل کی کامیابی کی بشارت بھی مضمر ہے۔ اس کے اندر یہ بات پوشیدہ ہے کہ قریش نے تو جو امانت حضرت ابراہیمؑ سے وراثت میں پائی تھی اس کے تمام مقاصد برباد کر کے رکھ دیے۔ اب اہل ایمان کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ ان مقاصد کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں اور اس امانت کے امین بنیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۳۲-۳۴)

یہ اسی مضمون کی مزید وضاحت ہے جو اوپر گزر چکا ہے کہ نعمتیں تو ساری کی ساری اللہ نے بخشیں لیکن ظالم مشرکوں نے ان میں سے ایک ایک کو اپنے مزعومہ دیوتاؤں کی طرف منسوب کر کے ان کی عبادت شروع کر دی۔ بارش، کشتی، دریا، سورج، چاند، شب اور روز سب کو انسان کی نفع رسانی میں اللہ نے سرگرم کیا ہے لیکن ان میں سے بعض چیزوں کو تو نادانوں نے خود دیوتا بنا دیا اور جن کو دیوتا نہیں بنایا ان پر دوسرے دیوتا حاکم و متصرف بنا دیے اور ان کی جے پکارنے لگے۔

انسان کی نفع رسانی کے لیے اشیاء کی تسخیر

'سَخَّرَ لَكُمْ' کا مفہوم ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ کسی شے کو کسی کی نفع رسانی میں لگا دینے کا ہے۔ آسمان و زمین، سورج اور چاند سب مسخر خدا ہی کے ہاتھ میں ہیں، البتہ خدا نے ان کو انسان کی نفع رسانی میں لگا رکھا ہے اور یہ اس کا فضل و کرم ہے۔

'وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ' دَآئِب کے معنی مستمر کے ہیں۔ یعنی ایک ہی انداز، ایک ہی راہ اور ایک ہی مدار و مستقر پر سیکنڈ اور منٹ کی پابندی کے ساتھ، اپنی مفوضہ خدمت کی انجام دہی میں مصروف ہیں، مجال نہیں کہ اس میں سرمو فرق آنے پائے۔ غور کرو کہ یہ ان کے خدا ہونے کی علامت ہے یا اصل حاکم کائنات خدائے عزیز و علیم کے محکوم و مقہور ہونے کی؟

'وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ' یہ خطاب انسان سے بحیثیت انسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی فطرت و خلقت کی رو سے جن چیزوں کے محتاج بنائے گئے ان ساری چیزوں میں سے اللہ نے تمھیں اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق بخشیں۔ طلب اور اس کے جواب میں یہ کامل مطابقت خود سب سے بڑی شہادت اس بات کی ہے کہ جس نے تم کو پیدا کیا اسی نے تمھاری ساری ضرورتوں کا اہتمام فرمایا ہے۔

'اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ' لفظ انسان اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن انہی مشرکین کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر کی آیت میں گزرا۔ چونکہ وہ اپنی نالائقی کے سبب سے لائق التفات نہیں اس وجہ سے بات عام صیغہ سے کہہ دی گئی۔ 'ظَلُوْمٌ' کے معنی حق کو تلف کرنے والا۔ ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ شرک کا ارتکاب کر کے انسان خدا کے حق کو بھی تلف کرتا ہے اور خود اپنے نفس کے حق کو بھی۔ 'كَفَّارٌ' کے معنی ناشکرے کے ہیں، جو نعمت تو کسی اور سے پاتا ہے اور گن کسی اور کے گاتا ہے۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۳۵-۴۱

ملتِ ابراہیمی کی وضاحت

قریش اپنے مذہب شرک کی حمایت میں سب سے بڑی دلیل جو پیش کرتے تھے وہ یہ تھی کہ یہ دین ان کو اپنے جد اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ سے وراثت میں ملا ہے۔ آگے اسی دعوے کی تردید آ رہی ہے اور یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک زرخیز و شاداب علاقہ سے ہجرت کر کے اس وادی غیر ذی زرع میں اپنی ذریت کو اس لیے بسایا تھا کہ وہ اس میں خدائے واحد کی عبادت کا ایک مرکز قائم کر سکیں تاکہ ان کی اولاد شرک کی تمام آلودگیوں سے پاک رہ کر خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کی عبادت کر سکے۔ اس وادی غیر ذی زرع میں امن و رزق کی تمام برکتیں حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں کا نتیجہ ہیں لیکن قریش نے ان تمام نعمتوں کو اپنے دیوتاؤں کے کھاتے میں ڈال دیا ہے اور خدائے واحد کو چھوڑ کر اپنے بتوں کی عبادت میں لگ گئے ہیں اور اسی کو حضرت ابراہیمؑ کا دین بتاتے ہیں۔ —— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۵-۴۱

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَ
بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝۳۵ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ

النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ
رَّحِيمٌ ﴿٣٦﴾ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ
عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ
النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿٣٧﴾
رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ ۗ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِن
شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿٣٨﴾ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ
لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿٣٩﴾
رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۚ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ ﴿٤٠﴾
رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ﴿٤١﴾ ع ۶ ۱۸

ترجمۂ آیات ۳۵-۴۱

اور یاد کرو جب ابراہیمؑ نے دعا کی کہ اے میرے رب اس سرزمین کو پرامن بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب! ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے تو جو میری پیروی کرے وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد میں سے ایک بن کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے رب، تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں تو تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔ اے ہمارے رب تو جانتا ہے جو ہم پوشیدہ رکھتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں اور اللہ سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ شکر ہے اس اللہ کے لیے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحاق عطا فرمائے۔ بیشک

میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔ اے میرے رب مجھے نماز کا اہتمام کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی اسے ہمارے رب اور میری دعا قبول فرما۔ اے ہمارے رب مجھے اور میرے والدین کو اور مومنین کو اس دن بخش جس دن حساب قائم ہوگا۔ ۳۵-۴۱

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳۵-۳۶)

حضرت ابراہیمؑ کی دعا

حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کو سرزمین مکہ میں بسایا ہے یہ دعا اس وقت کی ہے۔ سب سے پہلے تو اس سرزمین کے لیے انھوں نے امن کی دعا کی اس لیے کہ اس وقت تک یہ پورا علاقہ امن سے محروم تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اس طرح قبول فرمائی کہ انسان تو انسان اس سرزمین پر کسی جانور کو ستانا بھی گناہ ٹھہرا۔ پھر خانہ کعبہ کی بدولت چار مہینے حج و عمرہ کے لیے محترم قرار دے دیے گئے جن میں قافلے ملک کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک بے تکلف سفر کرتے، مجال نہیں تھی کہ کسی کا بال بیکا ہو۔ مزید برآں قریش کو خانہ کعبہ کی پاسبانی کی بدولت سارے ملک میں امامت و سیادت کا درجہ حاصل ہوگیا، ان کے قافلے ہر حصۂ ملک کا سفر کرتے اور قبائل ان سے تعرض کرنا تو در کنار ان کے لیے بدرقہ فراہم کرتے۔

دوسری دعا یہ فرمائی کہ مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی کی نجاست سے محفوظ رکھ۔ یہ وہ اصل مقصود تھا جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے ہجرت فرمائی تھی۔ اس دعا میں انھوں نے خود اپنے آپ کو بھی شامل کیا ہے جس سے شرک کی تعدی اور خطرناکی کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر بھی اس کی چھوت سے بچائے جانے کی دعا کرتے تھے۔ اس حقیقت کا اظہار رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ کے الفاظ سے بھی ہو رہا ہے کہ ان بتوں کا فتنہ ایسا ہے کہ ایک خلق کثیر اس کا شکار ہو کر رہ گئی۔ بلاغت زبان کا یہ ایک اسلوب ہے کہ کسی چیز کی شدت تاثیر و تسخیر کا اظہار مقصود ہو تو بعض اوقات اس کے لیے ضمیر اور فعل وہ استعمال کر دیتے ہیں جو عام طور پر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

دعا میں 'بنی' کا لفظ ہے جس کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ میرے بیٹوں کو شرک کی نجاست سے محفوظ رکھ لیکن یہ لفظ علی سبیل التغلیب استعمال ہوا ہے۔ مقصود یہی ہے کہ میری اولاد کو محفوظ رکھ۔ چنانچہ آگے اسی دعا میں 'ذریۃ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عام ہے۔

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ یہ اپنی اولاد میں سے ان لوگوں سے اعلانِ براءت ہے جو ان کے طریقہ سے ہٹ کر شرک و بت پرستی میں مبتلا ہوں۔ فرمایا کہ جو اس معاملہ میں میری پیروی کریں وہ تو بے شک مجھ سے اور میرے زمرے میں سے ہیں اور جو میری راہ سے ہٹ کر شرک میں مبتلا ہوں ان کا معاملہ تیرے حوالہ ہے، تو ان کے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جس کا تو ان کو مستحق پائے گا۔ تو غفور رحیم ہے، تجھ سے کسی ناانصافی کا اندیشہ نہیں۔ جو رحمت کے سزاوار ہوں گے وہ اس سے محروم نہیں ہوں گے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ شرک کرنے والوں کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے مغفرت کی دعا نہیں ہے بلکہ صرف ان کے معاملے کو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، خدائے غفور رحیم کے حوالہ کرنا ہے۔

رَبَّنَاۤ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ (۳۷)

ہجرت کا اصل مقصود — یعنی میں نے اپنی اولاد کو ایک بن کھیتی کی چٹیل زمین میں، تیرے محترم گھر کے پاس، اس لیے لا بسایا ہے تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں۔ تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرے شکرگزار رہیں۔

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ خدا کی توحید اور خالص اسی کی بندگی وہ چیز ہے جس کی خاطر انسان سب کچھ چھوڑ سکتا ہے اور اسے سب کچھ چھوڑ دینا چاہیے یہاں تک کہ اگر اسے ایک چٹیل زمین میں تنہا زندگی بسر کرنی پڑے تو اس کو بھی اسے اختیار کر لینا چاہیے لیکن خدا اور اس کی عبادت کو کسی حال میں بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

اقامتِ صلوٰۃ تعمیرِ کعبہ کا مقصد — دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ خانہ کعبہ اصلاً نماز کا مرکز ہے اس وجہ سے اس کی تولیت کے اصل حق دار وہ ہیں جو نماز کا اہتمام کریں نہ کہ وہ جو توحید اور نماز سب کچھ ضائع کر بیٹھے لیکن اس کی تولیت کے مدعی ہیں۔ یہاں حضرت ابراہیمؑ نے نماز کا ذکر خانہ کعبہ کے ابتدائی مقصدِ تعمیر کی حیثیت سے کیا ہے۔ بعد میں جب اس کے لیے ان کو حج کی منادی کا حکم ہوا تو یہ حج کا بھی مرکز بن گیا اور حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یادگار میں قربانی کا بھی۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ 'اقامتِ صلوٰۃ' کا مفہوم صرف نماز پڑھنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ چیز بھی اس میں شامل ہے کہ لوگوں کو اس کی دعوت دی جائے اور اس امر کا اہتمام و انتظام کیا جائے کہ لوگ نماز پڑھیں۔

دعائے ابراہیمی کے اصل اجزاء — یہاں حضرت ابراہیمؑ نے نماز اور اس سرزمین کی خاص نوعیت کے سبب سے اپنی اولاد کے لیے دو چیزوں کی دعا کی۔

ایک اس چیز کی کہ تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کی مقبولیت کا یہ اثر ہوا کہ خانہ کعبہ بہت جلد سارے عرب کا مرجع بن گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد تو یہ سارے عالم کا مرکز بن گیا۔

دوسری دعا مکہ کے بے آب وگیاہ ہونے کے سبب سے رزق وفضل کی کشائش کی کی۔ جس کا اثر بہت جلد اس شکل میں ظاہر ہوا کہ مکہ تمام عرب کی تجارت کا مرکز بن گیا۔ 'وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ' پر تفصیل بحث ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں کر آئے ہیں۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ (۳۸)

'رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ'۔ اس فقرے کی بلاغت احاطۂ بیان میں نہیں آسکتی۔ بندہ جب اپنے رب سے کسی اہم معاملے میں دعا کرتا ہے تو اس کو ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ بعض باتیں وہ کہنا تو چاہتا ہے لیکن وہ بیان میں نہیں آتیں، اسی طرح بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو دل میں تو ہوتی ہیں لیکن وہ ان کے کہنے میں کسی مبہم سبب سے کچھ حجاب سا محسوس کرتا ہے۔ اس فقرے نے اس طرح کی ساری باتوں کو سمیٹ لیا اس لیے کہ خدا کا علم ظاہر ومخفی سب کو محیط ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَي الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ (۳۹)

یہ اپنی دعا کے حق میں اللہ تعالیٰ کے پچھلے عظیم احسانات کا حوالہ دے کر گویا سفارش بہم پہنچائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس پروردگار نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل واسحاق عطا فرمائے، میں اس سے یہی امید رکھتا ہوں کہ جس طرح اس نے ان کے باب میں میری دعا کو قبولیت سے نوازا اسی طرح میری اس دعا کو بھی شرف قبول بخشے گا۔ میں اس سے مانگ کر کبھی محروم نہیں ہوا ہوں۔

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاۗءِ ؀ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ (۴۰-۴۱)

یہ آخر میں اپنے اور اپنی اولاد کے لیے اس مقصد میں سرگرم رہنے کی دعا کی جس کے لیے انھوں نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی اور جس کا ذکر اوپر 'رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ' کے الفاظ میں ہو چکا ہے 'وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ' میں مِنْ تبعیض کا ہے اس لیے کہ مکہ میں انھوں نے اپنی ذریت میں سے صرف حضرت اسمٰعیل کو بسایا تھا۔

سب سے آخر میں اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے اور تمام اہل ایمان کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی۔ حضرت ابراہیمؑ کے والد — آزر — کے متعلق قرآن کے متعدد مقامات میں تصریح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے چونکہ ہجرت کے وقت ان سے کہہ دیا تھا کہ میں آپ کے لیے استغفار کرتا رہوں گا۔ اس وجہ سے ان کے شرک وکفر پر شدید اصرار کے باوجود وہ ان کے لیے استغفار کرتے رہے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو اس سے روک دیا تو آپ رک گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعا جو اوپر مذکور ہوئی ہے اس ممانعت کے وارد ہونے سے قبل کی ہے۔

دعا کی خصوصیات

اس دعا میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سات مرتبہ 'رَبِّ' یا 'رَبَّنَا' کا لفظ آیا ہے۔ یوں بظاہر تو یہ ایک تکرار سی محسوس ہوتی ہے لیکن درحقیقت یہ چیز دعا کی خصوصیات بلکہ اس کے لوازم میں سے ہے۔ دعا کا اصل مزاج

تضرع، التجاوب، استغاثہ اور التجا و فریاد ہے۔ یہ چیز متقضی ہوتی ہے کہ جس سے دعا کی جا رہی ہے اس کو بار بار متوجہ کیا جائے۔ جب بندہ خدا کو 'رَبِّ' سے خطاب کرتا ہے تو وہ گویا اس لطف خاص کو اپنی دعا کے حق میں سفارشی بناتا ہے جس کا تجربہ اسے خود ہے اور جب اس کو 'رَبَّنَا' سے خطاب کرتا ہے تو وہ اس کے اس کرم عام کو اپنی دعا کے حق میں سفارشی بناتا ہے جس کا مشاہدہ تمام خلق میں ہو رہا ہے۔

یہاں وہ بات پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے جو اوپر گزر چکی ہے کہ یہ دعا قریش کو اس لیے سنائی گئی کہ وہ سوچیں کہ وہ کس مقصد سے اس وادی غیر ذی زرع میں بسائے گئے تھے اور اب کیا بن کے رہ گئے ہیں، نیز وہ اس امر پر بھی غور کریں کہ وہ تمام نعمتیں جو اس سرزمین پر ان کو حاصل ہوئیں، وہ حاصل تو ہوئیں حضرت ابراہیم کی دعا کی برکت اور خاص اللہ تعالیٰ کے فضل سے لیکن انھوں نے ان تمام نعمتوں کا منبع اپنے خیالی معبودوں کو قرار دے رکھا ہے۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ـــــــ آیات ۴۲-۵۲

خاتمۂ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اور کفار کے لیے سخت دھمکی ہے۔ ربط کلام بالکل واضح ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۲-۵۲

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ

اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ
وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ
فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ
النَّارُ ﴿۵۰﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾
هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْۤا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ
لِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾ ع ۱۱/۱۹

ترجمۂ آیات ۴۲-۵۲ اور اللہ کو، جو کچھ یہ ظالم کر رہے ہیں اس سے بے خبر نہ سمجھو۔ وہ ان کو بس ایک ایسے دن کے لیے ٹال رہا ہے جس میں نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ وہ سر اٹھائے ہوئے بھاگ رہے ہوں گے، ٹکٹکی بندھی ہوگی اور ان کے دل اڑے ہوئے ہوں گے۔ ۴۲-۴۳

اور تم لوگوں کو اس دن سے خبردار کر دو جس دن ان پر عذاب آ دھمکے گا تو یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت قبول کر لیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے ـــــ کیا تم اس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے رہے تھے کہ تم ٹلنے والے نہیں ہو۔ اور تم ان لوگوں کی بستیوں میں رہے بسے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اور تم پر واضح تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا اور تمھارے لیے ہم نے مثالیں بھی بیان کر دی تھیں۔ اور انھوں نے اپنی ساری چالیں چلیں اور یہ چالیں ان کی خدا کے پاس ہیں اگرچہ ان کی یہ چالیں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جاتے۔ ۴۴-۴۶

تو اللہ کو اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرنے والا نہ سمجھو، اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے۔ اس دن کو یاد رکھو جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی

اور سب اللہ واحد و قہار کے حضور پیش ہوں گے۔ اور تم مجرموں کو اس دن زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھو گے۔ ان کے لباس تارکول کے ہوں گے اور ان کے چہروں پر آگ چھائی ہوئی ہوگی۔ تاکہ اللہ ہر جان کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔ بے شک اللہ بڑی جلدی حساب چکا دینے والا ہے۔ یہ لوگوں کے لیے ایک اعلان ہے اور تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ آگاہ کر دیے جائیں اور تاکہ وہ جان لیں کہ وہی ایک معبود ہے اور تاکہ اہل عقل یاددہانی حاصل کریں۔ ۴۷-۵۲

۱۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۥ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ
مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ (۴۲-۴۳)

شخوص کا مفہوم تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ 'شَخَصَ شُخُوْصًا' کے معنی تو ارتفاع کے ہیں لیکن جب یہ آنکھوں کے لیے آئے تو اس کے معنی آنکھوں کی ٹنگی ہوئی یا پھٹی ہوئی رہ جانے کے ہوں گے۔

اہطاع کا مفہوم 'مُهْطِعِيْنَ' اِهْطَاع' کسی طرف تیزی سے بڑھنے اور لپکنے کے معنی میں آتا ہے بالخصوص جب کہ یہ بڑھنا اور لپکنا خوف و دہشت کی بنا پر ہو۔

اقناع کا مفہوم 'اقناع' سر اٹھانے یا آواز بلند کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں سر اٹھا کر چلنے کے معنی میں آیا ہے۔

خطاب پیغمبر صلعم سے عتاب قریش پر آیت میں خطاب ظاہر الفاظ کے اعتبار سے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں جو شدت عتاب ہے وہ تمام تر قریش پر ہے۔ پیغمبر صلعم کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ تم یہ نہ گمان کرو کہ جو کچھ یہ تمہارے مخالفین کر رہے ہیں ہم اس سے بے خبر ہیں۔ ہم بے خبر نہیں ہیں۔ ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں لیکن ہم ان کے معاملے کو اس دن پر ٹال رہے ہیں جس کے ہول کا یہ حال ہوگا کہ نگاہیں اٹھیں گی تو ٹنگی ہی رہ جائیں گی، پلک جھپکنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ سر اٹھائے ہوئے تیزی سے یہ موقف حشر کی طرف بھاگ رہے ہوں گے اور ان کے دل خوف و دہشت سے اڑے جا رہے ہوں گے۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ
نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ (۴۴)

یعنی آج یہ تمہاری بات نہیں سنتے تو سنیں انھیں اس دن سے آگاہ کر دو جس دن ان پر عذاب آ دھمکے گا اور یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے لوگ اس وقت فریاد کریں گے کہ اے ہمارے رب ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے۔ ہم تیری دعوت بھی قبول کر لیں گے اور تیرے رسولوں کی پیروی بھی کریں گے لیکن اس وقت توبہ اور اصلاح کا وقت گزر چکا ہو گا۔ ان کو جواب دے دیا جائے گا کہ کیوں اب کیا ہوا، کیا تم ہی وہ لوگ نہیں ہو جو قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ تم اپنی ضد سے ٹلنے والے نہیں ہو۔

وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ (۴۵)

تاریخ کی یاد دہانی

یعنی یہ بات نہیں ہے کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کا جو حشر ہوا اور خدا نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا اس سے تم بے خبر رہے ہو، انہی اقوام بائدہ و معذبہ کی بستیوں میں تم رہے بسے اور خدا نے تم کو اپنے رسولوں کے ذریعہ سے ان کے سبق آموز اور عبرت انگیز حالات بھی سنا دیے۔ یہ حالات محض قصے کے طور پر تمہیں نہیں سنائے گئے تھے بلکہ ان کے سنانے سے مقصود تم کو یہ بتانا تھا کہ یہی حشر تمہارا بھی ہونا ہے اگر تم نے رسول کی تکذیب کر دی۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا اور تم نہیں مانتے تو اب کس بات کے لیے مزید مہلت مانگ رہے ہو۔

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ (۴۶)

یعنی ان قوموں نے بھی جہاں تک چالیں چلنے کا تعلق ہے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن آج ان کی ساری چالیں خدا کے پاس دھری ہیں۔ اگرچہ یہ چالیں ان کی ایسی زبردست تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے کھسکائے جا سکتے تھے لیکن خدا نے ان کی یہ ساری چالیں بیکار کر دیں۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۴۷)

یہ خطاب بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور اس میں بھی جو تسکین اور طمانیت کا پہلو ہے وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور جو عتاب اور غضب کا پہلو ہے اس کا رخ کفار و مشرکین کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ گمان کرو کہ خدا نے اپنے رسولوں کے لیے فتح و نصرت کا جو وعدہ فرمایا ہے کسی حال میں اس کی خلاف ورزی کرے گا۔ وہ عزیز و غالب ہے کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا اور انتقام لینے والا ہے اس وجہ سے شریروں اور حق و عدل کے دشمنوں کو ضرور کیفر کردار کو پہنچائے گا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۴۸)

یوم آخرت کی یاد دہانی

'يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ' میں والسموٰت یعنی تبدل السموٰت غیر السموٰت۔

مطلب یہ ہے کہ انھیں وہ دن یاد دلاؤ جس دن یہ زمین اور یہ آسمان دونوں دوسری زمین اور دوسرے آسمانوں سے بدل دیے جائیں گے اور یہ سارے لوگ ایک ہی خدائے قہار کے حضور پیش ہوں گے۔ لفظ 'بَرَزُوْا' کے مفہوم کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں کہ اس کے اندر یہ مفہوم بھی ہے کہ اس دن نہ کسی کے ساتھ

اس کا کوئی حامی و مددگار ہوگا اور نہ کوئی شفیع و سفارشی۔ بس ہر ایک کی ذات ہوگی اور اس کے اعمال۔ آسمان و زمین بھی دوسرے ہوں گے، وہاں نہ کسی کے قلعے اور گڑھیاں ہوں گی نہ کسی کے ایوان و محل۔

'قہّار' کا مفہوم

لفظ 'قہّار' کا مفہوم ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس کا اصل مفہوم ہے تنہا سب پر اپنا کنٹرول رکھنے والا، دوسروں کی مدد و اعانت سے بالکل مستغنی، کسی کی مجال نہیں کہ اس کے قابو سے باہر نکل سکے۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۝ سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ ۝ لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۴۹-۵۱)

'سرابیل' کا مفہوم

'سَرَابِیل' سربال کی جمع ہے جس کے معنی قمیص کے بھی آتے ہیں اور لباس کے مفہوم میں بھی یہ آتا ہے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ یہ دوسرے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

'قطران' کا مفہوم

'قَطِرَان' کے اہل لغت نے مختلف معنی لکھے ہیں لیکن تارکول کے لیے یہ لفظ معروف ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں اسی معنی میں ہے۔ مستحقین دوزخ کے جسموں اور چہروں کی سیاہی کا ذکر قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی ہے۔ پھر تارکول پر آگ جس طرح بھڑکتی ہے وہ ایک معلوم و معروف حقیقت ہے۔

یوم آخرت کے ہولکی مزید تفصیل

یہ اس دن کی ہولناکی کی مزید تفصیل ہے کہ اس دن تمام مجرمین زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ ان کے لباس تارکول کے ہوں گے اور ان کے چہروں پر آگ کے شعلوں کی لپیٹ ہوگی اور یہ سب کچھ اس لیے ہوگا تاکہ ہر جان اپنے اعمال کا بدلہ پائے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ساری مخلوق کا حساب کرنے میں کوئی بڑا عرصہ لگ جائے گا۔ خدا پلک جھپکتے سب کا حساب چکا دے گا۔

هَٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ (۵۲)

آخری تنبیہ

یہ آخری تنبیہ ہے کہ یہ ساری باتیں اس لیے لوگوں کو پہنچا دی گئی ہیں کہ لوگوں پر خدا کی حجت پوری ہو جائے، لوگ عذاب اور قیامت سے خبردار ہو جائیں اور اس بات کو اچھی طرح جان لیں کہ ایک ہی خدا سے سابقہ پڑنے والا ہے، کوئی اور کام آنے والا نہیں ہے اور جو اہل عقل ہیں ان کو یاددہانی ہو جائے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

لاہور

۱۲ ستمبر ۱۹۷۰ء

تدبرِ قرآن

۱۵

الحِجر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود

پچھلی سورہ کے آخر میں کفار کے لیے جو تہدید و وعید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو تسکین و تسلی مجمل الفاظ میں وارد ہوئی ہے وہ اس سورہ میں بالکل سامنے آگئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ یہ قرآن بجائے خود ایک واضح حجت ہے۔ اگر یہ لوگ اس کو نہیں مان رہے ہیں، تمھیں خبطی اور دیوانہ کہتے ہیں، مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان پر فرشتے اتارے جائیں تب یہ مانیں گے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے، ہمیشہ سے رسولوں کے جھٹلانے والوں کی یہی روش رہی ہے، اگر ان کے مطالبہ کے مطابق ان کو معجزے دکھا بھی دیے گئے جب بھی یہ ہٹ سے باز آنے والے نہیں ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو، وہ وقت آئے گا جب یہ آرزوئیں کریں گے کہ کاش پیغمبر اور قرآن کی دعوت قبول کر کے مومن و مسلم بنے ہوتے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۵) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسکین و تسلی کہ یہ قرآن بجائے خود ایک واضح حجت ہے، یہ کسی خارجی نشانی یا کسی معجزے کا محتاج نہیں ہے۔ جو لوگ اس کو آج جھٹلا رہے ہیں وقت آئے گا جب وہ اپنی بدبختی پر ماتم کریں گے سو ان کو ان کے حال پر چھوڑو، یہ چند دن اپنی خود فراموشیوں میں مگن رہ لیں۔ اس قوم کی ہلاکت کے لیے خدا کی طرف سے ایک وقت مقرر ہے، جب وہ وقت پورا ہو جائے گا خدا کا عذاب آجائے گا۔ یہ خدا کے فرشتوں کے ظہور کا مطالبہ کر رہے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ فرشتے تو جب آتے ہیں خدا کا فیصلہ لے کر ہی آتے ہیں اس کے بعد کسی قوم کو مہلت نہیں ملا کرتی۔ اگر یہ لوگ اس قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں تو اس کی پروا نہ کرو، خدا اس کی حفاظت کا خود سامان کرے گا۔ یہی روش ان سے پہلے کی قوموں نے اختیار کی تو وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔ وہی حشر ان کا بھی ہونا ہے۔ یہ اطمینان رکھو کہ ان کو کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی قائل کرنے والا نہیں بن سکتا۔ وہ اس کو دیکھ کر بھی کوئی نہ کوئی بات بنا ہی لیں گے۔

(۱۶-۲۵) قرآن کی دعوت کی صداقت کی جو نشانیاں آفاق میں موجود ہیں ان کی یاددہانی۔ آسمان اور اس کے چمکتے ہوئے تارے، زمین اور اس کی نوع بنوع پیداوار، ہوائیں اور ان کی ابر خیزیاں۔ ان عجائب قدرت

کے مشاہدے سے وہ سبق کیوں نہیں حاصل کرتے؟ ان نشانیوں کے ہوتے کسی معجزے کے ظاہر ہونے کی کیا ضرورت باقی رہی؟

(۲۶-۴۸) آدمؑ اور ابلیس کے ابتدائی ماجرے کی یاددہانی جس سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ کفار کی گمراہی کا اصل مصدر کیا ہے اور ابلیس کی ذریات نے ان کو جس ضلالت میں پھنسایا ہے بالآخر اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ نیز شیطان کے فتنوں سے محفوظ رہنے والے متقین کی فوز و فلاح کی طرف ایک اجمالی اشارہ۔

(۴۹-۷۷) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے والے فرشتوں کے واقعہ کی یاددہانی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا اپنے بندوں پر بڑا مہربان بھی ہے اور ان پر دردناک عذاب لانے والا بھی۔ وہی فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لیے بیٹے کی بشارت لے کر آئے اور وہی فرشتے قوم لوط کے لیے صاعقۂ عذاب بن کر نمودار ہوئے۔ آخر میں کفار کو توجہ دلائی گئی ہے کہ تم لوط کی بستیوں پر سے آئے دن گزرتے ہو، اگر دیدۂ بینا رکھتے ہو تو ان کے انجام سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے؟ تم پیغمبر سے فرشتوں کے ظہور کے لیے مطالبہ کر رہے ہو۔ فرشتے تو جب مکذبین کے پاس آتے ہیں تو اسی طرح آتے ہیں جس طرح قوم لوط کے پاس آئے کہ ان کے آنے کے بعد ان پر عذاب الٰہی آ دھمکا۔

(۷۸-۸۴) قوم شعیبؑ اور قوم ثمود کے انجام کی طرف اجمالی اشارہ۔ قوم لوطؑ کی طرح قوم شعیبؑ اور قوم ثمود کے آثار پر سے بھی قریش کو اپنے تجارتی سفروں میں گزرنے کا موقع ملتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر دیدۂ بینا ہو تو قدم قدم پر مفسدین کے انجام کے آثار موجود ہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ جب اپنے ہی اوپر سب کچھ نازل ہو جائے تب ہی آنکھیں کھلیں۔

(۸۵-۹۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تمکین و تسلی کہ ابھی خوبصورتی کے ساتھ ان لوگوں سے درگزر کرو۔ ان کے کیے کا سارا انجام ان کے سامنے آ جائے گا۔ خدا نے قرآن عظیم کی شکل میں جو دولت گرانمایہ تمہیں بخشی ہے وہ تمہارے لیے کافی ہے۔ اس کے ہوتے تمہیں کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ ان کے طعنوں کی تم کچھ پروا نہ کرو، خدا کی تسبیح اور نماز میں مشغول رہو۔ صبح یقین طلوع ہوا ہی چاہتی ہے۔

سُوْرَةُ الْحِجْرِ (۱۵)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ۹۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ۱ - ۱۵ الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱﴾ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۲﴾ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ
الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا
كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۵﴾
وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۶﴾ لَوْ
مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷﴾ مَا نُنَزِّلُ
الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ﴿۸﴾ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا
الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۱﴾
كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۲﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ
خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ
فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ
ع ۱ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۵

یہ الف، لام، را ہے۔ یہ کتاب الٰہی اور ایک واضح قرآن کی آیات ہیں۔ وہ وقت آئیں گے جب یہ لوگ، جنھوں نے کفر کیا ہے، تمنا کریں گے کہ کاش ہم مسلم بنے ہوتے۔ ان کو چھوڑو، کھا پی لیں، عیش کر لیں اور آرزوؤں میں مگن رہ لیں۔ عنقریب یہ جان لیں گے۔ ہم نے جس قوم کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک معین نوشتہ رہا ہے۔ کوئی قوم نہ اپنی مدت مقررہ سے آگے بڑھتی نہ پیچھے ہٹتی۔ اور یہ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر یاد دہانی اتاری گئی ہے تم تو ایک خبطی ہو، اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے؟ ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر فیصلہ کے ساتھ اور اس وقت ان کو مہلت نہیں ملے گی۔ یہ یاد دہانی ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اور ہم نے تم سے پہلے بھی اگلے گروہوں میں اپنے رسول بھیجے تو جو رسول بھی ان کے پاس آتا وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے۔ ہم مجرموں کے دلوں میں اس کو اسی طرح اتارتے ہیں۔ یہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور اگلوں کی سنت گزر چکی ہے۔ اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے جس میں وہ چڑھنے لگتے تب بھی یہی کہتے کہ ہماری آنکھیں مدہوش کر دی گئی ہیں بلکہ ہم سب پر جادو کر دیا گیا ہے۔ ۱ - ۱۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ (۱)

قرآن اپنی صداقت کی خود دلیل ہے

حروف مقطعات پر ایک جامع بحث ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر کے آغاز میں کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک 'الٓرٰ' اس سورہ کا قرآنی نام ہے اور 'تِلْكَ' کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔ لفظ 'الْكِتٰب' پر بھی ہم بقرہ کی تفسیر کے شروع میں بحث کر چکے ہیں۔ اس سے مراد وہ خدائی کتاب ہے جس کے اتارنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا اور جس کی پچھلے نبیوں نے خبر دی تھی۔ قرآن کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کلام جو ان کو سنایا جا رہا ہے یہ کتاب الٰہی اور ایک واضح قرآن کی آیات پر مشتمل ہے۔ یہ اپنی صداقت کی دلیل خود

اپنے اندر رکھتا ہے، کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ اس کو نہیں مان رہے ہیں، اس کی صداقت کو جانچنے کے لیے معجزوں کی فرمائش کر رہے ہیں، وہ درحقیقت اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (۲)

یعنی آج تو یہ لوگ غرور و رعونت کے ساتھ اس کتاب کا انکار کر رہے ہیں لیکن آگے ایسے وقت آئیں گے اور بار بار آئیں گے جب یہ تمنائیں کریں گے کہ کاش اس کتاب کو قبول کر کے مسلمان بنے ہوتے کہ ان ہولناک نتائج سے محفوظ رہتے۔ یہ مضمون سورۂ ابراہیم آیت ۴۴ میں بھی گزر چکا ہے۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (۳)

یعنی اگر یہ اپنی سرمستیوں میں گم ہیں، تم کو اور تمہاری دعوت کو (خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) خاطر میں نہیں لا رہے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، چند دن یہ کھا پی لیں، مزے کر لیں اور لذیذ آرزوؤں کے خواب دیکھ لیں، عنقریب وہ وقت آیا چاہتا ہے جب یہ اپنی سرمستی کا انجام خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ ۝ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ (۴-۵)

عذاب الٰہی کے مؤخر ہونے کی وجہ

یہ وجہ بیان ہوئی ہے عذاب کے مؤخر ہونے کی۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے مطالبہ کے باوجود ان پر عذاب جو نہیں آ رہا ہے تو یہ تاخیر اللہ تعالیٰ کی ایک سنت پر مبنی ہے۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ وہ کسی قوم پر عذاب بھیجنے سے پہلے اس پر اپنی حجت تمام کرتا ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد بھی اگر وہ قوم اپنی سرکشی سے باز نہیں آتی تو لازماً وہ اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ اتمام حجت اور اخلاقی زوال کی وہ حد جس پر پہنچ کر کوئی قوم مستحق عذاب ہو جاتی ہے ایک خدائی نوشتہ میں مرقوم ہے۔ جب اس نوشتہ کی مدت پوری ہو جاتی ہے، قوم ہلاک کر دی جاتی ہے۔ سر مو اس میں فرق واقع نہیں ہوتا۔ نہ اس میں تقدیم ہوتی نہ تاخیر۔

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ۝ لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ (۶-۷)

آنحضرتؐ پر کفار کا طعن اور اس کا جواب

کفار آنحضرت صلعم کو طنزیہ انداز میں خطاب کر کے کہتے کہ اے وہ شخص جو مدعی ہے کہ اس پر خدا کی طرف سے ہمارے لیے یاد دہانی اتری ہے تم تو ہمیں ایک خبطی معلوم ہوتے ہو کہ ہمیں تو عذاب کی دھمکی سنا رہے ہو اور اپنے لیے فوز و فلاح کے مدعی ہو دراں حالیکہ ہمارے حالات تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے حالات سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ اگر ہم خدا کے مبغوض و مقہور ہیں اور تم خدا کے محبوب و منظور نظر ہو تو ہم کو یہ نعمتیں کیوں ملی ہوئی ہیں اور تم ان سے کیوں محروم ہو؟ یہ صورت حال تو صاف ظاہر کرتی ہے کہ تم ایک خبطی آدمی ہو اور

جبلیوں کی سی باتیں کر رہے ہو اور یہ بھی تمھارا ایک خبط ہی ہے کہ تم مدعی ہو کہ تمھارے پاس فرشتہ آتا ہے۔ اگر فرشتے آتے ہیں اور تم اس دعوے میں سچے ہو تو ان فرشتوں کو تم ہمارے پاس کیوں نہیں لاتے کہ ہم بھی ذرا دیکھیں اور سنیں کہ وہ کیسے ہیں اور کیا کہتے ہیں۔ آخر تمھیں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ وہ تمھارے پاس تو آتے ہیں اور ہمارے پاس نہیں آتے۔

'لَوْمَا تَأْتِيْنَا' میں 'لَوْمَا' اجارے، اکسانے یا مطالبہ کرنے کے مفہوم میں ہے یعنی کیوں نہیں ایسا کرتے؛ کلام عرب اور قرآن مجید میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ (۸)

یہ مذکورہ بالا مطالبہ کا جواب ہے۔ 'حق' کے معنی یہاں فیصلہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی عقل اور سمجھ سے کام لیں اور آفاق و انفس میں جو نشانیاں موجود ہیں اور جن کی طرف قرآن توجہ دلا رہا ہے ان پر غور کریں اور ان کی روشنی میں ایمان لائیں۔ ایمان لانے کے لیے فرشتوں کے اتارے جانے کا مطالبہ نہ کریں۔ فرشتے تو ہم لوگوں پر صرف اس وقت بھیجتے ہیں جب لوگ اندھے بہرے بن جاتے اور عذاب کے سوا ان کے لیے کوئی اور چیز باقی رہ ہی نہیں جاتی۔ اس وقت فرشتے خدا کا فیصلہ لے کر آتے ہیں اور وہ قوم نیست و نابود کر دی جاتی ہے اس کے بعد کسی کو مہلت نہیں ملتی۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۹)

قرآن کی حفاظت کا ذمہ دار خود خدا ہے

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت پرزور الفاظ میں تسکین و تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ (قریش) اس قرآن عظیم کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو تم اس کا غم نہ کرو۔ یہ کتاب، تمھاری طرف سے کسی طلب و تمنا کے بغیر ہم ہی نے تم پر اتاری ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس کو رد کر رہے ہیں تو رد کر دیں، خدا اس کے لیے دوسروں کو کھڑا کر دے گا جو اس کو قبول کریں گے اور اس کی دعوت و حفاظت کی راہ میں کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ یہی مضمون سورۂ انعام میں یوں بیان ہوا ہے۔ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ۔ ۸۹- انعام (اگر یہ لوگ اس کا انکار کر دیں تو تم اس کا غم نہ کرو ہم نے اس پر ایسے لوگوں کو مامور کر رکھا ہے جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں) مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اس کو قبول کرتے ہیں تو اس میں ان کی اپنی ہی دنیا و آخرت کی سعادت ہے، اور اگر یہ اپنی بدقسمتی اور شامت اعمال سے اس کو رد کر دیتے ہیں تو دوسرے اس کے قبول کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے۔ چنانچہ جب قریش نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے انصار کے سینے اس کے لیے کھول دیے، انھوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی حفاظت کی راہ میں کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔

'اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا' میں حصر و حصر کا جو مضمون پایا جاتا ہے اس سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ یہ کتاب تم نے ہم سے مانگ کے تو لی نہیں ہے کہ تم پر لوگوں سے اس کو قبول کروانے کی ذمہ داری ہو۔ تم

پر ذمہ داری صرف تبلیغ و دعوت کی ہے، تم اس کو ادا کر دو۔ رہا اس کتاب کی حفاظت اور اس کے قیام و بقا کا مسئلہ تو یہ ہم سے متعلق ہے، اس کی حفاظت اور اس کے قیام و بقا کا انتظام ہم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کن کن شکلوں میں پورا فرمایا، تاریخ میں اس سوال کا پورا جواب موجود ہے۔ اس تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۰-۱۳)

انبیاء کی سرگزشتوں کا حوالہ

تسکین و تسلی کے مضمون کو مزید مؤکد و مبرہن کرنے کے لیے یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی سرگزشتوں کا حوالہ ہے کہ آج اپنی قوم کی طرف سے جو تجربہ تمھیں ہو رہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم نے تم سے پہلے بھی جو رسول پچھلی قوموں میں بھیجے انھیں بھی اپنی اپنی قوموں کی طرف سے انہی حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ جس طرح آج تمھارا مذاق اڑایا جا رہا ہے اسی طرح تم سے پہلے آنے والے رسولوں کا بھی مذاق اڑایا گیا۔ اللہ کے رسولوں کی دعوت چیز ہی ایسی ہے کہ نافرمانیوں میں ڈوبے ہوئے مجرمین اس کو ٹھنڈے پیٹوں نہیں برداشت کرتے یہ چیز ان کو تیر و نشتر کی طرح چبھتی ہے اور وہ اس کو اگلنے کے لیے زور لگاتے ہیں چنانچہ یہ تمھاری قوم کے لوگ بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے بلکہ وہی روش انھوں نے اختیار کی ہے جو ان کے پیشروؤں نے اختیار کی اور لازماً اسی انجام سے بھی دوچار ہوں گے جس سے ان کے پیش رو دوچار ہوئے۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۝ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ (۱۴-۱۵)

منکرین کے انکار کا اصل سبب

یعنی فرشتوں کا اتارا جانا تو الگ رہا اگر ہم ان کے لیے آسمان میں کوئی دروازہ بھی کھول دیں اور وہ اس میں چڑھنے لگ جائیں جب بھی وہ ایمان نہ لانے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ پیدا کر ہی لیں گے۔ کہیں گے ہماری نگاہیں خیرہ کر دی گئی ہیں اور ہماری پوری قوم، مردوں اور عورتوں سب پر جادو کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا اصل سبب یہ نہیں ہے کہ ان کی طلب کے مطابق ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا جا رہا ہے بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور اپنے مزعومات میں کوئی تبدیلی قبول کرنے اور استکبار کے سبب سے پیغمبر کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

۲- آگے کا مضمون ——— آیات ۱۶-۲۵

آفاق و انفس کی نشانیوں کی طرف اشارہ

آگے ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو آفاق و انفس اور آسمان و زمین کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان باتوں کی تصدیق کرتی ہیں جن کی پیغمبر دعوت دے رہے ہیں۔ مقصد ان نشانیوں کے ذکر سے یہ ہے کہ قدرت کے معجزات کے ہوتے ہوئے کسی نئے معجزے کی ضرورت کہاں باقی رہی، دیکھنے والی آنکھیں اور

سوچنے والے دماغ ہوں تو ایک ایک پتہ معرفت کردگار کا دفتر ہے۔

آیات ۱۶-۲۵

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٦﴾ وَحَفِظْنَاهَا
مِن كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ﴿١٧﴾ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ
مُّبِينٌ ﴿١٨﴾ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا
مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ ﴿١٩﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ
لَهُ بِرَازِقِينَ ﴿٢٠﴾ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا
نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ﴿٢١﴾ وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ فَأَنزَلْنَا
مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ ﴿٢٢﴾ وَإِنَّا
لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ﴿٢٣﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ
مِنكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ﴿٢٤﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ
ع ۲ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥﴾

ترجمۂ آیات ۱۶-۲۵

اور ہم نے آسمان میں برج بنائے اور دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے اس کو مزین کیا اور ہر شیطانِ مردود کی دراندازی سے اس کو محفوظ کیا۔ اگر کوئی سن گن لینے کے لیے چوری چھپے کان لگاتا ہے تو ایک دمکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے۔ ۱۶-۱۸

اور زمین کو ہم نے بچھایا اور ہم نے اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے اور اس میں ہر قسم کی چیزیں تناسب کے ساتھ اگائیں اور ہم نے اس میں تمہاری معیشت کے سامان بھی رکھے اور ان کی معیشت کے بھی جن کو تم روزی نہیں دیتے۔ اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں لیکن ہم اس کو ایک معین اندازے کے ساتھ ہی اتارتے ہیں۔ ۱۹-۲۱

اور ہم ہی ہواؤں کو بار آور بنا کر چلاتے ہیں پھر آسمان سے پانی برساتے اور تم کو اس سے سیراب کرتے ہیں اور یہ تمھارے بس میں نہ تھا کہ تم اس کے ذخیرے جمع کر کے رکھتے۔ ۲۲

اور بے شک یہ ہم ہی ہیں کہ زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی سب کے وارث ہیں اور ہم ان کو بھی جانتے ہیں جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان کو بھی جانتے ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں اور بے شک تمھارا خداوند ہی ہے جو ان سب کو اکٹھا کرے گا۔ بے شک وہ علیم اور حکیم ہے۔ ۲۳-۲۵

۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ۝ وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ ۝ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُبِينٌ (۱۶-۱۸)

آسمانی نشانیوں کی طرف اشارہ

شہاب ثاقب کا کام

'بروج' کے معنی قلعہ اور محل کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد وہ آسمانی قلعے ہیں جو خدا نے آسمانوں میں بنائے ہیں، جن میں اس کے ملائکہ اور کروبیوں کی فوجیں برابر مامور رہتی اور ان حدود اور دائروں کی نگرانی کرتی ہیں جن سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ شیاطین انس کو ہے اور نہ شیاطین جن کو اور اگر کوئی شیطان ملاء اعلیٰ کی باتوں کی کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک دمکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک قلعہ کی برجیوں پر مامور سپاہی دشمن کے آدمیوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں، کسی اجنبی کو اپنے حدود کے اندر گھسنے کا موقع نہیں دیتے، اسی طرح خدا کے مامور ملائکہ ان شیاطین جن کو شہاب ثاقب کا نشانہ بناتے ہیں جو ان کے حدود میں ٹوہ لگانے کے لیے دراندازی کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے ضمناً اس کہانت کی بالکل بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے جس کا عہد جاہلیت میں بڑا رواج تھا اور جس کی آڑ میں کاہن لوگ غیب دانی کے دعوے کر کے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بناتے تھے۔ قرآن نے یہ واضح کر دیا کہ ملاء اعلیٰ کے دائروں تک شیاطین کو رسائی حاصل نہیں ہے اور اگر وہ چوری چھپے کان لگانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ شہاب کی سنگ باری کا ہدف بنتے ہیں۔ اسی پہلو سے یہاں شیطان کی صفت 'رجیم' آئی ہے اس لیے کہ 'رجیم' کے معنی سنگسار کردہ کے ہیں اور لفظ 'کل' اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ بڑے سے بڑا شیطان بھی بہر حال خدا کے محفوظ کیے ہوئے حدود میں داخل نہیں ہو سکتا۔

جس چیز کو عرفِ عام میں ستاروں کا ٹوٹنا کہتے ہیں موجودہ سائنس اس کی جو توجیہ بھی کرے اس سے قرآن کی بیان کردہ اس حقیقت کی تردید نہیں ہوتی اس لیے کہ سائنس کی رسائی کسی چیز کے صرف ظاہری اسباب و علل ہی تک ہے۔ قدرتِ الٰہی ان شہابوں سے کیا کیا کام لیتی ہے یہ بتانا سائنس کے بس سے باہر ہے۔ اس کو صرف اللہ تعالیٰ ہی بتا سکتا ہے اور اس کی باتوں کو جاننے کا واحد ذریعہ وحیِ الٰہی اور قرآن ہے۔

یہ مضمون یہاں ضمناً آگیا ہے۔ آیت کا اصل مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، آسمان و زمین کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلانا ہے جو اس کائنات کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان میں سے ہر نشانی ان باتوں کی تصدیق کر رہی ہے جن کی قرآن اور پیغمبر خبر دے رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے ان کے لیے تو آسمان بھی نشانیوں سے معمور ہے اور زمین بھی لیکن جن کی آنکھیں بند ہیں وہ ان نشانیوں سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے معجزوں کے مطالبے کرتے ہیں اور اگر کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان کو دکھایا جائے جب بھی جیسا کہ اوپر اشارہ فرمایا، یہ اندھے ہی بنے رہیں گے۔

نظمِ کلام کے پہلو سے یہاں خاص توجہ وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ کے ٹکڑے پر ہونی چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو اس کے لیے اس دنیا میں معجزات کی کمی نہیں ہے۔ وہ آسمان کو دیکھے۔ قدرت نے اس کو ستاروں اور سیاروں، چاند اور سورج، شفق اور قوس قزح اور دوسرے بے شمار گوناگوں و بوقلموں عجائب سے کس طرح سنوارا ہے کہ جس طرف بھی نگاہ اٹھتی ہے انسان حیران و ششدر ہو کے رہ جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل اور کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آجانے والی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکیم و علیم اور ایک بے پناہ قدرت و حکمت کے مالک کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اس کی قدرت و حکمت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اس کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ نہ دے بلکہ یہ لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں وہ سب کو اکٹھا کر کے ان کے اعمالِ نیک و بد کا حساب کرے اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزا یا سزا دے۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ (۱۹)

زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ

آسمان کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد یہ زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ جس طرح آسمان خدا کی نشانیوں سے معمور ہے اسی طرح زمین بھی اس کی نشانیوں سے معمور ہے۔ آسمان اوپر شامیانے کی طرح، چمکتے ہوئے قمقموں کے ساتھ، تنا ہوا ہے اور زمین نیچے، اپنی گوناگوں و بوقلموں نباتات کے ساتھ، فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے اور یہ خدائے قادر و قیوم ہی کی قدرت و حکمت ہے کہ اس کے اندر اس نے پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے ہیں جو اس کے توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہیں ورنہ، جیسا کہ دوسرے مقام میں فرمایا ہے، یہ ساری مخلوق سمیت کسی ایک جانب کو لڑھک پڑتی۔

وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ خدا نے اس

میں جو چیز بھی پیدا کی ہے ایک خاص توازن و تناسب کے ساتھ پیدا کی ہے اور اسی توازن و تناسب کی برکت سے یہ انسان کی رہائش اور تمدن و معیشت کے لیے سازگار ہوئی ہے۔ ورنہ جیسا کہ آگے ارشاد ہوا ہے، خدا کے خزانوں میں کسی چیز کی بھی کمی نہیں تھی، وہ اگر کسی چیز کو بھی اس کی حد مطلوب و معین سے متجاوز ہو جانے کے لیے چھوڑ دیتا تو اس زمین کا سارا نظام درہم برہم ہو کے رہ جاتا اور انسانوں کے بجائے اس میں کوئی اور ہی مخلوق آباد ہوتی یا یہ بالکل غیر آباد ہو کے رہ جاتی۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ (۲۰)

نظام ربوبیت کی طرف اشارہ

اس میں زبان کے معروف قاعدے کے مطابق ایک جگہ حرفِ جر کو محذوف کر دیا گیا ہے 'وَمَنْ لَّسْتُمْ' دراصل 'وَلِمَنْ لَّسْتُمْ' ہے۔ آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام ربوبیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس زمین میں اس نے انسان کے لیے بھی ضرورت کی وہ ساری چیزیں پیدا کی ہیں جن کا وہ اپنی زندگی کے بقا اور اس کی رفاہیت کے لیے محتاج ہے اور ان چیزوں کے لیے بھی زندگی کا سامان کیا ہے جن کے رزق کی کوئی ذمہ داری انسان پر نہیں ہے اگرچہ وہ انسان کے کام آنے والی ہیں اور انسان مختلف پہلوؤں سے ان سے فائدے اٹھاتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۲۱)

توازن و تناسب کی طرف اشارہ

یہ جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس توازن و تناسب کی طرف اشارہ ہے جو خالق کائنات کے تمام کاموں میں موجود ہے اور جس کے اوپر ہی اس دنیا کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔ خدا کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے، اس کے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں لیکن اس دنیا کا بقا مقتضی ہے کہ ہر چیز ایک تناسب کے ساتھ ظہور میں آئے اس وجہ سے وہ ہر چیز اتنی ہی مقدار میں بھیجتا ہے جتنی مقدار میں اس کا بھیجنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر کوئی چیز ذرا اپنی حد مطلوب سے زیادہ ہو جاتی ہے، اور یہ زیادتی بھی جب ہوتی ہے خدا ہی کے حکم سے ہوتی ہے، تو اس کے نتیجہ میں اس دنیا میں بڑی بڑی آفتیں برپا ہو جاتی ہیں۔ یہ ساری باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ دنیا نہ تو کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آگئی ہے جیسا کہ ملاحدہ و منکرین سمجھتے ہیں اور نہ یہ مختلف دیویوں اور دیوتاؤں کی بازیگاہ ہے جیسا کہ مشرکین نے سمجھا ہے۔ چنانچہ سورۂ فرقان کی آیت ۲ میں اجزائے کائنات کے اسی تناسب کو 'تقدیر' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس تقدیر کو شرک کی نفی اور توحید کی ایک واضح دلیل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ (۲۲)

'لقح' کے معنی باردار اور حاملہ کرنے کے ہیں۔ اسی سے 'لاقحۃ' اور اس کی جمع 'لواقح' ہے 'ریاح لواقح' ان ہواؤں کو کہتے ہیں جو بادلوں کو باردار کرتی اور بارش کا سبب بنتی ہیں۔

نظام ربوبیت کی مزید وضاحت

اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنی جس ربوبیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ اسی کی مزید وضاحت ہے کہ پانی جو تمہاری

اور تمام جانداروں کی زندگی کا ذریعہ اور تمام اسباب معیشت کو وجود میں لانے کا واسطہ ہے یہ خدا ہی کے حکم اور اسی کی مہربانی سے تمھیں حاصل ہوتا ہے۔ وہی ہے جو موسمی ہوائیں چلاتا ہے جو بادلوں کو جمع اور ان کو باردار کرتی ہیں جن سے تم سیراب ہوتے ہو۔ یہ تمھارے بس میں نہ تھا کہ تم اس پانی کے ذخیرے جمع کر کے رکھ چھوڑتے اور جب ضرورت پڑتی پانی برسا لیتے۔ یہ خدا ہی کا انتظام اور اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمھارے لیے یہ انتظام کر رکھا ہے۔

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ (۲۳)

مذکورہ حقائق کا لازمی تقاضا — اوپر جو باتیں ارشاد ہوئی ہیں یہ ان کا لازمی تقاضا واضح فرمایا گیا ہے کہ ہم ہی زندگی بھی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت بھی دیتے ہیں اور ہم ہی ہر چیز کے وارث بھی ہیں۔ جس طرح زندگی اور موت میں کسی کو دخل نہیں ہے اسی طرح زمین اور اہل زمین کی وراثت میں بھی کسی کا کوئی حصہ نہیں۔ سب کا مرجع و مولیٰ اللہ ہی ہے۔ اگر کسی نے کسی اور سے کوئی امید باندھ رکھی ہے تو یہ محض وہم ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۲۴-۲۵)

یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اتنی بے شمار مخلوقات کا حساب کتاب کس کے بس کی بات ہے! فرمایا کہ ہم ہی نے سب کو پیدا کیا اور سب کو روزی دی ہے ہم ان کو بھی جانتے ہیں جو گزر چکے اور ان سے بھی واقف ہیں جو بعد میں آئے یا آئیں گے۔ اللہ ان سب کو اکٹھا کرے گا اور سب کا حساب کرے گا۔ وہ حکیم و علیم ہے۔ اس کے حکیم ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ ایک روز جزا و سزا لائے اور اس کے علیم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ نہ کوئی اس سے اوجھل ہو سکتا اور نہ وہ کسی کے کسی عمل سے بے خبر ہے۔

۴- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۶-۴۸

آدم و ابلیس کے ماجرے کا حوالہ — آگے کی آیات میں آدم اور ابلیس کے ابتدائی ماجرے کا حوالہ دیا ہے۔ مقصود اس حوالے سے اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ آج جو لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں اور نہایت غرور و تکبر کے ساتھ خدا کے رسول کی تکذیب کر رہے ہیں ان کے کفر اور تکبر کا اصل سبب یہ نہیں ہے کہ رسولوں کی باتوں کی صداقت ثابت کرنے کے لیے دلیلیں موجود نہیں ہیں یا ان کی طلب کے مطابق ان کو معجزے نہیں دکھائے جا رہے ہیں بلکہ یہ ذریات ابلیس کے اس فریب میں آئے ہوئے لوگ ہیں جس کی دھمکی ابلیس نے اس وقت دی تھی جب اس کو آدم کے سجدہ کا حکم ہوا تھا۔ اس وقت اس نے سجدہ سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر مجھے مہلت دی جائے تو میں آدم کی ساری ذریت کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا، صرف وہی لوگ میرے دام فریب سے بچ سکیں گے جو خدا کے مخلص بندے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو اس کی مہلت دی اور فرمایا کہ جا ان میں سے جو تیرے فریب میں آئیں ان کو تو اپنے

دامِ فریب میں پھنسا، لیکن میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۶-۴۸

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ وَالْجَآنَّ
خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّيْ
خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَإِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ
نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ
كُلُّهُمْ أَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ إِلَّآ إِبْلِيْسَ أَبٰىٓ أَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ
يٰٓإِبْلِيْسُ مَا لَكَ أَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ أَكُنْ لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ
خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا
فَإِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾ قَالَ رَبِّ
فَأَنْظِرْنِيْٓ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ إِلٰى
يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ أَغْوَيْتَنِيْ لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ
فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾
قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ
سُلْطٰنٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ
أَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾ ع ۲ ۱۹ ۲
إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾ أُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَ
نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۷﴾
لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۸﴾

ترجمۂ آیات ۲۶-۴۸

اور بے شک ہم ہی نے انسان کو سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا اور اس سے پہلے جنوں کو آتشِ سموم سے پیدا کیا۔ اور یاد کرو جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں تو جب میں اس کو مکمل کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک لوں تو تم اس کے لیے سجدے میں گر پڑنا۔ تو تمام فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا بجز ابلیس کے۔ اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کیا۔ پوچھا، اے ابلیس، تیرا کیا معاملہ ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دے؟ وہ بولا میں ایک ایسے بشر کو سجدہ کرنے کو تیار نہیں جس کو تو نے سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔ فرمایا، یہ بات ہے تو تو یہاں سے نکل کہ تو راندۂ درگاہ ہوا اور روزِ جزا تک تجھ پر لعنت ہے۔ اس نے کہا اے میرے رب تو مجھے اس دن تک کے لیے مہلت دے دے جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا، اچھا، روزِ معین تک مہلت پانے والوں میں سے تو بھی ہے۔ بولا، اے رب، چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا میں زمین میں دنیا کو ان کی نگاہوں میں کھبا دوں گا اور ان میں سے تیرے خاص بندوں کے سوا سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ فرمایا، یہ ایک سیدھی راہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والی ہے۔ میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔ بجز ان کے جو گمراہوں میں سے تیرے پیرو بن جائیں اور ان سب کے لیے جہنم ہی موعود ہے۔ اس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کے لیے ان کا ایک مخصوص حصہ ہو گا۔ خدا ترس بندے باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ رہو ان میں سلامتی کے ساتھ نچنت ہو کر۔ ان کے سینوں کی کدورتیں ہم نکال دیں گے۔ وہ آمنے سامنے بھائی بھائی کی طرح تختوں پر براجمان ہوں گے۔ اس میں نہ تو ان کو کوئی تکان لاحق ہو گی اور نہ وہ اس سے نکالے ہی جائیں گے۔ ۲۶-۴۸

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (۲۶)

صلصال کا مفہوم

'صَلْصَال' خشک مٹی کو کہتے ہیں جو خشک ہو کر کھنکھنانے لگ جائے۔

حمأ مسنون کا مفہوم

'حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ' سیاہ اور بدبودار مٹی کو کہتے ہیں۔

انسان کی خلقت کا آغاز

زمین کے تمام جانداروں کی زندگی کا آغاز پانی اور کیچڑ ہی سے ہوا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے جن کے لیے یہ چاہا کہ وہ خشکی میں رہیں بسیں ان کے لیے خشک زمین مہیا فرمائی اور اس خشک زمین میں ان کے اندر کی وہ قوتیں اور صلاحیتیں ابھریں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ودیعت فرمائی تھیں اور جو اپنے نشوونما کے لیے زمین کے مخصوص ماحول کی محتاج تھیں۔ انسان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ وہ بھی پانی، کیچڑ اور خشک زمین ہی کی ایک مخلوق ہے۔ البتہ اس کو دوسرے جانداروں کے مقابل میں، جیسا کہ آگے ذکر آ رہا ہے، یہ امتیاز حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا تسویہ فرمایا یعنی ان تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے اس کو آراستہ کیا جو اس کے مقصد تخلیق کی تکمیل کے لیے ضروری تھیں۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ صرف یہی نہیں فرمایا کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا، جیسا کہ دوسرے مقامات میں ہے، بلکہ اس کے ساتھ 'حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ' کا اضافہ بھی ہے۔ اس سے مقصود زندگی کے نقطۂ آغاز کی طرف اشارہ بھی کرنا ہے اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا بھی کہ جس کی زندگی کا آغاز ایسے حقیر عنصر سے ہوا ہے اس کے لیے یہ کسی طرح زیبا نہیں کہ وہ اس قادر و قیوم سے اکڑے جس نے اس کو اتنے حقیر عنصر سے پیدا کیا اور پھر اس کو نہایت اعلیٰ صلاحیتوں سے آراستہ کیا۔

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۲۷)

'سَمُوْم' لو کی لپٹ اور ہوائے گرم کو کہتے ہیں۔

جنات کی خلقت کا آغاز

انسانوں کی خلقت کے بعد یہ جنوں کی خلقت کا پتہ دیا کہ انسانوں سے پہلے اللہ نے جنوں کو پیدا کیا اور ان کی خلقت آگ کے عنصر لطیف یعنی ہوائے گرم سے ہوئی۔

یہ امر یہاں پیش نظر رہے کہ انسان اور جنات کی خلقت کے بیان کرنے سے قرآن کا مقصود اصلی یہاں ان کے عناصر خلقت کا سراغ دینا نہیں ہے بلکہ اصل مقصود انسان اور ابلیس کی اس بنائے مخاصمت کو واضح کرنا ہے جس کا ذکر آگے کی آیات میں آ رہا ہے۔ ابلیس نے، جو جنوں میں سے تھا، اسی خلقت کو اپنی برتری کی دلیل ٹھہرا کر آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا جس کے سبب سے وہ ملعون ہوا اور اس کی یہ ملعونیت اس کی اور آدم کی ذریات میں ایک مستقل وجۂ عناد و حسد بنی اس وجہ سے قرآن نے اس کا حوالہ دیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (۲۸-۲۹)

اب یہ وہ اصل مضمون بیان ہو رہا ہے جس کی تمہید کے طور پر اوپر والی بات بیان ہوئی ہے۔ ہم آدمؑ و ابلیس کے اس ماجرے پر بقرہ آیات ۳۴-۳۸ اور اعراف آیات ۱۱-۲۵ کے تحت پوری وضاحت کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادے میں طوالت ہوگی۔ البتہ ان امور کی طرف ہم یہاں بھی اشارہ کریں گے جو سلسلۂ کلام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔

انسانی شرف کی بنیاد

ان آیات سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم آدمؑ کی تخلیق سے پہلے ہی دیا تھا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سجدہ کے اس حکم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وضاحت بھی تھی کہ یہ سجدہ اس وقت کیا جائے جب میں آدمؑ کا تسویہ یعنی اس کو تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے آراستہ کر لوں اور اس کے اندر اپنی روح پھونک لوں۔ اس سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کو جو کچھ شرف و فضیلت حاصل ہے وہ تمام تر ان قوتوں اور صلاحیتوں اور اس روحِ یزدانی کی بدولت ہے جو اس کو ودیعت ہوئی ہیں۔ اگر انسان ان کی حفاظت کرے اور ان کو ترقی دے تو وہ مسجودِ ملائک ہے اور اگر ان کو برباد کر دے تو پھر وہ نہ صرف ایک حیوان بلکہ حیوانات سے بھی فروتر ہے۔

'وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ' سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے اندر ایک نورِ یزدانی (DIVINE SPARK) بھی ودیعت ہوا ہے جو اس کے تمام روحانی کمالات کا سرچشمہ ہے اور اسی کے واسطہ سے وہ خدا سے جڑتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی پوری پوری حفاظت کرے۔ اگر وہ اس کو ضائع کر دے تو وہ ایک بے چراغ گھر ہے جس کے اندر صرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ (۳۰-۳۱)

آدمؑ اور ابلیس کی سرگزشت

تمام فرشتوں اور ان کے حکم میں داخل تمام مخلوقات نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل میں آدمؑ کو سجدہ کیا لیکن ابلیس نے، جو جنات میں سے تھا، اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا اور اس انکار کی وجہ، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے، اس نے صرف یہ بتائی کہ وہ آگ سے پیدا ہونے کے سبب سے ایک برتر مخلوق ہے تو ایک بشر کو کس طرح سجدہ کر سکتا ہے جو مٹی سے پیدا ہوا اور اس سے فروتر ہے۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (۳۲-۳۵)

یہ حکم ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں اور جنوں کے لیے ایک امتحان تھا جس میں فرشتے کامیاب رہے لیکن ابلیس، جو جنوں میں سے تھا، اپنے غرور و تکبر کے سبب سے اس میں ناکام رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس سرکشی کے جرم میں اس کو ملعون و مردود قرار دے کر وہاں سے نکلنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ تیرے اوپر یہ لعنت جزا کے دن تک مسلط رہے گی اور اس کے بعد تو اپنے اس جرم کی سزا بھگتے گا۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ (۳۶-۳۸)

شیطان کی فتنہ سامانیاں

ابلیس اس حکم اخراج اور اس لعنت سے متاثر یا مرعوب ہونے کے بجائے اور زیادہ اکڑ گیا۔ اس نے بعث قیامت تک کے لیے مہلت مانگی کہ اس کو موقع دیا جائے کہ وہ آدمؑ اور ان کی ذریات کو اپنے فتنوں میں مبتلا کرکے یہ ثابت کرے کہ یہ اس شرف کے اہل نہیں ہیں جو ان کو بخشا گیا ہے اور ان کو سجدہ نہ کرنے کے معاملے میں وہ بالکل بجانب حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ درخواست قبول فرمائی اور قیامت کے نفخ موعود تک کے لیے اس کو یہ مہلت دے دی گئی۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (۳۹-۴۰)

'اغوا' کے معنی گمراہ کرنے کے ہیں۔ چونکہ ابلیس آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کے معاملے میں اپنے آپ کو بجانب حق خیال کرتا تھا اس وجہ سے اس نے نہایت گستاخانہ انداز میں فعل 'اغوا' کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کیا۔ مطلب یہ کہ اگر میں اس حکم کی عدم تعمیل کے باعث گمراہ ٹھہرا تو اس میں میرا قصور نہیں ہے بلکہ یہ حکم ہی ایسا تھا کہ میں اس کی تعمیل نہیں کر سکتا تھا اس وجہ سے اگر میں اس کے سبب سے گمراہ ہوا تو اس پر تو ہی نے مجھے مجبور کیا۔

شیطان کی کوشش کا خاص ہدف

'لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ' یعنی میں دنیا اور اس کی مرغوبات کو انسان کی نگاہوں میں کھباؤں گا اور وہ ان کی طمع اور محبت میں اس طرح پھنس جائے گا کہ نہ اسے یہ یاد رہے گا کہ وہ مسجود ملائک ہے، نہ اس کو کچھ آخرت کا ہوش رہے گا اور نہ وہ تیری توحید پر قائم رہے گا۔

'وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ' یعنی ان کو توحید کی سیدھی راہ سے ہٹا کر شرک کی وادیوں میں بھٹکا دوں گا۔ ابلیس کا یہ قول سورہ اعراف آیت ۱۶-۱۷ میں یوں نقل ہوا ہے۔ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ (وہ بولا کہ چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں بیٹھوں گا، پھر ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے اور ان کے دہنے اور ان کے بائیں سے ان پر حملہ کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا) اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کے اغوا کا خاص ہدف توحید ہے۔ اس کی ساری فتنہ آرائیاں اس واحد غرض کے لیے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں آدمؑ کی اولاد کو خدا تک پہنچانے والی سیدھی راہ سے بھٹکا کر شرک کی گمراہی میں پھنسا دے۔

'اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ' یعنی میری ان فتنہ سامانیوں سے تیرے بندوں میں سے اگر کچھ خوش قسمت بچ رہیں گے تو وہی بچ رہیں گے جن کو تو نے اپنی توحید اور یاد آخرت پر قائم رہنے کے لیے خاص کر لیا ہو، باقی سب میرے فتراک ضلالت کے نخچیر ہو کے رہیں گے۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ (۴۱)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ توحید کا راستہ، جس سے بنی آدم کو گمراہ کرنے کی تو دھمکی دے رہا ہے، کوئی پیچ پیچ والا راستہ نہیں ہے بلکہ یہ مجھ تک پہنچا دینے والی نہایت سیدھی

اور ہموار راہ ہے۔ میرے جو بندے مجھ تک پہنچنا چاہیں گے اگر وہ اس راہ کو اختیار کریں گے تو یہ راہ خود بخود ان کو میرے آستانے پر لا ڈالے گی۔ اس میں کج روی اور گمراہی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ صرف شامت زدہ ہی ہوں گے جو اس سیدھی راہ کو چھوڑ کر کوئی کج پیچ والی راہ اختیار کریں گے۔

یہاں 'صراط' کے بعد 'علیٰ' جو آیا ہے یہ عربی زبان کے مخصوص اسلوب کے مطابق ہے۔ عربی زبان میں کسی سیدھے راستہ کی تعریف کے لیے یہ اسلوب بیان موجود ہے کہ یہ راستہ ایسا سیدھا ہے کہ راہرو کو خود منزل پر لا ڈالتا ہے۔ کلام عرب سے شواہد نقل کرنے میں غیر ضروری طوالت ہوگی اس وجہ سے ہم صرف قرآن کے بعض نظائر پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ سورۂ ہود میں ہے۔

اِنِّیْ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیْ وَرَبِّکُمْ ؕ مَا مِنْ	میں نے اللہ پر، جو میرا بھی خداوند ہے اور تمھارا بھی،
دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِھَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی	بھروسہ کیا۔ ہر جاندار کی پیشانی اس کی گرفت میں ہے۔
صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵۶ - ھود)	بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔

"بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے" یعنی اس کو پانے اور اس تک پہنچنے کے لیے مجھے بہت سی کج پیچ والی وادیاں قطع نہیں کرنی ہیں، اس کے پانے اور اس تک پہنچنے کے لیے یہ کافی ہے کہ میں توحید کی شاہراہ پر قائم و استوار اور اس کی بندگی میں سرگرم رہوں اور اس پر بھروسہ رکھوں کہ وہ ہر مشکل میں میری مدد فرمائے۔

اسی طرح سورۂ نحل آیت ۹ میں ہے۔

وَعَلَی اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْھَا جَآئِرٌ ؕ وَ	اور اللہ تک پہنچانے والی سیدھی راہ ہے اور بعض راہیں
لَوْ شَآءَ لَھَدٰىکُمْ اَجْمَعِیْنَ ۔	بالکل کج ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت پر کر دیتا۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ (۴۲)

ابلیس کی مہلت کی حد

'سُلْطٰنٌ' کے معنی اختیار و اقتدار کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس پر یہ بھی واضح فرما دیا کہ تجھے مہلت جو کچھ مل رہی ہے وہ صرف اس بات کی مل رہی ہے کہ تو لوگوں کو اپنی راہ پر چلنے کی ترغیب دے سکے اور ان کو بہکانے اور ورغلانے کی کوشش کرے۔ اس مہلت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تجھے یہ اختیار مل گیا ہے کہ تو جس کو چاہے گمراہی کے راستہ پر ڈال ہی دے۔ تیرا زور بس انہی پر چلے گا جو تیری پیروی کرنا چاہیں گے اور گمراہی کو پسند کریں گے۔ میرے ان بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا جو تیرے فتنوں سے محفوظ اور تیری تمام ترغیبات کے علی الرغم میری بتائی ہوئی سیدھی راہ پر گامزن رہیں گے۔

وَاِنَّ جَھَنَّمَ لَمَوْعِدُھُمْ اَجْمَعِیْنَ ۔ لَھَا سَبْعَۃُ اَبْوَابٍ ؕ لِکُلِّ بَابٍ مِّنْھُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ (۴۳ - ۴۴)

یہ ان لوگوں کا انجام بتایا گیا ہے جو شیطان کی پیروی کریں گے۔ فرمایا کہ ایسے سارے لوگ جو میری صراط مستقیم کو چھوڑ کر ابلیس کی راہ اختیار کریں گے، خواہ وہ جنات میں سے ہوں یا انسانوں میں سے اور خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، ان سب کا ٹھکانا جہنم ہوگی۔ ان کو جس عذاب کی آج خبر دی جا رہی ہے اس سے

وہ دوچار ہوں گے۔ لفظ 'اَجْمَعِیْن' کے زور کو سمجھنے کے لیے ابلیس کے قول 'لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْن' پر نظر رہے۔ ابلیس نے بڑے طنطنہ کے ساتھ دعویٰ کیا کہ 'میں سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا'۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو جواب بھی بھرپور ملا کہ اگر تو سب کو گمراہ کر کے چھوڑے گا تو میں بھی ان سب کو جہنم کے حوالہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔

جہنم کی راہ پر ڈالنے والے مہلکات

'لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ' یہ جہنم کی وسعت کی تعبیر ہے اور اگر غور کیجیے تو اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ وہ مہلکات جو انسان کو تباہ کرنے والے اور اس کو جہنم کی راہ پر ڈالنے والے ہیں اپنی اصل کے اعتبار سے سات ہیں۔ شیطان انہی میں سے کسی ایک میں یا بالآخر ان سب ہی میں مبتلا کر کے انسان کو جہنم کی راہ پر ڈال دیتا ہے

نظم کلام کے پہلو سے آیت کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اتنی بے شمار و بے نہایت مخلوق کو سزا دینے کے لیے ایسی وسیع جہنم کہاں سے مہیا کی جائے گی جو سب کو اپنے اندر سمیٹ لے۔ خدا نے ایسے مجرموں کو سزا دینے کے لیے بڑی وسیع جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں سات پھاٹک ہوں گے اور اس کے ہر پھاٹک سے جہنمیوں کے گروہ الگ الگ داخل ہوں گے۔

'جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ' کے الفاظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جہنم کے مختلف دروازوں سے داخل ہونے والوں کے درمیان ایک خاص نوعیت کی درجہ بندی ہوگی۔ اس درجہ بندی کی بنیاد کس چیز پر ہوگی، اس باب میں کوئی قطعی بات کہنا، جب کہ خود قرآن میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے، مشکل ہے۔ لیکن ہمارا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ قرآن نے جن چیزوں کا اصولی مہلکات کی حیثیت سے ذکر کیا ہے وہ اگر شمار کی جائیں تو وہ سات عنوانات کے تحت آتی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ شرک
۲۔ قطع رحم
۳۔ قتل
۴۔ زنا
۵۔ جھوٹی شہادت
۶۔ کمزوروں پر ظلم
۷۔ بغی

ان میں سے ہر ایک کے تحت طویل تفصیلات ہیں جن کے ذکر کا یہ محل نہیں ہے۔ ان پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۂ بنی اسرائیل میں آیات ۲۲-۳۸ کے تحت آئے گی۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۝ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ۝ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ (۴۵-۴۸)

خدا ترسوں کا انجام نیک

اہل دوزخ کا انجام بیان کرنے کے بعد اب یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور اس کے احکام پر عمل کرنے والے ہیں۔ فرمایا کہ وہ باغوں اور چشموں کے درمیان ابدی زندگی کے عیش و آرام میں ہوں گے۔ ان کے لیے خدا کی طرف سے یہ بشارت ہوگی کہ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ اب ہر قسم کے فکر و اندیشہ سے بالکل بے خوف اور بے خطر ہو کر اس میں رہو اور اپنے رب کی ابدی نعمتوں سے متمتع ہو۔ ان کے دل ایک دوسرے سے بالکل صاف ہوں گے اس وجہ سے وہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف رخ کیے ہوئے آمنے سامنے جنت کے تختوں پر فروکش ہوں گے۔ جن لوگوں کے اندر نفسانی کدورتیں ہوتی ہیں اگر وہ کسی مجلس میں مجتمع ہوتے بھی ہیں تو ایک دوسرے سے منہ پھیر کر بیٹھتے ہیں لیکن اللہ سے ڈرنے والوں میں اول تو نفسانی کدورتیں ہوتی ہی نہیں اور اگر تاویل و اجتہاد، رائے و قیاس اور رجحان و ذوق کے کسی اختلاف کے باعث ان کے اندر کوئی شکر رنجی ہوتی بھی ہے تو کشف حقیقت کے بعد وہ بھی دور ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ اس کے اثرات سے بھی ان کے دلوں کو پاک کر دے گا اور وہ باہم بالکل شیر و شکر ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جائیں گے۔

لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ بہتر سے بہتر عیش و آرام کی زندگی بھی کسی کو حاصل ہو لیکن اس میں تجدد و تنوع نہ ہو تو آدمی بجھ کے رہ جاتا ہے۔ جنت میں اہل جنت کو اس صورت حال سے سابقہ پیش نہیں آئے گا۔ اس میں ابدی عیش و آرام کی زندگی بھی ہوگی اور ہر لمحہ خدا کی نعمتوں میں ایسی گوناگونی و بوقلمونی ہوگی کہ اہل جنت کی طبیعت کبھی اس سے اچاٹ نہیں ہوگی۔

خلود کی بشارت

وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ یہ خلود کی بشارت ہے اور یہ سب سے بڑی بشارت ہے۔ بہتر سے بہتر عیش و آرام کی زندگی بھی حاصل ہو لیکن اس کے ساتھ یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ یہ عارضی یا فانی ہے تو سارا عیش کرکرا ہو کے رہ جاتا ہے۔ اہل جنت اس کھٹکے سے بالکل محفوظ ہوں گے۔ انھیں عیش و آرام کی جو زندگی حاصل ہوگی اس سے وہ کبھی محروم نہیں کیے جائیں گے۔

۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۹-۷۹

قریش کے مغروروں کو تنبیہ

آگے پہلے تو ایک مختصر تمہید ہے جس میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا کی ڈھیل سے کسی کو دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ بڑا غفور و رحیم بھی ہے اور بڑا منتقم و قہار بھی۔ پھر قریش کے ان مغروروں کو جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرشتوں کو دکھانے کا مطالبہ کر رہے تھے، متنبہ کیا گیا ہے کہ فرشتوں کا آنا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ وہ جب آتے ہیں کسی مہم پر آتے ہیں۔ اس حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں واضح کرنے کے لیے قوم لوط کی سرگزشت سنائی گئی ہے جن کی بستیوں پر سے قریش کو اپنے تجارتی سفروں میں آئے دن گزرنے کے مواقع ملتے تھے۔ اس سرگزشت کو سنانے سے مقصود قریش کو آگاہ کرنا ہے کہ اگر فرشتوں کو دیکھنے کا ارمان رکھتے ہو تو اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے بھی تیار رہو جو قوم لوط کا ہوا ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت کیجیے۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ آیات ۴۹-۷۷
الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾ وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ وقف لازم
فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا
نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓي اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ
فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾
قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ ﴿۵۶﴾ قَالَ فَمَا
خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾
اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ
اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا جَاۗءَ اٰلَ لُوْطِ ۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ ع ۴
اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ
يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ
بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا
حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَاۗءِ
مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَجَاۗءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ
اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾
قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ
كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾
فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ

اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾

ترجمۂ آیات ۴۹-۷۷ میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ بے شک میں بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہوں اور بے شک میرا عذاب بھی بڑا ہی دردناک ہے۔ اور ان کو ابراہیم کے مہمانوں سے متعلق بھی آگاہ کر دو۔ جب وہ اس کے پاس آئے تو انھوں نے سلام کہا۔ اس نے کہا ہم تو آپ لوگوں سے اندیشہ ناک ہیں۔ وہ بولے کہ آپ کوئی اندیشہ نہ کریں، ہم آپ کو ایک ذی علم فرزند کی بشارت دیتے ہیں۔ وہ بولا کہ کیا جب کہ مجھ پر بڑھاپا آچکا آپ لوگوں نے یہ بشارت دی تو یہ کس بل پر بشارت دے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم نے آپ کو ایک امر واقعی کی بشارت دی ہے تو آپ ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہوں۔ اس نے کہا کہ اپنے رب کی رحمت سے گمراہوں کے سوا اور کون ناامید ہو سکتا ہے۔ ۴۹-۵۶

اس نے پوچھا اے فرستادو! آپ لوگوں کے سامنے مہم کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ بس آل لوط اس سے مستثنیٰ ہیں، ہم ان سب کو بچا لیں گے بجز اس کی بیوی کے۔ اس کو ہم نے تاک رکھا ہے وہ بے شک پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہو گی۔ ۵۷-۶۰

تو فرستادے جب آلِ لوط کے پاس پہنچے اس نے کہا آپ لوگ تو اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم تمھارے پاس وہی چیز لے کر آئے ہیں جس کے باب میں یہ لوگ شک میں پڑے ہوتے تھے۔ اور ہم تمھارے پاس ایک شدنی لے کر آئے ہیں اور ہم بالکل ٹھیک بات کہہ رہے ہیں تو تم راتوں رات اپنے اہل و عیال کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ اور تم ان کے پیچھے پیچھے چلیو

اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کے بھی نہ دیکھے اور وہیں جاؤ جہاں کے لیے تمہیں حکم ہے اور ہم نے اپنے اس فیصلہ سے اس کو آگاہ کر دیا کہ صبح ہوتے ہی ان لوگوں کی جڑ کٹ کے رہے گی۔ ۶۱-۶۶

اور شہر والے خوش خوش آ پہنچے۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں تو تم لوگ مجھے رسوا نہ کرو، اللہ سے ڈرو اور مجھے ذلیل نہ کرو۔ وہ بولے کہ کیا ہم نے تم کو دوسروں کی آمد و شد سے روکا نہیں تھا۔ اس نے کہا اگر تم کچھ کرنے ہی پر تلے ہوئے ہو تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں۔ تیری جان کی قسم یہ لوگ اپنی سرمستی میں اندھے ہو رہے ہیں۔ تو دن نکلتے ہی ان کو ہماری ڈانٹ نے آ پکڑا اور ہم نے اس سرزمین کا اوپر کا تختہ نیچے کر دیا اور ان پر سنگِ گل کی بارش کر دی۔ بے شک اس سرگزشت میں بصیرت حاصل کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں اور یہ بستی ایک شاہراہ عام پر ہے۔ بے شک اس سرگزشت کے اندر اہلِ ایمان کے لیے بڑی نشانی ہے۔ ۶۷-۷۷

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ (۴۹-۵۰)

اللہ تعالیٰ سے متعلق صحیح تصور

یہ آیات اللہ تعالیٰ سے متعلق صحیح تصور کی وضاحت کرتی ہیں کہ اس کی ڈھیل سے کسی کو اس مغالطے میں نہیں پڑنا چاہیے کہ نیک اور بد دونوں اس کی نظر میں یکساں ہیں۔ وہ بڑا مہربان بھی ہے اور بڑا ہی منتقم اور قہار بھی۔ جو لوگ اس کی سیدھی راہ پر چلتے ہیں ان کے صبر کی آزمائش کے لیے ان کو امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے لیکن بالآخر وہی لوگ کامیاب و بامراد ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اس کی راہ سے انحراف اختیار کرتے ہیں اگرچہ کچھ عرصہ کے لیے ان کو ڈھیل ملتی ہے تاکہ ان پر حجت تمام ہو جائے لیکن بالآخر ان کو ان کے اس انحراف کی سزا مل کے رہتی ہے۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ۝ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (۵۱-۵۳)

تاریخ کی ایک شہادت

مذکورہ بالا حقیقت کی تائید میں یہ تاریخ کی ایک شہادت پیش کی گئی ہے کہ جو فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے پاس ایک ذی علم فرزند کی بشارت لے کر آئے وہی فرشتے قوم لوط کے لیے صاعقۂ عذاب لے کر آئے۔

'قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ' فرشتوں سے حضرت ابراہیمؑ کا یہ ارشاد اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ فرشتوں کا یوں علانیہ آنا کسی مہم ہی کے لیے ہو سکتا ہے اس وجہ سے ان کی اس آمد سے ان کو اندیشہ ہوا اور انھوں نے اپنے اندیشے کا ان کے سامنے اظہار بھی کر دیا۔ قریب ہی قوم لوط موجود تھی اور اس کا اخلاقی فساد اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا اس وجہ سے فرشتوں کو دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ نے یہ محسوس فرما لیا ہوگا کہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم لوط کی شامت اب آگئی ہے اور یہ فرشتے ان کی اسی شامت کا پیش خیمہ ہیں۔ فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کو اطمینان دلایا کہ آپ اپنے باب میں کسی بات کا اندیشہ نہ کریں، جہاں تک آپ کا تعلق ہے ہم آپ کے لیے تو ایک ذی علم فرزند کی بشارت لے کر آئے ہیں۔ فرزند کے لیے 'عَلِیْم' کی صفت کا حوالہ دے کر فرشتوں نے گویا ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا کہ وہ فرزند صرف فرزند ہی نہیں ہوگا بلکہ علم نبوت سے بھی سرفراز ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس چیز نے اس بشارت کی قدر و قیمت بہت بڑھا دی۔ بیٹے کے لیے بڑی سے بڑی چیز جس کی حضرت ابراہیمؑ تمنا کر سکتے تھے وہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ نبی ہو۔

قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِیْ عَلٰٓی اَنْ مَّسَّنِیَ الْکِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ (۵۴)

حضرت ابراہیمؑ کا حسن طلب

حضرت ابراہیمؑ ایک ذی علم فرزند کی بشارت سن کر جس قدر خوش ہوئے ہوں گے وہ ظاہر ہے لیکن ظاہری حالات کے اعتبار سے اس بشارت کا ظہور میں آنا چونکہ نہایت مستبعد تھا اس وجہ سے آپ نے چاہا کہ اس کی مزید تصدیق کرا لیں چنانچہ انھوں نے نہایت خوب صورت پیرایہ میں فرمایا کہ کیا یہ بشارت آپ لوگ مجھے اس وقت دے رہے ہیں جب کہ مجھ پر بڑھاپا آچکا ہے تو کس بل پر یہ بشارت دے رہے ہیں؟ مطلب یہ کہ اگر یہ بشارت من جانب اللہ ہے تو اس کی تصریح ہو جائے۔

قَالُوْا بَشَّرْنٰکَ بِالْحَقِّ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ (۵۵)

'حق' کے معنی امر واقعی اور ہو کے رہنے والی بات کے ہیں۔

فرشتوں کی اطمینان دہانی

فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کو اطمینان دلایا کہ آپ ظاہری حالات کی ناسازگاری سے بددل اور مایوس نہ ہوں، ہم نے آپ کو جو بشارت دی ہے ایک امر واقعی کی بشارت دی ہے اور حالات ظاہری خواہ کتنے ہی ناموافق و ناساعد ہوں لیکن یہ بات ہو کے رہے گی۔ فرشتوں کے اس جواب میں یہ بات مضمر ہے کہ یہ بشارت من جانب اللہ ہے اور جو بات من جانب اللہ ہے اس میں حالات کی ساعدت و ناساعدت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

قَالَ وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ (۵۶)

حضرت ابراہیمؑ کا شکر گزاری

حضرت ابراہیمؑ کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ یہ بشارت من جانب اللہ ہی ہے تو بے ساختہ ان کی زبان مبارک سے یہ کلمہ نکلا جس سے ان کا وہ جذبۂ شکر و سپاس بھی ظاہر ہو رہا ہے جو اس بشارت کے باب میں اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد ان کے اندر پیدا ہوا اور یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ فرشتوں سے جو سوال انھوں نے کیا

وہ خدا کے فضل و رحمت سے مایوسی کی بنا پر نہیں تھا بلکہ محض ظاہری اسباب کی ناسازگاری کی بنا پر تھا۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی انھوں نے ظاہر فرما دی کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی جو لوگ خدا کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں وہ ایمان سے محروم اور گمراہ ہوتے ہیں۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (۵۷)

لفظ 'خطب' کا غالب استعمال کسی اہم معاملہ اور کسی امر عظیم کے لیے ہوتا ہے۔

نزول ملائکہ کے سبب سے قوم لوط کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کا اندیشہ

حضرت ابراہیمؑ یہ بشارت سن کر اپنے معاملے میں تو مطمئن ہو گئے لیکن ان کے دل میں یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ محض ایک فرزند کی ولادت کی خوش خبری پہنچانے کے لیے تو اس طرح فرشتوں کی ایک پوری جماعت کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کا اس صورت میں آنا تو ضرور کسی اہم مقصد ہی کے لیے ہو سکتا ہے۔ پھر قریب ہی قوم لوط کا اخلاقی فساد اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا اور ان کے حالات سے حضرت ابراہیمؑ بے خبر نہیں تھے اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ ان کے دل میں یہ خیال بھی گزرا ہو کہ ہو نہ ہو یہ بجلی اسی خرمن فساد پر گرنے والی ہے۔ چنانچہ انھوں نے فرشتوں سے یہ سوال کر ہی دیا کہ فرزند کی ولادت کی خوش خبری تو میں نے سن لی، اب یہ بتائیے کہ اس وقت آپ لوگ کس مہم پر مامور کر کے بھیجے گئے ہیں۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۙ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ (۵۸ - ۶۰)

فرشتوں کا جواب

فرشتوں نے جواب دیا کہ ہم مجرموں کی ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں، اس اسلوب بیان سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

ایک تو اس سے فرشتوں کے اس غصہ و غضب کا اظہار ہو رہا ہے جو ان کو قوم لوط پر تھا۔ چنانچہ انھوں نے بجائے یہ کہنے کے کہ ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے یہ کہا کہ ہم مجرموں کی ایک قوم کی طرف بھیجے گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اندر اس قوم کے خلاف اتنی شدید نفرت تھی کہ ان کو اس کا نام لینا بھی گوارا نہیں ہوا۔

دوسری اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ کسی قوم پر اللہ کا فیصلہ کن عذاب اس وقت آیا کرتا ہے جب آوے کا آوا ہی بگڑ جاتا ہے اور اس پر اخلاقی فساد اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ ان کے اندر بھلے آدمی یا تو سرے سے رہ ہی نہیں جاتے یا کچھ افراد ہوتے بھی ہیں تو اس فاسد ماحول کے اندر ان کی زندگی اجیرن ہو کے رہ جاتی ہے۔

'اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ' لفظ 'آل' کے اندر چونکہ اتباع بھی شامل ہوتے ہیں اس وجہ سے بعید نہیں کہ کچھ لوگ حضرت لوطؑ پر ایمان بھی لائے ہوں۔ فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کے سامنے حضرت لوطؑ اور ان کے اتباع کے باب میں یہ تصریح اس لیے ضروری سمجھی کہ قوم لوط کے لیے عذاب کا فیصلہ سن کر قدرتی طور پر ان کے دل میں یہ تشویش پیدا ہوئی ہو گی کہ لوطؑ اور ان کے آل و اتباع کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا؟ فرشتوں نے ان کی یہ تشویش دور کرنے کے لیے بتا دیا کہ ہم ان سب کو اس عذاب سے بچا لیں گے۔

قانون الٰہی بے لاگ ہوتا ہے

إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَّرْنَا ۙ إِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِينَ - فرشتوں نے اس نجات سے صرف حضرت لوطؑ کی بیوی کو مستثنیٰ رکھا۔ اس کی بابت فرمایا کہ اس کو ہم نے تاک رکھا ہے کہ وہ مبتلائے عذاب ہونے والوں کے ساتھ پیچھے رہے گی اور اسی عذاب میں مبتلا ہوگی۔ اس تصریح سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خدا کا قانون بالکل بے لاگ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی زد سے پیغمبر کی بیوی بھی محفوظ نہیں رہتی۔ بلکہ لفظ قَدَّرْنَا کے صحیح مفہوم کو پیش نظر رکھیے تو اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ پیغمبروں اور نیکوں سے قرابت رکھنے کے باوجود اگر کوئی شخص خواہ مرد ہو یا عورت، بدی کی راہ اختیار کرے تو وہ خدا کے غضب کا دوسروں کے مقابل میں زیادہ سزاوار ٹھہرتا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ ۝ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُنْكَرُونَ (۶۱-۶۲)

حضرت لوطؑ اور فرشتے

حضرت ابراہیمؑ کو بشارت دے کر یہ فرشتے حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے۔ حضرت لوطؑ نے ان کو دیکھ کر محسوس کیا کہ یہ لوگ اس علاقے کے تو ہیں نہیں تو آخر یہ کون لوگ ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کس غرض سے آئے ہیں؟ بالآخر انھوں نے فرمایا کہ آپ لوگ تو اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ آپ لوگوں کو پہچان نہیں رہا ہوں، براہ کرم آپ لوگ اپنا تعارف کرائیے۔

قَالُوا بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كَانُوا فِيهِ يَمْتَرُونَ ۝ وَأَتَيْنَاكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ (۶۳-۶۴)

فرشتوں نے کہا ہم آدمی نہیں ہیں، جیسا کہ تم نے گمان کیا ہے بلکہ ہم وہ عذاب لے کر آئے ہیں جس سے تم اپنی قوم کے لوگوں کو ڈراتے رہے ہو لیکن وہ برابر شک ہی میں پڑے رہے۔ 'حق' کے معنی یہاں، جیسا کہ آیت ۸ میں گزر چکا ہے، عذاب اور شدنی کے ہیں۔ یہ ظاہر کر دینے کے بعد کہ ہم عذاب لے کر آئے ہیں یہ ظاہر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ ہم فرشتے ہیں۔ 'وَإِنَّا لَصَادِقُونَ' بطور تنبیہ و توثیق ہے کہ ہمیں بشر سمجھ کر کسی غلط فہمی میں نہ پڑنا۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ شدنی ہے تو اب جو ہدایت ہم کر رہے ہیں اس پر بلا تاخیر و تامل عمل کرو۔

فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ وَامْضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ (۶۵)

یہ وہ ہدایات ہیں جو فرشتوں نے حضرت لوطؑ کو اس موقع پر دیں۔

حضرت لوطؑ کو فرشتوں کی ہدایات

پہلی ہدایت یہ تھی کہ راتوں رات یہاں سے اپنے اہل و عیال سمیت نکل کر وہاں چلے جائیے جہاں کے لیے آپ کو حکم دیا جا رہا ہے۔ اس ہدایت کی وجہ، جیسا کہ آگے تصریح آ رہی ہے، یہ تھی کہ صبح کو اس بستی پر عذاب الٰہی آ دھمکنے والا تھا۔

دوسری ہدایت یہ تھی کہ آپ ان سب کے پیچھے پیچھے چلیے جس طرح راعی اپنے گلے کے پیچھے چلتا ہے کہ کوئی بھیڑ ریوڑ سے الگ رہ کر بھیڑیے کا شکار نہ ہو جائے۔

تیسری ہدایت یہ تھی کہ بستی سے نکلنے کے بعد تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کے بھی نہ دیکھے۔ کسی جگہ سے نکلتے ہوئے اس کی طرف مڑ مڑ کے دیکھنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کے ساتھ انس اور لگاؤ ہے۔ یہ انس اور

لگاؤ عام حالات میں تو ایک فطری چیز ہے اور ایک فطری تقاضے کو روکا یا دبایا نہیں جا سکتا لیکن جس بستی کے لیے اتمام حجت کے بعد عذاب الٰہی کا فیصلہ ہو چکا ہو اس سے نکلتے وقت اہل ایمان کو اس طرح دامن جھاڑ کے اٹھنا چاہیے کہ اس کے ساتھ دل کے لگاؤ کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ رہ جائے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ جب کبھی آپ کو معذب قوموں کی بستیوں پر سے گزرنے کا اتفاق پیش آتا تو آپ وہاں سے تیزی سے گزر جاتے اور دوسروں کو بھی اسی کی ہدایت فرماتے۔

وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ (۶۶)

'قَضَيْنَا' کے بعد 'الٰی' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں 'اَبْلَغْنَا' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس بات کا فیصلہ کر کے اس کو آگاہ کر دیا کہ صبح ہوتے ہی ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جائے گی۔

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۶۷)

'مَدِيْنَة' سے مراد یہاں قوم لوط کی بستی سدوم ہے۔ سدوم کے گنڈوں اور بدمعاشوں کو جب پتہ چلا کہ حضرت لوط کے پاس کچھ خوب رو مہمان آئے ہوئے ہیں تو وہ خوش خوش ان کے گھر پہنچے کہ آج خوب شکار ہاتھ آیا ہے، آج جی بھر کے اپنے ارمان نکالیں گے۔

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِىْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ (۶۸-۶۹)

حضرت لوط کے گھر پر گنڈوں کا حملہ

حضرت لوط نے جب دیکھا کہ گنڈوں نے ان کے گھر پر ہلا بول دیا ہے، ان کی اور ان کے مہمانوں کی عزت و آبرو خطرے میں ہے تو نہایت مؤثر انداز میں ان کو اپنی عزت و آبرو کا بھی واسطہ دیا اور خوف خدا کا بھی حوالہ دیا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں، ان کی عزت و آبرو کی حفاظت مجھ پر اخلاقاً فرض ہے، اگر ان پر تم نے کوئی دست درازی کی تو میں ان کی نگاہوں میں بالکل ذلیل ہو کر رہ جاؤں گا، یہ کہیں گے کہ اچھے کے گھر مہمان اترے کہ اس نے ہمیں گنڈوں اور بدمعاشوں کے حوالہ کر دیا۔ پھر ان کو خوف خدا بھی یاد دلایا کہ اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کی بے عزتی کر کے مجھے رسوا نہ کرو کہ میں کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہ جاؤں ـــــ یہ اپیل، اگر مخاطبوں کے اندر اخلاقی حس کی کوئی رمق باقی ہوتی، نہایت مؤثر ہوتی اس لیے کہ مہمانوں کی عزت بڑے سے بڑے لوگوں کے اندر بھی ایک اعلیٰ صفت سمجھی گئی ہے لیکن جن کی اخلاقی حس بالکل مردہ ہو چکی ہو ان پر اس کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔

قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (۷۰)

بدمعاشوں کی بہانہ سازی

بدمعاش سے بدمعاش لوگ بھی اپنی بدمعاشی کے لیے کوئی نہ کوئی عذر تلاش کر ہی لیتے ہیں۔ چنانچہ ان گنڈوں نے بھی اپنے اس اقدام کے لیے یہ سیاسی جواز پیدا کیا کہ تم باہر کے لوگوں سے ساز باز رکھتے ہو۔ باہر کے لوگ تمھارے پاس آتے ہیں اور تم ان سے ملتے جلتے ہو۔ تمھاری یہ سازش کسی نہ کسی دن ہمارے لیے خطرہ بن سکتی ہے اس وجہ سے ہم یہ دھوکا کھانے کے لیے تیار نہیں کہ تم مہمانوں کے پردے میں ہمارے لیے ایک دن کوئی مصیبت

لا کھڑی کرو۔

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِیْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ (۷۱)

قوم کی اخلاقی حس بیدار کرنے کی آخری تدبیر

ان بدمعاشوں کی اخلاقی حس کو بیدار کرنے کے لیے یہ حضرت لوطؑ کا آخری حربہ تھا جو انھوں نے استعمال کیا۔ انھوں نے جب دیکھا کہ یہ پاجی لوگ کسی طرح اپنی خباثت سے باز آنے والے نہیں ہیں تو فرمایا کہ یہ میری بیٹیاں ہیں جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو ان کے ساتھ کرو لیکن خدارا میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رسوا نہ کرو۔ سورۂ ہود آیت ۷۸ کے تحت ہم یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ یہ حضرت لوطؑ کی طرف سے کوئی پیشکش نہیں تھی بلکہ یہ اپنی قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے ان کی آخری تدبیر تھی۔ اگر ان لوگوں کے اندر اخلاقی حس کی کوئی رمق بھی ہوتی تو وہ سوچ سکتے تھے کہ ایک یہ شخص ہے جو اپنے مہمانوں کی عزت بچانے کے لیے اپنی عزت تک خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہے اور ایک ہم ہیں کہ اس کی اور اس کے مہمانوں کی عزت کے درپے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح کی بات ہے جس طرح ایک اعلیٰ کردار کا آدمی دوسرے کی جان یا آبرو بچانے کے لیے اپنی جان اور اپنے وقار کو خطرے میں ڈال دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (۷۲)

اتمام حجت اور عذاب

جب معاملہ اس حد کو پہنچ گیا کہ حضرت لوطؑ کا یہ آخری حربہ بھی ان بدمستوں پر کارگر نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نہایت پیار کے انداز میں تسلی دی کہ تمھاری جان کی قسم یہ لوگ اپنی بدمستی میں اندھے ہو رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ اب یہ راہ پر آنے والے لوگ نہیں ہیں تو تم ان کے پیچھے ہلکان نہ ہو۔ اب خدا کا عذاب ہی ان کا فیصلہ کرے گا۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُشْرِقِیْنَ (۷۳)

'صَیْحَةٌ' کے معنی ڈانٹ کے ہیں اور یہاں اس سے مراد وہ عذاب الٰہی ہے جو دن نکلتے ہی ان پر آدھمکا۔ چونکہ یہ عذاب، جیسا کہ آگے تفصیل آرہی ہے، باد تند کے ساتھ رعد و برق کی صورت میں آیا تھا اس وجہ سے اس کے لیے 'صَیْحَةٌ' کا لفظ نہایت موزوں ہے۔

فَجَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ (۷۴)

عذاب کی نوعیت

یہ اس عذاب کی طرف اجمالی اشارہ ہے جو قوم لوط پر آیا۔ اس عذاب کی نوعیت پر ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی تفسیر سورۂ ذاریات میں مفصل بحث فرمائی ہے۔ ہم اس کا ضروری حصہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ مولاناؒ کی تفسیر عربی میں ہے ہم اس کا اردو ترجمہ دے رہے ہیں۔

"قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو سخت ہو کر بالآخر حاصب (کنکر پتھر برسانے والی تند ہوا) بن گئی اس سے اول تو ان کے اوپر کنکروں اور پتھروں کی بارش ہوئی پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے

۱؎ قرآنی قسموں پر استاذ امام مولانا فراہیؒ کا رسالہ اقسام القرآن ملاحظہ فرمائیے۔

ان کے مکانات بھی الٹ گئے، چنانچہ انہیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا (ان میں سے بعض قوموں پر ہم نے کنکر پتھر برسانے والی آندھی بھیجی) نیز فرمایا۔ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ۔ پس ہم نے ان کی بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر تہ بہ تہ سنگ گل کے پتھروں کی بارش کی، یعنی ایسی تند ہوا چلی کہ ان کے مکانات اور ان کی چھتیں سب زمین کے برابر ہو گئیں اور اوپر سے کنکریوں اور ریت نے ان کو ڈھانک لیا جیسا کہ فرمایا وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى (اور الٹی ہوئی بستیاں جن کو الٹ دیا اور پھر ان کو ڈھانک دیا جس چیز نے ڈھانک دیا)"

تفسیر سورۂ ذاریات فراہیؒ

سجیل کی تحقیق

لفظ سجیل کی تحقیق مولانا فراہیؒ نے سورۂ فیل کی تفسیر میں یہ بیان فرمائی ہے۔

"سجیل دو فارسی لفظوں، سنگ (پتھر) اور گل (مٹی) سے معرب ہے۔ قرآن مجید نے دو طریقوں سے اس کی شرح کی ہے۔ ایک جگہ ہے وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ یعنی سجیل کے قسم کا کنکر۔ دوسری جگہ ہے حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ۔ یہ لفظ چونکہ عربی زبان میں شامل ہو چکا تھا اس وجہ سے قرآن نے اس کو استعمال کیا۔"

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ۔ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۷۵-۷۷)

'توسّم' کے معنی بھانپنے، تاڑنے اور کسی عبرت انگیز چیز سے درس عبرت حاصل کرنے کے ہیں۔

'سبیل مقیم' چلتا راستہ، عام گزرگاہ۔

قریش کے لیے درس عبرت

قوم لوط کی سرگزشت سنانے کے بعد اب یہ پہلے کفار قریش کو توجہ دلائی کہ اگر وہ آنکھیں رکھتے ہیں تو ان منذَر بستیوں سے درس عبرت حاصل کریں جو ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں بلکہ وہ ایسے چلتے راستہ پر واقع ہیں جن سے آئے دن ان کو گزرنا پڑتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ سدوم اور عمورہ کی بستیاں حجاز اور شام کے تجارتی راستہ پر واقع تھیں اور یہ راستہ دونوں ملکوں کے تجارتی قافلوں کی عام گزرگاہ تھا۔

پھر خاص طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو توجہ دلائی کہ اس سرگزشت میں ان کے لیے بھی بہت بڑی نشانی ہے کہ اہل حق کو اگرچہ امتحانات پیش آتے ہیں لیکن بالآخر وہی خدا کی رحمت کے سزاوار ٹھہرتے ہیں اور ان کے دشمن پامال ہو کے رہتے ہیں۔

۸- آگے کا مضمون ___ آیات ۷۸-۹۹

آگے رسولوں کی تکذیب کرنے والی بعض دوسری قوموں کا اجمالی تذکرہ اور ان کی اس تکذیب کے انجام کا بیان ہے پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم اپنی دعوت حق پر جمے رہو۔ اگر تمہاری قوم کے لوگوں نے بھی اپنی پیش رو قوموں ہی کی تقلید کی تو ان کا بھی وہی انجام ہونا ہے جو ان کا ہوا اور تم ان کے رویہ سے

بددل نہ ہو بلکہ خوبصورتی سے درگزر کرو۔ انجام کار کی کامیابی تمھارا اور تمھارے ساتھیوں ہی کا حصہ ہے ——
آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۷۸-۹۹ وَإِنْ كَانَ أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ لَظٰلِمِينَ ﴿٧٨﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَإِنَّهُمَا
لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ ﴿٧٩﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٨٠﴾
وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٨١﴾ وَكَانُوا يَنْحِتُونَ
مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا اٰمِنِينَ ﴿٨٢﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ﴿٨٣﴾
فَمَا أَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨٤﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ
الْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ
الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ﴿٨٥﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيمُ ﴿٨٦﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ
سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيمَ ﴿٨٧﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا
مَتَّعْنَا بِهٖ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ
لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٨٨﴾ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿٨٩﴾ كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى
الْمُقْتَسِمِينَ ﴿٩٠﴾ الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِينَ ﴿٩١﴾ فَوَرَبِّكَ
لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩٢﴾ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٩٣﴾ فَاصْدَعْ بِمَا الربع
تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ﴿٩٤﴾ إِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِينَ ﴿٩٥﴾
الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَقَدْ
نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ﴿٩٧﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ
رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِينَ ﴿٩٨﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ
الْيَقِينُ ﴿٩٩﴾

ترجمۂ آیات ۷۸ - ۹۹

اور بے شک بن والے بھی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے تو ہم نے ان سے بھی انتقام لیا اور یہ دونوں ہی کھلی شاہراہ پر واقع ہیں۔ اور حجر والوں نے بھی رسولوں کی تکذیب کی اور ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں تو وہ ان سے روگرداں ہی رہے اور وہ پہاڑوں کو تراش کر چین سے گھر بناتے تھے تو ان کو صبح تڑکے ہماری ڈانٹ نے آ پکڑا تو جو کچھ وہ کرتے رہے تھے ان کے کچھ کام نہ آیا۔ ۷۸-۸۴

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے غایت کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے اور بلاشبہ قیامت شدنی ہے تو ان سے خوبصورتی کے ساتھ درگزر کرو تمھارا رب بڑا ہی پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔ اور ہم نے تم کو سات مثانی اور قرآن عظیم عطا کیے۔ ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو جن چیزوں سے بہرہ مند کر رکھا ہے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور نہ ان کی حالت پر غم کرو اور اپنی شفقت کے بازو اہل ایمان پر جھکائے رکھو اور کہہ دو کہ میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ اسی طرح ہم نے ان تقسیم کر لینے والوں پر بھی اتارا تھا جنھوں نے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیے تو تیرے رب کی قسم ہم ان سب سے ان کے ان اعمال کی بازپرس کریں گے جو یہ کرتے رہے ہیں۔ تو جو کچھ تمھیں حکم ملا ہے اس کو آشکارا طور پر سنا دو اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ ہم ان مذاق اڑانے والوں سے، جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود شریک کرتے ہیں، تمھاری طرف سے نمٹنے کے لیے کافی ہیں سو وہ عنقریب جان لیں گے۔ اور ہم کو معلوم ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس سے تمھارا دل تنگ ہوتا ہے تو تم اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور سجدہ کرنے والوں میں سے بنو اور اپنے رب کی عبادت میں لگے رہو یہاں تک کہ امر یقینی تم پر آشکارا ہو جائے۔ ۸۵-۹۹

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِنْ كَانَ أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ لَظٰلِمِينَ (۷۸)

أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ سے مراد

'أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ' سے مراد اصحاب مدین ہیں جن کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ 'ایکہ' کے معنی جھاڑی اور بن کے ہیں۔ مدین کے پاس ایک بہت بڑا بن بھی تھا اس وجہ سے یہ لوگ اس نام سے بھی معروف تھے۔ اس سورہ میں چونکہ قریش کو عذاب الٰہی کے ان زمینی نشانات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جن پر سے ان کو اپنے تجارتی سفروں میں بار بار گزرنے کے مواقع ملتے تھے اس وجہ سے معذب قوموں کا ذکر مقامات اور ارضی نشانات کی نسبت کے ساتھ ہی آیا ہے۔

'ظٰلِمِينَ' سے یہاں ان کے شرک و کفر اور صراط مستقیم سے انحراف کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ جو لوگ اس ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں وہ خدا کے سب سے بڑے حق (توحید) سے بھی انکار کرتے ہیں اور خود اپنی جانوں پر بھی ظلم ڈھاتے ہیں اور بالآخر اس انجام سے دوچار ہوتے ہیں جو اس ظلم کی پاداش میں قدرت کی طرف سے ان کے لیے ظاہر ہوتا ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ (۷۹)

'انتقام' سے مراد یہاں وہ پاداش عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کے بعد ان کے لیے ظاہر ہوئی۔ 'وَإِنَّهُمَا' میں مثنی کی ضمیر سے اصحاب الایکہ کے ساتھ قوم لوط کی بستی کی طرف بھی اشارہ کر دیا جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ ان دونوں ہی بستیوں کے آثار و نشانات ڈھکے چھپے نہیں ہیں بلکہ ایک کھلی شاہراہ پر واقع ہیں جس سے اہل عرب کے قافلوں کو آئے دن گزرنے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ 'إِمَامٍ مُّبِينٍ' کا مفہوم بالکل وہی ہے جو اوپر 'سَبِيلٍ مُّقِيمٍ' کا بیان ہو چکا ہے۔ کھلی شاہراہ، عام گزرگاہ، چلتا راستہ۔ راستہ چونکہ رہنما ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے 'امام' کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ (۸۰)

أَصْحٰبُ الْحِجْرِ سے مراد

'حجر' شمالی عرب اور شام کے درمیانی علاقہ کو کہتے ہیں۔ یہ علاقہ قوم ثمود کا مسکن تھا جن کے اندر حضرت صالح علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ اوپر ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں قریش کو معذب اقوام کے ان آثار و نشانات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جن پر سے ان کو بار بار گزرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ اسی وجہ سے قوم ثمود کا ذکر بھی ان کے مسکن کی نسبت کے ساتھ ہوا۔ سرزمین لوط، سرزمین شعیبؑ اور علاقہ حجر یہ تینوں خطے باہم متصل ہیں اور عرب قافلوں کی یہ عام گزرگاہ تھے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ قوم ثمود نے تکذیب تو صرف حضرت صالح علیہ السلام کی کی تھی تو لفظ 'مُرْسَلِينَ' جمع کیوں استعمال ہوا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے ان کے جرم کی شدت اور

سنگینی ظاہر ہوتی ہے۔ خدا نے جتنے رسول بھیجے سب کی دعوت ایک اور سب کا پیغام واحد رہا ہے، اس وجہ سے جس نے ان رسولوں میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب کر دی اس نے گویا سب کی تکذیب کر دی۔

وَاٰتَیۡنٰہُمۡ اٰیٰتِنَا فَکَانُوۡا عَنۡہَا مُعۡرِضِیۡنَ (۸۱)

'آیات سے مراد' 'آیات' سے مراد عقلی و فطری دلائل بھی ہیں اور حسی معجزات بھی۔ حسی معجزات میں سے ناقۂ ثمود کا ذکر تو خود قرآن میں آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی ان کو معجزے دکھائے گئے ہوں لیکن قرآن نے ان کی تفصیل بیان کرنے کے بجائے صرف ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے، اس لیے کہ یہاں مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ سارے دلائل و معجزات ان پر بے اثر ہی رہے۔

وَکَانُوۡا یَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا اٰمِنِیۡنَ (۸۲)

قوم ثمود کی تعمیری سرگرمیاں یعنی پیغمبر کے انذار سے کان بند کیے ہوئے بے خوف اور بے فکر ہو کر اپنی تعمیری سرگرمیوں میں منہمک رہے۔ ان کو سنگ تراشی کے فن میں کمال حاصل تھا۔ پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر نہایت مستحکم اور شاندار مکانات بناتے تھے اور اپنے اس فن پر ان کو بڑا ناز اور فخر تھا۔ بھلا ان لوگوں کے دل پر پیغمبر کے اس ڈراوے کا کیا اثر پڑ سکتا تھا کہ یہی مستحکم اور شاندار مکانات اگر عذاب الٰہی آ گیا تو ان کے لیے قبروں کی صورت میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔

فَاَخَذَتۡہُمُ الصَّیۡحَۃُ مُصۡبِحِیۡنَ ﴿ۙ﴾ فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ (۸۳-۸۴)

قوم ثمود کے عذاب کی نوعیت یعنی بالآخر وہی ہوا جس سے پیغمبر نے ان کو ڈرایا تھا یعنی ایک دن عذاب الٰہی ان پر آ دھمکا اور اس نے اس طرح ان کی بستی کو تہ و بالا کر دیا کہ ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا، ان کی صناعی اور کاریگری اور ان کے سارے اسباب و وسائل میں سے کوئی چیز بھی ان کے کام نہ آ سکی۔ ان پر نازل ہونے والے عذاب کو یہاں 'صَیۡحَۃ' سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی ڈانٹ اور چیخ کے ہیں۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم اوپر بھی اشارہ کر آئے ہیں، یہ ہے کہ ثمود پر اللہ تعالیٰ نے دھاریوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ان کے لیے ہولناک کڑک اور بہرا کر دینے والی چیخ بھی تھی۔

وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِیۡلَ (۸۵)

خاتمۂ سورہ اور پیغمبر کو تسلی اب یہاں سے براہ راست پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب التفات ہے اور اس کی حیثیت خاتمۂ سورہ کی ہے جس نے سورہ کے تمام مطالب اپنے اندر سمیٹ لیے ہیں۔ آپ کو مخاطب کر کے صبر و استقامت اور مخالفوں کی مخالفت سے خوب صورتی کے ساتھ درگزر کرنے کی تلقین فرمائی جا رہی ہے۔ تمہید کلام یوں ہے کہ ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو جو پیدا کیا تو یوں ہی بے مقصد، عبث اور بے غایت نہیں پیدا کیا ہے بلکہ غایت و مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے کہ لوگ اس میں جو چاہیں کرتے پھریں اور ان سے کوئی بازپرس نہ ہو۔ اس کے باغایت اور بامقصد ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے

کہ ایک ایسا دن آئے جس میں لوگوں سے باز پرس ہو، جنھوں نے اس میں نیک کام کیے ہوں وہ اپنی نیکیوں کا صلہ پائیں اور جنھوں نے اس کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ کر اس میں صرف اپنے ہوائے نفس کی پیروی کی ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔ چنانچہ قیامت شدنی ہے وہ آکے رہے گی اور اس دن یہ لوگ جو تمھاری مخالفت میں آج ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں اپنا انجام دیکھ لیں گے تو ان کی مخالفتوں اور شرارتوں سے خوبصورتی کے ساتھ درگزر کرو۔ خوبصورتی کے ساتھ درگزر کا مطلب یہ ہے کہ نہ ان کی شرارتوں سے بددل اور مایوس ہو، نہ ان کی بیہودہ باتوں کا جواب دو اور نہ اپنے فرض دعوت و تبلیغ سے دست کش ہو بلکہ اپنے کام میں لگے رہو اور ان کے معاملے کو اللہ پر چھوڑ دو۔ اگر یہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو یہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی ان کی پیشرو قومیں ہو چکی ہیں۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ (۸۶)

یہ دلیل ہے اس بات کی جو اوپر والی آیت میں ارشاد ہوئی ہے کہ قیامت آکے رہے گی۔ فرمایا کہ تمھارا خداوند خلاق بھی ہے اور علیم بھی۔ جس نے یہ ساری دنیا پیدا کی ہے اور برابر پیدا کر رہا ہے اس کے لیے لوگوں کو ان کے مرنے کے بعد از سر نو پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اور وہ علیم بھی ہے، ہر ایک کے ایک ایک قول و فعل سے اچھی طرح باخبر، تو اس کے لیے لوگوں کے اقوال و اعمال کا مواخذہ و محاسبہ بھی کچھ دشوار نہیں۔ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ جو خالق ہے لازم ہے کہ وہ اپنی خلق سے پوری طرح باخبر بھی ہو اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ یعنی کیا وہ جس نے سب کو پیدا کیا ان سے بے خبر ہو سکتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (۸۷)

پیغمبر کے لیے سرمایۂ تسکین و تسلی

صبر و استقامت اور درگزر کی تلقین کے بعد یہ اس دولت گراں مایہ اور اس نعمت عظمیٰ کا حوالہ دیا گیا ہے جو تمام مشکلات و مصائب میں پیغمبر کے لیے سرمایۂ تسکین و تسلی اور بالآخر کار اس کی کامیابی و فتحمندی کی ضامن ہے۔ فرمایا کہ ہم نے تمھیں سات مثانی اور قرآن عظیم عطا کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس روحانی و ملکوتی لشکر کے رکھتے ہوئے تم اپنے دشمنوں اور مخالفوں کے مقابلے کے لیے اب کسی اور چیز کے محتاج نہیں رہے جس خدا نے اس قرآن عظیم کی ذمہ داری تم پر ڈالی ہے اس کی طرف سے یہ عہد ہے کہ وہ تم کو ضرور فتحمند کرے گا۔ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ۔

'سبع مثانی' سے کیا مراد ہے؟

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'سبع مثانی' سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کے جواب میں سلف سے مختلف اقوال منقول ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے قرآن کی ابتدائی سات بڑی سورتیں مراد ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد سورۂ فاتحہ ہے جس کے اندر بسم اللہ سمیت سات آیتیں ہیں اور یہ نمازوں میں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے پورا قرآن مراد ہے۔

اقوال تو بعض اور بھی ہیں لیکن قابل ذکر یہی تین قول ہیں اور ان میں سے بھی زیادہ شہرت دوسرے قول کو حاصل ہوئی۔ پہلے قول کی تائید میں اس کے قائلوں کی طرف سے کوئی دلیل میری نظر سے نہیں گزری۔ دوسرے قول کی تائید میں اس کے قائلوں کی طرف سے واحد دلیل جو دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ سورہ نمازوں میں بار بار دہرائی جاتی ہے۔ اگرچہ اس امر واقعی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سورہ نمازوں میں بار بار دہرائی جاتی ہے لیکن دو باتوں کے سبب سے اس قول پر دل نہیں جمتا۔

اول یہ کہ سورہ فاتحہ کی آیتیں سات اسی صورت میں بنتی ہیں جب بسم اللہ کو بھی اس کا ایک جزو تسلیم کیا جائے۔ بسم اللہ کا جزو فاتحہ ہونا ایک امر نزاعی ہے اور قوی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ بسم اللہ اس سورہ کے آغاز میں بھی اسی طرح ہے جس طرح دوسری سورتوں کے آغاز میں ہے۔ اس کے فاتحہ کے ایک جزو ہونے کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

دوسری یہ کہ بار بار دہرائے جانے کی دلیل اسی صورت میں دلیل بنتی ہے جب 'مثانی' کے معنی بار بار دہرائی جانے والی چیز کے ہوں۔ ظاہر ہے کہ 'مثانی' 'مثنیٰ' کی جمع ہے۔ 'مثنیٰ' بار بار دہرائی جانے والی چیز کو نہیں کہتے بلکہ اس چیز کو کہتے ہیں جو دو دو کر کے ہو۔ قرآن میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس کے معنی یہی ہیں۔ مثلاً

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (نساء - ۳)	تو نکاح کرو اپنی پسندیدہ عورتوں میں سے دو دو، تین تین اور چار چار کر کے۔
أَنْ تَقُومُوا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا (سبا - ۴۶)	یہ کہ اٹھو اللہ کے لیے دو دو کر کے اور ایک ایک کر کے پھر غور کرو۔

تیسرے قول کو اگرچہ کچھ زیادہ شہرت حاصل نہیں ہوئی لیکن دلائل کی روشنی میں یہ قول ہم کو زیادہ وزن دار معلوم ہوتا ہے۔

سب سے بڑی دلیل تو اس کے حق میں یہ ہے کہ قرآن میں خود یہ تصریح موجود ہے کہ پورا قرآن 'مثانی' ہے۔

اللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتٰبًا مُّتَشٰبِهًا مَّثَانِيَ (زمر - ۲۳)	اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے ایک متشابہ مثانی کتاب کی صورت میں۔

'مُتَشَابِہ' سے مراد ظاہر ہے کہ اس کے تمام اجزا کا باہم ہم آہنگ اور ہم رنگ ہونا ہے۔ یعنی اس میں کہیں کوئی تضاد و تناقض نہیں پایا جاتا۔

رہا یہ سوال کہ اس کے 'مثانی' ہونے کا کیا مفہوم ہے تو اس کا صحیح جواب ہمارے نزدیک وہی ہے جس کی طرف ہم اس کتاب کے مقدمہ میں اشارہ کر آئے ہیں کہ قرآن کی تمام سورتیں جوڑا جوڑا ہیں۔ ہر سورہ اپنے ساتھ

اپنا ایک شان بھی رکھتی ہے۔ ہم نے بڑی سورتوں میں سے بقرہ اور آلِ عمران کو اور چھوٹی سورتوں میں معوذتین کو اس کی مثال میں پیش کیا ہے اور اپنی اس کتاب میں سورتوں کی تفسیر کرتے ہوئے ہم اس حقیقت کو برابر واضح کرتے آرہے ہیں۔

قرآن میں سورتوں کے سات گروپ

ہم نے مقدمہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ یہ بھی واضح کیا ہے کہ قرآن میں سورتوں کی ترتیب اس طرح ہے کہ ان کے الگ الگ سات گروپ یا سات مجموعے بن گئے ہیں۔ ہر گروپ ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے۔ اس طرح قرآن گویا سات ابواب پر مشتمل ہے جن کے اندر سورتوں کی حیثیت فصلوں کی ہے۔ ان ابواب اور ان فصلوں میں مضامین مشترک بھی ہیں اور ہر باب اور ہر فصل کا ایک خاص امتیازی پہلو بھی ہے جو ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کی حیثیت پورے قرآن کے دیباچہ کی ہے جس میں اجمال کے ساتھ وہ تمام مطالب آگئے ہیں جو پورے قرآن میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

اس روشنی میں زیر بحث آیت کی تاویل ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے تمہیں سات مثانی کا مجموعہ یعنی قرآن عظیم دیا۔ گویا حرف 'من' اضافت کو ظاہر کر رہا ہے اور حرف 'و' تفسیر کے لیے ہے۔ یہ ساتوں مجموعے احقاق حق اور ابطال باطل کے ساتھ خدائی لشکر ہیں جو تمام باطل نظریات کے پرخچے اڑا دینے کے لیے کافی ہیں۔

بعض احادیث میں یہ جو آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فاتحہ کو سبع مثانی اور قرآن عظیم قرار دیا تو اس کا بھی ایک خاص محل ہے۔ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی حیثیت پورے قرآن کے دیباچہ کی ہے اور اس میں وہ تمام مطالب بالاجمال سمٹ آئے ہیں جو پورے قرآن میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ گویا اس نگینہ کے اندر قرآن عظیم کا پورا شہرستانِ معانی بند ہے۔ اس پہلو سے یہ سبع مثانی بھی ہے اور قرآن عظیم بھی۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَٱخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (۸۸)

لفظ 'ازواج' کا مفہوم

لفظ 'ازواج' طبقات کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مثلاً سورۂ واقعہ میں ہے 'وَكُنتُمْ أَزْوَٰجًا ثَلَٰثَةً' (اور اس وقت تم تین طبقات میں تقسیم ہو گے)۔

قوم کے اغنیاء کو چھوڑ کر مومنین پر شفقت کا حکم

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا نے تمہیں قرآن کی یہ نعمت عظمیٰ دے رکھی ہے جو تمہاری کامیابی و فتحمندی کی ضامن ہے تو تمہیں ان لوگوں کی طرف نگاہ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے جو اپنے مال و اسباب کے غرور میں مست ہیں اور تمہاری بات سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔

یہ حقیقت یہاں پیش نظر رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو اپنی قوم کے اغنیاء اور اربابِ ثروت و جاہ کی طرف خاص طور پر دعوت کے ابتدائی دور میں، جو توجہ ہوتی ہے تو اس کا سبب نعوذ باللہ یہ نہیں تھا کہ ان کی نگاہوں میں ان کے مال و متاع کی کوئی طمع یا وقعت تھی بلکہ اس کا سبب محض یہ تھا کہ اگر یہ زور و زر رکھنے والے

لوگ ایمان لائیں گے تو یہ اپنی دنیا اور عاقبت بھی سنواریں گے اور ان کا مال اور ان کا اثر دین کی تقویت اور ان کے زیردستوں کے لیے دین کی راہ کھولنے کا بھی ذریعہ ہوگا۔ اسی جذبۂ خیر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دعوت کے ابتدائی دور میں قریش کے اکابر و اعیان کی طرف خاص توجہ رہی لیکن جب انھوں نے آنکھیں نہیں کھولیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ آپ ان سے صرف نظر کر کے اپنی ساری توجہ اور شفقت ان لوگوں پر مبذول فرمائیں جو اگرچہ دولت دنیا نہیں رکھتے لیکن قرآن عظیم پر ایمان کی نعمت ان کو حاصل ہے۔

'ولا تحزن علیھم' سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان اغنیاء کی ایمان سے محرومی پر بڑا غم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے بھی روک دیا کہ ان لوگوں کی اس محرومی پر غم نہ کھاؤ۔ یہ شامت زدہ لوگ اسی کے سزاوار تھے کہ یہ قرآن پر ایمان کی نعمت سے محروم ہی رہیں۔

'واخفض جناحک للمؤمنین' میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ اب ان شامت زدہ لوگوں پر قہر الٰہی نازل ہونے میں دیر نہیں ہے تو جس طرح پرندہ کوئی خطرہ محسوس کرتے ہی اپنے بچوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتا ہے اسی طرح تم ان مومنین کو برابر اپنے دامن شفقت کے نیچے چھپائے رکھو۔

وقل انی انا النذیر المبین (۸۹)

یعنی تم ان مغروروں اور سرمستوں کو سنا دو کہ میں تو بس آنے والے عذاب اور خطرے سے ایک کھلا ہوا آگاہ کرنے والا ہوں سو میں نے اپنا فرض انجام دیا اور دے رہا ہوں۔ رہی یہ بات کہ تم نے میری بات سنی یا نہیں سنی تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں بلکہ خود تم پر ہے۔

کما انزلنا علی المقتسمین ۔ الذین جعلوا القرآن عضین (۹۰-۹۱)

یہود کے ہاتھوں تورات کے حصے بخرے

اس آیت کا تعلق اوپر کی آیت ۸۷ سے ہے یعنی پوری بات یوں ہے کہ ہم نے تمھیں سبع مثانی اور قرآن عظیم اسی طرح عطا کیا ہے جس طرح ان لوگوں پر اپنا کلام اتارا تھا جنھوں نے اس کے حصے بخرے کر کے اپنے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیے۔ یہ اشارہ یہود کی طرف ہے جنھوں نے حق کو چھپانے کے لیے اپنے قرآن یعنی تورات کی ترتیب بھی بدل ڈالی اور اس کو مختلف اجزا میں تقسیم کر کے اس کے بعض کو چھپاتے اور بعض کو ظاہر کرتے تھے۔ سورہ انعام آیت ۹۱ میں ان کی اس شرارت کا ذکر گزر چکا ہے۔ دوسرے آسمانی صحیفوں کے لیے لفظ قرآن کے استعمال کی نظیر خود قرآن میں موجود ہے ملاحظہ ہو سورۂ رعد کی آیت ۳۱۔

اس آیت میں ضمناً یہود کے اس اعتراض کا جواب بھی آگیا کہ تورات کے بعد اب کسی نئے قرآن کی ضرورت کیا باقی رہی؟ جواب یہ ہے کہ اول تو وہ قرآن اپنی اصلی صورت میں باقی کہاں رہا جس پر ان کو ناز ہے، اس کے تو انھوں نے حصے بخرے کر ڈالے اور اگر وہ اپنی صحیح صورت میں باقی ہوتا تو خود اسی سے اس نئے قرآن کی ضرورت کا ثبوت بھی مل جاتا۔

'عضون' کا مفہوم

'عضون'، 'عضۃ' کی جمع ہے جس کے معنی فرقے، ٹکڑے اور اجزاء کے ہیں۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۔ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹۲-۹۳)

یہ دونوں آیتیں یہود ہی سے متعلق ہیں۔ نہایت زوردار الفاظ میں قسم کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ جنھوں نے کتمانِ حق اور اپنے اغراض و اہوا کے لیے کتابِ الٰہی کے ساتھ یہ ظلم کیے ہیں ہم ان سے ان کی ان کارستانیوں کی بابت ایک دن ضرور باز پرس کریں گے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (۹۴)

اب کلام پھر اپنے اصل سلسلے سے مربوط ہو گیا ہے۔ حضورؐ کو تاکید کے ساتھ ہدایت کی جا رہی ہے کہ جو کچھ تمھیں حکم دیا جا رہا ہے بے کم و کاست اور بے خوف و خطر اس کو اس کے مخاطبوں تک پہنچا دو اور تمھارے خلاف مشرکین جو بکواس کر رہے ہیں اس کا نوٹس نہ لو۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۔ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۹۵-۹۶)

یعنی یہ مشرکین جو تمھارا مذاق اڑا رہے ہیں اور تم ان کو جو ڈراوے سناتے ہو ان پر ہنستے ہیں ان سے نمٹنے کے لیے تمھاری طرف سے ہم کافی ہیں۔ وہ عنقریب جان لیں گے کہ جو کچھ تم انھیں سنا رہے ہو اس کا ایک ایک حرف سچ ثابت ہوا۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (۹۷-۹۹)

کفار کے طنز پر صبر و استقامت کی تلقین

حصولِ صبر کی تدبیر: نماز

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے طنز و استہزاء پر صبر کی تلقین اور اس صبر کے حاصل کرنے کی تدبیر بتائی گئی ہے کہ حصولِ صبر و استقامت کے لیے اپنے رب کی تسبیح کرو، اپنے اہلِ ایمان ساتھیوں کے ساتھ نماز کا اہتمام کرو اور اپنے رب کی عبادت میں لگے رہو تا آنکہ صبحِ یقین طلوع ہو جائے یعنی ہر وہ بات واقعہ ثابت ہو کے رہے جس کی تم لوگوں کو خبر دے رہے ہو۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ اللہ لغزشوں کو معاف فرمائے اور اس کی صحیح باتوں سے پڑھنے والوں کو نفع پہنچے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

تدبرِ قرآن

١٦

النحل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس گروپ کی تمام سورتوں کے عمود پر ایک جامع بحث ہم سورۂ یونس کی تفسیر کے شروع میں کر آئے ہیں۔ رسول کی بعثت سے حق و باطل کے درمیان جو کشمکش شروع ہوتی ہے وہ لازماً رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کی فتح اور اس کے جھٹلانے والوں کی ہزیمت پر ختم ہوتی ہے۔ یہی حقیقت ایک نئے اسلوب سے اس سورہ میں بھی واضح کی گئی ہے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو اس کی آیت ۳۰ (لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ) کو عمود کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی جو لوگ نیکی اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے اس دنیا میں بھی فیروزمندی ہے اور آخرت کا گھر تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے ہی اور کیا ہی خوب ہے تقویٰ اختیار کرنے والوں کا گھر۔ یہی بات اس سورہ کی آیات ۴۱-۴۲ میں بھی فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ حق کی راہ میں مخالفین حق کے مظالم سہہ کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت اختیار کرتے ہیں ہم ان کو دنیا میں بھی اقتدار و تمکن عطا کرتے ہیں اور آخرت کا صلہ تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے ہی۔

سابق سورہ (سورۂ حجر) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس تسلی کے مضمون پر ختم ہوئی تھی کہ آج جو لوگ تمھارے انذار اور تمھاری تنبیہ و تذکیر کا مذاق اڑا رہے ہیں اور تمھاری باتوں کو محض ہوائی باتیں خیال کر رہے ہیں تم ان کے اس استہزاء سے دل شکستہ نہ ہو، تمھاری طرف سے ان متکبروں اور مغروروں سے نپٹنے کے لیے ہم کافی ہیں۔ اس مضمون کے بعد یہ سورہ بغیر کسی تمہید کے ان متکبرین ہی کو خطاب کر کے یوں شروع ہو گئی ہے کہ (اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ)۔ یعنی عذاب کے لیے امرِالٰہی صادر ہو چکا ہے تو اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ، اور یہ لوگ اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ جن کو خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہیں وہ ان کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ اللہ اس سے پاک اور برتر ہے کہ اس کا کوئی شریک و سہیم ہو۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۹) کفارِ قریش کو تنبیہ کہ عذابِ الٰہی کو آیا ہی ہوا سمجھو۔ اس کو مذاق سمجھ کر اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ جن کو تم نے خدا کا شریک بنا رکھا ہے وہ تم کو اس سے بچا لیں گے۔ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے کہ لوگ اس میں دھاندلی مچاتے پھریں اور اس کا خالق و مالک ان سے

کوئی باز پرس نہ کرے۔ پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوئے انسان کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ خدا سے جھگڑا کرنے کہ مرنے کے بعد اس کو کون دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس دنیا میں خدا کی ربوبیت اور اس کی پروردگاری کی جو نشانیاں ہر قدم پر موجود ہیں وہ اس بات کی شاہد ہیں کہ اس کا خالق نہایت ہی مہربان و رحیم ہے۔ وہ ایک ایسا دن ضرور لائے گا جس میں تمام معاملات کا فیصلہ کرے گا اور نیکوں اور بدوں دونوں کو ان کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔ پس لوگوں کے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ وہ اس کی بتائی ہوئی اور اس تک پہنچانے والی سیدھی راہ اختیار کریں اور کج و پیچ کی راہوں میں بھٹکنے سے بچیں۔ اگر خدا چاہتا تو سب کو راہ ہدایت ہی پر کر دیتا لیکن اس معاملے میں اس نے جبر کو نہیں پسند فرمایا بلکہ یہی چاہا کہ لوگ اپنے اختیار و انتخاب سے ہدایت کی راہ اختیار کریں۔

(۱۰-۲۳) توحید کے دلائل اس کائنات کے مختلف اجزاء میں توافق کے پہلو سے۔ یعنی اس کائنات کے مختلف اجزا میں جو باہمی سازگاری ہے وہ اس حقیقت کی نہایت واضح دلیل ہے کہ ایک ہی حکیم و قدیر کا ارادہ اس پوری کائنات میں کارفرما ہے۔ اس میں کسی اور کی شرکت نہیں ہے تو جو لوگ دوسرے معبودوں پر تکیہ کیے بیٹھے اور آخرت سے بے پروا ہیں وہ اپنے اس گھمنڈ کی سزا ایک دن ضرور بھگتیں گے۔

(۲۴-۳۲) قرآن اور اس کی تعلیمات سے متعلق متکبرین کی رائے اور ان کے رویے کی طرف اشارہ اور اس حقیقت کی تصریح کہ آج جو لوگ اپنی لیڈری کے زعم میں قرآن سے لوگوں کو برگشتہ کر رہے ہیں، وہ قیامت کے دن اپنی گمراہی کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی کچھ حصہ ان کو اٹھانا پڑے گا جن کی گمراہی کا وہ ذریعہ بنیں گے۔ ان کے مقابل میں خدا ترسوں کا جو رویہ ہے اس کا حوالہ اور ان کے اچھے انجام کی طرف اشارہ۔

(۳۳-۴۰) مشرکین، قرآن کی مخالفت اور اپنے باطل نظریات کی حمایت میں جو باتیں کہتے تھے ان میں سے بعض کا حوالہ اور ان کی تردید۔

(۴۱-۴۷) جو لوگ کلمۂ حق کی خاطر مشرکین کے ہاتھوں مصائب جھیل رہے تھے ان کی ہمت افزائی اور شرک کے علم برداروں کو ان کی سرکشی پر تہدید و وعید۔

(۴۸-۶۰) توحید کے دلائل اور مشرکین کو تنبیہ کہ سب کچھ اللہ واحد ہی کے اختیار میں ہے۔ اگر اس کی پکڑ میں آ گئے تو کوئی دوسرا اس کی پکڑ سے نجات دینے والا نہیں بن سکتا اور وہ جب چاہے اور جس حال میں چاہے لوگوں کو پکڑ سکتا ہے۔

(۶۱-۶۴) مشرکین کو تنبیہ کہ خدا نے اگر تم کو مہلت دے رکھی ہے تو اس لیے دے رکھی ہے کہ اس کے ہاں ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جب وہ وقت مقرر آ جائے گا تو پھر نہ اس سے پیچھے ہٹ سکو گے نہ آگے بڑھ سکو گے۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ جو کچھ تمہیں پیش آ رہا ہے یہی کچھ تم سے پہلے

رسولوں کو بھی پیش آچکا ہے۔ تمھارا کام لوگوں کو مومن و موحد بنا دینا نہیں ہے بلکہ صرف لوگوں پر اللہ کی حجت تمام کر دینا ہے۔

(۶۵-۸۳) اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں بخش رکھی ہیں ان میں سے کچھ کو گن کر مشرکین کو ملامت کہ ان میں سے کس نعمت کو وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ جو لوگ جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں ان کو راستہ پر لا کھڑا کرنا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ تمھاری ذمہ داری صرف حق کو پہنچا دینے کی ہے۔

(۸۴-۹۰) اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں حق کی تبلیغ کے لیے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ وہ ان سے قیامت کے دن گواہی دلوا دے گا کہ انھوں نے اللہ کا پیغام ان کو پہنچا دیا۔ یہی حیثیت اس امت کے لوگوں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اسی مقصد کے لیے اللہ نے آپ پر یہ کتاب اتاری اور اس کتاب کا جو بنیادی پیغام ہے اس کا اجمالی حوالہ۔

(۹۱-۹۵) یہود سے خطاب اور ان کو ملامت کہ تم اللہ سے عہد باندھ کر محض بربنائے حسد مخالفین حق کی صف میں جا کھڑے ہوئے اور اس بڑھیا کے مانند جو اپنا کاتا ہوا خود اپنے ہی ہاتھوں ادھیڑ کر رکھ دے تم اللہ سے باندھے ہوئے عہد کے بخیے ادھیڑ رہے ہو۔ اللہ کے عہد کو متاع دنیا کے عوض نہ بیچو اور اپنی قسموں کو لوگوں کو حق سے برگشتہ کرنے کا ذریعہ نہ بناؤ۔

(۹۶-۱۰۵) جو لوگ مخالفوں کی مخالفت کے علی الرغم حق پر ثابت قدم رہیں گے ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں بہترین صلہ کا وعدہ۔ قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں کو بدظن کرنے کے لیے مخالفین جو سخن سازیاں کرتے تھے ان میں سے بعض کا جواب۔

(۱۰۶-۱۱۱) اعدائے حق کی ستم رانیوں کے ہدف بنے ہوئے مسلمانوں کو صبر و استقامت کی تلقین اور ان لوگوں کو تہدید و وعید جو مخالفین سے مرعوب ہو کر اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ حق کی خاطر ہجرت کی طرف ایک اشارہ اور اس کا اجر و ثواب۔

(۱۱۲-۱۱۷) قریش کی تنبیہ کے لیے ایک بستی کی تمثیل کہ اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو ان کا بھی وہی انجام ہو سکتا ہے جو اس بستی والوں کا ہوا۔ نیز ان کو یہ ہدایت کہ اپنے جی سے حرام و حلال نہ ٹھہراؤ۔ اللہ نے جن چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے ان کو کھاؤ، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت ان کو حرام نہ ٹھہراؤ۔

(۱۱۸-۱۲۴) اس امر کی طرف اشارہ کہ یہود پر بھی وہی چیزیں حرام ٹھہرائی گئی تھیں جو اس ملت میں حرام ہیں لیکن انھوں نے اپنی سرکشی کے سبب سے خود اپنے اوپر بعض چیزیں حرام کر لیں اور اب ان کو ملت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ابراہیم کو نہ یہودیت و نصرانیت سے کوئی علاقہ تھا، نہ وہ مشرکین میں سے تھے، ان کی ملت ان سب سے الگ تھی اور وہی ملت ہے جس کی پیروی کی ہدایت تمھیں کی گئی ہے۔ سبت کے احترام کا تعلق

بھی یہود سے تھا، ملت ابراہیم سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

(۱۲۵-۱۲۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حکمت و موعظت کے ساتھ دعوت کی ہدایت اور اس راہ میں صبر و استقامت کی تلقین، صبر و استقامت کے حصول کا ذریعہ تعلق باللہ ہے۔ مخالفین کی سازشوں سے دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ اپنے متقی اور خوب کار بندوں کا ساتھی ہے۔

سورہ کے مطالب کا اجمالی تجزیہ کرنے کے بعد اب ہم اس کی تفصیلی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

سُورَةُ النَّحْلِ (۱۶)

مَكِّيَّةٌ ______ اٰيَاتُهَا ۱۲۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۹ أَتَىٰ أَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ ۚ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ⑴
يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ أَنْ
أَنْذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ ⑵ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ
بِالْحَقِّ ۚ تَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ⑶ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا
هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ ⑷ وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا ۗ لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ
وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ⑸ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ
تَسْرَحُونَ ⑹ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا
بِشِقِّ الْأَنْفُسِ ۚ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ⑺ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَ
الْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ⑻ وَعَلَى اللّٰهِ
قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ ۚ وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ⑼ ع ۱

ترجمۂ آیات ۱-۹ امرِ الٰہی صادر ہو چکا ہے تو اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ، وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ وہ فرشتوں کو اپنے امر کی روح کے ساتھ اتارتا ہے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے کہ لوگوں کو آگاہ کر دو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو مجھی سے

ڈرو۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا، وہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک گردانتے ہیں۔ اس نے انسان کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا تو وہ ایک کھلا ہوا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور چوپائے بھی اس نے تمہارے لیے پیدا کیے جن کے اندر تمہارے لیے جڑاول بھی ہے اور دوسری منفعتیں بھی اور ان سے تم غذا بھی حاصل کرتے ہو۔ اور ان کے اندر تمہارے لیے ایک شان بھی ہے جب کہ تم ان کو شام کو گھر واپس لاتے ہو اور جس وقت کہ ان کو چرنے کو چھوڑتے ہو۔ اور وہ تمہارے بوجھ ایسی جگہوں تک پہنچاتے ہیں جہاں تم شدید مشقت کے بغیر پہنچنے والے نہیں بن سکتے تھے، بے شک تمہارا رب بڑا ہی شفیق و مہربان ہے اور اسی نے پیدا کیے گھوڑے اور خچر اور گدھے کہ تم ان پر سوار ہو اور وہ زینت بھی ہیں اور وہ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ تک سیدھی راہ پہنچاتی ہے اور بعض راہیں کج ہیں اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت پر کر دیتا۔ ۱-۹

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَتَىٰ أَمْرُ اللَّهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ ۚ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۱)

جلد بازوں سے خطاب اور ان کی وعید

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی قوم کے لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ فرماتے کہ میں جس امرِ حق کی دعوت دے رہا ہوں اگر تم نے اس کو اختیار نہ کیا تو مہلت کی مدت گزر جانے کے بعد تم پر اللہ کا عذاب آ جائے گا تو سرکش لوگوں کی طرف سے آپ کو یہ جواب ملتا کہ جس عذاب کی دھمکی سنا رہے ہو وہ لاتے کیوں نہیں، ہم تو تمہاری بات جب مانیں گے جب اس عذاب کو دیکھ لیں گے جس کے روز روز ڈراوے سنا رہے ہو۔ آگے آیت ۳۳ میں اس کی تفصیل آئے گی۔ انہی جلد بازوں کو خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ عذاب کے لیے امرِ الٰہی صادر ہو چکا ہے تو اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔

'أَتَىٰ أَمْرُ اللَّهِ' (عذاب کے لیے امرِ الٰہی صادر ہو چکا ہے) محض دھمکی نہیں ہے بلکہ ایک امرِ واقعی کا بیان ہے۔ ہم اس کتاب میں متعدد آیات کے تحت اس سنتِ الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں کہ کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت ہی کے اندر یہ بات مضمر ہوتی ہے کہ جو لوگ اس رسول پر ایمان لائیں گے وہ نجات پائیں گے اور جو لوگ

اس کی تکذیب کریں گے وہ ہلاک کر دیے جائیں گے۔ رسول، حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی اور اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے رسول کی بعثت کے بعد اس کی قوم کے لیے دو ہی راہیں باقی رہ جاتی ہیں یا تو لوگ اس پر ایمان لائیں اور نجات حاصل کریں ورنہ خدا کی پکڑ میں آئیں اور اپنی سرکشی کا انجام بد دیکھیں۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ یعنی یہ لوگ اس خبط میں مبتلا رہیں کہ جن کو یہ خدا کا شریک و شفیع بنائے بیٹھے ہیں وہ ان کو خدا کے عذاب سے بچا لیں گے، خدا ان کے مزعومہ شریکوں سے پاک اور برتر ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ جن اعلیٰ صفات سے متصف ہے ان صفات کے ساتھ ان مشرکانہ ترہات کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ وہ اپنی تمام صفات میں یکتا اور وحدہٗ لا شریک ہے۔

اس آیت میں اسلوب بیان کا یہ فرق بھی ملحوظ ہے کہ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ میں براہ راست ان کو خطاب کیا ہے (بلاغت کا ایک اسلوب)
لیکن عَمَّا يُشْرِكُوْنَ میں خطاب کے بجائے غائب کا صیغہ آگیا ہے۔ اس میں بلاغت یہ ہے کہ پہلے ٹکڑے میں تہدید و وعید ہے جس کے لیے خطاب ہی کا اسلوب زیادہ موزوں ہے اور اس دوسرے ٹکڑے میں کراہت و نفرت کا اظہار ہے جس کے لیے غائب کا صیغہ زیادہ مناسب تھا گویا بات ان سے منہ پھیر کر فرمائی گئی۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (۲)

کفار کا مطالبہ دو چیزوں کے لیے تھا۔ ایک تو اس چیز کے لیے کہ ان پر بھی اسی طرح فرشتے (کفار کے بعض)
اتریں جس طرح پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دعویٰ ہے کہ ان پر فرشتے اترتے ہیں، دوسرا اس عذاب کے لیے جس سے (مطالبات کا)
پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ڈراتے تھے۔ چنانچہ اسی سورہ میں ان کے ان دونوں مطالبات کا حوالہ ہے۔ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۳۳ (وہ نہیں منتظر ہیں مگر اس بات کے کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تمہارے رب کا حکم ہی آجائے) ان میں سے دوسرے مطالبہ کا جواب، تو اوپر والی آیت میں دے دیا گیا کہ عذاب کے لیے امر الٰہی صادر ہو چکا ہے تو اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ اب یہ ان کے پہلے مطالبہ کا جواب دیا جا رہا ہے کہ ہر شخص اس بات کا اہل نہیں ہوتا کہ اس پر فرشتے اتریں۔ اللہ اپنے فرشتے اپنے بندوں میں سے ان پر اتارتا ہے جن پر چاہتا ہے۔ یعنی جن کو وہ اس کا اہل پاتا ہے اور جن کو وہ اس مقصد کے لیے انتخاب فرماتا ہے۔ (جواب)

بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ یعنی یہ فرشتے امر الٰہی کی روح کے ساتھ اترتے ہیں۔ روح سے مراد وحی الٰہی ہے۔ وحی الٰہی کو روح سے اس لیے تعبیر فرمایا گیا ہے کہ جس طرح جسم کی زندگی روح سے ہے اسی طرح روح و دل کی زندگی وحی الٰہی سے ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ انسان روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔ (روح سے مراد وحی الٰہی ہے)

اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ یعنی ہر رسول کو اللہ کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ لوگوں (رسولوں کو اللہ کی)
کو آگاہ کر دو کہ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے تو صرف مجھی سے ڈرو اور میری ہی عبادت کرو۔ کسی اور کو میرا ساجھی (مشترکہ ہدایت)

اور شریک نہ ٹھہراؤ۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۳)

کارخانۂ کائنات کے بالحق ہونے کا لازمی تقاضا

لفظ 'حق' کی تشریح سورۂ حجر کی آیت ۸۵ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس کے معنی غایت اور مقصد کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے یہ دنیا بے غایت و بے مقصد نہیں بنائی ہے۔ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل اور بازیچۂ اطفال نہیں ہے بلکہ اس کی ایک ایک چیز کے اندر قدرت و حکمت نمایاں ہے جو شاہد ہے کہ اس کا خالق حکیم و قدیر ہے۔ ایک حکیم و قدیر خالق کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کوئی عبث، باطل اور بے مقصد کام کرے۔ اس کے بامقصد اور باغایت ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن ضرور لائے جس دن سب اس کی طرف لوٹیں اور اپنے اعمال کی جزا یا سزا پائیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ تمام کارخانہ بالکل عبث اور بے غایت ایک کھیل بن کے رہ جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ مومنون کی آیت ۱۱۵ میں یوں واضح فرمایا ہے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے)۔

'تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ' یہ اسی اوپر والے مضمون کی ایک دوسرے پہلو سے تاکید ہے۔ کفار و مشرکین اول تو قیامت کے قائل نہ تھے، پھر ان کا اصل تعلق ان کے ان فرضی معبودوں اور شرکا و شفعاء سے رہ گیا تھا جن کی وہ پوجا کرتے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ وہ ان کی طرف سے خدا سے نمٹنے کے لیے کافی ہیں۔ ظاہر ہے یہ عقیدہ اس کارخانۂ کائنات کے 'بالحق' ہونے کی صریح نفی ہے۔ اس وجہ سے یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی کہ یہ لوگ اپنے جن معبودوں سے رنگ لگائے بیٹھے ہیں ان میں سے کوئی ان کے کام آنے والا نہیں ہے۔ خدا کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے۔ وہ ان تمام شریکوں سے پاک اور منزہ ہے۔ وہ جن اعلیٰ صفات سے متصف ہے ان کے ساتھ ان شریکوں کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ (۴)

انسان سے یہاں مراد وہی کفار و مشرکین ہیں جو اوپر کی آیات میں مخاطب ہیں۔ ان سے بیزاری کے لیے بات عام صیغہ سے کر دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیدا تو ہم نے انسان کو نجس پانی کی ایک بوند سے کیا لیکن اب وہ کھلم کھلا ہمارا ایک حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اب وہ اپنے دوبارہ اٹھائے جانے کو بھی بعید از امکان سمجھتا ہے اور کہتا ہے ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ - ق (کیا جب ہم مر جائیں گے اور گل سڑ کر مٹی ہو جائیں گے تو ہم از سرِ نو اٹھائے جائیں گے، یہ واپسی تو بہت ہی مستبعد ہے) اور جن کو اپنے زعم کے مطابق اس نے ہمارا شریک بنا رکھا ہے ان کی حمایت میں بھی ہم سے لڑتا ہے۔ آگے آیت ۲۷ میں ان کے اسی لڑنے کا حوالہ ہے وَیَقُوْلُ اَیْنَ شُرَكَآءِیَ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِیْهِمْ (اور وہ فرمائے گا کہ اب میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کی حمایت میں تم لڑتے تھے)۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۵)

'دِفْءٌ' چوپایوں کے بال اور اون وغیرہ کو کہتے ہیں جن سے بنے ہوئے لباس سردیوں میں گرمی حاصل کرنے کا ذریعہ بنتے

آیاتِ الٰہی کی طرف اشارہ

اب اس آیت اور آگے کی آیات میں مخاطب گروہ کے گردوپیش کی چیزوں اور ان کے گوناگوں فوائد و منافع کا حوالہ دے کر اس کو توجہ دلائی ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز شہادت دے رہی ہے کہ اس کائنات کا خالق نہایت ہی کریم و حکیم اور نہایت ہی مہربان و رحیم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نعمتیں تو تمہیں ساری خدا سے ملی ہیں لیکن تم عبادت دوسروں کی کرتے ہو اور جس کی پروردگاری کی یہ شانیں دیکھتے ہو اس کے متعلق یہ گمان کیے بیٹھے ہو کہ اس نے بس تمہیں ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے چھوڑ رکھا ہے، نہ ان نعمتوں کے جواب میں اس کا تم پر کوئی حق قائم ہوتا ہے اور نہ تمہیں اس کے آگے کبھی کوئی جواب دہی کرنی ہے۔ نعمتوں کے ذکر میں سب سے پہلے چوپایوں کا حوالہ دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ عرب کی اصل دولت یہ چوپائے ہی تھے۔ وہ بیشتر انہی سے لباس، غذا اور دوسرے گوناگوں فوائد حاصل کرتے تھے۔

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (٦)

چوپایوں کی نعمت

'جمال' سے مراد یہاں شان و شوکت اور دولت و عظمت ہے۔ اہلِ عرب کی اصل پونجی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، چوپائے ہی تھے اس وجہ سے وہاں کسی شخص کی ثروت و عظمت کا اندازہ اس کے گلے ہی سے کیا جاتا۔ اگر اس کا گلہ بڑا ہوتا تو وہ بڑا آدمی سمجھا جاتا اور اگر چھوٹا ہوتا تو چھوٹا آدمی خیال کیا جاتا۔

'اراحۃ' کے معنی شام کو گلے کو چراگاہ سے گھر واپس لانے کے ہیں اور 'سرح' کے معنی اس کو چرنے چگنے کے لیے صبح کو چھوڑنے کے ہیں۔ یہاں 'اراحۃ' کو 'سرح' پر مقدم کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ موقع کلام اظہارِ شان کا ہے اور شان کا اظہار گلے کی شام کو واپسی میں زیادہ ہے جب کہ وہ چراگاہ سے چر چگ کے تازگی اور فربہی کی حالت میں گھر کو واپس آتا ہے۔ یہ بات اس درجہ میں اس وقت نہیں ہوتی جب وہ صبح کو چرنے کے لیے چھوڑا جاتا ہے۔

وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ ۚ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ (٧)

یہ اشارہ اونٹوں کی طرف ہے جن پر عرب میں باربرداری اور سفر کا تمام تر انحصار تھا۔ یہ جانور طویل سے طویل اور پُرمشقت سے پُرمشقت سفر کے لیے، خاص طور پر صحرائی اور گرم ملکوں میں، خدائی سفینہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس وصف میں کوئی دوسرا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

نعمت سے متمتع ہونے والوں کے لیے سبق

'اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ' یہ وہ اصل سبق ہے جو ان نعمتوں سے متمتع ہونے والے انسان کو حاصل ہونا چاہیے کہ وہ یہ مانے کہ ان کا بخشنے والا نہایت ہی مہربان اور نہایت ہی رحیم و کریم ہے اور پھر اس سے جو بات لازم آتی ہے اس کو اختیار کرے یعنی اس منعم کا حق پہچانے، اس کا شکرگزار بندہ بنے، اس کی بندگی و اطاعت میں سرگرم رہے، اس کے حقوق میں دوسروں کو شریک نہ بنائے اور اس کے مقابل میں حریف بن کر نہ اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن انسان کی یہ عجیب شامت ہے کہ وہ خدا کی نعمتیں پا کر اس کا شکرگزار بندہ بننے کی بجائے خود اپنی شان میں مبتلا ہو جاتا ہے اور خدا کا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ مزید ستم یہ کہ اگر شکرگزار بھی ہوتا ہے

تو خدا کا نہیں بلکہ خدا کے سوا دوسروں کا ہوتا ہے۔

وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۸)

اونٹ کے بعد یہ دوسرے جانوروں کی طرف اشارہ فرمایا جو سواری کے کام بھی آتے اور سرداری کے لوازم میں سے ہونے کے باعث شان و شوکت کا بھی ذریعہ تھے نیز فرمایا کہ انہی تک محدود نہیں، خدا بے شمار ایسی مخلوقات بھی پیدا کرتا رہتا ہے، جن کو تم جانتے بھی نہیں بلکہ بالواسطہ یا بلاواسطہ تم یا تمہارے سوا دوسرے لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مقصود ان چیزوں کے ذکر سے بھی وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ گزرا کہ نعمتیں بخشی ہوئی تو سب خدا کی ہیں لیکن تم ان کو پاکر خدا کو تو بھول جاتے ہو اور اپنی شان اور دوسروں کی بندگی میں لگ جاتے ہو۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَاۗىِٕرٌ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۹)

'قصد' کے معنی سیدھے اور مستقیم کے ہیں۔ 'طَرِيْقٌ قَصْدٌ' سیدھا راستہ۔ 'قَصْدُ السَّبِيْلِ' میں صفت اپنے موصوف کی طرف مضاف ہوگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بندے کو خدا تک توحید کی سیدھی راہ پہنچاتی ہے، اس میں کج پیچ اور پگ ڈنڈیاں نہیں ہیں۔ خدا نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان وسائط کو حائل نہیں کیا ہے۔ اس نے اپنے تک پہنچنے کے لیے سیدھی راہ کھولی ہے، بندہ اس کو اختیار کرلے تو یہ سیدھے خدا تک پہنچا دیتی ہے۔ اسی حقیقت کو سورہ حجر کی آیت ۴۱ میں یوں واضح فرمایا گیا ہے۔ 'هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ' (یہ سیدھی راہ (توحید) سیدھے مجھ تک پہنچاتی ہے) یہی مضمون سورہ ہود آیت ۵۶ میں یوں بیان ہوا ہے۔ 'اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ' (بے شک، میرا رب ایک سیدھے راستہ پر ہے)

'وَمِنْهَا جَاۗىِٕرٌ' یعنی خدا تک تو توحید کی سیدھی راہ پہنچاتی ہے لیکن لوگوں نے اپنی شامت سے اس سیدھی راہ سے شرک کے کج پیچ کے راستے نکال لیے ہیں جن پر پڑ کے وہ اس طرح کھو جاتے ہیں کہ پھر خدا سے وہ دور سے دور تر ہی ہوتے جاتے ہیں۔ ان کے لیے اصل شاہراہ کی طرف لوٹنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔

'وَلَوْ شَاۗءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ' یعنی اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت کے راستہ ہی پر ڈال دیتا لیکن اس معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے بلکہ لوگوں کو اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی عقل و تمیز سے کام لیں اور جس راہ کو بھی اختیار کریں اپنی ذمہ داری پر اختیار کریں۔ اگر وہ توحید کی راہ اختیار کریں گے تو منزل تک پہنچیں گے اور اگر اس سے انحراف کریں گے تو اس کا انجام خود دیکھیں گے۔ اسی سورہ میں آگے ارشاد ہوا ہے۔ 'اِنْ تَحْرِصْ عَلٰي هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ' یعنی جن پر خدا کا قانون ضلالت نافذ ہو جاتا ہے، پھر ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوا کرتی تو ایسوں کی ہدایت کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰-۲۳

توحید کا مضمون ایک دوسرے پہلو سے

آگے پھر توحید کا مضمون ایک دوسرے پہلو یعنی کائنات میں توافق کے پہلو سے واضح کیا گیا ہے پھر آخر

میں تنبیہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ دوسرے معبودوں پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں وہ یاد رکھیں کہ قیامت کے دن، جب کہ لوگوں سے ان کے اعمال کی بابت پرسش ہونی ہے، ان کے یہ فرضی دیوی دیوتا کچھ کام آنے والے نہیں ہیں۔ سب کو اللہ ہی سے سابقہ پیش آنا ہے اور وہ ہر ایک کے تمام ظاہر و باطن سے واقف ہے اور ہر ایک کے ساتھ اس کے اعمال کے مطابق ہی معاملہ کرے گا۔

آیات ١٠-٢٣

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ
فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ (١٠) يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ
وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (١١)
وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ
بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (١٢) وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي
الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (١٣)
وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا
مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا
مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (١٤) وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ
تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (١٥) وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَ
بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (١٦) اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۭ اَفَلَا
تَذَكَّرُوْنَ (١٧) وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ
لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (١٨) وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ (١٩)
وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ
يُخْلَقُوْنَ (٢٠) اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (٢١) ع ٢

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

ترجمۂ آیات ۱۰-۲۳

وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا جس میں سے تم پیتے بھی ہو اور اسی سے وہ نباتات بھی اگتی ہیں جن میں تم مواشیوں کو چراتے ہو۔ وہ اسی سے تمہارے لیے کھیتی، زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے پھل پیدا کرتا ہے۔ بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سوچیں۔ اور اس نے رات اور دن، سورج اور چاند کو تمہاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے اور تارے بھی اسی کے حکم سے نفع رسانی میں لگے ہوئے ہیں، بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں۔ اور زمین میں جو چیزیں تمہارے لیے گوناگوں قسموں کی پھیلائیں، بے شک اس میں بھی بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو یاددہانی حاصل کریں۔ ۱۰-۱۳

اور وہی ہے جس نے سمندر کو تمہاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے وہ زیور نکالو جو تم پہنتے ہو اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ اس میں چیرتی ہوئی چلتی ہیں (تاکہ تم اس میں سفر کرو) اور اس کے فضل کے طالب بنو اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔ ۱۴

اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈال دیے ہیں کہ وہ تمہیں لے کر جھک نہ پڑے اور نہریں جاری کر دی ہیں اور راستے نکال دیے ہیں تاکہ تم راہ پاؤ اور دوسری علامتیں بھی ہیں اور تاروں سے بھی وہ راہ معلوم کرتے ہیں۔ ۱۵-۱۶

تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے ان کے مانند ہے جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے؟ تو کیا تم سوچتے نہیں؟

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو تم ان کا احاطہ نہ کر سکو گے۔ بے شک اللہ بڑا ہی بخشنے والا

مہربان ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کرتے، وہ تو خود مخلوق ہیں، مردہ غیر زندہ، اور ان کو احساس بھی نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ ۱۷-۲۱

تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ پر جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ گھمنڈ میں ہیں۔ لاریب خدا جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں، وہ تکبر کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ ۲۲-۲۳

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمۡ مِّنۡهُ شَرَابٌ وَّمِنۡهُ شَجَرٌ فِيۡهِ تُسِيۡمُوۡنَ (۱۰)

'اسامۃ' کے معنی مویشیوں کو چراگاہ کی طرف لے جانے کے ہیں۔

توحید کی دلیل توافق کے پہلو سے

آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہی ایک خدا ہے جو آسمان سے پانی اتارتا ہے جس کو تم زمین پر بسنے والے پیتے بھی ہو اور اسی سے وہ جنگل جھاڑیاں اور نباتات بھی اگتی ہیں جن میں تم اپنے مال مویشی چراتے ہو۔ یہ صورت واقعہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آسمانوں کے خدا اور ہیں، زمین کے خدا اور ہیں، اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ایک ہی خدا ہے تا در و قیوم آسمانوں اور زمین سب پر حکمران ہے۔ ظاہر ہے کہ آسمانوں اور زمین کا یہ توافق اس حقیقت کی کھلی شہادت ہے کہ ایک ہی حکیم و قدیر کا ارادہ آسمانوں اور زمین سب میں کارفرما ہے اور اس کی ربوبیت و پروردگاری کا خوان کرم اتنا وسیع ہے کہ انسان تو انسان، انسان کے کام آنے والے جانور بھی اس سے متمتع ہو رہے ہیں۔

يُنۡۢبِتُ لَكُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَالزَّيۡتُوۡنَ وَالنَّخِيۡلَ وَالۡاَعۡنَابَ وَمِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ (۱۱)

آخرت کی دلیل ربوبیت کے پہلو سے

اسی پانی سے وہ کھیتی، زیتون، کھجور، انگور اور گوناگوں قسم کے پھلوں کے باغ پیدا کرتا ہے۔ فرمایا کہ اس میں بہت بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو تفکر و تدبر کریں۔ توحید کی دلیل، توافق کے پہلو سے، تو اس میں ہے ہی لیکن تفکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت بڑی نشانی آخرت کی بھی ہے اس لیے کہ گوناگوں نعمتوں اور حکمتوں سے بھری ہوئی اس دنیا پر جب ایک حساس انسان غور کرتا ہے

تو وہ بے تحاشا پکار اٹھتا ہے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا، اے رب تو نے حکمتوں اور رحمتوں سے یہ معمور عالم عبث اور بے غایت نہیں پیدا کیا ہے۔ اس کے با غایت و با مقصد ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن لائے جس میں ان لوگوں پر انعام فرمائے جنھوں نے اس میں اپنی ذمہ داریاں پہچانی اور اپنے فرائض ادا کیے ہوں اور ان لوگوں سے باز پرس کرے جنھوں نے ہوش و گوش سے عاری ایک شتر بے مہار کی زندگی گزاری ہو۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (۱۲)

'سَخَّرَ لَكُمْ' کے معنی، جیسا کہ ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں، یہ ہیں کہ ان چیزوں کو خدا نے تمھاری خدمت اور نفع رسانی میں لگا رکھا ہے۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ خدا نے تو ان چیزوں کو تمھاری خدمت میں سرگرم کیا کہ تم اس کے شکر گزار رہو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جس نے انسان کی نفع رسانی کے لیے اپنی یہ شانیں اور قدرتیں دکھائی ہیں وہ اس کو غیر مسئول اور مطلق العنان نہیں چھوڑے گا لیکن نادانوں نے یہ صحیح راہ اختیار کرنے کے بجائے، انھی سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش شروع کر دی اور ان کے پیچھے اس خدا کو بھلا بیٹھے جو ان سب چیزوں کا خالق و مالک ہے۔

وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ (۱۳)

ہر پتہ معرفت کردگار کا دفتر ہے

یعنی زمین میں جو بے شمار گوناگوں و بوقلموں انواع و اقسام کی چیزیں تمھارے فائدے کے لیے پھیلا رکھی ہیں ان کو بھی دیکھو اور ان پر غور کرو۔ ان کے اندر بھی یاد دہانی حاصل کرنے والوں کے لیے بہت بڑی نشانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا بالکل سپاٹ، چٹیل، یک رنگ بلکہ بالکل بے رنگ بھی ہو سکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا گوشہ گوشہ عجائب قدرت سے معمور ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ اس کے خالق نے یہ چاہا کہ انسان اس کے جس گوشہ پر بھی نظر ڈالے وہیں اس کو اس کے خالق کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی کوئی نہ کوئی نشانی مل جائے اور وہ مصنوع سے صانع اور اس کی صفات کا درس حاصل کر سکے۔ گویا کہ پتہ پتہ معرفت کردگار کا دفتر ہے، ہر قدم پر صحیح نشان منزل کی طرف رہنمائی کرنے والی کوئی نہ کوئی نشانی موجود ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ یاد دہانی کرنے والی چیزوں سے انسان یاد دہانی حاصل کرے، آنکھیں بند کر کے نہ چلے بلکہ ایک ایک چیز کو دیکھے اور اس سے جو سبق حاصل ہوتے ہیں ان کو محفوظ رکھے۔

انسان کی اعلیٰ صفت تفکر و تذکر

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ انسان کی جو صلاحیتیں اس دنیا میں اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہیں ان کو بالترتیب 'يَتَفَكَّرُونَ'، 'يَعْقِلُونَ' اور 'يَذَّكَّرُونَ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف نزول ہے۔ انسان کی سب سے اعلیٰ صفت تو یہ ہے کہ وہ اس کائنات میں تفکر کرے، اسی تفکر سے اس کو اس کثرت کے اندر وحدت کی طرف رہنمائی اور اس کائنات کی اصل غایت کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو کم از کم یہ تو ہو

کہ وہ اپنی عقل سے کام لے اور اس کائنات کی ایک ایک چیز جس نشانِ منزل کی طرف انگلی اٹھا اٹھا کر اشارہ کر رہی ہے اس کی اس یاد دہانی سے فائدہ اٹھائے اور اندھے بھینسے کی طرح نہ چلے۔ انہی صفات کا حوالہ آگے اسی سورہ کی آیات ۶۵، ۶۷، ۶۹ میں بالترتیب 'یَسْمَعُوْنَ'، 'یَعْقِلُوْنَ'، اور 'یَتَفَکَّرُوْنَ' کے الفاظ سے آیا ہے۔ یہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف صعود ہے یعنی ایک معقول آدمی کے اندر کم از کم جو بات ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ معقول بات کو سنے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرے اگر یہ نہ ہو تو وہ سرے سے آدمی ہی نہیں ہے بلکہ نرا دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہے۔ اور اس کا اعلیٰ وصف یہ ہے کہ وہ اس کائنات میں تفکر کرے اس لیے کہ اسی تفکر سے علم صحیح اور معرفت حقیقی کے دروازے کھلتے ہیں اور قرآن درحقیقت انسان کی اسی صلاحیت کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۴)

سمندر کی نشانیوں کی طرف اشارہ

تسخیر بحر سے مراد وہی ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے یعنی خدا نے سمندر کو تمہاری خدمت اور نفع رسانی میں لگا رکھا ہے کہ تمہیں اس سے تازہ گوشت بھی حاصل ہوتا ہے اور تم اپنی زینت کے لیے اسی سے قیمتی موتی بھی نکالتے ہو۔

'وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ' یہاں قرینہ دلیل ہے کہ 'لِتَبْتَغُوْا' سے پہلے 'لِتَرْكَبُوْهَا' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل محذوف ہے اور حرف عطف 'وَ' اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

یعنی تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ ایک گہرے اور موجزن سمندر کے اندر اس کے پانی کو چیرتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم ان پر سوار ہو اور تجارتی سفر کر کے خدا کے فضل کے طالب اور اس کے شکرگزار رہو کہ اس نے اپنی قدرت و رحمت سے تمہارے لیے سمندر کے سینے پر سے نہایت صاف سڑکیں نکال دی ہیں جن پر سے تمہارے بڑے بڑے جہاز گزرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ خدا کے اس فضل و نعمت پر لوگ اس کے شکرگزار ہوں لیکن نادانوں نے ان دریاؤں اور سمندروں ہی کو دیوی دیوتا بنا کر ان کی پوجا اور عبادت شروع کر دی۔

وَاَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۙ وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ (۱۵-۱۶)

اس میں اعلیٰ عربیت کے اسلوب کے مطابق کلام کے بعض اجزاء جو بغیر اظہار کے ظاہر تھے، وہ حذف ہیں۔ ہم نے ترجمہ میں ان کو کھول دیا ہے۔ 'اَنْهٰرًا وَّسُبُلًا' یعنی فَجَّرَ فِیْهَا اَنْهٰرًا وَمَهَّدَ فِیْهَا سُبُلًا۔ 'عَلٰمٰتٍ' یعنی جَعَلَ بِالسَّبِیْلِ عَلٰمٰتٍ۔

دریاؤں اور راستوں کی نشانیوں کا

خدا نے زمین میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے ہیں جو اس کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں نہریں جاری کر دی ہیں جن سے طرح طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں، راستے نکال دیے ہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکو

اسان راستوں کو پہچاننے کے لیے مختلف قسم کی علامتیں (LAND MARKS) نصب کردی ہیں کہ ان کا تعین کرسکو، پھر اسی پر بس نہیں، آسمان پر ستارے بھی چمک رہے ہیں جن سے صحراؤں کے سفر میں لوگ راستوں، سمتوں اور اوقات کے تعین میں رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں تو خدا کی بنائی اور بخشی ہوئی ہیں تو عبادت و اطاعت خدا کی ہونی چاہیے یا خدا کے سوا ان چیزوں کی جنھوں نے کوئی چیز بھی نہیں بنائی۔

اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ (۱۷)

مذکورہ حقائق کے لازمی نتائج — اب یہ توحید اور جزا و سزا کے ان نتائج کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جو اوپر کی بیان کردہ تمام نعمتوں سے نکلتے ہیں۔ فرمایا کہ کیا وہ جو تمام چیزیں پیدا کرتا ہے ان کی مانند ہو جائے گا جو نہ صرف یہ کہ کچھ پیدا نہیں ہوتے بلکہ، جیسا کہ آگے آرہا ہے، وہ مخلوق ہیں۔ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ، یعنی یہ عقل کی کیسی موت ہے کہ اتنی موٹی سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے! یہاں اس حقیقت پر نظر رہے کہ مشرکین عرب ان چیزوں کا، جن کی طرف اوپر توجہ دلائی گئی ہے، خالق خدا ہی کو مانتے تھے لیکن اس کے باوجود انہی مخلوقات میں سے بہت سی چیزوں کو وہ خدا کا شریک ٹھہراتے اور جو حقوق خاص خالق کے ہیں ان میں وہ ان کو حصہ دار بناتے اور اس طرح خالق کو اس کی مخلوقات کے برابر کر دیتے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۸)

توبہ اور اصلاح کی دعوت — یعنی یہ نعمتیں جو گنائی گئی ہیں یہ تو خدا کی بے شمار نعمتوں میں سے چند ہیں۔ اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو ان کا احاطہ نہیں کرسکتے لیکن اس کے باوجود تم خدا کی ناشکری اور اس کے حقوق میں دوسروں کو شریک کرتے ہو۔ اپنی اس حرکت کے سبب سے تم سزاوار تو اس بات کے تھے کہ خدا تم کو فوراً ہر نعمت سے محروم کر دیتا لیکن اس نے تم کو مہلت دے رکھی ہے اس لیے کہ وہ بڑا ہی بخشنے والا اور مہربان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر توبہ اور اصلاح کرو اور اس کے غضب کے بجائے اس کی رحمت کے سزاوار بنو۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ (۱۹)

تہدید و وعید — یہ تہدید و وعید ہے یعنی خدا نے اپنی رافت و رحمت کے سبب تمہیں ڈھیل تو دے رکھی ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ وہ تمہارے ظاہر و باطن اور پوشیدہ و علانیہ سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ایک دن آئے گا جب کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی۔ وہ رتی رتی کا حساب اور عدل کے ساتھ تمام معاملات کا فیصلہ کرے گا۔ اس میں ایک لطیف اشارہ اس حقیقت کی طرف بھی ہے کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ نعمتیں سب اللہ ہی کی بخشی ہوئی ہیں لیکن جان کر انجان بنتے ہو، تمہارے دل مانتے لیکن زبانیں انکار کرتی ہیں۔ آگے اسی سورہ کی آیت ۸۳ میں یہ حقیقت یوں بیان ہوئی ہے۔ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ (وہ خدا کی نعمت کو پہچانتے ہیں، پھر اس سے ناآشنا بنتے ہیں اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں)۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ؕ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ

وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ (۲۰-۲۱)

معبودانِ باطل کی بے حقیقتی

ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت تو تمام معبودانِ باطل سے متعلق عام ہے اور دوسری آیت خاص انکے آباء و اجداد سے متعلق ہے جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ فرمایا کہ اللہ کے سوا جن کو یہ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسوں کو حاجت روائی کے لیے پکارنا محض نادانی ہے۔ پھر ان کے ان آباؤ اجداد کی طرف جن کو انھوں نے معبود بنا رکھا تھا، اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ تو مردہ ہیں، ان کو پتہ بھی نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ مطلب یہ کہ مردوں کو پکارنے سے حاصل! اَمْوَاتٌ کے ساتھ غَیْرُ اَحْیَآءٍ کی صفت تاکید مزید کے طور پر ہے یعنی مردہ بے حس۔

اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (۲۲)

منکرین کے انکار کی اصل علت غرور ہے

یعنی یہ امر تو ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے لیکن جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل اس کو ناگوار سمجھتے ہیں اور وہ گھمنڈ میں پڑے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اصل حقیقت ان لوگوں سے مخفی نہیں ہے لیکن چونکہ آخرت پر ان لوگوں کا ایمان نہیں ہے اس وجہ سے یہ بے خوف ہیں اور یہ اس امر میں ہتک محسوس کر رہے ہیں کہ جن چیزوں کو وہ آباء و اجداد کے زمانے سے پوجتے آ رہے ہیں ان کو ایک شخص کے کہنے پر چھوڑ دیں۔ گویا سوال ایک شے کے حق یا باطل ہونے کا نہیں بلکہ اپنی آن و شان کا ہے۔ ان کے اندر یہ غرور سمایا ہوا ہے کہ ایک چیز کتنی ہی باطل سہی لیکن جب وہ اس کو برابر کرتے آئے ہیں تو اس کو چھوڑ کر خود اپنے قول و عمل سے اپنے باطل پر ہونے کا اقرار کیوں کریں۔

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ (۲۳)

متکبرین خدا کے مبغوض ہیں

یعنی یقیناً اللہ ان کے اس باطنی محرک انکار اور ان کے اس ظاہری انکار دونوں کو جانتا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں استکبار کا خناس سمایا ہوا ہے اس وجہ سے وہ ایک حق کو حق مانتے ہوئے جھٹلا رہے ہیں اور ایک باطل سے اس کو باطل جانتے ہوئے چمٹے ہوئے ہیں۔ سو اللہ ایسے مغروروں اور متکبروں کو دوست نہیں رکھتا۔ 'دوست نہیں رکھتا' یعنی ان کو مبغوض رکھتا ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۴-۳۲

آگے چند آیات میں پہلے انہی متکبرین کی، جن کا ذکر اوپر گزرا، ان سازشوں اور شرارتوں کا ذکر ہے جو وہ اپنے زیر اثر لوگوں کو قرآن کی دعوت سے روکنے کے لیے کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ان کے اس انجام کا بھی ذکر ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں ان کی ان مفسدانہ کوششوں کے نتیجہ میں ان کے اور ان کی پیروی کرنے والوں کے سامنے آنے والا ہے۔ پھر ان کے مقابل میں ان متقیوں اور خدا ترسوں کا ذکر ہے جو قرآن کی دعوت کے علمبردار تھے اور دنیا و آخرت میں جو صلہ ان کی ان مساعی کا ملنے والا ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔

آیات ۲۴-۳۲

وَإِذَا قِيلَ لَهُم مَّاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٢٤﴾
لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ
ع يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ﴿٢٥﴾ قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِن
قَبْلِهِمْ فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُم مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِن
فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
يُخْزِيهِمْ وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تُشَاقُّونَ فِيهِمْ قَالَ
الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٢٧﴾ الَّذِينَ
تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ فَأَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ
مِن سُوءٍ بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٢٨﴾ فَادْخُلُوا
أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٢٩﴾ وَقِيلَ
لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرًا لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي
هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٠﴾
جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُمْ فِيهَا مَا
يَشَاءُونَ كَذَٰلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ ﴿٣١﴾ الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ
طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٢﴾

ترجمۂ آیات ۲۴-۳۲

اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمھارے رب نے کیا چیز اتاری ہے تو کہتے ہیں اگلوں کے فسانے، تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی حصہ بٹائیں جن کو یہ بغیر کسی علم کے گمراہ کر رہے ہیں۔ جان رکھو کہ نہایت ہی برا ہوگا وہ بوجھ

جو یہ اٹھائیں گے۔ ۲۴-۲۵

ان سے پہلے والوں نے بھی چالیں چلیں تو خدا نے ان کی عمارت بنیاد سے اکھیڑ دی پس ان کے اوپر سے ان پر چھت آ پڑی اور ان پر عذاب وہاں سے آیا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ پھر قیامت کے دن اللہ ان کو رسوا کرے گا اور پوچھے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کی حمایت میں تم لڑتے تھے۔ جن کو علم عطا ہوا وہ پکار اٹھیں گے کہ آج رسوائی اور بدبختی کافروں پر ہے۔ ان پر جن کو فرشتے اس حال میں وفات دیں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہوں گے تو اس وقت وہ سپر ڈال دیں گے کہ ہم تو کوئی برائی نہیں کر رہے تھے۔ ہاں، بے شک اللہ اچھی طرح باخبر ہے اس سے جو تم کرتے رہے ہو۔ اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو اسی میں ہمیشہ رہنے والے بن کر۔ پس کیا ہی برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا۔ ۲۶-۲۹

اور جو تقویٰ والے ہیں ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا چیز اتاری ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ خوب چیز اتاری ہے۔ جن لوگوں نے بھلائی کی راہ اختیار کی ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور دار آخرت تو اس سے کہیں بہتر ہے اور کیا ہی خوب ہے اہل تقویٰ کا گھر! ابد کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے، ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان کے لیے ان میں وہ سب کچھ ہوگا جو چاہیں گے۔ اللہ اہل تقویٰ کو اسی طرح صلہ دے گا۔ ان کو جن کو فرشتے پاکیزہ حالت میں وفات دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں آپ لوگوں پر سلامتی ہو جنت میں جا براجیے اپنے اعمال کے صلے میں۔ ۳۰-۳۲

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذَا قِيلَ لَهُم مَّاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۲۴)

'اَسَاطِیْرُ' 'اُسْطُوْرَۃٌ' کی جمع ہے۔ 'اُسْطُوْرَۃٌ' بے اصل اور بے حقیقت بات کو کہتے ہیں جس کی حیثیت

محض افسانے کی ہو۔

قرآن کی دعوت کا ردعمل قریش کے لیڈروں پر

قرآن کی دعوت بالخصوص رسولوں اور ان کے جھٹلانے والوں کی تاریخ، جو اس نے نہایت ہی صحیح پہلو سے نہایت ہی موثر انداز میں پیش کی، ایسی چیز نہیں تھی جو بے اثر رہ جاتی۔ اس نے مکہ کے عوام و خواص اور بالتدریج سارے عرب میں ایک ہلچل برپا کر دی۔ عوام چونکہ سیادت و قیادت کے پندار سے پاک ہوتے ہیں اس وجہ سے صحیح چیز ان پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن وہ اپنے لیڈروں کے تابع ہوتے ہیں اس وجہ سے خود کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ان کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ یہی صورت حال قرآن کی دعوت کے باب میں عرب میں پیش آئی۔ قرآن کی دعوت اور اس کے انذار نے جب لوگوں کو ہلا دیا تو عوام اپنے لیڈروں سے جا جا کر سوال کرنے لگے کہ یہ چیز، جو خدا کے نازل کردہ کلام کی حیثیت سے، آپ لوگوں کے سامنے پیش کی جا رہی ہے کیسی ہے، اس کے بارے میں آپ لوگوں کی کیا رائے ہے، اور اس میں اس کی تکذیب کا جو انجام بتایا گیا ہے اور جس کے حق میں تاریخ کے واقعات بھی پیش کیے گئے ہیں اس کی حقیقت آپ لوگوں کی نظر میں کیا ہے؟ لیڈروں نے یہ محسوس کر کے کہ ان کے پیرو اس سے متاثر ہو رہے ہیں اور یہ چیز ان کی لیڈری کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتی ہے، ان کو مطمئن کرنے کے لیے یہ جواب دینا شروع کیا کہ اس میں اگلوں کے فسانوں اور ماضی کے قصوں کے سوا ہے کیا۔ مطلب یہ کہ عاد و ثمود اور ماضی قدیم کی قوموں کے بے اصل قصے اس میں اپنے رنگ میں دہرائے جا رہے ہیں۔ ان قصوں سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہماری روش بالکل ٹھیک ہے۔ ہم اپنے آباؤ اجداد کے صحیح دین پر ہیں۔ ان بے حقیقت افسانوں سے مرعوب ہو کر کہیں تم لوگ اس شخص کے چکمے میں نہ آ جانا جو اپنی من گھڑت باتیں خدا کے نام سے پیش کر رہا ہے۔

لِيَحْمِلُوٓا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ أَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ (۲۵)

مفسدین کی سعی افساد کا انجام

یہ ان کی اس سعی نامراد کا انجام بیان ہو رہا ہے جو وہ لوگوں کو حق سے روکنے کے لیے کر رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا انجام یہ ہونا ہے کہ قیامت کے روز یہ اپنی گمراہی کا پورا بوجھ تو اٹھائیں گے ہی اس لیے کہ اس دن ان کے وہ شرکا و شفعا ان کے کچھ کام آنے والے نہیں ہیں جن کو یہ شریک خدا بنائے بیٹھے ہیں، مزید برآں اپنی سعی افساد کے بقدر ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی اٹھانا پڑے گا جو ان کی ان مفسدانہ کوششوں سے گمراہ ہوں گے۔

'وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ' میں 'مِنْ' تبعیض کے لیے ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کوئی شخص قیامت کے دن اس بنیاد پر کہ دوسرے نے اس کو گمراہ کیا ہے اپنی ذمہ داری سے کلیۃً بری نہیں ہو جائے گا بلکہ اسے بھی اپنی گمراہی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص عقل و فہم سے بہرہ مند اور مکلف کے حکم میں داخل ہے اس کے لیے یہ عذر کافی نہیں ہے کہ دوسرے نے اس کو گمراہ کیا

اس وجہ سے وہ گمراہ ہو گیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے خود اس کو جو عقل و بصیرت عطا فرمائی تھی اس نے اس سے کیوں کام نہ لیا۔ اس وجہ سے جس طرح اس کا گمراہ کرنے والا اپنی حد تک اس کی گمراہی کا ذمہ دار ٹھہرے گا اور اس کی سزا بھگتے گا اسی طرح یہ بھی اپنی حد تک اپنی گمراہی کا ذمہ دار قرار پائے گا اور اس کا خمیازہ بھگتے گا۔

'بِغَيْرِ عِلْمٍ' کی قید سے ان کے اس جرم کی سنگینی واضح ہوتی ہے کہ ایک طرف تو رسول کی دعوت ہے جو اس علم حقیقی پر مبنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر اترا ہے، دوسری طرف یہ مفسدین ہیں جو بغیر کسی علم ہی کے لوگوں کی رہنمائی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور ان کو ضلالت کے کھڈ میں گرا رہے ہیں۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُم مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِن فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ (۲۶)

مکر کا مفہوم

'مکر' کے معنی سازش اور چال کے ہیں، چونکہ ان مفسدین کی یہ تمام سرگرمیاں محض اپنی لیڈری کے تحفظ کے لیے تھیں، وہ دیدہ و دانستہ حق کی مخالفت کر رہے تھے اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'مکر' سے تعبیر فرمایا۔

ماضی کی معذب قوموں کی طرف اشارہ

یہ اشارہ ہے ماضی کی ان قوموں کی طرف جنھوں نے اپنے رسولوں کی اسی طرح کے اغراض کے تحت مخالفت کی جس طرح کے اغراض کے تحت قریش کے لیڈر آنحضرت صلعم کی مخالفت کر رہے تھے۔ فرمایا کہ اس کی پاداش میں اللہ کے عذاب نے ان کی عمارتیں بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دیں اور ان پر اللہ کا عذاب وہاں سے آ دھمکا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ اللہ کے رسول جب ان کو اللہ کے عذاب سے ڈراتے تو وہ اپنے اطمینان بخش حالات کے سبب سے حیران ہوتے کہ بھلا ہم پر عذاب کدھر سے آ جائے گا۔ بالآخر جب وہ عذاب آ گیا تب ان کو پتہ چلا کہ اس کے آنے کا راستہ یہ تھا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ محض استعارہ نہیں بلکہ بیان واقعہ ہے۔ معذب قومیں زلزلوں اور باد تند و سیلاب کے ایسے طوفانوں سے ہلاک ہوئیں جن سے ان کے مکانوں کی دیواریں اور چھتیں سب ان کے اوپر آ پڑیں۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِيهِمْ وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تُشَاقُّونَ فِيهِمْ ۚ قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكَافِرِينَ (۲۷)

قیامت کے دن مشرکین کی رسوائی

'خزی' کے معنی رسوائی کے ہیں۔ چونکہ ان مفسدین کے تمام فساد کا اصل سبب، جیسا کہ اوپر گزرا، تکبر تھا اس وجہ سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے اس تکبر کی پاداش میں ان کو ذلیل و رسوا کرے گا۔ 'وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تُشَاقُّونَ فِيهِمْ' یہ ان کی ذلت و رسوائی کی ایک شکل بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ اب دکھاؤ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کی حمایت میں تم ہر وقت آستینیں چڑھائے رہتے تھے۔ اس کی تفصیل آگے آیت ۸۶ میں یوں آئی ہے۔ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِن دُونِكَ ۖ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ (اور جب شرک کرنے والے اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو پکاریں گے کہ اے ہمارے رب یہ ہیں ہمارے وہ شریک جن کو تیرے سوا ہم پکارتے

تھے تو وہ ان کے منہ پر بات پھینک ماریں گے کہ تم لوگ بالکل جھوٹے ہو۔ ظاہر ہے کہ یہاں کی رسوائی کی انتہا ہوگی کہ جن کی حمایت میں زندگی بھر اللہ و رسول کے مقابل میں آستینیں چڑھائے رہے وہ عین وقت پر اس طرح ان کو جھوٹا قرار دیں گے۔

قیامت کے روز اہل علم کا مسرت

قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكَافِرِينَ ۔ اوپر ان مفسدین کا ذکر گزر چکا ہے جو بغیر کسی علم ہی کے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اب یہ ان کے مقابل میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو اللہ کے بخشے ہوئے علم میں سے حصہ ملا اور انھوں نے اس علم کی روشنی میں اپنے کو بھی منور کیا اور دوسروں کی بھی اس سے رہنمائی کی۔ فرمایا کہ یہ لوگ جب شرک کے علم برداروں کی یہ رسوائی دیکھیں گے تو خوشی سے پکار اٹھیں گے کہ آج رسوائی اور عذاب کافروں کا حصہ ہے۔ یعنی دنیا میں تو یہ بہت دندناتے رہے، آج اس غرور و بدمستی کا انجام دیکھیں گے۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ ۖ فَأَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ ۚ بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ (۲۸-۲۹)

کلام کا انطباق حال پر

یہ دو آیتیں بطور تضمین ہیں۔ اس تضمین سے اہل علم کی بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ صرف مستقبل کی ایک حکایت نہیں ہے بلکہ ان لوگوں پر بھی ٹھیک ٹھیک منطبق ہو رہی ہے جو آج اپنے غرور میں مست ہیں اور اسی حال میں مرتے ہیں۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ ۔ یعنی انھیں کافروں کے حکم میں وہ سب داخل ہیں جن کی جانیں فرشتے اس حال میں نکالتے ہیں کہ وہ اپنے کفر و شرک کی وجہ سے خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہوتے ہیں۔

سَلَم کے معنی حوالگی اور سپردگی

فَأَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ ۔ 'سَلَم' 'تسلیم' سے اسم ہے جس کے معنی حوالگی اور سپردگی کے ہیں۔ فَأَلْقَوُا السَّلَمَ یعنی لوگ ڈال دیں گے، سپر انداز ہو جائیں گے، صلح کی درخواست کریں گے۔

پہلے مرحلہ ہی میں سارا نشہ ہرن

یعنی ان کا یہ سارا غرور اور گھمنڈ اور سارا طنطنہ صرف اس وقت تک ہے جب تک ان کو موت کے فرشتوں سے سابقہ پیش نہیں آتا۔ جب ان سے سابقہ پیش آجاتا ہے اور وہ ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے جیسا کہ دوسرے مقام میں ذکر ہے، ان کی جانیں نکالتے ہیں تو پہلے ہی مرحلہ میں سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے اور وہ نہایت لجاجت سے درخواست کرتے اور جھوٹی معذرت پیش کرتے ہیں کہ ہم پر رحم کیا جائے ہم کوئی برائی نہیں کرتے رہے ہیں۔ بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۔ فرشتوں کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے کہ ہاں تم برائی کرتے رہے ہو۔ بے شک اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم کرتے رہے ہو۔

متکبروں کا ابدی ٹھکانا

فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ۔ یعنی اسی وقت ان کو یہ خبر بھی دے دی جاتی ہے کہ اب جہنم کے دروازوں میں، اسی میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو، اب اس سے نکلنا

نصیب نہ ہوگا۔ یہی متکبروں کا ٹھکانا ہے اور نہایت برا ٹھکانا ہے۔ لفظ ابواب، جمع ہے جس سے جہنم کی وسعت کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے اور اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ مجرمین اپنے اپنے جرائم کی حیثیت و نوعیت کے اعتبار سے اس میں الگ الگ دروازوں سے داخل ہوں گے۔

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا خَيْرًا ۗ لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ (۳۰)

متکبرین کے بالمقابل متقین کا رویہ

اب یہ متکبرین کے مقابل میں، ان لوگوں کا رویہ بیان ہو رہا ہے جو خدا سے ڈرنے والے تھے۔ فرمایا کہ جب پوچھنے والے ان سے پوچھتے ہیں کہ خدا نے کیسی چیز اتاری ہے تو وہ اس کی نہایت تحسین کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نہایت خوب چیز اتاری ہے۔ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الآیہ یہ ان متقیوں اور خوب کاروں کا وہ صلہ بیان ہوا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں ان کو ملنے والا ہے۔ فرمایا کہ ان کے لیے دنیا میں بھی بھلائی اور کامیابی ہے اور آخرت کا تو پوچھنا ہی کیا ہے، وہ تو ہے ہی بہتر۔ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ بالکل فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ کے مقابل میں ہے۔ جس طرح متکبرین کے ٹھکانے کے برے ہونے کی کوئی حد نہیں اسی طرح متقیوں کے گھر کے اچھے ہونے کی کوئی حد نہیں۔

رسولوں اور ان کے صحابہ کے لیے دنیا میں بھی کامیابی ہے

یہاں ان متقیوں کے لیے صریح الفاظ میں اس دنیا میں بھی کامیابی و نصرت کی بشارت ہے۔ اس کی وجہ جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ رسول اور اس کے ساتھیوں کے لیے اس دنیا میں بھی غلبہ اور اقتدار لازمی ہے۔ آگے آیت ۴۱ کے تحت ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ (۳۱)

جنّٰت عدن کا مفہوم

'عدن' کے معنی توطن اور اقامت کے ہیں۔ یہ متقین کے گھر کی تعریف ہے کہ وہ اقامت اور توطن کے باغ ہوں گے۔ خدا کے متقی بندے ان میں محض وقتی سیر و تفریح کے لیے نہیں بلکہ ان میں ہمیشہ رہنے بسنے کے لیے داخل ہوں گے۔ فعل يَدْخُلُونَ یہاں اپنے حقیقی اور کامل معنی میں ہے یعنی متقی ان باغوں میں عزت و اکرام کے ساتھ براجمان ہوں گے، ان میں ان کے لیے وہ سب کچھ حاضر ہوگا جو وہ چاہیں گے۔

تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ یہ ان باغوں کی تصویر و تعریف ہے۔ ایک اچھے باغ کا تصور یہ ہے کہ وہ بلندی پر ہو اور اس کے نیچے نہر جاری ہو۔ بلندی اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہے اور نیچے بہنے والی نہر اس کی شادابی و زرخیزی کی ضامن ہوتی ہے۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ ۙ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۳۲)

متقین کے ساتھ فرشتوں کا معاملہ

جس طرح اوپر والی آیت ۲۸ بطور تضمین ہے اسی طرح یہ آیت بھی بطور تضمین ہے جس سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا ہے۔ طَيِّبِينَ بالکل ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ کے مقابل میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان متقین سے مراد

وہ لوگ ہیں جن کو فرشتے اس حال میں وفات دیتے ہیں کہ وہ شرک و کفر کی ہر آزمائش سے بالکل پاک اور منزہ رہتے ہیں۔ فرشتے ان کو سلام کرتے ہیں اور ان کو ان کے اعمال کے صلہ میں جنت کی بشارت سناتے ہیں

۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۳-۴۷

مشرکین کی کج بحثیوں کی تردید اور اہل ایمان کو کامیابی کی بشارت

آگے انہی مشرکین کی ان کج بحثیوں کا حوالہ اور ان کی تردید ہے جو وہ اپنے رویہ کی حمایت و مدافعت میں کرتے تھے اور ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو استقامت اور اللہ پر بھروسہ قائم رکھنے کی تلقین کی گئی ہے اور یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ آزمائشوں کے دور سے گزرنے کے بعد بالآخر فتح و کامیابی انہی کا حصہ ہے۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۳۳-۴۷

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ
كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ
كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٣٣﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ
ع ۹ ۱۰ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٣٤﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا
لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَاۗؤُنَا
وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَي الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٣٥﴾ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ
كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ
مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۭ فَسِيْرُوْا فِي
الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٦﴾ اِنْ تَحْرِصْ
عَلٰي هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ
نّٰصِرِيْنَ ﴿٣٧﴾ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ

يَمُوتُ ۚ بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾
لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ
كَانُوا كَاذِبِينَ ﴿٣٩﴾ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ
ع ۶ ۵ ۱۱ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٤٠﴾ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا
وقف لازم لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا
يَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٤٢﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا
مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ ۚ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ
لَا تَعْلَمُونَ ﴿٤٣﴾ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ ۗ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ
النصف لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٤٤﴾ أَفَأَمِنَ الَّذِينَ
مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ
مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٤٥﴾ أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ
بِمُعْجِزِينَ ﴿٤٦﴾ أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ
رَحِيمٌ ﴿٤٧﴾

ترجمۂ آیات ۳۳ - ۴۷

یہ لوگ تو بس اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرے رب کا حکم ہی آجائے۔ یہی روش ان سے پہلے والوں نے اختیار کی۔ اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔ تو ان کو ان کے کیے کی سزائیں پہنچیں اور جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے اسی چیز نے ان کو گھیر لیا۔ ۳۳-۳۴

اور جن لوگوں نے شرک کیا وہ کہتے ہیں، اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کو نہ پوجتے

نہ ہم نہ ہمارے آباءو اجداد، اور نہ ہم اس کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ یہی روش ان سے پہلے والوں نے اختیار کیا تو رسولوں پر واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں۔ اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ ہی کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو تو ان میں سے کچھ کو اللہ نے ہدایت بخشی اور ان میں ایسے بھی ہوئے جن پر ضلالت مسلط ہو کے رہی۔ تو ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ کیا ہوا جھٹلانے والوں کا انجام۔ ۳۵-۳۶

اگر تم ان کی ہدایت کے حریص ہو تو اللہ ایسوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا جن کو گمراہ کر دیتا ہے اور ان کا کوئی مددگار نہیں بنتا۔ ۳۷

اور یہ پکی پکی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اس کو نہیں اٹھائے گا۔ ہاں، یہ اس کے اوپر ایک لازمی وعدہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یہ اس لیے ہے کہ یہ جس چیز میں اختلاف کر رہے ہیں اس کو وہ اچھی طرح واضح کر دے اور تاکہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔ جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اتنا ہی ہمارا کہنا ہوتا ہے کہ ہم اس کو کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ ۳۸-۴۰

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی بعد اس کے کہ ان پر ظلم ڈھائے گئے ہم ان کو دنیا میں بھی اچھی طرح متمکن کریں گے اور آخرت کا اجر تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے، کاش وہ جانتے! یہ ان مہاجرین کے لیے ہے جنھوں نے استقامت دکھائی اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ۴۱-۴۲

اور ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو دلائل اور کتابوں کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے رہے تو اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے اور ہم نے تم پر بھی یاد دہانی اتاری تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے اور تاکہ وہ غور کریں۔ ۴۳-۴۴

کیا وہ لوگ جو بری بری چالیں چل رہے ہیں اس بات سے نچنت ہیں کہ اللہ ان کو زمین کو دھنسا دے یا ان پر عذاب وہاں سے آدھمکے جہاں سے ان کو گمان بھی نہ ہو یا ان کو چلتے پھرتے پکڑ لے تو وہ اس کے قابو سے باہر نہیں نکل سکتے یا ان کو عین اندیشہ کی حالت میں دھر لے پس تمھارا پروردگار بڑا ہی شفیق و رحیم ہے۔ ۴۵-۴۷

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّآ أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرُ رَبِّكَ ۚ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُونَ (۳۳-۳۴)

تاریخ سے سبق لینے کی دعوت

یعنی یہ متکبرین تمھاری باتوں کی تصدیق کے لیے اس وقت تک تیار نہیں ہیں جب تک ان کے پاس فرشتے نہ آئیں یا ان پر وہ عذاب ہی نہ آجائے جس کی ان کو خبر دی جا رہی ہے۔ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ، یعنی یہی روش ان سے پہلے کی قوموں نے اپنے رسولوں کے ساتھ اختیار کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر عذاب الٰہی آدھمکا اور اس نے ان کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ یہی حشر ان کا بھی ہونا ہے اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی۔ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ، یعنی یہ پچھلی قومیں ہلاک ہوئیں تو اپنی ضد اور سرکشی کے سبب سے ہلاک ہوئیں۔ خدا نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا اس لیے کہ ان کو پہلے سے تمام نتائج و عواقب سے اس نے آگاہ کر دیا تھا بلکہ انھوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے کہ تنبیہ و تذکیر سے فائدہ اٹھانے کے بجائے عذاب کا مطالبہ کیا اور اپنے رسولوں کی تنبیہات کا مذاق اڑاتی رہیں۔

فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُونَ، یعنی ان پر جو عذاب آئے وہ ان کے اپنے اعمال کے نتیجے تھے۔ خدا نے ان کو وہی چیز دکھا دی جو انھوں نے اپنے لیے مہیا کی تھی۔

مشرکین کی بعض کج بحثیوں کا جواب

وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُونِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِينُ (۳۵)

یہ بھی ان لوگوں کی کج بحثی کی ایک مثال ہے۔ یعنی یہ مشرکین تمھیں زچ کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ ہم جن معبودوں کو پوجتے اور ان کے نام پر جن چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں یہ سب خدا ہی کی مرضی سے کرتے ہیں، ورنہ خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، اگر ہمارے یہ کام اس کی مرضی کے خلاف ہوتے تو وہ ہمیں اپنی قدرت سے ان

کاموں سے روک دیتا اور ہم ان میں ایک کام بھی نہ کر پاتے۔ کَذٰلِکَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ، یعنی یہ بھی کوئی نئی بات نہیں بلکہ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں انھوں نے بھی اسی طرح کی کج بحثیوں سے اپنے رسولوں کو چپ کرنے کی کوشش کی۔ مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے انہی کی روش اختیار کی ہے تو لازماً انہی کے انجام سے بھی دوچار ہوں گے۔ فَہَلْ عَلَی الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ یعنی اگر وہ تمھاری سچائی کی دلیل اس بات کو سمجھتے ہیں کہ تم اپنے تصرف سے ان کو اس دین کی راہ پر لگا دو جس کی ان کو دعوت دے رہے ہو تو رسولوں کا کام یہ نہیں ہوتا، ان کا کام صرف واضح طور پر لوگوں تک دین حق پہنچا دینا ہوتا ہے، یہ کام تم کر رہے ہو اور اسی پر تمھاری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ حق کو قبول کرنا یا نہ کرنا ان کی اپنی ذمہ داری ہے اور اس کے لیے عنداللہ وہی مسئول ہوں گے۔ اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ وہ حق یا باطل میں سے کسی چیز پر لوگوں کو مجبور کر دے بلکہ اس نے لوگوں کو اختیار بخشا ہے۔ اگر کوئی شخص حق کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس کو اسی راہ کی توفیق ملتی ہے اور اگر کوئی شخص باطل کی راہ پر چل پڑتا ہے تو اللہ اس کو اسی راہ میں ڈھیل دے دیتا ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْہُمْ مَّنْ ہَدَی اللّٰہُ وَمِنْہُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْہِ الضَّلٰلَۃُ ۚ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُکَذِّبِیْنَ (۳۶)

لفظ طاغوت کی تحقیق بقرہ آیت ۲۵۶ کے تحت گزر چکی ہے۔

اللہ کے ہر رسول نے اللہ ہی کی بندگی کی دعوت دی

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کے اس قول کا منشا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اسی کفر و شرک کی تعلیم دی ہے جس پر وہ ہیں تو یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر رسول نے صرف اللہ ہی کی بندگی اور طاغوت سے اجتناب کی تعلیم دی ہے تو جس نے ہدایت کی راہ پسند کی اس کو ہدایت کی توفیق ملی اور جو اپنی ضلالت ہی پر جما رہ گیا اس پر ضلالت پوری طرح مسلط ہو گئی۔ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ یعنی جن لوگوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی ان کی اس تکذیب کے انجام کے آثار اس سرزمین میں موجود ہیں تو ان آثار کا مشاہدہ کرو اور ان سے سبق لو۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی ہُدٰىہُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَہْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ وَمَا لَہُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ (۳۷)

پیغمبر صلعم کو تسلی

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے۔ آپ کو اپنی قوم کی ہدایت کی شدید تمنا تھی اس وجہ سے آپ ان کے پیچھے اپنے رات دن ایک کیے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ جو لوگ خدا کے قانون ضلالت کی زد میں آچکے ہیں اب ان کو ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔ ایسوں کا کوئی مددگار نہیں بنتا۔ خدا ہدایت انہی لوگوں کو بخشتا ہے جو اپنی فطری صلاحیتیں اس کے لیے استعمال کرتے اور اس کے طلب گار بنتے ہیں۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَہْدَ اَیْمَانِہِمْ ۙ لَا یَبْعَثُ اللّٰہُ مَنْ یَّمُوْتُ ۭ بَلٰی وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۸)

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ، اى بالغوا فى اليمين واجتهدوا۔ یعنی انھوں نے قسم کھانے میں مبالغہ کیا اور اپنا پورا زور لگا دیا۔

منکرین کی قسم کی تردید

منکرین کا انکار آخرت میں غلو

ایمان کے موانع میں سے ایک بڑا مانع قریش کے منکرین کے لیے یہ بھی تھا کہ وہ مرنے کے بعد کی زندگی کے نہ تو قائل تھے اور نہ اس کے قائل ہونا چاہتے تھے۔ وہ بڑے زور و شور سے قسمیں کھا کھا کے اپنے زیر اثر لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا ناممکن ہے، اللہ کسی کو نہیں اٹھائے گا۔ یہ محض محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دھونس ہے۔

بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ یہ ان کی تردید ہے اور اس تردید میں بھی وہی شدت ہے جو منکرین کے قول میں ہے۔ فرمایا کہ ہاں وہ لوگوں کو ضرور اٹھائے گا۔ یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہے جس کا ایفا اس نے اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے لیکن اکثر لوگ اس سے واقف نہیں ہیں اس وجہ سے وہ اس کا انکار کرتے یا مذاق اڑا رہے ہیں۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ (۳۹)

قیامت کی ضرورت

یہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کی ضرورت واضح فرمائی ہے کہ یہ اس لیے ہوگا کہ جن چیزوں کے بارے میں آج وہ اختلاف کر رہے ہیں ان میں امر حق اچھی طرح واضح ہو جائے اور جن لوگوں نے جانتے بوجھتے دھاندلیاں مچائی ہیں وہ اپنے کیے کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ اور یہ اس لیے بھی ہوگا کہ جو لوگ آج قسمیں کھا کھا کے لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ قیامت نہیں ہے وہ اچھی طرح جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے اور انھوں نے جھوٹی قسمیں کھائیں۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۴۰)

قیامت کلمۂ کن سے وجود میں آ جائے گی

یہ اس استبعاد کو رفع فرمایا ہے جس کی بنا پر کفار قیامت کا انکار کرتے تھے۔ فرمایا کہ ہم جب کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے لیے کسی اہتمام و انتظام کی ضرورت پیش نہیں آتی، ہم تو بس اتنا کہتے ہیں کہ ہو جا اور وہ کام ہو جاتا ہے تو ہمارے لیے لوگوں کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۴۱-۴۲)

مہاجرین حبشہ کی تحسین

یہ بات بھی یہاں قیامت کی ضرورت اور اس کے مقاصد کے تحت ہی بیان ہوئی ہے مطلب یہ ہے کہ آخر خدا کے بندے وہ بھی تو ہیں جو آج اس کی راہ میں اس کے دین کی خاطر طرح طرح کے مصائب و شدائد کا ہدف بنے ہوئے ہیں یہاں تک کہ وہ مجبور ہو کر محض اپنے دین کو بچانے کی خاطر اپنے وطن اور گھر در کو چھوڑ ایک غیر ملک حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے ہیں۔ کیا اللہ ان لوگوں کو ان کی ان جانبازیوں کا صلہ نہیں دے گا؟ ضرور دے گا۔ دنیا میں بھی ان کو اچھی طرح متمکن کرے گا اور

آخرت کا اجر تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ یعنی جو لوگ اللہ کے اس وعدے کی قدر و قیمت اور اس اجر آخرت کی عظمت سے واقف نہیں ہیں وہ جو چاہیں سمجھیں کاش وہ اس سے واقف ہوتے تو اگر واقف ہوتے تو انہیں اندازہ ہوتا کہ جن لوگوں کو وہ محروم سمجھ رہے ہیں انھوں نے دنیا اور آخرت دونوں کی کتنی بڑی بازی جیتی ہے۔

الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا وَعَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ۔ یہ انہی مہاجرین کی تعریف ہے کہ انھوں نے اللہ کی راہ (۴۲) میں ہر قسم کے مصائب جھیلے لیکن متزلزل نہیں ہوئے بلکہ اپنے موقف حق پر ڈٹے رہے اور جب گھر چھوڑنے تک نوبت آگئی تو اللہ کے بھروسہ پر دامن جھاڑ کر اٹھ گئے، ذرا اس بات کی پروا نہیں کی کہ کیا کھائیں گے اور کہاں سر چھپائیں گے۔

ہجرت کی حقیقت

ان آیتوں سے ہجرت کی حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ ہر نقل مکان کو ہجرت نہیں کہتے۔ ہجرت یہ ہے کہ آدمی اپنے دین کے معاملے میں ستایا جائے یہاں تک کہ وہ اپنا محبوب وطن اور اپنا عزیز اثاثہ چھوڑ کر وہاں سے نکلنے اور دوسری سرزمین کو اپنی پناہ گاہ بنانے پر مجبور ہو جائے۔ اس راہ میں صبر کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ اس کے سر پر آرے ہی کیوں نہ چل جائیں لیکن دین حق کی جو نعمت اس کو مل چکی ہے وہ اس سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہو اور توکل کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ حالات کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں لیکن وہ یہ اعتماد رکھے کہ اللہ اس کو تنہا نہیں چھوڑے گا بلکہ اس کی دست گیری فرمائے گا۔ یہی صبر و توکل ہجرت کی راہ میں زاد راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

منکرین عذاب کو جواب

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ (۴۳)

یہ ان لوگوں کا جواب ہے جن کا ذکر اوپر آیت ۳۳ میں گزرا ہے کہ وہ منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا اللہ کا عذاب ہی آجائے۔ پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم سے پہلے جتنے بھی رسول آئے ہیں سب بشر ہی تھے، بس یہ امتیاز ان کو حاصل ہوتا تھا کہ ان پر ہم اپنی وحی نازل کرتے تھے۔ پھر معترضین کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تم اس حقیقت سے بے خبر ہو تو جو پہلے کے حاملین کتاب ہیں ان سے پوچھ دیکھو وہ تمھیں بتائیں گے کہ انسانوں کے اندر منصب رسالت پر بشر ہی فائز ہوتے رہے ہیں، فرشتے نہیں فائز ہوتے رہے ہیں۔

بِالۡبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَلَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ (۴۴)

بِالۡبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ یعنی یہ رسول جو آتے رہے ہیں دلائل اور صحیفوں کے ساتھ ہی آتے رہے ہیں، عذابِ الٰہی لے کر نہیں آتے رہے ہیں جس کا مطالبہ یہ لوگ کر رہے ہیں۔

کتاب الٰہی اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ الایۃ یعنی جس طرح ہم نے پچھلے رسولوں کو دلائل اور صحیفوں کے ساتھ بھیجا اسی طرح تم پر بھی اپنی یاد دہانی (کتاب) اتاری تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دو جو ان کی طرف اتاری گئی

گئی ہے اور وہ اختلاف رفع ہو جس میں یہ دو اپنے دین سے متعلق مبتلا ہو گئے تھے۔ اور آیت ۳۹ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ 'وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ' یعنی کتاب اتارنے کا یہ مقصد بھی ہے کہ اس پر وہ غور کریں تاکہ ان کی کجرویوں اور گمراہیوں کی اصلاح ہو۔ اگر عذاب آگیا تو اس چیز کا موقع ان کے لیے باقی نہیں رہے گا۔ یہ تو اللہ کا بہت بڑا فضل و احسان ہے کہ اس نے عذاب کے بجائے کتاب اتاری جو رفع اختلاف کے لیے روشنی اور عقل کے لیے رہنمائی ہے تو انھیں چاہیے کہ اس نعمت پر وہ اپنے رب کے شکر گزار ہوں، اس پر ایمان لائیں، اس سے ہدایت حاصل کریں اور عذاب کے لیے جلدی نہ مچائیں۔

أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ۝ أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ۝ أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ (۴۵-۴۷)

مطالبۂ عذاب پر اظہار تعجب

یہ ان کے مطالبۂ عذاب پر اظہار تعجب اور ان کو ملامت ہے کہ اگر وہ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو کس برتے پر کر رہے ہیں؟ خدا جہاں سے چاہے ان کو پکڑ لے۔ اس کی پکڑ سے بچنے کا انھوں نے کیا سامان کر رکھا ہے؟ اگر خدا چاہے تو ان کے سمیت زمین کو دھنسا دے یا ان پر عذاب وہاں سے آدھمکے جہاں سے ان کو گمان بھی نہ ہو، یا چاہے تو عین ان کی آمد و شد کے دوران میں ان کو دھر لے، اگر وہ ایسا کرے جب بھی وہ اس کے قابو سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اسی طرح اگر وہ چاہے تو عین اس وقت ان کو پکڑ لے جبکہ وہ خطرے کو پوری طرح محسوس کر رہے ہوں اور اس کے لیے بیدار ہوں۔ غرض ہر حالت میں ان کو پکڑ سکتا ہے اگر وہ نہیں پکڑتا تو اس وجہ سے نہیں پکڑتا کہ وہ مہربان اور رحیم ہے۔ وہ اپنے بندوں کو آخری حد تک مہلت دیتا اور ان سے درگزر فرماتا ہے۔

۸- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۸-۶۰

توحید کی آفاقی و انفسی دلیلیں

آگے کی آیات میں توحید کی بعض آفاقی اور انفسی دلیلیں بیان ہوئی ہیں اور مقصود ان کے بیان کرنے سے تنبیہ کے اس مضمون کو مؤکد کرنا ہے جو اوپر کی آیات ۴۵-۴۷ میں گزرا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب کے لیے جلدی مت مچاؤ، اگر خدا کا عذاب آگیا تو اس سے نجات دینے والا خدا کے سوا کوئی اور نہیں بن سکتا۔ اگر کسی کو اپنے دیویوں دیوتاؤں پر اعتماد ہے تو یہ واضح رہنا چاہیے کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ وحدہٗ لا شریک ہے۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے کسی ارادے میں مزاحم یا مخل ہو سکے۔

آیات ۴۸-۶۰

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ
وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ ۝ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا

فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا
يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا
يُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ السجدة وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ
اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ
فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ
الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ
اٰتَيْنٰهُمْ فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ
نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾
وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا بُشِّرَ
اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى
مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ
فِي التُّرَابِ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
مَثَلُ السَّوْءِ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾ ع ۱۰/۱۲

ع ۱۰/۱۲ — آیات ۴۸-۶۰

ترجمۂ آیات ۴۸-۶۰

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ خدا نے جو چیز بھی پیدا کی ہے اس کے سائے دہنے اور بائیں
سے منقلب ہوتے ہیں اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے اور ان پر فروتنی ہوتی ہے اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے
ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں جاندار ہیں اور فرشتے بھی، وہ سرتابی نہیں کرتے۔ وہ اپنے اوپر
اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا ہے۔ ۴۸-۵۰

اور اللہ نے فرمایا کہ دو معبود نہ بنانا، وہ ایک ہی معبود ہے تو مجھی سے ڈرو۔ اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے تو کیا تم غیر اللہ سے ڈرتے ہو۔ ۵۱-۵۲

اور تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے تم فریاد کرتے ہو۔ پھر جب وہ تم سے تکلیف دور کر دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کا شریک ٹھہرانے لگتا ہے تاکہ ناشکری کریں اس چیز کی جو ہم نے ان کو بخشی ہے تو چند روزہ عیش کر لو، عنقریب تم جان لوگے۔ اور جن کے بارے میں انھیں کوئی علم نہیں ان کا حصہ لگاتے ہیں ان چیزوں میں سے جو ہم نے ان کو دی ہیں۔ خدا کی قسم! جو افترا تم کر رہے ہو اس کی تم سے پرسش ہونی ہے۔ ۵۳-۵۶

اور وہ اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں، وہ ان چیزوں سے پاک ہے، اور ان کے لیے ہے جو وہ چاہیں۔ اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوش خبری سنائی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ گھٹا گھٹا رہتا ہے۔ وہ اس منحوس خبر پر لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے۔ سوچتا ہے کہ اس کو ذلت کے ساتھ رکھ چھوڑے یا اس کو مٹی میں دفن کر دے۔ افسوس، کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔ بری تمثیل ان لوگوں کے لیے ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اللہ کے لیے اچھی صفتیں ہیں، وہ غالب اور حکیم ہے۔ ۵۷-۶۰

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِّلَّهِ وَ

هُمْ دَاخِرُونَ (۴۸)

تَتَفَيَّؤُ کے معنی تقلب اور ردوبدل کے ہیں۔

تفیؤ کے معنی تقلب اور ردوبدل

توحید کی تکوینی دلیل

یہ توحید کی تکوینی دلیل بیان ہوئی ہے کہ ہر چیز کا سایہ زمین پر بچھا رہتا ہے۔ گویا وہ خدا کے آگے سجدہ میں ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اٹھنا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ جب سورج سمت راس میں آتا ہے تو سایہ بالکل کھڑا ہو جاتا ہے، پھر جب سورج جھکنا شروع ہوتا ہے تو سایہ دوسری سمت میں زمین پر بچھنا شروع ہوتا ہے۔ ہر چیز کے سایہ کے چوبیس گھنٹے اسی رکوع و سجود میں گزرتے ہیں اور یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ سایہ کا یہ سجدہ سورج کی بالکل مخالف سمت میں ہوتا ہے، سورج اگر پورب کی طرف ہے تو سایہ پچھم کی طرف پھیلے گا اور اگر سورج پچھم کی طرف ہے تو سایہ کا پھیلاؤ پورب کی طرف ہوگا۔ یہ ایک لطیف اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ سایہ کی فطرت ابراہیمی ہے۔ آفتاب پرستی سے اس کو عار ہے۔

اس تکوینی شہادت کی روشنی میں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ کوئی شخص اگر سورج یا کواکب میں سے کسی چیز کی پرستش کرتا ہے تو اس کا اپنا سایہ اس کے اس فعل کی نفی کرتا ہے۔ وہ خود تو سورج کے آگے جھکتا ہے لیکن اس کا سایہ اس کی مخالف سمت میں جھکتا ہے۔ وہ طوعاً جس خدا کو سجدہ کرنے پر راضی نہیں ہے کرہاً اسی کے آگے سربسجود ہے اس لیے کہ اس کا سایہ خدا ہی کے آگے جھکا ہوا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ رعد کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ	اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں
الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ	ہیں، راضی خوشی یا مجبورانہ اور ان کے سائے صبح
بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (رعد-۱۵)	وشام سجدہ کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص طوعاً خدا کو سجدہ کرتا ہے اس کے سجدۂ تکوینی اور سجدۂ اختیاری میں تو پوری پوری مطابقت ہوتی ہے، رہا وہ شخص جو غیر اللہ کو سجدہ کرتا ہے تو اس کا اپنا سایہ اس کے اس سجدہ پر نکیر کرتا ہے۔

وَهُمْ دٰخِرُوْنَ یعنی اس تکوینی سجدہ میں ان پر عاجزی و فروتنی طاری ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس سے باہر کی حالت میں خدا سے اکڑتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے دائرہ اختیار میں اپنی اصل جبلت سے منحرف ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۴۹)

فرشتوں کی فروتنی اور فرمانبرداری

یعنی آسمانوں اور زمین میں جتنے بھی جاندار ہیں سب خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں اس لیے کہ سب کی جبلت خدا پرستی ہی ہے۔ فرشتے بھی خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہ نادان لوگ ان کو جو چاہیں بنا کر رکھ دیں لیکن وہ خود خدا کے فرمانبردار بندے ہیں وہ اس سے اکڑتے نہیں بلکہ بے چون و چرا اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۵۰)

یعنی باایں ہمہ قرب و اتصال خدا کی بارگاہ عالی سے ان کا مقام بہت پیچھے ہے۔ وہ اپنے اوپر خدا سے برابر ڈرتے رہتے ہیں، ناز اور تدلل کے فتنہ میں کبھی مبتلا نہیں ہوتے، جو کچھ حکم ملتا ہے فوراً اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (۵۱)

توحید کے حق میں خدا کی شہادت

یہ توحید کے حق میں خود خدا کی شہادت کا حوالہ ہے جو اس کے انبیاء اور رسولوں، کتابوں اور صحیفوں کے ذریعے سے لوگوں کو دی گئی ہے۔ فرمایا کہ اس نے لوگوں کو اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے یہی تعلیم دی ہے کہ دو معبود نہ بناؤ، میں ایک ہی معبود ہوں تو مجھی سے ڈرو۔

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ (۵۲)

دین کے معنی

'دین' کے معنی یہاں اطاعت کے اور 'واصب' کے معنی دائم کے ہیں۔

اطاعت واصب کے معنی دائم

مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے۔ وہی اطاعت کا حق دار ہے ہمیشہ۔ یعنی اس دنیا میں بھی اسی کی اطاعت ہونی چاہیے اور آخرت میں بھی اسی کی اطاعت ہوگی۔ اگر تم خدا کے سوا کسی اور سے ڈرتے ہو تو یہ سرتا سر تمہاری جہالت ہے۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْــَٔــرُوْنَ (۵۳)

'جأر، جؤارا' کے معنی تضرع اور فریاد کرنے کے ہیں۔

توحید کی انفسی دلیل

یہ توحید کی انفسی دلیل بیان ہوئی ہے کہ جتنی نعمتیں بھی تمہیں حاصل ہیں سب اللہ ہی کی بخشی ہوئی ہیں اور جب کبھی تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو تم خدا ہی کو پکارتے ہو۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اصل فطرت کے اندر صرف ایک ہی خدا کا شعور ہے، یہ دوسرے دیوی دیوتا جو تم نے بنا رکھے ہیں اصل فطرت کے اندر ان کی کوئی جگہ نہیں ہے چنانچہ جب کسی حقیقی پریشانی کا وقت آتا ہے تو یہ سارے بناوٹی دیوی دیوتا غائب ہو جاتے ہیں، صرف ایک ہی خدا باقی رہ جاتا ہے جس کا اعتقاد اصل فطرت کے اندر ودیعت ہے۔

ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ (۵۴)

پھر جب خدا مصیبت کو دور کر دیتا ہے تو وہی پچھلی خرمستیاں پھر عود کر آتی ہیں، وہی دیوی دیوتا پھر جاگ پڑتے ہیں جو مصیبت کے وقت میں غائب ہو گئے تھے اور اسباب و وسائل کا وہی اعتماد پھر بحال ہو جاتا ہے جو پہلے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ آدمی خدا کے بخشے ہوئے امن و اطمینان کو دوسروں کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتا ہے اور خود خدا کو طاق نسیاں پر رکھ دیتا ہے۔

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۵۵)

یہ اس صورت حال کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ اس طرح انسان خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کرتا اور ان کو دوسروں کی طرف منسوب کرتا ہے۔ 'فتمتعوا' یہ دھمکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی ناشکری کر کے اس کی نعمتوں سے چند روز فائدہ اٹھا لو۔ عنقریب تمہارے سامنے اس کفران نعمت کا نتیجہ آ جائے گا۔

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ ۗ تَاللَّهِ لَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَفْتَرُونَ (۵۶)

شرک خدا پر افترا ہے

یعنی جن دیویوں دیوتاؤں کے بارے میں ان کے پاس کوئی دلیل و ثبوت نہیں محض وہم و گمان کی بنا پر انھوں نے ان کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے، ان کو خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں میں حصہ دار بناتے ہیں، ان کے نام کے حصے بھی نکالتے ہیں اور بہت سی چیزوں کو ان کی طرف منسوب بھی کرتے ہیں کہ یہ ان کے فضل و کرم سے ان کو حاصل ہوئی ہیں۔ تَاللَّهِ لَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَفْتَرُونَ۔ یہ اپنی ذات کی قسم کھا کر ان کو دھمکی دی کہ یہ افترا جو تم خدا پر کر رہے ہو کہ اس نے فلاں اور فلاں کو اپنا شریک بنایا ہے، ایک دن اس کی تم سے پرسش ہونی ہے، خدا نے کسی کو اپنا شریک نہیں بنایا ہے، یہ محض تہمت ہے جو تم اس پر جوڑ رہے ہو۔

وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ ۙ وَلَهُم مَّا يَشْتَهُونَ (۵۷)

شرک کا دہرا گھنونا پن

یہاں شرک کے دہرے گھنونے پن کو واضح فرمایا ہے کہ اول تو یہی بات نہایت بھونڈی ہے کہ خدا کا کسی کو شریک و سہیم ٹھہرایا جائے پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جس چیز کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اس کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں، خود اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہیں لیکن خدا کے لیے انھوں نے بیٹیاں قرار دے رکھی ہیں۔ یہ امر بیاں واضح رہے کہ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور اس خیال سے ان کی پوجا کرتے تھے کہ اگر یہ راضی رہیں تو اپنے باپ سے سب کچھ منوا لیتی ہیں۔ 'سُبْحَانَهُ' یعنی اللہ تعالیٰ اس طرح کی تمام نسبتوں سے پاک و منزہ ہے، کوئی اس کا بیٹا یا بیٹی نہیں، سب اس کی مخلوق ہیں۔

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۚ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (۵۸-۵۹)

یعنی خدا کی طرف تو انھوں نے بیٹیاں منسوب کر رکھی ہیں درآنحالیکہ بیٹیوں کے معاملے میں خود ان کا اپنا حال یہ ہے کہ اگر ان میں سے کسی کو یہ خبر دی جائے کہ اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے تو غم سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ ہر وقت رنج و الم سے گھٹا گھٹا رہتا ہے، اس کو اپنے لیے باعث ننگ سمجھ کر لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور اس تردد میں پڑ جاتا ہے کہ ذلت گوارا کر کے اس کو زندہ رکھے یا اس کو زمین میں دفن کر کے اس ذلت سے چھٹکارا حاصل کرے۔

'أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ' یعنی جس چیز کو اپنے لیے مکروہ سمجھتے ہیں اسی چیز کو خدا کی طرف بڑی بے تکلف منسوب کرتے ہیں، اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ خدا کی طرف اس چیز کو منسوب کرنے میں احتیاط کرتے جس چیز کو اپنے لیے اس درجہ مکروہ سمجھتے ہیں۔ افسوس کتنا برا فیصلہ ہے جو انھوں نے کیا۔

لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۖ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۶۰)

یعنی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے لیے بری تمثیل ہے اور اللہ کے لیے اعلیٰ صفتیں ہیں لیکن ان لوگوں نے معاملہ اس کے بالکل برعکس کر رکھا ہے۔ اللہ کی طرف تو وہ چیزیں

منسوب کرتے ہیں جن کو خود اپنے لیے بری سمجھتے ہیں اور اپنے لیے اچھے نتائج اور اچھے انجام کے مدعی ہیں، وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى (اور وہ اللہ کے لیے وہ چیزیں قرار دیتے ہیں جن کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کے لیے اچھا انجام ہے)۔

١٠- آگے کا مضمون ——— آیات ٦١ - ٦۴

مشرکین کو تنبیہ و پیغمبر صلعم کو تسلی — آگے مشرکین کو تنبیہ ہے کہ خدا نے اگر تم کو مہلت دے رکھی ہے تو اس لیے دے رکھی ہے کہ اس کے ہاں ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آجائے گا تو پھر نہ اس سے پیچھے ہٹ سکو گے نہ آگے بڑھ سکو گے۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ جو کچھ تمھیں پیش آرہا ہے یہی کچھ تم سے پہلے رسولوں کو بھی پیش آچکا ہے۔ تمھارا کام لوگوں کو مومن و موحد بنا دینا نہیں ہے بلکہ لوگوں پر صرف اللہ کی حجت تمام کر دینا ہے۔

آیات ٦١-٦۴

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٦١﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿٦٢﴾ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦٣﴾ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٦۴﴾

ترجمۂ آیات ٦١-٦۴

اور اگر اللہ لوگوں سے ان کی حق تلفی پر فوراً مواخذہ کرتا ہوتا تو زمین پر کسی جاندار کو نہ چھوڑتا لیکن وہ ایک وقت معین تک لوگوں کو مہلت دیتا ہے تو جب ان کا وقت معین آجائے گا

تو اس سے نہ وہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ ۶۱

اور یہ اللہ کے لیے وہ چیز قرار دیتے ہیں جو خود اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے اچھا انجام ہے۔ لازماً ان کے لیے دوزخ ہے اور وہ اسی میں پڑے چھوڑ دیے جائیں گے۔ ۶۲

خدا کی قسم! ہم نے تم سے پہلے بھی قوموں کی طرف رسول بھیجے تو شیطانوں نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیے تو آج وہی ان کا رفیق ہے اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ۶۳

اور ہم نے تم پر کتاب صرف اس لیے اتاری ہے کہ تم ان پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دو جس میں وہ مختلف ہو گئے ہیں اور یہ ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ ۶۴

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۶۱)

کفر و شرک ظلم ہے 'ظلم' کے اصل معنی حق تلفی کے ہیں۔ چونکہ شرک و کفر سب سے بڑی حق تلفی ہے، جس کا ارتکاب کر کے بندہ اپنے رب کے سب سے بڑے حق کو بھی تلف کرتا ہے اور خود اپنی جان پر بھی سب سے بڑا ظلم ڈھاتا ہے، اس وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ کفر و شرک کو ظلم سے تعبیر کیا ہے۔

مطالبۂ عذاب کا جواب یہ کفار کے مطالبۂ عذاب کا جواب ہے کہ اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے کفر و شرک پر ان کو فوراً پکڑ لے۔ اگر وہ ایسا کرنے والا ہوتا تو زمین پر ایک جاندار کو بھی جینے کی مہلت نہ ملتی۔ بلکہ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ایک وقت معین تک مہلت دیتا ہے تاکہ جس کو توبہ و اصلاح کرنی ہو وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر توبہ و اصلاح کر لے ورنہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لے۔ ہاں جب وہ وقت معین آ جاتا ہے تو پھر اس سے نہ پیچھے ہٹنے کا موقع ملتا ہے نہ آگے بڑھنے کا۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ (۶۲)

أَفَمَنْ خَلَقَ الشَّيْءَ، نَسِيَهُ وَتَرَكَهُ' اس چیز کو بھلا دیا، چھوڑ دیا یعنی کفار و مشرکین دوزخ میں ڈال کر اسی میں پڑے چھوڑ دیے جائیں گے، پھر ان کی خبر نہیں لی جائے گی۔

مشرکین کی حماقت در حماقت

یہ ان کی حماقت در حماقت کی طرف اشارہ ہے کہ اول تو یہی بات عجیب ہے کہ انھوں نے خدا کی طرف بیٹیاں منسوب کر رکھی ہیں جن کی نسبت خود اپنی طرف ان کو گوارا نہیں پھر ان کے اعتماد پر یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ اگر آخرت وغیرہ کا کوئی مرحلہ بالفرض پیش آیا تو ان کی بدولت ان کے لیے سب خیریت اور ہر طرح کی کامیابی ہے۔ فرمایا کہ ان کے لیے لازماً دوزخ ہے اور وہ اس میں ایک مرتبہ ڈال کر ہمیشہ کے لیے اس طرح چھوڑ دیے جائیں گے کہ پھر ان کی خبر بھی نہیں لی جائے گی۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۶۳)

کفار کو دھمکی، پیغمبر صلعم کو تسلی

یہ کفار کو دھمکی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ آج جو کچھ تمھیں پیش آ رہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہی کچھ تم سے پہلے آنے والے رسولوں کو، ان کی قوموں کی طرف سے، پیش آ چکا ہے۔ ہم نے اپنے رسول بھیجے کہ لوگ ان کے ذریعہ سے ہدایت کی راہ اختیار کریں لیکن لوگوں نے رسولوں کے بجائے شیطان ہی کو اپنا رہنما بنایا۔ اس نے ان کی نگاہوں میں ان کے اعمال کھبا دیے اور وہ اپنی گمراہیوں سے نکلنے پر راضی نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہی ان کا رفیق اور ساتھی ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۶۴)

پیغمبر صلعم کی ذمہ داری کی آخری حد

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کی حد بتا دی گئی ہے کہ یہ کتاب ہم نے تم پر اس لیے نہیں اتاری کہ لازماً تم اس کو لوگوں سے قبول ہی کرا دو، اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے، تمھاری ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ اس کے ذریعہ سے اس دین حق کو اچھی طرح واضح کر دو جس میں لوگ مختلف ہو گئے ہیں تاکہ لوگوں کے لیے گمراہی پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم احساس فرض کی شدت کے سبب سے بسا اوقات یہ محسوس فرمانے لگتے کہ لوگ جو ہدایت کی راہ اختیار نہیں کر رہے ہیں تو اس میں کہیں آپ کی کسی کوتاہی کو دخل نہ ہو۔ آپ کی اس الجھن کو دور کرنے کے لیے آپ کی ذمہ داری بتا دی گئی کہ آپ پر صرف واضح طور پر دین کو پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے اور بس۔ آگے اس مضمون کو مزید واضح فرمایا ہے۔ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ. ۸۹ (اور اس دن کو یاد کرو جس دن ہم ہر امت میں اسی کے اندر سے ایک گواہ اٹھائیں گے اور ہم تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے اور ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے ہر چیز کو واضح کر دینے کے لیے اور ہدایت و رحمت اور بشارت بنا کر اسلام اختیار کرنے والوں کے لیے)۔

هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ یعنی یہ کتاب ہدایت ہے اپنے آغاز کے لحاظ سے اور رحمت ہے اپنے انجام کے لحاظ سے۔ جو لوگ اس ہدایت کو قبول کریں گے بالآخر وہی خدا کی رحمت کے مستحق ٹھہریں گے۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۶۵-۸۳

مشرکین کو ملامت اور پیغمبر صلعم کو تسلی

اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں بخش رکھی ہیں آگے ان میں سے کچھ کو گنا کر مشرکین کو ملامت کی گئی ہے کہ ان میں سے کس نعمت کو وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جو لوگ جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں ان کو راستہ پر لا کھڑا کرنا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے، تمہاری ذمہ داری صرف حق کو پہنچا دینے کی ہے۔

آیات ۶۵-۸۳ وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ
ع ۸ ۵ ۱۴ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ
مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا
لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ
سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَاَوْحٰى
رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا
يَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۭ
يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ ۭ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ڝ
وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ
ع ۹ ۶ ۱۵ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۷۰﴾ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا
الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَاۗدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰي مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ

سَوَآءٌ ۚ أَفَبِنِعْمَةِ ٱللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٧١﴾ وَٱللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ
أَزْوَٰجًا وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَٰجِكُم بَنِينَ وَحَفَدَةً وَرَزَقَكُم مِّنَ
ٱلطَّيِّبَٰتِ ۚ أَفَبِٱلْبَٰطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَتِ ٱللَّهِ هُمْ يَكْفُرُونَ ﴿٧٢﴾ وَ
يَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَ
ٱلْأَرْضِ شَيْـًٔا وَلَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿٧٣﴾ فَلَا تَضْرِبُوا۟ لِلَّهِ ٱلْأَمْثَالَ ۚ
إِنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٧٤﴾ ضَرَبَ ٱللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا
مَّمْلُوكًا لَّا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَىْءٍ وَمَن رَّزَقْنَٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ
يُنفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا ۖ هَلْ يَسْتَوُۥنَ ۚ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾ وَضَرَبَ ٱللَّهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ أَحَدُهُمَآ أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ
عَلَىٰ شَىْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَىٰهُ أَيْنَمَا يُوَجِّههُّ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ ۖ هَلْ
يَسْتَوِى هُوَ وَمَن يَأْمُرُ بِٱلْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٧٦﴾ وَلِلَّهِ غَيْبُ ع ١٠ ١٦
ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ وَمَآ أَمْرُ ٱلسَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ ٱلْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ ۚ
إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿٧٧﴾ وَٱللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّنۢ بُطُونِ أُمَّهَٰتِكُمْ
لَا تَعْلَمُونَ شَيْـًٔا وَجَعَلَ لَكُمُ ٱلسَّمْعَ وَٱلْأَبْصَٰرَ وَٱلْأَفْـِٔدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ ﴿٧٨﴾ أَلَمْ يَرَوْا۟ إِلَى ٱلطَّيْرِ مُسَخَّرَٰتٍ فِى جَوِّ ٱلسَّمَآءِ مَا
يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا ٱللَّهُ ۗ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٧٩﴾ وَٱللَّهُ
جَعَلَ لَكُم مِّنۢ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا وَجَعَلَ لَكُم مِّن جُلُودِ ٱلْأَنْعَٰمِ
بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ أَصْوَافِهَا

وَّ اَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ
لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ
لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ كَذٰلِكَ
يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ
الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ
الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾ ع ۱۱ ۱۷

ترجمۂ آیات ۶۵-۸۳

اور اللہ ہی نے آسمان سے پانی اتارا پس اس سے زمین کو زندہ کر دیا اس کے خشک ہو جانے کے بعد۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو بات کو سنتے ہیں اور بے شک تمہارے لیے چوپایوں میں بھی بڑا سبق ہے۔ ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں، پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار۔ اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی، تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی۔ بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۶۵-۶۷

اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر القا کیا کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو چھپر اٹھاتے ہیں، ان میں چھتے بنا، پھر ہر قسم کے پھلوں سے رس چوس پھر اپنے پروردگار کے ہموار راستوں پر چل۔ اس کے پیٹ سے مشروب نکلتا ہے جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔ ۶۸-۶۹

اور اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا، پھر وہی تم کو وفات دیتا ہے اور تم میں سے بعض ارذل عمر کی طرف لوٹا دیے جاتے ہیں کہ جاننے کے بعد وہ کچھ نہ جانیں۔ بے شک اللہ ہی علم والا اور

قدرت والا ہے۔ ۷۰

اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق کے معاملہ میں برتری دے رکھی ہے تو جن کو برتری دی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کو نہیں دے دیتے کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں تو کیا وہ اللہ کے فضل کا انکار کرتے ہیں۔ ۷۱

اور اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تمہیں پاکیزہ رزق عطا کیا، تو کیا یہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کے سوا ان چیزوں کو پوجتے ہیں جو نہ ان کے لیے آسمان سے کسی رزق پر اختیار رکھتی ہیں، نہ زمین سے اور نہ وہ اس کی استطاعت ہی رکھتی ہیں۔ تو تم اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو۔ بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ۷۲-۷۴

اور اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا اور اس کی جس کو ہم نے اپنی جانب سے اچھا رزق دے رکھا ہے جس میں سے وہ پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے، کیا یہ یکساں ہوں گے؟ شکر کا سزاوار اللہ ہے لیکن ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور اللہ مثال بیان کرتا ہے دو شخصوں کی جن میں سے ایک گونگا ہے جو کسی چیز پر قادر نہیں ہے اور وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے، جہاں کہیں بھی وہ اس کو بھیجتا ہے وہ کوئی کام درست کر کے نہیں لاتا۔ کیا وہ اور وہ جو عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ ایک سیدھی راہ پر ہے دونوں یکساں ہوں گے؟ ۷۵-۷۶

اور آسمانوں اور زمین کا بھید اللہ ہی کے لیے ہے اور قیامت کا معاملہ بس آنکھ جھپکنے کی طرح یا اس سے بھی جلد تر ہوگا، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۷۷

اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے سمع و بصر اور دل بنائے تاکہ تم شکر گزار بنو۔ ۷۸

کیا انھوں نے پرندوں کو آسمان کی فضا میں مسخر نہیں دیکھا؟ ان کو بس اللہ ہی تھامے ہوئے ہوتا ہے۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ اور اللہ ہی نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کا سکون پیدا کیا اور تمہارے لیے چوپایوں کی کھال کے گھر بنائے جنھیں تم اپنے کوچ اور قیام کے دن ہلکا پھلکا پاتے ہو اور ان کے اون، ان کے روئیں اور ان کے بالوں سے تمہارے لیے گھریلو سامان اور ایک وقت تک برتنے کی چیزیں بنائیں۔ ۷۹-۸۰

اور اللہ ہی نے تمہارے لیے اپنی پیدا کردہ چیزوں سے سایے بنائے اور تمہارے لیے پہاڑوں میں پناہ گاہیں بنائیں اور تمہارے لیے ایسے لباس بنائے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس بنائے جو تمہاری جنگ میں تم کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تم پر اپنی نعمت تمام کرتا ہے تاکہ فرمانبردار رہو۔ ۸۱

پس اگر وہ اعراض کریں تو تمہارے اوپر صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ یہ اللہ کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں پھر ان سے انجان بنتے ہیں اور ان میں اکثر ناشکرے ہیں۔ ۸۲-۸۳

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاللّٰهُ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّسۡمَعُوۡنَ (۶۵)

توحید کی دلیل آفاق کے پہلو سے

آسمانوں سے پانی برسانا اور زمین کو اس کے خشک ہو جانے کے بعد اس پانی سے از سر نو زندہ اور شاداب کر دینا اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ آسمان اور زمین دونوں میں ایک ہی خدائے حکیم و قدیر کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر ان کے اندر الگ الگ مختلف ارادے کارفرما ہوتے، جیسا کہ مشرکین سمجھتے ہیں، تو یہ توافق

کہاں سے وجود میں آتا جس پر اس دنیا کے بقا کا انحصار ہے۔

بعث و نشر کی دلیل — پھر یہ نہایت واضح نشانی قیامت اور بعث و نشر کی بھی ہے۔ جو خدا زمین کے چٹیل اور خشک مردہ ہو جانے کے بعد بارش کے ایک ہی چھینٹے سے اس کو حیات تازہ بخش دیتا ہے اس کے لیے قیامت کے دن لوگوں کو ان کی قبروں سے اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے۔

فعل اپنے حقیقی معنی میں — فعل 'یَسْمَعُوْنَ' یہاں اپنے حقیقی معنی میں ہے۔ یعنی جو لوگ بات کو کان کھول کر سنتے، اس کو سمجھتے اور اس کو قبول کرتے ہیں ان کے لیے تو اس کے اندر توحید اور قیامت سب کی دلیل موجود ہے۔ رہے وہ لوگ جو سننے اور سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں تو وہ خدا کے قانون کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کے کانوں کو کوئی چیز بھی نہیں کھول سکتی۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآىِٕغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ (۶۶)

دودھ کی نعمت کی طرف اشارہ — پانی کی نعمت کے بعد یہ دودھ کی نعمت کی طرف اشارہ فرمایا کہ غور کرنے والوں کے لیے چوپایوں کے اندر بھی خدا کی رحمت و ربوبیت اور اس کی توحید کے بڑے درس موجود ہیں۔ یہ چوپائے اسی زمین کی گھاس اور سبزیاں چرتے ہیں، جو ان کے پیٹوں میں ایک مرحلہ میں گوبر بنتی ہیں اور ایک مرحلہ میں خون، پھر اسی گوبر اور خون کے درمیان کے مرحلہ سے دودھ پیدا ہوتا ہے جس میں نہ گوبر کا کوئی شائبہ ہوتا ہے اور نہ خون کا، وہ ہر آمیزش سے بالکل پاک اور پینے والوں کے لیے نہایت خوش گوار، لذیذ اور غذا بخش ہوتا ہے۔ یہ ساری صورت حال اس بات کی شاہد ہے کہ یہ ساری کائنات ایک ہی صناع و حکیم اور ایک ہی قدیر و رحیم کے ارادے کے تحت چل رہی ہے یا اس بات کی شاہد ہے کہ اس کے اندر مختلف ارادے اپنے اپنے طور پر کام کر رہے ہیں؟

حصول عبرت علم کی کلید ہے — 'عِبْرَة' کے معنی ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک پہنچ جانا ہے۔ یہی عبرت علم کی کلید ہے۔ جس کے اندر یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں ان کے لیے ایک دروازہ کھل جانے تو اس کی روشنی میں دوسرے دروازے خود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ اپنی اس صلاحیت کو مردہ کر دیتے ہیں، ان کے عقل و دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، وہ دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن ان کو سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۗ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۶۷)

بعض اور غذاؤں کی طرف اشارہ — یعنی جس طرح اس نے چوپایوں سے تمہارے لیے دودھ پیدا کیا ہے اسی طرح کھجور اور انگور سے بھی تمہارے لیے غذا فراہم کی، تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بنا لیتے ہو اور پاکیزہ غذا بھی حاصل کرتے ہو۔

یہاں 'رِزْقًا' کے ساتھ 'حَسَنًا' کی صفت لگا کر ضمناً اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ کھجور اور انگور اور اس طرح کی چیزوں سے نشہ آور چیزیں تیار کرنا ان کا صحیح استعمال نہیں ہے بلکہ یہ ان چیزوں کا سوء استعمال

ہے۔ ان کا صحیح استعمال یہی ہے کہ ان سے پاکیزہ اور صحت بخش غذا حاصل کی جائے جس سے جسم اور عقل دونوں کو توانائی حاصل ہو نہ کہ ان کو ایسی شکل میں تبدیل کر دیا جائے کہ وہ عقل اور دل کو ماؤف کر دینے والی بن جائیں۔

ان تنوعات کی حکمت

'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ' یعنی اللہ نے اپنی نعمتوں میں یہ گوناگونی و بوقلمونی اس لیے رکھی ہے کہ سوچنے والے سوچیں اور سمجھنے والے سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دنیا اپنی بقا کے لیے ان تنوعات کی محتاج نہیں تھی، یہ بالکل سادہ اور یک رنگ بلکہ بالکل بے رنگ بھی ہو سکتی تھی لیکن اس کے خالق نے یہ چاہا کہ یہ اس کی صفات کا ایک پرتو اور مظہر ہو تاکہ غور کرنے والے غور کریں اور اس کی ایک ایک چیز سے اس کے خالق کی اعلیٰ صفات، اس کی بے نہایت قدرت و حکمت، اس کی غیر محدود رافت و رحمت، اس کی بے مثال ربوبیت و پروردگاری اور اس کی کامل وحدت و یکتائی کا کچھ تصور اور اس کی روشنی میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس کریں۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (۶۸-۶۹)

'وحی' اور 'ذلل' سے مراد

'وحی' سے یہاں مراد وہ جبلی اور فطری وحی ہے جو ہر مخلوق کو اپنے اندر کی ودیعت کردہ صلاحیتیں استعمال کرنے کے لیے فاطر فطرت و جبلت کی طرف سے ہوئی ہے۔ 'ذُلُل' 'ذَلُوْل' کی جمع ہے جس کے اصل معنی مطیع و منقاد کے ہیں۔ یہاں 'سبل' کی صفت ہے اس وجہ سے اس کے معنی ہموار، سیدھے اور بیٹھے ہوئے راستوں کے ہوں گے۔

شہد کی نعمت کی طرف اشارہ

پھلوں کی نعمت کے بعد یہ شہد کی نعمت کا ذکر فرمایا جو شہد کی مکھیاں انہی پھلوں سے تیار کرتی ہیں۔ فرمایا کہ تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو یہ القا کیا کہ (پہاڑوں، درختوں اور لوگوں کی بنائی ہوئی چھتوں میں اپنے چھتے بنا، پھر ہر قسم کے رس چوس اور تیرے رب نے تیری صلاحیتوں کے ظہور کے لیے جو راستے ہموار کر دیے ہیں ان پر سرگرمی کے ساتھ مصروف کار رہ۔ چنانچہ وہ اپنی جبلت کی رہنمائی میں پوری سرگرمی کے ساتھ مصروف کار رہتی ہے جس کے نتیجہ میں ان مکھیوں کے پیٹوں سے ایک مشروب برآمد ہوتا ہے جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور جن میں لوگوں کے لیے ان کے مختلف امراض کا علاج ہے۔

آیات الٰہی سے فائدہ اٹھانے والوں کی صفتیں

'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ' یہ ایک شہد کی مکھی کے اندر سے اللہ نے اپنی جو آتی قدرت و حکمت اور اتنی رحمت و ربوبیت کا اظہار فرمایا یہ اس لیے فرمایا کہ لوگ تفکر و تدبر کریں، اس کائنات کے خالق کی صفات کو سمجھیں اور ان کے تقاضوں کی روشنی میں اپنی دنیا اور آخرت کو سنواریں۔

'یَسْمَعُوْنَ'، 'یَعْقِلُوْنَ' اور 'یَتَفَکَّرُوْنَ' کا مطلب

اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے فائدہ اٹھانے والوں کی بالترتیب تین صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک 'یَسْمَعُوْنَ' یعنی وہ کھلے کانوں سے معقول باتوں کو سنتے اور ان کو قبول کرتے ہیں، دوسری

'یَعْقِلُوْنَ' یعنی وہ اپنی عقل سے کام لیتے ہیں اور سوچنے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، تیسری 'یَتَفَکَّرُوْنَ' یعنی وہ برابر اسرارِ کائنات میں تفکر و تدبر کرتے اور حقائق سے حقائق تک پہنچنے کی سعی میں لگے رہتے ہیں۔

یہی صفتیں انسانیت کا اصلی جوہر ہیں اور ان میں ایک حکیمانہ تدریج و ترتیب ہے۔

پہلا مرحلہ 'یَتَذَکَّرُوْنَ' — اس کائنات کے حقائق میں سے بے شمار حقائق ایسے ہیں جو بدیہیاتِ فطرت کے حکم میں داخل ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لیے کسی بڑی کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک معقول انسان اول تو ان کو خود سمجھتا ہے اور اگر خود نہیں سمجھتا ہے تو چونکہ معقول باتوں کے لیے اس کے کان کھلے ہوئے ہوتے ہیں اس وجہ سے دوسرے کسی معقول آدمی کی زبان سے ان کو سنتے ہی 'از دل ریزد بر دل ریزد' کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔

دوسرا مرحلہ 'یَعْقِلُوْنَ' — دوسرا مرحلہ 'یَعْقِلُوْنَ' کا ہے جہاں سوچنے سمجھنے اور عقل سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے جہاں مقدمات کی ایک ترتیب ہوتی ہے اور پھر ان سے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ یہ مرحلہ پہلے مرحلہ سے اونچا ہے اور علم کی راہ میں اس کے ثمرات بھی زیادہ وقیع ہیں لیکن ہے یہ عام عقل کی دسترس کی چیز۔ جو لوگ اپنی عقل کی قدر کرتے اور اس نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہ اس کی برکات سے محروم نہیں رہتے۔

تیسرا مرحلہ 'یَتَفَکَّرُوْنَ' — تیسرا مرحلہ 'یَتَفَکَّرُوْنَ' کا ہے یہ سب سے اونچا مرحلہ ہے۔ یہ ان لوگوں کا مقام ہے جو اسرارِ کائنات میں برابر غور کرتے اور علم کے مدارج برابر طے کرتے رہتے ہیں۔ یہ حکماء کا درجہ ہے۔ جس طرح شہد کی مکھی اپنی بے مثال کاوش سے طرح طرح کے پھولوں سے رس چوس کر شہد بناتی ہے جس میں لوگوں کے لیے غذا اور شفا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ اپنے تدبر و تفکر کی کاوشوں سے حکمت کا شہد جمع کرتے ہیں جس میں عقل و دل کے امراض کا مداوا ہوتا ہے۔ وہ خود بھی اس سے آسودہ رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے فیض پہنچتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ (۷۰)

زندگی اور موت خدا کی طرف سے ہے — یعنی زندگی اور موت اور عمر کی چھوٹائی اور بڑائی بھی خدا ہی کی طرف سے ہے۔ چنانچہ تم میں سے کتنے ہیں جو بچپن یا جوانی ہی میں مر جاتے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو ارذلِ عمر تک پہنچتے ہیں یہاں تک کہ ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ جاننے کے بعد کچھ نہیں جانتے۔ علیم و قدیر خدا ہی ہے۔ وہی تمام علم کا منبع ہے اور وہی ہر چیز کے لیے اندازے اور پیمانے مقرر کرتا ہے۔

عمر کا طول و قصر خدا کی طرف سے ہے — 'وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ' کا اسلوبِ بیان اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے پہلے کلام میں کچھ حذف ہے یعنی تم میں کچھ تو بچپن یا جوانی ہی میں مر جاتے ہیں اور کچھ ارذلِ عمر کو پہنچتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عمر کا طول و قصر خدا ہی کی طرف سے ہے، اس میں کسی دوسرے کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

قدرت کا ایک اشارہ — 'لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا' میں 'لِکَیْ' کا صحیح حق ادا کیجیے تو اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ قدرت بعض لوگوں کو ارذلِ عمر تک پہنچا کر یہ حقیقت ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ علم و عقل اور قدرت و اختیار سب خدا ہی کا عطیہ

بنتے۔ وہی انسان جس کو اپنے علم اور اپنی عقل پر بڑا ناز ہوتا ہے ایک وقت اس پر ایسا آتا ہے جب وہ خود بھی دیکھ لیتا ہے اور دوسرے بھی دیکھ لیتے ہیں کہ وہ شیرخوار بچوں کی طرح عقل و علم اور قدرت و اختیار سے بالکل عاری ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو اپنے تن بدن تک کا کچھ ہوش نہیں رہ جاتا۔ وہ تمام تر دوسروں پر انحصار کرتا اور اپنی ضروریات میں ان کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کی تمام علمی و عقلی صلاحیتیں اسی خدا کی طرف واپس ہو جاتی ہیں جو ان کا اصل عطا کرنے والا ہے۔ اس لیے کہ علیم و قدیر خدا ہی ہے۔ جس کو جس حد تک بھی علم و قدرت کی نعمت ملتی ہے خدا ہی سے ملتی ہے اس وجہ سے اس پر فخر و غرور جائز نہیں ہے بلکہ اس کا شکر واجب ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۷۱)

رزق بھی خدا ہی کا عطیہ ہے

عمر اور علم و عقل کی طرح رزق بھی خدا ہی کا عطیہ ہے۔ اسی نے کسی کو کم دیا ہے اور کسی کو زیادہ۔ یہ کسی کے اپنے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جتنا چاہے اپنے رزق میں اضافہ کر لے۔ اس وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ خدا ہی کا شکر گزار ہو اور اللہ کے بخشے ہوئے رزق و فضل کو دوسروں کی طرف منسوب کر کے اصل رازق کی ناشکری نہ کرے۔

انسانی فطرت کی ایک حقیقت

فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ الآیۃ۔ یہ انسانی فطرت کی ایک حقیقت کی طرف توجہ دلا کر اس سے جو سبق حاصل ہوتا ہے اس کو سامنے رکھا ہے کہ تمھارا اپنا حال تو یہ ہے کہ جن کو رزق میں برتری حاصل ہے وہ یہ نہیں کرتے کہ اپنی دولت اپنے غلاموں اور مملوکوں میں بانٹ کر خود ان کے برابر ہو جائیں اور ان کو اپنے برابر کر لیں تو خدا کے متعلق تم نے کیسے یہ فرض کر لیا کہ وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا اپنے غلاموں اور مملوکوں میں بانٹ کر خود ان کی سطح پر آ گیا ہے۔ یہ تو خدا کی نعمتوں کا صریح انکار ہے کہ اس کی بخشی ہوئی چیزوں کو ان کی طرف منسوب کیا جائے جن کو ان کے پیدا کرنے میں سر مو دخل نہیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ (۷۲)

بیوی بچوں کی نعمت خدا ہی سے ملی ہے

یعنی رزق و فضل کی طرح بیوی بچوں کی نعمت بھی تمھیں خدا ہی سے ملی ہے۔ اسی نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے بیویاں بنائیں اور ان سے بیٹوں اور پوتوں کا سلسلہ جاری کیا اور پاکیزہ چیزیں کھانے اور برتنے کو دیں۔ ان نعمتوں کا حق تو یہ تھا کہ لوگ خدا ہی کا شکر کرتے اور اسی پر ایمان لاتے لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ باطل معبودوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور اصل منعم کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (۷۳)

ایمان بالباطل کی تفصیل

یہ اس ایمان بالباطل اور ناشکری کی تفصیل ہے کہ وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ آسمان سے ان کے لیے کوئی رزق اتارنے پر اختیار رکھتی ہیں نہ زمین سے کوئی چیز برآمد کرنے پر۔ اور صرف یہی نہیں کہ بالفعل ان کو اختیار حاصل نہیں ہے بلکہ اگر وہ چاہیں بھی اور اس کے لیے اپنا پورا زور بھی صرف کر ڈالیں جب بھی ان کو اس کا اختیار حاصل نہیں ہو سکتا۔

فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۷۴)

صفات الٰہی کے بیان میں تمثیل سے احتراز کی ہدایت

'ضَرْبِ مَثَل' سے یہاں مراد تمثیل و تشبیہ کو ذریعہ بنا کر خدا کے لیے صفتیں بیان کرنا ہے۔ مثلاً یہ کہ اپنے اوپر قیاس کر کے یہ کہا جائے کہ خدا کے بیٹیاں ہیں یا دنیوی بادشاہوں پر قیاس کر کے خدا کو ان کی جیسی صفات سے متصف کیا جائے۔ شرک کے بیشتر دروازے اسی تمثیل و تشبیہ سے کھلے ہیں اس وجہ سے اوپر کی آیات میں خدا کی صفات کے باب میں صحیح رہنمائی دے کر اس فتنہ کے دروازے کو بند کر دیا۔ فرمایا کہ خدا کی صفات کے معاملے میں تشبیہ و قیاس کو رہنما نہ بناؤ۔ خدا اپنی صفات کو خود ہی جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ اس وجہ سے اپنی صفتیں جو وہ بتاتا ہے ان کو مانو اور ان پر ایمان لاؤ۔ یہی راستہ ہدایت کا ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۷۵)

خدا کی بیان کردہ تمثیل

یعنی اگر مثال ہی سننی ہے تو خدا مثال بیان کرتا ہے اس کو سنو۔ ایک طرف ایک غلام مملوک ہے جس کو کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں ہے اور دوسری طرف ایک آزاد ہے جس کو خدا نے خوب رزق و فضل دے رکھا ہے، وہ پوری آزادی سے پوشیدہ اور علانیہ اس میں سے خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں یکساں ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ نہیں، تو پھر خدا اور اس کے مملوکوں کو کس طرح یکساں کر دیتے ہو؟

'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ' یعنی صحیح طور پر سوچیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ شکر کا سزاوار اللہ ہے لیکن ان میں سے اکثر اس بدیہی حقیقت سے واقف نہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰي مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۷۶)

ایک دوسری تمثیل

یعنی ایک دوسری تمثیل سنو۔ دو شخص ہیں جن میں سے ایک گونگا بہرا[۱] غلام ہے، کسی چیز پر کوئی قدرت نہیں رکھتا، وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی اس کو بھیجتا ہے کوئی کام وہ صحیح کر کے نہیں لاتا اور ایک دوسرا شخص ہے جو آزاد ہے، دوسروں کو عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود بھی سیدھے راستہ پر ہے۔ کیا یہ دونوں شخص یکساں ہوں گے؟ اگر نہیں تو پھر تم خدا اور اس کی عاجز و بے بس مخلوقات کو

۱؎ یہ واضح رہے کہ گونگے اکثر حالات میں بہرے بھی ہوتے ہیں۔

یکساں کیسے کیے دیتے ہو۔

وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۷۷)

اثنائے کلام میں ایک تنبیہ

یہ اثنائے کلام میں ضدی مخاطبوں کو ایک تنبیہ ہے کہ قیامت کو بہت بعید نہ سمجھو۔ اگر اس کا وقت معلوم نہیں ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ آئے گی ہی نہیں۔ آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ ہی کے علم میں ہے۔ جب وہ اس کو لانا چاہے گا تو وہ آنکھ جھپکنے کی طرح آجائے گی بلکہ اس سے بھی جلد تر۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۷۸)

اللہ کی نعمتوں کا حق

یعنی انسان جب پیدا ہوتا ہے تو صرف ایک مضغۂ گوشت ہوتا ہے، عقل و علم اور قوت و صلاحیت سے بالکل عاری۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو سمع و بصر اور دل و دماغ کی قوتیں عطا فرماتا ہے۔ ان نعمتوں کا حق یہ ہے کہ تم اللہ کے شکرگزار بنو لیکن اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان نعمتوں کو پاکر ان کو خدا ہی کی ناشکری کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اسی مضمون کو سورۂ ملک میں یوں بیان فرمایا ہے۔ قُلْ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (کہہ دو کہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمھیں سمع و بصر اور دل عطا فرمائے لیکن تم بہت کم شکرگزار ہوتے ہو)۔

اَلَمْ یَرَوْا اِلَى الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۷۹)

آیات الٰہی کی طرف اشارہ

یعنی اگر یہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انھیں معلوم ہو کہ ہر چیز کو اس کی ضرورت کی چیزیں خدا ہی کی عنایت سے ملی ہیں۔ پرندے فضا میں اڑتے ہیں۔ آخر خدا کے سوا کون ہے جو ان کو فضا میں تھامتا ہے۔ سورۂ ملک میں ہے اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَى الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقْبِضْنَ ؕۘ مَا یُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍۭ بَصِیْرٌ (کیا انھوں نے اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھا، وہ اپنے پروں کو پھیلائے ہوئے بھی ہوتے ہیں اور ان کو سمیٹ بھی لیتے ہیں، ان کو خدائے رحمان ہی تھامتا ہے، بے شک وہ ہر چیز کی دیکھ بھال کرنے والا ہے)۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ یعنی جو لوگ ایمان لانا چاہیں ان کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ اس میں سب سے بڑی نشانی تو اس بات کی ہے کہ اس کائنات کا خالق رحمان و رحیم ہے، اس نے جو چیز بھی پیدا کی اس کو ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کیں اور اس کو ان کے استعمال کا سلیقہ عطا فرمایا۔ اس میں اس بات کی بھی نشانی ہے کہ یہ کائنات ایک ہی خدا وحدہٗ لاشریک لہٗ کے تصرف

میں ہے وہی اس کے افراد میں توافق و سازگاری پیدا کرتا ہے اور فضا کو پرندوں کی جولانگاہ بنا دیتا ہے۔

اس میں اس بات کی بھی نشانی ہے کہ جو چیز جہاں تھمی ہوئی ہے خدا ہی کے تھامے تھمی ہوئی ہے اگر وہ نہ تھامے تو کوئی چیز بھی اپنی جگہ پر ٹکی نہیں رہ سکتی۔ سورہ ملک میں ہے۔ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ ۝ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرِ (۱۵-۱۷) (وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو فرمانبردار بنا دیا تو اس کے مونڈھوں پر چلو پھرو، اور اس کے رزق میں سے کھاؤ اور اسی کی طرف اکٹھے ہونا ہے۔ کیا تم اس سے جو آسمان میں ہے بے خوف ہو گئے کہ وہ تمہارے سمیت زمین کو دھنسا دے، پس وہ دفعۃً چکر کرنے لگے۔ کیا تم اس سے جو آسمان میں ہے بے خوف ہو گئے کہ وہ تم پر سنگریزے برسا دینے والی آندھی بھیج دے تو تم جان لو گے کہ میرا ڈراوا کیسا ہے)

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُیُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا یَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَیَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ (۸۰)

خود اپنے حالات پر غور کرنے کی دعوت

یعنی پرندوں کو تو تم نے دیکھا کہ ان کا خیمہ و خرگاہ سب ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب ذرا اپنے حالات پر غور کرو کہ اللہ نے کس کس طرح تم کو اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو وجہ سکون و راحت بنایا، دن بھر کے تھکے ماندے جب تم اپنے گھروں کو واپس لوٹتے ہو تو کیسی راحت پاتے ہو اور رات کی تاریکی میں کیسی حفاظت کا احساس کرتے ہو۔ پھر خدا ہی ہے جس نے جانوروں کی کھالوں کو خیمے بنانے کے لیے موزوں بنا دیا جن سے تم خیمے بنا لیتے ہو جو تمہارے کوچ و قیام کے لیے نہایت ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ پھر انہی جانوروں کی اون اور ان کے بالوں سے تم اپنے دوسرے سامان اور ضرورت کی چیزیں تیار کر لیتے ہو جو تمہارے کام آتی ہیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِیْلَ تَقِیْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ (۸۱)

ظلال اور منازل کی طرف اشارہ

پھر اور دیکھو، یہ خدا ہی ہے جس نے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں میں تمہارے لیے سایہ پیدا کر دیا۔ تمہارے لیے پہاڑوں میں پناہ گاہیں بنا دیں، تمہارے لیے ایسے لباس بنا دیے جو گرمی اور دھوپ کی لپٹ سے تمہیں بچاتے اور جنگوں میں تمہاری حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ نے یہ اتمام نعمت تم پر اس لیے کیا کہ تم خدا کے سوا کسی اور کے محتاج نہ رہو اور اپنے آپ کو کلیۃً اپنے رب ہی کے حوالے کر دو۔

لباس کے ذکر میں گرمی سے حفاظت کا جو حوالہ آیا ہے یہ قرآن کے ابتدائی مخاطب اہل عرب کی رعایت سے ہے بلکہ اس سے اوپر جو چیزیں مذکور ہوئی ہیں ان میں بھی اہل عرب اور ان کی بدویانہ زندگی کی رعایت ملحوظ ہے۔ کلام کے حسن اور اس کے اثر کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے خطاب کے اس پہلو کا لحاظ رکھنا بھی ضروری

ہوتا ہے۔

روزمرہ کے استعمال کی اشیا کی نعمت

یہ امر بھی ملحوظ رکھیے کہ اوپر جن چیزوں کے حوالے آئے ہیں یہ روزمرہ زندگی کی عام چیزیں ہیں جن سے مخاطب گروہ کے ہر شخص کو سابقہ تھا۔ قرآن نے ان کا ذکر کر کے گویا توجہ دلائی ہے کہ جب ان چیزوں میں سے بھی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کو تم خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر سکو تو خدا کے سوا تم دوسروں کو کیوں پوجتے ہو آخر وہ کس مرض کی دوا ہیں؟ پھر تو تمہیں بالکلیہ اپنے آپ کو خدا ہی کے حوالے کرنا چاہیے جس نے تمہاری چھوٹی چھوٹی ضروریات تک کا اہتمام کیا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۸۲)

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہے کہ اگر یہ اعراض و انکار پر جم گئے تو تم زیادہ ان کے درپے نہ ہو تمہارے اوپر ان کے ایمان کی ذمہ داری نہیں ہے، صرف واضح طور پر حق کو پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ تم اپنا فرض ادا کر کے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ اپنی اس ضد کا انجام خود دیکھیں گے۔

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۸۳)

یعنی یہ بات نہیں ہے کہ یہ باتیں ان کی سمجھ میں نہ آرہی ہوں، آخر ایسا کون کودن ہو سکتا ہے کہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ ساری نعمتیں اللہ ہی کی بخشی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ جان کر انجان بنتے ہیں اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں، ان کے اندر سے ایمان لانے والے تھوڑے ہی نکلیں گے۔ تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ خود بھگتیں گے۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۸۴-۹۰

رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہے

اوپر رسولوں کی ذمہ داری کی آخری حد واضح کر دی گئی ہے۔ آگے اسی تعلق سے یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ رسول کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد کسی قوم کے لیے گمراہی پر قائم رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے گا جس کو وہ خدا کے سامنے پیش کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں حق کی تبلیغ اور اتمام حجت کے لیے اپنے رسول بھیجے۔ وہ ان سے قیامت کے دن گواہی دلوا دے گا کہ انھوں نے اللہ کا پیغام لوگوں کو پہنچا دیا۔ یہی حیثیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس امت کے لوگوں کے لیے ہے۔ اسی مقصد کے لیے اللہ نے آپ پر یہ کتاب اتاری ہے۔ اس کتاب کا جو بنیادی پیغام ہے آخر میں اس کا اجمالی حوالہ ہے۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۸۴-۹۰

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا
هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ
عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ

قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ
فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ۣ الثلثة
السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ
صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا
يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ
اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ
تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾ ع ۱۲ ۲ ۱۸
اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۗئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى
عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾

ترجمۂ آیات ۸۴-۹۰

اور یاد کرو اس دن کو جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ اٹھائیں گے، پھر جن لوگوں نے کفر کیا ہو گا نہ ان کو عذر پیش کرنے کی اجازت دی جائے گی اور نہ ان سے یہ فرمائش ہو گی کہ وہ خدا کو راضی کریں۔ اور جب وہ لوگ، جنھوں نے ظلم کیا ہو گا، عذاب کو دیکھ لیں گے تو پھر نہ وہ ان سے ہلکا ہی کیا جائے گا اور نہ انھیں مہلت ہی دی جائے گی۔ اور جب وہ لوگ، جنھوں نے شرک کیا ہے، اپنے شریکوں کو دیکھیں گے، پکاریں گے کہ اے ہمارے رب یہی ہمارے وہ شرکاء ہیں جن کو ہم تجھے چھوڑ کر پکارتے رہے تو وہ ان پر بات پھینک ماریں گے کہ تم بالکل جھوٹے ہو۔ اور وہ اس دن اللہ کے آگے سپر ڈال دیں گے اور جو کچھ وہ افترا کرتے رہے تھے وہ سب ہوا ہو جائے گا۔ جن لوگوں نے کفر کیا اور لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکا ہم ان کے عذاب پر عذاب کا اضافہ کریں گے بوجہ اس کے کہ وہ فساد مچاتے رہے۔ ۸۴-۸۸

اور یاد کرو جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ ان پر انھیں میں سے اٹھائیں گے اور تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے اور ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے ہر چیز کو کھول دینے کے لیے اور وہ ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے فرماں برداروں کے لیے بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا اور ذوی القربیٰ کو دیتے رہنے کا اور روکتا ہے بے حیائی، برائی اور سرکشی سے، وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو۔ ۸۹-۹۰

۱۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ (۸۴)

'امۃ' سے امت دعوت مراد ہے

'اُمَّۃٌ' سے یہاں مراد امت دعوت ہے جس کی طرف کسی رسول کی بعثت ہوتی ہے۔

'شہید' سے مراد رسول ہے

'شَہِیْد' سے مراد رسول ہے اس لیے کہ وہی دنیا میں اپنی قوم کے لوگوں پر حق کی گواہی دیتا ہے اور وہی قیامت کے دن گواہ بنا کر کھڑا کیا جائے گا اور گواہی دے گا کہ اس نے اللہ کا دین لوگوں کو پہنچا دیا تھا۔

'ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا' کے بعد کلام میں حذف ہے جس پر قرینہ دلیل ہے۔ یعنی قیامت کے روز رسولوں کی گواہی کے بعد کافروں کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ عذر و معذرت کے لیے زبانیں کھولیں۔

'استعتاب' کا مفہوم

'اِسْتِعْتَاب' کے معنی ہیں کسی کا کسی سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اس کی وجہ شکایت کو رفع کر کے اس کو راضی کرے۔ یہاں اس سے یہ مراد ہے کہ قیامت میں کافروں اور نافرمانوں سے یہ فرمائش نہیں کی جائے گی کہ وہ خدا کو راضی کرنے کی کوشش کریں اس لیے کہ اس وقت سعی و عمل کے دروازے بند ہو چکیں گے اور جزا و سزا کا مرحلہ شروع ہو جائے گا۔ مابعد الموت من مستعتب ولا بعد الدنیا دار الا الجنۃ او النار۔

کفار کو تنبیہ

یہ کفار کو تنبیہ ہے کہ اپنی سرکشی میں بہت آگے نہ بڑھتے جاؤ۔ اس دن کو بھی یاد رکھو جس دن ہر امت میں سے اس کی طرف بھیجے ہوئے رسول کو ہم گواہ بنا کر اٹھائیں گے اور اسی سے گواہی دلوائیں گے کہ اللہ کا پیغام اس نے پورا پورا لوگوں کو پہنچا دیا تھا۔ پھر نہ کسی کو عذر و معذرت پیش کرنے کے لیے زبان کھولنے کی اجازت دی جائے گی اور نہ کسی سے یہ کہا جائے گا کہ وہ اللہ کے غضب کو دور اور اس کو راضی کرنے کی کوشش کرے اس لیے کہ رسول کے اتمام حجت کے بعد نہ کسی عذر و معذرت کا موقع باقی رہتا اور نہ قیام قیامت کے بعد خدا کو راضی کرنے کے لیے کسی سعی کا۔

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ (۸۵)

'اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' سے یہاں مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے شرک کر کے خدا کے حقوق بھی تلف کیے اور اپنی جانوں پر بھی ظلم ڈھائے۔ فرمایا کہ یہ ظالم لوگ جب قیامت کے دن خدا کے عذاب کی پکڑ میں آجائیں گے تو پھر نہ اس عذاب میں کوئی تخفیف ہی ہوگی اور نہ عارضی طور پر ہی ان کو اس سے مہلت نصیب ہوگی، بلکہ وہ عذاب سخت سے سخت تر ہی ہوتا جائے گا اور اس کے تسلسل میں بھی کوئی انقطاع واقع نہ ہوگا۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۸۶)

مشرکین اور ان کے شرکاء میں ردوبدل

یعنی آج یہ مشرکین اپنے جن شریکوں پر اعتماد کیے بیٹھے ہیں وہ بھی روز حساب ان کو جھوٹا قرار دیں گے۔ یہ جب اپنے ان شریکوں کو دیکھیں گے تو پکاریں گے کہ اے پروردگار! یہی ہیں وہ جن کو ہم تیرے سوا پکارتے رہے ہیں۔ وہ جھٹ ان کے منہ پر بات پھینک ماریں گے کہ تم بالکل جھوٹے ہو۔ یعنی ہمیں کیا خبر کہ تم ہمیں پکارتے رہے ہو۔ اگر تم اس حماقت و جہالت میں مبتلا رہے ہو تو ذمہ داری سر تا سر تمھاری ہے، تم اس کو بھگتو۔ ہمیں اس میں کیوں گھسیٹنے کی کوشش کر رہے ہو۔ ہم نے تم سے کب کہا تھا کہ تم خدا کو چھوڑ کر ہمیں پکارو۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین کا یہ کہنا کہ یہی ہیں ہمارے شریک جن کو ہم تیرے سوا پکارتے رہے ہیں، فی الجملہ اپنے آپ کو بری ٹھہرانے کے لیے ہوگا کہ اصلی مجرم یہ ہیں جن کے سبب سے ہم گمراہ ہوئے۔ اس روشنی میں دیکھیے تو شرکاء کے جواب کی تلخی کا اصل رخ واضح ہوگا۔

وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ِالسَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۸۷)

لفظ 'سَلَم' کی تحقیق آیت ۲۸ کے تحت گزر چکی ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ جن کی زندگی بھر پوجا کرتے رہے وہی روز حساب ان کو جھوٹا قرار دیں گے تو ان کے لیے عذر و معذرت اور اپنی برأت میں کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جائے گی۔ پھر تو وہ بالکل بے بس ہو کر سپر ڈال دیں گے اور ان کے وہ دیوی دیوتا جن کو خدا پر افترا کر کے انھوں نے خدا کا شریک بنایا تھا، سب غائب ہو جائیں گے۔

یہاں شرک کو 'افترا' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین جن کو پوجتے تھے ان کی نسبت بالکل بے سند وہ یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ خدا نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صریح افترا علی اللہ ہے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ (۸۸)

شرک کے لیڈروں کے لیے مزید عذاب

یہ کنایہ مشرکین کے ان لیڈروں کی طرف اشارہ ہے جو صرف خود ہی مبتلائے کفر و شرک نہیں تھے بلکہ دوسروں کو بھی اللہ کی راہ سے روکتے تھے۔ فرمایا کہ ہم ان کے اس افساد کی پاداش میں ان کے عذاب پر عذاب کا اضافہ کریں گے۔ ان کو خود ان کی گمراہی کی بھی سزا بھگتنی ہوگی اور دوسروں کی گمراہی میں ان کا جو حصہ ہوگا اس کے بقدر وہ اس کی سزا بھی بھگتیں گے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ أَنفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (۸۹)

نبی صلعم دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے

یہ مضمون اوپر آیت ۸۴ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہاں یہ اضافہ ہے کہ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ یعنی جس طرح ہم تمام امتوں میں سے ایک گواہ ان پر کھڑا کریں گے اسی طرح تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر اٹھائیں گے۔ "ان لوگوں پر" یعنی ان اہل عرب پر جن کی طرف تمھاری بعثت براہ راست ہے اور جو تمھاری امت دعوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے اہل عرب کی طرف آپ کی بعثت براہ راست ہوئی اور تمام خلق کی طرف آپ کی امت کے واسطہ سے جس کو شُهَدَاءُ اللَّهِ فِي الْأَرْضِ کی حیثیت حاصل ہے اور جس پر اب قیامت تک خلق کی رہنمائی کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔

کتاب الٰہی، اتمام حجت کا ذریعہ ہے

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ میں اس چیز کا حوالہ ہے جو اس دنیا میں حق کی گواہی اور لوگوں پر اتمام حجت کا ذریعہ ہے۔ فرمایا کہ تمھارے اسی فرض منصبی کے تقاضے سے ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے جو شہادت حق کے لیے تمام پہلوؤں سے جامع اور مکمل اور ہر متعلق چیز کو اچھی طرح واضح کر دینے والی ہے تاکہ کسی کے لیے گمراہی پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اس کتاب کی تعریف میں مزید یہ فرمایا کہ هُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ یہ ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے جو اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دیں۔ یہ ان کو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرے گی پھر جو اس صراط مستقیم کو اختیار کر لیں گے ان پر خدائے رحمان و رحیم کی عظیم رحمت ہوگی اور یہ عظیم رحمت کی پیشگی بشارت ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (۹۰)

قرآنی اوامر و منہیات کا خلاصہ

یہ عظیم آیت تمام قرآنی اوامر و منہیات کا خلاصہ ہے۔ قرآن جن باتوں کا حکم دیتا ہے ان کی بنیادیں بھی اس میں واضح کر دی گئی ہیں اور جن چیزوں سے وہ روکتا ہے ان کی اساسات کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے۔ تمام قرآنی اوامر کی بنیاد عدل، احسان اور ذوی القربیٰ کے لیے انفاق پر ہے اور اس کی منہیات میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کے اندر فحشا، منکر اور بغی کی روح فساد پائی جاتی ہے۔ یہاں اس کا حوالہ دینے سے مقصود ان لوگوں کو متنبہ کرنا ہے جو قرآن کی مخالفت میں اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے تاکہ وہ سوچیں کہ جس چیز کی وہ مخالفت کر رہے ہیں اس کی تعلیم کیا ہے اور اس کی مخالفت سے کس عدل و خیر کی مخالفت اور کس شر و فساد کی حمایت لازم آتی ہے۔

یہاں نہایت اجمال کے ساتھ صرف اوامر و منہیات کی اساسات کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ کس طرح کے احکام ہیں جو عدل و احسان کے تحت آتے ہیں اور کس نوعیت کی منہیات ہیں جو فحشاء منکر یا بغی میں داخل ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل اس سے آگے کی سورہ ــ سورۂ بنی اسرائیل آیات ۲۲-۳۹ میں آئی

ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل سورۂ نحل کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے اس میں اس اجمال کی وضاحت کے لیے نہایت موزوں مقام تھا۔ ہم تکرارِ بحث سے بچنے کے لیے یہ مناسب خیال کرتے ہیں کہ اس اجمال کی وضاحت وہیں کی جائے۔ جب عدل، احسان، انفاق اور فحشا، منکر، بغی کے اہم اجزا بھی سامنے ہوں گے تو خیر و شر کے ان اصولوں کے سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی۔ وہیں انشاء اللہ ہم یہ بھی واضح کریں گے کہ اس تفصیل میں اور تورات کے احکامِ عشرہ میں بڑی مطابقت ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خیر و شر کے یہ اصول سابق ادیان میں بھی مسلم رہے ہیں۔

عدل کی توضیح

یہاں بالاجمال صرف یہ ذہن میں رکھیے کہ 'عدل' یہ ہے کہ جس کا جو حق واجب ہم پر عاید ہوتا ہے ہم بے کم و کاست اس کو ادا کریں، خواہ صاحبِ حق کمزور ہو یا طاقت ور اور خواہ وہ ہم کو مبغوض ہو یا محبوب۔

'احسان' کی توضیح

'احسان' عدل سے ایک زائد شے ہے۔ یہ صرف حق کی ادائیگی ہی کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ مزید برآں یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ دوسرے کے ساتھ ہمارا معاملہ کریمانہ اور فیاضانہ ہو۔

'ایتاءِ ذی القربیٰ' سے مراد

'ایتاءِ ذی القربیٰ' احسان کی ایک نہایت اہم فرع ہے۔ قرابت مند عدل و احسان کے حقدار تو ہیں ہی، مزید برآں وہ بر بنائے قرابت مزید انفاق کے مستحق ہیں، ہر صاحبِ مال کو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں پر فیاضی سے خرچ کرنا چاہیے۔

'فحشاء' سے مراد

'منکر' سے مراد

'فحشاء' کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کو کہتے ہیں۔ مثلاً زنا اور لواطت اور اس قبیل کی دوسری برائیاں۔

'منکر' معروف کا ضد ہے۔ معروف ان اچھی باتوں کو کہتے ہیں جن کا ہر اچھی سوسائٹی میں چلن ہو، مثلاً مہمانداری، مسافر نوازی اور اس قبیل کی دوسری نیکیاں۔ منکر اس کا ضد ہے تو اس سے مراد وہ باتیں ہوں گی جو معروف اور عقل و عرف کے پسندیدہ طریقہ اور آداب کے خلاف ہوں۔

'بغی' سے مراد

'بغی' کے معنی سرکشی اور تعدی کے ہیں یعنی آدمی اپنی قوت و طاقت اور اپنے زور و اثر سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اس سے دوسروں کو دبانے کی کوشش کرے۔

یہاں ان اجمالی اشارات پر قناعت کیجیے، آگے والی سورہ میں ان کی پوری تفصیل آئے گی۔

۱۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹۱-۹۵

یہود کو ملامت

آگے کی آیات میں خطاب یہود سے ہے اور یہ خطاب بغیر نام لیے اچانک اس طرح سامنے آگیا ہے جس طرح خطیب بسا اوقات محض رخ کی تبدیلی سے روئے سخن کو بدل دیتا ہے۔ اگرچہ وہ نام نہیں لیتا کہ خطاب کس سے ہے لیکن اس کی باتیں خود مخاطب کو معین کر دیتی ہیں۔ یہود اس مرحلہ میں اسلام کے باب میں غیر جانبدار نہیں رہ گئے تھے بلکہ وہ اس سے خطرہ محسوس کر کے اس کی مخالفت کے لیے اندر اندر سازشوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ انھوں نے قریش کے ان لیڈروں کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تھی جو اس دعوت سے روکنے کے لیے پورے

جوش و خروش سے میدان میں نکل آئے تھے۔ قرآن نے یہاں یہود کی اسی حرکت پر ان کو ملامت کی ہے کہ تم اللہ سے عہد باندھنے کے بعد محض بربنائے حسد مخالفین کی صف میں جا کھڑے ہوئے ہو اور اس بڑھیا کے مانند ہو جو اپنا کاتا بنا خود اپنے ہی ہاتھوں ادھیڑ کے رکھ دے۔ تم اللہ سے باندھے ہوئے عہد کے بخیے ادھیڑ رہے ہو۔ اللہ کے عہد کو متاع دنیا کے عوض نہ بیچو اور اپنی قسموں کو لوگوں کو حق سے برگشتہ کرنے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۹۱-۹۵

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ
تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا
تَفْعَلُوْنَ ﴿٩١﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ
اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ
اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٩٢﴾ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً
وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَلَتُسْـَٔــلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ
بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْۗءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ
وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٩٤﴾ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا
عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٩٥﴾

ترجمۂ آیات ۹۱-۹۵

اور اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو، جب کہ تم وہ باندھ چکے ہو، پورا کرو اور قسموں کو ان کو مؤکد کرنے کے بعد مت توڑو درآنحالیکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ ٹھہرا چکے ہو۔ بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ جس نے اپنا سوت خوب مضبوط کاتنے کے

بعد تار تار اور ھیٹر کے رکھ دیا۔ تم اپنی قسموں کو اس اندیشہ سے آپس کے فساد کا ذریعہ بناتے ہو کہ ایک امت دوسری امت سے کہیں بڑھ نہ جائے اللہ اس کے ذریعہ سے تمھاری آزمائش کر رہا ہے اور وہ قیامت کے دن اس چیز کو اچھی طرح تم پر واضح کر دے گا جس میں تم اختلاف کر رہے ہو۔ ۹۱-۹۲

اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ گمراہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کے باب میں ضرور تم سے پرسش ہونی ہے۔ ۹۳

اور تم اپنی قسموں کو آپس میں فریب کا ذریعہ نہ بناؤ کہ کوئی قدم جمنے کے بعد پھسل جائے اور تم اللہ کی راہ سے روکنے کی پاداش میں عذاب چکھو اور تمھارے واسطے ایک عذاب عظیم ہے اور اللہ کے عہد کو متاع قلیل کے عوض نہ بیچو۔ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ ۹۴-۹۵

۱۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمۡ وَلَا تَنۡقُضُوا الۡاَيۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡكِيۡدِهَا وَقَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰهَ عَلَيۡكُمۡ كَفِيۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا تَفۡعَلُوۡنَ (۹۱)

یہود کو ایفائے عہد کا حکم

اوپر آیت ۸۸ میں قریش کے ان اشرار کا ذکر گزر چکا ہے جو اللہ کے دین سے لوگوں کو روکنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ اب اس ضمن میں نام لیے بغیر یہود کو مخاطب کر لیا ہے اس لیے کہ اس مرحلہ میں انھوں نے بھی اپنے تمام مکر و فریب کے ساتھ اللہ کی راہ سے روکنے کی اس مہم کی پشت پناہی شروع کر دی تھی۔ ان کی طرف رخ کر کے فرمایا کہ اللہ سے جو عہد تم نے باندھا ہے اس کو پورا کرو اور اپنی قسموں کو موکد و موثق کرنے اور ان پر اللہ کو گواہ اور ضامن ٹھہرانے کے بعد نہ توڑو۔ یاد رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اور جو کچھ کرو گے اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شریعت کے ایک ایک حکم کو پوری جماعت کے سامنے پیش کرتے اور اللہ کو گواہ اور ضامن بنا کر لوگوں سے اس کی پابندی کا عہد لیتے اور لوگ قسم کھا کر اس کی پابندی کا عہد کرتے۔ اس طرح ان کی پوری شریعت کی حیثیت اللہ تعالیٰ اور بنی اسرائیل کے درمیان ایک عہد نامہ کی تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر تورات کو عہد نامہ کہتے ہیں۔ یہ عہد نامہ جس طرح شریعت کے عام احکام و قوانین پر مشتمل ہے، اسی طرح اس میں وہ عہد بھی شامل ہے جو بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل میں پیدا ہونے والے نبی امی کی تائید و نصرت کا لیا گیا تھا اوپر آیت اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ الاية کے تحت ہم یہ اشارہ بھی کر چکے ہیں کہ جن اساسات پر قرآن کے اوامر و نواہی مبنی ہیں بعینہٖ انہی اساسات پر تورات کے احکام عشرہ مبنی ہیں۔ قرآن نے یہاں انہی عہود کو یاد دلایا ہے کہ خدا سے جو عہد تم باندھ چکے ہو اس کو پورا کرو اور پابندی عہد کی پکی قسمیں کھانے اور ان پر اللہ کو ضامن اور گواہ ٹھہرانے کے بعد ان کو نہ توڑو، یاد رکھو کہ آج جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے اور کل تمہیں اس عہد کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا ۗ تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ ۚ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ ۚ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۹۲)

'انکاث' کا مفہوم

'انکاث'، 'نکث' کی جمع ہے جس کے معنی ادھیڑی ہوئی رسی یا تار تار کیے کپڑے یا سوت کے ہیں۔

'دخل' کا مفہوم

'دخل' کے معنی مکر و فریب اور فساد کے ہیں۔

یہود کی مفسدانہ سرگرمیوں کی طرف اشارہ

ان یہود ہی کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ جو اپنا کاتا ہوا سوت، اس کو اچھی طرح کاتنے اور مضبوط کرنے کے بعد، خود اپنے ہی ہاتھوں تار تار کر کے رکھ دے۔ یعنی پہلے تو تم نے عہد باندھا اور قسمیں کھا کھا کے اس کو خوب موکد و محکم کیا لیکن جب اس کو پورا کرنے کا وقت آیا تو اس عہد کے بخیے ادھیڑ کے رکھ دیے۔

'تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ' یعنی تم اپنی قسموں کو افساد اور مکر و فریب اور اللہ کے بندوں کو اللہ کی راہ سے روکنے اور ان کے جمے ہوئے قدموں کو اکھاڑنے کا ذریعہ بناتے ہو۔ یہ یہود کی ان مفسدانہ کوششوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ اسلام کی طرف مائل لوگوں کو اسلام سے روکنے یا اسلام قبول کر لینے والوں کو متزلزل کرنے کے لیے صرف کر رہے تھے۔ یہ قسمیں کھا کھا کر لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ یہ نیا دین سراسر خدائی دین کے خلاف ہے۔ ہمارے صحیفوں میں نہ اس کی کوئی سند موجود ہے اور نہ ہمارے نبیوں نے اس کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے۔ یہود کو چونکہ فی الجملہ مذہبی تقدس کی سند حاصل تھی اس وجہ سے ان کی یہ قسمیں ان لوگوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کرتی تھیں جو ان کی چالوں اور ان کے مخفی محرکات سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔

'اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ'۔ 'اَنْ' سے پہلے 'مَخَافَةَ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ اکثر محذوف ہو جایا کرتا ہے۔

یہود کی سرگرمیوں کا اصل محرک

یہود کی ان تمام مفسدانہ سرگرمیوں کے اصل محرک سے پردہ اٹھایا ہے کہ تمہاری یہ ساری تگ و دو اس حاسدانہ اندیشہ کی بنا پر ہے کہ تم ڈرتے ہو کہ کہیں یہ نئی قائم ہونے والی امت تمہاری امت سے عدد اور قوت میں بڑھ نہ جائے۔ اس خوف نے تمہیں حق کا حامی و ناصر ہونے کے بجائے اس کا دشمن بنا کر کھڑا کر دیا ہے اس طرح خدا تمہاری آزمائش کر رہا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ تم حق کے حامی بنتے ہو یا اپنے تعصبات ہی کے جال میں پھنس کر رہ جاتے ہو۔ یہ یاد رکھو کہ جن چیزوں کو آج تم بنائے اختلاف بنائے ہوئے ہو قیامت کے دن اللہ ان کو اچھی طرح واضح کر دے گا کہ حق کیا تھا اور تم نے کس طرح دیدہ و دانستہ اس پر پردے ڈالنے کی کوشش کی۔

یہود کی مثالی بڑھیا سے

'اَلَّتِیْ' اور 'اَلَّذِیْ' اگرچہ معرفہ کے لیے آتے ہیں لیکن تمثیلات میں معرفہ لانے سے مقصود بسا اوقات صرف صورتِ حال کو نگاہوں کے سامنے مصور کرنا ہوتا ہے اس وجہ سے یہاں کسی متعین بڑھیا کو مراد لینے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک ایسی بڑھیا کو فرض کر لینا کافی ہے جس سے چشمِ تصور کے سامنے واقعہ کی پوری تصویر آجائے۔
جس طرح یہاں یہود کی مثال ایک بڑھیا سے دی ہے اسی طرح ان کی مثال اعراف ۱۷۵-۱۷۶ میں ایک ایسے شخص سے دی ہے جس کو اللہ نے اپنی آیات و تعلیمات سے نوازا لیکن وہ ان سے نکل بھاگا، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شیطان کے ہتھے چڑھ گیا اور گمراہ ہو کے رہ گیا۔ اس کے لبدان کی تمثیل کتے سے دی ہے جو ہر وقت اپنی زبان نکالے رکھتا ہے، نہ ڈانٹا جائے جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے اور ڈانٹا جائے جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔ اس تمثیل میں بھی 'اَلَّذِیْ' استعمال ہوا ہے لیکن ہم نے اس کے محل میں واضح کیا ہے کہ اس سے مقصود محض تصویرِ حال ہے نہ کہ کسی متعین شخص کی طرف اشارہ۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَلَتُسْـَٔــلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۹۳)

یعنی اگر اللہ اپنے جبر و زور سے کام لینا چاہتا تو سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس نے جبر کے بجائے تمہیں اختیار بخشا ہے اور اس طرح تمہارا امتحان کرنا چاہتا ہے کہ تم اپنی سمجھ بوجھ اور اپنے اختیار و ارادہ سے کام لے کر ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہو یا ضلالت کی، تو تم میں سے جو ہدایت کے طالب بنتے ہیں ان کو ہدایت کی توفیق بخشتا ہے اور جو ضلالت ہی پر جمے رہنا چاہتے ہیں ان کو اسی پر چھوڑ دیتا ہے۔ ہم یہ حقیقت جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ خدا کی مشیت اس کی حکمت کے تحت ہے۔

'وَلَتُسْـَٔــلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ' یعنی اس بات کو یاد رکھو کہ اس نے تمہیں ہدایت و ضلالت میں امتیاز کرنے کے لیے عقل بھی عطا فرمائی ہے، پھر اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے تم پر حجت تمام کر دی ہے اس وجہ

سے ایک دن آئے گا جب تم میں سے ایک ایک سے جو کچھ تم کرتے رہے اس کی بابت پرسش ہونی ہے اور پھر تم اپنے اعمال ہی کے مطابق جزا و سزا پاؤ گے۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۹۴)

یہود کا ذریعۂ اضلال قسمیں تھیں

یہود لوگوں کو اسلام سے روکنے کے لیے سب سے زیادہ جس ہتھیار سے کام لیتے تھے وہ ان کی قسمیں تھیں۔ جھوٹے لوگ اول تو اپنی نفسیاتی کمزوری کے سبب سے قسمیں کھاتے ہی زیادہ ہیں، پھر ان کے پاس دلیل کون سی تھی جس کو وہ اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پیش کر سکتے سوائے قسموں ہی کا سہارا تھا۔ وہ انہی کے بل پر کوشش کرتے کہ جن لوگوں کے قدم اسلام میں جم چکے ہیں ان کو متزلزل کر دیں اور جو لوگ اس کی طرف مائل ہو رہے ہیں ان کو اس کی طرف بڑھنے سے روک دیں۔ یہ لوگ چونکہ سابق مذہب اور سابق انبیاء کے وارث ہونے کے بھی مدعی تھے اس وجہ سے اپنی مذہبی تقدس کے پردے میں وہ لوگوں کو قسمیں کھا کھا کے یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ اس نئے مذہب اور نئے پیغمبر کو سابق مذاہب اور سابق انبیاء سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ پیغمبر سابق مذاہب اور انبیاء کا جو حوالہ دیتے ہیں نعوذ باللہ اس میں وہ جھوٹے ہیں۔

'وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ' 'سوء' کے معنی بدی اور برائی کے ہیں۔ یہاں 'سوء' سے مراد نتیجۂ سوء اور انجام سوء یعنی عذاب ہے۔ چونکہ عذاب الٰہی لوگوں کے اپنے اعمال ہی کا ثمرہ اور نتیجہ ہو گا اس وجہ سے یہاں فعل ہی سے نتیجۂ فعل کو ظاہر کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ کرو کہ تمہاری فریب کارانہ قسموں سے کسی کے حق پر جمے ہوئے قدم اکھڑ جائیں اور تمہیں اللہ کی راہ سے روکنے کے اس جرم کی پاداش میں اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑے۔ اگر ایسا ہوا تو تمہارے لیے ایک عذاب عظیم ہے۔ تم حق کے گواہ بنا کر کھڑے کیے گئے ہو۔ اگر تمہی نے حق سے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی تو سزا بھی اس کی بہت ہی سخت بھگتو گے۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۹۵)

'اشتراء' بمعنی ترجیح و مبادلہ

لفظ 'اشتراء' پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بھی بحث کر چکے ہیں اور آل عمران کی آیت ۷۷ کے تحت بھی۔ جب مبادلہ چیز کا چیز سے ہو، جیسا کہ عموماً زمانۂ قدیم میں رواج رہا ہے تو ہر شے مبیع بھی ہو سکتی ہے اور ثمن بھی۔ اس وجہ سے کسی شے کا اشتراء اس مفہوم میں خریدنا نہیں ہوتا جس مفہوم میں ہم خریدنا بولتے ہیں بلکہ اس کا مفہوم مبادلہ ہوتا تھا۔ اس وجہ سے لفظ 'اشتراء' مبادلہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور پھر اس مفہوم سے ترقی کر کے ترجیح دینے کے معنی میں بھی۔

'ثمن قلیل' سے مراد دنیا و متاع دنیا

'ثمن قلیل' سے مراد دنیا اور متاع دنیا ہے اور 'مَا عِنْدَ اللّٰهِ' سے مراد اجر آخرت ہے۔ اجر آخرت کے مقابل میں خواہ دنیا اور متاع دنیا کی کتنی ہی بڑی مقدار حاصل ہو جائے وہ بہرحال ناچیز اور حقیر ہی ہے اس لیے

کہ وہ چند روزہ اور فانی ہے اور اجر آخرت ابدی اور لازوال ہے۔ فرمایا کہ عہد الٰہی کو حقیر منفعت دنیوی کے عوض نہ فروخت کرو۔ عہد الٰہی پر قائم رہنے کا اللہ کے ہاں جو صلہ ہے اس دنیا کی منفعتوں سے بدرجہا بڑھ کر ہے اگر تم اس حقیقت کو سمجھو۔

۱۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹۶-۱۰۵

آگے پہلے تو مخالفین حق کو دھمکی اور ان مسلمانوں کو جو حق کے مخالفین کے نرغہ میں تھے صبر و استقامت کی نصیحت اور اس کے اچھے انجام کی بشارت ہے۔ پھر قرآن کی دعوت کے سلسلہ میں جو چیز شیاطین کی دراندازیوں سے محفوظ رکھنے والی ہے اس کی ہدایت اور بعض ان اعتراضات کا جواب ہے جو یہود نے لوگوں کو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے بدظن کرنے کے لیے پھیلائے تھے اور جن کو قریش نے بھی بے سمجھے بوجھے دہرانا شروع کر دیا تھا۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

مخالفین کے بعض اعتراضات کے جواب

آیات ۹۶-۱۰۵

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا
اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ
ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ
اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ
فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ
عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ
۱۴ ع ۱۱ ۱۹ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ
اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ
يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۭ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ

هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٠٣﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا
يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٠٤﴾ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿١٠٥﴾

ترجمۂ آیات ۹۶-۱۰۵

جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے اور جو لوگ ثابت قدم رہیں گے ہم ان کو جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا بہترین اجر دیں گے۔ جو کوئی نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، وہ ایمان پر ہے، تو ہم اس کو ایک پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ہم ان کو جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا بہتر صلہ دیں گے۔ ۹۶-۹۷

پس جب تم قرآن پڑھو تو شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ اس کا ان لوگوں پر کچھ بھی زور نہیں چلتا ہے جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس کا زور بس انہی پر چلتا ہے جو اسے دوست رکھتے ہیں اور جو اللہ کے شریک ٹھہرانے والے ہیں۔ ۹۸-۱۰۰

اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بھیجتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ اتارتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ تم تو اپنے جی سے گھڑ لینے والے ہو۔ بلکہ ان میں کے اکثر علم نہیں رکھتے ہیں۔ کہہ دو اس کو روح القدس نے تمہارے رب کی جانب سے حق کے ساتھ اتارا ہے تاکہ وہ ان لوگوں کو جمائے رکھے جو ایمان لائے ہیں اور یہ ہدایت و بشارت ہو خدا کے فرمانبرداروں کے لیے۔ ۱۰۱-۱۰۲

اور ہمیں اچھی طرح علم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو تو ایک انسان سکھاتا ہے۔ اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ فصیح عربی زبان ہے۔ بے شک جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے ہیں اللہ ان کو راہ یاب نہیں کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ جھوٹ تو بس وہی لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لا رہے ہیں اور

یہی لوگ جھوٹے ہیں۔ ۱۰۳-۱۰۵

۱۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹۶)

مخالفین کے لیے تنبیہ اہل ایمان کے لیے بشارت — اس آیت کا پہلا ٹکڑا مخالفین کے لیے تنبیہ اور دوسرا ٹکڑا اہل ایمان کے لیے بشارت ہے جو اس وقت مخالفین کے نرغے میں طرح طرح کے روحانی و جسمانی مصائب کے ہدف بنے ہوئے تھے۔ مخالفین کو خطاب کر کے فرمایا کہ جس متاع دنیا کی محبت میں تم حق کی یہ مخالفت کر رہے ہو یہ ایک دن ختم ہو جانے والی ہے، باقی رہ جانے والی چیز وہ اجر ہے جو اس دنیا میں کیے ہوئے اعمال کے بدلے میں ملنے والا ہے۔ تو سن لو کہ یہ اجر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو آج ہماری راہ میں مصائب جھیل رہے ہیں اور حق پر ثابت قدم ہیں۔ ان کا یہ اجر ان کے اعمال کی نسبت سے کہیں بہتر ہوگا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹۷)

یہ اسی بشارت کی تفصیل ہے، فرمایا کہ جو کوئی نیک عمل کرے گا، عام اس سے کہ وہ مرد ہے یا عورت، اگر وہ ایمان پر قائم ہے تو ہم اس کو اچھی اور پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا بہترین صلہ دیں گے۔

اچھی اور پاکیزہ زندگی بسر کرانے کا یہ وعدہ دین اور دنیا دونوں اعتبار سے ہے۔ جو لوگ ایمان پر قائم ہنے اور عمل صالح کی زندگی بسر کرنے کا عزم کر لیتے ہیں ان کو آزمائشیں تو پیش آتی ہیں، شیاطین جن و انس ان کو ستانے اور الجھنوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کو اس کے لیے ڈھیل بھی ملتی ہے لیکن اس ڈھیل کی ایک معین حد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے بندوں کے صبر اور ان کی استقامت کا امتحان کرتا ہے اور خوب جانتا ہے کہ اس امتحان کی حد کیا ہونی چاہیے، چنانچہ جوں ہی وہ حد پوری ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ شیاطین جن و انس کو اس سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیتا۔ اہل ایمان ان امتحانات سے گزرنے کے بعد اپنے ایمان میں قوی سے قوی تر ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کی پاکیزگی اور ان کی طمانیت و سکینت میں روز افزوں اضافہ ہوتا ہے اور اگر اس راہ میں انھیں موت بھی پیش آتی ہے تو وہ اس کا بھی خندہ جبینی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اہل ایمان کی اس روحانی بادشاہی کا اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جو ایمان کی قوت اور اس کی حلاوت سے

نا آشنا ہیں۔

آیت میں یہ وعدہ تصریح کے ساتھ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے مذکور ہے۔ بظاہر یہاں تصریح کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کا ایک خاص محل ہے۔ وہ یہ کہ اس دور میں جس طرح مسلمان مرد اپنے ایمان پر ثابت قدم رہنے کے لیے نہایت کڑے امتحانات سے گزر رہے تھے اسی طرح بہت سی خواتین بھی اپنا ایمان بچائے رکھنے کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے تھیں اور ان کا امتحان کمزور عنصر ہونے کے سبب سے مردوں کے امتحان سے بھی زیادہ سخت تھا۔ یہاں قرآن نے مردوں کے ساتھ خاص طور پر عورتوں کی تصریح کر کے ان کی دلداری اور حوصلہ افزائی کر دی کہ اگر انھوں نے ایمان اور عمل صالح کی زندگی بسر کرنے کا عزم کر لیا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو ضرور پاکیزہ زندگی بسر کرائے گا۔ شیاطین اس نعمت سے ان کو محروم نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ اس کا موقع ان کو نہیں دے گا۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (۹۸)

شیطانی فتنوں سے پناہ مانگنے کی ہدایت

لفظ 'قَرَاْتَ' یہاں عام ہے۔ یعنی خواہ یہ پڑھنا اپنی تلاوت کے طور پر ہو یا لوگوں کو دعوت دینے اور انھیں قرآن سنانے کے لیے، دونوں ہی حالتوں میں اس کے پڑھنے سے پہلے شیطانِ رجیم سے اللہ کی پناہ مانگ لی جائے۔

یہ آیت تمہید ہے ان اعتراضات کے جواب کی جو یہود نے قرآن کے خلاف اٹھائے تھے اور جن کے اٹھانے سے ان کا مقصد قرآن پر ایمان لانے والوں یا اس کی طرف مائل لوگوں کو اس سے بدظن اور برگشتہ کرنا تھا۔ قرآن نے آگے آیات ۱۰۱-۱۰۴ میں ان اعتراضات کے جواب دیے ہیں اور اس جواب سے پہلے بطور تمہید یہ ہدایت فرمائی ہے کہ جب تم قرآن کو پڑھو یا دعوتِ حق کے لیے اس کو سناؤ تو اس سے پہلے شیطان رجیم کے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ یہ ہدایت اس لیے ہوئی کہ درحقیقت اصل دشمن قرآن کا شیطان ہی ہے۔ جب قرآن پڑھا یا سنایا جاتا ہے تو وہ اس کے خلاف وسوسہ اندازی کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے پڑھنے والوں اور سننے والوں کے دلوں میں وہ خود بھی وسوسے بھرنے کی کوشش کرتا ہے اور ان لوگوں کو بھی اللہ کی راہ سے روکنے کی اس مہم میں اپنا شریک کار بنا لیتا ہے جو انسانوں میں سے اس کے اولیاء اور دوست کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تعوذ گویا ایک تعویذ ہے جو اس قسم کے تمام اشرار و شیاطین کے فتنوں اور ان کی وسوسہ اندازیوں سے آدمی کو محفوظ رکھتا ہے۔

اس کی تاثیر آدمی کے دل کی حالت پر منحصر ہے۔ اگر آدمی محض زبان سے تعوذ کے الفاظ دہرا تا ہے تو اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا لیکن جن کے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلتی ہے وہ اس سے ایک ایسی قوت و طاقت حاصل کرتے ہیں جو شیطان اور اس کے اولیاء سے نبرد آزمائی میں بڑا سہارا بنتی ہے۔ یہ نبرد آزمائی اس امتحان کے مقتضیات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسانوں کے لیے مقرر کر رکھا ہے اس وجہ سے اس سے کسی حالت میں مفر نہیں ہے۔ اسی سے آدمی کی اپنی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ تعوذ کی یہ برکت

ہے کہ اگر آدمی کو اس کا سہارا حاصل ہو تو وہ شیطان اور اس کے ایجنٹوں سے شکست نہیں کھاتا۔

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُم بِهِ مُشْرِكُونَ (۹۹ - ۱۰۰)

سُلْطَان کے معنی قابو، زور اور اختیار کے ہیں۔

اہل ایمان پر شیطان کا کوئی زور نہیں چلتا

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو یہ مہلت تو ضرور ملی ہوئی ہے کہ وہ لوگوں کو بہکائیں اور ورغلائیں لیکن ان کو لوگوں پر زور و اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ لازماً ان کو گمراہ ہی کر دیں۔ شیطان کا زور صرف ان لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا دوست بناتے اور اللہ کے شریک ٹھہراتے ہیں، ان لوگوں پر اس کا کوئی زور نہیں چلتا جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس آیت نے گویا اطمینان دلا دیا کہ شیطان کے فتنے خواہ کتنے ہی خطرناک ہوں لیکن جو شخص ان سے محفوظ رہنا چاہے وہ اپنے آپ کو ان سے محفوظ رکھ سکتا ہے اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ خدا پر مضبوط ایمان رکھے اور سخت سے سخت حالات میں بھی اس کے فضل اور اس کی کارسازی پر بھروسہ کرے۔ شیطان سے مار وہی کھاتا ہے جو اس کی طرف دوستی کی پینگیں بڑھاتا ہے اور جس کے اندر شرک کی کچھ آلائش ہوتی ہے۔

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ ۙ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۱۰۱)

'آیت' سے مراد

'آیت' سے مراد کوئی حکم شرعی ہے۔

احکام شریعت کی تبدیلی پر یہود کا اعتراض

یہ ایک مثال ہے ان اعتراضات کی جو یہود لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کے لیے قرآن کے خلاف اٹھاتے تھے۔ فرمایا کہ جب ہم ایک حکم کو دوسرے حکم سے بدلتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ تم تو نرے مفتری ہو، اپنے جی سے ایک بات گھڑتے ہو اور لوگوں پر دھونس جمانے کے لیے اس کو خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہو، ورنہ اس کے کیا معنی کہ خدا ایک مرتبہ ایک قانون بنائے اور پھر اس قانون کو خود ہی دوسرے قانون سے بدل دے۔

یہ اشارہ ہے تحریم و تحلیل اور یوم السبت کے باب میں ان احکام کی طرف جن کا حوالہ آگے اسی سورہ کی آیات ۱۱۴-۱۱۶ اور ۱۲۴ میں آیا ہے۔ قرآن نے جب اس امت کے لیے یوم السبت کی حرمت ختم کر دی اور کھانے پینے کے باب میں وہ احکام دیے جو ملت یہود یا ملت مشرکین کے بجائے ملت ابراہیم پر مبنی تھے تو یہود نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ دیکھو، یہ شخص ایک طرف تو ہماری شریعت کو خدائی شریعت مانتا ہے دوسری طرف اس کے احکام کو ان سے مختلف احکام سے بدلتا ہے۔ اگر یہ شخص خدا کا رسول ہوتا تو وہ خدا کے دیے ہوئے احکام کو کس طرح بدل سکتا۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک یہ خدا کا رسول نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) ایک مفتری ہے۔ یہ بات کہی تو یہود نے لیکن بے سمجھے بوجھے قریش کے ان لیڈروں نے بھی دہرانی شروع کر دی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں کہی ہوئی ہر بات کو اپنی تائید سمجھتے تھے۔

'وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ' یہ قرآن نے مذکورہ بالا اعتراض کا جواب دیا ہے کہ اپنی اتاری ہوئی چیزوں کی حکمت و مصلحت کو خدا ہی خوب جانتا ہے۔ 'بَلْ اَکْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ' اکثر لوگ ان حکمتوں اور مصلحتوں کو نہیں جانتے۔

یہاں یہ بات اجمال کے ساتھ ارشاد ہوئی ہے۔ آگے کی آیات میں اس اجمال کی تفصیل آئے گی۔ ہم یہاں چند اشارات صرف اس لیے کیے دیتے ہیں کہ آگے نظم کلام کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ قرآن کا یہ جواب مندرجہ ذیل دو مبادی پر مبنی ہے۔

شریعت میں تدریج کا مصلحت
اول یہ کہ خدا نے اپنی شریعت کے نازل کرنے میں ترتیب و تدریج ملحوظ رکھی ہے تاکہ ایمان لانے والوں کے قدم شریعت میں خوب جم سکیں۔ یہ ترتیب و تدریج بعض حالات میں احکام میں تبدیلی کی مقتضی ہوئی ہے جو سرتاسر اہل ایمان کی مصلحت پر مبنی ہے۔

دوسرا یہ کہ اس ملت کی بنیاد ملت ابراہیمؑ پر ہے اور ملت ابراہیمؑ ملت یہود اور ملت مشرکین سے بالکل الگ ملت تھی۔ اس میں حرام وہی چیزیں ہیں جو ملت ابراہیمؑ میں حرام تھیں۔ یہی چیزیں اصلاً ملت یہود میں بھی حرام تھیں لیکن بعد میں انھوں نے اپنی بدعات کے ذریعہ سے ان میں اضافے کر لیے جو اللہ نے ان کی سزا کے طور پر ان پر باقی رکھے لیکن اس ملت کی اساس چونکہ ملت ابراہیم پر ہے اس وجہ سے اس میں وہ اضافے ختم کر دیے گئے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ (۱۰۲)

'روح القدس' سے مراد
'رُوْحُ الْقُدُسِ' سے مراد جبرائیل امین ہیں اور 'حق' سے مراد وہ خالص اور بے آمیز دین ہے جو اللہ کی طرف سے یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی تمام ملاوٹوں سے پاک و صاف ہو کر اترا ہے۔

قرآن کو وحی الٰہی ماننے سے یہود کا انکار
یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ جو لوگ تمھیں مفتری کہتے ہیں ان کو جواب دے دو کہ یہ جو کچھ میں پیش کر رہا ہوں اس کو اپنے جی سے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ خدا کے مقرب فرشتے جبریل امین نے میرے رب کی جانب سے مجھ پر اتارا ہے اور یہ سراسر حق ہے، شیاطین و مفسدین کی ہر ملاوٹ سے بالکل پاک و صاف۔

'لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' یعنی اللہ نے دین کو تمام ملاوٹوں سے پاک کر کے اس لیے اتارا ہے تاکہ وہ ایمان لانے والوں کو حق پر جما دے اور وہ لغزشوں اور گمراہیوں سے بالکل محفوظ ہو جائیں۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اگر دین کے بعض اجزا میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے تو وہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، تدریج کی مصلحت سے واقع ہوئی ہے اور مقصود اس سے لوگوں کو دین میں راسخ کرنا تھا۔ اگر سارا دین بیک دفعہ نازل کر دیا جاتا تو یہ لوگوں پر بہت شاق ہوتا اور ان کے قدم دین میں خوب مضبوطی سے نہ جم سکتے۔

'وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ' یعنی مخالفین اس سے جو فتنے چاہیں اٹھائیں لیکن جو لوگ خدا کی ہدایات پر آمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہنے کو تیار ہیں ان کے لیے تو یہ آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے اعتبار سے بشارت ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِيْنٌ (۱۰۳)

مخالفین کے ایک اور فتنہ کا رد

'وَلَقَدْ نَعْلَمُ' دراصل 'وَلَقَدْ كُنَّا نَعْلَمُ' ہے یعنی بعض اوقات مضارع سے پہلے افعال ناقصہ کو حذف کر دیتے ہیں۔ اس اسلوب پر پیچھے سورۂ بقرہ وغیرہ میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔

یہ مخالفین کے ایک دوسرے فتنے کا حوالہ دیا ہے جو وہ لوگوں کو قرآن سے بدگمان کرنے کے لیے اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اس کلام کو وحی الٰہی اور فرشتہ کا لایا ہوا کہنا تو محض ایک ڈھونگ ہے۔ یہ تو فلاں شخص ان کو سکھاتا ہے اور یہ حضرت اس کو سنا کر ہم پر رعب جماتے ہیں کہ اس کو خدا نے جبریل امین کے ذریعہ سے ان پر اتارا ہے۔ یہاں کسی متعین شخص کا نام مذکور نہیں، صرف اس کے عجمی ہونے کی تصریح ہے۔ مفسرین نے یہاں ایک سے زیادہ ناموں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک نام سلمان فارسیؓ کا بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مخالفین انہی کی طرف اشارہ کرتے رہے ہوں۔ قرآن کو ان کے نام سے بحث نہیں، صرف اعتراض سے بحث ہے اور اسی کا اس نے جواب دیا ہے۔ جواب کی تمہید اس طرح اٹھائی گئی ہے جس سے اس اعتراض کی لغویت واضح ہو رہی ہے اس لیے کہ 'وَلَقَدْ نَعْلَمُ' کے اسلوب ہی میں یہ بات مضمر ہے کہ ہم بار بار معترضین کی یہ بکواس سنتے رہے ہیں لیکن اس کی لغویت کے سبب سے ہم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس کے بعد فرمایا کہ اگر ان بوالفضولوں کو قرآن کے معانی و حقائق کی پرکھ نہیں ہے تو کم از کم اس کے بیان کی سطوت و جلالت اور اس کی زبان کی بے مثال فصاحت پر ہی غور کرتے تو ان پر اپنے اس اعتراض کی لغویت واضح ہو جاتی کہ کہاں ایک کچ مج بیان عجمی اور کہاں یہ ہوش کو ٹکر دینے والی عربی مبین۔ آخر ایسا کور دل کون ہو سکتا ہے جو منہ کے اڑاتے چھینٹوں اور آسمان کی بارش میں امتیاز نہ کر سکے۔

یہ بات علی سبیل التنزل فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کے معانی و حقائق تک تو ان لوگوں سے پہنچنے کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی جن کو گوہر اور پشیز میں امتیاز نہیں ہے لیکن ان کو اپنی طلاقت لسانی پر بڑا ناز ہے تو کم از کم اس کی زبان ہی پر غور کرتے کہ ایک عجمی تو درکنار خود ان کے کسی شاعر یا خطیب کے بس میں بھی یہ نہیں ہے کہ اس طرح کا کلام پیش کر سکے۔ یہاں تک کہ خود پیغمبر کے اپنے کلام اور اس کلام میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۰۴)

یعنی ایمان و ہدایت کا راستہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی آیات پر ایمان لایا جائے اس لیے کہ ہدایت وہی ہے جو اللہ کی طرف سے آئے تو جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہیں ان کو اللہ کی ہدایت

نصیب نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اپنے اوپر ہدایت کے دروازے بند کر لیے اور ان کے لیے آگے بس ایک دردناک عذاب ہی ہے۔

اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۱۰۵)

پیغمبر کو مفتری سمجھنے والوں کی لغویت

اوپر آیت ۱۰۱ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ یہ لوگ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک مفتری قرار دیتے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مفتری ہمارا پیغمبر نہیں ہے بلکہ مفتری وہ لوگ ہیں جو اللہ کی آیات پر تو ایمان نہیں لاتے جو اللہ کی ہدایت معلوم کرنے کا واحد ذریعہ ہیں لیکن ایک دین انھوں نے تصنیف کر رکھا ہے اور اس کو اللہ کا دین بتاتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ بالکل جھوٹا افترا ہے اور اس کے تصنیف کرنے والے ہی اصل جھوٹے ہیں۔

۲۰۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۱۰۶-۱۱۱

مظلوم مسلمانوں کو صبر و استقامت کی تلقین

آگے ان مسلمانوں کی طرف توجہ فرمائی ہے جو اعدائے حق کے جور و ستم کے ہدف بنے ہوئے تھے۔ ان کو خطاب کر کے صبر و استقامت کی تلقین فرمائی اور ساتھ ہی ان لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا ہے جو مخالفین سے مرعوب ہو کر اللہ کے دین سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ اسی سلسلہ میں ان مسلمانوں کی طرف بھی ایک اشارہ ہے جنھیں اعدائے حق کے مظالم سے تنگ آ کر ہجرت کرنی پڑی۔ ان کی تحسین فرمائی گئی ہے اور ان کے لیے مغفرت اور رضوان کی بشارت ہے۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۰۶-۱۱۱

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ
بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ
مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰۶) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۱۰۷) اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۱۰۸) لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۰۹) ثُمَّ
اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ
ع ۱۴ صَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۱۰) يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ

نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

ترجمۂ آیات ۱۰۶-۱۱۱

جو اپنے ایمان لانے کے بعد اللہ کا کفر کرے گا بجز اس کے جس پر جبر کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو، لیکن جو کفر کے لیے سینہ کھول دے گا تو ان پر اللہ کا غضب اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور اللہ کفر اختیار کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں اور جن کے سمع و بصر پر اللہ نے مہر کر دی اور یہی لوگ ہیں جو آخرت سے غافل ہیں۔ لازماً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں خائب و خاسر رہیں گے۔ ۱۰۶-۱۰۹

پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے آزمائشوں میں ڈالے جانے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور ثابت قدمی دکھائی تو ان باتوں کے بعد بے شک تیرا رب بڑا ہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔ اس دن جس دن ہر جان اپنی ہی مدافعت کرتی ہوئی حاضر ہوگی اور ہر جان کو وہی پورا پورا بدلہ میں ملے گا جو اس نے کیا ہوگا اور ان کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ ۱۱۰-۱۱۱

۲۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰۶)

زیر ستم مسلمانوں کو آگاہی

یہ ان لوگوں کو آگاہی ہے جو اس دور میں کفار کی ستم رانیوں کے ہدف تھے۔ فرمایا کہ جو لوگ اعدائے حق کے شکنجے میں ہیں ان کے لیے اس بات کی تو گنجائش ہے کہ وہ قلباً ایمان پر جمے رہتے ہوئے محض زبان سے کوئی کلمہ ایسا نکال دیں جس سے ان کی جان کے اس مصیبت سے چھوٹ جانے کی توقع ہو، لیکن اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اس جبر و ظلم کو بہانہ بنا کر اپنا سینہ کفر ہی کے لیے کھول دیں۔ جو لوگ ایسا کریں گے فرمایا کہ ان پر

اللہ کا غضب اور بہت بڑا عذاب ہے۔ ان کا ایک مرتبہ ایمان کی طرف آجانا اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اس چیز کی صحت و صداقت ان پر واضح ہو چکی ہے۔ اس کے بعد اس بات کی تو گنجائش باقی رہتی ہے کہ آدمی اسی کے تحفظ کے پہلو سے کوئی ایسی تدبیر اختیار کر سکے جو بظاہر اس کے خلاف ہو لیکن اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آدمی اس سے کلیتہً دستبردار ہو کر کفر ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لے۔ فرمایا کہ جو لوگ تن آسانی کی یہ راہ اختیار کریں گے ان پر خدا کا غضب اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۱۰۷)

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی — یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے، فرمایا کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے اپنی دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے اور خدا کی پکڑ سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو کفر کے حوالے کر دیا۔ اللہ ان لوگوں کے لیے تو اپنی ہدایت کی راہ کھولتا ہے جو ہر حال میں اس کی ہدایت ہی کو اپنا نصب العین بناتے ہیں لیکن ان لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا جو مشکلات سے گھبرا کر کفر ہی کو اپنا ملجا و ماویٰ بنا لیتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۱۰۸)

فرمایا کہ ایسے لوگ جو ایمان کی روشنی ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد محض اپنے دنیوی مفادات کی خاطر اس سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے دلوں، ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر مہر کر دیا کرتا ہے اور وہ ہدایت کی توفیق سے بالکل ہی محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ خود اصل حقیقت پر غور کرتے، نہ کسی دوسرے معقول آدمی کی بات سنتے اور نہ بصیرت حاصل کرنے کے لیے اپنی آنکھیں کھولتے۔ یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت بقرہ کی آیت ۷ کے تحت ہو چکی ہے۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ یعنی اصل بے خبر یہی لوگ ہیں اس لیے کہ ان کے دل اور ان کے کان آنکھ سب چاٹ ہو چکے ہیں۔ کسی طرف سے بھی کوئی بصیرت کی کرن ان کے اندر داخل ہونے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۰۹)

'لَا جَرَمَ' کے معنی لابد اور لا محالہ کے ہیں۔ اصلاً تو یہ کسی بات کی تاکید کے لیے آتا ہے لیکن موقع مقتضی ہو تو اس کے اندر قسم کا زور بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے یہ اس کا لازمی نتیجہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اپنی دنیا کی خاطر اس طرح آخرت سے بے پروا ہو جائیں گے آخرت میں سب سے زیادہ محروم و نامراد وہی ہوں گے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۱۰)

ہجرت حبشہ کے جانبازوں کے لیے بشارت — بزدلوں اور پست ہمتوں کا انجام بیان کرنے کے بعد اب یہ ان جانبازوں اور سرفروشوں کا ذکر ہے جنھوں نے اپنے دین کی خاطر کفار کے ہاتھوں ہر قسم کے مصائب جھیلے لیکن وہ اس سے دست بردار ہونے پر تیار نہ ہوئے

ہجرت سے یہاں اشارہ ہجرت حبشہ کی طرف ہے اور جہاد و صبر سے یہاں ان کی وہ جاں بازیاں مراد ہیں جو دین پر استقامت کے معاملے میں انھوں نے دکھائی ہیں۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے ان جاں گسل مصائب کا مقابلہ کر کے اپنے ایمان کی حفاظت کی ہے، خدا ان کی لغزشوں اور فروگذاشتوں سے درگزر فرمائے گا اور ان کو اپنی رحمت سے نوازے گا۔

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَن نَّفْسِهَا وَتُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ‎(۱۱۱)

آخرت کی یاد دہانی

یہ اس دن کی یقین دہانی ہے جس دن اللہ تعالیٰ کے حضور سب لوگوں کی پیشی ہوگی اور وہ کامل انصاف کے ساتھ سب کے معاملات کا فیصلہ فرمائے گا۔ فرمایا کہ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَن نَّفْسِهَا اُس دن ہر جان پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ نہ کوئی کسی کی وکالت کر سکے گا اور نہ کوئی کسی کا سفارشی بن کر کھڑا ہوگا جس نے جو کچھ کیا ہوگا اس کا سارا کیا دھرا اس کے سامنے آجائے گا، ہر ایک کے ساتھ کامل عدل کا معاملہ ہوگا کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔

۲۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۱۲-۱۲۴

قریش کے لیے ایک بستی کی مثال

آگے قریش کی تنبیہ کے لیے ایک بستی کو بطور مثال پیش کیا ہے کہ اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو ان کا بھی وہی انجام ہو سکتا ہے جو اس بستی والوں کا ہوا۔ نیز ان کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ اپنے جی سے حرام و حلال نہ ٹھہراؤ۔ اللہ نے جن چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے ان کو کھاؤ برتو، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت ان کو حرام نہ ٹھہراؤ۔ اسی ذیل میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ فرما دیا گیا کہ یہود پر بھی وہی چیزیں حرام کی گئی تھیں جو اس ملت میں حرام ہیں لیکن انھوں نے اپنی سرکشی کے سبب سے بعض چیزیں از خود اپنے اوپر حرام کر لیں اور ان کی حرمت کو وہ اب ملت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ ابراہیم کو نہ یہودیت و نصرانیت سے کوئی علاقہ تھا نہ ملت مشرکین سے۔ ان کی ملت ان سب سے الگ تھی اور وہی ملت ہے جس کی پیروی کی ہدایت تمھیں کی گئی ہے۔ سبت کے احترام کا تعلق بھی یہود سے تھا، ملت ابراہیم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ـــــ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۱۲-۱۲۴

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ‎(۱۱۲) وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ

ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا
نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ
الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ
فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَلَا
تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ
لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ
لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۪ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَعَلَى الَّذِيْنَ
هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ
وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا
السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْۤا اِنَّ رَبَّكَ
مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا ع ۱۵ ۲۱
لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ
وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ
فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ
اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ
عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

ترجمۂ آیات ۱۱۲-۱۲۴ اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی ہے جو بالکل امن و اطمینان کی حالت میں تھی،

ان کو ان کا رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے پہنچ رہا تھا۔ لیکن انھوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو بھوک کا مزا چکھایا اور خوف کا لباس پہنا دیا۔ اور ان کے پاس ایک رسول انھیں میں سے آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کر دی تو ان کو عذاب نے آدبوچا اور وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے۔ ۱۱۲-۱۱۳

تو اللہ نے تمھیں جو چیزیں جائز و پاکیزہ دے رکھی ہیں ان میں سے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی پرستش کرتے ہو۔ اس نے تو تم پر بس مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، حرام ٹھہرایا ہے، پس جو کوئی مجبور ہو جائے، نہ طالب ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا، تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اپنی زبانوں کے گھڑے ہوئے جھوٹ کی بنا پر یہ نہ کہو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام کہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹی تہمت لگائیں گے وہ ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔ ان کے لیے چند روزہ عیش اور دردناک عذاب ہے۔ ۱۱۴-۱۱۷

اور جو یہودی ہوئے ان پر بھی ہم نے وہی چیزیں حرام کیں جو ہم نے پہلے تم کو بتائیں اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔ ۱۱۸

پھر تمھارا رب ان لوگوں کے لیے جو جہالت سے برائی کر بیٹھیں پھر اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں تو بے شک تمھارا رب اس کے بعد بڑا بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے۔ ۱۱۹

بے شک ابراہیم ایک الگ امت تھے، اللہ کے فرمانبردار اور اس کی طرف یکسو اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ وہ اس کی نعمتوں کے شکرگزار تھے۔ اللہ نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کی رہنمائی ایک سیدھی راہ کی طرف فرمائی۔ اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی بھلائی عطا کی اور آخرت میں بھی وہ صالحین

کے زمرہ میں ہوں گے۔ پھر ہم نے تمہاری طرف وحی کی کہ ملتِ ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یکسو تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ ۱۲۰-۱۲۲

سبت انہی لوگوں پر عاید کیا گیا تھا جنھوں نے اس کے باب میں اختلاف کیا اور بے شک تمہارا رب ان چیزوں کے باب میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں، قیامت کے روز ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ ۱۲۴

۲۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۱۲)

'قریۃ' سے مراد سبا ہے: 'قریۃ' مرکزی بستی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اس کے توابع اور ملحقات ہوں۔ یہاں قریہ کی تصریح نہیں ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اشارہ سبا کی طرف ہے۔ اہل مکہ کے سامنے اس بستی کی مثال کئی جگہ تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہے

مشرکینِ مکہ کے لیے قوم سبا کی مثال: مثلاً ملاحظہ ہوں آیات ۱۵-۲۰ سورۂ سبا۔ اس بستی پر اللہ کا بڑا فضل و کرم تھا۔ وہ دور دیہ سرسبز و شاداب باغوں کی قطار تھی، نہریں تھیں، چشمے تھے لیکن اس کے باشندوں نے اللہ کی ناشکری اور اس کی نعمتوں کی ناقدری کی تو اللہ کا عذاب ایک بے پناہ سیلاب کی شکل میں نمودار ہوا اس نے سب کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

'فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ' اس میں عربیت کے اعلیٰ اسلوب کے مطابق حذف ہے۔ اگر اس حذف کو کھول دیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ طَعْمَ الْجُوْعِ وَاَلْبَسَهَا لِبَاسَ الْخَوْفِ یعنی اللہ نے ان کے کفرانِ نعمت کی پاداش میں ان کو بھوک کا مزہ چکھایا اور امن و اطمینان کی جگہ ان کو خوف و خطرے کا جامہ پہنا دیا۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (۱۱۳)

یعنی ان میں انہیں میں سے ایک رسول ان کو متنبہ کرنے کے لیے آیا تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے عذاب نے ان کو آ دبوچا اور یہ اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے اس لیے کہ اپنی ناشکری سے اس کے اسباب انھوں نے خود فراہم کیے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۱۱۴)

اہل سبا اور اہل مکہ میں مماثلت

اہل مکہ کو اہل سبا کا انجام یاد دلا کر ان کو یاد دہانی فرمائی کہ تمھیں بھی اللہ نے جو چیزیں حلال و طیب بخشی ہیں ان کو کھاؤ برتو اور اس کی نعمتوں پر اسی کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی پرستش کرنے والے ہو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اہل سبا اور اہل مکہ میں بڑی مماثلت تھی۔ اوپر اہل سبا کے باب میں جو الفاظ وارد ہوئے ہیں ان کو پڑھیے پھر حرم مکہ کی شان میں یہ الفاظ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا، ۵۷ قصص۔ پڑھیے تو دونوں کی مماثلت واضح ہو جائے گی جس طرح اہل سبا کو امن و چین کی زندگی حاصل تھی اسی طرح اہل مکہ کو بھی امن و اطمینان کی زندگی حاصل تھی۔ خانۂ کعبہ کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہ شہر امن و امان کا شہر تھا، کسی کی مجال نہیں تھی کہ بلد امین پر حملہ کرنے کی جرأت کر سکے۔ تمام ملک سے تجارتی قافلے یہاں بے خوف و خطر آتے اور اس شہر کے باشندوں کی خوش حالی کا ذریعہ بنتے۔ خود اہل مکہ کے تجارتی قافلے ہر موسم میں بے خوف و خطر دور دور کے سفر کرتے لیکن ان کو نقصان پہنچانا تو الگ رہا راستہ کے بدوی قبائل ان کی حفاظت کے لیے بدرقہ فراہم کرتے کہ یہ بیت اللہ کے خادم اور متولی ہیں۔ ان نعمتوں کا حق یہی تھا کہ یہ ان سے فائدہ اٹھاتے اور اللہ کے شکر گزار رہتے لیکن انھوں نے شرک میں مبتلا ہو کر اللہ کے بخشے ہوئے جانوروں کی قربانی اپنے مزعومہ شریکوں کے تھانوں اور استھانوں پر دی، محض اپنے مشرکانہ اوہام کے تحت اپنے جی سے ان کو حلال و حرام ٹھہرایا اور اس طرح اسی کفران نعمت کے جرم کے مرتکب ہوئے جس کے مرتکب ہو کر اہل سبا کیفر کردار کو پہنچے۔

مشرکین مکہ کا زعم باطل

اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لیے اس بات کو یاد رکھیے کہ مشرکین مکہ شرک کی تمام خرافات میں مبتلا ہونے کے باوجود دعویٰ یہی کرتے تھے کہ وہ پرستش خدا ہی کی کرتے ہیں۔ بتوں کی پرستش کے حق میں انھوں نے یہ دلیل پیدا کی تھی کہ ہم ان کی پرستش تو محض اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کے قریب کر دیں مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى، ان کا زعم یہ تھا کہ یہ خدا کے مقرب اور چہیتے ہیں۔ اگر یہ راضی رہیں تو خدا سے سفارش کر کے اپنے پرستاروں کو جو چاہیں دلوا سکتے ہیں۔ اسی زعم کے تحت وہ ان کو نذرانے اور چڑھاوے پیش کرتے اور ان کے نام پر جانور چھوڑتے جن کو تقدس کا یہ درجہ حاصل ہو جاتا کہ نہ ان کا دودھ اور گوشت کھانا جائز ہوتا اور نہ ان پر سواری کی جا سکتی۔ قرآن نے ان کے اسی مغالطہ کو یہاں رفع کیا ہے کہ اگر خدا ہی کی پرستش کا دعویٰ ہے تو اس کی نعمتوں پر اسی کا شکر ادا کرو، اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو نہ دوسروں کی طرف منسوب کرو، نہ ان کے لیے ان کی قربانی پیش کرو، نہ ان کے نام پر ان کو حرام و حلال ٹھہراؤ۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

خدا کی حرام کردہ چیزیں

ان جانوروں میں سے تمھارے اوپر حرام صرف مردار اور خون، لحم خنزیر اور وہ جانور ہے جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور اس میں بھی یہ رعایت ہے کہ اگر کسی شخص کی بھوک سے جان پر آ بنی ہو تو بقدر

سدرمق وہ ان میں سے کسی چیز کو کھا کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں خدا اس کو معاف کر دے گا اور اس پر رحم فرمائے گا۔ 'غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ' بس یہ ایک شرط اس کے ساتھ ہے کہ نہ اس حرام کو دل سے چاہنے والا بنے اور نہ سدرمق کی حد سے متجاوز ہو۔ یعنی یہ نہ کرے کہ اضطرار کو حرام خوری کا بہانہ بنائے اور پھر خوب حرام پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دے۔ مزید تفصیل کے طالب مائدہ آیت ۳ اور انعام ۱۴۵ کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ (۱۱۶)

تحلیل و تحریم کا حق صرف خدا کو ہے

یعنی حلال و حرام کرنے کا حق صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔ کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بغیر کسی خدائی سند کے محض اپنے مزعومات کی بنیاد پر کسی چیز کو حلال اور کسی چیز کو حرام قرار دینا شروع کر دے۔ یہ اللہ پر جھوٹا افترا ہے کیونکہ جو بات اس نے نہیں فرمائی وہ تم اس کی طرف منسوب کرتے ہو۔ اور یاد رکھو کہ خدا پر جھوٹا افترا کرنے والے کبھی فلاح یاب نہیں ہوں گے۔

'لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ' یعنی جن کے باب میں محض تمہاری اپنی زبان کے جھوٹے اور بے بنیاد دعوے ہیں، ان کے حق میں تمہارے پاس خدا کی طرف سے کوئی دلیل نہیں ہے۔

'لِتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ' یعنی اپنے جی سے حلال و حرام قرار دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے، بالآخر یہ بات خدا پر جھوٹے افترا تک منتہی ہوتی ہے جو شدید ترین جرائم میں سے ہے۔

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۱۷)

یہ 'لَا يُفْلِحُوْنَ' کی وضاحت ہے، یعنی اللہ پر افترا کرنے والوں کے لیے بس اس دنیا کی چند روزہ زندگی اور اس کا عیش و آرام ہے۔ اس کے بعد ان کے لیے ایک ابدی عذاب الیم ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۱۸)

یہود کی من مانی تحریم تحلیل

یعنی اصلاً یہود پر بھی وہی چیزیں حرام ٹھہرائی گئی تھیں جو اوپر آیات ۱۱۵ میں مذکور ہوئیں لیکن پھر انھوں نے خود اپنے جی سے کچھ چیزیں اپنے اوپر حرام کر لیں جو ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر ان پر حرام کر دی گئیں۔ خدا نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ اس کی وضاحت نساء کی آیت ۱۶۰ کے تحت گزر چکی ہے۔ تفصیل کے طالب اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْۗءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۱۹)

توبہ کرنے والوں کے لیے بشارت

یہ اوپر کی تنبیہات کے بعد ایک بشارت ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ جو لوگ خدا کی واضح ہدایات کے باوجود اب تک غلطیوں، جہالتوں اور معصیات میں گرفتار رہے ہیں ان

کے لیے اب بھی نجات کی راہ کھلی ہوئی ہے۔ تمہارا رب ان لوگوں کو بخش دے گا اور ان پر رحم فرمائے گا جنھوں نے جہالت کے سبب سے برائیاں کیں پھر اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری بعثت سے قبل جو تاریکی کا دور گزرا ہے اس میں لوگوں نے خدا کی جو نافرمانیاں کی ہیں اگر تمہاری اس دعوت کے بعد انھوں نے توبہ اور اصلاح کر لی تو ان کے لیے خدا کی رحمت میں داخل ہونے اور اس کی مغفرت کے مستحق ہونے کا موقع اب بھی باقی ہے۔ بدقسمت ہی ہوں گے وہ جو اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائیں۔

إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ (۱۲۰)

حضرت ابراہیمؑ کا اصل مقام

یہود، نصاریٰ اور مشرکین سب اپنی اپنی بدعات کی تائید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کو بطور سند استعمال کرتے تھے۔ ان میں سے ہر گروہ کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ ہی کے طریقہ پر ہے اور حرام و حلال کے معاملہ میں ملت ابراہیمی ہی کی پیروی کر رہا ہے۔ نصاریٰ بھی جنھوں نے خنزیر تک کو جائز کر لیا، اسی خبط میں مبتلا تھے۔ مشرکین مکہ کا تو پوچھنا ہی کیا وہ تو تھے ہی اپنے زعم میں ملت ابراہیم کے اجارہ دار، یہ سب بجائے اپنے اپنے رویہ کا جائزہ لینے کے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مطعون کرتے تھے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے طریقہ سے ہٹے ہوئے ہیں، حرام و حلال کے معاملہ میں ان کے ضابطہ کی پیروی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان سے الگ اپنی راہ انھوں نے نکالی ہے۔ قرآن نے ان سب کا یہ جواب دیا ہے کہ ابراہیم ایک الگ امت تھے، وہ اللہ کے فرمان بردار اور اس کی طرف یکسو تھے، وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ اسی طرح آل عمران میں فرمایا ہے کہ مَا كَانَ إِبْرَٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا۔ 'ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ اللہ کی طرف یکسو تھے۔'

'امۃ' کا لفظ ایک طرف تو حضرت ابراہیمؑ کی انفرادیت کا اظہار کر رہا ہے کہ وہ یہود، نصاریٰ اور مشرکین کسی میں سے نہیں تھے بلکہ ان سب سے الگ وہ ایک حنیف و مسلم تھے، دوسرے ان کی اس جامعیت و مرکزیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ نے ان کو بخشی تھی۔ اس لیے کہ وہ صرف ایک فرد نہیں بلکہ ایک عظیم امت کے بانی تھے۔

شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ۚ ٱجْتَبَىٰهُ وَهَدَىٰهُ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۱۲۱)

یہ حضرت ابراہیمؑ کی مزید تعریف ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں پر اللہ ہی کے شکر گزار رہے، تمہاری طرح اللہ کی نعمتوں کو اصنام و انصاب کی طرف منسوب کر کے خدا کی ناشکری کرنے والے نہیں تھے اور ان کی اسی شکر گزاری کی یہ برکت تھی کہ خدا نے ان کو منصب نبوت کے لیے انتخاب فرمایا اور ایک صحیح راہ کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی۔

وَءَاتَيْنَٰهُ فِى ٱلدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَإِنَّهُۥ فِى ٱلْءَاخِرَةِ لَمِنَ ٱلصَّٰلِحِينَ (۱۲۲)

یعنی دنیا میں بھی اللہ نے ان کو مال و جاہ عطا فرمایا یہاں تک کہ ان کی حیثیت ایک حکمران کی ہو گئی اور آخرت میں بھی وہ زمرہ صالحین میں اپنا درجہ اور مقام حاصل کریں گے۔

ثُمَّ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ أَنِ ٱتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ (۱۲۳)

یعنی ملتِ ابراہیمؑ کی پیروی کے یہ سارے مدعی، یہود، نصاریٰ اور مشرکین — تو بالکل جھوٹے ہیں البتہ ہم نے تمہاری طرف یہ وحی کی کہ تم ملتِ ابراہیمؑ کی پیروی کرو۔ چنانچہ تمہاری ملت ملتِ ابراہیمؑ ہے۔

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (۱۲۴)

سبت کا حکم ملتِ ابراہیم کا جزو نہیں تھا

یہ یہود کے ایک اعتراض کا جواب ہے۔ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر ایک اعتراض یہ بھی کرتے تھے کہ یہ لوگ سبت کا احترام نہیں کرتے۔ قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ سبت کا احترام ملتِ ابراہیمؑ کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ سبت یہود کے لیے مشروع ہوا تھا اور انھوں نے بھی اس کے باب میں اختلافات پیدا کر کے اس کی حرمت برباد کی۔ اب ان اختلافات کا فیصلہ قیامت کے روز ہوگا۔ سبت کے آداب و احکام کے بارے میں ان کے ہاں جو اختلافات ہیں ان کی تفصیل بڑی طولانی ہے۔ ہمارے لیے اس میں پڑنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۲۵-۱۲۸

خاتمۂ سورہ

آگے کی آیات خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتی ہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اللہ کے دین کی دعوت پر جمے رہنے اور مشکلاتِ راہ کا صبر و استقامت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ ساتھ ہی حصولِ صبر کا طریقہ بتایا گیا ہے اور یہ بشارت دی گئی ہے کہ اللہ کی معیت اس کے متقی بندوں ہی کو حاصل ہوتی ہے اور انجام کار کی کامیابی انہی کا حصہ ہے — آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۲۵-۱۲۸

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (۱۲۵) وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ (۱۲۶) وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ (۱۲۷)

ع ۱۶ / ۲۲ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ (۱۲۸)

ترجمۂ آیات ۱۲۵-۱۲۸

اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان کے ساتھ اس

طریقہ سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے۔ بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت پانے والے ہیں۔ اگر تم بدلہ لو تو بس اتنا لو جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے اور اگر تم صبر کرو تو یہ چیز صبر کرنے والوں کے لیے بہت ہی بہتر ہے۔ اور صبر کرو اور تمہیں صبر حاصل نہیں ہو سکتا مگر اللہ ہی کے تعلق سے اور تم نہ ان پر غم کرو اور نہ ان کی ان چالوں سے جو یہ چلتے رہتے ہیں پریشانی میں مبتلا ہو۔ بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا اور جو خوب کار ہیں۔ ۱۲۵-۱۲۸

۲۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اُدْعُ إِلٰى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (۱۲۵)

حکمت اور موعظت حسنہ — حکمت سے مراد بیان دلائل و براہین ہیں اور موعظت حسنہ سے مشفقانہ انداز میں تذکیر و تنبیہ، دعوت دین میں یہی دو چیزیں اصول کا رکی حیثیت رکھتی ہیں۔ آدمی جو بات بھی کہے دلیل و برہان کی روشنی میں کہے اور انداز دھونس جمانے کا نہیں بلکہ اس کے سچے جذبہ خیر خواہی و ہمدردی کا غماز ہو تاکہ مخاطب بدکنے کے بجائے اس کی باتوں کے سننے اور ان پر غور کرنے کی طرف مائل ہو۔ اگرچہ ہٹ دھرم لوگ اس سے بھی نہیں پسیجتے لیکن خیر و برکت کا طریقہ ہے یہی۔

پیغمبر صلعم اور صحابہ کو ہدایت — یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے آپ کے صحابہؓ کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم اللہ کے راستہ کی دعوت حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ دو۔ اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس دور میں، جیسا کہ پیچھے کی آیات سے واضح ہو چکا ہے، مخالفین کے رویہ نے بڑی گرماگرمی پیدا کر دی تھی، پھر اب آنحضرت صلعم بھی تنہا نہیں تھے بلکہ آپ کے ساتھ مومنین کی ایک جماعت میدان عمل میں آ گئی تھی۔ ایسی حالت میں یہ بات بعید از امکان نہیں تھی کہ مبادا مخالفین کے رویہ سے تنگ آ کر مسلمان بھی کوئی سخت رویہ اختیار کر لیں اور اس کا اثر دعوت کے مزاج پر پڑے۔ اس سے دعوت کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ ہدایت نازل ہوئی کہ دعوت دین کے معاملے میں قدم حکمت اور موعظت کے جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہونے چاہییں۔

حکمت تبلیغ — وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، دعوت کے کام میں بحث و گفتگو سے تو مفر نہیں لیکن اس میں بھی یہ قید

نگاری گئی کہ اس کے لیے بہتر طریقہ استعمال کیا جائے۔ اگر حریف اشتعال انگیز رویہ اختیار کرے تو اس کے رویہ سے متاثر ہو کر آدمی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش نہ کرے بلکہ ہر حالت میں اپنی شائستگی برقرار رکھے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں اسی حقیقت کی وضاحت یوں فرمائی گئی ہے۔ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَھُمْ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۵۳ (میرے بندوں کو ہدایت کر دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے۔ بے شک، شیطان ان کے مابین وسوسہ اندازی کرتا ہے بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے)

اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ' یعنی ایسے حالات میں معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ وہ گمراہوں سے بھی خوب واقف ہے اور جو ہدایت پر ہیں ان سے بھی خوب باخبر ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ داعی کی ذمہ داری صرف دعوت تک محدود ہے اگر اس نے اپنا فرض صحیح طور پر انجام دے دیا تو وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا۔ رہا یہ معاملہ کہ کون گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے اور کون ہدایت کا تو اس کا تمام تر تعلق اللہ سے ہے اور اس کو اسی پر چھوڑنا چاہیے۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ (۱۲۶)

صبر اور انتقام کے حدود کی رعایت

'فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ' میں مشاکلت کا وہی اسلوب ملحوظ ہے جس کی مثال دِنَّا ھُمْ کَمَا دَانُوْا ہے۔ 'کَمَا دَانُوْا یعنی کَمَا فَعَلُوْا'۔ اسی طرح اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم بدلہ لینا ہی چاہو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمھارے ساتھ کیا گیا ہے۔ جرم اور سزائے جرم میں عدم توازن نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ تم اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ علاوہ ازیں منہیات سے اجتناب مسلمان کے لیے ہر صورت میں لازم ہے۔ اگر مخالف ہمیں گالیاں دے تو ہم اس کے جواب میں گالیاں نہیں دے سکتے۔ اپنے معروف اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہم اس کا جواب دے سکتے ہیں۔

وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ۔ چونکہ یہ مرحلہ نازک ہے، ہر شخص حدود کو صحیح طور پر ملحوظ نہیں رکھ سکتا اور ان کے ملحوظ نہ رکھنے کی صورت میں اسلام کے عاید کردہ حدود و قیود بھی مجروح ہوں گے اور دعوت کے کام کو بھی اس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اس وجہ سے اولیٰ یہی ہے کہ صبر ہی کیا جائے۔ صبر کرنے والوں کے لیے بڑی نعمت ہے اس میں جو خیر و برکت ہے وہ انتقام میں نہیں ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ ہے کہ یہ ہدایات اس دور سے متعلق ہیں جب مسلمان افراد کی صورت میں اپنے مخالفوں کے اندر گھرے ہوئے اور ان کی چیرہ دستیوں کے شکار تھے۔ اس کا تعلق اس دور سے نہیں جب مسلمانوں کی باقاعدہ منظم حکومت قائم ہو گئی۔ ایک باقاعدہ منظم اسلامی حکومت کے حدود کار اور اس کے اختیارات اس سے مختلف ہیں۔ ان کی تفصیل پچھلی سورتوں خاص طور پر سورۂ انفال اور برأت میں، گزر چکی ہے اور آگے مدنی سورتوں میں ان کی مزید تفصیل آئے گی۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ (۱۲۷)

صبر کی ہدایت اور حصولِ صبر کی تدبیر

خطاب اگرچہ لفظاً پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن معناً، جیسا کہ اوپر والی آیت میں واضح ہو چکا ہے، تمام مسلمانوں سے ہے، گویا آپ کے واسطہ سے یہ تمام مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے۔ یہ صبر کی ہدایت بھی ہے اور حصولِ صبر کی تدبیر بھی۔ فرمایا کہ 'وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ' یعنی صبر نہیں حاصل ہو سکتا مگر اللہ کے تعلق سے۔ جو صبر کا مقام حاصل کرنا چاہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو زیادہ سے زیادہ بڑھائے۔ خدا کے ساتھ تعلق کا واسطہ اس کا ذکر ہے اور ذکر کا سب سے اعلیٰ طریقہ نماز ہے اس وجہ سے قرآن کے دوسرے مقامات میں صبر کے ساتھ نماز خصوصاً تہجد کے اہتمام کی تاکید فرمائی گئی۔

'وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ' یعنی نہ ان شامت زدوں کی حالت پر غم کرو اور نہ ان کی ان چالوں سے جو یہ رات دن چل رہے ہیں ہراساں اور پریشان ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ (۱۲۸)

نصرت کا وعدہ اور اسلام کے غلبہ کی بشارت

یہ نصرت کا وعدہ اور بالآخر اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کی بشارت ہے۔ فرمایا کہ اللہ اہل تقویٰ اور ان لوگوں کے ساتھ ہے جو خوب کار ہیں، 'مُّحْسِنُوْنَ' یعنی جو اپنے رب کی بندگی اور اس کی عبادت و اطاعت اس طرح کر رہے ہیں گویا اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ فرمایا کہ انہی لوگوں کو اللہ کی معیت حاصل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کی معیت انہی کو حاصل ہے تو لازماً انجام کار کی کامیابی بھی انہی کا حصہ ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

تدبرِ قرآن

۱۷

بنیٓ اسرآئیل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ ـــــ سورۂ نحل ـــــ کی، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، توام سورہ ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، صرف تفصیل و اجمال کا فرق ہے۔ پچھلی سورہ میں جو باتیں اشارات کی شکل میں ہیں وہ اس سورہ میں نہایت واضح صورت میں آگئی ہیں۔ مثلاً۔

پچھلی سورہ میں مشرکین مکہ کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کے لیے دعوت اور انذار دونوں ہے لیکن جہاں تک بنی اسرائیل کا تعلق ہے بات صرف اشارات کی شکل میں ہے۔ اس سورہ میں تفصیل کے ساتھ ان کو مخاطب کر کے، ان کی اپنی تاریخ کی روشنی میں، یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اگر تم اس غرے میں مبتلا ہو کر تم خدا کے محبوب اور چہیتے ہو تو یہ غرہ محض خود فریبی پر مبنی ہے، تمھاری اپنی تاریخ شاہد ہے کہ جب جب تم نے خدا سے بغاوت کی ہے تم پر مار بھی بڑی ہی سخت پڑی ہے۔ خدا کی رحمت کے مستحق تم اسی صورت میں ہوئے ہو جب تم نے توبہ اور اصلاح کی راہ اختیار کی ہے تو اگر اپنی بہبود چاہتے ہو تو اس پیغمبر کی پیروی کرو جو اسی سیدھی راہ کی دعوت دے رہا ہے جو تورات کے ذریعے سے تم پر کھولی گئی تھی۔ ساتھ ہی معراج کے واقعے کی طرف اشارہ کر کے مشرکین مکہ اور بنی اسرائیل دونوں پر یہ حقیقت بھی واضح فرمائی گئی ہے کہ اب مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں کی امانت خائنوں سے چھین کر اس نبیؐ امی کے حوالہ کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے تو جس کو اپنی روش بدلنی ہے وہ بدلے ورنہ اپنی ضد اور سرکشی کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔

قرآن جس فطری اور سیدھے طریقۂ زندگی کی دعوت دے رہا ہے، پچھلی سورہ میں صرف اس کی اساسات کی طرف اجمالی اشارہ تھا۔ اوامر میں عدل، احسان اور قرابت مندوں کے حقوق کی ادائی کا حوالہ تھا اور منہیات میں فحشاء، منکر اور بغی کا۔ اس سورہ میں اس کی پوری تفصیل آگئی ہے، اس تفصیل سے تورات کے احکام عشرہ کے ساتھ اس کی مطابقت واضح ہوتی ہے۔ گویا انسانی فطرت اور قدیم آسمانی تعلیم دونوں ہم آہنگ ہیں اس وجہ سے قریش اگر اس سے بغاوت کرتے ہیں تو ان کی بھی شامت ہے اور اگر بنی اسرائیل اس کے خلاف سازشیں کرتے ہیں تو ان پر بھی خدا کی پھٹکار ہے۔

پچھلی سورہ میں ہجرت کا ذکر بھی ہے لیکن اشارے کی شکل میں ہے۔ اس سورہ میں اس کا ذکر نہایت واضح طور پر ہوا ہے اور اس کے لیے جن تیاریوں کی ضرورت ہے ان کی ہدایت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے

صحابہؓ کو ایسے انداز میں دی گئی ہے جس سے یہ نمایاں ہو رہا ہے کہ اس کا وقت بہت قریب ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ سورہ ہجرت کے قریب زمانہ میں نازل ہوئی۔

سابق سورہ کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت واضح کرنے کے بعد اب ہم اس کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ بالاجمال پوری سورہ نظر کے سامنے آ جائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱) واقعہ معراج کی طرف اشارہ جس میں یہ حقیقت مضمر تھی کہ اب مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں گھروں کی امانت خائنوں اور بدعہدوں سے چھین کر نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کی گئی۔ اب یہی ان مقدس گھروں اور ان کے انوار و برکات کے وارث اور محافظ و امین ہوں گے اور ان کے غاصبین ـــــ مشرکین قریش اور یہود ـــــ عنقریب ان گھروں کی تولیت سے بے دخل کیے جائیں گے۔

(۲-۸) تاریخ بنی اسرائیل کی روشنی میں ان کے اس زعم کی تردید کہ وہ اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اس وجہ سے اب دنیا کی مذہبی پیشوائی ان کا اجارہ ہے۔ ان آیات میں ان پر واضح کیا گیا ہے کہ تمہیں خود تمہارے نبیوں کے ذریعہ سے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ تم دو مرتبہ خدا سے بغاوت اور زمین میں فساد مچاؤ گے اور دونوں مرتبہ خوب خوب پٹو گے۔ چنانچہ تمہاری تاریخ شاہد ہے کہ تم نے دو مرتبہ خدا سے بغاوت کی اور دونوں ہی مرتبہ خوب پٹے۔ ایک مرتبہ کلدانیوں کے ہاتھوں اور دوسری مرتبہ رومیوں کے ہاتھوں، تمہیں کلدانیوں کے شکنجہ سے نجات اس وقت ملی جب تم نے اپنے حالات کی اصلاح کی۔ اسی طرح اگر آئندہ بھی تم خدا کی رحمت کے مستحق بننا چاہتے ہو تو توبہ اور اپنے حالات کی اصلاح کرو۔ اس نبی امی کی دعوت نے تمہارے لیے توبہ اور اصلاح کی راہ کھول دی ہے۔ اگر سلامتی چاہتے ہو تو اس دعوت کو قبول کرو اور اس کی برکات میں حصہ دار بن جاؤ۔ اگر تم نے حسد میں مبتلا ہو کر اس نبی کی تکذیب کر دی اور نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ کے غرے میں مبتلا رہے تو یاد رکھو ہم کہیں چلے نہیں گئے ہیں، ہم تمہیں پھر اسی طرح پٹوائیں گے جس طرح اس سے پہلے پٹوا چکے ہیں۔

(۹-۲۱) مشرکین قریش اور بنی اسرائیل دونوں کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت کہ یہ قرآن فطرت کی اسی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کر رہا ہے جس کی طرف سابق انبیاء اور پچھلے صحیفوں نے رہنمائی کی ہے۔ ان کے لیے بشارت ہے جو اس کو قبول کر لیں اور ان کی شامت ہے جو اس کو رد کر دیں۔ ان لوگوں کی حالت پر افسوس جو اس دعوتِ حق کو قبول کرنے کے بجائے حسی معجزات اور عذاب کی نشانیاں مانگتے ہیں اور ان نشانیوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو آفاق میں بھی پھیلی ہوئی ہیں اور جن کی تفصیل اس کتاب میں بھی کر دی گئی ہے۔ یہ اپنے مزعومہ معبودوں پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں حالانکہ کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی، ہر ایک کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا ہے۔ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انذار و تنبیہ کے بغیر عذاب نہیں بھیجتا۔ اب ان کو تنبیہ ہو چکی ہے، اگر انھوں نے اس تنبیہ

سے فائدہ نہ اٹھایا تو آگے عذاب ہی کا مرحلہ باقی ہے۔ ساتھ ہی عذاب کے بارے میں سنت الٰہی کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

(۲۲-۳۹) قرآن جس طریق اقوم کی دعوت دے رہا ہے (جس کی طرف سورۂ نحل کی آیت ۹۰ میں اشارہ گزر چکا ہے) اس کی تفصیل۔ یہ تفصیل واضح کرتی ہے کہ تورات کے احکام عشرہ اور قرآن حکیم کی ان ہدایات میں پوری مطابقت ہے اور یہ عین انسانی فطرت کے موافق ہیں جن کے بغیر کوئی صالح معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا اس وجہ سے نہ بنی اسرائیل کے لیے ان سے فرار کا کوئی جواز ہے نہ بنی اسمٰعیل کے لیے۔ حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ تک سب نے انہی باتوں کی تعلیم دی ہے۔

(۴۰-۵۲) مشرکین قریش کی قرآن سے بیزاری کے اصل سبب کی طرف اشارہ کہ وہ توحید اور آخرت پر ایمان نہیں لانا چاہتے اس وجہ سے جب ان کو قرآن سنایا جاتا ہے تو وہ اس سے بدکتے اور پیغمبر پر طرح طرح کے فقرے چست کرتے ہیں حالانکہ ان دونوں باتوں کے دلائل اس قدر واضح ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا۔

(۵۳-۵۵) یہ تین آیتیں اثنائے کلام میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں۔ آپ کو یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اپنے صحابہؓ کو متنبہ کر دیں کہ دعوت کی اس گرماگرمی کے دور میں، تبلیغ حق کے جوش میں، کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالیں جو مخالفین کے لیے مزید اشتعال کا سبب بن جائے اور شیطان اسے فتنہ کا ذریعہ بنائے۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہارا فرض صرف تبلیغ حق تک محدود ہے لوگوں کو مومن و مسلم بنا دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے، اللہ ہی جس کو چاہے گا ایمان کی توفیق دے گا اور جس کو چاہے گا اس سے محروم رکھے گا۔ آیت ۵۵ میں یہ حقیقت واضح فرما دی گئی کہ اللہ نے اپنے تمام نبیوں کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت بخشی ہے اس وجہ سے کسی کے لیے مطلق ترجیح و تفضیل کی بحث نہ چھیڑنی چاہئے کہ وہ وجۂ فتنہ بن جائے۔

(۵۶-۵۷) التفات کی آیات بطور جملہ معترضہ تھیں۔ ان کے ختم ہونے کے بعد توحید کے اس مضمون کی تکمیل کر دی گئی جو اوپر سے چلا آرہا تھا۔ مشرکین، فرشتوں کو خدا کا شریک مانتے تھے۔ ان کی بابت فرمایا کہ خدا کا شریک ہونا تو الگ رہا وہ تو خود برابر خدا کے قرب اور اس کی رضا کے حصول کی جدوجہد میں سرگرم اور ہر وقت اس کے عذاب کے اندیشے سے لرزاں و ترساں ہیں۔

(۵۸-۶۰) مخالفین کے مطالبۂ نشانیٔ عذاب کا جواب اور اس باب میں سنت الٰہی کا بیان۔

(۶۱-۶۵) مخالفین کے اعراض و انکار کے اصل سبب کی طرف اشارہ کہ اللہ نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا تو انھوں نے نعمت کو شکر کے بجائے کفر و استکبار کا سبب بنا لیا۔ اس معاملے میں انھوں نے ٹھیک ٹھیک ابلیس کے نقش قدم کی پیروی کی ہے اور ابلیس نے ان کے باب میں اپنا گمان بالکل سچ کر دکھایا۔

(۶۶-۷۲) نعمت پا کر انسان کے غرور و استکبار کی تمثیل اور آنکھیں کھول کر زندگی بسر کرنے والوں اور آنکھیں بند

کر کے بھٹکنے والوں کے انجام کا بیان۔

(۷۳-۷۷) مخالفین کی مخالفت کے علی الرغم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت حق پر جمے رہنے کی تاکید اور اس امر کا اعلان کہ اگر قریش نے تمہیں اس سرزمین سے نکال دیا تو پھر ان کو بھی یہاں زیادہ دیر تک ٹکنا نصیب نہ ہوگا۔ نبی کی ہجرت کے باب میں سنت الٰہی کی وضاحت۔

(۷۸-۸۱) حصول صبر و ثبات کے لیے نماز کے اہتمام کی تاکید۔ قرب ہجرت کی طرف اشارہ اور اس کے لیے دعا کی تلقین۔ ظاہری حالات کے علی الرغم غلبۂ حق کی بشارت۔

(۸۲-۸۹) مخالفین کی حرماں نصیبی پر اظہار افسوس کہ وہ قرآن جیسی نعمت عظمیٰ کی ناقدری کر رہے ہیں حالانکہ یہ ان کے لیے شفا اور رحمت ہے اور تمام جن و انس مل کر بھی اگر ایسی کتاب لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے۔ ضمناً وحی اور جبریل سے متعلق مخالفین کا ایک معترضانہ سوال اور اس کا حکیمانہ جواب۔

(۹۰-۱۰۰) کفار کی طرف سے بعض معجزات کا مطالبہ اور ان کا جواب۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی کی طرف اشارہ۔ قریش کے متکبرین کو یہ تنبیہ کہ تم خدا کے خزائن نعمت کے ٹھیکے دار نہیں ہو کہ سمجھتے ہو کہ اگر نبوت کسی کو ملنے والی ہوتی تو تمہیں میں سے کسی کو ملتی۔ یہ اللہ کا فضل ہے اس نے جس کو چاہا دیا۔

(۱۰۱-۱۰۴) حضرت موسیٰؑ اور ان کے نو معجزات کا حوالہ۔ ان معجزات کے دیکھنے کے باوجود فرعون کی سرکشی اور اس کا انجام۔

(۱۰۵-۱۱۱) خاتمۂ سورہ ـــــ قرآن یکسر حق ہے۔ رسول کی ذمہ داری صرف انذار و تبشیر ہے۔ قرآن کا بالتدریج اترنا تعلیم کے پہلو سے ہے۔ جو بدبخت اس پر ایمان نہیں لا رہے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جن کے اندر علم کی روشنی ہے وہ اس پر ایمان لا رہے ہیں۔ اللہ اور رحمٰن سب خدا ہی کے نام ہیں۔ جو لوگ ان ناموں میں کوئی فرق کرتے اور ان کو بنائے اعتراض بناتے ہیں، ان کے درپے نہ ہو۔ اس دین کی روح میانہ روی ہے اور اس میانہ روی کو اپنی عبادات میں ملحوظ رکھو اور اللہ کی حمد اور اس کی تکبیر میں سرگرم رہو۔

اس تجزیۂ مطالب پر ایک نظر ڈال لیجیے اور دیکھیے کہ ایک معین عمود کے تحت کس طرح اس سورہ کی ہر کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہے ـــــ اب ہم توفیق الٰہی کی دعا کے ساتھ سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔

سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۱۷)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۱۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیت ۱ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی
الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ
هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①

ترجمۂ آیت ۱ پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو لے گئی ایک شب مسجد حرام سے اس دور والی مسجد تک جس کے اردگرد کو ہم نے برکت بخشی تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بیشک سمیع و بصیر وہی ہے۔ ۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (۱)

سُبْحٰنَ تنزیہ کا کلمہ ہے

'سُبْحٰنَ' جیسا کہ متعدد مواقع میں تصریح ہو چکی ہے، تنزیہ کا کلمہ ہے۔ یعنی اللہ کی ذات ہر نقص و عیب سے پاک و منزہ ہے۔ اس کلمہ سے کلام کا آغاز اس موقع پر کیا جاتا ہے جہاں مقصود خدا کے باب میں کسی سوئے ظن یا غلط فہمی کو رفع کرنا ہو۔ یہاں واقعۂ معراج کی تمہید اس لفظ سے اس لیے اٹھائی ہے کہ یہ واقعہ بھی خدا کے باب میں یہود اور مشرکین کے ایک بہت بڑے سوء ظن کو رفع کرنے والا تھا۔ یہ دونوں ہی گروہ خدا کے دین کے دو سب سے بڑے مرکزوں پر قابض تھے اور ان کو انھوں نے، ان کے بنیادی مقصد کے بالکل خلاف، نہ صرف شرک و بت پرستی کا اڈا بلکہ جیسا کہ سیدنا مسیحؑ نے فرمایا ہے کہ 'تم نے میرے باپ کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا ڈالا ہے'، ان کو انھوں نے چوروں اور خائنوں کا بھٹ ہی بنا ڈالا تھا۔ یہ دونوں ہی مقدس گھر بالکل خائنوں اور

بے ایمانوں کے تصرف میں تھے[1] اور یہ ان میں اس طرح اپنی من مانی کر رہے تھے گویا ان گھروں کا اصل مالک کانوں میں تیل ڈال کر اور آنکھوں پر پٹی باندھے سو رہا ہے اور اب کبھی وہ اس کی خبر لینے کے لیے بیدار ہی نہیں ہوگا۔ معراج کا واقعہ، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا ہے، اس بات کی تمہید تھا، کہ اب ان گھروں کی امانت اس کے سپرد ہونے والی ہے جو ان کے اصلی مقصد تعمیر کو پورا کرے گا اس وجہ سے اس کے بیان کا آغاز سُبْحٰنَ کے لفظ سے فرمایا اور آیت کے آخر میں اپنی صفات اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ کا حوالہ دے کر یہ واضح فرما دیا کہ جو نادان خدا کو نعوذ باللہ اندھا اور بہرا سمجھے بیٹھے تھے اب وہ اپنے کان اور اپنی آنکھیں کھولیں۔ اب ان کی عدالت کا وقت آگیا ہے۔ حقیقی سمیع و بصیر خدا ہی ہے اور اب وہ اپنے کامل علم و خبر کی روشنی میں لوگوں کا انصاف کرے گا۔

عبدٌ سے مراد آنحضرت صلعم

اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا اسراء کے معنی شب میں سفر کرنے کے ہیں اور جب 'ب' کے ذریعے سے یہ متعدی ہو جائے تو اس کے معنی شب میں کسی کو کہیں لے جانے کے ہیں۔ اگرچہ اس کے مفہوم میں شب میں نکلنے یا لے جانے کا مفہوم خود داخل ہے لیکن عام استعمال میں یہ لفظ کبھی کبھی اس مفہوم سے مجرد ہو جایا کرتا ہے اس وجہ سے 'لَيْلًا' کی قید سے اس بات کو مؤکد کرنا مقصود ہے کہ یہ واقعہ شب ہی میں پیش آیا۔

'بِعَبْدِهٖ' میں 'عبد' سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس موقع پر حضورؐ کے لیے اس لفظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضورؐ کے غایت درجہ اختصاص، آپؐ کے ساتھ اللہ کی غایت درجہ محبت اور آپؐ کے کمال درجہ عبدیت کی دلیل ہے۔ گویا آپؐ کی ذات کسی اور تعریف و تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ لفظ عبد نے خود انگلی اٹھا کر ساری خدائی میں سے اس کو ممیز کر دیا جو اس لفظ کا حقیقی محل و مصداق ہے۔

مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ سے مراد

'مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ' مسجد حرام سے تو ظاہر ہے کہ خانہ کعبہ مراد ہے۔ رہی دوسری مسجد تو اس کا تعارف دو صفتوں سے کرایا ہے۔ ایک 'اقصٰی' دوسری 'الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ'۔ 'اقصٰی' کے معنی ہیں دور والی۔ یہ مسجد حرم مکہ کے باشندوں سے، جو اس کلام کے مخاطب اول ہیں کم و بیش ۴۰ دن کی مسافت پر یروشلم میں تھی اس وجہ سے اس کو اقصٰی کی صفت سے موصوف فرمایا تاکہ ذہن آسانی سے اس کی طرف منتقل ہو سکے۔ پھر 'الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ' کی صفت اس کے ساتھ لگا کر اس سرزمین کی طرف بھی اشارہ کر دیا جس میں یہ مسجد واقع ہے۔ یہ اس سرزمین کی روحانی اور مادی دونوں قسم کی زرخیزیوں کی طرف اشارہ ہے۔ قدیم صحیفوں میں اس سرزمین کو دودھ اور شہد کی سرزمین کہا گیا ہے۔ جو اس کی انتہائی زرخیزی کی تعبیر ہے روحانی برکات کے اعتبار سے اس کا جو درجہ تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ جتنے انبیاء کا مولد و مدفن ہونے کا شرف اس سرزمین کو حاصل ہوا ہے کسی دوسرے علاقے کو حاصل نہیں ہوا۔

---

[1] مسجد اقصیٰ کی حالت کا اندازہ کرنے کے لیے تو حضرت مسیحؑ کے الفاظ ہی کافی ہیں۔ اگر حرم ابراہیمی کی حالت کا اندازہ کرنا ہو تو ہماری تفسیر سورۂ لہب پر ایک نظر ڈال لیجیے کہ ابولہب نے اس میں کیا اودھم مچا رکھی تھی۔

معراج کے سفر کی غایت

لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا یہ اس سفر کی غایت بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اپنے بندے کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ اسلوب بیان کی یہ بلاغت ملحوظ رہے کہ اوپر کی بات غائب کے صیغہ سے بیان ہوئی ہے جو تفخیم شان پر دلیل ہے اور یہاں صیغہ متکلم کا آگیا ہے جو التفات خاص کو ظاہر کر رہا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے یہ سفر اس لیے کرایا تاکہ اپنے بندے کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ یہ نشانیاں کیا تھیں اس کا کوئی ذکر یہاں نہیں ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ آثار و مشاہد اور وہ انوار و برکات ہیں جن سے یہ دونوں ہی گھر معمور تھے۔ مقصود ان کے دکھانے سے ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی واضح ہو جائے کہ اب یہ ساری امانت ناقدروں اور بدعہدوں سے چھین کر آپ کے حوالے کی جانے والی ہے۔ گویا دعوت کے اس انتہائی مشکل دور میں آپ کو اللہ کی مدد و نصرت کی جو بشارت دی جا رہی تھی معراج کے اس سفر نے اس پر ایک مزید مہر تصدیق ثبت کر دی اور جو کچھ ہونے والا تھا وہ آپ کو دکھا بھی دیا گیا۔

نبی کی رویائے

رہا یہ سوال کہ یہ جو کچھ آپ کو دکھایا گیا رویا میں دکھایا گیا یا بیداری میں تو اس سوال کا جواب اسی سورہ میں آگے قرآن نے خود دے دیا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ۔ ۶۰	اور ہم نے اس رویا کو جو ہم نے تمھیں دکھائی لوگوں کے لیے فتنہ ہی بنا دی۔

ظاہر ہے کہ یہاں جس رویا کی طرف اشارہ ہے اس سے اس رویا کے سوا کوئی اور رویا مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے جس کا ذکر آیت زیر بحث میں لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا کے الفاظ سے ہوا ہے۔ لفظ اراءت قرآن میں متعدد مقامات میں، رویا ہی دکھانے کے لیے آیا بھی ہے اور مفسرین نے اس سے یہی رویا مراد بھی لی ہے۔ اس وجہ سے اس کا رویا ہونا تو اپنی جگہ پر واضح بھی ہے اور مسلم بھی لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رویا کو خواب کے معنی میں لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ خواب تو خواب پریشان بھی ہوتے ہیں لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کو جو رویا دکھائی جاتی ہے وہ رویائے صادقہ ہوتی ہے۔ اس کے متعدد امتیازی پہلو ہیں جو ذہن میں رکھنے کے ہیں۔

رویائے صادقہ کے امتیازی پہلو

پہلی چیز تو یہ ہے کہ رویائے صادقہ وحی الٰہی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں پر جس طرح فرشتے کے ذریعے سے کلام کی صورت میں اپنی وحی نازل فرماتا ہے اسی طرح کبھی رویا کی صورت میں بھی ان کی رہنمائی فرماتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ یہ رویا نہایت واضح، غیر مبہم اور روشن صورت میں كَفَلَقِ الصُّبْحِ ہوتی ہے جس پر نبی کو پورا شرح صدر اور اطمینان قلب ہوتا ہے۔ اگر اس میں کوئی چیز تمثیلی رنگ میں بھی ہوتی ہے تو اس کی تعبیر بھی اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر واضح فرما دیتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ جہاں واقعات و حقائق کا مشاہدہ کرانا مقصود ہو وہاں یہی ذریعہ نبی کے لیے زیادہ اطمینان بخش ہوتا ہے اس لیے کہ اس طرح واقعات کی پوری تفصیل مشاہدہ میں آجاتی ہے اور وہ معانی و حقائق

بھی متشکل ہو کر سامنے آجاتے ہیں جو الفاظ کی گرفت ہی سے آتے ہیں۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ رویا کا مشاہدہ چشم سر کے مشاہدہ سے زیادہ قطعی، زیادہ وسیع اور اس سے ہزارہا درجہ عمیق اور دور رس ہوتا ہے۔ آنکھ کو مغالطہ پیش آسکتا ہے لیکن رویائے صادقہ مغالطہ سے پاک ہوتی ہے، آنکھ ایک محدود دائرہ ہی میں دیکھ سکتی ہے لیکن رویا بیک وقت نہایت وسیع دائرہ پر محیط ہو جاتی ہے، آنکھ حقائق و معانی کے مشاہدے سے قاصر ہے، اس کی رسائی مرئیات ہی تک محدود ہے۔ لیکن رویا معانی و حقائق اور انوار و تجلیات کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے تجلی الٰہی اپنی آنکھوں سے دیکھنی چاہی لیکن وہ اس کی تاب نہ لا سکے۔ برعکس اس کے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں جو مشاہدے کرائے گئے وہ سب آپ نے کیے اور کہیں بھی آپ کی نگاہیں خیرہ نہیں ہوئیں۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ کا موقع و محل اوپر واضح کیا جا چکا ہے۔ اس کے اندر حصر کا پہلو ہے۔ وہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ حقیقی سمیع و بصیر خدا ہی ہے۔ اس کے سمع و بصر سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہے۔ اگر دوسروں کو اس میں سے کوئی حصہ ملا ہے تو وہ خدا ہی کا عطا کردہ اور نہایت محدود ہے۔ مقصود ان صفات کا حوالہ دینے سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، مشرکین قریش اور بنی اسرائیل دونوں کو تنبیہ کرنا ہے کہ خدا کو اپنی کرتوتوں سے بے خبر نہ سمجھو، وہ ہر چیز کو دیکھ اور سن رہا ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲-۸

یہود کے کبر و غرور پر ضرب

آگے کی آیات میں یہود کے اس غرور پر ضرب لگائی گئی ہے کہ وہ اسرائیل کی اولاد اور خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں اس وجہ سے مذہبی پیشوائی ان کا اجارہ ہے۔ یہود اپنے اس غرور کے سبب سے اول تو اپنے خاندان سے باہر کسی کی نبوت و رسالت تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شروع ہی سے شدید مخالف تھے، پھر جب آپؐ نے شب معراج کے مشاہدات بیان کیے اور وہ ان کے علم میں آئے تو ان کا پارہ اور چڑھ گیا کہ یہ لو، یہ شخص ہمارے نبیوں کی وراثت اور ہماری امامت کا بھی مدعی بن بیٹھا۔ قرآن نے ان کے دماغ سے یہ ہوا نکالنے کے لیے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کا استحقاق کسی قوم کو بھی نسل و نسب کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا بلکہ ایمان و عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔ اور اس پر خود انہی کی تاریخ کی شہادت پیش کی ہے کہ خود تمہارے صحیفوں میں ہے کہ تم دو مرتبہ بڑے پیمانہ پر خدا سے بغاوت کرو گے اور زمین میں فساد مچاؤ گے اور دونوں مرتبہ خدا تم پر اپنے سخت گیر بندے مسلط کرے گا جو تمہارا کچومر نکال دیں گے۔ چنانچہ یہ پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوئیں۔ جب تم نے اصلاح کی ہے خدا نے تم پر رحمت کی ہے اور جب تم نے فساد مچایا ہے خدا نے تم پر اپنے عذاب کے کوڑے برسائے ہیں۔ یہی مرحلہ اس وقت بھی تمہارے سامنے ہے۔ ہمارے رسول کی دعوت نے تمہارے لیے صلاح و فلاح کی

ما کھول دی ہے۔ اگر تم نے یہ دعوت قبول کر لی تو اس کی برکتوں میں برابر کے حصہ دار ہوگے اور اگر تم نے یہ دعوت رد کر دی تو یاد رکھو کہ ہم کہیں چلے نہیں گئے ہیں، ہم پھر تمھاری اسی طرح خبر لیں گے جس طرح اس سے پہلے لے چکے ہیں ــــ آیات تلاوت کیجیے۔

آیات ۲-۸

وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا
مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ۝۲ ذُرِّیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ کَانَ
عَبْدًا شَکُوْرًا ۝۳ وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتٰبِ
لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا ۝۴ فَاِذَا
جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ
فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ ؕ وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝۵ ثُمَّ رَدَدْنَا لَکُمُ
الْکَرَّةَ عَلَیْهِمْ وَاَمْدَدْنٰکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَجَعَلْنٰکُمْ اَکْثَرَ
نَفِیْرًا ۝۶ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ ۟ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ
فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَکُمْ وَلِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ
کَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِیُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِیْرًا ۝۷ عَسٰی رَبُّکُمْ
اَنْ یَّرْحَمَکُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ وقف لازم
حَصِیْرًا ۝۸

ترجمۂ آیات ۲-۸

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت نامہ بنایا کہ میرے سوا کسی کو معتمد نہ بنائیو، اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کرایا۔ بے شک وہ ایک شکر گزار بندہ تھا۔ ۲-۳

اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں

فساد مچاؤ گے اور بہت سر اٹھاؤ گے۔ پس جب ان میں سے پہلی بار کی میعاد آ جاتی ہے تو ہم تم پر اپنے زور آور بندے مسلط کر دیتے ہیں تو وہ گھروں میں گھس پڑے اور شدنی وعدہ پورا ہو کے رہا۔ پھر ہم نے تمہاری باری ان پر لوٹائی اور تمہاری مال اور اولاد سے مدد کی اور تمھیں ایک کثیر التعداد جماعت بنا دیا۔ اگر تم بھلے کام کرو گے تو اپنے لیے کرو گے اور اگر برے کام کرو گے تو بھی اپنے ہی لیے۔ پھر جب پچھلی بار کی میعاد آ جاتی ہے تو ہم تم پر اپنے زور آور بندے مسلط کر دیتے ہیں کہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور تاکہ وہ مسجد میں گھس پڑیں جس طرح پہلی بار گھس پڑے تھے اور تاکہ جس چیز پر ان کا زور چلے اسے تہس نہس کر ڈالیں۔ کیا عجب کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے اور اگر تم پھر وہی کرو گے تو ہم بھی وہی کریں گے اور ہم نے جہنم کو تو کافروں کے لیے باڑا بنا ہی رکھا ہے۔ ۴-۸

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا (۲)

وکیل کے معنی کارساز اور معتمد: 'کتاب' سے مراد تورات ہے اور 'وکیل' کے معنی کارساز، معتمد اور اس ذات کے ہیں جس پر کامل بھروسہ کر کے اپنے معاملات اس کے حوالہ کر دیے جائیں۔

یہود کے بگاڑ کی تاریخ: یہ آیت تمہید ہے یہود کے اس بگاڑ اور فساد کے بیان کی جو آگے کی آیات میں آ رہا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے صحیفۂ ہدایت بنایا جس میں صاف یہ ہدایت درج تھی کہ میرے سوا کسی کو کارساز اور معتمد نہ بنائیو۔ مقصود اس کا حوالہ دینے سے یہ واضح کرنا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس اہتمام ہدایت کی کوئی قدر نہیں کی۔ اس کے صحیفۂ ہدایت کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا اور شرک سے بچتے رہنے کی صریح ہدایت کے باوجود شرک کی نجاستوں اور آلودگیوں میں مبتلا ہوئے۔

تورات میں توحید کی تعلیم: کتاب کے ذکر کے بعد توحید کی تعلیم کا حوالہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہی چیز تمام تعلیماتِ دین کے لیے مرکزِ ثقل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی پر تمام شریعت کی بنیاد بھی ہے اور اسی کے ساتھ وابستہ رہنے تک کوئی جماعت دین سے وابستہ بھی رہتی ہے۔ جہاں اس مرکزِ ثقل سے وابستگی کمزور ہوئی پھر بالتدریج سارا دین غارت

ہو کے رہ جاتا ہے۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں ہے کہ تورات توحید کی تعلیم سے بھری پڑی ہے۔ حوالے نقل کرنے میں طوالت ہوگی اس وجہ سے ہم صرف ایک حوالہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ خروج ۲۰:۲ میں ہے۔

"خداوند تیرا خدا جو تجھے زمینِ مصر سے غلامی کے گھر سے نکال لایا، میں ہوں۔ میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہووے، تو اپنے لیے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے سے مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں"

قرآن کے الفاظ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا اور تورات کے الفاظ "میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہووے" میں کتنی مطابقت ہے لیکن ان واضح ہدایات کے باوجود یہود بار بار شرک و بت پرستی میں مبتلا ہوئے جس پر ان کے نبیوں نے نہایت دردانگیز الفاظ میں ماتم بھی کیا ہے اور یہود کو ملامت بھی کی ہے۔ سیدنا مسیحؑ نے تو یہود کو مخاطب کر کے یہاں تک فرما دیا کہ "تو تو وہ ہے کہ تو نے پہلی شب میں چھنالا کیا"

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا (۳)

حرف ندا یہاں محذوف ہے۔ یعنی توحید کی اس تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو یہ یاددہانی بھی کر دی گئی تھی کہ اس بات کو ہمیشہ مستحضر رکھنا کہ تم ان باقیات الصالحات کی نسل سے ہو جن کو اللہ نے نوحؑ کے ساتھ ان کی کشتی میں بچایا۔ نوحؑ اللہ کے ایک شکرگزار بندے تھے تو تم بھی انہی کی طرح خدا کے شکرگزار اور اس کی توحید پر قائم رہنا ورنہ یاد رکھو کہ جس طرح اللہ نے قوم نوحؑ کے وجود سے، اس کے شرک کی پاداش میں، اپنی زمین کو پاک کر دیا اسی طرح تمہارے وجود سے بھی اپنی زمین کو پاک کر دے گا۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا (۴)

عربیت کا ایک اسلوب — 'قَضَيْنَا' کے بعد 'اِلٰى' کا صلہ عربیت کے قاعدے سے اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں 'اَبْلَغْنَا' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ یعنی ہم نے فیصلہ کر کے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔

یہود کے دو بڑے فسادات — 'فِی الْكِتٰبِ' میں 'الکتاب' کا لفظ یہاں تمام اسفار یہود پر مشتمل ہے۔ قرآن میں یہ لفظ تورات کے لیے بھی آیا ہے اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں کے لیے بھی۔ آیت میں یہود کے جن دو بڑے فسادات اور ان کے انجام کی خبر دی گئی ہے ان میں سے پہلے فساد اور اس کے عبرت انگیز انجام سے حضرت داؤد، یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقی ایل علیہم السلام نے آگاہ فرمایا اور دوسرے فساد اور اس کے عواقب سے سیدنا مسیحؑ نے ڈرایا۔ 'فساد' سے مراد جیسا کہ ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں، خدا کی توحید اور اس کی شریعت سے بغاوت ہے۔ اس قسم کے فسادات سے لو تو یہود کی پوری تاریخ بھری پڑی ہے چنانچہ ایک فساد کی تفصیل سورۂ بقرہ میں تابوت کے چھن جانے کے واقعہ سے متعلق بھی گزر چکی ہے لیکن

یہاں جن فسادات کا حوالہ ہے وہ ایسے فسادات ہیں کہ ان کے نتائج نے یہود کی پوری قوم کو ذلیل و پامال کر کے رکھ دیا۔ حضرت داؤدؑ نے پہلے فساد اور اس کے انجام کی جن لفظوں میں پیشین گوئی فرمائی تھی وہ یہ ہیں۔

انھوں نے (یعنی بنی اسرائیل نے) ان قوموں کو (یعنی مشرک قوموں کو) ہلاک نہ کیا، جیسا کہ خداوند نے ان کو حکم دیا تھا بلکہ ان قوموں کے ساتھ مل گئے اور ان کے سے کام سیکھ گئے اور ان کے بتوں کی پرستش کرنے لگے جو ان کے لیے پھندا بن گئے بلکہ انھوں نے اپنی بیٹیوں کو شیاطین کے لیے قربان کیا اور معصوموں کا یعنی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا خون بہایا .... اس لیے خدا کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی میراث سے (یعنی بنی اسرائیل سے) نفرت ہو گئی اور اس نے ان کو قوموں کے قبضے میں کر دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمران بن گئے۔

زبور باب ۱۰۶ آیات ۳۴-۴۱

دوسرے فساد کی پیشین گوئی کے سلسلہ میں سیدنا مسیحؑ کے الفاظ یہ ہیں۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے۔"

متی باب ۲۴ آیت ۲

لوقا میں ہے۔

"اے یروشلم کی بیٹیو! میرے لیے نہ روؤ بلکہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے روؤ کیونکہ دیکھو وہ دن آتے ہیں جب کہیں گے کہ مبارک ہیں بانجھیں اور وہ پیٹ جو نہ جنے اور وہ چھاتیاں جنھوں نے دودھ نہ پلایا۔ اس وقت وہ پہاڑوں سے کہنا شروع کریں گے کہ ہم پر گر پڑو اور ٹیلوں سے کہیں گے کہ ہمیں چھپا لو۔"

باب ۲۳ آیات ۲۸-۳۰

آیت کے آخر میں نَنۡعَذِّبَنَّکُمۡ مَرَّتَیۡنِ یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہیں۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد مچاؤ گے اور بہت سر اٹھاؤ گے اور ہم دونوں مرتبہ تم کو سخت سزا دیں گے۔ چونکہ یہ بات بالکل واضح تھی نیز اس کی پوری تفصیل آگے کی آیات میں آ رہی تھی اس وجہ سے یہاں اس کو حذف فرما دیا۔

فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰىهُمَا بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّيَارِؕ وَكَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا (۵)

'اِذَا' صرف مستقبل ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ بیان عادت و سنت اور بعض اوقات تصویر حال کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں تصویر حال ہی کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمے میں اس کو ملحوظ رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چنانچہ دیکھو جب پہلی بار کی میعاد آ جاتی ہے تو ہم تمھیں اپنے عذاب کا مزا چکھانے کے

لیے اپنے زورآور بندوں کو ابھار کر تم پر مسلط کر دیتے ہیں جو تمہارے گھروں میں گھس پڑتے ہیں اور خدا کا شدنی وعدہ پورا ہو کے رہتا ہے۔

'بعث'، کا صلہ جب 'علیٰ' کے ساتھ آتے تو وہ ابھارنے اور اکسانے کے ساتھ ساتھ مسلط کر دینے کے مفہوم پر بھی متضمن ہو جاتا ہے۔

یہود کی توہین و تذلیل کی تصویر

'فَجَاسُوا خِلٰلَ الدِّيَارِ' یہ یہود کی انتہائی توہین و تذلیل کی تصویر ہے اس لیے کہ جب دشمن اتنا زورآور ہو کر گھروں کے اندر گھس پڑے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے عزت و ناموس ہر چیز کو تاراج کر کے رکھ دیا۔ یہاں صرف اتنے ہی کے ذکر پر اکتفا فرمایا ہے اس لیے کہ ذلت کی تصویر کے لیے یہی کافی تھا لیکن آگے اس بات کا حوالہ بھی آئے گا کہ اس دشمن نے صرف گھروں میں گھسنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ مسجد اقصیٰ کی حرمت بھی پوری طرح برباد کی۔

بخت نصر کا حملہ اور یہود کی غلامی

یہ اشارہ بابل و نینوا کے بادشاہ بخت نصر یا نبوکد نضر کے حملہ کی طرف ہے جس نے ۶۰۰ ق م قبل مسیح میں یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔

یرمیاہ نبی نے اس کی پیشین گوئی یوں فرمائی تھی۔

"رب الافواج یوں کہتا ہے۔ اس لیے کہ تم نے میری باتیں نہ سنیں دیکھ میں اتر کے سارے گھرانوں کو اپنے خدمت گزار شاہ بابل نبوکد نضر کو بلا بھیجوں گا۔"

یرمیاہ ۲۵ : ۸-۹

ان کے انذار کی مزید تفصیل سنیے۔

"میں ایسا کروں گا کہ ان کے درمیان خوشی کی آواز اور خرمی کی آواز، دولہے کی آواز دلہن کی آواز، چکی کی آواز اور چراغ کی روشنی باقی نہ رہے اور یہ ساری سرزمین ویرانہ اور حیرانی کا باعث ہو جائے گی اور یہ قومیں ستر برس تک بابل کے بادشاہ کی غلامی کریں گی۔"

یرمیاہ ۲۵ : ۹-۱۰

یرمیاہ نبی کا نوحہ سنیے:۔

"خداوند نے صیہون کی بیٹی کو اپنے قہر کے ابر تلے چھپا دیا۔ اس نے اسرائیل کے جمال کو آسمان سے زمین پر پٹک دیا اور اپنے قہر کے دن اپنے پاؤں رکھنے کی کرسی کو یاد نہ کیا۔ خداوند نے یعقوب کے سارے مکانوں کو غارت کیا اور رحم نہ کیا۔ اس نے اپنے قہر میں یہوداہ کی بیٹی کے قلعوں کو ڈھا دیا۔ اس نے انہیں خاک کے برابر کر دیا۔ اس نے بادشاہت اور امیروں کو ناپاک کیا۔ اس نے اپنے قہر شدید میں اسرائیل کا ہر ایک سینگ بالکل کاٹ ڈالا۔"

یرمیاہ کا نوحہ ۲ : ۱-۳

آیت میں بخت نصر (یا بوکدنضر) اور اس کی فوجوں کے لیے 'عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ' (اپنے زور آور بندے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ ان کے دین اور تقویٰ کے اعتبار سے نہیں استعمال ہوئے ہیں بلکہ صرف اس حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں کہ انھوں نے خدا کے ارادہ کے اجراو نفاذ کے لیے آلہ و جارحہ کا کام دیا۔ یہ اگرچہ خود گندے تھے لیکن گندگی کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو صاف کرنے میں انھوں نے مشیت الٰہی کی تنفیذ کی اس وجہ سے انھیں بھی فی الجملہ خدا سے نسبت حاصل ہو گئی۔ بنی اسرائیل کو غرہ تھا کہ 'نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ' (ہم خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں)۔ خدا نے ان پر واضح کر دیا کہ جن جوتوں سے تم پٹتے ہو وہ تو خدا کی نظروں میں کچھ وقعت رکھتے ہیں لیکن تم کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا (۶)

ایک عرصہ کی غلامی اور بدحالی کے بعد جب بنی اسرائیل میں کچھ اصلاح حال کا جذبہ ابھرا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی طرف توجہ فرمائی، ان کے مال و اولاد میں برکت دی اور تائید الٰہی ان کے لیے اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ شاہ ایران اول سائرس شاہ ایران نے ۵۳۹ ق م میں کلدانیوں کو شکست دے کر ان کے ملک پر قبضہ کر لیا اور یہود کو جلاوطنی سے نجات دے کر وطن جانے اور اسے دوبارہ آباد کرنے کی اجازت دے دی، جس کے بعد بنی اسرائیل کو از سر نو خاصا فروغ حاصل ہوا۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا (۷)

نائیش کے اقوال یہود کی دوسری تباہی

'اِنْ اَحْسَنْتُمْ .... الایۃ' یعنی ایک طویل غلامی کے بعد یہ جو نجات حاصل ہوئی تھی اس کے اندر خود یہ درس مضمر تھا کہ اب اگر تم بھلائی کی روش اختیار کرو گے تو اس کا نفع خود اپنے ہی کو پہنچاؤ گے اور اگر پھر وہی سرکشی کی روش اختیار کرو گے تو اس کا انجام بھی ویسا ہی بھگتو گے۔ یہ نوشتہ دیوار بھی موجود تھا اور اس سے تمھارے نبیوں نے بھی تمھیں اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا لیکن ہوا وہی جس کی پیشین گوئی پہلے ہو چکی تھی یعنی تم اسی طرح کے فساد میں پھر مبتلا ہو گئے جس طرح کے فساد میں پہلے مبتلا ہوئے تھے چنانچہ جب تمھاری سرکشی کی دوسری میعاد آ جاتی ہے تو ہم تم پر اپنے دوسرے زور آور بندے مسلط کر دیتے ہیں تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور تاکہ یہ بھی مسجد میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے والے گھس گئے تھے اور تاکہ یہ ہر اس چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دیں جس پر ان کا زور چلے۔

'لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ' سے پہلے 'بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ' کے الفاظ محذوف ہیں۔ چونکہ اس کا قرینہ واضح تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا اور 'لِيَسُوْٓءٗا' پر جو لام ہے وہ اسی کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہا ہے۔

بائیبل ہسٹری کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس تباہی کی طرف اشارہ ہے جو ۷۰ء میں رومی شاہنشاہ طیطاؤس (ٹائیٹس) کے ہاتھوں یہود پر آئی، جس کی طرف حضرت مسیح نے اشارہ فرمایا تھا۔

عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یَّرۡحَمَکُمۡ ۚ وَ اِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا ۘ وَ جَعَلۡنَا جَہَنَّمَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ حَصِیۡرًا ﴿۸﴾

'حَصِیۡر' کا ٹھیک ترجمہ باڑا ہے جس میں جانوروں کو بند کرتے ہیں۔

یہ ان یہود سے خطاب ہے جو ان آیات کے نزول کے وقت موجود اور قرآن کی مخالفت میں کفار قریش کی ہمنوائی و پشت پناہی کر رہے تھے۔ ان سے خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے وہ تمہیں سنایا جا چکا۔ اب اگر خیریت چاہتے ہو تو اس نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت نے تمہارے لیے نجات کی جو راہ کھولی ہے، اس کو اختیار کرو، اور اپنے مستقبل کو سنوار لو۔ اگر تم نے توبہ اور اصلاح کی راہ اختیار کر لی تو خدا بھی تم پر رحم فرمائے گا اور اگر تم نے پھر اسی طرح کی حرکتیں کیں جیسی کہ پہلے کرتے آئے ہو تو ہم بھی تمہاری اسی طرح خبر لیں گے جس طرح پہلے لے چکے ہیں اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس دنیا میں جو ذلت و رسوائی ہوئی ہے وہ تو ہو گی ہی۔ آگے تمہارے جیسے کافروں کے لیے جہنم کا باڑا ہے جس میں سارے کے سارے بھر دیے جائیں گے۔

نبی صلعم کی یہود کے لیے نجات

اس آیت کے تیور لحاظ رکھنے کے قابل ہیں۔ پہلے ٹکڑے بات غائب کے صیغے سے فرمائی۔ پھر 'وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا' میں متکلم کا صیغہ آگیا۔ پہلے ٹکڑے میں بے پروائی کا انداز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم یہ صحیح راہ اختیار کر لو گے تو اپنے ہی کو نفع پہنچاؤ گے اور اگر نہ اختیار کرو گے تو اپنی ہی شامت کو دعوت دو گے، خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے۔ دوسرے ٹکڑے میں نہایت ہی سخت وعید ہے اس وجہ سے اول تو متکلم کا صیغہ آیا جو تہدید و وعید کے لیے زیادہ موزوں ہے پھر اس میں ابہام و اجمال بھی ہے۔ یہ تو بتایا کہ ہم لوٹیں گے، یہ نہیں بتایا کہ ہم کس شکل میں لوٹیں گے۔ یہ بات سمجھنے والوں کی سمجھ پر چھوڑ دی ہے اور اس جملے کی ساری شدت اس ابہام کے اندر مضمر ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹-۳۱

آگے کی آیات میں مشرکین قریش اور یہود دونوں کو اس قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے جو فطرت کی اسی صراط مستقیم کی دعوت دے رہا ہے جس کی دعوت تمام انبیاء نے دی ہے۔ اس دعوت پر ایمان لانے والوں اور اس کی تکذیب کرنے والوں، دونوں کا انجام واضح فرما دیا گیا ہے اور ان لوگوں کو ملامت کی گئی ہے جو آفاق میں پھیلی ہوئی نشانیوں اور قرآن کی واضح آیات سے آنکھیں بند کیے ہوئے عذاب کی نشانیوں کا مطالبہ کر رہے

ہیں۔ اسی ذیل میں بالاجمال اس سنت الٰہی کی وضاحت کر دی گئی ہے جو قوموں کو عذاب دینے کے معاملے میں
اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمائی ہے ـــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ
۹-۲۱ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ﴿٩﴾ وَأَنَّ الَّذِينَ لَا
ع ۱۰ ۱ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٠﴾ وَيَدْعُ
الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ﴿١١﴾
وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ ۖ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا
آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِتَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ
السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا ﴿١٢﴾ وَكُلَّ
إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا ﴿١٣﴾ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ
حَسِيبًا ﴿١٤﴾ مَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا
يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ
حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ﴿١٥﴾ وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا
فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ﴿١٦﴾ وَكَمْ
أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ ۗ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ
خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿١٧﴾ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا
نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا

مَّدۡحُوۡرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا وَهُوَ مُؤۡمِنٌ
فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعۡيُهُمۡ مَّشۡكُوۡرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَاۤءِ وَهٰٓؤُلَاۤءِ مِنۡ
عَطَآءِ رَبِّكَ ‌ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحۡظُوۡرًا ﴿۲۰﴾ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ
فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ‌ ؕ وَلَلۡاٰخِرَةُ اَكۡبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكۡبَرُ
تَفۡضِيۡلًا ﴿۲۱﴾

ترجمۂ آیات ۹-۲۱

بے شک یہ قرآن اس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں اس بات کی بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم نے ان کے لیے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۹-۱۰

اور انسان برائی کا اس طرح طالب بنتا ہے جس طرح اس کو بھلائی کا طالب بننا چاہیے اور انسان بڑا ہی جلد باز ہے اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا، سو ہم نے رات کی نشانی تو دھندلی کر دی اور ہم نے دن کی نشانی کو روشن بنایا تاکہ تم اپنے رب کے فضل کے لیے کوشش کرو اور تاکہ تم سالوں کی تعداد اور حساب معلوم کر سکو اور ہم نے ہر چیز کی پوری پوری تفصیل کر دی ہے۔ ۱۱-۱۲

اور ہم نے ہر انسان کا نصیبہ اس کے گلے کے ساتھ باندھ دیا ہے اور ہم قیامت کے روز اس کے لیے ایک رجسٹر نکالیں گے جس کو وہ بالکل کھلا ہوا پائے گا۔ لو، پڑھو اپنا اعمال نامہ! آج تم خود ہی اپنا حساب کر لینے کے لیے کافی ہو۔ جو ہدایت کی راہ چلتا ہے تو وہ اپنے ہی لیے ہدایت کی راہ چلتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے ہی اوپر وبال لاتا ہے اور کوئی

جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی اور ہم عذاب دینے والے نہیں بنتے جب تک کسی رسول کو بھیج نہ لیں۔ ۱۲-۱۵

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے خوش حالوں کو امر کر دیتے ہیں تو وہ اس میں خوب ادھم مچاتے ہیں۔ پس ان پر بات پوری ہو جاتی ہے پھر ہم اس کو یکقلم نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اور نوح کے بعد ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں اور تمھارا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے اور ان کو دیکھنے کے لیے کافی ہے۔ ۱۶-۱۷

جو دنیا ہی کا طالب بنتا ہے ہم اس کے لیے اسی میں جس قدر چاہتے ہیں، جس کے لیے چاہتے ہیں آگے بڑھا دیتے ہیں۔ پھر ہم نے اس کے لیے جہنم رکھ چھوڑی ہے جس میں وہ خوار اور راندہ ہو کر داخل ہوگا۔ اور جو آخرت کا طالب بنتا ہے اور اس کے شایانِ شان کوشش بھی کرتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو درحقیقت یہی لوگ ہیں جن کی سعی مقبول ہو گی۔ ہم تیرے پروردگار کی بخشش سے ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ان کی بھی اور ان کی بھی۔ اور تیرے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں۔ دیکھو ہم نے ان کے ایک کو دوسرے پر کس طرح فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت درجات اور فضیلت کے اعتبار سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ۱۸-۲۱

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (۹-۱۰)

اَقْوَمُ کا مفہوم — اَقْوَمُ کے معنی سیدھا اور مستقیم یعنی وہ راستہ جو ٹھیک فطرت اور عقل کے مطابق اور خدا تک پہنچنے اور پہنچانے والا ہے۔

یہود اور مشرکین کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت

یہ بنی اسرائیل اور مشرکین قریش دونوں کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت ہے کہ اگر خدا تک پہنچنا چاہتے ہو تو پیچ پیچ کی وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے اس راستہ کو اختیار کرو جس کی طرف قرآن بلا رہا ہے۔ یہ ان لوگوں کو اجر عظیم کی خوش خبری دیتا ہے جو اس پر ایمان لا کر عمل صالح کی زندگی اختیار کریں۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اس کے سبب سے اس قرآن کو بھی ٹھکرا رہے ہیں ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔

وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا (۱۱)

یہ حالت انہی مخالفین قرآن کی بیان ہوئی ہے جو اس پر ایمان لانے کے بجائے کسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ مطالبہ چونکہ نہایت احمقانہ اور خود ان کے حق میں نہایت مہلک تھا اس وجہ سے بات ان سے منہ پھیر کر عام الفاظ میں بانداز تاسف فرما دی گئی کہ انسان کا عجیب حال ہے کہ جس سرگرمی کے ساتھ اس کو خیر کا طالب ہونا چاہیے اس سرگرمی کے ساتھ وہ اپنے لیے آفت اور تباہی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ مہلت جو ان لوگوں کو ملی ہوئی ہے اس سے فائدہ اٹھانے اور اپنی زندگی کو بنانے سنوارنے کے بجائے یہ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد اس عذاب ہی کو دیکھ لیں جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ ۖ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا (۱۲)

اس آیت کے پہلے ٹکڑے میں فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ کے بعد مُظْلِمَةً لِّتَسْتَرِيحُوا یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہیں جن پر بعد کے الفاظ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ روشنی ڈال رہے ہیں۔ یعنی ہم نے شب کو تاریک بنایا تاکہ تم اس میں راحت حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں خدا کے رزق و فضل کے طالب بنو۔

عذاب کی نشانی کے طالبوں کے لیے آفاقی نشانیاں

یہ عذاب کی نشانی مانگنے والوں کو آفاق کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر نشانی ہی مطلوب ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ کوئی عذاب ہی کی نشانی آئے آخر یہ رات اور رات کے بعد دن کے طلوع کو کیوں نہیں دیکھتے کیا یہ کچھ کم نشانی ہے۔ رات آتی ہے تو تمہارے لیے راحت اور سکون کا بستر بچھا دیتی ہے جس میں تم دن کے تھکے ماندے آرام کرکے از سر نو چاق و چوبند ہو جاتے ہو اسی لیے خدا نے اس کو تاریک اور پرسکون بنایا ہے۔ پھر دن آتا ہے جس میں تم تازہ دم ہو کر اپنی معاشی سرگرمیوں اور خدا کے رزق و فضل کی طلب میں سرگرم ہوتے ہو چنانچہ اسی لیے تمہارے پروردگار نے اس کو روشن بنایا ہے۔

وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ۔ روز و شب کی یکے بعد دیگرے، پابندیٔ اوقات کے ساتھ، آمد شد کا یہ ایک مزید فائدہ بتایا کہ اس طرح تم مہینوں اور سالوں کا حساب بھی معلوم کر لیتے ہو اور دوسرے حساب بھی جان لیتے ہو۔ اگر یہ روز و شب کا فرق نہ ہوتا تو آخر کسی چیز کے تعین کے لیے تم نشان اور علامت امتیاز کس چیز کو ٹھہراتے؟

وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا۔ یعنی آفاق کی ان نشانیوں کے علاوہ ہم نے تم پر یہ احسان بھی کیا ہے کہ

اپنی اس کتاب میں بھی ہر ضروری چیز کی تفصیل کر دی ہے تاکہ غور کرنے والے کے اطمینان کے لیے یہ کتاب ہی کافی ہو جائے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رات اور دن کی آمد و شد سے جس حقیقت کی طرف یہاں توجہ دلائی گئی ہے قرآن نے صرف اسی پر بس نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے مقامات پر اس کے مزید پہلو واضح فرمائے ہیں، مثلاً تضاد کے باوجود ان کے درمیان جو توافق ہے اس سے توحید پر استدلال کیا ہے۔ رات کے بعد صبح کی آمد سے حشر و نشر کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان چیزوں کی تفصیل پیچھے بھی اس کتاب میں گزر چکی ہے اور آگے بھی ان کی تفصیلات آئیں گی۔

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ۝ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (۱۳-۱۴)

'طائر' کا مفہوم — طائر کے اصل معنی تو پرندے کے ہیں لیکن اہل عرب پرندوں سے چونکہ فال بھی لیتے تھے اور اپنے زعم کے مطابق ان سے قسمت بھی معلوم کرتے تھے اس وجہ سے یہ لفظ قسمت، حظ اور نصیبہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

یہ عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو تنبیہ ہے کہ اگر یہ جلدی یہ اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کے بل پر مچائے ہوئے ہیں تو انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہم نے ہر انسان کا نصیبہ اس کی گردن کے ساتھ لٹکا رکھا ہے جس نے جو کچھ کیا ہوگا اس کی پوری تفصیل ایک کھلے ہوئے رجسٹر کی صورت میں اس کے سامنے موجود ہوگی اور ہم اس سے کہیں گے کہ تم اپنا اعمال نامہ خود ہی پڑھ لو، تم اپنے حساب کے لیے خود ہی کافی ہو، اس میں کسی اور کی دخل اندازی کی ضرورت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حساب کے دن کوئی بھی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا۔ ہر ایک کے اعمال اس کے سامنے ہوں گے اور ہر ایک کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا ہوگا۔

مَّنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا (۱۵)

اتمام حجت کے لیے رسول کی بعثت — یہ اوپر کے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا اپنے ہی نفع کے لیے کرے گا اور جو گمراہی کی راہ چلے گا اس کا انجام خود ہی بھگتے گا۔ کوئی دوسری جان کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی۔ 'وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ ...... الاٰیۃ' یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو قوموں پر عذاب کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اختیار فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب بھیجنے سے پہلے اتمام حجت کے لیے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب کے لیے تم کیا جلدی مچائے ہوئے ہو؟ اس کا ایک مرحلہ تو طے ہو چکا کہ اتمام حجت کے لیے خدا کا رسول تمھارے پاس آگیا۔ اب تو عذاب کے آنے میں صرف اتنی کسر باقی ہے کہ تم پر حجت تمام ہو جائے۔ تمھاری شامت ہی ہوگی اگر تم نے اس فرصت سے فائدہ نہ اٹھایا۔

وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا (۱۶)

'امر' کا مفہوم

'اَمَر' صرف حکم دینے ہی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ بسا اوقات کسی کو ڈھیلا چھوڑ دینے اور مہلت دے دینے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ آپ کسی شخص یا گروہ سے افہام و تفہیم کی کوشش کرنے کے بعد جب تنگ آ جاتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ جاؤ، جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ بظاہر یہ امر ہی کا صیغہ استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم اِمہال ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی سرکش لوگوں پر اپنی حجت تمام کر چکنے کے بعد ان کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح سے بھر لیں۔

'مُتْرَفِيْن' کسی قوم کے کھاتے پیتے خوش حال طبقہ کو کہتے ہیں۔ چونکہ قوم کی باگ انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس وجہ سے سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت اصلاح میں سب سے پہلے اسی طبقہ کو خطاب کیا ہے۔ پھر جب اس طبقہ نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے نہ صرف ان کو مایوس کر دیا ہے بلکہ ان کے قتل کے درپے ہو گیا ہے تو نبی نے ہجرت فرمائی اور قوم عذابِ الٰہی کی گرفت میں آ گئی ہے۔

یہ عذاب کے معاملے میں سنتِ الٰہی کی مزید وضاحت ہے۔ فرمایا کہ جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش حالوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ اس میں خوب کھل کر خدا کی نافرمانیاں اور بدمستیاں کرتے تاآنکہ ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور ان کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ پھر خدا ان کو پکڑتا ہے اور اس بستی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتا ہے۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ ٱلْقُرُونِ مِنۢ بَعْدِ نُوحٍ ۗ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِۦ خَبِيرًۢا بَصِيرًا (۱۷)

یہ اسی مذکورہ سنتِ الٰہی کی تائید میں پچھلی تاریخ کا حوالہ ہے کہ نوح کے بعد ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کیا ہے، اگر یہ لوگ دیدۂ عبرت رکھتے ہیں تو ان کے حالات سے سبق لیں۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ وہ تمہاری قوم کے سرکشوں کے جرائم سے بھی اچھی طرح باخبر ہے اور سارے حالات کو دیکھ رہا ہے۔ جب وقت آ جائے گا تو وہ ان کا فیصلہ کرنے میں بھی دیر نہیں لگائے گا۔

مَّن كَانَ يُرِيدُ ٱلْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُۥ فِيهَا مَا نَشَآءُ لِمَن نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُۥ جَهَنَّمَ يَصْلَىٰهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا (۱۸)

عاجلہ کا مفہوم

'عَاجِلَة' آخرت کا مقابل لفظ ہے یعنی یہ دنیا اور اس کا نفع عاجل۔

اِمہال کے باب میں سنتِ الٰہی

یہ اِمہال کے باب میں سنتِ الٰہی بیان ہو رہی ہے کہ جو لوگ آخرت کو یک قلم نظر انداز کر کے صرف اسی دنیا اور اس کے نفع عاجل کے طلب گار بنتے ہیں خدا ان کو بھی محروم نہیں کرتا بلکہ ان میں سے بھی جس کے لیے چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ البتہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ ایسے لوگوں کا حصہ آخرت میں صرف جہنم ہے جس میں وہ مذموم و مطرود ہو کر داخل ہوں گے۔

اس آیت میں 'مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ' کے الفاظ خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات بھی دنیا طلبوں کے اپنے اختیار میں نہیں ہے کہ جو شخص اس دنیا میں جتنا چاہے حاصل کر لے بلکہ یہ معاملہ کلیۃً خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے جتنا چاہتا ہے دیتا ہے۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (۱۹)

اصل کامیاب گروہ

یہ آخرت کے طلبگاروں اور اصل فائز المرام گروہ کا بیان ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ آخرت کے طالب بنتے ہیں اور اس کے شایان شان کوشش بھی کرتے ہیں اور ان کے سینے ایمان سے بھی منور ہیں، درحقیقت یہی لوگ ہیں جن کی سعی عند اللہ مقبول ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ اس دنیا میں سے بھی جو کچھ ان کے لیے مقدر ہے پاتے ہیں اور آخرت تو ان کی کامیابی کا گھر ہے ہی۔

اس آیت میں بھی 'وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ' کے الفاظ خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت صرف تمنا کرنے سے نہیں مل جائے گی، بلکہ اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش بھی مطلوب ہے اور ساتھ ہی شرک کی ہر آمیزش سے پاک ایمان بھی۔ جب تک یہ دونوں چیزیں طلب آخرت کے ساتھ نہیں ہوں گی اس وقت تک یہ تمنا لاحاصل ہی رہے گی۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۲۰)

رب کی عطاو بخشش عام ہے

لفظ 'کل' جب مختلف جماعتوں کے ذکر کے بعد اس طرح آئے جس طرح یہاں آیا ہے تو وہ معرفہ کے حکم میں ہو جاتا ہے۔ یعنی اس سے وہ جماعتیں مراد ہوتی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے رب کی عطاو بخشش کا دروازہ مذکورہ دونوں گروہوں میں سے کسی پر بھی بند نہیں۔ جو لوگ آخرت سے بالکل بے پروا رات دن دنیا ہی کی طلب میں سرگرم ہیں، ان کو بھی خدا اس دنیا میں سے جو کچھ ان کے لیے مقدر کر رکھا ہے، دیتا ہے، یہ نہیں کرتا کہ ان کی خدا فراموشی اور آخرت فراموشی کے جرم میں ان کو دنیا سے محروم کر دے۔ اسی طرح جو لوگ آخرت کے طالب بنتے ہیں خدا اس دنیا میں سے ان کا مقدر حصہ دیتا ہے۔ یہ نہیں کرتا کہ دنیا سے بے پروائی کے سبب سے ان کو دنیا سے محروم کر دے بلکہ ان کو اس دنیا میں سے بھی ان کا حصہ دیتا ہے اور آخرت میں بھی وہ اپنی کوششوں کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اصل حقیقت یہ ہے تو آدمی اس فانی اور حقیر دنیا کے پیچھے اپنے آپ کو آخرت کی ابدی اور لازوال نعمتوں سے کیوں محروم کرے۔ وہ راستہ کیوں نہ اختیار کرے جس پر چل کر آخرت کی ابدی نعمتوں کا بھی حقدار بنے اور اس دنیا میں سے بھی جو کچھ اس کے لیے مقدر ہے اس سے بہرہ مند ہو۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا (۲۱)

یعنی دیکھو، یہ حقیقت اپنی جگہ پر بالکل واضح ہے کہ خدا ہی نے جس کو چاہا ہے زیادہ دیا ہے اور جس کو چاہا ہے کم دیا ہے۔ یہ انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جتنا چاہے حاصل کر لے۔ اسی طرح آخرت میں بھی تمام اختیار خدا ہی کے ہاتھ میں ہوگا، وہی جس کو چاہے گا عزت دے گا اور جس کو چاہے گا ذلت دے گا کہ کسی

دوسرے کو وہاں یہ زور و اثر حاصل نہیں ہو گا کہ وہ اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ یہ آخرت اپنے درجات و مراتب کے لحاظ سے اس دنیا کے درجات و مراتب کے لحاظ سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہو گی تو جس کو کوشش کرنی ہو وہ اس کے درجات و مراتب کا طالب بنے اور اس کے لیے کوشش کرے، اس دنیا کے پیچھے آخرت کو کیوں برباد کرے۔

۶۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۲۲-۳۹

اور آپ نے دیکھا کہ آیت ۹ میں یہ فرما کر کہ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ ..... الاٰیۃ (یہ قرآن اس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سیدھا ہے) کلام کا رخ بعض دوسری متعلق باتوں کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب پھر کلام اپنے اصل سلسلہ سے مربوط ہو گیا اور قرآن خدا تک پہنچنے کے جس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کی وضاحت شروع ہو گئی۔ یہی راستہ فطرت اور عقل کا سیدھا راستہ ہے اور یہی اس عدل و احسان کی زندگی کو وجود میں لاتا ہے جو خدا کو پسند ہے اور جس پر صالح معاشرہ اور صالح تمدن کی بنیاد ہے۔ یہاں سورۂ نحل کی آیت ۹۰ ذہن میں پھر تازہ کر لیجیے جس میں قرآن کے اوامر اور منہیات کی اساسات واضح کی گئی ہیں۔ اس لیے کہ آگے کی آیات اسی اجمال کی شرح کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ .... الاٰیۃ ___ آگے آیات کی تلاوت کیجیے۔

ع ۲ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ وَ
۲ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا
آیات ۲۲-۳۹ يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ
وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ
الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾
رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ
لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ
وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ
الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ

رَبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُل لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا ﴿٢٨﴾ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً
إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿٢٩﴾
إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ
خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿٣٠﴾ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ ع ۳ ۴
نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا ﴿٣١﴾ وَلَا تَقْرَبُوا
الزِّنَىٰ ۖ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ
الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَن قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا
لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا ﴿٣٣﴾ وَلَا
تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۚ وَأَوْفُوا
بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ﴿٣٤﴾ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ
وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿٣٥﴾ وَلَا
تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ
أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴿٣٦﴾ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ
لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ﴿٣٧﴾ كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ
سَيِّئُهُ عِندَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا ﴿٣٨﴾ ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ
مِنَ الْحِكْمَةِ ۗ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتُلْقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا
مَّدْحُورًا ﴿٣٩﴾

ترجمۂ آیات ۲۲-۳۹

اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کرکہ تو سزاوار مذمت اور درماندہ ہو کر رہ جائے

اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو۔ اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اف کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات کہو اور ان کے لیے رحمدلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب ان پر رحم فرما، جیسا کہ انھوں نے بچپن میں مجھے پالا۔ تمہارا رب جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس سے خوب واقف ہے۔ اگر تم سعادت مند ہو گے تو وہ رجوع کرنے والوں کو بڑا بخشنے والا ہے۔ ۲۳-۲۵

اور تم قرابت دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو بھی اور مال کو اللّے تللّے نہ اڑاؤ۔ اللّے تللّے اڑا دینے والے شیطانوں کے بھائی ہوتے ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ اور اگر تمھیں اپنے رب کے فضل کے انتظار میں، جس کے تم متوقع ہو، ان سے اعراض کرنا پڑ جائے تو تم ان سے نرمی کی بات کہہ دو۔ اور نہ تو اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھے رکھو اور نہ اس کو بالکل کھلا ہی چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ رہو۔ بے شک تمہارا رب ہی ہے جو رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، بے شک وہی اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا اور ان کو دیکھنے والا ہے۔ ۲۶-۳۰

اور تم اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشہ سے قتل نہ کرو، ہم ہی ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی بے شک ان کا قتل بہت بڑا جرم ہے۔ اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ کیونکہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت بری راہ ہے۔ اور جس جان کو خدا نے محترم ٹھہرایا اس کو قتل مت کرو مگر حق پر اور جو ظلماً قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے ولی کو اختیار دیا تو وہ قتل میں حدود سے تجاوز نہ کرے کیونکہ اس کی مدد کی گئی ہے۔ اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو مگر اس طریقہ سے جو اس کے حق میں

بہتر ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے سن پختگی کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کی پرسش ہونی ہے۔ اور جب تم ناپو تو ناپ پوری رکھو اور وزن صحیح ترازو سے کرو۔ یہی بہتر اور مآل کار کے اعتبار سے خوب تر ہے اور جس چیز کا تمہیں علم نہیں اس کے درپے نہ ہوا کرو۔ کیونکہ کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک چیز کی پرسش ہونی ہے اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کے طول کو پہنچ سکتے ہو۔ ان ساری باتوں کی برائی تمہارے رب کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ ہے۔ ۳۱-۳۸

یہ ان باتوں میں سے ہیں جو تمہارے رب نے حکمت میں سے تمہاری طرف وحی کی ہیں اور خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک نہ کرو کہ تم ملامت زدہ اور راندہ ہو کر جہنم میں جھونک دیے جاؤ۔ ۳۹

تورات کے احکام عشرہ

لہ تورات میں کم و بیش یہی باتیں جس انداز میں کہی گئی ہیں ان سے واقف رہنا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوگا اس وجہ سے ہم اس کا ضروری حصہ یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

"پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہہ کہ تم پاک رہو کیونکہ میں جو خداوند تمہارا خدا ہوں پاک ہوں۔ تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے اور تم میرے سبتوں کو ماننا۔ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ تم بتوں کی طرف رجوع نہ ہونا اور نہ اپنے لیے ڈھالے ہوئے دیوتا بنانا۔ میں خداوند تمہارا خدا ہوں اور جب تم خداوند کے حضور سلامتی کے ذبیحے گزرانو تو ان کو اس طرح گزراننا کہ تم مقبول ہو۔........

اور جب تم اپنی زمین کی پیداوار کی فصل کاٹو تو تو اپنے کھیت کے کونے کونے تک پورا پورا نہ کاٹنا اور نہ کٹائی کی گری پڑی بالوں کو چن لینا۔ اور تو اپنے انگورستان کا دانہ دانہ نہ توڑ لینا اور نہ اپنے انگورستان کے گرے ہوئے دانوں کو جمع کرنا۔ ان کو غریبوں اور مسافروں کے لیے چھوڑ دینا۔ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ تم چوری نہ کرنا اور نہ دغا دینا اور نہ ایک دوسرے سے جھوٹ بولنا اور تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھانا جس سے تو اپنے خدا کے نام کو ناپاک ٹھہرائے۔ میں خداوند ہوں۔ تو اپنے پڑوسی پر ظلم نہ کرنا نہ اسے لوٹنا۔ مزدور کی مزدوری کا تیرے پاس ساری رات صبح تک رہنے نہ پائے۔ تو بہرے کو نہ کوسنا اور نہ اندھے کے آگے ٹھوکر کھلانے کی چیز کو دھرنا بلکہ اپنے خدا سے ڈرنا۔ میں (باقی اگلے صفحہ پر)

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا (۲۲)

واحد کا خطاب جمع کے لیے

ہم متعدد مقامات میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ واحد کا خطاب بسا اوقات جمع کے لیے بھی آتا ہے۔ اس صورت میں گویا جماعت کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مخاطب ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ چنانچہ بیچ بیچ میں خطاب کے لیے جمع کا صیغہ بھی استعمال ہو گیا ہے جس سے خطاب کی اصل نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس بیچ میں اگر کہیں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہوا ہے تو وہ جماعت کے امام کی حیثیت سے ہوا ہے اس کی حیثیت شخصی خطاب کی نہیں ہے۔

'فَتَقْعُدَ' کا مفہوم

'فَتَقْعُدَ' یہاں اس مفہوم میں آیا ہے جس مفہوم میں افعالِ ناقصہ مثلاً 'تَکُوْنَ'، 'تُصْبِحَ' وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ اردو میں بھی 'بیٹھ رہو'، 'بیٹھ رہے' اس مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس صورت میں بیٹھنے کے معروف مفہوم سے یہ لفظ مجرد ہو جاتا ہے۔

قرآن کے طریق اقوام کی بنیادی دفعہ

قرآن جس عدل یا طریق اقوام کی تعلیم دیتا ہے یہ اس کی بنیادی دفعہ ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ خالق، مالک، رازق صرف خدا ہے تو اس کے حقوق اور اس کی خدائی میں کسی اور کو ساجھی بنانا عدل کے منافی اور بہت بڑا ظلم ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے۔

خدا کا شریک بنانے کا انجام

'فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا' یہ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک بنانے کا انجام بیان ہوا ہے اور 'فَتَقْعُدَ' کا ظرف 'یَوْمَ الْقِیٰمَةِ' یہاں محذوف ہے۔ یعنی اگر خدا کے ساتھ اس کے حقوق میں کسی اور کو شریک بناؤ گے تو قیامت کے روز سزاوارِ مذمت اور مخذول ہو کر رہ جاؤ گے۔ تم خود اپنی بدبختی کے ذمہ دار ہو گے اور تمہارے مزعومہ شرکاء و شفعاء میں سے نہ صرف یہ کہ کوئی تمہارا ساتھ نہ دے گا بلکہ وہ بھی تم پر لعنت اور نفرت کریں گے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۲۳)

خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا

یعنی یہ خدا ہی کا کام ہے کہ وہ یہ بتائے کہ اس کے حقوق میں کوئی شریک ہے یا نہیں ہے سو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا تم کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ خدا کے بعد سب سے بڑا حق ہو سکتا ہے تو والدین کا اپنی اولاد پر

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) خداوند ہوں۔ تم فیصلہ میں ناراستی نہ کرنا۔ نہ تو تو غریب کی رعایت کرنا نہ بڑے آدمی کا لحاظ بلکہ راستی کے ساتھ اپنے ہم سایہ کا انصاف کرنا۔ تو اپنی قوم میں ادھر ادھر لترا پن نہ کرتے پھرنا اور نہ اپنے ہم سایہ کا خون کرنے پر آمادہ ہونا، میں خداوند ہوں۔ تو اپنے بھائی سے بغض نہ رکھنا .... تو انتقام نہ لینا اور نہ اپنی قوم کی نسل سے کینہ رکھنا بلکہ اپنے ہم سایہ سے اپنی مانند محبت کرنا۔ میں خداوند ہوں۔ تم میری شریعتوں کو ماننا۔"

احبار باب ۱۹

ہو سکتا ہے اس لیے کہ ان کی پیدائش اور پرورش و پرداخت کا وہ ذریعہ بنتے ہیں لیکن ان کا حق بھی اللہ نے یہ نہیں قرار دیا کہ وہ اس کی عبادت میں شریک ٹھہرائے جائیں بلکہ ان کا حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ احسان کیا جائے۔ 'اِحْسَانًا' یہاں فعل محذوف ہے مفعول مطلق ہے اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کے ساتھ نہایت بہتر سلوک کیا جائے۔ یہاں سیاق کلام سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اگر عبادت میں کسی اور کو شریک کرنے کی کوئی ادنیٰ گنجائش بھی ہوتی تو اس کے حق دار والدین ہو سکتے تھے لیکن جب خدا نے ان کو بھی شریک نہیں کیا، ان کو صرف احسان ہی کا حقدار ٹھہرایا تو تا بدیگراں چہ رسد!

'اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا'

'اُفّ' دل کی بیزاری کے اظہار کا کلمہ ہے اور 'نَهْر' کے معنی ڈانٹنے اور جھڑکنے کے ہیں۔ اوپر جس احسان کا حکم ہے یہ اس کی وضاحت ہے کہ اگر ماں باپ تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ ان کے خلاف دل میں کوئی بیزاری پیدا ہونے پائے اور نہ زبان سے ان کے سامنے کوئی کلمۂ سوءادب کا نکلے بلکہ جب بھی ان سے بات کرنے کا موقع آئے شریفانہ اور سعادت مندانہ بات کرو اور ان کی دلداری و تسلی کرتے رہو۔

والدین کا حق احسان

آیت میں بڑھاپے تک پہنچ جانے کا حوالہ محض اس لیے دیا گیا ہے کہ یہی زمانہ ہوتا ہے جس میں ان لوگوں کو ماں باپ بوجھ محسوس ہوتے ہیں جو ان کی ان قربانیوں اور جاں فشانیوں کو بھول جاتے ہیں جو انھوں نے ان کے لیے بچپن میں کی ہوتی ہیں۔ سعادت مند اولاد تو اس بات کو یاد رکھتی ہے کہ جس طرح کبھی ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں مجھ کو اپنے والدین کی گود میں ڈالا گیا تھا اسی طرح اب میرے والدین ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کی صورت میں میرے گلے لگے ہیں اور میرا فرض ہے کہ میں ان کے احسان کا بدلہ احسان کی صورت میں دوں لیکن ہر شخص اس بات کو یاد نہیں رکھتا۔ یہ اسی بات کی یاددہانی ہے۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ والدین ہر دور میں محبت، تعظیم اور احسان کے حق دار ہیں ——— یہاں یہ بات ذہن میں محفوظ رہے کہ اوپر والی آیت میں جس طرح سب سے بڑے عدل کا ذکر آیا ہے اسی طرح اس آیت میں سب سے بڑے احسان کا ذکر ہے جو قرآن کی تعلیمات میں دوسری اساسی تعلیم کا درجہ رکھتا ہے۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (۲۴)

والدین کا حق فرمانبرداری و خدمت

'ذُلّ' کے معنی اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں۔ اس کے لیے 'جَنَاح' کے استعارے میں یہ تلمیح مضمر ہے کہ تمہارے والدین نے تمہارے بچپن میں تمھیں اسی طرح اپنے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھا جس طرح پرندہ اپنے بچے کو اپنے پروں کے نیچے چھپائے رکھتا ہے۔ اس کا حق یہ ہے کہ ان کے بڑھاپے میں تم بھی انھیں اپنی اطاعت و محبت کے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھو۔ اس اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ 'مِنَ الرَّحْمَةِ' کی قید اس کے منبع اور محرک کا پتہ دیتی ہے کہ یہ اطاعت و فرماں برداری تمام تر مہر و محبت اور شفقت و رحمت پر مبنی ہو، اس میں کسی

اور جذبہ کو دخل نہ ہو اس لیے کہ ان کی شفقت و محبت کا حق اگر کچھ ادا ہو سکتا ہے تو پھر محبت کے جذبہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ بغیر اس جذبے کے کوئی شخص والدین کا حق ان کے بڑھاپے میں ادا نہیں کر سکتا۔

والدین کے لیے دعا کا حق

وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا ...... الآیۃ۔ خدمت و محبت کے ساتھ ساتھ ان کے لیے یہ دعا کرتے رہنے کی ہدایت ہوئی کہ اے میرے رب جس طرح شفقت و محبت کے ساتھ انھوں نے بچپن میں مجھے پالا اسی طرح اس بڑھاپے میں تو ان پر اپنی محبت و رحمت نازل فرما۔ یہ دعا والدین کا حق بھی ہے۔ ساتھ ہی اس حق کی یاد دہانی بھی ہے جو والدین سے متعلق اولاد پر عائد ہوتا ہے اور یہ اس جذبۂ محبت کی محرک بھی ہے جو والدین کے ساتھ سلوک کے معاملے میں مطلوب ہے۔

رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِن تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا (۲۵)

والدین کے لیے دلی محبت اور کامل سعادت مندی

بڑھاپے میں والدین کی خدمت و محبت اس طرح کرنا جس طرح قرآن نے ہدایت فرمائی ہے کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ اس میں صرف ظاہری اطاعت ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ پاکیزہ قلبی جذبۂ محبت اور دلی لگاؤ بھی مطلوب ہے۔ اس کی اس مشکل کی وجہ سے قرآن نے یہ وضاحت بھی فرما دی کہ اصل مطلوب دلی محبت اور کامل سعادت مندی ہے۔ اگر یہ چیز موجود ہے تو خدا دلوں کے حال سے خوب واقف ہے۔ اس کے ہوتے اگر کوئی چھوٹی موٹی اتفاقیہ کوتاہی صادر ہو گئی تو اس کی تلافی توبہ اور رجوع الی اللہ سے ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اپنی اس طرح کی کوتاہیوں پر برابر اللہ سے معافی مانگتے رہیں گے تو اللہ ان کو معاف کر دے گا۔

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا (۲۶-۲۷)

قرابت دار، مسکین اور مسافر کا حق

عدل اور احسان کے حکم کے بعد قرآنی اوامر کی تیسری اساسی چیز ایتائے ذی القربیٰ یعنی عزیزوں اور قرابت داروں کی خدمت ہے۔ اب یہ اس کا بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ قرابت دار، مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر صاحب مال کے مال میں اس کے قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کا بھی حق ہے۔ یہاں لفظ 'حق' کا استعمال اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ محض اخلاقی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری حق واجب کی ہے جس کی ادائیگی صاحب مال پر لازمی ہے۔ اگر کوئی شخص اس حق کو ادا نہ کرے گا تو وہ عند اللہ غصب حقوق کا مجرم ٹھہرے گا۔ قرابت دار کے بعد دوسرا درجہ مسکین کا ہے۔ قرابت دار تو مجرد قرابت کی بنا پر حق دار بن جاتا ہے لیکن مسکین کو اس کی مسکینی حقدار بناتی ہے۔ اگر کوئی قرابت دار مسکین بھی ہو تو اس کا حق دہرا ہو جائے گا۔ قرابت دار کے بعد معاً مسکین کا ذکر اسلامی معاشرے میں مسکین کے درجے اور مرتبے کو ظاہر کرتا ہے۔ مسکین کے بعد ابن السبیل یعنی مسافر کا حق ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ مسافر صرف مسافر ہونے کی بنا پر حقدار بنتا ہے۔ اس کا مسکین ہونا ضروری نہیں ہے، ورنہ اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس امر میں شبہ نہیں ہے کہ حالت سفر بجائے خود ایسی چیز ہے جو عام حالات میں آدمی کو دوسروں کی مدد

کا محتاج بنا دیتا ہے اگرچہ وہ فقہی مفہوم میں مسکین کے حکم میں نہ آتا ہو۔

اعتدال و کفایت شعاری کی ہدایت

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ظاہر ہے کہ جب ہر صاحب مال کے مال میں دوسروں کے بھی حقوق ہوئے تو اس کو اللّے تللّے خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ پھر تو اس کے لیے صحیح رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ احتیاط اعتدال اور کفایت شعاری کے ساتھ اپنی جائز ضروریات پر خرچ کرے اور بقیہ مال کے معاملے میں وہ اپنے آپ کو دوسرے حق داروں کا امین سمجھے، اور اس امانت کو نہایت احتیاط کے ساتھ ادا کرے۔ جو شخص اپنی ضروریات کے معاملے میں محتاط اور کفایت شعار نہیں ہو گا اس کو اپنے ہی شوق پورے کرنے سے فرصت نہیں ہو گی تو وہ دوسروں کے حقوق کہاں سے ادا کر پائے گا۔

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ..... الآیۃ فرمایا کہ جو لوگ فضول خرچ ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ جن لوگوں کو اللہ اپنی نعمت دیتا ہے اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی نعمت کے شکر گزار رہیں اور اس کو انہی کاموں پر صرف کریں جو اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے موجب ہوں لیکن شیطان ان کو ورغلا کر اپنی راہ پر لگا لیتا ہے اور خدا کا بخشا ہوا مال ان سے ان کاموں پر خرچ کراتا ہے جو ان کو خدا سے دور سے دور تر اور شیطان سے قریب سے قریب تر کر دیں۔

وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُل لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا (۲۸)

یہ اس حالت کے لیے ہدایت ہے جب کہ بروقت کوئی شخص اس پوزیشن میں نہ ہو کہ وہ اوپر بیان کیے ہوئے حقوق ادا کر سکے۔ فرمایا کہ اگر تمہارے حالات ایسے ہوں کہ مذکورہ حق داروں میں سے کسی کی امداد سے تمہیں مجبوراً اعراض ہی کرنا پڑ جائے اور تمہیں توقع ہو کہ مستقبل قریب میں تمہارے حالات درست ہو جائیں گے اور تم اس کی مدد کر سکو گے تو اس سے دلداری اور ہمدردی کی بات کرو اور آئندہ کے لیے اچھے وعدے کے ساتھ اس کو رخصت کرو۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا (۲۹)

ہاتھ کو گردن سے باندھ لینا، تعبیر ہے انتہائی بخل اور خست کی اور ہاتھ کو بالکل کھلا چھوڑ دینا تعبیر ہے اسراف و تبذیر کی۔

اوپر آیات ۲۶ - ۲۷ میں اسراف و تبذیر کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے اس کے باب میں غلط فہمی سے بچانے کے لیے یہ صحیح نقطۂ اعتدال کی وضاحت فرما دی کہ منشائے الٰہی یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی ضروریات کے معاملے میں بالکل ہی بخیل و خسیس بن کر رہ جائے بلکہ صرف یہ مطلوب ہے کہ وہ اعتدال و کفایت شعاری کا رویہ اختیار کرے، نہ اپنے ہاتھ بالکل باندھ ہی لے، نہ ان کو بالکل کھلا ہی چھوڑ دے، بلکہ اعتدال کے ساتھ اپنی جائز ضروریات پر بھی خرچ کرے اور دوسروں کے حقوق بھی ادا کرے۔ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا یہاں تَقْعُدَ اسی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں آیت ۲۲ میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے ہاتھ بالکل ہی کھلے ہوئے چھوڑ دو گے تو بالآخر

اس کا نتیجہ یہ سامنے آئے گا کہ دوسروں کے حقوق کے معاملے میں سزاوار ملامت بھی ٹھہرو گے اور ادائے حقوق سے قاصر و درماندہ بھی ہو کر رہ جاؤ گے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا (۳۰)

یہاں 'یَقْدِرُ' کے بعد بھی 'لِمَنْ یَّشَآءُ' ہے جو وضاحت قرینہ کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے۔

رزق کی تنگی و کشادگی خدا کی مشیت پر منحصر ہے

اوپر والی آیت میں یہ جو فرمایا ہے کہ 'اور نہ تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھ کے رکھو'، یہ آیت اسی کی وضاحت میں ہے کہ رزق کی تنگی و کشادگی کا انحصار آدمی کی اپنی تدبیروں پر نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر خدا کی حکمت و مشیت پر منحصر ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے اچھی طرح باخبر اور ان کا نگران و نگہبان ہے۔ وہی اپنی مشیت و حکمت کے تحت جس کے لیے رزق کو چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کے رزق کو چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

بندے کے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ وہ احتیاط و اعتدال کے ساتھ اپنی ضروریات پر بھی خرچ کرے اور دوسروں کے حقوق بھی ادا کرے۔ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جو اس نقطۂ اعتدال سے منحرف ہو، خواہ وہ کسی سمت میں ہو۔

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا (۳۱)

'اِمْلَاق' کے معنی مفلسی اور ناداری کے ہیں۔

قتلِ اولاد کی ممانعت

یہ بات اوپر والی بات ہی پر متفرع ہے۔ یعنی جب اصل حقیقت یہ ہے کہ اصل رازق خدا ہی ہے تو کسی دوسرے کو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسری جان کو اس اندیشہ سے ہلاک کر دے کہ وہ کھائے گی کیا۔ عرب جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی جو سنگ دلانہ رسم جاری تھی اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ عورت کوئی کماؤ فرد تو ہے نہیں تو لڑکیوں کی پرورش کا بوجھ کیوں اٹھایا جائے۔ قرآن نے اس سنگ دلانہ جرم کے اصل محرک پر ضرب لگائی اور اس بربریت کا خاتمہ کیا۔ موجودہ زمانے میں ضبط ولادت کے نام سے جو تحریک چل رہی ہے اور جس کو بروئے کار لانے کے لیے روز نت نئی ترکیبیں ایجاد ہو رہی ہیں، وہ بظاہر تو وحشیانہ نہیں ہیں لیکن فلسفہ اور عقیدہ بنیادی طور پر اس کے اندر بھی وہی کار فرما ہے جو عرب جاہلیت کی بربریت کا محرک تھا۔ جاہل عربوں کی طرح موجودہ زمانے کا متمدن انسان بھی اپنے آپ کو دوسروں کا رزاق سمجھ بیٹھا ہے۔ قرآن نے 'نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ' فرما کر اس گمراہی کی اصلاح کی ہے۔ عرب کے وحشی تو اس حقیقت کو سمجھ گئے اور انھوں نے اپنی اصلاح بھی کر لی لیکن اس زمانے کے پڑھے لکھے جناتوں کو کون سمجھائے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ ۖ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا (۳۲)

منہیات کا بیان

آیت ۳۱ پر قرآنی اوامر ـــــ عدل، احسان، ایتائے ذی القربیٰ ـــــ سے متعلق بنیادی مسائل ختم ہوئے۔ اب آگے قرآنی منہیات ـــــ فحشاء، منکر، بغی ـــــ کے تحت جو چیزیں آتی ہیں ان کا بیان شروع ہو رہا ہے۔

زنا اور اس کے محرکات کی ممانعت

منہیات کے باب میں سب سے پہلے زنا کو لیا ہے اس لیے کہ یہ برائی صالح معاشرہ کی جڑ پر کلہاڑا مارنے والی برائی ہے۔ صالح معاشرہ کی بنیاد صالح خاندان پر ہے۔ صالح خاندان صحیح فطری جذبات کے ساتھ صرف

اسی صورت میں وجود پذیر ہو سکتا ہے جب والدین کے ساتھ اولاد کا تعلق صحیح نوعیت، صحیح نسب اور پاکیزہ مدنی رشتہ پر استوار ہو۔ اگر یہ چیز مفقود ہو جائے تو خاندان خاندان نہیں بلکہ فطری و روحانی جذبات و عواطف سے بالکل محروم و نا آشنا حیوانات کا ایک گلہ ہے۔ حیوانات کا کوئی گلہ نہ کسی صالح معاشرہ کی بنیاد رکھ سکتا نہ کسی صالح تمدن کا مقدمۃ الجیش بن سکتا۔

قرآن نے زنا کے اس مفسدے کے باعث اس کو اپنی منہیات کے باب میں سب سے پہلے لیا ہے۔ اور ایسے لفظوں میں اس سے روکا ہے جو زنا اور زنا کے تمام دواعی و محرکات کا سدباب کرنے والے ہیں۔ فرمایا لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى جس کے معنی ہیں زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو، یعنی ان تمام باتوں سے بھی دور دور رہو جو زنا کی محرک، اس پر اکسانے والی اور اس کے قریب لے جانے والی ہیں۔ یہاں بات صرف اصولی حیثیت سے فرمائی گئی ہے۔ اس وجہ سے اس کی کوئی تفصیل نہیں آئی ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ نور میں آئے گی جو اس گروپ کی آخری سورہ ہے۔ اس کی تفسیر میں ان شاء اللہ ہم واضح کریں گے کہ قرآن نے کن کن باتوں سے محض اس بنیاد پر روکا ہے کہ وہ زنا کے مقدمات و محرکات میں سے ہیں۔

اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا۔ یہ زنا کی ممانعت کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت ہی بری راہ ہے۔ کھلی ہوئی بے حیائی، یعنی اس کے برائی اور بے حیائی ہونے پر کسی منطقی بحث و حجت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ فطرت انسانی کی قدیم ترین جانی پہچانی ہوئی حقیقتوں میں سے ایک واضح ترین حقیقت ہے۔ انسان جب سے دنیا میں موجود ہے اس نے مرد اور عورت کے آزادانہ تعلق کو کبھی گوارا نہیں کیا بلکہ اس پر ہمیشہ نہایت سخت پابندیاں رہی ہیں اور وہ لوگ کبھی خوش دلی کے ساتھ معاشرے میں گوارا نہیں کیے گئے ہیں جنھوں نے ان پابندیوں کو توڑا ہے۔ وَسَآءَ سَبِيْلًا، یعنی اس طریق اقوم سے یہ بالکل منحرف راہ ہے جس کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ جو لوگ اس راستہ پر چل پڑتے ہیں وہ صالح خاندان، صالح معاشرہ اور بالآخر صالح حکومت سب کی جڑیں اکھاڑ کے رکھ دیتے ہیں۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (۳۳)

قتل کی ممانعت اور اسلامی قانون کا مزاج

اَلنَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ۔ یعنی ہر وہ جان جس کو اللہ نے محفوظ و محترم قرار دیا ہے، جو مباح الدم نہیں ہے، کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کو قتل کرے مگر حق کی بنا پر۔ یعنی صرف اس صورت میں جس میں شریعت نے اس کے قتل کا حکم دیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس قانونی جواز کے بغیر قتل ہوا تو وہ مظلومانہ قتل ہوا۔ ایسی صورت میں فرمایا کہ فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا، ہم نے اس کے اولیاء کو قاتل کے اوپر پورا اختیار دے دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس سے قصاص لیں، چاہیں تو خون بہا لیں اور اگر چاہیں تو معاف بھی کر سکتے ہیں۔ پورا اختیار دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی حکومت اولیائے مقتول کی مرضی لازماً نافذ کرائے گی۔ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ

إِنَّهُ كَانَ مَنْصُوْرًا یہ اولیائے مقتول کے لیے ہدایت ہے کہ چونکہ ان کو قانون اور حکومت کی حمایت حاصل ہے اس وجہ سے ان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ قاتل کو قتل کرنے کے معاملے میں حدود سے تجاوز کریں مثلاً یہ کہ اصل قاتل کے علاوہ دوسروں کو بھی قتل کر دیں یا قتل کے ایسے طریقے اختیار کریں جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے، مثلاً آگ میں جلانا یا مثلہ کرنا۔

اس آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اسلامی قانون میں قتل کے معاملے میں اصل مدعی کی حیثیت حکومت کی نہیں بلکہ اولیائے مقتول کی ہے۔ حکومت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اولیائے مقتول کی مرضی ٹھیک ٹھیک نافذ کرا دے۔ حکومت مدعی صرف اس شکل میں ہوگی جب مقتول لاوارث ہو یا وارث ہوں تو سہی لیکن کسی سبب سے ان کو مقتول کے معاملے سے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی ہو۔ موجودہ قوانین میں سارا اختیار صرف حکومت ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ اولیاء کو سرے سے کوئی تعلق رہ ہی نہیں جاتا۔ ہمارے نزدیک موجودہ قوانین اسلامی قانون کی بہت سی برکتوں سے خالی ہیں۔ ہم نے اس مسئلے پر اپنی ایک دوسری کتاب میں بحث کی ہے۔ یہاں اس کے اعادے کی گنجائش نہیں ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ أَشُدَّهٗ ۖ وَأَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۳۴)

مالِ یتیم کی حفاظت۔ اور جس شدت کے ساتھ زنا اور اس کے دواعی و محرکات سے روکا ہے اسی شدت کے ساتھ یتیم کے مال میں کسی ناجائز تصرف سے روکا ہے۔ فرمایا کہ بجز بہتری و بہبود کے ارادے کے یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ یعنی یتیم کے مال میں اولیاء کی صرف وہی مداخلت جائز ہے جو اس کی ترقی، اس کی حفاظت اور اس کے نشوونما کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہو۔ اس سے الگ ہو کر جو تصرف بھی ہوگا وہ خیانت ہے اس لیے کہ یتیم کا مال اولیاء کے ہاتھ میں درحقیقت امانت ہوتا ہے۔ حَتّٰى يَبْلُغَ أَشُدَّهٗ یعنی اولیاء کی یہ نگرانی صرف اس وقت تک کے لیے ہے جب تک یتیم اپنی پختگی اور سن رشد کو نہیں پہنچ جاتا۔ جب وہ بلوغ و رشد کو پہنچ جائے وہ اپنے مال کا مالک و مختار ہے۔ اس کا مال اس کے حوالے کر دیا جائے۔

ایفائے عہد کی ہدایت۔ وَأَوْفُوْا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا یتیم کے مال میں خیانت کی ممانعت کے ساتھ ہی یہ تمام عہود و مواثیق میں خیانت سے منع فرمایا کہ ہر عہد جو کرو اس کو پورا کرو، اس میں کوئی خیانت نہ کرو۔ اس لیے کہ ہر عہد کی بابت عنداللہ پرسش ہونی ہے۔

اس عہد میں ہر قسم کے عہد شامل ہیں۔ خواہ وہ کسی معاہدے کی صورت میں وجود میں آئے ہوں، یا معاہدے کی شکل میں تو وجود میں نہ آئے ہوں لیکن عادۃً اور عرفاً ان کو عہد ہی سمجھا اور مانا جاتا ہو۔ جس نوعیت کا بھی عہد ہو اگر وہ خلاف شریعت نہیں ہے تو اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔ سورۂ مائدہ کی تفسیر میں ہم یہ حقیقت بھی واضح کر چکے ہیں کہ شریعت کی حیثیت بھی درحقیقت بندوں اور خدا کے درمیان ایک معاہدہ کی ہے۔ انہی عہود کے ایفا پر عالم کا نظام

صالح معاشرہ اور صالح حکومت کا قیام و بقا منحصر ہے۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۳۵)

ایفائے کیل و وزن کی تاکید

ایفائے عہد کی تاکید کے بعد یہ ایفائے کیل و وزن کی تاکید ہے کہ آپس کے لین دین میں جب کوئی چیز ناپو یا تولو تو ناپ تول میں کوئی خیانت نہ کرو۔ ناپو صحیح پیمانے سے اور تولو ٹھیک ترازو سے۔ یہی طریقہ بہتر اور انجام کار کے اعتبار سے بھی اچھا ہے۔ یعنی معاشی اور تجارتی نقطۂ نظر سے بھی یہی طریقہ سود مند ہے اور مآل کار کے پہلو سے بھی یہی طریقہ بہتر ہے اس لیے کہ خدا کو پسند یہی طریقہ ہے۔ جو قوم ڈنڈی ماری کو شیوہ بنا لیتی ہے۔ بظاہر اس کے کچھ افراد اپنی دانست میں نفع کماتے ہیں لیکن وہ درحقیقت اس عدل و صداقت کی بنیاد ہی کو ڈھا دیتے ہیں جس پر صالح معاشرہ اور صالح تمدن کا قیام و بقا منحصر ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا (۳۶)

'قَفَوْتُهٗ، قَفَوْتُ اَثَرَهٗ' کے معنی ہیں اس کے پیچھے لگا یا ہو لیا۔ 'لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ' یعنی جس چیز کے بارے میں تمہیں قابل اطمینان علم نہیں ہے اس کے پیچھے نہ ہو لیا کرو اور محض اٹکل اور گمان کی بنا پر کسی کے بارے میں کوئی بات نہ لے اڑو۔

قذف اور تہمت وغیرہ کی ممانعت

یہ قذف اور تہمت وغیرہ کی قسم کی ساری باتوں کی ممانعت ہے۔ قرآن جو معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد حسن ظن اور اعتماد پر ہے اس وجہ سے کسی کے باب میں کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکالنی چاہیے جو محض گمان یا افواہ پر مبنی ہو اور وہ اس کی عزت و شہرت کو نقصان پہنچانے والی ہو۔ فرمایا کہ جو لوگ اس طرح کی غیر ذمہ دارانہ باتیں کرتے ہیں انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ کان، آنکھ اور دل ہر ایک سے اسی طرح کی باتوں کی بابت ایک روز پرسش ہونی ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا (۳۷)

غرور و تکبر کی ممانعت

'مرح' کے معنی اکڑ کر اور اترا کر چلنے کے ہیں۔ جو شخص اکڑ کر اور اترا کر چلتا ہے وہ زمین پر پاؤں مارتا ہوا اور گردن کو اٹھا کر چلتا ہے۔ یہ متکبرین اور مغروروں کی چال ہے۔ فرمایا کہ یہ مغروروں اور متکبروں کی چال نہ چلو۔ یاد رکھو کہ تم کتنا ہی زمین پر پاؤں مارتے ہوئے چلو لیکن تم خدا کی زمین کو پھاڑ نہیں سکتے، اسی طرح تم کتنا ہی سینہ تان کر اور گردن اور سر کو اونچا کر کے چلو لیکن تم پہاڑوں کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتے۔ مطلب یہ کہ جس خدا کی قدرت کی یہ شانیں دیکھتے ہو کہ اس نے تمہارے پاؤں کے نیچے یہ طویل و عریض زمین بچھا دی جس کے اوپر تمہاری حیثیت ایک بھنگے اور چیونٹی کی بھی نہیں اور جس نے یہ فلک بوس پہاڑ تمہارے آگے کھڑے کر دیے جن کے سامنے تم ایک گلہری کی بھی حیثیت نہیں رکھتے اس کی زمین پر اکڑنے اور اترانے کے کیا معنی! اپنی حیثیت پہچانو اور خدا کی عظمت اور اس کے جلال کے آگے ہمیشہ سرنگندہ رہو۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آدمی کی یہ حالت اس کے باطن پر عکس ڈالتی ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس شخص کے دل میں خدا کی عظمت و قدرت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جن کے دلوں کے اندر خدا کی عظمت و قدرت کا تصور بسا یا ہوا ہوتا ہے ان پر تواضع اور فروتنی کی حالت طاری رہتی ہے۔ وہ اکڑنے اور اترانے کے بجائے سر جھکا کر دبے پاؤں چلتے ہیں۔

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا (۳۸)

یہ اوپر کی تمام منہیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان میں سے ہر کام کی برائی تیرے رب کے نزدیک نہایت مکروہ ہے۔ لفظ 'مکروہ' یہاں فقہی مفہوم میں نہیں بلکہ اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی یہ ساری باتیں خدا کے نزدیک نہایت مبغوض اور قابل نفرت ہیں۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو ان میں سے کسی چیز کے بھی مرتکب ہوں گے وہ بھی خدا کے نزدیک قابل نفرت ٹھہریں گے۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۳۹)

یہ باتیں اجزائے حکمت میں سے ہیں

'ذٰلِكَ' کا اشارہ ان تمام باتوں کی طرف ہے جو اوپر سے لے کر یہاں تک بیان ہوئی ہیں۔ یہ ساری باتیں حکمت کے اجزاء میں سے ہیں۔ یعنی یہ وہ ٹھوس، راسخ اور غیر متزلزل حقیقتیں ہیں جو عقل، فطرت اور شریعت میں نہایت مضبوط بنیادیں رکھتی ہیں۔ تمہارے رب نے اپنے پیغمبر کے واسطہ سے یہ تمہاری طرف وحی کی ہیں کہ تم اپنی زندگیاں ان سے سنوارو۔

توحید کے مضمون کی یاد دہانی

'وَلَا تَجْعَلْ ...... الاٰیۃ' یہ آخر میں توحید کے اس مضمون کی پھر یاد دہانی کر دی جس سے آیت ۲۲ میں اس بحث کا آغاز فرمایا تھا۔ گویا توحید اس ساری تعلیمات کے لیے حصار اور شہر پناہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب تک یہ شہر پناہ قائم ہے اس وقت تک یہ تعلیمات بھی قائم ہیں اور اگر اس شہر پناہ میں کوئی رخنہ پیدا ہو گیا تو یہ ساری حکمت کی باتیں بھی ایک ایک کر کے ناپید ہو جائیں گی۔ توحید سے آغاز اور توحید ہی پر اختتام کی مثالیں قرآن مجید میں اور بھی ہیں بلکہ تورات میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں، اگر بحث کے دوسرے گوشوں میں نکل جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہاں ان کا حوالہ دیتے۔

۸۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۴۰-۵۷

کفار کی قرآن سے بیزاری کا اصل سبب

آگے کفار قریش کی قرآن سے بیزاری کے اصل سبب پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ لوگ چونکہ اپنے مزعومہ معبودوں کو چھوڑنے اور آخرت کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں اس وجہ سے قرآن اور پیغمبر سے چڑتے ہیں۔ اسی ضمن میں بطور جملہ معترضہ مسلمانوں کو یہ ہدایت بھی فرمادی گئی کہ تم دعوت میں حکیمانہ طریقہ اختیار کرو، مخالفین کے رویے سے متاثر ہو کر زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکالو جو ان بدکے ہوئے لوگوں کے لیے مزید وحشت کا سبب بن جائے۔

آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۰-۵۲ اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ
لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ
وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ
اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا
يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَ
مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ
تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ
جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا
مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ
وَقْرًا ؕ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِى الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ
نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ
هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾
الربع اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾
وَقَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا
جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ
فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ
مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ؕ قُلْ عَسٰۤى اَنْ
يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ

إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٥٢﴾ وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ ع ۱۲ ۵ ۵
الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿٥٣﴾
رَّبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ ۖ إِن يَشَأْ يَرْحَمْكُمْ أَوْ إِن يَشَأْ يُعَذِّبْكُمْ ۚ وَمَا
أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿٥٤﴾ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ
وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ ۖ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ﴿٥٥﴾
قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ
الضُّرِّ عَنكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ﴿٥٦﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ
رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ
إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴿٥٧﴾

ترجمۂ آیات ۴۰-۵۷

کیا تمہارے رب نے تمہارے لیے تو بیٹے مخصوص کیے اور اپنے لیے فرشتوں میں سے بیٹیاں بنا لیں۔ یہ تو تم بڑی ہی سنگین بات کہتے ہو۔ اور ہم نے اس قرآن میں گوناگوں اسلوبوں سے بات واضح کر دی کہ وہ یاددہانی حاصل کریں لیکن یہ چیز ان کی بیزاری ہی میں اضافہ کیے جا رہی ہے۔ کہہ دو کہ اگر کچھ اور الٰہ بھی اس کے شریک ہوتے جیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں تو وہ عرش والے پر ضرور چڑھائی کر دیتے۔ وہ پاک اور بہت برتر ہے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ بے شک وہ بڑا ہی حلم والا اور بخشنے والا ہے۔ ۴۰-۴۴

اور جب تم قرآن سناتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں

سکتے، ایک مخفی پردہ حائل کر دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر حجاب اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا کر دیتے ہیں کہ نہ اس کو سمجھیں نہ سنیں اور جب تم قرآن میں تنہا اپنے رب ہی کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت کے ساتھ پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور ہم خوب جانتے ہیں کہ جب یہ لوگ تمھاری طرف کان لگاتے ہیں تو کس غرض سے کان لگاتے ہیں اور جب کہ یہ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں جب کہ یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم لوگ تو بس ایک سحر زدہ شخص کے پیچھے چل پڑے ہو۔ دیکھو تم پہ کیسے کیسے فقرے چست کر رہے ہیں۔ یہ لوگ کھوئے گئے ہیں، کوئی راہ نہیں پا رہے ہیں۔ ۴۵-۴۸

اور یہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو ہم از سرِ نو اٹھائے جائیں گے! کہہ دو کہ تم پتھر یا لوہا بن جاؤ یا کوئی اور شے جو تمھارے خیال میں ان سے بھی سخت ہو۔ پھر وہ کہیں گے کہ ہمیں کون دوبارہ زندہ کرے گا؟ کہہ دو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔ پھر وہ تمھارے آگے سر ہلائیں گے اور کہیں گے کہ یہ کب ہوگا؟ کہہ دو کہ عجب نہیں کہ اس کا وقت قریب ہی آ پہنچا ہو جس دن وہ تم کو پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کرو گے اور تم یہ گمان کرو گے کہ تم بس تھوڑی ہی مدت رہے۔ ۴۹-۵۲

اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے۔ بے شک شیطان ان کے درمیان وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے، شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن تو ہے ہی۔ تمھارا رب تم کو خوب جانتا ہے، اگر وہ چاہے گا تم پر رحم فرمائے گا یا اگر چاہے گا تم کو عذاب دے گا اور ہم نے تم کو ان پر رسول بنا کر مامور نہیں کیا ہے اور تمھارا رب ہی خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔ ۵۳-۵۵

کہہ دو کہ ان کو پکارو، دیکھو جن کو تم نے اس کے سوا معبود گمان کر رکھا ہے، نہ وہ تم سے کسی مصیبت کو دفع ہی کر سکیں گے، نہ اس کو ٹال ہی سکیں گے۔ جن کو یہ پکارتے ہیں وہ تو خود ہی اپنے رب کے قرب کی طلب میں سرگرم ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ قرب حاصل کرتا ہے اور وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تمہارے رب کا عذاب چیز ہی ڈرنے کی ہے۔ ۵۶-۵۷

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ۭ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا (۴۰)

'اصفاء' کے معنی خاص اور خالص کر دینے کے ہیں۔

تردیدِ شرک تمثیلات سے

اوپر کے مجموعۂ آیات کو شرک کی تردید پر ختم فرمایا تھا، اسی مضمون کو ایک نئے اسلوب سے پھر لیا۔ فرمایا کہ کیا تمہارے رب نے تمہیں تو بیٹوں کے لیے مخصوص کر لیا اور خود اپنے لیے فرشتوں میں سے بیٹیاں بنا لیں۔ یہ واضح رہے کہ فرشتوں کو مشرکین عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور اس وہم کے ساتھ ان کی پرستش کرتے تھے کہ یہ اپنے باپ سے ان کے لیے سفارش کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کی اس دوہری حماقت پر توجہ دلائی ہے کہ اول تو کسی کو خدا کا شریک ٹھہرانا ہی حماقت ہے۔ پھر ستم بالائے ستم تم نے یہ کیا ہے کہ خدا کے لیے بیٹیاں منتخب کی ہیں جن کو خود اپنے لیے سخت ناپسند کرتے ہو۔

اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا۔ یعنی یہ تو تم بڑی ہی بھونڈی اور نہایت ہی سنگین بات کہتے ہو۔ یہ صرف حماقت ہی نہیں بلکہ حماقت در حماقت ہے کہ اپنے رب کے لیے اس چیز کا انتخاب کرتے ہو جس کو اپنے لیے گوارا کرنے پر آمادہ نہیں۔ گویا خدا کو تم نے خود اپنے سے بھی گرا دیا۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ۭ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (۴۱)

'تصریف' کے معنی گردش دینے کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد کسی حقیقت کو مختلف اسلوبوں اور گوناگوں طریقوں سے پیش کرنا ہے۔ مثلاً توحید ہی کا مضمون قرآن میں اتنے مختلف اسلوبوں اور طریقوں سے بیان ہوا ہے کہ غبی سے غبی آدمی بھی، اگر ہٹ دھرم نہ ہو تو اس کو ذہن نشین کر سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ ضدی اور جھگڑالو ہوتے ہیں، بات کو ماننا نہیں چاہتے، ان کی بیزاری اور نفرت اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے جتنی کہ بات واضح ہوتی جاتی ہے اس لیے کہ اس کی وضاحت کو وہ اپنی شکست اور رسوائی سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ ہم نے اس قرآن میں

توحید کی حقیقت اور شرک کی شناعت گوناگوں پہلوؤں سے واضح کی کہ یہ لوگ یاد دہانی حاصل کریں لیکن جتنی ہی ان کی دوا کی گئی اتنا ہی ان کا مرض بڑھتا گیا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا (۴۲)

مشرکین عرب دنیوی بادشاہوں اور بادشاہتوں پر قیاس کر کے اللہ تعالیٰ کو تو صاحب تخت و تاج یعنی معبود اعظم مانتے تھے اور اس کے تحت بہت سے دوسرے دیوی دیوتاؤں کو بھی مانتے تھے جن کی نسبت ان کا گمان تھا کہ وہ خدائی میں شریک ہیں اور اپنے پجاریوں کے لیے وہ صاحب عرش کے تقرب کا بھی ذریعہ بنتے ہیں اور ان کی خواہشیں اور ضرورتیں بھی اس سے پوری کرا دیتے ہیں۔ یہ ان کے اسی واہمہ کی تردید ہے۔ فرمایا کہ اگر خدا کے ساتھ اس کے کچھ شریک و سہیم بھی ہوتے، جیسا کہ تم گمان کیے بیٹھے ہو، تو وہ ایک نہ ایک دن ضرور صاحب عرش سے منازعت و مخاصمت کی راہ ڈھونڈھ لیتے اور یہ آسمان و زمین کا سارا نظام درہم برہم ہو کے رہ جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ جس زمین کے بادشاہوں اور بادشاہتوں پر قیاس کر کے تم نے یہ تخیل آراستہ کیا ہے اس میں تو دیکھتے ہو کہ آئے دن حکومتوں کے نقشے بگڑتے بنتے رہتے ہیں۔ اگر اسی طرح خدا کے بھی کچھ شریک و سہیم اور حریف ہوتے تو آخر وہ کیوں چپکے بیٹھے رہتے، وہ کیوں نہ صاحب عرش بننے کے لیے زور لگاتے لیکن یہاں تو دیکھتے ہو کہ نہ ایک دن کے لیے سورج اپنے محور سے کھسکا اور نہ زمین اپنے مدار سے منحرف ہوئی۔ اسی حقیقت کو دوسرے مقام میں یوں واضح فرمایا ہے۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ ۲۲۔ انبیاء (اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا دوسرے معبود بھی ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کے رہ جاتے)۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا (۴۳)

یعنی اللہ تعالیٰ اس قسم کے اوہام و خرافات سے بالکل منزہ اور نہایت برتر ہے۔ ان قیاسات و تشبیہات اس کی اعلیٰ صفات کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۚ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (۴۴)

تسبیح کا مفہوم

'تسبیح' کی اصل روح تنزیہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ان تمام نسبتوں اور صفتوں سے بری اور بالاتر قرار دینا جو اس کی اعلیٰ صفات اور شان کے منافی ہیں۔ اس کے ساتھ جب 'بِحَمْدِهٖ' کی قید لگ جاتی ہے جس طرح یہاں 'يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ' ہے تو اس کے اندر تنزیہ کے ساتھ اثبات کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے یعنی اس کو تمام اعلیٰ صفات سے متصف قرار دینا۔

مطلب یہ ہے کہ ایک خاص دائرہ کے اندر خدا نے تم کو اختیار بخشا ہے۔ اس سے غلط فائدہ اٹھا کر تم جو تہمتیں چاہو خدا پر جوڑو لیکن ساتوں آسمان اور زمین اور ان کے اندر جتنی مخلوقات ہیں سب خدا کی تسبیح کرتی ہیں لیکن تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں۔

'اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا' یعنی تمہاری یہ حرکت تو ایسی ہے کہ تم پر آسمان ٹوٹ پڑتا لیکن اللہ بڑا

ہی علیم اور غفور ہے، تمہاری ان حرکتوں کے باوجود تمہیں مہلت دیے جا رہا ہے۔

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا ﴿۴۵﴾

کفار کا قرآن سے وحشت زدہ ہونے کا اصل سبب

یہ اس تعجب کو دور فرمایا ہے کہ قرآن جیسی واضح چیز، جس میں ایک ایک بات گوناگوں اسلوبوں سے، جیسا کہ آیت ۴۱ میں فرمایا، بیان ہوئی ہے، ان لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی ہے اور یہ اس سے اس درجہ وحشت زدہ کیوں ہیں؟ فرمایا کہ یہ لوگ نہ آخرت کو مانتے ہیں اور نہ آخرت کو ماننا چاہتے ہیں۔ یہ چیز ان کے دلوں پر ایک مخفی حجاب بن کر چھا گئی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ قرآن کے انوار ان کے دلوں پر منعکس نہیں ہو پاتے۔

وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا ﴿۴۶﴾

'اکنۃ' کنان کی جمع ہے جس کے معنی پردہ کے ہیں۔ 'ان یفقھوہ' یعنی 'کراھۃ ان یفقھوہ'۔ 'ان' سے پہلے مضاف حذف ہو گیا ہے۔ 'وفی آذانھم وقرا' کے بعد 'ان یسمعوہ' حذف ہے، قرینہ اس پر دلیل ہے۔

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ قرآن کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا کر دیا ہے کہ وہ اس کو نہ سنیں۔ 'واذا ذکرت ربک فی القرآن وحدہ ولوا علی ادبارھم نفورا' یہ ان کی قرآن سے وحشت کا دوسرا بڑا سبب ہے کہ چونکہ تم قرآن میں صرف اللہ واحد ہی کا ذکر سناتے ہو، ان کے مزعومہ معبودوں کو کوئی درجہ نہیں دیتے، اور یہ لوگ آخرت کی طرح توحید سے بھی بیزار ہیں اس وجہ سے قرآن کو سنتے ہی وحشت زدہ ہو کر پیٹھ پیچھے بھاگتے ہیں۔

ختم قلوب کی سنت الٰہی

آیت میں دلوں پر پردہ اور کانوں میں ثقل پیدا کرنے سے اشارہ اس سنت الٰہی کی طرف ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں ختم قلوب کے عنوان سے ہوا ہے۔ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں پوری تفصیل کے ساتھ اس سنت الٰہی کے ہر پہلو کی وضاحت کر چکے ہیں، تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔ یہاں اس کے اعادے میں طوالت ہو گی۔

نَّحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُونَ بِهِ إِذْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ وَإِذْ هُمْ نَجْوَىٰ إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا ﴿۴۷﴾

یعنی یہ قرآن کو سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تو کبھی اس کو سنتے نہیں کہ اس سے ان کو نفع پہنچے۔ یہ اگر سنتے ہیں تو اس غرض سے سنتے ہیں کہ کوئی پہلو اعتراض اور نکتہ چینی کا ہاتھ آئے اور اس کو اس کے خلاف بدگمانیاں پھیلانے کے لیے لے اڑیں۔ فرمایا کہ ہم ان کی اس نیت کو بھی خوب جانتے ہیں اور ان کی ان سرگوشیوں کو بھی خوب جانتے ہیں جب یہ مسلمانوں کو قرآن سے برگشتہ کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ تم لوگ تو ایک بالکل خبطی اور سحر زدہ شخص کے پیچھے چل پڑے ہو۔

انظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ﴿۴۸﴾

'ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ' سے مراد یہاں فقرے اور پھبتیاں چست کرنا ہے۔ ملاحظہ ہو آیات ۸-۹ فرقان۔
مطلب یہ ہے کہ تم پر اور قرآن پر اعتراض کرنے کی کوئی راہ تو انھیں مل نہیں رہی ہے اس وجہ سے یہ بالکل کھوئے گئے ہیں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ماننا چاہتے نہیں اور تردید کا کوئی پہلو ہاتھ نہیں آرہا ہے اس وجہ سے جس کے منہ میں جو کچھ آجاتا ہے، دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے وہی بک دیتا ہے۔ کوئی کاہن بتاتا ہے، کوئی مجنون، کوئی ساحر کہتا ہے کوئی مسحور۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے حواس باختوں کی باتوں پر صبر کرو اور ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اصل حقیقت بہت جلد ان کے سامنے آجائے گی۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۴۹)

کفار کے آخرت سے بیزاری

یہ آخرت کے بارے میں ان کے استبعاد کو نقل فرمایا ہے کہ وہ بر سبیل استہزاء و طنز پوچھتے ہیں کہ کیا ہم جب سڑگل کر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو ہم از سر نو اٹھائے جائیں گے!!

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۙ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِىْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِىْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ؕ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا (۵۰-۵۱)

'قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِىْ صُدُوْرِكُمْ' فرمایا کہ ان کو جواب دے دو کہ ہڈیاں اور ریزے ریزے ہو جانا تو در کنار اگر تم پتھر یا لوہا بھی بن جاؤ یا ان سے بھی کوئی سخت تر چیز جو تمھارے خیال میں زندگی قبول کرنے کی صلاحیتوں سے بالکل خالی ہو، جب بھی تم از سر نو اٹھائے جاؤ گے۔

'فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا' فرمایا کہ تمھاری اس بات پر وہ کہیں گے کہ بھلا کون ہمیں اٹھائے گا؟ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی وہ کہیں گے کہ بھلا سڑگل جانے کے بعد کون ہمیں دوبارہ اٹھا سکتا ہے!! اس کا جواب بتایا کہ 'قُلِ الَّذِىْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ' ان سے کہہ دینا کہ وہی جس نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا، یہ جواب نہایت مختصر لیکن بھرپور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا کو تمھیں عدم محض سے پیدا کرنے میں کوئی زحمت پیش نہیں آئی، آخر تمھیں دوبارہ وجود میں لانے سے وہ کیوں عاجز ہو جائے گا۔

'فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ' 'انغاض' کے معنی سر ہلانے کے ہیں۔
مطلب یہ ہے کہ تمھارے اس مسکت جواب کے بعد بھی یہ چپ رہنے والے اسامی نہیں ہیں بلکہ اس کے بعد بانداز استہزاء وہ یہ سوال کریں گے کہ یہ کب ہوگا؟ اس کا جواب یہ بتایا کہ 'قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا' کہہ دیجیو کہ بہت ممکن ہے کہ اس کا وقت قریب ہی آ لگا ہو۔ اس جواب کے اندر یہ حقیقت مضمر ہے کہ جہاں تک قیامت کے وقت کا تعلق ہے اس کا پتہ تو اللہ کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبر کو بھی اس کا علم نہیں ہے لیکن جو چیز شدنی ہے وہ بہر حال شدنی ہے۔ وہ دیر سویر ہو کے رہے گی، اس کو محض اس بنیاد پر تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا ٹھیک ٹھیک وقت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ وقت تو اپنی موت کا بھی کسی کو معلوم نہیں ہے لیکن احمق ہی ہوگا جو اس کا اس بنا پر انکار کر بیٹھے کہ اس کو اس کا وقت معلوم نہیں ہے۔

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٥٢﴾

اب یہ ان کو براہِ راست خطاب کر کے فرمایا کہ آج تو بہت اکڑتے ہو لیکن اس دن کو یاد رکھو جس دن پکار ہوگی اور تم اس پکار پر خدا کی حمد کرتے ہوئے دوڑو گے۔ اس دن سارے حجابات چاک ہو جائیں گے اور ایک ایک حقیقت آنکھوں سے نظر آجائے گی۔ نیز یہ مدت جو تمہارے اور قیامت کے درمیان حائل ہے اور تمہیں بہت طویل نظر آرہی ہے، اس دن ایسا محسوس کرو گے کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے ہیں۔ مطلب یہ کہ جو مرا بس سمجھو کہ اس کی قیامت سر پر کھڑی ہے اس لیے کہ برزخ میں جو زندگی گزرے گی اس کا کوئی احساس باقی نہیں رہے گا۔

وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿٥٣﴾

مسلمانوں کو حکمتِ تبلیغ کی تعلیم

اوپر کی آیات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس دور میں مخالفین نے طنز و تعریض کے تمام ترکش سنبھال لیے تھے۔ جب جب کوئی موقع گفتگو کا نکلتا مسلمانوں کی بھی تحقیر کرتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی گستاخی اور بدتمیزی سے پیش آتے۔ اوپر آیت ۴۷ میں اس کی ایک مثال گزر چکی ہے۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اس باب میں مسلمانوں کو ضروری ہدایات دے دی جائیں تاکہ وہ کفار کے رویہ سے متاثر ہو کر کوئی ایسا قدم نہ اٹھا بیٹھیں جو دعوت کے مزاج کے منافی ہو۔ فرمایا کہ میرے بندوں (مسلمانوں) سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہو۔ یعنی مخالفین کی بے ہودہ باتوں کا جواب دینے کی کوشش نہ کریں۔ صرف صحیح اور سچی بات پہنچا دینے کی کوشش کریں اور اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ شیطان جو انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے، ہر وقت اس گھات میں لگا ہوا ہے کہ کب کوئی موقع ہاتھ آئے اور وہ وسوسہ اندازی کر کے سارے کام کو خراب کر دے۔ بعینہٖ یہی ہدایت اسی طرح کے مواقع کے لیے سورۂ نحل میں ان الفاظ میں گزر چکی ہے۔ اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ۔ ۱۲۵۔ نحل۔ سورۂ اعراف کی آیات ۱۹۸-۲۰۱ میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ مزید وضاحت مطلوب ہو تو ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

رَّبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ ۖ إِن يَشَأْ يَرْحَمْكُمْ أَوْ إِن يَشَأْ يُعَذِّبْكُمْ ۚ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿٥٤﴾

دعوت کے معاملہ میں مومنین کی ذمہ داری

یہ دعوت کے معاملے میں مومنین اور پیغمبر کی ذمہ داری کی حد واضح فرما دی تاکہ کفار کے معاندانہ رویے سے ان کے دل تنگ نہ ہوں۔ فرمایا کہ یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ کون رحمت کا مستحق ہے اور وہ ہدایت پا کر رحمت کا مستحق ہوگا اور کون عذاب کا مستحق ہے اور وہ گمراہی پر جما رہے گا اور عذاب کا سزاوار ٹھہرے گا۔ پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کی ذمہ داری صرف دعوت کو پہنچا دینے کی ہے۔ ان پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ لازماً سب کو مومن بنا ہی دیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم کوئی داروغہ تو مقرر نہیں ہوئے ہو کہ ان کے کفر و ایمان کے معاملے میں تمہیں جواب دہی کرنی ہو۔ تمہارے اوپر ذمہ داری صرف حق پہنچا دینے کی ہے وہ پہنچا دو، ماننا نہ ماننا ان کا

کام ہے اور اس کی پرستش خدا کے ہاں انھیں سے ہوتی ہے تم سے نہیں ہوتی ہے تو تم بلا وجہ زیادہ پریشان کیوں ہو۔

وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (۵۵)

تفضیلِ انبیاء میں صحیح نقطۂ نظر

مباحثہ کی گرماگرمی میں جو چیز سب سے زیادہ فتنہ کا سبب بنتی ہے وہ اپنے اپنے مقتداؤں کی متعصبانہ ترجیح و تفضیل ہے۔ جو جس کو مانتا ہے ساری فضیلت بس اسی کے ساتھ باندھ کے رکھ دیتا ہے، کسی دوسرے کے لیے کسی فضیلت کے تسلیم کرنے میں وہ اپنی ہتک اور شکست محسوس کرتا ہے۔ اس دور میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتنہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا یا اس کے اٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ تھا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ یہود، جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، اپنی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ میدانِ مخالفت میں اتر آئے تھے اور وہ مخالفین کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے۔ یہود کو، جیسا کہ بقرہ آیت ۲۵۳ کے تحت گزر چکا ہے، اس فتنہ سے خاص دلچسپی تھی۔ قرآن نے اس فتنہ کا سر کچلنے کے لیے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ زمین اور آسمان میں جو ہیں سب سے اللہ ہی خوب واقف ہے، وہی جانتا ہے کہ کس کا درجہ کیا ہے اور کون کس مرتبہ پر سرفراز ہے۔ اس چیز کو دوسرے لوگ نہیں جانتے۔ رہا یہ سوال کہ نبیوں میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے تو اللہ نے اپنے بعض انبیاء کو بعض پر بعض اعتبارات سے فضیلت بخشی۔ مثلاً حضرت موسیٰ سے اللہ نے کلام کیا، حضرت عیسیٰ ابن مریم کو بینات عطا فرمائیں اور روح القدس سے ان کی تائید کی، حضرت داؤد کو زبور عطا فرمائی۔ نبیوں کے باب میں یہی نقطۂ نظر صحیح ہے اور مسلمانوں کو اسی پر جمے رہنے کی تاکید ہوئی کہ وہ آنحضرت صلعم کے اختصاص و امتیاز کے جو پہلو ہیں ان کا بھی اظہار و اعلان کریں اور دوسرے نبیوں کے جو امتیازی پہلو ہیں ان کو بھی تسلیم کریں۔ اس مسئلے پر بقرہ آیت ۲۵۳ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔ حضرت داؤد کو جو زبور عطا ہوئی اس کا خاص امتیازی پہلو یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں یہی ایک کتاب منظوم شکل میں ہے، جو تمام تر حمد و تمجید کے نغمات پر مشتمل ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا (۵۶)

کلام کا تعلق سابق سے

اوپر کی تین آیتیں، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، اثنائے کلام میں، بطور جملہ معترضہ، برسرِ موقع تنبیہ و ہدایت کے لیے آ گئی تھیں، اب پھر کلام اپنے اصل سلسلہ یعنی آیات ۵۱-۵۲ سے جڑ گیا۔ اوپر ارشاد ہوا تھا کہ جس ساعت کے ظہور کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو کیا عجب کہ اس کا وقت قریب آ پہنچا ہو۔ اب بیان فرمایا کہ جن کو تم خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہو اگر تمھارا گمان یہ ہے کہ وہ تمھاری مدد کریں گے تو ان کو بلا دیکھو، نہ وہ کسی مصیبت کو دور کر سکیں گے اور نہ یہی کر سکیں گے کہ کچھ دیر ہی کے لیے اس کا رخ کسی اور طرف موڑ دیں۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ إِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۗ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا (۵۷)

یعنی جن فرشتوں کو یہ خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہیں وہ تو خود ہر وقت خدا کے قرب کی طلب میں سرگرم ہیں۔ وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور کیوں نہ ڈریں، تیرے رب کا عذاب چیز ہی

ایسی ہے کہ اس سے ہر شخص ڈرے اور بچے، خواہ وہ کتنا ہی عالی مقام ہو۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۵۸-۶۰

عذاب کے باب میں سنت الٰہی

پیچھے آیت ۵۱ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جب مشرکین کو عذاب الٰہی سے ڈراتے تو وہ حجت عذاب کا مطالبہ شروع کر دیتے کہ جس عذاب کی روزِ دھمکی سنا رہے ہو اس کو لا کر دکھاتے کیوں نہیں۔ اب یہاں اوپر والی آیات میں اس کا ذکر آیا تو اس باب میں جو سنت الٰہی ہے اس کی وضاحت فرما دی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی طلب پر عذاب کی نشانیاں اگر نہیں دکھاتا تو کیوں نہیں دکھاتا ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۸-۶۰

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝۵۸ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝۵۹ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝۶۰

ع ۶

ترجمۂ آیات ۵۸-۶۰

اور کوئی بستی ایسی نہیں ہے جس کو قیامت سے پہلے ہم ہلاک نہ کر چھوڑیں یا اس کو کوئی سخت عذاب نہ دیں۔ یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔ اور ہم نے قوم ثمود کو ایک اونٹنی ایک آنکھیں کھول دینے والی نشانی دی تو انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اس کی تکذیب کر دی اور ہم نشانیاں بھیجتے ہیں تو ڈرانے ہی کے لیے بھیجتے ہیں۔ ۵۸-۵۹

اور یاد کرو جب ہم نے تم سے کہا کہ تمہارے رب نے لوگوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اور وہ رویا جو ہم نے تم کو دکھائی اس کو ہم نے لوگوں کے لیے بس ایک فتنہ ہی بنا دیا اور اس درخت کو بھی جس پر قرآن میں لعنت وارد ہوئی اور ہم تو ان کو ڈراتے ہیں لیکن یہ چیز ان کی غایت سرکشی میں اضافہ کیے جا رہی ہے۔ ۶۰

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا ۚ كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا (۵۸)

'قَرْيَة' سے مراد یہاں، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، وہ مرکزی بستیاں ہیں جو کسی قوم کے اعیان و سترفین کا مرکز ہوتی ہیں۔

مطالبۂ نشانیٔ عذاب کا جواب

یہ کفار قریش کے مطالبۂ نشانیٔ عذاب کا جواب دیا جا رہا ہے کہ یہ عذاب کے لیے جلدی نہ مچائیں، ہر بستی جو کفر و طغیان کی راہ اختیار کرے گی وہ دو حالتوں میں سے کسی ایک سے لازماً دوچار ہو کے رہے گی۔ یا تو ہم اس کو ہلاک کر چھوڑیں گے یا اس کو سخت عذاب دیں گے۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی ہے لیکن اسی سورہ میں پیچھے وہ سنت الٰہی بھی بیان ہو گئی ہے جس کے تحت یہ بات واقع ہوتی ہے۔ آیت ۱۶ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ۔ (۱۶۔ بنی اسرائیل)	اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کر دینا چاہتے ہیں تو اس کے خوش حالوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں۔ پھر ان پر بات پوری ہو جاتی ہے پھر ہم اس کو یک قلم نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔

یوں تو یہ سنت الٰہی ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی لیکن کفار قریش کے لیے یہ مسئلہ اور بھی زیادہ سنگین اس وجہ سے بن گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں انہی کے اندر سے ایک رسول بھیج دیا تھا۔ رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو ایک خاص مدت تک مہلت پانے کے بعد وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔

'كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا' یعنی یہ بات نوشتۂ الٰہی یا خدا کے دفتر میں مرقوم ہے۔ اس نے یہ لکھ رکھا ہے کہ فلاں قوم ان ان جرائم کی اپنے ارادہ و اختیار سے مرتکب ہو گی اور ان کی پاداش میں وہ یوں اپنے کیفر کردار

کو پہنچے گا۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّآ اَنْ کَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا (۵۹)

نشانی نہ بھیجنے کی حکمت

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ حکمت و رحمت واضح فرمائی ہے جس کے سبب سے وہ لوگوں کے شدید مطالبہ کے باوجود کوئی نشانی عذاب نہیں بھیج رہا ہے۔ فرمایا کہ نشانیوں کا مقصد تو لوگوں کو ڈرانا اور متنبہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ ان کو دیکھ کر اس عذاب الٰہی سے ڈریں جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے لیکن پچھلی قوموں نے اپنی شامت اعمال سے ہمیشہ یہ کیا کہ ان نشانیوں سے متنبہ ہونے کے بجائے ان کی تکذیب کر کے اپنے لیے انھوں نے عذاب الٰہی کا دروازہ کھول لیا۔

'وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا' 'ب' کا صلہ چونکہ 'ظَلَمُوْا' کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا اس وجہ سے یہاں حذف مانیں گے یعنی 'ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ وَکَذَّبُوْا بِهَا' انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور ناقہ کے نشانی ہونے کی تکذیب کر دی۔

نشانیوں کی تکذیب کی ایک مثال

یہ مثال بیان ہوئی ہے اوپر والی بات کی کہ عذاب کی نشانیوں کی پچھلی قوموں نے کس طرح تکذیب کی ہے۔ فرمایا کہ ہم نے قوم ثمود کو ناقہ ایک آنکھیں کھول دینے والی نشانی کی حیثیت سے دی۔ اگر وہ ضد سے اندھے نہ ہو چکے ہوتے تو ان کے لیے وہ کافی تھی لیکن انھوں نے اس نشانی سے کوئی فائدہ اٹھانا تو درکنار ناقہ کی کونچیں کاٹ کر اس کو ہلاک کیا اور اس طرح خود اپنی ہلاکت کے لیے عذاب الٰہی کا دروازہ کھول لیا۔

'وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا' یعنی عذاب کی کوئی نشانی تو جب بھی ہم بھیجتے ہیں محض اصل عذاب سے متنبہ اور آگاہ کرنے کے لیے بھیجتے ہیں لیکن ہٹ دھرم لوگ اس سے قائل نہیں ہوتے، وہ اس کی کوئی نہ کوئی تاویل کر کے اپنی خوش فہمیوں کے لیے بہانہ پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ اگر لشکر برسا دینے والی ہوا (حاصب) کا کسی طرف سے طوفان اٹھے تو یہ کہیں گے کہ یہ تو ابر کرم ہے جو ہم پر برسنے والا ہے۔ اگر کوئی اور آفت ارضی یا سماوی نمودار ہو تو کہیں گے کہ قوموں پر ایسے نرم و سخت دن تو آیا ہی کرتے ہیں۔ غرض کوئی نشانی جس کا مقصود محض تخویف و تنبیہ ہو وہ تو ان کو قائل کرنے والی بن نہیں سکتی، یہ تو اگر قائل ہو سکتے ہیں تو اصل عذاب سے قائل ہو سکتے ہیں لیکن اس کے ظہور کے بعد قائل ہونے اور نہ ہونے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

وَاِذْ قُلْنَا لَکَ اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا طُغْیَانًا کَبِیْرًا (۶۰)

تنبیہی نشانیوں کے باب میں قریش کا رویہ

تخویفی و تنبیہی نشانیوں کے باب میں پچھلی قوموں کا جو رویہ رہا ہے اوپر کی آیات میں اس کی طرف اشارہ فرمایا۔ اب یہ خاص آنحضرت صلعم کی قوم کی بعض باتوں کا حوالہ دیا ہے جس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اگر ان کی طلب پر ان کو بھی کوئی تخویفی نشانی دکھائی گئی تو ان کا رویہ بھی پچھلی قوموں سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ یہ بھی اس کی

تکذیب کر دیں گے اس لیے کہ اب تک جو باتیں ان سے تخویف و تنبیہ کے مقصد سے کہی گئی ہیں انھوں نے ان سب کا مذاق ہی اڑایا ہے۔ مثلاً جب ہم نے تم کو یہ خبر دی کہ تمھارے رب نے لوگوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے تو انھوں نے اس سے متنبہ ہونے کے بجائے اس کا مذاق اڑایا کہ تم دور کی لے رہے اور ڈینگیں مار رہے ہو۔

یہ اشارہ ان آیات کی طرف ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ اب ہم کفارِ مکہ کے زور و اثر کو اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے مکہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مثلاً سورۂ رعد میں ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۔ (۴۱ - رعد) کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم سرزمین (مکہ) کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس کے اطراف سے اس کو کم کرتے ہوئے۔

یہ بات اس وقت فرمائی گئی تھی جب اطرافِ مکہ میں اسلام پھیلنے لگا اور مکہ اور اہلِ مکہ گویا آہستہ آہستہ اسلام کے گھیرے میں آ رہے تھے۔ یہی مضمون آیت ۴۴۔ انبیاء میں بھی ہے۔ پھر جب فتوحات کا دور شروع ہوا تو قرآن نے فتح مکہ کی پیشین گوئی ان الفاظ میں فرمائی۔

وَاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۔ (۲۱ - فتح) اور دوسری فتوحات بھی ہیں جن پر تم ابھی قادر نہیں ہو سکے لیکن اللہ نے ان کو اپنے احاطے میں لے لیا ہے۔

یہ باتیں ہوائی نہیں تھیں بلکہ حالات ان کی صاف پیشین گوئی کر رہے تھے لیکن قریش کے ضدی لیڈروں نے ان تمام تخویفات کا آخر وقت تک انکار ہی کیا یہاں تک کہ بالآخر انھیں مسلمانوں کے آگے گھٹنے ٹیک دینے پڑے۔

'وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ' یہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی دوسری مثال بیان ہوئی۔ فرمایا کہ جو رؤیا ہم نے تم کو دکھائی اس میں بھی ان کے لیے تخویف و تنبیہ مضمر تھی لیکن وہ بھی ان کے لیے فتنہ ہی بنی اور انھوں نے اس کا بھی مذاق ہی اڑایا۔

واقعۂ معراج پر ردِ عمل

'رُءْیَا' سے یہاں اشارہ واقعۂ معراج کی طرف ہے جس کا ذکر سورہ کے شروع میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ اس واقعہ کے اندر قریش اور بنی اسرائیل دونوں ہی کے لیے یہ تنبیہ مضمر تھی کہ اب مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ دونوں گھروں کی تولیت و امانت ان کے موجودہ خائن متولیوں سے چھین کر نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ پر ایمان لانے والوں کے حوالہ کی جانے والی ہے۔ لیکن اس تنبیہ سے دونوں میں سے کسی نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہر ایک نے طرح طرح سے اس کا مذاق اڑایا یہاں تک کہ جو چیز ان کی تنبیہ و تخویف اور ان کو ان کے مستقبل سے آگاہ کرنے کے لیے تھی وہ ان کی شامتِ اعمال سے ان کے لیے ایک فتنہ بن کے رہ گئی[1]۔

تنبیہات سے فائدہ نہ اٹھانے کی ایک اور مثال

'وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ' یہ تیسری مثال بیان ہوئی تنبیہات سے ان کے فائدہ نہ اٹھانے کی۔

---

[1] ہم پیچھے حضرات انبیاء کی رؤیا اور خواب کا فرق بھی واضح کر چکے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی رؤیا رویائے صادقہ ہوتی ہے۔ یہ وحی الٰہی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ آنحضرت صلعم کو متعدد بڑے بڑے واقعات رؤیا ہی میں دکھائے گئے۔ رؤیا کے مشاہدات بسا اوقات آنکھوں کے مشاہدات سے زیادہ قابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔

'شَجَرَۃَ مَلْعُوْنَۃ' سے اشارہ شجرۂ زقوم کی طرف ہے جس کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ وہ دوزخ میں ہوگا۔ اس کو دوزخی بھوک سے بیتاب ہو کر کھائیں گے پھر اس پر پیاس سے بے تاب ہو کر کھولتا پانی پیاسے اونٹوں کی طرح پئیں گے۔ شجرہ کے لیے 'ملعونہ' کی صفت 'مبارکہ' کی ضد ہے۔ ایک تو شجرۂ مبارکہ ہوتا ہے جو اپنے سایہ، اپنی طراوت اور اپنے پھل ہر چیز سے خلق کو فیض پہنچاتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس شجرۂ ملعونہ ہوتا ہے جس میں نہ سایہ نہ پھل، صرف کانٹوں کا ڈھیر، کڑواہٹ اور زہر سے بھرا ہوا، خلق کے لیے ایک لعنت اور مصیبت ہوتا ہے۔ زقوم کی صفت یہی ہے۔

ظاہر ہے کہ دوزخ کے یہ احوال اس لیے سنائے گئے ہیں کہ غفلت کے ماتے لوگ متنبہ ہوں اور اس سے بچنے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہوں آج کر لیں لیکن قریش کے لال بجھکڑوں نے اس تنبیہ و تخویف سے فائدہ اٹھانے کے بجائے، اس عالم کے حالات کو اس عالم کے حالات پر قیاس کر کے یہ نکتہ آرائی شروع کر دی کہ یہ دیکھو، یہ شخص آگ، پانی اور درخت سب کو ایک ہی جگہ جمع کیے دے رہا ہے! بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ آگ بھی ہو اور اس میں درخت بھی ہو، آگ بھی ہو اور اس میں پانی بھی ہو۔

'وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا' یعنی ہم تو ان کو ان باتوں سے مستقبل کے خطرات سے آگاہ کر رہے ہیں کہ یہ ان سے کچھ بچنے کی فکر کریں لیکن یہ چیزیں ان کو فائدہ پہنچانے کے بجائے الٹے ان کے اس طغیان کبیر ہی میں اضافہ کیے جا رہی ہیں جس میں یہ مبتلا ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے دماغ اتنے ٹیڑھے ہو چکے ہیں کہ سیدھی سے سیدھی بات بھی ان میں جا کر ٹیڑھی ہو جاتی ہے ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ ان کی طلب پر کوئی نشانی ان کو دکھا دی گئی تو یہ اس کو مان لیں گے۔ اس کو دیکھ کر بھی یہ کوئی نہ کوئی بات بنا ہی لیں گے۔ یہ نشانی عذاب سے فائدہ اٹھانے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ اصل عذاب سے قائل ہونے والے لوگ ہیں جس کے ظہور کے بعد قائل ہونے یا نہ ہونے کا سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

۱۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۶۱-۶۵

استکبار کا اصل سبب

آگے ان لوگوں کے طغیان و استکبار کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ اس کا اصل سبب وہ نہیں ہے جو یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ان کو عذاب کی کوئی نشانی نہیں دکھائی گئی بلکہ یہ ہے کہ اللہ نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا تو یہ نعمتوں کو پا کر اس کے شکرگزار بندے بننے کے بجائے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے۔ یہ روش اختیار کرنے میں انھوں نے ٹھیک ٹھیک ابلیس کے نقش قدم کی پیروی کی ہے اور ابلیس نے ذریت آدم کے بارے میں اپنا جو گمان ظاہر کیا تھا ان کے اوپر اپنے اس گمان کو حرف حرف سچ کر دکھایا۔

آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۶۱-۶۵

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ
قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿٦١﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا
الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۡ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ
اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٦٢﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاۗؤُكُمْ
جَزَاۗءً مَّوْفُوْرًا ﴿٦٣﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ
اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ
الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿٦٤﴾ اِنَّ عِبَادِيْ
لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿٦٥﴾

ترجمۂ آیات ۶۱-۶۵

اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے نہیں کیا وہ اڑا کہ کیا میں اس کو سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا۔ اس نے کہا ذرا دیکھ تو اس کو جس کو تو نے مجھ پر عزت بخشی ہے اگر تو نے مجھے روز قیامت تک مہلت دے دی تو میں، ایک تھوڑے قلیل کے سوا، اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا۔ فرمایا، جا، جو ان میں سے تیرے پیرو بن جائیں گے تو جہنم تم سب کا پورا پورا بدلہ ہے۔ اور ان میں سے جن پر تیرا بس چلے ان کو اپنے غوغا سے گھبرا لے، ان پر اپنے سوار اور پیدل چڑھا لا، مال اور اولاد میں ان کا ساجھی بن جا اور ان سے وعدہ کر لے اور شیطان ان سے محض دھوکے ہی کے وعدے کرتا ہے۔ بے شک میرے اپنے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا اور تیرا رب کارسازی کے لیے کافی ہے۔ ۶۱-۶۵

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ قَالَ أَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا (۶۱)

آدمؑ اور ابلیس کے اس ماجرے کے تمام اجزاء پر سورۂ بقرہ اور اعراف کی تفسیر میں بحث ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں ہم گفتگو سیاق و سباق کلام کی وضاحت ہی کی حد تک محدود رکھیں گے۔

کفار کے انکار کی اصل علت

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ ان لوگوں کے انکار کی اصل علت یہ نہیں ہے کہ ان کو عذاب کی کوئی نشانی نہیں دکھائی گئی بلکہ اس کی اصل وجہ ان کا استکبار ہے اور اس معاملے میں انھوں نے بالکل ٹھیک اپنے امام ابلیس کی سنت کی پیروی کی۔ جس طرح اس کو جب حکم ہوا کہ آدمؑ کو سجدہ کرے تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں ایک برتر مخلوق ہو کر ایک خاکی مخلوق کو کس طرح سجدہ کروں، اسی طرح یہ لوگ بھی خدا کی نعمتیں پا کر سیادت و امارت کے پندار میں اندھے ہو گئے ہیں اور ان کا یہ پندار ان کو اجازت نہیں دے رہا ہے کہ وہ تمھیں رسول مان کر تمھاری برتری اپنے اوپر تسلیم کر لیں اور اپنی زعامت کے پندار سے دست بردار ہو جائیں۔

قَالَ أَرَأَيْتَكَ هَٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا (۶۲)

'أَرَأَيْتَكَ' کا اسلوب خطاب طنز و تحقیر کے لیے بھی آتا ہے اور 'اِحْتَنَكَ الْجَرَادُ الْأَرْضَ' کے معنی ہوں گے کہ ٹڈی دل نے زمین کی ساری روئیدگی چٹ کر لی۔

قصۂ آدم و ابلیس کا سبق

یعنی آدمؑ و ابلیس کی یہ دشمنی ختم نہیں ہو گئی بلکہ یہ قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔ اس نے جوشِ حسد میں خدا سے یہ مہلت مانگی تھی کہ اگر تو نے مجھے قیامت تک مہلت دے دی تو میں آدمؑ کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا اور یہ ثابت کر دوں گا کہ آدمؑ اور اس کی ذریت میرے اور میری ذریت کے مقابل میں کسی شرف کے حقدار نہیں ہیں۔

اس کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ جو ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ابلیس اور اس کی ذریات کے نرغے میں آئے ہوئے لوگ ہیں اور اس نے روز اول جو دعویٰ کیا تھا ان لوگوں کے معاملے میں اس نے وہ سچ کر دکھایا ہے۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاؤُكُمْ جَزَاءً مَّوْفُورًا (۶۳)

یعنی ابلیس نے خدا سے قیامت تک کے لیے ذریت آدمؑ کو ورغلانے کی جو مہلت مانگی تھی خدا نے اس کو وہ مہلت دے دی تھی کہ جا جو کچھ تجھے کرنا ہے کر، تیرا اور تیری پیروی کرنے والوں کا پورا پورا بدلہ چکا دینے کے لیے جہنم کافی ہے۔ یعنی تجھ کو یہ مہلت دینے سے کسی زحمت کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں ہے کہ تمھاری سزا میں کوئی کسر رہ جائے گی اس لیے کہ جہنم ایسی چیز ہے کہ وہ ایک ہی ساتھ ساری کسر پوری کر دے گی

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا (۶۴)

'اِسْتِفْزَاز' کے معنی گھبرا دینے اور پریشان کر دینے کے ہیں اور 'صوت' سے مراد یہاں شور و غوغا، ہنگامہ اور پروپیگنڈا ہے۔

ابلیس کی مہلت کی مد

ابلیس اور اس کی ذریات کو اضلال کی مہم چلانے کی جس حد تک مہلت ملی ہوئی ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے تاکہ لوگ اس کو کوئی آسان بازی نہ سمجھیں بلکہ جو اس کے فتنوں سے اپنے ایمان کو بچانا چاہتے ہوں وہ ہر وقت اس کا مقابلہ کرنے کے لیے چوکس رہیں۔

ابلیس کے فتنوں کی گوناگونی

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ۔ یعنی جا، لوگوں کو صراط مستقیم سے ہٹانے کی مہم میں اپنے شور و غوغا، اپنے نعرے اور ہنگامے، اپنے ریڈیو اور سنیما، اپنے گانے بجانے، اپنے جلسوں اور جلوسوں، اپنی تقریروں اور اعلانات، اپنے اخبارات و رسائل اور اس قبیل کی ساری ہی چیزوں سے جو فائدہ اٹھا سکتا ہے اٹھا لے اور جن کے قدم اکھاڑ سکتا ہے اکھاڑ دے۔

وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ۔ 'خیل' سواروں کی جماعت اور 'رجل' پیادوں کی ٹولی۔ یعنی اپنے لشکر ضلالت کے سواروں اور پیادوں کو بھی ان پر چڑھا لا اور اس طرح بھی اگر تیرا بس چلے تو ان کو ایمان سے پھیرنے کی کوشش کر دیکھ۔ یہ ملحوظ رہے کہ سوار اور پیادے چڑھا لانا محض استعارہ ہی نہیں ہے بلکہ امر واقعی بھی ہے سو وہ تمام جنگیں جو دشمنانِ اسلام نے اہل ایمان کو دین حق سے پھیرنے کے لیے برپا کیں وہ سب اس میں داخل ہیں۔

وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ۔ یعنی جو مال اور اولاد ہم نے لوگوں کو بخشے ہیں تو اگر کر سکے تو جا کر ان میں ساجھی بن جا۔ تیرے پرستار ان میں تجھ کو شریک کریں گے۔ اپنے مال میں سے تیرا حصہ نکالیں گے، اپنی اولاد کے نام تیرے نام پر رکھیں گے اور بعض تیری رضا جوئی کے لیے ان کو قربان بھی کر دیں گے۔

وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا۔ یعنی ان کو نہایت لذیذ اور سنہرے وعدوں کے سبز باغ بھی دکھا لے جن میں مبتلا ہو کر زندگی کی حقیقی ذمہ داریوں سے وہ بالکل فارغ ہو بیٹھیں۔ اس کے بعد یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا یعنی شیطان جتنے وعدے بھی کرتا ہے سب محض فریب ہوتے ہیں۔ مثلاً مشرکین عرب کا یہ وہم کہ ہم جن فرشتوں کو پوجتے ہیں وہ ہمیں خدا کا مقرب بنا دیں گے یا یہود کا یہ وہم کہ ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں اس لیے ہمیں جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا (۶۵)

ایمان پر جمے رہنے والوں کو تسلی

'سُلْطَان' کے معنی اختیار اور قدرت کے ہیں۔ یعنی مذکورہ سارے فتنے برپا کرنے کی تو تجھے مہلت دی گئی لیکن تجھے یہ اختیار حاصل نہیں ہوگا کہ میرے جو بندے میری بندگی پر قائم و ثابت قدم رہنا چاہیں ان کو زبردستی

ابلیس کو اختیار مطلق حاصل نہیں

برگشتہ کردے، یہ ایمان پر جمے رہنے والوں کے لیے تسلی ہے کہ شیطان جو کچھ بھی کر گزرے لیکن یہ اختیار مطلق اس کو حاصل نہیں ہے کہ وہ جس کو چاہے ایمان سے پھیر دے۔ اختیار مطلق صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔ پھر مزید تسلی کے لیے فرمایا کہ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا یعنی اللہ کے جو بندے شیطان کے فتنوں کے علی الرغم اپنے ایمان پر قائم رہنا چاہیں گے اور اپنے آپ کو پورے اعتماد کے ساتھ اپنے رب کے حوالے کر دیں گے خدا ان کا کارساز ہے اور وہ کارسازی کے لیے کافی ہے، وہ سخت سے سخت حالات کے اندر بھی اپنے بندے کی حفاظت فرمائے گا اور اس کے ایمان کو بچائے گا۔

۱۴- آگے کا مضمون ——— آیات ۶۶-۷۲

سرکشوں اور غافلوں کی تمثیل

آگے انسان کی اس حالت کی تمثیل ہے کہ جب وہ کسی مصیبت میں پکڑا جاتا ہے تب وہ خدا خدا پکارتا اور اسی کے آگے روتا اور گڑگڑاتا ہے لیکن جوں ہی اس مصیبت سے نجات پا جاتا ہے پھر اکڑنے اور سرکشی کرنے لگتا ہے۔ اسے یہ بات بالکل فراموش ہو جاتی ہے کہ اگر خدا چاہے تو اس کو پھر اسی حالت میں گرفتار کر سکتا ہے اور اس طرح گرفتار کر سکتا ہے کہ پھر اس سے کبھی رہائی نصیب نہ ہو۔ اس کے بعد دو گروہوں کی تمثیل ہے ایک ان لوگوں کی جو دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اس سے صحیح سبق حاصل کرتے ہیں اور دوسری ان لوگوں کی جو ہمیشہ اندھے بنے رہتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کا آخرت میں جو انجام ہوگا وہ بیان فرمایا۔ یہ ساری تصویر و تمثیل قریش کے کفار کی ہے جو قرآن کے مخاطب اول تھے لیکن یہی رویہ دوسرے سرکشوں کا بھی ہوتا ہے اس وجہ سے بات عام الفاظ میں فرمائی گئی ہے ——— آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۶۶-۷۲

رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ
إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٦٦﴾ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ
تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ۖ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ
كَفُورًا ﴿٦٧﴾ أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ
حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَكِيلًا ﴿٦٨﴾ أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ فِيهِ
تَارَةً أُخْرَىٰ فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُمْ
بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا ﴿٦٩﴾ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا

بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ

ع فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿٧٠﴾ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ

بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ

وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٧١﴾ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ

اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿٧٢﴾

ترجمۂ آیات ۶۶-۷۲

تمھارا رب وہی ہے جو تمھارے لیے سمندر میں کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو۔ بے شک وہ تمھارے حال پر بڑا مہربان ہے۔ اور جب تمھیں سمندر میں مصیبت پہنچتی ہے تو اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو سب غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر جب وہ تم کو خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم اعراض کر بیٹھتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ۶۶-۶۷

کیا تم اس بات سے نچنت ہو گئے کہ وہ خشکی کی جانب تمھارے سمیت زمین کو دھنسا دے یا تم پر باد تند بھیج دے، پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ۔ یا تم اس سے نچنت ہو گئے کہ تم کو دوبارہ اسی میں لوٹائے پھر وہ تم پر باد تند کا جھونکا بھیج دے پس وہ تمھاری ناشکری کی پاداش میں تم کو غرق کر دے اور تم اس پر ہمارا کوئی پیچھا کرنے والا اپنے لیے نہ پاؤ۔ ۶۸-۶۹

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی اور تری دونوں میں ان کو سواری عطا کی اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فضیلت دی۔ اس دن کو یاد رکھو جس دن ہم ہر گروہ کو اس کے رہنما سمیت بلائیں گے۔ سو جن کو ان کا اعمال نامہ دہنے ہاتھ میں ملے گا وہ تو اپنے اعمال نامہ کو پڑھیں گے اور ذرا بھی ان کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جائے گی۔

اور جو اس دنیا میں اندھا بنا رہے گا وہ آخرت میں بھی اندھا اور گمراہ تر ہو گا۔ ۷۰-۷۲

۱۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَن تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ۖ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْإِنسَانُ كَفُورًا (۶۶-۶۷)

اللہ کی نعمتوں کی ناقدری

یہ تمثیل ہے اس بات کی کہ ہر نعمت جو انسان کو ملتی ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ملتی ہے۔ اس کا حق یہ ہے کہ انسان اس نعمت سے متمتع اور اپنے رب کا شکر گزار ہو لیکن یہ انسان کی عجیب بدبختی ہے کہ جب اس کو نعمت ملتی ہے تو وہ خدا سے اکڑ جاتا ہے اور ہر چیز کو اپنی سعی و تدبیر کا کرشمہ اور اپنے مزعومہ دیویوں دیوتاؤں کا فضل و کرم سمجھتا ہے لیکن جب کسی گردش میں آجاتا ہے تو خدا خدا پکارنے لگتا ہے، اس وقت سارے دیوی دیوتا اس کو بھول جاتے ہیں۔ پھر جب اللہ اس گردش سے اس کو نجات دے دیتا ہے تو وہ پچھلی خرمستی اس پر عود کر آتی ہے اور خدا کو وہ پھر طاق نسیاں پر رکھ دیتا ہے۔

کشتی اور دریا کی ایک مثال

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کشتی اور دریا کے سفر کی مثال دی ہے کہ یہ خدا ہی کی قدرت ہے کہ ہزاروں من کا وزنی جہاز سمندر کے سینے پر چلتا ہے۔ اللہ نے یہ انتظام اس لیے فرمایا ہے کہ انسان اپنے سفروں میں اس سے فائدہ اٹھائے اور خدا کے اس فضل و رحمت پر اس کا شکر گزار ہو لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب تک کشتی رواں دواں رہتی ہے اس وقت تک تو خدا کا اس کو کبھی خیال بھی نہیں آتا لیکن جب کشتی کسی طوفان میں گھر کر ہچکولے کھانے لگتی ہے تو اس وقت اس کو اپنی اکڑ بھی بھول جاتی ہے اور دوسرے دیوی دیوتا بھی بھول جاتے ہیں، اس وقت وہ صرف خدا ہی سے فریاد و استغاثہ کرتا ہے لیکن یہ حالت صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کشتی گرداب بلا میں رہتی ہے۔ جوں ہی کشتی اس گرداب بلا سے نکلی اور انسان نے خشکی پر قدم رکھا پھر نہ اسے مصیبت کی وہ ساعت یاد رہتی ہے اور نہ اس کو خدا سے اپنا رونا اور گڑگڑانا یاد رہتا۔

اس تمثیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی بھی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ یہ قریش کے سرکش لوگ تم سے عذاب کی جو نشانی مانگ رہے ہیں، اگر نشانی ان کو دکھا دی گئی تو یہ ایمان و ہدایت کی راہ اختیار کر لیں گے بلکہ جب مصیبت میں پھنسیں گے تو خدا خدا پکاریں گے لیکن اس سے چھوٹتے ہی پھر اپنی پچھلی بدمستیوں ہی میں مبتلا ہو جائیں گے ـــــ ایمان و ہدایت کی راہ یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کی صداؤں پر کان دھرے اور اپنی عقل کی رہنمائی کو قبول کرے۔ یہ لوگ اس کے لیے تیار نہیں ہیں تو عذاب کی کسی نشانی سے ان کو ہدایت کی راہ کس طرح مل جائے گی۔

أَفَأَمِنتُمْ أَن يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَكِيلًا (۶۸)

سرکشوں سے چند سوالات

اب یہ سوال فرمایا ہے کہ دریا سے خشکی میں آجانے کے بعد خدا سے بے خوف اور بے پروا کیوں ہو جاتے ہو؟ کیا سمجھتے ہو کہ خدا کی خدائی دریا ہی تک محدود ہے، خشکی اس کی خدائی سے باہر ہے؟ اگر وہ خشکی میں

زمین کو تمھارے سمیت دھنسا دے یا تم پر کنکر پتھر برسا دینے والی بادِ تند بھیج دے جو تم کو اور تمھارے مکانوں کو تہس نہس کر کے رکھ دے تو آخر کون ہے جو تم کو خدا سے بچانے والا بن سکے گا۔

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَکُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰی فَیُرْسِلَ عَلَیْکُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَکُمْ بِمَا کَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَکُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا (۶۹)

قاصف اور تبیع کا مفہوم

'قَاصِف' کے معنی توڑ دینے والی اور 'تَبِیْع' کے معنی نامراد و مددگار کے ہیں۔

یعنی تم ایک مرتبہ خدا سے چھوٹ جانے کے بعد یہ کیوں سمجھ بیٹھے کہ خدا سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے۔ آخر یہ بھی تو ممکن ہے کہ خدا تمھیں کفرانِ نعمت کی سزا دینے کے لیے پھر ایسے حالات پیدا کر دے کہ تمھیں دوبارہ پھر اسی سمندر سے سابقہ پیش آئے اور وہ تم پر ایسی بادِ تند بھیجے جو سب کچھ توڑ پھوڑ کر تمھیں غرق کر دے اور تمھارا کوئی حامی تمھاری حمایت میں ہمارا تعاقب کرنے والا نہ بن سکے۔ آگے آیت ۷۵ میں اسی مضمون کو یوں ادا فرمایا ہے۔ 'ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا'۔

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا (۷۰)

انسان کو اس کی ذمہ داری کی یاد دہانی

اب یہ انسان کو اس کی ذمہ داری یاد دلائی ہے کہ ہم نے انسان کو جو عزت بخشی ہے، خشکی اور تری دونوں میں اس کے لیے سواری کا جو انتظام کیا ہے، اس کو جو پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اس کو اپنی بہت سی مخلوقات پر جو فضیلت دی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ ان نعمتوں کا حق پہچانے اور اپنے رب کی ان نعمتوں کو پا کر اس سے اکڑنے اور اس کی نعمتوں کی ناشکری کرنے کے بجائے اس کا شکر گزار اور فرماں بردار بندہ بنے۔ نعمت پا کر اکڑنا ابلیس کی سنت ہے اور اس کا جو حشر ہوا وہ معلوم ہے۔

'وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا' سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ انسان کو دوسری مخلوقات پر جو فضیلت حاصل ہے وہ کلی نہیں ہے۔ خدا کی مخلوقات میں ایسی مخلوقات بھی ہیں جن پر انسان کی فضیلت نہیں ہے۔

یَوْمَ نَدْعُوْا کُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓئِکَ یَقْرَءُوْنَ کِتٰبَهُمْ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا (۷۱)

'اُنَاس' کے معنی انسانوں کے گروہ کے ہیں اور 'امام' سے مراد لیڈر اور پیشوا ہیں۔

جزا و سزا کے دن کی یاد دہانی

یہ اس دن کی یاد دہانی فرمائی ہے جس دن جزا اور سزا کی خدائی عدالت قائم ہو گی۔ فرمایا کہ اس دن ہم ہر گروہ کو ان کے لیڈروں اور پیشواؤں سمیت اپنے حضور حاضر ہونے کا حکم دیں گے۔ نیک بھی اپنے صالح پیشواؤں اور مقتداؤں کے ساتھ حاضر ہوں گے اور اشرار و مفسدین بھی اپنے ناہنجار لیڈروں کے ساتھ حاضر کیے جائیں گے۔ پھر نیکوں کو ان کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ پکڑائے جائیں گے اور بدوں کو ان کے بائیں ہاتھ میں۔ تو

جن کو ان کے اعمال نامے دہنے ہاتھ میں ملیں گے وہ ان کو پڑھیں گے اور وہ دیکھیں گے کہ ان کے ساتھ ذرہ برابر بھی ناانصافی نہیں کی گئی ہے۔ ان کی ایک ایک نیکی، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، سب درج ہے اور ہر ایک کا ان کو بھرپور صلہ بھی عطا ہوا۔ 'وہ ان کو پڑھیں گے' میں فعل اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ خوش ہو ہو کر ایک ایک چیز کو پڑھیں گے اور اپنے رب کی ذرہ نوازی پر اس کے شکر گزار ہوں گے۔ یہاں اگرچہ اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ ان لوگوں کے تاثرات کیا ہوں گے جن کو ان کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے لیکن سیاق کلام سے تو یہ بات ظاہر ہے کہ یہ لوگ اپنے اعمال نامے پڑھنے کے بجائے اپنے سر اور منہ پیٹیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی کہ ہمارے سارے اعمال نامے میں ایک نقطہ بھی روشن نہیں ہے، سب تاریکی ہی تاریکی ہے۔

ہر گروہ کو ان کے لیڈروں اور مقتداؤں کے ساتھ جمع کرنے میں اعزاز و تکریم کا پہلو بھی ہے اور اتمام حجت کا پہلو بھی۔ اتقیاء کے لیڈر تو یہ دیکھیں گے کہ الحمدللہ جس اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے انھوں نے بازیاں کھیلیں اس کا انجام اس شاندار صورت میں سامنے آیا اور اشرار کے لیڈر اپنی کارستانیوں کے انجام دیکھیں گے اور ان کی پیروی کرنے والے ان پر لعنت بھیجیں گے اور ان کے لیے، جیسا کہ دوسرے مقام میں تصریح ہے، دونے عذاب کا مطالبہ کریں گے۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (۷۲)

اصحاب الشمال کا انجام

اصحاب الیمین کے بعد یہ اصحاب الشمال کا انجام بیان ہو رہا ہے کہ چونکہ یہ لوگ دنیا میں اندھے بنے رہے اس وجہ سے یہ آخرت میں بھی اندھے ہی اٹھیں گے اور اصل منزل سے جو دوری آج ان کو ہے وہ دوری آج کی نسبت کہیں زیادہ ہو جائے گی اس لیے کہ آخرت کے ظہور کے بعد ان کے لیے صراط مستقیم کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جائے گا۔

اس آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اصحاب الیمین کو جو مرتبہ و مقام حاصل ہو گا وہ اس بنا پر حاصل ہو گا کہ انھوں نے دنیا میں آنکھیں بند کر کے زندگی نہیں گزاری بلکہ ہمیشہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور اللہ کی ایک ایک نشانی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

۱۶- آگے کا مضمون ___ آیات ۷۳-۸۴

آنحضرت صلعم کو موقف حق پر جمے رہنے کی تاکید

آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید ہے کہ مخالفین کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم اپنے موقف حق پر جمے رہو۔ یہ کتنا ہی زور لگائیں کہ تم قرآن میں ان کے حسب منشا کچھ ترمیم کر دو تو وہ تمہارے دوست اور ساتھی بن جائیں گے لیکن تم کو ایک شوشہ کے برابر بھی اس میں ترمیم و تغیر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تمہاری مخالفت میں یہ زیادہ سے زیادہ جو کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ تم کو یہ اتنا تنگ کریں کہ تم یہ شہر چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤ۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تمہارے بعد ان کو بھی اس شہر میں زیادہ ٹکنا نصیب نہ ہو گا۔ رسولوں کی ہجرت کے بعد ان کی قوموں کا جو حشر ہوا ہے وہی حشر ان

کا بھی ہوگا۔ اس کے بعد حصول صبر و استقامت کے لیے نماز خصوصاً تہجد کی تاکید ہوئی اور قرب ہجرت کی دعا تعلیم فرمائی گئی اور ہجرت کے ساتھ جو فتح وابستہ ہے اس کی طرف اشارہ فرمایا گیا۔ آخر میں مخالفین کی بدبختی پر اظہار افسوس ہے کہ قرآن جیسی چیز جو سرتاسر شفا اور رحمت ہے، ان لوگوں کی شامتِ اعمال سے ان کے لیے موجب وبال بن گئی ـــــ آیات کی تلاوت کیجیے

آیات ۷۳-۸۴ وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا
غَيْرَهُ ۖ وَإِذًا لَاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ﴿٧٣﴾ وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ
تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ﴿٧٤﴾ إِذًا لَأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَ
ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ﴿٧٥﴾ وَإِنْ كَادُوا
لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا ۖ وَإِذًا لَا يَلْبَثُونَ
خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٧٦﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا
ع ۸ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ﴿٧٧﴾ أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ
إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ ۖ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ﴿٧٨﴾
وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ
مَقَامًا مَحْمُودًا ﴿٧٩﴾ وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي
مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا ﴿٨٠﴾ وَقُلْ
جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ﴿٨١﴾ وَنُنَزِّلُ
مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۙ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ
إِلَّا خَسَارًا ﴿٨٢﴾ وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ ۖ وَ
إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوسًا ﴿٨٣﴾ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ فَرَبُّكُمْ
ع ۹ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا ﴿٨٤﴾

ترجمۂ آیات ۸۰-۷۳

اور بے شک قریب تھا کہ تم کو فتنوں میں ڈال کر اس چیز سے ہٹا دیں جو ہم نے تم پر وحی کی ہے تاکہ تم اس سے مختلف ہم پر افترا کر کے پیش کرو، اور تب وہ تم کو اپنا گاڑھا دوست بنا لیتے اور اگر ہم نے تم کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تم ان کی طرف کچھ جھک پڑتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم تم کو زندگی اور موت دونوں کا دوگنا عذاب چکھاتے پھر تم ہمارے مقابل میں اپنا کوئی مددگار نہ پاتے۔ ۷۳-۷۵

اور بے شک یہ اس سرزمین سے تمہارے قدم اکھاڑ دینے کے درپے ہیں تاکہ یہ تم کو یہاں سے نکال چھوڑیں، اور اگر ایسا ہوا تو تمہارے بعد یہ بھی ٹکنے نہ پائیں گے۔ ہم نے تم سے پہلے اپنے جو رسول بھیجے ان کے باب میں ہماری سنت کو یاد رکھو اور تم ہماری سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ نماز کا اہتمام رکھو زوال آفتاب کے اوقات سے لے کر شب کے تاریک ہونے تک اور خاص کر فجر کی قرأت کا۔ بے شک فجر کی قرأت بڑی ہی حضوری کی چیز ہے۔ اور شب میں بھی تہجد پڑھو، یہ تمہارے لیے مزید برآں ہے۔ توقع رکھو کہ تم کو تمہارا رب محمود اٹھانا اٹھائے اور دعا کرو کہ اے میرے رب مجھے داخل کر عزت کا داخل کرنا اور مجھے نکال عزت کا نکالنا اور مجھے خاص اپنے پاس سے مددگار قوت نصیب کر۔ اور اعلان کر دو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہوگیا اور باطل نابود ہونے والی چیز ہے۔ ۷۶-۸۱

اور ہم قرآن میں سے جو اتارتے ہیں وہ شفا اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے اور ظالموں کے لیے یہ چیز ان کے خسارے ہی میں اضافہ کر رہی ہے اور انسان پر جب ہم اپنا انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا اور پہلو بدل لیتا ہے اور جب اس کو مصیبت پہنچتی ہے تو مایوس ہو جاتا ہے۔ کہہ دو کہ ہر ایک اپنی روش پر کام کرے گا تو تمہارا رب ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو صحیح تر راستہ پر ہیں۔ ۸۲-۸۴

۱۷-۱ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا (۷۳-۷۵)

'لَيَفْتِنُوْنَكَ' یہاں 'يَصْرِفُوْنَكَ' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے جس کی طرف 'عَنْ' اشارہ کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مخالفین نے اتنا زور باندھا تھا کہ قریب تھا کہ تم کو فتنوں اور آزمائشوں میں ڈال کر تم کو موقف حق سے ہٹا دیں لیکن اللہ نے تم کو اس فتنہ سے بچا لیا۔

کفار کی دعوتِ مصالحت کا جواب

رسولوں کی دعوت میں ایک مرحلہ یہ بھی آیا ہے کہ مخالفین نے جب یہ محسوس کر لیا ہے کہ اب یہ دعوت جڑ پکڑ چکی ہے، صرف اندھی بہری مخالفت سے اس کا ہلانا ممکن نہیں رہا تو اس وقت انھوں نے یہ سیاسی چال چلی ہے کہ کوئی تجویز باہمی سمجھوتے کی پیش کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی یہ مرحلہ پیش آیا۔ مخالفین نے جب دیکھ لیا کہ اب یہ دعوت دلوں میں گھر کر رہی ہے تو ان کی بعض جماعتوں نے، روایات میں قبیلہ بنی ثقیف وغیرہ کا نام بھی آیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے یہ تجویز پیش کی کہ اگر فلاں فلاں احکام میں ترمیم کر دیں تو ہم یہ دعوت قبول کیے لیتے ہیں، پھر ہم اور آپ گہرے دوست بن کے رہیں گے[1]۔ یہ مرحلہ آنحضرت صلعم کے لیے بڑا ہی سخت تھا۔ ایک طرف اللہ کے اتارے ہوئے احکام تھے جن میں ایک نقطہ کے برابر بھی آپ ترمیم کرنے کے مجاز نہ تھے، دوسری طرف آپ اپنی قوم کے ایمان کے انتہائی حریص تھے اور کسی ایسے موقع کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہتے تھے جس سے قوم کے ایمان کی راہ پر بڑھنے کی کچھ امید بندھتی ہو۔ اس صورت حال نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تذبذب میں مبتلا کر دیا۔ 'لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ' کے الفاظ اسی تذبذب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس نازک مرحلے میں اپنے پیغمبر کی دست گیری فرمائی اور آپ کو تردد و تذبذب سے نکال کر صحیح شاہراہ پر کھڑا کر دیا۔

نبی کی عصمت کا مفہوم

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی کے معصوم ہونے کے معنی یہ نہیں کہ اس کو کوئی تذبذب کی حالت پیش نہیں آتی یا کوئی غلط میلان اس کے دل میں خطور نہیں کرتا بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اول تو اس کا میلان کبھی جانب نفس میں نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ جانب خیر ہی میں ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ جانب خیر میں بھی اگر وہ کوئی ایسا قدم اٹھاتا نظر آتا ہے جو صحیح نہیں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے اس کو بچا لیتا ہے اور صحیح سمت میں اس کی رہنمائی فرما دیتا ہے۔

خطاب نبی سے، عتاب کفار پر

'اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ...... الآیہ' ظاہر الفاظ کے اعتبار سے خطاب اگرچہ آنحضرت صلعم سے ہے لیکن اس میں جو زجر و عتاب ہے اس کا رخ سمجھوتے کی تجویزیں لانے والوں کی طرف ہے تاکہ وہ متنبہ ہو جائیں کہ جب اس قسم کے

---

[1] اسی سے ملتی جلتی بات مائدہ کی آیت ۴۹ میں بھی گزر چکی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

کسی اعلام پر خود پیغمبر کو دنیا اور آخرت میں دو گنے عذاب کی دھمکی ہے تو پھر اس کے پڑنے کا آنے کا کیا امکان رہا۔

'ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ' میں ایک مضاف محذوف ہے یعنی 'ضِعْفَ عَذَابِ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ عَذَابِ الْمَمَاتِ' اور یہ دو گنے عذاب کی دھمکی رسول کے درجے اور مرتبے کے اعتبار سے ہے۔ جن کے مرتبے جتنے ہی اونچے ہوتے ہیں اسی اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور اسی اعتبار سے ان کی گرفت بھی ہوتی ہے اگر وہ کوئی غلطی کرتے ہیں۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا (۷۶-۷۷)

'اِسْتِفْزَاز' کے معنی گھبرا دینے، پریشان کر دینے اور اکھاڑ دینے کے ہیں اور 'الْاَرْض' سے مراد یہاں سرزمین مکہ ہے۔

مخالفین جب سمجھوتے کی کسی تجویز کے بروئے کار آنے سے بھی مایوس ہو گئے تو ظاہر ہے کہ ان کی مخالفت جو پہلے بھی کچھ کم نہ تھی اس مایوسی کے بعد دو چند ہو گئی۔ انھوں نے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا کہ آپ کے قدم سرزمین مکہ سے اکھاڑ دیں کہ آپ یہاں سے نکلنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم کو انھوں نے یہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تو تمھارے بعد یہ بھی زیادہ ٹکنے نہ پائیں گے۔ تم سے پہلے جو ہم نے رسول بھیجے ان کی ہجرت کے بعد جو حشر ان کی قوموں کا ہوا وہی حشر لازماً ان کا بھی ہو گا۔ اس معاملے میں اللہ کی جو سنت پہلے سے چلی آ رہی ہے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے معاملے میں وہ بدل جائے۔

رسول کی ہجرت تک قوم امان ہوتی ہے

ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ رسول چونکہ اتمام حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے، نیز وہ جب تک قوم میں رہتا ہے اس کے لیے استغفار کرتا رہتا ہے اس وجہ سے اس کی موجودگی تک قوم کو اللہ کے عذاب سے امان حاصل رہتی ہے لیکن جب قوم کی روش سے تنگ آ کر وہ ہجرت پر مجبور ہو جاتا ہے تو قوم ایک بالکل جسد بے روح ہو کر رہ جاتی ہے اور اتمام حجت کا مرحلہ ختم ہو چکتا ہے۔ اس کے بعد یا تو اللہ کا کوئی عذاب نمودار ہوتا ہے جو غلاظت کے اس ڈھیر سے زمین کو صاف کر دیتا ہے یا اہل ایمان کی تلوار بے نیام ہوتی ہے اور وہ ان کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اہل مکہ کے اشرار کے معاملے میں یہی دوسری صورت پیش آئی۔

'سُنَّةَ' میرے نزدیک 'يَوْمَ' وغیرہ کی طرح فعل محذوف سے منصوب ہے یعنی 'اُذْكُرْ سُنَّةَ مَنْ' ہم نے جو رسول تم سے پہلے بھیجے ان کے اور ان کی قوموں کے معاملے میں ہماری جو سنت رہی ہے اس کو یاد رکھو۔ اس اسلوب میں فی الجملہ تخصیص ذکر کا پہلو مضمر ہوتا ہے اور یہ براہ راست اصل چیز کو نگاہ کے سامنے کر دیتا ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (۷۸)

'اِقَامَتِ صَلٰوة' کا مفہوم صرف نماز پڑھنا ہی نہیں بلکہ نماز کا اہتمام کرنا ہے۔

نمازوں کے اوقات

'دُلُوْك' کے معنی زوال کے ہیں۔ سورج کے زوال کے تین درجے ہیں۔ ایک وہ جب وہ سمت راس سے ڈھلتا

ہے، دوسرا جب مرئی العین سے نیچے کی طرف جھکتا ہے، تیسرا جب وہ افق سے غائب ہوتا ہے، یہ تینوں اوقات ظہر، عصر اور مغرب کی نمازوں کے ہیں۔ 'دُلُوْك' پر 'لِ' وقت کے مفہوم میں ہے۔ اس معنی کے لیے یہ عربی میں معروف ہے۔ جس مفہوم کو ہم لفظ 'پر' سے ادا کرتے ہیں بعض مواقع میں وہی مفہوم 'لِ' ادا کرتا ہے۔ مثلاً 'اَلصَّلٰوةُ لِاَوْقَاتِهَا' کے معنی ہوں گے نماز اس کے اوقات پر۔ 'اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ' نماز کا اہتمام کرو زوال آفتاب پر۔

'غَسَقِ الَّيْلِ' اول شب کی تاریکی جب کہ وہ گاڑھی ہو جائے۔ یہ نماز عشا کا وقت ہے۔

'وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ' اس کو اگرچہ 'اَقِمْ' کے تحت بھی رکھ سکتے ہیں لیکن میرے نزدیک اس کا نصب تخصیص ذکر کے پہلو سے ہے یعنی 'اَخُصُّ بِالذِّكْرِ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ' اس تخصیص ذکر سے نماز فجر کی خاص اہمیت واضح ہوتی ہے۔

'اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا' 'قرآن' سے مراد یہاں نماز فجر میں قرآن کی تلاوت ہے۔ یہ لفظ یہاں فی الجملہ طول قرأت کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے اور جہر قرأت کی طرف بھی۔ 'مَشْهُوْدًا' سے اس حضور قلب و دماغ کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے جو خاص طور پر نماز فجر میں امام اور مقتدیوں دونوں کو حاصل ہوتا ہے اور ملائکہ کی اس حاضری کی طرف بھی جو اس وقت مبارک کی برکات میں سے ہے اور جس کا ذکر احادیث میں آیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دن رات میں پانچ نمازوں اور ان کے اوقات کا ذکر خود قرآن میں ہے۔ بلکہ آگے والی آیت سے معلوم ہو گا کہ تہجد اور اس کے وقت کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ اتنی واضح آیات کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہے کہ قرآن میں پانچ وقت کی نمازوں کا کوئی ذکر نہیں ہے تو ایسے سرپھرے لوگوں کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔

اشیائے کائنات کا رکوع و سجود

نمازوں کے اوقات کے تعین میں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی بڑی نشانیوں کے رکوع و سجود کے اوقات کو ملحوظ رکھا ہے۔ زیر بحث آیت سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ سورج شب و روز کے تمام اوقات میں قیام، رکوع اور سجود میں رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام چیزوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے جن پر سورج کا عکس پڑتا ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ اپنے رب کے آگے برابر قیام، رکوع اور سجود میں رہتی ہیں 'ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ' اور 'اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ' وغیرہ آیات میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ تمام مخلوقات اپنی صورت و ہیئت سے انسان کو گویا دعوت دیتی ہیں کہ جس طرح وہ خدا کے آگے رکوع و سجود کرتی ہیں اسی طرح وہ بھی ان کا ہم آہنگ ہو کر اپنے رب کی نماز پڑھے لیکن یہ انسان کی عجیب بدقسمتی ہے کہ وہ کائنات کی مخلوق میں سے تو حقیر سے حقیر چیزوں کے آگے گھٹنے اور ماتھے ٹیکتا ہے لیکن اپنے اس رب حقیقی سے اکڑتا ہے جس کے آگے اس کی مسجود چیزیں بھی ہر وقت رکوع و سجود میں ہیں۔ اسی آفتاب کو لیجیے جس کے رکوع و سجود کا یہاں ذکر ہے، کون اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ دنیا میں کتنا پجا ہے اور کتنا پج رہا ہے۔

نماز صبر و استقامت کے لیے

یہاں نماز کے اس اہتمام کی تاکید، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، اس مشکل مرحلہ میں حصول صبر و استقامت کے لیے ہے جو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو درپیش تھا۔ راہ حق میں جو سخت مراحل آزمائش

کے پیش آتے ہیں ان میں حق پر استقامت اللہ کی معیت کے بغیر ممکن نہیں اور اللہ کی معیت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ نماز بالخصوص تہجد کی نماز ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (۷۹)

'تہجد' سے مراد — 'تہجد' کے معنی لغت میں تو شب میں کچھ سونے کے بعد اٹھنے کے ہیں لیکن اصطلاح قرآن میں اس سے مراد وہ نماز ہے جو شب میں کچھ سونے کے بعد اٹھ کر پڑھی جائے۔ 'بہ' میں 'ب' میرے نزدیک ظرفیہ ہے اور ضمیر مجرور کا مرجع 'لیل' ہے۔

'نافلہ' کا مفہوم — 'نَافِلَةً' اصل پر جو شے زائد ہو اس کو کہتے ہیں۔ اس کا استعمال کسی نعمت و رحمت پر زیادتی کے لیے ہوتا ہے، کسی بار اور مصیبت پر زیادتی کے لیے نہیں ہوتا یعنی یہ نماز ان پنج وقتہ نمازوں پر تمہارے لیے مزید ہے۔ 'لَكَ' سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے یہ نماز آپ کے لیے ضروری تھی۔ چنانچہ آپ نے زندگی بھر اس کا اہتمام رکھا۔ نمازوں کے اس اہتمام کی تاکید، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، شیطانی قوتوں کے مقابلہ کے لیے حصول قوت کے مقصد سے تھی۔ اسی مقصد کے لیے یہ تہجد کے اہتمام کی تاکید ہوئی اور اس کی نسبت فرمایا گیا کہ نَافِلَةً لَّكَ' یعنی یہ تمہارے لیے مزید کمک کے طور پر ہے جو راہ حق کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے تمہارے صبر و ثبات میں مزید اضافہ کرے گی۔ عام امتیوں کے لیے یہ نماز اگرچہ ضروری نہیں ہے لیکن جو لوگ شیطانی قوتوں کا مقابلہ کرنے اور حق کو دنیا میں برپا کرنے کے لیے اٹھیں ان کے لیے خدا کی نصرت حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی نماز ہے۔ چنانچہ امت کے صالحین نے جنھوں نے اس دنیا میں دین کی کوئی خدمت کرنے کی توفیق پائی ہے، اس نماز کا ہمیشہ اہتمام رکھا ہے۔

'عَسٰى' کا لفظ اصلاً امید و رجا، توقع اور ظن غالب کے اظہار کے لیے آتا ہے لیکن جب یہ اللہ تعالیٰ کی نسبت کے ساتھ آئے تو اس صورت میں امید و رجا کا تعلق اللہ تعالیٰ کے بجائے مخاطب یا متکلم سے ہو جائے گا۔ مثلاً عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ ۸ - بنی اسرآئیل' کا ترجمہ ہوگا، تم توقع رکھو کہ اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا۔ یوسف' کا ترجمہ ہوگا، میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لائے گا۔ اسی طرح 'عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا' کا ترجمہ ہوگا، تم امید رکھو کہ خدا تمھیں محمود اٹھانا اٹھائے گا۔ اس توجیہ سے وہ شبہ رفع ہو جاتا ہے جو عربیت سے ناآشنا لوگ اٹھاتے ہیں کہ خدا کے نزدیک تو ہر چیز معلوم و معین ہے تو اس کی طرف توقع اور ظن و گمان کی نسبت کے کیا معنی؟ آگے کسی موزوں مقام پر ہم واضح کریں گے کہ 'لَعَلَّ' اور اس کے ہم معنی الفاظ و حروف بھی جب خدا کی نسبت سے آتے ہیں تو ان میں بھی وہی مفہوم ہوتا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔

مقام محمود — 'مَقَامًا مَّحْمُوْدًا'۔ 'مَقَام' ہمارے نزدیک ظرف کے معنی میں نہیں بلکہ مصدر کے معنی میں ہے اور یہ یہاں مفعول مطلق کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ لفظ 'بعث' اور 'مقام' میں معنی کا اشتراک موجود ہے اس لیے کہ 'بَعَثَ' کے معنی اٹھانے اور 'مَقَام' کے معنی کھڑے ہونے اور اٹھنے کے ہیں اس وجہ سے اس کے مفعول مطلق واقع ہونے میں

کوئی قباحت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو تمھاری مخالفت و مذمت میں یہ شور و غوغا برپا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے لیکن تم اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو، نمازوں بالخصوص تہجد کا خاص اہتمام کرو اور یہ توقع رکھو کہ تمھارا رب تمھیں اس حال میں اٹھائے گا کہ ایک عظیم امت کی زبانوں پر تمھارے لیے ترانۂ حمد ہوگا اور عند اللہ بھی تمھاری مساعی محمود و مشکور ہوں گی۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (۸۰)

لفظ 'قُلْ' یہاں دعا کرنے کے مفہوم میں ہے۔ اس مفہوم میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ آیا ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۲۹۔ مومنون۔

لفظ 'صِدْقٍ' کی اصل روح، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، عزت، رسوخ اور استحکام ہے۔ 'سُلْطٰن' کے معنی غلبہ اور تمکن کے ہیں۔

قربِ ہجرت کا اشارہ اور ایک عظیم بشارت

اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ حالات اتنے سخت ہو چکے تھے کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مکہ سے ہجرت ناگزیر ہو چکی تھی لیکن اللہ کا رسول اللہ کے اذن کے بغیر ہجرت نہیں کرتا۔ اس وجہ سے آنحضرت صلعم اپنی دعوت اور اپنے مقام پر ڈٹے رہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ آپ کو یہ دعا تلقین کی گئی جس میں نہ صرف یہ کہ قربِ ہجرت کی طرف اشارہ ہے بلکہ یہ بشارت بھی مضمر ہے کہ آپ کے نکلنے سے پہلے ہی آپ کے داخل ہونے کا انتظام کر لیا گیا ہے، آپ کا نکلنا اور داخل ہونا دونوں عزت و وقار اور رسوخ و استحکام کے ساتھ ہوگا اور یہ کہ اس سفر میں غلبہ و نصرتِ الٰہی کا خاص خدائی بدرقہ آپ کے ہم رکاب ہوگا۔ دعا میں 'اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ' کا 'اَخْرِجْنِیْ' پر مقدم ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمھارے داخلہ کا انتظام تمھارے نکلنے سے پہلے ہی ہو چکا ہے اور 'مِنْ لَّدُنْكَ' کے الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ گو ظاہری حالات کیسے ہی نامساعد و مخالف ہوں لیکن تمھارا رب اپنے پاس سے تمھارے لیے سارے انتظام فرمائے گا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری الفاظ کے اعتبار سے تو یہ ایک دعا ہے جو آپ کو تلقین فرمائی گئی ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک عظیم بشارت ہے جو نہایت ہی پرخطر حالات میں آپ کو دی گئی۔ پھر ہجرت کے سفر کی سرگزشت اور مدینہ میں حضورؐ کے داخلہ کے حالات پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ خلق نے اس بشارت کے ایک ایک لفظ کو عملاً ظہور میں آتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۸۱)

'حق' سے مراد قرآن اور وہ دین حق ہے جس کو لے کر قرآن آیا تھا اور باطل سے مراد وہ دین باطل ہے جس کو مٹانے کے لیے قرآن نازل ہوا تھا۔

حق کی فتح اور باطل کی شکست کا اعلان

اوپر آپ کو ہجرت کی دعا سکھائی گئی تھی اب یہ انھیں نازک حالات کے اندر حق کی فتح اور باطل کی شکست کے اعلان کا آپ کو حکم ہوا۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں کہ ہجرت درحقیقت رسول کی فتح کا دیباچہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد رسول کے مخالفین لازماً مٹ جاتے ہیں اور دین حق کا بول بالا ہو کے رہتا ہے۔

'اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی فطرت کے اندر باطل کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ خودرو جھاڑیوں کی طرح اس وقت پھیلتا ہے جب اس کو صاف کرنے والے موجود نہیں ہوتے ہیں۔ جب اس کو صاف کرنے والے آموجود ہوتے ہیں تو حالات کے اعتبار سے گو انھیں مشقت اٹھانی پڑتی ہے لیکن بالآخر یہ نابود ہو کے رہتا ہے اور اس کی جگہ وہ کشت حق لہلہا اٹھتی ہے جس کا تخم اہل حق ڈالتے ہیں اس لیے کہ انسانی فطرت کی زمین درحقیقت فاطر فطرت نے اسی کشت حق کی پرورش کے لیے بنائی ہے نہ کہ اس خاروخس کی پرورش کے لیے جو محض غفلت کی پیداوار ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر یہ پیشین گوئی عملاً پوری ہو گئی۔ اس وقت آنحضرت صلعم نیزے کی انی سے خانہ کعبہ کے بتوں کو توڑتے جاتے اور یہ آیت پڑھتے جاتے گویا اس آیت کا مصداق منصۂ شہود پر آگیا۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (۸۲)

قرآن کی تکذیب کرنے والوں کی محرومی

یہ قرآن کی تکذیب کرنے والوں کی محرومی اور شامت زدگی پر اظہار افسوس اور ملامت ہے کہ ہم تو قرآن میں سے جو کچھ اتار رہے ہیں اس میں ان کے تمام روحانی و عقلی روگوں کا مداوا اور نتیجہ اور عاقبت کار کے اعتبار سے یہ ان کے لیے سراسر رحمت ہے لیکن جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں یہی چیز ان کے لیے مزید خسارے کا باعث بن رہی ہے کہ وہ اپنے اوپر اللہ کی حجت تمام کر کے اپنے آپ کو دنیا اور آخرت دونوں میں شدید عذاب کا مستحق بنا رہے ہیں۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا (۸۳)

'اَلْاِنْسَان' کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن یہاں اس سے مراد قریش کے وہی اشرار و مفسدین ہیں جن کا کردار یہاں زیر بحث ہے۔ انھوں نے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول سے متکبرانہ اعراض کی روش اختیار کی، جیسا کہ 'اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ' کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی ان سے منہ پھیر کر عام صیغہ سے بات فرمائی۔

'اَعْرَضَ' کے بعد 'نَاٰ بِجَانِبِهٖ' کے الفاظ سے ان کے اعراض کی تصویر سامنے آ رہی ہے۔ کسی چیز سے اعراض شائستہ انداز میں بھی ہو سکتا ہے لیکن جب انسان نفرت، بیزاری اور غرور کے انداز میں کسی چیز سے اعراض کرتا ہے تو وہ پہلو بدل لیتا اور مونڈھے پھیر لیتا ہے۔

فرمایا کہ انسان کا عجیب حال ہے، جب ہم اس پر اپنا فضل و انعام کرتے ہیں تب وہ ہم سے اکڑتا اور سرکشی کرتا ہے لیکن اس کے اعمال کی پاداش میں جب ہم اس کو کسی مصیبت میں گرفتار کر لیتے ہیں تو وہ دل شکستہ اور مایوس ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے لیے صحیح روش یہ تھی کہ ہمارے انعام پر ہمارا شکرگزار ہوتا اور کوئی آزمائش پیش آتی تو اس پر صبر کرتا۔ مطلب یہ ہے کہ یہی حال ہے تمھارے ان مخالفین کا، ہم نے ان کو اپنے فضل سے نوازا ہے تو ان کے غرور کا یہ حال ہے کہ تمھاری دعوت و تذکیر پر تم سے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اگر ہم نے ان کو دھر لیا تو پھر سارا نشہ ہرن ہو جائے گا اور یاس و نامرادی کی تصویر بن کر رہ جائیں گے۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (۸۴)

لفظ 'کل' اگرچہ نکرہ ہے لیکن بعض مواقع ہیں، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، یہ معرفہ کے حکم میں ہو جاتا ہے یعنی اس سے وہی جماعتیں یا اشخاص مراد ہوتے ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہوتا ہے۔

معاملہ اللہ کے حوالہ کرنے کی ہدایت

'شَاكِلَة' کے معنی طریقہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اگر تم میری بات سننے پر آمادہ نہیں ہو تو تم اپنی روش پر گامزن رہو گے اور میں بہرحال اپنی دعوت پر قائم رہوں گا۔ تمھارا رب خوب جانتا ہے کہ سیدھے راستے پر کون ہے، اپنے زعم کے مطابق تم یا میں اور میرے ساتھی۔ آگے آنے والے حالات بتا دیں گے کہ منزل پر کون پہنچتا ہے۔ یہ آیت گویا تفویض کی آیت ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہوئی کہ تم ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کر دو اور خود اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو۔

۱۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۸۵-۱۱۱

مخالفین کے اعتراضوں کے جواب

آگے مخالفین کے ان اعتراضات کا جواب ہے جو وہ قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے خلاف اٹھاتے تھے۔ ساتھ ہی ان مطالبات کا حوالہ بھی ہے جو وہ اپنے ایمان لانے کی شرط کے طور پر پیش کرتے تھے۔ ان مطالبات کو نقل کر کے ان کے جواب بھی دیے ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی بھی کہ جن کے اندر علم کا نور ہے وہ اس کتاب پر ایمان لا رہے ہیں، رہے وہ لوگ جو طرح طرح کے معجزات کے مطالبے کر رہے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑو، یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں ــــ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۸۵-۱۱۱

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ
الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۸۵) وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ
اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا (۸۶) اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ
اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا (۸۷) قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ
عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ
لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۸۸) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؗ
فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (۸۹) وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ
لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (۹۰) اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ

تُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ
عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ
مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ
عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾ ع ۹ ۱۰
وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ
اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ
لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ
وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ
الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا
خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا النصف
ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمْ
يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ
مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾
قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ
الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ ع ۱۱
بَيِّنٰتٍ فَسْئَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ
لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾
فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿۱۰۳﴾
وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ
وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴿۱۰۴﴾ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ
وقف لازم نَزَلَ ۗ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۱۰۵﴾ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ
لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ
اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۚ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ
يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ
السجدة رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾
قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۗ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ
الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ
ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ
يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ
ع ۱۲ ۱۱ ۱۲ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

ترجمۂ آیات ۸۵-۱۱۱

اور وہ تم سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم میں سے ہے اور تمہیں تو بس تھوڑا ہی سا علم عطا ہوا ہے۔ اور اگر ہم چاہیں تو اس وحی کو سلب کر لیں جو ہم نے تم پر کی ہے، پھر تم اس کے لیے ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار بھی نہ پا سکو گے۔ یہ تو بس تمہارے رب کا فضل ہے۔ بے شک اس کا فضل تم پر بہت بڑا ہے۔ کہہ دو کہ اگر تمام انس و جن

اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس جیسا قرآن لا دیں تو وہ اس جیسا نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔ ۸۵-۸۸

اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں طرح طرح سے ہر قسم کی حکمت کی باتیں بیان کی ہیں لیکن اکثر لوگ انکار ہی پر اڑے ہوئے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم تو تمھاری بات ماننے کے نہیں جب تک تم ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ نہ جاری کر دو یا تمھارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو جائے پھر تم اس کے بیچ بیچ میں نہریں نہ دوڑا دو یا تم ہم پر آسمان سے ٹکڑے نہ گرا دو جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو یا اللہ اور فرشتوں کو سامنے نہ لا کھڑا کرو یا تمھارے پاس سونے کا کوئی گھر نہ ہو جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تمھارے چڑھنے کو بھی ماننے کے نہیں جب تک تم وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جسے ہم پڑھیں — کہہ دو کہ میرا رب پاک ہے، میں تو بس ایک بشر ہوں، اللہ کا رسول۔ ۸۹-۹۳

اور ان لوگوں کو ایمان لانے سے، جب کہ ان کے پاس ہدایت آگئی، نہیں مانع ہوئی مگر یہ چیز کہ انھوں نے کہا کہ کیا اللہ نے ایک بشر ہی کو رسول بنا کر بھیجا۔ کہہ دو، اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے کسی فرشتے ہی کو رسول بنا کر اتارتے۔ کہہ دو کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے، بے شک وہی اپنے بندوں کو خوب جاننے والا ہے، خوب دیکھنے والا ہے۔ اور جس کو اللہ ہدایت دے گا وہی ہدایت پانے والا بنے گا اور جسے وہ گمراہ کر دے گا تو تم ان کے لیے اس کے سوا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے اور ہم قیامت کے دن ان کو ان کے مونہوں کے بل، اندھے، گونگے اور بہرے اکٹھا کریں گے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب جب اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی ہم اس کو مزید بھڑکا دیا کریں گے۔

یہ ان کا بدلہ ہوگا اس بات کا کہ انھوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے۔ کیا انھوں نے نہیں سوچا کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ قادر ہے کہ ان کے مانند پھر پیدا کر دے اور اس نے ان کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن یہ ظالم انکار ہی پر اڑے رہے۔ ۹۸-۹۹

کہہ دو کہ اگر میرے رب کے فضل کے خزانوں کے مالک تم ہوتے تو اس وقت تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ہاتھ روک لیتے اور انسان بڑا ہی تنگ دل ہے۔ ۱۰۰

اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں دیں تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو جب کہ وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ میں تو تم کو ایک سحر زدہ آدمی سمجھتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ تجھے خوب معلوم ہے کہ ان کو آسمانوں اور زمین کے رب ہی نے اتارا ہے آنکھیں کھول دینے کے لیے اور میں تو تم کو اے فرعون ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے ارادہ کیا کہ ان کے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دے تو ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق کر دیا۔ اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم ملک میں رہو بسو، پھر جب آخرت کا وعدہ آجائے گا تو ہم تم سب کو اکٹھا کر کے لائیں گے۔ ۱۰۱-۱۰۴

اور ہم نے اس کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور یہ حق ہی کے ساتھ اترا ہے اور ہم نے تم کو صرف ایک بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اور قرآن کو تو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیے اتارا کہ تم اس کو لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سناؤ اور ہم نے اس کو نہایت اہتمام سے اتارا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، وہ لوگ جن کو اس کے پہلے سے علم ملا ہوا ہے جب یہ ان کو سنایا

جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ شدنی تھا اور وہ ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے گرتے ہیں اور یہ ان کے خشوع میں اضافہ کرتا ہے۔ ۱۰۵-۱۰۹

کہہ دو کہ اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے نام سے، جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔ اور تم اپنی نماز کو نہ زیادہ جہری کرو اور نہ بالکل ہی سِرّی، ان دونوں کے بین بین کا راستہ اختیار کرو۔ اور کہو کہ شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس کے نہ کوئی اولاد ہے اور نہ اس کی بادشاہی میں اس کا کوئی ساجھی ہے اور نہ اس کو ذلت سے بچانے کے لیے کسی مددگار کی حاجت ہے اور اس کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔ ۱۱۰-۱۱۱

۱۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۸۵)

'روح' سے مراد — 'رُوْح' سے مراد یہاں وحی الٰہی ہے۔ وحی الٰہی کو روح سے تعبیر کرنے میں یہ اشارہ مضمر ہے کہ جس طرح جسم کی زندگی روح سے ہے، اسی طرح روح و عقل اور دل کی زندگی وحی الٰہی سے ہے۔ اس حقیقت کو سیدنا مسیحؑ نے یوں واضح فرمایا ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمے سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے، قرآن کو اسی پہلو سے جگہ جگہ روح سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (۲- نحل)	وہ اتارتا ہے فرشتوں کو روح کے ساتھ اپنے امر میں سے جن پر چاہتا ہے ان بندوں میں سے۔
يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ‎: (۱۵- غافر)	وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے روح القا کرتا ہے اپنے امر میں سے تاکہ وہ لوگوں کو ملاقات کے دن سے ہوشیار کر دے۔
وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (۵۲- الشوریٰ)	اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف وحی کی روح اپنے امر میں سے۔

روح کے متعلق سوال کا جواب — کفار اسی روح سے متعلق سوال کرتے اور ان کا یہ سوال تحقیق کی غرض سے نہیں بلکہ محض اعتراض و استہزا کے

ارادہ سے ہوتا۔ یعنی نعوذ باللہ ان کے سوال کا مطلب یہ ہوتا کہ یہ روح کیا بلا ہے جس کے تم اپنے اوپر اترنے کے مدعی ہو، ذرا اس کی حقیقت ہمیں بھی تو سمجھاؤ۔ جواب میں فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں علم تھوڑا ہی ملا ہے، یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ تم اس کائنات اور اس کے خالق کے سارے ہی بھید سمجھ جاؤ۔ اس روح کو وہی سمجھتے ہیں جن کو اس کا تجربہ ہوا ہے جس کے درد جگر نہ ہوا ہو وہ اگر درد جگر کو دیکھنے کے لیے چلے تو اس کو یہ درد کس طرح دکھایا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔

ان مخالفین قرآن کے ذہن میں یہ سوال کرتے وقت یہ بات بھی مخفی ہوتی کہ آخر تمہارے ہی اوپر یہ روح کیوں اترتی ہے، ہمارے اوپر کیوں نہیں اترتی؟ ان کے اسی ما فی الذہن کو سامنے رکھ کر اوپر کی آیات میں عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی اس شرف کا مستحق ہر بوالہوس نہیں ہوتا، اس کے لیے اللہ ہی جس کو چاہتا ہے انتخاب فرماتا ہے۔

'مِنْ اَمْرِیْ' اور 'مِنْ اَمْرِنَا' کے الفاظ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہیں کہ یہ چیز امور الٰہیہ میں سے ہے جس کی اصل حقیقت خدا ہی جانتا ہے۔ ہر شخص اس کی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا (۸۶-۸۷)

وحی کی حالت ایک تصرف غیبی ہے

اس آیت کا خطاب اگرچہ آنحضرت صلعم کی طرف ہے لیکن بات جو فرمائی گئی ہے اس کو انہی لوگوں کو سنانا مقصود ہے جن کا اوپر سوال نقل ہوا ہے فرمایا کہ یہ وحی کی حالت وکیفیت تو تمہارے لیے بھی ایک بالکل اضطراری کیفیت وحالت ہے جس میں تمہارے اختیار وارادہ اور تمہاری خواہش وکوشش کو کوئی دخل نہیں ہے۔ نہ تم اس کو اپنے ارادے سے لاسکتے اور نہ اپنے ارادے سے روک سکتے۔ یہاں تک کہ اگر ہم اس وحی کو سلب کر لیں جو ہم نے تم پر کی ہے تو کوئی طاقت ایسی نہیں جو تم کو یہ واپس دلا سکے۔ یہ محض ہمارا تصرف غیبی ہے جس سے تمہیں یہ چیز حاصل ہوتی ہے اور صرف ہمارا فضل ہے جس سے ہم نے تم کو سرفراز کیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ تمہارے رب کا تمہارے اوپر بہت ہی بڑا فضل ہوا ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۸۸)

ظاہر ہے کہ جب خود پیغمبر کی خواہش وکوشش کو بھی اس وحی کے لانے میں کوئی دخل نہیں ہے اور وہ بھی اپنے اختیار وارادے سے اس قسم کی کتاب پیش کرنے پر قادر نہیں درآنحالیکہ انہی کے واسطہ سے یہ ظہور میں آئی ہے تو تا بدیگراں چہ رسد۔ دوسروں کی کیا تاب ومجال ہے کہ اس قرآن کے مثل کوئی کتاب لاسکیں۔ انسان تو درکنار اگر انسان اور جنات دونوں آپس میں گٹھ جوڑ کر کے یہ زور لگائیں کہ اس طرح کی کوئی کتاب پیش کریں جب بھی وہ اس پر قادر نہیں ہو سکتے ——— قرآن کا یہ چیلنج کم وبیش چودہ سو سال سے موجود ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ

عرب و عجم میں سے کوئی اس کو قبول کرنے کی جرأت نہ کر سکا اور اگر کسی نے اس کی نقالی کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنے آپ کو مضحکہ بنانے سے محفوظ نہ رکھ سکا۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا (۸۹)

قرآن کے ذریعہ اتمام حجت

'تصریف' کے معنی یہاں ایک ایک حقیقت کو مختلف اسلوبوں اور گوناگوں پیرایوں سے بیان کرنا ہے اور 'ضرب مثل' سے مراد حکمت و معرفت کی بات کہنا ہے۔ عربی میں اس مفہوم کے لیے اس محاورہ کا استعمال معروف ہے۔ کسی حماسی کا شعر مشہور ہے۔

یاایھا ذوالامثال یضربھا لذی اللب الحکیم

اے بزرہ حکمت کی باتیں حکیم عاقل ہی کے لیے بیان کرتا ہے

مطلب یہ ہے کہ اس معجز کتاب کے نازل ہو جانے کے بعد جس میں حکمت کی ایک ایک بات گوناگوں اسلوبوں اور پیرایوں سے ہم نے بیان کی ہے ان لوگوں کے پاس یہ عذر باقی نہیں رہا کہ ان کے پاس خدا کی کوئی ہدایت نہیں آئی۔ اس کتاب نے ان پر حجت تمام کر دی ہے۔ اگر اس کے بعد بھی لوگوں کی اکثریت انکار ہی پر اڑی ہوئی ہے تو یہ ان کی اپنی محرومی و بدبختی ہے۔

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ۝ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۝ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (۹۰-۹۳)

مخالفین کے مطالبات برائے تصدیق رسالت

'ایمان' کا صلہ جب 'ل' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ایمان لانے کے نہیں بلکہ مجرد کسی بات کے ماننے اور باور کرنے کے ہوتے ہیں۔ اب یہ مخالفین کے وہ مطالبات نقل ہو رہے ہیں جن کو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کے لیے بطور شرط کے پیش کرتے تھے۔ وہ مطالبات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ یہ کہ دیکھتے دیکھتے آپ زمین سے ایک چشمہ جاری کر دیں۔

۲۔ یا یہ کہ آپ کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جائے اور آپ اس کے بیچ بیچ میں بہت سی نہریں نکال دیں۔

۳۔ یا یہ کہ آپ ہم پر آسمان کے کچھ ٹکڑے گرا دیں جیسا کہ آپ کا دعویٰ ہے یا یہ کہ اللہ اور فرشتوں کو روبرو دکھا دیں (قبیلا کے معنی ہوں گے رؤیتہ عیانا و مقابلۃ)۔

۴۔ یا یہ کہ آپ کے پاس ایک سونے کا مکان ہو جائے یا آپ ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے اس آسمان پر چڑھنے کو بھی اس وقت تک باور نہیں کریں گے جب تک آپ وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتاریں جس کو ہم پڑھیں۔

مطالبات کا جواب ان سارے مطالبات کے جواب میں ارشاد ہوا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ ان سے کہہ دو کہ میرا رب ہر قسم کی شرکت سے پاک ہے، میں تو بس ایک بشر اور رسول ہوں۔ یعنی میں نے خدائی یا خدائی میں شرکت کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ تم مجھ سے اس قسم کے مطالبے کرتے ہو، میرا رب ہر قسم کی شرکت سے منزہ، ارفع اور بالاتر ہے۔ میں تو صرف ایک بشر ہوں اور خدا کا ایک رسول۔ رسول کی حیثیت سے میرا فریضہ صرف یہ ہے کہ میں تم کو خدا کا پیغام پہنچا دوں۔ ان کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی کر دینے کا مجھے اختیار نہیں ملا ہوا ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوْا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوْا أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۴)

انسانوں کے لیے انسان کے نبی ہونے کی حکمت 'اَلْهُدٰی' یعنی اللہ کی واضح ہدایت اپنے تمام دلائل و براہین کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اللہ کی ہدایت کا تعلق ہے وہ تو نہایت واضح شکل میں، اپنے ناقابل تردید دلائل کے ساتھ، ان کے سامنے آچکی ہے۔ اب تو اگر یہ کسی چیز کو اپنے ایمان نہ لانے کے بہانے کے طور پر پیش کر رہے ہیں تو وہ صرف یہ چیز ہے کہ کیا ایک بشر کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے! یعنی جہاں تک دلائل کا تعلق ہے اس سے انکار کی کوئی گنجائش تو باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن ان کا کبر و غرور اس بات سے مانع ہے کہ وہ ایک بشر کو اپنا رسول مان لیں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (۹۵)

یعنی اگر ان کا یہ خیال ہے کہ کسی بشر کے بجائے کسی فرشتے کو ان کی طرف رسول ہو کر آنا تھا تو ان سے کہہ دو کہ اگر زمین میں انسانوں کے بجائے فرشتے رہتے بستے ہوتے تب تو ہم اگر ان کی طرف رسول بھیجتے تو لازماً آسمان سے کوئی فرشتہ ہی اتارتے لیکن جب زمین میں انسان رہتے بستے ہیں تو آخر انسانوں کی طرف کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجنے کے کیا معنی؟ رسول اس لیے آتا ہے کہ اس کی زندگی لوگوں کے لیے اسوہ اور نمونہ بنے۔ آخر کسی فرشتہ کی زندگی انسانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ کس طرح بن سکتی ہے؟

'مَلٰٓئِكَةٌ' کے ساتھ 'يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ' کی قید سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ زمین میں فرشتے آتے جاتے تو ہیں لیکن وہ خدا کے حکم کے تحت اس کی کسی مشیت کی تنفیذ کے لیے آتے جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت یہاں کے مستقل باشندوں کی نہیں ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ إِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا (۹۶)

معاملہ اللہ کے حوالہ کرنے کی ہدایت اب یہ اچھی طرح حجت تمام کر دینے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کر دو۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی دینے کے لیے کافی ہے کہ دلائل کی عدم وضاحت تمہارے لیے ایمان سے مانع ہے یا تمہاری ضد اور انانیت۔ اللہ اپنے بندوں کے ظاہر و باطن سے خوب واقف ہے۔ اب وہی فیصلہ فرمائے گا کہ تم پر میری رسالت کی صداقت واضح نہیں ہوئی تھی یا تم سب کچھ دیکھ، جان اور سمجھ کر اندھے بہرے اور گونگے بنے رہے۔

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۚ وَنَحْشُرُهُمْ

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (۹۷)

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت واضح فرما دی کہ اللہ ہی جس کو ہدایت دیتا ہے وہ ہدایت پاتا اور وہ جس کو گمراہ کر دے اس کے لیے کوئی بھی ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ یہ سنتِ الٰہی جس اساس پر مبنی ہے اس کی طرف وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں کہ جو لوگ اپنی آنکھیں اللہ کی نشانیاں دیکھنے کے لیے، اپنی زبانیں حق کی گواہی کے لیے اور اپنے کان اللہ اور رسول کی باتیں سننے کے لیے استعمال کرتے ہیں ان کو تو خدا کی طرف سے ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو یہ سب کچھ رکھتے ہوئے اندھے، بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں ان کو خدا کی ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کا چونکہ یہی حال ہے اس وجہ سے ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوگی اور قیامت کے دن ان کو ان نعمتوں کی ناقدری کی سزا ہم یہ دیں گے کہ ان کو ہم ان کے مونہوں کے بل اس حال میں گھسیٹتے ہوئے اکٹھا کریں گے کہ یہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے۔ نَحْشُرُهُمْ کے بعد عَلٰی اس بات پر دلیل ہے کہ یہ مونہوں کے بل گھسیٹتے ہوئے اکٹھے کیے جائیں گے۔ دوسری جگہ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ کے الفاظ وارد ہوئے جن سے اس مضمون کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ چہرے جن کو اللہ نے سمع و بصر اور نطق کی صلاحیتوں سے مزین فرمایا لیکن اس کے باوجود وہ اندھے، بہرے اور گونگے ہی بنے رہے بلاشبہ وہ اسی قابل ہیں کہ ایسی بھڑکتی آگ پر گھسیٹے جائیں جس کی لو کبھی دھیمی نہ ہونے پائے۔

ذٰلِكَ جَزَاۤؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۹۸)

فرمایا کہ یہ سزا ان کو اس لیے دی جائے گی کہ قدم قدم پر ہماری قدرت اور حیات بعد الممات کی نشانیاں دیکھنے کے باوجود وہ قیامت کے انکار ہی پر اڑے رہے اور بڑے طنطنہ کے ساتھ یہ کہتے رہے کہ کیا جب ہم ہڈیاں ہو جائیں گے اور سڑگل کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو بھلا از سرِ نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟ یعنی ان کے خیال میں یہ بالکل ناممکن اور محال ہے۔ فرمایا کہ ہم اسی محال کو واقعہ بنا کر ان کو اس کا مزہ چکھائیں گے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا (۹۹)

قیامت کے لیے وقت مقرر ہے

یعنی ان کو آخر دوبارہ اٹھائے جانے میں اتنا استبعاد کیوں نظر آتا ہے؟ کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جو خدا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے پر قادر ہے وہ ان کو دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں قاصر رہ جائے گا؟ کیا ان کو دوبارہ پیدا کرنا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے؟

'وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ' رہا یہ سوال کہ قیامت آتی ہے تو آ کیوں نہیں جاتی تو اس کے لیے جلدی نہ مچائیں۔ خدا نے اس کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ جب وہ وقت آجائے گا وہ یوم موعود بھی آجائے گا۔ 'فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا' یعنی اتنے واضح دلائل کے باوجود یہ اپنی جانوں

پر ظلم ڈھانے والے لوگ اس کے لیے تیاری کرنے کے بجائے اس کے انکار ہی پر اڑے ہوئے ہیں۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (۱۰۰)

کفار کی بخیلانہ ذہنیت پر ضرب

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ اس تمام ردو انکار میں قریش کے لیڈروں کی اس بخیلانہ ذہنیت کو بھی بڑا دخل تھا کہ جب دنیا کی تمام نعمتیں ہمیں ملی ہیں تو خدا اگر نبوت و رسالت کے منصب پر کسی کو سرفراز کرنے والا ہوتا تو ہم ہی میں سے کسی کو سرفراز کرتا، آخر یہ منصب جلیل ہم سادات کو چھوڑ کر اس غریب آدمی کے حوالہ کیوں کر دیتا۔ ان کی اسی بخیلانہ ذہنیت کو سامنے رکھ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ ان سے کہہ دیں کہ اگر میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک تم ہوتے تب تو بلاشبہ تم اس کے تنہا اجارہ دار بن بیٹھتے اور اپنے سوا اس میں سے کسی کو بھی اس ڈر سے کچھ نہ دیتے کہ مبادا یہ ختم ہو جائے لیکن اپنے فضل و رحمت کے خزانوں کا مالک میرا رب خود ہی ہے اس نے جن خزف ریزوں کا اہل تم کو پایا وہ تمھارے حوالے کیے اور جس فضل عظیم کے لیے میرا انتخاب فرمایا تمھارے اور بنی اسرائیل کے علی الرغم، اس سے مجھ کو نوازا۔ 'وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا' میں انسان کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن اشارہ انھی لوگوں کی طرف ہے کہ اگر یہ تنگ دل ہیں، اپنے سوا ان کے دل میں کسی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے تو آخر خدا کو انھوں نے اپنے جیسا کیوں گمان کر رکھا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْــَٔـلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰي مَسْحُوْرًا (۱۰۱)

مطالبۂ معجزات کا جواب

اوپر آیت ۹۰ سے ۹۳ تک ان معجزات کا ذکر گزر چکا ہے جن کا قریش مطالبہ کرتے تھے۔ یہ اسی مطالبہ کا جواب ہے کہ ایمان و ہدایت کی راہ معجزات سے نصیب نہیں ہوتی۔ ہم نے موسیٰ کو فرعون کی طلب پر نو نہایت کھلے کھلے معجزے دیے لیکن فرعون نے یہ سارے معجزے دیکھ کر کہا تو یہ کہا کہ اے موسیٰ میں تو تم کو ایک سحر زدہ آدمی سمجھتا ہوں۔ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جس کے اثر سے تم اس قسم کی بہکی بہکی باتیں میرے سامنے کہنے لگے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اسی طرح تمھیں بھی اگر تمھاری طلب کے مطابق معجزے دکھا دیے گئے تو تم بھی کوئی نہ کوئی بات بنا لوگے۔

حضرت موسیٰ کی مثال

'فَسْــَٔـلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ' میں ایک لطیف تلمیح ہے۔ وہ یہ کہ اس مرحلے میں بنی اسرائیل اسلام کی مخالفت کی مہم میں پوری طرح شریک ہو گئے تھے اور قریش یہ معجزات کے مطالبے زیادہ تر انھی کی شہ پر کرتے تھے۔ وہ قریش کو یہ سکھاتے تھے کہ ہمارے پیغمبر نے تو یہ یہ معجزے دکھائے تو یہ اگر نبوت کے مدعی ہیں تو یہ بھی اسی طرح کے معجزے دکھائیں۔ ان کی اسی حرکت کے سبب سے قرآن نے انھی کو گواہ بنا کر پیش کیا کہ ان کے نبی نے معجزے دکھائے تو ہی لیکن انھی سے پوچھو کہ یہ سارے معجزے دکھانے کا نتیجہ کیا نکلا؟ اگر نتیجہ یہی نکلا کہ فرعون اور اس کی قوم غرق ہو کے رہی تو آخر یہ راستہ وہ قریش کو کیوں دکھاتے ہیں!

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۗىِٕرَ ۚ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ

يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۔ ۱۰۲

حضرت موسیٰؑ کا جواب فرعون کو

'مَثْبُوْرًا' کے معنی ہلاکت زدہ کے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو جواب بالکل ترکی بہ ترکی دیا۔ فرمایا کہ تجھے خوب معلوم ہے کہ یہ معجزے کسی سحر و شعبدہ کے کرشمے نہیں ہو سکتے۔ ان کی نوعیت ہی گواہی دیتی ہے کہ ان کو اتار سکتا ہے تو آسمانوں اور زمین کا رب ہی اتار سکتا ہے اور اسی نے تیری آنکھیں کھول دینے کے لیے ان کو اتارا ہے۔ اگر ان کو دیکھنے کے بعد بھی تیری آنکھیں نہیں کھلیں تو تجھ پر اللہ کی حجت تمام ہو گئی اور میں سمجھتا ہوں کہ اب تیری ہلاکت کا وقت، اے فرعون! سر پر آپہنچا ہے۔

فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا (۱۰۳)

چنانچہ اس کے بعد اس نے اپنا پورا زور صرف کر دیا کہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کے قدم سرزمین مصر سے اکھاڑ دے اور اس کی سزا اس کو یہ ملی کہ خدا نے اس کو اور اس کے سارے ساتھیوں کو غرق کر دیا۔

وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا (۱۰۴)

فرعون کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل پر انعام

فرعون کو غرق کرنے کے بعد یہ بنی اسرائیل پر انعام ہوا کہ اللہ نے ان کو ارض مقدس میں بسایا۔ 'اَلْاَرْض' سے مراد یہاں قرینہ دلیل ہے کہ ارض مقدس ہے جس کا بنی اسرائیل سے وعدہ تھا۔ اس وعدے کو پورا کرتے وقت، اللہ نے ان کو آخرت کا وعدہ بھی یاد دلا دیا تھا کہ اس کامیابی کی خوشیوں میں آخرت کو نہ بھول جانا۔ جس طرح اپنے وعدے کے مطابق ہم تم کو سمیٹ کر یہاں لائے ہیں اسی طرح اپنے وعدے کے بموجب ایک دن سمیٹ کر حساب کتاب کے لیے حشر کے میدان میں جمع کریں گے۔ لیکن بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی اس یاد دہانی کو بالکل بھول گئے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا (۱۰۵)

دعوت کے معاملہ میں نبی کی ذمہ داری

یہ بات ذہن میں محفوظ رہے کہ یہ سلسلۂ بحث اصلاً وحی و قرآن کے ذکر سے چلا تھا۔ پھر اسی سے متعلق بعض دوسرے مسائل زیر بحث آ گئے۔ اب یہ مسائل ختم ہوئے تو اصل مسئلہ کو پھر لے لیا۔ فرمایا کہ ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور یہ حق ہی کے ساتھ اترا ہے۔ کسی باطل کی کوئی آمیزش نہ اس میں آگے سے ہوئی ہے نہ پیچھے سے۔ اگر ایسے بے آمیز حق کو بھی یہ لوگ طرح طرح کے شبہات کا ہدف بنا رہے ہیں تو تمہارے اوپر ایسے سر پھرے لوگوں کے ایمان و ہدایت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ تم صرف ایک مبشر و نذیر ہو۔ اپنا انذار و تبشیر کا فرض ادا کر کے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر یہ تمہاری بات نہیں سنیں گے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (۱۰۶)

قرآن کے تدریجاً اترنے کی حکمت

یعنی یہ قرآن جو جستہ جستہ اتر رہا ہے تو اس وجہ سے نہیں، جیسا کہ یہ سمجھتے ہیں کہ تم حالات کے مطابق سوچتے رہو اور جتنا تیار کر پاتے ہو اتنا سنا دیتے ہو، بلکہ یہ ہم ہی جستہ جستہ کر کے اس کو تم پر اتار رہے ہیں تاکہ تم اس کو

بالتدریج لوگوں کو سناؤ کہ یہ لوگوں کے فکر و عمل کا جزو بنتا جائے۔ اگر ان کا یہ گمان ہے کہ یہ خدائی کتاب ہوتی تو لازماً پوری کی پوری بیک دفعہ نازل ہو جاتی اس لیے کہ خدا کو کسی تیاری کی ضرورت نہیں تھی تو یہ گمان بھی صحیح نہیں ہے۔ خدا کو تو بلا شبہ کسی اہتمام و تیاری کی حاجت نہیں ہے۔ وہ چاہتا تو پوری کتاب ایک ہی وقت میں نازل کر دیتا لیکن اس نے بندوں کی ضرورت اور ان کے حالات کا لحاظ فرمایا اور اس کو نہایت تدریج و اہتمام کے ساتھ اتارا ہے۔ 'تَنْزِيْل' کا مفہوم، جیسا کہ ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں، تدریج و اہتمام کے ساتھ اتارنا ہے۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا (۱۰۷-۱۰۹)

صالحین اہل کتاب کا طرز عمل

'اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ' سے یہاں مراد قرینہ دلیل ہے کہ اچھے اہل کتاب ہیں۔ اہل کتاب میں جس طرح اشرار و مفسدین تھے جو اپنا ایڑی چوٹی کا زور قرآن کی مخالفت میں صرف کر رہے تھے اسی طرح ایک گروہ ایسے صالحین کا بھی تھا جو اپنے نبیوں اور صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی روشنی میں ایک رسول اور ایک کتاب موعود کا منتظر تھا۔ اس گروہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لائے ہوئے صحیفہ کے اندر ان پیشین گوئیوں کی جھلک دیکھی جن کے ظہور کے لیے وہ چشم براہ تھا۔ چنانچہ ان کا حال یہ تھا کہ ان کو جب قرآن سنایا جاتا تو بے تحاشا سجدے میں گر پڑتے اور اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کے پورے ہونے پر دل و جان سے اس کا شکر بجا لاتے۔ یہ اسی مبارک گروہ کی طرف اشارہ ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہوئی ہے کہ تم قریش اور بنی اسرائیل کے مکذبین کو سنا دو کہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ میرے اطمینان کے لیے یہ کافی ہے کہ اہل علم کا ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو اس قرآن کو سن کر بے تحاشا سجدے میں گر پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ایفائے وعدہ کو دیکھ کر اس پر گریۂ مسرت و شکر اور گریۂ خشوع کی دوگونہ کیفیت و حالت طاری ہو جاتی ہے۔ گریۂ شکر و مسرت کا پہلو تو اس میں ظاہر ہی ہے، زیادت خشوع کا اس میں یہ پہلو ہے کہ اس سے آخرت کے وعدے کی ازسرنو یاد دہانی ہوئی ہے کہ جس رب نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا لازماً وہ اپنا آخرت کا وعدہ بھی پورا کر کے رہے گا۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا (۱۱۰)

قرآن پر ایک اعتراض کا جواب

جب کسی چیز کے خلاف شبہ اور بدگمانی جڑ پکڑ لے تو اس سے تعلق رکھنے والی ان چیزوں پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے جن کے اندر کسی ادنیٰ شبہ کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ اہل عرب زمانۂ جاہلیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے اللہ اور رحمان دونوں نام استعمال کرتے تھے۔ کلام جاہلیت میں یہ دونوں ہی نام ملتے ہیں۔ البتہ

اتنی بات ضرور تھی کہ اسم رحمان زیادہ معروف اہل کتاب کے ہاں تھا۔ عرب کے ذہینوں نے یہیں سے اس نام کو بھی قرآن پر اعتراض کا بہانہ بنا لیا۔ انھوں نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ اس کتاب کی تیاری میں اس شخص کو (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو) اہل کتاب میں سے کچھ لوگ مدد دیتے ہیں۔ قرآن میں ان کا قول وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ جو نقل ہوا ہے اس سے ان کا اشارہ اسی گروہ کی طرف ہوتا تھا۔ بعد میں جب اسم رحمان کی طرف ان کی توجہ ہوئی تو اس کا انھوں نے اپنے گمان کی تائید میں پیش کرنا شروع کر دیا کہ دیکھو یہ شخص اپنے پیش کردہ کلام میں رحمان کا نام بہت لاتا ہے جو اہل کتاب سے اس کے تعلق کی دلیل ہے اور پھر یہیں سے انھوں نے یہ نتیجہ نکال لیا ہوگا کہ یہ ہمارے مذہب اور ہماری روایات پر اہل کتاب کے مذہب اور ان کی روایات مسلط کرنے کی ایک سازش ہے۔

قرآن نے اس کا جواب یہ دیا کہ اللہ کو خواہ اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے، جس نام سے بھی اس کو پکارو تمام اچھے نام اسی کے ہیں۔ یعنی مجرد نام کا تعصب قبول حق میں مانع نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کے نام اور بھی ہیں اور اس کو اس کے شایان شان ہر نام سے پکارا جا سکتا ہے۔

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ ...... الاٰیۃ معلوم ہوتا ہے اسی نوعیت کا کوئی اعتراض اسلام کے طریقۂ نماز پر بھی ان ذہینوں کو ہوا۔ مشرکین کے طریقۂ عبادت میں شور و غل اور مکاء و تصدیہ یعنی سیٹی اور تالی وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ برعکس اس کے اسلام میں نماز سنجیدگی اور وقار کا مظہر کامل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نماز کے اس وقار کا جوڑ بھی انھوں نے اہل کتاب سے ملا کر اس کو بھی اعتراض کا بہانہ بنا لیا ہو۔ اس باب میں ہدایت ہوئی کہ تمھاری نمازیں اور دعائیں بہت زیادہ جہری ہوں نہ بالکل ہی سری بلکہ ان کے بین بین کی راہ اختیار کرو۔ یہ اشارہ ہوا اس بات کی طرف کہ تم امت وسط ہو اس وجہ سے تمھاری نمازوں اور دعاؤں میں بھی امت وسط کی شان ہونی چاہیے۔

نماز میں وقار اور سنجیدگی کی تعلیم

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (۱۱۱)

یہ سورہ کے آخر میں آپ کو خدا ہی کی حمد و تکبیر اور اس کی بلا شرکت غیرے حاکمیت کے اعلان کی ہدایت ہوئی مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جس وادی میں چاہیں ٹھوکریں کھاتے پھریں لیکن تم یہ اعلان کر دو کہ شکر کا سزاوار حقیقی وہ اللہ ہے جس نے نہ تو اپنے لیے کوئی اولاد بنائی، نہ اس کی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک و سہیم ہے اور نہ اس کو کبھی ذلت و مقہوریت لاحق ہوتی ہے کہ اس سے بچانے کے لیے اس کو کسی حمایتی اور مددگار کی ضرورت پیش آئے۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حمایتی اور مددگار کی ضرورت اس کو پیش آتی ہے جس کو ذلت پیش آنے کا خطرہ ہو۔ جب خدا کی شان ذلت کے ہر شائبہ سے ارفع ہے تو اس کو حمایتی اور مددگار کی کیا ضرورت۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا یعنی اس کی تمام اعلیٰ صفات کا نہایت اہتمام سے اظہار و اعلان کرو، ان مشرکین کے علی الرغم۔

اللہ تعالیٰ کی بلا شرکت غیرے حاکمیت کا اعلان

اس سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

لاہور — ۲۷ اپریل ۱۹۷۱ء

تدبرِ قرآن

۱۸

الکہف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا زمانۂ نزول، عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ کی طرح یہ سورہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب حق و باطل کی کش مکش اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ قریش اپنے تمام حربوں کے ساتھ قرآن کی دعوت کو مٹا دینے پر تُل گئے تھے اور یہود و نصاریٰ نے بھی، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، درپردہ قریش کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تھی کہ انہی کے ہاتھوں یہ دعوت اپنے مرکز ہی میں ختم ہو جائے، اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے خود انھیں میدان میں نہ اترنا پڑے۔

ان حالات کے تقاضے سے اس سورہ میں چند باتیں خاص طور پر نمایاں ہوئی ہیں۔

۱۔ قریش کو انذار و تنبیہ کہ وہ اپنی دنیوی کامیابیوں کے غرے میں ایک بدیہی حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش نہ کریں۔ اب عذاب الٰہی ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے، اگر وہ اپنی رعونت سے باز نہ آئے تو وہ وقت دور نہیں ہے جب وہ اس عذاب کی زد میں آ جائیں گے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مظلوم صحابہ کو صبر و عزیمت کی تلقین۔ آنے والے مراحل یعنی ہجرت وغیرہ کی طرف بعض لطیف اشارات، ان مراحل میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو جو غیبی فتوحات حاصل ہونے والی ہیں ان کی بشارت۔

۳۔ جس طرح سابق سورہ ـــــ بنی اسرائیل ـــــ میں یہود کے چہرے سے نقاب الٹ دی گئی ہے اسی طرح اس سورہ اور اس کے بعد کی سورہ ـــــ سورۂ مریم ـــــ میں نصاریٰ کے چہرے سے نقاب الٹ دی گئی ہے اور مقصود اس سے قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ جن کی اپنی کوئی بنیاد نہیں ہے اگر ان کی شہ پر خدا کی اس نعمت کی ناقدری کرو گے جس سے اس نے تم کو سرفراز کرنا چاہا ہے تو یاد رکھو کہ پرائے شگون پر اپنی ناک کٹوا بیٹھو گے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کا تجزیہ بالاجمال یہ ہے:۔

(۱-۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین صبر کہ تمھاری ذمہ داری صرف انذار و تبشیر ہے۔ اگر یہ متمردین، قرآن پر ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں کوئی کج پیچ یا تمھاری دعوت و تبلیغ میں کوئی کسر ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ زخارفِ دنیا کی محبت میں اندھے ہو رہے ہیں تو تم ان کے پیچھے اپنے تئیں ہلکان نہ کرو۔ ایک وقت آنے والا ہے جب اس دنیا کے چہرے کا یہ مصنوعی غازہ اتر جائے گا اور یہ اپنے اصل روپ میں نمایاں ہو جائے گی۔ اس وقت یہ بدبخت لوگ اپنے سر پیٹیں گے۔

(۹-۲۶) اصحابِ کہف سے متعلق مخالفین کے اٹھائے ہوئے ایک سوال کا جواب جس سے ان کی اصل زندگی، لاطائل تفصیلات سے بالکل پاک ہو کر، اس طرح سامنے آگئی ہے کہ اس کے آئینہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جان نثار ساتھیوں کو گویا دکھا دیا گیا ہے کہ تم اس وقت دعوتِ حق کی راہ میں جس مرحلہ سے گزر رہے ہو یہ مرحلہ اصحابِ کہف کو بھی پیش آ چکا ہے۔ اگر تم بھی انہی کی طرح تمام خطرات کے علی الرغم، جادۂ حق پر استوار رہے تو اللہ تمھارے لیے بھی اسی طرح مشکلات کو آسان کرے گا جس طرح ان کے لیے آسان کیں۔ اور اسی طرح تمھارے لیے بھی پردۂ غیب سے اسباب و وسائل مہیا کرے گا جس طرح ان کے لیے مہیا فرمائے۔ اللہ اپنی راہ میں ثابت قدم رہنے والوں کو ضائع نہیں کرتا۔

(۲۷-۳۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دولتِ دنیا کے متوالوں سے بے نیاز ہو کر، اپنے ان غریب و نادار ساتھیوں کی طرف متوجہ ہونے کی ہدایت جو اگرچہ دولتِ دنیا سے محروم تھے لیکن ایمان کی دولت سے مالا مال اور شب و روز اللہ کی یاد اور اس کے دین کی دعوت میں سرگرم تھے۔ اسی ذیل میں آپ کو منکروں کی حالت پر غم کھانے سے روک دیا گیا ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان نہیں لا رہے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ سنتِ الٰہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں اور سنتِ الٰہی کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

(۳۲-۴۹) ایک تمثیل جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جو لوگ اسی دنیا کی کامیابیوں کو اصل کامیابی سمجھے بیٹھے ہیں ان پر خدا اور آخرت کی تلقین دہانی بڑی شاق گزرتی ہے۔ وہ اپنی انہی کامیابیوں کو اپنے برحق ہونے کی دلیل تصور کرتے ہیں، اس وجہ سے اگر کوئی اللہ کا بندہ ان کو خدا اور آخرت سے ڈراتا ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ بتاؤ تمھارا حال اچھا ہے یا ہمارا؟ اگر ہمارا حال اچھا ہے اور بالبداہت اچھا ہے تو ہم یہ کیوں نہ باور کریں کہ ہماری ہی زندگی اور ہمارا ہی عقیدہ و عمل بھی صحیح ہے۔ اس ذہن کے لوگ یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ جو جاہ و اقبال ان کو آج حاصل ہے اس پر کبھی زوال بھی آسکتا ہے۔ وہ قیامت کو ایک بہت بعید از امکان چیز سمجھتے ہیں اور اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں اس کو مانتے بھی ہیں تو اپنی زندگی کی موجودہ کامرانیوں کو دلیل بنا کر یہ گمان کر لیتے

ہیں کہ اگر ہمیں خدا کے پاس جانا ہی پڑا، جیسا کہ یہ سر پھرے مسلمان ڈراتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں اس سے بہتر مرتبہ و مقام حاصل ہوگا۔ اس تمثیل کو پیش کرنے سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ واضح کرنا ہے کہ آج بعینہٖ اسی طرح کے مغروروں سے تمھیں سابقہ ہے۔ یہ لوگ تمھاری بات سننے والے نہیں ہیں۔ ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب برقِ خرمن سوز ان کے سارے خرمن کو خاکستر کرکے رکھ دے گی۔ سو تم اس دنیا اور اس کی اس زندگی کی جس پر یہ ریجھے ہوئے ہیں، حقیقت ایک تمثیل سے سمجھا دو کہ یہ دنیا اور اس کی ساری رونقیں اور بہاریں چند روزہ ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ساتھ جانے والی نہیں ہے۔ ساتھ صرف نیک اعمال جائیں گے تو جن کو جمع کرنا ہو یہ سرمایہ جمع کرنے کی فکر کریں۔

(۵۰-۵۹) آدم اور ابلیس کی سرگزشت کی یاددہانی جس سے مقصود قریش کے مغروروں کو ان کی بدبختی پر متنبہ کرنا ہے کہ انھوں نے اپنی شامتِ اعمال سے ابلیس اور اس کی ذریات کو اپنا دوست اور کارساز بنا رکھا ہے۔ حالانکہ اولادِ آدمؑ کے ساتھ ان کی دشمنی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ اسی ضمن میں ان کی اس بدبختی پر بھی ملامت کی گئی ہے کہ اللہ نے تو ان پر عظیم فضل فرمایا کہ ان کی ہدایت کے لیے ایک ایسی کتاب اتاری جو ہر حقیقت کو گوناگوں پہلوؤں سے واضح کر دینے والی ہے لیکن یہ اس کو قبول کرنے کے بجائے اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ ان کو وہ عذاب دکھا دیا جائے جس سے قرآن ان کو ڈرا رہا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، وہ رحمت میں سبقت کرتا ہے، عذاب میں جلدی نہیں کرتا لیکن یہ شامت کے مارے لوگ عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں۔

(۶۰-۸۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک تربیتی سفر کی سرگزشت۔ یہ سفر اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت انھوں نے اس لیے کیا کہ ایک بندۂ خاص کے ذریعے سے وہ اس کائنات کے اس رمز سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سب ارادۂ الٰہی کے تحت ہوتا ہے اور ارادۂ الٰہی سر تا سر حکمت و برکت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بظاہر سرکشوں اور نافرمانوں کو ڈھیل ملتی ہے اور اہلِ حق مختلف قسم کی آزمائشوں اور تکلیفوں میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال بہتوں کے ایمان کو متزلزل کر دیتی ہے اور ان کے لیے جادۂ حق پر ثابت قدم رہنا نہایت ابتلا کا کام بن جاتا ہے۔ اس ابتلا میں ثابت قدم صرف وہی لوگ رہتے ہیں جن پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے سب ارادۂ الٰہی کے تحت اور اس کی حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہو رہا ہے لیکن انسان کا محدود علم اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے صحیح رویہ یہ ہے کہ راہِ حق میں ناموافق و نامساعد جو حالات بھی پیش آئیں آدمی ان سے دل شکستہ و مایوس نہ ہو بلکہ پورے عزم و جزم کے ساتھ موقفِ حق پر ڈٹا رہے، حکمتِ الٰہی کے ظہور کا انتظار کرے اور امید رکھے کہ اگر اس دنیا میں نہیں تو آخرت میں اس کا ظہور ہو کے رہے گا۔

یہی حکمت، صبر کی اساس و بنیاد ہے جس پر سارا دین قائم ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰؑ کو ایک عظیم مہم کے لیے انتخاب فرمایا تو اس صبر کی تربیت کے لیے ان کو اپنے ایک خاص بندے

کے پاس بھیجا کہ یہ چیز صرف جاننے کی نہیں بلکہ عملی تربیت کی بھی محتاج تھی۔ بعینہ یہاں یہ سرگزشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے آپ کے اس دور کے ساتھیوں کو اس مقصد سے سنائی گئی ہے کہ باغیوں اور نافرمانوں کو جو دندناتے دیکھ رہے ہو اور تم حق پر ہوتے ان کے مظالم کے جو ہدف بنے ہوئے ہو اس سے ہراساں اور مرعوب نہ ہونا۔ اس دنیا میں اگر مسکینوں کی کشتی میں چھید کیا جاتا ہے تو اس میں بھی حکمت خیر ہوتی ہے اور اگر ظالموں کی کسی بستی میں، کسی گرتی دیوار کو سہارا دیا جاتا ہے تو اس میں بھی خیر ہی مضمر ہوتا ہے لیکن انسان کا محدود علم خدا کے سارے اسرار کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

(۸۳ - ۱۰۱) ایک سوال کی تقریب سے ایک سلطان عادل ـــــ ذوالقرنین ـــــ کا ذکر جس سے مقصود قریش کے ان متمردین کو عبرت دلانا ہے جو پیغمبر کے انذار کو مذاق اور اپنے اقتدار کو لازوال سمجھتے تھے۔ ان کے سامنے خود انہی کے سوال پر یہ واضح فرمایا کہ ایک بندۂ مومن ذوالقرنین تھے جن کا حال یہ تھا کہ تمام مشرق و مغرب کو فتح کر لینے کے بعد بھی وہ ہر کامیابی کو اللہ کا انعام اور اس کا فضل سمجھتے اور ہر قدم اس کی مرضی کے مطابق اٹھاتے تھے اور ایک تم ہو کہ ذرا سا اقتدار جو مل گیا ہے تو اس کے نشہ میں خدا اور آخرت سب کا مذاق اڑانے لگے ہو۔

(۱۰۲ - ۱۱۰) خاتمۂ سورہ میں اسی تہدید و انذار کے مضمون کا پھر اعادہ ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوا ہے گویا آخر میں ایک نئے اسلوب سے اسی حقیقت کی پھر یاد دہانی فرما دی جو سورہ کا عمود ہے۔ ساتھ ہی ان لوگوں کا جواب بھی دے دیا جو قرآن کی پُر حکمت باتوں کا مذاق اڑاتے اور کسی حسی معجزہ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ فرمایا اگر دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو آفاق و انفس میں خدا کی اتنی نشانیاں ہیں کہ اگر سمندر روشنائی بن جائیں جب بھی ان کو قلم بند نہیں کیا جا سکتا۔ آخر میں پیغمبر صلعم کی زبان سے اعلان کرا دیا کہ معجزے اور نشانیاں دکھانا خدا کا کام ہے، میں تو تمہاری ہی طرح خدا کا ایک بندہ ہوں، تمہیں وہی سناتا ہوں جس کی مجھے وحی کی جاتی ہے۔

سورہ کے مطالب کا یہ اجمالی تجزیہ اس کے نظام اور عمود کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ۔

سُوْرَةُ الْكَهْفِ (۱۸)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۱۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ آیات
لَّهٗ عِوَجًا ۱ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَ ۱-۸
يُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ
اَجْرًا حَسَنًا ۲ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۳ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ
قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۴ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا
لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ
اِلَّا كَذِبًا ۵ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ
يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۶ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی

الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝

ترجمۂ آیات ۱-۸

شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں اس نے کوئی کج پیچ نہیں رکھا۔ بالکل ہموار اور استوار تاکہ وہ اپنی جانب سے جھٹلانے والوں کو ایک سخت عذاب سے آگاہ کر دے اور ایمان لانے والوں کو، جو نیک اعمال کر رہے ہیں، اس بات کی خوش خبری سنا دے کہ ان کے لیے بہت اچھا اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ خدا نے اولاد بنائی ہوئی ہے آگاہ کر دے۔ ان کو اس باب میں کوئی علم نہیں، نہ ان کو نہ ان کے آباء و اجداد کو۔ نہایت ہی سنگین بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے۔ یہ محض جھوٹ ہے جو وہ بک رہے ہیں۔ ۱-۵

تو شاید تم ان کے پیچھے اپنے تئیں غم سے ہلاک کر کے رہو گے اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے۔ روئے زمین پر جو کچھ ہے ہم نے اس کو زمین کے لیے سنگار بنایا ہے تاکہ ہم لوگوں کا امتحان کریں کہ ان میں اچھے عمل کرنے والا کون بنتا ہے اور ہم بالآخر اس پر جو کچھ ہے سب کو چٹیل میدان کر کے رہیں گے۔ ۶-۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ۔ سابق سورہ بنی اسرائیل جس مضمون پر ختم ہوئی تھی (ملاحظہ ہوں آیات ۱۰۵-۱۱۱) اسی مضمون سے اس سورہ کا آغاز فرمایا۔ قرآن کی صورت میں جو نعمتِ عظمیٰ اہل عرب پر نازل ہوئی تھی یہ اس کے حق کا اظہار ہے کہ یہ نعمت شکر کی موجب ہونی چاہیے نہ کہ کفر کی۔ بدقسمت

ہیں وہ لوگ جو اس کی ناقدری کریں اور اس کی تکذیب کے لیے نت نئے بہانے تلاش کریں۔

قرآن کی صفت

وَلَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجًا، قَيِّمًا: یہ اس کتاب کی صفت ہے کہ اس کتاب میں خدا نے کوئی کج پیچ نہیں رکھا ہے۔ نہ بیان کے اعتبار سے نہ معنی کے اعتبار سے۔ زبان اس کی عربی مبین ہے اور رہنمائی اس کی اس صراط مستقیم کی طرف ہے جس کے مستقیم ہونے کے دلائل عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے ہر گوشے میں موجود ہیں اور قرآن نے ان کو اتنے گوناگوں طریقوں سے بیان کر دیا ہے کہ کوئی عقل سے کام لینے والا ان کے سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا۔ صرف وہی ان سے محروم رہیں گے جو عقل سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ قرآن کی یہی صفت سورہ بنی اسرائیل میں بھی بیان ہوئی ہے۔ إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ (بے شک یہ قرآن اس راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سیدھا ہے)۔

قَيِّمًا لِّيُنذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا مِّن لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا (۲)

قرآن کا مقصد

لِّيُنذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا مِّن لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ: یہ اس کتاب کے نازل کرنے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ یہ انکار کرنے والوں کے لیے انذار اور ایمان لانے والوں کے لیے بشارت ہے۔ پہلے ٹکڑے میں 'الْكَافِرِينَ' یا 'الْمُكَذِّبِينَ' محذوف ہے۔ اس لیے کہ آگے والے ٹکڑے میں 'مُؤْمِنِينَ' موجود ہے جو تقابل کے اصول پر اس محذوف کو خود واضح کر رہا ہے۔

فعل 'يُنذِرَ' کا فاعل اللہ بھی ہو سکتا ہے اور عبدہٗ یعنی رسول بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے یہ کتاب خاص اپنے پاس سے اس لیے اتاری ہے کہ کافروں کو ایک عذاب شدید سے آگاہ و ہوشیار کر دے۔

دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا رسول لوگوں کو خدا کی طرف سے نازل ہونے والے عذاب شدید سے متنبہ کر دے۔

پہلی صورت میں 'مِن لَّدُنْهُ' کا لفظ اہتمام و عنایت پر دلیل ہوگا کہ اس مقصد کے لیے خدا نے خاص اپنے پاس سے اور اپنی نگرانی میں انتظام فرمایا۔ دوسری صورت میں اس سے عذاب کی شدت کا اظہار ہوگا کہ یہ عذاب کوئی ایسا ویسا عذاب نہیں ہوگا بلکہ قہر الٰہی ہوگا جس سے بچانے والا کوئی نہیں بن سکے گا۔

مَّاكِثِينَ فِيهِ أَبَدًا (۳)

مَّاكِثِينَ فِيهِ أَبَدًا: اس اجر حسن میں ہمیشہ رہیں گے یعنی اس بہشت میں ہمیشہ رہیں گے جو اس اجر حسن کے ثمرہ اور نتیجہ کے طور پر حاصل ہوگی۔ شے کو بول کر اس سے اس کے نتیجہ کو مراد لینا عربیت کا ایک معروف اسلوب ہے جس کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔

وَيُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا: یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے یعنی خاص طور پر ان

لوگوں کو آگاہ کر دے جو خدا کے لیے اولاد فرض کر کے ان کی عبادت میں لگے ہوئے اور ان کی شفاعت کے اعتماد پر خدا سے بالکل مستغنی ہو بیٹھے ہیں۔ اس سے مراد مشرکین عرب بھی ہیں اور نصاریٰ بھی۔ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور نصاریٰ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا بنائے ہوئے تھے۔

مشرکین کی اندھی تقلید

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا۔ علم سے مراد یہاں دلیل و برہان ہے۔ یعنی جن لوگوں نے خدا کے بیٹے اور بیٹیاں فرض کر کے ان کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے انھوں نے یہ افسانہ محض اپنے جی سے گھڑا ہے۔ نہ خدا نے کہیں یہ بات کہی ہے ورنہ ان بوالفضولوں کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے۔ یہ اپنے جن آباؤ اجداد کی تقلید میں یہ حماقت کر رہے ہیں ان کے پاس بھی اس کی کوئی دلیل نہیں تھی محض جہالت سے انھوں نے یہ ضلالت اختیار کی اور یہ بھی جہالت ہی سے ان کی لکیر کو پیٹ رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ بڑی ہی سنگین بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ پر تہمت و بہتان اور اس کی غیرت کو چیلنج ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی گستاخی سے باز نہ آئے تو عنقریب اپنا حشر دیکھیں گے۔

آنحضرت صلعم کو پرمحبت تسلی

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اور تسلی دینے کا انداز بہت پیارا ہے فرمایا کہ تم تو ان کے ایمان کے غم سے اس طرح گھلے جا رہے ہو کہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ اس کتاب پر ایمان نہ لائے تو ان کے پیچھے تم اپنے آپ کو ہلاک کر کے رہو گے! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے فرضِ رسالت کی ادائیگی کا احساس کتنا شدید تھا۔ آپ دعوت کے کام کے لیے اپنے رات دن ایک کیے ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی آپ کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ لوگ جو ایمان نہیں لا رہے ہیں تو مبادا اس میں آپ کی کسی کوتاہی کو دخل ہو۔ اس احساس کے باعث آپ کی مشقت اور آپ کے غم دونوں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو نہایت پُرمحبت انداز میں ٹوکا کہ اپنی ذمہ داری کے احساس میں اس درجہ غلو صحیح نہیں ہے۔ یہ ناشکرے اور ناقدرے لوگ جو اس کتاب پر ایمان نہیں لا رہے ہیں تو یہ نہ سمجھو کہ اس کے سمجھنے میں ان کو کوئی دشواری پیش آ رہی ہے یا تمھاری طرف سے فرضِ دعوت کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی ہو رہی ہے بلکہ اس کا اصل سبب کچھ اور ہے۔

منکرین کے انکار کا اصل سبب

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ یہ ان کے اعراض و انکار کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے۔ فرمایا کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اس میں ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کون اپنی عقل و تمیز سے کام لے کر آخرت کا طالب بنتا ہے اور کون اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ کر اسی دنیا کا پرستار بن کر رہ جاتا ہے۔ اس امتحان کے تقاضے سے ہم نے اس دنیا کے چہرے پر حسن و زیبائش کا ایک پرفریب غازہ

مل دیا ہے۔ اس کے مال و اولاد، اس کے کھیتوں کھلیانوں، اس کے باغوں اور چمنوں، اس کی کاروں اور کوٹھیوں، اس کے محلوں اور ایوانوں، اس کی صدارتوں اور وزارتوں میں بڑی کشش اور دل فریبی ہے۔ اس کی لذتیں نقد اور عاجل اور اس کی تلخیاں پس پردہ ہیں۔ اس کے مقابل میں آخرت کی تمام کامرانیاں نسیہ ہیں اور اس کے طالبوں کو اس کی خاطر بے شمار جانکاہ مصیبتیں نقد نقد اسی دنیا میں جھیلنی پڑتی ہیں۔ یہ امتحان ایک سخت امتحان ہے۔ اس میں پورا اترنا ہر بوالہوس کا کام نہیں ہے۔ اس میں پورے وہی اتریں گے جن کی بصیرت اتنی گہری ہو کہ خواہ یہ دنیا ان کے سامنے کتنی ہی عشوہ گری کرے لیکن وہ اس عجوزۂ ہزار داماد کو اس کے ہر بھیس میں تاڑ جائیں اور کبھی اس کے عشق میں پھنس کر آخرت کے ابدی انعام کو قربان کرنے پر تیار نہ ہوں۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے اپنی عقل و دل کی آنکھیں اندھی کر لی ہیں اور اپنی خواہشوں کے پرستار بن کے رہ گئے ہیں وہ اس نقد کو آخرت کے نسیہ کے لیے قربان کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے اگرچہ اس کے حق ہونے پر اس کائنات کا ذرہ ذرہ گواہ ہے۔

اس دنیا کا انجام

وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا۔ 'جُرُزٌ' بے آب و گیاہ زمین کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بے وقوف لوگ اس زمین کی جن چیزوں پر ریجھے ہوئے ہیں ایک وقت آئے گا کہ ہم ان ساری چیزوں کو مٹا کر اس کو چٹیل اور بے آب و گیاہ میدان کی طرح کر دیں گے۔ یہی مضمون آگے آیات ۴۶-۴۸ میں آ رہا ہے وہاں ان شاء اللہ اس کی مزید تفصیل ہوگی۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹-۲۶

اہل کتاب کے القا کیے ہوئے سوالات

قریش جس انداز سے قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے اس کا ذکر اوپر کی آیات میں گزرا۔ اسی مخالفت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اس دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے اہل کتاب جو مختلف قسم کے اینڈے بینڈے سوالات القا کرتے قریش ان کو بھی اٹھا لیتے اور آپ سے ان کے جواب کا مطالبہ کرتے۔ روح کے متعلق، ذوالقرنین کے متعلق اور اس نوع کے بعض دوسرے سوالات جن کا قرآن نے حوالہ دیا ہے، اہل کتاب کے اٹھائے ہوئے سوالات تھے۔ اسی نوع کا ایک سوال اصحاب کہف سے متعلق اہل کتاب نے اٹھایا اور ان کے اشارے سے قریش نے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ یہ غیر متعلق سوالات ظاہر ہے کہ حصول علم اور تحقیق حق کے مقصد سے نہیں کیے جاتے تھے بلکہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرنے کے لیے کیے جاتے۔ مقصد مخالفین کا صرف یہ ہوتا کہ اگر آپ نے کوئی جواب نہ دیا تو اس جواب نہ دینے کو مخالفت کا بہانہ بنائیں گے کہ دیکھو یہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ہمارے اس سوال کا جواب نہ دے سکے اور اگر جواب دیا اور کوئی بات ان کے مزعومات کے خلاف ہوئی تو اس کو مخالفت

کا بہانہ بنائیں گے کہ دیکھو یہ شخص کیا بے پر کی اڑا رہا ہے۔ اصل بات تو یوں ہے اور یہ اس کے برعکس یوں کہہ رہا ہے۔

قصۂ اصحاب کہف کے زیر بحث آنے کی نوعیت

یہ بات کہ اصحاب کہف کا قصہ یہاں مخالفین کے سوال کے جواب میں زیر بحث آیا ہے خود قرآن سے واضح ہے۔ آگے آیات ۲۲-۲۴ میں یہ بات تصریح سے آئے گی کہ قرآن نے اس قصہ سے تعرض سوال کے جواب میں کیا ہے۔ اس قسم کے سوالوں کے باب میں قرآن نے جو رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے وہ تو، جیسا کہ آگے واضح ہوگا، یہ ہے کہ ان سے تعرض ہی نہ کیا جائے بلکہ ان کو ٹال دیا جائے۔ لیکن کوئی سوال اگر مفید ہوا ہے یا اس کے جواب کو کسی مفید تعلیم کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے تو قرآن نے اس کا بقدر ضرورت جواب دے دیا ہے۔ اصحاب کہف کی زندگی چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے لیے، دعوت کے اس پُرآزمائش دور میں، نہایت سبق آموز ہو سکتی تھی اس لیے کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ انہی مراحل سے گزر رہے تھے جن سے اصحاب کہف کو گزرنا پڑا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی سرگزشت کا اتنا حصہ سنا دیا جتنا حق تھا۔ اس طرح گویا سوال کرنے والوں کے سوال کا جواب بھی ہوگیا، ماضی کی ایک پاکیزہ سرگزشت سے پیغمبرؐ اور صحابہؓ کو صبر و عزیمت کی تعلیم بھی مل گئی اور اہل حق کی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب جو افسانوں کے حجاب میں گم تھا ہر قسم کے گرد و غبار سے بالکل پاک صاف ہو کر از سر نو سامنے آگیا۔

اصحاب کہف کون تھے؟

اصحاب کہف کون تھے؟ ان کا تعلق تاریخ کے کس دور سے ہے اور یہ کن کے اسلاف میں سے ہیں؟ ان سوالوں کا کوئی قطعی جواب دینا نہایت مشکل ہے۔ ان کے باب میں قطعیت کے ساتھ اتنی ہی بات کہی جا سکتی ہے جتنی قرآن نے بیان کر دی ہے باقی جو کچھ ہے اس کی حیثیت محض افسانہ کی ہے، قرآن نے ان کی سرگزشت کا صحیح اور سبق آموز حصہ بیان کر کے ان کے باب میں مزید کھوج کرید کرنے سے، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، منع کر دیا ہے۔ اس وجہ سے ہم ایک ایسی چیز کے درپے ہونا پسند نہیں کرتے جس سے قرآن نے روکا ہے۔ البتہ قیاسات و قرائن سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ان لوگوں کا تعلق قریش یا یہود کی تاریخ سے نہیں ہے بلکہ نصاریٰ کی تاریخ سے ہے۔ ان کے ہاں ایسی روایات ملتی ہیں جو اصحاب کہف کے واقعہ سے مشابہت رکھتی ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ نصاریٰ اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں، جب دین کی خاطر رومیوں کے ہاتھوں ستائے گئے ہیں، اصحاب کہف نے دعوت حق کی راہ میں وہ بازی کھیلی ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔ ان لوگوں نے توحید اور آخرت کی دعوت پوری بے خوفی سے دی یہاں تک کہ ان کا پورا ماحول ان کا دشمن بن کر اٹھ کھڑا ہوا اور خطرہ پیدا ہوگیا کہ مخالفین ان کو سنگسار کر دیں گے۔ جب معاملہ اس حد کو پہنچ گیا تو ان لوگوں نے ایک غار میں پناہ لی اور اللہ تعالیٰ نے اس غار میں ان کی حفاظت کے لیے وہ سامان بہم پہنچائے جو صرف اللہ ہی بہم پہنچا سکتا تھا۔ بعد میں جب ان کے حالات لوگوں کے علم میں آئے اور تائیدِ الٰہی کی جو شانیں ان کے لیے ظاہر ہوئیں ان کا چرچا ہوا تو ان کی یادگاریں قائم ہوئیں اور

ہر گروہ ان کے ساتھ اپنی نسبت کا دعویٰ کرنے لگا۔ اس طرح نصاریٰ میں ایک مقدس روایت کی حیثیت سے ان کا ذکر باقی رہا لیکن یہ ذکر آہستہ آہستہ بس چند کرامتوں اور چند لاطائل بحثوں تک محدود رہ گیا۔ ان کی زندگی کا اصل کارنامہ نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گیا۔ اس سوال پر تو ان کے ہاں مناظرے ہوتے کہ ان کی تعداد کیا تھی؟ ان کا کتا تین کا چوتھا تھا یا پانچ کا چھٹا؟ لیکن یہ خبر کسی کو نہ تھی کہ ان کی دعوت کیا تھی اور اس دعوت کی راہ میں انھوں نے کیا قربانیاں دیں اور یہ بحثیں بھی غالباً اسی زمانہ تک باقی رہیں جب تک اصل نصرانیت کے کچھ بقایا موجود رہے۔ بعد میں جب پال نے نصرانیت کا حلیہ بالکل بگاڑ ڈالا تو نصاریٰ کے اصل اسلاف کی تمام روایتیں بھی پردۂ خفا میں چھپ گئیں۔ عرب کے نصاریٰ میں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں سے متعلق کچھ روایات باقی تھیں لیکن بالکل مسخ ہو کر۔ انہی نصاریٰ کی شہ سے یہ سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لایا گیا اور قرآن نے اس لیے اس کا جواب دیا کہ اس سے دعوت کے اس پرآشوب دور میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو بڑی تقویت حاصل ہو سکتی تھی۔ جس طرح اصحاب کہف اپنے ماحول میں ہدفِ مظالم بنے تھے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ بھی قریش کے مظالم کے ہدف تھے اور جس طرح اصحاب کہف کو غار میں پناہ لینی پڑی اسی طرح آپؐ اور آپ کے صحابہؓ کے سامنے بھی ہجرت حبشہ، غار ثور اور ہجرت مدینہ کے مراحل آنے والے تھے ۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت کیجیے۔

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ اٰيٰتِنَا　آیات ۹-۲۶
عَجَبًا ﴿٩﴾ إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ
لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ﴿١٠﴾ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى
اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ﴿١١﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ
الْحِزْبَيْنِ أَحْصٰى لِمَا لَبِثُوٓا أَمَدًا ﴿١٢﴾ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ　ع ۱۲/۱۴
نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ ۚ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿١٣﴾
وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُونِهٖٓ إِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ إِذًا شَطَطًا ﴿١٤﴾
هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهٖٓ اٰلِهَةً ۚ لَوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِمْ

بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿١٥﴾
وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ
يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ
مِّرْفَقًا ﴿١٦﴾ وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ
ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ
فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ
وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿١٧﴾ وَتَحْسَبُهُمْ ع ۲ ۱۴
اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖۗ
وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ
مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿١٨﴾ وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ
لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا
يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا
اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا
فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿١٩﴾
اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ
وَلَنْ تُفْلِحُوْۤا اِذًا اَبَدًا ﴿٢٠﴾ وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ
وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ
بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ

قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا ﴿٢١﴾
سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ
كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۖ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُل
رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۗ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا
مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا ﴿٢٢﴾ وَلَا تَقُولَنَّ ع ۱۵
لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ وَاذْكُر رَّبَّكَ
إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا ﴿٢٤﴾
وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ﴿٢٥﴾ قُلِ
اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا ۖ لَهُ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ أَبْصِرْ بِهِ
وَأَسْمِعْ ۚ مَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ
أَحَدًا ﴿٢٦﴾

کیا تم نے کہف و رقیم والوں کو ہماری نشانیوں میں سے کچھ بہت عجیب خیال کیا! جب ترجمۂ آیات
۹-۲۶ کہ کچھ نوجوانوں نے غار میں پناہ لی اور دعا کی کہ اے ہمارے رب ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش اور ہمارے اس معاملے میں ہمارے لئے رہنمائی کا سامان فرما، تو ہم نے غار میں ان کے کانوں پر کئی برس کے لیے تھپک دیا۔ پھر ہم نے ان کو بیدار کیا کہ دیکھیں دونوں گروہوں میں سے کون مدتِ قیام کو زیادہ صحیح شمار میں رکھنے والا نکلتا ہے۔ ۹-۱۲

ہم تمھیں ان کی سرگزشت ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں۔ یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں مزید افزونی عطا فرمائی اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط

کیا جب کہ وہ اٹھے اور کہا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو ہرگز نہیں پکاریں گے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم یہ حق سے نہایت ہی ہٹی ہوئی بات کہیں گے۔ یہ ہماری قوم کے لوگوں نے اس کے سوا کچھ دوسرے معبود بنا رکھے ہیں۔ یہ ان کے حق میں واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتے! تو ان سے بڑا ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ باندھیں۔ ۱۲-۱۵

اور اب کہ تم ان کو اور ان کے معبودوں کو، جن کو وہ خدا کے سوا پوجتے ہیں، چھوڑ کر الگ ہو گئے ہو تو غار میں پناہ لو، تمہارا رب تمہارے لیے اپنا دامنِ رحمت پھیلائے گا اور تمہارے اس مرحلہ میں تمہاری مایحتاج مہیا فرمائے گا۔ ۱۶

اور تم دیکھتے سورج کو کہ جب طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے دائیں جانب کو بچا رہتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو ان سے بائیں طرف کو کترا جاتا ہے اور وہ اس کے صحن میں ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جس کو اللہ ہدایت دے وہی راہ یاب ہوتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دے تو تم اس کے لیے کوئی دستگیری کرنے والا اور رہنمائی کرنے والا نہیں پا سکتے۔ ۱۷

اور تم ان کو جاگتا گمان کرتے حالانکہ وہ سو رہے ہوتے اور ہم ان کو داہنے بائیں کروٹیں بھی بدلواتے اور ان کا کتا دونوں ہاتھ پھیلائے دہلیز پر ہوتا، اگر تمہاری نظر ان پر پڑ جاتی تو تم وہاں سے الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تمہارے اندر ان کی دہشت سما جاتی۔ ۱۸

اور اسی طرح ہم نے ان کو جگایا کہ وہ آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ان میں سے ایک پوچھنے والے نے پوچھا، تم یہاں کتنا ٹھہرے ہو گے؟ وہ بولے ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کم ٹھہرے ہوں گے۔ بولے تمہاری مدتِ قیام کو تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے۔ پس اپنے میں سے کسی

کو اپنی یہ رقم دے کر شہر بھیجو تو وہ اچھی طرح دیکھ لے کہ شہر کے کس حصہ میں پاکیزہ کھانا ملتا ہے اور وہاں سے تمھارے لیے کچھ کھانا لائے اور چاہیے کہ وہ دبے پاؤں جائے اور کسی کو تمھاری خبر نہ ہونے دے۔ اگر وہ تمھاری خبر پا جائیں گے تو تمھیں سنگسار کر دیں گے یا تمھیں اپنی ملت میں لوٹا لیں گے اور پھر تم کبھی فلاح نہ پا سکو گے۔ ۱۹-۲۰۔

اور اسی طرح ہم نے ان پر لوگوں کو مطلع کر دیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ شدنی ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ وہ وقت بھی خیال کرو جب لوگ آپس میں ان کے معاملے میں جھگڑ رہے تھے تو بولے کہ ان کے غار پر ایک عمارت بنوا دو۔ ان کا رب ان کو خوب جانتا ہے۔ جو لوگ ان کے معاملے میں غالب آئے انھوں نے کہا کہ ہم تو ان کے غار پر ایک مسجد بنائیں گے۔ ۲۱

اب یہ کہیں گے یہ تین تھے، اُن کا چوتھا ان کا کتّا تھا اور کہیں گے یہ پانچ تھے ان کا چھٹا ان کا کتا تھا، بالکل اٹکل پچو! اور کہیں گے یہ سات تھے اور ان کا آٹھواں اُن کا کتّا تھا۔ کہہ دو میرا رب ہی ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے۔ ان کو بس تھوڑے ہی لوگ جانتے ہیں اور تم ان کے باب میں نہ بحث کرو مگر ٹالنے کے انداز میں اور ان کے باب میں ان میں سے کسی سے نہ پوچھو۔ اور کسی امر کے لیے یوں نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کر دوں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے اور جب تم بھول جایا کرو تو اپنے رب کو یاد کر لو اور کہو کہ امید ہے کہ میرا رب اس سے بھی کم مدت میں صحیح بات کی طرف میری رہنمائی فرما دے۔ ۲۲-۲۴

اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور نو سال مزید براں۔ کہہ دو اللہ ہی خوب جانتا ہے جتنی مدت وہ رہے۔ آسمانوں اور زمین کا غیب صرف اسی کے علم میں ہے۔ کیا ہی خوب

ہے وہ دیکھنے والا اور سننے والا۔ اس کے سوا ان کا کوئی کارساز نہیں اور وہ اپنے اختیار میں کسی کو ساجھی نہیں بناتا۔ ۲۵-۲۶

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا (۹)

صیغہ واحد کا خطاب جماعت سے

'حَسِبْتَ' کا خطاب ضروری نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہو بلکہ 'اَنْتُمْ' کے خطاب کی طرح یہ عام بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح کے خطاب ہیں، جیسا کہ ہم پیچھے اپنی کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ذکر کر چکے ہیں، مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مراد ہوتا ہے اور جمع کے خطاب کے بالمقابل اس میں زیادہ زور ہوتا ہے۔ خود اسی سلسلۂ کلام میں آگے متعدد خطابات بصیغۂ واحد ہیں۔ لیکن ان سب میں خطاب آنحضرتؐ سے نہیں بلکہ مخاطب گروہ سے ہے۔ مثلاً 'وَتَرَى الشَّمْسَ'، آیت ۱۷، 'وَتَحْسَبُهُمْ'، 'لَوِ اطَّلَعْتَ'، 'لَوَلَّيْتَ'، 'وَلَمُلِئْتَ' آیت ۱۸۔

یہ خطاب سوال کرنے والوں سے ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ فرمانے کا کیا محل ہے کہ کیا تم اصحاب کہف و رقیم کو ہماری نشانیوں میں سے کچھ عجیب چیز خیال کرتے ہو؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول تو اس سرگزشت سے واقف ہی نہیں تھے، اول اول آپ اس وحی کے ذریعہ ہی سے اس سے واقف ہوئے اور بالفرض آپ کچھ واقف رہے بھی ہوں تو اس میں آپؐ کے لیے تعجب اور حیرت کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے! اس سے کہیں زیادہ عجیب سرگزشتیں آپ کو سابق انبیائے کرام کی سنائی جا چکی تھیں۔ پھر آپؐ کے اصحاب کہف کے معاملہ کو عجیب اور نادر سمجھنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی! ہمارے نزدیک یہ سوال خطاب کرنے والوں سے ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ سوال اٹھایا ان کے پیش نظر اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کی نظر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی وقعت گھٹائیں کہ ہمارے ہاں تو اصحاب کہف جیسے اولیاء اللہ گزرے ہیں جن کے لیے خدا کی قدرت کی نہایت عظیم شانیں ظاہر ہوئیں تو ہم کسی اور کی ہدایت و رہنمائی کے محتاج کب ہو سکتے ہیں اور وہ بھی ایک ایسے نبی کی ہدایت کے جس کے اندر ہم اس طرح کی کوئی بات بھی نہیں پا رہے ہیں۔ یہ بات یہاں پیش نظر رہے کہ اس دور میں یہود و نصاریٰ دونوں کھلم کھلا یہ بات کہنے لگے تھے کہ جس کو ہدایت کی طلب ہو وہ یہودی بنے یا نصرانی، یہ نیا دین بھلا کیا ہے؟ اس سے بہتر تو مشرکین ہی کا دین ہے! سوال اٹھانے والوں کی اس پس پردہ ذہنیت کو سامنے رکھ کر قرآن نے جواب کا آغاز ہی اس بات سے کیا کہ اگر تم اصحاب کہف کے ماجرے کو بہت عجیب چیز سمجھتے ہو تو یہ بہت عجیب چیز نہیں ہے یہ خدا کی

بے شمار نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس طرح کی نشانیاں پہلے بھی ظاہر ہوئی ہیں اور آئندہ بھی ان لوگوں کے لیے ظاہر ہوں گی جن کے لیے خدا چاہے گا۔ یہ نشانیاں خدا کے اختیار میں ہیں۔ ان پر کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔

آیت کے خطاب کے معاملے میں ہماری رائے یہی ہے لیکن کوئی شخص اس کا مخاطب آنحضرتؐ ہی کو قرار دینا چاہے تو اس صورت میں آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ اگر تم معروف روایات کی بنا پر اصحاب کہف کے ماجرے کو عجیب سمجھتے ہو تو یہ کوئی عجیب چیز نہیں۔ خدا کی اس طرح کی نشانیاں پہلے بھی ظاہر ہوتی ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہوں گی۔ اس میں گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے لیے بشارت ہے کہ جس طرح خدا نے پہلے اپنے دین کے علمبرداروں کی حفاظت کے لیے اپنی قدرت کی شانیں ظاہر کی ہیں اسی طرح تمھارے لیے بھی ہر مرحلہ میں اس کی شانیں ظاہر ہوں گی۔

اصحاب کہف و رقیم کی وجہ تسمیہ

رہا یہ سوال کہ ان لوگوں کو اصحاب کہف و رقیم کیوں کہا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کے اہل کتاب میں یہ لوگ اسی لقب سے معروف تھے۔ 'کہف' کی طرف تو ان کی نسبت ظاہر ہے کہ غار میں پناہ لینے کی وجہ سے ہوئی۔ رہا 'رقیم' تو اس کے بارے میں ہمارے نزدیک راجح قول وہ ہے جس کی روایت عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ سے کی ہے کہ حضرت کعبؓ کا خیال تھا کہ رقیم اس بستی کا نام تھا، جس سے نکل کر اصحاب کہف نے غار میں پناہ لی۔ رقیم وادی کو بھی کہتے ہیں۔ ناموں کے بارے میں یہ تحقیق کہ ان کی اصل کیا ہے غیر ضروری بھی ہے اور نہایت مشکل بھی۔ عجمی نام عربی کے قالب میں آکر اس قدر بدل جاتے ہیں کہ ان کی اصل کی تحقیق کرو کئی لے مترادف بن جاتی ہے اور مقصد تعلیم کے پہلو سے اس کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں۔ اگر یہ نام قرآن نے رکھا ہوتا تب تو اس کے معنی اور اس کی اصل کی جستجو کی ایک خاص اہمیت تھی۔ لیکن یہ نام جیسا کہ ہم نے عرض کیا عرب کے اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کا اختیار کردہ ہے۔ قرآن نے اسی کو اختیار کر لیا ہے۔ دور حاضر کے بعض محققین کی رائے میں رقیم وہی شہر ہے جسے پیٹرا کے نام سے شہرت ملی اور عرب اسے بطرا کے نام سے جانتے ہیں۔

اِذۡ اَوَی الۡفِتۡیَۃُ اِلَی الۡکَہۡفِ فَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً وَّ ہَیِّیٴۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا (۱۰)

'رشد' کا مفہوم

'رَشَدَ' کے معنی ہیں اس نے ہدایت اور استقامت پائی۔ 'رَشِدَ اَمْرَہٗ' کے معنی ہوں گے اس نے اپنے معاملے میں ہدایت پائی 'وَ ہَیِّیٴۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا' کا مفہوم ہوگا کہ اے ہمارے رب ہمارے لیے اس راہ میں، جو ہم نے اختیار کی ہے تو رہنمائی اور استقامت کا بدرقہ مہیا فرما۔

نوجوانوں کی دعا

یہ وہ دعا ہے جو ان نوجوانوں نے اس وقت کی ہے جب انھوں نے غار میں پناہ لینے کا ارادہ کیا ہے آیت کے الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ یہ نوجوان لوگ تھے۔ نوجوانوں میں جب ایک مرتبہ حق کی حیثیت

جاگ پڑتی ہے تو پھر نہ وہ مصالح کی پروا کرتی ہے اور نہ خطرات کی۔ لیکن ان لوگوں کے اندر صرف جوانی کا جوش ہی نہیں تھا بلکہ اللہ کی بخشی ہوئی حکمت کا نور بھی تھا۔ اس وجہ سے اس نازک مرحلہ میں انھوں نے اللہ سے رہنمائی اور استقامت کی دعا کی اور یہی بات اہلِ ایمان کے شایانِ شان ہے۔

سرگزشت کا خلاصہ بطور تمہید

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ آیت اور اس کے بعد کی دو آیتیں اصل سرگزشت کے خلاصہ (SUMMARY) کے طور پر ہیں جن میں پہلے اجمال کے ساتھ سرگزشت قاری کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ اس کے بعد پوری سرگزشت تفصیل کے ساتھ سامنے آئے گی۔ تفصیل سے پہلے اجمال کا یہ طریقہ اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اصل مدعا نگاہ کے سامنے رہتا ہے۔ دوسری ضمنی باتیں اس کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ سرگزشتوں کے بیان میں یہ طریقہ قرآن نے جگہ جگہ اختیار کیا ہے۔

فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا۔ (۱۱)

'ضَرَبَ عَلَى الْاٰذَانِ' کا مفہوم

'ضَرَبَ عَلَى الْاٰذَانِ' کے لفظی معنی کانوں پر تھپکی لگانے یا تھپکنے کے ہیں۔ یہیں سے یہ محاورہ کسی کو سننے سے روک دینے یا پیار و شفقت سے سلا دینے کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کو جب سلاتے ہیں تو اس کے کانوں پر تھپکتے ہیں۔ غار میں پناہ لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ان پر کئی سالوں کے لیے نہایت آرام و سکون کی نیند طاری کر دی۔ نیند کے لیے یہ الفاظ بطور استعارہ استعمال ہوئے ہیں اور پیار کے ساتھ سلانے کے لیے یہ نہایت بلیغ استعارہ ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا۔ (۱۲)

برزخی زندگی کا ایک عکس

'لِنَعْلَمَ' پر 'ل' غایت و نہایت کے مفہوم میں ہے اور 'نَعْلَمَ' کے معنی یہاں دیکھنے اور جانچنے کے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اس طویل نیند کے بعد پھر ہم نے ان کو جگایا تاکہ یہ بات اس نتیجہ تک منتہی ہو کہ وہ دو گروہ ہو کر آپس میں اس سوال پر بحث کریں کہ اس حالتِ خواب میں وہ کتنی مدت رہے ہیں، کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ۔ اس طرح ہم ان کو جانچ لیں گے کہ اس مدت کا ان میں سے کون گروہ اندازہ کر سکا اور بالآخر یہ بات واضح ہو جائے کہ ان میں سے کوئی بھی اس کا اندازہ نہ کر سکا۔ نیز ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہی حال برزخی زندگی کا ہوگا۔ اس کی مدت کا بھی کسی کو احساس نہیں ہوگا۔ ہر شخص اٹھنے پر یہی گمان کرے گا کہ بس ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے ہیں۔ آگے آیت ۱۹ میں یہ مضمون مزید وضاحت سے آ رہا ہے وہاں اس کے تمام مخفی گوشے سامنے آ جائیں گے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى۔ (۱۳)

اجمال کے بعد تفصیل

'بالحق' کا مفہوم

اب یہ اجمال کے بعد ان کی سرگزشت کی تفصیل سنائی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ 'بالحق' کی قید ایک تو اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ ان لوگوں کی نسبت جو روایات ان کے نام لیواؤں میں معروف تھیں قرآن نے ان سے قطع نظر کر کے واقعہ کی اصل صورت پیش کی ہے۔ دوسری یہ کہ قرآن کے سامنے دوسروں کی طرح محض داستان سرائی

نہیں ہے بلکہ اصل مقصود اس حکمت و موعظت سے لوگوں کو آگاہ کرنا ہے جو اس سرگزشت کے اندر مضمر ہے۔
فرمایا کہ یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کی نگہداشت کی جس کی برکت سے
اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت میں افزونی عطا فرمائی۔ اس افزونی کا ظہور کس شکل میں ہوا؟ اس کا بیان آگے والی آیت
میں آ رہا ہے۔ یہاں 'فِتْیَۃٌ' کے لفظ پر نظر رہے۔ قرآن نے ان لوگوں کا جوانوں کے طبقہ سے ہونا ظاہر کر کے وقت
کے نوجوانوں بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے نوجوانوں کو توجہ دلا دی کہ وہ اس سرگزشت سے سبق
حاصل کریں اور انہی کی طرح دعوتِ حق کی راہ میں اپنی قوم کی عداوت سے بے پروا ہو کر چل کھڑے ہوں۔ خدا ہر مرحلہ
میں ان کا ناصر و مددگار ہوگا۔

نوجوانوں کی حوصلہ افزائی

وَّرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِہِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ
دُوْنِہٖۤ اِلٰـہًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا (۱۴)

'ربط اللہ علی قلبہ' کے معنی ہوں گے خدا نے اس کے دل کو قوت و عزیمت دے دی۔
'شط' کے معنی دور ہونے اور 'شطط' کے معنی 'تباعد عن الحق' یعنی حق سے انحراف اور دوری کے ہیں۔
مطلب یہ ہے کہ ہر چند حالات بہت ہی سخت تھے۔ کلمۂ حق کی دعوت دینا بڑا ہی جان جوکھم کا کام تھا لیکن ان
نوجوانوں کے ایمان میں خدا نے برکت دی جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ صرف اپنے ہی ایمان پر قانع ہو کر گھروں میں بیٹھ رہنے
پر راضی نہیں ہوئے بلکہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر دعوتِ توحید کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب اٹھ کھڑے ہوئے
تو اللہ نے اپنی سنت کے مطابق ان کے دلوں کو قوت و عزیمت بخشی اور انھوں نے اپنی قوم میں عام منادی کر دی کہ ہمارا رب
صرف وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ اس کے سوا ہم کسی اور کو رب ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگر ہم اس
کے سوا کسی اور کو رب مانیں گے تو ہماری یہ حرکت نہایت ہی بے جا اور حق سے بہت دور ہٹی ہوئی ہوگی۔

حق کی منادی

ہٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖۤ اٰلِہَۃً ؕ لَوْلَا یَاْتُوْنَ عَلَیْہِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا (۱۵)

'قومنا' سے مراد یہاں 'رقیم' کے لوگ ہیں۔ یہ ان حق پرست نوجوانوں کا اپنی پوری قوم کے لیے ایک چیلنج ہے
اور عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہاں 'ھٰؤُلَآءِ' کا لفظ جس انداز سے استعمال ہوا ہے اس سے ایک
قسم کی حقارت کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ پھر غائب کے صیغوں میں بھی حقارت مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں
نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کر دیا کہ یہ ہماری قوم کے بدھوؤں نے اللہ کے سوا جو اور معبود بنا رکھے ہیں تو یہ اپنے ان
معبودوں کے حق میں کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے۔ آخر اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو خدا کے اوپر
بہتان تراشے!!

قوم کو چیلنج

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْہُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ فَاْوٗۤا اِلَی الْکَہْفِ یَنْشُرْ لَکُمْ رَبُّکُمْ مِّنْ
رَّحْمَتِہٖ وَیُہَیِّئْ لَکُمْ مِّنْ اَمْرِکُمْ مِّرْفَقًا (۱۶)

مرفق کا مفہوم

مِرفق اس چیز کو کہتے ہیں جو آدمی کی ضرورت اور منفعت کی ہو۔ وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا یعنی اس مرحلہ میں جس چیز کے تم محتاج ہوگے اللہ تعالیٰ وہ تمھارے لیے مہیا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت کی بشارت

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے بشارت ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہاں کلام کا اتنا حصہ حذف ہے جو سیاق کلام سے خود واضح ہے یعنی بالآخر ان کے اور ان کی قوم کے درمیان کش مکش اتنی بڑھ گئی کہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ لوگ ان کو، جیسا کہ آیت ۲۰ سے واضح ہوتا ہے سنگسار کر دیں گے۔ اس وقت ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک خاص غار میں جو پہلے سے انھوں نے منتخب کر لیا تھا، پناہ گزیں ہو جائیں گے۔ اس مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی وحی کے ذریعہ سے بشارت دی کہ اب جب کہ تم نے اللہ کی خاطر اپنی قوم اور اس کے معبودوں کو چھوڑ دیا تو اپنے منتخب کردہ غار میں پناہ گیر ہو جاؤ۔ تمھارا رب تمھارے لیے اپنے فضل و رحمت کا دامن پھیلائے گا اور تمھاری تمام ضروریات کا سامان کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بس یہ چاہتا ہے کہ وہ ہمت کر کے اس کی راہ پر چلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ جب وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو آگے کی منزل کے لیے زاد و راحلہ وہ خود فراہم کرتا ہے۔ مَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق ۶۵: ۲-۳)

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ کیا یہ لوگ صاحبِ وحی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی کے ذریعہ سے بشارت دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وحی اسی قسم کی وحی تھی جس کے ذریعہ سے حضرت موسیٰ کی والدہ کو یہ ہدایت ہوئی کہ وہ بچہ کو ایک صندوق میں رکھ کے دریا میں ڈال دیں۔

ترکِ دنیا کے حق میں اہلِ تصوف کا غلط استدلال

اس واقعہ سے بعض صوفی حضرات نے گوشہ نشینی اور ترکِ دنیا کی زندگی کی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ بات ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اس غار میں پناہ اس وقت لی ہے جب وہ اپنے ماحول کی اصلاح کے لیے جان کی بازی کھیل کر اپنی قوم کے ہاتھوں سنگسار کر دیے جانے کے مرحلہ تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ مرحلہ بعینہٖ وہی مرحلہ ہے جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا اور آپ کو غارِ ثور میں پناہ لینی پڑی۔ ان لوگوں نے یہ غار نشینی رہبانیت کے لیے نہیں اختیار کی تھی بلکہ اعدائے حق کے شر سے اپنی جانیں بچانے کے لیے اختیار کی تھی۔

مفسرین کی ایک غلط فہمی

عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس آیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت کے مفہوم میں نہیں لیا ہے بلکہ اس کو خود اصحاب الکہف کا قول سمجھا ہے کہ انھوں نے آپس میں اپنے ساتھیوں سے یہ بات کہی، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ آیت میں جس قطعیت کے ساتھ اللہ کی مدد و نصرت کا وعدہ ہے، کوئی متواضع بندہ اس قطعیت کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ کوئی متواضع بندہ اس طرح کی بات کہے گا تو امید و رجا اور دعا ہی کے الفاظ میں کہے گا۔ چنانچہ آیت ۱۰ میں ان لوگوں کی دعا کا حوالہ بھی ہے۔

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ ۗ مَن يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۖ وَمَن

يُضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْشِدًا (١٧)

تزاور کا مفہوم

'تَزٰوَرُ' اصل میں 'تَتَزَاوَرُ' ہے۔ اس کے معنی ہٹ جانے، کترا جانے اور منحرف ہو جانے کے ہیں۔

قرض کا مفہوم

'تَقْرِضُهُمْ' قرض کے معنی کاٹنے اور کترانے کے ہیں۔ اسی سے 'قرض المکان' کا محاورہ پیدا ہوا جس کے معنی ہیں اس جگہ سے ہٹ گیا، کترا گیا، گریز کر گیا۔

فجوۃ کا مفہوم

'فَجْوَةٍ' دو چیزوں کے درمیان خلا، شگاف اور گوشہ کو کہتے ہیں۔ یہیں سے اس کا اطلاق مکان کے صحن پر بھی ہوتا ہے۔

غار میں ضروریات زندگی کا غیبی اہتمام

اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے غار میں جن ضروریات و مرافق کے مہیا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے اب یہ ان کا بیان ہو رہا ہے کہ اگر تم دیکھ پاتے تو دیکھتے کہ سورج جب طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے داہنی کو بچتا ہوا طلوع ہوتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو ان سے بائیں کو کتراتا ہوا ڈوبتا ہے اور وہ اس غار کے صحن میں آرام کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غار کا دہانہ اس طرح واقع ہوا تھا کہ اس کے اندر ہوا، روشنی اور حرارت، جو زندگی کی ضروریات میں سے ہیں، بآسانی پہنچتی تھیں۔ لیکن آفتاب کی تمازت اس کے اندر نہیں پاتی تھی۔ ہمارے مفسرین نے غار اور اس کے دہانے کی سمت، و جہت متعین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ کاوش غیر ضروری ہے۔ اس کی مختلف شکلیں فرض کی جا سکتی ہیں لیکن ان میں سے کسی کے متعلق جزم کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ صحیح بات وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتا دی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ اس نے اپنی تدبیر و کارسازی سے اپنے بندوں کے لیے ایک ایسا غار مہیا فرما دیا جہاں بغیر کسی کاوش کے ان کے لیے ساری ضروریات زندگی فراہم تھیں اور معلوم ہوتا کہ سورج بھی ان کے پاس سے گزرتا ہے تو ادب و احترام سے گزرتا ہے کہ ان کی خدمت کی انجام دہی کا شرف تو حاصل ہو لیکن ان کے آرام و سکون میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

ایک تنبیہ

'ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ الاية' اسی آیت الٰہی کے تعلق سے یہ تذکیر فرما دی کہ جہاں تک اللہ کی نشانیوں کا تعلق ہے، ایک سے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔ لیکن نشانیوں سے رہنمائی وہی حاصل کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ توفیق بخشتا ہے۔ جو اس توفیق سے محروم ہو جاتے ہیں، کوئی دوسرا ان کا کارساز و رہنما نہیں بن سکتا۔

وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۚ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا (١٨)

حفاظت کے لیے اہتمام

یہ وہ انتظام بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کے لیے فرمایا کہ باوجودیکہ وہ غار میں محو خواب تھے لیکن صورت حال ایسی تھی کہ اگر اتفاق سے کوئی ان کو دیکھ پاتا تو یہ گمان کرتا کہ وہ سو رہے ہیں بلکہ

وہ یہی سمجھتا کہ جاگ رہے ہیں۔ یعنی ان کو سوتا اور بے خبر سمجھ کر کوئی ان کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہ کر سکتا بلکہ ان کو اپنی حفاظت کے لیے بیدار و ہوشیار خیال کرتا۔ ان کے سونے کی ہیئت ایسی تھی کہ معلوم ہوتا کہ کچھ لوگ ذرا دم لینے کے لیے بس لیٹ گئے ہیں، ایسی نہیں کہ دیکھنے والا سمجھے کہ انٹا غفیل پڑ کر سو رہے ہیں۔

'وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ' فرمایا کہ ہم ان کو دہنے بائیں کروٹ بھی بدلاتے رہتے تھے۔ یہ کروٹ صحت جسمانی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے اور اس لیے بھی ضروری ہے کہ ایک ہی ہیئت پر پڑے پڑے جسم اکڑ نہ جائے۔ نیز یہ لوگ زمین پر ایک طویل وقفہ کے لیے سوئے تھے۔ اگر ایک ہی کروٹ پر عرصہ تک پڑے رہتے تو یہ اندیشہ تھا کہ زمین ان کے جسم کو نقصان پہنچا دے۔ اس لیے جس طرح ایک شفیق ماں گہوارے میں لیٹے ہوئے بچے کے پہلو بدلتی رہتی ہے اسی طرح قدرت ان کے پہلو بھی بدلواتی رہتی تھی۔

'وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ' یہ بھی اسی حفاظتی انتظام کے سلسلہ کی بات ہے کہ ان کا وفادار کتا غار کے دہانے پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اس طرح بیٹھا رہا کہ گویا پہرہ دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتا بھی اس دوران میں برابر سوتا ہی رہا لیکن اس کے سونے کی ہیئت وہ نہیں تھی جو عام طور پر کتوں کے سونے کی ہوتی ہے بلکہ وہ تھی جو ڈیوڑھی پر پہرہ دینے والے کتے کی ہوتی ہے۔ یہ انتظام اللہ تعالیٰ نے اس لیے فرمایا کہ کوئی شخص یا عام قسم کا جنگلی جانور غار میں گھسنے کی جرأت نہ کرے۔

'لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا' ظاہر ہے کہ اگر اس طرح کے کسی منظر پر اتفاق سے کسی کی نظر پڑ جائے تو وہ دہشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوگا۔ وہ ششدر رہ جائے گا کہ آخر پہاڑوں کے بیچ میں، ایک غار کے اندر یہ کون لوگ ہیں جو اس طرح لیٹے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں بھلے آدمی سمجھے یا بُرے، چور اور ڈاکو خیال کرے یا راہب اور سنیاسی، آسمانی مخلوق خیال کرے یا ارضی انسان خیال کرے یا جنات و ملائکہ، بہرحال اس پر اس حالت سے ایک انجانے قسم کا خوف ضرور طاری ہوگا۔ یہ خوف کی فضا وہاں قدرت نے اپنے بندوں کی حفاظت کے لیے پیدا کر دی تھی۔ دنیا کے حکمران خاردار تاروں سے محفوظ محلوں میں سوتے ہیں اور مسلح سپاہی ان کا پہرہ دیتے ہیں لیکن ان کی جان کو امان نہیں۔ اللہ کے بندے غاروں اور جنگلوں میں سوتے ہیں اور مجال نہیں کہ کوئی پرندہ وہاں پر مار سکے۔

وَكَذَٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۚ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوا أَحَدَكُم بِوَرِقِكُمْ هَٰذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا (۱۹)

بعث بھی ایک
کرشمہ تھی

'وَكَذَٰلِكَ' یعنی ان کے معاملہ میں جس طرح اپنی کارسازی کی وہ شان ہم نے دکھائی جو اوپر مذکور ہوئی

اسی طرح اپنی یہ نشانی بھی دکھائی کہ ان کو اس نیند سے بیدار کیا کہ ان کے اندر باہم اس امر میں سوال وجواب ہو کر یہ خواب کی حالت ان پر کتنی مدت طاری رہی اور بالآخر ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اس مدت کا اندازہ کرنے سے وہ بالکل قاصر ہیں، صرف اللہ ہی اس مدت سے واقف ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک صاحب نے ساتھیوں سے سوال کیا کہ بھلا اس حالت میں تم نے کتنے دن گزارے ہوں گے؟ ساتھیوں نے جواب دیا کہ زیادہ سے زیادہ ایک دن یا اس سے بھی کم۔ بالآخر اتفاق اس بات پر ہوا کہ اس مدت کا علم صرف اللہ ہی کو ہے اس وجہ سے اس سوال پر غور کرنا بے سود ہے۔ البتہ یہ کرو کہ اپنے میں سے کسی کو یہ رقم دے کر شہر بھیجو، وہ پہلے تحقیق کر لے کہ شہر کے کس حصہ میں پاکیزہ کھانا ملتا ہے اور وہاں سے وہ کچھ کھانے کو لائے اور خبردار! وہ دبے پاؤں جائے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دے۔

اصحاب کہف کی مدت قیام کے بارے میں باہمی سوال کا سبب

یہی وہ سوال وجواب ہے جس کا اوپر آیت ۱۲ میں اجمالاً حوالہ ہے۔ یہاں اس کی تفصیل ہو گئی جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ سوال وجواب انہی لوگوں کے درمیان ہوا۔ یہاں بھی 'لِیَتَسَآءَلُوْا' پر 'ل' غایت ونہایت کے مفہوم میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ ان کا یہ اٹھایا جانا اس نتیجہ تک منتہی ہو کہ وہ آپس میں سونے کی مدت سے متعلق سوال وجواب کریں اور یہ حقیقت ان پر واضح ہو جائے کہ اس مدت کا اندازہ کرنے سے وہ بالکل قاصر ہیں اور یہیں سے ان پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے کہ مرنے کے بعد برزخ کی زندگی کا بھی یہی حال ہو گا۔ قیامت کو جب لوگ اٹھیں گے تو ایسا معلوم ہو گا کہ اس حالت میں وہ ایک دن یا اس سے بھی کم رہے۔

فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا۔ 'اَيُّهَا' یعنی ای اطراف المدينة' یا 'ای نواحی المدينة' اور 'اَزْكٰى' سے پاکیزہ کھانا مراد ہے۔

ان لوگوں نے جس وقت غار میں پناہ لی اس وقت شرک وکفر کے غلبہ کے سبب سے ان کی قوم میں حرام و حلال کی تمیز نہیں رہی تھی اس وجہ سے ان لوگوں نے اس بات کی خاص طور پر تاکید کی کہ کھانا لانے والا اس امر کی اچھی طرح تحقیق کرلے کہ شہر کے کس حصہ میں نسبتاً زیادہ پاکیزہ کھانا ملنے کی توقع ہے۔ رقیم میں آخر کچھ اہل کتاب بھی تو رہتے ہوں گے۔ اس وجہ سے توقع تھی کہ ان کے ہاں حرام وحلال کی تمیز ہو گی لیکن اس تحقیق میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں بات کھل نہ جائے۔ اس وجہ سے انھوں نے یہ تاکید بھی کر دی کہ پوری احتیاط ملحوظ رہے، کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ 'تَلَطُّف' کے معنی کسی کام کو زیرکی، ہوشیاری اور احتیاط سے ڈرتے ڈرتے کرنے کے ہیں۔

احتیاط کے ساتھ تحقیق کی تاکید

آیت میں لفظ ورق کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے سکہ یا روپیہ کیا ہے لیکن ہم نے رقم کیا ہے اس لیے کہ ورق کے معنی چاندی کے ہیں اور یہ بجائے خود بھی سکہ کے قائم مقام ہو سکتی ہے۔ اس وجہ سے ہم نے ایسا لفظ اختیار کیا ہے جس کا اطلاق مسکوک اور غیر مسکوک دونوں پر ہو سکتا ہے۔

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا (۲۰)

اس سے اس اندیشہ کا اظہار ہوتا ہے جس کی بنا پر احتیاط اور رازداری کی تاکید کی گئی۔ جس زمانے میں ان لوگوں نے غار میں پناہ لی ہے اہل حق پر ظلم و تشدد اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور ان لوگوں نے سنگسار کر دیے جانے کے اندیشے سے یہ پناہ ڈھونڈی تھی۔ اسی اندیشہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ فرمایا کہ اگر کہیں لوگوں کو پتہ چل گیا تو پھر ہماری خیر نہیں ہے۔ پہلے تو کسی نہ کسی طرح بچ نکلے لیکن اب اگر پا گئے تو یا تو سنگسار کر دیں گے یا مرتد کر کے چھوڑیں گے، پھر کسی طرح بھی ان سے نجات حاصل کرنا ممکن نہ ہوگا۔

وَكَذَٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ ۖ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَانًا ۖ رَّبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ ۚ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا (۲۱)

اس 'كَذَٰلِكَ' کا عطف اوپر والے 'كَذَٰلِكَ' پر ہے یعنی جس طرح ہم نے وہ شان دکھائی اسی طرح ہم نے یہ شان بھی دکھائی کہ لوگوں کو ان سے باخبر کر دیا۔ یہاں اس بات کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ لوگ ان سے کس طرح آگاہ ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ جو صاحب کھانا لینے کے لیے بازار گئے انہی کو دیکھ کر بعض زیرک لوگوں نے تاڑ لیا ہو اور پھر ان کا سراغ لگانے کے درپے ہو گئے ہوں اور اس طرح آہستہ آہستہ لوگوں کی رسائی غار تک ہو گئی ہو۔ غور کرنے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب کہف کو جب یہ اندازہ ہو گیا کہ ان کی سن گن کچھ باہر پہنچ چکی ہے تو وہ اپنے غار میں معتکف ہو گئے اور اسی حال میں اللہ نے ان کو وفات دے دی۔ لوگوں کو ان کی پوری پوری اطلاع ان کی وفات کے بعد ہی ہوئی۔

واقعہ میں قیامت کے باب میں شہادت

'لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا' یعنی اللہ نے لوگوں کو ان کے حال سے اس لیے آگاہ کیا کہ یہ اس بات کی نشانی ہو کہ اللہ کا وعدۂ قیامت شدنی ہے اور اس کے ظہور میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ قیامت کے باب میں منکرین کو سب سے بڑا شبہ یہی پیش آتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کو بہت ہی مستبعد سمجھتے ہیں۔ اصحاب کہف کے واقعہ نے اس استبعاد کو رفع کرنے کے لیے ایک تازہ شہادت پیش کر دی کہ ایک مدت تک سوتے رہنے کے بعد وہ اپنے رب کے حکم سے پھر اٹھ بیٹھے۔ قرائن اس بات پر دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح لوگوں کو ان کے غار سے آگاہ فرمایا اسی طرح اس بات سے بھی آگاہ فرما دیا کہ ان لوگوں کی زندگی غار میں کس طرح گزری۔ اگرچہ آیت میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے لیکن یہ امر واضح ہے کہ لوگوں کو یہ بات معلوم تھی اور درحقیقت یہی چیز تھی جس کے سبب سے ان کی زندگی لوگوں کی نگاہوں میں ایک اعجوبہ بنی اور مرنے کے بعد یہ خلق کے مرجع عقیدت بن گئے۔ ہو سکتا ہے کہ جس زمانے میں لوگوں نے ان کی ٹوہ لگانے کی کوشش کی ہے اسی زمانے میں یہ راز بھی کھلا ہو اور بعد میں اس کا علم عام ہو گیا ہو اور پھر اس کی روایت نے تواتر کی حیثیت حاصل کر لی ہو۔

'إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَانًا رَّبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا'

اصحاب کہف کی وفات کے بعد قوم کا انقلاب حال

اب یہ قرآن نے اس انقلاب حال کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ان کی وفات کے بعد ہوا کہ ایک دن تو وہ تھا کہ یہ بےچارے سنگ سار کر دیے جانے کے ڈر سے ایک غار میں چھپے یا وہ دن آیا کہ لوگ ان کے ساتھ نسبت حاصل کرنے کے لیے آپس میں جھگڑنے لگے۔ ظاہر ہے کہ یہ تنازع مختلف گروہوں، فرقوں اور خاندانوں میں واقع ہوا ہوگا۔ اور اس لیے ہوا ہوگا کہ ہر ایک ان کو اپنے گروہ، اپنے فرقے اور اپنے مسلک و عقیدہ کے ساتھ منسوب کرنے کا خواہش مند رہا ہوگا۔ اہل حق کے ساتھ اس ظالم دنیا نے ہمیشہ یہی معاملہ کیا ہے۔ زندگی میں تو ان کو لوگوں کے پتھر کھانے پڑے لیکن مرنے کے بعد ان کے بت پوجے گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی مرنے کے بعد یہی ہوا کہ مختلف گروہ اور فرقے ان کے ساتھ قرب کے مدعی بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہوئی کہ ان کے مذہب و مسلک کا معاملہ تو اللہ کے حوالے کیا جائے البتہ ان کی یادگار میں ان کے غار پر ایک عمارت بنا دی جائے۔ لیکن دوسرے گروہ نے، جس کو اکثریت حاصل تھی، کہا کہ ہم ان کی یادگار میں ایک مسجد بنائیں گے اور اسی گروہ کی رائے غالب رہی۔ اس سے اس انقلاب حال کا کچھ اندازہ ہوتا ہے جو ان جانبازوں کی قربانیوں کے نتیجہ میں برپا ہوا کہ ملک میں ان لوگوں نے اکثریت حاصل کر لی جو موحد اور خدا پرست تھے۔ دوسرے لوگ جو موحد اور خدا پرست نہیں تھے ان کے اندر بھی اتنی تبدیلی اور رواداری واقع ہو گئی کہ اصحاب کہف کی یادگار قائم کرنے کی سعادت وہ بھی حاصل کرنے کے متمنی ہوئے۔

یادگار میں مسجد کی تعمیر

'رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ' میں ہمارے نزدیک عربیت کے معروف قاعدہ کے مطابق ایک مضاف محذوف ہے یعنی 'أَعْلَمُ بِدِينِهِمْ' معلوم ہوتا ہے اس گروہ کی رائے یہ تھی کہ ان کے دین و عقیدہ کی بحث زیر بحث لائے بغیر (؟) جانے بلکہ قوم کے متفق علیہ بزرگوں اور پیشواؤں کی حیثیت سے ان کی یادگار میں ان کے غار پر ایک ہیکل کی تعمیر کی جائے لیکن دوسرے گروہ نے یہ تجویز قبول نہیں کی بلکہ اس نے ایک مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اور یہی رائے غالب رہی۔

'عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا' میں بھی ہمارے نزدیک ایک مضاف محذوف ہے یعنی 'عَلَىٰ كَهْفِهِمْ'

قرآن مجید نے ان لوگوں کی یادگار کو مسجد سے تعبیر کر کے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ یہ موحد اور خدا پرست لوگ تھے۔ اس وجہ سے انھوں نے خدا کی عبادت کا گھر بنایا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہود اور نصاریٰ کے عبادت خانے اصلاً مسجد ہی تھے۔ ان میں خرابی تو اس وقت سے پیدا ہوئی ہے جب ان قوموں نے مشرکانہ عقائد اختیار کیے اور اپنے معبدوں کو شرک سے آلودہ کیا۔ یاد ہوگا قرآن نے یہود اور نصاریٰ کے 'صوامع' اور 'بیع' کو مساجد ہی کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ حج آیت ۴۰۔

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۗ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا (۲۲)

غیر ضروری سوالات سے گریز کی

اب یہ ایک جملہ معترضہ کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اصحاب کہف کی اصل حقیقت

تو یہی ہے جو تمہیں سنا دی گئی تھی لیکن یہ نہ سمجھو کہ یہ سوال کرنے والے اس سے مطمئن ہو جائیں گے اور ان کی زندگیوں سے سبق حاصل کریں گے بلکہ اب کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ ان کی تعداد تین تھی اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ یہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا۔ فرمایا کہ یہ ساری باتیں 'رَجْمًا بِالْغَيْبِ' یعنی محض اٹکل پچو ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ علاوہ ازیں کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ وہ سات تھے آٹھواں ان کا کتا تھا۔ تم ان سے کہہ دو کہ میرا رب ہی ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے۔ ان کی تعداد سے صرف تھوڑے ہی لوگ واقف ہیں۔

'فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا' 'مماراۃ' کے معنی بحث و مناظرہ کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر لوگ تمہارے سامنے اس طرح کے سوالات لے کر آئیں اور تم سے بحث و جدال کرنا چاہیں تو ان سے نہ الجھنا بلکہ سرسری طور پر بات کر کے ان کو ٹال دینے کی کوشش کرنا۔ اب اصحاب کہف کے باب میں کسی سے کچھ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب ان کی اصل سرگزشت اللہ نے بیان کر دی تو اللہ سے زیادہ کون جاننے والا ہے جس سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جن لوگوں کو بحث و مناظرہ کا روگ لگ جاتا ہے ان کو اصل حقیقت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کے مناظرہ کی ایک راہ بند کیجیے تو وہ کوئی دوسری راہ نکال لیں گے اس وجہ سے کسی دانش مند کے لیے یہ زیبا نہیں کہ ایسے لوگوں کے قائل کرنے کے درپے ہو۔ ایسے لوگوں سے جان چھڑانے ہی میں خیر ہے۔ ان کے ساتھ سنجیدہ ہو کر بحث کرنے کے بجائے ان کو خوبصورتی سے ٹالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بعض اہل تاویل نے اصحاب کہف کی تعداد سے متعلق آخری قول کو اقرب الی الصواب قرار دیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ پہلے دو قولوں کو تو قرآن نے صاف رجماً بالغیب قرار دیا ہے لیکن تیسرے قول سے متعلق کوئی اس طرح کی بات نہیں فرمائی ہے۔ یہ استنباط قرین صواب ہے لیکن ان کی تعداد سے متعلق ہمارا قول وہی ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَا۟يْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ○ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا (۲۳-۲۴)

وعدہ مشروط بمشیت الٰہی کیا جائے

اسی ذیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت بھی فرما دی کہ کسی امر میں یوں غیر مشروط وعدہ نہ کر لیا کرو کہ میں یہ کام کل کر دوں گا۔ اس ہدایت کی ضرورت غالباً یوں پیش آئی کہ اصحاب کہف کے متعلق جب پوچھنے والوں نے پوچھا ہو گا تو آپ نے یہ وعدہ کر لیا ہو گا کہ میں اس کا جواب کل دے دوں گا۔ اس قسم کے سوالات، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، آپ سے امتحاناً کیے جاتے تھے اس وجہ سے فطری طور پر آپ کی یہ خواہش ہوتی کہ ان کا جواب جلد دیا جائے اور آپ وحی کی رہنمائی کے بھروسہ پر وعدہ کر بیٹھتے۔ جہاں تک جواب جلد دینے کی خواہش کا تعلق ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کے اندر اپنی دعوت کی سربلندی کا

کی جو شدید آ رزو تھی اس کی وجہ سے آپ یہ چاہتے تھے کہ معترضین و مخالفین کے ہر سوال و اعتراض کا جواب فوراً دیا جائے تاکہ اپنی طرف سے ان کے لیے قبولِ حق میں کوئی عذر باقی نہ رہنے۔ لیکن اس معاملہ کا ایک اور پہلو بھی تھا جو نظر انداز ہو گیا تھا وہ یہ کہ بسا اوقات حکمتِ الٰہی کا تقاضا کسی سوال سے متعلق یہ ہوتا ہے کہ اس کا جواب نہ دیا جائے یا جواب تو دیا جائے لیکن فوراً نہ دیا جائے۔ اس وجہ سے نبی کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ وہ وحی کے بھروسہ پر کوئی غیر مشروط وعدہ کر بیٹھے بلکہ اس کو ہر وعدہ خدا کی مشیت کی شرط کے ساتھ کرنا چاہیے اور اگر کبھی بھول چوک ہو جائے تو یاد آنے پر اپنے رب کو یاد کرنا چاہیے اور جس سے وعدہ ہوا ہے اس سے کہنا چاہیے کہ کیا عجب کہ میرا رب موعودہ مدت سے بھی کم مدت میں صحیح بات کی طرف رہنمائی فرما دے۔

وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا (۲۵)

آیت ۲۵ کا تعلق پہلے فقرے سے

آیت ۲۲ سے جو جملہ معترضہ شروع ہوا تھا وہ آیت ۲۴ پر ختم ہوا۔ اب یہ آیت انہی اقوال سے متعلق ہے جو اوپر اصحابِ کہف کی تعداد سے متعلق نقل ہوئے ہیں۔ یعنی جس طرح وہ ان کی تعداد کے بارے میں یہ کہیں گے اسی طرح غار میں ان کی مدتِ قیام سے متعلق دعویٰ کریں گے کہ وہ غار میں تین سو سال اور مزید برآں نو سال رہے۔

عام طور پر لوگوں نے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر کے مفہوم میں لیا ہے لیکن ہمارے نزدیک ان کی مدتِ قیام کے باب میں قرآن نے کوئی قطعی بات نہیں کہی ہے۔ آیت ۱۱ میں 'سِنِیْنَ عَدَدًا' کے الفاظ ہیں۔ وہ اس بات پر تو ضرور دلیل ہیں کہ یہ لوگ غار میں کئی سال رہے لیکن تین سو نو سال کی مدت کی تعبیر کے لیے، عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ الفاظ بالکل ناموزوں ہیں۔ پھر اس کے بعد کی آیت 'قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا' اس مطلب سے بالکل ابا کرتی ہے۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے تو پھر یہ کہنے کے کیا معنی کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ ان کی مدتِ قیام کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں اس تاویل میں منفرد ہوں۔ متعدد دوسرے ائمہ تفسیر کی رائے بھی یہی ہے۔ وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ؗ وَّلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا (۲۶)

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب دلوایا گیا ہے کہ جس طرح اصحابِ کہف کی تعداد سے متعلق ان کے اندازے بالکل اٹکل پچو ہیں اسی طرح غار میں ان کی مدتِ قیام کے بارے میں بھی ان کا اندازہ بالکل غلط ہے۔ ان کو بتا دو کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ لوگ کتنی مدت غار میں رہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ان لوگوں کے خیال کی نفی کر رہا ہے جو 'وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ ... الآیۃ' کو اس معنی میں

لیتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مدتِ قیام کی خبر ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے معاً بعد یہ کہنے کا کوئی مناسب محل نہیں تھا کہ اللہ ہی ان کی مدتِ قیام کا بہتر علم رکھنے والا ہے۔ یہاں زبان کا یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھیے کہ اگر یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر کے مفہوم میں ہوتی تو کلام کا آغاز حرفِ عطف سے نہ ہوتا بلکہ حرفِ عطف کے بغیر ہوتا۔ حرفِ عطف اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہ انہی بے سروپا باتوں کے تحت ہے جو ان لوگوں کی طرف سے اوپر نقل ہوئی ہیں۔

زبان کا ایک نکتہ

'لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'۔ یعنی آسمانوں اور زمین کے تمام رازوں کا حقیقی علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ دوسروں کو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا اس نے بتایا ہے باقی سب رطب ویابس کا مجموعہ ہے۔ اس کی حیثیت یہ نہیں ہو سکتی کہ اس کی بنیاد پر انسان اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے علم کا مذاق اڑائے۔ آج انسان نے زمین کی تہوں کو الٹ پلٹ کر معلومات کا جو ذخیرہ جمع کیا ہے اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ قرآن کے بیان کردہ حقائق کے مقابل میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔

آسمانوں اور زمین کے تمام رازوں کا حقیقی علم اللہ ہی کے پاس ہے

'اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ'۔ یہ مبالغہ اور غایت درجہ تعریف کا اسلوبِ بیان ہے۔ یعنی کیا کہنے ہیں اس کے دیکھنے اور سننے کے! وہ بہت ہی خوب دیکھنے اور سننے والا ہے! آسمانوں اور زمین کی کوئی بات اور کوئی چیز بھی اس کے احاطۂ سمع و بصر سے باہر نہیں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب اس علیم و خبیر نے ایک سوال کا جواب دے دیا تو اب اس سے زیادہ جاننے والا کون ہے کہ اس سے رجوع کرنے کی ضرورت باقی رہے۔

اللہ تعالیٰ کا کامل علم

'مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا'۔ جب بات اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم تک پہنچ گئی تو یہیں سے اس کے تمام شرکاء و شفعاء کی نفی کے لیے راہ صاف ہوگئی کہ جو خود ہر بات سے سب سے زیادہ آگاہ ہے اس کے مقابل اگر لوگوں نے کچھ کارساز و مددگار سے اپنے لیے فرض کر رکھے ہیں تو وہ ذرہ بھی کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں کامل اور سب سے مستغنی ہے۔ وہ اپنے اختیار میں کسی کو شریک نہیں بناتا۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــــ آیات ۲۷-۳۱

آگے کا مضمون تمہیدِ سورہ کے مضمون سے متصل ہے۔ یاد ہوگا، سورہ کی تمہید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کے پیچھے پریشان ہونے سے روک دیا گیا جو زخارفِ دنیا کے عشق میں خدا اور آخرت کو بھولے بیٹھے ہیں اور قرآن کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے بعد ایک سوال کے جواب میں اصحابِ کہف کا ذکر آگیا تھا جس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں اٹھنے والے بندوں کو ضائع نہیں کرتا بلکہ ان کی ڈھارس بندھاتا، ان کی حوصلہ افزائی کرتا اور راہِ حق میں ان کو جو مشکلیں پیش آتی ہیں، ان میں غیب سے ان کی مدد فرماتا ہے۔ اب آگے اسی تمہید والے مضمون کو پھر لے لیا اور پیغمبر کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم پر جو کتاب وحی کی جا رہی ہے اس کو

لوگوں کو سناؤ اور مخالفین کے نت نئے مطالبات اور ان کے اعراض و استکبار کی پرواہ نہ کرو۔ ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں اللہ کا جو قانون ہے وہ بدل نہیں سکتا۔ تم ان اغنیاء و متکبرین سے بے پروا ہو کر اپنے غریب ساتھیوں پر اپنی ساری توجہ مرکوز کرو اور ان متکبرین کو سنا دو کہ جس کا جی چاہے، ایمان لائے، جس کا جی چاہے کفر کرے۔ جو کفر کرے گا وہ اپنا انجام خود دیکھ لے گا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۲۷-۳۱

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ
وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ
يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا
تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا
تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ
اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ
وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ
سُرَادِقُهَا ۚ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۚ
بِئْسَ الشَّرَابُ ۚ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ
جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ
مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ
مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۭ نِعْمَ الثَّوَابُ ۭ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾ ع ۴ ۱۶

ترجمۂ آیات ۲۷-۳۱

اور تمہارے رب کی جو کتاب تم پر وحی کی جا رہی ہے اس کو سناؤ، خدا کے قوانین کو کوئی بدل نہیں سکتا اور اس کے سوا تم کوئی پناہ نہیں پا سکتے اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ

جمائے رکھو جو صبح و شام اپنے رب کی رضا جوئی میں اس کو پکارتے ہیں۔ اور تمہاری نگاہیں حیاتِ دنیا کی زینتوں کی خاطر ان سے ہٹنے نہ پائیں اور تم ان لوگوں کی بات پر دھیان نہ کرو جن کے دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیے ہیں اور جو اپنی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہیں اور جن کا معاملہ حد سے متجاوز ہو چکا ہے۔ اور کہہ دو یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے، تو جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے۔ ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو اپنے گھیرے میں لے لیں گی۔ اور اگر وہ پانی کے لیے فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہو گا، چہروں کو بھون ڈالے گا۔ کیا ہی برا پانی ہو گا! اور کیا ہی برا ٹھکانا! ۲۷-۲۹

بے شک جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے تو ہم خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔ ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہاں وہ سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور وہ سندس و استبرق کی سبز پوشاک پہنیں گے، تختوں پر ٹیک لگائے ہوئے، کیا ہی خوب صلہ ہے اور کیا ہی خوب ٹھکانا۔ ۳۰-۳۱

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا (۲۷)

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید ہے کہ جو کتاب تم پر وحی کی جا رہی ہے، بس اس کو سناؤ۔ نہ مخالفین کے نت نئے مطالبات کی پروا کرو، نہ ان کے سوالات سے پریشان ہو اور نہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی پر غم کرو۔ اللہ نے ہدایت و ضلالت کے لیے جو قانون بنا دیا ہے وہ اٹل ہے، خدا کے قوانین و ضوابط کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ ہدایت وہی پائیں گے جن کو ہدایت کی توفیق حاصل ہو گی اور توفیق انہی کو حاصل ہو گی جو اس نعمت کے لیے اپنی صلاحیت کا ثبوت دیں گے۔ یہ معاملہ تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہے اور خدا کے سوا کوئی مرجع و ماویٰ نہیں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ ۖ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا (۲۸)

'فرط' کا مفہوم 'فرط' کے معنی اسراف، ظلم اور حدود سے تجاوز کے ہیں۔ 'الامر الفرط' وہ معاملہ جو حدود سے بالکل متجاوز ہو گیا ہو۔

متکبرین کے باب میں پیغمبر کو ہدایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کے سرداروں اور مالداروں کے ایمان کی فکر خدانخواستہ اپنی ذات کے لیے نہیں تھی بلکہ صرف دین کی سربلندی کی خاطر تھی۔ آپ سمجھتے تھے کہ ان لوگوں کا ایمان دوسروں کے ایمان کی راہ کھولے گا۔ اس خیال کے تحت آپ ان لوگوں کی نازبرداری میں بسا اوقات اپنے جاں نثار ساتھیوں کے حقوق سے غافل ہو جاتے۔ اس آیت میں آپ کو اس چیز سے روک دیا گیا۔ ارشاد ہوا کہ جو لوگ صبح و شام خدا کی یاد اور اس کی رضا جوئی میں سرگرم ہیں اپنی توجہ کا مرکز ان کو بناؤ۔ ان سرگشتگانِ دنیا کو جو اپنی خواہشوں کے پیرو ہیں اور جن کا معاملہ اب تمام حدود سے تجاوز کر چکا ہے، خاطر میں نہ لاؤ۔ تمہاری دعوت اپنا زادِ راہ اور اپنی عزت و شوکت خود اپنے ساتھ رکھتی ہے، ان لوگوں کے مال و متاع کی محتاج نہیں کہ تم ان کی طرف آنکھ اٹھاؤ۔ اس آیت کے لب و لہجہ میں جو تیزی ہے اہل ذوق جانتے ہیں کہ اس کا رخ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں بلکہ متکبرین اور اغنیاء کی طرف ہے جو صحابہؓ کو حقیر سمجھتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرتے تھے کہ آپ ان کو دور کریں تب ہم بات سننے کے روادار ہوں گے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ وَإِن يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ ۚ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا (۲۹)

متکبرین کو آگاہی 'قُلِ الْحَقُّ' یعنی 'قُلْ هٰذَا هُوَ الْحَقُّ' یعنی ان کی نازبرداری کے بجائے اب ان کو آخری آگاہی دے دو کہ یہی بات حق ہے جو خدا کی طرف سے اتری ہے اور جو میں نے تمہیں پہنچا دی ہے۔ اب کسی کے کفر و ایمان کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے جس کا جی چاہے ایمان لائے، جس کا جی چاہے کفر کرے۔ جو کفر کریں گے تو ایسے ظالموں کے لیے دوزخ کی آگ تیار ہے جس کی قناتیں ان کو اپنے گھیرے میں لے لیں گی اور جب یہ پانی پانی پکاریں گے تو ان کو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح کا پانی دیا جائے گا جو چہروں کو بھون کے رکھ دے گا۔ نہ پانی کی برائی کی کوئی حد ہو گی، نہ ٹھکانے کی، دونوں کی ہرناکی ایک سے ایک بڑھ کر۔

'مرتفق' کا مفہوم 'مُرْتَفَقًا' کے معنی ٹیک لگانے کی جگہ کے ہیں۔ ہم نے اس کے وسیع مفہوم کے اعتبار سے اس کا ترجمہ ٹھکانا کیا ہے۔

'يَشْوِي' کے معنی بھوننے کے ہیں۔ 'مُهْل' (پگھلے ہوئے تانبے) کے لیے اس کا استعمال اس کی

شدت وحدت کے اظہار کے لیے ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ۝ أُولَٰئِكَ
لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَ
يَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۚ نِعْمَ الثَّوَابُ
وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (۳۰-۳۱)

ایمان لانے والوں کا صلہ

کفر کرنے والوں کے انجام کے بیان کے بعد اب یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جو قرآن کی دعوت پر ایمان لائے۔ امراء و اغنیاء چونکہ ان لوگوں کو، ان کی غربت کے سبب سے، بہت حقیر سمجھتے تھے اس وجہ سے ان کے صلہ کے بیان میں ان چیزوں کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے جو وقت کے امراء کے لیے سرمایۂ فخر و ناز تھیں۔ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے ہم ان خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔ ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سندس و استبرق کے سبز لباس پہنیں گے، تختوں پر ٹیک لگائے ہوں گے۔ کیا ہی خوب صلہ اور کیا ہی خوب ٹھکانا ہو گا!!

جنت اور دوزخ کے احوال سے متعلق ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ یہ متشابہات میں داخل ہیں جن تمثیلات و تشبیہات سے اس نادیدہ عالم کے احوال کو ہمارے ذہن کے قریب لایا جا سکتا ہے، قرآن ان کے ذریعہ سے ان کو ہمارے ذہن کے قریب کرتا ہے۔ رہی ان کی اصل حقیقت تو اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ دوزخ کے 'مہل' یا جنت کے کنگن اور سندس اور استبرق کی حقیقت یہاں نہیں معلوم کی جا سکتی۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ قرآن ان چیزوں کے بیان میں اہل عرب ہی کی معلومات اور انہی کے ذوق کو ملحوظ رکھتا ہے اس لیے کہ تشبیہ و تمثیل میں مؤثر وہی چیزیں ہوتی ہیں جن سے مخاطب واقف ہوں۔

۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۳۲-۴۴

مومن اور کافر کی ذہنیت کی تمثیل

آگے دو شخصوں کی ایک تمثیل کے ذریعے سے مومن اور کافر دونوں کی ذہنیت واضح فرمائی ہے کہ مومن اس دنیا کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور ایک کافر اس کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس تمثیل سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ جو لوگ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے ان کا اصل مغالطہ کیا تھا۔ وہ در حقیقت اپنی اس دنیا کی کامیابی کو اپنے فکر و عمل کی صحت و صداقت کی دلیل سمجھ بیٹھے اور جب مسلمان ان کو خدا اور آخرت سے ڈراتے تو وہ کہتے کہ جب دنیوی اعتبار سے ہمارا حال تم سے اچھا ہے تو لازماً ہمارا ہی عقیدہ اور ہمارا ہی طریقہ بھی اچھا ہے۔ پھر وہ یہیں سے یہ نتیجہ بھی نکال لیتے کہ اول تو آخرت و قیامت وغیرہ محض ایک ڈھکوسلا ہے اور بالفرض ہو بھی تو ہم وہاں بھی تم سے اچھے ہی رہیں گے۔ اس روشنی میں آگے

کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ آیات ۴۴-۳۲
اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿٣٢﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ
اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿٣٣﴾ وَّ
كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا
وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ
اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿٣٥﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ
اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿٣٦﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ
يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ
رَجُلًا ﴿٣٧﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿٣٨﴾ وَلَوْلَآ اِذْ
دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا
اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٣٩﴾ فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ
وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿٤٠﴾ اَوْ
يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿٤١﴾ وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ
فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا
وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿٤٢﴾ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ
يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿٤٣﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ
لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿٤٤﴾ ع ۵

اور ان کو دو شخصوں کی تمثیل سناؤ۔ ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو ترجمۂ آیات ۴۴-۳۲

باغ بنائے، ان کو کھجوروں کی قطار سے گھیرا اور ان کے درمیان کھیتی کے قطعات بھی رکھے۔ دونوں باغ خوب پھل لائے، ان میں ذرا کمی نہیں کی۔ اور ان کے بیچ بیچ میں ہم نے نہر بھی دوڑا دی۔ اور اس کے پھلوں کا موسم ہوا تو اس نے اپنے ساتھی سے بحث کرتے ہوئے کہا، میں تم سے مال میں بھی زیادہ اور تعداد کے اعتبار سے بھی زیادہ طاقت ور ہوں۔ اور وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہوا کہ وہ اپنی جان پر آفت ڈھا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ کبھی برباد ہو جائے گا۔ اور میں قیامت کے آنے کا بھی گمان نہیں رکھتا اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا ہی گیا تو اس سے بھی بہتر مرجع پاؤں گا۔ ۳۲-۳۶

اس کے ساتھی نے بحث کرتے ہوئے کہا، کیا تم نے اس ذات کا انکار کیا جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے، پھر تم کو ایک مرد بنا کر کھڑا کیا۔ لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے یوں کیوں نہ کہا کہ یہ جو کچھ ہے سب اللہ کا فضل ہے۔ اللہ کے بدون کسی کو کوئی قوت حاصل نہیں۔ اگر تم مال و اولاد کے اعتبار سے مجھے اپنے سے کم دیکھتے ہو تو امید ہے کہ میرا رب تمہارے باغ سے بہتر باغ مجھے دے اور تمہارے باغ پر آسمان سے کوئی ایسی گردش بھیجے کہ وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے۔ یا اس کا پانی نیچے اتر جائے اور تم اس کو کسی طرح نہ پا سکو۔ ۳۷-۴۱

اور اس کے پھلوں پر آفت آئی تو جو کچھ اس نے اس پر خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور وہ باغ اپنی ٹٹیوں پر گر پڑا تھا۔ اور وہ کہہ رہا تھا کہ اے کاش! میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناتا۔ اور اس کے پاس نہ تو کوئی جتھا تھا جو خدا کے مقابلے میں اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود ہی انتقام لینے والا بن سکا۔ اس وقت سارا اختیار صرف خدائے برحق ہی کا ہے اور وہ بہترین اجر

اور بہترین انجام والا ہے۔ ۳۲-۴۴

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا۔ (۳۲)

قریش کے سامنے تمثیل کا آئینہ

یہ قریش کے متمردین کو ایک تمثیل سنائی جا رہی ہے تاکہ وہ اس کے آئینہ میں اپنا ظاہر و باطن بھی دیکھ لیں اور اس کشمکش حق و باطل کا انجام بھی ان کے سامنے آ جائے جو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان برپا تھی۔ یہ تمثیل دو ایسے شخصوں کی ہے جن میں سے ایک کو خدا نے دو بہترین باغ دیے تھے اور دوسرے کو اگرچہ اس قسم کی کوئی متاع حاصل نہیں تھی لیکن اس کا سینہ ایمان کی دولت سے مالا مال اور دل خدا کی معرفت سے باغ باغ تھا۔

دو باغوں کا ذکر تکمیلِ نعمت کی تعبیر کے لیے

دو باغوں کا ذکر تکمیلِ نعمت کے اظہار کے لیے ہے۔ سورۂ رحمان میں اہلِ جنت کے لیے بھی دو جنتوں کا ذکر آتا ہے۔ اس سے مقصود تکمیلِ نعمت ہے۔ اہلِ عرب کے نزدیک بہترین باغ کا تصور یہ تھا کہ انگوروں کا باغ ہو، کنارے کنارے کھجوروں کے درخت ہوں جو پھل بھی دیں، باغ کی خوب صورتی میں بھی اضافہ کریں اور سموم وغیرہ کی آفتوں سے باغ کی حفاظت بھی کریں۔ علاوہ ازیں باغ میں چھوٹے چھوٹے زراعتی قطعات بھی ہوں جن میں موسم کے لحاظ سے ضروری چیزوں کی کاشت کی جا سکے اور بیچ میں نہر ہو جس کی نالیاں باغ کے ہر گوشے میں دوڑا دی گئی ہوں۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا۔ (۳۳)

جس کو اس طرح کا باغ حاصل ہو وہ بھی ایک چھوڑ دو دو، اسے دنیا میں اور کیا چاہیے۔ فرمایا کہ دونوں باغوں نے خوب پھل دیے، ذرا کمی نہیں کی۔ باغ کے بیچ میں نہر جاری تھی جو اس کی شادابی، طراوت اور زرخیزی کی ضامن تھی۔

وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّأَعَزُّ نَفَرًا۔ (۳۴)

نعمت پا کر ناشکری

اب یہ بتایا کہ اس نعمت کو پا کر اس نعمت والے نے رویہ کیا اختیار کیا۔ ہونا تو یہ تھا کہ اس کا بال بال اس رب کا شکر گزار ہوتا جس نے اس کو یہ نعمت بخشی لیکن ہوا یہ کہ جب اس کے ساتھی نے اس کو خدا کا شکر گزار و فرمانبردار بندہ بننے کی نصیحت کی اور ناشکری کے انجام اور خدا کے قہر و غضب سے ڈرایا تو اس نے بحث شروع کر دی کہ بتاؤ تمہارا حال اچھا ہے یا میرا؟ میں مال میں بھی تم سے زیادہ اور میری جمعیت بھی تمہاری جمعیت سے

تری، تو تم مجھے کیا ڈراتے ہو، مجھے جو کچھ حاصل ہے یہ خود اس امر کی ایک ناقابلِ انکار شہادت ہے کہ تمہارے عقیدہ و عمل سے میرا عقیدہ و عمل زیادہ صحیح ہے۔

'وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ' سے اس بات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ بحث فصل کی تیاری کے زمانے میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ دولت کا نشہ باغ والے کے اندر پھلوں کی تیاری کے زمانے میں دو چند ہو جاتا ہے۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ۚ قَالَ مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَدًا ۝ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّدِدتُّ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنقَلَبًا (۳۵-۳۶)

'وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ' کا مفہوم

'وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ' یعنی وہ اپنی دولت و ثروت پر غرور کرتا اور اکڑتا ہوا اپنے باغ میں داخل ہوا اور بولا کہ میں کبھی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ میرا یہ باغ تباہ ہو جائے گا۔ قیامت و آخرت اوّل تو ہے نہیں لیکن اگر ہوئی، جیسا کہ یہ ملا ڈراتا ہے تو میں بہرحال وہاں اس سے بھی زیادہ بہتر زندگی پاؤں گا۔

قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا (۳۷)

بندۂ مومن کی حکمت

بندۂ مومن نے یہ اس متکبر کے استکبار اور انکارِ قیامت پر معارضہ کیا کہ اگر تم قیامت کے منکر ہو تو یہ کفر ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مرنے کے بعد خدا دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا؟ کیا تم نے خود اپنی ہستی پر غور نہیں کیا کہ تم جس آدم کی اولاد ہو خدا نے ان کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے اولادِ آدم کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا اور اسی پانی کی بوند سے تمہیں ایک بھلا چنگا مرد بنا کھڑا کیا۔ اگر خدا کی یہ قدرت دیکھتے ہو تو اس بات کو کیوں بعید سمجھتے ہو کہ خدا تمہیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے! یہ تو صریحاً خدا کی قدرت و حکمت کا انکار ہے جو کفر ہے۔

لَّٰكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا (۳۸)

شرک کا مخفی خناس

یہ بندۂ مومن نے اپنا عقیدہ بیان کیا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایمان کے لیے صرف خدا کو مان لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ خدا ہی کو اپنا رب، پروردگار اور آقا و مالک بھی مانے۔ اگر کوئی شخص اللہ کا اقرار کرتا ہے لیکن رب دوسروں کو بھی مانتا ہے تو وہ مشرک ہے۔ اور یہ شرک بھی کفر ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے مال و جاہ پر مغرور ہے، اس کو اپنی قابلیت کا ثمرہ و نتیجہ اور اپنے استحقاقِ ذاتی کا کرشمہ خیال کرتا ہے اور یہ خناس اس کے دماغ میں سمایا ہوا ہے کہ اس کو اس سے کوئی چھین نہیں سکتا تو یہ بھی شرک ہے اس لیے کہ ایسا شخص اپنے آپ کو خدا کی خدائی میں ساجھی سمجھتا ہے۔ توحید کا مطالبہ یہ ہے کہ بندہ کو جو نعمت بھی ملے اس کو خدا کا فضل و عطیہ سمجھے، اس کے لیے برابر اپنے رب کا شکرگزار رہے، اس کے باب میں اپنے آپ کو خدا کے آگے مسئول سمجھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ خدا جب چاہے اس نعمت کو چھین سکتا ہے۔

وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ إِن تَرَنِ أَنَا أَقَلَّ مِنكَ مَالًا وَوَلَدًا (۳۹)

ایمان کا تقاضا

یہ بندۂ مومن نے اس متکبر کو ایمان کا صحیح تقاضا بتایا ہے کہ اگر تم نے مجھے مال و اولاد میں اپنے سے کمتر پایا تھا تو یہ چیز اکڑنے اور مغرور ہونے کی نہیں تھی بلکہ اس پر تمہیں اپنے رب کا شکر گزار ہونا تھا کہ تمہارے رب نے تم کو اپنے فضل سے نوازا۔ اس کا حق یہ تھا کہ جب تم اپنے ہرے بھرے، میووں سے لدے باغ میں داخل ہوتے تو مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہتے یعنی یہ اعتراف کرتے کہ یہ سب کچھ رب کریم کا عطیہ ہے، اس کے بغیر کسی کو کوئی قوت و طاقت حاصل نہیں کہ کچھ بنا یا بگاڑ سکے۔

'اَنَا' یہاں دونوں مفعولوں کے درمیان بطور ایک فاصل کے آگیا ہے۔ اس کو جملہ سے براہ راست تعلق نہیں ہے۔ اس قسم کے زائد استعمال کی مثالیں کلام عرب میں بھی موجود ہیں اور ہماری اپنی زبان میں بھی۔

فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا (٤٠)

'حُسبان' کا مفہوم

'حُسْبَان' 'حُسْبَانَة' کی جمع ہے۔ 'حسبانہ' کڑک اور اولے کو کہتے ہیں۔

'زَلَق' کا مفہوم

'زَلَق' اس زمین کو کہتے ہیں جو بالکل چٹیل، سبزہ اور روئیدگی سے یک قلم محروم ہو۔ یعنی اگر تم نے میری غربت پر مغرورانہ طعن کیا ہے تو کچھ بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تمہارے باغ سے بہتر باغ دے اور تمہارے باغ پر کڑک اور اولے کا کوئی آسمانی عذاب بھیج دے اور وہ ایک چٹیل میدان ہو کے رہ جائے۔

اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا (٤١)

'غار الماء غورا' کے معنی ہیں پانی زمین میں نیچے اتر گیا۔

یعنی رعد اور اولے نہ سہی، یہ نہر جاری جس سے باغ سیراب ہوتا ہے اگر زمین میں غائب ہو جائے تو تم یا کوئی دوسرا کیا کر سکتا ہے۔

مغروروں کی آنکھ کا پردہ

اوپر متکبر کا قول گزرا ہے کہ 'مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا' اس نے اپنے شاداب اور پھلوں سے لدے ہوئے باغ کو دیکھ کر کہا کہ میں یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ یہ کبھی تباہ ہو جائے گا۔ یہی ذہن دنیا کے تمام مغروروں اور متکبرین کا ہوتا ہے۔ ان کو جو چین اور عیش حاصل ہوتا ہے وہ اس میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ ان کے اوپر یہ تصور بڑا شاق گزرتا ہے کہ اس میں کہیں سے کوئی رخنہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی ان کو خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ آخر ان کے قلعہ میں دراڑ پیدا ہونے کا کیا امکان ہے! لیکن جب وقت آجاتا ہے تو قدرت ایک ہی جنبش میں سارے قلعہ کو زمین بوس کر کے رکھ دیتی ہے اور اس وقت سب کو نظر آجاتا ہے کہ جس چیز کو اتنی بعید سمجھے تھے وہ بالکل پاؤں کے نیچے سے برآمد ہو گئی۔ اسی حقیقت کی طرف عبد مومن نے توجہ دلائی۔

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا (٤٢)

'احیط بالشیء' کے معنی ہیں وہ چیز تباہ کر دی گئی۔

ندامت بعد از وقت — بالآخر وہی ہوا جس سے بندۂ مومن نے ڈرایا تھا۔ کوئی آفت ارضی یا سماوی آئی اور اس نے سارے باغ کو آناً فاناً تباہ کر کے رکھ دیا۔ جن ٹٹیوں پر انگور کی بیلیں چڑھائی گئی تھیں وہ فرش زمین ہو گئیں اور سارا باغ ڈھے گیا۔ اب مغرور کی آنکھیں کھلیں، اس کو نظر آیا کہ جس باغ کی تباہی کو وہ بعید از امکان سمجھتا تھا وہ پلک جھپکتے یوں غارت ہو کے رہ گیا۔ تباہ شدہ باغ ایک میت کی طرح سامنے تھا اور وہ اس کی لاش پر کھڑا اپنے دونوں ہاتھ مل رہا تھا کہ اس سے کچھ بازیافت ہونی تو الگ رہی جو کچھ اس کے رکھ رکھاؤ پر خرچ کیا وہ بھی برباد ہوا۔ اس وقت اسے اپنے ناصح کی بات یاد آئی اور نہایت حسرت کے ساتھ بولا کہ کاش میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناتا۔

گھمنڈ شرک ہے — 'اپنے رب کا شریک نہ بناتا' یعنی غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اس خبط میں نہ پڑتا کہ یہ سب کچھ میری قابلیت و صلاحیت کا کرشمہ اور میرے استحقاقِ ذاتی کا ثمرہ ہے بلکہ اس کو اپنے رب کا فضل سمجھتا اور اسی کا شکر گزار رہتا۔

وَلَمْ تَكُن لَّهُ فِئَةٌ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِرًا (۴۳)

یعنی جب عذاب آیا تو نہ وہ پارٹی کام آئی جس پر ناز تھا اور جس کے اعتماد پر کہا تھا۔ أَنَا أَكْثَرُ مِنكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا، اور نہ اپنے ہی اندر اتنا بل بوتا تھا کہ انتقام کے لیے اٹھ سکے۔

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَخَيْرٌ عُقْبًا (۴۴)

بدوں پر عذاب نیکوں کی دادرسی ہے۔ — 'هُنَالِكَ' کا اشارہ ساعت عذاب کے ظہور کی طرف ہے۔ یعنی جب وہ وقت آجائے گا تو پھر تمام اختیار خدائے برحق ہی کے ہاتھ میں ہوگا کسی دوسرے کی کچھ پیش نہیں جائے گی، اور وہ اپنے صالح بندوں کو بہترین ثواب اور بہتر انجام سے نوازے گا۔ اوپر بدکاروں کے انجام کا ذکر ہو چکا تھا اس وجہ سے یہاں صرف خوب کاروں کے انجام کا ذکر ہوا۔ نیز یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ عذاب دنیا ہو یا عذاب آخرت اس سے اصل مقصود نیکوں کی دادرسی ہے۔ بدوں کو سزا دینا اس کا اصل مقصد نہیں بلکہ لازمی نتیجہ۔

۸۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۴۵-۴۹

آگے اس دنیا کی زندگی کی تمثیل پیش کی ہے جس کی محبت میں اندھے ہو کر یہ سرگشتگانِ غفلت قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ فرمایا کہ اس دنیا کی جتنی زینتیں ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی ساتھ جانے والی نہیں ہے، صرف آدمی کے اعمال صالحہ اس کے ساتھ جائیں گے تو جس کو کمائی کرنی ہو وہ اعمال صالحہ کی کمائی کرے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۵-۴۹

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ
فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا
وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ
وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ
صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ
نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ
مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا
يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا
حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾ ع ۶

ترجمۂ آیات ۴۵-۴۹

اور ان کو اس دنیوی زندگی کی تمثیل سناؤ کہ اس کو یوں سمجھو کہ بارش ہو جس کو ہم نے آسمان سے اتارا پس زمین کی نباتات اس سے خوب اُپجیں پھر وہ چورا ہو جائیں جس کو ہوائیں اڑائے لیے پھریں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ مال و اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والے اعمال صالحہ باعتبار ثواب اور باعتبار امید تمہارے رب کے نزدیک بہتر ہیں۔ اس دن کا خیال کرو جس دن ہم پہاڑوں کو چلا دیں گے اور تم زمین کو دیکھو گے کہ بالکل عریاں ہو گئی ہے اور ہم ان کو اکٹھا کریں گے تو ان میں سے کسی کو چھوڑیں گے نہیں۔ اور وہ سب کے سب صف بستہ تیرے رب کے حضور پیش کیے جائیں گے۔ ہم کہیں گے تم ہمارے پاس اسی طرح آئے ہو

جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا بلکہ تم نے گمان کیا کہ ہم تمہارے حساب کے لیے کوئی یوم موعود نہیں مقرر کریں گے۔ اور رجسٹر پیش کیا جائے گا تو تم مجرموں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں ہے اس سے لرزاں ہیں اور کہیں گے ہائے ہماری شامت! یہ رجسٹر عجب ہے جس نے نہ کوئی چھوٹا گناہ نوٹ کرنے سے چھوڑا ہے نہ کوئی بڑا گناہ۔ اور جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا سب موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔ ۴۵-۴۹۔

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا (۴۵)

'اِخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ' کا مفہوم — 'اِخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ' سے مطلب یہ ہے کہ زمین کی نباتات بارش کی بدولت خوب اپھیں اور اپنی کثرت اور اپنے زور کے باعث باہم دگر گتھم گتھا ہو جائیں۔

'دنیا کی زندگی' سے مراد — یہاں دنیا کی زندگی سے وہ زندگی مراد ہے جو اوپر والے پیرے میں زیر بحث آئی ہے۔ یعنی اس کی وہ زینتیں اور رونقیں جن پر فریفتہ ہو کر انسان خدا اور آخرت کو بھول بیٹھتا ہے۔ سورۂ حدید میں اس اجمال کی وضاحت فرما دی، ملاحظہ ہو۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا۔ (۲۰- حدید)	یاد رکھو کہ دنیا کی زندگی، یعنی کھیل کود، آرائش و زیبائش، باہمی تفاخر اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے مسابقت کی تمثیل اس طرح ہے کہ بارش ہو جس کی اپجائی ہوئی نباتات کافروں کے دلوں کو موہ لیں۔ پھر وہ خشک ہو جاتے اور تم دیکھو کہ وہ زرد پڑ گئی ہے پھر وہ چورا ہو جاتی ہے۔

دنیا کی زندگی کی تمثیل — اس آیت میں کئی چیزیں قابل بحث ہیں جن پر ہم ان کے محل میں گفتگو کریں گے۔ یہاں صرف اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ دنیا کی جس زندگی کی تمثیل دی گئی ہے آیت میں اس کی وضاحت بھی فرما دی گئی ہے کہ اس سے مراد لہو و لعب اور تفاخر و تکاثر کی زندگی ہے جس میں پھنس کر امراء و اغنیاء تمام حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں، عیش و تنعم، سینما اور تھیٹر، کار اور کوٹھی، مال و جائداد، روپیہ اور بینک بیلنس، عہدے اور مناصب

کے سوا کسی اور چیز کی ان کی نگاہوں میں کوئی قدر باقی رہ جاتی اور نہ کسی اور چیز کی طرف توجہ کرنے کے لیے ان کے پاس فرصت ہی ہوتی۔

اسی طرح آیت زیر بحث میں فرمایا کہ یہ دنیا کی جس زندگی پر ریجھے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس پر کبھی خزاں نہیں آئے گی، ان کو بتا دو کہ اس کی یہ بہار چند روزہ ہے۔ بارش نے وقتی رونق پیدا کر دی ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں ہے جب اس پر خاک اڑتی نظر آئے گی۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ جس طرح اس نے یہ بہار دکھائی اسی طرح وہ اس کی خزاں بھی دکھا دے گا۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا (۴۶)

خالی زینتیں

عرب میں چونکہ حمایت و مدافعت کا تمام تر انحصار خاندانی اور قبائلی عصبیت ہی پر تھا اس وجہ سے آدمی کی بڑائی کی علامتوں میں سے مال کے ساتھ اولاد کی کثرت بھی تھی۔ وہ اپنی باہمی مفاخرت کی مجلسوں میں کثرت اولاد کا ذکر خاص طور پر کرتے۔ اوپر جو مفاخرت مذکور ہوئی ہے اس میں بھی اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا کے الفاظ اسی ذہن کی غمازی کر رہے ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ مال و اولاد جن کے عشق میں تم دیوانے ہو رہے ہو۔ یہ تو محض اس دنیا کی زینتیں ہیں اور یہ دنیا اور اس کی تمام زینتیں چند روزہ ہیں۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی بقا اور پائداری حاصل نہیں۔ خدا کے ہاں اجر اور امید کے لحاظ سے بہتر وہ اعمالِ صالحہ ہیں جو ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں۔ اگر امید باندھنی ہے تو ان سے باندھو۔ ابدی برکات و نتائج انہی سے حاصل ہوں گے۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا (۴۷)

'وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً' یعنی آج تو یہ زمین لدی پھندی نظر آتی ہے۔ اس میں پہاڑ گڑے ہوئے ہیں۔ عالیشان ایوان و محل کھڑے ہیں۔ یہ باغوں اور چمنوں سے آراستہ ہے لیکن ایک دن آئے گا کہ دوسری چیزوں کا تو کیا ذکر اس کے پہاڑ بھی اکھاڑ دیے جائیں گے اور یہ ایک صفاچٹ میدان بن جائے گی۔ اس کی ہر رونق اس سے چھین لی جائے گی۔ فرمایا کہ اس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے، کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ نہ امیر کو، نہ غریب کو، نہ آقا کو، نہ غلام کو، نہ عابد کو نہ معبود کو۔

وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ۭ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ ۡ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا (۴۸)

خالی ہاتھ واپسی

اس دن سب کی پیشی تیرے رب کے حضور ہو گی صف بستہ۔ آج یہ اپنی امارت و ریاست کے گھمنڈ میں اکڑتے ہیں لیکن اس دن یہ غلاموں کی طرح اپنے رب کے آگے صف باندھے ہوئے حاضر ہوں گے اور ہم ان سے کہیں گے کہ دیکھو! جس طرح تم دنیا میں خالی ہاتھ گئے تھے اسی طرح آج خالی ہاتھ تم ہمارے پاس

حاضر ہوگئے۔ یعنی نہ آج تمہارے ساتھ تمہارے خدم و حشم ہیں اور نہ وہ اموال و اسباب جن پر تم دنیا میں نازاں تھے ’وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ‘ جو کچھ ہم نے تمہیں بخشا تھا وہ سب تم نے اپنے پیچھے چھوڑا۔ ’بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا‘ یعنی اس بےبسی اور محرومی کا تو تمہیں بھلا کیا گمان ہوتا، تم تو اس زعم میں مبتلا تھے کہ تمہارے حساب کتاب کے لیے سرے سے کوئی دن ہی مقرر نہیں ہے۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (۴۹)

دفترِ اعمال ’الکتٰب‘ سے مراد لوگوں کے اعمال کا دفتر ہے۔ فرمایا کہ یہ دفتر لوگوں کے سامنے لایا جائے گا اس وقت مجرم چونکہ اپنی کرتوتوں سے واقف ہوں گے، اس دفتر کے کھلنے سے لرزاں و ترساں ہوں گے اور جب وہ کھلے گا اور سب کا سارا کچا چٹھا سامنے آجائے گا تو وہ پکار اٹھیں گے کہ ہائے ہماری شامت! عجیب ہے یہ کتاب کہ کوئی چھوٹی بڑی بات بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں رہ گئی ہے اور وہ اپنا سارا کیا دھرا اپنے سامنے موجود پائیں گے۔ فرمایا کہ یہ اہتمام اس لیے ہوگا کہ تمہارا رب کسی پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔ وہ ہر ایک کو وہی کچھ دے گا جو اس نے کمایا ہوگا۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۵۰-۵۹

آگے آدمؑ و ابلیس کے ماجرے کا حوالہ دے کر قریش کو متنبہ کیا ہے کہ تم اس انکار و تکذیب میں بالکل سنتِ ابلیس کی پیروی کر رہے ہو۔ تم نے اسی ابلیس اور اس کی ذریت کو اپنا کارساز اور معبود بنا رکھا ہے جس نے قیامت تک کے لیے اولادِ آدم کو دشمنی کا چیلنج دے رکھا ہے۔ یہ تم نے خدا کو چھوڑ کر نہایت ہی برا بدل اپنے لیے تلاش کیا ہے۔ یہ قرآن جو تم کو سنایا جا رہا ہے، تمہارے لیے عظیم رحمت ہے۔ یہ حقیقت کو تمہارے سامنے گوناگون پہلوؤں سے پیش کر رہا ہے کہ بات تمہارے ذہن نشین ہو جائے لیکن تم رحمت کی جگہ عذاب کے اور روٹی کے بجائے پتھر کے طالب ہو اور مطالبہ کر رہے ہو کہ جب تک وہ عذاب تم کو نہ دکھا دیا جائے جس سے قرآن تمہیں ڈراتا ہے اس وقت تک تم اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہو۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ رسول کا کام عذاب لانا نہیں ہوتا بلکہ صرف انذار و تبشیر ہوتا ہے۔ تم اپنا فرض انجام دو اور ان لوگوں کو، جن کے دلوں پر پردے پڑ چکے ہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، تمہارا رب غفور رحیم ہے اس وجہ سے ان کو مہلت دے رہا ہے۔ وہ اگر فوراً عذاب دینا چاہے تو ابھی ان کی کمر توڑ کے رکھ دے لیکن اس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے تو اسی پر بھروسہ کرو اور صبر کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہو ــــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت کیجیے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ آیات ۵۰-۵۹
مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ
مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾ مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ
خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ
الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ
فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَاَ
الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا
مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ ع ۷ ۱۹
وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ
يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ
سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ
اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ
لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا
قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ
فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا
اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا
كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ

دُوۡنِهٖ مَوۡىِٕلًا ﴿۵۸﴾ وَتِلۡكَ الۡقُرٰٓى اَهۡلَكۡنٰهُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا وَجَعَلۡنَا

ع لِمَهۡلِكِهِمۡ مَّوۡعِدًا ﴿۵۹﴾

ترجمۂ آیات ۵۰-۵۹

اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے، وہ جنوں میں سے تھا پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ تو کیا تم اس کو اور اس کی ذریت کو میرے سوا اپنا کارساز بناتے ہو، درآنحالیکہ وہ تمہارے دشمن ہیں ؟ ظالموں کے لیے کیا ہی برا بدل ہے! اور میں نے ان کو نہ تو آسمانوں اور زمین کے پیدا کرتے وقت بلایا اور نہ خود انہی کو پیدا کرتے وقت بلایا اور میں گمراہ کرنے والوں کو دست و بازو بنانے والا نہ تھا۔ ۵۰-۵۱

اور یاد کرو جس دن وہ فرمائے گا کہ بلاؤ تو میرے شریکوں کو جن کو تم نے میرا شریک گمان کیا تو وہ ان کو بلائیں گے لیکن وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک مہلکہ حائل کر دیں گے اور مجرم دوزخ کو دیکھیں گے اور گمان کریں گے کہ وہ اسی میں گرنے والے ہیں اور وہ اس سے کوئی مفر نہیں پائیں گے۔ ۵۲-۵۳

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی رہنمائی کے لیے ہر قسم کی تنبیہات گوناگوں پہلوؤں سے بیان کر دی ہیں لیکن انسان سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے اور لوگوں کو بعد اس کے کہ ان کے پاس خدا کی ہدایت آچکی ہے، ایمان لانے اور اپنے رب سے مغفرت مانگنے سے نہیں روکا ہے مگر اس چیز نے کہ وہ چاہتے ہیں کہ خدا کا وہی معاملہ ان کے لیے بھی ظاہر ہو جائے جو اگلوں کے لیے ظاہر ہوا یا عذابِ الٰہی ان کے سامنے سے نمودار ہو جائے اور رسولوں کو تو ہم صرف خوشخبری دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجتے ہیں۔ اور یہ کافر باطل کی مدد سے کٹ حجتیاں

کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے حق کو پسپا کر دیں اور انھوں نے میری آیات کو اور اس چیز کو جس سے ان کو ڈرایا گیا ہے، مذاق بنا رکھا ہے۔ اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جن کو ان کے رب کی آیات کے ذریعے سے یاددہانی کی جائے تو وہ اس سے اعراض کریں اور اپنے ہاتھوں کی کرتوت کو بھول جائیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ دے دی ہے کہ اس کو نہ سنیں۔ اس وجہ سے تم ان کو ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ وہ کبھی ہدایت پانے والے نہیں ہیں۔ اور تمھارا رب بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔ اگر وہ ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑنا چاہتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا لیکن ان کے لیے ایک مقررہ وقت ہے اور وہ اس کے مقابل میں کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائیں گے۔ اور یہ بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا جب کہ ان کے لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے ایک وقت مقرر کیا۔ ۵۰-۵۹۔

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّیَّتَهٗٓ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَهُمْ لَکُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا (۵۰)

ابلیس جنات میں سے تھا

آدم اور ابلیس کے ماجرے پر سورۂ بقرہ و اعراف میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ یہاں ابلیس کی اصل و نسل سے متعلق اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ جنات ہی سے تھا۔ اس نے خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور راندہ ہوا۔ ابلیس کوئی مستقل اور غیر فانی مخلوق نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں بلکہ یہ اس جن کا لقب ہے جس نے حضرت آدم کو دھوکا دیا۔ حضرت آدم اور ان کی اولاد کے ساتھ اس کی دشمنی معلوم و مشہور ہے۔ اس کی ذریت اپنے جد اعلیٰ کے مشن کو پوری جانفشانی کے ساتھ پورا کر رہی ہے اور اس نے خود انسانوں میں سے انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایسے ایسے پرفن دجال تیار کیے ہیں کہ خود ابلیس بھی ان کو دیکھے تو ان کی کارروائی پر عش عش کر اٹھے اور ان کو داد دے کہ شاباش میرے فرزندو، خلق خدا کو گمراہ کرنے کے فن میں تم نے میرے بھی کان کتر لیے!

قریش کی ناعاقبت اندیشی پر اظہار افسوس

یہاں قریش کے متکبرین کو ابلیس اور اس کی ذریت کی اس پشتینی عداوت کو یاد دلا کر ان کے حال پر افسوس کیا گیا ہے کہ تمہاری بدبختی کی انتہا ہے کہ تم نے ابلیس اور اس کی ذریت کو تو اپنا مرجع اور کارساز بنایا اور خدا کو چھوڑ بیٹھے۔ پھر ان سے منہ پھیر کر فرمایا کہ کیا ہی برا بدل ہے جس کو خدا کی جگہ ان ظالموں نے اپنے لیے اختیار کیا!

مشرکین عرب میں جنات کی پوجا

یہاں وہ بات یاد رکھنی چاہیے جس کا ذکر ہم سورۂ انعام کی تفسیر میں کر چکے ہیں کہ مشرکین عرب جنات کو مختلف شکلوں میں پوجتے تھے۔ وہ ہر وادی اور ہر پہاڑ کے الگ الگ جن اور بھوت مانتے اور ان کی آفتوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کی جے پکارتے اور ان کو نذرانے اور چڑھاوے پیش کرتے۔ بعض جن تو اتنے خطرناک سمجھے جاتے کہ ان کو راضی رکھنے کے لیے بدقسمت لوگ اپنی اولاد تک کی قربانی پیش کرتے۔ ان کا وہم یہ تھا کہ اگر اس جن کو اپنی کسی اولاد کی قربانی دے کر راضی نہ رکھا گیا تو وہ ساری اولاد کو چٹ کر جائے گا۔

قرآن نے اس آیت میں یہ یاد دلا کر کہ ابلیس جنوں میں سے تھا مشرکین کو غیرت دلائی کہ بے شرمو! جن کے مورث اعلیٰ نے تمہارے جد اعلیٰ کے ساتھ یہ کچھ دشمنی کی تم ان کے یوں مرید اور نیاز مند بن کے رہ گئے ہو!

شامت زدگی کی آخری حد

'بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا' میں 'ظٰلِمِیْنَ' سے مراد مشرکین ہیں۔ یہ جملہ اظہار تعجب اور اظہار افسوس کا ہے کہ ان ظالموں نے خدا کا بدل بھی ڈھونڈا تو اپنے باپ اور ان کی ذریت کے ابدی دشمن کو! یہ شامت زدگی کی آخری حد ہے!

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا (۵۱)

طنزیہ اسلوب بیان

اس آیت کا اسلوب بیان طنزیہ ہے یعنی ان شیاطین کو اس فیاضی کے ساتھ میری خدائی اور میرے حقوق میں شریک بنا دیا گیا ہے حالانکہ نہ میں نے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرتے وقت ان کو بلایا کہ ذرا اس مہم میں میری مدد کریں اور نہ خود انہی کو پیدا کرتے وقت ان کو دعوت دی کہ ذرا اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں اور نہ میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بنانے کا روادار تھا لیکن آج یہ میری خدائی میں اس طرح شریک بنا دیے گئے ہیں کہ گویا سارے کارنامے انہی کے انجام دیے ہوئے ہیں۔

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا (۵۲)

'موبق' کا مفہوم

'موبق' کے معنی ہلاکت کا کھڈ، تباہی کا گڑھا۔

نفسی نفسی کا دن

یہ اس دن کی محرومی کو یاد دلایا ہے جس دن وہ ان مشرکین سے فرمائے گا کہ جن کو تم میرا شریک مانتے رہے ہو اب ان کو اپنی مدد کے لیے پکارو۔ چنانچہ وہ ان کو پکاریں گے لیکن وہ کوئی جواب نہ دیں گے اس لیے کہ ان کو خود اپنی پڑی ہوگی، وہ دوسروں کے قضیے کیا نبیڑیں گے۔ فرمایا کہ ان کے درمیان ایک تباہی کا کھڈ حائل ہوگا، نہ یہ ان کے پاس جا سکیں گے اور نہ وہ ان کے پاس پہنچ سکیں گے۔

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا (۵۳)

بے بسی کی تصویر

اور یہ مجرم کھلی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ سامنے جہنم تیار ہے اور اب لازماً ان کو اسی میں گرنا ہے لیکن وہ اس سے کوئی مفر نہیں پائیں گے۔ یہ ان کی بے بسی کی تصویر ہے کہ آنکھوں دیکھتے وہ اس جہنم میں گریں گے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۵۴)

مثل سے مراد

'مثل' سے مراد یہاں عالم غیب اور آخرت کے وہ حقائق ہیں جو تمثیل کے رنگ میں اور لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لیے سنائے گئے ہیں اور 'انسان' سے وہی جھگڑالو مخاطب ہیں جن سے یہاں بحث چل رہی ہے لیکن ان سے بیزاری کے اظہار کے لیے بات عام صیغہ سے کہہ دی گئی ہے۔

فرمایا کہ ہم نے تو لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لیے ہر قسم کی تنبیہات اس قرآن میں گوناگوں پہلوؤں سے بیان کر دی ہیں لیکن انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ وہ ان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کوئی نہ کوئی پہلو اعتراض کا ڈھونڈھ ہی لیتا ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَاۗءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا (۵۵)

'الناس' سے مراد یہاں بھی وہی لوگ ہیں جن سے بحث چل رہی ہے اور 'قبلا' کے معنی سامنے اور روبرو کے ہیں۔

مائدہ آسمانی کی جگہ قہر آسمانی کا طلب

مطلب یہ ہے کہ قرآن نے تو ہر قسم کی تنبیہات سنا دی ہیں، کوئی چیز مخفی نہیں رہ گئی ہے، لیکن جو لوگ حقیقت سے گریز کرنا چاہتے ہیں وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھ ہی لیتے ہیں۔ اب ان لوگوں کا یہ مطالبہ ہے کہ یا تو ان پر اسی طرح کی تباہی آجائے جس طرح کی تباہی پچھلی قوموں پر آئی اور جس سے قرآن ڈرا رہا ہے یا کم از کم یہ کہ عذاب سامنے سے آتا دکھائی دے اور وہ اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ لیں۔ اس کے بغیر وہ اس ہدایت پر ایمان لانے اور توبہ و استغفار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ قرآن ان کے آگے مائدۂ آسمانی بچھا رہا ہے لیکن یہ قہر آسمانی کے طلب گار ہیں! ایسے شامت زدوں کا بھلا کیا علاج! ان کو معلوم نہیں ہے کہ جب عذاب الٰہی نمودار ہو جائے گا تو وہ دیدار کر کے واپس نہیں چلا جائے گا بلکہ ان کا کچومر نکال کر رکھ دے گا تو اس کے بعد یہ کس چیز پر ایمان لائیں گے!

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا (۵۶)

رسولوں کی بعثت کا مقصد

یہ اوپر والے مطالبۂ عذاب کا جواب ہے۔ فرمایا کہ ہم رسولوں کو عذاب لانے کے لیے نہیں بھیجا کرتے بلکہ صرف انذار و تبشیر کے لیے بھیجا کرتے ہیں کہ وہ کافروں کو عذاب سے خبردار کریں اور ایمان لانے والوں کو جنت کی بشارت دے دیں۔ ان سے عذاب اور قیامت کو دکھا دینے کا مطالبہ کرنا ایک بالکل بے تکی بات اور حق کو

باطل کے ذریعے سے پسپا کرنے کے ہم معنی ہے۔ جو لوگ یہ شرارت کر رہے ہیں انھوں نے عذاب اور قیامت کی حقیقت نہیں سمجھی ہے۔ انھوں نے ہماری تنبیہی آیات اور خدا کی پکڑ کو مذاق بنا لیا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا (۵۷)

بدقسمتوں کے حال پر افسوس

یہاں بدقسمت لوگوں کی حالت پر افسوس کیا ہے کہ اپنی جانوں پر اس سے بڑھ کر ظلم ڈھانے والا کون ہو سکتا ہے جن کو آیاتِ الٰہی کے ذریعے سے یاد دہانی کی جائے لیکن وہ اس سے نفع اٹھانے کے بجائے ان کو ٹھکرائیں اور عذاب کا مطالبہ کریں اور یہ نہ سوچیں کہ جو اعمال انھوں نے کیے ہیں ان کی بنا پر وہ ہر وقت عذابِ الٰہی کے سزاوار ہیں۔ اگر ان کو مہلت مل رہی ہے تو محض خدا کی رحمت کے سبب سے مل رہی ہے۔

ختم قلوب کی سزا

فرمایا کہ یہ اپنی کرتوتوں کے سبب سے ختم قلوب کے سزاوار ہو چکے ہیں اس وجہ سے ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ قرآن کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ دے دی ہے کہ وہ اس کو نہ سنیں گویا اصل تالیفِ کلام یوں ہوگی۔ 'اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا مِنْ اَنْ يَّسْمَعُوْهُ' عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق 'اَنْ' سے پہلے 'مِنْ' یا 'کراھۃ' کا لفظ محذوف ہو گیا اور تقابل کے اصول پر 'فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا' کے بعد 'اَنْ يَّسْمَعُوْهُ' کے الفاظ حذف ہو گئے۔

'وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا'۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کے قانون کے تحت ان کے دلوں پر پردے پڑ چکے ہیں اور ان کے کان بہرے ہو چکے ہیں تو اب تم ان کو لاکھ اللہ کی آیات سناؤ وہ ہدایت قبول کرنے والے نہیں بن سکتے۔ اب ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو اور صبر کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہو تا آنکہ ان پر اچھی طرح حجت تمام ہو جائے۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا (۵۸)

مجرموں کو مہلت دینے کی حکمت

'مَوْئِل' کے معنی پناہ کی جگہ کے ہیں۔ اب یہ سبب بتایا جا رہا ہے اس بات کا کہ جب یہ ایسے نابکار لوگ ہیں کہ یہ کبھی ہدایت قبول کرنے والے نہیں ہیں تو آخر ان کو بارِ زمین بنائے رکھنے سے فائدہ کیا؟ کیوں نہ ان کے اوپر وہ عذاب بھیج کر جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں ان کو ختم ہی کر دیا جائے۔ فرمایا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ خدا بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے اس وجہ سے وہ مجرموں کو بھی انتہائی حد تک مہلت دیتا ہے۔ ورنہ اگر وہ ان کو فوراً پکڑنا چاہے تو ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑ لے، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں بن سکتا۔ لیکن اللہ جلدی نہیں کرتا بلکہ اس نے ان کی گرفتاری کے لیے ایک وقت ٹھہرا رکھا ہے۔ جب وہ آ جائے گا تو یہ اس سے کہیں نہیں بھاگ سکیں گے۔

وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِم مَّوْعِدًا (۵۹)

تاریخ کی شہادت

یہ اوپر والی بات پر تاریخی شہادت کی طرف اشارہ فرما دیا کہ یہ سامنے ان قوموں کی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ہلاک کر دیا۔ یہ ان کی بستیوں پر سے اپنے سفروں میں گزرتے ہیں ان کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔ ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے بھی ایک وقت مقرر کیا تھا چنانچہ جب وہ آگیا تو وہ تباہ کر دی گئیں۔

۱۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۶۰-۸۲

صبر کی عقائدی بنیادیں

پیچھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اعدائے حق اور متکبرین کے مقابل میں جس صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے آگے کی آیات میں اسی مضمون کی تکمیل کر دی گئی ہے۔ گویا سورہ اس مقام پر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ صبر کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ یہ کوئی منفی چیز نہیں بلکہ ایک مثبت حقیقت ہے۔ اسی پر تمام حق کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔ جس کے اندر یہ صفت راسخ نہ ہو وہ نہ تو خدا کا حق ادا کر سکتا ہے نہ بندوں کا۔ اس صفت کو راسخ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی عقائدی بنیادیں دل کے اندر راسخ ہوں۔ جب تک یہ بنیادیں اچھی طرح راسخ نہ ہوں صبر کا اور سے چپکا یا نہیں جا سکتا۔ یہ عقائدی بنیادیں تین ہیں۔

ایک یہ کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے سب خدا کے اذن اور اس کے ارادہ و مشیت کے تحت واقع ہوتا ہے۔ اس کے اذن و ارادہ کے بغیر ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا۔

دوسری یہ کہ خدا خیر مطلق اور حکیم ہے اس وجہ سے اس کا کوئی ارادہ بھی خیر اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ اگر اہل باطل کو ڈھیل دیتا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ باطل سے محبت کرتا یا اس کے آگے بے بس اور مجبور ہے بلکہ اس کے اندر بھی وہ کسی خیر عظیم کی پرورش کرتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ اہلِ حق کو مصائب و آلام میں مبتلا کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اسے اہلِ حق کے مصائب سے کوئی دلچسپی ہے بلکہ وہ اس طرح ان کے لیے کسی بڑے خیر کی راہیں کھولتا ہے۔

تیسری یہ کہ انسان کے علم کی رسائی محدود ہے اس وجہ سے وہ خدا کے ہر ارادہ کی حکمت کو اس دنیا میں نہیں معلوم کر سکتا۔ اس کے ارادوں کے تمام اسرار صرف آخرت ہی میں بے نقاب ہوں گے۔ اس دنیا میں انسان کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ خدا کے تمام فیصلوں پر صابر و شاکر رہتے ہوئے اپنا فرض ادا کرے اور مطمئن رہے کہ آج کی تلخیوں کے اندر جو خیر بھی چھپی ہوئی ہے اس کے روح افزا ثمرات ان شاء اللہ کل سامنے آئیں گے۔

حضرت موسیٰ کا ایک تربیتی سفر

اس کائنات کے اس رمز کو سمجھنے کے لیے یہاں حضرت موسیٰ کے ایک تربیتی سفر کی سرگزشت سنائی گئی ہے۔ حکمت کے اسرار واقعاتِ زندگی میں جس طرح مصور ہو کر سامنے آتے ہیں مجرد اظہار و بیان سے اس طرح سامنے نہیں آتے۔ حضرت موسیٰ کو اصلاح و تربیت کے لیے جو قوم ملی تھی وہ نہایت سکرو اور بزدلی تھی اور جس دشمن سے ان

کا سابقہ تھا وہ نہایت جبار و قہار تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی حکمت مقتضی ہوئی کہ وہ صبر میں نہایت راسخ و پختہ ہو جائیں تاکہ مخالف حالات کا پورے عزم و جزم کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ خدا نے ان کو اپنے ایک ایسے بندے کے پاس بھیجا جس کو اس نے کچھ خاص علم عطا فرمایا تھا۔ اس بندے نے حضرت موسیٰؑ پر خدا کے حکم سے اس کے ارادوں کے چند اسرار بے نقاب کیے جو تربیتِ صبر و رضا کے پہلو سے نہایت اہم تھے۔

مفسرین کی ایک غلط فہمی

ہمارے نزدیک حضرت موسیٰؑ کے اس سفر کا مقصد یہی تھا لیکن بعض مفسرین نے معلوم نہیں کہاں سے یہ فضول سی بات لکھ دی ہے کہ نعوذ باللہ حضرت موسیٰؑ ترنگ میں آکر کسی دن یہ کہہ بیٹھے تھے کہ اس وقت مجھ سے بڑا عالم کوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بطور تادیب و تنبیہ ان کو اپنے ایک بندے کے پاس بھیجا کہ وہ دیکھ لیں کہ ان سے بھی بڑا ایک عالم موجود ہے۔ اول تو حضرت موسیٰؑ ایسی بے محل بات فرماتے کیوں اور اگر انھوں نے فرمائی تو یہ کوئی غلط بات تو نہیں فرمائی۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ نبی سب سے بڑا عالم ہوتا ہے اور وہ اپنی پوری قوم کے سامنے اس حقیقت کا آشکارا طور پر اعلان بھی کرتا ہے۔ یہ بات ہر نبی نے اپنی قوم سے کہی ہے 'اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ' (اے میری قوم کے لوگو! میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) لیکن کسی نبی کی یہ بات نہ تو فخر و تعلی پر محمول کی گئی اور نہ اس کی بنا پر وہ مستوجب تادیب قرار پایا تو آخر حضرت موسیٰؑ ہی اس کے سبب سے کیوں سزا وار تنبیہ ٹھہرے؟ بہرحال یہ شانِ نزول بالکل لایعنی ہے۔ اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ اب اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۰-۸۲

وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبۡرَحُ حَتّٰۤی اَبۡلُغَ مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَيۡنِ اَوۡ اَمۡضِیَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا بَلَغَا مَجۡمَعَ بَيۡنِهِمَا نَسِيَا حُوۡتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيۡلَهٗ فِی الۡبَحۡرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدۡ لَقِيۡنَا مِنۡ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اَرَءَيۡتَ اِذۡ اَوَيۡنَاۤ اِلَی الصَّخۡرَةِ فَاِنِّیۡ نَسِيۡتُ الۡحُوۡتَ وَمَاۤ اَنۡسٰنِيۡهُ اِلَّا الشَّيۡطٰنُ اَنۡ اَذۡكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيۡلَهٗ فِی الۡبَحۡرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبۡغِ ۖ فَارۡتَدَّا عَلٰۤی اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾ فَوَجَدَا عَبۡدًا مِّنۡ عِبَادِنَاۤ اٰتَيۡنٰهُ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَعَلَّمۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّا

عِلْمًا ﴿٦٥﴾ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ
رُشْدًا ﴿٦٦﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ
عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿٦٨﴾ قَالَ سَتَجِدُنِىْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ
صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِىْ لَكَ اَمْرًا ﴿٦٩﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِىْ فَلَا تَسْـَٔلْنِىْ
عَنْ شَىْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٧٠﴾ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى ع ۹ ۱۱ ۲۱
اِذَا رَكِبَا فِى السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ
جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴿٧١﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ﴿٧٢﴾
قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِىْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِىْ مِنْ اَمْرِىْ عُسْرًا ﴿٧٣﴾
فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ
بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿٧٤﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ
لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ﴿٧٥﴾ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَىْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا
تُصٰحِبْنِىْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّىْ عُذْرًا ﴿٧٦﴾ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ
اَهْلَ قَرْيَةِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا
جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ
عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿٧٧﴾ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِىْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ
بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٧٨﴾ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ
لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِى الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ
مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿٧٩﴾ وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ

فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿٨٠﴾ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا
رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾ وَاَمَّا الْجِدَارُ
فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ
كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا
كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ
مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٨٢﴾ ع

ترجمۂ آیات ۶۰ - ۸۲

اور یاد کرو، جب کہ موسیٰؑ نے اپنے شاگرد سے کہا کہ میں چلتا رہوں گا یہاں تک کہ یا تو دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچ جاؤں یا اسی طرح سال ہا سال چلتا ہی رہوں گا۔ پس جب وہ ان کے ملنے کی جگہ پہنچے تو وہ اپنی مچھلی بھول گئے اور اس نے دریا میں اپنی راہ لی۔ پس جب وہ آگے بڑھ گئے تو موسیٰؑ نے اپنے شاگرد سے کہا کہ اب ہمارا کھانا لاؤ، ہمارے اس سفر سے تو ہم کو بڑی تکان ہو گئی۔ اس نے کہا کیا عرض کروں، جب ہم نے چٹان کے پاس پناہ لی تو میں مچھلی کو بھول گیا، اور یہ شیطان ہی تھا جس نے اس کو یاد رکھنے سے مجھے غافل کر دیا، اور اس نے عجیب طرح اپنی راہ دریا میں نکال لی۔ اس نے کہا، یہی تو ہمیں مطلوب تھا! پس وہ اپنے نقش قدم دیکھتے ہوئے واپس لوٹے تو انھوں نے پایا ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو جس کو ہم نے اپنے خاص فضل سے نوازا تھا اور جس کو خاص اپنے پاس سے علم عطا فرمایا تھا۔ ۶۱-۶۵

موسیٰؑ نے اس سے درخواست کی کہ کیا میں آپ کے ساتھ بایں شرط رہ سکتا ہوں کہ جو علم آپ کو عطا ہوا ہے آپ اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھائیں؟ اس نے جواب دیا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور آخر جو باتیں تمہارے دائرۂ علم سے باہر ہوں گی ان پر تم سے صبر ہو بھی کیسے سکے گا۔

اس نے کہا انشاءاللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ میں کسی معاملے میں بھی آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ ۶۶-۶۹

اس نے کہا اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو یہ شرط ہے کہ کسی چیز کے متعلق مجھ سے اس وقت تک کچھ نہ پوچھیو جب تک میں خود ہی اس کا کچھ ذکر نہ چھیڑوں۔ بالآخر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے اس میں چھید کر دیا۔ موسیٰؑ نے کہا کیا یہ چھید آپ نے اس میں اس لیے کیا ہے کہ اہل کشتی کو غرق کر دیں؟ یہ تو آپ نے بڑی ہی عجیب حرکت کی! اس نے کہا، میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے! موسیٰؑ نے کہا میری بھول چوک پر مواخذہ نہ کیجیے اور میرے معاملہ میں زیادہ سخت گیری نہ فرمائیے۔ ۷۰-۷۳

پھر چلے، یہاں تک کہ جب ایک لڑکے سے ملاقات ہوئی تو اس نے اس کو قتل کر ڈالا۔ موسیٰؑ نے کہا آپ نے ایک معصوم جان کو بغیر کسی قصاص کے قتل کر ڈالا! یہ تو آپ نے بڑی ہی منکر بات کی! اس نے کہا، میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے! موسیٰؑ نے کہا، اب اس کے بعد اگر میں آپ سے کسی امر کے متعلق پوچھوں تو مجھے ساتھ نہ رکھیے گا۔ آپ میری جانب سے حد عذر کو پہنچ گئے۔ پھر چلے یہاں تک کہ جب پہنچے ایک بستی والوں کے پاس تو ان سے کھانا کھلانے کی درخواست کی لیکن انھوں نے ان کی میزبانی سے انکار کر دیا۔ تو انھوں نے وہاں ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی، وہ دیوار اس نے کھڑی کر دی۔ موسیٰؑ نے کہا اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ مزدوری بھی ٹھہرا لیتے۔ اس نے کہا بس اب میرے اور تمھارے درمیان یہ جدائی ہے۔ میں اب تمھیں ان باتوں کی حقیقت بتاؤں گا جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ ۷۴-۷۸

کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے، میں نے

چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا جو تمام کشتیوں کو زبردستی غصب کر رہا تھا۔ ۷۹

رہا لڑکا تو اس کے ماں باپ باایمان تھے۔ ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بڑا ہو کر سرکشی و ناشکری سے ان پر تعدی نہ کرے۔ پس ہم نے چاہا کہ اُن کا رب اُن کو اس کی جگہ ایک ایسا فرزند عطا فرمائے جو پاکیزہ نفسی میں اس سے بہتر اور مروت و دردمندی میں اس سے بڑھ کر ہو۔ ۸۰-۸۱

اور رہا دیوار کا معاملہ تو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ اس کے نیچے ان کا دفینہ تھا اور ان کا باپ ایک صالح آدمی تھا۔ تیرے رب نے یہ چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا دفینہ نکالیں۔ یہ تیرے رب کی عنایت سے ہوا۔ اور یہ جو کچھ میں نے کیا اپنی رائے سے نہیں کیا۔ یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ ۸۲

۱۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا (۶۰)

'فتیٰ' کا مفہوم — 'فتیٰ' کا ترجمہ میں نے 'خادم'، 'نوجوان' یا 'لڑکے' کے بجائے شاگرد کیا ہے۔ اس میں فی الجملہ 'جوان' ہونے کا مفہوم بھی آجاتا ہے اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس جوان کے تعلق کی نوعیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے اس مہم میں رفاقت کے لیے جن الفاظ میں اس جوان سے استمزاج کیا ہے اس سے یہی متبادر ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت محض ایک نوکر کی نہیں بلکہ ایک نوجوان صحابی کی تھی جو حضرت موسیٰؑ کے شاگرد بھی تھے اور ان کی خدمت بھی کرتے تھے۔

'مجمع البحرین' سے مراد — 'مجمع البحرین' سے مراد غالباً خلیج عقبہ اور سویز کا وہ مقام اتصال ہے جہاں سے بعد کے مراحل میں حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے ساتھ گزرے ہیں۔

'حقب' کا مفہوم — 'حقب' کے معنی زمانہ، سال، ۸۰ سال یا اس سے بھی زیادہ مدت کے ہیں۔

حضرت موسیٰ کو اس سفر کی ہدایت ظاہر ہے کہ وحی کے ذریعہ سے ہوئی ہوگی۔ انھوں نے اس کا اظہار اپنے شاگرد سے کیا اور ان کے لفظ لفظ سے اس سفر کے لیے ان کا عزم بالجزم اور ذوق و شوق ٹپک رہا ہے۔

فرماتے ہیں کہ میں یا تو مجمع البحرین میں اس مقام تک پہنچ جاؤں گا جہاں پہنچنے کے لیے مجھے ہدایت ہوئی ہے یا پھر اسی منزلِ مقصود کی تلاش میں سالہا سال گزار دوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمت ہے تو اس سفر میں ساتھ دو ورنہ یہ بندہ تو بہرحال اس محبوب سفر پر روانہ ہو رہا ہے اور اس عزم کے ساتھ روانہ ہو رہا ہے کہ ع

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا (۶۱)

'سرب' کا مفہوم — 'سرب' کے معنی برتن سے پانی کے بہ جانے کے ہیں۔

ایک عجیب واقعہ — یہاں سرگزشت کا بہت سا حصہ محذوف ہے جو قرینہ سے واضح ہے۔ یعنی دونوں نے سفر کیا اور مجمع البحرین پہنچ گئے۔ یہاں ذرا دم لینے کے لیے ایک پہاڑی کے دامن میں بیٹھے، پھر وہاں سے چلے تو ناشتہ کے لیے جو مچھلی ساتھ لی تھی وہ ساتھ لینا بھول گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد، معلوم ہوتا ہے، شاگرد کو یہ بات یاد آئی اور وہ مچھلی لینے کے لیے واپس لوٹے لیکن یہاں پہنچے تو دیکھا کہ مچھلی نے ان کے سامنے تڑپ کر پانی کی راہ لی۔ یہ واقعہ اتنا عجیب تھا کہ شاگرد نے غالباً اس اندیشہ سے حضرت موسیٰؑ سے ذکر کرنے کی جرأت نہیں کی کہ وہ اتنی عجیب و غریب بات باور نہیں کریں گے اور عجب نہیں کہ ان کے عتاب شدید سے دوچار ہونا پڑے۔ چنانچہ آگے کو چل پڑے، شاگرد اسی حیص بیص میں رہا کہ اس واقعہ کا ذکر کروں یا نہ کروں اور حضرت موسیٰؑ نے خیال فرمایا ہو گا کہ شاگرد نے مچھلی اٹھا لی ہو گی۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا (۶۲)

'غداء' کا مفہوم — 'غَدَاء' کے معنی ناشتہ اور نہاری کے ہیں اور 'نصب' کے معنی تکان کے۔ یہاں 'غداء' کا لفظ اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ مچھلی بھنی ہوئی تھی۔ بے بھنی یا زندہ مچھلی کے لیے 'غَدَاء' کا لفظ کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

بالآخر جب وہاں سے کچھ دور نکل گئے تو حضرت موسیٰؑ نے شاگرد سے کہا کہ بھئی! اس سفر نے تو تھکا دیا اب ناشتہ لاؤ تو کچھ کھا لیا جائے۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا (۶۳)

شاگرد کی معذرت — مجبوراً شاگرد کو راز سے پردہ اٹھانا پڑا۔ جھجکتے اور ڈرتے ہوئے بولے کہ کیا عرض کروں جب ہم نے پہاڑی کے دامن میں پناہ لی تھی تو میں وہیں مچھلی بھول آیا تھا اور یقیناً یہ شیطان ہی کی حرکت تھی کہ میں اس کو یاد رکھنے سے قاصر رہا۔ پھر جا کے دیکھا تو مچھلی نے نہایت حیرت انگیز طریقہ سے دریا میں اپنی راہ نکال لی۔

'اَرَءَيْتَ' کا لفظ یہاں قائل کی جھجک کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسے ہم بولتے ہیں 'کیا عرض کروں' 'ذرا دیکھیے تو سہی' 'وَمَآ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ' کے الفاظ نہایت شستہ الفاظ میں اپنی کوتاہی کی معذرت کے لیے ہیں۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا (۶۴)

منزل کا سراغ

شاگرد نے تو بات ڈرتے ڈرتے بتائی کہ یہ سن کر معلوم نہیں کیا عتاب نازل ہو لیکن حضرت موسیٰؑ یہ مژدہ سن کر پھڑک اٹھے۔ فرمایا اسی کی تو تلاش تھی! معلوم ہوتا ہے کہ وحی یا رویا کے ذریعہ سے حضرت موسیٰؑ کو منزلِ مقصود کا سراغ یہی بتایا گیا تھا کہ جس مقام پر ان کے ناشتہ کی مچھلی زندہ ہو کر پانی کی راہ لے گی وہیں ان کی ملاقات اس بندۂ خاص سے ہوگی جو ان پر زندگی کے کچھ خاص راز فاش کرے گا۔ چنانچہ وہ یہ سراغ پاتے ہی الٹے پاؤں، اپنے نقشِ قدم کو تلاش کرتے، اس مقام پر واپس آئے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (۶۵)

حضرت خضرؑ سے ملاقات

یہاں ان کی ملاقات ایک خاص بندے سے ہوئی جس پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا اور جس کو اس نے اپنے کچھ خاص علم سے نوازا تھا۔ یہ کون تھے؟ قرآن نے ان کا نام نہیں بتایا ہے۔ صرف ان کے بعض مخصوص اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ بعض حدیثوں میں ان کا نام خضرؑ آیا ہے۔ چونکہ ان حدیثوں کے انکار کی کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں ہے اس وجہ سے یہی نام ہم اختیار کر لیتے ہیں۔

حضرت خضرؑ نبی تھے

حضرت خضر علیہ السلام بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی تھے۔ اس کا اول قرینہ تو یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر نبی بلکہ رسول کو ان کے پاس حصولِ علم اور حصولِ تربیت کے لیے بھیجا گیا۔ اگر حضرت خضرؑ نبی نہیں تھے تو ایک نبی کا غیر نبی کے پاس حصولِ علم و تربیت کے لیے بھیجا جانا بالکل ناموزوں سی بات ہے۔ اگرچہ اس نام کے کسی نبی کا ذکر قرآن یا تورات میں نہیں ملتا لیکن یہ چیز کچھ اہمیت رکھنے والی نہیں ہے۔ قرآن میں خود اس کی اپنی تصریح کے مطابق بہت سے انبیاء کا ذکر نہیں ہے۔ یہی حال تورات کا بھی ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، اپنے ہر نبی کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت دی ہے۔ حضرت خضرؑ کو بھی ایک خاص پہلو سے فضیلت حاصل تھی اور اسی طرح حضرت موسیٰؑ کو بھی فضیلت حاصل تھی۔ حضرت موسیٰؑ کا ان سے کچھ باتیں سیکھنا اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ حضرت خضرؑ کو حضرت موسیٰؑ پر مطلق فضیلت حاصل تھی۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ ان کے جو اوصاف اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں وہ حضرات انبیاء ہی سے مناسبت رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ ہمارے بندوں میں سے ایک خاص بندہ تھا، ہم نے اپنی طرف سے اس پر خاص فضل کیا تھا، ہم نے اس کو اپنے پاس سے ایک خاص علم عطا کیا تھا؛ علیٰ ہذا القیاس انھوں نے خود اپنے کاموں سے متعلق فرمایا کہ میں نے کوئی کام بھی خود اپنی رائے سے نہیں کیا بلکہ خدا کے حکم سے کیا ہے۔ یہ سب باتیں دلیل ہیں کہ وہ صاحبِ وحی نبی تھے اور ان کو یہ خاص امتیاز بھی حاصل تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے بعض ارادوں کے راز کھول دیے تھے۔

قَالَ لَهٗ مُوۡسٰى هَلۡ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنۡ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمۡتَ رُشۡدًا ۞ قَالَ اِنَّكَ لَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ مَعِىَ صَبۡرًا ۞ وَكَيۡفَ تَصۡبِرُ عَلٰى مَا لَمۡ تُحِطۡ بِهٖ خُبۡرًا (۶۶-۶۸)

حضرت خضر اور حضرت موسیٰ کی ایک ساتھ رفاقت

'رُشۡد' کے معنی علم و حکمت کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد وہ خاص علم ہے جو اسرارِ کائنات سے متعلق اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر کو بخشا۔ حضرت موسیٰ نے ان سے درخواست کی کہ اگر آپ اس علم خاص میں سے جو اللہ نے آپ کو بخشا ہے، مجھے بھی کچھ سکھائیں تو کچھ عرصہ اپنی خدمت میں مجھے رہنے کی اجازت دیجیے۔ حضرت خضر نے فرمایا کہ مجھے اجازت سے تو انکار نہیں ہے لیکن تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے۔ میرے ہاتھوں ایسے کام صادر ہوں گے جن کے بھید اور جن کی حکمت سے تم واقف نہیں ہو گے اور وہ کام تمھاری نگاہوں میں عجیب اور ناگوار ہوں گے تو آخر تم ان پر کس طرح صبر کرو گے؟

قَالَ سَتَجِدُنِىۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَاۤ اَعۡصِىۡ لَكَ اَمۡرًا (۶۹)

حضرت موسیٰ نے وعدہ کیا کہ ان شاء اللہ آپ مجھے ہر مرحلہ پر صابر پائیں گے اور میں ہرگز آپ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعۡتَنِىۡ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِىۡ عَنۡ شَىۡءٍ حَتّٰۤى اُحۡدِثَ لَكَ مِنۡهُ ذِكۡرًا (۷۰)

حضرت خضر نے اس وعدے کے بعد اس شرط پر ان کو اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی کہ جو کچھ وہ کریں اس کو چپ چاپ وہ دیکھتے رہیں، اس کے متعلق اس وقت تک وہ کوئی سوال نہ کریں جب تک حضرت خضر اس کو خود نہ چھیڑیں۔

فَانۡطَلَقَا حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِى السَّفِيۡنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقۡتَهَا لِتُغۡرِقَ اَهۡلَهَا ۚ لَقَدۡ جِئۡتَ شَيۡـًٔـا اِمۡرًا (۷۱)

'اِمۡر' کے معنی عجیب اور منکر کام کے ہیں۔

کشتی کا واقعہ

اس قول و قرار کے بعد دونوں اپنے تربیتی سفر پہ چلے اور ایک کشتی پر سوار ہوئے۔ کشتی پر سوار ہونے کے بعد حضرت خضر نے کسی جگہ سے کشتی کا کوئی تختہ توڑ کر اس کو عیب دار کر دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ اپنے قول و قرار کو نظر انداز کر کے بول اٹھے کہ یہ حرکت کیا آپ نے اس لیے کی ہے کہ اہل کشتی کو غرق کر دیں، یہ تو بڑی ہی نا روا حرکت آپ نے کی!!

قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ اِنَّكَ لَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ مَعِىَ صَبۡرًا ۞ قَالَ لَا تُؤَاخِذۡنِىۡ بِمَا نَسِيۡتُ وَلَا تُرۡهِقۡنِىۡ مِنۡ اَمۡرِىۡ عُسۡرًا (۷۲-۷۳)

'اِرۡهَاق' کے معنی کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنا، کسی کو مبتلائے آفت کرنا، 'اَرۡهَقَهٗ عُسۡرًا' کے معنی ہوں گے اس کو تنگی میں ڈال دیا۔

خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی بات یاد دلائی کہ میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے؟ حضرت

موسیٰ نے فوراً معذرت کی کہ بھول ہوئی، معاف کیجیے۔ میرے معاملہ میں سیادہ سخت گیری سے کام نہ لیجیے۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰىٓ اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ۝ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا (۷۴-۷۶)

لڑکے کے قتل کا واقعہ

پھر کہیں کو چلے۔ راستہ میں ایک لڑکا ملا۔ خضرؑ نے اس کو قتل کر دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ پھر بپھر گئے۔ بولے یہ آپ نے کیا کر ڈالا، ایک معصوم کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو آپ نے قتل کر ڈالا۔ یہ تو آپ نے بڑی بھونڈی حرکت کی! حضرت خضرؑ نے پھر ان کو اپنی بات یاد دلائی کہ کیا میں نہیں کہہ چکا ہوں کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے۔ حضرت موسیٰ نے پھر معافی مانگی اور کہا کہ اگر میں اس کے بعد کوئی سوال کروں تو آپ کو حق ہوگا کہ آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں، پھر آپ میری طرف سے معذور ہوں گے۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰىٓ اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا (۷۷)

بستی والوں کا واقعہ

پھر آگے کو چلے یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے۔ بھوکے تھے اس وجہ سے بستی والوں سے کچھ کھلانے کی فرمائش کی۔ شریف لوگ تو کسی بھی مسافروں کی میزبانی ایک سعادت سمجھتے ہیں لیکن اس بستی کے لوگ ایسے لئیم نکلے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ اور حضرت خضرؑ جیسے دو شریف مسافروں کو، ان کی درخواست پر بھی، روٹی دینے سے انکار کر دیا۔ ان کی اس کمینگی کے باوجود حضرت خضرؑ نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ان کی بستی کی ایک دیوار، جو گرا چاہتی تھی، محنت کر کے درست کر دی۔ آخر حضرت موسیٰ سے اس پر بھی نہ رہا گیا۔ انھوں نے ٹوکا کہ ان نااہلوں اور کمینوں کے لیے آپ نے یہ محنت بے مزدوری برداشت کی، اور کچھ نہیں تو ان سے اس محنت کی کچھ مزدوری ہی ٹھہرا لیتے! حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ بس جناب اب بحث ختم ہو چکی۔ اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا فیصلہ ہے۔ آگے میں ان باتوں کی حقیقت آپ کو بتاتا ہوں جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔ قرینہ دلیل ہے کہ حضرت خضرؑ نے جدائی کا یہ اعلان صرف اس بنا پر نہیں کیا کہ حضرت موسیٰ پر، خود ان کے اقرار کے مطابق، حجت تمام ہو چکی تھی بلکہ حکمت کی وہ تعلیم بھی مکمل ہو چکی تھی جو حضرت موسیٰ کو وہ دینا چاہتے تھے۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَاۗءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا (۷۹)

واقعات کی حکمت

اب یہ حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰ کو اپنے ایک ایک فعل کی وہ حکمت بتائی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ فعل کرائے۔

کشتی کے اندر چھید کرنے کی حکمت یہ بتائی کہ یہ کشتی مسکینوں کی تھی جو اسی کے ذریعہ سے دریا میں محنت مزدوری کر کے اپنے پیٹ پالتے تھے۔ پرے ایک بادشاہ تھا جو علاقہ کی تمام کشتیوں کو غالباً اپنی کسی جنگی مہم کے لیے زبردستی قبضہ میں کر رہا تھا۔ حضرت خضرؑ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ چاہا کہ مسکینوں کی اس کشتی کو عیب دار کر دوں

تاکہ بادشاہ اپنے مقصد کے لیے اس کو ناکارہ سمجھ کر اس پر قبضہ نہ کرے اور یہ غریب اپنی معاش کے اس واحد ذریعہ سے محروم ہونے سے محفوظ رہیں۔

یہ مثال ہے اس امر کی کہ دنیا میں غریبوں، مسکینوں اور نیکوں کو اگر کوئی مالی و معاشی نقصان پہنچتا ہے تو اس نقصان کے اندر انہی کا کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے اس لیے انھیں چاہیے کہ اس پر صبر کریں، اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہیں اور اس امر پر یقین رکھیں کہ خدا کا کوئی فیصلہ بھی حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا لیکن کوئی شخص ان حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَن يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۝ فَأَرَدْنَا أَن يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا (۸۰-۸۱)

أَقْرَبَ رُحْمًا کا مفہوم

'رُحم' کے معنی رقتِ قلب، ہمدردی اور محبت و شفقت کے ہیں۔ 'خَيْرًا مِّنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا' یعنی طبیعت اور اخلاق کی پاکیزگی کے اعتبار سے اس سے بہتر اور دردمندی اور مروت کے اعتبار سے اس سے زیادہ پاس و لحاظ والا۔

لڑکے کے قتل کی حکمت

اب یہ لڑکے کے قتل کی حکمت بتائی کہ اس کے ماں باپ مومن تھے اور یہ کفر پر اٹھنے والا تھا ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ جوان ہو کر ماں باپ کو اپنی سرکشی و ناسپاسی سے مبتلائے اذیت کرے گا۔ ہم نے چاہا کہ اس سرکش و نافرمان کی جگہ اللہ ان کو ایسی اولاد دے جو پاک نفس اور ہمدردی کرنے والی ہو۔

یہ مثال ہے اس بات کی کہ اہل ایمان کو اگر کوئی مصیبت جانی پہنچتی ہے تو اس میں بھی ان کے لیے کوئی خیر عظیم مضمر ہوتا ہے جس کو صرف اللہ ہی جانتا ہے اس وجہ سے اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ اس پر صبر کریں۔ جس دن اس کی حکمت واضح ہوگی معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ خدا نے کیا اسی میں خیر و فلاح تھی۔

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا ۚ فَأَرَادَ رَبُّكَ أَن يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ۚ ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِع عَّلَيْهِ صَبْرًا (۸۲)

دیوار کی مرمت کی حکمت

اب یہ ان ظالموں کی بستی کی ایک گرتی ہوئی دیوار کی مرمت کے لیے، بلا کسی معاوضے کے، انھوں نے جو زحمت برداشت کی اس کی حکمت سمجھائی کہ یہ دیوار درحقیقت دو یتیموں کی تھی، ان کے باپ نے جو ایک نیک آدمی تھا، اس کے نیچے ایک دفینہ محفوظ کیا تھا کہ اس کے بعد یہ اس کے بچوں کے کام آئے گا۔ اگر یہ دیوار گر جاتی تو یہ دفینہ بستی کے لٹیروں کے ہاتھ لگ جاتا اور یہ یتیم اس سے محروم ہو جاتے۔ اس وجہ سے تمھارے رب نے یہ چاہا کہ یہ دیوار ان بچوں کے جوان ہونے تک قائم رہے تاکہ وہ جوان ہو کر اپنا دفینہ خود نکال لیں۔ یہ درحقیقت تمھارے رب نے ان یتیموں پر رحم فرمایا ہے نہ کہ اس بستی کے لٹیروں پر۔

'وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي' آخر میں حضرت خضرؑ نے یہ تصریح بھی فرما دی کہ ان کاموں میں سے کوئی کام

بھی انھوں نے اپنی رائے سے نہیں کیا بلکہ ہر کام خدا کے حکم سے کیا ہے۔

یہ مثال ہے اس بات کی کہ اس دنیا میں نابکاروں اور ناہنجاروں کو جو رعایت ملتی ہے اس سے قدرت کا اصل منشا نابکاروں کی پرورش کرنا نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کے پردے میں قدرت اپنی ہی کسی مصلحت، خیر کی پرورش کرتی ہے اگرچہ اس کا علم ہمیں نہیں ہوتا۔ اس قسم کی رعایتوں سے اشرار تو اپنے اوپر صرف خدا کی حجت پوری کراتے ہیں۔ البتہ خدا ان کے ہاتھوں اہل حق کو نکھارتا ہے اور وہی اس دنیا کی خلقت کی اصل غایت ہیں۔

۱۴۔ مجموعۂ آیات ۶۰-۸۲ کے بعض ضمنی فوائد

حضرت موسیٰ کی اس سرگزشت کی اصل حکمت کی طرف تو ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں لیکن اس کے بعض ضمنی فوائد بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ہم بالاختصار ان کی طرف بھی توجہ دلا دینا چاہتے ہیں۔

حکمت صرف طالب صادق کو ملتی ہے

پہلی بات یہ ہے کہ جس چیز کو حکمت کہتے ہیں ہر مدعی اس کا اہل نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف طالب صادق کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ حلوائی کی دکان کا حلوا نہیں ہے کہ جس کے جیب میں پیسے ہوں، اس کو خرید لے بلکہ اس کے لیے بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے۔ یہ گھر بیٹھے بیٹھے حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ بسا اوقات اس کی خاطر کسی خضرِ راہ کی تلاش میں ستو باندھ کر خشکی و تری کا سفر کرنا پڑتا ہے اور امکان اس کا بھی ہے کہ ساری عمر اس سفر ہی میں بیت جائے۔ یہ کوچۂ عشق ہے جس میں درجے اور مرتبے کے رکھ رکھاؤ سے دست بردار ہو کر سر کے بل جانا پڑتا ہے۔ اس کی خاطر اپنی انانیت قربان کرنی پڑتی ہے۔ جب تک کوئی شخص یہ قربانی دینے کے لیے تیار نہ ہو وہ اس راہ میں قدم بھی نہ رکھے۔ یہ خیر کثیر کا خزانہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے صرف ان لوگوں کے لیے خاص کیا ہے جو حکمت و معرفت کے سوا ہر خواہش و آرزو سے دست کش ہو جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ اور خضرؑ کی اس سرگزشت میں یہ ساری باتیں اتنی واضح ہیں کہ ان کے دلائل نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ ہمارے لیے اصل رہنما شریعت ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہر حال میں ہم اسی کی پیروی کریں اور اگر کسی کی کوئی بات اس کے خلاف دیکھیں تو اس پر نکیر کریں اگرچہ اس کا ارتکاب حضرت خضرؑ جیسے مرشد ہی سے کیوں نہ ہوا ہو۔ چنانچہ دیکھ لیجیے حضرت موسیٰ باوجودیکہ خضرؑ کے پاس اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے گئے تھے لیکن انھوں نے ان کی کسی ایسی بات پر صبر نہیں کیا جس کو انھوں نے شریعت کے خلاف پایا۔ حضرت موسیٰ مطمئن اس وقت ہوئے ہیں جب حضرت خضرؑ نے ان کو یہ اطمینان دلایا ہے کہ جو کچھ انھوں نے کیا ہے حکم خداوندی کی تعمیل میں کیا ہے کوئی بات بھی اپنے جی سے نہیں کی ہے اور حضرت خضرؑ کی اس بات پر بھی ان کو اطمینان مجرد ان کے کہنے پر نہیں ہوا بلکہ وحی الٰہی کے ذریعہ سے ان کو پہلے سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت خضرؑ خدا کے خاص بندے ہیں، وہ جو کچھ بھی کریں گے خدا کے حکم کے مطابق کریں گے۔

اقطاب و ابدال کا تصور بے بنیاد ہے

اس وجہ سے ہم ان لوگوں کی بات بالکل بے سروپا سمجھتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہر دور میں حضرت خضرؑ کی طرح کچھ اقطاب و ابدال ہوتے ہیں جو بجائے خود حق و باطل کی کسوٹی ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں شریعت پر نہیں پرکھی جائیں کیونکہ ان کے کام براہِ راست ارادۂ الٰہی کے تحت ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اقطاب و ابدال کی یہ اصطلاحات یک قلم باطل ہیں۔ قرآن و حدیث میں ان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن فرض کر لیجیے کہ کوئی شخص قطب یا ابدال ہے تو ہم اس کی خلافِ شریعت باتوں کو کس طرح گوارا کر سکتے ہیں؟ حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ کی باتیں تو جیسا کہ معلوم ہوا، اس لیے گوارا فرمائیں کہ وحی کے ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ حضرت خضرؑ نے جو کچھ کیا ہے حکمِ خداوندی کی تعمیل میں کیا ہے لیکن ہمارے پاس کسی کے متعلق یہ معلوم کرنے کا کیا ذریعہ ہے کہ وہ قطب یا ابدال ہے اور اس کو خدا نے اپنی شریعت کی خلاف ورزی کا اختیار دیا ہے؟ خدا کی مرضیات و احکام معلوم کرنے کا واحد ذریعہ ہمارے پاس کتاب و سنت ہے۔ اس وجہ سے کوئی قطب و ابدال صاحب تو درکنار اگر خواجہ خضرؑ بھی آج آ جائیں اور کسی کو قتل کر کے یہ صفائی پیش کریں کہ یہ انھوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں کیا ہے تو ہم ان کے عذر کو رد کر کے ان کے قتل کا فتویٰ دے دیں گے۔ اس لیے کہ ہمارے پاس اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ کا حکم قرآن میں موجود ہے لیکن خواجہ خضرؑ کے کسی قتل کا خدا کی طرف سے مجاز ہونے کا ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

بعض شبہات کا ازالہ

تیسری چیز اس میں اسلوبِ بیان کا ایک اشکال ہے جو غور کرنے والے کے ذہن میں خلجان پیدا کرتا ہے وہ یہ کہ ایک طرف تو حضرت خضرؑ اپنے ان تمام کاموں کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں: مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ (میں نے ان میں سے کوئی کام بھی اپنی رائے سے نہیں کیا ہے) لیکن دوسری طرف کشتی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا (میں نے یہ چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں) پھر لڑکے کے باب میں ارشاد ہوتا ہے کہ فَخَشِیْنَآ (پس ہم کو اندیشہ ہوا) فَاَرَدْنَآ (پس ہم نے ارادہ کیا) پھر دیوار کے معاملہ میں کہتے ہیں کہ فَاَرَادَ رَبُّكَ (تیرے رب نے ارادہ کیا)۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی بات انھوں نے مختلف اسلوبوں سے کیوں فرمائی؟ جب انھوں نے سب کچھ خدا کے حکم کی تعمیل میں کیا تو اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے واضح اسلوب 'اَرَادَ رَبُّكَ' کا تھا، پھر یہ کہنے کے کیا معنی کہ "میں نے چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں"۔ علاوہ ازیں یہ سب کچھ کیا تو تھا تنہا حضرت خضرؑ نے تو آگے جمع کا صیغہ 'اَرَدْنَا' کیوں استعمال کیا؟ اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کو بھی شامل کر لیا ہے تو اس سلسلہ میں 'خَشِیْنَا' کا لفظ جو استعمال ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل ہی ناموزوں ہے۔ خدا کو کسی چیز کا اندیشہ ہونے کے کیا معنی؟ ان شبہات کے ازالہ کے لیے مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھیے۔

ایک یہ کہ جب بندہ کا ارادہ بعینہٖ وہی ہے جو خدا کا ارادہ ہے تو وہ اس کو خدا کی طرف بھی منسوب کر سکتا ہے اور اپنی طرف بھی۔ اس میں اگر فرق ہوتا ہے تو محض بلاغت کے کسی تقاضے کے تحت ہوتا ہے۔ مثلاً بعض مرتبہ حسنِ ادب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ایک بات کو خدا کی طرف نسبت دینے کے بجائے بندہ خود اپنی طرف

اس کو منسوب کرے۔ مثلاً یہاں کشتی میں چھید کرنے کا معاملہ فی الظاہر چونکہ ذرا بدنما تھا اس وجہ سے اس کو حضرت خضرؑ نے اپنی طرف منسوب کیا۔ اور یتیموں کے دفینہ کو محفوظ کرانے کا معاملہ چونکہ فی الظاہر بھی اچھا تھا اس وجہ سے اس کو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔

دوسری یہ کہ اس طرح کے مواقع میں جب متکلم اپنے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے تو گویا وہ اس پورے زمرہ کے قول یا ارادہ کی ترجمانی کرتا ہے جس کے نمائندے یا جس کے آلہ و جارحہ کی حیثیت سے وہ کسی کام کو انجام دیتا ہے۔ حضرت خضرؑ نے یہ سارے کام چونکہ کارکنان قضا و قدر کے ایک آلہ و جارحہ کی حیثیت سے انجام دیے۔ اس وجہ سے وہ اس کی تعبیر کے لیے جمع کا صیغہ بھی استعمال کر سکتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس طرح وہ فعل تنہا ان کا فعل نہیں رہا بلکہ جملہ کارکنان قضا و قدر کا فعل بن گیا۔

تیسری یہ کہ یہاں 'خَشِيْنَآ' کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے تعلق سے نہیں استعمال ہوا ہے بلکہ اس کو حضرت خضرؑ نے خاص اپنے اجتہاد کی تعبیر کے لیے استعمال کیا ہے۔ وحی یا فرشتہ کے ذریعہ سے ان کو جو حکم ہوا تھا وہ یہ تھا کہ فلاں لڑکے کو قتل کر دو اس لیے کہ اس کے ماں باپ مومن ہیں اور یہ کافر نا ہنجار اٹھے گا۔ اس حکم سے خود حضرت خضرؑ نے استنباط فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکا اپنے ماں باپ پر تعدی کرے گا۔ اس وجہ سے اس کے قتل کا حکم ہوا ہے۔ یہ ان کا اپنا استنباط تھا۔ اس کی تصریح اصل حکم الٰہی میں نہیں تھی۔ اس وجہ سے حضرت خضرؑ نے اس کو اپنے ایک اندیشہ کی حیثیت سے ذکر کیا اور اس کے لیے 'خَشِيْنَآ' کا لفظ استعمال کیا۔

۱۵۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۸۳-۹۸

یہود کا اٹھایا ہوا ایک سوال — آگے ذوالقرنین سے متعلق ایک سوال کا جواب آ رہا ہے۔ یہ سوال اٹھایا تو ہوگا یہود نے اور اس کے اٹھانے سے ان کا مقصد وہی رہا ہوگا جس کا ذکر ہم اصحابِ کہف سے متعلق سوال کے ضمن میں کر چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کیا جائے اور دعوتِ حق کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جائیں لیکن اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کرنے کا ذریعہ انھوں نے قریش کو بنایا ہوگا۔ یہ بات کہ یہ سوال یہود کا اٹھایا ہوا ہے اس وجہ سے قرین قیاس ہے کہ ذوالقرنین سے اصل دلچسپی یہود ہی کو تھی۔ وہ ان کو، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے، اپنا محسن بادشاہ سمجھتے تھے اور ان کے انبیاء کے صحیفوں میں ان کا ذکر بھی تھا۔ قرآن نے سوال کرنے والوں کی مفسدانہ ذہنیت کو جانتے ہوئے محض اس وجہ سے اس کا جواب دیا کہ ذوالقرنین کی زندگی ان متمردین اور سرگشتگانِ دنیا کے لیے بہت سبق آموز ہو سکتی ہے جن کی ذہنیت اس سورہ میں شروع سے آخر تک زیر بحث چلی آ رہی ہے۔

ذوالقرنین — یہ ذوالقرنین کون تھے؟ اس سوال کے جواب میں ہمارے مفسرین کی رائیں مختلف ہیں۔ عام طور پر لوگوں

نے سکندر رومی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ بعض لوگ اس سے ایرانی بادشاہوں کیخسرو، جسے خورس یا سائرس بھی کہا جاتا ہے، یا دارا کو مراد لیتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ ایک حمیری بادشاہ کا ذکر ہے۔ ان میں سے آخر الذکر قول کے حق میں کوئی قابلِ ذکر دلیل نہیں ہے۔ سکندر پر بھی وہ صفات منطبق نہیں ہوتیں جو قرآن نے ذوالقرنین کی بیان کی ہیں۔ قرآن نے ذوالقرنین کو پکا موحد، سچا مومن بالآخرۃ، نہایت ہی عادل اور رعایا پرور قرار دیا ہے جب کہ سکندر کے اندر ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں تھی۔ سکندر کی فتوحات کا دائرہ بھی اتنا وسیع نہیں ہے جتنا وسیع قرآن نے ذوالقرنین کی فتوحات کا بیان کیا ہے۔ اس کے لیے ذوالقرنین کے لقب کے استعمال کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ دارا کی بعض مغربی و مشرقی مہمات کا ذکر تاریخوں میں ضرور ملتا ہے لیکن اس راہ میں اس کی حیثیت پیش رو کی نہیں ہے بلکہ وہ درحقیقت کیخسرو ہی کی قائم کردہ ریاست کو مستحکم کرنے والا تھا۔

البتہ کیخسرو کی شخصیت کے متعدد پہلو ایسے ہیں جن کی بنا پر اس کو قرآن میں مذکور ذوالقرنین کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک صاحبِ ایمان اور عادل بادشاہ تھا جس کی عالی ظرفی اور مقبولیت کا اعتراف تمام پرانے اور نئے مورخین کو ہے۔ قرآن نے اس کی تین مہمات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے دو مہمیں، مشرقی اور مغربی ــــ تو تاریخ کی روشنی میں بھی ثابت ہیں۔ تیسری مہم کے بارے میں اگرچہ مورخین کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہتے لیکن شواہد اور قرائن اس کے بھی موجود ہیں۔

یہود کے صحیفوں میں ذوالقرنین کا ذکر

یہود پر اس بادشاہ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے بابل کی اسیری سے ان کو نجات دلائی اور اس کی مدد سے بیت المقدس اور ہیکل کی از سرِ نو تعمیر ہوئی۔ یہود کے انبیاء نے ان کی پیشین گوئی بھی کی تھی۔ یسعیاہ میں ہے:

> "خداوند اپنے ممسوح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا دہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے سامنے زیر کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں۔" ۴۵: ۱

اس پیشین گوئی میں 'خورس'، 'سائرس' کی ذرا سی بدلی ہوئی شکل ہے جو کیخسرو کے نام کا یونانی تلفظ ہے۔ اسی طرح دانیال نبی کا ایک مکاشفہ یوں منقول ہے۔

> "تب میں نے آنکھ اٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ دریا کے پاس ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں، دونوں سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے بعد نکلا تھا۔ میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ مغرب و شمال و جنوب کی طرف سینگ مارتا ہے، یہاں تک کہ نہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا ہو سکا اور نہ کوئی اس سے چھڑا سکا۔" (دانی ایل ۸: ۳-۴)

اس مکاشفہ کی تعبیر حضرت دانیال کو حضرت جبرائیل نے یہ بتائی کہ دو سینگوں سے مراد مادا (MEDIA) اور فارس کی دو بادشاہتیں ہیں جن کو موعود بادشاہ زیرنگیں کرے گا ــــ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ کیخسرو نے یہ دونوں

سلطنتیں زیرِ نگیں کریں اور اسی بنیاد پر اس کا لقب ذوالقرنین (دو سینگوں والا) قرار پایا ۔۔۔ اس کا ایک مجسمہ ماضی قریب میں اصطخر کے قریب دریافت ہوا ہے جو اردشیر اوّل کے زمانہ کا نصب کردہ ہے۔ اس میں اس کے تاج میں دو سینگ بھی ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ مجرد جلال و جبروت کی علامت کے طور پر ابھارے گئے ہوں یا ان کے اندر وہی رمز پوشیدہ ہو جس کا حوالہ اوپر گزرا۔ اس روشنی میں اب آیات کی تلاوت فرمائیے:

آیات ۸۳-۹۸

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝۸۳
اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِى الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝۸۴ فَاَتْبَعَ
سَبَبًا ۝۸۵ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِىْ
عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۥ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ
اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝۸۶ قَالَ اَمَّا مَنْ
ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا
نُّكْرًا ۝۸۷ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَاۗءَۨ الْحُسْنٰى ۚ وَ
سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝۸۸ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝۸۹ حَتّٰٓى اِذَا
بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ
مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝۹۰ كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝۹۱
ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝۹۲ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ
دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝۹۳ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ
اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ
خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝۹۴ قَالَ مَا مَكَّنِّىْ

فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾
آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ
انفُخُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾
فَمَا اسْطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ﴿٩٧﴾ قَالَ
هَٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي ۖ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۖ وَكَانَ
وَعْدُ رَبِّي حَقًّا ﴿٩٨﴾

ترجمۂ آیات ۸۳-۹۸

اور وہ تم سے ذوالقرنین کے بابت سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو، میں تم کو اس کا کچھ سبق آموز احوال سناؤں گا۔ ہم نے اس کو زمین میں بڑا اقتدار بخشا تھا اور اس کو ہر قسم کے اسباب و وسائل سے بہرہ مند کیا تھا۔ پس وہ ایک مرتبہ وسائل کے درپے ہوا یہاں تک کہ وہ سورج کے غروب ہونے کے مقام تک جا پہنچا۔ اس کو دیکھا کہ گویا وہ ایک سیاہ چشمے میں ڈوبتا ہے۔ اور اس کے پاس اس کو ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین چاہو ان کو سزا دو چاہو ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اس نے کہا جو ان میں سے ظلم کا مرتکب ہوگا تو اس کو تو ہم بھی سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب کی طرف بھی لوٹایا جائے گا اور وہ اس کو نہایت سخت عذاب دے گا۔ رہا وہ جو ایمان اور عمل صالح اختیار کرے گا تو اس کے لیے اللہ کے پاس بھی اچھا بدلہ ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ آسان معاملہ کریں گے۔ ۸۳-۸۸

پھر اس نے ایک اور مہم کی تیاری کی یہاں تک کہ جب وہ طلوع آفتاب کے مقام پر پہنچا تو اس نے اس کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جس کے لیے آفتاب کے بالمقابل ہم نے کوئی پردہ نہیں رکھا تھا۔ ایسا ہی ہم نے کیا اور ہم اس کے احوال سے خوب باخبر تھے۔ ۸۹-۹۱

اس نے پھر ایک اور مہم کی تیاری کی یہاں تک کہ دو پہاڑوں کے درمیان کے درّے تک جا پہنچا۔ ان دونوں پہاڑوں کے درے اس کو ایسے لوگ ملے جو کوئی بات سمجھ نہیں پاتے تھے۔ انھوں نے درخواست کی کہ اے ذوالقرنین، یاجوج و ماجوج ہمارے ملک میں فساد مچاتے رہتے ہیں تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کے لیے خرچ کا بندوبست کر دیں اور آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیں۔ اس نے جواب دیا کہ میرے رب نے جو کچھ میرے تصرف میں دے رکھا ہے وہ کافی ہے البتہ تم ہاتھ پاؤں سے میری مدد کرو، میں تمھارے اور ان کے درمیان ایک ٹھوس کھڑی کیے دیتا ہوں۔ میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لاؤ۔ یہاں تک کہ جب بیچ کے خلا کو بھر دیا، حکم دیا کہ اس کو خوب دھونکو۔ یہاں تک کہ جب اس کو آگ کر دیا حکم دیا کہ اب تانبا لاؤ اس پر انڈیل دوں۔ پس نہ تو وہ اس پر چڑھ ہی سکتے تھے اور نہ اس میں نقب ہی لگا سکتے تھے۔ اس نے کہا یہ میرے رب کا ایک فضل ہے۔ پس جب میرے رب کے وعدے کا ظہور ہوگا اس کو ہموار کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ شدنی ہے۔ ۹۲-۹۸

۱۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا (۸۳)

سائرس (کیخسرو) کے لیے ذوالقرنین کا لقب | سائرس (کیخسرو) کے لیے ذوالقرنین کا لقب، معلوم ہوتا ہے، عرب کے یہود کا اختیار کردہ ہے۔ 'سَاَتْلُوْا' میں ایک قسم کی اپیل مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پوچھتے ہو تو میں ان کی سرگزشت کا کچھ سبق آموز حصہ سناؤں گا۔ امید ہے گوش دل سے سنو گے اور اس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ لفظ 'ذکر' میں یاددہانی، تذکیر اور سبق آموزی کا جو مفہوم مضمر ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے۔

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا (۸۴)

سبب کا مفہوم | 'سَبَب' کے اصل معنی وسیلہ و ذریعہ کے ہیں یہاں 'مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا' کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مملکت میں ہر قسم کے وسائل و ذرائع (RESOURCES) موجود تھے۔

کیخسرو کی عظیم سلطنت

کیخسرو، جس کا اصل نام کورش تھا، کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں اپنے والد کمبوجیہ کی چھوٹی سی ریاست انشان کا والی مقرر ہوا۔ برسراقتدار آتے ہی اس کو مادا کے حکمران کے حملے کا مقابلہ کرنا پڑا جس میں اس کو فتح حاصل ہوئی۔ بعد کے چند سالوں میں اس نے وقت کی تمام بڑی ریاستوں کو زیر کر لیا اور بلخ اور مکران سے لے کر بحیرۂ روم تک اس کا سکہ چلنے لگا۔ اس سے پہلے اس سے زیادہ وسیع اور پرشکوہ سلطنت کوئی اور قائم نہیں ہوئی۔

فَاَتْبَعَ سَبَبًا (۸۵)

'اتباع' کے معنی پیچھے لگنے، درپے ہونے، تعاقب کرنے کے ہیں۔ 'اَتْبَعَ سَبَبًا' کے معنی ہوں گے اس نے وسائل و ذرائع کا جائزہ لیا، اس کا اہتمام کیا۔ پھر یہیں سے ذرا وسیع معنی میں یہ کسی مہم کی تیاری کے لیے استعمال ہوا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا (۸۶)

'مغرب الشمس' کا مفہوم

'مَغْرِبَ الشَّمْسِ' تک پہنچنا تعبیر ہے اس مفہوم کی کہ وہ مغرب میں ساحل سمندر تک پہنچ گیا۔ 'وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ' یعنی وہاں غروب آفتاب کے وقت ایسا نظر آتا کہ گویا وہ کسی سیاہ چشمہ میں ڈوب رہا ہے۔ یہاں اس تشبیہ سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ مغرب کی تمام دنیائے معلوم جہاں تک اس وقت کے انسان کے قدم پہنچ سکتے تھے وہاں تک ذوالقرنین نے زیر نگین کر لی۔ اب آگے سمندر تھا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ مغرب میں دنیا کی آخری حد یہی ہے اور سورج یہیں ڈوبتا ہے۔

کیخسرو کی مغربی مہم

یہ کیخسرو کی پہلی مہم کی طرف اشارہ ہے جو اس کے دارالسلطنت ہکمتانہ (موجودہ ہمدان) سے مغرب کے لیے ہوئی۔ اس مہم میں اس نے مادا (موجودہ عراق و شام) اور لیڈیا (موجودہ ترکی) کو زیر نگین کیا۔ لیڈیا کے دارالحکومت سارڈیس (نزد سمرنا) میں وہاں کے حکمران کروسس کو اس نے شکست دی جس کو بابل، مصر اور اسپارٹا کی حکومتوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس مہم میں کیخسرو کے قدم بحیرۂ روم کے ساحل ہی پر جا کے رکے۔

وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا۔

لفظ قول رویہ اور اختیار کی تعبیر کے لیے

لفظ 'قول' صورت حال، اختیار، اور رویہ کی تعبیر کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس فتح کے نتیجہ میں جو رعایا اس کے قبضہ میں آئی وہ اس طرح اس کے قدموں میں ہم نے ڈال دی اور ایسا اختیار اس پر اس کو دے دیا کہ چاہے وہ ان کو سزا دے، چاہے ان کے ساتھ احسان کرے، کوئی اس کے اختیار و اقتدار میں مداخلت کرنے والا نہیں تھا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا نے قولاً اس کو اجازت دے دی کہ وہ چاہے ظلم کرے چاہے عدل، اس کو دونوں کا یکساں حق ہے۔ حق تو صرف عدل اور احسان کا ہے۔ ہر بادشاہ اور حکمران خدا کی طرف سے عدل و احسان پر مامور ہے لیکن اس کو چھوٹ ظلم و ناانصافی کے لیے بھی ملی ہوتی ہے۔ اگر وہ عدل کرے گا تو خدا سے

اس کا انعام پائے گا اور اگر ظلم کرے گا تو اس کی سزا بھگتے گا۔ حکمرانوں کے لیے اصل ہدایت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو خطاب کر کے دی ہے۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ	اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے تو لوگوں
فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ	کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش
الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ	کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھیں اللہ کی راہ سے ہٹا دے۔
اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ	جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جائیں گے، ان کے
اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا	لیے سخت عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ روز حساب کو
نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ (صٓ-۲۶)	بھول بیٹھے۔

آیت زیر بحث میں ذوالقرنین سے اسی نوع کا خطاب ہے جس طرح کا خطاب سورۂ صٓ میں حضرت سلیمان علیہ السلام سے ہے۔

ھٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِکْ	یہ ہماری تمھارے اوپر بے حساب بخشش ہے تو چاہے
بِغَیْرِ حِسَابٍ (صٓ-۳۹)	تم لوگوں پر احسان کرو، چاہے روک رکھو۔

ظاہر ہے کہ یہ صرف اس آزادی کا بیان ہے جو انسان کو حاصل ہے کہ وہ چاہے کفر کی راہ اختیار کرے یا ایمان کی۔ اسی طرح اس کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ اللہ کی نعمتیں پاکر چاہے جود و کرم اور احسان و انفاق کی راہ اختیار کرے چاہے خِسّت و بخالت کی۔ اس کو آزادی دونوں کی ملی ہوئی ہے لیکن خدا کی نگاہوں میں ان میں سے پسندیدہ ایک ہی ہے اور اسی کا اس نے اپنے بندوں سے مطالبہ کیا ہے۔

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُہٗ ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّہٖ فَیُعَذِّبُہٗ عَذَابًا نُّکْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَہٗ جَزَآءَ نِۨ الْحُسْنٰی ۚ وَسَنَقُوْلُ لَہٗ مِنْ اَمْرِنَا یُسْرًا (۸۷-۸۸)

قول بلسانِ عمل — جس طرح اوپر کا قول بلسانِ حال ہے اسی طرح یہ قول بلسانِ عمل ہے یعنی اس نے اپنے رویہ اور طرزِ عمل سے یہ شہادت دی کہ جو ظلم و فساد کی راہ اختیار کرے گا اس کو تو ہم بھی سزا دیں گے اور اس سے زیادہ سخت سزا وہ خدا کے ہاں پائے گا، البتہ جو ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کریں گے وہ اپنے ایمان و عمل کے صلہ میں خدا کے ہاں بھی اچھے انجام سے سرفراز ہوں گے اور ہم بھی ان کے معاملہ میں نہایت نرم پالیسی اختیار کریں گے۔

رویہ اور عمل کی تعبیر قول سے عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ قرآن میں یہود کا یہ قول جو نقل ہوا ہے کہ 'قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا' یہ، جیسا کہ البقرہ ۹۳ کے تحت ہم نے اس کی تصریح کی ہے، ان کے عمل اور رویہ کی تعبیر ہے۔ خود اس آیت میں بھی 'وَسَنَقُوْلُ لَہٗ مِنْ اَمْرِنَا یُسْرًا' کے ٹکڑے میں قول سے مراد رویہ ہی ہے۔ اس لیے کہ اس کا ظاہر مفہوم یہی ہے کہ ہم بھی ان کے ساتھ نرم رویہ یا نرم پالیسی اختیار کریں گے۔ بعض لوگوں نے محض اوپر کے 'قُلْنَا' اور اس 'قَالَ' کی بنیاد پر ذوالقرنین کو نبی مان لیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک مجرد

یہ دلیل اس کو نبی ماننے کے لیے کافی نہیں ہے۔ البتہ اس کے ایک عادل اور خدا ترس بادشاہ ہونے کی شہادت ان آیات سے بھی ملتی ہے اور تاریخ سے بھی۔

ذوالقرنین کے متعلق تاریخ کی شہادت

مورخین لکھتے ہیں کہ سائرس کی فوج جس شہر کو فتح کرتی اس کے شہریوں کو ذرا بھی گزند نہ پہنچاتی۔ بادشاہ مفتوحہ قوموں کے لیے سراپا رحمت و شفقت تھا۔ اس نے تمام بھاری ٹیکس اور خراج بالکل معاف کر دیے۔ اس کے سخت دشمن بھی جب اس کے سامنے گرفتار کر کے لائے گئے تو اس نے ان کی معافی کا اعلان کر دیا۔ اس کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر انھوں نے بادشاہ کو اپنی غیر مشروط وفاداری کا یقین دلایا۔ ماد کے حملہ آور بادشاہ کو، اس کے شکست کھانے کے بعد، کیخسرو نے اس کی موت تک اپنے محل میں رکھا۔ اس کو دس ہزار پیادے اور پانچ ہزار سوار عطا کیے۔ اس طرح اس کی شاہانہ حیثیت برقرار رکھی۔

ذوالقرنین مذہب زردشت کے پیرو تھے

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین ایک مومن، موحد اور آخرت پر یقین رکھنے والا بادشاہ تھا۔ تاریخوں سے بھی اس بات کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ سائرس زردشت کا ہم عصر اور اس کا پیرو تھا۔ زردشت کی اصل تعلیمات میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا صحیح تصور ملتا ہے۔ اگرچہ بعد میں دوسرے مذاہب کی طرح یہ مذہب بھی تحریفات کی دست برد سے محفوظ نہیں رہا بلکہ ثنویت کے تصورات اس پر غالب آ گئے۔ دارا اپنے کتبوں میں اہورمزدا (اللہ) کا شکر ادا کرتا ہے، اپنی سلطنت کو اس کے فضل و کرم سے منسوب کرتا ہے اور اس سے راہ راست پر قائم رہنے کی توفیق مانگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دینداری اس کو ذوالقرنین ہی سے وراثت میں ملی۔ ذوالقرنین کو انبیائے بنی اسرائیل سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ یہ چیز بھی اس کے اندر دینی رجحانات کی تقویت کا باعث ہوئی۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰی قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ (۹۰-۸۹)

کیخسرو کی مشرقی مہم

یہ کیخسرو کی دوسری مہم کا ذکر ہے۔ بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ کے الفاظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ مہم مشرقی سمت میں تھی اور اس سمت میں بھی وہ آخری حدود تک پہنچ گیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس کا سبب مکران، قندھار اور بلخ کے وحشی اور صحرا گرد قبائل کی سرکشی ہوئی۔ انھوں نے فارس کی مشرقی سرحد پر بدامنی پھیلا رکھی تھی۔ بالآخر ذوالقرنین کو ان کی سرکوبی کے لیے اٹھنا پڑا اور یہ سارے علاقے اس نے فتح کر لیے۔ قرآن نے ان قبائل کے باب میں یہ جو کہا ہے کہ ان کے اور سورج کے مابین کوئی پردہ حائل نہیں تھا، یہ ان کے انتہائی وحشی اور غیر متمدن ہونے کی تصویر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبائل گھر در اور تعمیر و تمدن سے بالکل ناآشنا اپنی وحشت کے بالکل ابتدائی دور میں تھے، اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝ (۹۱)

ذوالقرنین اللہ کی صفات سے متصف تھے

یہ آیت بالکل اسی موقع و محل میں ہے جس موقع و محل میں سورۂ انبیاء کی آیت وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ

رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ (۵۱) سے وہاں حضرت ابراہیم کے منصب امامت و ہدایت پر سرفراز کیے جانے کی حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ہم اس سے اچھی طرح واقف تھے، یعنی ہم نے اگر اس کو یہ سرفرازی بخشی تو یوں ہی نہیں بخش دی بلکہ اس کی ان صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف تھے، جو اس کو اس منصب کا اہل ثابت کرتی تھیں۔ اسی طرح یہاں ذوالقرنین کی ان فتوحات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو اللہ کی عنایات سے ان کو حاصل ہوئیں، فرمایا کہ اس وسیع اقتدار اور عظیم امانت کو سنبھالنے کے لیے جس ظرف اور جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی وہ ان کے اندر بدرجہ کمال موجود تھیں اور ہم ان سے اچھی طرح باخبر تھے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّاۗءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝ (۹۲-۹۸)

کیخسرو کی تیسری مہم اور سد کی تعمیر

یہ کیخسرو کی تیسری مہم کا ذکر ہے۔ مورخین نے اس مہم کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے لیکن وہ اتنا بتاتے ہیں کہ بابل کی فتح کے بعد وہ شمال مشرق کی سمت میں ایک سفر پر روانہ ہوا۔ غالباً اس کی منزل بحر خزر (کیسپین) کے مشرق میں ترکستان کی جانب تھی۔ اسی سفر کے دوران وہ کسی کھڈ میں گر کر ہلاک ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم کے دوران اس سد کی تعمیر کا وہ واقعہ پیش آیا ہے جس کا قرآن نے یہاں تذکرہ کیا ہے۔

یاجوج و ماجوج

یہ سد، جیسا کہ قرآن سے واضح ہے یاجوج و ماجوج کے حملوں کو روکنے کے لیے تعمیر کی گئی۔ یاجوج ماجوج سے مراد نوح کے بیٹے یافث کی وہ اولاد ہے جو ایشیا کے شمالی علاقوں میں آباد ہوئی۔ حزقی ایل فرماتے ہیں:

"اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش، مسک اور توبل کا فرماں روا ہے متوجہ ہو اور اس کے خلاف نبوت کر" (حزقی ایل [illegible])

"اور کہہ خداوند یوں فرماتا ہے دیکھ اے جوج! روش، مسک اور توبل کے فرمانروا میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھرا دوں گا اور تجھے لیے پھروں گا اور شمال کے دور اطراف سے چڑھا لاؤں گا۔" (حزقی ایل [illegible])

روش، مسک اور توبل کے نام اب تک رشیا، ماسکو اور توبالسک کی صورت میں موجود ہیں اور یہ علاقے فلسطین سے شمال کے بعید اطراف میں ہیں۔ یاجوج و ماجوج کے قبائل بحر خزر کے شمال کی جانب اور

وسط ایشیا میں منگولیا کے علاقہ میں آباد تھے۔ ایران پران کی تاخت ترکستان کے رستے سے بھی ہوتی تھی اور کوہ قفقاز کے درّے کی راہ سے بھی۔ کوہ قفقاز (CAUCASUS) کیخسرو کے دارالحکومت سے ٹھیک شمال کو ہے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ بادشاہ نے درے کو بند کر کے اس خطرے کا سدِّباب کر دینا چاہا ہو۔

درۂ داریال کی آہنی دیوار

کوہ قفقاز کے درۂ داریال میں ایک آہنی دیوار موجود ہے۔ سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ روایات میں ہے کہ عباسی خلیفہ واثق نے اس دیوار کی تحقیقات پر پچاس افراد کی ایک ٹیم مقرر کی، جس نے اس کے موقع و محل کا سراغ لگایا۔ اس دیوار کو لوگ دارا یا نوشیرواں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لیکن زیادہ شواہد اس بات کے حق میں ہیں کہ یہ کیخسرو نے تعمیر کرائی ہوگی۔ مثلاً یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ کیخسرو کی سلطنت کی شمالی حد کوہ قفقاز تک تھی۔ اتنا وسیع علاقہ زیرنگین کر لینا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اس نے اس علاقہ کو فتح کرنے کے لیے کوئی اقدام کیا ہو۔ کورش نام کا ایک شہر اور ایک دریا کوہ قفقاز کے علاقے میں اب تک موجود ہے۔ آہنی دیوار کو گورا کا نام دیا جاتا ہے جو کورش ہی کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتی ہے۔ یہ دیوار دو چٹانوں کے درمیان بنی ہوئی ہے اور اس کے نچلے حصے میں برسات کے پانی کے نکلنے کے لیے کچھ جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔

'لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسری قوموں سے بھی ان لوگوں کا کوئی میل جول نہ تھا۔ اپنے علاقہ کے اندر محدود اور دوسروں سے بالکل بے تعلق زندگی رکھنے کی وجہ سے یہ دوسروں کی زبان مشکل ہی سے سمجھ پاتے تھے۔

ذوالقرنین کا جذبۂ خدمتِ خلق

'فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ' 'قُوَّة' سے مراد یہاں (MAN POWER) ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رعایا نے دیوار کی تعمیر کے لیے مصارف کی فراہمی کی جو پیشکش کی وہ ازراہِ فیاضی ذوالقرنین نے قبول نہیں کی۔ فرمایا کہ جہاں تک مال کا تعلق ہے وہ جتنا کچھ میرے رب نے میرے تصرف میں دے رکھا وہ بہتر ہے۔ اس 'بہتر' کے لفظ میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ وہ کافی ہے اور یہ بات بھی اس میں ہے کہ یہ مال ظلم و تعدی اور لوٹ مار کی ہر آلائش سے بالکل پاک ہے۔ البتہ لیبر تم فراہم کرو، میں تمہارے اور مفسدین یاجوج و ماجوج کے درمیان ایک دیوار کھڑی کیے دیتا ہوں۔

'اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ الاية' 'زُبَر' 'زبرۃ' کی جمع ہے۔ اس کے معنی آہن پارے کے ہیں۔ 'صدف' خول اور خلا کو کہتے ہیں یہاں اس کے مثنی استعمال کرنے میں اس کے دونوں طرفوں کا لحاظ ہے۔ جس طرح 'مشرقین' اور مغربین میں ان کے دونوں اطراف کا لحاظ ہے اسی طرح 'صدفین' میں اس کے دونوں کناروں کا لحاظ ہے۔ مقصود یہی بتانا ہے کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان کا خلا پورا بھر دیا گیا۔

'هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا' 'دَكَّآء'

اصل میں بے کوہان اونٹنی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد ڈھا دینا اور برابر کر دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اتنی عظیم الشان آہنی اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کھڑی ہو گئی کہ یاجوج و ماجوج کے لیے نہ اس پر چڑھنا ممکن رہا نہ اس میں نقب لگانا تو اس کو دیکھ کر ذوالقرنین نے تنگ ظرفوں کی طرح غرور کے نشہ میں یہ نہیں کہا کہ میں یہ وہ کارنامہ کیے جا رہا ہوں کہ اس کے لیے کبھی زوال نہیں بلکہ پوری تواضع اور فروتنی کے ساتھ یہ کہا کہ یہ خدمت جو انجام پائی ہے محض میرے رب کے فضل و کرم کا کرشمہ ہے۔ آج یہ دیوار ناقابلِ تسخیر ہے لیکن جب میرے رب کے وعدے کے ظہور کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پست و پامال کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ شدنی ہے۔

پیچھے دو شخصوں کی تمثیل کے ذیل میں مغرورینِ دنیا کی یہ ذہنیت آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب وہ اپنی کامیابی کے ہرے بھرے باغ میں داخل ہوتے ہیں تو غرور کے نشہ میں کہتے ہیں کہ مَآ اَظُنُّ اَنۡ تَبِيۡدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا میں گمان بھی نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہو سکے گا۔ اس کے بعد ایک بندۂ شاکر کی ذہنیت نمایاں فرمائی ہے کہ وہ اپنے بڑے سے بڑے کارنامہ پر بھی اپنے رب کا شکرگزار رہتا ہے اور اللہ کے شدنی وعدۂ آخرت کو یاد رکھتا ہے۔

۱۷- آگے کا مضمون ___ آیات ۹۹-۱۱۰

خاتمۂ سورہ

اب آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ یہ خاتمہ نہایت بلیغ گریز سے شروع ہوا ہے۔ ذوالقرنین نے اپنے عظیم بند کو دیکھ کر یہ جو فرمایا کہ جب میرے رب کے شدنی وعدۂ قیامت کے ظہور کا وقت آئے گا تو یہ ساری بلندیاں پست اور یہ تمام تعمیرات مسمار ہو جائیں گی، اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے وعدۂ قیامت کی یاد دہانی اور سرگشتگانِ دنیا کی تنبیہ کا ذریعہ بنا لیا اور انذار کا وہ مضمون جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا ایک نئے اسلوب سے پھر سامنے آ گیا۔ ہم نظمِ قرآن کی اس خصوصیت کی طرف متعدد مقامات میں اشارہ کر چکے ہیں کہ سورتیں بالعموم اسی مضمون پر ختم ہوتی ہیں جس مضمون سے ان کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سورہ کی تمہید اور خاتمہ پر ایک نظر ڈال کر دیکھیے یہ خصوصیت یہاں بھی موجود ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۹-۱۱۰

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ
فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿٩٩﴾ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ
عَرْضًا ﴿١٠٠﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا
ع ۱۱ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿١٠١﴾ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا

عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾
قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾
اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ
فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ جَهَنَّمُ
بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ
نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ
الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ
رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ
يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ
رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ
ع ۱۲ ۲ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

ترجمۂ آیات ۹۹-۱۱۰

اور اس دن ہم چھوڑ دیں گے وہ ایک دوسرے سے موجوں کی طرح ٹکرائیں گے اور صور پھونکا جائے گا پس ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور اس دن ہم جہنم کو ان کافروں کے روبرو پیش کریں گے جن کی آنکھوں پر ہماری تنبیہ سے پردہ پڑا رہا اور وہ سننے کی تاب نہیں لاتے تھے۔ ۹۹-۱۰۱

کیا ان کافروں نے گمان کیا کہ وہ میرے بندوں کو میرے سوا اپنے لیے کارساز

بنا لیں گے؛ ہم نے کافروں کے لیے جہنم بطور ضیافت تیار کر رکھی ہے۔ ۱۰۲

کہو، کیا ہم تمھیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی تمام سعی اس دنیا کی زندگی کے پیچھے اکارت گئی اور وہ گمان کرتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا۔ پس ان کے اعمال اکارت گئے اور قیامت کے دن ہم ان کو ذرا بھی وزن نہ دیں گے۔ یہی جہنم ان کا بدلہ ہے بوجہ اس کے کہ انھوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے رسولوں کا مذاق اڑایا۔ ۱۰۳-۱۰۶

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان کے لیے فردوس کے باغوں کی ضیافت ہے جس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں سے ہٹنا نہیں چاہیں گے۔ ۱۰۷-۱۰۸

کہہ دو اگر میرے رب کی نشانیوں کو قلم بند کرنے کے لیے سمندر روشنائی بن جائے تو میرے رب کی نشانیوں کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا اگرچہ ہم اس کے ساتھ اسی کے مانند اور سمندر ملا دیں۔ ۱۰۹

کہہ دو کہ میں تو بس تمھاری ہی طرح ایک بشر ہوں۔ مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود بس ایک ہی معبود ہے۔ پس جو اپنے رب کی ملاقات کا متوقع ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ ۱۱۰

۱۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

بعض آثارِ قیامت کی طرف اشارہ

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا (۹۹)

ذوالقرنین کے مذکورہ بالا فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ، الآیۃ پر عطف کر کے یہ اللہ تعالیٰ نے

ظہورِ قیامت کے مزید آثار کی وضاحت فرما دی جس سے ذوالقرنین کی بات پوری ہو گئی۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دریاؤں اور پہاڑوں کی جو حد بندیاں ہیں وہ سب ایک دن ختم ہو جائیں گی۔ اور قومیں ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرائیں گی جس طرح سمندر میں موجیں ٹکراتی ہیں۔ سائنس کی ترقیوں نے اب دریاؤں اور پہاڑوں کی رکاوٹیں تو یوں بھی ختم کر دی ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ظہورِ قیامت کے وقت یہ رہی سہی رکاوٹیں بھی بے معنی ہو جائیں گی اس آیت سے اور سورۂ انبیاء کی آیت حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۹۶؎ سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ قربِ قیامت میں یافث کی اولاد ایک طوفان کی طرح تمام دنیا پر چھا جائے گی اور پھر اسی طوفان کے اندر سے قیامت نمودار ہو جائے گی۔ یہ باتیں اگرچہ متشابہات کی نوعیت کی ہیں ان کا صحیح علم صرف خدائے عالم الغیب ہی کو ہے لیکن اس کے جو آثار دنیا میں نمودار ہو رہے ہیں ان سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔

فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا' میں جَمْعًا کی تاکید اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ صورِ قیامت سب کو جمع کرے گا۔ چھوٹے اور بڑے، عابد اور معبود، حاضر اور غائب کوئی بھی نہیں بچے گا۔ سب پکڑ بلائے جائیں گے۔

وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَىِٕذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا (۱۰۰)

جہنم کا مشاہدہ

یعنی آج تو عقل و دل کے اندھوں کو جہنم نظر نہیں آ رہی ہے لیکن اس دن ہم یہ جہنم ان کی آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دیں گے کہ جس چیز کو عقل کی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے اب اس کو تجربہ کی آنکھوں سے دیکھ لو۔

الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَاۗءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا (۱۰۱)

یہ ان کافروں کی صفت بیان ہوئی ہے کہ ان کی عقل اس طرح ماری گئی تھی کہ پیغمبر کی کوئی یاددہانی بھی ان کی آنکھیں کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور جب ہماری تنبیہات ان کو سنائی جاتی تھیں تو وہ ان کے سننے کی تاب نہیں لاتے تھے۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَاۗءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا (۱۰۲)

شرکا کی تردید

یہ مخاطبوں کو متنبہ کیا ہے کہ کیا ان بدبختوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یہ ہمارے بندوں میں سے کچھ کو اپنا مددگار و کارساز بنا لیں گے جو قیامت کے دن ہم سے ان کی سفارش کر کے ان کو چھڑا لیں گے۔ یہ محض ان کی خوش فہمی ہے۔ ایسے تمام کافروں کے لیے ہمارے پاس جہنم بطورِ ضیافت تیار ہے جس سے کسی کی سعی و سفارش بھی ان کو چھڑا نہ سکے گی۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا (۱۰۳-۱۰۶)

؎ یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے پل پڑیں گے۔

مغروروں کے پندار پر ضرب

یہ ان مغرورین دنیا کے اصل پندار پر ضرب لگائی ہے کہ یہ تو سمجھتے ہیں کہ بڑی کامیاب بازی کھیل رہے ہیں اور بڑے اچھے کام کر رہے ہیں لیکن ان کو بتا دو کہ آخرت میں سب سے زیادہ نامراد اور خسارے میں وہی لوگ ہوں گے جن کی تمام تگ و دو اس دنیا کی طلب کی راہ میں ہے۔ فرمایا کہ اس دنیا کے عشق نے ان کو ہماری آیات اور ہماری ملاقات سے بالکل بے نیاز و بے خوف کر دیا تو ان کے یہ سارے اعمال بالکل بے وزن و بے حقیقت ہو جائیں گے آج تو یہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں لیکن قیامت کے دن ہم ان کو کوئی وزن نہیں دیں گے۔ انھوں نے اپنے غرور میں ہماری آیات کی تکذیب کی اور ہمارے رسولوں کا مذاق اڑایا۔ اب اس کی پاداش میں جہنم کا مزا چکھیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا (۱۰۷-۱۰۸)

اہل ایمان کا صلہ

یہ ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرنے کا صلہ بتایا ہے کہ ان کے لیے فردوس کی ضیافت تیار ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور اس میں ہمیشہ رہنے کے باوجود کبھی اس سے اکتائیں گے نہیں اس لیے کہ اس میں ان کے مدارج بھی ہمیشہ بلند ہوتے رہیں گے اور ان کے لیے نعمتیں بھی برابر ان کی خواہش کے مطابق بدلتی رہیں گی۔ اس وجہ سے وہ اس کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کے خواہشمند کبھی نہیں ہوں گے۔

قُل لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا (۱۰۹)

معجزہ کا مطالبہ کرنے والوں کو جواب

کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی وہ نشانیاں ہیں جو آفاق و انفس میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ ان منکرین کو جواب ہے جو قرآن کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے اور پیغمبر سے کسی ظاہری اور حسی معجزے کا مطالبہ کرتے تھے۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر نشانیوں کے طلب گار ہو تو یہ کائنات، اتنی نشانیوں سے بھری ہوئی ہے کہ سمندر اگر روشنائی بن جائے تو اس کی روشنائی بھی ان کو قلم بند کرنے کے لیے ناکافی ہو اگرچہ اسی طرح کا ایک اور سمندر بھی اس کے ساتھ ملا لیا جائے۔ سورۂ لقمان میں یہ مضمون اس سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اور یہ سر تا سر بیان حقیقت ہے اس میں ذرہ برابر بھی مبالغہ نہیں ہے۔ سمندر تو اگر اپنی ہی نشانیوں اور عجائب کو قلم بند کرنا چاہے تو اس کی ساری روشنائی ان کے لیے بھی کافی نہ ہو۔ لیکن یہ نشانیاں صرف ان کو نظر آتی ہیں جن کے پاس آنکھیں ہوں۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (۱۱۰)

یعنی ان نشانیاں مانگنے والوں سے کہہ دو کہ میں تمھاری ہی طرح ایک بشر ہوں۔ نشانیاں دکھانا خدا کا کام ہے۔ میں نے رسول ہونے کا اعلان کیا ہے تو جو وحی میرے پاس آتی ہے وہ میں تمھیں سناتا ہوں۔ خدائی کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ تمھاری طلب کے مطابق معجزہ دکھا دوں۔ میرے پاس جو وحی آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو جو اپنے رب کی ملاقات کا متوقع ہے وہ بلا شرکت غیرے اس کی بندگی کرے۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس سورہ کی تفسیر میں حوالۂ قرطاس ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں سے درگزر فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

لاہور

۲۷ ؍ اکتوبر ۱۹۷۲ء

تدبرِ قرآن

١٩

مریم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سورۂ کہف کی مثنیٰ یا بالفاظ دیگر اس کی توام سورہ ہے۔ ان دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ وہی مضمون جو سورہ کہف میں بیان ہوا ہے اس میں بھی بیان ہوا ہے لیکن طریق استدلال اور ترجیح بیان میں فرق ہے۔ اس میں حضرت آدم، نوح اور ابراہیم علیہم السلام کی نسل میں پیدا ہونے والے انبیائے اولوالعزم کے متعلق یہ بات بتائی گئی ہے کہ ان کی دعوت، توحید کی دعوت تھی۔ انھوں نے نماز و زکوٰۃ کا حکم دیا لیکن ان کے پیرو شرک میں مبتلا ہوئے اور نماز و زکوٰۃ ضائع کر کے بدعات و شہوات میں پڑ گئے۔ اور اب جب کہ ان کو ان کے اصل دین کی دعوت دی جا رہی ہے تو اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے مقابل میں صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے اور انجام کار کی کامیابی کی بشارت دی گئی ہے۔ آخر میں مخالفین کی گمراہی کی اصل علت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ اہل ایمان کے مقابل میں اپنی دنیوی کامیابیوں کو اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ان کے برحق ہونے کی دلیل نہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے ان کے لیے ڈھیل ہے کہ خدا کی حجت ان پر پوری ہو جائے اور جب وہ پکڑے جائیں تو ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

اس میں حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر خاص طور پر نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم پچھلی سورہ میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس دور میں یہود کی طرح نصاریٰ نے بھی در پردہ قریش کی پشت پناہی شروع کر دی تھی۔ اہل کتاب کی اس پشت پناہی سے قریش کو بڑی طاقت حاصل ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب امی ہونے کے سبب سے مذہبی معاملات میں اہل کتاب سے ایک قسم کا حسن ظن رکھتے تھے جب انھوں نے دیکھا کہ اہل کتاب بھی انہی کے ہم خیال ہیں تو اس سے ان کا حوصلہ بہت بڑھ گیا۔ قرآن نے اہل کتاب کے اس اثر کو باطل کرنے کے لیے ان کی حقیقت واضح کی۔ چنانچہ پچھلے سورہ بنی اسرائیل میں یہود کا بالکل بے بنیاد ہونا واضح کیا ہے۔ اور اس سورہ میں بالکل اسی

انداز میں نصاریٰ کی بے ثباتی دکھائی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ قریش پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جن کی اپنی کوئی بنیاد نہیں ہے وہ بعلاحق و باطل کے اس معرکے میں ان کے لیے کیا سہارا بن سکیں گے ۔

اس تمہید کے بعد اب ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ - ۱۵) سورہ کا آغاز حضرت زکریاؑ کی اس دعا سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود ایک فرزند کے لیے کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرما کر ان کو حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی خوش خبری دی۔ یہ واقعہ تمہید ہے حضرت مریم کے اس واقعہ کی جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی خارق عادت ولادت کو ان کی الوہیت کی دلیل بنایا ۔ قرآن نے یہاں حضرت عیسیٰؑ سے پہلے حضرت یحییٰؑ کی ولادت کا ذکر کر کے دکھایا ہے کہ اگر مجرد خارق عادت ولادت ہی کسی کے الٰہ ہونے کی دلیل ہے تو یہ دلیل آنحضرت عیسیٰؑ سے پہلے حضرت یحییٰؑ کے حق میں موجود ہے۔ ان کی ولادت بھی ایک بوڑھے باپ اور ایک بانجھ ماں کے ہاں ہوئی۔ لیکن نہ تو انھوں نے خود الوہیت کا دعویٰ کیا نہ کسی دوسرے نے ان کو الٰہ بنانے کی کوشش کی۔ علاوہ ازیں یہی حضرت زکریاؑ ہیں جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ کی والدہ حضرت مریمؑ کی تربیت کی اور یہی حضرت یحییٰؑ ہیں جنھوں نے حسب روایات نصاریٰ، حضرت مسیحؑ کو مسح کیا تو پھر حضرت مسیحؑ ابن اللہ کس طرح بن گئے!

(۱۶ - ۳۶) حضرت مریمؑ کی پاکیزہ زندگی اور ان کے زہد و عبادت کا حوالہ۔ حضرت مسیحؑ کی ان کے ہاں جس طرح ولادت ہوئی اس کی تفصیل ۔ حضرت مسیحؑ نے گہوارے ہی میں جس طرح اپنے بندہ ہونے اور خدا کی طرف سے نماز و زکوٰۃ کی ہدایت پانے کی منادی کی ہے، اس کا تذکرہ اور ان بدبختوں کی حالت پر افسوس جنھوں نے یہ ساری باتیں جانتے بوجھتے اللہ کے ایک فرمانبردار بندے کو الٰہ اور اس کی ایک فرمانبردار بندی کو ابن اللہ کی ماں بنا کر رکھ دیا۔

(۳۷ - ۴۰) حضرت مسیحؑ کی واضح تعلیمات کے باوجود ان کے باب میں نصاریٰ کے باہمی اختلاف پر ان کو ملامت اور ایک ایسے دن کی آمد کی دھمکی جس دن اس سارے اختلاف کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

(۴۱ - ۵۰) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو توحید کی جو دعوت دی اور اس کے نتیجہ میں جس طرح انھیں ہجرت کرنی پڑی، اس کا حوالہ۔ پھر اس ہجرت کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑھاپے میں جو اولاد عطا فرمائی اس کا تذکرہ۔

(۵۱ - ۶۳) حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ادریس علیہم السلام کے حالات و خصوصیات کا اجمالی حوالہ کہ یہ آدمؑ و نوحؑ اور ابراہیمؑ و اسرائیلؑ کی ذریت میں اولوالعزم انبیاء گزرے ہیں۔ یہ سب خدا کی ہدایت سے سرفراز اور اس کے برگزیدہ بندے تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب خدا کی آیات سنتے تو روتے ہوئے سجدے

میں گر پڑتے۔ پھر انہی کی اولاد میں ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے نماز و زکوٰۃ سب ضائع کر دی اور اپنی خواہشوں کے پیرو بن گئے۔ یہ لوگ اپنی اس گمراہی کے انجام سے عنقریب دوچار ہوں گے۔ ان کے اندر سے نجات پانے والے وہی بنیں گے جو توبہ اور اصلاح کریں گے۔

(۶۴-۶۵) حضرت جبریل علیہ السلام کی زبان سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی ہدایت اور عجلت سے احتراز کرنے کی تلقین۔

(۶۶-۷۲) قیامت کی تکذیب کرنے والوں کو زجر و تنبیہ اور ان کے انجام کی طرف اشارہ۔

(۷۳-۸۲) مغروروں اور متکبروں کی طرف سے قرآن کے انذار کے جواب کا حوالہ کہ وہ کہتے ہیں کہ جب قرآن کے ماننے والوں کے مقابل میں ہمارا حال بہتر ہے تو لازماً ہمارا ہی عقیدہ و عمل بھی بہتر ہے۔ قیامت اول تو ہے نہیں اور اگر بالفرض ہوئی تو ہم ان خستہ فقیروں سے وہاں بھی بہتر حال میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس باطل ذہنیت کی تردید اور اصل حقیقت سے آگاہی۔

(۸۳-۹۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی تلقین کہ آپ عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کے مطالبہ سے پریشان نہ ہوں۔ ان مغروروں کا ایک ایک دن گنا جا رہا ہے۔ یہ جن معبودوں پر تکیہ کیے ہوئے ہیں یہ ان کے ذرا بھی کام آنے والے نہیں ہیں۔ قیامت کے دن سرخروئی صرف اہل ایمان کو حاصل ہوگی۔

(۹۷-۹۸) آنحضرت صلعم کو ہدایت کہ قرآن انذار و تبشیر کے لیے بہترین چیز ہے۔ اسی کے ذریعہ سے انذار و تبشیر کیجیے۔ جن کے اندر صلاحیت ہوگی وہ اس پر ایمان لائیں گے۔ جو ایمان نہیں لائیں گے وہ اپنا انجام خود دیکھ لیں گے۔ ان کے پیچھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

مطالب کے اس تجزیے سے سورہ کا مجموعی نظام بالکل واضح ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وبیداللہ التوفیق۔

سُوْرَةُ مَرْيَمَ (١٩)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ٩٨

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ (١) ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا (٢) اِذْ نَادٰى آیات ۱-۵
رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا (٣) قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ
الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا (٤) وَاِنِّيْ خِفْتُ
الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ
وَلِيًّا ۙ (٥) يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖۗ وَاجْعَلْهُ رَبِّ
رَضِيًّا (٦) يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ
نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا (٧) قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ
كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا (٨) قَالَ كَذٰلِكَ ۚ
قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ
شَيْئًا (٩) قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ
ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (١٠) فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى
اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (١١) يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ
وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (١٢) وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ

تَقِيًّا ﴿١٣﴾ وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُن جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿١٤﴾ وَسَلَٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱۵-۱

كٓهيٰعٓصٓ ۔ یہ تیرے رب کے اس فضل کی یاد دہانی ہے جو اس نے اپنے بندے زکریا پر کیا۔ جب اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔ اس نے دعا کی اے میرے پروردگار! میرے اندر سے میری ہڈیاں کھوکھلی ہو چکی ہیں اور میرا سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا اور اے میرے رب میں تجھے پکار کے کبھی محروم نہیں رہا۔ میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں کی طرف سے اندیشہ رکھتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے تو تو اپنے پاس سے مجھے ایک وارث بخش جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب کی روایات کا بھی۔ اور اے رب! اس کو پسندیدہ اخلاق بنائیو۔ ۶-۱

اے زکریا ہم تمھیں ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ ہم نے اس سے پہلے اس کا کوئی نظیر نہیں بنایا۔ اس نے کہا اے میرے خداوند! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، میری بیوی تو بانجھ ہے اور میں خود بڑھاپے کی بے بسی کو پہنچ چکا ہوں! فرمایا، ایسا ہی ہوگا تیرے رب نے فرمایا ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے۔ میں نے اس سے پہلے تم کو پیدا کیا درآنحالیکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ اس نے کہا، اے میرے خداوند! میرے لیے کوئی نشانی ٹھہرا دیجیے۔ فرمایا، تمھارے لیے نشانی یہ ہے کہ تم تین شب و روز لوگوں سے بات نہ کر سکو گے درآنحالیکہ تم بالکل تندرست ہو گے۔ پس وہ محراب عبادت سے نکل کر اپنے لوگوں کے پاس آیا اور ان سے اشارہ سے کہا کہ صبح و شام خدا کی تسبیح کرو۔ ۷-۱۱

اے یحییٰ کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور ہم نے اس کو بچپن ہی میں قوت فیصلہ عطا فرمائی اور خاص اپنے پاس سے سوز و گداز اور پاکیزگی۔ اور وہ نہایت پرہیزگار تھا۔ اور وہ اپنے

والدین کا فرماں بردار تھا، سرکش و نافرمان نہ تھا۔ اس پر سلامتی ہے جس روز وہ پیدا ہوا جس دن وہ مرے گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ ۱۲-۱۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

کٓھٰیٓعٓصٓ (۱)

یہ حروف مقطعات میں سے ہے۔ ان حروف پر مفصل بحث سورۂ بقرہ کے شروع میں دیکھیے۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا (۲)

حضرت زکریا کا ذکر خاص — 'ذکر' یہاں اسی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں آگے حضرت مریمؑ سے لے کر حضرت ادریسؑ تک تمام انبیاء کا ذکر بصیغۂ 'اذکر' ہوا ہے۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ نادانوں نے تو یہ تمام سرگزشتیں فراموش کر دیں، یہ تمھیں سنائی جا رہی ہیں تاکہ تم بھی ان سے بہرہ مند ہو اور دوسروں کو بھی یاد دہانی کرو کہ وہ بھی ان سے بہرہ مند ہوں۔ آیت میں 'عَبْدَهٗ' کا لفظ حضرت زکریا کے اختصاص پر دلیل ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ خود اپنا بندہ کہہ کر یاد فرمائے اس کے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے!

بولائے تو کہ گر بندۂ خویشم خوانی
ز سر خواجگی کون و مکاں برخیزم

إِذْ نَادَىٰ رَبَّهٗ نِدَاءً خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا (۳-۴)

اولاد کے لیے حضرت زکریا کی دعا اور انداز دعا — یہ حضرت زکریاؑ کی دعا ہے جو انھوں نے فرزند کی ولادت کے لیے کی ہے۔ یہ دعا انھوں نے ہیکل میں، جیسا کہ آگے اشارہ آ رہا ہے، غالباً بحالتِ اعتکاف کی ہے۔ فرمایا کہ اس نے چپکے چپکے اپنے رب کو پکارا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کا راز و نیاز کے انداز میں ہونا اس کے اولین آداب میں سے بھی ہے اور اس کی قبولیت کے لیے بہترین سفارش بھی۔ درحقیقت یہی دعائیں ہوتی ہیں جو ریا اور نمائش سے بھی پاک ہوتی ہیں اور انہی کے اندر بندہ اپنے دل کے اصلی راز بھی کھولتا ہے۔ اس وجہ سے دعا کے اس ادب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ صرف اجتماعی دعائیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

موثر تمہید — 'وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي' کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ میرا ظاہری جسم تو در کنار میرے تو اندر کی ہڈیاں تک کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ یہ حضرت زکریاؑ نے عرض مدعا سے پہلے اس کے لیے تمہید استوار کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ایسی مؤثر تمہید استوار کی ہے کہ اگر سوءِ ادب پر محمول نہ کیجیے تو عرض کروں کہ یہ خدا کی رحمت پر کمند ڈال دینے والی تمہید ہے۔ حضرت زکریاؑ نے ایک تو اپنے ضعف و ناتوانی کو سفارش میں پیش کیا۔ دوسرے اپنے ساتھ زندگی بھر

اپنے رب کے معاملے کو، فرماتے ہیں کہ اے رب میں کبھی تجھے پکار کے محروم نہیں رہا۔ غور کیجیے کہ جو سائل جس در سے کبھی محروم نہیں لوٹا ہے وہ اس پیری و ناتوانی میں، جب کہ اس کی ہڈیوں تک کی گود خشک ہو چکی ہے اس دروازے سے کس طرح محروم لوٹایا جائے گا۔

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا ۝ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۗ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا (۵-۶)

دینی وراثت کے حامل کے لیے دعا

'مَوَالِیْ' سے مراد کسی شخص کے بنی اعمام، بھائی بند اور اس کے نسبتی اعزہ و اقربا ہوتے ہیں۔ حضرت زکریاؑ کے اقربا، معلوم ہوتا ہے کہ اچھے لوگ نہیں تھے، ان کی طرف سے اندیشہ تھا کہ یہ لوگ، ان کی وفات کے بعد ان کی اور آلِ یعقوبؑ کی ان دینی روایات کو قائم نہ رکھ سکیں گے جو اس پاکیزہ خاندان کا اصل سرمایۂ امتیاز ہیں۔ انھیں فکر تھی کہ خاندان میں کوئی ایسا شخص اٹھے جو اس خاندان کے مشن کو زندہ رکھ سکے اور ان روایات کا حامل ہو جو آلِ یعقوب کا اصل ورثہ ہیں۔ اگرچہ خود پیری و ناتوانی کے آخری مرحلہ میں داخل ہو چکے تھے اور بیوی بانجھ تھیں، جہاں تک ظاہری اسباب و حالات کا تعلق ہے اس آرزو کے بر آنے کی کوئی توقع نہیں تھی، لیکن وہ اس رمز سے آگاہ تھے کہ اسباب و ذرائع خدا کے ہاتھ میں ہیں، خدا اسباب و ذرائع کا غلام نہیں ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے دعا فرمائی کہ اے رب اگرچہ اسباب ناپید ہیں لیکن تیرے اختیار میں سب کچھ ہے۔ تو خاص اپنے پاس سے مجھے ایک وارث عنایت فرما جو میری اور آلِ یعقوب کی دینی وراثت کو سنبھال سکے اور اے رب اسے پسندیدہ اخلاق بنائیے، وہ ان کمزوریوں سے پاک ہو جو اب اس خاندان میں در آئی ہیں۔

یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ ِۨ اسْمُهٗ یَحْیٰی ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا (۷)

سچی دعا اور اس کی قبولیت

جب دعا صحیح وقت پر، صحیح مقصد کے لیے، سچے جذبے کے ساتھ اور صحیح الفاظ میں کی جاتی ہے تو اس میں اور اس کی قبولیت میں کوئی فاصلہ نہیں رہ جاتا۔ اس کے لیے اسباب کے تمام پردے اٹھا دیے جاتے ہیں۔ ہر طرف تاریکی اور مایوسی ہوتی ہے، اسباب و حالات بالکل نامساعد نظر آتے ہیں، کسی طرف سے بھی امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی لیکن بندہ جب اس امید کے ساتھ اپنے آپ کو اپنے رب کے دروازے پر ڈال دیتا ہے کہ بہر حال میرے لیے یہی دروازہ ہے، میں نے جو کچھ پایا ہے یہیں سے پایا ہے اور جو کچھ پاؤں گا یہیں سے پاؤں گا تو بالآخر اس کے لیے خدا کی رحمت اس گوشہ سے نمودار ہوتی ہے جہاں سے اس کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا اور اس شان سے نمودار ہوتی ہے کہ اسباب و ظواہر کے غلام اس کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ حضرت زکریاؑ کی یہ دعا بھی ٹھیک مقصد کے لیے، ٹھیک وقت پر اور سچے جذبہ کے ساتھ تھی اس وجہ سے الفاظ زبان سے نکلے نہیں کہ اس کی قبولیت کی بشارات نازل ہو گئی۔ فرمایا کہ اے زکریا ہم تمھیں ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہو گا۔

لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا 'سمی' کے معنی نظیر و مثال کے ہیں۔ اس سورہ میں آگے آیت ۶۵ میں ہے۔ 'هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا' کیا تم خدا کی کسی نظیر سے آشنا ہو۔ یہ حضرت زکریا کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ ہر چند تم بوڑھے ہو اور تمھاری بیوی بانجھ ہے، بوڑھے مرد اور بانجھ بیوی کے ہاں اولاد کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے لیکن ہماری مرضی یہی ہے کہ ہم تمھیں ایسی ہی بے نظیر اولاد دیں۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا (۸)

'عتی' کے معنی ہیں کسی شے کا حد سے متجاوز ہو جانا، قابو اور اختیار سے باہر نکل جانا 'وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا' یعنی اب میں بڑھاپے کی اس حد کو پہنچ چکا ہوں کہ مجھے اپنے اعضاء و جوارح اور اعصاب پر قابو نہیں رہ گیا ہے۔

سوال مزید اطمینان کے لیے

یہ حضرت زکریا نے اس بشارت کے باب میں مزید اطمینان حاصل کرنے کے لیے اپنے اس تردد کا اظہار فرمایا جو ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے اس بشارت کے ظہور سے متعلق ان کو لاحق ہوا۔ فرمایا کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود اپنے بڑھاپے کی اس حد کو پہنچ چکا ہوں کہ مجھے اپنے اعصاب پر قابو نہیں رہ گیا ہے، ایسی حالت میں میرے ہاں اولاد کس طرح ہو گی۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا (۹)

قرینہ دلیل ہے کہ یہ جواب ہاتف غیب کی زبان سے ہے۔ 'كَذٰلِكَ' کی خبر کا حذف زور اور تاکید پر دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے رب کا فیصلہ یہی ہے، بس یوں ہی ہو گا۔ جس خدا نے عدم محض سے انسان کو وجود بخشا اس کے لیے بوڑھے باپ اور بانجھ ماں سے اولاد پیدا کر دینا کیا مشکل ہے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْ اٰيَةً ۚ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (۱۰)

اطمینانِ قلب کے لیے ایک اور درخواست

یہ حضرت زکریا نے اپنے اطمینانِ قلب کے لیے ایک اور درخواست پیش کر دی۔ یہ بشارت ان کی دلی آرزو کا مظہر اور ان کے لیے بڑی اہمیت رکھنے والی تھی اس وجہ سے انھوں نے چاہا کہ ہر پہلو سے اس پر شرح صدر ہو جائے۔ حضرت زکریا نے یہ بشارت ہاتف غیب سے سنی تھی اس وجہ سے انھیں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے یہ واہمہ کی خلاقی ہو اور اپنے ہی گنبدِ دل کی صدا اس شکل میں سنائی دی ہو۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ ان کو کوئی ایسی نشانی دکھا دی جائے جس سے انھیں پورا اطمینان ہو جائے کہ یہ بشارت رب ہی کی طرف سے ملی ہے، اس میں نفس یا شیطان کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس قسم کی درخواستیں بعض دوسرے انبیاء کی بھی قرآن میں مذکور ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام رویا اور ہاتفِ غیب کی باتیں قبول کرنے کے معاملے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ اس سے خدانخواستہ ان کے ایمان کے بارے میں کوئی شبہ کرنے کی گنجائش نہیں نکلتی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا کی یہ دعا بھی قبول فرمائی اور اس بشارت کے خدائی بشارت ہونے کی نشانی یہ مقرر فرما دی کہ تم تین شبانہ روز مسلسل تسبیح و تہلیل ذکر کر سکو گے لیکن کوئی اور لفظ زبان سے

نہ نکال سکو گے۔ ظاہر ہے کہ ایک آدمی پر ایسی حالت کا طاری ہو جانا کہ وہ ذکر الٰہی تو کر سکے لیکن کوئی اور کلمہ زبان سے نہ نکال سکے، کوئی شیطانی حالت نہیں ہو سکتی، یہ ہو سکتی ہے تو رحمانی حالت ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یہ حالت حضرت زکریاؑ پر طاری ہو گئی، وہ محراب عبادت سے نکل کر لوگوں میں آئے تو وہ کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ صرف اشارے سے انھوں نے لوگوں کو تسبیح و تہلیل میں مشغول رہنے کی ہدایت کی۔

بعض لوگوں نے اَلَّا تُكَلِّمَ کو خبر کے بجائے نہی کے معنی میں لیا ہے۔ آیت کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ نے نشانی مانگی تو ان کو حکم ہوا کہ تین رات لگاتار تم کسی سے بات نہ کرو۔ جن حضرات نے آیت کا مطلب یہ لیا ہے انھوں نے نہ تو اس بات پر غور کرنے کی زحمت اٹھائی کہ حضرت زکریاؑ نے کس چیز کی نشانی مانگی تھی اور نہ اس مسئلہ پر غور فرمایا کہ حضرت زکریاؑ کو تین شبانہ روز خاموش رہنے کے حکم میں نشانی ہونے کا کیا پہلو نکلا!

سَوِيًّا کا مفہوم 'سوی' مرض اور عیب سے بری کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تم تین شبانہ روز کسی سے بات تو نہ کر سکو گے لیکن یہ حالت کسی مرض یا خرابی کا نتیجہ نہیں ہو گی بلکہ ہر گونہ صحت کے ساتھ محض اللہ کے حکم سے بطور ایک نشانی کے ہو گی جس طرح حضرت موسیٰؑ کے ید بیضا کی نشانی سے متعلق فرمایا ہے کہ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اسی طرح یہاں لفظ سَوِيًّا بطور ایک بدرقہ کے ہے۔ لگاتار یا مسلسل کے معنی میں اس کا استعمال معروف نہیں ہے۔ آگے اسی سورہ میں یہ لفظ آیت ۱۷ میں بھی آیا ہے وہاں یہ صریحاً بھلے چنگے، ہٹے کٹے، تندرست اور مستوی القامت کے معنی میں ہے۔

لیالی شب و روز دونوں پر حاوی ہے 'لیالی' کا لفظ یہاں شب و روز دونوں پر حاوی ہے۔ سورۂ آل عمران میں یہی مضمون لفظ 'ایام' سے بیان ہوا ہے۔ ایام کا اطلاق بھی شب و روز دونوں پر ہوتا ہے۔ عربی میں یہ استعمالات معروف ہیں۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (۱۱)

تسبیح کی ہدایت کے اندر رمز 'محراب' سے مراد معبد کا کوئی حجرہ یا برآمدہ ہے۔ آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت زکریاؑ اس دعا کے وقت ہیکل ہی کے کسی گوشہ میں معتکف تھے۔ سورۂ آل عمران سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ نماز میں کھڑے تھے کہ یہ بشارت ان پر نازل ہوئی۔ اس کے بعد وہ اپنے لوگوں میں آئے اور اشارے سے ان کو برابر تسبیح و استغفار میں مشغول رہنے کی ہدایت کی۔ اس اشارے کے اندر یہ بات مضمر تھی کہ وہ قدرت کے کسی بہت بڑے راز کے امین ہیں جس کے اظہار کا وقت ابھی نہیں آیا ہے! لوگ خدا کی حمد و تسبیح میں مشغول رہ کر اس کا انتظار کریں اور دیکھیں کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (۱۲)

الکتٰب اور الحکم سے مراد 'کتاب' سے مراد ظاہر ہے کہ تورات ہے۔ حضرت یحییٰؑ پر کوئی الگ کتاب نازل نہیں ہوئی۔ لفظ 'حکم' پر ہم آل عمران ۷۹ کے تحت مفصل بحث کر چکے ہیں۔ اس سے مراد حق و باطل میں امتیاز کی قوت و صلاحیت ہے۔

یہی قوت و صلاحیت تمام علم و حکمت کی بنیاد ہے۔ یہ صلاحیت عام حالات میں تو سنِ رشد کے بعد ابھرتی ہے اور چالیس سال کی عمر میں پختہ ہوتی ہے لیکن حضرت یحییٰ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل ہوا کہ ان کو یہ دولت گرانمایہ بچپن ہی میں مل گئی۔

کتاب کو مضبوطی پکڑنے کا مفہوم

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت سے پہلے یہ مضمون محذوف ہے کہ بالآخر اللہ تعالیٰ کی بشارت کے مطابق حضرت یحییٰ کی ولادت ہوئی، وہ سنِ رشد کو پہنچے، اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور ان کو اپنی کتاب مضبوطی سے پکڑنے کی ہدایت فرمائی۔ 'کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو'، کا مفہوم یہ ہے کہ شیاطین اور اس کے اولیاء اس کتاب کے ابدی دشمن ہیں وہ تم کو اس کتاب سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر دیں گے تو خبردار خوف یا طمع یا کسی چیز سے بھی ڈرا کر یا ورغلا کر تم کو وہ اس سے ہٹنے نہ پائیں۔ چنانچہ حضرت یحییٰ کے متعلق معلوم ہے کہ اس کتاب کی خاطر انھوں نے سر کٹوا دیا۔

وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكَاةً ۖ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُن جَبَّارًا عَصِيًّا (۱۳-۱۴)

حنان کا مفہوم

'حنان' کے معنی محبت، ذوق و شوق اور سوز و گداز کے ہیں۔ یہ لفظ نہایت معروف و متداول الفاظ میں سے ہے اس وجہ سے تعجب ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف، بعض لوگوں نے یہ بات، کس طرح منسوب کر دی کہ انھوں نے فرمایا کہ مجھے اس کے معنی معلوم نہیں۔

قلب و روح کی اصل زندگی

یہ سوز و گداز اور یہ محبت ہی انسان کے قلب و روح کی زندگی کی اصل علامت ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان انسان نہیں بلکہ پتھر کی ایک مورت ہے۔ اس سوز و گداز میں سے حضرت یحییٰ کو، جیسا کہ 'مِن لَّدُنَّا' کے الفاظ سے واضح ہے، نہایت وافر حصہ ملا تھا۔ ان کے سوز و گداز اور جوشِ محبتِ الٰہی کا کچھ اندازہ کرنا ہو تو انجیلوں میں ان کے ارشادات پڑھیے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے اقوال کی حرارت آج بھی دلوں کو گرماتی اور روحوں کو تڑپاتی ہے۔

'زکوٰۃ' کا مفہوم

'حنان' کے بعد ان کی صفت میں 'زکوٰۃ' کا لفظ آیا ہے۔ 'زکوٰۃ' کے معنی پاکیزگی اور طہارت کے ہیں۔ اس طہارت سے مراد ظاہر اور باطن دونوں کی طہارت ہے۔ یہ درحقیقت 'حنان' ہی کا پرتو ہے۔ گداز باطنی موجود ہو تو نہ باطن میں کسی اخلاقی و عقائدی آلائش کا اثر باقی رہتا ہے نہ ظاہر میں۔

'تقی' کا مفہوم

'زکوٰۃ' کے بعد 'تقی' کا لفظ ہے۔ پچھلی دونوں صفتوں کا تعلق زیادہ تر انسان کے باطن سے ہے۔ اس لفظ میں ان کے ظاہری اعمال و اخلاق اور کردار کی تعریف ہے کہ نہایت ہی پرہیزگار اور متقی تھے۔ ان کی ساری زندگی ترکِ دنیا کی زندگی تھی۔ انھوں نے توبہ کی منادی اس زور و شور سے کی کہ اس سے دشت و جبل گونج اٹھے۔ ہیکل میں تقریر کرتے تو لوگوں کے دل دہل جاتے لیکن اس دنیا سے ان کا تعلق صرف دینے کے لیے تھا اس سے لیا انھوں نے کچھ بھی نہیں۔ جنگل کے شہد اور اس کی ٹڈیوں پر گزارہ کرتے۔ کمبل کی پوشاک سے تن ڈھانکتے اور جس سر کو چھپانے کے لیے اس دنیا میں کوئی چھت نہیں بنائی اس کو خدا کی کتاب کی خاطر کٹوا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ماں باپ کے ساتھ وفاداری

وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا۔ یہ ماں باپ کے ساتھ ان کی وفاداری کا بیان ہے کہ باوجودیکہ وہ یہ سمجھ سکتے تھے کہ ان کی ولادت سے لے کر ان کی تعلیم و تربیت تک ہر چیز براہ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہوئی ہے، وہ کسی چیز میں بھی اپنے ماں باپ کے محتاج نہیں ہوئے لیکن وہ اس قسم کی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ برابر اپنے والدین کے نہایت وفادار اور اطاعت شعار رہے۔ وہ سرکش اور نافرمان نہیں تھے۔

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا (۱۵)

ہر مرحلہ میں مبارک سلامتی

یہ فرشتوں کی مبارک سلامتی کا حوالہ ہے کہ یہ مردِ حق دنیا میں جس دن آیا قدوسیوں نے اس دن مبارک سلامتی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا، جس دن مرا اس دن بھی انھوں نے اَهْلًا وَّسَهْلًا کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور جس دن اٹھایا جائے گا اس دن بھی اسی نعرۂ تحیت کے ساتھ وہ اس کو خوش آمدید کہیں گے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس دنیا نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا کیا، خدا کے ہاں ہر مرحلہ میں اس کے ساتھ جو معاملہ ہوا یا ہوگا وہ مبارک سلامتی کا ہے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۶-۳۶

حضرت یحییٰؑ اور حضرت مسیحؑ کی باہمدگر مشابہت

آگے حضرت مریمؑ، ان کے بطن سے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت اور حضرت عیسیٰؑ کی اصل تعلیم کا تذکرہ ہے۔ اوپر حضرت یحییٰؑ کا ذکر یوں سمجھیے کہ اسی بیان کی تمہید کے طور پر تھا۔ حضرت یحییٰؑ خاندان کے اعتبار سے بھی حضرت عیسیٰؑ کے پیشرو اور شریک ہیں، اور اپنی ولادت کی نوعیت کے پہلو سے بھی بہت بڑی حد تک ان سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ کر کے اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کو اپنی آنکھوں کی پٹی کھولنے کی دعوت دی ہے کہ ایک ہی نسب و حسب کے یکے بعد دیگرے آنے والے دو نبیوں میں آخر یہ عظیم فرق انھوں نے کہاں سے پیدا کر دیا کہ ان میں سے ایک کو خدا بنا کے رکھ دیا درآنحالیکہ دونوں کی ولادت بھی کم و بیش ایک ہی طرح ہوئی اور دونوں کی تعلیم و دعوت بھی مہد سے لے کر لحد تک ایک ہی رہی ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۶-۳۶

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (۱۶)
فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ
لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۷) قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ
تَقِيًّا (۱۸) قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (۱۹)

الربع قَالَتْ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ أَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾ قَالَ
كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ
رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ
مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَأَجَآءَهَا الْمَخَاضُ إِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ
يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ
تَحْتِهَآ أَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّيْٓ
إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ فَكُلِيْ
وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ
إِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾ فَأَتَتْ
بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۖ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾
يٰٓأُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ أَبُوْكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ أُمُّكِ
بَغِيًّا ﴿۲۸﴾ فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ ۖ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ
صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۗ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾
وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ ۖ وَأَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ
مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾
وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ أَمُوْتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾
ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾ مَا كَانَ
لِلّٰهِ أَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۚ إِذَا قَضٰٓى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُوْلُ

لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۳۵﴾ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۶﴾

ترجمۂ آیات ۱۶ - ۳۶

اور کتاب میں مریم کی سرگزشت کو یاد کرو جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر پورب کی جگہ میں جا بیٹھی۔ پس اس نے اپنے آپ کو ان سے پردے میں کر لیا تو ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ بھیجا جو اس کے سامنے ایک کامل بشر کی صورت میں نمودار ہوا۔ وہ بولی کہ اگر تم کوئی خدا ترس آدمی ہو تو میں تم سے خدائے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں۔ اس نے کہا میں تو تمھارے رب ہی کا فرستادہ ہوں تاکہ تمھیں ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔ وہ بولی میرے لڑکا کیسے ہوگا، نہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ لگایا اور نہ میں کوئی چھنال ہوں۔ اس نے کہا یوں ہی ہوگا۔ تیرے رب کا ارشاد ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے۔ اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ (وہ ہمارا رسول ہو) اور ہم اس کو لوگوں کے لیے اپنی ایک نشانی اور اپنی جانب سے ایک رحمت بنائیں۔ اور یہ ایک طے شدہ امر ہے۔ ۱۶-۲۱

پس اس نے اس کا حمل اٹھا لیا اور وہ اس کو لے کر ایک دور کے مقام کو چلی گئی۔ بالآخر یہ ہوا کہ دردِ زہ اس کو کھجور کے تنے کے پاس لے گیا۔ اس وقت اس نے کہا، اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مر کھپ کے بھولی بسری چیز ہو چکی ہوتی! ۲۲-۲۳

پس (کھجور کے) نیچے سے فرشتہ نے اس کو آواز دی کہ مغموم نہ ہو۔ تمھارے پائیں سے تمھارے پروردگار نے ایک چشمہ جاری کر رکھا ہے اور تم کھجور کے تنہ کو اپنی طرف ہلاؤ، تم پر تر و تازہ خرمے جھڑیں گے پس کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ اور اگر کوئی آدمی متعرض ہو تو اس سے اشارے سے کہہ دیجیو کہ میں نے خدائے رحمان کے لیے روزے کی منت مان رکھی ہے، تو آج میں کسی انسان سے کوئی بات نہیں کر سکتی۔ ۲۴-۲۶

پس وہ اس کو گود میں اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی۔ لوگوں نے کہا، مریم! تم نے تو یہ نہایت عجیب حرکت کر ڈالی۔ اے ہارون کی بہن! نہ تمہارا باپ ہی کوئی برا آدمی تھا اور نہ تمہاری ماں ہی کوئی چھنال تھی۔ ۲۷-۲۸

اس نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا ہم اس سے کس طرح بات کریں جو ابھی گود میں بچہ ہے؟ بچے نے جواب دیا، میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے نبی بنایا ہے اور میں جہاں کہیں بھی ہوں اس نے مجھے سرچشمۂ خیر و برکت ٹھہرایا ہے اور جب تک جیوں اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی ہدایت فرمائی ہے اور مجھے ماں کا فرمانبردار بنایا ہے، مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا ہے۔ مجھ پر سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔ ۲۹-۳۳

یہ ہیں عیسیٰ ابن مریم۔ یہ اصل حقیقت بیان ہوئی ہے جس میں یہ لوگ جھگڑ رہے ہیں۔ خدا کے شایان نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے۔ وہ پاک ہے۔ جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس کو فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ ۳۴-۳۵

اور بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی تو اسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ ۳۶۔

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (۱۶)

'الکتاب' سے مراد اناجیل ہیں جن میں جستہ جستہ حضرت مریمؑ کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ ہم نے سورۂ آل عمران کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ ان کا حوالہ دیا ہے۔ اس وجہ سے یہاں ہم صرف آیات کے سیاق و سباق کی وضاحت کی حد تک بحث کو محدود رکھیں گے۔

ہیکل میں عورتوں کی عبادت کی جگہ مشرقی سمت میں تھی

'انتباذ' کے معنی لوگوں سے بالکل منقطع ہو کر ایک طرف ہو جانے کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت مریمؑ ہیکل کے مشرقی جانب میں معتکف ہو گئیں۔ مشرقی جانب میں اس وجہ سے کہ ہیکل کا جو حصہ عورتوں کے اعتکاف عبادت کے لیے خاص تھا وہ مشرقی سمت ہی میں تھا۔ اس عہد کے بیت المقدس کے نقشوں میں عورتوں کی جائے عبادت (WOMEN COURT) کو مشرقی جانب ہی دکھایا گیا ہے۔ نصاریٰ نے اپنا قبلہ جو مشرق کو بنایا اس میں بڑا دخل اسی چیز کو ہے کہ وہ ہیکل کی مشرقی سمت کو اپنی خاص سمت سمجھتے ہیں۔

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا ۖ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۷)

حضرت مریمؑ کا امتحان

لوگوں کے اور اپنے درمیان پردہ حائل کر لینا اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ اعتکاف میں بیٹھ گئیں۔ اس دوران میں اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس اپنا فرشتہ بھیجا جو ایک تندرست و توانا آدمی کی شکل میں ان کے سامنے نمودار ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت مریمؑ کا امتحان لینا منظور تھا کہ فرشتہ بشری روپ میں نمودار ہوا ورنہ حضرات انبیاءؑ کے لیے بھی فرشتوں کے ظہور کی عام شکل یہ نہیں رہی ہے۔ اس حادثہ کا جو اثر حضرت مریمؑ پر جو ابھی فرشتہ اور ہاتف وغیرہ سے ناآشنا تھیں، پڑا ہو گا اس کا اندازہ کرنا کچھ آسان نہیں ہے لیکن اس نازک موقع پر حضرت مریمؑ نے جس کردار کا مظاہرہ کیا وہ بے مثال ہے۔

قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا (۱۸)

حضرت مریمؑ کا بے مثال کردار

انھوں نے بڑے وقار کے ساتھ ظاہر ہونے والی ذات کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تم میں کچھ خدا ترسی ہے تو میں تم سے اپنے آپ کو خدائے رحمان کی پناہ میں دیتی ہوں۔

قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا (۱۹)

فرشتے نے کہا جس خدائے رحمان کے واسطے سے آپ مجھ سے پناہ مانگ رہی ہیں اسی کا بھیجا ہوا تو میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ کو ایک پاکیزہ خصائل فرزند عطا کروں۔

قَالَتْ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا (۲۰)

'بغی' بدکار اور چھنال عورت، کو کہتے ہیں۔

حضرت مریمؑ فرشتہ کی اس بات کو سن کر ہک دھک رہ گئیں۔ انھوں نے فرمایا کہ میرے لڑکا کس طرح پیدا ہو گا، مجھے تو کسی انسان نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور میں کوئی بدکار اور چھنال بھی نہیں ہوں!!

لوقا کی بے سروپا روایتِ نکاح

حضرت مریمؑ کے اس ارشاد سے یہ بات بالکل صاف واضح ہے کہ لوقا میں یہ روایت کہ یوسف نامی کسی شخص سے ان کا نکاح ہوا تھا، بالکل بے سروپا روایت ہے۔ اگر ان کا نکاح ہوا ہوتا تو یہ خبر ان کے لیے ایک نہایت مبارک خوش خبری ہوتی اور وہ مذکورہ الفاظ میں اس پر تشویش اور حیرت کا اظہار کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتیں۔ ہمارے نزدیک لوقا کی یہ روایت یہود کی دراندازی کا مولود فساد ہے اس لیے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی خارق عادت ولادت کے سخت مخالف ہیں۔ ہمارے ہاں جن لوگوں نے اس روایت کو بے سوچے سمجھے نقل کر لیا ہے انھوں نے

نے نادانستہ یہود ہی کی مقصد برآری کی ہے۔ حضرت مریمؑ کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی منت کے مطابق ہیکل کی خدمت کے لیے وقف تھیں اس وجہ سے ان کے نکاح اور بیاہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہیکل کے خدام گھر گرہستی کے تمام علائق سے یک قلم آزاد ہوتے تھے۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے ایک امرِ واقعی کو نظرانداز کر دیجیے اور اس سوال پر غور کیجیے کہ اگر حضرت مریمؑ کسی کے عقدِ نکاح میں تھیں تو ان الفاظ کا کیا موقع و محل تھا جو الفاظ انھوں نے فرمائے؟ یہ الفاظ تو کسی کنواری عفیفہ ہی کی زبان سے موزوں ہو سکتے ہیں، کسی شادی شدہ عورت کی زبان سے تو یہ موزوں نہیں ہو سکتے۔ علاوہ ازیں حضرت مریمؑ کے خاندان والوں نے جن الفاظ میں ان کو ملامت کی ہے اور جو آگے آ رہے ہیں وہ بھی اس صورت میں بالکل بے محل ہو کے رہ جاتے ہیں۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا ۚ وَكَانَ أَمْرًا مَقْضِيًّا (۲۱)

'وَلِنَجْعَلَهُ' کا معطوف علیہ بیان پر بنائے قرینہ محذوف ہے۔ اگر اس کو کھول دیجیے تو پوری بات گویا یوں ہوگی کہ تمھارے رب کا ارشاد ہے کہ ہم ایسا اس لیے کریں گے کہ اس کو بنی اسرائیل کے لیے رسول بنائیں اور وہ لوگوں کے لیے ہماری طرف سے ایک نشانی اور رحمت ہو۔

حضرت عیسیٰؑ ایک نشانی ہیں

حضرت عیسیٰؑ کا ایک نشانی ہونا قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ انبیاء آیت ۹۱۔ اور مومنون آیت ۵۰۔ ہمارے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خارق عادت ولادت قیامت کی بہت بڑی نشانی ہے۔ نادانوں کو قیامت پر سب سے بڑا شبہ یہی تو ہوتا ہے کہ آخر اسباب کے بغیر لوگ کس طرح دوبارہ پیدا ہو جائیں گے۔ حضرت عیسیٰؑ کا وجود اس شبہ کا جواب ہے کہ ہر چیز اللہ کے کلمہ 'کُن' سے ظہور میں آتی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ اسی کلمہ سے وجود میں آئے ہیں، چنانچہ اسی بنیاد پر ان کو انجیل اور قرآن دونوں میں 'کلمۃ اللہ' کہا بھی گیا ہے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا (۲۲)

'دور کی جگہ' سے مراد

'قَصِيّ' کے معنی دور کے ہیں۔ یہاں کوئی تصریح نہیں ہے کہ اس 'دور کی جگہ' سے کون سی جگہ مراد ہے۔ لیکن انجیلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ بیت اللحم چلی گئیں۔ ظاہر ہے کہ حمل کا احساس کرنے کے بعد وہ ایک شدید ذہنی پریشانی اور کرب میں مبتلا ہو گئی ہوں گی۔ اس طرح کے حالات میں آدمی کے لیے اپنا ماحول وحشت انگیز بن جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس سے الگ ہو کر کوئی اور مامن تلاش کرے، شاید وہاں سکون حاصل کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ حضرت مریمؑ کی یہ تدبیر اسی طرح کی ایک تدبیر تھی۔

فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَنْسِيًّا (۲۳)

'جِذْع' تنہ کو کہتے ہیں اور 'نَخْلَة' پر الف لام اس بات کا قرینہ ہے کہ کھجور کا یہ درخت پہلے سے ان کے علم میں تھا۔ ممکن ہے اس ذہنی پریشانی کے عالم میں انھیں رؤیا کے ذریعے سے یہ غیبی اشارہ ہوا ہو کہ جب ولادت کا مرحلہ آئے تو وہ فلاں کھجور کے پاس چلی جائیں، وہاں ان کے لیے ضروری لوازم فراہم ہوں گے۔ چنانچہ جب

انھوں نے دردِ زہ کا احساس کیا تو اس تاب نہ ہوتے ہوئے درخت کے نیچے چلی گئیں۔

حضرت مریمؑ کے دلی احساسات کا ایک عکس

قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔ ذرا تصور کیجیے کیا حال ہوا ہوگا ایک پاکیزہ گھرانے کی ایک کنواری عفیفہ کا جب اس نے اپنے گمان کے مطابق اپنی رسوائی کا یہ سامان اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا ہوگا! یہ فقرہ ان کے اندرونی احساسات کی بالکل صحیح تعبیر ہے۔ انھوں نے فرمایا اے کاش اس فضیحتے سے پہلے ہی میں مرگئی ہوتی، صرف مر ہی نہیں گئی ہوتی بلکہ لوگوں کے حافظہ سے میری یاد بھی محو ہو چکی ہوتی۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا (۲۴)

قرینہ دلیل ہے کہ 'نادی' کا فاعل فرشتہ ہے اور 'مِنْ تَحْتِهَا' میں ضمیر کا مرجع 'نَخْلَة' ہے۔ 'سَرِيّ' چھوٹے چشمہ کو کہتے ہیں۔

امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد حضرت مریمؑ کو بشارت

حضرت مریمؑ کا غم اس حد کو پہنچ گیا جس کا اظہار اوپر والی آیت سے ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود نہ تو اپنے رب کے سوا کسی اور سے انھوں نے شکوہ کیا اور نہ مایوس ہو کر کوئی غلط قدم اٹھایا۔ اللہ تعالیٰ کو بس یہی امتحان کرنا منظور تھا۔ اس امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد دفعۃً خدائے رحمان و رحیم کی رحمت مسکراتی ہوئی اس گوشہ سے نمودار ہوئی جس گوشہ سے اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی اس مومنہ و قانتہ بندی کے لیے اپنی وہ شانیں دکھائیں جو پوری تاریخ انسانی میں صرف اسی کے لیے ظاہر ہوئیں۔ کوئی اور اس میں اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ فرشتے نے درخت کے نیچے سے آواز دی کہ بس اب مغموم و آزردہ نہ ہو۔ غم کے ایام گزر گئے۔ نیچے ایک چشمہ ہے اور یہ کھجور کا درخت ہے جو تمھارے لیے تر و تازہ کھجوریں فراہم کرے گا۔ کھاؤ پیو اور فرزند کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرو۔

وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (۲۵)

'جِذْع' درخت کے تنہ کو کہتے ہیں۔ کھجور کے تنہ کو حضرت مریمؑ کا ہلانا محض رحمتِ الٰہی کے ظہور کا ایک بہانہ تھا ورنہ ظاہر ہے کہ ان کی قوتِ بازو اتنی کہاں کہ وہ کھجور کے درخت کو ہلا دیں۔

آیت کا اسلوبِ بیان یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جس طرح کوئی شخص اپنے خانسامے کو ناشتہ یا کھانا حاضر کرنے کی ہدایت کرتا ہے اسی طرح تم اس کھجور کے تنہ کو ہاتھ لگانا، یہ تمھارے لیے تازہ اور پکے کھجور حاضر کر دے گا۔

فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا (۲۶)

یعنی کھاؤ پیو اور بچہ کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرو اور روزے کی منت مان لو۔ اگر کوئی شخص آجائے اور کچھ پوچھنا چاہے تو اس سے کہہ دینا کہ میں نے روزے کی منت مان رکھی ہے، میں آج کسی سے بات نہیں کر سکتی۔

خاموشی کا روزہ

یہود کی شریعت میں خاموشی بھی روزے کے شرائط میں تھی۔ اگرچہ آیت میں اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ فرشتہ نے حضرت مریمؑ کو روزہ رکھ لینے کی بھی ہدایت کی لیکن فحوائے کلام سے یہ بات واضح ہے۔ جب فرشتہ ان کو

یہ ہدایت کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص کچھ پوچھے تو اس سے یہ کہہ دینا کہ میں روزے سے ہوں، کسی سے بات نہیں کر سکتی" تو اس سے آپ سے آپ یہ بات لازم آتی ہے کہ ان کو روزہ رکھنے کی بھی ہدایت ہوئی۔ ورنہ فرشتہ آخر غلط بیانی کی ہدایت کس طرح کر سکتا ہے؟

ممکن ہے یہاں کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضرت مریمؑ جس حال میں تھیں اس میں تو عورت کو روزہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہود کے ہاں مجرد خاموشی کا بھی روزہ تھا اور یہ روزہ ہر حال میں رکھا جا سکتا تھا۔ اسفارِ یہود میں "خاموش رہو" کی تعبیر اللہ کو یاد رکھنے اور اس کی عبادت کرنے کے لیے جگہ جگہ استعمال ہوئی ہے ملاحظہ ہو زکریاہ ب ۲، ۱۳

قول، بمعنی اشارہ

ایک بات اس آیت میں بعض لوگوں کو اور کھٹکے گی۔ وہ یہ کہ جب یہ روزہ خاموشی کا روزہ تھا تو یہاں لفظ 'قُولِی' (کہہ دینا) کے استعمال کا کیا محل تھا؟ پھر تو کوئی لفظ ایسا استعمال ہوتا جس کے معنی اشارہ کرنے کے ہوتے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ عربی میں 'قَالَ' اشارہ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ 'قال برمحه' (اس نے اپنے نیزے سے اشارہ کیا) 'قال بیده هكذا' (اس نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا) وغیرہ محاورات عربی میں معروف ہیں۔ آخر الذکر محاورہ تو بعض حدیثوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْـًٔا فَرِیًّا ۝ یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا (۲۷-۲۸)

حضرت مریمؑ کو خاندان والوں کی ملامت

فرشتے سے مذکورہ بالا رہنمائی حاصل کرنے کے بعد حضرت مریمؑ نومولود کو گود میں اٹھائے ہوئے اپنے خاندان والوں میں واپس آئیں۔ ان کو دیکھتے ہی سب ان پر پل پڑے۔ ہر شخص نے ان کو ملامت کی اور غیرت دلائی کہ جس کا باپ شریف، جس کی ماں عفیفہ اور جو ہارون جیسے نیک آدمی کی بہن ہو، حیف ہے اگر وہ ایسی حرکت کی مرتکب ہو!

ہارون سے یہاں مراد

'ہارون' سے مراد یہاں حضرت موسیٰؑ کے بھائی ہارونؑ نہیں ہیں بلکہ حضرت مریمؑ کے خاندان ہی کے لوگوں میں سے کسی نیک شہرت رکھنے والے شخص کا نام ہے۔ حدیثوں سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ ؕ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا (۲۹)

حضرت مریمؑ چونکہ خاموشی کا روزہ رکھے ہوئے تھیں، زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں اسی وجہ سے انھوں نے نومولود کی طرف اشارہ کیا کہ ان تہمتوں کا جواب انہی سے لو، میرے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

[illegible]

ظاہر ہے کہ اس عرصہ میں حضرت مریمؑ پر یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ نومولود اپنا اور ان کا مقدمہ لڑنے کے لیے خدا ہی کے ہاں سے پوری طرح مسلح ہو کر آیا ہے۔ وہ لوگ حضرت مریمؑ کی اس بات سے بہت جز بز ہوئے، بولے کہ ہم تم سے پوچھتے ہیں، اس بچے سے کس طرح بات کریں جو ابھی گہوارے میں ہے!!

جب حضرت مریمؑ کی آزمائش یہاں تک پہنچ گئی اور وہ ہر مرحلہ میں سو فی صدی کامیاب ثابت ہوئیں تو

وقت آ گیا کہ اللہ تعالیٰ اب اپنا اعلان کرا دے کہ وہ اپنے کسی بندے یا بندی کے لیے، جو اس کے امتحان میں کامیاب ہو جائے، اپنی کیا شانیں دکھاتا ہے۔

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ ۟ؕ اٰتٰىنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۪ۖ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ۫ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا (۳۰-۳۳)

گہوارے میں حضرت مسیح کے ارشادات

یہ حضرت مسیح کے وہ ارشادات ہیں جو اس موقع پر انھوں نے اپنی اور اپنی والدہ ماجدہ کی براءت میں گہوارے کے اندر سے فرمائے۔ حضرت مریمؑ جس امتحان میں ڈال دی گئی تھیں اس سے پوری عزت اور سرخروئی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری تھا کہ گود کا بچہ ہی ان کی پاک دامنی اور اپنی وجاہت کی شہادت دے تاکہ کسی کے لیے بھی اس کے بعد لب کشائی کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ہم حضرت مسیح کے ان ارشادات کی وضاحت سورۂ آل عمران کی تفسیر میں کر چکے ہیں یہاں صرف اشارات پر کفایت کریں گے۔

عبرانی میں لفظ 'ابن' کا مفہوم

پہلی بات انھوں نے یہ فرمائی کہ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ 'میں اللہ کا بندہ ہوں'۔ یعنی کوئی میری اس خارق عادت ولادت سے اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو کہ میں کوئی مافوق بشر ہستی ہوں۔ میں اللہ کا بندہ ہی ہوں۔ یہ قرآن نے ان کے ارشاد 'ابنُ اللہ' کی صحیح تعبیر بتائی ہے۔ عبرانی میں 'ابن' کا لفظ بندہ اور بیٹے دونوں کے لیے آتا ہے۔ موقع و محل سے اس کا تعین کرتے ہیں۔ حضرت مسیح کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں اس لفظ کی تاویل میں کسی التباس کی گنجائش نہیں تھی لیکن پال نے اس کو فتنہ کا ذریعہ بنا لیا اور تثلیث کا ایک پورا گورکھ دھندا تیار کر دیا۔ ہم انجیلوں کی روشنی میں اس سینٹ پالی کی تردید سورۂ آل عمران اور مائدہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

تورات پر حکمت کا اضافہ

دوسری بات انھوں نے یہ فرمائی کہ خدا نے مجھے کتاب و نبوت سے سرفراز فرمایا ہے اور میں جہاں کہیں بھی ہوں میرا وجود وہاں کے لیے سراپا خیر و برکت ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاں تک شریعت کا تعلق ہے تورات ہی کی شریعت پر عامل اور اسی کے داعی اور مجدد تھے۔ البتہ انھوں نے اس پر حکمت کا اضافہ فرمایا۔ یہی حکمت کے وعظ ہیں جو منتشر اور نا تمام حالت میں ہمیں انجیلوں میں ملتے ہیں۔ یہی لعل و گہر ہیں جو وہ اپنی زبانِ مبارک سے ہر دشت و چمن میں برساتے ہوئے گزرتے تھے اور جس دل میں ذرا بھی زندگی کی رمق ہوتی تھی اس کو زندہ جاوید کر دیتے تھے۔

تمام دین و شریعت کی بنیاد نماز اور زکوٰۃ پر ہے

تیسری بات انھوں نے یہ فرمائی کہ مجھے زندگی بھر کے لیے نماز اور زکوٰۃ کی ہدایت ہوئی ہے۔ دراصل یہی دو چیزیں ہیں جو تمام دین و شریعت کی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اس وجہ سے تمام آسمانی شرائع میں سب سے پہلے انھی کا ذکر آتا ہے۔ ان کی ظاہری شکلیں مختلف ادیان میں مختلف رہی ہیں لیکن بندگی رب اور ہمدردی خلق کی روح ان کی ہر شکل میں محفوظ رہی ہے۔ نماز آدمی کو اس کے رب سے صحیح طور پر جوڑتی ہے اور زکوٰۃ سے اس کا تعلق خلق کے ساتھ صحیح طور پر استوار ہوتا ہے۔ انھی دو چیزوں کی استواری پر تمام دین کے قیام کا انحصار

ہے۔ اگر کوئی شخص ان کو ڈھا دے تو وہ تمام دین کو ڈھا دے گا اگرچہ وہ دین کے نام پر کتنی ہی لاف زنی کرے۔

ماں کی فرمانبرداری

چوتھی بات انھوں نے یہ فرمائی کہ خدا نے مجھے اپنی ماں کا فرمانبردار بنایا ہے، مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا ہے۔ یعنی ہر چند میری ولادت کی نوعیت خاص ہے، میرے اوپر میرے رب کے انعامات بھی خاص ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں ایک ماں کا بیٹا اور فرمانبردار بیٹا ہوں۔ خدا کے خاص انعامات کے معنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ میری حیثیت عرفی و بشری میں کوئی فرق آگیا ہے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ جو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار نہیں وہ جبار و شقی ہے۔ حضرت مسیحؑ کے اس ارشاد سے انجیل کی بعض ان روایات کی تردید ہوتی ہے جن سے یہ گمان گزرتا ہے کہ خدانخواستہ وہ حضرت مریمؑ کا واجبی احترام نہیں کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ پر دعوائے الوہیت کی تہمت چپکائی گئی ہے تو اس کی تائید فراہم کرنے کے لیے اس قسم کی روایات بھی انجیلوں میں داخل کر دی گئیں۔

وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا (۳۳)

ہر مرحلہ میں سلام و تحیت

جس طرح آیت ۱۵ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰؑ سے متعلق ان کی زندگی اور موت کے ہر مرحلہ میں سلام و تحیت کی بشارت دی ہے اسی طرح یہ حضرت مسیحؑ نے اپنی ولادت، موت اور بعث کے ہر مرحلہ میں اپنے لیے قدوسیوں کے سلام اور ان کی تحیت کی خبر دی ہے۔ اس آیت سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ ولادت، موت اور موت کے بعد اٹھائے جانے کے مراحل سے جس طرح ہر بشر گزرتا ہے اور گزرے گا اسی طرح سیدنا مسیحؑ بھی گزرے اور گزریں گے۔ اس باب میں ان سے متعلق محض تفسیری روایات کی بنا پر کوئی ایسی بات فرض کر لینا احتیاط کے بالکل خلاف ہے جس کی کوئی سند قرآن میں نہیں ہے۔

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۳۴-۳۵)

ایک برمحل جملہ معترضہ بطور تنبیہ

یہ دو آیتیں، حضرت مسیحؑ کے ارشادات کے بیچ میں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور جملہ معترضہ ہیں۔ بالکل برمحل لوگوں کو عام طور پر اور نصاریٰ کو خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ ہے حضرت مسیحؑ کی اصل حقیقت جو انھوں نے خود اپنی زبان سے واضح فرمائی ہے۔

نصاریٰ کی معمہ سازی

قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ 'امتراء' کے اصل معنی بکری کے تھن کو اچھی طرح نچوڑنے کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ کٹ حجتی کر کے کسی بات کو بتنگڑ بنانے اور اس میں طرح طرح کے اوہام و شکوک پیدا کرنے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ فرمایا کہ حضرت مسیحؑ کی اصل حقیقت تو یہ ہے جو اللہ نے بھی بیان فرما دی اور خود حضرت مسیحؑ نے بھی واضح کر دی لیکن عیسائیوں نے اس کو گھس گھس کر افسانہ بنا دیا جس سے خود بھی اوہام میں مبتلا ہوئے اور دوسروں کو بھی مبتلا کر رہے ہیں۔ ہم نصاریٰ کی الٰہیات پر مائدہ، کے تحت تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں، اس پر ایک نظر ڈال کر دیکھیے تو اندازہ ہو گا کہ پال نے سیدھی سادی بات کو کس طرح ایک

چیستان اور معمہ بنا کے رکھ دیا ہے۔

نصاریٰ کا شرک — 'مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ' یہ اس شرک کی تردید ہے جس میں عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا فرض کر کے مبتلا ہوئے۔ فرمایا کہ خدا کی صفات کے یہ بات بالکل منافی ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ سُبْحٰنَهٗ وہ اس قسم کی تمام نسبتوں سے بالکل پاک ہے۔ 'اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ'۔ بیٹے کی ضرورت اس کو ہوتی ہے جو اپنے ارادوں اور منصوبوں کو بروئے کار لانے میں کسی کا محتاج ہو۔ خدا کسی کا محتاج نہیں۔ وہ جب کسی امر کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کے کلمۂ 'کن' سے اس کا ہر ارادہ پورا ہو جاتا ہے۔

اس ٹکڑے میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ حضرت عیسیٰ کی خارق عادت ولادت بھی ان کی الوہیت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ بھی خدا کے کلمۂ 'کن' ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ خدا نے چاہا کہ وہ یوں ہی پیدا ہوں تو وہ بن باپ کے کلمہ 'کن' سے پیدا ہو گئے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۳۶)

عبرانی میں 'اب' کا صحیح مفہوم — جملہ معترضہ ختم ہونے کے بعد یہ حضرت عیسیٰ کے ارشادات کا آخری ٹکڑا نقل ہوا ہے کہ انھوں نے مزید فرمایا کہ اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی تو اسی کی بندگی کرو، خدا تک پہنچانے والی سیدھی راہ یہی ہے۔ انجیلوں میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے یہ جو نقل ہوتا ہے کہ "میرا باپ اور تمھارا باپ" یہ قرآن نے اس کی صحیح تعبیر بتائی ہے۔ عبرانی زبان میں 'اب' باپ اور رب دونوں معنوں میں آتا ہے۔ اس کے صحیح مفہوم کا تعین اس کے محل استعمال سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ "میرا باپ اور تمھارا باپ" کے فقرے میں یہ رب ہی کے معنی میں ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو 'باپ' کے معنی میں لیا جائے تو پھر حضرت عیسیٰ کی کوئی خصوصیت نہیں رہ جاتی بلکہ ساری خدائی اللہ کی اولاد بن جاتی ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۳۷-۴۰

آگے چند آیات میں نصاریٰ کے باہمی اختلافات بیان کر کے ملامت اور ایک ایسے دن کی دھمکی ہے جس دن ایک علیم و خبیر خدا کی طرف سے ان کا سارا کچا چٹھا ان کے سامنے آجائے گا۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۳۷-۴۰

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ
يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۷﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ
الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ
قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ

الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾ ع ۲ / ۵

ترجمۂ آیات ۳۷ - ۴۰

پس ان کے اندر سے مختلف فرقوں نے باہم اختلاف کیا۔ تو ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا ایک ہولناک دن کی حاضری کے باعث ہلاکی ہوگی۔ جس دن یہ ہمارے حضور میں حاضر ہوں گے بڑے شنوا اور بڑے بینا ہو جائیں گے لیکن آج یہ ظالم نہایت کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور ان لوگوں کو اس حسرت کے دن سے آگاہ کر دو جب کہ معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور یہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ بے شک زمین اور روئے زمین پر بسنے والوں کے وارث ہم ہوں گے اور سارے لوگ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔ ۳۷-۴۰

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۳۷)

نصاریٰ کی گروہ بندیاں

یعنی حضرت مسیح کی اصل حقیقت تو وہ ہے جو اوپر بیان ہوئی اور یہ اس قدر واضح بات ہے کہ اس میں کسی اختلاف و نزاع کی گنجائش نہیں تھی لیکن عیسائیوں نے اپنی بدبختی سے اس میں اختلاف پیدا کیا۔ اور ان کے اندر بہت سے چھوٹے بڑے فرقے پیدا ہو گئے۔ ان میں سے حق پر صرف وہ تھوڑے سے لوگ قائم رہے جو شمعون کے پیرو تھے۔ یہی لوگ تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لائے اور انہی کی قرآن نے تعریف کی ہے۔ باقی سب جو پال کے پیرو ہوئے وہ مختلف گروہوں میں بٹتے چلے گئے۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ یہ دو فرقے تو مشہور ہی ہیں ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے بڑے بہت سے چرچ ان کے اندر ہیں۔

'مشہد یوم عظیم' سے مراد

'مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ' سے ہمارے نزدیک حضرات انبیاءؑ کی وہ شہادت مراد ہے جو قیامت کے روز وہ اپنی اپنی امتوں کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے دیں گے۔ اس شہادت کی پوری تفصیل سورۂ مائدہ میں بیان ہوئی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی شہادت کا ضروری حصہ ملاحظہ فرمائیے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ	جب کہ اللہ پوچھے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا
قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ	تم نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ اللہ کے سوا مجھے
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ	اور میری ماں کو معبود بناؤ؟ وہ کہیں گے تو پاک ہے
لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ۭ اِنْ	میرے لیے کس طرح زیبا تھا کہ میں وہ بات کہوں

كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۔ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۔ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (المائدۃ: ۱۱۶-۱۱۸)

جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے کہی ہوگی تو تو اسے جانتا ہے۔ جو کچھ میرے جی میں ہے اس کو تو جانتا ہے لیکن جو کچھ تیرے جی میں ہے اس کو میں نہیں جانتا۔ بے شک غیب کا رازداں تو ہی ہے۔ میں نے تو ان سے صرف وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ ہی کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ میں جب تک ان کے اندر رہا ان پر گواہ رہا۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو ان کا نگرانِ حال تو ہی رہا اور تو ہر چیز سے باخبر ہے۔ اگر تو ان کو سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخشے تو تو غالب اور حکیم ہے۔

آیت زیر بحث میں اسی شہدِ عظیم سے عیسائیوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خود حضرت عیسیٰ سے اللہ تعالیٰ وہ گواہی دلوا دے گا جو مائدہ کی مذکورہ بالا آیات میں بیان ہوئی ہے تو نصاریٰ نہ تو حضرت عیسیٰ کو منہ دکھانے کے قابل رہ جائیں گے نہ اللہ تعالیٰ کو۔ پھر تو ان کے لیے ہلاکی اور ماتم کے سوا کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی۔

اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۸)

'اسمع بہ' اور 'ابصر بہ' عربی میں تعجب کے صیغے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو انھیں اصل حقیقت جب سنائی اور سجھائی جاتی ہے تو نہ اس کو سنتے ہیں نہ اس کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں لیکن جب اس شہدِ عظیم سے ان کو سابقہ پیش آئے گا تو کانوں کے پردے بھی کھل جائیں گے اور آنکھوں کی پٹیاں بھی اتر جائیں گی معلوم ہوگا کہ اس وقت ان سے زیادہ بینا اور شنوا کوئی نہیں ہے، لیکن وہ وقت سننے اور سمجھنے کا نہیں بلکہ سر پیٹنے کا ہوگا۔

'ظالمون' سے یہاں مراد اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے وہ بدقسمت لوگ ہیں جو آنکھ کان رکھتے ہوئے اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے رہے۔

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۳۹)

یوم الحسرۃ سے مراد

'یوم الحسرۃ' سے مراد وہی شہادتِ عظیم کا دن ہے۔ اس دن آنکھیں تو سب کی کھل جائیں گی لیکن توبہ، اصلاح اور سعی و عمل کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ جو لوگ آج غفلت میں پڑے ہوئے ایمان نہیں لا رہے ہیں وہ حسرت سے کہیں گے کہ کاش ان کو دنیا میں پھر جانا نصیب ہوتا کہ وہ ایمان و عمل صالح کی زندگی گزار سکتے

لیکن ان کی یہ حسرت بس حسرت ہی رہے گی۔ اس دن سارے معاملات کا فیصلہ ہو جائے گا اور ہر ایک اپنے اعمال کے نتائج سے دوچار ہوگا۔

اِنَّا نَحۡنُ نَرِثُ الۡاَرۡضَ وَمَنۡ عَلَيۡهَا وَاِلَيۡنَا يُرۡجَعُوۡنَ۔(۴۰)

یعنی اس دن زمین اور اہل زمین سب کا مالک اور وارث اللہ ہی ہوگا اور سب کی پیشی اسی کے سامنے ہوگی۔ اس دن نہ کوئی کسی کی مدد کر سکے گا اور نہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی کسی کی سفارش کر سکے گا۔

۶۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۴۱-۶۳

آگے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس علیہم السلام کی سیرت اور ان کی تعلیم و دعوت کا اجمالی حوالہ ہے اور مقصود اس حوالہ سے ایک طرف تو نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے پہلے جو انبیاء عظام، آدم و نوح اور ابراہیم و اسرائیل علیہم السلام کی نسل سے گزرے ہیں ان سب کی تعلیم و دعوت یہی رہی ہے جو آج اللہ کا رسول تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے لیکن تم ایسے ناخلف نکلے کہ تم نے ان نبیوں کی تعلیم ضائع کر دی اور اس کی جگہ بدعتوں اور ضلالتوں میں مبتلا ہو گئے۔ دوسری طرف قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو جن کے ساتھ نسبت اور جن کے دین کے حامل و وارث ہونے کے تم مدعی ہو، ان خرافات سے کوئی تعلق نہیں تھا جن کو تم آج ملت ابراہیم کے نام سے پوج رہے ہو۔ اصل ملت ابراہیم یہ ہے جس کی دعوت تمہیں قرآن دے رہا ہے لیکن تم اس کی تکذیب کر رہے ہو ــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۴۱

وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذۡ
قَالَ لِاَبِيۡهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَلَا يُبۡصِرُ وَلَا يُغۡنِىۡ
عَنۡكَ شَيۡـًٔـا ﴿۴۲﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّىۡ قَدۡ جَآءَنِىۡ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَمۡ يَاۡتِكَ
فَاتَّبِعۡنِىۡۤ اَهۡدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾ يٰۤاَبَتِ لَا تَعۡبُدِ الشَّيۡطٰنَ ؕ
اِنَّ الشَّيۡطٰنَ كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اَنۡ يَّمَسَّكَ
عَذَابٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ فَتَكُوۡنَ لِلشَّيۡطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنۡتَ
عَنۡ اٰلِهَتِىۡ يٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ ۚ لَـئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكَ وَاهۡجُرۡنِىۡ

مَلِيًّا ﴿٤٦﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ
حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ
عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿٤٨﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا
نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ
صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾ ع وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰۤى ۫ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ ٣ ع ١٠ ٢
كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿٥١﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ
نَجِيًّا ﴿٥٢﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿٥٣﴾ وَاذْكُرْ
فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿٥٤﴾
وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۪ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ
مَرْضِيًّا ﴿٥٥﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٥٦﴾ ۙ
وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿٥٧﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ
مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۫ وَّمِنْ
ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۫ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ اِذَا تُتْلٰى
عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿٥٨﴾ السجدة فَخَلَفَ مِنْۢ السجدة ٥
بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ
يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾ ۙ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴿٦٠﴾ ۙ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ

جَنّٰتِ عَدۡنِ ۣالَّتِیۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَهٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعۡدُهٗ مَاۡتِیًّا ﴿۶۱﴾ لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡهَا لَغۡوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَ لَهُمۡ رِزۡقُهُمۡ فِیۡهَا بُكۡرَةً وَّ عَشِیًّا ﴿۶۲﴾ تِلۡكَ الۡجَنَّةُ الَّتِیۡ نُوۡرِثُ مِنۡ عِبَادِنَا مَنۡ كَانَ تَقِیًّا ﴿۶۳﴾

ترجمۂ آیات ۴۱ — ۶۳

اور کتاب میں ابراہیم کی سرگزشت کو یاد کرو۔ بے شک وہ راست باز اور نبی تھا۔ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ! آپ ایسی چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ وہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں! اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ہے تو آپ میری پیروی کریں، میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ، شیطان کی پرستش نہ کیجیے۔ شیطان خدائے رحمان کا بڑا ہی نافرمان ہے۔ اے میرے باپ! مجھے ڈر ہے کہ آپ کو خدائے رحمان کا کوئی عذاب آ پکڑے اور آپ شیطان کے ساتھی بن کے رہ جائیں۔ ۴۱ - ۴۵

وہ بولا، اے ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو رہے ہو! اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ تم مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور اور دفع ہو! ۔ ۴۶

ابراہیم نے کہا، اچھا میرا سلام! میں آپ کے لیے اپنے رب سے مغفرت مانگوں گا، وہ میرے حال پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو اور ان چیزوں کو جن کو آپ لوگ خدا کے ماسوا پوجتے ہیں، چھوڑ کر علیحدہ ہو رہا ہوں اور صرف اپنے رب ہی کی بندگی کروں گا۔ امید ہے کہ اپنے رب کی بندگی کر کے میں محروم نہیں رہوں گا۔ ۴۷ - ۴۸

پس جب وہ ان کو اور ان چیزوں کو جن کو وہ خدا کے ماسوا پوجتے تھے چھوڑ کر الگ ہو گیا تو ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے اور ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا اور ان کو اپنے فضل میں سے حصہ

دیا اور ان کو نہایت پائیدار شہرت عطا فرمائی۔ ۴۹-۵۰

اور کتاب میں موسیٰ کی سرگزشت کو یاد کرو۔ بے شک وہ برگزیدہ اور رسول اور نبی تھا۔ اور ہم نے اس کو طور کے مبارک کنارے سے آواز دی اور راز و سرگوشی کے لیے اس کو قریب کیا اور ہم نے اپنے فضل سے اس کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر اس کو دیا۔ ۵۱-۵۳

اور کتاب میں اسماعیل کی سرگزشت کو یاد کرو۔ بے شک وہ وعدے کا پکا اور رسول اور نبی تھا۔ وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔ ۵۴-۵۵

اور کتاب میں ادریس کو یاد کرو۔ بے شک وہ راست باز اور نبی تھا۔ اور ہم نے اس کو رتبۂ بلند پر پہنچایا۔ ۵۶-۵۷

یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے نبیوں میں سے، اپنا فضل فرمایا آدمؑ کی اولاد میں سے اور ان لوگوں کی نسل میں سے جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ سوار کرایا اور ابراہیمؑ و اسرائیلؑ کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور جن کو برگزیدہ کیا۔ جب ان کو خدائے رحمان کی آیتیں سنائی جاتیں تو سجدہ کرتے اور روتے ہوئے گر پڑتے۔ پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین اٹھے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے تو یہ لوگ عنقریب اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔ اس سے صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جو توبہ کریں گے اور ایمان و عمل صالح کی روش اختیار کریں گے۔ یہی لوگ ہوں گے جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔ ہمیشگی کے باغ جن کا خدائے رحمان نے اپنے بندوں سے عالم غیب میں وعدہ کر رکھا ہے۔ بے شک اس کا وعدہ پورا ہو کے رہے گا۔ یہ اس میں کوئی لغویات نہیں سنیں گے، بس تحیت ہی تحیت ہوگی۔ اس میں صبح و شام ان کا رزق مہیا ہوگا۔ یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے ان کو بنائیں گے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں گے۔ ۵۸-۶۳

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۥ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (۴۱)

حضرت ابراہیم کے ذکر کی تقدیم کی وجہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ نبوت و رسالت کے دونوں سلسلوں کے، جو حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ سے قائم ہوئے، مسلّم امام ہیں اس وجہ سے سب سے پہلے انہی کی سرگزشت اور دعوت و تعلیم کا حوالہ دیا تاکہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں پر حجت قائم ہو سکے۔

'الکتاب' سے مراد

'الکتاب' سے مراد عام طور پر ہمارے مفسرین نے قرآن کو لیا ہے۔ اگرچہ اس کا بھی ایک محل ہے لیکن میں نے اس سے کتب سابقہ کو مراد لیا ہے۔ میرے نزدیک یہ لفظ یہاں بھی اور آگے جہاں جہاں بھی انبیاء کے ذکر کے سلسلہ میں آیا ہے بطریق حوالہ ہے۔ یعنی تورات و انجیل کے حوالہ سے یہ یاد دہانی کی گئی ہے کہ تمام جلیل القدر انبیاء کی دعوت اور تعلیم وہی رہی ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ اس قرآن کو جھٹلانے والے درحقیقت اپنے انبیاء اور اپنے صحیفوں کی بھی تکذیب کر رہے ہیں۔

اور اگر اس سے قرآن کو مراد لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کتاب میں اس کے مخالفین کو ان انبیاء کی سرگزشت سناؤ کہ وہ اس سے سبق حاصل کریں۔ یہ ان کے لیے رحمت و برکت ہے۔ اگر اس سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو خود اپنے کو اللہ کی نعمت سے محروم کریں گے، کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔

ان دونوں صورتوں میں لفظ کا محل تو ضرور بدل جائے گا لیکن مدعائے کلام میں کچھ ایسا فرق واقع نہیں ہوگا۔

حضرت ابراہیم کی صدیقیت کے ذکر کا ایک خاص پہلو

یہاں حضرت ابراہیمؑ کی صدیقیت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اہل کتاب اور مشرکین عرب دونوں کو اس بات پر ملامت کی جا رہی ہے کہ تم حضرت ابراہیمؑ کی وراثت اور ان کی ذریت ہونے کے مدعی تو بنے بیٹھے ہو لیکن حال یہ ہے کہ تم نے ابراہیمؑ کی دعوت اور ان کی تعلیم کو بالکل برباد کر کے اس کی جگہ ایک نیا دین کھڑا کر لیا ہے۔ ابراہیمؑ تمہاری طرح خدا سے بدعہدی اور بے وفائی کرنے والے نہیں تھے بلکہ صداقت شعار، راست باز اور کامل وفادار تھے۔ خدا نے ان کو جن آزمائشوں میں ڈالا ان میں وہ پورے اترے اور ان امتحانوں میں پورے اترنے ہی کے صلہ میں اللہ نے ان کو امتوں کی امامت کے منصب پر سرفراز فرمایا۔ تم اگر ان کی وراثت اور ان کے ساتھ نسبت کے حق دار ہو سکتے ہو تو اس صورت میں ہو سکتے ہو جب کہ پوری راستبازی کے ساتھ اس عہد کو پورا کرو جو ابراہیمؑ کے واسطہ سے تم نے خدا سے باندھا ہے۔ اس کے بغیر نہ تم ابراہیمؑ کے ساتھ کسی نسبت کے حق دار ہو اور نہ اس امامت ہی میں تمہارا کوئی حصہ ہے جس کا وعدہ اللہ نے ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کے لیے فرمایا۔

سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیمؑ کی اس صدیقیت اور اس کے صلہ و انعام کا یوں ذکر ہوا ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ	اور یاد کرو جب کہ ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں
فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ	میں جانچا تو وہ اس نے پوری کر دکھائیں۔ اس کے رب

اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔ (البقرۃ - ۲ : ۱۲۴)

نے فرمایا کہ اب میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ اس نے سوال کیا، اور میری ذریت کو بھی؟ فرمایا کہ میرا یہ وعدہ ان سے متعلق نہیں ہے جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہوں گے۔

یہاں کلمات سے مراد ظاہر ہے کہ وہی امتحانات ہیں جن میں حضرت ابراہیمؑ مبتلا کیے گئے اور وہ ان میں سو فیصدی کامیاب رہے۔ ان امتحانات کا ذکر قرآن میں تفصیل سے ہوا ہے اور ہم بقرہ کی تفسیر میں ان کا حوالہ دے چکے ہیں۔ انہی امتحانوں میں کامیابی کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو 'صدیق' کے لقب سے نوازا اور قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز فرمایا اور ساتھ ہی حضرت ابراہیمؑ کے سوال کے جواب میں یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ یہ منصب نام و نسب کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ اعمال و کردار کے ساتھ وابستہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے بھی وہی لوگ اس کے حقدار ٹھہریں گے جو اپنے باپ کی صدیقیت کی لاج رکھیں گے۔ جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اور شرک و کفر کے علمبردار بن جائیں گے ان کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، خواہ وہ بنی اسحاق میں سے ہوں یا بنی اسماعیل میں سے۔

سورہ مریم کی زیر بحث آیت کے اصلی زور کو سمجھنے کے لیے لفظ 'صدیق' کے ان تمام مضمرات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اس کے بغیر آگے کے کلام کا اصلی رُخ متعین نہ ہو سکے گا۔

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْـًٔا ۝ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ۝ یٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا ۝ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّیْطٰنِ وَلِیًّا (۴۲-۴۵)

حضرت ابراہیمؑ کی تقریر اپنے باپ کے سامنے

یہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ تقریر ہے جو وحی الٰہی سے سرفراز ہونے کے بعد سب سے پہلے انھوں نے اپنے باپ — آزر — کے سامنے کی ہے۔ اس تقریر میں 'یٰۤاَبَتِ' (اے میرے باپ) کی تکرار حضرت ابراہیمؑ کی دل سوزی، دردمندی اور استمالت کی دلیل ہے۔ ایک سعادت مند بیٹے کے اندر باپ کی گمراہی سے جو تعلق خاطر اور جو اضطراب ہونا چاہیے وہ فقرے فقرے سے نمایاں ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام ہے نہ کہ چچا کا، جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے اور جس کو بے سوچے سمجھے ہمارے بعض مفسرین نے بھی قبول کر لیا اور پھر سبائیوں نے اس کو ایک فتنہ کا ذریعہ بنا لیا۔ ہم تورات کی اس روایت کی اس کے محل میں تردید کر چکے ہیں[۱]۔

اس تقریر کے چند حقائق

توحید کی اس تقریر میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کو، ایک فطری ترتیب کے ساتھ چند حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے۔

سب سے پہلے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ آخر اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی ان پتھر کی مورتوں کو معبود مان کر ان کی پوجا کرنے کا کیا تک ہے؛ کسی کو معبود بنا لینا کوئی شوق اور تفریح کی چیز نہیں ہے۔ اس کا تعلق تو

---

[۱] ملاحظہ ہو تدبر قرآن جلد سوم صفحات ۸۸-۸۹

انسان کی سب سے بڑی احتیاج سے ہے۔ انسان خدا کو اس لیے مانتا ہے اور اس کی عبادت کرتا ہے کہ وہ اس کی دعا و فریاد کو سنتا، اس کے دکھ درد کو دیکھتا اور اس کی ہر مشکل میں اس کی دستگیری کرتا ہے۔ آخر یہ آپ کے اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی مورتیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں، نہ آپ کے کچھ کام آسکتی ہیں، کس مرض کی دوا ہیں کہ آپ ان کے آگے ڈنڈوت کرتے ہیں۔ یہ گویا شرک کے بدیہی باطل ہونے کی دلیل ہے کہ اس کے باطن سے قطع نظر اس کا ظاہر ہی شہادت دیتا ہے کہ یہ کھلی ہوئی سفاہت اور عقل و فطرت سے بالکل بے جوڑ چیز ہے۔

دوسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ خدا کے معاملہ میں یہ طے کرنا کہ اس کا کوئی شریک ہے یا نہیں اور ہے تو کون ہے، یہ مجرد ظن و گمان رکھنے والی چیز نہیں ہے۔ آدمی ایک خدا کو تو اس لیے مانتا ہے کہ فطرت اور عقل و آفاق اور انفس کے اندر اس کی شہادت موجود ہے اور ہر انسان، جس کی فطرت سلیم ہو، اس کے ماننے پر مضطر ہے لیکن دوسروں کو ماننے کے لیے کیا مجبوری ہے کہ خواہ مخواہ کو ان کو بھی شریک خدا بنا کر اپنے سر پر لاد لے۔ اس معاملہ میں اعتماد کی چیز 'العلم' یعنی وہ علم حقیقی ہے جو خدا کی طرف سے وحی کے ذریعہ سے آتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کو دعوت دی کہ وہ ایسے اہم معاملہ میں مجرد وہم کی پیروی نہ کریں بلکہ ان کی پیروی کریں۔ وہ ان کے سامنے اس علم حقیقی کو پیش کر رہے ہیں جو خدا کی طرف سے ان کے پاس آیا ہے۔ اسی علم سے اس راہ کی طرف رہنمائی ہوگی جو خدا تک پہنچانے والی سیدھی راہ ہے۔ 'سیدھی راہ' یعنی یہ راہ بندے کو ہر واسطہ اور ہر وسیلہ سے بے نیاز کر کے براہ راست خدا تک پہنچانے والی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ راہ توحید کی راہ ہے۔

تیسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ شیطان کو سب سے زیادہ ملکہ اور ضد، جیسا کہ قصۂ آدمؑ و ابلیس، سے واضح ہے توحید کی صراط مستقیم ہی سے ہے۔ اس نے یہ قسم کھا رکھی ہے کہ وہ ذریت آدم کو اس صراط مستقیم سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنا پورا زور لگا دے گا اور ان کو شرک میں مبتلا کر کے چھوڑے گا۔ خدائے رحمان کے لیے کھلے ہوئے باغی کی ایسی وفادارانہ اطاعت درحقیقت اس کی عبادت ہے اور بدقسمت ہے وہ انسان جو خدا کو چھوڑ کر شیطان کی عبادت کرے۔

چوتھی حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اب تک تو آپ کے لیے ایک عذر تھا کہ خدا کی ہدایت آپ کو نہیں پہنچی تھی لیکن اب جب کہ خدا کی ہدایت آپ کو پہنچ چکی ہے آپ کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا اس وجہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ خدا کی پکڑ میں نہ آجائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر اسی انجام سے نہ دوچار ہوں جو شیطان اور اس کے اولیاء کے لیے مقدر ہے۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (۴۶) ۔

'ملی' مدت العمر اور زمانۂ طویل کے معنی میں آتا ہے۔ ہمارے نزدیک تقدیر کلام یوں ہے: 'واھجرنی ھجرا ملیا' یعنی میرے سامنے سے دفع ہو، کبھی اپنی شکل مجھے نہ دکھائیو۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ تقریر سن کر آزر کا غصہ بھڑک اٹھا۔ بولا، ابراہیمؑ! تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو　آزر کا جواب

رہے ہو! اگر تم اس حرکت سے باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگ سار کر دوں گا اور اب بہتر یہ ہے کہ تم میری نگاہوں سے دور ہو جاؤ اور کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قبائلی زندگی میں جس طرح آقاؤں کو اپنے غلاموں پر غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے تھے اسی طرح باپوں کو اپنے بیٹوں اور بیٹیوں پر بالکل غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ وہ ان کو قتل کر دیں، سنگ سار کر دیں یا زندہ درگور کر دیں، کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۔ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ڮ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا (۴۷-۴۸)

وداعی سلام

'سَلٰمٌ' یہاں وداعی سلام کے مفہوم میں ہے۔ جس طرح ملاقات کے لیے شائستہ اور بابرکت طریقہ یہ ہے کہ وہ سلام کے ساتھ ہو اسی طرح جدائی کے لیے بھی شائستہ طریقہ یہی ہے۔

'حفی' کا مفہوم

'اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا'۔ 'حَفِیّ' اس کو کہتے ہیں جو کسی کی بڑی خبر رکھنے والا، اس کے لیے بڑا اہتمام کرنے والا اور اس پر بے نہایت کرم فرمانے والا ہو۔

حضرت ابراہیم نے جب باپ کو اتنا غضب ناک دیکھا تو فرمایا کہ بہتر ہے، اگر آپ کی رائے یہی ہے کہ میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں تو میرا سلام لیجیے، میں یہاں سے چلا۔ اب آپ سے تو کچھ کہنے سننے کی گنجائش رہی نہیں لیکن میں اپنے رب سے آپ کے لیے مغفرت کی دعا کروں گا۔ وہ میری بڑی خبر رکھنے والا ہے۔ مجھے امید ہے وہ میری دعا قبول فرمائے گا۔

باپ کے لیے دردمندی اور حق کے لیے حمیت

باپ کے اس سنگ دلانہ رویہ کے باوجود، حضرت ابراہیم کا اس سے دعائے مغفرت کا وعدہ کرنا ان کی غایت درجہ دردمندی اور رقت قلب کی دلیل ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے باپ کے لیے اس وقت تک دعا جاری رکھی جب تک اللہ نے آپ کو اس سے روک نہیں دیا۔

لیکن اس دردمندی کے ساتھ ساتھ حق کی غیرت و حمیت کا جو تقاضا تھا وہ بھی انھوں نے پورا پورا ادا کیا۔ مروت یا خوف سے مغلوب ہو کر اپنی دعوت توحید کے معاملہ میں کوئی لچک یا مداہنت گوارا نہیں کی بلکہ چلتے چلاتے صاف صاف سنا دیا کہ میں آپ لوگوں سے بھی کنارہ کش ہوتا ہوں اور آپ لوگوں کے ان دیویوں اور دیوتاؤں سے بھی جن کو آپ لوگ خدا کے ماسوا پوجتے ہیں۔ مزید وضاحت یہ بھی فرما دی کہ میں اپنے رب کے سوا نہ کسی اور کو پکارتا ہوں نہ پکاروں گا اور میں امید رکھتا ہوں کہ اپنے رب کو پکار کر محروم نہیں رہوں گا۔

موم کی طرح نرم پتھر کی طرح سخت

حضرت ابراہیم کے اس اعلانِ برأت میں جو زور، جو اعتماد علی اللہ اور خلق سے جو بے نیازی ہے وہ لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ اول تو حضرت ابراہیم نے جمع کا صیغہ 'وَاَعْتَزِلُكُمْ' استعمال کیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ انھوں نے صرف آزر ہی سے نہیں بلکہ اس کے تمام حواریوں، ہمنواؤں اور خاندان سے بھی اعلانِ برأت کر دیا۔ اس کے ساتھ 'وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ' کہہ کر ان کے تمام معبودوں کو بھی ان کے ساتھ

شامل کر دیا گویا انھیں بھی لات مار دی۔ پھر بات کو صرف منفی پہلو ہی سے کہنے پر بس نہیں کیا بلکہ اس کو مثبت پہلو سے بھی آشکارا کر دیا فرمایا کہ وَّاَدۡعُوۡا رَبِّیۡ میں صرف اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور اس کے سوا میں کسی اور معبود سے آشنا نہیں۔ آخر میں اپنے رب پر اپنے غیر متزلزل اعتماد کا اظہار فرمایا کہ میں اپنے رب کو پکار کے کبھی محروم نہیں رہا ہوں، امید ہے کہ اس آزمائش میں بھی اس کی نصرت اور رہنمائی میرے ساتھ ہوگی۔ ایک طرف تو یہ نرمی، دوسری طرف یہ سختی! درحقیقت نرمی و سختی کا یہی امتزاج اور ان کی یہی ہم آمیزی ہے جو ایک داعی حق کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ جب تک آدمی موم کی طرح نرم اور پتھر کی طرح سخت نہ ہو وہ حق کی کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔

فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلۡنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾

ہجرت اور اس کی برکات

حضرت ابراہیمؑ کا مذکورہ بالا اعلانِ برأت ہجرت کے ہم معنی تھا چنانچہ اس کے بعد انھوں نے ہجرت فرمائی۔ اس ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت اسحاقؑ اور اس کے بعد حضرت یعقوبؑ عطا فرمائے اور ان میں سے ہر ایک کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا ذکر آیت میں جس انداز سے ہوا ہے اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت کے ثمرات و برکات میں سے ہیں۔ جو بندہ اپنے گھر در، اپنے باپ چچا اور اپنے اعزا و اقربا سب کو اپنے رب کی خاطر چھوڑتا ہے وہ سزاوار ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنے فضل خاص سے ایک دوسری بزم قدس آراستہ کرے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ جو لوگ خدا کی خاطر اپنے کو اجاڑتے ہیں وہ کس شان سے آباد ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے لیے خدا کی یہی شان ظاہر ہوئی۔ ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ ان کو اولاد عطا فرمائی بلکہ ایسی اولاد عطا فرمائی جن سے اس دنیا میں نبوت و رسالت اور رشد و ہدایت کے دو عظیم سلسلے قائم ہو گئے جن کا فیض ہزاروں برس سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ حضرت اسحاق کے ساتھ حضرت یعقوبؑ کا ذکر، درآنحالیکہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے پوتے ہیں، یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ باپ، بیٹا، پوتا تینوں نبی۔ ایں خانہ تمام آفتاب است! بلکہ حضرت یوسفؑ کو بھی ملا لیجیے تو انبیاء کا ایک پورا گھرانا آباد ہو جاتا ہے۔ یہ شرف سیدنا ابراہیمؑ کے سوا اور کس کو حاصل ہوا!

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں بادی النظر میں ایک بات کھٹکتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے حضرت اسحاق کا ذکر تو ہوا جو بنی اسرائیل کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہیں لیکن سیدنا اسماعیلؑ کا ذکر نہیں ہوا، جن سے بنی اسماعیل کا سلسلہ چلتا ہے، جن کے اندر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، حالانکہ برکاتِ ہجرت میں سے اولین اور سب سے بڑی برکت، جیسا کہ استاذ امامؒ نے اپنے رسالہ ذبیح میں ثابت کیا ہے، حضرت اسماعیلؑ ہیں۔ ہمارے نزدیک یہاں حضرت اسماعیل کا ذکر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آگے ان کا ذکر مستقلاً آ رہا ہے۔ اس سورہ میں جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، اصل مخاطب مشرکین عرب ہیں۔ اہل کتاب کا ذکر اس میں تبعاً آیا ہے۔ سورہ کا یہ مزاج مقتضی ہوا کہ حضرت اسماعیلؑ کا ذکر یہاں تبعاً نہ آئے، بلکہ اہتمام کے ساتھ علیحدہ آئے تاکہ اہل عرب کو

پوری طرح متوجہ کرسکے۔

یہ بات بھی نگاہ میں رکھیے کہ حضرت عیسیٰؑ کے ذکر کی تمہید حضرت زکریاؑ کے ذکر سے اٹھائی ہے جن کے ہاں حضرت یحییٰؑ کی ولادت ایسے حالات میں ہوئی کہ حضرت زکریاؑ بڑھاپے کی آخری منزل میں پہنچ چکے تھے اور ان کی بیوی بانجھ تھیں۔ پھر حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا ذکر کرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کا ذکر فرمایا اور معلوم ہے کہ ان کو بھی اولاد بڑھاپے ہی میں ملی۔ چنانچہ قرآن میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو اولاد کی بشارت ملی تو ان کی بیوی نے بالکل اسی طرح اظہارِ تعجب کیا جس طرح حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی بشارت ملنے پر حضرت زکریاؑ نے اظہارِ تعجب کیا۔ قرآن نے حضرت عیسیٰؑ کے ذکر کے آگے پیچھے ان دونوں نبیوں کا ذکر کرکے ضمناً گویا یہ رہنمائی بھی دے دی کہ خارقِ عادت ولادت کی مثالیں حضرت عیسیٰؑ سے پہلے بھی موجود رہی ہیں۔ مجرد اسی بنیاد پر کسی کو الوہیت کا درجہ دے دینا محض سفاہت ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهُم مِّن رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا (۵۰)

'رحمت' سے مراد وہ تمام افضال و عنایات اور وہ تمام برکتیں اور رحمتیں ہیں جو حضرت ابراہیمؑ و آلِ ابراہیمؑ کو از قبیل نبوت و رسالت اور از قسم برکاتِ دنیا حاصل ہوئیں اور جن کی تفصیلات بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہیں۔

'لِسَانَ صِدْقٍ' کا مفہوم

'لِسَانَ صِدْقٍ' میں 'لِسَان' سے مراد ذکر، چرچا اور شہرت ہے۔ لفظ 'صدق' کے اندر رسوخ، پائداری اور استحکام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح دوسرے مقام میں 'قَدَمَ صِدْقٍ' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کی دعوت کو خوب فروغ دیا اور ان کو وہ پائیدار عزت و شہرت حاصل ہوئی جو دنیا میں کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی پائیداری کا یہ عالم ہے کہ ہزاروں برس گزر گئے لیکن اس پر کہنگی نہیں آئی۔ سینکڑوں، ہزاروں جلیل القدر انبیاء و مصلحین اس مبارک خانوادے سے اٹھے اور حضرت ابراہیمؑ کے مشن کو زندہ کرتے رہے۔ آخر میں حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے اسی ملتِ ابراہیمؑ پر حضرت سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی جس سے اس عظمت و شہرت کو بقائے دوام حاصل ہوگیا۔ یہ سب کچھ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کی برکت ہے جس کا حوالہ سورۂ شعراء میں یوں آیا ہے۔ وَاجْعَل لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ ۔ ۸۴۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوسَىٰ إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا (۵۱)

حضرت موسیٰؑ کے لیے مخلص کا لقب

حضرت ابراہیمؑ کے بعد ان کی ذریت کے اسرائیلی سلسلہ میں، جلیل القدر نبی حضرت موسیٰؑ ہیں۔ ان کے متعلق فرمایا کہ وہ 'مخلص' اور رسول و نبی تھے۔ ان کا رسول و نبی ہونا تو بالکل واضح ہے اس لیے کہ وہ فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھی رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اور بنی اسرائیل کی طرف بھی۔ البتہ لفظ 'مخلَص' یہاں ان کے ایک خاص وصفِ امتیازی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ 'مخلَص' اس کو کہتے ہیں جو کسی کارِ خاص کے

لیے منتخب و مخصوص کیا گیا ہو۔ لفظ کے اس عام مفہوم کے اعتبار سے تمام انبیاء 'مُخلَص' ہیں اس لیے کہ وہ ایک خاص خدائی مشن کے لیے منتخب کیے گئے۔ چنانچہ قرآن میں، ان کی شان میں فرمایا بھی ہے کہ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ (ص: ۴۶) (ہم نے ان کو ایک خاص مشن یعنی آخرت کی یاد دہانی کے لیے منتخب کیا) اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا وہ خاص وصف امتیازی کیا ہے جس کی وجہ سے وہ اس لقب سے ملقب ہوئے جب کہ پورے قرآن میں یہ لقب ان کے سوا کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ لفظ حضرت موسیٰؑ کے اس امتیاز و اختصاص کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو ان کو خدا کے ساتھ ہم کلام ہونے کا حاصل ہوا۔ حضرت موسیٰؑ کے اس امتیازی وصف کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ ہم سورۂ نساء کی آیت 'وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا' ۱۶۴ کے تحت اس پر گفتگو کر چکے ہیں۔ آگے والی آیت بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس میں فرمایا ہے 'وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا' (ہم نے اس کو اپنی سرگوشی اور راز و نیاز کے لیے اپنے قریب کیا) تقریب و تکلم اور راز و نیاز کے اس مرتبۂ عالی کے لیے صرف حضرت موسیٰؑ ہی خاص کیے گئے اور ان کی اسی خصوصیت کو ظاہر کرنے کے لیے ان کو 'مُخلَص' کے لقب سے مشرف فرمایا گیا۔

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا (۵۲)

'ایمن' سے مراد 'اَیْمَن' کے معنی داہنے کے بھی ہیں اور مقدس و مبارک کے بھی۔ ہمارے نزدیک یہ یہاں مقدس و مبارک کے معنی میں ہے۔ قرآن کے نظائر سے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ آگے سورۂ طٰہٰ میں یہی مضمون یوں بیان ہوا ہے۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (طٰہٰ ۱۱-۱۳)

پس جب وہ اس کے پاس آیا تو اس کو آواز آئی کہ اے موسیٰ! یہ تو میں تمہارا رب ہوں تو تم اپنے جوتے اتار دو، تم وادی مقدس طویٰ میں ہو اور میں نے تمہیں منتخب کیا تو سنو جو تمہیں وحی کی جا رہی ہے۔

اس آیت سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جو صدا سنائی دی وہ وادی مقدس طویٰ کی سمت سے سنائی دی۔ اس وادی کو تقدس کا یہ درجہ اس وجہ سے حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی جلوہ گاہ ہونے کا شرف بخشا اور یہاں حضرت موسیٰؑ سے اس نے کلام کیا۔ اسی تقدیس کو آیت زیر بحث میں 'اَیْمَن' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور یہ چیز ایک قابل ذکر چیز تھی۔ جہاں تک اس لفظ کے دوسرے معنی کا تعلق ہے طور کی داہنی جانب کی نشان دہی کی کوئی خاص افادیت سمجھ میں نہیں آتی۔

'نجی' کا مفہوم وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا۔ 'نجی'، راز اور سرگوشی کو بھی کہتے ہیں اور اس شخص کو بھی کہتے ہیں جس سے سرگوشی کے انداز میں بات کی جائے، اور اس کو محرم راز بنایا جائے۔ یہ حضرت موسیٰؑ کے اسی امتیاز خاص کی وضاحت ہے

جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے طور کی مبارک جانب سے اس کو پکارا اور راز و نیاز کے لیے اس کو قریب کیا۔ حضرت موسیٰ کے ساتھ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے جو کلام کیا اس کو راز و نیاز اور سرگوشی سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاءؑ سے جب کلام کیا ہے تو ہمیشہ اپنے مقرب و معتمد فرشتے حضرت جبریل امین کے واسطہ ہی سے کیا ہے، کبھی براہِ راست کلام نہیں کیا۔ یہ شرف صرف حضرت موسیٰ کو حاصل ہوا کہ ان سے حضرت جبریلؑ کے واسطہ کے بغیر بات کی۔ کوئی تیسرا بیچ میں حائل نہیں ہوا البتہ حضرت موسیٰ کو اس موقع پر بھی باوجود اشتیاق کے اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عالم ناسوت میں کوئی جن و بشر یہاں تک کہ پہاڑ بھی خدا کی تجلی کی تاب نہیں لا سکتا۔ یہاں ان باتوں کا کوئی ذکر نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰ کے مابین اس موقع پر ہوئیں۔ اس کی تفصیل سورۂ طٰہٰ میں آئے گی۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا (۵۳)

حضرت موسیٰ پر ایک اور فضلِ خاص۔ ایک مددگار نبی کی بعثت

حضرت موسیٰ پر یہ فضلِ خاص بھی ہوا کہ کارِ نبوت کی انجام دہی میں ان کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے بھائی حضرت ہارونؑ کو ان کا وزیر اور مددگار بنایا اور ان کی یہ مدد محض رضاکارانہ نہیں بلکہ خدا کے ایک مامور و مسئول نبی کی حیثیت سے تھی۔ کسی رسول کی مدد کے لیے کسی نبی کا وزیر اور شریکِ کار کی حیثیت سے مقرر کیا جانا ایک امتیازِ خاص ہے جو حضرات انبیائے کرام کی تاریخ میں حضرت موسیٰ کے سوا اور کسی کے لیے معلوم نہیں۔ حضرت موسیٰ پر فرعون جیسے جبّار کے سامنے فرضِ رسالت کی ادائیگی اور بنی اسرائیل جیسی نکمی قوم کی اصلاح و تنظیم کی ذمہ داری جب ڈالی گئی تو وہ اس دوہری اور عظیم ذمہ داری سے بہت مضطرب ہوئے اور انھوں نے یہ دعا فرمائی کہ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ، هٰرُوْنَ اَخِي ، اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ، وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ، كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ، وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا (طٰہٰ ۲۹-۳۴) (اے رب میرے لیے میرے اہل خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو وزیر مقرر کر دے، اس کے ذریعہ سے میری کمر کو مضبوط کر اور اس کو میری ذمہ داری میں شریک کر تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ تیری تسبیح کر سکیں اور زیادہ سے زیادہ تیرا ذکر پھیلا سکیں) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی یہ دعا قبول فرمائی اور اس کا ذکر سورۂ طٰہٰ میں ایک عظیم احسان کی حیثیت سے ہوا۔ اسی احسان کی طرف یہاں آیت زیرِ بحث میں اشارہ فرمایا ہے — یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہود نے حضرت ہارونؑ کو بدنام کرنے کے لیے اپنے بعض سنگین جرائم کی ذمہ داری ان پر ڈال دی ہے لیکن قرآن نے ان کو ایک معصوم نبی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (۵۴)

حضرت اسماعیل کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ

اب یہ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت کے دوسرے سلسلہ کے سربراہ حضرت اسماعیلؑ کا ذکر فرمایا۔ قریش انہی کی نسل سے اور انہی کی ملت کے پیرو ہونے کے مدعی تھے۔ اس سلسلہ میں پہلے رسول اور نبی حضرت اسمٰعیلؑ ہوئے

اور آخری نبی و رسول ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کے ذکر سے مقصود خاص طور پر مشرکین عرب کو تنبیہ کرنا ہے کہ وہ غور کریں کہ حضرت اسماعیلؑ کا عمل اور ان کا پیام کیا تھا اور یہ ان سے کتنے بعید ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی وراثت کے مدعی ہیں اور اس زعم میں قرآن کی مخالفت کر رہے ہیں در آنحالیکہ وہ سرتاسر ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی ملت کی دعوت ہے۔

حضرت اسمٰعیلؑ 'صادق الوعد' ان کی خاص صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وہ وعدے کا سچا اور پکا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ اس وعدے کی طرف ہے جو انھوں نے حضرت ابراہیمؑ سے اپنے ذبح کیے جانے سے متعلق کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب ان سے استمزاج کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمھیں ذبح کر رہا ہوں تو بتاؤ تمھاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے بے دھڑک جواب دیا کہ آپ کو جو اشارہ ہوا ہے، آپ اس کی تعمیل کیجیے، ان شاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ پھر جب اس وعدے کی تکمیل کا وقت آیا تو انھوں نے بے جھجک اپنی گردن باپ کی چھری کے نیچے دے دی اور قریب تھا کہ چھری چل جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کا ہاتھ روک دیا کہ بس! مقصود امتحان تھا، وہ پورا ہو گیا اور باپ بیٹے دونوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وفاداری اور راست بازی کی سند عطا ہوئی۔

یہ یاد رکھیے کہ 'صَادِقَ الْوَعْدِ' بظاہر مرکب تو صرف دو لفظوں سے ہے لیکن یہ مومن و مسلم کے کردار کی ایک جامع تعبیر ہے۔ اللہ کا جو بندہ اپنے رب سے کیے ہوئے عہد میں راست باز ہے اور اس کی خاطر اپنی گردن کٹوا سکتا ہے اس نے ایمان و اسلام کی معراج حاصل کر لی۔ رہے وہ لوگ جو ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے نام پر محض نسب فروشی اور لاف زنی کر رہے تھے ان کے سامنے قرآن نے یہ آئینہ رکھ دیا ہے کہ وہ اس میں اپنی سیاہ رُوئی کا مشاہدہ کر لیں!

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۖ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا (۵۵)

حضرت اسمٰعیلؑ کا خاص وصف ایمان و اسلام میں حضرت اسمٰعیلؑ کا جو مرتبہ تھا وہ تو اوپر کے ایک ہی لفظ 'صَادِقَ الْوَعْدِ' سے واضح ہو گیا۔ اب ان کے نام لیواؤں کو یہ بات یاد دلائی گئی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔ نماز اور زکوٰۃ، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، تمام حقوق اللہ اور تمام حقوق العباد کی ایک جامع تعبیر ہے۔ انہی دو چیزوں پر تمام شرائع کی بنیاد ہے جس نے ان کا اہتمام کیا اس نے تمام دین و شریعت کو قائم کیا اور جس نے ان کو ہدم کیا اس نے پورے دین کو ہدم کیا۔

خدا کا کامل العیار بندہ 'وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا' ایک ایسی جامع تعریف ہے کہ اس کے بعد اس پر ایک حرف کے اضافے کی بھی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی نگاہوں میں بالکل ٹھیک ٹھیک ویسے ہی تھے جیسا وہ اپنے بندے کے لیے چاہتا ہے کہ وہ ہو۔ تو جس کے لیے خود پروردگار یہ شہادت دے کہ وہ اس کی پسند کے معیار پر پورا اترا اس سے بڑھ کر کامل العیار اور کون ہو سکتا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اسلام دشمنی کے جوش میں یہود نے حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی تاریخ بالکل مسخ کر دی ہے۔ بالخصوص حضرت اسماعیلؑ کی زندگی پر تو انھوں نے اس طرح پردہ ڈال دیا ہے کہ کسی کو ان کا سراغ بھی نہ مل سکے لیکن ہمارے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالۂ ذبیح میں ان تمام تحریفات کا پردہ چاک کر کے ان دونوں بزرگ نبیوں کی تاریخ از سر نو زندہ کر دی ہے۔ جو لوگ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے متعلق قرآن کے ان بیانات کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہوں ہم ان کو مشورہ دیں گے کہ وہ مولاناؒ کی مذکورہ کتاب کا گہری نظر سے ضرور مطالعہ کر ڈالیں۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۙ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (۵۶-۵۷)

حضرت ادریسؑ

حضرت ادریسؑ کے متعلق اسفار یہود اور بائبل ہسٹری میں کوئی ایسی چیز مجھے نہیں مل سکی جس کی بنیاد پر ان کی نسبت میں کوئی بات اعتماد کے ساتھ کہہ سکوں۔ قدیم و جدید مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے ان کی بنیاد تمام تر قیاسات و مفروضات پر ہے اس وجہ سے اس کا حوالہ دینا بے فائدہ ہے۔ قرآن نے جس انداز سے ان کا ذکر فرمایا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے صحیفوں میں ان کا ذکر موجود تھا اور ان کی نسبت کچھ غلط صحیح روایات بھی ان کے ہاں مشہور تھیں۔ اب یا تو یہ ہوا کہ جس طرح اکثر انبیاء کے نام عربی لب و لہجہ میں آ کر کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں اسی طرح حضرت ادریسؑ کا نام بھی بدل گیا ہو یا یہ ہوا کہ تورات کی ابتدائی روایات میں ان کا ذکر موجود رہا ہو لیکن بعد کے نسخوں سے ان کا ذکر غائب ہو گیا ہو۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تورات کئی مرتبہ غائب ہوئی ہے اور کئی مرتبہ زبانی روایات کے ذریعہ سے مرتب ہوئی ہے۔ اس وجہ سے اس کے نسخوں میں اختلاف بھی ہوا اور اس کے اندر برابر کمی بیشی بھی ہوتی رہی ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ قرآن نے جس طرح تورات کے بہت سے گم شدہ یا گم کردہ حقائق کا سراغ دیا ہے اور جس کی بہت سی مثالیں اس کتاب میں گزر چکی ہیں اسی طرح تاریخ انبیاء کے ایک گم گشتہ ورق کا پتہ حضرت ادریسؑ کا ذکر کر کے دیا۔ ان کا کردار بھی دوسرے انبیاء کی طرح پوری انسانیت کے لیے اسوہ اور نمونہ تھا اس وجہ سے قرآن نے صحیح پہلو سے ان کی یاد دہانی فرما دی اور ان کو از سر نو تاریخ میں زندہ کر دیا۔

حضرت ادریسؑ اور حضرت اسماعیلؑ میں وصفی اشتراک

ان کی تعریف میں بھی بعینہٖ وہی لفظ وارد ہوا ہے جو اوپر حضرت ابراہیمؑ کی تعریف میں وارد ہوا ہے۔ یعنی 'صدیق'۔ اس لفظ کے مضمرات اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت ادریسؑ کو یہ مقام بہت سے امتحانات سے گزرنے کے بعد ہی حاصل ہوا ہو گا۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت ادریسؑ کا ذکر یہاں بھی حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ ہوا ہے اور سورۂ انبیاء میں بھی حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ ہی ہوا ہے۔ اور حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ ان کو بھی صابرین میں شمار کیا گیا ہے اور فرمایا ہے وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ (الانبیاء ۸۵)

---

[1] مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اصل کتاب عربی میں 'الرای الصحیح فی من هو الذبیح' کے نام سے ہے۔ ہم نے اس کا ترجمہ اردو میں بھی 'ذبیح کون ہے؟' کے نام سے کر دیا ہے۔

(اور اسمٰعیل، ادریس اور ذوالکفل کو یاد کرو، ان میں سے ہر ایک ثابت قدموں میں سے تھا) ان دونوں مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان دونوں نبیوں میں بڑی گہری وصفی مماثلت ہے، اسی وجہ سے ان کا ذکر ساتھ ساتھ ہوا۔ ان کو صبر اور ثابت قدمی کے بڑے کڑے امتحانات سے گزرنا پڑا اور ان میں پاس ہونے کے صلہ میں ان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس مرتبۂ بلند کی سرفرازی حاصل ہوئی جس کا ذکر وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کے الفاظ سے ہوا ہے۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرٰهِيمَ وَإِسْرَآءِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا إِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۝ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۵۸-۵۹)

تمام انبیاء کا مشترک مشن

اب یہ ان تمام مذکورہ انبیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آدمؑ کی ذریت، نوحؑ کی ذریت، ابراہیمؑ و اسرائیلؑ کی ذریت کے گل سرسبد یہی انبیائے اولوالعزم ہیں۔ ان پر اللہ کا خاص انعام ہوا اور یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے اپنے دین کی ہدایت بخشی اور جن کو نبوت و رسالت کے منصب کے لیے انتخاب فرمایا۔ ان تمام کا مشترک وصف یہ تھا کہ جب خدا کی آیتیں ان کو سنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے۔ پھر فرمایا کہ ان کے بعد ان کی ذریت میں ایسے ناخلف اٹھے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشوں کے پیچھے لگ گئے تو یہ عنقریب اپنی اس گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

ناخلف جانشینوں کو تنبیہ

درحقیقت یہی وہ اصل مدعا تھا جس کے لیے مذکورہ بالا انبیاء کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں۔ قرآن کے اس وقت کے مخاطب، خواہ مشرکین عرب ہوں یا یہود و نصاریٰ، سب انہی انبیاء میں سے کسی نہ کسی نبی کے نام لیوا تھے اور وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ اور اسرائیلؑ کی ذریت میں خدا کی ہدایت کا سرچشمہ یہی لوگ ہوئے ہیں۔ قرآن نے ان سب کی دعوت اور ان کے کردار و عمل کا حوالہ دے کر ان کے ان ناخلف جانشینوں کے حال پر افسوس کیا ہے جو مدعی تو تھے ابراہیمؑ و یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہونے اور موسیٰؑ و مسیحؑ اور اسمٰعیلؑ کی پیروی کے لیکن حال یہ تھا کہ انھوں نے ان بزرگ نبیوں کے سکھائے ہوئے سارے دین کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

ان انبیاء کے باب میں یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ جب ان کو اللہ کی آیات سنائی جاتیں تو وہ روتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے، یہ ان کے ان نام لیواؤں پر تعریض ہے جن کا حال اس کے برعکس یہ تھا کہ ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتیں تو وہ نہایت استکبار اور رعونت کے ساتھ اس کی تکذیب کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے۔

'فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ' میں لفظ 'خَلْفٌ' ناخلف کے معنی میں ہے۔ ہم دوسری جگہ 'خَلَفٌ' اور 'خَلْفٌ' کے فرق کی وضاحت کر چکے ہیں کہ 'خَلْفٌ' بسکون لام اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ برے اخلاف

کے لیے آتا ہے۔ ان لوگوں کے ناخلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کے ساتھ نسبت اور ان کی وراثت کسی کو خاندان اور نسب کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی بلکہ ان کی لائی ہوئی ہدایت کے حامل ہونے کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ ان کا حال یہ تھا کہ انھوں نے نماز برباد کردی اور شہوات کے غلام بن گئے۔ ظاہر ہے کہ نماز ضائع کر دینے کے بعد وہ دین کا اصل سررشتہ ہی کھو بیٹھے۔ نماز ہی وہ چیز ہے جو اگر صحیح طور پر ادا کی جائے تو بندے کو وہ عہد یاد دلاتی رہتی ہے جو اس نے اپنے رب سے باندھا ہے۔ اگر یہ چیز ضائع کر دی جائے تو آدمی کا شیطان کے پیچھے پڑ جانا قطعی ہے ـــــ یہود و نصاریٰ اور مشرکین نے دین کے اس بنیادی حکم کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کی تفصیل سورۂ بقرہ، آل عمران اور انعام وغیرہ میں گزر چکی ہے۔ یہاں دہرانے میں طوالت ہوگی۔

ایک قابلِ توجہ بات

ایک بات یہاں قابلِ توجہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ انھوں نے نماز اور زکوٰۃ ضائع کر دی بلکہ فرمایا کہ نماز ضائع کردی اور شہوات کے پیچھے پڑ گئے حالانکہ اوپر تمام انبیاء کی تعلیم میں نماز اور زکوٰۃ دونوں چیزوں کا ذکر ہے اس وجہ سے ذوق چاہتا ہے کہ یہاں زکوٰۃ کے ضائع کر دینے کا ذکر بھی ہوتا۔ اسلوب کی یہ تبدیلی ایک خاص حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ یہ کہ زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ درحقیقت یہی اتباعِ شہوات ہے۔ جو شخص اپنی شہوات کی دلداری میں لگ جاتا ہے وہ پھر ان کا اس طرح غلام بن کے رہ جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ یہ گویا ترکِ انفاق و زکوٰۃ کے بجائے ان کے اصل موانع کا ذکر فرما دیا کہ یہ موانع ان پر مسلط ہو گئے۔

غَیّ سے مراد نتیجۂ عمل

'فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا' میں غیّ سے نتیجۂ عمل مراد ہے۔ وہ اپنی گمراہی سے دوچار ہوں گے یعنی اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آخرت میں جو چیز ان کے سامنے آئے گی وہ ان کی اپنی بوئی ہوئی فصل کا حاصل ہوگا۔ اس معاملے میں ان کے اوپر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ۝ جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًّا ۝ لَّا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا ۖ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۝ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَن كَانَ تَقِيًّا (۶۰ - ۶۳)

آخرت میں کام آنے والی چیز

یعنی نسب و حسب تو کوئی کام آنے والی چیز ثابت نہیں ہوگا البتہ جو لوگ اپنی غلطیوں سے رجوع کر کے اپنے اعمال کی اصلاح کر لیں گے وہ جنت میں داخل ہوں گے اور وہ اطمینان رکھیں کہ ان کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی بلکہ وہ اپنی ہر نیکی کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ ان کو ان کے اعمال کے صلہ میں عالمِ غیب میں ہمیشگی کے باغ ملیں گے۔ یہ خدائے رحمان کا اپنے نیک بندوں سے وعدہ ہے اور اس کا یہ وعدہ ضرور پورا ہوگا۔ 'مَاْتِيًّا' یعنی خدا کے اس موعود تک خدا کے تمام حق دار بندوں کی لازماً رسائی ہوگی کوئی اس کو وعدۂ فردا سمجھ کر اس کے بارے میں کسی شک میں مبتلا نہ ہو۔

ہر طرف مبارک سلامت

لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡهَا لَغۡوًا اِلَّا سَلٰمًا ' یعنی آج جو غوغا اور طوفان مخالفتِ حق و اہلِ حق کے خلاف برپا ہے یہ سب وہاں نابود ہو جائے گا۔ وہاں کوئی لغویات کانوں میں نہیں پڑے گی۔ ہر طرف مبارک سلامت اور تحیت و تہنیت کے تبادلے ہو رہے ہوں گے۔ اہلِ جنت بھی اپنی کامیابی و فتح مندی پر ایک دوسرے کو مبارک باد دیں گے اور ملائکہ بھی ان کی فیروزمندی پر ان کا خیر مقدم سلام کے ساتھ کریں گے۔

اہلِ جنت کے لیے اصل رزق

وَلَهُمۡ رِزۡقُهُمۡ فِیۡهَا بُكۡرَةً وَّعَشِیًّا ' صبح و شام سے ظاہر ہے کہ جنت کے صبح و شام مراد ہیں جن کی حقیقت جنت ہی میں معلوم ہوگی اور اہلِ ایمان کے لیے اصلی رزق خدا کا دیدار، اس کا سلام و پیغام اور اس کا التفات و اکرام ہے۔ یہ چیز بھی ان کو وہاں برابر حاصل ہوگی۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہاں بعض احادیث نقل کرتے جن میں یہ مضمون نہایت خوبی سے واضح ہوا ہے۔ لفظ رزق انوار و برکاتِ الٰہی اور نفحاتِ روح و ریحان کے لیے قرآن میں بعض اور مقامات میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً آلِ عمران آیت ۳۷ میں۔ اور یہ تعبیر دوسرے آسمانی صحیفوں میں بھی موجود ہے۔

جنت کے لیے پشتینی ٹھیکیداروں کو تنبیہ

تِلۡكَ الۡجَنَّةُ الَّتِیۡ نُوۡرِثُ مِنۡ عِبَادِنَا مَنۡ كَانَ تَقِیًّا ' فرمایا کہ اس جنت کا حق دار ہم اپنے بندوں میں سے ان لوگوں کو بنائیں گے جو خدا سے ڈرنے والے اور اس کے حدود و قیود کا احترام کرنے والے ہوں گے۔ ہر مدعی اور ہر بوالہوس اس کا حق دار نہیں بن جائے گا۔ یہ فقرہ ان لوگوں پر تعریض ہے جنھوں نے خدا کا سارا دین تو تاراج کر کے رکھ دیا تھا لیکن اپنے زعم میں جنت کے پشتینی ٹھیکے دار بنے بیٹھے تھے۔

۸- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹۸-۶۴

خاتمۂ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریل امین کی زبانی مخالفین کے مقابل میں صبر و استقامت کی تلقین ہے۔ پھر مخالفین کو ان کے انکارِ قیامت پر توبیخ ہے۔ خاص طور پر ان کی اس ذہنیت پر شدت کے ساتھ ضرب لگائی گئی ہے کہ آج اہلِ ایمان کے بالمقابل ان کو جو دنیوی برتری حاصل ہے اس کو وہ اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھے بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ بالفرض قیامت ہوئی تو وہ اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کی بدولت وہاں بھی اونچا مقام حاصل کریں گے۔ آخر میں حضورؐ کو لوگوں کے مطالبۂ عذاب سے بے پروا ہو کر قرآن کے ذریعے سے انذار و تبشیر کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ یہ ہر مرحلہ میں اتمامِ حجت کے تمام لوازم سے آراستہ ہے تو تم اسی کے ذریعے سے انذار و تبشیر کرو، جن کے اندر خوفِ خدا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ضدی اور جھگڑالو ہیں تو ان کو ان کے انجام سے آگاہ کر دو۔ اگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے تو وہ اس ضد کے انجام سے خود دوچار ہوں گے، تم ان کی ذمہ داری سے بری ہو ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۴-۹۸ وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۖ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا
بَيْنَ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا
ع ۴ بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ ۚ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾ وَ
يَقُولُ الْإِنْسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ أَوَلَا يَذْكُرُ
الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ
وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ
مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ
بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ
رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا
جِثِيًّا ﴿٧٢﴾ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ
آمَنُوا أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَقَامًا وَأَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿٧٣﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا
قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِئْيًا ﴿٧٤﴾ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلَالَةِ
فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمَٰنُ مَدًّا ۚ حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا
الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضْعَفُ
جُنْدًا ﴿٧٥﴾ وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ۗ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ
خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ مَرَدًّا ﴿٧٦﴾ أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ
بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا ﴿٧٧﴾ أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ
عِنْدَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ﴿٧٨﴾ كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ

الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾ وَنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا ﴿٨٠﴾ وَاتَّخَذُوا
مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لِيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ
وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ ع ۵ ۸
تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ﴿٨٣﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾ يَوْمَ
نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾ وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ
جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَٰنِ وقف لازم
عَهْدًا ﴿٨٧﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا وقف لازم
إِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ
الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَٰنِ
أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾ إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَٰنِ
عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ أَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
فَرْدًا ﴿٩٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ
الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾ فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ
وَتُنْذِرَ بِهِ قَوْمًا لُدًّا ﴿٩٧﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هَلْ
تُحِسُّ مِنْهُمْ مِنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾ ع ۶ ۱۴ ۹

ترجمۂ آیات ۶۴ - ۹۸

اور ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے۔ ہمارے آگے اور پیچھے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب اسی کے اختیار میں ہے اور آپ کا رب کسی چیز کو بھولنے والا نہیں ہے۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک وہی ہے تو اسی کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی

پر جمے رہو۔ کیا تم اس کی کسی اور نظیر سے آشنا ہو! ۶۴-۶۵

اور انسان کہتا ہے کہ کیا جب میں مر جاؤں گا تو پھر زندہ کر کے نکالا جاؤں گا! کیا یہ انسان اس بات کو نہیں چیتا کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا درآنحالیکہ وہ کچھ بھی نہ تھا! پس تیرے رب کی قسم! ہم ان کو بھی اور شیطانوں کو بھی ضرور اکٹھا کریں گے پھر ہم ان کو جہنم کے گرد اس طرح حاضر کریں گے کہ وہ دوزانو بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ پھر ہم ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو چھانٹ کر الگ کریں گے جو خدائے رحمان سے سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے رہے ہوں گے۔ پھر ہم ان لوگوں کے سب سے زیادہ جاننے والے ہوں گے جو اس جہنم میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ سزاوار ہوں گے (اور ان کو حکم دیں گے) کہ تم میں سے ہر ایک کو بہر حال اس میں داخل ہونا ہے۔ یہ تیرے رب کے اوپر ایک طے شدہ امر واجب ہے۔ ۶۶-۷۱

پھر ہم ان لوگوں کو نجات بخشیں گے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا ہو گا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کو اسی میں گھٹنوں بیٹھے چھوڑ دیں گے۔ ۷۲

اور جب ان کو ہماری واضح آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کر رکھی ہے وہ ایمان لانے والوں سے سوال کرتے ہیں کہ فریقین میں سے اپنے مرتبہ اور سوسائٹی کے اعتبار سے کون بڑھ کر ہے؟ اور ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کر چھوڑیں جو ان سے ساز و سامان اور شان و شوکت میں کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جو لوگ گمراہی میں پڑے رہتے ہیں تو خدائے رحمان کی شان یہی ہے کہ ان کی رسی اچھی طرح دراز کرے۔ یہاں تک کہ جب وہ دیکھ لیں گے اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے خواہ عذاب دنیا یا قیامت ـــــ ان کو پتہ چل جائے گا کہ درجے کے اعتبار سے کون بدتر اور حمایتیوں کے اعتبار سے کون کمزور تر ہے۔ ۷۳-۷۵

اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے جو ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں اور باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ اجر کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں اور مآل کار کے اعتبار سے بھی خوش انجام ہیں۔ ۷۶

بھلا دیکھا تم نے اس کو جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور دعویٰ کیا کہ میں آخرت میں بھی مال اور اولاد سے نوازا جاؤں گا! کیا اس نے غیب میں جھانک کر دیکھ لیا ہے یا خدائے رحمان سے کوئی عہد کرا لیا ہے! ہرگز نہیں، جو کچھ وہ بکتا ہے ہم اس کو نوٹ کر رکھیں گے اور اس کے عذاب میں مزید اضافہ کریں گے اور جن چیزوں کا وہ مدعی ہے اس کے وارث ہم بنیں گے اور وہ ہمارے پاس یکہ و تنہا حاضر ہوگا۔ ۷۷-۸۰

اور انھوں نے اللہ کے ماسوا معبود بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے پشت پناہ بنیں۔ ہرگز نہیں، وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے عدو بنیں گے۔ ۸۱-۸۲

تم نے دیکھا نہیں کہ ہم نے کافروں پر شیاطین کو چھوڑ دیا ہے، وہ انھیں خوب خوب اکسا رہے ہیں۔ تو تم ان کے فیصلے کے لیے جلدی نہ کرو۔ ہم ان کے لیے اچھی طرح گنتی کر رہے ہیں۔ ۸۳-۸۴

یاد کرو جس دن ہم خدا ترسوں کو خدائے رحمان کی طرف وفد و فد لے جائیں گے اور مجرموں کو جہنم کے گھاٹ کی طرف ہانکیں گے پیاسے۔ اس دن کسی کو شفاعت کا اختیار نہیں ہوگا مگر اس کو جس نے اللہ کے پاس کوئی عہد حاصل کر لیا۔ ۸۵-۸۷

اور کہتے ہیں کہ خدائے رحمان نے اولاد بنا رکھی ہے۔ یہ تم نے ایسی سنگین بات کہی ہے کہ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ دھماکے کے ساتھ گر پڑیں کہ انھوں نے خدا کی طرف اولاد کی نسبت کی۔ اور یہ بات خدا کے شایان نہیں ہے کہ وہ اولاد بنائے۔ آسمانوں

اور زمین میں جو بھی ہیں سب خدائے رحمان کے حضور بندے ہی کی حیثیت سے حاضر ہوں گے۔ سب کا اس نے احاطہ کر رکھا ہے اور اچھی طرح گن رکھا ہے اور ان میں سے ہر ایک اس کے حضور یکہ و تنہا حاضر ہوگا۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے خدائے رحمان مہر و محبت پیدا کر دے گا۔ ۸۸-۹۶

پس ہم نے اس کتاب کو تمھاری زبان میں اس لیے سہل و سازگار بنایا کہ تم خدا ترسوں کو بشارت پہنچا دو اور جھگڑالو قوم کو آگاہی سنا دو۔ اور ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم نے ہلاک کر چھوڑا۔ کیا تم ان میں سے کسی کو محسوس کرتے ہو یا ان کی کوئی آہٹ سنتے ہو! ۹۷-۹۸

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۖ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ ۚ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ۝ (۶۴-۶۵)

وسط کلام میں حضرت جبرئیل کی طرف سے ایک تلقین

یہ کلام حضرت جبرئیل امین کی طرف سے ہے جس میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین بھی فرمائی ہے اور اپنی اور دوسرے ملائکہ کی حیثیت بھی واضح فرما دی کہ ہم اپنے اختیار سے کچھ کرنے کے مجاز نہیں ہیں، ہمارا کام صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری ہے۔ اس تلقین صبر اور اس وضاحت کا ایک خاص موقع و محل ہے۔ وہ یہ کہ حق و باطل کی کشمکش کے اس مرحلہ میں مخالفین کے بالمقابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے واحد سہارا بس وحی الٰہی کا سہارا تھا۔ اسی آسمانی کمک سے مشکلات میں آپ کو تقویت و رہنمائی بھی حاصل ہوتی تھی اور اسی کے ذریعے سے مخالفین کے نت نئے اعتراضات کا جواب اور ان کے اٹھائے ہوئے فتنوں کا توڑ بھی ہوتا تھا۔ اس وجہ سے قدرتی طور پر آنحضرت کو اس مرحلہ میں نہایت بے چینی کے ساتھ حضرت جبرئیل کا، جو وحی الٰہی لانے کا ذریعہ تھے، انتظار رہتا۔ آنحضرت کی یہ بے چینی حالات کا لازمی تقاضا تھی۔ جو مجاہد دشمنوں کی دل بادل فوج کے مقابل میں محاذ پر ہو اس کو مرکز سے رہنمائی کا انتظار ہر وقت رہتا ہے تاکہ اس کا کوئی قدم غلط نہ اٹھ جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کی حکمت و مصلحت کے تحت ہوتا ہے جس کو صرف وہی جانتا ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت کو اس بے چینی پر قرآن میں جگہ جگہ صبر و انتظار کی تلقین کی گئی ہے کہ اپنے موقف پر ڈٹے رہو، جلدی نہ کرو، جس رہنمائی اور مدد کی ضرورت ہوگی وہ اپنے وقت پر اللہ نازل فرمائے گا۔ یہی مضمون سورۂ طٰہٰ میں یوں وارد ہوا ہے۔ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِن قَبْلِ أَن

یُّقْضٰٓی اِلَیْكَ وَحْیُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۱۱۴ - طٰہٰ) (اور قرآن کے لیے، اس کی وحی اپنی طرف تمام کیے جانے سے پہلے، جلدی نہ کرو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب، میرے علم میں افزونی فرما) یہ مضمون قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی آیا ہے لیکن یہاں یہ حضرت جبریل امین کی زبان سے ادا ہوا ہے جس سے اس کی بلاغت میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے۔ ہم اس کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت جبریلؑ کی معذرت

اس میں پہلی قابلِ توجہ چیز تو یہ ہے کہ یہ حضرت جبریل امین کی طرف سے آنحضرتؐ کی خدمت میں ایک نوع کی معذرت ہے کہ اگر ہم جلدی جلدی، آپ کے شوق و انتظار کی تسکین کے لیے، وحی لے کر نہیں اترتے تو اس میں ہماری کسی کوتاہی کو دخل نہیں ہے بلکہ ہمارا اترنا تمام تر اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ہے۔ جب تک اس کا حکم نہ ہو نہ ہم اتر سکتے ہیں اور نہ ہم آپ کے پاس کوئی وحی لا سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں ہمیں کوئی دخل نہیں ہے۔ ہم صرف اس کے احکام کی بجا آوری پر مامور ہیں۔

حضرت جبریلؑ اور ملائکہ کی اصل حیثیت

دوسری چیز قابلِ توجہ یہ ہے کہ اس سے حضرت جبریل امین اور پورے زمرۂ ملائکہ کی حیثیت واضح ہو گئی کہ ان کے تمام پیش و عقب اور جو کچھ ان کے مابین ہے سب پر اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور اس کا مکمل کنٹرول ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی سر مُو اپنے دائرہ سے تجاوز کر سکے یا کوئی اقدام اپنے ارادے سے کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو فراموش کرنے والا بھی نہیں ہے کہ کوئی اس کی بھول چوک سے فائدہ اٹھا کر کسی معاملے میں اپنی آزادیٔ رائے استعمال کر کے اس کی پکڑ سے محفوظ رہ سکے ـــــ فرشتوں کی اس حیثیت کا واضح ہونا ان مشرکینِ عرب کی حماقت پر ضرب لگانے کے لیے

مشرکین کی حماقت پر ایک کاری ضرب

ضروری تھا جو فرشتوں کی پوجا کر کے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اگر قیامت ہوئی تو یہ خدا کی بیٹیاں اپنے باپ سے کہہ سن کے ان کو بخشوا ہی لیں گی۔ ان بے وقوف لوگوں کو حضرت جبریلؑ کا یہ بیان سنا کر آگاہ کر دیا گیا کہ جب ذوالجلال کی بارگاہ میں جبریل امین کی، جو تمام زمرۂ ملائکہ کے گل سر سبد ہیں، بے بسی کا یہ حال ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

آنحضرت صلعم کو اطمینان دہانی

'وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِیًّا' میں ایک اور پہلو کی طرف بھی ذہن جاتا ہے۔ وہ یہ کہ پیغمبرؐ کو اطمینان دہانی ہے کہ اگر وحیٔ الٰہی میں کبھی دیر ہو تو یہ اطمینان رکھیے کہ یہ دیر کسی حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اس لیے کہ آپ کا رب کسی چیز کو بھولنے والا نہیں ہے، وہ آپ کے تمام حالات و مسائل سے باخبر اور ایک ایک دعا و مناجات کو یاد رکھے ہوئے ہے۔ اس کا اندیشہ نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھول جائے۔

'رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا'

لفظ 'سمی' آیت ۷ میں گزر چکا ہے۔ اس کے معنی نظیر اور مثیل کے ہیں۔

آنحضرت صلعم کو تلقین صبر

یہ آیت حضرت جبریلؑ کے قول کا جزو بھی ہو سکتی ہے اور بطریق تضمین اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت جبریل امین کے قول کی تکمیل بھی۔ اس قسم کی تضمین کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ ایک مثال سورۂ کہف میں بھی گزر چکی ہے۔ ان دونوں شکلوں میں سے جو شکل بھی اختیار کیجیے فرق صرف متکلم میں ہوگا، کلام کے مدعا میں کوئی فرق نہ ہوگا اور یہ متکلم کا فرق بھی محض ظاہری ہوگا اس لیے کہ حضرت جبریلؑ جو بات بھی فرماتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم

ہی سے فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ درباب وحی تم اپنا عذر واضح کردو چنانچہ انھوں نے واضح فرما دیا۔

میرا رجحان پہلے قول کی طرف ہے۔ یعنی حضرت جبریلؑ نے آنحضرتؐ کو صبر اور انتظار کی تلقین فرمائی کہ آپ کا معاملہ کسی ایسی ویسی ذات سے نہیں بلکہ تمام آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کے رب کے ساتھ ہے تو اسی کی بندگی کیجیے اور اس کی بندگی پر پورے استقلال و پامردی سے جمے رہیے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں لفظ 'عبادت' اپنے وسیع مفہوم یعنی عبادت اور اطاعت دونوں پر مشتمل ہے۔ اس لفظ کی یہ حقیقت ہم تفسیر سورۂ فاتحہ میں واضح کر چکے ہیں۔ آیت ۴۴ میں بھی یہ لفظ اطاعت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ لفظ

'صبر' اور 'اصطبار' کا مفہوم

'اصطبار' میں 'صبر' کے بالمقابل زیادہ زور ہے۔ عربیت کے اس قاعدے کو یاد رکھیے کہ حروف کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلیل ہوتی ہے۔ اور صبر یا اصطبار کے بعد اگر 'ل' ہو تو یہ انتظار کے مفہوم پر بھی متضمن ہوتا ہے۔ ہم نے لفظ کے ان مضمرات کو ترجمہ میں کھولنے کی کوشش کی ہے لیکن عربی زبان کے یہ نازک پہلو اردو کی گرفت میں مشکل ہی سے آتے ہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں بھی یہ مضمون آئے گا وہاں انشاءاللہ ہم اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

'هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا' یعنی جب خدا کا کوئی نظیر و مثیل اور ثانی نہیں تو کون ہے جو اس کے ارادوں میں مزاحم ہو سکے یا اس کا ہاتھ پکڑ سکے۔ آپ اپنا کام کیے جائیے وہ ہر مشکل کو آسان کرے گا اور اپنے ہر ارادے کو بروئے کار لائے گا۔

وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا (۶۶)

منکرین قیامت کے متناقض خیالات کی تردید

حضرت جبریلؑ کا کلام تمام ہوا۔ اب یہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہو رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین کے بعد اب یہ مخالفین کے اصل سبب تکذیب کا خود ان کے الفاظ میں حوالہ دے کر آگے اس کی تردید آ رہی ہے۔ یہاں لفظ 'انسان' اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد مشرکین عرب ہی ہیں جو قیامت کو ایک مستبعد چیز سمجھ کر اس کی تکذیب کرتے تھے۔ عام لفظ سے بات کہنے میں یہ بلاغت ہے کہ گویا وہ لائق التفات نہیں اس وجہ سے عام صیغہ سے بات کہہ دی گئی۔

قیامت کے باب میں مشرکین عرب کا موقف، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، صریح انکار کا نہیں تھا بلکہ وہ ایک قسم کے تناقض میں مبتلا تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو زندہ کرنے والا اور مارنے والا تو مانتے تھے لیکن اس بات کو بہت مستبعد سمجھتے تھے کہ مر کھپ جانے کے بعد سارے لوگ پھر زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اور سب کا حساب کتاب ہوگا۔ ان کے امرا و اغنیا اس غلط فہمی میں بھی مبتلا تھے کہ بالفرض قیامت ہوئی تو وہ وہاں بھی وہی کچھ پائیں گے جو ان کو یہاں حاصل ہے۔ پھر سب سے زیادہ اعتماد ان کو اپنے دیوی دیوتاؤں پر تھا، وہ فرشتوں کو خدا کی چہیتی بیٹیاں مان کر ان کی پرستش کرتے تھے اور ان کا زعم یہ تھا کہ اگر قیامت ہوئی اور حساب و کتاب سے سابقہ پیش آیا تو ان کے یہ معبود ان کو خدا سے چھڑا لیں گے۔ مشرکین کے ان متناقض خیالات کو سامنے رکھیے تب قرآن کے آگے کے مباحث سمجھ میں آئیں گے۔

اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا (۶۷)

ایک بدیہی تناقض ذہنی

یہ اسی تناقض ذہنی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جب یہ انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ خدا نے اس کو عدم محض سے وجود بخشا تو آخر اس کو یہ بات کیوں مستبعد معلوم ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد وہ اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے۔ جب وہ کچھ نہیں اسے پیدا کرسکتا ہے تو کچھ ہے اسے دوبارہ پیدا کر دینا اس کے لیے کیوں مشکل ہو جائے گا۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا (۶۸)

'شیاطین' سے شیاطین جن و انس دونوں مراد ہیں

'شیاطین' سے مراد یہاں قرینہ دلیل ہے کہ شیاطین جن بھی ہیں اور شیاطین انس بھی۔ عربوں کے متعلق ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ وہ بہت سے جنوں کی بھی پرستش کرتے تھے۔ اسی طرح ان کے گمراہ لیڈروں نے بھی ان کو گمراہ کیا اور انھوں نے آنکھ بند کر کے ان کی پیروی کی اور جب اللہ کے رسول نے ان کو آنکھیں کھولنے کی دعوت دی تو اس کے درپے آزار ہو گئے۔

'جثی' کا مفہوم

'جثی' جاث کی جمع ہے۔ 'جثا جثوا' کے معنی دوزانو اور اکڑوں بیٹھنے کے ہیں۔ یہ نشست مجرموں کی نشست ہے۔ جس طرح مجرم اپنا فیصلہ سننے کے لیے کسی حکمران کے سامنے بیٹھتے ہیں اسی طرح کی غلامانہ اور محکومانہ نشست کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔

مجرموں کی نشست جہنم کے اردگرد

اب یہ پوری تاکید کے ساتھ قسم کھا کر فرمایا کہ تیرے رب کی قسم، ہم ان کو اور ان تمام شیاطین کو جن کی انھوں نے عبادت، اور اطاعت کی اور ان کے ان تمام گمراہ لیڈروں کو جن کی انھوں نے پیروی کی، سب کو جہنم کے اردگرد اس طرح اکٹھا کریں گے کہ وہ مجرموں کی طرح دوزانو بیٹھے ہوئے اپنے فیصلہ کا انتظار کریں گے کہ کس کے لیے جہنم کے کس وارڈ میں جانے کا حکم ہوتا ہے۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا (۶۹)

دنیا میں ضلالت کے قائدآخرت میں جہنم کے قائد

فرمایا کہ اس کے بعد ہم ہر گروہ اور ہر پارٹی کے ان لیڈروں کو ان کے اندر سے چھانٹ کر الگ کریں گے جو خدا اور اس کے رسول کے سب سے زیادہ مخالف اور اس کے خلاف تحریکیں چلانے والے رہے ہیں۔ ان کو چھانٹ کر اس لیے الگ کیا جائے گا کہ جس طرح انھوں نے دنیا میں لوگوں کو گمراہ کرنے کی مہم میں ان کی قیادت کی اسی طرح اب پیروؤں کو جہنم میں لے جانے کے لیے بھی ان کی پیشوائی کریں۔ وہ آگے آگے ہوں گے اور ان کے پیرو پیچھے پیچھے اور جو جہنم کے جس طبقہ کا سزاوار ہوگا وہ اس میں داخل ہوگا۔

ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا (۷۰)

مشرکین کے تصور شفاعت پر تعریض

فرمایا کہ اس وقت اس بات کے جاننے والے کہ کون اس جہنم میں داخل ہونے کا سب سے زیادہ سزاوار ہے، کس کو سب سے پہلے داخل ہونا چاہیے اور کس طبقہ میں داخل ہونا چاہیے صرف ہم ہوں گے۔ کوئی دوسرا ان باتوں کا ہم سے زیادہ جاننے والا نہیں ہوگا کہ ہمیں کسی کے بارے میں اس سے مشورہ لینے کی ضرورت پیش آئے یا

کوئی کسی کے باب میں یہ کہنے کی پوزیشن میں ہو کہ وہ اس سے زیادہ ہم سے باخبر ہے اس وجہ سے اس کے معاملے میں اس کی سفارش درخور اعتنا ہے ۔۔۔ یہ مشرکین کے غلط عقیدۂ شفاعت پر ایک لطیف تعریض ہے کہ خدا کے ہاں کسی کے لیے سفارش تو وہ کر سکے جو کسی کے بارے میں خدا سے زیادہ واقف ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ آخر ایسا برخود غلط کون ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ سکے کہ فلاں کو آپ نہیں جانتے، میں جانتا ہوں، وہ بڑا نیک آدمی ہے، اس وجہ سے اس کو کچھ نہ کہیے بلکہ سیدھے جنت میں بھیج دیجیے!

وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (۷۱)

'حتم' کا مفہوم

'حتم' کے معنی واجب اور لازم کے ہیں۔ اور ضمیر خطاب کے مخاطب وہی مجرمین ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ اوپر کی بات بصیغۂ غائب کہی گئی ہے اور یہ بات ان کو مخاطب کر کے ارشاد ہوئی۔ ان دونوں اسلوبوں کے الگ الگ فائدے ہیں۔ جس طرح غائب کا اسلوب عدم التفات پر دلیل ہوتا ہے اسی طرح خطاب کا اسلوب شدتِ عتاب پر دلیل ہوتا ہے۔

مجرمین سے خطاب

قرآن مجید اور کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں کہ غائب کا اسلوب کلام دفعۃً خطاب کے اسلوب میں بدل گیا ہے۔[1] یہاں بھی اسی نوع کی تبدیلی ہوئی ہے۔ چونکہ مقصود شدتِ غضب کا اظہار ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان مجرموں کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ اب تمہارے لیے داد و فریاد اور عذر و معذرت کا وقت گزر گیا، اب تم میں سے بلا استثناء ہر ایک کو اس جہنم میں اترنا ہے۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا کہ یہ امر بالکل قطعی اور فیصل شدہ ہے، اس کو تمہارے رب نے اپنے اوپر لازم ٹھہرا لیا ہے۔ ایک دن تم اپنے دشمنوں کا یہ انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔

صرف مجرم جہنم پر وارد ہوں گے

آیت کی یہ تاویل بالکل واضح ہے لیکن ہمارے مفسرین نے اس کا مخاطب تمام بنی نوع انسان کو مان لیا ہے، چنانچہ وہ ہر شخص کے لیے، خواہ نیک ہو یا بد، جہنم سے گزرنا ضروری قرار دیتے ہیں۔ بس اتنی خیریت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جہنم پر پل صراط کے نام سے ایک پل ہو گا جس پر سے نیک لوگ تو گزر جائیں گے، البتہ وہ لوگ جہنم میں پڑے چھوڑ دیے جائیں گے جو برے ہوں گے۔ یہ غلط فہمی مفسرین کو صرف اسلوب کلام کے نہ سمجھنے کے سبب سے ہوئی ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ ان کی اکثر لغزشیں اسی چیز کا نتیجہ ہیں۔ تعجب ہے کہ اتنی سخت بات کہتے ہوئے ان حضرات کو قرآن کی وہ آیت یاد نہیں آئی جو سورۂ انبیاء میں نیکوکاروں سے متعلق وارد ہے۔ فرمایا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰىٓ	بے شک جن کے لیے ہمارا اچھا وعدہ ہو چکا ہے وہ اس
أُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ۔ لَا يَسْمَعُونَ	جہنم سے دور رکھے جائیں گے، وہ اس کا کھٹکا بھی نہیں
حَسِيسَهَا ۚ وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ خٰلِدُونَ ۔	سنیں گے اور وہ اپنی چاہت کی نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان
لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ	کو سب سے بڑی گھبراہٹ کی ساعت غمگین نہیں کرے گی
الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنْتُمْ	اور فرشتے اس بشارت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کریں گے کہ

[1] ملاحظہ ہو اسی سورہ کی آیت ۶۸۔

تُوْعَدُوْنَ ۝ (۱۰۱ - ۱۰۳ الانبیاء) یہ ہے آپ لوگوں کا وہ دن جس کا وعدہ کیے جا رہے تھے۔

تاویل کی اس قسم کی غلطیوں سے محفوظ رہنے کے لیے قرآن پر تدبر کرنے والوں کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اسالیب القرآن کا گہری نظر سے مطالعہ کر ڈالیں۔

ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا (۷۲)

اہل تقویٰ کے ساتھ معاملہ

'ثُمَّ' ترتیب کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ پہلے ظالموں سے نمٹے گا، ان کو واصل جہنم کرنے کے بعد ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوگا جو اس سے ڈرتے رہے۔ فرمایا کہ پھر ہم ان لوگوں کو نجات دیں گے جو ہم سے ڈرتے رہے اور ظالموں کو اسی جہنم میں اکڑوں بیٹھے چھوڑ دیں گے۔ 'نجات دیں گے' سے مراد یہ نہیں ہے کہ جہنم سے نجات دیں گے۔ جہنم کی تو اہل تقویٰ کو، جیسا کہ اوپر گزرا، ہوا بھی نہیں لگنے پائے گی۔ یہاں 'نجات دینے' سے مراد ان تمام ہموم و افکار اور اس تشویش و انتظار سے نجات دینا ہے جن سے بہر حال منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے تک اہل حق کو بھی سابقہ پیش آتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

'وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا' میں لفظ 'جثی' کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔ 'جثی' ان کو کہتے ہیں جو مجرموں کی طرح اپنی قسمت کے فیصلے کے انتظار میں دوزانو بیٹھے ہوئے ہوں۔ اوپر والی آیت میں تو اس کا محل استعمال بالکل واضح ہے لیکن یہاں اس کا استعمال کھٹکتا ہے اس لیے کہ 'فیھا' کا قرینہ دلیل ہے کہ یہ ان کی جہنم کے اندر کی حالت بیان ہو رہی ہے لیکن اس کے اندر تو ان کے رونے چلانے کا ذکر ہونا چاہیے، جیسا کہ دوسرے مقامات میں ہے، نہ کہ اکڑوں بیٹھنے کا۔ اس اشکال سے بچنے کے لیے اس کا مفہوم ہمارے مفسرین اور مترجموں نے بدل دیا ہے لیکن یہ تبدیلی لغت سے تجاوز کی نوعیت کی ہے اس وجہ سے ہم کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حالت بیان تو ہوئی ہے جہنم کے اندر ہی کی لیکن یہ بالکل ابتدائی مرحلہ کی بات ہے جب کہ وہ فیصلۂ الٰہی کے بعد جہنم کے داروغوں کے حوالہ کیے جائیں گے اور اکڑوں بیٹھے عذاب کے دروازے کے کھلنے کے منتظر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ کے داروغوں کے حوالہ کر کے اسی حالت میں چھوڑ کر ان سے بے التفات ہو جائے گا اور اس کے بعد ان کے لیے عذاب کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِیًّا (۷۳)

مغروروں کی ذہنیت

یہ ان مغروروں کی ذہنیت واضح کی جا رہی ہے کہ جب ان کو جزا و سزا اور عذاب دنیا و آخرت سے آگاہ کرنے والی نہایت واضح، مبنی بر دلائل آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو بڑی دیدہ دلیری سے وہ اہل ایمان سے یہ معارضہ کرتے ہیں کہ بتاؤ، مرتبہ و مقام، جاہ و منصب، اعوان و انصار، مجلس اور سوسائٹی کے اعتبار سے تمہارا درجہ اونچا ہے یا ہمارا؟ اگر ہمارا درجہ اونچا ہے، اور بالبداہت اونچا ہے، تو ہم کیونکر باور کر لیں کہ ہم خدا کے غضب کے سزاوار ہیں اور ہم پر کوئی عذاب آنے والا ہے! ہم تو دیکھتے ہیں کہ خدا کی نظروں میں ہم تم سے زیادہ عزت

رکھنے والے ہیں کہ اس نے ہم کو یہ کچھ دے رکھا ہے اور تم ان ساری چیزوں سے محروم ہو!

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِءْيًا (۷۴)

'قرن' کے معنی ایک دور کے لوگ، امت اور قوم۔ 'رءی' کے معنی نمود، منظر، شان و شوکت۔

مغروروں کے معارضہ کا جواب

ان معارضہ کرنے والوں کے جواب میں فرمایا کہ اسباب و سامان اور شان و شوکت کی زیادتی نہ تو کسی قوم کے خدا کے چہیتی ہونے کی دلیل ہے اور نہ یہ چیزیں خدا کی پکڑ سے بچانے والی ہیں۔ تاریخ میں کتنی ایسی قوموں کی مثالیں موجود ہیں جو اپنے ساز و سامان اور اپنی ظاہری چمک دمک کے اعتبار سے ان سے کہیں بڑھ کر تھیں لیکن جب انھوں نے خدا سے سرکشی کی تو وہ تباہ کر دی گئیں۔ یہاں صرف ان قوموں کی طرف اشارہ ہے۔ دوسری سورتوں میں ان کی تفصیل موجود ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمَٰنُ مَدًّا ۚ حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضْعَفُ جُندًا (۷۵)

سرکشوں کے معاملہ میں سنت الٰہی

یہ اس سنت الٰہی کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں اور سرکشوں کے معاملہ میں اختیار فرماتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ اپنی دنیوی برتری کے زعم میں جو لوگ تمھارے انذار کا مذاق اڑا رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرنے کے بجائے ضلالت ہی میں پڑے رہنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ ان کے عیش و آرام کو چھین لے یا ان کو فوراً عذاب میں پکڑ لے بلکہ اس کی رحمت کی شان یہ ہے کہ ان کو زیادہ سے زیادہ ڈھیل دے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں اور خدا کی حجت ان پر تمام ہو جائے۔ خدا کوئی کمزور ہستی نہیں ہے کہ اس کو اندیشہ ہو کہ فوراً نہ پکڑا تو شکار نکل جائے گا۔ اس کی تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے اس وجہ سے وہ برابر رسی دراز کیے جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یا تو وہ عذاب ہی ان پر آ دھمکے گا جو رسول کی تکذیب کا لازمی نتیجہ ہے یا وہ قیامت ہی نمودار ہو جائے گی جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔ اس وقت انھیں اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا کہ کون اپنے موقف و مقام کے لحاظ سے بدتر اور اپنے لاؤ لشکر کے اعتبار سے ضعیف تر ہے۔

اس آیت میں دو تین باتوں پر نگاہ رکھیے۔

چند قابل توجہ باتیں

ایک 'فَلْيَمْدُدْ' کے اسلوب پر۔ یہ نہیں فرمایا کہ 'خدا ان کی رسی دراز کرتا ہے'، بلکہ فرمایا کہ خدائے رحمان کے شایانِ شان بات یہی ہے کہ وہ ان کی رسی دراز کرے، یعنی ظالموں کو ڈھیل خدا کی قدرت، حکمت اور اس کی تدبیر کا مقتضا ہے۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اس ڈھیل کو اپنی کامیابی سمجھ کر سرکشی میں اور زیادہ دلیر ہو جائیں۔

دوسری چیز یہ نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ یہاں 'عذاب' اور 'ساعت' دو چیزوں کا ذکر ہے۔ جب یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ استعمال ہوں تو ایک سے عذاب دنیا مراد ہوتا ہے اور دوسرے سے عذاب قیامت۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے ان دونوں عذابوں سے اپنی اپنی قوموں کو ڈرایا ہے۔ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ اگر کوئی قوم اپنے رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو اتمام حجت کے بعد وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔

تیسری یہ کہ تفضیل کے صیغے بسا اوقات تقابل کے مفہوم سے مجرد ہو کر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں۔

یہ بات بھی یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں جس طرح عرب جاہلیت کے حمقاء خدا اور آخرت کی باتوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے اسی طرح موجودہ دور میں علم و سائنس کے عقلاء بھی اسی غرے میں خدا اور آخرت کو ایک واہمہ قرار دیتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک دوست نے ذکر کیا کہ امریکہ کے لوگوں کے سامنے خدا اور آخرت کا ذکر کیجیے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہماری عمروں کا اوسط تمہاری عمروں سے زیادہ ہے۔ اگر تمہاری بات صحیح ہے تو چاہیے تھا کہ تمہاری عمروں کا اوسط ہم سے زیادہ ہوتا۔ میں نے کہا ان کے ہاں عمروں کا اوسط بھی سب سے زیادہ ہے اور خودکشی کا اوسط بھی سب سے زیادہ ہے۔ ملک الموت کو اب بھی یہ لوگ اپنے ہاں سے بے دخل نہ کر سکے۔ البتہ یہ ہوا کہ ان کا کام ان لوگوں نے خود سنبھال لیا ہے!!

وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ۗ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ مَرَدًّا (۷۶)

اہل ایمان کو بشارت

یہ آیت اوپر کی آیت ۷۵ کے مقابل میں ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ ہدایت پر ضلالت کو ترجیح دینے والوں کی رسی دراز کرتا ہے اسی طرح ہدایت اختیار کرنے والوں کی ہدایت میں بھی، برابر اضافہ پر اضافہ فرماتا ہے۔ اور عاقل کے نزدیک دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہوتی کہ کسی کام کا فوری نفع کیا ہے بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اپنے اجر و ثواب اور اپنے انجام و مآل کار کے اعتبار سے کونسا کام بہتر ہے۔ دنیا کے پرستار صرف نفع عاجل کو دیکھتے ہیں انھیں اس سے بحث نہیں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ اس کے برعکس بندۂ مومن کی نگاہ مستقبل یعنی آخرت پر ہوتی ہے اور وہ اپنے ہر کام کا جائزہ مآل کار کے پہلو سے لیتا ہے۔ اس آیت میں اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان اسباب دنیا پر اترانے والوں کے طعنوں کی پروا نہ کرو، تم اگرچہ بے سروسامان ہو، لیکن تمہاری ہدایت میں دم بدم اضافہ ہو رہا ہے اور تمہارا یہ اندوختہ تمہارے لیے ابدی بادشاہی کی ضمانت ہے اور تمہیں طعنہ دینے والوں نے جو سروسامان اکٹھا کر رکھا ہے یا کر رہے ہیں یہ سب ان کے جلانے کے لیے ایندھن کا کام دے گا۔ 'مَرَدّ' کا ترجمہ میں نے مآل کار کیا ہے اور یہ ترجمہ میرے نزدیک لفظ کی اصل روح سے قریب تر ہے۔

'باقیات صالحات' کی تعبیر

قرآن میں اعمال صالحہ کو جگہ جگہ 'باقیات الصالحات' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ درحقیقت وہی اعمال صالحہ ہیں جو پائیدار اور غیر فانی ہیں۔ جو اعمال چند روزہ اور فانی ہیں وہ غیر صالح ہیں۔ رہا یہ سوال کہ باقی اعمال کون ہیں اور فانی کون ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو اعمال صرف دنیا کو مطلوب و مقصود بنا کر کیے جاتے ہیں وہ فانی ہیں اس لیے کہ یہ دنیا خود فانی ہے۔ باقی رہنے والے اعمال صرف وہ ہیں جو خدا اور آخرت کو مقصود بنا کر کیے جائیں اس لیے کہ خدا بھی غیر فانی ہے اور آخرت بھی۔

أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا ۝ أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ

عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (۷۸)

برخود غلط لوگوں کے مغالطہ کی تردید
یہ قرآن نے ان جھٹلانے والوں کے ایک اور مغالطہ کا حوالہ دے کر اس کی تردید فرمائی ہے۔ اس مغالطہ کا ذکر 'اَفَرَءَیْتَ' کے خطاب سے کیا ہے۔ عربی زبان کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ جب اس خطاب سے بات کا آغاز ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد کسی بہت ہی برخود غلط شخص یا کسی نہایت بھونڈی بات کا حوالہ آئے گا۔

یہاں عربیت کے اس اسلوب کو بھی یاد رکھیے جس کا ذکر ہم بعض دوسرے مقامات میں بھی کر چکے ہیں کہ 'اَلَّذِیْ' ضروری نہیں کہ ہر جگہ معرفہ ہی کے لیے آئے۔ بعض اوقات یہ تمثیل کے لیے بھی آتا ہے جس کی نہایت بلیغ مثالیں قرآن مجید میں بھی موجود ہیں[1] اور کلام عرب میں بھی۔ اس صورت میں اس سے کوئی متعین شخص مراد نہیں ہوتا بلکہ اس سے مقصود کسی خاص کردار یا کسی خاص ذہنیت کو ممثل و مصور کرنا ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہ کسی خاص شخص کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ یہ ایک خاص گروہ کی ذہنیت کی تصویر ہے۔

فرمایا کہ ذرا اس برخود غلط کو دیکھو جو اس زعم میں مبتلا ہے کہ اگر قیامت بالفرض ہوئی تو وہ وہاں بھی اسی طرح مال و اولاد کا حق دار ٹھہرے گا جس طرح یہاں ہے۔ اس ذہنیت کے لوگ نعمتوں کو اللہ کا عطیہ نہیں سمجھتے بلکہ اپنے استحقاق ذاتی یا اپنی قابلیت کا کرشمہ سمجھتے ہیں اس وجہ سے اس گھمنڈ میں مبتلا رہتے ہیں کہ ریاست و امارت کے وہ پیدائشی حقدار ہیں اس سے ان کو کون محروم کر سکتا ہے! اگر آخرت نامی کوئی شے ہے تو وہ وہاں بھی کوٹھیوں میں عیش کریں گے اور کاروں میں پھریں گے!

تردید بانداز تحقیر
'اَطَّلَعَ الْغَیْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا'۔ چونکہ یہ زعم بالکل احمقانہ اور طفلانہ قسم کا ہے اس وجہ سے اس کا جواب طنز و تحقیر کے انداز میں ہے۔ فرمایا کہ کیا انھوں نے غیب کے پردوں میں جھانک کر ان تمام چیزوں کو دیکھ لیا ہے جو ان کو آخرت میں ملنے والی ہیں یا خدا سے ان کے لیے کوئی گارنٹی لکھوائی ہے! — آخر کس بوتے پر یہ ناز ہے!!

كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ۝ (۷۹-۸۰)

تردید غضب کے لہجہ میں
یہ غضب کے لہجے میں اس زعم باطل کی تردید ہے۔ فرمایا کہ ہم اس کی بکواس کو بھی نوٹ کر رکھیں گے اور اس کی پاداش میں بھی اس کے عذاب میں اضافہ کریں گے۔ یعنی کفر و تکذیب کی جو سزا ملنی ہے وہ تو ملے ہی گی اس میں مزید اضافہ اس مغرورانہ دعا کے سبب سے بھی ہو جائے گا۔

'وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا'۔ یعنی ان تمام چیزوں کے، جن کا یہ مدعی ہے اور جن پر اس کو فخر و ناز ہے، مالک و وارث ہم ہوں گے اور یہ قیامت کے دن ہمارے حضور میں تنہا حاضر ہوگا، نہ اس کے ساتھ اس کا سر و سامان ہوگا، نہ اس کے اعوان و انصار ہوں گے اور نہ اس کے مزعومہ شرکاء و شفعاء ہوں گے۔ اس کو جو

---

[1] ملاحظہ ہو سورۂ نحل کی آیت ۹۲۔

چیزیں بھی ملی تھیں ہماری بخشی ہوئی ملی تھیں وہ سب ہم واپس لے لیں گے اور یہ جس طرح دنیا میں خالی ہاتھ گیا تھا اسی طرح خالی ہاتھ ہمارے پاس واپس آئے گا۔

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ہ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا (۸۱-۸۲)

معبودانِ باطل پر اعتماد — ان مشرکین کا سب سے بڑا سہارا ان کے معبودانِ باطل تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ اگر خدا کے ہاں حاضری اور حساب کتاب کا کوئی مرحلہ آیا تو ان کے یہ معبود اپنے زور و اثر سے، ان کو بچا ہی لیں گے۔ خصوصاً فرشتوں کی سفارش پر ان کو بڑا اعتماد تھا۔ ان کو وہ خدا کی چہیتی بیٹیاں گمان کرتے تھے اور اس خیال سے ان کی پوجا کرتے تھے کہ خدا ان کی بات نہیں ٹال سکتا۔ یہ دنیا میں بھی ان کو اپنے باپ سے سفارش کر کے ان کو رزق اور اولاد دلاتی ہیں اور اگر مرنے کے بعد بھی کسی مدد کی احتیاج پیش آئی تو یہ وہاں بھی قوت اور سہارا بنیں گی۔ اسی قوت اور سہارے کو یہاں 'عِزّ' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے اصل معنی قوت کے ہیں۔

مشرکین کے زعم باطل کی تردید — 'كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا' یہ ان کے اس زعم باطل کی تردید ہے۔ فرمایا کہ ان احمقوں کی یہ آرزو ہرگز پوری نہیں ہوگی بلکہ ان کے یہ معبود قیامت کے دن ان کی اس عبادت کا ان کے منہ پر انکار کریں گے۔ قرآن میں اس بات کی تصریح ہے کہ جب یہ مشرکین قیامت کے دن اپنے معبودوں کی دہائی دیں گے کہ ہم دنیا میں آپ کی پرستش کرتے رہے ہیں تو یہاں ہماری کچھ مدد کیجیے تو وہ جھٹ جواب دیں گے کہ ہمیں کیا خبر کہ کچھ احمق لوگ ہماری پرستش کرتے رہے ہیں۔ ہم نے کب کہا تھا کہ ہماری پرستش کرو، اگر تم نے یہ حماقت کی تو اس کا انجام بھگتو!

'وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا' یعنی یہ تو یہ آرزو لیے بیٹھے ہیں کہ ان کے یہ معبود ان کے لیے قوت اور سہارا بنیں گے لیکن معاملہ ہوگا اس کے بالکل برعکس، وہ الٹے ان پر لعنت بھیجیں گے اور ان کے دشمن بنیں گے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ہ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا (۸۳-۸۴)

عربی میں جب کہیں گے 'اَرْسَلَ الْكَلْبَ عَلَى الصَّيْدِ' تو اس کے معنی ہوں گے کتے کو شکار پر چھوڑ دیا۔ اسی اسلوب پر یہاں فرمایا ہے کہ ہم نے ان کافروں پر شیاطین کو چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان کو دعوتِ حق کے خلاف جتنا اکسا سکتے ہیں اکسا لیں۔ 'اَزَّ يَؤُزُّ' کے معنی برانگیختہ کرنے، بھڑکانے اور اکسانے کے ہیں۔

ایک سنت الٰہی — ان کافروں کے ساتھ یہ معاملہ اس سنتِ الٰہی کے مطابق ہوا جس کا ذکر سورۂ زخرف میں ہے کہ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۳۶ (جو خدائے رحمان کی یاد دہانی سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ہم ان پر کوئی شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پس وہ ان کا ساتھی بن جاتا ہے)

پیغمبر کو تسکین و تسلی — یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی ہے کہ ان مخالفین کی مخالفت سے

ہراساں اور پریشان نہ ہو اور ان کے بارے میں فیصلہ الٰہی کے ظہور کے لیے جلدی نہ کرو۔ ان کی مخالفت جتنی ہی شدت اختیار کرتی جا رہی ہے یہ اتنے ہی اپنی تباہی سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی حق دشمنی کے سبب سے اب ہم نے ان کے اوپر شیاطین کو چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان کو جتنا اکسا سکتے ہیں اکسائیں تاکہ ان پر ہماری حجت تمام ہو جائے۔ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا، یعنی اب ان کے فیصلہ کے ظہور میں دیر نہیں ہے۔ ان کا پیمانہ لبریز ہوا چاہتا ہے اور گھڑی کی سوئی اپنے آخری نقطہ پر پہنچ رہی ہے۔ ہم ایک ایک منٹ کو پورے اہتمام کے ساتھ گن رہے ہیں اور وقت پورا ہو جانے کے بعد ایک پل کے لیے بھی ان کو مہلت دینے والے نہیں ہیں۔

یاد ہوگا، اس مجموعۂ آیات کا آغاز حضرت جبریل امین کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تلقین صبر و انتظار سے ہوا تھا۔ وہی مضمون یہ دوسرے انداز سے براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ادا ہوا ہے جس میں مخالفین کے لیے آخری تنبیہ بھی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے معاملہ کا جلد فیصلہ ہو جانے کی بشارت بھی۔ 'تَؤُزُّهُمْ اَزًّا' اور 'فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ' کے الفاظ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ آیات اس زمانہ میں نازل ہوئی ہیں جب مخالفین کی مخالفت اپنی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہر وقت اس کشمکش کے فیصلہ کے لیے انتظار رہنے لگا تھا۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ۝ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ۝ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ (۸۵-۸۷)

'وفد' کا مفہوم — 'وَفَدَ وَفْدًا' کے معنی کہیں عزت و اکرام کے ساتھ جانے کے ہیں جس طرح سفیر اور قاصد بادشاہ اور امیر کے پاس جاتے ہیں۔

'ورد' کا مفہوم — 'وِرْد'، 'وَرَدَ يَرِدُ' سے اسم ہے۔ اس کے معنی گھاٹ پر اترنے کے ہیں جس طرح پیاسے اونٹ گھاٹ پر جاتے ہیں۔

مزعومہ شفاعت کی تردید — 'اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا' میں میرے نزدیک استثنا منقطع ہے۔ یہ ان مجرموں کی مزعومہ شفاعت کی نفی ہے۔ فرمایا کہ جس دن ہم متقیوں کو اعزاز کے ساتھ خدائے رحمان کے پاس لے جائیں گے اور ان مجرموں کو پیاسے اونٹوں کی طرح جہنم کے گھاٹ کی طرف ہانکیں گے۔ اس دن ان کے مزعومہ شفعاء کو شفاعت کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ یہ حق صرف ان لوگوں کو حاصل ہوگا جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا حق حاصل کر رکھا ہے۔

شفاعت سے متعلق چند اصولی باتیں — یہ حق کن لوگوں کو حاصل ہوگا؟ اس سوال پر ہم اس کتاب میں مناسب مواقع پر بحث کرتے آئے ہیں۔ چند اصولی باتوں کی یاد دہانی یہاں بھی کیے دیتے ہیں۔

شفاعت کا مقام صرف انبیائے کرام اور شہدائے امت کو حاصل ہوگا۔ یہ ایک منصب تکریم و تشریف ہے جس پر اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کو سرفراز فرمائے گا جو اس اکرام و اعزاز کے سزاوار ہوں گے۔

یہ لوگ بھی خدا کی اجازت سے شفاعت کریں گے اور صرف ان لوگوں کے لیے کریں گے جن کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت مرحمت فرمائے۔ یہ نہیں ہو گا کہ یہ کسی کی شفاعت کے لیے خود پیش قدمی کریں یا ان لوگوں کے لیے شفاعت کریں جن کے لیے خدا سے ان کو اجازت حاصل نہ ہو۔

یہ اپنی شفاعت میں وہی بات کہیں گے جو بالکل حق ہو گی۔ باطل کو حق یا بدی کو نیکی بنانا نہ ان کے شایان شان ہے نہ خدائے علام الغیوب کے آگے کوئی اس کی جسارت کر سکتا ہے۔

جن لوگوں نے شرک والحاد کی زندگی گزاری یا ایمان کے مدعی رہے لیکن ساری زندگی بطالت اور خدا و رسول کی نافرمانی میں گزاری ان کے لیے کوئی شفاعت نہیں۔

یہ ساری باتیں خود قرآن کے نصوص سے ثابت ہیں۔ ہم نے ان پر جگہ جگہ بحث کی ہے اور آگے بھی انشاء اللہ تفصیل سے ان پر بحث کریں گے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ ساری شرطیں شفاعت پر عاید ہیں اور ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا تو شفاعت کے بل پر گناہوں کے لیے لیسنس دینے یا حاصل کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ پھر تو شفاعت کی امید اگر کر سکتے ہیں تو وہ لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے زندگی تو ایمان و عمل صالح اور توبہ و اصلاح کی گزاری لیکن کوتاہی، غفلت یا جذبات سے مغلوب ہو کر نیکیوں کے ساتھ غلطیاں بھی کرتے رہے۔ اس طرح کے لوگ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سزاوار ٹھہریں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پر بخش دیے جائیں۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے شفاعت کے بل پر گناہوں ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے اور یہود کی طرح امیدوار ہیں کہ 'سَيُغْفَرُ لَنَا' ہم امتِ مرحومہ ہیں، ہمارے سارے گناہ بخش دیے جائیں گے تو قرآن کی روشنی میں اس خوش فہمی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا (۸۸)

'ولد' کا مفہوم

'وَلَد' کے معنی اولاد کے ہیں۔ یہ واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے آتا ہے۔ خدا کے لیے اولاد ماننے کے معاملے میں مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ سب یکساں ہیں۔ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ یہود حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں اور نصاریٰ نے حضرت مسیح کو جو کچھ بنایا ہے اس کی تفصیل اسی سورہ میں پیچھے گزر چکی ہے۔ اوپر کی آیت میں شفاعت باطل کی تردید فرمائی ہے۔ اب آگے کی چند آیات میں شرک کی اس گھناؤنی قسم کی تردید فرمائی ہے جو درحقیقت شفاعت باطل کے اسی تصور کے تحت وجود پذیر ہوئی جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ ظاہر ہے کہ اگر خدا سے اپنے جرائم کے لیے مفت لیسنس حاصل کرنا ہے تو یہ کام بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ خدا کے لیے کچھ بیٹے بیٹیاں فرض کیے جائیں اور ان کی پوجا کر کے یہ امید رکھی جائے کہ خواہ ہم کچھ کرتے رہیں خدا کے یہ چہیتے اور لاڈلے ہم پر خدا کو ہاتھ نہیں ڈالنے دیں گے۔ چنانچہ اہل عرب نے اسی خواہش کے تحت فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنایا اور نصاریٰ نے یہ عقیدہ ایجاد کیا کہ خدا نے اپنے محبوب بیٹے کو ہماری خاطر قربان کر کے ہمارے سارے گناہوں کا کفارہ بنا دیا۔

خدا کی اولاد ٹھہرانے کا جرم

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا (۸۹)

'اِدًّا' کے معنی ہیں سخت، دہشت اور سنگین بات۔ یہاں اس اسلوبِ کلام پر بھی نظر رہے کہ بات غائب کے صیغہ سے ہو رہی تھی لیکن جب شدتِ عتاب و غضب کا موقع آیا تو دفعۃً صیغہ خطاب کا آگیا۔ یہ وہی اسلوبِ کلام ہے جس کا ذکر ہم 'فَاٰذُوْهُمَا' 'وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ' کے تحت کر آئے ہیں۔

فرمایا کہ یہ تم بڑی ہی سنگین بات کے مرتکب ہوئے ہو۔ سنگین اس وجہ سے کہ یہ خدا کی خدائی اور اس کی یکتائی میں دوسرے کو شریک و سہیم بنانا ہے اور خدا غیور ہے اس وجہ سے اس بات کو وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ کسی کو اس کا کفو اور ہمسر قرار دے کر اس کی یکتائی کو بٹہ لگایا جائے۔ جب بندے، بندے ہو کر، کسی ایسی بات کو گوارا نہیں کرتے جو ان کی غیرت کو چیلنج کرے تو وہ خدائے غیور جو تمام ارض و سما کا تنہا مالک ہے اس بات کو کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ اس کے بندے اس کے سوا کسی اور کی بندگی کریں۔ خدا کی غیرت کی تعبیر کے لیے قدیم صحیفوں میں یہ تمثیل بھی استعمال ہوئی ہے کہ جب تم یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ تمھاری بیوی کسی غیر کی بغل میں سوئے تو خدائے غیور کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ اس کا بندہ کسی اور کو سجدہ کرے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا (۹۰)

'هَدًّا' کے معنی کسی دیوار وغیرہ کے دھماکے کے ساتھ گرنے کے ہیں۔

شرک کی سنگینی کی تعبیر

یہ اسی بات کی سنگینی واضح فرمائی ہے کہ قریب ہے کہ اس کے سبب سے آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ دھماکے کے ساتھ گر پڑیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس تہمت سے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو بھی ایسی غیرت و حمیت لاحق ہوتی ہے کہ وہ ایک منٹ کے لیے بھی ان نابکاروں کو برداشت کرنا نہیں چاہتے جو خدا کا شریک بناتے ہیں لیکن وہ خدائے رحمان کے حکم کے تابع ہیں اس وجہ سے جب تک وہ کسی گروہ کو مہلت دیتا ہے اس وقت تک وہ بھی اپنے غضب کو ضبط کرتے ہیں۔

ایک بیانِ حقیقت

یہ امر واضح رہے کہ یہ کوئی مبالغہ کا اسلوبِ بیان نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت کا بیان ہے۔ جب ایک غیور بیٹا اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی اس کو اس کے باپ کے سوا کسی اور باپ کی طرف منسوب کر دے یا اس کے باپ کے ساتھ دوسروں کو بھی اس کا باپ بنا دے تو آسمان و زمین اور دریا اور پہاڑ اس بے ناموسی کو کس طرح برداشت کر سکتے ہیں کہ کوئی ان کو خدائے وحدہ لا شریک لہٗ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کرے یا ان کی خلقت میں خدا کے سوا دوسروں کو بھی ساجھی مان لے۔ ہم دوسرے مقام میں اس حقیقت کی وضاحت کر چکے ہیں کہ آسمان و زمین، سورج اور چاند سب کی فطرت ابراہیمی ہے۔ وہ اپنے مظاہر سے اس فطرت تکوینی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی یہ فطرت اس بات سے ابا کرتی ہے کہ وہ ان لوگوں کو برداشت کریں جو خدا کے لیے اولاد ٹھہرائیں لیکن ان کی باگیں خدا کے ہاتھ میں ہیں اس وجہ سے وہ اپنی مرضی سے کوئی اقدام نہیں کر سکتے۔

اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (۹۱)

یہ آسمان و زمین اور پہاڑوں کے غصہ اور غضب کا سبب بیان ہوا ہے کہ ان کی یہ غضبناکی اس سبب سے ہے کہ لوگوں نے خدائے رحمان پر آل و اولاد کی تہمت لگائی۔

وَمَا يَنبَغِي لِلرَّحْمَٰنِ أَن يَتَّخِذَ وَلَدًا (۹۲)

خدا کے لیے اولاد ماننا اس کی صفاتِ ربوبیت کے منافی ہے

یہ خدا کے لیے اولاد ماننے کی ضلالت کی تردید خدا کی صفاتِ الوہیت کے منافی ہونے کے پہلو سے فرمائی کہ آخر اس کو ضرورت کیا پڑی ہے کہ وہ اپنے لیے اولاد بنائے! نہ اس کو اپنے کاموں میں کسی شریک و معاون کی ضرورت ہے نہ اپنی املاک و جائداد کے لیے کسی وارث و والی کی، نہ اپنا نام زندہ رکھنے کے لیے وہ کسی کا محتاج ہے، نہ اسے بڑھاپے کا کوئی سہارا مطلوب ہے۔ وہ اپنی ذات میں غنی اور بے نیاز ہے تو آخر وہ 'ولد' کس مقصد کے لیے بنائے گا۔

إِن كُلُّ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَٰنِ عَبْدًا (۹۳)

خدا کے حضور مخلوقات کی حیثیت

اب یہ اپنی تمام مخلوقات کی اصل حیثیت واضح فرما دی کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں۔ خواہ فرشتے ہوں یا جن و انس، اور ان کا جو درجہ و مرتبہ بھی ہو، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، سب بلا استثنا ایک دن خدائے رحمان کے حضور میں اس کے ایک بندے کی حیثیت سے حاضر ہوں گے۔ جہاں تک بندے ہونے کا تعلق ہے اس اعتبار سے سب برابر ہوں گے۔ وہاں نہ کوئی خدا کا بیٹا ہوگا نہ بیٹی۔

لَّقَدْ أَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا (۹۴-۹۵)

'احصاء' کا اصل مفہوم ضبط اور کنٹرول میں رکھنا ہے۔

قیامت کی حاضری کی نوعیت

اب یہ قیامت کے دن ہر ایک کی حاضری کی نوعیت واضح فرما دی کہ سب خدا کے کامل کنٹرول میں ہیں اور ہر ایک کو خدا نے اچھی طرح گن رکھا ہے اس وجہ سے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی اس کے قابو سے باہر ہو جائے یا گنتی میں کوئی سہو ہو جائے۔ پھر ہر ایک یکہ و تنہا حاضر ہوگا، نہ اس کے ساتھ اس کے اولاد و احفاد ہوں گے، نہ اعوان و انصار، نہ شرکاء و شفعاء۔ نفسی نفسی کا عالم ہوگا اور سب کو خدا کے آگے اپنے باب میں خود جواب دہی کرنی ہوگی۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا (۹۶)

تحیۃ تہم کا حال

اب یہ ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو اس کس مپرسی اور نفسی نفسی کی حالت سے محفوظ ہوں گے۔ فرمایا کہ البتہ وہ لوگ جنھوں نے ایمان و عمل صالح کی زندگی گزاری ہوگی ان کے لیے خدائے رحمان ہر طرف مہر و محبت کی فضا پیدا کر دے گا۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ ارشاد ہوئی ہے لیکن دوسرے مقامات میں تصریح ہے کہ اس دن اہل ایمان کا خیر مقدم فرشتے بھی سلام و تحیت کے ساتھ کریں گے، رب العزت کی طرف سے بھی ان کو سلام کہلایا جائے گا اور خود اہلِ ایمان بھی ایک تحیۃ تہم کی طرح ایک دوسرے کو مبارک باد دیں گے۔ غرض ہر طرف فضا تہنیت و مرحبا کے کلمات سے گونج رہی ہوگی!

صفتِ رحمان کی تکرار کی حکمت

اس مجموعۂ آیات بلکہ اس پوری سورہ میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اسمائے حسنیٰ میں سے اسم رَحْمٰن باربار آیا ہے۔ قرآن کی کسی سورہ میں بھی یہ نام اتنی بار نہیں آیا ہے جتنی بار اس سورہ میں آیا ہے۔ میرے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ تو اس سورہ کو رحمانی سورہ کہتے بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بلا کسی حکمت کے نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس کی حکمت یہ ہے کہ خدا کی صفات اور بندوں کے ساتھ اس کے معاملات کے باب میں ملتوں کو بیشتر گمراہی خدا کی صفت رحمانیت کے غلط تصور ہی سے پیش آئی ہے۔ اس سورہ میں دوسرے مطالب کے ساتھ رحمانیت کے غلط تصور کی اصلاح کر کے اس کا صحیح تصور بھی دیا گیا ہے اس وجہ سے اسم رحمان کا حوالہ اس میں بار بار آیا ہے۔

رحمانیت کے غلط تصور سے پیدا شدہ گمراہیاں

رحمانیت کے غلط تصور نے جو گمراہیاں پیدا کی ہیں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

سورہ میں سب سے پہلے نصاریٰ کا ذکر ہے اس وجہ سے پہلے انہی کی گمراہی کو لیجیے۔ ان کی گمراہی میں بڑا دخل ان کے اس واہمہ کو تھا کہ انسان چونکہ ازلی و ابدی گنہگار ہے، اس کی نجات کی کوئی شکل ہی نہیں ہے۔ اس وجہ سے خدائے رحمان نے اپنی رحمت سے اپنے بیٹے کو بھیجا جو قربان ہو کر اپنے تمام ماننے والوں کے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔

یہود کی گمراہی اس سورہ میں اگرچہ براہِ راست زیرِ بحث نہیں آئی ہے لیکن قرآن سے یہ بات واضح ہے کہ انھوں نے بھی اپنے جرائم کی پردہ پوشی کے لیے خدا کی رحمانیت ہی کی آڑ لی تھی۔ ان کا تصور یہ تھا کہ ہم نبیوں اور ولیوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے اول تو ہم دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو بس چند دن کے بعد کچھ تنبیہ کر کے خدائے رحمان ہم کو بخش دے گا۔

مشرکینِ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنا کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ اول تو حشر نشر کی باتیں محض خیالی ہیں لیکن اگر ان کے اندر کچھ حقیقت ہے تو خدائے رحمان کی یہ بیٹیاں سفارش کر کے ان کو اپنے باپ سے بخشوا ہی لیں گی۔

رحمانیت کا صحیح تصور

یہ تمام غلط فہمیاں اور گمراہیاں پس منظر میں موجود تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے اپنی رحمانیت کا صحیح تصور واضح فرمایا کہ اس کی رحمت اس کے عدل کو باطل نہیں کرتی بلکہ اس کا عدل بھی اس کی رحمت ہی کا مقتضیٰ ہے۔ وہ متقیوں کو جو بشارت دیتا ہے یہ بھی رحمت ہے اور سرکشوں کو جو انذار کرتا ہے یہ بھی اسی کی رحمت ہے۔ وہ اگر ظالموں اور سرکشوں کو اس لیے معاف کر دے کہ وہ بزرگوں اور نبیوں کی اولاد ہیں یا کسی نے ان کی سفارش کی ہے یا وہ اس کے مزعومہ بیٹے سے محبت کرنے والے ہیں تو یہ رحمت نہیں ہوگی بلکہ صریح ظلم ہوگا۔ اور اگر خدا ایسا کرے تو وہ خدائے رحمان نہیں ہوگا بلکہ نعوذ باللہ نہایت ظالم خدا ہوگا۔ وہ رحمان ہے تو اس کی اس رحمت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ حق پرستوں کی دادرسی کرے اور ان کی حق پرستی کا بھرپور صلہ دے اور ظالموں نابہنجاروں کو جہنم میں جھونک دے۔ یہ ظالموں کو جہنم میں جھونک دینا اس کی رحمت و رحمانیت کے منافی نہیں بلکہ یہ عین اس کی رحمت ہی کا ظہور ہے۔ یہ بات بھی یہاں یاد رکھیے کہ جو لوگ خدا کی نافرمانی کرتے ہیں وہ خدا کا کچھ نہیں

بگاڑتے بلکہ اپنا اور خدا کے بندوں کا بگاڑتے ہیں۔ خدا کے حدود و قیود اس کے اپنے تحفظ کے لیے نہیں ہیں، وہ ہر تحفظ سے بالاتر ہے، بلکہ یہ خلق کے تحفظ اور اس کی ترقی کے لیے ہیں اس وجہ سے مجرموں کا معاملہ خدا کا کوئی ذاتی معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ اس کی ساری مخلوق کا معاملہ ہے۔ اپنی مخلوق کے ساتھ اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی مجرم کو سزا دیے بغیر نہ چھوڑے گا ـــــ صفت رحمان کے ان تقاضوں کو سامنے رکھ کر اس سورہ کو غور سے پڑھیے تب یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اس میں جو تنبیہات یا بشارتیں وارد ہوئی ہیں سب خدا کی صفت رحمانیت پر مبنی ہیں۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا (۹۷)

ضمیر بلا مرجع

'یَسَّرْنٰہُ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ اگرچہ مرجع لفظوں میں مذکور نہیں ہے لیکن سورہ میں چونکہ شروع سے یہ بحث چلی آرہی ہے کہ تمام انبیاء کی اصل دعوت یہی رہی ہے جو قرآن دے رہا ہے تو گویا زیر بحث یہاں قرآن ہی ہے۔ اس قسم کے سیاق میں ضمیر بلا مرجع لانا نہ صرف یہ کہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ یہی تقاضائے بلاغت ہے یہ اسلوب مرجع کی شان پر دلیل ہوتا ہے کہ ہرچند وہ مذکور نہیں لیکن بغیر ذکر کے بھی ہر شخص اس کو جانتا ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں عام ہیں۔

'تیسیر قرآن' کا مفہوم

'تیسیر' کے معنی عام طور پر لوگوں نے آسان بنانا سمجھا ہے اور آیت کے معنی یہ لیے ہیں کہ قرآن نہایت آسان ہے۔ اگرچہ یہ بات بجائے خود صحیح ہے کہ قرآن کو خدا نے آسان بنایا ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ قرآن کوئی سپاٹ چیز ہے جس کے لیے کسی فکر و کاوش اور تدبر و تفکر کی ضرورت نہیں ہے۔ جن لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے انھوں نے لفظ 'تیسیر' کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ عربی میں اس کا اصلی مفہوم آسان بنانا نہیں بلکہ کسی شے کو اس کے پیش نظر مقصد کے لیے تمام لوازم سے آراستہ کر کے نہایت موزوں اور سازگار بنانا ہے۔ اگر کہیں کہ 'یَسَّرَ الْفَرَسَ لِلرُّکُوْبِ' تو اس کے معنی ہوں گے کہ گھوڑے کو زین، رکاب، لگام سے آراستہ کر کے سواری کے لیے تیار کر دیا۔ اس طرح 'وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ' کے معنی ہوں گے کہ ہم نے قرآن کو تعلیم و تذکیر کے لیے نہایت موزوں، تمام لوازم سے آراستہ اور نہایت سازگار بنایا ہے۔ قرآن کی تیسیر کے مختلف پہلوؤں پر ادب اور قرآن دونوں کی روشنی میں ہم نے اپنی کتاب 'مبادی تدبر قرآن' میں وضاحت سے بحث کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کی مراجعت کریں۔

'قَوْمًا لُّدًّا' سے مراد

'قَوْمًا لُّدًّا' سے مراد قریش ہیں۔ 'لُدّ'، 'اَلَدّ' کی جمع ہے۔ 'اَلَدّ' کے معنی جھگڑالو، ضدی اور ہٹ دھرم کے ہیں۔ اہل عرب اپنی بدویت کے سبب سے اکھڑ بھی تھے اور اپنی امیت کے باعث معاملاتِ دین میں بہت جاہل اور متعصب بھی اسی وجہ سے بات بات پر آنحضرتؐ کے خلاف مورچہ جماتے اور آپ کو زچ کرنے کے لیے روز نت نئے مطالبات پیش کرتے۔

آنحضرت صلعم کو تسلی اور مخالفین کو انذار

اب یہ آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور مخالفین کو انذار ہے۔ فرمایا کہ اس قرآن کو ہم نے تعلیم و تذکیر اور اتمام حجت کے لیے ہر پہلو سے نہایت موزوں، مدلل اور قائل کرنے والا بنایا ہے۔ پھر یہ تمہاری اور تمہاری قوم کی زبان میں ہے جس کو تم اچھی طرح سمجھ بھی سکتے ہو اور اپنی قوم کو، اگر وہ سمجھنا چاہیں تو، سمجھا بھی سکتے ہو۔ اس کے

ہوتے ہوئے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نسبے متعلق تمھاری ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو اس کا قائل کر دو۔ تمھارا فرض صرف یہ ہے کہ جن کے اندر خوفِ خدا ہے ان کو فوز و فلاح کی خوشخبری سنا دو۔ رہے وہ لوگ جو جھگڑنے کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں تو ان کو دنیا اور آخرت دونوں کے عذاب سے خبردار کر دو۔ یہی مضمون سورۂ طٰہٰ میں یوں وارد ہوا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا۔ (طٰہٰ - ۱۱۳)

چنانچہ ہم نے اس کو اتارا عربی قرآن کی صورت میں اور اس میں اپنی وعید گوناگوں پہلوؤں سے بیان کر دی تاکہ وہ خدا کے غضب سے بچیں یا یہ ہو کہ وہ از سرِ نو ان کی یاد کو بیدار کر دے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا (۹۸)

'رکز' کے معنی آہٹ، سن گن اور کھٹکے کے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تم اپنا فرض انذار و تبشیر ادا کر دو۔ جو لوگ تمھاری بات نہیں سنیں گے وہ اپنا انجام خود دیکھیں گے۔ تاریخ میں ان کے لیے کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہمارے عذاب کی زد میں آ چکی ہیں تو کیا تم آج ان میں سے کسی کی کہیں بو بھی محسوس کرتے ہو یا ان کی کہیں آہٹ بھی سنتے ہو! اسی طرح یہ بھی تمھاری تکذیب کی پاداش میں بے نام و نشان ہو جائیں گے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه وصل اللہ تعالیٰ علی محمد و بارک وسلم۔

لاہور

۲۷ر نومبر ۱۹۷۲ء

فہرست مضامین

فہرست مضامین

تفسیر سورۃ یونس - ۱۰

تفسیر سورۃ ہود - ۱۱

تفسیر سورۃ یوسف-۱۲

تفسیر سورۃ ابراہیم ۱۴

تفسیر سورۃ الحجر - ۱۵

تفسیر سورۃ النحل - ۱۶

تفسیر سورۃ بنی اسرائیل ۱۷

تفسیر سورۃ الکہف - ۱۸

تفسیر سورۃ مریم - ۱۹

خطاطی ——— عبدالغفور کیلانی

افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

طٰہٰ ۲۰ — القصص ۲۸

تدبرِ قرآن

جلد پنجم

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبّرِ قرآن

جلد پنجم

تفاسیر

سورۂ طٰہٰ (۲۰) ـــــ تا ـــــ سورۂ قصص (۲۸)

امین احسن اصلاحی

فاران

فاران فاؤنڈیشن

لاہور ـــــ پاکستان

اهتمام ← حسن خاور

مطبع ← فلک شیر پرنٹرز، ابراہیم روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت ← نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ ← فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

تدبرِ قرآن

۲۰

طٰہٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود

اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، مخالفین کے مقابل میں، صبر اور انتظار کی تلقین ہے کہ آپ ان کے پیچھے زیادہ پریشان نہ ہوں، اگر یہ آپ کی بات نہیں سنتے تو بہت جلد یہ اپنا انجام خود دیکھ لیں گے۔ اسی مضمون سے سورہ کا آغاز بھی ہوا ہے اور اسی پر اختتام بھی۔ اس صبر کے حصول اور اس کی تربیت کے لیے نماز اور دعا کے اہتمام کی ہدایت فرمائی گئی ہے اور ساتھ ہی عجلت و بے صبری کے نقصانات واضح فرمائے گئے ہیں۔ سورہ میں خطاب تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مخالفین سے اگر کوئی بات کہی بھی گئی ہے تو ان کو خطاب کر کے نہیں بلکہ منہ پھیر کر غائبانہ انداز میں کہی گئی ہے۔

پچھلی سورہ میں متعدد انبیائے عظام کا ذکر آیا ہے۔ اس میں صرف حضرت موسیٰ کی سرگزشت تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ ولادت سے لے کر دعوت و ہجرت تک جتنے اہم موڑ بھی ان کی زندگی میں پیش آئے ہیں سب اس سورہ میں نمایاں کیے گئے ہیں تاکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، دعوت کے اس مرحلہ میں بھی اور آگے کے مراحل میں بھی، جس رہنمائی کی ضرورت ہے وہ ایک عملی مثال کی صورت میں آپ کے سامنے رکھ دی جائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

مطالب کے اعتبار سے یہ سورہ تین حصوں میں تقسیم ہے۔

(۱-۸) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت دل نواز انداز میں یہ ہدایت کہ آپ دوسروں کے ایمان کی فکر میں اپنی زندگی کو ضرورت سے زیادہ نہ کھپائیں۔ آپ کا کام صرف ان لوگوں کو یاد دہانی کر دینا ہے جن کے اندر کچھ خشیت ہے۔ جن کے دل خشیت سے خالی ہیں ان کے اندر ایمان اتار دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ قرآن کسی سائل کی درخواست نہیں ہے بلکہ خالق ارض و سما اور مالک عرش و کرسی کا فرمان ہے اس کو اس کے شایانِ شان انداز میں پیش کیجیے ناقدروں اور مغروروں کی زیادہ نازبرداری کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے رب پر بھروسہ رکھیے۔ وہ آپ کے تمام سر و علانیہ سے اچھی طرح باخبر ہے۔

۹۰ - ۹۸) آگے حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جس کے نمایاں پہلو بالاجمال یہ ہیں۔

—— حضرت موسیٰؑ کا مدین سے واپسی پر وادیٔ مقدس طویٰ میں پہنچنا اور نبوت و رسالت سے سرفراز ہونا۔

—— نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد حضرت موسیٰؑ کو اولین ہدایت۔

—— عصا اور ید بیضا کے معجزات کا عطا کیا جانا۔

—— فرعون کے پاس انذار و دعوت کے لیے جانے کا حکم۔ شرح صدر اور حضرت ہارونؑ کے مددگار بنائے جانے کے لیے حضرت موسیٰؑ کی دعا اور اس دعا کی فوری قبولیت۔

—— حضرت موسیٰؑ کی تقویتِ قلب کے لیے اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس فضل خاص کی یاددہانی جو ان پر بچپن میں ہوا کہ وہ دریا میں ڈالے گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ ان کو دریا سے بچا لیا بلکہ ان کے اور اپنے دونوں کے دشمن سے ان کی پرورش کرائی اور دوبارہ ان کو ان کی اس ماں کی آغوش میں پہنچا دیا جس نے فرعون کے ڈر سے، کلیجہ پر پتھر رکھ کر، ان کو دریا کی موجوں کے حوالے کیا تھا۔

—— حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں ایک قبطی کے قتل ہو جانے کے واقعہ کی یاددہانی۔ حضرت موسیٰؑ کا مدین جانا۔ وہاں مختلف آزمائشوں اور مراحل سے گزرنے کے بعد پھر خدائی پروگرام کے مطابق بالکل معین وقت پر وادیٔ مقدس طویٰ میں پہنچنا اور منصب نبوت پر سرفراز ہونا۔

—— اس فضل خاص کی یاددہانی کے بعد حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں کی حوصلہ افزائی اور یہ ہدایت کہ وہ بے خوف و خطر فرعون کے پاس انذار و دعوت کے لیے جائیں۔ خدا ان کی حفاظت فرمائے گا۔

—— فرعون کو حضرت موسیٰؑ کی دعوت اور فرعون کا معارضہ۔

—— فرعون کے جمع کردہ ساحروں اور حضرت موسیٰؑ میں مقابلہ۔ ساحروں کی شکست اور ان کا حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانا۔

—— فرعون کی طرف سے حضرت موسیٰؑ اور ایمان لانے والے ساحروں پر سازش اور بغاوت کا الزام اور ان کو سولی پر چڑھانے کی دھمکی۔

—— بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر حضرت موسیٰؑ کو ہجرت کا حکم۔ فرعون کی طرف سے ان کا تعاقب۔ بالآخر حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کا بخیریت دریا کے پار ہو جانا اور فرعون اور اس کی فوجوں کی غرقابی۔

—— دریا پار کرنے کے بعد بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات فرمائے ان کا حوالہ اور بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی چند روزہ غیبت میں، جب کہ وہ کوہ طور پر تورات لینے گئے، سامری کے فتنہ میں مبتلا ہو کر جو حرکت کی اس کی تفصیل اور اس کے اسباب و عواقب پر تبصرہ۔

(۹۹ - ۱۳۵) حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت سنانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب اور التفات ہے۔ اور سورہ کی تمہید میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس خاتمہ میں اس کی تکمیل کر دی گئی ہے۔ آپؐ کو تسلی دی گئی ہے کہ ماضی

کی یہ سرگزشت جو آپ کو سنائی گئی ہے صرف قصۂ ماضی نہیں ہے بلکہ آپ کی اپنی سرگزشت بھی ہے۔ آپ کو جو کتاب عطا ہوئی ہے اس میں ہر پہلو سے لوگوں کو تنبیہ کر دی گئی ہے۔ اگر لوگ نہیں مانیں گے تو اس کا انجام دنیا اور آخرت دونوں میں خود بھگتیں گے۔ تاریخ میں ان کے لیے کافی سامان عبرت موجود ہے۔ اس وجہ سے آپ ان کے معاملے میں جلدی نہ کریں، صبر کے ساتھ خدا کے فیصلہ کا انتظار کریں۔ جلدی شیطان کو دراندازی کے لیے راہ دے دیتی ہے۔ آدمؑ نے جلدی ہی کی وجہ سے شیطان سے دھوکا کھایا تو آپ صبر کے ساتھ خدا کے وعدۂ نصرت کے ظہور کا انتظار کریں اور اس صبر کے حصول کے لیے نماز کا اہتمام کریں۔ امراء و اغنیاء کے ایمان کے لیے بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ ان کے ایمان سے دعوت کو قوت و شوکت حاصل ہوگی۔ آپ کی دعوت اپنا زاد و راحلہ خود اپنے ساتھ رکھتی ہے اور اللہ نے آپ کی کفالت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے۔ جو لوگ آپ کو زچ کرنے کے لیے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان سے کہہ دیجیے کہ میرا کام آگاہ کرنا تھا وہ میں نے کر دیا۔ اب اگر تم عذاب ہی کے منتظر ہو تو انتظار کرو۔ میں بھی اسی کا منتظر ہوں۔

سُوْرَةُ طٰهٰ (۲۰)

مَكِّيَّةٌ ـــــــــ اٰيَاتُهَا ۱۳۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۸

طٰهٰ ۝۱ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ
يَّخْشٰى ۝۳ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝۴
اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۵ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى
الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝۶ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ
فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝۷ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ لَهُ الْاَسْمَآءُ
الْحُسْنٰى ۝۸

ترجمۂ آیات ۱-۸

یہ سورۂ طٰہٰ ہے۔ ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ تم مصیبت میں پھنس جاؤ۔ یہ تو بس ان لوگوں کے لیے یاد دہانی ہے جو خدا سے ڈریں۔ یہ نہایت اہتمام کے ساتھ اس ذات کی طرف 1 سے اتارا گیا ہے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔ جو رحمان عرشِ حکومت پر متمکن ہے۔ اسی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، جو کچھ زمین میں ہے، جو کچھ ان کے درمیان ہے

اور جو کچھ زمین کے نیچے ہے۔ ۶-۱

خواہ تم علانیہ بات کہو یا چپکے سے، وہ علانیہ اور پوشیدہ سب کو جانتا ہے۔ اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تمام اچھی صفتیں اسی کے لیے ہیں۔ ۷-۸

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

طٰہٰ (۱)

یہ حروف مقطعات میں سے ہے۔ ان حروف پر مفصل بحث سورہ بقرہ کے شروع میں دیکھیے۔

مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى (۲)

تبلیغ میں حضورؐ کی محنت شاقہ اور آپ کو دل نوازتسلی

یہ نہایت دل نواز اور پر محبت انداز میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھایا ہے کہ قرآن کی تبلیغ و دعوت سے متعلق آپ نے اپنے سر پر جو ذمہ داری اٹھائی ہے اور جو محنت شاقہ اس کے لیے آپ جھیل رہے ہیں، اس کا مطالبہ ہرگز آپ سے نہیں ہے۔ آپ کی ذمہ داری صرف لوگوں تک اس کتاب کو پہنچا دینے کی ہے۔ جن کے اندر حق شناسی کی صلاحیت اور خشیت الٰہی کی کچھ رمق ہوگی وہ اس کو قبول کریں گے، جو ان صلاحیتوں سے عاری ہیں ان کے دلوں میں اس کو اتار دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ ان کے پیچھے آپ اپنی زندگی کو اجیرن بنالیں۔

یہ بات ہم اس کتاب میں متعدد جگہ واضح کر چکے ہیں کہ رات دن دعوت کے کام میں لگے رہنے کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیکھتے کہ لوگ اتنی واضح بات کو جھٹلا رہے ہیں اور کسی طرح ان کے دل نرم ہوتے نظر نہیں آتے تو آپ کو یہ پریشانی ہوتی کہ مبادا اس میں آپ ہی کی کسی کوتاہی کو دخل ہو۔ اس احساس سے دعوت کے کام میں آپ کی سرگرمیاں اور بڑھ جاتیں اور سارے جتن کر ڈالنے کے باوجود آپ کو کسی طرح تشفی نہ ہوتی۔ آپ کی اسی حالت پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ قرآن آپ پر اس لیے نہیں اتارا گیا کہ آپ کی زندگی اجیرن ہو کے رہ جائے۔ آپ کی جو ذمہ داری ہے وہ ادا کر دیجیے۔ دوسروں کے ایمان و اسلام کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔

اِلَّا تَذۡكِرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى (۳)

قرآن ایک تذکرہ ہے

اس ٹکڑے سے قرآن کی حیثیت بھی واضح ہوگئی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کی حد بھی معین ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کون لوگ اس سے اثر پذیر ہوں گے اور کون اس سے محروم رہیں گے۔

فرمایا کہ یہ تو بس ایک 'تذکرہ' ہے۔ 'تذکرہ' کے معنی یاددہانی کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یاددہانی جس چیز کی کی جاتی ہے وہ خارج سے لائی ہوئی چیز کی نہیں کی جاتی بلکہ اس چیز کی کی جاتی ہے جو مخاطب کے خود اپنے پاس ہو لیکن وہ اس کو بھولا ہوا ہو۔ قرآن پر غور کیجیے تو اس کی اصلی نوعیت یہی ہے۔ وہ کوئی اوپری اور انوکھی چیز نہیں ہے۔ وہ کسی خارج سے لائی ہوئی چیز کو ہمارے اوپر نہیں لادتا بلکہ انہی حقائق کی یاددہانی کرتا ہے جو خود ہماری فطرت کے اندر موجود ہیں لیکن ہم ان سے غافل ہیں۔ قرآن ان حقائق کی یاددہانی کے لیے جو دلائل استعمال کرتا ہے وہ بھی آفاق و انفس کے وہی دلائل ہیں جو ہماری عقل کے خزانے میں موجود ہیں۔ لیکن ہم یا تو ان کو استعمال نہیں کرتے یا ان کے بدیہی نتائج کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ عبرت و موعظت کے لیے قرآن نے جو تاریخ پیش کی ہے وہ بھی ان قوموں کی پیش کی ہے جو مخاطب گروہ کی جانی پہچانی ہوئی تھیں۔ جن انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا حوالہ دیا ہے یہ بھی وہ انبیاء ہیں جن کی ذریت اور جن کے پیرو ہونے کے لوگ مدعی تھے۔

قرآن سے اثر پذیر ہونے کے لیے شرط

اس یاددہانی سے اثر پذیر ہونے والوں کی صفت 'لِّمَنْ يَّخْشٰى' بیان فرمائی۔ قرینہ دلیل ہے کہ 'یخشی' کا مفعول یہاں محذوف ہے۔ قرآن کے نظائر کی روشنی میں اس محذوف کو متعین کیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ 'لِمَنْ يَّخْشٰى رَبَّهٗ بِالْغَيْبِ' یعنی یاددہانی ان لوگوں کے لیے ہے جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ یہ دوسرے لفظوں میں وہی بات ارشاد ہوئی ہے جو بقرہ کی دوسری ہی آیت میں 'هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ وہاں ہم نے تفصیل سے واضح کیا ہے کہ یہ تقویٰ اور یہ خوف ان تمام لوگوں کے اندر موجود ہوتا ہے جن کی فطرت مسخ ہونے سے محفوظ ہوتی ہے۔ اس طرح کے لوگوں پر اگر غفلت ہوتی ہے تو وہ قرآن کی یاددہانی سے دیر سویر جاگ پڑتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنی بداعمالیوں سے اپنی فطرت مسخ کر لیتے ہیں ان کو کتنا ہی جھنجھوڑیے وہ کروٹ نہیں لیتے۔ ان کے اوپر گدھوں کی طرح ڈنڈے کی منطق کے سوا اور کوئی منطق کارگر نہیں ہوتی۔ وہ سب کچھ سر کی آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں لیکن خدا کے ہاں ماننا صرف وہ معتبر ہے جو عقل و دل کی آنکھوں سے دیکھ کر مانا جائے نہ کہ سر کی آنکھوں سے۔

نبی مذکر ہوتا ہے نہ کہ مصیطر

قرآن کے تذکرہ ہونے سے یہ بات بھی نکلی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک 'مذکر' کی ہے، نہ کہ ایک 'مصیطر' کی۔ آپ کا فریضہ صرف یہ تھا کہ آپ لوگوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیں۔ لوگ اس سبق کو یاد کرتے ہیں یا نہیں، یہ لوگوں کی ذمہ داری تھی نہ کہ آپ کی۔ قرآن نے یہاں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اگر آپ کی قوم کے لوگ آپ کی تذکیر سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں تو آپ پریشان نہ ہوں، اس کے لیے جواب دہ عنداللہ وہ ہیں نہ کہ آپ۔

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى (۴)

'تنزیلا' کا مفہوم

'تنزیلا' کے معنی دوسرے مقام میں ہم واضح کرچکے ہیں کہ کسی چیز کو نہایت اہتمام اور ترتیب و تدریج کے ساتھ اتارنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن چونکہ لوگوں کی یاددہانی کے لیے اُترا ہے اس وجہ سے اللہ نے صرف اتنے پر اکتفا نہیں فرمایا کہ کسی نہ کسی طرح بات ایک مرتبہ لوگوں تک پہنچ جائے بلکہ نہایت اہتمام اور تدریج اور وقفہ وقفہ کے ساتھ اس کو اتارا تاکہ لوگوں کے لیے یہ عذر باقی نہ رہے کہ بات کے سننے یا سمجھنے میں کوئی کسر رہ گئی۔

قرآن کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ خالق کا فرمان ہے

'مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی' یہ قرآن کی عظمت واضح فرمائی کہ یہ زمین اور بلند آسمانوں کے خالق و مالک کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ نہ یہ کوئی ہوائی بات ہے کہ یوں ہی ہوا میں اڑ جائے نہ یہ کسی سائل کی درخواست ہے کہ لوگوں نے قبول کرلی تو سائل پر ان کا کرم ہوگا، نہ قبول کی تو سائل محروم ہو کر رہ جائے گا۔ بلکہ یہ خالق ارض و سما کا فرمان واجب الاذعان ہے اگر لوگوں نے اس کو رد کیا تو اچھی طرح سوچ لیں کہ اس کے نتائج کیا کچھ ہو سکتے ہیں۔

اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ اشارہ بھی ہے کہ اس کو اسی طرح لوگوں کے سامنے پیش کیجیے جس طرح آسمان و زمین کے خالق و مالک کا کلام پیش کیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے نہ زیادہ استمالت کی ضرورت ہے، نہ کسی الحاح و اصرار کی۔ اس کے قبول کرنے میں لوگوں کا اپنا نفع ہے نہ کہ خدا کا۔ یہ کوئی ملتجیانہ درخواست نہیں ہے بلکہ خلق کے لیے صحیفۂ ہدایت ہے اس کو رد کرنے والے خود اپنی شامت بلائیں گے۔ آپ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔

یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ سورۂ عبس میں یہی حقیقت یوں واضح کی گئی ہے۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ	ہرگز نہیں! یہ تو ایک یاددہانی ہے تو جو چاہے
ذَكَرَهٗ ۝ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ	اس سے فائدہ اٹھائے۔ یہ معزز، بلند اور پاکیزہ
مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍۭ	صحیفوں میں ہے۔ باعزت اور باوفا کاتبوں کے
بَرَرَةٍ ۔ (۱۱-۱۶)	ہاتھ میں۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى (۵-۶)

قرآن کی عظمت کا بیان اور خدا کی جن صفات کا مظہر ہے ان کا حوالہ

یہ قرآن کی عظمت کا بیان بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی جن صفات کا یہ مظہر ہے ان کی طرف اشارہ بھی۔ فرمایا کہ وہ خالق ارض و سما رحمان ہے۔ اس کی رحمانیت کا تقاضا ہے کہ وہ خلق کو پیدا کرکے یوں ہی چھوڑ نہ دے بلکہ جس طرح اس نے اس کی مادی زندگی کے اسباب و وسائل مہیا فرمائے اسی طرح اس کی ہدایت کا سامان بھی کرے، چنانچہ اس نے انسان کی رہنمائی کے لیے اس کو عقل و نطق سے نوازا اور اس پر مزید فضل یہ فرمایا کہ اس کی ہدایت کے لیے اپنی کتاب اتاری۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ رحمٰن میں 'اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ آج جو لوگ قرآن کو رد کر رہے ہیں وہ نہ تو خدا کا کچھ بگاڑ رہے ہیں نہ اس کے رسول کا بلکہ خود اپنے آپ کو خدا کی سب سے بڑی رحمت سے محروم کر رہے ہیں۔

'عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى' یہ خدائے رحمان کی صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ دنیا کو پیدا کر کے الگ تھلگ کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے بلکہ بالفعل اپنی کائنات کے عرش حکومت پر متمکن ہے۔ اس کائنات کا حقیقی فرمانروا وہی ہے اسی وجہ سے لوگوں کو قرآن کے ذریعہ سے اس نے اپنے احکام و قوانین سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس آگاہی کے بعد جو لوگ اپنی من مانی کریں گے وہ حساب کے دن اپنا انجام خود دیکھ لیں گے۔

'لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى' یہ شرک کی ہر جڑ کی جڑ کاٹ دی۔ فرمایا کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان اور جو کچھ زیرِ زمین ہے سب کا خالق و مالک وہی ہے۔ سب کو خلق بھی اسی نے کیا ہے اور سب پر اختیار بھی اسی کا ہے۔ اس کائنات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اس کی خدائی سے باہر ہو جس کو کسی خاص دائرے میں کوئی آزادی ملی بھی ہے وہ بھی اس کے امر و حکم کے تحت ہے۔ اس وجہ سے کوئی یہ گمان نہ کرے کہ وہ خدا سے کہیں بھاگ سکتا ہے یا کوئی دوسرا اس کو پناہ دے سکتا ہے۔

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى (۷)

عربیت کا ایک اسلوب

فصیح عربی کے اسلوب کے مطابق اس میں تقابل کے الفاظ بربنائے قرینہ، محذوف ہیں۔ اس اسلوب کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آئے ہیں۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات گویا یوں ہو گی 'وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ اَوْ تُخَافِتْ بِهٖ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَالسِّرَّ وَاَخْفٰى' یعنی خواہ تم بات کو علانیہ کہو یا چپکے سے کہو، خدا علانیہ، پوشیدہ اور پوشیدہ تر سب کو جانتا ہے۔

نبی صلعم کو ایک نئے پہلو سے تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دوسرے پہلو سے تسلی دی گئی ہے کہ آپ مطمئن رہیں کہ اپنی مشکلات میں جو کچھ بھی آپ اپنے پروردگار سے کہتے اور جو دعا و مناجات بھی کرتے ہیں خواہ سرًّا یا علانیۃً، اور جو پریشانی بھی آپ کو لاحق ہوتی ہے خواہ وہ زبان پر آئے یا دل کے مخفی گوشوں ہی میں رہے، آپ کا رب علیم و خبیر ہر چیز سے باخبر رہتا ہے۔ مقصود اس حقیقت کے اظہار سے ظاہر ہے کہ اس کا لازم ہے۔ یعنی جب آپ کا پروردگار ہر مخفی سے مخفی بھید سے بھی واقف ہے تو وہ آپ کی ہر مشکل کو آسان کرے گا اور ہر موڑ پر آپ کی رہنمائی فرمائے گا۔ اگر کسی امر میں کوئی تاخیر ہوتی ہے تو وہ کسی حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اسی میں آپ کے لیے خیر و برکت ہے۔ سورہ مریم کی آیت ۶۴ 'وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں مزید تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى (۸)

تفویض کی ہدایت

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کامل تفویض کی ہدایت ہے کہ آپ مخالفین کے رویہ سے پریشان اور ان کے پیچھے ہلکان ہونے کے بجائے اپنا معاملہ کلیۃً اپنے رب کے حوالے کیجیے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے ہوتے آپ کسی کے محتاج نہیں۔

تسلی و طمانیت کا خزانہ

'لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى' یہ ٹکڑا تسلی و طمانیت کا خزانہ ہے۔ اوپر کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو

اسمائے حسنیٰ کی برکات جو تسلی دی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے اس کی عظمت، اس کی رحمت، اس کی حاکمیت، اس کی یکتائی اور اس کے علم کے مقتضیات کی روشنی میں دی گئی ہے لیکن خدا کی صفات اتنی ہی تو نہیں ہیں! وہ تو تمام اچھی اور اعلیٰ صفتوں سے متصف ہے تو ظاہر ہے کہ ان صفات کے مقتضیات بھی حضورؐ کے لیے حالات کے اعتبار سے ظاہر ہوں گے۔ گویا اس ٹکڑے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ تمام اچھی صفتیں خدا ہی کے لیے ہیں اور وہ سب آپ کے اوپر سایہ فگن ہیں، آپ ان میں سے جس کا سہارا بھی لیں گے اس کی برکتوں سے متمتع ہوں گے۔ ان کے سوا آپ کسی اور سہارے کے محتاج نہیں ہیں۔

اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ یہاں اسماء سے مراد صفاتِ الٰہی ہیں اس لیے کہ خدا کے تمام نام اس کی صفات ہی کی تعبیر ہیں۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۹ تا ۹۸

اوپر کے مجموعۂ آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تسکین و تسلی دی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی روشنی میں دی گئی ہے۔ اب آگے حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت آرہی ہے جس میں وہی حقیقتیں، جو اوپر علمی انداز میں بیان ہوئی ہیں، چلتی پھرتی عملی زندگی میں دکھا دی گئی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد جن آزمائشوں سے گزرنا پڑا اور ان میں اللہ کی مدد نے جس طرح ان کو سہارا دیا، ان کی تفصیل اس سرگزشت میں آگئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے جو مراحل آنے والے تھے ابھی ان کا بہت بڑا حصہ پس پردہ تھا اس سرگزشت نے ان مراحل کو بھی آپؐ کے سامنے کر دیا اور ان کے لیے جن تیاریوں کی ضرورت تھی ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ زندگی عملی مثالوں سے جس قدر متاثر ہوتی ہے دوسری کسی چیز سے اس قدر متاثر نہیں ہوتی۔ خاص طور پر ایک نبی کی سرگزشت دوسرے نبی کے لیے تو یہ سمجھیے کہ بس اس کی اپنی ہی آپ بیتی ہوتی ہے۔

ــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۹-۹۸ وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝۹ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا
اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ
هُدًى ۝۱۰ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝۱۱ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ
اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۲ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا
يُوْحٰى ۝۱۳ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ

لِذِكْرِيْ ﴿١٤﴾ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا
تَسْعٰى ﴿١٥﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ
فَتَرْدٰى ﴿١٦﴾ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿١٧﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا
عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿١٨﴾ قَالَ اَلْقِهَا
يٰمُوْسٰى ﴿١٩﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿٢٠﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ
سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿٢١﴾ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ
بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿٢٢﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿٢٣﴾
اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَ ع
يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَ
اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾ وَ
اَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾
اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿٣٦﴾ وَ
لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿٣٧﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿٣٨﴾
اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ
يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ۭ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ
عَلٰى عَيْنِيْ ﴿٣٩﴾ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ۭ وقف لازم
فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۥ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ
مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۣ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۥ ثُمَّ جِئْتَ

عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی ﴿۴۰﴾ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ ﴿۴۱﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ
بِاٰیٰتِیْ وَلَا تَنِیَا فِیْ ذِكْرِیْ ﴿۴۲﴾ اِذْهَبَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۴۳﴾
فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی ﴿۴۴﴾ قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا
نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَاۤ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ﴿۴۵﴾ قَالَ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِیْ مَعَكُمَاۤ
اَسْمَعُ وَاَرٰی ﴿۴۶﴾ فَاْتِیٰهُ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا
بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ۬ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ
عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَاۤ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ كَذَّبَ
وَتَوَلّٰی ﴿۴۸﴾ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا یٰمُوْسٰی ﴿۴۹﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ
خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ﴿۵۰﴾ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ﴿۵۱﴾ قَالَ عِلْمُهَا
عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی ﴿۵۲﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ
الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ
فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴿۵۳﴾ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ﴿۵۴﴾ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُكُمْ ع ۲ ۱۱
وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰی ﴿۵۵﴾ وَلَقَدْ اَرَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ
وَاَبٰی ﴿۵۶﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ یٰمُوْسٰی ﴿۵۷﴾
فَلَنَاْتِیَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَیْنَنَا وَبَیْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ
نَحْنُ وَلَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًی ﴿۵۸﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ یَوْمُ الزِّیْنَةِ وَاَنْ
یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًی ﴿۵۹﴾ فَتَوَلّٰی فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَیْدَهٗ ثُمَّ اَتٰی ﴿۶۰﴾ قَالَ

لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ
وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾
قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ
بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ
ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ
تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿۶۵﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ
وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ
نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾ وَ
اَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا
يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا
بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿۷۰﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ
لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ
مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ
عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿۷۱﴾ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَاۗءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ
فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۷۲﴾
اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ
وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۷۳﴾ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ
لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ

فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾ وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ ع ۲۴ ۱۲
اِلٰى مُوْسٰٓى ڏ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ
لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ
مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾
يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ
الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿۸۰﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ
عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۱﴾ وَاِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ
صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾ وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ
هُمْ اُولَاۗءِ عَلٰٓي اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا
قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى
اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ڬ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا
حَسَنًا ڛ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ
بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ
اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا
هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۥ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ

قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿٨٩﴾ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ ع
مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ
وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿٩٠﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ
اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿٩١﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿٩٢﴾ اَلَّا
تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿٩٣﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ
اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ
قَوْلِيْ ﴿٩٤﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ
يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ
سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿٩٦﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ
لَا مِسَاسَ ۠ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ
ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿٩٧﴾ اِنَّمَآ
اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿٩٨﴾

ترجمۂ آیات ۹-۹۸

اور کیا موسیٰؑ کی سرگزشت تمہارے علم میں آئی ہے جب کہ اس نے دیکھا ایک شعلہ تو اس نے اپنے اہل خانہ سے کہا کہ تم لوگ ذرا ٹھہرو، مجھے آگ نظر آئی ہے تاکہ میں اس میں سے ایک انگارہ لاؤں یا ممکن ہے مجھے وہاں راستہ کا کچھ سراغ مل جائے۔ ۹

تو جب وہ اس کے پاس آیا تو اس کو آواز آئی کہ اے موسیٰؑ یہ تو میں تمہارا رب ہوں تو تم اپنے جوتے اتار دو کیونکہ تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ اور میں نے تم کو برگزیدہ کیا تو جو وحی کی جا رہی ہے اسے غور سے سنو! بیشک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کیجیو اور میری یاد

کے لیے نماز کا اہتمام رکھیو۔ بے شک قیامت شدنی ہے۔ میں اس کو چھپائے ہی رکھوں گا تاکہ ہر جان کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے۔ تو نماز سے تمہیں وہ شخص غافل نہ کرنے پائے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں کا پیرو ہے کہ تم ہلاک ہو کر رہ جاؤ۔ ۱۰ - ۱۶

اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے، اے موسیٰؑ! اس نے کہا، یہ میری لٹھیا ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لیے دوسرے فائدے بھی ہیں۔ فرمایا، اس کو زمین پر ڈال دو، اے موسیٰؑ! اس نے اس کو ڈال دیا تو دفعتہً وہ ایک رینگتا ہوا سانپ بن گئی۔ فرمایا اس کو اٹھا لو اور ڈرو نہیں، ہم اس کو پھر اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔ اور اپنے ہاتھ کو اپنے بازو کی طرف سکیڑ لو، وہ وہاں سے ایک دوسری نشانی بن کر، چٹا سفید، بغیر کسی مرض کے، برآمد ہوگا تاکہ ہم اپنی بڑی نشانیوں میں سے بعض کا تمہیں مشاہدہ کرائیں۔ ۱۷ - ۲۳

تم فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ اس نے دعا کی کہ اے میرے رب! میرے سینے کو میرے لیے کھول دے، اور میری مہم کو آسان کر اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں اور میرے خاندان سے میرے بھائی ہارونؑ کو میرے لیے وزیر مقرر کر کے میری کمر کو مضبوط کر اور اس کو میری ذمہ داری میں شریک بنا کہ ہم تیری زیادہ سے زیادہ تسبیح کریں اور زیادہ سے زیادہ تیرا چرچا پھیلائیں۔ بے شک تو برابر ہمارا نگرانِ حال رہا ہے۔ فرمایا، تمہاری درخواست منظور ہوئی، اے موسیٰؑ! ۲۴ - ۳۶

اور ہم نے تم پر ایک بار اور بھی اپنا فضل کیا جب کہ ہم نے تمہاری ماں کو الہام کی وہ بات جو وحی کی جا رہی ہے، کہ اس کو صندوق میں رکھ دو پھر اس کو دریا میں ڈال دو۔ پس یوں ہو کہ دریا اس کو کنارے پر ڈال دے کہ اس کو اٹھا لے وہ جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے اور میں نے

تم پر اپنی محبت کا پرتو ڈال دیا اور تاکہ تمھاری پرورش میری نگرانی میں ہو۔ جب کہ تمھاری بہن جاتی اور کہتی تھی کہ کیا میں ایسے لوگوں کا پتہ دوں جو اس بچے کی پرورش کریں۔ پس ہم نے تم کو تمھاری ماں کی طرف لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کھائے۔ ۳۷-۴۰

اور تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تو ہم نے تم کو غم سے نجات دی اور ہم نے تم کو خوب خوب پرکھا۔ پھر تم کئی سال اہل مدین میں رہے۔ پھر ایک خاص اندازہ کیے ہوئے وقت پر تم یہاں پہنچے اے موسیٰ! اور میں نے اپنے کار خاص کے لیے تمھیں منتخب کیا۔ ۴۰-۴۱

تم اور تمھارا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ جاؤ اور میرے ذکر میں ڈھیلے نہ پڑنا۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بے شک وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ پس اس کو نرمی کے ساتھ دعوت دو، شاید وہ یاد دہانی حاصل کرے یا ڈرے۔ ۴۲-۴۴

انھوں نے عرض کی اے ہمارے خداوند، ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر تعدی کرے یا اس کی سرکشی اور بڑھ جائے۔ فرمایا تم اندیشہ نہ کرو، میں تمھارے ساتھ سب کچھ سنتا دیکھتا ہوں پس اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں، تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان کو عذاب میں مبتلا نہ رکھ، ہم تیرے خداوند کے پاس سے ایک بڑی نشانی بھی لے کر آئے ہیں۔ اور سلامتی ان لوگوں پر ہے جو ہدایت کی پیروی کریں۔ ہم پر یہ وحی کی گئی ہے کہ ان لوگوں پر عذاب ہے جو جھٹلائیں اور اعراض کریں۔ ۴۵-۴۸

اس نے سوال کیا اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ اس نے جواب دیا، ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اس کی رہنمائی کی۔ اس نے پوچھا، تو پھر اگلی قوموں کا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ان کا علم میرے رب کے پاس ایک رجسٹر میں ہے۔ نہ میرا رب بھٹکتا

ہے نہ بھولتا ہے ــــ وہی جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارا بنایا اور اس میں تمہارے لیے راہیں نکالیں اور آسمان سے پانی برسایا، پس ہم نے اس سے مختلف نباتات کی گوناگوں قسمیں پیدا کر دیں۔ کھاؤ اور اپنے چوپایوں کو چراؤ۔ اس کے اندر اہل عقل کے لیے نشانیاں ہیں۔ اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے اور اسی میں تم کو لوٹائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔ ۴۹-۵۵

اور ہم نے اس کو اپنی ساری نشانیاں دکھائیں تو اس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔ اس نے کہا، موسیٰ! کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے بے دخل کر دو تو ہم بھی تمہارے مقابل میں ایسا ہی جادو لائیں گے۔ تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک مقام معین ٹھہرا لو، کوئی بیچ کی جگہ، نہ ہم اس کی خلاف ورزی کریں نہ تم۔ ۵۶-۵۸

اس نے کہا، تمہارے لیے وعدے کا دن میلہ والا دن ہے اور یہ کہ لوگ بوقت چاشت جمع کیے جائیں۔ پس فرعون وہاں سے ہٹا اور اپنی ساری تدبیریں اکٹھی کر کے پھر مقابلہ میں آیا۔ موسیٰ نے کہا تمہاری ناس ہو! اللہ پر جھوٹ نہ باندھو کہ وہ تم کو کسی عذاب میں پیس دے اور جس نے خدا پر جھوٹ باندھا وہ نامراد ہوا۔ ۵۹-۶۱

پس انھوں نے آپس میں، اپنے معاملہ میں، مشورت اور سرگوشی کی۔ انھوں نے کہا یہ دونوں بڑے ماہر جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے بے دخل کر دیں اور تمہارے اعلیٰ نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیں۔ تو اپنی ساری تدبیریں اکٹھی کر لو، پھر ان کے مقابل میں متحد ہو کر آؤ اور آج کامیاب وہی رہے گا جو غالب آئے گا۔ ۶۲-۶۴

انھوں نے کہا اے موسیٰ! یا تو تم پیش کرو یا پھر ہم ہی پہلے پیش کرنے والے بنتے ہیں۔ اس نے کہا بلکہ تم ہی پیش کرو۔ تو دفعتہً ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان کے جادو کے زور سے اس کو اس طرح

نظر آنے لگیں گویا وہ رینگ رہی ہیں تو موسیٰ دل ہی دل میں کچھ ڈرا۔ ہم نے کہا ڈرو نہیں، تم ہی غالب رہو گے اور تم اس کو جو تمہارے ہاتھ میں ہے زمین پر ڈالو، یہ ان کے سارے سوانگ کو جو انھوں نے رچایا ہے نگل جائے گا۔ یہ کرتب جو انھوں نے دکھایا ہے یہ تو بس ایک جادوگر کا کرتب ہے اور جادوگر جہاں بھی جائے کامیاب نہیں ہوتا۔ تو جادوگر سجدے میں گر پڑے۔ پکار اٹھے کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لائے۔ ۶۵-۷۰

فرعون نے کہا تم نے بدوں میری اجازت کے اس کی تصدیق کر دی بے شک وہی تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے تو میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا اور تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا اور تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم میں سے کس کی سزا زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہوتی ہے! انھوں نے جواب دیا کہ ہم ان روشن دلائل پر جو ہمارے پاس آئے ہیں اور اس ذات پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، تم کو ہرگز ترجیح دینے والے نہیں ہیں تو تمہیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو۔ تم جو کچھ کر سکتے ہو بس اس دنیاوی زندگی کا کر سکتے ہو۔ ہم اپنے رب پر ایمان لائے کہ وہ ہماری خطاؤں کو اور اس جادو کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا، بخشے اور اللہ ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ ۷۱-۷۳

بے شک جو شخص اپنے رب کے سامنے مجرم کی حیثیت سے حاضر ہوگا تو اس کے لیے جہنم ہے، نہ اس میں مرے گا، اور نہ جیے گا۔ اور جو اس کے پاس باایمان ہو کر جائیں گے، انھوں نے نیک عمل بھی کیے ہوں گے، تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے اونچے درجے ہوں گے۔ ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ صلہ ہے اس کا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ ۷۴-۷۶

اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ میرے بندوں کو شب میں لے کر نکل جاؤ۔ ان کے لیے دریا میں ایک

خشک راہ کھول لو، نہ تمہیں تعاقب سے کوئی خطرہ ہوگا نہ ڈوبنے کا کوئی اندیشہ! تو فرعون نے اپنی فوجوں کے ساتھ ان کا تعاقب کیا، بالآخر ان کو سمندر کی اس چیز نے ڈھانک لیا جس چیز نے ڈھانک لیا! اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا، اس کو صحیح راہ نہ دکھائی! ۷۷-۷۹

اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات بخشی اور تم سے طور کے مبارک جانب کو ایک میعاد ٹھہرائی اور تم پر ہم نے من و سلویٰ اتارا کہ ہماری بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اس نعمت کو پاکر سرکشی نہ کیجیو کہ تم پر میرا غضب نازل ہو اور جس پر میرا غضب اترا وہ تباہ ہوا! اور میں ان لوگوں کے لیے بڑا ہی غفار ہوں جو توبہ کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح کریں پھر ہدایت کی روش اختیار کریں۔ ۸۰-۸۲

اور اے موسیٰ یہ تم کو، اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی آنے پر کس نے ابھارا؟ اس نے کہا، وہ لوگ بھی میرے پیچھے ہی ہیں، اور میں، اے میرے رب! تیری خوشنودی کے لیے جلدی چلا آیا ہوں۔ فرمایا تو ہم نے تمہاری قوم کو تمہارے پیچھے ایک فتنہ میں ڈال دیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر ڈالا۔ تو موسیٰ اپنی قوم کے پاس غصہ اور غم سے بھرا ہوا لوٹا اور بولا کہ اے میری قوم کے لوگو، کیا تم سے تمہارے رب نے نہایت اچھا وعدہ نہیں کیا تھا! کیا تم پر زمانہ زیادہ گزر گیا یا تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو کہ تم نے میری ٹھہرائی ہوئی میعاد کی خلاف ورزی کر ڈالی!! ۸۳-۸۶

انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے آپ سے کیے ہوئے عہد کی خلاف ورزی اپنی مرضی سے نہیں کی۔ بلکہ قوم کے زیورات کا بوجھ جو ہمارے حوالہ کیا گیا تھا ہم نے اس کو پھینک دیا اور اس طرح سامری نے ڈھال کر پیش کر دیا۔ ۸۷

پس اس نے ان کے لیے ایک بچھڑا برآمد کر دیا۔ ایک دھڑ جس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی پس انھوں نے کہا یہی تمہارا معبود ہے اور یہی موسیٰ کا بھی معبود ہے لیکن وہ بھول گیا ہے۔ کیا

یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے تھے کہ نہ وہ کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ کوئی نقصان یا نفع پہنچا سکتا ہے! ۸۸-۸۹

اور ہارون نے ان سے پہلے ہی کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، تم اس کے ذریعہ سے فتنہ میں ڈال دیے گئے ہو، تمہارا رب خدائے رحمان ہے تو میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔ وہ بولے کہ ہم تو اسی کی عبادت پر جمے رہیں گے تا آنکہ موسیٰ ہمارے پاس واپس آجائیں۔ ۹۰-۹۱

موسیٰ نے کہا اے ہارون! جب تم نے دیکھا کہ یہ گمراہ ہوئے جا رہے ہیں تو تم کو میری پیروی سے کس چیز نے روکا! کیا تم نے میرے حکم کی نافرمانی کی۔ اس نے جواب دیا کہ اے میرے ماں جائے! نہ میری ڈاڑھی پکڑیے نہ میرا سر۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ مبادا آپ یہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا لحاظ نہ کیا۔ ۹۲-۹۳

موسیٰ نے پوچھا، اے سامری تیرا کیا ماجرا ہے؟ اس نے جواب دیا مجھے وہ چیز نظر آئی جو اوروں کو نظر نہیں آئی تو میں نے فرستادے کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی اٹھائی اور وہ اس میں ڈال دی اور اس طرح میرے نفس نے مجھے سجھایا۔ موسیٰ نے کہا، چل دور ہو، اب تیرے لیے زندگی بھر یہ ہے کہ تو کہتا پھرے کہ کوئی چھوئے نہیں اور تیرے لیے ایک اور وقت موعود بھی ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں اور اپنے اس معبود کو دیکھ جس پر تو فدا رہا ہے، ہم اس کو جلا دیں گے، پھر اس کو سمندر میں بکھیر دیں گے۔ تمہارا معبود تو بس اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ ۹۴-۹۸

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اہل مکہ کے لیے حضرت موسیٰ کی سرگزشت کی خاص اہمیت

وَهَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوسٰى (۹)

یہ اسلوب بیان قرآن میں تہدید و وعید کے لیے بھی آیا ہے اور ترغیب و تشویق کے لیے بھی۔ یہاں موقع و محل

دلیل ہے کہ یہ ترغیب و تشویق کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے موسیٰؑ کی سرگزشت سنی ہے؟ یہ سرگزشت ہم تمھیں سناتے ہیں۔ اس میں ان تمام سوالوں کا جواب مل جائے گا جو دعوت کے اس مرحلہ میں تمھارے سامنے موجود ہیں، یا آگے کے مراحل میں پیش آنے والے ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت قرآن میں مختلف اسلوبوں سے جو بار بار بیان ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی امت ہی کی وراثت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو منتقل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر صاحب شریعت نبی حضرت موسیٰؑ ہی تھے۔ ان کو اپنی امت کی تشکیل میں جو زہرہ گداز مراحل پیش آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی جس جس طرح نصرت فرمائی وہ ساری باتیں آنحضرتؐ کے لیے نہایت سبق آموز تھیں اور بنی اسرائیل نے قدم قدم پر جو ٹھوکریں کھائیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح و تربیت کے لیے جو ہدایات دیں وہ اس امت کے لیے درسِ عبرت ہیں۔ اس سرگزشت کو پڑھتے ہوئے اس کی اس اہمیت کو نظر انداز نہ کیجیے۔ یہ دوسروں ہی کی نہیں بلکہ اپنی بھی حکایت ہے۔

إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ‎(۱۰)

حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت ابتدائے نبوت سے

یہ حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کا آغاز اس وقت سے کیا ہے جب ان کو نبوت عطا ہوئی ہے۔ مدین سے واپسی پر جب وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ وادیٔ طور کے پاس پہنچے تو شب کا وقت تھا۔ راستہ کا بھی کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا اور سردی بھی معلوم ہوتا ہے کہ سخت تھی۔ اتنے میں ایک سمت سے انھیں شعلہ سا نظر آیا۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ تم لوگ یہیں ٹھہرو، مجھے ایک شعلہ سا دکھائی دیا ہے، میں وہاں جاتا ہوں یا تو وہاں سے تمھارے تاپنے کے لیے، جیسا کہ سورۂ قصص میں تصریح ہے، کوئی انگارہ لاؤں گا یا وہاں کچھ لوگ ہوتے تو ان سے راستہ معلوم کر لوں گا اور ہمارا سفر جاری رہ سکے گا۔

ایک شعلۂ مستعجل کا مشاہدہ

'آنَسْتُ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کو جو آگ نظر آئی اس کی نوعیت آگ کے کسی جلتے ہوئے الاؤ کی نہیں بلکہ ایک شعلۂ مستعجل کی تھی جو چمکا اور غائب ہو گیا۔ اس لیے یہ لفظ تاڑنے اور بھانپنے کے لیے آتا ہے۔ بس ایک چمک سی نظر آئی اور دفعتہً غائب ہو گئی۔ حضرت موسیٰؑ کے سوا اس کو کسی نے شاید دیکھا بھی نہیں۔ اگر بھڑکتی ہوئی آگ ہوتی تو حضرت موسیٰؑ یوں کہتے کہ دیکھو وہ سامنے آگ جل رہی ہے، میں یا تو وہاں سے راستہ معلوم کرتا ہوں اور اگر وہاں کوئی نہ ملا تو پھر تاپنے کا کچھ سامان کرتا ہوں تاکہ سردی میں بچاؤ کا کچھ سامان ہو سکے۔

فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يَا مُوسَىٰ ‎﴿﴾‏ إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۖ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ‎(۱۱-۱۲)

ندائے غیب

جب حضرت موسیٰؑ اس مقام پر پہنچے جہاں ان کو شعلہ نظر آیا تھا تو ان کو آواز آئی کہ اے موسیٰ یہ تو میں

تمھارا رب ہوں، یعنی تم تو آگ سمجھ کر یہاں آئے ہو لیکن یہاں آگ نہیں ہے بلکہ میں تمھارا رب ہوں۔

تواضع کی ہدایت اور اس کے آداب

'فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ' پہلی ہدایت یہ ہوئی کہ جوتے اتار دو۔ جوتے اتار کر حاضر ہونا صرف طہارت ہی کے آداب میں سے نہیں بلکہ تواضع کے آداب میں سے بھی ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں مسجد کے احترام کے لیے بھی اس کو ضروری قرار دیا گیا ہے اس لیے کہ مسجد خدا کے سامنے حاضری کی جگہ ہے جس کے لیے طہارت اور تواضع دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جوتے صاف ہوں تو ان کے ساتھ مسجد میں جانے میں کوئی ہرج نہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے اس لیے کہ یہ تواضع کے خلاف ہے اور مسجد کی حاضری کے لیے جس طرح طہارت شرط ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ تواضع شرط ہے۔

'إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى' یہ اس ہدایت کی علت واضح فرمائی ہے کہ تم اس وقت طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ 'طُوًى' اس میدان کا نام ہے جو جزیرہ نمائے سینا میں کوہ سینا کے دامن میں واقع ہے۔ کسی پہاڑ یا وادی یا رقبۂ زمین کا تقدس ایک امر اضافی ہے۔ زمین ساری خدا کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اس کے کسی ٹکڑے کو کسی دوسرے ٹکڑے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے الا آنکہ کسی ٹکڑے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی خاص نسبت ہو جاتے۔ اس وادی کو یہ خاص شرف حاصل ہوا کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنی تجلی اور اپنے کلام سے نوازا اس وجہ سے اس کو تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا۔

وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَى (۱۳)

'اِسْتِمَاع' کے معنی توجہ اور اہتمام کے ساتھ سننے کے ہیں۔ یہ جملہ اصل بات کہنے سے پہلے پوری طرح متوجہ کرنے کے لیے ہے یعنی میں نے تمھیں اپنے کار خاص، فریضۂ نبوت و رسالت کے لیے منتخب کیا ہے تو جو کچھ تم پر وحی کی جا رہی ہے اس کو غور و توجہ سے سنو۔ اس میں اس تشریف و تکریم کی طرف بھی اشارہ ہے جو منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے سبب سے حضرت موسیٰ کو حاصل ہوئی اور عظیم ذمہ داری کی طرف بھی جو حضرت موسیٰ پر اس منصب کی بدولت عاید ہوئی۔

إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي (۱۴)

حضرت موسیٰ کو اولین تعلیم

یہ اولین تعلیم ہے جو حضرت موسیٰ کو دی گئی اور یہی تعلیم ہمیشہ تمام انبیاء کو دی گئی ہے۔ اس آیت کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس میں تین باتیں مذکور ہیں۔

سب سے پہلے عقیدۂ توحید اس لیے کہ یہی عقیدہ مرکز دین ہے۔ جہاں تک خدا کے ماننے کا تعلق ہے دنیا نے ہمیشہ خدا کو مانا ہے۔ انکار خدا کی حماقت موجودہ زمانے کی پیداوار ہے۔ البتہ شرک کی ضلالت ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں انسان پر حملہ آور ہوتی رہی ہے چنانچہ ہر نبی کو سب سے پہلے توحید ہی کی تعلیم دی گئی اور ہر نبی نے سب سے پہلے شرک ہی کے خلاف جہاد کیا۔

دوسری چیز جس کی حضرت موسیٰ کو ہدایت ہوئی وہ خدا کی عبادت ہے۔ یہ عبادت اللہ تعالیٰ کا حق ہے

اور یہ حق بلاشرکت غیرے ہے۔ جب وہ معبود ہے تو لازم ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور جب اس کا کوئی شریک نہیں تو یہ بھی لازم ہے کہ یہ عبادت بلاشرکت غیرے ہو۔ اس عبادت کے لوازم میں سے، جیسا کہ ہم دوسرے مقامات میں ذکر کر چکے ہیں، خدا کی اطاعت بھی ہے۔ جس طرح خدا کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں ہے اسی طرح خدا کے احکام کے خلاف طوعاً کسی کی اطاعت بھی جائز نہیں ہے۔ عبادت کی اصل روح خدا کے آگے اپنی بندگی اور غلامی کا اقرار، اس کے ساتھ اپنے عہد اطاعت و وفاداری کی تجدید اور اس کا تذکر ہے۔ اس وجہ سے یہ بات خدا کی بندگی کے بالکل منافی ہے کہ تسبیح تو اس کی کی جائے اور شریعت خود تصنیف کی جائے یا کسی دوسرے کے لیے یہ حق تسلیم کیا جائے۔ یہ چیز شرک ہے۔ اس کے شرک ہونے کے دلائل ہم نے اپنے رسائل حقیقت شرک اور حقیقت توحید میں بیان کیے ہیں۔

تیسری چیز نماز ہے۔ نماز کے لیے 'اقامت' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے اندر اہتمام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ نماز کا حکم اللہ کے ذکر کو قائم و دائم رکھنے کے لیے دیا گیا ہے۔ 'اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ' نماز انفرادی ہو یا اجتماعی خدا کے ذکر کی سب سے بڑی محافظ بھی ہے اور اس کا سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ موثر مظہر بھی۔ اسی وجہ سے تمام انبیاء کو توحید کی تعلیم کے بعد سب سے پہلے اسی کی ہدایت ہوئی۔ نماز ہی کے ذریعے سے بندہ اپنے عہد بندگی کو یاد کرتا ہے جو اس کے رب نے اس سے لیا ہے اور جو اپنے رب سے اس نے باندھا ہے اور اسی کے ذریعہ سے کوئی امت اپنے اس میثاق کو یاد رکھتی ہے جو خدا نے اس سے لیا ہے اور جس کا خدا سے اس نے اقرار کیا ہے۔ اگر کوئی فرد یا امت نماز کو ضائع کر دے تو اس نے پورے دین کو ضائع کر دیا۔ اس مضمون کی وضاحت سورۂ مریم کی آیت ۵۹ کے تحت ہو چکی ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى (۱۵)

قیامت کی یاددہانی — یہ قیامت کی یاددہانی ہے اور اس کے لیے 'اٰتِيَةٌ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ وہ آئے گی، بلکہ یہ فاعل کا صیغہ ہے جس کے اندر زور اور تاکید ہے کہ یہ آ کے رہے گی، یہ شدنی اور اٹل ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قیامت کے باب میں عام ذہن کبھی انکار صریح کا نہیں بلکہ تعجب اور استبعاد کا رہا ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کے اثبات کے پہلو بہ پہلو اس کی قطعیت پر بہت زور دیا ہے۔

قیامت کا مقصد — 'لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى' یہ قیامت کا اصل مقصد بیان ہوا ہے کہ اس کا آنا اس لیے لابدی ہے کہ ہر جان کو اس کی کمائی کا، نیک ہو یا بد، بدلہ دیا جانا ناگزیر ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا ایک رحیم و حکیم کی بنائی ہوئی دنیا نہیں بلکہ ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے اور یہ بات بالبداہت خلاف عقل ہے۔ 'بِمَا تَسْعٰى' کے لفظ نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے عمل ہی کا بدلہ پائے۔ اگر کسی کے اعمال تو ہوں شیطان کے لیکن وہ کسی کی سعی و سفارش یا اپنے حسب نسب کے بل پر مرتبہ صالحین و ابرار کا حاصل کر لے یا باز پرس سے بری ہو جائے تو اس کے معنی نعوذ باللہ یہ ہوں گے کہ اللہ میاں کے ہاں بھی اصل قدر عمل اور کردار کی نہیں بلکہ

شفاعت و سفارش اور خاندان و نسب ہی کی ہے۔

ایک بلیغ جملہ معترضہ

آیت کے بیچ میں 'اَكَادُ اُخْفِيْهَا' کے الفاظ بطور جملہ معترضہ کے ہیں۔ یہ جملہ معترضہ نہایت بلیغ ہے۔ صرف یہ نہیں فرمایا کہ میں قیامت کو چھپائے رکھوں گا بلکہ فرمایا کہ قریب ہے کہ میں اس کو چھپائے ہی رکھوں۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ لفظ 'اَكَادُ' سے جملہ کے اندر یہ مضمون پیدا ہو گیا ہے کہ ہر چند میں نے تو ابھی قیامت پر پردہ ڈال رکھا ہے اور یہ پردہ ابھی ڈالے ہی رکھوں گا لیکن خود قیامت کا یہ حال ہے کہ وہ بے نقاب ہو جانے کے لیے بالکل بے قرار ہے۔ یہی مضمون دوسرے الفاظ میں سورۂ اعراف میں یوں وارد ہوا ہے 'ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً' (آسمان و زمین دونوں اس کے بوجھ سے گرانبار ہیں، وہ تمہارے اوپر بس اچانک ہی آ دھمکے گی)[1]

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى (۱۶)

ایجاز بیان کی ایک مثال

'عَنْهَا' میں ضمیر کا مرجع ہمارے نزدیک 'صَلٰوة' ہے اور 'بِهَا' کی ضمیر کا مرجع 'السَّاعَة' ہے۔ یعنی نماز سے تمہیں وہ شخص روکنے یا غافل نہ کرنے پاوے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں کا پیرو ہے۔ یہ مفہوم لینے میں اگرچہ بظاہر انتشارِ ضمیر کا سوال پیدا ہوتا ہے جس کو کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے لیکن انتشارِ ضمیر صرف اس صورت میں عیب ہے جب مرجع کے تعین کے لیے کوئی واضح قرینہ موجود نہ ہو۔ اگر واضح قرینہ موجود ہو تو یہ کوئی عیب نہیں بلکہ اس سے کلام میں ایجاز کا حسن پیدا ہوتا ہے اور فصحاء کے کلام میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں موجود ہیں۔

یہاں قرینہ بالکل واضح ہے۔ نماز اور قیامت کے ذکر کے بعد دو فعل استعمال ہوئے ہیں ایک 'يَصُدَّنَّكَ' اور دوسرا 'يُؤْمِنُ'۔ زبان کا ذوق رکھنے والا شخص بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ پہلا فعل 'صَلٰوة' سے واضح مناسبت رکھتا ہے اور دوسرا قیامت سے۔ یہی رائے اگلوں میں سے ابو مسلم کی ہے اور مجھے یہ رائے ہر اعتبار سے صحیح معلوم ہوتی ہے۔

نماز اور ایمان بالآخرۃ کا باہمی تعلق

حکمتِ دین کے پہلو سے اس مسئلہ پر غور کیجیے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص آخرت پر پختہ ایمان نہیں رکھتا اس کے لیے نماز ایک مصیبت ہے۔ قرآن میں اس کی تصریح موجود ہے۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ	اور بے شک یہ بہت گراں ہے مگر ان ڈرنے والوں پر جو
يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ	یہ گمان رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور
اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (بقرہ ۴۵-۴۶)	اسی سے ان کو سابقہ پڑنے والا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی قرآن میں موجود ہے کہ اتباعِ ہوا اور ترکِ نماز میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ سورۂ مریم میں یہ آیت گزر چکی ہے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا	پس ان کے بعد ایسے برے جانشین اٹھے جنھوں نے

---

[1] اس مضمون کی مزید وضاحت مطلوب ہو تو اس آیت کی تفسیر 'تدبر قرآن' جلد سوم صفحہ ۴۰۴ پر ملاحظہ فرمائیے۔

الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۵۹ - مریم) — نماز ضائع کر دی اور خواہشوں کے پیرو بن گئے تو وہ عنقریب اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

یہود نماز اور ایمان بالآخرۃ دونوں ضائع کر بیٹھے

ان آیات سے یہ بات واضح ہوئی کہ حضرت موسیٰؑ کو توحید کی تعلیم کے بعد سب سے پہلے جس چیز کی تاکید ہوئی وہ نماز ہے اور خاص طور پر جس چیز کی یاددہانی کی گئی وہ آخرت ہے۔ یہی بات حضرات انبیائے کرام کی تاریخ سے، جیساکہ سورۂ مریم میں آپ معلوم کر چکے ہیں، ہم آہنگ بھی ہے لیکن یہود کی بدقسمتی قابل ماتم ہے کہ انھوں نے نماز بھی ضائع کر دی اور آخرت کو بھی بھلا بیٹھے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ان کے صحیفوں میں قربانی کا ذکر تو ملتا ہے لیکن نماز کا ذکر، بالخصوص ہیکل میں، صرف ایک جگہ سفر خاص باب ۲۶ میں ملتا ہے۔ ان کے بعض فقہاء کا خیال تو یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نماز کا حکم سرے سے دیا ہی نہیں، اگر تورات میں اس کا کہیں ذکر ہے تو وہ بعد کے مرتبوں کی ایجاد ہے۔ رہا آخرت کا معاملہ تو ان کے صدوقی تو حشر بعد الموت کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جزا و سزا جو کچھ ہے سب اسی دنیا میں پوری ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں مرجئہ نے بھی اپنا عقیدہ معلوم ہوتا ہے کہ انہی سے مستعار لیا ہے۔

آخر میں لفظ 'فَتَرْدٰی' بطور تنبیہ ہے کہ اگر نماز اور یاد آخرت سے غفلت ہوئی تو سمجھ لو کہ بیڑا غرق ہو جائے گا۔ یہی چیزیں سارے دین کی حفاظت کرنے والی اور شیطان کے فتنوں سے امان میں رکھنے والی ہیں۔ جو ان سے غافل ہوا اس نے گویا اپنے آپ کو شیطان کے حوالہ کر دیا۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (۱۷)

لفظ 'یمین' داہنے بائیں کے مفہوم سے مجرد ہو کر صرف ہاتھ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ کلام عرب میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

سوال برائے التفات و نوازش

یہ سوال ظاہر ہے کہ تحقیق کے لیے نہیں بلکہ اظہار التفات و نوازش ہی کے لیے ہو سکتا ہے۔ جس طرح باپ بچے سے پوچھتا ہے کہ بیٹے یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے حالانکہ وہ اس چیز سے بیٹے سے زیادہ واقف ہوتا ہے اسی طرح رب کریم نے حضرت موسیٰؑ سے سوال کیا کہ موسیٰ! یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے؟ اور سوال اس چیز سے متعلق کیا جو آگے ان تمام خوارق کا ذریعہ بننے والی تھی جو حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں ظاہر ہوئے۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى (۱۸)

'هش' کے معنی

'هش' کے معنی درخت سے پتے جھاڑنے کے ہیں۔ عکبری نے 'اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ' کے معنی 'اَقُوْمُ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ' کے لیے ہیں۔ یعنی اس لٹھیا سے میں اپنے ریوڑ کی چرواہی اور حفاظت کرتا ہوں۔ اگر لغت سے اس معنی کی شہادت مل جاتی تو بہت خوب ہے لیکن عکبری نے کوئی شہادت نہیں پیش کی ہے۔ اس وجہ سے میں نے معروف معنی ہی کی پیروی کی ہے۔

بذلہ در حکایت برائز تر گفتم!

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ یہ میری لٹھیا ہے جس پر میں عندالضرورت ٹیک بھی لگاتا ہوں، اپنی بکریوں

کے لیے درختوں سے پتے بھی جھاڑ لیتا ہوں اور میرے دوسرے کام بھی اس سے نکلتے ہیں۔

صاف محسوس ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے سوال کا صرف سیدھا سادا جواب دے دینے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ان کے جواب میں کچھ انبساطِ کلام اور سخن گستری کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ وہ صرف یہ جواب بھی دے سکتے تھے کہ یہ میری لٹھیا ہے لیکن انھوں نے سوال کے انداز سے بھانپ لیا کہ یہ محض سوال نہیں ہے بلکہ اس میں التفاتِ خاص کی دل نوازی بھی ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے جواب میں تفصیل سے کام لیا کہ شاید اس طرح کچھ مزید سوال و جواب کی راہ کھلے۔ مخاطب کرنے والا محبوب و مطلوب ہو تو گفتگو کو طویل کرنے کی خواہش ایک امر فطری ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

قَالَ اَلْقِهَا یٰمُوْسٰی ۔ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی (۱۹-۲۰)

عصا کا معجزہ

ارشاد ہوا کہ اس لٹھیا کو زمین پر ڈال دو اور پھر قدرتِ خداوندی کا کرشمہ دیکھو! چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے لٹھیا زمین پر ڈال دی اور وہ دفعۃً ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گئی۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی (۲۱)

سانپ کو دیکھ کر ڈرنا ایک امر طبعی ہے چنانچہ حضرت موسیٰؑ اس منظر کو دیکھ کر ڈر سے کہ ہاتھ کی لٹھیا جو سانپ کو مارنے والی بن سکتی تھی وہ خود سانپ بن گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اطمینان دلایا کہ ڈرو نہیں، اس کو بے جھجک پکڑ لو تمھارے پکڑتے ہی ہم اس کو اس کی پہلی حالت پر کر دیں گے۔ یہ جیسی لٹھیا تھی ویسی ہی لٹھیا بن جائے گی۔

وَاضْمُمْ یَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ اٰیَةً اُخْرٰی (۲۲)

ید بیضا کا معجزہ

ساتھ ہی دوسری ہدایت یہ ہوئی کہ اپنے ہاتھ کو اپنی بغل کی طرف سکیڑ لو، پھر جب تم اس کو بغل سے نکالو گے تو وہ وہاں سے چٹا سفید، بغیر کسی مرض کے، ایک دوسری نشانی بن کر برآمد ہو گا۔

تورات کے ایک بیان کی تردید

یہ دوسرا معجزہ تھا جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوا۔ یہاں 'بیضاء' کے ساتھ 'مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ' کی قید اس شبہ کے ازالہ کے لیے ہے کہ یہ ہاتھ کی سفیدی کسی مرض کے سبب سے نہیں ہو گی بلکہ اللہ کی ایک نشانی کے طور پر ہو گی۔ اس سے تورات کی اس روایت کی تردید ہو جاتی ہے کہ جب موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ نکالا تو وہ برص سے سفید نکلا۔ یہ امر بھی یاد رکھیے کہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ کی یہ سفیدی مستقل نہیں تھی بلکہ قرآن کے الفاظ شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ظہور کو اس شرط کے ساتھ خاص کیا تھا کہ جب حضرت موسیٰؑ ایک نشانی کے طور پر دکھانے کے لیے اپنا ہاتھ اپنی بغل میں ڈال کر نکالیں گے تب یہ سفید نکلے گا۔ کسی مرض کا شبہ تو خدانخواستہ اس حالت میں ہوتا ہے جب ہاتھ مستقلاً سفید ہو جاتا، لیکن ایسا ہوتا تو پھر معجزہ کیا ہوتا؟

'اٰیَةً اُخْرٰی' مستقل جملہ نہیں ہے بلکہ یہ دوسرا حال ہے۔ ایک حال تو یہ ہے کہ وہ بغیر کسی مرض کے چٹا سفید بن کر نکلے گا، دوسرا حال یہ ہے کہ وہ ایک دوسری نشانی بن کر نکلے گا، ہم نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى (۲۳)

یہ حضرت موسیٰؑ کے لیے مستقبل کی فتوحات کی بشارت ہے کہ بظاہر تو یہ دو ہی معجزے ہیں لیکن یہ دو ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر ہاتھ کے بہت سے دوسرے بڑے بڑے معجزے بند ہیں۔ آگے جب امتحان کے مراحل آئیں گے تو تم دیکھو گے کہ ان سے ہماری قدرت و قہرمانیت کے کیا کیا کرشمے اور خوارق ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرعون کے مقابل میں ان کے جو کرشمے ظاہر ہوئے ان کی تفصیلات تورات میں موجود ہیں۔ خود قرآن میں عصا کے جو کرشمے مذکور ہیں ان کی عظمت ظاہر ہے۔ اسی عصا نے ان کے لیے سمندر سے راہ نکالی اور اسی سے انھوں نے ایک پہاڑی سے اکٹھے بارہ چشمے جاری کر لیے۔

معجزات کے باب میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ خاص معاملہ کی وجہ

توحید اور آخرت اور نماز کی تعلیم و تاکید اور ان دو معجزات کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ وہ فرعون کے پاس فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لیے جائیں اور اس کو خدا اور اس کے غضب سے ڈرائیں، وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معجزات کے باب میں معروف سنتِ الٰہی تو یہ رہی ہے کہ وہ حضرات انبیاءؑ کو اس وقت دیے گئے ہیں جب ان کی قوموں نے شدت کے ساتھ ان کا مطالبہ کیا ہے اور مقصود ان کے دیے جانے سے صرف اتمام حجت رہا ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لے رہے ہیں، کسی معجزے ہی کے دیکھنے کے لیے بضد ہیں ان کے پاس حق سے انحراف کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ پھر حضرت موسیٰؑ کے ساتھ یہ خاص معاملہ کیوں ہوا کہ ان کو منصب نبوت پر مامور کرتے ہی دو معجزے دے دیے گئے؟ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ ایک ایسے سرکش اور جابر حکمران کی طرف رسول بنا کر بھیجے جا رہے تھے جو شخصی اور قومی دونوں اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کا جانی دشمن تھا۔ ان کی بات سننا اور سمجھنا تو درکنار اندیشہ اس بات کا تھا کہ یہ علم ہوتے ہی کہ یہ حضرت موسیٰؑ ہیں فوراً ان کے قتل کا حکم دے دیتا۔ بلکہ ان کے قتل کا حکم تو اسی وقت وہ دے چکا تھا جب قبطی کے قتل کا واقعہ پیش آیا تھا لیکن حضرت موسیٰؑ چھپ کر مدین چلے گئے اس وجہ سے وہ اپنے ارادے میں ناکام رہا۔ ایک ایسے منتقم و جبار کے سامنے اگر حضرت موسیٰؑ ایک رسول کی حیثیت سے انذار کے لیے جاتے تو بھلا وہ ان کی بات سننے کا کب روادار ہوتا! وہ تو صرف اسی شکل میں کوئی بات سننے کے لیے تیار ہو سکتا تھا جب حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں کوئی ایسی بات ظاہر ہوتی جو اس کو مرعوب کر دیتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شروع ہی میں ان کو دو ایسے معجزوں سے مسلح کر دیا جن کی مدد سے وہ اپنے دشمن کی ہر تعدی سے محفوظ رہے اور انھوں نے فرعون کے سامنے جاتے ہی، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہو گا، اپنے ان معجزات کا اظہار بھی کر دیا تاکہ وہ خبردار رہے کہ اگر اس نے کوئی غلط اقدام کیا تو وہ بھی خالی ہاتھ نہیں آئے ہیں بلکہ ان کے ہاتھ میں بھی وہ عصا ہے جو ہر کبر و غرور کا سر پاش پاش کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۴)

فرعون کا طغیان

یہ وہ پہلی مہم ہے جس پر حضرت موسیٰؑ مامور فرمائے گئے۔ حکم ہوا کہ فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ فرعون کی سرکشی کی تفصیل سورۂ اعراف کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ وہ اپنے زعم میں خود رب اعلیٰ تھا اور مصریوں کے

سب سے بڑے دیوتا۔ سورج ۔۔ کا مظہر سمجھا جاتا تھا، اس کے اسٹیچو اور بت سارے مصر میں پوجے جاتے تھے۔ خدا کے بندوں کے ساتھ اس کا جو معاملہ تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہی بات کافی ہے کہ اس نے اپنی ساری مملکت میں یہ حکم جاری کر رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جتنے بیٹے پیدا ہوں وہ قتل کر دیے جائیں یا دریا میں پھینک دیے جائیں، صرف لڑکیاں لونڈیوں کی خدمت انجام دینے کے لیے زندہ رکھی جائیں۔ جس کا رویہ خالق اور خلق کے ساتھ یہ ہو اس کے طغیان میں کلام کی گنجائش کہاں رہی! حضرت موسٰیؑ چونکہ اس طغیان سے اچھی طرح باخبر تھے بلکہ وہ خود اس کے ستم زدہ تھے اس وجہ سے یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل نہیں فرمائی بلکہ صرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا۔

انبیاء کی دعوت اور عوامی تحریکات میں ایک اصولی فرق

یہاں وہ بات بھی نگاہ میں رکھیے جس کی طرف ہم ایک سے زیادہ مقامات میں اشارہ کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنے انذار اور اپنی دعوت کا مخاطب سب سے پہلے اپنی قوم اور سوسائٹی کے اعیان و اکابر کو بناتے ہیں اس لیے کہ سوسائٹی کا نظام انہی کی قیادت میں چل رہا ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی اصلاح کو قبول کر لیں تو ساری سوسائٹی بہت جلد اصلاح قبول کر لیتی ہے اور دعوت کی عقلیت و برتری کا رعب سب پر چھا جاتا ہے اور اگر وہ ضد و مکابرت کی وجہ سے حق کو جھٹلاتے ہیں تو یہ چیز بھی دعوت کے حق میں ایک پہلو سے مفید ہی ہوتی ہے اس لیے کہ ان کے پیروؤں پر اپنے لیڈروں کی منطق کا کھوکھلا پن واضح ہو جاتا ہے اور پھر اگر وہ حق قبول کرتے ہیں تو پورے شعور اور کامل بصیرت کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور یہ بصیرت ان کے اندر وہ قوت تسخیر پیدا کر دیتی ہے کہ کل تک اگر وہ دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کی طرح صرف مچھلیوں کے پکڑنے والے تھے تو اس انقلاب حال کے بعد آدمیوں کے پکڑنے والے بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو تحریکیں عوامی پراپیگنڈے سے اپنے کام کا آغاز کرتی ہیں ان کا سارا اعتماد عوام کو بھڑکانے والے جذباتی نعروں پر ہوتا ہے۔ انہی کے بل پر وہ چلتی ہیں اور جب تک قائم رہتی ہیں انہی کے بل پر قائم رہتی ہیں۔ ان کے اندر نہ عقل کا کوئی حصہ ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ جذبات کے ایک مؤثر عامل ہونے سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر انہی کے ہاتھ میں زندگی کی باگ دے دی جائے تو پھر زندگی کا انجام معلوم ہے!

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ۝ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۝ هَارُونَ أَخِي ۝ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ۝ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ۝ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا ۝ إِنَّكَ كُنتَ بِنَا بَصِيرًا ۝ قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ (۲۵-۳۶)

نبی اور دنیا پرست لیڈروں میں فرق

حضرت موسٰیؑ کے علم میں جونہی یہ بات آئی کہ ان پر فریضۂ رسالت کی ذمہ داریاں ڈال دی گئی ہیں اور اب انہیں فرعون کے پاس، خدا کے رسول کی حیثیت سے، انذار و تبلیغ کے لیے جانا ہے تو انھوں نے فوراً یہ دعا کی جو اوپر نقل ہوئی ہے۔ اس دعا کے لفظ لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موسٰیؑ نے اس بوجھ کو کتنا بھاری محسوس کیا ہے اور کس دل سوزی کے ساتھ اس بار گراں کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ سے مدد و رہنمائی کے لیے التجا کی ہے۔ دنیا پرست لیڈروں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ لیڈری ہی کی ہوس میں جیتے اور اسی کے عشق میں مرتے

ہیں لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کا سینہ اس ہوس سے بالکل پاک ہوتا ہے ۔ ان کو اللہ تعالیٰ جب امامت کے منصب پر مامور فرماتا ہے تو وہ اس کی ذمہ داریوں کے تصور سے کانپ اٹھتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ جب اس نے ان پر یہ بوجھ ڈالا ہے تو وہی اس کے اٹھانے کے لیے ہمت و قوت بخشے اور بہ قدم پر دستگیری و رہنمائی فرمائے۔

شرح صدر کی دعا 'قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ'۔ سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ نے شرح صدر کے لیے دعا فرمائی۔ اگر ذمہ داری بھاری ہو اور آدمی کو اس ذمہ داری کا کما حقہٗ احساس بھی ہو تو ہر حساس آدمی کا سینہ اس سے بھنچتا ہے۔ یہ آدمی کی کمزوری کی دلیل نہیں بلکہ یہ اس کے حساس اور فرض شناس ہونے کی دلیل ہے۔ حضرات انبیاءؑ نبوت کو مانگ کر نہیں پاتے بلکہ اس کی ذمہ داری، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی جاتی ہے اس وجہ سے قدرتی طور پر وہ اپنے سینہ میں اضطراب و تردد محسوس کرتے ہیں کہ معلوم نہیں وہ کس حد تک اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سینہ کی یہ خلش اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے دور ہو سکتی ہے۔ وہی دل میں ہمت و عزیمت ڈالتا ہے اور وہی آگے کے مراحل کے لیے علم و یقین کی روشنی عطا فرماتا ہے تب سینہ کھلتا اور حوصلہ بلند ہوتا ہے۔ یہ حقیقت یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاءؑ پر بھی سارا علم و یقین ایک ہی دن میں انڈیل نہیں دیا جاتا بلکہ وہ بھی زاد و راحلہ اپنی منازل سفر کے اعتبار سے پاتے ہیں اور برابر 'رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا' کا ورد رکھتے ہیں۔

مہم کی کامیابی کے لیے دعا 'وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ' اندرونی خلش کے ازالہ کی دعا کے بعد یہ حالات کی مساعدت، راہ کی ہمواری اور مہم کی کامیابی کے لیے دعا ہے کہ ہر چند یہ مہم بہت سخت ہے لیکن تو چاہے تو ہر مشکل کو آسان کر سکتا ہے تو اپنے فضل سے ہر مشکل کو آسان کر اور راہ کی ہر رکاوٹ کو دور کر۔

قوت اظہار و بیان عطا کیے جانے کی درخواست 'وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ'۔ یہ نہایت ادب و تواضع کے ساتھ، مقصد دعوت کے لیے قوت اظہار و بیان عطا کیے جانے کی درخواست ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دور میں ابلاغ کا واحد ذریعہ صرف کسی خطیب کی خطابت و زبان آوری ہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں خطیبوں کو سوسائٹی میں سب سے زیادہ عزت حاصل تھی۔ عرب میں تو یہ حال تھا کہ جو شخص قبیلہ کا خطیب ہوتا وہی اس کا زعیم اور قائد ہوتا۔ جوہر خطابت کے بغیر اس دور میں کوئی شخص قیادت و امارت کی ذمہ داریاں کما حقہٗ ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اب پریس کی ایجاد نے قلم کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے بلکہ اب تو اصل اہمیت پریس ہی کو حاصل ہے۔ آج اگر کوئی شخص کسی طرح پریس کی مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ ڈیموستھنیز سے بھی بڑا خطیب و زبان آور ہونے کا مدعی بن سکتا ہے اگرچہ وہ دو فقرے بھی صحیح بولنے پر قادر نہ ہو۔ لیکن پریس کی ایجاد سے پہلے خطابت اور زبان آوری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بالخصوص جن کے اوپر عوام کی قیادت و امارت کی ذمہ داری ہو وہ تو اس قابلیت کے بغیر اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام زبان آور خطیب نہیں تھے۔ خطابت و زبان آوری ہر چند نبوت و رسالت کے لوازم

میں سے نہیں ہے لیکن دعوت و تبلیغ کے اعتبار سے اس کی اہمیت، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بالخصوص اُس دور میں بہت تھی، اس وجہ سے جب ان پر رسالت کی ذمہ داری ڈالی گئی تو ان کو اپنی اس کمی کا احساس ہوا اور شرح صدر کی دعا کے ساتھ انھوں نے اظہار و بیان کی قوت بخشے جانے کی بھی دعا فرمائی کہ اے رب میری زبان کو قوت اور روانی عطا فرما تاکہ میں اپنی دعوت کو اس طرح پیش کر سکوں کہ لوگ میری بات کو سنیں اور سمجھیں۔

اپنی اس کمی کے احساس کی وجہ سے انھوں نے اپنے بڑے بھائی حضرت ہارُون کو اپنا شریک کار بنائے جانے کے لیے دعا بھی کی۔ حضرت ہارونؑ تورات اور قرآن مجید دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت زوردار خطیب تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو بجا طور پر یہ توقع تھی کہ اگر ان کا تعاون حاصل ہو گیا تو جس کمی کا وہ اپنے اندر احساس کر رہے ہیں اس کی تلافی ہو جائے گی۔ سورۂ قصص میں ان کی دعا یوں مذکور ہے۔

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ	اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے
لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ	تو اس کو ایک معاون کی حیثیت سے میرے ساتھ کیجیے
اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ۔	کہ وہ میری تائید کرے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ میری
(القصص - ۳۴)	تکذیب کریں گے۔

اس آیت سے یہ بات صاف واضح ہے کہ اصل ضرورت جس کو حضرت موسیٰؑ، مقصد دعوت کے لیے محسوس فرما رہے تھے ایک زوردار خطیب کی تھی۔ اس پہلو سے وہ اپنے اندر ایک کمی محسوس فرماتے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنے سے زیادہ ایک فصیح البیان خطیب کی ان کو مدد حاصل ہو جائے تاکہ وہ زیادہ بہتر اور مؤثر طریقے پر لوگوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کر سکیں۔

یہی بات سورۂ شعراء میں یوں مذکور ہوئی ہے۔

وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ	اور میرا سینہ بھنچتا ہے اور میری زبان رواں نہیں ہے
فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ (۱۳ - شعراء)	تو ہارون کے پاس پیغام بھیج۔

کیا حضرت موسیٰؑ میں لکنت تھی؟

ان آیات سے یہ بات تو ضرور معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کوئی زبان آور اور زوردار خطیب نہیں تھے لیکن یہ بات کہیں سے نہیں نکلتی کہ ان کی زبان میں لکنت تھی۔ لکنت کی روایت صرف تورات میں ہے۔ وہیں سے ہماری تفسیر کی کتابوں میں داخل ہوئی اور پھر اس کو مستند کرنے کے لیے ہمارے مفسرین نے ایک عجیب و غریب واقعہ بھی گھڑ لیا۔ تورات کی روایات کا جو حال ہے اس کا اندازہ اوپر آپ کر چکے کہ حضرت موسیٰؑ کے 'ید بیضاء' کو برص کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ جو لوگ اپنے نبی کو برص کا مریض قرار دے سکتے ہیں ان سے کیا بعید ہے اگر وہ اس کے اندر لکنت کا عیب بھی نکال دیں!

بہرحال قرآن میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے لکنت کا ثبوت ملتا ہو۔ 'وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ' کے الفاظ میں بھی جس بات کی درخواست ہے وہ لکنت دور کرنے کی نہیں بلکہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا،

اظہار و بیان کی وہ قابلیت و صلاحیت بخشے جانے کی درخواست ہے جو فریضۂ نبوت و رسالت کی ادائیگی کے لیے ضروری تھی۔ اور یہ درخواست نہایت متواضعانہ اسلوب و الفاظ میں ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے یوں نہیں فرمایا کہ مجھے دلوں کو تسخیر کرنے والا ایک جادو بیان خطیب بنا دے بلکہ نہایت خاکسارانہ انداز میں فرمایا کہ میری زبان کو وہ روانی عطا فرما کہ لوگ میری بات سمجھیں۔ یہ دعا کرنے کے لیے لکنت کا مریض ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک قادر الکلام بھی یہ دعا کر سکتا ہے اور اسے کرنی چاہیے۔ بسا اوقات معانی و حقائق کا جوش اس طرح سینہ میں امنڈتا ہے کہ ایک قادر الکلام آدمی بھی اپنی زبان اور اپنے قلم کو اس کی تعبیر سے قاصر محسوس کرتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو عام لیڈروں کی طرح صرف نعرہ نہیں لگانا تھا بلکہ دین کے حقائق و اسرار کی تفہیم کرنی تھی اور وہ بھی ایسے لوگوں کے سامنے جو نہ صرف ان کی تکذیب پر ادھار کھائے بیٹھے تھے بلکہ ان کی جان کے دشمن تھے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ حضرت موسیٰؑ کو صرف چھدا اتارنے کی خواہش نہیں تھی بلکہ وہ اپنے مخالفوں کے دل میں اتر جانے کا ارمان رکھتے تھے۔ مخالفوں سے تو یہ امید نہ تھی کہ ان کے دل اور ہو جائیں گے اس لیے انھوں نے اپنے رب سے زبان ہی اور مانگی تاکہ ان کو اپنی بات سمجھا سکیں۔

الغرض ہمارے نزدیک یہ لکنت کی روایت ناقابل اعتبار ہے۔ قطع نظر اس سے کہ حضرات انبیاء کو اللہ تعالیٰ جس طرح اخلاقی عیوب سے محفوظ رکھتا ہے اسی طرح خلقی نقائص سے بھی محفوظ رکھتا ہے، سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی بات یہ ہے کہ قرآن میں اس روایت کی تائید کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ فرعون کا طعنہ جو سورۂ زخرف میں وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ کے الفاظ سے نقل ہوا ہے اس پر انشاء اللہ ہم اس کے محل میں بحث کریں گے۔

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ٥ هٰرُوْنَ اَخِي ٥

حضرت ہارونؑ کو شریک کار بنانے کی دعا کی وجہ

اوپر سورۂ قصص اور سورۂ شعراء کی جن آیتوں کا حوالہ گزرا ہے اس سے یہ بات واضح ہے کہ ایک مددگار اور شریک کار کی ضرورت خاص طور پر حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوت بیان کی کمی کے پہلو سے فرمائی تھی اور اس کمی کی تلافی کے لیے وہ اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو نہایت موزوں آدمی سمجھتے تھے، وہ ان کے بڑے بھائی بھی تھے، ان کے اخلاق و کردار پر بھی حضرت موسیٰؑ کو پورا بھروسا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی فصاحت بیان کی، جیسا کہ تورات سے واضح ہے، قوم میں بڑی شہرت تھی۔ ان تمام صفات سے متصف آدمی جب، اپنے ہی گھر اور خاندان میں موجود ہو تو سب سے زیادہ وہی اس بات کا حق دار ہو سکتا تھا کہ اس کے شریک کار بنائے جانے کے لیے حضرت موسیٰؑ درخواست کرتے۔ 'مِنْ اَهْلِيْ' کے لفظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس انتخاب میں کسی خاندانی عصبیت کو دخل تھا۔ خاندانی عصبیت کا شبہ تو اس صورت میں ہوتا جب مجرد خاندان وجہ ترجیح بنتا لیکن جب وجہ انتخاب صفات ہیں تو نہ صرف یہ کہ اس شبہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے جب کسی فضل و رحمت کے لیے دعا کرے تو اس میں سب سے پہلے اپنے اہل و عیال کو شریک کرے بشرطیکہ وہ اہل و صالح ہوں۔ بقرہ کی تفسیر میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

حضرت ہارونؑ کی حیثیت

'اُشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ٥ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ' 'اَزْر' پیٹھ اور کمر کو کہتے ہیں۔ یعنی ہارونؑ کو

میرا وزیر اور شریک کار بنا کر میری کمر کو مضبوط کر تاکہ میں اس بارگراں کو حسن و خوبی کے ساتھ اٹھا سکوں۔ وَاَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ' سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی درخواست اس بات کے لیے تھی کہ حضرت ہارونؑ کی مدد صرف ایک صحابی اور ساتھی کی حیثیت سے نہیں بلکہ شریک نبوت کی حیثیت سے حاصل ہو۔ یعنی وہ بھی فرائض نبوت سے متعلق عنداللہ مسئول و ذمہ دار ہوں اور انھیں بھی براہ راست اللہ کی طرف سے رہنمائی اور عصمت حاصل ہو۔

یہ درخواست ایک بڑی اہم درخواست تھی اس لیے کہ حضرات انبیاء میں سے، جیسا کہ سورۂ مریم کی آیت ۵۳ کے تحت ہم ذکر کر چکے ہیں، کسی نبی کے متعلق یہ بات معلوم نہیں کہ ایک دوسرا نبی اس کا وزیر بنایا گیا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو یہ شرف بخشا اور ان کی یہ درخواست منظور فرمائی۔ دنیا دار لیڈروں میں تو چھوٹے چھوٹے عہدوں کے لیے بھی رشک و رقابت کا وہ جذبہ ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کو اپنے اختیارات کے قریب پھٹکنے دینے کے روادار نہیں ہوتے لیکن جہاں امانت اور ذمہ داری کا صحیح احساس ہو تو ایک نبی اپنی نبوت کے منصب عظیم میں بھی دوسرے کو شریک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے۔

یہاں یہ بات نوٹ رکھیے کہ تورات میں حضرت ہارونؑ کا ذکر اس حیثیت سے نہیں آیا ہے جس حیثیت سے قرآن میں آیا ہے۔ تورات میں ان کا ذکر بس حضرت موسیٰؑ کے ایک ساتھی اور ترجمان کی حیثیت سے آیا ہے اور وہ بھی ایک ایسے ساتھی کی حیثیت سے کہ سامری کی فتنہ انگیزیاں بھی انہی کے کھاتے میں ڈال دی گئی ہیں۔ یہ قرآن کا فیض ہے کہ اس نے ان شخصیتوں کی اصلی حیثیت اجاگر کی ہے۔

ذکر کا مفہوم

'كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِیْرًا' (۳۲-۳۴)۔ یعنی ہارونؑ کو شریک کار بنائے جانے کی درخواست اس لیے ہے کہ ہم دونوں مل کر تیری زیادہ سے زیادہ تسبیح اور تیرا زیادہ سے زیادہ ذکر کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں انفرادی ذکر و تسبیح ہی مراد نہیں ہے بلکہ اجتماعی ذکر و تسبیح بھی مراد ہے اور یہ تعبیر ہے فریضۂ نبوت کی ادائیگی کی۔ نبی اور انبیاء کے طریقہ پر کام کرنے والوں کی خلوت و جلوت دونوں ذکر و تسبیح ہوتی ہے۔ وہ مسجد میں جو کام کرتے ہیں وہ بھی ذکر و تسبیح ہے اور بازار میں جو کام کرتے ہیں وہ بھی ذکر و تسبیح ہے۔ ان کی رزم و بزم دونوں میں فرق عمل کا نہیں بلکہ صرف میدان عمل کا ہوتا ہے۔ اسی سورہ کی آیت ۱۴ میں آپ نے پڑھا ہے کہ 'اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ' (میرے ذکر کے لیے نماز کا اہتمام رکھنا) اور پھر اسی سورہ کی آیت ۴۲ میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں حضرات کو فرعون کے دربار میں جانے اور ساتھ ہی اس بات کی ہدایت ہوتی ہے کہ 'وَلَا تَنِیَا فِیْ ذِكْرِیْ' (اور میرے ذکر میں ڈھیلے نہ پڑنا) ظاہر ہے کہ اس ذکر سے مراد وہ انذار و تبلیغ ہی ہے جس کے لیے وہ فرعون کے پاس بھیجے جا رہے تھے۔

تسبیح اور ذکر میں ایک نازک فرق

تسبیح اور ذکر دونوں لفظوں کے ایک ساتھ ذکر کرنے میں ایک ادبی پہلو بھی ملحوظ ہے، وہ بھی نگاہ میں رہے۔ تسبیح میں تنزیہ کا پہلو غالب ہے اور ذکر میں اثبات کا اور یہ نفی و اثبات دونوں خدا کے ساتھ صحیح تعلق کو استوار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ جو چیزیں خدا کی شان، اس کی صفات اور اس کی مرضیات و احکام کے منافی ہیں ان

کی نفی کی جائے اور جو چیزیں اس کی شان، اس کی صفات اور اس کے احکام کے موافق ہیں ان کا اثبات و اظہار کیا جائے۔ ان دونوں چیزوں سے مل کر مومن کا عقیدہ اور کردار بنتا ہے۔ اور نفی اثبات پر مقدم ہے۔ جب تک آپ ماسوی اللہ سے بغاوت کا اعلان نہیں کرتے اس وقت تک آپ اللہ کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ لَآ اللّٰہُ سے پہلے لَآ اِلٰہَ کا اعلان ضروری ہے۔

دعا کے حق میں ایک سفارش

'اِنَّکَ کُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا'۔ یہ اپنی اس دعا کے حق میں اسی طرح کی سفارش ہے جس طرح کی سفارش حضرت زکریا نے اپنی دعا کے حق میں، 'مَا کُنْتُ بِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیًّا' کے الفاظ سے پیش کی ہے۔ سورۂ مریم کی تفسیر میں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ خدا کی بارگاہ میں آدمی کے لیے بہترین سفارش اس کا اپنا عمل نہیں ہے بلکہ خود خدا ہی کے فضل و کرم کا واسطہ ہے۔ جب بندہ اس اعتماد پر اپنے رب سے مانگتا ہے کہ جس نے بن مانگے سب کچھ بخشا ہے وہ بھلا مانگنے پر کس طرح محروم فرمائے گا تو رب کریم اپنے بندے کو محروم نہیں رکھتا۔ حضرت موسیٰ نے بھی اپنے اور اپنے بھائی کے ساتھ اپنے رب کے اسی معاملے کا حوالہ دیا ہے کہ جب تو ہمیشہ ہمارا نگران حال رہا ہے تو اب جب کہ ہم تیرے ہی نام کی خاطر اٹھ رہے ہیں بھلا تیرے فضل و کرم سے کیوں محروم رہیں گے!

درخواست منظور!

'قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی'۔ 'سُؤل' اور 'سوال' کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی درخواست اور التجا۔ ارشاد ہوا کہ موسیٰ! تمہاری درخواست منظور ہوئی۔ یہاں موسیٰ کے خطاب میں بھی بڑا پیار ہے اور منظوری کے الفاظ میں بھی بڑی شان جھلک رہی ہے۔ دعا کے الفاظ ختم ہوتے ہی بشارت سنادی گئی کہ تمہاری عرضی منظور! گویا بیک جنبشِ قلم، بلا کسی توقف اور بلا کسی استثناء کے سب منظور! ظاہر ہے کہ اس منظوری میں ان کی وہ درخواست بھی شامل ہے جو انھوں نے اظہار و بیان کی قوت بخشے جانے کے لیے کی۔ وہ بھی ان کو عطا ہوئی اور حضرت ہارونؑ ان کے وزیر بھی بنا دیے گئے۔ دعا اگر صحیح مقصد کے لیے، صحیح وقت پر، اچھے جذبے کے ساتھ کی جائے تو وہ خدا کی بارگاہ سے اسی طرح شرف قبولیت پاتی ہے!

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْکَ مَرَّۃً اُخْرٰٓی ۝ اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّکَ مَا یُوْحٰٓی ۝ اَنِ اقْذِفِیْہِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْہِ فِی الْیَمِّ فَلْیُلْقِہِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاْخُذْہُ عَدُوٌّ لِّیْ وَعَدُوٌّ لَّہٗ ؕ وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیْ ۚ۬ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (۳۷-۳۹)

ماضی کے ایک فضل خاص کی یاد دہانی

'وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْکَ الایۃ'۔ حضرت موسیٰ کا اضطراب رفع کرنے کے لیے جس طرح ان کی دعا کی قبولیت کی بشارت سنائی گئی اسی طرح ان کے اوپر اپنے اس فضل خاص کی بھی یاد دہانی فرمادی جو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس وقت فرمایا جب ان کی ولادت ہوئی اور اس بات کا خطرہ تھا کہ فرعون اسرائیلی بچوں کے قتل کی جو ظالمانہ اسکیم[1]

---

[1] یہ ظالمانہ اسکیم جن سیاسی خطرات کی بنا پر فرعون اور اس کے درباریوں نے چلائی تھی ان کی وضاحت سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ اعراف آیات ۱۲۹-۱۲۷۔

حضرت موسیٰ کی حفاظت کے لیے خدائی انتظامات

چلا رہا ہے اس کی زد میں وہ بھی آجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت نہ صرف یہ کہ اپنی قدرت و حکمت سے حضرت موسیٰ کو بچایا بلکہ فرعون ہی سے ان کی پرورش کرائی۔ اس واقعہ کی یاد دہانی سے مقصود یہ ہے کہ جس فرعون سے تمہاری حفاظت کے لیے خدا کی یہ شانیں ظاہر ہو چکی ہیں اس سے کوئی اندیشہ تمہارے دل میں کیوں خلجان کرے۔ تمہارا رب تمہارے ساتھ ہے۔

'اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰىٓ' یہ اس فضلِ خاص کی تفصیل بیان ہو رہی ہے کہ تمہاری حفاظت کے لیے ہم نے جو تدبیر پسند فرمائی اس کی وحی ہم نے تمہاری ماں کی طرف کی اور وہ وحی یہ تھی جو اب تمہیں وحی کی جا رہی ہے تاکہ تم پر واضح ہو جائے کہ ہم اس سے پہلے تمہارے اوپر اپنے کیسے بڑے بڑے فضل کر چکے ہیں۔ اگرچہ اس واقعہ کا اجمالی علم حضرت موسیٰ کو اپنی والدہ ماجدہ کے ذریعہ سے رہا ہوگا لیکن اس کے اندر دستِ غیب کی جو کارفرمائیاں تھیں ان کا پورا علم تو اس وحی کے ذریعہ ہی سے حضرت موسیٰ کو ہوا ہوگا۔ اسی بات کی طرف 'مَا يُوْحٰى' کا لفظ اشارہ کر رہا ہے۔

حضرت موسیٰ کی والدہ کو کیا وحی کی گئی؟

حضرت موسیٰ کی ماں کو جو وحی آئی وہ تو ظاہر ہے کہ القاء اور الہام کی نوعیت کی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک بات ان کے دل میں ڈال دی اور انھیں یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ یہ خدا کی ڈالی ہوئی بات ہے 'اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ' یہ وہ وحی ہے جو حضرت موسیٰ کی والدہ کو کی گئی۔ تورات کی کتاب خروج ۲: ۲-۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں حضرت موسیٰ کی ولادت ہوئی ہے اس زمانے میں اسرائیلی بچوں کے قتل کی سکیم بڑے زوروں سے چل رہی تھی۔ حضرت موسیٰ کی والدہ نے کچھ عرصہ تک (تورات کی روایت کے مطابق تین ماہ تک) تو بچے کو ظالموں سے چھپائے رکھا لیکن ان کو ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ اگر ظالم فرعونیوں کو پتہ چل گیا تو بچے کی خیر نہیں۔ تورات کی روایت یہ ہے کہ بالآخر انھوں نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا بنایا اور بچے کو اس میں ڈال کے ٹوکرے کو دریا کے کنارے پر جھاڑ کے نیچے رکھ دیا کہ شاید اس طرح کسی رحمدل کی نظر بچے پر پڑ جائے اور اس کی جان بچنے کی کوئی شکل نکل آئے۔ قرآن کا بیان یہ ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی ماں کے دل میں ڈالی کہ بچے کو ایک صندوق میں رکھ کر اس کو دریا میں ڈال دو اور اس باب میں کوئی فکر یا غم نہ کرو، ہم پھر بچے کو تمہاری طرف لوٹائیں گے اور اس کو اپنا رسول بنائیں گے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ بغیر اشارۂ غیبی کے حضرت موسیٰ کی والدہ آخر کس دل و جگر سے اتنا بڑا اقدام کر سکتی تھیں! اشارۂ غیبی کے بعد بھی نہ جانے ان کی مامتا پر کیا کچھ گزری ہوگی لیکن اس اشارۂ غیبی نے چونکہ یہ اطمینان بھی دلا دیا تھا کہ تم یہ کر گزرو اللہ تعالیٰ بچے کی حفاظت کا سامان خود کرے گا، اس وجہ سے انھوں نے کلیجہ پر پتھر رکھ کر اس کو دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا۔ سورہ قصص آیت ۷ میں اس اشارۂ غیبی کی وضاحت یوں ہوئی ہے۔ 'فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ' (اور جب تمہیں اس کے باب میں اندیشہ ہو تو اس کو دریا میں ڈال دیجیو، اور نہ ڈریو نہ غم کیجیو، ہم پھر اس کو تمہاری طرف لوٹائیں گے

اور اس کو اپنے رسولوں میں سے بنائیں گے) اس اقدام کے وقت حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے دل پر جو کچھ گزری ہے اس کی وضاحت سورۂ قصص کی تفسیر میں انشاء اللہ ہم کریں گے۔

'فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ' یہ اس وحی کا جزو نہیں ہے جو حضرت موسیٰؑ کی ماں کو ہوئی۔ اگر یہ بات بھی وحی میں شامل ہوتی تو اس کی صورت جواب امر کی ہوتی حالانکہ 'فَلْيُلْقِهِ' پر لام امر ہے اس وجہ سے یہ امر غائب ہے۔ جن لوگوں نے اس کا ترجمہ جواب امر کا کیا ہے ان کا ترجمہ بالکل غلط ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا "پس چاہیے کہ دریا اس کو کنارے پر ڈال دے" یعنی والدۂ حضرت موسیٰؑ کو تو اللہ تعالیٰ نے یہ وحی کی کہ بچے کو صندوق میں رکھ کے دریا کے حوالہ کر دو اور دریا کو یہ حکم فرمایا کہ وہ اس کو کنارے پر ڈال دے، اس کو وہ اٹھائے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے۔ یہ حضرت موسیٰؑ پر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت وحکمت اور اپنی شان وتدبیر کا اظہار فرمایا ہے کہ ہم نے تمھاری حفاظت وپرورش کے لیے اپنی یہ شان دکھائی کہ تمھاری ماں سے تمھیں دریا کی موجوں کے حوالہ کرایا اور پھر ان چاہا کہ دریا تمھیں ساحل پر ڈال دے اور اس طرح میرا اور تمھارا دونوں کا جو دشمن ہے یعنی فرعون وہ تمھاری پرورش کرے۔ ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

قدرت کا کرشمہ

'عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ' یہ خدا کے کمال تصرف کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور حضرت موسیٰؑ دونوں کے دشمن سے حضرت موسیٰؑ کی حفاظت وپرورش کرائی۔ خدا کا دشمن تو وہ اس وجہ سے تھا کہ وہ خود خدائی کا مدعی تھا، بھلا وہ اپنے سوا کسی اور خدا کو کس طرح گوارا کر سکتا تھا اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس کو جو دشمنی تھی اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ پھر یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور حضرت موسیٰؑ دونوں کے دشمن سے حضرت موسیٰؑ کی پرورش کرائی بلکہ اس کی تدبیر وحکمت کا یہ بھی ایک کرشمہ ہے کہ اس نے فرعون سے اس کے اور اس کی قوم کے سب سے بڑے دشمن کی پرورش کرائی اور فرعون نے خود اپنے ہی ہاتھوں اس خطرے کا سامان کیا جس سے بچنے کے لیے اس نے نہ جانے کیا کیا جتن کیے!

حضرت موسیٰؑ پر محبت الٰہی کا پرتو

'وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي' یہ وہ خدائی تدبیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے اور ان کے، دونوں کے دشمن کی نگاہوں میں محبوب بنا دینے کے لیے فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ ہم نے تم پر اپنی محبت کا ایک پرتو ڈال دیا۔ بچہ تو یوں ہی موہنا ہوتا ہے، ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر اس کو دیکھ کر شفقت پیدا ہوتی ہے۔ اور حضرت موسیٰؑ تو، تورات کی روایات سے ثابت ہے کہ نہایت خوب صورت بھی تھے[1] پھر مزید لطف خداوندی یہ ہوا کہ ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا پرتو ڈال دیا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس بچے کے موہنے پن کا جس پر محبت الٰہی کا پرتو ہو! ایک ایسا موہنا بچہ جب وہ سرکنڈوں کی ایک ٹوکری میں، دریا کی موجوں کا پھینکا ہوا، یکہ وتنہا، معصومیت ودل آویزی کی مورت بنا ہوا پڑا ہو تو آخر کس کا دل اس کو دیکھ کر تڑپ نہیں

۱؎ ملاحظہ ہو خروج ۲:۲، عبرانیوں ۱۱:۲۳، اعمال ۷:۲۰

جائے گا! فرعون آخر فرعون ہی تھا، کوئی پتھر تو نہیں تھا! چنانچہ یوں ہوا کہ فرعون اور اس کی بیوی نیل کے کنارے سیر کو نکلے، ان کی نظر ٹوکرے پر پڑ گئی۔ اس میں انھوں نے ایک چاند سے بچے کو دیکھا۔ سمجھ گئے کہ یہ کسی اسرائیلی کا بچہ ہے جس کو غالباً اس کے ماں باپ نے، اس کے قتل کے اندیشہ سے، تن بہ تقدیر، دریا کی موجوں کے حوالہ کر دیا ہے کہ شاید اسی راہ سے اس کے بچاؤ کی کوئی شکل پیدا ہو جائے۔ بچہ کو دیکھ کر ان کے دل میں رحم پیدا ہو گیا۔ اس رحم میں بھی زیادہ دخل فرعون کی بیوی کو تھا۔ عورتیں یوں بھی فطرۃً بچوں کے معاملے میں بڑی رحمدل ہوتی ہیں اور فرعون کی یہ بیوی تو، جیسا کہ سورۂ تحریم کی آیت ۱۱ سے ثابت ہے نہایت خدا ترس اور رحم دل بی بی تھیں۔ بہرحال اس خدائی تدبیر سے، دریائے نیل میں پھینکے ہوئے حضرت موسیٰ، اسی فرعون کے محل میں پرورش کے لیے پہنچ گئے، جس کے ڈر سے ان کی ماں نے اپنی آغوش سے جدا کر کے ان کو دریا کی آغوش میں دیا تھا!

'وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ' یہاں حرفِ عطف بربنائے قرینہ دلیل ہے کہ اس کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ ہم نے تم پر اپنی محبت کا پرتو اس لیے ڈالا کہ تم سے تمھارے دشمن محبت کریں اور تمھاری پرورش خاص ہماری نگرانی میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی محبت کا یہ پرتو ہی تھا جو حضرت موسیٰ کا محافظ بنا اور اس محافظ نے اس طرح ان کو محفوظ کر دیا کہ ان کو نہ صرف یہ کہ اپنے جانی دشمن سے کوئی خطرہ نہیں رہا بلکہ وہ دشمن ان کا گرویدہ بن گیا۔ اسی محافظِ محبت کو اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی آنکھ سے تعبیر فرمایا ہے۔ گویا اپنی محبت کا پرتو ڈال کر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر اپنی حفاظت کا پہرہ بٹھا دیا۔

اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۬ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۬ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى (۴۰)

اس آیت میں حضرت موسیٰ کی سرگزشت کا ایک بہت بڑا حصہ سمیٹ دیا گیا ہے۔ جن باتوں کی تذکیر اس موقع پر ضروری نہیں تھی ان کو حذف کر کے صرف چند باتوں کی طرف اجمالی اشارہ ہے اور پھر آگے سلسلۂ کلام اصل موضوع بحث سے مربوط ہو گیا ہے۔

حضرت موسیٰ کے اپنی ماں کی طرف لوٹائے جانے کے لیے خدائی تدبیر

'اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ ...... الاٰیۃ' یہ اس تدبیر کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے دریا میں ڈالے جانے کے بعد حضرت موسیٰ کو ان کی ماں کی طرف لوٹائے جانے کے لیے اختیار فرمائی۔ اوپر سورۂ قصص آیت ، کے حوالہ سے گزر

---

[1] تورات میں فرعون کی بیوی کے بجائے اس کی لڑکی کا ذکر آتا ہے کہ وہ اور اس کی سہیلیاں بچہ کو اٹھا کر لائیں۔ قرآن نے اس کی تصحیح کر دی۔ اس کی وضاحت کے لیے سورۂ قصص آیت ۹ کی تفسیر ملاحظہ کیجیے۔

چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی والدہ کو جب یہ ہدایت فرمائی کہ بچہ کو دریا میں ڈال دو تو ساتھ ہی یہ اطمینان بھی دلادیا کہ ہم بچے کو پھر تمھارے پاس واپس لائیں گے۔ یہ وعدہ جس شکل میں پورا ہوا یہاں اس کی طرف سرسری اشارہ ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ قصص کی آیات ۹-۱۳ میں یوں آئی ہے کہ جب فرعون کی بیوی نے بچہ کو دیکھا تو انھوں نے فرعون سے کہا کہ بڑا موہنا بچہ ہے۔ اس کو قتل نہ ہونے دو۔ یہ میری اور تمھاری دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ ہمارے کام آئے گا یا ہم اس کو لے پالک بنالیں گے۔ ادھر والدۂ حضرت موسیٰ کا یہ حال تھا کہ انھوں نے بچے کو ایمائے خداوندی سے دریا میں ڈال تو دیا لیکن غم سے کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ انھوں نے حضرت موسیٰ کی بہن سے کہا کہ وہ دیکھتی رہیں کہ صندوق کدھر بہہ کے جاتا ہے۔ وہ لوگوں کی نظر بچا کر اس کو دیکھتی رہیں۔ بالآخر ان کو معلوم ہوگیا کہ صندوق فرعون کے محل کے پاس پہنچا اور وہاں دریا نے اس کو کنارے پر ڈال دیا اور فرعون اور اس کی بیوی نے بچہ کو اٹھا لیا۔ حضرت موسیٰ کی بہن فرعون کے محل میں پہنچیں۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ بچے کو کسی دایہ کا دودھ پلانے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن بچہ مچلا ہوا ہے، وہ کسی کی چھاتی منہ ہی سے نہیں لگاتا۔ حضرت موسیٰ کی بہن نے فرعون کی بیوی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر آپ لوگ کہیں تو میں ایک ایسے گھر والوں کا پتہ دے سکتی ہوں جو اس بچے کی نہایت اچھی طرح دیکھ بھال کریں گے اور بچے کو مانوس کر لیں گے۔ چونکہ حضرت موسیٰ کے دودھ نہ پینے کے سبب سے فرعون اور اس کے گھر والوں کو نہایت پریشانی تھی اس وجہ سے یہ تجویز مان لی گئی اور اس طرح حضرت موسیٰ پھر اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ گئے۔

تورات میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے۔

> "تب اس کی بہن نے فرعون کی بیٹی کو کہا کہ کیسے تو میں جاکے عبرانی عورتوں میں سے ایک دائی تجھ پاس لے آؤں تاکہ وہ تیرے لیے اس لڑکے کو دودھ پلائے۔ فرعون کی بیٹی نے اسے کہا کہ جا۔ وہ چھوکری گئی اور لڑکے کی ماں کو بلایا۔ فرعون کی بیٹی نے اس سے کہا کہ اس لڑکے کو لے اور اسے میرے لیے دودھ پلا، میں تجھے اجرت دوں گی۔ اس عورت نے لڑکے کو لیا اور دودھ پلایا۔" خروج ۲: ۷-۹

تورات اور قرآن کے بیان میں جو فرق ہے اس پر تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر ذی فہم آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن کا بیان ہر اعتبار سے قرین عقل و فطرت ہے۔ افسوس ہے کہ تورات والے اپنے گھر کی باتوں سے بالکل بے خبر ہیں۔

یہاں اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ میں صیغے مضارع کے استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی بہن کو بار بار فرعون کی بیوی کو مطمئن کرنے کے لیے ان کے پاس آنا جانا پڑا تب وہ اپنی تجویز پر ان کو راضی کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ اس طرح حضرت موسیٰ دوبارہ اپنی ماں کے پاس پہنچے اور ماں کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ میں نے ترجمہ میں مضارع کے مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور عربیت کے اس قاعدہ کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ اگر اردو میں مدعا ٹھیک ادا نہ ہوا ہو

تو اس کو بہرے تعلم کی کوتاہی پر محمول کیجیے۔

وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَٰكَ مِنَ ٱلْغَمِّ وَفَتَنَّٰكَ فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِىٓ أَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَٰمُوسَىٰ ۝٤٠

قبطی کے قتل کا واقعہ

دریا سے نکالے جانے کے بعد سے لے کر عہد جوانی تک حضرت موسیٰؑ نے جن حالات میں زندگی گزاری ان میں سے یہاں صرف قبطی کے قتل اور ان کے مدین جانے کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اشارہ بھی اسی مقصد کے لیے ہے جس مقصد سے اوپر والے واقعہ کی یاددہانی کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اطمینان ہو جائے کہ جس رب نے ان کی ایسے خطرناک اور نامساعد حالات میں مدد اور رہنمائی فرمائی ہے وہ آگے کے مراحل میں بھی مدد اور رہنمائی فرمائے گا۔ یہاں چونکہ واقعات کی طرف صرف اجمالی اشارہ ہے اس وجہ سے ہم سورۂ قصص کی روشنی میں ان کی تفصیل کیے دیتے ہیں۔ یہ تفصیل ہم اپنے الفاظ میں کریں گے۔ آیات کی وضاحت اور ان کی مشکلات کی تحقیق انشاء اللہ اپنے محل میں آئے گی۔ قصص کی آیات ۱۴-۲۹ سامنے رکھیے، ان کی روشنی میں صورت واقعہ یوں سامنے آتی ہے۔

ان آیات کے اجمال کی وضاحت سورۂ قصص کی روشنی میں

حضرت موسیٰؑ جب جوان ہوئے اور ان کو عقل و علم کی روشنی حاصل ہوئی تو ان کو اپنی قوم کی ذلت و مظلومیت کا نہایت شدت کے ساتھ احساس ہوا۔ بنی اسرائیل کی حیثیت مصر میں غلاموں کی تھی اس وجہ سے ان کی بستی بھی اصل شہر سے الگ بسائی گئی تھی۔ اسرائیلی صرف خدمت اور بیگار کے لیے شہر جاتے اور وہاں اپنے قبطی آقاؤں کے ہاتھوں بری طرح پٹتے اور ذلیل ہوتے۔ حضرت موسیٰؑ کی غیرت ان مناظر کو دیکھ کر جوش میں آ جاتی اور بسا اوقات اپنے مظلوم ہم قوموں کی حمایت میں وہ سینہ سپر ہو جاتے۔ فرعونیوں کو اندیشہ ہوا کہ اگر اسرائیلیوں کو ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی لیڈر مل گیا تو وہ دلیر ہو جائیں گے اور پھر ان کی آقائی خطرے میں پڑ جائے گی اس وجہ سے وہ حضرت موسیٰؑ کے دشمن ہو گئے اور غالباً حکومت نے ان کا داخلہ بھی شہر میں بند کر دیا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ دشمنوں کی نظر بچا کر اپنے ہم قوموں کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے شہر میں جاتے۔ ایک دن اسی طرح نظر بچا کر وہ شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک اسرائیلی اور ایک قبطی آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰؑ سے فریاد کی۔ حضرت موسیٰؑ کی غیرت کو جوش آ گیا۔ انھوں نے اسرائیلی کی مدد کرنی چاہی تو قبطی ان سے الجھ پڑا۔ حضرت موسیٰؑ آدمی بگڑے تھے۔ انھوں نے جو ایک گھونسا رسید کیا تو وہ کہیں بے ڈھب پڑا اور قبطی وہیں ڈھیر ہو کے رہ گیا۔

حضرت موسیٰؑ کو اس حادثہ کا بڑا غم ہوا کہ بلاقصد ان کے ہاتھوں ایک ایسا جرم صادر ہو گیا جس پر وہ عنداللہ مسئول ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے بہت استغفار کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی غلطی معاف کر دی۔ اللہ تعالیٰ کے اس انعام پر انھوں نے عہد کیا کہ آئندہ میں کبھی مجرموں کا حمایتی نہیں بنوں گا۔ دوسرے دن پھر نظر بچا کر شہر پہنچے تو دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو کل طالب مدد ہوا تھا آج پھر ایک قبطی سے لڑ رہا ہے۔ اس نے حضرت موسیٰؑ کو دیکھا تو ان سے مدد کا طالب ہوا لیکن حضرت موسیٰؑ نے اس کو جھڑک دیا کہ تم ایک شریر آدمی معلوم

ہوتے ہوا! تاہم وہ بڑھے کہ قبطی کو پکڑلیں اور دونوں میں بیچ بچاؤ کرا دیں۔ اسرائیلی یہ سمجھا کہ آج وہ اسے غلطی پر سمجھ کر پکڑنا چاہتے ہیں۔ وہ ڈرا کہیں آج حضرت موسیٰؑ کا گھونسا اس پر نہ پڑ جائے ورنہ اس کی جان کی بھی خیر نہیں ہے۔ وہ چلّایا کہ موسیٰؑ! کل تم نے ایک جان لی ہے، کیا آج میری جان بھی لینے کا ارادہ ہے! اگر تم نے یہ روش اختیار کی ہے تو یہ تو کسی مصلح کی روش نہیں ہوئی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ تم ملک میں ایک ڈکٹیٹر بننے کا ارادہ رکھتے ہو۔[1]

اس سے حضرت موسیٰؑ کو یہ اندازہ ہو گیا کہ قبطی کے قتل کا واقعہ راز نہیں رہا ہے۔ پھر مزید برآں یہ ہوا کہ اکناف شہر سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا اور اس نے حضرت موسیٰؑ کو یہ خبر دی کہ اعیانِ حکومت آپ کے قتل کے منصوبے بنا رہے ہیں تو میرا خیر خواہانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ یہاں سے نکل جائیں۔

حضرت موسیٰؑ نے اس وقت ظالموں کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا فرمائی اور خدا کی رہنمائی و کارسازی کے بھروسہ پر مدین کا رخ کیا۔ مدین کے ایک چشمے پر کچھ دیر کے لیے ٹھہرے تو دیکھا کہ کچھ چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں لیکن دو عورتیں اپنے گلے کو روکے ہوئے کھڑی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے اندر جذبۂ فتوت ابھرا اور انھوں نے ان سے پوچھا کہ آخر تم کیوں اپنے گلے کو روکے ہوئے کھڑی ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے باپ بوڑھے ہیں، گلے کی چرواہی ہمیں کرنی پڑ رہی ہے اور ہم اس ریل پیل میں اپنے گلے کو پانی نہیں پلا سکتیں اس وجہ سے ہمیں دوسرے چرواہوں کے فارغ ہونے تک اپنی باری کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ان کی یہ بات سن کر حضرت موسیٰؑ کے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی۔ وہ اٹھے۔ ان کے گلے کو پانی پلایا اور پھر آ کر ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے اور یہ دعا کی کہ اے رب اس وقت تو مجھ پر اپنی جو رحمت نازل فرمائے، میں اس کا محتاج ہوں!

یہ دونوں صاحب زادیاں حضرت شعیبؑ کی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد ایک صاحب زادی شرماتی ہوئی حضرت موسیٰؑ کے پاس آئیں اور فرمایا کہ آپ کو ہمارے والد بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے گلے کو جو پانی پلایا ہے اس کا معاوضہ دیں۔ حضرت موسیٰؑ حضرت شعیبؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو اپنی ساری روداد سنائی۔ حضرت شعیبؑ نے ان کو تسلی دی کہ بس اب کوئی فکر نہ کرو، اللہ نے تم کو ظالموں سے نجات بخشی۔

حضرت شعیبؑ کی ایک صاحبزادی نے باپ سے سفارش کی کہ آپ ان کو اپنی خدمت میں لگا لیجیے، یہ ایک قوی اور امانت دار آدمی نظر آتے ہیں، امید ہے کہ نہایت بہتر خدمت کرنے والے ثابت ہوں گے۔

حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ میں اپنی ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے

---

[1] اس سوال پر انشاء اللہ ہم سورۂ قصص میں بحث کریں گے کہ یہ بات قبطی نے کہی یا اسرائیلی ہی اپنی حماقت کے سبب سے کہہ بیٹھا۔ یہاں مقصود صرف واقعہ کو سادہ طریقہ پر پیش کر دینا ہے تاکہ آیت زیر بحث کے مضمرات روشنی میں آجائیں۔

ساتھ اس شرط پر کر دینا چاہتا ہوں کہ تم آٹھ سال میری خدمت کرو اور اگر تم نے دس سال پورے کر دیے تو اس کا انحصار تمہاری مرضی پر ہے۔ اس معاملے میں تم پر میں کوئی دباؤ نہیں ڈالوں گا اور ان شاء اللہ تم مجھے ایک بہتر آدمی پاؤ گے۔

حضرت موسیٰؑ نے یہ بات منظور کر لی اور فرمایا کہ یہ معاہدہ میرے اور آپ کے درمیان طے ہے۔ یہ میری مرضی پر ہے کہ میں آٹھ سال آپ کی خدمت کروں یا دس سال، اس معاملے میں مجھ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔ اس معاہدے پر ہم دونوں اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں۔

معاہدہ کی یہ مدت پوری کر کے جب حضرت موسیٰؑ مصر کے لیے واپس ہوتے تب طور کی وادیٔ ایمن میں ان کو وہ تجلی نظر آئی جس کو دیکھ کر وہ آگ لینے گئے اور نبوت لے کر لوٹے۔

سورۂ قصص کی یہ ساری تفصیل اس لیے ہم نے پیش کی ہے کہ سورۂ طٰہٰ کی زیر بحث آیت میں یہ پوری تفصیل سمیٹ دی گئی ہے۔ جب تک یہ تفصیل سامنے نہ ہو آیت کا پورا مالۂ و ما علیہ سامنے نہیں آتا۔ اب آیت کے اجزا پر غور کیجیے۔

حضرت موسیٰ کے غیر ارادی قتل نفس کی نوعیت

وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ، مصری کے قتل کا واقعہ جن حالات میں پیش آیا ہے وہ اوپر کی تشریحات سے واضح ہو چکے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ قتل کا ارادہ رکھتے تھے اور نہ مظلوم کی حمایت کے سوا ان کے اندر کوئی اور جذبہ تھا۔ یہ جذبہ ایک نہایت محمود اور اعلیٰ جذبہ ہے جو ہر اس شخص کے اندر ہوتا ہے جو فتوت و شرافت اور حمیت و غیرت سے خالی نہیں ہے۔ اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے جو کچھ کیا وہ بجائے خود حق تھا۔ لیکن قضائے الٰہی سے ان کا گھونسا کچھ ایسا بے ڈھب پڑا کہ مصری اس کی تاب نہ لا سکا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ کو خیال ہوا کہ یہ فعل بلا ارادہ سہی لیکن ان سے ایسا کام صادر ہو گیا ہے جس پر عند اللہ ان سے مواخذہ ہو سکتا ہے۔ اس تصور نے ان کو ایک شدید غم میں مبتلا کر دیا۔ جن کے اندر خدا کا خوف ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو الاؤنس دینے میں بہت فیاض نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنا احتساب ان چیزوں پر بھی کرتے ہیں جن کے لیے وہ چاہیں تو آسانی سے عذر تلاش کر سکتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کسی بے جا قومی عصبیت میں بھی مبتلا نہیں تھے اس وجہ سے انھیں یہ غم بھی ہوا ہو گا کہ ممکن ہے جس کی حمیت و حمایت میں ان سے یہ فعل صادر ہوا، زیادتی اسی کی رہی ہو۔ چنانچہ اوپر کی تفصیلات میں آپ نے دیکھا کہ جب دوسرے دن اسی اسرائیلی کو ایک دوسرے مصری سے انھوں نے لڑتے دیکھا اور وہ پھر ان سے طالب مدد ہوا تو انھوں نے اس کو جھڑک دیا کہ تم ایک شریر آدمی ہو۔ اگر حضرت موسیٰؑ کے اندر قوم پرستی کا پندار ہوتا تو غم تو درکنار ان کو فخر ہوتا کہ اپنی قوم کی حمایت میں انھوں نے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ لیکن یہ چیز بھی نہیں تھی جو ان کے لیے وجہ تسلی بن سکے اس وجہ سے انھیں اس حادثہ کا غم ہوا اور انھوں نے اپنے رب سے معافی مانگی۔ اللہ نے ان کو معاف فرمایا اور اس معافی نے ان کو اس غم سے نجات دی۔

ہمارے نزدیک اس غم میں حکومت کے انتقام کے خوف کو اگر کوئی دخل رہا ہو گا تو صرف اس پہلو سے رہا ہو گا کہ حکومت ایک نہایت ظالم حکومت تھی جس سے کسی اسرائیلی کے لیے کسی انصاف کی توقع نہیں تھی۔ اگر کوئی عادل حکومت ہوتی تو حضرت موسیٰؑ سارا معاملہ اس کے سامنے رکھ دیتے اور اس کے فیصلہ کی پابندی کرتے لیکن فرعون جیسی ظالم حکومت کے اپنے آپ کو حوالہ کرنا بالکل خودکشی کے مترادف تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال بھی حضرت موسیٰؑ کے لیے باعث غم ہوئی ہوگی۔ اس غم سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے بالآخر وطن کو چھوڑا اور مدین چلے گئے۔

جہاں تک اس لغزش کے صدور کا تعلق ہے، اس کے بارے میں متعدد مقامات میں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاؑ سے، بعثت سے پہلے یا بعثت کے بعد، اگر کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ اتباع ہوا کی نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ وہ اتباع حق یا طلب حق کے جوش میں کبھی کبھی اس کی مطلوبہ حد سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز بجائے خود کوئی برائی نہیں ہے لیکن حضرات انبیاؑ چونکہ حق کی کسوٹی ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح کی باتوں پر بھی گرفت فرماتا ہے تاکہ میزان بالکل درست رہے۔ حضرت موسیٰؑ کی یہ لغزش بھی فی حقیقت ایک نیکی تھی لیکن نیکی بھی اپنے حدود سے متجاوز ہو جائے تو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بعض اوقات قابل گرفت بن جاتی ہے، بالخصوص حضرات انبیاؑ کے بارے میں۔

حضرت موسیٰؑ کے امتحانات

'وَفَتَنّٰکَ فُتُوۡنًا'۔ فتن فتونا کے معنی جانچنے اور پرکھنے کے ہیں۔ سنار سونے کو کٹھالی میں ڈال کر اس کے کھوٹ کو جو الگ کرتا ہے یہ لفظ اس کے لیے بھی آتا ہے۔ یہی لفظ اللہ تعالیٰ نے ان امتحانات کے لیے استعمال کیا ہے جن میں اس نے حضرت موسیٰؑ کو ڈال کر اچھی طرح پرکھا تاکہ جس کار خاص کے لیے وہ ان کو منتخب فرمانا چاہتا ہے اس کے وہ پوری طرح اہل بن جائیں۔ مصر میں ان کی زندگی، جیسی پرمحن تھی اور وہاں سے جن پرخطر حالات میں وہ نکلے ہیں ان کا کچھ اندازہ تو اوپر کے اقتباس سے ہو ہی گیا، مدین جا کر، آٹھ یا دس سال، وہاں کے پہاڑوں اور جنگلوں میں حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائیں۔ وہاں سے نکلے تو ابھی راستہ ہی میں تھے کہ رسالت کا بار عظیم ان پر ڈالا گیا۔ اس کے بعد جو زہرہ گداز حالات پیش آئے وہ اعراف میں بھی آپ پڑھ آئے ہیں، اس سورہ میں بھی پڑھیں گے اور آگے قصص اور دوسری سورتوں میں بھی۔ غرض ولادت سے لے کر آخر لمحہ زندگی تک امتحانوں ہی سے سابقہ رہا اور وہ بھی ایک سے ایک بڑھ کر!

امتحانات تربیت کا لازمہ ہیں

ان امتحانوں سے متعلق ایک حقیقت ہمیشہ مستحضر رکھیے کہ یہ انسان کی تعلیم و تربیت کا لازمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں کے ذریعہ سے انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے اس وجہ سے یہ بجائے خود بھاگنے اور گھبرانے کی چیز نہیں ہیں۔ جو شخص ان سے گھبراتا اور بھاگتا ہے وہ گویا اپنی تربیت سے گھبراتا اور بھاگتا ہے۔ ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی چیز ہے تو یہ نہیں ہے کہ امتحان پیش آیا بلکہ یہ ہے کہ اس امتحان میں وہ کہیں ناکام نہ رہ جائے۔

امتحانات کے بارے میں سنت الٰہی

یہ امتحانات صرف مشکلات و مصائب ہی کی راہ سے پیش نہیں آتے بلکہ انعامات و افضال کی شکل میں بھی پیش آتے ہیں۔ مصائب و مشکلات کے امتحانات میں اللہ تعالیٰ بندے کے صبر کی تربیت فرمانا چاہتا ہے اور انعامات و افضال کے امتحان میں اس کے شکر کو پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ اور اسی صبر و شکر پر تمام اعلیٰ صفات انسانی کا انحصار ہے۔ انہی دونوں صفتوں کی تکمیل سے دنیا میں نفسِ مطمئنہ کی بادشاہی حاصل ہوتی ہے اور پھر اسی کا ثمرہ وہ ابدی بادشاہی ہے جس کو قرآن نے 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

حکمت قرآن کا ایک دقیق مسئلہ

حکمتِ قرآن کا ایک دقیق مسئلہ یہ بھی ہے کہ صبر اور شکر کے امتحانوں میں سے زیادہ مشکل صبر کا امتحان ہے یا شکر کا؟ اس باب میں عارفین کی رائے مختلف ہے۔ میرا اپنا رجحان، قرآن کی روشنی میں، یہ ہے کہ شکر کا امتحان زیادہ مشکل ہے۔ اس میں پاس ہونے والوں کا اوسط بہت کم ہے۔ مصائب میں حق پر ثابت قدم رہنے والے تو کچھ نکل آتے ہیں لیکن نعمت پا کر بہکنے سے محفوظ رہنے والے بہت کم نکلتے ہیں۔ 'وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ' (سبا - ۱۳) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ جتنے ہی اعلیٰ مراتب پر فائز فرمانا چاہتا ہے ان کے امتحانات بھی اتنے ہی زیادہ اور اتنے ہی سخت ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرات انبیائے کرام کو جو امتحانات پیش آئے ہیں ان کی تفصیلات پڑھیے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہم اور آپ ان کے برداشت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے!

اصل ڈرنے کی چیز

ان امتحانوں کے معاملے میں اصل ڈرنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ امتحان پیش آئے یا پیش آئیں گے بلکہ ایک تو وہی چیز ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ انسان اس بات سے ڈرے کہ مبادا کسی امتحان میں وہ فیل ہو جائے اور دوسری بات، اس سے بھی زیادہ ڈرنے کی یہ ہے کہ مبادا وہ سرے سے امتحان ہی سے خارج کر دیا جائے۔ اس لیے کہ سنت الٰہی یہ بھی ہے کہ جو شخص بار بار فیل ہی ہوتا رہتا ہے بسا اوقات اللہ تعالیٰ اس کو اپنے امتحان ہی سے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کو 'امہال' کہتے ہیں اور یہ سخت ترین سزا ہے جو اس دنیا میں کسی فرد یا قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کے لیے ابد کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

مدین میں قیام کی مدت

'فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ' یہاں اس بات کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ مدین میں کتنے سال رہے لیکن اوپر سورۂ قصص کی روشنی میں ہم نے جو تفصیلات پیش کی ہیں ان سے واضح ہے کہ اس معاہدے کے تحت، جو حضرت شعیبؑ کے ساتھ انھوں نے کیا، کم از کم آٹھ سال یا زیادہ سے زیادہ دس سال وہاں انھوں نے گزارے اور اس دوران میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کی بکریاں چرائیں۔

مرحلۂ نبوت

'ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى' (۴۰) اوپر کے تمام حالات و واقعات کا حوالہ دینے کے بعد ارشاد ہوا کہ یہ جو کچھ ہوا ہماری سکیم اور ہمارے مقرر کیے ہوئے پروگرام کے مطابق ہوا اور ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے ٹھیک

اس وقت پر، جو ہم نے تمھاری یہاں کی حاضری کے لیے پہلے سے مقرر کر رکھا تھا، تم یہاں پہنچے اور ہم نے تمھیں اپنی نبوت و رسالت سے مشرف کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے تمھاری ولادت سے لے کر اب تک ہر مرحلہ میں تمھاری حفاظت کی ہے اور تمھارے لیے اپنے منصوبے تمھارے اور اپنے دونوں کے دشمنوں سے پورے کرائے ہیں وہ ہر قدم پر تمھارے ساتھ ہے اور جو ذمہ داری وہ تمھارے سپرد کر رہا ہے اس کے ادا کرنے کے لیے وہ خود راہیں کھولے گا اور خود اسباب فراہم فرمائے گا۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (۴۱)

'اِصْطِنَاع' کا اصل مفہوم کسی کو کسی خاص مقصد کے لیے تربیت اور ٹریننگ دینے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے جو تمھیں اتنی بھٹیوں میں تپایا اور اتنے امتحانوں سے گزارا ہے تو اپنے ایک کارِ خاص کے لیے یہ تمھاری تربیت کی ہے اور اب وہ کارِ خاص میں تمھارے سپرد کر رہا ہوں سو تم اس ذمہ داری کو اٹھاؤ اور میرے اعتماد پر اس کی انجام دہی کے لیے آگے بڑھو۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ (۴۲)

یہ اس حکم کا اعادہ ہے جو آیت ۲۴ میں دیا گیا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اس کو انذار کرو۔ بیچ کی آیات حضرت موسیٰ کی تسکین و تسلی کے لیے ہیں۔ ان کی دعا کی قبولیت کی بشارت اور ان پر سابق افضال و عنایات کا حوالہ دینے کے بعد پھر ہدایت ہوئی کہ میری نشانیوں کے ساتھ بے خوف و خطر، فرعون کے پاس جاؤ۔ پہلے صرف حضرت موسیٰ کو حکم ہوا تھا لیکن اب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں کو حکم ہوا اس لیے کہ حضرت موسیٰ کی درخواست پر حضرت ہارون بھی شریکِ نبوت بنا دیے گئے تھے۔

ذکر سے مراد

'وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ'، اسی ہدایت کی تاکید مزید ہے جو آیت ۱۴ میں دی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے ذکر میں ڈھیلے نہ پڑھنا۔ ذکر سے مراد، جیسا کہ آیت ۱۴ کے تحت ہم ذکر کر آئے ہیں، ذکرِ عبادت و ذکرِ دعوت دونوں ہی ہے۔ نبی کا ہر کام ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔ وہ جب نماز پڑھتا ہے تو اس کے ذریعہ سے درحقیقت اس تذکیر کے لیے اللہ تعالیٰ سے قوت و معرفت حاصل کرتا ہے جو وہ خلق کو کرتا ہے۔ دعوتِ حق کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی سرچشمہ سے اس کو غذا اور قوت حاصل ہوتی ہے۔ اگر اس سرچشمہ سے تعلق کمزور ہو جائے تو دعوت بے جان اور بے روح ہو جاتی ہے اور اگر اس سرچشمہ سے تعلق بالکل ہی منقطع ہو جائے تو پھر وہ دعوت بالکل شیطانی دعوت بن کے رہ جاتی ہے اگرچہ اس میں نام خدا ہی کا لیا جائے۔

اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۴۳)

فرعون کے طغیان کی تفصیل آیت ۲۴ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ خطاب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں سے ہے اس وجہ سے لازماً یہ بات بعد کے مرحلہ کی ہے جب حضرت موسیٰ مصر پہنچ چکے ہیں اس لیے کہ حضرت ہارون وادی طویٰ میں حضرت موسیٰ کے ساتھ نہیں تھے۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (۴۴)

انبیاء کا طریقِ دعوت

یہ طریقِ دعوت سے متعلق ہدایت ہے کہ دعوت بہرحال نرمی کے ساتھ دی جائے۔ اس ہدایت کی ضرورت صرف اس پہلو سے نہیں تھی کہ اب حضرت موسیٰؑ فرعون کے سامنے ایک بے بس اسرائیلی کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدا کے ایک سفیر کی حیثیت سے جا رہے تھے اور ہاتھ میں عصائے موسوی بھی تھا بلکہ لینت اور نرمی دعوتِ حق کی فطرت ہے۔ حضرات انبیاء کی بعثت تعلیم و اصلاح کے لیے ہوئی اس وجہ سے ان کی دعوت اور ان کے انذار میں ایک معلم کی شفقت اور ایک غمگسار کی دل سوزی ہمیشہ نمایاں رہی ہے۔ کسی نبی کے متعلق بھی یہ بات علم میں نہیں آئی کہ اس نے ہیکڑی جتائی اور دھونس جمائی ہو۔ سخت سے سخت حالات میں بھی ان کا طرزِ خطاب اور اندازِ جواب نہایت ہی نرم، مؤثر اور ہمدردانہ رہا ہے۔ ہیکڑی جتانا اور دھونس جمانا دنیا پرست لیڈروں کی خصوصیات میں سے ہے۔ موجودہ زمانے کے شیطانی پروپیگنڈے کی تو پیچھے ساری بنیاد ہی اسی پر ہے۔

دعوتِ انبیاء کا اصل مقصد

'لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى'۔ حضرات انبیاء کی دعوت و تعلیم کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ مخاطب میں تذکر اور 'خشیت' پیدا ہو۔ جن کے اندر صرف غفلت ہوتی ہے وہ تو نبی کی تذکیر سے فوراً جاگ پڑتے ہیں۔ وہ گویا راستہ بھولے ہوئے ہوتے ہیں، بتانے والے نے جوں ہی ان کو بتادیا وہ سیدھی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسرے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی گمراہی کچھ پختہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے اندر، اگر ان کے اندر قبولیتِ حق کی کچھ صلاحیت ہوتی ہے، نبی کے انذار سے خدا اور اس کی پکڑ کا کچھ خوف پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے لگتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال ہوتی ہے تو وہ ہدایت کی راہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں 'يَتَذَكَّرُ' سے پہلی حالت کی طرف اشارہ ہے اور 'يَخْشٰى' سے دوسری حالت کی طرف۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى (۴۵)

ایک اندیشہ کا اظہار

دونوں ہی حضرات نے یہ عرض کی کہ اے ہمارے رب! ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ وہ معاملہ پر غور کرنے سے پہلے ہی یا تو ہم پر ہاتھ ڈال دے گا یا یہ ہوگا کہ ہماری بات سنتے ہی، برہم ہو کر، اس ظلم و ستم میں اور اضافہ کر دے گا جو وہ اب تک بنی اسرائیل پر کر تا رہا ہے۔ 'فَرط' کا صلہ جب 'عَلٰی' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی کے خلاف عاجلانہ اقدام کے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ فرعون تو پہلے ہی غصہ سے بھرا بیٹھا ہے۔ بھلا وہ ہمیں زبان کھولنے کی اجازت کب دے گا! وہ بات سننے سے پہلے ہی یا تو ہمیں ختم کر دینے کی تدبیر کرے گا یا اس کی سرکشی اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ یہاں دعا میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں شریک ہیں۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے جس کا ذکر آیت ۴۳ کے تحت ہم نے کیا ہے کہ یہ ہدایات مصر پہنچنے کے بعد دی گئی ہیں جب حضرت ہارونؑ بھی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہو گئے ہیں۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى (۴۶)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی

اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ ڈرو نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں اور سب کچھ سنتا دیکھتا ہوں۔ 'میں تمہارے ساتھ ہوں' کے اجمال کے اندر جو تفصیل مضمر ہے وہ محتاج بیان نہیں اور 'سنتا دیکھتا ہوں' کے الفاظ کے اندر جو سطوت و جلالت اور جو تحفظ و ضمانت ہے وہ بھی تشریح سے بالاتر ہے۔ جب اللہ ساتھ ہے اور وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے اور وہی ایک مہم پر بھیج رہا ہے تو پھر اگر ساری خدائی بھی دشمن ہو جائے تو کیا ڈر ہے!

فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۖ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ ۖ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ (۴۷)

'إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ'۔ اگرچہ رسول کی حیثیت صرف حضرت موسیٰؑ ہی کو حاصل تھی، حضرت ہارونؑ صرف ایک نبی تھے لیکن یہاں علی سبیل التغلیب دونوں ہی حضرات کے لیے رسول کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

'فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ'۔ اس آیت کی تفسیر سورۂ اعراف کی آیات ۱۰۴ - ۱۰۵ کے تحت گزر چکی ہے[1]۔ وہاں ہم نے وضاحت کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے اور ان لوگوں کے خیال کی تردید بھی کی ہے جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو ایک قوم پرست لیڈر کی تحریک آزادی کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

آیت سے مراد

'قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ'۔ یہاں آیت سے مراد دلیل و حجت ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔ چنانچہ یہی مضمون سورۂ اعراف میں یوں آیا ہے 'قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ' (میں تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایک واضح حجت لے کر آیا ہوں) پیچھے ہم اس سوال پر بھی بحث کر آئے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو بالکل پہلے ہی مرحلہ میں معجزات کیوں دیے گئے اور وہ کیا خاص حالات تھے جن کے سبب سے انھوں نے بالکل پہلے ہی قدم پر ان کا اظہار و اعلان بھی کر دیا۔

خیرخواہی اور تنبیہ ساتھ ساتھ

'وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ'۔ اس فقرے میں وہ خیرخواہی اور ہمدردی بھی ہے جو انبیاؑ کی دعوت کی خصوصیت ہے اور جس کی حضرت موسیٰؑ کو آیت ۴۴ میں ہدایت ہوئی اور ساتھ ہی نہایت لطیف تنبیہ بھی ہے کہ سلامتی صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا کی ہدایت کی پیروی کریں۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک تو تم نے جو کچھ کیا وہ کیا لیکن اب جب کہ خدا کے رسولوں کے ذریعہ سے تمہارے پاس خدا کی ہدایت آچکی ہے تو سلامتی کی راہ یہی ہے کہ اس کو سیدھے سیدھے اختیار کر لو ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ (۴۸)

یہ اوپر والی آیت کے مضمر مضمون کو نہایت نرم انداز میں کھول دیا کہ ہم پر یہ وحی آئی ہے کہ جو جھٹلائے

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن ج ۳، ص ۴۱۷ - ۴۱۸

اور اعراض کرے گا اس کے اوپر عذاب آئے گا۔

آیت ۴۸ کے چند لطیف پہلو

اس آیت پر تدبر کیجیے تو کئی لطیف باتیں سامنے آئیں گی۔

ایک تو یہ کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے عام لیڈروں کی طرح فرعون پر اپنی طرف سے عذاب کی کوئی دھونس جمانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کو صرف اللہ تعالیٰ کی اس وحی کی خبر دی جو ان پر آئی تھی کہ تکذیب اور اعراض کرنے والوں پر اللہ کا عذاب آجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ انھوں نے اسی لیے اختیار فرمایا کہ اپنی طرف سے فرعون کے لیے کوئی وجہ اشتعال نہ پیدا ہونے دیں۔

دوسری یہ کہ انھوں نے فرعون کو مخاطب کرکے یوں نہیں فرمایا کہ اگر تو جھٹلائے گا اور اعراض کرے گا تو تجھ پر عذاب الٰہی آدھمکے گا بلکہ بصیغۂ عام یوں فرمایا کہ جو ایسا کرے گا اس کا انجام یہ ہوگا تاکہ فرعون کے کانوں میں بات پڑ بھی جائے اور اس کی انانیت کو ٹھیس بھی نہ لگے۔

تیسری یہ کہ کذّب کے مفعول اور تولّی کے متعلق، دونوں کو یہاں حذف کر دیا۔ یوں نہیں فرمایا کہ جو ہماری رسالت کی تکذیب اور ہماری لائی ہوئی ہدایت سے اعراض کرے گا اس پر عذاب آئے گا۔ اس لیے کہ یہ بات از خود واضح تھی اور اس کے اظہار سے بھی بہر حال فرعون کے پندار کو چوٹ لگتی۔

اوپر حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کو دعوت میں نرمی کی جو تلقین فرمائی گئی تھی یہ اس کا طریقہ بھی بتا دیا گیا کہ اس طرح دعوت دینا کہ بات بھی پہنچ جائے اور تمھاری طرف سے اشتعالِ طبع کا کوئی سبب بھی پیدا نہ ہونے پائے۔

قَالَ فَمَنۡ رَّبُّکُمَا یٰمُوۡسٰی (۴۹)

فرعون کو دعوت اور اس کا معارضہ

قرینہ دلیل ہے کہ یہاں بربنائے وضاحت یہ بات حذف کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو جو پیغام دے کر فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا وہ پیغام وہ لے کر گئے اور ٹھیک ٹھیک ہدایت الٰہی کے مطابق اس کو فرعون تک انھوں نے پہنچا بھی دیا۔ یہ سن کر فرعون بولا کہ اے موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے؟ یعنی تم جو رب کے رسول بن کر آئے ہو تو آخر وہ رب کون ہے؟ رب تو میں ہوں تو آخر تم میرے دربار میں اور کس رب کے رسول بن کر آئے ہو؟ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ فرعون کی حیثیت مصر میں (GOD - KING) اوتار بادشاہ کی سمجھی جاتی تھی۔ وہ مصریوں کے عقیدے میں ان کے سب سے بڑے دیوتا ــــ سورج ــــ کا مظہر تھا اور اسی عقیدے کے تحت اس کے اسٹیچو اور بت تمام مصر میں پوجے جاتے تھے۔

فرعون کا یہ سوال محض بطور طنز و تحقیر کے تھا ورنہ خدائی کے دعوے کے باوجود وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتا تھا کہ بنی اسرائیل اس کے غلام و محکوم سہی لیکن بہر حال وہ اس کو خدا نہیں مانتے۔ لیکن اب تک بنی اسرائیل کے خدا کی حیثیت مصر میں ایک بے جان خدا کی تھی جس کا نام تو بنی اسرائیل اپنے گھروں میں شاید لیتے رہے ہوں گے لیکن زندگی کے عملی معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ عملی معاملات پر خدائی فرعون

ہی کی تھی۔ یہ پہلی مرتبہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے خدا کو فرعون کے سامنے ایک زندہ خدا کی حیثیت سے پیش کیا اور صرف پیش ہی نہیں کیا بلکہ اس کے نام سے چند نہایت اہم مطالبات بھی اس کے سامنے رکھ دیے اور وہ بھی اس تنبیہ کے ساتھ کہ اگر سلامتی چاہتے ہو تو ہماری بات مانو ورنہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہو۔ ظاہر ہے کہ فرعون بنی اسرائیل کے اس زندہ خدا سے اب تک واقف نہیں تھا اس وجہ سے اس کو یہ صدا عجیب معلوم ہوئی اور اس نے تعجب اور تحقیر کے انداز میں یہ سوال کیا جو اوپر مذکور ہوا۔ تورات میں اس موقع پر جو عبارت ہے اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ خروج ۵: ۲ میں ہے۔

"فرعون نے کہا کہ خداوند کون ہے کہ میں اس کی آواز کو سنوں کہ بنی اسرائیل کو جانے دوں؟ میں خداوند کو نہیں جانتا اور میں بنی اسرائیل کو جانے نہ دوں گا"

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۵۰)

مختصر لیکن دندان شکن جواب

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی خلقت عطا فرمائی، پھر اس کی خلقت کے اعتبار سے اس کی رہنمائی فرمائی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر شے اپنے مقصدِ وجود کے اعتبار سے ایک خاص قالب و ہیئت رکھتی ہے اور پھر اس مقصدِ وجود کی تحصیل و تکمیل کے لیے اپنے اندر ایک جبلّی رہنمائی بھی رکھتی ہے۔ شہد کی مکھی کو جس مقصد کے لیے خالق نے پیدا کیا ہے اس کی تکمیل کے لیے اس کے ننھے سے وجود کے اندر اس نے وہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں جو اس کے لیے ضروری ہیں اور پھر اس کی جبلت کو یہ الہام بھی فرما دیا کہ وہ کس طرح اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرے اور اپنے لیے شہد کا ذخیرہ فراہم کرے۔ یہی حال اس کائنات کی ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کا ہے۔ ایک چیونٹی، ایک جھینگا، ایک مکڑی، ایک بکری، ایک شیر سب کو قدرت کی طرف سے ایک خاص نوع کی خلقت اور اس کی ضرورت کے اعتبار سے ایک جبلی ہدایت عطا ہوئی ہے۔ سب کو خدا نے الہام فرمایا ہے کہ کس طرح اور کس نوع کی اپنے لیے غذا حاصل کریں، کس طرح توالد و تناسل کا سلسلہ قائم کریں، کس طرح اپنی اور اپنی نسل کی حفاظت کریں، کس چیز سے بچیں اور کس چیز کو اختیار کریں اور پھر کس طرح اس کائنات کی مجموعی خدمت میں اپنا فریضہ ادا کریں۔

بلبل کی نغمہ سنجی، طوطی کی شکر فشانی اور کوئل کی کوک کس کا الہام ہے؟ ظاہر ہے کہ ان کے خالق ہی کا! تو وہی خالق ان کا اور سب کا رب بھی ہے۔

ہر شے پر ہدایت کا فیضان

صرف جاندار چیزوں ہی تک قدرت کا یہ فیض محدود نہیں ہے بلکہ چمن کے بیل بوٹے جو ثمر باری اور گل ریزی کرتے ہیں، سوسن، بنفشہ، گلاب اور سرو و صنوبر جو چمن آرائی کرتے ہیں، سیب، انار اور انگور جو دعوتِ شوق دیتے ہیں، آخر یہ کس کی بخشی ہوئی خلقت اور یہ کس کی عطا کردہ جبلت ہے؟ آخر کون ہے جو ان میں سے کسی ایک چیز کے بھی خلق کا دعویٰ کر سکے یا یہ کہہ سکے کہ یہ اس کا کرشمہ ہے کہ اس نے سیب کے اندر سیب کی خاصیت ودیعت کی اور کیکر کے اندر کیکر کی۔ چمن کے ہر پودے، میدان کی ہر گھاس اور جنگل کی ہر جھاڑی

میں یہ الگ الگ مزاج، الگ الگ رنگ و بو اور الگ الگ فوائد و نقصانات کون ودیعت کرتا ہے، جو کرتا ہے وہی رب ہے، نہ کہ ہر یرا غیرا شخص جو سر پر تاج اوڑھ لے اور خدائی کا دعوے دار بن بیٹھے وہ رب بن جاتے۔

زمین ہی نہیں ایک نظر آسمان پر بھی ڈالیے۔ یہ سورج، یہ چاند، یہ کہکشاں، یہ قوس قزح، یہ آسمان، یہ ابر، یہ ہوا، آخر کس نے ان کو پیدا کیا اور کون ہے جس نے ان کے فرائض ان کو الہام کیے؟ جس نے ان کو پیدا کیا اور ان کو ان کے فرائض الہام کیے وہی رب ہے! سورج کا اوتار بن کر تخت پر براجمان ہو جانا تو بہت آسان ہے لیکن کون ہے جو ایک منٹ کے لیے سورج کو اس کے وقت سے پہلے نمودار کر سکے یا افق سے اس کو غائب کر سکے!

اس کائنات میں اشرف المخلوقات کی حیثیت انسان کو حاصل ہے۔ اس کو قدرت نے بہترین خلقت بھی عطا فرمائی ہے اور نہایت اعلیٰ صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے لیکن نہ کسی کو اپنی خلقت کے معاملہ میں کوئی دخل ہے، نہ اپنی صلاحیتوں کی تخلیق ہی میں کسی کا کوئی حصہ ہے۔ یہ خدا ہی ہے جس نے ہمیں ہاتھ، پاؤں، ناک، کان اور آنکھ کی قوتیں دیں اور اسی نے ہمیں جبلت و فطرت اور عقل و ادراک و شعور کی نعمتیں بخشیں۔ یہ انہی چیزوں کا فیض ہے کہ آج خشکی و تری، دریا اور پہاڑ سب ہمارے لیے یکساں ہیں۔ ہم سمندروں کا سینہ چیرتے اور فضاؤں میں اڑتے ہیں۔ ہماری رسائی زمین کے بعید ترین گوشوں اور کونوں ہی تک نہیں بلکہ چاند و مریخ تک ہے۔ بجلی اور ایٹم سب پر ہمارا تصرف ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ایک لمحے کے لیے بھی یہ مغالطہ نہ ہو کہ یہ آپ کی اپنی پیدا کردہ صلاحیتوں کا کرشمہ ہے! جو اس مغالطہ میں ہے وہ احمق ہے! یہ سب خدا کی بخشی ہوئی عقل کا کرشمہ ہے جس کی بدولت انسان قدرت کے کچھ نوامیس دریافت کر کے چاند اور مریخ پر تاخت کرتا پھر رہا ہے۔ اگر یہ خدا کی بخشی ہوئی عقل کی رہنمائی سے اس کے کچھ قوانین دریافت کر لے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت پیدا کر لے تو اس پر اتنا مغرور نہ ہو جائے کہ خدا کی خدائی ہی کو چیلنج کر دے۔

حضرت موسیٰؑ نے جواب تو نہایت مختصر الفاظ میں دیا لیکن اس کے اندر تفصیل نہایت طویل مضمر ہے۔ اور اگرچہ الفاظ نہایت نرم ہیں لیکن جواب نہایت دندان شکن ہے۔ انھوں نے نہایت جامع الفاظ میں فرعون پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ رب ہونے کا حق دار تو وہی ہو سکتا ہے جس نے خلق کیا اور ہدایت بخشی، تمہارا حصہ نہ خلق میں نہ ہدایت میں تو تم رب ہونے کے مدعی کس طرح بن بیٹھے! یہی حقیقت دوسرے الفاظ میں یوں بیان ہوئی ہے۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى، (اپنے اس خدائے برتر کی تسبیح کرو جس نے خاکہ بنایا پھر اس کے نوک پلک درست کیے، اور جس نے صلاحیتیں ودیعت کیں پھر ان کے استعمال کا طریقہ بتایا)۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان پر خدا کی حجت قائم کر دینے کے لیے تو اس کی فطرت اور عقل کی رہنمائی ہی کافی

ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں اور اپنی کتابوں اور صحیفوں کے ذریعہ سے بھی انسان کی ہدایت کا انتظام کیا۔ بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ (القیٰمۃ: ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان اپنے اوپر خود گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذر تراشے)

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ (۵۱)

فرعون کا استہزاء

فرعون نے حضرت موسیٰ کی اس تذکیر پر سنجیدہ طریقہ سے غور کرنے کے بجائے باندازِ طنز و تحقیر یہ سوال کیا کہ اچھا، اگر رب کے پاس سے آئے ہو تو ذرا پچھلی قوموں کا حال سناؤ کہ ان کا کیا بنا اور وہ کس حال میں ہیں! مطلب یہ کہ جب وہاں سے آ رہے ہو تو وہاں کے سارے احوال سے تم تو واقف ہی ہو گے ذرا ہمیں بھی تو وہاں کا احوال سناؤ! یہ ملحوظ رہے کہ بر خود غلط اور متکبر لوگ اسی قسم کے غیر متعلق سوال چھیڑ کر سنجیدہ باتوں کو بے اثر بنانے اور اپنے اندھے بہرے معتقدین میں اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قَالَ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ ۖ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى (۵۲)

پُر وقار جواب اور تذکیر

فرعون کا سوال اگرچہ غیر متعلق بھی تھا اور تحقیر آمیز بھی لیکن حضرت موسیٰ نے نہ صرف جواب پُر وقار و سنجیدہ دیا بلکہ تذکیر و تنبیہ کا ایک اور نہایت پر حکمت درس بھی اس کو سنا دیا۔ فرمایا کہ ان قوموں کا سارا ریکارڈ میرے رب کے پاس ایک عظیم دفتر میں محفوظ ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ لفظ 'کتاب' کی تنکیر یہاں تفخیم شان پر دلیل ہے۔ یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ کوئی ایسی ویسی کتاب ہے بلکہ اس میں ایک ایک جزئیہ قلمبند ہے۔ جب یہ کھلے گی تو سب پکار اٹھیں گے کہ مَا لِهَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا (عجیب ہے یہ کتاب کہ کوئی چھوٹی یا بڑی بات ایسی نہیں رہ گئی ہے جس کو اس نے محفوظ نہ کر لیا ہو)

'لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى' یعنی میرے رب کا علم خطا اور نسیان سے بالکل پاک ہے۔ نہ وہ کوئی غلطی کرتا ہے نہ کسی چیز کو بھولتا ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی چیز اس کے علم میں آنے سے رہ جائے یا آئے تو غلط شکل میں آئے اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ علم میں آئی ہوئی کسی چیز کو بھول جائے۔ غور کیجیے، حضرت موسیٰ اس غیر متعلق اور طنزیہ سوال کا یہ جواب بھی دے سکتے تھے کہ مجھ سے کوئی فضول سوال نہ کرو۔ میں خدا کا رسول بن کر آیا ہوں، میں نے غیب دانی کا دعویٰ نہیں کیا ہے اور نہ یہ کہا ہے کہ تمام پچھلی قوموں کا ریکارڈ میرے پاس ہے۔ لیکن انھوں نے یہ جواب دینے کے بجائے نہایت بلیغ انداز میں اس کو یہ تنبیہ کی کہ ہر چند میں تو سارے غیب کا عالم نہیں لیکن میرا رب ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور اس کا علم ہر خطا و نسیان سے پاک ہے۔ اس کے پاس سارا ریکارڈ محفوظ ہے۔ جو قومیں صفحۂ ارض سے مٹ چکی ہیں ان کی نسبت بھی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اب وہ افسانۂ ماضی ہو چکی ہیں بلکہ سب کے نامۂ اعمال خدا کے بے خطا رجسٹر میں مرقوم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ایک چیز محفوظ ہے تو یہ صرف محفوظ رکھنے کے لیے تو محفوظ نہیں ہے بلکہ حساب و کتاب اور جزا و سزا کے لیے محفوظ ہے۔ یہ بات چونکہ بالکل ظاہر تھی اس وجہ سے حضرت موسیٰ

نے اس کا اظہار نہیں فرمایا لیکن ان کا انداز کلام خود اس کو نہایت خوبی کے ساتھ ظاہر کر رہا ہے۔ بعض مواقع میں کنایہ جتنا موثر ہوتا ہے صراحت اتنی موثر نہیں ہوتی۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَسَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ شَتَّىٰ ۝ كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ۝ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ۝ وَلَقَدْ أَرَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ (۵۳-۵۶)

ایک تضمین

قرینہ دلیل ہے کہ یہ چاروں آیتیں حضرت موسیٰؑ کے کلام کا حصہ نہیں ہیں بلکہ بطور تضمین، براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اس قسم کی تضمین کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کلام صرف ماضی کی ایک حکایت نہیں رہتا بلکہ وہ حال پر پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو جو جواب دیا اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ اپنی بات ملا کر قریش کے فراعنہ کو بھی سنا دی کہ یہ صرف ماضی کی حکایت نہیں ہے بلکہ تمہاری بھی حکایت ہے۔ تم بھی سن لو کہ کون تمہارا رب ہے اور کون تمہاری عبادت و اطاعت کا اصل حقدار ہے۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَسَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ شَتَّىٰ ۝ كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ۝

خدا کے رب ہونے کی دلیل اس کی ربوبیت کے پہلو سے

یہ خدا کے رب ہونے کی دلیل اس کی ربوبیت کے پہلو سے ہے یعنی جس ذات نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا، اس کے اندر خواہ کتنے پہاڑ بنائے، تو ان کے اندر تمہارے گزرنے کے لیے درے اور دروازے بھی بنا دیے۔ آسمان سے پانی برسایا اور اس سے قسم قسم کی نباتات اور طرح طرح کے درخت اُگا دیے جن میں سے ہر چیز زبان حال سے دعوت دے رہی ہے کہ خود بھی کھاؤ برتو اور اپنے چوپایوں کو بھی چراؤ چگاؤ۔ درحقیقت وہی ذات اس بات کی سزاوار ہے کہ اس کو رب مانو۔ فرمایا کہ پروردگاری کے اس اہتمام و انتظام کے اندر اہل عقل کے لیے بہت سی دلیلیں ہیں۔ یہاں ان دلیلوں کی وضاحت نہیں فرمائی ہے لیکن اس نظام ربوبیت کے اندر اس کے خالق کی قدرت، حکمت، رحمت کی جو دلیلیں ہیں وہ ان لوگوں سے مخفی نہیں ہو سکتیں جن کے اندر عقل ہے اور وہ اپنی عقل سے کام بھی لیتے ہیں۔ یہ نظام ربوبیت خدا کی توحید پر بھی شاہد ہے اور ایک روز جزا و سزا کی آمد پر بھی۔ ان دلائل کی وضاحت اس کتاب میں پیچھے بھی جگہ جگہ ہو چکی ہے اور آگے بھی آئے گی۔ یہاں مقصود صرف اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ رب مانے جانے کی حقدار تو وہی ذات ہو سکتی ہے جس نے پرورش کے یہ سارے سامان مہیا کیے ہیں۔ جب ان چیزوں کے مہیا کرنے میں کسی کو کوئی دخل نہیں ہے تو کوئی دوسرا رب ہونے کا حقدار کس طرح ہو سکتا ہے!

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ۔

ربوبیت سے معاد پر استدلال

یہ اسی ربوبیت سے قیامت پر استدلال فرمایا ہے کہ ہم نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا ہے اور پھر مرنے

کے بعد اسی میں تمھیں لوٹاتے ہیں اور پھر اسی سے تمھیں دوبارہ نکالیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس تمام اہتمام ربوبیت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں اس کائنات کے رب کا عدل ظہور میں آئے۔ جنھوں نے خدا کی نعمتوں کا حق ادا کیا ہو وہ اس کا صلہ پائیں اور جنھوں نے ان نعمتوں کو خدا کی زمین میں فساد کا ذریعہ بنایا ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔ فرمایا کہ یہ دوبارہ پیدا کر دینا ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں۔ جب ہم نے اسی سرزمین سے تم کو پیدا کیا اور ہمیں اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو پھر اسی سے دوبارہ پیدا کرنے میں کیوں مشکل پیش آئے گی جب کہ ہم تمھیں، تمھارے مرجانے کے بعد، اسی میں واپس بھی کر رہے ہیں!

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ؛

یعنی ہم نے فرعون کو اپنی ہر قسم کی نشانیاں دکھائیں لیکن وہ اس کے باوجود ہمارے رسولوں کی تکذیب پر اڑا ہی رہا اور ہماری ہدایت قبول کرنے سے انکار ہی کرتا رہا۔ یہاں نشانیوں سے مراد وہ تمام نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے بعد مصر میں، یکے بعد دیگرے، فرعون کو متنبہ کرنے کے لیے ظاہر ہوئیں لیکن فرعون آخر وقت تک اپنی ضد پر اڑا ہی رہا۔ ان نشانیوں کی تفصیل تورات میں موجود ہے۔ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم نے ان کا حوالہ دیا ہے۔

ان آیتوں پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ متکلم کے صیغے استعمال فرمائے اس وجہ سے یہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، حضرت موسیٰؑ کے کلام کا حصہ نہیں ہیں بلکہ تضمین ہیں۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى (۵۷)

فرعون کی ایک سیاسی چال

سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ اس دور میں فرعون اور اس کے ارکانِ حکومت کو بنی اسرائیل سے سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ ان کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ طاقتور ہو کر بیرونی دشمنوں کے آلۂ کار بن جائیں اور ایک دن فرعون اور اس کی قوم کو ملک سے بے دخل کر دیں۔ اسی خطرے کو پیشِ نظر رکھ کر اسرائیلی بچوں کے قتل کی مہم چلائی گئی لیکن یہ مہم ناکام رہی۔ بنی اسرائیل کی تعداد بڑھتی ہی گئی البتہ بنی اسرائیل کے اندر اس وقت تک کوئی ایسا لیڈر نہیں تھا جو ان کو منظم کر سکے۔ حضرت موسیٰؑ سے فرعون کو، جیسا کہ ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں، ان کے مدین جانے سے پہلے بھی خطرہ تھا کہ وہ اپنی قوم کو بیدار کر رہے ہیں وہ بنی اسرائیل کے مظلوموں کی حمایت و مدافعت میں ہمیشہ سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ چنانچہ اسی جرم میں ان کا داخلہ بھی شہر میں بند تھا اور بالآخر ایک قبطی کے قتل کے سبب سے انھیں مدین چلے جانا پڑا۔ اب جب وہ آئے اور اس شان کے ساتھ آئے کہ انھوں نے فرعون کے سامنے چند نہایت اہم مطالبات بھی نہایت دبدبہ کے ساتھ، رکھ دیے تو اس نے تاڑ لیا کہ اس کو جو خطرہ تھا اب وہ ایک حقیقت کی شکل میں سامنے آگیا ہے۔ چنانچہ اس نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ اے موسیٰؑ کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ اپنے اس جادو کے زور سے ہمیں ہمارے ملک سے بے دخل کر دو! ــــــ فرعون ایک نہایت گھاگ سیاسی تھا۔ اس نے ایک تو حضرت موسیٰؑ

کی اس دعوت کو ایک سیاسی خطرہ کا رنگ دے کر اپنی قوم کو مشتعل کرنے کی کوشش کی، دوسرے ان کے معجزات کو سحر سے تعبیر کر کے اس اثر کو مٹانے کی کوشش کی جو لوگوں پر ان کا پڑا ہوگا۔

فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهِ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهُ نَحْنُ وَلَا أَنتَ مَكَانًا سُوًى (۵۸)

'مَوْعِد' ظرف زمان اور ظرف مکان، یعنی وقت وعدہ اور مقام موعود، دونوں معنوں میں آتا ہے۔ اس آیت میں یہ دونوں معنوں کو محتمل ہے اور بعد والی آیت میں ظرف زمان کے معنی میں ہے۔ اس قسم کے ظرف کی بعض مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں۔

'سُوًى' کے معنی 'وسط' کے ہیں۔ 'مَكَانًا سُوًى' یعنی ایسی جگہ ہو جو ہمارے اور تمھارے دونوں کے لیے یکساں ہو۔ جہاں ہمارے آدمی بھی آسانی سے جمع ہو سکیں اور تمھارے آدمی بھی۔

فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو جواب دیا کہ اگر تم جادو کے بل پر ہمیں ہمارے ملک سے بے دخل کرنے اٹھے ہو تو ہمارے پاس جادو کی کمی نہیں ہے، ہم بھی ایسا ہی جادو دکھا سکتے ہیں تو تم ہمارے اور اپنے درمیان مقابلہ کے لیے کوئی ایسی جگہ متعین کرو جو فریقین کے لیے یکساں ہو اور دونوں طرف کے لوگ ایک معین وقت پر اس جگہ جمع ہوں، نہ تم اس کی خلاف ورزی کرو اور نہ ہم ـــــ فرعون کی اسکیم یہ تھی کہ مقابلہ کھلے میدان میں پوری پبلک کے سامنے ہو تاکہ سب کے سامنے حضرت موسیٰؑ کو شکست دے کر پہلے ہی مرحلہ میں ان کے قدم اس طرح اکھاڑ دیے جائیں کہ پھر وہ سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ وَأَن يُحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى (۵۹)

فرعون کے چیلنج کا جواب

حضرت موسیٰؑ کو چونکہ اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا اس وجہ سے انھوں نے بے دھڑک فرعون کا چیلنج منظور کر لیا۔ مصریوں کے ہاں سال میں دو تین بڑے میلے ہوتے تھے۔ انہی میں سے کسی میلے کی تاریخ سامنے تھی۔ انھوں نے اسی میلے کے دن کو نامزد کر دیا اور وقت بھی مقرر کر دیا کہ لوگ چاشت کے وقت جمع ہوں۔ میلہ کا دن لوگوں کی فرصت و فراغت کا دن ہوتا ہے اور کسی پبلک اجتماع کے لیے چاشت کا وقت سب سے زیادہ موزوں خیال کیا جاتا ہے۔ گویا حضرت موسیٰؑ نے بھی یہ چاہا کہ اسی مقابلے میں فرعون کے سحر و شعبدہ کا سارا طلسم باطل کر دیں۔

فَتَوَلَّىٰ فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهُ ثُمَّ أَتَىٰ (۶۰)

فرعون کی تیاریاں

'فَتَوَلَّىٰ' یعنی حضرت موسیٰؑ سے مذکورہ بالا قول و قرار کر کے فرعون وہاں سے ہٹا اور اپنی تدبیریں اکٹھی کرنے میں لگ گیا اور پھر پورے سر و سامان کے ساتھ میدان مقابلہ میں آیا۔ یہاں بات مختصر کر دی گئی ہے اس وجہ سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اس نے کیا تدبیریں کیں لیکن قرآن کے دوسرے مقامات میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ اس نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے یہ رائے دی کہ ان کا مقابلہ معمولی جادوگروں سے کرانے

میں شکست کا اندیشہ ہے اس وجہ سے مصلحت یہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں ہرکارے بھیج کر تمام ماہر جادوگر بلائے جائیں اور ان سے مقابلہ کرایا جائے۔ چنانچہ اسی تجویز پر عمل کیا گیا۔ مملکت کے ہر حصہ میں ہرکارے بھیجے گئے اور تمام بڑے بڑے جادوگر بلائے گئے۔

قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُم بِعَذَابٍ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرَىٰ (۶۱)

'سحت' کے اصل معنی ہڈی پر سے گوشت نوچنے کے ہیں۔ اسی سے 'اسحات' ہے جس کے معنی کسی چیز کا استیصال کر دینے اور اس کی جڑ اکھاڑ دینے کے ہیں۔

میدانِ مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ کا تقریر: یہ حضرت موسیٰؑ کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے میدانِ مقابلہ میں سب سے پہلے مجمع کے سامنے کی ہے۔ انھوں نے فرعون اور اس کے تمام ہم نواؤں اور جادوگروں کو مخاطب کر کے باندازِ تنبیہ فرمایا کہ تمہارا ناس ہو! تم ایک باطل کی حمایت میں حق کا مقابلہ کرنے آئے ہو۔ خدا پر جھوٹ تہمت نہ باندھو، کہ خدا تمہارا قلع قمع کر دے۔ یاد رکھو کہ جو خدا پر افترا کرتے ہیں وہ نامراد ہو کر رہتے ہیں۔

'افْتِرَاءٌ عَلَى اللّٰهِ' سے مراد، جیسا کہ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آئے ہیں، شرک ہے۔ شرک کو افتراء علی اللہ سے تعبیر کرنے کے وجوہ پر بھی ہم تفسیر سورۂ مائدہ اور سورۂ انعام میں گفتگو کر چکے ہیں۔ اوپر کی آیات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ فرعون سے مناظرہ اسی بات پر تھا کہ وہ مدعی رب ہونے کا تھا اور حضرت موسیٰؑ نے اس کے سامنے اس زعمِ باطل کی تردید فرمائی تھی کہ رب وہ ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور جس نے اس کی ہدایت اور پرورش کا انتظام فرمایا ہے نہ کہ تم جس کو نہ اس کے خلق میں کوئی دخل اور نہ اس کی تدبیر میں۔ اب وہی بات حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے تمام حامیوں کو مخاطب کر کے سنا دی کہ خدا کا کوئی شریک و سہیم نہیں اگر تم اپنے جی سے کسی اور کو شریک و سہیم بناتے ہو تو یہ تم اپنی من گھڑت بات خدا پر لگاتے ہو۔ خدا کی طرف سے اس کی کوئی سند تمہارے پاس نہیں ہے اور یہ درحقیقت تم خدا پر افترا کر رہے ہو جس کی پاداش میں تم مستحق ہو کہ خدا تم پر ایک عذاب بھیج کر تمھیں فنا کر دے۔ جو لوگ اللہ پر افترا کرتے ہیں وہ بالآخر نامراد ہو کر رہتے ہیں۔

فَتَنَازَعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ وَأَسَرُّوا النَّجْوَىٰ (۶۲)

اعیانِ فرعون کی خفیہ میٹنگ: 'تنازع فی الحدیث' اور 'تنازع امر' کا محاورہ عربی میں آپس میں تبادلۂ خیالات و آراء کے لیے آتا ہے یعنی جب تمام اعیانِ حکومت اور سارے ساحر جمع ہو گئے تو ان کی آپس میں ایک خفیہ میٹنگ ہوئی۔ آگے کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میٹنگ میں نہایت رازدارانہ طور پر فرعون کی طرف سے ساحروں کے دل میں یہ بات اتارنے کی کوشش کی گئی کہ موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں نہایت ماہر جادوگر ہیں اور ان کی کوشش یہ ہے کہ یہ اپنے جادو کے زور سے بنی اسرائیل کو منظم کر کے ہمیں اس ملک سے بے دخل کریں اور ہماری تمام تہذیب و ترقی کو جو ہم نے پروان چڑھائی ہے، مٹا کے رکھ دیں تو یہ موقع غفلت کا نہیں ہے بلکہ متحدہ طاقت سے اس خطرے کا مقابلہ کرو اور یاد رکھو کہ جو آج کے معرکے میں جیتا وہی فتحمند رہے گا۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى (۶۳)

یہ 'اِنْ' مخففہ 'اِنَّ' کے معنی میں ہے اور اس کے بعد جو 'لَ' ہے یہ اس کا قرینہ ہے۔ 'مُثْلٰی' 'اَمْثَل' کی مؤنث ہے۔ اس کے معنی اعلیٰ، عمدہ اور برتر کے ہیں۔

یہ وہ بات نقل ہوئی ہے جو خفیہ مجلس میں فرعون اور اس کے اعیان نے جادوگروں کو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کے خلاف بھڑکانے کے لیے کی۔

پہلی بات تو انھوں نے جادوگروں کے اندر پیشہ ورانہ رقابت کا جذبہ بھڑکانے کے لیے یہ کہی کہ یہ دونوں ماہر جادوگر ہیں۔ مقصد یہ کہ یہ اسی ہتھیار کے ساتھ میدان میں آئے ہیں جو تمھارے پاس بھی ہے تو اگر تم نے ان کے مقابلہ میں کمزوری دکھائی تو سب سے زیادہ ہوا خیزی تمھاری ہی ہوگی۔

دوسری بات یہ سمجھائی کہ یہ اپنے جادو کے زور سے ہم پر اپنا رعب جمانا اور بنی اسرائیل کو منظم کر کے تمہیں، تمھارے ملک سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہی کہ اس وقت تمھاری نہایت اعلیٰ اور شاندار تہذیب، جو تم نے اتنی محنت سے فروغ دی ہے، سخت خطرے میں ہے۔ اگر موسیٰؑ و ہارونؑ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگئے تو اس اعلیٰ تہذیب و تمدن کا یہ یک قلم خاتمہ کر دیں گے۔

ان باتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ارباب اقتدار اہل حق کے مقابلہ میں ہمیشہ اسی طرح کے حربے استعمال کرتے رہے ہیں جس قسم کے حربے فرعون اور اس کے اعیان نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ 'تمھارا ملک' اور 'تمھاری تہذیب' کے الفاظ میں خطاب محض عوام فریبی کے لیے ہے ورنہ فرعونی حکومت اور فرعونی تہذیب میں ایک مخصوص ارسٹوکریسی کے سوا دوسروں کی حیثیت صرف غلاموں اور قلیوں کی تھی لیکن ارباب اقتدار جب عوام کو اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں تو اسی طرح ان کو نشہ پلاتے اور بیوقوف بناتے ہیں۔

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى (۶۴)

یہ وہ مشورہ ہے جو غور و فکر کے بعد ساحروں کو دیا گیا کہ چونکہ مرحلہ بہت نازک اور مقابلہ نہایت ماہر جادوگروں سے ہے اس وجہ سے سب ساحر مل کر اپنی مجتمعہ طاقت سے ایک متحدہ محاذ بنا کر مقابلہ کریں۔ اس مشورے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی ہوگی کہ جس طرح سیاسی پارٹیوں میں باہم رقابتیں ہوتی ہیں، ہر ایک کی خواہش اور کوشش صرف اپنے مفاد کے لیے ہوتی ہے، اسی طرح پیشہ ور جماعتوں میں بھی آپس میں چشمک ہوتی ہے اور ہر ایک صرف اپنی برتری چاہتی ہے۔ فرعون اور اس کے اعیان کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ساحروں میں اس

طرح کا انتشار رہا تو شکست ہو جائے گی اس وجہ سے انھوں نے ان کو مشورہ دیا کہ الگ الگ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے بجائے سب مل کر متحدہ طاقت کے ساتھ مقابلہ کرو۔

'وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى'۔ یہ اس دن کی نزاکت اور اہمیت کی طرف اشارہ ہے کہ آج کا دن فیصلہ کن ہے۔ اگر بازی ہماری رہی تو مستقبل کی کامیابی ہمارے لیے ہے اور اگر ہم ہار گئے تو پھر وہ تمام خطرات لازماً پیش آ کے رہیں گے جو موسیٰ اور ہارون کی کامیابی کی صورت میں متصور ہیں۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى (۶۵)

حق اور باطل میدانِ مقابلہ میں

اس مشورت کے بعد بجا دیر مذکور ہوئی ساحر اور حضرت موسیٰ اپنی اپنی جماعتوں کے ساتھ میدانِ مقابلہ میں اترے۔ ساحروں نے آمنے سامنے ہوتے ہی اپنے پیشہ ورانہ اخلاق کے مطابق حضرت موسیٰ سے کہا کہ یا تو پہلے تم اپنا پانسہ پھینکو یا پھر ہمیں اپنا ہنر دکھاتے ہیں۔ ان کے اس قول سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اگرچہ انھوں نے موقع پہل کرنے کا حضرت موسیٰ کو بظاہر دیا لیکن دبی زبان سے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا کہ وہ پہل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس طرح کے مقابلوں میں تقدیم و تاخیر کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر فریق کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے پہلے ہی کرتب سے حاضرین کو اس طرح مسحور کرے کہ دوسرے فریق کا حوصلہ پست ہو جائے۔

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (۶۲)

ساحروں کا کرتب

حضرت موسیٰ کو چونکہ اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا، اللہ تعالیٰ نے خود ان کو یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ تم ہر میدان میں کامیاب و فتحمند ہو گے اس وجہ سے انھوں نے خود پہل کرنے کے بجائے پہلے انہی کو موقع دیا کہ تمہی اپنا ہنر دکھاؤ۔ وہ تو پہلے ہی سے تیار تھے چنانچہ حضرت موسیٰ کے یہ کہتے ہی انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر ڈال دیں اور ان کے جادو کے سبب سے حضرت موسیٰ کو ایسا خیال ہوا کہ گویا وہ دوڑ رہی ہیں۔ چونکہ ساحروں کے علم میں یہ بات تھی کہ حضرت موسیٰ اپنی لٹھیا کو سانپ بنا دیتے ہیں اس وجہ سے انھوں نے اسی قسم کے جادو سے ان کو زک دینے کی کوشش کی اور اس پر اتنا اضافہ کر دیا کہ ان کی رسیاں بھی سانپوں کی طرح رینگنے لگیں۔ اپنے خیال میں تو انھوں نے حضرت موسیٰ کو شکست دینے کا پورا اہتمام کیا تھا اس لیے کہ حضرت موسیٰ کی ایک ہی لٹھیا سانپ بنتی تھی اور ان کی بہت سی لاٹھیاں سانپ بن گئیں اور مزید برآں انھوں نے رسیوں کو بھی سانپ بنا کر دکھا دیا لیکن یہ سب کچھ، جیسا کہ لفظ 'يُخَيَّلُ' سے واضح ہے، محض حاضرین کی قوتِ متخیلہ پر جادو کے ایک فوری اثر کا کرشمہ تھا۔ جادو سے کسی شے کی حقیقت و ماہیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی بلکہ محض دیکھنے والوں کے ذہن و خیال پر اس کا ایک فوری اثر پڑتا ہے اور اگر حقیقت سامنے آ جائے تو فوراً ہی اس کا طلسم باطل بھی ہو جاتا ہے۔

فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى (۶۷)

یہ منظر دیکھ کر فطری طور پر حضرت موسیٰ کے دل میں ذرا اندیشہ پیدا ہوا اس لیے کہ اب تک ان کے سامنے ابھی

کا اصلی کمال ظاہر نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ مقابلہ بہر حال سخت ہے۔ ہر چند اللہ تعالیٰ کے وعدے کی بنا پر ان کو یہ اطمینان تھا کہ فتح انہی کی ہوگی لیکن جب صورتِ حال توقع سے زیادہ پیچیدہ سامنے آجائے تو دل میں وقتی طور پر کچھ نہ کچھ ہراس پیدا ہوتا ہی ہے۔ اسی طرح کا ایک وقتی ہراس حضرت موسیٰؑ کے دل میں بھی پیدا ہوا۔ لفظ 'خِیفَۃً' کی تنکیر سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ خوف محض معمولی اور وقتی تھا۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی (۶۸)

حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کی اطمینان دہانی

حضرت موسیٰؑ کا یہ ہراس دور کرنے کے لیے فوراً یہ بشارت نازل ہوئی کہ تم ذرہ برابر بھی اندیشہ نہ کرو۔ انھوں نے کتنا ہی بڑا جادو دکھایا ہو لیکن غالب اور سربلند تمہی رہوگے۔

وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی (۶۹)

معجزہ اور سحر میں فرق

ساتھ ہی یہ ہدایت ہوئی کہ یہ تمہارے ہاتھ میں جو لٹھیا ہے اس کو تم بھی ڈال دو۔ یہ ان کی اس ساری شعبدہ گری کو ہڑپ کر جائے گی۔ انھوں نے جو کچھ دکھایا ہے یہ محض ایک ساحر کا کرتب ہے اور ساحر جہاں بھی جائے کامیاب نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہاں اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ ساحر کا سحر حق کے مقابل میں کبھی نہیں ٹکتا لیکن بات ایک کلیہ کے رنگ میں کہی گئی ہے کہ ساحر کہیں بھی کامیاب نہیں ہوتا اس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔ سحر کا تعلق تمام تر فریب نظر اور دیکھنے والے کی قوت متخیلہ سے ہے، اصل حقیقت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، پھر اس پیشہ کے لوگ ہمیشہ سوسائٹی کے اراذل و انفار سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں جو چند دن اپنی شعبدہ بازیوں سے کچھ سادہ لوحوں کو بیوقوف تو بنا لیتے ہیں لیکن سوسائٹی کی تعمیر و اصلاح میں کوئی کردار ان کا نہ ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ برعکس اس کے حضرات انبیاء سے جو معجزے صادر ہوتے ہیں ان کے اندر ایک سطوت و جلالت ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا صدور ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہوتا ہے جو انسانیت کے گلِ سرسبد ہوتے ہیں جن کے دشمن بھی ان کے پاکیزہ اخلاق و کردار کی گواہی دیتے ہیں، جن کے ساتھ ایک عظیم دعوت ہوتی ہے جس کی حقانیت کی شہادت اس کے مخالفوں کے دل بھی دیتے ہیں۔ یہ لوگ جب دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو تاریخ کا ورق الٹ کر رخصت ہوتے ہیں۔ ان کی دعوت سے تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور دنیا ایک نیا جنم لیتی ہے۔ بتائیے کون ساحر ہے جس کا انسانی زندگی کے کسی شعبہ میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کارنامہ بھی ہو! یہاں وہ حقیقت بھی پیش نظر رکھیے جس کی طرف ہم پیچھے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ ہمارے متکلمین نے معجزہ اور سحر میں منطق کے ذریعہ سے جو فرق کرنے کی کوشش کی ہے یہ ایک سعی لاحاصل ہے۔ ماہِ نخشب اور خورشید جہاں تاب کے درمیان فرق منطق کے ذریعہ سے نہیں معلوم کیا جاتا! اس کا فیصلہ خود دیکھنے والے کر لیتے ہیں بشرطیکہ ان کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہوں۔

فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰی (۷۰)

سحر زدوں کا

یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے اپنی لٹھیا زمین پر ڈال دی اور اس نے ایک اژدھے کی طرح جادوگروں کے تمام سانپوں سنپولیوں کو نگلنا شروع کر دیا۔ جادوگروں نے یہ منظر جو دیکھا تو ان کی آنکھیں

کھل گئیں۔ جادوگروں میں اگر کوئی رمق اعترافِ حق کی ہو تو وہ اپنے شعبدہ اور نبی کے معجزہ میں سب سے زیادہ امتیاز کرنے والا ہو سکتا ہے۔ ان ساحروں کے اندر حق شناسی کی رمق تھی۔ آگے آیت ٧٢، سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جادوگر یہ احساس پہلے سے رکھتے تھے کہ حضرت موسیٰ جو چیز پیش کر رہے ہیں جادو نہیں ہے چنانچہ وہ ان کے مقابل میں آنے سے کتراتے بھی تھے لیکن انھیں حکومت کے کارندوں نے سیاسی خطرات کا ہوا کھڑا کر کے آمادہ کیا کہ وہ ان کا مقابلہ کریں۔ وہ کہنے سننے سے مقابلہ کے لیے آتو گئے لیکن جب انھوں نے اپنے شعبدہ کے مقابل میں حضرت موسیٰ کا اعجاز دیکھا تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ بے تحاشا سجدے میں گر پڑے۔ اس طرح سجدے میں گر پڑنا اس زمانے میں کسی کے کمالِ فن کے اعتراف کا ایک طریقہ تھا لیکن ان جادوگروں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ بھرے مجمع میں یہ اعلان بھی کر دیا کہ ہم ہارونؑ اور موسیٰؑ کے رب پر ایمان لائے۔ غور کیجیے ساری پبلک کے سامنے ساحروں کے اس اعترافِ شکست اور اس اعلانِ ایمان کے بعد فرعون اور اس کے درباریوں پر کیا گزری ہوگی! لیکن فرعون نہایت کائیاں سیاسی تھا اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے فوراً ایک نیا شغلہ چھوڑا۔

قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَهٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَكُمۡ ۚ اِنَّهٗ لَـكَبِيۡرُكُمُ الَّذِىۡ عَلَّمَكُمُ السِّحۡرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمۡ فِىۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ وَلَتَعۡلَمُنَّ اَيُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبۡقٰى (٧١)

فرعون کا سیاسی شغلہ

اس نے ساحروں سے کہا تم نے بدون میری اجازت کے موسیٰ کو سچا مان لیا۔ اب میں سمجھ گیا کہ درحقیقت وہی تمھارا گرو ہے جس نے تمھیں جادو کی تعلیم دی ہے اور تم نے باہمی سازش سے یہ فتح و شکست کا ڈرامہ دکھایا ہے تاکہ حکومت کی ہوا خیزی ہو اور تم موسیٰ کے اقتدار کے لیے راہ ہموار کرو۔ یہ حکومت کے خلاف تم نے سازش کی ہے اس وجہ سے میں تمھیں وہ سزا دوں گا جو ملک کے باغیوں کو دی جاتی ہے۔ میں پہلے تمھارے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کٹواؤں گا اور پھر عبرتِ عام کے لیے تمھیں کھجور کے تنوں پر سولی کے لیے لٹکاؤں گا۔ اس وقت تمھیں اندازہ ہوگا کہ میری سزا زیادہ سخت اور زیادہ پائیدار ہوتی ہے یا تمھارے گرو کی۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ ہزیمت نہایت رسوا کن تھی لیکن فرعون نے اپنی کیادی سے اپنے ساتھیوں کا حوصلہ قائم رکھنے کے لیے ایک بات بنا ہی لی۔

'قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَهٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَكُمۡ' اوپر ساحروں کا جو قول نقل ہوا ہے اس سے واضح ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ کے صرف ایک سچے آدمی ہونے ہی کا اقرار نہیں کیا بلکہ نہایت تصریح کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ ہم ہارونؑ اور موسیٰؑ کے رب پر ایمان لائے۔ اس اعلان کے اندر ظاہر ہے کہ فرعون کے رب ہونے کا انکار بھی مضمر تھا جس کی زد فرعون کی خدائی اور اس کی بادشاہی دونوں ہی چیزوں پر پڑتی تھی اس وجہ سے اس کے لیے یہ مسئلہ محض دین و عقیدہ کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ بالواسطہ اس کے اقتدار کو ایک چیلنج تھا۔ بھلا اس جسارت کو وہ اپنی حکومت میں کس طرح گوارا کر سکتا تھا!

'اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ'۔ کبیر سے مراد استاد اور گرو کے ہیں۔ فرعون نے اپنی ذہانت سے عوام فریبی کے لیے یہ شگوفہ چھوڑا کہ اصل میں یہی شخص (حضرت موسیٰؑ) تمہارا گرو ہے، اسی نے تمہیں جادو کا یہ فن سکھایا ہے۔ تمہاری آپس میں ملی بھگت تھی۔ تم نے یہ طے کر رکھا تھا کہ تم اس طرح کھلے میدان میں اپنے اس گرو کے سامنے اپنی شکست مان لو گے جس سے اس کی دھاک تمام لوگوں پر بیٹھ جائے گی اور پھر تم حکومت کے خلاف جو سازش کرنا چاہتے ہو اس میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ ہر چند یہ بات بالکل بے تکی تھی۔ فرعون خود اپنے ہی منتخب کیے ہوئے میدان میں خود اپنی ہی لائی ہوئی فوج سے ہارا تھا لیکن اس شکست کا اثر مٹانے کے لیے اس کو کوئی نہ کوئی بات تو آخر بنانی تھی چنانچہ اس نے بنائی اور داد دینی چاہیے کہ اس نے بڑی سیاسی ذہانت کا ثبوت دیا اور کیا عجب کہ اس طرح وہ بہتوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب بھی ہو گیا ہو لیکن حق کو اس قسم کی پُرفریب باتوں سے نہیں دبایا جا سکتا۔

'فَلَاُقَطِّعَنَّ ... الایۃ' جب ساحروں کو حکومت کے خلاف سازش کا مجرم قرار دیا گیا تو ان کے لیے اس سزا کا بھی اعلان کر دیا گیا جو اس زمانے میں حکومت کے خلاف سازش کرنے والوں کو دی جاتی تھی یعنی ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے جائیں اور ان کو برسرِ عام سولی دی جائے تاکہ دوسروں کو بھی عبرت حاصل ہو۔ 'فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ' سے مقصود اس کے برسرِ عام ہونے کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

ساحروں کا ایک وہم

'وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى' یعنی تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر تم نے اپنے گرو کی مرضی کے خلاف کیا تو وہ اپنے جادو کے زور سے تم کو کسی آفت میں مبتلا کر دے گا اس وجہ سے اس کے آلۂ کار بنے ہوئے ہو۔ لیکن جب میری سزا کا مزا چکھو گے تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میری سزا تمہارے گرو کی سزا کے مقابل میں کہیں زیادہ سخت اور پائیدار ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جادوگروں میں یہ وہم پایا جاتا ہے کہ اگر کوئی بات گرو کی مرضی کے خلاف کی جائے اور وہ کسی شاگرد سے ناراض ہو جائے تو اس شاگرد کو وہ اپنے جادو کے زور سے کسی بہت بڑی آفت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ فرعون نے اسی وہم کو سامنے رکھ کر جادوگروں کو متنبہ کیا کہ تم اپنے گرو کی سزا سے ڈرتے ہو لیکن میری سزا اس کی سزا سے کہیں زیادہ سخت اور عبرت انگیز ہو گی۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (٧٢)

ایمان کا کرشمہ

فرعون نے دھمکی تو بڑی سخت سنائی اور اسے توقع رہی ہو گی کہ وہ اس دھمکی سے ساحروں کو مرعوب کر لے گا لیکن اب اس کا سابقہ پیشہ ور جادوگروں سے نہیں بلکہ راسخ الایمان مومنوں سے تھا۔ انھوں نے فرعون کی یہ دھمکی سن کر کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر صاف سنا دیا کہ تمہیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو اب ہم ان روشن نشانیوں پر جو ہمارے مشاہدے میں آ چکی ہیں اور اپنے اس خالق پر جس نے ہمیں وجود بخشا ہے تمہیں ترجیح دینے والے نہیں ہیں۔ تم اگر کچھ کر سکتے ہو تو اسی دنیا کی زندگی کا کر سکتے ہو اور ہمیں اس دنیا کی زندگی کی کوئی پروا نہیں ہے ـــ دیکھا آپ نے

ایمان کا کرشمہ! یہ وہی جادوگر ہیں جن کا حال قرآن میں دوسری جگہ یہ بیان ہوا ہے کہ جب وہ مقابلہ کے لیے بلائے گئے تو انھوں نے بڑی لجاجت کے ساتھ فرعون سے اپنی کامیابی کی صورت میں انعام کی درخواست کی یا اب ایمان کے نور نے ان کے دلوں کو اس طرح منور کر دیا کہ خدا اور آخرت کے سوا اس دنیا کی کسی چیز کی ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت باقی نہیں رہی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کی راہ میں اپنی زندگی بھی قربان کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔

إِنَّآ ءَامَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطَٰيَٰنَا وَمَآ أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ ٱلسِّحْرِ ۗ وَٱللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰٓ (۷۳)

انھوں نے مزید فرمایا کہ ہم اپنے رب پر اس امید کے ساتھ ایمان لائے ہیں کہ وہ ہماری ان تمام غلطیوں کو بھی معاف فرمائے گا جو ہم سے صادر ہوئی ہیں اور اس سحر سے بھی درگزر فرمائے گا جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا اور اللہ ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔

'وَمَآ أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ ٱلسِّحْرِ' سے صاف واضح ہے کہ یہ لوگ حضرت موسیٰ کے مقابلہ کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ جانتے تھے کہ حضرت موسیٰ جو چیز پیش کر رہے ہیں یہ جادو نہیں ہے، کچھ اور ہی شے ہے لیکن حکومت کے دباؤ سے انھیں آنا پڑا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر حقیقت اس طرح واضح کر دی کہ ان کا سینہ اس کے اعتراف و اعلان کے لیے کھل گیا۔

'وَٱللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰٓ' یہ فرعون کی بات 'أَيُّنَآ أَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْقَىٰ' کا جواب ہے جو بالکل صحیح بھی ہے اور بھرپور بھی۔ انھوں نے فرمایا کہ تم ہمیں اپنی سزا سے ڈراتے ہو کہ وہ نہایت سخت اور پائیدار ہوگی لیکن ہم نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپنے رب کو اختیار کیا ہے جو تمام دنیا و مافیہا سے بہتر بھی ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی۔

إِنَّهُۥ مَن يَأْتِ رَبَّهُۥ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُۥ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ (۷۴)

ایک تضمین　یہ اور اس کے بعد کی دو آیتیں میرے نزدیک بطور تضمین ہیں۔ جس طرح اوپر آیات ۵۳-۵۶ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی تقریر کے ساتھ اپنی بات ملا کر اس کو مکمل اور مطابقِ حال کر دیا ہے اسی طرح ان لوگوں کے جواب کے ساتھ اپنی بات ملا کر اس کو مکمل اور مطابقِ حال کر دیا ہے۔ ان آیات کو تضمین ماننے کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ان میں جزاء و سزا اور آخرت کا حال جن الفاظ میں بیان ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کے شایانِ شان ہیں اور ان کا انداز اوپر کی آیات کے انداز سے بالکل مختلف ہے۔ فرمایا کہ جو اپنے رب کے حضور مجرم کی حیثیت سے حاضر ہوگا تو اس کے لیے دوزخ ہے جس میں نہ وہ مرے گا اور نہ جیے گا۔ مجرم کی حیثیت سے یعنی جس نے خدا کی نافرمانیاں کیں اور اس کو توبہ و اصلاح کی توفیق نہ ہوئی۔ 'لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ' اس عذاب کی شدت، اس کے خلود اور اس کی بے پناہی کی ایسی تعبیر ہے کہ اپنے لفظوں میں اس کو واضح کرنا ممکن نہیں، بڑی سے بڑی مصیبت بھی ہو تو اس سے نجات کے لیے موت بہرحال ایک آخری چارۂ کار رہے

لیکن جہاں موت بھی نہ ہو اور موت کے مصائب ہر طرف سے پیچھے پڑے ہوں وہاں کوئی کدھر جائے گا۔

وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى (۷۵)

یہ ان کے مقابل میں خائب المرام گروہ کا بیان ہوا کہ البتہ جو لوگ ایمان کے ساتھ خدا کے پاس حاضر ہوں گے اور اس کے ساتھ انھوں نے نیک اعمال بھی کیے ہوں گے ان کے لیے مراتبِ عالیہ ہیں۔

ایمان کی مقبولیت کے لیے اعمالِ صالحہ شرط ہیں

'مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ' کے اسلوبِ بیان پر غور کیجیے تو یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ایمان وہی ہے جس کے ساتھ عمل صالح بھی پایا جاتا ہے۔ جو ایمان عمل صالح سے خالی ہو اس کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔ ایسا ایمان ایک ٹھونٹھ درخت کے مانند ہے جو برگ و بار سے بالکل خالی ہے۔ جس درخت نے دنیا میں اپنے برگ و بار پیدا نہیں کیے آخر وہ آخرت میں کس طرح ثمربار ہو جائے گا! خدا کے ہاں اعمال کی مقبولیت کے لیے جس طرح ایمان شرط ہے اسی طرح ایمان کی مقبولیت کے لیے اعمالِ صالحہ شرط ہیں۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى (۷۶)

جنت ایک سستی چیز نہیں

یہ وضاحت ہے ان مراتبِ عالیہ کی یعنی ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ فرمایا کہ 'وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى' یہ صلہ ہے ان لوگوں کا جو اپنے ظاہر و باطن اور اپنے عقیدہ و عمل کو پاکیزہ بنائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جھوٹی تمناؤں سے ملنے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے حق دار وہی ٹھہریں گے جو اس کے حاصل کرنے کے لیے اپنے نفس کو ہر قسم کی آلائشوں سے، خواہ وہ فکری و نظری ہوں یا عملی و اخلاقی، پاک کرنے کی جدوجہد کریں گے۔ اس راہ میں آدمی کو جو ٹھوکریں لگتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے تدارک کی تدبیریں بھی اپنی اس کتاب میں بتا دی ہیں اور انسان اپنی کمزوریوں کی وجہ سے جن رعایتوں کا محتاج ہے وہ بھی اس کو بخشی گئی ہیں۔ ان چیزوں میں سے کسی چیز کا انکار دین میں غلو اور تشدد ہے لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جن لوگوں نے محض اپنے جی سے عمل کی اہمیت گھٹا کر اباحت کے دروازے کھول دیے ہیں، خواہ وہ ہمارے پرانے متکلمین ہوں یا نئے متکلمین، انھوں نے اپنی فیاضی سے جنت کو ایک بہت سستی چیز تو ضرور بنا دیا ہے اور اس سے ہم جیسے بے عملوں کو بڑی تسلی مل جاتی ہے لیکن قرآن میں ان کے اس نظریے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اور جنت کی کنجی بہرحال اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ اس نے ان متکلمین کے ہاتھ میں نہیں پکڑا دی ہے اس وجہ سے سلامتی اسی میں ہے کہ اس قسم کی جھوٹی آرزوؤں سے اپنے آپ کو محفوظ ہی رکھیے۔ قرآن نے ان کو یہود کی امانی باطلہ میں سے شمار کیا ہے اور ان کی تفصیل سورہ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى (۷۷)

'فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا' 'ضرب طریق' کے معنی عربی محاورہ کے لحاظ سے تو، جیسا کہ صاحبِ کشاف

نے تصریح کی ہے، راستہ بنا لینے کے ہیں لیکن یہاں اس لفظ کے استعمال میں ایک لطیف کنایہ حضرت موسیٰ کے عصا کی طرف بھی ہے اس لیے کہ اس راستہ کے بنانے میں حضرت موسیٰ کے عصا کو بھی دخل تھا اور عصا کی مناسبت لفظ 'ضرب' کے ساتھ واضح ہے۔

حذف کی ایک مثال

'لَا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى' میں 'تَخْشٰى' کا مفعول تقابل کے اصول پر میرے نزدیک محذوف ہے۔ اس محذوف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی۔ 'لَا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى غَرَقًا' یعنی نہ تم کو فرعون کی طرف سے پا لیے جانے کا کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ سمندر میں ڈوبنے کا کوئی خطرہ ہوگا۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔ میں نے ترجمہ میں اس حذف کو کھول دیا ہے۔

حضرت موسیٰ کو ہجرت کا حکم

یہاں حضرت موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کا ایک طویل حصہ حذف کر دیا گیا ہے جس پر سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے فرعون سے یہ مطالبہ جو کیا کہ میرے ساتھ بنی اسرائیل کو عید قربانی منانے کے لیے جانے دے تو فرعون نے اس مطالبہ کو ماننے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اس ظلم و تشدد میں اس نے مزید اضافہ کر دیا جو اب تک اس کے اور اس کے کارندوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر ہو رہا تھا۔ اس دوران میں یکے بعد دیگرے اللہ تعالیٰ نے مصر پر مختلف آفتیں نازل کیں کہ فرعون کی آنکھیں کھلیں لیکن جب کوئی مصیبت آتی تب تو وہ حضرت موسیٰ کی خوشامدیں کرتا کہ اگر تمہاری دعا سے یہ آفت ٹل گئی تو میں بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ جانے دوں گا لیکن حضرت موسیٰ کی دعا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جب آفت ٹل جاتی تو پھر اس کی سرکشی عود کر آتی اور وہ اپنے عہد سے مکر جاتا۔ اسی نزاع میں کئی سال بیت گئے۔ اس دوران میں حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کی قوم پر اپنا وہ فرض رسالت اچھی طرح ادا کر دیا جو ایک رسول کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتا تھا۔ بالآخر جب فرعون اور اس کی قوم پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو گئی تب حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ وہ بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے ہجرت کر جائیں۔

اب تک تو حضرت موسیٰ کا مطالبہ، جیسا کہ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں صرف یہ تھا کہ ان کو بنی اسرائیل کے ساتھ تین دن کی راہ بیابان میں قربانی کے لیے جانے کی اجازت، دی جائے[1] لیکن اب چونکہ وہ فرعون، اور اس کی قوم پر اتمام حجت کر چکے تھے اس وجہ سے سنتِ الٰہی کے مطابق ان کو اس علاقے سے ہجرت کا حکم ہو گیا۔ ارشاد ہوا کہ راتوں رات میرے بندوں کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ۔ 'میرے بندوں' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے تھے۔ ان میں عظیم اکثریت تو بنی اسرائیل ہی کی تھی لیکن ایک مختصر جماعت ان میں ان لوگوں کی بھی شامل تھی جو مصریوں میں سے ایمان لائے تھے۔ اوپر جن جادوگروں کے ایمان لانے کا ذکر ہے قرائن شاہد ہیں کہ وہ بنی اسرائیل میں سے نہیں بلکہ مصریوں میں سے تھے۔ لفظ 'عِبَادِیْ' ان تمام لوگوں پر مشتمل ہے جو حضرت موسیٰ پر ایمان لائے، عام اس سے کہ وہ مصری تھے یا اسرائیلی۔ قرآن میں ایک مومن آلِ فرعون

---

[1] استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو قربانی کے لیے مکہ لے جانا چاہتے تھے۔

کا ذکر بھی خاص طور پر ہوا ہے۔

قدرتِ خداوندی کا کرشمہ

'فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ' 'بحر' سے مراد یہاں بحر احمر کی شمالی خلیج ہے۔ ہدایت ہوئی کہ پوری جماعت کے ساتھ ساحل سمندر پر پہنچو اور وہاں اپنی لٹھیا سمندر پر مار کر اس کے اندر سے لوگوں کے لیے خشک راہ پیدا کر لو۔ یہ اسلوب بیان اس اختیار کو ظاہر کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے معجزے کے ذریعے سے حضرت موسیٰ کو بخشا کہ تم اس کے اشارے سے سمندر کو حکم دو گے تو وہ تمہارے گزرنے کے لیے خشک راستہ نکال دے گا۔

'الْبَحْرِ' پر الف لام اس بات کا قرینہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو متعین طور پر اس جگہ کی نشان دہی کر دی گئی تھی جہاں ان کو پہنچنا تھا۔ اس واقعہ کے متعلق تورات میں جو تفصیل آئی ہے وہ ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ اس موقع پر شانِ خداوندی کس شکل میں ظاہر ہوئی۔ کتاب خروج باب ۱۴ ملاحظہ ہو۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے؟ بنی اسرائیل سے کہہ کہ وہ آگے بڑھیں اور تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اس کو دو حصے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے۔ ....

..... پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے دہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا۔ اور مصریوں نے تعاقب کیا۔" (۱۴: ۱۵-۲۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معجزہ پوربی ہوا کے تصرف سے ظہور میں آیا۔ اس سے خلیج کا پانی اس طرح دو حصوں میں منقسم ہو گیا کہ بنی اسرائیل کے گزرنے کے لیے خشک راستہ پیدا ہو گیا۔

فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ (۷۸)

فرعون اور اس کی فوجوں کی غرقابی

'فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ' عربی میں یہ اسلوب بیان کسی چیز کی ایسی ہولناکی یا عظمت کے اظہار کے لیے آتا ہے جس کو الفاظ تعبیر کرنے سے قاصر ہوں۔

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے معجزات سے تنگ آ کر اگرچہ فرعون نے ان کو جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن ان کی روانگی کے بعد اس کی رائے بدل گئی اور اس نے فوج کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور بالآخر اپنی فوج سمیت سمندر کی بے پناہ موجوں کی لپیٹ میں آ گیا اس کی تفصیل تورات میں یوں آئی ہے۔

"جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیے تو فرعون اور اس کے خادموں کا دل ان لوگوں کی طرف سے پھر گیا اور وہ کہنے لگے کہ یہ ہم نے کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر ان کو جانے دیا۔ تب اس نے اپنا رتھ تیار کروایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لیا اور اس نے چھ سو چنے ہوئے رتھ بلکہ مصر کے سب رتھ لیے اور ان سبھوں میں سرداروں کو بٹھایا۔" خروج باب ۱۴: ۵-۷

اس کے بعد ان کے غرق ہونے کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا تاکہ پانی مصریوں اور ان کے رتھوں اور سواروں پر پھر بہنے لگے اور موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آگیا اور مصری الٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے مصریوں کو سمندر کے بیچ ہی میں تہ و بالا کر دیا اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا، غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا۔ پر بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی ان کے دہنے اور بائیں ہاتھ دیوار کی طرح رہا۔" خروج باب ۱۴: ۲۶-۲۹

وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ (۷۹)

قائد کی اصل ذمہ داری

یہ فرعون اور اس کی تباہ کن قیادت پر اظہار افسوس ہے کہ اس نے اپنی گمراہ کن روش کے سبب سے اپنی قوم کو ہلاکت کے سمندر میں غرق کیا، ان کی صحیح رہنمائی نہ کی۔ 'وَمَا هَدَىٰ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قائد اور حکمران کی اصل ذمہ داری اپنی قوم کی صحیح رہنمائی ہے۔ اس کی حیثیت درحقیقت ایک راعی کی ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنی خلق کے کسی گلہ کی چرواہی اور اس کی حفاظت پر مامور فرماتا ہے۔ بدبخت ہے وہ چرواہا جو اپنی انانیت پر پورے گلے کو بھینٹ چڑھا دے۔

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ قَدْ أَنجَيْنَاكُم مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوَاعَدْنَاكُمْ جَانِبَ الطُّورِ الْأَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۞ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِي ۖ وَمَن يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوَىٰ ۞ وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ (۸۰-۸۲)

بنی اسرائیل کو تنبیہ

دریا پار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنے عظیم احسانات یاد دلا کر ان کو وہ عظیم ذمہ داری یاد دلائی جو ان احسانات کے حق کے طور پر ان پر عائد ہوتی تھی اور ساتھ ہی اس انجام سے بھی آگاہ فرما دیا جو ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو ان نعمتوں کی ناقدری کریں گے اور شکر کے بجائے کفر اور طغیان کی راہ اختیار کریں گے۔ بعینہٖ اسی سیاق و سباق میں، الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ یہ مضمون سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم تفصیل کے ساتھ اس کے ہر پہلو کی وضاحت کر چکے ہیں اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارات پر اکتفا کریں گے۔ تفصیل کے طالب بقرہ کی تفسیر میں آیات ۴۶ - ۵۰ کے تحت جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

'وَوَاعَدْنَاكُمْ جَانِبَ الطُّورِ الْأَيْمَنَ' سے مراد وہ وعدہ ہے جو تورات دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے واسطہ سے بنی اسرائیل سے فرمایا اور جس کے لیے اس نے ان کو طور کے اسی مقدس جانب میں بلایا جہاں مدین سے واپس ہوتے ہوئے حضرت موسیٰؑ کو نبوت عطا ہوئی ——— اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی

جو قدر بنی اسرائیل نے کی اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

'وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى'۔ 'مَنّ'، 'وَسَلْوٰى' کی وضاحت بقرہ آیت ۵۷ کے تحت ہو چکی ہے۔ اس نعمت کی بھی بنی اسرائیل نے جو قدر کی اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

'كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ' یہاں نعمتوں کا حق بیان ہوا ہے۔ اس حق کی یاد دہانی ہر نعمت زبانِ حال سے بھی کرتی ہے اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے ان کے نبی کے واسطہ سے لفظوں میں بھی بار بار اس کی ہدایت فرمائی تھی۔ تورات میں اس کے شواہد موجود ہیں۔ 'وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ خدا کی نعمتوں کی فراوانی تم کو طغیان میں مبتلا نہ کرنے پائے۔ یہ طغیان فرعون کی روایت ہے اور اس کا انجام تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔

'وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى' یعنی اس قسم کا طغیان خدا کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ اور جس پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے وہ گر کے رہتا ہے۔ 'گر کے رہتا ہے' یعنی عزت کے عرش سے ذلت کے فرش پر۔ یہ ماجرا بھی تم اپنی آنکھوں دیکھ چکے ہو کہ جو خدائی کا مدعی تھا اس کا انجام کیا ہوا!

'وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى' یہ ان لوگوں کے لیے راہِ نجات بتا دی جو ان ہدایات پر عمل کا عزم بالجزم رکھتے ہیں۔ فرمایا کہ اس طرح کے لوگوں سے اگر کوئی غلطی صادر ہو تو اس کی اصلاح کا طریقہ توبہ ہے۔ وہ اپنی غلطی سے رجوع کریں، ایمان اور عمل صالح کی تجدید کریں اور آئندہ کے لیے خدا سے مزید ہدایت کے طالب بنیں۔

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى (۸۳-۸۴)

عربیت کا ایک اسلوب — 'اَعْجَلَكَ' کے بعد 'عَنْ' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں کوئی ایسا فعل محذوف مانا جائے جو چھوڑ کر آنے کے مفہوم میں ہو۔ اس لیے کہ 'عن' 'اعجلك' کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا اور ہم عربیت کے اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ کرتے آئے ہیں کہ جب فعل اور اس کے صلہ میں مناسبت ظاہری نہ ہو تو وہاں وہ فعل کسی ایسے فعل پر متضمن ہوتا ہے جو اس صلہ سے مناسبت رکھتا ہو۔ اس اصول کی روشنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے موسیٰ تمھیں اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی چلے آنے پر کس چیز نے ابھارا!

تورات کے حصول کے لیے حضرت موسیٰ کی عجلت — یہ اس موقع کا ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو طور کے اسی مقام پر، جہاں ان کو نبوت عطا ہوئی تھی، تورات دینے کے لیے بلایا ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تیس دن کی مدت مقرر کی تھی لیکن حضرت موسیٰ فرطِ شوق میں، قوم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری حضرت ہارونؑ کے سپرد کر کے، وقت سے کچھ پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ تورات میں اس کا ذکر ہے لیکن اس میں کسی مدت یا حضرت موسیٰ کی کسی عجلت کا ذکر نہیں ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ پہاڑ پر میرے پاس آ اور وہیں ٹھہرا رہ اور میں تجھے پتھر کی لوحیں اور شریعت

اور احکام جو میں نے لکھے ہیں دوں گا تاکہ تو انھیں سکھائے اور موسیٰؑ اور اس کا خادم یشوع اٹھے اور موسیٰ خدا کے پہاڑ کے اوپر گیا اور بزرگوں سے کہہ گیا کہ جب تک ہم لوٹ کر تمھارے پاس نہ آجائیں تم ہمارے لیے یہیں ٹھہرے رہو اور دیکھو ہارون اور حور تمھارے ساتھ ہیں جس کسی کا کوئی مقدمہ ہو وہ ان کے پاس جائے ۔“
خروج باب ۲۴: ۱۲-۱۴

اعراف میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً	اور ہم نے موسیٰؑ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس
وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ	کو پورا کیا دس مزید راتوں سے تو اس کے رب کی
رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ	مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی اور موسیٰؑ نے
مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ	اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ میری قوم میں میری
قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ	جانشینی کرنا اور اصلاح کرتے رہنا اور فساد کرنے والوں
الْمُفْسِدِيْنَ (۱۴۲-الاعراف)	کی روش کی پیروی نہ کرنا۔

حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے اس سوال کا جواب یہ دیا کہ اے میرے رب! میری قوم کے لوگ بھی بس میرے پیچھے ہی ہیں اور میں وقت موعود سے ذرا پہلے تیری خوشنودی کے لیے چلا آیا ہوں۔

حضرت موسیٰؑ کی یہ عجلت، جیسا کہ ان کے ارشاد سے واضح ہے، محض فرطِ شوق کا نتیجہ اور خدا کی رضا طلبی کے لیے تھی۔ اس پہلو سے یہ کوئی برائی نہیں بلکہ محبتِ الٰہی کا تقاضا تھی لیکن یہی عجلت ان کے لیے ایک شدید آزمائش اور ان کی قوم کے لیے ایک سخت فتنہ بن گئی۔ ان کی قوم کے اندر جو اشرار و مفسدین تھے انھوں نے ان کی اس غیبت سے فائدہ اٹھا کر قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا کر دیا اور حضرت ہارونؑ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود صورتِ حال پر قابو پانے میں ناکام رہے۔ حضرت موسیٰؑ کی قوم کا مزاج اس وقت تک سخت منفعل تھا۔ سورۂ اعراف میں ان کا حال بیان ہو چکا ہے کہ دریا پار کرنے کے معاً بعد جب ان کو بت پرست قوموں سے سابقہ پیش آیا تو انھوں نے حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے لیے بھی اسی طرح کا ایک بت بنا دیں جس طرح کے بت ان قوموں کے پاس ہیں۔ یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ کے طور پر جانے سے کچھ ہی پہلے کا ہے۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے ان مفسدین کو ڈانٹ بھی بتائی تھی۔ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے مفسدین سے بھی واقف رہے ہوں گے اور اس امر کا بھی سب سے بہتر وہی اندازہ کر سکتے تھے کہ ان بگڑے ہوئے لوگوں کو حضرت ہارونؑ کس حد تک کنٹرول میں رکھ سکیں گے۔ ایسے حالات کے اندر ان کی چند روز کی غیر حاضری بھی قوم کے لیے آزمائش بن سکتی تھی لیکن غلبۂ شوق میں وہ ان پہلوؤں کا کماحقہٗ اندازہ نہ فرما سکے اور اس کا نتیجہ نہایت خطرناک شکل میں سامنے آیا۔

یہ بات ہم جگہ جگہ ظاہر کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام سے اگر کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ اتباع ہوا

کی نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی وہ حق اور خدا کی رضا طلبی کی راہ میں حدِ مطلوب سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز فی نفسہٖ کوئی بری نہیں ہے لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ میزانِ حق ہوتے ہیں اور ان کا ہر قول و فعل دوسروں کے لیے نمونہ ہوتا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح کی باتوں پر بھی گرفت فرماتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی اس عجلت پر بھی گرفت ہوئی۔ اس سورہ میں، جیسا کہ آپ تمہید میں پڑھ آئے ہیں، ہمارے حضورؐ کو صبر اور انتظار کی تعلیم دی گئی ہے اس وجہ سے اس میں حضرت موسیٰؑ کی زندگی سے اس واقعہ کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کی راہ میں صبر اور انتظار ہی کی روش قرینِ مصلحتِ الٰہی ہے ورنہ بعض اوقات نیک سے نیک ارادہ کے ساتھ بھی جو عجلت کی جاتی ہے وہ بہتوں کے لیے مزلّۂ قدم بن جاتی ہے۔

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (۸۵)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو خبر دی کہ تم تو ہماری رضا جوئی کے شوق میں قوم کو چھوڑ کر وقت سے پہلے چلے آئے اور تمہارے بعد ہم نے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے اس کو گمراہی میں مبتلا کر دیا۔

'فَتَنَّا قَوْمَكَ' میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیت 'فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا' کے تحت ہم کر آئے ہیں۔ افراد ہوں یا اقوام، نیک ہوں یا بد، سب کی آزمائش ہر وقت ہوتی رہتی ہے اور اسی آزمائش کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کھرے اور کھوٹے کو ممیز کرتا ہے۔ یہاں مقصود یہ بتانا ہے کہ ہم نے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈالا اور وہ اس امتحان میں فیل ہو گئی۔ سامری نے اس کو گمراہ کر ڈالا۔

سامری کا فتنہ

سامری کا کوئی ذکر تورات میں نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کے متعلق صرف اتنی ہی بات علم میں آئی ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے اور جو آگے آ رہی ہے۔ تورات کے راویوں نے تو اس سارے فتنہ کو حضرت ہارونؑ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ یہ قرآن کا احسان ہے کہ اس نے اس فتنہ کے اصل بانی کا پتہ دیا اور حضرت ہارونؑ کو اس تہمت سے بری کیا۔

سامری کوئی اسرائیلی تھا یا ان مصریوں میں سے تھا جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہجرت کی؟ یہ ایک غیر متعلق اور غیر مفید سوال ہے۔ ہم اس غیر ضروری بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ قرآن سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک نہایت ہی فتین اور گھٹیا منافق تھا جو محض اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے حضرت موسیٰؑ کی جماعت میں گھسا ہوا تھا۔ آگے کی آیات سے معلوم ہوگا کہ اس کو متصوفانہ قسم کے کشوف و کرامات کے ڈھونگ رچانے کا فن بھی معلوم تھا۔ اس قسم کے چالاک لوگ بڑی آسانی سے سادہ لوح عوام کو اپنے دامِ فریب میں پھنسا لیتے ہیں۔ اس نے حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کچھ تو وقت سے پہلے چلے گئے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ تربیت کے تحت ان کی مدتِ قیام میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا۔ اس طرح سامری کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے بنی اسرائیل کے ان تمام عناصر کو اپنے ارد گرد اکٹھا کر لیا جو پہلے ہی سے بت پرستانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ اس نے ان کو سمجھایا کہ موسیٰؑ تو معلوم

نہیں خدا کی تلاش میں کہاں گئے، اگر تم لوگ اپنے زیورات چندے میں دو تو میں تمھارے لیے ایک معبود بنائے دیتا ہوں جو تمھاری رہنمائی کرے گا۔ موسیٰ تو تمھیں یہاں چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے، اب تم کب تک انتظار کرو گے سامری مصر کے فنِ بت گری کا بھی ماہر تھا اس نے لوگوں کے دیے ہوئے زیورات سے ایک بچھڑا بنایا جس کی شکل ایسی تھی کہ جب اس میں سے ہوا گزرتی تو اس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی۔ اس نے اس آواز کو جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، اپنی ایک کرامت کا نتیجہ قرار دیا اور سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت ہارونؑ نے لوگوں کو اس فتنہ سے بچانے کے لیے پورا زور لگایا لیکن جو لوگ حضرت موسیٰؑ کے دبدبہ سے دبے ہوتے تھے ان کو وہ دبانے میں کامیاب نہ ہو سکے یہاں تک کہ ان کی جان بھی خطرے میں پڑ گئی اور انھوں نے یہ بھی محسوس فرما لیا کہ اب اگر انھوں نے کوئی مزید قدم اٹھایا تو اس سے فائدہ کے بجائے الٹا نقصان ہوگا، جماعت کا شیرازہ بالکل درہم برہم ہو جائے گا اس وجہ سے انھوں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ حضرت موسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کریں۔

فَرَجَعَ مُوسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ (٨٦)

حضرت موسیٰؑ کی واپسی اور قوم پر ان کا عتاب

جب حضرت موسیٰؑ کو اس حادثہ کی خبر ملی تو اس کا جو اثر قدرتی طور پر ہونا تھا وہ ہوا۔ وہ نہایت غصہ اور غم کی حالت میں قوم کی طرف واپس آئے۔ غصہ تو ان کو مفسدین کی کامیاب شرارت پر تھا کہ انھوں نے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا اور آگے کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح صورتِ حال سامنے نہ ہونے کے سبب سے حضرت ہارونؑ پر بھی تھا کہ ان کو مفسدین سے ہوشیار رہنے کی جو ہدایت انھوں نے فرمائی تھی اس کو ملحوظ رکھنے میں وہ ناکام رہے۔ اور غم اپنی قوم کی اس بدبختی پر کہ میں تو اس کے لیے اللہ کی کتاب لینے گیا اور یہ ایک بچھڑا بنا کر اس کی عبادت میں لگ گئی!

انھوں نے سب سے پہلے قوم کو سرزنش فرمائی کہ نادانو، یہ تم کیا کر بیٹھے! کیا خدا نے تم سے نہایت مبارک وعدہ کتاب و شریعت دینے کا نہیں فرمایا تھا؟ کیا اس وعدے کے پورے ہونے میں اتنی دیر ہو گئی کہ تم صبر نہ کر سکے؟ کیا تم نے یہ چاہا کہ تم پر خدا کا غضب نازل ہو کہ تم اس عہد کو توڑ بیٹھے جو میں تم سے لے کر گیا تھا۔ اس عہد سے مراد وہ عہد ہے جس کا حوالہ ہم پیچھے نقل کر آئے ہیں کہ طور پر جاتے وقت قوم کے تمام سرداروں کو حضرت موسیٰؑ نے یہ ہدایت فرما دی تھی کہ میں شریعت لینے جا رہا ہوں، جب تک میں واپس نہ آؤں لوگ یہیں ٹھہرے رہیں اور تمام معاملات میں حضرت ہارونؑ کی ہدایات کی پیروی کریں۔

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ (٨٧)

اس آیت کے ایجاز کے سبب سے اس کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ ہم

اپنے لفظوں میں اس کا مطلب بیان کریں گے اس کے بعد اس کے الفاظ کی وضاحت کریں گے۔

قوم کے بزرگوں کی معذرت

حضرت موسیٰؑ نے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، سب سے پہلے قوم کے ان بزرگوں کو سرزنش کی جن پر انھوں نے اپنی غیر حاضری میں لوگوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ڈالی تھی۔ ان لوگوں نے اپنی مجبوری و بے بسی بیان کی کہ یہ جو کچھ ہوا اس میں ہمارے ارادے اور ہماری مرضی کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ لوگوں کے زیورات کی امانت کا جو بوجھ ہمارے اوپر تھا وہ لوگوں کے مطالبے پر ہم نے اپنے سر سے اتار دیا اور اس طرح سامری نے ان کے لیے یہ بچھڑا ڈھال کر تیار کر دیا۔ یعنی یہ جرم سرتاسر سامری اور اس کے فریب میں آئے ہوئے ان عوام کا ہے جن کے زیورات ہماری امانت میں تھے۔ ہم ان کے دباؤ میں آکر ان کے زیورات ان کے حوالہ کرنے پر مجبور ہو گئے اور ان زیورات سے سامری نے یہ فتنہ کھڑا کر دیا۔

'مَآ اَخۡلَفۡنَا مَوۡعِدَكَ بِمَلۡكِنَا'۔ 'ملک' کے معنی اختیار و اقتدار کے ہیں۔ یعنی آپ ہم سے جو عہد لے کر گئے تھے ہم نے اپنے امکان کے حد تک اس پر قائم رہنے کی پوری کوشش کی لیکن حالات اس قدر قابو سے باہر ہو گئے تھے کہ ہمارے لیے عوام کو کنٹرول میں رکھنا ناممکن ہو گیا۔

'وَلٰكِنَّا حُمِّلۡنَآ اَوۡزَارًا مِّنۡ زِيۡنَةِ الۡقَوۡمِ'۔ 'زِيۡنَةِ الۡقَوۡمِ' سے مراد لوگوں کے وہ زیورات ہیں جو ان سرداروں کی امانت میں تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سفر کی آبادھاپی میں ضائع ہونے کے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے قیمتی زیورات بہت سے لوگوں نے ان سرداروں کی امانت میں رکھ دیے تھے اور ان لوگوں نے ایک خدمت سمجھ کر مجبوراً یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ یہ زیورات بنی اسرائیل ہی کے لوگوں کے تھے یا قبطیوں کے؟ اس باب میں تورات کی روایات متضاد ہیں۔ کتاب خروج کے باب ۳۲ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنی اسرائیل ہی کے تھے لیکن اسی کتاب کی دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ملک چھوڑتے وقت سونے چاندی کے بہت سے زیورات اور ظروف مصریوں سے مستعار لیے تھے لیکن یہ دوسری روایت بالکل خلافِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اوّل تو بنی اسرائیل کو مصر میں یہ حیثیت حاصل نہیں تھی کہ وہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیورات مستعار لے سکیں اور مصری ان کو اپنے قیمتی ظروف تک اٹھا کر ان کو عاریۃً دے دیں بالخصوص ایسے حالات میں جب کہ سالوں سے ان کے اندر ایک شدید کشمکش برپا تھی اور مصری یہ اندیشہ رکھتے تھے کہ بنی اسرائیل ملک چھوڑ کر جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ ثانیاً حضرت موسیٰؑ شرعی اور اخلاقی پہلو سے یہ گوارا کس طرح کر سکتے تھے کہ وہ دوسروں کے عاریت دیے ہوئے مال پر اپنی قوم کو اس طرح قابض ہونے کی اجازت دیں! اس وجہ سے ہمارے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہ بنی اسرائیل ہی کے زیورات تھے۔ قرآن میں دوسری جگہ 'مِنۡ حُلِيِّهِمۡ' کے الفاظ ہیں۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل ہی کے زیورات تھے۔

'فَقَذَفۡنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلۡقَى السَّامِرِيُّ'۔ 'قذف' کے معنی پھینک دینے اور رقم کر دینے کے

ہیں۔ سرداروں نے کہا کہ ہم نے تو لوگوں کا لادا ہوا بوجھ ناخوش گواری کے ساتھ محض لوگوں کی خدمت کے خیال سے اٹھایا تھا۔ لیکن جب ہم مجبور کر دیے گئے تو ہم نے اس کو سر سے اتار پھینکا۔ عربی زبان کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں 'حملنا'، 'اوزار'، 'قذف'، تینوں ہی الفاظ اس احساس گراں باری کو ظاہر کر رہے ہیں جو ان سرداروں کو اس بار امانت کے سبب سے تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے جب ان کو سرزنش فرمائی تو ان کو خیال ہوا کہ چونکہ یہ بت ان زیورات سے تیار ہوا ہے جو ان کی امانت میں تھے اس وجہ سے ممکن ہے ان کے پیغمبر کو یہ گمان ہو کہ اس سازش میں کچھ ہاتھ ان کا بھی ہے۔ انھوں نے حضرت موسیٰؑ کا یہ شبہ دور کرنے کے لیے اپنی پوزیشن صاف کر دی کہ اس فتنہ میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے، البتہ لوگوں کے زیورات کا جو بوجھ ہمارے سر پہ لادا گیا تھا وہ ہم نے لوگوں کے مطالبہ سے مجبور ہو کر اپنے سر سے اتار پھینکا کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں کریں۔ ان کے اس قول سے کہ ہم نے یہ جو کچھ کیا اپنے اختیار سے نہیں کیا، یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اپنے امکان کی حد تک انھوں نے سامری کے فتنہ سے لوگوں کو بچانے کی کوشش کی لیکن حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ ان پر قابو پانا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ان کی یہ بے بسی چونکہ واضح تھی اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ان کا عذر قبول فرما لیا۔

'فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ' لفظ 'القاء' عربی میں وسیع معنوں میں آتا ہے۔ یہ جس طرح زمین پر کسی چیز کے ڈال دینے یا پھینک دینے کے معنی میں آتا ہے اسی طرح پانسہ پھینکنے کوئی ہنر دکھانے یا کوئی کرتب دکھانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ سورۂ حج میں انشاءاللہ ہم اس کی تحقیق بیان کریں گے۔ یہاں یہ لفظ ہنر اور کرتب دکھانے کے معنی میں ہے۔ اسی سورہ کی آیت ۶۵ میں ہے 'اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى' (ساحروں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ یا تو تم پہلے اپنا کرتب دکھاؤ یا پھر ہم ہی اپنا ہنر دکھاتے ہیں)

سرداروں نے اس فتنہ کی ساری ذمہ داری سامری پر ڈالی کہ ہم نے مجبور ہو کر زیورات کا بوجھ اپنے سر سے اتار دیا اور پھر اس طرح سامری نے اپنا کرتب دکھایا اور ایک بچھڑا بنا کر اس نے پیش کر دیا

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۥ فَنَسِيَ (۸۸)

اس طرح سامری نے ڈھال کر ایک بچھڑا برآمد کیا۔ 'جَسَدًا' دھڑ۔ 'خُوَارٌ' بچھڑے کے ڈکرنے کی آواز کو کہتے ہیں۔ یعنی اس نے ایک بچھڑے کا دھڑ بنایا جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سامری مصر کے فن بت گری کا ماہر تھا۔ اس زمانہ میں یہ فن مصر میں عروج پر تھا۔ اعراف کی تفسیر میں ہم اس سور کے بعض نوادر کا ذکر کر چکے ہیں۔ ایک ماہر آدمی کے لیے بچھڑے کا ایک ایسا دھڑ بنا لینا کچھ مشکل کام نہیں ہے جس میں سے ہوا گزرے تو بچھڑے کی سی آواز نکلے۔ سامری نے اس آواز کو اپنی کرامت کا نتیجہ قرار دیا اور عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے ان کو یہ باور کرایا کہ اس نے اس کے اندر حضرت جبریلؑ کے گھوڑے کی سم کی خاک ڈالی ہے جس سے یہ آواز نکلتی ہے۔ اس قسم کے متصوفانہ ڈھونگ رچانے والے تو آج بھی لوگوں کو بڑی آسانی سے احمق بنا لیتے ہیں اور سامری سے کہیں بڑھے بڑھے سامری ہمارے شہر شہر میں موجود ہیں تو اس زمانہ میں بنی اسرائیل جیسی سادہ لوح

قوم کو کسی سامری کے لیے بے وزن بنا لینا کیا مشکل کام تھا! چنانچہ جو مفسدین اس فتنہ کے بانی تھے انھوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ دراصل تمھارا اور موسیٰؑ کا معبود تو یہی ہے لیکن موسیٰؑ اس کو نظر انداز کر کے معلوم نہیں کہاں طور پر چلے گئے اور اس کو بھول گئے۔ اس پروپیگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کی عظیم اکثریت اس فتنہ میں پھنس گئی۔

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا (۸۹)

یہ ان سادہ لوحوں کی سادہ لوحی پر اظہار تعجب ہے کہ ان احمقوں نے ذرا نہ سوچا کہ یہ بے جان دھڑ جو نہ ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا اور نہ ان کو کوئی نقصان یا نفع پہنچا سکتا آخر کس مرض کی دوا ہے کہ اس کو معبود بنا بیٹھے! معبود کوئی کھلونا نہیں بلکہ وہ زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ آخر اس سے کون سی ضرورت پوری ہونے والی ہے کہ انھوں نے اس کی عبادت شروع کر دی!

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِن قَبْلُ يَا قَوْمِ إِنَّمَا فُتِنتُم بِهِ ۖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَٰنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي (۹۰)

حضرت ہارونؑ کی فتنہ سے برأت

یہ حضرت ہارونؑ کی اس فتنہ سے برأت کا اظہار ہے۔ تورات میں تو جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، اس سارے فتنہ کی ذمہ داری حضرت ہارونؑ پر ڈال دی گئی ہے لیکن قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں ان کو اس سے بالکل بری قرار دیا ہے۔ مِن قَبْلُ کے لفظ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے جوں ہی اس فتنہ کے ابھرنے کے آثار دیکھے اسی وقت سے لوگوں کو آگاہ کرنا شروع کر دیا کہ لوگو، یہ مفسدین تم کو فتنہ میں مبتلا کر رہے ہیں۔ تمھارا معبود خدائے رحمان ہے نہ کہ تمھارے اپنے ہی ہاتھوں کا ڈھالا ہوا کوئی بچھڑا تو میری بات مانو اور ان مفسدین کے پیچھے نہ لگو۔

قَالُوا لَن نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ (۹۱)

حضرت ہارونؑ نے لوگوں کو آگاہ کرنے کی پوری کوشش کی لیکن ان کی کسی نے ایک نہ سنی۔ لوگوں نے جواب دیا کہ اب تو ہم اس کی پرستش پر حضرت موسیٰؑ کی واپسی تک بہرحال قائم رہیں گے اور دیکھیں گے کہ وہ آ کر کیا فیصلہ دیتے ہیں۔ اس فقرے سے یہ بات نکلتی ہے کہ لوگ سامری کے چکمے میں آ کر، حضرت ہارونؑ کی تمام کوششوں کے علی الرغم ایک شدید حماقت تو کر بیٹھے لیکن بعد میں بہت سے لوگوں کو، جیسا کہ سورۂ اعراف سے واضح ہوتا ہے اپنی اس حماقت کا احساس ہوا۔ مگر ایک حماقت کر گزرنے کے بعد اس سے پیچھا چھڑانا آسان نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ لوگ بھی اس سے فوری دست برداری کا اعلان کرنے کے بجائے مجبور ہوئے کہ حضرت موسیٰؑ کی واپسی تک اسی جہالت پر جمے رہیں۔

قَالَ يَا هَارُونُ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ۝ أَلَّا تَتَّبِعَنِ ۖ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي (۹۲-۹۳)

حضرت ہارونؑ سے پرسش

قوم کے سرداروں سے پوچھ گچھ کے بعد حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ کی طرف متوجہ ہوئے جن پر قوم کی دیکھ بھال کی اصل ذمہ داری تھی۔ ان سے پوچھا کہ جب تم نے لوگوں کو گمراہی کی راہ پر جاتے دیکھا تو میری ہدایت کی پیروی کیوں نہ کی، کیا تم نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟ اس حکم سے مراد وہ حکم ہے جو طور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ

اور اپنے مقرر کردہ ناظروں کو دے گئے تھے۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۴۲ کے تحت بھی اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں کہ انھوں نے حضرت ہارونؑ کو ہدایت فرمائی تھی کہ میرے بعد جملہ معاملات میں میری جانشینی کرنا اور قوم کے اندر جو مفسد عناصر ہیں ان سے چوکنے رہنا، ان کو سر اٹھانے کا موقع نہ دینا۔ حضرت موسیٰؑ کے سوال کا انداز ایسا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ گمان نہیں تھا کہ حضرت ہارونؑ نے دیدہ دانستہ ان کے حکم کی نافرمانی کی ہے بلکہ وہ ان کا عذر معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر وہ کیا مجبوری پیش آئی کہ وہ اس فتنہ کا سدباب نہ کر سکے اور اس کو سر اٹھانے کا موقع مل گیا۔

'مَا مَنَعَكَ' کے بعد بظاہر 'اَلَّا تَتَّبِعَنِ' میں 'لا' کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ ہمارے اہلِ نحو اس کو زائد مانتے ہیں۔ لیکن یہ زائد نہیں ہے بلکہ یہ زبان کے معروف استعمال کے مطابق تاکید کے لیے آیا ہے۔ کلامِ عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب موجود ہے۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۚ إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي (۹۴)

حضرت ہارونؑ کی معذرت

حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کا سر اور ان کی ڈاڑھی پکڑ کر ان کو جھنجھوڑا کہ تم نے یہ کیا کمزوری دکھائی! حضرت موسیٰؑ کے اس طرزِ عمل سے ان کی حمیتِ حق بھی نمایاں ہو رہی ہے اور وہ محبت بھی جو فطری طور پر ان کو حضرت ہارونؑ سے تھی۔ اس محبت کا تقاضا یہی تھا کہ جب انھوں نے محسوس فرمایا کہ حضرت ہارونؑ سے دین کے معاملے میں کمزوری صادر ہوئی ہے تو وہ جذبات سے مغلوب ہو گئے اور ان کو انھوں نے سختی سے جھنجھوڑا۔ حضرات انبیاء اور صالحین کا طریقہ یہی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات میں تو رواداری برتتے ہیں لیکن دین کے معاملات میں وہ مداہنت نہیں برتتے۔ اس معاملے میں جو ان سے جتنا ہی قریب ہوتا ہے وہ اس کے لیے اتنے ہی زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ اہلِ دنیا کی روش اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ اپنی دنیا کے معاملات میں تو بڑے چوکنے اور زیرک ہوتے ہیں، اپنے باپ اور بیٹے کا بھی محاسبہ کرتے ہیں لیکن دین کے معاملے میں بالکل بے حمیت اور بے حس ہوتے ہیں۔ بھائی بند جو چاہیں کرتے پھریں ان کی غیرت کو ذرا بھی حرکت نہیں ہوتی!

حضرت ہارونؑ نے اپنی معذرت پیش کی اور انداز خطاب بہت ہی پیارا ہے۔ فرمایا، اے میرے ماں جائے! میری ڈاڑھی اور میرا سر نہ پکڑیے، مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں نے کوئی سخت قدم اٹھایا تو بنی اسرائیل کے درمیان تفرق ہو جائے گی اور پھر آپ کہیں گے کہ میں نے آپ کی نصیحت پر عمل نہیں کیا اور ملت کے اندر تفریق برپا کر دی۔ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ حضرت ہارونؑ نے لوگوں کو اس فتنہ سے روکنے کی انتہائی کوشش کی لیکن ایک عظیم اکثریت پر سامری کا جادو اس طرح چل چکا تھا کہ لوگوں کو روکنا تو درکنار اندیشہ اس بات کا پیدا ہو گیا تھا کہ مبادا اشرار حضرت ہارونؑ کو قتل کر دیں۔ اب دو ہی صورتیں باقی رہ گئیں تھیں۔ یا تو حضرت ہارونؑ اپنے ساتھیوں کو لے کر الگ ہو جائیں یا چند دن حضرت موسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کریں۔ پہلی صورت میں اندیشہ

تفریق ملت اور باہمی کشت و خون کا تھا۔ دوسری صورت میں توقع تھی کہ حضرت موسیٰؑ اپنے دبدبہ اور حسن تدبیر سے حالات پر قابو پالیں گے۔ اسی توقع کی بنا پر انھوں نے پہلی صورت اختیار نہ کی کہ اس سے اصلاح کی جگہ فساد کا اندیشہ تھا اور وہ حتی الامکان اس فساد سے قوم کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ (۹۵)

سامری سے بازپرس

تمام ذمہ داروں سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد جب بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی کہ دراصل اس سارے فساد کا بانی سامری ہی ہے تو حضرت موسیٰؑ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت تیکھے انداز میں اس سے سوال کیا کہ سامری! تو بتا، یہ تو نے کیا کیا؟ یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ کیا فتنہ کھڑا کر دیا؟

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ (۹۶)

سامری کا ڈھونگ

سامری نے جب دیکھا کہ اب وہ حضرت موسیٰؑ کی گرفت میں آچکا ہے تو اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ ایک بات بنائی جس میں اس نے ایک طرف تو اپنے اس فعل کے لیے ایک وجہ بھی بیان کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اس امر کا اعتراف بھی کر لیا کہ اب مجھ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ جو کچھ بھی میں نے سمجھا تھا یہ محض فریب نفس تھا اور میں غلط فہمی کے سبب سے نفس کے فریب کو ایک حقیقت سمجھ بیٹھا۔

بات تو اس نے یہ بنائی کہ مجھے ایک کشفی مشاہدہ ہوا جو صرف مجھی کو ہوا دوسروں کو نہیں ہوا۔ وہ یہ کہ میں نے دیکھا کہ حضرت جبریلؑ آئے ہیں اور میں نے ان کے نقش قدم (یا ان کے گھوڑے کے نقش قدم) سے ایک مٹھی خاک اٹھائی ہے اور ایک بچھڑا بنا کر اس کے اندر ڈال دی ہے جس سے وہ بولنے لگا لیکن اب آپ کی اس تنبیہ کے بعد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ یہ کوئی کشف کا مشاہدہ نہیں تھا بلکہ یہ محض میرے نفس کا ایک دھوکا تھا جس میں مبتلا ہو کر میں یہ جرم کر بیٹھا۔ سامری نے اس طرح حضرت موسیٰؑ کے سامنے اپنے آپ کو معذور ٹھہرانے کی کوشش کی کہ اس نے یہ جو کچھ کیا ایک کشف کے زیر اثر کیا، بطور خود کسی شرارت کے ارادے سے نہیں کیا۔ لیکن اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اب حضرت موسیٰؑ کی گرفت سے اس کے لیے چھوٹنا آسان نہیں ہے اور اس قسم کی دھونس یہاں کے آگے چلنے والی نہیں ہے اس وجہ سے اس نے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ یہ جو کچھ ہوا محض مغالطہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنے نفس کے ایک فریب کو ایک کشف سمجھ بیٹھا اور مجھ سے یہ جرم صادر ہو گیا۔

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا (۹۷)

سامری پر لعنت

اس کے اس عذر سے حضرت موسیٰؑ پر اس کی مکاری اور شرارت اچھی طرح واضح ہو گئی۔ انھوں نے اس کے اوپر لعنت کر دی اور عمر بھر کے لیے اس کو یہ سزا دی کہ اب تو یہ کہتا پھرے گا کہ لوگو، میں ناپاک ہوں، نہ کوئی مجھے ہاتھ لگائے اور نہ میں کسی کو ہاتھ لگا سکتا ہوں اور ساتھ ہی اس کو آخرت کے عذاب کی بھی خبر دے دی

کہ ایک عذاب موعود کا دن بھی تیرے لیے آنے والا ہے جس سے تو کسی طرح بھی اپنے کو بچا نہ سکے گا۔ وہ بہرحال شدنی ہے۔

'فَاذْهَبْ' یعنی دور دفع ہو۔ یہ یہاں دھتکارنے کے معنی میں آیا ہے۔

'فِی الْحَیٰوۃِ' یعنی تیرے لیے یہ لعنت کی سزا وقتی اور عارضی نہیں ہے بلکہ عمر بھر کے لیے یہ تیرے اوپر مسلط کر دی گئی۔

'لَا مِسَاسَ' کا مفہوم

'اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ' یعنی تو خود اپنی زبان سے پکارتا پھرے گا کہ میں ناپاک ہوں، نہ مجھے کوئی چھوئے نہ میں کسی کو چھونے کا مجاز ہوں۔

حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں جماعت سے کسی شخص کو کاٹ دینے کی سزا موجود ہے۔ احبار باب ۷ آیت ۲۱ میں بعض چیزوں کی حرمت بیان کرنے کے بعد ان کے مرتکب کے لیے یہ سزا بیان ہوئی ہے۔

"وہ کھانے والا آدمی اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے"

جس شخص کو یہ سزا دی جاتی وہ بالکل اچھوت بن کر رہ جاتا۔ نہ اس کی شادی غمی میں کوئی شریک ہوتا، نہ اس کو عبادت خانہ میں جانے کی اجازت ہوتی اور نہ کوئی اس کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیتا۔

اس سے زیادہ سخت سزا کوڑھیوں کے لیے بیان ہوئی ہے۔ احبار کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"اور جو کوڑھی اس بلا میں مبتلا ہو اس کے کپڑے پھٹے اور اس کے سر کے بال بکھرے رہیں اور وہ اپنے اوپر کے ہونٹ کو ڈھانکے اور چلا چلا کر کہے ناپاک ناپاک۔ جتنے دنوں تک وہ اس بلا میں مبتلا رہے وہ ناپاک رہے گا۔ اور وہ ہے بھی ناپاک۔ پس وہ اکیلا رہا کرے، اس کا مکان لشکر گاہ کے باہر ہو۔ (احبار ۱۳: ۴۵-۴۶)

یہی سزا حضرت موسیٰؑ نے سامری کو دی۔ بس یہ فرق ہے کہ کوڑھی کے لیے یہ سزا صرف اس وقت تک کے لیے تھی جب تک وہ اس مرض میں مبتلا رہے لیکن سامری کو حضرت موسیٰؑ نے یہ سزا عمر بھر کے لیے دی اس لیے کہ وہ منافقت کے کوڑھ میں مبتلا تھا جو ایک اخلاقی اور روحانی کوڑھ جسمانی کوڑھ سے زیادہ غلیظ ہے۔ مزید برآں اس پر حضرت موسیٰؑ نے لعنت بھی کر دی جو دین میں سخت ترین سزا ہے۔ قرآن کے الفاظ 'اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ' اور تورات کے الفاظ "اور چلا چلا کر کہے ناپاک ناپاک" ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کر دیکھیے تب قرآن کے الفاظ کا اصل مقام و محل اور اس کا اصل زور سمجھ میں آئے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ کسی کا خود اپنے ناپاک ہونے کا چلا چلا کر اعلان کرنا اس کی ذلت و رذالت کی آخری حد ہے!

سامری کے معبود کا حشر

'وَانْظُرْ اِلٰٓی اِلٰـهِكَ الَّذِیْ' الایۃ۔ ساتھ ہی حضرت موسیٰؑ نے اس کے ڈھالے ہوئے معبود کے متعلق بھی فرمایا کہ دیکھ تیری آنکھوں کے سامنے ہم اس کو جلائیں گے اور اس کو راکھ بنا کر سمندر میں بکھیر دیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے یہ اقدام اس لیے فرمایا کہ شرک کے ساتھ آثار شرک کا مٹانا ضروری ہوتا ہے تاکہ شرک کے تمام جراثیم کا یک قلم خاتمہ ہو جائے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فتح مکہ کے موقع پر تمام بتوں کا یک قلم خاتمہ

کرا دیا تھا۔

یہاں ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ حضرت موسیٰؑ نے سامری کو قتل کی سزا کیوں نہ دی جب کہ اسی جرم کے بہت سے مرتکبین کو جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکا ہے، انھوں نے قتل کرا دیا۔ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لعنت، جیسا کہ ہم اصحاب سبت کے سلسلہ میں ذکر کر چکے ہیں، قتل سے زیادہ سنگین اور عبرت انگیز سزا ہے۔ قتل کی سزا آناً فاناً ختم ہو جاتی ہے اور اس سے دوسروں کو جو عبرت ہوتی ہے وہ بھی وقتی ہوتی ہے لیکن یہ لعنت کی سزا دنیا اور آخرت دونوں میں آدمی کے ساتھ چپک کے رہ جاتی ہے۔ تصور کیجیے اس انسان کی شومیٔ قسمت کا جو زندگی بھر خود اپنی زبان سے یہ منادی کرتا پھرے کہ لوگو، میں ناپاک ہوں، کوئی مجھے ہاتھ نہ لگائے! یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ پیغمبر کی لعنت ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی کہیں بھاگ کر چھوٹ سکے۔ پیغمبر کا لعنت کیا ہوا جہاں کہیں بھی جاتا ہے لعنتی ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی!

تورات کی ایک دلچسپ روایت

اس بت سے متعلق قرآن کا ارشاد تو یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کو جلا کر اور کوٹ پیس کر اس کی راکھ سمندر میں بکھیر دی لیکن تورات میں یہ دلچسپ روایت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کی راکھ پانی میں گھول کر لوگوں کو پلا دی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تورات کے راویوں کو روایت گھڑنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے! آخر یہ کون سا شربت روح افزا تھا جو حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو پلانے کے لیے یہ اہتمام فرماتے! اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شاید اسی کا فیض ہے کہ حامل کتاب ہونے کے باوجود شرک اس بدقسمت قوم کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے، جس سے نہ کبھی اس کو نجات ملی اور نہ شاید کبھی ملے گی!

إِنَّمَآ إِلَٰهُكُمُ ٱللَّهُ ٱلَّذِى لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَسِعَ كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا (۹۸)

یعنی اس بچھڑے کو جن لوگوں نے معبود بنایا انھوں نے اپنی شامت بلائی۔ تمہارا معبود یہ بچھڑا نہیں بلکہ صرف وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وَسِعَ كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا۔ توحید کی دلیل ہے کہ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے، کوئی چیز بھی اس کے دائرۂ علم سے خارج نہیں ہے تو وہ اپنا کسی کو شریک کیوں بنائے اور دوسرے اس کا کسی کو شریک کیوں قرار دیں۔ جب وہ سب کچھ سنتا جانتا ہے تو وہ تنہا کافی ہے۔ کسی اور کی احتیاج کہاں باقی رہی۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۹۹-۱۳۵

حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت تمام ہوئی۔ اب آگے وہی مضمون جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا نئے اسلوب اور نئے دلائل کے ساتھ پھر سامنے آگیا۔ آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ماضی کی یہ سرگزشت جو ہم نے تمھیں سنائی ہے یہ صرف ماضی کی حکایت نہیں ہے بلکہ یہی کچھ تمہارے اور تمہارے مخالفین کے سامنے بھی پیش آ رہا ہے اور پیش آئے گا۔ جو لوگ تمہاری اس یاددہانی سے اعراض اور دوسروں کو برگشتہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ قیامت کے روز اپنا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی ان کو اٹھانا پڑے گا جو ان کے

سبب سے گمراہ ہوں گے۔ اور یہ قیامت کا دن بڑا ہی سخت دن ہوگا۔ اس دن کسی کی کچھ پیش نہیں جائے گی سب کی پیشی خدا ہی کے سامنے ہوگی اور اس کے سامنے کوئی اس کے اذن کے بغیر کسی کی سفارش کے لیے زبان نہ کھول سکے گا۔ تو تم نے جو یاد دہانی تم پر اتاری ہے اس کے اندر ہر خطرے سے لوگوں کو آگاہ کر دیا ہے۔ تم اس کو لوگوں کو سنا دو۔ جس کو توفیق ہوگی وہ اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ جو اس سے اعراض کرتا ہے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔

اس کی کوئی ذمہ داری تمہارے اوپر نہیں ہے اور یہ قرآن جس تدریج کے ساتھ اتر رہا ہے اسی تدریج کے ساتھ تم اس کو لوگوں کو سناؤ۔ اسی تدریج و ترتیب میں حکمت ہے۔ اس کے لیے جلدی نہ کرو۔ جلدی میں خیر و برکت نہیں ہے۔ آدمؑ نے جلدی کی تو اس کا نتیجہ اس شکل میں ان کے سامنے آیا کہ شیطان نے ان کو جنت سے نکلوا چھوڑا۔

جو لوگ تم سے نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کو خود ان کے ملک کی تاریخ کی طرف توجہ دلاؤ۔ اور ان کے طعن و طنز پر صبر کرو اور اس صبر کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ نماز کا اہتمام کرو۔ امراء و اغنیاء کے ایمان کے لیے بھی تمہیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ تم ان کے مال و اسباب کے محتاج ہو اور نہ تمہاری یہ دعوت ان کی سرپرستی کی محتاج ہے۔ تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا کفیل اور سرپرست اللہ ہے۔ جو لوگ تم سے کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ سب سے بڑی نشانی تمہارے پاس قرآن کی صورت میں آگئی ہے۔ اور یہ اسی لیے آئی ہے کہ تم پر حجت تمام ہو جائے۔ اگر تم لوگ اس کو کافی نہیں سمجھتے، کسی عذاب ہی کے طالب ہو تو اس کے لیے تم بھی انتظار کرو، میں بھی اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۹-۱۳۵ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ
لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾ مَنْ أَعْرَضَ عَنْهُ فَإِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾
خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۗ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ
وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ إِنْ
لَّبِثْتُمْ إِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ إِذْ يَقُوْلُ أَمْثَلُهُمْ
ع ۵ ۱۴ طَرِيْقَةً إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ
يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا
عِوَجًا وَّلَآ أَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ

خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿١٠٨﴾ يَوْمَىِٕذٍ
لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾
يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ
عِلْمًا ﴿١١٠﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۭ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ
ظُلْمًا ﴿١١١﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ
ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿١١٢﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّ
صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ
ذِكْرًا ﴿١١٣﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ
قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿١١٤﴾ وَلَقَدْ
عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿١١٥﴾ وَاِذْ قُلْنَا ع ٦ ١١ ١٥
لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى ﴿١١٦﴾ فَقُلْنَا
يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ
فَتَشْقٰى ﴿١١٧﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿١١٨﴾ وَاَنَّكَ لَا
تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿١١٩﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ
هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿١٢٠﴾ فَاَكَلَا
مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ
وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۡ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿١٢١﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ
فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿١٢٢﴾ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ

عَدُوٌّ ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ
وَلَا يَشْقٰى ﴿١٢٣﴾ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَّ
نَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَعْمٰى ﴿١٢٤﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمٰى
وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ﴿١٢٥﴾ قَالَ كَذٰلِكَ أَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيتَهَا ۚ وَ
كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿١٢٦﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي مَنْ أَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ
بِاٰيٰتِ رَبِّهِ ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقٰى ﴿١٢٧﴾ أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ
كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسٰكِنِهِمْ ۗ إِنَّ فِي ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي النُّهٰى ﴿١٢٨﴾ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا ع ١٣ ١٦
وَّأَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿١٢٩﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ
طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ
لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿١٣٠﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا
مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۗ وَرِزْقُ رَبِّكَ
خَيْرٌ وَّأَبْقٰى ﴿١٣١﴾ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۗ لَا
نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ۗ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿١٣٢﴾ وَقَالُوا
لَوْلَا يَأْتِينَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهِ ۗ أَوَلَمْ تَأْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ
الْأُولٰى ﴿١٣٣﴾ وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهِ لَقَالُوا رَبَّنَا
لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَّذِلَّ وَ
نَخْزٰى ﴿١٣٤﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوا ۚ فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ أَصْحٰبُ

الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿١٣٥﴾ ع ۱۷

ترجمۂ آیات ۹۹-۱۳۵

اسی طرح ہم تمہیں ماضی کی سرگزشتیں بھی سناتے ہیں اور خاص اپنے پاس سے تمہیں بھی یاد دہانی
عطا کی ہے۔ جو اس سے اعراض کریں گے وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے! اسی کے
کے تلے ہمیشہ رہیں گے اور قیامت کے دن یہ بہت بھاری بوجھ ہوگا! جس دن صور پھونکا جائے گا اور
مجرموں کو اس دن ہم اس حال میں اکٹھا کریں گے کہ خوف کے مارے ان کی آنکھیں نیلی پڑی ہوں گی۔ وہ
آپس میں چپکے چپکے کہتے ہوں گے کہ بس تم دس دن رہے ہوگے! ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ وہ کہیں گے جب
کہ ان میں جو سب سے بڑا لال بجھکڑ ہوگا کہے گا کہ بس زیادہ سے زیادہ ایک دن تم ٹھہرے ہوگے۔ ۹۹-۱۰۴

اور وہ تم سے پہاڑوں کی بابت سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ میرا رب ان کو گرد و غبار کی طرح اڑا دے گا
اور زمین کو بالکل صفاچٹ چھوڑ دے گا۔ نہ تم اس میں کوئی کجی دیکھو گے اور نہ کوئی بلندی۔ اس دن سب
پکارنے والے کے پیچھے چل پڑیں گے۔ مجال نہیں کہ ذرا اس سے کج ہو سکیں اور ساری آوازیں خدائے
رحمان کے آگے پست ہو جائیں گی، بس تم صرف کانا پھوسی ہی سنو گے۔ اس دن شفاعت نفع نہ دے گی الا
آنکہ خدائے رحمان جس کو اجازت دے اور جس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے۔ وہ ان کے آگے اور
ان کے پیچھے جو کچھ ہے سب سے باخبر ہے اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ سب کے چہرے
خدائے حی و قیوم کے حضور جھکے ہوئے ہوں گے اور جو کسی شرک کا مرتکب ہوا وہ نامراد ہوا۔ اور جو نیک
اعمال کرے گا اور وہ مومن بھی ہے تو اس کو نہ کسی حق تلفی کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی زیادتی کا۔ ۱۰۵-۱۱۲

اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن کی صورت میں اتارا اور اس میں ہم نے اپنی وعید گوناگوں پہلوؤں
سے واضح کر دی ہے تاکہ یہ لوگ خدا کے غضب سے بچیں یا یہ ان کے اندر کچھ سوجھ بوجھ پیدا کرے۔
پس اللہ بادشاہ حقیقی بہت برتر ہے۔ پس تم قرآن کے لیے، اپنی طرف اس کی وحی پوری کیے جانے

سے پہلے، جلدی نہ کرو، اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب میرے علم میں افزونی فرما۔ ۱۱۳-۱۱۴

اور ہم نے اس سے پہلے آدم پر ایک عہد کی ذمہ داری ڈالی تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم کی پختگی نہیں پائی اور جب کہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے۔ اس نے انکار کر دیا۔ تو ہم نے کہا کہ اے آدم، یہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے تو تم کو کہیں جنت سے نکال نہ چھوڑے کہ تم محروم ہو کر رہ جاؤ۔ اس میں تم کو یہ مقام حاصل ہے کہ تم اس میں نہ بھوکے رہو گے اور نہ ننگے۔ اور نہ تم کو پیاس ستائے گی اور نہ دھوپ لگے گی۔ تو شیطان نے اس کو ورغلایا، کہا کہ اے آدم، کیا میں تمھیں زندگی دوام کے درخت اور ایسی بادشاہی کا سراغ دوں جس پر کبھی کہنگی نہ آئے! تو ان دونوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا تو ان کے ڈھانکنے کی چیزیں عریاں ہو گئیں اور وہ اپنے اوپر باغ کے پتے گانٹھنے گانٹھنے لگے اور آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی تو بھٹک گئے۔ پھر اس کے رب نے اس کو نوازا، اس کی توبہ قبول کی اور اس کو ہدایت بخشی۔ حکم ہوا کہ تم سب یہاں سے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ پس اگر تمھارے پاس میری ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا، نہ وہ گمراہ ہو گا اور نہ محروم رہے گا۔ اور جو میری یاددہانی سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے ضیق کی زندگی ہو گی اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا اے رب تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا، میں تو بینا تھا! ارشاد ہو گا، اسی طرح دنیا میں ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو نظر انداز کیا تو اسی طرح تو آج نظر انداز کیا جائے گا اور اسی طرح ہم بدلہ دیں گے اس کو جو حدود سے تجاوز کرے گا اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہیں لائے گا اور عذاب آخرت زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہو گا۔ ۱۱۵-۱۲۷

کیا ان کے لیے یہ چیز ہدایت دینے والی نہ بنی کہ کتنی ہی قوموں کو ان سے پہلے ہم نے ہلاک کر

دیا جن کی بستیوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں بے شک اس کے اندر اہل عقل کے لیے بڑی بڑی نشانیاں ہیں! اور اگر تمہارے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی اور ایک اجل معین مقرر نہ ہو چکی ہوتی تو عذاب مسلط ہو کے رہتا۔ تو جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی، اس کی حمد کے ساتھ، تسبیح کرو سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے اطراف میں بھی تاکہ تم نہال ہو جاؤ۔ اور ان کی بعض جماعتوں کو آسائش زندگی کی جس رونق سے ہم نے ان کی آزمائش کے لیے بہرہ مند کر رکھا ہے اس کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ اور تمہارے رب کا رزق بہتر اور پائدار ہے۔ اور اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو۔ ہم تم سے رزق کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ہم تم کو رزق دیں گے اور انجام کار کی فیروزمندی تقویٰ کے لیے ہے۔ ۱۲۸-۱۳۲

اور یہ کہتے ہیں کہ یہ اپنے رب کے پاس سے ہمارے لیے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے! کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں میں جو کچھ مذکور ہے اس کی دلیل نہیں پہنچی! اور اگر ہم ان کو اس سے پہلے ہی کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو یہ کہتے کہ اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیری ہدایات کی پیروی کرتے! کہہ دو، ہر ایک منتظر ہے تو تم بھی انتظار کرو۔ تم عنقریب جان لو گے کہ سیدھی راہ والے کون ہیں اور منزل پر کون پہنچے۔ ۱۳۳-۱۳۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا (۹۹)

ماضی اور مستقبل دونوں کا آئینہ

كَذٰلِكَ کا اشارہ حضرت موسیٰؑ کی اسی سرگزشت کی طرف ہے جو پیچھے گزری۔ اب یہ آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ہم تمہیں ماضی کی یہ اہم سرگزشتیں بھی سنا رہے ہیں اور خاص اپنے پاس سے تمہیں بھی کتاب عطا فرمائی ہے۔ یعنی ماضی میں خدا نے اپنے رسولوں اور ان کے مخالفوں کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ بھی تمہیں سنا دیا ہے اور تمہارے ان مخالفوں کے ساتھ جو معاملہ کرنے والا ہے وہ بھی تمہیں بتا دیا ہے۔ اب اسی آئینے میں اپنا اور اپنے ان

حریفوں کا مستقبل دیکھ لو۔ 'ذکر' سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے پچھلے انبیاءؑ اور ان کی تعلیمات کا وہ حصہ بھی محفوظ کر دیا ہے جس کو محفوظ رکھنا تھا اور آخری رسول کی حیثیت سے جو ہدایت آنحضرتؐ پر نازل ہونے والی تھی وہ بھی اس میں ہے۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ یَحْمِلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وِزْرًا ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ حِمْلًا (۱۰۰ - ۱۰۱)

مخالفین کو دھمکی

یہ دھمکی ہے ان لوگوں کو جو اس یاددہانی سے اعراض کریں گے۔ فرمایا کہ جو اس سے اعراض کریں گے وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔ ان کے اوپر اپنی گمراہی کا بوجھ بھی ہوگا اور جو لوگ ان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوں گے ان کے بوجھ میں سے بھی ان کو اٹھانا پڑے گا۔ 'خٰلِدِیْنَ فِیْهِ' میں ضمیر لفظ 'وزر' کے لازم کے اعتبار سے آئی ہے۔ چونکہ 'وزر' سے مراد اس کا لازمی نتیجہ یعنی عذاب ہے اس وجہ سے فرمایا کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اس بوجھ کی نسبت فرمایا کہ نہایت ہی برا بوجھ ہوگا اس لیے کہ نہ تو اس سے کبھی نجات حاصل ہو سکے گی اور نہ کوئی اس کے اٹھانے میں معین و مددگار ہوگا۔ ہر ایک کو یہ بوجھ خود ہی اٹھانا پڑے گا۔

یَّوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ زُرْقًا (۱۰۲)

'زرق' 'ازرق' کی جمع ہے۔ 'ازرق' نیلگوں چشم کو کہتے ہیں لیکن عربی محاورہ میں یہ خوف زدہ اور دہشت زدہ آدمی کے لیے بھی آتا ہے اس لیے کہ شدتِ خوف کی حالت میں آنکھیں نیلی پڑ جایا کرتی ہیں اور ان کے سرخ ڈورے غائب ہو جاتے ہیں۔

اوپر والی آیت میں جس قیامت کا ذکر ہے یہ اس کی تصویر ہے کہ اس دن کو یاد کرو جس دن صور پھونکا جائے گا۔ یہ مجہول کا صیغہ اس کی ہولناکی کی تعبیر کے لیے ہے کہ ایک ہولناک آواز ایک ہلچل تو برپا کر دے گی لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ فرمایا کہ اس دن ہم ان تمام مجرموں کو جو ہماری اس یاددہانی سے برگشتہ ہیں اور دوسروں کو بھی برگشتہ کر رہے ہیں اکٹھا کریں گے اور آج تو وہ بڑی ڈھٹائی سے ہماری تنبیہ کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن اس دن سب کی آنکھیں خوف سے نیلی پڑی ہوں گی۔

یَّتَخَافَتُوْنَ بَیْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا (۱۰۳)

ایک مغالطہ کا ازالہ

یعنی آج تو یہ قیامت سے بالکل بے فکر اور بے خوف ہیں۔ اول تو اس کو بہت بعید از امکان چیز سمجھتے ہیں اور اگر کسی درجے میں اس کو مانتے بھی ہیں تو یہ خیال کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں کہ زندگی، پھر موت، پھر برزخ پھر قیامت یہ اتنی دور کی بات ہے کہ اس کی فکر میں ابھی سے اپنے عیش کو مکدر کرنا حماقت ہے۔ فرمایا کہ آج تو یہ اس کو بہت دور کی چیز سمجھتے ہیں لیکن جب وہ آن کھڑی ہوگی تو آپس میں ایک دوسرے سے سرگوشی کریں گے اور کہیں گے کہ ان سارے مراحل پر زیادہ سے زیادہ بس دس دن گزرے ہوں گے! یہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ برزخی زندگی کا قیامت کے دن کوئی احساس نہیں ہوگا، ایسا معلوم ہوگا کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے

ہیں۔ رہی یہ دنیا کی زندگی تو جب تک یہ ہے اس وقت تک تو آدمی اسی مغالطہ میں رہتا ہے کہ ابھی بہت عمر باقی ہے لیکن جب وقت آخر آجاتا ہے تب محسوس ہوتا ہے کہ جس چیز کو بہت طویل سمجھے تھے وہ بہت مختصر نکلی۔ خاص طور پر غفلت میں جو زندگی گزرتی ہے وہ آنکھ کھلنے کے بعد بس ایک خواب معلوم ہوتی ہے۔ قرآن نے اسی غفلت پر یہاں متنبہ کیا ہے کہ اصل اعتبار آج کے احساس کا نہیں کہ یہ تو یکسر مغالطہ ہے بلکہ اس احساس کا ہے جو حقیقت کے سامنے آنے کے بعد ہوگا۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا (۱۰۴)

یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم اس دن کے احوال و احساسات کی یہ خبر جو دے رہے ہیں یہ محض ہوائی باتیں ہیں جو صرف مرعوب کرنے کے لیے سنائی جا رہی ہیں بلکہ یہ حقائق ہیں جو پیش آئیں گے۔ اس دن لوگ جو کچھ کہیں گے ان سے سب سے زیادہ واقف ہم ہیں۔ یہ دس دن والی بات تو الگ رہی اس دن ان کے اندر جو سب سے زیادہ معقول دانشمند اور اندازہ دان سمجھا جاتا ہوگا وہ یہ کہے گا کہ دس دن کہاں! بس زیادہ سے زیادہ ایک دن تم دنیا میں رہے ہوگے!

'امثل' کے معنی

'امثل' کے معنی افضل و برتر کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ بطریق تعریض استعمال ہوا ہے یعنی ان کے اندر جو سب سے زیادہ لال بجھکڑ مانا جاتا ہوگا وہ اپنی اندازہ دانی کا یہ ثبوت فراہم کرے گا!

عرب جاہلیت کی شاعری پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ ان آیتوں میں جس مغالطہ پر متنبہ کیا گیا ہے اسی مغالطہ میں مبتلا ہو کر بہت سے شاعروں نے قیامت کو 'حدیث خرافہ' یعنی ایک مہمل بات قرار دیا ہے۔ میں ان شعروں کے نقل کرنے سے قصداً احتراز کر رہا ہوں اور ان کے نقل کرنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہے اس لیے کہ یہ مغالطہ صرف دور جاہلیت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس دور تمدن کے لوگوں کا بھی اصل مغالطہ یہی ہے — قرآن نے یہاں اسی مغالطہ پر متنبہ کیا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۝ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا (۱۰۵-۱۰۷)

'نسف' کے معنی

'نسف' کے معنی ہیں کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینا، غلہ کو چھاج میں رکھ کے پھٹکنا، کسی چیز کو خس و خاشاک اور خاک اور راکھ بنا کر ہوا میں اڑا دینا۔

'یذرھا' میں ضمیر کا مرجع زمین ہے۔ ظاہر اور مشہور چیزوں کے لیے عربی میں اس طرح ضمیر لاتے ہیں۔ قرآن میں آسمان اور زمین وغیرہ کے لیے اس طرح متعدد جگہ ضمیریں آئی ہیں 'مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ' (اور روئے زمین پر کسی جاندار کو باقی نہیں چھوڑے گا) میں بھی ضمیر کا مرجع زمین ہے اگرچہ الفاظ میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

'قاع صفصف' کا مفہوم

'قاع صفصف' ہموار اور چٹیل میدان کو کہتے ہیں جس میں نہ نشیب و فراز ہو، نہ سبزہ و نباتات، نہ

درخت اور جنگل۔

'امت' بلندی اور فراز کو کہتے ہیں۔

پہاڑوں کے غیر فانی ہونے کا نظریہ اور اس کا ابطال

قیامت کے باب میں اہل عرب کو جس طرح وہ مغالطہ تھا جو اوپر مذکور ہوا اسی طرح وہ اس مغالطہ میں بھی مبتلا تھے کہ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ کسی دن روئے زمین سے یہ تمام پہاڑ غائب ہو جائیں۔ عوام تو درکنار ان کے بہت سے دانشوروں تک کا خیال یہ تھا کہ پہاڑ غیر فانی ہیں۔ زہیر جو عرب کے حکیم شعراء میں سے ہے کہتا ہے کہ

الا ارئی علی الحوادث باقیا
ولا خالدا الا الجبال الرواسیا

(حوادث روزگار کے مقابل میں ان مستحکم پہاڑوں کے سوا میں اور کسی چیز کو بھی قائم و دائم رہنے والی خیال نہیں کرتا)

جب قرآن لوگوں کو قیامت کے زلزلہ سے ڈراتا تو اسی مغالطہ کی بنا پر بہت سے نادان آنحضرت صلعم سے طنز اور مذاق کے انداز میں، سوال کرتے کہ جب قیامت آئے گی تو ان عظیم الشان پہاڑوں کا کیا بنے گا؟ کیا وہ ان کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکے گی! فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ ہاں! میرا رب ان کو بھی پاش پاش کر کے گرد و غبار کی طرح اڑا دے گا اور اس زمین کو بالکل صفاچٹ چھوڑ دے گا، نہ اس میں کسی سبزہ اور درخت کا نشان ہو گا اور نہ اس میں وادیاں اور کہسار اور نشیب و فراز ہوں گے!!

عرب جاہلیت تو پہاڑوں کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے اس لیے کہ ان کے نزدیک پہاڑ ہی بڑی چیز تھے لیکن اس زمانے کا انسان خود اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھتا ہے اور اس زعم میں مبتلا ہے کہ وہ بہت جلد ساری کائنات کو مسخر کر لے گا اس زعم کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ اس کے نزدیک قیامت کا سوال بالکل خارج از بحث ہے!!

يَوْمَئِذٍ يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ ۚ وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَٰنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا (۱۰۸)

'ھمس' کے معنی باریک اور پست آواز کے ہیں جو کاناپھوسی کی نوعیت کی ہو۔

فرمایا کہ آج تو لوگ ہمارے داعی کی بات نہیں سن رہے ہیں، وہ صراط مستقیم کی دعوت دے رہا ہے تو یہ کج ہو کے چل رہے ہیں، اس کی مخالفت میں گلے پھاڑ رہے ہیں۔ لیکن اس دن کا داعی جب پکارے گا تو سب اس کے پیچھے چل پڑیں گے، کسی کی مجال نہ ہو گی کہ سر مو اس سے انحراف کر سکے اور خدائے رحمان کی ہیبت کے آگے سب کی آوازیں پست ہو جائیں گی، کسی کے حلق سے بھی آواز نہیں نکلے گی۔ جو بھی بات کرے گا سرگوشی اور کاناپھوسی کے انداز میں بات کرے گا۔

شفاعت کے لیے شرائط

يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (۱۰۹)

'مَنْ' کا استثناء میرے نزدیک یہاں منقطع ہے۔ یہ عربوں کی مزعومہ شفاعت کی تردید ہے۔ ان کا زعم یہ تھا کہ وہ جن معبودوں کو پوجتے ہیں وہ خدا کے لاڈلے اور چہیتے ہیں سو خود آگے بڑھ کر اپنے پجاریوں میں سے جس کے لیے چاہیں گے

سفارش کریں گے اور اس کو خدا سے چھڑا لیں گے۔ ان کے اس زعم کی تردید میں فرمایا کہ اس دن کسی کی شفاعت کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں ہے الا آنکہ خدائے رحمان کسی کو شفاعت کی اجازت دے اور کسی کے بارے میں وہ کسی کے کچھ کہنے کو پسند فرمائے۔ یعنی جو شفاعت کرے گا وہ بھی خدا کی اجازت سے کرے گا اور جس کے لیے شفاعت کی جائے گی وہ بھی بایں شرط مشروط ہے کہ خدا اس کے بارے میں کسی کے سفارش کرنے کو پسند فرمائے۔ مطلب یہ ہے کہ کام آنے والی شفاعت بیک وقت ان دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر کسی نے شفاعت سے متعلق ان شرائط سے قطع نظر کر کے کوئی اپنا نظریہ ایجاد کر رکھا ہے تو وہ محض اس کا واہمہ ہے جس کی حقیقت قیامت کے دن اس کے سامنے آجائے گی۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۲۸ کے تحت انشاء اللہ اس مضمون کی مزید وضاحت آئے گی۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا (۱۱۰)

اس ٹکڑے کی شرح آیت الکرسی کے تحت وضاحت سے ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کا علم سب کو محیط ہے۔ ہر ایک کے ماضی و مستقبل اور حاضر و غائب سب سے وہ واقف ہے۔ دوسرے کسی کی یہ حیثیت نہیں کہ اس کا علم خدا کے علم کا احاطہ کر سکے تو یہ مقام کس کا ہے کہ وہ کسی کے باب میں خدا کے علم میں کوئی اضافہ اور اس بنیاد پر اس کے حق میں کوئی سفارش کر سکے! خدا کسی کے متعلق کسی سے یہ معلوم کرنے کا محتاج نہیں ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے، اس کے اعمال کیا رہے ہیں اور وہ کیا معاملہ کیے جانے کا مستحق ہے؟ یہ ساری چیزیں اس کے علم میں موجود ہیں۔ اس مسئلے پر سورۂ مریم کی آیت ۶۵ کے تحت جو بحث گزر چکی ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۭ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا (۱۱۱)

'عنو' کے معنی فروتنی اور عجز و تذلل کے اظہار کے ہیں اور 'ظلم' سے مراد، جیسا کہ ہم متعدد مقامات میں واضح کر چکے ہیں، شرک ہے۔

شفاعتِ باطل کے امیدواروں کے ایک زعم کی تردید

یہ شفاعت باطل کے امیدواروں کے ایک اور زعم باطل کی تردید ہے۔ وہ اپنے جن مزعومہ شرکاء کو اپنا سفارشی سمجھے بیٹھے تھے ان کے متعلق یہ گمان بھی رکھتے تھے کہ خدا کے ہاں ان کو بڑے ناز و تدلل کا مقام حاصل ہے؛ وہ جو بات چاہیں خدا کے سامنے جرأت و اعتماد اور ناز و اصرار کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں اور خدا کو ان کی ناز برداری اس قدر محبوب و مطلوب ہے کہ وہ بہر حال ان کی بات مانتا اور ان کی سفارش پوری کرتا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اس قسم کے واہمہ میں مبتلا ہیں وہ اس کو اپنے ذہن سے نکال ڈالیں۔ خدا کے سامنے کسی کو بھی ناز و تدلل کا مقام حاصل نہیں ہے۔ اس کے سامنے ناز و تدلل کے بجائے سب کے چہرے خشیت و تذلل کے ساتھ جھکے ہوئے ہوں گے۔

یہاں اسمائے حسنیٰ میں سے 'حیّ' اور 'قیوم' کا حوالہ ہے۔ ان اسماء کے حوالہ کا ایک خاص محل ہے۔ مشرکین عرب کے متعلق ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ جہاں تک خدا کے ماننے کا تعلق ہے وہ خدا کو مانتے تھے لیکن اپنے شرکیہ عقائد کے تحت اس کی حیثیت انھوں نے بالکل وہ بنا کے رکھ دی تھی جو معاذ اللہ گھر کے ایک بڈھے بوڑھے ناکارہ وجود کی ہوتی ہے جو اپنی ساری ذمہ داریاں دوسروں کے سپرد کر کے خود گوشہ نشین بن کے بیٹھ جاتا ہے۔ اس

تصور نے ان کو خدا سے بالکل بے نیاز کر کے ان کا سارا اعتماد ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء پر جما دیا تھا۔ یہاں قرآن نے ان کے اس زعم باطل پر بھی ضرب لگائی اور فرمایا کہ خدا کوئی ناکارہ وجود نہیں بلکہ زندہ خدا ہے اور اپنی پیدا کی ہوئی اس دنیا کے سارے معاملات کو دوسروں کے اوپر چھوڑ کر کسی گوشہ میں ایک خاموش علۃ العلل بن کر نہیں بیٹھ رہا ہے بلکہ قیوم، یعنی اس کائنات کے سارے نظم کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو خود اپنی نگرانی اور اہتمام میں چلا رہا ہے۔

شرک باعث نامرادی ہے

وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا۔ 'ظلم' سے مراد شرک ہے اور یہاں اس لفظ کی تنکیر اس بات پر دلیل ہے کہ شرک کی جس نوع کا بھی کوئی مرتکب ہوگا وہ آخرت میں خاسر و نامراد ہوگا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شرک صرف یہی نہیں ہے کہ کوئی شخص بت پرستی کرے بلکہ اس کی جلی اور خفی بہت سی قسمیں ہیں اور اس کی ہر قسم باعث خسران و نامرادی ہے۔ ہم اس کی مختلف قسموں کی وضاحت اپنی اس کتاب میں بھی موقع موقع سے کر رہے ہیں اور اس موضوع پر 'حقیقت شرک' کے عنوان سے ہم نے مستقل کتاب بھی لکھی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (۱۱۲)

'ظلم' اور 'ھضم' کا مفہوم

'ظلم' اور 'ھضم' دونوں لفظ جب ایک ساتھ استعمال ہوں تو 'ظلم' کے اندر حق تلفی کا مفہوم پایا جاتا ہے اور 'ھضم' کے اندر غصب اور تعدی کا۔ یعنی ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی کا حق جو آپ پر عاید ہوتا ہے آپ اس کو دبا بیٹھیں۔ یہ ظلم ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ تعدی کر کے دوسرے کے پاس جو کچھ ہے اس کو چھیننے اور غصب کرنے کی کوشش کریں۔ یہ ھضم ہے۔

اوپر والی آیت میں فرمایا کہ جو کسی نوع کے شرک کا مرتکب ہوا وہ نامراد ہوا۔ یہ اس کے مقابل میں فرمایا کہ جو اعمال صالحہ کرے گا اور وہ مومن بھی ہو تو وہ اپنے اعمال کا بھرپور صلہ پائے گا۔ نہ اس کو کسی حق تلفی کا اندیشہ ہوگا نہ کسی تعدی کا۔

'وَهُوَ مُؤْمِنٌ' کا مفہوم ظاہر ہے کہ یہاں یہ ہے کہ وہ توحید پر قائم رہتے ہوئے نیک اعمال کرے۔ اگر اس میں شرک کی کوئی آلودگی ہو تو پھر اس کے اعمال کی خدا کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں ہے۔ اگر کوئی عمل خدا کی رضامندی کے لیے نہ کیا جائے بلکہ کسی اور غرض کے لیے کیا جائے تو اس کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے اگرچہ وہ بظاہر نیکی ہی کا کام کیوں نہ ہو!

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا (۱۱۳)

اصل سلسلۂ کلام نئی تمہید کے ساتھ

اس کا عطف اوپر والی بات پر ہے جہاں سے یہ سلسلۂ کلام چلا ہے۔ آیات ۹۹-۱۰۰ میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے خاص اپنے پاس سے تمہیں یہ یاددہانی (قرآن) عطا فرمائی ہے تو جو اس سے منہ موڑیں گے وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔ اس کے بعد انذار کے لیے قیامت کا ذکر آگیا تھا۔ قیامت کے ذکر کے بعد وہی اصل مضمون ایک نئی تمہید اور مزید تفصیل کے ساتھ از سر نو آگیا۔ فرمایا کہ اسی مقصد تذکیر کے لیے ہم نے

یہ قرآن عربی زبان میں اتارا ہے اور اس میں گوناگوں پہلوؤں سے ان عواقب و نتائج کی وضاحت کر دی ہے جن سے اس کی تکذیب کرنے والوں کو لازماً دوچار ہونا پڑے گا تاکہ لوگ اگر تقویٰ اور خدا ترسی کی راہ اختیار کرنا چاہیں تو وہ اختیار کریں اور اگر یہ نہیں تو پھر ہماری طرف سے ان کو یاد دہانی ہو جائے تاکہ اگر وہ ہماری پکڑ میں آئیں تو وہ یہ عذر نہ کر سکیں کہ ان کو یاد دہانی نہیں کی گئی۔

اہل عرب پر قرآن کا اتمام حجت۔

'قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا' کے الفاظ یہاں اہل عرب پر بطور اظہار احسان و امتنان کے بھی ہیں اور بطور اتمام حجت و قطع عذر کے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کو عربی زبان میں اتار کر ان لوگوں پر اپنا سب سے بڑا فضل بھی فرمایا کہ اپنی تذکیر و تعلیم کے لیے انہی کی زبان کو منتخب کیا اور اس طرح ان پر حجت بھی تمام ہو گئی۔ اب یہ قیامت کے روز یہ عذر نہیں کر سکتے کہ اگر ان کے پاس کوئی رسول، ان کی اپنی زبان میں کوئی کتاب لے کر آتا تو یہ سب سے زیادہ ہدایت کے اختیار کرنے والے بنتے۔ اس قرآن نے ان تمام عذرات کا خاتمہ کر دیا!

'صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ'۔ 'تصریف' کا مفہوم ہم متعدد جگہ واضح کر چکے ہیں کہ کسی بات کو گوناگوں و بوقلموں اسالیب سے پیش کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو یہ کتاب ہم نے ان کی اپنی زبان عربی میں اتاری، پھر یہ کہ اس سے اعراض کے جو نتائج ہوں گے ان کو مبہم نہیں چھوڑا بلکہ ان کو عقل کے، نقل کے، تاریخ کے، آفاق کے، انفس کے دلائل سے اچھی طرح مبرہن کر دیا ہے۔ اب اگر اس اہتمام کے بعد بھی یہ اس سے فائدہ نہ اٹھائیں تو نتائج کی ذمہ داری خود ان پر ہے!

'لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا'۔ یعنی اصل مقصود تو اس تمام اہتمام سے یہ ہے کہ ان کے اندر تقویٰ اور خدا ترسی پیدا ہو اور اگر یہ نہیں تو ان کو ہماری طرف سے یاددہانی ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں کس لیے برپا کیے گئے تھے اور اب کیا بنا رہے ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن نے عربوں کو ان کی وہ اصل تاریخ بھی از سر نو یاد دلائی ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے ان کے باپ حضرت اسمٰعیلؑ کو اس سرزمین میں ایک خاص مشن کے ساتھ بسایا تھا۔ اس کی وضاحت دوسرے مقامات میں تفصیل کے ساتھ ہو چکی ہے۔ آیت میں 'احداث' کا لفظ اسی پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ 'احداث ذکر' کا اصل مفہوم کسی سرگزشت کی از سر نو یاددہانی ہے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (۱۱۴)

نزول قرآن کے لیے آنحضرت کے اندر بے قراری کی اصل وجہ

اس آیت کا صحیح مفہوم ذہن نشین کرنے کے لیے سورۂ مریم کی آیات ۶۴-۶۵ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ مخالفین کی تمام مخالفتوں اور ذراتر خائیوں کے مقابلہ کے لیے آنحضرت صلعم کے پاس واحد ہتھیار قرآن ہی تھا۔ اس وجہ سے قدرتی طور پر اس کے اترنے کے لیے آپ کے اندر ایک بے قراری اور بے چینی پائی جاتی تھی۔ اسی سے مشکلات میں آپ کو رہنمائی ملتی تھی، یہی چیز الجھنوں اور پریشانیوں میں تسلی کا ذریعہ بنتی تھی اور مخالفین جو نت نئے مطالبات و اعتراضات روز روز پیش کرتے ان کے فیصلہ کن جواب بھی قرآن

ہی صرف سکتا تھا۔ ان وجوہ سے اس سپاہی کی طرح جو دشمنوں کی دل بادل فوج کے مقابل میں نبرد آزما ہو، آپ کو ہر وقت اس آسمانی کمک کا انتظار رہتا۔ حضورؐ کی اسی پریشانی کو دور کرنے کے لیے ارشاد ہوا کہ تم قرآن کے اتارے جانے کے لیے جلدی نہ کرو، خدا کی ذات بڑی ہی برتر اور بلند ہے۔ اپنی حکمتوں اور مصلحتوں کو وہ خود ہی جانتا ہے۔ وہی اس کائنات کا بادشاہ حقیقی ہے اور تم جو یاددہانی لوگوں کو سنا رہے ہو وہ اسی بادشاہ حقیقی کا فرمان ہے۔ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں ہے۔ تم لوگوں کے رد و قبول سے بالکل بے نیاز ہو کر جس تدریج اور ترتیب سے یہ اتر رہا ہے لوگوں کو سناتے رہو۔ اس کی تکمیل کے لیے خدا نے جو مدت مقرر کر رکھی ہے وہ اس کی حکمت و مصلحت سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس مدت سے پہلے اس کے اتار دیے جانے کے لیے جلدی نہ کرو۔ البتہ یہ دعا برابر کرتے رہو کہ اے رب میرے علم کو زیادہ کر!

یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اسی سیاق و سباق کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ہمارے مفسرین نے ان آیات کو اس محدود مفہوم میں لیا ہے کہ حضرت جبریلؑ جب آنحضرتؐ کو وحی سناتے تو آپ اس کو سیکھنے میں عجلت کر دیتے جس پر آپ کو ٹوکا گیا۔ اگرچہ یہ بات بجائے خود صحیح ہے کہ جس چیز کے لیے شوق و بے قراری ہو جذبۂ شوق اس کے لیے جلد باز بنا دیتا ہے، ہمارے پاس اگر کوئی ایسا نامۂ محبت آئے جس کے لیے ہم نے بے چینی کی گھڑیاں گزاری ہوں تو ہم یہی چاہیں گے کہ اس کو ایک ہی سانس میں پورا پڑھ ڈالیں۔ یہ جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور قرآن کے معاملہ میں حضورؐ کے اندر یہ جذبہ ضرور رہا ہوگا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ یہاں آپ کو اس چیز پر ٹوکا گیا ہے۔ اس کا اصل پس منظر وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ آگے بھی اس مضمون کی آیات جگہ جگہ آئیں گی۔ ان سے ان شاء اللہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُۥ عَزْمًا (۱۱۵)

'عَهِدْنَآ إِلَىٰ' کا مفہوم ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں۔ یہ اسلوب بیان کسی کو کوئی خاص ہدایت یا وصیت تاکید و اہتمام کے ساتھ کرنے کے لیے آتا ہے۔

عجلت سے احتراز کی ہدایت

اوپر کی آیت میں آنحضرتؐ کو قرآن کے معاملہ میں جلدی کرنے سے روکا ہے۔ اب اس جلدی کے نقصانات واضح کرنے کے لیے حضرت آدمؑ اور ابلیس کے ماجرے کا حوالہ دیا ہے کہ یہی عجلت آدمؑ کے لیے مزلۂ قدم ثابت ہوئی۔ انسانی فطرت کے اسی ضعف سے ابلیس نے فائدہ اٹھایا اور آدمؑ کو ورغلا کر اللہ کی اس ہدایت سے غافل کر دیا جو ان کو ایک خاص درخت کے پھل سے احتراز کے لیے کی گئی تھی۔ جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ آدمؑ کو جنت سے نکل کر اس دنیا کے دارالابتلاء میں آنا پڑا۔ مقصود اس ماجرے کی یاددہانی سے یہ ہے کہ یہ عجلت کسی کو بھی راس نہیں آئی ہے۔ اوپر حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت میں بھی یہ حقیقت واضح فرمائی گئی کہ ان کی عجلت بھی ان کو راس نہیں آئی بلکہ ان کے اور ان کی قوم کے لیے ایک سخت آزمائش بن گئی۔ ان واقعات کے پردے میں آنحضرتؐ کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آپ بھی اپنی دعوت کے معاملے میں جلدی نہ کریں بلکہ صبر و عزم کے ساتھ درجہ بدرجہ جس

طرح آپ کو ہدایت کی جا رہی ہے اپنے کام میں لگے رہیں۔ اگر آپ نے جلدی کی تو، خواہ وہ کتنے ہی اچھے مقصد کے لیے ہو، اس سے اندیشہ اس بات کا ہے کہ آپ کی امت کی تربیت میں خامی رہ جائے اور کوئی شیطان یا سامری اس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو ایک فتنہ میں مبتلا کر دے۔

'مِنۡ قَبۡلُ' ماضی کی سرگزشت کی یاددہانی ہے۔ یعنی جس طرح آج تمہیں عجلت نہ کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے اسی طرح پہلے تمہارے اور تمام نسل آدم کے باپ آدم علیہ السلام کو بھی ہدایت کی گئی تھی لیکن وہ اس کو ملحوظ نہ رکھ سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شیطان کے فریب میں آ گئے۔ چونکہ ماضی کے تجربات، بالخصوص جب کہ وہ اپنے ہی ابوالآباء کی زندگی سے تعلق رکھنے والے ہوں، نسل حاضر و مستقبل کے لیے نہایت سبق آموز ہوتے ہیں اس وجہ سے اشارہ فرمایا کہ پہلے کے واقعات و تجربات کو پیش نظر رکھو۔

'فَنَسِیَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَہٗ عَزۡمًا'۔ 'نسی' یہاں نگاہوں سے 'اوجھل ہو جانے' کے مفہوم میں ہے۔ یعنی حضرت آدمؑ کو جو ہدایت کی گئی ایک وقتی جذبۂ عجلت سے مغلوب ہو جانے کے سبب سے وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور وہ مضبوط عزم کے ساتھ اس پر قائم نہ رہ سکے۔ حضرت آدمؑ کو جو ہدایت کی گئی تھی اور ان سے جو لغزش صادر ہوئی اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ اس آیت میں صرف یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ جذبات و داعیات جتنے بھی ہیں سب انسانی سرشت کے اجزا ہیں لیکن ان کے لیے حدود و قیود ہیں اگر وہ اپنے حدود کے اندر رہیں تب تو وہ فرد اور معاشرہ سب کے لیے خیر و برکت ہیں لیکن اگر ان میں سے کسی کی باگ ذرا ڈھیل چھوڑ دی جائے تو پھر وہ فرد اور سماج دونوں کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ ان داعیات و جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے آدمی کو اپنے اندر صبر اور عزم کی صفت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ اسی صفت کو پیدا کر کے آدمی اپنے رہوار نفس کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ ورنہ معلوم نہیں کون سا جذبہ اس کو کس فتنہ میں مبتلا کر دے۔ عجلت بھی انسان کے جذبات میں سے ایک جذبہ ہے اور یہ اس کی سرشت میں داخل ہے۔ 'خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ' (انبیاء۔ ۳۷) اور 'وَکَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا' (اسراء۔ ۱۱) وغیرہ آیات میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن یہ انسان کے لیے نافع اسی وقت تک ہے جب تک یہ آدمی کے صبر اور عزم کے کنٹرول میں رہے۔ اگر یہ صبر اور عزم پر غالب ہو جائے تو پھر یہ انسان کے لیے بہت بڑا خطرہ بھی بن سکتا ہے۔

'وَلَمۡ نَجِدۡ لَہٗ عَزۡمًا'۔ عزم کا صحیح مفہوم صبر اور عزیمت و استقامت ہے، جس کا ضد بے صبری اور جلد بازی ہے۔ یہاں اصل مقصد کلام حضرت آدمؑ کی بے صبری اور جلد بازی ہی کی طرف اشارہ کرنا اور اس کے عواقب سے آنحضرتؐ کو آگاہ کرنا ہے۔

وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰی (۱۱۶)

اجمال کے بعد تفصیل

اوپر والی آیت میں قصۂ آدم و ابلیس کا وہ خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے جو یہاں اس کے بیان سے مدنظر ہے۔ اس کے بعد اب اصل قصہ کی تفصیل آ رہی ہے۔ قصوں کی تفصیل سے پہلے ان کا خلاصہ نگاہ کے سامنے کر دینے

سے نظم کلام کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ اسلوبِ بیان قرآن نے جگہ جگہ اختیار کیا ہے۔ اصحاب کہف کے واقعہ کے بیان کرنے میں بھی قرآن نے یہی اسلوب اختیار فرمایا ہے اور ہم اس کی وضاحت اس کے محل میں کر چکے ہیں۔

قصۂ آدم و ابلیس کا سبق

فرمایا کہ، یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو تعظیم بجا لاؤ تو سب نے اس حکم کی تعمیل کی مگر ابلیس نے اس کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ یہ ماجرا سورۂ بقرہ اور اعراف میں بھی بیان ہو چکا ہے اور ہم وہاں اس کے ہر جزو پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے دہرانے میں طوالت ہوگی۔ بقرہ کی آیات ۳۰-۳۹ کے تحت تدبر قرآن جلد اول کے صفحات ۱۱۲-۱۳۰ پر اور اعراف کی آیات ۱۱-۱۴ کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے اس حکم کی حکمت، سجدہ کی نوعیت، فرشتوں کے ساتھ اس حکم میں جنات کی شرکت کی علت، ابلیس اور اس کے غرور و استکبار، ہر چیز پر اپنے علم کے حد تک ہم نے گفتگو کی ہے۔

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (۱۱۷)

ابلیس نے صرف سجدہ کرنے ہی سے انکار نہیں کیا بلکہ، جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیات ۱۴-۲۲ کے تحت ہم وضاحت سے بیان کر آئے ہیں اس نے جوشِ حسد میں خود اللہ تعالیٰ کو یہ چیلنج کیا کہ اگر تو مجھے آدمؑ اور اس کی ذریت کو ورغلانے کی مہلت دے تو میں یہ ثابت کر دوں گا کہ نہ یہ مجھ پر کسی فضیلت کے سزاوار ہیں اور نہ اس جنت کے حقدار ہیں بلکہ میں ان میں سے اکثر کو اپنا مرید و ہمنوا بنا لوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو اس کو مہلت دے دی کہ جا تو جس کو ورغلا سکتا ہے ورغلا لے، میں تجھ کو اور تیرے سارے مریدوں کو جہنم میں جھونک دوں گا اور دوسری طرف حضرت آدمؑ کو آگاہ فرما دیا کہ تم جنت میں رہو لیکن اس امر کو یاد رکھو کہ ابلیس تمہارا ابدی دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں کسی گمراہی میں مبتلا کر کے جنت سے نکلوا چھوڑے اور تم محروم و نامراد ہو کر رہ جاؤ۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۱۱۸-۱۱۹)

جنتِ آدمؑ کی جامع تعریف

ان دو آیتوں میں اس جنت کی نہایت ہی جامع تعریف ہے جس میں حضرت آدمؑ رکھے گئے تھے۔ فرمایا کہ اس میں نہ تم بھوکے ہوگے نہ ننگے، نہ اس میں تمہیں پیاس ستائے گی نہ دھوپ۔ دوسرے لفظوں میں اگر اس بات کو کہنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں تم سردی اور گرمی دونوں کے آزار سے محفوظ رہوگے۔ سردی کے آزار میں سے بھوک اور عریانی ہے اور گرمی کی تکالیف میں سے پیاس اور دھوپ۔ جن لوگوں کی نظر اہل عرب کے کلام پر ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ بسا اوقات سردی اور گرمی کی تکالیف کا ذکر اسی طرح کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ پیاس کا ذکر بھوک کے ساتھ اور دھوپ کا ذکر عریانی کے ساتھ زیادہ موزوں ہوتا۔ ہمارے نزدیک یہ رائے عربیت کے ذوق سے محرومی کا نتیجہ ہے۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (۱۲۰)

آدمؑ پر ابلیس کا کامیاب حملہ

ابلیس اگرچہ اپنے استکبار اور حکمِ خداوندی کی نافرمانی کے باعث جنت سے راندہ ہو چکا تھا لیکن اس نے قیامت تک کے لیے آدمؑ اور اولادِ آدمؑ پر اپنا چلتر آزمانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مہلت حاصل کر لی تھی اس وجہ سے

وہ حضرت آدم کے پاس جنت میں بھی وسوسہ اندازی کے لیے پہنچ گیا اور ان کو سمجھایا کہ ایک خاص درخت کے پھل سے جو تمھیں روک دیا گیا ہے اس کا راز یہ ہے کہ ابدی زندگی اور ابدی بادشاہی کا درخت وہی ہے۔ اگر تم ابدی زندگی اور لازوال بادشاہی چاہتے ہو تو اس درخت کا پھل چکھو ورنہ آخر اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم اس جنت میں ہمیشہ رہو گے! اول تو انسان کے اندر یہ کمزوری موجود ہے کہ وہ جس چیز سے روک دیا جائے اس کا حریص بن جایا کرتا ہے۔ ثانیاً حضرت آدم کو یہ کھٹکا بھی تھا کہ اس جنت سے وہ نکالے بھی جا سکتے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ڈرایا تھا کہ ابلیس تمھارا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو جنت سے نکلوا چھوڑے۔ ابلیس نے آدم کے اسی اندیشہ کو تاڑ لیا اور نہایت خیر خواہانہ انداز میں ان کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ اگر وہ ابدی زندگی اور ابدی بادشاہی چاہتے ہیں تو انھیں اس درخت کا پھل کھا لینا چاہیے۔ اس خواہش کے غلبہ نے ان کو اس یاددہانی سے بالکل غافل کر دیا جو اللہ تعالیٰ نے ان کو شیطان کی دشمنی سے متعلق فرمائی تھی۔ وہ اپنے دشمن کو اپنا خیر خواہ سمجھ بیٹھے اور اس کے چکر میں آ گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شیطان اگرچہ بنی آدم کا ابدی دشمن ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ کامیاب حملہ وہ ہوتا ہے جو وہ دوست اور خیر خواہ کے بھیس میں کرتا ہے۔ وہ اسی بھیس میں آ کر وسوسہ اندازی کرتا ہے اور انسان کو یہ باور کراتا ہے کہ خدا اور رسول نے اس کو جن چیزوں سے روکا ہے اس کی تمام تہذیب و ترقی کا راز اگر ہے تو بس انھی چیزوں کے اختیار کرنے میں ہے۔ آج کے حالات کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہو گا کہ تمام محرمات شریعت کی اباحت کی سب سے بڑی دلیل جو شیطان کے ایجنٹ پیش کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ اگر ان چیزوں کے باب میں مذہب کے فتوے پر عمل کیا جائے تو تمام تہذیب و ترقی کا جنازہ نکل جائے گا!

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیت میں جو مضمون بیان ہوا ہے یہی مضمون سورۂ اعراف میں یوں آیا ہے مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ (۲۰) (تمھارے رب نے تم دونوں کو صرف اس وجہ سے اس درخت سے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے اور زندگی دوام کے مالک نہ بن جاؤ) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت زیر بحث میں 'مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى' (ایسی بادشاہی جس پر کبھی زوال نہ آئے) کے الفاظ ہیں اور اعراف میں 'اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ' (کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ بن جاؤ) کے الفاظ ہیں۔ ان دونوں باتوں کے اندر تضاد نہ سہی لیکن فرق تو بہرحال ہے تو آخر ان میں تطبیق کی کیا شکل ہے؟ اسی مشکل سے بچنے کے لیے بعض لوگوں نے 'مَلَكَيْنِ' کو 'مَلِكَيْنِ' بکسر لام پڑھا ہے یعنی کہیں تم دونوں بادشاہ نہ بن جاؤ اور اس طرح انھوں نے ان دونوں آیتوں میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اول تو اس صورت میں بھی پوری تطبیق نہیں ہوتی ثانیاً ہمارے نزدیک متواتر اور مشہور قراءت صرف مصحف ہی کی قراءت ہے اور ہم غیر متواتر قراءت پر قرآن کی کسی آیت کی تاویل کو صحیح نہیں سمجھتے۔

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ابلیس نے حضرت آدم و حوا کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے

ان کو مختلف قسم کی ترغیبات دیں کبھی ان کو فرشتے بن جانے کی امید دلائی اور کبھی ایک لازوال بادشاہی حاصل ہو جانے کی توقع دلائی۔ اس بات کی طرف ہمارا ذہن اس وجہ سے جاتا ہے کہ اعراف میں اس بات کی تصریح ہے کہ حضرت آدمؑ کو اپنے دام میں لانے کے لیے ابلیس کو بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ اس نے بڑی قسموں اور بڑی اطمینان دہانیوں کے بعد ان کو رام کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ سورۂ اعراف کی آیت ۲۲ میں فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُورٍ کے الفاظ ہیں۔ ہم نے وہاں ان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا صحیح مفہوم کسی کو درجہ بدرجہ اپنے ڈھب پر لانے یا شیشے میں اتارنے کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ ابلیس کے ایک ہی فقرے میں اس کے چکمے میں نہیں آگئے بلکہ اس نے مختلف مواقع پیدا کر کے ان کو مختلف قسم کے فریب دیے یہاں تک کہ وہ اس کے دام میں پھنس گئے۔ کبھی یہ کہا کہ خدا نے تم کو اس درخت سے اس اندیشہ سے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، اور کبھی یہ کہا کہ اس وجہ سے اس سے منع کیا ہے کہ تمہیں لازوال بادشاہی نہ حاصل ہو جائے۔ مقصد تو کسی نہ کسی طرح اپنے دامِ فریب میں لانا تھا اس وجہ سے جس وقت جو بات بن سکی وہ اس نے بنانے کی کوشش کی۔

فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ ۚ وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ (۱۲۱)

اس آیت کی وضاحت بقرہ کی تفسیر میں بھی ہو چکی ہے اور اعراف کی آیت ۲۲ کے تحت بھی۔ یہاں ان ساری باتوں کے دہرانے کی گنجائش نہیں ہے۔ 'غَوٰی' کے معنی 'ضَلَّ وَخَابَ' کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمؑ ابلیس کے چکمے میں آکر شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھا بیٹھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو جو حلۂ جنت پہنایا گیا تھا اور جس کی نسبت، جیسا کہ آیت ۱۱۸ میں گزرا، اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ تھا کہ اس سے وہ کبھی محروم نہیں ہوں گے، وہ ان سے چھن گیا اور وہ گھبراہٹ میں باغ کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانکنے لگے۔ 'وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى' یعنی اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو جو ہدایت دی تھی وہ اس پر قائم نہ رہ سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ صحیح راہ سے بھٹک گئے۔ 'وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ' سے حضرت آدمؑ و حوا کی اس گھبراہٹ اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا ہے جو دفعۃً حلۂ جنت سے محروم ہو جانے کے باعث ان پر طاری ہوئی۔ انھوں نے ابدی جنت کے حصول کی طمع میں یہ اقدام کیا لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ جو حاصل تھی وہ بھی ہاتھ سے گئی۔

ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ (۱۲۲)

'اجتباء' کا مفہوم

یہاں 'اجتباء' کا ذکر ان کی توبہ اور قبولیتِ توبہ سے پہلے ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ اس 'اجتباء' سے مراد حضرت آدمؑ کو توفیقِ توبہ اور کلماتِ توبہ سے سرفراز فرمانا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہی مضمون یوں آیا ہے۔

آدمؑ کی توبہ کا اثر

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۳۷) (پس آدمؑ نے اپنے رب کی طرف سے کچھ کلمات سیکھ لیے اور توبہ کی تو اس کے رب نے اس کی توبہ قبول فرمائی، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور بڑا ہی رحیم ہے) سورۂ اعراف میں ان کلماتِ توبہ کی وضاحت بھی ہے۔ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ

تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ ۲۳) انھوں نے دعا کی کہ اے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور رحم پر رحم نہ فرمایا تو ہم نامراد ہو کے رہ جائیں گے! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے جو لغزش ہوئی وہ اس پر سخت نادم ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو بندہ اپنے گناہ پر شرمسار ہوتا ہے وہ اس کو توبہ و اصلاح کی توفیق بخشتا ہے اور توبہ و اصلاح کے بعد اس کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے سے قریب کر لیتا ہے۔ اسی چیز کو یہاں 'اجتباء' سے تعبیر فرمایا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ بڑا ہی خوش بخت ہے وہ انسان جس کو احساسِ ندامت اور توفیقِ توبہ کے ساتھ ساتھ ربِ کریم کی طرف سے توبہ کے کلمات تلقین ہوں۔

'فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى' 'تَابَ' کے بعد جب 'عَلٰى' آتا ہے تو جیسا کہ ہم بقرہ ۳۷ کے تحت وضاحت کر چکے ہیں، یہ رحم کے مضمون پر بھی متضمن ہوتا ہے۔ یعنی اللہ نے اس کی توبہ قبول کی اور اس پر رحم فرمایا اور اس کو ہدایت دی۔ 'ہدایت دی' سے مراد ظاہر ہے کہ آگے کے مراحل کے لیے ہدایت دینا ہے تاکہ آدمؑ اور ان کی ذریت شیطان کے فتنوں کا مقابلہ کر سکے۔

عیسائیوں اور ذریتِ آدم کے منکروں کی تردید

اس آیت سے عیسائیوں کے اس خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو ان کے ہاں آدمؑ اور ان کی ذریت کے ابدی گنہگار ہونے کا پایا جاتا ہے اور ان لوگوں کے خیال کی بھی تردید ہوتی ہے جو حضرت آدمؑ کو صرف نسلِ انسانی کا باپ مانتے ہیں، ان کو نبی نہیں مانتے۔ اس آیت کے الفاظ بھی ان کی نبوت پر دلیل ہیں اور عقل بھی یہ تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اور ان کی ذریت کی رہنمائی کے لیے ان کے حسبِ حال ان کو شریعت عطا فرمائے۔ آگے کی آیت میں اس کی وضاحت آ رہی ہے۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (۱۲۳)

بقرہ آیت ۳۸ اور اعراف آیت ۲۴ کے تحت اس آیت کے تمام متعلقات پر گفتگو ہو چکی ہے۔ ہم نے ان آیات کے تحت وہ حکمت بھی واضح کی ہے جو متقضی ہوئی کہ حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت اس دنیا میں آ کر شیطان کا مقابلہ کریں اور یہ بات بھی واضح کی ہے کہ ان آیات میں خطاب حضرت آدمؑ و حوا سے نہیں بلکہ آدمؑ اور ابلیس سے بحیثیت دو فریقوں کے ہے۔

'بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ' یعنی شیطان تمہارا دشمن ہوگا اور تم، اگر تمہیں اپنی عاقبت عزیز ہے اور پھر جنت حاصل کرنے کے آرزو مند ہو، شیطان کے دشمن ہو گے اس لیے کہ ہر عاقل اپنے دشمن کو دشمن سمجھتا اور اس سے چوکنا رہتا ہے۔ صرف احمق اور ناعاقبت اندیش ہی ہوتا ہے جو اپنے دشمن سے دوستی گانٹھتا اور اس کے مشوروں پر کاربند ہوتا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

جن لوگوں نے محض اس غلط فہمی کی بنا پر کہ یہاں تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے اس کا مخاطب حضرت آدمؑ اور

ہوا کرتا ہے ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ اوّل تو بعینہٖ یہی بات بقرہ اور اعراف وغیرہ میں جمع کے صیغہ سے ارشاد ہوئی ہے، ثانیاً یہاں اگر مثنّی کا صیغہ آیا ہے تو اس کے ساتھ لفظ جَمِيْعًا بھی ہے، اگر مخاطب حضرت آدمؑ اور حوّا ہی ہیں تو یہ لفظ بالکل بے ضرورت ہو کے رہ جاتا ہے۔ ثالثاً آدمؑ و حوّا میں فطری تعلق عداوت کا نہیں بلکہ محبت کا ہے۔ میاں بیوی میں اگر عداوت ہوتی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ خدانخواستہ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ واقع ہوئے ہیں بلکہ یہ شیطان کی دراندازی اور فساد انگیزی سے پیدا ہوتی ہے۔ البتہ شیطان اور ان کے مابین دشمنی فطری ہے اور یہ دشمنی قیامت تک کے لیے ہے۔ شیطان کی دشمنی تو واضح ہے کہ وہ برنبائے حسد ہے اور اس کا وہ کھلم کھلا اعلان کر چکا ہے۔ رہا انسان تو وہ اگر ذی ہوش ہے تو اس کو یہ حقیقت ہمیشہ مستحضر رکھنی چاہیے کہ وہ اسی دشمن سے نبرد آزمائی کے لیے جنت سے نکال کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اگر وہ اس سے دوستی کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود اپنے دشمن کے آگے سپر انداز ہوتا ہے۔

شیطان کے مقابلہ کے لیے ہتھیار

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۔ یہ وہ ہتھیار ہے جو اللہ تعالیٰ نے شیطان کے مقابلہ کے لیے آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو مہیا فرمانے کا وعدہ فرمایا۔ چونکہ انسان اس دنیا میں بڑے ہی شاطر دشمن سے نبرد آزمائی کے لیے بھیجا گیا ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ اس کو عقل و فطرت کی ہدایت کے ساتھ ساتھ خاص اپنے پاس سے بھی ہدایت سے سرفراز فرمائے تاکہ وہ دہری طاقت و ہمت کے ساتھ شیطان کا مقابلہ کر سکے۔ فرمایا کہ اب تم یہاں سے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے تو جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے نہ وہ شیطان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوں گے اور نہ اس جنت سے محروم رہیں گے جس سے محروم رکھنے کے لیے شیطان نے قسم کھائی ہے۔

اس آیت سے دو باتیں بالکل واضح طور پر ثابت ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس دنیا میں شیطان کے فتنوں سے امان میں رہنے کا واحد ذریعہ اللہ کی کتاب ہے جو اس روشنی سے محروم ہے وہ ہر وقت شیاطین جن و انس کی زد میں ہے۔

حضرت آدمؑ نبی تھے

دوسری یہ کہ حضرت آدمؑ ایک نبی تھے۔ جب وہ شیطان کے ساتھ نبرد آزمائی کے لیے اس دنیا میں اتارے گئے ہیں اور اس سے مقابلہ کے لیے اللہ کی ہدایت ضروری ہے تو لازماً ان کی اور ان کی ذریت کی رہنمائی کے لیے، ان کے حالات کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے ان کو کوئی شریعت بھی دی ہوگی۔ ہم حضرت آدمؑ کی شریعت کے بعض احکام کی طرف سورۂ مائدہ کی تفسیر میں، بضمن قصۂ ہابیل و قابیل، اشارہ کر چکے ہیں۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۱۲۴)

ایمان کے بغیر طمانیت نہیں حاصل ہوتی

'مَعِيْشَةً ضَنْكًا' کے معنی تنگ زندگی کے ہیں جو سکون و طمانیت اور فراغ خاطر و شرح صدر کی نعمت سے محروم ہو۔ فرمایا کہ جو ہماری اس یاددہانی سے اعراض کرے گا وہ دنیا میں سکون قلب و شرح صدر سے محروم زندگی گزارے گا اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔

طمانیت قلب ذکر الٰہی سے ہے

سکونِ قلب و شرحِ صدر سے اس کی زندگی کے محروم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک خلا ہے جو اللہ کے ایمان کے سوا اور کسی چیز سے نہیں بھر سکتا اس وجہ سے جب تک اس کو ایمان حاصل نہ ہو کوئی دوسری چیز اس کو تسلی و طمانیت سے بہرہ مند نہیں کر سکتی۔ دوسری چیزیں خواہ وہ بظاہر کتنی ہی شاندار اور دلفریب کیوں نہ ہوں، وقتی بہلاوے کا کام تو دے سکتی ہیں لیکن قلب و روح کی بے قراری کو رفع نہیں کر سکتیں۔ جب بچہ بھوک سے روتا ہے تو اس کے منہ میں چُسنی یا نپل دے کر کچھ دیر کے لیے بہلایا جا سکتا ہے لیکن وہ آسودہ اسی وقت ہوتا ہے جب ماں اس کو چھاتی سے لگاتی اور اس کو دودھ پلاتی ہے۔ اس کے بغیر اس کی بے چینی نہیں جاتی۔ یہی حال انسان کا ہے وہ اپنے لیے جو اسباب و سامان بھی جمع کرلے لیکن اگر وہ خدا کے ایمان سے محروم ہے تو وہ غیر مطمئن، ڈانوا ڈول، اندیشہ ناک، مضطرب اور اندرونی خلفشار میں مبتلا رہے گا، اگرچہ وہ اپنی نمائشوں سے اس پر کتنا ہی پردہ ڈالنے کی کوشش کرے۔ نفسِ مطمئنہ کی بادشاہی صرف سچے اور پکے ایمان ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ!

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ بہت سے لوگ ایمان کے مدعی ہوتے ہیں لیکن ان کی زندگی نہایت پریشان حالی و پراگندہ بالی کی ہوتی ہے۔ برعکس اس کے کتنے ہیں جو خدا کو محض ایک وہم سمجھتے ہیں لیکن وہ بڑی بے فکری و طمانیت کی زندگی بسر کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو یہاں بحث ایمان کے مدعیوں سے نہیں بلکہ حقیقی اہلِ ایمان سے ہے۔ ثانیاً جن لوگوں کو خدا سے بے پروا ہونے کے باوجود ہم مطمئن خیال کرتے ہیں ہم صرف ان کے ظاہری کروفر کو دیکھتے ہیں۔ اگر کبھی ان کے سینوں میں جھانک کر دیکھنے کا موقع ملے تب معلوم ہو کہ ان کے اندر کتنے خطرے اور کتنے غلیان چھپے ہوئے بیٹھے ہیں لیکن یہ ہر ایک کو نظر نہیں آتے۔ ان کو وہ خود دیکھتے ہیں یا وہ لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کے اندر ایمانی بصیرت ہو۔

ذکر الٰہی سے غافل قیامت کو اندھے اٹھیں گے

وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى: اللہ کے ذکر سے اعراض کرنے والے قیامت کے روز اندھے اٹھائے جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ، کان اور دل کے پردے اٹھانے والی چیز اللہ کی یاددہانی ہے۔ اگر کوئی شخص اس یاددہانی سے اعراض کرتا ہے تو جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، وہ آنکھیں، کان اور دل ودماغ رکھتے ہوئے، اندھا بہرا اور لایعقل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ان عظیم نعمتوں کی ناقدری کی پاداش میں ایسے بلید جانوروں کو اندھا بنا کر اٹھائے گا۔ یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے صرف محسوسات کی غلامی کے لیے نہیں عطا فرمائی ہیں بلکہ ان حقائق کے مشاہدے کے لیے عطا فرمائی ہیں جو اس کائنات کے ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ پر نقش ہیں، اگر کوئی شخص سب کچھ دیکھتا ہے لیکن اس کو وہی حقیقت نظر نہیں آتی جو سب سے زیادہ نمایاں ہے تو ہر چند وہ سب کچھ دیکھتا ہے لیکن اس کو سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں!

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ قٓ میں فرمایا ہے فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ

اَلْیَوْمَ حَدِیْدٌ ۲۲ (پس ہم نے تیرے حجابات ہٹا دیے تو تیری نگاہ آج بہت تیز ہے) اور یہاں ارشاد ہوا ہے کہ ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے، تو ان دونوں میں تطبیق کس طرح ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ سورۂ قٓ میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اس قیامت کی طرف سے بالکل غافل رہے لیکن آج سارے حقائق سامنے آگئے اور سارے پردے چاک ہوگئے! اس اسلوب کلام کے اندر خاص بلیغ پہلو یہ ہے کہ اس دنیا میں تو محسوسات کے غلام اندھے بن کر زندگی گزارتے ہیں لیکن ان کو نہ صرف یہ کہ اپنے اندھے ہونے کا کوئی احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے آپ کو بڑا سقراط و بقراط اور بڑا ہی دانا و بینا سمجھتے ہیں لیکن قیامت کے دن ان کو اپنا اندھا ہونا نظر آجائے گا۔ آج تو یہ حال ہے کہ ہمارے سائنس دانوں کی آنکھیں تمام دوربینوں اور خوردبینوں سے مسلح ہونے کے باوجود اپنی آنکھیں دیکھنے سے بھی قاصر ہیں لیکن ایک دن آنے والا ہے جب سارے پردے اٹھ جائیں گے اور کسی کے لیے بھی مجال انکار باقی نہیں رہے گی، اسی انکشاف حقیقت کو 'فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ' سے تعبیر فرمایا ہے۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْٓ اَعْمٰی وَقَدْ كُنْتُ بَصِیْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰی (۱۲۵-۱۲۶)

'نسی' کے معنی یہاں نظر انداز کرنے کے ہیں۔ لفظ کے اس مفہوم کی وضاحت دوسرے مقام میں ہو چکی ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اندھے اٹھائے جائیں گے وہ فریاد کریں گے کہ اے رب! ہم تو آنکھیں رکھنے والے لوگ تھے تو تو نے ہم کو اندھے بنا کر کیوں اٹھایا! ارشاد ہوگا کہ ہم نے تمہارے پاس اپنی کتاب بھیجی جس کی آیات نے ایک ایک حقیقت تم پر واضح کی لیکن تم ان کو نظر انداز کر کے بالکل اندھے بہرے بنے رہے۔ مطلب یہ کہ اگر آنکھیں تھیں تو وہ آنکھیں ہماری اس ساری تذکیر و تنبیہ کے باوجود کیوں نہ کھلیں؟ جب تم نے اس وقت اپنی آنکھیں نہیں کھولیں تو سزاوار ہو کہ تمہاری آنکھیں بند ہی رہیں۔

'وَكَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰی' یعنی اب تمہارا یہ نالہ و شیون بے سود ہے۔ جس طرح تم نے ہماری آیات کو نظر انداز کیا اسی طرح تم سزاوار ہو کہ نظر انداز کیے جاؤ اور تمہاری اس فریاد پر کوئی توجہ نہ کی جائے۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِیْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ یُؤْمِنْۢ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰی (۱۲۷)

'اسرف' کے معنی حدود سے تجاوز کے ہیں۔ یہاں 'مَنْ اَسْرَفَ' سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اپنی قوتیں اور صلاحیتیں ان چیزوں پر برباد کیں جن سے ان کو بچنا تھا اور جو چیزیں اختیار کرنے کی تھیں ان سے انھوں نے آنکھیں بند رکھیں۔ فرمایا کہ یہ احوال آخرت جو بیان ہوئے ہیں ہم اسی طرح ان لوگوں کو بدلہ دیں گے جو اپنی صلاحیتوں کو بالکل غلط ہدف پر برباد کریں گے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر مزید تنبیہ فرمائی کہ آخرت کا عذاب کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ دنیا کی تنبیہات پر قیاس کر کے اس کو کوئی اہون چیز نہ سمجھے۔ وہ نہایت سخت بھی ہوگا اور نہایت پائیدار بھی۔

أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ (۱۲۸)

'أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ' کا صحیح مفہوم ہماری زبان میں یہ ہوگا کہ کیا فلاں چیز ان کے لیے ہدایت دینے والی اور ان کی آنکھیں کھولنے والی نہ بنی؟

نشانیٔ عذاب کے مطالبہ کا جواب

یہ کتاب الٰہی سے اعراض کرنے والوں کے مطالبۂ نشانیٔ عذاب کا جواب ہے۔ فرمایا کہ ان کو عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو یہ نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں تو کیا یہ چیز ان کو ہدایت دینے والی نہ بنی کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو، اپنی تذکیر و تنبیہ سے اعراض کرنے کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور وہ قومیں کسی دوسرے خطۂ ارضی کی نہیں بلکہ اسی ملک کی رہنے بسنے والی تھیں۔ ان کے تباہ شدہ آثار اور ان کے کھنڈروں پر سے یہ لوگ اپنے تجارتی سفروں میں برابر گزرتے ہیں! یہ اشارہ عاد و ثمود وغیرہ کی بستیوں کی طرف ہے جن کا ذکر اہل عرب کے اشعار میں بھی ملتا ہے اور ان کا عام شاہراہوں پر ہونا بھی معلوم ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ کوئی نشانی چاہتے ہیں تو ان کے اپنے ملک کی تاریخ اور اس کے آثار میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ آخر یہ ان سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے؟ عاقل تو وہ ہے جو دوسروں کے انجام سے سبق حاصل کرے، نہ کہ جب وہی انجام اپنے سامنے آ جائے تب مانے۔ اگر انسان یہ روش اختیار کر لے تو پھر اس میں اور حیوان میں فرق کیا رہا!

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى (۱۲۹)

'أَجَلٌ مُّسَمًّى' کا عطف 'كَلِمَةٌ' پر ہے۔

یہ اس مطالبۂ نشانیٔ عذاب کا جواب ہے۔ فرمایا کہ اگر تمھارے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ پا چکی ہوتی اور اس کے ظہور کے لیے ایک مدت معین نہ ہو چکی ہوتی تو جس عذاب کے لیے یہ جلدی مچاتے ہوئے ہیں وہ آج ہی ان پر آ دھمکتا۔ یعنی اگر اس کے ظہور میں تاخیر ہو رہی ہے تو یہ خدا کی سنت اور اس کے طے کردہ قاعدے اور ضابطے کے تحت ہو رہی ہے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ مبتلا رہے کہ یہ محض ہوائی بات ہے یا یہ کہ اللہ ابھی اس کا سامان نہیں کر پا رہا ہے اس وجہ سے عذاب نہیں آ رہا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ آیا ہے 'وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ' (الشوریٰ ۱۴) (اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے ایک مدت متعین تک کے لیے طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان آج ہی فیصلہ کر دیا جاتا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منکرین و مکذبین کے فیصلہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک یوم الحساب مقرر کر رکھا ہے جس کی مدت اور جس کا دن بھی معین ہے اس وجہ سے وہ جلد بازوں کی جلدی کے باوجود ان کو ڈھیل دے رہا ہے۔ بدقسمت ہیں وہ جو اس ڈھیل سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس کو اپنے طغیان میں اضافہ کا ذریعہ بنا لیں!!

یہاں 'كَلِمَةٌ' سے مراد کلمۃ الفصل ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یہ طے کر رکھا ہے کہ فیصلہ اور انصاف کا ایک دن آئے گا اور 'أَجَلٌ مُّسَمًّى' سے اس دن کے معین ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی اس کو مبہم و مجہول

نہ خیال کرے بلکہ منٹ اور سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ خدا کی جنتری میں وہ مندرج ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّکَ تَرْضٰی (۱۳۰)

نبی صلعم کو صبر کی تلقین اور نماز کی تاکید

اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کی تمام بکواس پر صبر کی تلقین اور اس صبر کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ نماز کے اہتمام کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ صبر اور نماز کے باہمی تعلق پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ صبر کی بنیاد درحقیقت اس عقیدے پر ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی مشیت سے ہوتا ہے اور اس کی مشیت تمام تر خیر پر مبنی ہوتی ہے۔ اس عقیدہ کو دل میں راسخ اور ذہن میں مستحضر رکھنے کے لیے سب سے بڑا اور مؤثر ذریعہ نماز ہے۔

'وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ' تسبیح کا عام مفہوم تو ذکرِ الٰہی ہے اور یہ ذکرِ الٰہی ہر وقت مطلوب ہے لیکن یہاں اس کا ذکر اوقات کی قید کے ساتھ ہے۔ اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد نماز ہے۔ 'تسبیح' کے ساتھ 'حمد' کی قید ذکرِ الٰہی کی صحیح صورت بتانے کے لیے ہے کہ یہ خدا کی 'تسبیح' اور 'تحمید' دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہو۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے اور 'تحمید' میں اثبات کا۔ خدا کے ذکر کی صحیح شکل یہی ہے کہ اس کو تمام خلافِ شان صفات سے بری اور تمام اعلیٰ صفات سے متصف قرار دیا جائے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک پہلو بھی صحیح طور پر ملحوظ نہ رہے تو خدا کے معاملے میں انسان کا تصور غلط ہو جاتا ہے جس سے اس کا سارا نظامِ فکر متزلزل ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعض مذاہب نے تنزیہہ کو اہمیت دی تو اس کی لَے اس قدر بڑھا دی کہ خدا کو بالکل نرنکار اور خلق سے بالکل بے تعلق بنا کر رکھ دیا جس کے نتیجہ میں ان کو وسائل و وسایط کا سہارا ڈھونڈنا پڑا۔ قرآن نے اس فتنہ سے محفوظ رکھنے کے لیے تسبیح اور حمد دونوں کی ہدایت فرمائی تاکہ بندے کا تعلق اس کے رب کے ساتھ صحیح بنیاد پر استوار ہو سکے۔ بغیر اس تعلق کی استواری کے انسان کا قدم جادۂ مستقیم پر نہیں جم سکتا۔

اوقاتِ نماز کی تعلیم

'وَقَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا' سورج کے طلوع اور غروب ہونے سے پہلے فجر اور عصر کی نمازیں ہیں۔ بخاری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی روایت ہے۔ ان دونوں نمازوں کے پہلے ذکر کرنے کی وجہ دین میں ان کی اہمیت ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے بھی ان دونوں نمازوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

'وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ' اور اوقاتِ شب میں بھی نماز پڑھو۔ اوقاتِ شب میں دو نمازیں ہیں ایک عشاء اور دوسری تہجد۔ یہاں فعل کا اعادہ تاکید پر دلیل ہے۔ یہ تاکید اس لیے فرمائی گئی ہے کہ یہ دونوں نمازیں نفس پر بہت شاق ہیں۔

'وَاَطْرَافَ النَّهَارِ' دن کے اطراف واجزا میں تین نمازیں ہیں۔ چاشت، ظہر اور مغرب۔ چاشت اور مغرب کا اطرافِ نہار میں ہونا تو واضح ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ظہر بھی اطرافِ نہار میں ہے اس لیے

کہ دن دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ظہر کا وقت اس کے پہلے حصے کے آخری کنارے اور دوسرے حصے کے ابتدائی کنارے پر ہے۔

اس آیت سے ان لوگوں کے خیال کی نہایت واضح طور پر تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ نمازوں کے اوقات قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ قرآن میں صرف فرض نمازوں ہی کے نہیں بلکہ اشراق اور تہجد کے اوقات بھی مذکور ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی اوقات کو اپنے عمل سے منضبط کر کے ان کی حد بندی فرما دی۔ مختلف نمازوں کی شکلیں بھی معین فرما دیں اور یہ بھی بتا دیا کہ ان میں سے کن نمازوں کی حیثیت فرض واجب کی ہے اور کن کی حیثیت نوافل کی۔ ظاہر ہے کہ ان تمام تفصیلات کا بتانا اور ہر نماز کے حدود و اطراف کا معین کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا کام تھا اس لیے کہ آپ صرف قرآن کے سنا دینے والے ہی نہیں بلکہ اس کے معلم بھی تھے۔

صبر و عزیمت کے حصول کے لیے نفلی نمازوں کا اہتمام

یہاں اس امر کو بھی ملحوظ رکھیے کہ آیت زیر بحث میں نماز کی تاکید صبر و عزیمت کے حصول کی تدبیر کی حیثیت سے فرمائی گئی ہے۔ یہ آیات حق و باطل کی کشمکش کے نہایت شکل دور میں نازل ہوئی ہیں۔ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے امت کو وہ تدبیر بتائی گئی ہے جو مشکلات و مصائب میں ثابت قدم رکھنے والی اور خدا کی رحمت و نصرت کا حق دار بنانے والی ہے۔ اس طرح کے حالات میں صرف فرض نمازوں ہی کا اہتمام مطلوب نہیں ہے بلکہ نوافل کا اہتمام بھی مطلوب ہے۔ قرآن، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور سلف صالحین کے عمل، ہر چیز سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ عام حالات میں تو تہجد و اشراق کی نمازوں کی حیثیت بہرحال نفلی نمازوں ہی کی ہے لیکن مشکلات و مصائب میں، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، ان کا اہتمام ضروری ہے۔

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی!

اس مسئلہ پر ان شاء اللہ سورۂ مزمل کی تفسیر میں ہم وضاحت سے بحث کریں گے اور کسی موزوں مقام پر ان مصالح پر روشنی ڈالیں گے جو اوقات نماز کے تعین میں ملحوظ ہیں۔

نمازوں کے اندر سب کچھ ہے

لَعَلَّكَ تَرْضٰى۔ دوسرے مقام میں یہی مضمون یوں بیان ہوا ہے۔ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ (اور تمہارا رب عنقریب تمہیں عطا فرمائے گا کہ تم نہال ہو جاؤ گے) ان دو لفظوں کے اندر بشارتوں کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے موقف پر ڈٹے اور اپنے کام میں لگے رہو اور نمازوں کا اہتمام رکھو، خدا تمہیں دنیا اور آخرت دونوں میں وہ کامرانیاں بخشے گا کہ تم نہال ہو جاؤ گے! انہی نمازوں کے اندر تمہارے لیے سب کچھ محفوظ ہے، اپنے رب کے سوا تمہیں کسی اور طرف نگاہ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى (۱۳۱)

امراء و اغنیاء سے بے نیازی کی ہدایت

اب یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کے امراء و اغنیاء کی زیادہ پروا اور دلداری کرنے سے روک دیا گیا۔ کسی قوم کے امراء و اغنیاء چونکہ قوم کے بناؤ اور بگاڑ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہی کے بگڑنے سے پوری

قوم بحیثیت اوران کی اصلاح سے پوری قوم کے اصلاح پذیر ہونے کی توقع ہوتی ہے اس وجہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہمیشہ یہ سنت رہی ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اپنی اپنی قوموں کے سرداروں اور بڑوں کو مخاطب کیا اور جب تک انھوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے مایوس نہیں کر دیا اس وقت تک وہ ان کی اصلاح کی فکر میں لگے رہے۔ حضرات انبیاء کرام کی اس سنت کے مطابق ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سب سے پہلے قریش کے سادات و امراء کو دعوت دی کہ اگر وہ اس حق کو قبول کر لیں گے تو ان کے زور و اثر اور ان کے مال و اسباب ہر چیز سے دعوت حق اور غربائے مسلمین کو تقویت حاصل ہوگی۔ یہ خواہش سرتاسر ان امراء و اغنیاء کی خیر خواہی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے جذبہ پر مبنی تھی لیکن جب ان امراء و اغنیاء نے اپنے رویہ سے ثابت کر دیا کہ یہ پسیجنے والے نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو بھی ان کے لیے زیادہ فکر مند ہونے سے روک دیا اور فرمایا کہ تم ان کے مال و اسباب کو ذرا خاطر میں نہ لاؤ، تمھاری دعوت اپنا زاد و راحلہ خود اپنے ساتھ رکھتی ہے اور تمھارا اور تمھارے ساتھیوں کا کفیل اللہ ہے۔ اگر یہ لوگ اس حق کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں تو اس میں تو ان کی اپنی محرومی ہے، خدا ان کا اور ان کے مال و اسباب کا محتاج نہیں ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ - 'أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ' سے اشارہ قریش کے ان گروہوں کی طرف ہے جو مکہ اور طائف وغیرہ میں عزت و اقتدار رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے مال و اسباب کی طرف آنحضرت صلعم کا نگاہ اٹھانا العیاذ باللہ اس لیے تو ہو نہیں سکتا کہ آپ کے اندر دولتِ دنیا کی کوئی طمع تھی، دولت دنیا تو مکہ و طائف کے امراء بڑی سے بڑی مقدار میں حضورؐ کے قدموں پر نثار کرنے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ آپ اپنی دعوت سے باز آجائیں۔ لیکن آپ نے ان کی اس پیشکش کے جواب میں ان کو دعوتِ ایمان کی چند آیتیں سنا دیں۔ حضرات انبیائے کرام اور صالحین نے ان لوگوں کے مال و اسباب کو کبھی وقعت نہیں دی ہے جنھوں نے اپنے دل اپنے رب کے حوالہ نہیں کیے ہیں۔ ایک عاقل و فرزانہ اگر ایک ایسے نوجوان کو دیکھتا ہے جو اپنی بھرپور جوانی اور اپنی تمام صلاحیتیں ایک بالکل غلط ہدف پر برباد کر رہا ہوتا ہے تو اس کے دل میں یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش یہ عاقبت اندیش بے وقوف نوجوان اپنی جوانی اور صلاحیتوں کی قدر کرے، اسی طرح حضورؐ کے اندر بھی یہ ارمان تھا کہ کاش آپؐ قوم کے امراء و اغنیاء ان نعمتوں کی قدر پہچانیں جو اللہ نے ان کو بخشی ہیں اور ان کا مال اور ان کی صلاحیتیں شیطان کی راہ میں برباد نہ ہوں۔ اس ارمان و حسرت کا تعلق تمام تر جذبۂ خیر خواہی و ہمدردی سے ہوتا ہے۔ اس میں ہرگز طمع و حرص کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس جذبۂ خیر خواہی کی بھی ایک حد ہے۔ اس حد پر پہنچ جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اس چیز سے روک دیا۔

'مَتَّعْنَا بِهِ' ایک امر واقعی کا اظہار ہے۔ دنیا میں اگر کسی کو مال و اسباب حاصل ہوتا ہے تو نہ وہ اس کے اب و جد کی میراث ہوتا اور نہ اس کی ذہانت و قابلیت کا ثمرہ بلکہ یہ خدا کی دین ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو دے کر یہ دیکھتا ہے کہ خدا کے دیے ہوئے مال و متاع کو پا کر یہ شخص خدا کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا ناشکرا۔ احمق ہے وہ

انسان جو اس حقیقت نفس الامری کو نہ سمجھے اور خدا کی نعمت کو خدا ہی کے خلاف بغاوت کا سبب بنا لے۔

'زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا' ہمارے نزدیک 'بِهٖ' کی ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ مجرور سے حال پڑنا فصیح عربی میں معروف ہے ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس کی مثالیں پیش کرتے آ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے جس مال و متاع سے ان کو بہرہ مند کیا ہے اس کی چمک دمک چند روزہ ہے۔ اس کا اگر کوئی نفع ہے تو یہ ہے کہ اس سے وہ آخرت کے لیے کچھ کمائی کر لیں۔ اگر وہ یہ نہیں کرتے تو یہ غازہ ایک دن اڑ جائے گا اور اس کی پیدا کردہ روسیاہی ہمیشہ کے لیے باقی رہ جائے گی۔

'لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ' یہ اس سنت الٰہی کا حوالہ ہے جس کی وضاحت اسی سورہ کی آیت 'وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا' کے تحت ہم کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں لوگوں کو مصائب سے بھی آزماتا ہے اور نعمتوں سے بھی۔ جب مصائب سے آزماتا ہے تو مقصود بندے کے صبر کا امتحان ہوتا ہے اور جب نعمتوں سے آزماتا ہے تو مقصود اس کے شکر کا امتحان ہوتا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے ان کو یہ مال و متاع جو بخشا ہے تو اس لیے نہیں کہ یہ اس کے حقدار تھے بلکہ اس لیے بخشا کہ ان کا امتحان کریں کہ یہ ہماری نعمتیں پا کر کیا بناتے ہیں۔ اگر انھوں نے ان نعمتوں کا یہی حق سمجھا ہے کہ ان کو پا کر ہمارے ہی سرکش بن جائیں تو اس کا انجام جلد دیکھ لیں گے۔

'وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى' مطلب یہ کہ تم اپنی دعوت اور اپنے ساتھیوں کے لیے ان ناقدروں اور ناشکروں کی سرپرستی کے محتاج نہیں ہو۔ تمھارے اور تمھارے ساتھیوں کے لیے خدا کے پاس سے جو کچھ عطا ہونے والا ہے وہ ہزار درجہ بہتر بھی ہے اور پائدار بھی۔ ان مغروروں کے پاس جو کچھ ہے اس کی چمک دمک تو چند روزہ ہے لیکن خدا جو کچھ بخشے گا وہ ابدی ہے۔ اس کے لیے کبھی زوال نہیں —— یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نیکی کا پودا اس آب حیات ہی سے پروان چڑھتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کی پرورش کے لیے نازل ہو۔ اگر آپ ہر جوہڑ کے پانی سے اس کو پروان چڑھانے کی کوشش کریں گے تو اول تو کسی ناپاک پانی سے اس کا نشو و نما پانا ہی اس کی فطرت کے خلاف ہے اور اگر وہ بظاہر نشو و نما پا بھی جائے گا تو وہ نیکی کے پھل نہیں بلکہ بدی ہی کے پھل دے گا۔ اس حقیقت کا تعلق حکمت قرآن سے ہے اور یہ تفصیل کے ساتھ اپنے محل میں زیر بحث آئے گی۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۭ لَا نَسْـَٔــلُكَ رِزْقًا ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (۱۳۲)

لفظ اہل کا مفہوم لفظ 'اھل' یہاں صرف اہل بیت نبی کے مفہوم میں نہیں ہے۔ یہ لفظ عربی میں وسیع معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً اہل کتاب، اہل انجیل، اہل قریہ، اہل اللہ، اہل قرون اور اہل حدیث وغیرہ۔ لسان العرب میں ہے: 'اھل الرجل اخص الناس بہ' (اہل الرجل سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس شخص سے خاص تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں) 'اھل کل نبی امتہ' (نبی کے اہل سے اس کے امتی مراد ہوتے ہیں) سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے حضرت عمرؓ کے خلیفہ بنانے کے بارے میں روایت ہے کہ جب قیامت کے دن میرا رب مجھ سے پوچھے گا کہ مسلمانوں کا والی کس کو بنا کے آئے ہو تو

عرض کردوں گا کہ 'استعملت علیھم خیر اھلك' (میں نے ان پر تیرے بہترین اہل کو خلیفہ بنایا ہے) سورۂ مریم کی آیت ۵۵ میں سیدنا اسماعیل کے متعلق ارشاد ہوا ہے 'وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ' ظاہر ہے کہ یہاں بھی 'اھل' سے حضرت اسماعیلؑ کے بیوی بچے ہی مراد نہیں ہیں بلکہ وہ تمام لوگ مراد ہیں جو ان سے وابستہ تھے۔

اسی طرح آیت زیر بحث میں بھی 'اھل' سے وہ تمام لوگ مراد ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے، عام اس سے کہ وہ حضورؐ کے خاص متعلقین ہوں یا دوسرے مسلمان اور عام اس سے کہ وہ قرشی و ہاشمی ہوں یا لونڈی اور غلام - ان سب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ فی الحقیقت وہ سب لوگ نبی کے کنبہ کے افراد ہوتے ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور نبی کو اسی طرح ان کی خبرگیری کی فکر ہوتی ہے جس طرح کسی کو اپنے خاص کنبہ کی خبرگیری کی فکر ہوتی ہے۔ غور کیجیے کہ یہاں لفظ 'اھل' نے غربائے مسلمین کی کتنی عزت و شان بڑھائی ہے! جن بیچاروں کا ابھی تک کوئی پرسان حال نہیں تھا اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل میں شامل کر دیا!!

'وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا' - ارشاد ہوا کہ تم اپنے لوگوں کو نماز کی ہدایت کرو اور اس پر جمے رہو۔ نماز سے مراد وہی نماز ہے جس کا اوپر والی آیت میں حکم دیا گیا ہے۔ یعنی اپنے اور اپنے لوگوں کے اندر صبر و استقامت پیدا کرنے کے لیے نماز کا اہتمام کرو اور استقلال کے ساتھ اس کا پورا پورا اہتمام کرو۔ 'واصطبر علیھا' کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ایک کسان اپنے کھیت میں ہل چلاتا، اس میں تخم ریزی کرتا، اس کو پانی دیتا اور برابر اس کی نگرانی کرتا ہے اسی طرح تم اپنے اس مبارک مزرعہ میں پوری محنت اور اس کی پوری حفاظت کرو، پھر دیکھو کہ اس سے دین و دنیا کی کیا برکتیں حاصل ہوتی ہیں! وہ برکتیں اس سے حاصل ہوں گی کہ نہال ہو جاؤ گے، تمھیں کسی اور کی طرف نگاہ اٹھانے کی احتیاج باقی نہیں رہے گی!!

'لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا' یعنی تمھارے اور تمھارے جاں نثاروں کے لیے روزی فراہم کرنے کی ذمہ داری ہم نے نہ تم پر ڈالی ہے اور نہ ہم تم سے اس کا مطالبہ کرتے ہیں، اس کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ 'نَحْنُ نَرْزُقُكَ' ہم تمھارے رزق کے ذمہ دار ہیں، تم ہمارا کام کرو اور نماز کا اہتمام رکھو۔ باقی جو ذمہ داری ہماری ہے وہ ہم پر چھوڑو۔ تم اس کے لیے فکرمند نہ ہو۔ سیدنا مسیحؑ نے اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے کہ 'جو مزدور اپنی ڈیوٹی پر ہے وہ اپنی مزدوری کا حق دار ہے'۔

اسلامی نظام میں خلیفہ اور حکمران اسلامی کنبہ کا قیم ہوتا ہے

یہاں 'نَرْزُقُكَ' میں ضمیر خطاب واحد پر بھی نظر رہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ 'ہم تم کو اور تمھارے لوگوں کو روزی دیں گے'، بلکہ فرمایا کہ 'ہم تم کو روزی دیں گے'۔ آنحضرت صلعم سے یہ خطاب اسلامی کنبہ کے سربراہ اور قیم کی حیثیت سے ہے۔ جب کنبہ کے قیم سے یہ وعدہ کیا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے پورے کنبہ یعنی تمام مسلمانوں کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اسلامی نظام میں خلیفہ اور حکمران کی حیثیت پورے اسلامی کنبہ کے قیم کی ہے اس وجہ سے اسے کنبہ کے ایک ایک فرد کی اسی طرح فکر رکھنی پڑتی ہے جس طرح ایک کنبہ کا سربراہ اپنے بیوی بچوں کی رکھتا ہے۔ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ

نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں اس حقیقت کو جس طرح ملحوظ رکھا اس کو بیان کروں تو بات دوسرے گوشوں میں نکل جائے گی۔ اس زمانے میں عوام کے غم میں حاشیوں پر زمزمہ خوانی کرنے والے تو بہت مل جائیں گے لیکن کوئی نہیں جو حضرت عمرؓ کی طرح یہ ذمہ داری محسوس کرے کہ میری مملکت کے بعید ترین گوشوں میں بھی اگر کوئی بھوکا سوتا ہے تو اس کی مسئولیت مجھ پر ہے اور صرف محسوس ہی نہ کرے بلکہ عملاً اپنے احساس کو ثابت بھی کر دے، یہاں تک کہ یہ احساس اس کو خود اپنے بیوی بچوں تک سے غافل کر دے!!

'وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى'۔ اوپر والے ٹکڑے میں اس دنیا کے رزق و فضل کا وعدہ تھا۔ یہ آخرت کی کامیابی کی بشارت ہے یعنی انجامِ کار کی کامیابی تو بہرحال اہلِ تقویٰ ہی کے لیے ہے، اس میں تو کسی اور کا کوئی حصہ ہی نہیں۔

نماز رزق کی ضمان ہے

یہاں ظاہر پرستوں کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہوگی کہ نماز بھلا آدمی کے رزق کی ضامن کس طرح ہو سکتی ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ یہ حقیقت ان لوگوں کو نہیں سمجھائی جا سکتی جو نہ خود نماز کی روح سے آشنا ہیں اور نہ انھیں کسی حقیقی نماز آشنا سے آشنائی ہوئی۔ یہ چیز سمجھانے کی نہیں بلکہ جاننے اور سمجھنے کی ہے۔ صرف تجربہ ہی اس کا یقین پیدا کر سکتا ہے۔ جو نماز کے لذت آشنا ہیں وہی جانتے ہیں کہ اس میں کیا ہے۔ میری اس بات کو ادعا پر محمول نہ فرمائیے۔ میں خود ایک بے عمل آدمی ہوں لیکن میں نے خود اپنی آنکھوں سے تاریخ کے صفحات میں بھی اور چلتے پھرتے انسانوں میں بھی ایسی پیشانیاں دیکھی ہیں جن کے سجدوں کے نشانات کی تابناکی آفتاب کو بھی شرماتی تھی اور جن کے استغنار کا یہ عالم تھا کہ تختِ جمشید کو بھی پائے استحقار سے ٹھکرا دینے والے تھے!!

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى (١٣٣)

نشانی کا مطالبہ کرنے والوں کو جواب

مخالفین جب دلائل کے میدان میں ہر طرف سے پسپا ہو جاتے تو ان کا آخری حربہ یہ ہوتا کہ وہ مطالبہ کرتے کہ اگر یہ رسول ہیں تو اپنی رسالت کے ثبوت میں یہ اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں پیش کرتے؟ نشانی سے مراد کوئی حسی معجزہ بھی ہوتا اور اس طرح کا کوئی عذاب بھی جس سے قرآن ان کو رسول کی تکذیب کی صورت میں آگاہ کر رہا تھا۔ اس سوال کے اٹھانے میں بھی زیادہ دخل اہلِ کتاب کو تھا۔ وہ مشرکین کو اس دور میں جس طرح بہت سے سوالات اُٹھا کرتے تھے، جن کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں، اسی طرح یہ سبق بھی پڑھاتے تھے کہ ان مدعی رسالت سے مطالبہ کرو کہ جس طرح پچھلے رسولوں نے بہت سی نشانیاں دکھائیں یہاں تک کہ ان کی خبر کے مطابق ان کی قوموں پر عذاب بھی آئے، آخر یہ اس طرح کی کوئی نشانی کیوں نہیں دکھاتے۔ قرآن نے یہاں اس مطالبہ کا جواب دیا اور اس جواب میں ان لوگوں کو بھی پیشِ نظر رکھا جو ان سوالات کے لیے وسوسہ اندازی کرتے تھے اور ان لوگوں کو بھی جو ان کو پیش کرتے تھے۔ اس آیت میں پہلے گروہ کو جواب دیا ہے اور اس کے بعد والی آیت میں دوسرے گروہ کو۔

پہلے گروہ یعنی اہلِ کتاب کو یہ جواب دیا کہ کیا ان کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ پچھلے صحیفوں میں جس آخری رسول کی بعثت کی بشارتیں تھیں وہ ان کا مظہر اور مصداق ان کے سامنے آگیا جس نے ان تمام پیشین گوئیوں کی تصدیق و تائید ان کے سامنے کر دی؟ ہم نے سورۂ بقرہ اور آل عمران کی تفسیر میں ان پیشین گوئیوں کا تفصیل سے حوالہ

دیا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ آنحضرت صلعم کو سابق صحیفوں کا جو مصدق کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی بعثت نے ان تمام پیشین گوئیوں کی عملی تصدیق کر دی۔ اسی تصدیق کو یہاں 'بینۃ' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى (۱۳۴)

اب یہ دوسرے گروہ یعنی مشرکین عرب کو پیش نظر رکھ کر جواب دیا کہ شامت زدہ لوگ دوسروں کے القاء سے متاثر ہو کر عذاب تو مانگتے ہیں لیکن اگر ہم رسول کے بھیجنے سے پہلے ان پر عذاب بھیج دیتے تو یہ قیامت کے روز یہ عذر کرتے کہ اے رب تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم اس ذلت و رسوائی سے دوچار ہونے سے پہلے تیری آیات کی پیروی کرتے۔ مطلب یہ کہ ہم نے اس عذر کو ختم کر دینے کے لیے ان کے پاس اپنا رسول بھیج دیا۔ اب ان پر حجت تمام ہو گئی۔ اگر اس کے بعد بھی یہ ایمان نہیں لاتے تو ان کے سامنے وہی چیز ظاہر ہو گی جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔

'ذلت' اور 'خزی' کا مفہوم

'ذلت' اور 'خزی' کے الفاظ اپنے عام استعمال میں ایک دوسرے کے مفہوم میں بھی آتے ہیں لیکن جب یہ دونوں ایک ساتھ آئیں جس طرح یہاں آئے ہیں تو ان کے درمیان ایک نازک سا فرق ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں 'ذلت' سے مراد وہ ذلت ہوتی ہے جس کا احساس ایک ذلیل ہونے والا خود اپنے باطن میں کرتا ہے اور 'خزی' سے وہ رسوائی مراد ہوتی ہے جو دوسروں کے سامنے اس کو ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ نہ ہم اپنی نگاہوں ہی میں ذلیل ہوتے اور نہ دوسروں کے آگے ہی رسوائی اور فضیحتا کی یہ نوبت آتی۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى (۱۳۵)

یہ آخری وارننگ ہے۔ اوپر کی دونوں آیتوں میں بات غائب کے صیغوں میں منہ پھیر کر فرمائی گئی ہے۔ اس میں شدتِ عتاب کے اظہار کے پہلو سے خطاب کے اسلوب میں فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اب فیصلہ کن مرحلہ سامنے ہے۔ دونوں پارٹیاں انتظار میں ہیں کہ اس کشمکش کا آخری انجام کیا ہوتا ہے اور اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے تو چندے انتظار کرو، عنقریب تم پر واضح ہو جائے گا کہ سیدھی اور ہموار راہ پر کون تھے اور وہ منزل مقصود پر پہنچنے والے بنے اور کون گمراہی کی راہ پر تھے اور وہ ہلاکت کے گڈھے میں گرے!

اس آیت میں میرے نزدیک قرینہ کی وضاحت کی بنا پر 'مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى' کا متقابل جملہ محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ میں نے اس محذوف کو کھول دیا ہے۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں سے درگزر فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔

لاہور

۲۵، جنوری ۱۹۷۳ء

تدبرِ قرآن

٢١

الانبیاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ سورہ طٰہٰ ـــــ کی مثنیٰ ہے۔ جس مضمون پر سورۂ طٰہٰ ختم ہوئی ہے اسی مضمون سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ سابق سورہ کی آخری آیت میں کفارِ قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ اگر تم کوئی نشانیٔ عذاب ہی دیکھنے پر اڑے ہوئے ہو تو انتظار کرو، اب اس عذاب کے آنے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ اس سورہ کا آغاز بغیر کسی نئی تمہید کے، بعینہٖ اسی مضمون سے فرمایا کہ ان لوگوں (کفارِ قریش) کے حساب کی گھڑی بالکل سر پر آچکی ہے لیکن یہ اپنی سرمستیوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ یہ پیغمبر کی تنبیہات کا مذاق اڑاتے اور اللہ کی آیات کا استہزا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس دنیا کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا ہے جس کو اس کے پیدا کرنے والے نے محض اپنا جی بہلانے کے لیے ایک کھیل تماشا بنایا ہے۔ ان کا سارا اعتماد ان کے خود تراشیدہ معبودوں پر ہے۔ حالانکہ یہ ساری چیزیں محض ان کے وہم کی ایجاد ہیں، انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ سابق سورہ میں صرف حضرت موسیٰ کی سرگزشت کا حوالہ تھا اس میں دوسرے انبیاءِ عظام علیہم السلام کا بھی حوالہ ہے اور نہایت واضح الفاظ میں غلبۂ حق اور فتح مکہ کے قرب کی پیشین گوئی کی گئی ہے جو کفارِ قریش کے لیے ایک آخری تنبیہ اور مسلمانوں کے لیے کشمکش حق و باطل کے اس شدید ترین دور میں ایک عظیم بشارت ہے۔

سورہ کے مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سابق سورہ کی طرح یہ سورہ بھی تین بڑے حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے قریش کو ان کی ان بوالفضولیوں پر نہایت واضح الفاظ میں تنبیہ و وعید ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہایت لاابالیانہ انداز میں وہ کر رہے تھے، پھر حضرات انبیاء علیہم السلام کی سرگزشتوں سے ان تمام حقائق کو مبرہن کیا گیا ہے جن کی قرآن کے ذریعہ سے ان کو دعوت دی جا رہی تھی، آخر میں اسی مضمون کو، جو شروع میں بیان ہوا ہے بعینہٖ اسی تمہید کے ساتھ از سرِ نو لے لیا ہے اور نہایت فیصلہ کن انداز میں مخالفین کو اس انجام سے آگاہ کیا ہے جس سے وہ دوچار ہونے والے ہیں۔

اگرچہ سورہ کا عمود اور نظام واضح کر دینے کے لیے یہ تمہید بھی کافی ہے لیکن ہم مزید وضاحت کے لیے سورہ کے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۵) قریش کو انذار کہ رسولؐ کی بعثت کے بعد، سنتِ الٰہی کے مطابق، اب ان کی قسمت میزان میں اور ان کے محاسبہ کا دن ان کے سر پر ہے لیکن یہ اپنی بدمستیوں میں کھوئے ہوئے خطرہ سے آگاہ کرنے والے رسول کا مذاق اڑا رہے ہیں، کوئی ان کو ساحر بتاتا ہے کوئی کاہن، کوئی اس کی وحی کو خواب پریشان سے تعبیر کرتا ہے، کوئی اس کو مفتری اور شاعر قرار دیتا ہے اور اس سے اگلے انبیاء کے سے خوارق و عجائب کا مطالبہ کرتا ہے حالانکہ تاریخ اور اہلِ علم گواہ ہیں کہ انبیاء ہمیشہ اسی طرح کی وحی کے ساتھ آئے جس طرح کی وحی کے ساتھ ان کا رسول آیا۔

ان پر اتمامِ حجت کے لیے جس یاد دہانی کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس آگئی۔ اب اگر یہ اس کو ٹھکراتے ہیں تو ان قوموں کے انجام کو یاد کرلیں جن کے پاس ان کے رسول آئے اور انھوں نے ان کی تکذیب کی۔ انھوں نے بھی اسی تمسخر کے ساتھ اپنے رسولوں کا مذاق اڑایا، پھر جب وہ اس کے نتیجہ میں خدا کی پکڑ میں آگئیں تو کوئی ان کا پناہ دینے والا نہ بنا اور ہم نے ان کو خس و خاشاک کی طرح اڑا دیا۔

(۱۶-۲۹) اس حقیقت کی یاد دہانی کہ اس دنیا کے خالق نے اس کو محض اپنا جی بہلانے کے لیے کوئی تھیٹر نہیں بنایا ہے کہ حق و باطل اور نیکی و بدی دونوں کی حیثیت اس میں یکساں ہو بلکہ اس کا خالق ایک عادل و حکیم ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ ایک دن لائے جس میں حق کا بول بالا ہو اور باطل کا وہ کچومر نکال دے۔ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ اس کے مزعومہ شرکاء و شفعاء اس کو خدا کے عدل کی گرفت سے بچالیں گے تو یہ اس کا محض ایک وہم باطل ہے۔ خدا کی خدائی میں کوئی شریک نہیں، جو بھی ہیں سب اس کے آگے سرفگندہ ہیں۔ اگر اس کائنات میں کئی ارادوں اور مشیتوں کی کارفرمائی ہوتی تو یہ درہم برہم ہو کے رہ جاتی۔ خدا کے نبیوں اور رسولوں کی تعلیم میں اس شرک کا کوئی شائبہ نہیں۔ ہر نبی نے توحید ہی کی تعلیم دی ہے۔ اگر کسی نے خدا کے لیے بیٹیاں فرض کر کے ان کو خدا کے ہاں اپنا سفارشی سمجھ رکھا ہے تو یہ محض خود فریبی ہے۔ فرشتے خدا کی بیٹیاں نہیں بلکہ اس کے باعزت بندے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے اس کے اذن کے بدون زبان نہیں کھول سکتے، وہ صرف اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور اگر کوئی بھی خدائی کا مدعی نکلا تو خدا اس کو جہنم میں جھونک دے گا۔

(۳۰-۳۳) نشانیوں کا مطالبہ کرنے والوں کے جواب میں نظامِ کائنات کی چند نہایت واضح نشانیوں کی طرف اشارہ کہ اگر ان کو نشانیوں کی طلب ہے تو آخر وہ ان نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے جو ہر وقت ان کے سامنے موجود اور خدا کی ربوبیت و رحمت، اس کے عدل و حکمت اور توحید و معاد کی گواہی دے رہی ہیں۔ انہی چیزوں کی دعوت ان کو پیغمبر دے رہا ہے تو جب اس کی تائید میں یہ سارے شواہد موجود ہیں تو کسی نئی نشانی کی کیا ضرورت باقی رہی۔

(۳۴-۴۲) ان لوگوں کو جواب جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اس بنا پر مذاق اڑا رہے تھے کہ آپؐ نہ تو بشریت

سے کوئی مافوق ہستی تھے اور نہ کوئی مال دار آدمی۔ ان کے باب میں فرمایا کہ اگر یہ پیغمبرؐ کا مذاق اڑاتے ہیں تو اڑا لیں لیکن یاد رکھیں جب خدا کی پکڑ میں آ جائیں گے تو ان کے یہ دیوی دیوتا ان کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے جن کی حمیت حمایت میں یہ خدا کے رسول کی توہین کر رہے ہیں۔

(۴۴-۴۷) متکبرین کے اصل سبب غرور کی طرف اشارہ اور یہ پیشین گوئی کہ یہ مکہ میں جس دعوت حق کو دبانے کے لیے زور آزمائی کر رہے ہیں وہ دعوت اطراف مکہ سے مکہ کی طرف بڑھ رہی ہے اور بہت جلد یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ دعوت غالب رہتی ہے یا اس کے یہ اعداء۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کریں تو تمہیں وحی کے ذریعہ سے آگاہ کر رہا ہوں لیکن تمہارے بہرے کان اس کو نہیں سن رہے ہیں، اگر خدا کے تازیانۂ عذاب کی زد میں آ گئے تو پھر اپنے سر پیٹیں گے۔

(۴۸-۷۷) ایک معنوی ترتیب کے ساتھ جلیل القدر انبیاء میں سے حضرت موسٰی، حضرت ابراہیم (بشمول حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب) اور حضرت نوح علیہم السلام کی تعلیم و دعوت اور ان کے جھٹلانے والوں کے انجام کی طرف اشارہ تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان تمام انبیائے عظام کی دعوت وہی رہی ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے اور لازماً اس کی مخالفت کرنے والوں کا انجام بھی وہی ہو گا جو ان انبیاء کی مخالفت کرنے والوں کا ہوا۔

(۷۸-۸۶) ایک صفاتی ترتیب کے ساتھ ان انبیاء کا ذکر جو شکر اور صبر کے نہایت کڑے امتحانوں میں ڈالے گئے اور وہ ان میں سوفی صد کامیاب رہے۔ پہلے زمرہ میں سے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا حوالہ دے کر قریش کو انہی کی طرح خدا کا شکر گزار بندہ بننے کی دعوت دی ہے۔ دوسرے زمرے کے انبیاء میں سے خاص طور پر حضرت ایوب، حضرت اسماعیل، حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کا حوالہ دیا ہے اور مقصود ان کا حوالہ دینے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مظلوم صحابہؓ کی حوصلہ افزائی ہے کہ جس طرح اللہ نے اپنے ان صابر بندوں کو ان کے صبر کے سلسلہ میں اپنی رحمت سے نوازا اسی طرح اگر تم بھی مصائب کے مقابل میں حق پر ثابت قدم رہے تو اللہ تم کو بھی اپنی رحمت سے نوازے گا۔

(۸۷-۹۱) ان انبیاء کی طرف ایک اجمالی اشارہ جن کے لیے نہایت تاریک اور بظاہر مایوس کن حالات کے اندر خدا کی قدرت و حکمت کی نہایت حیرت انگیز شانیں ظاہر ہوئیں۔ اس زمرہ کے انبیاء میں سے حضرت یونسؑ، حضرت زکریا، حضرت یحیٰی اور حضرت مریم و حضرت مسیح علیہم السلام کا حوالہ دیا ہے اور مقصود اس سے اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ خدا جب اپنے بندوں کو اپنی رحمت سے نوازنا چاہے گا تو کوئی چیز اس کے ارادے میں مزاحم نہ ہو سکے گی۔ حالات و اسباب سب اس کے اختیار میں ہیں۔

(۹۲-۱۱۲) خاتمۂ سورہ جس میں تمہید کے مضمون کو مزید مؤکد کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو اطمینان دلا دیا گیا ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت و تعلیم یہی رہی ہے جو تم دے رہے ہو تو تم اپنے کام میں لگے رہو اور

جن لوگوں نے اس میں اختلافات پیدا کیے اور پیدا کر رہے ہیں ان کے معاملہ کو ہمارے اوپر چھوڑ دو۔ یہ لوگ خدا کے عذاب کو دیکھ کر ہی ایمان لائیں گے لیکن اس وقت کا ایمان لانا بالکل بے سود ہو گا۔ آخرت کی کامرانی صرف اللہ کے نیک بندوں ہی کے لیے ہے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے فیصلہ کن اعلان کہ اب فیصلہ کی گھڑی سر پر ہے، جس کو فائدہ اٹھانا ہو وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھالے پھر یہ فرصت نصیب ہونے والی نہیں ہے۔ آخری آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ دعا کہ اے رب! اب میرے اور ان اعدائے حق کے درمیان تو فیصلہ فرما دے!

یہ سورہ کے مطالب کا سرسری تجزیہ ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآءِ (۲۱)

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــ اٰيَاتُهَا ۱۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۱۵ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ (۱) مَا يَاْتِيْهِمْ
مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ (۲) لَاهِيَةً
قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (۳) قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ
الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۴) بَلْ قَالُوْٓا
اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ښ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ
كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (۵) مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ
اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ (۶) وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ
فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۷) وَمَا جَعَلْنٰهُمْ
جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (۸) ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ
الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ (۹)
ع ۱ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰) وَ

كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا
آخَرِينَ ﴿١١﴾ فَلَمَّآ أَحَسُّوا بَأْسَنَآ إِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُونَ ﴿١٢﴾
لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوٓا إِلَىٰ مَآ أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تُسْـَٔلُونَ ﴿١٣﴾ قَالُوا يٰوَيْلَنَآ إِنَّا كُنَّا ظٰلِمِينَ ﴿١٤﴾ فَمَا زَالَتْ
تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيدًا خٰمِدِينَ ﴿١٥﴾

ترجمۂ آیات ١-١٥

لوگوں کے لیے ان کے محاسبہ کا وقت قریب آ لگا ہے اور یہ غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کیے جا رہے ہیں۔ ان کے رب کی طرف سے جو تازہ یاددہانی بھی ان کے پاس آتی ہے یہ اس کو بس مذاق کرتے ہوئے سنتے ہیں۔ ان کے دل غفلت میں مدہوش ہیں اور ان ظالموں نے آپس میں یہ سرگوشی کی کہ یہ تو بس تمہارے ہی مانند ایک بشر ہیں تو کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو میں پھنسو گے! ١-٣

اس نے کہا میرا رب آسمان اور زمین میں ہونے والی ہر بات کو جانتا ہے اور وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ٤

بلکہ انھوں نے کہا، یہ تو خواب پریشان ہیں، بلکہ اس کو انھوں نے گھڑ لیا ہے، بلکہ یہ ایک شاعر ہیں۔ پس یہ ہمارے پاس اس طرح کی کوئی نشانی لائیں جس طرح کی نشانیوں کے ساتھ سابق رسول بھیجے گئے تھے۔ ٥

ان سے پہلے کسی بستی کے لوگ بھی، جس کو ہم نے ہلاک کیا، ایمان لانے والے نہ بنے، تو کیا یہ لوگ ایمان لانے والے بنیں گے! اور تم سے پہلے جن کو بھی ہم نے رسول بنا کر بھیجا آدمیوں ہی میں سے بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ تو اہلِ علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے اور ہم

نہ ان کو ایسے جسم ہی نہیں دیے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ ابدی زندگی رکھنے والے بھی نہ تھے۔ پھر ہم نے ان سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ان کو اور جن کو ہم چاہتے ہیں نجات دی اور حدود سے تجاوز کر جانے والوں کو ہلاک کر دیا۔ ۶-۹

اور ہم نے تمھاری طرف بھی ایک کتاب اتاری ہے جس میں تمھارے حصہ کی یاددہانی ہے تو کیا تم سمجھتے نہیں! اور ہم نے کتنی ہی بستیاں ہلاک کر دیں جن کے لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے اور ان کے بعد دوسرے لوگ اٹھا کھڑے کیے۔ پس جب انھوں نے ہمارے عذاب کی آہٹ پائی تو لگے وہاں سے بھاگنے۔ ہم نے کہا، اب بھاگو مت، اپنے عیش کے سامانوں اور اپنی عیش گاہوں کی طرف پلٹو تاکہ تم سے پرسش ہو۔ انھوں نے واویلا کیا کہ ہائے ہماری بدبختی! بے شک ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے! وہ یہی واویلا کرتے رہے یہاں تک کہ ہم نے ان کو خس و خاشاک اور راکھ کے مانند کر دیا۔ ۱۰-۱۵

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ (۱)

سابق سورہ کے مضمون کی تکمیل

یہ سورہ بغیر کسی تسمیہ و تمہید کے شروع ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا، یہ ہے کہ یہ درحقیقت اسی انذار کے مضمون کی تکمیل ہے جس پر سابق سورہ تمام ہوئی ہے۔ سابق سورہ کی آخری آیات اور اس سورہ کی ابتدائی آیات نے ایک حلقۂ اتصال کی صورت اختیار کر لی ہے۔ سورۂ برأت کی تفسیر میں ہم اس نوع کے اتصال کی بعض خوبیوں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

الناس سے مراد مشرکین مکہ ہیں

'لِلنَّاسِ' سے مراد، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے مشرکین مکہ ہیں۔ یہ لوگ چونکہ خدا کی یاددہانی سے اعراض پر اڑے ہوئے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی ان سے اعراض کرتے ہوئے عام لفظ سے ان کا ذکر فرمایا۔ اس اسلوب بیان سے ایک قسم کی نفرت و کراہت اور حسرت کا اظہار ہو رہا ہے اور اس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

ایک سنت الٰہی کی یاددہانی

'لوگوں کے لیے ان کے محاسبہ کا وقت بالکل قریب آگیا ہے' یہ محض ایک دھمکی نہیں بلکہ بیان واقعہ ہے

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس سنت الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجتا ہے تو اس کے لیے ایک ہی راہ باقی رہ جاتی ہے کہ وہ ایمان لائے۔ اگر وہ یہ راہ نہیں اختیار کرتی تو اتمام حجت کے بعد وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ اسی سنتِ الٰہی کی روشنی میں فرمایا کہ رسول کی بعثت و دعوت کے بعد ان مشرکین کا یوم الحساب بھی بالکل قریب آ لگا ہے لیکن یہ بدستور غفلت میں پڑے ہوئے، رسول کی تذکیر و تنبیہ سے اعراض کیے جا رہے ہیں۔ یہاں بیک وقت ان کی دو حالتوں کا ذکر ہے، ایک غفلت، دوسری اعراض۔ غفلت یعنی زندگی کے اصل حقائق سے بے پروائی، بجائے خود بھی انسان کی شامت کی دلیل ہے اور ایک بہت بڑا جرم ہے لیکن یہ جرم اس صورت میں بہت زیادہ سنگین ہو جاتا ہے جب کوئی اللہ کا بندہ جھنجوڑنے اور جگانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر رہا ہو لیکن لوگ ایسے غفلت کے ماتے ہوں کہ اس کی کوئی نصیحت بھی سننے کے لیے تیار نہ ہوں۔

مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ (۲)

تازہ بتازہ یاددہانی — فرمایا کہ ان کے اندر غفلت اور لاابالی پن کے ساتھ سرمستی اور شرارت بھی ہے کہ ان کو بار بار گوناگوں پہلوؤں اور اسلوبوں سے یاددہانی کی جا رہی ہے لیکن جو تازہ تذکیر و تنبیہ بھی ان کے پاس آتی ہے اس کو سنجیدگی کے ساتھ سننے اور اس پر غور کرنے کے بجائے اس کو ہنسی مسخری میں اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سورہ طٰہٰ میں فرمایا ہے۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا۔ ۱۱۳ (اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا اور اس میں اپنی وعید گوناگوں پہلوؤں سے واضح کر دی کہ وہ خدا کے غضب سے بچیں یا یہ ان کے اندر ہماری یاددہانی کو تازہ کر دے) مطلب یہ ہے کہ اللہ نے صرف ایک بار ان کو سنا دینے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ ان کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے تازہ بتازہ یاددہانیاں بھیجیں لیکن وہ متنبہ ہونے اور ان کی قدر کرنے کے بجائے ہر تذکیر کو اپنے مذاق کا موضوع بنا لیتے ہیں۔

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ڰ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ڰ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (۳)

قریش کے لیڈروں کی سخن سازیاں — 'لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ' دوسرا حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل کا اصلی کام تفکر و تدبر ہے لیکن ان کا حال یہ ہے کہ ان کے دل اپنی دلچسپیوں میں ایسے کھوئے ہیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ بات اور بڑی سے بڑی حقیقت کو بھی یہ مذاق میں اڑا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ قریش کے لیڈروں اور ان کے دانشوروں کی وہ باتیں نقل ہو رہی ہیں جو وہ اپنی مجالس میں قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کے لیے لوگوں کے اندر پھیلاتے تھے۔ ان کو یہ اندازہ اچھی طرح ہو گیا تھا کہ قرآن کی دعوت دلوں میں گھر کر رہی ہے اور صاف ذہن رکھنے والے لوگ اس سے متاثر ہو رہے

ہیں۔ اس اثر کو مٹانے کے لیے انھوں نے لوگوں کے اندر یہ وسوسہ اندازی شروع کی کہ یہ جو کچھ ان کے کلام میں یہ زور و اثر اس چیز کا نتیجہ ہے کہ یہ کوئی فرستادے ہیں۔ دیکھتے نہیں کہ یہ بھی تمھارے ہی جیسے انسان ہیں، اگر خدا کو کوئی رسول ہی بھیجنا ہوتا تو وہ کسی فرشتے یا کسی اور مخلوق کو اپنا رسول بناتا نہ کہ ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو! اور یہ جو ان کے کلام میں زور و تاثیر اور فصاحت و بلاغت محسوس کرتے ہو یہ بھی محض اس شخص کی جادو بیانی کا کرشمہ ہے، جس طرح ہمارے دوسرے شاعر اور خطیب اپنی جادو بیانی سے لوگوں پر اثر ڈالتے ہیں اسی طرح یہ شخص بھی اپنی جادو بیانی سے لوگوں کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو تمھاری یہ بڑی سادہ لوحی ہوگی اگر تم جانتے بوجھتے اس شخص کے جادو میں پھنس گئے!

یہ اشغلے چونکہ لیڈر لوگ خاص اپنی مجالس میں ایجاد کرتے تھے اور وہیں سے القاء ہو کر یہ لوگوں کے اندر پھیلتے تھے، اس وجہ سے ان کو نَجْوٰی سے تعبیر فرمایا ہے اور اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا کے الفاظ سے یہ ظاہر فرما دیا کہ یہ وسوسہ اندازیاں کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے خود اپنے اوپر بھی ظلم کیا کہ اپنے دل و دماغ معطل کر لیے اور دوسروں کے اوپر بھی ظلم کر رہے ہیں کہ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔

سحر سے مراد اور قرآن کو سحر کہنے کی وجہ

اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ میں سحر سے مراد وہ کلام ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو سناتے تھے۔ اہل عرب اس کلام کو جس میں غیر معمولی تاثیر و تسخیر ہو سحر سے تعبیر کرتے تھے۔ زور و اثر رکھنے والے کلام کے لیے یہ تعبیر ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔ جہاں تک قرآن مجید اور آنحضرت صلعم کے ارشادات کی فصاحت و بلاغت اور سطوت و جلالت کا تعلق ہے وہ ایسی چیز تھی کہ اس کا انکار مخالفین بھی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے اس وجہ سے وہ مجبوراً اس کا اعتراف کرتے۔ البتہ وہ اپنے عوام کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ یہ زور و تاثیر اس چیز کا نتیجہ نہیں ہے کہ یہ کوئی آسمانی کلام ہے یا اس کا پیش کرنے والا خدا کا کوئی رسول ہے بلکہ یہ تمام تر الفاظ کی جادوگری اور زورِ خطابت کی ساحری ہے تو جانتے بوجھتے، دیکھتے سنتے اس شخص کے جادو میں نہ پھنسو۔ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ کا ٹکڑا لوگوں کے اندر احساس برتری ابھارنے کے لیے ہے کہ تم کوئی بھولے بھالے اور سادہ لوح لوگ نہیں بلکہ سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ ہو اس وجہ سے تمھیں اس فریب میں نہیں آنا چاہیے۔

قٰلَ رَبِّیْ یَعْلَمُ الْقَوْلَ فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۴)

تفویض الی اللہ

یہ اس ردعمل کا بیان ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مخالفین کی اس بکواس کا ہوا۔ آپ جانتے تھے کہ یہ اشغلے محض لوگوں کو ورغلانے کے لیے وہ لوگ ایجاد کر رہے ہیں جن پر قرآن کا حق ہونا اچھی طرح واضح ہے اس وجہ سے آپ نے ان لوگوں کو خطاب کیے بغیر معاملہ اللہ کے حوالہ کیا کہ میرا رب آسمان و زمین میں ہونے والی ہر بات کو جانتا ہے، وہ سمیع و علیم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سرگوشیاں جو نہاں خانوں میں بھی ہو رہی ہیں اور یہ فتنے جو لوگ بھی ایجاد کر رہے ہیں، میرا رب ہر بات کو اچھی طرح جانتا ہے۔ تو جب وہ جانتا ہے تو وہی اس کے تدارک کا سامان بھی فرمائے گا۔ میں اس معاملہ کو اپنے رب ہی کے حوالہ کرتا ہوں۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (۵)

اضغاث احلام

'اضغاث'، 'ضغث' کی جمع ہے۔ 'ضغث' گھاس کی اس مٹھی کو کہتے ہیں جو رطب و یابس اور خشک و تر دونوں کا مجموعہ ہو۔ یہیں سے 'اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ' کا محاورہ پیدا ہوا جس کے معنی خواب پریشان کے ہیں یعنی وہ خواب جو معنی و مفہوم سے بالکل خالی اور اپنے الجھاؤ کے سبب سے اس قابل نہ ہوں کہ ان کی تاویل و تعبیر کی طرف کوئی توجہ کی جائے اور ان کو کوئی اہمیت دی جائے۔

فرمایا کہ بات یہیں تک نہیں رہی ہے کہ یہ لوگ پیغمبر کی وحی کو سحر کہتے ہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کو خوابِ پریشان سے تعبیر کرتے ہیں، اس کو افترا قرار دیتے ہیں، پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک شاعر بتاتے ہیں اور مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر یہ خدا کے پیغمبر ہیں تو اس کے ثبوت کے لیے اسی طرح کی کوئی نشانی یہ بھی دکھائیں جس طرح کی نشانیوں کے ساتھ سابق انبیاء آئے۔

قرآن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے کلام کی حیثیت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کی حیثیت سے پیش فرماتے تھے جو آپ پر خدا کے مقرب فرشتہ جبرئیل امین کے واسطہ سے نازل ہوتی تھی۔ مخالفوں نے جب یہ محسوس کیا کہ قرآن کے متعلق اس دعوے نے بھی اس کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے اور لوگ اس کو انسانی کلام کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدائی الہام کی حیثیت سے قبول کر رہے ہیں تو اس کا توڑ کرنے کے لیے انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس کلام کے وحی الٰہی ہونے کا دعویٰ محض واہمہ کی خلاقی ہے۔ یہ خوابہائے پریشان کا مجموعہ ہے۔ جو خیالات اس شخص کے ذہن میں رچے بسے ہوتے ہیں وہی اس کو سوتے میں خواب میں نظر آتے ہیں اور یہ ان کو (العیاذ باللہ) عوام فریبی کے لیے اس دعوے کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ یہ خدا نے ایک فرشتہ کے ذریعہ سے وحی نازل کی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ دورِ حاضر کے بعض ملاحدہ نے بھی وحی کو ایک مشکوک چیز ٹھہرانے کے لیے بعینہٖ یہی بات کہی ہے جو عرب کے ان اشرار نے کہی تھی۔ بس اتنا فرق ہے کہ عرب کے جہلاء نے یہ بات ناتراشیدہ انداز میں کہی اور اس زمانے کے مدعیانِ عقل نے اس کو ایک فلسفہ کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انشاء اللہ آخری گروپ کی سورتوں میں ہم اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کریں گے۔

آنحضرت صلعم پر ایک شاعر ہونے کی تہمت

'بَلِ افْتَرٰىهُ' یعنی اس قرآن کو افترا بھی قرار دیتے ہیں۔ اس کو افترا قرار دینے سے ان کا مدعا یہ تھا کہ ہے تو ان کے (آنحضرت کے) اپنے ذہن کی ایجاد لیکن (العیاذ باللہ) یہ جھوٹ موٹ محض ہم پر اپنی دھونس جمانے کے لیے اس کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

'بَلْ هُوَ شَاعِرٌ' یعنی یہ ایک شاعر ہیں اور ان کے اس کلام کی ساری سحر آفرینی اس نوعیت کی ہے جس نوعیت کی سحر آفرینی ہمارے بڑے بڑے شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے زیادہ ان کو اور ان کے کلام کو اہمیت دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اہل عرب کا تصور یہ تھا کہ ہر بڑے شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے جو اس کو شعر القا کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شاعر

کہ کر وہ لوگوں کو اس مغالطہ میں مبتلا کرنا چاہتے تھے کہ نعوذ باللہ آپ کے ساتھ بھی کوئی جن ہے جو یہ کلام آپ پر القا کرتا ہے۔

مخالفین پر قرآن کا رعب

قرآن کے مخالفین کی ان باتوں سے ایک امر تو بالکل واضح ہے کہ وہ اس کی ہیبت و جلالت سے سخت مرعوب تھے اور یہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ لوگوں کے دلوں پر سے اس کے رعب کو ہٹایا نہیں جا سکتا۔ البتہ ان کی یہ کوشش تھی کہ لوگوں پر اس کے خدائی کلام ہونے کی جو ہیبت بیٹھتی جا رہی ہے اس کو کسی طرح کم کریں کہ لوگ اس کو وحی والہام کا درجہ نہ دیں بلکہ بشری و انسانی کلام ہی کے درجے میں رکھیں۔

معجزات کی نشانی کا مطالبہ

'کَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ' کے بعد 'بِالْاٰیٰتِ' قرینہ کی دلالت کی بنا پر حذف ہے۔ یعنی جب وہ یہ محسوس کرتے کہ قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان کی یہ اوٹ پٹانگ باتیں لوگوں کے دلوں میں اترنے والی نہیں ہیں تو یہ مطالبہ کرتے کہ اگر یہ رسول ہیں تو یہ بھی اسی طرح کی کوئی نشانی دکھائیں جس طرح کی نشانیاں پہلے آنے والے رسولوں نے دکھائیں۔ نشانی سے ان کی مراد اس طرح کے حسی معجزات یا عذاب کی نشانیاں ہیں جن کا ذکر دوسرے انبیاء کی سرگزشتوں کے سلسلہ میں آیا ہے۔ ان کا یہ حربہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں، ان کے زعم کے مطابق، سب سے زیادہ کارگر حربہ تھا اس لیے کہ قرآن کی دعوت تمام تر آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے دلائل پر مبنی تھی۔ وہ معجزات و خوارق اور نشانِ عذاب کے بجائے لوگوں کو آنکھیں کھولنے اور عقل و بصیرت سے کام لینے پر ابھارتا تھا کہ ایمان کا فطری راستہ عقل و دل کا راستہ ہے۔ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے وہ خوارق دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے اور عذاب کی نشانی دیکھ کر جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان لانا بے سود ہوتا ہے۔ قرآن کی یہ بات بالکل برحق تھی لیکن مخالفین اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گریز پر محمول کر کے لوگوں کو ورغلاتے کہ دیکھو، اگر یہ سچ مچ کوئی رسول ہوتے تو ان کے لیے ہمارا یہ مطالبہ پورا کر دینا کیا مشکل تھا! لیکن جب یہ اس سے گریز کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اپنے دعوے میں (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں۔

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ (۶)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ ان کی ان خرافات کی پروا نہ کرو۔ یہ ضد اور ہٹ دھرمی کی اسی روش پر چل پڑے ہیں جس پر ان سے پہلے ہلاک ہونے والی قومیں چلیں۔ جس طرح انھوں نے اپنے نبیوں کو جھٹلایا اور اس کی پاداش میں ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اسی طرح ان کے لیے بھی ہلاکت مقدر ہو چکی ہے۔ انھوں نے ہر قسم کی نشانیاں دیکھیں لیکن ایمان کی راہ اختیار نہ کی تو ان سے کس طرح توقع رکھتے ہو کہ اگر ان کی طلب کے مطابق ان کو کوئی نشانی دکھا دی گئی تو یہ ایمان لانے والے بن جائیں گے! یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی اسی طرح اندھے بنے رہیں گے جس طرح آج اندھے اور بہرے بنے ہوئے ہیں!

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْــَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۷)

رسول، بشر

اوپر آیت ۳ میں مخالفین کا یہ اعتراض نقل ہوا ہے 'هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ' (یہ تو تمہارے

ہی مانند ایک بشر ہیں) یہ اسی اعتراض کا جواب ہے کہ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ نہیں ہے کہ خدا نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا بلکہ تم سے پہلے جتنے بھی رسول آئے ہیں سب بشر ہی تھے کبھی خدا نے غیر بشر کو رسول بنا کر نہیں بھیجا۔ رسولوں کو جو امتیاز حاصل تھا وہ یہ نہیں کہ وہ مافوق بشر تھے بلکہ صرف یہ کہ ہم ان کے پاس اپنی وحی بھیجتے تھے، اسی طرح کی وحی جس طرح کی وحی ہم تمہارے پاس بھیجتے ہیں، جس کی مخالفت میں یہ لوگ یہ بکواس کر رہے ہیں۔

دشمن کی گواہی

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ - اوپر والے ٹکڑے میں خطاب کا رخ آنحضرت صلعم کی طرف تھا۔ یہ براہ راست مخالفین و معترضین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تم اس بات سے بے خبر ہو تو ان لوگوں سے پوچھ لو جن کو پہلے خدا کی کتاب ملی اور وہ نبیوں اور رسولوں کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ اشارہ اہل کتاب بالخصوص یہود کی طرف ہے۔ ان کو گواہ بنانا دشمن کو گواہ بنانے کے ہم معنی ہے اس لیے کہ اس دور میں، جیسا کہ پچھلی سورتوں سے واضح ہو چکا ہے، اہل کتاب من حیث الجماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور قریش کی حمایت کے لیے میدان میں اتر چکے تھے۔ قرآن نے ان کو گواہ بنا کر قریش پر حجت تمام کر دی کہ اس حقیقت سے انکار تو تمہارے حامیوں اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دشمن اہل کتاب کو بھی نہیں ہو سکتا تو انہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے! یہاں اہل کتاب کو اہل کتاب کے بجائے اَهْلَ الذِّكْرِ سے تعبیر کرنے میں یہ بلاغت ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت میں اندھے ہو جانے کی بات تو اور ہے لیکن ان میں سے جن کو اپنے نبیوں اور رسولوں کی یاد ہوگی وہ اس بدیہی حقیقت سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔

قریش پر ایک تعریض

اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کے الفاظ کے اندر قریش پر ایک تعریض بھی ہے کہ ہر چند یہ بات معلوم تو تمہیں بھی ہونی چاہیے کہ تم ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے خلف اور وارث ہونے کے مدعی ہو جو بہر حال بشر ہی تھے مافوق بشر نہیں تھے، لیکن تمہیں اگر یہ بات امی ہونے کے سبب سے بھول گئی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ کر اپنی یادداشت تازہ کر لو جن کو کم از کم یہ بات تو نہیں بھولی ہوگی کہ جتنے رسول بھی آئے سب بشر ہی تھے، کوئی بھی فرشتہ نہیں تھا۔

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (۸)

کوئی نبی مافوق بشر نہیں ہوا

یعنی وہ تمام انبیا بھی اسی طرح کی بشری خصوصیات کے ساتھ آئے تھے جس طرح کی بشری خصوصیات تمہارے اندر ہیں۔ نہ تو ان کو ایسے جسم ملے تھے جو کھانے پینے کی ضرورت سے مستغنی ہوں اور نہ وہ زندۂ جاوید ہو کر آئے تھے۔ وہ بھی انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے تھے اور انھیں بھی اسی طرح موت سے دوچار ہونا پڑا جس طرح ہر بشر کو اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

یہ اعتراض دوسری جگہ اس طرح نقل ہوا ہے۔

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا　　یہ تو بس تمہارے ہی مانند ایک بشر ہیں۔ جو تم کھاتے ہو

تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (المؤمنون - ۳۳-۳۴)

وہی یہ کھاتے ہیں اور جو تم پیتے ہو وہی یہ پیتے ہیں تو اگر تم اپنے ہی جیسے ایک انسان کو رسول مان لگے تو بڑے گھاٹے میں رہو گے۔

کسی نبی کو حیات جاوداں نہیں ملی

'وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ' میں ان کے اس زعم کی تردید ہے کہ رسول کو زندہ جاوید ہونا چاہیے۔ اسی سورہ میں آگے اس خیال کی تردید ان فرمائی گئی ہے۔ 'وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (۳۴-۳۵) یعنی ہم نے تم سے پہلے کسی انسان کو بھی، خواہ وہ نبی ہو یا غیرنبی، حیاتِ جاوداں نہیں بخشی، اگر تمھیں موت آنی ہے تو یہ بھی ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں، ہر نفس کو بہر صورت موت کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ مطلب یہ ہے کہ موت تو اس زندگی کا ایک ناگزیر مرحلہ ہے جس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ نبی کو بھی اس مرحلہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ چیز نہ اس کی نبوت کے لیے قادح ہے اور نہ اس کو نبی ماننے میں دوسروں کے لیے کوئی کسرِ شان کی بات ہے۔

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ (۹)

ہر رسول کی تکذیب کرنے والے ہلاک ہوتے

'وعد' سے مراد وہی وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے فرمایا کہ اگر لوگ تمھاری تکذیب کر دیں گے تو ہم تمھاری تکذیب کرنے والوں کو ہلاک کر دیں گے اور تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو نجات دیں گے۔ ہم یونس ۲۰ کے تحت واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک اس عذاب سے جو اس دنیا میں رسول کی تکذیب کر دینے والی قوم پر لازماً آتا ہے۔ دوسرے اس عذاب سے جو آخرت میں ہوگا۔ یہاں پہلا عذاب مراد ہے۔ فرمایا کہ تھے تو وہ بہرحال بشر ہی لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ہم نے ان سے جو وعدہ کیا تھا وہ سچا کر دکھایا یعنی ان کو اور جن کو ہم نے چاہا نجات دی اور ان لوگوں کو ہلاک کر دیا جو حدود سے تجاوز کر جانے والے تھے۔ یہاں 'مَنْ نَّشَآءُ' کے اسلوب بیان نے کلام کو مطابق حال کر دیا ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ صرف ماضی کی حکایت نہیں ہے بلکہ اس وقت تمھارے سامنے بھی یہی فیصلہ کن مرحلہ ہے۔ اگر تم نے اپنی ضد سے ہمارے عذاب کو دعوت دی تو ہم اس سے نجات انہی لوگوں کو دیں گے جن کو چاہیں گے۔ ہماری اس مشیت میں کوئی دوسرا دخیل نہ بن سکے گا اور نہ کوئی ہماری پکڑ سے بچ سکے گا۔

'مُسْرِفِيْنَ' سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا کی حدود کو ڈھٹائی کے ساتھ توڑتے ہیں اور رسول کے انذار کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کے باغی قرار پاتے ہیں اور باغیوں کی سرکوبی لازماً ہو کے رہتی ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰)

یاددہانی کے لازمی نتائج

یعنی جس طرح ہم نے پچھلی قوموں پر ان کے ہلاک کرنے سے پہلے ان کی تذکیر کے لیے رسول بھیجے کہ ان پر حجت تمام ہو جائے اسی طرح تمھارے اوپر بھی ایک کتاب اتار دی ہے جس میں تمھیں اچھی طرح یاددہانی کر دی ہے۔ اب تم ہمارے سامنے یہ عذر نہیں کر سکتے کہ تمھیں یاددہانی نہیں کی گئی۔ یہ یاددہانی اپنے لازمی نتائج اپنے ساتھ

رکھی ہے جو سنت الٰہی کے مطابق بہر حال ظاہر ہو کے رہیں گے۔ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں ہے کہ اگر تم نے رد کر دی تو یہ رد ہو جائے گی بلکہ اس کو رد کر دینے کا وہی نتیجہ تمہارے سامنے آکے رہے گا جو تم سے پہلے دوسری قوموں کے سامنے آچکا۔ خدا کی جو سنت آج تک جاری رہی ہے وہ تمہارے معاملے میں بدل نہیں جائے گی۔ 'اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ' یہاں سخت تہدید و وعید کے سیاق میں ہے کہ نادانو، تمہاری عقل کہاں کھوئی گئی ہے! کیوں اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہو! اس آیت کے صحیح زور کو سمجھنے کے لیے سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۳۲ - ۱۳۵ کے تحت جو وضاحت کی گئی ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (۱۱)

تاریخ کا حوالہ

پچھلی قوموں کی تاریخ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس طرح تم اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہو کہ خدا کی یاددہانی کا مذاق اڑا رہے ہو اسی طرح تم سے پہلے بھی بہت سی قومیں یہی حرکت کر چکی ہیں جس کی پاداش میں ہم نے ان کے پرخچے اڑا دیے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اسی جرم کے تم مرتکب ہو رہے ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدا وہی معاملہ تمہارے ساتھ نہ کرے جو اس نے ان کے ساتھ کیا۔

'كَانَتْ ظَالِمَةً' یہاں 'ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ' کے مفہوم میں ہے یعنی اللہ نے ان کے اوپر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والی بنیں۔ خدا نے اپنے رسول بھیج کر ان کو خطرے سے آگاہ کر دیا۔ لیکن انھوں نے اپنی رعونت کے سبب سے خود اس خطرے کے بند کو توڑا۔

قوموں کے ایک مغالطہ کی تردید

'وَاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ' یعنی خدا کے لیے ایک قوم کو مٹا دینا اور اس کی جگہ دوسری قوم کو برپا کر دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کوئی بھی اپنے وجود کو اس دنیا کے لیے ناگزیر نہ سمجھے کہ اس کے اجڑنے سے خدا کی دنیا اجڑ جائے گی۔ جب کوئی قوم بغاوت کی روش اختیار کرے گی خدا اس کو مٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو لائے گا اور دیکھے گا کہ وہ کیا روش اختیار کرتی ہے۔ اگر وہ بھی وہی روش اختیار کرے گی تو بالآخر اس کا بھی وہی حشر ہوگا ــــ افراد ہوں یا اقوام جب ان پر خدا سے بے پروائی غالب ہوتی ہے، تو وہ اپنے وجود کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے لگ جاتے ہیں۔ یہاں اسی مغالطہ کو دور فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو بہت بڑی چیز نہ سمجھو، خدا جب چاہے گا، یہاں جھاڑو پھروا دے گا اور تمہاری جگہ دوسروں کو لا بسائے گا۔

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (۱۲)

خدا کی پکڑ سے کوئی پناہ نہیں

یعنی جس طرح آج تم بڑے طنطنہ کے ساتھ خدا کے عذاب کو دعوت دے رہے ہو اسی طرح انھوں نے بھی بڑی رعونت کے ساتھ خدا کے عذاب کو دعوت دی بالآخر جب ہمارے عذاب نے ان کے دروازوں پر دستک دے دی تو اس کے مقابلہ کے لیے وہ کوئی تدبیر نہ کر سکے بلکہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن خدا کے عذاب سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ وہ جب دبوچ لیتا ہے تو اس کے چنگل سے کوئی نہیں نکل سکتا!

لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ (۱۳)

ایک طنزیہ اسلوب

یہ صورتِ حال کی تعبیر ہے یعنی خدا کی گرفت نے اپنی زبانِ حال سے ان سے کہا کہ اب کہاں بھاگتے ہو؟ اب بھاگو مت، بھاگنے کا وقت گزر گیا! خدا کی بخشی ہوئی جن رفاہیتوں میں اب تک عیش کرتے اور اپنے جن محلوں اور ایوانوں میں بیٹھ کر خدا کی آیات اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے رہے ہو، ان میں جاؤ تاکہ تمھاری اچھی طرح مزاج پرسی ہو۔ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ یہاں طنز و تضحیک کے مفہوم میں ہے۔ طنز و تضحیک کا یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی ہے۔ سخت اظہارِ غضب کے مواقع میں ہم بھی باندازِ طنز یوں کہتے ہیں کہ ٹھہرو، ابھی میں تمھاری مزاج پرسی کرتا ہوں، ابھی تمھاری خبر لیتا ہوں، ابھی پوچھتا ہوں۔ قرآن کے دوسرے مواقع میں بھی یہ اسلوب استعمال ہوا ہے۔ مثلاً آیت ۸۔ تکاثر اور آیت ۹۳۔ نحل میں۔

اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ رفاہیت و نعمت کی فراوانی تمھیں بخشی تو گئی خدا کی طرف سے تاکہ تمھاری شکرگزاری کا امتحان ہو لیکن تم اس کو اپنے اب وجد کی میراث اور اپنے استحقاقِ ذاتی اور اپنی قابلیت کا کرشمہ سمجھے اور اس کے بل پر اسی خدا سے تم نے بغاوت کی جس کے فضل سے تمھیں یہ نعمتیں حاصل ہوئیں تو اب اس کا مزہ چکھو۔ یہاں خطاب چونکہ امراء و اغنیاء سے ہے اور مساکن کا ذکر ان کے اسبابِ عیش و رفاہیت کے ذکر کے بعد ہے اس وجہ سے 'مساکن' سے مراد انہی امراء کے ایوان و محل ہیں۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۔ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (۱۴-۱۵)

بعد از وقت اعتراف

یعنی جب عذاب نے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تب ان کو ہوش آیا اور انھوں نے واویلا شروع کیا اور بول اٹھے کہ بے شک ہم خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے اور ہم نے یہ شامت خود بلائی۔ لفظ 'ظلم' کے اس مفہوم کی طرف اوپر آیت ۱۱ کے تحت ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ اعتراف انھیں اس وجہ سے کرنا پڑا کہ اس عذاب سے پہلے خدا کے رسول نے انھیں اچھی طرح خبردار کر دیا تھا لیکن وہ نہ صرف اندھے بہرے بنے رہے بلکہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس کا مطالبہ کرتے رہے۔ بالآخر جب وہ سر پر آ دھمکا تو انھیں ماننا پڑا کہ سارا قصور ان کا اپنا ہے۔

فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ الاٰیۃ۔ 'دَعْوٰی' کے معنی چیخ و پکار اور استغاثہ و فریاد کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد ان کی وہی چیخ و پکار ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ یعنی وہ اسی طرح چیخ پکار کرتے ہی رہ گئے، ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی اس لیے کہ عذاب آ جانے کے بعد چیخ پکار بے سود ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے ان کو کاٹی ہوئی گھاس اور بجھی ہوئی آگ کی مانند کر دیا۔ کاٹی ہوئی گھاس اور بجھی ہوئی آگ، کے استعارے میں یہ مضمون مضمر ہے کہ جس طرح گھاس کاٹ کر اس کے خشک انبار میں آگ لگا دی جائے اور وہ راکھ کا ڈھیر ہو کے رہ جائے اسی طرح ہم نے ان کو خاک اور راکھ بنا دیا۔ لفظ 'خٰمِدِيْنَ' یہاں مستعارلہ کی رعایت سے آیا ہے اور یہ عربی کا معروف اسلوب ہے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۶-۲۹

آگے اسی بات کی دلیل بیان ہوئی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ اس دنیا میں قوموں کا جو محاسبہ ہوتا ہے اور آگے قیامت میں جو ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو خدا نے محض اپنا جی بہلانے کے لیے اس طرح کا کوئی تھیٹر نہیں بنایا ہے جس طرح کے تھیٹر دنیا کے بادشاہ اپنے جی بہلانے کے لیے بناتے ہیں بلکہ یہ اس نے اپنے فضل و رحمت اور حق و عدل کے ظہور کے لیے بنائی ہے۔ اس فضل و رحمت اور حق و عدل کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس میں اس کے بندے شتر بے مہار کی زندگی نہ گزاریں بلکہ خدا کے نظام حق و عدل کے پابند ہو کر زندگی گزاریں اور یہ یوں ہی چلتی نہ رہے بلکہ اس کے بعد ایک ایسا یوم الحساب بھی آئے جس میں وہ لوگ اپنی کارکردگی کا صلہ پائیں جو اس دنیا کے خالق کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کریں اور وہ لوگ کیفر کردار کو پہنچیں جو اس میں دھاندلی مچائیں۔ اگر کسی ایسے یوم الحساب کے بغیر اسی طرح یہ دنیا چلتی رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا خالق کوئی کھلنڈرا ہے جس نے محض اپنی تفریح کے لیے یہ کھیل رچائی ہے اس کو اس کے خیر و شر اور عدل و ظلم سے کوئی بحث نہیں ہے۔ یہ خیال بالبداہت باطل اور خدا کی صفات عدل و رحم کے بالکل منافی ہے اس وجہ سے قیامت ناگزیر ہے۔ اسی سلسلہ میں شرک کی تردید بھی فرمائی اس لیے کہ اگر شرک کی کوئی گنجائش باقی رہے تو اس صورت میں بھی یہ دنیا بازیچۂ اطفال اور ایک کھیل تماشہ بن کے رہ جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایسے شرکاء و شفعاء کا وجود تسلیم کر لیا جائے جو خدا کے معاملات میں اتنے دخیل ہوں کہ وہ اپنے پجاریوں کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں تو قیامت کا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہوا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر یہ روز عدالت آیا بھی تو اس کے لیے کسی فکر و اہتمام کی ضرورت نہیں ہے، سفارشیوں کے ذریعہ سے اس عدالت سے چھوٹا جا سکتا ہے اور سفارش کے لیے ان کے یہ مزعومہ شرکاء و شفعاء ان کے نزدیک کافی ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۶-۲۹

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿١٦﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ
نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٧﴾ بَلْ
نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ
الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿١٨﴾ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ
عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿١٩﴾ يُسَبِّحُوْنَ
الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿٢٠﴾ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ

يُنْشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ
رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٢٢﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾
اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا
ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ
فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ
اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿٢٥﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ
وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ
بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ
اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَمَنْ يَّقُلْ
مِنْهُمْ اِنِّىْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ
ع ۲ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾

ترجمۂ آیات: ۱۶-۲۹

اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشہ کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھیل ہی بنانا چاہتے تو خاص اپنے پاس ہی بنا لیتے۔ اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے! بلکہ ہم حق کو باطل پر دے ماریں گے تو وہ اس کا بھیجا نکال دے گا تو دیکھو گے کہ وہ نابود ہو کے رہے گا اور تمھارے لیے اس چیز کے سبب سے، جو تم بیان کرتے ہو، بڑی خرابی ہے! ۱۶-۱۸

اور اسی کے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو اس کے پاس ہیں۔ وہ اس کی بندگی سے نہ سرتابی کرتے اور نہ تھکتے۔ وہ شب و روز اس کی تسبیح کرتے ہیں اور دم نہیں لیتے۔ ۱۹-۲۰

کیا انھوں نے زمین کے الگ معبود ٹھہرا لیے ہیں، وہ زمین کو شاداب کرتے ہیں؟ اگر ان دونوں کے اندر اللہ کے سوا الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو کے رہ جاتے۔ تو اللہ، عرش کا مالک، ان چیزوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں! وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے باب میں کسی کے آگے مسئول نہیں اور یہ سارے مسئول ہیں۔ کیا انھوں نے خدا کے ماسوا دوسرے معبود ٹھہرا رکھے ہیں؟ ان سے کہو کہ اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ تعلیم ہے ان لوگوں کی جو میرے ساتھ ہیں اور ان لوگوں کی بھی جو مجھ سے پہلے ہوئے۔ بلکہ ان میں سے اکثر حق سے بے خبر ہیں اس وجہ سے اعراض کیے جا رہے ہیں۔ اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول بھی بھیجے ان کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔ ۲۱-۲۵

اور یہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمان کے اولاد ہے، وہ ان باتوں سے ارفع ہے، بلکہ وہ خدا کے مقرب بندے ہیں۔ وہ اس کے آگے بات میں پہل نہیں کرتے، وہ بس اس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں۔ وہ ان کے آگے اور ان کے پیچھے جو کچھ ہے سب سے باخبر ہے اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر صرف اس کے لیے جس کے لیے اللہ پسند فرمائے۔ اور وہ اس کی خشیت سے لرزاں رہتے ہیں اور ان میں سے جو بھی مدعی بنے گا کہ اس کے سوا میں الٰہ ہوں تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے۔ ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیں گے۔ ۲۶-۲۹

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۱۶)

جزاء و سزا کے لازم ہونے کی دلیل — اوپر جو بات جزا و سزا کے لازمی ہونے سے متعلق فرمائی گئی ہے یہ اس کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ اگر اس دنیا کے پیچھے کوئی روزِ جزا و سزا نہیں ہے، یہ یوں ہی چلتی آئی ہے اور یوں ہی ہمیشہ چلتی رہے گی، کوئی نیکی کرے یا بدی، ظلم کرے یا انصاف، اس کے خالق کو اس کے خیر و شر سے کوئی بحث نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ

اس نے یہ محض اپنا جی بہلانے کے لیے ایک کھیل تماشا بنایا ہے، جب تک وہ چاہے گا اس سے جی بہلائے گا اور جب اکتا جائے گا اس کی بساط لپیٹ کر رکھ دے گا اور اپنی دلچسپی اور اوقات گزاری کے لیے کوئی نیا کھیل ایجاد کرے گا۔ فرمایا کہ ہم نے اس آسمان و زمین اور ان کے مابین کی چیزوں کو اس طرح کے کسی کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ یہ کارخانۂ کائنات اپنے وجود سے شاہد ہے کہ یہ ایک عادل و حکیم اور رحمان و رحیم کا بنایا ہوا کارخانہ ہے۔ نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، نہ یہ دیوتاؤں کی رزمگاہ ہے اور نہ یہ کسی بھگوان کی لیلا ہے بلکہ اس پُر حکمت کارخانہ کی ایک ایک چیز شاہد ہے کہ اس کے خالق نے اس کو ایک عظیم مقصد و غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کے عدل و حکمت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن آئے، جس میں اس کا مقصد ظہور میں آئے۔

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ (۱۷)

کھیل اور کارِ عبث خدا کی صفات کے منافی ہے۔

فرمایا کہ اول تو اس قسم کا کھیل اور کارِ عبث ہماری شان اور ہماری اعلیٰ صفات کے منافی ہے لیکن بالفرض ہم ایسا کرنے والے ہی ہوتے تو اپنے پاس ہی سے اس کا سروسامان مہیا کر لیتے، اس میں اپنے بندوں اور بندیوں اور اپنی دوسری مخلوقات کو کیوں گھسیٹتے! ہم اس کتاب میں روم کے قدیم سلاطین کے متعلق کہیں ذکر کر آئے ہیں کہ وہ اپنے تھیٹروں میں بھوکے شیروں اور اپنے مظلوم غلاموں کی چیر پھاڑ کا تماشا دیکھتے تھے۔ العیاذ باللہ یہی رائے اس کائنات کے خالق کے متعلق قائم کرنی پڑے گی اگر وہ اپنی تمام مخلوقات کو اس ابتلا میں ڈال کر ان کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں ظالم بھی ہیں اور مظلوم بھی، سرکش و باغی بھی ہیں اور وفادار و تابعدار بھی، ناشکرے اور نابکار بھی ہیں اور حق شناس و شکر گزار بھی، ایسی حالت میں اگر اس دنیا کے لیے کوئی روزِ عدل نہیں ہے تو پھر یہ روم کے سلاطین کے ایک تھیٹر کے مانند ہے۔ اس آیت میں اسی بے ہودہ خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اپنی مخلوقات کے ساتھ خدا کا جو تعلق ہے وہ اس بات کو واجب کرتا ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں حق و باطل کا فیصلہ ہو، حق سربلند ہو اور باطل نابود۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا ایک کھیل بن کے رہ جاتی ہے اور یہ چیز خدا کی صفات کے منافی ہے۔

'لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ' کے چند لفظوں کے اندر جس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم کوئی کھیل تماشا بنانا ہی چاہتے تو ہم اس کا سروسامان اپنے پاس ہی سے کر لیتے اس کے لیے آدمؑ و ابلیس، حق و باطل، ہدایت و ضلالت، عدل و ظلم، خیر و شر، اور ظلم و مظلومی کی یہ رزمگاہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بات خدا کے عدل و رحم کے بالکل منافی ہے کہ وہ ایک رزمگاہ میں اپنے بندوں اور بندیوں کو اتار دے اور خود ایک تماشائی بن کر صرف اس کا تماشا دیکھے، نہ ان لوگوں کو انعام دے جو اس جہاد میں کامیاب و سرخرو ہوں اور نہ ان لوگوں کو سزا دے جو اپنی ساری زندگی باطل کی پرستش اور اس کی حمایت میں گزاریں۔

'اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ' میں خدا کی نسبت اسی باطل تصور کی تردید ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اسی باطل تصور کی بنا پر دنیا کی مشرک قوموں نے اس کائنات کو اپنے دیوتاؤں کی ایک تماشہ گاہ قرار دیا اور ہندو فلسفیوں نے اس کو بھگوان کی لیلا سے تعبیر کیا۔ ان کے ہاں چونکہ قیامت کا کوئی واضح تصور نہیں تھا اس وجہ سے انھوں نے خیال کیا کہ جس

طرح دنیا کے بادشاہ اپنی تفریح کے لیے تھیٹر بناتے ہیں اسی طرح ان کے غیبی دیوتاؤں نے یہ دنیا بنائی ہے اور وہ اس میں کسی کو ظالم اور کسی کو مظلوم، کسی کو قاتل اور کسی کو مقتول بنا کر اس کا تماشہ دیکھتے اور اپنا جی بہلاتے ہیں۔ ہمارے اس زمانے کے منکرین و ملاحدہ اگرچہ زبان سے تو یہ بات نہیں کہتے کہ یہ کہنے میں نہایت بھونڈی ہے لیکن جب وہ قیامت اور ایک روز عدل و انصاف کو نہیں مانتے تو ان کے دل کے اندر بھی اصلاً یہی تصور باطل گھسا ہوا ہے اس لیے کہ انکار قیامت کے معنی دوسرے لفظوں میں یہی ہیں کہ یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال ہے۔ قیامت کو مانے بغیر اس کائنات کی کوئی ایسی توجیہ ممکن ہی نہیں ہے جو اس کو حق و عدل پر مبنی قرار دے سکے۔ ان دونوں میں اسی طرح کی نسبت ہے جس طرح کی نسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ اگر جوڑے کے ایک فرد کو اس کے دوسرے جزو سے الگ فرض کر کے اس کی توجیہ کرنا اور اس کے داعیات و مقتضیات کی حکمت معلوم کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ (۱۸)

'دمغ' کے معنی کسی کو اس طرح مارنے اور زخمی کرنے کے ہیں کہ وہ اس کا بھیجا نکال دے۔

اصل حقیقت کا بیان

فرمایا کہ تم جو اس دنیا کو ایک کھیل تماشہ سمجھے بیٹھے ہو، یہ خیال بالکل باطل ہے۔ اس میں ہم نے حق کے ساتھ باطل کو جو مہلت دے رکھی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ ہمارے نزدیک حق و باطل دونوں یکساں ہیں بلکہ یہ محض تمہارے امتحان کے لیے ہے کہ دیکھیں کون حق کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون باطل کا پرستار بنتا ہے۔ بالآخر ایک دن آئے گا جب تم دیکھو گے کہ ہم حق کا ہتھوڑا باطل کے سر پر اس طرح ماریں گے کہ وہ باطل کا بھیجا نکال کر رکھ دے گا اور جس طرح تم دیکھتے ہو کہ دماغ پر ضرب کاری آدمی کو آناً فاناً ختم کر دیتی ہے اسی طرح یہ ضرب کاری باطل کو چشم زدن میں نابود کر دے گی۔

'وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ' یعنی اس وقت تمہاری اس بکواس کے سبب سے جو تم آج کر رہے ہو تمہارے لیے صرف تباہی اور ہلاکی ہی ہو گی۔ 'مِمَّا تَصِفُوْنَ' سے ہمارے نزدیک مراد ان کا دنیا سے متعلق یہ تصور بھی ہے کہ یہ محض ایک کھیل تماشا ہے، اور ان کے شرک و شفاعت کا وہ عقیدہ بھی ہے جس کے سبب سے وہ آخرت سے بالکل نچنت ہو کر یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ بالفرض آخرت سے سابقہ پیش بھی آیا تو ان کے شرکاء و شفعاء ان کو ہر خطرے سے بچا لیں گے۔ فرمایا کہ تمہاری یہ تمام باتیں موجب وبال اور سبب ہلاکت بنیں گی۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۚ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (۱۹-۲۰)

شرک کے ماہیہ کی تردید

اوپر کی آیات میں جزا و سزا کے واجب ہونے پر صفات الٰہی سے استدلال تھا۔ اب یہ توحید کا بیان

آ رہا ہے تاکہ یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ اپنے شرکاء و شفعاء کی سفارش سے خدا کی پکڑ اور جزا و سزا سے بچ جائے گا تو یہ محض اس کا وہم ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ فرمایا کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب خدا ہی کی مخلوق اور اسی کے مملوک ہیں کسی کو خدا کے ہاں کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں ہے۔

فرشتوں کا حال

'وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ'۔ 'مَنْ عِنْدَهٗ' سے مراد خدا کے مقرب ملائکہ ہیں۔ فرمایا کہ وہ بھی اسی زمرے میں داخل ہیں۔ باہمہ قرب و شرف ان کا حال یہ ہے کہ نہ وہ اس کی عبادت سے کبھی سرتابی کرتے، نہ کبھی اس سے تھکتے۔ یہ مشرکین کے اس وہم کی تردید ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں فرض کر کے ان کی عبادت کرتے تھے ان کا گمان یہ تھا کہ ان کو خدا کے ہاں بڑا مرتبہ و مقام حاصل ہے جو بات چاہیں اپنے باپ سے منوا لیتی ہیں اور خدا ان کی نازبرداری میں ان کی ہر خواہش کی لازماً تعمیل کرتا ہے۔ وہ اپنی دنیا کی نعمتوں کو بھی انہی کا عطیہ سمجھتے اور آخرت کے باب میں بھی ان کا خیال تھا کہ اگر بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی ہوا تو ان کی بدولت وہاں بھی ان کو بڑا درجہ حاصل ہوگا۔ فرمایا کہ تم تو ان کے بل پر خدا سے اکڑتے ہو لیکن خود ان کا حال یہ ہے کہ نہ وہ کبھی خدا کی بندگی سے سرتابی کرتے اور نہ کبھی اس کام میں وہ کوئی تکان محسوس کرتے، وہ شب و روز خدا کی تسبیح و تہلیل میں سرگرم رہتے ہیں، ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں توقف نہیں کرتے۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ یُنْشِرُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ (۲۱ - ۲۲)

'انشر اللّٰہ الارض' کے معنی یہ ہوں گے، خدا نے زمین کو اس کے خشک ہو جانے اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد از سر نو زندہ و شاداب کر دیا مثلاً فرمایا ہے۔ 'وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا' (زخرف۔ ۱۱) (اور جس نے اتارا آسمان سے پانی ایک خاص اندازہ کے ساتھ پس ہم نے اس سے شاداب کر دیا خشک زمین کو)

زمین و آسمان کا رب ایک ہے

یہ مشرکین کے ایک دوسرے مشرکانہ وہم کی تردید ہے۔ بہت سے مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ زمین اور آسمان کے الٰہ الگ الگ ہیں۔ وہ ایک رب العرش کو مانتے تھے لیکن ان کا خیال یہ تھا کہ رب العرش اپنے عرش آسمان پر براجمان ہے، زمین میں دوسرے خداؤں کی خدائی چل رہی ہے۔ اسی وہم کے تحت وہ آسمان کے خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے زمینی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ اہل عرب کے علم الاصنام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تصور یہ تھا کہ زمین چونکہ رب العرش کی مملکت کا ایک بہت بعید علاقہ ہے اس وجہ سے اس کا انتظام و انصرام، دوسروں کے حوالہ کر کے وہ اس سے الگ تھلگ ہو گیا ہے۔ فرمایا کہ کیا انھوں نے زمین کے الگ الٰہ ٹھہرا لیے ہیں جو اس زمین کو زندگی بخشتے اور اس کو سرسبز و شاداب کرتے ہیں؟ ان کا یہ خیال بالکل ہی باطل ہے۔ اگر آسمان و زمین میں خدا کے ماسوا الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو

کے رہ جاتے۔ آخر آسمان والوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین کے خشک و بے آب وگیاہ ہو جانے کے بعد اس کو از سرِ نو پر بہار کر دینے کے لیے پانی برساتے یا ان کی دوسری ضروریات کی فراہمی میں کوئی حصہ لیتے! توحید کی اس دلیل کی وضاحت دوسرے مقام میں 'دلیل توافق' کے عنوان سے ہم کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے دہرانے میں طوالت ہوگی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کائنات کے بقا کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے مختلف اجزاء و عناصر اور اس کے تمام اضداد میں نہایت گہرا توافق ہے۔ اگر یہ توافق ایک لمحہ کے لیے بھی ختم ہو جائے تو اس کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ یہ توافق صریح طور پر اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اس پوری کائنات پر ایک ہی ذات کا ارادہ (۸۴ ، ۸۵) کارفرما ہے۔ اگر اس میں بہت سے ارادے کارفرما ہوتے تو آسمان و زمین کا باقی رہنا ناممکن تھا۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۔ توحید کی یہ دلیل بیان کرنے کے بعد اس کا نتیجہ سامنے رکھ دیا کہ خدائے رب العرش کے باب میں اس قسم کا تصور ایک احمقانہ تصور ہے۔ وہ اس قسم کی باتوں سے ارفع اور پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ جب وہ اس کائنات کے تختِ حکومت کا مالک ہے تو اسی کا حکم آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب پر چل رہا ہے، پھر دوسروں کی کسی مداخلت کے فرض کرنے کی گنجائش کہاں باقی رہی!

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (۲۳)

سب خدا کے آگے مسئول ہیں

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان واضح فرمائی کہ وہ کسی کے آگے مسئول اور جواب دہ نہیں، باقی سب، خواہ فرشتے ہوں یا جن و انس، اس کے آگے جواب دہ ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے اور اگر کسی نے اس کی جرأت کی تو اس کو اللہ کے حضور میں جواب دہی کرنی پڑے گی اور وہ اس جسارت کی سزا بھگتے گا۔ یہ مشرکین کے اس واہمہ کی تردید ہے کہ وہ اس کائنات کے نظم و نسق میں اپنے معبودوں کو دخیل سمجھ کر ان سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ خدا کے جس ارادے کو چاہیں بدلوا سکتے اور جو چاہیں اپنی مرضی سے کر سکتے ہیں، وہ خدا کی باز پرس سے بالاتر ہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ
قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ
اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۲۴-۲۵)

توحید کے اثبات اور شرک کی تردید میں تاریخ کی شہادت

یہ توحید کے اثبات اور شرک کی تردید میں تاریخ کی شہادت کا حوالہ ہے۔ اوپر کی مذکورہ دلیل توافق سے یہ ایک الگ اور مستقل دلیل ہے اس وجہ سے سوال 'اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً' کو پھر دہرایا گیا ہے فرمایا کہ اگر یہ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو بھی مانتے ہیں تو ان سے کہو کہ یہ ان کے حق میں کوئی دلیل لائیں۔ شرک کے حامیوں سے دلیل کا یہ مطالبہ اس بنیاد پر ہے کہ جہاں تک خدا کا تعلق ہے وہ تو مابہ النزاع اور اختلافی چیز

نہیں ہے، اس کو تو یہ بھی مانتے ہیں اس وجہ سے وہ ایک مسلم حقیقت ہے۔ رہا یہ دعویٰ کہ اس کے سوا کچھ اور بھی معبود ہیں تو یہ محتاج دلیل ہے اور اس کو ثابت کرنے کی ذمہ داری اس دعوے کے مدعیوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے حق میں اگر ان کے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو پیش کریں۔

ھٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِي: 'ھٰذا' یعنی یہ قرآن اپنے اندر وہ تعلیم بھی رکھتا ہے جو مجھ کو اور میرے ساتھ والوں (یعنی میری امت) کو دی گئی ہے اور اس میں وہ تعلیم بھی ہے جو مجھ سے پہلے انبیاء پر نازل ہوئی۔ سب نے اسی توحید کی تعلیم دی ہے کسی نے بھی شرک کی تعلیم نہیں دی ہے۔ اگر تمہارے پاس اس کے خلاف کوئی شہادت موجود ہے تو اس کو لاؤ۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ: یعنی یہ بات نہیں ہے کہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے جس کی بنا پر یہ توحید کی مخالفت اور شرک کی حمایت میں آستین چڑھائے ہوئے ہیں بلکہ صرف حق سے بے خبری اور جہالت ہے جو اس سارے اعراض و انکار کا سبب ہے۔ یہ آنحضرت صلعم اور آپؐ کے ساتھیوں کو تسلی دی گئی ہے کہ اس ہنگامۂ مخالفت سے تم آزردہ خاطر نہ ہو، جب مخالفت کی بنیاد دلیل و حجت پر نہیں بلکہ تمام تر بے خبری اور جہالت پر ہے تو اس مرض کا کیا علاج!

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔

یہ اوپر والے ٹکڑے 'ذِكْرُ مَنْ قَبْلِي' کی وضاحت ہے اور 'نُوْحِيْ' سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے، یعنی ہم نے تم سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے سب کو یہی وحی کرتے رہے ہیں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو میری ہی عبادت کیجیو۔ یہ امر واضح رہے کہ سابق انبیاء کے جو صحیفے موجود ہیں ان میں اگرچہ بے شمار تحریفیں ہو چکی ہیں لیکن توحید کی تعلیم آج بھی ان میں محفوظ ہے۔ ان کے حاملوں نے اگر شرک اختیار کیا ہے تو اپنے فاسد علمِ کلام کے سہارے پر اختیار کیا ہے نہ کہ ان صحیفوں کی تعلیم کی بنا پر۔ جس طرح قرآن کی نہایت واضح تعلیم توحید کے باوجود اس امت میں شرک کی بہت سی قسمیں گھس آئی ہیں۔ اسی طرح ان امتوں نے اپنے صحیفوں کی تعلیم کے بالکل خلاف شرک کی لعنت اختیار کی اور پھر اس کے حق میں خارج سے دلیلیں فراہم کرنے کی کوشش کی۔ تورات، انجیل، زبور وغیرہ کی تعلیمات کا حوالہ پچھلی سورتوں میں ہم دے چکے ہیں۔ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم بھی موجود ہے وہ بھی سرتاسر توحید ہے۔ الغرض حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم و دعوت کا جو ریکارڈ موجود ہے، وہ قرآن کے اس دعوے کی تصدیق کرتا ہے کہ اللہ کے ہر رسول نے توحید ہی کی تعلیم دی ہے، شرک کی تعلیم کسی نے بھی نہیں دی ہے۔ اس کے خلاف جو دعویٰ کرتا ہے وہ انبیاء کی تاریخ اور ان کی دعوت سے بالکل بے خبر ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (۲۶-۲۷)

خدا کے دربار میں فرشتوں کی حیثیت

یہ مشرکین کے باطل عقیدۂ شفاعت کی تردید ہے کہ وہ خدا کے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنا بیٹھے ہیں۔ اور اس خبط میں مبتلا ہیں کہ اس دنیا میں جو رزق و فضل ان کو ملتا ہے انہی کی عنایت سے ملتا ہے اور اگر آخرت ہوئی تو انہی کی سفارش سے وہاں بھی یہ نہایت اعلیٰ مراتب حاصل کر لیں گے۔ اس عقیدۂ باطل کی تردید یہاں، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس پہلو سے فرمائی گئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قسم کی سفارش کی کوئی گنجائش مان لی جائے تو آخرت کا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہوا اس لیے کہ جب خدا کی عدالت میں رشوت یا سفارش سے حق کو باطل اور باطل کو حق بنایا جا سکتا ہے تو یہ دنیا ایک اندھیر نگری بن کے رہ جاتی ہے۔ پھر یہ کارخانہ مبنی بر حق و عدل کہاں رہا! اور اس کے خالق کو عادل اور حکیم کون مانے گا!

فرمایا کہ ان لوگوں کا یہ خیال بالکل باطل ہے۔ اللہ جل شانہٗ بیٹوں، بیٹیوں اور بیوی بچوں کی نسبت سے پاک و ارفع ہے۔ اس قسم کی نسبتیں اس کی شانِ الوہیت کے بالکل منافی ہیں۔ فرشتے خدا کی بیٹیاں نہیں ہیں، جیسا کہ یہ بے وقوف لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ وہ اس کے باعزت بندے ہیں۔ ان کو خدا کے قرب کا مقام حاصل ہے لیکن یہ قرب ان کو اس لیے حاصل ہے کہ وہ شر سے بالکل پاک اور خدا کی بندگی اور وفاداری میں کامل العیار ہیں نہ اس لیے کہ وہ خدا سے جو چاہیں منوا لیتے ہیں۔

'لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ' یعنی زور و اثر یا ناز و تدلل سے کوئی بات منوا لینا تو درکنار وہ خدا کے آگے بات کرنے میں پہل بھی نہیں کرتے۔ جب ان کو اذن ہوتا ہے تب وہ زبان کھولتے ہیں اور جو بات ان سے پوچھی جاتی ہے حدِ ادب کے اندر اس کا جواب دیتے ہیں، اور ان کی یہ حیثیت بھی نہیں کہ بطور خود کسی کام کے لیے اقدام کر سکیں۔ وہ بس اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں جو خدا کی طرف سے ان کو دیا جاتا ہے۔ تو جن کی حیثیت خدا کے آگے یہ ہے ان سے یہ آس لگا بیٹھنا کہ وہ اپنے زور و اثر سے جس کو چاہیں گے خدا کی پکڑ سے چھڑا لیں گے یا جس درجے اور مرتبے پر اس کو چاہیں گے سرفراز کریں گے محض ایک احمقانہ آرزو ہے۔

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (۲۸)

'یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ' یعنی ان کے آگے پیچھے اور حاضر و مستقبل میں جو کچھ ہے خدا ان ساری باتوں سے خود اچھی طرح واقف ہے اس وجہ سے نہ تو وہ کسی کے باب میں خدا کے علم میں کوئی اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ کسی بات کو کچھ گھٹا یا بڑھا سکتے ہیں۔

'وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی' پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ کسی کے بارے میں سفارش کے لیے خود سبقت نہیں کریں گے بلکہ جن کے لیے خدا پسند فرمائے گا صرف انہی کے لیے سفارش کریں گے۔

'وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ' مزید برآں یہ بات بھی ہے کہ وہ خدا کے خوف سے ہر وقت

لرزاں و ترساں رہنے والے ہیں اس وجہ سے اس کا بھی کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی خلافِ حق بات زبان سے نکالیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان کی سفارش پر جو لوگ تکیہ کیے بیٹھے ہیں وہ ان ساری باتوں کو سوچ لیں، محض ایک وہم کے سہارے پر اپنی عاقبت خراب نہ کریں۔

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ (۲۹)

یعنی تم نے ان کو یہ درجہ دے رکھا ہے کہ گویا خدا ان کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے، وہ اس کو جس طرح چاہیں کھیل سکتے ہیں لیکن اصل حقیقت یہ ہے، اس کو اچھی طرح کان کھول کر سن لو، کہ اگر ان میں سے بھی کوئی کہیں یہ کہہ بیٹھے کہ خدا کے سوا وہ بھی ایک الٰہ ہے تو ہم اس کو جہنم میں جھونک دیں گے۔ یہی جہنم کی سزا ہے جو ہم نے تمام مشرکوں کے لیے ٹھہرا رکھی ہے وہی ہم ان کو بھی دے کے رہیں گے۔ یاد ہوگا کہ بعینہٖ یہی بات اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کو خطاب کر کے حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ مائدہ کے باب میں بھی فرمائی ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۰-۳۳

اوپر کی آیات میں معاد و توحید کی وہ دلیلیں بیان ہوئی ہیں جو عقل و فطرت اور صفاتِ الٰہی کے بدیہیات و مقتضیات پر مبنی ہیں۔ اب یہ نشانیوں کا مطالبہ کرنے والوں کو جن کا ذکر آیت ۵ میں ہے، آفاق کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ وہ کسی نئی نشانی کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں، خدا کی یہ کائنات، اس کی قدرت، رحمت، ربوبیت اور توحید و معاد کی نشانیوں سے بھری پڑی ہے، ان نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے؟ جب وہ ان ساری نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اگر کوئی نئی نشانی دکھا دی گئی تو ان کی آنکھیں کھل جائیں گی! دل میں ہدایت کے اترنے کی اصل راہ عقل ہے، جب انھوں نے عقل پر پٹی باندھ رکھی ہے تو ان کو ہدایت کس طرح نصیب ہو سکتی ہے! اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۳۰-۳۳

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ (۳۰) وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۳۱) وَجَعَلْنَا السَّمَاۗءَ سَقْفًا

مَّحۡفُوۡظًا ۚۖ وَّهُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهَا مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۳۲﴾ وَهُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ الَّيۡلَ
وَالنَّهَارَ وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ‌ ؕ كُلٌّ فِىۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۳۳﴾

ترجمۂ آیات ۳۰-۳۳ کیا ان کفر کرنے والوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں بند ہوتے ہیں، پھر ہم ان کو کھول دیتے ہیں اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا، تو کیا وہ پھر بھی ایمان نہیں لا رہے ہیں! اور ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ ان کو لے کر لڑھک نہ جائے اور ان پہاڑوں کے اندر ہم نے راستہ کے لیے درے بنائے تاکہ وہ راہ پائیں۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا اور وہ اس کی نشانیوں سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے رات اور دن، سورج اور چاند بنائے۔ ان میں سے ہر ایک ایک خاص مدار کے اندر گردش کر رہا ہے۔ ۳۰-۳۳

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَوَلَمۡ يَرَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ كَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا‌ ؕ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ
كُلَّ شَىۡءٍ حَىٍّ‌ ؕ اَفَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ (۳۰)

آفاق کی شہادت توحید، معاد اور جزا پر 'کَانَ' یہاں اسی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا میں ہے۔ 'رَتق' کے معنی بند اور فتق کے معنی کھولنے کے ہیں۔ آسمان اور زمین کے بند ہونے اور ان کے کھولنے سے مقصود یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ دیکھتے ہو کہ آسمان بند ہوتا ہے، اس سے بارش نہیں ہوتی، اسی طرح زمین بند ہوتی ہے اس سے سبزہ نہیں اگتا، پھر دیکھتے ہو کہ آسمان کھلتا ہے اور اس سے دھڑا دھڑ پانی برسنے لگتا ہے اور اس کے بعد خدا زمین کو بھی کھول دیتا ہے اور وہ اپنی نباتات کے خزانے اگلنا شروع کر دیتی ہے۔ کل تک زمین بالکل خشک اور مردہ پڑی ہوئی تھی لیکن بارش کے ہوتے ہی اس کے گوشے گوشے میں زندگی کے آثار نمودار ہو گئے۔

فرمایا کہ جو لوگ توحید و معاد کا انکار کر رہے ہیں اور قائل ہونے کے لیے کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ آخر وہ آفاق کی ان نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے جو ہر روز ان کے مشاہدے میں آ رہی ہیں۔ اللہ نے اپنی اس کائنات

میں یہ نشانیاں اسی لیے تو نمایاں فرمائی تھیں کہ لوگوں کو ان سے صحیح راہ کی طرف رہنمائی حاصل ہو!

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسی ایک مشاہدہ کے اندر ان تمام باتوں کی دلیلیں موجود ہیں جن کی قرآن ان کو دعوت دے رہا تھا۔

اس میں نہایت واضح دلیل توحید کی موجود ہے۔ اگر آسمان میں الگ الٰہ اور زمین میں الگ معبود ہوتے تو آسمان کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین کو زندہ و شاداب رکھنے کے لیے اپنے ذخیرے کا پانی صرف کرتا۔ زمین و آسمان میں یہ ذہین کی سی سازگاری اس بات کی صاف شہادت ہے کہ دونوں کا خالق و مالک ایک ہے اور دونوں پر اسی کا ارادہ کارفرما ہے۔

دوسری شہادت اس کے اندر معاد کی ہے۔ جب زمین خشک و بے آب و گیاہ، یا بالفاظ دیگر مردہ ہو کر از سر نو زندہ و شاداب ہو جاتی ہے تو موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو کیوں مستبعد خیال کیا جائے!

تیسری شہادت اس کے اندر انسان کے مسئول ہونے کی ہے۔ جب خدا نے انسان کی پرورش کے لیے یہ کچھ اہتمام فرمایا ہے کہ اپنے آسمان و زمین، سورج چاند، اور ابر و ہوا ہر چیز کو اس کی خاطر سرگرم کار رکھتا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کو بالکل شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دے، محاسبہ کا کوئی دن اس کے لیے مقرر نہ کرے۔

یہی مضمون سورۂ قٓ میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا	اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی اتارا پس ہم
فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝	نے اس سے اگائے باغ اور فصل کے غلے اور
وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝	دراز قامت کھجور جن پر تہ بہ تہ خوشے نکلتے ہیں۔
رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً	بندوں کی روزی کے لیے۔ اور اسی پانی سے ہم نے
مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝	مردہ زمین کو بھی زندہ کر دیا۔ اسی طرح قبروں سے
(قٓ: ۹ - ۱۱)	نکلنا ہوگا۔

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۳۱)

پہاڑوں جیسی 'رواسی' عربی میں پہاڑوں کی صفت کے لیے آتا ہے اور یہ صفت ایسی مشہور ہو گئی ہے کہ موصوف کے قائم مقام

عظیم نشانیاں کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہے۔ 'اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ' میں 'ان' سے پہلے 'کراهية' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ 'فجاج'، 'فج'، کی جمع ہے۔ 'فج' دو پہاڑوں کے درمیان کے شگاف کو کہتے ہیں۔

فرمایا کہ ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے جو اس کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں کہ مبادا وہ ان کے سمیت کسی سمت کو لڑھک کر کسی اور کرہ سے جا ٹکرائے اور یہ اہتمام بھی کیا کہ ان پہاڑوں کے درمیان درے بنا دیے ہیں کہ وہ لوگوں کے راستہ کا کام دیں کہ وہ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو

آجا سکیں۔ اگر خدا نے ایسا نہ کیا ہوتا تو لوگ اپنے اپنے علاقوں ہی کے اندر بند ہو کے رہ جاتے اور کسی کے امکان میں بھی نہ ہوتا کہ وہ ان دیواروں کو توڑ کر سفر اور تجارت کی راہیں کھول سکے۔

لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ کے اندر یہ مفہوم بھی ہے کہ لوگ ان راستوں سے رہنمائی حاصل کریں اور یہ مفہوم بھی ہے کہ خدا نے اپنی یہ عظیم نشانیاں اس لیے نمایاں فرمائیں کہ ان کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھلیں، ان پر پہاڑوں کے خالق کی قدرت، عظمت اور حکمت کی شانیں واضح ہوں اور وہ خدا تک پہنچنے کی راہ پائیں۔ لیکن یہ انسان کا عجب اندھا پن ہے کہ وہ پہاڑ جیسے عظیم نشان سے تو کوئی رہنمائی حاصل نہیں کرتا البتہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اگر اس کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ اس کو دکھا دیا جائے تو وہ ہدایت کی راہ اختیار کر لے گا۔ آخر جو پہاڑ کو دیکھنے سے قاصر ہے اس کو تل کس طرح نظر آجائے گا! سورۂ قٓ میں ہے۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا	اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ لنگر انداز
رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ	کر دیے اور اس میں نوع بنوع کی خوش منظر چیزیں
بَهِيْجٍ ۔ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ	اگائیں۔ ہر متوجہ ہونے والے بندے کے اندر بصیرت
مُّنِيْبٍ (قٓ: ۷-۸)	اور یاد دہانی پیدا کرنے کے لیے۔

اس آیت کے آخری الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ ان عظیم نشانیوں کے دکھانے سے قدرت کا اصل منشا یہ ہے کہ لوگوں کے اندر بصیرت پیدا ہو، ان کی آنکھیں کھلیں اور وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ لیکن یہ نشانیاں نافع ان کے لیے ہیں جو ان کی طرف متوجہ ہوں۔ جن کے اندر متوجہ ہونے کی صلاحیت نہیں ہے وہ سب کچھ دیکھ کر بھی اندھے کے اندھے ہی رہ جاتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ (۳۲)

آسمان اور اس کی نشانیوں کی طرف اشارہ

زمین کی بعض نمایاں نشانیوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد آسمان کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا کہ آخر یہ نشانیاں طلب کرنے والے آسمان کی اس ناپیدا کنار سقف نیلگوں کو کیوں نہیں دیکھتے جس کی وسعت و پہنائی کی کوئی حد نہیں لیکن اس کے باوجود اس کے اندر کسی معمولی سے معمولی خلل کی بھی کوئی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ چھت کب بنی لیکن اس امتداد زمانہ کے باوجود نہ اس پر کوئی کہنگی طاری ہوئی، نہ اس میں کوئی نقص و خلل پیدا ہوا۔ ہر قسم کے دراڑ اور شگاف سے بالکل محفوظ یہ قائم و دائم ہے۔

یہی مضمون سورۂ قٓ میں یوں بیان ہوا ہے۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ	کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف توجہ نہیں کی؟
كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ	ہم نے اس کو کیسا بنایا اور کس طرح اس کو زینت دی
فُرُوْجٍ ۔ (قٓ: ۶)	اور کہیں اس میں دراڑ اور کوئی شگاف نہیں!

سورۂ ملک میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۔	وہ ذات جس نے پیدا کیے سات آسمان تہ بہ تہ ۔
مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ	تم خدائے رحمان کی اس صنعت گری میں کوئی نقص
فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۔	نہیں پا سکتے۔ پس نگاہ دوڑاؤ، کیا تم کوئی خلل دیکھتے
ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ	ہو؟ پھر دوبارہ نگاہ دوڑاؤ، تمھاری نگاہ ناکام اور
اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ ۔	تھک ہار کر واپس آ جائے گی لیکن وہ کوئی خلل
(ملک : ۳ - ۴)	نہ پا سکے گی!

اس مضمون کی مزید وضاحت مطلوب ہو تو ۹۹ بنی اسرائیل اور ۲۷ - ۳۲ نازعات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ بعض لوگوں نے محفوظ سے یہ مراد لیا ہے کہ آسمان شیطان کی دراندازی سے محفوظ ہے۔ یہ بات بجائے خود صحیح ہے لیکن اس کا ایک خاص محل ہے۔ یہاں یہ چیز زیرِ بحث نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر خدا نے چاہا تو سورۂ ملک کی تفسیر میں ہم بحث کریں گے۔

'وَهُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جہاں تک نشانیوں کا تعلق ہے ان کی تو کوئی کمی نہیں ہے، اس کائنات کی ہر چیز نشانی ہے لیکن یہ نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں تو ایسے اندھوں کا کیا علاج!

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (۳۳)

آسمان کی طرف اشارہ کرنے کے بعد آسمان کی نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ وہی خدا ہے جس نے رات اور دن، سورج اور چاند پیدا کیے۔ ہر چند ان میں باہمدگر نسبت اضداد کی ہے لیکن یہ پورے توافق اور کامل ہم آہنگی کے ساتھ اس کائنات کی خدمت میں سرگرمِ عمل ہیں۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ ایک ہی قوتِ قاہرہ کے ہاتھ میں ان کی باگ ہے جو دنیا کے مجموعی مفاد کے لیے ان کو مسخر کیے ہوئے ہے۔

'كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ'۔ 'کل' سے مراد سورج اور چاند ہیں۔ ہم دوسرے محل میں ذکر کر چکے ہیں کہ لفظ 'کل' جب اس طرح آتا ہے تو یہ معرفہ کے حکم میں ہوتا ہے اور اس سے مراد سابق الذکر چیزیں ہی ہوتی ہیں عام اس سے کہ وہ دو ہیں یا اس سے زائد۔ فرمایا کہ یہ سورج اور چاند اپنے اپنے معین مدار میں حرکت کرتے ہیں، مجال نہیں کہ سرِمو ان سے منحرف ہو سکیں، اگر ذرا بھی ادھر ادھر ہو جائیں تو سارے نظامِ کائنات میں خلل واقع ہو جائے۔ منٹ اور سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ ان کا اپنی ڈیوٹی میں لگے رہنا اور بلا کسی ادنیٰ تخلف و توقف کے ہمیشہ لگے رہنا صاف اس بات کی شہادت ہے کہ حاکمِ کائنات کے محکوم اور اسی کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ اب یہ کیسی خرد باختگی ہے کہ ان نشانیوں کے ہوتے ہوئے، جن کا دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں میں یہ مشاہدہ کر رہے ہیں، کسی اور نشانی کا یہ مطالبہ کرتے ہیں اور اس سے بھی بڑی سفاہت اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے سورج اور چاند کو بھی معبود بنا رکھا ہے درآنحالیکہ وہ رات دن اپنے محکوم و مسخر ہونے کی منادی کر رہے ہیں!

۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۴-۴۷

پیچھے آیت ۵ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ بات یہاں سے چلی تھی کہ مخالفین اس بنیاد پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑا رہے تھے کہ آپ رسول کس طرح ہو سکتے ہیں جب کہ آپ بھی اسی طرح کے ایک بشر ہیں جس طرح کے عام بشر ہوتے ہیں اور مال و جاہ کے اعتبار سے بھی آپ کو کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ پھر وہ یہ کہتے کہ اگر ہم سے اپنی رسالت تسلیم کرانی ہے تو آپ کوئی ایسی نشانی دکھائیں جو یہ ثابت کر دے کہ فی الواقع آپ کی بات سچی ہے۔ اوپر کی آیات میں نشانیوں کے مطالبہ کا جواب دیا۔ اب آگے کی آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ تم ان لوگوں کے استہزا کی پروا نہ کرو۔ اب وقت آ رہا ہے کہ یہ تمھاری ہر بات کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور ان کی یہ ساری اکڑفوں ختم ہو جائے گی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۴-۴۷

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُونَ ﴿٣٤﴾
كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ وَ
إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ﴿٣٥﴾ وَإِذَا رَاٰكَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِن يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا
هُزُوًا ۖ أَهٰذَا الَّذِي يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُم بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ
كٰفِرُونَ ﴿٣٦﴾ خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۚ سَأُورِيكُمْ اٰيٰتِي فَلَا
تَسْتَعْجِلُونِ ﴿٣٧﴾ وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صٰدِقِينَ ﴿٣٨﴾
لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَن وُّجُوهِهِمُ النَّارَ
وَلَا عَن ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٣٩﴾ بَلْ تَأْتِيهِم بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ
فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٤٠﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ
بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ
ع ۳ ۱۲ ۳ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٤١﴾ قُلْ مَن يَكْلَؤُكُم بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ۗ
بَلْ هُمْ عَن ذِكْرِ رَبِّهِم مُّعْرِضُونَ ﴿٤٢﴾ أَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُم

مِّنْ دُوْنِنَا ۭ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾
بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَاۗءِ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۭ اَفَلَا
يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾
قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ښ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاۗءَ اِذَا مَا
يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَىِٕنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ
يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ
الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَـيْـــًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ
خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾

ترجمۂ آیات ۳۴-۴۷

اور ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کو ہمیشہ کی زندگی نہیں بخشی تو کیا اگر تم مرجانے والے ہو تو یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں! ہر جان کو موت کا مزا لازماً چکھنا ہے۔ اور ہم تم لوگوں کو دکھ اور سکھ دونوں سے آزما رہے ہیں پرکھنے کے لیے اور ہماری ہی طرف تمھاری واپسی ہونی ہے۔ ۳۴-۳۵

اور یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا جب تم کو دیکھتے ہیں تو بس تم کو مذاق بنا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں، اچھا یہی ہے جو تمھارے معبودوں کی ہجو کرتا ہے! اور حال یہ ہے کہ یہ خدائے رحمان کے ذکر کے منکر ہیں۔ ۳۶

انسان عجلت کے خمیر سے پیدا ہوا ہے۔ تو میں تم لوگوں کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھاؤں گا، تو تم مجھ سے جلدی نہ مچاؤ! اور یہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا، اگر تم سچے ہو! کاش یہ کفر کرنے والے جان پاتے اس وقت کو جب کہ یہ عذابِ نار کو نہ اپنے چہروں سے دفع کر سکیں گے، نہ اپنی پیٹھوں سے اور نہ ان کی کسی طرف سے کوئی مدد ہو گی۔ بلکہ وہ اچانک ان پر آ دھمکے گی اور

ان کو مبہوت کر دے گی۔ نہ وہ اس کو دفع ہی کر سکیں گے اور نہ ان کو مہلت ہی ملے گی۔ ۳۷-۴۰

اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو جن لوگوں نے ان میں سے مذاق اڑایا ان کو اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے۔ ان سے پوچھو کہ رات اور دن خدائے رحمان کی پکڑ سے کون تمہاری حفاظت کر رہا ہے؟ بلکہ یہ لوگ اپنے رب کی تنبیہ سے روگردانی کر رہے ہیں! کیا ان کے لیے ہمارے سوا کچھ اور معبود ہیں جو ان کو بچا لیں گے! نہ وہ خود اپنی مدد کر سکیں گے اور نہ ہمارے مقابل میں ان کی کوئی حمایت کی جا سکے گی! ۴۱-۴۳

بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو دنیا سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ اسی حال میں ان پر ایک طویل مدت گزر گئی۔ تاہم کیا وہ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ہم سرزمین (مکہ) کی طرف اس کو اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں تو کیا یہ لوگ غالب رہنے والے ہیں! ۴۴

کہہ دو، میں تو تمھیں بس وحی کے ذریعہ سے آگاہ کر رہا ہوں لیکن بہرے، جب وہ خطرے سے آگاہ کیے جاتے ہیں، پکار کو نہیں سنتے۔ اور اگر تمھارے رب کے عذاب کا کوئی جھونکا ان کو پہنچ گیا تو پکار اٹھیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی! بے شک ہم اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے! ۴۵-۴۶

اور قیامت کے دن ہم میزانِ عدل قائم کریں گے تو کسی جان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر کسی کا رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی عمل ہوگا تو ہم اس کو موجود کر دیں گے اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔ ۴۷

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ

اَلْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۳۴ - ۳۵)

رسول کی بشریت پر اعتراض کرنے والوں کو جواب

آیت ۳ میں کفار کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض گزر چکا ہے کہ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (یہ تو بس تمہارے ہی جیسے ایک بشر ہیں) یعنی جس طرح تم کھاتے پیتے ہو اسی طرح یہ بھی کھاتے پیتے ہیں اور جس طرح تم ایک دن مر جاؤ گے اسی طرح یہ بھی ایک دن مر جائیں گے تو اپنے ہی جیسے ایک انسان کو نبی و رسول ماننے کے کیا معنی؟ وہاں اس اعتراض کا جواب ایک دوسرے پہلو سے دیا ہے۔ یہاں اسی اعتراض سے پھر تعرض فرمایا اور اعتراض کرنے والوں کے مافی الذہن پر ایک اور پہلو سے ضرب لگائی۔ فرمایا کہ نبی اور رسول ہونے کے لیے زندۂ جاوید ہونا ضروری نہیں۔ اگر تم کو موت آنی ہے تو تم سے پہلے ہر بشر کو خواہ نبی ہو یا غیر نبی، یہ آئی ہے اور ہر ایک کو آئے گی۔ تم سے پہلے کوئی بھی ایسا نہیں گزرا ہے جو اس چیز سے محفوظ رہا ہو۔ اگر تم ایک دن وفات پاؤ گے تو یہ بھی ہمیشہ زندہ رہنے والے نہیں ہیں۔ یہ بھی لازماً ایک دن اس موت سے دوچار ہوں گے۔ یہ موت تو لازمۂ بشریت ہے۔ اس کا مزا تو ہر ایک کو چکھنا ہے۔ مطلب یہ کہ ان کے اس اعتراض میں اگر کوئی وزن ہو سکتا تھا تو اس صورت میں جب یہ زندگیٔ جاوداں لے کے آئے ہوتے۔ اس وقت تو یہ کہہ سکتے تھے کہ بھلا ہم حیاتِ ابدی کے مالک ایک فانی انسان کو کس طرح رسول مان لیں لیکن جب یہ بھی فانی ہیں تو آخر رسول ان کو کیوں غیر فانی مطلوب ہے!

رسول کے لیے نہ مافوق بشر ہونا ضروری ہے نہ مال دار

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ۔ یہ اسی اعتراض کے ایک دوسرے پہلو کا جواب ہے۔ کفار جس طرح آپ کے بشر ہونے پر معترض تھے اسی طرح وہ یہ بھی کہتے کہ اگر خدا کو کسی بشر ہی کو رسول بنانا ہوتا تو وہ مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو رسول بناتا، ان کو کیوں رسول بناتا جو مال و جاہ سے محروم ایک غریب آدمی ہیں۔ اس طعن کا جواب قرآن نے مختلف پہلوؤں سے جگہ جگہ دیا ہے۔ یہاں بھی اسی کا جواب ایک نئے انداز سے دیا ہے۔ فرمایا کہ رسول کے لیے جس طرح مافوق بشر ہونا ضروری نہیں اسی طرح اس کا صاحبِ مال و جائداد ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اس دنیا میں امارت نہ کسی کے مقربِ الٰہی ہونے کی دلیل ہے، نہ غربت اس کے حقیر ہونے کی دلیل ہے۔ اس دنیا میں غربت و امارت، دکھ اور سکھ، رنج اور راحت صرف امتحان کے لیے ہے۔ ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا اور ان کے کھرے کھوٹے میں امتیاز فرماتا ہے۔ جب وہ کسی کو مال و جاہ دیتا ہے تو اس کے شکر کا امتحان کرتا ہے اور جب فقر و غربت دیتا ہے تو اس کے صبر کا امتحان کرتا ہے۔ پھر سب کی واپسی خدا ہی کی طرف ہوگی اور وہ فیصلہ فرمائے گا کہ کس نے کمایا اور کس نے کھویا؟ مال و دولت پا کر جو لوگ اپنے آپ کو خدا کا منظورِ نظر سمجھ بیٹھتے ہیں یہاں تک کہ نبوت و رسالت کو بھی اپنا اجارہ خیال کرنے لگتے ہیں، وہ بالکل برخود غلط ہیں۔

آیت میں لفظ 'فِتْنَةً' کو زمخشری نے تاکیدِ فعل کے مفہوم میں لیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ مفعول لہ ہے۔ میں نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ اس لفظ کی تحقیق سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہے۔

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۳۶)

مٹی کی مورتوں کے لیے غیرت مند اور خدائے رحمان کے لیے بے غیرت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جس انداز اور جس لب ولہجہ میں وہ مذاق اڑاتے تھے، یہاں اس کا حوالہ ہے۔ فرمایا کہ توحید اور قیامت کے یہ منکرین جہاں کہیں تمھیں دیکھ پاتے ہیں تمھارا مذاق اڑاتے ہیں اور بڑی تحقیر کے انداز میں کہتے ہیں کہ اچھا یہی ہے جو تمھارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے۔ 'ذکر کرتا ہے' یعنی برائی کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ یَذْکُرُ اٰلِھَتَکُمْ کے بعد 'بِالسُّوْٓءِ' کا لفظ برنبائے غیرت وحمیت وہ حذف کر دیتے۔ گویا اپنے بتوں کے لیے برائی کا لفظ اپنی زبان پر لانا انھیں بطور نقل کفر بھی گوارا نہیں۔ 'یَذْکُرُ اٰلِھَتَکُمْ' میں ضمیر خطاب اپنے عوام کو بھڑکانے کے لیے ہے۔ یوں نہیں کہتے تھے کہ ہمارے معبودوں کی ہجو کرتا ہے بلکہ یوں کہتے کہ تمھارے معبودوں کی ہجو کرتا ہے۔ دونوں اسلوبوں کا فرق واضح ہے۔

'وَھُمْ بِذِکْرِ الرَّحْمٰنِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ': فرمایا کہ مٹی اور پتھر کی بنی ہوئی مورتوں کے لیے تو ان کے اندر یہ غیرت وحمیت ہے کہ جہاں کہیں ہمارے رسول کو دیکھ پاتے ہیں جھاڑ کے کانٹوں کی طرح اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں لیکن معبود حقیقی ـــ خدائے رحمان ـــ کے معاملہ میں ان کی حس اس طرح مردہ ہو چکی ہے کہ اس کے لیے غیرت و حمیت تو درکنار اس کے ذکر کے بھی روادار نہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جو لوگ کسی شرک میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے دل ایسے اوندھے ہو جاتے ہیں کہ اپنے شرکاء کے لیے تو ان کی حس اتنی تیز ہوتی ہے کہ ان کی حمیت وحمایت میں وہ ہر ایک سے لڑنے کے لیے آستینیں چڑھائے رہتے ہیں لیکن خدا کے معاملے میں وہ بالکل بے غیرت ہوتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے کوئی نعوذ باللہ خدا کو گالی بھی دے تو بھی ان کے اندر کوئی حرکت نہیں پیدا ہوتی! اس کی ایک خاص نفسیاتی وجہ ہے جس کی طرف قرآن مجید نے بعض جگہ اشارہ کیا ہے۔ کسی موزوں مقام پر اس کی وضاحت آئے گی۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ۝ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۳۷-۳۸)

عذاب کے لیے جلد بازی کا جواب

'انسان' سے مراد یہاں یہی مذاق اڑانے والے ہی لوگ ہیں۔ ایسے ناشائستہ لوگوں کا ذکر عام لفظ سے کر دیا ہے۔ فرمایا کہ پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کو تنگ کرنے کے لیے یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس عذاب کی دھمکی سنا رہے ہو آخر وہ کہاں اٹکا ہوا ہے؟ اگر سچے ہو تو اس کو لا کر دکھا کیوں نہیں دیتے کہ اس نزاع کا فیصلہ ہو جائے۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ یہ تاخیر تو خدا کی عنایت سے ہو رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو لوگ اس فرصت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں وہ فائدہ اٹھا کر توبہ و اصلاح کر لیں لیکن انسان بڑا ہی جلد باز پیدا ہوا ہے۔ یہ لوگ اس فرصت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ان کو خطاب کر کے تہدید کے انداز میں فرمایا کہ اگر عذاب کے طلبگار ہو تو جلدی نہ مچاؤ، میں بہت جلد اپنے عذاب کی نشانیاں تم کو دکھاؤں گا جس سے تم پر واضح ہو جائے گا کہ پیغمبر جس چیز سے تمھیں آگاہ کر رہا ہے وہ دنیا میں بھی تمھارے سامنے آ کے رہے گی اور آخرت میں بھی تم اس سے دوچار ہو گے۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَن وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَن ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۳۹)

یہ باندازِ حسرت فرمایا کہ آج تو یہ اس ڈھٹائی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں، کاش یہ اس وقت کا بھی کچھ اندازہ کر پاتے جب خدا کے عذاب کی آگ ان کو آگے پیچھے ہر طرف سے گھیر لے گی اور ان کی بے کسی کا یہ حال ہو گا کہ نہ یہ اپنے آگے سے اس کو دفع کر سکیں گے، نہ پیچھے سے اور نہ ان کے ان حمایتوں کی طرف سے ان کی کوئی مدد ہو سکے گی جن کی جمعیت پر ان کو ناز ہے اور نہ ان معبودوں ہی سے ان کو کچھ سہارا مل سکے گا جن کے بل پر وہ خدا سے اکڑ رہے ہیں!

بَلْ تَأْتِيهِم بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ (۴۰)

فرمایا کہ وہ جب آئے گی تو وقت بتا کر نہیں آئے گی۔ اس کا صحیح وقت نہ کسی کو معلوم ہے نہ معلوم ہو سکتا ہے اس وجہ سے یہ نہ پوچھو کہ وہ کب آئے گی! وہ، جب اس کا وقت آ جائے گا، اچانک آ دھمکے گی۔ اس وقت نہ اس کا امکان ہو گا کہ وہ اس کو دفع کر سکیں اور نہ ان کو اس کے بعد کوئی مہلت ہی دی جائے گی کہ وہ ذرا دم لے لیں یا توبہ و اصلاح کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۴۱)

آنحضرت صلعم کی تسلی کے لیے تاریخ کا حوالہ

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے تاریخ کا حوالہ ہے کہ تم سے پہلے اللہ کے جو رسول گزرے ہیں ان کے انذار کا بھی اسی طرح مذاق اڑایا گیا جس طرح تمہارے انذار کا مذاق اڑایا جا رہا ہے بالآخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس عذاب کا مذاق اڑایا گیا اس نے ان لوگوں کو آ گھیرا جنھوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ مطلب یہ ہے کہ وہی روزِ بد تمہارے ان مذاق اڑانے والوں کے سامنے بھی آنے والا ہے۔

'سَخِرُوا مِنْهُمْ' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں ان قوموں پر جو فیصلہ کن عذاب آتا ہے اس میں صرف وہی لوگ ہلاک ہوتے ہیں جو اپنی تکذیب پر اڑے رہ جاتے ہیں۔ اس سنتِ الٰہی کی طرف ہم دوسرے مقامات میں اشارہ کر چکے ہیں۔

قُلْ مَن يَكْلَؤُكُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمَٰنِ ۗ بَلْ هُمْ عَن ذِكْرِ رَبِّهِم مُّعْرِضُونَ (۴۲)

عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں سے ایک سوال

فرمایا کہ عذاب کے لیے جو لوگ اتنی جلدی مچائے ہوئے ہیں ان سے پوچھو کہ اس سے بچنے کے لیے انھوں نے کیا بندوبست کر رکھا ہے! آخر رات اور دن خدائے رحمان کی پکڑ سے بچانے کے لیے ان کی کون حفاظت کر رہا ہے؟ خدا کا عذاب رات میں آ جائے یا دن میں، کوئی اس کو روکنے والا نہیں بن سکتا تو اس طنطنہ کے ساتھ جو یہ اس کا مطالبہ کر رہے ہیں اس کے مقابلہ کے لیے ان کے پاس کون سا لشکر ہے!

'بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِم مُّعْرِضُوْنَ' یہ ان کی اس بدبختی پر اظہارِ افسوس ہے کہ ان کے اس سارے طنطنہ کی عمارت ریت پر قائم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ خدا کی پکڑ سے بچنے کے لیے انھوں نے کوئی انتظام کر رکھا ہے، جس کے بل پر اکڑ رہے ہوں بلکہ انجام سے بے پروا ہو کر خدا کی یاد دہانی سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔

أَمْ لَهُمْ آلِهَةٌ تَمْنَعُهُم مِّن دُونِنَا ۚ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ أَنفُسِهِمْ وَلَا هُم مِّنَّا يُصْحَبُونَ (۴۳)

یعنی کیا ان کی سرپرستی اور حفاظت کرنے کے لیے ہمارے سوا ان کے کچھ معبود ہیں جو ہماری پکڑ سے ان کو بچا لیں گے؟ اگر یہ اس طمعِ خام میں مبتلا ہیں تو انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ان کی مدد تو بھلا کیا کریں گے خدا کے مقابل میں وہ خود اپنی بھی مدد نہ کر سکیں گے اور نہ کسی دوسرے ہی کی مدد و رفاقت ان کو حاصل ہو سکے گی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین کے خود تراشیدہ اصنام کی اول تو کوئی حقیقت کچھ ہی نہیں، اگر بالفرض کسی کا کوئی وجود تھا تو اس کی بابت فرمایا کہ وہ خدا سے خود اپنے کو نہ بچا پائیں گے تو دوسروں کو بھلا کیا بچا سکیں گے!

بَلْ مَتَّعْنَا هَٰؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۗ أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ أَفَهُمُ الْغَالِبُونَ (۴۴)

اصل سبب استکبار و اعراض

یہ ان کے اصل سبب استکبار و اعراض سے پردہ اٹھایا ہے کہ ایک طویل مدت تک خدا کی نعمتوں سے بہرہ مند رہنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کے دل سخت سیاہ ہو چکے ہیں۔ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ عزت و اقتدار جو ان کو حاصل ہے ان کے آباء اجداد کا ورثہ ہے، یہ اس کے موروثی حق دار ہیں، اسی میں وہ پیدا ہوئے ہیں، اسی میں عیش کریں گے اور اسی کے وارث ان کے اخلاف ہوں گے۔ اس زعمِ باطل نے پیغمبر کے انذار سے ان کو بالکل بے پروا کر رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر کی ساری تنبیہات محض ہوائی ہیں۔ ان کے اقتدار کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔

ایک طویل مدت تک خدا کی نعمت سے بہرہ مند رہنے کا نتیجہ ناشکروں پر قساوتِ قلب ہی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ سورۂ حدید میں اس کا ذکر یوں آیا ہے۔

وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ	اور ان لوگوں کی طرح بن کر نہ رہ جائیں جن کو اس سے
مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ	پہلے کتاب دی گئی تو ان پر ایک طویل مدت گزر گئی
فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ (۱۶)	اور ان کے دل سخت ہو گئے۔

غلبۂ اسلام کے آثار کی طرف اشارہ

'أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا' 'الارض' سے مراد یہاں سرزمینِ مکہ ہے۔ سورۂ حج میں جہاں مسلمانوں کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ سرزمینِ حرم کو کفار کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے جہاد کریں وہاں فرمایا ہے کہ 'الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۴۱)' (ہم ان لوگوں کی مدد کریں گے جن کا حال یہ ہے کہ اگر ہم نے ان کو سرزمینِ حرم میں متمکن کیا تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے، منکر سے روکیں گے اور عاقبت کار کا

اللہ ہی کے اختیار میں ہے) قرینہ دلیل ہے کہ یہاں 'الارض' سرزمین حرم ہی کے لیے آیا ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ رعد آیت ۴۱ میں بھی بیان ہوا ہے۔ وہاں ہم وضاحت سے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال چکے ہیں۔

آیت زیر بحث میں ان آثار کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جو اس دور میں غلبۂ اسلام کے لیے نمایاں ہو چکے تھے۔ مکہ میں حق و باطل کی جو کشمکش برپا تھی اس میں مکہ کے حد تک تو حق ابھی مظلوم تھا لیکن اطراف کے قبائل اور خاص طور پر مدینہ میں اسلام کی دعوت جڑ پکڑ رہی تھی جس سے بالتدریج یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ کفر کا حیطۂ اقتدار کم ہو رہا ہے اور اسلام مکہ کے اطراف سے مکہ کو زیر نگیں کرنے کے لیے اس کو آہستہ آہستہ اپنے گھیرے میں لے رہا ہے۔ اسلام کے اسی تدریجی غلبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا یہ لوگ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ہم اطراف مکہ سے ان لوگوں کے تسلط کو بالتدریج کم کرتے ہوئے مکہ کی طرف بڑھ رہے ہیں! 'اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ' یعنی یہ قرائن اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اس کشمکش کے نتیجہ میں یہ غالب رہیں گے یا اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام اور اس کے علمبردار غالب رہیں گے! اگر کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو یہ لوگ ان آثار کو کیوں نہیں دیکھتے جو ان کے اپنے اطراف میں نمایاں ہو رہے ہیں!

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ۝ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۴۵-۴۶)

فرمایا کہ جو لوگ تم سے کسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ میں تو تم کو کسی اس طرح کی نشانی کے بجائے صرف وحی کے ذریعہ سے متنبہ کر رہا ہوں تاکہ تم کسی آفت میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر خدا کے غضب سے بچنے کی فکر کرو۔ یہ چیز تمھارے لیے نافع اور شکر کی سزاوار تھی لیکن تم اس کی قدر کرنے کے بجائے اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہو!

'وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ'۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ اگر یہ لوگ اس نعمت کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو یہ ان کی اپنی محرومی ہے۔ یہ عقل و دل کے بہرے ہیں اور جو بہرے ہوتے ہیں وہ جب کسی خطرے سے آگاہ کیے جاتے ہیں تو داعی کی پکار کو نہیں سنا کرتے یہاں تک کہ وہ اس کھڈ میں گر کے رہتے ہیں جس سے انھیں آگاہ کیا جاتا ہے۔

'وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ' الایۃ۔ یعنی آج تو یہ اس ڈھٹائی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں گویا وہ اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے جملہ اسلحہ سے لیس کھڑے ہیں لیکن ان کی یہ ساری شیخت صرف اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک وہ نمودار نہیں ہوتا۔ اگر قہر الٰہی کا کوئی ادنیٰ جھونکا بھی کسی طرف سے آ گیا تو یہ ساری شیخت ہرن ہو جائے گی، پھر یہ سر پیٹیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی! ہم خود اپنی جانوں پر آفت ڈھانے والے بنے کہ ہم نے رسول کی وحی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس سے عذاب کا مطالبہ کیا۔ 'نَفْحَةٌ' کی تنکیر یہاں اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ خدا کا عذاب تو بڑی چیز ہے اگر اس کا کوئی معمولی جھونکا بھی ان کو چھو گیا تو ان کے سارے

کس بل نکال دے گا!

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (۴۷)

قیامت ظہورِ عدل کے لیے ہے

'اَلْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ' میں 'لِ' کو مفسرین نے 'فی' کے معنی میں لیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ غایت و مقصد کے مفہوم میں ہے۔ یعنی مقصدِ قیامت کے ظہور کے لیے ہم عدل کی میزان نصب کریں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قیامت بجائے خود مقصود نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے عدل و انصاف کے ظہور کے لیے لازمی ہے۔

'وَاِنْ كَانَ' میں 'کان' کا اسم بربنائے وضاحت قرینہ محذوف ہے اور 'اَتَيْنَا بِهَا' میں ضمیرِ مؤنث 'حَبَّةٍ' کی مناسبت سے ہے۔

فرمایا کہ مقصدِ قیامت یعنی جزا و سزا کو بروئے کار لانے کے لیے ہم عدل کی میزانیں نصب کریں گے تو اس دن کسی جان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا بلکہ ہر جان ٹھیک ٹھیک کانٹے کی تول اپنے اعمال کا بدلہ پائے گی۔ رائی کے دانہ کے برابر بھی اگر کسی کا کوئی عمل ہوگا تو ہم اس کو بھی اس کے سامنے حاضر کر دیں گے۔

'وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ' ہم حساب کے لیے کافی ہیں۔ یعنی اس کام میں ہمیں کسی کی مدد و معاونت کی ضرورت نہیں ہوگی، ہم تنہا اس کو سرانجام دیں گے۔ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ساری خدائی کا یہ حساب کتاب ہم کس طرح کر سکیں گے تو یہ اس کا مغالطہ ہے اور اگر کوئی اس وہم میں مبتلا ہے کہ خدا کسی کے باب میں اس کے مزعومہ شرکاء و شفعاء سے کچھ معلومات حاصل کرنے کا محتاج ہوگا تو یہ بھی محض ایک واہمہ ہے۔

سورۂ لقمان میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ (۱۶)

اے میرے بیٹے کوئی عمل رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا تو خواہ وہ کسی گھاٹی میں ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں خدا اس کو موجود کر دے گا۔ بے شک خدا بڑا ہی باریک بین اور بڑی ہی خبر رکھنے والا ہے۔

۸- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۴۸-۷۷

اوپر آیت ۲۴ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے فرمایا کہ 'هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ' یعنی یہی تعلیم جو میں تمہیں دے رہا ہوں تمام انبیائے سابقین نے دی۔ اب ایک صوری ترتیب کے ساتھ ان انبیائے عظام کا حوالہ دیا جو امتوں کے بانی ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر صاحب شریعت نبی و رسول حضرت موسیٰ ہوئے ہیں[1]۔

۱؎ یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام جہاں تک شریعت کا تعلق ہے حضرت موسیٰ ہی کی شریعت کے پیرو تھے۔

چنانچہ پہلے ان کا ذکر فرمایا اور انہی کے ضمن میں حضرت ہارونؑ کا بھی ذکر فرمایا جو ان کے وزیر تھے۔ پھر ان سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا جو امتوں کے بانی اور نبوت کے دونوں سلسلوں ــــ بنی اسرائیل و بنی اسماعیل ــــ کے امام تھے اور انہی کے ضمن میں حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت لوطؑ کا حوالہ دیا۔ پھر ان کے اوپر حضرت نوحؑ کا حوالہ دیا جن کو آدم ثانی ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ ان انبیائے عظام کا حوالہ گویا پورے سلسلۂ رشد و ہدایت کا حوالہ ہے اور مقصود ان کے حوالہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کے سامنے اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ جو دعوت ان انبیاء نے دی وہی دعوت اب تم کو دی جا رہی ہے جن خصوصیات کے حامل یہ انبیاء تھے وہی خصوصیات تمہارے پیغمبر کے اندر بھی ہیں اور ساتھ ہی یہ یاددہانی بھی فرما دی گئی کہ جو انجام ان نبیوں کے جھٹلانے والوں کا ہوا وہی انجام لازماً تمہارا بھی ہو گا اگر تم ان کی تکذیب پر اڑے رہ گئے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۸-۷۰ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾
الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَ
هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۚ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ
اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ
قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ
اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ
مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَلْ
رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ
مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا
مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾
قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا
فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ

النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا
يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٢﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا
يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾
ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَالَ
اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾ اُفٍّ
لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوْا
حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٦٨﴾ قُلْنَا يٰنَارُ
كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ
الْاَخْسَرِيْنَ ﴿٧٠﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا
لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا
صٰلِحِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ
فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا
عٰبِدِيْنَ ﴿٧٣﴾ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ
الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰۗىِٕثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿٧٤﴾
وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٧٥﴾ وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى ع ۲۵ ٥
مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٦﴾
وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ
فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٧٧﴾

ترجمۂ آیات ۴۸-۷۷

اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی کسوٹی اور روشنی اور یاد دہانی عطا فرمائی، خدا ترسوں کے لیے۔ ان کے لیے جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ اور وہ قیامت سے لرزاں و ترساں رہنے والے ہیں۔ ۴۸-۴۹

اور یہ بھی ایک بابرکت یاد دہانی ہے جو ہم نے نازل فرمائی ہے تو کیا تم اس کے منکر ہی بنے رہو گے! ۵۰

اور اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی ہدایت عطا فرمائی اور ہم اس سے خوب باخبر تھے۔ جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ کیا مورتیں ہیں جن پر تم دھرنا دیے بیٹھے ہو! انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو انہی کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے۔ اس نے کہا تم بھی اور تمھارے باپ دادا بھی ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا رہے ہو۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ جو کچھ تم ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو سنجیدہ بات پیش کر رہے ہو یا ہنسی مسخری کر رہے ہو! اس نے کہا بلکہ تمھارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور میں اس پر تمھارے سامنے گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔ اور خدا کی قسم! جب تم یہاں سے رخصت ہو کر لوٹ گے تو میں تمھارے ان بتوں کے ساتھ ایک تدبیر کروں گا۔ پس اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا بجز ان کے ایک بڑے کے تاکہ وہ اسی کی طرف رجوع کریں۔ ۵۱-۵۸

وہ بولے کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی! بے شک وہ بڑا ہی ظالم ہے! لوگوں نے بتایا کہ ہم نے ایک جوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا، جس کو ابراہیم کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کو لوگوں کے سامنے حاضر کرو تاکہ وہ بھی گواہ رہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ ابراہیم! کیا یہ حرکت ہمارے معبودوں کے ساتھ تم نے کی ہے! اس نے جواب دیا کہ بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ

حرکت کی ہے تو انہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں۔ تو ان کو ذرا تنبہ ہوا اور آپس میں بولے کہ بلاشبہ تم ہی ناحق پر ہو۔ پھر اوندھے ہو گئے، بولے کہ تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں۔ اس نے کہا کیا خدا کے ماسوا تم ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو تم کو نہ تو کوئی نفع پہنچا سکیں نہ کوئی ضرر! تُف ہے تم پر بھی اور ان چیزوں پر بھی جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو! کیا تم لوگ سمجھتے نہیں! ۶۳-۶۷

انھوں نے کہا کہ اس کو آگ میں جلا دو اور اپنے معبودوں کی حمایت میں اٹھو، اگر کچھ کرنے کا ارادہ ہے! ہم نے حکم دیا کہ اے آگ تو ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بن جا اور انھوں نے اس کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی تو ہم نے انھیں ناکام بنایا۔ ۶۸-۷۰

اور ہم نے اس کو اور لوطؑ کو اس سرزمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی تھیں۔ اور ہم نے اس کو اسحاق اور مزید برآں یعقوب عطا کیے اور ہم نے ہر ایک کو نیک بخت بنایا۔ اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا جو ہماری ہدایت کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، اور ہم نے ان کو بھلائی کے کام، نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کے ادا کرنے کی ہدایت کی۔ اور وہ ہماری ہی بندگی کرنے والے تھے۔ ۷۱-۷۳

اور لوطؑ کو بھی ہم نے قوتِ فیصلہ اور علم کی نعمت عطا فرمائی۔ اور اس کو اس بستی سے نجات دی جس کے باشندے بدکاریوں کے مرتکب تھے۔ وہ لوگ بڑے ہی نابکار و ناہنجار تھے۔ اور ہم نے اس کو خاص اپنی رحمت میں داخل کیا، بے شک وہ نیکوکاروں میں سے تھا۔ ۷۴-۷۵

اور نوحؑ کو بھی ہم نے اپنی ہدایت بخشی۔ یاد کرو جب کہ اس نے دعا کی اس سے پہلے تو ہم نے اس کی دعا قبول کی پس اس کو اور اس کے لوگوں کو عظیم کلفت سے نجات دی اور اس کی مدد میں ان لوگوں سے ہم نے انتقام لیا۔ جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ بے شک وہ نہایت

ہی بڑے لگ تھے تو ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔ ۷۶-۷۷،،

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ (۴۸-۴۹)

'فرقان'، 'ضیاء' اور 'ذکر' کا مفہوم

'فرقان' حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والی کسوٹی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد تورات ہے۔ قرآن سے پہلے کتاب الٰہی کی حیثیت اسی کو حاصل رہی ہے اور کتاب الٰہی ہی وہ چیز ہے جو حق و باطل میں امتیاز کے لیے معیار کا کام دیتی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے قرآن کو بھی فرقان کہا گیا ہے۔ 'ضیاء' کے معنی روشنی کے ہیں۔ کتاب الٰہی کے لیے 'ضیاء'، اور 'نور' وغیرہ کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں اس لیے کہ یہ تمام ذہنی و اخلاقی اور فکری و عملی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت و معرفت کی شاہراہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ 'ذکر' کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔ یہ لفظ بھی جس طرح قرآن کے لیے جا بجا استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں تورات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں کی طرف سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ ان صحیفوں میں چونکہ آفاق، انفس اور تاریخ کے حقائق کی یاد دہانی کی گئی ہے اس وجہ سے ان کو 'ذکر' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

فرمایا کہ ہم نے موسیٰ اور ہارون کو حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اور روشنی و یاد دہانی عطا فرمائی لیکن وہ کتاب نافع صرف ان خدا ترسوں کے لیے ہوئی جو ہر چیز کو آنکھوں سے دیکھ کر ماننے کے بجائے غیب میں رہتے خدا اور آخرت سے ڈرنے والے تھے۔ مطلب یہ کہ اسی طرح یہ کتاب بھی کارگر صرف انہی پر ہوگی جن کی عقل و فطرت کا نور بجھا نہیں ہے بلکہ وہ خدا اور آخرت کا اپنے دلوں کے اندر خوف رکھتے ہیں۔ یہ مضمون سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات کے تحت تفصیل سے زیر بحث آ چکا ہے اس وجہ سے یہاں ہم اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۭ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (۵۰)

یعنی جس طرح موسیٰ کو تورات عطا فرمائی تھی اسی طرح یہ مبارک کتاب بھی ہم نے اتاری ہے۔ اگرچہ یہ باران رحمت کی طرح یکسر خیر و برکت ہے لیکن اس سے فیض صرف انہی کو پہنچے گا جن کے اندر صلاحیت ہے۔ 'اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ' یہ قریش کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا تم اس نعمت کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہو! مطلب یہ کہ اگر اس نعمت کا انکار کر رہے ہو تو سوچ لو کہ کس چیز کا انکار کر رہے ہو!

حضرت موسیٰ کا ذکر پچھلی سورہ میں تفصیل سے گزر چکا ہے اس وجہ سے یہاں صرف سرسری اشارہ کر کے آگے حضرت ابراہیم کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ فرمایا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ (۵۱)

رشد ہدایت میں حضرت ابراہیمؑ کا مرتبۂ خاص

'رُشْد' سے مراد ہدایت و معرفت ہے اور اس کی اضافت نے اس کے اندر ایک خاص امتیاز کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔ یعنی ابراہیم کو ہم نے وہ ہدایت و معرفت عطا فرمائی جو اس کے درجے اور مرتبے کے شایان شان تھی۔ ہدایت و معرفت کے مختلف مدارج ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو بھی اس میں سے کوئی حصہ عطا فرماتا ہے۔ وہ اس کی صلاحیتوں کو جانچ کر اس کے درجہ و مرتبہ کے اعتبار سے عطا فرماتا ہے۔ حضرت ابراہیم کو اس میں سے جو حصہ وافر ملا اس کی وضاحت ہم آیت 'وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ' الآیہ کے تحت کر چکے ہیں۔ ان کے اسی وصف خاص کی طرف یہاں اشارہ فرمایا ہے۔

'وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ' یعنی یہ مرتبۂ بلند جو ہم نے اس کو بخشا تو یوں ہی نہیں بخش دیا بلکہ نہایت کڑے امتحانوں میں ڈال کر اچھی طرح پرکھ لیا کہ وہ اس مرتبہ کا سزاوار ہے۔ اس فقرے میں ان لوگوں پر تعریض بھی ہے جو اپنے اندر ہمت تو حضرت ابراہیم کی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ سنت پر عمل کرنے کی بھی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ان کے ساتھ نسبت کے دعویدار اور اس نسبت کے بل پر اپنے آپ کو دنیا اور آخرت دونوں میں بڑے سے بڑے مرتبہ کا حق دار سمجھے بیٹھے تھے۔ فرمایا کہ خدا کے ہاں اس غلط بخشی کی گنجائش نہیں ہے وہ جس کو اپنی معرفت و حکمت بخشتا ہے اس کے ظرف اور اس کے حوصلہ کو دیکھ کر بخشتا ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (۵۲)

قوم سے اصنام کے بارے میں بحث

اب یہ ان کی بالکل ابتدائی سرگزشت حیات کا ایک واقعہ بیان ہو رہا ہے جس سے ان کی جرأت و حق بھی واضح ہو رہی ہے اور وہ ہدایت و معرفت بھی جو اللہ تعالیٰ نے عین عنفوان شباب میں ان کو بخشی۔ ان کی ولادت اگرچہ ایک بت پرست قوم، ایک مبتلائے شرک خاندان اور ایک مشرک اور بت گر باپ کے گھر میں ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو توحید کا وہ نور عطا فرمایا جس کی روشنی سے دنیا آج تک منور ہے اور قیامت تک منور رہے گی۔ انھوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں کو دعوت دی کہ یہ مورتیں کیا ہیں جن پر تم لوگ دھرنا دیے بیٹھے ہو! اس فقرے میں ان بتوں کے لیے جو استخفاف و تحقیر ہے اور لفظ 'عٰكِفُوْنَ' میں باپ اور قوم کی بلادت اور ان کے جمود پر جو طنز ہے وہ عربی زبان کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔ اس عمر میں اور ایسے ماحول کے اندر یہ نعرۂ حق وہی بلند کر سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ توفیق خاص سے نوازے اور جس کے ایمان کی سطوت و جلالت ہر خوف اور ہر طمع سے بالکل بے پروا و بے نیاز ہو۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۔ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۵۳-۵۴)

باپ دادا کا طریقہ بجائے خود دلیل نہیں ہے

اس قسم کی حماقتوں کے حق میں سب سے بڑی دلیل ہمیشہ ان کے حامیوں کی طرف سے یہی پیش کی گئی ہے کہ ان کا چلن باپ دادا سے چلا آ رہا ہے۔ یہی دلیل حضرت ابراہیم کی قوم کے لوگوں نے پیش کی کہ ان بتوں کی عبادت تو ہمارے باپ دادا نے کی ہے تو ہم ان کو کس طرح چھوڑ بیٹھیں۔ اگرچہ یہ بات بالکل احمقانہ ہے

لیکن عام لوگوں کے لیے یہ بہت ہی مرعوب کن ہوتی ہے۔ باپ دادا کے طریقہ کے لیے دلوں میں ایک حمیت و عصبیت جڑ پکڑ جاتی ہے جس کے سبب سے اس کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنا یا اس کی دعوت دینا بڑے جان جوکھم کا کام بن جاتا ہے۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے جو نور معرفت عطا فرمایا تھا اس کو ان پھونکوں سے نہیں بجھایا جا سکتا تھا۔ انھوں نے جواب میں پوری عزیمت و بے خوفی کے ساتھ فرمایا کہ تم اور تمھارے باپ دادا سب کھلی ہوئی گمراہی میں رہے اور ہو۔ کوئی ضلالت محض اس دلیل سے ہدایت نہیں بن جائے گی کہ وہ باپ دادا کے زمانہ سے چلی آ رہی ہے۔ بلکہ اس کو عقل و فطرت کی کسوٹی پر جانچنا پرکھنا بھی ضروری ہے!

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ۝ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ (۵۵-۵۶)

دعوتِ حق کی راہ میں ایک اور قدم

'حق' سے یہاں سنجیدہ اور سوچی سمجھی ہوئی بات مراد ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ بات ان کی قوم کے لوگوں کے لیے اتنی انوکھی اور عجیب تھی کہ وہ یہ باور نہ کر سکے کہ کوئی شخص سوچ سمجھ کر ایسی بات زبان سے نکال سکتا ہے۔ انھوں نے گمان کیا کہ یہ الھڑ نوجوان، جوانی کی ترنگ میں، بے سوچے سمجھے، بس یونہی ایک بات کہہ گزرا ہے۔ چنانچہ انھوں نے سوال کیا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہو واقعی اپنا عقیدہ بیان کر رہے ہو یا محض مذاق کر رہے ہو! انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کے اس نعرۂ حق کو ایک غیر سنجیدہ اور لاابالیانہ نعرہ قرار دے کر لوگوں کو اس کے اثر سے بچانا چاہا۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ نے ان کے جواب میں دعوتِ حق کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ فرمایا کہ یہ پتھر اور مٹی کے بت تمھارے رب نہیں ہیں بلکہ تمھارا رب آسمانوں اور زمین کا وہ خداوند ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور میں تمھیں اسی کی دعوت دیتا اور تمھارے اندر اسی کی منادی کرتا ہوں۔ شہادت یہاں دعوت اور اعلان کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ (۵۷)

حضرت ابراہیمؑ کا خاص طرز استدلال

حضرت ابراہیمؑ نے لگے ہاتھوں، بقید قسم، لوگوں کو اپنے اس ارادہ سے بھی آگاہ کر دیا کہ جب آپ لوگ یہاں سے ہٹ گئے تو میں ان بتوں کے ساتھ ایک خفیہ کارروائی کرنے کا عزم رکھتا ہوں۔ لفظ 'کید' پر ہم مختلف مقامات میں بحث کر چکے ہیں کہ یہ کسی ایسے اقدام کے لیے بھی آتا ہے جو کسی مخالف کے خلاف اس طرح کیا جائے کہ وہ اس سے باخبر نہ ہو سکے۔

'تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ' کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعوت بت خانہ کے اندر کسی اجتماع کے موقع پر دی ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا کہ جب آپ لوگ یہاں سے گھروں کو سدھاریں گے تو میں آپ کے ان خداؤں کی مرمت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اصل اسکیم کو حضرت ابراہیمؑ نے مخفی رکھا۔ یہ جس صورت میں ظاہر ہوئی اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ لیکن اس تفصیل کو پڑھنے سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے مخصوص طریقۂ بحث و استدلال کے ان پہلوؤں پر ایک نظر ڈال لیجیے جن کی وضاحت سورۂ انعام کی آیات ۷۶-۷۹ کے تحت بعنوان 'حضرت ابراہیمؑ

کے طرزِ استدلال کی بعض خصوصیات، ہم کر آئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بحث و استدلال میں لطیف و پاکیزہ طنز سے جس طرح کام لیتے ہیں اسی طرح استدراج بھی حجتِ ابراہیمی کی ایک نہایت نمایاں خصوصیت ہے۔ استدراج کا مطلب یہ ہے کہ وہ بحث میں اپنے حریف کو وہاں سے داؤں پر لاتے ہیں جہاں سے ان کو سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ بالآخر وہ چاروں شانے چت گرتا ہے اور اسے خود اپنی زبان سے اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ یہی طریقۂ استدراج حضرت ابراہیمؑ نے اپنے حریفوں کو قائل کرنے کے لیے اس موقع پر استعمال فرمایا۔ انھوں نے شب میں کوئی موقع نکال کر تمام چھوٹے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا صرف بڑے بت کو چھوڑ دیا اور ذہن میں یہ رکھا کہ اگر نوبت مجھ سے بازپرس کی آئی تو میں کہہ دوں گا کہ یہ حرکت تو ان بڑے صاحب کی معلوم ہوتی ہے اور مجھ سے پوچھنے کے بجائے خود ان مظلوموں ہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے، اگر وہ بولتے ہیں تو اپنی داستانِ غم خود ہی سنا دیں گے کہ یہ مصیبت ان پر کس کی لائی ہوئی ہے! ظاہر ہے کہ اس کے بعد وہ لازماً یہی کہیں گے کہ یہ تو بولتے نہیں تو ان سے کس طرح پوچھا جائے تو میں ان سے کہوں گا کہ نادانو! جو خود اپنے اوپر آئی ہوئی مصیبت کو نہ دفع کر سکتے ہیں نہ یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ مصیبت کس کے ہاتھوں ان پر آئی آخر وہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم ان کو معبود بنا کر ان کو ڈنڈوت کرتے ہو! یہی وہ ذہنی اسکیم ہے جس کو حضرت ابراہیمؑ نے کید سے تعبیر فرمایا۔ اس میں طنز، تضحیک اور استدراج کے جو پہلو ہیں وہ واضح ہیں اور حریفوں کو جس طرح بے بس ہو کر اس حجتِ ابراہیمی کے آگے گھٹنے ٹیک دینے پڑے اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ (۵۸)

بت شکنی کی سکیم پر عمل

'جُذٰذ' پاش پاش اور ٹکڑے ٹکڑے ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ یہ اس خفی تدبیر کا بیان ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ارادے کو بروئے کار لانے کے لیے اختیار فرمائی۔ انھوں نے موقع نکال کر بڑے بت کو چھوڑ کر باقی سب بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ بڑے بت کو اس خیال سے چھوڑ دیا کہ جب اس معاملہ کی تفتیش ہو تو وہ ان احمق لوگوں سے یہ کہہ سکیں کہ یہ تو اس بڑے کی کارستانی معلوم ہوتی ہے تو اس کی طرف رجوع کریں کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اور اگر یہ کہیں کہ یہ تو بولتے نہیں تو پھر ان پر اتمامِ حجت کا موقع ہاتھ آئے کہ جب یہ بڑے چھوٹے سب ہی گونگے ہیں تو آخر ان گونگوں بہروں کو معبود بنانے کے کیا معنی؟

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۹)

یہ دو الگ الگ مستقل جملے ہیں۔ پہلے جملہ سے ان کی حیرت و پریشانی کا اظہار ہو رہا ہے، دوسرے سے ان کے غصہ و غضب کا۔ یعنی جب انھوں نے اپنے معبودوں کا یہ حشر دیکھا تو پہلے تو ان کے اندر یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر وہ کون ہو سکتا ہے جس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ جسارت کی؟ پھر اپنے غصہ و غضب کا اظہار کیا کہ جس نے بھی یہ حرکت کی وہ بڑا ہی ظالم ہے!

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ (۶۰)

بالآخر جو لوگ حضرت ابراہیمؑ کے رجحانات اور ان کی مذکورہ بالا دعوت اور ان کے چیلنج سے آگاہ تھے انھوں نے بتایا کہ یہ اسی نوجوان کی حرکت ہو سکتی ہے جس کو ابراہیم کہتے ہیں، ہم نے اس کو ان بتوں کا ذکر تحقیر کے ساتھ کرتے سنا ہے۔ 'تحقیر' کے الفاظ انھوں نے بھی اسی طرح حذف کر دیے جس طرح آیت ۳۶ میں یہ حذف ہیں۔ اس حذف کی بلاغت ہم وہاں واضح کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے معبودوں کی شان میں گویا نقل کفر کو بھی گوارا نہیں کیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کے ساتھ جو معاملہ کرنے کی دھمکی دی تھی وہ بقید قسم ڈنکے کی چوٹ دی تھی۔ وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ان کی دعوت توحید بھی بالکل برملا اور آشکارا تھی۔ بہت سے لوگ ان کی ان باتوں سے واقف تھے لیکن اس وقت تک حضرت ابراہیمؑ کی ان باتوں کو جو لوگ سنتے تھے وہ ان کو، جیسا کہ اوپر گزر رہا ہے، ان کی نوجوانی کی ترنگ اور جسارت پر محمول کر کے ٹال جاتے تھے۔ ان کو یہ گمان نہیں تھا کہ فی الواقع حضرت ابراہیمؑ کوئی اس طرح کا اقدام کر گزریں گے جیسا کہ اب ان کے سامنے آیا، اس وجہ سے انھوں نے ان کے اوپر نہ کوئی قدغن عاید کرنے کی ضرورت سمجھی اور نہ بتوں کی حفاظت کے لیے کوئی اہتمام کیا۔ ان کا خیال یہ رہا ہوگا کہ کوئی ہمارے ان معبودوں سے کتنا ہی برگشتہ ہو لیکن ان کے خلاف کوئی خطرناک اقدام کرنے کی جسارت بھلا کیا کر سکے گا! لیکن جب یہ حادثہ پیش آیا تو جو لوگ حضرت ابراہیمؑ سے واقف تھے انھوں نے بتایا کہ ہو نہ ہو یہ کارروائی اسی نوجوان کی ہے جس کو ابراہیم کہتے ہیں۔ اس کو ہم نے ان معبودوں کی ہجو کرتے سنا ہے۔

'یُقَالُ لَهٗۤ اِبۡرٰهِیۡمُ' سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت بہت سے کانوں میں پڑ چکی تھی لیکن ابھی وہ قوم میں اتنے روشناس نہیں ہوئے تھے کہ لوگ شخصاً ان سے واقف ہوں تاہم ان کا نام مختلف حلقوں میں پہنچ چکا تھا اور وہ دین آبائی کے ایک باغی نوجوان کی حیثیت سے معروف ہو رہے تھے۔ اسی بنا پر ان گواہی دینے والوں نے ایک حقارت آمیز انداز میں یوں کہا کہ وہی سرپھرا نوجوان جس کو ابراہیمؑ ابراہیمؑ پکارتے ہیں، ہمارے ان معبودوں کی ہجو کرتا رہا ہے، ہو نہ ہو، یہ اسی کی کارستانی ہے!

قَالُوۡا فَاۡتُوۡا بِهٖ عَلٰۤی اَعۡیُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمۡ یَشۡهَدُوۡنَ (۶۱)

حضرت ابراہیمؑ پر مقدمہ

حضرت ابراہیمؑ پر الزام قائم ہو جانے کے بعد قوم کے سربراہوں نے حکم دیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو عام لوگوں کے سامنے لا کر پبلک کی موجودگی میں ان سے پوچھ گچھ کی جائے کہ سارا معاملہ لوگوں کے سامنے آئے اور لوگ اس کے گواہ رہیں۔ یہ اہتمام اس لیے ضروری خیال کیا گیا ہوگا کہ یہ جرم ان کے نزدیک ایک سنگین جرم تھا جس کی سزا بھی ان کی شریعت میں بہت سخت تھی اس وجہ سے انھوں نے چاہا کہ اس کی تحقیقات پبلک کے سامنے ہو تاکہ لوگوں کو جرم کی شناعت کا اندازہ بھی ہو اور مجرم کو جو سزا دی جائے وہ عام عبرت کی موجب بھی ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس زمانے میں اس طرح کے مذہبی معاملات میں حکم لگانے اور فتویٰ دینے کے مجاز مذہبی پیشوا ہوتے تھے۔ حکومت وقت (اگر کوئی ہوتی تھی) انہی کے فتوے کی تنفیذ کر دیتی تھی۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ ھٰذَا بِاٰلِھَتِنَا یٰٓاِبْرٰھِیْمُ ۝ قَالَ بَلْ فَعَلَہٗ ۖ کَبِیْرُھُمْ ھٰذَا فَسْـَٔلُوْھُمْ اِنْ کَانُوْا یَنْطِقُوْنَ (۶۲-۶۳)

حضرت ابراہیمؑ کا جواب — بالآخر مذکورہ بالا حکم کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام عام لوگوں کے سامنے، پیشوایانِ دین کی عدالت میں پیش کیے گئے اور ان سے سوال ہوا کہ ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ جرم تم نے کیا ہے؟ حضرت ابراہیم نے نہایت تیکھے طنز اور استہزا کے انداز میں جواب دیا کہ یہ کارستانی تو ان کے اس بڑے کی معلوم ہوتی ہے اور اس بارے میں مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، آخر آپ لوگ انہی سے کیوں نہیں پوچھتے، اگر یہ بولتے ہیں تو خود ہی اپنی کہانی آپ کو سنا دیں گے!

یہ جواب دے کر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے ان بزرگوں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں اعترافِ شکست کے سوا کوئی اور راہ ان کے لیے باقی ہی نہیں رہ گئی۔ ان کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا ھٰٓؤُلَآءِ یَنْطِقُوْنَ (یہ تو تمھیں اچھی طرح علم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں) ان کے اس اعتراف کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ اُفٍّ لَّکُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی اگر یہ اس لائق بھی نہیں ہیں کہ خود اپنی بپتا تم کو سنا سکیں تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ ان کی عبادت کرتے ہو! تم پر اور تمھارے ان معبودوں پر لعنت ہے۔ آخر تم لوگ عقل سے کیوں کام نہیں لیتے!

حضرت ابراہیمؑ پر خوف یا جھوٹ کی تہمت عربی سے بے خبری پر مبنی ہے — جن لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کے جواب، بَلْ فَعَلَہٗ کَبِیْرُھُمْ کو کذب یا خوف پر محمول کیا ہے وہ عربی سے بے خبری کے باعث اس ارشاد کی بلاغت کو نہ سمجھ سکے۔ خوف کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ جب وہ اس طرح بے دھڑک قوم کے بت خانے کے اندر توحید کی اذان دیتے ہیں، بتوں کے خلاف ایک عملی اقدام کا اعلان کرتے ہیں اور پھر عین عدالت کے منہ پر ساری قوم کے سامنے اُفٍّ لَّکُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ کے الفاظ سے بتوں پر بھی اور ان کے پوجنے والوں پر بھی لعنت کرتے ہیں تو ایسے مردِ حق کے بارے میں یہ گمان بالکل ہی خلافِ عقل ہے کہ وہ کسی خطرے سے مرعوب ہو کر سخن سازی کرے گا۔

رہا اس کے جھوٹ ہونے کا معاملہ تو قطع نظر اس سے کہ حضرت ابراہیمؑ جھوٹ بول سکتے ہیں یا نہیں کہی ہوئی بات میں کوئی پہلو ایسا نہیں ہے کہ اس کو جھوٹ پر محمول کیا جا سکے۔ اس کو کہہ سکتے ہیں تو ایک لطیف طنز، ایک پرمعنی استہزاء اور ایک حکیمانہ استدراج کہہ سکتے ہیں، جھوٹ کا تو اس میں کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجیے حضرت ابراہیمؑ کے مخالفوں نے بھی ان پر جھوٹ کا الزام نہیں لگایا حالانکہ اگر وہ ان کے جواب کو جھوٹ سمجھتے تو وہ بڑی آسانی سے ان کو جھوٹا قرار دے سکتے تھے۔ پھر جب ان کے دشمنوں نے ان کو جھوٹا قرار دینے کی جرأت نہیں کی تو نعوذ باللہ ہم ان کو جھوٹا کیوں قرار دیں!

بعض لوگوں کو ایک حدیث کی بنا پر مغالطہ ہوا تھا جس میں یہ آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین جھوٹ بولے جن میں سے ایک ان کا یہ قول بَلْ فَعَلَہٗ کَبِیْرُھُمْ ھٰذَا بھی ہے۔ ہمارے نزدیک اس حدیث کے سمجھنے

ہیں لوگوں سے غلطی ہوتی ہے۔ عربی میں لفظ 'کذب' کئی معنوں میں آتا ہے۔ اگر کہیں 'کَذَبَ فُلاَنٌ' تو اس کے معنی جس طرح یہ ہو سکتے ہیں کہ اس نے جھوٹ بولا اسی طرح یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس نے غلطی کی اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس نے توریہ کیا۔ اس کے صحیح مفہوم کا تعین اس کے سیاق و سباق سے ہوتا ہے۔ توریہ کا مفہوم اپنے مخالف کے سامنے اپنی بات کو اس طرح پیش کرنا ہے کہ مخاطب اس سے مغالطہ میں پڑ جائے۔ اوپر ہم نے 'استدراج' کا جو ذکر کیا ہے وہ بھی اسی میں شامل ہے۔ اس توریہ کی نہایت لطیف و پاکیزہ مثالیں قرآن میں بھی موجود ہیں اور سلف صالحین کے اقوال میں بھی۔ سورۂ یوسف کی تفسیر میں بعض عمدہ مثالیں گزر چکی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا ایک لطیف پاکیزہ توریہ اِنِّیْ سَقِیْمٌ بھی ہے۔ اس کی بلاغت انشاء اللہ سورۂ صافات کی تفسیر میں ہم واضح کریں گے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ بعض حالات میں یہ دشمن کے مقابل میں راستبازوں کا ایک کارگر حربہ ہے۔ حدیث میں حضرت ابراہیمؑ کے لیے کذب کے اس مفہوم کے ثبوت میں کلام عرب کے شواہد پیش کر سکتا ہوں لیکن بحث بالکل دوسرے گوشے میں نکل جائے گی اس وجہ سے اس کو کسی مناسب موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

ابطالِ شرک کی ایک واضح دلیل

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ سیدنا حضرت ابراہیمؑ کا قول بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا بجائے خود ابطالِ شرک کی ایک نہایت واضح دلیل ہے جو قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ اگر اس کائنات میں مختلف چھوٹے بڑے خداؤں کی خدائی مان لی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدائے اعظم اپنی خدائی میں دوسروں کی شرکت تسلیم کرنے پر راضی ہو اور اگر بالفرض کسی وقتی مصلحت سے وہ راضی بھی ہو جائے تو یہ امر بعید نہیں ہے کہ کسی دن وہ برہم ہو کر سب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ اسی حقیقت کو سیدنا ابراہیمؑ نے اپنے اس فعل سے متمثل کر کے دکھا دیا اور ان کے حریف اس حقیقت کو، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہوگا، پا بھی گئے اگرچہ وہ اس پر قائم نہ رہ سکے۔ بہرحال ہمارے نزدیک یہ ایک نہایت اعلیٰ حکیمانہ استدراج و استدلال اور شرک و اہلِ شرک کی تفضیح و تضحیک ہے۔ اس کو جھوٹ پر محمول کرنے کی کوئی ادنیٰ وجہ بھی نہیں ہے۔

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۶۴)

ایک تدریجی دوسرا اثر

یعنی حضرت ابراہیمؑ کی اس ٹھوکر نے ذرا ان کو متنبہ کیا اور وہ اپنے باطن کی آواز اور اپنے عقل و دل کی رہنمائی کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ تم لوگ تو اس نوجوان کو ظالم کہتے ہو لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ ظالم وہ نہیں بلکہ ظالم تم خود ہو کہ ایسی چیزوں کو معبود بنائے بیٹھے ہو جو یہ صلاحیت بھی نہیں رکھتی ہیں کہ خود اپنے سر پر آئی ہوئی مصیبت کو دفع کر سکیں یا اس کو کسی دوسرے سے بیان ہی کر سکیں۔

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ (۶۵)

'نکس' کے معنی کسی چیز کو اس طرح الٹ دینے کے ہیں کہ اس کے پاؤں اوپر ہو جائیں اور اس کا سر نیچے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس تنبیہ سے ذرا دیر کے لیے انھوں نے آنکھیں کھولیں تو سہی لیکن پھر اوندھے ہو

گئے اور بولے کہ یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں تو ہم ان سے کس طرح پوچھیں! ــــ جو لوگ اس قسم کی جہالتوں میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے دلوں پر بھی کبھی کسی واقعہ یا تنبیہ سے ایسی روشنی پڑتی ہے کہ انھیں سیدھی راہ صاف دکھائی دینے لگتی ہے لیکن عصبیتِ جاہلیت آسانی سے جان چھوڑنے والی چیز نہیں ہے اس وجہ سے وہ پھر اندھے بہرے بن جاتے ہیں اور ایک قدم صحیح اٹھا کر پھر وہی الٹی چال اختیار کر لیتے ہیں جو چل رہے ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کا بھرپور وار

قَالَ اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنۡفَعُكُمۡ شَیۡـًٔا وَّلَا یَضُرُّكُمۡ (۶۶)

حضرت ابراہیمؑ اپنے حریفوں کو جس مقام پر لانا چاہتے تھے ان کو انھوں نے وہاں لا کھڑا کیا۔ وہ پکار اٹھے کہ یہ تو بولتے نہیں تو ان سے کس طرح ان کا حال پوچھا جائے! ان کے اس اعتراف کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے ان پر بھرپور وار کیا۔ فرمایا کہ پھر تم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہو جو نہ تم کو کوئی نفع پہنچا سکیں نہ کوئی نقصان! یہ تقریر ظاہر ہے کہ بتوں کی بے بسی کو اس طرح آشکارا کر دینے کے بعد جتنی مؤثر ہو سکتی تھی اس کے بغیر اتنی مؤثر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے بغیر اگر یہی بات ان کے سامنے لائی جاتی تو وہ اس کے جواب میں سو باتیں بنا سکتے تھے لیکن اب جب کہ وہ پاش پاش ہو کر سامنے پڑے ہوئے اپنی زبانِ حال سے اپنی بے حقیقتی اور بے بسی کی کہانی خود ہی سنا رہے تھے تو ان کے پجاری ان کی حمایت میں کیا چیز پیش کر سکتے تھے۔

اُفٍّ لَّكُمۡ وَلِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (۶۷)

'اُفٍّ لَّكُمۡ' نہایت شدید نفرت و کراہت کا کلمہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اس طرح ان پر حجت تمام کر دی، پھر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلیں تو انھوں نے نہایت کراہت و بیزاری کے ساتھ فرمایا کہ تم پر اور تمھارے ان معبودوں پر جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، تُف ہے! 'اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ' یعنی کیا تم بالکل لایعقل بیل ہی ہو! بھلا ان پتھروں کی مورتوں کو پوجنے سے کیا حاصل! جن کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ وہ خود اپنی حفاظت نہیں کر سکیں تو آخر وہ تمھاری حفاظت کس طرح کریں گی!

مذہبی عدالت سے حضرت ابراہیمؑ کے لیے حکم سزا

قَالُوۡا حَرِّقُوۡهُ وَانۡصُرُوۡۤا اٰلِهَتَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ (۶۸)

جب پجاریوں اور مندر کے پروہتوں نے دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کا سارا کاروبارِ پیشوائی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ نہ ان کا کوئی بھرم رہ گیا ہے، نہ ان کے معبودوں کا تو اپنے عوام کو اکسایا کہ یہ وقت اپنے معبودوں کی حمایت میں اٹھنے کا ہے۔ اگر اس وقت اس نوجوان کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہ کی گئی تو آباؤ اجداد کا دین تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے اس اپیل کا عوام پر اثر ہوا اور حضرت ابراہیمؑ کے خلاف اقدام سے متعلق کچھ تجویزیں بھی سامنے آئیں لیکن ان تجویزوں سے پروہتوں کو اطمینان نہیں ہوا۔ انھوں نے ابھارا کہ اگر اس شخص کے خلاف سچ مچ کوئی مؤثر کارروائی کرنی ہے تو یہ کرو کہ اس کو جلا دو۔ پروہتوں نے چاہا

کہ یہ سزا دے کر اپنے زعم کے مطابق اس فتنہ کا کلی سدباب کر دیں۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (۶۹)

آگ حضرت ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بن گئی

اس فیصلہ کے بموجب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو آگ میں جلانے کی کوشش کی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو حضرت ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بنا دیا۔ اس کی کیا شکل ہوئی؟ قرآن میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے لیکن اس بات میں کوئی استبعاد نہیں ہے۔ اشیاء کے خواص و اثرات تمام تر اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ جس زہر کو جس کے لیے چاہے تریاق بنا دے اور جس تریاق کو جس کے لیے چاہے زہر بنا دے۔ اس قسم کے عجائبِ تصرفاتِ قدرت ہم آج بھی مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر خدا نے اپنے ایک پیغمبر کی حفاظت کے لیے آگ کو گلزار بنا دیا تو یہ کیا عجیب بات ہوئی!

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ (۷۰)

پروہتوں کی سازش کی ناکامی اور حضرت ابراہیم کی ہجرت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کے لیے پروہتوں نے ایک سازش کی جس کی طرف سورۂ صافات کی آیت ۹۸ میں اشارہ ہے۔ انشاء اللہ ہم وہاں اس کی وضاحت کریں گے۔ پروہتوں کی یہ سازش ناکام ہوئی اور اس کے بعد حضرت ابراہیم نے اس علاقہ سے ہجرت فرمائی۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ (۷۱)

'اَلْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ' سے زرخیز و شاداب علاقہ مراد ہے۔ یہ اشارہ ارضِ کنعان کی طرف ہے۔ یعنی جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حضرت ابراہیم کے لیے اپنے وطن میں ٹکنا ناممکن ہو گیا تو فرمایا کہ ہم نے اس کو اور لوط کو ان کی قوموں کے شر سے نجات دی اور کنعان کے علاقے میں ان کو ٹھکانا دیا۔ حضرت لوط حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے۔ اگرچہ ان دونوں حضرات کا دائرۂ دعوت الگ الگ تھا لیکن اس ہجرت میں حضرت لوط بھی ان کے ساتھ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ہجرت تک دونوں نے اپنی قوم ہی کو دعوت دی لیکن ہجرت کے بعد مختلف علاقوں کو اپنا مرکز بنایا۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہجرت کے بعد حضرت ابراہیم کی قوم سے کیا معاملہ ہوا۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ (۷۲-۷۳)

حضرت ابراہیم پر اللہ کا انعام

یہ اللہ تعالیٰ نے وہ انعام بیان فرمایا ہے جو ہجرت کے بعد اس نے حضرت ابراہیم پر یکے بعد دیگرے کیا۔ حضرت ابراہیم نے اللہ کی خاطر اپنی قوم اور عزیزوں کو چھوڑا تھا تو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے بیٹے پوتے عطا فرمائے۔ انھوں نے جن کو چھوڑا تھا وہ نابکار و نابنجار تھے اور اللہ نے ان کی جگہ ان کو جو دیے وہ سب ایک سے ایک بڑھ کر صالحین و اخیار میں سے تھے۔ 'نَافِلَةً' سے اس حقیقت کا اظہار

مقصود ہے کہ حضرت ابراہیم کو حضرت اسماعیلؑ تو ان کی دعا کے صلہ میں ملے مزید برآں اللہ تعالیٰ نے ان کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ بھی عطا فرمائے اور اس کے بعد نبوت کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔[1] 'وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ امتوں کے بانی اور قوموں کے امام ہوئے۔ اگرچہ ہر نبی اپنے منصب کے لحاظ سے امام ہوتا ہے لیکن بعض انبیاء ایسے بھی گزرے ہیں جن کے سایہ کے سوا ان کا کسی نے ساتھ نہیں دیا مگر حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام کو بالفعل اللہ تعالیٰ نے منصب امامت پر سرفراز فرمایا اور انھوں نے ایک عظیم امت کی قیادت فرمائی۔ 'وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ'۔ 'وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ' دراصل 'اِقَامَةَ الصَّلٰوةِ' ہے 'اِقَامَةَ' کی 'ۃ' آہنگ وصوت کے تقاضے سے گر گئی ہے۔ اس قسم کی تخفیف بتقاضائے حسن صوت عربی میں معروف ہے۔ ان انبیاء کی دعوت کے ان اجزاء کے گنانے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ ان کی دعوت وہی رہی ہے جو قرآن دے رہا ہے اور یہ تمام انبیاء صرف خدا ہی کے عبادت گزار تھے، خدائے واحد کے سوا انھوں نے کسی اور کے آگے سر نہیں جھکایا۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان نبیوں کے نام لیوا اور ان کے ساتھ نسبت کے مدعی ہیں وہ اس آئینہ میں اپنے منہ دیکھیں اور اپنے قول و عمل کا جائزہ لیں۔ وہ کیا تھے اور یہ کیا بن کے رہ گئے۔

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۙ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۷۴-۷۵)

حضرت لوطؑ پر حکم اور علم کا انعام

اوپر حضرت لوطؑ کا ذکر حضرت ابراہیم کے تعلق سے آیا تھا۔ اب یہ ان کا مستقل ذکر فرمایا کہ ان کو بھی ہم نے حکم اور علم عطا کیا۔ 'حکم' سے مراد فیصلہ کی قوت وصلاحیت ہے اور علم سے مراد علم نبوت ہے۔ پہلی چیز عقل و فطرت کی پاکیزگی کا ثمرہ ہے، دوسری چیز وحی الٰہی کی برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو منصب نبوت کے لیے انتخاب فرمایا وہ نخلِ فطرت کے بہترین ثمر تھے۔ انھوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ یہاں تک کہ ان کا باطن نورِ حکمت سے منور ہو کر نورِ وحی کے اخذ و اکتساب کے قابل ہو گیا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو نورِ وحی سے فیضیاب فرمایا تو وہ 'نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ' ہو گئے۔

حضرت لوطؑ کی ہجرت

'وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ' ان کی نجات کی جو شکل ہوئی اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ انھوں نے بھی سرزمین شام کی طرف ہجرت فرمائی۔ ان کی بستی کے لوگوں پر چونکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا اس وجہ سے ان کے وہاں سے نکلنے کو نجات سے تعبیر فرمایا۔ 'كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ'

---

[1] سورۂ صافات کی آیات ۱۰۰-۱۱۳ کے تحت انشاء اللہ یہ بحث آئے گی کہ حضرت ابراہیم کو حضرت اسماعیلؑ دعا کے صلہ میں ملے ہیں اور حضرت اسحاقؑ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے صلہ میں۔ اس تاریخی حقیقت کو یہود نے جس طرح مسخ کیا ہے اس کی تفصیل استاذ امامؒ کے رسالہ ذبیح میں دیکھیے۔

سے اغلامِ اِن کی امرد پرستی کی خباثت کی طرف اشارہ ہے جس کو بعض جگہ 'فاحشۃ' سے تعبیر فرمایا ہے لیکن لفظ جمع اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس نوع کی کوئی برائی کبھی تنہا نہیں ہوتی بلکہ یہ جب کسی قوم میں پیدا ہوتی ہے تو اس کے سایہ میں فواحش و خبائث کا ایک پورا کنبہ آباد ہو جاتا ہے۔ یہاں ان برائیوں کی کوئی تفصیل نہیں فرمائی اس لیے کہ اس قسم کی گھناؤنی برائیاں قابلِ ذکر نہیں ہوا کرتیں۔

قومِ لوط کا انجام

'اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِیْنَ' یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو ان لوگوں کے اندر سے نکالا اور ان پر اپنا عذاب نازل کیا۔ فرمایا کہ یہ نابکار اور نافرمان لوگ تھے اور لوطؑ صالح اور خوب کار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے صالح بندے کو ان ناہنجاروں کے اندر سے نکال لیا اور ان نابکاروں کو دفن کر دیا۔ 'وَاَدْخَلْنٰہُ فِیْ رَحْمَتِنَا' میں 'رحمت' سے مراد وہ نجات و فلاح بھی ہے جو اس دنیا میں ان کو حاصل ہوئی اور وہ کامیابی و کامرانی بھی جو آخرت میں ان کو حاصل ہوگی۔

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ فَنَجَّیْنٰہُ وَاَھْلَہٗ مِنَ الْکَرْبِ الْعَظِیْمِ (۷۶)

حضرت نوحؑ کا حوالہ

'نُوْحًا' کا نصب اس مفہوم سے پیدا ہوا ہے جو یہاں سلسلۂ کلام سے مستفاد ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے اپنے مذکورہ بالا بندوں پر اپنی رحمت نازل کی، ان کو نجات دی اور ان کی مدد فرمائی اسی طرح اس سے پہلے اپنے بندے نوحؑ کو بھی ہم نے نجات دی اور اس کی مدد فرمائی۔

حضرت نوحؑ کی آخری دعا

'اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ' یہ حضرت نوحؑ کی اس آخری دعا کی طرف اشارہ ہے جو سورۂ نوح میں تفصیل سے مذکور ہے اور جس کو پڑھ کر دل کانپ اٹھتا ہے۔ اس دعا کی قبولیت جس شکل میں ظاہر ہوئی اس کی تفصیل تو سورۂ نوح میں آئے گی۔ یہاں صرف اس سلسلہ کی آخری آیات کو یاد کر لیجیے۔

مِمَّا خَطِیْٓئٰتِھِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا	پس قومِ نوحؑ کے لوگ اپنے جرموں کی پاداش میں
نَارًا ۵ فَلَمْ یَجِدُوْا لَھُمْ مِّنْ	غرق کر دیے گئے، اور آگ میں داخل کیے گئے
دُوْنِ اللّٰہِ اَنْصَارًا ۵ وَقَالَ	اور وہ خدا کے مقابل میں اپنے لیے کوئی مددگار
نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَی	نہ پا سکے۔ اور نوحؑ نے دعا کی کہ اے میرے رب!
الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ۵	تو زمین پر ان کافروں میں سے ایک کو بھی چلتا پھرتا
اِنَّکَ اِنْ تَذَرْھُمْ یُضِلُّوْا	نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو یہ تیرے
عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوْٓا اِلَّا	بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف ناہنجاروں اور
فَاجِرًا کَفَّارًا ۵ رَبِّ اغْفِرْلِیْ	ناشکروں ہی کو جنم دیں گے۔ اے میرے رب!
وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ	میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما اور ان کی
مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ	جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ داخل ہو جائیں۔
الْمُؤْمِنٰتِ ۵ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ	اور تمام مومنین و مومنات کی اور ظالموں کے لیے

اِلَّا مَتَاعًا ۔ (نوح ۷۱ : ۲۸) صرف تباہی میں اضافہ کر۔

فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ۔ لفظ 'اَهْل' کی تحقیق سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۳۲ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس سے کسی شخص کے اہلِ خانہ اور اتباع و اصحاب سب مراد ہوتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے باایمان ساتھیوں کو ایک عظیم کلفت اور بہت بڑی مصیبت سے نجات بخشی۔ 'کرب عظیم' سے مراد وہ غم و الم بھی ہے جو اعدائے حق کی ستم رانیوں اور اذیتوں سے ایک مدت دراز تک ان کو اور ان کے مظلوم ساتھیوں کو لاحق رہا اور وہ عذاب عظیم بھی ہے جس میں بالآخر ان کی پوری قوم مبتلا ہوئی۔

وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ (۷۷)

قوم نوح کا انجام

'نَصَرْنٰہُ' کے بعد 'مِن' کا صلہ اس امر کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ لفظ 'اِنْتَقَمْنَا' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ عربی زبان کے اس اسلوب کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آرہے ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم نے اس کی مدد کی اور ان لوگوں سے ہم نے انتقام لیا جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔' ہم نے ترجمہ میں اس تضمین کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ 'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ' میں بالاجمال ان کے جرم کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نہایت ہی برے لوگ تھے۔ ان کے جرائم کی تفصیل پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکی ہے اور آگے سورۂ نوح میں بھی آئے گی۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ جتنی طویل مدت تک حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو جھنجھوڑا ہے اس کی کوئی دوسری مثال شاید مشکل ہی سے مل سکے گی اور حضرت نوحؑ کی دلسوزی اور دردمندی کا جو حال رہا ہے اس کی تفصیل خود حضرت نوحؑ کی زبان سے انشاءاللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں آئے گی لیکن یہ ایسے پتھر لوگ تھے کہ کوئی چیز بھی ان پر کارگر نہ ہو سکی۔ 'فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ' ان لوگوں کی اس سنگ دلی اور نابکاری کی سزا ان کو بالآخر یہ ملی کہ پوری قوم کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔ بلکہ یہ پوری قوم خدا کی زمین پر غلاظت کا ایک ڈھیر تھی جس کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے زمین کے سمندروں اور آسمان کے بادلوں کو حکم دیا کہ وہ اس ناپاکی کے ڈھیر سے خدا کی زمین کو دھو کر پاک کر دیں۔ چنانچہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ طوفانِ نوح نے اس زمین کو دھو کر بالکل پاک کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے پاکیزہ صفات ساتھیوں سے اس کو ازسرنو آباد کیا۔ اس مضمون کو اچھی طرح کھولنے کے لیے تورات میں قوم نوح سے متعلق جو کچھ آیا ہے اس کا حوالہ بہت مفید رہتا لیکن اس کے لیے موزوں جگہ انشاءاللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں آئے گی۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۷۸-۹۴

اوپر کی آیات میں، ایک تاریخی ترتیب کے ساتھ، ان انبیائے عظام کا ذکر ہوا جو ملتوں اور امتوں کے بانی ہوئے، اب آگے ایک صفاتی ترتیب کے ساتھ ان انبیاء کا ذکر آرہا ہے جو اپنی صفات اور اپنے کردار کے اعتبار سے پوری انسانیت کے لیے نمونہ ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت داؤد

اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا ذکر فرمایا جو بادشاہی اور درویشی کے امتزاج کی بہترین مثال تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے شوکتِ دنیا عطا فرمائی لیکن وہ اس کے فتنوں میں مبتلا ہونے کے بجائے برابر خدا کے شکرگزار رہے اور اپنی تمام صلاحیتیں اور اپنے تمام وسائل و ذرائع انھوں نے اپنے رب ہی کی رضا جوئی میں صرف کیے۔ اس کے بعد حضرت ایوب، حضرت اسماعیل، حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کا ذکر فرمایا جو اپنے صبر کے اعتبار سے تمام انسانیت کے گل سرسبد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے امتحانوں میں ان کو ڈالا اور ہر امتحان میں یہ ثابت قدم رہے۔ اس کے بعد حضرت یونس، حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہم السلام کا ذکر فرمایا جنھوں نے نہایت تاریک اور مایوس کن حالات کے اندر اپنے رب کو پکارا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کے لیے اپنی رحمتِ خاص سے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ ان انبیائے کرام کی زندگیوں میں ان متکبرین کے لیے بھی درس ہے جو خدا کی نعمتیں پا کر خدا ہی سے اکڑ رہے تھے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مظلوم صحابہؓ کے لیے بھی درس ہے جو آزمائش کے ایک نہایت ہی نازک دور سے گزر رہے تھے اور جن کو سامنے کی راہ بالکل بند ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ
وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا
وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا
فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ
فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ
بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾
وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ
وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾ وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ
وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ
ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰي
لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا ۚ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۶﴾ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ
مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ
اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ
نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِی الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۸﴾ وَزَكَرِیَّاۤ اِذْ نَادٰی
رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ ﴿۸۹﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۫
وَوَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰی وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ
فِی الْخَیْرٰتِ وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِیْنَ ﴿۹۰﴾ وَالَّتِیْۤ
اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَاۤ اٰیَةً
لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۱﴾ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖۗ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾
وَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ ع ۶
وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾

ترجمۂ آیات ۷۸-۹۴

اور داؤد اور سلیمان پر بھی ہم نے اپنا فضل کیا۔ یاد کرو جب کہ وہ ایک کھیتی کے مقدمے کا فیصلہ کر رہے تھے جب کہ اس میں کچھ لوگوں کی بکریاں شب میں جا پڑی تھیں اور ہم ان کے اس قضیہ پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم نے اس کو سمجھا دیا سلیمان کو اور ہم نے ان میں سے ہر ایک کو حکمت اور علم سے نوازا تھا۔ اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو داؤد کا ہم نوا کر دیا تھا، وہ اس کے ساتھ خدا کی تسبیح کرتے تھے اور یہ باتیں ہم ہی کرنے والے تھے! اور ہم نے اس کو تمہارے لیے ایک خاص جنگی لباس کی صنعت سکھائی تاکہ وہ تم کو جنگ میں محفوظ رکھے تو کیا تم بھی اسی طرح شکر کرنے والے بنتے ہو! ۷۸-۸۰

اور ہم نے سلیمان کے لیے بادِ تند کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں اور ہم ہر چیز سے باخبر ہیں۔ اور شیاطین میں سے بھی ہم نے اس کے لیے مسخر کیے تھے جو اس کے لیے سمندروں میں غوطے لگاتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے، اور ہم ان کو سنبھالنے والے تھے۔ ۸۱-۸۲

اور ایوب پر بھی ہم نے رحمت کی۔ جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مبتلائے آزار ہوں اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے! تو ہم نے اس کی دعا قبول فرمائی اور ہم نے اس کی تکلیف دور کر دی اور اس کو اس کے اہل و عیال بھی دیے اور ان کے مانند ان کے ساتھ اور بھی خاص اپنے فضل سے اور عبادت گزاروں کی یاد دہانی کے لیے۔ ۸۳-۸۴

اور اسمٰعیل، ادریس اور ذوالکفل پر بھی ہم نے فضل کیا یہ سب ثابت قدموں میں سے تھے۔ اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کیا، بے شک وہ نیکو کاروں میں سے تھے۔ ۸۵-۸۶

اور ذوالنون پر بھی ہم نے رحم کیا جب کہ وہ قوم سے برہم ہو کر چل کھڑا ہوا اور اس نے گمان کیا کہ ہم اس پر گرفت نہ کریں گے۔ پس اس نے تاریکیوں کے اندر پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بے شک میں ہی قصور وار ہوں! تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے نجات دی اور اسی طرح ہم اہل ایمان کو نجات دیتے ہیں۔ ۸۷-۸۸

اور زکریا پر بھی فضل کیا کہ جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ اے رب تو مجھے تنہا نہ چھوڑ اور بہترین وارث تو ہے تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور ہم نے اس کو یحییٰ عطا فرمایا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے سازگار کر دیا۔ بے شک یہ نیکی کے کاموں میں سبقت کرنے والے اور امید و بیم ہر حال میں ہماری ہی عبادت کرنے والے اور ہمارے آگے سرفگندہ رہنے والے تھے۔ ۸۹-۹۰

اور اس (پاک دامن بی بی) پر بھی اپنا فضل کیا جس نے اپنے اندیشہ کی جگہوں کی حفاظت کی تو ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونکی اور اس کو اور اس کے بیٹے کو دنیا والوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔ ۹۱

یہ تمھاری امت ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمھارا رب ہوں تو میری ہی عبادت کرو۔ اور انھوں نے اپنا دین ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ ہر ایک کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے! تو جو نیک عمل کرے گا اور وہ ایمان پر بھی ہوگا اس کی سعی رائگاں جانے والی نہیں، ہم اس کے لیے اس کو لکھ رکھنے والے ہیں۔ ۹۲-۹۴

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۙ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ (۷۸-۷۹)

داؤد و سلیمان یہاں اسی طرح منصوب ہیں جس طرح اوپر 'نُوْحًا' منصوب ہے یعنی سیاقِ کلام کی روشنی میں کوئی فعل محذوف مانیں گے۔ ہم نے ترجمہ میں اس محذوف کو کھول دیا ہے۔

'نفش' کے معنی بکریوں یا مویشیوں کا شب میں چرنا اور 'فَفَهَّمْنٰهَا' میں ضمیر مؤنث اس مرجع کے لیے آئی ہے جو سیاقِ کلام سے مستنبط و متبادر ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

حضرت داؤدؑ کے ایک مقدمہ کی طرف اشارہ اور اس اشارہ سے مقصود

یہاں ایک مقدمہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو حضرت داؤدؑ کی عدالت میں پیش ہوا۔ اس مقدمہ کی کوئی تفصیل نہیں فرمائی ہے۔ بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی بکریوں کا ریوڑ کسی کے کھیت میں جا پڑا تھا۔ حضرت داؤدؑ نے اس کا فیصلہ فرمایا لیکن اس فیصلہ میں وہ معاملہ کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ ان کے فرزند حضرت سلیمانؑ نے، جو ابھی کمسن ہی تھے، اپنی رائے پیش کی جو زیادہ صائب اور قرینِ عدل تھی۔ بالآخر حضرت داؤدؑ نے انہی کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمایا۔ یہ سوال کہ باپ نے کیا فیصلہ کیا اور بیٹے نے کیا رائے دی، خارج از بحث ہے اس لیے کہ قرآن

داؤدؑ و سلیمانؑ کی عدل گستری

کا مقصد یہاں مقدمہ کی روداد پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ایک تو یہ دکھانا ہے کہ حضرت داؤدؑ ایک حکمران اور پیغمبر ہونے کے باوجود اپنے فیصلوں میں اتنے محتاط تھے کہ اپنے ایک اجتہاد کا ضعف، اپنے ایک کم عمر فرزند کے توجہ دلانے

سے بھی جب ان پر واضح ہو گیا تو انھوں نے فوراً اپنا فیصلہ بدل دیا اور اپنے سے ایک عمر تر کی رائے قبول کر لی۔ دوسری یہ بات دکھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو ایک ایسا فرزند عطا فرمایا جو اپنے عنفوان شباب ہی سے ایسی اعلیٰ قوت فیصلہ رکھتا تھا کہ بسا اوقات اپنے عظیم باپ کو بھی مشورے دیتا تھا اور باپ اس کے فیصلوں کی قدر کرتا تھا۔ یہ کسی باپ کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ایسا لائق بیٹا عطا ہو جو امورِ حکومت میں نہ صرف اس کا دست و بازو بنے بلکہ بسا اوقات اس کی رہنمائی بھی کرے۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے یہاں اس مقدمہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہمارے مفسرین نے اس مقدمے کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ قرآن سے ایک بالکل خارج چیز ہے۔ اس کی مختلف شکلیں فرض کی جا سکتی ہیں لیکن ان کی نوعیت بالکل مفروضات کی ہے اور ہم مفروضات کے درپے ہونا پسند نہیں کرتے۔

حکمران کا اصل جوہر

'وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ' یعنی ہم اس خاندان کے لوگوں کو اپنی زمین میں حکومت دے کر بالکل الگ تھلگ نہیں جا بیٹھے تھے بلکہ دیکھتے رہے تھے کہ وہ کیا بناتے ہیں، رعایا کے اندر امن و عدل قائم کرنے کا ان کو کتنا احساس ہے، اور اپنی ذمہ داریوں کے معاملے میں وہ کتنے زیرک، کتنے محتاط اور کتنے بے نفس اور غیر جانبدار ہیں۔ چنانچہ ان باپ بیٹے نے یہ ثابت کر دیا کہ دونوں اس منصب کے پوری طرح اہل ہیں۔ بیٹے نے جونہی محسوس کیا کہ باپ سے در باب عدل لغزش ہوئی اس نے اپنا حق نصیحت ادا کیا اور باپ نے جونہی محسوس کیا کہ بیٹے کی رائے زیادہ قرین عدل ہے بے چون و چرا اس نے حق کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیا۔ یہی کردار حکمرانی کا اصل جوہر ہے اور اللہ تعالیٰ جن کو اپنی زمین میں خلافت دیتا ہے اسی جوہر کو پرکھنے کے لیے دیتا ہے۔

'وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا' یعنی ان کا یہی جوہر ہے جس کی بنا پر ہم نے ان میں سے ہر ایک کو حکمت اور نبوت سے نوازا۔

حکمرانی کے ساتھ درویشی

'وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ' یہ حضرت داؤدؑ کی درویشی کی طرف اشارہ ہے کہ ایک طرف تو ہم نے ان کو تختِ حکومت پر بٹھایا تھا، وہ پوری بیدار مغزی اور بے نفسی کے ساتھ رعایا کے اندر امن و عدل قائم کرتے تھے۔ دوسری طرف ان کے تعلق باللہ کا یہ حال تھا کہ وہ شب میں پہاڑوں میں نکل جاتے اور ان کے حمد و تسبیح کے نغموں اور گیتوں کی صدائے بازگشت پہاڑوں میں گونجتی اور پرندے بھی ان کی ہمنوائی کرتے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ تورات سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت داؤدؑ نہایت خوش الحان تھے اور اس خوش الحانی کے ساتھ ساتھ ان کے اندر سوز و درد بھی تھا۔ مزید برآں یہ کہ ان کی تمام مناجاتیں گیتوں اور نغموں کی شکل میں ہیں اور یہ گیت الہامی ہیں۔ ان گیتوں کا حال یہ ہے کہ زبور پڑھیے تو اگرچہ ترجمہ میں ان کی شعری روح نکل چکی ہے لیکن آج بھی ان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل سینہ سے نکل پڑے گا۔ حضرت داؤدؑ جیسا خوش الحان اور صاحبِ سوز و درد جب ان الہامی گیتوں کو پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ کر سحر کے سہانے وقت میں، پڑھتا رہا ہو گا تو یقیناً پہاڑوں سے بھی ان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہی ہو گی

اور پرندے بھی ان کی ہمنوائی کرتے رہے ہوں گے۔ یہ نہ خیال فرمائیے کہ یہ محض شاعرانہ خیال آرائی ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، اپنے رب کی تسبیح کرتی ہے لیکن ہم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ ان کا یہ شوقِ تسبیح اس وقت اور بھڑک اٹھتا ہے۔ جب کوئی صاحب درد کوئی ایسا نغمہ چھیڑ دیتا ہے جو ان کے دل کی ترجمانی کرتا ہے، اس وقت وہ بھی جھوم اٹھتے ہیں اور اس کی لَے میں اپنی لَے ملاتے ہیں۔ اگر پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح ہم نہیں سنتے سمجھتے تو یہ خیال نہ کیجیے کہ اس کو کوئی دوسرا بھی نہیں سنتا سمجھتا۔ وہ لوگ اس کو سنتے اور سمجھتے ہیں جن کے سینوں میں دل گداختہ ہوتا ہے۔ مولانا رومؒ نے خوب بات فرمائی ہے۔

فلسفی کو منکر حنانہ است

از حواس انبیاء بے گانہ است

اسی حقیقت کی طرف مرزا غالب نے یوں اشارہ کیا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اس ٹکڑے کا اسلوبِ بیان بھی قابلِ غور ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ سَخَّرْنَا لَهٗ بلکہ اسلوب بدل کر سَخَّرْنَا مَعَهٗ فرمایا۔ مَعَهٗ سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کی تسبیح میں اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو بھی ان کا شریکِ بزم بنا دیا تھا۔ جب وہ اپنا نغمۂ حمد چھیڑتے تو یہ بھی ان کی ہمنوائی کرتے۔

زبان کا ایک نکتہ

یہاں معطوف اور معطوف علیہ یعنی جِبَالَ اور طَیْرَ کے درمیان فعل یُسَبِّحْنَ حائل ہے۔ حالانکہ بظاہر اس کو طَیْرَ کے بعد آنا چاہیے۔ فعل کی اس تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ پرندوں کی تسبیح خوانی تو ایک معروف بات ہے البتہ پہاڑوں کی نواسنجی ایک نادر بات تھی۔ اس وجہ سے فعل کو ان سے متصل کر دیا۔

خدا ساز بات

وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ۔ یعنی یہ کام کسی اور کے کرنے کے نہیں بلکہ ہمارے ہی کرنے کے تھے اور ہم ہی ان کے کرنے والے بنے۔ ہم جس کے لیے چاہیں شجر و حجر، دریا، پہاڑ اور چرند و پرند ہر چیز کو اس کے پیچھے لگا دیں۔ خدا کی نعمتیں کسی کو اس کے اپنے زور و اقتدار سے نہیں ملتیں بلکہ خدا ہی کے دینے سے ملتی ہیں۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ (۸۰)

رات کا راہب اور دن کا شہسوار

یعنی یہ زاہد شب زندہ دار یہ نہ سمجھو کہ صرف تنہائی کے گوشوں میں بیٹھ کر اللہ ھو کرنے والا ہی تھا بلکہ یہ جس طرح رات کا راہب تھا اسی طرح دن کا شہسوار بھی تھا۔ ہم نے جنگ کے حملوں سے حفاظت کے لیے اس کو ایک خاص لباس بنانے کی تعلیم دی۔ اس خاص لباس سے اشارہ زرہ کی طرف ہے۔ اس کے موجد حضرت داؤدؑ ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ زرہ کی جو اعلیٰ قسمیں حضرت داؤدؑ نے ایجاد کیں ویسی زرہیں ان سے پہلے وجود میں نہیں آئی تھیں۔ عربوں کی رزمیہ شاعری میں داؤدی ساخت کی زرہوں کا ذکر بہت آتا ہے۔ اس عہد کے

وفاعی اسلحہ میں سب سے زیادہ اہمیت اسی کو حاصل رہی ہے۔ اب زمانہ بہت بدل چکا ہے۔ ان آلات واسلحہ کی اب کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن جس زمانے کی یہ بات ہے اس زمانے میں حضرت داؤدؑ اپنی انہی ایجادات کی بدولت دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت کے مالک تھے۔ مقصود اس کے ذکر سے یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ بالکل رھبان و بالنہار فرسان کی صحیح تصویر تھے۔ ایک طرف ان کی پرسوز دعاؤں اور مناجاتوں سے پہاڑوں کا دل موم ہوتا، دوسری طرف ان کی جنگی ایجادات اور ان کی فوجی یلغاروں سے دشمنوں پر لرزہ طاری رہتا۔

شکر میں حضرت داؤدؑ کی پیروی کی دعوت

'فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ'۔ حضرت داؤدؑ کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے بعد مخاطبوں کو خطاب کر کے سوال کیا کہ کیا اس طرح کے شکر گزار بندے بننے کا حوصلہ تم بھی رکھتے ہو! حکمت، نبوت، حکومت اور قوت سب کچھ پا کر حضرت داؤدؑ کے فقر و درویشی کا یہ حال تھا! دین و دنیا کی یہی ہم آمیزی خدا کو مطلوب ہے اور خدا کے شکر گزار بندے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نہ کہ وہ بے ہنر لوگ جو داؤدؑ و سلیمانؑ کی سطوت و عظمت کے گیت تو بہت گاتے ہیں لیکن دنیا کے کتے بنے ہوئے ہیں۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ (۸۱)

حضرت سلیمانؑ کا عظیم بحری بیڑا

یہاں 'لِ' اس بات کا قرینہ ہے کہ فعل 'سَخَّرْنَا' محذوف ہے۔ 'سَخَّرْنَا لَهٗ' کا مفہوم ہم اس کے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'لِ' کے صلہ کے ساتھ یہ لفظ کسی شے کو کسی کی خدمت میں لگا دینے کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی ہم نے تند ہواؤں کو بھی مسخر کر کے سلیمانؑ کی خدمت میں لگا دیا تھا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کی بری قوت تو بہت تھی لیکن ان کی حکومت کی بحری قوت میں بے مثال ترقی حضرت سلیمانؑ کے عہد میں ہوئی۔ انھوں نے ایسے بادبانی جہاز ایجاد کیے جو ہندوستان اور مغربی جزائر تک سفر کرتے تھے۔ ان کا بحری بیڑا وقت کا سب سے زیادہ طاقتور بیڑا تھا۔ بحر احمر میں اس کا مرکز ترسیس تھا جو خلیج عقبہ میں واقع تھا اور بحر متوسط میں صور، طائر اور یافہ کی بندرگاہیں۔ اس زمانے تک سمندری ہواؤں کو کنٹرول کرنے کا ذریعہ بادبان ہی تھے۔ یہی بادبان جہازوں کے لیے انجن کا کام دیتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ نے ایسے بادبان ایجاد کیے جو تند ہواؤں میں بھی جہاز کی آمد و رفت میں خلل واقع نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ اپنی معینہ سمتوں میں، موافق و ناموافق ہر قسم کی ہواؤں میں، اپنے لمبے لمبے سفر بے خوف و خطر جاری رکھتے۔ یہ چیز چونکہ خدا کی سکھائی ہوئی سائنس کا ثمرہ تھی اس وجہ سے فرمایا کہ ہم نے سلیمانؑ کے لیے تند ہوائیں مسخر کر دی تھیں جو اس کے حکم سے چلتی تھیں۔

'الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا' سے اشارہ فلسطین اور شام وغیرہ کے علاقے ہیں جو زرخیز ہونے کے سبب سے تجارتی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھنے والے تھے۔

'وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ'۔ بعینہٖ یہی فقرہ معمولی تغیر کے ساتھ آیت ۵۱ میں حضرت ابراہیمؑ کی شان

میں وارد ہوا ہے۔ وہاں ہم اس کا مفہوم واضح کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی صلاحیتوں اور ان کے ظرف اور حوصلہ کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس وجہ سے ہم نے ان کو اپنی ہواؤں پر یہ تصرف بخشا اور ہم یہ کچھ دے کر اپنی آنکھیں موند کر بیٹھ نہیں گئے تھے بلکہ ہر چیز کو جانتے اور دیکھتے رہتے تھے کہ سلیمانؑ ہماری بخشی ہوئی طاقت کو کس طرح استعمال کر رہے ہیں۔ درحقیقت یہی نکتہ ہے جو ہمارے اس عہد کے سائنسدانوں کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔

تسخیرِ کائنات خدا کا فضل ہے

انھیں تسخیرِ کائنات کی مہمات میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں ان کو وہ خدا کا فضل سمجھنے کے بجائے اپنی ذہانت کا کرشمہ تصور کرتے ہیں حالانکہ انسان کو جو کامیابی بھی حاصل ہوتی ہے خدا کی بخشی ہوئی عقل اور خدا ہی کی رہنمائی سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اوپر وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ سے اشارہ فرمایا ہے پھر جب انسان اس مغالطہ میں پڑ جاتا ہے کہ اس کی یہ تمام ایجادات اس کا اپنا کارنامہ ہیں تو اس مغالطہ کے بطن سے ایک اور مغالطہ جنم لیتا ہے جو اس سے بھی زیادہ مہلک ہے، وہ یہ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ ان حاصل کردہ قوتوں سے جس طرح چاہے کام لے کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے۔ قرآن نے وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ سے اس مغالطہ پر بھی ضرب لگائی ہے کہ قدرت نادان نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے خزانوں کی کنجیاں پکڑا کر خود کنارہ کش ہو کر بیٹھ رہے، لوگ جو چاہیں بناتے اور کرتے پھریں، بلکہ وہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور جب وہ آگاہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی بخشی ہوئی قوت کو اگر کسی نے غلط استعمال کیا تو وہ لازماً اس کے لیے ایک دن مسئول ہوگا۔ حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام اس رمز سے خوب آگاہ تھے اس وجہ سے بڑے بڑے دونوں میں عظیم کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اس مغالطہ میں مبتلا نہیں ہوئے کہ یہ ان کے اپنے کارنامے ہیں بلکہ انھوں نے ان ساری چیزوں کو خدا کا فضل سمجھا اور جو قدم بھی اٹھاتے یہ سوچ کر اٹھاتے کہ ایک دن ان کو خدا کے سامنے پیش ہونا اور اپنے ہر عمل کی جوابدہی کرنی ہے۔ یہی احساس ہے جو انسان کو خدا کا حقیقی شکر گزار و تابعدار بندہ بناتا ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کی زندگی کا یہ پہلو انشاءاللہ سورۂ نمل کی تفسیر میں تفصیل سے زیرِ بحث آئے گا۔

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ (۸۲)

حضرت سلیمانؑ نے مفسد عناصر کو تعمیری کاموں کی خدمت میں استعمال کیا

شیاطین سے مراد وہ شیاطین جن ہیں جن کو حضرت سلیمانؑ نے مسخر کر رکھا تھا۔ قرآن اور تورات دونوں سے ثابت ہے کہ ان کے پاس انسانوں، جنوں اور پرندوں کی باقاعدہ فوج تھی جس کی پریڈ ہوتی رہتی تھی۔ مثلاً فرمایا ہے۔ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (نمل - ۱۸) (اور سلیمان کے قبضہ میں جنوں، انسانوں اور پرندوں کی فوجیں تھیں جن کا جائزہ ہوتا رہتا تھا) سورۂ نمل میں حضرت سلیمانؑ کی فوج کے ایک عفریت جن کا بھی ذکر ہے۔ جس نے ان سے کہا کہ اگر حضور کا حکم ہو تو میں ملکۂ سبا کا تخت آپ کے دربار سے اٹھنے سے پہلے پہلے حاضر کر دوں۔ یہ جن سمندروں میں غوطہ لگا کر سمندری دولت، مونگے موتی وغیرہ بھی فراہم کرتے تھے اور دوسرے کام بھی کرتے تھے۔ اس طرح کے مفسد عناصر کو مسخر کر کے انسانیت کی مفید

خدمت میں استعمال کرنا حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک عظیم کارنامہ ہے اور ایک لائق حکمران کا اصلی کام یہی ہے کہ وہ نہ صرف مفید عناصر کو بلکہ مضر عناصر کو بھی اپنے علم و حکمت سے تعمیر و تمدن اور اصلاح و ترقی کی راہ پر لگا دے۔ ان شیاطین کو مسخر کرنے کے لیے حضرت سلیمانؑ کو جو علم عطا ہوا تھا اس پر مفصل بحث بقرہ کی آیت ۱۰۲ کے تحت ہاروت و ماروت کے ضمن میں، ہم کر چکے ہیں۔ بعض لوگوں نے شیاطین سے ان کافر قوموں کو مراد لیا ہے جو حضرت سلیمانؑ کے زیر نگیں تھیں لیکن ہمارے نزدیک یہ اس لفظ سے ایک قسم کا تجاوز ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ قرآن میں یہ لفظ اشرارِ جن اور اشرارِ انس دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن مطلق کافر قوموں کے لیے یہ لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس سے کافر قوموں کے اشرار مراد ہیں تو لفظ کے اندر اس کی بھی گنجائش ہے لیکن اصلاً نہیں تبعاً۔ اصلاً اس سے مراد جنوں ہی کے اشرار ہوں گے۔

جہلائے عہد کے سائنس دانوں کا ایک مغالطہ

وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ، یعنی ان شیطانی قوتوں کو حضرت سلیمانؑ کے لیے ہم نے جو مسخر کر دیا تھا تو یہ نہیں تھا کہ وہ محض ان کے اپنے بل بوتے پر ان کے قابو میں تھیں بلکہ ان کے اصلی نگران ہم تھے۔ ہمیں نے اپنے فضل سے ان کو سلیمانؑ کے قابو میں کر دیا تھا اور ہم ہی ان کی نگرانی کرنے والے تھے کہ نہ ان میں سے کوئی بھاگ سکے نہ کوئی حضرت سلیمانؑ کے منشا کے خلاف کوئی تعدی کر سکے۔ اگر ہم ان کے نگران نہ ہوتے تو یہ بے قابو ہو کر خطرے اور آفت کا سبب بھی بن سکتی تھیں۔ اس ٹکڑے میں ایک بہت بڑی تنبیہ ہے ان لوگوں کے لیے جو قدرت کی بعض قوتوں کو تسخیر کر کے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اب یہ ان کے مالک ہیں، نہ ان کو ان سے کوئی چھین سکتا اور نہ یہ ان کے خلاف کوئی بغاوت کر سکتیں۔ یہ خیال محض انسان کی تنگ ظرفی اور جہالت کا نتیجہ ہے۔ آج انسان نے بھاپ، گیس بجلی اور ایٹم وغیرہ کی جو قوتیں اپنے قابو میں کر رکھی ہیں ان پر خدا ہی نے انسان کو قابو دیا ہے اور یہ اسی وقت تک انسان کے قابو میں ہیں جب تک خدا چاہے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی قوت کی باگ بھی ذرا ڈھیل چھوڑ دے تو یہی قوتیں، جن کی مدد سے انسان آسمان و زمین کے قلابے ملا رہا ہے، چشم زدن میں اس کے سارے خرمن کو سوختہ کر کے رکھ دیں۔

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ (۸۳-۸۴)

حضرت ایوبؑ اور ان کا مثالی صبر

شکر کی دو اعلیٰ مثالیں پیش کرنے کے بعد اب یہ ان انبیائے کرامؑ کا ذکر آ رہا ہے جنھوں نے صبر کی نہایت اعلیٰ مثالیں قائم کی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت ایوبؑ کا ذکر فرمایا ہے۔ سِفرِ ایوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک عوض میں حضرت ایوبؑ ایک نہایت کامل اور راستباز انسان تھے۔ خدا نے انھیں بڑا خاندان اور بڑی دولت دے رکھی تھی۔ ان کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سات ہزار بھیڑیں، تین ہزار اونٹ، ایک ہزار بیل اور پانچ سو باربرداری کے گدھے ان کے پاس تھے۔ ان کے نوکر چاکر بھی بے شمار تھے۔ اہلِ مشرق میں اس درجہ کا مالدار کوئی اور نہ تھا لیکن یہ تمام خدم و حشم رکھنے کے باوجود وہ خدا کے نہایت شکر گزار اور فرمانبردار بندے

تھے کبھی کسی برائی سے وہ آلودہ نہ ہوتے۔

ان کی اس نیکی پر شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو حسد ہوا۔ انھوں نے طعنہ دیا کہ ایوب کی یہ خدا پرستی و راستبازی اس لیے ہوئی کہ خدا نے اسے ہر طرح کی خوشحالیاں دے رکھی ہیں۔ اگر یہ ان سے محروم ہو جائے تو پھر کبھی خدا کا شکر گزار نہ رہے[1]۔

اس کے بعد خدا کی طرف سے ان کے لیے آزمائشوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے مویشی لوٹ لیے گئے، نوکر چاکر قتل ہو گئے، اولاد مر گئی اور دولت و حشمت سب غائب ہو گئی لیکن حضرت ایوبؑ خدا سے مایوس ہونے کے بجائے اسی کے دروازے پر گر پڑے۔ سفر ایوب میں ہے کہ

"وہ سجدے میں گر پڑا اور کہا میں اپنی ماں کے پیٹ سے برہنہ پیدا ہوا تھا اور برہنہ ہی دنیا سے جاؤں گا۔ خداوند نے مجھے دیا تھا اور خداوند نے لے لیا اس کے نام کے لیے ساری پاکیاں اور مبارکیاں ہوں"۔

سفر ایوب ۱ : ۲۲

مالی آفات و مصائب کے بعد جسمانی تکالیف و آلام کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ،

"ایوب کے تلوے سے لے کر سر کی چاندی تک سارے جسم میں جلتے ہوئے پھوڑے نکل آئے۔ وہ ایک ٹھیکرا لے کر اپنا جسم کھجاتا تا اور راکھ پر بیٹھا رہتا۔" سفر ایوب ۲ : ۸

حضرت ایوب نے ان تکالیف کا بھی اسی صبر و رضا کے ساتھ مقابلہ کیا جس صبر و رضا کے ساتھ انھوں نے مالی آفات و مصائب کا مقابلہ کیا بالآخر اس امتحان سے بھی وہ بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوئے جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے زیادہ دیا جو انھوں نے کھویا تھا۔

"اور خداوند نے ایوب کی حالت بدل دی۔ اسے پہلے کی نسبت دو چند دولت عنایت کی۔ اس کے تمام عزیزوں کو اس کے گرد جمع کر دیا۔ اسے آخری عمر میں پہلے کی طرح اولاد ملی۔ وہ ایک سو چالیس برس تک جیا اور اپنی نسل کی چار پشتیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔" سفر ایوب ۴۲ : ۱۰

مقام رضا اور اس کا اجر

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ۔ اس دعا کی اس بلاغت کو ملحوظ رکھیے کہ حضرت ایوبؑ نے اپنے دکھ اور درد کا حوالہ تو دیا لیکن حرفِ مدعا کو زبان پر نہیں لائے۔ اس کو خدا کی رحمت پر چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ میں دکھی ہوں اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا دکھ تیرے آگے پیش کرتا ہوں اور معاملہ تیری رحمت کے حوالہ کرتا ہوں، تو جو کچھ کرے گا اپنی شانِ رحیمی کے مطابق کرے گا اور اسی میں میرے لیے برکت و رحمت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کو مقامِ رضا کہتے ہیں۔ جو اس مقام کو حاصل کر لیتا ہے اسی کو آخرت میں 'رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً' کا درجہ حاصل ہوگا۔ اس دنیا میں انسان کو جن حالات اور

---

[1] سفر ایوب۔ ۱ : ۹-۱۱

آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے ان میں یہ متعین کرنا کہ اس کی دنیا اور آخرت دونوں کے اعتبار سے خیر کس میں ہے، انسان کے لیے نہایت مشکل ہے۔ وہ اسا اوقات جس چیز کو چاہتا ہے اس کی عاقبت کے پہلو سے اس کے لیے فلاح وسعادت اس کے ضد پہلو میں ہوتی ہے اس وجہ سے ان تمام امور میں، جن میں خیر کا پہلو خدا کی طرف سے معین نہ ہو، معاملہ کو اللہ کے حوالہ کرنے ہی میں سعادت ہے۔ وہی جانتا ہے کہ بندے کے لیے بیماری بہتر ہے یا تندرستی، موت بہتر ہے یا زندگی!

فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کی دعا قبول فرمائی۔ ان کی وہ تمام تکالیف بھی دور فرما دیں جن میں وہ مبتلا تھے اور ان کے اہل وعیال اور ان کے خدم وحشم بھی ان کو از سرنو عطا فرمائے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرت ایوبؑ نے اپنی دعا میں صرف اپنی تکالیف کی طرف اشارہ فرمایا، آل و اولاد اور مال واسباب کے لیے کسی تمنا کا اظہار نہیں کیا۔ جن حالات میں مبتلا تھے ان میں ان کے لیے یہی بڑی چیز تھی کہ ان کے دکھ کا ازالہ ہو جائے، اس سے زیادہ کے لیے ارمان کرنے کی کہاں گنجائش تھی! لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو وہ بھی دیا جو انھوں نے مانگا اور وہ بھی دیا جس کا وہ اپنی تواضع کے سبب سے اب اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھ رہے تھے۔

وَاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس دور آزمائش میں ان کے جو اہل وعیال اور اعزا واقربا منتشر ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی اکٹھا کر دیا، جو وفات پا گئے تھے ان کے نعم البدل بھی دیے اور ان کے متعلقین کے دائرے کو مزید وسیع بھی کر دیا۔

رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ۔ یعنی یہ جو کچھ ہوا خاص ہمارے فضل سے ہوا۔ حالات بظاہر بالکل مایوس کن تھے، نہ ایوبؑ اس کی توقع کر سکتے تھے نہ کوئی دوسرا لیکن ہم نے اپنی رحمت سے اپنے بندے ایوبؑ کے لیے سب کچھ کر دیا۔ وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ۔ یعنی یہ ہم نے اس لیے بھی کیا کہ یہ واقعہ ہمارے عبادت گزار بندوں کے لیے ایک یادگار واقعہ ہو کہ ہمارے جو بندے ہر قسم کے نرم وگرم حالات میں ہمارے ہی ساتھ وابستہ رہتے ہیں ہم اسی طرح ان پر اپنا فضل کرتے ہیں اور کریں گے۔

اسمٰعیل، ادریس، اور ذوالکفل علیہم السلام

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۸۵-۸۶)

حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ادریس علیہما السلام پر سورۂ مریم کی آیات ۵۴-۵۷ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ ان دونوں نبیوں میں جو وصفی مماثلت ہے اس کی طرف بھی ہم نے وہاں اشارہ کیا ہے۔ یہاں ان کے ساتھ حضرت ذوالکفل کو بھی شامل کر دیا اور ان تینوں ہی حضرات کے باب میں فرمایا کہ 'كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفت صبر ان تینوں ہی حضرات کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان میں سے حضرت اسماعیلؑ کا صبر تو واضح طور پر معلوم ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ان کے صبر کا ذکر ہے لیکن حضرت ادریسؑ اور حضرت ذوالکفل کی سرگزشت جیسا

بالکل پردۂ خفا میں ہے۔ قدیم صحیفوں میں ان ناموں سے ان کا ذکر موجود نہیں ہے۔ اب یا تو یہ ہوا ہے کہ عربی لب و لہجہ میں یہ نام بالکل بدل گئے ہیں یا قدیم صحیفوں سے ان کے نام غائب ہو گئے تھے صرف قرآن نے ان کو از سرِ نو زندہ کیا۔ جو شکل بھی ہوئی ہو بہر حال ان دونوں نبیوں کے بارے میں میری ناچیز معلومات میں کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے ذوالکفل کو حضرت حزقیل پر منطبق کیا ہے۔ لیکن یہ اسی شکل میں قابلِ اعتماد ہے جب یہ ثابت ہو سکے کہ حضرت حزقیل اس لقب سے ملقب تھے۔ ان دونوں نبیوں کے نام قرآن ہی کے ذریعہ سے متعارف ہوئے ہیں اور صبر ان کی نمایاں خصوصیت بتائی گئی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ تورات یا قرآن کسی میں بھی جملہ انبیائے کرام کے نام اور حالات مذکور نہیں ہیں۔ تمام انبیائے کرام کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ ‌ۖ اِنِّىۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ۚ (۸۷)

ذوالنون علیہ السلام کی لغزش کی نوعیت

ذوالنون سے مراد حضرت یونس ہیں۔ قدیم صحیفوں میں ان کا نام یوناہ آیا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر ذوالنون (مچھلی والا) کے لقب سے کیا ہے: نون، مچھلی کو کہتے ہیں۔ چونکہ ان کو مچھلی نے نگل لیا تھا اس وجہ سے ان کو یہ لقب عطا ہوا جس میں مچھلی کے واقعہ کی تلمیح بھی ہے اور ایک قسم کا پیار بھی۔

حضرت یونس اہلِ نینوا کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ نینوا کی آبادی، صحیفۂ یونس کی روایت کے مطابق، ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ قرآن کی سورۂ صافات میں بھی مِائَةِ اَلۡفٍ اَوۡ يَزِيۡدُوۡنَ کے الفاظ آئے ہیں جس سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت یونس نے ایک مدت تک اہلِ نینوا کو دعوت دی لیکن کسی نے ان کی بات نہیں سنی۔ بالآخر ان پر حق کی حمیت غالب آئی اور قوم کی اس ناقدری و سنگ دلی سے مایوس و آزردہ ہو کر وہ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ جب ان پتھروں میں جونک لگنا ممکن نہیں ہے تو کیوں ایسے ناقدروں کے پیچھے اپنا وقت برباد اور ان کی خاطر اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا رکھا جائے؟ حق کی ناقدری و کس مپرسی پر ایک صاحبِ حق کے اندر یہ جذبہ پیدا ہونا ایک امر فطری ہے لیکن اس جذبہ کے غلبہ میں معاملہ کا ایک دوسرا نہایت اہم پہلو حضرت یونس کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ وہ یہ کہ خدا کے رسول کو اپنی قوم کو کب چھوڑنا چاہیے؟ یہ اس کے اپنے فیصلہ کرنے کی چیز نہیں بلکہ خدا ہی کے فیصلہ کرنے کی ہے۔ صرف خدا ہی جانتا ہے کہ کب کسی قوم کا پیمانہ لبریز ہوتا ہے اور کب کسی رسول کے لیے یہ روا ہے کہ وہ اپنی قوم سے اعلانِ براءت کر کے ہجرت کرے اور قوم کو اللہ کے عذاب کے حوالہ کرے۔ حضرات انبیاء کے لیے ہمیشہ یہ سنتِ الٰہی رہی ہے کہ وہ خدا کے اذن کے بغیر اپنی قوم کو نہ چھوڑیں اگرچہ ان کے سر پر آرے ہی کیوں نہ چلتے رہیں اور اگرچہ ایک شخص بھی ان کی دعوت پر کان دھرنے والا نہ نکلے۔ حضرت یونس حمیتِ حق کے جوش میں اس سنتِ الٰہی کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ ایک طویل مدت تک لوگوں کو جگانے اور جھنجھوڑنے کی کوشش کے بعد بھی جب کوئی ان کی بات کو سننے والا نہیں نکلا تو اب عنداللہ وہ بری الذمہ ہیں، انھیں ایسی ناہنجار قوم کو خدا کے

عذاب کے حوالہ کرکے اس سے الگ ہو جانا چاہیے۔ اپنے کو بری الذمہ سمجھنے کے معنی یہ بھی تھے کہ وہ اپنے اس اقدام پر خدا کی طرف سے کسی گرفت کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا گمان یہ تھا کہ اس طرح وہ اس ابتلاء سے چھوٹ جائیں گے جس میں وہ پڑے ہوئے ہیں۔

حضرت یونسؑ کا یہ خیال بجائے خود ایک پاکیزہ جذبہ پر مبنی تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے جو آزمائشیں مقرر کر رکھی ہیں وہ لازماً پوری ہو کے رہتی ہیں۔ وہ قوم سے بیزار ہو کر ایک کشتی میں، جو سفر پر روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی، سوار ہو گئے۔ کشتی کچھ منزل طے کرنے کے بعد طوفان میں گھر گئی۔ جب طوفان کسی طرح ٹلتا نظر نہیں آیا تو ملاحوں نے اس زمانے کے عام وہم کے مطابق یہ خیال کیا کہ ہو نہ ہو اس کشتی میں اپنے آقا سے بھاگا ہوا کوئی غلام سوار ہو گیا ہے، جب تک اسے پکڑ کر سمندر کے حوالے نہ کیا جائے گا اس طوفان سے نجات نہیں مل سکتی۔ بالآخر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کشتی میں مفرور غلام کون ہے قرعہ ڈالا گیا اور قرعہ ڈالنے کی خدمت، جیسا کہ سورۂ صافات میں اشارہ ہے، حضرت یونسؑ ہی کے سپرد ہوئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہوگی کہ تمام اہل کشتی میں لوگوں کو سب سے زیادہ ثقہ آدمی وہی نظر آتے ہوں گے۔ بہرحال قرعہ ڈالا گیا اور قرعہ حضرت یونسؑ کے نام کا نکلا جس کے نتیجے میں وہ کشتی سے سمندر میں لڑھکا دیے گئے۔ سمندر میں ان کو کسی بڑی مچھلی غالباً وہیل نے نگل لیا لیکن خدا کے رسول کو ہضم کرنا آسان نہیں ہے۔ حضرت یونسؑ نے جب دیکھا کہ مشکلات کی تاریکی سے نکلنے کی جو راہ انھوں نے اختیار کی اس نے ان کو اس سے بھی زیادہ گہری تاریکیوں میں ڈال دیا تو ان کے دل سے وہ زندۂ جاوید دعا نکلی جس کے لیے یہ ضمانت ہے کہ وہ اگر صدق دل سے کی جائے تو کبھی قبولیت سے محروم نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور مچھلی نے ان کو ساحل کی ریت پر اگل دیا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے نڈھال جسم کو گرمی اور دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے کدو یا اسی قسم کی کوئی بیل اگا رکھی تھی۔ جس کے نیچے ان کو پناہ ملی۔ جب اس حادثہ سے اوسان بجا ہوئے اور جسم میں کچھ جان آئی تو ان کو پھر اہل نینوا کے پاس انذار کے لیے جانے کی ہدایت ہوئی۔ صحیفۂ یونس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوبارہ انذار کے لیے قدرت نے ایک مؤثر تقریب بھی پیدا کر دی۔ وہ یوں کہ وہ بیل جس کے سایہ نے حضرت یونسؑ کو امان دی تھی، کسی سبب سے دفعتہً سوکھ گئی۔ احسان شناس لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے احسان کی بھی قدر کرتے ہیں۔ حضرت یونسؑ کو اس یادگار بیل کے یوں خشک ہو جانے کا احساس ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کو توجہ دلائی کہ ایک حقیر بیل جس کے لگانے اور پروان چڑھانے پر تم نے کوئی محنت نہیں کی، سوکھ جانے پر تم یوں ملول ہوئے تو غور کرو کہ میں اس عظیم نینوا کو کس طرح اپنے عذاب کے حوالے کر سکتا ہوں جس کو میں نے پیدا کیا، جس کی پرورش کی اور جس کو پروان چڑھایا ہے! جاؤ ان کو پھر دعوت دو، شاید وہ نیکی کی راہ اختیار کریں اور میری رحمت کے مستحق ٹھہریں۔ اس ہدایت کے مطابق حضرت یونسؑ پھر اہل نینوا کے پاس انذار کے لیے گئے اور ان کی اس دوبارہ دعوت و تذکیر کا یہ اثر ہوا کہ بادشاہ سے لے کر نینوا کے عام باشندے تک سب کانپ اٹھے، سب خدا پر ایمان لائے، بادشاہ

نے شاہی لباس اتار کر ٹاٹ کا پیرہن پہن لیا اور باشندوں کے نام فرمان جاری کیا کہ ہر کوئی اپنی بری راہ سے باز آجائے، روزہ رکھے، خدا کے حضور زاری کرے اور توبہ و انابت کا سر جھکائے!!

حضرت یونسؑ کے واقعہ کی روایت میں چونکہ مفسرین نے بڑا گھپلا کر دیا ہے اس وجہ سے میں نے اس کی صحیح نوعیت واضح کرنے کے لیے اس کی تفصیل پیش کر دی۔ یہ تفصیل صحیفۂ یونسؑ اور قرآن کی تصریحات و اشارات پر مبنی ہے۔ آگے سورۂ صافات کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت آئے گی۔ اس تفصیل کو پیش نظر رکھ کر اب آیت کے اجزاء پر غور کیجیے۔

قوم کی ناقدری پر غصہ

'اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا' 'مُغَاضِبًا' کا مفعول یہاں بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یعنی اپنی قوم سے ناراض و آزردہ ہو کر وہ اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ آزردگی و ناراضگی ظاہر ہے کہ اسی بات پر ہو سکتی ہے کہ انھوں نے متنبہ کرنے کے لیے سارے جتن کر ڈالے لیکن اس نے ان کی کوئی پروا نہ کی بلکہ حق کی توہین کرتی اور ان کی باتوں کا مذاق اڑاتی رہی۔

حضرت یونسؑ کے اقدام کا ایک مخفی پہلو

'فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ' یعنی وہ سمجھے کہ اس طرح وہ اس مصیبت سے چھوٹ جائیں گے جس میں اس وقت قوم کے ہاتھوں وہ مبتلا ہیں۔ اسی جوشِ غیرت میں ان کو اس بات کی طرف توجہ نہیں ہوئی کہ جس محاذ پر ان کو خدا نے مامور کیا ہے اگر وہ خدا کے حکم کے بغیر اس کو چھوڑیں گے تو خدا ان کو اس سے بھی کسی بڑی آزمائش میں ڈال سکتا ہے۔ اس فقرے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اقدام کے ایک ایسے پہلو پر عکس ڈالا ہے جس پر اگرچہ حضرت یونسؑ کی نظر نہیں پڑی تھی لیکن وہ اس کے اندر مضمر تھا۔ حضرت یونسؑ یہ گمان تو ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تو خدا کی گرفت سے باہر ہو جائیں گے۔ البتہ یہ گمان ان کو ہوا ہوگا کہ ان ناہنجاروں سے الگ ہو کر میں اس جنجال سے نکل جاؤں گا جس میں اس وقت ان کی خاطر مبتلا ہوں اور بقیہ زندگی یکسو ہو کر گزاروں گا۔ یہ گمان بجائے خود کوئی معصیت نہیں ہے لیکن رسول، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے محاذ پر مامور ایک مجاہد کی حیثیت رکھتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے سے میدان چھوڑے اگرچہ اس چھوڑنے کا محرک حمیتِ حق کا جذبہ ہی ہو۔ اگر وہ ایسا کرے تو درپردہ اس کے اندر یہ بات مخفی ہے کہ وہ خدا کے ابتلاء سے خود اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ یہ مخفی پہلو حضرت یونسؑ پر واضح نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو کھول دیا تاکہ اس کی سنگینی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ بسا اوقات آدمی ایک اقدام کرتا ہے جو بالکل معصومانہ ہوتا ہے لیکن وہ ایک ایسے گمان کی بھی غمازی کرتا ہے جو غلط ہوتا ہے اور اس کی طرف اس وقت تک توجہ نہیں ہوتی جب تک کوئی دانا اس کی طرف توجہ نہ دلائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت یونسؑ کے اسی گمان کو بے نقاب کیا ہے تاکہ اس کی اصلاح ہو۔ باطنی اصلاح و تربیت کے معاملہ میں یہی طریقہ حکیمانہ ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ تمام انسانیت کے لیے نمونہ ہوتے ہیں اس وجہ سے ان سے کوئی ادنیٰ لغزش بھی صادر ہوتی ہے تو

رسول محاذ پر مامور ایک مجاہد ہے

رب حکیم وعلیم اپنے خاص ایکسرے کے ذریعہ سے ان کو دکھا دیتا ہے کہ ان کی یہ بات کہاں تک متعدی ہو سکتی ہے اگر اس کا تدارک نہ ہو۔

اس ٹکڑے کی اگر یہ تاویل کی جائے تو یہ عقل وفطرت کے بالکل مطابق بھی ہے، اس سے حضرت یونسؑ پر کوئی الزام بھی عاید نہیں ہوتا اور اس تکلف کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی جو لوگوں نے 'لَنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ' کی تاویل میں لغت سے تجاوز کر کے کیا ہے۔ حالانکہ اس تکلف کے بعد بھی وہ اس مشکل کو حل نہ کر سکے جو اس میں ہے۔

فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

حضرت یونسؑ کی دعا

یہاں اس واقعہ کی تفصیل حذف کر دی گئی ہے جو حضرت یونسؑ کو کشتی میں پیش آیا۔ صرف اس دعا کا ذکر فرمایا ہے جو مچھلی کے پیٹ اور قعر سمندر کی تاریکیوں کے اندر انھوں نے کی اور جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ اس حذف کی وجہ، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہے کہ مقصود یہاں قصہ کی تفصیل نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ رب کریم تاریک سے تاریک حالات کے اندر بھی اپنے بندے کی دعائیں قبول فرماتا اور اس کو بڑی سے بڑی آفت سے نجات دیتا ہے بشرطیکہ بندہ اپنے رب ہی کو ملجاو ماویٰ سمجھے اور اسی سے دعا و فریاد کرے۔

صحیفۂ یونسؑ میں اس دعا کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے۔

"اس نے مچھلی کے پیٹ میں خداوند اپنے خدا سے دعا مانگی اور اس نے اس کی پکار سن لی تھی، وہ پاتال کے بطن میں سے چلایا اور اس کی پکار سنی گئی" ۲:۱

'ظُلُمٰت' کا مفہوم

لفظ 'ظُلُمٰت' اس تاریکی کی شدت اور اس کے اطراف کی وسعت اور اس کے ناپیدا کنار ہونے کو ظاہر کر رہا ہے۔ عربی زبان میں جمع کبھی کبھی کسی شے کے اطراف کی وسعت کے اعتبار سے بھی آتی ہے۔ ہم اس کی مثال میں 'مشارق' و 'مغارب' کا حوالہ دے چکے ہیں۔ یہاں اس سے مراد مچھلی کے پیٹ اور پاتال کی گہرائیوں کی تاریکیاں ہیں۔ مقصود اس لفظ سے یہ واضح کرنا ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ خدا کو اپنی بات سنانے کے لیے کسی پبلک پلیٹ فارم یا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے بندوں کی فریاد پاتال کی تاریکیوں اور سمندر کی گہرائیوں سے بھی سنتا اور ان کی فریاد رسی کرتا ہے۔

حضرت یونسؑ کا اعتراف تقصیر

'لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ' یہ حضرت یونسؑ کی دعا ہے۔ اس دعا میں ان کی طرف سے طلب و تمنا کسی چیز کی بھی نہیں ہے۔ صرف اپنی تقصیر کا اعتراف و اظہار ہے۔ اعتراف تقصیر کے بعد انھوں نے اپنے معاملے کو اپنے رب پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ جو فیصلہ فرمائے وہی حق ہے اور اسی میں حکمت و رحمت ہے اس لیے کہ وہ ہر عیب سے پاک ہے۔ سب سے پہلے خدا ہی کے معبود اور ملجا و ماویٰ ہونے کا اظہار کیا ہے، اس کے بعد اس کو ہر نقص و عیب سے پاک اور منزہ قرار دیا ہے، پھر اپنی تقصیر کا اعتراف فرمایا ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا سر تا سر میری اپنی ہی غلطی کا نتیجہ ہے۔ میں نے خود ہی اپنی جان پر ظلم ڈھایا، میرے رب

نے مجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ ۙ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ ۚ وَكَذَٰلِكَ نُنجِي الْمُؤْمِنِينَ (۸۸)

باوجودیکہ حضرت یونسؑ حرفِ مدعا زبان پر نہیں لائے تھے، صرف اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دیا تھا لیکن خدائے علام الغیوب جو پاتال کی فریادوں کو سنتا اور دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے، اس نے ان کے تمام غم والم کو دور فرما دیا۔ یہاں غم والم سے صرف وہی غم والم مراد نہیں ہے جو کشتی والے حادثے کے سبب سے پیش آیا بلکہ وہ غم والم بھی ہے جس کے سبب سے انھوں نے اپنی قوم کو چھوڑا تھا۔ قرآن میں دوسری جگہ اس بات کی تصریح ہے کہ اس حادثہ کے بعد جب انھوں نے از سرِ نو اپنی قوم کو دعوت دی تو ان کی پوری قوم ایمان لائی اور جو عذاب ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا اس سے خدا نے اس کو نجات دی۔

ایک ٹکڑا سرگزشت کو مطابق حال بنانے کے لیے

وَكَذَٰلِكَ نُنجِي الْمُؤْمِنِينَ۔ یہ ٹکڑا اس سرگزشت کو مطابقِ حال بنانے کے لیے ہے۔ ظاہر ہے کہ ان واقعات کے سنانے سے مقصود داستان سرائی نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو یہ اطمینان دلانا ہے کہ حالات کتنے ہی تاریک اور مایوس کن ہوں لیکن دل برداشتہ نہ ہونا۔ اللہ تعالیٰ تمھاری دعاؤں اور فریادوں کو جانتا اور سنتا ہے، وہ اپنے باایمان بندوں کو اسی طرح ہر غم والم سے نجات دیتا ہے جس طرح اس نے یونس کو نجات دی۔ ایک دن آئے گا کہ یہ ساری تاریکیاں، جن میں تم گھرے ہوئے ہو، کافور ہو جائیں گی، حق کا بول بالا ہوگا اور تمھاری قوم ایمان کے نور سے منور ہو جائے گی۔

وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ (۸۹)

حضرت زکریاؑ کی دعا کی قبولیت

حضرت زکریاؑ کی سرگزشت تفصیل کے ساتھ سورۂ مریم میں گزر چکی ہے۔ انھوں نے بھی بظاہر نہایت مایوس کن حالات میں اپنے رب سے دعا کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ظاہری حالات کے بالکل خلاف نا ممکن کو ممکن بنا دیا۔ سورۂ مریم کی تفسیر میں یہ بات گزر چکی ہے کہ ان کی بیوی بانجھ تھیں اور وہ خود بڑھاپے کی آخری منزل کو پہنچ چکے تھے۔ اعزا واقربا سب نااہل اور دین سے بے پروا تھے۔ حضرت زکریاؑ کو بڑھاپے میں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ آلِ یعقوبؑ کے جس دینی ورثہ کے وہ وارث ہیں خاندان میں اس کا کوئی اہل نہیں پیدا ہوا اور خود ان کا [illegible] آخر اب سر پر آ پہنچا۔ اس پریشانی میں انھوں نے دعا فرمائی کہ اے رب تو مجھے تنہا نہ چھوڑ بلکہ کوئی ایسا وارث عطا فرما جو میری اور آلِ یعقوبؑ کی دینی روایات کا حامل بن سکے۔

وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ۔ یعنی وارث کے لیے یہ دعا جو میں کر رہا ہوں اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ میرا کوئی وارث نہ ہوا تو تیرے دین کا کوئی حامل نہیں رہے گا۔ تیرا کوئی کام میرے یا میرے خاندان کے ساتھ بندھا ہوا نہیں ہے تو اپنے دین کا بہترین وارث خود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں یہ دعا جو کر رہا ہوں صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ تیرے دین کی خدمت کی جو سعادت اس خاندان کو، تیرے فضل سے حاصل رہی ہے اس سے یہ خاندان محروم نہ رہ جائے۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ تو جس کو چاہے گا اس خدمت کے لیے اٹھا کھڑا کرے گا، تو کسی کا محتاج

نہیں ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ (۹۰)

حضرت زکریاؑ کی دعا ایک نہایت اعلیٰ دینی مقصد کے لیے تھی۔ انھیں اولاد کی نہیں بلکہ دین کے ایک خادم کی تمنا تھی۔ وہ جس میراث کے حامل تھے وہ مال و جائداد کی میراث نہیں بلکہ آل یعقوبؑ کے دین کی میراث تھی اور چاہتے تھے کہ یہ مقدس امانت محفوظ رہے اس وجہ سے ان کی دعا درخور قبول ٹھہری۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بانجھ بیوی کو اولاد کے قابل بنا دیا اور ان کو حضرت یحییٰؑ جیسا نامور فرزند عطا فرمایا۔ حضرت زکریاؑ کی دعا ایک اعلیٰ دینی مقصد کے لیے تھی

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ۔ فرمایا کہ بالکل ناموافق و نامساعد حالات کے اندر ان کی یہ دعا اس لیے درخور قبول ٹھہری کہ یہ لوگ دنیا کے لیے بھاگ دوڑ کرنے والے نہیں بلکہ بھلائیوں اور نیکیوں کی راہ میں سبقت کرنے والے تھے۔ 'اِنَّهُمْ' میں ضمیر جمع حضرت زکریاؑ کے خاص اہل بیت کے لیے ہے۔ ان کے بنی اعمام تو، جیسا کہ سورۂ مریم سے واضح ہو چکا ہے، دین سے غافل لوگ تھے لیکن خاص حضرت زکریاؑ سے وابستہ لوگ دین دار تھے۔ ان لوگوں کے اندر تنافس دنیا کا روگ نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ مسابقت الی الخیر کی وہ روح باقی تھی جو آل یعقوبؑ کی امتیازی خصوصیت تھی۔ حضرت یحییٰؑ کی ولادت سے اس روح کو ایک تازہ دم طالب حاصل ہو گیا۔

ان کی دوسری صفت یہ بتائی ہے کہ 'يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا'، وہ امید و بیم ہر حال میں اپنے رب ہی کو پکارتے تھے۔ قرآن میں دنیا داروں اور مشرکوں کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ جب ان کو کوئی مشکل پیش آتی ہے تب تو وہ بڑی لمبی لمبی دعائیں ہم سے کرتے اور عہد باندھتے ہیں کہ اگر ان کی یہ ضرورت پوری ہو گئی تو ہمیشہ خدا کے وفادار بندے بن کر رہیں گے لیکن جب خدا ان کی ضرورت پوری کر دیتا ہے تو گن اپنی تدبیر اور دوسروں کی کارسازی کے گاتے ہیں اور خدا کو اس طرح بھول جاتے ہیں گویا اس کو کبھی پکارا ہی نہیں تھا۔ فرمایا کہ ان لوگوں کا کردار منافقانہ اور مشرکانہ نہیں تھا بلکہ وہ طمع اور خوف، امید اور بیم ہر حال میں خدا ہی کو پکارنے والے تھے۔ 'وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ' یعنی یہ نہیں تھا کہ نعمت ملے تو اکڑنے لگیں اور چھن جائے تو مایوس اور ناشکرے بن کر رہ جائیں بلکہ ہر حال میں وہ خدا ہی کے آگے سرفگندہ رہنے والے تھے۔

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۹۱)

یہ حضرت مریمؑ کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ سورۂ مریم میں گزر چکا ہے۔ یہاں ان کا نام نہیں لیا ہے اس لیے کہ ان کی جو صفت مذکور ہوئی ہے وہ ایک ایسی صفت ہے جس کا موصوف و مصداق ان کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہ اس صفت کے ساتھ ان کے اختصاص کی دلیل ہے۔

أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کا مفہوم

'أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا' کو اس کے عام لغوی مفہوم میں نہ لیجیے۔ 'أَحْصَنَ فَرْجَهُ' عربی زبان میں اسی طرح کا ایک محاورہ ہے جس طرح 'سد الثلمة'، 'رتق الفتق'، 'جبر الكسر' وغیرہ بہت سے محاورات ہیں۔ ان محاورات میں الفاظ کے لغوی مفہوم کا اعتبار نہیں بلکہ اس مفہوم کا اعتبار ہوتا ہے جس کے لیے یہ استعمال ہوتے ہیں۔ 'احصن فرجه' کا مفہوم 'تحصن من السوء' اس نے اپنے آپ کو ہر برائی سے پاک رکھا یا خطرے سے محفوظ رکھا۔ یہ محاورہ عورتوں کے لیے جس طرح استعمال ہوا ہے اسی طرح مردوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ لفظ 'فرج' کے معنی لغت عرب میں اصلاً بھی 'موضع مخافة' یعنی اندیشہ کی جگہ کے ہیں۔ میں اس کے شواہد پیش کر سکتا ہوں لیکن ان سے مستفید صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کی کلام عرب پر نظر ہو۔ کتاب کے عام قارئین ان سے استفادہ نہیں کر سکیں گے۔

حضرت مسیحؑ کے روح ہونے کا مفہوم

'فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُّوحِنَا' یعنی خاص اپنے کلمۂ 'کن' کے ذریعہ سے ان کے اندر ایک مولود کی روح ڈال دی۔ حضرت مسیحؑ کا استقرار بطن مادر میں چونکہ عالم اسباب کے عام ضابطہ سے الگ صرف کلمۂ 'کن' کے ذریعہ سے ہوا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی ڈالی ہوئی روح سے تعبیر فرمایا ہے۔ اسی اعتبار سے ان کو اور ان کی والدہ کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک عظیم نشانی بھی قرار دیا گیا ہے۔ ہم سورۂ مریم کی تفسیر میں ان کے نشانی ہونے کے پہلو واضح کر چکے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے، جیسا کہ انجیلوں سے واضح ہے، خود بھی اپنی نسبت یہی فرمایا ہے جو قرآن بیان کر رہا ہے، یہ محض پال کے پیرو عیسائیوں نے اپنی تحریفات کے ذریعہ سے بات کا بتنگڑ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہم ان تحریفات پر آل عمران کی تفسیر میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ (۹۲)

انبیاء کی سرگزشت خلاصۂ بحث

تمام انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد اب بطور خلاصۂ بحث کے فرمایا کہ ان تمام کی دعوت اور ان کا دین ابتداء سے انتہا تک ایک ہی ہے اور یہ سب انبیاء ایک ہی ملت و امت ہیں اور میں ہی تمہارا رب ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انبیاء کے درمیان کسی نے تفریق کی ہے، ان کے لائے ہوئے دین میں کسی نے بدعتیں ایجاد کی ہیں اور خدا کی توحید میں کسی نے شرک کی ملاوٹ کی ہے تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے۔ ان نبیوں کا دامن ان چیزوں سے پاک ہے۔

وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۖ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ (۹۳)

خدا کے دین میں تفریق پیدا کرنے والوں کو دھمکی

یہ ان لوگوں کو دھمکی ہے جنھوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے اس دین میں بدعتیں پیدا کر کے اس کو پارہ پارہ کیا اور اب ہر گروہ اپنی اپنی ڈگر کی حمایت میں انبیاء کے لائے ہوئے اس مشترک دین کی مخالفت کر رہا ہے جو قرآن اور خدا کے آخری رسول کے ذریعہ سے ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ تم ان مخالفت کرنے والوں کی کوئی پروا نہ کرو، ان سب کی واپسی بہرحال ہماری ہی طرف ہونی ہے کوئی اور مرجع بننے والا نہیں ہے ہم سب کے آگے اس کا کچا چٹھا رکھ دیں گے۔ کسی کی کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ (۹۴)

یعنی سب کی واپسی ہماری ہی طرف ہوگی تو جو عمل صالح کریں گے، بشرطیکہ وہ ایمان اور توحید پر قائم ہوں، وہ اطمینان رکھیں کہ ان کی سعی رائگاں نہیں جائے گی۔ ہم ان کو بھرپور صلہ دیں گے۔ ان کی ایک ایک نیکی کو ہم نوٹ کر رکھیں گے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ ان کا کوئی عمل ہماری یادداشت سے رہ جائے۔ بس یہ شرط ہے کہ وہ ایمان کے ساتھ انجام دیا گیا ہو۔ ہم اس حقیقت کی وضاحت بار بار کر چکے ہیں کہ خدا کے ہاں عمل صرف وہی مقبول ہے جو ایمان کے ساتھ صرف خدائے وحدہ لا شریک لہ کے لیے کیا جائے۔ جو عمل خدا کے لیے نہ کیا جائے اس کی خدا کے ہاں کوڑی کے برابر بھی وقعت نہیں ہے اگرچہ وہ ہجرت و جہاد ہی کیوں نہ ہو۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ـــ آیات ۹۵-۱۱۲

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ انذار کے اسی مضمون کی، جس سے سورہ کا آغاز فرمایا تھا، ایک نئے اسلوب سے آخر میں پھر یاد دہانی فرما دی ہے اور اس خاتمہ کی تمہید بھی بعینہٖ اسی لفظ سے شروع کی ہے جس لفظ سے سورہ کا آغاز ہوا ہے۔ شروع میں فرمایا تھا: اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ۔ یہاں جب اسی مضمون کو از سر نو لیا تو فرمایا: وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ۔ اس طرح قرآن اپنے نظم کی طرف خود رہنمائی کر دیتا ہے۔ اکثر سورتوں میں یہ اسلوب موجود ہے۔ استاذ امام اس اسلوب کو عود علی البدء سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سورہ کے مطالب کے پھیلاؤ میں اگر اصل مدعا نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو وہ از سر نو مخاطب کے ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۵-۱۱۲ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ
يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَاقْتَرَبَ
الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ
كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۷﴾ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً
مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا
يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰۗىِٕكَ عَنْهَا
مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ

خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا
يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاۗءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ
لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا
فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ
يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ
اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ
اٰذَنْتُكُمْ عَلٰي سَوَاۗءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾
اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ اَدْرِيْ
لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ
وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ۷ نصف

ترجمۂ آیات ۹۵-۱۱۲

اور جس بستی والوں کے لیے ہم نے ہلاکت مقدر کر رکھی ہے ان کے لیے حرام ہے کہ وہ رجوع کریں۔ وہ رجوع کرنے والے نہیں بنیں گے یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جب یاجوج ماجوج کھول دیے جائیں اور وہ ہر بلندی سے پل پڑیں۔ ۹۵-۹۶

اور قیامت کا شدنی وعدہ قریب آگیا ہے تو ناگہاں ان لوگوں کی نگاہیں ٹنگی رہ جائیں گی جنھوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ وہ پکاریں گے، ہائے ہماری بدبختی! ہم اس سے غفلت میں پڑے رہے، بلکہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے! ۹۷

اب تم اور جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے رہے ہو جہنم کے ایندھن بنو گے، تم لازماً اس میں

داخل ہو کر رہو گے۔ اگر یہ معبود ہوتے تو اس میں نہ پڑتے اور اب سب اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس میں ان پوجنے والوں کے لیے چلانا ہوگا اور ان کے معبودوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ کچھ نہیں سنیں گے۔ ۹۸-۱۰۰

البتہ جن کے لیے اچھے انجام کا ہماری جانب سے وعدہ ہو چکا ہے وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔ وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے۔ اور وہ اپنے من بھاتے عیش میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کو اس دن کی بڑی گھبراہٹ کا غم لاحق نہ ہوگا اور فرشتے ان کا خیر مقدم کریں گے، کہیں گے، یہ ہے آپ لوگوں کا وہ دن جس کا آپ لوگوں سے وعدہ کیا جا رہا تھا۔ ۱۰۱-۱۰۳

اس دن کا خیال کرو جس دن ہم آسمان کو لپیٹ لیں گے جس طرح طومار میں اوراق کو لپیٹتے ہیں۔ جس طرح ہم نے پہلی خلقت کا آغاز کیا اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ہم پر ایک حتمی وعدہ ہے۔ بے شک ہم یہ کر کے رہیں گے۔ ۱۰۴

اور ہم نے زبور میں موعظت کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے۔ بے شک اس کے اندر ہمارے عبادت گزار بندوں کے لیے بڑی آگاہی ہے۔ اور ہم نے تم کو تو بس اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ کہہ دو کہ میری طرف تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو کیا تم اپنے کو اسی کے حوالہ کرتے ہو۔ پس اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دو کہ میں نے تم سب کو یکساں طور پر خبردار کر دیا ہے، اب میں یہ نہیں جانتا کہ وہ وقت قریب ہے یا دور ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ بے شک وہی جانتا ہے کھلی بات کو بھی اور اس بات کو بھی جس کو تم چھپاتے ہو اور مجھے نہیں معلوم، شاید یہ فرصت تمھارے لیے ایک آزمائش اور فائدہ اٹھا لینے کی ایک مہلت ہو۔ ۱۰۵-۱۱۱

اس نے دعا کی، اے میرے پروردگار! حق کے ساتھ فیصلہ کر دے! اور ہمارا رب رحمان ہی

ہے جس سے مدد کی درخواست ہے ان باتوں کے مقابل میں جو تم بیان کرتے ہو! ۱۱۲

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَآ اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (۹۵)

حذف کا ایک اسلوب اور فعل فیصلۂ فعل کے مفہوم میں

اس آیت میں عربی کے معروف اسلوب کے مطابق ایک جزو حذف ہے جس کی وضاحت اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ کے جملہ نے کر دی ہے۔ پوری بات کو کھول دیجیے تو یوں ہوگی وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَآ اَنْ یَّرْجِعُوْا اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اور اس میں فعل 'اَھْلَکْنَا' فیصلۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔ بسا اوقات جب کسی امر کی قطعیت کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں گویا وہ واقع ہو چکا۔ رجوع کے معنی یہاں باطل سے حق کی طرف رجوع کرنے کے ہیں۔

اشرارِ قریش سے اعراض کی ہدایت

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اشرارِ قریش کے زیادہ درپے ہونے سے روکا گیا ہے کہ اب یہ لوگ سنتِ الٰہی کی زد میں آ چکے ہیں۔ جس طرح پچھلی قومیں جو ہلاک ہوئیں، لاکھ جتن کرنے کے باوجود ایمان نہیں لائیں، اسی طرح اب ان لوگوں کے لیے ایمان میں داخل ہونا حرام ہو چکا ہے اور ان کی ہٹ دھرمی کی پاداش میں ان کے لیے عذابِ الٰہی مقدر ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان لوگوں کا زیادہ غم نہ کھاؤ، ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ یہی مضمون اسی سورہ کی آیت ۶ میں یوں بیان ہوا ہے۔

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَھُمْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا اَفَھُمْ یُؤْمِنُوْنَ۔	ان سے پہلے کوئی قوم بھی جو ہلاکت کی زد میں آئی ایمان لانے والی نہ بنی تو کیا ان سے توقع رکھتے ہو کہ یہ ایمان لانے والے بنیں گے!

حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ (۹۶)

یاجوج و ماجوج کا غلبہ آثارِ قیامت میں سے ہے

یاجوج ماجوج پر مفصل بحث سورۂ کہف کی آیات ۹۸-۹۹ کے تحت گزر چکی ہے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہورِ قیامت کے وقت یاجوج ماجوج ہر طرف سے اُبل پڑیں گے اور ساری دنیا فساد سے بھر جائے گی۔ اس کی صورت کیا ہوگی؟ یہ چیز متشابہات میں سے ہے اور متشابہات کی اصل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے۔ یہاں مقصود اس کے ذکر سے صرف یہ دکھانا ہے کہ آج جو لوگ قرآن پر ایمان لانے کے لیے مختلف قسم کی نشانیوں اور عذاب کے مشاہدہ کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کے پیچھے اب پیغمبر کو اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے۔ یہ لوگ عقل و فطرت کے ان دلائل سے رام ہونے والے نہیں ہیں جو قرآن ان کے سامنے پیش کر رہا ہے بلکہ یہ اسی وقت ایمان لائیں گے جب قیامت ان کے سر پر آن کھڑی ہوگی اور جس وقت ایمان لانا یا نہ لانا دونوں یکساں ہوگا۔

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ (۹۷)

قیامت سر پر کھڑی ہے

یعنی یہ جس وعدۂ قیامت کو بہت دور کی بات سمجھ رہے ہیں وہ بہت دور نہیں بلکہ اس کے ظہور کا وقت بہت قریب آچکا ہے۔ سورۂ معارج میں فرمایا ہے اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا وَّنَرَاهُ قَرِيبًا (وہ اس کو بہت دور خیال کر رہے ہیں لیکن ہم اس کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں) انسان ہر چیز کو اپنے چھوٹے پیمانوں سے ناپتا ہے اس وجہ سے اسے قیامت بہت دور معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ خدائی دنوں کے اعتبار سے وہ بالکل سر پر کھڑی ہے۔ یہی مضمون اس سورہ کی پہلی آیت میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس کے بعض دوسرے پہلو بھی واضح کیے ہیں۔ ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

'فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا' یعنی وہ اچانک آدھمکے گی اور اس کا منظر ایسا ہولناک ہوگا کہ آج جو لوگ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس کا مطالبہ کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں ان کی آنکھیں ٹنگی رہ جائیں گی۔ یہ خوف اور دہشت زدگی کی تصویر ہے۔ انسان جب کوئی ہولناک چیز اچانک دیکھتا ہے تو ہکا بکا ہو کر اس کو دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔

قیامت کے معاملہ میں اصل حجاب

'يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ' یہ اس وقت کی ان کی زبانِ حال کی تعبیر ہے اس وجہ سے یہاں 'قَالُوا' حذف کر دیا۔ فرمایا کہ وہ اس وقت خود بول اٹھیں گے کہ بے شک ہم خود ایک شدنی حقیقت سے غفلت میں پڑے رہے۔ 'بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ' یعنی یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہم کو کوئی اس غفلت سے بیدار کرنے والا نہ آیا ہو۔ اللہ نے بیدار کرنے والے بھی بھیجے جنھوں نے ہمیں جگانے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا لیکن ہم خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے کہ ان کی تنبیہات کا مذاق اڑاتے رہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قیامت کے معاملہ میں اصل حجاب یہ نہیں ہے کہ اس کی کوئی مسکت دلیل نہیں ہے بلکہ اصلی حجاب انسان کی غفلت ہے۔ وہ ایک حقیقت کو، اس کے دلائل کی وضاحت کے باوجود، ماننا نہیں چاہتا اس لیے کہ اس کو ماننا اس کی خواہشوں کے خلاف ہے۔ ایسی حالت میں واحد چیز جو اس کو سہارا دیتی ہے وہ اس کی غفلت ہے۔ وہ غفلت میں پڑا ہوا اس کے لیے کسی اہتمام کو برابر ٹالتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن وہ اس کے سر پر آدھمکے گی۔

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ (۹۸)

اصنام اور ان کے پجاری دونوں جہنم میں

یعنی اس وقت ان کا یہ اعتراف ان کے لیے کچھ کارآمد نہ ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ تم اور تمھارے یہ تمام اصنام و احجار، جن کو تم معبود بنا کے پوجتے رہے ہو سب جہنم کا ایندھن بنو گے۔ 'أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ' یعنی اب روؤ یا فریاد کرو، تمھیں بہرحال ہلاکت کے اس گھاٹ پر اترنا ہے۔ اب اس سے مفر نہیں ہے۔

'وَمَا تَعْبُدُوْنَ' میں 'مَا' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں اس سے مراد وہ اصنام و احجار ہیں جن کی مشرکین عرب پرستش کرتے تھے۔ 'مَا' کا استعمال بے جان چیزوں ہی کے لیے معروف ہے۔ ان کو جہنم کا ایندھن بنانے سے مقصود ظاہر ہے کہ ان پتھروں کو سزا دینا نہیں بلکہ ان کے پجاریوں کو یہ دکھانا ہے کہ جن کو معبود سمجھ کر ان کے آگے وہ ڈنڈوت کرتے رہے ہیں ان کی یہاں کیا گت بن رہی ہے۔ مشرکین عرب جن فرشتوں یا جنوں کی پوجا کرتے تھے مثلاً لات، عزیٰ، منات اور ہبل وغیرہ اول تو یہ ان کے اپنے رکھے ہوئے فرضی نام تھے جن کا کوئی مسمّٰی سرے سے موجود ہی نہیں تھا پھر ان کی پوجا بھی وہ پتھروں کی مورتوں ہی کی شکل میں کرتے تھے۔ بعض مشرک قومیں جو انبیاء اور صالحین کی پرستش کرتی ہیں ان کا انجام یہاں زیرِ بحث نہیں ہے۔ ان کے معاملات کی تفصیل قرآن کے دوسرے مقامات میں آئی ہے۔ مثلاً عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریمؑ کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کے خلاف سیدنا مسیحؑ قیامت کے دن جو گواہی دیں گے اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح دوسرے انبیاء و صالحین بھی قیامت کے دن اپنے پجاریوں سے اعلانِ براءت کر دیں گے کہ ہمیں کیا خبر کہ تم ہماری پوجا کرتے رہے ہو! اگر تم نے یہ حماقت کی ہے تو اب اس کی سزا بھگتو! ہم نے تم سے کب کہا تھا کہ تم ہماری عبادت کرو۔

لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۹۹)

اصنام کو جہنم میں ڈالنے کا مقصد

یہ وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے یہ اصنام و احجار جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ ان کو جہنم میں ڈالنے سے اصل مقصود ان کے پوجنے والوں کو یہ دکھانا ہے کہ اگر یہ معبود ہوتے تو ان کی یہ درگت نہ بنتی! یہ ان کی تذلیل کی آخری حد ہوگی کہ جو ان کی تمام امیدوں کا آخری مرجع تھے ان کو وہ اپنی ہی طرح بے بس و مجبور اور گرفتارِ عذاب پائیں گے۔ 'وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ' یعنی یہ عابد و معبود سب ہمیشہ ہمیش کے لیے اسی جہنم میں اکٹھے رہیں گے۔ قرینہ دلیل ہے کہ اس بات کا پہلا ٹکڑا تو ان کو مخاطب کر کے کہا جائے گا اور دوسرا ٹکڑا ان کے اس انجامِ ابدی کا اعلان ہے۔

لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ (۱۰۰)

اگر التباس نہ ہو تو انتشارِ ضمیر عیب نہیں بلکہ ایجاز ہے

'زَفِيْرٌ' کے معنی آہ و فریاد اور چیخنے چلانے کے ہیں۔ اور ضمیر 'هُمْ' پہلے جملے میں میرے نزدیک پجاریوں کے لیے ہے اور دوسرے جملے میں ان کے اصنام و احجار کے لیے۔ اگرچہ اس صورت میں بظاہر انتشارِ ضمیر ہے لیکن انتشارِ ضمیر، جیسا کہ ہم جگہ جگہ مثالوں کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں، عیب صرف اس صورت میں ہے جب مرجع میں التباس کا اندیشہ ہو۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہو، مرجع کے تعین کے لیے واضح قرینہ موجود ہو، تو یہ عیب نہیں بلکہ ایجاز کے پہلو سے یہ کلام کا حسن ہے۔ یہاں التباس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ پجاری تو جہنم میں چیختے چلاتے اور آہ و فریاد کرتے ہوں گے اور ان بے حس پتھروں کو، جن کو انھوں نے معبود بنا کر پوجا، خبر بھی نہ ہوگی کہ کوئی آہ و فریاد کر رہا ہے اور ان سے مدد کا طالب ہے۔ یہ مضمون قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے کہ جہنمی مدد کے لیے فریاد کریں گے لیکن کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسرے

ٹکڑے میں ضمیر اور فعل دونوں وہ استعمال ہوئے ہیں جو ذی عقل ہستیوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو ان کا استعمال اصنام و احجار کے لیے کس طرح موزوں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضمیر اور فعل پجاریوں کے تصور کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں۔ ان پتھروں کو وہ چونکہ اپنا فریاد رس اور معبود خیال کرتے تھے اس وجہ سے یہ اسلوب بیان اختیار فرمایا گیا۔ اس کی مثالیں کلام عرب اور قرآن مجید میں بہت ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ (۱۰۱)

اچھے انجام والوں کے لیے بشارت

'حُسْنٰی' کا موصوف یہاں محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے لیے اچھے انجام کا وعدہ ہماری طرف سے پہلے سے ہو چکا ہے وہ لوگ البتہ اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ اس اچھے انجام کا وعدہ آیت ۹۴ میں گزر چکا ہے۔ وہاں فرمایا ہے کہ 'جو لوگ ایمان پر قائم رہتے ہوئے عمل صالح کریں گے' اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کی ناقدری نہیں کرے گا بلکہ ان کے ایک ایک عمل کو وہ نوٹ کیے ہوئے ہے اور ان کے ہر عمل کا ان کو بھرپور صلہ ملنے والا ہے۔

لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا ۖ وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ (۱۰۲)

ایک غلط خیال کی تردید

یعنی وہ اس جہنم سے اتنے دور رکھے جائیں گے کہ ان کو اس کی آہٹ بھی سنائی نہیں دے گی۔ اس آیت سے ان لوگوں کے خیال کی نہایت واضح الفاظ میں تردید ہو رہی ہے جو سورۂ مریم کی آیت ۷۱ 'وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا' کے خطاب کو صحیح طور پر معین نہ کرنے کے سبب سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ العیاذ باللہ ایک مرتبہ تمام اہل ایمان کو بھی جہنم سے گزرنا پڑے گا۔ ہم نے سورۂ مریم کی آیت مذکورہ کے خطاب کو متعین کر دیا ہے اور آیت زیر بحث کی روشنی میں مفسرین کے اس عام خیال کی تردید کر کے دونوں آیتوں کی باہمی موافقت واضح کر دی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

جنت کے اندر تنوع کی آزادی

'وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ'۔ عیش، جنت ہی کا عیش سہی، اگر انسان کو اس کے اندر اپنے حسب منشا تغیر و تبدل کی آزادی حاصل نہ ہو تو اس کی یکسانی اس کو افسردہ کر دے گی اور وہ اس سے اکتا کر جی بہلانے کے لیے کسی دوسرے ماحول کا طالب ہو گا۔ انسان ایک ذی ارادہ و اختیار ہستی ہے اس وجہ سے بڑے سے بڑے عیش کو بھی وہ اپنی ہی شرائط پر پسند کرتا ہے۔ اس کی فطرت کے اس تقاضے کی رعایت سے اللہ تعالیٰ نے اپنے باایمان بندوں کے لیے جنت بھی ایسی بنائی ہے جس میں وہ اپنی پسند کے مطابق جس طرح کا تنوع چاہیں گے پیدا کر لیں گے۔ ان کی کسی خواہش میں کوئی ادنیٰ رکاوٹ بھی حائل نہیں ہو گی۔ ظاہر ہے کہ یہ عیش دوام اور اس کے اندر حسب منشا تنوع اور رنگا رنگی پیدا کرنے کی یہ آزادی اس دنیا میں ہفت اقلیم کے کسی شاہنشاہ کو بھی نہ حاصل ہوئی، نہ حاصل ہو سکتی۔ اسی حقیقت کو دوسرے مقام میں یوں واضح فرمایا ہے کہ 'لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا' (اہل جنت اپنی جنت سے ٹلنے کا نام بھی نہیں لیں گے)

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ (۱۰۳)

ابدی بادشاہی کی بشارت

'فَزَعِ اکبر' سے مراد وہ عظیم ہلچل اور گھبراہٹ ہے جو نفخ صور کے بعد تمام کائنات میں برپا ہوگی اور جس کی ہولناک تصویر قرآن نے جگہ جگہ کھینچی ہے۔ خصوصاً آخری گروپ کی سورتوں میں تو قرآن کے اعجاز بیان نے اس طرح اس کو مصور کر دیا ہے کہ انسان دیدۂ بینا رکھتا ہو تو اس کو آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ اوپر آیت ۹۷ بھی اسی کی طرف فَاِذَا ہِیَ شَاخِصَۃٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کے الفاظ سے اشارہ کر رہی ہے۔ فرمایا کہ یہ عظیم ہلچل کا دن ہمارے باایمان بندوں کے لیے ذرا بھی اضطراب کا باعث نہیں بنے گا بلکہ اس دن ہمارے فرشتے اہلاً و سہلاً اور مرحبا کے نعروں سے ان کا استقبال کریں گے اور ان کو بشارت دیں گے کہ ابدی کامرانیوں کے جس مبارک دن کا، نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے، آپ لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا وہ آگیا۔ اب آپ لوگوں کو ابدی بادشاہی مبارک ہو!!

یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ ۚ کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ ۚ وَعْدًا عَلَیْنَا ۚ اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیْنَ (۱۰۴)

'سجل' اور 'کتب' کا مفہوم

'سجل' اس دفتر یا طومار یا فائل کو کہتے ہیں جس میں لکھے ہوئے اوراق محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔ 'کتب' یہاں اوراق نوشتہ کے معنی میں ہے۔ 'اَوَّلَ خَلْقٍ' ظرف کے محل میں ہے۔ اسی مضمون کو ادا کرنے کے لیے قرآن میں بعض جگہ 'اَوَّلَ مَرَّۃٍ' کا لفظ بھی آیا ہے۔

نئے آسمان اور نئی زمین

مطلب یہ کہ یہ سب کچھ اس دن ہوگا جس دن ہم اس پھیلے ہوئے آسمان کی بساط اس طرح لپیٹ کر رکھ دیں گے جس طرح طومار میں کاغذات لپیٹ کر رکھ دیے جاتے ہیں اور جس طرح ہم نے پہلی بار آسمان و زمین پیدا کیے اسی طرح ان کی جگہ نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ، نئے آسمان و زمین پیدا کریں گے۔ 'وَعْدًا عَلَیْنَا' میں مصدر تاکید کے لیے ہے۔ یعنی یہ ہمارے ذمہ ایک حتمی وعدہ ہے۔ ہم نے اپنے نیک بندوں سے، جیسا کہ اوپر والی آیت کے الفاظ 'کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ' میں اشارہ ہے، اس کا قطعی وعدہ کر رکھا ہے جس کا ایفا ہماری ذمہ داری ہے۔ 'اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیْنَ' یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ محض ہوائی باتیں ہیں جو ہم کر نہیں سکیں گے یا نہیں کریں گے۔ یہ ہم ضرور کریں گے، اس کا ہم نے پہلے سے فیصلہ کر رکھا ہے اور یہ ہمارے لیے ایک نہایت آسان بات ہے۔

وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُہَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (۱۰۵)

زمین کے وارث صالحین ہوں گے

اس آیت میں زبور کا حوالہ ہے۔ زبور میں یہ بات یوں تو جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ زمین کے وارث خدا کے نیک بندے ہی ہوں گے لیکن باب ۳۷ تو پورے کا پورا گویا صرف اسی ایک حقیقت کی وضاحت کے لیے مخصوص ہے اس وجہ سے ہم یہ پورا باب یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ قرآن کے حوالہ کی صحت و صداقت بھی واضح ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ زمین کی وراثت سے یہاں کس زمین کی وراثت مراد ہے، نیز 'مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ' کا صحیح مفہوم بھی متعین ہو سکے کہ 'ذکر' سے یہاں کس چیز کی طرف اشارہ ہے۔ پہلے ہم زبور سے حضرت داؤد کا

زبور نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی ان باتوں کی طرف اشارہ کریں گے جو آیت زیر بحث کی وضاحت کے لیے خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

زبور کا باب ۳۷

• تو بدکرداروں کے سبب سے بیزار نہ ہو
اور بدی کرنے والوں پر رشک نہ کر
کیونکہ وہ گھاس کی طرح جلد کاٹ ڈالے جائیں گے
اور سبزہ کی طرح مرجھا جائیں گے۔
خداوند پر توکل کر اور نیکی کر۔
ملک میں آباد رہ اور اس کی وفاداری سے پرورش پا۔
خداوند میں مسرور رہ
اور وہ تیرے دل کی مرادیں پوری کرے گا۔
اپنی راہ خداوند پر چھوڑ دے
اور اس پر توکل کر۔ وہی سب کچھ کرے گا۔
وہ تیری راست بازی کو نور کی طرح
اور تیرے حق کو دوپہر کی طرح روشن کرے گا۔
خداوند میں مطمئن رہ اور صبر سے اس کی آس رکھ۔
اس آدمی کے سبب سے جو اپنی راہ میں کامیاب ہوتا
اور برے منصوبوں کو انجام دیتا ہے بیزار نہ ہو۔
قہر سے باز آ اور غضب کو چھوڑ دے۔
بیزار نہ ہو۔ اس سے برائی ہی نکلتی ہے۔
کیوں کہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے
لیکن جن کو خداوند کی آس ہے ملک کے وارث ہوں گے۔
کیونکہ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا۔
تو اس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا پر وہ نہ ہوگا۔
لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے۔
اور سلامتی کی فراوانی سے شادمان رہیں گے۔
شریر راست باز کے خلاف بندشیں باندھتا ہے
اور اس پر دانت پیستا ہے۔

خداوند اس پر ہنسے گا
کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اس کا دن آتا ہے۔
شریروں نے تلوار نکالی اور کمان کھینچی ہے
تاکہ غریب اور محتاج کو گرا دیں۔
اور راست رو کو قتل کریں۔
ان کی تلوار ان ہی کے دل کو چھیدے گی
اور ان کی کمانیں توڑی جائیں گی۔
صادق کا تھوڑا سا مال
بہت سے شریروں کی دولت سے بہتر ہے
کیونکہ شریروں کے بازو توڑے جائیں گے۔
لیکن خداوند صادقوں کو سنبھالتا ہے۔
کامل لوگوں کے ایام کو خدا جانتا ہے۔
ان کی میراث ہمیشہ کے لیے ہوگی۔
وہ آفت کے وقت شرمندہ نہ ہوں گے
اور کال کے دنوں میں آسودہ رہیں گے۔
لیکن شریر ہلاک ہوں گے۔
خداوند کے دشمن چراگاہوں کی سرسبزی کی مانند ہوں گے۔
وہ فنا ہو جائیں گے۔ وہ دھوئیں کی طرح جاتے رہیں گے۔
شریر قرض لیتا ہے اور ادا نہیں کرتا:
لیکن صادق رحم کرتا ہے اور دیتا ہے
کیونکہ جن کو وہ برکت دیتا ہے وہ زمین کے وارث ہوں گے۔
اور جن پر وہ لعنت کرتا ہے وہ کاٹ ڈالے جائیں گے۔
انسان کی روشیں خداوند کریم کی طرف سے قائم ہیں
اور وہ اس کی راہ سے خوش ہے۔
اگر وہ گر بھی جائے تو پڑا نہ رہے گا
کیونکہ خداوند اسے اپنے ہاتھ سے سنبھالتا ہے۔
میں جوان تھا اور اب بوڑھا ہوں

تو بھی میں نے صادق کو بے کس
اور اس کی اولاد کو ٹکڑے مانگتے نہیں دیکھا۔
وہ دن بھر رحم کرتا ہے اور قرض دیتا ہے
اور اس کی اولاد کو برکت ملتی ہے۔
بدی کو چھوڑ دے اور نیکی کر
اور ہمیشہ تک آباد رہ۔
کیونکہ خداوند انصاف کو پسند کرتا ہے
اور اپنے مقدسوں کو ترک نہیں کرتا۔
وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں۔
پر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔
صادق زمین کے وارث ہوں گے
اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔
صادق کے منہ سے دانائی نکلتی ہے
اور اس کی زبان سے انصاف کی باتیں۔
اس کے خدا کی شریعت اس کے دل میں ہے۔
وہ اپنی روش میں پھسلے گا نہیں۔
شریر صادق کی تاک میں رہتا ہے
اور اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔
خداوند اسے اس کے ہاتھ میں نہیں چھوڑے گا
اور جب اس کی عدالت ہو تو اسے مجرم نہ ٹھہرائے گا۔
خداوند کی آس رکھ اور اسی کی راہ پر چلتا رہ
اور وہ تجھے سرفراز کر کے زمین کا وارث بنائے گا۔"

اس مزمور کے بعض نمایاں پہلو

ہمارے نزدیک زبور کے اسی مزمور کا قرآن نے یہاں حوالہ دیا ہے۔ اس مزمور پر غور کیجیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اس کی نوعیت ایک ترکیب بند کی ہے جس میں پہلے موعظت و نصیحت کی باتیں آتی ہیں پھر بار بار ایک ترجیع یا ٹیپ کے بند کی طرح یہ بات آتی ہے کہ زمین اور ملک کے وارث خدا کے نیک اور متقی بندے ہوں گے؛ یہ اسلوب کلام قرآن کی سورۂ رحمٰن کے اسلوب سے مشابہ ہے جس میں فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کی ترجیع ہے۔ خط کشیدہ فقروں پر نگاہ ڈالیے تو یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ یہاں صالحین و متقین کے لیے زمین کی

جس وراثت کا ذکر ہے اس کے ساتھ یہ بشارت بھی ہے کہ یہ وراثت ابدی ہوگی۔ مثلاً فرمایا ہے "ان کی میراث ہمیشہ کے لیے ہوگی" دوسری جگہ ہے "اور ہمیشہ تک آباد رہ" تیسری جگہ ہے "وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں" چوتھی جگہ نہایت واضح الفاظ میں ہے "اور صادق زمین کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے"[1]

ظاہر ہے کہ یہ ابدی وراثت کی بشارت اس زمین سے متعلق نہیں ہے جس پر ہم اور آپ آباد ہیں۔ اس کی نہ کوئی چیز ابدی ہے اور نہ اس کی وراثت صالحین و متقین کے لیے مخصوص ہے بلکہ یہ زمین اور اس کی ہر چیز فانی ہے اور اس میں نیکوں اور بدوں دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک مدت تک کے لیے یکساں مہلت بخشی ہے۔ جس کے بعد یہ آسمان و زمین دونوں فنا ہو جائیں گے اور نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ ایک جہانِ نو پیدا ہوگا جس کی ابدی وراثت صالحین و متقین کو حاصل ہوگی اور اہلِ باطل جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔

جہانِ نو کی وراثت صرف صالحین کو حاصل ہوگی — بعینہٖ یہی بات قرآن سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ اوپر کی آیت ۱۰۴ میں صاف تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک دن اس آسمان کی بساط لپیٹ کر رکھ دے گا۔ سورۂ ابراہیم آیت ۴۸ میں آسمان و زمین دونوں سے متعلق یہ تصریح ہے کہ یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ وَالسَّمٰوٰتُ (اس دن کو نگاہ میں رکھو جس دن زمین دوسری زمین سے اور آسمان دوسرے آسمان سے بدل دیے جائیں گے) اس بدلے ہوئے آسمان و زمین کے اندر بلاشبہ یہ قانون ہوگا کہ ان کی ابدی وراثت و بادشاہی صرف صالحین کو حاصل ہوگی نافرمانوں کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ یہ بات صرف زبور اور قرآن ہی سے نہیں بلکہ تمام آسمانی صحیفوں اور تمام نبیوں اور رسولوں کی تعلیم سے ثابت ہے۔

اسی حقیقت کو قرآن نے آیت زیرِ بحث میں زبور کے حوالہ سے واضح فرمایا ہے۔ زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر اترے ہوئے نغماتِ الٰہی کا مجموعہ ہے۔ حضرت داؤدؑ، جیسا کہ اسی سورہ میں بیان ہوا ہے، نبی بھی تھے اور اس زمین کے ایک جلیل القدر بادشاہ بھی۔ ایک بادشاہ کی زبان ہی سے یہ اعلان سب سے زیادہ موزوں ہو سکتا تھا کہ زمین کے حقیقی اور آخری وارث صرف اللہ کے نیک بندے ہی ہوں گے جب ایک صاحبِ جبروت بادشاہ اس حقیقت کی منادی کر گیا ہے تو کسی دوسرے کے لیے اس میں مجالِ سخن کہاں باقی رہی!!

آیت کے اجزا پر ایک نظر — اس وضاحت کے بعد اب آیت زیرِ بحث کے اجزا پر غور کیجیے۔

'وَلَقَدۡ کَتَبۡنَا فِی الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّکۡرِ' اوپر زبور کے باب ۳۷ کے حوالہ سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ قرآن نے یہاں زبور کی جس تعلیم کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس کے ایک مستقل باب میں نہایت تفصیل کے ساتھ، نہایت مؤثر انداز میں بیان ہوئی ہے اور یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ اسلوبِ بیان یہ اختیار فرمایا گیا ہے کہ اصل بات ترجیع و تکرار کے ساتھ اس طرح کہی گئی ہے کہ ہر بار اصل بات سے پہلے حکمت و موعظت

[1] ملاحظہ ہوں مزمور کے اندر خط کشیدہ فقرے۔

کی نہایت اعلیٰ باتوں کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اسی چیز کی طرف قرآن نے مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ اس اشارے کی اہمیت یہ ہے کہ وہ حقیقت یہی نصیحتیں ہیں جن پر عمل زمین کی ابدی بادشاہی کا ضامن ہے۔

'أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ' یہ وہ اصل بات ہے جس کے لیے قرآن نے زبور کا حوالہ دیا ہے۔ زبور کے حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ یہاں زمین سے مراد اس جہانِ نو کی زمین ہے جو قیامت کے بعد وجود میں آئے گی اور جس کے مالک و وارث بلا شرکت غیرے صرف اللہ کے نیکوکار بندے ہوں گے۔

إِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ (۱۰۶)

لفظ 'بَلَاغ' یہاں منادی عام اور بشارت عام دونوں کے مضمون کا حامل ہے اور لفظ کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کا یہ فیصلہ کہ زمین کے وارث صرف خدا کے نیکوکار بندے ہی ہوں گے اس کے عبادت گزار بندوں کے لیے ایک عظیم اعلانِ بشارت ہے تو جس کو بازی کھیلنی ہو اس کے لیے بازی کھیلے، اس حیاتِ چند روزہ کے پیچھے اپنی ابدی بادشاہی کو کیوں ضائع کرے!

وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۰۷)

یعنی اسی انذار و بشارت کے لیے ہم نے تمھیں لوگوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے کہ ان کو اس حقیقت سے آگاہ کر دو۔ تمھارے اوپر ذمہ داری صرف بلاغ اور منادی کی ہے، تم یہ فرض ادا کر دو۔ اگر مغرور و سرکش لوگ تمھارے انذار کا مذاق اڑاتے اور اس وقت موعود کے دکھا دینے کا مطالبہ کرتے ہیں تو تم ان سے کہہ دو کہ مجھے خدا نے رحمت بنا کر بھیجا ہے، عذاب بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ عذاب کب آئے گا۔ اس کے وقت کا علم صرف میرے رب ہی کو ہے۔

قُلْ إِنَّمَا يُوْحٰٓى إِلَيَّ أَنَّمَآ إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۰۸)

تم ان کو خبردار کر دو کہ مجھ پر جو وحی آئی ہے وہ یہ ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، کوئی اور اس کا شریک و سہیم نہیں ہے تو کسی اور کے اعتماد پر اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ کوئی دوسرا تمھیں خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکے گا۔

'فَهَلْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ' میں نہایت زوردار تنبیہ ہے کہ بتاؤ تم اپنے آپ کو اسی ایک قادر و قیوم کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ میرا جو فرض تھا وہ میں نے ادا کر دیا، اب ذمہ داری تمھاری ہے۔ اگر تم اپنی اسی ضد پر اڑے رہے اور اپنے خرکار و شعفار کے بل پر میری بات کا مذاق اڑاتے رہے تو میں بری الذمہ ہوا۔ اب نتائج کی ذمہ داری تمھارے اوپر ہے!!

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَإِنْ أَدْرِيْٓ أَقَرِيْبٌ أَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ (۱۰۹)

فیصلہ کن تنبیہ — یعنی اگر یہ تمھاری اس فیصلہ کن تنبیہ کے بعد بھی اپنی اسی اعراض کی روش پر جمے رہیں تو ان سے کہہ دو

کہ میں نے تمہارے بڑے اور چھوٹے، لیڈر اور پیرو، امیر اور غریب سب کو بلا فرق و تمیز آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا۔ اب تم میں سے کوئی یہ عذر نہیں کر سکتا کہ اس کو خبردار نہیں کیا گیا۔ رہی یہ بات کہ جس خطرے سے میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں اس کے ظہور کا وقت قریب ہے یا بعید تو اس کا علم مجھے بھی نہیں ہے۔ اس کا صحیح علم صرف اس خدا ہی کو ہے جس کے حکم سے میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔

إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ (۱۱۰)

تفویض الی اللہ یہ نہایت جامع اور بلیغ کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تمہاری کھلی باتوں کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ تم اپنے پیٹوں میں چھپائے ہوئے ہو اس کو بھی جانتا ہے تو معاملہ اسی کے حوالہ ہے جو اس کی حکمت کا تقاضا ہو گا وہ وہی کرے گا۔ وہ جانتا ہے کہ تم مجھ سے کیا مطالبہ کر رہے ہو اور تمہارے اس مطالبے کی تہ میں کیا چیز چھپی ہوئی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے وہ اس وجہ سے نہیں کر رہے تھے کہ فی الواقع وہ عذاب قیامت کو ناممکن یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا سمجھتے تھے بلکہ وہ محض آپ کو زچ کرنے اور اپنے عوام کو دھوکا دینے کے لیے ایسا کرتے تھے۔ اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ خدا تمہارے دلوں کے بھید سے بے خبر ہے، اس پر سب کچھ واضح ہے اس وجہ سے مجھے تمہارے اس مطالبے سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس کے علم اور اس کی حکمت پر پورا اعتماد ہے۔

وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ (۱۱۱)

'لَعَلَّهُ' میں ضمیر کا مرجع وہ تاخیر وعدہ ہے جس کا اشارہ اوپر والی آیت میں ہے یعنی یہ عذاب کا وعدہ جو مؤخر ہو رہا ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس تاخیر میں کیا بھید ہے۔ اس بھید کو خدا ہی جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تمہارے لیے ایک آزمائش ہو کہ خدا کی حجت تم پر اچھی طرح تمام اور تمہارا پیمانہ خوب بھر جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ابھی کچھ اور کھانے پینے کی مہلت دینا چاہتا ہو۔ بہر حال جو سبب بھی ہو اس مہلت پر مغرور ہونے کے بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔ اگر پہلی صورت ہے تو توبہ کے لیے جلدی کرو اور اگر دوسری صورت ہے تو شکر کی روش اختیار کرو۔

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ۗ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُونَ (۱۱۲)

دعا اور وداع یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا بھی ہے اور مخالفین کو وداع بھی۔

اللہ تعالیٰ سے آپ نے یہ دعا فرمائی کہ اے رب اب اس کشمکش کا تو حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور مخالفین کو آپ نے اس طرح وداع کیا کہ تم جو کچھ کہتے اور کرتے ہو میں اس کے مقابل میں اپنے رب رحمان ہی سے مدد کا طالب ہوں اس لیے کہ مستعان حقیقی وہی ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد ـــــــ ۱۸ مارچ ۱۹۷۳ء

تدبّرِ قرآن

۲۲

الحج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور زمانۂ نزول

یہ سورہ مکی دور کی اُن آخری سورتوں میں سے ہے جب مسلمانوں نے قریش کے ظلم و ستم سے تنگ آکر دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت شروع کر دی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی ہجرت کا وقت بالکل قریب آچکا تھا۔ اس دور میں قریش کے لیے آخری انذار و تنبیہ کے ساتھ یہ سورہ نازل ہوئی۔ اس میں ان کو خدا کے غضب سے ڈرایا گیا، توحید اور قیامت کی قطعیت نہایت مؤثر دلائل کے ساتھ واضح کی گئی اور حضرت ابراہیم کی دعوت اور بیت اللہ کے مقصد تعمیر کی روشنی میں ان پر یہ حقیقت واضح کی گئی کہ اس گھر کی تولیت کے اصل حقدار مشرکین نہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جن کو انھوں نے اس سے محروم کر رکھا ہے اور ان کو یہاں سے نکالنے کے لیے ان پر ہر قسم کے ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں۔ فتح مکہ کی طرف اشارہ تو پچھلی سورہ کی آیت ۴۴ میں بھی گزر چکا ہے، اس سورہ میں اس اشارے نے بالکل قطعی فیصلہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس میں قریش کو غدار اور غاصب قرار دے کر ان کو اس گھر سے بے دخل کیے جانے کی دھمکی اور مسلمانوں کو بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا اور قریش کو اس سے بے دخل کر کے ان کو اس کا امین و متولی بنائے گا۔

یہ سورہ مکی ہے

یہ سورہ اپنے مزاج و مطالب کے اعتبار سے مکی ہے۔ اس کی صرف چار آیات (۳۸-۴۱) ہجرت کے بعد کی ہیں جن میں مسلمانوں کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ اگر وہ حج کے لیے جائیں اور کفار قریش ان کو بزور روکنے کی کوشش کریں تو ان کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مدافعت میں تلوار اٹھائیں۔ اللہ ان کی مدد فرمائے گا۔ یہ بات چونکہ اوپر والی بات ہی کی وضاحت کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے مصحف کی ترتیب میں ان آیات کو یہاں جگہ ملی تاکہ اس اجازت کی حکمت واضح ہو جائے کہ مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کا یہ حق اس لیے حاصل ہے کہ قریش کا خانہ کعبہ پر تسلط بالکل غاصبانہ ہے۔ اس کی تولیت کے اصلی حق دار مسلمان ہیں نہ کہ قریش۔

انھی چند آیات کی بنا پر ہمارے مفسرین نے، اس سورہ کے مکی یا مدنی ہونے کے باب میں، اختلاف کیا ہے۔ لیکن کسی مکی سورہ میں چند مدنی آیتیں داخل ہو جانے سے، جب کہ ان آیات کی نوعیت بھی محض توضیحی آیات کی ہو، پوری سورہ کو مدنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بعض مدنی آیات سورۂ مزمل میں بھی ہیں حالانکہ وہ بالاتفاق مکی ہے ہم آگے ان آیات کی تفسیر میں واضح کریں گے کہ ان کی حیثیت اجمال کے بعد تفصیل کی ہے۔ ایک بات جو مکی زندگی

کے آخری دور میں فرمائی گئی تھی جب مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں اس کی تفصیل نازل ہوئی تو اجمال اور تفصیل دونوں کو ایک ساتھ رکھ دیا گیا۔ صاحب کشاف نے بھی اس سورہ کو باستثنائے چند آیات، مکی ہی قرار دیا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) مخالفین قرآن کو انذار کہ خدا کی پکڑ اور قیامت کا عذاب بڑی ہی ہولناک چیز ہے۔ بغیر کسی دلیل کے خدا کے شریک و شفیع گمان کر کے، قیامت سے بے پروا ہو بیٹھنا اور شیطان کی پیروی کرنا اپنی شامت کو دعوت دینا ہے۔ شیطان کا اصلی کام، جس کے لیے خدا نے اس کو مہلت دی ہے، ہدایت دینا نہیں ہے کہ اس کی پیروی کی جائے بلکہ یہ ہے کہ جو شامت زدہ لوگ اس کی پیروی کریں ان کو وہ سیدھے جہنم میں لے جا اتارے۔

(۵-۸) انسان کی خلقت اور زمین کے خشک و بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد از سر نو سرسبز و شاداب، ہو جانے سے امکانِ معاد پر استدلال، یہ واضح کرنے کے لیے کہ جو لوگ قیامت کے باب میں شک میں پڑے ہوئے اور اس سے بے پروا ہیں، نہ خود اپنی خلقت کی نوعیت اور اس کی حکمتوں پر غور کر رہے ہیں اور نہ اس کائنات کے روز مرہ مشاہدات پر، وہ آنکھیں کھولیں اور مشاہدۂ عذاب کے مطالبہ کے بجائے آفاق و انفس کی نشانیوں سے سبق حاصل کریں۔ قیامت کا آنا خدا کی صفات کا ایک بدیہی اور لازمی تقاضا ہے۔ وہ لاریب آکے رہے گی۔

(۹-۱۶) ان لوگوں کی تردید جو اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کے بل پر آخرت سے نچنت اور شرک کی حمایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث و مباحثہ کے لیے ہر وقت آستینیں چڑھائے رہتے۔ اس امر کی وضاحت کہ شرک کے ساتھ خدا کی بندگی کا دعویٰ ایک بالکل لاطائل دعویٰ ہے۔ جو لوگ محض اپنی ظاہری منفعتوں ہی کے حد تک خدا کی بندگی اور اطاعت کرنا چاہتے ہیں، اس راہ میں کوئی امتحان پیش آجائے تو وہیں سے وہ کترا جاتے ہیں اور دوسرے آستانوں پر جبہ سائی شروع کر دیتے ہیں، خدا کے ہاں ایسے دو دلوں اور منافقوں کی کوئی پوچھ نہیں ہے۔ ایسے لوگ خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق ہیں۔ یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر اپنی منفعتوں کی خاطر جن کی طرف بھاگتے ہیں ان کا ضرر ان کی منفعت سے قریب تر ہے۔ نافع و ضار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اگر کوئی خدا سے مایوس ہوتا ہے تو وہ آسمان میں کھونٹی لگا کر اپنی سی کر کے دیکھ لے کہ اس کی کوئی بڑی سے بڑی تدبیر بھی اس مشکل کو حل کرنے والی بنتی ہے!

(۱۷-۲۴) مسلمانوں کو تسلی اور تمام مخالفِ اسلام فرقوں اور گروہوں کو آگاہی کہ ہر ایک کا رویہ خدا کی نظر میں ہے۔ کسی کا کوئی قول و فعل بھی اس سے مخفی نہیں۔ بالآخر ایک دن سب کا معاملہ خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔ ایک طرف وہ لوگ ہوں گے جو آج خدا کی وحدانیت اور اس کے کلمۂ حق کی دعوت دے رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنی بدعتوں سے خدا کے دین کو بگاڑا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا جو شرک و کفر کے مرتکب ہوئے ہوں گے ان سب کو جہنم میں داخل کرے گا اور جو توحید و ایمان پر قائم رہیں گے وہ جنت کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں گے۔

(۲۵-۳۷) اصل ملت ابراہیمؑ اور بیت اللہ کے مقصد تعمیر کی وضاحت تاکہ مشرکین مکہ اور ان کے حامی اہل کتاب پر حقیقت واضح کر دی جائے کہ آج وہ اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمؑ اور بیت اللہ کا جو وارث و متولی سمجھے بیٹھے ہیں اور اس زعم میں خدا کے رسول اور اس کے ساتھیوں پر انھوں نے اس گھر کے دروازے بند کر رکھے ہیں، یہ محض ان کی برخود غلطی اور دھاندلی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس گھر کو اس شرک و بت پرستی کے لیے نہیں بنایا تھا جس کا ایک گڑھ بنا کے اس کو رکھ دیا گیا ہے بلکہ انھوں نے اس کو صرف خدائے واحد کی عبادت اور اسی کے حج و طواف کا مرکز بنایا تھا۔ اسی ضمن میں قربانی اور دوسرے شعائر و مناسک کی اصل روح کی طرف توجہ دلائی گئی تاکہ وراثتِ ابراہیمی کے یہ مدعی اپنا جائزہ لیں کہ حضرت ابراہیمؑ کیا تعلیم دے گئے تھے اور انھوں نے ان کی تعلیم کو کس طرح مسخ کیا ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ آج اللہ کے جو بندے ملتِ ابراہیمؑ کا احیاء کر رہے ہیں ان کو یہ اس گھر سے نکالنے پر تلے ہوئے ہیں۔

(۳۸-۴۱) یہ چار آیتیں مدنی ہیں۔ مسلمان، مدینہ سے ہجرت کر جانے کے بعد جب ایک منظم جماعت بن گئے تب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر وہ حج کے لیے جائیں اور کفار روکیں تو ان کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ یہ سوال اس وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا تھا کہ اشہرِ حُرم اور خاص طور پر حدودِ حرم میں جنگ زمانۂ جاہلیت میں بھی حرام سمجھی جاتی تھی۔ قریش اشہرِ حُرم اور حرم کی اس حرمت کو اپنے لیے ایک سپر بنائے ہوئے تھے اور مسلمان بھی اس حرمت کے منافی کوئی اقدام کرنے کی جرأت اس وقت تک نہیں کر سکتے تھے جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اجازت نہ ملے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ اجازت دے دی کہ اگر اس طرح کی کسی جنگ کی نوبت آئے تو تم بھی جنگ کرو۔ یہ جنگ اشہرِ حُرم یا حرم کی حرمت کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ بیت اللہ کی تطہیر کے لیے ایک مقدس جہاد ہے اور اگر تمھیں قوت حاصل ہو تو بیت اللہ کو اس کے غاصب قابضوں سے آزاد کرانا تمھارا فریضہ ہے۔ ساتھ ہی جہاد کی یہ حکمت بھی واضح فرما دی کہ اگر اس طرح کی جنگ بھی تقویٰ کے منافی سمجھی جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ تمام مساجد، جو اللہ واحد کی عبادت کے لیے تعمیر ہوتیں، کفار و شیاطین کے حوالے کر دی جائیں کہ وہ ان کو ڈھا کر رکھ دیں یا ان کو بت خانہ بنا ڈالیں۔ اس وجہ سے مسلمانوں کو اس جنگ سے نہ ہچکچانا چاہیے نہ مخالفوں کے طعنوں کی پروا کرنی چاہیے۔ اگر اس راہ میں جنگ پیش آئی تو، ان کی قلت تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود، خدائے قوی و عزیز ان کی مدد فرمائے گا تاکہ جب ان کو سرزمینِ حرم میں اقتدار حاصل ہو تو وہ اس کو شرک و کفر کی تمام نجاستوں سے پاک کر کے اس کے ان مقاصد کا احیاء کریں جن کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے ان کو آباد کیا تھا۔

تطہیرِ بیت اللہ کے لیے جہاد کی یہ اجازت چونکہ اسی بات کا ایک لازمی نتیجہ تھی جو اوپر والے پیرے میں بیان ہوئی کہ قریش کا اس گھر پر قبضہ غاصبانہ ہے، انھوں نے اس کے مقاصد برباد کر کے رکھ دیے ہیں، اس وجہ سے جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو گو یہ نازل مدینہ میں ہوئیں لیکن ترتیب میں ان کو جگہ یہاں دی گئی تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ صورتِ حال کے تقاضے سے یہ اجازت دی گئی۔

(۴۲-۵۲) تاریخ کی شہادت کہ اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے ان کی قوموں کو جو تہدید فرمائی وہ بالآخر پوری ہو کے رہی۔ کوئی قوم بھی اپنے رسول کی تکذیب کے بعد صفحۂ ارض پر قائم نہ رہ سکی۔ صرف ان کی عظیم عمارتوں کے کھنڈر

باقی رہ گئے ہو عبرت کے لیے کافی ہیں بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھیں ہوں لیکن جن کے دل اندھے ہو چکے ہوں ان کا علاج کسی طبیب کے پاس بھی نہیں ہے۔ جو لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے ان کو جواب کہ خدا کی تقویم تمہاری تقویم سے مختلف ہے۔ اس کے ہاں کا ایک دن تمہارے ہزار سالوں کی طرح ہے تو جلدی نہ مچاؤ خدا کی بات پوری ہو کے رہے گی۔ خدا نے جس طرح پچھلی قوموں کو مہلت دی اسی طرح تمہیں بھی مہلت دی ہے لیکن جس طرح ان پر عذاب آکر رہا اسی طرح تم پر بھی، اگر تم اپنی ہٹ سے باز نہ آئے، عذاب آکے رہے گا۔ رسول کا کام انذار و تبشیر ہے۔ عذاب کا فیصلہ خدا کے اختیار میں ہے۔

(۵۲-۵۷) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تمہارے یہ مخالفین تمہاری دعوت کی مخالفت میں جو جھاڑ کے کانٹے کی طرح تمہارے پیچھے پڑ گئے ہیں، رسولوں کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر رسول کو اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا ہے۔ جب کبھی کسی رسول یا نبی نے اصلاح احوال کی راہ میں کوئی حوصلہ کیا ہے شیاطین نے اسی طرح اس کے حوصلہ کی راہ مارنے کی کوشش کی ہے اور اس میں اڑنگے ڈالے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہمیشہ شیاطین کی وسوسہ اندازیوں کو مٹاتا اور اپنی باتوں کو غالب و مستحکم کرتا رہا ہے۔ شیاطین کو اللہ نے وسوسہ اندازی و فتنہ بازی کی یہ مہلت اس لیے دی ہے کہ یہ چیز حق کے سچے حامیوں اور بوالہوسوں میں وجہ امتیاز ہو۔ جو لوگ حق کے طالب ہوتے ہیں شیاطین کے پروپیگنڈے سے ان کا ایمان نکھرتا اور ان کا علم پختہ ہوتا ہے اور جو بوالہوس اور منافق ہوتے ہیں ان کی ضلالت پختہ سے پختہ تر ہو جاتی ہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ ان کے اور اہل حق کے درمیان فیصلہ فرمائے گا جو اہل حق ہوں گے اس امتحان سے گزرنے کے بعد آخرت کی بادشاہی کے وارث ہوں گے اور اہل باطل جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

(۵۸-۶۴) جو لوگ اس دور میں ہجرت کر چکے تھے یا اس کے لیے پا بہ رکاب تھے ان کو دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی بشارت اور خدا کی صفات اور آفاق کی شہادت سے اس بشارت کی تائید کے دلائل۔

(۶۵-۷۰) کفار کی طرف سے مطالبۂ عذاب کے باوجود ان کو جو مہلت ملی ہوئی تھی اس کی حکمت کی طرف اشارہ کہ خدا رحمت کرنے میں جلدی کرتا ہے، قہر کرنے میں وہ بڑا دھیما ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ اب تم ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ خدا قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور یہ چیز خدا کے لیے نہایت آسان ہے۔

(۷۱-۷۶) شرک اور شفاعت باطل کے نظریہ پر آخری ضرب تاکہ مشرکین پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جن شرکاء و شفعاء کے اعتماد پر وہ آخرت سے بے پروا ہیں، وہ خدا کی عدالت میں ذرا بھی ان کے کام آنے والے نہیں ہیں۔

(۷۷-۷۸) خاتمۂ سورہ جس میں مسلمانوں کو بحیثیت جماعت خطاب کر کے خدا کی عبادت اور اس کی راہ میں جہاد کی تاکید فرمائی گئی ہے کہ اب ملت ابراہیم کے وارث تم ہو، خدا نے تم کو مسلم کے لقب سے ممتاز فرمایا اور اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ خدا کے رسول نے جس طرح تم پر حق کی گواہی دی اسی طرح تم خلق پر حق کی گواہی دینے والے بنو، نماز و زکوٰۃ کا اہتمام کرو، خدا پر جمے رہو۔ وہی تمہارا مولیٰ ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔

مطالب کا یہ تجزیہ پوری سورہ کا نظام واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وبید اللہ التوفیق۔

سُوْرَةُ الْحَجِّ (۲۲)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۷۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ آیات
عَظِيْمٌ ① يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ ۱-۴
وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ
بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ② وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ
فِى اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ③ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ
مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ④

اے لوگو! اپنے خداوند سے ڈرو بے شک قیامت کی ہلچل بڑی ہی ہولناک چیز ترجمۂ آیات
ہے۔ جس دن تم اسے دیکھو گے اس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول ۱-۴
جائے گی اور ہر حاملہ اپنا حمل ڈال دے گی اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے حالانکہ وہ مدہوش
نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہے ہی بڑی ہولناک چیز! ۱-۲

اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بغیر کسی علم کے خدا کی توحید کے باب میں کٹ حجتی کرتے
اور ہر سرکش شیطان خبیث کی پیروی کرتے ہیں۔ جس کی یہ ڈیوٹی ہی مقرر ہے کہ جو اس کو دوست

بنائے گا وہ اس کو گمراہ کر کے رہے گا اور اس کی رہنمائی وہ عذاب دوزخ کی طرف کرے گا۔ ۳-۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ (۱)

'يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ' کا خطاب اگرچہ عام ہے لیکن مراد اس سے وہی متمردین قریش ہیں جو قیامت کی تکذیب کر رہے تھے اور عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ اپنے رب سے ڈرو، اس نے اپنی عنایت سے جو مہلت دے رکھی ہے اس کو غنیمت جانو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ وہ اپنی رحمت و رافت کے سبب سے درگیر ضرور ہے لیکن بڑا ہی سخت گیر بھی ہے۔ قیامت کو سہل چیز نہ سمجھو کہ اس ڈھٹائی کے ساتھ اس کا مطالبہ کر رہے ہو۔ اس کی ہلچل بڑی ہی ہولناک ہوگی۔ وہ پناہ مانگنے کی چیز ہے، مطالبہ کرنے کی چیز نہیں ہے!

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ (۲)

قیامت کی ہولناکی کی تصویر — یہ اس دن کی ہولناکی کی تصویر ہے کہ وہ دن ایسی نفسی نفسی کا ہوگا کہ کسی کے اعوان و انصار اور اس کے اخوان و اقربا اس کے ذرا کام نہ آئیں گے۔ اس دن ہر مرضعہ، جس کو اپنا بچہ جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے، اپنے بچے کو بھول جائے گی اور حاملہ دہشت کے سبب سے اپنا حمل ڈال دے گی۔ لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ بالکل مدہوش اور متوالے ہو رہے ہوں گے۔ لیکن یہ مدہوشی شراب کے نشہ کی نہیں ہوگی بلکہ عذاب الٰہی کی ہولناکی سب کو پاگل بنا کے رکھ دے گی!

آیت میں ایک ہی ساتھ مخاطب کے لیے جمع اور واحد دونوں کے صیغے استعمال ہوتے ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جمع کے لیے جب واحد کا صیغہ استعمال ہوتا ہے تو مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مراد ہوتا ہے اور اس میں جمع کے بالمقابل زیادہ زور ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ (۳)

ایک خاص اسلوب بیان — 'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ' کے اسلوب بیان میں جب کوئی بات کہی جاتی ہے تو اس سے منفرد عام میں سے خاص کا ذکر ہوتا ہے۔ اگر موقع و محل تحسین کا ہو تو یہ اسلوب تحسین کے لیے بھی آتا ہے اور اگر موقع و محل تقبیح کا ہو، جیسا کہ یہاں ہے، تو اس سے تقبیح کی شدت نمایاں ہوگی۔ اگر اس اسلوب کو اپنی زبان میں ادا کرنا چاہیں گے تو کہیں گے کہ لوگوں میں ایسے جاہل، احمق اور بدھو بھی ہیں جو یوں کہتے یا یوں کرتے ہیں۔ یہ خاص طور پر اس گروہ کا ذکر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، خاص طور پر توحید کی مخالفت میں، ہر وقت مناظرہ و مجادلہ کے لیے آستینیں چڑھائے رہتا تھا۔ اس طرح کے لوگ کسی معاشرہ میں بھی تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہوتے بلکہ ان کا ایک خاص طائفہ ہی ہوتا ہے

ان کا علم بھی بس سنی سنائی اور رٹی رٹائی باتوں پر مبنی ہوتا ہے لیکن زبان درازی میں طاق اور دراف زنی میں مشاق ہوتے ہیں اس وجہ سے شاطر لوگوں کے ایجنٹ بن کر بے چارے سادہ لوح عوام کو گمراہ کرنے کی خدمت خوب انجام دیتے ہیں۔

مجادلہ بغیر علم کے

'یُجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ'۔ 'فِی اللّٰہِ' سے مراد فی توحید اللہ ہے اس لیے کہ کفارِ عرب خدا کے منکر نہیں تھے۔ وہ صرف خدا کی توحید کے منکر تھے اور توحید کے انکار کے لیے ان کے پاس دینِ آبا کی اندھی تقلید کے سوا کوئی دلیل نہیں تھی۔ آگے آیت ۸ میں وضاحت آئے گی کہ ان کے پاس اللہ کے دین کا کوئی علم تھا، نہ عقل و فطرت کی کوئی ہدایت، نہ کوئی قرآن و کتاب، بس یوں ہی، بغیر کسی دلیل اور علم کے، خدا کی توحید کے بارے میں مناظرہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ پیشہ ور مناظروں کے پاس زبان درازی کے سوا اور کوئی علم نہیں ہوتا، یہ صرف اپنے ضالّ و مُضل لیڈروں سے الہام حاصل کرتے ہیں اور گلی گلی میں ان کا ڈھول پیٹتے پھرتے ہیں۔

شیطان سے مراد شیاطین جن و انس دونوں ہیں

'وَیَتَّبِعُ کُلَّ شَیْطٰنٍ مَّرِیْدٍ'۔ 'شیطان' سے مراد شیاطین جن و انس دونوں ہیں۔ لفظ 'کل' اس مفہوم کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ شیاطین جن اور شیاطین انس دونوں میں بڑا گہرا گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔ شیاطین جن، شیاطین انس ہی کو اپنی فتنہ انگیزیوں کا ذریعہ بناتے ہیں۔ شیاطین جن القا کرتے ہیں اور شیاطین انس ان کے القا کو مختلف ناموں سے ایک فلسفہ بناتے اور پھر اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اس کو تمام ذرائع سے پھیلاتے ہیں۔ قرآن نے اس طرح کے تمام ائمۂ ضلالت کے لیے شیطان ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔

'مرید' کے معنی

'مَرِیْدٌ' کے معنی شریر، خبیث اور متعری عن الخیر یعنی لاخیرے کے ہیں۔

'شَیٰطِیْن' خواہ شیاطین جن ہوں یا شیاطین انس، ظاہر تو ہوتے ہیں ہمیشہ خیر خواہ، ناصح، ہمدرد اور بہی خواہ قوم و وطن کے بھیس میں لیکن درحقیقت وہ نہایت ہی خبیث و شریر اور بالکل لاخیرے ہوتے ہیں۔ وہ خدا کے بندوں کو خدا کی راہ سے ہٹا کر اپنی ڈگر پر ڈال دیتے ہیں اور جو لوگ ان کے نقیب و چاؤش بن کر ان کے فتنوں کے پھیلانے میں ان کے آلۂ کار بن جاتے ہیں ان کو اپنے سمیت جہنم کا فرزند بنا دیتے ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی توحید کے بارے میں بے تکے مباحثے اور مناظرے کر رہے ہیں وہ ایسے ہی خبیث اور لاخیرے شیطانوں کے پیرو ہیں۔

قیامت کے ذکر کے ساتھ توحید کے ذکر کی حکمت

قیامت کے ذکر کے ساتھ ہی معاً توحید کا ذکر اس لیے ہے کہ درحقیقت قیامت کی ساری اہمیت توحید کے ساتھ ہی ہے۔ اگر خدا کے ساتھ اس کے شرکا و شفعاء کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو قیامت کی ساری اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی روزِ عدالت ہے تو اس سے کیا اندیشہ ہو سکتا ہے اگر ایسے شرکا و شفعاء موجود ہیں جو اپنے زور و رسائی یا سعی و سفارش سے اپنے نام لیواؤں کو خدا کی پکڑ سے بچا سکتے ہیں! اسی وجہ سے قرآن میں قیامت اور ردِ شرک دونوں مضمون ہمیشہ ساتھ ساتھ بیان ہوتے ہیں تاکہ لوگوں پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح کر دی جائے کہ خدا کی پکڑ سے کوئی بھی کسی کو بچانے والا نہیں بن سکے گا۔ سب کا معاملہ اسی کے حضور میں پیش ہو گا اور وہی تنہا ہر ایک کا فیصلہ فرمائے گا۔

كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَنْ تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ يُضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ (۴)

شیطان کی ڈیوٹی — قرآن میں جگہ جگہ یہ بات تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ شیطان نے قیامت تک کے لیے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مہلت لی ہے اور اللہ نے اس کو یہ مہلت دی ہے کہ جا، جو تجھے اپنا دوست، مددگار اور رہنما بنائیں ان کو گمراہ کر لے، میں ان کو اور تجھ کو سب کو جہنم میں جھونک دوں گا۔ اسی حقیقت کو یہاں 'كُتِبَ عَلَيْهِ' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی یہ شیطان کی خدا کی طرف سے ایک مقررہ ڈیوٹی ہے کہ جو اس کو دوست بنائیں ان کو وہ گمراہ اور جہنم کی طرف ان کی رہنمائی کرے۔ 'فَأَنَّهُ' کا عطف 'أَنَّهُ' پر ہے اور 'مَنْ تَوَلَّاهُ' بطور بیان شرط کے ہے یعنی شیطان کا یہ فریضہ کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرے اور ان کو جہنم کی راہ دکھائے بایں شرط مشروط ہے کہ جو لوگ اس کو اپنا ولی و کارساز بنائیں گے صرف وہی اس کے دام میں شکار ہوں گے خدا کے ان بندوں پر اس کا کوئی زور نہیں چلے گا جو اس کو اپنا دشمن سمجھیں گے اور ہمیشہ اس کے فتنوں سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے یہ کہا جائے کہ زہر کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ہلاک کرے، احمق ہیں وہ جو اس کو تریاق سمجھیں اور نگل لیں۔ شیطان کو خدا نے جو مہلت دی ہے وہ لوگوں کے امتحان کے لیے دی ہے اس کو لیڈر بنانے اور اس سے الہام حاصل کرنے یا اس کی پیروی کے لیے نہیں دی ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۵-۲۴

آگے قیامت اور توحید کے اسی مضمون کو، جو تمہید کی آیات میں بیان ہوا، ایک نئے رنگ سے لیا اور انسان کی خلقت کی نوعیت، اس کائنات کے مشاہدات، اور ان مشاہدات سے اس کائنات کے خالق کی جو صفات ہر عاقل کے سامنے آتی ہیں، ان سے قیامت اور توحید پر دلیل قائم کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ اگر انسان غور کرے تو قیامت اور توحید کے دلائل خود اس کے اپنے وجود اور اس کے اپنے ہی گرد و پیش میں موجود ہیں۔ اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ احمق ہیں وہ جو ایسے بدیہی حقائق کا انکار اور ان کے بارے میں حجتیں کرتے ہیں۔ اسی ضمن میں ان لوگوں کو بھی لیا، جو خدا کی بندگی اپنے شرائط پر کرنا چاہتے تھے۔ جہاں تک ان کے زعم میں خدا کے احکام ان کی خواہشوں کے مطابق ہوں وہاں تک تو وہ خدا کی بندگی پر راضی تھے، لیکن دین کی جن باتوں کو وہ اپنی خواہشوں اور اپنے مصالح کے خلاف سمجھتے ان سے وہ گریز کرتے۔ اسی طرح کے دودلوں اور منافقوں کا ایک گروہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر اس دور میں پیدا ہو گیا تھا جو خدا اور شیطان، کفر اور اسلام دونوں کو جمع کرنے کا خواہشمند تھا۔ اگرچہ اس گروہ کا رویہ کھلے ہوئے معاندین کے مقابل میں بظاہر بڑا والہانہ تھا لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ رویہ بھی شرک بلکہ نہایت گھناؤنا شرک ہے اس وجہ سے قرآن نے یہاں اس پر بھی ضرب لگائی کہ اس دورُخی پالیسی کی خدا کے دین

میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو لوگ نفع و ضرر دونوں خدا کے ہاتھ میں نہیں مانتے اور نرم گرم ہر طرح کے حالات میں خدا ہی کی بندگی نہیں کرنا چاہتے وہ اپنی پسندیدہ روش اختیار کریں لیکن یاد رکھیں کہ ان کی کوئی بڑی سے بڑی تدبیر بھی، خدا کی مرضی کے بدون، ان کے کام آنے والی نہیں بن سکتی۔ آخر میں اس کشمکش حق و باطل کے دونوں فریق ـــــ اہل ایمان اور حامیانِ کفر و شرک ـــــ کے انجام کا ذکر فرمایا کہ ایک دن آنے والا ہے جس میں فریقین کا معاملہ خدا کی عدالت میں پیش ہوگا اور دونوں اپنے اپنے عقیدہ اور عمل کے مطابق سزا یا انعام پائیں گے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵-۲۴

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ
مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ
وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى
اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ
مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ
بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ
اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝۵ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ
هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۶ وَّ
اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝۷
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ
مُّنِيْرٍ ۝۸ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ
وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۹ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ
يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۱۰ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ ع ۸
يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰي حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ

اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ
ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ
وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ
اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ
يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ
لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ
ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ وَكَذٰلِكَ
اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ
اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَ
الْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ
عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۩ ﴿۱۸﴾ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ؗ
فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ
رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿۱۹﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ وَ

لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿٢١﴾ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ
اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٢٢﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ ع ۱۲ ۹
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۗ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا
حَرِيْرٌ ﴿٢٣﴾ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ
الْحَمِيْدِ ﴿٢٤﴾

ترجمۂ آیات ۵-۲۴

اے لوگو! اگر تم دوبارہ جی اٹھنے کے باب میں شبہ میں ہو تو دیکھو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر منی کے ایک قطرے سے، پھر ایک جنین سے، پھر ایک لوتھڑے سے، کوئی کامل ہوتا ہے اور کوئی ناقص۔ ایسا ہم نے اس لیے کیا تاکہ تم پر اپنی قدرت و حکمت اچھی طرح واضح کر دیں اور ہم رحموں میں ٹھہرا دیتے ہیں جو چاہتے ہیں ایک مدت معیّن کے لیے۔ پھر ہم تم کو ایک بچّہ کی شکل میں برآمد کرتے ہیں، پھر ایک وقت دیتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے بعض پہلے ہی مر جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی آخری حد کو پہنچتے ہیں تاآنکہ وہ کچھ جاننے کے بعد کچھ بھی نہیں جانتے۔

اور تم زمین کو بالکل خشک دیکھتے ہو تو جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ لہریں لینے لگتی اور ابھرتی ہے اور طرح طرح کی خوش نما چیزیں اگاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اللہ ہی پروردگار حقیقی ہے۔ اور وہی مردوں کو زندہ

کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور قیامت آکے رہے گی، اس کے آنے میں ذرا شبہ نہیں اور اللہ ان سب کو ایک دن زندہ کر کے اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔ ۵-۷

اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو بغیر کسی علم، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے، تکبر سے اینٹھتے ہوئے، حجتیں کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے برگشتہ کریں۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ہم قیامت کے دن ان کو آگ کا عذاب چکھائیں گے کہ یہ ہے تیرے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت اور اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ ۸-۱۰

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی بندگی ایک کنارے پر کھڑے ہوئے کرتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچا تب تو ان کا دل خدا پر جمتا ہے اور اگر کوئی آزمائش پیش آگئی تو اوندھے ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی۔ کھلا ہوا خسارہ درحقیقت یہی ہے۔ یہ خدا کے سوا ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جو نہ ان کو کوئی نقصان پہنچا سکیں اور نہ کوئی نفع پہنچا پائیں۔ یہی بڑی دور کی گمراہی ہے۔ وہ ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جن کا ضرر ان کے نفع سے قریب تر ہے۔ کیا ہی برے ہیں ان کے یہ مرجع اور کیا ہی برے ہیں ان کے یہ ساتھی!! بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ بے شک اللہ جو چاہے گا کر ڈالے گا۔ ۱۱-۱۴

جو یہ گمان رکھتا ہو کہ خدا دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا تو وہ آسمان تک ایک رسی تانے اور پھر اپنے معاملہ کا فیصلہ کر ڈالے اور دیکھے کہ کیا اس کی یہ تدبیر اس کے غم کو دور کرنے والی بنتی ہے؟ اور ہم نے اسی طرح اس قرآن کو نہایت واضح دلیلوں کی صورت میں اتارا ہے

کہ لوگ ہدایت حاصل کریں اور بے شک اللہ ہی ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ ۱۵-۱۶

جو لوگ ایمان لائے، جنھوں نے یہودیت اختیار کی اور صابئین، نصاریٰ، مجوس اور جنھوں نے شرک کیا، اللہ قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ۱۷

کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے آگے جھکتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج چاند، تارے، پہاڑ، درخت اور چوپائے اور لوگوں میں سے بہتیرے۔ اور بہتیرے ایسے ہیں جن پر خدا کا عذاب لازم ہو چکا ہے۔ اور جن کو خدا ذلیل کر دے تو ان کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں بن سکتا۔ بے شک اللہ ہی کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ ۱۸

یہ دو فریق ہیں جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں اختلاف کیا تو جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے جامے تراشے جائیں گے۔ ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا پانی بہایا جائے گا۔ اس سے جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے سب پگھل جائے گا اور ان کی کھالیں بھی۔ اور ان کی سرکوبی کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔ جب جب وہ اس کے کسی عذاب سے نکلنے کی کوشش کریں گے اسی میں دھکیلے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کا عذاب!! ۱۹-۲۱

ہاں، اللہ ان لوگوں کو، جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے، ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان کو وہاں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے اور اس میں ان کا پہناوا یکسر ریشم ہو گا اور ان کی رہنمائی پاکیزہ کلمہ حمد کی طرف اور ان کی رہنمائی خدائے حمید کی راہ کی طرف ہو گی!! ۲۲-۲۴

۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ
عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ
أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ۖ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن
يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا
عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ (۵)

قیامت کا شاہد اپنے اندر اور باہر

'فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ' قیامت کے باب میں مشرکین عرب کی روش صریح انکار کی نہیں بلکہ شک اور تردد ہی کی تھی۔ وہ اس کو ایک بہت ہی بعید چیز خیال کرتے تھے اور اس استبعاد کی بڑی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ مرکھپ جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا ان کے خیال میں بہت بعید از قیاس بات تھی۔ اپنے اس واہمہ کے سبب سے اول تو قیامت کو وہ کوئی اہمیت دیتے ہی نہیں تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں اس کو مانتے بھی تھے تو ان کو اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء پر یہ اعتماد تھا کہ وہ اپنی سفارش سے ان کو خدا کی بازپرس سے بچا لیں گے۔ قرآن نے قیامت کا جب اس شد و مد سے ذکر کیا کہ وہی اس زندگی اور اس کائنات کی اصل غایت قرار پا گئی اور ساتھ ہی ان کے تمام شرکاء و شفعاء کو بھی بے حقیقت ثابت کر دیا تو یہ چیز ان پر بہت شاق گزری۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کی ساری عمارت بالکل ریت پر ہے۔ اس کو بچانے کے لیے ان کے پاس واحد حربہ صرف یہ رہ گیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے یہ مطالبہ کرتے کہ اگر قیامت ایسی ہی یقینی چیز ہے تو وہ اس کو دکھا دیں یا اس کی کوئی ایسی محسوس نشانی 'بشکل عذاب' دکھائیں جس کے بعد وقوع قیامت میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ قرآن نے ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر ان کو خود ان کے اپنے وجود اور اس دنیا میں روزمرہ کے مشاہدات کی طرف توجہ دلائی کہ قیامت اور توحید کی دلیل ڈھونڈنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خدا نے انسان اور اس کائنات کو بنایا ہی اس طرح ہے کہ جو شخص آنکھیں رکھتا ہے وہ اپنے اندر اور باہر ہر وقت خدا اور قیامت کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔

فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ

'عَلَقَة' کے معنی

لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ۔ 'عَلَقَة' خون کی پھٹکی کو بھی کہتے ہیں اور چھوٹے جاندار کیڑے کو بھی۔ یہ نطفہ کے قرار پا جانے کے بعد کا درجہ ہے جب وہ خون اور ایک جنین کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس کے اندر زندگی کی نمود پیدا ہو جاتی ہے۔

'مُضْغَة' کے معنی

'مُضْغَة' گوشت کے لوتھڑے کو کہتے ہیں۔ یہ 'عَلَقَة' کے بعد کا مرحلہ ہے جب جنین گوشت کے ایک لوتھڑے کی شکل میں ایک جسم کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس 'مُضْغَة' کی بابت فرمایا کہ ان میں سے بعض

کا ڈیزائن بالکل مکمل ہوتا ہے اور بعض کو قدرت نامکمل ہی چھوڑ دیتی ہے اور کسی کے بس میں بھی یہ نہیں ہے کہ اس کو مکمل کر دے۔

انسان کی اپنی خلقت ایک درس گاہ ہے

'لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ' یہ وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے انسان کی خلقت کے ان مراحل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا انسان کو وجود میں لانے کے لیے ان تمام مراحل اور اس سارے اہتمام کا محتاج نہیں تھا کہ پانی کی ایک بوند کسی مادہ کے رحم میں قرار پکڑے، پھر وہ خون اور جنین کی صورت اختیار کرے اور قدرت اپنے ڈیزائن کے مطابق اس کی نقاشی و مصوری کر کے اس کو حسین پیکر بنائے۔ اس تمام اہتمام و انتظام کے بغیر اگر خدا چاہتا تو بنے بنائے آدمی کسی دریا یا پہاڑ سے جھنڈ کے جھنڈ اور ریوڑ کے ریوڑ برآمد ہو جایا کرتے لیکن خدا نے یہ چاہا کہ انسان کی خود اپنی خلقت اس کے لیے خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی ایک درس گاہ بن جائے جس میں وہ اپنے اور اس کائنات کے احسن الخالقین کی معرفت حاصل کرے۔ اس کا خود اپنا وجود اس پر شہادت دے کہ جس نے اس اہتمام و عنایت کے ساتھ اس کو پیدا کیا ہے اس نے اس کو محض ایک کھلونا نہیں بنایا ہے بلکہ اس کی خلقت کے پیچھے ایک عظیم غایت ہے، جو لازماً ظہور میں آکے رہے گی۔ اس کے اپنے ہر بُنِ مُو سے اس کو یہ گواہی ملے کہ خالق نے اس کو مٹی کے خلاصہ اور پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا اور اس کو اس میں کوئی زحمت پیش نہیں آئی تو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا بھی اس کے لیے نہایت آسان ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ مومنون میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۠ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۚ ثُمَّ أَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۚ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۚ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۚ

(المؤمنون - ۲۳ : ۱۲ - ۱۶)

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا، پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک قرار کی جگہ میں رکھا، پھر ہم نے پانی کی بوند کو جنین کی شکل دی، پھر جنین کو ایک لوتھڑا بنایا، پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں، پھر ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا، پھر اس کو ایک بالکل ہی مختلف نمونہ کی شکل میں تشکیل کر دیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ بہترین پیدا کرنے والا! پھر اس کے بعد تم لازماً مرو گے، پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

سورہ مومنون کی اس آیت میں وہ خلاصہ بھی سامنے رکھ دیا ہے جس پر انسان کی خلقت کے یہ تمام مراحل شہادت دے رہے ہیں لیکن ہمارے دورِ حاضر کے فلسفیوں اور سائنسدانوں کا یہ عجیب اندھا پن ہے کہ انھیں انسان کی خلقت کے یہ تمام مراحل و مدارج تو نظر آتے ہیں لیکن اس اصل حقیقت تک ان کی نظر نہیں پہنچتی جس کو واضح کرنے ہی کے لیے خدا نے یہ سارا اہتمام فرمایا۔

'وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا'۔ ابھی اصل سلسلۂ کلام پورا نہیں ہوا تھا کہ بیچ میں 'لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ' کا ٹکڑا اچانک مخاطبوں کو جھنجھوڑنے کے لیے آگیا تھا کہ بلادت کے سبب سے وہ سو رہے ہوں۔ ان کو جھنجھوڑنے کے بعد پھر اصل سلسلۂ کلام کو لے لیا۔ فرمایا کہ اس کے بعد ایک مدت ہی تک اس کو رحم میں ہم ٹھہراتے ہیں کہ وہ ایک پورے بچے کی شکل اختیار کرے۔ 'مَا نَشَآءُ' یعنی یہ کلیۃً ہماری مشیت پر منحصر ہے کہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، خوب صورت ہو یا بدصورت، ناقص ہو یا کامل، کسی دوسرے کے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ وہ لڑکی کو لڑکا بنا دے یا بدصورت کو خوب صورت۔ 'اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى' یعنی اسی طرح وضع حمل کے لیے ہم نے ایک مدت ٹھہرا دی ہے اور یہ چیز بھی کلیۃً ہمارے ہی اختیار میں ہے، کسی کے بس میں نہیں ہے کہ ہماری مقرر کی ہوئی مدت میں کوئی تغیر و تبدل کر دے۔

ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ' یہاں 'لِ' اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سے پہلے فعل محذوف ہے۔ اس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں اور سورۂ مومن آیت ۶۷ میں بھی اس کی نہایت واضح مثال آئے گی۔ یعنی بچہ کی شکل میں تمہیں وجود بخشنے کے بعد ہم تمہیں ایک وقت دیتے ہیں کہ تم اپنی جوانی اور پختگی کو پہنچو اور یہ قانون بھی ہمارا ہی بنایا ہوا ہے، کسی کی مجال نہیں کہ وہ بچپن اور مراہقت کے مراحل کو لانگ کر جوانی کے حدود میں قدم رکھ دے۔

'وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ' یہاں تقابل کے اصول پر، بربنائے وضاحتِ قرینہ، پہلے ٹکڑے میں فی صباہ او فی شبابہ یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہیں اور دوسرے ٹکڑے میں 'ارذل العمر' کے الفاظ اس حذف کو واضح کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے کتنے تو اپنے بچپن یا جوانی ہی میں مر جاتے ہیں اور کتنے ایسے ہوتے ہیں جو بڑھاپے کی آخری منزل تک پہنچتے ہیں اور یہ امر بھی کلیۃً خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ کوئی شخص اپنی مدتِ حیات میں نہ کمی کر سکتا ہے نہ بیشی۔

لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا' 'لِ' غایت و نہایت کے مفہوم میں ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس کا ترجمہ 'یہاں تک' یا 'تا آنکہ' ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ 'علم' کی تنکیر تحقیر کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور تفخیم کے لیے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ ایسی ارذل عمر کو پہنچ جاتا ہے کہ تھوڑا بہت علم جو اس کو حاصل ہوا ہوتا ہے وہ بھی غائب ہو جاتا ہے۔ دوسری صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ وہ بہت کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ بھی نہیں جانتا، ہر چیز اس کے حافظہ سے محو ہو جاتی ہے۔ ہم پہلے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں اس لیے کہ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا ہے 'وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا' (تمہیں تو بس تھوڑا ہی علم عطا ہوا ہے) اصل حقیقت یہی ہے کہ انسان چاہے سقراط و بقراط ہی کیوں نہ بن جائے لیکن علم کے بحر بیکراں کا ایک قطرہ ہی ہے جس کا وہ حامل بنتا ہے۔ اس سے زیادہ کے لیے وہ اپنے اندر ظرف ہی نہیں رکھتا اور اس علم کا بھی حال یہ ہے کہ عمر کے ایک خاص حصہ میں وہ سب سلب ہو جاتا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اپنے علم پر بھی کسی کو غرہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی خدا ہی کی دین ہے،

(حاشیہ:) ہرنہ لیما ترمیہ

'لِ' غایت و نہایت کے مفہوم میں

وہی بخشتا ہے اور وہ جب چاہے اس کو چھین سکتا ہے۔

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ۔ انسان کی خلقت کے اندر قیامت کے جو دلائل ہیں ان کی طرف توجہ دلانے کے بعد اس کو باہر کی دنیا کی طرف توجہ دلائی کہ تم دیکھتے ہو کہ زمین بالکل خشک اور بے آب و گیاہ ہوتی ہے۔ پھر جب اس پر بارش ہوتی ہے تو وہ نرم و گداز ہو جاتی اور نوع بنوع خوشنما نباتات سے لہلہا اٹھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس زمین کو بار بار مرتے اور جیتے دیکھتے ہو تو آخر اسی زمین سے اپنے ہی دوبارہ جی اٹھنے کو کیوں بعید از امکان سمجھتے ہو؟ ہر فصل و موسم میں یہ ریہرسل تو تمہارے سامنے اسی غرض سے ہو رہا ہے کہ قیامت کا مشاہدہ اس کے ہونے سے پہلے ہی تمہیں ہو جائے۔ نُنْبِتُ لَكُمْ کے الفاظ یہاں مقدر ہیں۔ چونکہ یہ نشانی بالکل واضح تھی اس وجہ سے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں تھی۔

ایک نظر عالم خارج پر

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَأَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۙ وَّأَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ (۶-۷)

شروع سورہ سے کر یہاں تک جو کچھ بیان ہوا ان آیات میں اس کا خلاصہ سامنے رکھ دیا۔ یعنی خدا اور قیامت سے تمہیں ڈرتے رہنے کی یہ ہدایت جو کی جا رہی ہے اس لیے کی جا رہی ہے کہ معبود حقیقی صرف خدا ہی ہے، اس کے ماسوا جن کو تم نے اس کے شریک و سہیم بنا رکھے ہیں، اور جن کے بل پر تم خدا اور آخرت سے بے پروا ہوئے بیٹھے ہو، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ محض تمہارے وہم کی ایجاد ہیں۔ وَأَنَّهُ يُحْيِ الْمَوْتٰى یعنی اوپر جو دلائل مذکور ہوئے ان سے یہ بات ثابت ہے کہ خدا مُردوں کو زندہ کرتا ہے اس لیے جب وہ چاہے گا تمہیں اٹھا کھڑا کرے گا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو پانی کے ایک قطرے کو عاقل و بالغ انسان بنا دیتا اور زمین کو اس کے خشک اور چٹیل ہو جانے کے بعد باغ و بہار کر دیتا ہے، اس کے لیے دنیا کو از سرِ نو زندہ کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا!

خلاصۂ بحث

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيرٍ (۸)

آیت ۳ میں جن مجادلین کی طرف اشارہ فرمایا تھا یہ ان کے رویہ کی تفصیل ہے۔ وہاں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ خدا کے بارے میں مشرکین کی اصل مخاصمت عقیدۂ توحید سے تھی۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو وہ بلا بحث و نزاع مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ انھوں نے اس کے بہت سے دوسرے شریک بھی ٹھہرا رکھے تھے جن کو ثابت کرنے کی ذمہ داری خود ان پر عائد ہوتی تھی لیکن ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں تھی۔ بس زیادہ سے زیادہ جو چیز وہ پیش کرتے وہ یہ کہ ہمارے باپ دادا ان معبودوں کو پوجتے آئے ہیں اس لیے ہم ان کو پوجتے رہیں گے اور ان کی توہین کسی حال میں برداشت نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے کہ جب بحث کا تعلق دلیل کے بجائے مجرد آباء و اجداد کی اندھی تقلید سے رہ جائے تو یہ کبر و غرور ہے جس میں مبتلا ہو جانے کے بعد آدمی کے

بے دلیل مجادلہ کرنے والے

سامنے ساری منطق بے کار ہو کے رہ جاتی ہے، اسی وجہ سے قرآن نے اس بے دلیل مجادلہ کو کبر قرار دیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۙ إِن فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَّا هُم بِبَالِغِيهِ (مومن - ۵۶)

بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کے بارے میں بغیر کسی دلیل کے، جو ان کے پاس آئی ہو، کٹ حجتی کرتے ہیں، ان کے دلوں میں صرف غرور ہے جس میں ان کو کامیابی حاصل ہونے والی نہیں ہے۔

دوسرے مقام میں یہ حقیقت بھی واضح فرما دی ہے کہ اس سارے مجادلے کی محرک طریقۂ آبائی کی اندھی عصبیت ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا (لقمان - ۲۰-۲۱)

اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر کسی علم، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی رہنما کتاب کے جھگڑتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو کہتے ہیں ہم اسی طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

ثَانِيَ عِطْفِهِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۖ لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖ وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ (۹)

'ثَانِيَ عِطْفِهِ' ان کے کبر و غرور کی تصویر ہے۔ جب کوئی شخص غرور کے ساتھ کسی سے اپنا رخ موڑتا ہے تو شانے جھٹک کر موڑتا ہے۔ آدمی کے پاس دلیل نہ ہو اور وہ اپنے غلط موقف سے دستبردار ہونے کے لیے بھی تیار نہ ہو تو اس کے پندار کو بڑی چوٹ لگتی ہے اور اس کا انتقام وہ اپنے غرور کا مظاہرہ کر کے لینے کی کوشش کرتا ہے۔ 'لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ' یعنی یہ سارا طنطنہ اور یہ ساری حمیت کسی حق کی حمایت کے لیے نہیں بلکہ صرف اس لیے ہے کہ جس طرح وہ خود خدا کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے دوسروں کو بھی اسی طرح بھٹکا دے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ آدمی کا خدا کی راہ سے بھٹکا ہوا ہونا، اگر اس کو اپنی کمزوریوں کا احساس ہو، اس سے مایوس کر دینے والی چیز نہیں ہے، حق کی طرف اس کی بازگشت کا امکان ہے۔ لیکن جو شخص اپنے باطل کے حق میں اپنے پاس کوئی دلیل نہ رکھتے ہوئے بھی اس کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لیے، پوری رعونت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہو تو اس سے پھر کسی امید خیر کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

استکبار کی سزا دنیا اور آخرت کی رسوائی

لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب نار ہے۔ رسوائی اس لیے کہ انھوں نے حق کے مقابل میں استکبار کا مظاہرہ کیا اس وجہ سے وہ مستحق ہیں کہ دنیا میں بھی ذلیل ہوں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث رسول کے مخالفین ہیں

رسولوں کے مخالفین کے باب میں سنتِ الٰہی، جیسا کہ ہم متعدد مقامات میں واضح کر چکے ہیں، یہی ہے کہ اگر وہ حق کی مخالفت پر جمے رہ جاتے ہیں تو، اتمامِ حجت کے بعد، لازماً وہ اس دنیا میں بھی شکست اور ذلت سے دوچار ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی جہنم کے سزاوار ٹھہریں گے۔

عَذَابَ الْحَرِيْقِ میں بھی عمل اور جزا کی مشابہت کا پہلو موجود ہے۔ یعنی چونکہ وہ اس دنیا میں حق کے خلاف غصہ، نفرت اور حسد سے جلتے اور کھولتے رہے ہے اس وجہ سے وہ مستحق ہیں کہ آخرت میں جلنے کے عذاب کا مزا چکھیں۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۱۰)

زبانِ حال کی شہادت

ہم قرآن کے اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ کرتے آئے ہیں کہ جہاں مقصود صورتِ حال کی تعبیر ہو وہاں بالعموم 'قیل' اور 'یقال' وغیرہ حذف کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ یعنی زبانِ حال خود ان پر گواہی دے گی کہ یہ تمہاری اپنی ہی بوئی ہوئی بس بھری فصل کا حاصل ہے جو تمہارے سامنے آیا ہے، خدا نے تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی ہے۔

جو بوئے گا وہی کاٹے گا

'وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ'۔ اس اسلوب کی وضاحت بھی متعدد جگہ ہو چکی ہے کہ جب مبالغہ پر نفی آئے تو اس سے مقصود مبالغہ فی النفی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے 'لَيْسَ بِظَلَّامٍ' کے معنی ہوں گے اللہ تعالیٰ بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

آیت کا مقصود یہ ہے کہ آدمی اس دنیا میں جو بوئے گا اسی کی فصل آخرت میں کاٹے گا۔ اگر اس نے استکبار کی کاشت کی ہے تو استکبار کا حاصل رسوائی ہے، وہ رسوائی کی فصل کاٹے گا۔ اور اگر حق کے خلاف غصہ اور نفرت کی پرورش اس نے کی ہے تو اس کا حاصل جلنے کا عذاب ہے وہ اس سے دوچار ہوگا۔ غرض جو کچھ اس نے کیا ہوگا وہی اللہ تعالیٰ اس کے سامنے رکھ دے گا۔ سرِمو اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی!

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (۱۱)

مذبذبین کا کردار

ان کفار مشرکین کا ذکر کرنے کے بعد، جو شرک کی حمایت میں لڑائی ٹھانے ہوئے تھے، اب یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو بیک وقت یزدان اور اہرمن، اللہ اور غیر اللہ، حق اور باطل دونوں سے تعلق باقی رکھنا چاہتے تھے۔ یکسو ہو کر نہ وہ اہلِ ایمان کے اندر شامل ہونا چاہتے تھے نہ مشرکین کے اندر۔ وہ ان دونوں صفوں سے الگ کھڑے ہو کر اپنی مصلحت اور مفاد کو دیکھتے تھے۔ جس حد تک ان کو مسلمانوں کی ہمنوائی میں فائدہ نظر آتا ان کی ہمنوائی کرتے اور جب دیکھتے کہ شرک اور اہلِ شرک کی تائید میں فائدہ ہے، ان کے ساتھی بن جاتے۔ اس قسم کے دورنگے اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر، اس دور میں، مشرکین اور اہل کتاب کے اندر بھی پیدا ہو

گئے تھے جو کفر و اسلام دونوں میں سمجھوتے کے خواہشمند تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ خدا کی بھی بندگی ہونی چاہیے اور ان اصنام و الٰہہ کی بھی جن کی عبادت باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے۔ آخر یہ بھی کام آنے والی ہستیاں ہیں تو ان کو کیوں نظر انداز کیا جائے؟ یہی گروہ ہے جس کی طرف سے قرآن میں ترمیم کی تجویز بھی پیش ہوئی تھی جس کا ذکر سورۂ یونس میں گزر چکا ہے۔ اس طرح کے عناصر اگر مسلمانوں میں داخل ہونے تو وہ توحید میں یکسو نہیں ہوتے۔ جہاں تک ان کو راہ ہموار نظر آتی وہاں تک تو وہ قافلۂ اسلام کا ساتھ دیتے لیکن جب کوئی آزمائش پیش آجاتی تو وہیں لڑکھڑا جاتے اور خدا سے مایوس و بدگمان ہو کر دوسروں کو ولی و مرجع بنا بیٹھتے۔ یہ چیز اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرک ہے۔ اوپر مجادلین کا جو شرک بیان ہوا ہے۔ اس میں اور اس میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ حقیقت کا نہیں بلکہ صرف مزاج کا فرق ہے۔ مجادلین کے شرک کا مزاج معاندانہ ہے، اس کا مزاج منافقانہ۔ اس فرق کے سوا ان دونوں میں کوئی اور فرق نہیں ہے۔ توحید کا تقاضا صرف اس شکل میں پورا ہوتا ہے جب بندہ کلیۃً اپنے آپ کو اپنے رب کی تحویل میں دے دے، وہ پھولوں کی سیج پر لٹائے جب بھی راضی رہے اور اگر سر پر آرے چلوا دے جب بھی راضی و مطمئن رہے۔ صرف منفعت ہی کی حد تک جو خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے وہ موحد نہیں بلکہ مشرک ہے اور خدا کے ہاں ایسے ابن الوقتوں اور مفاد پرستوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ سرمد نے نہایت دو ٹوک بات کہہ دی۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن برضائے یار می باید داد یا قطع نظر زیار می باید کرد

'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ'۔ یہ اسلوب بیان یہاں اظہار تعجب اور اظہار نفرت و کراہت کے لیے ہے اور لفظ 'عبادت' پرستش اور اطاعت دونوں ہی معنوں پر مشتمل ہے۔ 'عَلٰى حَرْفٍ' یعنی ایک کنارے پر کھڑے ہو کر، دُور دُور سے۔ خدا کی بندگی اور اطاعت میں پوری طرح داخل ہو کر نہیں، جو 'اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً' کا تقاضا ہے بلکہ 'مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ' کے مصداق بن کر۔ نہ پوری طرح خدا کی طرف جو ایک حنیف مسلم کی شان ہے اور نہ کفار کی طرح کفر کی حمایت میں برہنہ ہو کر بلکہ ع منہ پھیر کر ادھر کو اُدھر کو بڑھا کے ہاتھ۔

'فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ'۔ 'فِتْنَةٌ' کے معنی یہاں مصیبت اور آزمائش کے ہیں۔ یہ 'عَلٰى حَرْفٍ' کی وضاحت ہے کہ یہ احمق لوگ خدا کی بندگی صرف اپنے مفاد کے حد تک کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک ہر بات ان کے منشا کے مطابق ہوتی رہے اس وقت تک تو یہ خدا سے راضی و مطمئن رہتے ہیں، لیکن کوئی امتحان پیش آجائے تو پھر یہ اوندھے ہو جاتے ہیں اور خدا کو چھوڑ کر دوسروں کے آستانوں پر جبہ سائی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ پھولوں کے طالب ہیں لیکن کانٹوں کی خلش برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں حالانکہ خدا کی راہ میں راحتوں کے ساتھ آزمائشیں بھی ہیں اور

جب تک کوئی ان آزمائشوں میں پورا نہ اترے خدا کے ہاں اس کی کوئی پوچھ نہیں ہے۔

خسر الدنیا والاٰخرۃ کا مفہوم

'خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ' فرمایا کہ ایسے احمق لوگ دنیا اور آخرت دونوں ہی برباد کرتے ہیں۔ اگر دنیا میں بندے کو کوئی آزمائش پیش آتی ہے، وہ جان یا مال کے کسی خسارہ میں مبتلا کیا جاتا ہے تو اس کے لیے اس خسارہ کے اندر ایک عظیم اخروی منفعت بھی پوشیدہ ہوتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے رب کے فیصلہ پر راضی و مطمئن رہے اور اپنے آپ کو اس کے آگے ڈال دے۔ اس طرح کا ہر امتحان بندے کے ایمان کو پختہ اور اس کی اخروی منفعتوں کو اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً کرتا ہے لیکن کوئی احمق اگر اس طرح کی کسی آزمائش سے گھبرا کر خدا سے مایوس و بدگمان ہو بیٹھے تو اس نے دنیا کا بھی نقصان اٹھایا اور اپنی آخرت بھی برباد کی۔ 'ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ' ظاہر ہے کہ اصلی اور کھلا ہوا خسارہ یہی ہے۔ اگر اس دنیا کا کوئی نقصان ہوا تو وہ نقصان نہیں ہے اگر بندے نے اپنا اخروی اجر اس کے عوض میں محفوظ کرا لیا۔ البتہ جس نے اپنی دنیا بھی کھوئی اور اپنی آخرت بھی اس کا خسران 'خُسْرَانٌ مُّبِيْنٌ' ہے۔

ابنائے زمانہ کا کردار

'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ' میں جس گروہ کا کردار بیان ہوا ہے، غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی کردار ابنائے زمانہ کا ہے۔ آج ہم بھی، جو اس شرک کو مٹانے ہی کے لیے مامور کیے گئے تھے، اسی طرح دور دور سے خدا کی بندگی کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن کو خدا کی کتاب بھی مانتے ہیں لیکن قانون، تہذیب، معاشرت، معیشت، سیاست ہر شعبۂ زندگی میں پیروی دوسروں کی کرتے ہیں۔ قرآن کا مصرف اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ جب کوئی مرے تو کچھ حافظ اس کے لیے قرآن خوانی کر کے اس کو بخشوا دیا کریں۔ اگرچہ اس نے خود کبھی اتفاق سے بھی قرآن کو ہاتھ نہ لگایا ہو!! ان کے نزدیک قرآن زندوں کے لیے نہیں بلکہ مردوں کے لیے اترا ہے اور وہ ہدایت کے لیے نہیں بلکہ صرف کبھی کبھی چوم لینے کے لیے ہے۔ خوب بات کہی جس نے کہی ہے کہ

یاران عجب انداز دو رنگی دارند مصحف بہ بغل دین فرنگی دارند

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (۱۲)

غیر اللہ سے دعا شرک اور ضلال بعید ہے

'يَدْعُوْا' یہاں دعا، استغاثہ، فریاد، استرحام اور استمداد سب معنوں پر مشتمل ہے۔ اگر خدا کے سوا کسی کو نافع و ضار مان کر، پکارا جائے تو یہ شرک ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ خدا سے مایوس ہو کر جن سے طالب مدد ہوتے ہیں وہ نہ ان کو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔ نفع و ضرر صرف خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ اگر کسی کو کسی سے کوئی نفع یا ضرر پہنچتا ہے تو اللہ ہی کے اذن سے پہنچتا ہے اس وجہ سے ہر حال میں بندے کا اعتماد اللہ ہی پر ہونا چاہیے نہ کہ اس سے مایوس ہو کر دوسروں پر۔ دوسروں کے نافع یا ضار ہونے کی حقیقت اسی سورہ کے آخر میں ایک تمثیل کے ذریعہ سے یوں واضح فرما دی گئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اے لوگو! ایک تمثیل سنائی جا رہی ہے تو اس کو

لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَـيْـــًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (الحج: ۷۳)

دھیان سے سن لو۔ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ وہ سارے کے سارے مل کر اس کے لیے اپنا زور لگا ڈالیں۔ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس سے اس کو چھڑا نہیں سکتے۔ طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتواں!

'ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ' فرمایا کہ دور کی گمراہی درحقیقت یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ خدا سے روٹھ کر کسی ایسے کی پناہ لیتے جو کوئی نفع یا نقصان ان کو پہنچا سکتا تب تو یہ ایک گمراہی ہوتی لیکن بہت دور کی نہ ہوتی لیکن خدا کی آزمائش سے بھاگ کر ایسوں کی پناہ ڈھونڈھنا جو خود اپنے چہرے سے بھی مکھی ہنکا نہیں سکتے صرف گمراہی نہیں بلکہ بہت دور کی گمراہی ہے۔ یہ خدا کے امتحان کی بھٹی سے بھاگے اور سیدھے جہنم میں جا کودے!

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ (۱۳)

ضرر نقد اور نفع موہوم اس 'يَدْعُوْا' کے بارے میں مجھے ان نحویوں کا مذہب قوی معلوم ہوتا ہے جو اس کو سابق 'الذى يَدْعُوْا' کا اعادہ اور بعد کے جملے سے اس کو بالکل غیر متعلق مانتے ہیں۔ اعادۂ فعل یہاں اظہارِ حسرت و افسوس کے لیے ہے 'لَمَنْ ضَرُّهٗٓ'، 'يَدْعُوْا' کا مفعول نہیں بلکہ اوپر والے مفعول 'مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ' پر ایک قسم کا استدراک ہے اور مقصود اس سے اس کے 'ضَلٰل بَعِيْد' ہونے کی وضاحت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں صرف یہی نہیں کہ وہ کوئی ضرر یا نفع نہیں پہنچا سکتے بلکہ ستم بالائے ستم ہے کہ ان کا ضرر ان کے نفع سے قریب تر ہے۔ اگر کسی ایسے کی پناہ ڈھونڈھی جاتے جو نہ نفع پہنچا سکے نہ ضرر تو یہ حماقت ہے لیکن حماقت بالائے حماقت یہ ہے کہ ایسے کی پناہ ڈھونڈھی جائے جس کا ضرر تو نقد اور ثابت و معلوم ہو لیکن نفع بالکل موہوم۔ جنھوں نے خدا سے تعلق توڑ کر دوسروں کو اپنا ولی و کارساز بنایا انھوں نے اپنا حقیقی سہارا تو ختم کر دیا ہے دوسرے مزعومہ سہارے تو وہ کام آتے ہیں یا نہیں؟ یہ بعد کی چیز ہے اور یہ بھی ان کے سامنے آجائے گی۔

امام اور مقتدی دونوں نابہنجار 'لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ' یہ فقرہ یہاں بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح آیت ۷۳ میں، جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے، 'ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ' ہے جس طرح وہاں فرمایا ہے کہ "طالب و مطلوب دونوں ہی بے بس و ناتواں" اسی طرح یہاں فرمایا ہے کہ مولیٰ اور عشیر دونوں ہی ایک سے ایک بڑھ کر نابہنجار! 'مولیٰ' سے مراد وہ شرکاء و شفعاء ہیں جن کو خدا کے سوا مرجع اور کارساز بنایا گیا اور 'عشیر' سے مراد وہ مشرکین ہیں جنھوں نے ان کو مرجع و کارساز بنایا۔ پیر اور مرید، امام اور مقتدی، لیڈر اور پیرو دونوں اگر ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے اور برے ہونے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہوں تو ان کا انجام معلوم ہے!

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

مخلصوں کا يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (۱۴)

انجام خدا سے مایوس ہو کر دوسروں کی پناہ ڈھونڈھنے والوں کا انجام بیان کرنے کے بعد یہ ان لوگوں کے انجام

کی طرف اشارہ فرمایا جو سختی و نرمی اور رنج و راحت ہر طرح کے حالات میں ایمان و عمل صالح کی روش پر قائم و دائم رہیں گے۔ فرمایا کہ بے شک اللہ ان لوگوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ سیاقِ کلام دلیل ہے کہ یہاں فعل اپنے کامل معنوں میں استعمال ہوا ہے اس لیے کہ یہ مقابل میں ہے 'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ' کے۔ اس وجہ سے اس سے لازماً وہ لوگ مراد ہوں گے جو تردد دلی اور نفاق میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ پوری دل جمعی و یکسوئی کے ساتھ اپنے رب کی بندگی پر جمے ہوئے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ۔ یعنی یہ مشرکین تو جن پر تکیہ کیے ہوئے ہیں وہ نہ کوئی نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ کوئی ضرر، یہاں تک کہ اگر کوئی مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس کو بھی اس سے بچا سکنے پر قادر نہیں۔ البتہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ جو چاہے کر ڈالتا ہے۔ اس میں مسلمانوں کے لیے طمانیت و بشارت ہے کہ تم ظاہری حالات کی ناساعدت کو نہ دیکھو۔ حالات خواہ کتنے ہی ناموافق و ناساعد ہوں اپنے رب پر جمے رہو۔ اور اطمینان رکھو کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ (۱۵)

ضمیر مفعول کا مرجع

'مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ'۔ 'یَنْصُرَہٗ' میں ضمیر کا مرجع 'مَنْ' ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا ہے ان کی رائے سیاق و سباق کلام سے بالکل بے جوڑ ہے۔ آیت میں اشارہ انہی دودلوں اور منافقوں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے اور جن کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ اگر انھیں کوئی آزمائش پیش آ جاتی ہے تو خدا سے مایوس و بدگمان ہو کر دوسروں کو مولیٰ و مرجع بنا بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پیش آمدہ مشکل سے خدا ان کو نہیں نکالے گا یا نہیں نکال سکتا۔

'مدّ بسبب' کا مفہوم

'فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ' آسمان میں رسی تاننا آخری اور انتہائی تدبیر کر دیکھنے کے لیے اسی طرح کا ایک استعارہ ہے جس طرح ہماری زبان میں تھگلی لگانے کا استعارہ ہے۔ سورۂ انعام میں بھی آسمان میں تھگلی لگانے کا استعارہ گزر چکا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ	اور اگر ان لوگوں کا اعراض تم پر ایسا ہی شاق گزر رہا ہے
اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ	تو اگر تم زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی لگا
اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ	کر ان کے لیے کوئی نشانی لا سکو تو لاؤ! اگر اللہ چاہتا
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَي الْهُدٰي فَلَا	تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا تو تم جذبات سے مغلوب
تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (انعام: ۳۵)	ہو جانے والوں میں سے نہ بنو!

زہیر اور اعشی نے بھی انتہائی اور آخری جدوجہد کے مفہوم کے لیے یہ محاورہ استعمال کیا ہے۔ زہیر کا

مصرع ہے ع ولو نال اسباب السماء بسلم

اسی طرح اعشیٰ کہتا ہے ع ورقیت اسباب السماء بسلم۔

'قطع' کا مفہوم — 'ثُمَّ لْيَقْطَعْ'، 'قطع' کے معنی ابومسلم نے قطع مسافت کے لیے ہیں یعنی وہ آسمان میں رسی تانے اور آسمان میں چڑھ جائے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی قطع وحی کے لیے ہیں یعنی جس کو یہ گمان ہو کہ اللہ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا وہ آسمان میں چڑھ کر سلسلۂ وحی کو قطع کر دے۔ اکثر لوگوں نے اس کے معنی پھانسی لگانے یا گلا گھونٹ لینے کے لیے ہیں یعنی وہ چھت میں رسی لٹکا کر اپنے آپ کو پھانسی لگا لے۔ ان تاویلوں میں جو قباحت ہے اس سے قطع نظر، لفظ 'قطع' کا جو مفہوم ان حضرات نے لیا ہے وہی محل نظر ہے۔ وحی کو منقطع کر دینے یا پھانسی لگا لینے کے معنی کے لیے تو اس لفظ کا استعمال بالکل ہی ناموزوں ہے۔ عربیت کا ذوق اس سے ابا کرتا ہے کہ کسی مفہوم کے لیے معروف و متداول الفاظ کے ہوتے ہوئے کسی ناموزوں لفظ کا استعمال قرآن کی فصاحت و بلاغت کے بالکل منافی ہے۔ قطع مسافت کے مفہوم کے لیے اگرچہ اس لفظ کو ناموزوں نہیں قرار دیا جا سکتا اس لیے کہ 'قطع وادی' وغیرہ کے محاورات عربی میں معروف ہیں لیکن یہاں اس لفظ کا استعمال اس مفہوم کے لیے بالکل ناموزوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آسمان کی طرف رسی تاننے کا ذکر ہے تو اس کے ساتھ 'فَلْيَتَصَعَّدْ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ موزوں ہو سکتا ہے۔ 'یقطع' اس کے ساتھ کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تمام اقوال ضعیف ہیں۔ البتہ عزم و جزم کے ساتھ کسی معاملہ کا فیصلہ کرنے کے مفہوم کے لیے یہ لفظ اعلیٰ عربی میں معروف ہے۔ اس کی نظیر خود قرآن میں موجود ہے۔ مثلاً سورۂ نمل میں ہے۔

قَالَتْ يَآ أَيُّهَا الْمَلَؤُا أَفْتُونِي فِيٓ	ملکۂ سبا نے کہا کہ اے دربار والو! میرے اس معاملے میں آپ
أَمْرِي ۚ مَا كُنتُ قَاطِعَةً أَمْرًا	لوگ اپنی رائے دیں۔ میں کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی
حَتَّىٰ تَشْهَدُونِ (نمل: ۳۲)	جب تک آپ لوگ موجود ہو کر مشورہ نہ دیں۔

خدا سے مایوسی و بدگمانی کا انجام — اجزائے آیت کی تشریح کے بعد اب آیت کے مفہوم پر غور کیجیے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو بدبخت و نامراد خدا سے مایوس و بدگمان ہو جائے کہ وہ اس کی مدد نہیں کرے گا اور اس بدگمانی میں مبتلا ہو کر دوسروں کو اپنا مولیٰ و مرجع بناتا ہے وہ جو چاہے کر دیکھے، وہ آسمان میں کمند لگائے اور اپنا پورا زور لگا کر اپنے معاملہ کا فیصلہ اور غم اور پریشانی کو اگر دور کر سکتا ہے تو دور کر لے۔ مطلب یہ کہ خدا کو ایسے لاخیروں سے کوئی بحث نہیں۔ وہ جہاں چاہیں آوارہ گردی کریں اور جس جوہڑ سے چاہیں اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کریں۔ لیکن یاد رکھیں کہ انسانی فطرت کے اندر جو پیاس ہے وہ ہر جوہڑ کے پانی سے نہیں بجھ سکتی، وہ صرف ایمان کے حوضِ کوثر ہی سے بجھتی ہے۔ اور اس کے اندر جو خلا ہے وہ ہر اینٹ پتھر سے نہیں بھرا جا سکتا، اس کو اگر بھرا جا سکتا ہے تو صرف اللہ واحد کی یاد ہی سے بھرا جا سکتا ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۲۴ 'وَمَنْ أَعْرَضَ

عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس آیت سے متعلق بعض مزید سوالات جو پیدا ہوں گے وہ اس سے صاف ہو جائیں گے۔ یہ امر بیان ملحوظ رہے کہ خدا سے مایوسی و بدگمانی شرک کے بہت بڑے عوامل میں سے ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت ہم اپنی کتاب حقیقتِ شرک میں کر چکے ہیں۔ انسان جب خدا سے کٹتا ہے تو وہ بہرحال اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کوئی نہ کوئی سہارا ڈھونڈھنے کی سعی کرتا ہے لیکن حقیقی سہارا چونکہ خدا اور صرف خدا ہی ہے اس وجہ سے وہ چاہے آسمان ہی پر چڑھ جائے اس کی ساری سعی لاحاصل ہی رہتی ہے۔

اس آیت میں فِی الْاٰخِرَۃِ کا لفظ بھی قابلِ غور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس دنیا میں خدا ہی یاور و ناصر ہے اسی طرح آخرت میں بھی خدا ہی یاور و ناصر ہے۔ اگر کوئی خدا کے رحم یا انصاف سے بدگمان ہو کر کسی اور کو اپنا یاور و ناصر بناتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے مقابل میں اس کے کام آئیں گے تو وہ یہ بھی کر دیکھے۔ اس کے اس وہم کی حقیقت بھی قیامت کے دن اس پر آشکارا ہو جائے گی۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ (۱۶)

یہ آیت بطور تنبیہ کے ہے اور 'كَذٰلِكَ' کا اشارہ توحید اور ردِ شرک کے ان روشن دلائل کی طرف ہے جو اوپر مذکور ہوئے۔ فرمایا کہ اسی طرح نہایت روشن دلائل کے ساتھ ہم نے قرآن کو اتارا ہے۔ اس کے بعد برنائے قرینہ یہ مضمون محذوف ہے کہ جو صاحبِ توفیق ہوں گے وہ آیات پر ایمان لائیں گے اور جو توفیق سے محروم ہوں گے وہ، جیسا کہ اوپر آیت ۸ میں اشارہ ہوا، اللہ اور اس کی آیات میں کٹھ حجتی ہی کرتے رہیں گے۔ 'وَاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ' میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو ہدایت و ضلالت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھی ہے اور جس کی وضاحت ہم بار بار کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت انہی کو نصیب ہوتی ہے جو اپنی عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ جو اندھے بہرے بن جاتے ہیں ان کے دلوں پر مہر کر دی جاتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٔيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۱۷)

مشرکین اور ان کے انجام کی تنبیہ

اس آیت میں جن گروہوں کا ذکر ہے ان میں سے مجوس اور مشرکین کے سوا ہر گروہ کا ذکر سورۂ بقرہ آیت ۶۲ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے یہود، نصاریٰ اور صابئین، سب پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۱۸۲ - ۱۸۷ جلد اول۔ مجوس اصلاً تو دین زردشت کے پیرو تھے اور دین زردشت کی بنیاد، جیسا کہ ہم سورۂ کہف میں بیان کر چکے ہیں، خالص توحید پر تھی لیکن جس طرح امتدادِ زمانہ سے ہر دین کا حلیہ بگڑا اسی طرح اس دین کے پیرو بھی اپنے اصل دین کو مسخ کر کے آتش پرستی اور دوسری مشرکانہ بدعتوں میں مبتلا ہو گئے۔

اوپر کی آیات میں مومنین اور مشرکین کے درمیان جس مناظرہ و مجادلہ کا ذکر ہوا ہے یہ آیت بھی اسی سے متعلق ہے۔ اس مناظرہ کے اصلی فریق تو مسلمان اور مشرکین قریش ہی تھے لیکن اس دور میں، جیسا کہ پیچھے کی سورتوں میں تفصیل گزر چکی ہے، دوسرے مذاہب کے پیرو بھی، جو عرب میں موجود تھے، اس میں فریق بن گئے، اور چونکہ اسلام کی دعوت کی زد ان سب پر پڑتی تھی اس وجہ سے ان کی ہمدردیاں مشرکین کے ساتھ تھیں۔ خاص طور پر یہود و نصاریٰ تو کھلم کھلا ہر محاذ پر ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ قرآن نے ان سب کو نام لے کر آگاہ کیا کہ آج خدا اور اس کی آیات کے باب میں جو محاذ گرم ہے وہ یہیں نہیں ختم ہو جائے گا بلکہ یہ قضیہ قیامت کے دن خدا کی عدالت میں بھی پیش ہونے والا ہے جس میں ایک طرف اہلِ ایمان ہوں گے، دوسری طرف یہ مشرکین اور ان کے ہمنوا ــــ یہود، صابئین، نصاریٰ اور مجوس ــــ اس دن خدا فیصلہ فرمائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ ظاہر ہے کہ یہاں فیصلہ سے مقصود اس کے نتیجہ کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اس دن ہر ایک کے سامنے اس کی اس سعی و سرگرمی کے نتائج آ جائیں گے جس میں وہ آج مصروف ہے۔ اہلِ ایمان اپنی جانبازیوں کا صلہ پائیں گے اور کفار و مشرکین اور ان کے اتحادی اپنی سرگرمیوں کے نتائج بھگتیں گے۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ۔ اہلِ ایمان کے لیے پیامِ تسلی اور اہلِ شرک اور ان کے حامیوں کے لیے تہدید و وعید ہے کہ خدا ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اپنے باایمان بندوں کی جانبازیوں اور سرفروشیوں کو بھی دیکھ رہا ہے اور مخالفین کی سازشوں اور شرارتوں کو بھی۔ اس وجہ سے وہ ہر ایک کے ساتھ ٹھیک ٹھیک وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ٹھہرے گا۔

جو اہلِ ایمان کے ساتھ نہیں وہ اہلِ کفر ہیں

اس آیت میں آپ نے غور کیا ہو گا کہ سب سے پہلے اہلِ ایمان کا ذکر ہوا ہے اور آخر میں مشرکین کا اور بیچ میں دوسرے مختلف فرقوں کا۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ ہے کہ اصل فریق کی حیثیت اس مباحثہ و مناظرہ میں انہی دو کو حاصل تھی، باقی گروہوں کی حیثیت ضمنی تھی۔ چنانچہ آگے آیت ۱۹ میں تصریح بھی ہے کہ اصل فریق دو ہیں۔ اہلِ ایمان اور اہلِ کفر و شرک۔ جو اہلِ ایمان کے ساتھ نہیں ہے وہ اہلِ کفر میں سے ہے، خواہ وہ کسی نام سے موسوم اور کسی دین کی پیروی کا مدعی ہو۔

اسم اور فعل کے مواقع استعمال میں ایک نازک فرق

آیت میں مختلف گروہوں کے ذکر کے لیے جو اسلوب بیان اختیار فرمایا گیا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ مسلمانوں اور یہود و مشرکین کا ذکر تو فعل کی شکل میں ہوا ہے اور صابئین، نصاریٰ اور مجوس کا اسم کی شکل میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عملاً اس میدان میں ایک طرف مسلمان تھے، دوسری طرف مشرکین اور یہود۔ یہود، مشرکین کی حمایت اور اسلام کی مخالفت میں اپنے حسد و عناد کے باعث بہت سرگرم تھے۔ باقی فرقوں کی ہمدردیاں اگرچہ تھیں تو مشرکین ہی کے ساتھ لیکن وہ کچھ زیادہ سرگرم نہ تھے۔ اس وجہ سے معرکہ کے اصلی حریفوں کو تو فعل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور دوسروں کا

ذکر اسم کے ساتھ۔ زبان کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ فعل کے اندر ایک قسم کی سرگرمی کا مفہوم پایا جاتا ہے جب کہ اسم بالعموم صرف علامت امتیاز کا فائدہ دیتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ؕ (۱۸)

کائنات کی ہر چیز سجدے میں ہے

یہ توحید کی وہ دلیل بیان ہوئی ہے جس کی شہادت اس کائنات کی ہر چیز اپنے وجود سے دے رہی ہے۔ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز اپنی تکوینی حیثیت میں ابراہیمی مزاج رکھتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ اور چوپائے سب خدا کے امر و حکم کے تحت مسخر ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی سرِ مو خدا کے مقرر کیے ہوئے قوانین سے انحراف نہیں اختیار کرتی۔ سورج، جس کو نادانوں نے معبود بنا کر سب سے زیادہ پوجا ہے، خود اپنے وجود سے گواہی دے رہا ہے کہ وہ شب و روز اپنے رب کے آگے قیام، رکوع اور سجدے میں ہے۔ طلوع کے وقت وہ سجدے سے سر اٹھاتا ہے، دوپہر تک وہ قیام میں رہتا ہے، زوال کے بعد وہ رکوع میں جھک جاتا ہے اور غروب کے وقت وہ سجدے میں گر جاتا ہے اور رات بھر اسی سجدے کی حالت میں رہتا ہے۔ اسی حقیقت کا مظاہرہ چاند اپنے عروج و محاق سے اور ستارے اپنے طلوع و غروب سے کرتے ہیں۔ پہاڑوں، درختوں اور چوپایوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں سے ہر چیز کا سایہ ہر وقت قیام، رکوع اور سجود میں رہتا ہے۔ اور غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی نظر آئے گی کہ اس سایہ کی فطرت ایسی ابراہیمی ہے کہ یہ ہمیشہ آفتاب کی مخالف سمت میں رہتا ہے۔ اگر سورج مشرق کی سمت میں ہے تو سایہ مغرب کی جانب پھیلے گا اور اگر مغرب کی جانب ہے تو ہر چیز کا سایہ مشرق کی طرف پھیلے گا۔ گویا ہر چیز کا سایہ اپنے وجود سے ہمیں اس بات کی تعلیم دے رہا ہے کہ سجدہ کا اصل سزاوار آفتاب نہیں بلکہ خالقِ آفتاب ہے۔

توحید کی یہ دلیل اشارات کی نوعیت کی ہے اس وجہ سے یہ منطق کی گرفت میں نہیں آتی لیکن نظامِ کائنات میں تدبر کرنے والوں کی نظر میں ان اشارات کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ ع

آں کس است اہلِ بشارت کہ اشارت داند

یہی دلیل سورۂ رعد میں یوں بیان ہوئی ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (رعد - ۱۵)	اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، خواہ طوعاً یا کرہاً اور ان کے سائے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں صبح و شام۔

اس آیت کی وضاحت سورۂ رعد میں ہم کر چکے ہیں۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس میں ظِلٰلُهُمْ

بِاَنْفُسُ وَ الْاٰصَالِ' کے الفاظ اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اگر کوئی شامت کا مارا اپنے دائرۂ اختیار میں خدا کو سجدہ کرنے سے بغاوت کرتا ہے تو اس کا اپنا سایہ اپنی شہادتِ حال سے اس پر اظہارِ نفرت کرتا ہے اور وہ بدستور اپنی ابراہیمی فطرت پر جما رہتا ہے، کسی حال میں بھی کسی غیر اللہ کے آگے جھکنے کا ننگ گوارا نہیں کرتا۔

سورۂ نحل میں یہی دلیل اس طرح بیان ہوئی ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ۔ (نحل: ۴۸-۴۹)	کیا ان لوگوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ ان کے سائے داہنے اور بائیں سے لوٹتے ہیں اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہوئے اور وہ اس کے آگے سرافگندہ ہوتے ہیں اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں آسمانوں اور زمین میں جو جاندار بھی ہیں اور فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

سب سے بڑا شرف سب سے بڑی ذلت: وَكَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ' یعنی یہی حال ان بہت سے اللہ کے بندوں کا بھی ہے جن کی فطرت سلیم ہے۔ جس طرح کائنات کی تمام بے ارادہ اشیاء اللہ ہی کے امر کے تابع اور اسی کے آگے سربسجود ہیں اسی طرح اللہ کے بہت سے بندے ایسے ہیں جنھوں نے اپنے اختیار و ارادے کو اللہ ہی کے امر و حکم کے تابع کر دیا ہے اور وہ اپنے رب کے سوا کسی اور کو سجدہ نہیں کرتے لیکن بہتوں نے اپنے اس اختیار و ارادہ کو غلط استعمال کیا ہے اور اس سب سے بڑے شرف کو، جو اللہ نے ان کو بخشا، اپنی شامتِ اعمال سے انھوں نے اپنے لیے سب سے بڑی گمراہی اور سب سے بڑی ذلت کا سبب بنا لیا۔ کائنات کی چیزوں کا حال تو یہ ہے کہ باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو انسان کی خدمت کے لیے بنایا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں سے کوئی چیز بھی یہ ننگ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ انسان کو سجدہ کرے لیکن انسان کی رذالت و سفاہت کا حال یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہوتے ہوئے اپنے سے فروتر مخلوقات کو معبود مان کر ان کے آگے ڈنڈوت کرتا ہے! فرمایا ہے کہ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ کا عذاب واجب ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے کو بھی ذلیل کیا اور اپنے رب کی بھی نہایت تحقیر کی۔

انسان کا شرف کردار کے ساتھ مشروط ہے: وَمَنْ یُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ' یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے انسان کو جو شرف بخشا ہے وہ صفات و کردار کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر وہ اس شرف کا حق ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے شرف کو قائم رکھتا ہے اور اس کے درجات و مراتب میں اضافہ فرماتا ہے اور اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتا تو وہ اس کو اپنی سنت کے مطابق اسی گڑھے میں گرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے جس میں وہ گرنا چاہتا ہے۔ 'نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی' اور اس مضمون کی دوسری آیات میں اسی

سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ اس سنتِ الٰہی کی زد میں آجاتے ہیں ان کو کوئی دوسرا سنبھالنے والا نہیں بن سکتا۔ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے کہ اب یہ لوگ جس ذلت کے گڑھے میں گر چکے ہیں اس سے ان کو نکالنے کے لیے تم لاکھ جتن کرو لیکن یہ اس سے نکلنے والے نہیں ہیں۔ خدا کی مشیت کا فیصلہ اس اتمامِ حجت کے بعد یہی ہے کہ اب یہ اس ذلت کی مار کھائیں۔

من چہ می سرایم و طنبورۂ من چہ می سراید

اس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ انسان کا اصلی شرف توحید ہے، اگر وہ اس شرف سے اپنے کو محروم کر لے تو اس کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی چیز سے بھی وہ فروتر اور حقیر بن کر رہ جاتا ہے، دوسری حقیقت اس سے یہ واضح ہوئی کہ اس کائنات کے ساتھ انسان کی ہم آہنگی اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک اس کی پیشانی کسی غیر اللہ کے سجدے سے آلودہ نہیں ہوتی۔ اگر وہ اس ذلت پر راضی ہو جائے تو وہ اس پوری کائنات سے بالکل بے جوڑ اور گول خانے میں ایک چوکھٹی چیز بن کر رہ جاتا ہے یہاں تک کہ خود اس کا اپنا سایہ بھی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ پھر اس میں اور اس کے سایہ میں ایسی بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس پر 'من چہ می سرایم و طنبورۂ من چہ می سراید' کی مثل صادق آتی ہے۔

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۚ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۭ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۭ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۤ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (۱۹-۲۲)

دونوں گروہوں کے انجام کی تفصیل

اب یہ ان دونوں فریقوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جن کا ذکر اوپر آیت ۱۷ میں گزرا۔ وہاں صرف اس قدر اشارہ فرمایا تھا کہ ایک دن آئے گا جب اللہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا، ان کے انجام کی تفصیل اس آیت میں بیان نہیں ہوئی تھی۔ ان آیات میں ان کے انجام کی تفصیل آرہی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

آیت ۱۷ میں کئی گروہوں کا ذکر ہے اور یہاں 'هٰذٰنِ خَصْمٰنِ' کے الفاظ ہیں۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس آیت میں انہی گروہوں کی طرف اشارہ ہے تو ان کے لیے مثنیٰ کا صیغہ کیوں استعمال ہوا، جمع کا صیغہ کیوں نہیں استعمال ہوا؟ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان، کلامِ عرب کی روشنی میں اس بات کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ اگر فریق دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لیے مثنیٰ اور جمع دونوں کے صیغے استعمال ہو سکتے ہیں۔ یہاں 'اخْتَصَمُوْا' کے صیغۂ جمع سے بھی ان کے خیال کی تائید نکلتی ہے۔ لیکن میرا رجحان، جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا، اس بات کی طرف ہے کہ یہاں اوپر کے گروہوں کا ذکر، ان کے ظاہری تعدد کو نظر انداز کر کے، ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے ہوا ہے۔ فی الظاہر تو یہود، نصاریٰ، صابئین، مجوس اور مشرکین الگ الگ گروہ تھے لیکن جہاں تک توحید اور اسلام کی مخالفت کا تعلق ہے اس میں یہ سب مشترک تھے بلکہ مخالفت کا مزاج، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، الگ الگ ضرور تھا لیکن اسلام کی مخالفت میں،

اپنے اپنے رجحان کے مطابق سب شریک تھے اس وجہ سے قرآن نے اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کے اصول کے مطابق ان سب کو ایک ہی پارٹی قرار دیا اور ان کے مقابل میں مسلمانوں کو ایک مستقل پارٹی کی حیثیت دی اور اسی حیثیت سے دونوں کے انجام کو بیان فرمایا۔

'اِخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّھِمْ' میں اسی بحث و جدال کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں اور ان کی مخالف پارٹیوں کے درمیان در باب شرک و توحید برپا تھا اور جس کا ذکر اوپر آیت ۳ اور آیت ۸ میں گزر چکا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ توحید اور شرک کے اس معرکے میں اہل کتاب نے، اہل کتاب ہونے کا دعوے رکھتے ہوئے، کھلم کھلا مشرکین عرب کا ساتھ دیا۔

شرک اپنی حقیقت کے اعتبار سے کفر ہے۔ 'فَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا' سے مراد وہ تمام پارٹیاں ہیں جنھوں نے توحید و شرک کی اس جنگ میں شرک کا ساتھ دیا۔ شرک کو کفر سے تعبیر کرنے کی وجہ کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ شرک اپنی اصل حقیقت و غایت کے اعتبار سے کفر ہی ہے اسی وجہ سے قرآن میں شرک کو کفر سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ شرک کو کفر کے مقابل میں اھون خیال کرتے ہیں ان کا خیال قرآن کے بالکل خلاف ہے۔

جزا اور عمل کی مطابقت 'قُطِّعَتْ لَھُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ' یعنی اس دنیا میں وہ حق کی مخالفت کے جوش میں نفرت، غصہ، حسد اور انتقام کی جس آگ میں جلتے رہے ہیں اس کی پاداش میں آخرت میں ان کے لیے آگ ہی کا جامہ تراشا جائے گا اور ان کے سروں پر کھولتا پانی انڈیلا جائے گا جو ان کے تمام اندرونی اعضاء اور ان کی بیرونی کھالوں کو پگھلا کے رکھ دے گا۔

'وَلَھُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ ۝ کُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْھَا مِنْ غَمٍّ اُعِیْدُوْا فِیْھَا':

'مَقَامِعُ' کے معنی ہتھوڑے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی سرکوبی کے لیے لوہے کے ہتھوڑے موجود ہوں گے، اگر وہ دوزخ کی کسی آفت سے بھاگنے کی کوشش کریں گے تو انہی ہتھوڑوں سے ان کی سرکوبی کر کے اسی آفت میں پڑے رہنے کے لیے ان کو واپس کیا جائے گا۔ 'مِنْ غَمٍّ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہاں دوزخ سے بھاگ نکلنے کا تو کوئی تصور بھی نہ کر سکے گا۔ بس زیادہ سے زیادہ اگر کوئی کوشش کر سکے گا تو اس بات کی کر سکے گا کہ ایک آفت کی شدت سے گھبرا کر کسی دوسری آفت کی پناہ ڈھونڈھے لیکن اس کا امکان بھی وہاں نہیں ہوگا۔ دوزخ کے دارو غے لوہے کے ہتھوڑوں سے ان کی سرکوبی کریں گے۔

زبان حال کی تعبیر 'وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ' یہ زبانِ حال کی تعبیر ہے۔ یعنی صورتِ حال خود ان کو پکار کر سنا دے گی کہ اب یہاں سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے، اب اسی میں رہو اور جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو! اسی طرح کے مواقع میں، جیسا کہ ہم جگہ جگہ اشارہ کرتے آئے ہیں 'قِیْلَ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زبانِ حال زبانِ قال سے زیادہ ناطق اور فصیح البیان ہوتی ہے۔ یہاں عربی کے معروف اسلوب کے مطابق معطوف علیہ محذوف ہے۔ یعنی 'اَخْسَئُوْا فِیْھَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ' اس کی مثالیں پیچھے

گزر چکی ہیں۔

یہاں عمل اور جزا کی مشابہت کے پہلو پر بھی نگاہ رہے۔ جن لوگوں کو قعرِ ہلاکت سے نکالنے کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے اپنا سارا زور صرف کر ڈالا لیکن وہ نہ صرف یہ کہ اس سے نکلنے پر راضی نہ ہوئے بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے اس بنا پر دشمن بن گئے کہ انھوں نے ان کو اس سے نکالنے کی کوشش کی تو آخرت میں جب اس کی حقیقت سامنے آئے گی تو اس سے بھاگنے کے کیا معنی؟ دنیا میں جس چیز سے ان کو اتنا عشق رہا اب اس کا مزہ چکھیں۔

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا ۖ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ۝ وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوا إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَمِيدِ (۲۳-۲۴)

اہلِ حق کے انجام کی تفصیل

مخالفینِ حق کا انجام بیان کرنے کے بعد اب یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جو مخالفین کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم مرتبتِ حق پر ڈٹے رہے۔ فرمایا کہ ان کے لیے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ 'يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا' میں 'لُؤْلُؤًا' اساور کے محل پر عطف ہے۔ یعنی وہ اس جنت میں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے۔ 'وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس جنت میں ان کا لباس ریشم ہی ریشم ہوگا۔ اسی کا لباس، اسی کا اوڑھنا، اسی کا بچھونا، اسی کے دوسرے لوازم۔

طیب من القول سے مراد

'وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ' سے اہلِ جنت کے اس کلمۂ حمد و شکر کی طرف اشارہ ہے جو ان کی زبانوں سے بے تحاشا اس وقت ادا ہوگا جب وہ دیکھیں گے کہ ان کے رب نے جتنے وعدے کیے وہ سب پورے ہوئے۔ سورۂ زمر آیت ۷۴ میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے۔ 'وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ' (اور وہ سب پکار اٹھیں گے کہ شکر ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہم سے اپنے کیے ہوئے وعدے پورے کیے) اسی ترانۂ حمد کا ذکر سورۂ فاطر آیت ۳۴-۳۵ میں بھی ہے۔ 'وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۖ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ' (اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہم سے غم کو دور کیا، بے شک ہمارا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا اور پذیرائی فرمانے والا ہے۔ جس نے اپنے فضل سے ہمیں قرار کی منزل میں آتارا)

صراط الحمید کا مفہوم

'وَهُدُوا إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَمِيدِ'۔ 'صِرَاطِ الْحَمِيدِ' سے مراد میرے نزدیک اسی 'دَارَ الْمُقَامَةِ' کی شاہراہ ہے جس کی طرف سورۂ فاطر کی محولۂ بالا آیت میں اشارہ ہوا۔ یہاں لفظ ہدایت، منزلِ مقصود کی طرف ہدایت کے مفہوم میں ہے اور صیغۂ مجہول تشریف و تکریم پر دلیل ہے کہ ملائکہ کی ایک جماعت کے ذریعہ سے ان لوگوں کی رہنمائی اس شاہراہ کی طرف کی جائے گی جو اس دار المقامۃ تک ان کو پہنچائے گا جو خدائے

حمید نے ان کے قیام کے لیے پسند فرمایا ہے۔

شاہد حق کے احوال کی تعبیر بادہ و ساغر کے الفاظ سے

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ جنت و دوزخ وغیرہ کے احوال کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہے۔ ان کو مخاطب کے ذہن سے قریب لانے کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان کی تعبیر کے لیے وہ اسلوب اختیار کیا جائے جس سے مخاطب مانوس ہوں۔ اہل عرب مصریوں اور ایرانیوں کے تمدن سے متاثر تھے اس وجہ سے تنعم و رفاہیت کی تعبیر کے لیے وہی اسلوب اختیار کیا جاتا ہے جس میں یا تو خود ان کے اپنے تصورات تنعم کی جھلک ہوتی ہے یا پھر ان تصورات کی جھلک ہوتی ہے جن سے فی الجملہ وہ آشنا تھے۔ ان تصورات میں زمانہ کے اختلاف سے بھی بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے الفاظ کے بجائے ہمیشہ حقیقت پر نظر رکھنی چاہیے۔ بس یہ ماننا چاہیے کہ اہل جنت کو یہ نعمتیں حاصل ہوں گی جو قرآن میں مذکور ہوئیں، رہی یہ بات کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے تو ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ جس طرح بعض اوقات شاہد حق کے

- احوال و معاملات کے لیے بادہ و ساغر کی تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں اسی طرح احوالِ آخرت کی تعبیر ان الفاظ و تمثیلات سے کی جاتی ہے جو مخاطب کے لیے قریب الفہم ہوں۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۵-۳۷

توحید و شرک کی بحث جو اوپر سے چلی آ رہی ہے یہاں وہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ قریش اور ان کے ہمنواؤں نے اس دور میں جو انتہائی شدید خصومت کی روش اختیار کر لی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ دعوتِ توحید اور ابطالِ شرک کی اس جدوجہد کی نوعیت صرف ایک کلامی و عقائدی نزاع کی نہیں ہے بلکہ اس کی ضرب ان کی اس مہنتی اور سیادت و قیادت پر بھی پڑنے والی ہے جو ان کو حرم کی تولیت کی بدولت حاصل ہے۔ قریش نے حرم پر اپنا قبضہ جما رکھا تھا اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس وراثت کے اصل حقدار اور متولی و امین وہی ہیں۔ خاندانِ بنی ہاشم کو خانہ کعبہ کی کلید برداری کا منصب حاصل تھا اور ان کا سرغنہ اس زمانے میں ابولہب تھا جو رفادہ کے تمام خزانے پر غاصبانہ قابض اور اس میں من مانے تصرفات کے لیے پوری طرح آزاد تھا۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ قریش کو صرف مکہ ہی میں سیادت و امارت حاصل نہیں تھی بلکہ حرم کے پاسبان سمجھے جانے کے سبب سے پورے عرب پر ان کی مذہبی پیشوائی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسے حالات میں وہ ایک ایسی دعوت کو ٹھنڈے پیٹوں کس طرح برداشت کر سکتے تھے جو ان کو ان تمام مفادات سے یک قلم محروم کر دے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کو حرم کی حاضری سے بھی محروم کر دیا اور ظلم و تشدد کے زور سے ان کو سرزمین مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ان حالات میں یہ آیات اتریں جن میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کو کس مقصد کے لیے بنایا تھا، ان کی دعوت کیا تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کن شعائر و مناسک

کی تعلیم دی تھی۔ یہ گویا ایک آئینہ ہے جو قریش کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس میں اپنا منہ دیکھ کر خود فیصلہ کر لیں کہ وہ اس وراثتِ ابراہیمی کے حق دار ہیں یا غاصب و غدار! ضمناً مسلمانوں کی اس میں حوصلہ افزائی بھی فرمائی گئی ہے اور ان کو ان ذمہ داریوں سے بھی آگاہ فرمایا گیا ہے جو آگے اس گھر کے مناسک و شعائر سے متعلق ان پر عاید ہونے والی ہیں ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۵-۳۷

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ ۚ وَمَنْ
ع ۴ ۳ ۱۰
يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۲۵﴾ وَإِذْ
بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ
لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿۲۶﴾ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ
بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ
عَمِيقٍ ﴿۲۷﴾ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ
مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَ
أَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ﴿۲۸﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا
نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿۲۹﴾ ذَٰلِكَ ۖ وَمَنْ يُعَظِّمْ
حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ ۗ وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ
إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ ۖ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ
الزُّورِ ﴿۳۰﴾ حُنَفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ
فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ
فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ﴿۳۱﴾ ذَٰلِكَ ۖ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ

تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ إِلٰٓى أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ
ع ۵ ۱۱ إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا
اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ
وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ أَسْلِمُوْا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ
اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي
الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ
مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ
فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ
كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ
لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۚ كَذٰلِكَ
سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۗ وَبَشِّرِ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

ترجمۂ آیات ۲۵-۳۷

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ لوگوں کو اللہ کی راہ اور اس مسجد حرام سے روکتے ہیں جس کو ہم نے لوگوں کے لیے یکساں بنایا، خواہ وہ اس کے شہری ہوں یا آفاقی (تو انھوں نے بہت بڑے ظلم کا ارتکاب کیا) اور جو اس میں کسی بے دینی، کسی شرک کے ارتکاب کا ارادہ کریں گے تو ہم ان کو ایک عذاب دردناک کا مزا چکھائیں گے۔ ۲۵

اور یاد کرو جب کہ ہم نے ابراہیم کے لیے ٹھکانا بنایا بیت اللہ کی جگہ کو اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرائیو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں

اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھیو! اور لوگوں میں حج کی منادی کر دو، وہ تمھارے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور نہایت لاغر اونٹنیوں پر بھی جو پہنچیں گی دور دراز گہرے پہاڑی رستوں سے۔ تاکہ لوگ اپنی منفعت کی جگھوں پر بھی پہنچیں اور چند خاص دنوں میں، ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ پس اس میں سے کھاؤ اور فاقہ کش فقیروں کو کھلاؤ۔ پھر وہ اپنے میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور بیت قدیم کا طواف کریں۔ ۲۶-۲۹

ان امور کا اہتمام رکھو! اور جو حرمات الٰہی کی تعظیم کرے گا تو اس کے رب کے نزدیک یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ اور تمھارے لیے چوپائے حلال ٹھہرائے گئے ہیں بجز ان کے جو تمھیں پڑھ کر سنا دیے گئے ہیں تو بتوں کی گندگی سے اجتناب رکھو اور جھوٹ بات سے بچو۔ اللہ ہی کی طرف یکسو رہو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرے اور چڑیاں اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے۔ ان امور کا اہتمام رکھو! اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یاد رکھے کہ یہ چیز دل کے تقویٰ سے تعلق رکھنے والی ہے۔ اور تمھارے لیے ان ہَدی کے جانوروں میں ایک خاص وقت تک مختلف قسم کی منفعتیں ہیں پھر ان کو قربانی کے لیے قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے۔ ۳۰-۳۳

اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مشروع کی تاکہ اللہ نے ان کو جو چوپائے بخشے ہیں ان پر وہ اس کا نام لیں۔ پس تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرو۔ اور خوش خبری دو ان کو جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے

کہ جب ان کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے ان کے دل دہل جاتے ، ان کو جو مصیبت پہنچتی ہے اس پر صبر کرنے والے ، نماز کا اہتمام رکھنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ ۳۴-۳۵

اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لیے شعائر الٰہی میں سے ٹھہرایا ہے۔ تمہارے لیے ان میں بڑے خیر ہیں تو ان پر اللہ کا نام لو ان کو صف بستہ کر کے۔ پس جب وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں تو ان میں سے کھاؤ اور کھلاؤ قانع محتاجوں اور سائلوں کو۔ اسی طرح ہم نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ تم خدا کے شکر گزار رہو۔ اور اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون بلکہ اس کو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اسی طرح ہم نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ تم اللہ کی ہدایت بخشی پر اس کی تعظیم بجا لاؤ۔ اور خوب کاروں کو خوش خبری سنا دو۔ ۳۶-۳۷

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ ؕ وَمَنْ یُّرِدْ فِیْہِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْہُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ (۲۵)

تالیف کلام کی دو شکلیں

اس آیت میں تالیف کلام کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے لے کر اَلْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ تک پورے ٹکڑے کو بطور توطیہ و تمہید مانیے اور اصل مبتداء وَمَنْ یُّرِدْ فِیْہِ کو قرار دیجیے۔ دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں خبر کو یعنی نُذِقْھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف مانیے۔ عربیت کے قاعدے سے یہ دونوں شکلیں صحیح ہیں۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان پہلی صورت کی طرف ہے اور میرا رجحان دوسری شکل کی طرف۔ میں نے ترجمے میں اسی کا لحاظ رکھا ہے لیکن آیت کی تاویل میں دونوں ہی صورتوں میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوگا۔

اشارہ قریش کی طرف

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ یہ اشارہ قریش کی طرف ہے۔ جنھوں نے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کر دیا تھا اور مسلمانوں کو جبر و زور کے ذریعہ سے اللہ کے دین سے بھی روک رہے تھے اور اس دور میں، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، انھوں نے مسلمانوں کو حرم کی حاضری سے بھی محروم کر دیا تھا۔

بنی ہاشم کی اجارہ داری پر ضرب

'الَّذِیۡ جَعَلۡنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَ الۡبَادِ'۔ یہ مسجد حرام کی تعریف ہے کہ اللہ نے اس میں حدودِ حرم کے مقیمین اور باہر سے آنے والوں دونوں کے حقوق یکساں رکھے ہیں۔ یہ قریش کی اجارہ داری اور رخاص طور پر بنی ہاشم کی جنبتی پر ضرب ہے کہ انھوں نے اللہ کے اس گھر پر اپنا جو تسلط مالکانہ و حاکمانہ جما رکھا ہے، جس کو چاہیں اس میں آنے دیں، جس کو چاہیں اس کی حاضری سے محروم کر دیں یہ بالکل ناجائز ہے۔ اس گھر پر کسی خاص خاندان کا اجارہ نہیں ہے۔ ہر شخص جو اللہ کی عبادت اور حج و طواف کے لیے اس گھر کا قصد کرے، خواہ قرشی و ہاشمی ہو یا غیر قرشی و غیر ہاشمی، مکی ہو یا غیر مکی، عربی ہو یا عجمی اس کے اوپر کسی کو کوئی قدغن عاید کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس کے مقیمین کا اگر کوئی حق و فرض ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ اس کو ان گندگیوں سے پاک و صاف رکھیں جن سے اس کو پاک و صاف رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو حکم دیا تھا اور جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ لیکن قریش کی یہ ستم ظریفی ہے کہ انھوں نے اللہ کے اس گھر کو ان تمام نجاستوں سے تو بھر دیا ہے جن سے پاک رکھنے کی اللہ نے ہدایت فرمائی تھی لیکن اس کی تولیت کے مدعی بنے بیٹھے ہیں اور اللہ کے ان بندوں کو اس سے روک رہے ہیں جو اس کو اس کے اصل ابراہیمی حسن و جمال سے از سر نو منور کرنا چاہتے ہیں۔

'الۡعَاکِفُ وَ الۡبَادِ' کا عام مفہوم تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہاں مقیم و آفاقی کا ہے لیکن حرم کے باشندوں کے لیے عاکف، کا لفظ استعمال کر کے قرآن نے ان کی اصل حیثیت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ان کی حیثیت حرم الٰہی کے ٹھیکیداروں، اجارہ داروں اور حکمرانوں کی نہیں ہے بلکہ اس کے معتکفین اور خدمت گزاروں کی ہے۔ وہ اس کو حضرت اسماعیلؑ کی طرح تمام دنیا کے لیے حج و عبادت کا مرکز بنائیں اور تمام خلق کو دعوت دیں کہ لوگ اس کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہونے کے لیے اس آستانۂ الٰہی پر آئیں۔

مسجد حرام پر کسی خاندان یا حکومت کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی

ان الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جہاں تک مسجد حرام کا تعلق ہے اس پر کسی خاندان یا کسی مخصوص حکومت کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی۔ اس میں عرب و عجم اور مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں کے حقوق بالکل یکساں ہیں۔ اہلِ مکہ یا ان کی حکومت کی حیثیت اس کے مالکوں کی نہیں بلکہ اس کے پاسبانوں اور خدمت گزاروں کی ہے۔ ان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کو شرک و بدعت کے ہر شائبہ سے پاک و صاف رکھیں اور اللہ کے جو بندے حج و قربانی کے لیے وہاں پہنچیں ان کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کریں لیکن کسی حال میں بھی دنیا کے کسی خطہ کے کسی مسلمان کو وہ اس کی حاضری سے محروم نہیں کر سکتے الا آنکہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ اللہ کے اس گھر کو ان مقاصد کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے جن

کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے اس کی تعمیر فرمائی ہے۔

حقوق کے ساتھ ساتھ اس گھر کی حفاظت و صیانت کی ذمہ داریوں میں بھی تمام دنیا کے مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ جو لوگ اس کے پاسبان ہیں وہ اس کو ان چیزوں سے آلودہ کر رہے ہیں جن سے اللہ نے اس کو پاک صاف رکھنے کا حکم دیا ہے تو تمام دنیا کے مسلمانوں کی یہ مشترک ذمہ داری ہے کہ وہ پاسبانوں کے ہاتھ پکڑیں۔ اس کے پاسبان یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ان کے گھر کا داخلی معاملہ ہے، دوسروں کو اس میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔ مسجد حرام کی حفاظت تمام مسلمانوں کی مشترک ذمہ داری ہے

اسی طرح اگر خدانخواستہ کوئی بیرونی طاقت اس پر حملہ کر دے تو اس کی حفاظت و مدافعت کے لیے تمام دنیا کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جائے گا۔ اس معاملے میں کسی قومی یا بین الاقوامی معاہدے اور مصلحت کا بھی کوئی لحاظ جائز نہیں ہوگا۔ اگر کسی ملک کی حکومت اس جہاد میں شرکت سے روکے تو ہر چند وہ نام نہاد مسلمانوں ہی کی حکومت ہو، اس کے خلاف بھی اہل ایمان پر فرض ہو گا کہ وہ جہاد کریں، اس لیے کہ حرم کی حفاظت و مدافعت کی ذمہ داری صرف اہلِ مکہ یا ان کی حکومت پر نہیں ہے بلکہ ہر کلمہ گو پر ہے۔ اس کو کسی صورت میں بھی پرایا جھگڑا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حرم کے حقوق اور ذمہ داریوں میں ہر مسلمان برابر کا شریک ہے۔ حرم امتِ مسلمہ کا دل ہے۔ اس کی صلاح تمام امت کی صلاح اور اس کا فساد پوری ملت کا فساد ہے۔

'سَوَآءَ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ' کے الفاظ سے یہ نتائج تو بدیہی طور پر نکلتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے لیکن ہمارے فقہاء کی ایک جماعت نے اس سے یہ مسئلہ بھی استنباط کیا ہے کہ حدودِ حرم میں نہ کوئی گھر کسی کی ذاتی ملکیت ہو سکتا اور نہ وہ کسی دوسرے سے کسی گھر کا کرایہ وصول کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ استنباط ضعیف ہے۔ آیت کے الفاظ پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ 'جَعَلْنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ' کے الفاظ مسجد حرام کی صفت کی حیثیت سے وارد ہوتے ہیں، پورے مکہ یا تمام حدودِ حرم کی صفت کے طور پر نہیں آتے ہیں۔ اس وجہ سے میں اس مسئلہ میں شوافع کے مسلک کو ترجیح دیتا ہوں جو اس پابندی کے حق میں نہیں ہیں۔

'وَمَنْ یُّرِدْ فِیْہِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْہُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ'۔ 'یُّرِدْ' کے بعد 'ب' کا صلہ اس کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ لفظ 'ھَمّ' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے۔ 'الحاد' کے معنی انحراف، کجی اور بے دینی کے ہیں۔ 'بظلم'، 'بالحاد' سے بدل واقع ہے۔ اور لفظ شرک کے مفہوم کے لیے قرآن مجید میں معروف ہے۔

آیت کا مدعا یہ ہے کہ یہ گھر وہ گھر ہے کہ اس میں اگر کوئی کسی بے دینی کا اور وہ بھی شرک جیسی بے دینی کرے گا تو ہم اس کو ایک عذاب دردناک کا مزا چکھائیں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ ارادہ، اور ھم میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ارادہ تو سوچ سمجھ کر ظہور میں آتا ہے لیکن 'ھَمّ' جیسا کہ 'وَھَمُّوْا بِمَا لَمْ یَنَالُوْا'

(توبہ : ۴۷)، وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا (یوسف : ۲۴) وغیرہ آیات میں وارد ہے کسی وقتی میلانِ نفس سے بھی ظہور میں آجاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس گھر کے شرائط و آداب بہت سخت ہیں۔ یہاں ان غلط چیزوں پر بھی گرفت ہے جو وقتی میلاناتِ نفس سے ظہور میں آجاتی ہیں۔ ع

ہشدار کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

'الحاد' کے بعد 'ظلم' کا اضافہ کر کے یہ حقیقت واضح فرما دی کہ جب یہاں معمولی کجروی بھی قابلِ گرفت ہے تو اس شرکِ عظیم کے لیے یہاں کس طرح گنجائش نکل سکتی ہے جس کا ایک وسیع کاروبار یہاں قریش نے پھیلا رکھا ہے!

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (۲۶)

حضرت ابراہیمؑ اور بیت اللہ کی صحیح تاریخ

اب یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بیت اللہ کی تاریخ بیان ہو رہی ہے تاکہ قریش پر یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جن مقاصد کے لیے اللہ نے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام سے یہ گھر تعمیر کرایا تھا وہ سارے ہی مقاصد انھوں نے برباد کر کے رکھ دیے ہیں اس وجہ سے یہ سزاوار ہیں کہ اب یہاں سے بے دخل ہوں اور وہ لوگ اس کے ذمہ دار بنائے جائیں جو اس عظیم امانتِ الٰہی کا حق ادا کرنے والے ہوں۔

'وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ'۔ 'تبوِیہ' کے معنی ٹھکانے، ٹھہرانے، آباد کرنے اور بسانے کے ہیں۔ یعنی تاریخ کی اس سرگزشت کو یاد کرو جب کہ ہم نے خاص اپنے حکم سے، ابراہیمؑ کی ہجرت کے بعد، ان کو اور اسماعیلؑ کو اس جگہ بسایا جس جگہ بیت اللہ ہے۔ 'بَوَّاْنَا' کے بعد 'لَ' اس امر کا قرینہ ہے کہ یہ مقام صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کا مسکن نہیں ٹھہرایا گیا تھا بلکہ ان کی ذریت (حضرت اسماعیلؑ) کا مسکن بھی یہی قرار پایا تھا۔ اہلِ عرب اپنی اس تاریخ سے بالاجمال واقف اور اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اولاد اور ان کی ملت کے وارث ہیں لیکن یہود نے یہ سازش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے بہت پہلے ہی تورات سے وہ ساری چیزیں نکال دیں یا ان کی تحریف کر دی جو حضرت ابراہیمؑ کے بیت اللہ کے ساتھ تعلق کی شہادت دینے والی تھیں تاکہ آخری رسول کی بعثت بنی اسمٰعیل کے اندر نہ ثابت ہو سکے۔ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کی ایک من گھڑت تاریخ بنائی اور یہ دکھانے کی کوشش کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کے بعد اپنا مستقر شام میں بنایا نہ کہ مکہ میں اور اپنے جس بیٹے کی قربانی کی وہ حضرت اسحاقؑ ہیں نہ کہ حضرت اسماعیلؑ۔ اور پھر مروہ، مکہ اور بیت اللہ اور ان سے تعلق رکھنے والی ساری ہی چیزوں پر تحریف کی سیاہی پھیرنے کی کوشش کی لیکن آخر وہ آفتاب سے زیادہ روشن حقیقت کو کہاں تک چھپانے میں کامیاب

ہوتے۔ اب بھی تورات میں، یہود کے علی الرغم، ایسی شہادتیں موجود ہیں جو ان کی سازش کا پردہ چاک کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف 'الرأی الصحیح فی من ھو الذبیح' میں یہود کی ان ساری سازشوں کو اچھی طرح بے نقاب کر دیا ہے اور ہم بھی اس کتاب میں تمام ضروری مباحث سے تعرض کر رہے ہیں۔ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۲۴ - ۱۳۴ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں، اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

قریش کے سامنے تاریخ کا آئینہ

'اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ' بعینہٖ یہی مضمون کم و بیش انہی الفاظ میں، سورۂ بقرہ میں یوں بیان ہوا ہے۔

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ	اور ابراہیم اور اسماعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر
طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ	کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع
وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (بقرہ: ۱۲۵)	سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ آیت ایک آئینہ ہے تاکہ قریش اس میں یہ دیکھ سکیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس مقصد اور کس حکم و ہدایت کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کو اس گھر کی تعمیر پر مامور فرمایا تھا اور اب اس کو قریش نے کیا بنا کے رکھ دیا ہے، پھر بھی اس کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں اور ان لوگوں کو اس سے روک رہے ہیں جو اس گھر کے اصلی مقاصد کی از سر نو تجدید کرنا چاہتے ہیں۔

وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (۲۷)

'رِجَال'، 'رَاجِل' کی جمع ہے جس کے معنی پیادہ چلنے والوں کے ہیں۔ 'ضَامِر' اس اونٹ یا اونٹنی یا گھوڑے کو کہتے ہیں جو طولِ سفر سے لاغر ہو گیا ہو۔ یہ لفظ مذکر و مؤنث دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ لفظ 'کل' اس کے ساتھ صفت کی تاکید کے طور پر ہے۔ مثلاً کہیں گے 'ھو العالم کل العالم' (وہ نہایت جید عالم ہے)۔ 'فج' پہاڑوں کے درمیان کے راستہ کو کہتے ہیں اور 'عمیق' اسی کی صفت ہے۔ پہاڑی راستے چونکہ تنگ ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ کثرتِ آمد و رفت سے گہرے ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کو منادیٔ عام

یعنی حضرت ابراہیمؑ کو اس گھر سے متعلق ایک ہدایت تو وہ ہوئی تھی جو اوپر کی آیت میں مذکور ہوئی، دوسری ہدایت یہ ہوئی کہ وہ اس گھر کے حج کے لیے لوگوں میں منادیٔ عام کریں کہ لوگ دور و قریب سے اس سرچشمۂ خیر و برکت سے مستفید ہونے کے لیے آئیں۔ اس میں بھی قریش کے رویہ پر تعریض ہے کہ ان کو کرنا تو یہ تھا کہ تمام خلق کو اس گھر کے حج و زیارت کی دعوت دیتے لیکن انھوں نے اس کے بالکل برعکس کیا یہ ہے کہ اس پر مارِ گنج بن کر بیٹھ گئے ہیں اور ملت ابراہیمؑ کے اصلی پیرو جب اس گھر کا قصد کرتے ہیں تو یہ ان پر پھنکارتے اور ان کو ڈستے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے لیے بشارت

'يَاْتُوْكَ رِجَالًا الاٰیۃ' یہ جواب امر ہے اس وجہ سے یہ حضرت ابراہیمؑ کے لیے بشارت ہے کہ جب

حج پر پابندیاں ناروا ہیں

تم حج کی منادی کر دو گے تو لوگ پیادہ اور سوار والہانہ اس گھر کے حج کے لیے آئیں گے۔ لوگوں کے اونٹ طول سفر سے لاغر اور مکہ کے راستے کثرت آمد و شد سے گہرے ہو جائیں گے۔

ان استعارات سے آنے والوں کی جس کثرت، جس شوق و عشق، جس وارفتگی و از خود رفتگی کا اظہار ہو رہا ہے اس کی شہادت آج ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی مکہ اور مدینہ کی سڑکیں اور منیٰ و عرفات کے میدان حج کے موقع پر دے رہے ہیں اور ہر دیکھنے والا اندازہ کر سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو بشارت دی گئی تھی وہ کس طرح ظہور میں آئی اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں کس طرح برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ پہلے اس راہِ عشق میں صرف اونٹنیاں لاغر ہوتی تھیں۔ اب زمانہ کی ترقی نے اس دوڑ میں بسوں، لاریوں، موٹروں اور ہوائی جہازوں کو بھی شریک کر دیا ہے۔ ان آیات کا سیاق اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پسند اور اس کی رضا یہی ہے کہ اس کے گھر کی زیارت کے لیے اس کے بندوں کے اندر یہ ذوق و شوق روز افزوں رہے اس وجہ سے بہت سی حکومتوں نے، اور وہ بھی مسلمان کہلانے والی حکومتوں نے حج پر پرمٹ، کوٹے، ٹرمے اور زرِ مبادلہ کے مختلف ناموں سے جو پابندیاں عاید کر رکھی ہیں یہ نہ صرف بالکل ناروا ہیں بلکہ ہمارے نزدیک صد، عن المسجد الحرام کے حکم میں داخل ہیں۔ کوئی غیر مسلم حکومت بھی اگر اپنے علاقے کے مسلمانوں پر اس قسم کی کوئی پابندی عاید کرے تو وہ اس کی مجاز نہیں ہے بلکہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا کہ یہ چیز اس فتنہ (PERSECUTION) کے حکم میں داخل ہے جس کو مٹانے کے لیے اس غیر مسلم حکومت کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کرنا چاہیے اگر وہ اس کی استطاعت رکھتے ہوں۔

لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ (۲۸)

حج کی دنیوی برکات

'لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ' بقرہ کی تفسیر میں ہم وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ حج کے مہینے اہل عرب کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے بھی موسم بہار کا حکم رکھتے تھے۔ اسی زمانے میں باہر سے اہل مکہ کی ضرورت کی تمام چیزیں مکہ کے بازاروں میں پہنچتی تھیں اور مکہ کا مال باہر کی منڈیوں کے لیے نکلتا تھا۔ اگر حج کے اصل مقصود کے ساتھ ساتھ اس قسم کے جائز دنیوی منافع حاصل کیے جائیں تو یہ چیز اس دینِ قیم کے مزاج کے منافی نہیں ہے جس کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی ہے بلکہ یہ اس امر کی شہادت ہے کہ یہ دین فطرت رہبانیت کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی اس عبادت میں بھی دین و دنیا کی ہم آمیزی کا اعتدال قائم رکھا ہے جس میں بظاہر سب سے زیادہ ترکِ دنیا کی نمود ہے۔ بس اصل چیز صحیح توازن کو قائم رکھنا ہے کہ حج صرف تجارتی یا سیاسی سفر بن کے نہ رہ جائے۔

'وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ'۔ 'بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ' کی تحقیق مائدہ آیت ۱ کے تحت گزر چکی ہے۔

ایامِ معلومات سے مراد

'اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ' سے مراد قربانی کے معین ایام ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں دین کی اس حکمت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ جس طرح اس دنیا کے کاموں میں اوقات، فصلوں اور موسموں کا اعتبار ہے، اگر اس کو قائم نہ رکھا جائے تو ساری جدوجہد اکارت ہو کے رہ جاتی ہے اسی طرح عبادات میں بھی مقام، اوقات ایام اور مہینوں کا اعتبار ہے۔ اگر ان کا حتی الامکان اہتمام نہ رکھا جائے تو عبادت اپنی اصلی برکت سے محروم رہ جاتی ہے۔ قربانی کے جو دن ہیں یہ اللہ و رسول کے مقرر کیے ہوئے ہیں اور یہ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار ہیں۔ ان میں امت کی سہولت کو پیش نظر رکھ کر اللہ و رسول نے ایک حد خاص تک وسعت بھی رکھی ہے۔ اس وسعت سے فائدہ اٹھانا تقویٰ کے منافی نہیں ہے لیکن ان ایام کا اعتبار دین میں ضروری ہے اور یہ چیز اس کائنات کی فطرت کے بالکل مطابق ہے۔

چوپایوں کی جانوں پر اللہ کے نام کا قفل

'وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ' اس آیت میں بھی اور آگے کی آیات میں بھی ذبح اور نحر کو ذکر اسم اللہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس اہتمام خاص کی وجہ یہ ہے کہ جاہلیت میں مشرکین کی تمام قربانیاں ان کے اصنام کے لیے ہوتی تھیں۔ اس فتنہ کے کلی سدباب کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمام چوپایوں کی جانوں پر اپنے نام کا قفل لگا دیا جو صرف اسی کے نام کی کنجی سے کھولا جا سکتا ہے۔ اس کے بغیر کسی چوپایہ کی جان لینا دین میں حرام ٹھہرا۔ 'عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ' اس بات کی دلیل ہے کہ کیوں چوپایوں کو خدا ہی کے نام پر ذبح کرنا ضروری ہے؟ یہ اس لیے ضروری ہے کہ یہ خدا ہی کے عطا کردہ ہیں اس وجہ سے کسی غیر اللہ کے نام پر ان کو ذبح کرنا خدا کی بھی ناشکری ہے اور جانوروں کی بھی تحقیر ہے۔ اس اسلوب میں اللہ تعالیٰ کے شکر کی ترغیب و تشویق بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کو چوپائے اپنے فضل و رحمت سے عطا فرمائے ہیں ان کا حق یہ ہے کہ بندے اس نعمت کے شکر کے طور پر ان کا نذرانہ اپنے رب کے حضور میں پیش کریں۔

مشرکین کے بعض تصورات کا خاتمہ

'فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ' فرمایا کہ یہ قربانی جو تمہیں پیش کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے وہ اس لیے نہیں کہ خدا کو ان قربانیوں سے کوئی نفع پہنچتا ہے۔ خدا کو ان قربانیوں کا گوشت یا خون کچھ بھی نہیں پہنچتا۔ تمہاری پیش کی ہوئی یہ چیز تمہی کو لوٹا دی جاتی ہے۔ تم خود اس کو کھاؤ اور بھوکوں اور محتاجوں کو کھلاؤ۔ قربانی کی مثال بالکل یوں ہے کہ کوئی اپنے سر کے تاج کو اصل بادشاہ کے قدموں پر رکھے اور بادشاہ اس تاج کو اپنے قدموں سے عزت دے کر پھر اس کے سر پر پہنا دے ــــ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ مشرک قومیں بلا استثناء یہ تصور رکھتی ہیں کہ ان کے معبود ان کی پیش کردہ قربانیوں سے بہرہ اندوز و لذت یاب ہوتے ہیں۔ مشرکین تو درکنار یہود تک کے یہاں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ خداوند بعض قربانیوں کی خوشبو سے بہت محظوظ ہوتا ہے۔ قرآن نے اس آیت میں بھی اور آگے کی آیات میں بھی ان تصورات کا خاتمہ کر دیا ہے۔

ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (۲۹)

'تفث' کے معنی میل کچیل کے ہیں۔ 'قضی تفثہ' یعنی اس نے اپنا میل کچیل دور کیا۔ یہ قربانی سے فارغ ہونے کے بعد حج کے آخری مراسم کی ادائیگی کی طرف اشارہ ہے۔ احرام کی پابندیوں اور مناسک کی سرگرمیوں کی وجہ سے بال وغیرہ بھی بڑھ جاتے ہیں اور جسم کا میل کچیل بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہی بات پسند ہے کہ ان ایام میں بندے پر یہی خستہ حالی و پراگندہ بالی کی حالت طاری رہے، لیکن حج کے بعد حجامت بنوائے، نہائے دھوئے، کپڑے بدلے اور اگر کوئی قربانی وغیرہ نذر مانی ہے تو وہ پوری کرے اور بیت اللہ کا آخری طواف کر کے حج سے فارغ ہو جائے۔ حج کے آخری مراسم

'بیت اللہ' کو یہاں 'بیت عتیق' سے تعبیر فرمایا ہے۔ 'عتیق' کے معنی اصل اور قدیم کے ہیں۔ 'بیت اللہ' کو 'عتیق' کہنے کی وجہ، جیسا کہ ہم بقرہ ۱۲۵ کے تحت واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ خدا کا اصل اور قدیم گھر یہی ہے نہ کہ بیت المقدس، جیسا کہ یہود دعویٰ کرتے ہیں۔ بیت المقدس اول تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد، حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں تعمیر ہوا ہے، پھر اس کی تعمیر بھی اس طرح ہوئی کہ اس کی اصل قربان گاہ کا رخ بیت اللہ ہی کی طرف تھا، اس لیے کہ تمام ذریت ابراہیم کا اصل قبلہ بیت اللہ ہی تھا۔ اگرچہ یہود نے ان تمام چیزوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن اصل حقیقت کے شواہد تورات میں آج بھی موجود ہیں اور بقرہ کی تفسیر میں ہم ان کی وضاحت کر چکے ہیں۔ بیت عتیق

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۳۰)

'ذٰلِكَ' جب اس طرح آتا ہے تو یہ پورے جملہ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ یعنی یہ باتیں ہیں جو بیت اللہ اور اس کے حج و مناسک سے متعلق ابراہیم کو بتائی گئی تھیں، ان کو اچھی طرح سن اور سمجھ لو۔ یہ گویا تنبیہ کا کلمہ ہے۔ حضرت ابراہیم کو جو ہدایات دی گئی تھیں وہ اس جملہ پر پوری ہوئیں۔ اب آگے ان لوگوں کو ہدایات دی جا رہی ہیں جو بیت اللہ کی وراثت کے مدعی تو تھے لیکن اس امانت کی ذمہ داریوں سے بالکل بے خبر تھے۔ 'ذٰلک' پورے جملہ کا قائم مقام

'وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ'۔ 'حُرُمٰتِ اللّٰهِ' سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کے احترام کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ مثلاً حرم، مسجد حرام، اشہر حرم، ہدی اور قلائد وغیرہ۔ ان تمام چیزوں کے احترام کی روایت حضرت ابراہیم کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ یہاں ان محترم چیزوں کی تعظیم و تکریم کی تاکید کی خاص وجہ یہ ہے کہ مشرکین نے حضرت ابراہیم کی تمام مقدس روایات اپنے دنیوی مفادات کی خاطر بالکل بدل ڈالی تھیں۔ شلاً چار محترم مہینوں ہی کو لیجیے۔ ان کو نسی کا قاعدہ ایجاد کر کے، جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے، قمری کے بجائے شمسی مہینوں کے مطابق کر لیا گیا تھا تاکہ تجارتی پہلو سے ان کو سازگار بنایا جا سکے۔ اس آیت میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ حرمات الٰہی کے احترام کی پابندیوں کے سبب سے ہو سکتا ہے کہ بظاہر بعض دنیوی مفادات کو کچھ نقصان پہنچے۔ لیکن دیکھنے کی چیز تمام حرمات الٰہی کے احترام کی ہدایت

یہ اشارہ ہے ان تفصیلات کی طرف جو سورۂ انعام میں گزر چکی ہیں۔ ملاحظہ ہوں سورۂ انعام کی آیات ۱۳۶-۱۵۱
یہ ساری تحریم و تحلیل چونکہ مشرکانہ عقائد و توہمات پر مبنی تھی اس وجہ سے فرمایا کہ اپنے بتوں کے تعلق سے جو گندگی تم نے اپنے اوپر لاد رکھی ہے اس سے بچو۔ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ اور خدا کے اوپر جھوٹ افترا سے بچو۔ یعنی حرام و حلال تو تم اپنے جی سے کرتے ہو لیکن اس کو مذہبی تقدس کا درجہ دینے کے لیے منسوب خدا کی طرف کرتے ہو کہ اس نے تمھیں ان باتوں کا حکم دیا ہے۔ یہ نہایت سنگین جھوٹ اور اللہ تعالیٰ جل شانہٗ پر افترا ہے، اس سے احتراز کرو۔ اسی چیز کو سورۂ انعام میں اِفْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ سے تعبیر فرمایا ہے۔ وَحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ۔ ۱۴۰

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۳۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کے تمام شعائر کی تعظیم اور تمام مناسک کی ادائیگی اس طرح مطلوب ہے کہ ہر کام اُس کی طرف یکسو ہو کر اور شرک کے ہر شائبہ سے بالکل پاک رہتے ہوئے کیا جائے۔ اگر کسی کام میں شرک کی کوئی آمیزش ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بالکل باطل ہے۔

شرک کی تمثیل

'وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ الاٰیۃ' یہ شرک کی تمثیل بیان ہوئی ہے کہ آدمی شرک کا ارتکاب کر کے اپنے اصل مرکز سے کٹ جاتا ہے اور جب وہ اصل مرکز سے کٹ گیا تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس شیطان کے ہتھے چڑھ جائے۔ وہ ایک بے لنگر کا جہاز ہے جو ہر چٹان سے ٹکرا سکتا اور ایک کٹا ہوا پتنگ ہے جس کو ہوا جہاں چاہے اڑا لے جا سکتی ہے۔ توحید سے انسان کو جس درجے کی سرفرازی حاصل ہوتی ہے اس سے محروم ہوتے ہی وہ اسی درجے کی پستی میں گر جاتا ہے۔ فرمایا کہ جو اللہ کا شریک بناتا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرا اور عقابوں نے اس کو آ اُچک لیا یا ہوا نے اس کو کسی گہرے کھڈ میں لے جا کر پھینک دیا!

یہ وقتی مفادات نہیں ہیں بلکہ ان کی اخروی برکتیں ہیں۔ جو لوگ ان اخروی برکتوں کی خاطر ہر حال میں ان کا احترام قائم رکھیں گے وہ یاد رکھیں کہ اللہ کے نزدیک یہ چیز ان کے لیے بہت بڑے خیر کا باعث ہوگی۔

مشرکین کے من گھڑت تحریمات کی تردید

وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ اوپر والا ٹکڑا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بطور تنبیہ کے ہے۔ اب 'عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ' کے تعلق سے یہ واضح فرمایا جا رہا ہے کہ مشرکین نے محض اپنے مشرکانہ توہمات کی بنا پر مختلف چوپایوں کے بارے میں یہ فتوے جو جاری کر رکھے ہیں کہ فلاں چوپایہ حلال ہے، فلاں حرام ہے، فلاں مردوں کے لیے جائز ہے اور فلاں عورتوں کے لیے ناجائز ہے، فلاں قسم کے چوپایہ پر سواری کرنا جائز ہے اور فلاں قسم کے چوپایہ پر جائز نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ، یہ ساری باتیں محض من گھڑت ہیں۔ ملت ابراہیم میں ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ملتِ ابراہیم میں حرام صرف وہی چوپائے ہیں جو قرآن میں پڑھ کر سنائے جا رہے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ شرک کا ارتکاب کر کے آدمی خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا بلکہ خود اپنے ہی کو اس سرفرازی اور اس امن و حفاظت سے محروم کر لیتا ہے جو توحید کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو بخشی ہے۔ پھر وہ شیطان کے ہر فتنہ کا ہدف اور اس کے بچھائے ہوئے ہر جال کا شکار ہے۔

ذٰلِكَ ۖ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (۳۲)

شعائر کی تعظیم کے لیے اصل شرط

یہ 'ذٰلِكَ' بھی اسی طرح کا ہے جیسا کہ اوپر آیت ۳۰ میں گزرا۔ یعنی اوپر جو باتیں بتائی گئیں ان کو اچھی طرح سن لو اور ان کو گرہ کر لو اور مزید برآں یہ اچھی طرح یاد رکھو کہ اللہ نے جو شعائر مقرر فرمائے ہیں ان کی تعظیم کا حق محض ظاہرداری سے ادا نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے دل کا تقویٰ مطلوب ہے۔ 'شعائر' جیسا کہ ہم بقرہ۔ ۱۵۸ 'اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ' کے تحت واضح کر چکے ہیں کسی عظیم حقیقت کے نشان اور مظہر کے طور پر مقرر ہوئے ہیں۔ ان سے اصل مقصود انہی حقائق کی تذکیر و تذکر ہے جو ان کے اندر مضمر ہیں۔ اگر ان حقائق کا اہتمام باقی نہ رہ جائے تو محض ظاہری رسم داری سے شعائر کی تعظیم کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ان کی صحیح تعظیم کا حق اسی وقت ادا ہوتا ہے جب وہ اثر ان سے اخذ کیا جائے جس کو پیدا کرنے کے لیے وہ مقرر ہوئے ہیں۔ آگے قربانی سے متعلق، جو ایک عظیم شعیرہ ہے، اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا	اللہ کو تمہاری ان قربانیوں کا نہ گوشت پہنچے گا اور
وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔ ۳۷	نہ ان کا خون بلکہ صرف تمہارا تقویٰ پہنچے گا۔

قربانی کے متعلق معلوم ہے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار ہے۔ انھوں نے اپنے محبوب فرزند —— حضرت اسماعیلؑ —— کی قربانی کر کے اسلام کی اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ مسلم کو ہر وقت اپنی عزیز سے عزیز شے اپنے رب کی خاطر قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اگر قربانی کی یہ حقیقت مستحضر نہ رہے اور آدمی ایک جانور کی گردن پر چھری چلا دے تو گو فی الظاہر اس نے قربانی کر دی لیکن فی الحقیقت وہ اس عظیم شعیرہ کی روح سے بے خبر رہا در آنحالیکہ خدا تک رسائی حاصل کرنے والی چیز وہ روح ہی ہے نہ کہ اس کی قربانی کا گوشت یا خون۔

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (۳۳)

لفظ 'مَحِلّ' پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ص ۴۲۹ پر بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے بعد حرف 'اِلٰی' اس بات کا قرینہ ہے کہ کوئی لفظ ایسا محذوف مانا جائے جس سے یہ مفہوم پیدا ہو کہ پھر ان کو بیت عتیق کے پاس لے جا کر قربان کرنا ہے۔

مشرکین کی بعض بدعات کی اصلاح

مشرکین جب کسی چوپایہ کو ہدی و نیاز کے لیے نامزد کر دیتے تو پھر اس سے کسی قسم کا انتفاع ناجائز سمجھتے۔ قرآن نے ان کی اصلاح فرما دی کہ ان شعائر کی تعظیم کے لیے یہ چیز ضروری نہیں ہے۔ اپنے قربانی کے جانوروں کو پالو اور ان سے اس وقت تک فائدہ اٹھاؤ جب تک ان کی قربانی کا وقت نہ آ جائے۔ اس

انتفاع سے ان کی حرمت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا البتہ یہ ضروری ہے کہ جب ان کی قربانی کا وقت آ جائے تو ان کو اللہ کے قدیم گھر کے پاس لے جا کر اللہ ہی کے لیے ان کو قربان کرو۔ اگر کسی اور تھان یا استھان پر لے جا کر ان کو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا تو اس سے ان کی حرمت برباد ہو جاتی ہے۔ 'بَیْتِ عَتِیْق' کی وضاحت اوپر گزر چکی ہے۔ 'ثُمَّ' یہاں میرے نزدیک ترتیب کو ظاہر کرتا ہے اس وجہ سے میں اس انتفاع کو اس وقت تک جائز سمجھتا ہوں جب تک قربانی ٹھکانے نہ لگ جائے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ (۳۴)

قربانی ایک قدیم ترین طریقۂ عبادت

لفظ 'مَنْسَك' کی تحقیق بقرہ آیت ۲۰۰ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے مختلف معانی میں سے قربانی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شرائع الٰہی میں قربانی ایک قدیم ترین عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کی امت کے لیے اس طریقۂ عبادت کو مشروع فرمایا کہ اللہ کے بندے اس طرح اللہ کے بخشے ہوئے چوپایوں پر اس کی شکر گزاری کا حق ادا کریں۔ یہاں قربانی کے قدیم ترین طریقۂ عبادت ہونے کا جو ذکر ہے اس کی شہادت کے لیے یہ کافی ہے کہ تورات اور قرآن دونوں میں حضرت آدمؑ کے بیٹے ہابیل کی قربانی کا ذکر موجود ہے۔

'لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ' خدا کی مشروع کی ہوئی اس عبادت کی یہ خصوصیت بیان ہوئی ہے کہ اللہ نے یہ عبادت خاص اپنی شکر گزاری کے لیے مشروع فرمائی ہے کہ اس کے عطا کیے ہوئے چوپائے اس کی خوشنودی اور رضا طلبی کے لیے لوگ اس کے حضور میں نذر گزرانیں اور اس طرح اس کی بخشی ہوئی نعمت پر اس کا شکر ادا کریں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام ادیانِ الٰہی میں قربانی کی مشروعیت اور اس کی اصل روح یہ رہی ہے۔ اس میں اگر کسی غیر اللہ کو شریک بنایا گیا ہے تو یہ مبتدعین کی پیدا کردہ ضلالت ہے۔ اللہ کے دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

'فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا' مطلب یہ ہے کہ معبود تم سب کا ایک ہی ہے تو اس کی قربانی اور عبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہ بناؤ بلکہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرو۔ یہی چیز اگلی قربانی کی اصل روح ہے۔

اخبات کی حقیقت

'وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ'۔ 'خبت' پست اور نشیبی زمین کو کہتے ہیں۔ اسی سے 'اخبات' ہے جس کے معنی فروتنی اور تذلل و تواضع کے اظہار کے ہیں۔ یہاں اس لفظ سے اسی حقیقت کا اظہار فرمایا گیا ہے جس کی ہدایت 'أَسْلِمُوا' کے لفظ سے ہوئی ہے۔ اسلام کی اصل روح 'اخبات' ہی ہے یعنی انسان کا صرف ظاہر ہی نہیں بلکہ اس کا دل بھی اپنے پروردگار کے آگے جھک جائے۔ جن لوگوں کے اندر یہ اخبات ہو حقیقی مومن و مسلم وہی ہیں اور انہی کے لیے خدا کے رضوان اور اس کی جنت کی بشارت ہے۔

الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳۵)

یہ مُخبتین کی صفت ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور اس کی آیتیں ان کو سنائی جاتی ہیں تو وہ متکبرین کی طرح، جن کا ذکر اسی سورہ میں آگے آیت ۷۲ میں آئے گا، ناک بھوں نہیں چڑھاتے بلکہ ان کے دل خشیتِ الٰہی سے دہل جاتے ہیں۔ 'وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ' اور جن کا حال یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں ہر مصیبت کو پوری ہمت کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں، ان لوگوں کی طرح نہیں ہیں جن کا حال آیت 'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ' کے تحت بیان ہوا کہ وہ ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے ہیں لیکن اس راہ میں کوئی چوٹ کھانے اور کوئی جوکھم برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ 'وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ' یہ مضاف مضاف الیہ کی ترکیب ہے۔ صبر اور نماز کے باہمی تعلق پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں گفتگو کر چکے ہیں۔ اس کا مفہوم صرف یہ نہیں ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ برابر نماز کا نہایت اہتمام رکھنے والے ہیں۔ 'وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ' اور خدا نے جو کچھ ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس اسلوب میں انفاق کی تسہیل اور اس کی ترغیب کا جو پہلو ہے اس پر بھی نگاہ رکھیے اور نماز اور انفاق میں جو رشتہ ہے اس کو بھی نظر سے اوجھل نہ ہونے دیجیے۔ دین کی حکمت سمجھنے کے لیے ان اجزاء کے باہمی تعلق کو سمجھنا ضروری ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۳۶)

'بُدْن' کا مفہوم

'بُدْن'، 'بَدَنَة' کی جمع ہے۔ یہ لفظ اونٹوں کے لیے آتا ہے لیکن یہاں یہ خاص طور پر ان اونٹوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو قربانی کے لیے نامزد کر دیے گئے ہوں اور جن کی حیثیت ہدی اور قلائد کی ہو چکی ہو۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تعریف میں فرمایا گیا ہے کہ 'جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ' (ان کو ہم نے تمہارے لیے شعائر میں سے ٹھہرایا ہے) ظاہر ہے کہ شعیرہ ہونے کا درجہ ہر اونٹ اور اونٹنی کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف نیاز کے اونٹوں کو حاصل ہوتا ہے۔

اونٹوں کے ذکر کی ایک خاص وجہ

اوپر آیت ۲۸ میں ان تمام چوپایوں کا ذکر ہو چکا ہے جن کی قربانی مشروع ہے۔ اس کے بعد اونٹوں کے ذکر کی چنداں ضرورت تو نہیں تھی اس لیے کہ 'بهيمة الانعام' میں یہ بھی شامل ہیں لیکن ایک خاص سبب سے ان کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا۔ وہ یہ کہ اونٹ اہل عرب کے محبوب چوپایوں میں سے ہے، لیکن یہود نے اپنی ایک کمزور روایت کی بنا پر، جس کا ذکر آل عمران ۹۳ کے تحت ہو چکا ہے، اس کو حرام قرار دے رکھا تھا۔ اپنی اسی روایت کی آڑ لے کر انھوں نے اونٹ کی قربانی کے مسئلہ کو بھی اسلام کے خلاف فتنہ انگیزی اور شورہ اندازی کا ذریعہ بنا لیا۔ انھوں نے یہ پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ بھلا یہ نیا دین حضرت ابراہیمؑ کا دین کس طرح ہو سکتا

ہے جس نے تمام انبیاء کے حرام کیے ہوئے جانور کی قربانی کو خدا کے تقرب کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ قرآن نے آلِ عمران کی آیت ۹۳ میں یہود کے اس واہمہ کی تردید فرمائی ہے اور یہود سے مطالبہ کیا ہے کہ اگر اس بات کا ان کے پاس کوئی ثبوت موجود ہو کہ اونٹ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حرام قرار دیا ہے تو وہ اس کو پیش کریں۔

'لَکُمْ فِیْہَا خَیْرٌ' یہ اونٹ کی قربانی کو شعائر الٰہی میں سے قرار دیے جانے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ اس کے اندر تمہارے لیے بڑی برکتیں اور بڑے فوائد ہیں۔ آیت 'لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ' کے تحت ہم عرض کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو قربانی اسی جانور کی پسند ہے جو عزیز و محبوب ہو۔ اونٹ عرب کے محبوب ترین جانوروں میں سے ہے۔ یہ ان کے صحرا کا سفینہ، ان کے تمام سفر و حضر کا رفیق اور ان کی تمام تجارتی سرگرمیوں کا واحد ذریعہ تھا۔ وہ اس کے دودھ، گوشت اور کھال ہر چیز سے بیش از بیش فائدے اٹھاتے تھے۔ قرآن نے اس کی انہی منفعتوں اور برکتوں کے سبب سے اہل عرب کو اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی اس نعمت کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز باعتبار دنیا اہل عرب کے لیے اتنی نفع بخش اور بابرکت ہو اگر وہ اس کو اپنے رب کی خوشنودی کے لیے قربان کریں تو یہ ان کے لیے خدا کے تقرب کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہو سکتی ہے۔

اونٹوں کی قربانی کا طریقہ

'فَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُہَا فَکُلُوْا مِنْہَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ'

یہ ان کی قربانی کرنے کا طریقہ بتایا کہ ان کو قبلہ رو صف بستہ کھڑے کر کے ان کو نحر کرو۔ نحر یا ذبح کو ذکر اللہ سے تعبیر کرنے کی وجہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ یہ صف بستہ کھڑا کرنا گویا خدا کے حضور نماز کے لیے ان کا قیام ہے اور نحر کے بعد جب وہ اپنے پہلو پر گر پڑیں تو یہ گویا رب کے حضور ان کا سجدہ ہے۔ فرمایا کہ اس کے بعد تم خود بھی اس کے گوشت سے فائدہ اٹھاؤ اور خوددار محتاجوں اور سائلوں کو بھی کھلاؤ۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اپنی قربانیوں سے کوئی فائدہ اٹھانا حرام سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس بدعت کی بھی اصلاح کر دی۔

قانع اور [illegible] وضاحت

یہاں مستحقین کے لیے 'قانع' اور 'معتر' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اصل مستحق تو جیسا کہ اوپر آیت ۲۸ میں گزرا، نادار و غریب لوگ ہیں لیکن غریبوں میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کی خودداری سوال کرنے کا ننگ گوارا نہیں کرتی اور بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو سوال کرتے ہیں۔ پہلی قسم کے ناداروں کے لیے 'قانع' کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور دوسری قسم کے ناداروں کے لیے 'معتر' کا۔ 'معتر' متعرض للسوال کہتے ہیں۔ آیت میں 'قانع' کی تقدیم سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا حق مقدم ہے اور چونکہ وہ سائل بن [illegible] کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتے اس وجہ سے دینے والوں کا فرض ہے کہ خود ان کے پاس پہنچیں، ان سے یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ دینے والوں کے پاس پہنچیں گے۔ آیت 'لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا' کے تحت اس مسئلہ پر وضاحت سے ہم لکھ چکے ہیں اور یہ اشارہ بھی کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

کے نزدیک غرباء کے لیے پسندیدہ یہ خودداری ہی کا رویہ ہے۔ اگرچہ مجبوری کی حالت میں سوال کرنے کی بھی اجازت ہے۔

'کَذٰلِکَ سَخَّرْنٰھَا لَکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ' مطلب یہ ہے کہ یہ محض اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے اونٹ جیسے عظیم جانور کی نکیل اس طرح تمہارے ہاتھ میں پکڑا دی ہے کہ تم اپنے سفر و حضر میں جس طرح چاہو اس سے فائدہ اٹھاؤ اور جب چاہو اس کو نحر کر دو۔ وہ تمہاری اطاعت سے سرِ انحراف نہیں کر سکتا۔ اگر خدا نہ چاہتا تو اونٹ تو درکنار کسی چھوٹے سے چھوٹے جانور کو بھی تم اس طرح اپنا تابع فرمان نہیں بنا سکتے تھے۔ خدا کے اس احسان کا قدرتی اور فطری حق یہی ہے کہ تم اس کے شکرگزار رہو، اس کے حقوق برابر ادا کرو اور ان حقوق میں دوسروں کو ساجھی نہ ٹھہراؤ۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ ؕ کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ (۳۷)

اصل حقیقت کی یاددہانی — یہ اسی حقیقت کی دوسرے پہلو سے یاددہانی ہے جس کی طرف اوپر آیت ۳۲ میں اشارہ فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا قربانیوں کے گوشت یا خون سے محظوظ نہیں ہوتا، جیسا کہ مشرکین نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ اس تقویٰ اور اس اسلام و اخبات سے خوشنود ہوتا ہے جو ان قربانیوں سے ان کے پیش کرنے والوں کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ قربانیاں پیش کرتے ہوئے اپنے اندر تقویٰ کی یہ روح پیدا کرو۔ اگر یہ چیز نہ پیدا ہوئی تو یہ محض ایک جانور کا خون بہا دینا ہوا، اس کا حاصل کچھ نہیں۔

'کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ' یہ اسی مضمون کا دوسرے لفظوں میں اعادہ ہے جو اوپر 'کَذٰلِکَ سَخَّرْنٰھَا الآیۃ' میں گزرا۔ البتہ اس میں اس شکر کا طریقہ بتا دیا کہ یہ خدا کی تکبیر و تہلیل کی صورت میں ہو یعنی اس نذرانہ کو خدا کی بارگاہ میں پیش کرتے ہوئے صرف خدا ہی کی عظمت و کبریائی کا اعتراف و اعلان کیا جائے، کسی غیر خدا کو اس میں ساجھی نہ بنایا جائے۔ چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں ان چوپایوں کو قبلہ رو کر کے ان پر تکبیر پڑھی جاتی اور 'منک ولک' کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ مزید برآں اس آیت میں اس شکر کے اصل محرک کا بھی پتہ دے دیا ہے کہ یہ شکر اس بات کا ہے کہ خدا نے تمہیں ہدایت بخشی یعنی اس اسلام و اخبات کی ہدایت بخشی جس کا اظہار حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی کر کے کیا۔

'وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ'۔ 'محسن' کا مفہوم ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ اس سے مراد وہ خوب کار لوگ ہوتے ہیں جو خدا کے ہر حکم کی تعمیل اس کو حاضر و ناظر جان کر اس طرح انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح اس کو انجام دینا چاہیے۔ یہاں بر بنائے قرینہ یہ مضمون محذوف ہے کہ جو لوگ ان شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی قربانی پیش کریں گے وہی لوگ دراصل خوب کار ہیں۔ ایسے خوب کاروں

کہ خدا کی خوشنودی اور اس کی جنت کی خوش خبری پہنچا دو!

۶- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۳۸-۴۱

یہ آیات مدینہ میں نازل ہوئیں اور چونکہ یہ، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، انہی باتوں پر متفرع اور انہی کی توضیح کی حیثیت رکھتی ہیں جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ اس وجہ سے ان کو مصحف کی ترتیب میں یہاں جگہ ملی۔

اوپر آیت ۲۵ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ وہاں، قریش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ اور مسجد حرام سے مسلمانوں کو روک رہے ہیں، درآنحالیکہ مسجد حرام پر کسی کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی، وہ بڑے ہی ظالم ہیں اور اللہ ایسے ظالموں کو ایک دردناک عذاب چکھائے گا۔ اس کے بعد بیت اللہ کی تاریخ اور اس کے مناسک و شعائر کی روشنی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ قریش نے اس گھر کی ساری حرمت برباد کر کے رکھ دی ہے ان کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اس گھر پر مسلط رہیں۔
ان آیات کے اندر ظاہر ہے کہ یہ اشارہ مضمر تھا کہ اس گھر کی تولیت کے اصل حقدار مسلمان ہیں نہ کہ قریش لیکن مکہ میں مسلمان بالکل بے بس اور مجبور تھے اس وجہ سے وہ اپنے اس حق کو حاصل کرنے کے لیے کوئی عملی اقدام نہیں کر سکتے تھے۔ مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد جب انھوں نے ایک تنظیم کی شکل اختیار کر لی تو ان کے اندر قدرتی طور پر یہ احساس شدت سے پیدا ہوا کہ انھیں اس گھر کی برکتوں سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔ لیکن اس کی شکل کیا ہو؟ ظاہر ہے کہ جب قریش نے اس بے دردی کے ساتھ ان کو اس گھر سے نکال چھوڑا تھا تو وہ آسانی سے یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کو حج و عمرہ کی اجازت دیں۔ اگر مسلمان اس کی کوشش کرتے تو لازماً جنگ کی نوبت آجاتی اور جنگ بھی حدودِ حرم اور اشہر حرم میں، جس کو جاہلیت اور اسلام دونوں میں ممنوع سمجھا گیا ہے۔ قریش اور ان کے حلیف ــــ اہل کتاب ــــ اس چیز کو بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈا کا ذریعہ بناتے کہ دیکھو اس نئے دین والوں نے حرم اور اشہر حرم کی حرمت پر بھی حملہ کر دیا جس کی جسارت ان سے پہلے کسی نے بھی نہیں کی تھی۔ یہ سارے مسائل اس وقت مسلمانوں کے سامنے تھے۔ ان آیات میں انہی سوالوں کے جواب دیے گئے ہیں۔

آیات ۳۸-۴۱

إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ
كَفُورٍ ﴿٣٨﴾ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ
نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا

اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ
لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ
اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝٤٠
اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ
الْاُمُوْرِ ۝٤١

ترجمۂ آیات ۳۸-۴۱

بے شک اللہ مدافعت کرے گا ان لوگوں کی جو ایمان لائے۔ اللہ ہر گز بدعہدوں اور ناشکروں کو پسند نہیں کرتا۔ جن سے جنگ کی جائے ان کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی بوجہ اس کے کہ ان پر ظلم ہوا اور بے شک اللہ ان کی مدد پر پوری طرح قادر ہے۔ جو مظلوم اپنے گھروں سے بے قصور محض اس جرم پر نکالے گئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو، ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، ڈھائے جا چکے ہوتے۔ اور بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کے لیے اٹھیں گے۔ بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔ یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ ۳۸-۴۱

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ (۳۸)

اس بحث کی تمہید ہی اللہ تعالیٰ نے مظلوم مسلمانوں کے لیے بشارت سے اٹھائی ہے۔ فرمایا کہ قریش نے ہمارے با ایمان بندوں پر جو ظلم ڈھایا ہے اس میں اپنے مظلوم بندوں کی مدافعت ہم کریں گے۔ یعنی اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کی حفاظت و مدافعت کے لیے اٹھیں، خدا اس جہاد میں ان کے ساتھ ہوگا اور ہر قدم پر ان کی نصرت فرمائے گا۔

مظلوم مسلمانوں کے لیے بشارت

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ۔ 'کُلَّ' یہاں میرے نزدیک تاکید صفت کے لیے ہے اور 'خَوَّانٍ كَفُورٍ' سے اشارہ کفار قریش کی طرف ہے۔ 'خَوَّان' کے معنی، خائن، غدار اور عہد شکن کے ہیں۔ یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انھوں نے وہ تمام عہود و شرائط پامال کر دیے ہیں جن کے تحت ان کو حرم کی پاسبانی سپرد ہوئی تھی۔ حضرت ابراہیم نے جن مقاصد کے لیے اس گھر کو تعمیر کیا تھا اور اپنی ذریت پر اس گھر سے متعلق جو ذمہ داری ڈالی تھی ان میں سے ایک ایک چیز کی انھوں نے آبرو شاری۔ اس وجہ سے یہ اس گھر کی تولیت کے حقدار نہیں ہیں اور ایسے غداروں اور خائنوں کو خدا کبھی پسند نہیں کرتا۔

قریش سے اعلانِ براءت

'خوّان' کے ساتھ 'کفور' کی صفت ان کی ناسپاسی و ناشکری کے بیان کے لیے ہے۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ قریش کو پورے عرب میں مذہبی پیشوائی اور سیاسی اقتدار کا جو مقام بلند حاصل ہوا وہ تمام تر بیت اللہ کی بدولت حاصل ہوا لیکن وہ بجائے اس کے کہ اس نعمت کی قدر کرتے اور اپنے رب کے شکر گزار رہتے اس گھر پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے اس کے نام پر حقوق تو سارے حاصل کرتے رہے لیکن خود اس کے حقوق و فرائض نہ صرف یہ کہ بالکل بھول بیٹھے بلکہ ان کے بالکل برعکس تدابیر سے اس گھر کی ساری عزت انھوں نے خاک میں ملا دی۔ فرمایا کہ ایسے غداروں اور ناشکروں سے خدا کو کیا تعلق! اللہ ایسے خائنوں اور ناسپاسوں کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ 'لَا يُحِبُّ' سے مقصود یہ ہے کہ خدا ایسے بدعہدوں کو مبغوض رکھتا ہے۔ ان کو جتنی مہلت ملنی تھی وہ مل چکی۔ اب وقت آگیا ہے کہ خدا اپنے حرم کو ان ناپاکوں سے پاک کرے اور اپنے ان بندوں کو اس کی تولیت سپرد کرے جو اس ابراہیمی امانت کا حق ادا کریں۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ (۳۹)

مسلمانوں کو اپنی مدافعت میں جہاد کی اجازت

'أُذِنَ' کا متعلق یہاں بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یعنی اب ان مسلمانوں کو جن سے جنگ کی جائے جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ اس وقت تک چونکہ مسلمانوں کی کوئی باقاعدہ تنظیمی ہیئت نہیں تھی اس وجہ سے ہر قسم کے مظالم کے ہدف رہنے کے باوجود ان کو جنگ کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ صبر کی ہدایت فرمائی گئی۔ اس لیے کہ منتشر افراد کی جنگ فساد کو مٹا کر حق و عدل قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی اور اسلام میں جنگ صرف حق و عدل کے قیام ہی کے لیے جائز ہے لیکن مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد حالات تبدیل ہوگئے اس وجہ سے ان کو اپنی مدافعت میں ہتھیار اٹھانے کی اجازت دے دی گئی۔ علاوہ ازیں

یہ اجازت اس پہلو سے بھی ضروری تھی کہ معاملہ حرم اور حدودِ حرم کا تھا۔ مسلمان حرم کے معاملے میں کوئی اقدام اس وقت تک نہیں کر سکتے تھے جب تک اللہ و رسول کی طرف سے ان کو اس کے لیے اجازت نہ ملے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں صرف مدافعانہ جنگ کی اجازت مذکور ہے اس لیے کہ اس مرحلے تک مسلمان ابھی اس سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی قوت نہیں رکھتے تھے۔ رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کے لیے جارحانہ جنگ بھی جائز ہے یا نہیں تو اس سوال کے جواب کے لیے ہماری تفسیر سورۂ برات کا تدبّر سے مطالعہ فرمائیے۔

'بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا' یہ اس اجازت کے حق میں ایک مزید وجہ کا حوالہ ہے۔ یعنی اوّل تو اپنا دفاع ہر شخص اور ہر جماعت کا حق ہے ہی، پھر مزید برآں یہ بات بھی ہے کہ ان مسلمانوں پر ظلم ہوا ہے۔ اس ظلم کی تفصیل آگے والی آیت میں آرہی ہے۔

'وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ' یہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا وعدۂ مدافعت کی توثیق بھی ہے اور کفارِ قریش کے لیے ایک قسم کی تہدید بھی۔ یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے اور کوئی ان کی مدد کر کے ان کو کیا تقویت پہنچا سکتا ہے۔ اللہ ان کی مدد پر پوری طرح قادر ہے اور جب وہ ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے تو دنیا کی کوئی قوت بھی ان کو شکست نہیں دے سکتی۔

اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۴۰)

'اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ' یہ مسلمانوں کی اس مظلومیت کی وضاحت ہے جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہوا ہے۔ یعنی ان لوگوں کو بغیر کسی جرم کے ان کے گھروں سے نکالا گیا ہے۔ اس اسلوبِ بیان میں وہ تمام مظالم و شدائد آپ سے آپ آگئے جن میں مسلمان مبتلا کیے گئے۔ اس لیے کہ کوئی اپنے وطن اور اپنے گھر در کو اس وقت تک چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک اس پر اس کے وطن کی سرزمین تنگ نہ کر دی جائے۔ مسلمانوں کی مظلومیت کی وضاحت

'اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ' یہ نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان مظلوموں کا اگر کوئی جرم بنتا ہے تو یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب بس اللہ ہے! یعنی ان کی سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑے حق کی دعوت ان کا سب سے بڑا گناہ بن گئی ہے اور اس جرم میں ان کو اتنا تنگ کیا گیا ہے کہ ان غریبوں کو اپنے گھر در کو خیر باد کہنا پڑا۔

بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ قرآن یہاں کلمۂ توحید کو ایک مرنجاں مرنج قسم کے کلمہ کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے کہ یہ کسی کے لیے کوئی چڑنے کی چیز تو ہے نہیں، کفارِ قریش خواہ مخواہ کو اس سے چڑے کر مسلمانوں کے درپے آزار ہو گئے۔ آخر اس سے کیا فرق پیدا ہوتا ہے کہ کوئی صرف ایک ہی خدا کو مانتے؛

جن لوگوں نے ایسا سمجھا ہے یہ محض ان کی خوش فہمی ہے۔ قریش ان لوگوں کی طرح اتنے بلید نہیں تھے کہ وہ اس کلمہ کے مضمرات کو نہ سمجھیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس کی زد کہاں تک ہے اس وجہ سے وہ اس کے دشمن تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح وہ سب سے بڑے حق کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ قرآن نے ان کی اسی حماقت کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے اور نہایت لطیف انداز میں توجہ دلائی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا۔

'صوامع' سے مراد

'صوامع' 'صومعۃ' کی جمع ہے۔ اصطلاحاً یہ لفظ ان بلند پہاڑوں اور مکانوں کے لیے آیا ہے جہاں عیسائی راہب عبادت کے لیے خلوت اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے تھے۔ اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ 'خانقاہیں' کیا جائے تو موزوں رہے گا۔

'بیع' سے مراد

'بیع' 'بیعۃ' کی جمع ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ دونوں کے عبادت خانوں کے لیے آتا ہے۔ لیکن آگے یہود کے عبادت خانوں کے لیے الگ لفظ آیا ہے۔ اس وجہ سے اقرب یہ ہے کہ اس سے مراد نصاریٰ کے گرجے ہوں۔ ان کے ہاں رہبانیت کے نظام کی وجہ سے خانقاہوں اور گرجوں دونوں کو یکساں اہمیت حاصل رہی ہے۔

'صلوات' سے مراد

'صلوات' 'صلاۃ' کی جمع ہے۔ یہ لفظ یہود کے کنیسوں کے لیے آتا ہے۔ عبرانی میں اس کی اصل 'صلوتا' ہے۔

'مساجد'

'مساجد' مسلمانوں کی مساجد کے لیے معروف ہے۔

جہاد کی اجازت کی حکمت

اب یہ حکمت بیان ہو رہی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اپنے باایمان بندوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دے دی ہے یہاں تک کہ حرم اور حدودِ حرم میں بھی اگر ان پر حملہ ہو تو وہاں بھی ان کو حق ہے کہ وہ اپنی مدافعت کریں اور اپنے رب سے یہ امید رکھیں کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا۔ فرمایا کہ یہ اجازت اس وجہ سے دی گئی ہے کہ اگر اللہ اشرار و شیاطین کو اپنے صالح بندوں کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، تمام گرجے، تمام کنیسے اور تمام مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، سب کب کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ چنانچہ ہمیشہ اللہ نے اپنے نبیوں اور رسولوں اور اپنے صالح بندوں کو جہاد کی ہدایت فرمائی اور انھوں نے جہاد کرکے تمام دینی اقدار اور شعائر کی حفاظت کی۔ اسی طرح آج مسلمانوں کو بھی یہ اجازت دی جا رہی ہے کہ وہ اللہ کے حرم اور اس کے شعائر کی حفاظت کے لیے اٹھیں اور اگر اس کے موجودہ غاصب و غدار مدعیانِ تولیت ان کی راہ میں مزاحم ہوں تو وہ ان کا جواب ترکی بہ ترکی دیں۔

مخالفینِ جہاد کو جواب

یہ امر ملحوظ رہے کہ مسلمانوں کے اس حوصلہ کو بھانپ کر قریش نے پہلے ہی سے ان کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا کہ اب یہ نئے دین والے حرم اور حدودِ حرم کی حرمت بھی باقی نہیں رہنے دینا چاہتے اور یہود و

نصاریٰ بھی انھیں کی نے میں نے ملا کر مسلمانوں کے اس جذبۂ جہاد کو دینداری کے خلاف قرار دے رہے تھے۔ قرآن نے دوسرے مقامات میں بھی دینداری کے ان مدعیوں کو جواب دیا ہے اور یہاں بھی ان سب کو جواب دیا ہے کہ اگر اللہ کی راہ میں جہاد دینداری کے خلاف ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کی ساری بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے اور مفسدین کو کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ دل کھول کے اپنے حوصلے پورے کرلیں۔

جہاد کے سب سے بڑے مخالف نصاریٰ تھے

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ آیت میں سب سے پہلے، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، نصاریٰ کی خانقاہوں اور ان کے گرجوں کا ذکر ہے۔ سب سے پہلے ان کی طرف اشارہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے جذبۂ جہاد پر سب سے زیادہ معترض، جیسا کہ سورۂ حدید کی تفسیر سے معلوم ہوگا، نصاریٰ ہی تھے۔ اگرچہ ان کی اس مخالفت کے محرکات بعض اور بھی تھے جن کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی لیکن ان کے رہبانی تصور کو اس میں بڑا دخل تھا۔ قرآن نے ان کے اسی تصور پر یہاں ضرب لگائی ہے کہ اسلام کی مخالفت کے جوش میں جو لوگ جہاد کو دینداری کے خلاف قرار دے رہے ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کریں کہ اگر دینداری کا یہی تصور پہلے بھی ہوتا تو آج زمین پر خدا کی عبادت کا ایک گوشہ بھی محفوظ نہ ہوتا۔

یہاں نصاریٰ اور یہود کے جن معابد کا حوالہ ہے ان کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ اصلاً ان کی حیثیت وہی تھی جو ہمارے ہاں مساجد کی ہے۔ ان میں خرابی اس وقت سے پیدا ہوئی ہے جب اہل کتاب شرک و بدعت میں مبتلا ہوئے۔

مسلمانوں سے وعدۂ نصرت سے متعلق بعض حقائق

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ۔ یہ اسی وعدۂ نصرت کو مزید مؤکد فرمایا ہے اور اس کے ساتھ بعض نئی حقیقتوں کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے جو نہایت اہم ہیں۔

ایک یہ کہ جو لوگ خدا کے دین اور اس کے شعائر کی حفاظت کے لیے اٹھتے ہیں وہ درحقیقت اپنے رب کی مدد کے لیے اٹھتے ہیں، اس وجہ سے خدا کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ان بندوں کی مدد فرمائے جو اس کی مدد کے لیے اٹھے ہیں۔

دوسری یہ کہ خدا کی مدد ہمیشہ ان لوگوں کے لیے ظہور میں آتی ہے جو حق کی راہ میں خود اپنا فرض ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خدا ان لوگوں کی مدد نہیں کرتا جو بنی اسرائیل کی طرح یہ چاہتے ہیں کہ خدا ان کے لیے میدان جیت کر تخت حکومت بچھا دے تب وہ جاکر اس پر براجمان ہو جائیں گے۔

خدا کے قوی و عزیز ہونے کے بعض خاص پہلو

إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ۔ میں بھی کئی پہلو ہیں۔

—— خدا قوی و عزیز ہے اس وجہ سے وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے جو لوگ اس کی مدد کرتے ہیں وہ درحقیقت خود اپنے لیے خدا کی مدد کی راہ کھولتے ہیں۔

—— مسلمان اپنی قلت تعداد اور دشمن کی بھاری جمعیت سے ہراساں نہ ہوں، جو خدا ذو العزۃ والجلال

ان کی پشت پناہی کا وعدہ کر رہا ہے وہ قوی و عزیز ہے۔

کفار مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ یہ چند چنے بھلا کیا بھاڑ پھوڑیں گے! یہی قطرے اب طوفان بنیں گے! اس لیے کہ ان کو خدا کی نصرت و حمایت حاصل ہے اور خدا قوی و عزیز ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ (۴۱)

'الارض' سے مراد سرزمین حرم

'الارض' سے مراد، جس طرح رعد۔ ۴۱ اور انبیاء۔ ۴۴ میں ارض مکہ ہے اسی طرح قرینہ دلیل ہے کہ یہاں بھی اس سے مراد ارض مکہ ہے اس لیے کہ یہاں جس جہاد کی اجازت دی گئی ہے اصلاً اس کا تعلق ارض حرم ہی کی آزادی و تطہیر سے ہے۔ فرمایا کہ اس کے موجودہ غاصب اجارہ داروں نے تو اس حرم کے وہ تمام مقاصد برباد کر دیے ہیں جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں اپنی ذریت کو بسایا تھا البتہ اگر ہم اپنے ان بندوں کو اس سرزمین میں، اپنی تائید و نصرت سے، اقتدار بخشیں گے تو یہ اس کے تمام مقاصد کو از سر نو بروئے کار لائیں گے۔ یہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔ بقرہ کی آیات ۱۲۴-۱۲۸ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ بعینہٖ یہی مقاصد ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کو حضرات ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا مرکز بنایا تھا اور آیت کا اسلوب بیان خود اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ قریش نے یہ تمام مقاصد برباد کر دیے ہیں۔

مسلمانوں کے اقتدار کے ثمرات

دنیا میں مسلمانوں کے اقتدار و تمکن کی پہلی بشارت یہی ہے جس کا آغاز حرم کی سرزمین سے ہوتا ہے، جس کی نسبت ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ اس کی حیثیت ملت کے قلب کی ہے۔ اسی کے صلاح و فساد پر تمام ملت کے صلاح و فساد کا انحصار ہے۔ بعینہٖ یہی فریضہ مسلمانوں پر ہر اس سرزمین کے لیے عاید ہوتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ ان کو اقتدار بخشے۔ اگر وہ یہ فریضہ ادا نہ کریں تو خدا کے نزدیک جس طرح دوسروں کا تسلط ناجائز ہے اسی طرح ان نام نہاد مسلمانوں کا تسلط بھی ناجائز ہے۔

نماز اور زکوٰۃ تمام دین کے لیے بمنزلہ شیرازہ ہیں

نماز اور زکوٰۃ، جیسا کہ ہم مختلف مقامات میں واضح کر چکے ہیں تمام شریعت کے لیے بمنزلہ شیرازہ ہیں۔ اگر ان کا ذکر ہو گیا تو گویا پوری شریعت کا ذکر ہو گیا۔

معروف پر عمل کی آزادی کا مفہوم

معروف و منکر پر بھی تفسیر سورۂ بقرہ میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ بعض سادہ لوح یہ سوال کرتے ہیں کہ جب قرآن نے معروف پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر گروہ اور ہر قوم کے لوگ اپنے اپنے معروف پر عمل کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ زندگی کے جن شعبوں میں خود خدا اور رسول نے معروف و منکر کو معین کر دیا ہے ان میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کے بتائے ہوئے معروف کو منکر یا اس کے منکر کو معروف بنائے۔ البتہ شریعت کے حدود کے اندر رہتے ہوئے

ہر قوم و ملک کے لوگ اپنے معروف پر عمل کے لیے آزاد ہیں۔

'وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ' یہ مسلمانوں کو بشارت ہے کہ ابھی آغاز کار ہے اس وجہ سے حالات مشتبہ اور انجام پردے میں ہے۔ ممکن ہے تم کو بھی اور دوسروں کو بھی یہ تمکن کی بشارت مستبعد معلوم ہو رہی ہو لیکن انجام کار اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر کے رہے گا۔ مسلمانوں کو بشارت

۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۴۲-۵۷

آیت اہم پر توضیحی آیات، جو بیچ میں بطور جملہ معترضہ آگئی تھیں، ختم ہوئیں۔ اب آگے کلام اپنے اصل سلسلہ سے پھر مربوط ہو گیا اور حضرات انبیائے کرام اور ان کے مکذبین کی تاریخ کی روشنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو تسلی دی گئی ہے کہ اطمینان رکھو، اللہ کا ہر وعدہ پورا ہو کے رہے گا اور اس کی ہر وعید شدنی ہے۔ اگر اس کے ظہور میں کچھ تاخیر ہو رہی ہے تو یہ سنتِ الٰہی کے تحت ہو رہی ہے۔ اس طرح اللہ اپنے نیک بندوں کا امتحان اور ان کے مخالفین کو ڈھیل دے کر ان پر اپنی حجت تمام کرتا ہے۔ لوگوں کے پاس آنکھیں ہوں تو اس سنتِ الٰہی کے آثار اس ملک میں قدم قدم پر موجود ہیں لیکن جن کے دلوں کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں ان پر یہ آثار کیا کارگر ہو سکتے ہیں!

اسی ذیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ تم مخالفین کے رویہ سے بے نیاز ہو کر ایک نذیر مبین کی طرح، لوگوں کو سامنے کے خطرے سے آگاہ کر دو۔ اگر یہ تمہاری دعوت کی راہ میں اڑنگے ڈالتے ہیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ہر نبی اور رسول کو اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا ہے لیکن اللہ کی بات پوری ہو کے رہی اور مخالفین و شیاطین کی تمام فتنہ انگیزیاں اللہ نے نابود کر دیں۔ شیاطین کو ان فتنہ انگیزیوں کا اللہ نے جو موقع دیا ہے تو اس لیے دیا ہے کہ اس طرح حق پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور اہل علم و ایمان پوری بصیرت کے ساتھ اس کو قبول کرتے ہیں، پھر ان کے قدم متزلزل نہیں ہوتے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۲-۵۷

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾
وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ
مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾ فَكَاَيِّنْ
مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا
وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ

لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى
الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴿٤٦﴾ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ
بِالْعَذَابِ وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۚ وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ
ع ۷ ۱۴ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴿٤٧﴾ وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ
ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْتُهَا وَإِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿٤٨﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا
لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٤٩﴾ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ
وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٥٠﴾ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
الْجَحِيمِ ﴿٥١﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا
إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي
الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٢﴾ لِّيَجْعَلَ
مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ
قُلُوبُهُمْ ۗ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿٥٣﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ
أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ
قُلُوبُهُمْ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَهَادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٥٤﴾
وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ
بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ ﴿٥٥﴾ الْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ
يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي جَنَّاتِ
النَّعِيمِ ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ

عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾

ع ۹ ۱۴

اور اگر یہ لوگ تمھاری تکذیب کر رہے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ ان سے پہلے قوم نوح، عاد، ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط اور مدین کے لوگ بھی تکذیب کر چکے ہیں۔ اور موسیٰ کی بھی تکذیب کی گئی تو میں نے ان کافروں کو کچھ ڈھیل دی، پھر ان کو دھر لیا تو دیکھو کیسی ہوئی میری پھٹکار! اور کتنی ہی بستیاں ہیں، جن کو ان کے ظلم کی حالت میں ہم نے ہلاک کر دیا تو وہ اپنی چھتوں پر ڈھئی پڑی ہیں اور کتنے ناکارہ کنوئیں اور کتنے پختہ محل ہیں جو ویران پڑے ہوئے ہیں! کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے کہ وہ ان سے سمجھتے یا ان کے کان ایسے ہو جاتے کہ وہ ان سے سنتے کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔ ۴۲-۴۶

ترجمۂ آیات ۴۲-۵۷

اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ اللہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی کرنے والا نہیں ہے۔ اور تمھارے رب کے ہاں کا ایک دن تمھارے شمار کے اعتبار سے ایک ہزار سال کی طرح کا ہوتا ہے۔ اور کتنی ہی بستیاں ہیں، جن کو ان کے ظلم کے باوجود میں نے ڈھیل دی، پھر ان کو پکڑ لیا اور میری ہی طرف سب کی واپسی ہے۔ ۴۷-۴۸

کہہ دو، اے لوگو! میں تو تمھارے لیے بس ایک کھلا ہوا آگاہی پہنچانے والا ہوں تو جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے اور جن کی تگ و دو ہماری آیات کی مخالفت کی راہ میں ہے وہی دوزخ والے ہیں۔ ۴۹-۵۱

اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول اور نبی بھی بھیجا تو جب بھی اس نے کوئی ارمان کیا تو شیطان نے اس کی راہ میں اڑنگے ڈالے۔ پس اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کے ڈالے ہوئے

وسوسوں کو، پھر اللہ اپنی باتوں کو قرار بخشتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسوں کو ان لوگوں کے لیے فتنہ بنائے جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو سخت دل ہیں اور بے شک یہ ظالم اپنی مخاصمت میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ اور ایسا اس لیے بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کو علم عطا ہوا ہے اچھی طرح جان لیں کہ یہی تیرے رب کی جانب سے حق ہے پس ان کے ایمان اس پر پختہ ہوں اور ان کے دل اس کے آگے جھک جائیں اور اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ضرور صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمائے گا۔ ۵۲-۵۴۔

اور یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے برابر اس کی طرف سے شک ہی میں رہیں گے یہاں تک کہ ان پر اچانک قیامت آ دھمکے یا ایک منحوس دن کا عذاب آ جائے۔ اس دن سارا اختیار اللہ ہی کو حاصل ہوگا۔ وہی ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ تو جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور جنھوں نے عمل صالح کیے ہوں گے وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی تکذیب کی وہی ہیں جن کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۵۵-۵۷

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّ ثَمُوْدُ ۙ وَقَوْمُ اِبْرٰهِیْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۙ وَّاَصْحٰبُ مَدْیَنَ ۚ وَکُذِّبَ مُوْسٰی فَاَمْلَیْتُ لِلْکٰفِرِیْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ (۴۲-۴۴)

'وَکُذِّبَ مُوْسٰی' حضرت موسیٰؑ کی تکذیب کا ذکر مجہول کے صیغہ سے کیا ہے درآنحالیکہ اوپر دوسرے انبیاء کی تکذیب کا ذکر ان کی قوموں کی طرف نسبت کے ساتھ فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی تکذیب ان کی قوم نے نہیں بلکہ فرعونیوں نے کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے صاحب

شریعت نبی حضرت موسیٰ ہی تھے جن کے حالات کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ ہو سکتا تھا۔ اس وجہ سے کسی تصریح کے بغیر، خاتمۂ کلام کے طور پر، بات یوں فرمادی گئی کہ تکذیب تو ابھی تم سے پہلے موسیٰ کی بھی ہو چکی ہے!

'نکیر' کا مفہوم

'نَكِيرِ' اصل میں 'نکیری' ہے، 'ی' گر گئی ہے اور کسرہ اس کی یادگار ہے۔ عربی میں قافیہ وغیرہ کی رعایت سے 'ی' اس طرح گر جایا کرتی ہے۔ 'نکیر' کے معنی عام طور پر اہل لغت نے انکار کے لیے ہیں لیکن مجھے اس سے انکار ہے۔ کلام عرب کے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی مجرد انکار کے نہیں بلکہ اس انکار کے ہیں جس کے ساتھ غیرت، نفرت اور بیزاری کی شدت پائی جاتی ہو۔ اس وجہ سے ہم نے اس کا ترجمہ پھٹکار کیا ہے۔

رسولوں کے معاملہ میں قوموں کی مشترک روایت

ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہاری قوم تمہارے ساتھ جو معاملہ کر رہی ہے یہ ذرا بھی اس سے مختلف نہیں ہے جو دوسری قوموں نے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا۔ رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ بعینہٖ یہی ہے جو ٹھیک ٹھیک تمہارے ساتھ بھی دہرائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس صورتِ حال میں نہ تمہاری کسی کوتاہی کو دخل ہے اور نہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہیں جن چیزوں سے مسلح ہو کر میدان میں اترنا تھا، ان میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ تمہاری جانب سے سب کچھ ٹھیک ہے لیکن قوموں کی جو روایت ہے وہ بدلنے والی نہیں ہے۔ پس اپنا کام کیے جاؤ! لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔

'فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ' یعنی جن قوموں نے رسولوں کی تکذیب کی ان کو اللہ نے فوراً نہیں پکڑا بلکہ ان کو کافی مدت تک ڈھیل دی لیکن اس ڈھیل نے اصلاحِ حال کے بجائے جب ان کی سرکشی ہی میں اضافہ کیا تو اللہ نے ان کو پکڑا اور پھر اس طرح پکڑا کہ ان کی ہستی ہی مٹا دی۔ یہی معاملہ تمہاری قوم کے ساتھ بھی ہوگا اگر اس نے اپنی روش نہ بدلی۔

'قصر مشید' کا مفہوم

'فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ' (۴۵)

'قَصْرٍ مَّشِيْدٍ' پختہ اور بلند ایوان و محل کو کہتے ہیں۔ اور عربیت کے قاعدے کے مطابق جس طرح بئر کے ساتھ 'مُعَطَّلَةٍ' کی صفت ہے اسی طرح اس کے ساتھ بھی متروک و مہجور یا اس کے ہم معنی کوئی صفت ماننی پڑے گی جو، وضاحت قرینہ کی بنا پر، حذف کر دی گئی ہے۔

قوموں کے اخلاقی زوال کے نتائج

اوپر والی آیت میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے یہ اسی کی شہادت ملک عرب کے ان آثار سے پیش کی گئی ہے جن پر سے اہل عرب کے تجارتی قافلے برابر گزرتے تھے اور جن کی روایات، جیسا کہ ان کے شعراء اور خطباء کے کلام سے واضح ہے، ان کے ہاں مشہور تھیں۔ فرمایا کہ کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ کتنے ہی شہر اور بستیاں ہیں، جن کو ان کے کفرانِ نعمت کی پاداش میں، ہم نے ہلاک کر دیا اور اب ان کا حال یہ ہے کہ ان کی دیواریں ان کی چھتوں پر گری پڑی ہیں۔

قوموں پر تباہی ان کے اخلاق و اعمال کے نتیجہ میں آتی ہے

'وَهِيَ ظَالِمَةٌ' یہاں حال کے محل میں ہے اور 'ظلم' کا مفہوم ہم جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں کہ اس سے مراد وہ ظلم ہے جو قومیں اپنے کفرانِ نعمت اور اپنے شرک کے سبب سے خود اپنی جانوں پر ڈھاتی ہیں۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ قوموں پر اس طرح کی جو تباہیاں آتی ہیں وہ محض اتفاقی حادثہ یا گردشِ روزگار کے طور پر نہیں آتی ہیں، جیساکہ احمقوں نے سمجھا ہے، بلکہ ان کا ظہور ان کے اخلاق و کردار کے اندر سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے رب کی ناشکری میں مبتلا ہوتی ہیں اور ان کا یہ ظلم ان کے تمام انفرادی و اجتماعی اخلاق و کردار کی چولیں ہلا دیتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ پہلے ان کی عظمت کی چھتیں زمین بوس ہوتی ہیں پھر ان کے وجود کی بنیادیں بھی اکھڑ جاتی ہیں۔

بربادی کی تصویر

'فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا' صورتِ حال کی تصویر ہے۔ بڑی عمارتوں کے انہدام کا آغاز بالعموم ان کی چھتوں سے ہوتا ہے۔ متروک و مہجور ہو جانے کے بعد پہلے ان کی چھتیں بوسیدہ ہو کر گرتی ہیں پھر دیواریں بھی غیر محفوظ ہو جانے کے باعث بادوباراں سے ڈھے جاتی ہیں۔

'وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ' کا عطف 'قَرْيَةٍ' پر ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ عرب کے ملک میں پانی کی قلت کے سبب سے کنوؤں اور چشموں کی بڑی اہمیت تھی۔ بستیاں وہیں بستی تھیں جہاں پانی دستیاب ہو اور کنوئیں بنائے جا سکتے ہوں۔ پھر لازماً سب سے زیادہ رونق بھی کنوؤں اور چشموں ہی پر ہوتی تھی اس وجہ سے کنوؤں کی ویرانی تعبیر ہے ساری ہماہمی اور تمام چہل پہل کے ختم ہو جانے کی۔

'وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ' کے ساتھ بھی، جیساکہ ہم نے اشارہ کیا، کوئی صفت 'معطلۃ' کی ہم معنی محذوف ماننی پڑے گی۔ اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کتنے پرشکوہ اور بلند و بالا ایوان و محل ہیں جو بالکل متروک و مہجور پڑے ہیں اور جن کی ڈیوڑھیوں کے آگے کبھی بڑے بڑے سردار اور حکمران سجدے کرتے تھے۔ اب ان کے کنگوروں اور ان کی برجیوں میں زاغ و زغن کے آشیانے ہیں!

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۴۶)

دلوں کے اندھے

یعنی یہ عبرت بخش آثار تو ہم نے زمین میں چھوڑے ہی اس لیے ہیں کہ لوگ ان کو دیکھیں اور ان سے عبرت حاصل کریں تاکہ ان کے دلوں کے اندر سوچنے کی اور ان کے کانوں کے اندر سننے کی صلاحیت بیدار ہو اس لیے کہ اس دنیا کی اصل آفت یہ نہیں ہے کہ سروں پر جو آنکھیں لگی ہوئی ہیں وہ اندھی ہو جاتی ہیں بلکہ یہ ہے کہ سینوں میں جو دل ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں! مطلب یہ ہے کہ اگر سروں کی آنکھوں کی بصارت جاتی رہے اور سینے میں بسنے والا دل بیدار ہو تو آدمی نابینا ہو کر بھی تمام حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن دل کی آنکھیں چوپٹ ہو چکی ہوں تو وہ دیکھتا تو سب کچھ ہے لیکن اسے سوجھتا کچھ بھی نہیں!

یہاں 'قُلُوبُ' کے ساتھ 'فِي الصُّدُورِ' کی قید اس امر کا قرینہ ہے کہ 'الابصار' کے ساتھ 'فی الرؤس'

یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف مانا جائے۔ تقابل کا اصول، جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں، اس کا تقاضا کر رہا ہے۔ چونکہ یہاں حال بے بصیرت لوگوں کا بیان ہو رہا ہے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ دل کا پتہ، اس کے مقام و محل کے تعین کے ساتھ دیا جائے کہ اصلی اندھا پن دل کا اندھا پن ہے اور یہ مکذبین رسول اسی اندھے پن میں مبتلا ہیں۔ کوئی ان کے سر کی آنکھیں کھلی دیکھ کر ان کو بینا نہ سمجھے۔ اس لیے کہ آنکھوں کے اندر بصیرت کی روشنی دل کی راہ سے آتی ہے اور ان کے دل کی آنکھیں بالکل اندھی ہیں۔

آثار سے عبرت پذیری سے گریز

یہ امر خاص طور پر یہاں ملحوظ رہے کہ عرب کے شعراء منزل جاناں کے آثار پر تو خون کے آنسو بہاتے تھے یہاں تک کہ اس کے چولہے اور چکی کے آثار تک کو یاد کر کے روتے اور رُلاتے لیکن ان کے احساس کی رسائی بس منزلِ جاناں کے آثار ہی تک تھی۔ اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے تاریخ کے ان آثار اور اپنے ملک کے ان کھنڈروں سے کوئی سبق حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جو دل کی آنکھیں کھولنے والی ہزاروں داستانیں زبانِ حال سے سنا رہے تھے۔ یہی حال ہمارے موجودہ زمانے کے ماہرینِ اثریات یا توسمین کا ہے انھوں نے بڑی گہری کھدائیاں کر کے بے شمار آثار سے عجائب خانے تو بھر دیے لیکن ان کی ساری تحقیق و تفتیش صرف اس نقطہ پر مرتکز ہے کہ یہ آثار پانچ ہزار برس پہلے کی تہذیب کے ہیں، یا سات ہزار برس پہلے کی تہذیب کے! وہ اصل حقیقت جس کی طرف یہ آثار اشارہ کر رہے ہیں نہ کسی کی سمجھ میں آئی ہے، نہ شاید آئے گی حالانکہ قدرت نے یہ آثار اسی حقیقت کی تذکیر کے لیے محفوظ کیے ہیں اس لیے کہ دلوں کے اندر بصیرت اسی حقیقت کے تذکر سے پیدا ہوتی ہے!

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۴۷)

انسان کا ایک مغالطہ

یعنی تم کو جھٹلانے والے جلدی مچائے ہوئے ہیں کہ جس عذاب کی تم ان کو وعید سنا رہے ہو وہ آ کیوں نہیں جاتا؟ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ آئے گا تو ضرور، خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا، لیکن انسان ہر چیز کو اپنے محدود پیمانوں سے ناپتا ہے اس وجہ سے اس کو چند سالوں کی مدت یا مہلت بہت طویل معلوم ہوتی ہے۔ وہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے یہ سب ہوائی باتیں ہیں حالانکہ یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں بلکہ حقائق ہیں لیکن خدا کے ہاں کے دن اس دنیا کے دنوں سے بالکل مختلف ہیں۔ خدا کے ہاں کا ایک دن اس دنیا کے دنوں کے حساب سے ایک ہزار سال کے مانند ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے سیکنڈ اور منٹ بھی اس دنیا کے برسوں کی مدت سے متجاوز ہوتے ہیں۔ انسان ہر چیز کا شمار اپنے چوبیس گھنٹوں کے دن کے حساب سے کرتا ہے اور خدا کے پروگرام اس کی اپنی تقویم کے اعتبار سے بنتے ہیں۔

خدائی دنوں کے پیمانے

مطلب یہ ہے کہ خدا اور اس کی ملکوت کے معاملات کو اپنے اوزان اور پیمانوں سے ناپنے تولنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارے ہاں جب صدیاں گزر جاتی ہیں تو خدا کے ہاں وہ منٹوں اور گھنٹوں کی بات ہوتی ہے۔ خدائی دنوں کا یہ حساب جو یہاں مذکور ہوا ہے یہ بھی صرف تقریبِ فہم کے لیے ایک تمثیل ہے اور

'کَاَلْفِ سَنَۃٍ' کے الفاظ خود اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ماحصل حقیقت ان دنوں کی کیا ہے ؟ اس کو صرف خدا ہی جانتا ہے ۔ یہ تمثیل جس طرح قرآن میں وارد ہوئی ہے اسی طرح زبور اور انجیل میں بھی ہے ۔ ۲ پطرس ، باب ۳ کے الفاظ ملاحظہ ہوں ۔

"یہ خاص بات تم پر پوشیدہ نہ رہے کہ خداوند کے نزدیک ایک دن ہزار برس کے برابر ہے اور ہزار برس ایک دن کے برابر"

آسمان و زمین کے چھ دنوں میں پیدا کیے جانے کا ذکر جس طرح قرآن میں ہے اسی طرح تورات میں بھی ہے اور ان چھ دنوں میں تقسیم کار کی جو صورت اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمائی ہے اس کی تفصیل حٰم السجدہ میں بیان ہوئی ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان سے ہمارے اور آپ کے دن مراد نہیں ہیں بلکہ یہ خدائی ایام ہیں جن کے طول و عرض کو صرف خدا ہی جانتا ہے ۔ ہمارے لیے یہ اجمالی علم کافی ہے کہ خدا نے الگ الگ عالم بنائے ہیں اور ہر عالم کا مدار و نظام الگ الگ ہے ۔ ایک کے معاملات کو دوسرے پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے ۔ ہمیں اپنے گز سے آسمان و زمین کے طول و عرض کو ناپنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے ۔

قرآن سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ملکوتِ الٰہی کے نظام میں بعض امور کے لیے اس سے بھی بڑے دن مقرر ہیں ۔ مثلاً جبریل امین اور ملائکہ کی دربارِ الٰہی میں خاص حضوری کے لیے جو دن ہے وہ پچاس ہزار سال کے برابر ہے ۔ سورہ معارج میں ہے ۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ اِلَیْہِ	فرشتے اور جبریل اس کی طرف ایک ایسے دن
فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ	میں صعود کرتے ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار سال
اَلْفَ سَنَۃٍ (معارج : ۴)	کے برابر ہے ۔

جن لوگوں نے آیتِ زیرِ بحث میں 'یَوْمٌ' سے یومِ قیامت مراد لیا ہے اور اس کے اس طول کو اس کی شدتِ عذاب سے استعارہ قرار دیا ہے ہمارے نزدیک ان کی تاویل سیاقِ کلام کے بھی خلاف ہے و رنظائرِ قرآن کے بھی ۔ خاص طور پر اس قول کی نسبت حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد جیسے اکابرِ تفسیر کی طرف بالکل ہی خلافِ حقیقت ہے ۔ لیکن اس وضاحت کے بعد ، جو ہم نے اوپر کی ہے ، اب اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی ۔

وَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اَمْلَیْتُ لَھَا وَھِیَ ظَالِمَۃٌ ثُمَّ اَخَذْتُھَا ۚ وَاِلَیَّ الْمَصِیْرُ (۴۸)

یہ عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب ہے کہ خدا کی ڈھیل سے مغرور نہ ہو ۔ کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں جن کو ان کے کفرانِ نعمت اور شرک کے باوجود ہم نے ڈھیل دی لیکن جب انھوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو بالآخر ان کو دبوچ لیا اور پھر کوئی ان کو ہم سے چھڑانے والا نہ بن سکا ۔ مطلب یہ ہے یہی حشر تمہارا بھی ہونے والا ہے ، اگر تمہاری اس اکڑ میں خم نہ پیدا ہوا ۔ 'وَاِلَیَّ الْمَصِیْرُ' اور یہ بھی یاد

رکھو کر بالآخر سب کی واپسی ہماری ہی طرف ہونی ہے۔ آخرت میں سب کو سابقہ صرف ہم سے پیش آئے گا، نہ کسی کے اعوان و انصار وہاں کسی کے کچھ کام آئیں گے نہ مزعومہ شرکاء و شفعاء۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۴۹-۵۱)

رسول کی اصل ذمہ داری

'نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ عربوں میں یہ طریقہ تھا کہ قبیلہ یا قافلہ جہاں ڈیرا ڈالتا وہاں کسی اونچی جگہ پر ایک نگران پہرہ دیتا اور اگر وہ کسی طرف سے کوئی خطرہ محسوس کرتا تو اپنے کپڑے اتار کر ننگا ہو جاتا اور خطرے کا اعلان کرتا جس کے بعد قبیلہ یا قافلہ کے سارے مرد تلواریں سونت کر مدافعت کے لیے تیار ہو جاتے۔ اس کو 'نذیر عریاں' کہتے تھے۔ یہ تعبیر چونکہ ناشائستہ تھی، نبی کے لیے اس کا استعمال موزوں نہ تھا، اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' کی شکل میں شائستہ بنا لیا ہے لیکن اس میں تلمیح 'نذیر عریاں' ہی کی طرف ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح ایک 'نذیر عریاں' قوم کو خطرے سے آگاہ کرتا ہے تم ایک 'نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' بن کر لوگوں کو آنے والے وقت سے آگاہ کر دو۔ لیکن بس آگاہ کر دو۔ نہ اس خطرے کو دکھا دینا تمہاری ذمہ داری ہے نہ اس سے لوگوں کو بچانا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر لوگ تمہارے اس واضح انذار کے بعد بھی متنبہ نہ ہوں گے تو نتائج کی ذمہ داری خود ان پر ہے۔ یہ مضمون 'اِنَّمَا' کے اندر جو حصر کا مفہوم ہے اس سے نکلتا ہے۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ۔

یہ وہ اصل انذار ہے جس سے آشکارا طور پر لوگوں کو آگاہ کر دینے کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی۔ اس کا آغاز اگرچہ اہل ایمان کے لیے بشارت سے ہوا ہے لیکن یہاں یہ بشارت بھی انذار ہی کا مقدمہ ہے اس لیے کہ کلام کا رخ قریش کے متکبرین کی طرف ہے اور یہ بشارت ان کے غرور پر ایک کاری ضرب ہے۔ فرمایا کہ لوگوں کو سنا دو کہ وہ وقت آرہا ہے جب ایمان و عمل صالح والوں کو تو مغفرت اور رزق کریم کی سرفرازی حاصل ہوگی، رہے وہ لوگ جن کی ساری بھاگ دوڑ ہماری آیات کی تکذیب اور ہمارے رسول کو شکست دینے کی راہ میں ہے وہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔

'رِزْقٌ كَرِيْمٌ' مغفرت کا ثمرہ اور جنت کی تمام نعمتوں کی ایک جامع تعبیر ہے۔ یہاں 'کریم' کی صفت اپنے اندر گوناگوں پہلو رکھتی ہے جن کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔

'مُعَاجَزَة' کے معنی اس سابقت کے ہیں جو کسی کو شکست دینے کے لیے کی جائے۔ یہاں اس سے اشارہ کفار کی اس بھاگ دوڑ کی طرف ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شکست دینے کے لیے وہ کر رہے تھے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۵۲)

'تمنی' کا اصل لغوی مفہوم، صاحب اقرب الموارد کی تصریح کے مطابق یہ ہے۔ یطلق عند اھل العربیۃ علی طلب حصول الشئ علی سبیل المحبۃ وعلی الکلام الدال علی ھذا الطلب (عربی زبان کے ماہرین کے نزدیک یہ لفظ کسی شے کے بطریق محبت حصول کی طلب کے لیے بولا جاتا ہے اور اسی طرح اس کلام پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو اس طلب پر دال ہو) ہم نے اس قول کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ ہمارے نزدیک کلام عرب کی روشنی میں، اس لفظ کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ قرآن میں اس کے مختلف صیغے سات آٹھ مقامات میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اسی مادے سے 'امنیۃ' کا لفظ بھی، جمع اور واحد کی مختلف صورتوں میں، سات آٹھ جگہ آیا ہے۔ ہر جگہ، ہر شکل میں، لفظ کی اصل روح موجود ہے۔ اردو میں اس کا مفہوم ہوگا، کسی چیز کی خواہش کرنا، ارمان کرنا، تمنا کرنا، حوصلہ کرنا، یا کسی مقصد کے لیے اپیل یا استمالت کرنا۔ اسی طرح 'امنیۃ' کے معنی خواہش، ارمان، تمنا، حوصلہ اور اپیل کے ہوں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس لفظ کے اندر بعض لوگوں نے قراءت کرنے کے معنی کہاں سے گھسا دیے ہیں۔ مجھے اس معنی میں یہ لفظ، کلام عرب میں کہیں نہیں ملا حالانکہ یہ عربی زبان کے کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ہے۔ بعض مفسرین نے اس مفہوم کی تائید میں ایک شعر نقل کیا ہے لیکن اول تو ایک کثیر الاستعمال لفظ کو، اس کے معروف مفہوم سے ہٹانے کے لیے، ایک غیر معروف شعر کی سند کی قدر کیا ہے۔ پھر وہ شعر بھی ہمارے نزدیک منحول ہے اور ہم اس کا منحول ہونا ثابت کر سکتے ہیں لیکن ایک غیر مفید بحث کو طول دینے سے کیا حاصل! اس بات کی بھی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے کہ صاحب لسان نے لفظ کے اس مفہوم کا بھی حوالہ دیا ہے۔ صاحب لسان کی ساری خوبیوں کے اعتراف کے باوجود، ان کی اس خامی کی طرف مقدمہ تفسیر میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ بسا اوقات وہ کسی لفظ کے تحت اہل تاویل کے بے سند اقوال بھی نقل کر دیتے ہیں اور چونکہ اس لغت کا بڑا پایہ ہے اس وجہ سے جو لوگ لغت کے نقادوں میں سے نہیں ہیں وہ اس طرح کے اقوال کو لے اڑتے ہیں حالانکہ ان اقوال کی، جب تک زبان کے استعمالات سے تائید نہ ہو، کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بہرحال ہمارے نزدیک اس لفظ کے اندر قراءت یا تلاوت کے معنی کے لیے کوئی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے۔

اب آیت کے مفہوم اور اس کے اجزا پر غور کیجیے۔

اوپر والی آیت میں معاندین کی جس سعی فی المعاجزۃ کا ذکر ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تمہی کو پیش آئی ہو۔ تم سے پہلے جتنے رسول اور نبی بھی آئے سب کو اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا۔ جب بھی کسی نبی نے لوگوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے کوئی قدم اٹھایا، کوئی حوصلہ کیا، کوئی دعوت دی اور حق کو سنانے، سدھارنے، بلانے اور ابھارنے کی کوشش کی تو اشرار و مفسدین نے اسی طرح اس کے حوصلے کی راہ میں اڑنگے ڈالے اور اس کی آواز کو دبانے اور اس کی تعلیم و دعوت کو شکست دینے کی کوشش کی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی دعوت و اصلاح کے ارادے سے اٹھتے تو ابولہب و ابوجہل وغیرہ آپ کی تردید کے لیے سایہ کی طرح ساتھ ساتھ ہوتے۔

یہاں ہدایت و اصلاح کی راہ میں نبی کے اقدام کو تمنّی اور اس کی سعی و جہد کو 'امنیۃ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ 'امنیۃ' کے معنی آرزو، حوصلہ اور ارمان کے ہیں۔ ان الفاظ کے استعمال سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کی تمنا اور آرزو تو شب و روز یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ کی ہدایت اور اس کی باتیں (آیات) اتارنے کی کوئی راہ کھلے اور وہ یہ راہ کھولنے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتا رہتا ہے لیکن شیاطین ہر وقت یہ راہ مارنے کے لیے گھات میں رہتے ہیں اور جہاں ان کو نبی کی کوئی بات بنتی نظر آئی فوراً اس کے خلاف طرح طرح کے پروپیگنڈے شروع کر دیتے ہیں۔ یہ امر یاد رکھیے کہ شیاطین اس وقت تک تو میٹھی نیند سوتے رہتے ہیں جب تک وہ دیکھتے ہیں کہ کسی طرف سے کلمۂ حق کی صدا نہیں آرہی ہے لیکن جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ کوئی دعوتِ حق بلند ہوئی تو ان کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگتا ہے اور پھر وہ اس کی مخالفت کے لیے اپنے تمام حربوں سے مسلح ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

نبی اور رسول کے فرق پر ہم آل عمران ۴۹ کے تحت وضاحت سے گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں ان دونوں لفظوں کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس آزمائش سے کوئی نبی یا رسول بھی نہیں بچا ہے۔ یہ آزمائش انبیا و رسل کے لیے اللہ کی ایک سنت ہے جو سب کو پیش آچکی ہے۔

لفظ 'شیطان' یہاں بطور اسم جنس ہے اور اس سے مراد شیاطین جن و انس دونوں ہیں، یعنی دونوں گٹھ جوڑ کر کے نبی کو شکست دینے کے لیے ایک متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں۔

شیاطین کی فتنہ انگیزیاں

'اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِىْٓ اُمْنِيَّتِهٖ' سے مراد یہ ہے کہ وہ نبی کے کام و اقدام اور اس کے ارادوں اور منصوبوں میں طرح طرح سے رخنہ اندازیاں کرتے اور قسم قسم کے اعتراضوں، طعنوں، شگوفہ بازیوں سے اس کے کلام و پیغام کے اثر کو مٹانے کے درپے ہوتے ہیں۔

'فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ'۔ 'نسخ' کے معنی، جیسا کہ آیت نسخ کے تحت وضاحت ہو چکی ہے، مٹانے کے ہیں اور 'احکام' کے معنی پایدار اور مستحکم کرنے کے۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء و رسل کو یہ آزمائش اللہ تعالیٰ کی سنت کے تحت پیش آتی ہے اور اس کا فائدہ، جیسا کہ آگے وضاحت آرہی ہے، دعوتِ حق کو پہنچتا ہے۔ حق و باطل کے اس تصادم کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ اللہ شیاطین کے اٹھائے ہوئے فتنوں کو تو جھاگ کی طرح بٹھا دیتا ہے اور اپنی اور اپنے رسول کی باتوں کو دلوں میں رسوخ و استحکام بخشتا ہے۔

'وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ'۔ یہ تسلی کے مضمون کو اللہ تعالیٰ کی صفات کے حوالہ سے مزید مؤکد و مدلّل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل میں یہ کشمکش کراتا ہے اور اپنے نبیوں کی دعوت کے مقابلہ میں شیاطین کو بھی زور آزمائی و فتنہ انگیزی کا موقع جو دیتا ہے تو یہ سب کچھ اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اس وجہ سے نبی کو اللہ کے علم اور اس کی حکمت پر بھروسہ رکھنا چاہیے کہ جو کچھ پیش آئے گا وہ اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت پر مبنی ہوگا اور اس کا نتیجہ اس کی دعوت کے حق میں بہتر ہی نکلے گا۔

بعینہٖ یہی مضمون بتغیر الفاظ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔ بعض نظائر ملاحظہ ہوں۔
سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ
عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ
يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ
الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۚ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ
مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا
يَفْتَرُوْنَ ۝ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا
هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ۝
(الانعام: ۱۱۲-۱۱۳)

اور اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں کے شیاطین
کو ہر نبی کا دشمن بنایا۔ وہ ایک دوسرے کو ملمع کی
ہوئی باتیں خلق کو فریب دہی کے لیے القا کرتے ہیں
اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کر پاتے تو ان کو
اور ان کی اس ساری فریب کاری کو نظر انداز کرو۔
اللہ نے اس کا موقع اس لیے دے رکھا ہے کہ
اس سے اہل ایمان کا ایمان محکم ہو اور تاکہ اس فتنہ کی
طرف ان لوگوں کے دل جھکیں جو آخرت پر ایمان نہیں
رکھتے اور تاکہ وہ اس کو پسند کریں اور تاکہ جو کمائی یہ
کرنی چاہتے ہیں کر لیں۔

ان آیات سے سورۂ حج کی زیر بحث آیت کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر 'يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا' کے الفاظ نگاہ میں رہیں۔ یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو آیت زیر بحث میں 'اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ' کے الفاظ سے تعبیر فرمائی گئی ہے۔

اسی طرح سورۂ فرقان میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ
عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ
هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ
جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ
بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝
وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ
بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝
(فرقان: ۳۱-۳۳)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے دشمن
بنائے اور اطمینان رکھو، تمہارا رب رہنمائی اور مدد
کے لیے کافی ہے۔ اور یہ کافر اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اس
شخص پر یہ قرآن آخر یک دفعہ کیوں نہیں نازل کر دیا گیا!
ہم نے ایسا اس لیے کیا کہ اس بار گراں کے لیے تمہارے
دل کو اس کے ذریعہ سے اچھی طرح مضبوط کر دیں اور ہم
نے اس کو اہتمام کے ساتھ بالتدریج اتارا۔ اور یہ جو شگوفہ
بھی چھوڑیں گے تو ہم اس کے جواب میں حق کو واضح اور
اس کی بہترین توجیہ کر دیں گے۔

اس آیت میں اس القائے شیطانی کی ایک مثال بھی پیش کر دی گئی ہے کہ اللہ کا رسول جب لوگوں کے سامنے اللہ کا کلام پیش کرتا ہے تو یہ معاندین، رسول کو مطعون کرنے کے لیے یہ شگوفہ چھوڑتے ہیں کہ اگر یہ

اللہ کے رسول ہیں تو یہ پورا قرآن بیک دفعہ کیوں نہیں پیش کر دیتے! آخر اللہ کے لیے یہ کیا مشکل ہے! مطلب یہ ہے کہ جب یہ ایسا نہیں کر رہے ہیں تو اس کے معنی (نعوذ باللہ) یہ ہیں کہ یہ خود اس کلام کو گھڑتے ہیں اور جتنا گھڑ پاتے ہیں اتنا سنا دیتے اور دھونس جمانے کے لیے جھوٹ موٹ اس کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

القائے شیطان کی بے بنیاد روایت

اس آیت کی توضیح میں ہم نے اس قدر تفصیل سے صرف اس لیے کام لیا ہے کہ کسی کے ذہن میں کوئی خلجان باقی نہ رہ جائے۔ اس توضیح کے بعد اس فضول سی روایت کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی جو ہمارے مفسرین نے، اللہ ان کو معاف کرے، اپنی کتابوں میں اس آیت کے شانِ نزول کی حیثیت سے درج کر دی ہے۔ اول تو یہ آیت، جیسا کہ آپ نے دیکھا، کسی شانِ نزول کی محتاج نہیں ہے بلکہ اپنے مفہوم و مدعا میں بالکل واضح اور اپنے سابق و لاحق سے بالکل مربوط ہے۔ پھر ستم یہ ہے کہ جو روایت یہ حضرات نقل کرتے ہیں نہ اس کا روایت کے اعتبار سے کوئی وزن ہے نہ درایت کے پہلو سے بلکہ وہ محض زنادقہ کا ایک القائے شیطانی ہے جو انھوں نے حضرات انبیاء علیہم السلام کی عصمت کو مجروح کرنے کے لیے گھڑا اور حضرات مفسرین اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اس کو اپنی کتابوں میں نقل کرتے آ رہے ہیں۔

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ
لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ
قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ اللَّهَ لَهَادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۵۳-۵۴)

حق کے مقابل میں باطل کو مہلت دیے جانے کی اصل حکمت

اب یہ حکمت واضح فرمائی جا رہی ہے اس بات کی کہ اس دنیا میں یہ صورتِ حال کیوں ہے کہ جب کوئی دعوتِ حق و خیر اٹھتی ہے تو اس کے مقابل میں اشرار و شیاطین بھی اپنی تمام فتنہ انگیزیوں کے ساتھ میدان میں اترتے ہیں؟ فرمایا کہ یہ اس لیے ہے کہ اللہ نے حق کے ساتھ باطل کو بھی اس دنیا میں مہلت دے رکھی ہے تاکہ جو حق کو اختیار کرے وہ بھی اختیار و تمیز کے ساتھ کرے اور جو باطل کی طرف جانا چاہے وہ بھی وضوحِ حق اور اتمامِ حجت کے بعد جائے۔ اسی کشمکش سے اہلِ ایمان کا ایمان پختہ ہوتا ہے اور اسی سے منافقین اور سخت دلوں پر اللہ کی حجت تمام ہوتی ہے۔

اشرار کے فتنوں کے مخفی فوائد

'فتنۃ' سے مراد آزمائش اور امتحان ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حق کے مقابل میں باطل اور اہلِ باطل کو بھی زور آزمائی کا موقع نہ دیا گیا ہوتا تو حق پرستوں اور باطل پرستوں میں امتیاز نہ ہوتا۔ یہ موقع مل جانے سے اہلِ باطل، اپنا من بھاتا کھاجا پا کر، باطل کے علمبرداروں کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور جو سچے حق پرست ہوتے ہیں، اہلِ باطل کی تمام باطل آرائیوں کے علی الرغم، حق پر جمے رہتے ہیں۔

لِلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ۔ مرض سے مراد نفاق ہے اور 'قاسیۃ القلوب' سے اشارہ قریش اور یہود کے ان کٹر معاندین کی طرف ہے جن کے باہمی گٹھ جوڑ سے، دعوتِ حق کے خلاف یہ مہم چل رہی تھی۔ فرمایا کہ باطل کو یہ مہلت اللہ نے اس لیے دی ہے کہ یہ منافقین اور اشرار کے لیے ایک

فتنہ بنے۔ وہ حق کے خلاف جو کھیل کھیلنے چاہتے ہیں وہ کھیل لیں اور اپنے دل کے ارمان پورے کر لیں۔

حق کے مقابل میں باطل کو مہلت دیے جانے کی دوسری حکمت

وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ۔ یہ انہی بدبختوں اور شامت زدوں کی حالت پر اظہارِ افسوس ہے کہ اب یہ حق کی مخالفت میں اتنی دُور نکل گئے ہیں کہ ان کی بازگشت کا کوئی امکان نہیں۔ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اب ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ سنتِ الٰہی کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں!

وَلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَیُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ۔ 'وَلِیَعْلَمَ' اور 'فَیُؤْمِنُوْا بِهٖ' دونوں مقامات میں فعل اپنے کامل معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اور 'اُوْتُوا الْعِلْمَ' میں 'علم' سے مراد قرآن و کتاب کا علم ہے۔ یہ حق کے مقابل میں باطل کو مہلت دیے جانے کی دوسری حکمت بیان ہوئی کہ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح وہ لوگ، جو علمِ کتاب سے کچھ بہرہ ور ہو چکے ہیں، اپنے علم میں پوری طرح راسخ ہو جاتے ہیں اور ان پر یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ جو علمِ کتاب تم سے ان کو ملا ہے وہ بالکل حق اور منجانب اللہ ہے۔ پھر ان کے علم کی یہ پختگی ان کے ایمان کو بھی پورا رسوخ و استحکام بخشتی ہے اور ان کے دل پوری یکسوئی اور کامل رضا کے ساتھ اپنے رب کی طرف جھک پڑتے ہیں۔

اشیا کی اصل حقیقت ان کے اضداد سے واضح ہوتی ہے

یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ اشیا کی اصل حقیقت ان کے اضداد ہی سے واضح ہوتی ہے۔ ایک بات کو آپ جانتے اور مانتے ہیں لیکن اس کے خلاف جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ اگر آپ کے سامنے نہیں آیا تو اس بات کا بڑا امکان ہے کہ وہ جب سامنے آئے تو آپ کا علم و ایمان متزلزل ہو جائے۔ لیکن وہ سب کچھ اگر آپ کے سامنے آ چکا ہے اور اس کے کھرے کھوٹے میں امتیاز کر کے آپ نے اس حق کو قبول کیا ہے تو اس کو علیٰ وجہ البصیرت آپ نے اختیار کیا ہے۔ پھر اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ کوئی بادِ مخالف آپ کے موقف سے آپ کو ہٹا سکے۔ دین میں یہی بصیرت پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں یہ انتظام فرمایا کہ حق کے مخالفین کو بھی یہ موقع دیا ہے کہ وہ حق کے خلاف جو زہر اُگلنا چاہتے ہیں وہ اگل لیں تاکہ جو لوگ حق کو قبول کریں محض تقلیدی طور پر نہ اختیار کریں بلکہ پوری معرفت کے ساتھ اختیار کریں۔

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا علم راسخ، اور مبنی بر حکمت و بصیرت ہو گا ان کا ایمان بھی تقلیدی نہیں ہو گا جو ہر جھونکے سے متزلزل ہو جائے بلکہ صحیح اور راسخ علم سے صحیح اور راسخ ایمان پیدا ہوتا ہے اور اسی راسخ ایمان سے وہ اسلام و اخبات وجود میں آتا ہے جو ایمان کی اصل روح ہے اور جس کے بغیر ایمان خدا کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔

اہل ایمان کو ثباتِ قدم کی بشارت

وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ جس طرح اوپر منافقین اور اشرار سے متعلق فرمایا ہے کہ وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ (اب یہ لوگ اتنی دور نکل جا چکے ہیں کہ ان کی حق کی طرف بازگشت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا) اسی طرح اس ٹکڑے میں اہل ایمان سے متعلق بشارت دی ہے کہ اگرچہ

شیاطین ان کی راہ مارنے کی تو بہت کوشش کریں گے لیکن اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو ضائع نہیں ہونے دے گا بلکہ اپنی توفیق بخشی سے ان کی رہنمائی صراط مستقیم کی طرف فرمائے گا۔ 'صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ' سے مراد وہ سیدھی راہ ہے جو بندے کو اس کے رب کی طرف لے جاتی ہے۔ نکرہ یہاں میرے نزدیک اس کی اہمیت وشان کے اظہار کے لیے ہے۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ ۝ الْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ (۵۵-۵۷)

مخالفین کو وعید

اوپر اہل علم وایمان کی تعریف میں فرمایا کہ مخالفین کی مخالفتیں ان کے اندر اس بات کو راسخ کرتی ہیں کہ پیغمبر جو وعدہ و وعید سنا رہے ہیں وہ بالکل حق ہے۔ اب فرمایا کہ رہے یہ مکذبین تو وہ اس وعدہ و وعید کی طرف سے اسی طرح شک میں مبتلا رہیں گے جس طرح آج ہیں۔ یہ تو اسی وقت مانیں گے جب ان پر یا تو قیامت اچانک آدھمکے یا کسی ہولناک منحوس دن کا عذاب ان پر آجائے۔ 'عقیم' بانجھ کو کہتے ہیں۔ 'فَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ' (ذاریات: ۲۹) (وہ بولی کہ میں تو ایک بانجھ بوڑھی ہوں) یہیں سے اس کے اندر بے فیض اور منحوس کا مفہوم پیدا ہوا اور اس کا اطلاق اس طوفانی ہوا پر بھی ہوا جو تباہی تو قیامت کی مچا دے لیکن اس کے اندر نفع کا کوئی پہلو نہ ہو۔ چنانچہ قوم عاد پر جو عذاب آیا اس کے لیے قرآن نے 'رِيحٌ عَقِيمٌ' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ 'وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ' (ذاریات: ۴۱) (اور ان کے لیے قوم عاد کے اندر بھی درس عبرت ہے جب کہ ہم نے ان پر منحوس ہوا بھیجی) سورۂ قمر آیت ۱۹ میں 'يَوْمِ نَحْسٍ' کی ترکیب بھی استعمال ہوئی ہے۔ ان کی تفصیلات ان کے محل میں دیکھیے۔

'الْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ' فرمایا کہ اگر یہ لوگ ظہور قیامت ہی کے منتظر ہیں تو اس بات کو یاد رکھیں کہ اس دن سارا اختیار و اقتدار صرف اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کا ہوگا۔ اس دن نہ ان کی جمعیتیں اور پارٹیاں ان کے کچھ کام آئیں گی اور نہ ان کے مفروضہ شرکا و شفعاء اور وہ دن جزا و سزا کے فیصلہ اور عدل کے ظہور کا ہوگا نہ کہ سعی و عمل کا۔ اس دن اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرما دے گا کہ کون جیتا اور کون ہارا اور ہر ایک اپنے عمل کے نتائج سے دوچار ہوگا۔

'فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ' یہ اس فیصلہ کا اعلان ہے جس کا اوپر والے ٹکڑے میں ذکر ہوا ہے۔ فرمایا کہ اس دن جو ایمان و عمل صالح والے لوگ ہیں وہ نعمت کے باغوں میں داخل ہوں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری باتوں کی تکذیب کی ہے ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔ ذلیل کرنے والا عذاب اس لیے کہ انھوں نے اپنے آپ کو خدا و رسول کے پیش کردہ حق سے بھی بالاتر سمجھا جو بدترین استکبار ہے۔ اس استکبار کی بنا پر وہ مستحق ہیں کہ آخرت میں ان کو صرف عذاب ہی نہ دیا جائے بلکہ وہ عذاب دیا جائے جو ذلیل کرنے والا بھی ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس سزا کی سنگینی

دو چند بلکہ دہ چند ہو جاتی ہے جو تعذیب کے ساتھ ساتھ اپنے اندر توہین و تذلیل کی پھٹکار بھی رکھتی ہو۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۵۸-۷۶

آگے ان مسلمانوں کی پہلے دلداری فرمائی ہے جو اس دور میں، اعدائے حق کی ستم رانیوں سے تنگ آکر اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے مختلف علاقوں کو ہجرت کر رہے تھے۔ ان کو اپنی صفات کا حوالہ دے کر اطمینان دلایا ہے کہ سارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے۔ جس طرح مایوسی کے بعد رحمت کی گھٹائیں اٹھتی ہیں اور زمین کو جل تھل کر دیتی ہیں اسی طرح تمہارے لیے بھی رحمت کی گھٹائیں برسیں گی اور تم نہال ہو جاؤ گے۔ تمہارے اعداء کو خدا جو مہلت دے رہا ہے تو اس لیے دے رہا ہے کہ خدا اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے، وہ عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا لیکن اس مہلت کی ایک مدت ہے۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو اس کا انجام دیکھیں گے۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ تمہارے یہ مخالفین جس ڈگر پر چلتے آئے ہیں اسی پر چلتے رہیں گے تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو اور ان کو زیادہ منہ نہ لگاؤ۔ جلد وہ دن آنے والا ہے جب خدا ان کے معاملہ کا فیصلہ کرے گا۔ اس دن ان کے یہ معبود کچھ کام آنے والے نہیں ہیں جن کے خلاف کچھ سنتے ہی ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ ان کے تن بدن میں آگ لگتی ہے تو لگے، تم ان کو صاف صاف سنا دو کہ تمہارے یہ معبود سب مل کر بھی ایک مکھی پیدا کر سکنے پر قادر نہیں ہیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو یہ اس سے اس چیز کو واپس لینے پر قادر نہیں ہیں۔ ان احمقوں کو یہ بھی سمجھا دو کہ فرشتوں کی حیثیت خدا کی بیٹیوں یا اس کے شریکوں کی نہیں بلکہ اس کے بندوں کی ہے۔ وہ ان کے اندر سے بھی اسی طرح اپنے پیغامبر منتخب کرتا ہے جس طرح انسانوں میں سے کرتا ہے۔ وہ ہر وقت خدا کے احاطہ میں ہیں۔ معاملات کا مرجع اور ان کا فیصلہ کرنے والا صرف اللہ ہی ہے ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۵۸-۷۶

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ ۵۸ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝ ۵۹ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ ۶۰ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ

وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ﴿۶۱﴾ ذٰلِكَ
بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ
وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ
خَبِيْرٌ ﴿۶۳﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ ع ۸ ۱۵
الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۶۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ
وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ
عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۵﴾
وَهُوَ الَّذِيْۤ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ
لَكَفُوْرٌ ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ
فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾ وَاِنْ
جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ
مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ
يَسِيْرٌ ﴿۷۰﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا
وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾ وَاِذَا تُتْلٰى
عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ
يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ

مِّنْ ذٰلِكُمْ ۗ اَلنَّارُ ۗ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۗ وَبِئْسَ
الْمَصِيْرُ ﴿٧٢﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۗ ع ۹ / ۱۶
اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا
وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۗ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ
مِنْهُ ۗ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿٧٣﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۗ
اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٧٤﴾ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ
مِنَ النَّاسِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ﴿٧٥﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ
وَمَا خَلْفَهُمْ ۗ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٧٦﴾

ترجمۂ آیات ۵۸-۷۶

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر وہ قتل کر دیے گئے یا مر گئے تو اللہ ان کو اپنے رزقِ حسن سے نوازے گا۔ اور بے شک اللہ ہی ہے جو بہترین رزق دینے والا ہے۔ وہ ان کو ایسی جگہ داخل کرے گا جس سے وہ راضی و مطمئن ہوں گے اور بے شک اللہ علیم و حلیم ہے۔ ۵۸-۵۹

یہ بات سن لی اور مزید یہ کہ جس نے ویسا ہی بدلہ دیا جیسا کہ اس کے ساتھ کیا گیا، پھر اس پر تعدی کی گئی تو اللہ اس کی ضرور مدد فرمائے گا۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ ۶۰

یہ اس وجہ سے ہوگا کہ اللہ ہی ہے جو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ یہ اس وجہ سے بھی ہوگا کہ اللہ ہی معبودِ حقیقی ہے اور جن چیزوں کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں سب باطل ہیں۔ اور بے شک اللہ ہی ہے جو برتر اور عظیم ہے۔ ۶۱-۶۲

دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں سے پانی برساتا ہے تو زمین اس سے سرسبز و شاداب

ہو جاتی ہے۔ بے شک اللہ بڑا ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔ اسی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی ہے جو بے نیاز اور سزاوار حمد ہے۔ ۶۳-۶۴

دیکھتے نہیں کہ اللہ نے تمھاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے زمین کی چیزوں کو اور کشتی کو بھی، وہ چلتی ہے سمندر میں اس کے حکم سے اور وہ آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ مبادا وہ زمین پر گر پڑے، مگر یہ کہ اس کے حکم سے۔ بے شک اللہ لوگوں کے ساتھ بڑا ہی مہربان اور بڑا ہی رحیم ہے۔ اور وہی ہے جس نے تمھیں زندگی بخشی، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے، پھر وہ تم کو زندہ کرے گا۔ بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ۶۵-۶۶

اور ہم نے ہر امت کے واسطے ایک طریقہ ٹھہرا دیا ہے تو وہ اسی پر چلیں گے۔ تو وہ اس معاملے میں تم سے نزاع کی راہ نہ پائیں اور اپنے رب کی طرف بلاتے رہو بے شک تم ہی سیدھی راہ پر ہو۔ اور اگر وہ تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ اللہ فیصلہ کرے گا تمھارے درمیان قیامت کے دن اس چیز کا جس میں تم اختلاف کر رہے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ اس کو جانتا ہے۔ یہ سب چیزیں ایک رجسٹر میں درج ہیں۔ بے شک یہ اللہ کے لیے نہایت ہی آسان ہے۔ ۶۷-۷۰

اور یہ اللہ کے ماسوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جن کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور نہ ان کے بارے میں ان کو کوئی علم ہی ہے۔ اور ان ظالموں کا کوئی مددگار بننے والا نہیں ہے۔ اور جب ہماری واضح آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو تم ان کافروں کے چہروں پر ناگواری پاتے ہو۔ گویا یہ ان لوگوں پر حملہ کر بیٹھیں گے جو ان کو ہماری آیات پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ کیا میں تمھیں اس سے بڑھ کر ناگوار چیز کی خبر نہ سناؤں؟ وہ ہے دوزخ!

اس کا اللہ نے ان لوگوں کے لیے وعدہ کر رکھا ہے جنھوں نے کفر کیا ہے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے! ۷۱-۷۲

اے لوگو! ایک تمثیل بیان کی جاتی ہے تو اس کو توجہ سے سنو! جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا کر سکنے پر قادر نہیں ہیں اگرچہ وہ اس کے لیے سب مل کر کوشش کریں۔ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے اس کو بچا بھی نہیں پائیں گے، طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتوان! انھوں نے اللہ کی، جیسا کہ اس کا حق ہے، قدر نہیں پہچانی! بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔ ۷۳-۷۴

اللہ فرشتوں میں سے اپنے پیغامبر چنتا ہے جس طرح انسانوں میں سے چنتا ہے۔ بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ وہ جو کچھ ان کے آگے اور ان کے پیچھے ہے سب کو جانتا ہے۔ اور اللہ ہی کی طرف سارے معاملات لوٹتے ہیں۔ ۷۵-۷۶

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَیَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ (۵۸)

راہ ہجرت میں اول قدم بھی منزل کے حکم میں ہے۔

اب یہ اسی اوپر والی بشارت پر، جو اہلِ ایمان کو دی گئی ہے، عطف کر کے خاص طور پر ان مظلوم مسلمانوں کو بشارت دی گئی ہے جو کفارِ قریش کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر، اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں گے وہ اطمینان رکھیں کہ اس راہ میں پہلا قدم بھی منزل کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر وہ اپنے دار الہجرت میں پہنچنے سے پہلے ہی قتل کر دیے گئے یا ان کو موت آ گئی تو ان کو شہادت کا درجہ نصیب ہوگا اور اللہ ان کو اپنے رزقِ حسن سے نوازے گا۔ آل عمران آیت ۱۶۹ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ خدا کی راہ میں مارے جانے والے مرتے نہیں بلکہ زندہ رہتے ہیں اور وہ اپنی برزخی زندگی میں بھی خاص اپنے رب کے خوانِ نعمت سے رزق پاتے ہیں۔ 'بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ'

راہ ہجرت میں طبعی موت بھی شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔

یہی بشارت یہاں ان لوگوں کو بھی دی گئی جو ہجرت کے ارادے سے نکلیں اور ان کو موت آجائے اگرچہ ان کو قتل نہ کیا گیا ہو۔ گویا اس راہ میں قتل ہونا ہی شہادت نہیں ہے بلکہ طبعی موت بھی شہادت ہی کے حکم میں ہے۔ 'رزق' یہاں، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں، خدا کے بے پایاں انعامات کی ایک جامع تعبیر ہے۔ اس کو محدود مفہوم میں نہیں لینا چاہیے۔ 'وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا جب 'خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ' ہے تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو کیا رزق دے گا جو اس کی خاطر اپنا گھر در سب کچھ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوں گے!

لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ (۵۹)

مہاجرین کے لیے عظیم بشارت

فرمایا کہ ان کو ایسی جگہ داخل کرے گا جہاں پہنچ کر وہ نہال ہو جائیں گے۔ 'يَرْضَوْنَهٗ' کا لفظ ہے تو نہایت مختصر سا لیکن اس کے اندر معانی کا ایک جہاں پوشیدہ ہے۔ یعنی خدا کی خاطر جو بندہ اپنے گھر اور وطن سے نکلتا ہے، اگر اسی راہ میں اس کو موت آجاتی ہے تو وہ اطمینان رکھے کہ خدا اس کو ایسی جگہ داخل کرے گا جہاں اس کی ساری توقعات ہی پوری نہیں ہو جائیں گی بلکہ وہ کچھ اس کو ملے گا جس کا اس جہان میں وہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں

'وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ' یعنی ہمارے بندے پورا اطمینان رکھیں کہ اس دنیا میں ہماری خاطر اعدائے حق کے ہاتھوں وہ جو کچھ جھیل رہے ہیں ہم اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ ہم ہر چیز سے واقف ہیں۔ لیکن 'علیم' کے ساتھ ساتھ ہماری صفت 'حلیم' بھی ہے۔ اس وجہ سے ہم اپنے دشمنوں کو جلدی نہیں پکڑتے بلکہ ان کو اصلاح حال کا پورا موقع دیتے ہیں۔ لیکن وہ یاد رکھیں کہ ہمارے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (۶۰)

ایک اہم اعلان

یہ 'ذٰلِكَ' جس طرح آیت ۳۰ میں گزر چکا ہے پورے جملہ کا قائم مقام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات جو کہی گئی ہے کوئی سرسری بات نہیں ہے بلکہ نہایت اہم حقیقت بیان ہوئی ہے۔ اس کو دوست اور دشمن اچھی طرح سن لیں۔ مزید برآں اب یہ اعلان بھی کیا جاتا ہے کہ مظلوم مسلمان اگر اپنے جان و مال کی مدافعت میں برابر سرابر کا کوئی اقدام کریں تو ان کو اس کا حق ہے۔ ان کو اس کی اجازت دی جاتی ہے۔ اور اگر اس کے بعد ان پر کوئی مزید تعدی کی گئی تو ان کے اعداء یاد رکھیں کہ خدا اپنے بندوں کی پشت پر ہے اور وہ ان کی ضرور مدد فرمائے گا۔

'وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ' میں 'عُوْقِبَ بِهٖ' مشاکلت کے اسی اسلوب پر ہے جو 'دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوْا' یا 'جزاءُ سيئةٍ سيئةٌ مثلها' وغیرہ میں ملحوظ ہے۔ 'ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ' میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اگر مسلمانوں کے کسی مدافعانہ اقدام سے چڑ کر کفار نے ان پر مزید تعدی کی کہ ان کا حوصلہ پست کر دیں کہ وہ آئندہ اپنے عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے کوئی جرأت نہ کر سکیں تو کفار یاد رکھیں اور مسلمان

مطمئن رہیں کہ اللہ تعالیٰ ہرگز ایسا نہیں ہونے دے گا بلکہ وہ اپنے بندوں کی ضرور مدد فرمائے گا۔ 'ضرور مدد فرمائے گا' کے اجمال کے اندر جو تفصیل پوشیدہ ہے، اس کی شہادت بعد کے واقعات نے دی اور تاریخ اس کی گواہ ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ بشارت مسلمانوں کو ہجرت کے وقت دی گئی تھی۔ بعد میں جب مسلمان مدینہ پہنچ کر ایک طاقت بن گئے تو یہی بات نہایت واضح الفاظ میں کہہ دی گئی جو آیات ۳۹-۴۰ میں گزر چکی ہے۔ ان پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'عفو' 'غفور' کی صفات کے حوالہ کا ایک خاص محل

اِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوۡرٌ کا یہاں ایک خاص محل ہے۔ یہ بات، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بالکل ہجرت کے وقت فرمائی گئی تھی۔ اس وجہ سے امکان تھا کہ کفار کے ہاتھوں ستائے ہوئے مسلمان جوابی کارروائی کے طور پر کوئی عاجلانہ قدم اٹھا دیں درآنحالیکہ ابھی اس کے لیے موزوں وقت نہیں آیا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات 'عفو' 'غفور' کی یاد دہانی فرما دی کہ ہرچند تمہیں اپنی جان، اپنے مال اور اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کا حق ہے اور خدا تمہاری پشت پر ہے لیکن ہم جس طرح لوگوں کی تعدیوں کے باوجود عفو و مغفرت سے کام لیتے ہیں اسی طرح چندے تم بھی عفو و درگزر سے کام لو۔ ان سرکشوں سے نمٹنے کا وقت بس آ ہی رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا رب اپنی صفات کا عکس تمہارے اندر بھی دیکھنا چاہتا ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَ یُوۡلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ وَ اَنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ (۶۱)

وعدۂ نصرت کی پہلی دلیل

یہ اوپر کے وعدۂ نصرت کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ خدا اس کائنات میں کوئی ناکارہ وجود نہیں ہے، جیسا کہ ان احمقوں نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ متصرف حقیقی وہی ہے۔ وہی ہر روز دن کے بعد رات کو لاتا ہے اور رات کے بعد دن کو نمایاں کرتا ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے یعنی (نعوذ باللہ) وہ کوئی اندھا بہرا نہیں ہے کہ اشرار و مفسدین اس کی دنیا میں جو دھاندلی مچاتے پھریں وہ بے خبر بیٹھا رہے۔ وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے۔ تو جب متصرف حقیقی بھی وہی ہے اور وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا بھی ہے تو آخر وہ اس کائنات کی سیاست سے بے تعلق کیسے رہے گا؟ لازم ہے کہ وہ ان لوگوں کے مقابل میں، جو اس کی دنیا میں فساد برپا کر رہے ہیں، ان لوگوں کی مدد فرمائے جو اس کی اصلاح کے طالب ہیں اور جب وہ رات کے بعد دن کے لانے پر قادر ہے اور اس کی اس قدرت کا مشاہدہ ہر شخص ہر روز کر رہا ہے تو کفر کی تاریکی کو مٹا کر دنیا کو ایمان کی روشنی سے جگمگا دینا اس کے لیے کیا مشکل ہے!

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡحَقُّ وَ اَنَّ مَا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ ہُوَ الۡبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡعَلِیُّ الۡکَبِیۡرُ (۶۲)

وعدۂ نصرت کی دوسری دلیل

یہ اسی بات کی دوسری دلیل ارشاد ہوئی کہ کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ آخر ان مخالفین کی پشت پر بھی تو کچھ طاقتیں ہیں۔ فرمایا کہ اس کائنات میں کارفرمائے حقیقی صرف اللہ ہے اور یہ لوگ اللہ کے سوا جن چیزوں کو پوجتے اور پکارتے ہیں سب بے حقیقت، محض وہم کی ایجاد، اور یکسر فریب اور دھوکا ہیں۔ اللہ بڑی ہی بلند و برتر اور عظیم ہستی ہے۔ ان پتھر اور مٹی کی مورتوں کا خدا کے ساتھ کیا جوڑ؟ جو احمق ان چیزوں کو معبود بنا کر پوج رہے

ہیں وہ خدا کی عظمت و شان سے بالکل بے خبر ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ (۶۳)

وعدۂ نصرت کی تائید میں آفاق کی شہادت

'اَلَمْ تَرَ' کے خطاب پر ہم مختلف مقامات میں بحث کر چکے ہیں کہ یہ مخاطب گروہ کے ایک ایک فرد کو توجہ دلانے کے لیے آتا ہے۔ اوپر کی آیات میں وعدۂ نصرت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کے حوالہ سے مؤید کیا ہے۔ اس آیت میں اپنی صفات کے ساتھ آفاق کی شہادت بھی شامل کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی موجودہ ظاہری حالات کی ناسازگاری کو دیکھ کر خدا کی نصرت کے ظہور کو بعید از امکان نہ سمجھے۔ یہ ہر شخص نہیں سمجھ سکتا کہ خدا کی شان کس طرح ظاہر ہوگی اور اس کے ہاتھ کدھر سے نمودار ہوں گے۔ زمین کو دیکھتے ہو کہ بالکل خشک اور چٹیل پڑی ہوتی ہے، نہ اس پر سبزہ اور روئیدگی کا کوئی اثر ہوتا اور نہ افق پر کسی جانب ابر کا کوئی نشان لیکن جب خدا چاہتا ہے تو اس کی بھیجی ہوئی ہوائیں بادلوں کے قافلے کے قافلے ہانک کر لاتی اور فضا میں پھیلا دیتی ہیں۔ پھر چشم زدن میں ساری زمین جل تھل ہو جاتی ہے اور دیکھتے دیکھتے ہر طرف سبزہ کی بانات بچھ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جب چاہے گا اپنی رحمت و نصرت کی گھٹائیں اپنے ان بندوں کے لیے بھی بھیج دے گا اگرچہ ظاہری حالات کتنے ہی ناسازگار رہوں۔

لطیف خبیر کا حوالہ نہایت لطیف طریقہ سے

'لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ' کی صفات کا حوالہ یہاں نہایت لطیف طریقہ سے آیا ہے۔ 'لطیف' کے معنی باریک بین اور دقیقہ رس کے ہیں۔ یعنی وہ اپنی تدبیروں کو اس طرح بروئے کار لاتا ہے کہ کسی کو ان کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ وہ بڑی خبر رکھنے والا ہے۔ لوگ صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں لیکن وہ ماضی کے پردوں میں جو کچھ چھپا ہوا ہے اس سے بھی باخبر ہے اور مستقبل کے اوٹ میں جو کچھ ہے اس سے بھی باخبر ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۶۴)

خدا بے پروا بھی ہے اور باہمہ بھی

یہ اوپر کے مضمون ہی کی مزید تاکید ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا اور اسی کے تصرف میں ہے تو اس کے ارادے میں کون مزاحم ہو سکتا ہے! وہ سب سے بے نیاز اور اپنی ذات میں مستغنی ہے۔ 'حمید' کی صفت یہاں بطور بدرقہ ہے یعنی وہ غنی ہونے کے ساتھ حمید بھی ہے۔ 'حمید' کے معنی ہیں ستودہ صفات اور تمام سزاوار حمد کاموں کا منبع۔ اس بدرقہ کی ضرورت اس لیے تھی کہ خدا کے بے نیاز ہونے کے سبب سے بندوں کے اندر مایوسی نہ پیدا ہو بلکہ وہ امید رکھیں کہ اس کے بے نیاز ہونے کے باوجود خلق کے لیے اس کا فیض ہر وقت جاری ہے، وہ بے ہمہ ہونے کے ساتھ ساتھ باہمہ بھی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۭ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَي الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۶۵)

قریش کے تمردہ کے لیے دھمکی

یعنی اس دنیا میں انسان کو جو مہلت ملی ہوئی ہے یہ خدا کے فضل و کرم اور اس کی عنایت و مہربانی سے ملی ہوئی ہے۔ آسمان و زمین کی ہر چیز جو انسان کی خدمت گزاری میں لگی ہوئی ہے اور جس کے بغیر اس دنیا میں انسان

کا بقرار ایک لمحہ کے لیے بھی ممکن نہیں ہے، یہ خدا ہی کے حکم سے لگی ہوئی ہے۔ اگر خدا کا حکم نہ ہو تو اس کائنات کی ہر چیز انسان کی باغی اور اس کی دشمن بن جائے۔ کشتی ہی کو دیکھو تو یہ خدا ہی کا حکم اور اسی کے قانون کی تسخیر ہے کہ وہ تمہارے لیے سمندر کے سینہ کو چیرتی ہوئی چلتی ہے ورنہ چشم زدن میں سارا بیڑا غرق ہو جائے۔ یہ خدا ہی ہے جو آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ مبادا وہ تمہارے سروں پر گر پڑے۔ 'اَنْ' سے پہلے مضاف کے محذوف ہونے کے قاعدے کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں۔

'اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ' یعنی یہ ساری چیزیں اس بات کی شاہد ہیں کہ اس دنیا میں انسان کو جو کچھ حاصل ہے یہ اس کے اپنے بل بوتے اور اس کے اپنے علم و سائنس پر مبنی نہیں ہے بلکہ خدا کی رافت و عنایت پر مبنی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس نظام کائنات کی ایک اینٹ بھی ذرا سا اس کی جگہ سے کھسکا دے تو ساری عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہے۔

ان فقروں کے تیور نگاہ میں رہیں۔ ان میں قریش کے متمردین کے لیے جو دھمکی ہے وہ لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ اگر عذاب میں تاخیر ہو رہی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ ہمارے لیے کوئی مشکل کام ہے بلکہ یہ صرف ہماری رافت و رحمت کے سبب سے ہے کہ تم اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنے رویہ کی اصلاح کر لو۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ (۶۶)

سرکشی کی اصل علت

یہ آخرت کی یاددہانی فرمادی کہ اگر اس دنیا میں عذاب نہ آئے تو یہ کون سی اطمینان کی بات ہے! آگے آخرت جو موجود ہے! بالآخر لوٹنا تو سب کو اللہ ہی کی طرف ہے۔ خدا ہی نے زندگی بخشی ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پھر وہی زندہ اٹھا کھڑا کرے گا۔ جب اس کو پہلی مرتبہ پیدا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تو آخر دوبارہ اٹھا کھڑا کرنے میں اس کو کیوں دشواری پیش آئے گی! 'اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ' یہ اس ساری سرکشی کی اصل علت بیان ہوئی ہے کہ جہاں تک قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا تعلق ہے وہ تو بالکل واضح ہیں، ان میں کسی بحث و نزاع کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ لوگ نہایت ناشکرے اور ناقدرے ہیں۔ لفظ 'انسان' سے اشارہ تو یہاں انہی مخالفین کی طرف ہے لیکن اظہارِ نفرت کے طور پر بات ان کو خطاب کر کے کہنے کے بجائے عام لفظ سے فرمادی گئی ہے۔ اس اسلوب میں اظہارِ حسرت کا مضمون بھی پایا جاتا ہے جس کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ (۶۷)

لفظ 'منسک' پر آیت ۳۴ میں بحث گزر چکی ہے۔ یہاں یہ لفظ طریقۂ عبادت، شریعت کے ظاہری ڈھانچہ اور اس کے قواعد و ضوابط کے لیے آیا ہے۔

مناظرہ بازوں سے گریز کرنے کی ہدایت

پیچھے اسی سورہ میں یہ تفصیل بھی گزر چکی ہے کہ اس دور میں یہود و نصاریٰ بھی کھلم کھلا قریش کا ساتھ دے رہے تھے بلکہ اس مناظرہ بازی کو سب سے زیادہ غذا وہی ہم پہنچا رہے تھے۔ اس وجہ سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے ہر امت کے لیے ایک ضابطہ ٹھہرایا تھا اور مقصود اس سے یہ تھا کہ یہ اس ضابطہ کے مطابق خدا کی عبادت کریں اور جب خدا اس میں کوئی تبدیلی کر دے تو اس کو بھی دل و جان سے قبول کر لیں تاکہ یہ ان کے مخلصین و جاہدین میں امتیاز کی کسوٹی ہو۔ چنانچہ ہر رسول کے زمانے میں شریعت کے ظاہری ڈھانچہ میں تبدیلیاں بھی ہوئیں اور مبتدعین کی پیدا کردہ بدعتوں کی اصلاح بھی ہوئی، جن کے اندر حق کی طلب تھی انھوں نے یہ اصلاح صدق دل سے قبول کر لی لیکن جو لکیر کے فقیر اور رسوم و عوائد کے پجاری تھے وہ پتھر کی طرح اپنی ضد ہی پر جمے اور اپنی مالوفات کی عصبیت میں حق کے خلاف مناظرہ بازیاں کرتے رہ گئے۔ فرمایا کہ یہی حال تمھارے ان مخالفین کا بھی ہے۔ یہ بھی اپنے جمود اور جاہلی عصبیت کے سبب سے اس ڈگر کو چھوڑنے والے نہیں ہیں جس پر چلتے آ رہے ہیں تو اب ان کے پیچھے زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ یعنی اب ان کو کوئی ایسا موقع نہ دو کہ ان کو تم سے مناظرے کی کوئی راہ ملے۔ بس اپنے رب کی جس سیدھی راہ پر تم گامزن ہو اس کی طرف ان کو بھی دعوت دے دو۔ اگر وہ آتے ہیں تو فبہا، اگر نہیں آتے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ بے شک تم ایک سیدھی راہ پر ہو تو جو سیدھی راہ پر ہے اس کو اس سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے کہ دوسرے غلط راہ پر جا رہے ہیں بعینہٖ یہی مضمون، معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ، قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی پیچھے گزر چکا ہے۔ ہم بعض آیات کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں، سورۂ بقرہ میں قبلہ کی بحث کے آخر میں ارشاد ہوا ہے۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (بقرہ ۲: ۱۴۸)	ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف رخ کرے گا تو تم بھلائیوں کی سمت میں سبقت کرو۔

سورۂ مائدہ میں فرمایا ہے۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (مائدہ ۵: ۴۸)	ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ضابطہ اور ایک طریقہ ٹھہرایا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس نے چاہا کہ اس چیز میں تمھاری آزمائش کرے جو اس نے تم کو بخشی تو بھلائیوں کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرو۔

یہ اظہار رواداری نہیں بلکہ اعلان براءت ہے

مذکورہ بالا آیات کی تفسیر پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ہم نے ان آیات کے تحت یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ رواداری کی ہدایت نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ یہ ان کے رویہ سے بیزاری کا اظہار و اعلان ہے۔

وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۶۸-۶۹)

یعنی جہاں تک تمہارا تعلق ہے تم اپنی طرف سے ان کو کسی بحث و مناظرہ کا موقع نہ دو۔ لیکن تمہارے اس رویہ کے باوجود اگر وہ مناظرہ کے لیے آہی دھمکیں تو بس ان کو یہ کہہ کر دفع کرنے کی کوشش کرو کہ اللہ ہمارے اور تمہارے اس اختلاف کا فیصلہ قیامت کے دن فرمائے گا۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان کو زیادہ منہ نہ لگاؤ بلکہ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں، جان بوجھ کر محض شرارت کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ یہ دلیلوں سے قائل ہونے والے اسامی نہیں ہیں۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِىْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۷۰)

خطاب پیغمبر سے ہے عتاب مخالفین پر: اس آیت میں اگرچہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس کے لفظ لفظ میں جو عتاب ہے اس کا رخ تمام تر مخالفین کی طرف ہے۔ فرمایا کہ کیا نہیں جانتے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے خدا سب سے باخبر ہے تو اب ان اشرار کے معاملہ کو اللہ ہی کے حوالہ کرو، وہی ان سے نمٹے گا! اِنَّ ذٰلِكَ فِىْ كِتٰبٍ سابق جملے کی دھمکی اس میں اور زیادہ تیز ہوگئی ہے۔ یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ محض ہوائی باتیں ہیں بلکہ ہر شخص کو معلوم ہونا چاہیے کہ خدا نے ہر شخص کا سارا ریکارڈ، پورے اہتمام کے ساتھ، ایک دفتر میں محفوظ کر رکھا ہے۔ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ اور کوئی اس مغالطہ میں بھی نہ رہے کہ بھلا ایک ایک فرد اور ایک ایک جزئیہ کی تفصیل کون محفوظ رکھ سکتا ہے۔ دوسروں کے لیے تو یہ کام بے شک ناممکن ہے لیکن اللہ کے لیے یہ بہت آسان ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ (۷۱)

ایک اور غلط فہمی کا ازالہ: یہ ایک اور غلط فہمی بھی رفع فرما دی کہ جس دن خدا انصاف کے لیے بیٹھے گا تو اس دن کوئی ان ظالموں کا مددگار نہ بن سکے گا۔ جن چیزوں کو انھوں نے خدا کا شریک و شفیع بنا رکھا ہے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے نہ خدا نے ان کے حق میں کوئی پروانہ جاری کیا ہے کہ وہ اس کی خدائی میں شریک ہیں اور نہ ان کے اپنے ہی پاس ان کے باب میں کوئی علم ہے۔ خدا کے اذن کے بدون کسی کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ خدا نے اس کو اپنا شریک بنایا ہے اللہ پر افترا ہے جو ایک جرم عظیم ہے اور جس چیز کے بارے میں کوئی عقلی و فطری دلیل نہیں ہے اس کو معبود بنانا محض ظن کی پیروی ہے اور ظن علم اور حق کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِىْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۲۲)

'سطا یسطو' کے معنی حملہ کر دینے اور پل پڑنے کے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان معبودوں کے حق میں کوئی دلیل ان کے پاس اگرچہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان کے لیے ان کی حمیت کا حال یہ ہے کہ جب توحید کے حق میں ان کو نہایت واضح اور مدلل آیات سنائی جاتی ہیں تو ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے، ان کے چہرے بگڑ جاتے اور بھویں تن جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی آیتیں سنانے والوں پر پل پڑیں گے۔ فرمایا کہ اگر اللہ کی آیات اور ان کے سنانے والوں سے یہ ایسے ہی چراغ پا ہوتے ہیں تو ان سے کہو کہ کیا میں تمھیں ایک ایسی چیز کی خبر دوں جو ان چیزوں سے کہیں زیادہ تمھارے چہروں کو بگاڑنے والی ہوگی اور اس سے لازماً تمھیں سابقہ پیش آنا ہے! وہ ہے دوزخ کی آگ!! اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

اصنام کی بے حقیقتی کی تمثیل اور ان کے حامیوں کو جواب

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـــًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (۷۳)

یعنی جب تم اپنے معبودوں کی بے حقیقتی کا بیان سن کر ایسے ہی چڑتے ہو تو آؤ ان کی بے بسی کی ایک حقیقت افروز تمثیل سن لو۔ یہ تمھارے سارے دیوی دیوتا، جن کو تم پکارتے ہو، اگر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں پیدا کر سکتے اگرچہ اس کے لیے سب مل کر اپنا پورا زور صرف کر ڈالیں۔ اور یہی نہیں کہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ ان کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ جو حلوا تم ان کے آگے پیش کرتے ہو اگر اس میں سے مکھی کچھ چھین لے جائے تو یہ اس کو بھی نہیں بچا سکتے! طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتواں!!

'ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ' میں نہایت لطیف و بلیغ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ انسان کسی کو معبود مانتا ہے تو اس وجہ سے مانتا ہے کہ اس سے اس کے ضعف و ناتوانی کا مداوا ہوتا ہے لیکن ان نادانوں نے اپنا معبود ان کو بنایا ہے جو ان سے بھی بڑھ کر عاجز و بے بس ہیں۔ یہ اپنی خستگی کی داد ان سے چاہتے ہیں جو بے چارے اپنے چہرے سے مکھی بھی ہانک سکنے پر قادر نہیں ہیں۔

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۷۴)

انھوں نے خدا کی شان اور اس کی عظمت و قدرت بالکل نہیں پہچانی۔ خدا ان کے معبودوں کی طرح کوئی عاجز و بے بس ہستی نہیں ہے بلکہ وہ نہایت ہی طاقتور اور غالب ہستی ہے۔ وہ جو ارادہ فرماتا ہے اس کو پورا کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے اور مجال نہیں ہے کہ کوئی اس کے ارادے میں مزاحم ہو سکے۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۷۵)

فرشتوں کی حیثیت

یعنی ان نادانوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر جو ان کی پوجا شروع کر رکھی ہے، یہ محض ان کی سفاہت اور خدا کی شان سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ فرشتے خدا کی بیٹیاں اور اس کے شریک و سہیم نہیں ہیں

بلکہ اس کے بندے ہیں۔ اگر ان کو کوئی مرتبہ حاصل ہے تو یہ ہے کہ جس طرح وہ انسانوں میں سے خاص خاص بندوں کو اپنا پیغمبر بناتا ہے اسی طرح فرشتوں میں سے اپنے خاص خاص بندوں کو اپنے پیغمبروں کے پاس اپنا قاصد بنا کر بھیجتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ سے بیک وقت دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک اس طرف کہ جو خدا خود سمیع و بصیر ہے، سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے اس کو ضرورت کیا ہے کہ وہ کسی کو اپنا شریک بنائے۔ دوسرا اس طرف کہ جب خدا سمیع و بصیر ہے تو وہ ان فرشتوں کے فرائض کی بھی ہر قدم پر نگرانی کر رہا ہے، مجال نہیں کہ وہ سرِ مو اس کے مقرر کردہ حدود سے متجاوز ہو سکیں۔

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۷۶)

ان فرشتوں کے آگے اور پیچھے جو کچھ ہے سب خدا کے علم کے احاطہ میں ہے اس وجہ سے نہ وہ خدا کے علم میں کوئی اضافہ کر سکتے، نہ ان کا کوئی قول و فعل خدا کی نگرانی سے بالاتر ہو سکتا اور نہ وہ کسی کے باب میں خدا سے یہ کہنے کے پوزیشن ہی میں ہیں کہ ان کو اس کے بارے میں علم ہے، خدا کو نہیں ہے۔ سارے امور خدا ہی کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔ نہ ان فرشتوں کے آگے پیش ہوتے ہیں، نہ پیش ہوں گے۔ خود ان فرشتوں کو جو امور تفویض ہوتے ہیں ان کی رپورٹ بھی خدا ہی کے حضور ان کو پیش کرنی ہوتی ہے۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۷۷-۷۸

خاتمۂ سورہ

یہ خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ اوپر آپ نے دیکھ لیا کہ کفار قریش کو غدار اور خائن ثابت کر کے وراثتِ ابراہیمی اور تولیت بیت اللہ کے لیے ان کو بالکل نااہل قرار دے دیا اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ اس کی تولیت کے اصلی حقدار یہ مسلمان ہیں جو وہاں سے نکالے گئے ہیں اور ان کو یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ بیت اللہ کی آزادی اور تطہیر کے لیے جہاد کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اب آگے کی آیات میں مسلمانوں کو وہ ہدایات دی جا رہی ہیں جو اس عظیم ذمہ داری کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہیں ——— آیات ملاحظہ فرمائیے۔

آیات ۷۷-۷۸

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ
وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ (۷۷) وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ
حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ
حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ

وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ؀۷۸

ع ۱۰ ۱۷

ترجمۂ آیات ۷۷-۷۸

اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ اور اپنے رب کی بندگی کرتے رہو اور بھلائی کے کام کرو تاکہ فلاح پاؤ۔ اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔ اسی نے تم کو برگزیدہ کیا اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمھارے باپ — ابراہیم — کی ملت کو تمھارے لیے پسند فرمایا۔ اسی نے تمھارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے۔ اور اس قرآن میں بھی تمھارا نام مسلم ہے۔ تاکہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے اور تم دوسرے لوگوں پر اس کی گواہی دو۔ اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔ وہی تمھارا مرجع ہے اور کیا ہی خوب مرجع اور کیا ہی خوب مددگار ہے!! ۷۷-۷۸

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۷۷)

مسلمانوں کے منصب امامت کے تقاضے

اوپر ہم نے اشارہ کیا کہ یہ اس منصب امامت کے تقاضے بیان ہو رہے ہیں جس کی اس سورہ میں بشارت دی گئی ہے۔ یہ منصب ایک عظیم سرفرازی بھی ہے اور ایک عظیم ذمہ داری بھی۔ اس وجہ سے سب سے پہلے رکوع و سجود کا حکم ہوا۔ رکوع و سجود نماز کی تعبیر ہے۔ لیکن ہم آیہ ۲۶ کے تحت اشارہ کر چکے ہیں کہ ان لفظوں سے جب نماز کی تعبیر کی جاتی ہے تو اس سے صرف موقت نمازیں ہی مراد نہیں ہوتیں بلکہ یہ نمازوں کے اندر شغف و انہماک کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور خاص طور پر ان سے تہجد کی نمازیں مراد ہوتی ہیں جن کا اہتمام عظیم ذمہ داریوں کا اہل بننے کے لیے ضروری ہے۔ یہ مرتبہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سرفرازی اور ذمہ داری دونوں کا ہے اس وجہ سے شکر گزاری کے پہلو سے بھی نماز کی ہدایت ہوئی اور آنے والی ذمہ داری کا اہل بننے کے پہلو سے بھی۔ یہاں اسی سورہ کی آیت ۲۶ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے جس میں مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ حرم کی

تولیت کے لوازم کیا ہیں اور ان سے ان کا رب ان کو اس منصب پر سرفراز کرنے کے بعد کیا توقع رکھتا ہے۔

'وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ' یہ خاص کے بعد عام کا ذکر ہے اور 'عبادت' جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، اطاعت کے مفہوم پر بھی متضمن ہے۔ یعنی زندگی کے سارے گوشوں میں خدا ہی کی بندگی اور اسی کی اطاعت کرو۔

'وَافْعَلُوا الْخَيْرَ' یہ اس سے بھی زیادہ عام ہے۔ یعنی مزید نیکیاں اور بھلائیاں بھی کرو۔ یہ ان نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف اشارہ ہے جن کا درجہ اگرچہ فرائض و اوامر کا نہیں ہے لیکن وہ فضائل و مکارم میں داخل ہیں اور زندگی کے سنوارنے میں ان کو بڑا دخل ہے۔

'لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ' یعنی ان کاموں کا اہتمام کرو تو اس سے اس تمکن فی الارض کی صلاحیت بھی تمھارے اندر ابھرے گی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے اور آخرت کی بازی جیتنے کی اہلیت بھی تم میں پیدا ہوگی۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ ھٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (۷۸)

روحانی تیاری کے ساتھ عملی جدوجہد کی ہدایت

'وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ' اوپر کی اخلاقی و روحانی تیاری کے ساتھ ساتھ یہ پورے تن من دھن کے ساتھ عملی جدوجہد کی ہدایت ہوئی۔ جہاد سے مراد یہاں قتال نہیں ہے۔ وہ مشروط بشرائط و حالات ہے۔ اس کا ذکر آیات ۳۸-۴۱ میں گزر چکا ہے۔ یہاں اس سے مراد ہر وہ جدوجہد ہے جو اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے بندے کے امکان میں ہو۔

'فِي اللّٰهِ' میں مضاف محذوف ہے یعنی 'فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' اور 'حَقَّ جِهَادِهٖ' سے مقصود یہ تنبیہ ہے کہ یہ جدوجہد نیم دلی اور کمزوری کے ساتھ مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کے لیے جی جان کی بازی لگا دی جائے۔

'هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ' یعنی جو خدا تم سے اس جہاد کا مطالبہ کر رہا ہے وہی ہے جس نے اپنے دین کامل کی عظیم امانت کا حامل بنانے کے لیے تمھارا انتخاب کیا ہے۔ 'انتخاب کیا ہے' یعنی دوسروں کو 'خواہ قریش ہوں یا یہود' معزول کر کے انتخاب کیا ہے تو اس انتخاب کی لاج رکھو اور دوسروں کی امامت کے اس منصب کی ذمہ داریوں کو پورے عزم و جزم کے ساتھ سنبھالو۔ 'وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ' یعنی اس دین میں تمھارے اوپر اس طرح کی قیدیں اور پابندیاں نہیں ہیں جیسی کہ یہود کے دین میں تھیں۔ اللہ نے اپنے فضل سے اس دین فطرت کو اس قسم کی پابندیوں سے محفوظ رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چند یہ بار ہے تو عظیم لیکن ایسا نہیں ہے کہ تم اس کو اٹھا نہ سکو۔

'مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ' یعنی یہ تمھارے باپ ابراہیم کی ملت ہے تو باپ کی ملت سے زیادہ اولاد کے لیے اور کون سی ملت مطلوب و محبوب ہو سکتی ہے! یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں اصل خطاب بنی اسمٰعیلؑ سے

ہے جو نہ صرف یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے بلکہ ان کو ان کی اولاد ہونے پر بڑا فخر و ناز بھی تھا۔ 'مِّلَّةَ' سے پہلے 'اِتَّبِعُوا' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل بھی محذوف مان سکتے ہیں اور 'اِجْتَبٰی' کو کسی ایسے فعل پر متضمن بھی مان سکتے ہیں جو موقع سے مناسبت رکھنے والا ہو۔ میں نے مائدہ کی آیت 'وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا' کو پیش نظر رکھ کر تضمین مانی ہے اور ترجمہ میں اسی کا لحاظ رکھا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی طرف اشارہ

'هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِينَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِي هٰذَا'۔ یہ اس دین کے ملت ابراہیمؑ ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں جنھوں نے تمہارا نام اس سے پہلے مسلم رکھا اور پھر وہی نام تمہارے لیے اس دین میں بھی اختیار کیا گیا۔ بعض لوگوں نے 'هُوَ' کا مرجع اللہ تعالیٰ کو مانا ہے لیکن میرے نزدیک یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کی طرف اشارہ ہے جو بقرہ میں یوں وارد ہے 'رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ' ۔ ۱۲۹ (اے ہمارے رب! تو ہم دونوں کو مسلم بنا اور ہماری ذریت میں سے ایک امت مسلمہ برپا کر) مقصود اس نام اور اس دعا کی طرف اشارہ کرنے سے مسلمانوں کی ہمت افزائی ہے کہ تم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے مظہر ہو، اپنی اس تاریخ کو برابر یاد رکھو! اس سے یہ غلط فہمی کسی کو نہ ہو کہ اسلام یا مسلم کا لفظ سب سے اول حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے استعمال فرمایا۔ اسلام تو تمام کائنات کی فطرت ہے۔ 'وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ' (آل عمران ۸۳) اور تمام انبیاء کا دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔ البتہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی ذریت سے ایک امت کے پیدا ہونے کی دعا فرمائی تھی اور اس کا نام انھوں نے پہلے ہی سے امت مسلمہ رکھا تھا چنانچہ جب اس امت کا ظہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اسی نام سے اس امت کو موسوم فرمایا۔

امت مسلمہ کے وجود کا مقصد

'لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ'۔ بعینہٖ یہی مضمون بقرہ آیت ۱۴۳ میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے۔ 'وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا' (اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک ایسی امت بنایا جو وسط شاہراہ پر قائم ہے تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے) یہ اس انتخاب کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ نے تمہارا انتخاب سب کو معزول کر کے اس لیے فرمایا ہے کہ جس طرح اللہ کا رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے اسی طرح اب تم قیامت تک خلق پر اللہ کے دین کی گواہی دینے والے بنو۔ یہی تمہارے وجود کا مقصد اور تمہارے اصطفاء و اجتباء کی غایت ہے۔ اس شہادت کے مقتضیات پر ہم بقرہ ۱۴۳ کے تحت گفتگو کر چکے ہیں۔

نماز اور زکوٰۃ کی ہدایت شہادۃ علی الناس کی ذمہ داری کے پہلو سے

'فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيرُ'

اوپر والی آیت میں نماز ہی سے بات کا آغاز ہوا تھا اور اس کا پہلو ہم واضح کر چکے ہیں۔ اب یہ نماز اور زکوٰۃ کے اہتمام کی ہدایت ہی پر سورہ ختم ہو رہی ہے۔ یہاں نماز و زکوٰۃ کے اس اہتمام کی ہدایت شہادت علی الناس

کی اس ذمہ داری کے پہلو سے ہے جو اس امت پر ڈالی گئی ہے۔ انہی دو ستونوں پر، جیسا کہ تفسیر سورۂ بقرہ فصل ۲۹ میں ہم واضح کر چکے ہیں، پورے دین کی عمارت قائم ہے اس وجہ سے جب تک ان کا اہتمام باقی رہے گا دین باقی رہے گا۔ اگر ان کا اہتمام ختم ہو جائے گا تو دین بھی منہدم ہو جائے گا۔

شہادتِ حق کی راہ کا بدرقہ

'وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ' اور 'وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ' کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ ان مشکلات کا مداوا بتایا گیا ہے جو شہادتِ حق کی راہ میں پیش آئیں گی۔ فرمایا کہ پورے عزم و جزم کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہو، اپنے رب کو یاد رکھو، اس کی کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور اس کی مدد و نصرت پر پورا بھروسہ رکھو، وہ بہترین مرجع اور بہترین مددگار ہے!!

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

رحمان آباد

۶ر جولائی ۱۹۷۳ء

تدبرِ قرآن

۲۳

المؤمنون

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ — سورۂ حج — کی توام اور مثنیٰ ہے۔ سورۂ حج جس مضمون پر تمام ہوئی ہے اسی مضمون سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ سورۂ حج کے آخر میں مسلمانوں کا فریضۂ منصبی یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول نے دینِ حق کی گواہی جس طرح تم پر دی ہے اسی طرح اب تمہارا فرض ہے کہ یہ گواہی تم خلق پر دو۔ ساتھ ہی اس منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جن باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے مثلاً اہتمامِ نماز، ادائیگیِ زکوٰۃ اور توکل علی اللہ، ان کی ہدایت فرمائی ہے۔ اب اس سورہ کو پڑھیے تو بعینہٖ اسی مضمون سے اس طرح شروع ہو گئی ہے گویا اسی کا تکملہ و تتمہ ہے۔ سورۂ حج کی آخری اور سورہ مومنون کی ابتدائی آیات نے ایک حلقۂ اتصال کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مضمون کے اعتبار سے بھی دونوں سورتوں میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ صرف اسلوبِ بیان اور نہجِ استدلال کا فرق ہے۔ سورۂ حج میں اہلِ ایمان کو فوز و فلاح کی اور کفار کو ذلت و نامرادی کی جو خبر دی گئی ہے وہ اس سورہ میں پوری طرح آشکارا ہو گئی ہے۔ خاص طور پر اہلِ ایمان کے لیے بشارت کا مضمون اس میں بالکل کھل کر سامنے آگیا ہے اور وہ اوصاف بھی وضاحت سے بیان ہو گئے ہیں جن کے ساتھ یہ بشارت مشروط ہے۔ اسی طرح کفار پر بھی یہ حقیقت اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے کہ تمہیں جس ذلت کی خبر دی جا رہی ہے وہ لازماً پیش آکے رہے گی، آفاق و انفس اور تاریخ کی شہادت یہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو امتحان کا گھر بنایا ہے اس وجہ سے اس میں اہلِ ایمان کی آزمائش بھی ہوتی ہے اور اہلِ کفر کو ڈھیل بھی دی جاتی ہے۔ لیکن یہ عارضی وقفے ہیں۔ بالآخر حق ہی کا بول بالا ہوگا اور اہلِ باطل نامراد ہوں گے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۱) اہلِ ایمان کے لیے فوز و فلاح اور جنت کی وراثت کی بشارت اور یہ بشارت جن شرائط کے ساتھ مشروط ہے ان کا بیان۔

(۱۲-۲۲) انسان کی خلقت میں خدا کی قدرت و حکمت کی جو نشانیاں ہیں ان سے موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر استدلال اور اس کائنات میں خدا کی پروردگاری کے جو آثار و شواہد ہیں ان سے جزا و سزا کے لازم ہونے پر دلیل۔

(۲۳-۵۰) حضرات انبیاء علیہم السلام کی سرگزشتوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ۔ ابتدائی انبیاء میں سے حضرت نوحؑ کا اور آخری انبیاء میں سے حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور حضرت مسیح علیہم السلام کا نام لے کر اور بیچ کے تمام انبیاء کا نام لیے بغیر حوالہ جس سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ آج جس انداز سے خدا کے رسول کی تکذیب ہو رہی ہے اسی انداز سے [illegible]

اور مفسدوں نے رسولوں کی تکذیب کی ہے لیکن اللہ نے رسولوں کی دعوت کو فروغ دیا اور شریروں کی جڑ کاٹ دی۔ یہی اب بھی ہوگا لیکن یہ دنیا دارالامتحان ہے اس میں اہلِ حق کی آزمائش لازمی ہے۔ اس آزمائش کے تقاضے سے اہلِ باطل کو بھی ایک حدِ خاص تک مہلت دی جاتی ہے کہ وہ بھی جتنا زور لگانا ہے لگالیں۔ ان کے پاس کوئی عذر نہ باقی رہ جائے۔

(۵۱-۶۷) تمام انبیاء کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ہی دین ملا اور وہ ایک ہی دعوت کے داعی بن کر آئے لیکن ان کی امتوں نے ان کے لائے ہوئے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیا اور اب سب اپنے اپنے طریقہ پر مگن ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقینِ صبر کہ ان کو ان کی سرمستی میں کچھ دن مگن رہنے دو۔ یہ اس مغالطہ میں ہیں کہ مال و اولاد کی جو نعمت انھیں ملی ہوئی ہے یہ ان کے خیر میں اضافہ ہے۔ یہ خیر میں اضافہ نہیں بلکہ ان کی تباہی میں اضافہ ہے لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔ خیر میں اضافہ وہ لوگ کر رہے ہیں جن کے اندر ایمان، خشیت، اخلاص اور انفاق کی صفات پائی جاتی ہیں۔ وہ بے شک اپنی نیکیوں کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ رہے یہ دنیا دار اور دنیا پرست تو یہ اسی طرح اپنی دلچسپیوں میں ڈوبے رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب ہم ان کو پکڑیں گے تو یہ اپنے سر پیٹیں گے لیکن اس وقت ان کا سارا چیخنا چلانا بے سود ہوگا۔

(۶۸-۷۷) مکذبین کے بعض شبہات و اعتراضات کا حوالہ اور ان کے بے بنیاد ہونے کی طرف اشارہ۔ نیز ان کے مطالبۂ عذاب کا جواب کہ اگر ان کو عذاب کا کوئی نمونہ دکھا بھی دیا گیا تو یہ ان کے لیے سودمند نہ ہوگا۔ جس طرح یہ دوسروں پر گزرے ہوئے حوادث سے کوئی سبق نہیں لیتے اسی طرح اگر خود ان پر بھی کوئی آفت آئے تو اس سے چھوٹتے ہی پھر گرد جھاڑ کے اپنی بدمستیوں میں کھو جائیں گے۔

(۷۸-۹۰) معجزے اور نشانیاں مانگنے والوں کو کان، آنکھ اور دل و دماغ سے کام لینے کی دعوت کہ اگر تم خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لو تو تمھیں مرنے کے بعد اٹھنا اور جزا و سزا کا معاملہ ایک بدیہی حقیقت معلوم ہوگا۔ پھر ان کے تضادِ فکر کے بعض پہلوؤں کی نشاندہی کہ یہ لوگ خود اپنے مسلّمات کے نہایت بدیہی لوازم سے محض اپنی خواہشوں کی پیروی میں گریز اختیار کر رہے ہیں۔

(۹۳-۱۱۸) خاتمۂ سورہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معاندین کے رویہ سے چندے درگزر کرنے اور آنے والے عذاب سے پناہ مانگتے رہنے کی تلقین اور کفار کو وعید کہ وہ وقت قریب ہے جب تم سر پیٹو گے اور آرزوئیں کرو گے کہ کاش تمھیں دنیا میں جا کر کچھ نیکی کرنے کا موقع ملے لیکن اس وقت اس کا موقع گزر چکا ہوگا۔ اس وقت صرف وہ لوگ فلاح پائیں گے جن کے پلڑے بھاری ہوں گے۔ اس وقت فائز المرام ہمارے وہی بندے ہوں گے جو آج تمھیں خدا کی راہ کی دعوت دے رہے ہیں لیکن تم ان کا مذاق اڑا رہے ہو۔ آج تمھیں یہ دنیا کی زندگی بڑی طویل معلوم ہو رہی ہے لیکن اس دن اندازہ ہوگا کہ یہ زندگی چند لمحوں میں گزر گئی۔ تم نے گمان کیا کہ ہم نے تمھیں شترِ بے مہار بنا کر اس دنیا میں چھوڑ رکھا ہے اور تمھیں ہمارے پاس لوٹنا نہیں ہے لیکن تمھیں ایک ہی خدائے برتر و عظیم کی طرف لوٹنا ہوگا اور تمھارے شرکاء و شفعاء تمھارے کچھ کام نہیں آئیں گے۔

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۳)

مَكِّيَّةٌ ______ اٰيَاتُهَا ۱۱۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۱ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ
فٰعِلُوْنَ ۝۴ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۶ فَمَنِ ابْتَغٰى
وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۷ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ
منزل ۴ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۱

ترجمۂ آیات ۱-۱۱ فائز المرام ہوئے وہ اہلِ ایمان جو اپنی نمازوں میں فروتنی اختیار کرنے والے اور جو لغویات سے احتراز کرنے والے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ ادا کرتے رہنے والے اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے معاملے کے سو اس بارے میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو ان کے سوا کے خواہش مند ہوئے تو وہی ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی

حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے۔ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے! ۱-۱۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱)

اہل ایمان کو فلاح دنیا و آخرت کی بشارت

لفظ 'مُؤْمِنُوْنَ' ہرچند عام ہے لیکن یہاں اس کے مصداق اصل وہی اہل ایمان ہیں جو اس دور میں حق کی خاطر ہجرت اور جہاد کی بازیاں کھیل رہے تھے۔ فرمایا کہ وہ فائز المرام ہوئے۔ یہ بشارت ہے تو مستقبل سے متعلق لیکن اس کو تعبیر ماضی کے صیغے سے فرمایا ہے جس سے مقصود اس کی قطعیت کا اظہار ہے اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک بات کا فیصلہ ہو چکا تو گویا وہ بات واقع ہو چکی۔ یہاں جس فلاح کی بشارت ہے اس کا حقیقی ثمرہ تو فلاح آخرت ہے۔ وہی اصل چیز ہے اور اہل ایمان کا نصب العین ہمیشہ وہی ہوتی ہے لیکن اس کے اندر تمکن فی الارض کی وہ بشارت بھی مضمر ہے جو پچھلی سورہ میں دی گئی ہے۔ لیکن اس کا ذکر چونکہ پچھلی سورہ میں وضاحت سے ہو چکا ہے اس وجہ سے اس سورہ میں اصل انعام — فردوس — کا ذکر ہوا۔ دوسری چیزیں اس کے تحت خود بخود آ گئیں۔

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (۲)

روح نماز کی طرف اشارہ

'خشوع' کے معنی عاجزی، تذلل، نیازمندی اور فروتنی کے ہیں۔ یہ لفظ مختلف شکلوں میں قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ 'خشعت الاصوات' اور 'تخشع قلوبهم' وغیرہ کے استعمالات سے لفظ کی اصل روح پر روشنی پڑتی ہے اس وجہ سے جن لوگوں نے اس کے معنی مجرد 'سکون' کے لیے ہیں ہمارے نزدیک ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ یہ اس نماز کی اصل روح کی طرف اشارہ ہے جس پر مذکورہ فلاح کا انحصار ہے۔ مطلب یہ کہ رب کے آگے آدمی کی کمر اور اس کا سر ہی نہ جھکے بلکہ اس کا دل بھی سرنگندہ ہو جائے۔ ان اہل ایمان کی کیفیت یہی ہے کہ نمازوں میں ان کے قیام، ان کی ہیئت، ان کی آواز اور ان کے رکوع و سجود ایک ایک چیز سے ان کے دل کے خشوع کی شہادت ملتی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ پچھلی سورہ کی آخری آیت میں 'اقامت صلوٰۃ' کی ہدایت ہوئی تھی جو نماز کے ظاہری اہتمام و التزام کی تعبیر ہے۔ اس سورہ میں نماز کی اصل روح کا ذکر ہوا اور وہ بھی اس حیثیت سے کہ یہ ان اہل ایمان کی صفت ہے جن کو فلاح کی یہ بشارت دی جا رہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (۳)

زندگی پر نماز کا اثر

یہ زندگی پر نماز کا اثر بیان ہوا ہے۔ 'لغو' سے مراد ہر وہ قول و فعل ہے جو زندگی کے اصل مقصود —

رضائے الٰہی — سے غافل کرنے والا ہو۔ قطع نظر اس سے کہ وہ مباح ہے یا غیر مباح۔ جس نماز کے اندر خشوع ہو اس کا اثر زندگی پر لازماً یہ پڑتا ہے کہ فضول، غیر ضروری، لایعنی، بے مقصد چیزوں سے آدمی احتراز کرنے لگتا ہے۔ اس کو ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اگر میں نے کوئی فضول قسم کی حرکت کی تو اپنے عالم الغیب مالک کو ایک روز منہ دکھانا ہے اور اس چیز کی شب و روز میں کم از کم پانچ بار اس کو یاد دہانی ہوتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کا ضمیر اتنا بیدار اور حساس ہو کہ ہر غیر ضروری حرکت سے اس کی طبیعت انقباض محسوس کرے وہ کسی بڑی بے حیائی اور برائی کا مرتکب کبھی مشکل ہی سے ہوگا۔ نماز کا زندگی پر یہی اثر سورۂ عنکبوت میں یوں بیان ہوا ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ۔۴۵ (نماز بے حیائی اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے) روکنے کا مطلب یہی ہے کہ وہ ایک نہایت ہی موثر واعظ و زاجر ہے جو شب و روز میں پانچ مرتبہ انسان کو تذکیر کرتی رہتی ہے کہ دربارِ الٰہی کے شایانِ شان اعمال و کردار کیا ہیں اور انسان کو کہاں جانا ہے اور اس کے لیے اس کو کیا تیاریاں کرنی چاہئیں اور اپنے آپ کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہیے۔

آیت کا اصل مفہوم تو یہی ہے لیکن موقع کلام ایک اور ضمنی مفہوم کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ اس میں مخالفین کی ان خرافات پر ایک تعریض بھی ہے جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر وقت بکتے رہتے تھے۔ یہ مفہوم سورۂ قصص کی اس آیت سے نکل رہا ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (قصص : ۵۵)	اور جب وہ کوئی فضول بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے ساتھ تمہارے اعمال۔

یہی مضمون دوسرے مقام میں وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (فرقان : ۷۲) کے الفاظ سے ادا ہوا ہے۔ ان آیات کی روشنی میں زیرِ بحث آیت سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ اللہ کے یہ بندے مخالفین کی ژاژ خائیوں میں اپنا وقت برباد کرنے کے بجائے اپنے رب کے ذکر اور اس کی آیات کے فکر میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (۴)

نماز کے بعد دین کا دوسرا ستون، جیسا کہ ہم اس کتاب میں وضاحت سے بیان کر چکے ہیں، زکوٰۃ ہے۔ سورۂ مریم اور سورۂ انبیاء میں آپ تفصیل سے پڑھ آئے ہیں کہ ہر نبی کے باب میں یہ بات وارد ہوئی ہے کہ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تعلیم دیتا تھا) اس زکوٰۃ کی قانونی شکل ہر دین میں کچھ مختلف رہی ہے لیکن انفاق فی سبیل اللہ کی تعبیر کے لیے یہ ایک جامع اور معروف لفظ ہے اور اس کی حیثیت دین میں نماز کے مثنیٰ اور اس کے مظہرِ اول کی ہے۔ نماز بندے کو خالق سے جوڑتی ہے اور زکوٰۃ بندے کو بندوں کے ساتھ مربوط کرتی ہے اور جو بندہ خلق اور خالق دونوں سے صحیح بنیاد پر مربوط

نماز کے بعد دین کا دوسرا ستون زکوٰۃ ہے

ہو جائے درحقیقت وہی بندہ دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کا سزاوار ہے۔ اگرچہ یہ سورہ مکی ہے اور اسلام میں باقاعدہ اصطلاحی زکوٰۃ کا نظام بعد میں قائم ہوا لیکن یہ لفظ مصطلحہ شرعی زکوٰۃ کے مفہوم میں نہیں بلکہ انفاق کے مفہوم میں ہے۔ جن لوگوں نے اس کو مصدری معنی یعنی تزکیہ کے مفہوم میں لیا ہے، ان کی رائے ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ یہ لفظ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مکی سورتوں میں بھی نماز کے ساتھ بار بار آیا ہے اور کہیں بھی اس سے مراد تزکیہ نہیں بلکہ انفاق فی سبیل اللہ ہی ہے جس کے برکات و ثمرات میں سے تزکیہ بھی ہے۔

نماز اور زکوٰۃ میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے

فلسفۂ دین کے پہلو سے نماز اور زکوٰۃ ایمان کے دو بازو ہیں اور ان دونوں کے درمیان قدر مشترک خدا کی شکر گزاری ہے۔ یہی شکر گزاری کا جذبہ بندے کو نماز پر ابھارتا ہے جو تمام تر شکر ہے اور یہی شکر گزاری کا جذبہ اللہ کی راہ میں انفاق اور قربانی پر ابھارتا ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ زکوٰۃ درحقیقت نماز ہی کا ایک مظہر اور پہلو ہے اور دونوں میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔

پھر نماز کی روح، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا خشوع اور خشیت بھی ہے' اس پہلو سے یہ ہر برائی اور بے حیائی سے، جیسا کہ سورۂ عنکبوت کے حوالہ سے اوپر واضح ہوا، روکنے والی چیز ہے۔ چنانچہ اوپر بیان ہوا کہ جن کی نمازوں میں خشوع ہوتا ہے وہ منکرات اور لغویات سے احتراز کرتے ہیں۔ اب اسی نماز کے مزید اثرات آگے بیان ہو رہے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ (۵-۷)

شہوانی خواہشات پر قابو

یعنی یہ لوگ اپنی شہوانی خواہشات کو کنٹرول میں رکھتے ہیں۔ ان کو صرف وہیں آزادی دیتے ہیں جہاں اس کا حق ان کو حاصل ہے۔ یعنی بیویوں اور لونڈیوں پر[1]۔ یہ نہیں ہوتا کہ شہوات سے اندھے ہو کر بالکل سانڈ بن جائیں اور ہر حرمت پر دست اندازی اپنا حق سمجھ لیں۔ فرمایا کہ اپنے حدود کے اندر یہ چیز مباح ہے۔ اس پر کسی کو ملامت نہیں۔ یعنی کوئی اس کو تقویٰ، دینداری اور خدا ترسی کے منافی نہ سمجھے جیسا کہ راہبانہ تصورات کے تحت عام طور پر سمجھا گیا ہے۔ البتہ وہ لوگ جو اس حد سے آگے بڑھیں گے وہ خدا کے حدود کو توڑنے والے ہیں۔ یہاں صرف ان کے جرم کا ذکر فرمایا، اس کی سزا کا ذکر نہیں فرمایا۔ سزا کا ذکر نہ کرنے میں غصہ اور نفرت کی جو شدت ہے وہ خود واضح ہے۔ ع

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

یہاں اس امر کو یاد رکھیے کہ موجودہ مغربی اور مغرب زدہ سوسائٹی میں جنسی آزادی پر اگر کوئی قدغن ہے تو صرف اس صورت میں ہے جب جبر و اکراہ کی نوبت آئے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو پھر ہر ایک کو ہر قسم کی

---

[1] غلاموں اور لونڈیوں کے مسئلہ پر ہم اس کتاب میں پیچھے بھی بحث کر چکے ہیں اور آگے سورۂ نور کی تفسیر میں بھی اس پر مفصل بحث آ رہی ہے۔

آزادی حاصل ہے۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۸)

امانات اور عہود کی حفاظت

'امانات' سے مراد وہ تمام امانتیں بھی ہیں جو ہمارے رب نے قوتوں اور صلاحیتوں، فرائض اور ذمہ داریوں کی شکل میں یا اللہ امانت وافضال اور اموال و اولاد کی صورت میں ہمارے حوالہ کی ہیں۔ اور وہ امانتیں بھی اس میں داخل ہیں جو کسی نے ہمارے پاس محفوظ کی ہوں یا ازروئے حقوق ان کی ادائیگی کی ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہو۔ اسی طرح عہد میں وہ تمام عہد و میثاق بھی داخل ہیں جو ہمارے رب نے ہماری فطرت سے عالمِ غیب میں لیے ہیں یا اپنے نبیوں کے واسطہ سے، اپنی شریعت کی شکل میں، اس دنیا میں لیے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس وہ تمام عہد و میثاق بھی اس میں داخل ہیں جو ہم نے اپنی فطرت یا انبیاء کے واسطہ سے اپنے رب سے کیے ہیں یا کسی جماعت یا فرد سے اس دنیا میں کیے ہیں، خواہ وہ قولاً و تحریراً عمل میں آئے ہوں یا ہر شائستہ سوسائٹی میں بغیر کسی تحریر و اقرار کے سمجھے اور مانے جاتے ہوں۔ فرمایا کہ ہمارے یہ بندے ان تمام امانات اور ان تمام عہود و مواثیق کا پاس و لحاظ رکھنے والے ہیں۔ نہ اپنے رب کے معاملہ میں خائن اور غدار ہیں نہ اس کے بندوں کے ساتھ بے وفائی اور عہد شکنی کرنے والے ہیں۔

ان دو لفظوں کے اندر وہ تمام شرعی و اخلاقی، قانونی اور عرفی ذمہ داریاں آگئیں جن کا احترام ہر شریعت میں مطلوب رہا ہے۔ یہاں یہ اوپر کی باتوں کے بعد ایک جامع بات کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہے اور در حقیقت اسی اجمال کی تفصیل ہے جو پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔

حکمتِ دین کا ایک نکتہ

یہاں حکمتِ دین کا یہ نکتہ نگاہ میں رہے کہ نماز ہی ان تمام امانات و عہود کی اصل محافظ ہے۔ نماز خود بھی جیسا کہ تفسیر سورۂ بقرہ میں ہم واضح کر چکے ہیں، بندے کا اپنے رب کے ساتھ عہد و میثاق ہے جس کی تجدید ہر بندۂ مومن دن رات میں کم از کم پانچ مرتبہ کرتا رہتا ہے اور یہ ان تمام عہود و مواثیق اور امانات و فرائض کی یاد دہانی بھی ہے جن کی ذمہ داری بندے پر عاید ہوتی ہے۔ ان مسائل پر ہم اس کتاب میں بھی موزوں مقامات میں بحث کر رہے ہیں اور خاص نماز کے اسرار و حقائق پر 'حقیقتِ نماز' کے عنوان سے ہم نے ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ (۹)

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نماز ہی سے اہلِ ایمان کی صفات کا ذکر شروع ہوا تھا اور اسی پر آ کر ختم ہوا۔ شروع میں نماز کا ذکر اس کی روح یعنی 'خشوع' کے پہلو سے ہوا اور آخر میں اس کی محافظت، اس کے رکھ رکھاؤ اور اس کی دیکھ بھال کے پہلو سے ہوا۔ اس لیے کہ وہ برکات جو نماز کی بیان ہوئی ہیں اسی صورت حال میں حاصل ہوتی ہیں جب اس کے اندر خشوع کی روح ہو اور اس کی برابر رکھوالی بھی ہوتی رہے۔ یہ باغ جنت کا پودا ہے جو پوری نگہداشت کے بغیر پروان نہیں چڑھتا۔ ذرا غفلت اور ناقدری ہو جائے تو یہ بے ثمر ہو کے رہ جاتا ہے

بلکہ اس کے بالکل ہی سوکھ جانے کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی حقیقی برکات سے بہرہ مند ہونے کی آرزو ہے تو شیاطین کی تاخت سے اس کو بچائیے اور وقت کی پوری پابندی کے ساتھ آنسوؤں سے اس کو سینچتے رہیے۔ تب کچھ اندازہ ہوگا کہ رب نے اس کے اندر آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی ہے!!

یہ بات کہ نماز ہی تمام دین کی محافظ ہے قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے۔ ہم نے دوسرے مقام میں ان تمام مثالوں کا حوالہ دیا ہے۔ یہ دین کی اس حکمت کی طرف اشارہ ہے کہ نماز ہی سے تمام نیکیاں نشوونما بھی پاتی ہیں اور وہی اپنے حصار میں ان کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ اگر نماز وجود میں نہ آئے تو دوسری نیکیاں بھی وجود میں نہیں آسکتیں اور اگر نماز منہدم کردی جائے تو دین و اخلاق کا سارا چمن تاراج ہو کر رہ جائے گا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ جس نے نماز ضائع کردی تو وہ باقی دین کو بدرجہ اولیٰ ضائع کر دے گا۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۱۰-۱۱)

فردوس کی وراثت کے اصل حقدار

فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جو اپنے باپ کی کھوئی ہوئی جنت کے وارث ہوں گے اور پھر ان کو اس سے نکالے جانے کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا، جیسا کہ آدمؑ کو پیش آیا بلکہ وہ اس میں اپنے باپ کے ساتھ ہمیشہ ہمیش رہیں گے اس لیے کہ وہ اس میں اپنے دشمن شیطان کو ہمیشہ کے لیے شکست دے کر داخل ہوں گے۔ فردوس جنت کے اعلیٰ ترین مقامات میں سے ہے اور یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جو اس دنیا میں حق کی سربلندی کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں گے۔

۲- مجموعۂ آیات ۱-۱۱ کے مطالب کا خلاصہ

اگرچہ آیات کی وضاحت کرتے ہوئے ہم تمام ضروری باتوں کی طرف اشارہ کرتے آئے ہیں لیکن چونکہ انہی باتوں پر تمام صلاح و فلاح کا انحصار ہے اس وجہ سے مناسب ہوگا کہ ان کو ازسرِنو ذہن میں مستحضر کر لیجیے۔ یہ باتیں اپنی حکیمانہ ترتیب کے ساتھ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- خدا کے ہاں تمام صلاح و فلاح کا انحصار اس ایمان پر ہے جو آدمی کے اندر ایک ملکۂ راسخہ کی حیثیت حاصل کرے۔ محض اوپری اور ظاہر دارانہ ایمان کی اس کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔

۲- اس ایمان کا اولین مظہر نماز ہے۔ جس ایمان سے نماز نہ پیدا ہو وہ ایک ٹھونٹھ درخت ہے جو صرف جلانے کے کام آسکتا ہے۔

۳- نماز کی اصل روح خشوع یعنی دل کی فروتنی ہے۔ اگر نماز اس خشوع سے خالی ہو تو اس کا زندگی پر کوئی مفید اثر نہیں پڑتا۔

۴- جس نماز میں خشوع کی روح موجود ہو وہ آدمی کو فواحش و منکرات اور لاطائل باتوں سے روک دیتی ہے۔ نماز میں بندے کو خدا کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اس معیت کا شعور بندے کو ان تمام سفاسف سے دور رکھتا ہے جو اس کے شایانِ شان نہ ہوں۔

۵- ایمان کا دوسرا مظہر اور نماز کا دوسرا بازو زکوٰۃ یعنی انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ احکام شریعت میں یہی دو حکم سب سے بڑے ہیں۔ انہی پر تمام شریعت کا مدار ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا ہادم دونوں کا ہادم ہے۔ مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں سیدنا ابوبکرؓ نے جو اقدام کیا وہ اسی حکمتِ دین پر مبنی تھا۔

۶- اپنے دل اور اپنے مال دونوں پر خدا کی حکمرانی تسلیم کرنے والے کبھی اپنی خواہشوں اور شہوات کی پیروی میں ایسے اندھے نہیں ہوتے کہ خدا کے حدود کو توڑ کر اس کے بندوں کے حقوق اور ناموس پر دست درازی کریں۔

۷- یہ لوگ تمام امانات اور عہد کا پاس کرتے ہیں خواہ ان کا تعلق خدا سے ہو یا بندوں سے۔

۸- یہ لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کی نماز ایک شہر پناہ کی طرح ان کے پورے دین کی حفاظت کرتی ہے۔

۹- جو لوگ ان صفات کے حامل ہوں گے وہی خدا کی جنت کے وارث ہوں گے اور یہی اصل کامیابی ہے۔

ان تمام باتوں کی تفصیل اگلی سورہ ــــ سورۂ نور ــــ میں آئے گی جو اس سورہ کا تکملہ اور تتمہ ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جب انسان کا باطن ایمان کے نور سے منور ہوتا ہے تو اس سے زندگی کے ہر گوشہ میں، خواہ وہ انفرادی ہو یا خاندانی و اجتماعی، کیا نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر اس سے محروم ہو تو اندر اور باہر ہر گوشے میں کس طرح کی تاریکی پھیلتی ہے۔

۲- آگے کا مضمون ــــ آیات ۱۲-۲۲

اوپر اہلِ ایمان کو جو بشارت دی گئی ہے اگرچہ وہ ایک حقیقت ہے اور اس کے اندر ایمان سے محروم منکرین قرآن کے لیے جو انذار مضمر ہے وہ بھی ایک حقیقت ہے لیکن جو لوگ سرے سے آخرت ہی کے قائل نہ ہوں، مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کو نہایت مستبعد سمجھ رہے ہوں ان پر اس انذار و بشارت کا کیا اثر ہو سکتا تھا! وہ ان ساری باتوں کو محض واہمہ کی خلاقی سمجھتے اور ان کا مذاق اڑاتے۔ ان کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر آگے انفس و آفاق کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے وجود کی تشکیل جن مراحل سے گزرتی ہے اگر کوئی اسی پر غور کرے تو اس کو اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں رہ جائے گا کہ جو خدا یہ سب کچھ کر سکتا ہے اس کے لیے کسی چیز کے مرکھپ جانے کے بعد اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے وجود سے باہر اس کائنات پر غور کرے تو اس کو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اس کا خالق اس کو پیدا کر کے کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے بلکہ وہ نہایت بیداری اور اہتمام، نہایت ہی انعام و اکرام اور نہایت ہی قدرت و شان کے ساتھ اس کی نگہداشت و پرورش فرما رہا ہے۔ تو جب وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ لوگوں کو یوں ہی شتر بے مہار بنا کر چھوڑے رکھے، نیکوں کو ان کی

نیکیوں کا انعام اور بدوں کو ان کی بدیوں کی سزا دینے کے لیے ایک روزِ جزا و سزا لانے! یہ دلیل سورۂ حج کی آیت ۵ میں بھی بیان ہو چکی ہے۔ یہاں یہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور اس کے بعض پہلو بھی نمایاں ہوئے ہیں جو وہاں مخفی رہ گئے تھے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۲-۲۲

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً
فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا
الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ
لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾
ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾
وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ
غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي
الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ
بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا
تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ
وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ
مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾
وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱۲-۲۲

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا، پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک محفوظ مستقر میں رکھا، پھر ہم نے پانی کی بوند کو ایک جنین کی شکل دی۔ پھر جنین کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا۔ پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں۔ پھر ہڈیوں کو گوشت کا

جامہ پہنایا۔ پھر اس کو ایک بالکل ہی مختلف مخلوق کی شکل میں کر دیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا! پھر تم ان سب کے بعد لازماً مرنے والے ہو، پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔ ۱۲-۱۶

اور ہم نے تمہارے اوپر سات تہ بہ تہ آسمان بنائے۔ اور ہم مخلوق سے بے پروا نہیں ہوئے۔ اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا ایک اندازہ کے ساتھ۔ پس اس کو زمین میں ٹھہرا دیا اور ہم اس کو واپس لے لینے پر قادر ہیں۔ پس ہم نے اس سے تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اگائے۔ تمہارے لیے ان میں بہت سے میوے ہیں جن سے تم لذت اندوز بھی ہوتے ہو اور اپنی غذا کا سامان بھی کرتے ہو۔ اور وہ درخت بھی اگایا جو طور سینا میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ روغن اور کھانے والوں کے لیے سالن کے ساتھ اگتا ہے۔ اور تمہارے لیے چوپایوں میں بھی بڑا درس آموزی کا سامان ہے۔ ہم ان چیزوں کے اندر سے، جو ان کے پیٹوں میں ہیں، تمہیں (خوش ذائقہ دودھ) پلاتے ہیں اور تمہارے لیے ان میں دوسرے بھی بہت سے فوائد ہیں۔ اور ان سے تم اپنی غذا کا سامان بھی حاصل کرتے ہو۔ اور ان پر اور کشتیوں پر سواری بھی کرتے ہو۔ ۱۷-۲۲

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۚ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۚ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۚ (۱۲-۱۴)

انسان کا اپنا وجود خدا اور آخرت کا شاہد ہے

انسان کی خلقت کے ان تدریجی مراحل کا بیان، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سورۂ حج میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں اس کی تمہید اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ، سے اٹھائی ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

مقصود اس کے بیان سے زندگی بعد الموت کا اثبات ہے۔ نیز وہاں اثنائے کلام میں 'لِنُبَيِّنَ لَكُمْ' کے الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں جو اس حقیقت کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ انسان کی خلقت کے لیے اللہ تعالیٰ نے تدریج و ترقی کا یہ اہتمام اس لیے فرمایا کہ ہر انسان کا اپنا وجود خدا کی قدرت، اس کی حکمت اور اس کی پروردگاری کا ایسا نشان ہو کہ آخرت کے باب میں اس کو کسی خارجی دلیل کی ضرورت باقی نہ رہے۔ سورۂ حج میں اس آیت کے الفاظ کی بھی تحقیق گزر چکی ہے اور اس کا مدعا بھی تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ یہاں اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک انسان کی خلقت کا تعلق ہے یہ تمام مراحل بالکل معلوم و معروف ہیں۔ جدید سائنس نے اس کے بعض ایسے گوشے بھی بے نقاب کر دیے ہیں جن کی طرف قرآن نے صرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا تھا کہ انسان کے علم میں جتنا ہی اضافہ ہوتا جائے گا اتنے ہی اس کے اسرار کھلتے جائیں گے۔ اس نوع کی بعض باتوں کی طرف ہم پیچھے اس کتاب میں اشارہ کر آئے ہیں۔ غرض یہ راز تو سب کو معلوم ہے کہ مٹی کے جوہر سے وجود میں آنے والی پانی کی ایک بوند ہے جس کو قدرت پرورش کر کے درجہ بدرجہ اس طرح پروان چڑھاتی ہے کہ بالآخر وہ سقراط و بقراط اور ارسطو و جالینوس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے؟ کیا یہ ساری تدریج و تکمیل اور ساری تربیت و نگہداشت محض اندھے بہرے مادے کی کارفرمائی ہے؟ کیا یہ تمام قدرت و حکمت اور تمام ربوبیت و رأفت بالکل بے مقصد و غایت ایک کھیل ہے جس کے پیچھے کوئی نتیجہ اور انجام نہیں ہے؟ کیا جو پانی کی ایک بوند کو آدمی بنا سکتا ہے، وہ اس آدمی کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا؟ یہی سوالات ہیں جن کے جواب میں نادانوں نے، اگرچہ وہ فلسفی اور سائنسدان کے معزز ناموں ہی سے موسوم ہوں، خلاف کیا ہے۔ قرآن نے انہی سوالوں کے جواب کے لیے انسان کو خود اس کے وجود کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ان کے جواب کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود اپنے وجود کے مراحل پر غور کرو، ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔

'ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ' میں اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کہاں پانی کی ایک بوند اور کہاں ایک بھلا چنگا، عاقل و بالغ انسان، دونوں میں کیا نسبت ہے! لیکن ہر انسان کے وجود میں قدرت کا یہ کرشمہ موجود ہے تو جس قدرت کا یہ کرشمہ ہر وجود میں مشاہدہ کرتے ہو اس سے یہ کیوں بعید سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے؟ کیا وہ کام اس سے زیادہ مشکل ہے!

'فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ' یہ وہ تاثر اور نتیجہ بیان ہوا ہے جو انسان کی خلقت کے ان تمام مراحل پر غور کرنے والے کے سامنے آنا چاہیے کہ اللہ، جس نے ایک ایک وجود کے اندر اپنی یہ شانیں اور حکمتیں اور یہ عنایتیں اور برکتیں ظاہر فرمائی ہیں، بڑی ہی بابرکت اور بافیض ہستی ہے کہ اس نے ذلیل پانی کی ایک بوند کو رحم مادر کے صدف میں پرورش کر کے ایک گوہر آبدار بنا کر نکالا اور اس کے اندر ایسی اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت فرمائیں کہ وہ فرشتوں کا مسجود اور زمین میں خدا کی خلافت کا اہل ٹھہرا۔ مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں پر غور کرنے سے آدمی کے اندر صرف خدا کا اقرار ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کے بے پایاں فیض وجود والی ہستی اور اس کے نہایت حکیم و قدیر

اور نہایت اعلیٰ و برتر خالق ہونے کا یقین پیدا ہوتا ہے۔ یہاں عربی زبان کے اس اسلوب کو بھی یاد رکھیے کہ 'اَفْعَلُ' کا صیغہ بالخصوص جب کہ وہ جمع کی طرف مضاف ہو بسا اوقات تفضیل و ترجیح کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض اعلیٰ مرتبہ صفت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ اس وجہ سے 'اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ' کے معنی ہوں گے کہ وہ صرف خالق ہی نہیں بلکہ بہترین خالق ہے۔ اس نے انسان کو جیسا تیسا پیدا ہی نہیں کر دیا ہے بلکہ بہترین ساخت اور بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس اسلوب سے ناواقفیت کے باعث لفظ 'خالق' کا مفہوم بدل دیا ہے حالانکہ اس قسم کے کسی تصرف کی ضرورت نہیں ہے۔ مقصود یہاں یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسان کی خلقت خود اس بات کی شاہد ہے کہ وہ کسی اندھے بہرے مادے، یا کسی محرک اول یا علۃ العلل کی ایجاد نہیں ہے اور نہ اس کا ارتقاء آپ سے آپ ہوا یا ہو رہا ہے بلکہ وہ سراپا خیر و برکت ہستی خدائے جواد و کریم کا پیدا کیا ہوا ہے جو بہترین خالق ہے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ (۱۵-۱۶)

یہ وہ اصل نتیجہ ہے جس کو سامنے لانے ہی کے لیے اوپر کے تمام مراحل خلقت بیان ہوئے ہیں کہ ان مراحل سے گزرنے کے بعد لازماً ایک دن آنا ہے کہ تم مرتے ہو اور کسی کے لیے بھی اس موت سے مفر نہیں ہے۔ پھر قیامت کا دن آئے گا اور اس دن تم لازماً اٹھائے جاؤ گے۔ اس اٹھائے جانے کو مستبعد سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے جس خدا کی یہ شانیں تم خود اپنے وجود کے اندر مشاہدہ کرتے ہو اس کے لیے تمہیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے!

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ (۱۷)

'طَرَآئِق' کا مفہوم — 'طَرَآئِقُ' 'طَرِيْقَةٌ' کی جمع ہے۔ 'طرائق' 'استرۃ' یعنی دھاریوں کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں صفت بول کر موصوف کو مراد لیا ہے جو عربی زبان میں معروف ہے۔ یعنی دھاریوں والے سات آسمان۔ یہاں اس لفظ سے آسمان کی رنگا رنگی و بوقلمونی کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے اور اس بارش کی طرف بھی جس کا ذکر آگے نہایت اہتمام سے آرہا ہے۔

'وَمَا كُنَّا' یہاں بیانِ شان کے لیے ہے جس طرح 'كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا' میں ہے۔ یعنی ہم اپنی مخلوق کو پیدا کر کے اس سے غافل نہیں ہو بیٹھے بلکہ برابر نہایت اہتمام کے ساتھ اس کی پرورش اور دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

اہتمامِ ربوبیت کیوں ہے! — اوپر کی آیات میں انسان کی خلقت کا بیان ہوا اور مقصود امکانِ معاد کی طرف توجہ دلانا ہے۔ اب یہ ربوبیت کے اہتمام و انتظام کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ خدا اس دنیا کو پیدا کر کے اس کے خیر و شر سے بے تعلق ہو کر نہیں بیٹھا ہے بلکہ وہ برابر اس کی پرورش و پرداخت فرما رہا ہے۔ اس نے رنگا رنگ سات آسمان بنانے اور ان آسمان سے پانی برسانا اور اپنی مخلوق کی پرورش کا برابر سامان کر رہا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ (۱۸)

پانی ہی سے تمام زمین کی زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ آسمان سے نازل فرماتا ہے اور یہ اس کی رحمت و ربوبیت ہی کا یہ کہ وہ اس کو ایک خاص اندازہ اور مقدار کے ساتھ اتارتا ہے ورنہ اگر وہ اس کے دہانے ایک مرتبہ کھول دے

تو کوئی اس کو بند کرنے پر قادر نہیں اور یہی پانی رحمت و برکت ہونے کے بجائے طوفانِ نوح کی طرح عذابِ نقمت بن جائے۔ پھر یہ اس کی رحمت و ربوبیت ہی ہے کہ وہ اس پانی کو زمین میں ٹکا دیتا ہے، جو ایک ذخیرے اور محفوظ خزانے کی طرح تمام مخلوقات کے کام آتا ہے۔ اگر خدا چاہتا تو وہ اس سارے پانی کو غائب کر دیتا۔ اس کی ایک بوند بھی اس زمین میں نہ ٹک سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی ارادہ ہے جو آسمانوں اور زمین دونوں میں کارفرما ہے۔ اگر ان میں الگ الگ ارادے کارفرما ہوتے تو آسمان کے کارفرماؤں کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین والوں کے لیے ان کی ضرورت کے مطابق ناپ تول کر پانی برساتے اور اس کی بھی فکر رکھتے کہ پانی کا ذخیرہ زمین میں ضرورت کے اوقات کے لیے محفوظ بھی رہے۔ پھر یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جس ذاتِ واحد کے ارادے سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے وہ نہایت مہربان و کریم ہستی ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ اس دنیا کی پرورش کر رہی ہے۔

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۱۹)

'تَاْكُلُوْنَ' کا قرینہ دلیل ہے کہ 'فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ' کے بعد 'تَتَفَكَّهُوْنَ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف مانا جائے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

یعنی اسی پانی سے اللہ نے تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اگائے جن میں تمہارے لیے اور بھی بہت سے پھل پیدا ہوتے ہیں جن سے تم لذت اندوز ہوتے اور انہی باغوں سے تم اپنے لیے غذائی اجناس بھی حاصل کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے صرف زندہ رہنے کا سامان ہی نہیں پیدا کیا بلکہ تمہارے کام و دہن کی ضیافت کا سامان بھی مہیا فرمایا۔ جینے کو تو انسان صرف روٹی سے بھی جی سکتا ہے لیکن ربِ کریم نے تمہارے آگے قسم قسم کے میوے اور پھل بھی چن دیے۔ اہلِ عرب کے ہاں ایک اچھے باغ کا تصور، جیسا کہ سورۂ کہف کی آیت ۳۲ میں مذکور ہے، یہ ہے کہ انگوروں کا باغ ہو۔ اس کے کنارے کنارے کھجوروں کی باڑھ ہو اور بیچ بیچ میں مختلف اجناس اور دوسرے موسمی پھلوں کے قطعات ہوں۔ ان کے ہاں اصل پھل کی حیثیت تو کھجور اور انگور ہی کو حاصل تھی لیکن دوسرے پھل اور بعض غذائی اجناس بھی پیدا ہوتیں۔ انہی کی طرف 'فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ' اور 'مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ (۲۰)

'شَجَرَةً' سے مراد زیتون کے درخت ہیں۔ اگرچہ اس کا نام نہیں لیا ہے لیکن جو صفات اس کی بیان فرمائی ہیں وہ خود پتہ دے رہی ہیں کہ اس سے مراد زیتون ہی ہے۔ طورِ سینا اس کی پیداوار کا خاص علاقہ تھا۔ اس کا روغن اہلِ عرب میں بہت مقبول تھا اور اہلِ کتاب کے ہاں تو اس کو صرف غذائی روغن ہی کا نہیں بلکہ ایک قسم کے مذہبی تقدس کا بھی درجہ حاصل تھا۔ 'صِبْغٌ' کے معنی سالن کے ہیں۔ یہ مکھن کی طرح ایک لذیذ اور مقوی سالن بھی تھا۔ یہاں اس کی تنکیر اس کی خوبی پر دلیل ہے۔ یعنی صِبْغٌ طَيِّبٌ لِّلْاٰكِلِيْنَ کھانے والوں کے لیے

ایک اچھا سالن۔ یہ اس کے دوسرے فوائد کے ساتھ اس کی ایک مزید خوبی کا بیان ہے۔

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ (۲۱)

'عِبْرَةٌ' کے معنی، جیسا کہ آل عمران ۱۳ کے تحت واضح ہو چکا ہے، ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک عبور کر جانا اور اس سے سبق حاصل کرنا ہے۔ اس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اوپر جو چیزیں مذکور ہوئیں ان میں جو درس عبرت و موعظت ہے وہ تو ہے ہی، اگر تم غور کرو تو تمہارے لیے تمہارے چوپایوں کے اندر بھی بڑا سبق موجود ہے۔

'نُسْقِيكُمْ' کا دوسرا مفعول یہاں ظاہر نہیں فرمایا ہے۔ دوسری جگہ اس کو 'لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشَّارِبِينَ' (نحل: ۶۶) کے الفاظ سے ظاہر فرما دیا ہے۔ اسی طرح 'مِّمَّا فِي بُطُونِهَا' یہاں مجمل ہے دوسری جگہ اس کی وضاحت 'مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ' (نحل: ۶۶) کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ اگر ان محذوفات کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان چوپایوں کے پیٹ کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو بالکل بے آمیز اور خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔

'وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ' ان کے خاص فائدے کے ساتھ ساتھ یہ ان کے دوسرے فوائد و منافع کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ ان کا دودھ ہی نہیں بلکہ ان کی ایک ایک چیز تمہارے لیے نفع رساں ہے۔ یہ تمہاری سواری اور بار برداری کے کام آتے ہیں، تمہاری کاشت کاری میں معین ہیں، ان کا گوشت، چمڑا اور ان کی اون ہر چیز تمہارے لیے کارآمد ہے۔ یہاں تک کہ ان کا گوبر بھی تمہارے کھیتوں کے لیے کھاد کا کام دیتا ہے اور یہ تمہارے لیے غذائی ذخیرہ کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ تم ان کا تر و تازہ گوشت بھی کھاتے ہو اور ان کا گوشت خشک کر کے اپنی سفری ضروریات کے لیے بھی محفوظ کر لیتے ہو اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جن کی اصل اہمیت ان کے غذائی پہلو ہی سے ہے۔

وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ (۲۲)

'تُحْمَلُونَ' کے اندر سواری اور بار برداری دونوں چیزیں شامل ہیں اور اہل عرب کی زندگی چونکہ عام طور پر خانہ بدوشی کی تھی، موسموں کے ساتھ برابر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے۔ اس وجہ سے ان کے لیے یہ دونوں ہی مسئلے بڑی اہمیت رکھنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ضرورت کے سبب اونٹ پیدا کیا جو ان کے صحرا کا سفینہ ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر اور کشتی کا ذکر ساتھ ساتھ فرمایا کہ ہم نے تمہارے صحرا کے لیے بھی کشتی کا انتظام کیا اور سمندر کے لیے بھی۔

اصل حقیقت کی طرف اشارہ یہاں اصل حقیقت پر نگاہ رہے کہ مقصود ان چیزوں کے ذکر سے درس عبرت ہے کہ کیا جس رب نے ہماری ایک ایک ضرورت کا اس مجزرسی کے ساتھ اہتمام فرمایا ہے اس کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہم کو پیدا کر کے بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھ رہا ہے؟ کیا اس کی یہ ربوبیت ہمارے اوپر کوئی حق اور ذمہ داری

عاید نہیں کرتی؟ اور کیا اس کا لازمی تقاضا یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں ان ذمہ داریوں سے متعلق ہم سے پرسش ہو، جنھوں نے ان کا حق ادا کیا ہو وہ انعام پائیں، جنھوں نے اس دنیا کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ کر ساری زندگی بطالت میں گزاری ہو وہ اس کی سزا بھگتیں! ظاہر ہے کہ عقل و فطرت کی شہادت اسی دوسرے پہلو کے حق میں ہے۔ جو لوگ کریم کے دروازے سے سب کچھ پاکر اس کا حق نہیں پہچانتے یا اس کے ماسوا دوسروں کے گن گاتے ہیں وہ لئیم اور ناشکرے ہیں اور لازم ہے کہ وہ اپنی اس ناشکری کا انجام دیکھیں۔

۵-آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۳-۵۰

آگے حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے مکذبین کی تاریخ کا اجمالی حوالہ ہے اور مقصود اس سے تاریخ کی روشنی میں اس حقیقت کو واضح کرنا ہے جو یہاں زیر بحث ہے۔ یعنی اہل ایمان کی فلاح اور حق کی تکذیب کرنے والا[illegible] سی ضمن میں اس سنت الٰہی کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کا انجام جب ہے تو بہر حال ابدی خسران لیکن اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اہل حق کی بھی آزمائش کرتا ہے۔ اس آزمائش کے تقاضے سے اہل باطل کو بھی کچھ عرصہ ڈھیل دی جاتی ہے۔ وہ اس ڈھیل کو اپنی کامیابی تصور کرتے ہیں حالانکہ یہ چیز ان کی کامیابی نہیں بلکہ ان کے لیے موت کا پھندا بنتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام اور ان کے مکذبین کا حوالہ پچھلی سورہ کی آیات ۴۲-۵۴ میں بھی گزر چکا ہے لیکن بہت اجمال کے ساتھ۔ اس میں فی الجملہ تفصیل ہے لیکن نام کے ساتھ ذکر انبیائے اولین میں سے صرف حضرت نوحؑ کا اور آخری انبیاء میں سے حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور حضرت مسیح علیہم السلام کا ہے۔ بقیہ انبیاء کا نام لیے بغیر صرف ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ
۲۳-۵۰ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ
عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۖۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ
اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٤﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ
حَتّٰى حِيْنٍ ﴿٢٥﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿٢٦﴾ فَاَوْحَيْنَاۤ
اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا

وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا
مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ
اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ
فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ
رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ
قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ ۲ ع ۱۰ ۲
مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ
مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَىِٕنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ
اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ
تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا
تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا
نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُۨ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا
وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾
قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ
بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَاۗءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ ثُمَّ اَنْشَاْنَا

مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا
يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَ اُمَّةً
رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ
فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ڏ
بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ
كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا
لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا
مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ
ع ۳ اُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾

ترجمۂ آیات ۲۳-۵۰

اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو اس نے دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں تو کیا تم اس کے غضب سے ڈرتے نہیں! تو اس کی قوم کے اعیان نے، جنھوں نے کفر کیا، کہا کہ یہ تو بس تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہے، تم پر اپنی برتری جمانا چاہتا ہے۔ اور اگر اللہ رسول ہی بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجتا۔ اس طرح کی بات ہم نے اپنے اگلے بزرگوں میں تو سنی نہیں! یہ تو بس ایک ایسا شخص ہے جس کو ایک قسم کا جنون ہے۔ تو کچھ دن اس کے باب میں انتظار کرو! ۲۳-۲۵

تو اس نے دعا کی کہ اے میرے رب! تو اس چیز سے میری مدد کر جس میں انھوں نے مجھ کو جھٹلایا۔ تو ہم نے اس کو وحی کی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق کشتی بنا

توجب ہمارا عذاب آجائے اور طوفان اُمڈ پڑے تو اس میں ہر چیز کے جوڑے رکھ لو اور اپنے لوگوں کو بھی سوار کرا لو بجز ان کے جن کے بارے میں قول فیصل ہو چکا ہے اور مجھ سے ان لوگوں کے باب میں کچھ نہ کہیو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے! وہ لازماً غرق ہو کے رہیں گے! ۲۶-۲۷

پس جب تم اور تمھارے ساتھی کشتی میں سوار ہو لیں تو شکر ادا کیجیو کہ شکر ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات دی اور دعا کیجیو کہ اے رب تو مجھے اتار مبارک اتارنا اور تو بہترین اتارنے والا ہے۔ بے شک اس سرگزشت میں بڑی نشانیاں ہیں! اور بے شک ہم امتحان کرنے والے ہیں! ۲۸-۳۰

پھر ہم نے ان کے بعد دوسرے لوگ اٹھائے اور ان میں بھی ایک رسول انہی میں سے اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں تو کیا تم اس سے ڈرتے نہیں! اور اس کی قوم کے اعیان نے، جنھوں نے کفر کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا اور ان کو ہم نے دنیا کی زندگی میں رفاہیت دے رکھی تھی، کہا کہ یہ تو بس تمھارے ہی مانند ایک بشر ہے۔ وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی بات مان لی تو تم بڑے ہی گھاٹے میں رہو گے! کیا وہ تمھیں اس بات کا ڈراوا دیتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور خاک اور ہڈیاں بن جاؤ گے تو تم پھر نکالے جاؤ گے! بہت ہی بعید اور نہایت ہی مستبعد ہے یہ ڈراوا جو تمھیں سنایا جا رہا ہے!! زندگی تو بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، یہیں ہم مرتے اور جیتے ہیں، اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ یہ تو ایک ایسا شخص ہے جس نے خدا پر ایک جھوٹ گھڑا ہے اور ہم اس کو ہرگز ماننے والے نہیں۔ ۳۱-۳۸

اس نے دعا کی اے میرے رب! تو میری مدد فرما اس چیز سے جس میں انھوں نے مجھے جھٹلایا۔ ارشاد ہوا، بہت جلد وہ پشیمان ہو کر رہیں گے۔ تو ان کو ایک سخت ڈانٹ نے شدنی کے ساتھ آ دبوچا۔ تو ہم نے ان کو خس و خاشاک کر دیا۔ تو خدا کی پھٹکار ہو ایسے بدبختوں پر! ۳۹-۴۱

پھر ہم نے ان کے بعد دوسری قومیں اٹھائیں۔ نہ کوئی قوم اپنی اجلِ معیّن سے پہلے ہی کرتی اور نہ وہ اس سے پیچھے ہی ہٹتی ہے۔ پھر ہم نے اپنے رسول بھیجے مسلسل۔ جب جب آیا کسی قوم کے پاس اس کا رسول تو انھوں نے اس کو جھٹلایا تو ہم نے بھی ایک کے پیچھے دوسری کو لگا دیا اور ان کو افسانہ بنا دیا۔ تو خدا کی پھٹکار ہو ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے! ۴۲-۴۴

پھر ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ کو اپنی نشانیوں اور ایک واضح حجّت کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا تو انھوں نے تکبر کیا اور وہ نہایت مغرور لوگ تھے۔ انھوں نے کہا کیا ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں کی بات مان لیں درآنحالیکہ ان کی قوم ہماری غلامی کر رہی ہے! تو انھوں نے ان کو جھٹلا دیا اور وہ بالآخر ہلاک ہو کے رہے۔ اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عنایت کی تاکہ وہ راہ یاب ہوں۔ ۴۵-۴۹

اور ہم نے ابنِ مریم اور اس کی ماں کو ایک عظیم نشانی بنایا اور ان کو ایک سکون اور چشمے والے ٹیلہ پر پناہ دی! ۵۰

۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۲۳)

ایک حسین گریز — یہاں ایک نہایت ہی حسین و بلیغ تخلص ہے جس کو ہماری شاعری کی اصطلاح میں گریز کہتے ہیں۔ اوپر ربوبیت کے شواہد سے جزا و سزا پر جو استدلال کیا ہے وہ 'وَعَلَیْهَا وَعَلَی الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ' (اور تم ان چوپایوں اور کشتیوں پر سوار کیے جاتے ہو) پر ختم ہوا ہے۔ اب آگے جب تاریخی شواہد کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے

پہلے حضرت نوحؑ کے واقعہ کو لیا جو تاریخی تقدم کے اعتبار سے بھی رسولوں کی سرگزشت کا سرنامہ ہے اور خاص طور پر کشتی ہی کو ان کی اور ان کے ساتھیوں کی نجات کا اللہ تعالیٰ نے ذریعہ بنایا۔ کشتی کے ذکر کے بعد اس کشتی والے واقعہ کا ذکر اس طرح آگیا ہے گویا بات میں سے بات پیدا ہو گئی ہے۔

حضرت نوحؑ کی سرگزشت ایک خاص پہلو سے

تورات اور قرآن دونوں میں رسولوں کی تاریخ کا آغاز حضرت نوحؑ ہی سے ہوتا ہے۔ آپ کی سرگزشت کے مختلف پہلو پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں جس مقصد سے یہ سرگزشت بیان ہو رہی ہے وہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا اس دنیا کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق ہو بیٹھا ہے وہ خدا کو بالکل غلط سمجھے ہیں۔ خدا نے ہمیشہ اس کی مادی پرورش کا بھی انتظام فرمایا ہے اور اس کی روحانی و اخلاقی اصلاح کے لیے اپنے رسول بھی بھیجے۔ جن لوگوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی خدا نے اتمام حجت کے بعد، ان کو ہلاک کر دیا اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ان کو نجات و فلاح بخشی۔ اس دنیا کے ساتھ خدا کا یہ معاملہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بالآخر وہ ایک ایسا دن بھی لائے گا جس میں وہ نیکوکاروں اور بدکاروں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔

'اَفَلَا تَتَّقُوْنَ' کے بعد اس کا مفعول محذوف ہے۔ یعنی کیا تم لوگ خدا کے قہر و غضب سے ڈرتے نہیں کہ اس کی خدائی میں دوسروں کو شریک کر کے ان کی بندگی کرتے ہو۔ یہ تو کھلی ہوئی بغاوت ہے جس پر ہر لحظہ تم اس کے عذاب کے سزاوار ہو۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً ښ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۴)

قوم کے لیڈروں کی طرف سے حضرت نوحؑ کی مخالفت

'مَلَأُ' سے مراد، جیسا کہ ہم بقرہ ۲۴۶ کے تحت وضاحت کر چکے ہیں، قوم کے اعیان، سردار اور لیڈر ہیں۔ دعوتِ حق کی مخالفت میں پیش پیش ہمیشہ یہی ہوتے ہیں اس لیے کہ اپنے وقت کے نظامِ باطل کے سربراہ ہونے کے سبب سے رسول کی کامیابی میں وہ اپنی موت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ رسول کی دعوت سلیم الفطرت لوگوں پر اثرانداز ہو رہی ہے تو وہ اس کے اثر کو مٹانے کے لیے طرح طرح کی سخن سازیاں کرتے اور اپنے عوام کو اپنی مٹھی میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ اس کی نیت و صداقت پر حملہ کرتے ہیں کہ اس شخص کا یہ دعویٰ کہ یہ خدا کا فرستادہ ہے محض جھوٹ اور افترا ہے! یہ جھوٹ محض اس لیے اس نے گھڑا ہے کہ تمہارے اوپر اپنے خدائی فرستادہ ہونے کی دھونس جما کر تمہارا لیڈر بن جائے۔ 'يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ' کی بلاغت پر نگاہ رہے۔ یہ نہیں کہا کہ ہماری لیڈری چھیننا چاہتا ہے بلکہ یہ کہا کہ تم پر اپنی سیادت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس زہرآلود فقرے میں سادہ لوح عوام کو بھڑکانے کے لیے جو مواد موجود ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہے۔

مخالفت کے لیے بہانہ

'وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً' یہ رسول کی تکذیب کے لیے ان لال بجھکڑوں کی عقلی دلیل مذکور ہوئی ہے کہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے انھوں نے یہ بھی کہا کہ اول تو ہماری رہنمائی کے لیے کسی نبی اور

رسول کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم خود اپنی رہنمائی کے لیے کافی ہیں، اور اگر بالفرض خدا کسی کو نبی اور رسول بنا کر بھیجنے والا ہی ہوتا تو فرشتوں کو اس کام خاص کے لیے منتخب کرتا۔ آخر ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو نبی و رسول بنا کر بھیجنے کے کیا معنی!

'مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ'۔ یعنی مزید تم یہ ہے کہ یہ شخص جو کچھ پیش کرتا ہے تمام تر بدعت و ضلالت اور باپ دادا کے طریقہ کے بالکل خلاف ہے۔ ہم نے اس قسم کی باتیں اپنے اسلاف کی روایات میں کبھی نہیں سنیں۔ یہی مضمون اسی سورہ کی آیت ۶۸ میں یوں بیان ہوا ہے۔ 'اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ یَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِیْنَ' (کیا انھوں نے کلام پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس ایسی چیز آئی جو ان کے اگلے آباء و اجداد کے پاس نہیں آئی) سورۂ قصص میں ہے۔ 'مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ۔ ۳۶' (یہ محض ایک جادو ہے جس کو جھوٹ موٹ خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ اور اس طرح کی باتیں ہم نے اگلوں میں تو کبھی سنی نہیں) یہی مضمون دوسرے مقام میں اس طرح ہے۔ 'مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ (ص: ۷)

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰی حِیْنٍ (۲۵)

رسول پر خلل دماغ کا الزام: یعنی ان لیڈروں نے اپنے عوام کو یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ شخص جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے پاس خدا کی طرف سے کوئی فرشتہ وحی لے کر آتا ہے تو اس سے اس کے رعب میں نہ آؤ۔ یہ محض ایک قسم کا خلل دماغ ہے جس کے سبب سے اس کو ایک قسم کا وسوسہ لاحق ہوتا ہے جس کو یہ آسمانی وحی سمجھ بیٹھتا ہے۔ 'فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰی حِیْنٍ' یعنی اس شخص کی ان باتوں کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ مستقبل کے جس عذاب سے تم کو ڈرا رہا ہے اس سے کسی اندیشہ میں مبتلا نہ ہو۔ یہ سب اس کے وساوس ہیں۔ بہت جلد یہ ہوا میں اڑ جائیں گے۔ بالکل اسی قسم کی بات قریش کے لیڈروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہی جس کا حوالہ سورۂ طور میں دیا گیا ہے۔ 'اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ۔ ۳۰' (کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس کے لیے ہم گردش روزگار کے منتظر ہیں) قریش کا مطلب یہ تھا کہ کوئی ان کے ساحرانہ کلام سے مسحور ہو کر اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ ان کی باتوں کی کوئی بنیاد ہے اور اب مستقبل کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ محض شاعرانہ خیال آرائی اور چند روز کی گرماگرمی ہے۔ بہت جلد یہ ختم ہو جائے گی۔ جس طرح ہمارے بہت سے شاعر اپنی بولیاں بول کر اڑ گئے اسی طرح ایک دن یہ بھی اڑ جائیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ وقت کے لیڈر جب کسی شخص کے بارے میں یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ عوام اسے مستقبل کے بارے میں پیشین گوئیاں کرنے والے کی حیثیت سے قبول کر رہے ہیں تو اس سے وہ بہت اندیشہ ناک ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق وہ اپنے پیروؤں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کا یہ سارا طلسم چند روزہ ہے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ (۲۶)

وعدۂ عذاب کے ظہور کے لیے حضرت نوح کی دعا

یعنی جب معاملہ اس حد تک پہنچ گیا، حضرت نوحؑ نے یہ دعا کی کہ اے رب! اب تو میرے اور میری قوم کے درمیان فیصلہ فرما دے اور اس وعدۂ عذاب کو پورا کر کے میری مدد فرما جس سے میں نے ان کو شب و روز ڈرایا لیکن انھوں نے میری سنی ان سنی کر دی اور اس عذاب کے بارے میں مجھے جھٹلا دیا۔ حضرت نوحؑ کی اس دعا کا ذکر، تفصیل کے ساتھ سورۂ نوح میں آئے گا۔ یہاں اس دعا کے معاً بعد، آگے والی آیت میں، حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے اور عذاب سے بچنے کے لیے تیاریوں کی ہدایت ہوئی جو اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی یہ دعا اسی وعدۂ عذاب کے ظہور کے لیے تھی۔ آگے اسی سلسلہ میں دوسرے انبیاؑ کی زبانی بھی یہی دعا منقول ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۳۹۔ اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ہ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ (ارشاد ہوا کہ بہت جلد یہ اپنی کرتوت پر پچھتائیں گے تو خدا کی ڈانٹ نے ان کو آدبوچا) یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخالفین کی کشمکش میں آخری مرحلہ ہمیشہ یہی پیش آیا ہے کہ جس عذاب سے انھوں نے اپنی قوم کو ڈرایا قوم کے سرکشوں نے اسی عذاب کا مطالبہ کیا اور جب اللہ تعالیٰ کی سنتِ امہال کے تحت اس میں تاخیر ہوئی تو مکذبین نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ چونکہ تم وہ عذاب نہیں لا سکے جس کی دھمکی رات دن سنا رہے ہو اس وجہ سے تم بھی جھوٹے ہو اور یہ عذاب کی دھمکی بھی جھوٹی ہے۔ یہی مرحلہ ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام نے دعا فرمائی ہے کہ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ (اعراف: ۸۹) (اے ہمارے رب! اب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے) اسی مرحلہ میں حضرت نوحؑ نے بھی یہ دعا فرمائی ہے اور اس کا مطلب وہی ہے جو ہم نے اوپر واضح کیا۔ صاحب کشاف نے آیت کا یہ مطلب لیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں 'انصرنی بانجاز ما وعدتھم من العذاب وھو ما کذبوہ فیہ' یعنی اے رب تو اس وعدۂ عذاب کو پورا کر کے میری مدد فرما جس سے تو نے ان کو ڈرایا ہے۔ یہی چیز ہے جس کے بارے میں ان کی قوم کے لوگوں نے ان کو جھٹلایا۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (۲۷)

بعض اجمالات کی وضاحت

یہ آیت، بلکہ حضرت نوحؑ کی پوری سرگزشت سورۂ ہود میں گزر چکی ہے۔ اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارات پر کفایت کریں گے۔ کسی چیز کی تفصیل مطلوب ہو تو وہاں دیکھ لیجیے۔ 'بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا' یعنی یہ کشتی ہمارے اہتمام اور ہماری ہدایات کے مطابق بناؤ۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا نقشہ، اس کی جزئیات کی تفصیل کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ذریعہ سے حضرت نوحؑ کو بتایا تاکہ یہ اس عظیم مہم کے لیے بالکل موزوں ہو جو پیش نظر تھی۔ 'امر' سے مراد حکم عذاب ہے۔ 'فَارَ التَّنُّوْرُ' اسی طرح کا ایک محاورہ ہے جس طرح 'حمی الوطیس' وغیرہ محاورات ہیں۔ ان محاورات کا مفہوم متعین کرنے میں الفاظ کا لحاظ نہیں

بلکہ صرف اس مفہوم کا لحاظ ہوتا ہے جس کے لیے یہ استعمال ہوتے ہیں۔ 'فَارَ التَّنُّوْرُ' طوفان کے امڈ پڑنے اور جوش مارنے کی ایک تعبیر ہے۔ 'مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ' میں لفظ 'کل' جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں، مجموعہ جنس کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے۔ یعنی ان جانوروں میں سے جو براہِ راست انسان کی معاشی ضرورت سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ 'اثْنَيْنِ' 'زوجین' کی وضاحت کے طور پر ہے یعنی ہر چیز میں سے نر و مادہ بس دو دو رکھ لیے جائیں اس سے زیادہ رکھنے کی فکر نہ کی جائے۔ 'اَھْل' کی تشریح سورۂ انبیاء میں ہم کر چکے ہیں کہ اس میں آدمی کے اہل و عیال کے ساتھ اس کے اتباع و اصحاب بھی شامل ہوتے ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت نوحؑ پر ان کی قوم کے کچھ لوگ ایمان لائے، اگرچہ ان کی تعداد بہت قلیل تھی۔ 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے اتمامِ حجت کے بعد اب سنتِ الٰہی کے بموجب ہلاکت مقدر ہو چکی ہے۔ ان میں سب سے نمایاں، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، خود حضرت نوحؑ کا بیٹا تھا۔ فرمایا کہ یہ لوگ اس کشتی میں تمہارے ساتھ نہ ہوں گے۔ 'وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' میں 'ظَلَمُوْا' سے مراد 'ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ' ہے۔ یعنی جنہوں نے تمہاری تکذیب پر اصرار کر کے خود اپنی شامت کو دعوت دی۔ فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ جب قہرِ الٰہی کی موجیں ان ظالموں کو اپنے گھیرے میں لے لیں تو تمہارے اندر ان کے لیے رافت کا جذبہ ابھرے اور تم ہم سے ان کی نجات کی دعا کرنی شروع کر دو۔ عذاب آ جانے کے بعد یہ مرحلہ گزر جائے گا۔ پھر ان کے باب میں تمہاری بھی کوئی شنوائی نہیں ہونی ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک لازماً غرق ہو کے رہے گا۔ 'وَلَا تُخَاطِبْنِيْ الآیۃ' کا یہ پہلو خاص طور پر نگاہ میں رہے کہ جب عذابِ الٰہی آ دھمکتا ہے تو اس کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ ان کے اندر بھی معذبین کے لیے جذبۂ رافت ابھرنے کا امکان ہوتا ہے جن کی حمایت و نصرت ہی کے لیے وہ ظہور میں آتا ہے لیکن پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی دعا اور سفارش بھی کچھ کام نہیں آتی۔

فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ أَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ (۲۸-۲۹)

حضرت نوحؑ کی ہجرت اور ہجرت کے مناسب دعا

حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کا کشتی پر یہ سوار ہونا اپنی قوم سے اسی طرح کی ہجرت تھی جس طرح کی ہجرت دوسرے رسولوں کو کرنی پڑی اس وجہ سے ان کو ہجرت کے مناسب حال دعا تلقین کی گئی کہ سوار ہو چکنے کے بعد یہ دعا کرنا کہ اس اللہ کے لیے شکر ہے جس نے ظالموں سے ہمیں نجات دی اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کرنا کہ اے رب تو ہمیں جہاں اتارے خیر و برکت اور اپنے فضل و رحمت کے ساتھ اتار۔ تو بہترین اتارنے والا ہے۔ ہجرت کے وقت اسی مضمون کی دعائیں دوسرے انبیاؑ سے بھی منقول ہیں۔ ہمارے حضورؐ نے بھی ہجرت کے وقت اسی طرح کی دعا فرمائی تھی۔ 'رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا'۔ یہ دعا چونکہ اللہ تعالیٰ کی سکھائی ہوئی ہے اس وجہ سے دعا کے پیرایہ میں یہ مستقبل

کی فوز و فلاح کی بشارت بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمہارے رب نے تمھیں ناپاکوں اور ناہنجاروں کے ماحول سے نجات دی، اب وہ تمھیں بہترین میزبان کی طرح اتارے گا اور جہاں اتارے گا اس سرزمین کو تمہارے لیے مبارک بنائے گا، تم پھولو پھلو گے اور انہی چند افراد اور تھوڑے سے وسائل معاش سے یہ دنیا پھر آباد و معمور ہوگی۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ وَّاِنْ کُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ (۳۰)

سرگزشت کے اصل مدعا کی طرف اشارہ

یہ اس اصل مدعا کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سرگزشت کے اندر غور کرنے والوں کے لیے بہت سے حقائق ہیں۔ سب سے واضح حقیقت تو اس سے یہ سامنے آتی ہے کہ خدا اس دنیا کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ اس نے خلق کی اصلاح و ہدایت کے لیے اپنے رسول بھیجے۔ دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جو لوگ رسول کی مخالفت اور اس کی تکذیب کے درپے ہوتے ہیں ایک حدِ خاص تک اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتا ہے لیکن بالآخر خدا ان کو پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو پھر کوئی ان کو چھڑا نہیں سکتا۔ تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں فوز و فلاح رسول اور اس کے ساتھیوں کو حاصل ہوتی ہے۔ البتہ اس فوز و فلاح سے پہلے انھیں آزمائش کے ایک دور سے گزرنا پڑتا ہے۔ 'وَاِنْ کُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ' سے اسی سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ چوتھی حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جس طرح رسولوں کی دعوت ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اسی طرح ان کے مخالفین کی مخالفت کا انداز بھی ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے اس وجہ سے ہر رسول کی زندگی دوسرے رسولوں کے لیے اور ہر امت کی سرگزشت دوسری امت کے لیے ایک مستقل درس ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ (۳۱)

عاد اور ثمود کی طرف اشارہ

'قرن' جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، صدی کے مفہوم میں بھی آتا ہے اور اس سے ایک دور کے لوگ اور قوم و امت بھی مراد ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قوم نوح کو تباہ کر دینے کے بعد نوحؑ اور ان کی کشتی کے ساتھیوں کی نسل سے ہم نے دوسری قومیں اٹھائیں۔ یہ اشارہ عاد و ثمود کی طرف ہے۔ سورۂ اعراف میں قوم نوحؑ کے جانشین کی حیثیت سے قوم عاد کا اور عاد کے خلفاء کی حیثیت سے ثمود کا ذکر ہوا ہے۔

فَاَرْسَلْنَا فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۳۲)

حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کی طرف اشارہ

یہ ان رسولوں کی طرف اشارہ ہے جو عاد و ثمود کی طرف بھیجے گئے۔ یعنی حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کی طرف جن کی سرگزشتیں سورۂ ہود اور سورۂ اعراف میں گزر چکی ہیں۔ 'اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ' میں 'اَنْ' سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ یعنی اس پیغام کے ساتھ ان کو بھیجا کہ لوگو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ یہ دعوت بعینہٖ وہی دعوت ہے جو حضرت نوحؑ نے دی اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

'رَسُوْلًا مِّنْهُمْ' یعنی یہ رسول بھی انہی قوموں کے اندر کے فرد تھے۔ کوئی فرشتے یا جن نہیں تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا

بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ہر قوم کی طرف رسول انہی میں سے بھیجا۔ اس احسان کے مختلف پہلوؤں کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ (۳۳)

متکبرین کے استکبار کی علت

'مَلَأ' کی وضاحت آیت ۲۴ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں ان متکبرین کی بعض ایسی صفات بیان ہوئی ہیں جن سے ان کے طغیان اور رعونت کے اصل سبب پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت اور آخرت میں خدا کے آگے پیشی کے منکر و مکذب تھے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ان کو دنیا میں جو رفاہیت و خوش حالی حاصل ہوئی ان کے لیے فتنہ بن گئی۔ انھوں نے سمجھا کہ ان کی یہ دنیاوی کامیابیاں ان کے عمل اور عقیدہ کی صحت کی دلیل ہیں، آخرت اول تو ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو جو کچھ ان کو یہاں حاصل ہے کوئی وجہ نہیں کہ وہ آخرت میں اس سے محروم ہو جائیں۔ اس دولت و رفاہیت کے سبب سے وہ اپنے اوپر کسی کی برتری تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے، اور وہ بھی ایک ایسے شخص کی برتری جس کو ان کی طرح مال و جاہ حاصل نہیں تھا! اپنے اس غرور پر انھوں نے یوں پردہ ڈالنے کی کوشش کی کہ اگر خدا کسی کو ہماری رہنمائی کے لیے بھیجنے والا ہی ہوتا تو کسی مافوق بشر ہستی کو بھیجتا۔ ہمارے ہی جیسے ایک بشر کو رسول بنانے کے کیا معنی!

وَلَئِنْ أَطَعْتُم بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ (۳۴)

عوام کو بھڑکانے کے لیے جذباتی حربہ

یہ اپنے عوام کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے انھوں نے ایک جذباتی حربہ استعمال کیا کہ اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کو، خدا کا رسول مان کر، اس کا قلادۂ اطاعت اپنی گردن میں ڈال لیا تو دین اور دنیا دونوں اعتبار سے اپنی لٹیا ڈبو دو گے۔ معلوم نہیں یہ شخص تمھیں کس کھڈ میں گرائے اور کہاں لے جا کے مارے کہ وہاں تم پانی بھی نہ پاؤ! مطلب یہ ہے کہ اس قسم کا کوئی مہلک قدم اٹھانے سے پہلے خوب سوچ لو۔ ہم تمھیں نیک و بد اچھی طرح سمجھائے دیتے ہیں!

أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُم مُّخْرَجُونَ ○ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ (۳۵-۳۶)

'ہیہات' کا موقع استعمال اور مفہوم

'وَعَدَ يَعِدُ' یہاں ڈرانے کے معنی میں ہے جس طرح 'اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ' میں ہے یعنی شیطان تمھیں غریبی سے ڈراتا ہے۔ 'ہیہات' اسم فعل ہے۔ یہ عربی میں مختلف شکلوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس موقع پر بولا جاتا ہے جب کسی چیز کو نہایت مستبعد اور بعید از امکان ظاہر کرنا ہو۔ تکرار کی صورت میں اس کے اندر تاکید اور شدت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ استفہام یہاں استنکار کے مفہوم میں ہے۔

یعنی وہ بہت تعجب اور حیرت سے کہتے ہیں کہ کیا یہ شخص تمھیں اس بات سے ڈراتا ہے کہ جب تم مر کر اور سڑ گل کر مٹی اور ہڈی بن جاؤ گے تو از سر نو زندہ کر کے قبروں سے نکالے جاؤ گے! یہ ڈراوا جو تمھیں سنایا جا رہا ہے یہ نہایت ہی مستبعد اور نہایت ہی بعید از امکان ہے! مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی اس طرح کی خیالی باتوں سے

مرعوب ہوکر کہیں اس کے جال میں نہ پھنس جانا۔

إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ (۳۷)

منکرین قیامت کی خود باختگی

یعنی زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں ہم مرتے ہیں اور یہیں جیتے ہیں۔ مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ پہلے مکذبین قیامت ہوں یا پچھلے دونوں ہی نے قیامت کا انکار کسی دلیل کی بنیاد پر نہیں بلکہ مجرد اس کے استبعاد کی بنا پر کیا ہے۔ درآنحالیکہ اس سے ہزاروں لاکھوں درجہ مستبعد چیزیں ہروقت اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور ان کو مانتے ہیں۔ قرآن نے لوگوں کی اسی خود باختگی پر جگہ جگہ اظہار تعجب کیا ہے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ (۳۸)

اوپر کی باتیں تو ان دانشوروں نے اپنے عوام کو برگشتہ و مشتعل کرنے کے لیے کہیں اور پھر اپنی دانش و بینش کا اظہار ان لفظوں میں کیا کہ اگر کوئی اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اس شخص کو رسول باور کرتا ہے تو کرے، ہمارے نزدیک تو اس نے خدا پر یہ جھوٹ گھڑا ہے کہ خدا نے اس کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اس وجہ سے ہم تو اس کے اس دعوے کو ہرگز باور کرنے والے نہیں ہیں۔

قَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ (۳۹)

یہ آیت اوپر گزر چکی ہے اور وہاں اس کی پوری تشریح ہو چکی ہے۔

قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نَادِمِينَ (۴۰)

پیغمبر کی مذکورہ دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اطمینان دلایا کہ اب وعدۂ الٰہی کے ظہور میں زیادہ دیر نہیں ہے اپنی اس رعونت پر یہ لوگ بہت جلد پچھتائیں گے۔

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (۴۱)

'صَيْحَةٌ' کا مفہوم

'صَيْحَةٌ' کے معنی ڈانٹ کے ہیں اور قرآن میں یہ عذاب الٰہی کی تعبیر کے لیے جگہ جگہ استعمال ہوا ہے، خواہ وہ عذاب کسی شکل میں ظاہر ہوا ہو۔ اس کو سخت آواز کے عذاب کے ساتھ مخصوص کر دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

'حق' کا مفہوم

'حق' سے مراد یہاں وہ وعدۂ حق ہے جو تکذیب کی صورت میں بشکل عذاب لازماً ظاہر ہونے والا تھا اور جس کی پیغمبر نے ان کو خبر دے دی تھی۔

'غثاء' کا مفہوم

لفظ 'غثاء' قرآن مجید اور کلام عرب دونوں میں دو مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ انشاء اللہ سورۂ اعلیٰ کی تفسیر میں ہم اس پر مفصل بحث کریں گے۔ یہاں یہ پامال شدہ خس و خاشاک کے مفہوم میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی اس دعا کے بعد ان پر خدا کا عذاب اس امر واقعی کے ساتھ آدھمکا جس کو لوگ محض خالی ڈھول دھمکی سمجھ رہے تھے اور ہم نے ان کو بالکل خس و خاشاک بنا کر رکھ دیا۔

'فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ'۔ لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے۔ یعنی ایسے ناہنجاروں پر خدا کی پھٹکار ہو! یہ اس

عذاب کی معنوی تعبیر ہے۔ عذاب الٰہی درحقیقت خدا کی لعنت ہوتا ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ (۴۲)

بعد کے انبیاء کی طرف اشارہ

اوپر والی آیت ۳۱ میں لفظ 'قرن' آیا ہے، اور یہاں 'قرون' جمع ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے بعد بالتدریج حضرت نوحؑ کی نسل سے متعدد قومیں اٹھیں اور ان میں سے ہر ایک کی ہدایت و اصلاح کے لیے خدا نے اپنے رسول بھیجے۔ اگرچہ ان تمام رسولوں کے نام نہ تورات میں مذکور ہیں، نہ قرآن میں لیکن قرآن اور تورات دونوں میں یہ اشارہ موجود ہے کہ خدا نے تمام قوموں میں اپنے رسول بھیجے۔ قرآن میں تو یہ بات نہایت واضح الفاظ میں فرمائی گئی ہے لیکن یہود چونکہ اپنے مخصوص خاندان کے انبیاء کے سوا دوسرے انبیاء کی تاریخ گم کرنے کے درپے ہمیشہ رہے ہیں اس وجہ سے تورات میں اس بات کا ذکر واضح الفاظ میں نہیں ہے۔ تاہم اشارات اس میں بھی موجود ہیں۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (۴۳)

قوموں کی اجل معین کا اندازہ اور قریش کو تنبیہ

میرے نزدیک یہاں، عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق، مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے اور اوپر کی آیت اور اس آیت کے درمیان، وضاحتِ قرینہ کی بنا پر، خلا بھی ہے۔ اگر محذوف کو کھول دیجیے اور خلا کو بھر دیجیے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ان قوموں کی طرف ہم نے اپنے رسول بھیجے لیکن انھوں نے ان کی تکذیب کی جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ ہر قوم اپنی مہلت پوری کر چکنے کے بعد اپنے کیفرِ کردار کو پہنچی۔ نہ کسی قوم پر اس کی اجل معین پوری ہونے سے پہلے عذاب آیا اور نہ کسی قوم کو، اجل معین پوری ہو جانے کے بعد ایک منٹ کی مہلت ملی۔ قوموں کی ہلاکت کی 'اجل' سے متعلق ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اجل قوموں کے اخلاقی زوال کے پیمانہ سے ناپ کر مقرر کی ہے اور یہ خدا ہی جانتا ہے کہ کب کوئی قوم اپنے اخلاقی زوال کی اس حد کو پہنچی کہ اب اس کے وجود سے خدا کی زمین کو پاک ہو جانا چاہیے۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اپنے رسول سے عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ جب تمہارا پیمانہ بھر جائے گا تو تم بھی فنا کر دیے جاؤ گے۔ نہ تمہارے جلدی مچانے سے خدا وقت سے پہلے تم پر عذاب بھیجے گا اور نہ وقت پورا ہو جانے کے بعد ایک سیکنڈ کی مہلت دے گا۔ قوموں کے باب میں سنتِ الٰہی یہی رہی ہے، اسی سنت کے مطابق تمہارے ساتھ بھی معاملہ ہوگا۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۴۴)

'تترا' کا مفہوم

'تترٰی' کی اصل 'وترٰی' ہے۔ عربی کے معروف قاعدے کے مطابق 'و' 'ت' سے بدل گئی ہے۔ 'جاء القوم تترٰی' کے معنی ہوں گے لوگ تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے آئے۔

قوموں کی تعداد کے اضافہ کے ساتھ ان کی اصلاح کے اہتمام میں اضافہ

بالتدریج قوموں کی تعداد میں جتنا ہی اضافہ ہوتا گیا اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت و اصلاح کے اہتمام و انتظام میں بھی اسی رفتار سے اضافہ فرمایا۔ یہاں تک کہ ایک ہی دور میں الگ الگ قوموں میں الگ الگ رسول بھی آئے۔ اگرچہ

تاریخوں میں تفصیل نہیں ملتی لیکن حضرت ابراہیمؑ و حضرت لوطؑ کا ایک زمانے میں ہونا تو قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور حضرت شعیبؑ ایک ہی دور کے رسول ہیں۔ یہ اہتمام اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ خدا اپنی خلق کی اصلاح سے کبھی بے پروا نہیں رہا ہے۔ لیکن جس قوم کے پاس بھی اس کا رسول آیا اس نے اس کی تکذیب کی جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ یکے بعد دیگرے ہر قوم کو خدا نے ہلاکت کے اسی گڑھے میں جھونک دیا جس میں اس کی پیشرو قوم کو پھینکا۔ 'وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ' یعنی پھر یہ ہوا کہ جن کو اپنے کروفر، اپنی قوت و شوکت اور اپنے عروج و اقبال پر بڑا ناز و فخر تھا وہ ماضی کی ایک داستانِ پارینہ بن کے رہ گئے۔ 'فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ'۔ یہ جیسا کہ آیت ۴۱ میں گزر چکا ہے، لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے اور اس جملہ کے موقع و محل سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ باوجودیکہ ان قوموں کی تاریخ بہت پرانی ہو چکی ہے لیکن ان کے عدم ایمان پر خدا کا جو غضب ہے وہ بدستور باقی ہے اور آج بھی ان کے ذکر کے ساتھ خدا ان پر لعنت کرتا ہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۴۵)

آیات اور سلطانِ مبین سے مراد

حضرت نوحؑ کے بعد کے تمام رسولوں کی طرف اجمالی اشارہ کرنے کے بعد یہ ان رسولوں کا ذکر ہے جن کی مفصل سرگزشت تورات و انجیل کے صحیفوں میں موجود ہے۔ فرمایا کہ ہم نے اپنی نشانیوں اور ایک حجت قاطعہ کے ساتھ موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ کو فرعون اور اس کے اعیان کے پاس رسول بنا کر بھیجا۔

'آیات' سے مراد میرے نزدیک وہ عام معجزات ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں فرعونیوں کے انذار کے لیے ظاہر ہوئے۔ ان کی تفصیل تورات میں بھی موجود ہے اور ہم نے اپنی اس کتاب میں بھی ان کے حوالے دیے ہیں۔ 'سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ' سے میرے نزدیک عصا کا معجزہ مراد ہے۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ اس معجزے کو درحقیقت ایک برہان اور حجتِ قاطع کی حیثیت حاصل تھی اس وجہ سے اس کو 'سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ' سے تعبیر فرمایا۔ اسی معجزے کے ذریعہ سے فرعون اور اس کے درباریوں نے اپنی قوم اور اپنے تمام ماہر جادوگروں کے سامنے نہایت رسواکن شکست کھائی۔ قرآن میں بعض جگہ اس کو 'بَيِّنَة' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی نہایت واضح حجت۔ لفظ 'سلطان' سورۂ رحمان کی آیت 'لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ' میں توقیع الٰہی اور سندِ خداوندی کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اس اعتبار سے بھی معجزۂ عصا کے لیے یہ لفظ نہایت موزوں ہے اس لیے کہ اس کی حیثیت حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں فی الواقع ایک خدائی سند ہی کی تھی۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۚ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۚ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ (۴۶-۴۸)

فرعونیوں کے قومی مزاج کی خصوصیت

یعنی انھوں نے بھی وہی استکبار کی روش اختیار کی جو ہمیشہ سے انبیاء کے مکذبین کی رہی ہے۔ 'وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ'۔ ان کے قومی مزاج کی خصوصیت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ استکبار ان کے کسی وقتی ہیجان و اشتعال کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ تھے ہی نہایت سرکش اور متمرد لوگ۔ فرعونیوں کے اسی مزاج کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا تو فرمایا کہ اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی (طٰہٰ: ۲۴) (فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت سرکش ہوگیا ہے) اور یہ بات بھی ہم اس کے محل میں ذکر کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مرحلہ میں حضرت موسیٰؑ کو عصا کا معجزہ جو عطا فرمایا تو اسی لیے عطا فرمایا کہ ان کا مقابلہ سخت سرکشوں سے تھا۔ ان سرکشوں کی سرکوبی کے لیے حضرت موسیٰؑ کا مسلح ہونا ضروری تھا۔ 'فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ' یہ ان کے استکبار کی وضاحت ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو حق سے بالاتر سمجھا اور کہا کہ ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں کی بات باور کر کے اپنے اوپر ان کی بالاتری کس طرح تسلیم کریں بالخصوص جب کہ ان کی قوم ہماری غلامی و تابعداری کر رہی ہے! 'فَكَذَّبُوۡهُمَا فَكَانُوۡا مِنَ الۡمُهۡلَكِيۡنَ' نتیجہ یہ نکلا کہ اس غرّے میں مبتلا ہو کر انھوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلا دیا اور اسی کھڈ میں جا گرے جس میں ان سے پہلے ان کے بہت سے ہم مشرب گر کے تباہ ہو چکے تھے۔

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ لَعَلَّهُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ (۴۹)

حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم پر انعام

فرعون اور فرعونیوں کی سرکوبی کے بعد یہ وہ انعام ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم پر فرمایا کہ فرعون اور اس کے درباری تو اس غرّے میں مبتلا رہے کہ بھلا وہ ایک ایسے شخص کی بات کس طرح مانیں جو ایک ایسی قوم کا فرد ہے جو ان کی غلامی کر رہی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی شخص اور اس کی قوم کو اپنی کتاب سے سرفراز فرمایا کہ وہ زندگی کے مراحل میں اس سے رہنمائی حاصل کریں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'الکتاب' سے یہاں تورات کے سوا کسی اور چیز کو مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور تورات کے متعلق معلوم ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کو مصر سے ہجرت کے بعد عطا ہوئی ہے۔ 'يَهۡتَدُوۡنَ' جمع کا صیغہ قوم کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے جس کا ذکر فرعونیوں کے قول 'وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ' میں گزر چکا ہے۔

وَجَعَلۡنَا ابۡنَ مَرۡيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّاٰوَيۡنٰهُمَاۤ اِلٰی رَبۡوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيۡنٍ (۵۰)

ذات قرار و معین کا مفہوم

'ربوۃ' مرتفع اور ہموار زمین کو کہتے ہیں۔ 'ذات قرار' کے معنی پرسکون اور 'معین' کے معنی چشمہ کے ہیں۔

حضرت مریم اور حضرت مسیح کی سرگزشت کی طرف اجمالی اشارہ

یہ سیدنا مسیحؑ کے وقت ولادت کی طرف اشارہ ہے۔ جب حضرت مریمؑ کو ایک الگ تھلگ جگہ ایک درخت کے نیچے جا بیٹھنے کی غیبی ہدایت ہوئی۔ یہ جگہ مرتفع اور پرسکون تھی۔ یہاں کھجور کا ایک مثمر درخت بھی تھا اور اس کے نیچے ایک صاف و شفاف شیریں چشمہ بھی۔ اپنی زندگی کے اس نازک مرحلہ میں حضرت مریمؑ ایک پرسکون گوشۂ تنہائی کی سخت محتاج تھیں تاکہ زبانِ خلق کے طعنوں اور کچوکوں سے محفوظ رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے فضل و رحمت سے ان کے لیے ایک پرامن گوشۂ راحت مہیا فرما دیا۔ یہ ساری تفصیل سورۂ مریم میں گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے اس 'ربوۃ' کے محل و مقام کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور اس واقعہ کے ایک عظیم نشانی ہونے کی بھی وضاحت کی ہے۔ چونکہ یہ تفصیلات پچھلی سورتوں میں گزر چکی تھیں اس وجہ سے قرآن نے یہاں صرف اشارہ کر دیا ہے۔

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

۷۔ آگے کا مضمون ـــــــ آیات ۵۱-۶۷

آگے یہ واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام رسولوں کو ایک ہی دین دیا لیکن ان کی امتوں نے اس دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور اب جس کے پاس جو کچھ ہے اسی میں مگن ہے، اس کے خلاف کچھ سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ ان کو کچھ دن اور موقع دو۔ یہ اپنی دنیوی کامیابیوں پر خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ بڑے تیر مار رہے ہیں حالانکہ یہ صرف اپنی تباہی کے سامان کر رہے ہیں لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہے۔ اصلی فتوحات دراصل وہ لوگ حاصل کر رہے ہیں جو آج خدا سے ڈرتے اور اس کی آیات پر ایمان لا رہے ہیں۔ بے شک یہ بازی جیتنے والے لوگ ہیں۔ رہے یہ بر خود غلط لوگ تو جلد وہ دن آنے والا ہے جب یہ اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے لیکن کسی طرف سے ان کی کچھ شنوائی نہ ہوگی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۵۱-۶۷ يَٰٓأَيُّهَا ٱلرُّسُلُ كُلُوا۟ مِنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَٱعْمَلُوا۟ صَٰلِحًا ۖ إِنِّى بِمَا تَعْمَلُونَ
عَلِيمٌ ﴿٥١﴾ وَإِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱتَّقُونِ ﴿٥٢﴾
فَتَقَطَّعُوٓا۟ أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۖ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿٥٣﴾
فَذَرْهُمْ فِى غَمْرَتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٥٤﴾ أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِۦ
مِن مَّالٍ وَبَنِينَ ﴿٥٥﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِى ٱلْخَيْرَٰتِ ۚ بَل لَّا يَشْعُرُونَ ﴿٥٦﴾
إِنَّ ٱلَّذِينَ هُم مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴿٥٧﴾ وَٱلَّذِينَ هُم بِـَٔايَٰتِ
رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٨﴾ وَٱلَّذِينَ هُم بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ﴿٥٩﴾ وَٱلَّذِينَ
يُؤْتُونَ مَآ ءَاتَوا۟ وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَٰجِعُونَ ﴿٦٠﴾
أُو۟لَٰٓئِكَ يُسَٰرِعُونَ فِى ٱلْخَيْرَٰتِ وَهُمْ لَهَا سَٰبِقُونَ ﴿٦١﴾ وَلَا نُكَلِّفُ
نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَلَدَيْنَا كِتَٰبٌ يَنطِقُ بِٱلْحَقِّ ۚ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٦٢﴾
بَلْ قُلُوبُهُمْ فِى غَمْرَةٍ مِّنْ هَٰذَا وَلَهُمْ أَعْمَٰلٌ مِّن دُونِ ذَٰلِكَ
هُمْ لَهَا عَٰمِلُونَ ﴿٦٣﴾ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَخَذْنَا مُتْرَفِيهِم بِٱلْعَذَابِ إِذَا

هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿٦٤﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَدْ
كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿٦٦﴾
مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

ترجمۂ آیات ۵۱ - ۶۷

اے رسولو، پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ جو کچھ تم کرو گے میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اور یہ تمھاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمھارا رب ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو۔ ۵۱ - ۵۲

پس امتوں نے اپنے دین کو اپنے درمیان ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اب ہر گروہ اسی میں مگن ہے جو اس کے پاس ہے تو ان کو ان کی سرمستی میں کچھ دن چھوڑ دو۔ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو ان کے مال و اولاد میں اضافہ کر رہے ہیں تو ان کے لیے بھلائی میں اضافہ کر رہے ہیں! بلکہ ان کو اصل حقیقت کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔ ۵۳ - ۵۶

بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کی خشیت سے ہر وقت ترساں ہیں۔ اور وہ لوگ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ اور وہ لوگ جو دیتے ہیں تو جو کچھ دیتے ہیں اس طرح دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرتے رہتے ہوتے ہیں کہ انھیں خدا کی طرف پلٹنا ہے ـــــ یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور وہ ان کو پا کر رہیں گے ـــــ اور ہم کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے اور ہمارے پاس ایک رجسٹر ہے جو بالکل ٹھیک ٹھیک بتا دے گا اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہو گی۔ ۵۷ - ۶۲

بلکہ ان لوگوں کے دل اس چیز سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کے کچھ اور مشاغل

ان کے ماسوا ہیں، یہ انہی میں پڑے رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب ہم ان کے مترفین کو عذاب میں پکڑیں گے تو وہ آہ و فریاد کریں گے۔ اب آہ و فریاد نہ کرو، اب ہماری طرف سے تمہاری کوئی مدد نہیں ہوگی! جب ہماری آیتیں تم کو سنائی جاتی تھیں تو تم پیٹھ پیچھے بھاگتے تھے، گھمنڈ کرتے ہوئے گویا کسی افسانہ گو کو چھوڑ رہے ہو! ۶۲-۶۷

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (۵۱)

تمام رسولوں کو مشترک ہدایت

یہ اس ہدایت کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کو دی کہ اللہ کی بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جو کچھ تم کرو گے میں اس سے اچھی طرح باخبر ہوں۔ مطلب اس بات کا حوالہ دینے سے یہ ہے کہ اللہ نے تو اپنے رسولوں کو یہ ہدایت دی، اسی پر انھوں نے عمل کیا اور اسی کی اپنی اپنی امتوں کو دعوت دی لیکن ان کی امتوں نے خود اپنے جی سے، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت طیبات کو حرام اور خبائث کو حلال ٹھہرایا اور اپنے رسولوں کی بتائی ہوئی شاہراہ چھوڑ کر بدعملی اور کفر و فسق کی راہ اختیار کی۔

'اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ' میں تہدید و تسلی دونوں ہے۔ یعنی اگر تم نیک عمل کرو گے تو وہ بھی میرے علم میں رہے گا اور میں اس کا پورا پورا صلہ دوں گا اور اگر برائی کا ارتکاب کرو گے تو وہ بھی میرے علم میں رہے گی اور میں اس کی سزا بھی دے کر رہوں گا۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۔ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۵۲-۵۳)

تمام انبیاء کی مشترک دعوت کے برخلاف ان کی امتوں کا رویہ

ان تمام انبیاء کی دعوت ایک ہی رہی ہے اور یہ سب ایک ہی امت ہیں۔ یہ ایک ہی دین لے کے آئے اور لوگوں کو ایک ہی امت بنانے کی کوشش کی اور میں ہی سب کا رب ہوں۔ یعنی اصل حقیقت تو یہ ہے لیکن امتوں نے اپنی باہمی ضد م ضدا سے اپنے واحد دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اب حال یہ ہے کہ جو کچھ جس کے پاس ہے وہ اسی میں مگن ہے بعینہٖ یہی بات تمام انبیاء کی دعوت کا حوالہ دینے کے بعد سورۂ انبیاء میں یوں فرمائی گئی ہے۔ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ڮ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۔ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۔۔۔۔ (یہ سب تمہاری ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمہارا رب ہوں تو میری ہی بندگی کرو اور انھوں نے اپنے درمیان اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا)

یہی مضمون اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَـ
بَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ
مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ
بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا
اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا
الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ
الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۲۱۳)

لوگ ایک ہی امت بنائے گئے (تو لوگوں نے اس میں اختلاف کیا) تو اللہ نے نبیوں کو خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ قول فیصل کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دے جس میں انھوں نے اختلاف کیا اور اس میں اختلاف انہی لوگوں نے کیا جن کو وہ چیز دی گئی تھی، کھلی ہوئی تنبیہات کے آجانے کے باوجود محض آپس کی ضدم ضدا کے باعث۔

انبیاء اور ان کی امتوں کے باب میں قرآن کا موقف

یہاں نبیوں اور امتوں کے باب میں قرآن کے موقف کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔ اگرچہ اس کی وضاحت سورۂ بقرہ اور سورۂ انبیاء کی تفسیر میں ہو چکی ہے لیکن اس کو اچھی طرح نہ سمجھنے کے باعث لوگ شدید غلط فہمیوں میں مبتلا ہوئے ہیں اس وجہ سے ہم اصل حقیقت پھر واضح کیے دیتے ہیں۔

قرآن اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ دنیا میں خدا کے جو نبی اور رسول آئے وہ الگ الگ دینوں کی دعوت لے کر آئے اور انھوں نے الگ الگ امتوں کی بنا ڈالی بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی نے ایک ہی امت — امت مسلمہ — کے قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ جب قوموں نے اس دین میں بگاڑ پیدا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس بگاڑ کی اصلاح کے لیے دوسرے نبی اور رسول بھیجے۔ ان نبیوں اور رسولوں نے اصل دین سے الگ کوئی چیز نہیں پیش کی بلکہ صرف اصل دین کو قائم کرنے پر اپنا سارا زور صرف کیا اور اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت متقضی ہوئی تو انھوں نے اسی دین کے مزید متقضیات نمایاں کیے۔ قرآن اسی مبارک سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ اس نے اصل دین کو، جس کی دعوت آدمؑ و نوحؑ سے لے کر حضرت مسیحؑ تک ہر نبی نے دی، بالکل نکھار کر، اس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا ہے اور اس کے جو پہلو ابھی تشنۂ تکمیل تھے اور جن کی تکمیل کا کام، سابق انبیاء کی پیشینگوئیوں کے مطابق آخری بعثت پر اٹھا رکھا گیا تھا، ان کی اس نے تکمیل کر دی۔ اپنی اس حقیقت کے اعتبار سے تمام ملتوں اور قوموں کا اصل دین یہی ہے۔ لیکن قوموں نے اپنی تنگ نظری اور تعصب کے سبب سے اس کی مخالفت کی اور اب جس کے پاس جو کچھ ہے، خواہ وہ کتنا ہی محرف اور ناتمام ہو، وہ اسی پر اڑا ہوا اور اسی میں مگن ہے — یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کے طور پر فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ ایسے شامت زدہ ہیں کہ وہ اپنے ہی کھوئے ہوئے خزانے سے بہرہ مند نہیں ہونا چاہتے ان کا غم تم کہاں تک کھاؤ گے!

فَذَرْهُمْ فِیْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰی حِیْنٍ (۵۴)

'غَمْرَةٌ' سے مراد یہاں غفلت کی سرمستی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ جب تم نے

ان کو ان کا جھنجھوڑا لیکن یہ کروٹ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو اب ان کو ان کے حال پر چھوڑو، یہ خود بہت جلد اپنی اس سرمستی کا انجام دیکھ لیں گے۔ 'حَتّٰی حِیْنٍ' سے مراد مہلت کی وہ مدت ہے جو ان کے لیے مقرر تھی اور جس کے ختم ہونے کا وقت اب قریب آ لگا تھا۔

اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِیْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِی الْخَیْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا یَشْعُرُوْنَ (۵۵-۵۶)

سرگشتگان دنیا کو تنبیہ

'مَالٍ وَّ بَنِیْنَ' دنیاوی رفاہیت کی ایک جامع تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سرمستوں کی سرمستی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کو دنیا کی جو خوشحالیاں دے رکھی ہیں ان کی تھپکیاں ان کو جاگنے نہیں دے رہی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ عیش جو ان کو حاصل ہے، ان کی زندگی کے کامیاب ہونے کی دلیل ہے اور ان کامیابیوں اور فتوحات میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہے گا اس وجہ سے کسی ڈرانے والے کے ڈراووں سے ڈر کر انہیں اپنا عیش مکدر نہیں کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ اگر وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں تو بہت غلط سمجھے ہیں۔ یہ جن چیزوں کو کامیابیاں تصور کیے ہوئے ہیں یہ کامیابیاں نہیں ہیں بلکہ یہ قدرت کے استدراج کا پھندا ہے جس میں پھنس جانے کے بعد وہ کبھی اس سے چھوٹ نہیں سکیں گے لیکن وہ اپنی بلادت کے سبب سے اس حقیقت کا احساس نہیں کر رہے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ خَشْیَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِکُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰی رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝ (۵۷-۶۱)

بازی جیتنے والوں کی صفات

یہاں سورہ کی ابتدائی دس آیات پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ وہاں جن اہل ایمان کو فوز و فلاح کی بشارت دی ہے۔ انہی کا ذکر ذرا مختلف الفاظ میں پھر فرمایا کہ البتہ یہ لوگ، جن کی صفات یہ یہ ہیں، حقیقی کامیابیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور بے شک یہ لوگ اپنی منزل مقصود کو پہنچ کے رہیں گے۔ ان لوگوں کی مندرجہ ذیل صفات یہاں گنائی ہیں اور یہ صفات ان مسلمانوں کی ہیں جو اس دور میں دنیا کی تمام مرغوبات سے منہ موڑ کر رضائے الٰہی کی طلب کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی خشیت سے ہر وقت لرزاں و ترساں ہیں۔ اس کی شہادت ان کی نمازوں سے ملتی ہے۔ چنانچہ اوپر فرمایا ہے۔ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ۔

دوسری صفت یہ ہے کہ 'هُمْ بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ' یہ متکبرین کی طرح خدا کی آیات کا مذاق نہیں اڑاتے بلکہ جب اللہ کا رسول ان کو یہ آیات سناتا ہے تو وہ ان پر آمنّا و صدّقنا کہتے ہیں۔

تیسری صفت یہ ہے کہ 'هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِکُوْنَ' ان کا سارا اعتماد اپنے رب پر ہے وہ کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراتے۔

چوتھی صفت یہ ہے کہ 'یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰی رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ' وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں نمائش اور فخر کے لیے نہیں خرچ کرتے بلکہ خدا کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتے ہیں

کہ ایک دن اس کو منہ دکھانا ہے۔ اَنَّهُمْ اِلٰی رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ میرے نزدیک وَجِلَۃٌ کے وضاحت کے طور پر ہے۔ اس سے اس خوف کی وضاحت ہو گئی جو ان کے دلوں میں سمایا ہوا ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ فرمایا کہ بے شک یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں اور کامیابیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور یہ ان نیکیوں کے ثمرات پا کے رہیں گے نہ کہ وہ لوگ جو ہمارے استدراج کو اپنی فتوحات سمجھ رہے ہیں اور برابر اپنی ہلاکت کے غار کی طرف آنکھیں بند کیے ہوئے ٹک ٹٹ بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ یہ آیت اوپر کی آیت ۵۶ کی مقابل آیت اور شروع کے مضمون قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الآیہ کی وضاحت مزید کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں دونوں آیتوں کے اسلوب بیان کے اس فرق پر بھی نگاہ رہے کہ اوپر تو فرمایا کہ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ (یہ عیش دنیا کے متوالے اس مغالطہ میں ہیں کہ ان کے مال و اولاد میں ہم جو اضافہ پر اضافہ کر رہے ہیں یہ ان کے لیے خیر میں اضافہ کر رہے ہیں) اور ان اہل ایمان کے باب میں فرمایا کہ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ (بے شک یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور یہ اپنی بازی جیتیں گے۔ اسلوب بیان کا یہ فرق واضح کرتا ہے کہ اس دنیا میں انسان جو کچھ پاتا ہے وہ بہرحال خدا ہی کے دیے پاتا ہے اور اس کی حیثیت انعام کی نہیں بلکہ امتحان کی ہوتی ہے۔ البتہ آخرت میں انسان جو کچھ پائے گا وہ اس کی اپنی سعی عمل کا ثمرہ اور اس کی اپنی محنت کا اجر ہو گا تو جس کو مسابقت کرنی ہو وہ اس میدان میں کرے۔ نہ کہ اس میدان میں جس کی ہر چیز محض وقتی اور آزمائشی ہے۔

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۶۲)

اہل ایمان کو ایک بشارت

یہ بطور جملہ معترضہ اہل ایمان کے لیے اسی طرح کی بشارت اور تسلی ہے جس طرح کی بشارت بقرہ کی آخری آیت میں گزر چکی ہے۔ یعنی ہر چند ہے تو یہ امتحان سخت لیکن اہل ایمان اطمینان رکھیں کہ ہم اپنی راہ میں سابقت کرنے والوں کو کسی ایسے امتحان میں نہیں ڈالتے جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو اور یہ اطمینان بھی رکھیں کہ وہ ہماری راہ میں جو مشقت بھی جھیلیں گے، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، وہ ہمارے پاس ایک رجسٹر میں درج ہوتی ہے۔ وہ رجسٹر، جزائے اعمال کے دن، ہر ایک کے تمام اعمال کا پورا پورا ریکارڈ، بالکل ٹھیک ٹھیک پیش کر دے گا اور ہر شخص اس کے مطابق اپنے ہر عمل کا صلہ پائے گا، کسی کی ذرہ برابر بھی کوئی حق تلفی نہ ہو گی۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْــَٔــرُوْنَ (۶۳-۶۴)

متکبرین اور ان کے پیروؤں کا انجام

اس اضراب کا تعلق متکبرین کے اسی مغالطہ سے ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ وہ اپنی رفاہیت و خوش حالی کو اپنی نیک اعمالی و نیک مآلی کی دلیل بنائے بیٹھے ہیں۔ وہاں صرف ان کے مغالطہ کی طرف اشارہ کر کے کلام اہل ایمان کے ذکر کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب پھر وہی سلسلۂ کلام عود کر آیا۔ فرمایا کہ ان لوگوں کے دل، اس انذار سے جو خدا کا رسول ان کو سنا رہا ہے، غفلت کے پردوں میں ہیں اور یہ اسی طرح اپنی سرمستیوں میں کھوئے رہیں گے اہل ایمان

کے جو اعمال، آیات ۵۷ - ۶۰ میں مذکور ہوئے ان کے اندر ان کے لیے کوئی کشش نہیں۔ ان کی دلچسپی کے اعمال کچھ اور ہیں اور وہ انہی میں منہمک رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب خدا کا عذاب ان کو دبوچ لے گا تب وہ فریاد کریں گے لیکن اس وقت ان کا فریاد کرنا بالکل بے سود ہو گا۔

'جَأَرَ يَجْأَرُ' کے معنی تضرع و زاری کرنے کے ہیں اور 'مُتْرَفِين' مالداروں اور خوش حالوں کو کہتے ہیں۔ وہ عذابِ الٰہی جو رسول کے انذار کے نتیجہ میں آتا ہے وہ اصلاً مترفین ہی کے لیے آتا ہے اس لیے کہ رسول کے انذار سے اصل کد انھیں کو ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا 'أَخَذْنَا مُتْرَفِيهِم بِالْعَذَابِ' لیکن ضمناً اس کی لپیٹ میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو مترفین کے طبقہ سے تو نہیں ہوتے لیکن اپنی شامتِ اعمال سے آلۂ کار انھیں کے بن جاتے ہیں اس وجہ سے جس طرح گندم کے ساتھ گھن پس جاتا ہے اسی طرح اپنے سرپرستوں کے ساتھ وہ بھی پس جاتے ہیں۔

لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ إِنَّكُم مِّنَّا لَا تُنصَرُونَ ۝ قَدْ كَانَتْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ تَنكِصُونَ ۝ (۶۵ - ۶۶)

یعنی اس وقت ان کی فریاد کا جواب ہماری طرف سے یہ ہو گا کہ اب ہمارے آگے رونے گڑگڑانے کا وقت گزر چکا۔ اس کا موقع پہلے تھا لیکن اس وقت تو تمھاری رعونت کا حال یہ رہا کہ جب ہماری آیات انذار تم کو سنائی جاتیں تو تم پیٹھ پیچھے بھاگتے اور ہمارے رسول کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ ہوتے تو اب اپنی ضد کا انجام بھگتو! اب ہماری طرف سے اپنے لیے کسی خیر کی امید نہ رکھو اور کوئی دوسرا بھی آج ہمارے مقابل میں تمھاری کوئی مدد نہ کر سکے گا۔ فرعون کی سرگزشت میں بھی بعینہٖ یہی بات مذکور ہوئی ہے۔ وہ جب طوفان کی لپیٹ میں آگیا تو چلایا کہ میں موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لایا۔ لیکن اس کا یہ اقرارِ ایمان درخورِ اعتنا نہیں ٹھہرا۔ بلکہ اس کو جواب ملا کہ اب ایمان لائے! ایمان لانے کا وقت پہلے تھا جب تم نے نافرمانی کی۔ پیچھے ہم اس امر کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ بات قولاً بھی ہو سکتی ہے اور صورتِ حال کی تعبیر بھی۔

مُسْتَكْبِرِينَ بِهِ سَامِرًا تَهْجُرُونَ ۝ (۶۷)

آیت ۶۷ کی تالیف اور اس کی تاویل

اس آیت کی تالیفِ کلام اور اس کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ ان کے اقوال نقل کرنے اور ان پر تنقید کرنے میں بڑی طوالت ہو گی اس وجہ سے ہم صرف اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔

'مُسْتَكْبِرِينَ' کے بعد 'بِهِ' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ لفظ یہاں استہزا کے مفہوم پر متضمن ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'بِهِ' کی ضمیر مجرور کا مرجع مفسرین کے ایک گروہ نے لفظ 'آیات' کو قرار دیا ہے، جو اوپر والی آیت میں مذکور ہے، اور اس کو علیٰ سبیل التاویل 'ذکر' اور 'کتاب' کے مفہوم میں لیا ہے۔ اگرچہ یہ بات عربیت کے خلاف نہیں ہے۔ 'آیت'، 'کتاب'، 'ذکر' اور 'رسول' متبادل الفاظ کی حیثیت سے قرآن میں استعمال ہوئے

ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ بسا اوقات ضمیر کا مرجع یا اسم اشارہ کا مشارٌ الیہ الفاظ میں مذکور نہیں ہوتا بلکہ نحوائے کلام سے متبادر ہوتا ہے اور اس کا تعین قرینہ کرتا ہے۔ قرآن اور کلامِ عرب دونوں میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں اور آخری گروپ کی سورتوں میں اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس ضمیر کا مرجع رسولؐ ہے جن کی تکذیب اور جن کے ساتھ استہزا کے عواقب اس سورہ میں زیر بحث ہیں اور جن کی تلاوتِ آیات قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ میں مذکور ہے۔

'سَامِرًا' کے معنی افسانہ خواں اور قصہ گو کے ہیں۔ یہ 'تَهْجُرُوْنَ' کا مفعول بھی ہو سکتا ہے اور اگر اس کو ضمیر مجرور سے حال مانیں جب بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ مجرور سے حال پڑنے کی متعدد مثالیں اس کتاب میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

'تَهْجُرُوْنَ' اپنے بالکل معروف معنی (تم چھوڑتے تھے) میں استعمال ہوا ہے۔ اس کو اس کے معروف معنی سے ہٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر اس تالیفِ کلام پر آپ کو اطمینان ہے تو لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ سے لے کر یہاں تک جو بات فرمائی گئی ہے وہ سادہ الفاظ میں یوں ہے کہ اب روؤ یا چلاؤ، اس سے کچھ حاصل نہیں، اب نہ ہمارے ہاں تمہاری کچھ شنوائی ہے اور نہ کوئی دوسرا ہی تم کو ہم سے چھڑا سکتا ہے۔ ہماری خوشنودی حاصل کرنے کا وقت وہ تھا جب ہمارے رسول کی زبانی تم کو ہماری آیات سنائی جا رہی تھیں لیکن اس وقت تمہاری بد دماغی کا یہ حال تھا کہ تم نہایت تکبر کے ساتھ، اس کا مذاق اڑاتے ہوئے، اس طرح اس سے کتراتے تھے گویا وہ کوئی افسانہ گو اور قصہ خواں ہے جس کی بات تمہارے نزدیک درخورِ اعتنا نہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے متمردین کو پچھلی قوموں کی جو سرگزشتیں سناتے ان سے وہ سبق لینے کے بجائے آپؐ کا مذاق اڑاتے اور اپنے عوام کو ورغلاتے کہ اس شخص کے پاس ہے کیا! پچھلی قوموں کی کچھ حکایات ہیں جن کو یہ سناتا پھر رہا ہے! اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔

۹۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۶۸-۹۲

آگے چند آیات میں کفار کے لاابالی پن پر زجر و توبیخ ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی ضد اور مکابرت سے مایوس نہ ہو، تم صراطِ مستقیم پر ہو اور یہ لوگ صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں، یہ اپنا انجام خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اگر ہم ان لوگوں کو بطور تنبیہ کسی مصیبت میں بھی مبتلا کریں جب بھی یہ سنبھلنے والے نہیں ہیں بلکہ ان سے چھوٹتے ہی یہ پھر اپنی سرمستیوں میں کھو جائیں گے جن میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد آفاق و انفس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ لوگ لاابالی پن چھوڑ کر کچھ سوچنے

سمجھنے کی طرف مائل ہوں لیکن اس کے جواب میں بھی انھوں نے یہی کہا کہ وہ سب پچھلوں کے فسانے ہیں۔ اس کے بعد چند آیات میں لوگوں کے تضادِ فکر کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان سے سوال کیا ہے کہ ایک طرف تو تم صحیح باتوں کا اقرار و اعلان کرتے ہو لیکن پھر تمھاری عقل کہاں گم ہو جاتی ہے کہ ان کے بالکل برعکس باتیں مان کر ضلالت کی وادی میں بھٹک جاتے ہو! ___ اس روشنی میں آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۶۸-۹۲

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُمْ مَا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿۶۸﴾
أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ ﴿۶۹﴾ أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ
بَلْ جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ وَأَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ ﴿۷۰﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ
أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ بَلْ أَتَيْنَاهُمْ
بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُعْرِضُونَ ﴿۷۱﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ خَرْجًا
فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿۷۲﴾ وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ
المربع إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۷۳﴾ وَإِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ عَنِ
الصِّرَاطِ لَنَاكِبُونَ ﴿۷۴﴾ وَلَوْ رَحِمْنَاهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِنْ ضُرٍّ
لَلَجُّوا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۷۵﴾ وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ
فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ ﴿۷۶﴾ حَتَّىٰ إِذَا فَتَحْنَا
عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيدٍ إِذَا هُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ﴿۷۷﴾ وَهُوَ ع ۴
الَّذِي أَنْشَأَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ ﴿۷۸﴾
وَهُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۷۹﴾ وَهُوَ الَّذِي
يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۸۰﴾
بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُونَ ﴿۸۱﴾ قَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا
تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا

هٰذَا مِنْ قَبْلُ إِنْ هٰذَآ إِلَّآ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٨٣﴾ قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ
وَمَنْ فِيهَآ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨٤﴾ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ أَفَلَا
تَذَكَّرُونَ ﴿٨٥﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿٨٦﴾
سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٨٧﴾ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوتُ كُلِّ
شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨٨﴾
سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ فَأَنّٰى تُسْحَرُونَ ﴿٨٩﴾ بَلْ أَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَ
إِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ﴿٩٠﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ
إِلٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ
سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿٩١﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى
عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٩٢﴾ ع ۵

ترجمۂ آیات ۶۸-۹۲

کیا ان لوگوں نے کلام پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ چیز آئی جو ان کے اگلے آباواجداد کے پاس نہیں آئی! یا انھوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں اس وجہ سے اس کے منکر بنے ہوئے ہیں! یا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص پر کچھ جنون کا اثر ہے! یہ جنون نہیں ہے بلکہ وہ ان کے پاس حق لے کر آیا ہے لیکن ان میں سے اکثر حق سے بیزار ہیں اور اگر حق ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتا تو آسمان و زمین اور جو ان میں ہیں سب تباہ ہو جاتے۔ بلکہ ہم تو ان کے پاس ان کے حصہ کی یاددہانی لائے ہیں تو وہ اپنی یاددہانی سے اعراض کر رہے ہیں۔ ۶۸-۷۱

کیا تم ان سے کوئی معاوضہ طلب کر رہے ہو! تمھارے رب کا صلہ تمھارے لیے بہتر ہے اور وہ بہترین روزی بخشنے والا ہے! اور بے شک تم ان کو ایک سیدھی راہ کی دعوت دے

رب ہے ہوا اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں وہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں (اور اگر ہم ان کو کسی آزمائش میں ڈالنے کے بعد) پھر ان پر رحم کرتے اور ان کی تکلیف دور کر دیتے تو وہ بدستور اپنی سرکشی ہی پر اڑے اسی طرح بھٹکتے رہتے۔ اور ہم نے ان جیسوں کو عذاب میں پکڑا لیکن نہ وہ اپنے رب کے آگے جھکے اور نہ وہ تضرع ہی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب ہم ان پر ایک سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے تو وہ اس میں بالکل مایوس ہو کے رہ جائیں گے۔ ۷۷-۷۱

اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے کان، آنکھ اور دل بنائے، پر تم بہت کم شکرگزار ہوتے ہو! اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا ہے پھر تم اسی کے پاس اکٹھے کیے جاؤ گے۔ اور وہی ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے اور اسی کے اختیار میں ہے رات اور دن کی آمد و شد تو کیا تم سمجھتے نہیں! ۷۸-۸۰

بلکہ انھوں نے بھی وہی بات کہی جو اگلوں نے کہی۔ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک اور ہڈیاں بن جائیں گے تو از سر نو اٹھائے جائیں گے! اس کی دھمکی تو ہم کو اور اس سے پہلے ہمارے آباء و اجداد کو بھی سنائی گئی۔ یہ محض اگلوں کے فسانے ہیں! ۸۱-۸۳

ان سے پوچھو، یہ زمین اور جو اس میں ہیں کس کے ہیں، اگر تم جانتے ہو! کہیں گے اللہ کے۔ کہو تو کیا تم اس سے یاددہانی نہیں حاصل کرتے! پوچھو، ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا خداوند کون ہے؟ کہیں گے یہ سب اللہ کے ہیں۔ کہو تو کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں! پوچھو، وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے، لیکن اس کے مقابل میں پناہ نہیں دی جا سکتی، اگر تم جانتے ہو! وہ کہیں گے یہ باتیں اللہ ہی کے اختیار کی ہیں۔ کہو، پھر تمھاری مت کہاں ماری جاتی ہے۔ ۸۴-۸۹

بلکہ ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ خدا نے کسی کو اپنی اولاد نہیں قرار دیا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود شریک ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود جو کچھ اس نے پیدا کیا ہوتا اس کو لے کر الگ ہو جاتا اور وہ ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا۔ خدا ایسی باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ غائب و حاضر کا جاننے والا ہے اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں! ۹۰-۹۲

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَفَلَمۡ يَدَّبَّرُوا الۡقَوۡلَ اَمۡ جَآءَهُمۡ مَّا لَمۡ يَاۡتِ اٰبَآءَهُمُ الۡاَوَّلِيۡنَ (۶۸)

استفہام بہ اسلوب بقصد زجر و ملامت

یہ اور آگے جو باتیں استفہامیہ اسلوب میں آئی ہیں سب بطور اظہارِ حسرت اور بقصدِ زجر و ملامت ہیں۔ 'قول' سے مراد یہاں قرآن ہے جس سے اعراض کا ذکر اوپر والی آیت میں ہو چکا ہے۔ فرمایا کہ آخر یہ لوگ اس قرآن سے اس درجہ کیوں بدک رہے ہیں! کیا انھوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا یا ان کا گمان یہ ہے کہ یہ ان کے باپ دادا کے طریقہ کے خلاف ہے۔ چونکہ یہاں کلام زجر اور حسرت کے انداز میں ہے اس وجہ سے بات مجمل چھوڑ دی گئی ہے۔ دوسرے مقام میں یہ تصریح ہے کہ ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں اس وجہ سے قرآن کی باتیں ان کے دلوں میں نہیں اترتیں۔ قرآن کو باپ دادا کی روایات کے خلاف سمجھ کر اس سے بدکنا بھی نری جہالت ہے۔ باپ دادا کا طریقہ بجائے خود اپنی صحت و صداقت کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کا عقل و فطرت کی کسوٹی پر پورا اترنا بھی ضروری ہے۔ علاوہ ازیں آخر یہ لوگ اپنی ناک سے آگے کیوں نہیں دیکھتے! ان کے اصل جدِّ اعلیٰ تو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ ہیں وہ تو اسی دین کے حامل اور داعی تھے۔ یہ لوگ اپنے ان اجدادِ کرام کی پیروی کیوں نہیں کرتے، اپنے انہی آباد کی لکیر کیوں پیٹے جا رہے ہیں جو دین سے بالکل بے خبر تھے!

اَمۡ لَمۡ يَعۡرِفُوۡا رَسُوۡلَهُمۡ فَهُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ (۶۹)

قریش کو ایک سخت خطرے سے آگاہی

یہ اس سنتِ الٰہی کی روشنی میں، جو قرآن میں نہایت وضاحت سے بیان ہو چکی ہے، قریش کو ایک سخت خطرے سے آگاہی ہے۔ وہ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قوم پر اتمامِ حجت کے لیے ایک رسول بھیجتا ہے جو اسی قوم کے اندر سے ہوتا ہے۔ اگر قوم اس پر ایمان لاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو برومند کرتا اور زمین میں اس کو اقتدار بخشتا ہے اور اگر وہ رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو اتمامِ حجت کے بعد وہ لازماً فنا کر دی جاتی

ہے۔ اس وجہ سے کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت کا مرحلہ ایک بڑا ہی نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ اسی مرحلہ میں اس کی زندگی یا موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ بدقسمت ہے وہ قوم جو اس مرحلہ کی نزاکت کو نہ سمجھے اور اپنے رسول کے معاملہ میں لاابالی پن کا مظاہرہ کرے۔ قریش کی اسی ناعاقبت اندیشی پر یہ ان کو تنبیہ ہے کہ کیا انھوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں اس وجہ سے اس کا انکار کیے جا رہے ہیں یا یہ سب کچھ انجان بوجھ کر ہو رہا ہے۔ دیدہ دانستہ ہو رہا ہے تو اس کھیل کا انجام معلوم ہے!

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ بِہٖ جِنَّۃٌ ؕ بَلۡ جَآءَہُمۡ بِالۡحَقِّ وَ اَکۡثَرُہُمۡ لِلۡحَقِّ کٰرِہُوۡنَ (۷۰)

رسول کو خبطی قرار دینے کی وجہ دراصل حق بیزاری ہے

یعنی اگر وہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ رسول کو خبط اور سودا لاحق ہے تو یہ خود ان کے اپنے پاگل ہونے کی دلیل ہے۔ رسول کو کوئی خبط و سودا نہیں ہے۔ وہ تو جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ بالکل حق ہے اور اس کی ایک ایک بات پوری ہو کے رہے گی۔ البتہ یہ لوگ خود حق سے بیزار ہیں۔ اس وجہ سے رسول کو دیوانہ قرار دے رہے ہیں۔ مریض کو جب طبیب کی تشخیص کردہ دوائیں کڑوی معلوم ہوتی ہیں اور وہ ان کو حلق سے اتارنے پر تیار نہیں ہوتا تو وہ اپنے کو مریض تسلیم کرنے کے بجائے الٹے طبیب ہی کے مشورے کو ہذیان قرار دیتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا تھا۔ یہ اپنے باطل کو چھوڑ کر حق کے کڑوے کسیلے گھونٹ حلق سے اتارنے کے لیے تیار نہیں تھے اس وجہ سے رسول کو دیوانہ قرار دیتے تھے کہ اس طرح اپنی خرد باختگی پر کچھ پردہ ڈال سکیں۔

وَ لَوِ اتَّبَعَ الۡحَقُّ اَہۡوَآءَہُمۡ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ وَ مَنۡ فِیۡہِنَّ ؕ بَلۡ اَتَیۡنٰہُمۡ بِذِکۡرِہِمۡ فَہُمۡ عَنۡ ذِکۡرِہِمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ (۷۱)

خواہشاتِ نفس اور حق کے درمیان بعد المشرقین ہے

اب یہ خواہشاتِ نفس اور حق دونوں کے اختلافِ مزاج کو واضح فرمایا ہے کہ ان دونوں کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ خواہشاتِ نفس کے مطالبے کچھ اور ہیں، حق کے تقاضے، ان سے بالکل الگ کچھ اور ہیں۔ اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، جیسا کہ یہ چاہتے ہیں کہ قرآن اور پیغمبر کی باتیں ان کی خواہشوں کے مطابق ہوں تب یہ ان کو مانیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ اس پوری کائنات کی تباہی ہے۔ اس لیے کہ یہ خیر کی جگہ شر، عدل کی جگہ ظلم، نیکی کی جگہ بدی، امانت کی جگہ خیانت اور اس سے بڑھ کر یہ کہ توحید کی جگہ شرک اور قیامت کے بجائے انکارِ قیامت کے علم بردار ہیں۔ اگر یہ تمام اقدار ان کی خواہشوں کے مطابق تلپٹ ہو جائیں تو اس دنیا کا سارا اخلاقی نظام درہم برہم ہو جائے اور اگر اس کے اندر شرک کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے تو شرک کے ساتھ تو اس کائنات کا نظام ایک دن بھی باقی نہ رہ سکتا۔ اس حقیقت کو آگے اسی سورہ میں یوں واضح فرمایا ہے۔ مَا اتَّخَذَ اللّٰہُ مِنۡ وَّلَدٍ وَّ مَا کَانَ مَعَہٗ مِنۡ اِلٰہٍ اِذًا لَّذَہَبَ کُلُّ اِلٰہٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعۡضُہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ (۹۱) (اللہ نے نہ تو اپنے لیے کوئی اولاد بنائی اور نہ کوئی معبود اس کے ساتھ شریک ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود، جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے اس کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا)

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تو حق کو اپنی خواہشوں کے پیچھے چلانا چاہتے ہیں اور اس دنیا کی نجات و فلاح حق کے پیچھے چلنے میں ہے۔ خالق کائنات اپنی دنیا کو ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ اب یہ لوگ خود فیصلہ کریں کہ حق کے پیچھے چل کر زندگی چاہتے ہیں یا باطل کے ساتھ چمٹے رہ کر موت اور ہلاکت! اگر زندگی مطلوب ہے تو یہ گھونٹ حلق سے اتارنے پڑیں گے، خواہ کڑوے لگیں یا میٹھے۔ اس سے الگ زندگی کی کوئی اور راہ نہیں ہے۔

یاددہانی سے اعراض کرنے والوں کا انجام

'بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ' یہ دوسرے الفاظ میں وہی تنبیہ ہے جو اوپر 'اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ' کے الفاظ میں گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اس قرآن کو کسی افسانہ گو کی افسانہ گوئی سمجھے ہیں تو بہت غلط سمجھے ہیں۔ یہ ان کے حصہ کی وہ یاددہانی ہے جو اتمام حجت کے لیے ہم نے ان کی طرف بھیجی ہے۔ اگر اس یاددہانی سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو یاد رکھیں کہ ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو ان سے پہلے خدا کی یاددہانی کی ناقدری کرنے والی قوموں کا ہو چکا ہے۔ اوپر ہم اس سنتِ الٰہی کا حوالہ دے چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف اپنے رسول بھیجے اور ان رسولوں کے ذریعہ سے ان قوموں کو یاددہانی کی۔ جس قوم نے اس یاددہانی کی قدر کی اس نے فلاح پائی، جس نے اس کی قدر نہ کی وہ فنا کر دی گئی۔ یہاں اسی سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ کر کے آگاہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ اس یاددہانی سے اعراض کیے جا رہے ہیں اور اس کے عواقب سے بے خبر ہیں!

نبی کا زاد و راحلہ اس کے ساتھ ہوتا ہے

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَیْرٌ ﳓ وَّهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ (۷۲)

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آپؐ کے مخالفین کے لیے ملامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان کے آگے جو کچھ پیش کر رہے ہو، اس کا کوئی معاوضہ تو طلب کر نہیں رہے ہو کہ یہ اس کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں۔ تم نے تو مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہے ہو۔ اگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو اس میں ان کی اپنی ہی محرومی ہے۔ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے تمھاری دعوت قبول نہ کی تو اس سے تمھیں کوئی نقصان پہنچا دیں گے تو بالکل غلط سمجھتے ہیں۔ تمھارے لیے تمھارے رب کا بخشا ہوا اجر ہی بہتر ہے اور وہ بہترین فضل فرمانے والا ہے۔ خدا کا رسول کوئی تاجر یا دکاندار نہیں ہوتا بلکہ ایک داعی حق ہوتا ہے۔ اس کی دعوت اپنا زاد و راحلہ خود اپنے ساتھ رکھتی ہے اور یہی شان ان لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو نبیوں کے طریقے پر کام کرتے ہیں۔

وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ وَاِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ (۷۳-۷۴)

صراط مستقیم سے انحراف کی اصل علت

یعنی جہاں تک تمھاری دعوت کا تعلق ہے وہ تو زندگی کی صحیح شاہراہ پر چلنے کی دعوت ہے۔ اسی شاہراہ پر چل کر انسان منزلِ مقصود کو پہنچ سکتا ہے لیکن اس کو اختیار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ اگر آخرت پر ایمان نہ رکھتا ہو تو آخر اس کو کیا پڑی ہوئی ہے کہ وہ اپنے نفس کی آزادیوں اور بے قیدگیوں پر پہرہ بٹھائے۔ اپنی نقد لذتوں کی قربانی تو وہی دے سکے گا جس کو ایک روزِ جزا کا انتظار ہو۔ جس کو اس قسم

کے کسی دن کا انتظار نہیں ہے وہ اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے چلے گا خواہ ان کی پیروی میں وہ صراط مستقیم سے کتنا ہی دور نکل جائے۔ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ آپ کی بتائی ہوئی راہ سے جو لوگ انحراف اختیار کیے ہوئے ہیں اس کا سبب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی پیچ و خم ہے، یہ تو بالکل سیدھی راہ ہے، خرابی جو کچھ ہے ان کے دلوں میں ہے۔ ان لوگوں کے دلوں میں آخرت پر ایمان نہیں ہے اور جن کے اندر آخرت پر ایمان نہ ہو وہ اس سیدھی راہ سے کج ہو کر ہی چلیں گے۔ حکمت دین کی اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھیے کہ جب تک اس دنیا کے ساتھ آخرت کو نہ مانئیے نہ اس اونٹ کی کوئی کل سیدھی نظر آئے گی اور نہ زندگی کی صحیح شاہراہ متعین ہو سکے گی۔ اس حقیقت کو ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۷۵)

آنحضرت کو تسلی تاریخ کی روشنی میں — اس آیت میں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق، شرط میں سے کچھ حصہ، بر بنائے وضاحت قرینہ حذف ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ اگر ہم ان کو بطور تنبیہ کسی مصیبت میں مبتلا کرتے کہ ان کے اندر کچھ خوفِ خدا اور تضرع پیدا ہو، پھر ان پر رحم کرتے، وہ ان کی مصیبت دور کر دیتے تو یہ پھر اپنی اسی سرکشی میں پڑے ہوئے اسی طرح بھٹکتے رہتے۔ مطلب یہ ہے کہ اس ذہنیت کے لوگوں کو عذاب کی نشانیاں بھی، جن کا یہ مطالبہ کرتے ہیں، کوئی نفع نہیں پہنچاتیں۔ اگر ان سے ان کی گردنوں میں ذرا خم پیدا ہوتا بھی ہے تو محض وقتی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ مصیبت کے دن گزرتے ہی ان کے لیڈر یہ سبق پڑھانا شروع کر دیتے ہیں کہ اس طرح کے نرم و گرم حالات تو قوموں کو پیش آیا ہی کرتے ہیں، اس کو ہمارے ایمان و اخلاق سے کیا تعلق! — یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ عذاب کی کوئی نشانی مانگتے ہیں تو اس کو کوئی اہمیت نہ دو۔ اس قماش کے لوگوں کو کوئی نشانی نفع نہیں پہنچاتی۔

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ (۷۶)

تنبیہی عذاب — 'وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ' یعنی 'وَلَقَدْ اَخَذْنَا اَشْيَاعَهُمْ' ہم نے ان کے ہم مشربوں کو اس سے پہلے اپنے تنبیہی عذابوں میں پکڑا لیکن نہ تو ان کے دلوں میں خستگی اور فروتنی پیدا ہوئی اور نہ وہ اپنے رب کے آگے گریہ و زاری کرتے تھے۔ یہ پچھلی تاریخ کی روشنی میں اسی بات کی دلیل بیان ہوئی ہے جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی ہے کہ تاریخ شاہد ہے کہ اس قماش کے لوگ تنبیہات سے کوئی سبق نہیں لیتے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو بھی کوئی تنبیہ کی گئی تو پیغمبر کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ یہ اس سے کوئی سبق لیں گے۔ 'هُمْ' سے مراد یہاں قریش نہیں بلکہ ان کے وہ ہم مشرب ہیں جو پچھلی امتوں میں گزر چکے تھے۔ عربی میں غایت مجانست و مشابہت کے اظہار کے مواقع میں اس طرح ضمیریں آتی ہیں۔ اس کی مثالیں قرآن اور کلامِ عرب میں موجود ہیں۔ اس میں یہ بلاغت ہے کہ اُن کو پکڑا تو گویا انہی کو پکڑا اس لیے کہ مرتکب دونوں ایک ہی جرم کے ہیں۔

'استكانة' اور 'تضرع' میں ظاہر و باطن کا فرق ہے۔ 'استكانة' دل کی شکستگی و خستگی کی تعبیر

ہے اور 'تضرع' سے مراد وہ گریہ و زاری اور دعا و فریاد ہے جو استکانۃ کے نتیجہ کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔
میرے نزدیک یہاں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِیْدٍ اِذَا هُمْ فِیْهِ مُبْلِسُوْنَ (۷۷)

'عذابِ شدید' سے مراد

یعنی تنبیہی جھڑکیوں سے تو ان مغروروں کا دماغ درست ہونے والا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے گا جب ان کی اس تکذیب کے نتیجہ میں ہم ان پر اپنے عذابِ شدید کے دروازے کھول دیں گے۔ 'عذابِ شدید' سے مراد یہاں وہ فیصلہ کن عذاب ہے جو سنتِ الٰہی کے تحت ہر اس قوم پر آیا جس نے اپنے رسول کی تکذیب کر دی اور اپنی ضد پر اڑی رہ گئی۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کر چکے ہیں۔ اس عذاب کے ظہور کے بعد پھر قوم کو مہلت نہیں ملتی۔ اس کے تمام سہارے اور تمام امیدیں یک قلم ختم ہو جاتی ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف آیت کے آخری الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۷۸)

کان، آنکھ اور دل کا اصلی مصرف

اوپر کے کلام میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اور اس میں قریش کو جو تہدید و وعید ہے وہ غائب کے صیغہ سے ہے۔ اب یہ ان کو براہِ راست مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ خدا نے جو تم کو کان، آنکھ اور دل عطا فرمائے ہیں تو کاہے کے لیے عطا فرمائے ہیں! اسی لیے تو کہ ان سے نصیحت و حکمت کی وہ باتیں جو تمہیں سنائی جا رہی ہیں سنو، اللہ کی وہ نشانیاں جو آفاق و انفس میں پھیلی ہوئی ہیں اور جن کی طرف تمہیں توجہ دلائی جا رہی ہے، ان کو دیکھو، اور ان سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں اور جو تمہارے سامنے نہایت واضح طور پر پیش کیے جا رہے ہیں ان پر غور کرو۔ کان، آنکھ اور دل دماغ کا اصلی مصرف یہی ہے لیکن تم عجیب شامت زدہ لوگ ہو کہ حق کو ماننے کے لیے دلیل کے بجائے تنبیہ کے ڈنڈے کا مطالبہ کر رہے ہو! مطلب یہ ہے کہ اگر عقل اور استدلال سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے آدمی صرف ڈنڈے ہی کی منطق سے قائل ہو تو اس میں اور گدھے میں کیا فرق رہا!

'قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ' اظہارِ حسرت و افسوس کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کی بخشی ہوئی اتنی اعلیٰ نعمتیں پا کر ان کی بہت کم قدر کرتے ہو! شکر کی اصل حقیقت، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں نعمت کی قدر دانی ہے اور نعمت کی قدر دانی یہ ہے کہ آدمی اس سے صحیح فائدہ اٹھائے اور اپنے منعم کا شکر گزار رہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَاِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ (۷۹)

توحید اور قیامت کی ایک جامع دلیل

یہ قیامت اور حشر کی طرف توجہ دلائی کہ اس مغالطہ میں نہ رہو کہ بس یہیں پیدا ہوتے یہیں مر کھپ جاؤ گے۔ جب ایک کسان اپنے کھیت میں بوتا ہے تو محض بونے کی خاطر نہیں بوتا بلکہ ایک دن وہ اس کو اکٹھا بھی کرتا ہے۔ اسی طرح جس نے تمہیں اس زمین میں پھیلایا ہے وہ ایک دن تمہیں جمع بھی کرے گا تو

یہ یاد رکھو کہ تم صرف اسی کے کھیتے ہیں جمع کیے جاؤ گے۔ آخر اس کی بنائی ہوئی فصل میں کوئی دوسرا کس طرح شریک
بن جائے گا! غور کیجیے ان چند لفظوں کے اندر کس خوبی سے امکانِ قیامت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے،
معاد کی صورت بھی بیان ہو گئی ہے اور توحید کی دلیل بھی واضح ہو گئی ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۸۰)

اختلافِ لیل و نہار کے بعض اشارات

"اختلاف اللیل والنھار" سے مراد دن اور رات کی ایک دوسرے کے بعد، پوری پابندیٔ اوقات
کے ساتھ، آمد و شد ہے۔ اس نشانی کی طرف قرآن نے جگہ جگہ توجہ دلائی ہے۔

دن اور رات کا پوری پابندیٔ اوقات کے ساتھ آنا اور جانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اس کائنات
کے خالق کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ یہ بجائے خود نہ آنے کے مجاز ہیں نہ جانے کے۔

ان کے نظام میں کسی کا دخل انداز نہ ہو سکنا اس بات کی شہادت ہے کہ متصرفِ حقیقی صرف اللہ وحدہٗ
لاشریک ہے۔

اختلافِ مزاج و صورت کے باوجود ان دونوں میں اس کائنات کی پرورش کے لیے جو سازگاری ہے
وہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کائنات میں ایک ہی حکیم و قدیر کا ارادہ کارفرما ہے جو اس کے تمام اضداد
میں ربط پیدا کرتا ہے اور ان کو کائنات کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

شب میں آرام کی نیند کے بعد صبح کو اٹھ کھڑے ہونا ہر انسان کے لیے قیامت کی یاد دہانی ہے کہ اسی
طرح برزخ کی نیند کے بعد جب اللہ تعالیٰ چاہے گا ہر شخص اٹھ کھڑا ہو گا۔

ان کے علاوہ بعض مزید اشارات بھی قرآن نے اختلافِ لیل و نہار سے نکالے ہیں اور ہم نے اس
کتاب میں ان کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں فرمایا کہ وہی جو
زندگی اور موت دیتا ہے اور جس کے دستِ تصرف میں رات اور دن کی آمد و شد ہے، وہی تمہارا حقیقی معبود
ہے، اسی سے سابقہ پڑنا ہے اور اسی کی طرف تمھیں یہ بلایا جا رہا ہے تو تم کہاں بھٹکے ہوئے جا رہے ہو!
کیا اتنی واضح حقیقت تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے!

بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُونَ ۝ قَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ۝ لَقَدْ
وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا هَٰذَا مِنْ قَبْلُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۸۱-۸۳)

وہی پرانا جواب

یعنی یہ ساری باتیں اپنی جگہ پر واضح اور ثابت ہیں لیکن یہ ان کے دلوں میں کسی طرح نہیں اتر رہی
ہیں۔ انھوں نے یہ سب کچھ سن کے وہی بات کہی جو ان کے اگلے ہم مشربوں نے کہی۔ انھوں نے کہا بھلا جب
ہم مر کے مٹی اور ہڈی بن جائیں گے تو کیا دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے! یہ انوکھی بات ہے! ابھی
ڈراوا ہمیں سنایا جا رہا ہے اور اس سے پہلے یہی ڈراوا ہمارے اگلوں کو بھی سنایا گیا لیکن قیامت کو نہ آنا تھا نہ آئی
نہ آئے گی۔ یہ سب پرانے فسانے ہیں جو بار بار دہرائے جا رہے ہیں۔ ہم ان دھمکیوں میں آنے والے نہیں ہیں!

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۸۴-۸۵)

منکرین کا تضادِ فکر

اب یہ ان منکرین کے تضادِ فکر کو نمایاں کیا جا رہا ہے کہ ایک طرف تو یہ آسمان و زمین کا خالق و مالک اور مختارِ کل خدا ہی کو مانتے ہیں دوسری طرف یہ ایسی باتیں بھی مانتے ہیں جو اس کے بالکل ضد میں یا ان باتوں کا انکار کرتے ہیں جو ان کے اس مسلمہ کے لازمی نتیجہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مشرکینِ عرب کے متعلق ہم یہ بات اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ وہ آسمان و زمین کا خالق و مالک اور معرفِ حقیقی تو صرف خدا ہی کو مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ شرک کی ان اقسام میں بھی مبتلا تھے جن کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ رہی قیامت تو اس کو اول تو وہ ایک نہایت مستبعد چیز سمجھتے تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں مانتے تھے تو ان کا خیال تھا کہ ان کے سفارشی خدا کی گرفت سے ان کو بچا لیں گے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ اسی قسم کا تضادِ فکر ہے جس میں بالعموم آج کل کے مسلمان مبتلا ہیں۔ یہ خدا کا اقرار بھی کرتے ہیں اور اس اقرار کے جو لازمی نتائج ہیں ان کا انکار بھی کرتے ہیں۔ ایمان کے مدعی بھی ہیں اور ساتھ ہی نہایت دھڑلے سے وہ باتیں بھی مانتے اور کرتے ہیں جو ایمان کے بالکل منافی ہیں۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ ذرا ان مدعیانِ علم سے پوچھو کہ یہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے کس کا اور کس کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ 'اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' کے الفاظ میں ان کے تضادِ فکر پر ایک قسم کی تعریض ہے اس لیے کہ جو علم متضاد افکار کا مجموعہ ہو وہ علم نہیں بلکہ جہل اور شدید قسم کا جہل ہے۔ فرمایا کہ تمہارے اس سوال کا جواب تو بہرحال وہ یہی دیں گے کہ یہ ساری چیزیں اللہ ہی کی اور اللہ ہی کے قبضہ و تصرف میں ہیں۔ پھر ان سے کہو کہ 'اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ' اپنے اسی مسلمہ کی روشنی میں تم آخر اپنے افکار و عقائد کا جائزہ کیوں نہیں لیتے! اس کے بعد تم توحید کا کس طرح انکار کرتے ہو؟ یہ شرکا و شفعاء تم نے کہاں سے گھڑ لیے؟ قیامت تمھیں کیوں ایک عجیب چیز معلوم ہوتی ہے اور رسول کی دعوت سے تم اس طرح کیوں بھڑکتے ہو!!

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۸۶-۸۷)

فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ ساتوں آسمان اور عرشِ عظیم کا خداوند کون ہے؟ اوپر کا سوال زمین اور اہلِ زمین سے متعلق تھا، یہ سوال ساتوں آسمان اور عرشِ عظیم سے متعلق ہے۔ 'عرشِ عظیم' اللہ تعالیٰ کے ہمہ گیر اقتدارِ مطلق کی تعبیر ہے۔ اہلِ عرب جس طرح زمین کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے اسی طرح ساتوں آسمان اور عرشِ عظیم کا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ وہ دنیا کی دوسری مشرک قوموں کی طرح آسمانوں اور زمین کے الگ دیوتاؤں کے قائل نہیں تھے۔ فرمایا کہ وہ تمہارے اس سوال کا جواب بھی یہی دیں گے کہ یہ ساری چیزیں اللہ ہی کی اور اسی کے قبضہ و تصرف میں ہیں۔ چونکہ 'مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ' کے سوال کا اصل مطلب یہ ہے کہ ان میں خدائی کس کی ہے اس وجہ سے اس کے جواب میں 'لِلّٰهِ' بالکل موزوں ہے۔ فرمایا کہ اگر وہ تمہارے اس سوال کا جواب بھی اثبات میں دیتے ہیں تو پھر ان سے پوچھو کہ تم ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کے مالک

سے ڈرتے نہیں کہ اس کی خدائی میں دھاندلی مچاتے، اس کے احکام و قوانین کی خلاف ورزی کرتے اور دوسروں کو بلا کسی استحقاق کے اس کی خدائی میں شریک بناتے ہو! اگر اس کا قہر و غضب تم پر نازل ہو جائے تو آخر کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے۔

قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (۸۸ - ۸۹)

'ملکوت' سے مراد

'مَلَكُوْت' یہاں زمامِ اختیار و اقتدار کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی زمام ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ وہ تو جس کو چاہے پناہ دے سکتا ہے لیکن کسی دوسرے کی یہ شان نہیں ہے کہ اس کی پکڑ سے کسی کو چھڑا سکے؟ فرمایا کہ اس کا جواب بھی لامحالہ وہ یہی دیں گے کہ یہ سارے اختیارات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ مشرکینِ عرب جن معبودوں کو پوجتے تھے ان کے متعلق ان کا یہ تصور نہیں تھا کہ وہ ایسا اختیار و اقتدار رکھتے ہیں کہ اپنے زور و اقتدار سے وہ کسی کو خدا کی پکڑ سے بچا سکیں بلکہ وہ فرشتوں کو خدا کی چہیتی بیٹیاں سمجھ کر ان کی پوجا محض اس امید پر کرتے تھے کہ یہ راضی رہیں تو ان کے طفیل میں خدا ان سے راضی رہے گا۔ اس سوال کے ساتھ بھی 'اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' کے الفاظ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے جو میتھالوجی تیار کی ہے اس میں تو تم نے یہ درجہ کسی کو نہیں دیا لیکن اگر کوئی ہے اور تم اس کو جانتے اور مانتے ہو تو ذرا اس کا نام لو۔ پھر فرمایا کہ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار نہیں مانتے تو ان سے پوچھو کہ کس نے تم پر افسوں پھونکا ہے کہ بالکل تمھاری مت ماری گئی ہے اور تم خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی جے پکارتے ہو۔

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۹۰ - ۹۲)

مذکورہ بالا سوال و جواب پر استدراک

اب اس سارے سوال و جواب پر استدراک ہے کہ یہ جو کچھ مانتے ہیں یہ خود ان کے اپنے اعترافات کے بالکل خلاف ہے اس وجہ سے ہم نے اس قرآن میں جو کچھ پیش کیا ہے یہ حق ہے اور یہ بالکل جھوٹے ہیں اس لیے کہ یہ خود اپنے منہ سے اپنے آپ کو جھٹلا رہے ہیں۔ خدا نے نہ کسی کو اپنا بیٹا بنایا ہے، نہ کسی کو اپنی بیٹی اور نہ کوئی اس کا ساجھی اور شریک ہے۔ اگر اس کائنات کی تخلیق میں اور الٰہ بھی شریک ہوتے تو ہر الٰہ اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا اور یہ سارا نظام کب کا درہم برہم ہو چکا ہوتا۔ اس طرح کی خرافات جو یہ بیان کرتے ہیں یہ خدا کی اعلیٰ صفات کے بالکل منافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام غائب و حاضر کا خود علم رکھنے والا ہے تو اس کو ضرورت کیا ہے کہ وہ کسی کو اپنا شریک بنائے۔ وہ ان چیزوں سے برتر ہے جن کو یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

یونانیوں اور ہندوؤں کی میتھالوجی میں ان کے دیوتاؤں کی جو خونریز جنگیں مذکور ہیں یہاں ان پر بھی نظر رہے اور قدیم یونانیوں کا یہ عقیدہ بھی نگاہ میں رہے کہ مرد کو سورج نے پیدا کیا ہے اور عورت کو زمین نے۔ غور کیجیے کہ اگر سورج اپنے پیدا کیے ہوئے مردوں کو لے کر الگ ہو جاتے تو زمین کی عورتوں کا کیا حشر ہوگا! قرآن نے یہاں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کارخانۂ کائنات قائم ہی اس وجہ سے ہے کہ اس میں ایک ہی خالق و مالک کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر اس میں دوسرے الٰہ بھی شریک ہوتے تو اس کا قیام و بقا ناممکن تھا۔

۱۱۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹۳-۱۱۸

خاتمۂ سورہ — آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی گئی ہے کہ اب فتح و نصرت کا وقت قریب ہے۔ اہل ایمان کامیاب و فتح مند اور آپ کے مخالفین دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی سے دوچار ہوں گے تو کچھ عرصہ ان کی شرارتوں سے درگزر کرو۔ فیصلہ کی گھڑی سر پر آ گئی ہے۔ جس مدت کو یہ بہت طویل سمجھ رہے ہیں اور جس کے دھوکے میں اپنی شرارتوں میں دلیر ہوتے جا رہے ہیں، انجام سامنے آ جانے کے بعد محسوس کریں گے کہ وہ پلک جھپکتے گزر گئی اور اس وقت اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۳-۱۱۸

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿٩٣﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَاِنَّا عَلٰۤى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿٩٥﴾ اِدْفَعْ
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَقُلْ رَّبِّ
اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿٩٧﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ
يَّحْضُرُوْنِ ﴿٩٨﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿٩٩﴾
لَعَلِّيْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ
وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿١٠٠﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَاۤ اَنْسَابَ
بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿١٠١﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٢﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا
اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٣﴾ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا

كَٰلِحُونَ ﴿١٠٤﴾ أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿١٠٥﴾
قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ ﴿١٠٦﴾ رَبَّنَا
أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ ﴿١٠٧﴾ قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ﴿١٠٨﴾
إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَ
أَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا حَتَّىٰ أَنسَوْكُمْ ذِكْرِي
وَكُنتُم مِّنْهُمْ تَضْحَكُونَ ﴿١١٠﴾ إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ
الْفَائِزُونَ ﴿١١١﴾ قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ﴿١١٢﴾ قَالُوا لَبِثْنَا
يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَاسْأَلِ الْعَادِّينَ ﴿١١٣﴾ قَالَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَّوْ
أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١١٤﴾ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا
لَا تُرْجَعُونَ ﴿١١٥﴾ فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ
الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ﴿١١٦﴾ وَمَن يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ
بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِندَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ ﴿١١٧﴾ وَقُل رَّبِّ
ع ۱۶/۶ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ﴿١١٨﴾

دعا کرو کہ اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے وہ عذاب دکھائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے تو اے میرے پروردگار! مجھے ان ظالموں میں شامل نہ کیجیو۔ اور بے شک ہم اس بات پر قادر ہیں کہ جس عذاب سے ہم ان کو ڈرا رہے ہیں وہ تم کو دکھا دیں۔ ۹۳-۹۵ ترجمۂ آیات ۹۳-۱۱۸

ان کی شرارتوں سے خوبصورتی کے ساتھ درگزر کرو، یہ جو کچھ ہرزہ سرائی کر رہے ہیں ہم اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور دعا کرتے رہو کہ اے رب! میں شیاطین کے وسوسوں سے تیری پناہ

مانگتا ہوں۔ اور اے میرے رب اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔ ۹۸-۹۷

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوگی تو وہ کہے گا کہ اے رب مجھے پھر واپس بھیج کہ جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کچھ نیکی کماؤں! ہرگز نہیں! یہ محض ایک بات ہے جو وہ کہنے والا بنے گا اور آگے ان کے ایک پردہ ہوگا اس دن تک کے لیے جس دن وہ اٹھائے جائیں گے۔ تو جب صُور پھونکا جائے گا تو اس دن نہ آپس کا نسب کام آئے گا اور نہ وہ ایک دوسرے سے طالب مدد ہوں گے۔ پس جن کے پلّے بھاری ہوں گے وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے پلّے ہلکے ہوں گے تو وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا، وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ ان کے چہروں کو آگ جھلسے گی اور اس میں ان کے منہ بگڑے ہوئے ہوں گے۔ کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں تو تم ان کو جھٹلاتے تھے! کہیں گے اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر غالب رہی اور ہم گمراہی میں پڑے رہے۔ اے ہمارے رب ہمیں اس جہنم سے ایک مرتبہ نکال، اگر ہم پھر ایسا کریں تو بے شک ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہوں گے۔ حکم ہوگا، دفع ہو، اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔ میرے بندوں کی ایک جماعت ان لوگوں کی بھی تھی جو دعا کرتے تھے کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے تو تو ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین رحم فرمانے والا ہے تو تم نے ان کو مذاق بنایا، یہاں تک کہ ان کے ساتھ تمھارے اس شغل نے تم کو میری یاد سے غافل رکھا اور تم ان کی ہنسی اڑاتے رہے۔ آج میں نے ان کی استقامت کا صلہ دیا کہ وہی کامیاب ہونے والے بنے۔ ۹۹-۱۱۱

کہنے والا کہے گا، سالوں کے حساب سے زمین میں کتنی مدت رہے ہو گے! کہیں گے ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصّہ، یہ بات شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجیے۔ کہنے والا کہے گا تم تو بس تھوڑی

ہی مدت رہے۔ کاش تم اس بات کو جانتے ہوتے! ۱۱۲-۱۱۴

تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بس یوں ہی بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے! تو بڑی ہی برتر ذات ہے اللہ، بادشاہِ حقیقی کی، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، عرشِ کریم کا مالک۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور اِلٰہ کو بھی پکارے گا، جس کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، تو اس کا حساب اس کے رب کے ہاں ہوگا اور کافر فلاح نہیں پائیں گے! اور دعا کرو کہ اے رب! مجھے بخش اور مجھ پر رحم فرما اور تو بہترین رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۱۵-۱۱۸

۱۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ۝ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۹۳-۹۴)

وعدۂ عذاب کے باب میں پیغمبر کو بشارت

رسول کی تکذیب کی صورت میں قوم پر جو عذاب آیا کرتا ہے، قریش کے متکبرین کو جب اس سے ڈرایا جاتا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرتے کہ اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لاؤ۔ ان کے اس مطالبہ کا جواب قرآن نے جگہ جگہ دیا ہے۔ مثلاً سورۂ یونس میں ہے۔ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ۔ ۴۶ (اور یا تو ہم تمھیں دکھا دیں گے اس عذاب کا کچھ حصہ یا تم کو وفات دیں گے اور ان کی واپسی ہماری ہی طرف ہوگی) اسی طرح سورۂ رعد میں فرمایا ہے۔ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ۔ ۴۰ (اور یا تو ہم اس عذاب کا کچھ حصہ تم کو دکھا دیں گے جس سے ان کو آگاہ کر رہے ہیں یا تم کو وفات دیں گے اور تمھارے اوپر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، محاسبہ ہمارے ذمہ ہے) بعینہٖ یہی مضمون سورۂ غافر کی آیت ۷۷ میں بھی ہے۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک مکذبین کے لیے وعدۂ عذاب کا تعلق ہے وہ تو قطعی ہے۔ رہا اس کے ظہور کا وقت کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں ظہور میں آئے گا یا آپ کی وفات کے بعد تو اس سوال کے جواب کو ان آیات میں مبہم چھوڑ دیا گیا تھا لیکن آیتِ زیرِ بحث اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے غلبہ و نصرت کے ظہور کا وقت اب بالکل قریب ہے، یہ بات آپ کی حیاتِ مبارک ہی میں واقع ہوگی اور اس کا لازمی نتیجہ آپ کے دشمنوں کی ہلاکت بھی ہے۔ یہ اشارہ یوں نکلتا ہے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا تلقین کی گئی ہے کہ دعا کرو کہ اے رب اگر تو اس عذاب کو میری زندگی ہی میں ان ظالموں پر لانے والا ہے جس سے ان کو

ڈرایا جاتا رہا ہے تو مجھے اپنے دامنِ رحمت کے نیچے رکھیو، ان ظالموں میں شامل نہ کیجیو۔ اس دعا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو بشارت اور آپ کے مکذبین کے لیے جو آخری انذار ہے وہ بالکل واضح ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ آپ کے اعداء آپ کی زندگی ہی میں پامال ہو گئے اور آپ جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کا اعلان کر کے تشریف لے گئے۔

وَإِنَّا عَلَىٰٓ أَن نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقَٰدِرُونَ (۹۵)

ناسازگار حالات کے علی الرغم اللہ کا ارادہ پورا ہوگا

یہ اسی بشارت کو، جو اوپر والی آیت میں مضمر ہے، مؤکد فرمایا ہے۔ اس لیے کہ اس دور میں ابھی حالات بہت ناسازگار تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ معاندین کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر گھر سے ہجرت پر مجبور ہو رہے تھے۔ یہ باور کرنا کچھ آسان نہیں تھا کہ اسی تاریکی کے اندر سے عنقریب روشنی پیدا ہونے والی ہے۔ اس تردد کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اس بات پر پوری طرح قادر ہیں کہ تمہاری زندگی ہی میں تمہارے دشمنوں کو پامال کر دیں۔ حالات ہمارے ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتے!

ہجرت کی طرف اشارہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دعا کی تلقین صرف اس عذاب کی شدت کو نہیں ظاہر کر رہی ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ اس میں ہجرت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ اے رب اگر یہ عذاب میری زندگی ہی میں آنے والا ہے تو اس کے آنے سے پہلے پہلے میری اور میرے باایمان ساتھیوں کی نجات کی راہ کھول۔ گویا دعا کے اسلوب میں آپ کو یہ بشارت بھی دے دی گئی کہ اس عذاب سے محفوظ رکھنے کا سامان آپ کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے کر لیا ہے۔

ٱدْفَعْ بِٱلَّتِى هِىَ أَحْسَنُ ٱلسَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ (۹۶)

عفو و درگزر کی ہدایت

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر اور عفو و درگزر کی تلقین ہے کہ ان کے برے سلوک کا جواب بدستور اپنے اچھے سلوک سے دیتے رہو۔ جو بیہودہ مرائیاں اور بدتمیزیاں یہ کر رہے ہیں ہم ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی ایک ایک شرارت کا مزہ ہم ان کو چکھائیں گے، تم ان کے رویہ سے دل گرفتہ نہ ہو۔ ان کا معاملہ ہمارے اوپر چھوڑ دو۔ اب فیصلہ کا وقت قریب ہے۔

وَقُل رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَٰتِ ٱلشَّيَٰطِينِ ۝ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَن يَحْضُرُونِ (۹۷-۹۸)

حصولِ صبر و عفو و درگزر کی دعا

یہ حصولِ صبر و عفو و درگزر کی دعا تلقین فرمائی گئی ہے۔ 'شیطان' سے مراد شیاطین جن بھی ہیں جو دلوں میں وسوسہ اندازی کرتے ہیں اور وہ شیاطین انس بھی جن کا رویہ یہاں زیرِ بحث ہے۔ فرمایا کہ برابر یہ دعا کرتے رہو کہ اے رب مجھے شیاطین جن کے وسوسوں سے بھی محفوظ رکھ اور ان شیاطین انس سے بھی محفوظ رکھ کہ وہ میرے پاس بحث و جدال اور شر و فساد کے لیے نہ آئیں۔

حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءَ أَحَدَهُمُ ٱلْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ٱرْجِعُونِ ۝ لَعَلِّىٓ أَعْمَلُ صَٰلِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ۚ كَلَّآ ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۖ وَمِن وَرَآئِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ (۹۹-۱۰۰)

کفار کی بدمزگی وقت حسرت

یعنی یہ لوگ اپنی ان شرارتوں سے باز آنے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آدھمکے گی اور اس عالم کے احوال و معاملات سے سابقہ پیش آئے گا تب ان کی آنکھیں کھلیں گی۔ اس وقت بڑی لجاجت سے درخواست کریں گے کہ اے رب! مجھے ایک بار دنیا میں پھر جانے دے تاکہ جو مال و متاع وہاں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں جا کر کچھ نیکی کما لوں۔ کَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا فرمایا کہ یہ بات ہرگز ہونے والی نہیں ہے۔ بس یہ ایک بات ہوگی جو بڑی حسرت کے ساتھ وہ کہے گا لیکن اس کی اس حسرت کے پورے ہونے کا وقت گزر چکا ہوگا۔ عمل کی مہلت بس اس دنیا کی زندگی تک ہے۔ اس مہلت حیات کے ختم ہونے کے بعد ان کے آگے ایک پردہ ہوگا جو اسی دن اٹھے گا جس دن وہ حساب و کتاب کے لیے اٹھائے جائیں گے۔ اس ٹکڑے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بات وہ کہنے کو تو کہے گا لیکن اگر اس کو دنیا میں پھر بھیج دیا جائے تو وہ کرے گا وہی جو کرتا رہا ہے۔ قرآن میں اس مفہوم کے لیے نظیر موجود ہے لیکن یہاں ہمارے نزدیک وہی مفہوم ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے۔ اس کے نہایت واضح نظائر آخری گروپ کی سورتوں میں موجود ہیں۔

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ (۱۰۱)

قیامت کے دن کی نفسی نفسی

یہ قیامت کے دن کی نفسی نفسی کی تصویر ہے کہ اس دن نہ کسی کا نسب کچھ کام آئے گا اور نہ وہ ایک دوسرے سے طالب مدد ہو سکیں گے۔ 'تَسَآءُل' کے معنی آپس میں ایک دوسرے سے طالب مدد ہونا ہے۔ مصیبت کے وقت میں نسبی و خاندانی عصبیت اور قومی و قبائلی تعاون و تناصر اس دنیا میں بڑا سہارا ہے اور عرب میں اس چیز کو خاص طور پر بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں اپنے خاندان یا قبیلہ کی دہائی پکار دیتا تو اس کے قبیلہ کا ہر شخص اس کی حمایت میں کٹ مرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ فرمایا کہ صور پھونکے جانے کے بعد سارے نسب ختم ہو جائیں گے اور کوئی ایک دوسرے سے نہ طالب مدد ہو سکے گا اور نہ کوئی کسی کی مدد کر سکے گا۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِیْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِیْهَا كٰلِحُوْنَ (۱۰۲-۱۰۴)

اس دن کسی کا حسب نسب کچھ کام نہیں آئے گا بلکہ صرف اس کا عمل کام آئے گا۔ جن کے پلے بھاری ہوں گے وہ تو کامیاب ہوں گے اور جن کے پلے ہلکے ہوئے وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں رکھا، وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم میں پڑیں گے۔ اس جہنم میں ان کا حال یہ ہوگا کہ آگ ان کے چہروں کو جھلسے گی اور وہ منہ بسورے ہوئے ہوں گے۔

اَلَمْ تَكُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّیْنَ ۝ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ (۱۰۵-۱۰۷)

کفار کی فریاد اور اس کا جواب

یعنی جب وہ چیخیں چلائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ جواب ملے گا کہ اب کیوں روتے چلاتے

ہو، اس دن سے آگاہ کرنے کے لیے جب تم کو ہماری آیتیں سنائی جاتی تھیں تب تو تم ان کی تکذیب کرتے تھے! وہ اعتراف کریں گے کہ اے رب! یہ ہماری بدبختی اور شقاوت تھی جو ہم پر چھائی رہی کہ ہم نے اس دن کی تکذیب کی، بلاشبہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے ہیں لیکن اے ہمارے رب، ایک بار اور ہمیں موقع دے۔ اگر ہم پھر یہی کچھ کریں تو لاریب ہم اسی کے سزاوار ہیں۔

قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ (۱۰۸)

لفظ 'خَسَأ' کتے کو دھتکارنے کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی اس التجا کا یہ جواب ملے گا کہ چلو دفع ہو! اسی میں پڑے رہو اور اب مجھ سے کوئی بات نہ کرو۔

إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ۝ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا حَتَّىٰ أَنسَوْكُمْ ذِكْرِي وَكُنتُم مِّنْهُمْ تَضْحَكُونَ ۝ إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ (۱۰۹-۱۱۱)

غربائے مسلمین کی دلداری

یہ اس غیرت کا بیان ہے جس کے سبب سے خدا نے بطور ان اشقیا کو بات کرنے سے روک دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اب تم میرے آگے زبان نہ کھولو، تم وہ شقی اور بدبخت لوگ ہو کہ جب میرے بندوں کی ایک جماعت میرے آگے 'رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ' کی دعا کرتی تھی تو تم نے ان کو مذاق بنا رکھا تھا اور اس شغل مذاق میں اس طرح تم منہمک رہے کہ تمھیں یہ بات یاد بھی نہ رہی کہ کبھی مجھ سے بھی تمھیں سابقہ پڑنے والا ہے اور تم پوری جسارت کے ساتھ ان کی ہنسی اڑاتے رہے تو آج میں نے ان کی صبر و استقامت کا ان کو صلہ دیا، اب وہ فائز المرام ہیں اور تم یہ بھاڑ جھونکو اور اسی میں جلو!

'فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي' میں لفظ 'فریق' اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں اس سے مراد خاص طور پر غربائے مسلمین ہیں جو اپنی غریبی اور بے کسی کے سبب سے متمردین قریش کے ظلم و ستم اور ان کے مذاق و استہزا کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ وہ تو مجھ سے مغفرت اور رحمت کی دعا کرتے تھے اور تم ان کی دعا اور نماز کو اپنی رعونت کے سبب سے ایک شغل تفریح بنائے ہوئے تھے۔ 'سِخْرِي' اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں جس کو ایک کھلونا اور مذاق بنایا جائے۔ کسی کو مذاق بنانا بجائے خود ایک بہت بڑی رعونت ہے اور یہ رعونت دہ چند ہو جاتی ہے اگر کوئی شقی اس کی دعا اور نماز کا مذاق اڑائے اس لیے کہ اس صورت میں وہ صرف اسی کا مذاق نہیں اڑاتا بلکہ خود خدا کا بھی مذاق اڑاتا ہے۔

'حَتَّىٰ أَنسَوْكُمْ ذِكْرِي' یعنی اس شغل تفریح میں تم ایسے منہمک رہے کہ کبھی تمھیں یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ کوئی تمھارا خدا بھی ہے جو تمھاری ان حرکتوں کو، جو تم اس کے ذاکر و شاغل اور صابر و شاکر بندوں کے ساتھ کر رہے ہو، دیکھ رہا ہے اور ایک دن وہ ضرور ان میں سے ایک ایک چیز کا انتقام لے گا۔

'إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ' یعنی اب آنکھیں کھول کر دیکھ لو، وہ چیز تمھارے سامنے موجود ہے جس کو تم نے بھلائے رکھا۔ تمھارے تمام ظلم و ستم اور مذاق و تمسخر کے علی الرغم میرے جو بندے

یری بندگی پر جمے رہے میں نے آج ان کو ان کی استقامت کا بھرپور صلہ دے دیا۔' اَنَّھُمْ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ' یہ اس جملہ کی تفصیل ہے کہ وہی کامیاب ہونے والے بنے جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ ان کا مذاق اڑانے والے نامراد ہوئے۔ یہاں اس سورہ کی پہلی آیت 'قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خٰشِعُوْنَ' کو ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ جس بات سے سورہ کا آغاز ہوا تھا اب اسی پر سورہ کا اختتام ہو رہا ہے۔ یہ عود علی البدء کا اسلوب قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے اور نظم قرآن کے نہایت واضح دلائل میں سے ہے۔

غور کیجیے، ان آیات کا ان غربائے مسلمین پر کیا اثر پڑا ہو گا جو اس دور میں متکبرین کے ظلم اور تمسخر کا ہدف بنے ہوئے تھے ان کے صبر و عزیمت کو رب غیور کی اس دلداری سے کتنی غذا اور قوت حاصل ہوئی ہوگی!

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِی الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِیْنَ ۝ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْــَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ۝ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۱۲-۱۱۴)

طول حیات کا مغالطہ

اب یہ واضح فرمایا کہ ظہور قیامت کو یہ جو بہت بعید چیز سمجھے ہوئے اس مغالطہ میں ہیں کہ اگر وہ آئی بھی تو اس کے آنے میں ابھی اتنی دیر ہے کہ ابھی سے اس کی فکر میں اپنا عیش مکدر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ مغالطہ بہت جلد دور ہو جائے گا۔ نفخ صور کے بعد جب یہ اٹھیں گے تو ان کو محسوس ہو گا کہ جس زندگی کو وہ بہت طویل سمجھے ہوئے تھے وہ پلک جھپکتے ختم ہو گئی۔

'قٰلَ' کا فاعل یہاں اللہ تعالیٰ یا کوئی فرشتہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ یہ 'قَالَ قَآئِلٌ' کے مفہوم میں ہے۔ یعنی قیامت کو جب یہ اٹھیں گے تو انھیں میں سے کوئی پوچھنے والا پوچھے گا کہ بھلا بتاؤ، دنیا میں ہم کتنی مدت رہے ہوں گے؟ دوسرے جواب دیں گے کہ بس ایک دن یا ایک دن سے بھی کچھ کم۔ 'فَسْــَٔلِ الْعَآدِّيْنَ'۔ یہ جواب دینے والوں کی طرف سے بیزاری کا اظہار ہو گا کہ بھلا کسی کو کیا پتہ کہ ہم دنیا میں کتنے دن رہے، اگر کسی نے اس کا شمار رکھا ہو تو اس سے جا کے پوچھو! یعنی آج جس زندگی کے طول اور اس کے عیش پر ریجھے ہوئے ہیں۔ ایک دن آنے والا ہے جب اس کے متعلق کوئی سوال بھی طبیعت پر نہایت گراں گزرے گا۔ 'قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ'۔ یہ بھی انہی میں سے کسی کی بات ہو گی جس میں کچھ ملامت و حسرت کا مفہوم بھی ہے، یعنی دنیا میں تم رہے تو بہت کم لیکن اس کو جاننے اور سمجھنے کا وقت وہ تھا جب تم دنیا میں تھے، اب تو اس کا وقت گزر چکا ہے۔

یہی مضمون سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۰۲-۱۰۴ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں یہ تصریح ہے کہ یہ باتیں انہی کے درمیان آپس میں ہوں گی۔ 'يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا' (وہ آپس میں سرگوشی کریں گے کہ بس تم ایک عشرہ دنیا میں رہے ہو گے) اسی سلسلہ میں ان کے سب سے زیادہ دانا و بینا کی یہ بات بھی نقل ہوئی ہے کہ 'اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا' (جب کہ ان میں جو سب سے زیادہ ہوش و گوش والا ہو گا کہے گا کہ بس تم ایک دن دنیا میں رہے ہو گے) میرے نزدیک آیات زیر بحث میں بھی آخری قول ان کے 'اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً' کا نقل ہوا ہے۔

سورۂ کہف آیت ۱۹ میں اصحاب کہف کا طویل نیند سے اٹھنے کے بعد جو مکالمہ مذکور ہوا ہے اور جو درحقیقت مثال ہے عالم برزخ کے بعد کی زندگی کی، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال و جواب ان کے اپنے ہی درمیان ہوگا۔ یہ ایک حقیقت ہے، جس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ غفلت کی زندگی کا سارا طول و عرض صرف اس وقت تک وسیع ہوتا ہے جب تک وہ حاصل رہتی ہے، جب گزر جاتی ہے تو بس ایک خواب معلوم ہوتی ہے!

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (۱۱۵)

جزاء و سزا صفات الٰہی کا لازمی تقاضا ہے

یعنی اگر تم جزا و سزا سے بے پروا بیٹھے ہو تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو یوں ہی بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم اسی طرح شتر بے مہار چھوٹے پھرو گے اور ایک دن مر جاؤ گے اور تمھاری واپسی ہماری طرف نہیں ہونی ہے! مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے یہ سمجھا ہے تو یہ تم نے بہت ہی غلط سمجھا ہے۔

فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ (۱۱۶)

یہ اپنی صفات کی یاد دہانی فرمائی ہے جس سے مقصود اس مغالطہ کی تردید ہے جس میں جزا و سزا کے یہ منکرین مبتلا تھے۔ فرمایا کہ خدا کی ذات بہت ہی بلند و برتر ہے۔ اس بلند و برتر ہستی کی شان سے یہ بات نہایت بعید ہے کہ وہ کوئی کارِ عبث کرے اور محض کھیل تماشہ کے طور پر ایک پورا جہان پیدا کر ڈالے۔ وہ 'اَلْمَلِكُ الْحَقُّ' یعنی اس کائنات کا بادشاہ حقیقی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنی رعیت کے درمیان عدل و انصاف نہ کرے اور ظالم و مظلوم دونوں کو یکساں کر دے۔ 'لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ' یعنی اس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے کہ کوئی اس مغالطہ میں رہے کہ اس کی پکڑ سے وہ کسی دوسرے کی سعی و سفارش سے اپنے کو بچا لے جائے گا۔ 'رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ' 'عرش' خدا کی حکومت کی تعبیر ہے اور لفظ 'کریم' قرآن میں باعزت اور بافیض کے معنی میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ایک باعزت اور بافیض عرش کا خداوند ہے تو اس کی حکومت ایک اندھیر نگری کس طرح ہو سکتی ہے!

وَمَن يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِندَ رَبِّهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ (۱۱۷)

یہ اوپر والے توحید کے مضمون کی مزید وضاحت فرما دی کہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی اس کی عبادت میں شریک کرے گا، جب کہ کسی شریک کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے، تو وہ یاد رکھے کہ خدا کے آگے اس کو ایک دن اس کا حساب دینا ہوگا۔ اور یہ امر بھی وہ یاد رکھے کہ جو لوگ خدا کا کسی کو شریک ٹھہرائیں گے وہ کافر ہیں اور کافر فلاح نہیں پائیں گے۔ 'قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ' سے یہ سورہ شروع ہوئی تھی اور 'لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ' پر ختم ہوگئی۔

وَقُل رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ (۱۱۸)

دعا کے پیرایہ میں اہل ایمان کو تسکین نصرت کی بشارت

یہ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے آپ کے ساتھیوں کو طلب مغفرت و رحمت کی دعا تلقین فرمائی گئی ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ دعا وہی ہے جس کا حوالہ آیت ۱۰۹ میں گزر چکا ہے اور جس کا منکرین مذاق اڑاتے تھے۔ اس دعا کی تلقین سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اپنے اسی موقف پر ڈٹے رہو اور

یہی دعا کرتے رہو۔ یہی تمھارے لیے مغفرت و رحمت کے دروازے کی کلید ہے۔ یہ دعا کے اسلوب میں اہل ایمان کے لیے فتح و نصرت کے ظہور کی بشارت ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ اللھم اغفر وارحم وانت خیر الراحمین۔

رحمان آباد
۱۰ر اگست ۱۹۷۳ء

تدبرِ قرآن

۲۴

النّور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱- سورہ کا محل و مقام، عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ اس گروپ کی آخری سورہ ہے — یہ مدنی ہے۔ اس کی حیثیت سابق سورہ —— سورۂ مؤمنون —— کے تکملہ اور تتمہ کی ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ اس کی کوئی مثنیٰ سورہ نہیں ہے۔ ہم مقدمہ میں ذکر کر چکے ہیں کہ جو سورتیں اپنی سابق سورہ کے تکملہ و تتمہ کی حیثیت رکھتی ہیں وہ گویا سابق سورہ ہی کا جزو ہوتی ہیں اس وجہ سے ان کے ساتھ ان کے کسی جوڑے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی مثالیں آگے بھی آئیں گی۔

یہاں سورۂ مؤمنون کی آیات ۱ — ۱۱ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ وہاں بیان ہوا ہے کہ خدا کے ہاں فوز و فلاح ان اہل ایمان کے لیے ہے جن کی نمازوں میں خضوع و خشوع ہے، جو لغویات سے احتراز کرنے والے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے اور اپنے شہوانی جذبات پر پورا قابو رکھتے ہیں، ان سے مغلوب ہو کر خدا کے مقرر کردہ حدود و قیود کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول و قرار کا پاس و لحاظ رکھنے والے ہیں۔

جب تک مسلمان مکہ میں رہے ایمان کے یہ اثرات اور تقاضے ظاہر ہے کہ ان کی انفرادی زندگیوں ہی میں ابھر سکتے تھے اس لیے کہ مکہ میں ان کی کوئی اجتماعی تنظیم نہیں تھی لیکن ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ میں مجتمع ہو گئے اور ان کی ایک اجتماعی و سیاسی تنظیم بھی وجود میں آگئی تب وقت آیا کہ اس ایمان کے تقاضے معاشرتی و سیاسی زندگی میں بھی نمایاں ہوں۔ چنانچہ جس رفتار سے حالات سازگار ہوتے گئے معاشرہ کی اصلاح و تطہیر کے احکام نازل ہوئے اور ایمان کی اس نورانیت کی جگمگاہٹ، جو اب تک صرف افراد تک محدود تھی، ایک پوری ہیئت اجتماعی پر ضوفگن ہوئی۔

سورۂ نور اسی سلسلہ کی ایک سورہ ہے جس میں وقت کے خاص حالات کے مطابق اہل ایمان کو ان احکام و ہدایات سے آگاہ کیا گیا ہے جو ان کے نو تشکیل معاشرے کو ایمان کے تقاضوں سے منور کرنے اور منافیٔ ایمان مفاسد سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھے۔

اب ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ عمود کے ساتھ اس کے اجزاء کی مطابقت واضح ہو جائے۔

ب ۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ - ۳) جرم زنا کی سزا کا بیان اور مسلمان کے لیے کسی زانیہ یا مشرکہ سے اور کسی مومنہ کے لیے کسی زانی یا مشرک سے نکاح کی ممانعت۔

(۴ - ۵) قذف کی سزا اور اس کے لیے شہادت کا قانون۔

(۶ - ۱۰) اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لیے شریعت کی مطلوبہ شہادت پیش نہ کر سکے تو اس کا فیصلہ فریقین کی قسم سے ہوگا۔ اس قسم کے طریقہ کی وضاحت۔

(۱۱ - ۲۶) فتنۂ افک کی طرف ایک اجمالی اشارہ اور اس کے تعلق سے ان رخنوں کا سدِباب جو معاشرہ کی تباہی کا سبب ہو سکتے تھے۔ جن منافقین نے یہ فتنہ اٹھایا ان کی پردہ دری اور ان کو وعید۔ جن مسلمانوں نے اس معاملہ میں بے پروائی اور سہل انگاری سے نادانستہ منافقین کے مقصد کو تقویت پہنچائی ان کو تنبیہ کہ وہ آئندہ ان منافقین سے ہوشیار رہیں۔ یہ منافقین مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ کو مجروح کرنے کے درپے ہیں اس وجہ سے مسلمانوں کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ ایک دوسرے کے عزت و ناموس سے متعلق جو بات کوئی ان کے کان میں ڈال دے اس کو لے اڑیں بلکہ انھیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا چاہیے اور کسی کے باب میں کوئی الزام اس وقت تک قبول نہیں کرنا چاہیے جب تک اس کا ثبوت موجود نہ ہو۔

(۲۷ - ۳۱) اگر کسی مسلمان کو اپنے کسی دوسرے بھائی کے گھر میں جانے کی ضرورت پیش آئے تو وہ چند معین ضابطوں کی پابندی کرے تاکہ گھروں کے اندر بدنگاہی اور شیطان کو دراندازی کی راہ نہ ملے۔ ان ضابطوں کی وضاحت اور اس صورت میں گھر کی خواتین پر جو پابندیاں شریعت نے عائد کی ہیں ان کی تفصیل۔

(۳۲ - ۳۴) عقدِ بیوگان اور لونڈیوں غلاموں کے نکاح کی تاکید تاکہ معاشرہ شیطان کی رخنہ اندازیوں سے محفوظ رہے۔ غلاموں کو آزادوں کی سطح پر لانے اور غلامی کو ختم کرنے کے لیے مکاتبت کی ہدایت اور مکاتبت کے طلبگار غلاموں کی مالی امداد کی تاکید۔ نیز لونڈیوں سے پیشہ کرانے کی شدت سے ممانعت۔

(۳۵ - ۴۰) ایمان اور کفر کی تمثیل جس میں واضح فرمایا ہے کہ جس دل کے اندر ایمان ہوتا ہے اس کا ظاہر اور باطن دونوں مطلع انوار بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس نورِ ایمان سے محروم ہوتے ہیں ان کے اندر اور باہر گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا رہتا ہے۔

(۴۱ - ۴۶) آفاق کے دلائل کی روشنی میں ایمان کی دعوت کہ اس کائنات میں معبودِ حقیقی صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ ہر چیز صرف اسی کی حمد و تسبیح کرتی ہے اس وجہ سے انسانوں کا بھی فرض ہے کہ اسی خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ پر ایمان لائیں، اس کی عبادت و اطاعت میں کسی اور کو شریک کر کے اپنے آپ

کر اس کے غضب کا مستحق نہ بنائیں۔

(۴۷ - ۵۴) منافقین کو تنبیہ کہ ان کی یہ منقسم وفاداری کی پالیسی چلنے والی نہیں ہے کہ اپنے مفاد کے حد تک تو وہ خدا اور رسول کا کلمہ پڑھیں اور اگر کوئی بات ان کو اپنے مفاد کے خلاف نظر آئے تو خدا اور رسول کو چھوڑ کر اپنی من مانی کریں۔ اگر فوز و فلاح مطلوب ہے تو یکسوئی کے ساتھ رسول کا ساتھ دیں ورنہ جس وادی میں بھٹکنا چاہتے ہیں اس میں بھٹکتے پھریں، خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے اور یہ بھی یاد رکھیں کہ اصل چیز ایمان و اطاعت ہے، جھوٹی قسموں سے رسول کو چکمہ دینے کی کوشش نہ کریں۔ رسول کا کام اللہ کے دین کو پہنچا دینا تھا، وہ اس نے پہنچا دیا۔ اب لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے انجام کو اچھی طرح سوچ لے۔

(۵۵ - ۵۷) رسول کے راستباز ساتھیوں کو نہایت واضح الفاظ میں زمین کی خلافت کی بشارت کہ تمہارے مخالفین اور دین کے اعداء تمہارا یا تمہارے دین کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ تم نماز کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور پوری دل جمعی کے ساتھ رسول کی اطاعت پر جمے رہو، جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خوف کی حالت کو امن و اطمینان سے بدل دے گا۔

(۵۸ - ۶۱) پیچھے آیات ۲۷ - ۳۱ میں گھروں کے اندر کے پردے سے متعلق جو ہدایات دی گئی ہیں، بعد میں انہی سے متعلق کچھ سوالات پیدا ہوئے۔ ان آیات میں ان کے جواب دیے گئے ہیں اور ان کے ساتھ یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ آیات لوگوں کے سوالوں کے جواب میں بعد میں نازل ہوئی ہیں۔

(۶۲ - ۶۴) خاتمۂ سورہ ــــ توضیحی آیات کے بعد اصل سلسلۂ کلام، اطاعتِ رسول سے متعلق، جو آیت ۵۰ میں گزرا پھر سامنے آ گیا اور اسی اہم مضمون پر یہ عظیم سورہ ختم ہوئی ہے۔ اس خاتمہ میں مسلمانوں کو عموماً اور منافقین کو خصوصاً متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ کا رسول جب کسی اجتماعی کام کے لیے تمہیں بلائے تو اس کے بلانے کو کسی عام شخص کا بلانا نہ سمجھو کہ جی چاہا گئے، جی چاہا نہ گئے اور گئے بھی تو جب جی چاہا اٹھ کے چل دیے۔ بلکہ ضرور جاؤ اور جب تک اجازت نہ ملے اس وقت تک وہاں سے نہ اٹھو۔ اسی اطاعت میں تمہاری دین و دنیا کی فلاح کا راز مضمر ہے۔

اس تجزیہ مطالب سے عمود کے ساتھ اس سورہ کے اجزاء کا تعلق اچھی طرح واضح ہو گیا ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

سُورَةُ النُّورِ (۲۴)

مَدَنِيَّةٌ ______ آيَاتُهَا (۶۴)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

سُورَةٌ أَنزَلْنَاهَا وَفَرَضْنَاهَا وَأَنزَلْنَا فِيهَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لَّعَلَّكُمْ آیات ۱-۱۰
تَذَكَّرُونَ ﴿۱﴾ الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ
مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ
إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا
طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲﴾ الزَّانِي لَا يَنكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ
مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ
ذَٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳﴾ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ
يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا
لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۴﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا
مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا ۚ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۵﴾ وَالَّذِينَ
يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُن لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ
أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ ۙ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۶﴾ وَالْخَامِسَةُ
أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿۷﴾ وَيَدْرَأُ عَنْهَا

الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۙ﴿۸﴾
وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۹﴾ وَلَوْ
ع لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱-۱۰

یہ ایک اہم سورہ ہے جو ہم نے نازل کی ہے اور اس کے احکام ہم نے فرض ٹھہرائے ہیں اور اس میں ہم نے نہایت واضح تنبیہات بھی اتاری ہیں تاکہ تم اچھی طرح یاد رکھو۔ ۱

زانی عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو اور خدا کے قانون کی تنفیذ کے معاملے میں ان کے ساتھ کوئی نرمی تمھیں دامن گیر نہ ہونے پائے اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر سچا ایمان رکھتے ہو اور چاہیے کہ ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ موجود رہے۔ ۲

زانی نہ نکاح کرنے پائے مگر کسی زانیہ یا مشرکہ سے اور کسی زانیہ سے نکاح نہ کرے مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اور اہلِ ایمان پر یہ چیز حرام ٹھہرائی گئی ہے۔ ۳

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں، پھر اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ نہ پیش کریں تو ان کو اسّی کوڑے مارو اور ان کی کوئی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ یہی لوگ اصلی فاسق ہیں۔ جو لوگ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں گے تو اللہ مغفرت فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں اور ان کے پاس ان کی ذات کے سوا کوئی گواہ نہ ہو تو ان کی گواہی کا طریقہ یہ ہے کہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ وہ سچے ہیں اور پانچویں بار یہ کہیں کہ ان پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹے ہوں۔ اور عورت سے سزا کو یہ چیز دفع کرے گی کہ وہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب

ہو اگر یہ شخص سچا ہو۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کا کرم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ توبہ قبول فرمانے والا اور صاحبِ حکمت ہے تو تم اس کی پکڑ میں آجاتے۔ ۴-۱۰

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۱)

سورہ کی اہمیت کا اظہار

یہ سورہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سورۂ مومنون کے تکملہ و تتمہ کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے بغیر کسی خاص تمہید کے محض ایک تنبیہ سے شروع ہوگئی ہے۔ حذفِ مبتدا، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، اس بات کا قرینہ ہے کہ مقصود مخاطب کی ساری توجہ کو خبر پر مرکوز کرانا ہے جس سے اس سورہ کی اہمیت و عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی یہ ایک عظیم سورہ ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے۔ 'ہم نے نازل کیا ہے' یعنی اس کو کوئی معمولی چیز اور ہوائی بات نہ سمجھو بلکہ یہ ہمارا اتارا ہوا کلام اور ہمارا نازل کردہ فرمان ہے اس وجہ سے اس کی ہر بات کی تعمیل ہمارے فرمانِ واجب الاذعان کی حیثیت سے کی جائے۔ 'وَفَرَضْنٰهَا' یعنی اس میں جو احکام و ہدایات ہیں ان کی حیثیت فرائض کی ہے، سب بے چون و چرا ان کی اطاعت کریں، کسی معاملہ میں سہل انگاری و بے پروائی کو راہ نہ پانے دیں۔

سورہ کی تنبیہات کی طرف اشارہ

'وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ' یہ ان تنبیہات کی طرف اشارہ ہے جو اس سورہ میں احکام و ہدایات کے بیان کے ساتھ ساتھ مقطع کی طرح بار بار وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہوں آیات ۱۰، ۱۴، ۱۷، ۲۰، ۳۴، ۴۶ اور ۵۰۔ ان تنبیہات کا مشترک مقصود یہ ہے کہ یہ احکام جو دیے جا رہے ہیں پورے اہتمام کے ساتھ ان کی پابندی کرو ورنہ یاد رکھو کہ خدا کی پکڑ بڑی ہی سخت چیز ہے۔ اس سورہ میں ان تنبیہات کی ضرورت خاص طور پر اس وجہ سے تھی کہ اس میں خاندان و معاشرہ اور تعزیرات و حدود سے متعلق جو احکام دیے گئے ہیں وہ پچھلی امتوں کے لیے مزلۂ قدم ثابت ہوئے جس کے سبب سے وہ امتیں خدا کے عتاب میں آئیں۔ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا عظیم فضل و احسان ہے کہ اس نے احکام کے ساتھ ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے بھی بار بار آگاہ فرما دیا تاکہ لوگ اچھی طرح بیدار و ہوشیار رہیں۔ 'لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ' سے اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲)

زنا کی سزا

معاشرے کے انتشار و فساد میں سب سے زیادہ دخل زنا کو ہے اس لیے کہ معاشرہ کے استحکام کا

انحصار رحمی رشتہ کی پاکیزگی اور اس کے ہر قسم کے اختلال و فساد سے محفوظ ہونے پر ہے اور زنا اس رشتہ کی پاکیزگی کو ختم کر کے معاشرے کو صنفی انتشار کی راہ پر ڈال دیتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ پورا معاشرہ ایک پاکیزہ معاشرہ کے بجائے ڈھوروں ڈنگروں کا ایک گلہ بن کے رہ جاتا ہے۔ یہ اختلال و انتشار چونکہ صالح تمدن کی بنیاد کو اکھاڑ دینے والا ہے اس وجہ سے تمام آسمانی مذاہب میں زنا کو ایک مستوجب سزا جرم قرار دیا گیا ہے۔ اسلام نے بھی بالکل پہلے ہی مرحلہ سے اس انتشار کو روکنے کے لیے احکام دیے۔ چنانچہ نساء کی آیات ۱۵-۱۶ میں اس سلسلہ کے ابتدائی احکام دیے گئے جب کہ حالات حدود و تعزیرات کے نفاذ کے لیے ابھی سازگار نہیں ہوئے تھے اور ساتھ ہی یہ اشارہ فرما دیا گیا کہ اس باب میں قطعی اور آخری احکام بعد میں نازل ہوں گے۔ چنانچہ اس آیت سے وہ وعدہ پورا ہو گیا۔ زانیہ اور زانی دونوں کے لیے یہ حکم ہوا کہ ان کو سو سو کوڑے مارے جائیں۔

تنفیذ حدود کے معاملہ میں مداہنت ایمان کے منافی ہے

'وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ' یہاں 'دین' سے مراد یہی حد ہے جو زنا کی بیان ہوئی ہے۔ یعنی اس کی تنفیذ کے معاملے میں کسی نرمی یا مداہنت یا چشم پوشی کو راہ نہ دی جائے۔ نہ عورت کے ساتھ کوئی نرمی برتی جائے نہ مرد کے ساتھ، نہ امیر کے ساتھ نہ غریب کے ساتھ۔ خدا کے مقرر کردہ حدود کی بے لاگ اور بے رُو رعایت تنفیذ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا لازمی تقاضا ہے۔ جو لوگ اس معاملے میں مداہنت اور نرمی برتیں ان کا اللہ اور آخرت پر ایمان معتبر نہیں ہے۔ یہاں یہ چیز بھی قابل توجہ ہے کہ سزا کے بیان میں عورت کا ذکر مرد کے ذکر پر مقدم ہے۔ اس کی وجہ جہاں یہ ہے کہ زنا عورت کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتا وہاں یہ بھی ہے کہ صنف ضعیف ہونے کے سبب سے اس کے معاملہ میں جذبۂ ہمدردی کے ابھرنے کا زیادہ امکان ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے یہاں اس کے ذکر کو مقدم کر دیا تاکہ اسلوب بیان ہی سے یہ بات واضح ہو جائے کہ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہے، عورت ہو یا مرد۔

حدود کے معاملہ میں یہود کی مداہنت

حدود کے معاملہ میں اس شدت کے ساتھ تاکید و تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ یہود نے اکثر حدود عملاً بالکل ساقط کر دیے تھے۔ زنا کی سزا ان کی شریعت میں رجم تھی لیکن عملاً صورت یہ تھی کہ اگر کوئی غریب اس جرم میں ماخوذ ہوتا تب تو اس پر یہ سزا نافذ کی جاتی لیکن کوئی امیر اس کا ارتکاب کرتا تو اس سے تعرض نہ کرتے۔ اور اب موجودہ زمانے میں تو یہ مستقل فلسفہ بن گیا ہے کہ جو لوگ جرائم کا ارتکاب

عصر حاضر کا فلسفہ اور اس کی برکات

کرتے ہیں وہ کسی ذہنی بیماری کے سبب سے کرتے ہیں اس وجہ سے وہ مستحق تربیت و اصلاح و ہمدردی کے ہیں نہ کہ کسی سخت سزا کے۔ اس فلسفہ کی یہ برکت ہے کہ خدا کی زمین گنڈوں اور بدمعاشوں سے بھر گئی ہے اور کسی شریف آدمی کی بھی جان اور عزت ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہ گئی ہے۔ آپ اپنے ہی ملک کو دیکھیے۔ اگر آپ اپنے قانون و امن کے ذمہ داروں کے سامنے زنا کی اس سزا کا ذکر کیجیے جو

اوپر مذکور ہوئی ہے تو، ایمان کے بلند بانگ دعووں کے باوجود، اس کو وحشیانہ کہیں گے اور اگر مصلحت کی وجہ سے وحشیانہ نہ کہیں تو بہرحال اس کو وحشیانہ سمجھتے ہیں لیکن ملک کی صورت حال یہ ہے کہ بلا مبالغہ سال میں ہزاروں جانیں اور آبروئیں نہایت بے دردی و بے رحمی کے ساتھ، بدمعاشوں کے ہاتھوں اس طرح برباد ہوتی ہیں کہ ان کی خبریں سرصبح کر اخباروں میں پڑھ پڑھ کر کلیجہ شق ہوتا ہے۔

چوروں اور زانیوں کے لیے تو ان حضرات کے جذبۂ رأفت و ہمدردی کا یہ حال ہے کہ یہ ان کے لیے گویا خدائے رحمان و رحیم سے بھی زیادہ مہربان بن گئے ہیں کہ ان کا ہاتھ کاٹنے اور ان کو کوڑے مارنے کے تصور سے ان کا دل کانپتا ہے لیکن ان چوروں اور بدمعاشوں کے ہاتھوں خاندان کے خاندان جو آئے دن قتل و نہب اور بے عزتی و بے ناموسی کا شکار ہو رہے ہیں ان کی مظلومیت پر ان کے دل ذرا نہیں پسیجتے!

اسلامی حدود و تعزیرات کی برکت

اگر یہ حضرات اپنے دعوائے ایمان کی لاج رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے تو کم از کم دنیا کے تجربات ہی سے کچھ سبق حاصل کریں۔ اسی روئے زمین پر نجد و حجاز اور یمن کی حکومتیں بھی ہیں۔ ان میں اسلامی حدود و تعزیرات نافذ ہیں۔ اس اعداد و شمار کے زمانے میں آسانی سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاں چوری، رہزنی، ڈکیتی اور زنا کے کتنے واقعات ہوئے اور کتنے چوروں کے ہاتھ کاٹے گئے اور کتنے زانیوں کے کوڑے لگائے گئے۔ میرے پاس اعداد و شمار تو نہیں ہیں لیکن عینی شاہدوں کے بیانات بھی میرے علم میں ہیں اور میرا ذاتی مشاہدہ بھی ہے کہ وہاں نہ جرائم کا وجود ہے نہ مجرموں کا۔ یہ صرف اسلامی حدود و تعزیرات کا دبدبہ ہے کہ وہاں نہ چوری اور زنا کے واقعات ہوتے ہیں نہ چوروں کے ہاتھ کاٹنے اور زانیوں کو کوڑے مارنے کی نوبت آتی ہے۔ اگر کبھی کبھار کوئی اکا دکا کوئی واقعہ پیش آ جاتا ہے تو مجرم کو اس کی جو سزا ملتی ہے عوام کی سبق آموزی کے لیے وہی کافی ہوتی ہے۔ اس کے مقابل میں جب ہم اپنے ملک کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو سیدنا مسیح کے الفاظ میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ "تم نے میرے باپ کے گھر کو چوروں اور ڈاکوؤں کا بھٹ بنا کے رکھ دیا ہے"

اسلامی حدود و تعزیرات کا ایک اہم مقصد

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اسلامی حدود و تعزیرات کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ ان سے دوسروں کو عبرت و موعظت حاصل ہو۔ چنانچہ قرآن میں ان کو 'نَكَالٌ' سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی عبرت انگیز سزا کے ہیں۔ اس مصلحت کا تقاضا یہ ہوا کہ یہ سزائیں پبلک میں، مسلمانوں کی ایک جماعت کی موجودگی میں دی جائیں۔ اگر یہ جیلوں کی کوٹھڑیوں میں چپ چپاتے دے دی جائیں تو ان کی یہ مصلحت فوت ہو جاتی ہے۔ 'طَآئِفَةٌ' کے معنی گروہ اور جماعت کے ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس لفظ کا اطلاق ایک شخص پر بھی ہوتا ہے۔ معلوم نہیں ان حضرات کی اس نادر تحقیق کا ماخذ کیا ہے!

آیت کے عموم پر فقہا کی بعض قیدیں اور ان کے باب میں ہمارا نقطۂ نظر

اس آیت کے ظاہر الفاظ کا جہاں تک تعلق ہے وہ تو ہر قسم کے زانی اور ہر قسم کی زانیہ کے لیے عام ہیں لیکن ہمارے فقہا نے اس عموم پر بعض قیدیں عاید کی ہیں جن میں سے بعض صحیح ہیں، بعض ہمارے نزدیک غلط ہیں اور بعض محتاج تفصیل ہیں۔ اگرچہ ہمارے لیے فقہی مباحث میں زیادہ گھسنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن بعض ضروری باتوں کی طرف اشارہ ناگزیر ہے۔

- ایک یہ کہ اس حد کے اجرا و نفاذ کے لیے دارالاسلام یا بالفاظ دیگر اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے نزدیک یہ شرط لازمی ہے۔ یہ احکام نازل ہی اس وقت ہوئے ہیں جب اسلامی حکومت مدینہ میں استوار ہو گئی ہے۔
- دوسری یہ کہ یہ حد صرف عاقل و بالغ پر نافذ ہوگی۔ نابالغ اور فاترالعقل اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ بات بھی بالکل بدیہی ہے۔ نابالغ اور مجنون ہر قانون میں مرفوع القلم سمجھے گئے ہیں۔
- تیسری یہ کہ غلام اور لونڈی پر صرف نصف حد جاری ہوگی۔ یہ بات بھی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس کی دلیل سورۂ نساء آیت ۲۵ میں موجود ہے۔ اصل یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں غلاموں کا عقلی و اخلاقی معیار اتنا پست ہو چکا تھا کہ ان کو یک بیک آزادوں کی صف میں نہیں لایا جا سکتا تھا اس وجہ سے ان کے معاملات میں اسلام نے ایک تدریج ملحوظ رکھی۔ یہاں تک کہ جب ان کی ذہنی و اخلاقی حالت بلند ہو گئی تو ان کے لیے مکاتبت کا وہ قانون نازل ہو گیا جو اسی سورہ میں آگے زیر بحث آئے گا۔ اس قانون کے بعد ہر ذی صلاحیت غلام کے لیے آزادی کی نہایت کشادہ راہ کھل گئی اور وہ حقوق اور ذمہ داریوں، دونوں میں، دوسروں کے ساتھ برابر کے شریک ہو گئے۔ آگے ہم اس مسئلہ کے بعض اہم پہلو واضح کریں گے۔
- چوتھی قید فقہا کے ایک گروہ نے یہ عاید کی ہے کہ یہ حد صرف مسلمان پر نافذ ہوگی، غیر مسلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ بات ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اسلامی حکومت میں غیر مسلم رعایا اپنے پرسنل لا کی حد تک تو بے شک حکومت کے عام قوانین سے مستثنیٰ ہوگی لیکن حدود و تعزیرات سے، جن کا تعلق ملک کے امن و عدل سے ہے، اس کو مستثنیٰ رکھنا کس طرح ممکن ہے؟ اگر ایک مسلمان کو بجرم زنا آپ کوڑے لگائیں یا رجم کریں اور اسی جرم میں ایک غیر مسلم پر کوئی گرفت نہ کریں یا کوئی دوسری معمولی سزا دیں تو زنا کا سدِباب ناممکن ہوگا۔ یہی حال چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا کا ہے۔ اگر ایک اسلامی حکومت چوری کے جرم میں مسلمانوں کے تو ہاتھ کاٹے لیکن اپنی غیر مسلم رعایا کو اس حد سے مستثنیٰ رکھے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ مسلمانوں کو چوری سے روک کر اپنے ملک میں غیر مسلموں کو چوری کا لائسنس دے رہی ہے۔ یہ بات بالبداہت خلافِ عقل ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی۔ آنحضرتؐ

نے بھی غیر مسلموں پر حدود جاری فرمائے اور خلفائے راشدین نے بھی۔ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق کی وضاحت ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی ریاست' میں کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

پانچویں قید تقریباً تمام فقہاء نے اس پر یہ عاید کی ہے کہ اس حد کا تعلق صرف اس زانی سے ہے جس کی شادی نہ ہوئی ہو یا شادی تو ہوئی ہو لیکن ابھی اس نے مباشرت نہ کی ہو۔ رہے وہ جن کی شادی بھی ہو چکی ہے اور جو مباشرت بھی کر چکے ہیں قرآن کے لیے سزا رجم کی ہے۔ اس رجم کا ثبوت وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل سے لاتے ہیں اور اس طرح وہ اس آیت میں بیان کردہ حد کو کنوارے اور کنواری کے لیے خاص کر دیتے ہیں یا یوں کہیے کہ شادی شدہ زانی اور زانیہ کے حد تک اس کو سنت کے ذریعہ سے منسوخ مانتے ہیں۔

اس آیت پر فقہاء کی یہ قید بڑی اہم ہے۔ اس کو تخصیص کہیے یا نسخ، مجرد اخبار احاد کی بنا پر قرآن کے کسی حکم عام کو اس طرح مقید یا منسوخ کر دینا بہرحال ایک ایسی بات ہے جس پر دل مطمئن نہیں ہوتا۔ چنانچہ خوارج اس نسخ یا تخصیص کو نہیں مانتے، وہ رجم کا انکار کرتے ہیں اور اس حد کو، جو آیت میں مذکور ہوئی ہے، ہر قسم کے زانیوں کے لیے عام مانتے ہیں۔

ان قدیم خوارج سے زیادہ اہم مسئلہ ہمارے جدید خوارج کا ہے۔ قدیم خوارج اس اعتبار سے غنیمت تھے کہ وہ صرف رجم کے منکر تھے۔ جلد کے منکر نہیں تھے۔ لیکن ہمارے جدید خوارج تو جلد کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں بھلا وہ رجم کی بات کب سننے والے ہیں! اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ رجم کا ماخذ قرآن میں کیا ہے اور اس آیت کے حکم اور رجم کے حکم میں تطبیق کی کیا شکل ہے؟ میں پہلے ان روایات پر ایک نظر ڈالوں گا جن سے فقہاء نے رجم پر استدلال کیا ہے۔ اس کے بعد قرآن میں رجم کی سزا کا جو ماخذ ہے اس کی نشان دہی کروں گا اور پھر یہ واضح کروں گا کہ رجم کی سزا کس طرح کے مجرموں کے لیے ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کو یہ سزا دی وہ کس قماش کے لوگ تھے۔ اگرچہ بحث طویل ہو رہی ہے، لیکن ان کو نظر انداز کرنا بھی ممکن نہیں ہے اس وجہ سے اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

رجم کی سزا کے حق میں فقہاء کے استدلال کا ماخذ

فقہاء نے جس روایت کی بنا پر شادی شدہ کے حد تک اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے وہ عبادہ بن صامت سے بدیں الفاظ مروی ہے۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم خذوا عنی قد جعل اللہ لھن سبیلا البکر بالبکر جلد مائۃ	عبادہ بن صامت راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس وقت جو کچھ بتا رہا ہوں اس کو میری طرف سے محفوظ کرو۔ زانیہ عورتوں کے باب میں اللہ نے جو حکم نازل کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ نازل فرما دیا۔ پس اگر مرتکب زنا

وتغریب عام والثیب بالثیب	دونوں کنوارے ہوں تو ان کے لیے سو کوڑوں اور ایک سال کی جلاوطنی
الجلد والرجم۔	کی سزا ہے اور اگر دونوں شادی شدہ ہوں تو کوڑے اور رجم کی سزا ہے۔

اس روایت پر تنقید

اس روایت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کنوارے زانی کے لیے ایک ہی ساتھ کوڑے مارنے کی سزا کا حکم بھی ہے اور ایک سال کی جلاوطنی کا بھی۔ اسی طرح شادی شدہ کے لیے ایک ہی ساتھ کوڑے کی سزا بھی مذکور ہوئی ہے اور رجم کی سزا بھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں سزائیں ساتھ ہی دی جائیں گی؟ اس کا جواب ہمارے فقہاء، حنفی اور شافعی دونوں، یہ دیتے ہیں کہ جلد اور رجم دونوں سزائیں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں اور حدیث میں کوڑے مارنے کی جو سزا مذکور ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے تعامل سے منسوخ ہوگئی، شادی شدہ کے لیے صرف رجم کی سزا ہے۔

غور کیجیے، عبادہ بن صامت کی یہی روایت ہے جس کے بل پر سورۂ نور کی آیت کو منسوخ ٹھہرایا گیا حالانکہ قرآن کو قرآن کے سوا کوئی دوسری چیز منسوخ نہیں کرسکتی۔ پھر جب حدیث سے بھی بات نہیں بنی تو اس کو دوسری روایات سے منسوخ کر دیا گیا۔ ہمارے فقہاء کی اسی طرح کی باتیں ہیں جن سے لوگوں کے دلوں میں دین کے متعلق بدگمانیاں پیدا ہوئیں۔ میں آگے چل کر دکھاؤں گا کہ اگر روایت پر قرآن کی روشنی میں غور کیا جائے تو قرآن کے ساتھ اس کی مطابقت ہو جاتی ہے۔ نہ کسی چیز کو ناسخ ماننے کی ضرورت پیش آتی ہے، نہ کسی چیز کو منسوخ۔

فقہا کا ایک دوسرا ماخذ

دوسری روایت جو اس سلسلہ میں پیش کی جاتی ہے، دل پر جبر کر کے، میں اس کو نقل کیے دیتا ہوں۔

عن ابن عباس قال قال عمرؓ	ابن عباس راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے
قد خشیت ان یطول بالناس	کہ جب لوگوں پر کچھ زمانہ گزر جائے گا تو وہ وقت آ جائے گا کہ
زمان حتی یقول قائل لا نجد	کہنے والے کہنے لگیں گے کہ رجم کی سزا کا ذکر اللہ کی کتاب میں تو
الرجم فی کتاب اللہ فیضلوا	ہم کہیں نہیں پاتے اور اس طرح وہ خدا کے ایک فریضہ کو جو اس
بترک فریضۃ انزلھا اللہ و	نے نازل فرمایا ہے، ترک کر کے گمراہ ہو جائیں گے حالانکہ ہم نے خود
قد قرأنا الشیخ والشیخۃ	یہ آیت تلاوت کی ہے الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما
اذا زنیا فارجموھما البتۃ۔	البتۃ (بوڑھی اور بوڑھا جب زنا کے مرتکب ہوں تو ان کو لازماً سنگسار کرو)

اس روایت پر تنقید

میں نے جیسا کہ عرض کیا، اس روایت کو نہایت کراہت کے ساتھ، محض اس لیے نقل کیا ہے کہ اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے راہ ان الجھنوں کو صاف کرنا ضروری ہے جو زنادقہ کی پھیلائی ہوئی ہیں اور ہمارے مفسرین اور فقہاء کی سادگی کی وجہ سے تفسیر اور فقہ کی کتابوں میں بھی ان کو جگہ مل گئی ہے۔

اس روایت پر غور کیجیے تو ہر پہلو سے یہ کسی منافق کی گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور مقصود اس کے گھڑنے سے قرآن کی محفوظیت کو مشتبہ ٹھہرانا اور سادہ لوحوں کے دلوں میں یہ وسوسہ پیدا کرنا ہے کہ قرآن کی

بعض آیات قرآن سے نکال دی گئی ہیں۔

سب سے پہلے اس کی زبان پر غور کیجیے۔ کیا کوئی سلیم المذاق آدمی اس کو قرآن کی ایک آیت قرار دے سکتا ہے؟ اس کو تو قولِ رسولؐ قرار دینا بھی کسی خوش ذوق آدمی کے لیے ناممکن ہے چہ جائیکہ قرآن حکیم کی ایک آیت۔ آخر قرآن کے مخمل میں اس ٹاٹ کا پیوند آپ کہاں لگائیں گے! قرآن کی لاہوتی زبان اور افصح العرب والعجم کے کلام کے ساتھ اس عبارت کا کیا جوڑ ہے!

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ قرآن کی ایک آیت تھی تو اس کو نکال کس نے دیا جب کہ اس کا حکم یعنی سزائے رجم باقی ہے؟ آیت کو نکال دینے اور حکم کو باقی رکھنے کا آخر کیا تک ہے! اگر یہ قرآن کی ایک آیت تھی اور نکال دی گئی تو یہ اس بات کا ثبوت ہوا کہ رجم کا حکم پہلے تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ پھر اس سے رجم کے حق میں استدلال کے کیا معنی!

تیسری بات یہ ہے کہ اس کو اگر صحیح باور بھی کر لیجیے جب بھی اس سے ہمارے فقہاء کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ ان کو ثبوت چاہیے شادی شدہ زانی کے رجم کا اور اس میں حکم بیان ہوا ہے بوڑھی زانیہ اور بوڑھے زانی کا۔ ہر شادی شدہ کا بوڑھا ہونا تو ضروری نہیں ہے! پھر دعویٰ اور دلیل میں مطابقت کہاں رہی!

بہرحال یہ روایت بالکل بیہودہ روایت ہے اور ستم یہ ہے کہ اس کو منسوب حضرت عمرؓ کی طرف کیا گیا ہے حالانکہ ان کے عہد مبارک میں اگر کوئی یہ روایت کرنے کی جرأت کرتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان کے دُرّے سے نہ بچ سکتا۔ ہمارے فقہاء میں یہ بڑی کمزوری ہے کہ جب وہ اپنے حریف سے مناظرہ پر آتے ہیں تو جو اینٹ پتھر انھیں ہاتھ آ جاتے وہ اس کے سر پر دے مارتے ہیں۔ پھر یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی زد خود دین پر کہاں تک پڑتی ہے۔

رجم کی سزا کا ماخذ اور اس کا محل

رجم کے ثبوت میں جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ یہی ہیں اور ان کا جو حال ہے وہ اوپر بیان ہو چکا۔ اب سوال یہ ہے کہ رجم کی سزا کا ماخذ کیا ہے؟ کس قسم کے مجرموں کے لیے یہ سزا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح کے زانیوں کو یہ سزا دی؟ ان سوالات پر غور کرنا اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ بات بالبداہت معلوم ہے کہ رجم کی سزا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض مجرموں کو دی اور خلفائے راشدین نے بھی دی۔ جو لوگ اس امر واقعی کا انکار کرتے ہیں وہ ہر چیز کا انکار کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے مجھے ان کی زیادہ فکر نہیں ہے البتہ چونکہ میں خود رجم کی سزا کا قائل ہوں اس وجہ سے میں قرآن سے اس سزا کا ماخذ اور اس کا موقع و محل واضح کرنا اپنی ایک ذمہ داری سمجھتا ہوں۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے پہلے ایک تمہید اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔

مجرموں کی دو قسمیں

مجرم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جن سے چوری یا قتل یا زنا یا قذف کا جرم صادر ہو جاتا ہے لیکن اس کی نوعیت یہ نہیں ہوتی کہ وہ معاشرہ کے لیے آفت اور وبالِ (ح ہ ہ ہ ہ ہ ہ ہ ہ) بن جائیں یا حکومت

کے لیے لا اور آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں۔ دوسرے وہ ہوتے ہیں جو اپنی انفرادی حیثیت میں بھی اور جتھہ بنا کر بھی معاشرے اور حکومت دونوں کے لیے آفت اور خطرہ بن جاتے ہیں۔ پہلی قسم کے مجرموں کے لیے قرآن میں معین حدود اور قصاص کے احکام ہیں جو اسلامی حکومت انہی شرائط کے مطابق نافذ کرتی ہے جو شرائط قرآن و حدیث میں بیان ہوئے ہیں۔ دوسری قسم کے مجرمین کی سرکوبی کے لیے احکام سورۂ مائدہ کی آیات ۳۳-۳۴ میں دیے گئے ہیں اور ان کی تفصیل ہم ان کے محل میں کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس کا ضروری حصہ ہم یہاں بھی نقل کیے دیتے ہیں تاکہ آگے کی بحث کے لیے راہ صاف ہو جائے ہمارے الفاظ یہ ہیں۔

جرم کی نوعیت کے مطابق سزا

"اللہ و رسول سے محاربہ یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ یا جتھہ جرأت و جسارت، ڈھٹائی اور بے باکی کے ساتھ اس نظام حق و عدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اللہ اور رسول نے قائم فرمایا ہے۔ اس طرح کی کوشش اگر بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہو تو اس کے مقابلے کے لیے جنگ و جہاد کے احکام تفصیل کے ساتھ الگ بیان ہوئے ہیں۔ یہاں بیرونی دشمنوں کے بجائے اسلامی حکومت کے ان اندرونی دشمنوں کی سرکوبی کے لیے تعزیرات کا ضابطہ بیان ہو رہا ہے جو اسلامی حکومت کی رعایا ہوتے ہوئے، عام اس سے کہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، اس کے قانون اور نظم کو چیلنج کریں۔ قانون کی خلاف ورزی کی ایک شکل تو یہ ہے کہ کسی شخص سے کوئی جرم صادر ہو جائے۔ اس صورت میں اس کے ساتھ شریعت کے عام ضابطۂ حدود و تعزیرات کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کی کوشش کرے، اپنے شر و فساد سے علاقے کے امن و نظم کو درہم برہم کر دے، لوگ اس کے ہاتھوں ہر وقت اپنی جان، مال، عزت، آبرو کی طرف سے خطرے میں مبتلا ہیں۔ قتل، ڈکیتی، رہزنی، آتش زنی، اغوا، زنا، تخریب، تہریب اور اس نوع کے سنگین جرائم حکومت کے لیے لا اور آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں۔ ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے عام ضابطۂ حدود و تعزیرات کے بجائے اسلامی حکومت مندرجہ ذیل اقدامات کرنے کی مجاز ہے:"

اس کے بعد ہم نے رجم کا ماخذ ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

'أَن يُقَتَّلُوٓا' یہ کہ فسادی الارض کے یہ مجرمین قتل کر دیے جائیں۔ یہاں لفظ 'قتل' کے بجائے 'تقتیل' باب تفعیل سے استعمال ہوا ہے۔ باب تفعیل معنی کی شدت اور کثرت پر دلیل ہوتا ہے اس وجہ سے 'تقتیل' 'شر تقتیل' کے معنی پر دلیل ہوگا۔ اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ ان کو عبرت انگیز اور سبق آموز طریقہ پر قتل کیا جائے جس سے دوسروں کو سبق حاصل ہو۔ صرف وہ طریقہ اس سے مستثنیٰ ہو گا جو شریعت میں ممنوع ہے مثلاً آگ میں جلانا۔ اس کے ماسوا دوسرے طریقے جو گنڈوں

اور بدمعاشوں کو عبرت دلانے، ان کو دہشت زدہ کرنے اور لوگوں کے اندر قانون اور نظم کا احترام پیدا کرنے کے لیے ضروری سمجھے جائیں، حکومت ان سب کو اختیار کر سکتی ہے۔ رجم یعنی سنگسار کرنا بھی ہمارے نزدیک 'تقتیل' کے تحت داخل ہے۔ اس وجہ سے وہ گنڈے اور بدمعاش جو شریفوں کے عزت و ناموس کے لیے خطرہ بن جائیں، جو زنا اور اغوا کو پیشہ بنا لیں، جو دن دہاڑے لوگوں کی عزت و آبرو پر ڈاکہ ڈالیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوں ان کے لیے رجم کی سزا اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔"

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں رَجم کی سزا کا کوئی ذکر نہیں ہے، ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ اس سزا کا ذکر سورۂ مائدہ کی آیت ۳۳ سے ماخوذ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ رسالت میں رَجم کے جو واقعات پیش آئے ان کی اس مخصوص نوعیت کے پیشِ نظر امام بخاریؒ نے اپنی 'الجامع الصحیح' میں انہیں آیتِ محاربہ کے تحت بیان کیا ہے اور 'کتاب المحاربین' ہی میں ایک ایسی روایت بھی لاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف میں بعض لوگ رجم کی سزا کا ماخذ سورۂ مائدہ کی اس آیت کو سمجھتے تھے۔

اب آیئے ایک اجمالی نظر ان بعض واقعات پر بھی ڈال لیجیے جو عہدِ رسالت میں اس سزا کے نفاذ کے پیش آئے ہیں۔

ماعز کے جرم کی نوعیت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں رَجم کا سب سے زیادہ مشہور واقعہ ماعز کے رجم کا ہے۔ اس شخص کے بارے میں کتابوں میں جو روایات ملتی ہیں ان میں نہایت عجیب قسم کا تناقض ہے۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑا بھلا مانس تھا اور بعض سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت بدخصلت گنڈا تھا۔ میری رہنمائی کے لیے یہ بات کافی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رَجم کی سزا دلوائی اور اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی۔ اس وجہ سے میں ان روایات کو ترجیح دیتا ہوں جن سے اس کا وہ کردار سامنے آتا ہے جس کی بنا پر یہ مستحقِ رَجم ٹھہرا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کسی غزوہ کے لیے نکلتے تو یہ چپکے سے دبک کے بیٹھ رہتا اور مردوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر شریف بہوؤں بیٹیوں کا تعاقب کرتا۔ بعض روایات سے اس تعاقب کی نوعیت بھی واضح ہوتی ہے کہ اس طرح تعاقب کرتا جس طرح بکرا بکریوں کا کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی شرارتوں کی رپورٹ ملتی رہی، لیکن چونکہ کسی صریح قانون کی گرفت میں یہ نہیں آیا تھا اس وجہ سے آپؐ نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ بالآخر یہ قانون کی گرفت میں آگیا۔ آپؐ نے اس کو بلوا کر نہایت تیکھے انداز میں پوچھ گچھ کی۔ وہ تاڑ گیا کہ اب بات چھپانے سے نہیں چھپ سکتی اس وجہ سے اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ جب یہ اقرار کر لیا تو آپؐ نے اس کے رَجم کا حکم دے دیا اور اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی۔ اس کے رجم کے بعد لوگوں کا عام تاثر، جو روایات سے معلوم ہوتا ہے، وہ یہ تھا کہ بہت سے لوگوں نے یہ کہا کہ اس شخص کی شامت نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ یہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گیا۔ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کے بعد اس کے بارے میں لوگوں کو کفِ لسان کی ہدایت فرمائی، لیکن عام تاثر لوگوں کا یہی تھا۔

یہاں ہم چند روایات اُن کے اصل الفاظ میں نقل کر رہے ہیں تاکہ حسبِ ذیل امور بالکل واضح ہو کر سامنے آجائیں:

ایک یہ کہ ماعز نے پہلے انسوں کی طرح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے جرم کا اقرار نہیں کیا تھا، بلکہ وہ اپنے قبیلہ والوں کے اصرار پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں، اس توقع پر آیا کہ خود حاضر ہو جانے سے غالباً وہ کسی بڑی سزا سے بچ جائے گا، حضورؐ کو اس کے جرم کی اطلاع پہلے سے مل چکی تھی اور اس نے آپؐ کی پوچھ گچھ کے نتیجے میں اقرارِ جرم کیا۔

دوسرے یہ کہ اس کا کردار ایک نہایت بدخصلت گُنڈے کا کردار تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کسی غزوہ کے لیے نکلتے تو مردوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر یہ جنس زدہ بدمعاشوں کی طرح عورتوں کا تعاقب کرتا۔

تیسرے یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مغفرت کے لیے دعا کی نہ اس کا جنازہ پڑھا جو اس بات کی شہادت ہے کہ اس کو کٹر منافق قرار دیا گیا۔

روایات یہ ہیں:

(۱)۔۔۔ قال: یا ابن اخی، انا اعلم الناس بهذا الحديث، كنت فيمن رجم الرجل انا لما خرجنا به فرجمناه فوجد مس الحجارة، صرخ بنا: يا قوم ردّوني الى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فان قومي قتلوني وغرّوني من نفسي، وخبروني ان رسول الله صلى الله عليه وسلم غير قاتلي، فلم ننزع عنه حتى قتلناه، فلما رجعنا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم واخبرناه، قال: فهلّا تركتموه وجئتموني به، ليستثبت رسول الله صلى الله عليه وسلم منه، فاما لترك حد فلا، قال: فعرفت وجه الحديث۔

(ابوداؤد، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالک)

۔۔۔۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بھتیجے! میں سب لوگوں سے زیادہ اس بات سے واقف ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے اس شخص کو رجم کیا۔ واقعہ یوں ہے کہ ہم نے اسے باہر لا کر سنگسار کرنا شروع کیا۔ پتھر پڑے تو وہ چیخا 'لوگو! مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس لے چلو۔ میرے قبیلے کے لوگوں نے مجھے مروا دیا۔ انھوں نے مجھے دھوکے میں رکھا۔ وہ مجھے یہی کہتے رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے قتل نہیں کرائیں گے'، لیکن ہم نے اسے قتل کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ پس جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوٹے اور آپؐ کو اس جزع فزع کے بارے میں بتایا تو آپؐ نے فرمایا: 'تم نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا؟ تم اسے میرے پاس کیوں نہیں لائے؟' یہ آپؐ نے اس لیے فرمایا کہ آپ حقیقت معلوم کر سکیں۔ آپؐ نے یہ بات حد ساقط کرنے کے لیے نہیں فرمائی تھی، راوی بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد یہ حدیث میری سمجھ میں آ گئی۔

(ب) .... فرميناه بجلاميد الحرّة (يعني الحجارة) حتّٰى سكت، قال: ثم قام رسول الله صلى الله عليه وسلم خطيبًا من العشي، فقال: اوكلما انطلقنا غزاة في سبيل الله، تخلّف رجل في عيالنا له نبيب كنبيب التيس، عليّ ان لا اوتي برجل فعل ذلك الا نكلت به. قال: فما استغفرله ولا سبّه.

(صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزنا)

پس ہم نے اسے وادیٔ حرّہ کے پتھروں سے مارا، یہاں تک کہ وہ ختم ہوگیا، راوی بیان کرتے ہیں کہ اسی دن عصر کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا: کیا ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جب کبھی ہم جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے نکلتے تھے تو ایک ایسا شخص پیچھے ہمارے اہل وعیال میں رہ جاتا تھا جو شہوت کے جوش میں بکرے کی طرح ممیاتا تھا۔ سنو، مجھ پر لازم ہے کہ اس طرح کی حرکتیں کرنے والا کوئی شخص میرے پاس لایا جائے تو میں اسے عبرت ناک سزا دوں۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے نہ اس کے لیے مغفرت کی دعا کی اور نہ اسے برا بھلا کہا۔

(ج) عن ابن عباسؓ ان ماعز بن مالك اتى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: انه زنى، فاعرض عنه، فاعاد عليه مرارًا، فسأل قومه: أمجنون هو؟ قالوا: ليس به بأس. قال: أفعلت بها؟ قال: نعم، فامر به ان يُرجم، فانطلق به فرُجم ولم يصل عليه.

(ابوداؤد، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالك)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ماعز بن مالک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو اس نے اقرار کیا کہ اس نے زنا کیا ہے۔ آپؐ نے اعراض کیا تو اس نے اپنا یہ اقرار کئی مرتبہ دہرایا۔ اس پر بھی آپؐ متامل رہے۔ پھر آپؐ نے اس کی قوم کے لوگوں سے پوچھا: کیا یہ پاگل ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں، یہ بھلا چنگا ہے۔ آپؐ نے اس سے پوچھا: کیا تم نے واقعی اس لڑکی سے بدکاری کی ہے؟ اس نے کہا: ہاں! پس آپؐ نے حکم دیا کہ اسے رجم کردیا جائے چنانچہ اسے لے جایا گیا اور رجم کردیا گیا اور اس کا جنازہ نہیں پڑھا گیا۔

(د) .... فامر به فرُجم فكان الناس فيه فريقين، قائل يقول لقد هلك لقد احاطت به خطيئتُه.

(صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزنا)

.... نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز کے بارے میں حکم دیا اور اسے رجم کردیا گیا تو لوگ اس کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ان میں سے ایک کی رائے تھی کہ اس کی شامت نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ یہ ہلاک ہوگیا۔

(ھ) .... فامر به فرجم، فسمع النبي صلى الله عليه وسلم رجلين من اصحابه يقول احدهما لصاحبه: انظر

.... پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز کے بارے میں حکم دیا تو اسے رجم کردیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں سے دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے یہ کہتے ہوئے

الیٰ ھٰذا الّذی ستر اللہ علیہ فلم تدعہ نفسہ حتیٰ رجم رجم الکلب۔ (ابوداود، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالک)	سنا: اس بدبخت کو دیکھو، اللہ نے اس کا پردہ ڈھانکے رکھا تھا، لیکن اس کے نفس نے اس کو نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ کتے کی طرح سنگ سار کر دیا گیا۔

غامدیہ کا واقعۂ رجم

ماعز بن مالک اسلمی کے بعد دوسرا بڑا واقعہ غامدیہ کا ہے جو قبیلۂ غامد (قبیلۂ جُہَینہ کی ایک شاخ) کی ایک عورت تھی۔ اس کے بارے میں روایات میں جو تفصیلات ملتی ہیں، ان سے نہ اس کے کردار کے بارے میں کوئی معلومات حاصل ہوتی ہیں نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شادی شدہ تھی۔ تھوڑی بہت تفصیلات جو بیان ہوئی ہیں ان میں ماعز کے واقعہ ہی کی طرح بہت سے امور باہم متناقض ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں اسے ٹالنے کی کوشش کی، لیکن یہ اپنے اقرار پر مُصر رہی تو آپ نے فرمایا: اچھا، نہیں مانتی تو جاؤ، وضع حمل کے بعد آئیو، حمل سے فارغ ہو کر وہ بچے کے ساتھ آئی تو آپ نے فرمایا: جا اور اس کو دودھ پلا، دودھ چھٹانے کے بعد آئیو! پھر وہ دودھ چھٹانے کے بعد آئی تو اس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا جو اس نے بچے کو کھلا کر حضورؐ کو دکھایا۔ تب آپ نے اس کے رجم کا حکم صادر فرمایا۔ اس کے برعکس بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اقرار کیا تو آپ نے اسے وضع حمل تک ایک انصاری کی نگرانی میں دے دیا۔ وضعِ حمل کے بعد اس نے اطلاع دی تو آپ نے فرمایا: ابسے اس حالت میں رجم نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے چھوٹے بچے کو کوئی دودھ پلانے والا بھی نہیں! اس پر انصار میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا: اس کی رضاعت کی ذمہ داری مجھ پر ہے، اس کے بعد آپ نے بغیر کسی توقف کے اس کے رجم کا حکم دے دیا۔

روایات کے مطالعہ سے بیان کا یہ تناقض ہی سامنے نہیں آتا، یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کوئی آزاد قسم کی عورت تھی جس کا نہ کوئی شوہر تھا، نہ سرپرست جو اس کے کسی معاملے کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار ہوتا۔ وضعِ حمل تک کی مدت اس نے ایک انصاری کے ہاں گزاری، اس کے اقرار سے لے کر سزا کے نفاذ تک، کسی موقع پر بھی اس کے خاندان یا قبیلہ کا کوئی آدمی مقدمہ کی کارروائی کے سلسلہ میں سامنے نہیں آیا۔ اگرچہ غامدیہ کے کردار کے بارے میں روایات محفوظ نہیں ہوسکیں، لیکن ہمارے نزدیک اس کا معاملہ بھی ماعز کی طرح کا تھا جس کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رجم کرایا۔

اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بہت سی ڈیرے دالیاں ہوتی تھیں جو پیشہ کراتی تھیں اور ان کی سرپرستی زیادہ تر یہودی کرتے تھے جو ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اسلامی حکومت قائم ہو جانے کے بعد ان لوگوں کا بازار سرد پڑ گیا، لیکن اس قسم کے جرائم پیشہ انسانی سے باز نہیں آتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قماش کے کچھ مرد اور بعض عورتیں زیرِ زمین یہ پیشہ کرتے رہے اور تنبیہ کے باوجود باز نہیں آئے۔ بالآخر جب وہ قانون کی گرفت میں آئے تو سورۂ مائدہ کی اسی آیتِ محاربہ کے تحت جس کا حوالہ اوپر گزرا، آپ نے ان کو رجم کرایا۔

زنا بالجبر کے جرم کو رجم کی سزا

زنا بالجبر کا جرم بھی چونکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے حرابہ اور فساد فی الارض ہی کے قبیل سے ہے، اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مرتکب کو، مجرد زنا کی سزا یعنی سو کوڑے کے بجائے سورۂ مائدہ کی آیتِ محاربہ کے تحت رجم ہی کی سزا دی ہے۔ اس مقدمہ میں مجرم، نماز کے لیے جاتی ہوئی ایک خاتون پر سرِ راہ حملہ آور ہونے کی وجہ سے چونکہ کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا، اس لیے آپ نے اس کے شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونے کے بارے میں بھی کسی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ حدیث میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے۔

عن علقمة بن وائل عن ابيه، ان امرأة خرجت على عهد النبي صلى الله عليه وسلم تريد الصلوٰة، فتلقاها رجل، فتجللها فقضى حاجته منها، فصاحت وانطلق، فمرّ عليها رجل، فقالت: ان ذاك فعل بي كذا وكذا. ومرّت عصابة من المهاجرين فقالت: ان ذلك الرجل فعل بي كذا وكذا، فانطلقوا، فاخذوا الرجل الذي ظنت انه وقع عليها فاتوها به، فقالت: نعم هو هذا. فاتوا به النبي صلى الله عليه وسلم، فلما امر به قام صاحبها الذي وقع عليها، فقال: يا رسول الله، انا صاحبها، فقال لها: 'اذهبي فقد غفر الله لك' وقال للرجل قولاً حسناً. وقال ابوداؤد: يعني الرجل المأخوذ، وقال للرجل الذي وقع عليها: 'ارجموه'. (ابوداؤد، كتاب الحدود، باب في صاحب الحد يجيئ فيقر، والترمذي، ابواب الحدود)

علقمہ بن وائل اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت نماز پڑھنے کے لیے گھر سے نکلی تو راستے میں ایک شخص نے اسے دیکھا پس اس نے اس پر غلبہ پایا اور اپنے نفس کی پیاس بجھائی۔ اس پر وہ چیخی چلائی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اسی اثنا میں ایک آدمی کا گزر اس طرف سے ہوا تو اس عورت نے اسے بتایا کہ ایک شخص نے اس طرح اسے رسوا کیا ہے۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ مہاجرین میں سے ایک گروہ بھی اس طرف آنکلا۔ اس نے انہیں بھی اپنی روداد سنائی تو وہ بھاگے اور اس شخص کو پکڑ لیا جس کے بارے میں اس عورت کا خیال تھا کہ اس نے اس سے زیادتی کی ہے۔ پس وہ اسے اس کے پاس لے آئے تو اس نے کہا: ہاں، یہ وہی ہے۔ چنانچہ وہ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے تو آپ نے بلا تأمل اسے سزا دینے کا حکم دے دیا۔ یہ دیکھ کر اصل مجرم کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ میں تھا جس نے اس عورت سے زیادتی کی۔ اس پر آپ نے اس عورت سے کہا: 'جا! اللہ نے تجھے معاف کر دیا'، اور اس شخص سے کلماتِ خیر فرمائے جو شبہ میں پکڑا گیا تھا پھر اس شخص کے بارے میں جس نے اس عورت سے بدکاری کی تھی، فرمایا: 'اسے رجم کر دو'۔

خلاصۂ بحث

اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رجم کی سزا کے جو واقعات احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں وہ عام قسم کے زانیوں کے واقعات نہیں ہیں، بلکہ ان بدقماشوں کے واقعات ہیں جو اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر شریفوں کی عزت و ناموس کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں، کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اور اس فعل قبیح کو بطور پیشہ کے اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ قانون کے ہاتھ ان کی گردن تک پہنچنے والے ہیں تو اس میل کے مجرموں کی عام نفسیات کے مطابق اعتراف و اقرار کے لیے حاضر ہو جاتے ہیں تاکہ معاشرے اور قانون، دونوں کی ہمدردیاں حاصل کر سکیں۔ رہی یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مجرموں کے شادی شدہ ہونے کی تحقیق بھی فرمائی، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے قوانین کی طرح اسلامی شریعت کا بھی یہ مسلمہ اصول ہے کہ حدود و تعزیرات کے نفاذ میں مجرم کے احوال کی رعایت کی جانی چاہیے۔ اس رعایت میں عمر، شادی، دماغی حالت، ماحول، غرض ہر وہ چیز جو جرم کی محرک یا اس کے ارتکاب میں رکاوٹ بن سکتی ہے، عدالت کے پیش نظر رہے گی۔ احادیث میں ثیب، و بکر، کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کا اطلاق عربیت کی رو سے جس طرح شادی شدہ اور غیر شادی شدہ پر ہوتا ہے، اسی طرح پختہ عمر کے آدمی اور الھڑ نوجوان پر بھی ہوتا ہے۔ ہمارے فقہاء کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے مجرم کی حالتوں میں سے ایک حالت کو مناطِ حکم قرار دے دیا، درآں حالیکہ اس کا تعلق مناطِ حکم سے نہیں ہے، اس طرح کی چیزیں تو ہر جرم کی سزا نافذ کرتے وقت ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ لہٰذا آیت زیر بحث کو جو لوگ منسوخ مانتے ہیں، ان کا خیال ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ قرآن کی کوئی آیت قرآن کے سوا کسی دوسری چیز سے منسوخ نہیں ہوتی ہے اور یہ ناسخ و منسوخ، دونوں قرآن میں موجود ہیں۔ منسوخ ہونا تو ایک طرف رہا، اگر کسی آیت کی تحدید و تخصیص بھی ہوئی ہے تو اس کے قرائن و اشارات یا تو آیت کے سیاق و سباق اور اس کے موقع محل میں مضمر ہیں یا خود قرآن کے دوسرے مقامات میں موجود ہیں۔

عبادہ بن صامتؓ کی روایت کا صحیح محل

اس روشنی میں اگر عبادہ بن صامتؓ کی روایت کی تاویل کیجیے تو اس کا بھی ایک موقع و محل نکل آتا ہے۔ وہ یوں کہ اس میں جو حرف 'و' ہے اس کو جمع کے بجائے تقسیم کے مفہوم میں لیجیے یعنی کوئی زانی کنوارا ہو یا شادی شدہ، دونوں کی اصل سزا تو جلد (تازیانہ) ہی ہے لیکن اگر کوئی کنوارا تازیانہ کی سزا سے قابو میں نہیں آ رہا ہے تو حکومت اس کو، اگر مصلحت دیکھے، مائدہ کی مذکورہ بالا آیت کے تحت جلاوطنی کی سزا بھی دے سکتی ہے اس لیے کہ اس آیت میں 'نفی' (جلاوطنی) کا اختیار بھی حکومت کو دیا گیا ہے۔ اسی طرح شادی شدہ زانی کی اصل سزا، جیسا کہ روایت سے واضح ہے، ہے تو تازیانہ ہی لیکن اگر کوئی شخص تازیانہ کی سزا سے قابو میں نہیں آ رہا ہے اور معاشرے کے لیے ایک خطرہ بن چکا ہے تو اس کو حکومت 'تقتیل' یعنی رجم کی سزا از روئے سورۂ مائدہ دینے کا اختیار رکھتی ہے۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً ؗ وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُہَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ (۳)

خبر نہی کے مفہوم میں

'لَا یَنْکِحُ' یہاں خبر کے مفہوم میں نہیں بلکہ نہی کے مفہوم میں ہے۔ نہی کے اندر جب نہی کے ساتھ ارشاد و موعظت کا مفہوم بھی ہو تو وہ خبر کی صورت میں آتی ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت بقرہ ۲۲۸ کے تحت ہو چکی ہے۔ یہاں مقصود مسلم معاشرہ کی حسِ ایمانی کو بیدار کرنا ہے کہ تمھارے اندر زنا سے وہ

نفرت و بیزاری ہونی چاہیے کہ کوئی زانی اگر تمھارے اندر نکاح کرنا چاہے تو کوئی صاحب ایمان اس کو اپنی بیٹی دینے کے لیے تیار نہ ہو۔ اس کو اگر نکاح کے لیے ملے تو کوئی زانیہ یا مشرکہ ہی ملے، کوئی مومنہ اپنے آپ کو اس کے حبالۂ عقد میں دینے پر راضی نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی زانیہ ہو تو کوئی باایمان اس سے نکاح نہ کرے۔ اس کو اگر کوئی نکاح کے لیے ملے تو کوئی زانی یا مشرک ہی ملے، کوئی مسلمان اس نجاست کو اپنے گھر میں لانے پر راضی نہ ہو۔ فرمایا کہ 'وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ' زانیوں اور زانیات کے ساتھ ازدواجی رشتہ اہل ایمان کے لیے حرام ہے۔

زنا اور شرک کی باہمی مشابہت

آیت میں زانی اور مشرک اور زانیہ اور مشرکہ کا ایک ساتھ ذکر بڑا معنی خیز ہے۔ زنا اور شرک کی باہمی مشابہت پر ہم اس کتاب میں جگہ جگہ لکھ چکے ہیں۔ قدیم آسمانی صحیفوں میں شرک کو چھنال عورت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ہم اس کے محل میں اس تشبیہ کی بلاغت واضح کر چکے ہیں۔ زنا اسی طرح کی اخلاقی نجاست ہے جس طرح کی عقائدی نجاست شرک ہے۔ قرآن میں اسی وصفی اشتراک کی وجہ سے شرک اور مشرکین کو نجس کہا بھی گیا ہے۔

مسلم معاشرہ کی حس ایمانی کی بیداری کی ضرورت

معاشرہ کی ایمانی حس کو بیدار کرنے کی یہ ضرورت اس وجہ سے تھی کہ مجرد قانون، خواہ وہ کیسا ہی بے لاگ اور حکیمانہ ہو، معاشرہ کی حفاظت اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک خود معاشرہ کے اندر برائی سے نفرت موجود نہ ہو۔ ہر قانون کے نفاذ کے لیے، بالخصوص جب کہ وہ ایک سخت قانون بھی ہو، لازماً ایسی شرطیں ہوتی ہیں کہ بہت سے مجرمین اپنے آپ کو اس کی زد سے بچائے رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے مجرمین سے نمٹنا خود معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو اپنی آنکھوں میں جگہ نہ دے بلکہ وہ جہاں بھی رہیں نکو بن کے رہنے پر مجبور ہوں۔ اگر وہ کسی شریف مسلمان سے رشتہ داری کے خواہش مند ہوں تو وہ ان کی درخواست ٹھکرا دے یہاں تک کہ اس طرح کے لوگ کسی شریف خاندان میں قرابت کا حوصلہ ہی نہ کر سکیں۔ یہ بیداری جرائم کے سدباب کے لیے ناگزیر شے ہے۔

اس دور کی آفات میں سے صرف یہی ایک آفت نہیں ہے کہ حدود و تعزیرات اسلامی نہیں ہیں بلکہ اس سے بڑی آفت یہ ہے کہ لوگوں کے اندر حس اسلامی نہیں ہے۔ اس زمانے میں اگر کوئی اپنی لڑکی کے لیے بر تلاش کرتا ہے تو اس کے اندر تمام وہ اوصاف تلاش کرتا ہے جو دنیاوی وجاہت کے پہلو سے ضروری خیال کیے جاتے ہیں لیکن بہت تھوڑے لوگ اب ایسے رہ گئے ہیں جو معاملہ کے اس پہلو کو نگاہ میں رکھتے ہوں جس کی طرف آیت میں رہنمائی فرمائی گئی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴-۵)

قذف کے معاملہ میں شہادت اور سزا کا قانون

اب یہ قذف کے معاملہ میں شہادت اور سزا کا قانون بیان ہو رہا ہے کہ شریف اور آزاد مومنات پر جو لوگ زنا کی تہمت لگائیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جرم کے چار عینی شاہد پیش کریں۔ اگر وہ چار گواہ معتبر نہ پیش کر سکیں تو پھر حکم ہے کہ ان کو اسی کوڑے مارو اور ہمیشہ کے لیے ان کو ساقط الشہادت قرار دے دو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اسلامی معاشرہ میں کسی کا ہمیشہ کے لیے مردود الشہادۃ قرار دے دیا جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ معاشرے کے اندر یہ اس کی عرفی حیثیت کے بالکل ختم ہو جانے کے ہم معنی ہے۔ اس امت کا اصلی مرتبہ یہ ہے کہ یہ شُهَدَآءُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ ہے۔ اگر کوئی شخص ساقط الشہادت قرار دے دیا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس امت کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس کو جو اصلی سرفرازی حاصل ہوئی تھی وہ اس نے کھو دی۔

'اَلَّذِيْنَ' اگرچہ مذکر کے لیے آتا ہے لیکن اگر کوئی عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس حکم سے مستثنیٰ رہے اس وجہ سے یہ لفظ عورت اور مرد دونوں کے لیے علیٰ سبیل التغلیب عام ہو گا۔

لفظ 'مُحْصَنٰتُ' اس طرح کے سیاق میں 'حرائر' یعنی لونڈیوں کے مقابل میں شریف زادیوں کے لیے آتا ہے اس وجہ سے جو لوگ لونڈیوں اور غلاموں کے معاملے میں اس کی نصف سزا کے قائل ہیں ان کی بات مبنی بر دلیل ہے۔

توبہ اور اصلاح کے بعد اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس طرح کے لوگوں کے گناہ تو معاف ہو جائیں گے لیکن جہاں تک ساقط الشہادت ہونے کا تعلق ہے یہ چیز بدستور باقی رہے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ توبہ کا تعلق انسان کے دل سے ہے اور دل کا حال صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ آیت کے الفاظ سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ مغفرت کا تعلق صرف توبہ سے ہے 'شہادت' سے اس کا تعلق نہیں ہے وہ ساقط الشہادت 'اَبَدًا' یعنی عمر بھر کے لیے رہیں گے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۔ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۔ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۙ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۔

لعان کا ضابطہ

اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور اس کی ذات کے سوا اس کے پاس کوئی گواہ نہ ہو تو اس صورت میں معاملہ کا فیصلہ قسم سے ہو گا۔ اس کو اصطلاحِ شریعت میں 'لعان' کہتے ہیں۔ اس کی شکل یہ ہو گی کہ مرد چار بار اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے گا کہ میں جو الزام لگا رہا ہوں اس میں سچا ہوں۔ پانچویں

بار یہ کہے گا کہ اگر وہ جھوٹ الزام لگا رہا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ اگر عورت مرد کی اس قسم کی کوئی مذمت نہ کرے تو اس پر زنا کی وہی حد جاری ہو جائے گی جو اوپر مذکور ہوئی ہے۔ اور اگر وہ اس الزام کو تسلیم نہیں کرتی تو اس کے لیے سزا سے بریت اس صورت میں ہو گی جب وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ہو اگر یہ شخص سچ کہہ رہا ہے۔

'وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ' میں 'عذاب' سے مراد ظاہر ہے کہ وہی حد ہے جو اوپر آیت ۲ میں مذکور ہوئی ہے۔ اس کے سوا کسی اور سزا کو اس سے مراد لینا عربیت کے بالکل خلاف ہو گا۔

اگر کسی میاں بیوی کے درمیان ایک دوسرے کی تکذیب اور باہدگر ملاعنت کا یہ واقعہ پیش آ جائے تو فقہاء کی یہ رائے ہے کہ قاضی ان کے درمیان تفریق کرا دے گا۔ یہ رائے مبنی بر حکمت معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ معاملہ اس حد تک خراب ہو جانے کے بعد ان کے درمیان اس سازگاری کی توقع نہیں کی جا سکتی جو میاں بیوی کی طرح زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ (۱۰)

ایک تنبیہ — یہ آیت، جیسا کہ پہلی آیت میں اشارہ ہو چکا ہے، بطور تنبیہ و تذکیر ہے اور اس میں جواب شرط عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق، محذوف ہے۔ آگے آیت ۲۰ میں اس محذوف کو کھول بھی دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کے فضل و رحمت اور اس کے تواب و حکیم ہونے کی برکت ہے کہ وہ تم کو یہ روشن ہدایات اور واضح و پُرحکمت احکام دے رہا ہے کہ تمہارے لیے توبہ و اصلاح کی راہ کھلے ورنہ تم جس روش پر چل پڑے تھے یہ تو خدا کے غضب کو دعوت دینے والی تھی۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ احکام اس زمانہ میں نازل ہوئے ہیں جب مسلمانوں کے اندر، منافقین کی ریشہ دوانیوں سے، بعض نہایت سخت قسم کی، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے، کمزوریاں ظاہر ہوئی تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کمزوریوں پر سزا دینے کے بجائے اپنے فضل و رحمت سے ان کو ان احکام و ہدایات کے نزول کا سبب بنا لیا جو اسلامی معاشرہ کو شیاطین و منافقین کی ریشہ دوانیوں اور فتنہ انگیزیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۱-۲۶

آگے فتنۂ افک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس موقع پر مسلمانوں کی ایک جماعت سے صادر ہوئیں کہ وہ بھی منافقین کے اٹھائے ہوئے فتنہ میں نادانستہ شریک ہو گئے اور بے سوچے سمجھے اسی طرح کی باتیں بولنے لگے جس قسم کی باتیں منافقین پھیلانی چاہتے تھے۔ حالانکہ مسلمانوں کے باہمی تعلق کی بنیاد اعتماد اور کامل حسن ظن پر ہونی چاہیے۔ اگر کوئی مسلمان اپنے دوسرے بھائی بہن کی نسبت کوئی بُری

بات سنے تو اس وقت تک وہ اس کو قبول نہ کرے اور نہ زبان پر لائے جب تک اس کی پوری تحقیق نہ ہو جائے۔ اسی سلسلہ میں منافقین اور ان کے سرپرستوں کی در پردہ اس خواہش اور کوشش کا سراغ دیا ہے کہ وہ طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ اکھاڑ دینے کے درپے ہیں اس وجہ سے ان سے پوری طرح ہوشیار رہنا چاہیے اور خود اپنے ہاتھوں ان کی مقصد برآری کا سامان نہیں کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے جو ضروری ہدایات ہیں وہ بھی اسی ذیل میں دی گئی ہیں اور جو لوگ بالکل نادانستہ اس فتنہ میں ملوث ہو گئے تھے ان سے درگزر کی ہدایت بھی فرمائی گئی ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِنْكُمْ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَكُمْ آیات
بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ وَ ۱۱-۲۶
الَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۱﴾ لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ
ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ
مُبِينٌ ﴿۱۲﴾ لَوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا
بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿۱۳﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ
اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِي مَا أَفَضْتُمْ
فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۴﴾ إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُمْ
مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ ﴿۱۵﴾
وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَٰذَا
سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ﴿۱۶﴾ يَعِظُكُمُ اللَّهُ أَنْ تَعُودُوا لِمِثْلِهِ
أَبَدًا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۷﴾ وَيُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ
حَكِيمٌ ﴿۱۸﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا
لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا

تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَ ع ۲ / ۸
مَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا
فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ
اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ
مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ
الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾
يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾ يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ
اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ
وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا
يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾ ع ۳ / ۹

ترجمۂ آیات ۱۱-۲۶

جن لوگوں نے فتنۂ افک برپا کیا وہ تمہارے ہی اندر کا ایک گروہ ہے۔ تم اس چیز کو اپنے لیے بُری نہ خیال کرو بلکہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے جو گناہ کمایا وہ اس کے حساب میں پڑا اور جو اس فتنہ کا اصل بانی ہوا ہے اس کے لیے تو ایک عذابِ عظیم ہے۔ ۱۱

ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ بات سنی تو مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کی

بابت نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا بہتان ہے! ۱۲

آخر یہ لوگ اپنے اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہ کیوں نہ لائے! تو جب یہ لوگ گواہ نہیں لائے تو لازماً اللہ کے نزدیک یہی لوگ جھوٹے ہیں۔ ۱۳

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی، دنیا اور آخرت میں، تو جس چیز میں تم ملوث ہو گئے تھے اس کے باعث تم کو ایک عذاب عظیم آ پکڑتا۔ خیال کرو جب تم اپنی زبانوں سے وہ بات نقل کر رہے تھے اور اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کی بابت تمھیں کوئی علم نہیں تھا! اور تم اس کو معمولی بات خیال کر رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ ایک بہت بڑی بات ہے! ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کو سنتے ہی تم نے کہہ دیا ہوتا کہ ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ایسی بات زبان پر لائیں! معاذ اللہ یہ تو ایک بہت بڑا بہتان ہے! ۱۴-۱۶

اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو ایسی بات تم سے پھر کبھی صادر نہ ہو۔ اور اللہ تمھارے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کیے دے رہا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۱۷-۱۸

بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی کا چرچا ہو، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں ایک دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور اللہ رؤف و رحیم نہ ہوتا تو تم ایک آفت میں پھنس جاتے۔ ۱۹-۲۰

اے لوگو جو ایمان لائے ہو شیطان کے نقوشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔ اور جو شیطان کے نقوشِ قدم کی پیروی کرتا ہے تو وہ یاد رکھے کہ شیطان ہمیشہ بے حیائی اور برائی کی راہ سجھاتا ہے۔ اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہو سکتا۔ بلکہ اللہ

ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ سمیع و علیم ہے۔ ۲۱

اور جو تم میں صاحبِ فضل اور کشادہ حال ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ قرابت مندوں، مسکینوں اور راہِ خدا میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ نہ کریں گے بلکہ عفو و درگذر سے کام لیں۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمھیں بخشے! اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۲۲

بے شک جو لوگ پاکدامن، بھولی بھالی، باایمان عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہوئی اور ان کے لیے ایک بڑا عذاب ہے۔ اس دن جس دن ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے سامنے ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ ان کا واجبی بدلہ پورا کر دے گا اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی حق اور واضح کر دینے والا ہے۔ ۲۳-۲۵

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہوں گی اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہوں گی اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ یہ لوگ بری ہوں گے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں۔ ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔ ۲۶

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِينَ جَآءُو بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ
لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُۥ مِنْهُمْ لَهُۥ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۱)

'إفك' جھوٹی، من گھڑت، خود تراشیدہ اور خلافِ حقیقت بات کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے اشارہ اس فتنہ کی طرف ہے جو غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر منافقین نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو متہم کرنے کے لیے برپا کیا۔ بعض جھوٹ ایسے ہوتے ہیں جن کا ذکر بھی زبان پر لانا گوارا نہیں ہوتا اور یہ جھوٹ تو تمام مسلمانوں کی ماں سے متعلق تراشا گیا تھا اس وجہ سے قرآن نے اس کی طرف لفظ 'إفك' سے اشارہ کر کے اس کو نظر انداز کر دیا۔ بس اتنا پتہ دے دیا کہ اس کے ایجاد

فتنۂ افک

کرنے والے اور اس کو پھیلانے والے کون لوگ ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ جس منبع فساد سے یہ بات چلی ہے اس کی پھیلائی ہوئی بات بجائے خود نہ قابلِ ذکر ہے اور نہ لائقِ غور و تحقیق البتہ اس سے جو سبق حاصل ہوتے ہیں وہ سب کے لیے حرزِ جان بنانے کے قابل ہیں۔ چنانچہ قرآن نے نفسِ واقعہ کی نوعیت کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذی فہم مسلمانوں کے اندر نفسِ واقعہ کے افترا و بہتان ہونے سے متعلق کوئی تردد نہیں پایا جاتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ منافقین کا اٹھایا ہوا فتنہ ہے لیکن جب کوئی سنسنی پیدا کرنے والی بات عوام میں پھیلا دی جاتی ہے تو جو لوگ زیادہ معاملہ فہم نہیں ہوتے وہ بے سمجھے بوجھے اس کی نقل و روایت شروع کر دیتے ہیں[1]۔

منافقین کی طرف اشارہ

'عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ' سے اشارہ منافقین کے اس مارِ آستین گروہ کی طرف ہے جو مسلمانوں کے اندر گھسا ہوا تھا۔ ان کا سردار عبداللہ بن اُبی تھا۔ چونکہ اپنے ظاہری طور طریق میں یہ لوگ مسلمانوں سے الگ نہیں تھے اس وجہ سے ان کو مسلمانوں کے اندر گھس کر اپنا زہر پھیلانے کا موقع مل جاتا اور بہت سے سادہ لوح مسلمان ان کے چکموں میں آ جاتے۔ یہاں قرآن نے 'عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ' کہہ کر انہی کی طرف انگلی اٹھائی ہے اور مقصود اس اشارے سے مسلمانوں کو ان کی طرف سے ہوشیار کرنا ہے کہ یہ تمہارے اندر ہی گھسے ہوئے ایک گروہ کا اٹھایا ہوا فتنہ ہے، ان سے ہوشیار رہو۔

اس فتنہ کے اندر خیر کے پہلو

'لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ' یعنی ان شریروں نے یہ فتنہ جو اٹھایا یہ تمہارے حق میں برا نہیں ہوا بلکہ اگر تم اس سے صحیح فائدہ اٹھاؤ تو اس میں تمہارے لیے بہت سے پہلو خیر کے ہیں۔

خیر کا ایک نمایاں پہلو تو اس کے اندر یہی تھا کہ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اپنے اندر کے ایک

---

[1] تاریخ و سیرت کی کتابوں سے واقعہ کی نوعیت صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بنی مصطلق (واقع ۶ھ) سے مدینہ منورہ واپس ہو رہے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ ایک الگ اونٹ پر ہم سفر تھیں۔ راستہ میں فوج نے شب میں کہیں پڑاؤ ڈالا۔ فوج کے کوچ سے پہلے ام المومنینؓ ضرورت سے باہر نکلیں۔ اتنے میں فوج کے کوچ کا حکم ہو گیا۔ قافلہ روانہ ہو گیا، اور ساتھ ہی ام المومنینؓ کا ساربان بھی یہ سمجھ کر روانہ ہو گیا کہ آپ اپنے ہودج میں سوار ہیں۔ ام المومنینؓ جب جگہ پر واپس آئیں اور دیکھا کہ قافلہ روانہ ہو گیا تو شب میں اس کے سوا انھیں کوئی اور تدبیر نظر نہیں آئی کہ وہیں ٹھہر جائیں تاآنکہ اللہ تعالیٰ کوئی راہ پیدا کرے۔ حضرت صفوانؓ صحابی اس خدمت پر مامور تھے کہ وہ قافلہ کے پیچھے پیچھے چلیں تاکہ بھولی بسری چیزوں کا جائزہ لے سکیں۔ جب صبح کو وہ پڑاؤ کی جگہ پر پہنچے اور دیکھا کہ ام المومنینؓ پیچھے رہ گئیں تو انھوں نے 'اِنَّا لِلّٰه' پڑھا۔ بالآخر اپنا اونٹ بٹھایا۔ ام المومنینؓ اس پر سوار ہو گئیں اور انھوں نے مہار پکڑ کر اونٹ کو قافلے سے جا ملایا۔ فوج کے کوچ و مقام کے دوران میں اس قسم کے واقعہ کا پیش آ جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن منافقین نے اسی ذرا سی بات کو ایک افسانہ بنا ڈالا۔

مارِ آستین گروہ کو اچھی طرح پہچان لینے کا موقع مل گیا۔ اگر یہ موقع نہ پیدا ہوتا تو معلوم نہیں اندر ہی اندر یہ سرطانی پھوڑا کیا شکل اختیار کرتا اور اس سے کیا مفاسد ظہور میں آتے!

دوسرا خیر کا پہلو اس کے اندر یہ نکلا کہ مسلمانوں کے اندر جو بعض کمزوریاں دبی ہوئی تھیں وہ اس امتحان سے اُبھر کر سامنے آگئیں اور بروقت ان کی اصلاح و تدبیر ہوگئی۔ معاشرہ کے تزکیہ کے نقطۂ نظر سے اس کی جو اہمیت ہے وہ بالکل واضح ہے۔

تیسرا پہلو اس میں خیر کا یہ ہے کہ اس واقعہ نے معاشرہ کی اصلاح و تنظیم سے متعلق بہت سے احکام و ہدایات کے نزول کے لیے ایک نہایت سازگار فضا پیدا کردی۔ اگر اس فضا کے پیدا ہوئے بغیر یہ احکام اترتے تو بہت سے لوگوں پر ان کی حقیقی قدر و قیمت واضح نہ ہو سکتی۔

بانیِ فتنہ کی طرف اشارہ

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ کِبْر کسی جرم یا گناہ کے اصل اور بڑے حصہ کو کہتے ہیں۔ 'اَلَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ' یعنی جو اس فتنہ کا اصل برپا کرنے والا ہوا ہے، یہ اشارہ عبداللہ بن اُبی کی طرف ہے۔ یہ نہایت خبیث منافق تھا۔ اس سے پہلے بھی یہ متعدد فتنے برپا کر چکا تھا اور اس فتنے کی تو ساری ذمہ داری اصلاً اسی پر تھی۔ اوپر کے ٹکڑے میں مسلمانوں کو تسلی تھی کہ تمہارے لیے تو یہ فتنہ بہ اعتبار نتیجہ موجبِ خیر ہی ہوا ہے البتہ ان اشرار و مفسدین کے لیے یہ باعثِ ہلاکت ہوا۔ ان میں سے جس نے جس درجہ کا اس فتنہ میں حصہ لیا ہے وہ اپنے درجے کے اعتبار سے اس کی سزا بھگتے گا اور جو اس سارے طوفان کا اصل بانی ہے اس کے لیے تو آخرت میں ایک عذابِ عظیم ہے۔

لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ (١٢)

اسلامی معاشرہ کا اخلاقی اصول

اسلامی معاشرے میں ہر مسلمان مرد و عورت کا یہ حق ہے کہ دوسرے افرادِ معاشرہ ان کے بارے میں حسنِ ظن رکھیں اور اس وقت تک ان کے اس حق کا احترام کریں جب تک دلیل سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ اس حسنِ ظن کے حق دار باقی نہیں رہے۔ اس حق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کے بارے میں کسی مسلمان کے کان میں کوئی ایسی بات پڑے جو اس حسنِ ظن کو مجروح کرنے والی ہو تو وہ اس کو ایک سوغات سمجھ کر فوراً قبول نہ کرلے اور اس کی نقل و روایت نہ شروع کردے بلکہ اس کو رد کردے اور اس وقت تک اس کو باور نہ کرے جب تک اس کے سامنے اس کا کوئی معقول ثبوت نہ آجائے۔ اس طرح کے معاملات میں غیر جانبداری کا رویہ بھی جائز نہیں ہے کہ آدمی اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر نظر انداز کردے کہ دوسرا بدنام ہو رہا ہے، مجھے اس قضیے سے کیا سروکار! بلکہ حتی الامکان اسے اپنے بھائی کی مدافعت کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ ہر مسلمان پر اپنے دوسرے مسلمان بھائی کی عزت و آبرو کی حفاظت ایک فرض ہے۔ اسلامی معاشرہ کے اسی اخلاقی اصول پر یہاں مسلمانوں کو تنبیہ فرمایا ہے کہ جب تمہارے کانوں میں یہ بات پڑی تو آخر تم نے ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ ظن سے کام کیوں نہ لیا اور صاف صاف یہ کیوں نہ اعلان کردیا کہ یہ کھلا ہوا بہتان اور ایک صریح

تہمت ہے۔

ہمارے معاشرہ کا فسادِ مزاج

ایک طرف اسلامی معاشرے کے اس اخلاقی اصول کو سامنے رکھیے اور دوسری طرف اپنے معاشرے کا جائزہ لیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج اس کے بالکل برعکس اصول کارفرما ہے۔ آج نظریہ یہ ہے کہ ہر شخص سوءِ ظن کا مستحق ہے الا آنکہ کسی شخص کے ساتھ اپنی کوئی شخصی یا گروہی غرض وابستہ ہو اور دوسروں کی نسبت سنسنی پیدا کرنے والی افواہیں پھیلانا تو اس زمانے میں ایک مستقل فن اور ایک نہایت کامیاب پیشہ بن گیا ہے۔ ہماری قوم میں کتنے اہلِ قلم ہیں جن کا پیشہ ہی یہی ہے کہ وہ اسی طرح کی افواہوں کی تلاش میں

ہوئی صبح اور رکھ کر کان پر گھر سے قلم نکلے

یہ افواہیں نہایت جلی عنوانات سے اخبارات و رسائل میں چھپتی ہیں اور سب سے زیادہ کامیاب اخبارات و رسائل وہی ہیں جو اس طرح کی افواہیں ایجاد کرنے میں سب سے زیادہ شاطر ہیں۔ معاشرے کے فسادِ مزاج کا حال یہ ہے کہ لوگ اس طرح کی چیزیں پڑھتے ہیں اور هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ کہنا تو درکنار ان کی ہر بات پر اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہتے اور وحی و الہام سمجھ کر ان کی نقل و روایت کرتے ہیں۔

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۱۳)

الزام کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کا مطالبہ

یعنی ان مفتریوں کی بات لائقِ اعتنا ہو سکتی تھی تو اس صورت میں ہو سکتی تھی جب یہ شریعت کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ پیش کرتے۔ یہ امر واضح رہے کہ اس طرح کے الزام کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کی شہادت کا قانون اس سے بہت پہلے سورۂ نساء (آیت ۱۵) میں نازل ہو چکا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان مفسدوں نے یہ الزام لگایا تھا تو ان کی شرعی اور قانونی ذمہ داری یہ تھی کہ یہ چار گواہ پیش کرتے لیکن جب وہ چار گواہ پیش نہ کر سکے تو خدا کے قانون کی رو سے تو وہی جھوٹے ہیں۔ پھر جن لوگوں نے ان کی طرف سے ثبوت فراہم ہوئے بغیر ان کی بات باور کر لی، آخر کس سند کی بنیاد پر باور کر لی؟

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِىْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۴)

مسلمانوں کو پھر تنبیہ

'افاض فی الحدیث' کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بات میں سے بات نکلتے ہوتے آدمی کہیں سے کہیں جا پہنچے اور بات کا بتنگڑ بنا ڈالے۔ آیت ۱۰ کے بعد یہ پھر مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ اس معاملے میں تم جس روش پر چل نکلے تھے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم کو ایک عذابِ عظیم آ پکڑتا لیکن تم پر دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ کی رحمت ہے اس وجہ سے اس نے درگزر فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے اس فضل و رحمت کی قدر کرو، ایسا نہ ہو کہ کسی اسی طرح کے فتنہ میں پھر مبتلا ہو کر اپنے آپ کو مستحق عذاب بنا ڈالو۔

یہ خطاب سارے معاشرے سے ہے حالانکہ اس معاملے میں ملوث ہونے والے یا سہل انگاری و بے پروائی کو راہ دینے والے زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اس خطابِ عام کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے مفاسد کی نوعیت

وبائی امراض کی ہے۔ اگر چند افراد کے اندر بھی اس کا ظہور ہو تو ہر شخص کو خطرہ سے آگاہ ہو جانا چاہیے کہ مبادا یہ وبا عام ہو جائے اور پھر اس کے نتیجہ میں پورا معاشرہ خدا کی پکڑ میں آجائے۔

إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا ۚ وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ (۱۵)

نقل و روایت کے معاملہ میں احتیاط کی ہدایت

یہ اسی بات کی سنگینی کا اظہار ہے جس کو کچھ لوگوں نے ایک معمولی بات سمجھ کر بے تکلف اس کی نقل و روایت شروع کر دی اور یہ انھوں نے نہ سوچا کہ جس چیز کو وہ معمولی سمجھ رہے ہیں وہ اللہ کے نزدیک بڑی ہی سنگین بات ہے۔ کسی بات کو قبول کرنے کا اصلی راستہ عقل ہے نہ کہ زبان اور نقل و روایت کے قابل وہ بات ہوتی ہے جس کی بنیاد قابل اعتماد علم پر ہو نہ کہ افواہ پر۔ اگر عقل کو آدمی معطل کر دے اور اس کے پاس صرف گز بھر کی زبان رہ جائے تو نقد و درایت کے بغیر وہ کان میں پڑی ہوئی ہر بات کی روایت شروع کر دے گا اور اس طرح وہ خود بھی شیطان کے پھیلائے ہوئے فتنہ میں مبتلا ہو گا اور دوسروں کو بھی مبتلا کرے گا۔

اس آیت میں مسلمانوں کو اسی خطرہ سے آگاہ کیا گیا ہے کہ اس معاملہ میں کچھ لوگوں نے عقل کے بجائے صرف زبان کو قبولِ روایت کا ذریعہ بنایا اور علم کے بجائے محض ایک افواہ کی روایت شروع کر دی۔ انھوں نے یہ بات ایک معمولی بات سمجھی حالانکہ اپنے نتائج و عواقب کے اعتبار سے یہ چیز نہایت خطرناک اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک جرم عظیم ہے۔

وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَا أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ (۱۶)

'سُبْحٰنَكَ' یہاں بالکل اسی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں ہم 'مَعَاذَ اللہ' بولتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب تمہارے سامنے ایک ایسی بات آئی تھی جو ثبوت و شہادت سے بالکل عاری تھی اور جس کی زد صرف ایک مومنہ کے عزت و ناموس ہی پر نہیں بلکہ ام المومنینؓ کے عزت و ناموس پر پڑ رہی تھی تو تم نے اس کو سنتے ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ بے ثبوت و شہادت کسی مومنہ کی شان میں ایسی بات زبان سے نکالنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔ 'مَعَاذَ اللہ'! یہ صریح بہتان ہے!

ان آیات سے روایت و درایت اور قبولِ روایت سے متعلق جو اصول نکلتے ہیں وہ بڑے اہم ہیں۔ اگر بحث کے اپنے حدود سے متجاوز ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم ان کو واضح کرنے کی کوشش کرتے۔ اصحابِ علم ان آیات کے اس پہلو پر نگاہ رکھیں۔

يَعِظُكُمُ اللَّهُ أَن تَعُودُوا لِمِثْلِهِ أَبَدًا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ وَيُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۱۷-۱۸)

تنبیہ مزید

لفظ 'وَعْظ' کے اندر زجر اور نہی کا مفہوم خود مضمر ہے اس وجہ سے اس کے بعد حرف 'لَا' کے لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آیتیں بھی اسی طرح بطور تنبیہ ہیں جس طرح اوپر تین آیتیں گزر چکی ہیں۔ اس سورہ میں جو

ہدایات دی گئی ہیں وہ خدا کے قہر و غضب سے محفوظ رہنے کے لیے نہایت ضروری ہیں اس وجہ سے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ یہ تنبیہات بار بار آ رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تمھیں تنبیہ کر رہا ہے کہ ایسی حرکت آئندہ پھر کبھی تم سے صادر نہ ہو۔ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ یعنی اس طرح کی باتوں سے احتراز ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر ان سے احتراز نہ کیا گیا تو ایمان کا دعویٰ بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ وَیُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ یعنی اللہ نے اپنی ہدایات اچھی طرح واضح کر دی ہیں، اب ذمہ داری تمھاری ہے۔ اور یہ یاد رکھو کہ اللہ علم و حکمت والا ہے اس وجہ سے جو کچھ اس نے بتایا ہے اسی میں تمھارے لیے خیر و برکت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ احکام ایک علیم و حکیم کے بتلائے اور سکھائے ہوئے ہیں، کسی کو خدا سے زیادہ علیم و حکیم ہونے کے خبط میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ۚ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۹)

فتنہ برپا کرنے میں یہود کی سازش

یہ ان منافقین کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے یہ فتنہ برپا کیا۔ یہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہود کے زیر اثر تھے اور یہود پر یہ بات بہت شاق تھی کہ مسلمانوں کی اخلاقی برتری کی دھاک ان کے مخالفوں کے دلوں پر بھی بیٹھتی جا رہی ہے۔ عربوں کا معاشرہ دورِ جاہلیت میں بالکل خبیثون و خبیثات کا معاشرہ بن چکا تھا اور یہود کا معاشرہ اہل کتاب ہونے کے باوجود، ان سے بھی زیادہ بگڑا ہوا تھا۔ اب جب انھوں نے دیکھا کہ اسی گندگی کے ڈھیر سے طیبون و طیبات کا ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ ابھر رہا ہے جو ملائکہ کے لیے بھی قابل رشک ہے تو اس آئینہ میں ان کو اپنی تصویر بہت مکروہ نظر آئی۔ اس کا انتقام لینے کی تدبیر انھوں نے یہ سوچی کہ مسلمانوں کے اندر بھی برائی اور بے حیائی کا چرچا پھیلے اور اس کارِ خیر کے لیے انھوں نے اپنے زیر اثر اور پروردہ منافقین کو ذریعہ بنایا جنھوں نے خاص اہل بیت رسالت کو ہدف بنایا کہ اگر وہ اپنی اس سازش میں کامیاب ہو گئے تو مسلمانوں کے اخلاقی وقار کی ساری عمارت منہدم ہو جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت سے ان کی سازش کامیاب نہ ہونے دی ــــ انھی اشرار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جو لوگ یہ ارمان رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر برائی و بے حیائی کا چرچا ہو ان کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں ایک دردناک عذاب ہے۔

وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ، یہ ان مسلمانوں کو تنبیہ ہے جو ان چھپے ہوئے مفسدین سے اچھی طرح آگاہ نہ ہونے کے باعث ان کے اٹھائے ہوئے فتنوں کے لپیٹ میں آ جاتے تھے اور اس موقع پر بھی کچھ لوگ آ گئے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ وَاَنَّ اللّٰہَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۲۰)

مزید تنبیہ

بعینہٖ یہی آیت اوپر گزر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۱۰۔ بس یہ فرق ہے کہ وہاں تَوَّابٌ حَکِیْمٌ ہے

اور یہاں رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ہے۔ 'لَوْ' کا جواب یہاں بھی محذوف ہے اور یہ حذف تنبیہ کی شدت پر دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہاری (خطاب مسلمانوں سے ہے) اس شدید غلطی پر تمہاری گرفت نہیں کی ورنہ تمہارے اندر کے لوگوں نے جس طرح اسلام کے دشمنوں کی مقصد برآری کا سامان کیا تھا اس پر تم سزاوار تھے کہ خدا کی گرفت میں آجاتے لیکن خدا رؤف و رحیم ہے اس وجہ سے اس نے، تمہاری غلطی کے باوجود، تمہیں توبہ اور اصلاح کی مہلت دی۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّبِعُوا۟ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيْطَٰنِ ۚ وَمَن يَتَّبِعْ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيْطَٰنِ فَإِنَّهُۥ يَأْمُرُ بِٱلْفَحْشَآءِ وَٱلْمُنكَرِ ۚ وَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ مَا زَكَىٰ مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يُزَكِّى مَن يَشَآءُ ۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۲۱

یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہات اوپر گزر چکی ہیں۔ فرمایا کہ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ یہ بات اچھی طرح نوٹ کر لو کہ شیطان جب بھی سجھائے گا برائی اور بے حیائی کی راہ ہی سجھائے گا، وہ کبھی نیکی اور بھلائی کی راہ نہیں سجھائے گا۔ یہ تنبیہ یوں تو عام ہے لیکن یہاں خاص طور پر اسی ہدایت کو مؤکد کر دیا ہے جو اوپر گزر چکی ہے کہ کسی کی عزت و ناموس کے معاملے میں ہر اس بات کی نقل و روایت نہ شروع کر دو جس کے باب میں تمہیں کوئی علم نہ ہو۔ جس بات کا کوئی ثبوت نہ ہو وہ محض ظن ہے اور ظن کی پیروی شیطان کی پیروی ہے۔

ایک لطیف اور باریک تنبیہ

وَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ مَا زَكَىٰ مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يُزَكِّى مَن يَشَآءُ یہ اسی سلسلہ کی ایک نہایت لطیف اور باریک تنبیہ ہے۔ جو لوگ دوسروں کی عزت و ناموس کے معاملے میں ہر قسم کی رطب و یابس باتیں بے پروائی سے قبول کر لیتے اور ان کی بنا پر ان سے بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کا یہ رویہ غمازی کرتا ہے کہ وہ اپنے باب میں ضرورت سے زیادہ حسن ظن بلکہ ایک قسم کے ادعائے تزکیہ میں مبتلا ہیں، خواہ ان کو اپنے اس باطن کا شعور ہو یا نہ ہو۔ اسی مخفی چور سے یہاں ان لوگوں کو آگاہ کیا ہے جنھوں نے ام المومنینؓ کے باب میں دشمنوں کی اڑائی ہوئی افواہ کو بغیر کسی نکیر کے قبول کر لیا۔ فرمایا کہ ہر شخص یاد رکھے کہ جس کو بھی کوئی پاکی و پاکیزگی حاصل ہوتی ہے محض اللہ کے فضل سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر اس کی توفیق شامل حال نہ ہو تو کوئی پاک نہیں ہو سکتا تو کسی کو اپنے تقویٰ و تزکیہ کا اتنا غرہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ دوسروں کے معاملے میں ہر قسم کی باتیں بے تحقیق قبول کر لے۔

وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ میں اس بات کی یاد دہانی ہے کہ جو شخص اپنی ذات کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ حسن ظن میں مبتلا ہوتا ہے وہ اس بات کو نہ بھولے کہ خدا سمیع و علیم ہے۔ وہ ہر شخص کی مخفی سے مخفی بات کو بھی سنتا اور جانتا ہے۔

وَلَا يَأْتَلِ أُو۟لُوا۟ ٱلْفَضْلِ مِنكُمْ وَٱلسَّعَةِ أَن يُؤْتُوٓا۟ أُو۟لِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينَ وَٱلْمُهَٰجِرِينَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ۖ

وَلۡيَعۡفُوۡا وَلۡيَصۡفَحُوۡا ؕ اَلَا تُحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَـكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (۲۲)

ان لوگوں سے درگزر کی ہدایت جو محض سادگی کے سبب سے اس فتنہ میں ملوث ہو گئے

اب یہ اسی اوپر والی بات پر عطف کر کے ان لوگوں کے باب میں عفو و درگزر کی ہدایت فرمائی جو محض اپنی سادگی کے سبب سے اس فتنہ کی سنگینی کا اندازہ نہ کر پائے اور اس کے نقل و روایت میں ملوث ہو گئے۔ اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ اصل حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اس بات کا اندیشہ تھا کہ بہت سے لوگ ان لوگوں کی امداد و سرپرستی سے دستکش ہو جائیں گے جنھوں نے کسی نوعیت سے اس جھوٹ کے پھیلانے میں حصہ لیا۔ روایات میں ہے کہ مسطحؓ ایک نادار صحابی حضرت ابوبکرؓ کے عزیز تھے۔ حضرت ابوبکرؓ ان کی سرپرستی فرماتے تھے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ وہ بھی اس فتنہ میں شریک ہیں تو قدرتی طور پر آپ کو نہایت صدمہ ہوا اور آپ نے قسم کھالی کہ اب میں مسطح کی کبھی کوئی مدد نہیں کروں گا۔ اسی قسم کے رویہ کا اندیشہ دوسرے غیرت مند مسلمانوں کی طرف سے بھی تھا اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور رزق و مال کی کشادگی عطا فرمائی ہے وہ مستحق قرابت داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو، ان کی کسی غلطی کی بنا پر، اپنی سرپرستی و امداد سے محروم کر دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں بلکہ عفو و درگزر سے کام لیں، غلطیاں اور کوتاہیاں ہر ایک سے ہوتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ درگزر فرماتا ہے۔ اگر وہ ہر ایک کی غلطی پر مواخذہ کرے اور اپنی عنایات سے اس کو محروم کر دے تو اس کے مواخذہ سے کون بچ سکتا ہے! تو جو لوگ اپنی غلطیوں پر اللہ کی مغفرت کے طلبگار ہیں انھیں چاہیے کہ وہ بھی دوسروں کی غلطیوں کو معاف کریں۔ اللہ غفور رحیم ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی صفات کا عکس اس کے بندوں کے اندر بھی پایا جائے۔

آیت میں 'اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ' کے الفاظ حق اور ذمہ داری کی یاددہانی کے لیے ہیں کہ جن کو اللہ اپنے فضل و رزق کی کشادگی سے نوازتا ہے ان سے وہ یہ چاہتا ہے کہ جس طرح خدا نے ان کو کشادگی کے ساتھ، ان کی کوتاہیوں اور غلطیوں کے باوجود، دیا ہے اسی طرح وہ بھی اس کے بندوں کو فیاضی اور کشادگی کے ساتھ دیں اور ان کی کسی غلطی سے متاثر ہو کر ان کی مدد سے ہاتھ نہ کھینچیں۔

'اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' کے الفاظ اظہارِ استحقاق کے لیے ہیں کہ جو لوگ قرابت مند بھی ہیں، مسکین بھی ہیں اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی صعوبات بھی برداشت کی ہیں وہ بہرحال اپنا ایک حق رکھتے ہیں اور وہ محض اس بنا پر اپنے اس حق سے محروم نہیں ہو جائیں گے کہ نادانستہ وہ کسی غلطی کے مرتکب ہو گئے۔

'اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ' میں اسی باریک حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہے۔ جس طرح کسی کے باب میں محض افواہوں کی بنا پر بدگمانی میں مبتلا ہو جانا خود اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ حسن ظن بلکہ ادعائے تزکیہ کی دلیل ہے اسی طرح کسی کی غلطی پر اس

سے ورگزر نہ کرنا اور اس کو اپنی سرپرستی سے محروم کر دینا اپنے آپ کو غلطیوں سے مبرا سمجھنے کے ہم معنی ہے اگرچہ آدمی کو اپنے اس مخفی خیال کا شعور نہ ہو۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حکمتِ دین کے پہلو سے یہ دونوں غلطیاں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ اسی وجہ سے ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ موزوں ہوا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ (۲۳-۲۵)

منافقین کے جرم کی شناعت اور ان کو تہدید

'مُحْصَنٰتٌ' یہاں پاکدامن شریف زادیوں کے مفہوم میں ہے اور 'غٰفِلٰتٌ' سے مراد دنیا کے چھل فریب سے ناآشنا بھولی بھالی خواتین ہیں۔ اگرچہ الفاظ عام ہیں اور مراد ان سے وقت کے مسلم معاشرہ کی تمام شریف زادیاں ہیں لیکن ان میں ایک لطیف اشارہ خاص طور پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی طرف ہے جو ان الفاظ کا سب سے اعلیٰ مصداق وہی ہو سکتی ہیں۔

'رَمْیٌ' کے اصلی معنی تو تیر مارنے کے ہیں لیکن یہ کسی پر تہمت اور بہتان لگانے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں 'غٰفِلٰتٌ' پر تہمت لگانے کے لیے اس لفظ کے استعمال میں ایک خاص بلاغت ہے۔ اس کے اندر یہ کنایہ ہے کہ جو لوگ بھولی بھالی پاکدامن بیبیوں پر تہمت لگاتے ہیں وہ گویا سوتے میں ان کو اپنی تیراندازی کا ہدف بناتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں پر دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی پھٹکار ہے۔ نہ یہ دنیا میں برومند ہوں گے نہ آخرت میں۔ دنیا میں بھی عنقریب ان کی جڑ کٹ کے رہے گی اور آخرت میں تو ان کے لیے بہرحال عذاب عظیم ہے ہی۔ ان منافقوں پر اللہ تعالیٰ کی اس لعنت کا اثر بالآخر یہ ظاہر ہوا کہ اسلام کے غلبہ نے ان کا اور ان کے سرغنوں کا سرزمین عرب سے بالکل خاتمہ کر دیا۔

'يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ الآیۃ' یعنی جس دن خدا کے عذاب عظیم سے سابقہ پیش آئے گا اس دن نہ وہ خود کوئی عذر پیش کر سکیں گے اور نہ ان کے جرم کو ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی شہادت کی ضرورت ہوگی۔ اس دن ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ پاؤں خود ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ آج وہ اپنی ان درپردہ سازشوں اور درپیشہ روانیوں پر پردہ ڈال سکتے ہیں لیکن ان کی زبانوں اور ان کے ہاتھ پاؤں سے تو ان کی کوئی حرکت ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ انھی گواہوں سے خدا گواہی دلوا دے گا کہ انھوں نے کیا کیا تہمتیں تراشی ہیں اور کیا کیا شر و فساد برپا کیے ہیں۔

'يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ' لفظ 'دِیْن' یہاں بدلہ اور جزا کے معنی میں ہے۔ یعنی اس دن اللہ تعالیٰ ان کا واجبی بدلہ پورا پورا چکا دے گا۔ ان کے ساتھ نہ کوئی رعایت ہوگی نہ کوئی زیادتی۔

'وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ' یعنی آج تو ابھی حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے اس وجہ سے یہ اللہ کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ نہ یہ یقین ہے کہ اللہ سراپا حق و عدل ہے اس لیے

لازماً وہ حق کو غالب اور باطل کو نابود کر کے رہے گا اور نہ یہ یقین ہے کہ وہ ہر چیز کو واضح کرنے والا ہے۔ ان غلط فہمیوں نے ان کو ان کی شرارتوں میں بہت بیباک بنا دیا ہے لیکن اس دن ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ خدا سراپا حق و عدل ہے اور اسی کے ساتھ وہ 'مُبِیْنُ' یعنی تمام حقائق کو آشکارا کرنے والا بھی ہے۔

اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ ۚ وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ ۚ
اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ ۖ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ (۲۶)

آخرت میں نفوس کی درجہ بندی اخلاق کے اعتبار سے ہوگی

یعنی اس دنیا میں تو ابھی حالات پر بہت کچھ پردہ پڑا ہوا ہے اور گھر و شیر دونوں رلے ملے ہوئے ہیں لیکن جب جزائے حق کا دن آئے گا تو اس دن نفوس کی درجہ بندی، جیسا کہ آیت وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (تکویر ـ ۷) میں ارشاد فرمایا ہے، اعمال و اخلاق اور ایمان و عقائد کے اعتبار سے ہوگی۔ اس دن خبیث عورتیں خبیث مردوں کے ساتھ باندھ دی جائیں گی اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے ساتھ جوڑ دیے جائیں گے۔ اسی کے مقابل میں پاکیزہ اخلاق عورتوں کو پاکیزہ صفات مردوں کی رفاقت حاصل ہوگی اور پاکیزہ اخلاق مردوں کو پاکیزہ اخلاق بیویاں ملیں گی۔ اور یہ لوگ اس دن تمام خرافات اور بکواسوں سے جو ان کے خلاف کی جا رہی ہیں بالکل بری اور پاک ہوں گے اور ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہوگی ——— ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ یہ دو لفظ آخرت کی تمام نعمتوں کی جامع تعبیر کے طور پر آتے ہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۷-۳۴

اب آگے ان رخنوں کو بند کیا ہے جو معاشرے میں بدنگاہی، تہمت اور اخلاقی مفاسد کو راہ دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس آزادی پر چند قیدیں عاید کی ہیں جو زمانۂ جاہلیت کی سوسائٹی میں، دوسروں کے گھروں میں آنے جانے کے معاملہ میں، لوگوں کو حاصل تھی۔ پھر بیواؤں اور ذی صلاحیت لونڈیوں اور غلاموں کے نکاح کی ہدایت فرمائی ہے تاکہ شریروں کو سوسائٹی میں رخنہ اندازی کی کوئی راہ نہ ملے۔ اسی ذیل میں غلاموں کی آزادی کے لیے مکاتبت کی ایک کشادہ راہ کھول دی اور اس آزادی کے حصول کے لیے لوگوں کو ان کی امداد پر ابھارا تاکہ غلام آزادوں کی صف میں آئیں، ان کا اخلاقی معیار اونچا ہو اور معاشرے میں ایمان کی اساس پر کامل ہم آہنگی و یک رنگی پیدا ہو ——— اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۷-۳۴

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا
وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَهْلِهَا ۚ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۲۷) فَاِنْ

ثُمَّ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ
قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
عَلِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ
فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾ قُلْ
لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۚ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۚ
اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ
اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ
مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا
لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ
اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا
مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ
الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ
لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۚ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ
عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۚ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى
يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ
اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ
الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۚ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا

لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ
اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ
مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾ ع ۱۰

ترجمۂ آیات ۲۷-۳۴

اے ایمان والو، اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک تعارف نہ پیدا کر لو اور گھر والوں کو سلام نہ کر لو۔ یہی طریقہ تمھارے لیے موجب خیر و برکت ہے تاکہ تمھیں یاددہانی حاصل رہے۔ پس اگر تم ان گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک تمھیں اجازت نہ ملے۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہی طریقہ تمھارے لیے پاکیزہ ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اور ان غیر رہائشی مکانوں میں داخل ہونے میں تمھارے لیے کوئی ہرج نہیں جن میں تمھارے لیے کوئی منفعت ہے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔ ۲۷-۲۹

مومنوں کو ہدایت کرو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی پردہ پوشی کریں۔ یہ طریقہ ان کے لیے پاکیزہ ہے۔ بے شک اللہ باخبر ہے ان چیزوں سے جو وہ کرتے ہیں۔ اور مومنہ عورتوں کو کہو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے اندیشہ کی جگہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ کریں مگر جو ناگزیر طور پر ظاہر ہو جائے اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بکل مار لیا کریں اور اپنی زینت کا اظہار نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں کے سامنے یا اپنے باپوں کے سامنے یا اپنے شوہروں کے باپوں کے سامنے یا اپنے بیٹوں کے سامنے یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے سامنے یا اپنے بھائیوں کے سامنے یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے سامنے یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے سامنے یا اپنے تعلق کی عورتوں کے سامنے یا اپنے مملوکوں کے سامنے یا ایسے زیر کفالت مردوں کے سامنے جو عورت کی ضرورت کی عمر سے نکل چکے ہوں

یا ایسے بچوں کے سامنے جو ابھی عورتوں کی پس پردہ چیزوں سے آشنا نہ ہوں۔ اور عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مار کے نہ چلیں کہ ان کی مخفی زینت ظاہر ہو۔ اور اے ایمان والو، سب مل کر اللہ کی طرف رجوع کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۳۰-۳۱

اور اپنی رانڈوں اور رنڈوؤں اور ذی صلاحیت غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کرو۔ اگر وہ تنگ دست ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے۔ اور جو لوگ نکاح کرنے کی مقدرت نہیں پا رہے وہ اپنے کو ضبط میں رکھیں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے اور جو مکاتب ہونے کے طالب ہوں تمہارے مملوکوں میں سے تو ان کو مکاتب بنا دو اگر تم ان میں صلاحیت پاؤ اور ان کو اس مال میں سے دو جو خدا نے تم کو دیا ہے اور اپنی لونڈیوں کو پیشہ پر مجبور نہ کرو جب کہ وہ عفت کی زندگی کی خواہاں ہیں، محض اس لیے کہ کچھ متاع دنیا تمھیں حاصل ہو جائے اور جو ان کو مجبور کرے گا تو اس اکراہ کے بعد اللہ ان کے لیے غفور رحیم ہے۔ اور بے شک ہم نے تمھاری طرف روشن آیتیں بھی اتاری ہیں، اور ان لوگوں کی تمثیل بھی سنا دی ہے جو تم سے پہلے گزرے اور خدا ترسوں کے لیے موعظت بھی۔ ۳۲-۳۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۲۷)

گھروں کے اندر داخل ہونے کے لیے طلب اذن کی ہدایت

'استیناس' کے معنی متعارف و مانوس ہو جانے کے ہیں اور 'بیوت' سے مراد، جیسا کہ آگے والی آیت میں وضاحت آ رہی ہے، رہائشی مکانات ہیں جن میں کسی کے بیوی بچے رہتے ہوں۔ فرمایا کہ اگر کسی مسلمان کو اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے رہائشی مکان میں جانے کی ضرورت پیش آئے تو یوں ہی دندناتا ہوا نہ گھس جائے بلکہ پہلے انس و تعارف حاصل کرے جس کا شائستہ اور بابرکت طریقہ یہ ہے کہ دروازے پر کھڑا ہو

کر گھر والوں کو سلام کرے۔ اگر ادھر سے سلام کا جواب اور اجازت ملے تو گھر میں داخل ہو ورنہ واپس ہو جائے۔

سلام اپنے آپ کو متعارف کرانے اور طلب اذن کا نہایت پاکیزہ طریقہ ہے۔ آیت میں 'تَسْتَاْنِسُوْا' کے بعد 'وَتُسَلِّمُوْا' طریقۂ تعارف کی وضاحت کے لیے ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دروازے پر کوئی سلام کرے گا تو گھر والے معلوم کر ہی لیں گے کہ کون صاحب ہیں؟ کیا چاہتے ہیں اور گھر کے اندر ان کا داخل ہونا مناسب ہے یا نہیں اور اس وقت ان کا آنا مناسب ہے یا کسی اور وقت؟

اذن کے لیے سلام کا طریقہ

گھروں کے اندر داخل ہونے کے لیے طلب اذن کا کوئی نہ کوئی طریقہ تو تمام مہذب قوموں میں ہمیشہ سے رہا ہے۔ عرب جاہلیت کے شرفاء میں بھی اس کا رواج تھا بلکہ ان کے ہاں اس کے لیے جو الفاظ تھے وہ تقریباً بالکل ان الفاظ کے ہم معنی ہیں جو اس وقت مغربی یا مغرب زدہ سوسائٹی میں رائج ہیں لیکن اسلام نے ان کو اختیار نہیں کیا بلکہ ان کی جگہ پر سلام کی ہدایت فرمائی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلام کا طریقہ یہ بتایا کہ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کرے۔ اگر کوئی جواب مل جائے فبہا اور اگر جواب نہ ملے تو تین بار تک سلام کر کے واپس لوٹ آئے۔

اس پابندی کے بعد ظاہر ہے کہ اس اندیشے کے امکانات کا سد باب ہو گیا کہ کوئی غیر مطلوب شخص کسی نامناسب وقت میں کسی کے زنانہ مکان کے اندر گھس آئے۔ اس کے بعد صرف وہی لوگ گھروں کے اندر آ سکتے تھے جو صاحب خانہ سے یا تو کوئی قرابت رکھتے ہوں یا صاحب خانہ کو ان پر پورا پورا اعتماد ہو۔

اس طریقہ کی برکتیں

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ یہ اس پابندی کی برکت واضح فرمائی ہے تاکہ طبائع پر یہ زیادہ شاق نہ ہو۔ فرمایا کہ یہ تمہارے لیے موجب خیر و برکت ہے تاکہ تمہیں یاددہانی حاصل ہو جایا کرے۔ گویا اس کی نوعیت دروازے پر ایک مبارک نوٹس کی ہے کہ گھر میں داخل ہونے والے کو بھی یاددہانی ہو جائے کہ وہ دوسرے کے حرم میں قدم رکھ رہا ہے جہاں اس کو کچھ خاص اخلاقی آداب کا لحاظ رکھنا ہے اور گھر والوں کو بھی آگاہی ہو جائے کہ ان کے اندر اس وقت ایک ایسا شخص موجود ہے جس کے معاملے میں ان کے اوپر کچھ حدود و قیود ہیں جن کا احترام دنیا اور آخرت دونوں میں موجب خیر و برکت ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (۲۸)

یعنی اگر طلب اجازت کے بعد معلوم ہو جائے کہ گھر میں اس وقت اجازت دینے والا کوئی نہیں ہے تو جب تک اجازت نہ ملے گھر کے اندر داخل نہ ہو اور اگر واپس ہو جانے کے لیے کہا جائے تو واپس ہو جاؤ۔

'هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ' یعنی ہر چند ہے تو یہ دل پر شاق گزرنے والی بات لیکن اخلاقی پہلو سے یہی طریقہ پاکیزہ ہے۔ معلوم نہیں کیا حالات ہیں جن کی بنا پر گھر والوں نے اجازت نہیں دی۔ اس طرح کے

مدامت ہیں اپنے وقار سے زیادہ صاحبِ خانہ کے مصالح ہی کے لحاظ میں حکمت اور شیطان کے فتنوں سے امان ہے۔

خدا کی صفت علم کی بار بار یاددہانی کی حکمت

'وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ' یہ مضمون یہاں معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ بار بار آیا ہے۔ آگے فرمایا ہے۔ 'وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ' پھر ارشاد ہوا ہے 'اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ'۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کی یہ بار بار یاددہانی اس وجہ سے کی جا رہی ہے کہ جن چیزوں سے یہاں روکا جا رہا ہے ان کے لیے نفس کے اندر چور دروازے بہت سے ہیں۔ جب تک خدا کے علیم و خبیر ہونے کا صحیح طور پر استحضار نہ ہو مجرد احکام و ہدایات سے ان رخنوں کو بند کرنا ممکن نہیں ہے۔ شیطان کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتا ہے اور آدمی ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ البتہ اگر اس تصور کا دل پر ہر وقت غلبہ رہے کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے تو یہ چیز شیطان کی مخفی سے مخفی چالوں سے بھی انسان کو محفوظ رکھتی ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ (۲۹)

'غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ' سے مراد

'غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ' سے مراد قرینہ دلیل ہے کہ یہاں وہ مکانات ہیں جو غیر رہائشی ہیں یعنی جن میں آدمی کے بیوی بچے نہ رہتے ہوں۔ اوپر کی ہدایات سے واضح ہے کہ اجازت لینے کی یہ پابندی اصلاً بدنگاہی اور مواقعِ تہمت سے بچانے کے لیے کی گئی ہے اس وجہ سے ان مکانوں کے لیے یہ پابندی ضروری نہیں ہے جو غیر رہائشی ہیں۔ ان میں آدمی بغیر اذن کے بھی جا سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ بھی 'فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ' کی قید لگی ہوئی ہے۔ یعنی کوئی منفعت اور ضرورت اس کے لیے داعی ہو۔ 'مَتَاعٌ لَّكُمْ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ مکانات یوں ہی عام ضرورت کے مثلاً دکانیں، سرائیں، ہوٹل وغیرہ۔ مردانہ نشست گاہیں بھی اسی حکم میں داخل ہیں۔

'وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ' یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ اوپر گزر چکی ہے۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ آدمی کے اندر اگر خدا کی صفتِ علم کا صحیح استحضار نہ ہو تو وہ اس آزادی سے بھی غلط فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایک شخص کسی کے زنانہ مکان میں، بدون اجازت، گھس جائے اور جب اس پر اعتراض ہو تو وہ یہ عذر کر دے کہ میں نے سمجھا کہ یہ مردانہ نشست گاہ یا دفتر ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (۳۰)

گھر کے اندر ہونے کے بعد کی احتیاطیں

مذکورہ بالا اجازت کے بعد اگر کوئی شخص کسی کے مکان میں داخل ہو تو اس کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھے اور اپنی شرم کی جگہوں کی حفاظت کرے۔ 'قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ غضِ بصر اور حفاظتِ فروج تقاضائے ایمان ہے اور 'مِنْ اَبْصَارِهِمْ' کے 'مِنْ' سے یہ بات نکلتی

ہے کہ مقصود صرف اس حد تک نگاہوں کو نیچی رکھنا ہے کہ گھر کی عورتوں سے اپنی نظر کو بچائے رکھے اس لیے کہ یہ ہدایت درحقیقت انہی کو پیش نظر رکھ کر دی گئی ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلی کہ اسلام نے یہ اجازت جو دی ہے وہ محض رفع حرج کے پہلو سے صاحب خانہ کے اعزہ واقربا اور تعلق واعتماد کے لوگوں کے لیے دی ہے۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ ہر شخص کے گھر میں اس زمانے میں نہ مردانہ نشست گاہیں تھیں اور نہ آج ہو سکتی ہیں لیکن یہ ہدایات خود اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اگر مردوں کے الگ بیٹھنے کا گھر میں انتظام ہو تو قریبی اعزہ واقربا کے سوا دوسرے مردوں کا گھر کی عورتوں سے الگ ہی بیٹھنا اسلام میں مطلوب ہے آگے کی آیات سے ان شاء اللہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔

غض بصر کی ہدایت کی اہمیت

'غض بصر' کی ہدایت بڑی اہم ہدایت ہے۔ نگاہ ہی درحقیقت مرد و عورت کے درمیان اولین قاصد کا کام دیتی ہے۔ اگر اس کے اوپر ایمانداری کے ساتھ کوئی شخص پہرہ بٹھا دے تو وہ شیطان کے بہت سے فتنوں سے امان میں ہو جاتا ہے۔

حفظ فروج میں اصل دخل لباس کو ہے

'حفظ فروج' میں بڑا دخل اس چیز کو ہے کہ لباس باقرینہ ہو۔ اس زمانے میں فیشن کے شوق نے لباس میں ایسی ایجادیں کر دی ہیں کہ اس کا اصل مقصود ستر بالکل غائب ہو گیا ہے۔ صرف زینت کا مقصد باقی رہ گیا ہے اور زینت بھی وہ زینت جس کے اندر صریح بدقوارگی نمایاں ہے۔ پہلے تو صرف عورتوں ہی کا رونا تھا لیکن اب تو مردوں نے بھی وہ لباس اختیار کر لیا ہے کہ اس لباس میں وہ شریفوں کی کسی مجلس میں بھی جانے کا حق نہیں رکھتے چہ جائیکہ کسی باایمان مسلمان کے گھر کے اندر۔

'ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ'۔ یعنی گھروں کے اندر یہ احتیاطیں اخلاقی پاکیزگی کے نقطۂ نظر سے نہایت اعلیٰ اور اہم ہیں بشرطیکہ ان احتیاطوں کے ساتھ یہ حقیقت بھی ہر وقت مستحضر رہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، خواہ کتنے ہی مخفی طریقے سے کرے، خدا اس سے باخبر ہوتا ہے۔ اگر یہ حقیقت مستحضر نہ ہو تو نہ نگاہ کو آوارگی سے بچایا جا سکتا ہے نہ اعضا کو نمائش سے۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

گھر کے اندر عورتوں کا پردہ

اب یہ عورتوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ اگر گھر کے اندر کوئی غیر محرم داخل ہو تو وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اپنی شرم کی جگہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کی چیزیں اس کے سامنے نہ ظاہر ہونے دیں، صرف وہ زینت

اس سے مستثنیٰ ہے جس کا ظاہر ہونا ناگزیر ہے۔ زینت کی چیزوں کا اظہار صرف شوہر کے سامنے جائز ہے یا محرموں کے سامنے یا اپنے میل جول اور تعلق و خدمت کی عورتوں کے سامنے، یا اپنے ملوکوں کے سامنے یا ایسے مردوں کے سامنے جو بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان کی کفالت و پرورش کا بار گھر والوں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے یا ایسے بچوں کے سامنے جو ابھی جنسی معاملات سے ناآشنا ہوں۔ اور مزید یہ کہ اگر کسی غیر محرم کی موجودگی میں عورتوں کو گھر کے اندر نقل و حرکت کی ضرورت پیش آئے تو زمین پر پاؤں مار کے نہ چلیں کہ زیوروں کی جھنکار سنائی دے۔

یہ اس آیت کا سادہ مطلب ہوا۔ اس کے بعض اجزاء جو وضاحت طلب ہیں، ہم ان کی وضاحت بھی کیے دیتے ہیں۔

اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کا مفہوم

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا: زینت کی چیزوں میں لباس بھی داخل ہے اور زیورات بھی۔ ان میں سے ہر چیز کو نہ تو چھپانا ممکن ہے نہ ہر چیز کا ظاہر ہونا ناگزیر ہے۔ لباس کا بھی ظاہری حصہ بہرحال ظاہر ہو کے رہے گا اور زیورات بھی بالخصوص ہاتھ کے بعض زیورات بغیر زحمت کے نہیں چھپائے جا سکتے۔ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کے استثناء نے اس قسم کی غیر معمولی زحمتوں سے بچا کر صرف ان زینتوں کو چھپانے کی ہدایت فرمائی جن کے چھپانے میں زیادہ زحمت نہیں ہے۔

اوڑھنی مسلمان خواتین کے لباس کا ضروری جزو ہے

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ۔ خمار، دوپٹہ اور اوڑھنی کو کہتے ہیں۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اوڑھنی مسلمان خواتین کے لباس کا ایک ضروری جزو ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ کسی غیر محرم کی موجودگی میں عورتوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس اوڑھنی سے اپنے سر اور کمر کے ساتھ اپنے گریبانوں کو بھی چھپائیں ——— ایک طرف اس حکم کو سامنے رکھیے اور دوسری طرف اپنی قوم کی مہتر جات کو دیکھیے کہ انھوں نے اوڑھنی کو دقیانوسیت قرار دے کر یک قلم خارج قرار دے دیا اور چاک گریبان اور سینے کے ابھار کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا لازمۂ تہذیب ٹھہرا!

'اٰبَآئِهِنَّ'۔ لفظ 'اٰبَآء' اپنے وسیع معنوں میں اجداد و اعمام سب پر مشتمل ہے۔ محرم اعزہ کے نمایاں عناصر کے نام گنا دیے ہیں لیکن مراد وہ سب ہیں جو اس حکم میں داخل ہیں۔

'نِسَآئِهِنَّ' سے مراد

'اَوْ نِسَآئِهِنَّ' میں بعض فقہاء نے صرف مسلمان عورتوں کو مراد لیا ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ میرے نزدیک اس بارے میں صاحب کشاف کی رائے صحیح ہے۔ انھوں نے اس سے میل جول اور تعلق و خدمت کی عورتوں کو مراد لیا ہے (من فی صحبتهن وخدمتهن من النساء) یہ امر ملحوظ رہے کہ ہر قسم کی اجنبی عورتوں کے سامنے عورتوں کے لیے اپنی زینت کا ظاہر کرنا فتنہ اور خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ بعض عورتیں

لہ اس پابندی سے صرف وہ بوڑھی عورتیں مستثنیٰ ہیں جو نکاح کی عمر سے گزر چکی ہیں۔ اگرچہ ان کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ وہ بھی اس کا اہتمام رکھیں۔ اس کی وضاحت آگے آیت ۶۰ میں آئے گی جو اس آیت کی توضیح کے طور پر بعد میں نازل ہوئی۔

بڑی تعامہ ہوتی ہیں۔ ان سے بچ کے رہنے ہی میں سلامتی ہے۔ معلوم نہیں وہ کس آفت میں مبتلا کر دیں۔

(ما ملکت ایمانھن سے لونڈی اور غلام دونوں مراد ہیں)

'اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ' سے مراد لونڈی اور غلام دونوں ہیں۔ بعض فقہاء نے اس سے صرف لونڈیاں کو مراد لیا ہے لیکن اس تخصیص کا کوئی قرینہ الفاظ میں موجود نہیں ہے۔ اگر صرف لونڈیاں ہی مراد ہوتیں تو صحیح اور واضح تعبیر 'اَوْ اِمَآئِهِنَّ' کی ہوتی۔ ایک عام لفظ، جو لونڈیوں اور غلاموں دونوں پر مشتمل ہے، اس کے لیے استعمال نہ ہوتا۔ پھر یہاں اس سے پہلے 'نِسَآئِهِنَّ' کا لفظ آ چکا ہے جو ان تمام عورتوں پر، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، مشتمل ہے جو میل جول اور خدمت کی نوعیت کی وابستگی رکھتی ہیں۔ اس کے بعد لونڈیوں کے علیحدہ ذکر کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں یہ بات قرآن کی تصریحات کے بھی خلاف ہے۔ آگے اسی سورہ میں، انہی احکام سے متعلق، بعض توضیحات آئیں گی جو بعد میں نازل ہوئیں۔ ان میں لونڈیوں اور غلاموں دونوں کو، تین مخصوص اوقات کے علاوہ، اجازت کے بغیر گھر میں آنے جانے کی اجازت دی ہے اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ 'طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ' کہ تم ایک دوسرے کے سامنے ہر وقت آمد و شد رکھنے والے ہو۔۱؎ ان وجوہ سے میں ان فقہاء کی رائے کو صحیح سمجھتا ہوں جو اس لفظ کو لونڈیوں اور غلاموں دونوں کے لیے عام مانتے ہیں۔ البتہ ان کے لیے بھی وہ پابندی ضروری ہوگی جو خود قرآن نے بیان کر دی ہے اور جس کی وضاحت آگے آیت ۵۸ میں آئے گی۔ لیکن اس بحث کی نوعیت اب مجرد ایک علمی بحث کی ہے، اس لیے کہ غلامی کا مسئلہ اب ختم ہو چکا ہے اور اس سلسلہ میں، دنیا کی تاریخ میں سب سے

(ملازموں کا حکم)

پہلے اسلام نے قدم اٹھایا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ اب مسئلہ غلاموں کا نہیں بلکہ نوکروں اور ملازموں کا ہے۔ ان کے باب میں قرآن کے اشارات سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں تک بوڑھے ملازموں اور بچوں کا تعلق ہے ان کے لیے تین اوقات کے سوا، جن کی تفصیل آگے آئے گی، گھروں میں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ رہے جوان ملازم تو ان کے باب میں، میرے نزدیک، ان تمام ہدایات پر عمل کرنا ضروری ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔ ان کے لیے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت لینا بھی ضروری ہے اور گھر میں ان کی موجودگی کی صورت میں ان پر اور گھر کی خواتین پر وہ پابندیاں بھی لازمی ہیں جو زیر بحث آیات میں بیان ہوتی ہیں۔

(بڑھوں اور معذوروں کا حکم)

'اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ' سے مراد وہ بوڑھے، معذور، نابینا اور اپاہج مرد مراد ہیں جو جنسی جذبات و خواہشات کے دور سے نکل چکے ہوں۔ اگر ایسے مردوں میں سے کسی کی کفالت و سرپرستی گھر والوں نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور وہ وہیں رہتے سہتے ہیں تو ان کے معاملے میں بھی وہ پابندیاں نہیں ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ میرے نزدیک یہی حکم بوڑھے ملازمین کا بھی ہے بس ان تین اوقات میں ان کے لیے اجازت کی ضرورت ہوگی جو آگے آیت ۵۸ میں مذکور ہیں۔

۱؎ ملاحظہ ہو آیت ۵۸۔

'اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ' سے مراد وہ بچے ہیں جن کے اندر ابھی جنسی شعور بیدار نہیں ہوا ہے اور وہ عورتوں کے صنفی اعضا کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتے جس نگاہ سے ایک مرد دیکھتا ہے۔ ان کے لیے اول اول اجازت لینے کی پابندی نہیں تھی لیکن بعد میں تین اوقات میں ان کے اوپر بھی پابندی عائد ہو گئی۔ تفصیل اس کی آگے آئے گی۔

اظہارِ زینت کا ایک مخصوص دائرہ ہے

'وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ'۔ زینت کی چیزوں کے استعمال میں اصلی جذبہ نمائش کا ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ چیز انسان بالخصوص عورت کی فطرت میں داخل ہے لیکن اس کا ایک مخصوص دائرہ ہے۔ موجودہ زمانہ کی متبرجات کی طرح ہر جگہ اپنی زینت کی نمائش کرتے پھرنا اسلام میں جائز نہیں ہے۔ اسی وجہ سے یہ ہدایت ہوئی کہ غیر محرموں کی موجودگی میں اگر عورتوں کو گھر کے اندر چلنے پھرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس طرح زمین پر پاؤں مار کے نہ چلیں کہ زیورات کی جھنکار سنائی دے۔

مسلمانوں کو اجتماعی توبہ کی ہدایت

'وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ' یہ ہدایات چونکہ پورے مسلم معاشرہ کی اصلاح و تطہیر کے لیے دی گئی ہیں اس وجہ سے سب کو خطاب کر کے رجوع الی اللہ کی دعوت دی گئی کہ سب مل کر اپنی اب تک کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح کرو اور زندگی کا وہ طریقہ اختیار کرو جس کی طرف قرآن تمھاری رہنمائی کر رہا ہے۔ یہی راستہ فوز و فلاح کا راستہ ہے۔ اس فوز و فلاح کے شرائط سورۂ حج آیت ۷۷ اور مومنون آیت ۱ کے تحت بیان ہو چکے ہیں۔ تفصیل کی ضرورت ہو تو ان پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

گھر سے باہر کے پردے کے احکام سورۂ احزاب میں بیان ہوئے ہیں

اوپر کی دونوں آیتوں میں مردوں اور عورتوں دونوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں، سیاق و سباق اور آیات کے الفاظ سے واضح ہے کہ یہ گھروں کے اندر کے پردہ سے متعلق ہیں۔ رہا یہ سوال کہ کسی عورت کو کسی ضرورت سے گھر سے باہر نکلنا پڑے تو اس صورت میں اس کو کیا کرنا چاہیے؟ اس سوال کا جواب یہاں نہیں دیا گیا ہے۔ اس کا جواب سورۂ احزاب میں آئے گا ــــ ان شاء اللہ ہم وہاں اس پر تفصیل سے بحث کریں گے۔ ویسے ہم نے 'قرآن اور پردہ' کے عنوان سے ایک الگ رسالہ بھی لکھ دیا ہے جس میں قرآن کی روشنی میں یہ واضح کیا ہے کہ اندر اور باہر دونوں صورتوں کے لیے قرآن نے پردے کے نہایت قطعی احکام دیے ہیں۔ تفصیل کے طالب اس رسالہ کو پڑھیں۔ ان قطعی احکام کے بعد بھی جن لوگوں کو قرآن میں پردے کا حکم کہیں نظر نہیں آتا ان کے بارے میں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے ان کو غیر محرم عورتوں سے جس غضِ بصر کی ہدایت فرمائی تھی وہ غضِ بصر ان حضرات نے قرآن سے کر لیا ہے۔ یہ لوگ قرآن کو چومتے تو بڑی عقیدت سے ہیں لیکن آنکھیں بند کر کے اور پھر چومنے کے بعد اس کو شاید بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں!

'وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۭ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ' (۳۲)

'ایامٰی' سے مراد

'ایامٰی' 'ایّم' کی جمع ہے۔ 'ایّم' اس مرد کو بھی کہتے ہیں جو بیوی سے محروم ہو اور اس عورت کو بھی

کہتے ہیں جو شوہر سے محروم ہو۔ یعنی رانڈ اور رنڈوے دونوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے بلکہ اپنے وسیع مفہوم میں یہ ان مردوں اور عورتوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو بن بیاہے رہ گئے ہوں۔

لفظ 'صٰلحین' سے مراد — لفظ 'صٰلِحِیْنَ' یہاں جسمانی اور اخلاقی دونوں قسم کی صلاحیتیں رکھنے والوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ عربی میں یہ لفظ اس جامع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

رانڈوں اور رنڈوؤں کے نکاح کی ہدایت — معاشرے کے اندر اخلاقی مفاسد اور شیطان کی دراندازیوں کے لیے ایک وسیع دروازہ یہ چیز بھی کھولتی ہے کہ اس میں بہت سے مرد بیویوں سے محروم اور بہت سی عورتیں شوہروں سے محروم ہوں۔ اس سے ناجائز تعلقات کے امکانات بھی بہت بڑھ جاتے ہیں اور تہمتوں کے پھیلانے کے لیے شریروں کو مواقع بھی ہاتھ آتے ہیں۔ اس برائی کے پیدا ہونے میں جس طرح بعض حالات میں غربت کو دخل ہے اسی طرح بعض حالات میں، بالخصوص عورتوں کے معاملہ میں، خاندانوں، برادریوں اور قبیلوں کے رسم و رواج کو بھی بڑا دخل ہے۔ بعض خاندانوں اور برادریوں میں عقدِ بیوگان کو معیوب تصور کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی خرابیوں کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک معاشرے کے اندر ان کی اصلاح کا احساس نہ پیدا ہو۔ اس وجہ سے قرآن نے معاشرے کو ہدایت فرمائی کہ اپنے اندر کے رانڈوں اور رنڈوؤں اور بے نکاح مردوں اور عورتوں کے نکاح کرو۔ مطلب یہ ہے کہ اس چیز کے لیے لوگوں کے اندر احساس پیدا کرو، اس کے مخالف رجحانات کی بیخ کنی کرو، جو لوگ غریب ہیں ان کی حوصلہ افزائی اور اعانت کرو تاکہ وہ بھی معاشرے کے اندر اپنا جائز مقام حاصل کریں اور ان کے مجرد رہنے کے سبب سے جو نقصانات ان کو اور معاشرہ کو پہنچ سکتے ہیں ان کا سدِ باب ہو۔

اسی طرح غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو اخلاقی و جسمانی اعتبار سے ذی صلاحیت ہیں ان کے بھی نکاح کر دو۔ ذی صلاحیت سے مراد وہ لونڈیاں اور غلام ہیں جو اپنی ذمہ داریاں سنبھال سکتے اور اپنے حقوق و فرائض کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ہدایت بھی اس وجہ سے فرمائی گئی کہ اس طرح غلاموں کا اخلاقی و معاشرتی معیار اونچا ہو گا اور وہ بالتدریج معاشرہ کے صالح اجزا بن جائیں گے۔

ذی صلاحیت لونڈیوں اور غلاموں کے نکاح کی ہدایت — 'اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِھِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ' اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ مردوں کے لیے شادی سے محروم رہ جانے کی عام وجہ غربت ہوتی ہے۔ غریب آدمی اول تو کسی کنبہ کی ذمہ داری اٹھانے سے خود بھی گھبراتا ہے لیکن وہ نہ بھی گھبرائے تو کوئی عورت اپنے آپ کو اس کے حبالۂ عقد میں دینے پر کب راضی ہوتی ہے اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت دی کہ جو لوگ غریب ہیں وہ بھی اطمینان رکھیں اور دوسرے بھی یہ اطمینان رکھیں کہ نکاح فقر میں اضافہ نہیں کرتا بلکہ خدا کے رزق و فضل میں اضافہ کرتا ہے۔

نکاح رزق و فضل میں اضافہ کرتا ہے — جو آدمی اپنے ایمان و اخلاق کی حفاظت کے لیے نکاح کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی نظرِ کرم ہوتی ہے اور وہ اس کی دستگیری فرماتا ہے۔ آدمی جب تک بیوی سے محروم رہتا ہے وہ کچھ خانہ بدوش سا بنا رہتا ہے اور اس کی بہت سی

صلاحیتیں سکڑی اور دبی ہوئی رہتی ہیں۔ اسی طرح عورت جب تک شوہر سے محروم رہتی ہے اس کی حیثیت بھی اس بیل کی ہوتی ہے جو سہارا نہ ملنے کے باعث پھیلنے اور پھولنے پھلنے سے محروم ہو۔ لیکن جب عورت کو شوہر مل جاتا ہے اور مرد کو بیوی کی رفاقت حاصل ہو جاتی ہے تو دونوں کی صلاحیتیں ابھرتی ہیں اور زندگی کے میدان میں جب وہ دونوں مل کر جدوجہد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی جدوجہد میں برکت دیتا ہے اور ان کے حالات بالکل بدل جاتے ہیں۔

'وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ'۔ یہ اسی بشارت کو مؤکد کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا حوالہ دیا ہے کہ اللہ کے دامنِ کرم میں بڑی گنجائش ہے اور وہ سب کے حالات اور ضروریات سے اچھی طرح باخبر ہے۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۗ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۗ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

نکاح کی عدم مقدرت بدکاری کے جواز کے لیے عذر نہیں ہے

'وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا'۔ اوپر والی ہدایت تو معاشرہ کے لیے تھی لیکن افراد کی اخلاقی ذمہ داری بہرحال باقی رہے گی۔ اگر کوئی شخص نکاح کی مقدرت نہیں پا رہا ہے تو یہ چیز بدکاری کے جواز کے لیے کسی حال میں عذر نہیں بن سکتی۔ ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ضبط میں رکھے اور خدا کے فضل و رحمت کا انتظار کرے۔ جو شخص اپنے ایمان و اخلاق کی حفاظت کے لیے یہ جہاد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے راہ کھولے گا۔ آیت کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے۔

مکاتبت کا مفہوم اور اس کا حکم

'وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ' الآیۃ۔ 'کتاب' اور 'مکاتبت' ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا سے اس بات کا خواہاں ہو کہ وہ فلاں مدت کے اندر اس کو اتنی رقم یا اس کی کوئی متعین خدمت انجام دے دے گا یا اس کے کسی کام کی تکمیل کر دے گا، جس کے بعد آقا اس کو آزاد کر دے، ایسی صورت میں حکم ہے کہ اس غلام کو مکاتب بنا دیا جائے۔ عام علماء تو اس حکم کو مندوب و مستحب کے مفہوم میں لیتے ہیں لیکن حضرت عمرؓ، ابن سیرینؒ اور داؤدؒ نے اس کو وجوب کے مفہوم میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک ایسے غلام کو مکاتب بنا دینا مالک پر واجب ہے۔ میرے نزدیک یہی مذہب قوی ہے۔ یہ احکام، جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، معاشرہ کو دیے جا رہے ہیں اس وجہ سے اس صورت میں مالک کی حیثیت ایک خود مختار آقا کی باقی نہیں رہ جاتی ہے بلکہ ایک فریق کی بن جاتی ہے۔ اگر غلام اور آقا دونوں باہم دگر بطور خود معاملہ طے کر لیں تو بہتر ہے اور اگر ان کے درمیان کوئی نزاع واقع ہو تو اس کا فیصلہ معاشرے کے ذمہ دار لوگ کر دیں گے اور بدرجۂ آخر اگر ضرورت داعی ہو تو معاملہ عدالت میں بھی جا سکتا ہے۔

مکاتبت کے لیے صلاحیت

'اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا'۔ اس صورت میں صرف یہ چیز دیکھی جائے گی کہ مکاتبت کا مطالبہ کرنے والے غلام

کے اندر کارکردگی کی ایسی صلاحیت اور ذمہ داری کا ایسا احساس ہے یا نہیں کہ وہ مالک کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے کو پورا کر سکے۔ اس شرط کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ امکان اس بات کا بھی تھا کہ کوئی نکھٹو غلام مالک سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مکاتبت کا مطالبہ تو کر بیٹھے لیکن اس میں کوئی صلاحیت کارکردگی نہ ہو اور وہ اس چیز کو محض پبلک سے اعانت مانگنے اور گداگری کا پیشہ اختیار کر لینے کا ایک بہانہ بنا لے اور معاشرے پر ایک بار بن کے رہ جائے۔ اس اندیشہ کی وجہ یہ تھی کہ کسی غلام کے مکاتب ہو جانے کے بعد اس کے باب میں قرآن نے لوگوں کو یہ ہدایت بھی، جیسا کہ آگے آ رہی ہے، فرمائی ہے کہ لوگ اس کی دل کھول کر مدد کریں اور بیت المال سے بھی اس کی اعانت کی جائے تاکہ وہ مکاتبت کی رقم ادا کرنے کے قابل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس چیز کی طمع بہت سے ایسے غلاموں کے اندر بھی مکاتب بننے کا ارمان پیدا کر سکتی تھی جو خود ہاتھ پاؤں مارنے کی صلاحیت رکھنے والے نہ ہوتے لیکن مالک کی خدمت سے آزاد ہو کر معاشرے پر ایک بار بن جاتے اور اگر معاہدے کی شرائط پوری نہ کر پاتے تو لازماً ایک نزاع و اختلاف کا ذریعہ بنتے۔

لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ شرط کسی ذی صلاحیت غلام کی آزادی میں مانع نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے کہ اس بات میں بھی، بصورتِ نزاع، آخری فیصلہ معاشرے اور قاضی کے اختیار میں تھا۔ اگر کسی غلام کو یہ شکایت ہوتی کہ اس کا مالک اس شرط کو بہانہ بنا کر اس کی آزادی میں رکاوٹ ڈالنا چاہتا ہے درآنحالیکہ وہ مکاتب بننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے تو وہ اپنا معاملہ معاشرہ کے ذمہ داروں اور پنچوں کے سامنے بھی پیش کر سکتا تھا اور بدرجۂ آخر عدالت میں بھی لے جا سکتا تھا۔

مکاتب کی مدد انفاق فی سبیل اللہ ہے — 'وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اٰتٰىكُمْ' یہ معاشرے کو ابھارا ہے کہ جو غلام اپنی آزادی کے لیے کمر ہمت باندھیں تو، اپنے اس مال میں سے جو خدا نے تمہیں دے رکھا ہے، پورے حوصلہ سے، ان کی مدد کرو۔ یہ ترغیب مال داروں کو دی ہے اور 'مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اٰتٰىكُمْ' کے الفاظ ان کے اندر جذبۂ شکر ابھارنے کے لیے ہیں کہ جو چیز خدا کی دی ہوئی ہے اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے دریغ نہ کرو۔ اس سے یہ بات بھی نکلی کہ جو لوگ اس مقصد کے لیے انفاق کریں گے ان کا یہ انفاق فی سبیل اللہ ہو گا۔

اموالِ زکوٰۃ سے مکاتب کی مدد — یہ امر ملحوظ رہے کہ سلف اس بات پر متفق ہیں کہ ایسے غلاموں کی امداد اموالِ زکوٰۃ اور بیت المال سے بھی کی جائے۔ بیت المال میں غلاموں کی آزادی کے لیے اسلام نے ایک مستقل مد رکھی ہے جس کی وضاحت سورۂ توبہ میں ہو چکی ہے۔

مکاتبت کا حق لونڈیوں کو بھی حاصل ہے — مکاتبت کا یہ حق اسلام نے جس طرح غلاموں کو دیا اسی طرح لونڈیوں کو بھی دیا۔ 'مِمَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ' کے الفاظ کی عمومیت بھی اس پر دلیل ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کا عمل بھی۔ روایات میں حضرت بریرہؓ اور حضرت جویریہؓ کے واقعات موجود ہیں۔

اس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد تمام ذی صلاحیت غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کی نہایت

وسیع راہ کھل گئی۔ اس کے بعد صرف وہی غلام باقی رہے جو یا تو اپنی حالت پر قانع اور مطمئن تھے یا ان کے اندر ہاتھ پاؤں مارنے اور معاشرے کے اندر خود اپنی جگہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسے غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کا اعلانِ عام کر دیا جاتا تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ اپنے مالکوں کی سرپرستی سے بھی محروم ہو جاتے اور خود بھی اپنی کفالت کا انتظام نہ کر پاتے جس کے سبب سے وہ معاشرے پر ایک بار بن کے رہ جاتے۔

'وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا' الآية

'فَتَيَات' یہاں لونڈیوں کے لیے استعمال کیا ہے اور مقصود اس لفظ کے استعمال سے معاشرے کے اندر ان کی عزت کو بڑھانا ہے۔ 'فتاۃ'، 'فتی' کی مؤنث ہے۔ جس طرح 'فتی' کے معنی جوان اور لڑکے کے ہیں اسی طرح 'فتاۃ' کے معنی لڑکی اور چھوکری کے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی اپنے غلام کو 'عبد' اور اپنی لونڈی کو 'امۃ' نہ کہے بلکہ 'فتی' (جوان) اور 'فتاۃ' (لڑکی) کہے۔ ظاہر ہے کہ لونڈیوں اور غلاموں کے لیے الفاظ کی یہ تبدیلی بھی انہی اصلاحات کا ایک جزو ہے جو ان کے معاشرتی درجے کو اونچا کرنے کے لیے ظہور میں آئیں اور اوپر مذکور ہوئیں۔ مقصود اس لفظ کی تبدیلی سے غلاموں اور لونڈیوں کے اندر احساس خودداری کو بیدار کرنا اور لوگوں کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا تھا کہ اب لوگ غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق اپنے قدیم تصورات کو بدلیں اور ان کو اپنے معاشرے کے بھائی بہن کی نگاہ سے دیکھیں۔

'اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا' کی قید یہاں بطور شرط کے نہیں بلکہ صورتِ واقعہ کی تعبیر کے لیے ہے۔ جب اسلام نے زنا پر حد جاری کرنے کا حکم دے دیا، غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کی ہدایت فرمائی اور مکاتبت کے ذریعہ سے لونڈیوں اور غلاموں کی آزادی کی ایک نہایت کشادہ راہ کھول دی تو قدرتی طور پر لونڈیوں کے اندر بھی ایک عام احساس بیدار ہوا کہ وہ اپنے اخلاقی معیار کو اونچا کریں اور ان میں سے جو اپنے مالکوں کے دباؤ کی وجہ سے پیشہ کراتی تھیں، وہ خواہش مند ہوئیں کہ یہ حرام پیشہ چھوڑ کر پاکدامنی کی زندگی بسر کریں اور اگر کوئی نسل پیدا ہو تو کسی کے قیدِ نکاح میں ہو کر زندگی گزاریں۔ اصلاحات کے اس دور میں اس رجحان کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا لیکن اس کی زد ان مالکوں کے مفاد پر پڑتی تھی جنھوں نے زمانۂ جاہلیت میں چکلے قائم کر رکھے تھے اور جو اپنی لونڈیوں سے پیشہ کراتے اور ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان میں سے بعض اسلام کے دور میں بھی، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں، خفیہ طور پر چکلے قائم کیے ہوئے تھے۔ مشہور منافق عبداللہ بن اُبیّ نے بھی، جس نے فتنۂ افک برپا کیا، ایک چکلہ قائم کر رکھا تھا۔ تاریخوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے خبیث لوگ آسانی سے اس بات پر راضی نہیں ہو سکتے تھے کہ یہ لونڈیاں ان کے چنگل سے نکل جائیں۔ چنانچہ وہ اپنے تمام ہتھکنڈے ان کو پاکدامنی کی زندگی بسر کرنے سے روکنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ انہی لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، باندازِ تنبیہ، فرمایا کہ اب ان لڑکیوں

کو جب کہ وہ پاک دامنی کی زندگی اختیار کرنا چاہتی ہیں، بدکاری پر مجبور نہ کرو۔ ورنہ یاد رکھو کہ اکراہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ ان کو تو معاف کر دے گا البتہ وہ لوگ اپنا انجام سوچ لیں جو ان کی عفت کے ساتھ یہ گھنونا کھیل کھیل رہے ہیں! یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ بعض چکلے والوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، بعد کے مراحل میں، رجم بھی کرا دیا۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (۳۴)

...ت کا ...ادہ

یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ اس سورہ میں بار بار آئی ہے۔ پیچھے بھی اس کی مثالیں گزر چکی ہیں اور آگے آیت ۶۴ میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔ ان تنبیہات کے بار بار اعادہ کی حکمت کی طرف ہم اس سورہ کی پہلی ہی آیت کے تحت اشارہ کر آئے ہیں۔ ' وَمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ' سے اشارہ اس تمثیل کی طرف ہے جو آگے آیت ۳۵ میں آرہی ہے اور جس کی وضاحت آپ کے سامنے ان شاء اللہ آئے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہاری طرف یہ نہایت واضح ہدایات نازل کر دی ہیں اور تمہاری حوصلہ افزائی کے لیے ان اسلاف صالحین کی تمثیل بھی پیش کر دی ہے جن کے نقشِ قدم کی تمہیں پیروی کرنی ہے۔ ان کے اندر ان لوگوں کے لیے بڑی نصیحت و موعظت ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔ رہے وہ لوگ جن کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہیں تو ان کے اوپر کوئی وضاحت و موعظت بھی کارگر نہیں ہوتی۔ وہ اپنا انجام خود دیکھیں گے۔

۶۔ غلامی کا بالتدریج خاتمہ

اس مجموعہ آیات میں جو اہم ہدایات دی گئی ہیں ان کی بقدرِ ضرورت وضاحت آیات کے تحت ہو چکی ہے۔ البتہ غلامی سے متعلق ہم یہاں ان باتوں کو یکجا کر دینا چاہتے ہیں جن کی طرف پیچھے جگہ جگہ ہم اشارہ کر چکے ہیں تاکہ اس سلسلہ میں جو غلط فہمیاں لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں ان کا ازالہ ہو سکے۔

غلامی اسلام کے اپنے نظام کا کوئی جزو نہیں تھی بلکہ اس کو اسلام نے وقت کے بین الاقوامی اور ملکی حالات کے تحت محض اس لیے گوارا کر لیا تھا کہ اگر بیک گردشِ قلم اس کے خاتمہ کا اعلان کر دیا جاتا تو اس سے دشمن قوموں کو بھی شہ ملتی اور خود اپنے معاشرے کے اندر بھی نہایت سخت قسم کی معاشرتی اور معاشی الجھنیں پیدا ہو جاتیں۔ اس دور میں اول تو جنگی قیدیوں کے مسئلہ کا ایک معروف حل یہی تھا کہ جنگ میں جو قیدی گرفتار ہوں ان کو فاتحین غلام بنالیں ثانیاً ہر جگہ نخاسوں پر غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کا کاروبار ہوتا تھا اور ہر ذی استطاعت کے گھر میں ہر سن و سال کی لونڈیاں اور غلام موجود تھے۔ ایسے حالات میں اگر بیک وقت یہ اعلان کر دیا جاتا کہ تمام لونڈیاں اور غلام آزاد ہیں تو قطع نظر اس سے کہ اس سے مخالف قومیں فائدہ

اٹھا تھا ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا کہ ان تمام لونڈیوں اور غلاموں کو معاشرے میں کہاں کھپایا جائے؟ ان میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے افراد کی بھی تھی جو یہ صلاحیت نہیں رکھتے تھے کہ خود اپنی کفالت کا بار اٹھا سکیں۔ غلامی کی صورت میں تو ان کی کفالت کی ذمہ داری قانوناً ان کے مالکوں کے اوپر تھی لیکن آزاد ہو جانے کی صورت میں ان کے لیے اس کے سوا کوئی سبیل باقی نہ رہتی کہ بھیک مانگیں اور معاشرے پر ایک بوجھ بنیں۔ بالخصوص لونڈیوں کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ تھا۔ ان کے بے سہارا ہونے میں بہت سے اخلاقی مفاسد کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ بیت المال، ظاہر ہے کہ اتنی بڑی فوج کی کفالت کے بار کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان مصالح کی وجہ سے اسلام نے ان کی آزادی کی ایک ایسی راہ اختیار کی جس سے وہ خطرات بھی پیدا نہیں ہوئے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور بالتدریج تمام ذی صلاحیت غلام اور لونڈیاں آزاد ہو کر اسلامی معاشرہ کے جزو بھی بن گئے۔

یہاں اس مسئلہ کی تمام تفصیلات سے بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہوگی۔ البتہ ہم چند اہم مبادی کی طرف اشارہ کریں گے جن سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ اسلام نے غلاموں کو آزادوں کی صف میں لانے کے لیے بالتدریج کیا کیا تدابیر اختیار کیں۔

۱۔ اسلام نے اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ مکی زندگی کے بالکل ابتدائی دور ہی سے فَکُّ رَقَبَۃٍ یعنی غلام آزاد کرنے کو ایک بہت بڑی معاشرتی نیکی قرار دیا۔ مکی سورتوں میں فَکُّ رَقَبَۃٍ اور اطعام فقراء کا ذکر بالکل ساتھ ساتھ ہوا ہے اور بعض آیات میں اس کو حصولِ سعادت کی راہ میں اولین قدم بتایا گیا ہے بالخصوص امراء و اغنیاء کے لیے۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت واضح الفاظ میں غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ نہ صرف حسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی بلکہ مالکوں پر ان کے انسانی حقوق کو شرعی درجہ دے دیا جس سے ان کے معاملہ میں مالکوں کی وہ خود مختاری اور مطلق العنانی ختم ہو گئی جو زمانۂ جاہلیت میں ان کو حاصل تھی۔

۳۔ بعض گناہوں اور کوتاہیوں کی صورت میں غلام آزاد کرنے کو کفارہ اور صدقہ ٹھہرایا گیا۔

۴۔ تمام ذی صلاحیت لونڈیوں اور غلاموں کے نکاح کر دینے کی ہدایت فرمائی گئی تاکہ معاشرے کے اندر ان کا اخلاقی و معاشرتی معیار اونچا ہو۔

۵۔ بیت المال اور اموالِ زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مستقل مدّ فِی الرِّقَابِ بھی رکھی گئی تاکہ غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کی مہم کو زیادہ سے زیادہ تقویت بہم پہنچائی جائے۔

۶۔ زمانۂ جاہلیت میں جن مالکوں نے لونڈیوں سے پیشہ کرانے کے لیے چکلے قائم کر رکھے تھے ان کے چکلے زنا کے جرم قرار پا جانے کے بعد ختم ہو گئے اور اگر کسی نے خفیہ طور پر اس کاروبار کو جاری رکھنے کی کوشش

کی تو اس کو نہایت عبرت انگیز سزا دی گئی۔ یہاں تک کہ اس قبیل کے بعض مردوں اور عورتوں کو حضورؐ نے رجم بھی کرادیا۔

۷۔ لونڈیوں اور غلاموں کے لیے 'عبد' اور 'امۃ' کے تحقیر آمیز الفاظ استعمال کرنے کے بجائے 'فتی' اور 'فتاۃ' کے الفاظ استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی گئی تاکہ اس گروہ سے متعلق لوگوں کے قدیم تصورات میں تبدیلی پیدا ہو۔

۸۔ اسیرانِ جنگ سے متعلق بھی بالعموم یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ خاص خاص سرغنوں کو تو بے شک قتل کردیا گیا لیکن عام قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احساناً چھوڑ دیا گیا۔

۹۔ آخر میں مکاتبت کو ایک قانونی حیثیت دے دی گئی جس کے بعد ہر ذی صلاحیت غلام اور لونڈی کے لیے آزادی کی نہایت کشادہ راہ کھل گئی۔ ان کی امداد و حوصلہ افزائی کے لیے عام لوگوں کو بھی، جیسا کہ اوپر گزرا، ابھارا گیا اور ان کے لیے بیت المال میں بھی ایک خاص مد رکھی گئی۔ اس قانون نے عملاً غلامی کا خاتمہ کردیا۔ اس کے بعد صرف وہ غلام بچ رہے جو ہاتھ پاؤں مارنے کی صلاحیت سے عاری تھے اور ان کے لیے یہی شکل معاشرے کے حق میں بھی اور خود ان کے حق میں بھی بہتر تھی ورنہ وہ معاشرے پر ایک بوجھ بنتے اور گداگری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتے۔

ان تمام باتوں کے دلائل قرآن و حدیث میں نہایت تفصیل سے موجود ہیں۔ میں ان کو پیش کرسکتا ہوں لیکن بحث اپنے حدود سے متجاوز ہو جائے گی اس لیے صرف اشارات پر کفایت کرتا ہوں پچھلے مباحث میں ان میں سے اکثر کے دلائل بیان ہو چکے ہیں اور اگر کسی بات کی دلیل نہیں بیان ہوئی ہے تو ان اشارات کی روشنی میں اہلِ علم خود ان کے دلائل نہایت آسانی سے فراہم کرسکتے ہیں۔

۷۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۳۵-۴۰

اب آگے وہ آیات آرہی ہیں جن کی حیثیت اس سورہ کے اندر آفتابِ تاباں کی ہے۔ جس کا پرتو سورہ کے تمام اجزاء پر پڑ رہا ہے۔ ان میں ایمان اور کفر دونوں کی تمثیل بیان ہوئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ایمان سے انسان کے ظاہر اور باطن میں کیا روشنی پیدا ہوتی ہے اور اس سے کس طرح کے اعمال، انفرادی و اجتماعی زندگی میں، ظہور میں آتے ہیں اور کفر سے انسان کے ظاہر و باطن پر کس طرح کی تاریکی چھا جاتی ہے اور بالآخر وہ انفرادی و اجتماعی زندگی پر کس طرح ہلاکت مسلط کردیتی ہے۔ مقصود ان تمثیلوں کے پیش کرنے سے اہلِ ایمان پر یہ واضح کرنا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر گوشے کو ایمان کی نورانیت سے منور کریں اور اہلِ کفر پر یہ واضح کرنا ہے کہ اگر وہ کفر کی 'ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ' ہی میں پڑے رہنا چاہتے ہیں، ایمان کی روشنی میں نہیں آنا چاہتے تو اپنے انجام کو اچھی طرح سوچ لیں! ___ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۵-۴۰

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ
اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ
شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ
وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ
يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۙ ﴿۳۵﴾ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ
اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَ
الْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ
الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ
الْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ
وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ
كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ
شَيْــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۙ ﴿۳۹﴾
اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ
سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ
وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾ ع ۵ ۱۱

ترجمۂ آیات ۳۵-۴۰

اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ دل کے اندر اس کے نورِ ایمان کی تمثیل یوں
ہے کہ ایک طاق ہو جس میں ایک چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو، شیشہ ایک چمکتے
تارے کی مانند ہو۔ چراغ ایک ایسے شاداب درخت زیتون کے روغن سے جلایا جاتا ہو
جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اُٹھے گا

روشنی کے اوپر روشنی! اللہ اپنے نور کی ہدایت جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے۔ اور اللہ یہ تمثیلیں لوگوں کی رہنمائی کے لیے بیان فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے ـــ یہ طاق ایسے گھروں میں ہیں جن کی نسبت خدا نے امر فرمایا کہ وہ تعمیر کیے جائیں اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے۔ ان میں ایسے لوگ صبح و شام خدا کی تسبیح کرتے ہیں جن کو کاروبار اور خرید و فروخت اللہ کی یاد، نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتے۔ وہ ایک ایسے دن کی آمد سے اندیشہ ناک رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں سب مضطرب ہوں گے۔ کہ اللہ ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے اور ان کو اپنے فضل سے مزید نوازے اور اللہ جس کو چاہے گا بے حساب بخشے گا۔ ۳۵-۳۸

اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی تمثیل یہ ہے کہ جیسے چٹیل صحرا میں سراب ہو جس کو پیاسا پانی گمان کرے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئے گا تو وہاں کچھ نہ پائے گا البتہ اس کے پاس اللہ کو پائے گا پس وہ اس کا حساب چکا دے گا اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔ یا یوں خیال کرو کہ جیسے ایک گہرے سمندر کے اندر تاریکیاں ہوں، موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہو، اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں۔ تاریکیوں پر تاریکیاں چھائی ہوئی ہوں۔ اگر اپنا ہاتھ بھی نکالے تو اس کو بھی نہ دیکھ پائے اور جس کو اللہ روشنی نہ بخشے تو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں۔ ۳۹-۴۰

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَ

غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۳۵)

جو خدا کو نہیں مانتا اس کے لیے یہ کائنات بالکل ظلمات ہے

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یہ آسمان و زمین بلکہ یہ پوری کائنات اس شخص کے لیے ایک عالمِ ظلمات اور اندھیر نگری ہے جو خدا کو نہیں مانتا یا مانتا ہے لیکن خدا کی صفات اور ان کے مقتضیات کو نہیں تسلیم کرتا۔ ایسا شخص نہ یہ جان سکتا کہ یہ دنیا کہاں سے آئی ہے اور نہ یہ جان سکتا کہ اس کے وجود میں آنے کی غایت اور مقصد کیا ہے؟ وہ خود اپنے متعلق بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس کا مقصدِ وجود کیا ہے؟ وہ اس دنیا میں مطلق العنان اور بے مہار ہے یا پابند و محکوم؟ وہ مسئول ہے یا غیر مسئول؟ اس کے لیے کیا خیر ہے اور کیا شر؟ اسے ظلم کی روش اختیار کرنی چاہیے یا عدل کی؟ اسے صرف اپنے مفاد اور خواہشوں کی پیروی کرنی چاہیے یا ان سے کسی بالاتر نصب العین کی؟ ان سوالوں کے صحیح جواب ہی پر صحیح اور کامیاب زندگی کا انحصار ہے لیکن جو شخص خدا کو نہیں مانتا وہ ان سوالوں کا صحیح حل نہیں پا سکتا۔ وہ اندھیرے میں اندھے بھینسے کی طرح بھٹکتا پھرتا ہے اور بالآخر ایک دن قعرِ ہلاکت میں گر کر اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جاتا ہے۔

جو خدا کو مانتا ہے اس کے لیے کائنات بھی دن کی طرح روشن ہے

البتہ جو شخص خدا کو اس کی صحیح صفات کے ساتھ مانتا ہے وہ اس کائنات کا سرا بھی پا جاتا ہے اور اس کا انجام بھی اس پر واضح ہو جاتا ہے۔ اس پر ان تمام سوالوں کے جواب بھی روشن ہو جاتے ہیں جن کو خدا کا نہ ماننے والا کبھی حل نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے یہ دنیا اس کے لیے اندھیر نگری نہیں رہتی بلکہ ایمان کے نور سے اس کے لیے اس کی ہر چیز جگمگا اٹھتی ہے اور اس کا ہر پہلو اس پر روشن ہو جاتا ہے۔ وہ جو قدم بھی اٹھاتا ہے پورے دن کی روشنی میں اٹھاتا ہے اور جس سمت میں بھی چلتا ہے خدا کے ایمان کا نور اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہی حقیقت اس ٹکڑے میں واضح فرمائی گئی ہے کہ اس آسمان و زمین کا نور اللہ ہے جس کے پاس یہ نور ہے وہ روشنی میں اور صراطِ مستقیم پر ہے۔ اور جو اس نور سے محروم ہے وہ ایک عالمِ ظلمات میں بھٹک رہا ہے اور کوئی دوسرا اس کو روشنی نہیں دے سکتا۔ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔

دل کے اندر نورِ ایمان کی تمثیل

مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ۔ یہ تمثیل بیان ہو رہی ہے اس بات کی کہ جس دل کے اندر ایمان کی روشنی داخل ہوتی ہے وہ اس کی فطرت کے نور کے اوپر ایک اور نور کا اضافہ کر دیتی ہے جس سے اس کا باطن مطلعِ انوار بن جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس نورِ ایمان کی مثال قلب کے اندر یوں ہے کہ ایک طاق ہو جس میں ایک چراغ رکھ دیا گیا ہو۔ چراغ ایک گلوب کے اندر ہو اور گلوب کا شیشہ ایک چمکتے ستارے کے مانند چمک رہا ہو۔

مِشْكٰوة سے مراد انسان کا دل ہے جس کو چراغ رکھنے کے طاق یا چراغ دان سے تشبیہ دی گئی ہے۔ چراغ کے لیے قاعدہ ہے کہ وہ گھر میں اونچی جگہ پر رکھا جاتا ہے تاکہ روشنی پورے گھر کے اندر پھیلے۔ انسان کے اندر دل ہی وہ جگہ ہے جہاں روشنی ہو تو وہ اس کے سارے ظاہر و باطن میں پھیلتی ہے۔ اس چراغ کی نسبت

فرمایا کہ وہ ایک شیشہ کے اندر بند ہے۔ شیشہ کے اندر بند ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ چراغ کی لَو ہوا کے جھونکوں سے منتشر نہیں ہونے پاتی بلکہ ایک مرکز پر مرتکز رہتی ہے جس سے اس کی تابانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ٹھیک یہی حال ایمان کے فیض سے قلب کا ہوتا ہے۔ وہ بھی ڈانوا ڈول ہونے سے بالکل محفوظ ہو جاتا ہے۔ خواہ کیسے ہی حالات ہوں لیکن وہ ہر حال میں راضی و مطمئن رہتا ہے۔ ایسے ہی دل کو قرآن میں 'نفسِ مطمئنہ' سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور یہ سب سے بڑی دولت ہے جو انسان کو ایمان کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔

اس شیشہ کے متعلق فرمایا کہ وہ ایک چمکتے ستارے کی مانند ہے۔ شیشہ اگر میلا ہو تو وہ نہ صرف یہ کہ روشنی میں کوئی اضافہ نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے حجاب بن جاتا ہے۔ فرمایا کہ ایمان کی روشنی ہر قسم کی کثافت سے دل کو پاک و صاف کر کے آئینہ کی طرح اس کو مجلی کر دیتی ہے۔

يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ

مبارکۃ اپنے لغوی مفہوم میں

'مُّبٰرَكَةٍ' یہاں اپنے لغوی مفہوم میں ہے جس طرح زرخیز و شاداب زمین کو قرآن میں مبارک کہا گیا ہے اسی طرح یہاں شاداب اور ثمر آور درخت کے لیے لفظ 'مبارک' استعمال ہوا ہے۔

وسط باغ کے درخت کی خصوصیات

'لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ' یہ شجرۂ مبارکہ کی صفت ہے یعنی یہ درخت نہ تو باغ کے شرقی جانب کا ہے اور نہ غربی جانب کا بلکہ وسط باغ کا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ باغ کے کناروں کے درخت بالخصوص، جو مشرق یا مغرب میں ہوں ہمیشہ دھوپ اور ہوا کی زد میں ہونے کے سبب سے اتنے اچھے پھل نہیں دیتے جتنے اچھے پھل وسط باغ کے درخت دیتے ہیں اس وجہ سے یہ قید بڑھا کر اس درخت کی غایت درجہ شادابی و ثمر باری کی طرف اشارہ فرما دیا۔

ایمان کی روشنی ان کو نصیب ہوتی ہے جن کی فطرت صالح ہوتی ہے

یہ اس چراغ کی مزید صفت بیان فرمائی کہ یہ ایک ایسے شاداب و زرخیز درخت زیتون کے روغن سے جلتا ہے جو نہ باغ کی مشرقی جانب کا ہے نہ مغربی جانب کا بلکہ وسط باغ کا ہے اور اس کا روغن اتنا صاف و شفاف ہے کہ معلوم ہوتا ہے آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے گا۔

یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ یہ ایمان ان لوگوں کے سینوں کو اپنا نشیمن بناتا ہے جن کی فطرت ہر قسم کے فساد اور بگاڑ سے محفوظ ہو۔ جن کی فطرت کا روغن غیر فطری ملاوٹوں سے پاک ہوتا ہے وہ خود دعوتِ ایمان کی ذرا سی رگڑ سے بھڑک اٹھتا ہے اور اس طرح فطرت کے نور کے اوپر ایمان کے نور سے سینہ 'نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ' بن جاتا ہے۔

'يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ' 'هدى يهدى' کا صلہ جب 'ل' کے ساتھ آتا ہے تو وہ توفیق بخشی کے مفہوم پر بھی، جیسا کہ سورۂ یونس ۳۵ میں ہم واضح کر چکے ہیں، متضمن ہوتا ہے۔ یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو ایمان و ہدایت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی

ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس نورِ ایمان سے انہی لوگوں کے دلوں کو منور فرماتا ہے جو اپنی فطرت کے روغن کو محفوظ رکھتے ہیں۔ جو اس روغن کو ضائع کر بیٹھتے ہیں یا اس کے اصل مزاج کو اپنے زیغ و انحراف سے بگاڑ لیتے ہیں ان کے دل ایمان کی روشنی کو نہیں پکڑتے۔ 'لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ' کے الفاظ اسی زیغ و انحراف سے محفوظ ہونے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ان الفاظ میں ایک لطیف تلمیح یہود و نصاریٰ کی اس نزاع کی طرف بھی ہے جو قبلہ کے تعلق سے ان کے مابین، مشرق و مغرب کے باب میں، برپا ہوئی اور جس کے سبب سے وہ اصل نقطۂ وسط سے اتنے دور ہو گئے کہ ہمیشہ کے لیے امتِ وسطیٰ کے شرف سے محروم ہو گئے اور قبولِ اسلام کی سعادت ان کو حاصل نہ ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ اپنی مزید توفیق کے دروازے انہی کے لیے کھولتا ہے جو پہلے سے بخشی ہوئی توفیق کی قدر کرتے ہیں، جو اس کی قدر نہیں کرتے ان سے وہ ہدایت بھی واپس لے لی جاتی ہے جو فطرت کے ذریعہ سے ان کو بخشی جاتی ہے۔ سیدنا مسیحؑ کا ارشاد ہے کہ جو ایک پیسہ میں چور ہے اس کو ایک لاکھ کی امانت نہیں سونپی جاتی۔

'وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ' میں 'لِلنَّاسِ' سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی لوگوں کی تعلیم و تذکیر کے لیے اللہ تعالیٰ یہ تمثیلیں بیان فرماتا ہے تاکہ لوگ ان سے ایمان کی قدر و قیمت پہچانیں اور اس کے نور سے اپنے دلوں کو منور کریں۔ تمثیلیں حقائق کو واضح کرنے کا سب سے اعلیٰ اور کارگر ذریعہ ہوتی ہیں۔ اگر لوگ ان سے بھی فائدہ نہ اٹھائیں تو یہ ان کی محرومی ہی ہے!

'وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ' یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی مشیت ہمیشہ اس کے علم و حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ ہر ایک کے ظاہر و باطن سے اچھی طرح واقف ہے اس وجہ سے ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جس کا وہ سزاوار ہوتا ہے۔

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۙ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۶-۳۸)

'فی بیوت' کا کلام میں محل — 'فِيْ بُيُوْتٍ الآیۃ' - 'فِيْ بُيُوْتٍ' کا تعلق میرے نزدیک 'مشکوٰۃ' سے ہے۔ اس ظرف نے واضح کر دیا کہ اس تمثیل میں بت خانوں اور مے خانوں کے طاق کی مثال پیش نہیں کی گئی ہے بلکہ اللہ کے معابد کے طاقوں کی مثال پیش کی گئی ہے۔

تمثیل میں معابد کے ذکر کی وجہ — تمثیل میں ظاہر ہے کہ مشکوٰۃ سے مراد قلبِ سلیم یا بالفاظِ دیگر قلبِ مومن ہے۔ یہ قلب ہر قالب میں نہیں پایا جاتا بلکہ خاص خاص قالبوں ہی میں پایا جاتا ہے اور یہ قلب ہر جگہ نہیں ملتے بلکہ ان کے ملنے کی اصل جگہ خدا کی مساجد اور اس کے معابد ہیں۔ زمخشریؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ ان کے نزدیک اصل تالیفِ کلام یوں ہے "فی بیت من بیوت اذن اللہ ان ترفع ..... الآیۃ"

تمثیل میں اشارہ مساجد کے طاقوں کی طرف ہے

اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ۔ 'رفع' یہاں بنانے اور تعمیر کرنے کے معنی میں ہے۔ مثلاً وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ (بقرہ: ۱۲۷) (اور یاد کرو جب کہ ابراہیم بیت اللہ کی بنیادیں تعمیر کر رہے تھے)، اور 'ذکر' یہاں نماز اور ذکر و دعوت کی ان تمام شکلوں پر حاوی ہے جو اللہ کی یاد اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے اختیار کی جائیں۔ 'اَذِنَ اللّٰہُ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گھر خدا کے حکم سے تعمیر ہوئے کہ ان میں اس کا کلمہ بلند کیا جائے۔ اگرچہ یہاں الفاظ عام ہیں لیکن ان کے اولین مصداق وہ معابد ہیں جو براہ راست اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم ہوئے مثلاً بیت اللہ جس کی تعمیر کا حکم اللہ تعالیٰ نے حضرات ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کو دیا یا بیت المقدس جس کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے اذن سے فرمائی۔ پھر وہ معابد بھی انہی کے حکم میں داخل ہوں گے جو ان کی شاخوں کی حیثیت سے تعمیر ہوئے۔ رہے وہ معابد جو مشرکوں نے اذن الٰہی کے بالکل خلاف اپنے اصنام و اوثان کی پرستش کے لیے قائم کیے وہ اس حکم سے خارج ہیں۔ ان کی حیثیت نجاست خانوں کی ہے۔ ان کے طاق اس تمثیل میں مراد نہیں ہیں۔

یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ ۙ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ

مؤثر کے بعد اثر کا بیان

اوپر کی آیات میں ایمان کی تصویر و تمثیل ہے۔ جب بات مساجد کے ذکر تک پہنچ گئی تو وہیں سے حاملین ایمان کے ذکر کے لیے نہایت موزوں تقریب پیدا ہوگئی تاکہ واضح ہو جائے کہ اس ایمان کے جو لوگ حامل ہوتے ہیں ان کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ یہ مؤثر کی وضاحت کے بعد گویا اثر کا بیان ہوا تاکہ حقیقت عملی زندگی میں مصور ہو کر سامنے آ جائے۔ فرمایا کہ جن مساجد و معابد کے طاقوں کی یہاں تمثیل پیش کی گئی ہے ان میں صبح و شام اللہ کے ایسے بندے اس کی تسبیح کرتے ہیں جن کو تجارت اور بیع خدا کی یاد، نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتے اس لیے کہ وہ ایک ایسے دن کی آمد سے ہر وقت اندیشہ ناک رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھوں سب پر حالتِ اضطراب طاری ہوگی۔

'غدو و اصال' کا مفہوم

'غدو و اصال' عربی میں اس مفہوم میں بولے جاتے ہیں جس مفہوم میں ہم اپنی زبان میں صبح و شام کے الفاظ بولتے ہیں۔

'رجال' سے مراد

لفظ 'رجال' سے ان لوگوں کی غایت درجہ تعریف واضح ہو رہی ہے۔ یعنی یہ وہ مردانِ خدا ہیں کہ انھیں اس دنیا کی کوئی چیز بھی خدا سے غافل نہیں کرتی۔ انھیں ہر چیز سے زیادہ خدا کی رضا مطلوب ہے۔

'تجارۃ' اور 'بیع' کا مفہوم

'تجارۃ' اور 'بیع' میں سے پہلا لفظ تو عام تجارتی کاروبار کے مفہوم میں ہے اور بیع بیچنے کے معنی میں مشہور ہے۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ اگر کسی چیز کے بیچنے کا موقع ہو تو تاجر اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ تجارت تو درکنار اس طرح کے مواقع طمع بھی ان کو خدا سے غافل نہیں کرتے اور مومن کی اصل شان یہی ہے کہ وہ تجارت اور بیع و شرا سب کچھ کرے لیکن خدا کی یاد اور اس کے فرائض کی بجاآوری

سے غافل نہ ہو۔

نماز اور زکوٰۃ

نماز اور زکوٰۃ کا ذکر دین کے دو بنیادی فرائض کی حیثیت سے آیا ہے۔ انہی کے تحت درحقیقت پورا دین ہے۔ اس کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔

تقلب قلوب و ابصار کا مفہوم

'تتقلب فیہ القلوب والابصار' قیامت کے ہول کی تصویر ہے۔ یعنی اس دن ان لوگوں کو کسی کل چین نہیں پڑے گا جنھوں نے زندگی اس دن سے غفلت میں گزاری۔ ان کے دل الٹے جا رہے ہوں گے اور ان کی یہ بدحواسی ان کی نگاہوں سے ظاہر ہوگی۔

لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ ۗ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۸)

'ل' ثمرۂ فعل کے اظہار کے لیے

یہ 'ل' لام علت نہیں ہے بلکہ یہ وہ لام ہے جو کسی فعل کے انجام، نتیجہ اور ثمرہ کے بیان کے لیے آتا ہے۔ مثلاً فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا (قصص ۸) (اور فرعون کے گھر والوں نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ان کے لیے دشمن اور غم بنے) امرؤالقیس کا ایک مشہور شعر ہے۔ ؎

وما ذرفت عيناك الا لتضربي
بسهميك في اعشار قلب مقتل

اس میں بھی غور کیجیے، 'لتضربي' پر 'ل' نتیجۂ فعل ہی کے بیان کے لیے ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو کچھ آخرت کے اندیشہ سے اس دنیا میں اللہ کی رضا جوئی کے لیے کر رہے ہیں اس کا صلہ ان کو ان کے اعمال سے کہیں بہتر ملے گا اور پھر مزید براں اللہ ان کو اپنے فضل سے نوازے گا اور اللہ جن کو اپنے فضل سے نوازتا ہے ان کو بے حساب بخشتا ہے۔ 'بے حساب' یعنی جس کا ان کو سان گمان بھی نہیں ہوگا۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِندَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ ۗ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۳۹)

کفر و اہل کفر کے ظاہر و باطن کی تمثیل

ایمان اور حاملینِ ایمان کے ایمان و عمل کی تمثیل بیان کرنے کے بعد یہ کفر اور اہل کفر کے ظاہر و باطن کی تمثیل بیان ہو رہی ہے کہ اُدھر جس درجے کی روشنی ہوتی ہے ادھر اسی درجے کی تاریکی ہوتی ہے۔ اہل ایمان کی تمثیل میں پہلے مؤثر یعنی ایمان کو نمایاں فرمایا تھا اس کے بعد اثر یعنی عمل کو اور اہل کفر کی تمثیل میں پہلے اثر کو نمایاں فرمایا ہے، اس کے بعد مؤثر کو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان ایک گہری حقیقت ہے جس کی جڑیں انسانی فطرت کے اعماق کے اندر اتری ہوئی ہوتی ہیں اور درحقیقت اسی کے بابرکت اثرات و ثمرات ہوتے ہیں جو زندگی کے اعمال و اخلاق میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس کفر گھورے پر اُگے ہوئے ایک درخت کے مانند ہوتا ہے جس کے زہریلے پھل تو اعمال کی صورت میں سامنے ہوتے ہیں لیکن فطرت کے اندر اس کی کوئی جڑ نہیں ہوتی جس کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہو۔

فرمایا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ان کی اور ان کے اعمال کی تمثیل یوں ہے کہ جیسے کسی چٹیل ریگستان میں سراب ہو جس کو پیاسا پانی سمجھ کر اس کی طرف بڑھے لیکن جب وہاں پہنچے تو اس پر یہ راز کھلے کہ وہ جس چیز کو لہریں لیتا ہوا پانی سمجھا وہ درحقیقت چمکتی ہوئی اور لہریں لیتی ہوئی ریت تھی اور یہ دیکھ کر وہ بالکل عاجز و درماندہ ہو کر رہ جائے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن! بالآخر وہیں پیاس سے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دے۔ فرمایا کہ یہی حال ان کفار کا قیامت کے دن ہوگا۔ یہ بھی جب اپنے اعمال کے پاس پہنچیں گے تو ان پر یہ راز کھلے گا کہ ان کے سارے اعمال ھَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا خاک اور راکھ ہو کر پراگندہ ہو گئے۔ البتہ اس دن اپنے اعمال کی جگہ وہ اپنے رب سے دوچار ہوں گے اور وہ ان کا حساب پورا کر دے گا اور وہ چشم زدن میں حساب چکا دینے والا ہے۔

کفار کی محرومی کی تصویر: حَتّٰۤی اِذَا جَآءَہٗ سے لے کر آخر آیت تک اس محرومی کی تصویر ہے جس سے ان کفار کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا یعنی پوری بات یوں ہے کہ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ الکافر اعمالہ یوم القیٰمۃ۔ چونکہ تمثیل میں اصل مقصد آخرت کی محرومی ہی کو واضح کرنا تھا اس وجہ سے کلام کا رخ بے تکلف اس کی طرف مڑ گیا اور ضمیر مفعول میں رعایت مشبہ بہ یعنی سراب کی ہے۔

لفظ کفر یا اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا کہیں قرآن میں صرف منکرین خدا کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے۔ قرآن کے مخاطبوں میں کوئی گروہ بھی منکر خدا نہیں تھا بلکہ سب مشرک تھے۔ انھیں مشرکوں کو قرآن نے کہیں کفار کہا ہے اور کہیں مشرکین۔ اس لیے کہ شرک درحقیقت کفر ہی ہے۔ دین میں خدا کا صرف مان لینا ہی مطلوب نہیں بلکہ اس کو تمام صفات اور ان صفات کے تمام تقاضوں کے ساتھ ماننا مطلوب ہے۔ جو شخص خدا کو اس کی صفات اور ان کے مقتضیات کے ساتھ نہیں مانتا ہے اس کے سارے اعمال قیامت کے دن بالکل بے وزن ہو کے رہ جائیں گے خواہ اس نے وہ کتنے ہی تگ و دو کر کے انجام دیے ہوں۔

وَاللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ یہ درحقیقت اس مغالطہ کو دفع کرنے کے لیے ہے جس میں لوگ مبتلا ہوتے ہیں کہ آخرت اور حساب کتاب اگر ہے بھی تو یہ اتنی دور کی بات ہے کہ اس کے لیے ابھی سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی دنیا اور اتنے بے شمار افراد کے تمام اعمال و اقوال کا حساب کتاب کون کر سکتا ہے! فرمایا کہ جن لوگوں نے اس قسم کے مغالطوں میں پڑ کر ساری زندگی ضلالت اور بدمستی میں گزار دی وہ آخرت میں دیکھیں گے کہ سارا حساب کتاب پلک جھپکتے ان کے سامنے آ گیا ہے۔

اَوۡ کَظُلُمٰتٍ فِیۡ بَحۡرٍ لُّجِّیٍّ یَّغۡشٰہُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِہٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِہٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُہَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ یَدَہٗ لَمۡ یَکَدۡ یَرٰىہَا ؕ وَ مَنۡ لَّمۡ یَجۡعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوۡرًا فَمَا لَہٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ﴿۴۰﴾

بحر لجّی گہرے سمندر کو کہتے ہیں۔ لُجّ سمندر کا وہ حصہ جہاں پانی سب سے زیادہ گہرا ہو۔ لجّی اسی کی طرف نسبت ہے۔

اوپر والی آیت میں اہل کفر کے اعمال کی مثال تھی۔ اب یہ ان کی ذہنی تاریکی کی تمثیل ہے کہ وہ خدا کو نہ ماننے یا صحیح طور پر نہ ماننے کے سبب سے ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر زندگی گزارتے ہیں۔ اس اندھیرے کی مثال یہ ہے کہ گہرا سمندر ہو، رات اندھیری ہو، موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہو اور اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں اور یہ ان تہ بہ تہ تاریکیوں کے اندر گھرے ہوئے ہوں۔ حال یہ ہو کہ اگر ہاتھ بھی نکالیں تو وہ بھی سجھائی نہ دیتا ہو۔ فرمایا کہ روشنی تو خدا کے ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کو اس کی بدبختی کے سبب سے خدا نے ایمان کی توفیق نہیں بخشی اس کو کہیں سے بھی روشنی حاصل نہیں ہو سکتی۔ وہ جب تک ایمان کی شاہراہ پر نہیں آئے گا اسی طرح تاریکیوں میں بھٹکتا رہے گا اور دن بدن اس کی تاریکیوں میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔ (کفار کی ذہنی تاریکی کی تمثیل)

۹۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۱-۵۷

ایمان اور کفر کی حقیقت واضح کر دینے کے بعد آگے کی آیات میں ایمان باللہ کی دعوت ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی ان صفات اور نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی جو شہادت دیتی ہیں کہ اس کائنات میں اسی خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا تصرف ہے، کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے اس وجہ سے سب اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کریں۔ پھر خاص طور پر منافقین کو متنبہ کیا ہے کہ اب ان کی منقسم وفاداری کی پالیسی نہیں چل سکتی، وہ یا تو یکسو ہو کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں داخل ہو جائیں ورنہ یاد رکھیں کہ اللہ اس سرزمین میں اپنے مخلص بندوں کو اقتدار بخشے گا اور ان کے تمام دشمن، خواہ چھپے ہوتے ہوں یا کھلے ہوئے، ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے۔
اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

(آیات ۴۱-۵۰)
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ
كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾
وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ
يُزْجِىْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ
يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ
فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ
يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً

لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ
عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى
اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾ لَقَدْ
اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾
وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنْ
يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ
بَلْ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا ع ۱۲
اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَ
اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ
اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ
جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۭ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ
مَّعْرُوْفَةٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ
اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا
حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَ

لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ
خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ وَمَن كَفَرَ بَعْدَ
ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٥٥﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٥٦﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا
مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ وَلَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٥٧﴾ ع ۱۴

ترجمۂ آیات ۴۱-۵۷

دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے بھی پروں کو پھیلائے ہوئے۔ ہر ایک کو اپنی نماز اور تسبیح معلوم ہے اور اللہ باخبر ہے اس چیز سے جو وہ کر رہے ہیں۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ ہی کی طرف ہے سب کی واپسی۔ ۴۱-۴۲

دیکھتے نہیں کہ اللہ ہانکتا ہے بادلوں کو، پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے، پھر ان کو تہ بہ تہ کر دیتا ہے۔ پھر دیکھتے ہو کہ ان کے بیچ سے مینہ نکلتا ہے۔ اور آسمان سے ــــ اس کے اندر کے پہاڑوں سے ــــ اولے برساتا ہے۔ پس جن پر چاہتا ہے ان کو نازل کرتا ہے اور جن سے چاہتا ہے ان کو ہٹا دیتا ہے۔ اس کی بجلی کی کوند معلوم ہوتا ہے کہ نگاہوں کو اُچک لے جائے گی۔ اللہ ہی ہے جو رات اور دن کو گردش دیتا ہے۔ بے شک ان چیزوں کے اندر اہلِ نظر کے لیے بڑا سامانِ عبرت ہے۔ ۴۳-۴۴

اور اللہ نے پیدا کیا ہر جاندار کو پانی سے، تو ان میں سے بعض تو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض دو پاؤں سے چلتے ہیں اور ان میں سے بعض چار پیروں پر چلتے ہیں۔ اللہ جو چاہے پیدا کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۴۵

ہم نے واضح کر دینے والی آیات اتار دی ہیں اور اللہ ہی جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ

کی ہدایت دیتا ہے۔ ۴۶

اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کی۔ پھر ان میں سے ایک گروہ پھر جاتا ہے اور یہ لوگ درحقیقت مومن نہیں ہیں اور جب یہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک گروہ پہلو تہی کرتا ہے۔ اور اگر حق ان کو ملنے والا ہو تو اس کی طرف نہایت فرمانبردارانہ آتے ہیں۔ کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا یہ ابھی شک میں پڑے ہوتے ہیں یا ان کو اندیشہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان کے ساتھ ناانصافی کریں گے بلکہ یہ لوگ خود ہی ظالم ہیں۔ اہلِ ایمان کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ جب وہ اپنی کسی باہمی نزاع کے فیصلہ کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مانا اور درحقیقت یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے اور جو اس سے ڈریں گے اور اس کے حدود کی پاسداری کریں گے، وہی لوگ ہیں جو فائز المرام ہوں گے۔ ۴۷-۵۲

اور انھوں نے پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر تم ان کو جہاد کا حکم دو گے تو وہ ضرور نکلیں گے۔ کہہ دو کہ قسمیں نہ کھاؤ۔ بس دستور کے مطابق اطاعت اصل چیز ہے! جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ پس اگر تم اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ رسول پر صرف وہ ذمہ داری ہے جو اس پر ڈالی گئی ہے اور تم پر وہ ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے اور اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو راہ یاب ہو گے اور رسول پر صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ ۵۳-۵۴

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عملِ صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک میں اقتدار بخشے گا جیسا کہ ان لوگوں کو اقتدار بخشا جو ان سے پہلے گزرے اور ان کے

اس دین کو متمکن کرے گا جس کو ان کے لیے پسندیدہ ٹھہرایا اور ان کی اس خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو درحقیقت وہی لوگ نافرمان ہیں۔ ۵۵

اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے اور ان کافروں کی نسبت یہ گمان نہ کرو کہ یہ زمین میں ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں گے۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور وہ بے شک نہایت ہی برا ٹھکانا ہے۔ ۵۶-۵۷

۱۰- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (۴۱)

اس کائنات کی ہر چیز اپنے عمل سے خدا کی تسبیح کی دعوت دیتی ہے

بعینہٖ یہی مضمون سورۂ حج کی آیت ۱۸ میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کی پوری وضاحت کر چکے ہیں۔ اس کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے اور ان کی ظاہری حالت، جو ہمارے مشاہدے میں آتی ہے، اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جس طرح وہ اپنے ظاہر میں ہر آن اپنے رب کے آگے سرفگندہ اور اس کے حکم کی تعمیل میں سرگرم ہیں اسی طرح ان کا باطن بھی ہر لحظہ اپنے رب کی تسبیح و تقدیس میں مصروف ہے۔ اگرچہ ہم ان کی زبان اور ان کی حرکات سے اچھی طرح آشنا نہ ہونے کے سبب سے، جیسا کہ فرمایا ہے۔ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (اسراء۔ ۴۴) ان کی تسبیح و نماز کو سمجھ نہیں سکتے۔ یہ ساری چیزیں اپنی زبان حال سے انسان کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ بھی اس حمد و تسبیح میں ان کے ساتھ شامل ہو اور انہی کی طرح صرف اپنے رب ہی کی بندگی کرے۔ اگر وہ اس سے کوئی الگ راہ اختیار کرتا ہے تو گویا وہ ساری دنیا سے بالکل جدا راہ اختیار کرتا ہے اور ایک ایسی راگنی چھیڑتا ہے جو اس کائنات کے مجموعی نغمہ سے بالکل بے جوڑ ہے۔ اس میں خدا کی راہ اختیار کرنے والوں کی ہمت افزائی بھی ہے کہ وہ اپنے آپ کو تنہا یا اقلیت میں نہ سمجھیں! اس راہ کا مسافر کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ یہ راہ قافلوں سے بھری ہوتی ہے۔ اس میں ساری کائنات اس کی ہم سفر ہے۔ اگر تھوڑے سے ناشکرے انسان اس سے الگ ہوں تو ان کی علیحدگی سے وہ کیوں بددل اور مایوس ہو جب کہ خدا کے آسمان و زمین، اس کے شمس و قمر، اس کے دریا اور پہاڑ اور اس کے سارے چرند و پرند ہر وقت اس کے ہم رکاب ہیں۔

فضا کے پرندوں کی عبادت کی طرف اشارہ

'وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ' یہ آسمان و زمین کے درمیان کی چیزوں میں سے پرندوں کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ پرندے بھی فضا میں اپنے پروں کو پھیلائے ہوئے خدا ہی کی تسبیح کرتے ہیں۔ دوسرے مقام میں پرندوں کے نغموں اور چہچہوں کا حوالہ ہے۔ یہاں ان کے پروں کے پھیلانے کا ذکر ہے جو خدا کے آگے ان کے افتراش کی تصویر ہے۔

ہر چیز کی عبادت کا طریقہ الگ الگ ہے

'كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ' یعنی یہ نہ خیال کرو کہ دنیا کی ہر چیز کے لیے خدا نے نماز اور تسبیح کا ایک ہی طریقہ ٹھہرایا ہے بلکہ اس نے ہر چیز کو تسبیح و عبادت کے الگ الگ طریقے الہام فرمائے ہیں، اور ہر چیز نے اپنی نماز و تسبیح کا طریقہ اچھی طرح سیکھ لیا ہے اور وہ اسی طریقہ کے مطابق خدا کی حمد و تسبیح کرتی ہے۔

'وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ' یعنی اگر تم ان کی تسبیح و عبادت کو نہیں جانتے تو اس سے کچھ فرق پیدا نہیں ہوتا۔ خدا ان کے ان تمام کاموں سے واقف ہے جو وہ کرتے ہیں اور خدا ہی تم کو ان کے اس کام سے آگاہ کر رہا ہے تاکہ تم اس سے سبق حاصل کرو۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (۴۲)

عبادت و حمد صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے

یہ اس بات کی دلیل ارشاد ہوئی کہ کیوں ہر چیز خدا ہی کی حمد و تسبیح کرتی ہے اور کیوں سب کو اسی کی حمد و تسبیح کرنی چاہیے۔ فرمایا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کی ہے اور سب کی واپسی بھی بالآخر خدا ہی کی طرف ہونی ہے۔ نہ اس کائنات کے نظام میں کسی کا کوئی دخل ہے اور نہ آخرت میں خدا کے سوا کوئی اور مرجع و ماویٰ بننے والا ہے تو جب یہاں اور وہاں ہر جگہ سارا اختیار و اقتدار اسی کو حاصل ہے تو اس کے سوا کسی دوسرے کی تسبیح و عبادت کس حق کی بنا پر کی جائے!

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۭ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ (۴۳)

رحمت اور نقمت دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہیں

یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ اس کائنات میں سارا اختیار و اقتدار صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ وہی اس میں اپنے اختیار مطلق سے جو تصرف چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کی حکمت کے سوا اور کوئی اس میں دخیل نہیں ہے۔ دیکھو، زمین پیاسی ہوتی ہے، کسی کی طاقت نہیں کہ آسمان سے پانی کی ایک بوند ٹپکا دے۔ وہی اپنی ہواؤں سے بادلوں کو ہانک کر لاتا ہے، ان کے الگ الگ ٹکڑوں کو باہم جوڑ کر ان کو تہ بہ تہ کرتا ہے۔ پھر ان سے ابر رحمت برساتا اور ساری زمین کو جل تھل کر دیتا ہے۔ اسی طرح دیکھو، اس کی رحمت کی طرح اس کی نقمت بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ انہی بادلوں کو جس کے لیے وہ چاہے عذاب بنا دیتا ہے وہ ان کے لیے پانی کے بجائے اپنے اندر گویا اولوں کے پہاڑ چھپائے ہوئے نمودار ہوتے ہیں۔ پھر جن پر

اس کا حکم ہوتا ہے وہ اولوں کی سنگ باری کر کے ان کو تباہ کر دیتے ہیں اور جن کو وہ چاہتا ہے اس آفت سے بچا لیتا ہے۔ کسی دوسرے کی مجال نہیں کہ وہ اس آفت سے اپنے کو یا دوسروں کو بچا سکے۔ ان بادلوں کے اندر جو بجلی ہوتی ہے اس کی چمک کا یہ حال ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کو اچک لے جائے گی۔

یہ امر واضح رہے کہ اس ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و نقمت دونوں پر اپنے تنہا اختیار کو واضح فرمایا ہے۔ پہلے ٹکڑے میں رحمت کی تمثیل ہے اور دوسرے ٹکڑے میں، جو وَ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ سے شروع ہوتا ہے، اس کے عذاب کی تمثیل ہے۔ اس میں اشارہ سرما کے ان بادلوں کی طرف ہے جو تند ہواؤں، شدید کڑک دمک اور اولوں کے ساتھ نمودار ہوتے اور ان سے ایسی بے پناہ ژالہ باری ہوتی کہ بستیاں کی بستیاں ان کے نیچے ڈھک جاتیں۔ گویا ان کے اندر اولوں کے پہاڑ ہیں۔ قرآن نے عذاب الٰہی سے جن قوموں کی تباہی کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض قومیں اسی آفت سے تباہ ہوئیں۔ ہم ان کا ذکر ان کے محل میں کر چکے ہیں۔

یُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّیۡلَ وَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَعِبۡرَۃً لِّاُولِی الۡاَبۡصَارِ (۴۴)

رات اور دن کی آمد و شد پر تنہا اللہ ہی کا اختیار ہے

اسی طرح رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کو لانا بھی خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ کسی کی طاقت نہیں کہ رات میں دن ظاہر کر دے یا دن میں رات نمودار کر دے یا ان کی آمد و شد میں منٹ یا سیکنڈ کا فرق ہی پیدا کر دے۔ فرمایا کہ ان تمام باتوں کے اندر جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، اہل نظر کے لیے بڑا سامان عبرت ہے۔ 'عبرۃ' کا مفہوم ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک عبور کر جانا ہے۔ یعنی جو لوگ وہ نظر رکھتے ہیں جو ظاہر کے اندر باطن اور جزئیات کے اندر کلیات کو دیکھ لینے والی ہے ان کو ان شاہدات کے بعد اس بات میں ذرا بھی شک باقی نہیں رہ سکتا کہ یہ کائنات ایک خدائے حکیم و قدیر کی بنائی ہوئی ہے جو اس ساری کائنات پر یکہ و تنہا حاکم و متصرف ہے اس وجہ سے تنہا وہی حقدار ہے کہ اس کی عبادت و اطاعت کی جائے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہی 'عبرۃ' انسانیت کا اصل جوہر ہے۔ اگر یہ جوہر کسی کے اندر نہیں ہے تو وہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہے اور جو آنکھ ظاہر کے اندر باطن کو نہ دیکھ سکے وہ کور ہے۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

وَ اللّٰهُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ ۚ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰی بَطۡنِهٖ ۚ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰی رِجۡلَیۡنِ ۚ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰۤی اَرۡبَعٍ ؕ یَخۡلُقُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (۴۵)

تعدد انواع و تعدد آلہہ کی دلیل نہیں

یعنی انواع و اجناس اور اشکال و صور کا اختلاف و تعدد بھی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کائنات میں مختلف ارادے کارفرما ہیں، جیسا کہ نادان مشرکوں نے سمجھا، بلکہ یہ اس دنیا کے خالق کی

قدرت و حکمت کی دلیل ہے۔ ایک ہی پانی سے اس نے تمام جانداروں کو وجود بخشا۔ ان میں سے بعض پیٹوں کے بل رینگتے ہوئے چلتے ہیں، بعض دو ٹانگوں پر چلتے ہیں، بعض چار پیروں پر چلتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دو ٹانگوں والوں کا خالق الگ اور چار ٹانگوں والوں کا خدا الگ ہے! سب کا خالق ایک ہی ہے۔ وہی اپنی قدرت سے جو چاہے پیدا کرتا ہے اور جس کو جو شکل و صورت چاہتا ہے دیتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے اس وجہ سے سب کو چاہیے کہ اپنے آپ کو اسی کے حوالہ اور اسی کی بندگی و اطاعت کریں۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۴۶)

ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں سنت الٰہی

یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ آیت ۳۴ میں گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہ آنکھیں کھول دینے والی اور صراط مستقیم کو دکھا دینے والی آیتیں اتار دی ہیں۔ اب ہم اپنی سنت کے مطابق ان لوگوں کو صراط مستقیم کی ہدایت دیں گے جو اس کے طالب بنیں گے۔ رہے ناقدرے اور ناشکرے لوگ تو وہ اپنی خواہشات نفس کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہیں گے، یہاں تک کہ ان کا انجام ان کی آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ یہ بات ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ خدا نے اپنی مشیت کو اپنی سنت کے تحت رکھا ہے جو اس اعتبار سے تو مطلق ہے کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا اس کو بدل نہیں سکتا لیکن اس کی ہر مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے۔

وَیَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ (۴۷)

منافقین کے رویہ پر تبصرہ

تعریض الی اللہ کی عام دعوت کے بعد اب یہ خاص طور پر منافقین کو لیا ہے جن کے فتنے اس دور میں، جیسا کہ فتنۂ افک سے معلوم ہوتا ہے، بہت بڑھ گئے تھے۔ فرمایا کہ جہاں تک زبانی اظہار و اعلان کا تعلق ہے یہ بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اللہ و رسول کے ایمان اور اطاعت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب اس دعوئے ایمان و اطاعت کے امتحان کا وقت آتا ہے تو یہ بالکل پھسڈی ثابت ہوتے ہیں۔

'وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ' یعنی اس قسم کے مدعیان ایمان اللہ کے نزدیک مومن نہیں ہیں۔ ایمان کا حق صرف کلمہ پڑھ دینے سے پورا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے شرط لازم ہے کہ اللہ و رسول کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت کی جائے۔ اگر کوئی شخص یہ شرط پوری نہیں کرتا تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹا اور پکا منافق ہے۔

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۴۸)

رسول کی عدالت سے کترانے والے منافقین

یہ ان کے نفاق اور عدم ایمان کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ جب ان کے درمیان کوئی قضیہ پیدا ہوتا ہے اور ان کو یہ دعوت دی جاتی ہے کہ اس کو اللہ اور رسول کے سامنے پیش کریں تاکہ اللہ کا رسول اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ کرے تو ان میں سے ہر ایک گروہ برابر اعراض کی روش اختیار کرتا ہے۔ اللہ

کی طرف دعوت کے معنی ظاہر ہے کہ اللہ کے قانون کے سامنے پیش کرنے کی دعوت کے ہیں جس کا ترجمان اللہ کا رسول ہوتا ہے۔ اللہ کا رسول جو فیصلہ کرے وہی اللہ کا فیصلہ ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ و رسول کے ایمان کا مدعی ہے لیکن اپنے معاملات کے فیصلہ کے لیے دوسروں کی طرف رجوع کرتا ہے، رسول کی عدالت سے کتراتا ہے تو وہ منافق ہے۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جو اس کتاب میں دوسرے مقام میں تفصیل سے بیان ہو چکی ہے کہ ابتداءً جب تک اطرافِ مدینہ میں یہود بھی اپنے اپنے دائروں میں اثر و رسوخ رکھتے رہے، منافقین کی یہ روش رہی کہ وہ اپنے فیصلے انہی کی عدالتوں میں لے جاتے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ یہود نے شریعتِ الٰہی کو محرّف کر کے بالکل خواہشاتِ نفس کے سانچے میں ڈھال لیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے حکام کو رشوت دے کر بڑی آسانی سے خریدا جا سکتا تھا۔ اس صورتِ حال سے منافقین یہ فائدہ اٹھاتے کہ اگر ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے اپنے حسبِ منشا فیصلہ حاصل کر سکنے کی توقع ہوتی تب تو اپنے ایمان و اسلام کی نمائش کے لیے نہایت فرمانبردارانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں مقدمہ لاتے اور اگر یہ توقع نہ ہوتی تو یہود کی عدالتوں سے رجوع کرتے۔

وَإِنْ يَكُنْ لَهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ (۴۹)

یعنی اگر انھیں یہ اندازہ ہوتا کہ پیشِ نظر قضیہ میں اسلام کے قانون کا فیصلہ ان کے حق میں ہے تب تو نہایت فرمانبردارانہ معاملہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں لاتے اور اگر یہ اندازہ ہوتا کہ اسلام کا قانون ان کے مفاد کے خلاف ہے تو یہود کی عدالتوں میں لے جاتے۔ ان کی اس روش کو قرآن نے تحاکم الی الطاغوت سے تعبیر کیا ہے اور اس کو شرک قرار دیا ہے جس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔

أَفِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۵۰)

'مرض' کا مفہوم

لفظ 'مَرَضٌ' جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، قرآن میں حسد کی تعبیر کے لیے بھی آیا ہے اور نفاق کی تعبیر کے لیے بھی۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اس سے نفاق مراد ہے۔ حسد و نفاق دونوں کا دل کی بیماری کی حالت ہونا واضح ہے۔

'ارتیاب' کا مفہوم

'ارتیاب' کے معنی مبتلائے شک ہونے کے ہیں۔ یہ شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے باب میں بھی ہو سکتا ہے اور اسلام کے مستقبل کے باب میں بھی۔ منافقین کی مذبذب پالیسی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ ڈرتے تھے کہ مسلمانوں اور ان کے مخالفوں میں جو کشمکش اس وقت برپا ہے اس میں آخری بازی معلوم نہیں کس کی رہے تو مصلحت یہی ہے کہ دونوں کے ساتھ تھوڑا تھوڑا تعلق باقی رکھا جائے تاکہ دونوں میں سے جس کی بھی فتح ہو اپنا مفاد محفوظ رہے۔

'حیف' کا مفہوم — 'حیف' کے معنی ظلم و جور کے ہیں۔

منافقین کی پالیسی کا پوسٹ مارٹم — فرمایا کہ ان منافقین نے یہ نیمے دروں نیمے بروں کی جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے یہ تین حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو ان کے دلوں کے اندر نفاق کا روگ ہے، یا وہ رسول کی رسالت اور اسلام کے مستقبل کی طرف سے ابھی شک میں ہیں یا انھیں اندیشہ ہے کہ اگر وہ اپنے معاملات اللہ و رسول کی عدالت میں لائیں گے تو اللہ و رسول ان کے ساتھ ناانصافی کریں گے۔ اب وہ خود فیصلہ کریں کہ وہ ان تینوں میں سے کسی ایک بیماری میں مبتلا ہیں یا بیک وقت تینوں ہی میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے جو بات بھی ہو بہرحال وہ ایمان کے منافی ہے۔

منافقین کے رویہ پر تبصرہ — 'بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ' یعنی انھیں اللہ و رسول سے ظلم و ناانصافی کا اندیشہ ہے حالانکہ وہ یہ روش اختیار کر کے خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ وہ اپنے گمان میں اپنے مستقبل کے مفاد کو محفوظ کر رہے ہیں حالانکہ انھوں نے ایک گرتی دیوار کے سایہ میں پناہ لی ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۱)

سچے مسلمانوں کی شان — یہ سچے مسلمانوں کی شان بتائی کہ ان کو جب کسی معاملہ کے فیصلہ کے لیے اللہ و رسول کی طرف بلایا جائے تو ان کی شان یہ ہونی چاہیے کہ وہ یہ کہتے ہوئے اس کو قبول کریں کہ ہم نے سنا اور مانا۔ فرمایا کہ جو لوگ اس طرح ہر لوث اور ہر طمع و خوف سے بالاتر ہو کر اپنے آپ کو اللہ و رسول کے حوالہ کریں گے درحقیقت دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے حقیقی مفاد کو محفوظ کرنے والے وہی ہیں نہ کہ یہ لوگ جو بیک وقت کفر و اسلام دونوں سے اپنے مفاد کی حد تک دوستی رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ دو کشتیوں کے سوار لازماً ڈوب کے رہیں گے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۵۲)

'يَتَّقْهِ' میں تخفیف کی وجہ سے لفظ کی شکل کچھ بدل گئی ہے لیکن اس قسم کی تخفیف عربی میں معروف ہے۔

'خشیت' اور 'تقویٰ' سے مراد — 'خشیۃ' اور 'تقویٰ' یہاں دونوں لفظ ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ میرے نزدیک 'خشیۃ' یہاں دل کی حالت کی تعبیر کے لیے ہے اور 'تقویٰ' سے مراد حدود الٰہی کی پاسداری ہے۔ یعنی ایک کا تعلق باطن سے ہے، دوسرے کا تعلق ظاہر سے۔

اصلی فائز المرام گروہ — فرمایا کہ اصل فائز المرام ہونے والے وہ لوگ ہیں جو نرم و گرم ہر طرح کے حالات میں، اپنے تمام ذاتی اغراض و مفادات سے بالاتر ہو کر، اللہ و رسول کی اطاعت کریں اور ان کے دلوں میں اللہ کا خوف ہو اور وہ اپنی روز مرہ کی زندگی میں خدا کے حدود کی پوری پوری پاسداری کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نجات و فلاح کے لیے اولاً تو مجرد دعوائے ایمان کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت بھی شرط لازم ہے۔ ثانیاً محض اطاعت بھی کافی نہیں ہے بلکہ اس اطاعت کے ساتھ خدا کی خشیۃ اور تقویٰ بھی

ہونا ضروری ہے۔ فرمایا کہ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ، یہی لوگ فائز المرام ہونے والے ہیں۔ رہے وہ مفاد پرست جو محض اپنے مفاد کے حد تک اللہ و رسول کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں اللہ اور رسول کو ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۭ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾

منافقین کی روش جہاد کے معاملہ میں

سمع و طاعت کا عہد کرنے کے باوجود منافقین جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے کتراتے تھے اسی طرح جہاد سے بھی کتراتے تھے۔ زبان سے لاف زنی کا تو یہ حال تھا کہ جب جہاد کا ذکر آتا تو بڑی زوردار قسمیں کھا کھا کے حضورؐ کو یقین دلاتے کہ جب آپ کا حکم ہوگا ہم جان و مال سے حاضر ہیں لیکن جب وقت آتا تو کترا جاتے۔ فرمایا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ قسمیں زیادہ نہ کھاؤ، قسمیں عمل کا بدل نہیں بن سکتیں۔ اصل شے جو مطلوب ہے وہ اصول کے مطابق اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ اگر یہ چیز موجود نہیں ہے تو خالی خولی قسموں سے تم کتنے دن اپنے کردار پر پردہ ڈالے رکھ سکو گے!

اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، یعنی ان جھوٹی قسموں سے تم دوسروں کو دھوکا دے سکتے ہو لیکن اس خدا کو کس طرح دھوکا دے سکتے ہو جو تمہارے ہر قول و فعل سے اچھی طرح باخبر ہے۔

قرآن میں منافقین کے زیادہ قسمیں کھانے کا ذکر دوسرے مقامات میں بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی آئے گا۔ اس کی نفسیاتی وجہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ جن کے پاس کردار کی شہادت موجود نہیں ہوتی وہ اپنے کو معتبر ثابت کرنے کے لیے قسموں ہی کو ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کے دلوں کے اندر یہ چور چھپا ہوا ہوتا ہے کہ جب تک وہ قسم نہیں کھائیں گے مخاطب ان کی بات باور نہیں کرے گا۔ ثقہ اور صاحب کردار آدمی کو اپنے کردار پر اعتماد ہوتا ہے اس وجہ سے اس کو قسم کھانے کی ضرورت زیادہ پیش نہیں آتی۔

طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ میں اسلوب کلام

طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ اسی طرح کا جملہ ہے جس طرح فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ہے۔ یہ خبر محذوف کا مبتدا بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ اگر نکرہ موصوف ہو تو اس کے اندر مبتدا ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور مبتدائے محذوف کی خبر بھی۔ دونوں ہی صورتوں میں مفہوم میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوگا اس لیے کہ اس قسم کے حذف سے اصل مقصود مخاطب کی پوری توجہ کو مذکور پر مرتکز کرنا ہوتا ہے اور یہ چیز دونوں ہی صورتوں میں یہاں حاصل ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾

منافقین کو تہدید و نصیحت

یہ منافقین کو تنبیہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ اگر اس چیز سے منہ موڑو گے تو یاد رکھو کہ تم رسول کا کچھ نہیں بگاڑو گے بلکہ اپنے ہی کو تباہ کرو گے۔ تمہارے معاملے میں رسول کے اوپر صرف اتنی ہی ذمہ داری ہے جو اللہ کی طرف سے اس پر ڈالی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ اللہ کا دین تمہیں واضح طور پر پہنچا دے۔

ہوا س نے اپنا یہ فرض بحسن و خوبی ادا کر دیا۔ اب یہ ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ وہ تمہیں ایمان و ہدایت کے راستہ پر چلا بھی دے۔ ایمان و ہدایت کی راہ اختیار کرنے کی ذمہ داری خود تمہارے اوپر ہے اور خدا کے ہاں تمہی کو اس کی جواب دہی کرنی ہے کہ رسول کی بات تم نے کیوں نہیں مانی اور یہ ہدایت کی راہ کیوں نہیں اختیار کی؟

'وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا' اس فقرے میں تہدید اور نصیحت دونوں ہے۔ یعنی رسول کی اطاعت کرو، فوز و فلاح کی راہ اسی سے پاؤ گے ورنہ یاد رکھو کہ اپنی شامت بلاؤ گے۔

رسول کی ذمہ داری صرف بلاغ مبین ہے

'وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ' یہ رسول کی ذمہ داری واضح فرما دی کہ خدا کی طرف سے اس پر ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ واضح طور پر لوگوں کو اللہ کا دین پہنچا دے۔ اب اس کے بعد اگر تم اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرتے ہو تو اس کا خمیازہ خود بھگتو گے۔

ایمان کا لازمی تقاضا اطاعت

ان آیات میں دیکھیے بار بار ایمان کا لازمی تقاضا اللہ اور رسول کی اطاعت کو بنایا گیا ہے اور اللہ کی اطاعت کا راستہ رسول کی اطاعت کو قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بغیر مجرد 'اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ' کہہ دینے سے اگر ایمان کا حق ادا ہو جاتا تو یہ منافقین اس اقرار و اعلان میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ وہ تو 'اٰمَنَّا' کے ساتھ 'اَطَعْنَا' کا بھی اقرار کرتے تھے اور اپنے دعوے کی صداقت پر نہایت پکی پکی قسمیں بھی کھاتے تھے۔ پھر آخر وہ 'فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ' کے سزاوار کیوں ٹھہرے!

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِیْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِیْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵۵)

رسول کے پیرؤوں کے لیے غلبہ و تمکن کی بشارت

یہ منافقین کے اس شک پر ضرب لگائی ہے جو اسلام کے مستقبل سے متعلق اپنے دلوں میں وہ رکھتے تھے اور جس کی طرف اوپر 'اَمِ ارْتَابُوْا' کے الفاظ سے اشارہ گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ پوری راست بازی کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کر لیں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہو چکا ہے کہ اللہ ان کو اس سرزمین میں اسی طرح اقتدار بخشے گا جس طرح پچھلے رسولوں کی امتوں کو اس نے اقتدار بخشا اور ان کے دین کو جس کو اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے، اس ملک میں مستحکم کرے گا اور ان کی اس خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔

یہاں جس وعدے کا حوالہ ہے اس کا ذکر سورۂ انبیاء، سورۂ حج اور سورۂ مؤمنون میں پوری وضاحت کے ساتھ گزر چکا ہے۔

'كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ' سے سابق رسولوں اور ان کی امتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ہم رسولوں کے باب میں اس سنت الٰہی کا حوالہ بار بار دے چکے ہیں کہ رسول اور اس کے پیرؤوں کے لیے اس دنیا میں غلبہ لازمی ہے۔ رسول کے اتمام حجت کے بعد اس کے جھٹلانے والے لازماً تباہ کر دیے

گئے اور قیادت و سیادت کی باگ ان کے بعد ان لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو رسول پر ایمان لائے۔

وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ۔ یعنی اس دینِ اسلام کو جس کو ان کے لیے اللہ نے پسند فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے، وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا، اس دین کو اس سرزمین میں متمکن کرے گا۔ یعنی اسی دین کا قانون اس ملک میں چلے گا اور اسی کی اساسات پر اس ملک کا نظامِ اجتماعی و سیاسی استوار ہوگا۔ اس دین کے سوا کسی اور دین کا اقتدار اس ملک میں باقی نہیں رہے گا۔

وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا۔ یعنی اس وقت اس دین کے دشمنوں کے سبب سے جو خوف و اندیشہ کی حالت ہے، یہ ایک عارضی حالت ہے۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے جب اس خوف کی حالت کو اللہ تعالیٰ امن سے بدل دے گا اور اس ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک کسی کی مجال نہ ہوگی کہ وہ اللہ کے دین یا اس دین کے حاملوں کے لیے کوئی خطرہ پیدا کر سکے۔

يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا۔ یعنی اس سرزمین پر تنہا میری ہی عبادت ہوگی، میرے سوا کسی اور کی عبادت نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ فتح مکہ کے بعد جس طرح پورا ہوا وہ تاریخ کی ایک ایسی حقیقت ہے جس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ پورے جزیرۂ عرب کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرما دیا کہ 'لا یجتمع فیہا دینان' (اس میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے)

وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ یعنی آج تو ابھی امتحان و آزمائش کا مرحلہ ہے اس وجہ سے ان لوگوں کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے جو اللہ کے دین کی مخالفت کر رہے ہیں لیکن آگے فیصلہ کی گھڑی بھی آنے والی ہے اس وقت وہ لوگ اپنا انجام دیکھ لیں گے جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ سے مقصود اس کے لازم کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۵۶)

یہ علاج بتایا ہے کہ اگر اپنے دلوں کو نفاق، خوف اور شک کے امراض سے پاک رکھنا چاہتے ہو تو نماز کا اہتمام کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رسول کے ہر حکم کی بے چون و چرا اطاعت کرو۔ اگر یہ راہ اختیار کرو گے تو تم پر اللہ کی رحمت ہوگی اور تم دنیا اور آخرت دونوں میں فائز المرام ہو گے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ وَلَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۵۷)

ان منافقین کے دلوں پر اسلام کے مخالفین خصوصاً قریش کی جو ہیبت طاری تھی یہ اس کو دور فرمایا ہے کہ ان کافروں کے متعلق یہ خیال نہ کرو کہ یہ ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں گے۔ یہ اس زمین میں بھی ہمارے قابو میں ہیں اور آخرت میں تو ان کے لیے بہر حال دوزخ ہے ہی اور یاد رکھو کہ وہ نہایت ہی برا ٹھکانا ہے۔

۱۱- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۵۸-۶۴

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ آیات ۲۷-۳۱ میں پردہ سے متعلق جو ہدایات دی گئی ہیں ان کے بارے میں جو سوالات و شکوک بعض لوگوں کے ذہنوں میں بعد میں پیدا ہوئے ان کی وضاحت ان آیات میں کی گئی ہے۔ یہ آیات چونکہ اصل احکام کے بعد نازل ہوئی ہیں اس وجہ سے ان کو سورہ کے آخر میں رکھا گیا اور ان کے ساتھ یہ تصریح بھی ہے کہ یہ آیات بطور وضاحت نازل ہوئی ہیں۔

آخر میں تین آیتیں منافقین سے متعلق ہیں جن کا ذکر اوپر آیات ۴۷-۵۰ میں ہوا ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتیں بھی بعد میں مزید تنبیہ کے طور پر نازل ہوئی ہیں اس وجہ سے اصل سلسلۂ کلام سے الگ ان کو آخر میں جگہ دی گئی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۸-۶۴ يَٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ
لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِّنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ
حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ
ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ طَوّٰفُوْنَ
عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا
كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا
فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ
وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى
حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى
اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ
اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ

أَخَوٰتِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ أَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ أَوْ صَدِيْقِكُمْ ۗ
لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوْا جَمِيْعًا أَوْ أَشْتَاتًا ۗ فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا
فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى أَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ۗ كَذٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ ع ۸ ۱۴
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَإِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى أَمْرٍ جَامِعٍ
لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَأْذِنُوْهُ ۗ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَأْذِنُوْنَكَ أُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ
فَأْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۗ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۗ
قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ
يُخَالِفُوْنَ عَنْ أَمْرِهٖٓ أَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ
أَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ أَلَآ إِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ قَدْ يَعْلَمُ مَآ أَنْتُمْ
عَلَيْهِ ۚ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ إِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ
شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾ ع ۹ ۱۵

ترجمۂ آیات ۵۸-۶۴

اے ایمان والو، تمہارے غلام اور لونڈیاں بھی اور تمہارے اندر کے وہ بھی جو ابھی بلوغ کو نہیں پہنچے ہیں، تین وقتوں میں اجازت لیا کریں۔ ایک نماز فجر سے پہلے، دوسرے دوپہر کو جب تم اپنے کپڑے اتارتے ہو، اور نماز عشاء کے بعد۔ یہ تین اوقات تمہاری بے پردگی کے ہیں۔ ان اوقات کے علاوہ تمہارے اور ان کے اوپر بدون اجازت آنے جانے میں کوئی قباحت نہیں۔ تم ایک دوسرے کے پاس آمد و شد رکھنے والے ہو۔ اسی طرح اللہ تمہارے

لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور جب تم میں سے وہ جو بچے ہیں بلوغ کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ وہ بھی اسی طرح اجازت لیں جس طرح ان کے پہلوں نے اجازت لی۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور عورتوں میں سے بڑی بوڑھیاں، جو اب نکاح کی امید نہیں رکھتی ہیں، اگر اپنے دوپٹے اتار دیں تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں اور یہ بات کہ وہ بھی احتیاط کریں ان کے لیے بہتر ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ۵۸-۶۰

نہ نابینا پر کوئی تنگی ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی تنگی ہے اور نہ مریض پر کوئی تنگی ہے اور نہ خود تمھارے اوپر کوئی تنگی ہے اس بات میں کہ تم اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اپنے زیر تولیت کے گھروں سے یا اپنے دوستوں کے گھروں سے کھاؤ پیو، خواہ اکٹھے ہو کر یا الگ الگ۔ بس یہ بات ہے کہ جب گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کرو جو اللہ کی طرف سے ایک بابرکت اور پاکیزہ دعا ہے۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ ۶۱

مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ اور جب کسی اجتماعی معاملہ کے لیے رسول کے پاس ہوتے ہیں تو اس وقت تک وہاں سے نہیں ٹلتے جب تک اس سے اجازت نہ لے لیں۔ جو لوگ تم سے اجازت لے کر جاتے ہیں وہی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ تو جب وہ اپنی کسی ضرورت سے اجازت مانگیں تو تم ان میں سے جس کو چاہو اجازت دے دیا کرو اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کرو۔ بے شک اللہ

غفور رحیم ہے۔ ۶۲

تم لوگ رسول کے بلانے کو اس طرح کا بلانا نہ سمجھو جس طرح تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ اللہ تم میں سے ان لوگوں سے اچھی طرح باخبر رہا ہے جو ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک جایا کرتے رہے ہیں۔ پس وہ لوگ جو اس کے حکم سے گریز کرتے رہے ہیں اس بات سے ڈریں کہ ان پر کوئی آزمائش آجائے یا ان کو ایک دردناک عذاب آپکڑے۔ آگاہ رہو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم جس حال پر ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے اور جس دن یہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا وہ اس سے ان کو باخبر کرے گا اور اللہ ہر چیز سے اچھی طرح واقف ہے۔ ۶۳-۶۴

۱۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (۵۸-۵۹)

غلاموں اور بچوں کے لیے تین اوقات میں اجازت لینے کی پابندی

پیچھے آیت ۲۷ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہاں گھروں میں داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کی جو شرط لگائی ہے اس سے غلاموں اور نابالغ بچوں کو مستثنیٰ رکھا تھا۔ یہ بعد میں ان پر بھی یہ قید عائد کر دی گئی کہ تین اوقات میں وہ بھی اجازت لیا کریں۔ نماز فجر سے پہلے، دوپہر کے وقت جب تم قیلولہ کے لیے کپڑے اتارتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔ ان تین اوقات میں خاص احتیاط کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ اوقات بے تکلفی اور بے پردگی کے ہیں۔ فجر سے پہلے اور عشاء کے بعد کے اوقات کا بے پردگی کے اوقات ہونا تو واضح ہے۔ دوپہر کا وقت بھی عام طور پر آرام کا ہوتا ہے۔ خاص طور پر عرب میں گرم ملک ہونے کی وجہ سے، اس وقت لوگ قیلولہ کرتے ہیں۔ ان اوقات میں غلاموں اور بچوں کا بے اجازت گھر میں داخل ہونا اس بات کا محتمل

تھا کہ وہ گھر والوں کو کسی ایسے حال میں دیکھیں جس میں دیکھنا پسندیدہ نہ ہو۔ اس وجہ سے یہ پابندی عائد کر دی گئی۔ اور ان پابندیوں کے عائد کرنے میں ایک تدریج ملحوظ رکھی گئی تاکہ یہ طبائع پر زیادہ شاق نہ ہوں۔ ان تین اوقات کے سوا ان پر اجازت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کی حکمت یہ واضح فرمائی ہے کہ طَوّٰفُوْنَ عَلَیْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ تم ہر وقت ایک دوسرے کے پاس آمد و شد رکھنے والے ہو اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کسی تنگی میں ڈالنا پسند نہیں فرمایا۔

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ الاٰیۃ: لیکن یہ نابالغ بچے بھی اجازت لینے کی قید سے مستثنیٰ صرف اس وقت تک ہیں جب تک نابالغ ہیں۔ بالغ ہونے کے بعد ان پر بھی وہ تمام پابندیاں عائد ہو جائیں گی جو دوسروں کے لیے مذکور ہوئی ہیں۔ اس دلیل کی بنا پر کہ یہ بچپن سے گھر میں آتے جاتے رہے ہیں ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہوگی۔

دونوں آیتیں توضیحی ہیں

ان دونوں آیتوں کے ساتھ دیکھ لیجیے، یہ تصریح موجود ہے کہ یہ بعد میں سابق احکام کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی ہیں اور یہ وضاحت خدا کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی یہ جانتا ہے کہ بندوں کی تربیت و اصلاح کے لیے کیا احکام دیے جائیں اور وہ کس ترتیب و تدریج کے ساتھ نازل کیے جائیں۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِیْنَةٍ ؕ وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۶۰)

بوڑھی عورتوں کے لیے ایک رخصت

یہ آیت بھی توضیحی آیات میں سے ہے۔ پیچھے آیت ۳۱ میں عورتوں کو گھر کے اندر کسی غیر محرم کی موجودگی میں، جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں یہ ہدایت بھی ہے وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُیُوْبِهِنَّ وہ اپنی اوڑھنیوں کے آنچل سے اپنے گریبان ڈھانک لیا کریں۔ اس حکم عام سے یہاں ان عورتوں کو مستثنیٰ کر دیا جو اب نکاح کی عمر سے گزر چکی ہیں۔ یعنی اگر وہ اوڑھنیوں کا یہ اہتمام نہ کریں تو اس میں چنداں ہرج نہیں ہے بشرطیکہ وہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں۔ اگرچہ پسندیدہ بات ان کے لیے بھی یہی ہے کہ وہ بھی احتیاط کو ملحوظ رکھیں جو دوسری عورتوں کے لیے بیان ہوئی ہے۔ بڑی بوڑھیوں کے لیے یہ رعایت ان کی آسانی کے لیے رکھی گئی ہے لیکن اس میں بھی فتنہ کا ایک پہلو ہے۔ جس طرح بعض مردوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ بوڑھے ہو جاتے ہیں لیکن ناک لگی ہی رہ جاتی ہے اسی طرح بعض عورتوں میں بھی یہ کمزوری ہوتی ہے کہ بوڑھی ہو جاتی ہیں لیکن اپنے زیورات اور اپنی ثروت کی نمائش کا شوق ان کے اندر سے نہیں نکلتا۔ چونکہ یہ چیز بجائے خود آدمی کے دین کے لیے ایک فتنہ ہے اس وجہ سے اس کی طرف توجہ دلا دی کہ وہ اس رخصت سے کوئی غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔

وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ، یہاں تنبیہ کے لیے ہے۔ یعنی ہر شخص کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خدا سے کوئی

بات مخفی نہیں رہتی۔ وہ سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَن
تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ
أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا
مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا ۚ فَإِذَا
دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ
لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۶۱)

پردہ کا مقصد معاشرتی روابط کا انقطاع نہیں

یہ آیت بھی توضیحی آیات ہی سے ہے۔ جب گھروں کے اندر جانے پر وہ پابندیاں عائد کردی گئیں جو پیچھے بیان ہوئیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ اسلام سوشل آزادیوں کو محدود کرنا چاہتا ہے کہ خاص اپنے عزیزوں، قریبیوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے گھروں میں بھی اب کوئی شخص آزادی و بےتکلفی کے ساتھ نہیں آجا سکتا۔ بہت سے لوگ جو معذور و مجبور تھے اور اپنی مجبوری کے سبب سے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں ہی کے گھروں پر گزارہ کرتے تھے انھوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ اب ان کی آزادی محدود ہو گئی۔ دور جاہلیت میں چونکہ غیر محدود آزادی ویسے بھی لوگوں کو حاصل رہی تھی اس وجہ سے اس کے مقابل میں اتنی پابندی بھی بعض طبائع پر شاق گزری۔ اس طرح کے لوگوں کے شبہ کو دور کرنے کے لیے یہ وضاحت فرما دی گئی کہ بعض احتیاطی پابندیوں کے عائد کرنے سے نہ یہ مقصود ہے کہ اندھے، لنگڑے اور مریض اپنے تعلق کے لوگوں کے سہارے سے محروم ہو جائیں اور نہ یہ مطلب ہے کہ اعزہ و اقربا اور دوستوں کے ساتھ معاشرتی روابط منقطع ہو جائیں۔ لوگ ایک دوسرے کے ہاں آئیں جائیں، ملیں جلیں، کھائیں پئیں۔ انفرادی طور پر بھی اور تقریبات میں اجتماعی طور پر بھی۔ ان چیزوں پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ مطلوب جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ جب لوگ گھروں میں داخل ہوں تو سلام کرکے داخل ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مبارک اور پاکیزہ طریقۂ تحیت و دعا ہے جس سے باہمی تعلقات کی خوش گواری میں اضافہ ہوتا ہے اور شیطان کی دراندازیوں کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس پابندی کو گراں نہ سمجھو۔ اس میں تمام تر تمھاری ہی فلاح و بہبود پیش نظر ہے۔

'اوما ملکتم مفاتحہ' سے مراد

'اَوْ مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ' سے مراد، میرے نزدیک، وہ گھر ہیں جن کی تولیت کی کسی شخص پر ذمہ داری ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی یتیم کا ولی ہے۔

'كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ': یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ یہ کسی سابق حکم کی، جیسا کہ ہم نے تصریح کی، وضاحت ہے۔ 'لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ جن لوگوں نے ان ہدایات کو نارو پابندی پر محمول کیا، یہ محض ناسمجھی کی بنا پر کیا۔ قرآن نے یہ وضاحت اس لیے فرمائی ہے کہ اس

قسم کے لوگوں کی یہ نافہمی دور ہوا اور وہ ان احکام کی افادیت و برکت کو اچھی طرح سمجھیں۔

اس آیت میں تمام رشتہ داروں اور قرابت داروں کا اس تصریح کے ساتھ الگ الگ جو ذکر آیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں مشترک خاندانی نظام کا رواج نہیں تھا بلکہ ہر بالغ شادی کے بعد اپنا الگ گھر بسا تا تھا۔ اور اس تصریح سے وہ بات بھی نکلی جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ اس سورہ میں زیر بحث وہ پردہ ہے جو اعزہ و اقربا اور تعلق و اعتماد کے لوگوں کے گھروں کے اندر آنے جانے کی صورت میں مردوں اور عورتوں دونوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہاں اس پردے کی وضاحت نہیں ہے جو عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں اختیار کرنا چاہیے۔ اس کی وضاحت جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سورۂ احزاب میں ہوئی ہے اور ہم وہاں ان شاء اللہ اس پر مفصل گفتگو کریں گے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۶۲﴾

اجتماعی کاموں سے کھسکنے والے منافقین کو تنبیہ

یہ اور اس کے بعد کی آیات، منافقین کے اس ذکر سے متعلق ہیں جو آیت ۵۰ پر ختم ہوا ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات بطور تنبیہ مزید بعد میں نازل ہوئی ہیں اس وجہ سے ان کو بعد میں نازل ہونے والی آیات کے ساتھ جگہ دی گئی تاکہ ان کی پوری اہمیت واضح ہو۔ فرمایا کہ اصل مومن وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر سچا اور پکا ایمان رکھتے ہیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ فعل 'اٰمَنُوْا' یہاں اپنے کامل مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ 'وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ' یہ ان کے رسوخ ایمان کی ایک علامت بیان ہوئی ہے کہ جب وہ کسی اجتماعی کام کے لیے رسول کے ساتھ ہوتے ہیں تو منافقین کی طرح یہ نہیں کرتے کہ جب چاہا وہاں سے چپکے سے کھسک گئے بلکہ انھیں کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو رسول سے اجازت لے کر وہاں سے نکلتے ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ اجازت لیتے ہیں وہی سچے مومن ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ مومن نہیں بلکہ پکے منافق ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ اپنی کسی واقعی ضرورت کے لیے اجازت کے طالب ہوں تو ان میں سے، جس کو چاہو، اجازت دے دیا کرو اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر چند اس طرح کی اجازت مانگنا کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے اس لیے کہ رسول کی معیت و نصرت سے بڑھ کر، بالخصوص جب کہ کوئی اجتماعی ضرورت درپیش ہو، کوئی دوسرا کام نہیں ہو سکتا لیکن انسانی کمزوریوں کو پیش نظر رکھ کر رسول کو یہ اجازت دے دی گئی کہ اگر وہ کسی کو اجازت دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں اور اس کی اس کمزوری کے لیے اللہ سے استغفار کریں۔

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضًا ۚ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۶۳﴾

خطاب، باعتبار الفاظ، اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ کلام کا رخ منافقین ہی کی طرف ہے۔ فرمایا کہ اگر رسول کسی اجتماعی کام کے لیے دعوت دیں تو اس کو دوسروں کے بلانے کی طرح نہ سمجھو بلکہ ہر شخص کا فرض ہے کہ رسول کی ہر دعوت پر لبیک کہتا ہوا ان کی خدمت میں حاضر ہو۔

'قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا'۔ مضارع سے پہلے یہاں فعل ناقص محذوف ہے۔ 'تسلل' کے معنی چل دینے اور چپکے سے کھسک جانے کے ہیں۔ 'لواذ' کے معنی ایک دوسرے کی آڑ اور پناہ لیتے ہوئے۔

یہ منافقین کو تنبیہ ہے کہ اللہ ان لوگوں سے برابر آگاہ رہا ہے جو رسول کے بلائے ہوئے اجتماعات سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے کھسک جایا کرتے رہے ہیں کہ پرسش ہو تو یہ عذر کر سکیں کہ ان کو حضورؐ کے حکم کی خبر نہیں ہوئی۔ اس اسلوب بیان میں جو غصہ اور عتاب مضمر ہے وہ زبان کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔

'فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ الآیۃ' 'مخالفۃ' یہاں گریز اور فرار کے مفہوم پر متضمن ہے اس وجہ سے اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آیا ہے۔ مخالفین کی مخالفت کی نوعیت درحقیقت گریز و فرار ہی کی تھی۔ وہ اپنی بزدلی کے سبب سے سامنے تو 'اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا' ہی کہتے لیکن درپردہ گریز و فرار کی کوشش کرتے۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے یہ روش اختیار کر رکھی ہے وہ اس بات کو نہ بھولیں کہ اس کے نتیجہ میں وہ اللہ تعالیٰ کی کسی بہت بڑی آزمائش میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں اور کسی دردناک عذاب میں بھی گرفتار ہو سکتے ہیں۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ۭ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۶۴)

یہ اس سورہ میں منافقین کو آخری تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ جس حال میں تم رہے ہو، یا ہو اس سے اللہ برابر باخبر رہا ہے اور ہے۔ اس کے بعد ان سے منہ پھیر کر فرمایا کہ یہ لوگ اس دن کو یاد رکھیں جس دن اللہ کے حضور ان کی پیشی ہوگی اور اللہ ان کا سارا کچا چٹھا ان کے سامنے رکھ دے گا۔ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

ان سطروں پر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس گروپ کی اس آخری سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں سے درگزر فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

رحمان آباد

۲۴ ستمبر ۱۹۷۳ء

تدبرِ قرآن

۲۵

الفرقان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورتوں کے چوتھے گروپ پر ایک اجمالی نظر

سورہ فرقان سے سورتوں کا چوتھا گروپ شروع ہو رہا ہے۔ اس میں آٹھ سورتیں ــــ فرقان، شعراء، نمل، قصص، عنکبوت، روم، لقمان، سجدہ ــــ مکی ہیں، آخر میں صرف ایک سورہ ــــ احزاب ــــ مدنی ہے۔ سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے کا اصول دوسرے گروپوں کی طرح اس میں بھی مرعی ہے۔ البتہ سورۂ احزاب کی حیثیت خاتمۂ بحث یا سورۂ نور کی طرح تکملہ و تتمہ کی ہے۔ اسلامی دعوت کے تمام ادوار ــــ دعوت، ہجرت، جہاد ــــ اور تمام بنیادی مطالب ــــ توحید، رسالت، معاد ــــ اس میں بھی زیر بحث آئے ہیں البتہ اسلوب، انداز اور مواد استدلال دوسرے گروپوں سے اس میں فی الجملہ مختلف نظر آئے گا۔

اس گروپ کا جامع عمود اثبات رسالت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے وحی الٰہی ہونے کے خلاف قریش اور ان کے حلیفوں نے جتنے اعتراضات و شبہات اٹھائے اس گروپ کی مختلف سورتوں میں، مختلف اسلوبوں سے، ان کے جواب بھی دیے گئے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا اصل مرتبہ و مقام بھی واضح فرمایا گیا ہے۔ اسی کے ضمن میں قرآن پر ایمان لانے والوں کو، مرحلۂ امتحان سے گزرنے کے بعد، دنیا اور آخرت دونوں میں فوز و فلاح کی بشارت دی گئی ہے اور جو لوگ اس کی تکذیب پر اڑے رہیں گے، اتمام حجت کے بعد، ان کو ان کے انجام سے آگاہ کیا گیا ہے۔

یہ پورے گروپ پر ایک اجمالی نظر ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر گروپ کی ایک ایک سورہ کی الگ الگ تفسیر شروع کرتے ہیں۔

ب۔ سورہ کا عمود

اس سورہ کا عمود قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع ہے۔ مخالفین نے جو شبہات و اعتراضات، قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اٹھائے وہ اس میں نقل کر کے ان کے جواب دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی مخالفین کے اعتراض و انکار کے اصل محرکات کا بھی پتہ دیا گیا ہے اور قرآن کی جن باتوں سے وہ خاص طور پر متوحش تھے، مثلاً

دعوتِ توحید یا انذارِ عذاب، وہ مزید دلائل سے مبرہن کی گئی ہیں۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کا تجزیہ یہ ہے۔

(۱-۹) قرآن کا نزول سب سے بڑی برکت والی ہستی کی طرف سے سب سے بڑی برکت و رحمت کا نزول ہے لیکن توحید اور قیامت کے منکرین اس کو افتراء اور سازش قرار دے رہے ہیں۔ ان باتوں کا حوالہ جو مخالفین آنحضرت صلعم اور قرآن سے برگشتہ و بدگمان کرنے کے لیے لوگوں میں پھیلاتے تھے۔

(۱۰-۳۴) مخالفین کے اعتراضات و مطاعن کا جواب، اور اس مخالفت کے پس پردہ محرک کی طرف اشارہ۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو صبر و استقامت کی تلقین اور تکذیب کرنے والوں کے انجام بد کا بیان۔

(۳۵-۴۴) رسولوں اور ان کے مکذبین کی تاریخ کی طرف ایک اجمالی اشارہ جس سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو صبر و استقامت کی تلقین ہے کہ جو لوگ اس کتاب کی تکذیب کر رہے ہیں یہ نہ خیال کرو کہ یہ سننے سمجھنے والے لوگ ہیں۔ یہ چوپایوں سے بھی زیادہ لایعقل اور اپنی خواہشوں کے غلام ہیں۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ تم ان پر حجت تمام کر دو۔ یہ اسی راہ پر چلیں گے جس پر چل رہے ہیں اور اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو ان کے لیے مقدر ہے۔ تم اپنے فرض کی ادائیگی کے ذمہ دار ہو، ان کے رخ موڑ دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔

(۴۵-۶۰) قرآن کی دعوت کے اساسی مسائل — توحید اور معاد — کے اثبات میں آفاق کے بعض دلائل کی طرف اشارہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی تلقین کہ مخالفین کے مطالبۂ معجزات سے بے پروا ہو کر اسی قرآن کے ذریعہ سے ان پر اتمام حجت کرو۔ اس قرآن میں گوناگوں اسالیب سے وہ ساری باتیں واضح کر دی گئی ہیں جن کا واضح ہونا تمام حجت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔ اگر لوگ اس کو نہیں مانتے تو تمہارا کام صرف انذار و تبشیر ہے۔ تم اپنا فرض ادا کر کے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ان بے سروپا اعتراضات کو کوئی اہمیت نہ دو جو انھوں نے محض قرآن کی مخالفت کے لیے بطور بہانہ ایجاد کیے ہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہے۔

(۶۱-۷۷) اس دنیا کے روز و شب تذکیر و تنبیہ کے لیے کافی ہیں بشرطیکہ انسان یاددہانی حاصل کرنا اور اپنے رب کا شکرگزار بندہ بننا چاہے۔ جن لوگوں کے اندر انابت اور خشیت ہوتی ہے وہ اس طرح اکڑا نہیں کرتے جس طرح یہ متمردین اکڑ رہے ہیں بلکہ ان کی روش ان سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ خدا کے ذاکر و شاکر بندوں کی صفات کا بیان۔ آخر میں متمردین قریش کو تنبیہ کہ تمھیں جو اس درجہ اہمیت دی گئی اور تمھارے لیے تعلیم و دعوت کا یہ اہتمام کیا گیا تو اس لیے نہیں کہ تمھارے بغیر خدا کا کوئی کام بند ہے یا بند ہو جائے گا بلکہ مقصود صرف تمھاری صلاح و فلاح تھی۔ اب اگر تم خدا کی اس نعمت کی قدر نہیں کر رہے ہو تو وہ چیز لازماً پیش آ کے رہے گی جو اس ناقدری کا لازمی نتیجہ ہے۔

مطالب کے اس تجزیہ سے سورہ کا عمود اور نظام اچھی طرح واضح ہو گیا ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ واللہ الموفق للخیر والسداد۔

سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ (۲۵)

مَكِّيَّةٌ ______ اٰيَاتُهَا ۷۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ آیات ۱-۹
نَذِيْرًا ۙ﴿۱﴾ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ
وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ فَقَدَّرَهٗ
تَقْدِيْرًا ﴿۲﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ
يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ
مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴿۳﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ
اِلَّاۤ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛۚ فَقَدْ جَآءُوْ
ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۚ﴿۴﴾ وَقَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِىَ تُمْلٰى
عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۵﴾ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِىْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِى
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۶﴾ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا
الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ
مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ﴿۷﴾ اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ
جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۸﴾

ع ۹ انْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ﴿٩﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۹

بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر حق و باطل کے درمیان امتیاز کر دینے والی کتاب اتاری تاکہ وہ اہلِ عالم کے لیے ہوشیار کر دینے والا بنے! وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جس نے اپنے لیے کوئی اولاد نہیں بنائی اور اس کی بادشاہی میں کوئی اس کا ساجھی نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ایک خاص اندازہ ٹھہرایا۔ اور لوگوں نے اس کے سوا دوسرے معبود بنائے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے، وہ خود مخلوق ہیں اور جو خود اپنے لیے بھی نہ کسی ضرر پر اختیار رکھتے ہیں نہ کسی نفع پر اور نہ ان کو موت پر کوئی اختیار ہے نہ زندگی پر اور نہ مرنے کے بعد زندہ کرنے پر۔ ۱ - ۳

اور کافر کہتے ہیں کہ یہ محض جھوٹ ہے جس کو اس شخص نے گھڑا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے ظلم اور جھوٹ دونوں باتوں کا ارتکاب کیا! اور کہتے ہیں کہ یہ اگلوں کے فسانے ہیں جو اس نے لکھوائے ہیں تو وہ اس کو صبح اور شام لکھ کر تعلیم کیے جاتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اس کو اس نے اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید کو جانتا ہے بے شک وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے! ۴ - ۶

اور کہتے ہیں کہ کیا بات ہے اس رسول کی کہ یہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے! اس کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ وہ اس کے ساتھ لوگوں کو ڈرانے والا بنتا! یا اس کے لیے کوئی خزانہ اتارا جاتا یا اس کے لیے کوئی باغ ہوتا جس سے وہ اپنی معاش حاصل کرتا! ـــــ اور ان ظالموں نے کہا کہ تم لوگ تو بس ایک سحر زدہ شخص کے پیچھے لگ لیے ہو! دیکھو، تمھارے اوپر کیسی کیسی پھبتیاں چست کر رہے ہیں! پس یہ بالکل کھوئے گئے ہیں اور نہ کوئی راہ

نہیں پا رہے ہیں۔ ۷-۹

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (۱)

قرآن اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے

جس طرح 'تعاظم' اور 'تعالیٰ' اور اس باب کے دوسرے صیغوں کے اندر مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے اسی طرح 'تبارک' کے اندر بھی مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یعنی بڑی ہی بابرکت اور بافیض ہستی ہے وہ جس نے لوگوں کے انذار کے لیے، اپنے بندے پر، ایک ایسی کتاب اتاری جو حق اور باطل کے درمیان امتیاز کے لیے ایک حجت قاطع کی حیثیت رکھتی ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس نعمت کی قدر اور اس کتاب کی روشنی میں اپنی گمراہیوں کی اصلاح کریں، طرح طرح کے اعتراضات اٹھا کر اس کی مخالفت اور اللہ کے رسول سے کسی معجزے یا کسی نشانی عذاب کا مطالبہ نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو اس کتاب کے بجائے وہ اپنے رسول کو کسی تازیانۂ عذاب سے مسلح کر کے بھی بھیج سکتا تھا، اس کے لیے یہ کام ذرا بھی مشکل نہیں تھا، لیکن اس نے اپنی عظیم مہربانی کی وجہ سے یہ پسند فرمایا کہ وہ لوگوں کو ایک ایسی روشنی دکھائے جو لوگوں کو پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کر کے فوز و فلاح کی راہِ سعادت کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن کو 'فرقان' کے لفظ سے تعبیر کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ یہ کتاب اپنے دعاوی اور اپنے پیش کرنے والے کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے بجائے خود دلیل و حجت ہے، یہ کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو رسول کے ہاتھوں تقسیم ہونے والی اس نعمتِ عظمیٰ سے متمتع ہونے کے بجائے اس سے ایسی چیزوں کا مطالبہ کریں جو ان کے لیے خیر کے بجائے تباہی کا باعث ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک خاص برمحل التفات

'عَلٰی عَبْدِهٖ' میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک خاص التفات پایا جاتا ہے۔ اس التفات کا یہاں ایک خاص محل ہے۔ آگے کفار کے وہ اعتراضات نقل ہوئے ہیں جو وہ نہایت تحقیر آمیز انداز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے۔ یہ اعتراضات زیادہ تر مکہ اور طائف کے دولت مندوں کے اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی مالی برتری کے گھمنڈ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی اسباب و وسائل سے بے تعلقی پر خاص طور پر چوٹیں کرتے اور اس چیز کو آپ کی رسالت کی تردید کی ایک بہت بڑی دلیل کی حیثیت سے پیش کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں منکبرین کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندۂ خاص پر 'فرقان' کی شکل میں جو نعمتِ عظمیٰ اتاری ہے اس کے بعد وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ خلق کے انذار کے وہ جس مشن پر مامور ہے اس کی تکمیل کے لیے وہ جس زاد و راحلہ کا محتاج ہے وہ سب بدرجۂ کمال اس کے پاس موجود ہے۔

یہ آیت اس سورہ کی تمہید ہے۔ اس کے یہ مضمرات جو ہم نے واضح کیے ہیں وہ آگے کے مباحث سے ان شاء اللہ مزید واضح ہو جائیں گے۔

الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا (۲)

قرآن کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ خالق کائنات کا فرمان واجب الاذعان ہے — اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی فیض بخشی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اب یہ اپنی توحید اور کبریائی و یکتائی کا حوالہ دیا ہے جس سے مقصود اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ جس نے خلق کے انذار و تذکیر کے لیے یہ کتاب اتاری ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اس وجہ سے کوئی اس کتاب کو کسی سائل کی درخواست نہ سمجھے بلکہ یہ اس کائنات کے بادشاہِ حقیقی کا فرمان واجب الاذعان ہے۔ اگر اس کی تکذیب کی گئی تو جس نے اس کو اتارا ہے وہ اس کی تکذیب کا انتقام لینے کے لیے کوئی کمزور ہستی نہیں ہے۔ وہ اس کا انتقام لے گا اور جب انتقام لے گا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ بن سکے گا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ — وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ یعنی اگر کسی نے اس کے بیٹے بیٹیاں فرض کر کے ان کی عبادت شروع کر رکھی ہے اور اس زعم میں مبتلا ہے کہ وہ اس کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے تو وہ اس خیالِ خام کو دل سے نکال دے۔ نہ خدا کے کوئی بیٹی ہے نہ بیٹا، نہ اس کی بادشاہی میں کوئی اور اس کا ساجھی ہے۔ وہ اپنی بادشاہی کا یکہ و تنہا مالک ہے، وہ کسی مددگار و شریک کا محتاج نہیں ہے۔

خدا کی یکتائی کی دلیل — وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا۔ یہ اس کی توحید و یکتائی کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور ہر چیز کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کے ٹھہرائے ہوئے اندازہ سے سرِمو کم و بیش یا آگے پیچھے ہو سکے۔ انسان کو پیدا کیا تو اس کے لیے زندگی اور موت کی ایک حد معین کر دی کوئی اس حد سے باہر نہیں نکل سکتا۔ ابر و ہوا سب اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے پابند ہیں۔ سورج اور چاند جن کو نادانوں نے معبود بنا کر پوجا، ایک مخصوص محور و مدار کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں اور اپنے وجود سے شہادت دے رہے ہیں کہ وہ ایک خدائے عزیز و حکیم کے پیدا کیے ہوئے اور اسی کے مقرر کیے ہوئے حدود و قیود کے پابند ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف دوسرے مقام میں یوں توجہ دلائی ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (یٰسٓ: ۳۸) — اور سورج اپنے ایک معین مدار پر گردش کرتا ہے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے!

اس سے زیادہ وسیع الفاظ میں یہی بات یوں فرمائی گئی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر: ۲۱) — اور ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں لیکن ہم ان کو ایک خاص اندازے ہی کے ساتھ اتارتے ہیں۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (۳)

یہ اسی مضمون کی توضیح مزید ہے اور اس میں اظہار تعجب کا مضمون بھی مضمر ہے کہ اصل حقیقت تو یہ ہے جو بیان ہوئی لیکن قرآن اور رسول کے ان مخالفین کا حال یہ ہے کہ انھوں نے خدا کے سوا ایسی چیزوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے جو نہ صرف یہ کہ کسی چیز کو پیدا کر سکنے پر قادر نہیں بلکہ وہ خود خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں اور جو دوسروں کو کوئی نقصان یا نفع پہنچانا تو درکنار خود اپنے کو بھی کسی نقصان سے بچانے یا کوئی نفع پہنچانے پر قدرت نہیں رکھتی ہیں اور جن کو نہ موت پر کوئی اختیار ہے نہ زندگی پر اور نہ مرنے کے بعد زندہ کرنے پر۔ ــــــ مطلب یہ ہے کہ ایسے بے بس فرضی معبودوں کے بل پر قرآن کے پیش کردہ حقائق کو جھٹلانا محض ان کی خود باختگی ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا (۴)

قرآن سے عوام کو بدگمان کرنے کے لیے قریش کے لیڈروں کا پروپیگنڈا

یہ مخالفین کے وہ اقوال نقل ہو رہے ہیں جو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لیے وہ پھیلاتے تھے۔ ہم دوسرے مقام میں یہ ذکر کر چکے ہیں کہ جہاں تک قرآن کے زور بیان اور اس کی تاثیر و تسخیر کا تعلق ہے اس کے انکار کی تو قریش کے لیڈروں کے اندر ہمت نہیں تھی۔ اس کے اعتراف پر تو وہ مجبور تھے۔ البتہ یہ کوشش ان کی تھی کہ ان کے عوام پر قرآن کے کتاب آسمانی ہونے کا تصور جو بیٹھتا جا رہا ہے وہ بیٹھنے نہ پائے بلکہ وہ اس کو اسی درجہ میں رکھیں جس درجہ میں اعلیٰ شاعروں یا زوردار خطیبوں کا کلام رکھا جاتا ہے۔ ان کو اصلی کد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے رسالت بالخصوص قرآن کے وحی الٰہی ہونے سے تھی۔ اس کی تردید میں وہ یہ کہتے تھے کہ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کا دعویٰ جو کیا جاتا ہے یہ بالکل جھوٹ ہے۔ یہ وحی الٰہی نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اپنے ذہن کا گھڑا ہوا کلام ہے جس کو وہ جھوٹ موٹ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں تاکہ اس طرح ہم پر اپنی برتری کی دھونس جمائیں۔

وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ۔ اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے ایک اور جھوٹ اس کے ساتھ وہ یہ لگا دیتے کہ اس کتاب کی تصنیف میں کچھ دوسرے لوگوں کے ذہن بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ شریک ہیں۔ اس اضافے کی ضرورت اس وجہ سے انھوں نے محسوس کی ہوگی کہ قرآن میں پچھلے انبیاء کی سرگزشتوں اور ان کی تعلیمات کے حوالے بھی تھے جن کے جاننے کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر یہ وحی الٰہی نہیں ہے تو آخر یہ باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح معلوم ہو گئیں اور وہ بھی ایسی تفصیل اور صحت کے ساتھ کہ پچھلے صحیفوں پر ایمان کے مدعیوں کو بھی اس تفصیل و صحت کے ساتھ معلوم نہیں تھیں۔ اس سوال کے جواب میں انھوں نے اس کے ساتھ اس جھوٹ کا بھی اضافہ کر دیا کہ کچھ دوسرے ہاتھ بھی اس سازش میں

شریک ہیں۔ مخالفین کے اس قول میں جو ابہام ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب الزام جھوٹا ہو تو اس کے لیے ابہام ہی کا اسلوب موزوں ہوتا ہے۔ اگر اس کے لیے تصریح کا اسلوب اختیار کیا جائے تو اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ مخالفین کا یہ اشارہ کن لوگوں کی طرف تھا، اس سوال کے جواب میں ہمارے مفسرین نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس ابہام کا مبہم رہنا ہی ٹھیک ہے اس لیے کہ الزام لگانے والوں کا مقصد محض ایک الزام لگانا تھا نہ کہ فی الواقع کسی شخص یا اشخاص کا سراغ دینا۔ قریش نے اس مبہم الزام سے اپنے عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہوگی کہ قرآن میں آسمانی کتابوں کے انداز کی جو باتیں اور حکمتیں ہیں ان کو وحی کا نتیجہ نہ سمجھو بلکہ بعض اہل کتاب یا دوسری قوموں کے تعلیم یافتہ اشخاص جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی بن گئے ہیں وہ ان کو اس طرح کی باتیں بتاتے ہیں اور وہ ان کو اپنے فصیح و بلیغ الفاظ میں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ان کے اوپر فرشتہ وحی لایا ہے۔ اس مسئلہ پر سورۂ نحل کی آیت ۱۰۳ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

'ظُلم' اور 'زُور' کا مفہوم

'فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا' 'جَآءُوْ' یہاں مرتکب ہونے کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ 'ظُلْم' سے مراد ان کا وہ شرک ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے اور 'زُوْر' سے اشارہ ان کے اس قول کی طرف ہے جو قرآن کے باب میں نقل ہوا ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ شرک کے ظلم عظیم کے بھی مرتکب ہوئے اور ساتھ ہی قرآن کی مخالفت میں ایک بہت بڑے جھوٹ کے بھی ——— یہ کہہ کر بات ختم کر دی ہے۔ اس کے نتیجے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اس ڈھٹائی کے ساتھ اتنے بڑے بڑے جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں، اندازہ کر لو کہ وہ کس انجام کے مستحق ہیں!

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (۵)

'اِكْتَتَبَ فُلَانٌ' کا صحیح مفہوم لغت میں یہ ہے کہ 'سأل ان يكتب له' اس نے درخواست کی کہ اس کے لیے لکھ دیا جائے۔

'تُمْلٰى' کے بعد 'عَلٰى' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ 'تُلْقٰى عَلَيْهِ' یا 'تُقْرَءُ عَلَيْهِ' کے مضمون پر متضمن ہے۔ اس وجہ سے اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ اس کو لکھوائے جاتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ اس کو لکھ کر تعلیم کیے جاتے ہیں۔ یہاں یہ دوسرے معنی میں ہے، اس لیے کہ قریش جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی ہیں۔ آپ لکھنا نہیں جانتے۔

قریش کی طرف سے آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش

یہ اوپر والے الزام ہی کی مزید وضاحت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن میں ہے کیا، محض اگلوں کے فسانے ہیں جو اس میں دہرائے گئے ہیں! اس شخص نے کچھ لوگوں سے یہ فرمائش کی کہ اس کے لیے یہ لکھ دیے جائیں چنانچہ وہ صبح و شام اس کے لیے لکھتے ہیں اور یہ شخص انہی کی لکھی ہوئی چیزوں کو ہمارے

سامنے وحی الٰہی کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو اس کتاب میں کوئی ایسی حکمت ہے جس سے مرعوب ہوا جائے اور نہ اس کے پیش کرنے والے کا یہ دعویٰ ہی صحیح ہے کہ یہ وحی آسمانی ہے جو اضطراراً اس کے اوپر نازل ہوتی ہے بلکہ پچھلی قوموں اور پچھلے نبیوں کے کچھ جھوٹے سچے قصے ہیں جو اس شخص نے فرمائش کر کے دوسرے لوگوں سے لکھوائے ہیں۔ اس طرح انھوں نے قرآن کی حکمت کے اثر کو بھی مٹانے کی کوشش کی اور اس کے وحی آسمانی ہونے کے دعوے کو بھی مشتبہ کرنا چاہا لیکن ظاہر ہے کہ ان کی یہ کوشش آفتاب پر خاک ڈالنے کے ہم معنی تھی۔ قرآن نے تاریخ جس حکمت کے ساتھ پیش کی تھی اس کی زد براہِ راست متمردین قریش کے غرور پر پڑتی تھی اور اس کے آئینہ میں ان کو اپنا مستقبل نہایت بھیانک نظر آتا تھا اس وجہ سے وہ چاہتے تھے کہ اس کو ماضی کا افسانہ کہتے تھے لیکن حقیقت کو افسانہ کہہ کر اپنے ہی دل کو تسلی دی جا سکتی ہے نہ دوسروں ہی کو دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ اگر ایک سلمان فارسیؓ اور ایک ابوفکیہہ رومیؓ یا دو چار اہل کتاب مل کر قریش کے زعم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن جیسی معجز کتاب تصنیف کر سکتے تھے تو قریش کے پاس تو ہزاروں عربی و عجمی اور لاکھوں اہل کتاب تھے، آخر انھوں نے ان کی مدد سے ایک قرآن تیار کر کے کیوں نہ پیش کر دیا کہ اس کے معجزہ ہونے کا دعویٰ باطل ہو جاتا! لیکن جب وہ قرآن کی مسلسل تحدی کے باوجود اس کی کوئی نظیر نہ پیش کر سکے تو ان کی اس مہمل بات کو کون باور کر سکتا تھا کہ یہ عظیم کتاب بعض عجمیوں یا بعض اہل کتاب کی ایجاد ہے۔ چونکہ یہ بات بالبداہت مہمل تھی اس وجہ سے قرآن نے اس کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی۔ آگے والی آیت میں صرف اصل حقیقت کا اظہار فرما دیا جس میں ان بوالفضولوں کی اس بوالفضولی پر ایک لطیف طنز بھی ہے۔

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (۶)

معترضین پر ایک لطیف طنز اور ان کو تنبیہ

فرمایا کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ اس کتاب کو اتارنے والا وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کے سارے بھیدوں اور تمام اسرار و رموز سے خود اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ اس کی تصنیف میں کسی عربی و عجمی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ کوئی کتنا ہی بڑا عالم و حکیم ہو وہ اس کتاب سے بصیرت و رہنمائی تو حاصل کر سکتا ہے لیکن اس طرح کی کتاب تصنیف کرنا تو درکنار وہ اس کے علم و حکمت میں کوئی اضافہ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت اس کتاب کی سطر سطر سے واضح ہے کہ اس کا اتارنے والا وہی ہے جو اس کائنات کے تمام بھیدوں سے واقف اور اس کے ظاہر و باطن اور آغاز و انجام ہر چیز سے باخبر ہے چنانچہ اس نے ماضی کی خبریں بھی سامنے رکھ دی ہیں، حاضر کی ذمہ داریاں بھی واضح کر دی ہیں اور مستقبل کے نتائج سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا یعنی وہ چونکہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے اس وجہ سے اس نے یہ کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ جو لوگ توبہ و اصلاح کرنا چاہیں وہ توبہ و اصلاح کر کے اس کی رحمت

کے مستحق بن جائیں مطلب یہ ہے کہ وہ اتارنے کو تو عذاب بھی اتار سکتا ہے۔ وہ حق کے دشمنوں کے رویہ سے اچھی طرح باخبر ہے لیکن وہ اپنی رحمت کے سبب سے عذاب میں جلدی نہیں کرتا بلکہ چاہتا ہے کہ لوگ ہدایت کی راہ اختیار کریں تاکہ اس کی مغفرت کے سزاوار ہوں۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ بہرحال وہ سارے حالات و معاملات سے اچھی طرح واقف ہے۔ اگر لوگوں نے صحیح روش نہ اختیار کی تو اس کا جو انجام ہونا ہے وہ بھی سامنے آکے رہے گا۔

وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ۙ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا ۙ أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا ۚ وَقَالَ الظّٰلِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا (۷-۸)

یہ مخالفین کے بعض اور اعتراضات کا حوالہ دیا ہے۔

معترضین کے بعض اور اعتراضات رسول پر

مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ کے اسلوب میں استعجاب اور طنز و استہزا دونوں ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ خوب رسول ہیں کہ اللہ کے رسول ہونے کے مدعی ہیں اور حال یہ ہے کہ ہمارے ہی طرح یہ بھی کھانے پینے کے محتاج ہیں اور اپنی ضروریات و احتیاج کی فراہمی کے لیے ہماری طرح یہ بھی بازاروں میں پھرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر خدا کو کوئی رسول ہی بھیجنا ہوتا تو کیا ہمارے ہی جیسے ایک بشر کو رسول بناتا، آخر اس کے پاس فرشتوں کی ایک فوج ہے ان میں سے کسی کو اس نے رسول بنا کر کیوں نہ بھیجا۔

لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا۔ یعنی اگر کسی بشر ہی کو رسول بنایا تھا تو کم از کم یہ تو ہونا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ہوتا جو ساتھ ساتھ منادی کرتا پھرتا کہ لوگو، یہ اللہ کے رسول ہیں، یہ جس چیز سے ڈرا رہے ہیں اس سے ڈرو۔ یا آسمان سے ان کے لیے کوئی خزانہ اتار دیا جاتا یا ان کے پاس کوئی شاندار باغ ہوتا جس سے یہ اپنی معاش حاصل کرتے اور عام آدمیوں کی طرح ان کو بازاروں میں جوتیاں چٹخاتے نہ پھرنا پڑتا! مطلب یہ ہے کہ جب ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو آخر ہم ان کو اللہ کا رسول کس طرح مان لیں!

وَقَالَ الظّٰلِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا۔ یعنی مذکورہ بالا اعتراضات کے بعد یہ ظالم لوگ مسلمانوں کو خطاب کر کے یہ کہتے ہیں کہ اگر تم لوگوں نے ایک ایسے شخص کو رسول مان لیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم لوگ ایک ایسے شخص کے پیرو بن گئے ہو جس پر کسی نے جادو کر کے اس کی عقل کو مختل کر دیا ہے جس کے سبب سے وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا (۹)

معترضین کی حواس باختگی

یہ آیت بعینہٖ سورۂ بنی اسرائیل میں بھی گزر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۴۸۔ وہاں ہم واضح کر چکے

ہیں کہ 'ضربِ مثل' کا محاورہ جس طرح کوئی تمثیل بیان کرنے یا کوئی حکمت کی بات کہنے کے لیے آتا ہے اسی طرح کسی پر اعتراض کرنے یا اس پر پھبتی چست کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ اعتراض باطل کے مفہوم میں یہ لفظ آگے اسی سورہ کی آیت ۳۲ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں پھبتی یا اعتراض ہی کے مفہوم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخالفین کی مذکورہ بالا خرافات نقل کرنے کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ دیکھو، یہ تمھارے اوپر کیسی کیسی پھبتیاں چست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن کوئی بات بنتی نظر نہیں آتی ہے تو جس کے منہ میں جو آتا ہے وہی بک دیتا ہے۔

فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا۔ یعنی مخالفت کے جنون میں بالکل کھوئے گئے ہیں۔ اعتراض کی کوئی راہ نہ پا رہے ہیں، نہ پا سکیں گے۔ محض اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس طرح یہ حقیقت کو کب تک جھٹلا سکیں گے! یہ امر ملحوظ رہے کہ جب کوئی شخص کسی سچی بات کی دیدہ و دانستہ مخالفت کرتا ہے تو وہ اسی طرح کی حواس باختگی کا مظاہرہ کرتا ہے جس طرح کی حواس باختگی ان اعتراضات کے اندر پائی جاتی ہے۔

۲- آگے کا مضمون ___ آیات ۱۰-۳۴

آگے مذکورہ بالا اعتراضات کے جواب بھی دیے، ان کے اصل محرکات پر بھی روشنی ڈالی اور اس ہٹ دھرمی مخالفت کا جو انجام ان لوگوں کے سامنے آنے والا ہے اس کی طرف بھی اشارہ فرمایا۔ اسی ضمن میں بعض نئے اعتراضات بھی زیر بحث آگئے ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو صبر و استقامت کے ساتھ ان تمام خرافات کو نظر انداز کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰-۳۴
تَبٰرَكَ الَّذِیْۤ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ یَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴿۱۰﴾ بَلْ كَذَّبُوْا
بِالسَّاعَةِ ۫ وَ اَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِیْرًا ﴿۱۱﴾ اِذَا رَاَتْهُمْ
مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَیُّظًا وَّ زَفِیْرًا ﴿۱۲﴾ وَ اِذَاۤ اُلْقُوْا مِنْهَا
مَكَانًا ضَیِّقًا مُّقَرَّنِیْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾ لَا تَدْعُوا الْیَوْمَ
ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِیْرًا ﴿۱۴﴾ قُلْ اَذٰلِكَ خَیْرٌ اَمْ جَنَّةُ

الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ لَهُمْ
فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۶﴾ وَيَوْمَ
يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ
عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ
يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَ
اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۸﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ
بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ
مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۱۹﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ
اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا
بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾ وَقَالَ ع ۲
الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى
رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ
الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا
مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً
مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾
وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ
يَوْمَئِذِ ۣالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾
وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ

الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿٢٧﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿٢٨﴾
لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ
خَذُوْلًا ﴿٢٩﴾ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ
مَهْجُوْرًا ﴿٣٠﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ
وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿٣١﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ
عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ مع
رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ
اَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿٣٣﴾ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ
اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿٣٤﴾ ع ۳ ۱۲ ۱

ترجمۂ آیات ۱۰-۲۱

بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جو چاہے تو تمھیں اس سے بھی کہیں بہتر چیزیں بخش دے ـــ ایسے باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں، اور تمھارے لیے محل بنوا دے۔ بلکہ ان لوگوں نے قیامت کو جھٹلا دیا ہے اور ہم نے قیامت کے جھٹلانے والوں کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ وہ دور ہی سے جب ان کو دیکھے گی تو وہ اس کا بپھرنا اور دھاڑنا سنیں گے۔ اور یہ جب اس کی کسی تنگ جگہ میں باندھ کر ڈال دیے جائیں گے تو اس وقت اپنی ہلاکت کو پکاریں گے۔ آج ایک ہی ہلاکت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی ہلاکتوں کو پکارو! ان سے پوچھو، کیا یہ بہتر ہے یا وہ جنت ابد جس کا خدا ترسوں سے وعدہ کیا جا رہا ہے! وہ ان کے لیے صلہ اور ٹھکانا ہوگی۔ اس میں ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ تیرے رب کا وعدہ ہے جس

کے ایفا کی اس پر حتمی ذمہ داری ہے۔ ۱۰-۱۶

اور اس دن کو خیال کرو جس دن ان کو اور جن چیزوں کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں، وہ اکٹھا کرے گا پس ان سے پوچھے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا انھوں نے خود ہی صحیح راہ کھوئی ؛ وہ جواب دیں گے کہ معاذ اللہ! ہمیں یہ حق کہاں تھا کہ ہم تیرے سوا دوسروں کو کارساز بنائیں! بلکہ تو نے ان کو اور ان کے آبا و اجداد کو دنیا سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ وہ تیری یاد بھلا بیٹھے اور ہلاک ہونے والے بنے ـــــ یہ لو، انھوں نے تو تمھاری بات میں جو تم کہتے تھے تمھیں جھوٹا ٹھہرا دیا! سو اب تم نہ تو عذاب کو ٹال سکتے اور نہ اپنی کوئی مدد کر سکتے۔ اور جو بھی تم میں سے شرک کا مرتکب ہو گا ہم اس کو ایک بڑا عذاب چکھائیں گے۔ ۱۷-۱۹

اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں میں سے جن کو بھی بھیجا وہ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔ اور ہم نے تم کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے تو بولو، صبر کرتے ہو! اور تمھارا رب سب دیکھ رہا ہے۔ ۲۰

اور جو ہمارے حضور پیشی کا اندیشہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اوپر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے یا ہم اپنے رب ہی کو دیکھتے! انھوں نے اپنے جی میں اپنے کو بہت بڑا سمجھا اور بڑی اکڑ دکھائی! جس دن فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن مجرموں کے لیے کوئی خوش آئند بات نہیں ہو گی اور وہ پناہ پناہ پکار اٹھیں گے! اور ہم ان کے ہر اس عمل کی طرف، جو انھوں نے کیا ہو گا، بڑھیں گے اور اس کو پراگندہ غبار بنا دیں گے۔ اس دن جنت والے بہترین ٹھکانے اور نہایت خوب آرام گاہ میں ہوں گے۔ ۲۱-۲۴

اور جس دن کہ آسمان ایک بدلی کے ساتھ پھٹے گا اور فرشتوں کے پرے کے بعد پرے آتارے جائیں گے، اس دن حقیقی بادشاہی خدائے رحمان ہی کی ہوگی اور وہ دن کافروں پر بڑا ہی کٹھن ہوگا! اور جس دن اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا حسرت سے اپنے ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا کاش میں نے رسول کی معیت میں راہ اختیار کی ہوتی! ہائے میری بدبختی! کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا! اسی نے مجھے گمراہ کر کے اس یاددہانی سے برگشتہ کیا بعد اس کے کہ وہ میرے پاس آچکی تھی! اور شیطان انسان کے ساتھ بڑا ہی بے وفائی کرنے والا ہے! اور رسول کہے گا کہ اے میرے رب، میری قوم نے اس قرآن کو پس انداز کردہ چیز بنایا۔ اور اسی طرح ہم نے مجرموں میں سے ہر نبی کے دشمن بنائے اور تیرا رب رہنمائی اور مدد کے لیے کافی ہے۔ ۲۵-۳۱

اور ان کافروں نے کہا کہ اس کے اوپر پورا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتار دیا گیا! ہم نے ایسا ہی کیا تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو تدریج و اہتمام کے ساتھ اتارا ہے۔ اور یہ لوگ جو اعتراض بھی اٹھائیں گے ہم اس کا صحیح جواب اور اس کی بہترین توجیہ تمہیں بتادیں گے۔ جو لوگ جہنم کی طرف اپنے مونہوں کے بل گھسیٹے جائیں گے وہ اپنے ٹھکانے کے اعتبار سے بدتر اور راہ کے اعتبار سے گمراہ تر ہیں۔ ۳۲-۳۴

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا (۱۰)

اعتراضات کا جواب

جس طرح نقل اعتراضات کی تمہید لفظ 'تبارک' سے اٹھائی ہے اسی طرح جواب کی تمہید بھی اسی لفظ سے اٹھائی ہے اور سب سے پہلے معترضین کے اس اعتراض کو لیا ہے جو سب سے آخر میں آیت ۸ میں نقل

ہوا ہے۔ فرمایا کہ خدا کی ذات بڑی ہی بافیض اور بڑی ہی صاحبِ جُود و کرم ہے۔ اس کے پاس نہ باغوں کی کمی ہے اور نہ خزانوں کی۔ یہ ایک باغ کو کہتے ہیں۔ خدا اگر چاہے تو تمہارے لیے بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں اور بہت سے ایوان و محل تیار کرا دے اور یہ سب کچھ تمہیں ایک دن ملنے والا ہے۔ لیکن ان لوگوں کی نگاہیں چونکہ اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہیں، آخرت کی زندگی کا، جو اصل زندگی ہے، یہ کوئی تصور نہیں رکھتے اس وجہ سے یہ اپنے دنیوی اسباب و وسائل پر نازاں اور تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ دنیا دارالامتحان ہے، دارالانعام نہیں ہے۔ یہاں کی غربت و امارت دونوں امتحان کے لیے ہے۔ انعام کا گھر آخرت ہے۔ جو وہاں کامیاب ہوا وہ ہمیشہ کے لیے کامیاب ہے اور جو وہاں نامراد ہوا وہ ہمیشہ کے لیے نامراد ہے اور وہاں کی کامیابی ان لوگوں کے لیے ہے جو اس دنیا میں خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ وَأَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا (۱۱)

یہ ان کے اصل مغالطہ کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اپنی دنیوی کامرانیوں کو جو اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھے ہوئے ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت کے منکر ہیں۔ حالانکہ انھیں نہیں معلوم کہ جو لوگ آخرت کے منکر ہیں ہم نے ان کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے اگرچہ اس دنیا میں ان کے پاس کتنے ہی مربعے، کتنے ہی باغ اور کتنی ہی کوٹھیاں ہوں!

دوزخ اور اہلِ دوزخ کی تصویر

إِذَا رَأَتْهُمْ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا (۱۲)

تَغَيُّظ کے معنی غصہ سے بھرنے اور زَفِیر کے معنی چیخنے اور دھاڑنے کے ہیں۔ یہ اس دوزخ کی صفت بیان ہوئی ہے جو ان ظالموں کے لیے اللہ تعالیٰ نے تیار کر رکھی ہے۔ فرمایا کہ وہ ان سے انتقام کے جوش میں پہلے سے بھری ہوئی ہے اور ان کو دور ہی سے دیکھ کر اس طرح دھاڑے گی جس طرح بھوکا شیر دھاڑتا ہے۔

وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُقَرَّنِينَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا (۱۳)

یہ تصویر ہے ان ظالموں کے عذاب دوزخ کی۔ فرمایا کہ جب یہ اس کی کسی نہایت تنگ جگہ میں، باندھ کر ڈال دیے جائیں گے تو وہاں وہ اپنی موت کو پکاریں گے۔ یعنی اول تو جگہ تنگ اور پھر اس میں بھی وہ باندھ کر اور زنجیروں میں جکڑ کر ڈالے جائیں گے۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُؤْصَدَةٌ ۝ فِي عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ (الہمزۃ: ۸-۹) یعنی وہ ان کے اوپر سے بند ہوگی اور وہ اس کے اندر لمبے لمبے ستونوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہوں گے۔ ایک اور مقام میں ان کے لیے سلاسل اور اغلال کا ذکر بھی آیا ہے۔

دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا۔ ثُبُور کے معنی موت اور ہلاکت کے ہیں یعنی اس وقت وہ موت کی دہائی دیں گے اس لیے کہ اس عذاب سے رہائی کی واحد شکل جو ان کو نظر آئے گی وہ یہی ہوگی کہ کسی طرح موت

آئے وہ ان کی زندگی کا خاتمہ کر دے لیکن وہاں موت بھی نہیں آئے گی۔ دوسرے مقام میں تصریح ہے کہ وہاں موت ان پر ہر طرف سے بل پڑ رہی ہوگی لیکن وہ مریں گے نہیں بلکہ برابر لَا يَمُوْتُ وَلَا يَحْيٰى کے ضیق میں مبتلا رہیں گے۔

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا (۱۴)

اس دن ان سے کہا جائے گا کہ آج ایک ہی موت کی دہائی نہ دو بلکہ بہت سی موتوں کی دہائی دو۔ یعنی آج تم پر نئی نئی بے شمار مصیبتیں ٹوٹیں گی اور تم کو ہر مصیبت پر اسی طرح واویلا کرنا ہے لیکن تمہارا یہ سارا واویلا بالکل بے سود ہوگا۔ یہ بات قولاً بھی ہو سکتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جہنم کے داروغوں کے ذریعہ سے ان کو کہلائی جائے گی اور صورتِ حال کی تعبیر بھی ہو سکتی ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہم کر چکے ہیں۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا ۝ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا (۱۵-۱۶)

جنت اور اہلِ جنت کی تصویر

اب یہ اس اصل مدعا کا ذکر ہے جس کے لیے دوزخ کی یہ ساری تفصیل سنائی گئی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ جو لوگ تمہیں طعنہ دیتے ہیں کہ تمہارے پاس کوئی باغ کیوں نہ ہوا ان سے پوچھو کہ یہ دوزخ بہتر ہے جو ان کے لیے تیار ہے یا وہ جنت خلد جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں سے وعدہ فرما رکھا ہے! یعنی تمہاری نگاہیں چونکہ اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہیں اس وجہ سے تم اپنے باغوں اور محلوں پر نازاں اور مومنین کی بے مائگی پر طعنہ زن ہو۔ اگر تمہیں آخرت کا علم ہوتا اور تم یہ جان سکتے کہ وہاں تمہارے لیے کیا عذاب تیار ہے اور اہلِ ایمان کے لیے کس ابدی بادشاہی کا اہتمام ہے تو تم ان غریب اہلِ ایمان پر رشک کرتے اور اپنی شامتِ اعمال پر اپنے سر پیٹتے لیکن تمہیں تو اس دنیا کے غرور نے اس طرح اندھا کر دیا ہے کہ اپنی ناک سے آگے تمہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

اس جنت سے متعلق یہاں چار باتیں فرمائی گئی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ اہلِ ایمان کو ان کے اعمال کے صلے اور بدلے کے طور پر ملے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کو یہ اطمینان دلا دے گا کہ یہ تم نے اپنی سعی و عمل سے حاصل کی ہے اور تم اس کے پوری طرح حقدار ہو۔

دوسری یہ کہ یہ ان کی ابدی قیام گاہ ہوگی۔ اس سے محروم ہونے کا ان کو کبھی کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔

تیسری یہ کہ اس میں وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمیشہ کے لیے ملے گا۔

چوتھی یہ کہ اس جنت کا اہلِ ایمان سے اللہ تعالیٰ نے حتمی وعدہ فرمایا ہے اور از خود اپنے اوپر اس کا ایفاء واجب اور اپنے بندوں کے آگے اس کے لیے اپنے کو ذمہ دار و مسئول ٹھہرایا ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَاۗءِ اَمْ هُمْ

ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًا ۢ بُوْرًا (۱۷-۱۸)

آخرت میں انبیاء و صالحین کا اپنے پرستاروں سے اعلانِ براءت

اوپر آیات ۲-۴ میں ان شرکاء کا ذکر گزر چکا ہے جن کے اعتماد پر یہ مشرکین آخرت سے بے پروا ہو کر قرآن اور رسول کا مذاق اڑا رہے تھے۔ یہاں انہی کو پیشِ نظر رکھ کر فرمایا کہ حشر کے دن اللہ ان کے ساتھ ان کے ان معبودوں کو بھی جمع کرے گا جن کو یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں اور ان سے سوال کرے گا کہ کیا تم لوگوں نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا انھوں نے اپنی راہ خود گم کی؟ وہ جواب دیں گے کہ معاذ اللہ ہمارے لیے یہ کس طرح روا تھا کہ ہم تیرے سوا کسی اور کو اپنا ولی و کارساز بناتے یا دوسروں کو اس کا حکم دیتے! اصل بات یہ ہے کہ تو نے معیشتِ دنیا کی جو فراوانی ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو بخشی اسی میں ان کی کئی پشتیں گزر گئیں جس کے سبب سے وہ سمجھ بیٹھے کہ وہ اسی عیش کے لیے پیدا ہوئے ہیں، اسی میں جئیں گے اور اسی میں مریں گے، وہ اس کے پیدائشی حق دار ہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ آخرت اول تو کوئی شے ہے نہیں اور اگر بالفرض ہے تو جس طرح اس دنیا میں ہم سب پر بالا ہیں اسی طرح آخرت میں بھی سب پر بالا رہیں گے۔ ان کے اس مغالطے نے ان کو راہِ حق سے برگشتہ رکھا اور جن لوگوں نے ان کو اصل حقیقت کی یاددہانی کی بھی اس دنیوی برتری کو اپنے برحق ہونے کی دلیل قرار دے کر انھوں نے ان کو جھٹلا دیا اور ہلاک ہونے والے بنے۔

اس جواب سے صاف واضح ہے کہ یہ ان انبیاء و صلحاء اور ملائکہ کا جواب ہوگا جن کی پرستش کی گئی ہے۔ رہے مشرکین کے وہ خیالی اصنام و اوثان جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو اگرچہ جمع تو، جیسا کہ وَمَا يَعْبُدُوْنَ کے عموم سے ظاہر ہوتا ہے، ان کی مورتیں بھی کی جائیں گی لیکن ان سے کسی سوال و جواب کا کیا سوال! البتہ قرآن میں دوسرے مقامات میں یہ تصریح موجود ہے کہ یہ بھی اپنے پوجنے والوں کے ساتھ جہنم میں جھونک دی جائیں گی تاکہ جن بدقسمت لوگوں نے ان کی پرستش کی ان پر واضح ہو جائے کہ جن کے آگے انھوں نے زندگی بھر ڈنڈوت کی ان کا کیا حشر ہوا!

یہاں انبیاء و صلحاء کا جو جواب نقل ہوا ہے بعینہٖ وہی جواب حضرت مسیحؑ کی زبان سے سورۂ مائدہ کی آیات ۱۱۵-۱۱۸ میں نقل ہوا ہے، اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

اصل سبب انکار

وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ - میں وہی بات فرمائی گئی ہے جو سورۂ حدید کی آیت ۱۶ میں یوں فرمائی گئی ہے کہ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ (ان لوگوں کو عیش و رفاہیت کا طویل زمانہ ملا اس وجہ سے ان کے دل سخت ہو گئے) آیت میں ذکر سے مراد وہ یاددہانی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو برابر آخرت کو یاد رکھنے کی کی گئی۔ یہ مضمون انبیاء آیت ۴۴ اور قصص آیت ۴۵ میں بھی بیان ہوا ہے۔ مزید وضاحت مطلوب ہو تو ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

قَوْمًا بُوْرًا۔ بُوْر واحد جمع اور مذکر ومؤنث سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی شور زمین کے بھی ہیں اور فاسد و ناکارہ آدمی کے بھی۔ یہاں یہ قوم کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہلاک ہونے والی قوم کے ہیں۔

فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ لا فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا (۱۹)

ایک بلیغ اسلوب — یہاں مستقبل کی بات کو بتقاضائے بلاغت ماضی کی شکل میں کر دیا ہے۔ فرمایا کہ یہ لو، انھوں نے تو تمھاری اس بات کو جھٹلا دیا جو تم کہتے تھے! تمھارا دعویٰ تو یہ تھا کہ انھوں نے تمھیں اپنی عبادت کا حکم دیا ہے اور تم جن باتوں کو اختیار کیے ہوئے ہو انہی کی ہدایت کے مطابق اختیار کیے ہوئے ہو لیکن ان کا کہنا تو یہ ہے کہ اپنی عبادت کا کسی کو حکم دینا تو درکنار وہ اس بات کے بھی ایک لمحہ کے لیے روادار نہیں کہ کسی کو اپنا ولی و کارساز بنائیں۔

ظلم عظیم کی سزا عذاب کبیر — فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا، الآیۃ۔ یعنی اس آخری اتمام حجت اور قطع عذر کے بعد تمھارے لیے کوئی راہ فرار باقی نہ رہ جائے گی۔ نہ تم خود اپنے سے عذاب کو ہٹا سکو گے اور نہ اپنی یا کسی دوسرے کی کوئی مدد ہی کر سکو گے اور تم میں سے جو بھی شرک کے مرتکب ہوں گے ہم ان کو ایک عذاب عظیم چکھائیں گے یہ امر واضح رہے کہ شرک کی سزا عذاب کبیر اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرک کی حیثیت ظلم عظیم کی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا (۲۰)

تمام رسول بشر تھے — اس آیت میں اگرچہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن آیت کے الفاظ خود شاہد ہیں کہ کلام کا رخ عام لوگوں کی طرف ہے چنانچہ اس میں ضمیریں اور فعل واحد بھی استعمال ہوئے ہیں اور جمع بھی۔ یہ معترضین کے اس اعتراض کا جواب ہے جو اوپر آیت ۷ میں نقل ہوا ہے۔ فرمایا کہ اگر تم بشر ہو، کھانا بھی کھاتے ہو، بازاروں میں لین دین کے لیے بھی تمھیں جانا پڑتا ہے تو ان میں سے کوئی بات بھی منصب رسالت کے منافی نہیں ہے۔ تم سے پہلے جتنے رسول بھی ہم نے بھیجے وہ سب بلا استثنا، کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں عام آدمیوں کی طرح چلتے پھرتے بھی تھے۔ قرآن کا یہ جواب بالکل واضح ہے اس لیے کہ یہ معترضین حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کو نہ صرف نبی و رسول مانتے تھے بلکہ ان کی ذریت اور ان کے دین کے وارث ہونے پر ان کو بڑا فخر و ناز تھا لیکن ان میں سے کسی کے متعلق بھی ان کا یہ دعویٰ نہیں تھا کہ وہ مافوق بشر تھے بلکہ ان کو وہ بشر ہی تسلیم کرتے تھے۔ اسی طرح بنی اسرائیل بھی اپنے انبیاء میں سے کسی کے مافوق بشر ہونے کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ قرآن نے دوسرے مقام میں قریش کے ان معترضین سے کہا کہ

ہے کہ اگر تم نبوت و رسالت کی تاریخ سے بے خبر ہو تو ان اہل کتاب سے پوچھ لو جو انبیاء و رسل کی تاریخ سے واقف ہیں کہ ان کے انبیاء کھانا کھاتے تھے یا نہیں اور انھیں بازاروں میں چلنے پھرنے کی ضرورت پیش آتی تھی یا نہیں؟ عیسائیوں نے اگرچہ پال کے زمانہ سے حضرت عیسیٰ کو مافوق البشر بنانے کی بڑی کوشش کی لیکن ان کے اور ان کی والدہ ماجدہ کے کھانا کھانے سے وہ بھی انکار نہیں کر سکتے اس لیے کہ انجیلوں میں یہ چیز نہایت تصریح کے ساتھ موجود ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کو بھی ان کے متعلق دعوائے الوہیت کے خلاف دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ (مائدہ: ۷۵) (ماں بیٹا دونوں کھانا کھاتے تھے)۔

انبیاء اور ان کے مخالفین کی ایک دوسرے کے لیے آزمائش

وَجَعَلْنَا بَعْضَکُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَۃً۔ بعینہٖ یہی مضمون انعام آیت ۵۳ میں گزر چکا ہے۔ وہاں فرمایا ہے۔ وَکَذٰلِکَ فَتَنَّا بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لِّیَقُوْلُوْٓا اَھٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنْۢ بَیْنِنَا (اسی طرح ہم نے ایک کو دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے تاکہ یہ متکبرین کہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان سے اپنے فضل کے لیے منتخب کیا!) یعنی مسلمانوں کی غربت ان کفار کے لیے فتنہ بن گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تمام نعمتوں اور مال و جاہ کے وارث اور مالک ہم ہیں تو یہ دین اگر کوئی خدائی دین ہوتا تو وہ ان قلاش مسلمانوں کو کس طرح ملتا، وہ بھی لازماً ہمیں ملتا اور اگر اللہ انسانوں ہی میں سے کسی کو نبی بنانے والا ہوتا تو طائف یا مکہ کے کسی رئیس کو بناتا نہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے غریب آدمی کو اس منصب پر سرفراز کرتا! اسی طرح یہاں فرمایا ہے کہ ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لیے آزمائش بنایا ہے۔ یعنی تمہاری غربت ان کے لیے قبولِ حق کی راہ میں حجاب بن گئی ہے۔ حق تو یہ تھا کہ وہ نعمت پا کر خدا کے شکر گزار بندے بنتے لیکن یہ نعمت ان کے لیے استکبار کا سبب بن گئی اور اس استکبار کے نشہ میں انھوں نے تمہاری پیش کردہ دعوت پر غور کرنے اور اس کو اختیار کرنے کے بجائے تمہیں اعتراضات و مطاعن کا ہدف بنا لیا اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے صبر کا امتحان ہے۔

عربیت کا ایک بلیغ اسلوب

اَتَصْبِرُوْنَ۔ یہ مسلمانوں کو خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ وہ تو اپنے شکر کے امتحان میں بالکل ناکام رہے اب تم بتاؤ کہ تم ان کے طنز و استہزاء اور ان کی مخالفت و عداوت کے مقابل میں ثابت قدم رہنے والے بنتے ہو یا نہیں؟ عربیت کا ذوق رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ جب امر کے اندر ترغیب و تشویق اور حث و تحریض کا مفہوم پیدا کرنا ہو تو وہ خبر یہ اسلوب کے قالب میں آتا ہے اور اگر اس پر حرفِ استفہام آ جائے تو اس کے اندر مزید زور پیدا ہو جاتا ہے۔ ھَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ (شعراء: ۳۹) کے تحت اس اسلوب کی مزید وضاحت آئے گی اور پیچھے بھی اس کی بعض عمدہ مثالیں گزر چکی ہیں۔ یہ مسلمانوں کو اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ اگر تمہارے مخالفین اپنے امتحان میں ناکام رہے تو ان کو ان کی قسمت کے حوالہ کرو، تمہارے سامنے صبر کے امتحان کا جو مرحلہ ہے اس میں کامیابی کے لیے عزم و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھو۔

وَکَانَ رَبُّکَ بَصِیْرًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا نگرانِ حال ہے۔ اس کی نصرت پر پورا بھروسہ رکھو۔

اگر تم ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ان تمام مخالفتوں کے علی الرغم منزلِ مقصود پر پہنچائے گا۔

اس آیت میں فتنہ کو اللہ تعالیٰ نے جو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو اس نے اپنے بندوں کے امتحان کے لیے اس دنیا میں جاری فرمائی ہے۔ اس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آرہے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْمَلَائِكَةُ أَوْ نَرَىٰ رَبَّنَا ۗ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا ۝ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَائِكَةَ لَا بُشْرَىٰ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِينَ وَيَقُولُونَ حِجْرًا مَّحْجُورًا (۲۱-۲۲)

متکبرین کے استکبار پر ایک ضرب

الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا سے قرآن میں متکبرین کے اس گروہ کو تعبیر کیا گیا ہے جو خدا کے حضور پیشی کے اندیشے سے بالکل بے فکر اور بے خوف تھا۔ اس گروہ کا جہل و غرور اور اس کا گھمنڈ دوسرے کفار و معاندین سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا اس وجہ سے اس کا ذکر الَّذِينَ كَفَرُوا کے لفظ سے نہیں ہوا بلکہ ایسی صفت کے ساتھ ہوا ہے جس سے اس کا غرور پوری طرح بے نقاب ہو سکے۔ اس گروہ کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس خدا کا فرشتہ آتا ہے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے تو آخر ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے یا ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ خود خدا بے حجاب ہو کر سامنے آئے اور ہم اس کو دیکھیں۔ یہ مطالبہ ظاہر ہے کہ وہی لوگ کر سکتے تھے جو بالکل ہی سر پھرے، مغرور اور ساتھ ہی پہلے سرے کے احمق ہوں۔ اس وجہ سے ان کی اس احمقانہ بات کا جواب دینے کے بجائے ان کے اس غرور پر ضرب لگائی۔ فرمایا کہ ان لوگوں نے بڑی اکڑ دکھائی کہ خدا اور فرشتوں کو دیکھنے کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کو اندازہ نہیں کہ خدا اور فرشتوں کا دیکھنا کیا ہوتا ہے! خدا تو در کنار جب وہ دن آئے گا جس دن یہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو وہ ان کے لیے کوئی خوش آیند دن نہیں ہو گا بلکہ اس دن پناہ! پناہ! پکار اٹھیں گے! آگے اس دن کی ہولناکی کی مزید تفصیل آرہی ہے۔

حِجْرًا مَّحْجُورًا کا مفہوم

حِجْرًا مَّحْجُورًا کے ایک معنی تو سخت پردہ اور اوٹ کے ہیں۔ اس معنی میں یہ لفظ اسی سورہ کی آیت ۵۳ میں آگے آئے گا۔ دوسرے یہ استعاذہ کے الفاظ سے ہے اور سیبویہ کی رائے یہ ہے کہ جب یہ اس مفہوم میں آتا ہے تو بالکل اسی شکل میں استعمال ہوتا ہے اور فعل محذوف سے منصوب ہوتا ہے جس طرح مَعَاذَ اللّٰهِ استعمال ہوتا ہے۔

وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنثُورًا (۲۳)

متکبرین کے اعمال کی بے وقعتی

فرمایا کہ ان لوگوں کو اپنی جن خدمات اور جن کارناموں پر بڑا ناز ہے اور جن کی بنا پر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا میں بھی وہ ملک و قوم کے ہیرو سمجھے جانے کے حق دار ہیں اور اگر آخرت کوئی چیز ہے تو وہاں بھی ان کو بڑے سے بڑے مراتب ملیں گے، ہم ان کے ان اعمال کو منتشر ذرات بنا کر اڑا دیں گے۔ اس لیے

دیا ہے ہاں اس عمل کی کوئی قدر نہیں ہے جو خالص ہماری رضا کے لیے نہ کیا گیا ہو۔ قَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا من عمل کے اسلوبِ بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ہم خود آگے بڑھ کر ان کے ہر عمل کو ٹھکرا دیں گے، خواہ وہ عمل بڑا ہو یا چھوٹا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اعمال کی انتہائی تحقیر کی دلیل ہے۔

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَئِذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِیْلًا (۲۴)

اہلِ جنت کی عیش

یہ ان کے مقابل میں اہلِ جنت کا حال بیان ہوا کہ جن کو یہ اس دنیا میں نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ اس دن بہترین مستقر اور اعلیٰ ترین آرامگاہ میں ہوں گے۔ مقیل، قیلولہ کی جگہ کو کہتے ہیں لیکن یہ عام استعمال میں آرامگاہ اور عیش گاہ کے مفہوم میں آتا ہے۔ امرؤ القیس کا مصرع ہے [illegible] (ایسی عیش گاہ میں عیش کرو جو ہر نحوست سے محفوظ ہے) خیر اور احسن یہاں تقابل کے مفہوم میں نہیں ہیں بلکہ یہ خوب ترین اور بہترین کے مفہوم میں ہیں۔ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

وَیَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِیْلًا ۝ اَلْمُلْكُ یَوْمَئِذِ ۣالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ یَوْمًا عَلَی الْكٰفِرِیْنَ عَسِیْرًا (۲۵-۲۶)

قیامت کے دن فرشتوں کا ظہور

یہ بھی اسی جواب کا حصہ ہے جو اوپر فرشتوں کو دیکھنے کا مطالبہ کرنے والوں کو دیا گیا ہے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کو چاہیے کہ اس دن کا تصور کریں جس دن آسمان پھٹے گا اور اس سے ایک بدلی نمودار ہوگی اور اس کے ذریعے سے فرشتوں کے پرے کے پرے، یکے بعد دیگرے، اتارے جائیں گے۔ فرمایا کہ اس دن کسی کی کچھ پیش نہیں جانے کی۔ جن معبودوں پر ان لوگوں کو بڑا ناز و اعتماد ہے وہ بھی ان کے کچھ کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ حقیقی بادشاہی اس دن خدائے رحمان ہی کی ہوگی اور کافروں پر یہ دن بڑا ہی کٹھن ہوگا! یہ ملحوظ رہے کہ حقیقی اختیار اور حقیقی بادشاہی یوں تو ہمیشہ خدا ہی کی ہے لیکن اس دنیا میں اس حقیقت پر پردہ پڑا ہوا ہے اس وجہ سے نادانوں کو مغالطہ ہوتا ہے اور وہ اپنی خدائی کا ڈنکا بجانے لگتے ہیں لیکن قیامت کے دن ہر شخص پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ سارا زور و اختیار صرف اللہ ہی کو حاصل ہے، دوسرے کسی کو بھی کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

وَیَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْهِ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا ۝ یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا ۝ لَقَدْ اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ ؕ وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (۲۷-۲۹)

قیامت کے دن مخالفینِ رسول کی حسرت

ہاتھ کاٹنا اظہارِ حسرت و ندامت کی تعبیر ہے۔ اور یہ تعبیر ہماری زبان میں بھی موجود ہے۔ اور ظالم سے مراد یہاں اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا یعنی ہر وہ شخص جس نے رسول کی مخالفت کی۔

فرمایا کہ ان لوگوں کو چاہیے کہ اس دن کا تصور کریں جس دن ہر وہ شخص جو آج اندھا بہرا بن کر رسول کی

ت کر رہا ہے اور اس طرح خود اپنی جان پر ظلم ڈھا رہا ہے نہایت حسرت کے ساتھ اپنے ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا کہ کاش میں نے اللہ کے رسول کے ساتھ اس کی بتائی ہوئی راہ اختیار کرلی ہوتی اور اپنی بدبختی سے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا جس نے مجھے خدا کی یاددہانی سے، جب کہ وہ میرے پاس آچکی تھی، برگشتہ کرکے گمراہی میں ڈالا!

'اَضَلَّنِیْ' کے بعد 'عَنْ' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ 'صرف' کے معنی پر متضمن ہے یعنی اس نے مجھے اپنی ان گمراہ کن باتوں سے، جو اس نے رسول اور اللہ کی کتاب کے خلاف کہیں، مجھے گمراہ اور رسول کے بتائے ہوئے راستہ سے برگشتہ کیا۔ ان باتوں کا حوالہ آیات ۴، ۵، ۷، ۸، ۲۰، ۲۱، ۳۲، ۴۱ اور ۴۲ میں موجود ہے۔

'بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ' میں اپنی بدبختی کا اعتراف ہے کہ اگر اللہ کی ہدایت میرے پاس نہ آئی ہوتی تو بھی کوئی عذر بھی پیش کرسکتا تھا لیکن اب میں کیا عذر کرسکتا ہوں جب کہ میرے اوپر حجت تمام کی جاچکی ہے۔

'وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا' 'خَذُوْل' کے معنی وقت پر ساتھ چھوڑ دینے والا، بے وفا اور غدار۔

میرے نزدیک یہ اظہار حسرت کرنے والوں کے قول کا جزو نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے۔ بلکہ بیان کے فون پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے برمحل تذکیر و تنبیہ ہے کہ شیطان اس طرح عین وقت پر دغا دینے والا اور ساتھ چھوڑ دینے والا ہے۔ لفظ 'شیطان' یہاں جنس کے مفہوم میں ہے۔ اس سے شیاطین جن و انس دونوں مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تو یہ نابنجار لوگ ایک دوسرے کے ساتھی، لیڈر اور پیرو ہیں۔ ہر ضلالت کے پھیلانے اور ہر حق کو دبانے میں ایک دوسرے کے دست و بازو بنے ہوئے ہیں لیکن جب آخرت کا مرحلہ پیش آئے گا تو ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔ پیرو کہیں گے کہ فلاں نے ہمیں گمراہ کیا، اگر یہ نے نہ ورغلایا ہوتا تو ہم سیدھی راہ پر ہوتے، اور لیڈر جواب دیں گے کہ تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہمارا ساتھ دیا، ہم نے تو تمہیں وہی بنایا جو ہم خود تھے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۳۰)

قیامت کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے رب سے شکوہ

'رسول' سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن کو جھٹلانے والے خود اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے۔ دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے رب سے شکوہ کریں گے کہ اے رب! میں نے تیری کتاب، پوری دلسوزی کے ساتھ، اپنی اس قوم کے سامنے پیش کی لیکن ان لوگوں نے اس کی کوئی قدر نہیں کی بلکہ نہایت ناقدری کے ساتھ اس کو ٹھکرا دیا۔ حضور کا یہ شکوہ ان اشقیاء کے تابوت میں آخری کیل ہوگا جس کے بعد ان کے لیے زبان کھولنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جائے گی۔ یہ بات سورۂ مائدہ میں تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے کہ قیامت کے دن انبیاء اپنی اپنی قوموں کے معاملہ میں گواہی دیں گے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ ۗ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيرًا (۳۱)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ اشقیاء تمہاری مخالفت جو کر رہے ہیں یہ انبیاء کی تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر دور کے مجرمین نے اسی طرح اپنے رسولوں کی مخالفت کی ہے۔ لفظ 'مجرمین' اوپر آیت ۲۲ میں گزر چکا ہے۔ یہ لفظ ان گمراہ کرنے والے لیڈروں کے لیے استعمال ہوا ہے جن کا رویہ اس سورہ میں زیر بحث ہے۔ فرمایا کہ یہی جرائم پیشہ لوگ ان تمام فسادات کے ذمہ دار ہوتے ہیں جن کی نبی اصلاح کرنا چاہتا ہے اور ان تمام مفاسد سے ان کا مفاد وابستہ ہوتا ہے اس وجہ سے وہ نبی کی دعوت کو ٹھنڈے پیٹوں نہیں برداشت کرتے بلکہ اپنے تمام اوچھے ہتھیاروں سے اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں لیکن تم اطمینان رکھو، تمہارا رب ہر شکل میں تمہاری رہنمائی اور مدد کے لیے کافی ہے۔

یہ بات چونکہ سنتِ الٰہی کے مطابق ہوتی ہے، اس لیے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ باطل کو بھی ایک حدِ خاص تک زور آزمائی کی مہلت دی ہے، اس وجہ سے اس کو منسوب اپنی طرف فرمایا۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں۔ انعام کی آیت ۱۱۲ میں یہ مضمون زیادہ وضاحت سے گزر چکا ہے۔ تفصیل کے طالب اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيلًا (۳۲)

قرآن کے بیک وقت نہ اترنے کی وجہ

یہ ان معترضین کا چوتھا اعتراض نقل ہوا ہے۔ وہ قرآن کے خلاف لوگوں میں یہ خیال بھی پھیلاتے تھے کہ اگر یہ خدا کی اتاری ہوئی کتاب ہے تو آخر یہ پوری کی پوری بیک وقت کیوں نہیں نازل کر دی گئی۔ خدا کے لیے تو کچھ سوچنے اور اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اس کو تھوڑی تھوڑی اتارے! یہ اعتراض وہ اپنے اسی پروپیگنڈے کو تقویت پہنچانے کے لیے کرتے تھے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں کچھ دوسرے لوگ بھی شریک ہیں۔ چنانچہ جتنی مقدار میں وہ تیار کر پاتے ہیں اتنی اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو سکھاتے ہیں اور یہ اس کو وحی الٰہی بنا کر ہمیں سناتے ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ ہم نے اس کو اسی طرح اتارا ہے تاکہ اس طرح ہم تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو ایک خاص تدریج و اہتمام کے ساتھ نازل کیا تاکہ لوگ اس کو سیکھیں۔ مطلب یہ ہے کہ اتارنے کو تو ہم پوری کتاب ایک ہی دفعہ نازل کر سکتے تھے لیکن سوال تمہارے تحمل اور لوگوں کی تعلیم و تربیت کا بھی تھا۔ اگر یہ پوری کتاب ایک ہی مرتبہ میں نازل کر دی جاتی تو نہ تم ہی اس بارِ گراں کو اٹھا سکتے اور نہ لوگوں ہی کے اوپر صحیح طریقہ سے اتمامِ حجت ہو سکتا اس وجہ سے اللہ نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا تاکہ تم بھی اس کو برداشت کر سکو اور لوگ بھی اگر سیکھنا چاہیں تو اس کو سیکھ سکیں۔ ایک استاذ اگر چاہے تو پوری کتاب ایک ہی نشست میں شاگردوں کو سنا دے لیکن کیا اس طرح شاگرد کتاب کو محفوظ بھی کر سکیں گے!

"وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا"۔ 'ترتیل' کے معنی اہتمام کے ساتھ پڑھنے اور سنانے کے ہیں۔ اس کا عطف اس فعل پر ہے جو 'كَذٰلِكَ' کے بعد محذوف ہے۔ یہ بات یہاں بطور اظہار احسان ارشاد ہوئی ہے کہ یہ ہماری نہایت بے جا لوگوں پر مہربانی ہے کہ ہم نے ان کو ایک ساتھ پوری کتاب نہیں پکڑا دی بلکہ اس کو نہایت اہتمام و تدریج کے ساتھ سبق سبق کر کے پڑھا اور سنا رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چیز ممنون و شکر گزار ہونے کی ہے نہ کہ اعتراض و نکتہ چینی کی لیکن ان ظالموں نے اس چیز کو بھی ایک وجہ اعتراض بنا لیا۔

آسمانی صحیفوں میں سے کوئی صحیفہ بھی بیک دفعہ نازل نہیں ہوا

یہ امر ملحوظ رہے کہ آسمانی صحائف میں سے کوئی صحیفہ بھی بیک دفعہ نہیں نازل ہوا ہے۔ جن لوگوں نے یہ خیال کیا ہے، ان کا خیال ان صحائف سے بے خبری پر مبنی ہے۔ تورات بھی پوری کی پوری بیک دفعہ نہیں نازل ہوئی۔ بیک دفعہ اس کے صرف احکام عشرہ نازل ہوئے ہیں جو الواح میں لکھ کر حضرت موسیٰ کو عطا ہوئے۔ لیکن تورات صرف احکام عشرہ ہی پر تو مشتمل نہیں ہے اس میں تو شریعت موسوی کے تمام احکام و قوانین ہیں جو حضرت موسیٰ کی پوری زندگی میں درجہ بدرجہ نازل ہوئے۔ ان میں بہت سے احکام ایسے ہیں جن کے متعلق قرآن اور تورات دونوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کی ہجرت سے پہلے نازل ہوئے ہیں، بہت سے احکام دریا کے عبور کے بعد یا صحرائے سینا کی زندگی کے دور میں نازل ہوئے ہیں۔ اسی طرح انجیل تمام تر سیدنا مسیحؑ کے مواعظ حکمت پر مشتمل ہے جو مختلف مواقع پر حسب اقتضائے حالات آپ پر نازل ہوئے اور آپ نے ان سے اپنی قوم کو انذار کیا۔ یہی حال زبور کا ہے۔ یہ حضرت داؤدؑ کی منظوم مناجاتوں اور تلقینات پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً آپ پر القا ہوئیں۔ غرض یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی بیک دفعہ، مابین الدفتین، نازل ہوئی۔ آخر ایسا ہو بھی کیسے سکتا تھا! حضرات انبیاء علیہم السلام کوئی مصنف نہیں تھے کہ پوری پوری کتابیں لکھ کر ایک ہی دفعہ لوگوں کے ہاتھوں میں پکڑا دیں۔ وہ داعی، معلّم اور مزکّی ہوتے تھے۔ انھیں ایک پوری مریض قوم کا علاج اور تزکیہ کرنا ہوتا تھا۔ ان کے اس فرض منصبی کا فطری اور قدرتی تقاضا یہ تھا کہ وہ اس اصلاح کی راہ میں تدریج کے ساتھ قدم آگے بڑھائیں اور ہر قدم پر ضرورت کے مطابق ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی حاصل ہو۔ جہاں تک مجھے علم ہے علمائے اہل کتاب بھی اپنی کتابوں میں سے کسی کتاب کے بیک دفعہ نازل ہونے کے مدعی نہیں ہیں۔ اور اگر کوئی ہے تو اس کا دعویٰ خود اس کی کتاب کی تصریحات کے صریح خلاف ہے۔ ہمارے مفسرین یہ بات جو لکھتے ہیں کہ تورات، زبور اور انجیل بیک دفعہ نازل ہوئی ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا (۳۳)

آیت ۹ کے تحت ہم واضح کر آئے ہیں کہ ضرب مثل کا محاورہ اعتراض و نکتہ چینی کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ یہ اعتراض ہی کے مفہوم میں ہے اور آیت میں اس کا مقابل لفظ 'حق' استعمال ہوا ہے جس سے یہ بات نکلی کہ اس سے مراد یہاں اعتراض باطل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دہانی

معترضین کے تمام اعتراضوں کا مسکت اور دل نشین جواب دینے کے بعد یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم مطمئن رہو۔ یہ لوگ جو اعتراض باطل بھی تمہارے خلاف اٹھائیں گے اس کے جواب کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ ہم اس کا صحیح جواب اور اس کی بہترین توجیہ و تفسیر تم پر نازل کر دیں گے۔ اس اطمینان دہانی کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت و رسالت اور قرآن کی جو دعوت لوگوں کو دی وہ خدا کے حکم سے دی، اس میں کوئی ادنیٰ دخل بھی آپ کی اپنی خواہش کو نہیں تھا۔ آپ کے اس دعوے اور دعوت کی وجہ سے پوری قوم آپ کی دشمن بن کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اگر مخالفین کے ان تمام حملوں کی مدافعت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ اپنے اوپر نہ لیتا تو تمام خلق کا منہ آپ کس طرح بند کر سکتے تھے۔

الَّذِينَ يُحْشَرُونَ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ سَبِيلًا (۳۴)

گمراہوں کی گمراہی کی اصل منزل

'یُحْشَرُوْنَ' کے بعد 'علیٰ' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ 'یُسْحَبُوْنَ' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت بھی ہو گئی ہے۔ فرمایا ہے۔ 'یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ' جس دن وہ اپنے منہوں کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے۔

یہ آیت اوپر کی آیت ۲۴ کے مقابل میں ہے۔ اُس میں اہل جنت کو اچھے انجام کی بشارت دی ہے اس میں اہل دوزخ کے انجام کا ذکر فرمایا ہے کہ سب سے زیادہ برے ٹھکانے میں اور سب سے زیادہ راہ کھوئے ہوئے وہ لوگ ہوں گے جو منہوں کے بل گھسیٹ کر دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے۔

'وَاَضَلُّ سَبِیْلًا' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں گمراہوں کو اپنی گمراہی کی اصل منزل کا پتہ نہیں ہوتا اس وجہ سے وہ یہ اندازہ نہیں کر پاتے کہ جس راہ پر وہ چل رہے ہیں وہ ان کو کہاں لے جائے گی۔ آخرت میں جب ان کی گمراہی کی اصل منزل ـــــ دوزخ ـــــ سامنے آجائے گی تب انھیں اندازہ ہوگا کہ وہ کہاں سے چلے اور کہاں پہنچے!

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۵-۴۴

آگے حضرت موسیٰ اور حضرت نوح اور ان کے درمیان کی ان قوموں کا اجمالی حوالہ ہے جن کے اندر رسولوں کی بعثت ہوئی۔ مقصود اس حوالہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا اور آپ کی قوم کو تنبیہ کرنا ہے کہ ان قوموں کو بھی اللہ نے اپنی تعلیمات و ہدایات سے آگاہ کیا لیکن انھوں نے ان کی قدر کرنے کے بجائے ان تعلیمات کے پیش کرنے والوں کا مذاق اڑایا جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ وہ نہایت تباہ کن انجام سے دوچار ہوئیں۔ اس سورہ میں واقعات کی طرف صرف اشارہ ہے۔ آگے کی سورہ میں اجمال کی مثنیٰ ہے، ان واقعات کی تفصیل آئے گی۔ واقعات کی ترتیب مصودی بھی ہے اور نزولی بھی۔ پہلے

حضرت موسیٰؑ کا ذکر فرمایا ہے جو سلسلۂ بنی اسرائیل کے سب سے زیادہ جلیل القدر صاحب کتاب و شریعت نبی و رسول ہیں۔ اس کے بعد حضرت نوحؑ کا ذکر فرمایا ہے جن سے حضرت آدمؑ کے بعد، گویا سلسلۂ رسالت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ نیچے سے اوپر کی طرف اشارہ ہوا۔ پھر درمیان کی دوسری امتوں کا ذکر فرمایا اور ان کے ذکر میں ترتیب نزولی یعنی اوپر سے نیچے کی طرف ہے۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۳۵-۴۴

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا ﴿۳۵﴾
فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَی الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِیْرًا ﴿۳۶﴾
وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا کَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰیَةً ؕ
وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۳۷﴾ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۠ وَاَصْحٰبَ
الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَیْنَ ذٰلِکَ کَثِیْرًا ﴿۳۸﴾ وَکُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫
وَکُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِیْرًا ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَی الْقَرْیَةِ الَّتِیْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ
السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ یَکُوْنُوْا یَرَوْنَهَا ۚ بَلْ کَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾ وَ
اِذَا رَاَوْکَ اِنْ یَّتَّخِذُوْنَکَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ
رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾ اِنْ کَادَ لَیُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْهَا ؕ
وَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ حِیْنَ یَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِیْلًا ﴿۴۲﴾
اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَکُوْنُ عَلَیْهِ وَکِیْلًا ﴿۴۳﴾
اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَکْثَرَهُمْ یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ
ع ۲　بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا ﴿۴۴﴾

ترجمۂ آیات ۳۵-۴۴

اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارونؑ کو اس کا مددگار بنایا۔ پس ہم نے ان کو حکم دیا کہ تم دونوں ان لوگوں کے پاس جاؤ جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے۔ پس ہم نے ان لوگوں کو بالکل ہی پامال کر کے رکھ دیا۔ اور قوم نوح کو بھی ہم

نے ہلاک کیا جب کہ انھوں نے رسولوں کو جھٹلایا ہم نے ان کو غرق کر دیا اور ہم نے ان کو لوگوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا دیا اور ان ظالموں کے لیے ہم نے ایک دردناک عذاب بھی تیار کر رکھا ہے۔ اور عاد، ثمود، اصحاب رسّ اور ان کے درمیان بہت سی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا اور ہم نے ان میں سے ہر ایک کے لیے اپنی تعلیماتِ حکمت واضح کیں اور بالآخر ہر ایک کو نیست و نابود کر دیا۔ اور یہ لوگ تو اس بستی پر سے گزرے بھی ہیں جس پر تباہی کی بارش برسائی گئی، کیا یہ اس کو دیکھتے نہیں رہے ہیں! بلکہ یہ لوگ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے متوقع نہیں رہے ہیں۔ ۳۵-۴۰

اور جب بھی یہ تمھیں دیکھتے ہیں بس تمھیں مذاق بنا لیتے ہیں۔ اچھا یہی ہیں جن کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے! اس شخص نے تو ہمیں ہمارے معبودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا اگر ہم ان پر جمے نہ رہتے! اور عنقریب، جب یہ عذاب دیکھیں گے، جان لیں گے کہ سب سے زیادہ بے راہ کون ہے۔ بھلا یہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے تم اس کے ذمہ دار ہو گے! کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں! یہ تو بس چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ۔ ۴۱-۴۴

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا (۳۵)

حضرت موسیٰؑ کے ساتھ حضرت ہارونؑ کا ذکر اتمامِ حجت کے پہلو سے — حضرت موسیٰؑ کے ساتھ حضرت ہارونؑ کا ذکر ان کے مددگار کی حیثیت سے بار بار جو آتا ہے اس سے مقصود اس احسان اور اتمامِ حجت کے پہلو کو نمایاں کرنا ہوتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ ایک رسول کے ساتھ اپنے ایک دوسرے پیغمبر کو اس کی مدد کے لیے مامور فرمایا۔ دوسرے مقام میں یہ تفصیل گزر چکی ہے کہ اظہار و بیان کے پہلو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اندر ایک کمی

محسوس فرماتے تھے اس وجہ سے انھوں نے دعا فرمائی کہ حضرت ہارون کو ان کا شریکِ کار بنا دیا جائے کہ ان کی زبان آوری اور فصاحت کی مدد سے وہ پوری قوت و اعتماد کے ساتھ تبلیغ حق کر سکیں تاکہ دعوت و اتمام حجت کے پہلو سے اداے فرض میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان دونوں نبیوں نے بیک وقت فرعونیوں کو دعوت دی لیکن انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس احسان و اہتمام کی کوئی قدر نہ کی۔

فَقُلْنَا اذْهَبَا إِلَى الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَدَمَّرْنَاهُمْ تَدْمِيرًا (۳۶)

مقصود یہاں چونکہ اجمالی اشارہ ہے اس وجہ سے پوری بات دو فقروں میں سمیٹ دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ان دونوں رسولوں کو اپنی نشانیوں کے ساتھ ان لوگوں کی طرف بھیجا لیکن انھوں نے ان تمام نشانیوں کو سحر قرار دے کر ان کی تکذیب کر دی جس کی سزا بالآخر ان کو یہ ملی کہ ہم نے ان کو یک قلم پامال کر دیا۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی ہے کہ جن کے دل مسخ ہو چکے ہوتے ہیں وہ کسی طرح بھی ہدایت قبول نہیں کرتے یہاں تک کہ وہ دو دو رسولوں اور ان کے تمام معجزات کی بیک وقت تکذیب کر دیتے ہیں اور اس میں ساتھ ہی قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ اگر انھوں نے بھی فرعون اور اس کی قوم کی روش کی تقلید کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کا انجام ان سے کچھ مختلف ہو!

وَقَوْمَ نُوحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ آيَةً ۖ وَأَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا (۳۷)

ایک رسول کا انکار تمام رسولوں کا انکار ہے

حضرت نوحؑ کی قوم نے اگرچہ تکذیب ایک ہی رسول — حضرت نوحؑ — کی کی لیکن یہاں لفظ جمع 'الرسل' استعمال ہوا ہے اس کی وجہ ہمارے نزدیک وہی ہے جس کا ذکر ہم سورۂ ہود کی آیت ۵۹ کے تحت کر آئے ہیں کہ تمام رسولوں کا پیغام چونکہ ایک ہی ہے اور ان کے بھیجنے والا بھی ایک ہی ہے اس وجہ سے ایک کا انکار سب کا انکار ہے۔ اس طریق تعبیر سے مقصود اس جرم کی سنگینی کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جو لوگ کسی رسول کی تکذیب کرتے ہیں وہ سوچ لیں کہ یہ بات کہاں سے کہاں تک پہنچتی ہے۔ اس اسلوب کی شالیں آگے والی سورہ میں بھی آئیں گی۔

'وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ آيَةً'۔ یعنی ہم نے ان کے اس انجام کو بعد والوں کے لیے ایک درسِ عبرت بنا دیا کہ وہ اس سے سبق لیں کہ جو لوگ رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں بالآخر ان کا حشر یہ ہوا کرتا ہے۔

'وَأَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا' یعنی اس قسم کے ظالموں کی سزا اسی دنیا کے عذاب پر بس نہیں ہے بلکہ ان کے لیے آخرت میں بھی ہم نے نہایت دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

وَعَادًا وَثَمُودَ وَأَصْحَابَ الرَّسِّ وَقُرُونًا بَيْنَ ذَٰلِكَ كَثِيرًا (۳۸)

یہاں فعل 'أَهْلَكْنَا' بربنائے قرینہ حذف ہے۔

اصحاب الرس کون تھے؟

اصحاب الرس کی تحقیق میں مجھے افسوس ہے کہ اب تک کامیابی نہ ہو سکی۔ ابن جریرؒ نے متعدد نام ذکر کیے ہیں لیکن ان میں سے کسی پر ان کو خود بھی اطمینان نہیں ہے۔ انھوں نے بحث کے آخر میں یہ ظاہر بھی کر دیا ہے کہ ان میں سے کسی کے متعلق بھی وثوق کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔

صاحب کشاف نے دوسرے ناموں کے ساتھ قومِ شعیبؑ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے بلکہ اسی کو مقدم رکھا ہے لیکن یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ سورۂ قٓ میں اصحاب الرس اور اصحاب الایکہ دونوں نام الگ الگ دو مستقل قوموں کے لیے آتے ہیں اور اصحاب الایکہ سے خود قرآن کی تصریح کے مطابق، جیسا کہ آگے والی سورہ میں وضاحت آئے گی، اصحاب مدین یعنی حضرت شعیبؑ کی قوم کے لوگ مراد ہیں۔ اگر اصحاب الرس سے قومِ شعیب مراد ہوتی تو پھر اس کے ساتھ اصحاب الایکہ کے ذکر کا کیا محل تھا!

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ارض القرآن میں اس سے اسماعیلی قبائل کے بارہ سلسلوں میں سے قیدما کو مراد لیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ اس کے حالات بالکل مجہول ہیں۔ حالات کے مجہول ہونے سے قطع نظر بنی اسماعیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی رسول کی بعثت ثابت نہیں ہے اور یہاں اصحاب الرس کا ذکر جس سیاق میں آیا ہے اس سے یہ بات واضح ہے کہ ان کی طرف رسول کی بعثت ہوئی اور انھوں نے عاد و ثمود کی طرح اس کی تکذیب کی۔

بہرحال ان کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عرب کی اقوام بائدہ میں سے کسی قوم کا حوالہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بھیجا لیکن اس نے اس رسول کی تکذیب کی اور سنتِ الٰہی کے مطابق مستحقِ عذاب ٹھہری۔ شعرائے جاہلیت میں زہیر نے وادیٔ رس کا ذکر کیا ہے۔ ع

وھن و وادی الرس کالید للفم (اور وہ اور وادیٔ رس اس طرح تھے جس طرح منہ کو ہاتھ)

تاریخ کی نارسائی

'وَقُرُوۡنًۢا بَیۡنَ ذٰلِکَ کَثِیۡرًا' (اور ان کے درمیان اور بھی کتنی قومیں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر چھوڑا) قرآن میں اس بات کا جگہ جگہ ذکر ہے کہ انبیاء و رسل صرف اتنے ہی نہیں ہیں جتنے قرآن میں بیان ہوئے ہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ جو لوگ ہر چیز کو تاریخ کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ تاریخ کی نارسائی سے ناواقف ہیں۔ تاریخ کی رسائی بہت محدود ہے اور اس کا بیشتر حصہ رطب و یابس ہر قسم کے مواد پر مشتمل ہے۔ اس دنیا کے احوال سے سب سے زیادہ باخبر اس کا خالق ہی ہے اس وجہ سے اصلی اعتماد اللہ تعالیٰ کی کتاب پر ہونا چاہیے نہ کہ تاریخ کی کتابوں پر۔ اگر قرآن نے کسی تاریخی واقعہ کا ذکر کیا ہے تو وہ ہمارے علم میں ایک بابرکت اضافہ ہے۔ اگر تاریخ سے بھی اس کی تائید ہو جائے تو فبہا، نہ ہو تو اس کو تاریخ کی نارسائی پر محمول کیجیے۔

وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ ۖ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيرًا (۳۹)

'ضرب مثل' کا مفہوم

'ضرب مثل' یہاں پوری وضاحت و تفصیل اور تذکیر و تنبیہ کے تمام لوازم کے ساتھ حقائق واضح کر دینے کے مفہوم میں ہے۔ جب کسی کو کوئی بات اچھی طرح ذہن نشین اور اس کے عواقب و نتائج سے پوری طرح آگاہ کر دینا ہو تو اس کے لیے حقائق کو مصور و متمثل کر دینے والی تمثیلیں اور تاریخ کے احوال و واقعات سب سے زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔ حضرات انبیاء چونکہ لوگوں پر اللہ کی حجت تمام کرنے کے لیے آئے اس وجہ سے انھوں نے صرف اصول و ضوابط بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ تمثیلات اور تاریخ کے احوال و واقعات سے ان کو اچھی طرح مدلل و مبرہن بھی کر دیا۔ چنانچہ آپ قرآن میں دیکھتے ہیں کہ ہر حقیقت امثال و واقعات سے اس طرح واضح کر دی جاتی ہے کہ ایک ہٹ دھرم کے سوا کوئی ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہی طریقہ تمام رسولوں نے اختیار فرمایا۔ اس کے بعد بھی جو لوگ نہیں سمجھے ظاہر ہے کہ وہ لوگ عقل و دل سے سمجھنے والے لوگ نہیں تھے بلکہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ماننے والے تھے۔ ایسوں کے بارے میں سنتِ الٰہی، جیسا کہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں، یہ ہے کہ وہ اس قہرِ الٰہی سے تباہ کر دیے جاتے ہیں جس کی وہ تکذیب کرتے اور جس کو آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ ہم نے ان تمام قوموں کو اچھی طرح سمجھا دیا لیکن جب انھوں نے سمجھنے سے انکار کر دیا تو بالآخر ان کو بالکل پامال بھی کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہی حشر تمھاری قوم کا بھی ہونا ہے اگر اس نے قرآن کی قدر نہ کی۔

وَلَقَدْ أَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۚ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنَهَا ۚ
بَلْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ نُشُورًا (۴۰)

آنکھوں کی بے بصیرتی آخرت کے تصور سے پیدا ہوتی ہے

یہ اشارہ قوم لوط کی بستی کی طرف ہے۔ 'أُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ' سے مراد وہ عذاب ہے جو ان پر آیا۔ اس عذاب کی نوعیت ہم نے اس کتاب میں اس کے محل میں واضح کی ہے۔ اگر اس کی پوری تحقیق مطلوب ہو تو مجموعہ تفاسیر فراہیؒ میں سورۂ ذاریات کی تفسیر پڑھیے۔

یہ قریش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ دوسری قوموں کے احوال و مقامات سے دور یا نا بلد ہیں تو کیا اس قوم کے آثار سے بھی نا آشنا ہیں جو ہمارے نہایت ہولناک عذاب کا نشانہ بنی! اس بستی پر سے تو یہ آئے دن اپنے تجارتی سفروں میں گزرتے ہیں! کیا اس کے آثار بھی یہ نہیں دیکھتے رہے ہیں! دیکھتے تو رہے ہیں لیکن چونکہ یہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے اس وجہ سے سب کچھ دیکھنے کے باوجود اندھے بنے ہوئے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قریش کے تجارتی قافلے قوم لوط کی بستیوں کے کھنڈروں پر سے برابر گزرتے تھے۔ اس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔

اس آیت میں یہ حقیقت واضح ہوئی کہ آدمی کی آنکھوں کے اندر بصیرت آخرت کے تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو آدمی بظاہر ٹک ٹک دیکھتا تو ہے لیکن اسے نظر کچھ نہیں آتا۔

وَإِذَا رَأَوْكَ إِن يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا ۖ أَهَٰذَا الَّذِي بَعَثَ اللَّهُ رَسُولًا ۝ إِن كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ آلِهَتِنَا لَوْلَا أَن صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۚ وَسَوْفَ يَعْلَمُونَ حِينَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ أَضَلُّ سَبِيلًا (۴۱-۴۲)

یعنی اللہ نے تو ان پر یہ فضل فرمایا کہ تمھارے اور قرآن کے ذریعہ سے ان پر دنیا اور آخرت کے حقائق واضح کیے لیکن ان کی محرومی اور بدبختی کا یہ حال ہے کہ جب بھی تمھیں دیکھتے ہیں تمھارا مذاق اڑاتے اور طنز و تحقیر کے انداز میں کہتے ہیں کہ اچھا یہی ہیں جن کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے! ان حضرت نے تو ہمیں ہمارے معبودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا اگر ہم ان کی عبادت پر جمے نہ رہتے! فرمایا کہ آج تو ان کو اپنی حماقت پر جمے رہنے پر بڑا ناز ہے لیکن کل کو جب یہ اپنی اس جہالت کے نتیجہ میں عذاب سے دوچار ہوں گے تب انھیں اندازہ ہوگا کہ ہمارے پیغمبر نے ان کو گمراہ نہیں کرنا چاہا تھا بلکہ اس نے ان کی رہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف کی تھی جس کو اختیار نہ کر کے بالآخر وہ کہاں سے کہاں پہنچے! 'مَنْ أَضَلُّ سَبِيلًا' میں جس حقیقت کی طرف اشارہ ہے اس کی وضاحت ہم اوپر آیت ۳۴ کے تحت کر آئے ہیں کہ گمراہوں کو اپنی گمراہی کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک اس کا انجام سامنے نہ آئے۔ وہ اپنی خواہشوں کے غلام ہوتے ہیں اور وہ خواہشیں ان کو اس طرح اندھا بنا دیتی ہیں کہ کوئی تذکیر و تنبیہ بھی ان پر کارگر نہیں ہوتی۔

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا ۝ أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ ۖ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا (۴۳-۴۴)

خواہشوں کے غلام چوپایوں سے بھی بدتر ہیں۔

'أَرَأَيْتَ' کے اسلوبِ خطاب پر اس کے محل میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جن لوگوں نے اپنی عقل کو معطل کر کے اپنی باگ اپنی خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے بھلا تم ان کی ہدایت و اصلاح کے ذمہ دار کس طرح بن سکتے ہو! انسان کے اندر رہنمائی کا چراغ عقل ہے نہ کہ نفس کی خواہشیں تو جو لوگ اس چراغ کو گل کر کے اپنی خواہشوں کے پرستار بن جائیں گے آخر ان کو رستہ دکھانا کس کے بس میں ہے! یہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ خواہشیں جتنی بھی ہیں وہ سب اندھی ہیں۔ وہ صرف اپنے مطالبے کو پورا کرنا چاہتی ہیں۔ ان کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ کیا حق ہے کیا باطل اور کیا خیر ہے کیا شر؟ تو جو شخص ان کا پیرو بن جاتا ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ گویا وہی اس کی معبود ہیں، وہ اس طرح شیطان کے پھندے میں پھنس جاتا ہے کہ اس سے اس کے لیے چھوٹنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

'اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ الآیۃ' یعنی تم (خطاب پیغمبرؐ سے ہے) اس طرح جو ان کی اصلاح کی فکر میں اپنے رات دن ایک کیے ہوئے ہو تو کیا یہ توقع رکھتے ہو کہ ان کے اندر سننے اور سمجھنے کی کچھ صلاحیت ابھی باقی ہے۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے تو یہ صحیح نہیں ہے یہ اپنی سننے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ضائع کر کے بالکل چوپایوں کے مانند بلکہ چوپایوں سے بھی بدتر بن چکے ہیں۔

یہ بات ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ عقل و خرد کو معطل کر کے خواہشوں کی پرستش کرنے والوں کے لیے قرآن نے چوپایوں کی تعبیر جو اختیار فرمائی ہے یہ کوئی مبالغہ کا اسلوب بیان نہیں ہے بلکہ بیان حقیقت ہے۔ چوپائے بہر حال اور بہر شکل اپنی اس جبلت پر قائم رہتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی خواہشات کی پیروی میں سر مو اپنی جبلت سے انحراف نہیں اختیار کرتے۔ لیکن انسان جب اپنی خواہشوں کا غلام بن جاتا ہے تو وہ جبلت اور فطرت کے تمام حدود توڑ کر چوپایوں سے بھی بدتر بن جاتا ہے۔

۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۵-۶۲

اوپر کے مجموعۂ آیات میں آپ نے دیکھا کہ تاریخ کے شواہد کی روشنی میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے۔ اب آگے کی آیات میں بعض آفاقی و کائناتی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن سے ان تمام باتوں کی تصدیق و تائید ہو رہی ہے جو آپؐ اپنی قوم کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ ان نشانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین بھی فرمائی گئی ہے کہ تمھیں اپنے مفوضہ فریضہ کے ادا کرنے کے لیے جن دلائل و براہین سے مسلح ہونا چاہیے وہ گوناگوں اسلوبوں سے قرآن میں واضح کر دیے گئے ہیں تو تم اسی کتاب کے ذریعہ سے ان لوگوں پر اللہ کی حجت تمام کرنے کی کوشش کرو اور ان کے ان نت نئے مطالبات و اعتراضات کی کوئی پروا نہ کرو جو وہ تمھیں زچ کرنے یا محض اپنی ساکھ جمائے رکھنے کے لیے کر رہے ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۵-۶۲

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ
جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا
یَّسِیْرًا ﴿۴۶﴾ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا
وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ وَهُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ
یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً

مَيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ
بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا
فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿۵۱﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا
كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ
اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾ وَهُوَ الَّذِيْ
خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۭ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿۵۴﴾
وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۭ وَكَانَ الْكَافِرُ
عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ
مَآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ
سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۭ وَ
مع كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۸﴾ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ
فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا
ع ۵ الرَّحْمٰنُ ۤ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾ السجدة تَبٰرَكَ الَّذِيْ
جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿۶۱﴾ وَهُوَ
الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ
اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾

ترجمۂ آیات ۴۵-۶۲ *کیا تم نے اپنے رب کی اس قدرت کی طرف نگاہ نہیں کی کہ کس طرح وہ سایہ کو پھیلا دیتا*

ہے اور اگر وہ چاہتا تو اس کو اسی طرح ساکن چھوڑ دیتا! پھر ہم سورج کو اس پر ایک دلیلِ راہ بناتے ہیں پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ ۴۵-۴۶

اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے شب کو پردہ پوش اور نیند کو دافعِ کلفت بنایا اور دن کو وقتِ نشور بنایا۔ ۴۷

اور وہی ہے جو اپنے بارانِ رحمت سے پہلے ہواؤں کو خوش خبری بنا کر بھیجتا ہے اور ہم آسمان سے پاکیزہ پانی اتارتے ہیں کہ اس سے مردہ زمین کو از سرِ نو زندہ کر دیں اور اس کو پلائیں اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چوپایوں اور انسانوں کو۔ ۴۸-۴۹

اور ہم نے اس کو ان کے درمیان گوناگون اسلوبوں سے واضح کر دیا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں لیکن اکثر لوگ ناشکری ہی پر اڑے ہوئے ہیں اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک نذیر بھیج دیتے تو تم ان ناشکروں کی بات کا دھیان نہ کرو اور اسی کے ذریعہ سے ان سے پورا پورا جہاد کرو۔ ۵۰-۵۲

اور وہی ہے جس نے ملایا دو دریاؤں کو۔ ایک کا پانی شیریں اور خوشگوار اور دوسرے کا نہایت شور و تلخ اور ان کے درمیان اس نے ایک پردہ اور ایک مضبوط بند کھڑا کر دیا۔ ۵۳

اور وہی ہے جس نے انسانوں کو پانی سے پیدا کیا اور پھر ان کو نسبی اور سسرالی رشتوں سے جوڑا اور تیرا رب بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔ ۵۴

اور یہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں جو نہ انھیں کوئی نفع پہنچا سکتی ہیں نہ کوئی نقصان اور یہ کافر اپنے رب کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ہم نے تو تم کو بس ایک خوشخبری دینے والا اور ایک آگاہ کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ تم کہہ دو کہ میں تم سے اس

کا کوئی صلہ نہیں مانگ رہا ہوں بس یہ ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب تک پہنچانے والی راہ اختیار کرے۔ اور اپنے زندہ خداوند پر، جو مرنے والا نہیں ہے، بھروسہ رکھو اور اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ رہنے کے لیے کافی ہے۔ جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ ادوار میں، پھر وہ اپنے عرش پر متمکن ہوا۔ وہ رحمان ہے پس اس کی شان باخبر سے پوچھو! اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدائے رحمان کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں، رحمان کیا ہے! کیا ہم اس چیز کو سجدہ کریں جس کا حکم تم ہمیں دیتے ہو! اور یہ چیز ان کی نفرت کو اور بڑھاتی ہے۔ ۵۵-۶۰

بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک منوّر چاند بنایا اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو یکے بعد دیگرے آنے والا بنایا ان کے لیے جو یاد دہانی حاصل کریں یا شکر گزار بننا چاہیں۔ ۶۱-۶۲

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا ۙ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا (۴۵-۴۶)

رات اور دن کا تصرف خدا کے اختیار میں ہے

'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب یہاں فرداً فرداً ہر مخاطب سے ہے۔ اور 'ظِلّ' سے مراد یہاں شب کا سایہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ تمام دنیا پر پھیلا دیتا ہے اور اگر وہ اس کو مستقل طور پر مسلط کر دے تو کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کو ہٹا سکے۔ یہ اسی کی شان اور قدرت ہے کہ وہ ہر روز اس سایہ کو پھیلاتا اور ہر روز اس کو سمیٹتا ہے۔ اس دنیا کے بقا کے لیے جس طرح اس کا پھیلایا جانا ضروری ہے اسی طرح اس کا سمیٹا جانا بھی ناگزیر ہے اور ان دونوں باتوں میں سے کسی پر بھی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سوا کسی کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ وہی اپنے سورج کو ہر روز بھیجتا ہے جو اس تاریکی کے اندر دلیل راہ بنتا اور اس کو آہستہ آہستہ کافور کرتا ہے۔ یہی مضمون سورۂ قصص میں یوں بیان ہوا ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ۭ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۔ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (قصص ۷۱-۷۳)

ان سے کہو کہ بتاؤ، اگر اللہ رات کو تمہارے اوپر قیامت تک کے لیے مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لیے روشنی کو لائے گا، کیا تم سنتے نہیں! ان سے پوچھو کہ بتاؤ، اگر اللہ تمہارے اوپر دن کو قیامت تک کے لیے مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لیے شب کو لائے گا جس میں تم سکون پا سکو! کیا تم دیکھتے نہیں! یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو اور تاکہ تم اسی کے شکر گزار بنو۔

'وَّجَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا' جس طرح کسی چیز کی دلیل اس کو کھولتی اور واضح کرتی ہے اسی طرح سورج شب کی عالمگیر تاریکی کے اندر دلیلِ راہ بنتا، اس کو ہٹاتا اور کھولتا ہے۔ اگر وہ روشنی نہ دکھائے تو سب بھٹکتے ہی رہ جائیں، کسی کو پتہ نہ چلے کہ اس گنبدِ بے در کے اندر سے نکلنے کی کوئی راہ بھی ہے یا نہیں!

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا (۴۷)

رات اور دن کے فوائد و منافع

یہ اسی روز و شب کی نشانیوں کی طرف ایک دوسرے زاویہ سے توجہ دلائی۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے شب کو تمہارے لیے پردہ پوش بنایا، تم اس کی راحت بخش چادر اوڑھ کر آرام سے سو رہتے ہو اور تمہاری نیند کو تمہارے لیے دافعِ کلفت بنایا جو تمہیں از سرِ نو زندگی کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے تازہ دم اور چاق و چوبند بنا دیتی ہے پھر دن کو تمہارے لیے از سرِ نو اٹھنے کا وقت بنایا کہ تم خدا کے رزق و فضل کے طالب بنو اور یہ ہر صبح کو قیامت کے دن اٹھنے کی یاد دہانی بھی کرتا ہے کہ جس طرح تم شب میں سونے کے بعد صبح کو اٹھ بیٹھتے ہو اسی طرح موت کی نیند کے بعد صبحِ قیامت کو جاگ پڑو گے۔ لفظ 'نشور' یہاں نہایت خوبی کے ساتھ موت کے بعد کی زندگی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر دیکھنے والی آنکھیں اور سوچنے والے دل و دماغ ہوں تو روزانہ رات اور دن کی آمد و شد اور ان کے فوائد و منافع میں خدا کی قدرت، رحمت، ربوبیت، حکمت، توحید اور قیامت کی اتنی نشانیاں موجود ہیں کہ قرآن کی ہر بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ کافی ہیں۔ لیکن یہ نشانیاں ان کے لیے نافع ہیں جن کے اندر سوچنے سمجھنے اور عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ جن کے اندر یہ ارادہ نہیں پایا جاتا وہ

ان تمام نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے نئی نشانیوں ہی کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ آگے یہ مضمون آیت ۴۶ میں بھی آ رہا ہے اور سورۂ نمل کی آیات ۸۶-۸۷ میں بھی آئے گا جس سے اس کے بعض دوسرے پہلو بھی روشنی میں آئیں گے۔

وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۚ وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا ﴿٤٨﴾ لِّنُحْيِيَ بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا وَنُسْقِيَهُ مِمَّا خَلَقْنَا أَنْعَامًا وَأَنَاسِيَّ كَثِيرًا ﴿٤٩﴾

بارش کی نشانیوں کی طرف اشارہ

'رَحْمَتِهِ' یہاں بارش کے مفہوم میں ہے اور یہ لفظ اس معنی میں جگہ جگہ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ رات اور دن کی آمد و شد کے اندر اللہ تعالیٰ کی جن صفات کا مشاہدہ ہو رہا ہے ان کی طرف توجہ دلانے کے بعد یہ بارش کی رحمت کی طرف توجہ دلائی جو ہر چند روز تو نہیں آتی لیکن اس زمین کا ہر جاندار اس کا محتاج ہے اور جب آتی ہے تو ہمیں پروردگار کی ان تمام صفات اور نشانوں کا مشاہدہ کرا دیتی ہے جس پر قرآن کی دعوت کی بنیاد ہے۔

فرمایا کہ وہی خدا تمھارا رب ہے جو باران رحمت سے پہلے موسمی ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے جو مختلف اطراف سے بادلوں کو ہانک کر لاتی ہیں، پھر ان کو تہ بر تہ اکٹھا کرتی ہیں، پھر جہاں کے لیے رب کا حکم ہوتا ہے وہاں وہ بادل پاکیزہ اور پاکیزگی بخش پانی برسا دیتے ہیں جس سے مردہ زمین از سرِ نو حیاتِ تازہ حاصل کر لیتی ہے اور خدا کی مخلوقات میں سے بے شمار چوپائے اور انسان اس سے سیراب ہوتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ غور کرو، کیا یہ دنیا جس کے ہر گوشے میں اتنی حکمتیں اور قدرتیں نمایاں ہیں بغیر کسی خالق کے وجود میں آگئی ہے؟ یہ سب کچھ محض کسی اندھی بہری علت العلل کا کرشمہ ہے؟ آسمان سے لے کر زمین تک ابر، ہوا، بارش اور انسان و حیوانات کی ما یحتاج میں یہ ربط آپ سے آپ پیدا ہو گیا ہے؟ کیا اضداد کی اس باہمی ہم آہنگی کے مشاہدہ کے بعد یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر مختلف ارادے کارفرما ہیں؟ کیا رحمت و ربوبیت کا یہ اہتمام انسان پر رب رحمان و رحیم کی طرف سے کوئی ذمہ داری عاید نہیں کرتا؟ کیا ہر بارش کے بعد زمین کی از سرِ نو زندگی اس حقیقت کی یاد دہانی نہیں کر رہی ہے کہ جو حکیم و قدیر اپنی قدرت و حکمت کا یہ مشاہدہ برابر کرا رہا ہے اس کے لیے لوگوں کے مرنے اور مٹی میں مل جانے کے بعد ان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے؟

انسانوں اور چوپایوں کے ساتھ 'کثیرا' کی صفت لانے سے مقصود یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں ایسی مخلوقات بھی ہیں جن کو اس نے پانی کا محتاج نہیں بنایا ہے لیکن بہت سی مخلوقات ایسی ہیں جو اپنی زندگی کے لیے پانی کی محتاج ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر چوپایوں اور انسانوں کا ذکر فرمایا جو نمایاں اور برتر ارضی مخلوقات میں سے ہیں۔ ان کے

ذکر کے ساتھ ان کے توابع اور دوسری مخلوقات آپ سے آپ ان کے تحت آ گئے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۝ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝ (۵۰-۵۲)

آنحضرتؐ کی طرف ایک التفات

یہاں قرینہ دلیل ہے کہ ضمیر مفعول کا مرجع قرآن ہے جس کی تائید و تصویب ہی کے لیے اوپر کے دلائل بیان ہوئے ہیں۔ یہ نشانیوں کے ذکر کے بیچ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات ہے کہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے ان کی وضاحت کے لیے ہم نے اس قرآن کو لوگوں کے درمیان گوناگوں اسلوبوں سے سنا دیا ہے لیکن ان کی اکثریت اس نعمت کی قدر کرنے کی بجائے ناشکری اور انکار ہی پر اڑی ہوئی ہے تو اب نہ قصور تمہاری سعی کا ہے اور نہ ہمارے اہتمام تذکیر و تعلیم کا بلکہ سارا قصور ان لوگوں کا اپنا ہے۔

قرآن کے دلائل کے گوناگوں پہلو

'تصریف' کے مفہوم کی وضاحت دوسرے مقام میں ہو چکی ہے کہ قرآن نے ہر حقیقت کو اتنے گوناگوں پہلوؤں سے واضح کر دیا ہے کہ صرف ضدی اور ہٹ دھرم ہی ان کو جھٹلا سکتا ہے۔ 'بَیْنَھُمْ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ مخاطب قوم کے ہر طبقہ اور ہر گروہ پر حجت تمام کر دی گئی ہے۔ یہ نہیں ہوا ہے کہ تبلیغ و تعلیم کی یہ جدوجہد کسی خاص گروہ ہی کے اندر محدود رہی ہو۔

'وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ کُلِّ قَرْیَۃٍ نَّذِیْرًا' یعنی اگر ہم دیکھتے کہ تمہارے اکیلے ہونے کے باعث دعوت و تبلیغ کے کام میں کوئی کسر رہی جا رہی ہے تو ہم ہر بستی میں ایک ایک منذر بھیج دیتے۔ ہمارے لیے یہ کام کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ لیکن کمی تمہاری طرف سے نہیں ہے بلکہ ساری خرابی خود ان لوگوں کے اندر ہے جو اپنے کان بند اور اپنی عقلیں معطل کیے ہوئے ہیں۔

'فَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا' تو یہ لوگ نت نئے مطالبات تمہارے سامنے محض تمہیں زچ کرنے کے لیے جو پیش کر رہے ہیں ان کی کوئی پروا نہ کرو۔ بلکہ اسی قرآن کے ہتھیار سے اس جہاد میں برابر لگے رہو۔ 'جِھَادًا کَبِیْرًا' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر چند ہے تو یہ جہاد نہایت کٹھن، اگر ان لوگوں کی طلب کے مطابق کوئی عذاب ان پر بھیج دیا جائے تو چشم زدن میں سارے قضیہ کا فیصلہ ہو سکتا ہے لیکن حکمت الٰہی یہی ہے کہ عذاب الٰہی کے بجائے اس کتاب ہی کے ذریعہ سے تم ان کے ساتھ جہاد کرو تاکہ ان کے اوپر اچھی طرح اللہ کی حجت پوری ہو جائے اور جس کے اندر ادنیٰ رمق بھی حق کو قبول کرنے کی ہے وہ اگر چاہے تو حق کو قبول کر لے اور کسی کے لیے بھی عند اللہ کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

'اطاعۃ' کا مفہوم

لفظ 'طَاعَۃٌ' یہاں کسی کی بات ماننے اور اس کا لحاظ کرنے کے مفہوم میں ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا

بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا (۵۳)

کائنات کے اضداد کی باگ خدا کے ہاتھ میں ہے

'مرج' کے معنی چھوڑنے کے ہیں اور فرات کے معنی ہیں غایت درجہ شیریں و خوشگوار۔ 'حِجْرًا مَّحْجُوْرًا' کی وضاحت آیت ۲۲ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں یہ مضبوط آڑ اور محکم اوٹ کے مفہوم میں ہے۔ 'حِجْرًا مَّحْجُوْرًا' اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح 'ظِلًّا ظَلِیْلًا' وغیرہ ترکیبیں ہیں۔

انفس کی آیات کے بعد یہ پھر آفاق کی نشانیوں میں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت کی ایک اور عظیم نشانی کی طرف توجہ دلائی کہ وہی خدا ہے جو ایک طرف سے شیریں پانی کے دریا کو چھوڑتا ہے دوسری طرف سے کھاری پانی کے سمندر کو۔ دونوں کی موجیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ نہیں ہوتا کہ شیریں پانی کھاری بن جائے یا کھاری پانی شیریں بلکہ دونوں اپنے اپنے حدود کے اندر اپنی مزاجی خصوصیات باقی رکھتے ہیں۔ خدائے قدیر و حکیم ان کے درمیان ایک ایسی غیر مرئی دیوار کھڑی کر دیتا ہے جو نہ کسی کو نظر آتی ہے اور نہ دونوں کا باہمی ٹکراؤ اس کو توڑ ہی سکتا ہے۔ یہ اس بات کی صاف شہادت ہے کہ اس کائنات میں جتنے بھی اضداد ہیں سب ایک بالاتر حکیم و قدیر کے تصرف کے تحت ہیں۔ وہ جس کو جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جس جگہ چاہتا ہے روک دیتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ وہ خدا کے مقررہ حدود سے سرِ مو تجاوز کر سکیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اضداد کے وجود سے مشرک قوموں کو سب سے زیادہ گمراہی پیش آئی ہے۔ انھوں نے اس کائنات کو اضداد کی ایک رزم گاہ سمجھ لیا اور ان میں سے ہر ضد کو دیوتا قرار دے کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ قرآن نے اس مغالطہ کو مختلف اسلوبوں سے رفع فرمایا ہے جن کی وضاحت ہم نے ان کے محل میں کی ہے۔ یہاں بھی اسی حقیقت کی طرف ایک نئے اسلوب سے توجہ دلائی ہے کہ اس کائنات میں جو اضداد ہیں وہ مطلق العنان نہیں ہیں بلکہ صاف نظر آتا ہے کہ ان کی باگ ایک بالاتر قوت کے ہاتھ میں ہے۔ اسی چیز کی طرف سورۂ رحمان میں بھی اشارہ فرمایا ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ○ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ (۱۹ : ۲۰)

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا (۵۴)

اضداد میں توافق کی ایک نفسی دلیل

'نَسَبًا وَّصِهْرًا' یعنی ذا نَسَبٍ وَّصِهْرٍ۔ 'نسب' کا مفہوم تو واضح ہے۔ 'صِهْر' اس قرابت کو کہتے ہیں جو سسرالی رشتہ سے وجود میں آئے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے پانی سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بھی پیدا کیا پھر ان دونوں کے اندر ایسے فطری داعیات ودیعت فرمائے کہ انسان ایک طرف نسبی تعلقات رکھنے والا بن سکے اور دوسری طرف سسرالی روابط کے ساتھ جڑ سکے اور اس طرح اس خاندان اور معاشرت و اجتماعیت کی تعمیر کرنے والا بنے جس کے لیے خالق حکیم و قدیر نے اس کو وجود بخشا ہے۔ 'وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا' یعنی یہ قدرت و اختیار صرف خدا ہی کو حاصل ہے

کہ وہ ایک ہی پانی سے اضداد کو وجود میں لائے اور پھر ان اضداد کو اپنی قدرت و حکمت سے ایک سلک میں پرو دے۔ یہ اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ ایک ہی علیم و قدیر کا ارادہ اس پوری کائنات پر متصرف ہے۔ وہی اپنی قدرت سے ایک ہی مادہ سے اضداد کو وجود میں لاتا اور پھر اپنی بے نہایت حکمت سے ان اضداد کے اندر وابستگی و پیوستگی پیدا کرتا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اوپر کی آیات میں آفاقی دلائل بیان ہوئے تھے اور یہ دلیل انفسی دلائل میں سے ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۭ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰي رَبِّهٖ ظَهِيْرًا (۵۵)

شیطان سے دوستی اور خدا سے پیکار

آفاق و انفس کے دلائل و شواہد تو اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ کائنات کا خالق و مالک اللہ وحدہٗ لاشریک ہے جو پوری قدرت و حکمت کے ساتھ اس کے نظام کو چلا رہا ہے لیکن یہ احمق لوگ ایسی چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں جو نہ انھیں کوئی نفع پہنچا سکتی ہیں، نہ کوئی نقصان۔

'وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰي رَبِّهٖ ظَهِيْرًا' 'کافر' یہاں اسم جنس کے مفہوم میں ہے اور اس سے مراد وہ مشرکین ہی ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے اس لیے کہ شرک اپنی حقیقت کے اعتبار سے کفر ہی ہے۔ 'ظہیر' کے معنی مددگار کے ہیں اور جب اس کے ساتھ 'علیٰ' آئے تو اس کے اندر حریف اور مدمقابل کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصل حقیقت تو وہ ہے جو بیان ہوئی لیکن یہ کافر اپنے رب حقیقی کے مقابل میں شیطان کے مددگار اور اپنے پروردگار کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور خدائے واحد کی بندگی کی اس دعوت کی اپنی پوری قوت سے مخالفت کر رہے ہیں جو خدا کا رسول ان کو دے رہا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا (۵۶)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمھاری ذمہ داری صرف انذار و تبشیر ہے۔ تم اپنی دعوت ان لوگوں کو پہنچا دو اور اس کی تکذیب کے نتائج سے اچھی طرح آگاہ کر دو۔ اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا ان کی اپنی ذمہ داری ہے۔ اس کی بابت تم سے کوئی پرسش نہیں ہونی ہے۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۵۷)

یعنی ان کو صاف صاف سنا دو کہ میں اس دعوت کا کوئی صلہ تو تم سے مانگ نہیں رہا تھا کہ تمھارے رد و قبول کا مجھ پر کوئی اثر پڑے۔ میں نے تمھارے رب کا پیغام تمھیں پہنچایا ہے اور مدعا صرف یہ ہے کہ جو اپنے رب کی راہ اختیار کرنا چاہے وہ اس کو اختیار کرے۔ اگر اس کو اختیار کرو گے تو اس کا نفع تمھی کو ہوگا، اگر نہ اختیار کرو گے تو اس کا خمیازہ تمھی بھگتو گے۔ اس سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہی مضمون سورہ سبا میں یوں بیان ہوا ہے: قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ (۴۷)

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ ۚ وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا (۵۸)

یعنی اپنے خدائے حی لایموت پر بھروسہ رکھو۔ وہ زندہ خدا ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس پر بھروسہ کرنے والے کبھی محروم و نامراد نہیں ہوتے۔ اس میں ایک لطیف تعریض مشرکین کے ان مردہ خداؤں پر ہے جن کی نسبت فرمایا ہے کہ: وہ کوئی نفع پہنچا سکتے نہ نقصان۔

'وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ' یہ حصول صبر و توکل کا وسیلہ ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و توکل کی تلقین فرمائی گئی ہے وہاں زیادہ سے زیادہ خدا کی تسبیح و تحمید میں مشغول رہنے اور اہتمام نماز کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس پر اس کے محل میں ہم وضاحت کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

'وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا' یعنی اپنے ان مخالفین کا معاملہ اپنے رب کے حوالہ کرو۔ وہ ان کے تمام جرائم سے پوری طرح باخبر ہے اور جب باخبر ہے تو ان کے ساتھ وہی کرے گا جس کے یہ سزاوار ہیں۔

الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۚ الرَّحْمَٰنُ فَاسْأَلْ بِهِ خَبِيرًا (۵۹)

چند صفات الٰہی کی طرف اشارہ

یہ اسی خدائے حی لا یموت کی مزید صفات بیان ہوئیں کہ اسی نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ چھ دنوں سے مراد، جیسا کہ اعراف ۵۴ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں، خدائی ایام ہیں جن کے طول و عرض کو وہی جانتا ہے۔ ہم ان کو اپنی زبان میں چھ ادوار سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کائنات کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر نہیں آگئی ہے بلکہ اس کے خالق نے اس کو نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہے۔

'ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ' یعنی اس اہتمام سے اس کائنات کو پیدا کر کے اس کا خالق کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے جیسا کہ احمقوں نے گمان کیا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ ایک کارِ عبث ہوتا اور ایک مدبر و حکیم کی شان کے یہ بات بالکل خلاف ہے کہ وہ کارِ عبث کرے۔ بلکہ وہ بالفعل اپنی اس کائنات کے عرشِ حکومت پر متمکن ہے اور اس کے سارے انتظام کی نگرانی فرما رہا ہے۔ اس میں جو ارتقاء ہوا ہے وہ خود بخود نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے خالق کی تدبیر و حکمت سے ہوا ہے اور اس کے نظم و نسق میں اس کے سوا کسی کو بھی کوئی دخل نہیں ہے۔

'الرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا' 'اَلرَّحْمٰنُ' خبر ہے، اس کا مبتدا محذوف ہے۔ یعنی جس نے اس کائنات کو وجود بخشا ہے وہ رحمان ہے۔ مخاطب کی پوری توجہ خبر پر مرکوز کرنے کے لیے مبتدا کو حذف کر دیا۔ یہاں صفتِ رحمان کی تذکیر سے مقصود خاص طور پر اس کائنات کے باغایت و بامقصد ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ اس کا خالق رحمان ہے اور اپنی اس رحمت ہی کے لیے اس نے اس کو

پیدا کیا ہے، اس کی اس صفت کا لازمی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن وہ لائے جس میں اس کی یہ رحمت اس کے کامل عدل کے ساتھ ظہور میں آئے۔ اس مضمون کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

خدا اپنی صفات کو خود ہی جانتا ہے

'فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا' میں خطاب عام مخاطبوں سے ہے جن سے اوپر سے بحث چلی آرہی ہے اور ضمیر مجرور کا تعلق 'خبیر' سے ہے۔ 'سوال' کے ساتھ 'ب' کا صلہ اسی صورت میں آتا ہے جب یہ لفظ استہزاء کے مفہوم پر متضمن ہو۔ یہاں اس کا محل نہیں ہے۔ 'خَبِیر' سے اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات والاصفات کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور اس کی تنکیر اظہار تفخیم کے لیے ہے۔ فرمایا کہ خدا نے اپنی جو صفتیں بیان فرمائی ہیں اس کی حقیقی صفتیں وہ ہیں نہ کہ وہ جو تم نے اپنے جی سے گھڑ کر اس کی طرف منسوب کر رکھی ہیں۔ اگر اس کی صفتیں معلوم کرنی ہیں تو اٹکل کے تیر تکے نہ چلاؤ بلکہ اسی خبیر سے معلوم کرو جو اپنی صفات سے سب سے زیادہ واقف خود ہے۔ بالکل اسی اسلوب میں سورۂ فاطر میں ارشاد فرمایا ہے: 'وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۭ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ (۱۴)' (اور قیامت کے دن تمہارے شرکاء تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے اور ایک باخبر سے بڑھ کر تمہیں کوئی دوسرا خبر نہیں دے سکتا)۔ ظاہر ہے کہ یہاں 'خبیر' سے مراد اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اپنی کتاب اور اپنے رسول کے واسطہ سے لوگوں کو اصل حقائق سے آگاہ فرما رہا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۤ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا (۶۰)

اسم رحمان پر قریش کا اعتراض اور اس کا جواب

یعنی اس کائنات کے خالق کی سب سے بڑی صفت تو رحمان ہے لیکن ان نادانوں کا حال یہ ہے کہ جب ان کو خدائے رحمان کو سجدہ اور اس کی عبادت کی دعوت دی جاتی ہے تو بڑی رعونت کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ یہ رحمان کیا چیز ہے؟ کیا ہم ہر اس چیز کو سجدہ کریں جس کا تم ہمیں حکم دیتے ہو؟ 'وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا' یعنی بجائے اس کے کہ مطلوب حقیقی کی طرف رہنمائی سے وہ خوش ہوں اور صدق دل سے اس کی قدر کریں، یہ چیز ان کی نفرت اور بیزاری کو بڑھاتی ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱۰ کے تحت ہم تفصیل کے ساتھ یہ بیان کر چکے ہیں کہ اہل عرب اگرچہ خدا کے لیے اسم رحمان سے ناواقف نہیں تھے، ان کے لٹریچر میں اللہ اور رحمان دونوں نام ملتے ہیں لیکن اسم رحمان زیادہ معروف اہل کتاب کے ہاں تھا، مشرکین عرب زیادہ تر اسم اللہ ہی بولتے تھے۔ قریش کے لیڈروں نے اس چیز کو بھی قرآن کے خلاف اپنی قوم کو بھڑکانے کا ایک بہانہ بنا لیا۔ پیچھے گزر چکا ہے کہ انھوں نے قرآن کے خلاف یہ بدگمانی پیدا کرنے کی بھی کوشش کی تھی کہ اس کی تصنیف میں بعض علمائے اہل کتاب بھی شریک سازش ہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ لفظ رحمان پیش کرتے کہ دیکھو اس کتاب میں لفظ 'رحمان' بار بار آتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کچھ اہل کتاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پردے میں ہمارے

اور اپنے دینی تصورات کو مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ بدگمانی کی فضا میں اس طرح کے شگوفے عوام کو بھڑکانے کے لیے بڑے کارگر ہوتے ہیں۔ اس سے قومی اور مذہبی دونوں ہی قسم کے جذبات میں اشتعال پیدا ہوتا ہے چنانچہ بہت سے جاہلوں کے اندر اسم رحمان کے خلاف ایک شدید قسم کی عصبیت و نفرت پیدا ہو گئی۔ قرآن نے ان کی اس حماقت پر سورۂ بنی اسرائیل میں بھی توجہ دلائی ہے اور یہاں بھی کہ یہ نام تمہارے لیے بے شمار برکتوں اور رحمتوں کا خزانہ ہے۔ دوسروں کی ضد میں اپنے کو اس بابرکت نام کی برکتوں سے کیوں محروم کرتے ہو!

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (۶۱-۶۲)

اصل ضرورت نشانیوں کی نہیں بلکہ نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے ارادہ کی ہے

اوپر کی آیات التفات کے بعد یہ آخر میں پھر آیات آفاق کی طرف توجہ دلائی کہ جہاں تک نشانیوں کا تعلق ہے ان کی کمی نہیں ہے۔ ضرورت کسی نئی نشانی کی نہیں بلکہ نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے جذبے اور ارادے کی ہے۔ جن کے اندر یہ جذبہ اور ارادہ نہیں پایا جاتا وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔

لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا۔ تذکّر عقل کا فعل ہے اور شکر دل کا۔ اللہ تعالیٰ نے عقل اور دل کو بیدار کرنے والی نشانیوں سے اس کائنات کے چپہ چپہ کو معمور کر رکھا ہے لیکن ان سے نفع اٹھانا انسان کے اپنے ارادے پر منحصر ہے اور اس ارادے کے امتحان ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اسی پر اس کے تمام شرف کا انحصار ہے اس معاملہ میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے۔

بروج سے مراد

جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا۔ بروج کی وضاحت سورۂ حجر کی آیت ۱۶ کے تحت گزر چکی ہے۔ ہمارے نزدیک اس سے وہ قلعے اور دیدبان مراد ہیں جو اس نظام کائنات میں اللہ تعالیٰ نے اس لیے بنائے ہیں کہ شیاطین جن و انس ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ ان قلعوں اور دیدبانوں میں اللہ کے کرّوبیوں کا پہرہ رہتا ہے جو استراق سمع کرنے والے شیاطین کی نگرانی کرتے ہیں۔ یہ انتظام اللہ تعالیٰ نے اس لیے فرمایا ہے کہ ملأ اعلیٰ کے حدود میں اس کے مقرب فرشتوں کے سوا کسی اور کی رسائی نہ ہو سکے۔ صرف وہی ان حدود میں داخل ہوتے ہیں اور وہی اس کی وحی اور اس کی اتاری ہوئی غیب کی خبریں اس کے نبیوں اور رسولوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس واسطہ کے سوا غیب کی باتیں معلوم کرنے کا کوئی اور واسطہ نہیں ہے اس وجہ سے غیب دانی کے دوسرے مدعی خواہ وہ کاہن و منجم ہوں یا کوئی اور یہ سب جھوٹے ہیں ـــ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس انتظام کا ذکر بھی اللہ تعالیٰ نے تبارک کی اسی تمہید سے فرمایا ہے جس سے سورہ کا آغاز فرمایا ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یکسر خیر و برکت

ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ وحی کے چشمۂ صافی کو ہر قسم کی شیطانی دراندازیوں سے بالکل محفوظ رکھے اس لیے کہ روح اور دل کی زندگی اور دنیا و آخرت کی تمام صلاح و فلاح کا انحصار اسی پر ہے۔ یہاں ان اشارات پر اکتفا فرمائیے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ان شاء اللہ آخری گروپ کی سورتوں میں آئے گی۔

'خِلْفَۃً' کا مفہوم وہی ہے جو قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں 'اختلاف اللیل والنہار' کے الفاظ سے تعبیر ہوا ہے یعنی رات اور دن کی ایک دوسرے کے پیچھے گردش۔ یہ گردش جن حقائق کی یاددہانی کرتی ہے ان کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۶۳-۷۷

خاتمۂ سورہ آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کے اوصاف گنائے ہیں جن کی عقل و دل کی صلاحیتیں زندہ ہیں اور وہ اس کی نشانیوں اور اس کی نازل کی ہوئی کتاب سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ تصویر ان لوگوں کی ہے جو آگے بڑھ کر قرآن پر ایمان لانے والے بنے اور اسی تصویر سے ان لوگوں کا ظاہر و باطن بھی بالکل بے نقاب ہو گیا ہے جو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۳-۷۷ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ
الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ
قِيَامًا ﴿۶۴﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ
اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾
وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ
قَوَامًا ﴿۶۷﴾ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ
النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ
ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ
فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ

يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۰﴾ وَ
مَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَ
الَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ وَ
الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ
وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا
صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۙ ﴿۷۵﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ
مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ
كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ ع

ترجمۂ آیات ۶۳-۷۷

اور خدائے رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے الجھتے ہیں تو وہ ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور جو راتیں اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام میں گزارتے ہیں اور جو دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔ بے شک اس کا عذاب بالکل چمٹ جانے والی چیز ہے۔ بے شک وہ نہایت ہی برا مستقر اور نہایت ہی برا مقام ہے۔ ۶۳-۶۶

اور جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے اور نہ تنگی اور اس کے درمیان کی معتدل راہ اختیار کرتے ہیں۔ ۶۷

اور جو نہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارتے اور نہ اس جان کو جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا بغیر کسی حق کے قتل کرتے اور نہ بدکاری کرتے اور جو کوئی ان باتوں کا مرتکب

ہوگا وہ اپنے گناہوں کے انجام سے دوچار ہوگا۔ قیامت کے دن اس کے عذاب میں درجہ بدرجہ اضافہ کیا جائے گا اور وہ اس میں خوار ہو کر ہمیشہ رہے گا۔ مگر وہ جو توبہ کر لیں گے، ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے تو اللہ ان کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ اور جو توبہ کرتا ہے اور عمل صالح اختیار کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ کی طرف لوٹتا ہے۔ ۶۸-۷۱

اور جو کسی باطل میں شریک نہیں ہوتے اور اگر کسی بے ہودہ چیز پر سے ان کا گزر ہوتا ہے تو وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو ان کے رب کی آیات کے ذریعہ سے یاددہانی کی جاتی ہے تو ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے۔ اور جو دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی جانب سے آنکھوں کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیزگاروں کا سربراہ بنا۔ ۷۲-۷۴

یہ لوگ ہیں کہ ان کو ان کی ثابت قدمی کے صلے میں بالاخانے ملیں گے اور ان میں ان کا خیر مقدم تحیت و سلام کے ساتھ ہوگا۔ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ خوب ہوگا وہ مستقر اور مقام۔ ۷۵-۷۶

کہہ دو کہ میرے رب کو تمہاری کیا پروا ہے اگر تمہیں دعوت دینا مدِ نظر نہ ہوتا! سو تم نے اس کی تکذیب کر دی تو وہ چیز عنقریب لازم ہو کر رہے گی۔ ۷۷

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۶۳)

'ھَوْنٌ' اور 'سَلٰمٌ' کا مفہوم

'ھَوْنٌ' کے معنی خاکساری اور فروتنی کے ہیں اور 'سَلٰمٌ' جس طرح خیر مقدم کے مواقع کے لیے ہے اسی طرح ان مواقع کے لیے بھی ہے جب کسی سے خوبصورتی اور شائستگی کے ساتھ علیحدہ ہونا اور اس سے پیچھا چھڑانا مقصود ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزر سے علیحدہ ہوتے وقت جو سلام کیا وہ اسی طرح کا سلام تھا۔

[illegible] عباد الرحمٰن کا بیان

اوپر کی آیات میں ان متمردین کا ذکر گزر چکا ہے جو کبر و غرور کے نشہ میں نہ کسی بات کو سننے کے لیے تیار تھے نہ سمجھنے کے لیے، یہاں تک کہ ان کے لیے خدا کا محبوب نام 'رحمان' بھی ایک چِڑ بن کر رہ گیا تھا، وہ اس کے سننے کے بھی روادار نہ تھے۔ اب ان کے مقابل میں یہ 'عباد الرحمان' کی خصوصیات بیان ہوئی ہیں جن سے مقصود ایک طرف تو متمردینِ قریش کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھ دینا ہے جو ان کے آگے انسانیت کے اصلی حسن و جمال کو بے نقاب کر دے تاکہ اس طرح ان پر بھی ان کے ظاہری و باطنی عیوب اچھی طرح واضح ہو جائیں اور مسلمانوں پر بھی نہایت عمدہ پیرائے میں واضح ہو جائے کہ خدائے رحمان کے بندوں کو اس دنیا میں کیا روش اختیار کرنی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر و باطن کو کن محاسن سے آراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔

اکڑنا شیطان کی سنت ہے

یہاں موقع کلام کے تقاضے سے سب سے پہلے جس صفت کا حوالہ دیا ہے وہ فروتنی و خاکساری ہے۔ فرمایا کہ ہمارے یہ بندے زمین میں اکڑتے اور اتراتے نہیں بلکہ نہایت تواضع کے ساتھ چلتے ہیں۔ یہ چلنے میں خاکساری ان کے باطن کے ایک عکس کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہے۔ اصل مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کے دلوں پر خدا کی عظمت و کبریائی کی ایسی ہیبت طاری رہتی ہے کہ یہ چیز ان کے ہر اس قدم سے نمایاں ہوتی ہے جو وہ زمین پر رکھتے ہیں۔ انسان کے اندر استکبار ہو تو یوں تو وہ اس کی ہر حرکت سے نمایاں ہوتا ہے لیکن اس کی چال خاص طور پر اس کا مظہر ہوتی ہے اس وجہ سے یہاں خاص طور پر اس کا حوالہ دیا۔ مقصود در اصل، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی ہے کہ ان کے دل استکبار سے پاک ہیں، استکبار کی حقیقت حق کے آگے اکڑنا ہے۔ اگر ایک شخص ہر حق کے آگے، خواہ وہ بڑا ہو چھوٹا، سرِ تسلیم خم کر دے تو وہ عباد الرحمٰن میں شامل ہے اگرچہ وہ حق کی حمیت و حمایت میں سینہ تان کر اور سر اونچا کر کے چلے اور اگر وہ حق کے آگے سرکشی کرے تو وہ اولیائے شیطان میں سے ہے اگرچہ وہ اپنی چال میں مصنوعی طور پر کتنی ہی مسکینی پیدا کر لے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ استکبار ابلیس کی سنت ہے اور یہ وہ لَس کی گانٹھ ہے جس کے ہوتے آدمی کے اندر کسی نیکی کا نشوونما پانا ناممکن ہے۔

بدتمیزوں سے الجھنا عباد الرحمٰن کی شان کے خلاف ہے

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا۔ 'مُخَاطَبَةٌ' یہاں اُلجھنے کے مفہوم میں ہے۔ یعنی جب اس طرح کے اُجڈ اور بدتمیز لوگ، جن کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر پھبتیاں اوپر مذکور ہوئی ہیں، ان سے الجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کو اپنے تمسخر و استہزاء کا ہدف بناتے ہیں تو وہ سنتِ ابراہیمی پر عمل کرتے ہیں، ان سے الجھنے کے بجائے ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ 'سلام'، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، کسی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا ایک شائستہ اور بابرکت طریقہ ہے۔ اس طرح اگر کسی سے علیحدگی اختیار کی جاتی ہے تو توقع ہے کہ اس کے اندر خیر کی کوئی رمق ہو گی تو وہ اپنے رویہ پر نظرِ ثانی کرے گا اور الجھنے الجھانے کے بجائے بات سننے اور سمجھنے کی طرف مائل ہو گا اور اگر کسی کے

اندر خیر کی کوئی رمق ہی نہیں ہے اور وہ محض مجادلہ و مناظرہ کے درپے ہے تو ایسے شخص کو منہ لگانا عباد الرحمٰن کے شایانِ شان نہیں ہے۔ یہ مضمون سورۂ قصص کی آیت ۵۵ میں وضاحت سے آئے گا۔

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (۶۴-۶۶)

عباد الرحمٰن کی خلوت کی زندگی

اوپر کی آیت میں ان کی جلوت کی زندگی کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس آیت میں ان کی خلوت کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فرمایا کہ وہ اپنی راتیں اپنے رب کے آگے سجود و قیام میں گزارتے ہیں۔ سُجَّدًا وَّقِيَامًا کے اسلوب بیان سے جو شوق و اضطراب نمایاں ہو رہا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے صرف فرض نمازیں مراد نہیں ہیں بلکہ یہ تہجد کے سجود و قیام کی شب بیداریوں اور بے قراریوں کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی راتیں نہ عیش کدوں میں گزارتے اور نہ نرم و گرم بستروں میں، دنیا و عاقبت سے بے فکر ہو کر سوتے بلکہ راتوں میں اٹھ اٹھ کر عذابِ جہنم سے بچائے جانے کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔

إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا۔ غرام، لازم ہو جانے والی اور چمٹ جانے والی چیز کو کہتے ہیں۔ یہ ٹکڑا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اس اندیشے کی تائید و تصدیق کے طور پر ہے جس کے باعث وہ اپنی راتیں اس بے چینی و بے قراری میں گزارتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس طرح عذابِ جہنم سے پناہ مانگتے ہیں تو یہ بالکل صحیح اور نہایت عاقبت اندیشانہ کام کر رہے ہیں اس لیے کہ عذابِ جہنم ایک ایسی چمٹ جانے والی چیز ہے کہ اس سے پیچھا چھڑانا ناممکن ہو گا۔ اس سے بچنے کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا ہے اسی زندگی میں کیا جا سکتا ہے اور صرف خدا ہی کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔

إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۔ 'مُسْتَقَرّ' اور 'مُقَام' یوں تو ہم معنی الفاظ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتے ہیں لیکن جب یہ دونوں ایک ساتھ استعمال ہوں تو ان کے درمیان کچھ فرق ہو جاتا ہے۔ میں ان کے مواقعِ استعمال پر غور کرنے سے جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ 'مُسْتَقَرّ' میں مستقل قیام گاہ کا مفہوم پایا جاتا ہے اور 'مقام' عارضی جائے قیام کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہنم ایک ایسی ہولناک جگہ ہے کہ مستقل مستقر کی حیثیت سے تو درکنار ایک عارضی منزل کی حیثیت سے بھی وہ گوارا کیے جانے کے قابل نہیں ہے حالانکہ کوئی بری سے بری جگہ بھی ایسی ہو سکتی ہے کہ کسی پہلو سے وہ وقتی طور پر گوارا کی جا سکے۔

وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (۶۷)

انفاق کے لیے اہتمام

یہ ان کے اس اہتمام کی طرف اشارہ ہے جو ان کے اندر انفاق فی سبیل اللہ کے لیے پایا جاتا ہے۔ فرمایا کہ جب وہ اپنی ضروریات پر خرچ کرتے ہیں تو اس میں احتیاط و کفایت شعاری ملحوظ رکھتے ہیں۔ نہ وہ اس میں اسراف کو راہ دیتے ہیں نہ بخالت کو۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے مال میں دوسروں کے بھی حقوق ہیں۔ اس وجہ سے وہ اپنی ضروریات کو ان کے حدود سے متجاوز نہیں ہونے دیتے تاکہ دوسروں کے حقوق ادا کر سکیں۔

اگرچہ متوسط درجہ کی زندگی کے لیے کوئی ایک معین معیار مقرر کرنا مشکل ہے۔ اس میں حالات کے تغیر کے اعتبار سے فرق ہو سکتا ہے لیکن یہ فرق اتنا باریک نہیں ہے کہ ایک عام آدمی اس کو معلوم نہ کر سکے۔ اپنی قوم اور اپنے معاشرے کے معیار کو سامنے رکھ کر ہر صاحب مال اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا کیا معیار رکھے کہ اپنے دوسرے غریب بھائیوں اور اپنے دین کی بھی خدمت کر سکے۔ اس معاملہ میں سلف صالحین نے ہمارے لیے جو نمونہ چھوڑا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کو الاؤنس دینے کے بجائے آدمی کا غالب رجحان دوسرے پہلو کی طرف رہنا چاہیے یعنی وہ اپنا معیار زندگی اونچا کرنے کے خبط میں مبتلا ہونے کے بجائے زیادہ سے زیادہ انفاق فی سبیل اللہ کرے۔ اس راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا بھی اسراف نہیں ہے۔ رہے وہ لوگ جو معیار زندگی اونچا کرنے کی دُھن میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو وہ شیطان کے بھائی بن جاتے ہیں اور ان کو کبھی خدا اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ جس معاشرے میں یہ بیماری عام ہو جاتی ہے بالآخر اس پر اشتراکیت کا عذاب مسلط ہو کر رہتا ہے۔

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا (۶۸)

'اَثَام' کے معنی جوہری نے نتیجۂ گناہ کے لیے ہیں۔ یہ اسی طرح کا استعمال ہے جس طرح کوئی فعل یا اسم لاتے ہیں اور مقصود اس سے اس کا ثمرہ و نتیجہ ہوتا ہے۔ 'فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا' میں بھی یہی اسلوب ملحوظ ہے۔ فرمایا کہ نہ وہ اپنے رب کا کسی کو شریک ٹھہراتے اور نہ کسی جان کو ناحق قتل کرتے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے۔ 'النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ' میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جان کو محترم ٹھہرایا ہے اور اس پر تعدّی حرام ہے الا آنکہ وہ کسی ایسے جرم کا ارتکاب کرے جس کے نتیجہ میں وہ قانونِ الٰہی کی اس حفاظت سے محروم ہو جائے۔ یہ تینوں جرائم — شرک، قتل اور زنا — حقوق اللہ اور حقوق العباد کے سلسلہ کے سب سے بڑے جرائم میں سے ہیں۔ اس بات پر تمام آسمانی مذاہب کا اتفاق ہے۔ فرمایا کہ خدائے رحمان کے بندے ان جرائم کے پاس نہیں پھٹکتے۔ جو لوگ ان کے مرتکب ہو رہے ہیں یاد رکھیں کہ وہ ان کے انجام سے لازماً دوچار ہوں گے۔

جزا ہے جنسِ عمل

يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا (۶۹)

'مُضَاعَفَة' کے معنی کسی شے پر اضافہ کرنے کے ہیں، عام اس سے کہ یہ اضافہ دوگنا ہو یا اس سے زیادہ۔ اور استعمالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر تدریجی اضافہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے جس طرح 'لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً' میں ہے۔

یہ اسی نتیجۂ جرائم کا بیان ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا۔ فرمایا کہ جو لوگ ان جرائم میں سے کسی جرم کے مرتکب ہوں گے وہ قیامت میں ان کی سزا اس طرح بھگتیں گے کہ بالتدریج ان کی سزا میں اضافہ

کما ہوتا جائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ کچھ سزا بھگت کر وہ چھوٹ جائیں یا آہستہ آہستہ ان کی سزا میں کچھ تخفیف ہو جائے بلکہ وہ نہایت ذلت کی حالت میں اس عذاب میں ہمیشہ مبتلا رہیں گے۔ عذاب پر ذلت کے اضافہ نے اس کی سنگینی دوچند کر دی ہے۔ عذاب ایسا بھی ہو سکتا ہے جو عذاب تو ہو لیکن اس میں ذلت نہ ہو لیکن اس عذاب میں ذلت کی مار بھی ہوگی۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ باتیں قریش کے متکبرین کو سنائی جا رہی ہیں اور استکبار کی اصل سزا دلمی ذلت ہی ہے۔

إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ○ وَمَن تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا (۷۰-۷۱)

توبہ کے اثرات

فرمایا کہ اس نتائج اعمال کے عذاب سے صرف وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو توبہ و اصلاح کر کے ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کر لیں گے۔ توبہ کے شرائط و آداب پر ہم نساء ۱۷-۱۸ کے تحت مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔ 'يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ' کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ توبہ کر کے ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں ان کی نیکیاں ان کے اعمال نامے کے پچھلے گناہوں کو محو کر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی جگہ پر ان کی نیکیوں کو رکھ دیتا ہے جو ان کے گناہوں کو ڈھانک لیتی ہیں۔

توبہ کرنے والوں کے لیے عظیم بشارت

'وَمَن تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا'۔ یہ ٹکڑا بالکل 'وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا' کے مقابل میں ہے اور اس میں توبہ کرنے والوں کے لیے عظیم بشارت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے گناہوں کے ساتھ ہی مریں گے وہ تو بہر حال اپنے گناہوں سے دوچار ہوں گے لیکن جو توبہ کر لیں گے وہ نہایت سرخروئی کے ساتھ اپنے رب کی طرف لوٹیں گے۔ 'مَتَابًا' کی تاکید تفخیم شان کے لیے ہے یعنی یہ لوٹنا نہایت عزت و شان کا ہوگا۔ سیدنا مسیحؑ نے کھوئی ہوئی بھیڑ والی تمثیل میں نہایت بلاغت سے یہ بات سمجھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے توبہ کرنے والے بندے کی توبہ سے کس قدر خوش ہوتا ہے اور اس کو اپنے کس درجے کے فضل و کرم سے نوازتا ہے۔ وہی بات اس آیت سے واضح ہو رہی ہے۔

اس میں توبہ کے لیے حوصلہ افزائی کا یہ پہلو بھی ہے کہ بسا اوقات آدمی گناہ کی زندگی چھوڑنے سے اس وجہ سے گھبراتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے یہ زندگی چھوڑ دی تو اسے اپنے لیے ایک نیا ماحول تلاش کرنا پڑے گا جو ایک نہایت مشکل کام ہے۔ یہ آیت ایسے لوگوں کو تسلی دیتی ہے کہ جو لوگ برائی اور برے ماحول کو چھوڑتے ہیں ان کو اللہ کی معیت اور سرپرستی حاصل ہوتی ہے اور جن کو یہ چیز حاصل ہو وہ ہر چیز سے مستغنی ہیں۔

وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا (۷۲)

لغویات سے احتراز

'زُورٌ' کذب و باطل کو کہتے ہیں اور 'لَغْوٌ' سے مراد وہ باتیں اور کام ہیں جو ثقہ و سنجیدہ لوگوں کے شایان شان نہ ہوں۔ فرمایا کہ ہمارے یہ بندے کسی باطل کام میں شریک نہیں ہوتے اور اگر کسی لغو چیز

کے پاس سے گزرنا ہی پڑ جائے تو نہایت وقار و شرافت سے وہاں سے گزر جاتے ہیں جس طرح ایک گندی جگہ سے ایک صفائی پسند آدمی گزر جاتا ہے۔ سورۂ قصص آیت ۵۵ میں یہی بات یوں بیان ہوئی ہے۔ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ (اور جب وہ لغو باتیں سنتے ہیں تو ان سے اعراض کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے ساتھ تمہارے اعمال، ہمارا سلام لو، ہم جاہلوں سے الجھنا نہیں چاہتے)

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۷۳)

قرآن کے مخالفین پر تعریض

اس آیت میں اللہ کے ان بندوں کی تعریف بھی ہے اور ساتھ ہی اس میں قرآن کے ان اندھے بہرے مخالفین پر تعریض بھی جو قرآن کو محض اعتراض و نکتہ چینی کے لیے سنتے تھے۔ فرمایا کہ ہمارے ان بندوں کو قرآن کے ذریعہ سے جب تعلیم و تذکیر کی جاتی ہے تو وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کی مخالفت کے لیے اس پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے۔ یہ مضمون سورۂ جن آیت ۱۹ اور معارج آیات ۳۶-۳۷ میں تفصیل سے آئے گا۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (۷۴)

اہل و عیال کی عاقبت کی فکر

یہ لوگ اپنی عاقبت کی فکر کے ساتھ اپنے اہل و عیال اور اپنی آل اولاد کی عاقبت کی بھی برابر فکر رکھتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ، ہر شخص اپنے اہل و عیال کا چرواہا بنایا گیا ہے اور قیامت کے روز ہر شخص سے اس کے گلہ کے خیر و شر سے متعلق پرسش ہونی ہے۔ اس ذمہ داری کا کماحقہٗ احساس رکھنے کی وجہ سے وہ اپنے اہل و عیال کے اندر ان لاابالی لوگوں کی طرح زندگی نہیں گزارتے جن کو صرف اپنے عیش دنیا کی فکر ہوتی ہے، اس امر سے انھیں کوئی بحث نہیں ہوتی کہ ان کے اہل و عیال نیکی کی راہ پر چل رہے ہیں یا بدی کی۔ ان لوگوں کے لاابالی پن کا ذکر سورۂ قیامہ اور سورۂ مطففین میں آئے گا۔ اللہ کے بندوں کا حال اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ان کو دنیا سے زیادہ اپنے متعلقین کی آخرت کی فکر رہتی ہے کہ ان میں سے کوئی شیطان کی راہ نہ اختیار کرے۔ سورۂ طور کی آیت اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ (۲۶) (اور ہم اس سے پہلے اپنے اہل و عیال میں ڈرتے رہنے والے تھے) میں ان کے اسی فکر و اندیشہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس اندیشے کی وجہ سے وہ برابر اپنے رب سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے رب! ہم کو ہمارے اہل و عیال کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب کر، ان کے اعمال و اخلاق تیری پسند اور ہماری تمناؤں کے مطابق ہوں اور ہم اس دنیا میں صالحین و متقین کے سربراہ ہوں اور آخرت میں بھی صالحین و متقین کے سربراہ کی حیثیت سے اٹھیں، فساق و فجار کے امام کی حیثیت سے نہ اٹھیں۔

ہم نے اس آیت کی جو تاویل کی ہے اس سے یہ بات واضح ہے کہ یہ قیادت و سیادت کے حصول کی

دعا نہیں ہے بلکہ ہر صاحب کنبہ کو بالفعل جو سیادت حاصل ہوتی ہے اس کی ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کی دعا ہے۔ اس آیت کی تفسیر ہم نے اپنی کتاب 'توضیحات' میں بھی لکھی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ۝ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا (۷۵-۷۶)

تواضع کا صلہ جنت کا عالی مقام

فرمایا کہ یہ لوگ جو مذکورہ بالا صفات سے متصف ہیں اپنے ان اوصاف و اعمال کے صلے میں جنت کے بالاخانے پائیں گے۔ انھوں نے دنیا میں تواضع اور فروتنی کی زندگی گزاری اس وجہ سے یہ جنت کی عالی مقامی کے سزاوار ہوں گے۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا ہے 'مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے'۔

'بِمَا صَبَرُوا' سے یہ بات واضح ہوئی کہ ان اوصاف کا پیدا کرنا اور ان کو برقرار رکھنا کوئی سہل بازی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے بڑے صبر و استقامت کی ضرورت ہے۔ 'وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا' یعنی جو لوگ اس امتحان صبر میں پورے اتر جائیں گے وہ بے شک اس بات کے سزاوار ہوں گے کہ خدا کے فرشتے مبارک سلامت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کریں۔

'حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا' اوپر دوزخ کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کے مقابل میں یہ الفاظ جنت کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مستقر ہونے کی حیثیت سے بھی خوب ہے اور مقام ہونے کے اعتبار سے بھی خوب ہے!

قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ ۖ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا (۷۷)

مخالفین کو دھمکی

یہ آخر میں مخالفین کو دھمکی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ ان لوگوں کو آگاہ کر دو کہ میں جو تمھارے پیچھے اس طرح پڑا ہوا ہوں تو اس وجہ سے نہیں کہ تمھارے بغیر خدا کا کوئی کام بند ہے یا بند ہو جائے گا۔ میرے رب کو تمھاری یا کسی کی کیا پروا ہو سکتی ہے! مقصود صرف تمھیں حق کی دعوت دینا ہے اور اس میں فائدہ سر تا سر تمھارا ہی ہے نہ کہ میرا اور میرے رب کا۔ اب اگر تم نے اس دعوت کو جھٹلا دیا ہے تو اس کا جو انجام ہے اس کے لیے تیار رہو، وہ لازمی ہے۔ عنقریب اس سے سابقہ پیش آکے رہے گا۔ یہاں اس سنت الٰہی کو یاد رکھیے جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھی ہے۔

بتوفیق ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

رحمان آباد ـــ ۳۰ر نومبر ۱۹۷۳ء

تدبرِ قرآن

۲۶

الشعراء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ — سورۂ فرقان — کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اس میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا اثبات ہے لیکن نہج استدلال اور اسلوب بیان اس کا سابق سورہ سے مختلف ہے۔

سابق سورہ میں جن انبیائے کرام کی سرگزشتوں کی طرف اجمالی اشارہ فرمایا گیا تھا اس میں ان کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قریش کاہن اور شاعر ہونے کا جو الزام لگاتے تھے اس میں اس الزام کی خاص طور پر تردید فرمائی ہے۔

اس میں ہر پیرے کے بعد آیات اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ۚ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۔ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ بطور ترجیع آٹھ بار وارد ہوئی ہیں۔ اس ترجیع سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ آپ کی صداقت کے ثبوت کے لیے آپ سے کسی نشانیِ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے وہ اس میں خاص طور پر مخاطب ہیں۔ ان کو تاریخ کے حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ رسولوں اور ان کے مکذبین کی تاریخ سے سبق لیں۔ ان لوگوں کی روش کی تقلید نہ کریں جو خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال لیجیے تاکہ عمود کے ساتھ اس کے مختلف اجزا کا تعلق اور اس کا مجموعی ربط و نظام اچھی طرح واضح ہو جائے۔

(۱ - ۹) تمہید، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر قرآن کے مخالفین اس پر ایمان نہیں لا رہے ہیں، کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں تو آپ اس چیز سے پریشان نہ ہوں۔ اگر اللہ چاہے گا تو کوئی ایسی نشانی اتار دے گا جو ان سب کی گردنیں قرآن کے آگے جھکا دے گی لیکن قرآن کی صداقت کسی خارجی نشانی کی محتاج نہیں ہے۔ یہ اپنی صداقت کی دلیل خود اپنے اندر ہی رکھتا ہے۔ اگر یہ لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں تو جن خطرات سے

قرآن ان کو آگاہ کر رہا ہے وہ سب ایک ایک کرکے پیش آکر رہیں گے۔ اس کائنات میں نشانیوں کی کمی نہیں ہے لیکن جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کے لیے کوئی نشانی کارگر نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کو خدا جب چاہے پکڑ سکتا ہے وہ عزیز و غالب ہے، کوئی اس کے ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتا لیکن وہ نہایت رحیم بھی ہے اس وجہ سے لوگوں کی سرکشی کے باوجود ان کو مہلت دیتا ہے۔

(۱۰-۶۸) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت جس میں وہ واقعات اجمالاً بیان ہوئے ہیں جو فرعون کے پاس جانے کے حکم سے لے کر اس کی غرقابی تک پیش آئے۔ سرگزشت کے آخر میں انہی آیات کی ترجیع ہے جن کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔

(۶۹-۱۰۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت توحید کا حوالہ جو انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو دی۔ اسی ذیل میں ان لوگوں کے انجام کا بیان ہے جو اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کے بل پر آخرت سے بے پروا ہیں۔ آخر میں آیاتِ ترجیع ہیں۔

(۱۰۵-۱۲۲) حضرت نوحؑ کی دعوت اپنی قوم کو اور قوم کا متکبرانہ جواب اور انجام کار اس کی غرقابی۔ آخر میں آیاتِ ترجیع۔

(۱۲۳-۱۴۰) حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت اپنی قوم عاد کو۔ قوم کی طرف سے ان کی متکبرانہ تکذیب اور اس کے نتیجہ میں عذاب الٰہی کا ظہور — آخر میں آیات ترجیع۔

(۱۴۱-۱۵۹) حضرت صالحؑ کی دعوت قوم ثمود کو، قوم ثمود کی تکذیب اور اس کا انجام — آخر میں آیات ترجیع۔

(۱۶۰-۱۷۵) حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت، ان کی قوم کا رویہ اور اس کا انجام — آخر میں آیات ترجیع۔

(۱۷۶-۱۹۱) حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی دعوت کے ساتھ اہلِ مدین کا سلوک اور بالآخر ان کا حشر۔ اس سرگزشت کے آخر میں بھی انہی آیات کی ترجیع ہے جن کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔

(۱۹۲-۲۲۷) خاتمۂ سورہ جس میں تمہید کے مضمون کی پوری وضاحت فرما دی گئی ہے۔ اس کی تفصیلات تفسیر میں آئیں گی۔ یہاں اجمالاً مندرجہ ذیل امور ذہن میں رکھیے۔

(ا) قرآن کا منبع وحی الٰہی ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت روح الامین کے ذریعہ سے آنحضرتؐ پر نازل فرمایا ہے۔

(ب) اس کا عربی مبین میں نازل ہونا اہلِ عرب پر اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان ہے۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو یہ ان کی انتہائی محرومی و بدبختی ہے۔

(ج) اس کے دلائل پچھلے انبیاء کے صحیفوں میں موجود ہیں اور علمائے اہل کتاب ان سے واقف ہیں۔

(د) یہ کفار کے لیے انذار و تنبیہ ہے تاکہ مواخذہ سے پہلے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیا جائے تو جو لوگ اس کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں وہ اس کے نتائج دور تک سوچ لیں۔

(ھ) اس کو جنوں اور شیطانوں کی وحی قرار دینا محض خرد باختگی ہے۔ شیاطین جس قسم کے لوگوں پر اترتے ہیں ان کی علامات کی طرف اشارہ۔

(و) یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ قرآن اور شعر، پیغمبر اور شاعر میں امتیاز کرنے والی بعض کسوٹیوں کی طرف اشارہ۔

سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ (۲۶)

مَكِّيَّةٌ ______ اٰيَاتُهَا ۲۲۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۹
طٰسٓمٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ
اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ
اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴿۴﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ
مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ﴿۵﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْا
فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى
الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿۷﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
ع ۱ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۹﴾

ترجمۂ آیات ۱-۹
یہ طٰسٓمٓ ہے۔ یہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔ شاید تم اپنے آپ کو اس فکر میں ہلاک کر کے رہو گے کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں بنتے! اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی نشانی اتار دیں پس ان کی گردنیں اس کے آگے جھکی ہی رہ جائیں۔ اور ان کے پاس خدائے رحمان کی طرف سے جو تازہ یاد دہانی بھی آتی ہے یہ اس سے اعراض کرنے والے ہی بنے رہتے ہیں۔ سو انھوں نے جھٹلا دیا تو جس چیز کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں اب اس کی تنبیہات ان کے آگے

ظاہر ہوں گی۔ ۱-۶

کیا انھوں نے زمین کی طرف نگاہ نہیں کی! ہم نے اس میں کتنی نوع بنوع کی فیض بخش چیزیں اگا رکھی ہیں! اس میں بے شک، بہت بڑی نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اور بے شک تمہارا رب غالب بھی ہے، مہربان بھی۔ ۷-۹

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

طٰسٓمّٓ (۱)

'طٰسٓمّٓ' ہمارے نزدیک مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ ہم نے ترجمہ میں یہ محذوف کھول دیا ہے۔ یعنی یہ سورۃ 'طٰسٓمّٓ' ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۲)

آفتاب آمد دلیل آفتاب

'کتاب مبین' سے مراد ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہے جس نے نہایت فصیح و بلیغ زبان میں اپنی دعوت کے ہر پہلو کو گوناگوں اسلوبوں سے بالکل مدلل و مبرہن کر دیا ہے۔ قرآن کی اس صفت کے ذکر سے یہاں مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ آپ جو کتاب لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ اپنی صحت و صداقت کی خود سب سے بڑی دلیل ہے۔ کسی خارجی شہادت کی محتاج نہیں ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ اس کی تصدیق کے لیے کسی معجزہ یا نشانی عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کا مطالبہ درخور اعتناء نہیں ہے، آپ اس کی پروا نہ کریں۔ آفتاب اپنی دلیل خود ہوتا ہے۔ اس پر خارج سے کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۳)

دل نواز تسلی

وہی تسلی کا مضمون جو اوپر والی آیت میں مخفی تھا اس آیت میں نہایت دل نواز پیرائے میں واضح ہو گیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے کہ ان لوگوں کا اس 'کتاب مبین' پر ایمان نہ لانا آپ کے دل پر اتنا شاق ہے کہ معلوم ہوتا ہے آپ اس غم میں اپنے کو ہلاک کر کے رہیں گے حالانکہ قصور نہ آپ کا ہے نہ اس کتاب کا، سارا قصور ان لوگوں کا خود اپنا ہے کہ ایک بالکل واضح حقیقت کو جھٹلانے کے لیے مختلف قسم کے بہانے تلاش کر رہے ہیں۔ آپ کی ذمہ داری صرف تبلیغ ہے۔ اس کا حق آپ نے پورا پورا ادا کر دیا اور ادا کر رہے ہیں، پھر ایسے ناقدروں کے پیچھے آپ اپنے کو کیوں ہلکان کریں!

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (۴)

عربیت کا ایک اسلوب

آیت میں بظاہر 'خاضعین' کی جگہ 'خاضعۃ' ہونا تھا لیکن 'اعناقھم' میں مضاف الیہ کی رعایت سے 'خاضعین' آیا ہے۔ یہ عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ اس کی بعض مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں۔

پیغمبر کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے تہدید

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کے ساتھ کفار کے لیے دھمکی بھی مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے کوئی نشانی دیکھنے ہی پر اڑے ہوئے ہیں تو یاد رکھیں کہ ہمارے پاس نشانیوں کی کمی نہیں ہے۔ ہم جب چاہیں آسمان سے کوئی ایسی نشانی اتار سکتے ہیں جس کے آگے سب کی گردنیں جھک جائیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہ سوچ سمجھ کر اپنے اختیار و ارادہ سے ایمان لائیں۔ ہمارے ہاں معتبر ایمان وہی ہے جو اختیار و ارادہ کے ساتھ لایا جائے نہ کہ مجبور ہو کر۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی ہے کہ جب ایمان کے باب میں سنت الٰہی یہ ہے تو آپ ان لوگوں کے مطالبات سے پریشان کیوں ہوں، ان کے معاملے کو خدا پر چھوڑ دیں!

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۵-۶)

دوا سے مریض کی بیزاری اور اس کا انجام

یہ ذرا مختلف الفاظ میں وہی مضمون ہے جو سورۂ فرقان کی آخری آیت میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تذکیر و تعلیم کے اس سارے اہتمام سے، جو رب رحمان نے ان کے لیے کیا، مقصود یہی تھا کہ یہ لوگ سوچیں سمجھیں اور زندگی کی صحیح روش اختیار کریں لیکن ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ جتنی ہی ان کے علاج کی تدبیر کی گئی اتنی ہی دوا اور طبیب سے ان کی نفرت بڑھتی گئی۔ اللہ نے تازہ بتازہ، نو بنو اسلوبوں سے ان کو یاددہانی کی لیکن وہ اعراض کرنے والے ہی بنے رہے اور قرآن و رسول دونوں کا انھوں نے مذاق اڑایا۔ ان کی اس روش کے بعد اب ان کے لیے اس کے سوا کوئی چیز بھی باقی نہیں رہ گئی ہے کہ جس قرآن کا انھوں نے اب تک مذاق اڑایا ہے، اس نے جن نتائج سے ان کو خبردار کیا ہے وہ ایک ایک کر کے ان کے سامنے آئیں۔ چنانچہ وہ ان کے سامنے آئیں گے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ (۷)

'زوج' کے معنی قسم اور نوع کے ہیں۔ 'من کل زوج' یعنی نوع بنوع چیزیں۔ 'کریم' یہاں فیض بخش اور منفعت رساں کے مفہوم میں ہے۔ اہل عرب انگور کو 'کرم' کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نام انھوں نے انگور کی غایت درجہ منفعت رسانی ہی کی وجہ سے رکھا۔

زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ

آیت کا مطلب یہ ہے کہ آخر یہ لوگ آسمان سے اترنے والی کسی نشانی عذاب ہی کے منتظر کیوں ہیں؟ اس زمین پر پھیلی ہوئی ان گوناگوں نعمتوں کو کیوں نہیں دیکھتے جن کو رب رحیم و کریم نے اسی لیے پیدا کیا ہے کہ لوگ ان سے فائدہ بھی اٹھائیں اور بصیرت و یاددہانی بھی حاصل کریں!

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ۚ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ (۸-۹)

یعنی اگر یہ کسی نشانی ہی کے طالب ہیں تو اس سے بڑی نشانی اور کیا چاہیے! یہاں ان تمام دلائلِ توحید و قیامت و جزا کو ذہن میں مستحضر کر لیجیے جو قرآن میں تفصیل سے مذکور ہوئے ہیں اور جن کی شہادت میں قرآن نے زمین کی انہی نعمتوں اور برکتوں کا حوالہ دیا ہے۔ آگے سورۂ لقمان کی آیت ۱۰ اور سورۂ سجدہ کی آیت ۲۷ کے تحت اس مضمون کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔

'وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ' یعنی یہ بات نہیں ہے کہ نشانیوں کی کمی ہے۔ نشانیوں سے تو اس زمین کا چپہ چپہ معمور ہے لیکن جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کا کیا علاج!

صفتِ عزیز و رحیم کی سنت پہلو

'وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ' یہ وہی اوپر والی بات اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کی روشنی میں واضح فرمائی ہے کہ تمھارا خداوند عزیز بھی ہے اور ساتھ ہی رحیم بھی۔ 'عَزِیْزٌ' یعنی غالب، وہ جو چاہے کر سکتا ہے کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ اگر وہ ان پر فوراً کوئی عذاب نازل کر دے تو کوئی اس کی پکڑ سے ان کو بچا نہ سکے گا لیکن وہ رحیم بھی ہے اس وجہ سے عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں کرتا کہ جو لوگ توبہ اور اصلاح کرنی چاہیں وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر لیں اور اس کی رحمت کے سزاوار بن جائیں۔ یہاں مبتدا کے اعادہ سے مقصود خاص طور پر ان صفات پر زور دینا اور لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرنا ہے اس لیے کہ خدا کی ان صفات کو مستحضر نہ رکھنے ہی کے باعث نادانوں کو یہ مغالطہ پیش آیا کہ وہ خدا کی ڈھیل کو اپنے رویہ کی صحت و صداقت کی دلیل سمجھ بیٹھے اور نہایت غرور کے ساتھ ان لوگوں کا مذاق اڑایا جنھوں نے ان کو اصلاح کی دعوت دی ــــــ یہ آیات اس سورہ میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بار بار آئیں گی اس وجہ سے ان کے مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے تاکہ آگے اس کے اعادے کی ضرورت نہ پیش آئے۔

۲- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۰-۶۸

حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت کا بیان

آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی وہ سرگزشت جس کی طرف پچھلی سورہ میں اجمالی اشارہ فرمایا گیا تھا، تفصیل کے ساتھ آ رہی ہے۔ یہ سرگزشت اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا ہے اور پھر فرعون اور اس کی فوج کی غرقابی پر ختم ہوتی ہے۔ اس دور کے تمام اہم واقعات کی طرف اس میں اشارے ہیں۔ یوں تو اس سرگزشت کا ہر حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے لیے بھی سرمایۂ تسکین و تسلی اور آپؐ کے مخالفین کے لیے سبق آموز ہے لیکن سورہ کے عمود کے پہلو سے خاص چیز جو اس میں قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ اغراض و شہوات کے غلام بن کر اپنے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ضائع کر بیٹھتے ہیں ان پر کوئی بڑے سے

بڑا معجزہ بھی کچھ کارگر نہیں ہوتا۔ ان کی آنکھیں صرف اس وقت کھلتی ہیں جب ان کا انجام ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰-۶۸

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ
اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾
وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ
لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ
اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالَ
اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾
وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ
فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ
فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَتِلْكَ
نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ
وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ
اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ
رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ
اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا
بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰـهًا غَيْرِيْ
لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ

مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَلْقٰى
عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ
بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ ع ۲
عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا
تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ
حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ
لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾
لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا جَآءَ
السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ
الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ
لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ
عِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلْقٰى
مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ
سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَ
هٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ
الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ
وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾ قَالُوْا
لَا ضَيْرَ ۫ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا

خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥١﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ ع ۳ ۱۸
اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿٥٢﴾ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِى الْمَدَآئِنِ
حٰشِرِيْنَ ﴿٥٣﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿٥٤﴾ وَاِنَّهُمْ لَنَا
لَغَآئِظُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿٥٦﴾ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ
جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿٥٧﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿٥٨﴾ كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿٥٩﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ
قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ
سَيَهْدِيْنِ ﴿٦٢﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ
الْبَحْرَ ۭ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿٦٣﴾ وَاَزْلَفْنَا
ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿٦٤﴾ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿٦٥﴾ ثُمَّ
اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿٦٦﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٦٧﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٦٨﴾ ع ۱۷ ۸

ترجمۂ آیات ۱۰-۶۸

اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ کو کہ ظالم قوم ـــ قوم فرعون ـــ کے پاس جاؤ، کیا وہ ڈریں گے نہیں! اس نے کہا، اے میرے رب! مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ بھنچتا ہے اور میری زبان رواں نہیں ہے تو ہارون کے پاس پیغام بھیج اور ان کے ایک گناہ کا بار بھی میرے اوپر ہے تو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ ۱۰-۱۴

فرمایا، ہرگز نہیں! پس تم دونوں ہماری نشانیوں کے ساتھ جاؤ، ہم تمہارے ساتھ

سننے والے ہیں۔ تو فرعون کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم خداوند عالم کے رسول ہیں کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے۔ اس نے کہا، کیا ہم نے تم کو بچپن میں اپنے اندر پالا نہیں؟ اور تم نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے اندر بسر کیے اور تم نے اپنی وہ حرکت کی جو کی اور تم ناشکروں میں سے ہو! ۱۵-۱۹

موسیٰ نے جواب دیا کہ میں نے یہ اس وقت کیا اور میں خطا واروں میں سے تھا تو جب مجھے تم لوگوں سے اندیشہ ہوا تو میں تم سے بھاگا۔ پھر میرے رب نے مجھے قوتِ فیصلہ عطا فرمائی اور مجھے رسولوں میں سے بنایا۔ اور یہ احسان ہے جو تم مجھے جتا رہے ہو جس کے عوض تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے! ۲۰-۲۲

فرعون نے پوچھا اور یہ رب العالمین کیا چیز ہے! اس نے جواب دیا کہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا خداوند، اگر تم لوگ یقین کرنے والے بنو! اس نے اپنے اردگرد والوں سے کہا، سنتے نہیں ہو! اس نے کہا، تمہارا بھی رب اور تمہارے اگلے آباء و اجداد کا بھی رب! فرعون نے کہا، تمہارا یہ رسول، جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، بالکل خبطی ہے۔ موسیٰ نے کہا، مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر تم عقل رکھتے ہو! وہ بولا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید کر کے رہوں گا۔ موسیٰ نے کہا کیا اس صورت میں بھی کہ جب میں تمہارے پاس کوئی واضح نشانی لے کر آیا ہوں؟ اس نے کہا، وہ پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ تو اس نے اپنا عصا ڈال دیا اور وہ دفعتہً ایک صریح اژدہا بن گیا اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچا تو وہ یکایک دیکھنے والوں کو چٹا نظر آیا۔ فرعون نے اپنے اردگرد کے درباریوں سے کہا، بے شک یہ بڑا

ہی ماہر جادوگر ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تمھیں تمھارے ملک سے نکال دے تو تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو! ۳۴-۳۵

انھوں نے کہا کہ اس کو اور اس کے بھائی کو ابھی ٹالیے اور شہروں میں ہرکارے بھیجیے جو آپ کے پاس تمام ماہر جادوگروں کو لائیں۔ تو ساحر ایک معین دن کے مقررہ وقت کے لیے جمع کیے گئے اور لوگوں کو منادی کر دی گئی کہ لوگو، جمع ہو تاکہ ہم ساحروں کا ساتھ دیں اگر وہ غالب رہنے والے ثابت ہوں۔ تو جب ساحر جمع ہوئے تو انھوں نے فرعون سے کہا، کیا ہمارے لیے کوئی صلہ بھی ہے اگر ہم ہی غالب رہنے والے ہوئے! اس نے کہا، ہاں! اور اس وقت تم مقربین میں سے بھی ہو گے۔ ۳۶-۴۲

موسیٰ نے ان سے کہا پیش کرو جو کچھ تم پیش کرنے والے ہو۔ انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں اور بولے کہ فرعون کے اقبال کی قسم، ہم ہی غالب رہنے والے ہوں گے! تو موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا تو یکایک وہ نگلنے لگا اس سوانگ کو جو وہ رچاتے تھے۔ تو ساحر بے تحاشا سجدے میں گر پڑے۔ بولے کہ ہم ایمان لائے خداوند عالم، موسیٰ اور ہارون کے رب پر۔ ۴۳-۴۸

اس نے کہا، تم نے اس کو مان لیا قبل اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں۔ بے شک وہی تمھارا گرو ہے جس نے تمھیں جادو کی تعلیم دی ہے۔ تو تم عنقریب جان لو گے! میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا اور تم سب کو سولی دوں گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ کوئی ڈر نہیں، ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹیں گے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہماری غلطیاں بخش دے گا کہ ہم پہلے ایمان لانے والے بنے۔ ۴۹-۵۱

اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی، ہمارے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ۔ بے شک تمھارا تعاقب کیا جائے گا۔ پس فرعون نے شہروں میں ہرکارے بھیجے کہ یہ لوگ مٹھی بھر ہیں اور یہ ہمیں غصہ دلا رہے ہیں اور ہم ایک مستعد جمعیت ہیں۔ ۵۲-۵۶

پس ہم نے نکالا ان کو باغوں اور چشموں سے اور خزانوں اور ایک باعزت مقام سے۔ اسی طرح ہم کرتے ہیں اور ہم نے ان چیزوں کا وارث بنایا بنی اسرائیل کو۔ ۵۷-۵۹

پس انھوں نے ان کا تعاقب کیا صبح تڑکے۔ تو جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا، ہم تو پکڑے گئے! موسیٰؑ نے کہا، ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا رب ہے وہ میری رہنمائی فرمائے گا۔ ۶۰-۶۲

پس ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنا عصا دریا پر مارو۔ پس وہ پھٹ گیا اور ہر حصہ ایک عظیم تودے کے مانند بن گیا۔ اور ہم قریب لائے وہیں دوسروں کو اور ہم نے موسیٰ اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو نجات دی، پھر دوسروں کو غرق کر دیا۔ ۶۳-۶۶

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تیرا رب، وہ عزیز و رحیم ہے۔ ۶۷-۶۸

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰٓی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ط اَلَا یَتَّقُوْنَ (۱۰-۱۱)

یہ حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب مدین سے واپس ہوتے ہوئے وادیٔ مقدس طویٰ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے کلام سے مشرف فرمایا اور ان کو منصب رسالت پر سرفراز کر کے فرعون اور اس کی قوم کے پاس انذار کے لیے جانے کی ہدایت فرمائی۔

ایک خاص اسلوب بیان

'اَلَا یَتَّقُوْنَ' کا اسلوب بیان فرعون اور اس کی قوم کے غایت درجہ طغیان و فساد کو ظاہر کر رہا ہے۔

اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کیا یہ ظالم لوگ اسی طرح بگٹٹ اپنی سرکشی میں بڑھتے ہی چلے جائیں گے اور اس کے انجام اور خدا کے قہر و غضب سے نہیں ڈریں گے؟ آگے آیات ۱۲۵، ۱۴۳، ۱۶۲، ۱۶۲ اور ۱۷۸ سے معلوم ہوگا کہ بعینہٖ اسی اسلوب سے دوسرے انبیائے کرام نے بھی اپنی اپنی قوموں کو انذار فرمایا ہے۔ اس اسلوب خطاب میں حسرت، غصہ، زجر و ملامت اور عذاب الٰہی کے قرب کی جو وعید ہے وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ ہ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ہ وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ہ (۱۲-۱۴)

نبوت پا کر حضرت موسیٰؑ کے اندیشے

حضرت موسیٰؑ اس عظیم ذمہ داری سے بہت ڈرے اور یہ ڈرنا ذمہ داری کے صحیح احساس کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ مدین جانے سے پہلے ہی انھیں یہ اندازہ اچھی طرح ہو چکا تھا کہ فرعونیوں کے سامنے کوئی حق بات کہنا کتنا مشکل ہے۔ نیز وہ اپنے اندر قوت بیان کی کمی بھی محسوس فرماتے تھے اور قبطی کی موت کا جو واقعہ ان کے ہاتھوں ہو چکا تھا اس کی بنا پر بھی وہ اندیشہ ناک تھے کہ فرعون اور اس کے اعیان ان کے خلاف غصہ میں بھرے بیٹھے ہوں گے وہ ان کو آسانی سے معاف کرنے والے نہیں ہیں بالخصوص اس صورت میں جب کہ وہ ان کے سامنے رسالت کا دعویٰ لے کر جائیں گے اور ان کے ظلم و تعدی پر ان کو انذار کریں گے۔ اپنے یہ اندیشے ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت موسیٰؑ نے اپنی یہ گزارش بھی پیش کر دی کہ اگر مرضی الٰہی یہی ہے کہ میں یہ بارِ گراں اٹھاؤں تو میری مدد کے لیے براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے بھائی ہارون کو میرا شریکِ کار بنا دیا جائے جو فصیح اللسان آدمی ہیں۔ تاکہ ہم دونوں مل کر اس خدمت کو بہتر طریقہ پر انجام دے سکیں۔

قَالَ کَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَکُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ہ فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۱۵-۱۷)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطمینان دہانی

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے اس اندیشے کی تو پوری شدت کے ساتھ تردید فرما دی کہ قبطی انھیں قتل کر دیں گے لیکن حضرت ہارونؑ کے بارے میں ان کی درخواست، جیسا کہ دوسرے مواقع میں تصریح اور یہاں اشارہ ہے، منظور فرمائی اور ان کو حکم دیا کہ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور کوئی اندیشہ نہ رکھو۔ اِنَّا مَعَکُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ' اطمینان دہانی کا نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ دوسرے مقام میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے، اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی (طٰہٰ-۴۶) (میں تم دونوں کے ساتھ سنتا اور دیکھتا ہوں تو مجال ہے کہ کوئی تمہیں گزند پہنچا سکے!)

فرعون کی طرف ایک کے بجائے دو رسول

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارونؑ، حضرت موسیٰؑ کے مددگار، شریکِ رسالت کی حیثیت سے تھے۔ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت ہو گئی۔ فرمایا ہے:

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ (طٰهٰ: ۴۷) (ہم دونوں تیری طرف تیرے رب کے رسول ہیں) فرعون کے سامنے اس امرِ واقعی کا اظہار اتمامِ حجت کے پہلو سے ہوا ہے کہ ایک چھوڑ دو دو رسول، اللہ نے اس کی طرف بھیجے ہیں اگر اس کے بعد بھی اس نے صحیح ردِ عمل اختیار نہ کی تو اس کی شامت ہی ہے۔

اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ سے متعلق مولانا فراہیؒ کا نقطۂ نظر

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کی وضاحت سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ ہم کر چکے ہیں۔ تورات سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کو عید قربانی منانے کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں لے جانا چاہتے تھے، لیکن بتصریح تورات میں نہیں ہے کہ بیابان میں کہاں لے جانا چاہتے تھے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ ان کو حج و قربانی کے لیے مکہ معظمہ لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے مولانا کا یہ خیال ایک نظریے کی حیثیت سے پیش کر دیا ہے، ان کے دلائل میرے سامنے نہیں ہیں اس وجہ سے میں پوری طرح اس پر مطمئن نہیں ہوں۔ میں اپنا رجحان اعراف کی تفسیر میں ظاہر کر چکا ہوں۔ بعض باتیں مولاناؒ کے اس خیال کی تائید کرتی ہیں۔ ممکن ہے آگے کسی موزوں مقام پر میں ان کی وضاحت کروں۔ فرعون کو انذار کے ساتھ یہ حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کی تنظیم اور ان کے اندر دین کے احیاء و تجدید کے سلسلہ میں پہلی ہدایت ہوئی۔

تورات میں اس واقعہ کے ابہام کی وجہ

اس امرِ خاص میں تورات کے بیان کے اندر جو ابہام ہے اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو حضرت موسیٰ نے اس کو فرعون پر ظاہر نہ کرنا چاہا ہو اس وجہ سے اس کو مبہم ہی رکھا ہو یا یہ ہوا کہ یہود نے اس کے اظہار کو اپنے مصالح کے خلاف پا کر جس طرح حضرت اسماعیلؑ اور خانہ کعبہ کی ساری تاریخ پر پردہ ڈال دیا اسی طرح اس بات پر بھی پردہ ڈال دیا۔

اَنْ اَرْسِلْ، اصل میں بِاَنْ اَرْسِلْ ہے۔ عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق ب حذف ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس پیغام کے ساتھ رسول بن کر آئے ہیں۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۝ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (۱۸-۱۹)

فرعون کا حضرت موسیٰؑ کو حقارت آمیز جواب

یہاں اتنی بات بربنائے قرینہ حذف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے بموجب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو ساتھ لے کر فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس گئے اور انذار کے ساتھ ساتھ اس کے سامنے بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کا مطالبہ بھی رکھا۔ بھلا فرعون یہ تصور کہاں کر سکتا تھا کہ کوئی اس کے سامنے اتنا بڑا دعویٰ اور اتنا اہم مطالبہ لے کر آئے گا اور وہ بھی ایک اسرائیلی! اس نے نہایت حقارت آمیز انداز میں کہا کہ کیا تم وہی نہیں ہو جس کی پرورش بچپن میں ہم نے اپنے گھر میں کی ہے اور کیا تم وہی نہیں ہو جس نے وہ حرکت کی جو تم نے کی! بے شک تم بڑے ہی ناشکرے ہو۔ 'کافر' یہاں لغوی یعنی ناشکرے کے معنی میں ہے اور فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ سے اس کا اشارہ قبطی کے واقعۂ قتل

کی طرف تھا جس کی سنگینی کی تعبیر کے لیے اس نے یہ ابہام کا اسلوب اختیار کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ذرا خدا لگتی خود لسپناسی! تم ہمارے پروردہ اور ہمارے مجرم ہونے کے باوجود ہمارے سامنے اپنی نبوت کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کو ساتھ لے جانے کا مطالبہ لے کر اٹھے ہو۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۰-۲۱)

ضال کا مفہوم

'ضَآلٌّ' یہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس مفہوم میں وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ ...) میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی سرگشتہ، جویائے راہ، کھویا ہوا۔

حضرت موسیٰ کا اعتراف حق اور اظہار حق

حضرت موسیٰ نے جہاں تک قبطی کے واقعہ کا تعلق تھا صاف صاف اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور فرمایا کہ بے شک مجھ سے یہ فعل صادر تو ہوا لیکن اس وقت ہوا جب مجھے میرے رب کی طرف سے علم کی صحیح روشنی حاصل نہیں ہوئی تھی بلکہ میں ابھی جستجوئے علم کی راہ میں سرگشتہ اور کھویا ہوا تھا، چنانچہ جب مجھ سے یہ فعل صادر ہو گیا اور مجھے اندیشہ ہوا کہ اس نادانستہ فعل پر آپ لوگ مجھے قتل کر دیں گے تو میں یہاں سے نکل گیا۔ اس کے بعد میرے رب نے مجھے علم و حکمت کی روشنی اور حق و باطل میں امتیاز کے لیے قوت فیصلہ عطا فرمائی اور مجھے اپنے رسولوں میں سے بنایا اور اب میں ایک رسول کی حیثیت سے آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔ میری موجودہ حیثیت میری سابق حالت سے بالکل مختلف ہے۔ اس گزرے ہوئے واقعہ کو نظر انداز کر کے میری بات پر دھیان دیجیے۔

قبطی کے قتل کے واقعہ کی نوعیت پر ہم سورۂ طٰہٰ میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں کہ یہ محض حمایت مظلوم کے جذبہ کے تحت حضرت موسیٰ سے بالکل بلا قصد صادر ہو گیا جس پر حضرت موسیٰ کو نہایت صدمہ ہوا۔ انھوں نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

تنہا فطرت رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہے

اس امر پر بھی ہم سورۂ ہود وغیرہ میں گفتگو کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام بعثت سے قبل بھی فطرت سلیمہ پر ہوتے تھے لیکن تنہا فطرت اور عقل زندگی کے پُرپیچ راستوں میں انسان کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اس میں بہت سے موڑ ایسے آتے ہیں جہاں انسان کی عقل سرگشتہ و حیران رہ جاتی ہے اور جب تک اس کو خدا کی رہنمائی حاصل نہ ہو وہ صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اسی حکمت و معرفت کو حضرت موسیٰ نے یہاں 'حکم' سے تعبیر فرمایا ہے۔ آگے آیت ۸۳ کے تحت اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۲)

حضرت موسیٰ کا بلیغ جواب

یہ حضرت موسیٰ نے فرعون کے اس اظہار احسان کا جواب دیا ہے جس کا ذکر آیات ۱۸-۱۹ میں گزرا ہے اور غور کیجیے کہ کس قدر بلیغ جواب دیا ہے۔ فرمایا کہ تم اپنا یہ احسان مجھے اپنے اس ظلم عظیم کو جائز ثابت کرنے کے لیے جتا رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے! مطلب یہ ہے کہ یہ احسان ہے تو یہی، اس کا

شکریہ! لیکن اس احسان کے بدلے میں تمھیں یہ حق تو نہیں حاصل ہو سکتا کہ تم تمام بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھو اور میں اس کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھاؤں!

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۳)

دعوائے رسالت کا استہزاء

فرعون اپنے طعنہ اور اظہار احسان، کا جواب تو ایسا مسکت پا گیا کہ اس کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی اس وجہ سے اس نے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے حضرت موسیٰؑ کے دعوائے رسالت کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ اوپر آیت ۱۶ میں گزر چکا ہے کہ حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارون علیہما السلام نے اس کے سامنے اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اس نے 'رب العلمین' کا مذاق اڑایا کہ یہ رب العلمین کیا چیز ہے جس کے تم دونوں رسول بن کر آئے ہو! اس کا مطلب یہ تھا کہ سب سے بڑے دیوتا کا اوتار اور رب العلمین تو میں ہوں، تو میرے ہوتے اور کون رب العلمین ہے جس نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ (۲۴)

دعوت کی راہ میں ایک قدم اور آگے کی طرف

حضرت موسیٰؑ نے اس کے اس گستاخانہ طنز کے جواب میں اپنی دعوت کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ فرمایا کہ تمھارا رب العلمین وہی ہے جو آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا رب ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'مَا بَيْنَهُمَا' کے تحت سورج چاند سب آگئے اور فرعون، جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، سورج دیوتا کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔

'اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ' یعنی اصل حقیقت یہ ہے جو میں نے واضح کر دی ہے۔ اس کو مانو یا نہ مانو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں۔ بلکہ خود تم لوگوں پر ہے۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ (۲۵)

فرعون کی بوکھلاہٹ

حضرت موسیٰؑ کا جواب فرعون کے کبر پر ایک کاری ضرب تھا اس وجہ سے وہ تلملا اٹھا اور درباریوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا کہ تم لوگ سن رہے ہو، یہ شخص کیا کہہ رہا ہے!

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (۲۶)

دعوت کی راہ میں مزید ایک قدم اور آگے کی طرف

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے اس غیظ و غضب کی کوئی پروا کیے بغیر اپنی دعوت کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ فرمایا کہ تمھارا بھی رب اور تمھارے اگلے آباؤ اجداد کا بھی رب! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ باطل ادیان کی بنیاد تمام تر پچھلوں کی تقلید ہی پر ہوتی ہے اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے لگے ہاتھوں یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ اگر اس معاملے میں تم نے اپنے باپ دادا کی روایات پر بھروسہ کیا ہے تو یہ بھروسہ بے بنیاد ہے۔ ان کا رب بھی وہی ہے جس کی دعوت میں دے رہا ہوں۔ اگر انھوں نے اس کو چھوڑ کر کسی اور کو رب بنایا تو یہ ان کی ضلالت و جہالت ہے۔ ان کی کورانہ تقلید کر کے اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (۲۷)

فرعون کی جھنجھلاہٹ

حضرت موسیٰ نے جب ان کے آباو اجداد کی گمراہی بھی واضح کر دی تو فرعون کا پارہ بہت چڑھ گیا۔ غصہ سے جھنجھلا کر اس نے نہایت تحقیر انگیز، طنزیہ انداز میں، درباریوں سے کہا کہ تمھارا یہ رسول، جو بزعم خویش تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، مجھے تو ایک بالکل دیوانہ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب یہ شخص ہمارے آباو اجداد کو بھی احمق اور گمراہ ثابت کر رہا ہے تو اس کے پاگل ہونے میں کیا شبہ رہا! 'رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ' میں طنز کے ساتھ لوگوں کو اکسانے کی خواہش بھی مضمر ہے کہ دیکھ لو، یہ شخص ہے جو مدعی ہے کہ تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے!

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲۸)

فرعون کی خدائی پر آخری ضرب

حضرت موسیٰ نے فرعون کی اس بدتمیزی کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ اس کو بالکل نظر انداز کر کے اپنی دعوت کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھ گئے۔ فرمایا کہ وہی مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب ہے بشرطیکہ تم لوگ عقل سے کام لو اور سوچنے سمجھنے والے بنو! یہ فرعون کی خدائی پر حضرت موسیٰ کی آخری ضرب تھی۔ وہ اپنے آپ کو سورج کا اوتار سمجھتا تھا۔ حضرت موسیٰ نے اس پر واضح کر دیا کہ جس کو نہ مشرق پر کوئی اختیار نہ مغرب پر اگر وہ اپنے آپ کو رب سمجھتا ہے تو یہ اس کی اور اس کو رب ماننے والوں کی عقل کا فتور ہے آپ لوگ اپنی عقل سے کام لیجئے تو یہ بات ایسی واضح ہے کہ کسی کو اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (۲۹)

فرعون کی دھمکی

جب فرعون نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ اس کی کسی بات کو سرے سے لائق اعتنا ہی نہیں سمجھتے بلکہ پوری بے خوفی کے ساتھ اپنی ایک بات کے بعد دوسری بات پہلی سے بھی بڑھ چڑھ کر کہہ گزرتے ہیں اور ہر بات اس کی خدائی پر ایک سخت سے سخت تر ضرب کی نوعیت رکھتی ہے تو وہ بالکل بے حوصلہ ہو کر چلا اٹھا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو یاد رکھو کہ میں تمھیں قید کر کے چھوڑوں گا۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ (۳۰)

معجزات کی نشانی

اس کا گمان ہو گا کہ اس کھلی ہوئی دھمکی کے بعد حضرت موسیٰ سہم جائیں گے لیکن انھوں نے نہایت متانت اور وقار کے ساتھ فرمایا کہ کیا تمھارا یہی فیصلہ اس صورت میں بھی ہو گا جب میں تمھیں کوئی نہایت واضح نشانی اس بات کی دکھا دوں کہ میں خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں؟

قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۳۱)

فرعون نے کہا اگر تم اپنی سچائی کی کوئی نشانی رکھتے ہو تو اس کو دکھاؤ۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَاۗءُ لِلنّٰظِرِيْنَ (۳۲-۳۳)

فرعون کے اس مطالبے پر حضرت موسیٰ نے عصا اور ید بیضا کے دونوں معجزے دکھائے۔ ان معجزات کی

تفسیر سورۂ طٰہٰ میں ہو چکی ہے۔ یہاں صرف یہ چیز خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ یہ معجزے حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی طلب پر اس وقت دکھائے ہیں جب اس نے ان کی دعوتِ توحید کے جواب میں، جو تمام تر عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے دلائل پر مبنی تھی، ان کو قید کرنے کی دھمکی دی ہے۔

قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ ۝ يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُم بِسِحْرِهِ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ (۳۴-۳۵)

معجزات کی ظاہری اور فرعون کی چالبازی

ان معجزات کی ظاہری ایسی نمایاں تھی کہ فرعون اور اس کے درباری سب ہکا بکا رہ گئے۔ لیکن فرعون نے نہایت ہوشیاری سے لوگوں کو مرعوبیت سے بچانے کی کوشش کی۔ اس نے حضرت موسیٰؑ کے اس کارنامے کی تو داد دی اس لیے کہ اس سے مفر نہیں تھا لیکن ساتھ ہی یہ تاثر بھی لوگوں کو دینے کی کوشش کی کہ یہ محض فنِ جادوگری میں مہارت کا کرشمہ ہے، اس کو نبوت و رسالت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مزید برآں حضرت موسیٰؑ کے خلاف ایک سیاسی بدگمانی پیدا کرنے کے لیے ذہنوں میں یہ وسوسہ بھی ڈال دیا کہ یہ شخص اپنے جادو کے زور سے لوگوں کو اپنے حق میں ہموار کرنا اور ہم کو اس ملک سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ ہم دوسرے مقام میں نہایت وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ اس وقت اس بدگمانی کے پھیلنے کے لیے فضا نہایت سازگار تھی۔ اس ہوّے سے ڈرا کر فرعون نے درباریوں سے پوچھا کہ اس خطرے کی مدافعت کے لیے آپ لوگ کیا مشورہ دیتے ہیں!

قَالُوا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ۝ يَأْتُوكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيمٍ (۳۶-۳۷)

درباریوں کا مشورہ

درباریوں نے مشورہ دیا کہ بہتر ہے کہ ان کے جادو کا توڑ جادو ہی سے کیا جائے لیکن عام جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرانا قرینِ مصلحت نہیں ہے۔ اس میں شکست اور جگ ہنسائی کا اندیشہ ہے۔ اس وجہ سے بروقت تو ان کو ٹالیے اور مملکت کے تمام شہروں میں اپنے خاص آدمیوں کو بھیج کر تمام ماہر جادوگروں کو بلوائیے اور ان سے ان کا مقابلہ کرائیے۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ۝ وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُم مُّجْتَمِعُونَ ۝ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِن كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ (۳۸-۴۰)

حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ کی تیاری

درباریوں کے اس مشورے پر عمل کیا گیا۔ ایک خاص دن میں، ایک معین وقت پر، ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو مرکز میں جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ دوسرے مقام میں یہ تصریح بھی ہے کہ ایک دن میلہ کا اور وقت چاشت کا مقرر ہوا اور مقابلہ کے لیے میدان ایک ایسا منتخب ہوا جس میں ہر سمت کے لوگوں کو پہنچنے میں یکساں سہولت ہو۔ مزید برآں وقتِ موعود پر لوگوں کو جمع ہونے کے لیے خوب ابھارا بھی گیا کہ ہمارے ساحر اس وقت ملک کو ایک بہت بڑے خطرے سے بچانے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی اور ان کا ساتھ دینے کے

ہے اس موقع پر ضرور موجود ہو۔ ھَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ کے استفہامیہ اسلوب میں حث و تحریض اور تشویق و ترغیب کا جو مفہوم مضمر ہے وہ عربی کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔ اس کی بعض مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں اور آگے بھی اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ میں یہ مضمون مضمر ہے کہ ہمارے یہ ساحر اس وقت ہمارے قومی وقار کے تحفظ کے لیے میدان میں اتر رہے ہیں، تو ہم میں سے ہر شخص کو اس بات کا آرزومند ہونا چاہیے کہ ان کو اس مقابلے میں فتح حاصل ہو اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ہمیں ان کا ساتھ دینا چاہیے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۴۱-۴۲)

فرعون کی طرف سے ساحروں کی حوصلہ افزائی

ساحر جب فرعون کے سامنے حاضر ہوئے تو انھوں نے فن پیشہ وروں کی طرح یہ التجا پیش کی کہ اگر ہم اس مقابلے میں غالب رہے تو سرکار سے بھرپور انعام ملے گا نا! فرعون نے ان کو اطمینان دلایا کہ انعام تو جو ملنا ہے وہ ملے ہی گا۔ مزید برآں تم پر اپنی جانب کی یہ نوازش بھی ہوگی کہ تم مقربین بارگاہِ شاہی میں شامل کیے جاؤ گے!

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ (۴۳-۴۴)

حضرت موسیٰ اور ساحروں کا مقابلہ

جب میدانِ مقابلہ میں حضرت موسیٰ اور ساحروں کا آمنا سامنا ہوا تو حضرت موسیٰ نے ساحروں ہی کو پہل کرنے کا موقع دیا اور فرمایا کہ جو ہنر تم دکھانا چاہتے ہو دکھاؤ۔ ان کے پاس جو رسیاں اور لاٹھیاں تھیں وہ انھوں نے پانسہ کے تیروں کی طرح پھینکیں اور ساتھ ہی یہ قسم کھائی کہ فرعون کے اقبال کی قسم ہم ہی غالب رہیں گے! بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ میں 'ب' ہمارے نزدیک قسمیہ ہے۔ فرعون کو چونکہ ان کے ہاں دیوتا کی حیثیت حاصل تھی اس وجہ سے کوئی اہم قدم اٹھاتے ہوئے وہ اس کے عزت و اقبال کی قسم کھاتے۔ تورات میں ان کے شواہد موجود ہیں۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ (۴۵)

سحر و ساحری کے طلسم پر عصائے موسیٰ کی ضرب کاری

جواب میں حضرت موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور وہ ان کے اس سارے سوانگ کو، جو وہ اب تک لوگوں کو ہیبت زدہ بنانے کے لیے رچاتے رہے تھے، نگلنے لگا۔ مَا يَاْفِكُوْنَ کے اسلوب سے یہ بات نکلتی ہے کہ صرف یہی نہیں ہوا کہ اس موقع پر ساحروں نے جو کرتب دکھایا عصائے موسیٰ نے اس کا بھرم کھول دیا، بلکہ اس نے ان کے اب تک کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا اس لیے کہ یہی ہنر کا شاہکار تھا۔ جب اس کا یہ حشر ہوا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ عصائے موسیٰ نے سحر و ساحری کے سارے طلسم ہی کو باطل کر دیا۔

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (۴۶ - ۴۸)

ساحروں کا اعترافِ حق

ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ سحر و معجزہ کے فرق کو سب سے زیادہ پرکھنے والا ایک ساحر ہی ہو سکتا ہے اگر اس کے اندر اعترافِ حق کی رمق ہو۔ ان ساحروں کے اندر یہ رمق موجود تھی اس وجہ سے وہ اس کو دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑے، علیٰ رؤس الاشہاد اپنے ایمان کا اعلان کر دیا اور اس تصریح کے ساتھ کہ ہم ایمان لائے ربّ العالمین، موسیٰ اور ہارون کے رب پر! اوپر آیات ۱۲ اور ۲۴ میں فرعون کے اس غیظ و غضب کا ذکر گزر چکا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے پیش کردہ 'ربّ العالمین' کے خلاف وہ ظاہر کر چکا تھا۔ ساحروں نے کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر اسی ربّ العالمین پر اپنے ایمان کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ اتنی وضاحت اور بھی کر دی کہ موسیٰ اور ہارون کے رب پر، تاکہ کسی ادنیٰ اشتباہ کی بھی کوئی گنجائش کسی کے لیے باقی نہ رہے۔ یہ ہے ایمان کا ایک ادنیٰ کرشمہ!

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۥ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۴۹)

فرعون کی طرف سے سازش کا ہوّا

بھرے میدان میں اس طرح کی شکست سے ظاہر ہے کہ فرعون اور اس کے درباریوں کی نہایت سخت رسوائی ہوئی لیکن فرعون آسانی سے شکست ماننے والا آدمی نہیں تھا۔ اس نے حالات کو سنبھالنے کے لیے فوراً ایک سازش کا ہوّا کھڑا کر دیا۔ ساحروں سے کہا، تم نے میری اجازت کے بغیر اس طرح سب کے سامنے اس شخص پر اپنے ایمان کا جو اعلان کیا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہی تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادو کی تعلیم دی ہے۔ تمہاری اور اس کی پہلے سے ملی بھگت تھی کہ اس طرح تم سب کے سامنے اپنی شکست مان لو گے جس سے اس کی دھاک سب کے دلوں پر بیٹھ جائے گی اور ملک کے اندر انقلاب برپا کرنے کی راہ اس شخص کے لیے ہموار ہو جائے گی۔ یہ مملکت کے خلاف تم نے ایک سازش کی ہے اس وجہ سے میں تم کو اور تمہارے اس گرو کو وہ سزا دوں گا جو حکومت کے باغیوں کو دی جاتی ہے۔ پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے جائیں گے اور پھر عبرتِ عام کے لیے تم کو سولی پر لٹکا یا جائے گا۔

[illegible] توجیہ

یہاں اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ کے الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ فرعون کا مطلب یہ تھا کہ اگر فی الواقع تم نے اس شخص کو راست باز آدمی سمجھا تھا تو تمہاری خیر خواہی کا تقاضا یہ تھا کہ تم یہ بات پہلے میرے علم میں لاتے اور میں اس کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرتا لیکن تم نے میری اجازت کے بغیر سب کچھ خود بطورِ خود کر ڈالا جو اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ یہ فتح و شکست کا سارا ڈراما تمہاری ایک سازش ہے۔

قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۡ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ

اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۰-۵۱)

'لَا ضَيْرَ'۔ 'ضَيْر' کے معنی حرج اور ضرر کے ہیں۔ اور 'اَنْ كُنَّا' اصل میں 'لِاَنْ كُنَّا' ہے، زبان کے معروف قاعدے کے مطابق 'ل' یہاں حذف ہو گیا ہے۔

نورِ ایمان کا کرشمہ

فرعون نے دھمکی تو بہت بڑی دے دی لیکن اس کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب یہ ساحر وہ ساحر نہیں ہیں جنھوں نے بڑی لجاجت سے اس سے انعام کی درخواست کی تھی بلکہ نورِ ایمان کی ایک ہی جھلک نے ان کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں پہنچ کر فرعون اور اس کی ساری سلطنت کی ان کی نگاہوں میں بالِ مگس کے برابر بھی وقعت باقی نہیں رہی ہے۔ انھوں نے بڑی بے خوفی کے ساتھ جواب دیا کہ اگر ہم کو یہ سزا ملی جس کی دھمکی دی گئی ہے تو اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے، ہم بہرحال اپنے رب ہی کے پاس جائیں گے اور اگر ہم تیرے نزدیک اس بنا پر سازش کی سزا کے مستحق ہیں کہ تیری اجازت کے بدون ہم نے موسیٰؑ پر ایمان لانے میں سبقت کی ہے تو ہم اس سزا کا خیر مقدم کرتے ہیں اس لیے کہ اوّل المؤمنین ہونے کے صلے میں ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہماری تمام غلطیاں معاف فرما دے گا۔

اگرچہ بجا طور پر یہ بات نہایت حیرت انگیز ہے کہ ساحر ایک ہی جست میں معرفت کے اس مرتبۂ بلند پر پہنچ گئے لیکن یہ بات تعجب کی نہیں ہے۔ سیدنا مسیحؑ نے بھی اپنے ان پڑھ شاگردوں سے فرمایا تھا کہ جب میرے نام پر تم لوگ عدالتوں میں پکڑ وائے جاؤ گے تو پہلے سے نہ سوچنا کہ کیا جواب دوگے، وقت پر روح القدس خود تمھارے دل میں بات ڈالے گا۔

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْۤ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (۵۲)

حضرت موسیٰؑ کی ہجرت اور فرعون کی طرف سے ان کا تعاقب

یہاں سرگزشت کا کچھ حصہ محذوف ہے۔ ہم دوسرے محل میں، قرآن اور تورات دونوں کی روشنی میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ اس مقابلے میں شکست کھا جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان ایک عرصے تک کشمکش چلتی رہی۔ اس دوران میں مصر پر بہت سی آفتیں نازل ہوئیں جن سے ملک تباہی کے کنارے آ لگا۔ ان مصائب سے تنگ آ کر فرعون کے درباریوں نے اس کو مشورہ دیا کہ بنی اسرائیل جہاں جانا چاہتے ہیں ان کو وہاں جانے کی اجازت دے دی جائے ورنہ ملک تباہ ہو جائے گا۔ بالآخر فرعون نے مجبور ہو کر اجازت تو دے دی لیکن جب حضرت موسیٰؑ اپنی پوری قوم کو ساتھ لے کر نکلے تو اس کی رائے بدل گئی، اس نے فوراً ہر جگہ اپنے آدمی بھیج دیے کہ تمام علاقوں کے سردار اپنے تمام فوجیوں اور تمام سامانِ جنگ کے ساتھ مرکز میں پہنچیں تاکہ بنی اسرائیل کا تعاقب کیا جائے۔

آیت میں اسی صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کو بذریعہ وحی یہ ہدایت کر دی کہ تم راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر نکل جاؤ اور ساتھ ہی اس بات سے بھی آگاہ کر دیا کہ اگرچہ فرعون نے تم کو جانے کی اجازت دے دی ہے لیکن تمھارے باوجود تمھارا تعاقب کیا جائے گا۔ اس خطرے سے

تمھیں ہوشیار رہنا چاہیے

فَأَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِينَ ۝ إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيلُونَ ۝ وَإِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُونَ ۝ وَإِنَّا لَجَمِيعٌ حٰذِرُونَ (۵۳-۵۶)

فرعون خود اپنی تدبیر کے جال میں

چنانچہ فرعون نے سرداروں اور فوجیوں کو اکٹھا کرنے کے لیے مملکت کے تمام شہروں میں اپنے آدمی دوڑا دیے اور چونکہ قبطی حضرت موسیٰؑ کے کارناموں سے بہت مرعوب تھے اس وجہ سے ان کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈا بھی زور و شور سے کیا گیا کہ اسرائیلیوں کی حیثیت ہی کیا! وہ مٹھی بھر تو ہیں لیکن ہاتھی سے گنا کھانے چلے ہیں! وہ اپنی حرکتوں سے ہمیں غصہ دلا رہے ہیں، لیکن ہم ایک بھاری جمعیت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے نمٹنے کے لیے پوری طرح چوکس اور بیدار رہیں! ہم ہرگز ان کو اس بات کا موقع نہیں دیں گے کہ وہ ملک میں کوئی گڑبڑ پیدا کریں یا ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں!!

فَأَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُونٍ ۝ وَّكُنُوزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيمٍ (۵۷-۵۸)

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تدبیر سے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے باغوں اور چشموں اور اپنے خزانوں اور دولت کدوں سے نکلیں اور اپنے تمام لاؤ لشکر اور سروسامان سمیت سمندر میں غرق ہوں۔

كَذٰلِكَ ۖ وَأَوْرَثْنٰهَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ (۵۹)

ایک بلیغ حذف

كَذٰلِكَ کے بعد نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔ یعنی ہم مجرموں اور رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ اس حذف سے کلام میں جو زور پیدا ہو گیا ہے وہ اہل ذوق سے مخفی نہیں ہے۔

ضمیر مفعول کا استعمال ایک مخصوص اسلوب

وَأَوْرَثْنٰهَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ میں ضمیر مفعول سے مراد بعینہٖ وہی نعمتیں نہیں ہیں جن سے قبطیوں کو اللہ تعالیٰ نے نکالا بلکہ اسی نوع کی وہ نعمتیں ہیں جو بنی اسرائیل کو مصر سے نکلنے کے بعد سرزمین فلسطین میں حاصل ہوئیں۔ چنانچہ دوسرے مقام میں اس کی تصریح بھی ہے۔ فرمایا۔ ......

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشٰرِقَ الْأَرْضِ وَمَغٰرِبَهَا الَّتِي بٰرَكْنَا فِيهَا ...... (الاعراف - ۱۳۷) (اور وہ لوگ جو دبا کے رکھے گئے تھے ہم نے ان کو اس سرزمین کے تمام مشرق و مغرب کا مالک بنایا جس میں ہم نے اپنی برکتیں رکھی تھیں) اس آیت میں 'ارض مبارک' سے مراد ظاہر ہے کہ سرزمین فلسطین ہے۔ مصر سے نکلنے اور صحرا گردی کا دور ختم ہونے کے بعد یہی زرخیز علاقہ بنی اسرائیل کے قبضہ میں آیا ہے۔ مصر یا مملکت مصر کے کسی علاقے پر بنی اسرائیل کا قبضہ تاریخوں سے ثابت نہیں ہے۔

ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ ہم نے ضمیر کا مرجع معین کرنے میں یہاں تکلف سے کام لیا ہے۔ آیت کا ظاہر مفہوم تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن باغوں، چشموں اور خزانوں سے اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کو بے دخل کیا انہی کا وارث بنی اسرائیل کو بنایا۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ اعلیٰ عربی میں ضمیریں اس طرح بھی آتی ہیں۔ اس کتاب میں ہم اس کی متعدد مثالیں ذکر کر چکے ہیں۔ سورۂ مائدہ میں اس کی ایک نہایت واضح مثال موجود ہے۔ مسلمانوں کو بنی اسرائیل کے سوالات کی نوعیت کے سوالات کرنے سے ان الفاظ میں روکا گیا ہے۔

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ	اسی طرح کے سوالات تم سے پہلے ایک قوم کے لوگوں نے کیے تو وہ ان کو نباہ نہ سکنے کے سبب سے کافر ہوئے۔
(المائدۃ ۵: ۱۰۲)	

ظاہر ہے کہ یہاں ضمیر کا مرجع جن سوالات کی طرف ہے بعینہٖ وہی سوالات بنی اسرائیل نے نہیں کیے تھے بلکہ اسی قبیل کے سوالات کیے تھے۔ اسی طرح آیت زیرِ بحث میں بھی بعینہٖ وہی باغ، چشمے اور خزانے مراد نہیں ہیں جن کا سابق آیت میں ذکر ہے بلکہ اسی نوع کی وہ نعمتیں اور برکتیں مراد ہیں جو بنی اسرائیل کو مصر سے ہجرت کے بعد علاقۂ فلسطین میں حاصل ہوئیں۔

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ۝ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (۶۰-۶۲)

[illegible] بالآخر صبح تڑکے فرعونیوں نے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔ جب بنی اسرائیل نے دیکھا کہ آگے سمندر ہے اور پیچھے فرعون کا لشکر تو وہ بہت گھبرائے کہ اب تو ہم مارے گئے۔ تورات میں ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ کیا مصر میں ہمارے دفن ہونے کے لیے جگہ نہیں تھی کہ تم نے یہاں لا کر ہمیں مروانے کا سامان کیا! حضرت موسیٰ نے ان کو اطمینان دلایا کہ گھبراؤ نہیں، میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ ہمارے لیے راہ کھولے گا۔ اگرچہ آگے سمندر ہے اور پیچھے فرعون کی فوجیں، بظاہر تمھیں راہ مسدود نظر آ رہی ہے لیکن میرے رب نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ تمھیں ہرگز کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ خدا اپنی قدرت کا کرشمہ دکھائے گا اور ہمارے لیے راہ کھل کر رہے گی۔ تورات میں یہ ماجرا یوں بیان ہوا ہے!

"جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیے تو فرعون اور اس کے خادموں کا دل ان لوگوں کی طرف سے پھر گیا اور وہ کہنے لگے کہ ہم نے یہ کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر ان کو جانے دیا۔۔۔۔۔۔ اور مصری فوج نے فرعون کے سب گھوڑوں اور رتھوں اور سواروں سمیت ان کا پیچھا کیا۔۔۔۔۔۔ اور جب فرعون نزدیک آ گیا تب بنی اسرائیل نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ مصری

ان کا پیچھا کیے چلے آتے ہیں اور وہ نہایت خوف زدہ ہو گئے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی۔ اور موسیٰ سے کہنے لگے کیا مصر میں قبریں نہ تھیں کہ تو ہم کو وہاں سے مرنے کے لیے بیابان میں لے آیا ہے؟ .... تب موسیٰ نے لوگوں سے کہا ڈرو مت، چپ چاپ کھڑے ہو کر خداوند کی نجات کے کام کو دیکھو جو وہ آج تمہارے لیے کرے گا کیونکہ جن مصریوں کو تم آج دیکھتے ہو ان کو پھر کبھی ابد تک نہ دیکھو گے۔ خداوند تمہاری طرف سے جنگ کرے گا اور تم خاموش رہو گے

(خروج: باب ۱۴: ۵-۱۴)

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۗ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۚ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ۚ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ۚ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۗ (۶۳-۶۶)

قدرت خداوندی کا کرشمہ

یہ حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کے اعتماد علی اللہ کا امتحان تھا۔ اس امتحان میں بنی اسرائیل تو اپنی روایت کے مطابق بالکل ناکام رہے لیکن حضرت موسیٰؑ سو فیصد کامیاب ہوئے۔ اس امتحان سے گزرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھایا۔ حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ اپنا عصا سمندر پر مارو۔ انھوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ایسی ہوا چلی کہ سمندر کا پانی پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ دونوں طرف پانی کی دیوار کھڑی ہو گئی اور بیچ میں سے خشک راستہ نکل آیا۔ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر اس راستہ پر چلے۔ تدبیر الٰہی فرعونیوں کو بھی اسی مقام پر لائی اور انھوں نے بنی اسرائیل کے تعاقب میں اپنے رتھ اور گھوڑے سب ان کے پیچھے ڈال دیے۔ اس کے بعد حکم الٰہی سے وہ ہوا جس نے سمندر کے پانی کو پھاڑ کر راستہ پیدا کیا تھا رک گئی۔ حضرت موسیٰؑ تو اپنی قوم کے ساتھ بخیریت کنارے پر پہنچ گئے، ادھر سمندر کا پانی برابر بہنے لگا اور فرعونی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ انھوں نے پیچھے بھاگنے کی کوشش کی لیکن بھاگنے کا وقت گزر چکا تھا۔ بالآخر پوری فوج غرق ہو گئی۔

تورات میں یہ ماجرا یوں بیان ہوا ہے:۔

"پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے دہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا اور مصریوں نے تعاقب کیا اور فرعون کے سب گھوڑے اور رتھ اور سوار ان کے پیچھے پیچھے سمندر کے بیچ میں چلے گئے ....

اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا تاکہ پانی مصریوں اور ان کے رتھوں اور سواروں پر پھر بہنے لگے۔ اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آ گیا اور مصری الٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی

میں مصریوں کو تہہ و بالا کر دیا : خروج : باب ۱۴ : ۲۱-۲۷)

آیت میں لفظ طَوْدٌ جو آیا ہے اس کے معنی پہاڑ اور تودے کے ہیں۔ تورات میں اسی مفہوم کو دیوار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے مقامِ عبور سے متعلق استاذ امام مولانا فراہیؒ کی رائے علمائے اہلِ کتاب کی رائے سے بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے اپنی یہ رائے اپنی تفسیر سورۂ ذاریات میں ظاہر فرمائی ہے اس رائے کے حق میں ان کے دلائل چونکہ میرے علم میں نہیں ہیں اس وجہ سے میں اس باب میں ابھی متردد ہوں۔ سورۂ ذاریات مجموعہ تفاسیر فراہی میں شامل ہے۔ تحقیق کے طالب اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝ (۶۷-۶۸)

ترجیع — یہ سرگزشت کے آخر میں وہی ترجیع ہے جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کو نشانی ہی مطلوب ہے تو اس سرگزشت کے اندر بڑا سامان عبرت موجود ہے لیکن جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ نشانیوں ہی کے مطالبے کرتے رہ جاتے ہیں۔ بڑی سے بڑی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی فرعونیوں کی طرح ان کی اکثریت کو ایمان لانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے سرکشوں کو جب چاہے پکڑ سکتا ہے، وہ عزیز ہے لیکن وہ ان کو توبہ و اصلاح کے لیے مہلت دیتا ہے اس لیے کہ وہ رحیم بھی ہے۔

۴- آگے کا مضمون ـــــــ آیات ۶۹-۱۰۴

حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اور ان کی قوم کے ردِ عمل کا بیان — آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت اور ان کی قوم کے ردِ عمل کا ذکر ہے اور آخر میں وہی آیات ترجیع ہیں جو اوپر گزر چکی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس سرگزشت کے سنانے سے بھی مقصود وہی ہے جو پچھلی سرگزشت کے سنانے سے ہے۔

ایک بات یہاں خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ پچھلی سورہ میں حضرت موسیٰؑ کے ذکر کے بعد حضرت نوحؑ کا ذکر آ گیا تھا، بیچ کے انبیاء میں سے کسی کا ذکر نہیں آیا تھا۔ اس سورہ میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت نے اس خلا کو بھر دیا۔ اس لیے کہ حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان سب سے زیادہ جلیل القدر نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۹-۱۰۴

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ﴿٦٩﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ ﴿٧١﴾ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ﴿٧٢﴾ أَوْ يَنفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ﴿٧٣﴾ قَالُوا

بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ﴿٧٤﴾ قَالَ أَفَرَأَيْتُم مَّا كُنتُمْ
تَعْبُدُونَ ﴿٧٥﴾ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ ﴿٧٦﴾ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي
إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴿٧٧﴾ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ﴿٧٨﴾ وَالَّذِي
هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ﴿٧٩﴾ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ﴿٨٠﴾ وَالَّذِي
يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ﴿٨١﴾ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ
الدِّينِ ﴿٨٢﴾ رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ﴿٨٣﴾ وَاجْعَل
لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ ﴿٨٤﴾ وَاجْعَلْنِي مِن وَرَثَةِ جَنَّةِ
النَّعِيمِ ﴿٨٥﴾ وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ ﴿٨٦﴾ وَلَا تُخْزِنِي
يَوْمَ يُبْعَثُونَ ﴿٨٧﴾ يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ
بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٨٩﴾ وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٩٠﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ
لِلْغَاوِينَ ﴿٩١﴾ وَقِيلَ لَهُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿٩٢﴾ مِن دُونِ اللَّهِ
هَلْ يَنصُرُونَكُمْ أَوْ يَنتَصِرُونَ ﴿٩٣﴾ فَكُبْكِبُوا فِيهَا هُمْ وَالْغَاوُونَ ﴿٩٤﴾
وَجُنُودُ إِبْلِيسَ أَجْمَعُونَ ﴿٩٥﴾ قَالُوا وَهُمْ فِيهَا يَخْتَصِمُونَ ﴿٩٦﴾
تَاللَّهِ إِن كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٩٧﴾ إِذْ نُسَوِّيكُم بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٩٨﴾
وَمَا أَضَلَّنَا إِلَّا الْمُجْرِمُونَ ﴿٩٩﴾ فَمَا لَنَا مِن شَافِعِينَ ﴿١٠٠﴾ وَلَا صَدِيقٍ
حَمِيمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٢﴾ إِنَّ فِي
ذَٰلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٠٣﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٤﴾ ع ٥

ترجمۂ آیات ۶۹-۱۰۴

اور ان کو ابراہیم کی سرگزشت سناؤ۔ جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ بھلا یہ تم لوگ کن چیزوں کی پرستش کرتے ہو! انھوں نے جواب دیا کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور برابر ان کی پوجا پر جمے رہیں گے! ۶۹-۷۱

اس نے کہا، کیا یہ تمھاری سنتے ہیں جب تم ان کو پکارتے ہو یا تمھیں نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں! انھوں نے کہا بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے ہوئے پایا ہے۔ ۷۲-۷۴

اس نے کہا، کیا تم نے ان چیزوں پر غور کیا ہے جن کو تم پوجتے رہے ہو، تم بھی اور تمھارے اگلے آبا و اجداد بھی! یہ سب میرے تو دشمن ہیں، بجز اللہ رب العالمین کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہ میری رہنمائی فرماتا ہے اور جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے اور جو مجھے موت دے گا پھر مجھے زندہ کرے گا اور وہ جس سے میں متوقع ہوں کہ جزا کے دن میرے گناہ معاف کرے گا۔ ۷۵-۸۲

اے میرے رب! مجھے قوت فیصلہ عطا فرما اور مجھے زمرۂ صالحین میں شامل کر اور بعد والوں میں میرا نیک ذکر قائم رکھ اور مجھے باغِ نعمت کے وارثوں میں سے بنا۔ اور میرے باپ کی مغفرت فرما، بے شک وہ گمراہوں میں سے تھا اور جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے اس دن مجھے رسوا نہ کیجیو۔ ۸۳-۸۷

جس دن نہ مال کام آدے گا اور نہ اولاد، بس وہ فائز المرام ہوں گے جو تندرست و پاک دل لے کر حاضر ہوں گے اور جنت خدا ترسوں کے لیے قریب لائی جائے گی اور دوزخ گمراہوں کے لیے بے نقاب کی جائے گی۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے تھے وہ کہاں ہیں! کیا وہ تمھاری مدد کریں گے یا اپنا دفاع کریں گے!

پس وہ اس میں اوندھے جھونک دیے جائیں گے، وہ بھی اور سارے گمراہ بھی اور ابلیس کے سارے لشکر بھی۔ ۸۸ - ۹۵

اور وہ اس میں باہم جھگڑتے ہوئے کہیں گے، خدا کی قسم! ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے جب کہ تم کو خداوندِ عالم کا ہمسر ٹھہراتے رہے۔ اور ہم کو تو بس مجرموں نے گمراہ کیا تو نہ اب ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی سرگرم دوست! پس ہمیں ایک مرتبہ اور لوٹنا نصیب ہو کہ ہم ایمان لانے والوں میں سے بنیں! ۹۶ - ۱۰۲

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان میں کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۰۳ - ۱۰۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ (۶۹ - ۷۱)

سوال کا طرز

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال استفہام کی نوعیت کا نہیں بلکہ استخفاف کی نوعیت کا تھا۔ یعنی یہ کیا فضول اور بے حقیقت چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو! ان کی قوم نے ان کا جواب حمیتِ جاہلیت کے پورے جوش و غرور کے ساتھ دیا کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور تمھارے علی الرغم اسی طرح ان کو پوجتے رہیں گے، تم کتنا ہی زور لگاؤ لیکن ہم اپنے ان معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۝ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ۝ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (۷۲ - ۷۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کی بے حقیقتی واضح کرنے کے لیے سوال کیا کہ جب تم ان سے دعا و فریاد کرتے ہو تو کیا یہ تمھاری دعا و فریاد سنتے ہیں یا تمھیں کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں یا پہنچا سکتے ہیں تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم ان کی پرستش کرتے ہو! قوم کے لوگوں نے جواب دیا کہ یہ باتیں ہم نہیں جانتے۔ بس ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح کرتے پایا ہے، سو ہم اسی طرح کرتے رہیں گے۔ اپنے آباء و اجداد کے طریقے کو ہم تمھارے کہنے سے نہیں چھوڑ سکتے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے اس دور کی باتیں نقل ہو رہی ہیں جب وہ تمام عقلی و نقلی اور آفاقی و انفسی دلائل سے اپنی قوم پر حجت تمام کر چکے ہیں۔ آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ اس کے بعد انھوں نے قوم سے اعلان برأت کر کے ہجرت فرمائی ہے۔ اس مرحلے میں ظاہر ہے کہ نبی کی دعوت کا انداز بدل جاتا ہے اور قوم کے جواب کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔ پیغمبر جو کچھ کہتا ہے اس کی نوعیت قوم کی عقل اور اس کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی آخری کوشش کی ہوتی ہے اور قوم جو کچھ جواب دیتی ہے اس کی نوعیت آخری ضد اور ہٹ دھرمی کے مظاہرے کی۔ یہ دونوں ہی باتیں یہاں سوال و جواب سے واضح ہو رہی ہیں۔

قَالَ أَفَرَءَيْتُم مَّا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ ۝ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُمُ ٱلْأَقْدَمُونَ ۝ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّىٓ إِلَّا رَبَّ ٱلْعَٰلَمِينَ (۷۵-۷۷)

حضرت ابراہیمؑ کا اعلان برأت

'اَفَرَءَيْتُمْ' کے اسلوب میں تعجب اور اظہار نفرت و بیزاری کا مضمون پایا جاتا ہے۔ یعنی ذرا ان چیزوں پر نگاہ تو ڈالو جن کو تمھارے باپ دادا پوجتے رہے اور جن کی پرستش پر تمھیں بھی ناز ہے۔ یہ بالکل بے حقیقت چیزیں ہیں۔ ان کے بارے میں میرا یہ فیصلہ سن لو کہ یہ ساری چیزیں میری دشمن ہیں اور میں ان سے بیزار ہوں۔ میں اللہ رب العالمین کے سوا کسی چیز کی پرستش نہیں کرتا۔ 'یہ چیزیں میری دشمن ہیں' یعنی یہ شیطان کے ایجاد کیے ہوئے پھندے ہیں اور شیطان بنی نوع انسان کا دشمن ازلی ہے جس کا اصل کام ہی یہ ہے کہ وہ خلقِ خدا کو صراط مستقیم سے روکے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کا وہ اعلان برارت ہے جس کے بعد انھوں نے ہجرت فرمائی۔ سورۂ والصافات میں ان کا کلمۂ ہجرت یوں نقل ہوا ہے: 'اِنِّىْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ (۹۹)' (میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں وہ میری رہنمائی فرمائے گا) اسی ہجرت کا اعلان عنکبوت کی آیت ۲۶ میں ہے۔ پیغمبر اپنے ماحول کا نہایت خیر خواہ، دوست، مشفق اور ہمدرد ہوتا ہے لیکن جب ماحول خود اس کا دشمن بن جاتا ہے اور اس کی ہدایت کی قدر کرنے کے بجائے اس سے اپنی ضلالت کی قدر کرانا چاہتا ہے تو وہ ان کو اپنا دشمن سمجھ کر اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ میں ان کا دشمن ہوں بلکہ یوں فرمایا کہ وہ میرے دشمن ہیں۔

ٱلَّذِى خَلَقَنِى فَهُوَ يَهْدِينِ ۝ وَٱلَّذِى هُوَ يُطْعِمُنِى وَيَسْقِينِ ۝ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ۝ وَٱلَّذِى يُمِيتُنِى ثُمَّ يُحْيِينِ ۝ وَٱلَّذِىٓ أَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لِى خَطِيٓـَٔتِى يَوْمَ ٱلدِّينِ (۷۸-۸۲)

رب حقیقی کی صفات

اپنی قوم کے بتوں کی بے حقیقتی واضح کرنے کے بعد یہ حضرت ابراہیمؑ نے اس رب حقیقی کی صفات بیان فرمائی ہیں جو عبادت و اطاعت کا اصلی حق دار ہے۔

خلق و پرورش

'اَلَّذِىْ خَلَقَنِىْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ' یعنی میری عبادت کا اصلی حق دار وہ ہے جس نے مجھے

پیدا کیا اور وہ بہری رہنمائی فرماتا ہے۔ یہ بیان واقعہ بھی ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ خلق اور ہدایت میں لزوم عقلی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں صرف پیدا ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس نے ہمارے اندر نہایت اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت فرمائیں اور پھر ہمیں ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور اُجاگر کرنے کا سلیقہ عطا فرمایا۔ اس نے ہمیں نہایت اعلیٰ فطرت پر پیدا کیا اور ہمیں عقل عطا فرمائی جو حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کرنے والی اور جزئیات سے کلیات اور محسوسات سے معقولات تک پہنچنے والی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ہ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی' (الاعلیٰ: ۲-۳) (جس نے ہمارا خاکہ بنایا پھر اس کے نوک پلک سنوارے اور جس نے ہمارے اندر صلاحیتیں ودیعت فرمائیں، پھر ان کے استعمال کے لیے ہماری رہنمائی فرمائی)۔

روحانی پرورش

یہ ہدایت خدا کی صفتِ خلق کا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، لازمی تقاضا ہے۔ جس خدا نے اس اہتمام اور اس حکمت کے ساتھ انسان کو پیدا کیا ہے اس کی رحمت و حکمت سے یہ بات بعید تھی کہ وہ پیدا کر کے اس کو یوں ہی بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ نہ صرف ایک کارِ عبث ہوتا بلکہ یہ ایک ظلم بھی ہوتا جو اس کی شان کے منافی ہے۔ اس وجہ سے اس نے جس طرح انسان کی تمام مادی ضروریات کا اہتمام فرمایا اسی طرح اس کی اس روحانی ضرورت کا بھی اہتمام فرمایا اور چونکہ انسان کے اصلی کمال کا انحصار اس کی اسی ضرورت کے ما حقہٗ پورے ہونے پر تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس معاملے کو تنہا اس کی عقل پر نہیں چھوڑا بلکہ اس کی ہدایت کے لیے نبوت و رسالت کا انتظام بھی فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کی سزاوار وہ ذات ہے جو ان تمام افضال و عنایات کا منبع ہے نہ کہ یہ پتھر کی مورتیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں، نہ نفع پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان!

'وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ہ وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ' روحانی و عقلی ربوبیت کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کی مادی پرورش کی طرف توجہ دلائی کہ میرا رب وہ ہے جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں کبھی بیمار پڑ جاتا ہوں تو وہ اپنے فضل و رحمت سے مجھے شفا بخشتا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرک قومیں اپنے معبودوں کو کائنات کا خالق و مالک نہیں مانتی رہی ہیں بلکہ وہ ان کو رزق و فضل کا ذریعہ سمجھتی رہی ہیں اور خاص طور پر اس وہم کو ان کے شرک میں بڑا دخل رہا ہے کہ بیماری ان کی ناراضگی سے لاحق ہوتی ہے اور شفا ان کی خوشنودی سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کے ان اوہام پر بھی ضرب لگائی کہ ان میں سے کسی چیز میں بھی ان اصنام کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ ساری چیزیں اس کائنات کے رب کے اختیار میں ہیں۔

'وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ' کا اسلوب بیان بھی قابلِ توجہ ہے۔ کھلانے، پلانے اور شفا دینے

کے انعال کی نسبت تو براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی لیکن بیمار ہونے کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ اس کی وجہ سوءِ ادب سے احتراز بھی ہے اور اس حقیقت کا اظہار بھی کہ نعمتیں جس قدر بھی بندے کو ملتی ہیں وہ سب خدا کے فضل و جود سے ملتی ہیں لیکن اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بسا اوقات اس کے کسی عمل پر مترتب ہوتی ہے۔ ہر چند وہ پہنچتی تو خدا کے اذن و حکم ہی سے ہے لیکن اس میں انسان کی اپنی غفلت کو بھی دخل ہوتا ہے اس وجہ سے وہ بندے کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی پہلو کو مدنظر رکھ کر یہاں یہ فرمایا کہ "جب میں بیمار پڑتا ہوں" یہ نہیں فرمایا کہ "وہ مجھے بیمار کرتا ہے"۔

پیدائش و ہدایت سے روزِ جزا کی دلیل

وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ۔ یہ اس خلق و ہدایت اور اہتمامِ ربوبیت کے لازمی نتیجہ کی طرف توجہ دلائی کہ وہی ہے جو مجھے ایک دن موت دے گا اور پھر لازماً اس کے بعد ایک دن زندہ بھی کرے گا۔ جب اس نے مجھے پیدا کیا اور اس میں اس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو دوبارہ زندہ کرنے میں کیوں مشکل پیش آئے گی اور ایسا ہونا اس کے اس سارے اہتمامِ ہدایت و ربوبیت کا لازمی تقاضا بھی ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ میرے لیے ہدایت اور پرورش کا یہ اہتمام فرمائے اور پھر یہ زندگی یوں ہی تمام ہو جائے۔

وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ۔ یہ اس روزِ جزا و سزا کے ظہور کی طرف اشارہ ہے جس سے اس دنیا کی زندگی کے بعد لازماً ہر شخص کو سابقہ پیش آنا ہے، لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اس کے ظہور کی خبر دینے کی بجائے اپنی اس توقع کا اظہار فرمایا جو اپنے رب سے وہ اس دن کے پیش آنے پر رکھتے ہیں۔ گویا اس دن کا پیش آنا تو ایک بدیہی حقیقت ہے جس میں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے البتہ اس کے لیے ہر شخص کو تیاری کرنی چاہیے اور اپنے رب سے یہ امید رکھنی چاہیے کہ جو اس سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاریں گے وہ ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے گا۔

حالات کے تقاضے سے ایک خاص اسلوبِ کلام

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مخاطبوں کے سامنے اپنی دعوت کے تمام مبادی رکھ دیے ہیں جن کے اندر نہایت گہرا منطقی ربط بھی ہے لیکن انھوں نے ان کو پیش کرنے میں دعویٰ اور دلیل کا اسلوب اختیار کرنے کے بجائے اپنے ذاتی تاثرات کے اظہار کا انداز اختیار فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مرحلہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اعلانِ براءت و ہجرت کا تھا۔ اس مرحلے میں قوم کو مخاطب کر کے بحث و استدلال کے انداز میں کچھ کہنا بے سود تھا اس وجہ سے انھوں نے اپنے ذاتی تاثرات نہایت بلیغ انداز میں ان کے سامنے رکھ دیے کہ شاید اس طرح ان کے دل میں کوئی بات اتر جائے۔ اگر دلوں میں زندگی کی کچھ رمق ہوتی ہے تو یہ اسلوب بعض اوقات نہایت مؤثر ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کی نہایت بلیغ مثالیں موجود ہیں۔

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِينَ ۝ وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ ۝ (۸۳-۸۴)

ہجرت کے وقت حضرت ابراہیم کی دعا

یہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا ہے جو اعلانِ برارت و ہجرت کے اس نازک موقع پر انھوں نے کی ہے۔

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا 'حُكْمٌ' سے مراد، جیسا کہ آیت ۲۱ کے تحت گزر چکا ہے، وہ صحیح قوتِ فیصلہ ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کو خاص طور پر عطا ہوتی ہے۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ ایک نہایت اہم قدم اٹھا رہے تھے اور اس بات کے محتاج تھے کہ آگے کے تمام مراحل میں ان کو صحیح فیصلہ کی توفیق اور خدا کی رہنمائی حاصل ہو اس وجہ سے انھوں نے سب سے پہلے اسی کے لیے دعا فرمائی۔

وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ حق کی خاطر اپنے خاندان اور اپنی قوم سے بھی انھوں نے اعلانِ برارت فرما دیا تھا اس وجہ سے یہ دعا بھی فرمائی کہ ان بروں کی جگہ اچھوں کی معیت و رفاقت حاصل ہو۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

دعوت کے فروغ کے لیے حضرت ابراہیم کی دعا

وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ 'لِسَانٌ' کے معنی یہاں شہرت اور چرچا کے ہیں اور اس کی اضافت چونکہ 'صدق' کی طرف ہے اس وجہ سے اس سے مراد ذکرِ جمیل ہوگا بلکہ اس کے اندر پائیداری اور دوام و استمرار کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعوت کے فروغ و استحکام کے لیے دعا فرمائی کہ آنے والی نسلوں میں وہ پھیلے اور اس کو پائیداری نصیب ہو۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کو جو قبولیت حاصل ہوئی تاریخ میں اس کی کوئی اور مثال موجود نہیں ہے۔ بنی اسرائیل میں جتنے نبی و رسول آئے سب انہی کی دعوت لے کر آئے اور آخر میں خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعوت کو ایک عالمگیر اور زندہ جاوید دعوت بنا دیا۔

وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ۝ وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ ۝ وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ (۸۵-۸۷)

آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے جنت کی اور اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی۔

وَلَا تُخْزِنِي، یہ باپ کے حق میں ایک نہایت مؤثر سفارش ہے۔ آدمی کے اعزہ و اقربا بالخصوص ماں باپ کی رسوائی خود اس کی رسوائی کے ہم معنی ہوتی ہے اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے باپ کی بھی مغفرت فرما کہ اس کا جہنم میں پڑنا آخرت میں میرے لیے رسوائی کا سبب نہ بنے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دعا سے اپنے باپ کا حق انتہائی دلسوزی کے ساتھ ادا کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ کا قانونِ عدل بالکل بے لاگ ہے۔ باپ کے حق میں ان کی دعا قبول نہیں ہوئی بلکہ بعد میں آپ کو اس کے لیے دعا کرنے سے بالکل روک دیا گیا۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۸۸-۸۹)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم کی بات کی تکمیل

یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا جزو نہیں ہے بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کی تکمیل و توضیح ہے۔ فرمایا کہ اس دن کسی کے مال و اولاد اس کے کچھ کام نہیں آئیں گے، صرف وہی لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں باریاب ہوں گے جو قلبِ سلیم کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ کسی کی اولاد اگر کچھ کام آنے والی بن سکتی تو اس اعتبار سے آزر سے زیادہ خوش قسمت کون تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا فرزند عطا فرمایا لیکن جب وہ بھی اپنے باپ کے کچھ کام نہ آسکے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

'قلبِ سلیم' سے مراد

'قلبِ سلیم' سے مراد شرک و نفاق کی ہر آلائش سے بالکل پاک اور محفوظ دل ہے۔ جس دل میں کسی اور کی حصہ داری یا نفاق کی بیماری ہو اس کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ (۹۰-۹۱)

نیکوکاروں کی تشریف و تکریم

'اُزْلِفَتْ' کے معنی قریب لانے کے ہیں۔ یہ نیکوکاروں کی تشریف و تکریم کی طرف اشارہ ہے کہ جنت ایک پیشکش کی طرح ان کے سامنے پیش کی جائے گی۔ اس دنیا میں انھوں نے جو نیکی کمائی اس کے صلے میں وہ ان کے لیے پہلے سے آراستہ و پیراستہ تیار ہوگی۔ اس دن انھیں اس کے لیے کوئی سفر نہیں کرنا پڑے گا بلکہ وہ خود ان کے سامنے لائی جائے گی۔ اسی طرح دوزخ بھی گمراہوں کے لیے بالکل تیار ہے۔ قیامت کے دن بس اس کا پردہ اٹھا دیا جائے گا اور جس چیز کو وہ نہایت بعید سمجھ کر اس سے بالکل بےخوف رہے وہ دیکھ لیں گے کہ اس کے ظہور میں صرف پردہ اٹھنے کی دیر تھی۔

وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ (۹۲-۹۳)

بدقسمتوں کا حشر

'نَصْر' کے معنی دوسرے کی مدد کرنے اور 'اِنْتِصَار' کے معنی خود اپنی مدافعت کرنے کے ہیں۔

فرمایا کہ اس وقت دوزخ میں پڑنے والوں سے کہا جائے گا کہ تم خدا کے سوا جن کی پرستش کرتے رہے ہو، بتاؤ، اب وہ کہاں ہیں! کیا وہ تمہاری یا خود اپنی ہی کوئی مدافعت کر سکتے ہیں!

فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ۝ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ (۹۴-۹۵)

'کَبّ' کے معنی منہ کے بل گرانے اور پچھاڑنے کے ہیں۔ اسی سے 'کُبْکِبَ' ہے جس کے اندر حرف کی زیادتی نے مبالغہ کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔ یعنی اس تفضیح کے بعد وہ اور ان کے سارے اصنام و الٰہہ اور ان کے وہ لیڈر جن کی انھوں نے پیروی کی اور ابلیس کا سارا لشکر جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ۝ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۹۶-۹۸)

لیڈروں اور پیروؤں کی باہمی

'مُخْتَصَمَۃ' کے معنی آپس میں لڑنے جھگڑنے کے ہیں۔ یہ جھگڑا جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات

ہیں تصریح ہے کہ شرک کے علمبردار لیڈروں اور ان کے پیروؤں میں ہوگا۔ پیرو لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم نے تمہاری پیروی میں یہ روزِ بد دیکھا تو کیا آج تم ہمارے اس عذاب میں کچھ حصہ بٹاؤ گے؟ لیڈر جواب دیں گے کہ ہم جیسے خود تھے ویسا ہی ہم نے تم کو بنایا، تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی! اسی جھگڑے کی طرف اجمال کے ساتھ یہاں اشارہ فرمایا ہے کہ پیرو اپنے سر پیٹیں گے اور اپنے لیڈروں سے قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم کھلی ہوئی گمراہی میں رہے کہ ہم نے تم کو خداوندِ عالم کا ہمسر ٹھہرایا۔ 'اِذْ نُسَوِّیْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' کی تفسیر ابن کثیرؒ نے ان الفاظ میں کی ہے: ای نجعل امرکم مطاعا کما یطاع امر رب العالمین (یعنی ہم تمہارے احکام کی اس طرح اطاعت کرتے رہے جس طرح خداوندِ عالم کے احکام کی اطاعت کرنی چاہیے تھی) یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین جن ہستیوں کی پرستش کرتے تھے، خواہ وہ فرشتے ہوں یا جنات، وہ تو محض ان کی مفروضہ خیالی ہستیاں تھیں اس وجہ سے ان سے کسی سوال و جواب کا معاملہ خارج از بحث ہے۔ قیامت کے دن ان کے پرستاروں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ محض ان کے اپنے رکھے ہوئے نام تھے جن کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں ہے۔ البتہ جن لوگوں نے ان کی پرستش کی بنا ڈالی، جنھوں نے لوگوں کو خدا کی بندگی سے ہٹا کر ان کی طرف موڑا اور ان کی حمایت و حمایت میں خدا کے رسولوں کی تکذیب کی، وہ لوگ موجود ہوں گے۔ ان کو مخاطب کر کے ان کے پیرو وہ بات کہیں گے جو اوپر مذکور ہوئی۔

وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ ۝ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ ۝ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۹۹-۱۰۲)

پیروؤں کا ماتم اپنی بدبختی پر

اوپر والی بات تو پیرو اپنے لیڈروں کو مخاطب کر کے کہیں گے اور یہ باتیں وہ نہایت حسرت و اندوہ کے ساتھ خود اپنے آپ کو ملامت اور اپنی بدبختی پر ماتم کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہمیں ان مجرموں ہی نے گمراہ کیا۔ اگر یہ نہ گمراہ کرتے تو ہم ہدایت پر ہوتے اور یہ روزِ بد نہ دیکھتے۔ قرینہ دلیل ہے کہ لفظ 'مُجْرِمُوْنَ' وہ اپنے لیڈروں کے لیے استعمال کریں گے۔

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ۔ یہ اظہارِ حسرت کے الفاظ ہیں یعنی جن کی شفاعت کی امید پر زندگی بھر ان کی پرستش کی وہ بھی سب ہوا ہو گئے اور جن کا عمر بھر جھنڈا اٹھائے پھرے ان میں سے بھی آج کوئی ہماری حمایت و مدافعت کے لیے نظر نہیں آتا!

فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً الآیۃ۔ یہ وہ اپنی تمنا کا اظہار کریں گے کہ کاش ہمیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں جانا نصیب ہوتا کہ ہم ان مجرموں سے اظہارِ براءت کرتے اور ایمان لانے والوں میں سے بنتے۔ لیکن ان کی یہ تمنا بس تمنا ہی رہے گی۔ اس کے پورے ہونے کا وقت ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔ ان آیات میں آباء و اجداد اور اپنے لیڈروں کی اندھی تقلید پر چلنے والوں کو اچھی طرح متنبہ کر دیا گیا ہے

کہ قیامت کے دن کسی کے لیے یہ عذر کچھ نافع نہیں ہوگا کہ اس کو دوسروں نے گمراہ کیا اس وجہ سے وہ گمراہی میں پڑا بلکہ ہر شخص کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۱۰۳-۱۰۴)

یہ وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے اور اس کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔

۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰۵-۱۲۲

حضرت نوحؑ کی دعوت کا بیان

آگے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت، ان کی قوم کی طرف سے ان کی تکذیب اور اس کے نتیجہ میں قوم پر عذاب کا نزول اور آخر میں انہی آیات کی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۰۵-۱۲۲

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٠٥﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا
تَتَّقُوْنَ ﴿١٠٦﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٠٨﴾
وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١١٠﴾ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ
اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿١١١﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١١٢﴾
اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿١١٣﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٤﴾
اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١١٥﴾ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ
مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿١١٦﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿١١٧﴾ فَافْتَحْ
بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٨﴾
فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿١١٩﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا
بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿١٢٠﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
ع ۶/۱۸ ۱۰ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٢١﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٢٢﴾

ترجمۂ آیات ۱۰۵-۱۲۲

نوح کی قوم نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔ جب کہ ان کے بھائی نوح نے ان کو آگاہ کیا، کیا تم لوگ ڈرتے نہیں! میں تمھارے لیے ایک معتبر رسول ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور میں اس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو عالم کے خداوند کے ذمہ ہے تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ انھوں نے جواب دیا، کیا ہم تمھیں مان لیں اور حال یہ ہے کہ تمھاری پیروی رذیلوں نے کی ہے! اس نے کہا، مجھے اس کی کیا خبر جو وہ کرتے رہے ہیں؟ ان کا حساب کرنا تو میرے رب ہی کا کام ہے، اگر تم سمجھو! اور میں مومنوں کو تو دھتکارنے والا ہوں نہیں، میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۱۰۵ - ۱۱۵

انھوں نے کہا، اے نوحؑ! اگر تم باز نہ رہے تو تم سنگسار ہو کر رہو گے۔ ۱۱۶

اس نے دعا کی، اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا تو میرے اور ان کے درمیان بالکل واضح فیصلہ فرما دے اور مجھ کو اور میرے ساتھ جو اہلِ ایمان ہیں ان کو نجات دے تو ہم نے اس کو اور اس کے ساتھ والوں کو بھری کشتی میں نجات دی۔ پھر اس کے بعد باقیوں کو ہم نے غرق کر دیا۔ ۱۱۷ - ۱۲۰

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے۔ اور ان کے اندر کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اور بے شک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۲۱ - ۱۲۲

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ (۱۰۵)

قوم نوحؑ نے تکذیب اگرچہ ایک ہی رسول ——— حضرت نوحؑ ——— کی کی تھی لیکن لفظ مُرْسَلِيْنَ

جمع استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ ردّ و قبول کے معاملے میں اصل اعتبار درحقیقت رد یا قبول کرنے والوں کی ذہنیت کا ہوتا ہے۔ جب تمام نبیوں کی دعوت وہی رہی ہے جو حضرت نوحؑ نے دی تو جن لوگوں نے ان کی دعوت رد کر دی انھوں نے گویا ہر نبی و رسول کی دعوت رد کر دی۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس طرح تمام انبیاء کی دعوت یکساں رہی ہے اسی طرح ان کی تکذیب کرنے والوں کی ذہنیت بھی ہمیشہ یکساں رہی ہے۔ اور پھر اس کا انجام بھی ہمیشہ ایک ہی ہوا ہے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے یہاں یہ سرگزشت بیان ہوئی ہے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکذبین اس سے سبق حاصل کریں۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ (۱۰۶-۱۰۷)

رسول امین

'أَلَا تَتَّقُونَ' میں دعوت یا انذار و تنبیہ ہے اور 'رَسُولٌ أَمِينٌ' میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ میں کوئی مفتری اور جھوٹا مدعی نہیں ہوں، جیسا کہ تم نے گمان کیا ہے، بلکہ خدا کا رسول ہوں اور پوری دیانت و امانت کے ساتھ تمھیں وہی باتیں پہنچا رہا ہوں جن کے پہنچانے کا مجھے حکم ہوا ہے۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (۱۰۸)

تم سلامتی چاہتے ہو تو اپنی اس ضد اور سرکشی کو چھوڑو اور اللہ کی پکڑ سے ڈرو جس کا راستہ یہ ہے کہ میری بات سنو اور مانو اور ان سرکشوں کی پیروی سے باز آؤ جو تمھیں ہلاکت کی راہ دکھا رہے ہیں۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (۱۰۹-۱۱۰)

حقیقت پر غور کرنے کی ترغیب اور اظہار بے نیازی

اس ٹکڑے میں مخاطبوں کو حقیقت پر غور کرنے کے لیے ترغیب بھی ہے اور ساتھ ہی بے نیازی کا اظہار بھی۔ مطلب یہ ہے کہ میں یہ جو کچھ تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں محض تمھاری خیر خواہی کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ میں اس پر تم سے کسی صلے اور معاوضے کا طالب نہیں ہوں کہ تم اس سے گھبرا کر میری باتیں سننے سے گریز کرو۔ اگر تم میری باتیں سنو اور مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے۔ اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے۔ میرا اجر میرے رب کے ذمہ ہے اور وہ مجھے اس سے محروم نہ فرمائے گا۔ خواہ تم میری بات مانو یا نہ مانو۔ تو میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ اللہ کے غضب سے ڈرو اور میری مانو!

قَالُوا أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ (۱۱۱)

خوئے بد را بہانہ بسیار

حضرت نوحؑ کی اس مخلصانہ اور دردمندانہ نصیحت کا جواب قوم کے متکبرین نے یہ دیا کہ تمھاری پیروی تو ہماری قوم کے اراذل و انفار نے کی ہے تو ہمارے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم اعیان و اشراف ہو کر ان کے پہلو بہ پہلو تمھاری مجلس میں بیٹھیں۔ مطلب یہ کہ اگر ہمیں اپنے قریب لانا چاہتے ہو تو پہلے ان لوگوں کو اپنے سے دور کرو۔ قوم کا یہ معارضہ اس بات کی دلیل ہے کہ جہاں تک حضرت نوحؑ کی دعوت کا تعلق ہے اس کی تردید کے لیے ان متمردین کے پاس کوئی بات باقی نہیں رہی تھی لیکن وہ کسی صورت میں اپنی شکست

ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تھے اس وجہ سے انھوں نے اپنی رعونت کی تسکین کے لیے آخر میں یہ بہانہ ڈھونڈ لیا کہ حضرت نوحؑ کے ساتھی غریب اور پست حال لوگ ہیں تو ہم ان کے ساتھی کس طرح بن سکتے ہیں! خوئے بدرا بہانہ بسیار!

قَالَ وَمَا عِلْمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّي لَوْ تَشْعُرُونَ ۝ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ (۱۱۲-۱۱۵)

شرافت و رذالت کا انحصار آدمی کے عمل پر ہے

حضرت نوحؑ نے ان کے اس معارضے کا جواب دیا اور سبحان اللہ، کتنا بلیغ جواب دیا! فرمایا کہ مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں! مطلب یہ ہے کہ شرافت و رذالت کا انحصار تو آدمی کے عمل و کردار پر ہے نہ کہ نسب و خاندان اور مال و جائداد پر، تو مجھے کیا معلوم کہ اب تک ان کا عمل کیا رہا ہے! ان کے ماضی کا احتساب میرے رب کے ذمہ ہے۔ میرے سامنے تو ان کا حاضر ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے رب پر ایمان لائے اور اس سے ڈرنے والے ہیں۔

لَوْ تَشْعُرُونَ یعنی اگر اس حقیقت کا احساس تمھیں بھی ہوتا تو تم بھی وہی کہتے جو میں کہہ رہا ہوں لیکن تمھارے ذہنوں میں یہ احساس سمایا ہوا ہے کہ شرافت و رذالت کا انحصار مال و دولت پر ہے۔ اس وجہ سے ان کی غریبی تمھارے لیے قبولِ حق میں حجاب بن گئی ہے۔

وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ۔ مطلب یہ کہ اگر تم اپنے ایمان کی شرط یہ ٹھہراتے ہو کہ میں ان مومنوں کو اپنے پاس سے دھتکار دوں تو یہ تو میں کرنے سے رہا۔ اگر تم اس چیز کے سبب سے ایمان نہیں لاتے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میں صرف ایک نذیر مبین ہوں۔ میں نے اپنا فرض انذار ادا کر دیا۔ اب جو ایمان نہیں لائے گا، اس کی مسئولیت خود اس پر ہے۔ اس کے باب میں مجھ سے کوئی پرسش نہیں ہوگی۔

قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ (۱۱۶)

قوم کی آخری دھمکی

بحث کے میدان میں پسپا ہو جانے کے بعد حضرت نوحؑ کی قوم نے ان کو یہ آخری دھمکی دی کہ اگر تم اپنی اس دعوت سے باز نہ آئے تو یاد رکھو کہ بالآخر ہم تم سے جان چھڑانے کے لیے تم کو سنگسار کر کے رہیں گے۔ الفاظ سے یہ بات صاف نکل رہی ہے کہ سنگسار کرنے کی دھمکی وہ پہلے بھی دیتے رہے تھے لیکن حضرت نوحؑ نے اس کی کوئی پروا نہیں کی بالآخر قوم نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا کہ ہماری دھمکی کو صرف دھمکی نہ خیال کرو ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں کر گزریں گے۔

قَالَ رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ۝ فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَنَجِّنِي وَمَنْ مَعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۱۱۷-۱۱۸)

حضرت نوحؑ کی دعا فتح و نصرت کے لیے

قوم کے اس فیصلہ کن اعلان کے بعد جب حضرت نوحؑ اس کے ایمان لانے سے بالکل مایوس ہو گئے

تب انھوں نے رسولوں کی معروف سنت کے مطابق، اپنے رب سے دعا کی، اے میرے رب! میری قوم نے میری تکذیب کر دی تو اب تو میرے اور اس کے درمیان آخری فیصلہ فرما دے اور مجھ کو اور میرے ساتھ جو اہل ایمان ہیں ان کو نجات دے۔ 'فَتْحًا' کی تاکید سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت نوحؑ نے یہ دعا اس فتح و نصرت کے ظہور کے لیے فرمائی ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً اس کی قوم کی ہلاکت اور رسول اور اس کے ساتھیوں کی نجات کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ○ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِیْنَ (۱۱۹-۱۲۰)

تیر بہدف دعا — حضرت نوحؑ کی یہ دعا بالکل صحیح وقت پر زبان سے نکلی اس وجہ سے تیر بہدف ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کو جس عذاب کی دھمکی دی تھی وہ طوفان کی شکل میں نمودار ہوا جس نے ساری قوم کو غرق کر دیا۔ صرف حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھی اس سے محفوظ رہے۔

'الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ'۔ شحن کے معنی کسی چیز کو پُر کرنے کے ہیں۔ یہاں کشتی کے لیے اس صفت کے ذکر سے مقصود یاد دہانی ان چیزوں کی طرف اشارہ کرنا ہے جن کو کشتی میں رکھنے کی حضرت نوحؑ کو ہدایت ہوئی تھی اور جن کی تفصیل دوسرے مقامات میں گزر چکی ہے۔ یہ کشتی خاص اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ان ساری چیزوں کو سامنے رکھ کر بنائی گئی تھی جن کو طوفان سے بچانا مقصود تھا۔ چنانچہ وہ چیزیں اس میں بھر لی گئیں، باقی ساری چیزیں غرق ہونے کے لیے چھوڑ دی گئیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ (۱۲۱-۱۲۲)

ترجیع — یہ آخر میں وہی ترجیع ہے جس کی وضاحت اوپر گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کو کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو تاریخ کی اس سرگزشت میں بہت بڑی نشانی موجود ہے لیکن یہ ضدی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ یہ ایمان نہ لانے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں اور ان کی اکثریت کوئی بڑی سے بڑی نشانی دیکھ کر بھی ایمان لانے والی نہیں ہے۔ تمھارا رب جب چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے، وہ ہر چیز پر غالب ہے لیکن وہ ان کو اس لیے مہلت دے رہا ہے کہ وہ عزیز ہونے کے ساتھ ساتھ رحیم بھی ہے۔

۸- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۲۳-۱۴۰

یاد ہوگا، سابق سورہ میں دو جلیل القدر نبیوں ـــ حضرت موسیٰؑ اور حضرت نوحؑ ـــ کا ذکر کر کے درمیان کی قوموں کا ذکر صرف ان کا اجمالی حوالہ دے کر چھوڑ دیا تھا۔ اس سورہ میں آگے ان اقوام کے حالات کی تفصیل آرہی ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا اور بالآخر وہ کس انجام کو پہنچیں۔ ترتیب بیان بالکل تاریخی ہے اور ہر سرگزشت کے خاتمہ پر انھیں آیات کی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہیں۔ سب سے پہلے قوم عاد کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

حضرت ہودؑ کی دعوت کا بیان

آیات ۱۲۳-۱۴۰

كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٢٣﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا
تَتَّقُونَ ﴿١٢٤﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٢٥﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٢٦﴾
وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٢٧﴾
أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ﴿١٢٨﴾ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ
تَخْلُدُونَ ﴿١٢٩﴾ وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ﴿١٣٠﴾ فَاتَّقُوا
اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٣١﴾ وَاتَّقُوا الَّذِي أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُونَ ﴿١٣٢﴾
أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ ﴿١٣٣﴾ وَجَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٣٤﴾ إِنِّي أَخَافُ
عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٣٥﴾ قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَعَظْتَ أَمْ
لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَاعِظِينَ ﴿١٣٦﴾ إِنْ هَٰذَا إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٣٧﴾
وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿١٣٨﴾ فَكَذَّبُوهُ فَأَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ
ع ۸ الرَّحِيمُ ﴿١٤٠﴾

ترجمۂ آیات ۱۲۳-۱۴۰

قوم عاد نے رسولوں کی تکذیب کی۔ جب کہ ان کے بھائی ہود نے ان کو آگاہ کیا کہ کیا تم لوگ ڈرتے نہیں! میں تمہارے لیے ایک رسول امین ہوں۔ تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو! اور میں اس پر تم سے کسی صلے کا طالب تو ہوں نہیں، میرا اجر تو بس عالم کے رب کے ذمہ ہے۔ ۱۲۳-۱۲۷

کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے رہو گے اور شاندار محل بناتے رہو گے گویا تمھیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ اور جب بھی تم کسی پر حملہ آور ہوتے ہو تو جبارانہ حملہ آور

ہوتے ہو۔ تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس نے ان چیزوں سے تمھیں مدد پہنچائی جن کو تم جانتے ہو۔ اس نے تمھاری مدد کی چوپایوں اور اولاد سے اور باغوں اور چشموں سے۔ بے شک میں تم پر ایک ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ ۱۲۸-۱۳۵

انھوں نے جواب دیا، ہمارے لیے یکساں ہے، خواہ تم نصیحت کرو یا نصیحت کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ یہ بات نویس اگلوں سے چلی آ رہی ہے اور ہم پر ہرگز عذاب آنے والا نہیں ہے۔ تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا پس ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تمھارا رب وہ غالب اور مہربان ہے۔ ۱۳۶-۱۴۰

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ عَادُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (۱۲۳-۱۲۶)

تمام رسولوں کی ملت ایک ہے اس وجہ سے ایک کی تکذیب سب کی تکذیب ہے

'مُرْسَلِيْنَ' کے جمع لانے کی وجہ آیت ۱۰۵ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ کسی ایک رسول کی تکذیب درحقیقت تمام رسولوں کی تکذیب ہے۔ اسی بنیاد پر قرآن نے اہل کتاب کے دعوائے ایمان کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنے والا قرار دیا۔ تمام رسولوں کی دعوت اور ان کی ملت ایک ہے اس وجہ سے ان میں سے کسی ایک کو جھٹلانے والا سب کو جھٹلانے والا ہے۔

'اَخُوْهُمْ هُوْدٌ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام ان کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں تھے جس کے ماضی و حاضر سے وہ ناواقف ہوں بلکہ انہی کے بھائی بند اور انہی کے اندر وہ پلے بڑھے تھے۔ جس شخص کی پوری زندگی ان کے سامنے ہو اور اس میں کہیں حرف رکھنے کی گنجائش نہ ہو، اگر اس کو انھوں نے جھوٹا اور مفتری قرار دیا تو اس کو ان کی شامت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے!

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۲۷)

بدکنے والوں کو ملامت اس آیت کے اندر جو پہلو ترغیب و توبیخ کے ہیں ان کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ مزید برآں اس میں ان بدکنے والوں کو ملامت بھی ہے جو حضرت ہودؑ کی بات سننے کے لیے کسی طرح تیار ہی نہیں ہوتے تھے۔ فرمایا کہ خدا کے بندو، میری بات سنو تو سہی، میں نے اس پر کوئی ٹکٹ تو نہیں لگا رکھا ہے جو تم پر گراں گزر رہا ہے، میرا اجر تو میرے رب کے ذمہ ہے، میں تم سے اس پر کسی اجر کا طالب نہیں ہوں میں تو تمھیں یہ بالکل مفت دے رہا ہوں۔

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ۝ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ (۱۲۸-۱۲۹)

'رِيعٌ' اس بلند زمین کو کہتے ہیں جو دور سے نظر آئے۔

'آيَةً' یہاں نشانی اور یادگار کے مفہوم میں ہے۔

'مَصَانِعُ' قلعوں اور گڑھیوں کے لیے بھی آتا ہے اور محلوں اور ایوانوں کے لیے بھی۔

'لَعَلَّكُمْ' فصیح عربی میں 'كَأَنَّكُمْ' یعنی گویا کہ کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔

فساد تمدن پر تنبیہ یہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس کے فاسد تمدن پر متنبہ فرمایا کہ مکانوں اور عمارتوں کی تعمیر ضرورت کے لیے ہے نہ کہ محض نمائش اور تفاخر و تنافس کے لیے۔ تمھارا حال یہ ہے کہ شوق تعمیر کا جنون اس طرح تم پر مستولی ہے کہ تمھارا ہر دولت مند اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ ہر بلند اور خوش منظر جگہ پر اس کی دولت و ثروت کی کوئی یادگار اور اس کے قیام و تفریح کے لیے کوئی کوٹھی اور بنگلہ بن جائے۔ اور یہ کام کسی واقعی انفرادی یا اجتماعی ضرورت کو سامنے رکھ کر نہیں ہو رہا ہے بلکہ بالکل عبث محض نمائش اور تفاخر کے لیے ہو رہا ہے۔ اور اس میں تمھارے انہماک کا یہ حال ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ تم نے گزرگاہ کو منزل سمجھ کر یہیں ڈیرے ڈال دیے ہیں اور تمھاری ساری توجہ اسی کی تعمیر و ترقی پر مرکوز ہے۔ کسی کو ہوش ہی نہیں کہ اصل منزل آگے ہے اور اس کے لیے بھی کوئی تیاری ضروری ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کے اعیان و امراء کو خطاب کر کے فرمائی ہے۔ جب آخرت کو نظر انداز کر کے صرف دنیا مطلوب بنتی ہے تو تمدن کا مزاج بالکل فاسد ہو جاتا ہے۔ جن کے پاس وسائل و ذرائع ہوتے ہیں وہ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کوٹھی کے جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی قابل ذکر جگہ ایسی نہ رہ جائے جہاں ان کی کوئی شاندار یادگار تعمیر نہ ہو جائے۔ دوسری طرف حال یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں غرباء کے پاس سر چھپانے کے لیے جھونپڑے بھی نہیں ہوتے اور ان میں سے کتنے انہی شاندار کوٹھیوں کے سامنے فٹ پاتھوں پر سردی سے ٹھٹھر کر یا لُو سے جھلس کر مر جاتے ہیں۔

تمدن کا یہ فساد اول تو اس بات کا نتیجہ ہے کہ حاجیات و ضروریات سے پہلے لوگ کمالیات و تعیشات

کے میدان میں مقابلہ شروع کر دیتے ہیں اور دوسرا سبب اس کا آخرت فراموشی ہے۔ حضرت ہودؑ نے یہاں فساد کے ان دونوں اسباب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ پہلے سبب کی طرف لفظ 'تَعْبَثُوْنَ' اشارہ کر رہا ہے اور دوسرے سبب کی طرف 'لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ'۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت ہودؑ کی یہ تشخیص اگرچہ اپنی قوم کے تمدن سے متعلق ہے لیکن یہ ٹھیک ٹھیک ہماری قوم کے تمدن پر بھی منطبق ہو رہی ہے۔ یہاں ان اشارات پر کفایت فرمائیے۔ اِنْ شَآءَ اللّٰہ سورۂ نمل کی تفسیر میں ہم صالح اور فاسد تمدن پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (۱۳۰)

فساد فی الارض پر تنبیہ

اوپر کی آیت میں قوم کے داخلی فسادِ مزاج کی طرف اشارہ تھا۔ یہ ان کے خارجی فساد فی الارض کی طرف اشارہ ہے۔ جنگ اگر مجرد اپنی قوت و صولت کے مظاہرے اور دوسروں کو مغلوب و محکوم بنانے کے لیے ہو تو یہ فساد فی الارض ہے۔ یہ جائز صرف اس صورت میں ہے جب یہ کسی شر و فساد کے مٹانے کے لیے ہو۔ اس صورت میں بلاشبہ یہ ایک بہت بڑی نیکی بلکہ خدا کی عبادت بن جاتی ہے۔ صالحین کے ہاتھوں دنیا میں جو جہاد ہوئے ہیں وہ ہمیشہ یا تو مدافعت میں ہوئے ہیں یا استیصالِ فتنہ کے لیے اور یہ دونوں صورتیں حمایتِ حق اور اعلائے کلمۃ اللہ کی ہیں۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کو اس برائی سے بھی روکنے کی کوشش کی۔ فرمایا کہ تمہاری جنگیں سب جبارانہ ہیں۔ تم دوسروں کو اپنا غلام و محکوم بنانے کے لیے خدا کی زمین میں خونریزی کرتے ہو جو فساد فی الارض ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝
وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۳۱-۱۳۵)

'فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ' یہ بات تقریباً ہر رسول سے قرآن میں منقول ہوئی ہے۔ یہ نہایت دلسوزی و دردمندی کے ساتھ قوم کو گویا آخری مرحلے میں تذکیر و تنبیہ ہے کہ اب بھی وقت گزرا نہیں ہے اللہ سے ڈرو، اپنی اس غلط روش سے باز آجاؤ اور اپنے مفسد لیڈروں کی پیروی کرنے کے بجائے میری بات مانو۔

انعام کے اندر استدراج کا پہلو

'وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ' یہ حضرت ہودؑ نے قوم کو خدا کے جلال و جبروت کے بجائے اس کے انعامات کے حوالہ سے ڈرایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مال و اولاد اور باغوں اور چشموں کی جو نعمتیں خدا نے تمھیں دے رکھی ہیں ان کو بتانے اور گنانے کی ضرورت نہیں ہے، تم خود اپنی آنکھوں سے ان کو دیکھ رہے ہو۔ یہ نعمتیں جس نے دی ہیں اس لیے نہیں دی ہیں کہ تم آخرت کو پس پشت ڈال کر اور سرکش و جبار بن کر زمین میں پھیلو بلکہ اس لیے دی ہیں کہ اس کے شکر گزار اور فرمانبردار بن کر زندگی بسر کرو ورنہ یاد رکھو کہ ایک ہولناک دن کا عذاب تم پر منڈلا رہا ہے۔ اس عذاب سے مراد وہ عذاب ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً قوم پر آیا ہے۔

جن کے اندر خدا کی معرفت ہوتی ہے وہ اس کے ابتلاء سے زیادہ اس کے انعام کی صورت میں اس سے ڈرتے ہیں کہ مبادا اس انعام کا حق ادا نہ ہو سکے اور یہ انعام استدراج کی صورت اختیار کر لے لیکن خدا کے اس بھید کو بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ (۱۳۶)

حضرت ہودؑ کی اس ساری دلسوزی و دردمندی اور اس تمام تذکیر و تنبیہ کا جواب قوم نے نہایت تحقیر و استہزا کے ساتھ یہ دیا کہ آپ ہمیں نصیحت فرمائیں یا نہ فرمائیں ہمارے لیے دونوں یکساں ہے۔ ہم بہرحال آپ کی بات ماننے والے نہیں ہیں۔ 'اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ' کے الفاظ پر اچھی طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر ایک مخفی قسم کا طنز بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ماننا تو الگ رہا ہماری نگاہوں میں تو آپ کی اس بے قراری و بے چینی کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے جو ہمارے مستقبل سے متعلق آپ ظاہر کرتے ہیں۔ ہم تو اس کو محض ایک خبط و جنون سمجھتے ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ بسا اوقات آدمی اپنے کسی ناصح مشفق کی نصیحت قبول کرنے سے گریز بھی کرتا ہے تو کم از کم اس کے دل میں ناصح کی ہمدردی و خیر خواہی کی قدر ہوتی ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ میں اس کی نصیحت قبول کر سکوں یا نہ کر سکوں لیکن یہ مجھے نصیحت کرتا رہے۔ لیکن یہ دل کی قساوت کی آخری حد ہے کہ آدمی نہ صرف یہ کہ ناصح کی بات قبول نہ کرے بلکہ اس کی ہمدردی اور دل سوزی کو بھی ٹھکرا دے۔ حضرت ہودؑ کی قوم نے یہی روش اختیار کی۔ جب انھوں نے نہایت دل سوزی کے ساتھ فرمایا کہ میں اپنی باتوں کی تم سے کوئی قیمت تو مانگ نہیں رہا ہوں، کم از کم میری بات سن تو سہی! قوم نے ان کی اس دردمندانہ التجا کا یہ جواب دیا کہ آپ اپنے گھر بیٹھیں، ہمیں آپ کی ان نصیحتوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (۱۳۷ - ۱۳۸)

'خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ' وہ روایت جو پہلوں سے چلی آرہی ہے۔

یعنی عذاب کا جو ڈراوا تم ہمیں سنا رہے ہو، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس سے پہلے بھی اس قسم کے ڈراوے سنائے جاتے رہے ہیں لیکن یہ محض ڈراوے تھے۔ نہ پہلے عذاب آیا نہ اب ہم پر کوئی عذاب آنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے جیسے وہمی لوگ اس قسم کی باتیں پہلے بھی کرتے رہے ہیں۔ ہم اس قسم کے فرضی اندیشوں میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں۔ یہ مضمون سورۂ مومنون: ۸۳ میں بھی گزر چکا ہے اور آگے سورۂ نمل آیت ۶۸ میں بدیں الفاظ آیا ہے۔ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔ (اس کی دھمکی ہمیں بھی سنائی جا رہی ہے اور اس سے پہلے ہمارے آباؤ اجداد کو بھی سنائی جا چکی ہے۔ یہ محض اگلوں کے فسانے ہیں)

یہ امر ملحوظ رہے کہ اس دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسے خلا کا نہیں گزرا ہے جس میں غافلوں کو جھنجھوڑنے

والوں نے عذاب اور قیامت سے لوگوں کو نہ ڈرایا ہو لیکن غافلوں نے ہمیشہ وہی روش اختیار کی جو قوم ہود نے اختیار کی۔ قیامت کو انھوں نے اس لیے افسانہ قرار دیا کہ اس کا ذکر تو چلا آ رہا ہے لیکن وہ آتی نہیں۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ نہ وہ آئی ہے، نہ آئے گی بلکہ یہ محض دہمیوں کا پھیلایا ہوا افسانہ ہے۔

اسی طرح قوموں پر جو عذاب آئے ان کی یاددہانی بھی بالکل بے اثر رہی۔ وقت کے دانشوروں نے ان کی توجیہ یہ کرلی کہ اس طرح کے نرم و گرم دن تو قوموں کی زندگی میں پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ ان کو ہمارے عقائد و اعمال سے کیا تعلق!

فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ (۱۳۹-۱۴۰)

فرمایا کہ اس طرح انھوں نے ہود علیہ السلام کو جھٹلا دیا جس کے بعد ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد وہی آیات ترجیع ہیں جو اوپر گزر چکی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آپ کے مخاطبوں کے لیے تہدید و وعید ہے کہ اگر کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو تاریخ کی اس سرگزشت میں بہت بڑی نشانی موجود ہے۔ لیکن یہ لوگ ایمان نہ لانے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں اور جو لوگ بہانے ڈھونڈتے ہیں سنتِ الٰہی کے مطابق ایک وقت خاص تک بہر حال ان کو بھی مہلت ملتی ہے لیکن وہ خدائے عزیز کی پکڑ سے کہاں بھاگ کر جا سکیں گے!

۱۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۴۱-۱۵۹

حضرت صالحؑ کی دعوت کا بیان

آگے قوم ثمود اور ان کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کی سرگزشت ہے اور آخر میں انہی آیات کی ترجیع ہے جن کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں جو یکسانی رہی ہے وہ بھی اس سے واضح ہے اور ان کی قوموں کے رویے اور ان کے انجام میں جو یک رنگی رہی ہے وہ بھی اس سے نمایاں ہے۔ اب بعینہٖ اسی روش کا مظاہرہ اپنے رسول کے ساتھ قریش کر رہے تھے تو آخر ان کا انجام اس سے مختلف کیوں ہوتا جو ان کے دوسرے پیشروؤں کا ہوا ـــ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۴۱-۱۵۹

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِیْنَ ۝۱۴۱ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۱۴۲ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝۱۴۳ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۝۱۴۴ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ

الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٤٥﴾ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ﴿١٤٦﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿١٤٧﴾
وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿١٤٨﴾ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ
بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿١٤٩﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٥٠﴾ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ
الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٥١﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿١٥٢﴾
قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿١٥٣﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ
فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٥٤﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ
لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿١٥٥﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ
فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٥٦﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿١٥٧﴾
فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
ع ١٩ ١٢ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٥٨﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٥٩﴾

ترجمۂ آیات ۱۴۱-۱۵۹

ثمود نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔ جب کہ ان کے بھائی صالحؑ نے ان کو متنبہ کیا کہ کیا تم لوگ خدا سے ڈرتے نہیں! میں تمہارے لیے خدا کا ایک امانت دار رسول ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور میں تم سے اس پر کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو بس عالم کے رب ہی کے ذمہ ہے۔ ۱۴۱-۱۴۵

کیا تم انہی نعمتوں میں جن میں یہاں ہو، ہر خطرے سے محفوظ، چھوڑے رکھے جاؤ گے! باغوں اور چشموں میں! کھیتیوں اور گتھم گتھا خوشوں والے کھجوروں کے باغوں میں! اور پہاڑوں میں تراش تراش کر خوش خوش گھر بناتے رہو گے! تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو اور حد سے گزر جانے والوں کی بات نہ مانو، جو ملک میں فسا

برپا کر رہے ہیں اور اصلاح نہیں کر رہے ہیں۔ ۱۴۶-۱۵۲

وہ بولے کہ تم تو بس ایک سحر زدہ معلوم ہوتے ہو۔ تم تو بس ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ تو تم کوئی نشانی لاؤ، اگر تم سچے ہو۔ ۱۵۳-۱۵۴

اس نے کہا، یہ ایک اونٹنی ہے۔ ایک دن پانی پینے کی باری اس کی ہے اور ایک معین دن کی باری تمہارے لیے ہے۔ اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچائیو ورنہ تم کو ایک ہولناک دن کا عذاب آ پکڑے گا۔ پس انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں تو انھیں پچھتانا پڑا۔ بالآخر ان کو عذاب نے آ دبوچا۔ بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں اور بے شک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۵۵-۱۵۹

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (۱۴۱-۱۴۴)

قوم کی تہمت کا جواب اور بد عمل لیڈروں کی پیروی سے احتراز کی ہدایت

بعینہٖ یہی آیات اوپر والی سرگزشت میں گزر چکی ہیں اور وہاں ان کی وضاحت ہو چکی ہے۔ حضرت صالحؑ کا یہ ارشاد کہ میں ایک رسول امین ہوں جواب ہے قوم کی اس تہمت کا کہ انھوں نے خدا کے رسول ہونے کا دعویٰ بالکل جھوٹ موٹ کیا ہے اور عذاب کا ڈراوا محض دھونس جمانے کے لیے سنا رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ میں کوئی جھوٹا مدعی اور مفتری نہیں ہوں بلکہ خدا کا رسول ہوں اور بے کم و کاست، پوری امانت داری کے ساتھ، تمھیں وہی سنا رہا ہوں جس کے سنانے کے لیے بھیجنے والے نے مجھے بھیجا ہے۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ میں یہ تنبیہ ہے کہ اپنے گمراہ کرنے والے لیڈروں کے چکمے میں نہ آؤ۔ اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو ورنہ یاد رکھو کہ وہ روزِ بد دور نہیں ہے جس کی تمھیں خبر دے رہا ہوں۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱۴۵)

بے نیازی خدمت خلق کے لیے ایک لازمی شرط ہے

اس میں ترغیب و تودیع اور اظہار بے نیازی کے جو مختلف پہلو ہیں ان کی طرف پیچھے اشارہ

ہو چکا ہے۔ بے نیازی خدمتِ خلق کے لیے ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ لوگوں کی زبانیں بند کر دینا کسی کے بس میں نہیں ہے لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام نے برملا اس امر کا اعلان فرمایا کہ ہم تم سے کچھ مانگنے کے لیے نہیں بلکہ تمھیں دینے کے لیے آئے ہیں۔ یہ مقام ہے بہت مشکل لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں دعوتِ حق کو فروغ ایسے ہی بے نیازوں کے ذریعے سے ہوا ہے جو خلق سے کسی صلے کے طالب نہیں ہوتے ہیں۔

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ ۝ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ۝ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ (۱۴۶-۱۴۹)

نعمت کے ساتھ شکرِ نعمت نہ ہو تو وہ استدراج ہے۔

اوپر والی بات بطور تمہید تھی۔ یہ اس اصل خطرے سے حضرت صالحؑ نے قوم کو آگاہ فرمایا جو بالکل سامنے تھا لیکن دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں مغروروں کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی مادی فربہی کو اپنی صحت و توانائی گمان کیے بیٹھے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے آگاہ فرمایا کہ یہ فربہی صحت نہیں بلکہ ایک ناگہانی موت کا الارم ہے۔ اوپر حضرت ہودؑ کی سرگزشت میں ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ نعمت کے ساتھ اگر شکرِ نعمت موجود نہ ہو تو وہ استدراج ہے جو بالآخر قوم کے لیے تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو توجہ دلائی اور الفاظ سے صاف واضح ہے کہ یہ اس دور میں توجہ دلائی ہے جو قوم کی ترقی و عروج کا دور تھا۔

نعمت منعم کی ایک امانت ہے

'فِي مَا هَاهُنَا' سے اشارہ اس رفاہیت و خوش حالی کی طرف ہے جو قوم کو حاصل تھی۔ بعد کے الفاظ سے اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ نعمت و رفاہیت اگر کسی کے لیے غفلت کا باعث ہو تو یہ اس کی بلادت کی دلیل ہے۔ ہر نعمت منعم کی شکرگزاری کا حق واجب کرتی ہے اور اس شکرگزاری کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ برابر چوکنا رہے کہ مبادا کسی نعمت کا حق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی ہو جائے۔ نعمت کسی کا حق نہیں بلکہ منعم کی طرف سے ایک امانت ہے اس وجہ سے جس کی تحویل میں جتنی ہی زیادہ امانت ہو اس کو اتنا ہی زیادہ فکرمند اور بیدار رہنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص نعمت پا کر نچنت ہو کر سو رہے کہ یہ نعمت اس کا حق ہے اور وہ اس میں عیش کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے تو وہ نہایت احمق ہے۔ نعمت کے اندر بے فکری، جس کو آیت میں 'آمِنِينَ' سے تعبیر فرمایا گیا ہے، بالآخر وہی نتیجہ پیدا کرتی ہے جو ریشم کے کیڑے کے سامنے آتا ہے کہ جو ریشم وہ اپنے اوپر تنتا ہے اسی کے اندر وہ گھٹ کر مرتا اور وہی اس کا کفن بنتا ہے۔ قرآن میں ربوبیت سے قیامت پر جو جگہ جگہ استدلال کیا گیا ہے اس میں بھی یہی پہلو ہے کہ ہر نعمت کے ساتھ مسئولیت لازمی ہے۔ اس پر انسان کی فطرت اور اس کی عقل گواہ ہے۔ صرف وہی اس کا انکار کر سکتے ہیں جن کی فطرت مسخ اور عقل ماؤف ہو چکی ہو۔

'طَلْعُهَا هَضِيمٌ' یعنی 'دَاخِلٌ بَعْضُهَا فِي بَعْضٍ' وہ کھجوریں جن کے خوشے آپس میں گتھم گتھا ہوں۔

'فِیْ جَنّٰتٍ ...... طَلْعُهَا هَضِيْمٌ' یہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، 'فِیْ مَا هٰهُنَآ' کے اجمال کی تفصیل ہے۔ ہم دوسرے مقام میں وضاحت کر چکے ہیں کہ عرب میں اچھے باغ کا تصور یہ تھا کہ انگوروں، اناروں کا باغ ہو اور اس کے نیچے نہریں جاری ہوں۔ بیچ بیچ میں مختلف چیزوں کی کاشت کے لیے قطعات ہوں اور کنارے کنارے کھجوروں کی باڑھ ہو۔ یہاں انہی اجزاء کو الگ الگ گنا کر سوال فرمایا ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یہ ساری چیزیں تمھیں دے کر باغ کا اصل مالک اس سے بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھ رہا ہے اور اس کی بابت تم سے کوئی پرسش نہیں ہونی ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ یہی حقیقت تمثیل کی صورت میں، انجیلوں میں بھی بار بار واضح فرمائی گئی ہے۔

'وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ'۔ 'فَرِهٌ' کے معنی خوش ہونے، مگن ہونے، اکڑنے اور اترانے کے ہیں۔ یہ حالت کسی کے بخت اور عاقبت نااندیش ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اوپر لفظ 'اٰمِنِيْنَ' جو آیا ہے اسی کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ چنانچہ سورۂ حجر کی آیت ۸۲ میں اسی مضمون کو 'اٰمِنِيْنَ' سے تعبیر فرمایا ہے۔

تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود نے فن سنگ تراشی میں بہت ترقی کی تھی۔ ان کے امراء و اغنیاء پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر اپنے لیے شاندار پہاڑی ایوان و محل بنواتے اور جس طرح اوپر قوم عاد کے ذکر میں گزرا ہے ان کا یہ ذوق بھی محض ان کے تفاخر کا نتیجہ تھا۔ لفظ 'فٰرِهِيْنَ' ان کے اس ذوق کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ محض تفاخر کے لیے دولت کا اسراف خدا اور آخرت سے بے فکری کا نتیجہ ہے اور اس سے جو تمدن وجود میں آتا ہے اس میں خلق کے لیے خیر و رفاہیت کا کوئی پہلو نہیں ہوتا اس وجہ سے قانونِ قدرت میں اس کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ وہ بہت جلد شاندار کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو اسی خطرے سے آگاہ فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ یہ جو کچھ تم بنا رہے ہو یہ ہی بنانے کے لیے تم ہمیشہ چھوڑے رکھے جاؤ گے۔ اب اس کی مہلت تمام ہونے والی ہے۔

آخرت سے بے
پروائی تعمیری
ذوق کا
اس کی نحوست
تعمیری ذوق
ہے

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۱۵۰-۱۵۲)

وہی تنبیہ جو آیت ۱۴۴ میں گزری ہے حضرت صالح علیہ السلام نے پھر دہرائی کہ اب بھی وقت باقی ہے، خدا سے ڈرو اور میری بات مانو۔ یہاں کھل کر یہ بات بھی فرما دی کہ اپنے ان لیڈروں کے چکمے میں نہ آؤ جو خدا کے حدود کو لانگ کر بہت دور نکل جا چکے ہیں۔ یہ ملک میں فساد برپا کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ مدعی اصلاح کے ہیں اور ان کی ذمہ داری بھی یہی تھی کہ یہ اصلاح کرتے لیکن یہ اصلاح نہیں کر رہے ہیں بلکہ اصلاح کے نام سے افساد کر رہے ہیں۔ ہم تفسیر سورۂ بقرہ میں یہ واضح

خدا سے ڈرو
لیڈروں سے
ہوشیار رہنے
کی ہدایت

کر چکے ہیں کہ جس طرح اس کائنات کے بقاء کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے اندر ایک ہی خدا کا ارادہ کارفرما ہے اسی طرح اس زمین کی صلاح کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے اندر اسی ایک خدا کا قانون چلے۔ اگر خدا کے قانون کے سوا کوئی اور قانون اور نظام اس میں چلایا جائے تو یہ اس زمین کے امن و عدل کو درہم برہم کرتا ہے اگرچہ اس کو کتنے ہی خوبصورت نام اور کتنے ہی نیک ارادے کے ساتھ چلایا جائے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۱۵۳-۱۵۴)

حضرت صالحؑ کو قوم کا جواب

مُسَحَّرِیْنَ میں مَسْحُوْرِیْنَ سے زیادہ مبالغہ ہے۔ قوم نے حضرت صالحؑ کی اس دردمندانہ تذکیر و تنبیہ کا یہ جواب دیا کہ تم تو ہم کو ایک بالکل ہی سحر زدہ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کسی نے تم پر ایسا جادو کر دیا ہے کہ تمھاری عقل بالکل ہی ماری گئی ہے جس کے سبب سے ہماری اس تہذیب و ترقی میں تمھیں ہر طرف خطرے ہی خطرے نظر آ رہے ہیں اور اس خطرے سے تم ہمیں بھی ڈرا رہے ہو۔ آخر تمھارے ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ ہم تمھیں خدا کا رسول مان لیں اور تمھارے ڈراوے سے مرعوب ہو کر اپنی اس تمام تہذیب و ترقی کی بساط لپیٹ کر رکھ دیں! تم بھی تو ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ اگر خدا کو کوئی رسول ہی بھیجنا تھا تو آخر اس نے ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو رسول بنا کر کیوں بھیجا؟ کسی فرشتے یا کسی مافوق بشر ہستی کو کیوں نہیں بھیجا؟ بہرحال ہم تو تمھیں ایک جھوٹا اور لاف زن سمجھتے ہیں۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ہمیں کوئی ایسی نشانی دکھاؤ جس کو دیکھ کر ہم جان جائیں کہ بے شک تم خدا کے رسول ہو، اگر ہم نے تمھاری بات نہ مانی تو ہم پر وہ عذاب آ جائے گا جس سے تم ڈراوے سنا رہے ہو۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۵۵-۱۵۶)

قوم کے لیے عذاب کی نشانی کا تعین

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کے اس فیصلہ کن جواب کے بعد ایک اونٹنی کو، جو ہو سکتا ہے کہ انھی کی رہی ہو، نامزد کر دیا کہ یہ عذاب کی نشانی ہے۔ یہ عذاب کے مقابل میں ایک بند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر تم نے اس بند کو توڑا تو تم پر عذاب الٰہی آ دھمکے گا۔ خبردار اس کو کوئی گزند نہ پہنچا ہو! ساتھ ہی بطور امتحان یہ ہدایت بھی دے دی کہ مویشیوں کے پانی پلانے کے گھاٹ پر ایک دن پانی پینے کی باری اس کی ہوگی اور ایک دن تمھارے مویشیوں کے لیے خاص ہوگا۔ جو دن اونٹنی کی باری کا ہو اس میں کوئی اس سے مزاحم نہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے جانوروں کے پانی پلانے کا گھاٹ ایک ہی تھا۔ حضرت صالحؑ نے اس پابندی سے اس معاملے کو ایک سخت آزمائش بنا دیا تاکہ قوم کی جسارت پوری طرح بے نقاب ہو جائے۔ مقصود یہ دیکھنا تھا کہ اگر اس تنبیہ کے بعد بھی لوگوں نے اونٹنی کو گزند پہنچانے کی جسارت کی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد وہ خود ان پر بھی ہاتھ اٹھانے سے باز نہیں رہیں گے

اور جب قوم رسول کے معاملے میں طغیان کی اس حد تک بڑھ جاتی ہے تو سنتِ الٰہی کے بموجب وہ عذاب کی گرفت میں آجاتی ہے۔

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ (۱۵۷)

ایک کی بدبختی سب کے لیے موجب عذاب

بھلا یہ اشرار اس پابندی کو کب گوارا کرنے والے تھے کہ ایک دن گھاٹ پر حضرت صالحؑ کی اونٹنی بلا شرکت غیرے، پانی پیے اور دوسرے دن وہ پلائیں۔ چنانچہ انھوں نے جسارت کرکے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ اس فعل کا ارتکاب اگرچہ کیا ایک ہی شخص نے لیکن قرآن نے اس کو منسوب پوری قوم کی طرف کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی شرارت پر دوسرے راضی ہوں، اس کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جرم کے ارتکاب میں سب شریک ہیں چنانچہ اس کے نتیجہ میں جو عذاب آیا وہ سب پر آیا۔

فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ عذاب کی تعبیر ہے۔ یعنی بالآخر انھیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اس جرم کے ارتکاب کے بعد وہ اس پر پچھتائے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جرم کے بعد ان کو تین دن کی مہلت ملی۔ یہ مہلت ظاہر ہے کہ اسی لیے ملی تھی کہ اگر اب بھی ان کو اپنے اس جرم کا احساس ہو جائے تو وہ توبہ و استغفار سے خدا کے عذاب سے اپنے کو بچا سکتے ہیں لیکن اس مہلت سے بھی انھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۱۵۸-۱۵۹)

یہ وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۶۰-۱۷۵

حضرت لوطؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت کا بیان

آگے حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کی سرگزشت ہے۔ حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام نے اپنی اپنی قوموں کو ان کے تمدنی فساد پر تنبیہ فرمایا اور حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس کی ایک نہایت شدید اخلاقی برائی پر تنبیہ فرمایا ـــــ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ برائیاں کبھی منفرد نہیں ہوتیں بلکہ یہ خدا اور آخرت سے بے خوفی کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہیں اس وجہ سے ان کا فساد زندگی کے ہر گوشے میں پھیلا ہوا ہوتا ہے البتہ قوموں کے مزاج اور ان کے ماحول کے اعتبار سے ان کا بروز کسی خاص پہلو میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس سورہ میں وہی نمایاں پہلو زیر بحث آئے ہیں۔ حضرت لوطؑ نے قوم کی اس مہلک بیماری کے عواقب سے آگاہ کیا لیکن قوم نے ان کی باتوں کی کوئی پروا نہیں کی اور بالآخر اسی انجام کو پہنچی جس سے انھوں نے آگاہ کیا۔ اس سرگزشت کا خاتمہ بھی اسی ترجیع پر ہوا ہے جو اوپر گزر چکی

ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام سرگزشتوں کے سنانے سے مقصود ایک ہی ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۶۰-۱۷۵

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِالْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٦٠﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا
تَتَّقُوْنَ ﴿١٦١﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٦٢﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٦٣﴾
وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٤﴾
اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٥﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ
رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿١٦٦﴾ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ
تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿١٦٧﴾ قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ
الْقَالِيْنَ ﴿١٦٨﴾ رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٦٩﴾ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ
اَجْمَعِيْنَ ﴿١٧٠﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿١٧١﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿١٧٢﴾
وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿١٧٣﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧٤﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
ع ۹ ۱۶ ۱۳ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٧٥﴾

ترجمۂ آیات ۱۶۰-۱۷۵

قوم لوط نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔ جب کہ ان کے بھائی لوط نے کہا کہ کیا تم لوگ خدا سے ڈرتے نہیں! میں تمہارے لیے ایک دیانتدار رسول ہوں۔ تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ میں اس پر تم سے کسی صلے کا طالب نہیں ہوں۔ میرا صلہ تو بس خداوند عالم کے ذمہ ہے۔ ۱۶۰-۱۶۴

کیا تم خلق میں سے مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو! اور تمہارے رب نے تمہارے لیے جو بیویاں پیدا کی ہیں ان کو چھوڑتے ہو! بلکہ تم لوگ نہایت ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو! ۱۶۵-۱۶۶

وہ بولے کہ اے لوط! اگر تم باز نہ آئے تو تم لازماً یہاں سے نکال چھوڑے جاؤ گے۔ اس نے کہا، میں تمہارے اس عمل سے سخت بیزار ہوں۔ اے رب! تو مجھے اور میرے اہل کو ان کے عمل کے انجام سے نجات دے۔ تو ہم نے اس کو اور اس کے سارے اہل کو نجات دی، صرف ایک بڑھیا پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ چھوڑ دی گئی۔ پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا اور ہم نے ان پر برسایا نہایت ہولناک برسانا۔ تو کیا ہی بری تھی وہ بارش جو ان پر برسی جن کو انجام سے آگاہ کیا جا چکا تھا! ۱۶۸-۱۷۳

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔ اور بے شک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۷۴-۱۷۵

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱۶۰-۱۶۴)

یہ آیات اوپر کی سرگزشتوں میں گزر چکی ہیں اور وہاں ان کی وضاحت ہو چکی ہے۔

أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ۝ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ (۱۶۵-۱۶۶)

قوم لوط دیوثیت

یہ ان کی سب سے بڑی معصیت کی طرف اشارہ ہے۔ ہم دوسرے مقام میں وضاحت کر چکے ہیں کہ امرد پرستی قوم لوط میں فیشن بن گئی تھی۔ یہ دیوثیت اگر کسی قوم میں فیشن کی حیثیت حاصل کر لے تو وہ قوم خدا کی زمین پر نجاست کا ایک ڈھیر بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے اپنی زمین کو پاک کر دیتا ہے۔

قوم کے اندھے پن کی طرف اشارہ

'ذُكْرَانَ' کے بعد 'مِنَ الْعَالَمِينَ' کے الفاظ سے قوم کے اندھے پن کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ خلق میں سے تمہیں اس مقصد کے لیے مرد ہی ملے حالانکہ اس ضرورت کے لیے خدا نے جو چیز بنائی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے بلکہ اندھوں کو بھی نظر آ سکتی ہے! ان کے اسی اندھے پن کی طرف

سورۂ نمل میں یوں اشارہ فرمایا ہے۔ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۔ ۵۴ (کیا تم اس کھلی ہوئی بےحیائی کا ارتکاب کرتے ہو درآنحالیکہ تم آنکھیں رکھتے ہو!)

الٹی گنگا بہانے کا انجام

وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ۔ یہ اس اندھے پن کی وضاحت بھی ہے اور اس ذوقِ فاسد کا لازمی نتیجہ بھی۔ جن لوگوں کے اندر یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے ان کی فطرت بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ عورت کی رغبت ان کے اندر بالکل مردہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے لوگ بنجر کو سیراب کرتے اور کھیتوں کو خشک ہونے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور پھر یہ الٹی گنگا بہانے کا جو نتیجہ نکلنا چاہیے وہ نکلتا ہے۔

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ۔ یہ انتہائی غم و حسرت کا فقرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے جرم کے گھنونے پن کی تعبیر سے الفاظ قاصر ہیں۔ تم فطرت کے تمام حدود توڑ کر بہت دور نکل گئے ہو!

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ (۱۶۷)

قوم کی فیصلہ کن دھمکی

قوم نے اس تمام دلسوزی و دردمندی کا جواب یہ دیا کہ اے لوط! اگر تم اپنی اس نصیحت و ملامت سے باز نہ آئے تو یاد رکھو کہ تم یہاں سے نکال کر چھوڑے جاؤ گے! فقرے کا تیور صاف بتا رہا ہے کہ خروج کی یہ دھمکی پہلی دھمکی نہیں بلکہ آخری فیصلہ کن دھمکی ہے۔ یہ دھمکی وہ پہلے بھی دیتے رہے تھے۔ اس کی طرف قرآن میں اشارات موجود ہیں لیکن اس دھمکی کا انداز سابق دھمکیوں سے مختلف ہے۔ اب انھوں نے اپنا دوٹوک فیصلہ سنا دیا کہ اپنی زبان بند کرو ورنہ یاد رکھو کہ ہم تم کو نکالنے کی جو دھمکی دیتے رہے ہیں وہ پوری کر کے رہیں گے۔

قَالَ اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ (۱۶۸)

'قلی' کے معنی شدید بغض و نفرت کے ہیں۔ حضرت لوطؑ نے قوم کی فیصلہ کن دھمکی کا جواب بھی بھرپور دیا۔ فرمایا کہ میں تو تمھارے اس عمل سے شدید بغض و نفرت رکھنے والوں میں سے ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مجھ سے بیزاری و عناد کا سبب یہ ہے کہ میں تمھارے اس عمل پر تمھیں ملامت کرتا ہوں تو تمھاری یہ دھمکی مجھے اس سے نہ روک سکتی اور نہ ذرا اس میں مجھے نرم کر سکتی۔ خوب کان کھول کر سن لو کہ میں اس سے شدید بغض و نفرت رکھنے والوں میں سے ہوں تو تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو، کر گزرو۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

دھمکی کا بھرپور جواب

'مِنَ الْقَالِيْنَ' میں لفظ جمع لانے سے کلام میں زیادہ زور پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں ہی تنہا اس سے بیزار نہیں ہوں بلکہ ہر وہ انسان جس کی فطرت سلیم اور عقل مستقیم ہے اس سے بیزار ہوگا اور میں انہی میں ہوں۔ میں تمھارے اس عمل کے ساتھ کسی طرح تمھارا ساتھی بننا گوارا نہیں کرتا۔

رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ (۱۶۹)

حضرت لوطؑ کی دعا

'مِمَّا یَعْمَلُوْنَ' میں عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق مضاف محذوف ہے۔ یعنی من عقوبۃ ما یعملون' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ۔

حضرت لوطؑ نے قوم کی اس دھمکی کے بعد اندازہ فرمالیا کہ اب فیصلہ کی آخری گھڑی قریب آگئی ہے۔ ان لوگوں نے جب میرے نکالنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو سنتِ الٰہی کے مطابق ان پر عذاب بھی لازماً آئے گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے متعلقین اور اپنے ساتھیوں کے لیے دعا مانگی کہ اے رب اس نابکار قوم کے اعمال کے نتیجے میں جو عذاب اس پر آنے والا ہے اس سے مجھ کو اور میرے اہل کو محفوظ رکھیو۔ لفظ 'اھل' پر ہم دوسری جگہ بحث کرچکے ہیں کہ اس کے اندر اتباع بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر کچھ لوگ حضرت لوطؑ پر ان کی قوم میں سے، ایمان لائے ہوں گے تو وہ بھی اس میں شامل ہیں۔

فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ۝ اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ۝ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ۝ وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ (۱۷۰-۱۷۳)

اس کے بعد قوم لوط پر عذاب آگیا۔ اس عذاب کی نوعیت کی تفصیل ہم سورۂ حجر کی تفسیر میں کرچکے ہیں۔

'عَجُوْز' سے مراد حضرت لوطؑ کی بیوی ہے جس کی ساری ہمدردیاں اپنی قوم کے ساتھ تھیں۔ اس وجہ سے حضرت لوطؑ کے اہل میں سے ہونے کے باوجود یہ عذاب کی گرفت میں آگئی۔ لفظ 'عجوز' یہاں اس کے لیے بطور تحقیر استعمال ہوا ہے۔

قریش کو تنبیہ

'فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ' میں قریش کے لیے انذار و تنبیہ ہے کہ جن لوگوں کو کسی رسول کے ذریعہ سے انذار کیا جاتا ہے اگر وہ اس انذار کو خاطر میں نہیں لاتے تو ان پر اسی طرح خدا کے غضب کی بارش ہوتی ہے اور یہ بارش نہایت ہی بری بارش ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ (۱۷۴-۱۷۵)

یہ آخر میں وہی ترجیع ہے جس کی وضاحت اوپر ہوچکی ہے۔

۱۴- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۷۶-۱۹۱

حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت کا بیان

آگے حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم اصحاب مدین کی سرگزشت ہے۔ جس طرح اوپر حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کے اخلاقی فساد پر اس کو متنبہ کیا اسی طرح حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو اس کے معاشی فساد پر متنبہ کیا لیکن اس قوم نے بھی اپنے رسول کے ساتھ وہی روش اختیار کی جو اس کی پیشرو قوموں نے

اختیار کی اور بالآخر اسی انجام سے دوچار ہوئی جس سے دوسری قومیں دوچار ہوئیں۔ یہ سرگزشت بھی اسی ترجیع پر تمام ہوتی ہے جو اوپر ہر سرگزشت کے خاتمہ پر وارد ہوئی ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۷۶-۱۹۱

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا
تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾
وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾
اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ
الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي
الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾
قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا
وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ
السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ
عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾

ع ۱۰ / ۱۶ / ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۷۶-۱۹۱

اصحاب الایکہ نے بھی رسولوں کی تکذیب کی جب کہ شعیب علیہ السلام نے ان کو آگاہ کیا، کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں! میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں طلب کرتا۔ میرا صلہ تو بس خداوند عالم کے ذمہ ہے۔ ۱۷۶-۱۸۰

تم لوگ پورا پورا ناپ کرو اور خسارہ پہنچانے والوں میں سے نہ بنو اور صحیح ترازو سے

تولا کرو۔ اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو اور زمین میں مفسد بن کر نہ پھیلو اور اس ذات سے ڈرو جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور تم سے پہلوں کو بھی۔ ۱۸۱-۱۸۴

انھوں نے جواب دیا کہ تم تو ایک بالکل سحر زدہ ہو۔ اور تم تو بس ہمارے ہی جیسے ایک بشر ہو۔ اور ہم تو تم کو بالکل جھوٹوں میں سے خیال کرتے ہیں۔ ۱۸۵-۱۸۶

تو اگر تم سچے ہو تو ہم پر آسمان سے ٹکڑے گراؤ۔ اس نے کہا میرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا پس ان کو بادل والے دن کے عذاب نے آ دبوچا اور بے شک وہ ایک ہولناک دن کا عذاب تھا۔ ۱۸۷-۱۸۹

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تیرا رب بڑا ہی عزیز و رحیم ہے۔ ۱۹۰-۱۹۱

۱۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ (۱۷۶)

اصحاب ایکہ سے مراد اہل مدین ہیں

'ایکۃ' جھاڑی، بن اور جنگل کو کہتے ہیں۔ مدین کے پاس ایک جنگل بھی تھا اس وجہ سے اصحاب مدین، اصحاب الایکہ کے نام سے بھی مشہور تھے۔ بعض مفسرین نے اصحاب الایکہ اور اصحاب مدین کو دو الگ الگ قومیں سمجھا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ حضرت شعیبؑ کی بعثت ان دونوں قوموں کی طرف ہوئی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۷۷-۱۸۰)

یہ آیات اوپر کی سرگزشت میں گزر چکی ہیں اور وہاں ان کے ہر جزو کی وضاحت ہو چکی ہے۔

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ۝ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (۱۸۱-۱۸۲)

ناپ تول میں کمی نظام کائنات کے منافی ہے

اصحاب مدین تجارت پیشہ تھے اور اس پیشے میں انھوں نے بڑی ترقی کر لی تھی لیکن جب خدا اور آخرت سے غفلت ہو تو شیطان ہر چیز کے اندر گھس کر فساد پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے

اندر ناپ تول میں کمی کرنے کی بیماری پھیل گئی۔ یہ معاشی فساد ایک شدید قسم کی متعدی بیماری ہے جو کسی قوم میں پیدا ہو جائے تو ہر دکاندار اور ہر تاجر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر بے ایمانی، ناپ تول میں غبن، ملاوٹ، تہ بازاری اور چور بازاری کی ایسی ایسی شکلیں ایجاد ہو جاتی ہیں کہ معاشرے کا ہر شخص چیخ اٹھتا ہے۔ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ایک میزان کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اسی میزان پر یہ آسمان و زمین قائم ہیں۔ اگر یہ درہم برہم ہو جائے تو یہ آسمان و زمین درہم برہم ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ نظام انسانوں کو یہ رہنمائی دیتا ہے کہ وہ بھی اپنے اندر ہر شعبۂ زندگی میں صحیح میزان کے قیام کا پورا پورا اہتمام رکھیں ورنہ ان کا سارا معاشی و معاشرتی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ یہاں اشارے پر کفایت کیجیے۔ ان شاء اللہ سورہ رحمان کی تفسیر میں ہم اس نکتہ پر وضاحت سے گفتگو کریں گے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۱۸۳)

اشیاء میں ملاوٹ

یعنی ناپ تول میں کمی اور ڈنڈی ماری کر کے لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو۔ اسی کی ایک نہایت ہی مجرمانہ صورت اشیاء میں ملاوٹ بھی ہے کہ کوئی شخص گندم میں جو، گھی میں چربی، شکر میں ریت، گوشت میں چھیچھڑے اور دودھ میں پانی ملا کر فروخت کرے۔ اس طرح وہ بظاہر خریدار کو وزن یا پیمانہ کے اعتبار سے تو چیز پوری کر دیتا ہے لیکن اس کے اندر اصل شے ایک ثلث کے بقدر بھی مشکل سے ہوتی ہے۔ اور اس میں مضر صحت اشیاء کی جو ملاوٹ ہوتی ہے وہ مزید برآں۔ یہاں تک کہ آدمی بازار کی کوئی چیز کھاتا ہے تو اس کا دل دھڑکتا رہتا ہے کہ وہ کوئی کھانے کی چیز کھا رہا ہے یا زہر نگل رہا ہے۔

حرام خوری کا موٹاپا راس آنے والی چیز نہیں ہے

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ یعنی میزان حق و عدل کو درہم برہم کر کے اگر تم نے دنیا میں ترقی کی تو یہ ترقی کوئی مبارک ترقی نہیں ہے۔ دنیا میں بڑھو تو مفسد بن کر نہ بڑھو بلکہ مصلح بن کر پھلو پھولو۔ اگر حرام کی نفع اندوزی سے موٹے ہوئے تو یہ موٹاپا راس آنے والی چیز نہیں ہے۔ اس کا انجام نہایت مہلک ہو گا!

وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ (۱۸۴)

خدا کے ہاں سب کے لیے ایک ہی باٹ اور ترازو ہے

جِبِلَّة کے معنی خلق و خلقت کے ہیں۔ یہ حضرت شعیبؑ نے تاریخ سے سبق حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی کہ جس خالق نے اگلوں کو پیدا کیا اسی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے۔ اگر اس نے اگلوں کو تمدن و معاشرت میں فساد پیدا کرنے کے سبب سے نیست و نابود کر دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارے معاملے میں اس کی سنت بدل جائے اور وہ تمہیں تمھارے اس معاشی فساد پر سزا نہ دے۔ اگر تمہارا خدا ان کے خدا سے کوئی الگ ہوتا تب تو تم یہ توقع کر سکتے تھے کہ تمہارے لیے اس نے کوئی الگ قانون بنایا ہو گا لیکن خدا وہی ہے اور لاریب وہی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کے پاس اگلوں کے لیے کوئی اور باٹ اور ترازو ہو تمہارے لیے کوئی اور۔ خدا تو سب کے لیے ایک ہی ترازو سے تولے گا تو اس سے ڈرو اور اپنی اس روش کی اصلاح کرو۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۱۸۵-۱۸۷)

مکذبین کا مطالبۂ عذاب

قوم نے حضرت شعیبؑ کی اس دردمندانہ تنبیہ کا وہی جواب دیا جو دوسرے رسولوں کے مکذبین سے منقول ہوا ہے۔ اول یہ کہ یہ الٹی پلٹی باتیں جو تم کر رہے ہو یہ اس بات کا قرینہ ہیں کہ تم پر کسی نے نہایت سخت قسم کا جادو کر دیا ہے۔ دوسرا یہ کہ جب تم ہمارے ہی جیسے ایک بشر ہو تو ہم تمھیں خدا کا بھیجا ہوا رسول کس طرح مان لیں! تیسرا یہ کہ اگر تم سچ مچ رسول ہو، اگر ہم نے تمھاری بات نہ مانی تو ہم پر آسمان ٹوٹ پڑے گا تو ہم پر آسمان سے کچھ ٹکڑے گرا کر دکھاؤ۔ 'کِسَفٌ' جمع ہے 'کِسْفَۃٌ' کی۔ دوسری سورتوں میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے قوم کو آگاہ کیا تھا کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تم پر اسی طرح کا کوئی عذاب آئے گا جس طرح کے عذاب عاد، ثمود اور قوم لوطؑ پر آئے۔ ان کے اس انذار کے جواب میں قوم نے ان کے سامنے یہ مطالبہ رکھ دیا۔

قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۸۸)

حضرت شعیبؑ کا اپنے رب پر تفویض الی اللہ

یہ تفویض الی اللہ کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان سے ٹکڑے گرانا میرے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ تمھاری کارستانیوں سے اچھی طرح باخبر ہے تو میں اس معاملے کو اسی کے حوالہ کرتا ہوں۔ اس کی حکمت کا جو تقاضا ہو گا وہ ظہور میں آئے گا اور بالکل ٹھیک وقت پر ظہور میں آئے گا۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۸۹)

عذاب یوم الظلہ

قوم شعیب کے عذاب کی نوعیت ہم سورۂ اعراف آیت ۹۱ کی تفسیر کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ تفصیل کے طالب وہاں دیکھ لیں۔ اس عذاب کی تعبیر سورۂ ہود آیت ۹۴ میں لفظ 'صَيْحَةٌ' سے کی گئی ہے جس کے معنی ڈانٹ اور کڑک کے ہیں۔ پھر اسی کی تعبیر یہاں 'عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ' سے کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب دور سے دیکھنے میں غبار یا ابر یا دھوئیں کے ایک ستون یا سائبان کی شکل میں نظر آیا۔ یہ قرینہ جیسا کہ ہم قوم لوط کی سرگزشت میں بیان کر چکے ہیں حاصب کے عذاب کا ہے۔ حاصب کے عذاب میں حاصب، رَجْفَۃٌ، صَيْحَةٌ اور ظُلَّۃٌ سب جمع ہو جاتے ہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۱۹۰-۱۹۱)

یہ آخر میں وہی ترجیع ہے جو اوپر ہر سرگزشت کے بعد آئی۔

۱۶- آگے کا مضمون ____ آیات ۱۹۲-۲۲۷

خاتمۂ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں اور سلسلۂ کلام، سورہ کی تمہید، یعنی اصل عمود، سے جڑ گیا ہے۔

وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ قرآن کا کتاب الٰہی ہونا بالکل واضح ہے۔ جو لوگ اس کو ماننے کے لیے کسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ محض نہ ماننے کا ایک بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر اللہ چاہے تو کوئی ایسی نشانی بھی ان کو دکھا سکتا ہے جس کے آگے ان کی اکڑی ہوئی گردنیں جھک جائیں لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس طرح کی کوئی نشانی دیکھنے کے بجائے یہ عقل و بصیرت سے کام لیں۔ تاہم اگر ان کی یہی ہٹ دھرمی قائم رہی تو قرآن ان کو جن خطرات سے آگاہ کر رہا ہے ان میں سے ایک ایک خطرہ ان کے سامنے آ کے رہے گا۔ اس کے بعد اسی حقیقت کو مبرہن کرنے کے لیے حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی سرگزشتیں شروع ہو گئی تھیں کہ اگر ان کو کسی نشانی ہی کی طلب ہے تو ان واقعات سے کیوں سبق نہیں لیتے؟ ان میں سے ہر واقعہ کے اندر نشانی موجود ہے۔ اگر انہی قوموں کی روش انھوں نے بھی اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے ساتھ خدا کا معاملہ اس سے مختلف ہو جو ان قوموں کے ساتھ ہوا۔ سرگزشتوں کا یہ سلسلہ حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت پر ختم ہوا۔ اس کے بعد تاریخی اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ ان کی سرگزشت چونکہ اوپر نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی تھی اس وجہ سے یہاں اس کو نہیں لیا بلکہ کلام اصل عمود کی طرف لوٹ آیا کہ یہ قرآن خدا کا اتارا ہوا کلام ہے۔ یہ کوئی شیطانی القاء نہیں ہے اور نہ یہ کوئی شاعری ہے۔ اس کی پیشین گوئیاں پچھلے صحیفوں میں بھی موجود ہیں اور علمائے بنی اسرائیل ان سے واقف ہیں۔ اگر یہ بدقسمت لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں تو پیغمبر کو ان کی کوئی پروا نہیں کرنی چاہیے بلکہ اپنی ساری توجہ اپنے ایمان لانے والے ساتھیوں پر مرکوز کر دینی چاہیے۔ یہ شامت زدہ لوگ خود اپنا انجام بہت جلد دیکھ لیں گے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۹۲-۲۲۷

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٩٢﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾
عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿١٩٥﴾
وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٩٦﴾ أَوَلَمْ يَكُن لَّهُمْ آيَةً أَن يَعْلَمَهُ
عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿١٩٧﴾ وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ ﴿١٩٨﴾
فَقَرَأَهُ عَلَيْهِم مَّا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿١٩٩﴾ كَذَٰلِكَ سَلَكْنَاهُ فِي
قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ﴿٢٠٠﴾ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ

الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۱﴾ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ
نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ
مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ مَآ اَغْنٰى
عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا
مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾ وَمَا تَنَزَّلَتْ مع
بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ
عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ
مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ
جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ
اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۰۷﴾
الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ
الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ
وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ
تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا
يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ
كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۗ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾ ۱۱ ع ۳۶ ۱۵

ترجمۂ آیات ۱۹۲ - ۲۲۰

اور بے شک یہ نہایت اہتمام سے خداوندِ عالم کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو تمہارے قلب پر امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے تاکہ تم لوگوں کو آگاہ کر دینے والوں میں سے بنو۔ واضح عربی زبان میں! اور اس کا ذکر اگلوں کے صحیفوں میں بھی ہے۔ کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں؟ ۱۹۲ - ۱۹۷

اور اگر ہم اس کو کسی عجمی پر اتارتے اور وہ ان کو یہ سناتا تو وہ اس پر ایمان لانے والے نہ بنتے۔ ہم مجرموں کے دلوں میں اس کو اسی طرح داخل کرتے ہیں۔ یہ اس پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ پس وہ ان پر اچانک آدھمکے گا اور وہ اس سے باخبر نہ ہوں گے۔ اس وقت کہیں گے، کیا ہمیں کچھ مہلت ملے گی! ۱۹۸ - ۲۰۳

کیا وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں! بھلا بتاؤ تو کہ اگر ہم ان کو چند سال اور بہرہ مند رکھیں پھر ان پر وہ عذاب آجائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے تو یہ بہرہ مندی ان کے کس کام آئے گی! ۲۰۵ - ۲۰۷

ہم نے کسی بستی کو بھی ہلاک نہیں کیا مگر اس کے لیے پہلے ہوشیار کرنے والے بھیجے، یاددہانی کے لیے اور ہم ظالم نہیں ہیں۔ ۲۰۸ - ۲۰۹

اور اس کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں۔ نہ یہ ان کے لیے لائق ہے اور نہ یہ ان کے بس کا ہے۔ وہ سن گن لینے سے معزول کیے جا چکے ہیں۔ ۲۱۰ - ۲۱۲

پس تم اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارنا کہ تم بھی سزاوارِ عذاب ٹھہرو۔ اور اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈراؤ اور جن اہلِ ایمان نے تمہاری پیروی کی ہے ان کے لیے اپنی شفقت کے بازو جھکائے رکھو۔ ۲۱۳ - ۲۱۵

اگر یہ لوگ تمھاری نافرمانی کر رہے ہیں تو ان کو سنا دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو میں اس سے بری ہوں۔ اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ رکھو۔ اس خدا پر جو تمھیں دیکھتا ہے اس وقت جب تم اٹھتے ہو اور دیکھتا ہے تمھاری آمد و شد کو سجدہ کرنے والوں کے درمیان۔ بےشک وہ سمیع و علیم ہے۔ ۲۱۶-۲۲۰

کیا میں تمھیں بتاؤں کہ شیاطین کن پر اترتے ہیں! وہ لپاٹیوں بدکاروں پر اترتے ہیں جو کان لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ ۲۲۱-۲۲۳

اور شاعروں کی پیروی گمراہ کرتے ہیں۔ کیا نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں! اور وہ کہتے ہیں وہ جو کرتے نہیں۔ بس وہ اس سے مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے، جنھوں نے نیک اعمال کیے، جنھوں نے اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کیا اور جنھوں نے بدلہ لیا بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہوا۔ اور یہ جنھوں نے ظلم کیا ہے عنقریب جان لیں گے کہ ان کا ٹھکانا کیا ہوتا ہے۔ ۲۲۴-۲۲۷

۱۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (۱۹۲-۱۹۴)

قرآن کا مرتبہ و مقام

'اِنَّهٗ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ چونکہ اصل سیاق کلام، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، واضح ہے اس وجہ سے ضمیر مرجع کے بغیر آگئی ہے۔

'تَنْزِيْلٌ' کے معنی اہتمام کے ساتھ اتارنے کے ہیں۔ یہ قرآن کے منکرین و مخالفین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ یہ قرآن کاہنوں کے کلام کی طرح کوئی شیطانی القا نہیں ہے بلکہ نہایت اہتمام سے اتارا ہوا اللہ رب العالمین کا کلام ہے اس وجہ سے اس کی قدر کریں۔ اس کی تکذیب کر کے اپنی شامت نہ بلائیں۔

'نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ'۔ 'اَلرُّوْحُ الْاَمِيْنُ' حضرت جبریل علیہ السلام کا لقب ہے۔ امین کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حضرت جبریل کے حوالہ کیا وہ بے کم و کاست

بغیر کسی ادنیٰ تغیر و تبدل کے، انھوں نے پیغمبر کو پہنچایا ہے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی خیانت نہیں کی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اسلام دشمنی کے جوش میں یہود اور روافض نے حضرت جبریلؑ پر نعوذ باللہ خیانت کا الزام بھی لگایا ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں اس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

'عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ' ضمیر کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یعنی اس وحی کا مہبط تمہارا نفس نہیں بلکہ قلب ہے جو انسان کے وجود کا سب سے اشرف و اعلیٰ حصہ ہے اس وجہ سے اس شبہے کا کوئی امکان نہیں ہے کہ اس میں کسی نفسانی وسوسہ یا شیطانی دندغہ کو کوئی دخل ہو۔ اگرچہ آیت میں خطاب ظاہر الفاظ کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن کلام کا مقصود مخالفین پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ یہ کلام پاک منبع سے نکلا ہے، پاک ذریعہ سے اترا ہے اور پاک ترین محل میں اس نے اپنا مستقر بنایا ہے۔

'لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ' یہ اس کلام کے اس اہتمام و شان کے ساتھ اتارے جانے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ یہ اس لیے اتارا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے تم ان لوگوں کو، جو خدا اور آخرت سے بالکل بے پروا ہو کر زندگی بسر کر رہے ہیں اس غفلت کے نتائج و عواقب سے اچھی طرح آگاہ کر دو۔ یعنی یہ کلام محض کلام نہیں ہے بلکہ یہ انذار ہے اور تم ایک منذر ہو اس وجہ سے لوگ اس کو گوشِ ہوش سے سنیں ورنہ ان نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار رہیں جن کی یہ خبر دے رہا ہے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ (۱۹۵)

اہل عرب کو تنبیہ — یہ اہلِ عرب پر اظہارِ احسان ہے کہ اللہ نے یہ تم پر خاص فضل فرمایا ہے کہ اس نے اس کلام کو نہایت واضح عربی زبان میں اتارا ہے۔ یہ چیز تمہارے لیے باعث شرف بھی ہے اور اس میں تمہارے اوپر اتمام حجت بھی ہے۔ اب تم یہ عذر نہیں کر سکتے کہ تم اس کے سمجھنے سے قاصر رہے۔ اس اہتمام کے بعد بھی اگر تم نے اس کی قدر نہ کی تو اس کی ذمہ داری تمہارے ہی اوپر ہوگی۔

وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ۝ اَوَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۱۹۶-۱۹۷)

قرآن کے حق میں سابق صحیفوں کی شہادت — یہ قرآن کے حق میں سابق صحیفوں کی شہادت کا حوالہ ہے کہ اس کا ذکر اور اس کی پیشین گوئی انبیائے سابقین کے صحیفوں میں بھی موجود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیم و دعوت سے متعلق تورات، زبور اور انجیل میں جو پیشین گوئیاں ہیں ہم ان کا حوالہ ان کے محل میں دے چکے ہیں۔ ان پیشین گوئیوں سے بنی اسرائیل کے علماء اچھی طرح آگاہ تھے۔ اگرچہ ان کی اکثریت نے ان کو چھپایا لیکن ان کے اندر ایسے علمائے حق بھی تھے جنھوں نے ان کا برملا اظہار کیا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان بھی لائے۔ قرآن نے ان کی اس حق پرستی کی جگہ جگہ نہایت شاندار الفاظ میں تعریف فرمائی ہے۔

انھی پیشین گوئیوں اور انھی علماء کا حوالہ دے کر یہ قرآن کے مخالفین سے سوال کیا ہے کہ کیا قرآن اور

اس کے داعی کی صداقت کی یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ وہ کسی مزید نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں؟ یہ امر ملحوظ رہے کہ دینی معاملات میں اہل عرب اہل کتاب کی برتری تسلیم کرتے رہے ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے جوش میں وہ ایسے اندھے ہو گئے کہ جن اہل کتاب نے ان کی پیٹھ ٹھونکی ان کو تو انھوں نے اپنا ہمدرد و بہی خواہ سمجھا لیکن جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کی ان کو انھوں نے، جیسا کہ پچھلی سورہ میں گزر چکا ہے، قرآن کی تصنیف میں شریک سازش قرار دے دیا۔

ترجمہ اصل قرآن کا قائم مقام نہیں

آیت وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ کی یہ تاویل جو ہم نے کی ہے نہایت واضح ہے۔ اس کے شواہد پیچھے بھی اس کتاب میں گزر چکے ہیں، آگے بھی آئیں گے لیکن معلوم نہیں کہ کس طرح بعض فقہاء کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ انھوں نے اس سے یہ استنباط کیا ہے کہ قرآن کسی عجمی زبان میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ کسی دوسری زبان میں اگر قرآن کو منتقل کیا جائے گا تو وہ قرآن نہیں ہوگا بلکہ اس کا ترجمہ ہوگا اور ترجمہ اور اصل میں آسمان و زمین کا فرق ہوتا ہے۔ پورے قرآن کو تو درکنار قرآن کی کسی ایک سورہ بلکہ ایک آیت کے ترجمہ کو قرآن کی سورہ یا اس کی آیت کا قائم مقام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جو لوگ قرآن کے ایجاز اور اس کے اعجاز سے واقف ہیں ان کا تجربہ تو یہ ہے کہ بعض آیات کا مفہوم بالکل واضح ہوتا ہے۔ مترجم ان میں کوئی ابہام یا اشکال بھی محسوس نہیں کرتا، لیکن برسوں کی محنت کے بعد بھی جب وہ ان کا ترجمہ کرنے بیٹھتا ہے تو، ترجمہ کی زبان پر پوری قدرت رکھنے کے باوجود، وہ صاف محسوس کرتا ہے کہ ترجمہ میں آیت کی بلاغت تو درکنار اس کے پورے مفہوم کو بھی وہ ادا نہیں کر پایا۔ قرآن تو خیر ایک معجز کتاب ہے، دوسرے آسمانی صحائف، جن کے معجز ہونے کا دعویٰ نہیں کیا گیا ہے، ان کا حال بھی یہ ہے کہ ان کے ترجموں کو ان کی اصل کا قائم مقام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ بلکہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی گمراہی میں بڑا دخل اس چیز کو بھی ہے کہ ان کے صحیفوں کی اصل زبان مٹ گئی اور انھوں نے ان کے ترجموں ہی کو اصل کا قائم مقام قرار دے کر انہی پر اپنی تمام فقہ اور سارے علم کلام کی بنیاد رکھ دی۔ پال نے نصاریٰ کو گمراہ کرنے میں انجیلوں کے ترجموں سے جو کام لیا ہے اس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔ بہرحال ہمارے نزدیک یہ استنباط اس آیت سے بالکل بے جوڑ اور بجائے خود بالکل غلط بلکہ دین کے لیے ایک شدید فتنہ ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ جن فقہاء کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کسی غلط فہمی کی بنا پر منسوب کی گئی ہے لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے الگ ہے اس وجہ سے ہم اس کی تحقیق میں پڑنا نہیں چاہتے۔

وَلَوْ نَزَّلْنَٰهُ عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ ۝ فَقَرَأَهُ عَلَيْهِم مَّا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ (۱۹۸-۱۹۹)

یہ اسی امتنان و احسان کے مضمون کی، جو آیت ۱۹۲ میں گزرا، مزید وضاحت فرمائی کہ اگر یہ قرآن کسی عجمی پر عجمی زبان میں اترا ہوتا اور وہ ان کو سناتا تب تو وہ یہ عذر کرتے کہ عربی کے لیے عجمی قرآن کے کیا

معنی! لیکن اب وہ کیا عذر پیش کریں گے جب کہ اللہ نے انہی کی بہترین زبان میں اور انہی کے بہترین شخص پر اس کلام کو نازل فرمایا! سورہ حٰمٓ السجدہ میں یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے، وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِیًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ ءَاَعْجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ (۴۴) (اور اگر ہم اس کو عجمی قرآن بناتے تو یہ کہتے کہ اس کی آیات کھول کیوں نہ گئیں! کلام عجمی اور مخاطب عربی) سورۂ نحل کی آیت ۱۰۳ میں بھی اس مضمون کے ایک پہلو کی وضاحت ہوئی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ۝ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ۝ فَیَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝ فَیَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ (۲۰۰-۲۰۳)

'سَلَكَ' کے معنی کسی چیز کو کسی چیز کے اندر داخل کرنے کے بھی آتے ہیں۔ یہاں یہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مخالفین قرآن کی اصل بیماری — یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ قرآن سے جو بدک رہے ہیں اس کا سبب قرآن کی کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ ان کے دلوں کی خرابی ہے۔ مسلسل مجرمانہ زندگی بسر کرنے کے سبب سے ان کے دل اس قدر فاسد ہو چکے ہیں کہ ان کے اندر اب کوئی صحیح چیز قبول کرنے کی صلاحیت باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔ ایک غلط روش پر پختہ ہو جانے کے باعث ان کے دل ٹیڑھے ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے قرآن کی سیدھی باتیں ان کے دلوں کو چیرتی ہوئی داخل ہوتی ہیں اور ان کی طبیعتیں اس کو قبول کرنے سے ابا کرتی ہیں۔ جس کا معدہ فاسد ہو چکا ہو اس کو صالح سے صالح غذا بھی دیجیے تو اس کی طبیعت اس کو قبول نہیں کرتی بلکہ وہ قے کر دیتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہو چکا ہے اور یہ بات سنت الٰہی کے تحت ہوئی ہے۔ اس لیے کہ جو لوگ اپنی فطرت مسخ کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہے۔ اب یہ لوگ قرآن کی صداقت اسی وقت تسلیم کریں گے جب اس عذاب کو دیکھ لیں گے جس کی قرآن ان کو خبر دے رہا ہے۔ وہ عذاب ان پر اچانک آئے گا۔ اس کے ظہور سے پہلے ان کو اس کی کوئی خبر بھی نہ ہوگی۔ اس وقت وہ نہایت حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ کیا ہمیں کچھ تھوڑی سی مہلت اور ملے گی کہ ہم اپنے رویے کی اصلاح کر لیں لیکن اس کا وقت گزر چکا ہو گا۔

اَفَبِعَذَابِنَا یَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ اَفَرَءَیْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِیْنَ ۝ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ۝ مَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یُمَتَّعُوْنَ (۲۰۴-۲۰۷)

سوال اظہار تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ جو چیز شدنی ہے وہ بہر حال شدنی ہے۔ اگر اس میں کچھ دیر ہو رہی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب یہ اس سے مامون ہو گئے۔ اگر ہم نے ان کو چند سال اور کھانے پینے کی مہلت دے دی تو اس سے کیا فرق پیدا ہو جائے گا بالآخر تو ان کو اسی چیز سے سابقہ پیش آنا ہے جس سے ان کو آگاہ کیا جا

رہا ہے! ان کے اندر رسول کی بعثت نے اب یہ فیصلہ کن مرحلہ ان کے سامنے کر دیا ہے۔ اس میں اگر تاخیر ہو رہی ہے تو یہ مصلحتِ الٰہی سے ہو رہی ہے۔ اس تاخیر کے سبب سے اگر یہ اس سے بےغیرت ہو کر اس کا مذاق اڑا رہے ہیں تو یہ ان کی بدبختی ہے۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ۝ۖۛ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲۰۸-۲۰۹)

قریش کو تنبیہ — یہ اس سنتِ الٰہی کی یاددہانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے قوموں کے معاملے میں اختیار فرمائی ہے کہ وہ عادل اور رحیم ہے اس وجہ سے انذار اور اتمامِ حجت کے بغیر وہ کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا۔ ذِكْرٰى یہاں رسولوں کے مقصدِ بعثت کی وضاحت کے لیے ہے اور اسلوبِ بیان واضح کر رہا ہے کہ مقصود اس پر خاص طور پر زور دینا ہے کہ بغیر اس یاددہانی کے اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا۔ بغیر یاددہانی کے ہلاک کرنا ظلم ہوتا اور اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ سنتِ الٰہی کے مطابق تذکیر کے لیے ایک منذر آ گیا ہے۔ اگر تم نے اس کی قدر نہ کی تو اس کا جو لازمی نتیجہ ہے وہ تمہارے سامنے آ کر رہے گا۔ اور یہ کوئی ظلم نہیں ہوگا بلکہ عین عدل ہوگا۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ (۲۱۰)

اوپر آیت ۱۹۲ میں جو بات مثبت پہلو سے فرمائی ہے وہی بات یہاں منفی پہلو سے ارشاد ہوئی ہے۔ ان مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا کلام ہے۔ شیاطین کا اتارا ہوا نہیں ہے جیسا کہ تم (یعنی قریش) سمجھتے یا کہتے ہو۔

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (۲۱۱-۲۱۲)

یہ دلیل ارشاد ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں یہ شیطانی کلام نہیں ہو سکتا۔

پہلی دلیل اس کی یہ ہے کہ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ یعنی اس طرح کا کلام اتارنا شیاطین کے لائق کام نہیں ہے اس لیے کہ یہ شیاطین کے مقصد اور ان کے مشن کے بالکل خلاف ہے۔ یہ کلام اتار کر آخر اپنے ہی ہاتھوں وہ اپنی سلطنت برباد کیوں کریں گے! بعینہٖ یہی بات سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے وقت کے فقیہوں اور فریسیوں کے جواب میں فرمائی تھی جب انھوں نے آپ کے معجزات کے تاثر کو مٹانے کے لیے عوام میں یہ پھیلانا شروع کیا کہ یہ بدروحوں کو لوگوں کے اندر سے نکالنے کا جو کرشمہ دکھاتے ہیں یہ بھوتوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے دکھاتے ہیں۔ ان کے جواب میں سیدنا مسیحؑ نے جو کچھ فرمایا وہ انجیل میں یوں نقل ہوا ہے۔

"لیکن ان میں سے (اشارہ فقیہوں اور فریسیوں کی طرف ہے) بعض نے کہا یہ تو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے ...... مگر اس نے (حضرت مسیحؑ نے) ان کے خیالات کو جان کر ان سے کہا جس سلطنت میں پھوٹ پڑے وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس گھر میں پھوٹ

پڑے وہ برباد ہو جاتا ہے۔ اور اگر شیطان بھی اپنا مخالف ہو جائے تو اس کی سلطنت کس طرح قائم رہے گی؟ (لوقا باب ۱۱: ۱۶-۱۸)

بعینہٖ یہی بات قرآن نے 'مَا یَنۡۢبَغِیۡ لَہُمۡ' کے دو لفظوں میں فرما دی ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ 'وَمَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ' وہ اس طرح کا کلام نازل کر بھی نہیں سکتے۔ قرآن نے قریش کو یہ تحدی بار بار کی کہ اگر تم اس کلام کو انسانی کلام سمجھتے ہو تو اس کے مانند کوئی کلام اپنے شریکوں، شاعروں، کاہنوں اور جنوں کی مدد سے پیش کرو۔ لیکن وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ کلام جنات و شیاطین کے بس کا کام نہیں ہے۔ اگر ان کے بس کا ہوتا تو ان کے ساتھ سب سے زیادہ گہری دوستی تو قریش اور اس کے کاہنوں کی تھی۔ آخر انھوں نے ان کی مدد کیوں نہیں کی!

تیسرا جواب یہ دیا ہے کہ 'اِنَّہُمۡ عَنِ السَّمۡعِ لَمَعۡزُوۡلُوۡنَ' یعنی ان کو ملأ اعلیٰ کی باتوں کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اگر تمھارا یہ گمان ہے کہ یہ ملأ اعلیٰ کی باتوں کی کچھ سن گن لے لیتے ہیں تو یہ محض واہمہ ہے۔ اب تک اگر یہ کچھ کان لگانے اور ٹوہ لینے کی کوشش کرتے بھی رہے ہیں تو اب اس سے بھی روک دیے گئے ہیں۔ سورۂ جن میں خود جنات کی زبان سے ان کا اعتراف یوں نقل ہوا ہے۔

وَاَنَّا لَمَسۡنَا السَّمَآءَ فَوَجَدۡنٰہَا مُلِئَتۡ حَرَسًا شَدِیۡدًا وَّشُہُبًا ۝ وَّاَنَّا کُنَّا نَقۡعُدُ مِنۡہَا مَقَاعِدَ لِلسَّمۡعِ ؕ فَمَنۡ یَّسۡتَمِعِ الۡاٰنَ یَجِدۡ لَہٗ شِہَابًا رَّصَدًا ۝ (جن: ۸-۹)

اور ہم نے آسمان کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ اس کو مضبوط پہرے داروں اور شہابوں سے بھر دیا گیا ہے اور ہم اس میں مختلف ٹھکانوں میں کچھ سننے کے لیے بیٹھتے تھے لیکن اب جو کوئی کان لگائے گا تو ایک شہاب کو اپنی گھات میں پائے گا۔

سورۂ جن کی یہ آیت نظام ملکوت میں ایک اہم انتظام کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو قرآن کو ہر قسم کی شیطانی مداخلت سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ان شاء اللہ سورہ کی تفسیر میں ہم اس کی وضاحت کریں گے۔

فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ فَتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِیۡنَ (۲۱۳)

چند آیات التفات

یہ اور آگے کی چند آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں۔ خطاب اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس میں جو عتاب ہے اس کا رخ مکذبین و منکرین کی طرف ہے۔ فرمایا کہ اصل حقیقت یہ ہے جو تم پر ظاہر کر دی گئی ہے تو تم بہرحال اللہ واحد کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک نہ کرو بلکہ ان لوگوں کی تمام مخالفت کے علی الرغم اپنے موقف حق پر جمے رہو کہ اس عذاب سے محفوظ رہو جو ان مکذبین پر آیا چاہتا ہے۔

وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ۝ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (۲۱۴-۲۱۵)

قریبی خاندان کو انذار کا حکم

یعنی اس عذاب سے جس کی خبر دی جا رہی ہے، اپنے اہل خاندان کو ہوشیار کر دو۔ یہ تمھارے

عزیزو اقارب ہیں اس وجہ سے تمھاری خیر خواہی کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قریبی خاندان ہی تھا جس کو بیت اللہ کی تولیت اور اہل عرب کی دینی و دنیاوی پیشوائی کا منصب حاصل تھا اس وجہ سے قرابت اور سیاست دونوں کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ان کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیں۔ اگر وہ اصلاح قبول کر لیتے تو دوسروں کی اصلاح کا معاملہ بہت آسان ہو جاتا۔ اسی وجہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہمیشہ یہ سنت رہی ہے کہ انھوں نے اپنے زمانہ کے قائدین کو انذار کیا ہے۔ عوام کی طرف اس وقت توجہ فرمائی ہے جب قائدین نے اپنے رویہ سے مایوس کر دیا ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے پہلے سارا زور یہود کے علماء پر صرف فرمایا لیکن جب وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے تو انھوں نے عوام کی طرف توجہ فرمائی۔ اسی پہلو سے یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے عشیرۂ اقربین کے انذار کی ہدایت ہوئی کہ قرابت کا حق بھی ادا ہو جائے اور اگر وہ اصلاح قبول کر لیں تو آگے کے لیے دعوت کی راہ بھی صاف ہو جائے۔

'وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ' جو لوگ ایمان لا چکے تھے ان کے معاملے میں آپ کو یہ ہدایت ہوئی کہ جس طرح کسی خطرے کو محسوس کر کے مرغی اپنے بچوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپائے رکھتی ہے اسی طرح تم ان لوگوں کو اپنی شفقت کے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھو کہ ان میں سے کوئی غفلت کے سبب سے اس عذاب کی زد میں نہ آ جائے جس کی خبر دی جا رہی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آپ پر ایمان لانے والوں میں اس عشیرۂ اقربین کے بہت کم افراد شامل تھے جن کے اوپر انذار کی ہدایت ہوئی ہے بلکہ یہ زیادہ تر عوام کے طبقہ کے غریب و نادار لوگ تھے جن کو قریش کے اکابر نہایت حقیر سمجھتے تھے لیکن ان کے لیے اس شفقت و رحمت کی ہدایت ہوئی اور اُن کے لیے اُس انذار کی۔

فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ (۲۱۶)

یعنی اگر تمھارے عشیرۂ اقربین کے لوگ تمھارے انذار کو خاطر میں نہ لائیں تو تم ان سے صاف الفاظ میں اعلانِ برأت کر دو کہ جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو میں اس کی ذمہ داری سے بری ہوں۔ ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ یہ اعلانِ برأت انذار کا آخری مرحلہ ہے۔ اس کے بعد رسول کے مکذبین کے لیے عذاب اور رسول اور اس کے ساتھیوں کے لیے ہجرت کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ یہ اعلانِ برأت تمام انبیاء علیہم السلام سے منقول ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے جس طرح اعلانِ برأت کیا وہ پیچھے گزر چکا ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ (۲۱۷)

یعنی اس اعلانِ برأت کے نتائج کی پروا نہ کرو بلکہ اپنے رب عزیز و رحیم پر پورا بھروسہ رکھو کہ وہ آگے کے مراحل میں، ہر مشکل اور ہر خطرے میں، تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی مدد فرمائے گا۔

وہ عزیز ہے، اس وجہ سے جو کچھ وہ کرنا چاہے گا کر ڈالے گا۔ کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا اور رحیم ہے اس وجہ سے وہ اپنے ان بندوں کو اپنی رحمت سے نوازے گا جو اس کی خاطر اپنے عزیزوں قریبوں کو چھوڑیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس اعلانِ براءت کے بعد پیغمبر اور اس کے ساتھی اپنے ماحول سے کٹ کر ایک نئے ماحول سے جڑتے ہیں اور یہ نیا ماحول بالکل پردۂ خفا میں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ مرحلہ نہایت کٹھن ہوتا ہے۔ اپنوں کو دشمن بنا لینا درآنحالیکہ مستقبل بالکل مجہول ہو کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ یہ بازی وہی لوگ کھیل سکتے ہیں جن کو اپنے رب پر پورا بھروسہ ہو کہ وہ عزیز بھی ہے اور رحیم بھی۔

الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ۙ وَ تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ ۝ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۲۱۸-۲۲۰)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی شب خیزی، فکرمندی اور طلب رضائے الٰہی میں سرگرمی و مستعدی کی نہایت شاندار و دل نواز انداز میں تعریف و تحسین ہے کہ اپنے اس رب پر پورا بھروسہ رکھو جو تمہیں اس وقت دیکھتا ہے جب تم شب میں تہجد کے لیے اٹھتے ہو، اور اس سے دعا و مناجات کرتے ہو اور یہ کوشش بھی کرتے ہو کہ تمہارے دوسرے ساتھی بھی اس شب خیزی و دعا و مناجات کی برکتوں اور سعادتوں سے بہرہ مند ہوں۔ تمہاری یہ ساری سرگرمیاں تمہارے رب کے علم میں ہیں۔ وہ سمیع و علیم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس کے علم میں ہیں تو یہ ضائع جانے والی نہیں، تمہارا رب عزیز و رحیم ہر شکل میں تمہاری مدد فرمائے گا۔

حِیْنَ تَقُوْمُ
'حِیْنَ تَقُوْمُ' کی تاویل میں مفسرین سے مختلف اقوال منقول ہیں اور ان میں سے ہر قول کی صحت کا احتمال ہے لیکن 'تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ' کے قرینہ کی بنا پر میں زیادہ قوی ان لوگوں کے قول کو سمجھتا ہوں جنھوں نے اس سے قیام لیل کو مراد لیا ہے۔ ہم یہ بات مختلف مقامات پر بدلائل واضح کر چکے ہیں کہ دعوت کے مراحل جتنے ہی سخت ہوتے گئے ہیں قدرتی طور پر اتنی ہی آپ کی شب بیداری میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے تاکید میں بھی اضافہ ہوتا گیا ہے۔ آخری گروپ کی سورتوں میں اس کی تفصیلات ان شاء اللہ آئیں گی۔ یہاں آپ کی انہی سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے کہ تمہاری شب بیداریوں کو خدا دیکھ رہا ہے۔ یہ چیز ضائع جانے والی نہیں ہے۔ یہ مضمون سورۂ طور کی آیت ۴۸ اور سورۂ قٓ کی آیت ۴۰ میں بھی آئے گا۔ وہاں ہم ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

'وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ' 'تَقَلُّبٌ' کے معنی آمد و شد اور ذہاب و ایاب کے ہیں۔

نبیؐ اور صحابہؓ کی شب خیزی کی تحسین
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح خود شب کی دعا و مناجات کا اہتمام فرماتے تھے۔ اسی طرح اپنے صحابہؓ کو بھی اس کی تاکید فرماتے تھے اور وقتاً فوقتاً آپ مسجد میں جا کر یہ روح پرور منظر دیکھتے بھی تھے کہ لوگ دعا و عبادت میں مشغول ہیں۔ اوپر آیت ۲۱۵ میں آپ کو مومنین کے باب میں یہ ہدایت جو فرمائی گئی کہ ان کو اپنی شفقت کے بازوؤں کے نیچے رکھو، یہ بھی اسی کا ایک پہلو ہے کہ آپ کی طرح آپ کے ساتھی بھی پوری طرح پکے اور بیدار رہیں۔ انجیلوں میں سیدنا مسیحؑ کے بارے میں بھی آتا ہے کہ جب

آزمائش کا آخری مرحلہ آیا ہے تو وہ ایک پہاڑی پر جا کر دعا میں مشغول ہو گئے اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت فرمائی کہ وہ جاگیں اور دعا کریں کہ فتنہ میں نہ پڑیں۔ پھر وہ بار بار اپنے شاگردوں کے پاس یہ دیکھنے کے لیے آئے کہ وہ دعا کر رہے ہیں یا نہیں۔ شاگرد سو جاتے تو وہ ان کو بار بار جگاتے کہ دعا کرو تاکہ فتنہ سے محفوظ رہو۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ اوپر توکل کی ہدایت کے ساتھ اپنی صفات عزیز و رحیم کا حوالہ دیا ہے۔ اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی شب بیداریوں کا حوالہ دینے کے بعد اپنی صفات سمیع و علیم کا حوالہ دیا ——— موقع و محل بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ کی انہی صفات کے استحضار پر توکل کی بنیاد ہے۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ (۲۲۱-۲۲۳)

شیاطین کن پر اترتے ہیں؟ اوپر کی آیات میں آپ نے دیکھا کہ پوری وضاحت کے ساتھ قرآن کے منبع و مصدر، اس کے مامون و محفوظ واسطۂ نزول اور اس کے پاک و مطہر حامل کا ذکر ہوا ہے اور اس بات کی تردید کی گئی ہے کہ یہ کوئی القائے شیطانی ہے۔ یہ ساری باتیں قرآن کے ان مخالفین کی تردید میں فرمائی گئی ہیں جو نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ آپ ایک کاہن ہیں اور جس طرح کاہنوں پر شیاطین غیب کی باتیں القاء کرتے ہیں اسی طرح ان پر بھی شیاطین یہ کلام القاء کرتے ہیں جس کو یہ ہمارے سامنے وحی الٰہی کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اب یہ خلاصۂ بحث کے طور پر ان الزام لگانے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا اگر تم فی الواقع یہ جاننا چاہتے ہو کہ شیاطین کن پر اترتے ہیں تو آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ کن پر اترتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ ان لپاٹیوں اور نابکاروں پر اترتے ہیں جو ان کی طرف کان لگاتے ہیں اور ان میں اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کاہنوں کی تصویر ہے جن کے دامِ فریب میں مشرکین عرب پھنسے ہوئے تھے۔ ان صفات کے ساتھ ان کا ذکر کر کے، ان کا پورا کردار سامنے کر دیا ہے۔ ان کی پہلی صفت یہ بتائی ہے کہ یہ 'اَفَّاكٍ' یعنی بالکل لاغی، دروغ باف اور لپاٹیے ہوتے ہیں۔ یہ سادہ لوحوں کو بیوقوف بنانے کے لیے طرح طرح کے جھوٹ گھڑتے ہیں اور پھر اس دعوے کے ساتھ ان کو پیش کرتے ہیں کہ یہ باتیں ان پر غیب سے القاء ہوئی ہیں۔ ان کی دوسری صفت 'اَثِيْمٍ' بیان ہوئی ہے یعنی اخلاقی اعتبار سے یہ ہر قسم کے گناہوں میں آلودہ ہیں۔ آخر میں ان کے اس ڈھکل کی تصویر پیش کی گئی ہے جو عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے یہ لوگ اختیار کرتے تھے۔ ان لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ احمق لوگ جب کسی معاملے میں غیب کی باتیں معلوم کرنے کے لیے ان سے رجوع کرتے تو یہ لوگ کچھ عملیاتِ سفلیہ کے ساتھ مراقبہ کرتے اور پھر ایک مقفّٰی کلام کی صورت میں (جو اکثر بالکل بے معنی یا ذو معانی ہوتا) اپنا الہام پیش کرتے کہ یہ ان پر غیب سے فلاں جن نے القاء کیا ہے۔ ان کے اس مراقبہ کو یہاں 'القائے سمع' سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ وہ مراقبہ میں اس طرح بیٹھتے گویا ہاتف غیب سے کوئی بات سننے کے لیے کان لگائے ہوتے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ

رہا ہے کہ مراقبہ کا یہ طریقہ تمام مشرک قوموں میں رہا ہے۔ کاہن، پروہت، جوگی، عامل، متصوفین اور قبروں کے مجاورین اسی طرح کی نمائش کر کے ارواحِ غیب سے رابطہ پیدا کرنے کا دعویٰ کرتے اور لوگوں کو بیوقوف بناتے رہے ہیں۔

کہانت کے جھوٹے مدعی

وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۔ کاہنوں میں بعض بعض تو عملیات سفلیہ کے جاننے والے ہوتے اور ان کے ذریعہ سے وہ بعض جنات سے تعلق پیدا کر لیتے تھے جو ان پر جھوٹ سچ کچھ القا بھی کرتے تھے لیکن اکثر کاہن محض اس پیشہ کو عوام فریبی کا ایک کامیاب پیشہ سمجھ کر کاہن ہونے کے مدعی بن جاتے اور لوگوں کو اُلو بناتے پھرتے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان میں سے اکثر اپنے اس باطل پیشۂ کہانت میں بھی سچے نہیں ہیں بلکہ جھوٹے ہیں۔ اگر ایک شخص ساحر ہو اور وہ اپنے کو ساحر کی حیثیت سے پیش کرے تو گو سحر و ساحری ایک باطل شے ہے لیکن وہ اپنے دعوے میں سچا ہے لیکن ایک شخص ساحر نہ ہو اور ساحر ہونے کی نمائش کرے تو وہ لپاٹیا ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۝ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (۲۲۴-۲۲۷)

آنحضرتؐ پر شاعر ہونے کے الزام کی تردید

اوپر کی آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کہانت کے الزام کی تردید ہوئی۔ اب آگے کی آیات میں شعر و شاعری کے الزام کی تردید آ رہی ہے۔ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر یا قرآن کو جو شعر کہتے تھے تو شعر یا شاعری کے معروف معنی میں نہیں کہتے تھے۔ آخر وہ ایسا کہہ بھی کیسے سکتے تھے! معروف معنی میں نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہنے کی کوئی وجہ تھی اور نہ قرآن کو شعر کہنے کی۔ اصل یہ ہے کہ جب قریش نے دیکھا کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت دلوں کو مفتوح کرتی جا رہی ہے اور اس طرح اس کے خدائی کتاب ہونے کا دعویٰ روز بروز مستحکم ہوتا جا رہا ہے تو اس کے توڑ کے لیے انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن میں جو بلاغت و جزالت ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ کوئی آسمانی کلام ہے بلکہ جس طرح ہمارے بڑے بڑے شاعروں کے کلام میں بلاغت ہوتی ہے اسی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام میں بھی بڑی بلاغت ہے جو دلوں کو مسحور کرتی ہے۔ مطلب یہ کہ ان کو اگر رکھو تو اپنے بلند رتبہ شاعروں ہی کے درجے میں رکھو، ان کو خدا کا رسول اور ان کے کلام کو وحیِ الٰہی کا درجہ و مرتبہ دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کے اندر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اہل عرب یہ تصور رکھتے تھے کہ ہر بڑے شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے جو اس کو شعر الہام کرتا ہے۔ یہ تصور دے کر وہ لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ دعویٰ کہ ان کے اوپر خدا کی طرف سے ایک فرشتہ یہ کلام لے کر آتا ہے محض واہمہ ہے۔ یہ فرشتہ نہیں بلکہ اسی طرح کا کوئی جن ہے جس طرح کا جن ہر بڑے شاعر کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

الزام لگانے والوں کے اس ذہنی پس منظر کو سامنے رکھ کر اب قرآن کے جواب پر غور کیجیے۔ قرآن نے یہاں تین کسوٹیاں معترضین کے سامنے رکھ دی ہیں کہ ان پر پرکھ کر وہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ کلام شعر اور اس کا پیش کرنے والا کوئی شاعر ہے یا یہ کلام، کلامِ ربانی اور اس کا سنانے والا اللہ کا رسول ہے۔

فیصلہ کے لیے تین کسوٹیاں

پہلی کسوٹی: درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ (۲۲۴) پہلی کسوٹی یہ ہے کہ درخت اپنے پھل اور آدمی اپنے ساتھیوں سے پہچانا جاتا ہے۔ تم اپنے شاعروں کو دیکھو کہ ان کے کلام نے کس طرح کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا اور ان کو متاثر کیا ہے اور پھر پیغمبر کو دیکھو کہ ان کے کلام و پیغام نے کس طرح کے لوگوں کو اپنی طرف جذب کیا ہے؟ اگر انصاف سے دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ ان شعراء کے ساتھی گمراہ، اوباش، عیاش اور شر پسند قسم کے لوگ بنتے ہیں اور اس کے بالکل برعکس پیغمبر کے کلام نے ان لوگوں کو متاثر کیا ہے جو شریف نیک طینت، صالح فطرت اور خدا ترس ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عرب کی سوسائٹی میں شاعری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ عوام کی باگ بالکل انہی کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ یہ جو آگ بھڑکا دیتے ان کے پیرو عوام نتائج سے بے پروا ہو کر، بے خطر اس میں کود پڑتے۔ بکر و تغلب کی مشہور لڑائی، جس کے متعلق مشہور ہے کہ نصف صدی تک جاری رہی، اس کی آگ بھڑکانے میں سب سے زیادہ دخل مشہور شاعر مہلہل کے اشعار کو تھا۔ اخلاقی اعتبار سے اس شاعری کا جو حال تھا اس کا اندازہ ان کے سب سے بڑے شاعر امرؤالقیس کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے بڑے شاعروں میں اس کی فحاشی کی مثال نہیں مل سکتی۔ یہاں تک کہ اہل عرب بھی، اس کو اپنا سب سے بڑا شاعر ماننے کے باوجود اس کو الملك الضليل 'رند بادشاہ' کہتے تھے۔ اس کی شاعری میں اگر مکارم اخلاق کی باتیں ملتی ہیں تو وہ بطور مفاخر کے ملتی ہیں اور ان کے ساتھ بھی ایسے گھنونے مفاسد چپکے ہوئے تھے کہ ان کا ضرر ان کے نفع پر غالب ہو گیا تھا۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں جوئے اور شراب کی بحث میں ہم اس مسئلہ پر لکھ آئے ہیں۔ تفصیل کی ضرورت ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ظاہر ہے کہ جو شاعر اس مزاج اور اس قماش کے ہوں گے وہ اسی قسم کے لوگوں کو اپنے اردگرد جمع کر سکیں گے جو ان کے ہم مشرب اور ہم رنگ ہوں۔

دوسری کسوٹی: شاعروں کا کوئی معین ہدف نہیں ہوتا

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ (۲۲۵) یہ دوسری کسوٹی ہے کہ ان شاعروں کی شاعری کا کوئی معین ہدف نہیں۔ جو واردہ دل پر گزر گیا، اگر اس کو ادا کرنے کے لیے ان کو کوئی اچھوتا اسلوب ہاتھ آ گیا تو اس کو شعر کے قالب میں ڈھال دیں گے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ رحمانی ہے یا شیطانی، روحانی ہے یا نفسانی، اس سے خیر کی تحریک ہو گی یا شر کی۔ ان کے اشعار پڑھیے تو ایک شعر سے معلوم ہو گا کہ ولی ہیں، دوسرے شعر سے معلوم ہو گا کہ شیطان ہیں۔ ایک ہی سانس میں وہ نیکی اور بدی دونوں کی باتیں بے تکلف کہتے ہیں اور چونکہ اچھوتے اور مؤثر اسلوب سے کہتے ہیں اس وجہ سے پڑھنے والے دونوں

سے متاثر تو ہوتے ہیں لیکن نفس کو زیادہ مرغوب چونکہ بدی کی باتیں ہیں اس وجہ سے اس کے نقوش تو دلوں پر قائم رہ جاتے ہیں، نیکی کا اثر غائب ہو جاتا ہے اور اس طرح اگر ان کے کلام میں کچھ افادیت ہوتی بھی ہے تو وہ ان کے تضادِ فکر میں غائب ہو جاتی ہے ۔ جھاڑ جھنکاڑ کے جنگل میں اگر کچھ صالح پودے بھی لگا دیے جائیں تو وہ مثمر نہیں ہوتے۔

اس کے بالکل برعکس قرآن کی ہم آہنگی و ہم رنگی کا حال یہ ہے کہ اس کا مخصوص و معین ہدف ہے اور شروع سے لے کر آخر تک اس کی ہر آیت اسی ہدف پر پہنچتی ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ اس کے اندر کوئی کسی تضاد و تناقض کی نشان دہی کر سکے اور قرآن نے اپنے اس معین ہدف کی صداقت ایسے مضبوط دلائل سے ثابت کر دی ہے کہ ایک ہٹ دھرم کے سوا کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے کلام کو شعر اور اس کے پیش کرنے والوں کو شاعر کہنے کا کیا تک ہے!

تیسری کسوٹی: شاعر صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (۲۲۶) یہ تیسری کسوٹی ہے کہ شاعر گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کے غازی نہیں ہوتے۔ وہ اپنے شعروں میں تو اپنے آپ کو رزم کے رستم و اسفندیار اور کوچۂ عشق کے مجنوں و فرہاد کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں لیکن یہ محض لاف زنی ہوتی ہے، عملی اعتبار سے وہ بالکل صفر ہوتے ہیں۔ وہ خیالی دنیا میں رہتے ہیں اور ان کی ساری رزم و بزم بالکل خیالی ہوتی ہے۔ جن مکارم اخلاق کی تعریف میں وہ آسمان و زمین کے قلابے ملاتے ہیں ان پر عمل کرنے کی انھیں کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ اسی طرح اپنی جس رندی کا وہ اپنے شعروں میں اشتہار دیتے ہیں وہ بھی درحقیقت اپنی ہوس کا اشتہار دیتے ہیں۔ عملی اعتبار سے وہ اس میں بھی بزدل ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس پیغمبر کو دیکھو کہ وہ جو کلام پیش کر رہے ہیں اس کا سب سے بڑا عملی نمونہ وہ خود ہیں۔ جس خدا ترسی، جس بندگیٔ رب، جس ایثار اور جس قربانی کی دعوت وہ خلق کو دیتے ہیں اس پر سب سے آگے بڑھ کر اور سب سے زیادہ عمل وہ خود کرتے ہیں اور ان کا کٹر سے کٹر دشمن بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ ان کا کوئی قول و فعل سرمو اس کتاب سے منحرف ہے جو وہ لوگوں کو خدا کی کتاب کی حیثیت سے سنا رہے ہیں تو ایک ایسے قدسی صفات شخص کو ان شاعروں کی صف میں کھڑے کرنے کے کیا معنی جن کے اقوال و اعمال میں ادنیٰ مطابقت بھی نہیں ہے!

دربار رسالت کے شعراء کا استثناء

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۭ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (۲۲۷) یہ اس عام کلیہ سے جو شعراء سے متعلق مذکور ہوا، استثناء ہے اور یہ اشارہ ہے دربارِ رسالت کے شاعروں کی طرف۔ فرمایا کہ یہ لوگ بے شک ایمان کی دولت سے بہرہ مند ہیں۔ ایمان نے ان کی شاعری کا ایک ہدف معین کر دیا ہے اس وجہ سے یہ ہرجائی تیر نہیں پھینکتے بلکہ ان کا ہر شعر کلمۂ حق کی حمایت میں اور رفع ذکرِ الٰہی کے لیے ہوتا ہے اور

یہ صرف گفتار کے غازی نہیں ہیں بلکہ تقویٰ اور عمل صالح کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا: یعنی ان کے کلام میں عشق و ہوس اور مفاخر و مطاعن کے بجائے زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر اور اعلائے کلمۃ اللہ ہوتا ہے۔ وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا: یعنی اگر انھوں نے اپنے شعروں میں دوسروں سے متعلق کچھ کہا ہے تو وہ ہجو نہیں ہے بلکہ اپنے حق کی حمایت و مدافعت میں کہا ہے جب کہ ان پر زیادتی کی گئی ہے۔ ہر مظلوم کو اپنی اور دوسرے مظلوموں کی مدافعت کا حق حاصل ہے۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ۔ جب ان لوگوں کی مظلومی کا ذکر آ گیا تو ساتھ ہی ان ظالموں کے انجام کی طرف بھی اشارہ فرما دیا جو اس ظلم کے مرتکب ہوئے۔ فرمایا کہ ابھی تو ان کے ظلم کی مدافعت زبان سے ہو رہی ہے لیکن عنقریب وہ وقت بھی آنے والا ہے جب یہ کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ یہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں!

بہارے شعراء اور ان کی شاعری

شعراء اور ان کی شاعری پر قرآن نے یہ تنقید جو کی ہے اگرچہ اصلاً اس کا تعلق جاہلیت کے شعراء اور ان کی شاعری سے ہے لیکن انصاف سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تنقید ٹھیک ہمارے شعراء اور ان کی شاعری پر بھی منطبق ہو رہی ہے۔ اور یہ بات میں ان عام شاعروں کو سامنے رکھ کر نہیں عرض کر رہا ہوں جو صرف تک بندی کرتے ہیں۔ ایسے شاعروں کی خرافات پڑھنے کا اتفاق مجھے کبھی مشکل ہی سے پیش آیا ہے۔ میں یہ بات ان بلند رتبہ شاعروں کو پیش نظر رکھ کر عرض کر رہا ہوں جن کے شاعر ہونے میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر قرآن کی اس کسوٹی پر ان کے کلام کو جانچیے تو مشکل سے گنتی کے چند شاعر ایسے نکلیں گے جو اس کسوٹی پر پورے اتریں گے۔ باقی سب فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ اور يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ کے مصداق اور ان کے مداح اور پیرو بھی انہی کی طرح غاوٗنَ میں داخل ہیں۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ جو باتیں قلم سے صحیح نکلی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے صحیح نکلی ہیں اور اگر کوئی بات غلط نکلی ہے تو وہ میرے علم کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ضرر سے مجھ کو بھی محفوظ رکھے اور اس کتاب کے قارئین کو بھی۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین۔

رحمان آباد

۲۰ر جنوری ۱۹۷۴ء

تدبّرِ قرآن

۲۷

النّمل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ یہ قرآن کوئی شاعری اور کہانت نہیں ہے بلکہ اللہ کا اتارا ہوا کلام ہے لیکن جو لوگ اس پر ایمان نہیں لانا چاہتے وہ اس کے انذار کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ قرآن ان کو جس چیز سے ڈرا رہا ہے جب وہ اس کو دیکھ لیں گے تب اس پر ایمان لائیں گے اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ وہ عذاب کو دعوت دینے کے بجائے رسولوں اور ان کے جھٹلانے والوں کی تاریخ سے سبق حاصل کریں۔ اس سورہ میں یہ واضح فرمایا ہے کہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و بشارت بنا کر نازل فرمایا ہے لیکن اس پر ایمان وہی لائیں گے جن کے دلوں کے اندر آخرت کا خوف ہے۔ جو لوگ اس دنیا کے عیش و آرام میں مگن ہیں وہ اپنے ان مشاغل سے دستبردار نہیں ہو سکتے جن میں وہ مشغول ہیں۔ ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں اس طرح کھبا دیے گئے ہیں کہ اب کوئی تذکیر و تنبیہ بھی ان پر کارگر نہیں ہو سکتی۔ پچھلی سورہ میں بحث کی بنیاد صفاتِ الٰہی میں سے صفات — عزیز و رحیم — پر رکھی ہے جن کے تمام پہلوؤں کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ اس سورہ کی بنیاد صفات — حکیم و علیم — پر ہے کہ یہ قرآن خدائے حکیم و علیم کا اتارا ہوا ہے تو وہ جو کچھ کرے گا وہ حکمت اور علم پر مبنی ہوگا۔ پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو اپنے رب حکیم و علیم پر بھروسہ رکھنا چاہیے کہ وہ ان کو اچھے انجام سے ہمکنار کرے گا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۶) سورہ کی تمہید، جو سورۂ بقرہ کی تمہید سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ اس میں واضح فرمایا ہے کہ یہ قرآن بجائے خود نہایت واضح اور عقل و دل کو اپیل کرنے والی کتاب ہے، لیکن جو لوگ آخرت کو نہیں ماننا چاہتے وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ وہ جن دلچسپیوں میں منہمک ہیں شیطان نے ان کی نگاہوں میں وہ اس طرح کھبا دی ہیں کہ اب وہ ان کے پیچھے اندھے ہو چکے ہیں۔ وہ اسی طرح بھٹکتے رہیں گے۔

(۷-۱۴) حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کا ابتدائی حصہ جس میں یہ واضح فرمایا ہے کہ اللہ نے ان کو نہایت واضح نو نشانیوں کے ساتھ فرعون کے پاس رسول بنا کر بھیجا لیکن فرعون اور اس کی قوم نے یہ یقین کرنے کے باوجود کہ یہ خدائی نشانیاں ہیں حضرت موسیٰ کی رسالت تسلیم نہیں کی اور بالآخر وہ ہلاک ہو کر رہے۔

(۱۵-۴۴) اللہ تعالیٰ کے صالح و مصلح بندوں کا ذکر کہ نعمت ان کو اندھا نہیں بناتی بلکہ جتنا ہی ان نعمتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اتنی ہی منعم حقیقی کے آگے ان کی فروتنی اور سرافگندگی بڑھتی جاتی ہے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام

پر اللہ تعالیٰ کے جو انعامات ہوئے ان میں سے بعض کا حوالہ جس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نعمت و جاہ اور حکمت و سائنس میں سے جو کچھ ان کو بخشا وہ کسی کو بھی نہیں بخشا لیکن انھوں نے ہر نعمت کو اللہ کا فضل جانا اور یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھی کہ یہ نعمتیں دے کر اللہ تعالیٰ ان کا امتحان کر رہا ہے کہ وہ اس کے شکر گزار بندے بنتے ہیں یا ناشکرے۔

(۴۵-۵۳) مفسدین فی الارض کے انجام کو واضح کرنے کے لیے قوم ثمود کی مثال کا حوالہ۔ پچھلی سورہ میں بھی ان کے فساد فی الارض کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس سورہ میں اس کی مزید وضاحت ہوئی ہے کہ ان کی جمعیت بہت بھاری تھی۔ ان کے لونہایت جنگجو قبائل تھے اور یہ برابر جنگ و فساد میں سرگرم رہتے تھے۔ حضرت صالحؑ نے ان کی اصلاح کی کوشش کی لیکن انھوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی بات سنی نہیں بلکہ ان کے قتل کے بھی درپے ہو گئے۔ بالآخر ان پر اللہ کا فیصلہ کن عذاب آیا اور ان کی پرشوکت تعمیرات جن پر ان کو ناز تھا، کھنڈروں کی شکل میں تبدیل ہو گئیں۔ ان کھنڈروں کے آثار قریش کی عبرت کے لیے موجود تھے۔

(۵۴-۵۸) قوم لوط کی سرگزشت کی طرف اجمالی اشارہ۔ حضرت لوطؑ نے ان کے اخلاقی فساد کی اصلاح کی کوشش فرمائی اور اس کے برے انجام سے ان کو ڈرایا لیکن وہ ان کی بات سننے کے بجائے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اپنے اندر سے نکال دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے کہ یہ لوگ بڑے پارسا بنتے ہیں کہ ہمیں نصیحت کرنے اٹھے ہیں۔ بالآخر ان پر بھی خدا کا عذاب آیا جس نے ان کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ ان کے آثار پر سے بھی قریش کو اکثر گزرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔

(۵۹-۶۸) اس کائنات کی گوناگوں نشانیوں اور نعمتوں میں سے ایک ایک کی طرف اشارہ کر کے مخاطبوں سے سوال کہ ان میں سے کس چیز کو تم خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر سکتے ہو؟ جب ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب نہیں کر سکتے تو آخر اللہ کے سوا دوسری چیزوں کی کیوں پرستش کرتے ہو اور ان کے بل پر اللہ اور اس کے رسول سے کیوں لڑنے اٹھ کھڑے ہوئے ہو! آخر میں اس بات کی طرف اشارہ کہ جہاں تک شرک اور ... کا تعلق ہے ان کے حق میں تو کوئی دلیل یہ پیش نہیں کر سکتے لیکن آخرت کے معاملے میں یہ سخت تضاد فکر میں مبتلا ہیں۔ اس کو یہ محض اگلوں کا افسانہ کہتے ہیں اور یہی چیز درحقیقت ان کی ساری سرکشی کا سبب ہے۔

(۶۹-۹۳) خاتمۂ سورہ، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ نہ ان کے حال پر غم کرو، نہ ان کی چالوں سے پریشان ہو۔ اگر یہ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ جو مہلت مل رہی ہے اس پر اللہ کا شکر کرو، اپنی شامت نہ بلاؤ۔ تم اپنا فرض ادا کر دو۔ اگر یہ نہیں سنتے تو تمھارا کام مُردوں اور بہروں کو سنانا نہیں ہے۔ تم یہ اعلان کر دو کہ مجھے اسی قرآن کے سنانے کی ہدایت ہوئی ہے۔ جو اس پر ایمان لائے گا اس کا نفع اسی کو پہنچے گا اور جو اس کا انکار کرے گا اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میں صرف ایک منذر ہوں۔ لوگوں پر کوئی داروغہ مقرر کر کے نہیں بھیجا گیا ہوں۔

سُوْرَةُ النَّمْلِ (۲۷)

مَكِّيَّةٌ ـــــــــ اٰيَاتُهَا ۹۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝۱ هُدًى وَّبُشْرٰى
۱-۶ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۳ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۴ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ
الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝۵ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى
الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝۶

ترجمۂ آیات ۱-۶ یہ طٰسٓ ہے۔ یہ قرآن اور ایک واضح کتاب کی آیات ہیں۔ یہ ہدایت و بشارت ہے ان ایمان لانے والوں کے لیے جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہی ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ۱-۳

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیے ہیں پس وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے دنیا میں بھی برا عذاب ہے اور آخرت میں وہی ہیں جو بڑے خسارے میں ہوں گے۔ اور بے شک یہ قرآن تم کو ایک

حکیم و علیم کی طرف سے تعلیم کیا جا رہا ہے ۔ ۴ - ۶

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

طٰسٓ تفف تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۱)

'طٰسٓ' یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔

قرآن اپنے دعوے پر خود حجت ہے

'تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ'۔ لفظ 'قُرْاٰن' کتاب آسمانی کے لیے معروف ہے اس کے ساتھ 'كِتَابٍ مُّبِيْنٍ' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ یہ اپنے ہر دعوے پر خود ایسی حجت ہے کہ اس کی صحت و صداقت کو جانچنے کے لیے کسی خارجی شہادت اور کسی معجزہ و نشانی کی ضرورت نہیں ہے یہ صفت یہاں اس کے ان معترضین و مخالفین کے سامنے رکھ کر لائی گئی ہے جو اس کی تصدیق کے لیے کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہاں ان دونوں لفظوں نے اس کی عظمت کے پہلو کو بھی واضح کر دیا ہے اور اس کی حجت کے پہلو کو بھی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خدا کا اتارا ہوا قرآن ہے کوئی مذاق و استہزا کی چیز نہیں ہے اور اتمام حجت کے پہلو سے یہ خود اپنے وجود کے اندر مکمل ہے تو جو لوگ اس کو ہنسی مسخری میں ٹالنا چاہتے ہیں وہ سوچ لیں کہ ان کی اس حرکت کے نتائج کیا کچھ نکل سکتے ہیں!

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۲-۳)

قرآن ہدایت و بشارت ہے

یعنی اس کے مخالفین اس کی قدر کریں یا نہ کریں لیکن یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت و بشارت بن کر نازل ہوئی ہے جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ان کو یہ زندگی کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی بھی کر رہی ہے اور دنیا اور آخرت دونوں میں فوز و فلاح کی بشارت بھی دے رہی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا ذکر یہاں ان اہل ایمان کی جامع صفت کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ ان دونوں چیزوں کی حیثیت دین میں تمام نیکیوں کے شیرازے کی ہے، خواہ وہ حقوق اللہ سے تعلق رکھنے والی ہوں یا حقوق العباد سے۔ ان کا ذکر ہو گیا تو گویا سب کا ذکر ہو گیا۔

جو لوگ آخرت کا یقین رکھتے ہیں وہی اس قرآن پر ایمان لائیں گے

'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ' میں حصر اور تاکید کا اسلوب یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو لوگ نماز اور زکوٰۃ کا یہ اہتمام کر رہے ہیں درحقیقت وہی لوگ آخرت پر یقین رکھنے والے ہیں اور اسی چیز نے ان کو اس کتاب پر ایمان لانے کی توفیق بخشی ہے۔ رہے وہ لوگ جن پر یہ چیزیں شاق ہیں تو وہ آخرت کے یقین سے محروم ہیں اور اس قسم کے لوگ اس کتاب پر ایمان سے محروم ہی رہیں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ (۴)

منکرینِ قرآن کا سببِ انکار

یہ منکرین کے اصل سببِ انکار کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں بلکہ اسی دنیا کی زندگی کو کل زندگی سمجھے ہوئے بیٹھے ہیں ان کی نگاہوں میں ان کے اعمال اس طرح کھبا دیے گئے ہیں کہ اب ان سے ہٹ کر کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں۔ یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے کہ جو لوگ اسی دنیا کو مقصود و مطلوب بنا کر اپنی تمام ذہانت و قابلیت اسی کی طلب میں لگا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال و مشاغل کو اس طرح ان پر مسلط کر دیتا ہے کہ پھر نہ وہ ان کے چھوڑنے ہی پر آمادہ ہوتے اور نہ ان سے چھوٹ ہی سکتے۔ وہ انہی کے اندر بھٹکتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک دن فرشتۂ اجل آ کر ان کو دبوچ لیتا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَهُمْ سُوءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ (۵)

مکذبینِ رسول پر اس دنیا میں بھی عذاب آیا

اس آیت میں عذابِ آخرت کا چونکہ مستقلاً ذکر ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ 'سُوءُ الْعَذَابِ' کا تعلق عذابِ دنیا سے ہے۔ یہاں ذکر مکذبینِ رسول کا ہے اور مکذبینِ رسول پر اس دنیا میں بھی، جیسا کہ ہم اس کے محل میں ذکر کر چکے ہیں، لازماً عذاب آتا ہے اس وجہ سے فرمایا کہ ان کے لیے دنیا میں بھی برا عذاب ہے اور آخرت میں بھی۔ 'وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ' میں اسی طرح حصر اور تاکید کا اسلوب ہے جس طرح اوپر 'وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ' میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے ساری زندگی چونکہ دنیا ہی کو مطلوب و مقصود بنا کر گزاری، آخرت کا ان کو کبھی دھیان ہی نہیں آیا، یہاں تک کہ اسی دنیا کے عشق میں انھوں نے قرآن کا بھی مذاق اڑایا تو آخرت میں سب سے زیادہ خسارے میں تو یہ لوگ ہوں گے ہی!

وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ (۶)

آنحضرتؐ کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان نہیں لاتے بلکہ تمہاری مخالفت کے درپے ہیں تو تم ان کی پروا نہ کرو بلکہ مطمئن رہو کہ یہ کلام تمہارے اوپر جس ذات کی طرف سے اتارا جا رہا ہے وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی۔ اس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے تو جو کچھ اس کے علم و حکمت کا تقاضا ہو گا وہی ہو گا اور اسی میں تمہارے لیے خیر ہے۔ جب وہ حکیم و علیم تمہارے اوپر اس کلام کو نازل فرما رہا ہے تو وہ تمہیں تنہا نہیں چھوڑے گا بلکہ ہر قدم پر تمہاری رہنمائی فرمائے گا اور تمہیں منزلِ مقصود پر پہنچائے گا۔

۲۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۷-۱۴

آگے حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کے اس حصہ کا اجمالی حوالہ ہے جب ان کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا ہے اور نو معجزات سے مسلح کر کے ان کو فرعون اور اس کی قوم کے پاس انذار کے لیے جانے کی ہدایت فرمائی۔ یہاں اس سرگزشت کے حوالہ سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر تین باتوں کی طرف

متوجہ کرتا ہے۔

پہلی یہ کہ آپ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح قرآن کی وحی سے سرفراز فرمایا جس طرح حضرت موسیٰ کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے جو آپ پر ہوا ہے۔ نہ آپ کو اس نئے تجربے سے پریشان ہونا چاہیے اور نہ دوسروں کو اس سے متوحش ہونے کی کوئی وجہ ہے۔

دوسری یہ کہ جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے ایک دو نہیں بلکہ اکٹھے نو معجزات دیے اور جن لوگوں کو وہ معجزے دکھائے گئے ان کو یقین تھا کہ یہ خدائی معجزات ہیں لیکن پھر بھی وہ ایمان نہیں لائے۔

تیسری یہ کہ مفسدین کو اللہ تعالیٰ ایک خاص مدت تک ڈھیل دینے کے بعد لازماً فنا کر دیتا ہے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷-۱۴ إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا
بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ﴿٧﴾ فَلَمَّا
جَاءَهَا نُودِيَ أَن بُورِكَ مَن فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ
اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٨﴾ يَا مُوسَىٰ إِنَّهُ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٩﴾
وَأَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّىٰ مُدْبِرًا وَلَمْ
يُعَقِّبْ ۚ يَا مُوسَىٰ لَا تَخَفْ إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُونَ ﴿١٠﴾
إِلَّا مَن ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١﴾
وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ ۖ فِي
تِسْعِ آيَاتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴿١٢﴾
فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿١٣﴾ وَجَحَدُوا
بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۚ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿١٤﴾ ع

ترجمۂ آیات ۷-۱۴

یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا، میں نے ایک آگ سی دیکھی ہے۔ میں وہاں سے یا تو کوئی خبر لاتا ہوں یا آگ کا کوئی انگارا تاکہ تم تاپو۔ تو جب وہ اس کے پاس آیا تو اس کو آواز آئی کہ مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے اردگرد ہیں! اور پاک ہے اللہ، عالم کا خداوند! ۷-۸

اے موسیٰ، یہ تو میں ہوں، خدائے عزیز و حکیم! اور تم اپنا عصا ڈال دو۔ تو جب اس نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا گویا سانپ ہو تو وہ پیچھے کو مڑا اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ ڈرو نہیں، میرے حضور پیغمبروں کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ ہاں مگر جو کسی برائی کا مرتکب ہوا پھر اس نے برائی کے بعد اس کو بھلائی سے بدل دیا تو میں بخشنے والا اور مہربان ہوں۔ ۹-۱۱

اور تم اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو، وہ بغیر کسی مرض کے سفید نکلے گا۔ نو نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے پاس جاؤ۔ وہ بڑے ہی نافرمان لوگ ہیں۔ پس جب ان کے پاس ہماری آنکھیں کھول دینے والی نشانیاں آئیں انھوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ اور انھوں نے ظلم اور گھمنڈ کے سبب سے ان کا انکار کیا حالانکہ ان کے دلوں نے ان کو تسلیم کیا تو دیکھو کیا ہوا ان مفسدین کا انجام! ۱۲-۱۴

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ (۷)

حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت حضورؐ کے لیے سبق آموز

حضرت موسیٰؑ کی یہ سرگزشت پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے اور اس کے ہر جزو کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔ یہاں ہم اس کے صرف اس پہلو کو مدنظر رکھیں گے جس کا تعلق سورہ کے نظام سے ہے۔ نبوت و رسالت کے

متعلق یہ بات معلوم ہے کہ یہ کوئی عام تجربے کی چیز نہیں ہے۔ اس کا تجربہ صرف انہی لوگوں کو ہوا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس کارِ خاص کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ اس وجہ سے جن کو یہ چیز عطا ہوئی ان کو بھی اس کے اسرار و رموز سے مانوس ہونے میں کچھ وقت لگا اور جن کے سامنے اس کی دعوت پیش کی گئی انھوں نے بھی اس کو بالعموم ایک انوکھی اور عجیب چیز سمجھا اور اس کے خلاف طرح طرح کے شبہات و اعتراضات اٹھائے۔ ان دونوں ہی چیزوں کا واحد علاج یہی ہو سکتا تھا کہ ان نبیوں کے حالات سنائے جائیں جو اس سلسلہ کے تمام مراحل سے گزر چکے تھے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کے مشاہدات و تجربات سے طمانیت و سکینت حاصل ہو اور آپ کے معترضین و مخالفین پر بھی ان کی حجت قائم ہو سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ سے سب سے زیادہ مشابہ نبی و رسول سیدنا موسیٰؑ تھے جن کی زندگی کے حالات بھی تفصیل کے ساتھ تورات میں موجود تھے اور ان پر ایمان کی مدعی ایک قوم بھی موجود تھی جو بدقسمتی سے قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی، جیسا کہ آگے اس سورہ میں بھی اس کی طرف اشارہ آئے گا، مخالفت کر رہی تھی۔ اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ کے حالات و تجربات اس مرحلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی سب سے زیادہ تسکین بخش ہو سکتے تھے اور مخالفین کے لیے بھی سب سے زیادہ سبق آموز ہو سکتے تھے بشرطیکہ وہ ان سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ انہی دونوں مقصدوں سے یہ سرگزشت سنائی جا رہی ہے۔ مخاطب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں لیکن روئے سخن مخالفین کی طرف بھی ہے۔

نبوت ایک موہبتِ ربانی ہے

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ نبوت و رسالت ایک خاص موہبتِ ربانی اور فضلِ یزدانی ہے۔ اس کو اکتساب یا طلب و تمنّا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مصنف، شاعر، خطیب، کاہن، ساحر، منجّم، جوتشی اور اس قبیل کے سارے ہی لوگ اپنے فن اور پیشہ کو سیکھنے کے لیے جد و جہد کرتے ہیں اور اس کی طلب و تمنا میں ایک عمر کھپاتے ہیں تب کہیں ان کو اپنے فن میں کچھ درخور حاصل ہوتا ہے لیکن نبی و رسول کی تربیت اللہ تعالیٰ خود اپنی نگرانی میں کرتا ہے۔ نبی نہ کسی کا شاگرد ہوتا، نہ وہ کسی مدرسہ میں بیٹھتا اور نہ اس کے ذہن میں نبوت کا کوئی گمان یا ارمان ہوتا بس اللہ تعالیٰ ہی، زندگی کے نشیب و فراز کے امتحانوں سے گزار کر، اس کو اس کارِ خاص کے لیے تیار کرتا ہے جو اس کے سپرد کیا جاتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کی تربیت مصر کے زندان میں ہوئی۔ حضرت داؤدؑ نے اپنی نسبت خود فرمایا ہے کہ مجھے خداوند نے بھیڑ سالہ سے نکالا اور اسرائیل کے تخت پر لا بٹھایا، اسی طرح حضرت موسیٰؑ، جن کی سرگزشت یہاں بیان ہو رہی ہے، مدین میں حضرت شعیبؑ کی بکریاں چراتے رہے۔ وہاں سے مصر کے لیے واپس ہوتے ہوئے اندھیری اور ٹھنڈی رات میں راستہ بھول گئے۔ دور سے ایک روشنی دکھائی دی۔ انھوں نے گھر والوں سے کہا تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ مجھے آگ نظر آئی ہے۔ میں وہاں جاتا ہوں، اگر کچھ لوگ وہاں ہوئے تو ان سے راستہ کا پتہ کرتا ہوں ورنہ آگ ہی کا کوئی انگارہ لاتا ہوں کہ تم لوگ اس سردی میں تاپ سکو۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوۡدِیَ اَنۡۢ بُوۡرِکَ مَنۡ فِی النَّارِ وَ مَنۡ حَوۡلَہَا ؕ وَ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (۸)

رب العالمین کی ندا حضرت موسیٰؑ کو

حضرت موسیٰ تو آگ لینے گئے لیکن وہاں یہ آواز سنائی دی کہ مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور وہ جو اس کے ارد گرد ہیں۔ مجہول کا صیغہ ابہام اور تفخیم کو ظاہر کر رہا ہے یعنی حضرت موسیٰ کو ایک ہاتف کی آواز تو سنائی دی لیکن وہ یہ متعین نہ کر سکے کہ یہ کس کی آواز ہے اور کہاں سے آئی ہے مَنْ بُوْرِکَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَھَا یہ اسی آواز کی تفصیل ہے کہ یہ آگ نہیں ہے بلکہ اس روشنی کے پردے میں اللہ تعالیٰ کی بابرکت ذات اپنے بابرکت کروبیوں کے جلو میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ اپنی اور اپنے کروبیوں دونوں کی مبارکی کا حوالہ اس موقع پر صرف بیانِ حقیقت کے لیے نہیں بلکہ حضرت موسیٰ کو مانوس کرنے کے لیے بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ حضرت موسیٰؑ کے لیے نہایت اہم تھا۔ دامنِ کوہ اور اندھیری رات میں، بالکل خلافِ توقع، اس آواز کو سن کر حضرت موسیٰؑ پر نہیں معلوم کیا گزری ہوگی اور نہ معلوم کیا گزرتی اگر اس کا پہلا ہی کلمہ برکت کی بشارت کا نہ ہوتا۔ اس مبارک کلمہ نے حضرت موسیٰؑ کی بڑی ڈھارس بندھائی ہوگی کہ جو آواز ان کو سنائی دی ہے اس کے پیچھے کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ یہ منبعِ خیر و برکت سے ایک بابرکت آواز آئی ہے۔

وَ سُبْحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تنزیہہ کا کلمہ ہے اور یہ اسی مضمون کی تاکید مزید ہے جو اوپر والے ٹکڑے میں بیان ہوا ہے۔ یعنی اللہ، عالم کا رب، ہر عیب سے پاک اور منزہ ہے اور یہ اسی کی تجلی ہے جو تمہیں نظر آئی ہے تو اس پر بھروسہ رکھو۔ وہ تمہارے ساتھ وہی کرے گا جو اس کی رحمت و ربوبیت کے شایانِ شان ہے۔ اس سے کسی گزند کا اندیشہ نہیں ہے۔ اور وہ تمام عالم کا رب ہے اس وجہ سے اس کے اختیار میں سب کچھ ہے۔

یٰمُوۡسٰۤی اِنَّہٗۤ اَنَا اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ (۹)

صفاتِ عزیز و حکیم کا تعارف

اوپر کی بات تو ہاتفِ غیب کی آواز تھی جو حضرت موسیٰؑ کو سنائی دی۔ اب یہ خود حضرت موسیٰؑ کو مخاطب کر کے رب العزت نے اپنا تعارف کرایا کہ میں ہی خدائے عزیز و حکیم ہوں۔ ان صفات سے تعارف کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ نہیں ہو سکتی کہ حضرت موسیٰؑ ان سے ناواقف تھے۔ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے اور ایک مدت تک حضرت شعیبؑ کی صحبت و معیت میں رہے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے۔ مقصود ان کی تذکیر ہے اس مہم کے بیان کے لیے جس کو مضبوط کرنا تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور فرمانا چاہا۔ پچھلی سورہ میں اَلْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ کی صفات بار بار آئی ہیں اور ان کے مضمرات ہم واضح کر چکے ہیں۔ یہاں عزیز کے ساتھ حکیم کی صفت آئی ہے۔ جس سے مقصود اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ جس ذات نے تم کو اس وقت خطاب و کلام سے مشرف فرمایا ہے۔ وہ ہر چیز پر غالب و مقتدر ہے کوئی اس کے کسی ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتا اور ساتھ

ہی وہ حکیم ہے اس کا ہر ارادہ حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اور اسلوب کلام چونکہ حصر در حصر کا ہے۔ اس وجہ سے اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ میرے مقابل میں کسی اور کے زور و اقتدار یا میری حکمت و مصلحت کے مقابل میں کسی اور کی حکمت و مصلحت کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ غور کیجیے کہ ان صفات کی معرفت اس مہم کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے کتنی ضروری تھی جس پر حضرت موسیٰؑ مامور کیے جا رہے تھے اور جس کا ذکر آگے کی آیات میں آ رہا ہے۔ خدا کی انہی صفات کی معرفت نے حضرت موسیٰؑ کے اندر وہ عزیمت پیدا کی کہ وہ بنی اسرائیل جیسی نکمی قوم کے ساتھ فرعون جیسے جبار کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر قدم پر فیروزمندی عطا فرمائی۔

وَاَلۡقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهۡتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدۡبِرًا وَّلَمۡ يُعَقِّبۡ ؕ يٰمُوۡسٰى لَا تَخَفۡ
اِنِّىۡ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ (۱۰)

انبیاء کے مشاہدات میں ایک خاص قابلِ توجہ پہلو: اوپر کی آیات میں حضرت موسیٰؑ کو پیش نظر مہم کے لیے ذہنی و قلبی طور پر تیار کرنے والی تعلیمات ہیں۔ اس کے بعد ان کو وہ عظیم ظاہری نشانیاں دی گئیں جن سے فرعون کے مقابلہ کے لیے ان کا مسلح ہونا ضروری تھا۔ ان میں سب سے اہم نشانی عصا کی تھی جس سے بعد کی تمام نشانیوں کا ظہور ہوا۔ اس نشانی کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے اور یہ بات بھی ہم واضح کر چکے ہیں کہ بالکل پہلے ہی مرحلے میں حضرت موسیٰؑ کو یہ نشانیاں کیوں دی گئیں۔ یہاں صرف ایک بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے

نبوت کے ابتدائی مشاہدات نبی کے لیے نامانوس ہوتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق، عصا کو زمین پر ڈال دیا اور وہ سانپ کے مانند رینگنے لگا تو حضرت موسیٰؑ ایسا ڈر کے بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس واقعہ کا یہ پہلو ہمارے نزدیک اس حقیقت کے اظہار کے لیے یہاں خاص طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ نبوت کے ابتدائی مرحلہ کے مشاہدات نبی کے لیے بالکل نامانوس، نہایت انوکھے اور عجیب ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ شروع شروع میں ان سے گھبراتا ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ اس کو ان سے مانوس کر دیتا ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ حضرات انبیاء علیہم کو یہ چیز طلب اور ارمان پر نہیں ملی ہے بلکہ بالکل خلافِ توقع اس کا ظہور ہوا ہے اور بڑے اندیشوں، بڑی فکروں اور بہت ہی احتیاط کے ساتھ انھوں نے ایک فریضۂ الٰہی کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری اٹھائی ہے جب کہ ان کو پوری طرح یہ شرح صدر حاصل ہو گیا ہے کہ جو شاہدے ان کو ہو رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہیں اور وہ ایک خاص فریضہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے نبوت میں جو شاہدے ہوتے اور ان کے سبب سے آپؐ پر شروع شروع میں جو کیفیت طاری رہی اس کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف آخری گروپ کی سورتوں میں اشارات ہیں۔ ان شاء اللہ ان کے محل میں ہم ان کی وضاحت کریں گے۔

حضرت موسیٰؑ کی تسکین: يٰمُوۡسٰى لَا تَخَفۡ اِنِّىۡ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ۔ جب حضرت موسیٰؑ اپنے عصا کو سانپ

کی صورت میں دیکھ کر بھاگے اور پیچھے مڑ کے بھی دیکھنے کی انھیں جرأت نہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نہایت دل نوازانداز میں تسلی دی کہ موسیٰؑ! تم نہ ڈرو، اس سے تم کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس سے جو خطرہ پیش آئے گا وہ تمھارے دشمنوں کو پیش آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس کے رسولوں کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ وہ بالکل مامون و محفوظ ہوتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں کی طرف وہ بھیجے جاتے ہیں ان لوگوں کے لیے خطرہ ہے اگر وہ رسولوں پر ایمان نہیں لاتے۔ مطلب یہ ہے کہ تم خدا کے رسول ہو اور یہ عصا تمھارے لیے ایک تلوار ہے تو تم اس سے کیوں ڈرو، اس سے ڈریں تمھارے دشمن!

حضرت موسیٰؑ کے لیے پہلی نشانی

إِلَّا مَن ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوٓءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۱)

اللہ تعالیٰ کے نیک اور سلیم الفطرت بندوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب ان کو کوئی اندیشے کی حالت پیش آتی ہے تو فوراً ان کا ذہن اپنی کسی غلطی کی طرف جاتا ہے کہ مبادا یہ اسی کا خمیازہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا ذہن اس موقع پر قبطی کے قتل کے واقعہ کی طرف منتقل ہوا ہو۔ اگرچہ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے توبہ کرلی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول بھی فرمالی تھی لیکن حضرات انبیاء اور صالحین اپنا محاسبہ کرنے میں بڑے محتاط ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے 'لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُونَ' کے وعدہ بشارت کو مؤکد کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ میرے کسی بندے سے اگر کوئی غلطی صادر ہوجاتی ہے، پھر وہ توبہ و صلاح سے اس کی تلافی کر دیتا ہے تو میں اس کو معاف کر دیتا ہوں، میں بڑا ہی غفور و رحیم ہوں۔ اس بات کو بیان عام صیغے میں فرما کر اس کے فیض کو ہمہ گیر کر دیا ہے کہ یہ معاملہ کچھ تمھارے ہی لیے خاص نہیں ہے بلکہ میں اپنے ہر بندے کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہوں۔

حضرت موسیٰؑ کے ایک اندیشہ کا ازالہ

وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ فِي تِسْعِ ءَايَٰتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِۦٓ إِنَّهُمْ كَانُوا۟ قَوْمًا فَٰسِقِينَ (۱۲)

یہ دوسری نشانی ہے جو اسی موقع پر عطا ہوئی۔ اس کی وضاحت بھی پیچھے سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ وغیرہ میں ہو چکی ہے۔ 'تَخْرُجْ بَيْضَآءَ' کے ساتھ 'مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ' کی قید حضرت موسیٰؑ کے اس تردد کے رفع کرنے کے لیے تھی کہ ہاتھ کے سفید ہونے سے ان کو کسی مرض کا وہم نہ ہو۔ قرآن کے اسلوب بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ اطمینان دہانی ان کو یہ معجزہ دیتے وقت ہی کر دی گئی تھی اور یہی بات قرین عقل و فطرت ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو عصا کے معجزے سے جو تشویش ہوئی تھی اسی طرح کی تشویش ان کو اس معجزے سے بھی ہوتی اگر یہ اطمینان دہانی ان کو نہ کر دی جاتی۔ اس سے ضمناً تورات کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں برص کے مانند سفیدی تھی۔ اس پر تفسیر سورۂ طٰہٰ میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے لیے دوسری نشانی

'فِي تِسْعِ ءَايَٰتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِۦٓ' اس سے پہلے فعل 'اِذْهَبْ' محذوف ہے۔ یعنی نو نشانیوں سے مسلح ہو کر فرعون اور اس کی قوم کے پاس انذار کے لیے جاؤ، وہ بڑے ہی نافرمان ہو گئے

ہیں۔ ابتداءً تو حضرت موسیٰؑ کو عصا اور ید بیضا کی دو ہی نشانیاں دی گئیں لیکن ان کے اندر بہت سی نشانیاں مضمر تھیں جو بعد کے مراحل میں ظاہر ہوئیں۔ ان نشانیوں کی تفصیل، تورات کے حوالوں کے ساتھ بقرہ، اعراف اور طٰہٰ وغیرہ کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ یہ تمام نشانیاں حضرت موسیٰؑ کے عصا سے ظاہر ہوئیں اس وجہ سے عصا کی صورت میں حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے مقابلہ کے لیے گویا پوری میگزین دے دی گئی۔ یہ امر بھی یہاں واضح رہے کہ ان نو نشانیوں سے بھی صرف وہ نشانیاں مراد ہیں جو فرعون اور اس کی قوم کے مقابل میں ظاہر ہوئیں۔ وہ نشانیاں جو اس عصا کے ذریعہ سے خاص بنی اسرائیل کے لیے ظاہر ہوئیں وہ ان سے بالکل الگ ہیں اور ان کی تعداد بھی، تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ کم نہیں ہے، بہت ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۱۳)

حضرات انبیاء کے معجزات آنکھیں کھول دینے والے ہوتے ہیں

مُبْصِرَةً کے معنی ہیں آنکھیں کھول دینے والی نشانیاں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام سے جو معجزات ظہور میں آئے ان کا معجزہ ہونا دیکھنے والوں سے مخفی نہیں رہا۔ ان کی قاہریت نے اندھوں کی آنکھیں بھی کھول دیں لیکن جو لوگ نہیں ماننا چاہتے تھے انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے ان معجزات کو بھی جادو قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ خود جادوگروں نے بھی علی الاعلان اعتراف کر لیا کہ یہ جادو نہیں ہے لیکن پھر بھی ہٹ دھرموں نے اپنی ضد نہیں چھوڑی، اس کو جادو ہی کہتے رہے۔ یہاں وہ بات یاد رکھیے جو اوپر گزر چکی ہے کہ ایک ساحر کا انتہائی کمال یہ ہوتا ہے کہ اس کی لٹھیا سانپ کی طرح رینگنے لگ جائے اور اس کرتب کے لیے نہ جانے وہ کیا کیا پاپڑ بیلتا ہے تب کہیں جا کر اس کو اپنے فن میں کچھ دخل حاصل ہوتا ہے اور اس پر اس کو بڑا ناز ہوتا ہے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کا حال یہ ہوا کہ وہ اپنے عصا کو سانپ کی طرح رینگتے دیکھ کر ڈر کے بھاگے اور اس وقت تک ان کو قرار نہیں آیا جب تک اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی نہیں دی، پھر بھی ظالموں نے ان کو ایک ماہر جادوگر اور ان کی نشانیوں کو سحر مبین، قرار دیا۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ (۱۴)

منکروں کے انکار کا اصل سبب ان کا ظلم اور علو ہوتا ہے

یہ آخر میں وہ اصل مدعا سامنے رکھ دیا گیا ہے جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ دعوتِ حق کو قبول نہیں کرنا چاہتے وہ ایک دو نہیں بلکہ نو نو معجزات دیکھ کر بھی اپنے انکار کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھ ہی لیتے ہیں۔ ان کے دل اقرار کرتے ہیں کہ داعی کی بات حق ہے لیکن زبانوں سے وہ برابر اس کی تکذیب ہی کرتے رہتے ہیں۔ ان کے انکار کی اصل علت یہ نہیں ہوتی کہ حق ان پر اچھی طرح واضح نہیں ہوتا بلکہ اس کا اصل سبب ان کا ظلم اور علو ہوتا ہے۔ وہ خدا اور اس کے بندوں کے حقوق تلف کرنے کے خوگر ہو جاتے ہیں اور ان کی یہ عادت ان سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے اور ان کے اندر استکبار پیدا ہو جاتا ہے جس کے سبب سے اپنی خواہش کے خلاف کسی بڑے سے بڑے حق کے آگے بھی جھکنے

کے لیے وہ تیار نہیں ہوتے۔ ایسے مفسدین کا انجام وہی ہوتا ہے جو فرعون اور اس کی قوم کا ہوا۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۵-۴۴

اوپر کی آیات سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ حق کے انکار کا اصل سبب حقیقت کا خفا نہیں بلکہ لوگوں کا ظلم و استکبار ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نعمت عطا فرماتا ہے وہ نعمت ان کے لیے فتنہ بن جاتی ہے اور وہ بجائے اس کے کہ خدا کے زیادہ سے زیادہ شکر گزار اور اس کے فرماں بردار بندے بنیں خدا سے اکڑنے والے اور اس کی زمین میں فساد برپا کرنے والے بن جاتے ہیں۔ اب ان کے مقابل میں اللہ کے صالح و مصلح بندوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ ان پر اللہ کی نعمتیں جتنی ہی زیادہ ہوتی جاتی ہیں ان کی گردنیں ثمر بار شاخ کی طرح خدا کے آگے اتنی ہی جھکتی جاتی ہیں۔ اس کردار کی عملی مثال کے طور پر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو عظمت و شوکت عطا فرمائی ان کے ہم عصر حکمرانوں میں کسی کو بھی وہ حاصل نہیں ہوئی اور جن اسباب و وسائل پر ان کو تصرف بخشا ان پر کسی کو کبھی تصرف حاصل نہ ہوا لیکن یہ سب کچھ پاکر وہ کسی ظلم یا استکبار میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے ہر نعمت کو اللہ تعالیٰ کا ایک امتحان جانا، اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کی اور اس امتحان میں پورے اترے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ
فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ
دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا
مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿١٦﴾ وَحُشِرَ
لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ
يُوْزَعُوْنَ ﴿١٧﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ
يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَ
جُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٨﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَ
قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ

عَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ
فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾ وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَاۤ اَرَى
الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿۲۰﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا
اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۱﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ
بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ
بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ
كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ
لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ
عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ
يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ
وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ السجدة
قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ اِذْهَبْ
بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا
يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾
اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾
اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ ع ۲ ۱۷
فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا
نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ

مَاذَا تَأْمُرِينَ ﴿۳۳﴾ قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا
وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۖ وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ﴿۳۴﴾ وَإِنِّي مُرْسِلَةٌ
إِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنَاظِرَةٌ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُونَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَاءَ
سُلَيْمَانَ قَالَ أَتُمِدُّونَنِ بِمَالٍ فَمَا آتَانِيَ اللَّهُ خَيْرٌ مِمَّا آتَاكُمْ
بَلْ أَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُونَ ﴿۳۶﴾ ارْجِعْ إِلَيْهِمْ فَلَنَأْتِيَنَّهُمْ بِجُنُودٍ
لَا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِنْهَا أَذِلَّةً وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿۳۷﴾
قَالَ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي
مُسْلِمِينَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفْرِيتٌ مِنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ
تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ ۖ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِينٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِي
عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ
طَرْفُكَ ۚ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي
لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ ۖ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ
وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ ﴿۴۰﴾ قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ
أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ ﴿۴۱﴾ فَلَمَّا جَاءَتْ
قِيلَ أَهَٰكَذَا عَرْشُكِ ۖ قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ ۚ وَأُوتِينَا الْعِلْمَ
مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَعْبُدُ مِنْ
دُونِ اللَّهِ ۖ إِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كَافِرِينَ ﴿۴۳﴾ قِيلَ لَهَا ادْخُلِي
الصَّرْحَ ۖ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۚ

قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۗ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ
ع وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾

ترجمۂ آیات

اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو بڑا علم عطا فرمایا اور انھوں نے کہا کہ شکر ہے اللہ کے لیے جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہمیں فضیلت عطا فرمائی۔ ۱۵

اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا۔ اور اس نے کہا، اے لوگو، ہمیں پرندوں کی بولی کا علم بھی عطا ہوا ہے اور دوسری بھی سب چیزیں ہمیں بخشی گئی ہیں۔ بے شک یہ نہایت ہی کھلا ہوا فضل ہے۔ ۱۶

اور سلیمان کے جائزے کے لیے اس کا سارا لشکر، جنوں، انسانوں اور پرندوں میں سے اکٹھا کیا گیا اور ان کی درجہ بندی کی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے، ایک چیونٹی نے کہا، اے چیونٹیو، اپنے سوراخوں میں گھس جاؤ کہ سلیمان اور ان کا لشکر تمھیں پامال نہ کر ڈالے اور انھیں اس کا احساس بھی نہ ہو۔ پس وہ اس کی بات سے خوش ہو کر مسکرایا اور دعا کی، اے میرے رب مجھے سنبھالے رکھ کہ میں تیرے فضل کا شکر گزار رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمایا اور میں ایسے نیک کام کروں جو تجھے پسند ہوں اور تو اپنے فضل سے مجھے اپنے صالح بندوں کے زمرے میں داخل کر۔ ۱۷-۱۹

اور اس نے پرندوں کی فوج کا جائزہ لیا تو بولا کہ کیا بات ہے، میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں! وہ کہیں غائب ہے یا غیر حاضروں میں ہے! میں اس کو سخت سزا دوں گا یا ذبح کر ڈالوں گا یا پھر وہ کوئی واضح عذر میرے سامنے پیش کرے۔ زیادہ دیر نہیں گزری کہ وہ آیا

اور اس نے کہا کہ میرے علم میں وہ چیز ہے جو آپ کے علم میں نہیں ہے اور میں ملک سبا سے ایک سچی خبر لایا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت اس پر حکمرانی کر رہی ہے اور اس کو سب کچھ حاصل ہے اور اس کا تخت بہت بڑا ہے۔ میں نے اس کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کے سوا سورج کو پوجتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیے ہیں، پس ان کو صحیح راہ سے روک دیا ہے، پس وہ راہ یاب نہیں ہو رہے ہیں۔ ۲۰-۲۴

(شیطان نے ان کو صحیح راہ سے روک دیا ہے) کہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔ ۲۵-۲۶

اس نے کہا، ہم دیکھیں گے کہ تم نے سچ کہا ہے یا تم جھوٹوں میں سے ہو۔ یہ میرا نامہ لے کر جاؤ اور ان کے پاس ڈال دیجیو اور ہٹ کر دیکھیو کہ کیا ردِ عمل وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ۲۷-۲۸

اس نے کہا، اے اہلِ دربار، ایک گرامی نامہ میرے پاس ڈالا گیا ہے۔ وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور وہ یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، تم لوگ میرے مقابل میں سرکشی نہ کرو اور میرے پاس مطیع ہو کر حاضر ہو۔ اس نے کہا، اے درباریو، میرے اس معاملے میں مجھے رائے دو۔ میں کسی معاملے کا اس وقت تک فیصلہ نہیں کرتی جب تک آپ لوگ موجود نہ ہوں۔ ۲۹-۳۲

انھوں نے جواب دیا کہ ہم طاقت اور اعلیٰ جنگی صلاحیت رکھنے والے لوگ ہیں۔ فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے تو غور فرما لیجیے کہ کیا حکم دیتی ہیں۔ ۳۳

اس نے کہا، بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو درہم برہم اور اس کے معززین کو ذلیل کر کے چھوڑتے ہیں اور یہی یہ لوگ بھی کریں گے اور میں ان کے پاس

اپنے سفیر ہدیہ کے ساتھ بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ سفیر کیا جواب لاتے ہیں۔ ۳۴-۳۵

تو جب سفیر سلیمان کے پاس پہنچا، اس نے کہا کیا تم لوگ میری مدد مال سے کرنا چاہتے ہو! مجھے خدا نے جو دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو اس نے تم کو دیا ہے۔ یہ تمہی لوگ ہو کہ اپنے ہدیوں پر خوش ہوتے ہو! ان کے پاس واپس جاؤ، ہم ان پر ایسی فوجوں سے چڑھائی کریں گے کہ وہ ان کے مقابلے کی تاب نہ لا سکیں گے اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ خوار ہوں گے۔ ۳۶-۳۷

سلیمان نے کہا، اے دربار یو! تم میں سے کون اس کا تخت ان لوگوں کے میرے حضور میں فرمانبردار ہو کر حاضر ہونے سے پہلے پہلے لائے گا؟ جنوں میں سے ایک سرہنگ نے کہا، میں اس کو آپ کے پاس آپ کے اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے پہلے حاضر کر دوں گا اور میں اس کام پر قدرت رکھنے والا اور ایک امانت دار ہوں۔ جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا، میں اس کو آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے حاضر کر دوں گا۔ پس اس نے اس کو اپنے سامنے موجود دیکھا تو اس نے کہا یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ میرا امتحان کرے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔ اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی نفع کے لیے شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی تو میرا رب بے نیاز و کریم ہے۔ ۳۸-۴۰

اس نے حکم دیا کہ اس کے تخت کی شکل بدل دو، دیکھیں وہ پہچانتی ہے یا نہ پہچاننے والوں میں سے ہو کے رہ جاتی ہے۔ پس جب وہ آئی تو اس سے سوال کیا گیا کہ کیا تمہارا تخت ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا، گویا کہ وہی ہے اور ہم کو اس سے پہلے علم حاصل ہو چکا تھا اور ہم فرمانبرداروں میں تھے۔ اور اس کو روک رکھا تھا ان چیزوں نے جن کو اللہ

کے ماسوا وہ پوجتی رہی تھی۔ وہ ایک کافر قوم میں سے تھی۔ ۴۱-۴۳

اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جاؤ تو جب اس نے اس (کے فرش) کو دیکھا اس کو گہرا پانی گمان کیا اور اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں۔ سلیمان نے کہا یہ تو شیشوں سے بنا ہوا محل ہے! اس نے کہا، اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا، اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ رب العلمین کے حوالہ کیا۔ ۴۴

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۵)

علم سے مراد — 'عِلْمًا' سے مراد وہ حکمت و معرفت بھی ہے جو حضرات داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو حاصل ہوئی جس کا مظاہر زبور و امثال میں ہے اور سائنس کا وہ علم بھی ہے جس کی بدولت انھوں نے وہ عظیم سلطنت قائم کی جو اپنی بری و بحری قوت کے اعتبار سے اپنے زمانے کی سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت تھی۔ سورۂ انبیاء کی تفسیر میں اس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔

حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا جذبۂ شکر — 'وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ الاية' یہ ان کے شکر و سپاس کی تعبیر ہے کہ اپنے زمانے کی سب سے زیادہ طاقت ور حکومت کے فرماں روا اور ایجادات و صنائع میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہونے کے باوجود ان کے اندر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گھمنڈ نہیں پیدا ہوا کہ یہ سب کچھ ان کے اپنے ذاتی کارنامے ہیں بلکہ وہ برابر اپنے رب کے شکر گزار رہے کہ یہ عزت و فضیلت ان کو اللہ نے عطا فرمائی ہے۔ 'عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ' کے اندر یہ حقیقت مضمر ہے کہ اصل عزت و فضیلت ایمان کی عزت و فضیلت ہے۔ جس کو یہ حاصل نہیں ہے اس کے لیے عزت و فضیلت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ عزت و فضیلت کی بات ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ اپنے باایمان بندوں میں سرفرازی بخشے۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ (۱۶)

حضرت سلیمانؑ کے فضائل — یعنی حضرت داؤدؑ کے بعد حضرت سلیمانؑ ان کے وارث ہوئے۔ جیسا نامور باپ تھا اس سے بڑھ

کرنا مور بنیا ہوا۔ سورۂ انبیاء میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنی بری فوج کے ساتھ ساتھ اپنی بحری طاقت کو بڑی ترقی دی۔ ان کا بحری بیڑا دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور بیڑا تھا۔ اس آیت سے اور آگے کی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کو پرندوں کی بولی کا بھی خاص علم عطا ہوا تھا اور ان کی تربیت کر کے وہ اپنی فوج میں ان سے نامہ بری، خبر رسانی اور سراغ رسانی کا کام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر لیتے تھے اور اس طرح انھوں نے گویا اپنی ایک فضائی فوج بھی مرتب کر لی تھی لیکن یہ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود انھوں نے تنگ ظرفوں کی طرح یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں اب ایک ناقابل تسخیر طاقت بن گیا ہوں بلکہ آیت کا سیاق صاف اس بات کی دلیل ہے کہ جب ان کی فوجی قوت میں یہ شاندار اضافہ ہوا ہے تو بجائے اس پر فخر کرنے کے انھوں نے اپنی قوم کو یہ پیغام دیا کہ لوگو، ہمیں پرندوں کی بولی کا علم بھی حاصل ہو گیا ہے اور دوسرے اسباب و وسائل بھی، جو ترقی کے لیے ضروری ہیں، ہمیں حاصل ہیں تو یہ ہمارے اوپر خدا کا کھلا ہوا فضل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے اس کھلے ہوئے فضل کا حق یہ ہے کہ ہم اس کے زیادہ سے زیادہ شکر گزار اور اس کے سب سے بڑھ کر اطاعت گزار بنیں۔ تورات میں اگرچہ حضرت سلیمانؑ کو ایک بالکل دنیا دار بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے بلکہ ان کی طرف نعوذ باللہ شرک و بت پرستی کی نسبت بھی کی گئی ہے لیکن کتاب سلاطین میں یہ تصریح موجود ہے کہ انھوں نے اپنی عظمت و شوکت کو برابر اللہ تعالیٰ کا فضل قرار دیا اور اپنی قوم کو بھی اسی فضل و نعمت پر خدا ہی کا شکر گزار رہنے کی تاکید فرمائی۔

منطق الطیر کا علم

عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ پرندوں کے اندر بھی نطق و ادراک ہے اور حضرت سلیمانؑ کو ان کے نطق کا خاص علم عطا ہوا تھا۔ اگر ہم ان کے نطق کو نہیں سمجھتے تو ہمارا نہ سمجھنا اس کی نفی کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن میں صاف تصریح ہے کہ کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے لیکن ہم اس کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ اسی طرح قرآن میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ جتنے بھی چرند پرند ہیں سب ہماری ہی طرح الگ الگ امتیں ہیں۔ سورۂ نحل کی تفسیر میں ہم قرآن کے اس ارشاد کے مضمرات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کو تو پرندوں کی بولی کا خاص علم عطا ہوا تھا جن کو یہ علم نہیں ملا ہے وہ بھی یہ جانتے ہیں کہ جتنے بھی حیوانات ہیں سب اپنی نفرت، محبت، عتاب، التفات، خوشی، غم، فکرمندی، طمانیت، استمالت، ملاعبت اور اپنے دوسرے جذبات کی تعبیر کے لیے الگ الگ بولیاں بھی اختیار کرتے ہیں اور ان کے اظہار کے لیے ان کی الگ ہوتی ہیں۔ جو لوگ کسی مقصد خاص کے لیے ان جانوروں کی تربیت کرتے ہیں وہ ان کی آوازوں اور اشارات کو اسی طرح سمجھتے ہیں جس طرح اپنے ہم جنسوں کی بولی اور ان کے اشارات کو سمجھتے ہیں۔ پھر ان سے بھی زیادہ ان لوگوں کا علم ہے جنھوں نے سائنٹفک طریقے

پران حیوانات کا تجربہ و مشاہدہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے علمی تجربہ و مشاہدے سے جو معلومات فراہم کی ہیں ان کو پڑھیے تو انسان دنگ رہ جاتا ہے کہ بڑے جانور تو درکنار ننھی سی چیونٹی کے اندر بھی قدرت نے جو دانش و بینش، جزرسی و ہوشیاری اور جو فہم و فراست ودیعت فرمائی ہے وہ ایسی ہے کہ اس سے انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ آج کتوں سے سراغ رسانی اور جاسوسی کے سلسلے میں جو کام لیے جا رہے ہیں کیا وہ کم حیرت انگیز ہیں! جب انسان اپنے تجربات اور اپنی تجرباتی سائنس کے ذریعہ سے جانوروں کے اتنے اسرار دریافت کر سکتا ہے اور ان سے یہ کچھ کام لے سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اگر حضرت سلیمانؑ کو پرندوں کی بولی کا خاص علم دے دیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بولی درحقیقت آوازوں ہی کی ترکیب و تالیف سے وجود میں آتی ہے۔ جو چیزیں ادراک و شعور اور جذبات رکھتی ہیں وہ اپنے ادراک و شعور اور جذبات کی تعبیر کے لیے مختلف قسم کی آوازیں نکالتی ہیں اور انہی کی تالیف و ترکیب سے بولی وجود میں آتی ہے۔ اشارات بھی اسی میں داخل ہیں۔ ان کو غیر ناطق زبان سمجھیے۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (۱۷)

'حُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ' میں مضاف محذوف ہے۔ یعنی حضرت سلیمانؑ کے جائزہ اور ملاحظہ کے لیے ان کی ساری فوج جمع کی گئی۔

'وَزْعٌ' کے اصل معنی روکنے، تھامنے اور سنبھالنے کے ہیں۔ آگے آیت ۱۹ میں اسی معنی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے لیکن فوج کے تعلق سے جب یہ لفظ آئے تو اس کے معنی تربیت دینے اور درجہ بندی و صف بندی کرنے کے ہوتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کی فوج

اب یہ حضرت سلیمانؑ کی افواج کی ایک پریڈ کا ذکر فرمایا ہے جس میں ان کی تمام فوج، جو جنوں انسانوں اور پرندوں پر مشتمل تھی، ان کے ملاحظہ کے لیے اکٹھی کی گئی۔ 'فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ' یعنی مقصود اس اجتماع سے ان کی ترتیب اور الگ الگ درجہ بندی تھی۔ یہاں اس پریڈ کے ذکر سے اصل مدعا، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا، یہ دکھانا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی فوج کیسی حیرت انگیز صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں، جنوں اور پرندوں پر مشتمل تھی۔ لیکن جب ان کے فوجیوں کی طرف سے ان کی حیرت انگیز صلاحیتیں ظاہر ہوئیں تو وہ بجائے اس کے کہ ان سے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہوں اور یہ ڈھنڈورا پیٹیں کہ میں اب دنیا میں ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن گیا ہوں، انھوں نے اپنا سر نہایت تواضع کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھکا دیا کہ اے رب! اگر تو نے مجھ پر یہ فضل فرمایا ہے تو مجھے سنبھال کہ میں کہیں بہک نہ جاؤں بلکہ ہمیشہ تیرا شکرگزار اور فرمانبردار بندہ رہوں۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ

سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (۱۸)

وادئ نمل کی وضاحت

وَادِ النَّمْلِ، سے کوئی مخصوص وادی بھی مراد ہو سکتی ہے جو اسی نام سے معروف رہی ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن نے اس کا ذکر اس نام سے محض اس خصوص کی وجہ سے کیا ہو کہ اس میں چیونٹیاں بہت تھیں۔ چیونٹیاں، چیونٹے اور اس نوع کے تمام حشرات اپنے گوڑھ انہی علاقوں میں بناتے ہیں جن کا ماحول ہر اعتبار سے ان کے لیے سازگار ہو۔

حضرت سلیمانؑ حضرت نوری ہو بھی سکتے

یہ ذکر اسی پریڈ کے موقع کا ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کی فوجیں مارچ کرتی ہوئی چیونٹیوں کی وادی میں پہنچیں تو ایک چیونٹی نے اپنے دَل کو خطرے سے آگاہ کیا کہ اے چیونٹیو! اپنی بلوں میں گھس جاؤ، مبادا سلیمانؑ اور اس کی فوجیں تمھیں پامال کر دیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو۔ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ یعنی حضرت سلیمانؑ کی دَل بادل فوج کی راہ میں تو پہاڑ بھی گرد ہیں، اس کو بھلا اس بات کا احساس کہاں ہو گا کہ ہمارے حقیر وجود اس کے پاؤں تلے روندے گئے۔

چیونٹیوں کے عجائبات

چیونٹیوں کے متعلق سائنس نے جو حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں اس سے قطع نظر ایک عام آدمی بھی اگر ان کے کسی بڑے دَل کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے دیکھے تو ان کے عسکری نظام اور ڈسپلن کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ پوری فوج ایک قائد کی قیادت میں مارچ کر رہی ہے۔ دَل کے دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ان کے رضاکاروں اور اسکاؤٹوں کی لائن ہوتی ہے جو اپنے معین حدود کے اندر برابر تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ وہ نگرانی کی ڈیوٹی پر مامور ہیں۔ جونہی ان کو کسی خطرے کا احساس ہوتا ہے وہ اپنے حدود کے اندر اس سے دَل کو آگاہ کرتے ہیں اور دَل اپنے آپ کو اس سے بچانے کی تدبیر اختیار کرتا ہے۔ وہ منظر ان کا خاص طور پر دیدنی ہوتا ہے جب ان کا کوئی قبیلہ مستقل طور پر ایک مقام سے دوسرے مقام کے لیے اپنے تمام غذائی ذخائر اور اپنے تمام اولاد و احفاد کے ساتھ ہجرت کرتا ہے۔ میں نے بعض مرتبہ ان کی اس مہاجرت کا غور سے مشاہدہ کیا ہے۔ اگر میں ان مشاہدات کو قلم بند کروں تو ایک طویل داستان بن جائے۔

چیونٹیوں کے یہ کارنامے تو ہما و شما کو بھی نظر آتے ہیں لیکن سائنس دانوں نے ان کے جن عجائب کا انکشاف کیا ہے۔ ان کے بعد تو اس امر میں کسی شبہے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی ہے کہ وہ بھی، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے، ہماری ہی طرح امتیں ہیں۔ ان کی بعض قسمیں ہماری ہی طرح بعض جانوروں کو پالتی ہیں اور ان کو اپنے اغراض و ضروریات کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ اپنے لیے کھیت بناتی اور ان میں بیج بوتی ہیں اور جب فصل تیار ہوتی ہے تو دروکے بعد اس کو تہ خانوں میں محفوظ کر دیتی ہیں۔ ان کی باقاعدہ فوج بھی ہوتی ہے جو مخصوص افسروں کی کمان میں دشمن پر حملہ آور ہوتی ہے۔ ان کے ہاں

تربیت اور ٹریننگ کا باقاعدہ نظام ہے۔ غرض وہ ساری خصوصیات ان کے اندر بھی پائی جاتی ہیں جو انسانوں کے اندر پائی جاتی ہیں بس صرف شکل و صورت اور درجہ و مرتبہ کا فرق ہے۔

یہاں چیونٹی کی طرف جس 'قول' کی نسبت کی گئی ہے اگرچہ وہ اشاروں کی زبان سے بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ، جیسا کہ مریم ۲۶ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں، اشارے سے کوئی بات کہنے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہاں آیت سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ اس سے مسموع قول مراد ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ چیونٹیاں کی صرف وہی قسمیں نہیں ہیں جن سے ہم اپنے علاقوں میں آشنا ہیں بلکہ سائنس کی تحقیقات نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بے شمار قسمیں مختلف علاقوں اور زمینوں میں پائی جاتی ہیں جن میں صامت و ناطق ہر قسم کی چیونٹیاں ہیں۔ حضرت سلیمانؑ جس طرح پرندوں کی بولی سمجھتے تھے اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ان حشرات کی آواز بھی سنتے اور سمجھتے تھے۔ اور یہ علم ان کے پاس خداداد تھا۔

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّن قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ ﴿١٩﴾

'فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا' میں لفظ 'ضَحِكَ' خوشی اور ابتہاج و سرور کے مفہوم میں ہے جس طرح ہود آیت ۷۱ میں ہے۔ مجرد 'تَبَسَّمَ' استخفاف و تحقیر کی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ 'ضَاحِكًا' کی قید نے معین کر دیا کہ یہ تبسم خوشی اور سرور کی نوعیت کا تھا۔

وہ حقیقت جس کے لیے مذکورہ واقعہ بیان ہوا ہے

'أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ' لا یہ 'وَزَعَ' کے معنی کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔ یہاں یہ تھامنے اور سنبھالنے کے مفہوم میں ہے۔ یعنی حضرت سلیمانؑ نے یہ دعا فرمائی کہ اے رب جب تو نے میرے علم میں یہ افزونی عطا فرمائی ہے کہ میں حشرات و ہوام کی بولی بھی سمجھنے لگا ہوں تو ایسا نہ ہو کہ میں غرور و طغیان میں مبتلا ہو کر تیری راہ سے بھٹک جاؤں بلکہ تو میری باگ اپنے ہاتھ میں رکھ اور مجھے توفیق دے کہ تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر جو فضل عظیم فرمایا ہے میں اس کا حق ادا کر سکوں اور میرے ہاتھوں وہ کام انجام پائیں جو تیری رضا کے مطابق ہوں اور آخرت میں مجھے صالحین کی معیت حاصل ہو۔

یہی وہ اصل حقیقت ہے جس کے اظہار کے لیے اوپر والا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے جن کی نظر اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہے اور وہ خدا سے بے خبر ہیں ان کو جب کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو وہ اس پر اتراتے اور اکڑتے ہیں گویا انھوں نے کوئی بڑا تیر مارا ہے اور پھر اس غرور اور اکڑ کا لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں اور صلاحیتوں کو خدا کی رضا کے کاموں میں صرف کرنے کے بجائے شیطان کی مقصد برآری میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن حضرت سلیمانؑ

کا حال یہ تھا کہ اپنی ہر شان اور کاروائی کو انھوں نے اپنے رب کا فضل جانا اور اس سے برابر ڈرتے رہے کہ ان کا کوئی قدم خدا کی پسند کے خلاف نہ اٹھے۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ۝ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ (۲۰-۲۱)

حضرت سلیمان کی انضباطِ فوج

اسی پریڈ کے موقع پر جب انھوں نے اپنے پرندوں کی فوج کا جائزہ لیا تو ہُدہُد کو غائب پایا۔ اس پر غضبناک ہو کر فرمایا کہ کیا بات ہے میں ہُدہُد کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ موجود ہے، مجھے نظر نہیں آیا ہے، یا غیر حاضر ہے؟ یا تو وہ اپنی اس غیر حاضری کے لیے کوئی معقول عذر پیش کرے ورنہ یا تو میں اس کو سخت سزا دوں گا یا ذبح کر چھوڑوں گا۔

اَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ سے پہلے برنبائے قرینہ اتنی بات محذوف ہے کہ وہ موجود ہے میں دیکھ نہیں رہا ہوں یا ....

سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ اصل میں دلیل و حجت کے مفہوم میں آتا ہے۔ یہاں یہ اپنی صفائی میں کسی عذرِ معقول کے لیے آیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی فوج میں باقاعدہ تربیت پائے ہوئے مختلف قسم کے پرندے بھی تھے جن سے وہ پیغام رسانی، سراغ رسانی اور دریافتِ احوال کی مہمات میں کام لیتے تھے اور چونکہ وہ پرندوں کی بولی سمجھتے تھے اس وجہ سے وہ موجودہ زمانے کے سائنس دانوں سے بدرجہا اعلیٰ طریقہ پر یہ کام لیتے تھے۔

تجسسِ احوال کے لیے پرندوں کی فوج

پیغام رسانی اور دریافتِ احوال وغیرہ کے سلسلہ میں پرندوں سے کام لینے کا طریقہ موجودہ زمانے میں بھی موجود ہے اور قدیم زمانے میں بھی یہ پایا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حالات کے ضمن میں اہلِ تورات نے اس قسم کے کسی واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن حضرت نوحؑ کے حالات میں یہ ذکر ہے کہ جب انھوں نے یہ اندازہ کرنا چاہا کہ طوفان کا پانی اتر گیا ہے یا نہیں تو کشتی سے ایک کبوتری اڑائی۔ کچھ دیر کے بعد وہ کبوتری اپنی چونچ میں زیتون کی ایک تازہ شاخ لے کر آئی جس سے حضرت نوحؑ نے یہ اندازہ فرمایا کہ اب پانی اتر گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خبر رسانی اور تجسسِ احوال وغیرہ کی مہمات کے لیے پرندوں کی تربیت کا فن بہت قدیم بلکہ ابتدائے تاریخ سے موجود ہے۔ کبوتر کی نامہ بری تو خیر معروف ہی ہے۔ حضرت نوحؑ کے مذکورہ بالا واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرندہ تجسسِ احوال کے مقصد کے لیے بھی بہت زیرک ہے۔ موجودہ زمانہ کی سائنس نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ فلسطین کے علاقے میں ہُدہُد کی کثرت ہے۔ یہ پرندہ بھی اس مقصد کے لیے کبوتر ہی کی طرح ہوشیار ہے اس وجہ سے

حضرت سلیمانؑ نے اپنی فوج میں اس سے کام لیا۔

حضرت سلیمانؑ نے جس انداز سے ہُدہُد کی غیر حاضری پر عتاب فرمایا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرندے فوجی ڈسپلن کے تحت تھے۔ انھیں اس نظم کی پوری پوری پابندی کرنی پڑتی تھی اور کسی خلاف ورزی کی صورت میں انھیں فوجی ضوابط کے تحت سزا بھگتنی پڑتی تھی۔

فَمَکَثَ غَیۡرَ بَعِیۡدٍ فَقَالَ اَحَطۡتُّ بِمَا لَمۡ تُحِطۡ بِہٖ وَ جِئۡتُکَ مِنۡ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ یَّقِیۡنٍ ۔ اِنِّیۡ وَجَدۡتُّ امۡرَاَۃً تَمۡلِکُہُمۡ وَ اُوۡتِیَتۡ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ لَہَا عَرۡشٌ عَظِیۡمٌ ۔ وَجَدۡتُّہَا وَ قَوۡمَہَا یَسۡجُدُوۡنَ لِلشَّمۡسِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَہُمۡ فَصَدَّہُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ فَہُمۡ لَا یَہۡتَدُوۡنَ (۲۲-۲۴)

ہُدہُد کی رپورٹ ملک سبا کے بارے میں

فَمَکَثَ غَیۡرَ بَعِیۡدٍ۔ مَکَثَ کا فاعل، میرے نزدیک، حضرت سلیمانؑ ہیں۔ یعنی ہُدہُد پر جو عتاب انھوں نے فرمایا اس کے بعد زیادہ دیر نہیں گزری کہ ہدہد آگیا اور اس نے اپنی کارگزاری کی یہ رپورٹ پیش کی کہ میں ملک سبا سے ایک ایسی سچی اطلاع لے کر آیا ہوں جو حضور کے علم میں نہیں ہے۔ سبا عرب کا وہ مغربی جنوبی علاقہ ہے جہاں یمن، حضرموت اور عسیر واقع ہیں۔ ہُدہُد کے قول کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت سلیمانؑ اس ملک اور اس کے حالات سے بالکل ہی بے خبر ہیں۔ اتنے قریب کے ملک سے حضرت سلیمانؑ بالکل بے خبر کیسے ہو سکتے تھے جب کہ تورات اور قرآن دونوں سے یہ بات ثابت ہے کہ ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کے حالات اور ان کی حکمت سے، جیسا کہ آگے وضاحت آرہی ہے، فی الجملہ واقف تھیں۔ جب ملکۂ سبا واقف تھیں تو حضرت سلیمانؑ کے ناواقف ہونے کے کیا معنی جن کا بحری بیڑا دور دور کے ممالک تک سفر کرتا تھا۔ ہدہد کا مطلب یہ تھا کہ اس ملک سے متعلق میں تازہ تفصیلی رپورٹ لے کر آیا ہوں جس سے حضور کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ اَحَطۡتُّ بِمَا لَمۡ تُحِطۡ بِہٖ کے الفاظ سے بھی یہی بات نکلتی ہے۔ ان الفاظ کا صحیح مدعا یہ ہے کہ حضور والا اس ملک سے متعلق جو کچھ جانتے ہیں میں اس سے کہیں زائد معلومات حاصل کر کے آیا ہوں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ ہُدہُد نے یہ بات اپنی غیر حاضری کے عذر کے طور پر پیش کی ہے اس وجہ سے اس نے اپنی رپورٹ کا قابلِ وثوق ہونا بھی واضح کیا اور تازہ معلومات پر مشتمل ہونا بھی۔ اس طرح کا اضافہ ہر ملک کا سفیر اور مخبر اپنے ملک کے حکمران کی معلومات میں کرتا ہے اور کر سکتا ہے اس وجہ سے اس میں حضرت سلیمانؑ کے علم اور ان کی معلومات کی تحقیر کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

اِنِّیۡ وَجَدۡتُّ امۡرَاَۃً .... الآیۃ۔ ملک کے حکمران سے متعلق اس نے یہ رپورٹ دی کہ ان پر ایک عورت حکومت کر رہی ہے اور انداز کلام سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عورت کی حکمرانی اس کی نظر میں ایک تعجب انگیز امر ہے۔ ملک کے وسائل و ذرائع سے متعلق اس نے یہ رپورٹ دی کہ اُوۡتِیَتۡ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ یعنی ملک کی رفاہیت و ترقی سے متعلق جو چیزیں ضروری ہیں وہ سب اس کو حاصل ہیں۔ ملک کی عظمت سے متعلق اس نے یہ رپورٹ دی کہ لَہَا عَرۡشٌ عَظِیۡمٌ اس کا تخت بہت بڑا ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ اس زمانے کے بادشاہوں کے تخت و تاج چونکہ سونے چاندی اور زر و جواہر سے آراستہ ہوتے تھے اس وجہ سے ان کی بڑائی بیشتر انہی چیزوں کی بڑائی سے ناپی جاتی تھی۔

ملک کی مذہبی و اخلاقی حالت سے متعلق اس نے یہ رپورٹ دی کہ ملکہ اور اس کی قوم کے لوگ سب آفتاب پرست ہیں اور یہ آفتاب پرستی اور ان کے دوسرے اعمال و اخلاق اس طرح شیطان نے ان کی نگاہوں میں کھبا دیے ہیں کہ صحیح راہ — توحید اور خدا پرستی کی راہ — ان کو سجھائی نہیں دے رہی ہے۔

اَلَّا یَسۡجُدُوۡا لِلّٰہِ الَّذِیۡ یُخۡرِجُ الۡخَبۡءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ یَعۡلَمُ مَا تُخۡفُوۡنَ وَ مَا تُعۡلِنُوۡنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ (۲۵-۲۶)

ایک تضمین

میرے نزدیک یہ دو آیتیں ہدہد کے قول کا جزو نہیں ہیں بلکہ یہ اسی قسم کی تضمین ہے جس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہدہد کی بات 'فَصَدَّهُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ' کے ساتھ اس بات کو ملا کر کلام کو بالکل مطابق حال کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان نے ان کو اس خدا کی بندگی سے روک دیا جو آسمان و زمین کی تمام مخفیات کو بے نقاب کرتا ہے اور جو تمہارے تمام سرّ و علانیہ سے اچھی طرح واقف ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ عرش عظیم کا مالک وہی ہے۔

اس کے تضمین ہونے کے قرائن بالکل واضح ہیں، ان کی مزید وضاحت تحصیل حاصل ہوگی۔ 'مَا تُخۡفُوۡنَ وَ مَا تُعۡلِنُوۡنَ' کے صیغہ ہائے خطاب ہدہد کی زبان سے بالکل ناموزوں ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی فرما سکتا تھا۔

'یُخۡرِجُ الۡخَبۡءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ' میں 'خَبۡءَ'، 'مَخۡبُوۡءٌ' کے مفہوم میں ہے۔ یعنی زمین و آسمان کی تمام پوشیدہ چیزوں کو بے نقاب تو اللہ تعالیٰ کرتا ہے لیکن نادان لوگ پوجا غیر اللہ کی کرتے ہیں۔ آسمان کی پوشیدہ چیزوں سے یہاں اشارہ سورج، چاند، زہرہ، مشتری اور بارش وغیرہ کی طرف خاص طور سے ہے جن میں سے سورج کی پوجا سب سے بڑے دیوتا کی حیثیت سے، اہل سبا کرتے تھے۔ زمین کی پوشیدہ چیزوں سے اشارہ ان چیزوں کی طرف ہے جو اس سے اگتی یا برآمد ہوتی ہیں۔ مثلاً درخت، نباتات، دریا اور چشمے وغیرہ۔ فرمایا کہ ان تمام چیزوں کا خالق و مالک تو اللہ وحدہٗ لا شریک ہے اور وہ تمہارے تمام پوشیدہ و علانیہ سے واقف بھی ہے تو دوسری چیزوں کی بندگی کرنے کے کیا معنی!

'لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ'۔ یعنی اصل عرش عظیم کا، جو تمام آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے، مالک وہی ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ اس کے عرش کے آگے کسی کے عرش کی بھی، خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو، کوئی وقعت و حیثیت نہیں ہے۔

قَالَ سَنَنۡظُرُ اَصَدَقۡتَ اَمۡ کُنۡتَ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۲۷﴾ اِذۡہَبۡ بِّکِتٰبِیۡ ہٰذَا فَاَلۡقِہۡ اِلَیۡہِمۡ ثُمَّ تَوَلَّ عَنۡہُمۡ فَانۡظُرۡ مَاذَا یَرۡجِعُوۡنَ (۲۷-۲۸)

ایک قرین قیاس بات

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا، جلد ہی تمہارے سچے یا جھوٹے ہونے کا امتحان ہوا جاتا ہے،

میرا یہ نامہ لے کر جاؤ اور ان کے آگے ڈال دو۔ پھر پرے ہٹ کر دیکھو کہ وہ کیا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد ان کی طرف سے کوئی نہ کوئی ردِ عمل لازماً ظاہر ہوگا جس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ تم نے یوں ہی سبا تک جانے کی بڑ ہانکی ہے یا اس میں کچھ حقیقت بھی ہے! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت سبا کا مسئلہ پہلے سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے زیرِ غور تھا اور عجب نہیں کہ اس کے زیرِ غور ہی ہونے کے سبب سے ہُدہُد نے اس ملک کے حالات کے جائزہ کے لیے یہ پرواز کی ہو۔ اگر پہلے سے کوئی اسکیم نہ ہوتی تو یہ بات بعید از قیاس ہے کہ مجرد ہُدہُد کے صدق و کذب کی جانچ کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام ملکۂ سبا کو الٹی میٹم بھیج دیں۔ آگے اس خط کا حوالہ آ رہا ہے اور اس کی نوعیت بالکل الٹی میٹم کی ہے۔

ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ کی ہدایت کا مدعا صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ خط ان کے سامنے ڈال کر فوراً وہاں سے واپس نہ آ جانا بلکہ یہ جائزہ لینے کی بھی کوشش کرنا کہ اس خط پر ان کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ پرے ہٹنے کی ہدایت ہُدہُد کو حضرت سلیمانؑ نے اس لیے فرمائی کہ وہ لوگ بے تکلف اظہارِ خیال کر سکیں اور ایک غیر ملک کے قاصد کی موجودگی کے باعث کوئی جھجک نہ محسوس کریں لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس زمانے میں پرندوں کے ذریعہ سے نامہ بری تو ایک معروف بات تھی لیکن یہ بات کہ حضرت سلیمانؑ کا نامہ بر ہُدہُد باتوں کو سنتا اور سمجھتا بھی ہے کم از کم اس مرحلے تک ملک سبا کے لوگوں کے علم میں اس کے ہونے کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّىْٓ اُلْقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ○ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَىَّ وَاْتُوْنِىْ مُسْلِمِيْنَ (۲۹-۳۱)

حضرت سلیمانؑ کا نامہ ملکۂ سبا کے نام

نامہ کے موصول ہونے کے بعد ملکہ نے فوراً اپنے درباریوں سے مشورہ کیا۔ ان کو بتایا کہ اِنِّىْٓ اُلْقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ (میرے پاس ایک معزز گرامی نامہ ڈلوایا گیا ہے) اس اندازِ تعارف سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ پرندوں کے ذریعہ سے خطوط بھیجنے اور بھجوانے کا طریقہ اس زمانے میں کم از کم بادشاہوں کے ہاں، ایک معلوم و معروف طریقہ تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ملکہ کو بھی اس طرح، بغیر کسی قاصد کے، خط آنے پر تعجب ہوتا اور درباری بھی اس پر تعجب کا اظہار کرتے لیکن نفسِ خط کے وصول ہونے پر نہ ملکہ نے کسی تعجب کا اظہار کیا نہ ان کے درباریوں نے بلکہ ملکہ نے بھی اس کا ذکر ایک عام واقعہ کی حیثیت سے کیا اور درباریوں نے بھی اس کو عادی واقعہ ہی کی حیثیت سے سنا۔

دوسری یہ کہ ملکہ نے اس خط کا ذکر ایک معزز خط کی حیثیت سے کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ خط — حضرت سلیمانؑ — کی عزت و عظمت ان کے اور ان کے درباریوں کے دل میں پہلے سے موجود تھی۔ اس کے شواہد تورات اور تالمود میں بھی موجود ہیں۔ اور آگے قرآن میں بھی اس کے اشارات آ رہے ہیں۔

اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِۙ یہ ملکہ نے اصل خط کا خلاصہ پیش کیا کہ یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اس کا آغاز بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ سے ہوا ہے۔ قدیم زمانے کے سلاطین و امراء کے خطوط و فرامین کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ان کا آغاز مُرسل اور مُرسل الیہ کے نام سے ہوتا۔ ملکہ نے چونکہ خط کا پورا متن نہیں بلکہ خلاصہ ہی پیش کیا اس وجہ سے مرسل کے نام اور اس کے بعد خاص طور پر اس کے بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ سے شروع ہونے کا ذکر کیا۔ اس سے بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ نے خط کے اس سرنامہ کو خاص طور پر اہمیت دی اور یہ چاہا کہ اس کے اندر جو دعوتی روح ہے اس کو اس کے درباری بھی سمجھیں۔

اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَیَّ وَاۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِيۡنَ۔ یہ حضرت سلیمانؑ کے خط کا اصل مدعا ملکہ نے بتایا کہ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ میرے مقابل میں سرکشی نہ کرو بلکہ میری اطاعت میں داخل ہو جاؤ۔

اگرچہ قرینہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ نے حضرت سلیمانؑ کے خط کا خلاصہ پیش کیا ہے لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ قدیم زمانے میں خطوط اور فرامین طویل نہیں لکھے جاتے تھے بلکہ نہایت مختصر اور قلّ و دلّ ہوتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط سے بھی اسی کی شہادت ملتی ہے اس وجہ سے اگر حضرت سلیمانؑ کا خط اتنا ہی رہا ہو جب بھی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

حضرت سلیمانؑ کا مطالبہ اہل سبا سے — تورات کی کتاب سلاطین سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ان کے گرد و پیش کی تمام ریاستیں اور حکومتیں یا تو خود ان کی باجگزار اور ماتحت بن گئی تھیں یا حضرت سلیمانؑ نے ان کو طاقت کے زور سے اپنے زیرِ نگین کر لیا تھا اور ایسا انھوں نے اس اصول کے تحت کیا تھا کہ کفر و شرک کا اقتدار خدا کی زمین میں سب سے بڑا فساد ہے جس کو مغلوب کرنا اہلِ حق کے فرائض میں سے ہے۔ اس اصول کے تحت اہلِ سبا سے بھی انھوں نے مطالبہ کیا کہ وہ سیدھے سیدھے ان کی ماتحتی میں داخل ہو جائیں، سرکشی کی روش نہ اختیار کریں کہ ان کے خلاف ان کو کوئی اقدام کرنا پڑے۔ 'مُسۡلِمِيۡنَ' یہاں اطاعت اور فرمانبرداری کے مفہوم میں ہے، اسلام لانے کے مفہوم میں نہیں ہے۔ ایک صحیح اسلامی حکومت کو یہ حق تو حاصل نہیں ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اسلام لانے پر مجبور کرے لیکن اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اقتدار پر متمکن نہ ہونے دے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ خدا کی زمین میں خدا کے قانون کے سوا کسی اور قانون کی بالادستی خدا سے بغاوت اور فساد فی الارض ہے۔

قَالَتۡ يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا اَفۡتُوۡنِیۡ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ‌ۚ مَا كُنۡتُ قَاطِعَةً اَمۡرًا حَتّٰى تَشۡهَدُوۡنِ (۳۲)

ملکۂ سبا کا مشورہ اپنے درباریوں سے — خط کا مضمون سنا کر ملکہ نے درباریوں سے مشورہ طلب کیا کہ آپ لوگ اس معاملے میں رائے دیجیے کہ مجھے کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ اور ساتھ ہی اہلِ دربار کی دلجوئی و استمالت کے لیے یہ بھی کہا کہ میں کسی اہم معاملے کا فیصلہ اس وقت تک نہیں کرتی جب تک آپ لوگوں کی موجودگی میں آپ لوگوں کا مشورہ نہ حاصل

کرلوں۔ اس دل جوئی کی ضرورت ملکہ نے غالباً اس لیے محسوس کی کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے جنگ کے لیے، جیسا کہ آگے کے حالات سے واضح ہوگا، تیار نہیں تھیں اور ان کی یہ خواہش تھی کہ ان کے اعیان بھی معاملہ پر اسی طرز سے سوچیں جس طرز سے وہ سوچ رہی ہیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ کوئی شخصی حکومت بھی اس معنی میں شخصی نہیں ہوا کرتی کہ بادشاہ اپنی ذات کے سوا ہر شخص سے بالکل مستغنی ہو۔ اس معنی میں شخصی تو فرعون کی حکومت بھی نہیں تھی۔ آخر وہ بھی اپنے اعیان اور درباریوں سے مشورہ کرتا تھا! اسی طرح ملکۂ سبا نے بھی اپنے اعیان سے مشورہ کیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ملکۂ سبا کی حکومت جمہوری یا شورائی تھی ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اس کو کہہ سکتے ہیں تو اعیانی حکومت کہہ سکتے ہیں اور وہ بھی ایک خاص مفہوم میں۔

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ (۳۳)

درباریوں کا مشورہ — درباریوں نے کہا کہ ہم وسائل جنگ اور افراد کی تعداد کے اعتبار سے بھی طاقتور ہیں اور ہمارے آدمی جنگی مہارت و بسالت کے اعتبار سے بھی ممتاز و نامور ہیں تو آپ اگر جنگ کا فیصلہ فرمائیں تو ہم حریف سے بیٹھے نہیں ہیں لیکن فیصلہ بہرحال آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ غور فرما لیجیے کہ کیا حکم دیتی ہیں۔

'اُولُوْا قُوَّةٍ' سے انھوں نے اپنی عددی قوت اور وسائل جنگ کی طرف اشارہ کیا اور 'اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ' سے اپنی جنگی مہارت و بصیرت اور جرأت و بسالت کی طرف۔ جنگ کے لیے یہی دو چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درباریوں کا رجحان جنگ کی طرف تھا اور انھوں نے اپنا یہ رجحان ملکہ کے سامنے ظاہر کر دیا۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (۳۴)

ملکہ کی رائے — ملکہ نے درباریوں کے اس رجحان کی تائید نہیں کی۔ حضرت سلیمانؑ کی قوت و صولت اور ان کی دانش و حکمت سے متعلق ان کو بہت سی باتیں پہنچ چکی تھیں۔ اس وجہ سے جنگ کے رجحان کی انھوں نے حوصلہ شکنی کی اور اس کے عواقب سے اپنے درباریوں کو ڈرایا کہ بادشاہ لوگ جب کسی ملک یا شہر کو فتح کرتے ہیں تو اس کو بالکل تلپٹ کر کے رکھ دیتے ہیں اور ان کے ہاتھوں ملک کے معززین کو ذلیل و خوار ہونا پڑتا ہے بصورت غلبہ سلیمانؑ اور ان کے فوجی بھی لازماً یہی کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جنگ سے احتراز ہی میں خیر ہے۔

وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ (۳۵)

ملکہ کی مصالحت کی پالیسی — ملکہ نے جنگ کے بجائے مصالحت و استمالت کی پالیسی اختیار کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ میں پہلے اپنے سفیروں کے ذریعے سے حضرت سلیمانؑ کے پاس تحفے بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ ہمارے اس جذبۂ خیرسگالی کا ان پر کیا اثر پڑتا ہے اور ہمارے سفیر ان کی طرف سے کیا جواب لے کر لوٹتے ہیں۔

'فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ' سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ملکہ کو اپنی اس سفارت کی کامیابی

کی کچھ زیادہ توقع نہیں تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ حضرت سلیمانؑ کے سامنے سوال اصول کا ہے۔ ان کو تحفوں اور ہدیوں سے رام کرنا ممکن نہیں ہے لیکن وہ جنگ سے بچ کر معاملے کو طے کرنے کی کوئی ایسی راہ نکالنا چاہتی تھیں جو ان کے اور سارے اہل ملک کے لیے بہتر ہو اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ان کے مزاج میں سلامت روی اور عاقبت بینی تھی۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ (۳۶)

حضرت سلیمانؑ کا جواب ملکہ سبا کے وفد کو

ملکہ نے اپنی تجویز کے مطابق تحائف و ہدایا کے ساتھ ایک وفد حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں بھیجا۔ 'جَآءَ' واحد کا صیغہ وفد کے لحاظ سے آیا ہے یعنی فَلَمَّا جَآءَ مَنْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ۔ ملکہ کے اوپر کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے اور حضرت سلیمانؑ کے آگے کے الفاظ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ایک پورا وفد حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ لیکن حضرت سلیمانؑ نے ان کے تحائف و ہدایا قبول نہیں فرمائے۔ بلکہ صاف لفظوں میں ان کو جواب دے دیا کہ آپ لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہیں، میں مال کا محتاج نہیں ہوں۔ مجھے میرے رب نے جو کچھ دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے جو آپ لوگوں کے پاس ہے۔ 'فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ' کے اجمال میں مال و جاہ اور حکمت و حکومت کی وہ ساری نعمتیں شامل ہیں جو حضرت سلیمانؑ کو حاصل تھیں۔ انھوں نے فرمایا کہ اس قسم کے ہدیوں اور تحفوں سے آپ ہی لوگ خوش ہوتے ہیں۔ میں اس کا شائق نہیں ہوں۔

حضرت سلیمانؑ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میرا مطالبہ آپ کی ملکہ اور آپ کی حکومت سے اطاعت کا ہے۔ میں صرف دوستی کا خواہشمند نہیں ہوں کہ ان تحفوں سے خوش ہو جاؤں کہ ہمارے درمیان دوستی کی رسم و راہ قائم ہو گئی۔ مال و متاع میرے پاس بہت ہے اور وہ بہر شکل آپ لوگوں کے مال سے بہتر ہے۔ آپ لوگ تو اس طرح کی چیزوں سے خوش ہوتے ہیں اس لیے کہ آپ لوگوں کی نظر میں ساری قدر انہی چیزوں کی ہے لیکن میرے پیش نظر اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ میرے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ میں تحفوں سے خوش ہو کر شرک و کفر کے اقتدار کو خدا کی زمین پر جائز تسلیم کر لوں۔

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۳۷)

حضرت سلیمانؑ نے رئیس وفد کو یہ جواب دیا کہ تم اپنی ملکہ اور ان کے اعیان کے پاس جاؤ۔ ہم ان پر ایسی افواج قاہرہ سے حملہ کریں گے جن کے مقابلہ کی تاب وہ نہ لا سکیں گے اور ان کو اس ملک سے اس طرح ذلیل کر کے نکالیں گے کہ وہ خود اپنی نظروں میں خوار ہو کر رہ جائیں گے۔

'قِبَلٌ' کے معنی قوت، طاقت اور مقدرت کے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کو اپنے قاصد کے ذریعہ سے یہ

بات معلوم ہو چکی تھی کہ ملکۂ سبا کے درباریوں کو اپنے اسباب و وسائل اور اپنی شجاعت و بسالت پر بڑا ناز ہے اس وجہ سے انھوں نے ان کو آگاہ فرمایا کہ میری فوج کے مقابلہ میں ان کا یہ سارا غرہ ختم ہو جائے گا۔

'اَذِلَّۃً' کے ساتھ 'وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ' کے اضافہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ میری فوجیں اس طرح ان کو ذلیل کر کے ملک سے نکالیں گی کہ وہ خود اپنی نظروں میں بھی خوار ہو کے رہ جائیں گے۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم جنگ میں تو شکست کھا جاتی ہے لیکن اس کا حوصلہ باقی رہتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میری فوجیں اس طرح ان کے کس بل نکال دیں گی کہ پھر یہ جنگ کا کبھی نام بھی لینے کی جرأت نہیں کریں گے۔

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (۳۸)

حضرت سلیمانؑ کی ایک تدبیر

سفیروں کو واپس کر دینے کے بعد حضرت سلیمانؑ نے یہ اندازہ اچھی طرح فرما لیا کہ یہ لوگ جنگ کا خطرہ مول لینے کی جرأت نہیں کریں گے بلکہ بہت جلد ان کے مطالبہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیں گے۔ اس سے پہلے پہلے انھوں نے یہ چاہا کہ ملکہ اور ان کے درباریوں کے سامنے ان کی طرف سے کوئی ایسی بات ظاہر ہو جائے جو ان کو بالکل ہی مرعوب کر دے۔ چنانچہ انھوں نے یہ ارادہ فرمایا کہ ملکہ کے اس تخت کو، جس کی شان و عظمت کی ان کے قاصد نے خبر دی تھی، اپنے دربار میں منگوا لیں۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے درباریوں سے فرمایا کہ تم میں سے ایسا کون ہے جو ملکہ کے تخت کو، قبل اس کے کہ وہ لوگ میرے پاس فرماں بردارانہ آئیں حاضر کر دے؟

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ (۳۹)

'عِفْرِيْتٌ' کے معنی کاردان، شاطر اور چالاک کے ہیں اور ساتھ ہی اس کے اندر تگڑے، زور آور اور لیڈر ہونے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے میں نے اس کا ترجمہ سرہنگ کیا ہے۔

جنوں کے ایک سرہنگ کی پیشکش

یہ بحث اپنے مقام میں گزر چکی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا علم بھی عطا ہوا تھا جس کے ذریعہ سے انھوں نے بہت سے جنوں کو مسخر کر کے اپنی حکومت کی مختلف قسم کی خدمات میں لگا رکھا تھا۔ جب حضرت سلیمانؑ نے درباریوں کے سامنے مذکورہ بالا خواہش کا اظہار کیا تو اس کی تعمیل کے لیے سب سے پہلے ایک شاطر جن نے اپنی خدمات پیش کیں کہ اگر حضور یہ خدمت میرے سپرد فرمائیں تو میں آپ کی اس مجلس کے برخاست ہونے سے پہلے پہلے ملکہ کے تخت کو حاضر کر سکتا ہوں۔ ساتھ ہی اس نے یہ اطمینان بھی دلایا کہ میں اس تخت کو اٹھا لانے کی قوت بھی رکھتا ہوں اور دیانت دار بھی ہوں اس وجہ سے حضور اطمینان رکھیں کہ میں اس میں کوئی تصرف نہیں کروں گا۔

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۣ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ

لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ (۴۰)

ایک عالم کتاب کا دعویٰ

جب ایک جن نے پیشکش کی تو دربار کے ایک عالم کتاب کی غیرت جوش میں آ گئی۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہوئی؟ یہ دربار کے برخاست ہونے تک تخت کے لانے کا وعدہ کرتا ہے، میں آپ کی پلک جھپکتے اس کو حاضر کیے دیتا ہوں۔ اتنے میں حضرت سلیمانؑ نے دیکھا کہ تخت ان کے سامنے موجود ہے۔

علم کتاب سے مراد ظاہر ہے کہ خدا کی کتاب و شریعت یعنی تورات کا علم ہے۔ اس عالم کتاب کو معلوم ہوتا ہے کہ اس علم میں بھی درخور حاصل تھا جس کا ذکر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہاروت و ماروت کے ضمن میں وضاحت سے کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ خواص کلمات و اسمائے الٰہی کا علم ہے جو سحر و شعبدے وغیرہ جیسے علوم سفلیہ کے مقابلہ کے لیے دو فرشتوں کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو بابل کی اسیری کے زمانہ میں عطا ہوا تھا۔ یہ علم بجائے خود پاکیزہ ہے لیکن اس کی نوعیت ایک شمشیر دو دم کی ہے جس کو فاسد اغراض میں استعمال کر کے انسان فتنہ میں پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ بقرہ میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ فرشتوں نے اس علم کو فتنہ سے تعبیر بھی فرمایا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانے تک تو ان کے شدید احتساب کے سبب سے اس علم کو کوئی غلط مقاصد میں استعمال کرنے کی جرأت نہ کر سکا لیکن بقرہ میں اس بات کی تصریح ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے بعد یہود اسی علم کے ہو کے رہ گئے۔ تورات سے ان کو کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی بلکہ مزید ستم یہ کیا کہ اس کو انھوں نے عملیات سفلیہ کا ضمیمہ بنا لیا اور اپنے عوام کو یہ باور کرایا کہ حضرت سلیمانؑ کی تمام عظمت و شوکت انھی چیزوں کے بل پر قائم تھی۔

یہ علم، تورات یا آسمانی صحیفوں کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ یہ ان سے الگ ہے۔ یہ ایک خاص دور میں، ایک خاص ضرورت و مصلحت کے تحت، بنی اسرائیل کو عطا ہوا تھا جس کی وضاحت بقرہ کی تفسیر میں ہم کر چکے ہیں۔ یہاں اَلَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کتاب و شریعت کے علم کے ساتھ بھی ایسا علم حاصل کیا جا سکتا ہے جس کی تاثیر و تسخیر کا مقابلہ شیاطین جن و انس اپنی عملیات سفلیہ کے زور سے نہیں کر سکتے۔

حضرت سلیمانؑ کی شکر گزاری

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ۔ الاٰیۃ یہ وہ اصل مدعا ہے جس کے لیے یہ واقعہ سنایا گیا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیکھا کہ فی الواقع ملکۂ سبا کا تخت ان کے سامنے موجود ہے، اور اس کے لیے نہ انھیں خود کچھ کرنا پڑا اور نہ کسی جن و شیطان سے ان کو مدد لینی پڑی بلکہ ان کے دربار کے ایک عالم کتاب نے اللہ کے نام و کلمات کے ذریعے سے یہ کارنامہ کر دکھایا تو بجائے اس کے کہ وہ اس پر مغرور ہوں اور نہ اترائیں وہ فوراً پکار اٹھے کہ یہ سب میرے رب کا فضل ہے اور وہ یہ فضل کر کے میرا امتحان کر رہا ہے کہ میں اس کا شکر گزار و فرماں بردار بندہ بنتا ہوں یا ناشکرا! جو شخص نعمت پا کر خدا کا شکر گزار رہتا ہے وہ خدا کو کوئی نفع نہیں پہنچاتا بلکہ اپنے ہی کو نفع پہنچاتا ہے۔ میرا رب تو بالکل بے نیاز ہے لیکن اس بے نیازی کے

ساتھ ساتھ وہ کریم بھی ہے اس وجہ سے وہ ان لوگوں کو بھی اپنی نعمتوں سے محروم نہیں کرتا جو اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اس کے خلاف بغاوت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا نَنظُرْ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ (۴۱)

حضرت سلیمانؑ کا ایک تفنن

حضرت سلیمانؑ کے پیش نظر تخت کے منگوا لینے سے مقصود مجرد اس کا منگوا لینا تو تھا نہیں بلکہ وہ اس طرح ملکہ اور اس کے اعیان کے سامنے اس علم حق کی سطوت کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بخشا تھا۔ انھوں نے چاہا کہ جب ملکہ آئیں تو وہ اس تخت کو دکھا کر ان سے پوچھیں کہ جس تخت پر آپ تسرکش ہوتی ہیں وہ اسی طرح کا ہے یا اس سے کچھ مختلف ہے! یہ ایک قسم کا تفنن تھا جس کے لیے انھوں نے اپنے آدمیوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ تخت کی ہیئت میں فی الجملہ تبدیلی کر دی جائے تاکہ ملکہ صاحبہ کے لیے ان کا اپنا تخت ایک پہیلی بن جائے اور ہم دیکھیں کہ یہ پہیلی بوجھنے میں وہ کامیاب ہوتی ہیں یا ناکام رہ جاتی ہیں!

فَلَمَّا جَاءَتْ قِيلَ أَهَٰكَذَا عَرْشُكِ ۖ قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ ۚ وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ (۴۲)

ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کے دربار میں

ملکہ نے تحائف کے ساتھ جو وفد حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں بھیجا تھا اس کی ناکام واپسی کے بعد ملکہ نے حضرت سلیمانؑ سے براہ راست ملاقات کا ارادہ فرمایا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن سے بھی، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا، اس کی تائید ہوتی ہے کہ ملکہ حضرت سلیمانؑ کی حکمت سے بہت متاثر تھیں۔ اس صورت حال کے پیدا ہو جانے کے بعد انھوں نے چاہا کہ وہ براہ راست حضرت سلیمانؑ سے گفتگو کر کے ان کے علم و حکمت سے بھی مستفید ہوں اور اپنے سیاسی مسئلہ کا بھی کوئی حل تلاش کریں چنانچہ وہ اپنے بہت سے وزراء و اعیان کے ساتھ حضرت سلیمانؑ سے ملاقات کے لیے آئیں۔ یہاں ان کے سامنے وہ پہیلی رکھی گئی جس کا ذکر اوپر ہوا۔ ان کا تخت دکھا کر ان سے سوال کیا گیا کہ آپ کا تخت ایسا ہی ہے یا اس سے کچھ مختلف؟ ملکہ یہ منظر دیکھ کر بالکل ٹھک رہ گئیں! بڑی احتیاط کے ساتھ بولیں کہ یہ تو گویا وہی ہے! اس کے ساتھ انھوں نے صاف لفظوں میں یہ اعتراف کر لیا کہ حضرت سلیمانؑ کی عظمت و شوکت کا علم اس سے پہلے بھی ہمیں تھا اور ہم قلبی طور پر ان کے مطیع و منقاد ہو چکے ہیں۔ 'مِن قَبْلِهَا' میں ضمیر کا مرجع یہ واقعہ یا معجزہ ہے جو ملکہ کے مشاہدہ میں آیا۔ ملکہ کے اس قول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے کارناموں اور ان کے علم و حکمت سے تنہا وہی متاثر نہیں تھیں بلکہ ان کے دوسرے بہت سے وزراء و امراء بھی متاثر تھے۔ اور یہ بات بالکل قرین قیاس ہے۔ آخر ملکہ کے تاثرات سے ان کے دوسرے مقربین متاثر کیوں نہ ہوتے، ممکن بلکہ اغلب ہے کہ اس موقع پر وہی مقربین ملکہ کے ساتھ رہے ہوں۔

وَصَدَّهَا مَا كَانَت تَّعْبُدُ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ إِنَّهَا كَانَتْ مِن قَوْمٍ كَافِرِينَ (۴۳)

حق کی راہ

یہ قرآن نے توجیہ بیان کی ہے اس بات کی کہ حضرت سلیمانؑ کے علم و حکمت سے اس قدر متاثر اور قلبی طور پر ان کی مطیع و منقاد ہونے کے باوجود آخر ملکہ اتنے عرصے تک ایک غلط دین پر کیوں جمی رہ گئیں ؟ فرمایا کہ اس کا سبب ان کے وہ اصنام تھے جن کو وہ پوجتی رہی تھیں اور ان کی وہ کافر قوم جس کی وہ ایک فرد تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ روایات اور قومی روابط کی زنجیریں ہر شخص آسانی سے نہیں توڑ سکتا۔ کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر حق واضح ہوتا ہے لیکن وہ اپنے ماحول کے بندھنوں میں ایسے بندھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان سے رہائی حاصل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ صرف صاحب توفیق ہی ہوتے ہیں جو راہ کے ان بھاری پتھروں کو ہٹانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ مشکل یوں تو ہر ایک کی راہ میں ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کو سیادت و قیادت کا منصب حاصل ہوتا ہے ان کے لیے یہ مشکل دو چند بلکہ دہ چند ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ماحول کے بالکل ہی غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔ مدعی تو وہ ہوتے ہیں لوگوں کے لیڈر ہونے کے لیکن چلتے ہیں لوگوں کے پیچھے پیچھے۔

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۚ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۗ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۴)

حضرت سلیمانؑ کے شیش محل کے اندر ملکہ سبا کی حیرانی

اس کے بعد حضرت سلیمانؑ کے خدام کی طرف سے ملکہ سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ محل کے اندر تشریف لے چلیں۔ ملکہ محل کے اندر داخل ہوئیں تو ان کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ انھوں نے فرش پر قدم رکھا تو انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی گہرے پانی کے حوض میں اتر رہی ہیں اور جس طرح ایک پانی میں اترنے والا اپنے پائنچے چڑھا لیتا ہے بالکل بے ساختہ، غیر ارادی طور پر، انھوں نے بھی اپنے پائنچے چڑھا لیے۔ اس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو بتایا کہ یہ پانی کا حوض نہیں بلکہ یہ محل اور اس کا یہ فرش شیشہ سے بنایا گیا ہے۔

مقصود اس بیان سے یہ دکھانا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تعمیری کمال کا یہ حال تھا کہ ان کے شیش محل میں پہنچ کر ملکۂ سبا جیسی صاحب تاج و اورنگ بھی فرش کو حوض سمجھیں اور بے ساختہ ان سے ایسی حرکت صادر ہو گئی جس سے ثابت ہو گیا کہ یہ منظر ان کو زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

معلوم ہوتا ہے محل کا فرش شیشہ کی دبیز تختیوں سے بنایا گیا تھا اور اس کے نیچے پانی بہہ رہا تھا اس وجہ سے کوئی انجان جب فرش پر قدم رکھتا تو اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ گویا وہ کسی حوض میں اتر رہا ہے۔ ایک دیہاتی جب کسی متمدن شہر کے ایوانوں اور محلوں میں داخل ہوتا ہے تو اس کو اس طرح کی حیرانی بہت پیش آتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے محل کا جمال یہ تھا کہ اس کے اندر دیہاتی تو درکنار ملکہ سبا بھی ایک دیہاتی بن گئیں۔

ملکۂ سبا کا اعتراف و اعلان

قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ ایک طرف حضرت سلیمانؑ

کی حکمت و معرفت اور دوسری طرف یہ شان و شکوہ، ان دونوں چیزوں نے مل کر ملکہ کو اتنا متاثر کیا کہ وہ بے تحاشا پکار اٹھیں کہ اے رب! میں نے اپنی جان پر بڑا ظلم ڈھایا کہ اب تک شرک و بت پرستی میں گرفتار اور قومی رسوم و روایات کی پرستار بنی رہی۔ اب میں اپنے آپ کو سلیمانؑ کے ساتھ خداوند عالم کے حوالہ کرتی ہوں۔ ملکہ نے یہ اعلان کر کے اپنے آپ کو اللہ رب العلمین کی اور اپنی حکومت کو حضرت سلیمانؑ کی ماتحتی میں دے دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ شیش محل بھی اللہ کی ایک نشانی ہے جس کے ساتھ عبدیت و انابت اور شکرگزاری و وفاداری کا وہ جمال ہو جو حضرت سلیمانؑ کے اندر تھا۔ اس سے خلق کو رہنمائی ملتی ہے اور وہ آنکھوں کو خیرہ کرنے کے بجائے ان کو بصیرت بخشتا ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو پھر وہ کبر و غرور کا ایک نشان اور ایک ظلمت خانہ ہے اگرچہ کوئی اس کا نام قصر ابیض (WHITE HOUSE) ہی کیوں نہ رکھ چھوڑے۔

عبدیت کا جمال اور شکوہ خسروی

حضرت سلیمانؑ کے اس شیش محل سے متعلق یہ بات بھی یاد رکھیے کہ یہ نہ دوسروں کی مدد امداد کے قرض سے بنا تھا اور نہ اپنے ملک کے لوگوں کو بھوکوں مار کے بنا تھا۔ بلکہ یہ اس وقت بنا جب حضرت سلیمانؑ کی قوم کی رفاہیت کا یہ حال تھا کہ تورات میں آتا ہے کہ ملک کے اندر سونے کی اتنی کثرت تھی کہ چاندی کی وہاں کوئی قیمت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ علاوہ ازیں خود قرآن سے، سورۂ سبا کی تفسیر میں ان شاء اللہ واضح ہو جائے گا کہ حضرت سلیمانؑ نے صرف ایوان و محل ہی نہیں تعمیر کیے تھے بلکہ ان ایوانوں کے پہلو بہ پہلو عظیم لنگر خانے بھی قائم کیے تھے جہاں سے ضرورت مندوں کو پیٹ بھر کر روٹی ملتی تھی۔ بہرحال تعمیر و تمدن بجائے خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ جس طرح عبدیت کے جمال کے ساتھ خسروی شکوہ میں کوئی خرابی نہیں ہے اسی طرح خلق کی رفاہیت کے ساتھ تعمیرات کے شکوہ میں بھی کوئی خرابی نہیں ہے۔ خرابی درحقیقت عدم توازن میں ہے اور اس عدم توازن سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا بڑے ہی صاحب توفیق لوگوں کا کام ہے۔

ملکہ سبا کا ذکر تورات میں

ملکہ سبا کی یہ سرگزشت تورات میں اس تفصیل و وضاحت سے نہیں آئی ہے لیکن اس کے بھی ضروری حصے پر نظر ڈال لیجیے تاکہ قرآن مجید اور تورات میں جو قدر مشترک ہے وہ سامنے آجائے۔ تورات میں ملکہ کی آمد اور ان کے تاثرات کا یوں ذکر ہوا ہے۔

> اور جب سبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سنی تو وہ آئی .... اور وہ بہت بڑی جلو کے ساتھ یروشلم میں آئی اور اس کے ساتھ اونٹ تھے جن پر مصالح اور بہت سا سونا اور بیش بہا جواہر لدے تھے اور جب وہ سلیمان کے پاس پہنچی تو اس نے ان سب باتوں کے بارہ میں جو اس کے دل میں تھیں اس سے گفتگو کی .... اور جب سبا کی ملکہ نے سلیمان کی ساری حکمت اور اس محل کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان کی نعمتوں اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک اور اس کے ساقیوں اور اس سیڑھی کو جس سے وہ خداوند کے گھر کو جاتا تھا دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے ـــــ اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ سچی خبر تھی جو میں نے تیرے

کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی۔ تو بھی میں نے وہ باتیں باور نہ کیں جب تک خود آکر اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ نہ لیا اور مجھے تو آدھا بھی نہیں بتایا گیا تھا کیونکہ تیری حکمت اور اقبال مندی اس شہرت سے جو میں نے سنی بہت زیادہ ہے۔ خوش نصیب ہیں تیرے لوگ اور خوش نصیب ہیں تیرے یہ ملازم .... اور سلیمان بادشاہ نے سبا کی ملکہ کو سب کچھ جس کی وہ مشتاق ہوئی اور جو کچھ اس نے مانگا دیا۔ علاوہ ازیں سلیمان نے اس کو اپنی شاہانہ سخاوت سے بھی عنایت کیا۔ پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئی۔" (۱۔سلاطین: باب ۱۰-۱-۱۳)

تورات کا یہ بیان اگرچہ ادھورا ہے لیکن قدر مشترک اس میں بھی موجود ہے۔

تورات کے اس بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے بعد ملکہ اپنی مملکت کو واپس چلی گئیں۔ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل قرین قیاس ہے اور قرآن میں کوئی چیز اس کے خلاف نہیں جاتی۔ جب ملکہ نے سیاست اور مذہب دونوں میں حضرت سلیمانؑ کی اطاعت کر لی اور ان کے بہت سے وزراء و اعیان بھی ملکہ کے ہم خیال تھے اور وہ اپنی مملکت کی بلا شرکت غیرے بادشاہ اور اپنی رعایا میں مقبول تھیں تو دین اور سیاست دونوں کے نقطۂ نظر سے یہی بات صحیح تھی کہ وہ اپنے ملک میں جا کر اپنی حکومت ان اصولوں کے مطابق چلائیں جو حضرت سلیمانؑ نے ان کو بتائے۔ بعض تفسیری روایات میں یہ جو آیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ان سے نکاح کر کے ان کو اپنے حرم میں داخل کر لیا، یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ سند کے اعتبار سے بھی یہ روایات ضعیف ہیں۔

۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۵-۵۸

اوپر فرعون کے تمرّد، حضرت سلیمانؑ کی شکرگزاری اور ملکۂ سبا کی سلامت روی کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں اور یہ دکھایا گیا ہے کہ علو و استکبار کا انجام کیا ہوتا ہے اور شکرگزاری و فروتنی کا صلہ کیا ملتا ہے۔ اب خاص عرب کی اقوام بائدہ میں سے دو قوموں ـــــ قوم ثمود و قوم لوط ـــــ کے افساد اور ان کے انجام کا حوالہ دیا تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ یہ دور کے ملکوں ـــــ مصر، فلسطین اور یمن ـــــ کے واقعات ہیں، بلکہ خود اپنے ملک کے اندر کی ان قوموں کے انجام سے بھی سبق لیں جن کے علو و استکبار کے نتائج کی داستان سنانے کے لیے ان کے عالی شان تعمیرات کے کھنڈر آج بھی ان کے سامنے موجود ہیں۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۴۵-۵۸
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٤٥﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ

قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوا
اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ
تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي
الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ
ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾
وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾
فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ
يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَلُوْطًا
اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَئِنَّكُمْ
لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ
تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا
اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ
وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ
مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾ ع

ع ۴ ۱۴ ۱۹

ترجمۂ آیات ۴۵-۵۸

اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو اس پیغام کے ساتھ رسول بنا کر
بھیجا کہ لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔ تو دو فریق بن کر آپس میں جھگڑنے لگے۔ اس نے کہا اے
میری قوم کے لوگو، تم بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہوئے ہو تم

اللہ سے مغفرت کیوں نہیں مانگتے کہ تم پر رحم کیا جائے! ۴۵ - ۴۶

انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو یہ سب تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی نحوست سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا، تمھارا نصیبہ اللہ کے پاس ہے بلکہ یہ تو تم آزمائے جا رہے ہو۔ ۴۷

اور شہر میں نو خاندان تھے جو زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے اللہ کی قسم کھا کر عہد کیا کہ ہم اس کو اور اس کے لوگوں کو چپکے سے ہلاک کر دیں گے پھر ہم اس کے وارث سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے آدمی کی ہلاکت میں شریک نہیں ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں۔ اور انھوں نے بھی چال چلی اور ہم نے بھی تدبیر کی اور وہ باخبر بھی نہ ہوئے۔ تو دیکھو کیسا ہوا ان کی چال کا انجام! ہم نے ان کو اور ان کی پوری قوم کو ہلاک کر دیا۔ پس یہ ہیں ان کے گھر ویران پڑے ہوئے بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے! بے شک اس کے اندر بڑا سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ اور ہم نے نجات دی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جو ڈرتے تھے۔ ۴۸ - ۵۳

اور ہم نے لوط کو بھی رسول بنا کر بھیجا۔ جب اس نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم کھلی آنکھوں دیکھتے ہوئے اس بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو! کیا تم لوگ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو! بلکہ تم بڑے ہی جاہل ہو! تو اس کی قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ انھوں نے کہا کہ لوط کے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دو، یہ لوگ بڑے پارسا بنتے ہیں! تو ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو نجات دی بجز اس کی بیوی کے، اس کو ہم نے پیچھے رہ جانے والوں میں شمار کر رکھا تھا۔ اور ہم نے ان پر برسایا ایک ہولناک برسانا، پس کیا ہی بری بارش ہوئی ان لوگوں پر جن کو آگاہ کیا جا چکا تھا! ۵۴ - ۵۸

٧- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِیْقٰنِ یَخْتَصِمُوْنَ (٤٥)

حضرت صالحؑ کی دعوت اور اس کا ردِّ عمل۔

یعنی حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو اللہ واحد کی بندگی اور اسی کی اطاعت کی دعوت دی۔ یہ ایک ایسی دعوت تھی جس میں کسی اختلاف و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اس کا سب کو خیر مقدم کرنا تھا لیکن ہوا یہ کہ کچھ لوگ تو حضرت صالحؑ پر ایمان لائے اور دوسرے بہت سے اشرار و مفسدین اس دعوتِ حق کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس طرح قوم دو گروہوں میں بٹ گئی اور دونوں میں بحث و نزاع شروع ہو گئی۔

قَالَ یٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (٤٦)

دعوتِ حق کے مخالفین کا عام رویہ، جیسا کہ قرآن میں جگہ جگہ واضح ہو چکا ہے، یہی رہا ہے کہ رسول نے قوم کو جس عذاب سے ڈرایا قوم نے اسی عذاب کا مطالبہ شروع کر دیا کہ اس عذاب کو آنکھوں سے دکھا دو تب ہم مانیں گے کہ تم خدا کے رسول اور اپنی بات میں سچے ہو۔ یہی مطالبہ حضرت صالحؑ کی قوم نے بھی کیا۔ حضرت صالحؑ نے نہایت دردمندی کے ساتھ سمجھایا کہ لوگو! میں تمھیں خدا کی رحمت کی دعوت دے رہا ہوں تو تم اس رحمت سے پہلے خدا کی نقمت کے لیے کیوں جلدی مچا رہے ہو، عذاب کے مطالبہ کے بجائے تم اپنے جرائم کی معافی کیوں نہیں مانگتے کہ خدا کی رحمت کے مستحق ہو! 'سَیِّئَة' سے مراد، یہاں قرینہ دلیل ہے کہ عذاب اور نقمت ہے اور 'حَسَنَة' سے استغفار جس کا ثمرہ خدا کی رحمت ہے۔ یہ امر ملحوظ ہے کہ اس مرحلے میں بعینہٖ یہی رویہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے بھی اختیار کر لیا تھا۔ ان کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ اگر اس دعوت کی تکذیب کا انجام ان کی ہلاکت ہے تو اس ہلاکت کی کوئی نشانی ان کو دکھا دی جائے تب وہ مان جائیں گے کہ بے شک قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اس کا لانے والا اللہ کا رسول ہے۔ ان لوگوں کو گویا حضرت صالحؑ کی زبان سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ تم کو روٹی دی جا رہی ہے تو پتھر نہ مانگو۔ روٹی کی جگہ پتھر مانگنے والوں کا انجام بہت عبرت انگیز ہو چکا ہے اور تمھاری بدبختی ہی ہو گی اگر اس سے سبق نہ حاصل کرو۔

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ (٤٧)

ہم اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اعراف ٩٤ کے تحت کر چکے ہیں کہ رسولوں کی بعثت کے زمانے میں ایسی آزمائشوں کا ظہور خاص طور پر ہوا ہے جس سے قوم کے اندر انابت و خشیت پیدا ہو تاکہ لوگوں کے دل رسول کی دعوت کی طرف مائل ہوں اور وہ متنبہ ہوں کہ اگر انھوں نے رسول کی بات نہ مانی تو ان پر وہ فیصلہ کن عذاب آ جائے گا جس کی رسول خبر دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام دعوتِ حق کے لیے فضا کو

سازگار بنانے کے لیے فرمایا لیکن لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے یا تو اپنے لیڈروں کے اس مغالطے سے اپنے کو تسلی دے لی کہ اس طرح کے نرم و سخت دن تو قوموں پر آیا ہی کرتے ہیں، ان کو کسی کی تصدیق و تکذیب سے کیا تعلق! یا ان آفتوں کو رسول اور اس کے ساتھیوں کے کھاتے میں ڈال دیا کہ یہ ان کی نحوست کے نتائج ہیں جن سے ہم دوچار ہو رہے ہیں، یہ ہمارے معبودوں اور ہمارے باپ دادا کے دین کے مخالف بن کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اس وجہ سے ہمارے معبودوں اور بزرگوں کی مار ان پر پڑی ہے اور ان کی لائی ہوئی آفت میں ہم بھی حصہ پا رہے ہیں۔

یہ جو ہم نے عرض کیا ہے اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کتاب میں پیچھے اس پر مفصل بحثیں گزر چکی ہیں۔ یہاں آیت زیر بحث میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب ہم نے اپنی سنت کے مطابق ان کو مختلف آزمائشوں میں مبتلا کیا تاکہ ان کے دل رسول کی دعوت کی طرف مائل ہوں اور وہ ڈریں کہ اگر انھوں نے رسول کی تکذیب کی تو لازماً وہ عذاب الٰہی کی گرفت میں آجائیں گے تو ان تنبیہات سے متاثر ہونے کے بجائے انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو صالحؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست ہے کہ ہم ان آفتوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے ہٹ دھرم لوگوں کا کیا علاج! اگر عذاب نہیں آتا تو اس کی نشانی مانگتے ہیں اور اگر نشانی دکھاؤ تو اس کو پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کی نحوست پر محمول کرتے ہیں۔

قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ۔ لفظ 'طائر' پر تفصیلی بحث اعراف ۱۳۱ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں لفظ 'طائر' نصیبہ اور قسمت کے مفہوم میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ آزمائشیں اور آفتیں جو پیش آرہی ہیں ان کو تم ہماری نحوست کا نتیجہ قرار دے رہے ہو حالانکہ ان سب کا سررشتہ خدا کی تدبیر و تقدیر اور اس کی مشیت و حکمت سے ہے۔ یہ ہماری نحوست کے سبب سے نہیں ظاہر ہو رہی ہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری آزمائش ہو رہی ہے۔ ان آزمائشوں میں ڈال کر وہ تمھیں دیکھ رہا ہے کہ تم میں کچھ صلاحیت قبولِ حق کی ہے یا اب تم بالکل ہی مردہ اور دفن کر دیے جانے کے لائق ہو چکے ہو!

وَكَانَ فِی الْمَدِیْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ (۴۸)

'رھط' کا مفہوم

'رَهْط' کے معنی قبیلہ اور خاندان کے ہیں۔ سورۂ ہود میں حضرت شعیبؑ کی سرگزشت میں یہ لفظ گزر چکا ہے وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْنَا ضَعِیْفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (۹۱) (اور ہم تو تم کو اپنے اندر ایک کمزور آدمی خیال کرتے ہیں اور تمھارے خاندان کا خیال نہ ہوتا تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے) استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی شکل میں جمع اور واحد دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جن لوگوں نے اس کا ترجمہ شخص کیا ہے ہمارے نزدیک انھوں نے غلط ترجمہ کیا ہے۔

مفسدین کی قوت و جمعیت

اب یہ مفسدین کی قوت و جمعیت کو واضح فرمایا ہے کہ شہر میں نو خاندان تھے جو سب کے سب حضرت صالحؑ

کی دعوت کے مخالف تھے اور حضرت صالحؑ ان کے اندر تیس دانتوں کے اندر ایک زبان کی حیثیت رکھتے تھے۔ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ یعنی یہ تمام خاندان برابر افساد میں سرگرم تھے اور کسی قیمت پر اصلاح قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اصلاح کا واحد راستہ خدا کی بندگی اور اس کی اطاعت میں داخل ہونا ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام نے اسی کی دعوت دی ہے۔ اس وجہ سے اس دعوت کی مخالفت افساد فی الارض ہے۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۴۹)

حضرت صالحؑ کے خلاف ان کی قوم کے لیڈروں کی سازش

تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ میرے نزدیک یہاں بدل کے محل میں ہے۔ یعنی مذکورہ بالا مفسدین کے تمام خاندانوں نے اللہ کی قسم کے ساتھ آپس میں یہ عہد کیا کہ ہم پوشیدہ طور پر صالحؑ اور ان کے آل و اتباع کو ختم کر دیں گے، پھر ان کے خون کا اگر کوئی مدعی ان کے وارثوں میں سے کھڑا ہوا تو ہم ان سے یہ کہہ دیں گے کہ ان کے آدمی کے قتل میں ہمارا ہاتھ نہیں ہے اور ان کو پوری طرح اطمینان دلا دیں گے کہ ہم بالکل سچے ہیں۔ پوشیدہ طور پر قتل کی یہ سکیم، عہد و پیمان کے ساتھ، اس لیے بنائی گئی کہ یہ لوگ حضرت صالحؑ کو کھلم کھلا قتل کرنے سے ڈرتے تھے کہ اس طرح ان کے خاندان سے ایک مستقل نزاع پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قبائلی زندگی میں کسی خاندان کے آدمی کا مارا جانا کوئی آسان معاملہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس سے قاتل اور مقتول کے خاندانوں میں قتل و قصاص کی ایک لامتناہی جنگ چھڑ جاتی تھی۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے ان کو کھلم کھلا سنگسار کرنے کے بجائے ان کو اور ان کے اہل کو خفیہ طور پر قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور ساتھ ہی یہ پوشیدہ عہد و پیمان بھی ہوا کہ اس منصوبہ میں سب شریک ہوں تاکہ افشائے راز نہ ہو اور اگر ہو بھی تو حضرت صالحؑ کے ورثاء قاتلوں کی بھاری جمعیت سے مرعوب ہو کر کسی انتقامی کارروائی کی جرأت نہ کر سکیں۔ یاد ہو گا، اسی قسم کا منصوبہ قریش کے تمام خاندانوں نے دار الندوہ میں بیٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بنایا تھا کہ سب مل کر آپؐ کو ایک ساتھ قتل کریں تاکہ آپؐ کا خاندان قصاص کے مطالبہ کی جرأت نہ کر سکے۔ اس مرحلے میں یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی لیے سنایا گیا ہے کہ تمھارے معاند اشرار بھی اسی قسم کی سازشیں کر رہے ہیں یا کریں گے لیکن جس طرح اللہ نے حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھیوں کی حفاظت فرمائی اسی طرح وہ تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی بھی حفاظت فرمائے گا۔

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۵۰-۵۱)

مفسدین کی چال کے مقابل میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر

ان مفسدین نے جو چال چلی اس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا۔ اس کے مقابل میں اللہ تعالیٰ نے جو تدبیر اختیار فرمائی اس کا ذکر سورۂ شعراء اور بعض پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ دیکھ لو، ان کی چال کا

انجام کیا ہوا! اَنَّا دَمَّرۡنٰهُمۡ وَقَوۡمَهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ' یہ اسی انجام کی وضاحت ہے کہ ہم نے ان مفسدین اور ان کی ساری قوم کو پامال کر کے رکھ دیا۔

فَتِلۡكَ بُيُوۡتُهُمۡ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوۡا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۞ وَاَنۡجَيۡنَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ (۵۲-۵۳)

'تِلۡكَ' کا اشارہ یہاں اس بات پر دلیل ہے کہ گویا قریش کو ان کے سامنے کی ایک چیز کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی دور کی داستان نہیں ہے بلکہ ثمود کی شاندار تعمیرات کے کھنڈر اپنی داستانِ عبرت سنانے کے لیے تمہارے ملک میں موجود ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ ثمود، عاد کے بقایا میں سے تھے اس وجہ سے تعمیرات کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا تھا اور ان کے تباہ شدہ آثار موجود تھے جن پر سے قریش کے قافلوں کو وقتاً فوقتاً گزرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ 'بِمَا ظَلَمُوۡا' یعنی بِمَا ظَلَمُوۡٓا اَنۡفُسَهُمۡ' یہ انجام بد اس وجہ سے ان کو دیکھنا پڑا کہ حضرت صالحؑ کی تکذیب کر کے انھوں نے خود اس کے اسباب پیدا کیے۔

'اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ' یہ فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے یعنی جو لوگ جاننے اور سمجھنے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کے لیے اس سرگزشت میں بڑا درسِ عبرت موجود ہے لیکن جو لوگ کچھ سننا سمجھنا چاہتے ہی نہ ہوں ان کے اوپر کوئی موعظت بھی کارگر نہیں ہو سکتی!

'وَاَنۡجَيۡنَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ' یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو اللہ نے نجات بخشی۔ ان کی خاص صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ خدا اور اس کے عدل و انتقام سے ڈرنے والے تھے۔

وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ (۵۴)

حضرت لوطؑ اور قوم لوط کا بیان

یہ اوپر والے واقعہ پر معطوف ہے اس وجہ سے یہاں فعل محذوف ہے۔ یعنی 'اَرۡسَلۡنَا لُوۡطًا'۔

'اَلۡفَاحِشَةَ' کھلی ہوئی بے حیائی و بے شرمی کو کہتے ہیں جس کے بے حیائی ہونے میں کسی اختلاف و نزاع کی گنجائش نہ ہو۔ اس کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔

'وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ' یعنی کوئی برائی مخفی قسم کی ہو تو اس میں مبتلا ہو جانا تو چنداں تعجب کی بات نہیں ہے لیکن ایک کھلی ہوئی بے حیائی میں، آنکھیں رکھتے ہوئے مبتلا ہو جانا بدبختی اور اندھے پن کی آخری حد ہے۔ اگر ایک شخص اندھا ہو اور اس کے پاؤں غلاظت پر پڑ جائیں تو اس کے لیے عذر ہے لیکن تمہارے لیے کیا عذر ہے جب کہ تم دونوں آنکھیں رکھتے ہوئے غلاظت کھا رہے ہو!

اَئِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تَجۡهَلُوۡنَ (۵۵)

استفہام یہاں اظہارِ تعجب و حیرت و کراہت کے لیے ہے۔ 'مِنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ' کی قید ان کے اندھے پن کو واضح کر رہی ہے کہ تقاضائے شہوت کے لیے ایک فطری اور جائز چیز کے موجود ہوتے تمہارا یہ انحراف تمہاری فطرت کے مسخ ہونے کی دلیل ہے۔ لفظ 'جَهۡل' جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، جذبات و خواہشاتِ نفس

سے اس طرح مغلوب ہو جانے کے لیے آتا ہے کہ آدمی عقل و ہوش بالکل ہی کھو بیٹھے بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ. یعنی تمھاری عقلیں بالکل ہی ماؤف و مغلوب ہو گئی ہیں۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ (۵۶)

حضرت لوطؑ کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکانے کی کوشش

اس کھلی ہوئی بے حیائی کے حق میں کوئی دلیل تو وہ گھڑ نہیں سکتے تھے لیکن اس کو چھوڑنے کے لیے بھی وہ تیار نہیں تھے اس وجہ سے واحد چارۂ کار ان کے پاس یہی رہ گیا کہ کسی نہ کسی طرح حضرت لوطؑ کی سرزنش سے پیچھا چھڑائیں۔ قوم کے سرغنوں نے اپنے آدمیوں کو ورغلایا کہ لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو اس بستی سے نکال دو۔ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ (یہ لوگ بڑے پارسا بنتے ہیں) اس فقرے میں جو زہر ہے وہ اہلِ ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف اپنی قوم کے جذبات بھڑکانے کے لیے انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ دیکھو ان کے نزدیک ہماری پوری قوم کی قوم تو بدمعاشوں اور گنڈوں کی قوم ہے بس یہی گنتی کے چند نفوس پاک دامن رہ گئے ہیں! جب کوئی برائی وبائے عام کی شکل اختیار کر لے تو اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو اس طرح کے زہر آلود طعنوں سے بڑی آسانی کے ساتھ نکو بنایا جا سکتا ہے۔ اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ آج بیگمات کی کسی مجلس میں بے پردگی کے خلاف دو کلمے کہہ کر اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔

لفظ 'آل' پر ہم دوسرے محل میں بحث کر کے واضح کر چکے ہیں کہ یہ اہل و عیال اور اتباع سب پر مشتمل ہے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ (۵۷)

لفظ 'اہل' بھی، جیسا کہ ہم اس کے محل میں وضاحت کر چکے ہیں، اہل و عیال اور اتباع و صحابہ سب کے لیے آتا ہے اور یہاں یہ اسی مفہوم میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں ذمہ داری بقدرِ انعام ہے

'قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ' سے صرف یہی بات نہیں واضح ہوتی کہ حضرت لوطؑ کی بیوی اس نجات سے محروم رہی بلکہ یہ بات بھی اس سے نکلتی ہے کہ اس پتھراؤ کا نشانہ بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص طور پر تاک رکھا تھا جو قوم لوط پر ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب پیغمبر کی بیوی ہو کر بھی اس کی ہمدردیاں اپنی نابکار قوم کے ساتھ ہی رہیں تو دوسروں کے مقابل میں خدا کے غضب کی وہ زیادہ مستحق تھی۔ اللہ تعالیٰ جن کو تعلیم و ہدایت کے جتنے ہی زیادہ مواقع میسر فرماتا ہے، اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتے تو ان کو سزا بھی اسی کے حساب سے ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ذمہ داری بقدرِ انعام ہے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ (۵۸)

قوم لوط کا انجام

یعنی لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو تو اللہ تعالیٰ نے نجات بخشی اور بقیہ پوری قوم پر، فرمایا کہ، ہم نے ایک نہایت بری بارش برسائی۔ اس بارش سے مراد اس پتھراؤ کی بارش ہے جس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر

چکی ہے: 'فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بری بارش نتیجہ تھی اس بات کا کہ ان لوگوں پر اللہ نے اپنے ایک رسول کے ذریعہ سے اتمامِ حجت فرما دیا تھا۔ اس اتمامِ حجت کے بعد بھی جب وہ اندھے بہرے ہی بنے رہے تو مستحق ٹھہرے کہ وہ سنگسار کر کے زمین میں دفن کر دیے جائیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قوم ثمود کی طرح قوم لوط کی بستیاں بھی قریش کی گزرگاہ تھیں۔ اسی وجہ سے ان دونوں قوموں کا خاص طور پر اس سورہ میں ذکر فرمایا کہ دور اور قریب دونوں کے آثار کی طرف ان کو توجہ دلا دی جائے۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۵۹-۹۳

خاتمۂ سورہ آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں اوپر بیان کیے ہوئے واقعات کے نتائج سامنے رکھ دیے گئے ہیں خاص طور پر قرآن کی دعوتِ توحید پورے زور کے ساتھ، اس کے آفاقی و انفسی دلائل کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ نیز منکرین کے اصل سببِ انکار سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ ان کی ساری سخن سازیوں کے پس پردہ یہ چیز ہے کہ یہ آخرت کے بارے میں متردد ہیں حالانکہ وہ ایک حقیقت ہے۔ آفاق و انفس کے دلائل پکار پکار کر اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ یہی بات، یاد ہوگا، تمہید کی آیات میں بھی فرمائی گئی ہے۔ اس طرح خاتمۂ سورہ کا مضمون تمہید کے ساتھ مربوط ہو گیا ہے۔

مطالب کے بیچ بیچ میں بھی اور سورہ کے آخر میں خاص طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ قرآن کے انکار اور تمہاری تکذیب کے لیے جو مطالبات و اعتراضات پیش کر رہے ہیں تم ان کی پروا نہ کرو۔ تمہارا کام اندھوں اور بہروں کو دکھانا اور سنانا نہیں ہے۔ تم ان کو صاف بتا دو کہ میرے اوپر اس قرآن کو پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے اس کو ماننا اور نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ اگر یہ اس کو نہیں مانیں گے تو قرآن جن باتوں سے ان کو آگاہ کر رہا ہے ان میں سے ایک ایک چیز ان کے سامنے آ کے رہے گی۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۹-۹۳ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ۭ آٰللّٰهُ خَيْرٌ
الجزء ۲۰ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ
السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَاۗىِٕقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ
اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اَمَّنْ
جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ
وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا

يَعْلَمُونَ ﴿٦١﴾ أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ
خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ﴿٦٢﴾ أَمَّنْ
يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ
يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٦٣﴾ أَمَّنْ
يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ
أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٦٤﴾ قُلْ
لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُونَ
أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿٦٥﴾ بَلِ ادَّارَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ
مِنْهَا ۖ بَلْ هُمْ مِنْهَا عَمُونَ ﴿٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا ع
وَآبَاؤُنَا أَئِنَّا لَمُخْرَجُونَ ﴿٦٧﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هَٰذَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا
مِنْ قَبْلُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٦٨﴾ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ
فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ﴿٦٩﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ
وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ﴿٧٠﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ
إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٧١﴾ قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي
تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٧٢﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ
لَا يَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا
يُعْلِنُونَ ﴿٧٤﴾ وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ
مُبِينٍ ﴿٧٥﴾ إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي

هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٧٦﴾ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾ اِنَّ رَبَّكَ
يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿٧٨﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ
عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿٧٩﴾ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ
اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٨٠﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ
تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨١﴾ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ
اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَاۗبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا
لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿٨٢﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا ع
فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿٨٣﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ
تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ
بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٨٥﴾ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا
فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٨٦﴾ وَيَوْمَ
يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ
شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿٨٧﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً
وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۭ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ
بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٨٨﴾ مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ
يَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿٨٩﴾ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۭ
هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٠﴾ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ
هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ۡ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ

مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ
لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ
لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ ع ۱۱ / ۲

ترجمۂ آیات ۵۹-۹۳

کہہ دو کہ شکر کا سزاوار اللہ ہے اور اس کے ان بندوں پر سلامتی و رحمت ہے جن کو اس نے برگزیدہ کیا۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں! ۵۹

(کیا تمھارے یہ معبود بہتر ہیں) یا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے جس نے آسمان سے پانی اتارا۔ پس ہم نے اس پانی سے خوش منظر باغ اگائے۔ تمھارے امکان میں نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اگا سکتے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ بلکہ یہ راہِ حق سے انحراف اختیار کرنے والے لوگ ہیں! ۶۰

(کیا تمھارے یہ اصنام سزاوارِ شکر ہیں) یا وہ جس نے زمین کو ٹھکانا بنایا اور جس نے اس کے درمیان نہریں جاری کیں اور اس کے لیے اس نے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان جس نے پردہ ڈال دیا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے! بلکہ ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے! ۶۱

(کیا تمھارے یہ شرکا مستحقِ عبادت ہیں) یا وہ جو محتاج کی دادرسی کرتا ہے جب کہ وہ اس کو پکارتا ہے اور اس کے دکھ کو دور کرتا ہے اور تم کو زمین کی وراثت دیتا ہے؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے! بہت ہی کم تم لوگ یاددہانی حاصل کرتے ہو! ۶۲

(کیا تمھارے یہ دیوی دیوتا لائقِ پرستش ہیں) یا وہ جو بحر و بر کی تاریکیوں میں تمھاری رہنمائی کرتا ہے اور جو ہواؤں کو اپنے بارانِ رحمت سے پہلے خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے؟ کیا اللہ

کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہیں؟ اللہ بہت ہی برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں! ۶۳

(کیا تمھارے مزعومہ شفعاء لائقِ بندگی ہیں) یا وہ جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرے گا اور جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے! کہو کہ تم اپنی دلیل لاؤ، اگر تم سچے ہو! ۶۴

کہہ دو کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، اللہ کے سوا کسی کو بھی غیب کا علم نہیں ہے اور انھیں پتہ بھی نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ ۶۵

بلکہ آخرت کے باب میں ان کا علم الجھا ہوا ہے۔ بلکہ یہ لوگ اس کے بارے میں مبتلائے شک ہیں، بلکہ یہ لوگ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ کافر کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے آباؤ اجداد بھی تو کیا ہم دوبارہ نکالے جائیں گے! اس کی دھمکی ہمیں بھی دی گئی اور اس سے پہلے ہمارے آباو اجداد کو بھی۔ یہ محض اگلوں کے فسانے ہیں۔ ۶۶-۶۸

ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیا ہوا۔ ۶۹

اور ان کے حال پر غم نہ کرو اور نہ ان کی چالوں سے جو وہ چل رہے ہیں فکر مند ہو۔ اور یہ پوچھتے ہیں کہ یہ دھمکی کب ظہور میں آئے گی اگر تم سچے ہو! کہہ دو کہ بہت ممکن ہے کہ جس چیز کے لیے تم جلدی مچانے ہوئے ہو اس کا کوئی حصہ تمھارے پیچھے ہی لگا ہوا ہو۔ اور بے شک تمھارا رب لوگوں پر بڑے فضل والا ہے لیکن ان میں کے اکثر شکر گزار نہیں ہوتے۔ اور تمھارا رب خوب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور آسمان و زمین میں کوئی ایسی مخفی چیز نہیں ہے جو ایک واضح رجسٹر میں درج نہ ہو۔ ۷۰-۷۵

بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر بھی ان بہت سی چیزوں کو واضح کر رہا ہے جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔ بے شک تیرا رب اپنے حکم ناطق کے ذریعہ سے ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور وہ غالب اور علم والا ہے۔ پس اللہ پر بھروسہ رکھو بے شک واضح حق پر تمہی ہو۔ ۷۶ - ۷۹

تم مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے پھیر کر راہ پر لانے والے بن سکتے۔ تم تو بس انہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں۔ پس وہی فرمانبردار بنیں گے۔ ۸۰-۸۱

اور جب ان پر بات پوری ہو جائے گی تو ہم ان کے لیے زمین سے کوئی جانور نکال کھڑا کریں گے جو ان کو بتائے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اور اس دن کا خیال کرو جس دن ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کی ایک فوج اکٹھا کریں گے جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے تھے پس ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔ یہاں تک کہ جب وہ اکٹھے ہو جائیں گے تو پوچھے گا کہ کیا تم نے میری آیات کو جھٹلایا حالانکہ تمہارا علم ان کا احاطہ نہ کر سکا تھا یا کیا کرتے رہے تھے! اور ان پر بات پوری ہو جائے گی بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے پس وہ کچھ نہ بول سکیں گے۔ ۸۲ - ۸۵

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات کو تاریک بنایا تاکہ وہ اس میں آرام کریں اور دن کو روشن بنایا تاکہ اس میں کام کریں۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۸۶

اور اس دن کا خیال کرو جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں

سب گھبرا اٹھیں گے۔ صرف وہی اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ چاہے گا اور سب اس کے آگے سرنگندہ ہو کر حاضر ہوں گے۔ اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر گمان کرو گے کہ وہ ٹکے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے۔ یہ اس خدا کی کاریگری ہو گی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔ بے شک وہ ہر اس چیز سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔ جو نیکی کے ساتھ حاضر ہوں گے تو ان کے لیے اس سے بہتر صلہ ہے اور وہ اس دن ہر گھبراہٹ سے مامون رہیں گے۔ اور جو برائی کے ساتھ آئیں گے تو وہ اوندھے منہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے کہ تم کو بدلے میں وہی مل رہا ہے جو تم کرتے رہے ہو۔ ۸۷-۹۰

مجھے تو بس یہی حکم ملا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اس کو محترم ٹھہرایا اور جس کے اختیار ہی میں سب کچھ ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں فرماں برداری کرنے والوں میں سے بنوں اور قرآن کو سناؤں تو جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا وہ اپنے ہی فائدے کے لیے اختیار کرے گا اور جو گمراہی اختیار کرے گا تو تم کہہ دو کہ میں تو بس ایک آگاہ کر دینے والا ہوں۔ اور کہہ دو کہ سزاوار شکر اللہ ہے۔ وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم ان کو پہچان جاؤ گے اور جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اس سے تمھارا رب غافل نہیں ہے۔ ۹۱-۹۲

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰی ط آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۵۹)

ایک بلیغ گریز دو حقیقتوں کی وضاحت

اس آیت کی حیثیت پیچھے اور آگے کے مطالب کے درمیان ایک بلیغ گریز اور نہایت خوب صورت حلقۂ اتصال کی ہے۔ اوپر جو واقعات مذکور ہوئے ہیں ان سے دو حقیقتیں نہایت واضح ہو کر سامنے آگئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ اس کے عدل اور اس کی رحمت کی نشانیاں ہر قدم پر اس دنیا میں نمایاں ہیں۔ اس نے سرکشی کرنے والوں کو سزائیں بھی بڑی سخت دی ہیں اور

اپنے منتخب اور برگزیدہ بندوں کی نصرت بھی برابر فرماتی ہے۔

دوسری یہ کہ سارا اختیار و اقتدار اللہ وحدہ لاشریک ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے علاوہ جن کی پرستش کی گئی ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ وقت آنے پر نہ اپنے کو خدا کی پکڑ سے بچا سکے اور نہ اپنے پجاریوں کو۔

اب یہ آیت اسی خلاصہ کو سامنے پیش کر کے آگے توحید پر جو خطبہ آ رہا ہے اس کے لیے تمہید استوار کر رہی ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ تمھاری اور تمھاری پیش کردہ کتاب کی تکذیب کر رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ یہ سرگزشتیں جو تمھیں سنائی گئی ہیں ان سے یہ حقیقت سورج کی طرح روشن ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ شکر کا سزاوار صرف اللہ ہے جس نے اپنے عدل و رحمت کی یہ شانیں دکھائی ہیں اور یہ کہ سلامتی اور نجات اللہ کے ان بندوں ہی کے لیے ہے جن کو وہ دعوتِ حق اور خدمتِ خلق کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ ان کے دشمن کتنے ہی زور لگائیں لیکن وہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ ان کی حفاظت فرماتا ہے اور ان کے ہاتھوں حق کا بول بالا ہوتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اصل حقیقت تو یہ ہے جو تاریخ کے ان دلائل سے ثابت ہوئی تو ان سے پوچھو کہ کیا عبادت و شکرگزاری کے لیے اللہ بہتر ہے جس کی یہ شانیں بیان ہوئیں یا ان کے وہ مزعومہ شرکاء و شفعاء جو نہ اپنی کسی مدد پر قادر ہیں اور نہ اپنے پجاریوں کی، اب آگے اسی مضمون سے توحید کے بیان کے لیے گریز ہے۔

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ (۶۰)

اس آیت اور اس کے بعد کی آیات کے صحیح زور کو سمجھنے کے لیے عربیت کے اس اسلوب کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جس کی طرف ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اشارہ کرتے آئے ہیں کہ اس قسم کے سوالیہ جملوں میں مقصود استفہام اور سوال و جواب نہیں ہوتا بلکہ افحام، اتمام حجت اور زجر و تنبیہ ہوتا ہے۔ متکلم پورے زورِ بیان کے ساتھ سوالیہ انداز میں حقائق کو پیش کرتا جاتا ہے اور مخاطب کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔ گویا اس کی تردید میں کچھ کہنے کے لیے کوئی گنجائش کسی کے لیے سرے سے ہے ہی نہیں۔ اسی زورِ بیان کے تقاضے سے اس قسم کے جملوں میں بعض اجزائے کلام حذف کر دیے جاتے ہیں جن کو مخاطب خود سمجھ لیتا ہے یا اس کو سمجھ لینا چاہیے۔ کلام کے اس خلا کو متکلم کا زورِ کلام بھر دیتا ہے۔ خطبائے جاہلیت کے کلام میں اس حذف و ایجاز کی مثالیں بہت ہیں لیکن قرآن کے آگے ان کو پیش کرنا آفتاب کے آگے دیا جلانا ہے۔ اردو میں یہ اسالیب چونکہ نہیں ہیں اس وجہ سے ترجمہ میں ہم نے کلام کے محذوفات کھول دیے ہیں۔

'أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ' سے پہلے اتنی بات گویا محذوف ہے کہ بتاؤ، تمھارے وہ معبود بہتر ہیں جن کا نہ اس کائنات کی خلق و تدبیر میں کوئی حصہ ہے نہ تمھاری پرورش و پرداخت میں یا وہ ذات بہتر ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے اس نے آسمان سے پانی اتارا جس سے اس نے

خوش منظر باغ اگائے۔ جن کے درختوں کو اگا سکنے پر تم قادر نہیں تھے۔

فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهۡجَةٍ میں اسلوبِ کلام بدل گیا ہے۔ اوپر کے ٹکڑے میں غائب کے اسلوب میں بات فرمائی گئی تھی اس میں متکلم کا اسلوب آگیا ہے۔ یہ امتنان و احسان اور عنایت و ربوبیت کے اظہار کے لیے ہے۔

'ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ' یعنی بتاؤ کیا ان سارے کاموں کے کرنے میں خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی شریک رہا ہے! ظاہر ہے کہ نہیں۔ تو پھر تم نے ان کی پرستش کس حق کی بنا پر شروع کر دی۔ یہاں وہ بات یاد رکھیے جو ہم جگہ جگہ ذکر کرتے آرہے ہیں کہ مشرکین آسمان و زمین کا خالق یا ابر و ہوا کا مصرف خدا ہی کو مانتے تھے۔

'یَعۡدِلُوۡنَ' کا مفہوم

بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ يَّعۡدِلُوۡنَ۔ 'یَعۡدِلُوۡنَ' یہاں 'عَدَلَ یَعۡدِلُ' کی عدولًا سے ہے جس کے معنی 'جَارَ وَظَلَمَ' کے آتے ہیں۔ یعنی ان لوگوں کے پاس اپنے معبودوں کے حق میں کوئی دلیل تو ہے نہیں لیکن یہ کج رو اور حق ناشناس لوگ ہیں اس وجہ سے یہ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اوپر اسلوب خطاب کا تھا لیکن یہ اسلوب غائب کا آگیا۔ یہ نفرت و کراہت اور اظہارِ حسرت پر دلیل ہے۔ گویا بات ان سے منہ پھیر کر فرمائی گئی ہے۔

اَمَّنۡ جَعَلَ الۡاَرۡضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنۡهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِىَ وَجَعَلَ بَيۡنَ الۡبَحۡرَيۡنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (۶۱)

یہاں بھی سوال کا پہلا جزو محذوف ہے۔ یعنی بتاؤ، تمہارے یہ فرضی دیوی دیوتا مستحق عبادت ہیں یا وہ ذات جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا؟ 'قَرَارًا' کے معنی سکون و قرار کی جگہ کے ہیں۔ زمین کو دوسرے مقامات میں گہوارہ اور بستر سے بھی تعبیر فرمایا ہے۔ وہی مضمون یہاں لفظ 'قَرَارًا' سے ادا کیا گیا ہے۔

'وَجَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنۡهٰرًا' یعنی جس طرح اس نے تمہاری پرورش کے لیے آسمان سے پانی اتارا اسی طرح اس زمین میں بھی دریا اور چشمے جاری کر دیے۔

'وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِىَ' اور اس زمین کو اپنے محور و مستقر پر ٹکائے رکھنے کے لیے اس نے اس میں پہاڑ گاڑ دیے کہ کہیں یہ تم کو لیے ہوئے کسی جانب کو لڑھک نہ جائے۔

'وَجَعَلَ بَيۡنَ الۡبَحۡرَيۡنِ حَاجِزًا' 'بَحۡرَيۡنِ' سے مراد، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے، کھاری اور شیریں پانی کے دریا ہیں، فرمایا کہ یہ اسی کی قدرت و حکمت ہے کہ وہ ایک طرف سے شیریں پانی کے دریا کو چھوڑتا ہے اور دوسری طرف سے کھاری پانی کے سمندر کو، دونوں آپس میں ملتے ہیں لیکن دونوں کے درمیان اللہ تعالیٰ ایک غیر مرئی دیوار کھڑی کر دیتا ہے، مجال نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی اس دیوار کو لانگ کر دوسرے کے حدود میں مداخلت کر سکے۔ فرمایا کہ بتاؤ، اس قدرت، اس

حکمت، اس اہتمام ربوبیت، اس تزئینِ اضداد اور اس قیامِ توازن و توافق میں خدا کے ساتھ تمھارے معبودوں کا بھی کوئی حصہ ہے! اگر نہیں ہے اور بالکل بدیہی طور پر معلوم ہے کہ نہیں ہے تو آخر خدا کی خدائی میں وہ کس حق کی بنا پر ساجھی بنا دیے گئے ہیں!

بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔ یہ غائب کا اسلوب یہاں اظہارِ حسرت و افسوس کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ باتیں تو بالکل بدیہی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان میں کے اکثر ان کو نہیں جانتے اور بتانے پر بھی ان کا حال یہ ہے کہ ان کو جاننا نہیں چاہتے۔

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ (۶۲)

قبولیتِ دعا کے باب میں بعض حقائق

اس سے پہلے بھی اسی طرح کا سوال محذوف ہے جس کی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ یعنی بتاؤ، تمھارے یہ دیوی دیوتا بہتر ہیں جو نہ سنتے نہ دیکھتے، نہ ضرر پہنچا سکتے، نہ نفع، نہ کسی کی فریاد رسی پر قادر نہ کسی کی مدد پر یا وہ ذات جو مضطر کی فریاد رسی اور اس کے دکھ درد کا ازالہ کرتی ہے! یعنی جس کی بھی فریاد رسی ہوتی ہے بہرحال اسی کی طرف سے ہوتی ہے، کسی اور کی طرف سے نہیں ہوتی۔ یہاں یہ امر یاد رکھیے کہ یہی مضمون قرآن کے دوسرے مقامات میں مشیتِ الٰہی کی قید کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و حکمت جس کے لیے مقتضی ہوتی ہے اس کے دکھ درد کو دور فرما دیتا ہے اور کسی حقیقی مضطر کی فریاد رسی اگر بروقت نہیں ہوتی تو کسی دوسرے زیادہ موزوں تر وقت کے لیے اٹھا رکھی جاتی ہے اور اگر اس شکل میں نہیں ہوتی جس شکل میں وہ چاہتا ہے تو اس سے مختلف اور بہتر شکل میں پوری ہوتی ہے اور اگر اس دنیا میں نہیں ہوتی تو وہ آخرت میں اس کے لیے موجبِ اجر ہوگی۔ قبولیتِ فریاد و دعا کے باب میں ان باتوں کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس نکتہ کو ان تمام اصولی حقائق کی روشنی میں سمجھیے۔

قوموں کا ردوبدل تمام تر خدا کے اذن سے ہوتا ہے

وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ۔ اسلوبِ بیان دلیل ہے کہ یہاں مراد ایک قوم کو ہٹا کر دوسری قوم کو اس کی جانشین بنانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں یہ جو دیکھتے ہو کہ ایک قوم مٹتی اور دوسری قوم اس کی جگہ لیتی ہے تو نہ یہ اتفاقی واقعات ہیں اور نہ یہ ردوبدل کرنے پر خدا کے سوا کوئی دوسرا قادر ہے۔ یہ سب کچھ خدا ہی کے حکم اور اسی کی حکمت کے تحت ہوتا ہے۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اگر آج تم کو اس سرزمین میں اقتدار حاصل ہے تو یہ تمھارا اپنا حاصل کردہ نہیں ہے بلکہ یہ خدا ہی کا عطا کردہ ہے۔ یہ اقتدار دے کر وہ تمھارا امتحان کر رہا ہے کہ تم اس کو پا کر کیا بناتے ہو؟ اگر تم نے بھی وہی روش اختیار کی جو تم سے پہلے مفسدین نے اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمھارے سامنے بھی وہی انجام نہ آئے جو ان کے سامنے آیا۔ خدا کا معاملہ سب کے ساتھ ایک ہی اصول کے مطابق ہے۔

قوموں کی خود فراموشی

أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ۔ یعنی ان میں سے کون سا کام ایسا ہے جس کے

بارے میں تم کہہ سکتے ہو کہ اس میں خدا کے سوا کسی اور کی قدرت و مشیت کا بھی کوئی دخل ہے لیکن تم وہ خود فراموش لوگ ہو کہ بہت کم یاددہانی حاصل کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی میں جو تنبیہات اور آزمائشیں پیش آتی ہیں ان کے پیش آنے پر تو تم خدا خدا پکارتے ہو لیکن جب وہ گزر جاتی ہیں تو خدا کو بھول کر پھر اپنی خود فراموشیوں میں گم ہو جاتے ہو اور تمھیں یاد بھی نہیں رہتا کہ کبھی تم نے خدا کو پکارا بھی تھا اور اس سے کوئی قول و قرار بھی کیا تھا!

یہ مضمون دوسرے مقامات میں نہایت وضاحت سے بیان ہو چکا ہے۔ اسی طرح تاریخ نے قوموں کے ردوبدل سے متعلق جو درس عبرت و موعظت تمھارے لیے محفوظ کیے ہیں وہ بھی تمھیں صرف اس وقت یاد آتے ہیں جب سب کچھ تمھارے اپنے سروں پر گزر جائے۔ گزر جانے کے بعد تمھارے لیے تاریخ بھی عہد ماضی کا ایک افسانہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے دونوں ٹکڑوں اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ اور وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ میں بڑا گہرا معنوی ربط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تم ان مصائب سے کوئی سبق حاصل کرتے ہو جو تمھاری انفرادی زندگیوں میں پیش آتے ہیں اور نہ اس ردوبدل ہی سے کوئی عبرت پکڑتے جس سے قوموں کو دوچار ہونا پڑتا ہے تو جن کی یادداشت اتنی کمزور ہو ان کو کون سبق پڑھا سکتا ہے!

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾

اس سے پہلے بھی اسی طرح کا سوال محذوف ہے جس کی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ یعنی خشکی و تری کی تاریکیوں میں جو رستہ دکھاتا ہے اور ابر رحمت سے پہلے جو موسمی ہواؤں کو چلاتا ہے وہ لائق عبادت اور سزاوار شکر ہے یا تمھارے یہ ناکارہ معبود جو کسی مصرف کے نہیں ہیں! بر و بحر میں رستہ دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو انتظام فرمایا ہے اس کی وضاحت قرآن میں جگہ جگہ ہوئی ہے۔ یہی مضمون دوسرے مقام میں وَعَلٰمٰتٍ ؕ

زمین و آسمان دونوں میں ایک ہی خدا کی خدائی ہے

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (النحل ۱۶) کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی خدا نے زمین میں بھی نشانات گاڑ دیے ہیں اور آسمان میں بھی ستاروں کے قمقمے لگا دیے ہیں جو خشکی و تری دونوں کی تاریکیوں میں مسافروں کی رہنمائی کرتے ہیں جو اس بات کی صاف شہادت ہے کہ اس کائنات کا خالق نہایت مہربان و کریم اور خشکی و تری اور آسمان و زمین ہر جگہ تنہا اسی کا اختیار و اقتدار ہے اور وہی ہے جو زمین کے خشک ہو جانے کے بعد موسمی ہواؤں کو اپنے ابر رحمت کی بشارت بنا کر ابھارتا ہے جو بادلوں کے ٹکڑے جمع اور ان کو تہ بہ تہ کرتی ہیں اور پھر وہ جہاں چاہتا ہے ان کو برسا دیتا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آسمان کے خدا الگ، زمین کے خدا الگ، ابر کے دیوتا الگ اور ہواؤں کے خدا جدا ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کے ان تمام اجزائے مختلفہ کے اس توافق اور ان کی اس ہم آہنگی کے مشاہدہ کے بعد بھی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس میں مختلف ارادے کارفرما ہیں اور خدا کی اس خدائی میں دوسرے دیوی دیوتا بھی شریک ہیں تو وہ نہایت کودن ہے۔ اس کائنات کا خالق ان فرضی دیویوں اور دیوتاؤں سے منزہ اور ارفع ہے! اللہ تعالیٰ جل شانہ کے ساتھ ان حقیر چیزوں

کا کوئی جواز نہیں ہے۔

أَمَّنْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ ۗ أَءِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۶۴)

ایک بدیہی حقیقت کا بدیہی نتیجہ

یہاں بھی سوال کا ایک حصہ محذوف ہے جو قرینہ سے واضح ہو رہا ہے۔ یعنی تمہارے یہ اصنام و اوثان لائقِ عبادت ہیں یا وہ ذات جس نے اس خلق کا آغاز کیا اور ہر چیز کو وجود میں لاتی ہے؟ اس کے ساتھ ثُمَّ يُعِيدُهُ کا ملاکر ابدارِ خلق کے ایک بدیہی نتیجہ کو ظاہر فرما دیا کہ جب وہی ہر چیز کا آغاز فرماتا ہے تو وہ اس کا اعادہ بھی کر سکتا ہے اور وہ ایسا لازماً کرے گا بھی۔ اگر وہ نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے یہ سارا کارخانہ بالکل عبث بنایا ہے۔ دوسرے مقامات میں یہ بات دلائل کی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ یہاں یہ ایک بدیہی حقیقت کے ایک بدیہی نتیجہ کے طور پر بیان کر دی گئی ہے کہ جب اس کائنات کے ابداء سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے اعادہ میں شک کی گنجائش کہاں سے نکلی!

وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ۔ یعنی خلق کے بعد وہی ہے جو تمہاری رزق رسانی اور پرورش کا سامان کرتا ہے اور اس کام میں وہ آسمان کو بھی استعمال کرتا ہے اور زمین کو بھی — آسمان سے وہ تمہارے لیے پانی برساتا ہے اور زمین سے تمہارے لیے طرح طرح کی چیزیں اگاتا ہے۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ ان کاموں میں کوئی اور بھی شریک ہے!

خدا مدعا بحث

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔ مطلب یہ کہ یہ ساری چیزیں جو مذکور ہوئیں ان کا کوئی فاعل ماننا تو ناگزیر ہے، بغیر کسی فاعل حکیم و قدیر کے یہ چیزیں وجود میں نہیں آگئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک خدائے حی و قیوم کا وجود تو برہانِ قطعی سے ثابت ہے اس وجہ سے اس کو ہم مانتے ہیں اور تمہارے لیے بھی اس کے ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اب اگر تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اس ایک کے سوا کچھ اور خدا بھی ہیں تو ان کے ثبوت کے لیے دلیل پیش کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر ان کے حق میں تمہارے پاس کوئی برہان ہے تو اس کو پیش کرو۔

شرک کی دلیل مشرکین پیش کریں

اس ساری بحث کا خلاصہ دو لفظوں میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ جو خدا کو نہیں مانتا ان سوالوں کا کوئی اطمینان بخش جواب دے جو اوپر مذکور ہوئے اور اگر مانتا ہے لیکن اس کے ساتھ دوسرے خداؤں کو بھی شریک کرتا ہے تو وہ ان خداؤں کے حق میں دلیل پیش کرے۔ دلیل و ثبوت کی ذمہ داری بہرحال منکروں یا مشرکوں پر ہے۔ خدا کے ماننے والوں پر کسی چیز کو ثابت کرنے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ وہ تو ایک بدیہی حقیقت کو مانتے ہیں۔

[illegible]

قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ (۶۵)

یہ توحید و شرک کی اس بحث کی آخری بات ہے کہ اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہے کہ آسمانوں اور زمین

کے اندر غیب کا علم کسی اور کو بھی ہے اس وجہ سے وہ لائق عبادت ہے تو اس کی یہ غلط فہمی بھی دور کر دو کہ غیب کا علم خدا کے سوا آسمانوں اور زمین میں کسی کو بھی نہیں ہے۔ جب آسمان والوں میں سے بھی کسی کو غیب کا پتہ نہیں تو زمین والوں کا کیا سوال! فرمایا کہ غیب کا علم تو درکنار ان کو یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے؟ یعنی جب انھیں اپنے اٹھائے جانے کی بھی خبر نہیں تو ان کی شفاعت کے بھروسہ پر ان کو معبود مان کر ان کی پرستش کرنے کے کیا معنی! یہ مضمون سورۂ نحل کی آیات ۲۰-۲۱ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کے ہر پہلو پر بحث کر چکے ہیں۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۚ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ (۶۶)

'اِدّٰرَكَ' دراصل 'تَدَارَكَ' ہے جو بقاعدۂ ادغام 'اِدّٰرَكَ' ہو گیا ہے جس طرح 'تَثَاقَلَ' سے 'اِثَّاقَلَ' بن گیا ہے۔ 'تَدَارَكَ الْقَوْمُ' کے معنی ہوں گے قوم کے اگلے پچھلے سب ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے۔ قرآن مجید میں ہے: 'حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا' (یہاں تک کہ جب وہ سب اس میں اکٹھے ہو لیں گے) یہیں سے اس کے اندر اختلاط اور گڈمڈ ہونے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ اس لیے کہ جب مختلف چیزیں اکٹھی ہو جاتی ہیں تو وہ آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔

آخرت کے باب میں مشرکین عرب کی ذہنی الجھن

یہ بات ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ مشرکین عرب کا موقف آخرت کے باب میں صریح انکار کا نہیں تھا بلکہ وہ ایک قسم کی ذہنی الجھن میں مبتلا تھے۔ اس کو ماننا چاہتے نہیں تھے اور اس کے صریح انکار کی گنجائش پاتے نہیں تھے۔ اس وجہ سے وہ ایک قسم کی گومگو کی حالت میں مبتلا تھے۔ بعض منہ پھٹ اور بالکل لاابالی قسم کے لوگ اگرچہ ضد کے جوش میں اس کا انکار بھی کر بیٹھتے تھے لیکن عام حالت یہ نہیں تھی بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک ذہنی الجھن ہی کی تھی۔ وہ اس کو نہ ماننے کی خواہش کے تحت ایک بہت ہی مستبعد بات قرار دیتے تھے کہ بھلا مر جانے اور سڑ گل جانے کے بعد دوبارہ پیدا کرنا اور ساری دنیا کا حساب کتاب اور ان کی جزا و سزا کس کے بس کی بات ہے! لیکن اس پر بھی ان کا ذہن پوری طرح مطمئن نہیں تھا اس وجہ سے اپنی تسلی کے لیے وہ یہ بھی کہتے تھے کہ بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی پڑا اور حساب کتاب کی نوبت آہی گئی تو ہمارے دیوی دیوتا اپنی سعی و سفارش سے ہمیں بچا ہی لیں گے۔ اس کے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے ان کی اسی ذہنی کشمکش کو 'ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ' سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ نہایت ہی حقیقت افروز تعبیر ہے لیکن تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے مفسرین اس کی تاویل میں معلوم نہیں کس طرح الجھن میں پڑ گئے!

یہ آیت یہاں بالکل اسی محل میں ہے جس محل میں تمہید کی آیت ۵ ہے۔ جس طرح وہاں فرمایا ہے کہ اگرچہ یہ قرآن بالکل واضح ہے لیکن جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ہیں اور نہ ماننا چاہتے ہی ہیں وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے اسی طرح توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال پر یہاں ناقابل انکار دلائل پیش کرنے کے بعد

فرمایا کہ یہ نہ خیال کرو کہ سورج کی طرح یہ روشن حقائق ان کی سمجھ میں نہیں آ رہے ہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت کے باب میں یہ سخت ذہنی الجھن میں مبتلا ہیں۔ اس کی طرف سے یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں بلکہ اس کی طرف سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ حقائق سے گریز و فرار کی اصلی علت آخرت سے گریز و فرار ہی ہے۔ آخرت کو مان لینے سے چونکہ انسان پر عظیم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اس وجہ سے وہ اس سے بھاگتا ہے۔ اور فرار کے لیے چونکہ کوئی راہ نہیں ہے اس وجہ سے وہ چور دروازے تلاش کرتا ہے۔ یہ چیز اس کو ایک شدید ذہنی الجھن میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ حقائق سے گریز کے لیے ان کے اندر شک کے پہلو ڈھونڈتا ہے۔ یہ غیر فطری جستجو اس کو شک کا مریض بنا دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے صریح حقائق سے آنکھیں بند کر کے اندھا بننا پڑتا ہے۔ گویا قرآن نے اس آیت میں ان کے مرض کے تدریجی ارتقاء کو واضح فرمایا کہ انھوں نے آخرت کو نہ ماننے کی خواہش کے تحت اپنے ذہن و فکر کو مریض بنایا۔ پھر جب وہ شک کے مریض بن گئے تو انھیں آفاق و انفس کے تمام شواہد و حقائق سے آنکھیں بند کر لینی پڑیں اس لیے کہ اس میں حقائق کا مواجہہ ان کی طبیعت پر نہایت شاق گزرتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا وَآبَاؤُنَا أَئِنَّا لَمُخْرَجُونَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا هَٰذَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۶۷-۶۸)

یہ ان کے شک کی وضاحت ہے کہ اول تو ان کو یہی بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ سڑ گل کر مٹی ہو جائیں گے تو وہ از سر نو قبروں سے زندہ کر کے کس طرح نکالے جائیں گے!

دوسری یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ قیامت کی آمد آمد کا چرچا تو ہم بہت دنوں سے سن رہے ہیں۔ آج ہم کو اس سے ڈرایا جا رہا ہے، اس سے پہلے ہمارے اگلوں کو بھی ڈرایا گیا لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ یہ سب اگلوں کے فسانے ہیں جو ہر زمانے میں دہرائے گئے ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ (۶۹)

آنکھوں کے لیے سرمۂ بصیرت

یہ ان کے اس اندھے پن کا علاج بتایا ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں آیا ہے۔ مطلب یہ کہ آنکھیں کھولنے سے کھلتی ہیں اس لیے اپنے ملک میں آنکھیں کھول کر چلو پھرو اور کھلی قوموں کے آثار پر عبرت کی نگاہ ڈالو تو تمھیں نظر آئے کہ اللہ کے رسولوں نے ان کو جس عذاب سے ڈرایا وہ کس طرح ان کے سامنے آیا۔ یہ آثار اللہ نے اس زمین میں اسی لیے محفوظ رکھے ہیں کہ یہ تمھارے لیے نشانِ عبرت اور سرمۂ بصیرت کا کام دیں۔ اس سے تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ جس چیز سے تمھیں ڈرایا جا رہا ہے وہ محض اگلوں کا فسانہ نہیں بلکہ یکسر حقیقت ہے۔ اور اسی سے تم پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ جب مجرموں کا یہ انجام اس دنیا میں

ہوا ہے تو آخر اللہ تعالیٰ ایک ایسا دن کیوں نہیں لائے گا جس میں اس کے کامل عدل اور اس کی کامل رحمت کا ظہور ہو!

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ (۷۰)

آنحضرتؐ کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ تم ان کی اس روش پر غم نہ کرو۔ تم ان کو روٹی دے رہے ہو اور یہ پتھر مانگتے ہیں تو یہ ان کی اپنی محرومی و بدبختی ہے۔ تم اپنا فرض انجام دے کر ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان پر کڑھنے اور ان کی ہٹ دھرمی پر غم کھانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اسی طرح ان کی ان شرارتوں سے بھی ذرا دل تنگ اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے جو وہ تمہارے ساتھیوں اور تمہاری دعوت کے خلاف کر رہے ہیں۔ ان کی ساری چالیں اور شرارتیں خدا کی مٹھی میں ہیں۔ وہ ان کی ہر چال بے کار کر دے گا اور تمہیں ہر شر سے محفوظ رکھے گا۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ رَدِفَ لَكُم بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ (۷۱-۷۳)

'رَدِفَ' بغیر صلہ کے بھی آتا ہے اور 'لِ' کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے۔ کلام عرب میں دونوں کی نظیریں ہیں۔ اس کے معنی ہیں ایک شے کے دوسری شے کے پیچھے لگے ہوئے ہونے کے۔

مکذبین کا مطالبۂ عذاب اور اس کا جواب

اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک عذاب دنیا سے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً ظاہر ہوتا ہے دوسرے عذاب آخرت سے۔ اس انذار کا جواب ان کی قوموں نے ہمیشہ یہی دیا کہ 'مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ' یہ عذاب کب آئے گا؟ یعنی اگر تم سچے ہو تو یا تو قیامت لاؤ جس کی دھمکی سنا رہے ہو، اگر قیامت نہیں تو وہ عذاب ہی لا کر دکھاؤ جو تمہاری تکذیب کی صورت میں تمہارے گمان کے مطابق لازماً ہم پر آنے والا ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک ضرور دکھاؤ۔ اس کے بغیر ہم یہ ماننے والے نہیں ہیں کہ تم اپنے دعوے اور وعدے میں سچے ہو۔

'قُلْ عَسٰٓى اَنْ ...... الاٰیۃ' فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ عجب نہیں کہ جس چیز کے لیے تم جلدی مچاتے ہوئے ہو اس کا کوئی حصہ تمہارے پیچھے ہی لگا ہوا ہو۔ 'الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ' سے قیامت مراد ہے جس کے لیے یہ جلدی مچانے کا ذکر اوپر آیت ۶۸ میں بھی گزر چکا ہے اور آیت ۷۱ میں بھی۔ 'بَعْضُ' سے مراد وہ عذاب ہے جو رسول کی تکذیب کا لازمی نتیجہ ہے۔ فرمایا کہ عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ، اب تو اس کا ظہور تمہارے رویے پر منحصر ہے۔ اگر تم ایمان نہ لانے تو قیامت کی عدالت کبریٰ کا ایک نمونہ تمہارے لیے ظاہر ہو کے رہے گا۔ یہ چیز رسول کی بعثت ہی کے اندر مضمر ہے۔ یہاں اس بات کو 'عَسٰی' کے لفظ سے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بہرحال عذاب کے ظہور کا انحصار قوم کے رویے پر تھا۔ وہ ایمان لا کر اس سے محفوظ بھی رہ سکتی تھی۔ چنانچہ ہوا بھی یہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کی اکثریت ایمان لائی اس وجہ سے اس پر

اس قسم کا کوئی عذاب نہیں آیا جس قسم کا عذاب پچھلی قوموں پر آیا۔

'وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ'۔ یہ عذاب اور قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کے حال پر اظہارِ افسوس ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو جو مہلت دیتا ہے وہ اپنے فضل و کرم سے محض اس لیے دیتا ہے کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے رویے کی اصلاح کریں اور اس کی رحمت کے مستحق بنیں، لیکن لوگوں کی ناشکری کا حال یہ ہے کہ وہ اس مہلت اور اس فضل کو اللہ کے رسول کے جھوٹے ہونے کی دلیل بنا لیتے ہیں اور جہاں سے ان کو رحمت لے کر اٹھنا چاہیے وہاں سے وہ اس کا غضب لے کر لوٹتے ہیں۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِى السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۷۴-۷۵)

آنحضرتؐ کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے انذار

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور آپ کے مخالفین کے لیے انذار بھی۔ آپ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم ان سے بالکل بے خطر رہو۔ تمہارا رب ان کے سینوں کے مخفی منصوبوں سے بھی واقف ہے اور ان کے برملا اعلانات سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے ہر فتنے کے تدارک کے لیے خود سامان فرمائے گا۔ یہ گویا 'لَا تَكُنْ فِىْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ' کے مضمون کی تاکید ہوئی۔

'وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ' الاٰیۃ' میں مخالفین کو دھمکی ہے کہ وہ یاد رکھیں کہ آسمان و زمین کا ہر بھید خدا کے ہاں ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ وہ ہر چیز کا نوٹس لے گا اور اس سے کوئی راز بھی چھپا یا نہ جا سکے گا۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِىْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (۷۶-۷۸)

یہود کی طرف ایک اشارہ

یہ اشارہ یہود کی طرف ہے۔ اصلاً تو یہ سورہ قریش کے جواب ہی ہے اس لیے کہ دعوت کے ابتدائی دور میں قرآن کے دوسرے مخالفین — یہود وغیرہ — صرف دور کے تماشائی تھے لیکن دعوت کے قدم جتنے ہی آگے بڑھتے گئے آہستہ آہستہ یہود نے بھی پس پردہ قریش کی حمایت شروع کر دی۔ چنانچہ قرآن نے بھی ان سے تعرض شروع کر دیا۔ ابتداءً تو ان کا ذکر اشارات ہی کی شکل میں ہوا لیکن پھر بتدریج جس طرح وہ کھلتے گئے اسی طرح قرآن کا اندازِ بیان بھی کھلتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھی پوری طرح بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے۔ زیرِ بحث آیات میں ان کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے۔ بعد کی سورتوں میں آپ دیکھیں گے کہ بالتدریج یہ اجمال تفصیل کا رنگ اختیار کر لے گا۔ یہود کے معاملہ میں یہی اندازِ بحث پچھلے گروپوں میں بھی رہا ہے۔

فرمایا کہ قرآن جس طرح بنی اسماعیل (قریش) پر اتمامِ حجت کر رہا ہے اسی طرح یہ بنی اسرائیل پر بھی

ان بہت سے حقائق کو واضح کر رہا ہے جن سے وہ اختلاف میں پڑ کر محروم ہو گئے تھے۔ 'وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ' یعنی اگر وہ اس پر ایمان لانے والے بنیں تو یہ ان کو اختلافات کی بھول بھلیوں سے نکال کر دین کی صراطِ مستقیم پر چلائے گا اور ان کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں موجبِ رحمت ہوگا۔ 'اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ' یعنی اگر انھوں نے اس قرآن کی قدر نہ پہچانی اور اس کی رہنمائی نہ قبول کی تو یاد رکھیں کہ آج تو اللہ تعالیٰ ان کے اختلافات اس کتاب کے ذریعہ سے رفع کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے بعد وہ دن بھی آنے والا ہے جس میں وہ اپنے حکمِ ناطق کے ذریعہ سے ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ یہاں واضح قرینہ موجود ہے کہ یہ بات روزِ قیامت سے متعلق فرمائی گئی ہے اور 'حکم' سے مراد وہ حتمی و آخری فیصلہ ہے جس کے بعد کسی کے لیے زبان کھولنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

'وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ' یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا حوالہ دیا ہے کہ یہود یاد رکھیں کہ اللہ عزیز و علیم ہے۔ نہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ سکتا اور نہ کوئی چیز اس سے مخفی ہے۔

یہی مضمون بعینہٖ اسی طرح کے موقع و محل میں سورۂ یونس میں بھی گزر چکا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ	اور ہم نے بنی اسرائیل کو عزت و استحکام کا مقام بخشا
صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ	اور ان کو اپنے پاکیزہ رزق و فضل سے نوازا تو علم پانے
فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ	کے بعد انھوں نے اس میں اختلاف پیدا کیا۔ بے شک
اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ	تمہارا رب قیامت کے دن ان چیزوں کے باب میں
الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ	ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ اختلاف
(یونس: ۹۳)	کرتے رہے ہیں۔

سورۂ ہود میں یہی مضمون اس طرح آیا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ	اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تو اس میں اختلاف پیدا
فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ	کر دیا گیا اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے
رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ	طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور
لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۔	بے شک وہ اس کی طرف سے ایک الجھن میں ڈال دینے
(ھود: ۱۱۰)	والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

یہاں جس اختلاف کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اس کی وضاحت سورۂ یونس اور سورۂ ہود کی مذکورہ بالا آیات کے تحت بھی ہو چکی ہے اور سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بھی۔ تورات کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ اس میں صرف تحریف ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ متناقض روایات کا مجموعہ بھی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلانا ناممکن ہے کہ اس میں کتنا حصہ حق ہے اور کتنا باطل و محرف۔ تورات کے اس طرح مسخ ہو جانے کے سبب سے یہود خدا کی دی

ہوئی روشنی سے محروم ہو کر بالکل تاریکی میں گھر گئے تھے۔ قرآن نے ان کو اس تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانا چاہا لیکن انھوں نے اس روشنی کی قدر کرنے کے بجائے اس کو بجھانے کی کوشش کی۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۖ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۖ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۷۹-۸۱)

آنحضرتؐ کے لیے تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی چالوں اور مخالفتوں سے بالکل بے پروا ہو کر اپنے رب کی نصرت پر بھروسہ رکھو، واضح حق پر تمہی ہو۔ اسی حق کا بول بالا ہو کر رہے گا اور تمہارے یہ مخالفین، خواہ قریش ہوں یا یہود، اپنے باطل کے ذریعہ سے تمہارا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی ساری چالیں بیکار کر دے گا۔ اللہ کا کلمہ بلند ہو کر رہے گا۔

'اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى الاٰیۃ' یعنی اگر یہ لوگ تمہاری بات نہیں سنتے تو تم ان کے حال پر غم نہ کرو، تمہارا کام مُردوں کو سنانا نہیں ہے اور نہ بہروں کو سنانا ہے بالخصوص جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں۔ 'اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ' کی قید سے یہاں یہ بات نکلی کہ بہرے بھی اگر کان لگائیں اور دھیان کریں تو کچھ سن سکتے ہیں لیکن یہ تو وہ بہرے ہیں جو بہرے بھی ہیں اور پیٹھ پھیر کر بھاگے بھی جا رہے ہیں تو ایسے بدقسمتوں کو کوئی بات کس طرح سنائی جا سکتی ہے!

'وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ' یہاں 'عَنْ' اس بات کا قرینہ ہے کہ لفظ 'هَادِیٌ' کسی ایسے مفہوم پر متضمن مانا جائے جو 'عَنْ' کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو۔ یہ حرف چونکہ کسی کو کسی شے سے ہٹانے اور پھیرنے کے مفہوم پر بھی دلیل ہوتا ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہٹا کر ہدایت دینے والے نہیں بن سکتے۔

'اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ' یعنی تمہاری اس دعوت کا فیض پہنچ سکتا ہے تو انھیں لوگوں کو پہنچ سکتا ہے جو ہماری آیات پر ایمان لانا چاہیں۔ 'يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا' میں فعل ہمارے نزدیک ارادۂ فعل کے معنی میں ہے جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر سننے اور سمجھنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں پایا جاتا وہ اس نعمت کی کیا قدر کریں گے! 'فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ' یعنی جن کے اندر سننے سمجھنے کا ارادہ پایا جاتا ہے وہ بے شک ایمان لائیں گے اور اپنے رب کے فرمانبردار بنیں گے۔

ہدایت کے باب میں سنت الٰہی

یہ حقیقت یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر طلبِ ہدایت کا داعیہ ودیعت فرمایا ہے اور سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ اس داعیہ کی قدر کرتے ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ ہدایت کی مزید راہیں کھولتا ہے اور اگر کوئی اس داعیہ کی قدر نہیں کرتا تو صرف یہی نہیں ہوتا کہ اس کے لیے مزید ہدایت کے دروازے نہیں کھلتے بلکہ اس کا یہ فطری داعیہ بھی مُردہ ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو سیدنا مسیحؑ نے یوں واضح فرمایا ہے

کہ اس سے وہ بھی لے لیا جاتا ہے جو اس کو دیا گیا۔"

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ (۸۲)

'وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ' سے یہ مراد ہے کہ جب ان کے باب میں اللہ کا فیصلہ صادر ہو جائے گا اور سنتِ الٰہی کے مطابق جس چیز کے وہ مستحق ہیں اس کے ظہور کا وقت آ جائے گا۔

'عَلَيْهِمْ' میں ضمیر کا مرجع قریش ہیں جن سے اس سورہ میں خطاب ہے اور جو مطالبہ کر رہے تھے کہ قرآن ان کو جس عذاب یا قیامت کی خبر دے رہا ہے جب تک وہ ان کو یا ان کی کوئی نشانی دیکھ نہ لیں گے اس وقت تک وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ ان کے اس مطالبے کا ذکر آیات ۷۱، ۷۲ میں گزر چکا ہے۔

'تُكَلِّمُهُمْ' یہاں اس مفہوم میں ہے جس مفہوم میں سورۂ روم کی آیت ۳۵ میں ہے۔ فرمایا ہے:

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ	کیا ہم نے اتارا ہے ان پر کوئی دلیل جو شہادت دے رہا
يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ	ہو ان چیزوں کے حق میں جن کو یہ خدا کی شریک
(الروم: ۳۵)	ٹھہراتے ہیں؟

یہاں ظاہر ہے کہ لفظ 'تکلم' اس عام معنی میں نہیں ہے جس معنی میں ہم بولتے ہیں بلکہ اس کا مفہوم کسی چیز کے حق میں دلیل، نشانی یا شہادت ہوتا ہے۔

فرمایا کہ اگر یہ منکرین تمھاری بات اس وقت تک ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک تم ان کو کوئی نشانیِ عذاب نہ دکھا دو تو اس طرح کی کوئی نشانی دکھا دینا خدا کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ وہ ان کو توبہ، اصلاح کے لیے مہلت دے رہا ہے اس وجہ سے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعہ سے ان کو تعلیم و تذکیر اور انذار و تبشیر کر رہا ہے لیکن جب اتمامِ حجت کا یہ وقت گزر جائے گا اور سنتِ الٰہی کے بموجب ان کے لیے عذاب ہی کا فیصلہ ہو جائے گا تو کوئی نشانی ظاہر کر دینے کے لیے خدا کو کوئی اہتمامِ خاص نہیں کرنا ہے۔ وہ زمین ہی سے کوئی جانور اٹھا کھڑا کرے گا جو اس بات کی شہادت دے دے گا کہ یہ نابکار لوگ اللہ کی آیات پر یقین کرنے والے نہیں ہیں اس وجہ سے قہرِ الٰہی کے مستحق ہیں۔ اس اسلوبِ بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابھی تو اللہ تعالیٰ آسمان سے اپنی ہدایت نازل فرما رہا ہے اور اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعہ سے ان پر حجت تمام کر رہا ہے لیکن ان کی شامتِ اعمال سے اگر ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو ہی گیا تو خدا زمین سے کسی جانور کے ذریعہ سے بھی ان پر شہادت دلوا دے گا۔

رسولوں کی تاریخ میں اس طرح کی نشانی کی ایک مثال ناقۂ ثمود ہے۔ حضرت صالحؑ کی قوم نے جب ان کی بات کسی طرح نہیں مانی اور برابر اس بات پر مصر ہی رہی کہ اس کو کوئی عذاب کی نشانی دی جائے تو حضرت صالحؑ نے ایک اونٹنی نامزد کر دی کہ یہ عذاب کی نشانی ہے۔ اگر تم نے اس کو کوئی گزند پہنچایا تو تم پر

قہر الٰہی ٹوٹ پڑے گا چنانچہ جونہی انھوں نے اس کو گذند پہنچایا اللہ کا عذاب ان پر آدھمکا۔

اس آیت کی یہ تاویل، میرے فہم کے حد تک، قرآن کے الفاظ، نظام اور اس کے نظائر کی روشنی میں بالکل واضح ہے لیکن ہمارے مفسرین اس کے تحت ایک عجیب و غریب 'دابۃ' کا ذکر کرتے ہیں جو قیامت کے قریب ظاہر ہوگا۔ میرے نزدیک اس کا تعلق اس آیت سے نہیں بلکہ آثار قیامت کی روایات سے ہے۔ ان روایات کو نقد حدیث کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیے۔ اگر وہ اس کسوٹی پر پوری اتریں تو ان کو قبول کیجیے ورنہ رد کر دیجیے۔

یہاں یہ امر بھی یاد رکھیے کہ قریش کو یہ دھمکی جو دی گئی تھی وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ جب ان کے بارے میں خدا کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اگر قریش اپنی ضد پر اڑے رہ جاتے تو ان کو لازماً اسی عذاب سے سابقہ پیش آتا جس کی اس آیت میں وعید ہے لیکن معلوم ہے کہ قریش کی اکثریت آہستہ آہستہ مشرف باسلام ہو گئی اس وجہ سے ان پر اس طرح کا کوئی فیصلہ کن عذاب نہیں آیا جس قسم کا عذاب عاد و ثمود اور دوسری قوموں پر آیا بلکہ ان کے اشرار اہل حق کے ساتھ تصادم ہی میں ختم ہو گئے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّن يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ (۸۳)

مکذبین کی جماعت حشر کے دن — یہ روز حشر کی یاد دہانی فرمائی کہ اس دن کو یاد رکھو جس دن اللہ تعالیٰ ہر امت میں سے اپنی آیات کی تکذیب کرنے والوں کی ایک پوری فوج جمع کرے گا اور ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔ لفظ 'يُوزَعُونَ' آیت ۱۷ میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تحقیق کر چکے ہیں۔ یہ درجہ بندی ان کے جرائم کی نوعیت اور ان کی مقدار کے اعتبار سے ہوگی اور پھر جو پارٹی جس درجے کی سزا کی مستحق ہوگی اسی لحاظ سے دوزخ کے الگ الگ حلقوں میں بھیج دی جائے گی۔ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِّكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ (الحجر: ۴۴) (اور دوزخ کے سات دروازے ہوں گے اور ہر دروازے کے لیے ان میں سے ایک معین حصہ ہوگا)۔

لفظ 'فوج' سے ان مکذبین کی کثرت کی طرف اشارہ ہے اور مقصود اس اشارے سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کی کثرت کے باوجود نہ ان کے جمع کرنے میں خدا کو کوئی زحمت پیش آئے گی اور نہ ان کے لیے اس کی دوزخ میں جگہ کی قلت کا کوئی سوال ہوگا۔ وہ ان تمام افواج کو اپنے اندر مضم کرلے گی اور اس کے بعد بھی 'هَلْ مِن مَّزِيدٍ' پکارے گی۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوا قَالَ أَكَذَّبْتُم بِآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّاذَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۸۴)

مکذبین سے ایک سوال — جب یہ سارے مجرمین اکٹھے ہو لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے سوال فرمائے گا کہ بتاؤ کیا تم نے میری آیات کی تکذیب کی درآنحالیکہ تمھارے علم نے ان کا پورا پورا احاطہ نہیں کیا تھا یا تم کیا بناتے رہے تھے! مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اس روز حشر و نشر اور جزاء و سزا کو اس بنیاد پر جھٹلایا ہوتا کہ تمھارے پاس تمام اسرار کائنات

کا علم ہے تب تو تمھارا ایک موقف ہو سکتا تھا لیکن اس طرح کا محیط کل علم نہ رکھنے کے باوجود اگر تم نے میری تنبیہات کی تکذیب کی تو اب بتاؤ تمھارے پاس کیا عذر ہے؟

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی بات کو تسلیم کرنے کے لیے یہ چیز کافی ہے کہ اس کے دلائل و آثار عقل و فطرت اور آفاق و انفس میں موجود ہیں۔ محض اس بنیاد پر اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے تمام اطراف جوانب کا ہمارا علم احاطہ نہ کر سکا۔ اگر کوئی شخص اس بنیاد پر اس کی تکذیب کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام اسرارِ کائنات کے احاطہ کا مدعی ہے اور یہ چیز نہ کسی کو حاصل ہے اور نہ فاطرِ کائنات کے سوا کسی کو حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسے شخص کی مثال اس احمق کی ہے جو ہمالہ کا انکار اس بنا پر کر دے کہ اس نے اس کی تمام چوٹیوں اور اس کی تمام وادیوں کا مشاہدہ نہیں کیا۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِم بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنطِقُونَ (۸۵)

مکذبین کی بے بسی

یعنی اللہ تعالیٰ کے اس سوال کے جواب میں وہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں گے۔ ان کی زبانیں بالکل گنگ ہو جائیں گی اور ان کے اعمال کی پاداش میں ان پر خدا کا فیصلۂ عذاب نافذ ہو جائے گا۔ یہاں بھی وہی 'وَقَعَ الْقَوْلُ' آیا ہے جس پر پیچھے بحث گزر چکی ہے لیکن یہاں روزِ حشر کا ماجرا بیان ہو رہا ہے اس وجہ سے اس سے اللہ تعالیٰ کا وہ فیصلہ مراد ہے جو ان تمام مجرمین کو جہنم میں جھونک دینے کے لیے ہوگا۔ 'لَا يَنطِقُونَ' کی وضاحت کے لیے سورہ یٰسین کی یہ آیت بھی پیشِ نظر رکھیے۔ 'الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۶۵)' (آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے اعمال سے متعلق ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے)۔ اس آیت میں 'تُكَلِّمُنَا' بھی قابلِ توجہ ہے جس پر پیچھے بحث گزر چکی ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا اللَّيْلَ لِيَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۸۶)

اس آیت میں، عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق، متقابل الفاظ محذوف ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں 'مظلمًا' حذف ہے اور دوسرے ٹکڑے میں 'لِتَعْمَلُوا' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل۔ اس ایجاز کی بلاغت کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

فعل 'يُؤْمِنُونَ' یہاں ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔

عذاب کی نشانی مانگنے والوں کو ملامت

یہ نشانیِ عذاب کا مطالبہ کرنے والوں کو ملامت ہے کہ آخر یہ محروم القسمت لوگ عذاب ہی دیکھنے کے لیے کیوں اڑے ہوئے ہیں؟ اس کائنات کی نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے! کیا ان کو ہماری ہر روز ظاہر ہونے والی یہ عظیم قدرت و حکمت نظر نہیں آتی کہ ہم نے رات کو تاریک و پرسکون بنایا تاکہ وہ اس میں سکون و راحت حاصل کریں اور دن کو روشن بنایا تاکہ وہ اس میں کام کریں! 'إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ'۔

اس میں ایک ہی نہیں بلکہ بہت سی نشانیاں موجود ہیں لیکن یہ نشانیاں ان لوگوں کو نظر آسکتی ہیں جن کے اندر ایمان لانے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔

شب و روز کی یکے بعد دیگرے آمد و شد، تضاد کے باوصف ان کے توافق اور خلق کے لیے ان کی نفع رسانی سے اس کائنات کے خالق کی قدرت، حکمت، ربوبیت، توحید اور حشر و نشر پر قرآن نے جو دلیلیں قائم کی ہیں ان کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ یہاں لفظ 'اٰیٰتٍ' سے اجمالی اشارہ ان سب کی طرف ہے لیکن موقع و محل کے تقاضے سے خاص طور پر قیامت اور حشر و نشر کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ اس کا مشاہدہ تو اس دنیا میں ہر روز کر رہے ہو جس طرح تم رات میں ہر روز سوتے ہو اور پھر صبح کو اٹھ بیٹھتے ہو اسی طرح مرنے کے بعد ایک وقت آئے گا کہ اٹھ بیٹھو گے۔ خدا ہر چوبیس گھنٹوں میں یہ مشاہدہ اسی لیے کرا رہا ہے کہ اصل حقیقت کی یاددہانی تمہیں ہر روز ہوتی رہے لیکن جو لوگ کسی بات کو ماننا ہی نہ چاہیں ان کی ہٹ دھرمی کا کیا علاج! سورۂ فرقان کی آیت ۴۷ میں اس حقیقت کی طرف یوں توجہ دلائی ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا (الفرقان: ۴۷)	اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے شب کو پردہ پوش، نیند کو دافع کلفت اور دن کو وقت نشور بنایا۔

اور اسی کی تذکیر وہ دعا کرتی ہے جو سو کر اٹھنے کے وقت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے۔

وَیَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِیْنَ (۸۷)

ہولِ قیامت کی یاددہانی

یہ قیامت کے ہول کی یاددہانی فرماتی ہے کہ اس کو کوئی آسان چیز نہ سمجھو۔ جب صور پھونکا جائے گا تو اس کے ہول سے سب گھبرا اٹھیں گے۔ 'اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ' صرف وہی لوگ اس دن کی ہلچل سے مامون رہیں گے جن کو اللہ اس سے مامون رکھے۔ اسی اجمال کی وضاحت آگے آیت ۸۹ میں بدیں الفاظ ہوئی ہے۔ 'مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ یَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ' (جو نیکی کا توشہ لے کر آئیں گے ان کے لیے اس سے بہتر صلہ ہوگا اور وہ اس دن ہر گھبراہٹ سے بالکل مامون ہوں گے) 'وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِیْنَ' یعنی سب چھوٹے اور لیڈر، پیرو سب اس دن خدا کے حضور میں نہایت ذلت کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ 'دٰخِرِیْنَ' کے معنی 'صٰغِرِیْنَ' کے ہیں۔ اس ذلت سے صرف وہی لوگ محفوظ رہیں گے جن کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ (۸۸)

یہ اس دن کے ہول کی مزید تفصیل ہے کہ دوسری چیزوں کا تو کیا ذکر اس دن پہاڑوں کا بھی یہ حال ہوگا کہ

بظاہر وہ جمے ہوئے نظر آئیں گے حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑتے ہوئے ہوں گے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ شعرائے عرب میں جو حکیم تھے ان تک کا حال یہ تھا کہ وہ دوسری تمام چیزوں کو تو فانی مانتے تھے لیکن پہاڑوں کو غیر فانی سمجھتے تھے۔ 'صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ' یہ اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح 'وَعْدَ اللّٰہِ'، 'صِبْغَۃَ اللّٰہِ' وغیرہ ترکیبیں قرآن میں ہیں۔ یہ اسلوب اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کسی شے کی طرف خاص طور سے توجہ دلانا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اس خدا کی کاریگری ہوگی جس نے ہر چیز کو محکم کیا ہے۔ جب اسی نے ہر چیز کو محکم کیا ہے تو وہ یہ بھی کر دکھائے گا کہ پہاڑ جمے ہوئے بھی نظر آئیں گے اور وہ ہوا میں اڑتے ہوئے بھی ہوں گے۔

'اِنَّہٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ' یہ اس اصل چیز کا بیان ہے جس سے آگاہ کرنے کے لیے قیامت کے اس ہول کی تفصیل سنائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن اس کائنات میں ہلچل کا حال یہ ہوگا اور اللہ تمہاری اس ساری کرتوت سے اچھی طرح باخبر ہے جو تم کر رہے ہو اور جب واقف ہے تو لازماً وہ اس کی جزا و سزا بھی دے گا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ خَیْرٌ مِّنْہَا ۚ وَھُمْ مِّنْ فَزَعٍ یَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ۔ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَکُبَّتْ وُجُوْھُھُمْ فِی النَّارِ ؕ ھَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۸۹-۹۰)

یہ اوپر والے ٹکڑے 'اِنَّہٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ' کا لازمی نتیجہ بیان فرمایا ہے کہ جو نیکی کما کر اس دن حاضر ہوں گے ان کے لیے تو بہترین صلہ ہوگا اور وہ اس دن کی گھبراہٹ سے بالکل مامون اور بے خوف ہوں گے لیکن جو لوگ بدی کی کمائی کر کے آئیں گے تو وہ اوندھے منہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے کہ تمہارے اعمال ہی کا بدلہ ہے جو تمہیں مل رہا ہے۔ تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی جا رہی ہے۔

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ ھٰذِہِ الْبَلْدَۃِ الَّذِیْ حَرَّمَھَا وَلَہٗ کُلُّ شَیْءٍ ز وَّاُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۔ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اھْتَدٰی فَاِنَّمَا یَھْتَدِیْ لِنَفْسِہٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ (۹۱-۹۲)

آنحضرتؐ کے مشن کی وضاحت

یہ آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے آپ کے مشن اور مقصد دعوت کی بالکل فیصلہ کن انداز میں وضاحت کرا دی تاکہ قریش اگر سنبھلنا چاہیں تو سنبھل جائیں ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

ہمارے نزدیک یہاں 'اِنَّمَآ اُمِرْتُ' سے پہلے لفظ 'قُلْ' برنبائے قرینہ محذوف ہے۔ بعد میں اس کی وضاحت ہو گئی ہے چنانچہ فرمایا ہے 'فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا' اور 'وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ'۔

فرمایا کہ ان لوگوں کو صاف صاف سنا دو کہ مجھے تو یہ ہدایت ہوئی ہے کہ میں اس سرزمین کے اس رب کی بندگی کروں جس نے اس کو محترم ٹھہرایا اور جس کے اختیار ہی میں سب کچھ ہے اور یہ کہ میں اسی کی اطاعت کرنے والوں میں سے بنوں۔ یہ اجمالی اشارہ ہے سرزمین مکہ اور بیت اللہ کی تاریخ کی طرف کہ جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کو منتخب فرمایا اور اس کو محترم ٹھہرایا، میں اسی مقصد کے احیاء و تجدید

کے لیے مبعوث ہوا ہوں اس وجہ سے تم لوگ میری مخالفت میں خواہ کتنا ہی زور لگاؤ لیکن اس سے کوئی مجھے پھیر نہیں سکتا۔ یہ سرزمین ملتِ ابراہیم کا مرکز ہے اس وجہ سے میری دعوتِ توحید ہی وہ اصل کام ہے جو یہاں ہونا چاہیے اور میں وہی کام کر رہا ہوں۔ 'وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ' یعنی یہاں اس گھر کے رب کے سوا دوسروں کی جو پرستش ہو رہی ہے یہ بالکل ناروا ہے۔ میں ان کی پرستش سے بری ہوں۔ 'وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ' یعنی جس طرح مجھے اس گھر کے رب ہی کی عبادت کا حکم ہوا ہے اسی طرح اس بات کی بھی ہدایت ہوئی ہے کہ میں صرف اسی کی اطاعت کرنے والوں میں سے بنوں، اس کے سوا کسی اور کی اطاعت نہ کروں۔

'وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ الآية' یعنی تم لوگ مجھے زچ کرنے کے لیے جو نت نئے مطالبات کر رہے ہو مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مجھے صرف یہ ہدایت ہوئی ہے کہ میں یہ قرآن تم کو سناؤں تو جو اس کو سنے گا اور اس سے ہدایت حاصل کرے گا اس کا فائدہ اسی کو حاصل ہوگا اور جو اس کے بعد بھی اپنی گمراہی پر جما رہ جائے نا توا س سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں تو بس ایک منذر ہوں۔ آگاہ کر دینے کے بعد میری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں سیدنا ابراہیمؑ کی اس دعا پر بھی نگاہ رہے جو انھوں نے ذریتِ اسماعیل کے اندر ایک رسول کی بعثت سے متعلق فرمائی تھی۔ اس میں بھی مبعوث ہونے والے رسول کا خاص کام 'يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ' بتایا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جس کام کے لیے اس مرکزِ توحید کے بانی نے دعا فرمائی تھی میں اس کارِ خاص پر مامور ہوا ہوں اور وہی کام کر رہا ہوں، اب جو اپنی بھلائی چاہتا ہے وہ اس برکت میں شریک ہو ورنہ اپنے انجام کا انتظار کرے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۹۳)

یعنی ان سے کہہ دو کہ اللہ ہی شکر کا سزاوار ہے جس نے مجھ پر قرآن کی یہ نعمت اتاری اور میں وہ تم کو سنا رہا ہوں۔ اگر تم اس کی قدر نہیں کر رہے ہو اور مجھ سے نشانیوں کا مطالبہ کر رہے ہو تو وہ وقت بہت جلد آرہا ہے جب وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھائے گا اس وقت تمھیں پتہ چلے گا کہ میں نے تمھیں کتنی سچی باتیں بتائی تھیں لیکن تم نے اپنی بدبختی سے ان کی قدر نہیں کی۔ 'فَتَعْرِفُونَهَا' یعنی اس وقت تم جانو گے کہ کسی نے آج اس انجام سے تمھیں آگاہ کیا تھا لیکن تم نے اس کو جھٹلایا اور اپنی بدبختی یہ شامت بلائی۔ مگر اس جاننے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

'وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ' یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تم جو شرارتیں کر رہے ہو خدا اس سے بے خبر ہے۔ وہ ہر چیز سے باخبر ہے اور تمھاری خبر لے گا لیکن اس کے ہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے انجام کو پہنچی۔ فالحمد للہ علی ذٰلک

رحمان آباد

۲۱ر فروری ۱۹۷۴ء

تدبّرِ قرآن

۲۸

القصص

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ نمل ـــــ کا مثنیٰ ہے۔ اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ البتہ اجمال و تفصیل اور اسلوب بیان و نہج استدلال کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے۔ سابق سورہ میں حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کا صرف اتنا حصہ اجمالاً بیان ہوا ہے جو ان کو رسالت عطا کیے جانے اور فرعون کے پاس جانے کے حکم سے متعلق ہے۔ اس سورہ میں وہ پوری سرگزشت، نہایت تفصیل سے بیان ہوئی ہے، جو ان کی ولادت باسعادت سے لے کر ان کو تورات عطا کیے جانے تک کے احوال و مشاہدات پر مشتمل ہے۔ سابق سورہ میں بنی اسرائیل کی طرف صرف ایک ضمنی اشارہ تھا، اس سورہ میں ان کے صالحین و مفسدین دونوں کا رویہ نسبۃً وضاحت سے زیر بحث آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں یہود کھل کر سامنے آ گئے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعینہٖ اسی مقصد سے سنائی گئی ہے جس مقصد سے سورۂ یوسف میں حضرت یوسفؑ کی سرگزشت سنائی گئی ہے کہ اس آئینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اچھی طرح دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی حفاظت و صیانت اور اپنی اسکیموں کو بروئے کار لانے کے لیے اپنی کیا شانیں دکھاتا ہے اور آپؐ کے مخالفین بھی دیکھ لیں کہ اس دعوت کی مخالفت میں بالآخر ان کو کس انجام سے دوچار ہونا ہے۔

قریش پر اس سورہ میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جس طرح اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اسی طرح اس نے اس پیغمبر اور اس کتاب کو تمہاری طرف بھیجا ہے تاکہ تم پر اللہ کی ہدایت پوری طرح واضح ہو جائے اور تمہارے پاس گمراہی پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

بنی اسرائیل پر یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اگر یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول نہ ہوتے تو کس طرح ممکن تھا کہ حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے ان گوشوں سے بھی یہ واقف ہوتے جن سے تم بھی صحیح صحیح اور اس تفصیل سے واقف نہیں ہو اور ساتھ ہی اس امر واقعی کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ جو ہدایت، اللہ نے تم پر نازل فرمائی تھی وہ تم نے اختلافات میں پڑ کر گم کر دی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اپنے اس رسول کے ذریعہ سے اس ہدایت کو از سر نو زندہ کرے اور خلق پر اپنی حجت تمام کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں یہ تسلی دی گئی ہے کہ اس قرآن کو تم نے اللہ سے مانگ کر نہیں لیا ہے بلکہ

اللہ نے خود تم پر اس کی ذمہ داریاں ڈالی ہیں تو جب اس نے خود تم پر اس کا بار ڈالا ہے تو تم مخالفوں کی مخالفت اور راہ کی مشکلات سے بے پروا ہو کر اپنا فرض انجام دو۔ جس اللہ نے یہ بوجھ تم پر ڈالا ہے وہ خود ہر قدم پر تمھاری رہنمائی و دست گیری فرمائے گا اور تمھیں کامیابی کی منزل پر پہنچائے گا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴۳) حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت ان کی ولادت باسعادت کے وقت سے ے کر تورات کے عطا کیے جانے تک۔

(۴۴-۴۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات جس میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ تم حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے ان مراحل و مقامات سے واقف نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ان سے واقف کیا کہ تمھارے ذریعہ سے اللہ کی ہدایت و شریعت دنیا میں پھر زندہ ہو۔ یہ اللہ کا تمھارے اوپر بھی فضل ہے اور تمھاری اس قوم پر بھی جس کے اندر اب تک کوئی رسول نہیں آیا تھا۔ اللہ نے یہ چاہا کہ ان کو کوئی سزا دینے سے پہلے تمھارے ذریعہ سے ان پر اپنی حجت تمام کر دے۔

(۴۷-۵۵) قریش کی طرف سے اس دعوتِ حق کی مخالفت اور اشرارِ یہود کی شہ پر یہ مطالبہ کہ اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو اس طرح کے معجزے کیوں نہیں دکھاتے جس قسم کے معجزے حضرت موسیٰؑ نے دکھائے؟ اس معارضہ کا مسکت جواب اور ساتھ ہی ان اچھے اہل کتاب کی تحسین جو اپنی قوم کے تمام غوغا کے علی الرغم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی دعوت کی تائید کر رہے تھے۔

(۵۶-۶۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور قریش کے اس اندیشہ کا جواب کہ اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں گے تو اس سے ان کی تمام سیاست و معیشت تباہ ہو جائے گی۔

(۶۲-۷۵) ان شرکاء و شفعاء کی بے حقیقتی کی وضاحت جن کو مشرکین اپنی تمام کامیابیوں کا ذریعہ سمجھتے اور ڈرتے تھے کہ اگر ان کو انھوں نے چھوڑا تو ان پر تباہی آ جائے گی۔

(۷۶-۸۴) ایک یہودی سرمایہ دار کے انجام کا بیان جس سے مقصود اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ نعمتیں جو بھی ملتی ہیں سب خدا کی طرف سے ملتی ہیں لیکن بدبخت لوگ ان کو اپنی قابلیت کا ثمرہ اور اپنے فرضی معبودوں کا فضل و کرم سمجھتے ہیں۔

(۸۵-۸۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و عزیمت کی تلقین کہ تم اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو، مخالفین کے غوغا کی پروا نہ کرو۔ جس خدا نے تم پر قرآن کی دعوت کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ تمھاری راہ کی ہر مشکل آسان کرے گا۔

سُورَةُ الْقَصَصِ (۲۸)

مَكِّيَّةٌ ______ اٰيَاتُهَا ۸۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓمّٓ ۝۱ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۲ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ آیات ۱-۴۶
نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۳ اِنَّ فِرْعَوْنَ
عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ
يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ
الْمُفْسِدِيْنَ ۝۴ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى
الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝۵ وَنُمَكِّنَ
لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا
كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝۶ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا
خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا
رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۷ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ
فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۭ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا
كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ۝۸ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَ
لَكَ ۭ لَا تَقْتُلُوْهُ ڰ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا

يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ
بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰﴾ وَقَالَتْ
لِاُخْتِهٖ قُصِّیْهِ ؗ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱﴾
وَحَرَّمْنَا عَلَیْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ
بَیْتٍ یَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى
اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ ۧ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا ع
وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۴﴾ وَدَخَلَ الْمَدِیْنَةَ عَلٰى
حِیْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِیْهَا رَجُلَیْنِ یَقْتَتِلٰنِ ۗ هٰذَا مِنْ
شِیْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ
عَلَى الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَیْهِ ۗ قَالَ هٰذَا
مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ
نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶﴾ قَالَ رَبِّ
بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۷﴾ فَاَصْبَحَ
فِی الْمَدِیْنَةِ خَآىِٕفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ
یَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤى اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّاۤ اَنْ
اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ یٰمُوْسٰۤى اَتُرِیْدُ اَنْ
تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِیْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا

فِي الْأَرْضِ وَمَا تُرِيدُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْمُصْلِحِينَ ﴿١٩﴾ وَجَاءَ رَجُلٌ
مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يَا مُوسَىٰ إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ
لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ إِنِّي لَكَ مِنَ النَّاصِحِينَ ﴿٢٠﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا
ع ۸ يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٢١﴾ وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ
مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَنْ يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿٢٢﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ
مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِنَ النَّاسِ يَسْقُونَ وَوَجَدَ مِنْ دُونِهِمُ
امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ
الرِّعَاءُ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ ﴿٢٣﴾ فَسَقَىٰ لَهُمَا ثُمَّ تَوَلَّىٰ إِلَى الظِّلِّ فَقَالَ
رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ ﴿٢٤﴾ فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا
تَمْشِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ قَالَتْ إِنَّ أَبِي يَدْعُوكَ لِيَجْزِيَكَ أَجْرَ مَا
سَقَيْتَ لَنَا فَلَمَّا جَاءَهُ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ قَالَ لَا تَخَفْ
نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥﴾ قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ
إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ ﴿٢٦﴾ قَالَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ
أُنْكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ عَلَىٰ أَنْ تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَ حِجَجٍ فَإِنْ
أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ
سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٢٧﴾ قَالَ ذَٰلِكَ بَيْنِي وَ
بَيْنَكَ أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا
ع ۳ نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿٢٨﴾ فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ آنَسَ

مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ
اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّآ
اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ
الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰٓی اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ
فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰٓی اَقْبِلْ
وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ
بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّاضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ
بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا
فٰسِقِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾
وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْٓ ۫
اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ
وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا ۛۚ بِاٰیٰتِنَآ ۛۚ اَنْتُمَا وَ
مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ
قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا
الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالَ مُوْسٰی رَبِّیْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی مِنْ
عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾
وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰٓاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ ۚ فَاَوْقِدْ لِیْ
یٰهَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ فَاجْعَلْ لِّیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓی اِلٰهِ مُوْسٰی

وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ ﴿۳۸﴾ وَاسْتَکْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِی الْاَرْضِ
بِغَیْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَ
جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ ۚ فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ
الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۰﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ
لَا یُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ
هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ ﴿۴۲﴾ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ ع ۴
مَآ اَهْلَکْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰی بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًی وَّرَحْمَةً
لَّعَلَّهُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾ وَمَا کُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ اِذْ قَضَیْنَآ
اِلٰی مُوْسَی الْاَمْرَ وَمَا کُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۴۴﴾ وَلٰکِنَّآ اَنْشَاْنَا
قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَیْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا کُنْتَ ثَاوِیًا فِیْٓ اَهْلِ مَدْیَنَ
تَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِنَا ۙ وَلٰکِنَّا کُنَّا مُرْسِلِیْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا کُنْتَ
بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَیْنَا وَلٰکِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّکَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا
مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِکَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾

ترجمۂ آیات ۱-۴۶

یہ طٰسٓمّٓ ہے یہ واضح کتابِ الٰہی کی آیات ہیں ہم تمھیں موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کا کچھ حصہ ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں ان لوگوں کی ہدایت کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۱-۳

بے شک فرعون سرزمینِ مصر میں بہت سرکش ہو گیا تھا۔ اور اس نے اس کے باشندوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو اس نے دبا رکھا تھا۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کر چھوڑتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا، بے شک وہ زمین میں فساد برپا کرنے والوں

میں سے تھا۔ اور ہم یہ چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو ملک میں دبا کر رکھے گئے تھے اور ان کو پیشوا بنائیں اور ان کو وراثت بخشیں اور ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں اور فرعون و ہامان اور ان کی فوجوں کو ان کے ہاتھوں وہ دکھائیں جس کا وہ اندیشہ رکھتے تھے۔ ۴-۶

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اس کو دودھ پلاؤ، پس جب تمہیں اس باب میں اندیشہ ہو تو اس کو دریا میں ڈال دیجیو اور نہ اندیشہ کیجیو اور نہ غم۔ ہم اس کو تمہارے پاس لوٹا کر لائیں گے اور اس کو اپنے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں۔ ۷

تو فرعون کے گھر والوں نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ان کے لیے دشمن اور باعث غم بنے۔ بے شک فرعون و ہامان اور ان کے اہل لشکر سے بڑی چوک ہوئی اور فرعون کی بیوی نے کہا، یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اس کو قتل نہ کرو۔ کیا عجب کہ یہ ہم کو نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا ہی بنا لیں اور ان کو انجام کی کچھ خبر نہ تھی۔ ۸-۹

اور موسیٰ کی ماں کا دل بالکل بے چین ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ اس کے راز کو ظاہر کر دیتی اگر ہم اس کے دل کو نہ سنبھالتے کہ وہ اہل ایمان میں سے بنی رہے۔ اور اس نے اس کی بہن سے کہا کہ تو اس کے پیچھے پیچھے جا تو وہ اس کو دور سے دیکھتی رہی اور ان لوگوں کو اس کی خبر نہ ہونے پائی۔ ۱۰-۱۱

اور ہم نے اس کو پہلے ہی سے دودھ پلائیوں کے دودھ سے روک دیا تھا تو اس نے کہا کیا میں ایک ایسے گھر والوں کا آپ لوگوں کو پتہ دوں جو آپ لوگوں کی خاطر اس کو پالیں گے اور وہ اس کی بڑی خیر خواہی سے دیکھ بھال کریں گے! پس ہم نے اس کو اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کھائے اور تاکہ وہ اچھی طرح جان لے

کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کے رہتا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ ۱۱-۱۳

پس جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا اور پورا ہوا تو ہم نے اس کو قوتِ فیصلہ عطا فرمائی اور علم بخشا اور خوب کاروں کو ہم اسی طرح صلہ دیتے ہیں۔ ۱۴

اور ایک دن لوگوں کی بے خبری میں وہ شہر میں داخل ہوا تو اس میں اس نے دو آدمیوں کو لڑتے پایا۔ ایک اس کے اپنے گروہ میں سے تھا اور دوسرا اس کے دشمنوں کے گروہ میں سے۔ تو جو اس کے گروہ میں سے تھا اس نے اس سے اس شخص کے مقابل میں مدد کی درخواست کی جو اس کے مخالفوں میں سے تھا تو موسیٰ نے اس کے گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ اس نے کہا یہ تو مجھ سے شیطانی کام صادر ہو گیا، بے شک وہ ایک کھلا ہوا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔ اس نے دعا کی، اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا تو مجھے بخش دے۔ تو خدا نے اسے بخش دیا۔ بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ اس نے کہا، اے رب! چونکہ تو نے مجھ پر فضل فرمایا تو میں عہد کرتا ہوں کہ میں مجرموں کا مددگار کبھی نہیں ہوں گا۔ ۱۵-۱۷

پس دوسرے دن وہ شہر میں داخل ہوا ڈرتا، ٹوہ لیتا ہوا، تو دیکھا کہ وہی شخص، جو کل اس سے طالبِ مدد ہوا تھا، آج پھر اس کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ موسیٰ نے کہا، تم خود ایک کھلے ہوئے شریر آدمی ہو۔ پس جب اس نے ارادہ کیا کہ پکڑے اس کو جو ان دونوں کا دشمن تھا تو وہ بول اٹھا کہ اے موسیٰ کیا تم آج مجھے قتل کرنا چاہتے ہو جس طرح تم نے کل ایک شخص کو قتل کیا! تم تو اس ملک میں ایک جبّار بننے کا ارادہ کر رہے ہو، تم اصلاح کرنے والوں میں سے نہیں بننا چاہتے۔ ۱۸-۱۹

اور شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا۔ اس نے بتایا کہ اے موسیٰ

اعیانِ حکومت تمہارے قتل کے مشورے کر رہے ہیں۔ تو یہاں سے نکل جاؤ، میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔ تو وہ وہاں سے ڈرتا اور ٹوہ لیتا ہوا نکل کھڑا ہوا اور اس نے دعا کی، اے رب! مجھے ظالموں کی قوم سے نجات دے۔ ۲۰-۲۱

اور جب اس نے مدین کا رخ کیا تو اس نے دعا کی، امید ہے کہ میرا رب میری رہنمائی سیدھی راہ کی طرف فرمائے گا۔ اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچا تو اس نے اس پر لوگوں کی ایک بھیڑ دیکھی جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے اور ان سے ورے دو عورتوں کو دیکھا جو اپنی بکریاں کو روکے کھڑی ہیں۔ اس نے ان سے پوچھا تمہارا کیا ماجرا ہے؟ انھوں نے کہا، ہم اس وقت تک پانی نہیں پلاتے جب تک چرواہے اپنی بکریاں ہٹا نہ لیں اور ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں۔ تو اس نے ان دونوں کی خاطر پانی پلایا پھر سائے کی طرف ہٹ گیا اور دعا کی، اے میرے رب! جو خیر بھی اس وقت تو میرے لیے اتارے میں اس کا حاجت مند ہوں۔ ۲۲-۲۴

پس ان میں سے ایک شرماتی ہوئی آئی۔ کہا کہ میرے باپ آپ کو بلاتے ہیں کہ آپ نے ہماری خاطر جو پانی پلایا اس کا آپ کو صلہ دیں۔ تو جب وہ اس کے پاس آیا اور اس کو سارا ماجرا سنایا، اس نے کہا، اب اندیشہ نہ کرو، تم نے ظالموں سے نجات پائی۔ ۲۵

ان میں سے ایک نے کہا، ابا جان! ان کو ملازم رکھ لیجیے۔ کیونکہ آپ کے لیے بہترین ملازم وہی ہو سکتا ہے جو قوی اور امانت دار ہو۔ ۲۶

اس نے کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ اس شرط پر کر دوں کہ تم آٹھ سال میری ملازمت کرو۔ اور اگر تم نے دس سال پورے کر دیے تو یہ بات تمہاری مرضی سے ہوگی۔ میں تم پر کوئی مشقت ڈالنا نہیں چاہتا۔ ان شاء اللہ تم مجھے

ایک بھلا آدمی پاؤ گے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہے۔ دونوں میں سے جو مدت بھی پوری کر دوں تو اس معاملے میں مجھ پر کوئی جبر نہ ہو گا اور اللہ ہمارے اس قول و قرار پر، جو ہم کر رہے ہیں، گواہ ہے۔ ۲۷-۲۸

تو جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور اپنے اہل کے ساتھ روانہ ہوا تو اس نے طور کی جانب سے ایک آگ دیکھی۔ اس نے اپنے اہل سے کہا، مجھے آگ نظر آئی ہے، تم لوگ ٹھہرو کہ میں وہاں سے کوئی خبر یا آگ کا کوئی انگارا لاؤں تاکہ تم لوگ تاپو۔ ۲۹

تو جب وہ اس کے پاس آیا، خطۂ مبارک میں، وادیٔ ایمن کے کنارے سے، درخت سے اس کو آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں اللہ، عالم کا خداوند ہوں۔ اور یہ کہ تم اپنا عصا ڈال دو تو جب اس نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا گویا سانپ ہو تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پھر مڑ کے نہ دیکھا۔ اے موسیٰ! آگے آؤ اور ڈرو نہیں، تم بالکل مامون ہو۔ تم اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو وہ بغیر کسی مرض کے سفید نکلے گا اور سکیڑ لو اپنا بازو جس طرح خوف سے سکیڑ لیتے ہیں پس یہ تیرے رب کی جانب سے دو نشانیاں ہیں فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس جانے کے لیے۔ بے شک وہ بڑے ہی نافرمان لوگ ہیں۔ ۳۰-۳۲

اس نے کہا، اے رب! میں نے ان میں سے ایک آدمی کو قتل کیا ہے تو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ اور میرے بھائی، ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں تو ان کو بھی میرے ساتھ مددگار کی حیثیت سے بھیج کہ وہ میری تائید کریں۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے۔ ارشاد ہوا کہ ہم تمہارے بھائی کو بھی تمہارے لیے قوتِ بازو بنائیں گے اور تم دونوں کو خاص دبدبہ عطا کریں گے تو وہ تم پر دست درازی نہ کر سکیں گے تو ہماری نشانیوں

کے ساتھ جاؤ، تم دونوں اور جو تمھاری پیروی کریں گے، غالب رہو گے۔ ۳۲-۳۵

توجب موسیٰ ان کے پاس ہماری نہایت واضح نشانیوں کے ساتھ آیا تو انھوں نے کہا، یہ تو محض گھڑا ہوا جادو ہے اور ہم نے اس طرح کی باتیں اپنے اگلوں میں تو سنی نہیں! ۳۶

اور موسیٰ نے کہا، میرا رب خوب جانتا ہے اس کو جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور جس کے لیے دار آخرت کا انجام خیر ہے۔ ظالم ہرگز فلاح پانے والے نہیں بنیں گے۔ ۳۷

اور فرعون نے کہا، اے درباریو! میں تو تمھارے لیے اپنے سوا کسی اور معبود سے واقف نہیں تو اے ہامان! تم مٹی کی اینٹوں کا پزادہ لگواؤ اور میرے لیے ایک اونچا محل بنواؤ کہ میں موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں، میں تو اس کو ایک جھوٹا آدمی خیال کرتا ہوں۔ ۳۸

اور اس نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں ناحق گھمنڈ کیا اور انھوں نے گمان کیا کہ ان کو ہماری طرف لوٹنا نہیں ہے تو ہم نے اس کو اور اس کی فوجوں کو پکڑا، پس ان کو سمندر میں پھینک دیا تو دیکھو، ظالموں کا انجام کیسا ہوا! اور ہم نے ان کو دنیا میں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیشوا بنایا اور قیامت کے دن ان کی کوئی مدد نہ ہو گی اور اس دنیا میں ہم نے ان کے پیچھے لعنت لگا دی ہے اور قیامت کے دن وہی خوار ہونے والوں میں سے ہوں گے۔ ۳۹-۴۲

اور ہم نے اگلی امتوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو کتاب عطا کی لوگوں کے لیے بصیرتیں بخشنے والی اور ہدایت و رحمت بنا کر تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ ۴۳

اور تم تو نہ پہاڑ کے جانب غربی میں موجود تھے جب کہ ہم نے موسیٰؑ کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا اور نہ تم انہی لوگوں میں تھے جو وہاں موجود تھے لیکن ہم نے بہت سی قومیں اٹھائیں تو ان پر ایک زمانہ گزر گیا اور وہ ہماری یاد دہانی کو بھلا بیٹھے تو ہم نے تم کو رسول بنایا کہ ان کو

یاد دہانی کرو) اور تم اہلِ مدین میں بھی ہماری آیتیں سناتے مقیم نہ تھے لیکن ہم تم کو ایک رسول بنانے والے تھے (سو ہم نے ان احوال سے تم کو باخبر کیا) اور تم طور کے پہلو میں بھی موجود نہ تھے جب کہ ہم نے موسیٰ کو پکارا لیکن تم اپنے رب کی رحمت سے (مبعوث کیے گئے کہ تم ایک ایسی قوم کو ہشیار کرو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ہشیار کرنے والا نہیں آیا" تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ ۴۴-۴۶

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

طٰسٓمّٓ ہ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۱-۲)

حروفِ مقطعات پر پیچھے بحث گزر چکی ہے۔ 'کتابِ مبین' کے اندر احسان و امتنان اور اتمامِ حجت کے جو پہلو ہیں، خاص طور پر اہلِ کتاب کے لیے، ان کی وضاحت بھی ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ کم و بیش انہی الفاظ سے سابق سورہ کی تمہید بھی شروع ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ دونوں کا مرکزی مضمون ایک ہی ہے۔

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۳)

موسیٰؑ و فرعون کی سرگزشت سنانے کا اصل مقصد

خطاب اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن آیت کے آخری الفاظ 'لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' خود شاہد ہیں کہ مقصود اس سرگزشت کے سنانے سے وقت کے فراعنہ یعنی قریش کے لیڈروں کے کان کھولنا ہے۔ 'بِالْحَقِّ' یعنی بالکل ٹھیک ٹھیک، غایت و مدعا اور عبرت و موعظت کے ساتھ۔ تورات میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت نہ تو ٹھیک ٹھیک بیان ہوئی ہے اور نہ اس سے وہ موعظت ہی سامنے آتی ہے جو اس کی اصل روح ہے۔ قرآن نے یہ سرگزشت اس کے ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر سنائی ہے۔ 'لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' میں فعل ہمارے نزدیک ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔ یہ ٹکڑا اپنے اندر ایک قسم کی تنبیہ رکھتا ہے کہ ہم یہ سرگزشت سنا تو رہے ہیں لیکن اس کا فائدہ انہی کو پہنچے گا جن کے اندر ایمان لانے کا ارادہ پایا جاتا ہے۔ جو اندھے بہرے بن چکے ہیں وہ بدستور اندھے بہرے ہی بنے رہیں گے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۴)

سرگزشت سے پہلے اس کا خلاصہ

اصل سرگزشت سے پہلے یہ اور اس کے بعد کی دو آیتیں اس غایت و مقصد کو سامنے کر دینے کے لیے

وارد ہوئی ہیں جس کو پیش نظر رکھ کر یہ سنائی جا رہی ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب متعدد مقامات میں اختیار کیا گیا ہے کہ کوئی سرگزشت سنانے سے پہلے وہ مدعا مختصر الفاظ میں قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے جو اس کے سنانے سے پیش نظر ہوتا ہے تاکہ سرگزشت کے پھیلاؤ میں اصل حقیقت قاری کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ سورۂ کہف میں اس کی مثال گزر چکی ہے۔

'اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ'۔ زمین میں 'علو' (سرکشی) یہ ہے کہ زمین کے اصل خالق و مالک کا مرضی اور اس کے احکام کو نظرانداز کر کے کوئی اس میں اپنی من مانی کرنے لگ جائے اور خدا کے بندوں کو خدا کی بندگی و اطاعت میں داخل کرنے کے بجائے ان سے اپنی بندگی و غلامی کرانے لگے۔

'وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ' یہ اسی 'علو' اور 'فساد فی الارض' کی وضاحت ہے کہ اس نے ملک کے باشندوں کو طبقات میں تقسیم کیا اور ان میں سے ایک گروہ کو اس نے بالکل دبا کر اور غلام بنا کر رکھا۔ جب راعی و رعیت سب خدا کی مملوک ہیں تو کسی ملک کے حکمران کے لیے یہ بات جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ رعایا کے درمیان کوئی تفریق و امتیاز برتے بلکہ راعی و رعیت سب کے لیے بلا امتیاز ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام عدل و مساوات ہونا چاہیے لیکن فرعون نے بنی اسرائیل کو تو غلاموں کی حیثیت دے رکھی تھی اور خود خدا بن بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی اپنی قوم قبطیوں کو یہ اختیار دے رکھا تھا کہ وہ بنی اسرائیل سے غلاموں کی طرح کام لیں۔

'يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ' اس جبر و ظلم کی ایک مثال ہے جو فرعون اور قبطیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر ہو رہا تھا۔ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کی سنگدلانہ اسکیم فرعون اور اس کے اعیان نے جس سیاسی اندیشہ کی بنا پر چلائی تھی اس کی وضاحت سورۂ طٰہٰ اور بعض پچھلی دوسری سورتوں میں ہو چکی ہے۔

'اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ' یعنی یہ خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا درآنحالیکہ اللہ اپنی زمین میں جس کو بھی حکمرانی کا منصب بخشتا ہے عدل و امن کے قیام کے لیے بخشتا ہے۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ (۵)

مظلوموں کو ابھارنے کا الٰہی فیصلہ

'نُرِيْدُ' سے پہلے، عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق، فعل ناقص محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان تو یہ ظلم و ستم ڈھاتے ہوتے تھے اور ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں لیکن ہمارا ارادہ یہ تھا کہ ہم مظلوموں پر احسان کریں، ان کو پیشوائی کا منصب بخشیں اور ظالموں کو مٹا کر مظلوموں کو وراثت و خلافت عطا کریں۔ 'نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً' سے اشارہ اس دینی پیشوائی کی طرف ہے جو حضرت موسیٰؑ کی بعثت کے بعد بنی اسرائیل کو حاصل ہوتی۔ اور

'نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِیْنَ' سے خلافت و حکومت مراد ہے جو ان کو ارضِ فلسطین میں ملی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں جس کے حدود نہایت وسیع ہو گئے یہاں تک کہ مصر کی حکومت بھی ان کی ایک باجگزار ریاست بن گئی۔

وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ (٦)

بنی اسرائیل کو اقتدار دینے کا خدائی فیصلہ

'تمکین فی الارض' سے مراد اقتدار و صولت و دبدبہ ہے۔ یعنی ارادۂ الٰہی یہ ہوا کہ ان دبائے ہوئے مظلوموں کو ایک مضبوط اقتدار و سلطنت عطا کرے اور فرعون و ہامان اور ان کی فوجوں کو وہ چیز دکھا دے جس کا وہ اندیشہ رکھتے تھے۔ 'مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ' سے اشارہ فرعون اور اس کے اعیان کے اس [illegible] کی طرف ہے جس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں کہ وہ بنی اسرائیل کی تعداد میں روز افزوں اضافہ سے بہت خائف تھے کہ اگر یہ قوت پکڑ گئے تو یا تو وہ خود ملک پر قابض ہو جائیں گے یا باہر کے دشمنوں سے مل کر یہاں سے قبطیوں کو بے دخل کر دیں گے۔ اسی خطرے کے سدباب کے لیے ان احمقوں نے بنی اسرائیل کے ذکور کے قتل کی وہ اسکیم بنائی تھی جس کی پوری تفصیل ہم پچھلی سورتوں میں پیش کر چکے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی اسکیم کے مقابل میں ان کی ساری اسکیمیں اور پیش بندیاں بالکل بیکار ثابت ہوئیں۔ ارادۂ الٰہی مظلوموں کے حق میں پورا ہو کے رہا اور ان کے دشمن تمام زور و سطوت اور تمام تدبیر و تدبر کے باوجود پامال ہوئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اسی حقیقت کو قریش کے اکابر و زعما کے سامنے رکھنے کے لیے وہ سرگزشت سنائی جا رہی ہے جو آگے آ رہی ہے تاکہ لوگ اس قصہ کو قصہ کی حیثیت سے نہ سنیں بلکہ اس حق کو مدنظر رکھ کر سنیں جو اس کے اندر مضمر ہے۔

ہامان فرعون کا وزیر تھا

یہاں بالکل پہلی مرتبہ فرعون کے ساتھ 'ہامان' کا ذکر بھی آیا ہے اور اس طرح آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت فرعون کے وزیر کی تھی اور اس کو بنی اسرائیل کو دبائے رکھنے کے مسئلہ سے خاص دلچسپی تھی۔ آگے بھی اس کا ذکر فرعون کے وزیر اعظم ہی کی حیثیت سے آ رہا ہے۔ تورات میں یہ نام نہیں آیا ہے لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوتا۔ کتنی باتیں ہیں جن میں قرآن نے تورات کے بیانات کی تصحیح کی ہے یا ان پر اضافہ کیا ہے۔ یہ بھی حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ بعض مستشرقین نے اس نام کو اعتراض کا ہدف بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مصر میں اس نام کا کوئی شخص نہیں تھا۔ ان لال بجھکڑوں کا یہ اعتراض بالکل ہی احمقانہ ہے۔ کیا یہ حضرات یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کو فرعون اور اس کے تمام وزراء و اعیان اور اس عہد کے تمام اکابر مصر کے ناموں کی فہرست مل گئی ہے؟ وزراء و اعیان تو در کنار کیا یہ حضرات خود اس فرعون کے بارے میں متفق اللفظ ہیں جو حضرت موسیٰؑ کا ہم عصر تھا؟ قرآن کی مخالفت کے جنون میں اس قسم کی باتیں جو یہ

ولک کہتے ہیں وہ بالکل ہی ناقابلِ التفات ہیں۔ یہ لوگ پائی ہوئی حقیقت کو گم کرنے میں تو بڑے ماہر ہیں۔ لیکن جب کسی چیز کا سراغ دیتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مینڈے کی ٹانگ پر ہاتھی کا خول چڑھایا ہے۔

بنی اسرائیل کے اندیشہ سے فرعون کی فوجی تیاریاں

یہاں فرعون و ہامان کے ساتھ ساتھ خاص طور پر ان کی فوجوں کا جو ذکر بار بار آیا ہے اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان نے بنی اسرائیل کے مسئلہ کو ایک بالکل سیاسی رنگ دے دیا تھا۔ ان کی کثرتِ تعداد کو وہ اپنی حکومت کے لیے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے فرعون نے اپنے تمام امراء و اعیان کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں اپنی فوجوں کو بنی اسرائیل کے خطرے سے نمٹنے کے لیے بالکل چوکس رکھیں۔ چنانچہ جب اس نے بنی اسرائیل کے تعاقب کا فیصلہ کیا تو اپنے تمام امراء اور وزراء کو ان کی فوجوں سمیت طلب کیا۔ فرعون کو اپنی ان افواج پر، جیسا کہ قرآن اور تورات دونوں سے واضح ہوتا ہے، بڑا ناز تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ سارا غرور و ناز چشم زدن میں ختم کر دیا۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ ۖ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي ۖ إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ (۷)

اصل سرگزشت کا آغاز

اب یہاں سے اصل سرگزشت شروع ہوتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ کی ولادت ہوئی تو فرمایا کہ ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اس کو دودھ پلاتی رہو۔ اگر تمھیں کوئی اندیشہ ہو تو اس کو دریا میں ڈال دیجیو اور ذرا فکر و غم نہ کیجیو، ہم اس کو تمھارے پاس واپس لائیں گے اور اس کو اپنے رسولوں میں سے بنائیں گے۔

'وحی' سے مراد یہاں ظاہر ہے کہ وہ اصطلاحی وحی نہیں ہے جو حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ بلکہ الہام و القاء یا رؤیا کے ذریعہ سے اس طرح دل میں کوئی بات ڈال دینا ہے جس سے دل کو اس پر فی الجملہ اطمینان ہو جائے۔

حضرت موسیٰ کی حفاظت کے لیے خدائی انتظامات

جس زمانے میں حضرت موسیٰ کی ولادت ہوئی ہے بنی اسرائیل کے بچوں کے ہلاک کرنے کی سکیم بڑے زوروں سے چل رہی تھی۔ اول اول تو یہ کام فرعون اور اس کے اعیان نے دائیوں سے لینا چاہا لیکن تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ دائیوں نے اس میں کچھ زیادہ تعاون نہیں کیا۔ بالآخر فرعون نے قبطیوں کو یہ عام حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو اولادِ نرینہ پیدا ہو اس کو دریا میں پھینک دیا کریں۔ اسی خطرناک زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اس وجہ سے قدرتی طور پر ان کی والدہ ماجدہ کا دل ہر وقت دھڑکتا تھا کہ معلوم نہیں کس وقت کسی ظالم کی نظر بچے پر پڑ جائے اور وہ اس کو اچک لے جائے۔ اسی خطرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ابھی تو تم اس کو دودھ پلاؤ۔ اگر اس طرح کا کوئی خطرہ محسوس ہو تو بے خوف و خطر بچے کو تم خود اپنے ہاتھوں دریا کے حوالہ کر دینا اور ذرا غم و فکر نہ کرنا۔ ہم اس کو

تمھارے پاس واپس بھی لائیں گے اور اس کو مستقبل میں اپنے شرفِ رسالت سے بھی مشرف کریں گے۔ دریا میں ڈالنے کی یہ ہدایت ظاہر ہے کہ اس وجہ سے فرمائی گئی کہ فرعون نے جو راستہ بچوں کی ہلاکت کے لیے اختیار کیا تھا اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت موسیٰ کے لیے وہی راستہ نجات کا راستہ بنے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۳۹ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک صندوق میں بچے کو رکھ کے صندوق کو دریا میں بہا دینے کی ہدایت ہوئی تھی۔ تورات میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے۔

"وہ عورت حاملہ ہوئی اور بیٹا جنا اور اس نے اسے خوب صورت دیکھ کے تین مہینے تک چھپا رکھا اور جب آگے اس کو نہ چھپا سکی تو سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا بنایا اور اس پر لاسا اور رال لگایا اور لڑکے کو اس میں رکھا اور اس نے اسے دریا کے کنارے پر جھاڑ میں رکھ دیا۔"

تورات کے بیان میں جو کمیاں اور غلطیاں ہیں ان کی طرف سورۂ طٰہٰ اور سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں خاص چیز جو قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی والدہ ماجدہ کو الہام کے ذریعے سے یہ تسلی دے دی گئی تھی کہ اس بچے کو ہم تمھارے پاس پھر واپس لائیں گے اور اس کو منصبِ رسالت پر سرفراز کریں گے اور یہ تسلی، اسلوبِ کلام دلیل ہے کہ ایک حتمی وعدے کی شکل میں دی گئی تھی۔ یہی چیز تھی جس کے اطمینان پر حضرت موسیٰ کی والدہ ماجدہ یہ بازی کھیل گئیں ورنہ کوئی ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کو اس طرح دریا کی موجوں کے حوالہ کس طرح کر سکتی ہے!

فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۭ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ (۸)

حضرت موسیٰ شاہی محل میں اتنی بات بربنائے قرینہ یہاں محذوف ہے کہ حضرت موسیٰ کی والدہ نے جب خطرہ محسوس کیا تو ہدایتِ خداوندی کے مطابق بچے کو سرکنڈے کے ایک صندوق میں رکھ کر صندوق کو دریائے نیل کے حوالہ کر دیا۔ تورات کی مذکورہ بالا روایت پر اعتماد کیجیے تو واقعہ کی تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ تین ماہ تک تو انھوں نے بچے کو کسی نہ کسی طرح چھپائے رکھنے کی کوشش کی لیکن بالآخر انھیں یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ تدبیر کارگر ہونے والی نہیں ہے۔ چنانچہ ناچار انھیں وہ اقدام کرنا ہی پڑا جس کا ذکر اوپر ہوا۔ دریائے نیل اسرائیلیوں کی بستی کے پاس سے گزرتا ہوا فرعون کے محل کی طرف جاتا تھا۔ وہاں دریا کی موجوں نے صندوق کو کنارے پر ڈال دیا۔ فرعون کے گھرانے کے لوگوں کی نظر اس پر پڑ گئی۔ انھوں نے جب دیکھا کہ صندوق میں ایک موہنا بچہ پڑا ہوا ہے تو بادشاہ اور ملکہ کے حکم سے بچے کو شاہی محل میں لایا گیا۔ فرعون کی بیوی، جیسا کہ سورۂ تحریم سے واضح ہے، نہایت نیک دل تھیں۔ انھوں نے کہا اس بچے کو قتل نہ کرو، بہت ممکن ہے کہ یہ ہم کو نفع پہنچائے یا ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔ اس طرح حضرت موسیٰ شاہی محل میں پہنچ گئے اور بادشاہ اور ملکہ دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن گئے۔ یہاں لفظ آل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب

صندوق میں پڑے ہوئے ایک بچے کا ذکر شاہی محل تک پہنچا تو خاندانِ شاہی کے تمام چھوٹے بڑے موقع پر پہنچ گئے اور سب اس کو اٹھا کر محل میں لائے۔

تقدیرِ الٰہی کے بھید کسی کو معلوم نہیں

لِیَکُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا۔ اس 'لِ' کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں کہ یہ غایت و انجام کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ انھوں نے تو بچے کو اس لیے اٹھایا کہ وہ ان کے لیے، جیسا کہ آگے ملکہ کے قول سے واضح ہو گا، آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا لیکن تقدیرِ الٰہی کا یہ بھید ان کو نہیں معلوم تھا کہ اس بچے کے ہاتھوں فرعونی اقتدار کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕیْنَ۔ یہ فرعون، ہامان اور ان کے فوجیوں کے رویے پر عام تبصرہ ہے کہ وہ اپنی حماقت کے سبب سے یہ سمجھے کہ تمام اختیار و اقتدار ان کے ہاتھ میں ہے، وہ بنی اسرائیل کو ہمیشہ اسی طرح دبائے رکھیں گے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ اگر خدا چاہے گا تو ان کے سب سے بڑے قاتل کی پرورش ان کے شاہی محل میں، خود بادشاہ اور ملکہ کے ہاتھوں کرائے گا! اوپر آیت ۶ کے مضمون پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَیْنٍ لِّیْ وَلَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖۗ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (۹)

فرعون کی بیوی نہایت نیک دل تھیں

ملکہ نے جب بچے کو دیکھا تو اس کی موہنی صورت پر قربان ہو گئیں۔ فرعون سے کہا، یہ تو میری اور تمہاری دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اس کو قتل نہ کرو۔ امید ہے یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا ہی بنا لیں۔ ملکہ کے متعلق دوسرے مقام میں ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ نہایت نیک دل اور فرعون کے رویہ سے سخت بیزار تھیں۔ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا یہ بعینہ وہی بات ہے، جو عزیزِ مصر نے، حضرت یوسفؑ سے متعلق، اپنی بیوی کو خطاب کر کے کہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ملکہ کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی اور اگر تورات کے بیان کو باور کر لیا جائے کہ جس نے حضرت موسیٰؑ کے صندوق کو سب سے پہلے دیکھا وہ فرعون کی لڑکی تھی تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت تک ان کے ہاں کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ اس وجہ سے انھوں نے اس توقع کا اظہار کیا کہ اول تو اس شکل و صورت کا بچہ فوائد و برکات سے خالی نہیں ہو سکتا، پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر کسی اولادِ نرینہ کے لیے ہماری امید پوری نہ ہوئی تو ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنا لیں گے۔ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ، یعنی بادشاہ اور ملکہ یہ سوچ رہے تھے، انھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ قدرت اس پردے میں اپنی کیا شان دکھانے والی ہے!

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۰)

آزمائش میں اہل ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

حضرت موسیٰ کی والدہ نے جب کوئی مفر نہ دیکھا تو جی کڑا کر کے صندوق دریا میں ڈالنے کو تو ڈال دیا لیکن اس کے بعد ان پر جو کچھ گزری یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا دل صبر و قرار سے بالکل خالی ہو گیا۔ قریب تھا کہ بے صبری میں ان سے کوئی ایسی بات صادر ہو جائے جس سے سارا راز فاش ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو سنبھال لیا تاکہ جس دولتِ ایمان سے وہ بہرہ مند تھیں اس پر اس آزمائش میں بھی وہ ثابت قدم رہیں۔ ماں انسان بہرحال انسان ہے۔ کسی ماں کے لیے خود اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کو دریا کی موجوں کے حوالہ کر دینا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ اگرچہ ایک اشارۂ غیبی کا سہارا ان کو حاصل تھا اور یہ سہارا نہ ہوتا تو بھلا وہ اس کا تصور بھی کس طرح کر سکتی تھیں تاہم جب اپنا حال یہ ہے کہ اس واقعہ کا تصور کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ دل سینہ سے نکل پڑے گا تو اس وقت حضرت موسیٰ کی والدہ کے دل پر جو کچھ گزری ہو گی اس کا اندازہ ان کے رب کے سوا اور کون کر سکتا ہے! لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اس نازک موقع پر سنبھالا اور وہی سنبھال سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں اور بندیوں کو امتحان میں تو ڈالتا ہے کہ یہ امتحان اس کی سنت ہے اور یہ امتحان درجے اور مرتبے کے اعتبار سے سخت سے سخت تر بھی ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کی یہ سنت بھی ہے کہ جو لوگ اس کے امتحان کی راہ میں بازی کھیل جاتے ہیں وہ ان کو سنبھالتا بھی ہے۔ حضرت موسیٰ کی والدۂ ماجدہ نے چونکہ بچے کو دریا کی موجوں کے حوالہ کر کے اپنے ایمان و توکل کی شہادت دے دی تھی اس وجہ سے آگے کے مرحلے میں خود ربِ کریم نے ان کے دل کو سنبھال لیا کہ ان کے اس ایمان و توکل کی لاج قائم رہے، کوئی ایسی بات صادر نہ ہونے پائے جو اس کے منافی ہو۔ اپنے باایمان بندوں اور بندیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یوں ہی ہے لیکن اس کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں!

وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ فَبَصُرَتْ بِهِ عَن جُنُبٍ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۱۱)

دل کی تسلی کے لیے آخری تدبیر

جب صندوق پانی میں بہتا ہوا آگے کو چلا تو انھوں نے حضرت موسیٰ کی بہن سے فرمایا کہ اس کے پیچھے پیچھے کنارے کنارے تم بھی جاؤ اور دیکھو کہ صندوق کدھر کو جاتا ہے۔ یہ دل کی تسلی کے لیے آخری تدبیر تھی جو وہ کر سکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ صندوق کا تعاقب ایک خاص حد تک ہی ممکن تھا، بالآخر تو اس کو نگاہوں سے اوجھل ہونا ہی تھا لیکن جتنی دیر بھی اور جتنی دور تک بھی اس کو دیکھنا ممکن ہو سکے وہ اس سے محروم رہنا کس طرح گوارا کر سکتی تھیں! چنانچہ حضرت موسیٰ کی بہن دور سے اس طرح اس کو دیکھتی رہیں کہ کسی کو اس واقعہ کی طرف توجہ نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و احسان ہوا کہ ان کی یہ مہم کامیاب رہی۔ صندوق کا فرعون کے محل کے پاس ساحل پر لگ جانے اور ننھے بھائی کو محل میں لے جانے کا سارا ماجرا انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی محل اسرائیلیوں کی بستی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِن قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ

وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ (۱۲)

اللہ تعالیٰ کی ایک اور کارسازی

اب یہ اس تدبیر کا ذکر ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو ان کی والدہ کی طرف لوٹانے کے لیے اختیار فرمائی۔ اوپر گزر چکا ہے کہ بچے کو محل میں بڑے چاؤ پیار سے لے جایا گیا۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے اس بات کی فکر ہوئی ہوگی کہ بچے کو کسی دایہ کا دودھ پلایا جائے۔ دایہ بلائی گئی تو حضرت موسیٰ نے اس کا دودھ نہیں پیا۔ دوسری بلائی گئی۔ تیسری بلائی گئی۔ یکے بعد دیگرے کئی دایائیں بلائی گئیں لیکن حضرت موسیٰ نے کسی کی چھاتی منہ سے نہیں لگائی۔ اس صورتِ حال سے حضرت موسیٰ کی بہن نے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر کہا اگر آپ لوگ کہیں تو میں ایک ایسے گھر والوں کا پتہ دوں جو پوری خیر خواہی اور محبت کے ساتھ بچے کی خورد و پرداخت کریں گے۔ محل والے پریشان تو تھے ہی وہ فوراً راضی ہو گئے اور اس طرح حضرت موسیٰ کے اپنی ماں کے آغوش میں پہنچنے کی راہ کھل گئی۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۳)

حضرت موسیٰ پھر ماں کی آغوش میں

اس تدبیر سے خدائے کارساز و کریم نے حضرت موسیٰ کو دریا سے نکلوایا اور پھر ان کو ان کی ماں کی گود میں پہنچا دیا تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ان کا غم دور ہو جائے۔

اصل نکتہ

'وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ' یہ اس وعدے کے ایفاء کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۷ میں گزرا کہ تم بچے کو بے خوف و خطر دریا میں ڈال دینا، ہم اس کی حفاظت کریں گے اور اس کو بعد میں تم سے ملائیں گے۔ فرمایا کہ اس طرح ہم نے اس کو دکھا دیا کہ ہم جو وعدہ کرتے ہیں، خواہ اس کا ایفا بظاہر کتنا ہی مستبعد کیوں نہ نظر آئے لیکن ہم اس کو پورا کر کے رہتے ہیں اور ہماری تدبیر کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ 'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ' یہ اصل نکتہ کی بات ارشاد ہوئی ہے کہ اکثر لوگ اپنی بلادت کے سبب سے اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ وہ خدا کے وعدوں کو محض ہوائی باتیں خیال کرتے ہیں اور ان کے اعتماد پر کوئی بازی کھیلنے میں ان کو خسارہ اور خطرہ نظر آتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوتے دیکھ لیں تب مانیں گے حالانکہ اس دنیا میں اصل امتحان تو یہی ہے کہ لوگ اپنے رب کے ان وعدوں اور وعیدوں کے لیے جئیں اور مریں جن کی حقیقت ابھی سامنے آئی ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ (۱۴)

حضرت موسیٰ کی جوانی کا اصلی جمال

'بَلَغَ اَشُدَّهٗ' سے جوانی کو پہنچنا مراد ہے اور اس کے ساتھ لفظ 'اسْتَوٰٓى' عقلی و مزاجی اعتدال و توازن کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یعنی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جسمانی اعتبار سے جوانی کو اور عقلی و مزاجی اعتبار سے اعتدال و توازن کی عمر کو پہنچے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جوانی بجائے خود کوئی بڑی وقیع چیز نہیں ہے اگر اس کے ساتھ عقلی و مزاجی اعتدال کا جمال نہ ہو۔

'حُکم' سے مراد قوتِ فیصلہ اور علم سے مراد خدا کی معرفت ہے۔ اس حکم و علم کے مختلف مدارج ہیں۔ اس کا اعلیٰ درجہ وہ ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں یہی الفاظ حضرات انبیاء علیہم السلام کے علم کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں لیکن یہاں ظاہر ہے کہ وہ علم و حکمت مراد نہیں ہے اس لیے کہ یہ حضرت موسیٰؑ کی ابتدائی زندگی کے احوال بیان ہو رہے ہیں۔ نبوت ان کو، جیسا کہ آگے تفصیل آرہی ہے، اس کے بہت بعد ملی ہے۔

فرمایا کہ جب حضرت موسیٰ جوانی کو پہنچے اور ان کی عقل اور ان کے مزاج میں اعتدال و توازن آگیا تو ہم نے ان کو حکمت و معرفت سے نوازا۔ 'وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ' جو لوگ خوب کار ہوتے ہیں ہم ان کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ 'مُحْسِنِينَ' سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو ان کے صحیح مصرف میں بالکل صحیح طریقہ پر استعمال کرتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کو ہم اپنے علم و حکمت میں سے حصہ دیتے ہیں۔ یہی علم و حکمت انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کا اصل جمال و کمال ہے۔ اگر کوئی شخص یہ نہ حاصل کر سکا تو اس نے اپنی ساری صلاحیتیں بھی برباد کیں اور اپنی جوانی بھی غارت کی۔

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلٰى حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۖ هٰذَا مِنْ شِيعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنْ شِيعَتِهٖ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۖ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهٗ ۚ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۱۵-۱۶)

'مدینۃ' سے مراد

'مدینۃ' سے مراد اصل شہر ہے جو شرفاء و اعیان کا مرکز اور حکومت کا مستقر تھا۔ بنی اسرائیل کی حیثیت چونکہ محض غلاموں اور خدمت گاروں کی تھی اس وجہ سے ان کی بستی اصل شہر سے الگ بسائی گئی تھی۔ وہ صرف مزدوروں اور خدمت گاروں کی طرح کام کے اوقات میں شہر میں جایا کرتے تھے۔

صالح جوانی میدانِ عمل میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب جوان ہوتے اور ان کے اندر وہ فتوت و مروّت اور حمیت و غیرت پیدا ہوئی جو صالح جوانی اور علم و معرفت کا خاصہ ہے تو وہ وقتاً فوقتاً شہر میں اپنے مظلوم بھائیوں کا حال دیکھنے کے لیے جانے لگے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی حمیت و حمایت کے سبب سے قبطیوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے تھے اس وجہ سے انھیں یہ کام لوگوں کی نگاہوں سے بچ بچا کے لیے اوقات میں کرنا پڑتا جن میں لوگ آرام کرتے ہیں۔ ایک دن وہ اسی طرح کے تجسس کے لیے شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک قبطی اور ایک اسرائیلی دونوں لڑ رہے ہیں۔ اسرائیلی نے جب حضرت موسیٰؑ کو دیکھا تو ان سے طالب مدد ہوا۔ حضرت موسیٰؑ اس کو مظلوم دیکھ کر، بتقاضائے فتوت و حمایت حق، اس کی مدد کے لیے بڑھے اور چاہا کہ بیچ بچاؤ کرا دیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قبطی اپنی رعونت کے سبب سے ان سے الجھ پڑا۔ انھوں نے اپنی مدافعت میں اس کو گھونسا مارا تو وہ ایسا بے ڈھب پڑا کہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ کا تو قبطی کے قتل کرنے کا کوئی ارادہ

رکھتے تھے اور نہ ان کو اس صورت حال کے پیش آنے کا کوئی گمان تھا۔ بالکل بے ارادہ جب یہ حادثہ پیش آگیا تو انھیں فوراً اپنی غلطی پر سخت پشیمانی ہوئی اور انھوں نے اپنے رب سے معافی مانگی کہ اے رب میں نے اپنی جان پر سخت ظلم ڈھایا تو مجھے معاف فرما دے۔ چونکہ یہ غلطی ان سے بالکل بے ارادہ ہوئی تھی، پھر انھوں نے معافی بھی بلا تاخیر مانگی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو فوراً ہی معاف فرما دیا اور اس معافی کی غیبی طور پر ان کو بشارت بھی مل گئی۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

اوپر یہ جو ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بھرپور جوانی کے ساتھ اپنی حکمت و معرفت سے بھی نوازا تھا یہ اسی حکمت و معرفت کا کرشمہ ہے۔ اگر حضرت موسیٰ صرف ایک تگڑے جوان ہوتے تو اپنے گھونسے کی شہ زوری اور بے پناہی پر فخر سے پھولے نہ سماتے۔ بالخصوص ایک قبطی کے اس طرح قتل کو تو وہ اپنا ایک زندۂ جاوید کارنامہ سمجھتے لیکن انھوں نے اپنے دشمن کے معاملے میں بھی، اپنی ایک غیر ارادی غلطی کو، اپنا ایک جرم سمجھا اور اپنے رب سے اس کی فوراً معافی مانگی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ معاملہ حضرت موسیٰ اور ان کے رب ہی کے درمیان کا معاملہ تھا۔ مصر میں اس وقت جو صورت حال تھی اس میں اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ حضرت موسیٰ حکومت اور زنانون سے کسی انصاف کی توقع کرتے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ فَلَنۡ اَکُوۡنَ ظَهِیۡرًا لِّلۡمُجۡرِمِیۡنَ (۱۷)

ایک پاکیزہ عہد

احسان کا شکریہ

نعمت، صالحین کے لیے شکر گزاری میں اضافہ کرتی ہے اس وجہ سے جب اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ فضل فرمایا کہ ان کو معافی دے دی تو آئندہ کے لیے انھوں نے یہ عہد فرمایا کہ اب میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔ "مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا" سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ آپ نے اسرائیلی کی حمایت اس کو مجرم سمجھتے ہوئے کی۔ آپ نے تو جو کچھ کیا اس کو مظلوم سمجھتے ہوئے کیا، اس کی فریاد پر کیا اور وقت کے حالات کی بنا پر ان کو گمان یہی ہوا کہ قبطی ظالم اور اسرائیلی مظلوم ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کے معافی مانگنے پر یہ نہیں فرمایا کہ تم بے قصور ہو، قبطی ظالم آدمی تھا، بلکہ ان کو ایک غلطی کا مرتکب قرار دیتے ہوئے معافی دی تو اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے مظلوم کی حمایت کرنی چاہی لیکن معاملہ کی تحقیق نہ کرنے کے سبب سے مجھ سے ظالم کی حمایت صادر ہو گئی۔ اس وجہ سے آئندہ کے لیے آپ نے یہ عہد فرمایا کہ اب میں بلا تحقیق کسی کی حمایت نہیں کروں گا بلکہ صرف اسی کی حمایت کروں گا جس کا مظلوم ہونا معلوم ہو۔ چنانچہ دوسرے ہی دن آپ نے جب اسی اسرائیلی کو ایک دوسرے قبطی سے لڑتے دیکھا اور وہ حسب سابق پھر حضرت موسیٰ سے طالب مدد ہوا تو آپ نے اس کو جھڑک دیا کہ تم ایک شریر آدمی معلوم ہوتے ہو۔

فَاَصۡبَحَ فِی الۡمَدِیۡنَةِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسۡتَنۡصَرَهٗ بِالۡاَمۡسِ یَسۡتَصۡرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوۡسٰۤی اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیۡنٌ (۱۸)

عہد کا احترام

دوسرے روز حضرت موسیٰؑ ڈرتے اور ٹوہ لیتے ہوئے پھر شہر میں داخل ہوئے۔ شہر میں جاتے ہوئے احتیاط تو، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، پہلے بھی وہ کرتے تھے لیکن اب اس واقعہ کے سبب سے اور بھی طرح طرح کے اندیشے رہے ہوں گے کہ معلوم نہیں اس کا ردّعمل ان کے اور ان کی قوم کے خلاف کیا ہوتا ہے، زبانوں پر کیا چرچے ہیں اور ان کے بارے میں کیا چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں! اتنے میں دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو کل ان سے طالب مدد ہوا تھا آج پھر فریاد کر رہا ہے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے اس کو جھڑک دیا کہ تم خود ایک کھلے ہوئے شریر آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اس کے کھلے ہوئے شریر آدمی ہونے کی ایک کھلی ہوئی دلیل تو یہی تھی کہ کل بھی وہ ایک شخص سے الجھا ہوا تھا جس کے نتیجہ میں ایک سنگین حادثہ پیش آ چکا تھا اور آج بھی ایک دوسرے شخص سے وہ لڑ رہا تھا۔ یہ واضح قرینہ اسی بات کا تھا کہ یہ شخص شر پسند ہے۔ اور دوسری وجہ وہ تھی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کی معافی سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اسرائیلی کو مظلوم سمجھ کر اس کی حمایت کرنے میں ان سے غلطی صادر ہوئی، اس معاملے میں ان کو تحقیق کرنی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ وعدہ جو فرمایا تھا کہ آئندہ میں کسی مجرم کی پشت پناہی نہیں کروں گا اس موقع پر انھوں نے اس کا پورا احترام ملحوظ رکھا۔ اس مرتبہ وہ فوراً اس کی حمایت کے لیے نہیں اٹھ کھڑے ہوئے بلکہ قرائن کو سامنے رکھ کر اسی کو تنبیہ کی کہ تم خود ایک جھگڑالو اور شریر آدمی معلوم ہوتے ہو۔

فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ (۱۹)

ایک اسلوب کی وضاحت

'ان' سے پہلے یہاں کوئی مناسب موقع فعل محذوف ہے۔ یعنی جب معاملہ یوں ہوا یا جب بات یہاں تک پہنچی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے پہلے زبانی افہام و تفہیم سے فریقین کو ہموار کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس سے کام نہ چلا بلکہ قبطی نے کچھ اکڑ دکھائی تو آپ نے اس کو پکڑ کر علیحدہ کرنا چاہا۔ اس قبطی کو یہاں 'عَدُوٌّ لَّهُمَا' سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰؑ اور اسرائیلی دونوں کا دشمن۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ اسرائیلی کا تو وہ بالفعل دشمن تھا ہی اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس کی دشمنی قومی اعتبار سے بھی تھی اور اس پہلو سے بھی کہ وہ اپنی اصلاحی سرگرمیوں کے سبب سے تمام قبطیوں کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے تھے۔

اسرائیلی کی حماقت سے افشائے راز

حضرت موسیٰؑ نے پکڑنا تو چاہا قبطی کو لیکن انھوں نے پہلے جھڑکا اسرائیلی کو تھا اس وجہ سے اس نے گمان کیا کہ آج ہو نہ ہو ان کا گھونسا اس پر پڑنے والا ہے۔ اس گھبراہٹ میں وہ چلایا کہ کل تم نے ایک شخص کو جس طرح قتل کیا ہے اسی طرح آج معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ اس طرح اس نے اپنی حماقت سے راز کھول دیا۔ بعض لوگوں نے 'يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ' الخ کو قبطی کا قول قرار دیا ہے لیکن یہ قرین قیاس نہیں کیونکہ ایک تو قتل کا واقعہ ابھی راز تھا، دوسرے قبطی حضرت موسیٰؑ کو مصلح نہیں سمجھتے تھے۔

إِنْ تُرِيْدُ إِلَّآ أَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْأَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ أَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ؏

مفسدوں کا کردار

'جَبَّار' کے معنی یہاں مطلق العنان اور قابو سے باہر کے ہیں۔ یعنی افشائے راز کے ساتھ ساتھ اس نے حضرت موسٰیؑ پر یہ چوٹ بھی کر ڈالی کہ ہم تو یہ گمان کر رہے تھے کہ تم اس ملک میں اصلاح کرنا چاہتے ہو لیکن معلوم ہوا کہ اصلاح نہیں کرنا چاہتے بلکہ ایک بالکل مطلق العنان اور بے قابو آدمی بن کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔۔۔

اس کے اس قول سے ایک طرف تو مفسد لوگوں کا کردار سامنے آتا ہے کہ جب تک کوئی شخص ان کی مدد و حمایت کرے وہ اس کو بہت بڑا مصلح سمجھتے ہیں لیکن اگر وہ ان کو کسی برائی سے روکنے کی کوشش کرے تو وہ نہ صرف اس کو ایک بہت بڑا مفسد قرار دیتے ہیں بلکہ اس کے خلاف جاسوسی کرنے والے اور اس کے رازوں کو طشت از بام کرنے والے بھی بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف اس سے حضرت موسٰیؑ کا کردار بھی سامنے آتا ہے کہ وہ اسی زمانے سے اپنی قوم کے اندر ایک مصلح اور مرجع امید سمجھے جانے لگے تھے۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يٰمُوْسٰٓى إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ إِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ (٢٠)

مومن کا کردار

حضرت موسٰیؑ کی ذات تو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، پہلے ہی سے فرعونیوں کی نظر میں کھٹک رہی تھی لیکن جب یہ واقعہ پیش آ گیا اور ایک اسرائیلی ہی کی زبان سے وہ افشا بھی ہو گیا تو قدرتی طور پر فرعونیوں کی آتش غضب پوری طرح ان کے خلاف بھڑک اٹھی اور وہ ان کے قتل کے منصوبے بنانے لگے۔

'وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى'۔ اصل شہر، جو حکومت اور اعیانِ حکومت کا مرکز تھا، وہ جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بنی اسرائیل کی بستی سے پرے تھا اس وجہ سے اس کو 'أَقْصَا الْمَدِيْنَة' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا کہ وہاں سے ایک شخص یہ معلوم کر کے کہ اعیانِ حکومت حضرت موسٰیؑ کے قتل کے مشورے کر رہے ہیں، بھاگا ہوا حضرت موسٰیؑ کو اطلاع دینے آیا کہ آپ کے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں، میں آپ کا خیر خواہ ہوں اس وجہ سے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ یہاں سے فوراً نکل جائیں۔ اس شخص سے متعلق یہاں کوئی تفصیل مذکور نہیں ہے لیکن سورۂ مومن میں ایک مومن آلِ فرعون کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے ان کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ یہ ابتدا ہی سے حضرت موسٰیؑ کے خیر خواہوں میں سے تھے اور بعد کے ادوار میں، جیسا کہ سورۂ مومن میں تفصیل آئے گی، انھوں نے اعیانِ حکومت کے سامنے حضرت موسٰیؑ کی بڑی پرزور حمایت کی۔ اس وجہ سے ظن غالب یہ ہے کہ یہ اشارہ بھی انہی کی طرف ہے۔

'إِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ'۔ یہ صفائی انھوں نے اس وجہ سے پیش کرنی ضروری سمجھی کہ بدگمانی کی اس فضا میں جو اس وقت اسرائیلیوں اور قبطیوں کے درمیان تھی یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے حضرت موسٰیؑ یہ خیال کریں کہ ایک فرعونی اس طرح ان کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لفظ 'يَسْعٰى' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جونہی ان کو معلوم ہوا کہ معاملہ نہایت سنجیدہ بلکہ خطرناک ہو چکا ہے، وہ اعیانِ حکومت میں سے

ہونے کے باوصف، بھاگے ہوئے حضرت موسیٰؑ کے پاس ان کی بستی میں آئے۔ ان کی یہ سرگرمی ان کی ہمدردی و خیرخواہی کی ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ ۖ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (٢١)

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈرتے اور بچتے بچاتے ہوئے مصر سے نکل کھڑے ہوئے اور چونکہ فرعونیوں کی طرف سے تعاقب کا اندیشہ تھا اس وجہ سے انھوں نے یہ دعا فرمائی کہ اے رب مجھے ان ظالموں کے شر سے نجات دے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَن يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ (٢٢)

حضرت موسیٰؑ کا قصدِ مدین اور اللہ کی راہ میں کام کرنے والوں کے لیے ایک سبق

اسلوبِ کلام سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ جس وقت مصر سے نکلے ہیں اس وقت انھوں نے اپنے سفر کی منزل متعین نہیں کی تھی۔ یہ فیصلہ انھوں نے بعد میں کیا کہ انھیں مدین کی طرف جانا چاہیے اور مدین کے معاملے میں بھی یہ بات ان کے ذہن میں واضح نہیں تھی کہ انھیں کس کے پاس اور کس مقام پر جانا چاہیے بلکہ بغیر کسی تعین کے مدین کی سمت کو اس امید کے ساتھ چل کھڑے ہوئے کہ رب کریم و کارساز سیدھی راہ کی طرف رہنمائی فرمائے گا اور کسی مستقر پر پہنچائے گا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰؑ کا یہ نکلنا اس نوعیت کی ہجرت نہیں تھا جس کا مرحلہ ان کی بعثت کے بعد پیش آیا۔ ہجرت کے معاملے میں تو سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ اس کا وقت بھی اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرمایا ہے اور اس کے تمام مراحل و منازل بھی اپنے رسول پر خود واضح فرمائے ہیں لیکن اس سفر میں حضرت موسیٰؑ کے سامنے اس طرح کی کوئی واضح غیبی رہنمائی نہیں تھی۔ بس متوکلاً علی اللہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے اسی توکل نے ان کی دستگیری و رہنمائی کی۔ اس پہلو سے یہ واقعہ اللہ کے ان تمام بندوں اور بندیوں کے لیے نہایت سبق آموز ہے جن کو حق کی راہ میں کوئی ابتلاء پیش آئے۔ اگر وہ اللہ کے اعتماد پر کوئی قدم اٹھائیں گے تو ان کو خدا کی رہنمائی حاصل ہوگی اگرچہ اس کے لیے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح بشارت نہ ملی ہو۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ وَوَجَدَ مِن دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ ۖ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۖ قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّعَاءُ ۖ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ (٢٣)

'ماء' سے مراد

'ماء' سے مراد چشمہ بھی ہو سکتا ہے اور کنواں بھی۔ تورات میں کنویں ہی کا ذکر آیا ہے ویسے پہاڑی چشمے بھی کنووں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ بالعموم ان تک پہنچنے کے راستے نہایت تنگ ہوتے ہیں اس وجہ سے ان پر پانی پینا اور پلانا کوئی سہل کام نہیں ہوتا بالخصوص جب کہ پانی پینے پلانے والوں کی بھیڑ بھی ہو۔

ایک واقعہ کا حضرت موسیٰؑ پر اثر

حضرت موسیٰؑ مدین پہنچے تو اس کے کنویں یا چشمے پر بیٹھ گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ چرواہوں کی ایک بھیڑ اپنے اپنے گلوں کو پانی پلا رہی ہے اور دو عورتیں اپنے گلے کو روکے ہوئے ان سے پرے

کھڑی ہیں۔ لفظ 'تَذُوْدٰنِ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا گلہ تو گھاٹ پر پہنچ کر پانی پینے کے لیے آگے بڑھنے کے لیے زور لگا رہا ہے لیکن ان بیچاریوں کو زبردستی اس کو پیچھے ہٹانا پڑ رہا ہے۔ انھوں نے ان سے پوچھا کہ تمھارے سامنے کیا مشکل ہے؟ یہاں آ کر تم اپنے گلے کو کیوں روکے کھڑی ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے باپ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں گلے کی دیکھ بھال ہمیں کرنی پڑ رہی ہے اور ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس بھیڑ کے اندر گھس کر اپنے گلے کو پانی پلا سکیں اس وجہ سے ہمیں چرواہوں کے واپس ہونے تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جب تک وہ اپنے گلے ہٹا نہ لیں ہم اپنے گلے کو پانی نہیں پلا سکتے۔

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (۲۴)

حضرت موسیٰ کا جذبۂ حمایت ضعیف

ان شریف زادیوں کی یہ بات سن کر حضرت موسیٰ کا جذبۂ حمایتِ ضعیف بھڑک اٹھا۔ وہ اٹھے اور ان کی بکریوں کو انھوں نے پانی پلا دیا۔ اور پانی پلا کر پھر اسی سایہ میں آ کر بیٹھ گئے جس کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور دعا فرمائی کہ اے رب! اس وقت جو چیز بھی تو میرے لیے نازل فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔

چند قابلِ توجہ باتیں

یہاں چند باتیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت موسیٰ کو یہ بات نہایت اہم محسوس ہوئی کہ دو شریف لڑکیوں کو بکریاں چرانے کا پُرمشقت کام کرنا پڑ رہا ہے اور وہ اس بے بسی کے ساتھ عین گھاٹ کے سامنے اپنی بکریوں کو روکے کھڑی ہیں۔ حضرت موسیٰ کے اس احساس کا اظہار ان کے 'مَا خَطْبُكُمَا' کے سوال سے ہو رہا ہے۔ عربی میں لفظ 'خَطْبٌ' کسی امر عظیم و اہم ہی کے لیے آتا ہے اس وجہ سے ان کے اس سوال کے اندر یہ بات مضمر ہے کہ تمھیں کیا افتاد اور مشکل پیش آئی ہے کہ بکریوں کی چرواہی کی یہ پُرمشقت خدمت تمھیں انجام دینی پڑ رہی ہے اور تم اس طرح اپنی بکریوں کو یہاں روکے کھڑی ہو، صاحبزادیوں نے حضرت موسیٰ کے سوال کو بالکل ٹھیک ٹھیک سمجھ کر جواب دیا کہ یہ خدمت ہمیں اس لیے انجام دینی پڑ رہی ہے کہ ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں اور ہم اپنی بکریوں کو اس لیے روکے کھڑی ہیں کہ ہم مردوں کی اس بھیڑ میں نہیں گھس سکتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دور میں بھی عورتوں اور مردوں کے دائرۂ کار الگ الگ سمجھے جاتے تھے اور اگر عورتوں کو کسی مجبوری کے سبب سے کوئی اس طرح کی خدمت انجام دینی ہی پڑتی تھی جو مردوں کے دائرۂ کار سے تعلق رکھنے والی ہو تو اس کو انجام تو دیتی تھیں لیکن محض بربنائے مجبوری اور وہ بھی مردوں کے شانہ بشانہ اور ان کے اندر گھل مل کر نہیں بلکہ پوری احتیاط اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ، حتی الامکان مردوں سے الگ تھلگ رہتے ہوئے۔ ایک طرف حضرت شعیبؑ کے زمانے کے اس معاشرتی تصور کو سامنے رکھیے جس کی شہادت حضرت شعیبؑ کی صاحبزادیوں اور حضرت موسیٰؑ کے اس واقعے سے ملتی ہے۔ دوسری طرف اپنی قوم کے ان سماجی مصلحین کے دعوے پر غور کیجیے جو کہتے ہیں کہ عورتوں اور مردوں کا دائرۂ کار بالکل ایک ہی ہے اس لیے دونوں کو ہر میدان میں بالکل شانہ بشانہ کام کرنا چاہیے۔ یہ حضرات دلیل تو اپنے

دیتے ہیں۔ پر دیہاتوں کی غریب عورتوں کی زندگی سے پیش کرتے ہیں لیکن نتیجہ اس سے شہروں کی بیگمات کے لیے اخذ کرتے ہیں۔

دوسری چیز اس واقعہ میں قابلِ توجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حمایتِ ضعیف کا حق تو فوراً پوری مستعدی سے ادا کر دیا کہ یہ ان کی فتوت و مروت کا تقاضا تھا لیکن اس کے بعد ایک حرف بھی ان صاحبزادیوں کے سامنے ان کی زبان سے ایسا نہیں نکلا جس سے ان کی کسی پریشانی یا مسافرت یا ضرورت کا اظہار ہو بلکہ جس سایہ سے ان کی مدد کے لیے اٹھے تھے اسی سایہ میں آ کر پھر بیٹھ گئے۔ اور اپنے رب سے دعا کی کہ اے رب جس منزل کو سامنے رکھ کر میں نے ادھر کا رخ کیا تھا وہ تو آ گئی۔ اب بس تیرے فضل و رحمت کا منتظر ہوں، تو جو خیر بھی اس مرحلے میں میرے لیے نازل فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔ اس دعا کی بلاغت کی تعبیر سے زبان قاصر ہے۔ صرف اہلِ ذوق ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ چونکہ یہ دعا بالکل صحیح وقت پر، صحیح جذبے کے ساتھ، بالکل صحیح الفاظ میں زبان سے نکلی اس وجہ سے اس کا اثر بلا کسی تاخیر کے ظاہر ہوا۔ صاحبزادیوں نے حضرت موسیٰ کے اس احسان کا ذکر اپنے باپ سے کیا اور اس طرح حضرت موسیٰ کے لیے اس خیر کی راہ کھل گئی جس کے لیے انھوں نے دعا فرمائی تھی۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِىْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۭ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۪ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۲۵)

حضرت موسیٰ کے لیے خیر کی راہ

حضرت موسیٰ ابھی سایہ ہی میں بیٹھے تھے کہ ان میں سے ایک صاحبزادی لجاتی شرماتی ہوئی آئیں اور بولیں کہ آپ کو ہمارے والد ماجد بلاتے ہیں کہ آپ نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا آپ کو صلہ دیں۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روز صاحبزادیاں چونکہ معمول کے خلاف وقت سے پہلے فارغ ہو کر گھر پہنچ گئیں اس وجہ سے حضرت شعیبؑ نے ان سے پوچھا کہ آج تم اتنی جلدی کیسے چلی آئیں؟ اس پر انھوں نے بتایا کہ آج ایک مصری نے ہم پر یہ احسان کیا کہ اس نے ہماری بکریوں کو خود بھر کر پانی پلا دیا۔ حضرت شعیبؑ نے ان سے فرمایا تم نے ان کو چھوڑ کیوں دیا؟ جا کر ان کو بلا لاؤ کہ ہمارے ہاں روٹی کھائیں۔ باپ کے حکم کی تعمیل میں ایک صاحبزادی حضرت موسیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بولیں کہ آپ کو ہمارے والد بلاتے ہیں کہ آپ نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا بدلہ دیں۔ حضرت موسیٰؑ اس وقت اس طرح کی کسی مدد کے نہایت محتاج تھے۔ اس کو انھوں نے ایک تائیدِ غیبی سمجھا اور فوراً اس کے ساتھ ہو لیے۔

شریف بیبیوں کے اطوار

یہاں تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ کے الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ اوپر مِنْ دُوْنِهِمُ کے الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ وہ چرواہوں کی بھیڑ سے بالکل الگ کھڑی ہوتی تھیں۔ یہ بات بھی اوپر گزر چکی ہے کہ انھوں نے اپنی اس کنارہ کشی کی علت یہ بیان فرمائی کہ مردوں کی بھیڑ سے بچنے کے لیے انھیں یہ زحمت اٹھانی پڑتی ہے کہ جب تک چرواہے یہاں سے ہٹ نہ جائیں وہ انتظار کرتی ہیں۔ پھر یہاں

فرمایا کہ جب وہ حضرت موسیٰ کو بلانے کے لیے آئیں تو شرماتی ہوئی آئیں۔ یعنی یہ نہیں کیا کہ آکر بے دھڑک حضرت موسیٰ کے سامنے کھڑی ہو جائیں بلکہ سمٹی سمٹائی، کپڑوں کو سنبھالے اور اپنی احتیاط کی جگہوں کو محفوظ کیے ہوئے آئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ واقعہ کی یہ جزئیات قرآن نے اس جزرسی کے ساتھ کیوں بیان فرمائی ہیں؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن ہر قدم پر یہ نمایاں کرنا چاہتا ہے کہ شریفانہ زندگی کے عادات و اطوار کیا ہیں اور شریف بی بیوں کو مردوں کے معاملے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہی شریفانہ عادات و اطوار ہیں جن کو قرآن نے ایک ضابطہ کی صورت میں سورۂ نور اور سورۂ احزاب میں ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ سورۂ نور کی تفسیر میں اس ضابطہ کی وضاحت ہم کر چکے ہیں اور خدا نے چاہا تو احزاب کی تفسیر میں اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رکھیے کہ یہ ان خواتین کے عادات و اطوار بیان ہوئے ہیں جنھیں اپنی بکریوں کی چرواہی کرنی پڑتی تھی۔ تو جب ان کے لیے عنداللہ پسندیدہ روش یہ ہے تو ان خواتین کے لیے پسندیدہ روش کیا ہوگی جن کو اس طرح کی کوئی مجبوری نہیں ہے!

فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۔

(حضرت موسیٰ حضرت شعیبؑ کی خدمت میں) حضرت شعیبؑ کی اس دعوت پر حضرت موسیٰؑ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو اپنی ساری داستان سنائی۔ حضرت شعیبؑ نے ان کا سارا ماجرا سن کر فرمایا کہ اب تم کوئی اندیشہ نہ کرو۔ خدا نے ظالموں سے تمھیں نجات دی۔ گویا اس طرح حضرت موسیٰؑ کو ان کی اس دعا کی قبولیت کی بشارت مل گئی جو انھوں نے مصر سے نکلتے ہوئے بدیں الفاظ فرمائی تھی۔ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ؗ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ (۲۶)

یہاں اِحْدٰىهُمَا کے اعادے سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰ کے حق میں یہ سفارش حضرت شعیبؑ کی دوسری صاحبزادی نے فرمائی۔ اگر انھی نے یہ سفارش کی ہوتی جو ان کو بلانے کے لیے گئی تھیں تو یہاں فاعل کے اعادے کی ضرورت نہیں تھی۔

(صاحب کردار کے کردار کا اندازہ ایک نظر ہی میں ہو جاتا ہے) حضرت شعیبؑ کو اپنے گلے کی دیکھ بھال کے لیے ایک مددگار کی ضرورت تو تھی ہی اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہ کسی موزوں آدمی کی تلاش میں بھی تھے۔ اس وجہ سے صاحبزادی صاحبہ نے سفارش کی کہ انھی کو ملازم رکھ لیجیے۔ بہترین ملازم وہی ہوتا ہے جو قوی اور امانت دار ہو۔ یہ قوی بھی ہیں اور ساتھ ہی امانت دار بھی۔ جہاں تک جسمانی صحت و قوت کا تعلق ہے یہ ایک ایسی کھلی ہوئی چیز ہے کہ آدمی بیک نظر اس کا اندازہ کر سکتا ہے لیکن امانت و دیانت کا تعلق کردار سے ہے جس کا صحیح صحیح اندازہ تجربہ سے ہوتا ہے۔ یہ تجربہ عام حالات میں تو بہت دیر میں ہوتا ہے لیکن بعض حالات میں بالکل باوّلِ وہلہ ہو جاتا ہے۔ آدمی کی پیشانی اور اس کی نگاہیں گواہی دیتی ہیں کہ یہ کس کردار کا آدمی ہے۔ صاحبزادی صاحبہ نے حضرت موسیٰؑ کی مروت، بے نیازی اور پاکیزہ نگاہی کا تجربہ تو خود ہی کر لیا تھا پھر ان کی فتوت کی وہ سرگزشت، جو

حضرت موسیٰؑ نے حضرت شعیبؑ کو سنائی، سن کر ان پر یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی کہ اس عزم و ہمت کے آدمی کے اندر اگر امانت و دیانت نہ ہوگی تو بھلا کس میں ہوگی!

قَالَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ عَلَىٰ أَن تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَ حِجَجٍ ۖ فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِندِكَ ۖ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ ۚ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ (۲۷)

حضرت شعیبؑ کی پیشکش

حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے یہ پیش کش فرمائی کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح اس شرط پر تمھارے ساتھ کر دوں کہ تم آٹھ سال میری خدمت کرو اور اگر تم نے دس سال پورے کر دیے تو یہ تمھاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں اس معاملے میں تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا، ویسے ان شاء اللہ تم مجھے بھلے آدمیوں میں سے پاؤ گے۔ قرینہ دلیل ہے کہ حضرت شعیبؑ نے یہ پیش کش اشارۂ غیبی پر فرمائی ہوگی اور ان کا یہ ارشاد کہ 'وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ' حضرت موسیٰؑ کو معاملہ پر غور کر کے فیصلہ کرنے کے لیے ایک مہلت تھی کہ وہ اس شرط پر اچھی طرح غور کر کے فیصلہ کریں، ان کے دباؤ میں آکر مجبورانہ کوئی فیصلہ نہ کریں۔

یہاں مہر کے معاملے پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ مہر کا تعلق کلیۃً لڑکی کی مرضی سے ہے۔ اگر باپ اس کا نکاح کسی ایسی شرط پر کر دے جو جائز ہو اور لڑکی اس پر راضی ہو تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

قَالَ ذَٰلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ ۖ أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۖ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ (۲۸)

حضرت موسیٰؑ کی طرف سے پیشکش کی منظوری

حضرت موسیٰؑ نے یہ پیش کش اور یہ شرط دونوں منظور کر لیں۔ فرمایا کہ ان دونوں مدتوں میں سے جو مدت بھی میں پوری کر سکا مجھے اس کا اختیار حاصل رہے گا۔ 'نَقُولُ' یہاں قول و قرار اور عہد و پیمان کے مفہوم میں ہے یعنی اس وقت ہم جو قول و قرار کر رہے ہیں اس پر ہم اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں۔

فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ آنَسَ مِن جَانِبِ الطُّورِ نَارًا قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ (۲۹)

سفر کی واپسی اور جلوۂ طور کا مشاہدہ

حضرت موسیٰؑ موعودہ مدت پوری کرنے کے بعد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مصر کے لیے روانہ ہوئے۔ اس بات کی تصریح قرآن یا تورات میں نہیں ہے کہ انھوں نے آٹھ سال کی مدت پوری کی یا وہاں دس سال گزارے۔ البتہ تورات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ بیوی کے سوا آپ کے دو بچے بھی تھے۔ جب جبل طور کے قریب پہنچے تو رات اندھیری تھی اور سردی بھی تھی۔ اندھیرے میں راستہ کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اتنے میں طور کی جانب سے آگ کی ایک جھلک سی دکھائی دی۔ آپ نے بیوی بچوں سے فرمایا، تم لوگ یہیں

شہود۔ مجھے آگ کی جھلک نظر آئی ہے ۔ میں وہاں جاتا ہوں ۔ اگر وہاں کچھ لوگ ہوئے تو راستہ کی خبر لاتا ہوں ورنہ آگ ہی کا ایک انگارہ لاؤں تاکہ تم لوگ تاپ سکو۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۰)

اس آیت کے تمام اجزاء کی وضاحت سورۂ طٰہٰ اور سورۂ نمل وغیرہ کی تفسیر میں پیچھے گزر چکی ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ اس جگہ پہنچے جہاں سے ان کو آگ نظر آئی تھی تو وادیٔ مبارک کے کنارے سے، جو مبارک خطہ میں تھی، ایک خاص درخت سے یہ آواز آئی اے موسیٰ! یہ تو میں ہوں، اللہ، عالم کا خداوند۔

یہاں آواز کی نشان دہی کے لیے تین ظرف مذکور ہوئے ہیں، ایک یہ کہ یہ آواز وادیٔ مبارک کی سمت سے آئی، دوسرا یہ کہ یہ وادی، مبارک خطہ میں تھی، تیسرا یہ کہ یہ آواز ایک خاص درخت سے آئی۔ ان تمام تعینات کے ذکر سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو یہ آواز فضائے لامتناہی کے اندر ایک مبہم وبے جہت آواز کی صورت میں نہیں بلکہ تعین جہت و مقام کے ساتھ ایک مبارک وادی، ایک مبارک خطہ اور ایک مبارک درخت سے سنائی دی۔ کسی وادی یا خطہ یا درخت کا مبارک ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے نور و ظہور کے لیے انتخاب فرمایا اور اس کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ اس کے قدوسیوں کی جلوہ گاہ اور ہر قسم کی شیطانی دراندازی سے پاک و محفوظ ہو۔ سورۂ نمل کی آیت ۸ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

پہلی آواز جو حضرت موسیٰؑ کو سنائی دی

'اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ' اوپر کے ٹکڑے میں آواز کے محل و مقام کی پاکی و برتری کا اظہار تھا۔ یہ وہ آواز ہے جو سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کو سنائی دی۔ ارشاد ہوا کہ تم تو آگ سمجھ کر یہاں آگ لینے آئے ہو لیکن یہاں آگ نہیں بلکہ میں ہوں، اللہ، عالم کا خداوند! یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات والا صفات کا تعارف کرایا ہے۔ 'رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ' کے مضمرات بہت وسیع ہیں اس وجہ سے بعض مقامات میں یہی مضمون دوسرے الفاظ میں بھی وارد ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ نمل میں ہے اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' یہ اسی 'رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ' ہی کے مضمون کی وضاحت دوسرے الفاظ میں ہے۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ (۳۱)

پہلا معجزہ

ساتھ ہی یہ ہدایت ہوئی کہ اپنا عصا زمین پر ڈال دو۔ حضرت موسیٰؑ نے اس ہدایت کی تعمیل کی تو دیکھا کہ عصا سانپ کی طرح حرکت کرنے لگا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ سخت دہشت زدہ ہوئے اور اس طرح پیچھے کو بھاگے کہ اس کی طرف مڑ کے دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کی۔ 'وَلَمْ يُعَقِّبْ' کی وضاحت سورۂ نمل کی آیت ۱۰ کے تحت ہو چکی ہے۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کو نبوت کے ابتدائی مشاہدات بالکل بے سان گمان پیش آتے ہیں، نہ ان کے ذہن میں پہلے سے ان کا کوئی تصور ہوتا، نہ ارمان، اس وجہ سے شروع شروع میں وہ ان سے گھبراتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کو بالتدریج ان سے مانوس کر دیتا ہے۔ ساحروں، کاہنوں، متنبیوں اور مفتریوں کے ذہن میں تو پہلے سے ایک اسکیم ہوتی ہے اور وہ اس کے لیے بہت سے پاپڑ بیلتے ہیں اور جب ان کو عوام فریبی کے لیے کوئی شعبدہ ہاتھ آجاتا ہے تو اس کو اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھتے ہیں لیکن حضرات انبیائے کرام اس قسم کے وساوس سے بالکل پاک ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو کوئی معجزہ دیا جاتا ہے تو وہ ان کے لیے ایک بالکل انوکھی چیز ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ جس قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے جانے والے تھے اس کے ساحروں کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ اپنی لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپ بنا دیتے اور اس فن کو حاصل کرنے کے لیے نہیں معلوم وہ کیا کیا ریاضتیں کرتے اور جب اس میں کامیاب ہو جاتے تو سمجھتے کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی مراد حاصل ہو گئی لیکن حضرت موسیٰ کا حال یہ ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی لاٹھی کو سانپ بنا دیا تو وہ اس سے خوف زدہ ہو کر بھاگے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے اس ابتدائی مشاہدہ کے اس پہلو کو خاص طور پر اسی لیے نمایاں فرمایا ہے کہ آپ کے جس معجزے کو فرعونیوں نے سحر و ساحری کا کرشمہ قرار دیا اس کو دیے جانے کے وقت حضرت موسیٰ پر کیا گزری!

یٰمُوْسٰٓی اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ قف اِنَّکَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ۔ حضرت موسیٰؑ پر یہ اضطراری دہشت جب طاری ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے نہایت رأفت کے ساتھ ان کو اطمینان دلایا کہ اے موسیٰؑ! آگے بڑھو، اس کو اٹھاؤ، اس سے تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ خطرہ ہے تو تمہارے دشمنوں کے لیے ہے تم ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہو۔ سورۂ نمل میں یہی مضمون لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی تم تو ہمارے ایک رسول ہو۔ ہم اپنے رسولوں کو اپنے خاص اسلحہ سے مسلح کرتے ہیں۔ ان سے جو خطرہ پیش آتا ہے وہ ہمارے دشمنوں کو پیش آتا ہے نہ کہ ہمارے رسولوں کو۔

اُسْلُکْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ز وَّاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِکَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّکَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ (۳۲)

یہ دوسرے معجزے کے ظہور کا طریقہ بتایا گیا کہ تم اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو، پھر جب اس کو نکالو گے تو وہ بغیر کسی مرض کے چٹا سفید نکلے گا۔ وَاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّهْبِ' یہ ہاتھ کو گریبان میں ڈالنے کا طریقہ بتایا گیا کہ جس طرح کوئی شخص ڈر سے اپنے بازو بھینچ لیتا ہے اسی طرح تم اپنا ہاتھ بازو کے اندر ڈال کر اس کو بھینچ لو۔ یہی مضمون سورۂ طٰہٰ میں یوں بیان ہوا ہے۔

وَاضْمُمْ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ (۲۲)	اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان کی طرف سکیڑ لو وہ وہاں سے بغیر کسی مرض کے سفید برآمد ہوگا۔

'مِنَ الرَّهْبِ' یہاں اسی طرح آیا ہے جس طرح دوسرے مقامات میں 'مِنَ الذُّلِّ' یا 'مِنَ الرَّحْمَةِ' وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ۔

'الیٰ' سے پہلے یہاں کوئی فعل محذوف ہے جس کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں، آگے بھی آرہی ہیں۔ یعنی اپنے رب کی طرف سے ان دو واضح نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے پاس انذار کے لیے جاؤ۔ 'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ' میں اس بات کی توجیہ ہے کہ تمھیں ان عظیم نشانیوں سے کیوں مسلح کیا گیا ہے اور فرعون اور اس کی قوم کے پاس تمھیں کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ اس لیے کہ وہ بڑے ہی نافرمان اور سرکش ہو گئے ہیں۔ ان کو اس سرکشی کے انجام سے آگاہ اور ان واضح نشانیوں کے ذریعہ سے ان پر حجت تمام کر دو۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ (۳۳)

حضرت موسیٰؑ کا ایک اندیشہ

حضرت موسیٰؑ اس عظیم مہم کے لیے حکم الٰہی کی تعمیل میں تیار تو ہو گئے لیکن ساتھ ہی اپنے ایک اندیشہ کا بھی انھوں نے اظہار فرمایا کہ میں نے ان کے ایک آدمی کو قتل کیا ہے اس وجہ سے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے دیکھتے ہی قتل کر دیں گے۔ حضرت موسیٰؑ کا مطلب یہ تھا کہ یوں تو میں آٹھ دس سال باہر گزارنے کے بعد مصر جا رہا ہوں اس وجہ سے گمان ہے کہ شاید وہ اس واقعہ کو بھول چکے ہوں لیکن ایک رسول کی حیثیت سے اگر میں ان کے پاس گیا تو بھلا وہ کب مجھے معاف کرنے والے ہیں۔

وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ۡ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ (۳۴)

'رِدْاً' کے معنی مددگار و معین کے ہیں۔ دوسرے مقامات میں اسی مفہوم کے لیے 'وزیر' استعمال ہوا ہے۔

'يُّصَدِّقُنِيْٓ' یعنی 'يُؤَيِّدُنِيْ' وہ میری مدد کریں۔

حضرت ہارونؑ کے تعاون کی درخواست

یہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی ایک اور مشکل کا اظہار فرمایا۔ سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ وہ اپنی اس عظیم ذمہ داری کے اعتبار سے اپنی قوت بیان میں کمی محسوس فرماتے تھے اس وجہ سے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست بھی کی کہ میرے بھائی ہارونؑ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں، انھیں اس کام میں میرا مددگار بنا دے کہ وہ میری تائید و مدد کریں۔ یہی بات دوسرے مقام میں یوں مذکور ہوئی ہے کَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا (طٰہٰ ۲۰: ۳۳-۳۴) (تاکہ ہم دونوں مل کر تیری زیادہ سے زیادہ تسبیح کریں اور تیرا زیادہ سے زیادہ چرچا پھیلائیں) —— 'اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ' یعنی مجھے یہ ڈر ہے کہ وہ میری بات آسانی سے نہیں مانیں گے بلکہ مجھے جھٹلانے کی کوشش کریں گے اس وجہ سے میری مدد ایک فصیح اللسان

آدمی کے ذریعہ سے فرما کر ہم دونوں مل کر پوری قوت سے ان پر اتمام حجت کریں۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا ۚ بِآيَاتِنَا ۚ أَنتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُونَ (۳۵)

'سُلْطَانٌ' سے مراد یہاں غلبہ، دبدبہ اور ہیبت ہے۔

'بِآيَاتِنَا' میں دو امکان ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو 'نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا' سے متعلق مانیے یعنی ہم اپنے معجزات کے ذریعہ سے فرعونیوں پر تمھارا دبدبہ قائم کر دیں گے۔ دوسرا یہ کہ اس سے پہلے کوئی محذوف مانیے جس کی مثال اوپر آیت ۳۴ میں گزر چکی ہے۔

فرعونیوں پر حضرت موسیٰؑ کا رعب

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی درخواست حضرت ہارونؑ کے بارے میں منظور فرمائی اور ساتھ ہی ان کو یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ تم خاطر جمع رکھو، ہم فرعونیوں پر تمھارا ایسا رعب و دبدبہ قائم کر دیں گے کہ وہ تم پر دست درازی کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان پہلے ہی مقابلے میں حضرت موسیٰؑ سے اتنے مرعوب ہو گئے کہ ان سے پیچھا چھڑانے کی دلی تمنا رکھنے اور اپنی تمام سطوت و طاقت کے باوجود ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس کا بڑا سبب جو تورات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے یہ ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان حضرت موسیٰؑ کو جھوٹا آدمی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو یقین تھا کہ یہ سچے آدمی ہیں۔ لیکن ان کی دعوت چونکہ ان کو اپنے مفاد کے خلاف نظر آتی تھی اس وجہ سے اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ تاہم وہ جانتے تھے کہ اگر ہم نے ان کو کوئی گزند پہنچایا تو ہماری خیر نہیں ہے۔ اس وجہ سے تمام عناد و مخاصمت کے باوجود انھوں نے ان کے قتل کی جرأت نہیں کی۔ تورات سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ جب مصر پر کوئی آفت آتی تو وہ حضرت موسیٰؑ ہی سے درخواست کرتے کہ وہ اپنے رب سے دعا کریں کہ یہ آفت ٹل جائے۔

فَلَمَّا جَاءَهُم مُّوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَمَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ (۳۶)

حضرت موسیٰؑ کے معجزات اور ان کی دعوت کی مخالفت

جب حضرت موسیٰؑ ان روشن اور ناقابلِ تردید نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے پاس آئے تو انھوں نے ان کے معجزات کو تو جادو کا کرشمہ قرار دیا اور ان کی دعوت توحید کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ یہ ہمارے آباؤ اجداد کی روایات کے بالکل خلاف ہے۔ 'سِحْرٌ مُّفْتَرًى' یعنی حضرت موسیٰؑ یہ کرشمے دکھاتے تو ہیں اپنے جادو کے زور سے لیکن ہم پر رعب جمانے کے لیے جھوٹ دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ یہ معجزے ہیں جو ان کو خدا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ 'مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ' کا اشارہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت توحید کی طرف ہے۔ یعنی ان کا یہ دعویٰ کہ یہ رب العلمین کے رسول ہیں بالکل انوکھا اور نرالا دعویٰ ہے۔ ہم نے اپنے اگلوں سے کسی رب العالمین کا ذکر کبھی نہیں سنا۔ آگے آیت ۳۸ میں اس کی

وضاحت اسی ہے۔ بعینہٖ یہی بات ہے جو دوسرے مقامات میں مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ کے الفاظ میں گزر چکی ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۳۷)

مستقبل سے متعلق حضرت موسیٰ کا چیلنج یہ مستقبل سے متعلق حضرت موسیٰ کا ان کو چیلنج ہے کہ تم لوگ مجھے مفتری قرار دے رہے ہو تو میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا ہے اور کون لوگ جانتے بوجھتے اس کو جھٹلا رہے ہیں! کس کو انجام کار کی کامیابی حاصل ہونے والی ہے اور کون مغلوب و نامراد ہونے والے ہیں! دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ حضرت موسیٰ نے نہایت بلیغ اور شائستہ اسلوب میں یہ اعلان فرما دیا کہ میں اور میرے ساتھی ان شاء اللہ غالب و متمند رہیں گے اور تم لوگ ذلیل و خوار ہو کر رہو گے۔

یعنی یہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ جو لوگ خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کی تکذیب کریں گے وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں اور یہ ظالم ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔ اسلوب کلام دلیل ہے کہ یہاں مقابل کا جملہ محذوف ہے۔ ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَي الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ (۳۸)

'ھامان' کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔ یہاں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو فرعون کے وزیر اعظم یا کم از کم وزیر تعمیرات کی حیثیت حاصل تھی۔

فرعون کا استہزاء 'اَوْقِدْ عَلَى الطِّيْنِ' کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اینٹوں کا پزاوہ لگوا اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مٹی کی عمارت بنوا کر اس پر آگ دہکا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نینوا اور مصر وغیرہ میں تعمیر کا یہ طریقہ معروف رہا ہے کہ مٹی کا مکان بنا کر اس پر خوب آگ دہکاتے جس سے دیواروں پر چینا کاری کی صورت پیدا ہو جاتی اور وہ بارش و ہوا کے اثرات سے بالکل محفوظ ہو جاتیں۔

'لَعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى' میں 'اِلٰی' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں تضمین ہے۔ گویا پوری بات یوں ہے۔ 'لَعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ عَلَى الصرح فانظر الى الٰه موسٰى' ظاہر ہے کہ اس نے یہ بات محض حضرت موسیٰ کا مذاق اڑانے کے لیے کہی۔ سورۂ زخرف کی آیت ۵۴ سے بھی اس کی نوعیت محض مذاق و استہزاء ہی کی معلوم ہوتی ہے۔

فرعون نے پہلے تو اپنے درباریوں کو مخاطب کر کے کہا کہ موسیٰ (علیہ السلام) جس رب العالمین کے رسول بن کر وارد ہوتے ہیں مجھے تو اس رب العلمین کا کوئی علم نہیں ہے۔ تمہارا معبود اپنے سوا میں کسی کو نہیں سمجھتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس فتنہ سے تم لوگ ہوشیار رہو۔ اس کے بعد ہامان سے مخاطب ہو کر اس نے کہا کہ اے ہامان!

تم پکا کر اینٹوں کا پزاوہ لگوا کر ایک اونچی عمارت بنواؤ تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے رب کو جھانک کر دیکھ لوں کہ وہ کہاں بیٹھا ہوا ہے! میں تو اس شخص کو بالکل جھوٹا سمجھتا ہوں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ فراعنہ و متمردین اسا اوقات نہایت واضح حقائق کا اسی طرح مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے اندھے پیروکاروں کے لیے یہی مذاق دلیل بن جاتا ہے بلکہ کتنے احمق تو اس کے مذاق کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ فرعون کے پرستاروں کے لیے کچھ بعید بھی نہیں کہ وہ اس کو حقیقت سمجھے ہوں ... رہا ہے ... اس کی حیثیت مصریوں کے نزدیک ان کے سب سے بڑے دیوتا — سورج — کے ... مینار کی تھی۔ ایک او نار کے لیے آسمانوں کے اطراف و جوانب میں جھانک لینا کیا مشکل ہے! سورۂ مومن میں اس کا یہ قول یوں نقل ہوا ہے۔ یٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ (المومن ۴۰: ۳۶-۳۷) (اے ہامان! میرے لیے ایک اونچی عمارت بنوا تاکہ میں آسمانوں کے اطراف میں پہنچوں) اس پہلو سے اس کی یہ بات اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ (۳۹)

استکبار بغیر الحق

'يَعْنِيْ بِغَيْرِ الْحَقِّ' کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ وہی مفہوم 'اسْتِكْبَارٌ بِغَيْرِ الْحَقِّ' کا بھی ہے۔ اس زمین و آسمان میں استکبار کا حق صرف اس کو حاصل ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور ان کے نظام کو چلا رہا ہے۔ جن کو نہ ان کے خلق میں کوئی دخل اور نہ جن کا ان کے تدبیر و انتظام میں کوئی حصہ اگر وہ اس میں اکڑتے ہیں اور اپنی مالکیت کے مدعی بن کر اٹھتے ہیں تو یہ ان کی شامت کی دلیل ہے۔ اس قسم کے استکبار کو اس کائنات کا خالق زیادہ مہلت نہیں دیتا۔ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ اس زمین کے بادشاہِ حقیقی کے حکم و قانون کے خلاف کوئی قانون اس میں جاری کرنا بھی 'استکبار بغیر الحق' میں داخل ہے اور یہ ٹھیک ٹھیک اسوۂ فرعون کی پیروی ہے۔

'وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ' یہ اس استکبار کی علت بیان ہوئی ہے کہ وہ اس وجہ سے اس میں مبتلا ہوئے کہ انھوں نے یہ گمان کیا کہ خدا نے ان کو شترِ بے مہار بنا کر چھوڑ رکھا ہے اور ان کو اس کے سامنے کبھی جواب دہی کے لیے حاضر ہونا نہیں ہے۔

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ (۴۰)

استکبار کا انجام

یہ اس استکبار کا انجام بیان فرمایا کہ ہم نے فرعون اور اس کی فوجوں کو پکڑا اور ان کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔ ان کے پکڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو تدبیر اختیار فرمائی اس کی پوری تفصیل پچھلی سورتوں، بالخصوص سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں، گزر چکی ہے۔ 'فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ' یہ اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جس کو واضح کرنے ہی کے لیے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور ان فرعونوں کے لیے تنبیہ و تذکیر بھی جو آنحضرتؐ

اور آپ کی دعوت کے معاملے میں بالکل اسی روش پر چل رہے تھے جو روش حضرت موسیٰؑ کے مقابل میں فرعون اور اس کے اعوان و انصار نے اختیار کی تھی۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ (۴۱)

'جَعَلْنَا' یہاں 'اَمْهَلْنَا' کے مفہوم پر متضمن ہے جس کی مثالیں گزر چکی ہیں اور 'يَدْعُوْنَ' سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔

یہ اس استکبار کے انجام کی مزید تفصیل ہے کہ ہم نے دنیا میں ان کو ڈھیل دی اور وہ جہنم کی طرف دعوت دینے والے لیڈر بنے رہے اور قیامت کے روز ان کا حال یہ ہوگا کہ کسی طرف سے ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔ دنیا میں وہ جن کے امام و پیشوا بنے رہے وہ سب ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت ہوگی۔ نہ لیڈر پیرؤوں کے کچھ کام آسکیں گے اور نہ پیرو لیڈروں کے۔

وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ (۴۲)

جس دنیا میں وہ لیڈری اور پیشوائی کرتے رہے اور لوگوں سے اپنے نعرے لگواتے رہے، فرمایا کہ اس میں ہم نے ان کے پیچھے ہمیشہ کے لیے لعنت لگا دی اور آخرت میں بھی وہ ذلیل و خوار ہوں گے۔ یہی مضمون سورۂ ہود میں یوں بیان ہوا ہے۔

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ	تو انھوں نے فرعون کی رائے کی پیروی کی اور فرعون کی
فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ۔ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ	رائے صائب نہ تھی، وہ قیامت کے دن اپنی قوم
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ	کے آگے آگے ہوگا اور ان کو دوزخ کے گھاٹ پر
وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۔ وَ	اتارے گا اور کیا ہی برا ہوگا یہ گھاٹ! اور اس دنیا
اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ	میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت
الْقِيٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝	کے دن بھی، اور کیا ہی برا ہوگا یہ صلہ جو ان کو
(ھود: ۹۷-۹۹)	ملے گا!

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۴۳)

مظلوموں پر انعام

ظالموں کا انجام واضح کرنے کے بعد یہ اس فضل و انعام کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مظلوموں پر فرمایا۔ اور جس کی طرف اس سرگزشت کی تمہید میں 'وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا ... الآیۃ' کے الفاظ سے اشارہ گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے پچھلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰؑ کو کتاب عطا کی۔ اس کتاب کی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگوں کے لیے بصیرت، ہدایت اور رحمت تھی۔ 'بصیرت' یعنی دل و دماغ کی صلاحیتیں اور تعقل و تفکر کی قوتیں بیدار کرنے والی۔ اس کو بصورت جمع لانے سے مقصود یہ واضح کرنا ہے

کہ وہ ایسی آیات اور ایسے دلائل پر مشتمل تھی جو آنکھیں کھول دینے والی تھیں۔ 'ھُدًی' و 'رَحْمَۃً' کی وضاحت ہم کر چکے ہیں کہ یہ دونوں لفظ جب ساتھ ساتھ آتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ آغاز، یعنی اس دنیا کی زندگی میں، ہدایت اور انجام، یعنی آخرت کی زندگی میں رحمت۔

یہ واضح رہے کہ کسی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب و شریعت کا دیا جانا دنیا کی امامت و پیشوائی دیے جانے کے ہم معنی ہے بشرطیکہ وہ اس نعمت کی قدر کرے۔ بنی اسرائیل کو یہ نعمت سب سے پہلے دی گئی۔ یہاں 'مِنْ بَعْدِ مَآ اَھْلَکْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰی' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ باقاعدہ کتابی شکل میں، اللہ کی یہ سب سے بڑی نعمت سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے بنی اسرائیل ہی کو ملی لیکن انھوں نے اس کتاب کے ساتھ نہایت بے دردانہ سلوک کیا جس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وَمَا کُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ اِذْ قَضَیْنَآ اِلٰی مُوْسَی الْاَمْرَ وَمَا کُنْتَ مِنَ الشّٰھِدِیْنَ (۴۴)

آنحضرتؐ کی رسالت کا اثبات

سرگزشت کے آخر میں یہ اور اس کے بعد کی دو آیتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں جن میں آپؐ کی نبوت کا اثبات ہے اور کلام کا رخ یہود کی طرف بھی ہے اور قریش کی طرف بھی۔ فرمایا کہ تم موسیٰؑ کو کتاب دیے جانے کے وقت نہ تو طور کے مغربی جانب ہی میں موجود تھے جب کہ ہم نے معاملہ کا فیصلہ کر کے اس سے موسیٰؑ کو آگاہ کیا اور نہ ان لوگوں کے ساتھ ہی موجود تھے جو اس وقت پہاڑ کے نیچے موسیٰؑ کی قوم میں سے تورات کے انتظار میں تھے۔

'بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ' یعنی بجانب الطور الغربی۔

'قَضَیْنَآ اِلٰی مُوْسَی الْاَمْرَ'۔ 'قَضَیْنَا' یہاں 'عَھِدْنَا' کے مفہوم پر متضمن ہے جس طرح دوسرے مقام میں 'عَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ' آیا ہے۔

'وَمَا کُنْتَ مِنَ الشّٰھِدِیْنَ' میں 'شَاھِدِیْنَ' سے مراد حضرت موسیٰؑ کی قوم کے لوگ ہیں۔ یہ اس وقت کی بات کا حوالہ ہے جب حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو دامن کوہ میں چھوڑ کر، اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق تورات لینے، تنہا طور پر تشریف لے گئے ہیں۔ اس اثناء میں قوم، طور کے نیچے حضرت موسیٰؑ کا انتظار کرتی رہی اور اسی موقع پر سامری کا فتنہ پیش آیا ہے۔ تفصیل ان تمام واقعات کی پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔

مقصود کلام یہ ہے کہ تورات دیے جانے کے وقت نہ تو تم حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہی موجود تھے اور نہ ان کی قوم ہی کے ساتھ تو آخر یہ ساری سرگزشت اس صحت و صداقت اور اس تفصیل کے ساتھ تمھیں کس طرح معلوم ہوئی؟ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ اللہ نے ان باتوں سے تمھیں اپنی وحی کے ذریعہ سے آگاہ فرمایا اور تم اس کے رسول ہو۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت جس تفصیل اور جس صحت و صداقت کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئی ہے اس تفصیل و صحت کے ساتھ تورات میں نہیں بیان ہوئی ہے۔ اگر آپ سرگزشت کے اتنے ہی حصے کو لے کر، جتنی اس سورہ میں بیان ہوئی ہے، تورات کے بیان سے اس کا موازنہ کیجیے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن کے بیان کے مقابل میں تورات کا بیان بے ربط اور محرف بھی ہے اور ان تمام ضروری اجزا سے خالی بھی جو اس سرگزشت کی اصل روح ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ساری باتیں اس صحت و صداقت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح معلوم ہوئیں؛ اگر کوئی ہٹ دھرم یہ کہے کہ آپ نے یہ باتیں اہل کتاب سے سن کر نقل کیں تو یہ بالبداہت غلط ہے۔ جو شخص سنی سنائی بات نقل کرتا ہے وہ مشہور روایت کے مطابق نقل کرتا ہے نہ کہ اس سے بالکل مختلف۔ اور وہ بھی ایسی صحت و تنقید کے ساتھ کہ جو منصف بھی اس کو سنے پکار اٹھے کہ واقعہ کی اصل نوعیت یہ ہے جو قرآن نے بیان کی ہے نہ کہ وہ جو تورات کے راویوں نے پیش کی ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں قرآن اور تورات دونوں کے بیانات کا مقابلہ کر کے دکھاتا کہ تورات میں سرگزشت کے اصل اجزا یا تو غائب ہیں یا بالکل مسخ شدہ صورت میں ہیں۔ برعکس اس کے قرآن نے واقعہ کے تمام فطری اجزا ایسے منطقی ربط و تسلسل کے ساتھ پیش کیے ہیں کہ ان کی عظمت و حکمت آپ سے آپ دل میں اترتی جاتی ہے۔

وَلٰکِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَیْہِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا کُنْتَ ثَاوِیًا فِیْٓ اَھْلِ مَدْیَنَ تَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِنَا ۙ وَلٰکِنَّا کُنَّا مُرْسِلِیْنَ (۴۵)

اس آیت کے ابتدائی ٹکڑے کا تعلق اوپر والی آیت سے ہے یعنی تم ان احوال سے واقف نہیں تھے لیکن ہم نے تم کو واقف کیا۔ اور یہ اس لیے کیا کہ موسیٰؑ کے بعد ہم نے بہت سی نسلیں پیدا کیں تو ان پر ایک طویل زمانہ گزر گیا اور لوگ ہماری اس کتاب کو بھلا بیٹھے جو ہم نے ان کو ہدایت و رحمت بنا کر عطا کی تھی۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ ہم تمہارے ذریعہ سے اس ہدایت کو از سر نو زندہ کریں۔ یہاں فَتَطَاوَلَ عَلَیْہِمُ الْعُمُرُ کے بعد فَنَسُوا الذِّکْرَ یا اس کے ہم معنی الفاظ برنبائے قرینہ محذوف ہیں۔

وَمَا کُنْتَ ثَاوِیًا فِیْٓ اَھْلِ مَدْیَنَ۔ یعنی جس طرح تم موسیٰؑ کو تورات دیے جانے کے وقت طور کے جانب غربی میں موجود نہیں تھے اسی طرح مدین میں بھی موجود نہ تھے کہ حضرت موسیٰؑ کے اس دور کے حالات سے واقف ہوسکتے جو انھوں نے مدین میں گزارا یا حضرت شعیبؑ کی دعوت اور ان کی قوم کے انجام سے واقف ہوتے۔ ان چیزوں میں سے تم کسی چیز سے بھی واقف نہ تھے لیکن ہم نے تم کو ان سے واقف کیا کہ جس طرح ہم نے پہلے رسول بھیجے اسی طرح تمھیں رسول بنائیں۔ کُنَّا مُرْسِلِیْنَ اسی طرح کا اسلوب ہے جس طرح کُنَّا فٰعِلِیْنَ ہے۔ یہ اسلوب کلام کسی فیصلۂ قطعی اور عزم جازم کے اظہار کے لیے آتا ہے۔

'اہلِ مدین' کے بعد 'تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا' کے اضافہ سے یہاں اشارہ حضرت شعیبؑ کی سرگزشت کی طرف بھی ہوگیا جو قرآن کی متعدد سورتوں میں تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں پر انذار و تبشیر کا فرض انجام دینے پر تم تو مامور نہ تھے لیکن خدا نے تم کو وہاں کے حالات سے بھی باخبر کیا۔ یہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہے کہ تم سے بھی وہی کام لے جو تم سے پہلے مبعوث ہونے والے رسولوں سے اس نے لیا۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اس حقیقت کو نہ سمجھیں۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۴۶)

یعنی جس طرح تم مدین میں موجود نہ تھے اسی طرح تم طور کے پہلو میں بھی اس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰؑ کو آواز دی ہے۔ یہ اشارہ ہے اس آواز دینے کی طرف جس کا ذکر آیت ۳۰ میں گزرا ہے فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ۔ الآیۃ۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان ساری باتوں سے بے خبر تھے لیکن رحمتِ الٰہی مقتضی ہوئی کہ وہ تم کو رسول بنائے اس وجہ سے اس نے تم کو ان باتوں سے باخبر کیا اور یہ تمھاری رسالت کی نہایت واضح دلیلیں ہیں۔ 'رَحْمَةً' سے پہلے 'اَرْسَلْنَاكَ' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل محذوف ہے۔

آنحضرتؐ کی بعثت کا مقصد

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ یہ آنحضرتؐ کے اصل مقصدِ بعثت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سارا اہتمام اس لیے فرمایا کہ تم اس قوم کو انذار کرو جس کے پاس اس سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ یہ اشارہ بنی اسماعیل کی طرف ہے۔ یہ لوگ کتاب و شریعت سے بے خبر اُمّی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ان کے اندر کسی رسول کی بعثت نہیں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے مطابق، جس کی تفصیلات پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں، ان کی ہدایت کے لیے نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کو انہی کے اندر سے مبعوث فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی رحمت ہے، جو ان پر نازل ہوئی ہے اگر یہ اس کی قدر کریں۔ اور اس کے اندر یہ اشارہ بھی ہے کہ اگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو یہ ان کے لیے بہت بڑی نقمت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اگر کوئی قوم خدا کے بھیجے ہوئے منذر کے انذار سے یاددہانی نہیں حاصل کرتی تو وہ تباہ کر دی جاتی ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۷-۶۱

اوپر کی آیات التفات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

آپ کی بعثت بہت بڑی رحمت ہے اگر وہ اس کی قدر کریں گے اور یہ بہت بڑی نقمت بھی ہو سکتی ہے انھوں نے اس کی ناقدری کی۔ آگے اسی مضمون کی مزید وضاحت فرمائی ہے کہ اس رسول کی بعثت سے مقصود اتمامِ حجت ہے۔ اب اگر یہ لوگ کسی عذاب کی گرفت میں آئے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے آگاہ نہیں کیا۔ لیکن ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ یہ یہودیوں سے سیکھ کر ہمارے پیغمبر پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کو بھی اس قسم کے معجزے کیوں نہیں دیے گئے جس قسم کے معجزے حضرت موسیٰؑ کو دیے گئے۔ ان سے پوچھو کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم نے کب ان کے معجزات کی قدر کی جو تم سے یہ توقع کی جائے کہ اگر اس قسم کے معجزے تم کو دکھائے گئے تو تم ان کی قدر کرو گے! اسی ضمن میں ان اہل کتاب کی تحسین کی گئی ہے جو اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر قرآن کی تائید اور بڑے صبر کے ساتھ اپنی قوم کے غوغا کا مقابلہ کر رہے تھے۔ نیز قریش کے اس خدشہ کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے قرآن کی دعوت قبول کر لی تو اس ملک سے ان کی جڑ اکھڑ جائے گی۔ ان کو تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اس دعوت کے قبول کرنے کی صورت میں تو ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ البتہ اگر انھوں نے اس کو رد کر دیا تو سنتِ الٰہی کے بموجب ان کی تباہی یقینی ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۷-۶۱

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا
لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ
اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى
مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ٙ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾
قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا
يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى
مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا ع ۵
لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ

قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ
الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿٥٣﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ
اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٥٤﴾ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ
وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي
الْجٰهِلِيْنَ ﴿٥٥﴾ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ
مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿٥٦﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى
مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۭ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا
يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ
مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ
الْوٰرِثِيْنَ ﴿٥٨﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ
اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى
اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٠﴾ ع ٦ / ١٠ / ٩
اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿٦١﴾

(اور ہم رسول نہ بھیجتے) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان پر ان کے اعمال کے سبب سے کوئی ترجمۂ آیات ٤٧ - ٦١

آفت آئی تو وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہلِ ایمان میں سے بنتے۔ تو جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو کہتے ہیں کہ جس طرح کی چیز موسیٰ کو ملی تھی اس طرح کی چیز ان کو کیوں نہ ملی! کیا اس طرح کے لوگوں نے اس چیز کا انکار نہیں کیا جو اس سے پہلے موسیٰ کو دی گئی؟ انھوں نے کہا، دونوں ماہر جادوگر ہیں جنھوں نے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اور کہا کہ ہم ان سب کے منکر ہیں۔ ۴۷ - ۴۸

ان سے کہو کہ اگر تم اس کو جھٹلاتے ہو تو اللہ کے پاس سے کوئی اور کتاب لاؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو، میں اسی کی پیروی کروں گا، اگر تم سچے ہو۔ اگر وہ تمھارا یہ چیلنج قبول نہ کریں تو یقین کرو کہ بس یہ اپنی خواہشوں کے پیرو ہیں۔ اور ان سے بڑھ کر گمراہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کے پیرو بنے ہوئے ہیں۔ اللہ ظالموں کو ہرگز راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۴۹ - ۵۰

اور ہم نے ان کے لیے کلام کے تسلسل کو قائم رکھا تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی اس سے پہلے، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب وہ ان کو سنائی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، ہم اس کے آنے سے پہلے سے اس کو ماننے والے رہے ہیں۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کو دہرا اجر ملے گا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے اور ہم نے جو رزق ان کو دے رکھا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب یہ لغو بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں

اور تمھارے لیے تمھارے اعمال، پس ہمارا سلام لو، ہم جاہلوں سے الجھنا پسند نہیں کرتے۔ ۵۱-۵۵

تم جن کو چاہو، ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور وہی ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔ ۵۶

اور وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم تمھارے ساتھ ہو کر اس ہدایت کے پیرو بن جائیں تو ہم اپنے ملک سے اُچک لیے جائیں گے۔ کیا ہم نے ان کو متمکن نہیں کیا ایک مامون حرم میں جس کی طرف خاص ہمارے فضل سے ہر چیز کی پیداواریں کھنچی چلی آ رہی ہیں؛ لیکن ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔ ۵۷

اور کتنی قومیں اپنے سامانِ معیشت کی ناشکری کرنے والی ہوئی ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر چھوڑا۔ پس یہ ہیں ان کی بستیاں جو ان کے بعد آباد نہیں ہوئیں مگر بہت کم، اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔ اور تیرا رب بستیوں کا ہلاک کرنے والا نہیں بنتا جب تک ان کی مرکزی بستی میں کوئی رسول نہ بھیج لے جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنا دے۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں بنتے مگر اسی وقت جب ان کے باشندے اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بن جاتے ہیں۔ ۵۸-۵۹

اور جو چیز بھی تمھیں عطا ہوئی ہے تو یہ بس حیاتِ دنیا کی متاع اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور پائیدار ہے۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں! کیا وہ جس سے ہم نے ایک خوش آئند وعدہ کر رکھا ہے پس وہ اس موعود کو لازماً پا کے رہے گا اس کے مانند ہوگا جس کو ہم نے حیاتِ دنیا کی متاع دی ہے پھر وہ قیامت کے دن حاضر کیے جانے والوں میں سے بننے والا ہے۔ ۶۰-۶۱

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَوْلَآ أَن تُصِيبَهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَيَقُولُوا۟ رَبَّنَا لَوْلَآ أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ ءَايَٰتِكَ وَنَكُونَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ (۴۷)

'لَوْلَا' کا جواب، اگر قرینہ واضح ہو تو حذف ہو جایا کرتا ہے۔ یہاں بھی حذف ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔

بنی اسماعیل پر احسان اور ان کو تنبیہ

یہ قریش یا بالفاظ دیگر بنی اسماعیل پر احسان بھی ہے اور ان کو تنبیہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے تو بغیر کسی رسول کی بعثت کے بھی، ان کے اعمال کی پاداش میں، ان کو پکڑ لیتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا تاکہ وہ یہ عذر نہ کر سکیں کہ اگر ہمارے پاس خدا کوئی رسول بھیجتا تو ہم اللہ کی آیات کی پیروی کرنے والے اور رسول پر ایمان لانے والے بنتے۔ ان کے اس عذر کو ختم کر دینے اور ان پر حجت تمام کر دینے کے لیے ہم نے ان کے اندر اپنا رسول بھی بھیج دیا ہے۔ اب اگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو یاد رکھیں کہ ان پر اللہ کی حجت پوری ہو چکی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور فطرت کی جو روشنی عطا فرمائی ہے وہ بھی انسان کو گمراہی اور بدعملی کی زندگی سے بچانے کے لیے کافی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ مجرد اس فطری ہدایت ہی کی بنا پر لوگوں کو ان کی بدعملیوں کی سزا دیتا تو یہ بات عدل کے خلاف نہ ہوتی لیکن مزید اتمام حجت و قطع عذر کے لیے اس نے اپنے رسول بھی بھیج دیے جس کے بعد کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اسی وجہ سے سنت الٰہی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ جس قوم نے بھی رسول کی تکذیب کی وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئی۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ ٱلْحَقُّ مِنْ عِندِنَا قَالُوا۟ لَوْلَآ أُوتِىَ مِثْلَ مَآ أُوتِىَ مُوسَىٰٓ ۚ أَوَلَمْ يَكْفُرُوا۟ بِمَآ أُوتِىَ مُوسَىٰ مِن قَبْلُ ۖ قَالُوا۟ سِحْرَانِ تَظَٰهَرَا وَقَالُوٓا۟ إِنَّا بِكُلٍّ كَٰفِرُونَ (۴۸)

لفظ 'حق' یہاں رسول اور کتاب دونوں پر مشتمل ہے اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں اپنی حقیقت کے اعتبار سے بالکل ایک ہیں۔ 'مِنْ عِنْدِنَا' اس حق کی عظمت و شان کے اظہار کے لیے ہے کہ یہ خدا کی طرف سے آیا ہوا حق ہے اس وجہ سے اب وہ سب کچھ جو اس کے خلاف ہے باطل اور مٹ جانے والی چیز ہے۔

یہود کا سکھایا ہوا ایک شبہ اور اس کا جواب

فرمایا کہ ہم نے تو اتمام حجت، قطع عذر اور شکوک و اوہام کے ازالہ کے لیے خاص اپنے پاس سے حق نازل فرمایا لیکن یہ لوگ یہ معارضہ کر رہے ہیں کہ ان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس طرح کے معجزے کیوں نہیں دیے گئے جس قسم کے حضرت موسیٰ کو دیے گئے۔

قرینہ دلیل ہے کہ اس اعتراض کو پھیلایا تو قریش نے لیکن اس کے سکھانے والے یہود تھے۔ آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ اس دور میں یہود نے قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اکسانے

کے لیے مدبر پردہ ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں۔ یہ انھی کا چھوڑا ہوا شوشہ ہے۔ انھوں نے قریش کو یہ سکھایا کہ یہ اللہ کے رسول ہونے کے مدعی ہیں لیکن رسول یوں ہی نہیں آیا کرتے۔ ہمارے رسول کو تو فلاں فلاں معجزے عطا ہوئے تھے تو آخر اللہ تعالیٰ نے اس طرح کا کوئی معجزہ ان کو کیوں نہیں دیا۔ قریش اپنی سادہ لوحی کے سبب سے یہود کی چال نہ سمجھ سکے اور بے سمجھے بوجھے یہ اعتراض بھی انھوں نے نقل کرنا شروع کر دیا۔ قرآن نے یہاں اسی کا جواب دیا ہے۔ فرمایا اَوَلَمْ یَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ 'کیا انھی کے بھائی بندوں نے ان معجزات کا انکار نہیں کیا جو حضرت موسیٰؑ کو دیے گئے۔' یہاں فعل کی نسبت مشابہت قلوب کی بنا پر کی گئی ہے۔ عربی میں فعلوں اور ضمیروں کا اس طرح استعمال معروف ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں۔ یعنی جب ان کے دلوں کے اندر بھی وہی رعونت ہے جو فرعونیوں کے دلوں میں تھی تو ان کا عمل گویا انھی کا عمل ہے۔ اس جواب کی بلاغت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اس بات کو بھی پیش نظر رکھیے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ اس اعتراض کے سکھانے والے دراصل یہود تھے۔

'قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا' لفظ 'سحر' یہاں ساحر کے مفہوم میں ہے لیکن اس کے اندر مبالغہ کا مضمون پیدا ہو گیا ہے جس طرح 'زید عدل' استعمال ہوتا ہے۔ اور 'تظاھر' کے معنی تعاون اور گٹھ جوڑ کرنے کے ہیں۔ یعنی حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے جو شاندار معجزے دکھائے تو ان پر ایمان لانے کے بجائے فرعون اور اس کے اعیان نے کہا کہ یہ دونوں بڑے ماہر جادوگر ہیں اور انھوں نے ہمارے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ 'وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ' یعنی خواہ یہ کچھ ہی کرتب دکھائیں اور کتنا ہی زور لگائیں ہم ان پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ہم ان دونوں کے بھی منکر ہیں اور ان کے ان سارے کرشموں کے بھی۔

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰی مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۴۹)

قریش سے ایک مطالبہ

یعنی یہ لوگ مخالفت کے جوش میں حضرت موسیٰؑ کے معجزات اور ان کے فضل و کمال کا حوالہ تو دیتے ہیں لیکن یہ محض تمھارے اوپر اعتراض کے لیے ایک بہانہ ہے۔ اگر ان کی اس بات میں سچائی کا کوئی شائبہ ہے تو آخر یہ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے والے کیوں نہ بنے! ان سے کہو کہ اگر ان دونوں (یعنی قرآن اور تورات) سے بھی زیادہ ہدایت بخشنے والی کوئی کتاب ہے تو اس کو لاؤ، میں اس کی پیروی کرنے کو تیار ہوں۔

ہدایت کی جستجو فطرت کا تقاضا ہے

مطلب یہ ہے کہ ہدایت کی جستجو تو ہر سلیم الفطرت انسان کی فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔ جس کے اندر ہدایت کی جستجو نہیں ہے وہ جوہر انسانیت سے عاری ہے۔ فطرت کے اسی تقاضے کے تحت میں تورات کو بھی مانتا ہوں اور اس سے زیادہ ہدایت بخشنے والے قرآن کو بھی۔ اور اگر تم ان دونوں سے بھی زیادہ ہدایت بخش کوئی کتاب پیش کرو تو میں اس کی پیروی کے لیے بھی آمادہ ہوں لیکن تمھارا ماجرا عجیب ہے کہ تم نہ تو تورات کو مانتے، نہ قرآن کو البتہ مجھ سے معارضہ کرنے کے لیے یہ اعتراض لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہو کہ میں اس طرح کے معجزے کیوں نہیں دکھاتا جس طرح کے معجزے حضرت موسیٰؑ نے دکھائے۔ 'اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ' یعنی

حضرت موسیٰ کی حمایت میں تمھارا یہ جوش و خروش محض ہدایت سے فرار کے لیے ایک بہانہ ہے ورنہ اس کے کیا معنی کہ پیرو تو تم نہ موسیٰؑ کے بنتے ہو اور نہ میرے، البتہ یہ اعتراض تمھیں ہے کہ میرے اندر حضرت موسیٰؑ کے کمالات نہیں ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن تورات کا مکذب نہیں بلکہ اس کا مصدق ہے۔ قرآن اگر تردید کرتا ہے تو صرف اس کی تحریفات کی تردید کرتا ہے۔ تورات کے مقابل میں قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ صرف وہی ہدایت کا صحیفہ ہے بلکہ وہ صرف اپنے 'اَهْدٰی مِنْهُمَآ' ہونے کا مدعی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اس نے اللہ کی ہدایت کو تمام تحریفات سے پاک کرکے پیش کیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کی آخری اور کامل ہدایت کا صحیفہ ہے جس کی پیشین گوئی خود تورات میں بھی موجود ہے۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۰)

[illegible] یعنی اگر تمھارے اس چیلنج کے جواب میں یہ ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخش کوئی کتاب پیش بھی نہیں کرتے اور ان میں سے کسی کی پیروی کے لیے بھی تیار نہیں ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے نفس کی خواہشوں کی پیروی کرنا چاہتے ہیں تو جو اللہ کی ہدایت کے بغیر محض اپنی خواہشوں کا پیرو ہے اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہوگا! نفس کی خواہشیں صرف اپنے مطالبے پورا کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے اندر حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت نہیں ہے اور بسا اوقات وہ اتنی زور آور ہو جاتی ہیں کہ بڑی آسانی سے انسان کی عقل کو بھی مغلوب کر لیتی ہیں اس وجہ سے انسان کے لیے فلاح کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ ان خواہشوں کی پیروی اللہ کی ہدایت کی روشنی میں کرے۔ اگر اس روشنی کے بغیر وہ ان کے پیچھے چل پڑے گا تو لازماً وہ ہلاکت کے گڑھے میں گرے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے خواہشوں کے اسی مہلکہ سے بچانے ہی کے لیے اپنی ہدایت نازل فرمائی ہے تو بدقسمت ہے وہ جو اس ہدایت کی قدر نہ کرے اور اپنی باگ اندھی بہری خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دے۔ ایسے لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں اور سنتِ الٰہی کے بموجب وہ ہدایت سے محروم ہی رہتے ہیں۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۵۱)

قرآن اہل کتاب کے لیے جانی پہچانی ہوئی چیز ہے — یعنی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت ہی کی خاطر یہ اہتمام فرمایا کہ اپنی تعلیم و تذکیر کے سلسلہ کو کبھی منقطع نہیں ہونے دیا بلکہ اس کے تسلسل کو برابر قائم رکھا۔ حضرت موسیٰؑ کو جو کتاب عطا ہوئی جب اس کے حاملوں نے اس کو فراموش کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نعمت سے سرفراز فرمایا۔ اوپر آیات ۴۵-۴۶ میں جو مضمون گزر چکا ہے ایک نئے اسلوب سے یہ اسی کا اعادہ ہے۔ مطلب

یہ ہے کہ یہ قرآن کوئی انوکھی اور متوحش ہونے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک جانی پہچانی ہوئی چیز ہے اس وجہ سے سب سے پہلے تو اہل کتاب کا فرض ہے کہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں اس لیے کہ جو نعمت ان کو پہلے ناتمام شکل میں ملی تھی اب وہ اپنی کامل شکل میں ان کو دی جا رہی ہے۔ پھر بنی اسماعیل کی سعادت بھی اسی میں ہے کہ اس کو سینہ سے لگائیں اس لیے کہ اب اللہ تعالیٰ نے ان کو براہِ راست اپنی نعمت سے نوازا ہے۔ اب تک ان کے اندر نہ کوئی رسول آیا تھا نہ ان کے لیے کوئی کتاب نازل ہوئی تھی۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ۔ وَاِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ (۵۲ - ۵۳)

'اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ' سے صالحین اہل کتاب مراد ہیں۔ ان کے لیے معروف کے صیغہ کا استعمال بھی، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، اس بات کا قرینہ ہے اور قرآن کے باب میں ان کا رویہ بھی، جو یہاں مذکور ہوا ہے، اس پر شاہد ہے۔

صالحین اہل کتاب کے رویہ کی تحسین

یہ قرآن کے حق میں ایک سند کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر لاخیرے دنا قدرے قسم کے لوگ اس قرآن سے بدک رہے ہیں تو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ آخر صالحین اہل کتاب بھی تو ہیں جو اس نعمت کی قدر کر رہے ہیں اور آگے بڑھ کر اس پر ایمان لا رہے ہیں، ان کا حال تو یہ ہے کہ جب ان کو یہ کتاب سنائی جاتی ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں کہ بے شک یہی حق ہے ہمارے رب کی جانب سے اور ہم تو اس کے پہلے سے ماننے والے رہے ہیں۔

'اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ' میں جو حصر و تاکید ہے وہ اس بات پر دلیل ہے کہ قرآن نے پچھلے صحیفوں کی جن تحریفات سے پردہ اٹھایا ان کے باب میں بھی انھوں نے اپنی قوم کے مفسدین کے علی الرغم، صدق دل سے قرآن کے بیان کی تائید کی اور ساتھ ہی قریش کے لیڈروں کو بھی انھوں نے رہنمائی دی کہ قرآن بالکل حق اور خدائی کتاب ہے اس وجہ سے وہ اس کی قدر کریں، اس کی مخالفت کر کے اپنی شامت کو دعوت نہ دیں۔

'اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ' یعنی ہم تو اس کے نزول سے پہلے ہی سے اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس کے ماننے والے رہے ہیں۔ یہ مضمون بقرہ ۱۴۶، انعام ۱۱۴ میں بھی گزر چکا ہے۔ ایک نظر ان پر بھی ڈال لیجیے۔ لفظ 'مسلمین' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہم پہلے ہی سے اپنے آپ کو اس کتاب اور اس رسول کے حوالے کر دینے کے لیے منتظر تھے چنانچہ جب ہم نے ان کو پایا تو ان کی اطاعت میں داخل ہو گئے۔

اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (۵۴)

فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جو اپنی اس استقامت کے صلہ میں دہرا اجر پائیں گے۔ ایک اجر تو انھیں اس بات کا ملے گا کہ ان کو جو دین حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے ملا، اپنی قوم کے عام بگاڑ کے باوجود، وہ اس پر ثابت قدم

رہے۔ دوسرا اس بات کا کہ جس نبی خاتم اور دین کامل کی پیشین گوئی حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام نے کی تھی وہ برابر اس کے لیے چشم براہ رہے اور جب وہ آیا تو انھوں نے یوسفِ گم گشتہ کی طرح اس کا استقبال کیا۔ 'بِمَا صَبَرُوْا' کی صفت کے حوالہ کا یہاں ایک خاص محل ہے جس کو نگاہ میں رکھیے۔ وہ یہ کہ ان لوگوں کو اپنے سابق دین پر قائم رہنے کے لیے بھی بڑے زہرہ گداز مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اور جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو ان کو اپنی قوم اور قریش دونوں کی مخالفت سے دوچار ہونا پڑا لیکن ان تمام مخالفتوں کا انھوں نے پوری پامردی سے مقابلہ کیا۔ نصاریٰ میں سے شمعون کے پیروؤں نے اپنی قوم کے مبتدعین و محرفین کے ہاتھوں جو مصائب جھیلے ان کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں بھی موجود ہے اور ہم نے بھی اس کتاب میں جگہ جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ یہی اہلِ حق تھے جن کو قرآن کی دعوت قبول کرنے کی توفیق حاصل ہوئی اور قرآن نے متعدد سورتوں میں ان کی حق دوستی و ثابت قدمی کی تعریف فرمائی ہے۔

صالحینِ اہلِ کتاب کا کردار — وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ۔ 'حَسَنَةٌ' سے مراد یہاں صبر و عزیمت اور عفو و درگزر ہے اور 'سَيِّئَةٌ' سے مخالفین کے اعتراضات و مطاعن اور ان کے سب و شتم کی طرف اشارہ ہے۔ ان لوگوں نے جب اپنے قبولِ اسلام کا اظہار کیا تو ان کی قوم نے بھی ان کو دینِ آبائی کا دشمن اور ملت کا غدار قرار دیا اور دوسرے اعدائے حق نے بھی ان کو اپنے لعن طعن کا ہدف بنا لیا لیکن ان لوگوں نے ہر حملہ کا جواب مومنانہ شرافت اور کریمانہ عفو و درگزر سے دیا۔

'وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ' کا بھی یہاں ایک خاص محل ہے جس کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ قرآن نے جگہ جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اہلِ کتاب بالخصوص یہود کے لیے قبولِ اسلام کی راہ میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ بنی وہ ان کی زر پرستی ہے۔ اس سورہ میں بھی آگے ان کے قارون کا ذکر آ رہا ہے اور دوسری سورتوں میں بھی ان کی قارونی اور زر پرستانہ ذہنیت کا ذکر بار بار ہوا ہے۔ جن لوگوں کو زر پرستی کا روگ لگ جاتا ہے وہ کبھی حق قبول کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ سیدنا مسیحؑ نے فرمایا کہ جس طرح اونٹ سوئی کے ناکے میں نہیں جا سکتا اسی طرح دولت مند خدا کی بادشاہی میں نہیں داخل ہو سکتا۔ سورۂ لہب سے واضح ہوتا ہے کہ ابولہب کی عداوتِ اسلام میں بھی سب سے زیادہ دخل اس کی زر پرستی اور حرصِ مال ہی کو تھا۔ یہاں ان صادقین کی صفت 'مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ' کا حوالہ دے کر قرآن اسی حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہے کہ ان لوگوں کو طمعِ مال کی بیماری نہیں لگی تھی اس وجہ سے ان کو قبولِ اسلام کی توفیق حاصل ہوئی۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ (۵۵)

مخالفین سے — يَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ' کی مزید وضاحت ہے کہ یہ لوگ جب مخالفین کی بکواس سنتے ہیں

تو ان سے الجھنے کے بجائے اعراض کرتے ہیں۔ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ یہ ان کے اعراض کا طریقہ بیان ہوا ہے کہ جب مخالفین و معترضین ان سے الجھتے ہیں تو وہ ان سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اچھا بھائی! زیادہ بحث و جدال سے کیا فائدہ، ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں، آپ اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو، ہمیں ہماری اختیار کردہ راہ پر چلنے دو، آپ اپنی راہ پر چلو!

سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ یہ سلام، مفارقت کے مفہوم میں ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو سلام کیا تھا۔ یہ کسی سے پیچھا چھڑانے کا ایک نہایت شائستہ طریقہ ہے۔ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ یہ ان کے طرزِ عمل کی تعبیر ہے کہ وہ دل میں یہ خیال کر کے کہ جاہلوں سے الجھنے سے کچھ فائدہ نہیں، ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس طریقۂ تعبیر کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ بسا اوقات آدمی کا طرزِ عمل ہی اس کے قول کا قائم مقام بن جاتا ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ (۵۶)

آنحضرتؐ کو تسلی

هِدَایَت یہاں ہدایت یافتہ بنا دینے کے مفہوم میں ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ تم ان لوگوں کے پیچھے زیادہ ہلکان نہ ہو۔ تمہارا کام صرف لوگوں تک پیغامِ حق پہنچا دینا ہے یہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے کہ تم جس کو چاہو ہدایت یافتہ بنا دو بلکہ یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت پانے کا اہل ہے، کون نہیں ہے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں جو سنتِ الٰہی ہے اس کی وضاحت ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰی مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۭ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجْبٰٓی اِلَیْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۵۷)

خدائی نظام کی مخالفت کے لیے شیاطین کا مخصوص حربہ

یہ قریش کے ایک اور اعتراض کو نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس دین کو قبول کرنے کے معاملے میں ہم تمہارے ساتھی بن جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے گرد و پیش کی ساری دنیا کو اپنا دشمن بنا لیں اور یہ دشمن مل کر ہمیں ہمارے اس ملک سے اچک لے جائیں۔

قریش کو پورے ملک پر جو اقتدار حاصل تھا وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے دینِ شرک کی برکت سے ان کو حاصل ہوا ہے۔ وہ اپنے دیویوں دیوتاؤں کو تو تمام خیر و برکت کا ذریعہ مانتے ہی تھے۔ مزید برآں انھوں نے پورے ملک پر اپنی مذہبی و سیاسی دھاک قائم رکھنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی تھی کہ تمام قبائلِ عرب کے اصنام خانہ کعبہ میں جمع کر دیے تھے اور اس طرح گویا وہ سب کے امام و پیشوا بن گئے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ توحید بلند کی تو اس کے خلاف انھوں نے اپنی قوم کو یہ کہہ کر بھی بھڑکایا کہ اگر ہم اپنے تمام دیویوں دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک خدا کے بن کر رہ جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری تمام جمعیت پارہ پارہ ہو جائے گی، تمام عرب ہمارا دشمن بن کر اٹھ کھڑا ہوگا اور اس ملک سے ہماری جڑ

اکھڑ جائے گی۔ یہ بعینہٖ وہی اعتراض ہے جو آج ہمارے لیڈر حضرات اسلامی نظام، اسلامی معاشرت، اسلامی حدود و تعزیرات اور اسلامی نظام معیشت کے خلاف اٹھاتے ہیں کہ اگر ہم ان کو اختیار کرلیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے تمام نظام معیشت و معاشرت کا تیا پانچہ کرکے رکھ دیں اور ساری دنیا میں نکوبن کے رہ جائیں۔ یاد ہوگا یہی اعتراض فرعون اور اس کے اعیان نے حضرت موسیٰؑ کی تعلیم و دعوت کے خلاف بھی اٹھایا تھا کہ یہ شخص ہماری اعلیٰ تہذیب (طَرِیْقَتِکُمُ الْمُثْلٰی) کو مٹانے کے درپے ہے۔ خدائی نظام کی مخالفت میں شیاطین کا سب سے زیادہ کارگر حربہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔

بیت اللہ کی برکات

اَوَلَمْ نُمَکِّنْ لَّھُمْ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجْبٰٓی اِلَیْہِ ثَمَرٰتُ کُلِّ شَیْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا۔ یہ ان کے اعتراض کا جواب دیا کہ ان بے خبروں کو پتہ نہیں کہ جس زمانے میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کو اس سرزمین میں بسایا ہے نہ یہاں کسی کی جان کے لیے امان تھی، نہ زندگی بسر کرنے کے معاشی وسائل ہی یہاں موجود تھے لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اس گھر کو بسایا اور اس کے ساکنوں کے لیے رزق و امن کی دعا کی جس کی برکت سے یہ حال ہوا کہ آج ہر علاقے سے ہر قسم کی پیداوار یہاں کھنچی چلی آرہی ہے۔ حج اور اشہر حُرم کی بدولت مکہ کی رفاہیت میں جو برکتیں ظاہر ہوئیں ان پر پچھلی سورتوں میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہ انہی کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری برکتیں حاصل تو ہوئی ہیں ان کو اللہ کے فضل اور حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی برکت سے لیکن آج ان شامت زدوں کا حال یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے اس دین کو اختیار کرلیا جس کی قرآن دعوت دے رہا ہے اور جو اصلاً حضرت ابراہیمؑ ہی کا دین ہے، تو یہ تباہ ہو کے رہ جائیں گے!

وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ یہ ان کے حال پر اظہار افسوس ہے کہ ان کی اکثریت آج اپنی تاریخ سے کس درجہ بے خبر ہو کر رہ گئی ہے۔

سورۂ عنکبوت میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا	کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان کے لیے تو ایک
وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِھِمْ	مامون حرم بنایا اور ان کے گرد و پیش کا حال یہ ہے
اَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَۃِ	کہ لوگ اچک لیے جاتے ہیں تو کیا وہ باطل پر ایمان
اللّٰہِ یَکْفُرُوْنَ (عنکبوت: ۶۷)	رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔

لفظ 'ثَمَرٰتٌ' پر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بحث کرچکے ہیں کہ یہ صرف 'فواکہ' کے لیے نہیں آتا بلکہ ہر قسم کی غذائی اجناس کے لیے بھی آتا ہے۔

نُمَکِّنْ لَّھُمْ حَرَمًا اٰمِنًا۔ اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح سورۂ نور میں وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ (نور: ۵۵) ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس حرم کو بجائے خود بالکل محفوظ و مامون بنایا ہے۔ یہ دوسروں کی حفاظت کا محتاج نہیں بلکہ خود دوسروں کو

کا محافظ ہے۔ سورۂ قریش میں ان شاء اللہ اس حقیقت کی وضاحت ہم تفصیل سے کریں گے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۗ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (۵۸)

قریۂ کا ایک لفظ 'بطر' کے معنی اکڑنے، اترانے اور فخر و ناز کرنے کے ہیں۔ چونکہ اس کا استعمال بطور متعدی معروف نہیں ہے اس وجہ سے 'مَعِيْشَتَهَا' کے نصب کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ عام طور پر لوگوں نے یہاں یا تو حرف جر محذوف مانا ہے یا ظرف۔ اس ذا ما کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ 'مَعِيْشَتَهَا'، 'اَهْلَكْنَا' کا مفعول ہے۔ لیکن مجھے ان اقوال میں سے کسی قول پر بھی اعتماد نہیں ہے۔ بعضوں نے 'بَطِرَتْ' کو 'كَفَرَتْ' کے مضمون پر متضمن قرار دیا ہے۔ یہ رائے اقرب الی الصواب ہے۔ عربی میں 'بَطِرَ الْحَقَّ' کا استعمال 'تَكَبَّرَ عَنْهُ' کے مفہوم میں معروف ہے۔ یعنی اس نے حق سے متکبرانہ اعراض کیا۔ اسی طرح اگر کہیں 'بَطِرَ فُلَانٌ نِعْمَتَهُ' تو اس کا مفہوم ہوگا 'اِسْتَخَفَّهَا فَكَفَرَهَا' (اس نے اس نعمت کو حقیر سمجھ کر اس کی ناشکری کی)۔ میرے نزدیک ان استعمالات کی بنیاد تضمین ہی کے اصول پر ہے اور آیت میں بھی یہ لفظ اسی اصول پر استعمال ہوا ہے۔

ناز کرنے والی قوموں کا انجام
یہ قریش کو انذار و تنبیہ ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ اس سرزمین میں تم کو جو امن و رفاہیت حاصل ہے یہ تمہاری اپنی تدبیر و تدبر کا کرشمہ ہے اس وجہ سے تمہیں اس پر بڑا ناز و فخر ہے حالانکہ یہ جو کچھ تمہیں حاصل ہوا ہے خدا ہی کے فضل و کرم سے حاصل ہوا ہے۔ اس کا حق یہ ہے کہ تم اس پر اترانے کے بجائے خدا کے شکر گزار بنو اور یاد رکھو کہ تم سے پہلے کتنی قومیں گزری ہیں جو تمہاری ہی طرح خدا کی نعمتوں کو اپنا حق سمجھ کر ان پر اترائیں تو اس کی پاداش میں ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور ان کی بستیاں تم سے دور نہیں ہیں۔ تم ان پر سے گزرتے ہو۔

'فَتِلْكَ' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ بستیاں مخاطب کی جانی پہچانی ہوئی ہیں۔ یہ اشارہ ثمود اور قوم لوط وغیرہ کی بستیوں کی طرف ہے جو قریش کی تجارتی گزرگاہوں پر تھیں۔ 'لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا' میں میرے نزدیک وہی مضمون ہے جو سورۂ ہود میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے۔ 'ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ' (۱۰۰) (یہ بستیوں کی سرگزشتیں ہیں جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض قائم ہیں اور بعض ختم ہو چکی ہیں) وہاں ہم اس آیت کی تفسیر کر چکے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ میرے نزدیک عربیت کے اعتبار سے یہ مفہوم لینے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ویسے اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان بستیوں کا سارا کروفر تو اجڑ گیا یہ الگ بات ہے کہ کبھی گڈریوں، چرواہوں اور خانہ بدوشوں نے ان میں اپنے ڈیرے ڈال لیے ہوں تو ڈال لیے ہوں۔

'وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ' یعنی وہ تو سب فنا ہو گئے جو اپنے آپ کو ان کا مالک و حکمران گمان

کرتے تھے اور ان کی وراثت ہماری طرف لوٹ آئی اس لیے کہ تمام آسمان و زمین کے حقیقی مالک و وارث ہم ہی ہیں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (۵۹)

ہلاکت پیغمبر کی بعثت کے بعد

یہ وہی انذار کا مضمون مزید واضح اور تیز ہوگیا ہے۔ فرمایا کہ قوموں پر فیصلہ کن عذاب کے معاملے میں سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا جب تک اس کی مرکزی بستی میں اپنا ایک رسول بھیج کر لوگوں کو اپنی آیات اچھی طرح سنا نہ دے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک قریش کا تعلق ہے اس سنتِ الٰہی کا ایک مرحلہ پورا ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مرکزی بستی — مکہ — میں اپنا ایک رسول بھیج دیا جو رات دن لوگوں کو اللہ کی آیات کے ذریعہ سے انذار کر رہا ہے۔ اب عذاب کا انحصار ان کے رویہ پر ہے۔

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ۔ یہ اسی سنتِ الٰہی کے دوسرے مرحلے کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بستی کو ہلاک نہیں کرتا جب تک اس کے باشندے اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے نہ بن جائیں۔ 'ظلم ڈھانے' سے مراد یہ ہے کہ رسول کی اس تمام تذکیر و تنبیہ کے بعد بھی وہ اپنے شرک و کفر پر اڑے ہی رہیں اور رسول کی تکذیب کر دیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اب قریش اور ان کے اعوان و انصار کے لیے یہ آخری مرحلہ درپیش ہے۔ اگر انھوں نے رسول کی قدر نہ پہچانی، اپنی ضد پر اڑے رہ گئے، تو ایک خاص وقت تک مہلت دینے کے بعد وہ لازماً عذابِ الٰہی کی زد میں آجائیں گے اور یہ خدا کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۶۰)

قریش کو براہ راست تنبیہ

اوپر کی تنبیہات بالواسطہ تھیں۔ اب یہ براہِ راست قریش کے لیڈروں کو مخاطب کر کے تنبیہ فرمایا کہ جو رفاہیت و خوش حالی تمھیں حاصل ہے اس پر اتراؤ نہیں۔ یہ جو کچھ بھی ہے بس حیاتِ چند روزہ کی متاع اور عارضی رونق ہے۔ اصل چیز جو بہتر اور غیر فانی ہے وہ خدا کے پاس ہے جو ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو آخرت کے طالب بنیں گے اور اس کے لیے جدوجہد کریں گے تو اس متاعِ عارضی اور وقتی چمک دمک پر ریجھ کر حیاتِ ابدی کے خزانوں کو ضائع نہ کرو۔ عقل سے کام لو۔ 'اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ' کیا تم لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے!

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ (۶۱)

'احضار' یہاں مجرموں کی طرح پکڑ کر حاضر کیے جانے کے مفہوم میں ہے اس وجہ سے 'مُحْضَرِیْنَ' کے اندر ذلت کے ساتھ حاضر کیے جانے کا مفہوم خود پیدا ہو گیا ہے۔

یعنی سوچو کہ ایک تو وہ لوگ ہیں جن سے اللہ نے آخرت کی ابدی بادشاہی کا وعدہ کر رکھا ہے اور یہ ابدی بادشاہی لازماً پا کے رہیں گے، اس لیے کہ اللہ کے وعدے سے سچا وعدہ کس کا ہو سکتا ہے، دوسرے وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے حیاتِ چند روزہ کی متاعِ فانی تو دی ہے مگر بالآخر قیامت کے دن نہایت ذلت کے ساتھ وہ خدا کے حضور پیشی کے لیے گھسیٹ کر لائے جائیں گے۔ بتاؤ کہ ان میں سے بہتر اور لازوال (خَیْرٌ وَّاَبْقٰی) انجام والا کون ہو گا!

۴۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۶۲-۷۵

اب آگے اوپر کے مضمون کی تائید کے لیے شرک اور شرکاء کی تردید ہے کہ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ آخرت میں ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء کچھ کام آنے والے بنیں گے تو وہ اس وہم کو اپنے دماغ سے نکال دے۔ ان شرکاء کو نہ اس دنیا کے انتظام و انصرام میں کوئی دخل ہے، نہ یہ آخرت میں کام آنے والے ہیں۔ ان بے حقیقت چیزوں کے بل پر جو لوگ قرآن کی دعوت کو جھٹلا رہے ہیں وہ اپنا انجام اچھی طرح سوچ لیں۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۶۲-۷۵

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿۶۲﴾
قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا ۚ
أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۖ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ ﴿۶۳﴾
وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَرَأَوُا
الْعَذَابَ ۚ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ ﴿۶۴﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ
مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ﴿۶۵﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ يَوْمَئِذٍ
فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ ﴿۶۶﴾ فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا
فَعَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ﴿۶۷﴾ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ

وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٨﴾
وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٦٩﴾ وَهُوَ اللّٰهُ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ
وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٧٠﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ
سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ
اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿٧١﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ
سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ
تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ
الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ
كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا
بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا
يَفْتَرُوْنَ ﴿٧٥﴾ ع ١٠

ترجمۂ آیات ۶۲-۷۵
اور اس دن کا دھیان کرو جس دن خدا ان کو پکارے گا پھر پوچھے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم میرا شریک گمان کرتے رہے ہو! تو جن پر خدا کی بات پوری ہو چکی ہو گی وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا، ہم نے ان کو اسی گمراہ کیا جس طرح ہم خود گمراہ ہوئے۔ ہم تیرے حضور ان سے اعلان براءت کرتے ہیں۔ یہ ہم کو نہیں پوجتے رہے ہیں۔ ۶۲-۶۳

اور ان سے کہا جائے گا کہ اب اپنے شریکوں کو بلاؤ تو وہ ان کو پکاریں گے لیکن وہ ان کو جواب نہ دیں گے اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے، کاش وہ ہدایت اختیار کرنے والے بنے ہوتے! ۶۴

اور اس دن کا دھیان کرو جس دن خدا ان کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تو اس دن ان کی سٹی بھول جائے گی تو وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ گچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ ہاں! جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور عمل صالح کیا، وہ توقع ہے کہ فلاح پانے والوں میں سے ہوگا۔ ۶۵-۶۷

اور تیرا رب ہی پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ ان کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اللہ پاک و برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور تیرا رب جانتا ہے جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور وہی اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی شکر کا حق دار ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور اسی کے اختیار میں فیصلہ ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۶۸-۷۰

ان سے کہو کہ بتاؤ، اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے، تا قیامت رات ہی کو مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے پاس روشنی لائے گا، تو کیا تم لوگ سنتے نہیں! کہو، تم لوگ بتاؤ، اگر تم پر دن ہی کو ہمیشہ کے لیے، تا قیامت مسلط رکھے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے لیے رات کو لائے گا جس میں تم سکون پاتے ہو۔ تو کیا تم لوگ دیکھتے نہیں! اور اس نے اپنی رحمت ہی سے تمھارے لیے رات اور دن کو بنایا ہے کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو۔ اور تاکہ تم شکرگزار ہو۔ ۷۱-۷۳

اور اس دن کا خیال کرو جس دن ان کو پکارے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کو تم میرا شریک گمان کرتے تھے۔ اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو الگ کریں گے اور لوگوں سے کہیں گے کہ اپنی دلیل پیش کرو تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ حق بجانب اللہ ہے۔ اور جو کچھ وہ افترا کرتے رہے تھے وہ سب ہوا ہو جائے گا۔ ۷۴-۷۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ (۶۲)

شرک اور اہل شرک کا انجام

یہ اور آگے کی تمام آیات مسلسل تنبیہات کی نوعیت کی ہیں جن میں یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن شرک کرنے والوں، شرک کے داعی لیڈروں اور خود شرکاء کا کیا حشر ہوگا۔ فرمایا کہ اس دن کو نہ بھولو جس دن خدا تمام مشرکین کو اپنی عدالت میں پیشی کے لیے پکارے گا اور ان کو حکم دے گا کہ میرے وہ شرکاء کہاں ہیں جن کو تم میرا شریک گمان کرتے رہے ہو؟ أَيْنَ شُرَكَائِيَ کے ابہام کے اندر مشرکین کے ساتھ ساتھ ان کے مزعومہ شرکاء پر جو قہر و غضب مضمر ہے وہ اصحاب ذوق سے مخفی نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اب ان کو پیش کرو تاکہ تم بھی اور تمہارے ساتھ وہ بھی اپنا انجام دیکھ لیں۔

قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۖ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ (۶۳)

گمراہ لیڈروں اور ان کے پیروؤں کی جوتی پیزار

حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ سے مراد مشرکین کے وہ لیڈر ہیں جن کے لیے خدا کا فیصلۂ عذاب صادر ہو جائے گا۔ فرمایا کہ گمراہ لوگ آخری عذر کے طور پر اپنے لیڈروں کی طرف اشارہ کریں گے کہ اے ہمارے رب! دراصل یہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا، اگر یہ ہمیں گمراہ نہ کرتے تو ہم گمراہ نہ ہوتے۔ أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ان کے لیڈر جھٹ جواب دیں گے کہ ہم جو کچھ خود تھے وہی ہم نے ان کو بنایا، یہ خود شامت زدہ تھے کہ انھوں نے ہماری پیروی کی۔ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ یعنی ہم ان کے اعمال کی ذمہ داری سے تیرے حضور میں اپنی برات کا اعلان کرتے ہیں۔ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ یہ لوگ ہماری پرستش نہیں کرتے رہے ہیں کہ ہمارے اوپر ان کی کوئی ذمہ داری ہو۔ یہ اپنی آزادی رائے اور اپنی پسند سے ہماری باتیں مانتے رہے ہیں ۔۔۔ گمراہ لیڈروں اور ان کے پیروؤں کی یہ جوتی پیزار قرآن مجید میں کئی جگہ مذکور ہوئی ہے۔ ہم ایک مثال اعراف سے پیش کرتے ہیں۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِی النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤی اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝ (الاعراف ۷: ۳۸-۳۹)

حکم ہوگا، داخل ہو جاؤ دوزخ میں ان گروہوں کے ساتھ جو جنوں اور انسانوں میں سے تم سے پہلے داخل ہوئے، جب جب داخل ہوگا کوئی گروہ وہ اپنے ہم مشربوں پر لعنت کرے گا۔ یہاں تک کہ جب سب اس میں اکٹھے ہو لیں گے، پچھلے اگلوں کے باب میں کہیں گے، اے ہمارے رب! یہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تو ان کو دونا عذاب دوزخ دے۔ ارشاد ہوگا، تم میں سے ہر ایک کے لیے دونا عذاب ہے لیکن تم جانتے نہیں۔ اور اگلے پچھلوں سے کہیں گے، تمھیں بھی تو ہم پر کوئی فضیلت نہ حاصل ہوئی تو اپنے عمل کی پاداش میں اب عذاب چکھو۔

حٰمٓ السجدۃ: ۳۰ آیت ۲۹ کے تحت ان شاء اللہ، ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

وَقِیْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا یَهْتَدُوْنَ (۶۴)

مشرکین کے معبودوں کی بے حقیقتی یعنی اپنے جن لیڈروں پر وہ اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈالنا چاہیں گے، جب وہ صاف صاف ان سے اعلانِ براءت کر دیں گے تو ان سے پھر کہا جائے گا کہ اب بولو، تمھارے ان لیڈروں نے تو تم سے براءت کا اعلان کر دیا تو تمھارے وہ معبود کہاں ہیں جن کی پرستش کرتے رہے ہو؟ اس وقت وہ گھبراہٹ میں اپنے ان شریکوں کو پکاریں گے جن کے وہ بت پوجتے رہے تھے۔ مثلاً لات، منات، عزیٰ اور نائلہ وغیرہ کو، لیکن وہ ان کی کوئی فریاد رسی نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہوگا۔ وہ محض خیالی ہستیاں تھیں۔ آخرت میں راز کھل جائے گا کہ انھوں نے محض گمان کی پرستش کی۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں ذکر مشرکینِ عرب کا ہے جن کے تمام اصنام و الٰہ محض خیالی اور خود تراشیدہ تھے۔ جن قوموں نے کسی واقعی ہستی کی پرستش کی ہے مثلاً نصاریٰ، جنھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی پرستش کی، ان کا ذکر قرآن میں الگ ہوا ہے کہ قیامت کے دن حضرت مسیح اپنے پرستاروں سے اعلانِ براءت کر دیں گے کہ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کچھ احمق لوگوں نے میری پرستش کی ہے۔ میں نے تو سب کو اللہ واحد کی بندگی کی دعوت دی تھی۔

وَرَاَوُا الْعَذَابَ یعنی جن کی شفاعت کی امیدوں پر جیتے اور مرے ان کا پکارنا بالکل صدا بصحرا

ثابت ہوگا۔ البتہ خدا کا عذاب سامنے ہوگا اور اس سے انھیں سابقہ پیش آئے گا۔

'لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ' یہ ان کے حال پر اظہارِ حسرت و افسوس ہے کہ کاش وہ ہدایت حاصل کرنے والے بنے ہوتے کہ اس عذاب سے دوچار نہ ہوتے۔ اس سے اس عذاب کی ہولناکی اور بے پناہی واضح ہوتی ہے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ٥ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ (۶۵-۶۶)

مشرکوں کی بدحواسی قیامت کے دن

یہ بھی روزِ قیامت کے احوال ہی کے سلسلہ کی بات ہے کہ اس دن ہر امت کی پکار ہوگی اور ان سے سوال ہوگا کہ خدا نے جو رسول تمھاری ہدایت کے لیے بھیجے ان کی دعوت کا تم نے کیا جواب دیا؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال بھی ان سے ان کے جرم کی سنگینی واضح کرنے کے لیے ہوگا کہ خدا نے تو تمھاری ہدایت کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ اپنے رسول بھیجے کہ ہر پہلو سے حق تم پر واضح ہو جائے تو تم بتاؤ، تم نے اس اہتمام کی کیا قدر کی!

'فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ' کا مفہوم ٹھیک وہی ہے جو ہم اپنے محاورے میں سٹی بھول جانے سے تعبیر کرتے ہیں یعنی اس وقت سب پر ایسی بدحواسی طاری ہوگی کہ کسی سے کوئی بات بنائے نہیں بنے گی۔

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے!

'فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ' یعنی وہ ایسی حالت سراسیمگی میں گرفتار ہوں گے کہ اس سوال کے جواب کے لیے کسی سے کچھ پوچھ پاچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ ایسے اوقات میں مرجع امید لیڈر ہوا کرتے ہیں لیکن ان کا ماجرا اوپر گزر چکا کہ انھیں خود اپنی پڑی ہوگی وہ دوسرے کی کیا خبر لیں گے! یہ مضمون مائدہ کی آیت ۱۰۹ میں بھی گزر چکا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ (۶۷)

اہلِ ایمان کے لیے فلاح کی بشارت

'عَسٰى' جب اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کے ساتھ آئے تو اس کے اندر، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، وعدہ اور بشارت کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔

جو لوگ شرک ہی پر جیسے اور مرے ان کا انجام واضح کرنے کے بعد یہ ان لوگوں کو بشارت دی ہے جو شرک و شفاعتِ باطل کے عقیدہ سے توبہ کر کے ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کر لیں گے، فرمایا کہ یہ لوگ توقع ہے کہ فلاح پانے والوں میں سے بنیں۔ یعنی یقین تو انھیں بھی اپنی فلاح کا نہیں کر بیٹھنا چاہیے اس لیے کہ نجات و فلاح جس کو بھی حاصل ہوگی خدا کے فضل ہی سے حاصل ہوگی لیکن توقع کا حق وہ رکھتے ہیں اس لیے کہ خدا غفور رحیم ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۭ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۶۸)

فرشتوں کی حیثیت

یہاں 'یَخْتَارُ' کے بعد بھی 'مَا یَشَآءُ' بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یہ فرشتوں کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو بھی خدا ہی نے پیدا کیا ہے اور اگر ان کو اپنا مقرب و برگزیدہ بنایا ہے تو اسی نے بنایا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ 'اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ' (الحج: ۷۵) (اللہ منتخب کرتا ہے اپنے رسول فرشتوں میں سے بھی اور لوگوں کے اندر سے بھی) مطلب یہ ہے کہ فرشتوں کو جو برتری باعتبار خلق یا باعتبار تقرب حاصل ہے، وہ خدا ہی کی عطا کردہ ہے۔ اس چیز کی بنا پر ان کو یہ درجہ حاصل نہیں ہو گیا ہے کہ ان کو خدا کی خدائی میں شریک بنا دیا جائے۔ 'مَا کَانَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ' ان کو بذاتِ خود کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ 'سُبْحٰنَ اللّٰہِ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ' اللہ تعالیٰ اس قسم کی تمام نسبتوں سے پاک اور برتر ہے۔ اگر کسی کو اس کے اختیارات اور اس کی صفات میں شریک بنا دیا جائے تو اس سے اس کی تمام اعلیٰ صفات کی نفی ہو جاتی ہے ___ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اوپر آیت ۶۴ میں جن شرکاء کا ذکر آیا ہے، وہ مشرکین عرب کے تصور کے مطابق، ملائکہ ہی کے زمرہ سے تعلق رکھنے والے تھے اس وجہ سے قرآن نے یہاں فرشتوں کی اصل حیثیت واضح فرما دی کہ ان کو خدا کی مخلوقات میں فی الجملہ برتری تو حاصل ہے لیکن یہ خداداد ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ان کی ذاتی نہیں ہے۔

وَرَبُّکَ یَعْلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوْرُھُمْ وَمَا یُعْلِنُوْنَ (۶۹)

احاطۂ علم الٰہی کی دلیل سے شرک کا ابطال

یہ احاطۂ علمِ الٰہی کی دلیل سے شرک کا ابطال فرمایا ہے کہ جب تیرا رب ان کے سرّ و علانیہ ہر چیز سے خود اچھی طرح باخبر ہے تو اس کو ضرورت کیا ہے کہ وہ کسی کو اپنا شریک و سہیم بنائے! وہ اپنی مملکت میں دوسروں کو شریک تو جب بنائے جب وہ لوگوں کے احوال و معاملات سے باخبر رہنے کے لیے کسی کا محتاج ہو اور اس کے ہاں کسی کے باب میں کسی کی سفارش کی ضرورت تو جب پیش آئے جب کوئی اس کے حضور میں اضافہ کرنے کی پوزیشن میں ہو کہ فلاں کے باب میں نعوذ باللہ خدا کو خبر نہیں ہے، اسے ہے۔ جب اس طرح کی کوئی بات فرض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو فرشتوں کو اس مفروضہ پر پوجنے کے کیا معنی کہ وہ خدا کے ہاں کسی کے لیے تقرب و سفارش کا وسیلہ ہیں!

وَھُوَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَۃِ وَلَہُ الْحُکْمُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (۷۰)

خلاصہ

یہ اوپر کی ساری بحث کا خلاصہ بیان کر دیا ہے کہ بس وہی اللہ معبودِ حقیقی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کے سوا جن کو بھی معبود بنایا گیا ہے سب باطل ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ کو معبودِ اعظم کی حیثیت سے اہلِ عرب بھی مانتے تھے لیکن ساتھ ہی اس کے شریک بھی مانتے تھے۔ یہ ان کے شرک کی نفی کر دی۔

'لَہُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَۃِ' یعنی دنیا میں بھی جو نعمت انسان کو ملی ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف

سے ملا ہے اور آخرت میں بھی جو نعمت حاصل ہونے والی ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ملے گی۔ اس وجہ سے اس دنیا میں بھی حمد و شکر کا سزاوار وہی ہے اور آخرت میں بھی وہی حمد و شکر کا سزاوار ہوگا، کسی دوسرے کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ آخرت میں اتمام نعمت کے بعد اہل جنت کی زبانوں پر جو ترانۂ حمد جاری ہوگا سورہ یونس میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

'وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ' ہر ایک کا فیصلہ اسی کے اختیار میں ہوگا اور سب کی پیشی اسی کے حضور میں ہونی ہے، کوئی اور مرجع و ماویٰ بننے والا نہیں ہے۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِضِيَاءٍ ۖ أَفَلَا تَسْمَعُونَ ۝ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (۷۱-۷۲)

مخاطب کے مسلّمات سے استدلال

'قُلْ' یہاں سوال کرنے اور پوچھنے کے معنی میں ہے جب سوال بالکل بدیہی نوعیت کا ہو جس کے جواب میں مخاطب کے لیے کسی اختلاف کی گنجائش نہ ہو تو اتمام حجت کے پہلو سے یہی لفظ زیادہ موزوں رہتا ہے۔ یہ بات مشرکین عرب کو بھی تسلیم تھی کہ آسمان و زمین اور روز و شب کا خالق خدا ہی ہے۔ ان کے اسی مسلمہ کو بنیاد بنا کر سوال فرمایا کہ بھلا بتاؤ تو سہی کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر ہمیشہ کے لیے رات ہی کو مسلط کر دے تو تمہارے معبودوں میں سے کوئی ہے جو تمہارے لیے دن کی روشنی نمودار کر سکے! اسی طرح بتاؤ کہ اگر وہ تمہارے اوپر قیامت تک کے لیے دن ہی کو مسلط کر دے تو کیا تمہارے معبودوں میں سے کسی کے اندر یہ بوتا ہے کہ وہ رات کو لا سکے جس میں تم دن کے تھکے ماندے سکون حاصل کرتے ہو! مطلب یہ ہے کہ جب اس کائنات کے ان تصرفات میں، جن پر تمام مخلوقات کے بقاء کا انحصار ہے، تمہارے ان دیویوں دیوتاؤں کو کوئی دخل نہیں ہے تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم نے ان کو خدا کی خدائی میں شریک بنا رکھا ہے!

اسلوبِ بیان کی بلاغت

یہاں اسلوب بیان کی یہ بلاغت بھی قابل توجہ ہے کہ شب کے ذکر کے بعد تو فرمایا کہ 'أَفَلَا تَسْمَعُونَ' (کیا تم لوگ سنتے نہیں) اور دن کے ذکر کے ساتھ فرمایا کہ 'أَفَلَا تُبْصِرُونَ' (کیا تم لوگ دیکھتے نہیں) یہ اسلوب تصویر حال کے لیے ہے۔ گویا پہلی بات شب کے اندھیرے میں فرمائی جا رہی ہے کہ اگر رات کے اندھیرے میں تمہیں سجھائی نہیں دے رہا ہے تو کیا سنائی بھی نہیں دے رہا ہے تو آخر اس بات کو سنتے کیوں نہیں! اسی طرح دوسری بات گویا دن کی روشنی میں فرمائی جا رہی ہے کہ اس وقت تو پورے دن کی روشنی موجود ہے تو کیا اس روشنی میں بھی تمہیں یہ بدیہی حقیقت نظر نہیں آ رہی ہے!

اس میں یہ بلاغت بھی ہے کہ معقولات کو محسوسات کی حیثیت دے دی گئی ہے جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بدیہیات ہیں جن کو سمجھنے کے لیے زیادہ تامل و فکر کی ضرورت نہیں ہے، بس اتنا کافی ہے کہ آدمی کے کان اور اس کی آنکھیں کھلی ہوں۔ لیکن تمہارا حال تو یہ ہے کہ نہ شب کے سکون میں تمہیں کچھ سنائی دیتا

نہ دن کے اجالے میں کچھ دکھائی دیتا۔

ایک چیز ان آیات میں اور بھی قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ رات کے ساتھ اس کی صفت 'تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ' تو مذکور ہوئی لیکن دن کے ساتھ اس کی کسی صفت کا ذکر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے جگہ جگہ اشارہ کیا ہے کہ بعض مرتبہ کلام کے متقابل اجزاء بتقاضائے ایجاز و بلاغت، حذف کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں دن کا فائدہ چونکہ بالکل واضح تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا۔ آگے والی آیت میں اس حذف کی وضاحت ہو گئی ہے۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۷۳)

خدا کے انعامات کا حق شکر

یعنی یہ رات اور دن کا لانا صرف خدا کے فضل و رحمت ہی کا کرشمہ ہے، کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے اور تمہارا خدا پر کوئی حق بھی قائم نہیں تھا کہ وہ تمہارے لیے یہ اہتمام کرتا کہ رات آ کر تمہارے لیے راحت و سکون کا بستر بچھائے اور پھر دن طلوع ہو کر تمہارے لیے تلاشِ رزق و فضل کا میدان گرم کرے۔ یہ سب کچھ مجرد خدا کی رحمت کا ظہور ہے تاکہ تم ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے اس رب کے شکرگزار رہو جس نے تمہارے لیے یہ کچھ اہتمام کیا ہے۔ آیت میں 'لِتَسْكُنُوْا' کا تعلق رات سے ہے اور 'وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ' کا تعلق دن سے۔ انسان کسبِ رزق کے لیے جو جدوجہد کرتا ہے اس کو 'ابتغائے فضل' سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ خدا کے پیدا کیے ہوئے اسباب و وسائل سے انسان کی ساری جدوجہد اسی کی مرضی کے مطابق ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ خدا کے دیے ہوئے اسلحہ کو خدا کے خلاف استعمال کرتا ہے اور اس طرح وہ اس کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ه وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۷۴-۷۵)

آخری اتمامِ حجت

آیت ۷۴ بعینہٖ اس سلسلۂ بحث کے آغاز میں بھی گزر چکی ہے۔ یہاں یہ ایک اور ماجرے کی تمہید کے طور پر آئی ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مشرکوں پر آخری اتمامِ حجت کے لیے یہ بھی کرے گا کہ ہر امت پر اپنے رسولوں کے ذریعہ سے یہ گواہی دلا دے گا کہ انھوں نے ان کو دینِ توحید کی تعلیم دی تھی، شرک کی تعلیم نہیں دی۔ رسولوں کی اس گواہی کے بعد اللہ تعالیٰ امتوں سے پوچھے گا کہ اب بتاؤ تم نے کس سند کی بنا پر خدا کے شریک ٹھہرائے، اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو پیش کرو، اس وقت سب پر واضح ہو جائے گا کہ حق بجانب اللہ ہے اور ان کے تمام خود تراشیدہ معبود بالکل بے حقیقت ثابت ہوں گے۔

'شَهِيْد' سے مراد اللہ کے وہ رسول ہیں جو ہر امت کی طرف بھیجے گئے۔ ان کو 'شہید' کے لفظ سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ انھوں نے خدا کے دین کی گواہی اپنی اپنی امتوں پر اس دنیا میں بھی دی ہے اور

آخرت میں بھی وہ گواہی دیں گے کہ انھوں نے خدا کا دین ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا تھا۔ اگر بعد والوں نے اس میں بدعتیں داخل کی ہیں تو یہ ان کی اپنی ذمہ داری ہے، وہ ان سے بری ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ہر امت اپنے شرک و بدعت کی تائید میں اپنے رسولوں اور نبیوں ہی کا حوالہ دیتی ہے کہ یہ انہی کی تعلیم ہے جس پر وہ عمل کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی شہادت کے ذریعہ سے ان پر آخری حجت تمام کر دے گا جس کے بعد کسی کے لیے لب کشائی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ سورۂ مائدہ کی آیات ۱۰۹-۱۱۷ کے تحت اس شہادت کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔ وضاحت مطلوب ہو تو ایک نظر ان پر بھی ڈال لیجیے۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تاویل مریم کی آیت ۶۹ اور حٰم السجدۃ کی آیت ۴۷ کی روشنی میں کرتے ہیں۔ لیکن مجھے اس پر اطمینان نہیں ہے۔ میں نے جو تاویل کی ہے دوسرے مفسرین کی تاویل بھی یہی ہے اور قرآن کے واضح نظائر اسی کے حق میں ہیں۔ والعلم عند اللہ۔

۶- آگے کا مضمون ___ آیات ۷۶-۸۴

آگے کا مضمون اوپر آیت ۵۸ سے مربوط ہو گیا ہے۔ اوپر یہ بیان ہوا تھا کہ اپنی رفاہیت و خوشحالی پر اترانے والی کتنی قومیں گزری ہیں جن کو خدا نے تباہ کر دیا اور ان کو اپنے جن معبودوں پر ناز تھا وہ ان کو خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکے۔ اس کے بعد ضمناً ردِ شرک کا مضمون آگیا جو آیت ۷۵ پر تمام ہوا۔ اس کے بعد پھر اسی اوپر والے مضمون کو از سرِ نو لے لیا اور ایک یہودی سرمایہ دار ___ قارون ___ کے فخر و غرور اور اس کے عبرت انگیز انجام کو بطور مثال ذکر کر کے ان لوگوں کو متنبہ فرمایا جو دنیا کی زینتوں پر ریجھ کر خدا اور آخرت کو بھلا بیٹھے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں قارون کا مماثل ابولہب تھا۔ اس کو بھی اپنی دولت پر بڑا ناز تھا اور اس کی یہ دولت مندی خود اس کے لیے بھی اور دوسرے بہتوں کے لیے بھی فتنہ بنی ہوئی تھی۔ اس مثال سے مقصود اسی طرح کے لوگوں کی آنکھیں کھولنا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۷۶-۸۴

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ
الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ
لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ (۷۶) وَابْتَغِ
فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۷۷ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ
اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ
اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ۭ وَلَا يُسْـَٔـلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۷۸
فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝۷۹
وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ
وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝۸۰ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ
بِدَارِهِ الْاَرْضَ ۣ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ ۤ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ۝۸۱ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ
بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ
عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ
ع ۸/۱۱ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸۲ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ
لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝۸۳
مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا
يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۸۴

ترجمۂ آیات ۷۶ - ۸۴

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا تو اس نے ان کے مقابل میں سر اٹھایا۔ اور ہم
نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے جن کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت سے مشکل سے

اٹھتی تھیں۔ جب کہ اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا کہ اترا و مت! اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو کچھ خدا نے تمھیں دے رکھا ہے اس میں آخرت کے طالب بنو۔ اور دنیا میں سے اپنے حصہ کو نہ بھولو۔ اور جس طرح خدا نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان کرو۔ اور زمین میں فساد کے طالب نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ فساد چاہنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۷۶-۷۷

اس نے جواب دیا کہ مجھے یہ جو کچھ ملا ہے میرے ذاتی علم کی بدولت ملا ہے۔ کیا اس نے یہ نہیں جانا کہ خدا نے اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چھوڑا جو قوت میں اس سے بڑھ چڑھ کر اور جمعیت میں اس سے زیادہ تھیں اور مجرموں سے ان کے جرموں کی بابت سوال بھی نہیں کیا جاتا۔ ۷۸

پس وہ پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے نکلا تو جو لوگ حیاتِ دنیا کے طالب تھے انھوں نے کہا کاش ہمیں بھی وہی کچھ حاصل ہوتا جو قارون کو حاصل ہے، بے شک وہ بڑا ہی نصیبہ ور ہے! اور جن لوگوں کو علم عطا ہوا تھا انھوں نے کہا، شامت زدو! ایمان اور عمل صالح والوں کے لیے خدا کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے اور یہ حکمت صرف صابروں ہی کو عطا ہوتی ہے۔ ۷۹-۸۰

پس ہم نے اس کے اور اس کے گھر سمیت زمین کو دھنسا دیا تو نہ اس کے لیے کوئی جماعت ہی ایسی اٹھی جو خدا کے مقابل میں اس کی مدد کرتی اور نہ وہ خود ہی اپنی مدافعت کرنے والا بن سکا۔ اور وہ لوگ جو کل اس کی جگہ کے متمنی تھے پکار اٹھے کہ لاریب! اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے

چاہتا ہے تنگ کرتا ہے۔ اگر اللہ کا ہم پر فضل نہ ہوا ہوتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا۔ لاریب، کافر فلاح نہیں پائیں گے! ۸۱-۸۲

یہ دارِ آخرت ہم انہیں لوگوں کے لیے خاص رکھیں گے جو زمین میں غرور اور فساد کے چاہنے والے نہیں ہیں اور انجام کار کی کامیابی خدا ترسوں ہی کے لیے ہے۔ جو نیکی کما کر لائے گا تو اس کے لیے اس سے بہتر صلہ ہے اور جو بدی کما کر لائے گا تو بدی کمانے والوں کو وہی بدلہ ہی ملے گا جو وہ کر کے آئیں گے۔ ۸۳-۸۴

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ (۷۶)

قارون کا حضرت موسیٰؑ پر حسد

قارون کا ذکر تورات کی کتاب گنتی باب ۱۶ میں آیا ہے۔ تورات میں اس کا نام قورح مذکور ہوا ہے، اس کے نسب نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات موسیٰؑ و ہارونؑ کے خاندان — بنی لاوی — سے اور رشتہ میں حضرت موسیٰؑ کے سگے چچا کا لڑکا تھا۔ اس کو حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کی امامت و سیادت کا بڑا حسد تھا اس وجہ سے اس نے یہ نعرہ بلند کیا کہ خاندان کے تمام آدمی یکساں مقدس اور دیندار ہیں تو آخر موسیٰؑ و ہارونؑ (علیہما السلام) ہی کو کیا ایسے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ وہ قوم کی امامت و پیشوائی کریں۔ دوسروں کو یہ حق کیوں حاصل نہیں ہے! چنانچہ وہ خاندان کے کچھ لوگوں کو ملا کر حضرت موسیٰؑ کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ تورات کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"اور قورح بن اضہار بن قہات بن لاوی نے بنی روبن میں سے الیاب کے بیٹوں داتن اور ابیرام اور پلت کے بیٹے اون کے ساتھ مل کر اور آدمیوں کو ساتھ لیا اور وہ اور بنی اسرائیل میں سے ڈھائی سو اور اشخاص، جو جماعت کے سردار اور چیدہ اور مشہور آدمی تھے، موسیٰ کے مقابل میں اٹھے اور وہ موسیٰ و ہارون کے خلاف اکٹھے ہو کر ان سے کہنے لگے تمہارے تو بڑے دعوے ہو چلے کیونکہ جماعت کا ایک ایک آدمی مقدس ہے اور خداوند ان کے بیچ رہتا ہے سو تم اپنے آپ کو خداوند کی جماعت سے بڑا کیونکر ٹھہراتے ہو" (گنتی باب ۱۶: ۱-۳)

اس کی اسی بغاوت کو قرآن نے یہاں 'فَبَغٰی عَلَیْہِمْ' سے تعبیر فرمایا ہے۔

قارون کی دولت مندی

'وَاٰتَیْنٰہُ مِنَ الْکُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَہٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَۃِ اُولِی الْقُوَّۃِ' یہ اس کی سرمایہ داری اور دولت مندی کا ذکر فرمایا جس سے مقصود اس کی اس سرکشی اور استکبار کے سبب پر روشنی ڈالنا ہے کہ چونکہ وہ بڑا مالدار آدمی تھا اس وجہ سے اس کو یہ بات کھلتی تھی کہ وہ اپنے مقابل میں اپنے خاندان اور اپنی قوم پر حضرات موسیٰؑ و ہارونؑ کی برتری تسلیم کرے۔ فرمایا کہ ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقت ور جماعت سے اٹھتی تھیں۔ یہ کوئی مبالغہ کا اسلوب بیان نہیں ہے بلکہ بیان واقعہ ہے۔ اس زمانے میں خزانوں کی حفاظت کے لیے اس طرح کی تجوریاں، آہنی الماریاں اور سیف نہیں ہوتے تھے جس طرح کے ہمارے زمانے میں ہوتے ہیں اور نہ اس طرح کے صیقل کردہ قفل اور کنجیوں ہی کا رواج تھا جن کا اب ہے۔ اس زمانے کے بڑے سرمایہ دار بالعموم زمین دوز خزانے بناتے اور ان کو محفوظ کرنے کے لیے ان کے پھاٹکوں اور دروازوں میں بڑے بڑے آہنی کنڈے لگا کر ان میں بھاری بھاری آہنی اڑنگے، جو خاص اسی غرض کے لیے تیار کیے جاتے، پھنساتے۔ ان اڑنگوں کو پھنسانا اور ان کو کھولنا دونوں ایک مشکل کام ہوتا اور ان کے تمام لوازم مل ملا کر ایک بھاری بوجھ بن جاتے۔ جب بھی ان کو ہٹانے یا اٹھانے کی ضرورت پیش آتی تو ایک طاقت ور جماعت کی ضرورت ہوتی۔ یہی طریقہ اس زمانے میں شہر پناہوں اور قلعوں کے آہنی دروازوں کو بند کرنے کے لیے بھی اختیار کیا جاتا۔ اس طریقہ کی بعض یادگاریں اب بھی ہماری دیہاتی زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ آیت میں اسی طرح کی کنجیوں کی طرف اشارہ ہے۔ عرب میں جس طرح کسی کے پاس بھاری بھاری دیگوں کا پایا جانا اس کی فیاضی کی دلیل تھا اسی طرح اس قسم کی کنجیوں کا پایا جانا اس کی سرمایہ داری کی نشانی تھا۔

قوم کے دانشمندوں کی قارون کو نصیحت

'اِذْ قَالَ لَہٗ قَوْمُہٗ لَا تَفْرَحْ ...' جب اس نے سرکشی کی یہ روش اختیار کی تو اس کی قوم کے دانشمند لوگوں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کے غرور میں خدا ہی کے خلاف نہ اکڑو، یاد رکھو کہ خدا اکڑنے اور اترانے والوں کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ یہ شائستہ الفاظ میں اس کو تنبیہ تھی کہ یہ روش اختیار کرنے والے بالآخر خدا کی پکڑ میں آجاتے ہیں۔ لفظ قوم اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد قوم کے اصحاب علم ہیں۔ آگے آیت ۸۰ میں اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ یہاں عام لفظ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قوم کی اکثریت حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھی صرف تھوڑے سے مفاد پرست تھے جن کو قارون نے اپنے ساتھ ملا کر اپنی پارٹی بنالی تھی۔

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰىکَ اللّٰہُ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ (۷۷)

یہ اسی نصیحت کی مزید تفصیل ہے جو انھوں نے قارون کو کی۔ اس کا ایک ایک فقرہ حکمت و معرفت کا

خزانہ ہے۔

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰـکَ اللّٰہُ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ۔ یعنی خدا نے تمھیں یہ رفاہیت جو بخشی ہے اکڑنے اور اترانے کے لیے نہیں بخشی ہے بلکہ اس لیے بخشی ہے کہ تم اس کو آخرت کی فوز و فلاح حاصل کرنے کا ذریعہ بناؤ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ بھی تمھیں حاصل ہے نہ تمھارے اب وجد کی میراث ہے اور نہ تمھاری قابلیت و استحقاق کا کرشمہ ہے بلکہ یہ سرتاسر خدا کی بخشش ہے اور اس کی ہے کہ خدا نے تمھارا امتحان کیا ہے کہ اس کو پاکر تم اس کے پرستار بن کر بیٹھ جاتے ہو یا اس کو خدا کی خوشنودی و رضا طلبی کا ذریعہ بناتے ہو۔

وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا۔ یہ نہایت حکیمانہ تنبیہ ہے کہ یاد رکھو کہ اس دنیا کی ہر چیز آنی و فانی ہے۔ اس کی کسی چیز کو بھی بقا نہیں ہے۔ تمھاری ابدی زندگی میں اس میں سے تمھارے کام آنے والی چیز وہی بنے گی جو تم آج خدا کی راہ میں صرف کرو گے۔ اگر تم خدا اور اس کے بندوں کے حقوق سے آنکھیں بند کیے ہوئے سونے اور چاندی کے اس ڈھیر کی پوجا کرتے رہے تو یاد رکھو کہ وبال اور نار کے سوا تم اس سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکو گے۔

عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ تم اس دنیا میں سے بھی اپنا حصہ نظر انداز نہ کرو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آخرت کی خاطر اس دنیا کو تج دو بلکہ یہ کہتے ہیں کہ آخرت کو بھی فراموش نہ کرو۔ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل غلط ہے اور گوناگوں پہلوؤں سے غلط ہے لیکن صحیح مطلب واضح کر دینے کے بعد اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ: یعنی جس طرح خدا نے تمھارے ساتھ یہ اچھا معاملہ کیا ہے اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔ خدا اپنی صفات کا عکس اپنے بندوں میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ یاد رکھو کہ جو خدا محسن ہے وہ کبھی ان لوگوں کو پسند نہیں کر سکتا جو اس کے بندوں کے معاملے میں تنگ دل ہوں۔

فساد فی الارض کی حقیقت وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ۔ یہ اسی مضمون کی وضاحت اس کے منفی پہلو سے ہے۔ فَسَادِ فِی الْاَرْضِ کی وضاحت ہم اس کتاب میں جگہ جگہ کر چکے ہیں۔ زمین میں فساد صرف چوری، رہزنی اور ڈکیتی ہی نہیں ہے۔ یہ تو محض اس کے بعض مظاہر ہیں۔ اصل فساد علو و استکبار ہے۔ استکبار کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے حدود بندگی سے تجاوز کر کے خدا کے حدود و حقوق میں مداخلت کرے۔ جو لوگ اس جرم کے مرتکب ہیں وہ مفسدین فی الارض میں شامل ہیں، خواہ وہ یہ کام کتنی ہی ناش فروشیوں کے ساتھ کریں۔ ایسے لوگوں کو خدا پسند نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ وہ ان لوگوں کو کیسے پسند کر سکتا ہے جو اس کے مقابل میں سر اٹھائیں اور اس کے حرم میں دراز دستی کریں۔ اور جب وہ ان کو پسند نہیں کرتا تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ ان کی حیثیت اس کے چمن میں خود رو جھاڑیوں اور اس کے خوان کرم پر ناخواندہ مہمانوں

کی ہے۔ بالآخر ایک وقت آئے گا کہ خودرو جھاڑیاں اکھاڑی جائیں گی اور ناپسندیدہ لوگ کھدیڑے جائیں گے!

قَالَ إِنَّمَآ أُوتِيتُهُۥ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِىٓ ۚ أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ ٱللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن قَبْلِهِۦ مِنَ ٱلْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا ۚ وَلَا يُسْـَٔلُ عَن ذُنُوبِهِمُ ٱلْمُجْرِمُونَ (۷۸)

قارون کا جواب

قارون نے جواب دیا کہ یہ مال و متاع جو مجھے حاصل ہے میری حسنِ تدبیر، مہارتِ فن اور قابلیت کا ثمرہ ہے، اس کو خدا سے کیا تعلق کہ اس میں اس کا کوئی حق قائم ہوا اور مجھ پر اس کے ادا کرنے کی ذمہ داری ہوا لفظ 'عِندِىٓ' سے اس کے ذہن کا یہ مخفی پہلو ظاہر ہوتا ہے کہ اس تمام دولت کا سرچشمہ خود میرے اندر ہے نہ کہ خدا کے اندر اس وجہ سے مجھے اس باب میں خدا یا کسی اور سے کوئی اندیشہ نہیں ہے مطلب یہ ہوا کہ آپ لوگوں کا یہ سارا وعظ میرے آگے بالکل بے سود ہے، یہ وعظ کسی اور کو سنائیے!

اللہ تعالیٰ کی تنبیہ

'أَوَلَمْ يَعْلَمْ الآیۃ' یہ اس کے قول پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبصرہ ہے کہ اس بدقسمت نے یہ لاف زنی کرتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ اس سے پہلے کتنے گزر چکے ہیں جو قوت و جمعیت میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوئے لیکن خدا نے ان کو چشم زدن میں تباہ کر دیا! یہ امر ملحوظ رہے کہ اس سے کچھ ہی پہلے فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ پیش آ چکا تھا جس کو اگر اس نے دیکھا نہیں تو سنا تو بہرحال ہوگا۔ یہاں 'أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً' میں اسباب و وسائل، خدم و حشم اور اسلحہ و آلات کی قوت مراد ہے اور 'أَكْثَرُ جَمْعًا' میں 'جمع' سے قبیلہ و خاندان کی جمعیت مراد ہے۔

'وَلَا يُسْـَٔلُ عَن ذُنُوبِهِمُ ٱلْمُجْرِمُونَ' جب خدا اس قسم کے مجرموں کو پکڑنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر ان کو اتنی مہلت بھی نہیں دی جاتی کہ ان سے ان کے جرم کی بابت کچھ پوچھ لیا جائے اور اگر ان کے پاس کوئی جواب ہے تو وہ سن لیا جائے۔ بلکہ اس کا عذاب ان کو فوراً دبوچ لیتا ہے اور قیامت کے دن بھی خدا کو کسی سے اس کے جرائم کی بابت کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ہر مجرم کی پیشانی اس کے ہاتھ پاؤں اور اس کے اعضاء و جوارح خود اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ يُعْرَفُ ٱلْمُجْرِمُونَ بِسِيمَٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِٱلنَّوَٰصِى وَٱلْأَقْدَامِ (رحمٰن: ۴۱)

فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِۦ فِى زِينَتِهِۦ ۖ قَالَ ٱلَّذِينَ يُرِيدُونَ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا يَٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ أُوتِىَ قَٰرُونُ إِنَّهُۥ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (۷۹)

قارون کا جلوس اور عوام پر اس کا اثر

معلوم ہوتا ہے اس نے اسی دوران میں اپنے زور و اثر اور اپنی قوت و جمعیت کی نمائش کے لیے کوئی جلوس نکالا تاکہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کو مرعوب اور اپنی جمعیت میں اضافہ کرے۔ 'فِى زِينَتِهِۦ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس موقع پر اس نے اپنی دولت و حشمت کا خاص طور پر مظاہرہ کیا اس لیے کہ عوام کالانعام کو سب سے زیادہ یہی چیز متاثر کرتی ہے۔ بہ لعینہٖ اسی طرح کی حرکت ہے جس،

کے تماشے آئے دن آپ کے لیڈر حضرات آپ کے شہروں اور قصبوں میں دکھاتے رہتے ہیں۔ اس کا اثر ان لوگوں پر جو اسی دنیا کی دولت کو سب کچھ سمجھتے ہیں، یہ پڑا کہ وہ اس کا نعرہ لگانے لگے کہ بے شک قارون بڑا ہی نصیبہ ور ہے!

وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ (۸۰)

قوم کے اہل دانش کا رد؟

قوم میں جو لوگ علم و دانش رکھنے والے تھے انھوں نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اصل چیز مال و دولت اور اس کی نمائش نہیں ہے بلکہ ایمان و عمل صالح اور اس کا اجر و ثواب ہے جس کے لیے انسان کو اپنی زندگی وقف کرنی چاہیے۔ لیکن یہ حکمت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی، صرف انہی کو حاصل ہوتی ہے جن کے اندر دنیا کی رغبات و مطامع کے مقابل میں ایمان و عمل پر جمے رہنے کی ہمت و عزیمت ہوتی ہے۔

حقیقی علم خدا کی معرفت اور آخرت کا علم ہے

'اُوْتُوا الْعِلْمَ' میں 'علم' سے مراد علم حقیقی ہے یعنی خدا کی معرفت اور آخرت کا علم۔ یہی علم ہے جس سے انسان کو اصل روشنی حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ علم کسی کو حاصل نہ ہو تو وہ تاریکی میں ہے، اگرچہ وہ دوسرے علوم میں کتنا ہی شاطر ہو۔ قارون مالیات کے فن کا بہت بڑا ماہر تھا اور اوپر واضح ہو چکا ہے کہ اس کو اس فن میں مہارت کا دعویٰ بھی تھا لیکن علم حقیقی سے وہ محروم تھا اس وجہ سے اتنی دولت رکھنے کے باوجود اس کی حیثیت ایک مارِ گنج سے زیادہ نہ بن سکی۔ بالکل یہی حال دوسرے علوم کا بھی ہے۔ وہ بھی انسان کے لیے نافع اسی وقت بنتے ہیں جب اس کو علم حقیقی کا نور حاصل ہو۔ اگر اس نور سے وہ محروم ہو تو ان سے وہ چالاک، کاردان اور شاطر تو بن جاتا ہے لیکن انسان نہیں بنتا۔ اور بغیر انسان بنے چالاکی و ہوشیاری نہایت خطرناک چیز ہے۔ یہ نادان کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھیے کہ جہاں تک مجرد چالاکی و ہوشیاری کا تعلق ہے اس فن میں شیطان کسی سے پیچھے نہیں ہے بلکہ وہ تمام چالاکوں کا مرشد و امام ہے۔

حکمت صابروں کو حاصل ہوتی ہے

'وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ' میں ضمیر کا مرجع وہ حکمت و موعظت ہے جس کی ان اصحاب علم نے تلقین فرمائی۔ اس طرح ضمیر لانا عربی میں معروف ہے اور اس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ علم حقیقی اور صبر دونوں بالکل توام ہیں اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اصل حکمت صرف انہی کو حاصل ہوتی ہے جن کے اندر صبر ہو۔ یعنی جو آخرت کی طلب میں اس دنیا کی بڑی سے بڑی دولت و شوکت کو قربان کرنے کی اپنے اندر ہمت رکھتے ہوں۔ جن کے اندر یہ حوصلہ اور ظرف نہ ہو وہ اس حکمت کے حامل نہیں بن سکتے۔

اس ٹکڑے کے متعلق ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ انہی اصحاب علم کے قول کا جزو ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور تضمین ان کی تحسین ہے۔ اس بارے میں ابھی جزم کے ساتھ کوئی بات

میں نہیں کہہ سکتا لیکن اس طرف ذہن جاتا ضرور ہے اور قرآن میں اس کی نظیریں بھی موجود ہیں۔ اس صورت میں اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ حکمت ان لوگوں کو اس وجہ سے عطا ہوئی کہ یہ صابرین میں سے تھے۔ قارون کی دولت و حشمت اور اس کے طمطراق سے مرعوب ہوکر پھسل جانے والے لوگ نہیں تھے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ (۸۱)

قارون پر حضرت موسیٰؑ کی لعنت اور اس کا عبرتناک انجام

یہاں قارون کے اس قصہ کا ایک حصہ محذوف ہے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے دیکھا کہ سامری کے فتنہ کے بعد ان کی قوم میں ایک اور فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے تو انھوں نے قارون اور اس کے ساتھیوں کو خیمۂ اجتماع کے سامنے مباہلہ کی دعوت دی تاکہ واضح ہو جائے کہ خدا کی نظروں میں مقبول اور پسندیدہ کون ہے۔ تورات میں اس کی تفصیل طویل ہے۔ ہم صرف اس کا ضروری حصہ یہاں نقل کرتے ہیں۔

> اور داتن اور ابیرام اپنی بیویوں، بیٹوں اور بال بچوں سمیت نکل کر اپنے خیموں کے دروازوں پر کھڑے ہوئے۔ تب موسیٰ نے کہا، اس سے تم جان لوگے کہ خداوند نے مجھے بھیجا ہے کہ میں یہ سب کام کروں کیونکہ میں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔ اگر یہ آدمی (اشارہ قارون اور اس کے جتھہ کی طرف ہے) ویسی ہی موت مریں جو سب لوگوں کو آتی ہے یا ان پر ویسے ہی حادثے گزریں جو سب پر گزرتے ہیں تو میں خداوند کا بھیجا ہوا نہیں ہوں۔ پر اگر خداوند کوئی نیا کرشمہ دکھائے اور زمین اپنا منہ کھول دے اور ان کو ان کے گھر بار سمیت نگل جائے اور یہ جیتے جی پاتال میں سما جائیں تو تم جاننا کہ ان لوگوں نے خداوند کی تحقیر کی ہے۔ اس نے یہ باتیں ختم ہی کی تھیں کہ زمین ان کے پاؤں تلے پھٹ گئی اور زمین نے اپنا منہ کھول دیا اور ان کو اور ان کے گھر بار کو اور قورح کے ہاں کے سب آدمیوں کو اور ان کے سارے مال و اسباب کو نگل گئی۔ سو وہ اور ان کا سارا گھر بار پاتال میں سما گئے اور زمین ان کے اوپر برابر ہوگئی اور وہ جماعت میں سے نابود ہو گئے اور سب اسرائیلی جو ان کے آس پاس تھے ان کا چلانا سن کر یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ کہیں زمین ہم کو بھی نہ نگل لے۔ (گنتی باب ۱۶: ۲۸-۳۴)

اس سے معلوم ہوا کہ قارون اور اس کے ساتھیوں کے زمین میں دھنسائے جانے کا واقعہ حضرت موسیٰؑ کی لعنت اور بددعا کے نتیجے میں ظہور میں آیا۔ اور اس طرح پیش آیا کہ نہ قارون اپنی مدافعت میں کچھ کر سکا اور نہ اس کا وہ جتھہ اس کے کچھ کام آسکا جس کے بل پر اس نے حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ کرنا چاہا تھا۔

وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (۸۲)

عام ذہن کے لوگ کسی کو اقتدار یا دولت مند دیکھتے ہیں تو اس پر رشک سے مرنے لگتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اس کا یہ اقتدار اور اس کی یہ دولت لازوال ہے۔ ان کو لاکھ سمجھائیے کہ یہ چیزیں عارضی و فانی ہیں لیکن یہ بات کسی طرح ان کے دل میں نہیں اترتی البتہ جب وہ چاروں شانے چت گرتا ہے تب ان کو ناصحوں کی باتیں یاد آتی ہیں اور وہ بھی پکار اٹھتے ہیں کہ ہاں بھائی! ٹھیک کہا تھا جس نے کہا تھا کہ اللہ ہی کے اختیار میں سب کا رزق و فضل ہے، وہی جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے۔ یہی حال قارون کے طمطراق پر فریفتہ ہونے والوں کا بھی ہوا۔ انھوں نے بھی جب اس کا انجام دیکھا تو بول اٹھے کہ یہ اللہ کا بڑا احسان ہوا کہ ہم اس کے ساتھی نہ بنے ورنہ ہمارا بھی وہی حشر ہوتا جو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا ہوا۔ ان لوگوں کی بات سچی نکلی جو کہتے تھے کہ کافروں کو فلاح حاصل نہیں ہوتی!

عوام کی زود پشیمانی

لفظ 'امس'، فصیح عربی میں صرف گزرے ہوئے کل کے لیے نہیں آتا بلکہ ماضی قریب کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں یہ تو کل کی بات ہے' یہاں بھی یہ اسی مفہوم میں ہے یعنی ابھی کل تک جو لوگ قارون کی شان و شوکت پر مرتے تھے وہ یہ کہنے لگے۔

'امس' کا محل استعمال

'وَیْ کَاَنَّ' میں 'وَیْ' تنبیہ کا کلمہ ہے۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں ارے کہتے ہیں اسی طرح عربی میں 'وَیْ' ہے۔ اس کے ساتھ جب 'کَاَنَّ' یا 'کَاَنَّہٗ' مل جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ 'ارے! یہ تو گویا کہ وہی بات ہوئی ......'

'وی' کا محل استعمال

'یَبْسُطُ' کے بعد 'لِمَنْ یَّشَآءُ' تقابل کے معروف اصول کے مطابق حذف ہوگیا ہے۔ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔

اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قارون کی یہ حکایت محض ماضی کی ایک حکایت کی حیثیت سے نہیں بیان ہوئی ہے بلکہ اس کے پردے میں ابولہب اور اس کے ساتھیوں کا کردار اور انجام پیش کیا گیا ہے جس قسم کا فتنہ حضرت موسیٰؑ کی قوم میں قارون تھا اسی قسم کا فتنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں ابولہب تھا۔ یہاں زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن دونوں کی مماثلت کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم اشارہ کریں گے تاکہ اس قصہ کی اصلی حکمت واضح ہو سکے۔

قارون اور ابولہب میں مماثلت کے بعض پہلو

(۱) جس طرح قارون حضرت موسیٰؑ کے خاص خاندان ــــ بنی لاوی ــــ کا سب سے بڑا دولت مند تھا اسی طرح ابولہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان ــــ بنی ہاشم ــــ میں سب سے بڑا دولت مند تھا۔ رشتہ کے اعتبار سے بھی دونوں میں بڑی مماثلت تھی۔ ابولہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا اور قارون، اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں، حضرت موسیٰؑ کا برادر عم زاد تھا۔

(۲) دونوں بڑے اونچے درجے کے سرمایہ دار تھے۔ قارون کی دولت مندی کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ ابولہب کی دولت کا ذکر ان شاء اللہ سورۂ ہمزہ اور سورۂ لہب کی تفسیر میں آئے گا۔ ابولہب خانۂ کعبہ کا کلید بردار

اور رفادہ کے پورے خزانے پر تنہا قابض و متصرف تھا۔ اس طرح اس نے حرام و حلال کے تمام راستوں سے بے شمار دولت اکٹھی کرلی تھی۔

(۳) دونوں نہایت بخیل، شکبر اور قسی القلب تھے۔

(۴) اپنے اپنے رسولوں کے ساتھ دونوں کے عناد کی نوعیت بھی ایک ہی تھی۔ قارون یہ چاہتا تھا کہ خاندان کی مذہبی پیشوائی اسے حاصل رہے تاکہ اس کی سرمایہ داری پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ابولہب بھی یہی چاہتا تھا کہ خانہ کعبہ کی کلید برداری اور رفادہ کی دولت پر اس کا قبضہ رہے، اس سے اسے کوئی محروم نہ کرنے پائے۔

(۵) انجام کے اعتبار سے بھی دونوں میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں خدا کے قہر و غضب کے ہدف ہوئے۔ قارون کا انجام اوپر بیان ہو چکا ہے۔ ابولہب کا انجام ان شاء اللہ، سورۂ لہب کی تفسیر میں تفصیل سے بیان ہوگا۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ یہاں قارون کے پردے میں درحقیقت ابولہب اور ابولہب پرستوں کا ذکر ہوا ہے۔ جب تک قرآن میں بیان کردہ واقعات کا یہ پہلو سامنے نہ ہو اس وقت تک ان کی اصل حکمت واضح نہیں ہوتی۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۸۳)

اوپر کی موعظت کا خلاصہ

یہ اوپر کی بیان کردہ موعظت کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ یہ دارِ آخرت جس کا ذکر ہوا، ہم نے ان لوگوں کے لیے خاص کر رکھا ہے جو خدا کی زمین میں استکبار اور فساد کے طالب نہیں بنیں گے بلکہ اس کے بندے بن کر زندگی بسر کریں گے اور اس کے اندر اس نظامِ حق و عدل کے حامی و علم بردار ہوں گے جس کو خدا نے پسند فرمایا ہے۔ یہی لوگ متقی ہیں اور انجام کار فوز و فلاح ان متقیوں ہی کے لیے ہے۔ نَجْعَلُهَا یہاں خاص کرنے کے مفہوم میں ہے اور یہ بات فحوائے کلام سے واضح ہے کہ اصل متقی وہی لوگ ہیں جن کے سینے استکبار سے اور جن کے اعمال فساد سے پاک ہوں۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۸۴)

نیکوں کے ساتھ فضل اور بدوں کے ساتھ عدل کا معاملہ

یہ وہ اصول بیان فرما دیا جس کے مطابق آخرت میں نیکوں اور بدوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ معاملہ کرے گا۔ فرمایا کہ جو نیکی کی کمائی کر کے آئیں گے ان کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے مطابق معاملہ کرے گا، ان کو ان کی نیکیوں سے کہیں بہتر صلہ دے گا۔ اور جو بدی کی کمائی کر کے آئیں گے ان کے ساتھ اپنے عدل کے مطابق معاملہ کرے گا۔ جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا اس کا ثمرہ ان کے آگے رکھ دیا جائے گا کہ یہ تمھاری اپنی ہی بوئی ہوئی فصل کا حاصل ہے، اب اس کا مزا چکھو!

۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۸۵-۸۸

خاتمۂ سورہ آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اس قرآن کو تم نے خدا سے مانگ کر تو لیا نہیں ہے کہ اس کی فکر میں گھلے جا رہے ہو۔ جس خدا نے تم پر اس کو اتارا ہے وہی اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ کرنے میں تمہارا مددگار رہے گا۔ وہ تم کو بہر حال کامیابی کی منزل تک پہنچائے گا۔ تو تم ان مخالفین کی ذرا پروا نہ کرو۔ اپنی دعوت پر جمے رہو۔ یہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم اپنے موقف میں ذرا بھی تبدیلی یا نرمی نہ آنے دو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۸۵-۸۸ إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ مَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٨٥﴾ وَمَا كُنتَ تَرْجُو أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ ﴿٨٦﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ آيَاتِ اللَّهِ بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ إِلَيْكَ ۖ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٨٧﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ ۘ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ (وقف لازم) لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٨﴾

ع ۹ ۱۲

ترجمۂ آیات ۸۵-۸۸ بے شک جس نے تم پر قرآن کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ تمہیں ایک اچھے انجام تک پہنچا کے رہے گا۔ کہہ دو کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اللہ کی ہدایت لے کر آیا ہے اور کون ہے جو کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ ۸۶

اور تم تو متوقع نہ تھے کہ تم پر کتاب اتاری جائے، یہ تو بس تمہارے رب کا فضل ہوا ہے اور تم ان کافروں کے پشت پناہ نہ بنو۔ اور یہ تم کو اللہ کی آیات سے روکنے نہ پائیں جب کہ وہ تمہاری طرف اتاری جا چکی ہیں اور تم اپنے رب کی دعوت دو اور مشرکوں میں سے

نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ فیصلہ اسی کے اختیار میں ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۸۶ - ۸۸

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ مَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۸۵)

نصرت کی شاندار کامیابی کی بشارت

'معاد' کے معنی مرجع، نہایت اور انجام کار کے ہیں۔ اس کی تنکیر یہاں تفخیم شان پر دلیل ہے اس وجہ سے یہ 'معاد حسن' کے مفہوم میں ہوگا یعنی شاندار انجام اور اعلیٰ مرجع۔

اوپر کے مباحث کے بعد بطور خلاصۂ بحث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ تم ان مخالفوں کی مخالفت کی ذرا پروا نہ کرو۔ جس نے تمہارے اوپر اس قرآن کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ اس کے فرائض کی ادائیگی کی راہ میں ہر قدم پر تمہاری مدد فرمائے گا اور دنیا و آخرت دونوں میں تمہیں شاندار انجام سے ہم کنار کرے گا۔

'لَرَادُّكَ' کے اندر ایک فیصلۂ حتمی و قطعی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ بات علیٰ رغم اعداء ہو کے رہے گی۔ جس طرح خدا نے اپنے تمام رسولوں کو فائز المرام کیا اسی طرح تمہیں بھی فائز المرام کرے گا۔ رسولوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے وہ بالکل اٹل ہے۔

'قُل رَّبِّي أَعْلَمُ مَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ' یعنی اب اپنے ان مخالفین سے بحث بند کرو اور ان سے یہ آخری بات کہہ دو کہ خدا خوب جانتا ہے کہ کون اللہ کی ہدایت لے کر آیا ہے اور کون کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک افہام و تفہیم کا تعلق ہے تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ وہی فیصلہ فرمائے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون گمراہی پر۔ 'الْهُدَىٰ' سے مراد ہدایت الٰہی ہے۔ اس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔ خدا کی ہدایت کے بعد اگر کوئی شخص گمراہی میں پڑا رہے تو وہ ایک کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ جس طرح کوئی شخص پورے دن کی روشنی میں بھٹکتا پھرے۔

وَمَا كُنتَ تَرْجُو أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ (۸٦)

جو ذمہ داری بندے پر خدا ڈالتا ہے وہ اس میں اس کی مدد فرماتا ہے

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ تم نے یہ کتاب اپنے اوپر خدا سے مانگ کر نہیں اتروائی

نہیں ہے کہ اس کی ساری ذمہ داری خدا تم پر ڈال کر اس سے بے تعلق ہو جائے۔ یہ تو تمھارے رب کی رحمت ہے جو اس نے تم پر تمھاری طلب و تمنا کے بغیر، نازل فرمائی ہے تو جس کام کے لیے اس نے تمھیں خود منتخب فرمایا ہے وہی اس کے حقوق و فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہر گام پر تمھاری رہنمائی بھی فرمائے گا اور چونکہ یہ رحمت ہے، کوئی زحمت نہیں ہے اس وجہ سے بہر حال اس کا انجام تمھارے حق میں بھی اور ان لوگوں کے حق میں بھی جو اس کو قبول کریں گے، رحمت ہی کا باعث ہوگا۔ اگر ناشکرے لوگ اس کی ناقدری کر رہے ہیں تو وہ اپنے ہی کو خدا کی رحمت سے محروم کر رہے ہیں۔

قریش کو بالواسطہ تنبیہ

فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ۔ یہ خطاب اگرچہ ظاہر الفاظ کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں جو تنبیہ و عتاب مضمر ہے اس کا رخ مکذبین قرآن کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیز تمھیں خدا کی طرف سے ملی ہے اس کو بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر وہ تمھیں کچھ دبانا اور نرم کرنا چاہتے ہیں تو تم اس میں کسی تبدیلی یا مداہنت کے مجاز نہیں ہو۔ تم خدا کے آگے مسئول ہو، ان کے آگے مسئول نہیں ہو۔ اگر ان کی خاطر سے تم نے کوئی مداہنت کی تو تم مجرموں کے مددگار اور پشت پناہ بن جاؤ گے۔ یہ قریش کے لیڈروں کو سنا کر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو متنبہ کر دیا تاکہ اگر وہ اپنے دل کے کسی گوشے میں یہ امید دبائے بیٹھے ہوں کہ ان مخالفتوں سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نرم کر لیں گے تو اس سے آخری درجے میں مایوس ہو جائیں۔

نبوت اللہ کی موہبت خاص ہے

اس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی کہ نبوت و رسالت ایک موہبت ربانی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے اس کار خاص کے لیے منتخب فرماتا ہے اور وہی، جس کو منتخب فرماتا ہے اس کی تربیت فرماتا ہے۔ نبی کو یہ منصب بغیر کسی طلب و تمنا اور کسی انتظار و توقع کے ملتا ہے اور خدا ہی اس منصب کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اس کی مدد فرماتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ انسانی فطرت کی مضمر صلاحیتوں ہی کا ایک بروز ہے ان کا خیال بالکل غلط ہے ـــــ انشاء اللہ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث آخری گروپ کی سورتوں میں آئے گی۔

جو عہدہ تمنا کے بغیر ملتا ہے اس میں خدا مدد فرماتا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی کہ آدمی پر اگر کسی منصب و عہدہ کی ذمہ داریاں اس کی طلب و تمنا کے بغیر عائد ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان میں اس کی مدد فرماتا ہے اور اگر وہ کسی عہدہ کا طالب بن کر اس کو حاصل کرتا ہے تو خدا اس کو اس کے عہدہ کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس بات کی وضاحت احادیث میں بھی نہایت موثر انداز میں ہوئی ہے۔

قرآن کے معاملے میں مداہنت کرنے والا مجرموں کا ساتھی ہے

تیسری بات یہ معلوم ہوتی کہ قرآن کے معاملے میں ہمیں ہرگز کسی نرمی و مداہنت کو گوارا نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم مجرموں کے ساتھی اور ان کے مددگار بن جائیں گے۔

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۸۷)

شرکین کو جس چیز سے سب سے زیادہ چڑ تھی اسی پر سب سے زیادہ زور

یہ اسی اوپر والے مضمون کی وضاحت مزید تاکید کے ساتھ ہے کہ خواہ یہ مخالفین کتنا ہی زور لگائیں لیکن یہ اللہ کی آیات سے تمھیں روکنے نہ پائیں۔ یہ جن باتوں سے چڑتے ہیں ان کو برملا کہو اور ڈنکے کی چوٹ کہو۔ خدا کی جو بات تم پر نازل ہو چکی ہے اب نہ وہ واپس ہو سکتی اور نہ دبائی جا سکتی۔ اب اس کے بلاغ کی ذمہ داری تم پر عائد ہو چکی۔ خدا کی بات کے ہوتے اس سے انحراف ہلاکت کی راہ پر چلنا ہے۔

وَادْعُ اِلٰی رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اپنے رب کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور مشرکین میں سے نہ بنو۔ یہ خطاب بھی اسی طرح کا ہے جس طرح کا خطاب اوپر کی آیت میں گزر چکا ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ قریش کے لیڈروں کو سب سے زیادہ چڑ دعوتِ توحید سے تھی اس وجہ سے سب سے زیادہ زور اسی پر دیا اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ اگر تم ان لوگوں کی مخالفت سے مرعوب ہو کر توحید کی دعوت میں کوئی مداہنت کی روش اختیار کرو گے تو تم بھی مشرکین میں سے بن جاؤ گے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۸۸)

مداہنت کے ہر امکان کا سدباب

یہ آخر میں اسی بات کی مزید وضاحت فرما دی کہ مداہنت کے ہر امکان کا سدباب ہو جائے۔ فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو، معبود صرف وہی ہے اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ فیصلہ کا تمام اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے اور قیامت کے دن سب کی واپسی اسی کی طرف ہونی ہے۔ کوئی اور مولیٰ و مرجع نہیں ہے۔

بتوفیق ایزدی آج بروز جمعۃ المبارک ۱۰ بجے دن اس سورہ کی تفسیر اختتام کو پہنچی۔ فالحمد للہ علی ذٰلک۔

رحمان آباد

۲۹ مارچ ۱۹۷۴ء

فہرست مضامین

فہرست مضامین

تفسیر سورۃ طٰہٰ - ۲۰

تفسیر سورۃ الانبیاء - ۲۱

تفسیر سورۃ الحج - ۲۲

تفسیر سورۃ المؤمنین۔ ۲۳

تفسیر سورۃ النّور ۲۴

تفسیر سورۃ الفرقان-۲۵

تفسیر سورۃ الشعرآء - ۲۶

تفسیر سورۃ النمل - ۲۷

تفسیر سورۃ القصص ۲۸

خطاطی ـــ عبدالغفور کیلانی

افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

العنکبوت ۲۹ — الزُمر ۳۹

تدبرِ قرآن

جلد ششم

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبّرِ قرآن

جلد ششم

تفاسیر

سورۂ عنکبوت (۲۹) — تا — سورۂ زُمر (۳۹)

امین احسن اصلاحی

فاران

فاران فاؤنڈیشن

لاہور — پاکستان

اہتمام ـــــ حسن خاور

مطبع ـــــ فلک شیر پرنٹرز، ابراہیم روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت ـــــ نومبر 2009ء ـــ ذیقعد 1430ھ

ادارہ ـــــ فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

طبع اوّل

الحمد للہ تدبر قرآن جلد پنجم[1] طباعت کے لیے پریس کے حوالہ کی جا رہی ہے۔ توقع ہے کہ ان شاء اللہ کتاب بہت جلد قدر دانوں تک پہنچ جائے گی۔ بعض وجوہ سے، جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے اس کتاب کی طباعت و اشاعت کا سابق انتظام بدلنا پڑا جس کے سبب سے اس کی اشاعت میں کچھ تاخیر ہوئی جو قدر دانوں کے لیے باعث تشویش ہوئی لیکن امید ہے کہ یہ تاخیر باعث خیر و برکت ہوگی۔ اس تاخیر سے یہ فائدہ اٹھایا گیا ہے کہ کاپیاں نہایت احتیاط سے دوبارہ پڑھی گئی ہیں جس سے غلطیوں کا احتمال بہت کم رہ گیا ہے۔

یہ جلد سورۂ زمر پر تمام ہوئی ہے اور میں بفضلِ خدا سورۂ مجادلہ پر اس وقت کام کر رہا ہوں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ جلد ششم[2] سے زیادہ کا مواد تیار ہے۔ اب یہ بات طے ہے کہ کتاب آٹھ جلدوں میں تمام ہوگی۔ آخری حصہ کی سورتوں میں زبان اور نظام کی مشکلیں زیادہ ہیں اور میرا ارادہ یہی ہے کہ بحث و نظر کا جو معیار اب تک رہا ہے وہی آخر تک قائم رکھنے کی کوشش کی جائے۔ مطمع نظر اس سے کہ کتاب کے مؤلف کو اس خدمت کے لیے کتنی فرصت نصیب ہوتی ہے۔

اصحابِ علم کی طرف سے اس ناچیز خدمت کی جو پذیرائی ہوئی ہے وہ میری توقعات سے بہت زیادہ ہے۔ میں اس کے لیے اپنے رب ہی کا شکر گزار ہوں اور اس سے ملتجی ہوں کہ وہ آگے کے کام میں بھی میرے ذہن اور قلم کو جادۂ حق پر استوار رکھے اور اس کتاب کو خلق کے لیے نافع اور میرے لیے ذریعہ نجات بنائے۔ میں نے اس کتاب میں اپنے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی سپرد کردہ امانت ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری دلی آرزو یہ ہے کہ رب کریم مجھے اس کوشش میں کامیابی عطا فرمائے۔ اس سے زیادہ میں کسی چیز کا بھی متمنی و مدعی نہیں ہوں۔

---

1. ترتیب نو ـــــ جلد ششم
2. ترتیب نو ـــــ جلد ہفتم

کتاب کی ظاہری خوبیوں میں اگر کوئی کمی یا بیشی ہوئی ہے تو اس کا تعلق کلیتہً خاور صاحب سلمہٗ سے ہے۔ اگر وہ کوئی اضافہ کرسکے تو ان کے حسنِ ذوق اور سلیقۂ کار سے یہی توقع ہے۔ اور اگر نہیں کرسکے ہیں تو میرے نزدیک وہ سزاوارِ ملامت ہرگز نہیں ہیں۔ اس کوچے میں وہ بالکل نووارد ہیں۔ محض میری محبت اور استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کے افکار سے والہانہ عقیدت کی بنا پر انھوں نے یہ بارِ گراں اپنے سر پر اٹھا لیا ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے یہ کام آسان بنا دے۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

رحمان آباد۔ ضلع شیخوپورہ

۱۶؍دسمبر ۱۹۷۷ء

۵ محرم الحرام ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۲۹

العنکبوت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس سورہ کا آغاز ان لوگوں کو مخاطب کر کے ہوا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے جرم میں ستائے جا رہے تھے۔ خاص کر نوجوان اور غلام، سورہ کے نزول کے دور میں، اپنے باپوں اور آقاؤں کے ہاتھوں بڑی سخت آزمائش کے دور سے گزر رہے تھے۔ قدرتی طور پر اس صورت حال نے کمزور ارادے کے لوگوں کے اندر بہت سے سوالات قرآن اور رسول کی صداقت سے متعلق پیدا کر دیے ۔ جن کا برموقع جواب دیا جانا ضروری ہوا۔ تاکہ مظلوموں اور کمزوروں کی ہمت افزائی بھی ہو اور جو لوگ خدا کی ڈھیل کو اپنی فتح سمجھ کر ظلم و ستم میں بالکل بے باک ہونے جا رہے تھے ان کو بھی تنبیہ ہو۔

حالات کے تقاضے سے اس میں ہجرت کی طرف بھی اشارات ہیں اور مظلوم مسلمانوں کو یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ انھیں بہرحال ظلم کے آگے سپر نہیں ڈالنی چاہیے۔ اگر حق کی خاطر انھیں اپنے وطن کو چھوڑنا پڑ جائے تو اس کے لیے بھی انھیں تیار رہنا چاہیے۔ نہ خدا کی زمین تنگ ہے اور نہ اس کے خزانۂ رزق میں کمی ہے۔ جو لوگ خدا کی راہ میں ہجرت کریں گے خدا ان کے لیے خود اپنا دامنِ رحمت پھیلائے گا اور ان کی ساری ضروریات کا کفیل ہو گا۔

پچھلی سورہ میں اہل کتاب کی مخالفت کی طرف بعض اشارات گزرے ہیں۔ اس سورہ میں ان کی مخالفت کھل کر سامنے آگئی ہے اس وجہ سے مسلمانوں کو یہ رہنمائی بھی دی گئی ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ بحث میں ان کو کیا روش اختیار کرنی چاہیے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۷) اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ حق کی راہ میں آزمائشیں لازماً پیش آتی ہیں۔ یہی پہلے بھی ہوا ہے اور یہی آئندہ بھی ہو گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت ہے۔ اسی سے مومن و منافق میں امتیاز ہوتا ہے۔ البتہ آج جن لوگوں کو اللہ نے ڈھیل دے رکھی ہے وہ اس بات کو یاد رکھیں کہ وہ خدا کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتے اور جو لوگ ظلم و ستم کا ہدف بنے ہوئے ہیں وہ یہ یقین رکھیں کہ آج ایمان کی راہ میں جو دکھ وہ جھیل رہے ہیں ان سے کہیں بڑھ کر وہ اس کا صلہ پانے والے ہیں۔

(۸-۱۳) والدین اور بزرگوں کی اطاعت کے حدود کی وضاحت کہ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت کے تحت

ہے اس وجہ سے اگر کسی کے ماں باپ اس سے خدا کی نافرمانی کا مطالبہ کریں تو اس معاملے میں ان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ خدا کے ہاں کوئی دوسرے کے اعمال کا ذمہ دار نہ ہوگا، ہر شخص کو اپنے اعمال کی جواب دہی خود کرنی ہے۔

(۱۴-۴۰) حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور مدین، عاد، ثمود، قارون، فرعون اور ہامان کے واقعات کی طرف اجمالی اشارہ جس سے مقصود انہی باتوں کو تاریخ کی روشنی میں مدلل کرنا ہے جو تمہید میں مذکور ہوئی ہیں۔ یعنی

— حق کی راہ میں امتحان کے مراحل سے گزرنا اللہ تعالیٰ کی ایک مقرر کردہ سنت ہے۔

— حق کے مقابل میں رشتوں، قرابتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ سب سے بڑا حق اللہ کا ہے۔

— جو لوگ اللہ کے بندوں اور بندیوں کو فتنوں میں ڈالتے ہیں وہ خدا کی گرفت سے باہر نہیں جا سکتے۔

(۴۱-۴۵) ان لوگوں کے زور و اثر کی تمثیل جو دوسرے سہاروں کے بل پر خدا کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کی تمام سعی و تدبیر کی مثال مکڑی کے جالے کی ہے جس سے زیادہ کمزور و بودا بنیاد تعمیر کرنی بھی نہیں ہے۔ ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے بلکہ ایک غایت و حکمت کے ساتھ خدا نے اس کو بنایا ہے اور وہ غایت و حکمت ایک دن لازماً ظہور میں آئے گی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ تم تمام مخالفتوں سے بے پروا ہو کر لوگوں کو اللہ کی کتاب سناؤ اور نماز کا اہتمام کرو۔ اسی نماز کے اندر اہل ایمان کے لیے تمام شرور و آفات سے امان اور یہی طاقت کا اصل خزانہ ہے۔

(۴۶-۵۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اہل کتاب کے بعض اعتراضات کا جواب۔ ان کے ساتھ بحث میں مسلمانوں کو جو روش اختیار کرنی چاہیے اس کی ہدایت۔ اچھے اہل کتاب کی تحسین۔ جو لوگ کسی معجزہ کا مطالبہ کر رہے تھے ان کو جواب۔

(۵۳-۵۵) عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے اس کی وضاحت

(۵۶-۶۰) جو مسلمان ایمان لانے کے جرم میں کفار کے ہاتھوں ستائے جا رہے تھے ان کو ہجرت کی ہدایت اور دنیا و آخرت دونوں میں ان کو فوز و فلاح کی بشارت۔

(۶۱-۶۹) خاتمۂ سورہ جس میں خود مشرکین کے مسلمات سے ان پر توحید کے باب میں حجت تمام کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان کو ملامت کی گئی ہے کہ اس سرزمین میں تمہیں امن و رفاہیت تو خدا کے حرم کی بدولت حاصل ہوئی لیکن تم خدا کی نعمت کی ناشکری کر رہے ہو اور عین خدا کے حرم میں بیٹھ کر اپنے خود تراشیدہ معبودوں کے گن گا رہے ہو۔ ان کی اس ناشکری کا جو انجام ان کے سامنے آنے والا ہے اس کا بیان اور اہل حق کو خدا کی مدد و نصرت کی بشارت جو اس تاریک ماحول میں حق کا نور پھیلانے کے لیے جد و جہد کر رہے تھے۔

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ (۲۹)

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــــ اٰيَاتُهَا ۶۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۳
الٓمّٓ ۝۱ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ
لَا يُفْتَنُوْنَ ۝۲ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ
اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳ اَمْ حَسِبَ
الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۴
مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ۝۵ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ
عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ
عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۷
وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ
مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۭ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ
فِي الصّٰلِحِيْنَ ۝۹ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ

فِی اللّٰہِ جَعَلَ فِتْنَۃَ النَّاسِ کَعَذَابِ اللّٰہِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ
مِّنْ رَّبِّکَ لَیَقُوْلُنَّ اِنَّا کُنَّا مَعَکُمْ ؕ اَوَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِیْ
صُدُوْرِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ
الْمُنٰفِقِیْنَ ﴿۱۱﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِیْلَنَا
وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰکُمْ ؕ وَمَا ھُمْ بِحٰمِلِیْنَ مِنْ خَطٰیٰھُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ
اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَھُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِھِمْ ز
ع ۱۳ ۱۴ وَلَیُسْئَلُنَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ عَمَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾

ترجمہ آیات یہ الٓمّٓ ہے۔ کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ محض یہ کہہ دینے پر چھوڑ دیے
۱ - ۱۳ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے؟ اور ہم نے تو ان لوگوں کو بھی
آزمایا جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ سو اللہ ان لوگوں کو ممیز کرے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں
کو بھی ممیز کر کے رہے گا۔ ۱-۳

کیا جو لوگ برائیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں وہ گمان رکھتے ہیں کہ ہمارے قابو سے باہر
نکل جائیں گے! بہت ہی بُرا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں! جو اللہ کی ملاقات کا متوقع ہے
وہ اطمینان رکھے کہ اللہ کا مقرر کردہ وقت ضرور آکے رہے گا اور وہ سننے والا جاننے والا
ہے۔ اور جو ہماری راہ میں جدوجہد کر رہا ہے تو وہ اپنے ہی فائدے کے لیے جدوجہد کر رہا
ہے۔ اللہ عالم والوں سے بے نیاز ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال
کیے تو ہم ان کی برائیاں ان پر سے جھاڑ دیں گے اور ان کو ان کے عمل کا بہترین بدلہ دیں گے۔
اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی۔ اور اگر وہ تجھ

پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں، تو ان کی بات نہ مان۔ میری ہی طرف تم سب کی واپسی ہے تو جو کچھ تم کرتے رہے ہو میں اس سے تمہیں آگاہ کروں گا اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے تو ہم ان کو صالحین کے زمرہ میں داخل کریں گے۔ ۸۔۹

اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے لیکن جب اللہ کی راہ میں انھیں دکھ پہنچتا ہے تو وہ لوگوں کے پہنچائے ہوئے دکھ کو خدا کے عذاب کے مانند قرار دے بیٹھتے ہیں اور اگر تمہارے رب کی طرف سے کوئی مدد ظاہر ہوگی تو کہیں گے کہ ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ تھے۔ کیا لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ اس سے اچھی طرح باخبر نہیں ہے! اور اللہ ایمان والوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا اور منافقوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا۔ ۱۰۔۱۱

اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہماری راہ پر چلتے رہو، ہم تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھا لیں گے۔ حالانکہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں بنیں گے۔ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ اور یہ لوگ اپنے گناہ لادے ہوئے ہوں گے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ اور بوجھ بھی۔ اور جو افترا وہ کر رہے ہیں قیامت کے دن اس کی بابت ان سے پرسش ہونی ہے۔ ۱۲۔۱۳

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (۱-۲)

'الٓمّٓ' اس سورہ کا نام ہے۔ اس کی تحقیق سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

راہِ حق میں آزمائش لازماً پیش آتی ہیں

'اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ الآیۃ' بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے لیکن اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو مکہ کی پُرمحن زندگی سے گھبرا اٹھے تھے۔ بعض لوگ اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن ان کو اس راہ کی

صعوبتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ ان کو گمان تھا کہ جب انھوں نے نیکی کی راہ میں قدم رکھا ہے تو راہ ہموار ملے گی اور وہ ٹھنڈی سڑک سے منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ ان لوگوں کو جب کفار کے ہاتھوں زہرہ گداز مصائب سے سابقہ پیش آیا تو ان کے قدم ہل گئے اور اس طرح کے حالات میں خام ذہن کے لوگوں کو جس طرح کے شبہات لاحق ہوتے ہیں ان کے ذہنوں میں بھی اسی قسم کے شبہات پیدا ہونے لگے۔ مثلاً یہ کہ اگر یہ اللہ کا راستہ ہے تو یہ آنا دشوار گزار کیوں ہے؟ اگر اس کی دعوت دینے والے اللہ کے رسول ہیں تو ان پر ایمان لانا اتنا جان جوکھم کا کام کیوں ہے؟ ہم جب اللہ کے کام کے لیے اٹھے ہیں تو ہم دین کی خدمت کر رہے ہیں، پھر ہماری راہ میں یہ رکاوٹیں اور یہ اڑنگے کیوں ڈال دیے گئے ہیں! اس طرح کے سوالات کا پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ راہِ حق اور اس کے تقاضوں سے اچھی طرح آشنا نہیں تھے اور نہایت آسانی سے نفاق کے فتنہ میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ اس سورہ میں سب سے پہلے انہی لوگوں کی بیماری کی طرف توجہ فرمائی گئی۔ ارشاد ہوا کہ اگر لوگوں نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ وہ ایمان کا دعویٰ کریں گے اور مجرد ان کے اس دعوے کی بنا پر ان کا نام مومنین صادقین کے رجسٹر میں درج ہو جائے گا، ان کے کھرے کھوٹے ہونے کی کوئی جانچ نہیں ہو گی، تو یہ انھوں نے نہایت غلط سمجھا تھا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (۳)

یہ اللہ تعالیٰ نے نہایت مؤکد الفاظ میں اپنی اس سنت کی یاد دہانی فرمائی جس سے ان لوگوں کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے جو ایمان و اسلام کا دعویٰ لے کر اٹھتے ہیں۔ فرمایا کہ ان لوگوں سے پہلے جو لوگ یہ دعویٰ لے کر اٹھے ہم نے ان کو بھی آزمائشوں میں ڈال کر ان کا امتحان کیا، اسی طرح ان کا بھی امتحان کریں گے۔ یہ اشارہ پچھلے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی طرف ہے۔ 'فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ' یعنی اگر یہ امتحان نہ ہو تو آخر یہ کس طرح ثابت ہو گا کہ کون اپنے دعوے میں سچا ہے، کون جھوٹا ہے۔ اس وجہ سے اللہ لازماً راست بازوں اور جھوٹے مدعیوں میں امتیاز کرے گا۔ 'عَلِمَ' یہاں ممیز و معین کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے اور صیغہ یہاں وہ استعمال ہوا ہے جو تاکید کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک مقررہ سنت ہے اس وجہ سے یہ کسی کو ناگوار ہو یا گوارا بہرحال اس امتحان سے ہر ایک کو گزرنا ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے علم کا تعلق ہے وہ ہر چیز کو محیط ہے۔ وہ ہر ایک کے باطن سے اچھی طرح باخبر ہے کہ کون مخلص ہے اور کون منافق، لیکن وہ لوگوں کے ساتھ جزا و سزا کا معاملہ مجرد اپنے علم کی بنیاد پر نہیں کرتا بلکہ لوگوں کے عمل کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس وجہ سے وہ ہر ایک کو امتحان میں ڈال کر پرکھتا ہے اور اسی امتحان سے ہر ایک کے مدارج معین ہوتے ہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۴)

ایمان کا دعوے کرنے والوں کو تنبیہ کرنے کے بعد یہ ان لوگوں کو بھی متنبہ فرمادیا جو کمزور مسلمانوں کو ظلم وستم کا ہدف بنائے ہوئے تھے۔ فرمایا اگر ان لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یہ اسی طرح ظلم وستم کرنے کے لیے چھوٹے رکھے جائیں گے اور کبھی ہماری گرفت میں نہیں آئیں گے تو ان کا یہ گمان بالکل غلط ہے۔ شریروں کو تنبیہ

یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن اشارہ انہی ناہنجار لوگوں کی طرف ہے جو بے بس مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے تھے اور خدا کی ڈھیل سے شہ پا کر دن پر دن دلیر ہوتے جارہے تھے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ خدا اسی طرح ان کو ڈھیل دیے رکھے گا تو وہ بڑی سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ، یعنی ان کا یہ فیصلہ خدا کے بارے میں نہایت برا فیصلہ ہے۔ خدا کو اگر انھوں نے کمزور سمجھا ہے کہ وہ ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا جب بھی ان کا یہ فیصلہ نہایت برا ہے اور اگر انھوں نے اپنی ان تمام ستم رانیوں پر اس کو راضی اور اس معاملے سے بالکل بے تعلق و بے پروا سمجھ رکھا ہے جب بھی ان کا یہ فیصلہ نہایت غلط اور نہایت برا ہے۔

مَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۵)

یہ مظلوم مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ بہر حال تمہیں ہر کام آخرت کی امید پر کرنا ہے اور اگر تم یہ امید رکھتے ہو تو اطمینان رکھو کہ اللہ نے اس کے لیے جو مدت ٹھہرا رکھی ہے وہ لازماً پوری ہو کے رہے گی۔ ایک دن تم اپنے رب سے ملو گے اور اس دن تم اپنی ہر اس محنت و زحمت کا صلہ پاؤ گے جو اس کی خاطر تم نے جھیلی ہوگی۔ خدا سمیع و علیم ہے۔ کوئی چیز اس کے احاطۂ علم سے باہر نہیں ہے۔ تمہاری سرفروشیاں بھی اس کے علم میں ہوں گی اور تمہارے دشمنوں کی ستم رانیاں بھی اس کے سامنے ہوں گی۔ مظلوم مسلمانوں کو تسلی

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا یُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (۶)

یہ متنبہ فرمایا ہے کہ جو شخص ایمان لاتا اور اس راہ میں مشقتیں اٹھاتا ہے وہ یاد رکھے کہ وہ اپنا ہی مستقبل سنوارتا اور اپنا ہی گھر بھرتا ہے، وہ خدا اور اس کے دین پر کوئی احسان نہیں کرتا۔ اس وجہ سے اسے اس بات سے دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے کہ اسے کوئی مصیبت پیش آئی۔ اگر اسے کوئی مصیبت پیش آئی تو خدا کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ تمام عالم سے مستغنی ہے۔ البتہ لوگ اس کے محتاج ہیں اس وجہ سے خدا کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی بھی جو کوئی دیتا ہے وہ درحقیقت اپنے ہی نفع کے لیے دیتا ہے، اس سے خدا کو کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ یہاں یہ حقیقت اچھی طرح ملحوظ رہے کہ دنیا کی طرح دین بھی خدا کے کام آنے والی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ بندوں ہی کے کام آنے والی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ راستہ انسان ہی کی سعادت کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ جس طرح ایک کسان اپنے کھیت میں مشقت کرتا ہے تو وہ اپنے ہی لیے کرتا ہے، کسی دوسرے کے لیے نہیں کرتا اسی طرح انسان دین کی راہ میں چل کر اپنی ہی منزلیں طے کرتا ہے۔ خدا کی منزل نہیں طے کرتا۔ ایک بدیہی حقیقت کی یاد دہانی

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ (۷)

اہل ایمان کے ساتھ اللہ کا معاملہ

قرینہ دلیل ہے کہ لفظ سَیِّئَاتُ یہاں صغائر یعنی چھوٹے گناہوں کے مفہوم میں ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر صاحبِ ایمان و عمل کے ساتھ یہ معاملہ کرنے والا ہے کہ اس کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے وہ درگزر فرمائے گا اور اس نے جو نیک اعمال کیے ہوں گے ان کا وہ اُن سے کہیں بڑھ کر صلہ دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب بندوں کے ساتھ خدا کا معاملہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل کا صلہ پانے والا ہے تو پھر اس کے دل میں یہ وسوسہ کیوں پیدا ہو کہ اس نے خدا کی راہ میں کوئی تکلیف جھیلی تو یہ اس نے اللہ اور اس کے دین پر کوئی احسان کیا!

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۸)

باپ ماں کے حقوق خدا کے حقوق کے تحت ہیں

اوپر کی آیات میں جس آزمائش کا ذکر ہوا ہے اس میں ایک بڑا حصہ اس آزمائش کا بھی تھا جو اسلام لانے والے نوجوانوں کو اپنے کافر باپوں اور سرپرستوں کے ہاتھوں پیش آئی۔ باپ ماں کے حقوق چونکہ ہر دین میں مسلّم رہے ہیں اس وجہ سے اس حق سے باپوں نے بسا اوقات بہت غلط فائدہ اٹھایا ہے کہ اپنے حق کے نام پر انھوں نے اپنی اولاد کو خدا کے حقوق سے روکنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں انھوں نے ظلم و ستم سے بھی دریغ نہیں کیا ہے۔ اس کی مثالیں ہر دعوتِ حق کی تاریخ میں موجود ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جو کچھ ان کے باپ کے ہاتھوں گزری اس کی تفصیل اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہے۔ حضرت موسیٰ کی دعوت کے دور میں نوجوانوں کو جن حالات سے سابقہ پیش آیا ان کی طرف بھی پچھلی سورتوں میں اشارہ گزر چکے ہیں۔ یہی صورتِ حال ان نوجوانوں کو بھی پیش آئی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے۔ وہ بھی اسلام لانے کے جرم میں اپنے باپوں اور سرپرستوں کے ظلم و ستم کے ہدف بن گئے۔ اس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہوا کہ اس باب میں نوجوانوں کو واضح ہدایت دے دی جائے کہ والدین اگر ان کے دین کے سلسلے میں مداخلت کریں تو انھیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی ہے اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی اس کو فرمائی ہے کہ اگر وہ تجھ پر اس بات کے لیے دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو بے دلیل میرا شریک ٹھہرا تو اس معاملے میں ان کی اطاعت نہ کیجیو۔ تَوصِیَۃ یہاں ہدایت دینے کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں یہ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ قرآن نے اس کو یہاں تمام مذاہب اور تمام انبیاء کی مسلّم تعلیم کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ تورات، انجیل اور زبور سب میں والدین کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کے تحت جگہ دی گئی ہے۔ والدین کو جو حق اولاد پر ملا ہے وہ خدا ہی کا عطا کردہ ہے اس وجہ سے ان کو یہ

حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اولاد کو خدا کے حقوق سے روکیں اور جب والدین کو یہ حق حاصل نہیں ہے، جن کا حق خدا کے حق کے بعد سب سے بڑا ہے تو پھر دوسروں کے لیے اس حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسلام میں قانون ہے کہ لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ خالق کے حکم کے خلاف کسی مخلوق کی اطاعت بھی جائز نہیں۔

شرک ایک بے دلیل چیز ہے

'مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ' یہ شرک کی نفی کی دلیل ہے جو قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ 'علم' کے معنی دلیل و برہان کے ہیں جہاں تک ایک خدا کا تعلق ہے وہ تو ایک بدیہی حقیقت ہے جس کو ایک مشرک بھی بہرحال مانتا ہے۔ رہے دوسرے اس کے شریک تو ان کی دلیل پیش کرنا ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو ان کو شریک خدا ٹھہراتے ہیں اور جب تک ان کے حق میں کوئی دلیل نہ ہو کسی عاقل کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ ان کو خدائی میں شریک کر کے ان کی غلامی کا قلادہ بھی اپنی گردن میں ڈال لے۔

تنبیہ اور تسلی دونوں

'إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ' میں تسلی بھی ہے اور تنبیہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ سب کی واپسی میری ہی طرف ہونی ہے کوئی اور مرجع و ماویٰ بننے والا نہیں ہے تو میں سب کو ان کے اعمال سے باخبر کروں گا۔ باخبر کرنے سے مراد ظاہر ہے کہ اعمال کی جزا اور سزا دینے کے ہیں۔ یعنی آج جو لوگ میرے بندوں کو میری راہ سے روکنے کے لیے ان پر ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں ان کی کرتوتیں بھی میں ان کے سامنے رکھوں گا اور میرے جو بندے میری راہ میں استقامت دکھائیں گے ان کی جانبازیوں کا انعام بھی ان کو بھرپور دوں گا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ (۹)

اوپر کی آیت میں نمایاں پہلو تنبیہ کا تھا اس آیت میں تسلی کے پہلو کا صریح الفاظ میں ذکر فرمادیا۔ 'آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ' یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی جو لوگ اپنے دشمنوں کی تمام دشمنی کے علی الرغم ایمان و عمل صالح پر قائم و استوار رہیں گے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کو ہم بلاشبہ زمرۂ صالحین میں داخل کریں گے۔ زمرۂ صالحین سے مراد اللہ کے ان خالص و مخلص بندوں کا گروہ ہے جن کو اس دنیا کی مختلف آزمائشوں سے گزار کر اللہ تعالیٰ آخرت کی ابدی بادشاہی کے لیے منتخب فرما رہا ہے۔ اس گروہ میں ہر مدعی کے لیے جگہ نہیں ہے۔ اس میں صرف وہی لوگ بار پائیں گے جو اپنے آپ کو امتحان کی کسوٹیوں پر کھرا ثابت کریں گے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ ۖ وَلَئِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِنْ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۚ أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ (۱۰)

ایمان کے مدعیوں کو تنبیہ

یہ ایمان کے مدعیوں کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ ایمان کا دعویٰ کرنے کو تو کر بیٹھے لیکن جب اس راہ کی آزمائشوں سے سابقہ پیش آیا ہے تو وہ لوگوں کی پہنچائی ہوئی اذیت سے اس طرح گھبرا اٹھے ہیں جس طرح خدا کے عذاب سے ڈرنا اور گھبرانا چاہیے۔ حالانکہ اس دنیا میں جو دکھ بھی پہنچے گا بہر حال وہ چند روزہ ہے۔ برعکس اس کے خدا جس عذاب میں پکڑنے والا ہے وہ ابدی ہے۔ اس وجہ سے حق کی خاطر اس دنیا میں بڑی سے بڑی مصیبت جھیل لینا بھی آسان ہے بمقابلہ اس کے کہ اس سے مرعوب ہو کر آدمی اپنے آپ کو ابدی عذاب کا سزاوار بنا لے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت جاری ہے اس کے تحت ہر شخص کو بہر حال دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ یا تو وہ حق کا راستہ انتخاب کرے اور پھر پوری پامردی کے ساتھ خلق کی بے مہری بلکہ اس کے ظلم و ستم کا مقابلہ کرے اور اگر اس کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تو پھر باطل کے ساتھ چلے اور آخرت میں ابدی خسران سے دوچار ہو۔ ان دو کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے۔

یہاں یہ چیز بھی قابلِ توجہ ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں آدمی کو جو دکھ پہنچتے ہیں ان کو 'فتنہ' یعنی آزمائش سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ ان کی حیثیت بہر حال ایک آزمائش سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ پیش آئے گا اس کو عذاب سے تعبیر فرمایا اس لیے کہ وہ درحقیقت عذاب ہوگا جس سے مفر کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

'وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ' یعنی اس وقت تو آزمائشوں نے ان کے قدم ہلا دیے ہیں اور یہ دشمنانِ حق کے ہم نوا بن بیٹھے ہیں لیکن کل جب خدا کی مدد و نصرت کے آثار ظاہر ہوں گے تو یہ بڑے دعوے کے ساتھ کہیں گے کہ ہم نے بھی اس حق کی خاطر بڑی قربانیاں دی ہیں اس راہ میں ہم کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔

'اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ' فرمایا کہ یہ دعویٰ تو اس کے آگے کارگر ہو سکتا ہے جو دلوں کے بھیدوں سے بے خبر ہو۔ جس پر سارا ظاہر و باطن آشکارا ہو اس پر یہ فریب کیا چلے گا!

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ (۱۱)

مطلب یہ ہے کہ جب اس طرح مخلصین کے ساتھ منافقین بھی ملے ہوئے ہیں تو اللہ ان کو اسی طرح چھوٹے نہیں رکھے گا بلکہ وہ ان دونوں کو چھانٹ کر الگ الگ کرے گا۔ 'اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' سے یہاں مومنین مخلصین مراد ہیں۔ اس لیے کہ اس کے مقابل میں منافقین کا ذکر ہے جن کا کردار اوپر والی آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے ہیں لیکن اس راہ میں چوٹ کھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ بات بصیغۂ تاکید بیان ہوئی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ فرق و امتیاز اللہ تعالیٰ کی صفات کا لازمی تقاضا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ بات اس کے عدل کے منافی ہوگی۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطَايَاكُمْ وَمَا هُم بِحَامِلِينَ
مِنْ خَطَايَاهُم مِّن شَيْءٍ ۖ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ ۖ وَلَيُسْأَلُنَّ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ (۱۲-۱۳)

بزرگوں کی غلط منطق

'اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا' اگرچہ باعتبار لفظ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ کفار ہیں جن کی اولاد یا دوسرے زیردست افراد اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ لوگ اپنے زیردستوں کو اسلام سے پھیرنے کے لیے ان پر جبر و ظلم بھی کرتے اور یہ اخلاقی دباؤ بھی ڈالتے کہ ہم نیک و بد اور خیر و شر کو تم سے زیادہ سمجھنے اور پرکھنے والے ہیں۔ اس وجہ سے تم ہمارے طریقے پر چلتے رہو، اگر ہمارا طریقہ غلط ہوا تو اس کا عذاب ثواب ہماری گردن پر ہے، تم اس کی ذمہ داری سے بری ہو، تمہارا بوجھ ہم اٹھالیں گے۔ یہ منطق بزرگوں، سرپرستوں باپوں، استادوں، پیروں اور لیڈروں کی طرف سے، اپنے چھوٹوں کے مقابل میں، پہلے بھی ہمیشہ استعمال کی گئی ہے اور اب بھی استعمال کی جاتی ہے اور بسا اوقات یہ مؤثر بھی ہوتی ہے۔ ایک خاص حد تک اس کی تاثیر ایک امر فطری ہے اور اس میں چنداں ہرج بھی نہیں ہے۔ لیکن دین کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ اس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے اس کے اپنے کندھوں پر ڈالی ہے۔ اس معاملے میں بے سوچے سمجھے نہ کسی کی تقلید جائز ہے اور نہ کسی کو اپنی تقلید پر مجبور کرنا جائز ہے۔ خدا کے ہاں کوئی بھی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بن سکے گا۔ 'لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی' یہاں اسی حقیقت کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ اپنے زیردستوں کو یہ اطمینان دلا رہے ہیں کہ وہ ان کے بوجھ اٹھالیں گے وہ بڑی غلط فہمی میں ہیں اور یہ بالکل جھوٹا اطمینان دلا رہے ہیں۔ قیامت کے دن ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ یہ اپنے گناہوں کے بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہوں گے اور ان لوگوں کے بوجھوں سے بھی ان کو حصہ بٹانا پڑے گا جو ان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوں گے۔

'عَمَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ' سے مراد وہ بدعتیں ہیں جو ایجاد تو انھوں نے خود کیں لیکن ان کو منسوب اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں اور ان کی حمایت میں اتنا غلو ہے کہ دوسروں کو بھی ان پر مجبور کرتے ہیں اور ان کے عذاب و ثواب کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ ان سب کی بابت قیامت کے دن ان سے پرسش ہوتی ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۴-۴۰

اوپر کی آیات میں تین باتیں مذکور ہوئی ہیں۔

ایک یہ کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اٹھتے ہیں وہ ٹھنڈی سڑک سے منزل مقصود تک نہیں پہنچ جاتے بلکہ ان کو اس راہ میں بہت سے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے، ان سے گزرے بغیر اللہ تعالیٰ کے

ہاں کسی کو صادقین و مخلصین کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔

دوسری یہ کہ دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر شخص خود مسئول و ذمہ دار ہے، کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بن سکے گا اس وجہ سے اس عذر پر تکیہ کرنا کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس نے کوئی بے راہروی دوسرے کے دباؤ سے اختیار کی، خواہ یہ دباؤ اخلاقی ہو یا مادی۔

تیسری یہ کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حق پرست بندوں کو مختلف قسم کی مصیبتوں میں مبتلا کر کے ان کو حق سے پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو ایک خاص حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل تو ملتی ہے لیکن اس ڈھیل سے اگر ان کا طغیان بڑھ جاتا ہے تو وہ لازماً اللہ تعالیٰ کے قانون کی گرفت میں آتے ہیں اور جب اس کی گرفت میں آجاتے ہیں تو پھر ان کے لیے کوئی مفر باقی نہیں رہتا۔

آگے کی آیات میں انہی حقائق کو حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخالفین و مکذبین کے احوال و واقعات سے مبرہن کیا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا
خَمْسِیْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَیْنٰهُ
وَاَصْحٰبَ السَّفِیْنَةِ وَجَعَلْنٰهَاۤ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۵﴾ وَاِبْرٰهِیْمَ
اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا
وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا
یَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ
وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ
اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۸﴾
اَوَلَمْ یَرَوْا كَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ
عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ بَدَاَ

الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ۚ ﴿٢٠﴾ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ
تُقْلَبُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۡ
وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٢٢﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا ع ٢ ٩ ١٤
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ
لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٣﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا
اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ
مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ
بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا
لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ
اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٦﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ
وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ
فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٢٧﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ
لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ
مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٨﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ
وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ
قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالَ

ع ٣ ٨ ١٥ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٣٠﴾ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ
بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا
كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿٣١﴾ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ؕ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ
فِيْهَا ٘ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۟ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٣٢﴾
وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا
وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۫ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ
كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٣٣﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا
مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿٣٤﴾ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ
بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ
يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ
مُفْسِدِيْنَ ﴿٣٦﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ
دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٣٧﴾ ۙ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۠ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ
مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ
وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿٣٨﴾ ۙ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ
جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا
سٰبِقِيْنَ ﴿٣٩﴾ ۚ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ
حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا
بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ

كَانُوٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۴۰

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو وہ ان کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار سال رہا۔ تو ان کو طوفان نے آپکڑا اور وہ اپنی جانوں پر خود ظلم ڈھانے والے بنے۔ پس ہم نے اس کو اور کشتی والوں کو نجات دی اور اس واقعہ کو دنیا والوں کے لیے ایک عظیم نشانی بنایا۔ ۱۴-۱۵ ربط آیات ۱۴-۴۰

اور ابراہیم کو بھی رسول بنا کر بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر جانو۔ تم اللہ کے سوا بس بتوں کی پوجا کر رہے ہو اور بہتان گھڑ رہے ہو۔ جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو یہ تمہارے لیے رزق پر کوئی اختیار نہیں رکھتے تو اللہ ہی کے پاس رزق کے طالب بنو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کے شکرگزار رہو۔ اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۶-۱۷

اور اگر تم جھٹلاؤ گے تو یاد رکھو کہ تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں نے جھٹلایا اور رسول پر واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ ۱۸

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ کس طرح اللہ خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کر دیتا ہے۔ بے شک یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ ان سے کہو، زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ کس طرح اللہ نے خلق کا آغاز کیا اور پھر اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور جس پر چاہے گا رحم کرے گا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اور نہ تم زمین میں خدا کے قابو سے باہر نکل سکو گے اور نہ آسمان میں اور تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار۔ اور جن لوگوں

نے اللہ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا تو وہی لوگ ہیں جو میری رحمت سے محروم ہوئے اور وہی لوگ ہیں جن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ۱۹-۲۳

تو اس کی قوم کا جواب صرف یہ ہوا کہ انھوں نے کہا کہ اس کو قتل کر دو یا جلا دو۔ تو اللہ نے اس کو آگ سے نجات دی بے شک اس کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ ۲۴

اور اس نے کہا تم نے اللہ کے سوا جو بُت بنائے ہیں، تمھاری آپس کی دوستی بس دنیا کی زندگی تک ہے۔ پھر قیامت کے دن تم میں سے ہر ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمھارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور تمھارا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ۲۵

پس لوط نے اس کی تصدیق کی اور کہا، میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ بے شک وہی عزیز و حکیم ہے۔ ۲۶

اور ہم نے اس کو عطا کیے اسحاق اور یعقوب اور اس کی ذریت میں نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری کیا۔ اور ہم نے اس کا صلہ اس کو دنیا میں بھی دیا اور وہ آخرت میں بھی نیکوکاروں کے زمرے میں سے ہوگا۔ ۲۷

اور لوط کو بھی ہم نے رسول بنایا۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ ایک کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو۔ تم سے پہلے دنیا میں کسی قوم نے بھی اس کا ارتکاب نہیں کیا! کیا تم مردوں سے شہوت رانی کرتے اور فطرت کی راہ مارتے ہو! اور اپنی مجلسوں میں بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو! تو اس کی قوم کا جواب صرف یہ ہوا کہ وہ بولے کہ اگر تم

سچے ہو تو ہمارے اوپر اللہ کا عذاب لاؤ! ۲۸-۲۹

اس نے دعا کی، اے رب! اس مفسد قوم کے مقابل میں میری مدد کر۔ اور جب ہمارے فرستادے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے، انھوں نے کہا، ہم اس بستی والوں کو ہلاک کر دینے والے ہیں۔ اس کے باشندے بڑے ہی نابنجار ہیں! اس نے کہا، اس میں تو لوط بھی ہے! انھوں نے جواب دیا کہ جو اس میں ہیں ہم ان کو خوب جانتے ہیں۔ ہم اس کو اور اس کے متعلقین کو بچا لیں گے مگر اس کی بیوی کو، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہو گی۔ ۳۰-۳۲

اور جب یوں ہوا کہ آئے ہمارے فرستادے لُوط کے پاس تو وہ ان سے آزردہ اور دل تنگ ہوا اور وہ بولے کہ تم نہ کوئی اندیشہ کرو، نہ غم، ہم تم کو اور تمھارے متعلقین کو بچا لیں گے بجز تمھاری بیوی کے، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہو گی۔ ہم اس بستی والوں پر، ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں، آسمان سے ایک آفت اتارنے والے ہیں! اور ہم نے اس کی ایک واضح نشانی باقی رکھی ان لوگوں کے لیے جو سوچنا سمجھنا چاہیں۔ ۳۳-۳۵

اور ہم نے مدین والوں کے پاس ان کے بھائی شعیب کو بھیجا تو اس نے دعوت دی، اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو اور یوم آخرت کے منتظر رہو اور زمین میں فساد مچانے والے بن کر نہ بڑھو۔ تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ان کو زلزلہ نے آ پکڑا۔ پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ ۳۶-۳۷

اور عاد اور ثمود کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا۔ اور تم پر ان کی بستیوں کے نشان واضح ہیں۔ اور شیطان نے ان کے مشاغل ان کی نگاہوں میں کھبا دیے اور اس طرح ان کو صحیح راہ سے روک دیا، حالانکہ وہ بڑے ہی ہوشیار لوگ تھے۔ ۳۸

اور قارون و فرعون اور ہامان کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا اور موسیٰ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے ملک میں گھمنڈ کیا اور وہ ہمارے قابو سے باہر نکل جانے والے نہ بن سکے۔ ۳۹

پس ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا۔ ان میں سے بعض پر ہم نے گرد باد کا طوفان بھیجا۔ اور ان میں سے بعض کو کڑک نے آ پکڑا، اور ان میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے بعض کو ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ ۴۰

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (۱۴)

حضرت نوحؑ کا طویل امتحان

حضرت نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سال عمر کا ذکر صرف اسی سورہ میں آیا ہے۔ عمر کی یہ تصریح اس سورہ کے عمود کے تقاضے سے ہوئی ہے۔ اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ جو لوگ حق کی راہ اختیار کریں ان کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ جلدی سے، بغیر کوئی زحمت و مشقت جھیلے، منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے بلکہ انھیں ایک طویل مدت تک آزمائشوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی حقیقت کو مبرہن کرنے کے لیے یہاں حضرت نوحؑ کی عمر کا حوالہ دیا کہ انھیں اپنی قوم کے ساتھ ایک طویل مدت تک کشمکش کرنی پڑی تب کہیں جا کر وہ اللہ تعالیٰ کے امتحان میں سرخرو اور اپنے فرض سے فارغ ہوئے۔

حضرت نوحؑ کے زمانہ میں عمروں کا اوسط

حضرت نوح علیہ السلام کی جو عمر یہاں مذکور ہوئی ہے بالکل تورات کے بیان کے مطابق ہے۔ تورات میں ہے:

"اور طوفان کے بعد نوح ساڑھے تین سو برس اور جیتا رہا اور نوح کی کل عمر ساڑھے نو سو برس کی ہوئی، تب اس نے وفات پائی۔" (پیدائش: ۹ - ۲۸-۲۹)

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں عمروں کا اوسط آج کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ حضرت نوحؑ کے والد کی عمر سات سو ستتر برس کی ہوئی۔ ان کے دادا کی عمر نو سو انہتر برس مذکور ہے۔ اسی طرح ان کے

دوسرے اجداد میں سے کسی کی عمر نو سو باسٹھ برس مذکور ہے اور کسی کی آٹھ سو پچانوے برس۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوحؑ کی یہ عمر اس دور کی اوسط عمر کے بالکل مطابق ہے۔ اس عہد کی کوئی مدون تاریخ موجود نہیں ہے۔ صرف تورات ہی کے ذریعہ سے کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ تورات کے ان بیانات کی تکذیب کی جائے ـــــ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ اس عہد میں جب کہ ہماری یہ زمین ابھی آباد ہو رہی تھی اور تمدن و معیشت کے وہ مفاسد ظہور میں نہیں آئے تھے جو اب زندگی کے ہر شعبے پر چھا گئے ہیں، اگر عمروں کا اوسط زیادہ رہا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے بلکہ یہ عین حکمتِ الٰہی اور فطرت انسانی کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

'فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ' اس ٹکڑے سے تمہید میں بیان کردہ دوسری حقیقت کی تائید ہوئی کہ ہر چند اللہ تعالیٰ اعدائے حق کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن اس ڈھیل کی ایک حد ہوتی ہے جس کے بعد وہ ان کو ضرور پکڑ لیتا ہے اور یہ پکڑنا ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنتے ہیں اس لیے کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو چکی ہوتی ہے۔ سنتِ الٰہی کے مطابق جس طرح اہلِ حق کا کامیابی کی منزل پر پہنچنے سے پہلے امتحان ضروری ہے اسی طرح اہلِ باطل پر عذاب سے پہلے ان پر اتمامِ حجت لازمی ہے۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِیْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (۱۵)

امتحان کے بعد حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کی نجات

یعنی اتنی طویل کشمکش اور آزمائش کے بعد وہ مرحلہ آیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو نجات دی اور اس واقعہ کو دنیا والوں کے لیے ایک عظیم نشانی بنایا جس کے آئینہ میں اہلِ حق اور اہلِ باطل دونوں اپنے اپنے انجام دیکھ سکتے ہیں۔

ضمیر کا مرجع پورا واقعہ ہے

'وَجَعَلْنٰهَا' میں ضمیر کا مرجع کوئی معین لفظ نہیں ہے بلکہ وہ پورا واقعہ ہے جو اوپر بیان ہوا۔ عربی میں ضمیروں کے استعمال کا یہ طریقہ معروف ہے، اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

حضرت نوحؑ کے اس واقعہ میں اس بات کی دلیل بھی موجود ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی طرف سے کوئی دوسرا جواب دہی نہ کر سکے گا۔ اگر اس کی کوئی گنجائش ہوتی تو حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کو خدا کی پکڑ سے ضرور بچا لیتے لیکن جب حضرت نوحؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر اپنے بیٹے کے کچھ کام نہ آ سکے تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔

وَاِبْرٰهِیْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ۭ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۶)

حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اور ان کا امتحان

یعنی جس طرح ہم نے نوحؑ کو رسول بنا کر بھیجا تھا اسی طرح ابراہیمؑ کو بھی اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے بھی اپنی قوم کو دعوت دی کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس کے غضب سے ڈرو۔ اس کے غضب

سے ڈرو، یعنی اس کی بندگی میں دوسروں کو شریک کر کے اس کے غضب کو دعوت نہ دو۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ تنبیہ کا کلمہ ہے۔ یعنی یہ بہترین نصیحت اور بہترین موعظت ہے جو میں بالکل وقت پر تمھیں پہنچا رہا ہوں بشرطیکہ تم اس کو سمجھو اور اس کی قدر کرو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۱۷)

یعنی اپنے جن معبودوں کو تم شریک خدا سمجھ کر پوج رہے ہو ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ محض بت اور تھان اور استھان ہیں۔ وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا یعنی تمھارا یہ دعویٰ کہ خدا نے ان کو اپنی خدائی میں شریک بنایا ہے محض ایک بہتان ہے جو تم خدا پر لگا رہے ہو۔ نہ خدا نے کہیں یہ فرمایا ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے اور نہ تمھارے پاس اس کے حق میں کوئی دلیل ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ یعنی اگر تمھارا یہ گمان ہے کہ رزق و فضل پر تمھارے ان دیوتاؤں کا کوئی اختیار ہے تو یہ محض تمھارا وہم ہے ان کو تمھارے رزق پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ہر چیز خدا ہی کے اختیار میں ہے تو اگر تم رزق و فضل کے طالب ہو تو خدا ہی کی طرف رجوع کرو اور اسی سے مانگو۔

وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ یعنی تمھاری عبادت و شکر گزاری کا اصل حقدار وہی ہے جس کے اختیار میں سب کچھ ہے اور جو تمھیں سب کچھ دیتا ہے تو اس کے حق میں دوسروں کو شریک کر کے اس کی ناشکری نہ کرو۔

وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ یعنی مرنے کے بعد تم اٹھائے جاؤ گے اور تمھاری پیشی اسی کے سامنے ہونے والی ہے۔ اس دن تمھارے یہ اصنام و اوثان تمھارے کچھ کام آنے والے نہیں بنیں گے۔

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۱۸)

یہ نہایت سخت الفاظ میں تنبیہ ہے کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی اور میری تکذیب پر اڑے رہے تو یاد رکھو کہ تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں نے اپنے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تو جو انجام ان کا ہوا اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہو۔

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ یعنی رسول کے اوپر ذمہ داری صرف واضح طور پر اللہ کی بات پہنچا دینے کی ہوتی ہے۔ وہ فرض میں نے ادا کر دیا۔ اب ذمہ داری تمھاری ہے۔ اب جو پرسش ہوگی وہ تم سے ہوگی۔ اب مجھ سے یہ پرسش نہیں ہوگی، کہ تم نے ہدایت کی راہ کیوں نہیں اختیار کی!

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۱۹)

چند آیات بطور تضمین

یہ اور اس کے بعد کی آیات، آیت ۲۳ تک، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی طرح کی تضمین ہے جس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات جب قیامت کے ذکر تک پہنچی تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے قیامت کے دلائل کا حوالہ دے کر حضرت ابراہیم کی بات کو مکمل اور کلام کو بالکل مطابق حال بنا دیا۔

اَوَلَمۡ یَرَوۡا کَیۡفَ یُبۡدِئُ اللّٰہُ الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ۔ یعنی اگر انھیں مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے میں کوئی شک ہے تو کیا انھوں نے اس کائنات میں اس حقیقت کا مشاہدہ نہیں کیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ چیزوں کو پیدا کرتا ہے، پھر ان کو فنا کرتا ہے اور پھر دوبارہ ان کا اعادہ کر دیتا ہے۔ یہ اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے جو مختلف اسلوبوں سے، متعدد مقامات میں پیچھے گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب زمین کو بالکل خشک و بے آب و گیاہ کر دینے کے بعد اس کو از سر نو سرسبز و شاداب کر دینے میں خدا کو کوئی مشکل نہیں پیش آرہی تو لوگوں کے مر کھپ جانے کے بعد ان کو دوبارہ زندہ کر دینے میں اس کو کیوں مشکل پیش آئے گی۔

اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ۔ یعنی اس کو مستبعد اور بعید از امکان نہ خیال کرو۔ جس خدا نے ہر چیز کو عدم سے وجود بخشا اور جو برابر اپنی اس قدرت کا اس کائنات میں مشاہدہ کرا رہا ہے اس کے لیے تمھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا نہایت سہل ہے۔

قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ ثُمَّ اللّٰہُ یُنۡشِئُ النَّشۡاَۃَ الۡاٰخِرَۃَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (۲۰)

دنیا کے نظام پر صحیح نقطۂ نظر سے غور کرنے کی دعوت

یہ اس دنیا کے نظام پر صحیح نقطۂ نگاہ سے غور کرنے کی دعوت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا کے نظام کو اس طرح چلا رہا ہے کہ یہ تمام حقائق کی تعلیم کے لیے خود اپنے وجود کے اندر ایک مکمل تربیت گاہ ہے۔ توحید، قیامت اور جزا و سزا کے لیے باہر سے دلیل ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس دنیا کے شب و روز کے مشاہدات میں ان میں سے ہر چیز کی شہادت موجود ہے۔ فرمایا کہ اس زمین میں چلو پھرو اور غور کی نگاہ سے دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کس طرح خلق کا آغاز فرماتا ہے اور پھر اس کو فنا کر کے اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ ایک قوم کو وہ وجود بخشتا ہے اور پھر اس کو مٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو لاتا ہے۔ رات کے بعد دن نمودار کرتا ہے، خزاں کے بعد بہار آجاتی ہے۔ یہ سارے مشاہدات وہ اسی لیے کرا رہا ہے کہ انسان مرنے کے بعد کی زندگی کو بعید از امکان نہ تصور کرے بلکہ اپنے روز مرہ کے مشاہدات کی روشنی میں یقین رکھے کہ جس خالق کی قدرت کے یہ کرشمے وہ ہر روز اور ہر آن مشاہدہ کر رہا ہے اس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡحَمُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ اِلَیۡہِ تُقۡلَبُوۡنَ (۲۱)

یعنی اس دنیا کے واقعات و حوادث اور اس کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم فرماتا ہے۔ اس کے اپنے قانونِ عدل و حکمت کے سوا اور کوئی چیز بھی اس کی مشیت و قدرت پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے۔ قرآن میں قوموں کی جو تاریخ بیان ہوئی ہے وہ اس حقیقت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ آخرت میں بھی عذاب و ثواب کا معاملہ تمام تر اسی کے اختیار میں ہوگا، کوئی دوسرا اس کے اس اختیار میں مداخلت نہ کر سکے گا۔ وہی اپنے عدل و حکمت کے مطابق جس کو چاہے گا سزا دے گا، جس کو چاہے گا اپنی مغفرت سے نوازے گا۔

'وَاِلَیْہِ تُقْلَبُوْنَ': اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ سب کی واپسی بالآخر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہوتی ہے، کسی اور کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ وہ مولیٰ و مرجع بن سکے۔ جب اس دنیا میں اس کی گرفت سے بچانے والا کوئی اور نہ بن سکا، کسی اور کی دہائی کچھ کارگر نہ ہو سکی تو آخرت میں اس کے نافع ہونے کی توقع کس بنیاد پر کی جائے!

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ز وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (۲۲)

اوپر کی باتیں غائب کے اسلوب میں ارشاد ہوئی ہیں۔ اب یہ قریش کو براہِ راست خطاب کر کے تنبیہ کی جا رہی ہے تاکہ کلام بالکل مطابقِ حال ہو جائے۔ فرمایا کہ جب وہ تم کو پکڑنا چاہے گا تو اس کی پکڑ سے نہ تم زمین میں کہیں اس کے قابو سے باہر نکل سکو گے اور نہ آسمانوں میں۔ نہ یہاں تمہارا کوئی ساتھی اور کارساز بن سکے گا نہ آخرت میں تمہارا کوئی حامی و شفیع ہوگا۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَلِقَآئِہٖٓ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۲۳)

'یَئِسُوْا' یہاں 'حُرِمُوْا' اور 'یُحْرَمُوْا' کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ لوگ ہمیشہ کے لیے خدا کی رحمت و عنایت سے محروم ہوئے۔ اس لفظ میں 'حُرِمُوْا' کے بالمقابل زیادہ زور ہے۔ بعض اوقات کسی چیز سے محرومی اس کے دوبارہ حصول کی امید کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ محرومی زیادہ دل شکن نہیں ہوتی۔ کفار کو آخرت میں خدا کی رحمت سے جو محرومی ہوگی وہ کامل مایوسی کے ساتھ ہوگی۔ ان کے لیے امید کے دروازے ہمیشہ کے واسطے بند ہو جائیں گے۔

فرمایا کہ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا، جو آج ان کو سنائی جا رہی ہیں اور خدا کے حضور پیشی کا، جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے، انکار کیا وہ یاد رکھیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے میری رحمت سے مایوس و نامراد ہوئے۔ اس رحمت کا استحقاق پیدا کرنے کا موقع صرف اسی دنیا کی زندگی میں ہے۔ جو لوگ یہ فرصت

رائگاں کردیں گے ان کے لیے اس کو کھو کر پا سکنے کا کوئی امکان نہیں۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِۦٓ إِلَّآ أَن قَالُوا۟ ٱقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنجَىٰهُ ٱللَّهُ مِنَ ٱلنَّارِ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَـٰتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۲۴)

اصل سرگزشت کا بقیہ حصہ

بیچ میں تضمین کی جو آیات آگئی تھیں وہ اوپر کی آیت پر ختم ہوئیں۔ اب اصل سرگزشت کا بقیہ حصہ پھر سامنے آگیا۔ فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس دردمندانہ دعوت کا جواب ان کی قوم نے دیا تو یہ دیا کہ اس شخص کو یا تو قتل کردو یا جلا دو۔ بالآخر اسی دوسری رائے پر اتفاق ہوا اور قرآن میں دوسری جگہ یہ تصریح ہے کہ اس کے لیے ایک خفیہ اسکیم بنائی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دشمنوں کے اس شر سے بچا لیا۔ فرمایا کہ اس واقعہ کے اندر ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان کی راہ اختیار کریں۔

اس سرگزشت کی نشانیاں

اس میں پہلی نشانی تو اس بات کی ہے کہ جو لوگ ایمان کی راہ اختیار کریں وہ اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ اس راہ میں بہت سے سخت امتحانات پیش آتے ہیں جن سے گزرے بغیر کوئی شخص ایمان کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو اس راہ میں آگ کے الاؤ کے اندر سے ہو کر گزرنا پڑا ہے۔

دوسری نشانی اس بات کی ہے کہ اس راہ میں علائق کی زنجیریں کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے باپ — آزر — نے ان پر پورا دباؤ ڈالا کہ ان کو ایمان کی راہ سے روک دے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ دین کے معاملہ میں ان کا باپ خدا کے ہاں ان کی طرف سے جواب دہ نہیں ہوگا بلکہ انھیں اپنی جواب دہی خود کرنی ہوگی! اس وجہ سے باوجود اس کے کہ وہ اپنے باپ کے لیے اپنے سینہ میں ایک نہایت دردمند دل رکھتے تھے لیکن وہ اس کے مقابل میں اپنے دین کی حفاظت کے لیے علائق محبت کی تمام زنجیریں توڑ کر سینہ سپر ہو گئے۔

تیسری نشانی اس میں اس بات کی ہے کہ جو لوگ حق کو لپاڑنے کے لیے اپنا زور و زر اور اپنا اختیار و اقتدار استعمال کرتے ہیں، اگرچہ ایک حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو زور آزمائی کی مہلت ملتی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ آزمائش کا یہ ایک لازمی تقاضا ہے لیکن اس مہلت کی ایک خاص حد ہے۔ اگر اہلِ حق اس کے مقابل میں ڈٹ جاتے ہیں تو بالآخر فتحمند وہی ہوتے ہیں اور اہلِ باطل دنیا اور آخرت دونوں میں رسوا ہوتے ہیں۔

وَقَالَ إِنَّمَا ٱتَّخَذْتُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ أَوْثَـٰنًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۖ ثُمَّ يَوْمَ ٱلْقِيَـٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا وَمَأْوَىٰكُمُ ٱلنَّارُ وَمَا لَكُم مِّن نَّـٰصِرِينَ (۲۵)

گمراہ لیڈروں اور گمراہ پیرووں کی دوستی بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے

اِنَّمَا حصر کے مفہوم میں ہے اور مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ بیانِ علت کے لیے نہیں بلکہ بیانِ حال کے لیے ہے۔
مطلب یہ ہے کہ یہ جو تم نے اللہ کے سوا دوسرے اصنام و اوثان بنائے ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ محض تمہارے خیال و وہم کی ایجادیں ہیں۔ ان کے ساتھ تمہاری ساری دوستی و نیازمندی بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے۔ قیامت کے دن جب اصل حقیقت سامنے آئے گی تو تم ایک دوسرے کا انکار کروگے اور آپس میں ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے۔ تم کہو گے کہ اے رب، ہم کو فلاں اور فلاں نے گمراہ کیا۔ اگر یہ نہ ورغلاتے تو ہم تیری سیدھی راہ پر ہوتے۔ وہ جواب دیں گے کہ ہم جیسے خود تھے ہم نے تم کو ویسے ہی بنایا، تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی تو ہم کو ملامت کرنے کے بجائے خود اپنے کو ملامت کرو اور اپنے کیے کی سزا بھگتو۔ اس جنگ و جدال کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ ہوا ہے اور مقصود اس کے ذکر سے یہ ہے کہ جو لوگ دعوت کے اس دور میں اپنے زیردستوں کو یہ اطمینان دلا رہے تھے کہ وہ ان کے طریقے پر چلتے رہیں، قیامت کے دن وہ ان کی طرف سے جواب دہی کرلیں گے، ان کو یہ آگاہی دے دی جائے کہ اس دن اس قسم کے لیڈر اور اس قسم کے پیرو، اس قسم کے معبود اور اس قسم کے عابد سب ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے۔ دوستی و وفاداری کے سارے دعوے بس اسی وقت تک ہیں جب تک اصل حقیقت سے پردہ نہیں اٹھتا۔ پردہ اٹھتے ہی سب پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس طرح کے سارے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۲۶)

اول اول حضرت لوطؑ نے حضرت ابراہیمؑ کا ساتھ دیا

اٰمَنَ لَهٗ تصدیق و تائید کے مفہوم میں ہے۔ حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے اور خود منصب رسالت پر فائز اور اپنی قوم کی دعوت پر مامور تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے جو روش اختیار کی اس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا۔ یہاں حضرت لوطؑ کی تصدیق و تائید کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی پر بھی ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ ان کی دعوت میں ان کی ہمنوائی کرنے والا حضرت لوطؑ کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا لیکن بالآخر وہ وقت بھی آیا کہ ان کی دعوت کی صدائے بازگشت دنیا کے کونے کونے سے اٹھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت

وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔ 'قَالَ' کا فاعل حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے اپنی قوم کا رویہ دیکھ لیا کہ وہ ان کے قتل کر دینے اور جلا دینے کے درپے ہے تو انھوں نے سنتِ الٰہی کے مطابق، ہجرت کا عزم فرمایا کہ اب میں قوم کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں، میرا رب عزیز و حکیم ہے۔ یعنی اگرچہ بظاہر حالات بالکل نامساعد ہیں لیکن میرا رب ہر چیز پر غالب ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ وہ میرے لیے اپنی قدرت و حکمت سے راہ کھولے گا اور اس تاریکی کے اندر سے روشنی نمودار کرے گا۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۷)

ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ کا انعام

یہ وہ انعام بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہجرت کے بعد فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ اگرچہ ابراہیمؑ نے جب ہجرت کی ہے لوط علیہ السلام کے سوا اور کوئی ان کی ہمنوائی کرنے والا نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ وہ ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں صالحین و ابرار کی معیت و رفاقت نصیب کرتا ہے۔ چنانچہ ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ جیسے بیٹے اور پوتے عطا فرمائے جن سے دین کے خدمت گزاروں کا ایک عظیم گھرانا آباد ہوا اور اس گھرانے کے اندر اللہ تعالیٰ نے نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری فرمایا۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کو اس دنیا میں بھی ان کی خدمات کا صلہ عطا ہوا اور آخرت میں بھی وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوں گے۔

نبی صلعم اور آپ کے صحابہؓ کو بشارت

اس آیت میں در پردہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے بشارت ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سورہ مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب مسلمانوں پر کفار نے عرصۂ حیات بالکل تنگ کر دیا تھا اور مظلوم مسلمانوں کے لیے ہجرت کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان حالات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے اس پہلو کو نمایاں کر کے اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی دی کہ اگر یہ مرحلہ پیش آتا ہے تو اس سے ہراساں نہ ہونا، اپنے باپ ابراہیمؑ کی طرح اپنے رب عزیز و حکیم کے بھروسہ پر دامن جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہونا۔ اگر اپنے رب کی خاطر تم اپنی ناہنجار قوم کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں اچھے ساتھی پیدا کرے گا۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۫ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۲۸)

حضرت لوطؑ کی دعوت

حضرت لوطؑ، اوپر گزر چکا ہے، حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے، ان کی دعوت کا علاقہ اگرچہ الگ تھا لیکن زمانہ ایک ہی تھا۔ ان کی قوم میں یوں تو وہ ساری ہی برائیاں تھیں جو دوسری مشرک قوموں میں رہی ہیں لیکن امرد پرستی کی بے حیائی اس قوم میں فیشن کی حیثیت حاصل کر گئی تھی اس وجہ سے اس کی اصلاح پر ان کو خاص طور پر توجہ مرکوز کرنی پڑی۔ لفظ 'فَاحِشَة' سے انھوں نے اسی بے حیائی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ 'فَاحِشَة' کھلی ہوئی بدکاری و بے حیائی کو کہتے ہیں جس کے بدکاری و بے حیائی ہونے میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ 'تَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ' کے الفاظ سے حضرت لوطؑ نے لوگوں کی اخلاقی حس بیدار کرنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ان کو غیرت دلائی کہ یہ تو وہ بے حیائی ہے جو سب سے پہلے اس روئے زمین پر تمہی نے ایک فیشن کی حیثیت سے اختیار کی ہے، تم سے پہلے کسی قوم نے بھی یہ لعنت ایک قومی تہذیب کی حیثیت سے اختیار نہیں کی۔

ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ 'مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ' سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ قوم لوط سے پہلے دنیا میں کسی ایک فرد نے بھی اس برائی کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ لفظ 'اَحَد' جمع کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اس کی مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں اس وجہ سے اس کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ تم سے پہلے کسی قوم نے بھی اس بے حیائی کو من حیث القوم اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔ اس برائی کا یہی وہ پہلو ہے جس کے سبب سے پوری قوم لوط عذاب کی مستحق ٹھہری۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ ۙ۬ وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ (۲۹)

برائی فیشن کی حیثیت سے

'سبیل' سے مراد یہاں فطرت کی راہ ہے۔ حضرت لوطؑ نے ان کو نہایت دردمندانہ لہجہ میں فطرت سے اس انحراف پر ملامت فرمائی کہ بدبختو، تم مردوں سے شہوت رانی کرتے اور فطرت کی راہ مارتے ہو! ظاہر ہے کہ اگر کسی قوم میں یہ بیماری عام ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ عورتوں کی طرف مردوں کی رغبت بالکل ہی ختم ہو جائے گی اور اگر کچھ رہے گی بھی تو وہ بھی صحیح نوعیت کی نہ ہوگی اور اس طرح پوری قوم ابلاکِ نسل کی اس راہ پر چل پڑے گی جو فاطرِ فطرت کے منشا کے بالکل خلاف اور تباہی کی راہ ہے۔

'وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ' سے اس فسادِ اخلاق کے عام ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کوئی ڈھکی چھپی برائی نہیں رہ گئی تھی بلکہ ان کی سوسائٹی میں اس نے 'تہذیب' اور فیشن کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ مجلسوں میں علانیہ ناشائستہ حرکتیں ہوتیں اور فخر و لذت کے ساتھ ہر بزم و انجمن میں ان کے چرچے ہوتے۔ ہماری جس شاعری کو حالی مرحوم نے سنڈاس سے بدتر قرار دیا ہے وہ انہی خرافات کا دفتر ہے اور ہمارے قومی اخلاق و کردار پر اس کا جو اثر پڑا اس کے زرد انگیز نتائج کی تفصیل تاریخ کے صفحات میں موجود ہے۔

'فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ الاٰیۃ' یعنی ان تمام دردمندانہ تنبیہات کا جواب اس قوم نے دیا تو یہ دیا کہ اگر تم سچ مچ اللہ کے رسول ہو اور تمہاری تکذیب سے ہم پر اللہ کا کوئی عذاب آنے والا ہے تو ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ تم اس عذاب کو دکھا دو تب ہم تمہاری بات باور کریں گے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ (۳۰)

حضرت لوطؑ کی فریاد بارگاہ الٰہی میں

جب قوم نے اپنی ضد سے حضرت لوطؑ کو بالکل مایوس کر دیا تب انھوں نے اپنے رب سے فریاد کی کہ اے رب، میری تمام سعیِ اصلاح بے سود ہو چکی ہے تو اب اس مفسد قوم کے مقابل میں میری مدد فرما۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مُهْلِكُوْۤا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ (۳۱)

رحمت و نقمت دونوں خدا ہی کے اختیار میں

'بُشْرٰی' سے مراد وہ بشارت ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو دی۔ اس کا ذکر اوپر آیت ۲۷ میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ جو فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لیے بیٹے اور پوتے کی بشارت لے کر آئے وہی فرشتے قوم لوطؑ کے لیے عذاب کا تازیانہ لے کر آئے۔ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت کے ساتھ قوم لوطؑ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی بھی خبر دی کہ اب ہم اس بستی والوں کو (اشارہ قوم لوطؑ کی بستی کی طرف ہے) ہلاک کر دینے والے ہیں۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہی ہاتھ میں رحمت و نقمت دونوں ہیں۔ جس طرح ایک ہی بارش کو وہ کسی کے لیے عذاب اور کسی کے لیے رحمت بنا دیتا ہے اسی طرح اس کے جو فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لیے بشارت لے کر آئے وہی قوم لوطؑ کے لیے عذاب کا پیش خیمہ بن کر نمودار ہوئے۔ اس سے مشرک قوموں کے اس واہمہ کی بھی تردید ہو رہی ہے جس میں وہ اس کائنات کے اندر اضداد کے وجود کے سبب سے مبتلا ہوئیں کہ انھوں نے خیر و شر کے الگ الگ دیوتا مان کر ان کی الگ الگ عبادت شروع کر دی۔

'اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ' یہ قوم لوطؑ کی ہلاکت کی علت بیان ہوئی ہے کہ ان کے ہلاک کیے جانے کا فیصلہ خود ان کے اس ظلم کے نتیجہ میں ہوا جو انھوں نے اپنے اوپر کیا کہ فطرت کی راہ سے کھلم کھلا انحراف اختیار کیا اور اللہ کے رسول نے جب اس کے نتائج سے ان کو آگاہ کیا تو اس کی بات پر کان دھرنے کے بجائے اس سے عذاب کا مطالبہ کیا۔ اس طرح کے لوگوں پر جو عذاب آتا ہے وہ خود ان کے ظلم کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔

قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ڭ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۤ
كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ۔ (۳۲)

حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی تشویش کا ازالہ

حضرت ابراہیمؑ کو جونہی فرشتوں کی اس مہم کا علم ہوا انھیں حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کی فکر پڑ گئی کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ انھوں نے سوال فرمایا کہ اس بستی میں تو لوطؑ بھی ہیں؟ فرشتوں نے ان کو اطمینان دلایا کہ اس میں جتنے اہل ایمان ہیں ہم ان سب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ ان کے بارے میں بالکل مطمئن رہیں، ہم لوطؑ اور ان کے تمام متعلقین کو اس عذاب سے بچا لیں گے، صرف ان کی بیوی پیچھے رہ جائے گی اور وہ عذاب کی زد میں آئے گی۔

وَلَمَّآ اَنْ جَاۗءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْۗءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۣ
اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ (۳۳)

زبان کا ایک نکتہ

یہاں زبان کا ایک نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے جس کی طرف علامہ ابن قیمؒ نے اشارہ فرمایا ہے کہ جب 'لَمَّا' اور اس کے بعد کے فعل کے درمیان 'اَنْ' آ جائے تو اس صورت میں شرط اور اس کے جواب کے درمیان سبب اور مسبب کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت لوطؑ کی آزردگی کا سبب

مطلب یہ ہے کہ جب فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے پاس سے ہو کر حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے تو وہ ان کو دیکھ کر آزردہ اور متردّد ہوئے۔ یہاں یہ سوال قابلِ غور ہے کہ حضرت لوطؑ فرشتوں کو دیکھ کر آزردہ و دل تنگ کیوں ہوئے؟ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کا خیر مقدم کیوں نہیں کیا؟ قرآن مجید کے دوسرے مقامات کے مطالعہ سے ان کی اس آزردگی و پریشانی کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں، جو الگ الگ دو مختلف مرحلوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔

پہلے مرحلے میں تو وہ ان کو دیکھ کر اس وجہ سے پریشان ہوئے کہ یہ فرشتے خوبرو نوجوانوں کی شکل میں آئے تھے۔ ان کا اس شکل و صورت میں آنا قوم لوط کے لیے ایک آخری ابتلا تھا تاکہ ان کے اندر جو خبث بھرا ہوا ہے وہ پوری طرح ظاہر ہو جائے اور جو عذاب ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے اس کے وہ آخری درجے میں مستحق بن جائیں۔ حضرت لوطؑ پر یہ حقیقت چونکہ ابھی واضح نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے وہ اپنے دروازے پر چند خوبرو شریف زادوں کو دیکھ کر سخت پریشان ہوئے کہ آج کا دن تو بہت کٹھن ہے۔ بستی کے گنڈوں کو جب ان نوجوانوں کی خبر ہو گی تو وہ ٹوٹ پڑیں گے اور مجھ کو اور میرے مہمانوں کو رسوا کریں گے۔ چنانچہ ان کا یہ اندیشہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ گنڈے ان نوجوانوں کی خبر پاتے ہی حضرت لوطؑ کے گھر پر ٹوٹ پڑے اور ان کو رسوا کرنا چاہا۔ حضرت لوطؑ نے لاکھ منت سماجت کی لیکن انھوں نے ان کی ایک نہیں سنی۔ بالآخر فرشتوں نے اپنا پردہ اٹھایا اور حضرت لوطؑ کو اطمینان دلایا کہ تم اطمینان رکھو، ہم چھوکرے نہیں ہیں جیسا کہ ان اندھوں نے گمان کیا ہے بلکہ ہم خدا کے فرشتے ہیں اور ان کے لیے فیصلہ کن عذاب لے کر آئے ہیں۔ فرشتوں کے اس انکشافِ راز سے حضرت لوطؑ کو یہ تو اطمینان ہوا کہ گنڈوں کے شر سے وہ اور ان کے مہمان محفوظ ہیں لیکن عذاب کی خبر بھی ان کے لیے سخت تردّد کا باعث ہوئی کہ اب دیکھیے ان کے اور ان کے متعلقین کے لیے کیا حکم ہوتا ہے! فرشتوں نے اس پہلو سے بھی ان کو اطمینان دلایا کہ تم اپنے اور اپنے متعلقین کے باب میں کوئی اندیشہ نہ کرو، ہم تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو اس آفت سے نجات دیں گے۔ البتہ تمھاری بیوی تمھارے ساتھ یہاں سے نہیں نکلے گی۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ مبتلائے عذاب ہو گی۔

حضرت لوطؑ کی بیوی کے ذکر کا عام مدعا

یہاں حضرت لوطؑ کی بیوی کے انجام کی طرف دوم مرتبہ اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کو مؤکد کرنا ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ دین کے معاملہ میں کوئی کسی دوسرے کے بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا۔ عورت ہو یا مرد ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے۔ حضرت لوطؑ کی بیوی ایک جلیل القدر پیغمبر کی بیوی تھی لیکن چونکہ وہ خود نابنجار تھی اس وجہ سے وہ بھی عذاب میں گرفتار ہوئی اور حضرت لوطؑ سے جو نسبت اس کو حاصل تھی وہ اس کے لیے کچھ نافع نہ بن سکی۔

إِنَّا مُنزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (۳۴)

قوم لوط پر قہرِ آسمانی

حضرت لوطؑ کو نجات کی خوش خبری دینے کے بعد فرشتوں نے ان کو اس فیصلۂ الٰہی سے بھی آگاہ کر دیا کہ اس بستی والوں پر ہم قہرِ آسمانی نازل کرنے والے ہیں۔ 'رجز' سے مراد اس طرح کا عذاب ہے جو سننے اور دیکھنے والوں کے دلوں میں کپکپی پیدا کر دے۔ اس کے ساتھ مِّنَ السَّمَآءِ کی قید اس کی شدت اور بے پناہی کے اظہار کے لیے ہے۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں قہرِ الٰہی یا عذابِ آسمانی کے الفاظ بولتے ہیں اسی طرح عربی زبان میں یہ اسلوب ہے۔ اس عذاب کی نوعیت پر ہم اس کے محل میں گفتگو کر چکے ہیں۔ 'بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ' سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کا عذاب کسی قوم پر اس وقت بھیجتا ہے جب سرکشی و نافرمانی اس کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۳۵)

خاموش آثار سے صرف اہلِ عقل فائدہ اٹھاتے ہیں

قوم لوط کی یہ بستی قریش کی تجارتی گزرگاہ پر واقع تھی اس وجہ سے وہ ان کے لیے اس سنتِ الٰہی کے ظہور کا ایک نہایت واضح نشان تھی جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا تھا لیکن یہ خاموش آثار نافع ان کے لیے ہوتے ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن ان کو نظر کچھ بھی نہیں آتا۔ آخر اس زمانے میں کتنے ماہرینِ اثریات ہیں جو قدیم کھنڈروں کے ایک ایک نقش کو پڑھ لینے میں بڑے ہوشیار ہیں لیکن ان سے جو اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں ان کے سمجھنے میں ان کی عقل بالکل کند ہے۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِىْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (۳۶-۳۷)

بعض اقوام و افراد کی طرف اجمالی اشارات

اوپر کی سرگزشتیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں لیکن آگے صرف اجمالی حوالے پر اکتفا فرمایا ہے۔ مقصود ان کے حوالہ سے اسی حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں مبرہن کرنا ہے جس کی طرف سورہ کی تمہید میں اشارہ فرمایا ہے کہ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۴) (کیا جو لوگ برائیاں کر رہے ہیں انھوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں گے؟ اگر انھوں نے یہ گمان کر رکھا ہے تو بہت ہی برا فیصلہ کر رہے ہیں) آگے کے تاریخی واقعات اسی بات کے ثبوت میں پیش کیے گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شرارت کرنے والوں کو جو ڈھیل دیتا ہے اس سے ان کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اب ان کی پکڑ نہیں ہوگی یا وہ خدا کے قابو سے باہر ہیں۔ اس سلسلہ میں اقوام میں سے قوم شعیب اور عاد و ثمود کا حوالہ دیا ہے اور جبار و سرکش افراد میں سے قارون، فرعون اور ہامان کا اور قریش کو متنبہ کیا ہے کہ جو زور و اقتدار آج تم کو اور تمہارے لیڈروں کو حاصل ہے اس سے زیادہ زور و اقتدار ماضی میں ان کو حاصل رہ چکا ہے لیکن جب انھوں نے سرکشی کی اور ہماری تنبیہات کے باوجود باز نہیں آئے تو ہم نے ان کو پکڑا اور اس طرح پکڑا کہ ان کا سارا زور و زر ہمارے مقابل میں ذرا بھی ان کے کام نہ آ سکا۔

قوم شعیب — قوم شعیب کے متعلق پیچھے واضح ہو چکا ہے کہ اس قوم نے تجارت کے میدان میں بڑی ترقی کی تھی۔

اور قریش میں قدرِ مشترک — یہی اصل میدان قریش کا بھی تھا۔ اس لیے کہ یہ بھی تجارت پیشہ تھے لیکن ابھی یہ ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچے تھے۔ شاید اسی اشتراک کی وجہ سے انہی کے حالات اور انجام کی طرف سب سے پہلے توجہ دلائی۔ فرمایا کہ اہلِ مدین کے حالات سے سبق لو جن کی طرف ہم نے شعیبؑ کو رسول بنا کر بھیجا۔ انھوں نے ان کو خدا کی بندگی کی دعوت دی اور آخرت کا خوف دلا کر متنبہ کیا کہ دنیا میں بڑھو اور پھیلو تو مفسدین کر نہ پھیلو بلکہ مصلح اور حق و عدل کے علم بردار بن کر پھیلو لیکن انھوں نے حضرت شعیبؑ کی ایک بات بھی نہ سنی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے عین ان کے دورِ عروج میں ان کو پکڑا اور ایسا عذاب ان پر آیا کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ سورۂ ہود کی آیت ۸۵ کے تحت ان کے فساد فی الارض اور آیت ۹۴ کے تحت ان کے عذاب کی تفصیل گزر چکی ہے۔

وَعَادًا وَّثَمُودَا۟ وَقَد تَّبَيَّنَ لَكُم مِّن مَّسَٰكِنِهِمْ ۖ وَزَيَّنَ لَهُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ ٱلسَّبِيلِ وَكَانُوا۟ مُسْتَبْصِرِينَ (۳۸)

عاد اور ثمود — یہاں فعل 'اَخَذْنَا' بربنائے قرینہ محذوف ہے یعنی ہم نے عاد و ثمود کو بھی اس سے پہلے عذاب میں پکڑا۔ ان قوموں کی تمدنی و تعمیری ترقیوں کا ذکر پچھلی سورتوں میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ 'وَقَد تَّبَيَّنَ لَكُم مِّن مَّسَٰكِنِهِمْ' یہ قریش کو توجہ دلائی گئی ہے کہ قوم لوط کی طرح ان کی بستیوں کے آثار بھی تم سے مخفی نہیں ہیں، تم اپنے تجارتی سفروں میں ان کے کھنڈروں پر سے گزرتے ہو اور اندازہ کر سکتے ہو کہ ماضی میں وہ کس شان و شوکت کے مالک تھے لیکن اب ان کے کھنڈروں کے سوا ان کی کہانی سنانے والا بھی زمین پر کوئی باقی نہیں رہا۔ 'وَكَانُوا۟ مُسْتَبْصِرِينَ' یعنی یوں تو وہ بڑے کاردان، بڑے زیرک، ہوشیار، تعمیر و تمدن اور حکومت و سیاست میں بڑے ماہر و چالاک تھے لیکن ان کی یہ چالاکی و ہوشیاری ان کو شیطان کے پھندوں سے نہ بچا سکی۔ اس نے ان کے دنیوی انہماک کو اس طرح ان کی نگاہوں میں کھبا دیا کہ ان کی آنکھیں خدا اور آخرت کی طرف سے بالکل بند ہو گئیں جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ اصل شاہراہ سے وہ بالکل منحرف ہو گئے اور ہلاکت کے کھڈ میں جا گرے ــــ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ مجرد سائنس اور تمدن و تعمیر میں کسی قوم کا عروج اس بات کی شہادت نہیں ہے کہ وہ زندگی کی صحیح شاہراہ پر گامزن ہے، جیسا کہ عام طور پر بے بصیرت لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی ایک آنکھ کھلی ہوئی ہے جو اس دنیا کو دیکھتی ہے لیکن دوسری آنکھ جو اس دنیا کی پس پردہ حقیقتوں کو دیکھتی ہے اگر وہ کھلی ہوئی نہ ہو تو تمام علم و سائنس کے باوجود شیطان اس کو ہلاکت کے ایسے کھڈ میں گراتا ہے جس سے اس کو کبھی نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔

وَقَٰرُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَٰمَٰنَ ۖ وَلَقَدْ جَآءَهُم مُّوسَىٰ بِٱلْبَيِّنَٰتِ فَٱسْتَكْبَرُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ

وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ (۳۹)

تاریخ کے بعض نمایاں متکبرین

یہ نام بھی اسی فعل محذوف کے تحت ہیں جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ گزرا۔ اقوام کے ذکر کے بعد یہ تاریخ کے بعض نمایاں متکبرین — قارون، فرعون اور ہامان — کا ذکر فرمایا ہے۔ ان تینوں کا ذکر تفصیل سے پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے۔ سورۂ قصص میں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم میں جو حیثیت قارون کی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں اسی سے ملتی جلتی حیثیت ابولہب کی تھی۔ اس وجہ سے یہ محض ماضی کے اشخاص کا حوالہ نہیں ہے بلکہ قریش کے سامنے یہ ایک آئینہ رکھا گیا ہے جس میں ان کے لیڈر اپنی شکلیں بڑی آسانی سے پہچان سکتے تھے۔ فرمایا کہ ان کو بھی موسیٰؑ نے بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں لیکن ان کی آنکھوں پر غرور کی ایسی ایسی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں کہ کوئی نشانی بھی ان کو کھولنے میں کارگر نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ خدا کے عذاب نے ان کو آ دبوچا۔ 'وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو آیت ۳ میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی جب وہ ہمارے عذاب کی گرفت میں آ گئے تو اپنے تمام طمطراق، اور اپنے تمام لاؤ لشکر اور اپنی ساری دولت و حشمت کے باوجود ہماری گرفت سے باہر نہ نکل سکے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۴۰)

خلاصۂ کلام

اب یہ آخر میں بطور خلاصہ مذکورہ بالا تمام اقوام و افراد کا انجام یکجا بیان فرما دیا کہ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے اس کے جرم کی پاداش میں پکڑا۔ کسی پر ہم نے حاصب (کنکر پتھر برسا دینے والی طوفانی ہوا) بھیجی، کسی پر رعد و برق کا عذاب بھیجا، کسی کو زمین سمیت دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔

پچھلی سورتوں میں ان تمام عذابوں کی تفصیل گزر چکی ہے۔

— قوم لوط پر حاصب کا عذاب آیا۔

— عاد، ثمود، مدین پر صیحہ کا عذاب نازل ہوا۔

— قارون زمین میں دھنسا دیا گیا۔

— فرعون اور ہامان غرق کر دیے گئے۔

'وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ' یعنی یہ جو کچھ ہوا خدا کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہوا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیا گیا تھا لیکن انھوں نے اللہ کے رسولوں کی کوئی پروا نہ کی۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۱۔ ۶۹

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں بالترتیب مندرجہ ذیل باتیں واضح فرمائی گئی ہیں۔

مشرکین نے شرک کی اساس پر جو گھروندا بنا لیا ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس کی حیثیت مکڑی کے جالے کی ہے۔ اگر اس کے بل پر انھوں نے حق کا مقابلہ کرنا چاہا ہے تو انھوں نے نہایت کمزور سہارا ڈھونڈا ہے۔ یہ سہارا نہ دنیا میں ان کے کام آنے والا بنے گا نہ آخرت میں۔

اہلِ ایمان اطمینان رکھیں کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا عدل ایک دن ظاہر ہو کے رہے گا۔ اہلِ ایمان صبر کے ساتھ اس عدل کے ظہور کا انتظار کریں، دعوتِ حق کے کام میں لگے رہیں اور نماز کا اہتمام رکھیں، نماز تمام برائیوں سے محفوظ رکھنے والی اور اللہ تعالیٰ کی یاد بہت بڑی طاقت ہے۔

اہلِ کتاب کے متعلق مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ اگر وہ مشرکین کے پہلو بہ پہلو تم سے بحث و مناظرہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو جہاں تک ان کے اشرار کا تعلق ہے ان کو تو منہ نہ لگاؤ البتہ ان کے اندر جو معقول لوگ ہیں ان کو حُسن و خوبی کے ساتھ اس قدرِ مشترک کی اساس پر دعوت دو جو ان کے اور تمہارے درمیان موجود ہے۔ اسی ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بعض دلائل کی طرف اشارہ اور مخالفین کے بعض مطالبات کا جواب۔

ان مسلمانوں کو ہجرت کی ترغیب جو کفار کے ہاتھوں مصائب کے ہدف بنے ہوئے تھے اور ہجرت کرنے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ تعالیٰ کی جو مدد اور کفالت حاصل ہوتی ہے اس کی بشارت۔

آخر میں مشرکینِ قریش کو نہایت سخت الفاظ میں تہدید و وعید کہ قرآن کے خلاف ان کی تمام محاذ آرائی خود ان کے اپنے مسلمات کے خلاف ہے۔ یہ نہایت ناشکرے اور ناہنجار لوگ ہیں۔ ان کو جو نعمتیں حاصل ہوئی ہیں وہ ہیں تو تمام تر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ لیکن یہ ان کو منسوب دوسروں کی طرف کرتے اور ان کو خدا کا شریک بناتے ہیں۔ یہ لوگ عنقریب اپنی اس ناشکری کا انجام دیکھیں گے اور جو لوگ آج اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے لیے اپنی راہیں فراخ کرے گا۔

اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۱-۶۹

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۚ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ

كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ
شَیْءٍ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴۲﴾ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا
لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ اُتْلُ مَاۤ ع ۴ ۱۴ ۱۶
اُوْحِیَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ
الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا
تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۖ
اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا
وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾
وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ
اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ
بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِیْ
صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا
الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ
اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ
اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ
لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِیْ وَبَيْنَكُمْ ع ۵ ۴ ۱

شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ
وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ
بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ
بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَاِنَّ
جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ
وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ يٰعِبَادِىَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِىْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّاىَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ كُلُّ
نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ
عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ
اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ
مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ
اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ
عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۲﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ
مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا
لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ ع ۱۲
وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ

لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۶۴﴾ فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا وقف لازم
اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ
يُشْرِكُونَ ﴿۶۵﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۙ وَلِيَتَمَتَّعُوا ۖ فَسَوْفَ
يَعْلَمُونَ ﴿۶۶﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ
النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ﴿۶۷﴾
وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا
جَاءَهُ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْكَافِرِينَ ﴿۶۸﴾ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا
فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۶۹﴾ ع ۷ ۳

ترجمہ آیات ۴۱-۶۹ ان لوگوں کی تمثیل جنھوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنائے ہیں بالکل مکڑی کی تمثیل ہے جس نے ایک گھر بنایا۔ اور بے شک تمام گھروں سے بودا گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔ کاش کہ وہ اس حقیقت کو جانتے! بے شک اللہ اچھی طرح جانتا ہے ان چیزوں کو جن کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں اور وہ عزیز و حکیم ہے اور یہ تمثیلیں ہیں جن کو ہم لوگوں کے غور کرنے کے لیے بیان کرتے ہیں لیکن ان کو صرف اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔ ۴۱-۴۳

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو مقصد حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے ایمان والوں کے لیے۔ جو کتاب تم پر وحی کی جا رہی ہے اس کو پڑھو اور نماز کا اہتمام کرو۔ بے شک نماز بے حیائی اور منکر سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۴۴-۴۵

اور اہل کتاب سے نہ بحث کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے بجز ان کے جو ان میں سے

ظالم ہیں اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہم پر نازل ہوئی اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف اتاری گئی اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کی فرماں برداری کرنے والے ہیں۔ ۴۶

اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی کتاب اتاری تو جن کو ہم نے کتاب عطا فرمائی ہے وہ اس پر ایمان لائیں گے اور ان میں سے بعض اس پر ایمان لا بھی رہے ہیں۔ اور ہماری آیات کا تو بس وہی انکار کرتے ہیں جو کٹر کافر ہیں۔ اور تم تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ ایسا ہوتا تو یہ جھٹلانے والے مین میکھ نکالتے۔ بلکہ یہ تو کھلی ہوئی آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا ہوا ہے۔ اور ہماری آیات کا بس وہی لوگ انکار کر رہے ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ ۴۷-۴۹

اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی جانب سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں! کہہ دو، نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ کیا ان کے لیے یہ چیز کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب اتاری وہ ان کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔ بے شک اس کے اندر رحمت اور یاددہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ کہہ دو کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اللہ کا جنھوں نے انکار کیا وہی لوگ اصلی نامراد ہیں۔ ۵۰-۵۲

اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں اور اگر اس کے لیے ایک مدت مقرر نہ ہوتی تو ان پر عذاب آ دھمکتا۔ اور وہ ان کے اوپر اچانک آ جائے گا اور ان کو

اس کی خبر بھی نہ ہوگی۔ اور وہ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ جہنم کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس دن کو یاد کریں جس دن عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے ان کو ڈھانک لے گا اور ارشاد ہوگا کہ اب چکھو اس چیز کا مزا جو تم کرتے رہے ہو۔ ۵۴-۵۵

اے میرے بندو، جو ایمان لائے ہو، بے شک میری زمین بڑی کشادہ ہے تو بس میری ہی بندگی کرو۔ ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ہم ان کو جنت کے بالاخانوں میں متمکن کریں گے، اس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ کیا ہی خوب صلہ ہے کارگزاروں کا، جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر ہر حال میں انھوں نے بھروسہ رکھا اور کتنے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی ان کو بھی رزق دیتا ہے اور تم کو بھی۔ اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۵۶-۶۰

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور کس نے مسخر کیا ہے سورج اور چاند کو؟ تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ تو وہ کہاں اوندھے ہو جاتے ہیں! اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان سے کس نے پانی اتارا، پس اس سے زمین کو زندہ کیا، اس کے مردہ ہو چکنے کے بعد، تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ کہو، شکر کا سزاوار اللہ ہے۔ بلکہ ان کے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۶۱-۶۳

اور یہ دنیا کی زندگی تو بس لہو و لعب ہے۔ اور دارِ آخرت ہی ہے جو اصل زندگی کی جگہ

ہے اگر وہ اس کو جانتے! ۶۴

پس جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اللہ کو پکارتے ہیں اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔ پس جب ان کو خشکی کی طرف نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ اس کے شریک ٹھہرانے لگتے ہیں کہ ہم نے جو نعمت بخشی اس کی ناشکری کریں اور چند دن اور بہرہ مند ہولیں۔ پس وہ عنقریب جانیں گے۔ ۶۵-۶۶

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے ایک مامون حرم بنایا اور حال یہ ہے کہ لوگ ان کے گرد و پیش سے اُچک لیے جاتے ہیں! تو کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں! اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جب کہ وہ اس کے پاس آچکا ہے! کیا ایسے کافروں کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہوگا! ۶۷-۶۸

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے اور بے شک اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے! ۶۹

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۴۱)

شرک اور اہلِ شرک کی تمثیل

اوپر کے بیان کردہ تاریخی حقائق سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہیں بن سکتا۔ مشرکین نے خدا کے سوا جو سہارے ڈھونڈھے تھے وہ سب جھوٹے ثابت ہوئے۔ اور یہ جس طرح اس دنیا میں جھوٹے ثابت ہوئے اسی طرح آخرت میں بھی جھوٹے ثابت ہوں گے۔ خدا کا قانون مجازات اور اس کا بے لاگ عدل لازماً ظہور میں آکے رہے گا اور جو لوگ اپنے فرضی دیوتاؤں کی سفارش پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جس سہارے کو انھوں نے قلعہ کی دیوار سمجھا اس کی حقیقت

مکڑی کے جالے سے زیادہ نہیں تھی۔ اسی حقیقت کو یہاں تمثیل کی صورت میں سمجھایا ہے کہ اللہ کے سوا دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے والوں کی مثال مکڑی کی ہے جو اپنے بنے ہوئے جالے کو اپنے زعم میں بڑی چیز سمجھتی ہے لیکن سب سے زیادہ بے ثبات اور بودا گھر مکڑی ہی کا ہوتا ہے جو ہوا کے ایک جھونکے کی بھی تاب نہیں لا سکتا۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ یعنی اصل حقیقت تو یہ ہے جو ظاہر کر دی گئی ہے لیکن اس کا فائدہ تو جب ہے کہ یہ لوگ سمجھیں لیکن ان نادانوں میں اس حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت کہاں!

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۲)

یعنی کوئی یہ نہ خیال کرے کہ مشرکین کے دیویوں دیوتاؤں کی یہ تمثیل ان کی مبالغہ آمیز تحقیر ہے۔ یہ تحقیر نہیں بلکہ اصل حقیقت کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دیویوں دیوتاؤں کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے۔ "اچھی طرح واقف ہے" کے اسلوب بیان میں جو طنز و تحقیر مضمر ہے وہ اصحاب ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی معروف ہے۔

شرک کی نفی خدا کی صفات سے — وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ یعنی یہ دیوی دیوتا اس خدا کے مقابل میں اپنے پجاریوں کے کیا کام آ سکیں گے جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔ عزیز یعنی سب پر غالب اور سب کی رسائی سے بالاتر۔ حکیم یعنی جس کا ہر کام عدل و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدا عزیز ہے تو کوئی دوسرا، خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی اونچا ہو اس کو اپنے زور و اثر سے دبا نہیں سکتا اور جب وہ حکیم بھی ہے تو کوئی اس کے قانون مجازات و عدل کو باطل نہیں کر سکتا۔ تو جب یہ دیوی دیوتا نہ اس کو دبا سکتے اور نہ اس کے عدل پر سر مو اثر انداز ہو سکتے تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ نادان لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کے متعلق یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ خدا کے ہاں بڑا زور و اثر رکھنے والے ہیں اس وجہ سے یہ اپنی پرستش کرنے والوں کو، خواہ ان کے اعمال کچھ بھی ہوں گے خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ یہ عقیدہ خدا کے عزیز و حکیم ہونے کی نفی کرتا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ان دونوں صفتوں کی یاد دہانی کر کے اس بیہودہ عقیدہ کی نفی کر دی۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (۴۳)

قرآن کی اصطلاح میں اصل علم کون ہیں؟ — 'امثال' سے اشارہ ان تمام امثال و واقعات کی طرف ہے جو اوپر مذکور ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ یہ مثالیں ہم جو بیان کر رہے ہیں اس سے مقصود داستان سرائی نہیں ہے۔ ہم یہ اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ لوگ ان پر غور کریں اور خود اپنی زندگیوں کے لیے ان سے سبق حاصل کریں۔ کوئی مثال جب کسی کے سامنے رکھی جاتی ہے تو اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر اس کو خود اس کا ماضی و مستقبل دکھا دیا جائے۔ لیکن دوسروں کی مثال سے خود اپنے لیے سبق حاصل کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جن کے اندر عقل و علم کی روشنی موجود ہو۔ یہاں 'عالمون' سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی فطری صلاحیتیں

زندہ اور جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ ہر واقعہ سے سبق حاصل کرتے ہیں جس سے درجہ بدرجہ ان کے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ برعکس اس کے جن کے اندر سبق آموزی و عبرت پذیری کی صلاحیت مردہ ہو جاتی ہے وہ اول تو اس طرح کی چیزوں کی طرف دھیان ہی نہیں کرتے اس لیے کہ اس سے ان کی نیند میں خلل پڑتا ہے اور اگر کچھ توجہ کرتے بھی ہیں تو اس میں اپنے لیے کوئی درس تلاش نہیں کرتے بلکہ اس کو محض قصۂ ماضی سمجھتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں اصلی عالم وہ لوگ نہیں ہیں جو اپنے اوپر کتابوں کا بوجھ لادے ہوئے ہیں بلکہ عالم وہ ہیں جو آفاق و انفس کی نشانیوں پر غور کرنے والے اور ان سے صحیح سبق حاصل کرنے والے ہیں۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۴۴)

آسمان و زمین کی شہادت

یعنی آسمانوں اور زمین کے نظام پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ دنیا نہ تو کسی خالق کے بغیر وجود میں آگئی ہے اور نہ یہ مختلف دیوتاؤں کی کوئی بازی گاہ یا رزم گاہ ہے بلکہ یہ ایک علیم و حکیم اور عزیز و مقتدر خالق نے ایک مقصد حق کے ساتھ اس کو وجود بخشا ہے اور یہ اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ ایک دن آئے گا جب یہ مقصد حق سب کے سامنے آجائے گا۔ اس دن اس کے خالق کا کامل عدل ظاہر ہوگا اور باطل بالکل نابود ہو جائے گا۔ جو لوگ اس دنیا کو ایک بازی گاہ سمجھ کر زندگی بطالت میں گزار رہے ہیں وہ اپنی اس بے فکری کے انجام سے دوچار ہوں گے اور جو لوگ آنکھیں کھول کر زندگی بسر کریں گے وہ خالق کی ابدی خوشنودی کے حق دار ٹھہریں گے۔ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا، الاٰیۃ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ' 'اٰيَةً' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے یعنی اس میں اہل ایمان کے لیے بہت بڑی نشانی ہے۔ اس نشانی کے مختلف پہلو مختلف مقامات میں واضح کیے جا چکے ہیں اس وجہ سے یہاں ہم صرف اجمالی اشارات پر اکتفا کریں گے۔

اس میں سب سے بڑی نشانی تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک روز جزا و سزا کے ظہور کی ہے۔ یہ دنیا اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ اس کا خالق حکیم ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں اس کا کامل عدل و حق ظاہر ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا محض کسی کھلنڈرے کا ایک کھیل ہے اور یہ بات اس عظیم خالق کی شان کے بالکل منافی ہے جس کی قدرت، حکمت اور رحمت اس دنیا کے ہر گوشے سے نمایاں ہے۔

دوسری نشانی اس میں اس بات کی ہے کہ اس دنیا میں انجام کے اعتبار سے کامیاب زندگی وہی ہے

جو آخرت کو نصب العین بنا کر گزاری جائے اس لیے کہ ابدی کامیابی اور ابدی ناکامی کا فیصلہ وہیں ہونا ہے۔ یہ دنیا آخرت کے بغیر نا تمام ہے۔ اس کی تکمیل آخرت میں ہوگی جب کہ اس کی پیدائش کا اصل مقصد ظہور میں آئے گا۔ یہ چیز اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر چیز کے خیر و شر کا فیصلہ اس کے اخروی نتائج کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔ ہو سکتا ہے بلکہ ہمیشہ ہوا ہے کہ حق کی راہ میں اہل حق کو نہایت زہرہ گداز مصائب سے سابقہ پیش آیا ہے لیکن ان مصائب سے گھبرا کر حق سے انحراف جائز نہیں ہے اس لیے کہ یہ مصائب اپنے نتائج کے لحاظ سے نہایت خوش آئند ہیں۔

تیسری نشانی اس میں اس بات کی ہے کہ شرک و شفاعت کا نظریہ بالکل باطل ہے اس لیے کہ یہ نظریہ اس کائنات کے 'بالحق' ہونے کی بالکل نفی کر دیتا ہے۔ اگر اس کائنات میں ایسے شرکاء و شفعاء کا وجود مان لیا جائے جو اپنے زور یا اثر سے کسی حق کو باطل یا باطل کو حق بنا سکتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ کائنات 'بالحق' نہیں ہے بلکہ ایک اندھیر نگری ہے۔

اس ٹکڑے کی مزید وضاحت آگے سورۂ روم کی آیت ۸ کے تحت آئے گی۔ یہاں ان اشارات پر اکتفا فرمائیے۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (۴۵)

پیغمبر صلعم اور مسلمانوں کو تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ تم یہ قرآن لوگوں کو سناؤ اور اسی کے ذریعے سے لوگوں کو دعوت دو۔ اگر مخالفین ان نشانیوں اور دلائل کی طرف توجہ نہیں کرتے جن کی طرف قرآن ان کو توجہ دلا رہا ہے بلکہ معجزے یا عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو ان کے ان مطالبات کی کوئی پروا نہ کرو۔ قرآن ان کے لیے ایک عظیم رحمت ہے۔ اگر وہ اس کی قدر نہیں کریں گے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے۔

'وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ' یعنی اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے نماز کا اہتمام کرو۔ اس خاص مرحلے میں نماز کے اہتمام کی یہ تاکید، قرینہ دلیل ہے کہ عام نماز کے ساتھ اس خاص نماز کے لیے ہے جس کی ہدایت صبر و استقامت کے حصول کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو فرمائی گئی تھی اور جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکا ہے۔

دعوت اور جماعتی تربیت کے لیے دو باتوں کی ہدایت

یہاں دو باتوں کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ ایک تلاوتِ وحی کی، دوسری اہتمام نماز کی۔ پہلی چیز کا تعلق عام تبلیغ و دعوت سے ہے اور دوسری چیز کا تعلق مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی تربیت و اصلاح سے۔ آیت کے اسلوب سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین فرمائی جا رہی ہے کہ جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے ان کے نت نئے مطالبات کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جو وحی تم پر کی جا رہی ہے وہ لوگوں کو پہنچا دو، وہ اس کی قدر کریں یا نہ کریں۔ تمھارے اوپر اصل ذمہ داری اس وحی کو

پہنچا دینے کی ہے۔ اس سے آگے تمہارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ رہے وہ لوگ جو تمہاری دعوت قبول کر چکے ہیں قرآن کی تربیت کے لیے نماز کا اہتمام کرو۔ یہی چیز ان کو ان مفاسد سے پاک کرے گی جو پچھلی قوموں کی تباہی کا باعث ہوئے اور اسی سے ان کے اندر وہ قوت و ہمت پیدا ہو گی جو مشکلات و مصائب کے علی الرغم ان کو ایک صالح معاشرہ کی ذمہ داریاں اٹھانے کا اہل بنائے گی۔

نماز کے دو اہم پہلو

یہاں اس نماز کے دو اثرات بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ (اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ) اور دوسرا یہ کہ نماز اللہ کی یاد ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے (وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ) نماز کے یہ دونوں پہلو کسی قدر وضاحت کے محتاج ہیں۔

'فحشاء' اور 'منکر' کے دو لفظوں نے اخلاقی مفاسد کے تمام پہلو اپنے اندر سمیٹ لیے ہیں۔ بہت سی برائیاں ایسی ہیں جو شہوانی جذبات کی بے اعتدالی یا ان کے انحراف سے وجود میں آتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ پورے معاشرے کو اس طرح بے حیا بنا دیتی ہیں کہ لوگوں کے اندر سے بے حیائی کا احساس ہی مٹ جاتا ہے۔ ماضی کی قوموں میں سے اس کی مثال کے طور پر قرآن نے قوم لوط کا ذکر کیا ہے۔ حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کی بے حیائی کے لیے 'فاحشۃ' کا لفظ استعمال بھی فرمایا ہے۔ اس زمانے میں جدید فکر و فلسفہ اور نئی تہذیب کی برکت سے بے حیائی و فحاشی کی جو نت نئی شکلیں وجود میں آئی ہیں اور برابر آ رہی ہیں ان کے مقابل میں قوم لوط کی بے حیائی بالکل گرد ہو کے رہ گئی ہے اور جن لوگوں کی نظر حالات پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اب ہمارا معاشرہ بھی پوری طرح ان کے لپیٹ میں آ چکا ہے اور آہستہ آہستہ لوگوں کا ضمیر اس طرح مردہ ہوتا جا رہا ہے کہ ہماری قوم کا بہت بڑا طبقہ، جو ہماری بدقسمتی سے تعلیم یافتہ بھی کہلاتا ہے، ان بے حیائیوں کو بے حیائی سمجھنا تو درکنار ان کو تہذیب و ترقی کا لازمہ سمجھنے لگا ہے اور جو لوگ ان پر تنقید کرتے ہیں ان کو احمق اور دقیانوسی قرار دیتا ہے۔

دوسری برائیاں وہ ہیں جو طمع و حرص کی بے اعتدالی اور حب مال و جاہ کی زیادتی سے ظہور میں آتی ہیں۔ ان کے لیے یہاں جامع لفظ 'مُنْکَر' استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ معروف کا ضد ہے اس وجہ سے وہ تمام برائیاں اس میں شامل ہیں جو ایک صالح معاشرہ کی پاکیزہ روایات اور اس کے معروف مسلّمات کے خلاف ہوں۔ پچھلی قوموں میں سے قوم عاد و ثمود کے تمدنی مفاسد اور قوم شعیب کے معاشی فساد کا ذکر قرآن نے اس کی مثال کے طور پر کیا ہے اور اس زمانے میں معاشرت و معیشت کا یہ فساد زندگی کے ہر شعبہ پر جس طرح چھا چکا ہے اس کے متعلق یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ ماضی کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔

یہاں معروف و منکر سے متعلق ان اشارات پر قناعت فرمائیے۔ آگے سورۂ روم کی آیات ۳۱ - ۴۰ اور سورۂ لقمان کی آیت ۱۷ کے تحت اس پر مفصل بحث ان شاء اللہ آئے گی۔

فرمایا کہ نماز ان تمام برائیوں سے روکتی ہے۔ روکتی ہے، یعنی نماز کی حیثیت ایک نہایت مؤثر واعظ و زاجر کی ہے۔ جو لوگ نماز اس کے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کرتے ہیں، خواہ خلوت کی نماز ہو یا جلوت کی، ان کی نماز اپنے ظاہر و باطن دونوں سے، ان کو ان حقائق کی یاددہانی کرتی رہتی ہے جن کی یاددہانی زندگی کو صحیح شاہراہ پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ خاص طور پر خلوت کی نمازیں انسان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کی مثال اس ڈرائیور کی ہے جو اپنی زندگی کی گاڑی پوری رفتار سے چلا تو رہا ہے لیکن اس کی رہنمائی کے لیے داہنے بائیں جو نشانات اس کو صحیح راہ بتانے اور خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے لگے ہوئے ہیں ان سے وہ بالکل بے پروا اور بے خبر ہے۔ ایسا ڈرائیور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی گاڑی کس کھڈ میں گرائے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ اثرات اس نماز کے بیان ہو رہے ہیں جو صحیح تذکر اور اخلاص کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ اگر کسی نماز کے اندر یہ اثرات مفقود ہوں تو لازماً وہ یا تو صحیح تذکر سے خالی ہے یا اخلاص سے۔ یعنی یا تو نماز پڑھنے والا اپنی نماز کے معنی مفہوم سے بالکل بے خبر ہے، اس کو کچھ معلوم نہیں کہ نماز میں اس نے کس چیز کا اقرار اور کس بات کا انکار کیا ہے یا یہ کہ اس نے محض دوسروں کو دکھانے کے لیے ریاکاری (ایکٹنگ) کی ہے۔

'وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ'۔ یہ نماز کے دوسرے پہلو کی طرف اشارہ ہے اور دو لفظوں کے اندر معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نازک موقع پر جماعت کے اندر عزم و حوصلہ اور قوت و استقامت پیدا کرنے کے لیے نماز کے اہتمام کی جو تاکید کی جا رہی ہے اس کو کوئی معمولی بات یا محض طفل تسلی نہ تصور کرے۔ اس سوئے ظن میں نہ مبتلا ہو کہ بھلا نماز جماعت کی تنظیم و تقویت میں کیا مؤثر ہو سکتی ہے! حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ اسی سے انسان کے دل کو حقیقی طمانیت و سکینت حاصل ہوتی ہے۔ 'اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ' (اچھی طرح سن لو کہ دلوں کو طمانیت اللہ کی یاد سے حاصل ہوتی ہے) اور دل ہی انسان کے اندر وہ چیز ہے جو تمام عزم و حوصلہ کا منبع ہے۔ اگر دل مضبوط ہے تو انسان سے زیادہ طاقت ور کوئی چیز نہیں اور اگر دل کمزور ہے تو انسان سے زیادہ ناتواں کوئی شے نہیں اور دل کو قوت دینے والی اصلی چیز خدا کی یاد ہے جس کی سب سے زیادہ بہتر جامع اور مؤثر شکل نماز ہے۔

شجاعت اور تہور میں فرق

یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث دل کی وہ طمانیت و سکینت ہے جو انسان کے اندر وہ عزم و حوصلہ پیدا کرتی ہے کہ جو اس کو خدا کے سوا ہر خوف اور ہر طمع سے بے پروا کر دیتی ہے۔ یہی وہ اصلی قوت اور حقیقی شجاعت و بسالت ہے جو ایمان اور خدا کی یاد سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ شجاعت اس تہور سے بالکل مختلف چیز ہے جو مایوسی یا جذبۂ انتقام، یا خوف یا ناموری کی خواہش یا ناعاقبت اندیشی

سے ظہور میں آتا ہے۔ جو لوگ شجاعت اور تہور کے اس فرق سے واقف نہیں ہیں وہ ایک مومن کی شجاعت اور ایک کافر کے تہور کو ایک ہی نوعیت کی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ دونوں کے نفسیاتی محرکات بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور اس دنیا میں دونوں کے اثرات بھی دو بالکل مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک کا منبع ایمان اور اللہ کی یاد ہے اور دوسرے کا منبع ان نفسیاتی محرکات میں سے کوئی محرک ہوتا ہے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ اس وجہ سے ایک کی شجاعت سے دنیا میں اس طرح کی برکت و رحمت ظہور میں آتی ہے جس طرح کی رحمت و برکت حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ کی شجاعت سے ظہور میں آئی اور دوسرے کے تہور سے اس قسم کا شر و فساد ظہور میں آتا ہے جس قسم کا شر و فساد ہٹلر اور مسولینی اور اس قبیل کے دوسرے متہورین کے ہاتھوں ظہور میں آیا۔

مسلمانوں کو تسلی

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ: یہ مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اپنی تربیت اور دوسروں کی اصلاح کے لیے جو جد و جہد بھی تم کر رہے ہو یا کرو گے اللہ اس سے اچھی طرح واقف ہے تو جب وہ واقف ہے تو اس پر پورا بھروسہ رکھو کہ وہ تمہاری کوئی محنت خواہ وہ شب کی خلوتوں میں ہو یا دن کی جلوتوں میں، ضائع نہیں جانے دے گا بلکہ تم اپنی ہر کوشش کا بھرپور صلہ پاؤ گے۔

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ اوپر کے ٹکڑے میں خطاب بصیغۂ واحد ہے اور اس ٹکڑے میں جمع کا صیغہ آگیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اوپر کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے ہے۔ علاوہ خطاب بھی تمام امت سے ہے اس لیے کہ دعوت اور تربیت کی ذمہ داری جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھی اسی طرح دوسرے مسلمانوں پر بھی تھی لیکن واحد کے خطاب سے یہ بات نکلتی ہے کہ پیغمبر کو تو یہ فرض بہرحال ادا کرنا ہے، خواہ دوسرے اس کو ادا کریں یا نہ کریں۔ وہ ادا کریں گے تو اپنی ایک ایک محنت کا اجر پائیں گے اور اگر نہیں کریں گے تو خدا اور اس کے رسول کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ اپنی ہی محرومی کا سامان کریں گے۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۴۶)

پڑھے لکھے حریفوں سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو ہدایت

دعوت کے اس دور میں، جو اس سورہ میں زیر بحث ہے، اہل کتاب بھی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اس وجہ سے جس طرح اوپر والی آیت میں ان لوگوں کے باب میں دعوت کا طریقہ واضح کر دیا گیا جو قرآن کی صداقت تسلیم کرنے کے لیے معجزات کے طالب تھے اسی طرح یہاں چند آیات میں اس طریقہ کی وضاحت فرما دی گئی جو اہل کتاب کے ساتھ بحث و استدلال میں مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اہل کتاب کی اس خصوصیت کی وجہ آگے کی آیات سے خود واضح ہو جائے گی کہ ان کی دینی حیثیت بھی مشرکین عرب سے بالکل مختلف تھی اور ان کے شبہات و اعتراضات بھی ذرا مختلف نوعیت کے تھے۔ یہ پڑھے لکھے

جنات تھے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ ان سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو ضروری ہدایات پہلے سے دے دی جائیں۔

فرمایا کہ اہل کتاب سے بحث و استدلال کی نوبت آئے تو ان سے صرف احسن طریقہ سے بحث و استدلال کرو۔ مجادلہ تو یہاں اچھے معنوں یعنی بحث و استدلال اور حجت کے مفہوم میں ہے۔ اور طریقۂ احسن کی وضاحت اسی آیت کے آگے والے ٹکڑے میں آگئی ہے کہ تمہارے اور ان کے درمیان دین کے جو مشترک اقدار ہیں ان کو بنیاد قرار دے کر ان سے مطالبہ کرو کہ وہ بھی ان مشترک اقدار اور ان کے لوازم کو تسلیم کریں اور اپنی مانی ہوئی باتوں کی خود اپنے منہ سے تردید نہ کریں۔ اس طریقۂ بحث سے ان کی انانیت کو ٹھیس نہیں لگے گی۔ ان میں جو سلیم الطبع ہوں گے وہ تمہاری باتوں پر غور کریں گے اور کیا عجب کہ ان میں سے کچھ ایسے نفوس بھی نکل آئیں جو حق کو قبول کرلیں۔

'اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ'۔ عام طور پر لوگوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اہل کتاب میں سے جو شریر اور مناظرہ باز ہیں ان کے ساتھ طریق احسن کی پابندی ضروری نہیں ہے، ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے لیکن میرے نزدیک یہ استثنائے منقطع ہے اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رہے وہ جو ان میں سے شریر اور مناظرہ باز ہیں تو ان کو سرے سے منہ ہی نہ لگاؤ۔ قرآن کے نظائر سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضدی اور کج فہم مناظرہ بازوں اور کٹ حجتی کرنے والوں سے اعراض کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ سورۂ کہف میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ جو ہٹ دھرم بات سمجھنی نہیں چاہتے ان سے اول تو تعرض ہی نہ کرو اور اگر کبھی بحث کی نوبت آہی جائے تو بات ٹالنے (مراء ظاہر) کے انداز میں گفتگو کرو۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اور صالحین کا طریقۂ بحث و دعوت ہمیشہ یہی رہا ہے اور یہی طریقہ خیر و برکت کا طریقہ ہے۔ شریروں اور کج فہموں کے جواب میں انھیں کی سی روش اختیار کرلینا اور الزام کا جواب الزام اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا نہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے اور نہ اس میں کوئی خیر و برکت ہے۔

احسن طریقۂ بحث کی وضاحت

'وَقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَاُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ وَاِلٰـهُنَا وَاِلٰـهُکُمۡ وَاحِدٌ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ'۔ یہ اس احسن طریقۂ بحث و دعوت کی وضاحت ہے کہ تمہارے اور ان کے درمیان قدر مشترک موجود ہے اس وجہ سے اس قدر مشترک کو بنیاد بنا کر ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دو۔ ان سے کہو کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتری ہے اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتری ہے۔ ہم جس کتاب پر ایمان لائے ہیں وہ تمہاری کتابوں کی مکذب نہیں بلکہ ان کی مصدق ہے۔ تمہاری کتابوں میں آخری نبی اور کتاب کامل سے متعلق جو پیشین گوئیاں تھیں وہ اپنے مصداق کے ظہور کی منتظر تھیں اس کتاب سے وہ مصداق ظہور میں آگیا تو ہم تمام اگلے انبیاء اور صحیفوں پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ اگر تم بھی صحیح روش

اختیار کرو تو تمہیں اس رسول اور اس کتاب سے چڑھنے کے بجائے ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے جن کے ظہور سے سب سے زیادہ تمہارا اسرار دستیجا ہوا ہے اس لیے کہ ان کی بشارت اپنے صحیفوں کے واسطے سے تمہی نے دنیا کو سنائی تھی۔ اب اگر ضد میں آکر تم نے انکار کیا تو تم خود اپنے کو اور اپنے صحیفوں کو جھٹلاؤ گے در آنحالیکہ ہم تمہارے صحیفوں کی تصدیق و تائید کر رہے ہیں۔

اسی طرح ان کو کامل توحید کی بھی دعوت دو اور ان سے کہو کہ ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ اس مسئلہ میں ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی اصولی نزاع نہیں ہے۔ تورات و انجیل اور دوسرے تمام صحائف توحید کی تعلیم سے معمور ہیں۔ بس ہم میں اور تم میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ جو باتیں اس مسلّم حقیقت کے خلاف ہیں ہم نے ان کو چھوڑ کر اپنے آپ کو اپنے ایک ہی رب کے حوالہ کر دیا ہے۔ اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم توحید کے بھی مدعی ہو اور ساتھ ہی تم نے اپنے اندر ایسی باتیں بھی جمع کر رکھی ہیں جو اس عقیدے سے صریحاً متناقض ہیں تو ہماری دعوت تمہارے لیے یہ ہے کہ جس طرح ہم نے اپنے آپ کو کلیتہً اپنے ایک ہی رب کے حوالہ کر دیا ہے اسی طرح تم بھی اپنا یہ تناقض دور کر کے مسلم بن جاؤ۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ (۴۷)

قرآن کا دعویٰ

'وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ' یعنی دعوت کے اسی اصول پر جس کی طرف اوپر کی آیت میں اشارہ ہے ہم نے تم پر یہ کتاب اتاری ہے۔ یہ کتاب اس بات کی مدعی نہیں ہے کہ سب سے پہلے یہ باتیں اسی کتاب میں نازل ہوئیں بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نبیوں اور رسولوں نے اسی دین کی دعوت دی ہے جس کی دعوت یہ کتاب دے رہی ہے لیکن پچھلی امتوں نے یا تو اللہ کی اتاری ہوئی تعلیمات بھلا دیں یا ان میں اپنی خواہشِ نفس کے مطابق تبدیلیاں کر دیں اس طرح اللہ کا دین بالکل مسخ و محرف ہو گیا تھا۔ اب اللہ نے اپنے دین کو بالکل صحیح اور مکمل صورت میں اس کتاب اور اس رسول کے ذریعہ سے پھر دنیا میں اتارا ہے تاکہ خلق اللہ کی ہدایت سے محروم نہ رہے۔

صالحین اہلِ کتاب کے ایمان کی بشارت

'فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ' ہم پیچھے جگہ جگہ یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قرآن نے جہاں جہاں اہلِ کتاب کا ذکر معروف کے صیغے سے کیا ہے، جیسا کہ یہاں ہے، بالعموم اچھے معنوں میں کیا ہے اس وجہ سے 'اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ' سے یہاں مراد عام اہلِ کتاب نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر کے وہ لوگ ہیں جو اپنے علم کے حد تک تورات و انجیل پر قائم تھے۔ ان لوگوں کے بابت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ اگر ان کے آگے تم اس کتاب کو اس طرح پیش کرو گے جس طرح تمہیں ہدایت کی جا رہی ہے تو یہ صالحین اس کتاب پر ایمان لائیں گے۔

'وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ' یہاں 'يُؤْمِنُ بِهٖ' حال کے مفہوم میں ہے۔ فرمایا کہ اسی گروہ

کے کچھ لوگ ہیں جن کو تم دیکھ رہے ہو کہ وہ ایمان لا بھی رہے ہیں۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی جن کے اندر صلاحیت باقی ہے آہستہ آہستہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے۔

'وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ' یعنی ہماری آیات (قرآن) کا انکار تو ان اہل کتاب میں سے صرف وہی کریں گے جو کٹے کافر ہیں یعنی جن کا ایمان نہ اپنی کتابوں اور اپنے نبیوں اور رسولوں پر ہے اور نہ وہ آئندہ کسی چیز پر ایمان لانے کے لیے تیار ہیں۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (۴۸)

آنحضرت صلعم کی رسالت کی ایک دلیل

یہ اہل کتاب کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر وہ ضد اور انانیت سے کام نہ لیں تو تمہاری رسالت کی یہ دلیل ان کے لیے کافی ہے کہ ایک شخص جس نے نہ آسمانی صحیفوں میں سے کوئی صحیفہ پڑھا اور نہ جو لکھنے کے فن سے واقف ہے آخر اس کے اوپر یہ تمام علوم کہاں سے برس پڑے کہ اس نے نہ صرف تمام نبیوں کی تعلیم کو از سر نو زندہ کر دیا بلکہ جو کسر انھوں نے چھوڑی تھی وہ بھی اس نے پوری کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی یہ دلیل یوں تو سب پر حجت ہے لیکن اہل کتاب پر یہ خاص طور پر حجت ہے اس لیے کہ وہ انبیاء سابقین کی تمام شریعت و حکمت کے وارث تھے۔ انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ حضرت نوحؑ و حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ و حضرت مسیحؑ تک کے سارے خزائن حکمت ایک اُمّی پر کس طرح نازل ہو گئے۔

'اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ' یعنی اگر تم پڑھے لکھے ہوتے تب تو یہ جھٹلانے والے لوگ کوئی نہ کوئی لایعنی بات شک پیدا کرنے والی بنا سکتے تھے۔ بصورت موجودہ ان کے لیے کوئی بات بنانے کا موقع تو ہے نہیں لیکن اب بھی اگر وہ شکوک پیدا کرتے ہیں تو ان کی شامت ہی ہے۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ (۴۹)

سچے اہل کتاب کے لیے قرآن ان کے دل کی آواز ہے

یعنی اہل کتاب میں سے جن کے اندر دین کا صحیح علم ہے ان کے سینوں میں تو یہ قرآن نہایت واضح اور روشن آیات کی شکل میں موجود ہے۔ وہ اس کی ہر بات کو اپنے ہی دل کی بات سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایک جانی پہچانی ہوئی اور ایک موعود و منتظر چیز ہے۔ وہ اپنے نبیوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس کے لیے سراپا انتظار تھے۔ اور اب اس کو پا کر سمجھتے ہیں کہ گویا ان کو اپنی مطلوب و محبوب چیز مل گئی۔ قرآن مجید میں سچے اہل کتاب کے جذبات، قرآن اور آخری رسول سے متعلق نہایت واضح الفاظ میں نقل ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح آخری بعثت کے لیے چشم براہ تھے اور کس والہانہ جذبہ کے ساتھ انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس آیت میں بھی اجمال کے ساتھ اسی حقیقت کی

طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

'وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ' میں وہی حقیقت دوسرے الفاظ میں واضح فرمائی گئی ہے جو اوپر آیت ۴۷ میں بیان ہو چکی ہے۔ یعنی قرآن کی ان آیات کا انکار تو وہی کرتے ہیں جنھوں نے اللہ کے عطا کردہ علم کی ناقدری کر کے اپنے سینوں اور دلوں کو تاریک کر لیا ہے اور اس طرح خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے ہیں۔ یہاں 'ظّٰلِمُوْنَ' سے وہی بدبخت لوگ مراد ہیں جن کا ذکر اوپر آیت ۴۶ میں 'اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' کے الفاظ سے ہوا ہے اور جن کے باب میں مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ ان سے کوئی امید نہ رکھی جائے۔ وہ بالکل ناقابلِ علاج ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۵۰)

اہل کتاب کے سکھائے ہوئے ایک اعتراض کا جواب

یہ اہل کتاب کا ایک اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے لیکن جواب کا انداز نہایت بے پروائی کا ہے، یہاں تک کہ ان کو مخاطب کرنا بھی پسند نہیں فرمایا ہے بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپ کے واسطہ سے ان کو بات پہنچا دی ہے۔ اہل کتاب کا عام اعتراض نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اول اول یہی رہا ہے کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو ان کو اس طرح کے معجزے کیوں نہیں عطا ہوئے جس طرح کے معجزے ہمارے نبیوں، خاص طور پر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو عطا ہوئے۔ یہ اعتراض وہ قریش کو اکسانے کے لیے اٹھاتے تھے۔ قریش کے لیڈر ان سے سوال کرتے کہ آپ لوگ نبوت و رسالت کے لوازم و خصوصیات سے خوب واقف ہیں تو ان نئے مدعیٔ نبوت کے بارے میں آپ لوگوں کی رائے کیا ہے؟ اس کے جواب میں وہ نہایت معصومانہ انداز میں یہ کہہ دیتے کہ ہم اور کچھ تو کہہ نہیں سکتے لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو آخر ان پر بھی اس طرح کے معجزے کیوں نہیں اتارے گئے جس طرح کے معجزے سابق نبیوں پر اتارے گئے! اہل کتاب کے اس اعتراض سے چونکہ قریش کو ایک بہت بڑی تائید حاصل ہو جاتی اس وجہ سے وہ اس کو خوب پھیلاتے اور عوام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرتے۔ قرآن نے یہاں اہل کتاب کے القا کردہ اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور جواب میں اہل کتاب سے زیادہ قریش کو سامنے رکھا ہے اس لیے کہ اس قسم کے اعتراضات سے سب سے زیادہ نقصان انہی کو پہنچا کہ وہ اپنے حاسدوں کے حسد کے شکار ہو کر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی رحمت سے محروم ہو جائے۔

'قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' یہ اس اعتراض کا پہلا جواب ہے کہ نشانیوں اور معجزات کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، میں اس معاملے میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔ وہ اگر چاہے گا تو کوئی نشانی دکھا دے گا اور نہیں چاہے گا تو نہیں دکھائے گا۔ میں تو صرف ایک نذیر مبین ہوں، مجھے حکم ہے کہ تمہیں آنے والے خطرات سے اچھی طرح آگاہ کر دوں سو یہ فرض میں ادا کر رہا ہوں۔ باقی تمام

امور اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ میں نے رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، خدائی کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ تمہاری طلب کے مطابق معجزے دکھا دوں۔

اَوَلَمۡ یَکۡفِہِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَرَحۡمَۃً وَّ ذِکۡرٰی لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (۵۱)

یہ دوسرا جواب ہے اور نہایت جامع ہے۔ فرمایا کہ کیا ان کے لیے تمہاری نبوت و رسالت کی یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر ایک کتاب اتاری ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ایک پوری کتاب ان کو سنائی جا رہی ہے جو اپنے دعوے پر خود حجت ہے اور اس کا سنانے والا بھی سامنے موجود ہے تو اس عظیم نشانی کے ہوتے کسی اور نشانی کی ضرورت کہاں باقی رہی۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَرَحۡمَۃً وَّ ذِکۡرٰی لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ۔ یعنی یہ تو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہوا ہے کہ کسی حسی معجزے یا کسی نشانیِ عذاب کے بجائے اس نے ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اگر وہ کوئی حسی معجزہ دکھاتا تو وہ بہرحال ایک وقتی چیز ہوتا اور اگر کوئی نشانیٔ عذاب دکھاتا تو وہ ایک آفت ہوتی اور معلوم نہیں وہ کس شکل میں نمودار ہوتی۔ یہ تو اللہ کا بہت بڑا فضل ہوا ہے کہ اس نے ان پر کتاب اتاری جو ان کے واسطے ایک دائمی رحمت اور یاددہانی ہے بشرطیکہ وہ اس کی قدر کریں اور اس پر ایمان لائیں۔ لفظ 'ذِکۡرٰی' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ قرآن درحقیقت انسان کو انہی حقائق کی یاددہانی کرتا ہے جو خود اس کی عقل و فطرت کے اندر موجود ہیں لیکن وہ ان کو بھولا ہوا ہے۔ قرآن کی صداقت ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی نشانی یا معجزے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان قرآن کی رہنمائی میں اپنی فطرت کے خزانوں کا جائزہ لے۔ وہ خود پکار اٹھے گا کہ قرآن جو کچھ بتا رہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔

قُلۡ کَفٰی بِاللّٰہِ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ شَہِیۡدًا ۚ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡبَاطِلِ وَ کَفَرُوۡا بِاللّٰہِ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ (۵۲)

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے یہ شبہات و اعتراضات جو اٹھائے جا رہے ہیں یہ تو محض اوپری باتیں ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے دل گواہی دے رہے ہیں کہ تم اللہ کے رسول ہو اور جو کچھ تم ان کو بتا رہے ہو حرف حرف ٹھیک ہے تو ایسے لوگوں سے زیادہ بحث و حجت کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو اور ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہی کے لیے کافی ہے کہ فی الحقیقت تم پر میری صداقت واضح نہیں ہوئی اس وجہ سے تم نے انکار کیا یا سب کچھ جان بوجھ کر محض اپنی مشیخت کی پاسداری میں تم نے میری تکذیب کی۔ اللہ آسمانوں اور زمین کے ہر بھید سے اچھی طرح واقف ہے، وہ قیامت کے دن سارا راز کھول دے گا۔ البتہ یہ یاد رکھو کہ جو لوگ جان بوجھ کر باطل پر ایمان لائیں گے اور خدا کا انکار کریں گے وہی لوگ آخرت میں اصلی نامراد ہونے والے ہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاۗءَهُمُ الْعَذَابُ ۭ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۵۳)

اوپر جن نشانیوں کے مطالبے کا ذکر ہے ان میں خاص طور پر عذاب کی نشانی کے لیے قریش بہت مستعجل تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن کی تکذیب کی صورت میں ان کو عذاب سے ڈراتے تو اس سے ان کے پندار کو بڑی چوٹ لگتی اور وہ جھنجھلا کر آپ کو زچ کرنے کے لیے یہ مطالبہ کرتے کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو تو جس عذاب کی دھمکی سنا رہے ہو وہ لاؤ، ہم اس کو دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔ فرمایا کہ عذاب کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مدت مقرر ہے۔ اس مدت سے پہلے عذاب نہیں آتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ مقررہ سنت نہ ہوتی تو ان پر عذاب آ دھمکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس معاملے میں اگر ان لوگوں کی اس جلدبازی کے باوجود دیر ہو رہی ہے تو اس دیر کا سبب نہ کسی کا پاس و لحاظ ہے، نہ کسی کی قوت و صولت اور نہ کسی تیاری کی ضرورت، بلکہ خود خدا کا اپنا ٹھہرایا ہوا قانون ہے۔ اس قانون کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قوموں کی تباہی کی مدت ان کے اخلاقی زوال کے پیمانے سے ناپ کر مقرر کی ہے۔ صرف وہی جانتا ہے کہ کب کسی قوم کا پیمانہ لبریز ہوا، کوئی دوسرا اس چیز کو نہیں جانتا۔ فرمایا کہ جب عذاب کا وقت آجائے گا تو وہ اچانک ان پر آ دھمکے گا، وہ اس کے مقابل میں کوئی پیش بندی نہ کر سکیں گے۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵۴-۵۵)

جس عذاب کے لیے وہ جلدی کر رہے ہیں وہ ان کے ساتھ ہے

یہاں ان کے استعجال بالعذاب کو پھر دہرایا ہے۔ بظاہر اس تکرار کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ اعادہ اظہار تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے طنطنہ سے بار بار عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں گویا عذاب ان سے بہت دور ہے، حالانکہ عذاب ان کے اوپر اور ان کے نیچے سے ان کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ خدا کی جہنم کے احاطے میں ہیں۔ یہ جن اعمال کے اندر گھرے ہوئے ہیں یہی اعمال ان کے لیے جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ جس عذاب کے لیے وہ جلدی مچاتے ہوئے ہیں اس کا پورا سامان تو انھوں نے خود فراہم کر رکھا ہے۔ ان کے یہی اعمال ایک دن عذاب بن کر ان کے اوپر اور نیچے سے ان کو ڈھانک لیں گے اور اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ اب لو، اس عذاب کا مزہ چکھو جس کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے ــــ مطلب یہ ہوا کہ جس عذاب کا لبادہ انھوں نے خود اوڑھ رکھا ہے اس کے لیے جلدی مچانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کوئی باہر سے منگانے کی چیز تو نہیں ہے، اس کو تو انھوں نے اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ یہ محض خرد باختگی ہے کہ وہ اس کو دور سمجھ کر اس کے لیے جلد بازی کر رہے ہیں۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ (۵۶)

مظلوم مسلمانوں سے خطاب

یہ ان مظلوم مسلمانوں کو خطاب فرمایا جن کا مسئلہ ابتدائے سورہ سے اس میں زیر بحث ہے۔ انداز خطاب میں بڑی دلنوازی ہے۔ فرمایا کہ اے میرے بندو، جو مجھ پر ایمان لائے ہو، اگر تم پر مکہ کی سرزمین تنگ کر دی گئی ہے تو تم مایوس اور دل شکستہ ہو کر میری بندگی کے عہد سے دست بردار نہ ہونا بلکہ اپنے اس عہد پر جمے رہو۔ اگر یہ سرزمین تمہیں چھوڑنی پڑی تو اطمینان رکھو کہ میری زمین بہت کشادہ ہے، کوئی اور سرزمین تمہارا خیر مقدم کرے گی۔ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ بہرحال تم جمے رہو کہ میرے سوا کسی اور کی بندگی کی ذلت گوارا نہ کرو گے۔ اگر میری خاطر تم اپنے گھروں کو چھوڑو گے تو تمہاری ذمہ داری میرے اوپر ہے اور میرے پاس کسی چیز کی بھی کمی نہیں ہے۔

ہجرت سے متعلق ہدایات

اس آیت سے چند باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آگئیں۔

—— ایک یہ کہ کسی سرزمین سے ہجرت صرف اس وقت ضروری ہوتی ہے جب اس میں آدمی کے دین و ایمان کے لیے فتنہ پیش آجائے۔

—— اگر فتنہ پیش آجائے تو وہ ہر قیمت پر اللہ کی بندگی کے عہد پر قائم رہے، کسی صورت میں بھی غیر اللہ کی بندگی کی ذلت گوارا نہ کرے۔

—— اگر اپنے ایمان کو بچانے کے لیے اپنا گھر در سب کچھ چھوڑنا پڑ جائے تو سب کچھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ رزاق و کفیل ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۵۷)

تسلی و ایک اہم تنبیہ

یہ آیت اگرچہ تہدید و تسلی دونوں کی متحمل ہے لیکن یہاں پیش و عقب کی آیات تسلی کے مفہوم کی تائید میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ زندگی تو چند روزہ ہے۔ بالآخر ایک دن سب کو مرنا اور خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے تو اس حیاتِ چند روزہ کی خاطر آدمی اپنے رب سے کیوں شرمسار ہو! اپنے رب کی خاطر اس دنیا ہی پر کیوں نہ لات مار دے!

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (۵۸)

یعنی خدا کے ہاں کسی کی کوئی سعی رائگاں نہیں جائے گی۔ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی زندگی بسر کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو جنت کے بالا خانوں میں فروکش کرے گا اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس حیاتِ چند روزہ کے ایمان و عمل صالح کے بدلے جب یہ اجر دائمی و ابدی حاصل ہونے والا ہے تو یہ بہت بڑی چیز ہے۔ ہر عاقل کو اسی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے، اس دنیا کے بڑے سے بڑے عیش کی خاطر بھی اس کو قربان نہیں کرنا چاہیے۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۵۹)

'عاملین' کی صفت ہے اور اس سے کلام بالکل مطابق حال ہوگیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ صلہ ہمارے ان کارگزار بندوں کے لیے ہے جو ہر طرح کے حالات میں ہماری بندگی پر ثابت قدم اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے رہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اپنے رب پر یہ بھروسہ ہی ہے جو ہر طرح کے حالات میں بندے کو خدا کی بندگی پر استوار رکھتا ہے۔ اگر یہ بھروسہ نہ ہو تو ہجرت اور جہاد تو درکنار کوئی معمولی آزمائش بھی آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶۰)

خدا کا خوانِ کرم بہت کشادہ ہے

یعنی جس طرح خدا کی زمین بہت کشادہ ہے اسی طرح خدا کا خوانِ کرم بھی بہت کشادہ ہے۔ اگر اللہ کی راہ میں اموال و جائداد سے دست بردار ہونا پڑ جائے تو بے درنگ ہاتھ جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہونا، یہ نہ سوچنا کہ آگے کیا کھائیں گے اور کہاں سے پہنیں گے؟ دیکھتے ہو کہ اس زمین میں کتنے جاندار ہیں جو اپنے ساتھ اپنی روزی باندھے نہیں پھرتے تاہم ان کا رب ان کو ان کا رزق بہم پہنچاتا ہے۔ وہی رب ان کو بھی رزق دیتا ہے وہی تم کو بھی رزق دیتا ہے۔ وہ سمیع و علیم ہے۔ اس وجہ سے ہر ایک کی فریاد سنتا اور ہر ایک کی ضرورت کو جانتا ہے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ تم اس کو پکارو گے اور وہ بے خبر رہے گا یا تم حاجت مند ہو گے اور وہ تمہاری پریشانی سے ناواقف ہوگا۔

یہی حکمت سیدنا مسیحؑ نے اپنے انداز میں یوں واضح فرمائی ہے:

"تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے؟ اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں تو بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے نہ کاتتے ہیں تو بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے ان میں سے کسی مانند ملبّس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو، تم کو کیوں نہ پہنائے گا! اس لیے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے؟ کیونکہ ان سب چیزوں کی تلاش میں غیر قومیں[1] رہتی ہیں اور تمہارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج ہو۔ بلکہ تم پہلے اس کی بادشاہی اور اس کی راست بازی

---

[1] غیر قوموں سے حضرت مسیح علیہ السلام کا فر قوموں کو مراد لیتے ہیں۔ یہ قدیم صحیفوں کی ایک معروف اصطلاح ہے۔

کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تم کو مل جائیں گی۔ پس کل کے لیے فکر نہ کرو کیونکہ کل کا دن اپنے لیے آپ فکر کر لے گا۔ آج کے لیے آج ہی کا دکھ کافی ہے۔" متی باب ۶: ۲۵-۳۴

یہ قرآن کی بلاغت کا اعجاز ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے جو حکمت اتنے فقروں میں واضح فرمائی ہے وہ اس نے ایک ہی آیت میں سمیٹ دی ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۚ فَأَنّٰى يُؤْفَكُونَ (۶۱)

خدا ہی پر بھروسہ کرنے کے دلائل

اوپر کی آیات میں خدا ہی پر بھروسہ کرنے اور اسی کی راہ میں جینے اور مرنے کی جو تعلیم دی گئی ہے، اس آیت میں اور آگے کی آیات میں اسی کے دلائل بیان ہو رہے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور حقدار نہیں ہے کہ اس کی بندگی کی جائے اور اس پر بھروسہ کیا جائے۔ یہ حقیقت ایسی مسلّم ہے کہ اس سے ان لوگوں کو بھی مجالِ انکار نہیں ہے جو خدا کے بہت سے شریک و سہیم بنائے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی پوجا کر رہے ہیں۔ اگر ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا خالق، سورج اور چاند کا مسخر کرنے والا کون ہے تو وہ بھی اس کا یہی جواب دیں گے کہ اللہ! اس واضح حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد پھر وہ معلوم نہیں کہاں بھٹک جاتے ہیں کہ دوسروں کو بھی ماویٰ و مرجع مان کر ان کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ حقیقت اس کتاب میں ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ مشرکینِ عرب اپنی دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کو آسمان و زمین یا سورج و چاند کا خالق نہیں مانتے تھے۔ ان تمام چیزوں کا خالق و مالک وہ اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس وہم میں بھی مبتلا تھے کہ جن ہستیوں کی وہ پوجا کرتے ہیں وہ خدا کی بڑی مقرب ہیں۔ وہ ان کے لیے جو چاہیں خدا سے منوا سکتی اور کرا سکتی ہیں۔ فَأَنّٰى يُؤْفَكُونَ کے الفاظ سے ان کے اسی تضادِ فکر پر اظہارِ تعجب فرمایا ہے کہ جب ہر چیز کا خالق و مالک خدا ہے تو آخر دوسروں کو ماویٰ و مرجع بنانے، ان کی پوجا کرنے اور ان سے استعانت و استرحام کا کیا تُک ہے! یہ تو خود اپنے منہ سے خود اپنے مسلک کی تردید ہے!

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۶۲)

رزق کی کمی بیشی قسمت پر کے تحت ہے

یعنی جب آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے اور سورج اور چاند کو ہماری خدمت میں اسی نے سرگرم کیا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ رزق کے خزانوں کا مالک کوئی اور بن بیٹھے۔ پھر تو وہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور اپنے علم و حکمت کے مطابق رزق کی تقسیم فرماتا ہے۔ نہ کوئی دوسرا اس سے زیادہ علم رکھنے والا ہے کہ اس کو بتائے کہ فلاں کا رزق پہنچا ہے، فلاں کا نہیں پہنچا اور نہ کوئی اس کے بندوں کے احوال و مصالح سے اس سے زیادہ باخبر ہے کہ اس کو یہ بتا دے سکے کہ فلاں کا رزق زیادہ ہونا چاہیے۔ فلاں کا کم۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۶۳)

مشرکین کا تضادِ فکر — اسی طرح اگر ان سے سوال کرو کہ وہ کون ہے جو آسمان سے پانی اتارتا ہے اور اس سے زمین کو، اس کے خشک اور بے آب وگیاہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ و شاداب کر دیتا ہے تو اس سوال کا جواب بھی وہ یہی دیں گے کہ اللہ! ان سے کہو، اگر اس بات کا تم کو اقرار ہے تو پھر تو شکر کا سزاوار بھی اللہ تعالیٰ ہی ہوا تو آخر تم اس کے سوا دوسروں کی عبادت کس حق کی بنا پر کرتے ہو!

مشرکین عرب ابر و ہوا پر بھی حقیقی تصرف اللہ تعالیٰ ہی کا مانتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ رزق وفضل کو دوسروں کی طرف منسوب اور ان کی عبادت کرتے۔ اس طرح وہ ایک شدید قسم کے تضادِ فکر میں مبتلا تھے حالانکہ جب یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہیں تو شکر کا حقدار بھی وہی ہوا اور یہی شکر تمام عبادت و اطاعت کا محرکِ اوّل ہے۔ اس کی وضاحت ہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ، یعنی یہ تضادِ فکر ہے تو نہایت بھونڈے قسم کا لیکن ان کی اکثریت اس پر غور نہیں کرتی۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۶۴)

گمراہی کا اصل سبب — یہ ان کی ساری گمراہی کے اصل سبب کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس دنیائے فانی کی دلفریبیوں نے ان کو اس طرح گرویدہ کر لیا ہے کہ وہ اس کے مفادات سے بالاتر ہو کر کسی چیز کو سوچ ہی نہیں سکتے۔ حالانکہ یہ دنیا جس پر یہ ریجھے ہوئے ہیں اور جس کے عشق نے ان کی عقل اور ان کے دل کی ہر چیز کو ماؤف کر دیا ہے اس کی حقیقت چند روزہ لہو و لعب سے زیادہ کچھ بھی نہیں، اصلی زندگی دارِ آخرت کی زندگی ہے لیکن اس کی طرف سے ان کی آنکھیں بند ہیں۔ دنیا کی زندگی قدر و قیمت رکھنے والی چیز اس صورت میں بنتی ہے جب آخرت کو نصب العین بنا کر گزاری جائے۔ اس صورت میں بے شک انسان اس چند روزہ زندگی کے بدلے میں ابدی بادشاہی حاصل کرتا ہے۔ یہ نصب العین اگر نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو پھر یہ محض چند دن کا کھیل تماشہ ہے اور اس کے بدلے میں انسان ابدی خسران کا وارث بنتا ہے۔ فرمایا کہ اصل حقیقت یہ ہے بشرطیکہ یہ دنیا کے متوالے لوگ اس حقیقت کو جانیں اور سمجھیں۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۙ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۶۵-۶۶)

دنیا کے سرمستوں کی تمثیل — یعنی دنیا کے ان سرمستوں کی مثال کشتی کے مسافروں کی ہے۔ جب کشتی سازگار ہوا کے ساتھ رواں دواں ہوتی ہے تو یہ اس میں اس طرح مگن ہوتے ہیں گویا ابر و ہوا سب انہی کے تابع فرمان ہیں لیکن جونہی کشتی کسی طوفانی

گرداب میں پھنسی ان کو خدا یاد آتا ہے اور اس وقت وہ اس سے مخلصانہ اطاعت کا عہد کرتے ہوئے دعا کرتے لیکن جب کشتی گرداب میں سے نکل جاتی ہے تو وہ اپنی انہی سرمستیوں اور گمراہیوں میں پھر کھو جاتے ہیں جن میں پہلے کھوئے ہوئے تھے اور خدا سے کیا ہوا عہد ان کو بالکل بھول جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس طرح خدا کی بخشی ہوئی نجات ان کے لیے خدا ہی کی ناشکری کی راہ کھولتی ہے اور ہم بھی ان کو ڈھیل دے دیتے ہیں کہ وہ چند دن ہماری نعمتوں سے متمتع ہو لیں، بالآخر ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہی ہے۔

اس آیت میں بعض اجزاء محذوف ہیں، ہم نے نظائر قرآن کی روشنی میں وہ کھول دیے ہیں۔ یہ مضمون مختلف اسالیب سے زیر بحث آچکا ہے اس وجہ سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ سورۂ روم میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُم مُّنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا أَذَاقَهُم مِّنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ۝ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝

(الروم: ۳۳-۳۴)

اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی طرف متوجہ ہو کر پھر جب وہ ان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھا دیتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے کہ اس نعمت کی ناشکری کریں جو ہم نے ان کو بخشی۔ تو چند دن فائدہ اٹھا لو، عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا!

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ (۶۷)

اوپر کی تمثیل کا انطباق قریش کے حال پر

فرمایا کہ بالکل یہی حال قریش کے ان ناشکروں کا ہے۔ یہ اپنی تاریخ کی اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم نے ان کے لیے ایک مامون حرم بنایا جس میں یہ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں درآنحالیکہ ان کے گردوپیش کا حال یہ ہے کہ لوگ دن دہاڑے اچک لیے جاتے ہیں، نہ کسی کی جان کے لیے امان ہے نہ کسی کا مال محفوظ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کی قدر انھوں نے یہ کی ہے کہ اس کے بنائے ہوئے حرم کے کونے کونے میں انھوں نے بتوں کو لا بٹھایا ہے اور ان کی پوجا کر رہے ہیں۔ ان بدبختوں سے پوچھو کہ کیا وہ باطل پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں!

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اوپر کشتی کی جو مثال دی ہے اس میں اور اس صورت واقعہ میں بڑی گہری مناسبت ہے۔ یہ مامون حرم قریش کے لیے ایک سفینۂ نجات کے مانند تھا جس میں ہر خطرے سے بالکل بےخوف وہ چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس چین کی زندگی نے ان کو خدا سے بالکل غافل کر دیا۔ حالانکہ اگر خدا چاہتا تو ان کو بھی وہ اسی بے اطمینانی میں مبتلا کر سکتا تھا جس میں ان کے گردوپیش کے لوگ مبتلا تھے لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب تک کشتی سازگار ہوا سے رواں دواں ہے اس وقت تک وہ چین کی بانسری

بجاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بازی اس کی ہے لیکن جب کسی گرفت میں آجاتا ہے تو واویلا شروع کر دیتا ہے۔

اس حرم کی تولیت کی بدولت قریش کو جو رفاہیت اور سارے عرب پر جو قیادت و سیادت حاصل ہوئی اس پر مفصل بحث کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ سورۂ قصص کی آیت ۵۷ کے تحت بھی اس پر بحث گزر چکی ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ (۶۸)

فردِ قرارداد جرم سنانے کے بعد ایک سوال

تمام فردِ قرارداد جرم سنانے کے بعد سوال فرمایا کہ ان لوگوں سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑ کر لگائیں یا حق کو جھٹلائیں جب کہ وہ ان کے پاس آچکا ہے۔ 'افترا علی اللہ' سے مراد دین شرک ہے اور 'حق' سے مراد یہاں قرآن اور رسول ہیں۔ 'لَمَّا جَآءَهٗ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ رسول کی بعثت سے پہلے تو ان کے لیے اللہ کے ہاں کچھ عذر ہو سکتا تھا لیکن اب جب کہ رسول بھی آچکا اور قرآن بھی نازل ہو چکا تو ان کے لیے کیا عذر باقی رہا! 'اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ' کیا ایسے کٹے کافروں کا ٹھکانا بھی دوزخ میں نہ ہوگا! مطلب یہ ہے کہ ایسوں کے دوزخی ہونے میں بھلا کسے کلام ہو سکتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (۶۹)

اہلِ ایمان کو بشارت

کفار کو ان کے ٹھکانے تک پہنچا کر ان مظلوم مسلمانوں کی طرف پھر توجہ فرمائی جن کا مسئلہ اس سورہ میں ابتدا سے زیر بحث ہے۔ فرمایا کہ ہمارے جو بندے ہماری راہ میں آج طرح طرح کی مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہ وعدہ ان کے لیے دین، دنیا اور آخرت تینوں سے متعلق ہے۔ یعنی ان کے لیے دین کی راہیں بھی کھلیں گی، ان کی دنیا کی مشکلات بھی حل ہوں گی اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ ان کی رہنمائی صراطِ حمید کی طرف فرمائے گا۔

'وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ' یہ ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی معیت کی بشارت ہے اور یہ بہت بڑی بشارت ہے اس لیے کہ جن کو اللہ کی معیت حاصل ہو تمہیں تو تم سب ان کی راہ میں گرد ہیں لیکن یہ بشارت 'احسان' کی قید کے ساتھ مقید ہے۔ یعنی یہ معیت ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو نہایت خوبی کے ساتھ راہِ حق کی مصیبتوں کا مقابلہ کریں گے اور ہر مرحلے میں اپنے رب پر پورا پورا بھروسہ کرنے والے ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔

اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کر دے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

بروز پیر، دس بجے دن
۲۷ مئی ۱۹۷۴ء
رحمان آباد

تدبرِ قرآن

۳۰

الرّوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ ـــ عنکبوت ـــ کا مثنیٰ ہے اور دونوں کا قرآنی نام بھی ایک ہی یعنی الٓمّٓ ہے۔ اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ پچھلی سورہ میں ظاہری حالات کے علی الرغم مسلمانوں کو نصرتِ الٰہی اور غلبہ کی بشارت دی گئی ہے اور اس بشارت کی بنیاد اس حقیقت پر رکھی گئی ہے کہ اس کارخانۂ کائنات کو اللہ تعالیٰ نے بالحق پیدا کیا ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ تمام امر و نہی اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ اس دنیا میں بھی اپنے رسول اور اپنے ساتھیوں کو غلبہ بخشے گا اور اس دنیا کے بعد آخرت بھی ہے جس میں اس کے کامل حق و عدل کا ظہور ہوگا۔ اس وقت باطل یکسر نابود ہو جائے گا اور حق و اہلِ حق کو ابدی بادشاہی حاصل ہوگی۔

یہ مسائل مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں کے درمیان زیرِ بحث ہی تھے کہ اسی اثنا میں یعنی ۶۱۴ء میں پڑوس کے ملک یعنی شام اور فلسطین میں یہ انقلاب پیش آیا کہ مجوسیوں نے حملہ کر کے رومیوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔ رومی چونکہ نصرانیت کے پیرو تھے اس وجہ سے دین و عقیدہ کے اعتبار سے وہ مسلمانوں سے قریب تھے اور اس قربت کے سبب سے قدرتی طور پر مسلمانوں کو ان سے ہمدردی تھی۔ اس کے برعکس مجوسی دینِ شرک کے پیرو تھے اس وجہ سے مشرکین کی تمام ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ مجوسیوں کے ہاتھوں رومیوں کی اس شکست سے مشرکینِ مکہ کو بڑی شہ ملی۔ اس کی آڑ میں انھوں نے قرآن کی ان تمام باتوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیا جو ان کی خواہشوں کے خلاف تھیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان جو یہ کہتے ہیں کہ دینِ توحید ہی حق ہے یا مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگا یا قیامت آنے والی ہے جس میں حق کا بول بالا ہوگا، یہ سب باتیں ان کی محض لاف ہیں۔ اگر ان کی یہ باتیں سچی ہوتیں تو بھلا مجوسیوں کو رومیوں پر کس طرح غلبہ حاصل ہوتا! یہ واقعہ تو اس بات کی صاف شہادت ہے کہ ہمارا ہی دین و عقیدہ اور ہمارا ہی نظریۂ زندگی صحیح ہے اور ہم ہی غالب و حاکم رہیں گے۔

قرآن نے اس سورہ میں اسی واقعہ کو بنیاد بنا کر ان تمام حقائق کو از سرِ نو مبرہن کیا ہے جن کو مشرکین نے مشتبہ بنانے کی کوشش کی۔

اس سورہ کا نظام سمجھنے کے لیے اگرچہ یہ تمہید بھی کافی ہے لیکن ہم سہولت کے لیے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۷) رومیوں اور مجوسیوں کے واقعہ کی طرف ایک اجمالی اشارہ اور اس حقیقت کا اظہار کہ اس دنیا میں قوموں

کے رد و بدل کے جو واقعات پیش آتے ہیں وہ اتفاقی واقعات کے طور پر نہیں پیش آتے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک مبنی بر عدل سنت کے تحت ظہور میں آتے ہیں لیکن اس سنت تک ان لوگوں کی نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں جو صرف اس دنیا کے ظواہر کو دیکھنے کے عادی ہیں۔

(۸ - ۱۰) اس دنیا کے نظام اور اس کی تاریخ پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے گا کہ اس کے خالق نے اس کو کھیل تماشہ نہیں بنایا ہے اس وجہ سے یہ لازماً جزا و سزا پر منتہی ہوگی۔ قوموں کی تاریخ سے بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ان کے کردار کے مطابق معاملہ کیا ہے اس وجہ سے قیامت ناگزیر ہے جو لوگ اس کا انکار کر رہے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت کا انکار کر رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی تو اس دن اہلِ ایمان کو فلاح حاصل ہوگی اور اہلِ کفر نامراد ہوں گے جن لوگوں نے شرکاء و شفعاء بنا رکھے ہیں وہ نہایت ہی غلط سہارے پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قیامت کے دن یہ شفعاء بالکل بے حقیقت ثابت ہوں گے۔ عبادت و اطاعت کا اصلی حقدار اللہ ہے۔ اسی کی حمد و تسبیح اس کائنات کی ہر چیز کر رہی ہے۔ اس وجہ سے انسانوں کا بھی فرض ہے کہ وہ صبح و شام اسی کی تسبیح کریں۔

(۱۹ - ۲۹) قیامت اور توحید کے آفاقی و انفسی دلائل۔

(۳۰ - ۴۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو اصل دینِ فطرت پر قائم رہنے اور اسی کی دعوت دینے کی تاکید۔ اس دین کی بنیاد نماز اور زکوٰۃ پر ہے۔ جن لوگوں نے اس دینِ فطرت کو بگاڑا ہے ان کو زجر و تنبیہ کہ اب ان کے محاسبہ کا وقت آگیا ہے، وہ پچھلی قوموں کی تاریخ سے سبق لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تم صبر کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہو اور فیصلہ کے دن کا انتظار کرو۔

(۴۶ - ۶۰) اللہ تعالیٰ کے وعدۂ نصرت کے ظہور کے جو دلائل و آثار تاریخ و آفاق میں موجود ہیں ان کی طرف اشارہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تم اپنی دعوت انہی لوگوں کے دلوں میں اتار سکتے ہو جو سننے سمجھنے والے ہیں۔ اس وجہ سے ان لوگوں کے رویہ سے بددل نہ ہو جو اندھے بہرے بن چکے ہیں۔ سوچنے سمجھنے والوں کے لیے یہ قرآن کافی ہے۔ باقی رہے ضدی اور ہٹ دھرم تو ان کو کوئی معجزہ بھی قائل نہیں کر سکتا۔ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ اللہ کا وعدۂ نصرت پورا ہو کر رہے گا۔

سُوْرَةُ الرُّوْمِ (٣٠)

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــــــ اٰيَاتُهَا ٦٠

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿١﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿٢﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿٣﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ
مِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿٤﴾ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ
يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٥﴾ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦﴾ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ښ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿٧﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ
اَنْفُسِهِمْ ۣ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ﴿٨﴾
اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ
اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ فَمَا كَانَ اللّٰهُ
لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٩﴾ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ
اَسَاۗءُوا السُّوْۗاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٠﴾ ع ١ ٤

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ
السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ
شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ
يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ
رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ
لِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَسُبْحٰنَ
اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۸

یہ الٓمّٓ ہے۔ رومی پاس کے علاقے میں مغلوب ہوئے اور وہ اپنی مغلوبیت کے بعد عنقریب — چند سالوں میں — غالب آجائیں گے۔ اللہ ہی کے حکم سے ہوا جو پہلے ہوا اور اللہ ہی کے حکم سے ہوگا جو بعد میں ہوگا اور اس وقت اہلِ ایمان مسرور ہوں گے۔ اللہ کی مدد سے۔ وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور عزیز و رحیم تو وہی ہے۔ یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ وہ اس دنیا کی زندگی کے صرف ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ بالکل ہی بے خبر ہیں ۱ - ۷

کیا انھوں نے اپنے دلوں میں غور نہیں کیا! اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے نہیں پیدا کیا ہے مگر غایت و حکمت اور ایک مدتِ مقرر کے ساتھ۔ اور لوگوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں ۔ ۸

کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ ان سے قوت میں زیادہ اور زمین کو زرخیز بنانے اور آباد کرنے میں ان سے بڑھ چڑھ کر تھے اور ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے۔ پس اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ پھر ان لوگوں کا انجام، جنھوں نے بری روش اختیار کی، بُرا ہوا۔ بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑاتے رہے۔ ۹-۱۰

اللہ ہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جس دن قیامت واقع ہوگی تو مجرم اس دن مایوس ہو جائیں گے اور ان کے شریکوں میں سے کوئی ان کے لیے سفارش کرنے والا نہیں بنے گا اور وہ اپنے شریکوں کا انکار کریں گے۔ ۱۱-۱۳

اور جس دن قیامت واقع ہوگی مومن و کافر دونوں الگ الگ ہو جائیں گے۔ پس جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے وہ تو ایک شاندار باغ میں مسرور ہوں گے۔ رہے وہ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کی تکذیب کی تو وہ عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔ پس اللہ ہی کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے اور جس وقت صبح کرتے ہو اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہو رہی ہے اور عشا کے وقت بھی اور اس وقت بھی جب تم ظہر کرتے ہو۔ ۱۴-۱۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

نبی صلعم کی رسالت کا اثبات آپ کے پیش کردہ اصولوں کی صداقت کے پہلو سے

الٓمّٓ (۱) یہ ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں، مستقل جملہ ہے۔ یعنی یہ

سورۂ النّجم ہے۔ یہ اس سورہ کا اصل قرآنی نام ہے۔ یہی نام سابق سورہ کا بھی ہے۔ قرینہ ہے اس بات کا کہ عمود کے اعتبار سے دونوں سورتوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ پچھلی سورہ میں اس کائنات کا جو فلسفہ بیان ہوا تھا اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر رسول اور اس کے ساتھیوں کے لیے دنیا اور آخرت میں جس نصرت الٰہی اور غلبہ کی بشارت دی گئی تھی، ایک خاص واقعہ کہ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، دلیل بنا کر کفار نے اس کا خوب مذاق اڑایا اور اس طرح ان کے زعم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تکذیب کے لیے ان کو ایک ایسی شہادت مل گئی جس پر وہ بہت مسرور ہوئے اور قدرتی طور پر ان کی یہ شادمانی مسلمانوں کے لیے باعثِ رنج ہوئی۔ قرآن نے اس سورہ میں اسی واقعہ کو تمہید بنا کر ان تمام پہلوؤں کی وضاحت فرمائی جن سے بے خبری کی بنا پر کفار مغالطہ میں مبتلا ہوئے اور جن کے اچھی طرح ذہن نشین نہ ہونے کے سبب سے مسلمانوں کی ایک جماعت کو بھی خلجان لاحق ہوا۔ اس طرح یہ سورہ گویا سابق سورہ کے مطالب کو از سر نو مدلل و مبرہن اور ان تمام شبہات کا ازالہ کر رہی ہے جو اس سلسلہ میں پیدا ہوئے یا پیدا ہو سکتے تھے۔ گویا دونوں سورتوں میں زیرِ بحث موضوع ایک ہی ہے۔ فرق صرف پہلو اور نہجِ استدلال کا ہے۔ ان دونوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت آپ کے پیش کردہ اصولوں کی صداقت کے پہلو سے واضح کی گئی ہے۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِہِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۥ لِلّٰہِ
الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ (۲-۴)

'اَدْنَی الْاَرْضِ' سے مراد یہاں شام و فلسطین کی سرزمین ہے جو عرب کی سرزمین سے بالکل متصل تھی۔ | قرآن کی ایک
اس علاقے پر اس زمانے میں رومیوں کی حکومت تھی لیکن وہ اس وقت سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا | پیشین گوئی
تھے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ایرانیوں نے ان پر حملہ کر دیا اور ان علاقوں سے ان کو بے دخل کر دیا۔ یہ واقعہ | کی صداقت
سنہ ۶۱۴ء یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے چھٹے یا ساتویں سال پیش آیا۔

'وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِہِمْ سَیَغْلِبُوْنَ'۔ 'غَلَبٌ' اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔ یہ قرآن نے پیشین گوئی فرمائی کہ اگرچہ رومی اس وقت مغلوب ہو گئے ہیں لیکن یہ مغلوبیت ان کی عارضی ہے، بہت جلد وہ پھر ایرانیوں پر غالب ہو جائیں گے۔

'فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ' یعنی اس انقلاب میں، جس کی قرآن خبر دے رہا ہے، زیادہ دن نہیں لگیں گے صرف چند سالوں کے اندر اندر یہ واقع ہو جائے گا۔ اگرچہ 'سَیَغْلِبُوْنَ' کے اندر بھی مستقبل قریب کا مفہوم موجود تھا لیکن اس میں ایک قسم کا ابہام تھا اس ابہام کو رفع کرنے کے لیے اس کے ساتھ 'فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ' کی قید لگا دی جس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ انقلاب زیادہ سے زیادہ اگلی دہائی کے اندر واقع ہو جائے گا۔ لفظ 'بِضْعٌ' کا اطلاق دس سے زیادہ کی تعداد کے لیے نہیں ہوتا۔ اس تعیین و تصریح کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ اس واقعہ کو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مشرکین نے اپنے فکر و فلسفہ کی صحت

کی دلیل بنالیا تھا جس سے قدرتی طور پر مسلمانوں کو صدمہ پہنچا۔ قرآن نے اس مؤکد پیشین گوئی کے ذریعے سے ایک طرف تو مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ تمہارے مخالفوں نے اس واقعہ کو اپنے حق میں جو دلیل بنایا ہے اور جس سے وہ بہت خوش ہیں، ان کی یہ خوشی چند روزہ ہے، بہت جلد یہ غم سے بدل جائے گی۔ دوسری طرف مشرکین کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے جانچنے کے لیے ایک کسوٹی رکھ دی کہ یہ پیشین گوئی آپ کی نبوت کی ایک دلیل ہوگی۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ اس واقعہ کے تقریباً نو سال بعد ہرقل نے رومیوں کو از سر نو منظم کر کے ایرانیوں کو سخت شکست دی اور ان سے نہ صرف اپنے علاقے واپس لے لیے بلکہ ان کے بھی بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح قرآن کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہو گئی۔

قوموں کے بناؤ اور بگاڑ میں اصلی عامل کردار ہے

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ۔ یعنی جو کچھ ہوا وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوا ہے اور آگے جو کچھ ہوگا وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوگا۔ قوموں کی زندگی میں اتنے بڑے بڑے انقلابات محض اتفاقاتِ زمانہ اور گردشِ روزگار سے نہیں پیش آتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیش آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ہر حکم حق و عدل پر مبنی ہوتا ہے۔ رومیوں نے جب اپنے اندر وہ خرابیاں پیدا کر لیں جو کسی قوم کو خدا کے تازیانۂ تنبیہ کا مستحق بناتی ہیں تو وہ اس سے محض اس بنیاد پر نہیں بچ سکتے تھے کہ وہ بعض اچھے عقائد و رسوم کا اظہار کرتے ہیں۔ صرف رسوم و عقائد اجتماعی زندگی کے بنانے بگاڑنے میں اصلی دخل نہیں رکھتے بلکہ اصل شے وہ انفرادی و اجتماعی کردار ہے جو ان عقائد و رسوم سے پیدا ہوتا ہے یا پیدا ہونا چاہیے۔ اگر وہ کردار نہ پیدا ہو تو محض کھوکھلے رسوم کچھ بھی کارآمد نہیں ہوتے۔ چنانچہ رومیوں کا یہی کھوکھلا پن مجوسیوں کے آگے ان کی شکست کا سبب ہوا اور اب مستقبل قریب میں ان کے لیے جس غلبہ کی بشارت دی جا رہی ہے تو وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوگا اور اللہ کا ہر حکم عدل و حق پر مبنی ہوتا ہے اس وجہ سے لازماً یہ غلبہ اس وجہ سے ان کو حاصل ہوگا کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح کر کے ایرانیوں کے مقابل میں اپنے کو اللہ کی مدد کا مستحق بنائیں گے۔

مسلمانوں کا رویہ دوسری قوموں کے ساتھ

وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ اس دن مسلمان خوش ہوں گے اس وجہ سے بھی کہ جو لوگ مذہب اور فکر و فلسفہ میں ان سے قریب تر ہیں ان کو فتح ہوگی اور اس وجہ سے بھی کہ قرآن کی ایک عظیم پیشین گوئی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے، پوری ہوگی۔

یہ امر یہاں قابلِ توجہ ہے کہ باوجودیکہ رومی صحیح نصرانیت کے پیرو نہیں تھے بلکہ ان کے عقائد و اعمال میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کو مجوسیوں کے مقابل میں ان سے ہمدردی ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ہمدردی کی تحسین فرمائی۔ اسلام نے دوسری غیر مسلم قوموں کے ساتھ اسی اصول پر اپنے قانون اور معاملات کی بنیاد رکھی ہے۔ یعنی جو قوم اپنے نظریات و عقائد اور فکر و فلسفہ

میں اسلام سے جتنی ہی قریب ہوگی بین الاقوامی میدان میں مسلمانوں کی ہمدردیاں دوسروں کے مقابل میں ان کے ساتھ اتنی ہی زیادہ ہوں گی۔

بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۵)

رُومیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

'بِنَصْرِ اللّٰهِ' کا تعلق 'سَيَغْلِبُوْنَ' سے بھی ہو سکتا ہے اور 'يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ' سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ غلبہ جو ان کو حاصل ہوگا اللہ تعالیٰ کی مدد سے حاصل ہوگا، اس لیے کہ اللہ ہی جس کی چاہتا ہے مدد فرماتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت تمام تر حق و عدل پر مبنی ہے اس وجہ سے وہ انھیں کی مدد فرماتا ہے جو اس کے عدل و حکمت کی رو سے اس کی مدد کے سزاوار ہوتے ہیں۔ 'عزیز و رحیم' کی صفات کا حوالہ یہاں اس کی مشیت کی نوعیت کے اظہار کے لیے ہے کہ وہ غالب و مقتدر ہے اس وجہ سے اس کی مشیت میں کوئی مزاحم تو نہیں ہو سکتا لیکن ساتھ ہی وہ رحیم بھی ہے اس وجہ سے اس کا ہر ارادہ عدل و رحمت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنی مشیت کے زور میں یہ نہیں کرتا کہ قوموں کو قوموں سے ٹکرا کر ان کے فساد فی الارض کا تماشا دیکھے۔

وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۶)

مسلمانوں کے غلبہ کا وعدہ

'وَعْدَ اللّٰهِ' یہاں مصدر مؤکد ہے اس وجہ سے اس کے اندر تاکید کا مفہوم پیدا ہو جائے گا یعنی اہل ایمان کی مدد کا یہ وعدہ بالکل قطعی اور اٹل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا لیکن جن لوگوں کی نظر صرف ظاہری اسباب و حالات تک محدود ہے وہ اس مخفی ہاتھ کو نہیں دیکھ رہے ہیں جو ان ظواہر کے اندر کارفرما ہے۔ اس وجہ سے وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔

یہاں جس وعدے کے پورے ہونے کی طرف اشارہ ہے وہ صرف رومیوں کے غلبہ کا وعدہ نہیں ہے بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے غلبہ کا وہ وعدہ بھی ہے جس کی تکذیب کے لیے قریش نے مجوسیوں کی فتح کو دلیل بنایا تھا۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرنے کے بعد یہ قرآن نے نہایت تاکید کے ساتھ اس وعدے کے پورے ہونے کا اظہار فرمایا جو اصلاً اس سورہ میں زیر بحث ہے۔ آگے اسی سورہ کی آیات ۴۷، ۶۰ میں اس کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ښ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۷)

ظاہر پرستوں کا اصل مغالطہ

اوپر والی آیت میں ان ظاہر پرستوں کے جس اندھے پن کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ اس کی توجیہ ہے کہ اول تو یہ لوگ اس دنیا کے صرف ظاہر حالات کو دیکھتے ہیں، ان کے باطن تک ان کی نگاہ نہیں پہنچتی کہ اصل متصرف اس کے اندر کون ہے اور اس کی صفات کیا ہیں اس وجہ سے یہ ان کے لیے ایک کھیل تماشا بن کر رہ گئی ہے، دوسرے یہ آخرت سے بالکل غافل ہیں اور جب یہ آخرت سے غافل ہیں تو آخرت کے بغیر اس کارخانۂ کائنات کو مبنی بر عدل و حکمت تصور کرنا ناممکن ہے۔ 'وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ

هُمْ غٰفِلُوْنَ' میں مبتدا کا اعادہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اس حقیقت کو زور و تاکید کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ آخرت سے اصل غافل یہی لوگ ہیں۔ اس تاکید کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین عرب اگرچہ آخرت کا صاف الفاظ میں انکار نہیں کرتے تھے لیکن انھوں نے شرک و شفاعت کا ایک ایسا نظام کھڑا کر رکھا تھا کہ آخرت ان کے لیے ایک بالکل بے حقیقت چیز بن کر رہ گئی تھی۔ قرآن یہاں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کوئی یہ نہ گمان کرے کہ یہ لوگ آخرت کو کسی درجے میں بھی مانتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ آخرت سے یہ لوگ بالکل ہی بے خبر ہیں۔

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ ۟ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ (۸)

کائنات کی مقصدیت سے استدلال

اس آیت میں اور آگے کی چند آیات میں اسی حقیقت کی تائید ہیں، جو اوپر بیان ہوئی، آفاق کے دلائل کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر وہ خود اپنے باطن میں اتر کر غور کرتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان میں سے کسی چیز کو بھی بے غایت و مقصد، محض کھیل تماشے کے طور پر، نہیں بنایا ہے بلکہ ہر چیز ایک غایت و مقصد اور ایک مقررہ مدت کے ساتھ بندھی ہوئی پیدا ہوئی ہے۔ تو جب اس کائنات کی ہر چیز اپنے اندر ایک غایت و حکمت رکھتی ہے اور اس کے لیے ایک مدت بھی مقرر ہے تو کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ انسان جو اس کے اندر، واضح طور پر، ایک برتر مخلوق کی حیثیت رکھتا ہے، بالکل بے مقصد اور عبث پیدا کیا گیا ہو۔ اس چیز کا لازمی تقاضا ہے کہ ایک روز جزا و سزا آئے جس میں وہ اپنے اعمال کی بابت مسئول ہو، اپنی نیکیوں کا صلہ پائے اگر اس نے نیکیاں کی ہوں اور اپنی بدیوں کی سزا بھگتے اگر اس نے بدیاں کمائی ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ کارخانۂ کائنات ایک کھلنڈرے کا کھیل اور انسان ایک شترِ بے مہار اور بے غایت و مقصد وجود بن کے رہ جاتا ہے اور یہ بات اس کائنات کی اس مقصدیت اور حکمت کے بالکل منافی ہے جس کی شہادت اس کے ہر گوشہ سے مل رہی ہے۔ یہی مضمون دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے 'وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ' (اور وہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور کرتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو نے یہ کارخانہ عبث نہیں پیدا کیا۔ تیری ذات پاک ہے تو ہمیں عذابِ نار سے بچائیو!) 'اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ' کے الفاظ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ آسمان و زمین کی خلقت کی یہ حکمت ان لوگوں پر کھلتی ہے جو بالکل غیر جانبدار ہو کر اپنے باطن میں غوطہ لگاتے اور اصل حقیقت کو پانا چاہتے ہیں۔ رہے وہ جو محض دوسروں کے اندھے مقلد یا حقیقت کو جھٹلانے کے لیے معجزات اور نشانیوں کے طالب اور مناظرہ و مجادلہ کے لیے آستینیں چڑھائے رہتے ہیں وہ اس سے محروم ہی رہتے ہیں۔

وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكَٰفِرُونَ: یعنی ہے تو یہ حقیقت بالکل واضح لیکن اس کے باوجود بہت سے نادان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف کھانے پینے اور عیش کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور اسی طرح ایک دن ختم ہو جائیں گے۔ ان کے لیے خدا کے آگے پیشی کا کوئی دن آنا نہیں ہے۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوٓا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَآ أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَٰتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوٓا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ ثُمَّ كَانَ عَٰقِبَةَ الَّذِينَ أَسَٰٓـُٔوا السُّوٓأَىٰٓ أَن كَذَّبُوا بِـَٔايَٰتِ اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِءُونَ (۹-۱۰)

تاریخ کے دلائل کی طرف اشارہ

یہ اسی حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کے دلائل کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر وہ اپنے ہی ملک کے آثار اور اس کی تاریخ پر نظر ڈالتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ جو قومیں اپنی عسکری قوت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر اور تمدنی و تعمیری صلاحیتوں میں ان سے کہیں آگے تھیں، ان کا انجام کیا ہو چکا ہے! اشارہ قوم عاد، ثمود، قوم مدین وغیرہ کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں تفصیل کے ساتھ پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکی ہیں۔ فرمایا کہ ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن انھوں نے اپنی آنکھیں اس طرح بند رکھیں کہ وہ کسی نشانی سے بھی نہ کھلیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کو عذاب میں پکڑا اور ان کا عذاب میں پکڑا جانا ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہوا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے اس لیے کہ انھوں نے اس انذار کی کوئی قدر نہیں کی جس کا اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اہتمام فرمایا بلکہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور نہایت جسارت کے ساتھ ان کا مذاق اڑاتے رہے ـــــ مطلب یہ ہے کہ قریش قوموں کی اس تاریخ پر غور کریں کہ اس سے کیا بات ثابت ہوتی ہے؟ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے، جس میں ہر شخص اپنے زور میں جو چاہے کرتا پھرے، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے، یا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ قوموں کے ساتھ اپنے قانون عدل و حکمت کے مطابق معاملہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی دوسری بات ثابت ہوتی ہے اور پھر اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن بھی آئے گا جس میں اللہ تعالیٰ ایک ایک فرد کا محاسبہ کرے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔

اللَّهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۱۱)

اصل حقیقت

اوپر کی آیات میں اس کائنات کے 'بالحق' ہونے سے قانونِ مجازات کی صحت و صداقت پر استدلال فرمایا ہے۔ اب اس آیت اور بعد کی چند آیات میں نہایت آشکارا الفاظ میں وہ اصل حقیقت سامنے رکھ دی ہے جس سے ہر ایک کو سابقہ پیش آنا ہے۔ فرمایا کہ اللہ ہی خلق کا آغاز فرماتا ہے اور وہی اس کا اعادہ فرمائے گا۔ ان دو لفظوں میں دعویٰ اور دلیل دونوں جمع ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ اللہ اس خلق کا

اعادہ فرمائے گا، دلیل اس کی یہ ہے کہ اسی نے اس کا آغاز کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس نے اس کا آغاز کیا اور اس کام میں اس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی اس کو اس کے اعادے میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ بلکہ اعادہ ابدا کے مقابل میں زیادہ آسان ہے۔ یہ جواب ہے منکرین قیامت کے شبہ کا کہ وہ قیامت کو نہایت مستبعد چیز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جب خلق کا ابدا مستبعد نہیں ہے تو اس کے اعادے میں کیا استبعاد ہے!

'ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ'۔ یہ منکرین کے ایک دوسرے مغالطے کو رفع فرمایا۔ منکرین، اول تو قیامت کے وقوع ہی کو نہایت مستبعد خیال کرتے تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجے میں مانتے بھی تھے تو ان کا گمان یہ تھا کہ ہمارا لوٹنا تو ہمارے معبودوں کی طرف ہوگا اور ان کو خدا کے ہاں اتنا تقرب حاصل ہے کہ اول تو وہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے اوپر ہاتھ ڈالنے ہی نہیں دیں گے اور اگر اس نے ہاتھ ڈالا تو وہ اپنی سفارش سے ہم کو بچالیں گے۔ فرمایا کہ یہ خبط اپنے ذہن سے نکالو۔ ہر ایک کی پیشی اللہ ہی کے حضور ہونی ہے۔ اس دن کوئی اور مرجع و ماویٰ نہیں بنے گا۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ہ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ (۱۲-۱۳)

'ابلاس' کے معنی بالکل مایوس اور بھونچکا ہوکر رہ جانا ہے۔ فرمایا کہ آج یہ مخالفین جن کی شفاعت پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں جب قیامت کے دن ان کے سامنے اصل صورتِ حال آئے گی تو وہ مایوس اور بھونچکے ہوکر رہ جائیں گے ـــــ وہ دیکھیں گے کہ جن کو انھوں نے شریک خدا بنایا اور جن کی زندگی بھر پوجا کی ان میں سے کوئی بھی ان کی شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔

'وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ'۔ اور خود ان کا حال یہ ہوگا کہ جن کی حمایت میں آج آستینیں چڑھائے ہوئے ہر ایک سے لڑنے کو تیار ہیں، ان کے منکر بن جائیں گے۔ سورۂ قصص کی تفسیر میں ہم یہ واضح کرچکے ہیں کہ قیامت کے مختلف مراحل میں مشرکین اپنے شرکاء کے معاملے میں مختلف رویے اختیار کریں گے ـــــ کبھی تو وہ ان کو اپنی مدد کے لیے پکاریں گے اور کبھی وہ مرحلہ بھی آئے گا کہ صاف صاف ان کا انکار کریں گے۔ حیرانی و پریشانی کے عالم میں جہاں جو بات بنتی نظر آئے گی وہ کریں گے لیکن قیامت بات بنانے کی جگہ نہیں ہوگی بلکہ حقائق سے دوچار ہونے کی جگہ ہوگی۔

یہاں زبان کے اس اسلوب پر بھی نگاہ رہے کہ مستقبل کے احوال ماضی کے صیغوں ـــــ 'وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ' اور 'وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ' ـــــ میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ اسلوب تقریب فہم کے لیے اختیار کیا جاتا ہے گویا مخاطب جس چیز کو نہایت بعید سمجھتے ہیں متکلم اس کو ماضی کے اسلوب میں ایک واقع شدہ واقعہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ احوالِ قیامت کے بیان میں قرآن نے یہ اسلوب اکثر جگہ استعمال کیا ہے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ہ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ

يُحْبَرُوْنَ ٥ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (۱۴-۱۶)

کفار کا ایک مغالطہ

یعنی اس دنیا کا کارخانہ ابتلاء کے قانون کے تحت چل رہا ہے اس وجہ سے اس میں نیک و بد اور مومن و فاسق دونوں ملے جلے ہوئے ہیں اور اکثر حالات میں اہل حق مظلوم و مقہور اور اہل باطل غالب و متمکن ہیں اس وجہ سے اس دنیا کا یا لحق ہونا ان لوگوں کو نظر نہیں آتا جن کے اندر بصیرت نہیں ہے لیکن جب آخرت کا یوم الفرقان نمایاں ہوگا اور اس دن نیک و بد اور مومن و کافر دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہو جائیں گے۔ جو ایمان و عمل صالح والے لوگ ہوں گے وہ ایک شاندار باغ میں مسرور شاداں ہوں گے اور جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی آیات و ملاقات کو جھٹلایا ہوگا وہ عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔ یہاں 'رَوْضَۃٌ' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ یعنی جنت کے باغوں میں سے شاندار باغ میں۔ 'یُحْبَرُ' کے معنی خوش اور مسرور کرنے کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے لیے وہ تمام اسباب مہیا فرما دے گا جو ان کی خوشی کے لیے ضروری ہوں گے۔ مجرمین کے باب میں لفظ 'مُحْضَرُوْنَ' ان کی ذلت و بے بسی کی تصویر کے لیے ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عذاب میں اس طرح باندھ کر اور گھسیٹ کر لائے جائیں گے جس طرح سزا یافتہ قیدی لائے جاتے ہیں۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ٥ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (۱۷-۱۸)

توحید اور قانون مجازات کا تقاضا

اب یہ تقاضا بیان ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی اسی یکتائی اور اس کے قانون مجازات کا جس کا بیان اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ جب اصل حقیقت یہ ہے جو بیان ہوئی تو ہر ایک کا فرض ہے کہ صرف اللہ ہی کی تسبیح کرے شام و صبح اور عشا کے وقت اور ظہر کے وقت۔

'وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'۔ یہ اوقات تسبیح کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ بطور تنبیہ و تذکیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خدا ہی کی تسبیح کی جو دعوت دی جا رہی ہے یہ کوئی بیگانہ دعوت نہیں ہے بلکہ آسمانوں اور زمین کے ہر گوشے سے خدا ہی کی حمد کا ترانہ گونج رہا ہے۔ تو جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کر رہے ہیں اُن کا سُر اس کائنات کے مجموعی سُر سے بالکل بے جوڑ ہے البتہ جو لوگ خدا کی حمد و تسبیح کر رہے ہیں وہ اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اس میں دعوت کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی بے نیازی کا اظہار بھی ہے کہ اگر کچھ بدقسمت خدا کی حمد و تسبیح سے گریز کریں گے تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ اس کائنات میں اس کی حمد و تسبیح کرنے والوں کی کمی ہے، آسمانوں اور زمین کا ہر گوشہ اس کی حمد کرنے والوں سے معمور ہے۔

اوقات عبادت کے تعین میں حکمت

یہاں جو اوقات مذکور ہوئے ہیں ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حمد و تسبیح کے لیے

وہ اوقات خاص طور پر پسند فرمائے ہیں جن کی اس کی کسی بڑی نشانی کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ رات دن میں داخل ہوتی ہے یا دن رات میں داخل ہوتا ہے۔ یا سورج سمت راس سے جھکتا ہے یا رات تاریک ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو انسان غور کرنے والا ہے یہ اوقات اس کے ذہن و دماغ پر خاص طور پر اثر انداز ہوتے اور اس کو جھنجھوڑتے ہیں کہ وہ اس ذات کو اس وقت یاد کرے جس کے حکم سے یہ عظیم تغیر اس دنیا میں واقع ہوا ہے۔ اگر ان اوقات میں بھی کوئی شخص اللہ کی نشانیوں اور اس کی شانوں سے متاثر نہیں ہوتا تو وہ نہایت بلید جانور ہے۔

اوقات نماز میں سے فجر اور ظہر کا ذکر تو اس آیت میں نہایت واضح طور پر موجود رہا ہے۔ 'تُمْسُوْنَ' میں اگر عصر اور مغرب دونوں کو شامل کر لیجیے اور 'عَشِيًّا' سے 'عشاء' کو مراد لیجیے تو تمام اوقات نماز آ جاتے ہیں۔ لفظ 'عشی' کا اطلاق زوال کے وقت پر بھی ہوتا ہے اور مغرب سے لے کر عشاء کے وقت پر بھی' اس وجہ سے اس سے عشاء کا وقت مراد لینے میں لفظ سے کوئی تجاوز نہیں ہوگا۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۱۹ - ۲۹

آگے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ بعث و قیامت اور توحید کے دلائل آ رہے ہیں۔ قیامت کا بیان اس پہلو سے ہوا ہے کہ اس دنیا کی اصلی غایت و حکمت قیامت ہی سے واضح ہوگی اور توحید کا مضمون اس پہلو سے اس کے ساتھ آیا ہے کہ توحید کے بغیر قیامت ایک بالکل بے معنی چیز ہو کے رہ جاتی ہے۔ جب نظریہ یہ ہو کہ آدمی کے اعمال خواہ کچھ ہی ہوں شرکا و شفعاء اس کو بخشوا لیں گے تو قیامت کا آنا نہ آنا دونوں یکساں ہوا۔ قیامت کی ساری اہمیت اس عقیدے میں ہے کہ اس دن خدا کے کامل حق و عدل کا ظہور ہوگا اور کسی کا زور و اثر بھی اس کے بے لاگ عدل کے ظہور میں مزاحم نہ ہو سکے گا ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۹-۲۹ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْأَرْضَ
ع بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ وَكَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ ﴿١٩﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ
خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنتُم بَشَرٌ تَنتَشِرُونَ ﴿٢٠﴾ وَمِنْ
آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ
بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١﴾

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿٢٢﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ
وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاۤؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّسْمَعُوْنَ ﴿٢٣﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا
وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاۤءِ مَاۤءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ اَنْ تَقُوْمَ
السَّمَاۤءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ
اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿٢٥﴾ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ
لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ
اَهْوَنُ عَلَيْهِ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ
هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٧﴾ ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ ع ٣ ٦
لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاۤءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ
فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاۤءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ كَذٰلِكَ
نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٢٨﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا
اَهْوَاۤءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَا
لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٩﴾

ترجمہ آیات ١٩-٢٩

وہ زندہ کو مردہ سے پیدا کرتا ہے اور مردہ کو زندہ سے پیدا کرتا ہے اور زمین کو
اس کے خشک ہو جانے کے بعد از سر نو شاداب کر دیتا ہے اور اسی طرح تم بھی

نکالے جاؤ گے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر تم دیکھتے دیکھتے بشر بن کر روئے زمین پر پھیل جاتے ہو اور یہ بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور ہمدردی ودیعت کی۔ بے شک اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو غور کرنے والے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی خلقت اور تمھاری بولیوں اور تمھارے رنگوں کا تنوع بھی ہے۔ بے شک اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں اصحاب علم کے لیے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے رات اور دن میں تمھارا سونا اور اس کے فضل کا طالب بنتا ہے ـــ بے شک اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو سننے سمجھنے والے ہیں اور وہ اپنی نشانیوں میں سے تم کو دکھاتا ہے بجلی کو جو خوف بھی پیدا کرتی ہے اور امید بھی اور اتارتا ہے آسمان سے بارش پس زندہ کر دیتا ہے اس سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد۔ بے شک اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ چیز بھی ہے کہ آسمان و زمین اس کے حکم سے قائم ہیں پھر جب وہ تم کو زمین سے نکلنے کے لیے ایک ہی بار پکارے گا تو تم دفعتہً نکل پڑو گے۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اسی کے مملوک ہیں، سب اسی کے فرمانبردار ہیں اور وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے سب سے برتر صفت ہے اور عزیز و حکیم وہی ہے۔ ۲۰-۲۷

وہ تمھارے لیے خود تمھارے اندر سے ایک تمثیل بیان کرتا ہے۔ کیا ہم نے تم کو جو

رزق و فضل بخشا ہے اس میں تمہارے مملوکوں میں سے بھی کچھ شریک ہیں کہ تم اور وہ اس میں برابر کے حقوق رکھنے والے بن گئے ہو اور جس طرح تم اپنوں کا لحاظ کرتے ہو اسی طرح ان کا بھی لحاظ کرتے ہو؟ اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں بلکہ اپنی جانوں پر ان ظلم کرنے والوں نے بے دلیل اپنی بدعات کی پیروی کر رکھی ہے تو ان کو کون ہدایت دے سکتا ہے جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے! اور ان کا کوئی بھی مددکرنے والا نہیں بنے گا۔ ۲۸-۲۹

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ وَكَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ (۱۹)

قیامت کا شاہد روزمرہ کے واقعات میں

'اخراج' کے معنی جس طرح کسی چیز سے کسی چیز کے نکالنے کے آتے ہیں اسی طرح کسی چیز کے ظاہر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ یہ منکرین قیامت کے استبعاد کو رفع فرمایا ہے کہ تم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو بہت مستبعد سمجھتے ہو حالانکہ اس دنیا کے ہر گوشہ میں زندہ کو مردہ سے ظہور میں آتے اور زندہ پر موت کو طاری ہوتے دیکھتے ہو۔ اس کی مثال کے طور پر فرمایا کہ تم زمین کو دیکھتے ہو کہ وہ بالکل خشک اور مردہ ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ بارش کے ایک ہی چھینٹے سے اس کے ہر گوشے میں زندگی نمودار کر دیتا ہے! اسی طرح تم بھی ایک دن مرکھپ جانے کے بعد نکال کھڑے کیے جاؤ گے۔ زندگی اور موت سب خدا کے اختیار میں ہے۔ نہ اس کے لیے زندہ کو مردہ کرنا مشکل ہے نہ مردہ کو زندہ کرنا قیامت کا یہ ریہرسل برابر تمہاری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ اگرچہ یہاں مثال دراصل حیات بعد الموت کی پیش کرنی مقصود ہے لیکن اپنی کامل قدرت کو سامنے لانے کے لیے موت بعد الحیات کا بھی حوالہ دے دیا ہے۔ انعام کی آیات ۹۵-۹۶ کے تحت اس پر مفصل بحث گزر چکی ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنتُم بَشَرٌ تَنتَشِرُونَ (۲۰)

قدرت الٰہی کا شاہد خود اپنے وجود میں

یعنی تم کو جن حقائق کے ماننے کی دعوت دی جا رہی ہے وہ تمام تر تمہارے خالق کی قدرت و حکمت پر مبنی ہیں تو اس کی قدرت و حکمت کے ثبوت کے لیے تم کسی خارجی دلیل کا مطالبہ کیوں کرتے ہو؟ اس کی سب سے بڑی دلیل تو خود تمہاری خلقت ہی کے اندر موجود ہے۔ اس نے تم کو جامد مٹی سے پیدا کیا اور پھر تم زندہ

اور عقل و شعور رکھنے والی ہستی بن کر تمام روئے زمین پر پھیل گئے۔ اِذَا یہاں اس عظیم قدرت و شان کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے۔ یعنی غور کرو، کہاں خشک مٹی اور کہاں جیتا جاگتا انسان، دیکھتے دیکھتے خدا کی قدرت نے اسی مٹی سے ایک پورا جہان آباد کر دیا! مطلب یہ ہے کہ اگر یہ انسان اس بات پر جھگڑے کہ خدا اس کو دوبارہ کس طرح پیدا کر سکتا ہے تو یہ بلادت و حماقت کی انتہا ہے۔ اسی بات کو قرآن میں دوسرے مقام میں یوں فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا مٹی سے لیکن اب وہ ہمارا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا ہے اور علانیہ ہماری قدرت کو چیلنج کر رہا ہے!

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۲۱)

ہر چیز کے جوڑے جوڑے ہونے کی حکمتیں

اب ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے وجود سے خارج کی ایک عظیم نشانی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہم نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے تمہارا جوڑا پیدا کیا تاکہ تم اس سے تسکین و راحت حاصل کرو اور اس تسکین و راحت کے حصول کے لیے تمہارے درمیان محبت و ہمدردی ودیعت فرمائی —— فرمایا کہ جو لوگ غور کرنے والے ہیں ان کے لیے اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں۔

اس کے اندر ایک واضح نشانی تو اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی ہے اور ہر چیز اپنے مقصد وجود کی تکمیل اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر کرتی ہے۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس دنیا کا بھی ایک جوڑا ہے جس کو آخرت کہتے ہیں۔ اسی آخرت سے اس دنیا کی غایت کی تکمیل ہوتی ہے۔

دوسری نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ ہمارا خالق نہایت مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔ اس نے ہمارے اندر جوڑے کی طلب دی تو ہماری ہی جنس سے ہمارا جوڑا بھی اس نے پیدا کیا اور پھر دونوں کے اندر محبت و ہمدردی کے جذبات بھی ودیعت فرمائے تاکہ دونوں دو قالب یک جان ہو کر زندگی بسر کریں۔

تیسری نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ اس کائنات کے اضداد کے اندر نہایت گہرا توافق اور ایک بالاتر مقصد کے لیے نہایت عمیق سازگاری پائی جاتی ہے جو اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اس کا خالق و مالک ایک ہی ہے جو اپنی حکمت کے تحت اس کائنات کے اضداد میں توفیق پیدا کرتا ہے۔

چوتھی نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ ان لوگوں کا خیال بالکل احمقانہ ہے جو سمجھتے ہیں کہ اس کائنات کا ارتقا آپ سے آپ ہوا ہے۔ اگر اس کا ارتقا آپ سے آپ ہوا ہے تو اس کے اضداد میں یہ حیرت انگیز توافق کہاں سے پیدا ہوا؟ یہ تو اس بات کی صاف شہادت ہے کہ ایک قادر و حکیم ہستی ہے جو اس پورے نظام کو اپنی حکمت کے تحت چلا رہی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ (۲۲)

کثرت کے اندر وحدت

اُسی حقیقت کی طرف جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی ہے ایک دوسرے زاویے سے توجہ دلائی کہ اگر لوگ غور کریں تو ان کو یہ چیز صاف نظر آئے گی کہ اس کائنات میں کثرت کے اندر وحدت مضمر ہے۔ ایک طرف آسمانوں کی ایک وسیع اور ناپیدا کنار کائنات ہے اور دوسری طرف یہ کرۂ زمین ہے۔ بظاہر دونوں میں کتنی دوری ہے لیکن اس دوری کے باوجود دونوں میں اتنا گہرا اتصال ہے کہ کوئی عاقل یہ تصور نہیں کر سکتا کہ دونوں الگ الگ خالقوں کی قدرت سے وجود میں آتے اور الگ الگ ارادوں کے تحت گردش کر رہے ہیں بلکہ ان کی باہمی سازگاری پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ ایک ہی قدیر و حکیم دونوں پر متصرف ہے اور دونوں کو ایک مشترک مقصد کے لیے مسخر کیے ہوئے ہے۔ اسی طرح انسانوں کے عالم پر غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ قوموں قوموں کی زبانیں الگ اور فرد فرد کا لہجہ مختلف ہے، اسی طرح ان کے رنگ بھی الگ الگ ہیں لیکن اس اختلاف و تنوع کے باوجود کوئی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں رنگ اور فلاں زبان و لہجہ کے لوگ الگ خدا کی مخلوق ہیں اور فلاں رنگ و روغن کے لوگ کسی الگ خالق کی مخلوق ہیں، بلکہ ہر دانشمند یہ جانتا ہے کہ ایک ہی خالق نے تمام انسانوں کو وجود بخشا ہے۔ یہ محض اس کی حیرت انگیز کاریگری کا کرشمہ ہے کہ اس نے ہر انسان کا لب و لہجہ اور اس کا ناک نقشہ ایسا بنایا ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کا بھی جائزہ لیجیے تو ناممکن ہے کہ کوئی دو فرد بھی آپ کو بالکل ایک ہی رنگ و روغن، ایک ہی قد و قامت اور ایک ہی ناک نقشہ کے مل سکیں۔

حقیقی علم کون ہیں؟

'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ' فرمایا کہ علم والوں کے لیے اس کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔ اوپر والی آیت میں 'لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ' فرمایا تھا یہاں 'لِلْعٰلِمِیْنَ' فرمایا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اصلی عالم درحقیقت وہی لوگ ہیں جو اس کائنات پر تفکر کرتے اور اس تفکر سے اس کی کثرت کے اندر وحدت اور اس کے اضداد کے اندر توافق و سازگاری کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر اس کے خالق کی صفات قدرت و حکمت سے اس نتیجہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ یہ عظیم کائنات بے غایت و مقصد نہیں ہو سکتی اس وجہ سے لازم ہے کہ ایک روز جزا آئے جس میں نیکوکار اپنی نیکیوں کا صلہ پائیں اور بدکار اپنی بدیوں کی سزا بھگتیں۔

انسانوں کے درمیان وصل و فصل کی بنیاد

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ قوموں کے درمیان زبان اور رنگ کے اختلاف کو فارق نہیں ہونا چاہیے۔ انسانوں کے درمیان یہ چیزیں وصل و فصل کی بنیاد نہیں ہیں۔ جس طرح رنگوں اور زبانوں کے اختلاف کے باوجود تمام انسان خدا کی مخلوق ہیں اسی طرح اس قسم کے تمام ظاہری اختلافات کے علی الرغم تمام انسانوں کو ایک ہی خدائی نظام کے تحت زندگی بسر کرنی چاہیے۔ جو لوگ رنگ، نسل یا زبان یا اس نوع کی کسی اور چیز کو انسانوں کے درمیان وصل و فصل کی بنیاد بناتے ہیں۔

وہ اس کائنات کی وحدت پر ضرب لگاتے ہیں اور یہ چیز قرآن کی اصطلاح میں شرک اور فساد فی الارض ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (۲۳)

'وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ' کا عطف 'مَنَامُكُمْ' پر ہے اس وجہ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی نشانیوں میں سے یہ چیز بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات بنائی جس میں تم سوتے ہو اور دن بنایا جس میں تم اس کے رزق و فضل کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے ہو۔ اس مفہوم کی نظیریں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔

دلائل ان کے لیے نافع ہوتے ہیں جو بات کو سنیں

'اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ' فرمایا کہ اس میں بھی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو بات کو سنیں۔ رات اور دن کے توافق کے اندر توحید کی جو دلیل ہے اور شب میں سونے کے بعد صبح کو اٹھنے میں قیامت کا جو اشارہ ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے لیکن یہ نشانیاں اور دلیلیں ان لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہیں جو پیغمبر اور قرآن کی بات کو توجہ سے سنیں۔ اس فقرے میں مخالفین کے رویہ پر تعریض ہے کہ جو لوگ بات سننے اور سمجھنے کے بجائے مخالفت کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں ان کے لیے یہ سارے دلائل بے سود ہیں۔

اوپر کی آیات میں 'تفکر' اور 'علم' کا ذکر ہوا ہے اور ہم ان کے باہمی تعلق کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں 'سمع' کا ذکر ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا درجہ اوپر کی دونوں چیزوں کے نیچے ہے لیکن حصولِ علم کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے۔ اگر ایک شخص کے اندر اتنی معقولیت موجود ہو کہ وہ معقول لوگوں کی باتیں توجہ سے سنے تو اس راہ سے بھی اس کو ہدایت حاصل ہو سکتی ہے اگرچہ وہ کائنات کے نظام اور اس کے اسرار میں زیادہ تفکر کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۲۴)

امید و بیم دونوں کا مرکز خدا ہے

اور اس کی نشانیوں میں سے بجلی بھی ہے جو اپنے اندر امید و بیم اور طمع و خوف دونوں کے پہلو رکھتی ہے۔ یہ ابرِ رحمت کی بشارت اور اس کا مقدمۃ الجیش بن کر بھی نمودار ہوتی ہے اور کسی قوم کے لیے عذاب کا تازیانہ بن کر بھی۔ پہلی صورت تو عامۃ الورود ہے جس کا تجربہ ہم ہمیشہ کرتے ہیں۔ دوسری صورت کی مثالیں بھی قوموں کی تاریخ میں موجود ہیں۔ قرآن نے عاد و ثمود کی تباہی کے سلسلے میں 'صاعقہ' کا ذکر کیا ہے اور ہم اس کے محل میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ فرمایا کہ اس میں بھی ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیں۔ اس میں پہلی نشانی تو اس بات کی ہے کہ نعمت و نقمت دونوں خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اس وجہ سے امید و بیم اور خوف و طمع دونوں حالتوں میں بندے کو اللہ ہی کی طرف

رجوع کرنا چاہیے۔ مشرکین کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ کسی کو رحمت لانے والا اور کسی کو عذاب نازل کرنے والا بنائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ دوسری نشانی اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کے معاملات سے بالکل بے تعلق ہو کر کسی گوشے میں نہیں بیٹھا ہوا ہے بلکہ وہ براہِ راست تمام امور کی تدبیر فرماتا ہے اور اپنے قانونِ حق و عدل کے مطابق قوموں کو جزا اور سزا دیتا ہے۔ تیسری نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی قوم پر عذاب نازل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسے علیحدہ کوئی ایٹم بم نہیں بنانا پڑتا بلکہ وہ اپنی جس نعمت کو جب چاہے نقمت کی صورت میں تبدیل کر دیتا ہے۔

'وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا' کے استدلالی پہلو کی طرف آیت ۹ کے تحت ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ۭ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ڰ مِّنَ الْاَرْضِ ڰ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ۝ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (۲۵-۲۶)

آسمان اور زمین خدا کے حکم سے قائم ہیں۔

یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ آسمان و زمین کا یہ ٹھوس نظام کس طرح متزلزل ہو سکتا ہے کہ قیامت آجائے گی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اہلِ عرب پہاڑوں کی نسبت جو سوال اٹھاتے تھے اور جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ اسی پہلو سے اٹھاتے تھے کہ بھلا ان کو کون ان کی جگہ سے ہلا سکتا ہے! اس وجہ سے قیامت کے ڈراوے ان کے خیال میں بالکل وہمی ڈراوے تھے۔ ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا ہے کہ آسمان و زمین جو قائم ہیں تو اللہ کے حکم سے قائم ہیں اور اسی وقت تک قائم رہیں گے جب تک اللہ تعالیٰ ان کو قائم رکھنا چاہے گا۔ پھر جب وہ اس نظام کو درہم برہم اور دوسرا نظام قائم کرنا چاہے گا تو اس کو اس میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئے گی، وہ زمین کی طرف سے تمھیں بلانے کے لیے ایک ہی پکار پکارے گا اور تم سب دفعۃً زمین سے نکل پڑو گے۔ یعنی اس کو پکارنے کی زحمت بھی بار بار نہیں اٹھانی پڑے گی۔ ایک ہی پکارنا بالکل کافی ہوگا۔ اسی مضمون کو دوسرے مقام میں یوں فرمایا ہے 'وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ' (اور زمین اپنے رب کی فرمانبرداری کرے گی اور اس کے لیے یہی زیبا ہے)۔

'وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ'۔ یہ اوپر والی بات کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اسی کی مخلوق، اسی کے مملوک اور اسی کے فرمانبردار ہیں تو کس کی مجال ہے کہ اس کے حکم سے سرتابی اور اس کی پکار سے سرمو انحراف کر سکے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۭ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲۷)

یہ اوپر والے ٹکڑے 'اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ' کی دلیل بھی ہے اور اس میں اس توحید کے مضمون کی تمہید بھی ہے جو آگے آرہا ہے۔ قیامت کے دن اٹھائے جانے کی یہ دلیل اوپر آیت ۱۱ میں بھی گزر چکی ہے۔

یہاں بعینہٖ اسی کا اعادہ نہیں ہے بلکہ اس پر 'وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ' کا اضافہ بھی ہے۔ فرمایا کہ وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ تم سوچو تو اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہو کہ اسی نے خلق کو وجود بخشا ہے تو اس کے دوبارہ پیدا کیے جانے کو کیوں مستبعد خیال کرتے ہو؟ پہلا کام زیادہ مشکل ہے یا یہ دوسرا؟

تمام اعلیٰ صفتیں اللہ ہی کے لیے ہیں

'وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'۔ 'مثل' یہاں صفت کے مفہوم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے لیے یہ لفظ اس وجہ سے قرآن میں استعمال ہوا ہے کہ اس کی صفتیں انہی الفاظ میں بیان ہوئی ہیں جو ہماری زبان کے ہیں اور جن کو ہم اپنے لیے بھی بولتے ہیں۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ یہ تمثیلی صورت اختیار کیے بغیر یہ صفتیں ہماری فہم سے قریب نہیں آسکتی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس اعلیٰ مفہوم میں استعمال ہوئی ہیں جو اللہ جل شانہٗ کے شایانِ شان ہے۔

فرمایا کہ آسمانوں اور زمین میں تمام اعلیٰ صفتوں کا اصلی حقدار وہی ہے، کوئی دوسرا ان صفات میں اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اس کے بعد خاص طور پر اپنی دو صفتوں ——— عزیز و حکیم ——— کا حوالہ دیا کہ وہ ہر چیز پر غالب، سب سے بالاتر، اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں، اس کے ارادے میں اس کی حکمت کے سوا اور کوئی چیز بھی دخیل نہیں، اور اس ساری کائنات میں کوئی نہیں جو اس کی صفات میں برابری کر سکے۔ اس سے یہ بات لازمی نتیجہ کے طور پر آپ سے آپ نکل آئی کہ جب صفات میں کوئی اس کی برابری کا نہیں تو اس کے حقوق میں بھی کوئی اس کی برابری کا نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۲۸)

خدا کے حقوق میں حصہ داری کے خلاف ایک دلیل

یہ خدا کی صفات اور اس کے حقوق میں دوسروں کی حصہ داری کے خلاف ایک ایسی دلیل کی طرف توجہ دلائی ہے جس پر خود مخاطب کا طرزِ عمل شاہد ہے۔ فرمایا کہ تمہارے شرک کے خلاف دلیل ڈھونڈھنے کے لیے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے تمہارے باہمی طرزِ عمل ہی کو اللہ تعالیٰ تمہارے آگے بطور مثال پیش کرتا ہے۔ تم بتاؤ کہ جو رزق و فضل ہم نے تم کو دے رکھا ہے اپنے غلاموں کے لیے بھی تم اس میں اس طرح کی حصہ داری تسلیم کرتے ہو کہ وہ اور تم اس میں برابر کے شریک ہو جائیں اور تم ان کا بھی اسی طرح لحاظ کرو جس طرح اپنا اور اپنے حق داروں کا لحاظ کرتے ہو! لفظ 'خوف' یہاں لحاظ کرنے کے مفہوم میں ہے۔ یہ لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس پر ہم کہیں بحث کر آئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جب تم اپنے حقوق میں اپنے مملوکوں کے لیے مساوی درجے کی حصہ داری تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہو درآنحالیکہ جو کچھ تمہارے پاس ہے ہمارا عطا کردہ ہے تو خدا کے حقوق میں تم اس

کی مخلوقات کو کس طرح شریک بنائے دے رہے ہو؟ یہ تو نہایت بھونڈی بات ہوئی کہ جس چیز کو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے اس کو خدا کے لیے پسند کرتے ہو حالانکہ تمام اعلیٰ صفات اور برتر حقوق کا اصل حقدار آسمانوں اور زمین میں وہی ہے۔ شرک کی تردید میں یہ اسی طرح کی نفسیاتی دلیل ہے جس طرح کی دلیل دوسرے مقام میں یوں بیان ہوئی ہے کہ یہ مشرکین خود تو لڑکیوں کو ناپسند کرتے اور اپنی طرف ان کی نسبت سے بھی شرماتے ہیں لیکن اللہ کے لیے انھوں نے بہت سی بیٹیاں فرض کر رکھی ہیں۔ اس میں دلیل کا اصلی پہلو یہ ہے کہ شرک کے خلاف انفس و آفاق اور عقل و فطرت میں جو شواہد و دلائل موجود ہیں وہ تو ہیں ہی، ان سے قطع نظر یہ دلیل بھی اس کے خلاف موجود ہے کہ مشرکین جس چیز کو اپنے لیے پسند نہیں کرتے اس کو خدا کے ساتھ جوڑتے ہیں' حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جس بات کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اس کو خدا کے لیے بدرجۂ اولیٰ ناپسند کرتے۔

'کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ' اس دلیل نے وضاحتِ مقصد کی گویا تکمیل کر دی' اس وجہ سے فرمایا کہ ہم اس طرح اپنے دلائل کی تفصیل بیان کر رہے ہیں لیکن یہ دلائل کارآمد ان کے لیے ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں، جنھوں نے اپنی عقلوں پر تالے چڑھا رکھے ہوں ان کے لیے یہ دلیلیں کیا کارآمد ہو سکتی ہیں!

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ یَّهْدِیْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ (۲۹)

عقل کی جگہ خواہشوں کی پیروی کرنے والوں کا انجام

'اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا' سے مراد یہی مشرکین ہیں جنھوں نے شرک جیسے 'ظلم عظیم' کا ارتکاب کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ عقل سے رہنمائی حاصل کرنے والی مخلوق نہیں بلکہ اپنی خواہشوں اور بدعات کے پیچھے چلنے والے ہیں۔ 'بِغَیْرِ عِلْمٍ' میں 'علم' سے مراد دلیل و حجت ہے۔ یعنی اس پیروی میں انھوں نے علم اور دلیل کو رہنما نہیں بنایا ہے بلکہ آنکھ بند کر کے خواہشوں کے پیچھے چل پڑے ہیں۔

'فَمَنْ یَّهْدِیْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ' یعنی جو اللہ کے قانون کی زد میں آکر گمراہ ہو چکے ہوں بھلا ان کو کون راہ یاب کر سکتا ہے! اللہ نے رہنمائی کے لیے انسان کو عقل عطا فرمائی ہے لیکن بہت سے شامت زدہ عقل کے بجائے اپنی باگ اپنی خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں۔ ایسے کج عقلوں کو خدا ان کی خواہشوں کے پیچھے آوارہ گردی کے لیے چھوڑ دیا کرتا ہے۔ 'وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ' پھر وہ اسی آوارہ گردی میں زندگی گزار دیتے ہیں۔ نہ اس دنیا میں ان کو اس ضلالت سے نکالنے میں کوئی مددگار بنتا اور نہ آخرت میں ان کو ان کے مہلک انجام سے بچانے میں کوئی ان کا مددگار بن سکے گا۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۳۰-۳۹

اوپر کی آیات میں مشرکین کے ان تمام اعتراضات کا، جو انھوں نے رومیوں کی شکست اور مجوسیوں

کی نمع کر دیل بنا کر اسلام کی دعوت کے خلاف اٹھاتے، جواب دیا گیا۔ آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ دینِ فطرت ——— اسلام ——— پر قائم رہنے اور اس کے دونوں بنیادی ستون ——— نماز اور انفاق ——— قائم کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے اور آخر میں قریش کو تنبیہ کیا گیا ہے کہ ان کے عقیدہ و عمل کے فساد نے ان کا ہر طرف سے احاطہ کر لیا ہے اس وجہ سے اب ان کے محاسبہ کا وقت قریب آلگا ہے۔ وہ جلد اپنے انجام سے دو چار ہوں گے اور جو لوگ دینِ قیم ملتِ ابراہیم پر پوری مضبوطی سے قائم رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے نوازے گا ——— اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ
لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۰ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۳۱ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ
كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۳۲ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا
رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۝۳۳ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۥ وقفة
فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳۴ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا
بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ۝۳۵ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ
تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ۝۳۶ اَوَلَمْ
يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۳۷ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ
وَابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَاُولٰٓئِكَ

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ
فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ
اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

ترجمۂ آیات ۳۰-۳۹

پس تم اپنا رُخ یکسو ہو کر دینِ حنیفی کی طرف کرو۔ اس دینِ فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف متوجہ ہو کر اور اسی سے ڈرو اور نماز کا اہتمام رکھو۔ اور تم لوگ مشرکین میں سے نہ ہو۔ ان مشرکین میں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور گروہ گروہ بن گئے۔ ہر پارٹی بس اسی پر مگن ہے جو اس کے اپنے پاس ہے۔ ۳۰-۳۲

جب لوگوں کو کوئی تکلیف لاحق ہوتی ہے تو اپنے رب کو پکارتے ہیں اسی کی طرف متوجہ ہو کر۔ پھر جب اللہ ان کو اپنی رحمت سے شاد کام کر دیتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے کہ جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا اس کی ناشکری کریں تو چند روز حظ اٹھا لو، عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا۔ کیا ہم نے ان پر کوئی ایسی دلیل اتاری ہے جو ان چیزوں کی شہادت دے رہی ہو جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں! ۳۳-۳۵

اور جب ہم لوگوں کو رحمت سے شاد کام کرتے ہیں تو وہ اس پر اترانے لگتے ہیں اور اگر ان کے اعمال کے سبب سے ان کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو وہ فوراً مایوس ہو جاتے ہیں۔ کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہی کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لیے

چاہتا ہے فراخ اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان والے ہیں۔ ۳۶-۳۷

پس قرابتدار کو اور مسکین و مسافر کو اس کا حق دو۔ یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو سودی قرض تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ دوسروں کے مال کے اندر پروان چڑھے تو وہ اللہ کے ہاں پروان نہیں چڑھتا اور جو تم زکوٰۃ دو گے اللہ کی رضا جوئی کے لیے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کے ہاں اپنے مال کو بڑھانے والے ہیں۔ ۳۸-۳۹

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

دینِ فطرت کی پیروی کی ہدایت

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰)

یہاں خطاب واحد کے صیغہ سے ہے جس کا ظاہر قرینہ یہی ہے کہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے خطاب ہے۔ چنانچہ بعد کی آیت میں آپ دیکھیں گے کہ حال اور خطاب کے تمام صیغے جمع استعمال ہوئے ہیں۔ اب یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے امت کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ اوپر جو دلائل بیان ہوئے ہیں ان سے یہ بات بالکل مبرہن ہو گئی کہ تمھاری دعوت اور تمھارے پیش کردہ دین کے برخلاف تمھارے مخالفوں کے سارے اعتراضات بالکل لایعنی ہیں تو تم بالکل یکسو ہو کر اپنا رخ اللہ کے حقیقی دین کی طرف رکھو اور ان مخالفوں کی یاوہ گوئی کی مطلق پروا نہ کرو۔ 'الدِّیْن' سے مراد اللہ کا حقیقی دین۔ اسلام۔ ہے جس کی دعوت اس کے تمام نبیوں اور رسولوں نے دی اور جس کی تکمیل نبی امی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوئی۔ یہی دین اللہ تعالیٰ کا اصلی دین ہے چنانچہ فرمایا ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (اصلی دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہے) 'حَنِیْفًا' کے معنی یکسو ہو کر یعنی شرک کے تمام علائق سے کٹ کر اس طرح اپنا رخ اس دینِ توحید کی طرف کرو جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا رخ اس دین کی طرف کیا ۔۔۔ یہ لفظ قرآن میں خاص طور پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لیے استعمال

ہوا ہے اس وجہ سے اس لفظ کے استعمال میں اس حنیفیت اور یکسوئی کے لیے ایک یاددہانی ہے جس کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم فرمائی۔

'فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا' یہاں ایک فعل محذوف ہے جو سابق فعل سے مستفاد ہوتا ہے یعنی ہر طرف سے کٹ کر اس دین فطرت کی پیروی کرو جس پر خاطر فطرت نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اس حذف فعل کے فائدے کی طرف ہم دوسری جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سے مقصود مخاطب کی ساری توجہ مفعول پر مرتکز کرنا ہوتا ہے۔ یہ اس 'الدین' کی صحت و صداقت کی دلیل بیان ہوئی ہے جس کی طرف یکسو ہونے کی اوپر والے ٹکڑے میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ یہ دین کوئی خارج کی چیز نہیں ہے جو تم پر اوپر سے لادی جا رہی ہو بلکہ یہ عین تمہاری فطرت کا بروز اور تمہارے اپنے باطن کا خزانہ ہے جو تمہارے دامن میں ڈالا جا رہا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ جو فلسفی یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک صفحۂ سادہ اور تمام تر اپنے ماحول کی پیداوار اور الف و عادت کی مخلوق ہے، ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہترین ساخت اور بہترین فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اس کو خیر و شر اور حق و باطل کی معرفت عطا فرمائی ہے اور نیکی کو اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کا جذبہ بھی اس کے اندر ودیعت فرمایا ہے لیکن اس کی یہ فطرت حیوانات کی جبلت کی طرح نہیں ہے کہ وہ اس سے انحراف نہ اختیار کر سکے بلکہ وہ اپنے اندر اختیار بھی رکھتا ہے اس وجہ سے بسا اوقات وہ اس دنیا کی محبت اور اپنی خواہشوں کی پیروی میں اس طرح اندھا ہو جاتا ہے کہ حق و باطل کا شعور رکھتے ہوئے نہ صرف باطل کی پیروی کرتا ہے بلکہ باطل کی حمایت میں فلسفے بھی ایجاد کر ڈالتا ہے۔

انبیاء فطرت کو اجاگر کرنے کے لیے آئے

انسان انبیائے کرام کی رہنمائی کا محتاج اس وجہ سے نہیں ہوا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز یا ان کے شعور سے عاری تھا بلکہ اس وجہ سے ہوا کہ اس راہ میں اس کو اس کی بعض کمزوریوں کے سبب سے، جن کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں، بہت سے مغالطے پیش آ سکتے تھے نیز مبادیٔ فطرت کے تمام لوازم اور ان کے سارے مقتضیات کو سمجھنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی رہنمائی کے لیے نبی و رسول بھیجے۔ ان نبیوں اور رسولوں کی تعلیمات چونکہ انہی مبادی پر مبنی ہیں جو انسان کے اندر ودیعت ہیں اس وجہ سے جو سلیم الطبع تھے انھوں نے نبیوں کی ہر بات کو اپنے ہی دل کی آواز سمجھا، صرف ان لوگوں نے ان کی مخالفت کی جنھوں نے اپنی فطرت مسخ کر ڈالی تھی، اگرچہ اپنے دلوں کے اندر وہ بھی رسولوں کی صداقت و حقانیت کے معترف رہے۔ اس مسئلہ پر ہم سورۂ ہود اور سورۂ نور کی تفسیر میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔ وضاحت مطلوب ہو تو ان پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ قرآن کو 'ذکر' اور 'ذکریٰ' جو کہا گیا ہے اس میں بھی یہی پہلو ہے کہ وہ درحقیقت انہی حقائق کی یاددہانی کرتا ہے جو انسان کے اندر موجود ہیں لیکن اس نے خود فراموشی میں ان پر نسیان کا پردہ

ڈال رکھا ہے۔

'لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ' میں لائے نفی، نفی امکان یا نفی وقوع کے مفہوم میں نہیں ہے بلکہ نفی جواز کے مفہوم میں ہے۔ 'خلق' سے مراد وہی فطرت ہے جو اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے۔

فطرت سے انحراف تباہی ہے

مطلب یہ ہے کہ جو چیز اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے اس کو بدلنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو ہر چیز کا خالق ہے وہ اپنی مخلوقات کے مقاصد و مقتضیات کو جتنے بہتر طریقے پر جانتا یا جان سکتا ہے کوئی دوسرا نہیں جان سکتا کہ وہ کسی چیز میں ترمیم و تغیر کرنے کا حقدار بن سکے۔ اگر کوئی شخص اس کی جسارت کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی چیز کی اصلاح کا مدعی ہے جو بالبداہت ایک حماقت ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ خدا نے آنکھیں پیشانی کے ساتھ لگائی ہیں، کوئی ان کو گدی یا پاؤں کے ساتھ لگانے کی کوشش کرے یا اللہ تعالیٰ نے عورت کو عورت اور مرد کو مرد بنایا لیکن عورت مرد بننے کے لیے زور لگائے یا مرد عورت بننے کی خواہش مند ہو جائے۔ اس قسم کی سعی نامراد کا نتیجہ بگاڑ اور فساد کے سوا کچھ اور نہیں نکل سکتا۔ بالکل یہی حال دین فطرت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جو مبادی فطرت کے اندر ودیعت فرمائے ہیں انہی پر انسان کی دنیا میں صلاح اور آخرت میں فلاح منحصر ہے۔ اگر انسان اس سے ذرا سا انحراف اختیار کرے تو وہ خدا کی صراط مستقیم سے ہٹ جائے گا جس کا لازمی نتیجہ اس کے دین اور اس کی دنیا دونوں کی تباہی ہے اگرچہ وہ یہ انحراف علم اور سائنس کے کتنے ہی بلند بانگ دعاوی کے ساتھ کرے۔

'ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ' فرمایا کہ یہی دین سیدھا دین ہے یعنی اس کو انسان کی عقل اور اس کی فطرت کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا نہایت سیدھا اور قریبی راستہ ہے، اس میں کہیں کوئی کج پیچ نہیں ہے۔

'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ' لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے اس وجہ سے انھوں نے اس میں بگاڑ پیدا کیا اور اب اس بگاڑ ہی پر قائم رہنے یا لوگوں کو اس پر قائم رکھنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں۔

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۳۱)

حنیفیت کی تاکید

'مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ' حال پڑا ہوا ہے 'فَاَقِمْ وَجْهَكَ' کی ضمیر خطاب سے۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ لفظاً یہ خطاب اگرچہ واحد ہے لیکن منشأ یہ جمع کے حکم میں ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو خطاب ہے وہ امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے۔ اس حال کے جمع لانے سے خطاب کی یہ نوعیت بالکل مبرہن ہو گئی۔ اوپر والی آیت میں حنیفیت کی تاکید فرمائی ہے، اس آیت میں 'انابت' اور 'تقویٰ' کی تاکید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے مجرد عقلی یکسوئی کافی نہیں ہے بلکہ دل کی انابت و خشیت بھی مطلوب ہے، اور حدود الٰہی کی پوری پوری پاسداری بھی۔

'وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ'۔ نماز اس دینِ قیم کے بنیادی احکام میں سے ہے اور یہی اس حنیفیت اور انابت و تقویٰ کی محافظ اور اس کا مظہر ہے جس کی یہاں ہدایت فرمائی گئی ہے۔

'وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ' یہ تنبیہ ہے کہ مشرکین سے دور رہو اس لیے کہ انھوں نے یہ ساری چیزیں برباد کر دی ہیں جو دینِ قیم کے لوازم میں سے ہیں۔

مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۲)

مشرکین سے بیزاری کا اظہار

یہ انہی مشرکین کی تفصیل ہے جن کے طریقہ سے بچنے کی اوپر والی آیت میں ہدایت فرمائی گئی ہے۔ اس وضاحت سے کلام بالکل مطابقِ حال ہو گیا ہے۔ اس کے اول مصداق قریش ہیں جنھوں نے اس دین کو، جو ان کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ذریعہ سے ملا، شرک میں مبتلا ہو کر، بالکل ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان کو ایک خدا کی تعلیم دی تھی لیکن انھوں نے سینکڑوں خدا بنا ڈالے اور ہر گروہ اپنے معبود پر اس طرح فدا تھا کہ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مسلمانوں کو یہ ہدایت اس لیے نہیں فرمائی گئی کہ ان میں سے کسی کے مشرکین کے ساتھ جا ملنے کا اندیشہ تھا بلکہ یہ شرک اور مشرکین سے بیزاری کا اظہار ہے جو مشرکین کے بجائے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے ــــ گویا مشرکین اپنی ہٹ دھرمی کے سبب سے لائقِ خطاب نہیں رہے اس وجہ سے بات اپنوں کو مخاطب کر کے کہہ دی گئی۔

وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِیْبِیْنَ اِلَیْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ یُشْرِكُوْنَ ۙ لِیَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَیْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۪ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳۳-۳۴)

یہ مشرکین کو براہِ راست دھمکی ہے کہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کسی گرداب میں پھنستے ہیں تب تو نہایت نیازمندی سے اور تذلل کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں لیکن جب خدا ان کو اپنی رحمت سے نواز دیتا ہے تو پھر یہ خدا کو بھول کر اپنے انہی معبودوں کی طرف لوٹ جاتے ہیں جن کو انھوں نے شریک بنا رکھا ہے۔ یہ مضمون پیچھے مختلف اسلوبوں سے گزر چکا ہے اور آگے سورۂ لقمان کی آیت ۳۲ میں ایک نئے اسلوب سے آئے گا۔

'لِیَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَیْنٰهُمْ فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ' یہ مضمون بعینہٖ عنکبوت کی آیت ۶۶ میں بھی گزر چکا ہے۔ یعنی وہ نعمت تو پاتے ہیں خدا سے لیکن گن گاتے ہیں دوسروں کے اور اس طرح خدا کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔ اس کے بعد نہایت تند لہجہ میں مخاطب کر کے فرمایا کہ اچھا کچھ دن ہماری نعمتوں سے اپنی اس ناسپاسی و ناشکری کے باوجود، فائدہ اٹھا لو، عنقریب تمھاری اس حرکت کا خمیازہ تمھارے سامنے آنے والا ہے۔

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ یَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ یُشْرِكُوْنَ (۳۵)

ہم پیچھے اس اسلوب کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اس قسم کے سوالیہ جملوں میں کلام کا ایک ٹکڑا حذف ہو جاتا ہے جس کی غمازی متکلم کا لب و لہجہ کر دیتا ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہو گا کہ ان نادانوں نے ازخود خدا کے شریک بنا رکھے ہیں یا ہم نے کوئی دلیل اتاری ہے جو ان کے شریکوں کے شریکِ خدا ہونے کی شہادت دے۔

رہی ہو!! اس اسلوبِ کلام میں طنز و تحقیر اور غیظ و غضب سب جمع ہو جاتا ہے۔ آخری گروپ کی سورتوں میں اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔

توحید کی ایک نفسیاتی دلیل

ان آیات میں توحید کی ایک نہایت اہم نفسیاتی دلیل کی طرف توجہ دلائی گئی۔ وہ یہ کہ جب انسان پر حقیقی افتقار اور بے بسی کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ تمام دوسرے اسباب و وسائل اور خود تراشیدہ معبودوں کو چھوڑ کر پوری انابت کے ساتھ اپنے ربِّ حقیقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی اصل فطرت کے اندر ایک خدا کے سوا کسی اور کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ لیکن جب افتقار کی حالت ختم ہو جاتی ہے تو پھر وہ انہی گمراہیوں میں کھو جاتا ہے جن میں وہ اس سے پہلے کھویا ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شرک کا اصل سبب انسان کی غفلت ہے۔ یہ غفلت جب قدرت کی کسی تنبیہ سے دور ہو جاتی ہے تو اس کو اصل حقیقت نظر آجاتی ہے لیکن جب حالات بدل جاتے ہیں تو اس کی سابق غفلت پھر عود کر آتی ہے۔

وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ (۳۶)

تکلیف اور راحت دونوں آزمائش ہیں

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تو جب لوگوں کو اپنی نعمت سے نوازتا ہے تو یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب کے شکر گزار ہوں اور اگر ان کو ان کے اعمال کے نتیجے میں کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے تو یہ چاہتا ہے کہ وہ اس آزمائش پر صبر کریں لیکن بہت تھوڑے لوگ ایسے نکلتے ہیں جو نعمت پر شکر اور مصیبت پر صبر کریں۔ زیادہ لوگ ایسے ہی نکلتے ہیں جو نعمت پاتے ہیں تو فخر کرتے ہیں اور اکڑتے ہیں اور اگر کسی آزمائش میں پڑتے ہیں تو دل شکستہ اور مایوس ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ باتیں سب عام الفاظ میں ارشاد ہوئی ہیں اس لیے کہ عام حالت درحقیقت یہی ہے لیکن ان آیات کے نزول کے وقت ظاہر ہے کہ ان کا اشارہ قریش کی طرف تھا اور اس طرح در پردہ ان کو متنبہ فرمایا گیا کہ آج تو خدا کی بخشی ہوئی نعمت پر اسی کے آگے اکڑتے ہو لیکن کل کو اگر کسی پکڑ میں آگئے تو روؤ گے اور چلاؤ گے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیت کے الفاظ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ سے یہ بات نکلتی ہے کہ لوگوں کو اگر کوئی بری افتاد اس دنیا میں پیش آتی ہے تو ان کے برے اعمال کے نتیجے میں پیش آتی ہے۔ جہاں تک بروں کا تعلق ہے سنتِ الٰہی یہی ہے جو اس آیت میں بیان ہوئی ہے لیکن اس دنیا میں نیکوں یہاں تک کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی بڑی بڑی آزمائشیں پیش آتی ہیں۔ اس قسم کی آزمائشیں اللہ تعالیٰ کی اس سنتِ ابتلاء کے تحت پیش آتی ہیں جو اس کے تمام بندوں کے لیے عام ہیں، خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ ان کا تعلق ضروری نہیں کہ آدمی کے اعمال ہی سے ہو بلکہ اکثر حالات میں مجرد اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تربیت ان کی مقتضی ہوتی ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۳۷)

نعمت اور آزمائش دونوں میں صحیح رویہ

یعنی کیا ان لوگوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ رزق کی فراخی ہو یا تنگی دونوں اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

وہی جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو تنگ کر دیتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے کشادہ کر دیتا ہے۔ اس کا یہ چاہنا تمام تر اس کی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے نہ تو کسی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مایوس ہو اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ اترانے اور اکڑنے والا بنے۔ اترانے کا حق اس کو ہے جس کا رزق اس کے اپنے اختیار میں ہو اور خدا سے مایوس وہ ہو جو اپنے لیے کوئی اور در دروازہ تلاش کر سکے۔ جب ان دونوں میں سے کوئی بات بھی ممکن نہیں ہے تو صحیح رویہ صرف یہی ہے کہ بندہ نعمت پر شکر کرے اور آزمائش پر صبر۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں ہی چیزوں سے بندے کا امتحان کرتا ہے اور یہ آخرت میں کھلے گا کہ کون اس کے امتحان میں کامیاب ہوا اور کون ناکام!

فرمایا کہ اگر لوگ اس حقیقت پر غور کریں تو اس میں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان لانے والے ہیں۔

اس میں سب سے بڑی نشانی تو اس بات کی ہے کہ اس کائنات کے تمام امور اللہ وحدہ لاشریک ہی کے اختیار میں ہیں۔ جس طرح موت اور زندگی پر کسی کو اختیار نہیں ہے اسی طرح رزق کی تنگی و کشادگی پر بھی کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

دوسری نشانی اس بات کی ہے کہ اس دنیا میں رزق کی کشادگی نہ کسی کی کامیابی کی دلیل ہے نہ اس کی تنگی کسی کی ناکامی کی، بلکہ یہ دونوں ہی چیزیں بندے کے امتحان کے لیے ہیں۔ کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ آخرت میں ہوگا۔

تیسری نشانی اس میں یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں ہر وقت بندے کے شکر اور صبر کا امتحان ہوتا رہتا ہے اور انسان کے تمام اعلیٰ اوصاف کا سرچشمہ یہی دو صفتیں ہیں۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳۸)

اوپر آیت ۳۱ میں دینِ فطرت کے اولین رکن نماز کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد بعض مناسب مقام تنبیہات آ گئی تھیں جن میں آخری تنبیہ یہ تھی کہ جس کو رزق کی فراخی حاصل ہو تو اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کو اب وجد کی وراثت یا اپنے فضل و کمال کا ثمرہ سمجھ کر اس پر اترائے بلکہ اس کو اپنے رب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

شکر گزاری کا طریقہ — اس آیت میں اس شکر گزاری کا طریقہ بتا دیا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے مال میں سے قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دے۔ 'حقّہ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ رزق کی کشادگی عطا فرماتا ہے اس کے مال میں درحقیقت دوسروں کے حقوق بھی ہوتے ہیں جو اس کی امانت میں ہوتے ہیں، اس وجہ سے یہ اس کا فرض ہے کہ وہ ان حقوق کو ادا کرے۔ اگر اس نے اس میں کوتاہی کی تو وہ حقوق کا غصب کرنے والا ٹھہرے گا۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی رضا کے طالب ہیں ان کے لیے یہی طریقہ بہتر ہے اور آخرت میں

وہی فلاح حاصل کرنے والے بنیں گے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ اپنے مال کو فخر و غرور یا عیش و تنعم یا مال پروری کا ذریعہ بنائیں گے ان کا مال خدا کے ہاں موجب وبال و خسران ہوگا۔

وَمَآ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّیَرۡبُوَا۟ فِیۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرۡبُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ ۚ وَمَآ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ زَکٰوۃٍ تُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُضۡعِفُوۡنَ (۳۹)

'ربا' اس مال کو بھی کہتے ہیں جو کسی کو سودی قرض کے طور پر دیا جائے اور اس سود کو بھی کہتے ہیں جو کسی قرض پر حاصل کیا جائے۔ اس لفظ کو جن لوگوں نے ہدیہ یا عطیہ کے معنی میں لیا ہے انھوں نے بالکل غلط لیا ہے۔ یہ لفظ یہاں اس اسلوب پر استعمال ہوا ہے جس کو تسمیۃ الشیء بما یئول الیہ کہتے ہیں جس طرح اِنِّیۡۤ اَعۡصِرُ خَمۡرًا ہے۔ ہم نے اس آیت پر ایک مستقل مضمون لکھ دیا ہے جو ہمارے مجموعۂ مضامین میں ملے گا۔

لفظ 'زکوٰۃ' یہاں اصطلاحی زکوٰۃ کے مفہوم میں نہیں بلکہ صدقات کے عام مفہوم میں ہے۔ اس مفہوم میں اس کا استعمال قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی ہوا ہے۔

الفاق کا ضد کردار

اوپر کی آیت میں انفاق کا جو حکم دیا ہے یہ اس کے ضد کردار کا بیان ہے کہ جو لوگ مال کو پاکر اس کو اللہ کی رضا جوئی میں خرچ کرنے کے بجائے مال پروری کی فکر میں لگ جاتے ہیں اور اس کو سودی قرض کے طور پر دیتے ہیں کہ ان کا مال دوسروں کے مال کا خون چوس کر فربہ ہو جائے تو وہ یاد رکھیں کہ اس قسم کا مال اس دنیا میں موٹا ہو تو ہو لیکن خدا کے ہاں اس میں کوئی بڑھوتری نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ اس مال کو، جیسا کہ دوسرے مقام میں وضاحت ہے، مٹا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اس مال میں بڑھوتری ہوتی ہے جو خدا کی رضا جوئی کے لیے خدا کی راہ میں خرچ کیا جاتا ہے۔

اس آیت کے الفاظ پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ سود خوار کے مال کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے سانڈے سے تشبیہ دی ہے جو دوسرے کی چراگاہ میں چر کر موٹا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی فربہی میں کوئی خیر و برکت نہیں ہے۔ خیر و برکت صرف اس مال میں ہے جو اپنی چراگاہ میں چر کر پروان چڑھتا ہے پھر خدا کی رضا جوئی اور ادائے حقوق کی راہ میں قربان ہوتا ہے۔ فرمایا کہ بے شک یہ لوگ اپنے سرمائے کو بڑھانے والے بنیں گے۔ اس بڑھانے کی شرح قرآن کے دوسرے مقامات میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔

مال جمع کرنے کی خواہش بالعموم مستقبل کے اندیشوں کو پیش نظر رکھ کر ہوتی ہے لیکن انسان مستقبل کو بہت تنگ نگاہ سے دیکھتا ہے اس وجہ سے اس کی نظر اسی زندگی تک محدود رہ جاتی ہے۔ اصل مستقبل یعنی آخرت کو وہ نہیں دیکھتا حالانکہ اس کے مال کا اصلی فائدہ صرف اس صورت میں اس کو حاصل ہو سکتا ہے جب وہ اس دنیا کے بنکوں میں جمع کرنے کے بجائے خدا کے بنک میں اس کو جمع کرے تاکہ وہ اس کی ابدی زندگی میں اس کے کام آئے۔

یہاں اس بات کو بھی یاد رکھیے جس کی طرف ہم دوسرے مقام میں اشارہ کر چکے ہیں کہ ایک تاجر یا کاروباری کے سرمایہ میں جو اپنے سرمایہ کو کسی جائز تجارت یا کاروبار میں لگا کر اس کو بڑھاتا ہے اور ایک سود خور کے سرمایہ میں جو سود پر قرض دے کر اس میں اضافہ کرتا ہے یہ بنیادی فرق ہے کہ تاجر کا سرمایہ ہر قسم کے حالات و خطرات کا مقابلہ کر کے خود اپنی چراگاہ میں فربہی و توانائی حاصل کرتا ہے اور سود خور کا سرمایہ ایک کمین گاہ میں چھپ کر، بغیر کوئی خطرہ مول لیے، حاجتمندوں سے غنیمت حاصل کرتا اور موٹا ہوتا ہے۔ ان دونوں کے اسی بنیادی فرق کے سبب سے اسلام نے تجارت اور کاروبار کی بڑھوتری کو مبارک قرار دیا ہے اور سود کی بڑھوتری کو فاسد اور حرام۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۰ - ۶۰

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کو دھمکی دی گئی ہے کہ انھوں نے دینِ فطرت کی دونوں بنیادیں ـــــ توحید اور ہمدردی خلق ـــــ ڈھا دی ہیں اور اس طرح پورے نظامِ معاشرت و تمدن کو بگاڑ کر خدا کی زمین کو فساد سے بھر دیا ہے۔ اس چیز نے ان کو مستحق بنا دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کسی گرفت میں آئیں تاکہ وہ اپنے اس فساد فی الارض کا کچھ مزا چکھیں۔

پھر مسلمانوں کو غلبہ و نصرت کی بشارت دی گئی ہے اور اس کائنات کے شواہد سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کسی پر نازل کرنا چاہتا ہے تو اپنے تصرفِ غیبی سے ناسازگار حالات کو بھی سازگار بنا دیتا ہے۔

اسی کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو دینِ فطرت پر جمے رہنے کی تاکید اور ان لوگوں سے بے پروا ہونے کی ہدایت فرمائی گئی جو بالکل اندھے بہرے بن چکے ہیں ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۰ - ۶۰
اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ هَلْ
مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی
عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی
النَّاسِ لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾ قُلْ
سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ

كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ ﴿٤٢﴾ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِن قَبْلِ
أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ ﴿٤٣﴾ مَن كَفَرَ
فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِأَنفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ ﴿٤٤﴾ لِيَجْزِيَ
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِن فَضْلِهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ﴿٤٥﴾
وَمِنْ آيَاتِهِ أَن يُرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ وَلِيُذِيقَكُم مِّن رَّحْمَتِهِ
وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٤٦﴾
وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُم بِالْبَيِّنَاتِ
فَانتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرَمُوا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٧﴾
اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ
كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ
فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٤٨﴾
وَإِن كَانُوا مِن قَبْلِ أَن يُنَزَّلَ عَلَيْهِم مِّن قَبْلِهِ لَمُبْلِسِينَ ﴿٤٩﴾
فَانظُرْ إِلَىٰ أَثَرِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ
ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٥٠﴾ وَلَئِنْ أَرْسَلْنَا
رِيحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوا مِن بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ ﴿٥١﴾ فَإِنَّكَ
لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿٥٢﴾
وَمَا أَنتَ بِهَادِ الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا
فَهُم مُّسْلِمُونَ ﴿٥٣﴾ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِن ع ٥ ١٣ ٨

بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ۭ يَخْلُقُ
مَا يَشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴿۵۴﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ
الْمُجْرِمُوْنَ ڏ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ۭ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ
قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ
اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۡ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾
فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾
وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَلَىِٕنْ جِئْتَهُمْ
بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ
يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ
ع ۶ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾

ترجمۂ آیات ۴۰ - ۰۰

اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تم کو روزی دی، پھر تم کو موت دیتا ہے، پھر تم کو زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے شریکوں میں سے بھی کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کوئی کام کرتا ہو! وہ پاک ہے اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں! خشکی اور تری ہر جگہ لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں فساد چھا گیا ہے تاکہ اللہ ان کی بعض کرتوتوں کا مزہ چکھائے تاکہ یہ رجوع کریں۔ ۴۰ - ۴۱

ان سے کہو کہ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو پہلے ہو گزرے ہیں! ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے۔ ۴۲

پس اپنا رُخ دینِ قیم کی طرف سیدھا رکھو قبل اس کے کہ اللہ کی طرف سے ایک

ایسا دن آجائے جس کے لیے پھر واپسی نہیں ہے۔ اس دن وہ جدا جدا ہوجائیں گے۔
جس نے کفر کیا اس کا وبال اس پر ہوگا اور جنھوں نے نیک اعمال کیے وہ بے شک اپنے
لیے زمین ہموار کر رہے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بدلہ دے ان لوگوں کو جو ایمان
لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے۔ اللہ کافروں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا۔ ۴۳-۴۵

اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو اپنے ابر رحمت کی
خوش خبری دینے والی بنا کر اور تاکہ وہ تم کو اپنی رحمت سے نوازے اور تاکہ کشتیاں اس
کے حکم سے چلیں اور تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ ۴۶

اور ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے ان کی قوموں کی طرف۔ پس وہ ان کے پاس
کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جنھوں نے جرم کیا۔ اور
اہلِ ایمان کی نصرت ہم پر لازم تھی۔ اللہ ہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو پس وہ بادلوں کو
ابھارتی ہیں پھر اللہ ان کو پھیلا دیتا ہے آسمان میں جس طرح چاہتا ہے اور ان کو تہ بہ تہ
کرتا ہے پھر تم دیکھتے ہو مینہ کو ان کے بیچ سے نکلتے ہوئے پس جب وہ اس کو نازل کرتا
ہے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے تو وہ یکایک خوش ہوجاتے ہیں حالانکہ وہ
اس کے نازل کیے جانے سے قبل، اس خوشی سے پہلے، بالکل مایوس تھے۔ پس رحمتِ الٰہی
کے آثار کو دیکھو، وہ کس طرح زمین کو زندہ کر دیتا ہے اس کے مُردہ ہوجانے کے بعد!
بے شک وہی مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۴۷-۵۰

اور اگر ہم دوسری ہوا بھیج دیں پس وہ کھیتوں کو زرد ہوئی دیکھیں تو اس کے بعد وہ کفر
کرنے والے بن کر رہ جائیں گے۔ تو تم نہ مُردوں کو اپنی پکار سنا سکتے اور نہ بہروں کو سنا
سکتے جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جا رہے ہوں۔ اور نہ اندھوں کو تم ان کی ضلالت سے موڑ کر

راہ پر لا سکتے۔ تم تو بس ان کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لانے والے ہوں، پس وہی اطاعت کرنے والے ہیں۔ ۵۱-۵۳

اللہ ہی ہے جس نے تم کو ناتوانی سے پیدا کیا، پھر ناتوانی کے بعد قوت بخشی، پھر قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے اور وہی علیم قدیر ہے۔ ۵۴

اور جس دن قیامت واقع ہوگی، مجرم قسم کھا کر کہیں گے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ اسی طرح ان کی عقلیں اوندھی ہو جاتی رہی ہیں۔ اور جن کو علم و ایمان عطا ہوا ہوگا وہ کہیں گے کہ اللہ کے رجسٹر کی رُو سے تو تم قیامت تک رہے ہو۔ سو یہ حشر کا دن ہے لیکن تم جانتے نہیں تھے۔ پس اس دن ان لوگوں کو ان کی معذرت کچھ نفع نہ دے گی جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہوگا اور نہ ان سے یہ چاہا جائے گا کہ وہ خدا کو راضی کریں۔ ۵۵-۵۷

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی تمثیلیں بیان کر دی ہیں اور اگر تم ان کے پاس کوئی سی نشانی بھی لاؤ گے تو جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یہی کہیں گے تم لوگ بالکل جھوٹے ہو۔ اسی طرح اللہ مہر کر دیا کرتا ہے ان لوگوں کے دلوں پر جو جاننا نہیں چاہتے۔ تو تم صبر کرو، بے شک اللہ کا وعدہ شدنی ہے اور یہ بے یقین نہ رکھنے والے تم کو بے وزن نہ بنانے پائیں۔ ۵۸-۶۰

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ط ھَلْ مِنْ شُرَکَآئِکُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِکُمْ مِّنْ شَیْءٍ ط سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۴۰)

قریش کو دھمکی

مجوسیوں کے وقتی غلبہ کو دلیل بنا کر قریش نے مسلمانوں کے غلبہ اور توحید و قیامت ہر چیز کو مشکوک بنانے کی جو مہم چلائی اس کی تردید پیچھے کی آیات میں تفصیل سے ہو چکی ہے۔ اب یہ قریش کو براہِ راست دھمکی دی جا رہی ہے کہ اس قسم کی طفل تسلیوں سے اپنے کو بہلانے کی کوشش نہ کرو بلکہ حقائق کا مواجہہ کرو۔ تم نے اپنے اعمال سے جو فساد اپنے چاروں طرف جمع کر لیا ہے اس کے نتائج کے ظہور کا وقت اب سر پر آگیا ہے اور تمہارے یہ فرضی دیوی دیوتا اس سے تمھیں بچا نہ سکیں گے۔ یہ آیت اسی دھمکی کی تمہید ہے۔ فرمایا کہ تم کو پیدا تو خدا نے کیا، روزی وہ دیتا ہے، موت اس کے اختیار میں ہے پھر تم کو زندہ وہ کرے گا۔ تم ان کاموں میں سے کسی ایک کام کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ تمہارے ان دیوتاؤں کے ہاتھوں انجام پاتا ہے یا وہ اس میں اللہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں تو آخر ان کے بل پر تم کب تک جیو گے اور اگر تم خدا کی پکڑ میں آگئے تو یہ تمہارے کیا کام آئیں گے؟

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ: اوپر کی بات تو ان کو خطاب کر کے فرمائی ہے اور یہ بات ان سے منہ پھیر کر فرمائی ہے۔ ان دونوں اسلوبوں کی بلاغت پر ہم مختلف مقامات میں گفتگو کر چکے ہیں۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (۴۱)

جس طرح روز و شب اور صبح و شام وغیرہ کے الفاظ احاطہ پر دلیل ہوتے ہیں اسی طرح بر و بحر کے الفاظ بھی اس طرح کے سیاق میں صرف احاطہ پر دلیل ہوتے ہیں۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے پر خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اعتقادی ہو یا عملی فساد طاری ہو چکا ہے۔ فکر و نظر کی صحت کا انحصار تمام تر اللہ تعالیٰ کے ایمان پر ہے اور عمل کی ساری استقامت اسلام پر مبنی ہے اور یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی انہدام دوسرے کے انہدام کو مستلزم ہے اور جب یہ دونوں منہدم ہو جائیں تو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر فساد لازماً مستولی ہو کے رہے گا۔ اگر ان دونوں کے انہدام کے باوجود کہیں زندگی کی چمک دمک نظر آتی ہے تو وہ بالکل عارضی چیز ہے اور جو لوگ اس کو کچھ اہمیت دیتے ہیں وہ فریبِ نظر میں مبتلا ہیں۔

لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ: یہ نتیجہ بیان ہوا ہے اس صورتِ حال کا۔ یعنی جب لوگ اپنے اعمال سے اس طرح زندگی کے ہر شعبہ کو فساد سے بھر دیتے ہیں تو وہ گویا زبانِ حال سے اللہ تعالیٰ کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ان کی کرتوتوں کا کچھ مزہ ان کو چکھائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اعمال کا کچھ مزا چکھاتا ہے اور مقصود اس سے ان کو متنبہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کریں اور غلط روی سے باز آکر زندگی کی صحیح شاہراہ کی طرف مڑیں۔

یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ رسولوں کی قوموں پر دو قسم کے عذاب آئے ہیں۔ اوّل تنبیہی پھر فیصلہ کن۔

یہاں قریش کو پہلے قسم کے عذاب سے ڈرایا ہے کہ تم نے اپنے اعمال سے اپنے آپ کو ایک تنبیہی عذاب کا مستحق بنا لیا ہے لیکن یاد رکھو کہ اگر وہ عذاب آ گیا اور تم نے اپنی روش نہ بدلی تو پھر وہ عذاب بھی آ جائے گا جو تمہاری کمر توڑ کے رکھ دے گا۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ (۴۲)

یعنی ان لوگوں سے کہو کہ اپنے آپ کو طفل تسلیوں سے نہ بہلاؤ بلکہ خود اپنی آنکھوں سے اپنے ملک کی پچھلی قوموں کے آثار پر نگاہ ڈالو کہ ان کا انجام کیا ہو چکا ہے۔ ان کی اکثریت بھی تمہاری ہی طرح مشرک تھی۔ جس طرح تمہارے اندر سے موحد بہت تھوڑے نکلے ہیں اسی طرح ان کے اندر سے بھی خالص خدا پرست بہت تھوڑے نکلے۔ بالآخر اللہ نے ان تھوڑے سے خدا پرستوں کو علیحدہ کر لیا اور اکثریت کو اپنے عذاب سے تباہ کر دیا۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ ۖ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ (۴۳)

آنحضرت صلعم کی طرف التفات

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی طرف اس قسم کا التفات ہے جس قسم کا التفات اوپر آیت ۳۱ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ ہٹ دھرم اور شامت زدہ لوگ نہیں سنتے تو ان کی پروا نہ کرو بلکہ تم خدا کے سیدھے اور فطری دین کی طرف یکسو ہو جاؤ اور اس دن کی مسئولیت سے بچنے کی فکر کرو جس کا آنا قطعی ہے اور جب وہ دن خدا کی طرف سے ظہور میں آئے گا تو کسی کی طاقت نہیں ہو گی کہ اس کو ٹال سکے۔ 'يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ' یعنی آج تو ان لوگوں کو اپنے شرکاء و شفعاء پر بھی اعتماد ہے اور اپنی جمعیت پر بھی ناز ہے لیکن اس دن سب متفرق ہو جائیں گے، کوئی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔ آیت ۱۴ میں لفظ 'يَتَفَرَّقُونَ' آیا ہے، یہاں 'يَصَّدَّعُونَ' ہے۔

مَن كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِأَنفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ (۴۴)

اس دن ہر ایک اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔ جس نے کفر کیا ہو گا اس کے کفر کا وبال اسی پر آئے گا، کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا۔ اسی طرح جو لوگ عمل صالح کر رہے ہیں وہ درحقیقت اپنے ہی مستقبل کو سنوار رہے ہیں اور اس کا صلہ انہی کو ملنے والا ہے۔

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِن فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (۴۵)

قیامت کا اصل مقصد

اس کا تعلق اوپر والی آیت 'مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ' سے ہے یعنی اس دن کے آنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان و عمل صالح والوں کو اپنے فضل سے صلہ دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کا اصل مقصود اہل ایمان کو جزا دینا ہے۔ کفار کو سزا دینا اس کی اصل غایت نہیں بلکہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ 'مِن فَضْلِهِ'

کے لفظ سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اہلِ ایمان کو جو صلہ ملے گا وہ محض ان کے اعمال کے پیمانے سے تول کر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے مطابق ملے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کا فضل ایسی چیز ہے کہ اس کا اندازہ ہم اپنے پیمانوں اور قیاسوں سے نہیں کر سکتے۔

اہلِ کفر سے نفرت۔

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ اس ٹکڑے میں کفر و اہلِ کفر کے لیے جو نفرت و کراہت چھپی ہوئی ہے قلم اس کی تعبیر سے قاصر ہے۔ اہلِ ایمان کے درجے و مرتبے کا اندازہ کرنے کے لیے تو تنہا یہی بات کافی ہے کہ آخرت کا ظہور ہی تمام تر ان کی داد و دہش اور ان کے انعام کے لیے ہے۔ رہے اہلِ کفر تو یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف یہ فرما کر ان کا ذکر ختم کر دیا کہ اللہ ان کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ ان کو پسند نہیں کرتا تو وہ جیسی جہنم میں بھی جا گریں خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَکُمْ مِّنْ رَّحْمَتِہٖ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْکُ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۴۶)

اس آیت اور اس کے بعد کی آیات میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ جس طرح دیکھتے ہو کہ گھٹی ہوئی فضا کے اندر سے اللہ تعالیٰ سازگار ہوا چلا دیتا ہے جو تمہارے لیے اس کے باران رحمت کی بشارت بن کر ظاہر ہوتی ہے تاکہ تم کو اپنے رزق و فضل سے نوازے اسی طرح موجودہ ناموافق حالات کے اندر سے بھی تمہارے لیے سازگار حالات پیدا کر دے گا۔ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْکُ بِاَمْرِہٖ یعنی یہی سازگار ہوائیں ہیں جن کے ذریعہ سے تمہاری کشتیاں بحکم خدا چلتی ہیں تاکہ تم ایک مقام سے دوسرے مقام کا سفر کر سکو۔ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ اور تاکہ تم تجارت وغیرہ کے ذریعہ سے اس کے رزق و فضل کے طالب بن سکو۔ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ یعنی ربوبیت کا یہ سارا نظام اس نے اس لیے قائم فرمایا ہے تاکہ تم اس کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو اور اس کے شکر گزار رہو۔ اس میں مسلمانوں کے لیے نہایت لطیف انداز میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ خدا کی نصرت و برکت تمہارے لیے ظاہر تو ہو گی لیکن اس کو پا کر اپنے رب سے غافل نہ ہو جانا بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے برابر شکر گزار رہنا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِہِمْ فَجَآءُوْہُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا ۭ وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ (۴۷)

یہ اسی اوپر والی حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں واضح فرمایا ہے کہ تم دنیا میں پہلے رسول نہیں ہو بلکہ تم سے پہلے بھی ہم رسول بھیج چکے ہیں تو ہماری جو سنت ان کے معاملے میں ظاہر ہو چکی ہے وہی تمہارے معاملے میں بھی ظاہر ہو گی۔ تم سے پہلے جو رسول آئے وہ بھی تمہاری طرح اپنی قوموں کے پاس کھلی کھلی نشانیاں اور دلیلیں لے کر آئے لیکن ان کی قوموں نے ان نشانیوں اور حجتوں کی قدر کرنے کے بجائے مجرمانہ روش اختیار کی اور اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی دشمن بن گئیں۔ بالآخر ان کی اس مجرمانہ روش کا نتیجہ یہ نکلا

کہ ہم نے ان سے ان جرائم کا انتقام لیا جن کی وہ اہلِ حق کے باب میں مجرم ہوئیں۔ اس لیے کہ اہلِ ایمان کی نصرت ہم پر حق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی معاملہ تمھارے دشمنوں کے ساتھ بھی ہوگا تم مطمئن رہو۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَ (۴۸-۴۹)

اوپر کی آیت میں نصرت کی جو بشارت اس قطعیت کے ساتھ دی گئی ہے وقت کے ظاہری حالات اس کے بالکل خلاف تھے اس وجہ سے مسلمانوں، بالخصوص عام مسلمانوں کو، اطمینان دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و رحمت کے ظہور کی ایک ایسی نشانی کی طرف توجہ دلائی جس کا تجربہ و مشاہدہ ہر شخص کو ہوتا رہتا ہے۔ فرمایا کہ یہ اللہ ہی کی قدرت اور شان ہے کہ وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو اپنی حکمت کے مطابق جس طرح چاہتا ہے فضا میں پھیلاتا اور ان کو تہ بہ تہ کرتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ ان کے درمیان سے مینہ نکلتا ہے تو پھر جو خدا کی اس رحمت سے فیضیاب ہوتے ہیں وہ یکایک خوشیاں منانے لگتے ہیں حالانکہ اس سے ذرا پہلے وہ اس سے بالکل مایوس ہوتے ہیں ــــــ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہی شانِ رحمت تمھارے لیے بھی ظاہر ہوگی۔ آج تمھیں یہ چیز بہت بعید نظر آتی ہے لیکن جب ظاہر ہوگی تو تمھیں یہ بہت قریب کی چیز معلوم ہوگی اور تم اس وقت خوش ہو جاؤ گے۔

'مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ' کے بعد پھر 'مِّنْ قَبْلِهٖ' میں بظاہر کچھ تکرار سی محسوس ہوتی ہے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تکرار نہیں ہے۔ بلکہ یہاں دو الگ الگ باتیں فرمائی گئی ہیں۔ یعنی بارش سے پہلے وہ بارش سے مایوس تھے اور بشارت کے ظہور سے پہلے خوشی سے۔

فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۵۰)

قیامت کا یہ ذکر مسلمانوں کی تسلی ہی کے ضمن میں ہے۔ اہلِ ایمان کی تمام امیدوں کا مرجع چونکہ آخرت ہی ہے اس وجہ سے اوپر کی آیات میں اس دنیا کے اندر ان کی کامیابی کے آثار کی طرف اشارہ کرنے کے بعد آخرت کی رحمت کے ظہور کی طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ جس طرح زمین میں اس کی رحمت کے آثار دیکھتے ہو کہ وہ اس کے خشک ہو جانے کے بعد اس کو دوبارہ باغ و بہار کر دیتا ہے اسی طرح وہ دوبارہ مردوں کو بھی زندہ کر دے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار آخرت کو جو جھٹلاتے اور اس کو محض تمھارا خواب و خیال قرار دیتے ہیں۔ تم ان کی لاطائلیوں کی پروا نہ کرو۔ خدا کی یہ عظیم رحمت ظاہر ہو کے رہے گی اور تمھارے یہ حریف اس دن اپنی بدبختی و محرومی پر اپنے سر پیٹیں گے۔ یہ حقیقت قرآن سے واضح ہے کہ قیامت دراصل اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا مقتضیٰ ہے اور اس کا اصل مقصد اہلِ ایمان کو ان کی جانبازیوں کا

صلہ دینا ہے۔ سورۂ انعام کی آیت ۱۲ 'كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں، اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ (۵۱)

ایک استدراک — یہ اوپر کی آیات ۴۸-۴۹ پر استدراک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کا عام حال یہ ہے کہ ذرا دیر میں مایوس ذرا دیر میں مگن ہو جاتے ہیں۔ بارش میں ذرا توقف ہو جائے تو سب کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں، بارش ہو جائے تو ناچنے کودنے لگتے ہیں اور اگر بارش کے بعد ہم کوئی ناسازگار ہوا بھیج دیں اور وہ اپنی اگی ہوئی فصلوں کا رنگ زرد پڑتے دیکھیں تو وہی ناشکری و مایوسی ان پر پھر چھا جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے متلوّن مزاج ہیں ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو، تمھاری باتیں صرف ان کے دلوں میں اتریں گی جو نعمت پر شکر اور مصیبت پر صبر کا مزاج رکھتے ہوں۔

لفظ 'رِیَاح' اور 'رِیح' کے فرق پر ہم اس کے محل میں بحث کر چکے ہیں۔ مقدم الذکر کا غالب استعمال سازگار اور موسمی ہواؤں کے لیے اور موخرالذکر کا عام استعمال آفت لانے والی ہوا کے لیے ہوتا ہے۔ 'فَرَاَوْهُ' میں ضمیر کا مرجع 'زَرْع' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ ہوگا جس کا قرینہ اوپر والی آیت میں موجود ہے اس لیے کہ 'يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا' کا مفہوم زمین کا سبزہ اور نباتات سے معمور ہو جانا ہے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۵۲-۵۳)

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایسے متلوّن مزاج اور بے ثبات ہیں کہ آن میں کچھ اور آن میں کچھ ہیں — ذرا میں مایوس اور ذرا میں مغرور ہو تے ہیں۔ خدا کی بے شمار نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی ان کے دل خدا پر نہیں جمتے، وہ روحانی و عقلی اعتبار سے زندہ نہیں بلکہ مردہ ہیں، سننے والے نہیں بلکہ بہرے ہیں، دیکھنے والے نہیں بلکہ اندھے ہیں۔ ایسے مردوں، بہروں اور اندھوں کو سنانا، سمجھانا نہ تمھارے بس میں ہے اور نہ اس کی تمھارے اوپر کوئی ذمہ داری ہے۔ 'وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہروں سے بھی کچھ سننے سمجھنے کی توقع کی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ پکارنے والے کی طرف متوجہ ہوں لیکن ان بہروں سے کس خیر کی امید ہو سکتی ہے جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں! 'وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ' میں 'عَنْ' اس بات پر دلیل ہے کہ لفظ ہدایت یہاں 'صَرْف' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے۔ یعنی تم اندھوں کو ان کی غلط روی سے موڑ کر راہ راست پر نہیں لا سکتے۔ 'اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا' یہاں آیات سے مراد آفاق و انفس کی وہ نشانیاں ہیں جن کی طرف پوری تفصیل کے ساتھ پیچھے توجہ دلائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری باتیں اگر کارگر ہو سکتی ہیں تو ان لوگوں پر کارگر ہو سکتی ہیں جو خدا کی قدرت، رحمت اور اس کے عدل کی ان نشانیوں کو مانتے ہوں جو آفاق میں پھیلی

ہوگئی ہیں، جو ان کو نہ مانتے ہوں ان کے آگے سارا وعظ بھینس کے آگے بین بجانے کے حکم میں داخل ہے۔
فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ یعنی جو لوگ آفاق و انفس کی نشانیوں کو دیکھتے، سمجھتے اور مانتے ہیں وہ بے شک تمہاری بات سنیں سمجھیں گے اور تمہاری دعوت پر اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالہ کر دیں گے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ (۵۴)

ایک تنبیہ — اب یہ آخر میں تنبیہ ہے کہ کسی کو اپنی قوت و صلاحیت اور اپنے اسباب و وسائل پر ناز نہیں ہونا چاہیے۔ جو کچھ بھی انسان کو ملتا ہے سب خدا ہی کا دیا ہوا ملتا ہے اور پھر اسی کی طرف سب لوٹ جاتا ہے۔ تم اپنے وجود ہی پر غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نہایت ہی کمزور و ناتواں حالت میں تم کو وجود بخشتا ہے۔ پھر اس ناتوانی کے بعد جوانی کی توانائیاں اور صلاحیتیں عطا فرماتا ہے۔ اس کے بعد پھر بڑھاپے کی صورت میں اسی سابق ناتوانی کا دور عود کر آتا ہے۔ کسی کے امکان میں نہیں ہے کہ اپنی پائی ہوئی جوانی اور طاقت کو برقرار رکھ سکے۔ یہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے کہ وہ جو چاہے پیدا کرتا اور پیدا کر سکتا ہے۔ وہی ہر چیز کا علم اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬ مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ (۵۵)

یہ دوسری تنبیہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی کو بہت طویل نہیں خیال کرنا چاہیے۔ قیامت کے دن جب مجرم لوگ اٹھیں گے تو قسم کھا کے آپس میں کہیں گے کہ ہمارا یہ سارا زمانہ جو گزرا ہے ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر قیامت ہے بھی تو اس کے ظہور میں زندگی، موت، برزخ اور حشر و نشر کے بہت سے طول طویل مراحل حائل ہیں، ابھی سے اس کے لیے فکرمند ہونے اور اپنا عیش مکدر کرنے کی کیا ضرورت ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس دن یہ اٹھیں گے تو اس دن ان کا احساس یہ ہوگا کہ یہ سارے مراحل پلک جھپکتے گزر گئے۔

وَكَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ یعنی ان نادانوں کو اصل حقائق کا اندازہ کرنے کی توفیق کبھی نہیں ہوتی۔ قیامت کے دن انھیں اپنا سارا ماضی پلک جھپکتے ختم ہوتا نظر آئے گا لیکن جب تک دنیا میں رہے ان کو زندگی، موت اور حشر و نشر کے مراحل اتنے طویل نظر آتے تھے کہ اس کے لیے انھوں نے فکرمند ہونے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ ؗ فَهٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۵۶)

قیامت کے دن اہل علم کی طمانیت — اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِیْمَانَ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی عقل اس دنیا میں سیدھی رہی اور ان کو اللہ کی آیات کا علم اور خدا اور آخرت کا ایمان نصیب ہوا۔ وہ ان لوگوں کی اس بدحواسی پر ٹوکیں گے کہ تمہارا یہ

اندازہ بالکل غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی رو سے تو تم قیامت تک رہے ہو اور آج یہ قیامت کا دن تمہارے سامنے ہے لیکن تم اس کو جانتے نہیں رہے ہو۔ 'کِتٰبُ اللّٰہِ' سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ دفتر ہے جس میں ساری باتیں مندرج ہیں۔ 'وَلٰکِنَّکُمْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ' سے مقصود یہ ہے کہ تم اس کو محض ایک خیالی چیز سمجھتے رہے۔ اس کو تم نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنی زندگی کی قدر و قیمت پہچانتے اور اس کو آخرت کے نصب العین کے تحت گزارتے ہیں ان پر روزِ حشر میں کوئی بدحواسی نہیں طاری ہوگی بلکہ وہ یہ محسوس کریں گے کہ زندگی کا جو سفر انھوں نے شروع کیا تھا اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے پروگرام کے مطابق اس سفر کی آخری منزل پر وہ پہنچ گئے۔

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُہُمْ وَلَا ہُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ (۵۷)

لفظ 'اِسْتِعْتَاب' پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن کسی کو اس کی کوئی معذرت نفع نہیں دے گی اور نہ کسی کو یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے رب کو راضی کرنے کی کوشش کرے۔ ان چیزوں کے لیے جو موقع مطلوب ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں دے دیا ہے۔ جس نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا اس کو یہ موقع پھر کبھی حاصل نہ ہو سکے گا جس کو تیاری کرنی ہو آج تیاری کر لے۔ پھر کسی کو یہ کہنے کا موقع ملنے والا نہیں ہے کہ اس کو تیاری کے لیے وقت نہیں ملا۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ہٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ جِئْتَہُمْ بِاٰیَۃٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ (۵۸)

'ضربِ مثل' اصل میں تو کسی موعظت و حکمت کی بات کو تمثیل کی صورت میں پیش کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن یہ اپنے وسیع مفہوم میں مجرد موعظت و حکمت کی بات بیان کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ اس محاورے پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔

اب یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جو باتیں بتانے اور سمجھانے کی ہیں وہ سب ہم نے اس قرآن میں بیان کر دی ہیں تو تم اس چیز کو ان کے آگے پیش کر دو۔ اور اس بات کو یاد رکھو کہ اگر وہ اس کتاب سے نہ سمجھے تو خواہ تم ان کو کتنا ہی بڑا معجزہ دکھا دو یہ کفر کرنے والے یہی کہیں گے کہ یہ بھی جھوٹ اور محض تمہاری شعبدہ بازی اور ساحری ہے۔

کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۵۹)

یعنی جو لوگ اپنے آپ کو سمع و بصر اور دل کی صلاحیتوں سے محروم کر لیتے ہیں اور کوئی معقول بات سننا سمجھنا نہیں چاہتے اللہ تعالیٰ اسی طرح ان کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّکَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ (۶۰)

'استخفاف' کے معنی کسی کو ہلکا پھلکا اور معمولی سمجھ کر باتوں میں اڑا دینا اور اس کو بے وزن بنا دینا ہے۔

اب یہ آخر میں نہایت قطعی الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا کہ تم اپنے موقف پر جمے رہو۔ اللہ نے دنیا اور آخرت میں تمہاری نصرت اور فلاح کا جو وعدہ کیا ہے وہ پورا ہو کے رہے گا تو یہ لوگ جو اللہ کے وعدوں پر یقین نہیں رکھتے ہیں تمہارا مذاق اڑا کر تمہیں بے وزن بنانے کا موقع نہ پائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنی دعوت اور اپنے موقف پر جمے رہے تو یہ خود رسوا اور بے وزن ہوں گے۔ تمہارے قدم اکھاڑنے کی جو کوششیں یہ کر رہے ہیں یہ سب ناکام ہو جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

رحمان آباد } ۲۲ رجون ۱۹۷۴ء
ہفتہ

تدبرِ قرآن

۳۱

لقمٰن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

دونوں سابق سورتوں ـــــ العنکبوت اور الروم ـــــ کی طرح اس سورہ کا قرآنی نام بھی 'الٓمّٓ' ہی ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ ان کے عمود و مضمون میں فی الجملہ اشتراک ہے۔ اس سورہ کی تمہید سورۂ بقرہ کی تمہید سے ملتی جلتی ہوئی ہے اور بقرہ کا قرآنی نام بھی یہی ہے۔ بقرہ کی تمہید میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس قسم کے لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور کس قسم کے لوگ اس سے اعراض کریں گے۔ اسی طرح اس سورہ کی تمہید میں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ کس قسم کے لوگ اس برکت و رحمت سے فائدہ اٹھائیں گے اور کون لوگ اس سے محروم رہیں گے۔

سابق سورہ میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ یہ قرآن اس دینِ فطرت کی دعوت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور اس دعوے پر آفاق و انفس کے دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ اس سورہ میں آفاق و انفس کے دلائل کے ساتھ ساتھ عرب کے مشہور حکیم ـــ لقمان ـــ کے نصائح کا حوالہ دیا گیا ہے جس کا مقصود اہلِ عرب پر یہ واضح کرنا ہے کہ ان کے اندر جو صحیح فکر و دانش رکھنے والے لوگ گزرے ہیں انھوں نے بھی انہی باتوں کی تعلیم دی ہے جن باتوں کی تعلیم یہ پیغمبر دے رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقلِ سلیم (COMMON SENSE) انہی باتوں کے حق میں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں، نہ کہ ان باتوں کے حق میں جن کی وکالت قرآن کے مخالفین کر رہے ہیں۔ یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اصل فطرت یہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ سوچنے سمجھنے والے لوگ ان حقائق تک کس طرح پہنچتے؟

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مغربی فلاسفر جب اخلاقیات پر بحث کرتے ہیں تو اس کی بنیاد وہ عقلِ عام کے معروف اخلاقی مسلّمات (COMMON SENSE ETHICS) ہی پر رکھتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ اخلاقی مسلّمات کہاں سے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک حکیم فاطر اور فطرۃ اللہ کو تسلیم کرنے سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ اس حقیقت سے گریز کی سزا ان کو اللہ تعالیٰ نے یہ دی کہ ان کا سارا فلسفۂ اخلاق بالکل بے بنیاد اور بے معنی ہو کے رہ گیا ہے۔ ان کی تمام فلسفیانہ کاوشیں نہ تو نیکی اور بدی کے امتیاز کے لیے کوئی کسوٹی معین کر سکیں اور نہ وہ یہ بتا سکے کہ کیوں انسان کو نیکی کرنی چاہیے اور کیوں بدی سے بچنا چاہیے۔ سود مندی، لذت، خوشی اور فرض برائے فرض وغیرہ کی قسم کے جتنے نظریات بھی انھوں نے ایجاد کیے سب باد ہوا ثابت ہوئے اور خود انھی نے ان کے بخیے

اوصیٹر کے رکھ دیے۔ قرآن نے نہ صرف اخلاقیات کی بلکہ پورے دین کی بنیاد فطرت پر رکھی ہے اور یہ فطرت چونکہ ایک حکیم فاطر کی بنائی ہوئی ہے اس وجہ سے کسی کے لیے اس سے انحراف جائز نہیں ہے۔ جو شخص اپنی فطرت سے انحراف اختیار کرے گا وہ اپنے آپ کو تباہ اور اپنے فاطر کو ناراض کرے گا۔ انسان کی رہنمائی کے لیے اس کی فطرت اپنے اندر حقائق و معارف کا خزانہ رکھتی ہے لیکن انسان اپنے ماحول سے متاثر ہو کر بگڑ بھی سکتا ہے اور اپنے اختیار سے غلط فائدہ اٹھا کر اپنی فطرت کی خلاف ورزی بھی کر سکتا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے فطرت کے تمام مضمرات واضح کر دیے تاکہ کسی کے لیے کسی التباس و اشتباہ کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ بلکہ ہر شخص فطرت کی سیدھی راہ پر چل کر دنیا کی فوز و فلاح اور آخرت میں اپنے رب کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

اس سورہ میں لقمان کی حکمت کے حوالے سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، قرآن کی تائید میں ایک ایسے حکیم کی شہادت پیش کرنا ہے جس نے زندگی کے حقائق پر غور کیا تھا اور جو قرآن کے مخالفین کے نزدیک بھی نہایت ہی بلند پایہ اور واجب الاحترام حکیم سمجھا جاتا رہا ہے۔ ساتھ ہی اس میں قرآن کی دعوت کی تائید میں آفاق و انفس کے دلائل ایک نئے اسلوب سے پیش کیے گئے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ — ۱۱) یہ کتاب ایک پُر حکمت کتاب ہے جو لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت بن کر نازل ہوئی ہے لیکن اس کا فیض انہی لوگوں کو پہنچے گا جو اپنی فطرت کی صلاحیتیں زندہ رکھنے اور ان سے کام لینے والے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اس حکیمانہ کلام پر مخالفین کی مزخرف باتوں کو ترجیح دیتے اور اس سے متکبرانہ اعراض کر رہے ہیں تو وہ اپنے اس استکبار کی پاداش میں ذلت کے عذاب سے دوچار ہوں گے، عزت و سرفرازی صرف اس پر ایمان لانے والوں ہی کو حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ شدنی ہے اس لیے کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب خدا ہی کی مخلوق ہے، کسی اور کی اس میں کوئی حصہ داری نہیں ہے۔ جو لوگ مدعی ہیں کہ اس میں کسی اور کی بھی حصہ داری ہے وہ دکھائیں کہ ان کے معبودوں نے کیا پیدا کیا ہے۔

(۱۲ — ۱۹) لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت کی ہے اس کا حوالہ، جس سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ اہلِ عرب جس کی حکمت پر فخر کرتے اور جس کی روایات ان کے لٹریچر میں موجود ہیں، اس نے بھی اپنے بیٹے کو انہی باتوں کی نصیحت کی تھی جن کی دعوت یہ حکیمانہ کتاب دے رہی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عقلِ سلیم اسی دعوت کے حق میں ہے۔ جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ درحقیقت عقلِ سلیم اور فطرتِ سلیم سے جنگ کر رہے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کے لیے خاص طور پر تنبیہ ہے جو اس دور میں، جیسا کہ سورۂ عنکبوت میں گزر چکا ہے، اپنے بیٹوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے ان پر ظلم کر رہے تھے۔ گویا قرآن نے یہ دکھایا ہے کہ لقمان اپنے بیٹے کو جن باتوں پر کاربند ہونے کے لیے اس دل سوزی سے نصیحت کرتے تھے آج انہی باتوں سے روکنے کے لیے باپوں کی طرف سے

بیٹوں پر ستم ڈھائے جا رہے ہیں۔

(۲۰-۲۴) توحید کے مضمون کی تائید کہ جتنی ظاہری و باطنی نعمتیں انسان کو ملی ہوئی ہیں وہ ہیں تو سب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ، اور اس حقیقت سے کسی کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود بہت سے نادان لوگ اللہ کی توحید کے باب میں جھگڑ رہے ہیں حالانکہ نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے، نہ کسی حکیم یا کسی پیغمبر کی رہنمائی اور نہ کسی کتاب الٰہی کی روشنی اور جب ان کو اللہ کی کتاب کی پیروی کی دعوت دی جاتی ہے تو بڑے پندار کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم اپنے باپ دادا کے طریقے کی پیروی کرتے رہیں گے اگرچہ ان کے باپ دادا شیطان کی پیروی کرتے رہے ہوں۔ خدا کے ساتھ تعلق کی مضبوط رسی صرف ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو خدا کی اتاری ہوئی کتاب کی پیروی کریں اس لیے کہ بالآخر تمام امور کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ ایسے سرپھرے لوگوں کا غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ایک دن ان لوگوں کا انجام ان کے سامنے رکھ دے گا۔

(۲۵ - ۳۰) مخالفین کی تردید میں خود ان کے اعتراضات کا حوالہ کہ یہ لوگ خود اپنے مسلّمات کے لوازم تسلیم کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ ان کو اعتراف ہے کہ تمام آسمان و زمین کا خالق اللہ ہی ہے تو جب وہی خالق ہے تو شکر اور عبادت کا حقدار اس کے سوا کوئی اور کس طرح ہو سکتا ہے؟ ہر چیز اسی کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ وہ ہر ایک سے بے نیاز ہے۔ وہ کسی کے ہاتھ بٹانے کا محتاج نہیں اور وہ خود ستودہ صفات ہے اس وجہ سے اس کی نظر عنایت کو متوجہ کرنے کے لیے کسی کی سفارش کی حاجت نہیں۔ اس کی قدرت و حکمت کی اتنی نشانیاں اس کائنات میں موجود ہیں کہ اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر، مزید سات سمندروں کے اضافے کے ساتھ، روشنائی بن جائیں جب بھی اس کی تمام نشانیوں کو قلم بند کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے تمام خلق کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ویسا ہی ہے جیسا ایک جان کو پیدا کر دینا۔ رات اور دن سب اسی کے حکم سے گردش کرتے ہیں اور وہ ہر چیز سے پوری طرح باخبر ہے۔ اگر اس کائنات کے نظام میں کسی اور کا بھی دخل ہوتا تو یہ درہم برہم ہو کے رہ جاتا۔

(۳۱ - ۳۴) کشتی کی تمثیل سے مخالفین کو تنبیہ کہ ذرا میں اترانے والے اور ذرا میں مایوس ہو جانے والے نہ بنو بلکہ نعمت میں شکر کرنے والے اور مصیبت میں صبر کرنے والے بنو۔ آج جو کچھ تمہیں حاصل ہے اس کا حق یہ ہے کہ اپنے رب کے شکرگزار بنو اور اس دن کو یاد رکھو جس دن نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آسکے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے۔ اس دن کا آنا ایک امر قطعی ہے۔ محض اس بنیاد پر اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ آج تمہیں اس کے ظہور کا وقت نہیں معلوم ہے۔ زندگی کی کتنی حقیقتیں ہیں جن کے ظہور کا وقت کسی کو معلوم نہیں لیکن کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کرتا۔ حقیقی علیم و خبیر صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

سُوْرَةُ لُقْمٰنَ (۳۱)

مَكِّيَّةٌ ـــــــ اٰيَاتُهَا ۳۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝۱ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۲ هُدًى وَّرَحْمَةً آیات
لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝۳ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ۱-۱۱
وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ
رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ
لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا
هُزُوًا ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۶ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا
وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۷ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ
جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۝۸ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ۝۹ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي
الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ ۭ وَاَنْزَلْنَا
مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝۱۰ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ
فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۱ ع ۱۱ ۱۰

ترجمۂ آیات ۱-۱۱

یہ الٓـمّٓ ہے۔ یہ پُر حکمت کتاب کی آیات ہیں۔ ہدایت و رحمت بن کر نازل ہوئی ہیں خوب کاروں کے لیے۔ ان کے لیے جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ یہی اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ ۱-۵

اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو فضولیات کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے گمراہ کریں بغیر کسی علم کے۔ اور ان آیات کا مذاق اڑائیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اور جب ان کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو اس طرح متکبرانہ اعراض کرتے ہیں گویا ان کو سنا ہی نہیں، گویا ان کے کانوں میں بہرا پن ہے تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو! البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے نعمت کے باغ ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کے رہے گا۔ اور وہ غالب و حکیم ہے۔ ۶-۹

اس نے بنایا آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے جو تمھیں نظر آئیں اور زمین میں پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ تمھارے سمیت لڑھک نہ جائے اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے۔ اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا پس اس میں نوع بنوع فیض بخش چیزیں پیدا کیں۔ ۱۰

یہ ساری چیزیں تو اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ تو اب مجھے دکھاؤ کہ انھوں نے کیا چیزیں پیدا کی ہیں جو اس کے سوا ہیں! بلکہ یہ ظالم لوگ ایک صریح گمراہی میں مبتلا ہیں!! ۱۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓ (۱)

حروفِ مقطعات پر ایک جامع بحث سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ (۲-۳)

اس کتاب سے فائدہ وہی اٹھائیں گے جن کی صلاحیتیں زندہ ہیں

تِلْكَ کا اشارہ الٓمّٓ کی طرف ہے۔ اس سورہ کا قرآنی نام یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سورہ ایک پُرحکمت کتاب کی آیات پر مشتمل ہے لیکن حکمت کے جواہر ریزوں کا قدردان ہر شخص نہیں ہوتا۔ ان کی قدر کرنے والے وہی لوگ ہوں گے جو 'محسن' ہوں گے۔ 'مُحْسِن' سے مراد وہ خوب کار لوگ ہیں جنھوں نے اپنے سوچنے سمجھنے کی قوتوں سے صحیح کام لیا، اپنی فطرت کی صلاحیتوں کو زندہ رکھا اور اپنی بصیرت کے حد تک جو قدم بھی اٹھایا صحیح سمت میں اٹھایا۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے یہ آیات ہدایت اور رحمت ہیں۔ وہ دنیا میں ان سے ہدایت حاصل کریں گے اور آخرت میں ان کے لیے یہ باعثِ فضل و رحمت ہوں گی۔ لفظ 'مُحْسِن' پر ہم پیچھے بھی اس کتاب میں بحث کر چکے ہیں اور آگے آیت ۲۲ میں بھی یہ آ رہا ہے۔ وہاں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ اس تمہید ہی سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جو لوگ اس کتاب کی ناقدری کر رہے ہیں ان کی یہ ناقدری اس کتاب کے بے قیمت ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ ان ناقدروں کی فطرت کے مسخ ہونے کی دلیل ہے۔ اس وجہ سے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان لوگوں کے رویے سے بددل نہیں ہونا چاہیے۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۴)

'محسنین' کی صفات

یہ 'مُحْسِنِيْن' کی صفات بیان ہوئی ہیں اور ان کے پردے میں وہ لوگ نگاہوں کے سامنے کر دیے گئے ہیں جو اس وقت اس لفظ کے صحیح مصداق تھے۔ فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھنے والے ہیں۔

'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ' میں ان اہلِ ایمان کی غایت درجہ تحسین ہے۔ یعنی درحقیقت یہی لوگ ہیں جو آخرت پر پکا یقین رکھنے والے ہیں۔ اسی یقین کا یہ ثمرہ ہے کہ ان کو نماز اور زکوٰۃ کے اہتمام کی توفیق حاصل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ نماز اور زکوٰۃ سے غافل ہیں وہ درحقیقت آخرت کے یقین سے محروم ہیں اور اگر وہ اس کے مدعی ہیں تو وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵)

فرمایا کہ یہی لوگ اس دنیا میں اپنے رب کی صراطِ مستقیم پر ہیں اور یہی لوگ آخرت میں فلاح پانے والے بنیں گے۔ باقی سارے لوگ گمراہی پر ہیں اور وہ آخرت میں جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا

هُزُوًا ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۶﴾

لَهْوَ الْحَدِيثِ کا مفہوم 'اِشْتِرَاءٌ' کے معنی، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، ترجیح دینے کے بھی آتے ہیں۔ 'لَهْوَ الْحَدِيثِ' اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح دوسرے مقام میں 'زُخْرُفَ الْقَوْلِ' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ یہاں یہ لفظ کتاب حکیم کی آیات کے مقابل میں استعمال ہوا ہے۔ اس وجہ سے اس سے مراد وہ گمراہ کن باتیں ہیں جو وقت کے مفسدین لوگوں کو آیات الٰہی سے برگشتہ کرنے کے لیے پھیلاتے تھے۔ قرآن لوگوں کو زندگی کے اصل حقائق کے سامنے کھڑا کرنا چاہتا تھا لیکن مخالفین کی کوشش یہ تھی کہ لوگ انہی مزخرفات میں پھنسے رہیں جن میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہاں اسی صورت حال کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور اسلوب بیان اظہار تعجب کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو لوگوں کی ہدایت کے لیے ایک پرحکمت کتاب اتاری ہے لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان میں بہتیرے اس کے مقابل میں انہی فضول باتوں کو ترجیح دیتے ہیں جو ان کی خواہشوں اور بدعتوں کے لیے سند تصدیق فراہم کرتی ہیں۔

'لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا'۔ 'عِلْمٌ' سے مراد دلیل و برہان ہے۔ آگے آیت ۲۰ میں بھی یہ لفظ آ رہا ہے۔ وہاں اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ مفسدین کی یہ تمام سعی نامراد اس لیے ہے کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں حالانکہ اللہ کی راہ چھوڑ کر جس راہ پر وہ چل رہے ہیں اور جس پر لوگوں کو بھی چلانا چاہتے ہیں اس کے حق میں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے لیکن اس کے باوجود جسارت کا یہ عالم ہے کہ اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے اور اپنی بے سروپا باتوں کی تائید میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے ہیں۔

'أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ'۔ اوپر اہل ایمان کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہی لوگ ہدایت پر ہیں اور وہی لوگ فلاح پانے والے بنیں گے۔ اس کے مقابل میں یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو قرآن کی آیات حکمت کے مقابل میں اپنی خرافات بدعت وضلالت کو پھیلانے میں سرگرم تھے۔ فرمایا کہ ان کے لیے ایک نہایت سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔ 'ذلیل کرنے والا عذاب' اس وجہ سے ہوگا کہ حق کے مقابل میں اپنی بات کی پچ استکبار ہے اور استکبار کی سزا اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلت و رسوائی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عذاب اور عذاب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یوں تو ہر عذاب عذاب ہے، اللہ تعالیٰ اس سے امان میں رکھے، لیکن سب سے زیادہ سخت وہ عذاب ہے جو رسوا کر دینے والا ہو۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا ۖ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۷﴾

استکبار کی سزا یہ ان لوگوں کے اس استکبار کی تصویر ہے جس کے سبب سے یہ ذلت کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ فرمایا کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب ان کو ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ نہایت غرور کے ساتھ اس طرح پیٹھ پھیر

کر چل دیتے ہیں گویا انھوں نے ان کو سرے سے سنا ہی نہیں، گویا ان کے دونوں کان بہرے ہیں۔ یعنی یہ ہماری آیات کو یک قلم ناقابلِ التفات سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر ان کا پندار اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ ہماری باتیں ان کے لیے لائقِ توجہ ہی نہیں رہ گئی ہیں تو پھر ہماری طرف سے ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر معاملہ محض غفلت کا ہو تو اس کی اصلاح تذکیر و تنبیہ سے ہو سکتی ہے لیکن جب تذکیر و تنبیہ کے جواب میں رعونت و استکبار کا مظاہرہ ہونے لگے تو یہ مرض لا علاج ہے۔ اس طرح کے لوگ دوزخ ہی کا ایندھن بننے والے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ۙ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۸-۹)

قرآن کا مذاق اڑانے والوں کو جواب

یہ ان کے مقابل میں ان لوگوں کا صلہ بیان ہوا ہے جو اللہ کی آیات پر ایمان لانے والے اور ان کے مطابق اپنی زندگیوں کو بنانے اور سنوارنے والے ہیں۔ فرمایا کہ ان کے لیے نعمت کے باغ ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ 'وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا' یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا حتمی وعدہ ہے جو پورا ہو کے رہے گا۔ اس جملے میں تاکید در تاکید کا جو مضمون مضمر ہے اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس تاکید کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ اوپر آیت ۶ میں ذکر ہو چکا ہے کہ متکبرین اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے استہزا کا خاص ہدف وہ آیتیں تھیں جن میں اس دور کے بے بس اور غریب مسلمانوں کو ایک ابدی بادشاہی کی خوش خبری سنائی جاتی تھی۔ معاملے کا یہ پہلو مقتضی ہوا کہ یہ بات یہاں پورے زور اور تاکید سے کہی جائے کہ مذاق اڑانے والے اگر اس کا مذاق اڑاتے ہیں تو اڑائیں لیکن اہلِ ایمان اطمینان رکھیں کہ اللہ کا یہ وعدہ پورا ہو کے رہے گا۔

وعدۂ قیامت کی قطعیت پر صفاتِ الٰہی سے استدلال

'وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ' یہ اسی وعدے کے حتمی ہونے پر اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات سے دلیل پیش کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر مستکبروں اور ظالموں کو سزا اور اہلِ ایمان و عمل صالح والوں کو جزا نہ دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نہ وہ عزیز ہے نہ حکیم ہے بلکہ العیاذ باللہ وہ ایک بالکل عاجز و بے بس ہستی ہے جس نے بالکل بے غایت و بے حکمت یہ دنیا بنا ڈالی۔ حالانکہ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ خدا نہ صرف عزیز و حکیم ہے بلکہ حقیقی عزیز و حکیم وہی ہے۔ اس طرزِ استدلال کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ یہاں اشارے پر اکتفا فرمائیے۔

خَلَقَ السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ۖ وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۚ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ (۱۰)

یہ اس کائنات کے ان دلائل و شواہد کی طرف توجہ دلائی ہے جن پر ایک نظر ڈال کر ایک متوسط درجہ کی عقل کا آدمی بھی، یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ اس کائنات کا خالق عزیز یعنی ہر چیز پر غالب و مقتدر

بھی ہے اور اس کے ہر کام میں اس کی قدرت کے ساتھ اس کی بے پایاں حکمت بھی نمایاں ہے۔ فرمایا کہ یہ اسی کی قدرت و حکمت ہے کہ اس نے آسمانوں کی یہ عظیم چھت ایسے ستونوں کے بغیر ہی کھڑی کر دی جو تمہیں نظر آئیں اور ساتھ ہی زمین میں پہاڑ لنگر انداز کر دیے کہ یہ کہیں تمہارے ساتھ لڑھک نہ جائے۔ پھر اس چھت کے نیچے اور اس زمین کے اوپر بے شمار قسم کے جاندار پھیلا دیے اور ان کی پرورش کے لیے آسمان سے پانی برسایا اور اس پانی سے ہر قسم کی فیض بخش چیزیں اگائیں۔

'بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا' میں 'تَرَوْنَهَا' 'عَمَدٍ' کی صفت ہے۔ یعنی یہ عظیم چھت اس کے عظیم خالق نے کھڑی تو کی ہے ستونوں پر لیکن یہ اس کی قدرت، حکمت اور کاریگری کا اعجاز ہے کہ یہ ستون کسی کو نظر نہیں آتے۔ اس نے اس کائنات کے اجزائے مختلفہ کو جذب و کشش کے ایسے قوانین کے ساتھ باندھ رکھا ہے جو صرف اسی کو نظر آتے ہیں۔

'زَوْجٍ كَرِيمٍ' میں لفظ 'كَرِيمٍ' کا صحیح لغوی مفہوم فیض بخش ہے۔ یہ خدا کی قدرت کے ساتھ ساتھ اس کی رحمت و ربوبیت کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے یہ عظیم محل اور یہ قصر بے ستون تعمیر کر کے اس کے مکینوں کی پرورش کے لیے اپنی گوناگوں نعمتوں کے انبار بھی لگا دیے۔

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۱۱)

خدا کے شریک ٹھہرانے والوں سے ایک سوال

مطلب یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں تو اللہ کی بنائی ہوئی ہیں اور تم کو بھی یہ اعتراف ہے کہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی ہیں تو اب بتاؤ کہ تم اس کے سوا دوسری چیزوں کو جو پوجتے ہو تو انھوں نے کیا پیدا کیا ہے اور ان کا کیا کارنامہ ہے کہ تم نے خدا کی خدائی اور اس کے حقوق میں ان کو بھی شریک بنا دیا ہے!!

'بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ' یہ ان سے منہ پھیر کر ان کے حال پر اظہار افسوس فرمایا ہے کہ ان ظالموں کے پاس اس حرکت کے جواز کی کوئی دلیل تو ہے نہیں جسے وہ پیش کر سکیں بلکہ ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے جس میں وہ پڑے ہوئے ہیں۔

۲۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۱۲ - ۱۹

آگے لقمان کی حکمت اور ان کی ان حکیمانہ نصیحتوں کا حوالہ ہے جو انھوں نے اپنے سعادتمند فرزند کو فرمائی ہیں اور ان کے حوالہ سے مقصود، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا، اہل عرب کے سامنے خود ان کے حکماء اور ان کی حکمت کو پیش کر کے یہ دکھانا ہے کہ تمہارے اندر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی حکمت و معرفت میں سے کچھ حصہ ملا انھوں نے بھی اپنے متعلقین کو انہی باتوں کی تعلیم دی جن کی تعلیم تم کو یہ پر حکمت کتاب دے رہی ہے لیکن یہ تمہاری بدبختی و محرومی ہے کہ تم اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید پر تو بہت نازاں ہو جنھوں نے بے سوچے سمجھے شیطان کی پیروی کی لیکن اپنے ان اسلاف کی حکمت سے تم نے کوئی فائدہ

نہیں اٹھایا جنھوں نے زندگی کے حقائق پر سنجیدگی سے غور کیا اور اپنے قول و عمل سے اپنے بعد والوں کے لیے نہایت پاکیزہ روایات چھوڑیں۔ اس بے خردی کا نتیجہ تمھارے سامنے یہ آیا کہ جن باتوں کی لقمان اپنے فرزند کو نہایت دردمندی کے ساتھ تعلیم دیتے تھے انہی باتوں سے آج تم اپنی اولاد کو روکنے کے لیے نہایت ظالمانہ سزائیں دیتے ہو۔

لقمان کی شخصیت

یہ لقمان کون تھے؟ بعض لوگوں نے ان کو حبشی النسل قرار دیا ہے لیکن یہ بات ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ محمد بن اسحاق نے ان کا نسب سیدنا ابراہیمؑ سے ملایا ہے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ شعرائے جاہلیت میں سے طرفہ بن عبد اور سلمیٰ بن ربیعہ نے اپنے شعروں میں ان کا اور ان کے قبیلہ کا ذکر کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں ان کو اور ان کی قوم کو بڑی شان و شوکت حاصل تھی اور یہ قوم عاد کے لقایا میں سے تھے۔

بعض لوگوں نے ان کو نبی قرار دیا ہے لیکن مذہب جمہور یہ ہے کہ یہ نبی نہیں بلکہ ایک حکیم تھے۔ عرب کے لٹریچر سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے اور قرآن نے بھی ان کا ذکر ایک حکیم ہی کی حیثیت سے کیا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بعض شعراء نے اپنے شعروں میں ان کی اس نصیحت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کا حوالہ قرآن نے دیا ہے لیکن دم تحریر میرے پاس حوالہ کی کتابیں نہیں ہیں اس وجہ سے میں اس باب میں کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔

بعض مورخین نے ان کو بادشاہ مانا ہے۔ بادشاہ نہ سہی لیکن ان کو سرداری کا منصب ضرور حاصل تھا۔ شعرائے جاہلیت نے جس انداز سے ان کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یمن میں اپنے قبیلہ پر ایک پدرسرانہ قسم کی سرداری حاصل تھی۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں فرمائی ہیں، ان سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ نصیحتیں اس کو سرداری کی ذمہ داریاں سونپتے وقت کی ہیں۔ آگے اس کی وضاحت آئے گی ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۲-۱۹

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ

(تعظ النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

وَلِوَالِدَيْكَ ۗ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿١٤﴾ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي
مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا
مَعْرُوفًا ۖ وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ۚ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٥﴾ يَا بُنَيَّ إِنَّهَا إِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ
فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمَاوَاتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللَّهُ ۚ
إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ﴿١٦﴾ يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ
وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ
الْأُمُورِ ﴿١٧﴾ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿١٨﴾ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ
وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۚ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴿١٩﴾ ع ٢ ١١

ترجمہ آیات ١٢-١٩

اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کے شکر گزار رہو اور جو شکر گزار رہے گا
تو اپنے ہی لیے رہے گا۔ اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ ١٢
اور یاد کرو جب کہ لقمان نے اپنے بیٹے سے اس کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ
اے میرے بیٹے! اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیو۔ بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ ١٣
اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر
دکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا۔ کہ میرے شکر گزار
رہو اور اپنے والدین کے۔ میری ہی طرف بالآخر لوٹنا ہے۔ اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو
کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں تو ان کی بات نہ

ماننیو اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک رکھیو۔ اور پیروی ان کے طریقہ کی کیجیو جو میری طرف متوجہ ہیں۔ پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہے اور میں جو کچھ تم کرتے رہے ہو اس سے تم کو آگاہ کروں گا۔ ۱۴-۱۵

اے میرے بیٹے! کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ہو گا تو خواہ وہ کسی گھاٹی میں ہو یا آسمانوں یا زمین میں ہو اللہ اس کو حاضر کر دے گا۔ بے شک اللہ نہایت ہی باریک بین اور باخبر ہے۔ ۱۶

اے میرے بیٹے! نماز کا اہتمام رکھو، نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور جو مصیبت تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو۔ بے شک یہ باتیں عزیمت کے کاموں میں سے ہیں۔ ۱۷

اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ بے شک سب سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی آواز ہے۔ ۱۸-۱۹

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (۱۲)

حکمت کا اولین ثمر

حکمت کا اولین ثمر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ اللہ اپنے جس بندے کو اس دولت سے بہرہ مند کرتا ہے اس کا اولین اثر جو اس پر مترتب ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن جاتا ہے اور یہی شکر تمام حقوق اللہ اور تمام حقوق العباد کی معرفت کی بنیاد ہے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں ہم اس پر مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔ حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور ذوالقرنین کے واقعات کے سلسلہ میں بھی اس حقیقت کی طرف مفید اشارات گزر چکے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے صاحب حکمت اور حکیم ہونے کی اولین شناخت یہ ہے کہ اس کے اندر اپنے رب کی شکر گزاری ہو۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو وہ بالکل کھوکھلا ہے اگرچہ وہ علم و فلسفہ کا کتنا ہی بڑا ماہر اور امام کیوں نہ سمجھا جاتا ہو۔

ایک شبہ کا ازالہ

وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۔ یہ برسرِ موقع ایک دفع دخل مقدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں سے اپنی شکر گزاری کا جو مطالبہ کیا ہے یا اس کو جو اس نے پسند فرمایا ہے تو اس میں اس کا کوئی نفع ہے بلکہ اس کو اس نے بندوں ہی کے نفع کے لیے پسند فرمایا ہے۔ جو شخص خدا کا شکر گزار رہتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے لیے اللہ کی نعمتوں کو بڑھاتا ہے۔ رہا اللہ کا معاملہ تو وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ نہ کسی کی شکر گزاری سے اس کو کوئی نفع پہنچتا اور نہ کسی کی ناشکری سے کوئی نقصان۔ ساتھ ہی وہ حمید بھی ہے یعنی تمام اعلیٰ صفات سے متصف اور یہ تمام صفات اس کی ذاتی ہیں۔ نہ ان میں کوئی اضافہ کر سکتا، نہ کمی۔ اس کی اس صفت ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خواہ کوئی اس کے احسانات کی قدر کرے یا ناقدری لیکن اس دنیا میں اپنے رزق و فضل سے وہ کسی کو بھی محروم نہیں کرتا۔ آگے آیت ۲۶ میں بھی انہی صفات کا حوالہ آ رہا ہے، وہاں مزید وضاحت ہو جائے گی۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (۱۳)

شکر کی اصل روح

جس طرح حکمت کا اولین ثمرہ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے اسی طرح شکر کی اصل روح شرک سے اجتناب ہے۔ بندے کو تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی سے ملتی ہیں اس وجہ سے جس طرح اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے اسی طرح یہ بھی واجب ہے کہ وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو دوسروں کی طرف نہ منسوب کرے۔ دوسروں سے اگر بندے کو کوئی نفع پہنچتا ہے تو وہ اللہ ہی کے حکم سے پہنچتا ہے اس وجہ سے شکر کا اصل سزاوار اللہ ہی ہے۔ دوسروں کا حق اللہ تعالیٰ کے حق کے تحت ہے۔ اللہ کا حق سب سے بڑا ہے اگر کوئی شخص خدا کے حق میں دوسروں کو شریک کرتا ہے تو وہ سب سے بڑے حق کو تلف کرنے والا بنتا ہے جو ایک ظلمِ عظیم ہے۔

موقع اور بات دونوں کی اہمیت کی طرف اشارہ

یہاں یہ امر بھی توجہ کے لائق ہے کہ لقمان نے یہ باتیں اس وقت کہی ہیں جب وہ بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے۔ اس سے موقع اور بات دونوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی سرسری بات نہیں ہے جو راہ چلتے کہہ دی گئی ہو بلکہ لقمان نے خاص اپنے بیٹے کو، ایک اہم موقع پر، خاص اہتمام کے ساتھ، بطور ایک موعظت کے بتائیں اور ان پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے کی تاکید کی۔ اس سے مقصود قرآن کے مخاطبوں کو توجہ دلانا ہے کہ ایک دانش مند باپ اپنے بیٹے کو کیا تعلیم دیتا تھا اور آج اس کے احمق نام لیوا اپنی اولاد کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہیں!

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسٰنَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰي وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۔ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓي اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ

فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۱۴-۱۵)

دو آیتیں بطور تضمین — یہ دو آیتیں لقمان کی موعظت کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور تضمین ہیں۔ لقمان نے بیٹے کو خدا کی شکرگزاری کا حق ادا کرنے کی تاکید تو فرمائی لیکن اللہ تعالیٰ جل شانہ کے حق کے پہلو بہ پہلو اپنے حق کا ذکر انھوں نے ادب کے خلاف تصور فرمایا اس وجہ سے اس کو نظر انداز کر کے قیامت کے ذکر کی طرف بڑھ گئے۔ یہ بات انھوں نے ادباً کی اور ان کی تواضع کے شایانِ شان بات یہی تھی! لیکن خدا کے حق کے بعد فطرت کی تربیت میں سب سے بڑا حق والدین کا ہے' اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے لقمان کے اس چھوڑے ہوئے خلا کو اپنی طرف سے بھر دیا۔ فرمایا کہ ہم نے انسان کو اس کے والدین کے باب میں ہدایت کی۔ اس ہدایت کا ذکر عنکبوت۔ آیت ۸ میں بھی گزر چکا ہے اور سورۂ بنی اسرائیل میں بھی۔ وہاں ہم نے واضح کیا ہے کہ خدا کے حق کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم تمام انبیائے کرام اور تمام آسمانی صحیفوں نے بالاتفاق دی ہے۔ یہاں اس ہدایت کی تفصیل آگے والے ٹکڑے سے ہوگئی ہے کہ اَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ (کہ میرا شکرگزار رہ اور اپنے ماں باپ کا) یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی شکرگزاری کے ساتھ انسان کو اس کے والدین کی شکرگزاری کی ہدایت فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اوپر خدا کے بعد سب سے بڑا حق اس کے والدین کا ہے اس لیے کہ وہی اس کے وجود میں آنے اور پرورش پانے کا ذریعہ بنتے ہیں، والدین سے بڑا کسی کا حق بھی نہیں ہے' لیکن یہ حق شکرگزاری اور خدمت کا ہے نہ کہ عبادت کا۔ شکر کا مفہوم اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ اس کی اصل حقیقت ایفائے حق ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو مجرد زبان سے شکر ایک بالکل بے حقیقت چیز ہے۔

خدا کے خلاف والدین کی اطاعت جائز نہیں ہے — وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا۔ یعنی اگر والدین اس بات کے لیے اولاد پر دباؤ ڈالیں کہ وہ کسی چیز کو بے دلیل خدا کا شریک بنائے تو یہ حق ان کو حاصل نہیں ہے، اولاد کا فرض ہے کہ اس معاملے میں ان کی اطاعت سے صاف انکار کر دے۔ شرک کے بے دلیل ہونے پر اس کتاب میں ہم جگہ جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہ اس کی مستقل صفت ہے اس لیے کہ اب تک شرک کی تائید میں اس کے حامی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکے' جب کہ خدا کا حال یہ ہے کہ ہر مشرک اس کو لازماً تسلیم کرتا ہے۔ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا یعنی اگر والدین شرک اختیار کرنے کے لیے زور لگائیں تو اس معاملے میں تو ان کی اطاعت نہ کی جائے لیکن جہاں تک دنیا کا معاملہ ہے اس کے اندر ان کے ساتھ حسنِ سلوک دستور کے مطابق باقی رکھا جائے۔ ان کی ضروریات حتی الامکان پوری کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان کی ہدایت کے لیے برابر دعا بھی کی جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت تک اپنے باپ کے لیے دُعا جاری رکھی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اس سے روک نہیں دیا گیا۔ کافر والدین سے بیٹے کے لیے کلی انقطاع صرف اس شکل میں صحیح ہے جب

مسلم معاشرہ جماعتی حیثیت سے ان سے اور ان کی قوم سے براءت کا اعلان کرے۔ اس کی وضاحت سورۂ براءت میں ہو چکی ہے۔

ماں کا حق باپ کے حق سے زیادہ ہے

یہاں ایک چیز یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جہاں تک شکرگزاری اور خدمت کا تعلق ہے اس کی ہدایت تو باپ اور ماں دونوں کے لیے فرمائی ہے لیکن قربانیاں اور جانفشانیاں صرف ماں کی گنائی ہیں، باپ کی کسی قربانی کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ فرمایا ہے حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ، (اس کی ماں نے اس کو اٹھایا دکھ کے بعد دکھ جھیل کر اور پھر اس کا دودھ چھڑانا ہوا دو سالوں کے اندر)۔ یہاں حمل، ولادت اور رضاعت تینوں مراحل کی طرف اشارہ ہے (اگرچہ ولادت کا ذکر غایت وضاحت کے سبب سے محذوف ہے) اور ان تینوں ہی کا تعلق ماں سے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ماں کا حق باپ کے مقابل میں زیادہ ہے۔ اسی پر وہ حدیث مبنی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کا حق باپ کے مقابل میں تین درجہ زیادہ قرار دیا ہے۔

'إِلَيَّ الْمَصِيرُ' میں تنبیہ ہے کہ یہ بات ہر شخص کو یاد رکھنی چاہیے کہ بالآخر سب کو میری ہی طرف پلٹنا ہے۔ اگر کسی نے میری شکرگزاری اور والدین کے حق میں کوتاہی کی تو وہ میری بازپرس سے نہیں چھوٹ سکتا۔

'وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ'۔ شرک کے معاملے میں والدین کی اطاعت نہ کرنے کی ہدایت کے ساتھ یہ اولاد کو تاکید مزید ہے کہ اسے بہرحال انہی لوگوں کے طریقے کی پیروی کرنی ہے جو خدا کی طرف متوجہ ہیں، ان لوگوں کی راہ نہیں اختیار کرنی چاہیے جو خدا سے منحرف ہیں اگرچہ وہ اس کے والدین ہی کیوں نہ ہوں۔ سورۂ عنکبوت میں والدین کا قول نقل ہو چکا ہے کہ وہ اپنی اولاد اور اپنے زیردستوں سے کہتے ہیں کہ اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطَايَاكُمْ-۱۲ (تم ہمارے طریقے کی پیروی کرتے رہو، ہم تمہاری غلطیوں کا بوجھ اٹھانے کے ذمہ دار ہیں) یہاں اسی قول پر تعریض کرتے ہوئے فرمایا کہ جو بھی خدا کے خلاف کسی راستہ کی پیروی کی دعوت دے اس کی پیروی جائز نہیں ہے۔ پیروی صرف ان لوگوں کی کرنی ہے جو خدا کی راہ پر ہیں۔

'ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ'۔ یہ خطاب والدین اور اولاد دونوں سے یکساں ہے اور اس میں تنبیہ بھی ہے اور اطمینان دہانی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ایک دن سب کی واپسی میری ہی طرف ہونی ہے اور اس دن جو کچھ جس نے کیا ہوگا میں اس کے سامنے رکھ دوں گا۔ اگر کسی کے والدین نے میرے بخشے ہوئے حق سے غلط فائدہ اٹھا کر اولاد کو مجھ سے منحرف کرنے کی کوشش کی تو وہ اس کی سزا بھگتیں گے اور اگر اولاد نے والدین کے حق کے ساتھ ساتھ میرے حق کو بھی کما حقہٗ پہچانا اور اس حق پر قائم رہنے میں استقامت دکھائی تو وہ اپنی اس عزیمت کا بھرپور صلہ پائے گی۔

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ
يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ (۱۶)

لقمان کی موعظت قیامت کے باب میں

تضمین کی آیات کے بعد لقمان کی موعظت پھر شروع ہوگئی۔ اوپر لقمان نے بیٹے کو شرک سے اجتناب اور توحید کی تعلیم دی ہے اور یہ بات اپنے محل میں واضح ہو چکی ہے کہ اسی عقیدے پر تمام عقائد کی بنیاد ہے۔ توحید کے بعد دوسرا بنیادی عقیدہ آخرت کا عقیدہ ہے۔ اس آیت میں آخرت سے متعلق ان کی موعظت کا حوالہ ہے۔ فرمایا کہ اے بیٹے! اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی نیک یا بد عمل کسی کا ہوگا تو خواہ وہ کسی پہاڑی یا گھاٹی کے اندر ہو یا لامتناہی یا ناپیدا کنار فضاؤں اور آسمانوں میں ہو یا زمین کی تہوں میں ہو، جہاں کہیں بھی ہوگا، خدا قیامت کے دن اس کو حاضر کر دے گا، اس لیے کہ اللہ نہایت باریک بیں اور نہایت باخبر ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم سے ناآشنائی ہی ہے جس کے سبب سے قوموں کو توحید کے معاملے میں مغالطہ پیش آیا اور وہ شرک میں مبتلا ہوئیں اور یہی چیز آخرت کے باب میں بھی بہت سی گمراہیوں کا سبب ہوئی۔ اس وجہ سے لقمان نے اس حکمت کی یاد دہانی کی جو توحید اور قیامت دونوں کے باب میں ان کے فرزند کے ذہن کو بالکل صاف کر دے۔

'اِنَّهَا' میں ضمیر قصہ یا ضمیر شان ہے۔ اس صورت میں متکلم، ضمیر اپنے معہود ذہنی کو پیش نظر رکھ کر استعمال کرتا ہے۔ یہاں معہود ذہنی 'حبۃ خردل' کے برابر عمل ہے اس وجہ سے 'حبۃ' کی رعایت سے ضمیر مؤنث استعمال ہوئی۔

'صَخْرَةٍ' سے پتھر مراد لینا ضروری نہیں ہے اس سے پہاڑی اور گھاٹی بھی مراد لے سکتے ہیں۔ یہ بات عربیت کے بالکل مطابق ہوگی۔ میں نے ترجمہ میں اسی مفہوم کو پیش نظر رکھا ہے۔ ابن جریر نے بھی ایک گروہ کا یہی قول نقل کیا ہے۔

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰي مَآ اَصَابَكَ ۭ
اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۱۷)

شکر کا اثر زندگی پر نماز کا اہتمام

اللہ تعالیٰ کے شکر کی تعلیم دینے کے بعد اس شکر کا زندگی میں جو اثر نمایاں ہونا چاہیے اس کی ہدایت فرمائی۔ اس سلسلہ میں سب سے اول، نماز کو لیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر کا سب سے اوّل اور سب سے بڑا مظہر نماز ہی ہے۔ یہی تمام انبیاء اور تمام مذاہب کی متفق علیہ تعلیم ہے۔ فرمایا کہ اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو۔ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'نماز قائم کرو' کا مفہوم یہ ہے کہ نماز کا اہتمام کرو۔ یعنی خود بھی نماز کی پابندی کرو اور دوسروں کے لیے بھی اس کا انتظام کرو اور ان کو اس کے لیے ابھارو۔

امر بالمعروف

'وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ' یہ خدا کی شکرگزاری ہی کا دوسرا پہلو ہے جو بندے کو خلق سے مربوط کرتا ہے۔ نماز بندے کو اس کے رب سے جوڑتی ہے اور امر بالمعروف کے ذریعے سے وہ اللہ کے بندوں سے جڑتا ہے۔

معروف میں وہ تمام کام شامل ہیں جو ادائے حقوق سے متعلق ہیں۔ مثلاً اللہ کی راہ میں انفاق، یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں اور دوسرے مستحقین کی مدد اور اس نوع کے دوسرے کام جو ہر اچھی سوسائٹی میں معلوم و معروف ہیں اور جن کا یہ اہتمام ہر وہ شخص کرتا ہے اور اس کو کرنا چاہیے جو اپنے رب کا شکر گزار بندہ ہے۔

نہی عن المنکر 'وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ' یہ ان چیزوں سے باز رکھنے کی ہدایت ہے جو معروف کی ضد ہیں۔ بدخیالت، غصب حقوق، تعدّی، عہد شکنی، فخر و غرور اور اس قبیل کی ساری چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔

صبر 'وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ' یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہ راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے۔ جب اس فرض کو ادا کرنے کے لیے اٹھو گے تو ہر قدم پر تمہیں راہ مشکلات و مصائب سے رندھی ہوئی نظر آئے گی، اگر تم میں صبر نہیں ہو گا تو ایک قدم بھی تم آگے نہیں بڑھا سکو گے۔ اگر اس راہ کی بازیاں جیتنی ہیں تو ضروری ہے کہ جو کچھ پیش آئے اس کا پوری عزیمت سے مقابلہ کرو۔

'اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ' یہ اسی مضمون کی مزید تاکید اور وضاحت ہے کہ یہ کام نیم دلی کے ساتھ اور ڈھیلے ڈھالے ہاتھوں سے نہیں انجام پاتے۔ ان سے وہی لوگ عہدہ برآ ہوتے اور ہو سکتے ہیں جو پوری عزیمت کے ساتھ ان کے انجام دینے کے لیے اٹھتے اور سر دھڑ کی بازی لگا کر ان کو انجام دیتے ہیں۔ سورۂ عصر میں حق کے ساتھ صبر کا جو ذکر آیا ہے وہ بھی اسی تعلق سے آیا ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۱۸)

'تصعیر خد' کے معنی ہیں بربنائے غرور و تکبر لوگوں سے بے رخی و بے پروائی اختیار کرنا۔

'للناس' سے مراد عوام الناس خصوصاً غربا و فقرا ہیں جن کو امرا و اغنیا حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

شکر کے منافی باتیں اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کے موجبات بیان ہوئے ہیں۔ اب یہ ان باتوں کا ذکر آ رہا ہے جو اس شکر گزاری کے منافی ہیں۔ شکر کا مظہر، جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، اخبات و تواضع ہے اور اس کا ضد غرور و تکبر ہے۔ جو لوگ سفلہ اور کم ظرف ہوتے ہیں وہ نعمت پا کر اکڑنے اور اترانے والے بن جاتے ہیں اور ان لوگوں کو نہایت حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جو ان کے ہم سر نہیں ہوتے۔ لقمان نے اس روش کے اختیار کرنے سے اپنے فرزند کو روکا۔

'وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا' یہ آیت بعینہٖ سورۂ بنی اسرائیل میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے ساتھ یہ تنبیہ بھی ہے کہ 'لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا - ۳۷' یعنی کوئی کتنا ہی اکڑ کے اور سر اونچا کر کے چلے لیکن اسے یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ نہ وہ زمین کو پھاڑ سکتا اور نہ وہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتا تو جس خدا کی قدرت و عظمت کے یہ آثار ہر شخص دیکھ رہا ہے اس کی خدائی میں اکڑنے اور اترانے کے کیا معنی! آدمی کا غرور اس کے چہرے اور اس کی گردن سے بھی نمایاں ہوتا ہے اور اس کی چال

سے بھی، لقمان نے ان دونوں ہی چیزوں میں غرور کی روش اختیار کرنے سے اپنے بیٹے کو روکا۔

'اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ' یہ تنبیہ ہے اور بڑی ہی سخت تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی اکڑنے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ جن کو مال و جاہ حاصل ہوا اور وہ اس کو اللہ تعالیٰ کے انعام کے بجائے اپنی قابلیت و استحقاق کا کرشمہ سمجھ بیٹھیں ان کے اندر شکر کے بجائے لازماً فخر و غرور کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لقمان نے اسی خطرے سے اپنے بیٹے کو آگاہ فرمایا ہے کہ نعمت کو اللہ کا انعام اور اس کا امتحان سمجھنا، اس کے سبب سے مغرور ہو کر اپنے کو خدا کے غضب کا مستحق نہ بنا لینا۔

وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ (۱۹)

تواضع اور فروتنی کی تعلیم

اوپر کی باتیں نہی کے اسلوب میں ہیں۔ اب یہ اسی تواضع و فروتنی کی تعلیم مثبت انداز میں دی ہے کہ اپنی چال میں اکڑ کے بجائے فروتنی و تواضع اور اپنی آواز میں کرختگی اور خشونت کی جگہ نرمی اور لینت پیدا کرو۔

'مِنْ' اس بات پر دلیل ہے کہ جب خالق نے انسان کو ایک ہی قسم کی آواز پر نہیں پیدا کیا ہے بلکہ اس کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے کہ اس کو وہ پست بھی کر سکتا ہے اور بلند بھی تو موقع و محل کے مطابق وہ اس صلاحیت کو استعمال کرے، گدھے کی طرح ہمیشہ اپنا حلق اور لوگوں کے کان پھاڑنے ہی کی کوشش نہ کرے۔

'اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ' کا ٹکڑا یہاں کراہت اور سخت لب و لہجہ سے نفرت دلانے کے لیے ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس کو حسن بیان اور حسن کلام کی نعمت سے نوازا ہے تو وہ اس مقام کو چھوڑ کر گدھوں کی صف میں شامل ہونے کی کوشش کیوں کرے! یہ بلبل کی بدقسمتی ہے کہ وہ زاغ و زغن کی ہمنوائی کرے!!

لقمان کی نصیحتیں بڑوں کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہیں

لقمان کی یہ نصیحتیں اگرچہ ہر شخص کے لیے اپنے اندر یکساں خیر و برکت رکھتی ہیں لیکن ان لوگوں کے لیے یہ خاص اہمیت رکھنے والی ہیں جن کو قیادت و سربراہی اور امارت و حکومت کا مقام حاصل ہو۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، لقمان صرف ایک حکیم نہیں بلکہ ایک حکمران حکیم تھے۔ ان کو اپنی قوم کی سربراہی حاصل تھی اور یہ نصیحتیں اپنے بیٹے کو انھوں نے سرداری و قیادت کی ذمہ داریاں سمجھانے کے لیے کی ہیں۔ یہ اگرچہ نبی نہیں تھے لیکن ان کو حضرت داؤدؑ سے فی الجملہ مشابہت ہے۔

۴- آگے کا مضمون- آیات ۲۰ - ۳۴

لقمان کی نصیحت میں سرفہرست اللہ واحد کی شکر گزاری کی تلقین ہے۔ اب آگے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کیوں اللہ ہی شکر کا سزاوار ہے۔ آفاق و انفس میں اس کے دلائل کیا ہیں؟ ساتھ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ اپنے مخالفین کے معاملے کو اب ہمارے اوپر چھوڑو، ہم ہی ان کا فیصلہ کریں گے۔ یہ لوگ نشانیوں کا جو مطالبہ کر رہے ہیں اس کی پروا نہ کرو۔ اللہ کی اتنی نشانیاں موجود

ہیں کہ اگر زمین کے سارے درخت قلم اور سمندر، مزید سات سمندروں کے اضافہ کے ساتھ، روشنائی بن جائیں جب بھی اس کی نشانیوں کو قلم بند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عہد شکن اور غدار لوگ ہیں۔ جب یہ کسی پکڑ میں آتے ہیں تو اللہ کی اطاعت و وفاداری کا عہد کرتے ہیں لیکن جب ذرا ڈھیل ملتی ہے تو وہی سرکشی ان پر پھر عود کر آتی ہے اور اپنے قول و قرار کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ اس قسم کے عہد شکن ناشکروں پر کوئی نشانی کارگر نہیں ہو سکتی۔ آخر میں آخرت کی یاد دہانی ہے کہ لوگو! اس دن سے ڈرو جس دن نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام آئے گا اور نہ بیٹا باپ کے بلکہ ہر ایک کو اپنی جواب دہی خود کرنی ہے۔ اگر آج یہ نہیں معلوم ہے کہ قیامت کا ظہور کب ہوگا تو اس سے کسی کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا ڈراوا محض ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کتنے حقائق ہیں جن کے ظہور کا وقت کسی کو معلوم نہیں لیکن کوئی عاقل بھی ان کا انکار نہیں کر سکتا ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۰-۳۴

الم تروا ان الله سخر لكم ما في السموت وما في الارض
واسبغ عليكم نعمه ظاهرة وباطنة ومن الناس من
يجادل في الله بغير علم ولا هدى ولا كتب منير ⑳ واذا
قيل لهم اتبعوا ما انزل الله قالوا بل نتبع ما وجدنا
عليه اباءنا اولو كان الشيطن يدعوهم الى عذاب
السعير ㉑ ومن يسلم وجهه الى الله وهو محسن فقد
استمسك بالعروة الوثقى والى الله عاقبة الامور ㉒ و
من كفر فلا يحزنك كفره الينا مرجعهم فننبئهم بما
عملوا ان الله عليم بذات الصدور ㉓ نمتعهم قليلا ثم
نضطرهم الى عذاب غليظ ㉔ ولئن سالتهم من خلق
السموت والارض ليقولن الله قل الحمد لله بل اكثرهم
لا يعلمون ㉕ لله ما في السموت والارض ان الله هو

الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ أَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَ
الْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ
إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٧﴾ مَّا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ
إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ﴿٢٨﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ
وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَىٰ
أَجَلٍ مُّسَمًّى وَأَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٩﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ
هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ
الْكَبِيرُ ﴿٣٠﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ ع ٣ ١١ ١٢
لِيُرِيَكُم مِّنْ آيَاتِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿٣١﴾ وَ
إِذَا غَشِيَهُم مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ
فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا
إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ ﴿٣٢﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا
لَّا يَجْزِي وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَيْئًا
إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم
بِاللَّهِ الْغَرُورُ ﴿٣٣﴾ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ
وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا
وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿٣٤﴾ ع ٤ ١٣

تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کی چیزوں کو تمھاری خدمت — ترجمہ آیات ٢٠-٣٤

میں لگا رکھا ہے اور تمہارے اوپر ہر قسم کی ظاہری و باطنی نعمتیں پوری کی ہیں! پھر بھی لوگوں میں ایسے لوگ ہیں جو اللہ کے باب میں بغیر کسی دلیل، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑتے ہیں! اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے اتاری ہے تو جواب دیتے ہیں کہ ہم یہ نہیں کریں گے، بلکہ اسی طریقہ کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ شیطان ان کو عذابِ دوزخ کی طرف بلا رہا ہو! ۲۰-۲۱

اور جو اپنا رخ فرمانبردارانہ اللہ کی طرف کرے گا اور وہ خوب کار بھی ہے تو اس نے بے شک مضبوط رسی تھامی۔ اور انجام کار تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اور جس نے کفر کیا اس کا کفر تمہارے لیے باعثِ غم نہ ہو۔ ہماری ہی طرف ان سب کی واپسی ہے تو جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا ہم اس سے ان کو آگاہ کریں گے۔ اللہ دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔ ہم ان کو کچھ دن برومند کریں گے پھر ان کو ایک سخت عذاب کی طرف دھکیلیں گے۔ ۲۲-۲۴

اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو جواب دیں گے اللہ نے! کہو، شکر کا سزاوار بھی اللہ ہے۔ بلکہ ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے۔ بے شک اللہ ہی بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ ۲۵-۲۶

اور اگر زمین میں جو درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر، سات مزید سمندروں کے ساتھ، روشنائی بن جائیں جب بھی اللہ کی نشانیاں قلم بند نہیں ہو سکتیں۔ بے شک اللہ غالب و حکیم ہے۔ ۲۷

اور تم کو پیدا کر دینا اور تم کو زندہ کر دینا بس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کا پیدا کر دینا اور زندہ کر دینا، بے شک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ ہی ہے جو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ ہر ایک گردش کرتا ہے ایک مقررہ وقت تک اور یہ کہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی معبودِ حقیقی ہے اور جن چیزوں کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ باطل ہیں۔ اور بے شک برتر اور عظیم اللہ ہی ہے۔ ۲۸-۳۰

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ ہی کے فضل سے کشتی دریا میں چلتی ہے تاکہ وہ تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر صبر و شکر کرنے والے کے لیے اور جب موجیں سائبانوں کی طرح ان کو ڈھانک لیتی ہیں وہ اللہ کو پکارتے ہیں خالص اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے، پس جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف کر دیتا ہے تو ان میں کچھ راہ پر رہتے ہیں اور باقی بے راہ ہو جاتے ہیں اور ہماری آیات کا انکار بس وہی لوگ کرتے ہیں جو بالکل بدعہد اور ناشکرے ہوتے ہیں۔ ۳۱-۳۲

اے لوگو، اپنے رب کی پکڑ سے بچو اور اس دن سے ڈرو جس دن نہ کوئی باپ اپنی اولاد کے کام آئے گا اور نہ کوئی اولاد اپنے باپ کے کچھ کام آنے والی بن سکے گی۔ بیشک اللہ کا وعدہ شدنی ہے تو دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈالنے پاوے اور نہ اللہ کے باب میں فریبکار تمھیں دھوکے میں رکھے! قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے اور وہی بارش اتارتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہوتا ہے اور کسی کو بھی پتہ نہیں کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا اور نہ کسی کو یہ علم ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ

علیم و خبیر ہے۔ ۲۲-۲۴

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (۲۰)

خدا ہی کی شکرگزاری کے دلائل

اس سورہ کی تمہید آیت ۱۱ پر ان الفاظ پر ختم ہوئی تھی ھٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (یہ ساری چیزیں تو اللہ کی مخلوق ہیں تو تم مجھے دکھاؤ کہ انھوں نے کیا چیزیں پیدا کی ہیں جن کو تم اس کے سوا معبود بنائے بیٹھے ہو! بلکہ یہ ظالم نہایت کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں!) اس کے بعد اسی حقیقت کی تائید میں لقمان کی حکمت کا حوالہ آ گیا تھا کہ انھوں نے بھی اپنے فرزند کو خدا ہی کا شکرگزار رہنے کی تلقین کی تھی۔ اب اسی مضمون کو آفاق کے دلائل کی روشنی میں مزید واضح فرمایا اور انداز کلام اظہار تعجب اور زجر کا ہے کہ خدا کے بندو، تم نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ آسمانوں اور زمین کی جتنی چیزیں بھی تمھارے کام آ رہی ہیں ان سب کو تمھاری مقصد برآری میں خدا نے لگایا ہے، ان میں سے کسی چیز کے متعلق بھی تم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ خدا کے سوا کسی اور نے ان کو پیدا کیا ہے تو آخر کس دلیل سے تم نے دوسروں کو شریک بنایا اور ان کی عبادت کر رہے ہو!

تمام ظاہری و باطنی نعمتیں اللہ ہی کی عطا کردہ ہیں

'وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً' 'اسباغ' کے اصل معنی وسیع اور کشادہ کرنے کے ہیں پھر یہیں سے یہ اتمام و تکمیل کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ 'وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ'، یعنی اس نے ہر پہلو سے اپنی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔ یہ نعمتیں ظاہری و مادی بھی ہیں اور عقلی و روحانی بھی۔ شکل و صورت، قد و قامت، ہاتھ پاؤں، غذا، لباس اور اس قبیل کی دوسری تمام چیزیں بھی اس کی بخشی ہوئی ہیں اور سمع و بصر، عقل و ادراک اور بصیرت و ہدایت کی نعمتیں بھی اسی کی عطا کردہ ہیں، ان میں سے کسی چیز کے متعلق کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ خدا کے سوا کسی اور سے اس کو ملی ہیں یا کوئی دوسرا ان کے ملنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ تو جب تمام نعمتوں کو بخشنے والا اللہ ہی ہے تو بندے کی تمام شکرگزاری و نیازمندی کا حق دار بھی وہی ہوا۔ پھر بلا کسی دلیل کے کوئی دوسرا اس کے اس حق میں کس طرح ساجھی بن سکتا ہے!

مشرکین کا بے دلیل مجادلہ

'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ' یعنی جہاں تک خدا اور اس کی شکرگزاری کے حق کا تعلق ہے وہ تو ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جس سے کسی کے لیے مجال انکار نہیں ہے، لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ لوگوں میں ایسے شامت زدہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کی توحید کے بارے میں جھگڑتے ہیں حالانکہ ان کے پاس نہ کوئی دلیل ہے، نہ کوئی رہنمائی ہے اور نہ کسی روشن کتاب کی سند ہے۔ 'يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ'

میں مضاف محذوف ہے یعنی فِیْ تَوْحِیْدِ اللّٰهِ۔ مشرکینِ عرب خدا کے منکر نہیں تھے، ان کا سارا جھگڑا توحید کے باب میں تھا۔ 'بِغَیْرِ عِلْمٍ' میں علم سے مراد کوئی دلیل ہے خواہ وہ عقلی ہو یا نقلی۔ اوپر آیت ۶ میں بھی یہ لفظ گزر چکا ہے۔ یہ لفظ جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں 'ظن' کے مقابل میں بھی آتا ہے' اس وجہ سے اس سے ہر وہ چیز مراد ہو سکتی ہے جو یقین و اعتماد پیدا کرنے والی ہو۔ لفظ 'هُدًى' یہاں 'کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ' کے ساتھ آیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ خاص سے پہلے عام کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت خلق کو انبیاء علیہم السلام کی زبانی تعلیم کے ذریعہ سے بھی پہنچی ہے اور روشن صحیفوں کے ذریعہ سے بھی مثلاً تورات، زبور، انجیل اور قرآن مجید کے ذریعے سے۔ میرا خیال ہے کہ 'هُدًى' سے یہاں پہلی قسم کی دلیل مراد ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ دلیل کی یہ نفی اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے۔ مشرکین اپنے موقف کی تائید میں جو کچھ کہتے تھے اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اس کی نوعیت مجرد تقلید کی ہے اور مجرد تقلید کوئی دلیل نہیں ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْهُمْ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ (۲۱)

یہ ان کے مجادلہ بلا علم کی تفصیل ہے کہ جب ان کو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کی پیروی کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہم نے باپ دادا سے جو طریقہ پایا ہے ہم اسی پر چلتے رہیں گے' اس سے ہٹ کر کوئی نئی راہ اختیار کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔ فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ کیا اس شکل میں بھی یہ اسی روش پر جامد رہیں گے جب کہ شیطان ان کو تقلیدِ آباء کے اس تعصب میں مبتلا کر کے ان کو جہنم کی طرف بلا رہا ہو! مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کی صحت و صداقت کی مجرد یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ آباء و اجداد سے چلی آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جس طرح بے سوچے سمجھے تم باپ دادا کے طریقہ کو دین بنائے بیٹھے ہو اسی طرح تمہارے باپ دادا نے بھی بے سوچے سمجھے اگلوں سے جو پایا ہو اس کو دین بنا لیا ہو۔ اس وجہ سے دانش مندی اور حق پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی جس کتاب کی تم کو دعوت دی جا رہی ہے اس کو سنو، اس پر غور کرو اور اس کے دلائل کی روشنی میں اپنے عقائد و اعمال کا جائزہ لو۔ ایسا نہ ہو کہ اس اندھے بہرے تعصب میں مبتلا ہو کر شیطان کی پیروی میں جہنم میں جا گرو۔ یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ قومی دین، قومی تہذیب اور قومی روایات کے نعروں میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ نعرے بلند کرتے ہیں وہ قومی تہذیب و روایات کے محافظ سمجھے جاتے ہیں اور عوام ان کے نعروں سے اس طرح مسحور ہو جاتے ہیں کہ اس کے خلاف وہ کوئی بات بھی سننے کے روادار نہیں ہوتے، خواہ وہ کتنی ہی بڑی حقیقت ہو۔ میرے نزدیک 'یَدْعُوْهُمْ' میں ضمیر مفعول کا مرجع 'اٰبَآءَ' نہیں بلکہ خود اس قول کے قائلین ہیں۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲)

اسلام کی اصل روح احسان ہے

'اَسْلَمَ' کا صلہ 'ل' کے ساتھ بھی قرآن میں آیا ہے اور 'اِلٰی' کے ساتھ بھی۔ دونوں کے مواقع استعمال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صورت میں تو یہ کامل تفویض و سپردگی کے مفہوم میں آیا ہے جو اسلام کی اصل حقیقت ہے۔ دوسری صورت میں جیسا کہ یہاں ہے یہ نیازمندانہ متوجہ ہونے کے مفہوم میں آیا ہے۔ یہ متوجہ ہونا حقیقی بھی ہو سکتا ہے اور غیر حقیقی بھی اس وجہ سے اس کے ساتھ 'محسن' کی قید لگی ہوئی ہے۔ 'احسان' کے معنی، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، کسی کام کو کمال درجہ خوبی و اخلاص کے ساتھ کرنے کے آتے ہیں۔ اس قید کے لگ جانے سے لفظ 'اسلام' کا مفہوم یہاں متعین ہو گیا کہ آدمی خدا کی طرف متوجہ ہو اور کمال درجہ خوبی و یکسوئی اور پوری وفاداری و جاں نثاری کے ساتھ متوجہ ہو۔ مشرکین و منافقین کی طرح نہیں کہ نام تو خدا کا لیتے ہیں لیکن اس کی خدائی اور اس کے حقوق میں دوسروں کو بھی شریک کیے بیٹھے ہیں اور ان کے نزدیک اصل اہمیت خدا اور اس کے احکام کی نہیں بلکہ اس کے شریکوں اور ان سے متعلق رسوم و اوہام کی ہے۔

خدا کے ساتھ تعلق کا اصل ذریعہ

یہ آیت تقلیدِ آباء کے علم برداروں اور شرک کی حمایت میں لڑنے والوں کے جواب میں ارشاد ہوئی ہے کہ نہ باپ دادا کے طریقہ کی اندھی تقلید کوئی کام آنے والی چیز ہے اور نہ دیویوں دیوتاؤں کا سہارا کچھ کام آنے والا بنے گا۔ البتہ جو لوگ پورے اخلاص اور حسنِ عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں انھوں نے اپنے رب کے ساتھ وابستہ کرنے والی ایک مضبوط رسی تھام لی ہے جو ان کے لیے خدا کے ساتھ تعلق و توسّل کا ایک محکم ذریعہ ہو گی اور یہ کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔

ایک تنبیہ

'وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ'۔ یہ تنبیہ ہے اور بڑی ہی سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس رسی کے سوا دوسری رسیاں جو لوگوں نے تھام رکھی ہیں، وہ بھی ان کے لیے کچھ کام آنے والی بن سکیں گی۔ ان جھوٹے سہاروں میں سے کوئی بھی کام آنے والا نہیں ہے اس لیے کہ تمام امور بالآخر اللہ ہی کے آگے پیش ہوں گے، کوئی دوسرا مولیٰ و مرجع بننے والا نہیں ہے کہ اس کا سہارا کچھ کام آسکے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ۭ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۲۳)

نبی صلعم کو تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اور ساتھ ہی اوپر والی آیت میں مخالفین کے لیے جو دھمکی ہے وہ مزید مؤکد کی گئی ہے۔ فرمایا کہ آج جو لوگ تمہاری دعوت کی مخالفت کر رہے ہیں ان کی مخالفت تمہارے لیے ذرا بھی باعثِ غم نہ ہو۔ بالآخر ان سب کی پیشی ہمارے ہی سامنے ہونی ہے۔

اس دن ہم ان کے آگے ان کا سارا کچا چٹھا رکھ دیں گے۔ ’اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ‘ یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ ساری دنیا کے اعمال و اقوال سے واقف ہونا اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم کا حال یہ ہے کہ لوگوں کے سینوں میں جو راز چھپے ہوتے ہیں وہ ان سے بھی باخبر ہے۔

نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ (۲۴)

سب خدا کی زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں

’اضطرار‘ کے بعد ’الیٰ‘ کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ لفظ مجبور کر کے کشاں کشاں لے جانے کے مفہوم پر متضمن ہے۔ اس تضمین کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ آخرت کا معاملہ بہت دور کا معاملہ ہے۔ اس دنیا کی مہلت ایک بالکل محدود مہلت ہے۔ فرمایا کہ ہم نے ان کو جو مہلت دی ہے یہ چند روزہ ہے۔ یہاں ہم کچھ دن ان کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کریں گے پھر ہم ان کو کشاں کشاں ایک شدید عذاب کی طرف گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان اس دنیا میں قدرت کے ایسے نوامیس و قوانین میں جکڑا ہوا ہے جن سے کسی کے لیے کسی حال میں بھی مفر نہیں ہے۔ شاہ و گدا سب ان کے آگے یکساں بےبس ہیں اور ہر ایک کو بہرحال وہیں جانا ہے جہاں ان قوانین کی زنجیر ان کو گھسیٹ کر لے جاتی ہے۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۲۵)

مخالفین پر خود ان کے مسلمات سے اتمام حجت

یہ خدا کی شکرگزاری کی وہ دلیل بیان ہوئی ہے جس کے بنیادی مقدمہ کا اعتراف خود مخالفوں کو بھی ہے۔ فرمایا کہ اگر ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کس نے کیا ہے تو اس کا جواب وہ یہی دیں گے کہ اللہ نے۔ ان سے کہو کہ جب تم تمام چیزوں کا خالق خدا ہی کو مانتے ہو تو پھر تو شکر کا حقدار بھی وہی ہوا۔ آخر یہ بات کس قاعدے سے جائز ہو سکتی ہے کہ خالق تو تنہا وہ ہو لیکن شکر کے سزاوار دوسرے بھی بن جائیں جن کا نہ اس کائنات کے خلق میں کوئی حصہ اور نہ اس کی تدبیر میں!

’بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ‘ یعنی یہ بات نہیں ہے کہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کی بنیاد کسی دلیل پر ہے۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کو خود اپنے تسلیم کردہ مقدمات کے بدیہی نتائج و لوازم کا بھی علم نہیں ہے۔ اس جہل کا نتیجہ یہ ہے کہ خود اپنے مانے ہوئے مسلمات کو خود اپنے ہی دوسرے اعمال و عقائد سے جھٹلا دیتے ہیں۔

لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (۲۶)

اصل حقیقت کا اظہار

یہ اصل حقیقت کا اظہار ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اسی کی مخلوق و مملوک اور سب اسی کے دروازے کے سائل و محتاج ہیں۔ بے نیاز اور ستودہ صفات صرف اسی کی ذات ہے۔ اس وجہ سے شکر کا سزاوار حقیقی تنہا وہی ہے، اس کے سوا کسی کا بھی یہ درجہ و مرتبہ نہیں ہے کہ اس کے اس حق میں وہ

شریک قرار دیا جا سکے۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۷)

سورۂ کہف میں یہی مضمون بدیں الفاظ گزرا ہے:

نشانیوں کی تعبیر کلمات سے

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا	ان سے کہہ دو کہ اگر میرے رب کی نشانیوں کو قلم بند کرنے کے
لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ	لیے سمندر بھی روشنائی بن جائے تو میرے رب کی نشانیوں کے
قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ	قلم بند ہونے سے پہلے سمندر خشک ہو جائے گا اگرچہ اسی کے
وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (۱۰۹)	برابر ہم اور روشنائی فراہم کریں۔

'کَلِمٰتُ' سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ نشانیاں ہیں جو اس کی ذات، صفات اور اس کی قدرت و حکمت پر گواہی دیتی ہیں۔ چونکہ ہر نشانی اللہ کے کلمۂ 'کُنْ' کا مظہر ہے اور ہر نشانی اپنی زبانِ حال سے ناطق بھی ہے اس وجہ سے یہاں نشانیوں کو کلمات سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ تعبیر نہایت ہی معنی خیز تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کوئی ایسی مبہم و مجہول چیز نہیں ہے کہ اس کے باب میں لوگوں کو ایسا التباس پیش آئے کہ لوگ جس اینٹ پتھر کو چاہیں خدا سمجھ کر اس کو ڈنڈوت شروع کر دیں۔ اس کائنات میں خدا کی اتنی نشانیاں ہیں کہ اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر، مزید سات سمندروں کے اضافے کے ساتھ، روشنائی بن جائیں جب بھی ان کا قلم بند کیا جانا ممکن نہیں ہے۔ اور یہ تمام نشانیاں اس بات پر شاہد ہیں کہ اس کا خالق عزیز و حکیم ہے۔ ان دونوں صفتوں کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات میں سے ہیں اور قرآن میں ان سے جگہ جگہ توحید، قیامت اور رسالت تینوں پر استدلال کیا گیا ہے اور یہی مسائل قرآن کے اصول مسائل ہیں۔ گویا اس کائنات کی ہر چیز اس کے خالق کے عزیز و حکیم ہونے کی گواہی دے رہی ہے اور انہی کے مقتضیات ہیں جن کو تسلیم کرنے کی قرآن دعوت دے رہا ہے۔

ہر چیز شاہد ہے کہ خدا عزیز و حکیم ہے

اس آیت میں 'اقلام' کا مقابل لفظ 'مداد' حذف ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری عبارت یوں ہوگی۔ 'مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ مِدَادًا' حذف کے اس اسلوب کی مثالیں ہم جگہ جگہ پیش کرتے آ رہے ہیں۔

سورۂ کہف کی مذکورہ بالا آیت کے تحت ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ کوئی مبالغہ کا اسلوب نہیں ہے بلکہ یہ بیانِ حقیقت ہے۔ وہاں ہم نے لکھا ہے کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے تو یہ روشنائی خود سمندر ہی کے عجائب کو قلم بند کرنے کے لیے کافی نہیں ہوگی چہ جائیکہ اس پوری کائنات کے عجائب۔ یہ زمین جو ہمارے قدموں کے نیچے ہے خدا کی لامتناہی کائنات کا ایک نہایت ہی حقیر حصہ ہے لیکن سائنس کی تمام ترقیوں کے باوجود اب تک انسان اس کے جو عجائب دریافت کر سکا ہے اس کی حیثیت سمندر کے ایک قطرے سے زیادہ نہیں ہے

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۲۸)

خدا کے عزیز و حکیم ہونے کا لازمی تقاضا

یہ اوپر کے تمام مقدمات کا نتیجہ اور خلاصہ سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ جب اس کائنات کی ہر چیز شاہد ہے کہ اس کا خالق عزیز بھی ہے اور حکیم بھی تو اس امر میں کسی شک کی گنجائش کہاں باقی رہی کہ ایک دن اللہ تعالیٰ سب کو از سرِ نو پیدا کر کے قبروں سے اٹھائے گا۔ وہ عزیز ہے اس وجہ سے اس کے لیے یہ کام ذرا بھی مشکل نہیں ہے اور حکیم ہے اس وجہ سے یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو وہ عزیز نہیں رہتا اور اگر کر سکنے کے باوجود نہ کرے تو یہ اس کی حکمت کے منافی ہے اس لیے کہ قیامت کے بغیر یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال بن کے رہ جاتی ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

'اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ' میں مضاف محذوف ہے یعنی 'كَخَلْقِ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ' یا 'كَبَعْثِ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ' یعنی کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ اتنی ساری مخلوق کو از سرِ نو پیدا کرنا اور ان کو اکٹھا کرنا کس کے امکان میں ہے۔ فرمایا کہ اللہ کے لیے ایک نفس کو پیدا کر دینا اور تمام جہان کو پیدا کر دینا اور اس کو اٹھا کھڑا کرنا یکساں ہے۔ اس کے ایک ہی کلمۂ 'کن' یا ایک ہی نفخ صور سے ساری دنیا از سرِ نو زندہ ہو کر اٹھ کھڑی ہو گی۔ وہ ہر چیز پر قادر اور عزیز ہے۔

'اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ' یہ قیامت کے اصل مقصد، حساب کتاب، کی یاددہانی ہے کہ کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہ ہو کہ اتنی وسیع خلقت کے احوال و معاملات کا علم کسے ہے کہ وہ ان کا حساب کرنے بیٹھے گا۔ فرمایا کہ اللہ سب کچھ سن اور دیکھ رہا ہے، کوئی چیز اس کے علم و مشاہدہ سے باہر نہیں ہے اس وجہ سے اس کو لوگوں کا حساب کرنے اور ان کو جزا یا سزا دینے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئے گی۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲۹)

آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ

اوپر آیت ۲۰ میں 'اَلَمْ تَرَوْا' جمع کے صیغہ سے اپنی آیات کی طرف توجہ دلائی تھی یہاں 'اَلَمْ تَرَ' واحد کے صیغہ سے توجہ دلائی ہے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب جمع کے لیے بھی آتا ہے۔ اس صورت میں گویا مخاطب گروہ کے ایک ایک شخص کو فرداً فرداً توجہ دلائی جاتی ہے اور اس میں جمع کے مقابل میں زیادہ زور ہوتا ہے۔

فرمایا کہ یہ خدا ہی کی قدرت و حکمت ہے کہ وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ 'رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنا' تعبیر ہے یکے بعد دیگرے، پوری سرگرمی کے ساتھ، ایک دوسرے کے تعاقب اور پوری پابندیٔ اوقات کے ساتھ، ان کی آمد و شد کی۔

'وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى' اور یہ اسی کی قدرت و حکمت ہے کہ اس نے سورج اور چاند کو اپنی خلق کی خدمت گزاری کے لیے مسخر کر رکھا ہے اور یہ دونوں پوری پابندیٔ اوقات کے ساتھ

اپنے مداروں میں گردش کرتے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ مدار سے سرِ مو انحراف ہو یا نظامِ اوقات کی پابندی میں منٹ یا سیکنڈ کا بھی فرق واقع ہونے پائے۔

ان نشانیوں کی طرف توجہ دلانے سے مقصود انہی حقائق کو مبرہن کرنا ہے جو اوپر زیرِ بحث آئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا کی قدرت کی یہ نشانیاں دیکھتے ہو اس کی نسبت تم یہ گمان کرتے ہو کہ وہ تم کو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا؟ جو رات اور دن اور سورج اور چاند کو اس طرح گردش دے رہا ہے کیا اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس کا شریک ہونے کا درجہ رکھتی ہے! اور کیا جس نے اپنی ربوبیت کی یہ شانیں دکھائی ہیں اس کی نسبت اس سوئے ظن کی کوئی گنجائش ہے کہ اس نے یہ سارا کارخانہ بالکل عبث بنایا ہے، اس کے پیچھے کوئی روزِ جزا نہیں ہے۔

وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ یعنی اگر تم اس نظامِ ربوبیت و قدرت پر غور کرو تو اس امر میں ذرا شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہے گی کہ جو اس سارے نظام کو چلا رہا ہے وہ تم سے اور تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ بے خبر ہو تو وہ تمہاری پرورش کس طرح کرے گا؟ اور اگر باخبر ہے تو آخر وہ تم سے پرسش کیوں نہیں کرے گا کہ تم نے اس کی پروردگاری کا حق ادا کیا یا نہیں!

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۳۰)

نظامِ کائنات کی باقاعدگی خدا کی توحید کی دلیل ہے

یعنی اس نظامِ کائنات کے اندر یہ باقاعدگی، یہ پابندی اور یہ ہم آہنگی و توافق جو پائی جاتی ہے یہ اس وجہ سے پائی جاتی ہے کہ معبودِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اس تمام کائنات کی باگ تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اس کے سوا کچھ دوسرے الٰہ بھی اس کے خلق و تدبیر میں دخیل ہوتے تو یہ سارا نظام جیسا کہ فرمایا ہے لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا درہم برہم ہو جاتا۔ اس وجہ سے وہ سارے معبود بالکل بے حقیقت اور باطل ہیں جن کی یہ لوگ پرستش کر رہے ہیں۔ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ یعنی یہ نظامِ کائنات جس طرح خدا کی یکتائی پر شاہد ہے اسی طرح اس بات پر بھی شاہد ہے کہ خدا کی ذات بڑی ہی برتر اور بڑی ہی عظیم ہے۔ اس کی قدرت و حکمت کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ وہ رات کے بعد دن کو نمودار کر دیتا ہے اور دن پر رات کو ڈھانک دیتا ہے اور سورج اور چاند سب کی نکیل اس کے ہاتھ میں ہے۔ جو ذات اتنی عظیم و بلند ہے وہ اس سے ارفع ہے کہ کسی چیز کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۳۱)

مغروروں کو تنبیہ

اب یہ کشتی کی مثال سے مخاطبوں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ذرا میں مغرور اور مایوس ہو جانے والے نہ بنو بلکہ امتحان و آزمائش میں صبر کرنے والے اور نعمت میں شکر کرنے والے بنو۔ یہی راستہ سلامتی

کا ہے اور اسی پر چل کر فلاح حاصل کرنے والے بن سکو گے مگر تمہارا حال یہ ہے کہ اس وقت خدا کی عنایت سے جو تمہارے حالات سازگار ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر تمہارے پاؤں ہی نہیں پڑ رہے ہیں حالانکہ یہ سارا نشہ بالکل عارضی ہے۔ اگر ابھی خدا کی کسی پکڑ میں آ گئے تو سارا نشہ ہرن ہو جائے گا اور توبہ توبہ پکار اٹھو گے۔ لیکن یہ توبہ بھی بالکل وقتی ہو گی، جونہی حالات سازگار ہوں گے وہی سرمستی پھر عود کر آئے گی۔ ایک کشتی کے مسافروں کو جس طرح کے حالات پیش آتے ہیں ان سے سبق لو۔ اگر کوئی آزمائش میں صابر اور نعمت میں شاکر رہنا چاہے تو اس کے لیے ان کے حالات میں بڑا درس ہے۔

وَإِذَا غَشِيَهُم مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ (۳۲)

یہ اوپر کے اجمال کی تفصیل ہے کہ کشتی کے مسافروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب تک کشتی رواں دواں رہتی ہے اس وقت تک ان کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ خدا کی چلائی ہوئی سازگار ہوا کا کرشمہ ہے کہ وہ سمندر کے سینہ پر سوار اس سکون و راحت کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ اس کو اپنی ذہانت و قابلیت کا کرشمہ سمجھتے ہیں اور خدا اور اس کی قدرت کو بھولے رہتے ہیں۔ لیکن جب دفعتہً کسی گوشے سے طوفانی ہوائیں نمودار ہوتی ہیں اور سائبانوں کی مانند اٹھنے والی موجیں ان کو ڈھانک لیتی ہیں تب ان کو خدا یاد آتا ہے اور وہ سو سو طرح اس سے فریاد کرتے اور آئندہ کے لیے اطاعت و وفاداری کا عہد کرتے ہیں لیکن جب کشتی ساحل پر پہنچ جاتی ہے تو ان میں سے تھوڑے اپنے عہد پر قائم رہنے اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے والے نکلتے ہیں، باقی غدار و ناشکرے نکلتے ہیں اور وہ سب خدا کی نشانیوں کو فراموش کر کے اپنی پچھلی سرمستیوں میں کھو جاتے ہیں۔

یہ قریش کے متمردین کو تنبیہ اور ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ اس وقت ان کے حالات سازگار ہیں اس وجہ سے خدا سے بے نیاز ہیں اور جب ان کو خدا کی پکڑ سے ڈرایا جاتا ہے تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن جب کسی پکڑ میں آ جائیں گے تو توبہ توبہ پکاریں گے۔ پھر جب ڈھیل مل جائے گی تو ان کو اپنا یہ عہد یاد بھی نہیں رہے گا۔ ایسے عہد شکن اور ناشکرے لوگ کسی نشانی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔

'فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ' کے بعد 'وَأَكْثَرُهُمْ كَفُورُونَ' یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔ اس محذوف کو بعد کے ٹکڑے 'وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ' نے کھول دیا ہے۔ 'مُقْتَصِدٌ' کے معنی راہِ حق و عدل پر چلنے والے کے ہیں۔

'وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ'۔ 'خَتَّار'، 'خَتْر' سے مبالغہ ہے۔ اس کے معنی ... ختّار و
بدترین قسم کی بے وفائی و عہد شکنی کرنے والا۔ یہ الفاظ یہاں اوپر کے الفاظ 'صَبَّارٍ شَكُورٍ' ... استعمال کفور

ہوتے ہیں۔ 'صَبَّار' سے وہ لوگ مراد ہیں جو ہر طرح کے حالات میں اپنے رب کے عہد پر استوار رہتے ہیں اور 'خَتَّار' سے وہ لوگ مراد ہیں جو نعمت میں تو خدا سے بے پروا رہتے ہیں البتہ جب کسی مصیبت میں پھنستے ہیں تو خدا سے عہد و پیمان باندھتے ہیں لیکن یہ عہد و پیمان ان کو صرف اسی وقت تک یاد رہتا ہے جب تک خدا کی پکڑ میں رہتے ہیں، اس سے چھوٹتے ہی وہ اپنے سارے عہد و پیمان کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدترین قسم کی غداری ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے نہ اللہ کی نعمت کی نشانیاں کارگر ہوتی ہیں نہ کوئی تنبیہ ان پر اثر انداز ہوتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۥ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۳۳)

آخری تنبیہ — یہ آخری تنبیہ ہے کہ لوگو اپنے رب کی پکڑ اور اس کے قہر و غضب سے بچو اور اس دن سے ڈرتے رہو جس دن نہ کوئی باپ اپنی اولاد کے کچھ کام آئے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آنے والا بن سکے گا بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ باپ اور بیٹے کا رشتہ سب سے زیادہ قریبی رشتہ ہے جب یہ ایک دوسرے کے کام آنے والے نہ بن سکیں گے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

زبان کے ایک اسلوب کی بلاغت — یہاں اسلوبِ بیان کی یہ ندرت ملحوظ رہے کہ بیٹے کے کام نہ آسکنے کی نفی میں شدت پائی جاتی ہے۔ فرمایا ہے 'وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا' زبان کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ مبتدا کے علاوہ اور فعل کی جگہ اسم کے استعمال نے اس جملہ میں بڑا زور پیدا کر دیا ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اول تو ہر باپ کو فطری طور پر اپنے بیٹے سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ پیری میں اس کا سہارا بنے گا، دوسری یہ کہ بیٹا اپنی عمر اور صلاحیت کے اعتبار سے باپ کے مقابل میں زیادہ اس بات کا اہل ہوتا ہے کہ اپنے ناتواں باپ کی مدد کر سکے۔ تیسری یہ کہ بیٹے کے اندر جوانی کے سبب سے فتوت و حمیت کا جذبہ بھی زیادہ قوی ہوتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس دن نفسی نفسی کا یہ عالم ہوگا کہ بیٹا بھی اپنے باپ کے کام آنے والا نہ بن سکے گا۔

اس دنیا کا فریب، نظر — یہاں اس دور کے حالات پر نظر رہے جس دور میں یہ آیات اتری ہیں۔ سورۂ عنکبوت کی تفسیر میں بھی ہم اشارہ کر چکے ہیں اور اس سورہ کی آیت ۱۵ کے تحت بھی یہ بات گزر چکی ہے کہ اس دور میں باپوں کی طرف سے بیٹوں پر ان کو اسلام سے روکنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا تھا اور اس کے حق میں بزرگانہ دلیل یہ پیش کی جاتی تھی کہ تم ہمارے طریقہ کی پیروی کرتے رہو۔ قیامت کے دن تمہارے نیک و بد کے ذمہ دار ہم ہیں۔ یہ آیت اس بات کی تردید کر رہی ہے۔

'اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا' یعنی اللہ کا یہ وعدہ شدنی ہے۔ قیامت آکے

رہے گی تو یہ دنیا کی زندگی تمھیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یعنی اس دنیا کا نظام چونکہ مجازات کے اصول پر نہیں چل رہا ہے بلکہ اس میں حق کے ساتھ باطل کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے اور اہلِ باطل اس میں زیادہ سربلند ہیں اس وجہ سے نادانوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ قیامت کا ڈراوا محض ڈراوا ہے۔ فرمایا کہ یہ چیز کسی کو غلط فہمی میں نہ ڈالے — یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ اس امتحان کے نتائج کے ظہور کا دن بعد میں آنے والا ہے۔

وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ یعنی یہ فریبِ نظر اور یہ دھوکا خدا کے بارے میں کسی کو غلط فہمی میں نہ ڈالے کہ خدا نے یہ دنیا بے مقصد بنا ڈالی ہے اور وہ اس کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق ہو کر الگ بیٹھا ہوا ہے۔ اگر کسی نے ایسا سمجھا ہے تو وہ خدا کو بہت غلط سمجھا ہے۔ بالآخر ایک دن آئے گا جس دن خدا کا کامل عدل ظاہر ہو گا اس دن اس قسم کی غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے لوگ اپنی اس حماقت پر اپنے سر پیٹیں گے۔ یہی مضمون 'مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ' والی آیت میں بھی بیان ہوا ہے۔ لفظ 'غرور' اس دنیا کے فریبِ نظر کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور اس فریبِ نظر میں مبتلا کرنے والے شیطان کے لیے بھی اور یہاں دونوں ہی معنی بنتے ہیں۔ البتہ اتنی بات یاد رکھیے کہ 'فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا' میں اس فریبِ نظر پر تنبیہ ہے جو آدمی کو اس دنیا کے باب میں لاحق ہوتا ہے اور 'وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ' میں اس مغالطہ سے آگاہ کیا گیا ہے جو نادانوں کو اللہ تعالیٰ کے باب میں لاحق ہوتا ہے۔ اور فلسفۂ دین کے اعتبار سے یہی دو مغالطے ہیں جو تمام گمراہیوں کی جڑ ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (۳۴)

ایک شبہ کا ازالہ

یہ ایک دفع دخلِ مقدر یعنی ایک شبہ یا اعتراض کا برسرِ موقع جواب ہے۔ مخالفین کو جب قیامت سے ڈرایا جاتا تو وہ جھٹ یہ سوال کرتے کہ 'مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ' آخر یہ دھمکی کب پوری ہو گی! اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتی! اس کے جواب میں فرمایا کہ اس کے آنے کا وقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ اگر اس کا وقت معلوم نہیں ہے تو اس سے اس حقیقت کی نفی نہیں ہو جاتی۔ زندگی کی کتنی حقیقتیں ہیں جن کے وقت اور ان کی نوعیت کا کسی کو علم نہیں ہوتا لیکن کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کرتا — بارش ہوتی ہے اور اس کے ہونے سے کوئی انکار نہیں کرتا لیکن اس کے ٹھیک ٹھیک وقت، اس کی مقدار اور اس کے مقامات کو کون بتا سکتا ہے! اس زمانے میں انسان نے سائنس میں بڑی ترقی کر لی ہے اور حکومتیں لاکھوں کروڑوں روپے محکمۂ موسمیات پر خرچ کرتی ہیں لیکن ان محکموں کی پیشین گوئیوں کی حقیقت ظن و تخمین سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح ایک عورت حاملہ ہوتی ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ یہ عورت جنے گی، لیکن کیا جنے گی اور کب جنے گی اس کو خدا کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ علیٰ ہذا القیاس کسی کو یہ پتہ نہیں کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا، کیا فرائض انجام دے گا اور کن حالات و مشاغل میں اس کی زندگی گزرے گی۔ بڑے بڑے

ضابطہ پسندوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی احتیاط سے اپنے پروگرام بناتے ہیں اور بڑی وضع داری سے ان کو نباہتے ہیں لیکن عین وقت پر کوئی ایسی افتاد پیش آجاتی ہے کہ ان کا سارا پروگرام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ افراد تو درکنار حکومتوں تک کا حال یہ ہے کہ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ منصوبہ بندی کرتی ہیں کہ اس سال ہم اپنے ملک میں اتنی گندم یا اتنا چاول پیدا کریں گے لیکن ذرا سا موسم کا تغیر و تبدل اور بارش کا اتار چڑھاؤ ساری منصوبہ بندی پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اور زیادہ دور کیوں جائیے، آدمی کے لیے خود اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ کتنی اہمیت رکھنے والا ہے لیکن کون جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا اور کہاں دفن ہوگا! آدمی گھر سے کسی خوشی کسی تقریب کے لیے نکلتا ہے اور وہاں سے اس کی لاش آتی ہے۔ پیدا کہاں ہوتا ہے، رہتا بستا کہیں ہے اور دفن کہیں ہوتا ہے۔ تو جب اتنی قریب کی ایسی واضح حقیقتوں کا علم بھی انسان کو نہیں ہے حالانکہ یہ زندگی کے وہ حقائق ہیں جن کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا تو قیامت کا اگر وقت نہیں معلوم ہے تو وہ کیوں مشتبہ ہو جائے!!

اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ اصل علیم و خبیر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہی جانتا ہے کہ قیامت کب آئے گی، لیکن وہ آئے گی ضرور۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے وقوع کی شہادت دے رہا ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وللہ الحمد والمنۃ۔

اتوار، ۱۰ بجے دن
۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء
رحمان آباد

تدبرِ قرآن

۳۲

السّجدة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــــ لقمان ـــــــ کا مثنیٰ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ قرآنی نام بھی دونوں کا ایک ہی یعنی الٓمّٓ ہے۔ تمہید بھی دونوں کی ایک ہی نوع کی ہے۔ اس کا آغاز اس مضمون سے ہوتا ہے کہ یہ کتاب خداوند عالم کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اس کو اتار کر اللہ تعالیٰ نے ان امّی عربوں پر عظیم احسان فرمایا ہے جن کے اندر اب تک کوئی منذر نہیں آیا تھا۔ وہ انتہائی ناشکرے ہوں گے اگر انھوں نے اس کی قدر کرنے کے بجائے اس کے کتاب الٰہی ہونے کے دعوے کو افترا قرار دیا۔ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے بعد کلام کا رُخ قرآن کے ان دعاوی کے اثبات کی طرف مڑ گیا ہے جو خاص طور پر مخالفین کی وحشت کا باعث تھے اور جن کے سبب سے وہ اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ آخر میں تورات کا حوالہ ہے کہ اسی طرح کی کتاب، اللہ نے حضرت موسیٰؑ پر بھی اتاری تھی جس کی فرعون اور اس کی قوم نے مخالفت کی اور اس کا نہایت برا انجام ان کے سامنے آیا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جس طرح تورات کے حاملین کو صبر کے امتحانوں سے گزرنے کے بعد کامیابی حاصل ہوئی اسی طرح تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو بھی صبر کے امتحان سے گزرنا پڑے گا۔ اگر تم ان مراحل سے کامیابی سے گزر گئے تو فتح تمہی کو حاصل ہوگی، تمہارے یہ مخالفین بالآخر پامال ہو کر رہیں گے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) یہ قرآن اللہ کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں ہے جو لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا کی طرف اس کی نسبت ایک افترا ہے وہ آگاہ رہیں کہ یہ افترا نہیں بلکہ یہ بالکل حق ہے اور اس کا مقصد ان لوگوں کو انذار کرنا ہے جن کے اندر کوئی منذر اب تک نہیں آیا تھا۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان قوموں کا ہو چکا ہے جنھوں نے خدا کے منذروں کی تکذیب کی۔

(۴-۹) یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہے اور پیدا کر کے اس نے اس کو چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ براہِ راست وہ اس کا انتظام فرما رہا ہے۔ تمام احکام اسی کی طرف سے صادر ہوتے اور پھر اسی کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔ اس کا کوئی دوسرا شریک و شفیع نہیں ہے۔ وہ خود تمام غائب و حاضر کا جاننے والا ہے۔ اس نے انسان کو بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ان صلاحیتوں

سے فائدہ اٹھاتے اور خدا کے شکر گزار بنتے ہیں۔

(۱۰-۱۴) منکرین قیامت کے شبہات کا جواب اور ان کے اصل محرکِ انکار کی طرف اشارہ۔ قیامت کے دن ان کا جو حال ہوگا اس کی تصویر اور اس امر کا بیان کہ اس دن کسی کا اقرار و اعتراف کسی کے لیے کچھ نافع نہ ہوگا۔ حقائق کو آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ان کا ماننا معتبر ہوتا تو اللہ تعالیٰ سب کو ایمان ہی پر پیدا کرتا، پھر یہ عقل و تمیز کی صلاحیتیں دینے اور ان کے امتحان کی کیا ضرورت تھی!

(۱۵-۲۲) قرآن پر ایمان لانے والوں کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کہ جو لوگ استکبار سے پاک ہیں اور جن کی نگاہوں میں حق کی عزت ہے وہ اس پر ایمان لائیں گے۔ یہ لوگ اس کی آیات سن کر اپنے سر جھکا دیتے ہیں، راتوں میں اٹھ اٹھ کر اپنے رب کو یاد کرتے اور اس کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا رکھی ہے آج ان کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبرداربندوں اور نافرمانوں کے ساتھ ایک ہی معاملہ نہیں کرے گا۔ ان نافرمانوں کو آخرت میں جو سزا ہونی ہے وہ تو ہوگی ہی، اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ ان کو سزا دے گا تاکہ وہ متنبہ ہونا چاہیں تو متنبہ ہو جائیں۔

(۲۳-۲۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تم سے پہلے اللہ نے موسیٰؑ کو بھی کتاب دی تھی تو جن لوگوں نے اس کو جھٹلایا خدا نے ان سے انتقام لیا۔ اسی طرح اس کتاب کے جھٹلانے والوں سے بھی وہ لازماً انتقام لے گا اور جس طرح بنی اسرائیل کے اندر سے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو امامت کا منصب بخشا جو حق پر ثابت قدم رہے اسی طرح وہ تمہارے ساتھیوں کو بھی خلق کی رہنمائی کے منصب پر سرفراز فرمائے گا اگر وہ حق پر مضبوطی سے جمے رہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی تاریخ کی طرف اجمالی اشارہ کہ تاریخ کی شہادت اسی حقیقت کو ثابت کر رہی ہے بشرطیکہ لوگوں کے پاس سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں ہوں۔

(۲۷-۳۰) کفار کو وعید کہ وہ اہلِ حق کے غلبہ کی اس بشارت کو بہت بعید از امکان چیز سمجھتے ہیں اور مذاق سے پوچھتے ہیں کہ یہ فتح کب ظاہر ہوگی! ان کو جواب کہ جب یہ چیز ظاہر ہوگی تو اس وقت اس کو ماننا ان لوگوں کے لیے ذرا بھی نافع نہ ہوگا جو آج اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے کج فہموں سے اعراض کی ہدایت کہ اگر یہ لوگ فیصلہ کے دن ہی کے منتظر ہیں تو تم بھی ان کا پیچھا چھوڑو اور اسی کا انتظار کرو۔

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ (٣٢)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ٣٠

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿١﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢﴾ اٰيات ١-١٤
اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا
مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿٣﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى
عَلَى الْعَرْشِ ۗ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۗ اَفَلَا
تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٤﴾ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ
اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿٥﴾ ذٰلِكَ
عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٦﴾ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ
شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ﴿٧﴾ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ
مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿٨﴾ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ
وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿٩﴾
وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۭ بَلْ هُمْ
بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ﴿١٠﴾ بُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ

ع ١١ ٢ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ﴿١١﴾ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ
نَاكِسُوا رُءُوسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا
نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ﴿١٢﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ
هُدَاهَا وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ
النَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٣﴾ فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا
إِنَّا نَسِينَاكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾

ترجمۂ آیات ١-١٤

یہ الٓمٓ ہے۔ اس کتاب کی تنزیل، اس میں ذرا شبہ نہیں، خداوندِ عالم کی طرف سے ہے۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے خود اپنے جی سے گھڑ کر اس کو خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے! بلکہ یہی تیرے رب کی جانب سے حق ہے تاکہ تم ان لوگوں کو ہوشیار کر دو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں آیا تاکہ وہ راہ یاب ہوں۔ ١-٣

اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو چھ دنوں میں پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ اس کے سوا نہ تمھارے لیے کوئی کارساز ہے اور نہ اس کے مقابل میں کوئی سفارشی۔ کیا تم لوگ چیتتے نہیں! ٤

وہی آسمان سے زمین تک سارے امور کا انتظام فرماتا ہے۔ پھر یہ تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھارے شمار سے ہزار سال کے برابر ہے۔ وہ غائب حاضر کا جاننے والا، عزیز و رحیم ہے۔ ٥-٦

جس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب ہی بنائی ہے! اس نے انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا، پھر اس کی نسل حقیر پانی کے خلاصہ سے چلائی۔ پھر اس کے نوک پلک سنوارے

اور اس میں اپنی روح پھونکی اور تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے ـــــ تم بہت ہی کم شکرگزار ہوتے ہو!! ۷-۹

اور کہتے ہیں کہ کیا جب ہم زمین میں رل مل جائیں گے تو ہم پھر نئی خلقت میں آئیں گے! بلکہ یہ لوگ اپنے رب کے آگے پیشی کے منکر ہیں۔ کہہ دو کہ تمھاری جان وہ فرشتہ ہی قبض کرتا ہے جو تم پر مامور ہے پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب کہ یہ مجرمین اپنے رب کے حضور اپنے سر جھکائے ہوئے اعتراف کریں گے کہ اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا تو ہمیں لوٹا کہ ہم نیک کام کریں، ہم یقین کرنے والے بن گئے۔ اگر ہم چاہتے تو ہر ایک کو اس کی ہدایت خود ہی دے دیتے لیکن میری طرف سے یہ بات متحقق ہو چکی ہے کہ میں جنوں اور انسانوں، سب سے جہنم کو بھر کے چھوڑوں گا تو اب چکھو مزا اس بات کا کہ تم نے اس دن کی پیشی کو بھلائے رکھا۔ ہم نے بھی تم کو نظر انداز کیا اور تم اپنے کیے کی پاداش میں اب ہمیشگی کا عذاب چکھو۔ ۱۰-۱۴

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱-۲)

'الٓمّٓ' کی تحقیق سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ سابق سورہ کی طرح اس سورہ کی تمہید بھی بقرہ کی تمہید سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔

قرآن پر قریش اور یہود کا اصل اعتراض

'تنزیل' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ صرف اتارنے کے نہیں بلکہ اہتمام خاص کے ساتھ درجہ بدرجہ اتارنے کے ہیں۔ 'الکتٰب' سے مراد قرآن مجید ہے۔ یعنی اس کتاب کی تنزیل اللہ ربّ العٰلمین کی طرف سے ہے۔ اس کے اللہ ربّ العٰلمین کی طرف سے ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ 'لَا رَيْبَ فِيْهِ' کا یہی مفہوم ہم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ اس آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ قریش اور یہود دونوں کو سب سے زیادہ اختلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس

دعوے سے تھا کہ یہ کتاب آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی جاتی ہے۔ اس دعوے کو وہ، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہوگا 'اِفْتِرَاء' قرار دیتے یعنی آنحضرت صلعم پر یہ الزام لگاتے کہ نعوذ باللہ اس کتاب کو یہ تصنیف تو خود کرتے ہیں لیکن ہمارے اوپر دھونس جمانے کے لیے اس کو جھوٹ موٹ منسوب اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۳)

یہ سوال حیرت و تعجب کی نوعیت کا ہے کہ کیا یہ لوگ حق کی مخالفت میں ایسے اندھے بہرے ہوگئے ہیں کہ اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے کے دعوے کو افترا قرار دیتے ہیں! مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کے اندر انصاف اور سچائی کی کوئی رمق ہوتی تو یہ بات وہ زبان سے نہ نکالتے لیکن یہ لوگ مخالفت کے جوش میں بالکل اندھے بہرے بن چکے ہیں۔

جواب میں دھمکی — بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ۔ اس الزام کا جواب قرآن مجید نے مختلف پہلوؤں سے دیا ہے جن کی وضاحت پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ یہاں کوئی تفصیلی جواب دینے کے بجائے نہایت سخت دھمکی کے انداز میں دعوے کو مزید مؤکد کر دیا ہے۔ اور یہ تاکید یہاں دو پہلوؤں سے نمایاں ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ یہی حق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جس دین آبائی کے علمبردار ہیں وہ بالکل باطل ہے، صحیح دین یہی ہے جس کی دعوت یہ کتاب دے رہی ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کتاب کے متعلق اس وہم میں نہ رہیں کہ اس کو خدا کی طرف جھوٹ موٹ نسبت دی جا رہی ہے۔ یہ فی الحقیقت خدا ہی کی طرف سے ہے، اگر یہ لوگ اسی طرح اس کو جھٹلاتے رہے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے۔

اُمّی عربوں پر اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان — لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ۔ یہ اس کتاب کے اس اہتمام کے ساتھ اتارنے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے اتاری ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے ان لوگوں کو اس زندگی کے انجام اور آخرت کے احوال سے آگاہ کر دو جن کے اندر تم سے پہلے کوئی منذر نہیں آیا۔ یہاں 'قوم' سے مراد اہل عرب ہیں جن کے اندر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ یہ اس کتاب کے احسان کا پہلو نمایاں فرمایا گیا ہے کہ اُمّی عربوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب نازل کر کے بہت بڑا فضل فرمایا ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ اس عظیم نعمت کی قدر کریں۔

ساتھ ہی اس کے اندر انذار کا پہلو بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کے اندر اپنا منذر بھیج دیتا ہے تو اس قوم کی قسمت میزان میں آجاتی ہے۔ اگر اس کے بعد بھی وہ اپنے رویہ کی اصلاح نہیں کرتی تو ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو لازماً تباہ کر دیتا ہے۔ اس سنت الٰہی کی وضاحت جگہ جگہ اس کتاب میں ہو چکی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۚ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (۴)

انذار کا عام موضوع

اوپر کی آیت میں اس کتاب کی تنزیل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا خاص مقصد انذار بتایا گیا ہے۔ اب یہ اسی کی تفصیل آ رہی ہے۔ انذار کا خاص موضوع دو چیزیں ہیں۔ ایک توحید دوسری قیامت قرآن مجید اول تو اس بات سے ڈراتا ہے کہ لوگ غلط سہاروں اور زعمی معبودوں کی شفاعت کی امید پر زندگی نہ گزاریں۔ اس کائنات کا خالق و مدبر تنہا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ سب کو بالآخر اسی کی طرف لوٹنا اور اسی کے آگے جواب دہ ہونا ہے۔ اس وجہ سے اسی کی شکرگزاری اور اسی کی عبادت و اطاعت سب پر واجب ہے۔

دوسرے وہ قیامت سے ڈراتا ہے کہ قیامت شدنی ہے۔ بالآخر سب کی پیشی خدا ہی کے آگے ہوگی۔ اس وقت مجرم اپنے جرم کا اعتراف اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ اگر ایک مرتبہ پھر انھیں دنیا میں جانے کی مہلت نصیب ہو تو وہ ایمان و عمل صالح کی زندگی گزاریں گے لیکن وہاں اس قسم کی درخواستوں اور التجاؤں کا موقع باقی نہیں رہے گا۔

آیت زیر بحث اور بعد کی چند آیتوں میں توحید کا بیان ہوا ہے اس کے بعد قیامت اور احوالِ قیامت کا ذکر آئے گا۔

یہ کائنات کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں نہیں آئی ہے

'اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ'۔ چھ دنوں سے مراد جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، خدائی ایام ہیں اور آگے وضاحت آ رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کا ایک دن ہمارے ہزار سالوں کے برابر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے چھ دنوں سے مراد چھ ادوار ہوں گے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کی خلقت کسی اتفاقی واقعہ کی طرح ظہور میں نہیں آئی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہایت تدریج و اہتمام کے ساتھ وجود بخشا ہے۔ یہ تدریج و اہتمام اس کی غایت و حکمت پر دلیل ہے اور اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کوئی کھیل تماشا نہیں ہے بلکہ ایک بامقصد و باغایت کارخانہ ہے۔

اس کا انتظام اللہ تعالیٰ براہ راست خود کر رہا ہے

'ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ'۔ یعنی اس اہتمام و انتظام سے اس دنیا کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ وہ اپنے عرشِ حکومت پر متمکن ہو کر براہ راست اور بالفعل اس کا انتظام بھی فرما رہا ہے۔ یہ مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو پیدا کر کے اس کا انتظام اپنی دوسری مقرب ہستیوں کے سپرد کر دیا ہے اور خود اس سے بالکل الگ ہو بیٹھا ہے۔ اس تصور کی بنیاد جس وہم پر تھی اس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔

براہ راست انتظام کا لازمی نتیجہ

'مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ'۔ یہ اس کے لازمی نتیجہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جب

براہ راست تمام امور کی باگ اسی کے ہاتھ میں ہے تو سب کی پیشی بھی اسی کے آگے ہوتی ہے اور وہی سارے معاملات کا فیصلہ فرمائے گا۔ اس وقت اس کے سوا نہ کوئی کسی کا کارساز و مددگار بن سکے گا اور نہ اس کے مقابل میں کوئی کسی کی سفارش کر سکے گا۔ لفظ 'دُوْنَ' میں سوا اور مقابل دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اس وجہ سے یہاں 'وَلِیّ' کے ساتھ 'شَفِیْع' کی بھی نفی فرما دی۔

'اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ' یہ تمام نتائج چونکہ مخاطب کے مسلمات پر مبنی ہیں اس وجہ سے ان کو سامنے رکھ دینے کے بعد تنبیہ کیا کہ آخر ایسی واضح باتیں تم لوگ کیوں نہیں سمجھتے!!

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۵-۶)

مشرکین کے ایک خاص گروہ کی تردید

یعنی آسمان سے لے کر زمین تک تمام امور کی تدبیر وہی فرماتا ہے۔ یہ مشرکین کے اس گروہ کی تردید ہے جو اس وہم میں مبتلا تھا کہ زمین چونکہ اللہ تعالیٰ کی کائنات کا ایک دور دراز علاقہ ہے اس وجہ سے اس نے اپنی حکومت صرف آسمان تک محدود رکھی ہے، زمین کا انتظام اس نے اپنے دوسرے کارندوں کے حوالہ کر دیا ہے۔ اسی گروہ کو مخاطب کر کے قرآن میں بعض جگہ یہ سوال آیا ہے کہ کیا زمین میں الگ خدا اور آسمان میں الگ خدا ہیں! کیسی بے عقلی کی باتیں کرتے ہو!

'ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ' یعنی تمام امور صادر بھی اسی کی طرف سے ہوتے ہیں اور پھر رجوع بھی اسی کی طرف ہوتے ہیں۔ 'يَعْرُجُ اِلَيْهِ' یہاں (REFER) ہونے کے مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ احکام صادر کر کے پھر بے تعلق نہیں ہو بیٹھتا بلکہ ہر چیز اس کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہے اور وہ پوری طرح باخبر رہتا ہے کہ کارکنانِ قضا و قدر نے کیا فرائض انجام دیے اور کس طرح انجام دیے۔

خدائی ایام کی نوعیت

'فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ' عام طور پر لوگوں نے اس سے مراد قیامت کا دن لیا ہے اور اس دن لوگوں کے اعمال کی جو پیشی خدا کے سامنے ہوتی ہے ان کے نزدیک یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ قیامت کا دن چونکہ بہت سخت ہوگا اس کی اس سختی کو بطریق استعارہ یوں تعبیر فرمایا کہ وہ ہزار سال کے برابر بن جائے گا۔ ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ حج میں اس طرح آیا ہے:

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۴۷)

اور تمہارے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار سے ہزار سالوں کے برابر کا ہوتا ہے۔

وہاں یہ آیت عذاب کے لیے لوگوں کی جلد بازی کے جواب میں وارد ہوئی ہے کہ جب ان کو عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس عذاب کی دھمکی ہم ایک مدت سے سن رہے ہیں لیکن وہ آیا نہیں، اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتا! ان کے جواب میں فرمایا ہے کہ خدا کے کاموں کو اپنے محدود پیمانوں

سے نہ ناپو۔ تمہارے دن جو بیس گھنٹوں کے ہوتے ہیں اس وجہ سے تمہیں چند سالوں کی مدت بھی بہت طویل محسوس ہوتی ہے لیکن خدا کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار سے ایک ہزار سال کے برابر کا ہوتا ہے اور اسی کے حساب سے اس کے سارے پروگرام اور منصوبے بنتے ہیں۔ تم اپنے دنوں کو پیش نظر رکھ کر گھبرانے لگتے ہو کہ فلاں بات پر اتنی مدت گزر گئی لیکن اب تک وہ واقع نہیں ہوئی اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکال لیتے ہو کہ یہ دھمکی تمہیں جھوٹ موٹ سنائی گئی حالانکہ خدائی دنوں کے اعتبار سے ابھی اس پر ایک گھڑی بھی نہیں گزری ہوتی ہے۔

بعینہٖ اسی سیاق میں آیت زیر بحث بھی وارد ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام امر و تدبیر خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ اسی کی طرف سے احکام صادر بھی ہوتے ہیں اور پھر اسی کی طرف لوٹتے بھی ہیں لیکن یہ صادر ہونا اور لوٹنا سب خدائی دنوں کے حساب سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے نہ ہر شخص ان کے نتائج سے آگاہ ہو سکتا اور نہ ہر شخص ان کی حکمتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ بندوں کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ خدا کے معاملات میں جلد بازی نہ کریں بلکہ صبر کے ساتھ انتظار کریں۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ۔ غیب اور حاضر کا جاننے والا اور عزیز و رحیم وہی ہے۔ دوسرے کسی کا بھی یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ کائنات کے تمام اسرار سے واقف ہو سکے۔ وہ تمام غائب و حاضر سے واقف بھی ہے اور عزیز و رحیم بھی ہے۔ اس وجہ سے بندوں کو چاہیے کہ وہ کامل حسن ظن کے ساتھ اس پر بھروسہ کریں۔

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہی مضمون سورۂ معارج میں یوں وارد ہوا ہے:

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ	فرشتے اور جبریل اس کی طرف صعود کرتے
فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ	ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مدت پچاس
اَلْفَ سَنَةٍ (۴)	ہزار سال کے برابر ہے۔

بظاہر اس آیت اور اوپر کی آیت میں تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن یہ تضاد نہیں ہے۔ دنوں کا یہ تفاوت مداروں کے اختلاف پر مبنی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے مختلف سیاروں کے دن الگ الگ ہیں۔ پھر یہ بات بھی توجہ کے قابل ہے کہ آیت زیر بحث میں امور کے پیش کیے جانے کا ذکر ہے اور سورۂ معارج میں ملائکہ اور جبریل کی پیشی کا ذکر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ امور کی پیشی ہزار سال کے دن میں ہوتی ہو اور ملائکہ اور جبریل کی براہ راست پیشی کا دن پچاس ہزار سال کے برابر ہو۔ یہ امور غیب ہیں۔ ان کے باب میں کوئی بات جزم کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تاہم اتنی بات بالکل واضح ہے کہ دونوں آیتوں میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ سورۂ حج کی تفسیر میں اس مسئلہ پر ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ سورۂ معارج کی تفسیر میں ان شاء اللہ ہم اس کے بعض دوسرے گوشوں پر بھی نظر ڈالیں گے۔

الَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (۷-۹)

انذارِ قیامت کے لیے تمہید صفاتِ الٰہی سے

اللہ تعالیٰ کی صفات عالم الغیب والشہادۃ اور عزیز و رحیم کو بنیاد قرار دے کر آگے قیامت کے انذار کے لیے تمہید استوار فرمائی کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی۔ یعنی اس نے جو چیز بھی بنائی ہے اس کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور اس کے بے نہایت علم کی شاہد ہے۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی لے کر انسان اگر اس پر غور کرے تو اس کی عقل صانع کی صنعت و کاریگری پر دنگ رہ جاتی ہے اور وہ بے خود ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ 'تَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ' (بڑی ہی بابرکت ذات ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا!!) یہیں سے انسان پر اس حقیقت کا دروازہ کھلتا ہے کہ جو ذات اتنی قدرت رکھنے والی، اتنی حکیم، اتنی باریک بیں اور ایسی رحمان و رحیم ہے اس کی نسبت یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتنا بڑا عالم بالکل بے مقصد کھڑا کر دے۔ پس ضروری ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں وہ حق و باطل میں امتیاز کرے۔ ان لوگوں کو جزا دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس دنیا میں اندھوں بہروں کی زندگی گزاری، نہ انھوں نے خود اس کی حکمتوں پر غور کیا اور نہ دوسرے غور کرنے والوں کی باتوں کو لائق اعتنا سمجھا۔

خدا کی قدرت کا کرشمہ انسان

'وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ'۔ اوپر والے ٹکڑے میں یہ بات جو فرمائی ہے کہ اس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی، اس کے ثبوت میں خارج کی مثالیں پیش کرنے کے بجائے خود انسان ہی کی خلقت کو بطور مثال پیش کیا ہے کہ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود اپنی ہی خلقت کے مراحل و مدارج پر غور کرو اور دیکھو کہ خدا کی قدرت و حکمت اور اس کی ربوبیت کی کیا کیا نشانیاں تمھارے اندر ظاہر ہوئی ہیں! فرمایا کہ یہ انسان جو آج اپنی قابلیتوں پر اتنا نازاں ہے، اس کا آغاز خدائے حکیم و قدیر نے کسی بڑے قیمتی جوہر سے نہیں کیا بلکہ مٹی سے کیا، اسی سے اس کا قالب بنا اور اسی مٹی کے اندر سے اس کے اندر زندگی کی حرکت نمودار ہوئی لیکن دیکھو خالق کی قدرت و حکمت کہ اس نے مٹی کے لوندے کو کیا سے کیا بنا دیا!!

انسان کی خلقت کا دوسرا مرحلہ

'ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ' یہ انسان کی خلقت کے دوسرے مرحلہ کی طرف اشارہ ہے کہ دوسرے مرحلے میں اس کی حیثیت یہ ہوئی کہ مٹی کے بجائے اس کی نسل کے چلنے کا ذریعہ حقیر و ناپاک پانی کا خلاصہ بنا۔

تیسرا مرحلہ

'ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ'۔ 'تسویہ' کے معنی جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، کسی چیز کو سنوارنے اور اس کی نوک پلک درست کرنے

کہتے ہیں۔ آرٹ کی اصطلاح میں جس چیز کو تکمیلی یا اتمامی عمل (FINISHING TOUCH) کہتے ہیں ٹھیک وہی مفہوم تَسْوِیَۃ کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیسرے مرحلے میں اگر اس نے مٹی سے بنے ہوئے اس انسان کے نوک پلک سنوارے اور اس کے اندر اپنی روح پھونکی تب اس کے اندر سمع و بصر اور دل کی وہ صلاحیتیں نمودار ہوئیں جو دوسری حیوانی مخلوقات کے مقابل میں اس کے لیے وجہ امتیاز ہیں۔

انسان کا اصلی شرف

'نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ' میں روح سے مراد وہ روح ہے جس کو ہم روح ملکوتی سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسان کے اندر حیوانی روح کے ساتھ ایک نور یزدانی (DIVINE SPARK) بھی ہے اور اسی نور کے فیض سے انسان کے سمع و بصر اور فواد میں وہ روشنی پیدا ہوئی ہے جس سے اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ اگر اس روشنی سے وہ محروم ہو جائے تو پھر اس کا باطن بھی اسی طرح تیرہ و تار ہے جس طرح حیوانات کا ہے۔ کان، آنکھ اور دل حیوانات کے پاس بھی ہیں لیکن وہ نور یزدانی سے محروم ہیں اس وجہ سے ان کے کانوں، آنکھوں اور دلوں میں وہ صلاحیت نہیں ہے جو انسان کے سمع و بصر اور دل میں ہے۔ اگر انسان اپنے کو اس نور سے محروم کر لے تو پھر وہ بھی ایک حیوان ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس نور کو باقی رکھنا اور اس کو بڑھانا یا گھٹانا انسان کے اپنے اختیار پر منحصر ہے۔ جو لوگ اس کی قدر کرتے اور اس کے حقوق ادا کرتے ہیں وہ اس میں اضافہ کرتے ہیں اور ان کے اندر یہ قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے اور جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے ان کے اندر یہ ضعیف ہوتے ہوتے بالکل ہی بجھ جاتا ہے۔

'مِنْ رُّوْحِهٖ' میں اضافت سے مقصود فی الجملہ اس روح کے اختصاص کا اظہار ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے خاص فیوض و برکات میں سے ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حصہ ہے۔ اس غلط فہمی پر تنبیہ اس لیے ہم نے ضروری سمجھی ہے کہ وحدت الوجود کی گمراہیوں میں بڑا دخل اسی غلط فہمی کا ہے۔

تسویہ اور نفخ روح سے پہلے انسان جمادیت کے دور میں تھا

اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تسویہ اور نفخ روح سے پہلے انسان پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب انسان حیوانات کی طرح ناتراشیدہ اور بصیرت و ادراک سے محروم تھا۔ اس دور کے بعد تسویہ نے اس کے ظاہر کو سنوارا اور نفخ روح نے اس کے باطن کو منور کیا۔

خلاصۂ بحث

'قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ' یعنی اپنی خلقت کے ان تمام مراحل پر غور کرو کہ کس طرح خدا نے تمھارا آغاز کیا اور پھر کس درجے تک تم کو پہنچایا! حق تھا کہ تمھارا بال بال اپنے رب کی اس عنایت و ربوبیت کا شکر گزار ہوتا اور جو نعمتیں و صلاحیتیں اس نے تم کو بخشیں ان کو تم اس کی رضا کے کاموں میں استعمال کرتے لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ تم بہت ہی کم اس کے شکر گزار ہوتے ہو۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ (۱۰)

سب کچھ دیکھنے کے بعد انسان کی بے بصیرتی

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو سمع و بصر اور ادراک و تعقل کی جو صلاحیتیں بخشی تھیں وہ اس لیے بخشی تھیں کہ ان سے وہ کام لیں اور خدا کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کے آثار کے مشاہدہ سے اس نتیجے تک پہنچیں کہ یہ دنیا عبث نہیں پیدا ہوئی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس دن ہر شخص اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے اپنے رب کے حضور حاضر کیا جائے اور وہ جزا یا سزا پائے لیکن اس انسان کی کج فہمی کا یہ حال ہے کہ جب اس کو قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو خدا کی قدرت کی اتنی شانیں دیکھنے کے باوجود، وہ طنز و استہزا کے ساتھ یہ سوال کرتا ہے کہ کیا جب ہم گل سڑ کر زمین میں رل مل جائیں گے تو اس کے بعد از سر نو زندہ کیے جائیں گے!!

قیامت کے انکار کے لیے ایک بہانہ

'بَلْ هُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ'۔ یعنی یہ باتیں سب اوپر کے بہانے ہیں۔ آخر خدا کی اتنی شانیں اپنے وجود کے اندر اور باہر دیکھتے ہوئے یہ اتنے غبی کس طرح ہو سکتے ہیں کہ اپنے دوبارہ پیدا کیے جانے کو اس کی قدرت سے بعید سمجھیں! اصل چیز یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کے آگے پیشی اور اعمال کی جواب دہی کے منکر ہیں، اس چیز کو تسلیم کرنا ان کے دلوں پر بہت شاق ہے اس وجہ سے اس سے گریز کے لیے یہ تمام عقلی استبعادات اور شبہات گھڑے اور اٹھائے جا رہے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بسا اوقات انسان انکار تو کسی اور چیز کا کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے انکار کے لیے بہانہ کسی اور چیز کو بناتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ براہِ راست اس حقیقت کے انکار کی کچھ زیادہ گنجائش وہ نہیں پاتا۔ مشرکینِ عرب کا حال بھی یہی تھا۔ وہ خدا کے قائل تھے اس وجہ سے خدا کے آگے پیشی کا صریح انکار ان کے لیے مشکل تھا لیکن اس کو ماننے سے جو بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں وہ ان کے لیے بھی تیار نہیں تھے اس وجہ سے اس سے گریز کے لیے اول تو وہ قیامت پر اس قسم کے شبہات وارد کرتے تھے جس کی ایک مثال اوپر گزری اور بدرجۂ آخر اس کو مانتے بھی تھے تو اس کے نتائج سے بچاؤ کے لیے انھوں نے شرکاء و شفعاء ایجاد کر لیے تھے۔

دونوں شبہات کا کھلا جواب

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (۱۱)

یہ اوپر کی دونوں باتوں کا جواب ہے کہ جو مرتا ہے اس کو خدا کا وہ فرشتہ ہی وفات دیتا ہے جو خدا کی طرف سے ہر شخص پر مامور ہے۔ اس وجہ سے کوئی شخص مرنے کے بعد بھی خدا اور اس کے مامور ملائکہ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ چاہے گا وہ ہر شخص کو اٹھا کھڑا کرے گا اور وہ اس کے مامور ملائکہ کی نگرانی میں ان کے سامنے حاضر کیا جائے گا۔

'ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ'۔ یعنی کوئی اس طمع خام میں بھی مبتلا نہ رہے کہ اس کی واپسی اس کے مزعومہ شرکاء و شفعاء کی طرف ہونی ہے۔ اس دن ان شرکاء و شفعاء کا کوئی وجود نہیں ہوگا، سب کی پیشی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سامنے ہی ہوگی اور وہی سب کا فیصلہ فرمائے گا۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا

نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ (۱۲)

خطاب کی نوعیت اور تمنی کے جواب کے حذف کی بلاغت

'وَلَوْ تَرَىٰ' میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہو سکتا ہے اور عام مخاطبوں سے بھی۔ پہلی شکل میں یہ آیت تسلی کے سیاق میں ہوگی اور دوسری صورت میں تہدید کے سیاق میں۔ اگر پہلی صورت اختیار کیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ آج تو یہ لوگ تمہارے آگے بہت اکڑ رہے ہیں اور بڑے تبختر و رعونت کے ساتھ قیامت اور خدا کے آگے پیشی کا انکار کر رہے ہیں لیکن اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب یہ تمام مجرمین سر نیہوڑائے اپنے رب کے سامنے حاضر ہوں گے تو ـــــــ یہاں تمنی کا جواب محذوف ہے اور اس حذف میں بڑی بلاغت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس وقت ان کی بے بسی کا وہ منظر دیکھتے جس کا آج تصور بھی نہیں کر سکتے!

'رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ'۔ یعنی اس وقت ان میں سے ہر ایک کی زبان پر یہ اعتراف ہوگا کہ اے ہمارے رب! ہم نے اچھی طرح دیکھ اور سن لیا۔ اب ہمیں ایک بار دنیا میں پھر لوٹا تاکہ ہم کچھ نیکی کمائیں۔ ہمیں ہر بات کا پورا یقین ہو گیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (۱۳)

مشاہدہ کے بعد کا ایمان بے سود ہے

یہ ان کے اعتراف اور ان کی درخواست کا جواب ہے جو برسرِ موقع ان کو دیا جائے گا کہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد تمہارا یہ اقرار و ایمان بالکل بے سود ہے۔ اگر اللہ کو اس طرح کا مجبورانہ ایمان پسند ہوتا تو وہ ہر شخص کو ایمان و ہدایت پر ہی پیدا کرتا۔ یہ اس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہدایت کے معاملے میں اس نے لوگوں کو اختیار دیا کہ وہ امتحان کرے کہ کون اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر ایمان کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون اپنی خواہشوں کی پیروی میں شیطان کی راہ پسند کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حتمی فیصلہ کا حوالہ

'وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ' یہ اس فیصلہ کی طرف اشارہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اس کے چیلنج کے جواب میں آگاہ فرما دیا تھا۔ قرآن میں اس کا ذکر جگہ جگہ آیا ہے۔ سورۂ ص میں اس کا حوالہ یوں ہے:

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۸۲﴾	ابلیس نے کہا تیرے عزت و جلال کی قسم! میں
إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿۸۳﴾	ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ بس ان میں سے تیرے
قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ﴿۸۴﴾	خاص بندے ہی بچ رہیں گے۔ اللہ نے فرمایا کہ پھر یہ
لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ	بات بھی حق ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں کہ میں بھی
وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ	تجھ سے اور تیری ذریت سے اور ان انسانوں میں

أَجْمَعِيْنَ ٥ (ص ۳۸: ۸۴-۸۵) سے جو تیری پیروی کریں گے، سب کو جہنم میں بھر کے رہوں گا۔

یہاں اس قول کا حوالہ دینے سے مقصود مجرموں کو اس بات سے آگاہ کرنا ہوگا کہ اب عذر و معذرت کا وقت گزر گیا۔ اللہ نے شیطان کے جواب میں پہلے ہی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ بنی آدم میں سے جن کو گمراہ کر سکتا ہے گمراہ کرے۔ انسان کو خدا نے یہ آزادی دی ہے کہ وہ چاہے تو رحمان کی راہ اختیار کرے اور چاہے تو شیطان کی راہ اختیار کرے۔ دنیا کی زندگی میں یہ امتحان تھا۔ اب امتحان کا مرحلہ گزر چکا اور نتائج بھگتنے کی باری ہے چنانچہ آج وہ انجام تمہارے سامنے آگیا اور میری بات تم پر پوری ہوئی۔

فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا إِنَّا نَسِينَاكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۱۴)

'نسی' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، نظر انداز کرنے اور ٹالنے کے بھی آتے ہیں۔ یہاں یہ نظر انداز کرنے ہی کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب کسی سوال و درخواست کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ جس طرح تم نے اس دن کو نظر انداز کیے رکھا آج ہم نے تم کو نظر انداز کیا۔ اب تمہاری کوئی درخواست و التجا ہمارے نزدیک درخور اعتنا نہیں رہی۔ اب اپنے اعمال کی پاداش میں ہمیشگی کا عذاب چکھو۔ یعنی یہ تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ عمر بھر جس فصل کی تم نے کاشت کی ہے یہ اسی کا حاصل تمہارے سامنے آیا ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۵-۲۲

اوپر کی آیات سے واضح ہوا کہ جو لوگ قرآن پر ایمان لانے سے گریز کر رہے تھے ان کے گریز کے اسباب کیا تھے۔ اب آگے کی آیات میں یہ بتایا ہے کہ کس قسم کے لوگ ہیں جو اس کتاب پر ایمان لا رہے ہیں یا لائیں گے اور ان کے لیے خدا کے ہاں کیا اجر و ثواب اور کیا مرتبہ و مقام ہے اور جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ دنیا اور آخرت دونوں میں کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں ——— آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۵-۲۲

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۩ (۱۵) تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (۱۶) فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾ أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ
فَاسِقًا ۚ لَا يَسْتَوُونَ ﴿١٨﴾ أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وقف غفران
فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ
فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا
فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ
تُكَذِّبُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ
الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٢١﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ
بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنْتَقِمُونَ ﴿٢٢﴾ ع ۲ ۱۱ ۱۵

ترجمۂ آیات ۱۵-۲۲

ہماری آیات پر تو بس وہی لوگ ایمان لاتے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے ذریعے سے ان کو یاد دہانی کی جاتی ہے تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے. ان کے پہلو بستروں سے کنارہ کش رہتے ہیں. وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں خوف اور طمع سے اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں تو کسی کو پتہ نہیں کہ ان لوگوں کے واسطے ان کے اعمال کے صلہ میں آنکھوں کی کیا ٹھنڈک پوشیدہ ہے!! ۱۵-۱۷

تو کیا وہ جو مومن ہے اس شخص کے مانند ہو جائے گا جو نافرمان ہے! دونوں یکساں نہیں ہو سکتے!! جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے راحت کے باغ ہیں جو ان کو ان کے اعمال کے صلہ میں، اولین سامانِ ضیافت کے طور پر، حاصل ہوں گے۔ رہے وہ جنھوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ جب جب وہ اس

ہیں سے نکلنے کی کوشش کریں گے اسی میں دھکیلے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ اب اس دوزخ کے عذاب کا مزہ چکھو جس کی تم تکذیب کرتے رہے تھے۔ ۱۸-۲۰

اور ہم ان کو بڑے عذاب کے سوا قریب کا عذاب بھی چکھائیں گے تاکہ یہ رجوع کریں۔ اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جن کو ان کے رب کی آیات کے ذریعہ سے یاد دہانی کی جائے پھر وہ ان سے اعراض کریں! ہم ایسے مجرموں سے ضرور انتقام لیں گے۔ ۲۱-۲۲

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ (۱۵)

قرآن پر ایمان لانے والوں کی صفات

یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کے سیاق میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی دنیوی برتری کے زعم میں اپنے کو حق سے بھی بڑا سمجھنے لگے ہیں ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو، ہماری ان آیات پر صرف وہ لوگ ایمان لائیں گے جن کے دلوں کے اندر خشیت و انابت ہے۔ ان کو جب ان کے ذریعہ سے خدا اور آخرت کی یاد دہانی کی جاتی ہے تو وہ جھگڑنے کے بجائے بے تحاشا سجدوں میں گر پڑتے اور اپنے رب کی تسبیح کرتے ہیں اس کی حمد کے ساتھ۔ یعنی ان آیات سے اثر پذیر وہ لوگ ہوں گے جن کے دلوں کے اندر قساوت نہیں پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے دلوں پر اگر غفلت کا کچھ غبار ہوتا ہے تو وہ تذکیر و تنبیہ سے فوراً صاف ہو جاتا ہے اور پھر وہ حق کو ایسے جوش و جذبہ کے ساتھ اختیار کرتے ہیں کہ سالوں کی منزل، دنوں میں طے کرتے ہیں۔

'سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ' 'تسبیح' اور 'حمد' دونوں کے ایک ساتھ ذکر کرنے کے فائدے پر ہم دوسری جگہ روشنی ڈال چکے ہیں۔ 'تسبیح' کے اندر تنزیہ کا پہلو غالب ہے اور 'حمد' کے اندر اثبات کا ۔۔۔ خدا کی صحیح معرفت ان دونوں ہی پہلوؤں کو ملحوظ رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی پہلو بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو انسان خدا کے باب میں ایسی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ خدا کا وجود اور عدم دونوں اس کے لیے یکساں ہو کے رہ جاتا ہے۔

گُر کی بات

'وَهُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ' یہ اصل گُر کی بات ارشاد ہوئی ہے کہ ان لوگوں کے اندر یہ صلاحیت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ ان میں استکبار نہیں ہے۔ استکبار کی حقیقت پر ہم دوسری جگہ روشنی ڈال چکے ہیں۔

اس کا صحیح مفہوم حق کے مقابل میں اکڑنا ہے۔ یہ بیماری امّ الامراض ہے۔ جو لوگ اس مہلک مرض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اپنی خواہشوں اور اپنی رائے کے مقابل میں کسی واضح سے واضح حق کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو قبولِ حق کی صلاحیت سے بالکل ہی محروم کر دیتا ہے۔ قبولِ حق کی توفیق صرف وہی لوگ پاتے ہیں جو حق کو، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، ہر چیز سے بالا سمجھتے ہیں اور جب وہ ان کے سامنے آتا ہے تو خواہ کسی گوشے سے آئے، یہاں تک کہ اگر ان کا دشمن بھی اس کو پیش کرے، تو وہ فوراً اس کے آگے گردن جھکا دیتے ہیں۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۱۶)

یعنی ان لوگوں پر خدا کے حضور پیشی اور آخرت کی باز پرس کا خوف چونکہ ہر وقت طاری رہتا ہے اس وجہ سے وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اور بستروں کی لذت و راحت سے اپنے کو محروم رکھ کر اپنے رب کو پکارتے اور اس کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ یہ ڈرتے بھی اسی سے ہیں اور امید بھی اسی سے رکھتے ہیں۔ اور جو کچھ خدا نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خدا کی راہ میں وہ خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت میں دو چیزوں کا ذکر آیا ہے۔ ایک نماز، دوسری انفاق۔ ایمان کے بعد یہی دو چیزیں اس کے اولین مظاہر کی حیثیت رکھتی ہیں اور پھر انہی دو پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس مسئلہ پر ہم اس کتاب میں جگہ جگہ بحث کر چکے ہیں۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۷)

شب بیداری اور قربانیوں کا صلہ تصور سے بالاتر

یہ ان لوگوں کی شب بیداری اور انفاق کا صلہ بیان ہوا ہے کہ ان کے لیے اللہ نے آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا رکھی ہے اس دنیا میں اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ ایک نادیدہ عالم کی زندگی کی خاطر ان لوگوں کی ان جانفشانیوں پر آج جو لوگ ہنس رہے ہیں وہ بھی اس کو دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے اور اہلِ ایمان بھی نہال ہو جائیں گے کہ ان کی قربانیوں کا صلہ ان کے اندازوں اور قیاسوں سے کہیں بڑھ کر ملا۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ یعنی یہ جو کچھ ان کو ملے گا ان کے اپنے ہی اعمال کا صلہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کی چند روزہ مساعی کا صلہ ایک ابدی بادشاہی کی صورت میں دے گا اور فرمائے گا کہ یہ تمھارے اپنے ہی اعمال کا صلہ ہے۔ ہر چند یہ جو کچھ ملے گا یہ ہوگا اللہ تعالیٰ کا فضل لیکن اس کو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا ثمرہ قرار دے گا اس لیے کہ آدمی کو اپنے کارناموں کے ثمرات و نتائج سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسری چیز سے نہیں حاصل ہوتی۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ (۱۸)

اوپر کی بات کی دلیل

یہ اوپر والی بات کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش

نہیں ہے۔ ایسا ہی ہوگا اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دنیا کے خالق کے نزدیک مومن اور فاسق دونوں یکساں ہیں اور وہ اپنے وفادار بندوں اور اپنے باغیوں اور غداروں میں کوئی فرق نہیں کرے گا۔ ایسا سمجھنا اس کارخانۂ کائنات کے مبنی بر حکمت ہونے کی نفی اور اس کے خالق کے عادل، رحیم اور حکیم ہونے کا انکار ہے اس وجہ سے یہ بات صریحاً باطل ہے۔ دونوں خدا کے نزدیک یکساں نہیں ہو سکتے پس ضروری ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں خدا کے وفادار بندے اپنی وفاداریوں کا صلہ پائیں اور اس کے نافرمان اپنی نافرمانیوں کی سزا بھگتیں۔

وَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ جَنّٰتُ الۡمَاۡوٰی ۫ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ (۱۹)

جنات الماوٰی — یہ اس جزا اور سزا کی تفصیل بیان فرمائی کہ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی زندگی بسر کریں گے ان کے لیے راحت کے باغ ہوں گے جو ان کو ان کے اعمال کے صلہ میں اولین سامانِ میزبانی کی حیثیت سے ملیں گے۔ 'نُزُل' اس سامانِ ضیافت کو کہتے ہیں جو مہمان کے سامنے اس کے مرکب سے اترتے ہی پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'جنات الماوٰی' سے مراد وہ جنتیں ہیں جن میں یہ اہلِ ایمان اوّل اوّل اتارے جائیں گے۔ وہاں ان کی ابتدائی ضیافت ہوگی اور پھر وہ اصل جنت میں بھیجے جائیں گے۔ گویا ان باغوں کی حیثیت اہلِ جنت کے لیے (REST HOUSE) کی ہوگی اور اس کے جمع لانے سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ باغ تمام اہلِ جنت کے لیے الگ الگ ہوں گے۔ سورۂ نجم کی آیت ۱۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ 'جَنَّةُ الْمَاْوٰی' 'سدرۃ المنتہٰی' کے پاس ہے اور 'سدرۃ المنتہٰی' عالمِ ناسوت اور عالمِ لاہوت کے درمیان آخری نقطۂ اتصال ہے اس وجہ سے اگر اس کے پاس 'جنّات الماوٰی' ہوں تو یہ ان کے لیے موزوں ترین مقام ہے۔ یہ امورِ غیب کی باتیں ہیں، ان کے باب میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے لفظ 'نُزُل' کے مقتضیات کی وضاحت کے لیے لکھا ہے۔ ان شاء اللہ سورۂ نجم کی تفسیر میں 'جنت الماوٰی' پر مزید بحث آئے گی۔

وَاَمَّا الَّذِیۡنَ فَسَقُوۡا فَمَاۡوٰٮهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَاۤ اُعِيۡدُوۡا فِيۡهَا وَقِيۡلَ لَهُمۡ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ النَّارِ الَّذِىۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ (۲۰)

فساق کا انجام — اہلِ ایمان کی جزا بیان کرنے کے بعد یہ فساق و فجار کی سزا کا بیان ہے۔ فرمایا کہ ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگی۔ یہ اس میں سیدھے دھکیل دیے جائیں گے۔ دوزخ میں ان کے لیے اولین سامانِ ضیافت، قرآن کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ کھولتا ہوا پانی اور زقوم ہوگا۔ یہ وہاں سے نکلنے کے لیے زور لگائیں گے لیکن جب جب نکلنے کی کوشش کریں گے اسی میں دھکیل دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ اب یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ وہی دوزخ اور اس کا عذاب ہے جس کا تم مذاق اڑاتے رہے تھے۔ اب اس کا مزا چکھو!

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۲۱)

قریش کے لیے تنبیہی عذاب

'عَذَابِ اَدْنیٰ' سے مراد اس دنیا کا عذاب ہے جو تذکیر و تنبیہ کے لیے آتا ہے۔ اوپر کی آیت میں 'عذاب اکبر' کا ذکر تھا جس سے کفار کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا۔ فرمایا اس 'عذاب اکبر' سے پہلے اس دنیا میں بھی ہم ان لوگوں کو اپنے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔ 'ان لوگوں' سے مراد ظاہر ہے کہ قریش ہیں۔ یہاں جو باتیں فرمائی گئی ہیں اگرچہ عام الفاظ میں فرمائی گئی ہیں لیکن ان کے اوّل مخاطب قریش ہی ہیں۔ ان کو دھمکی دی ہے کہ وہ متنبہ رہیں کہ اس دنیا میں بھی ان کو سزا ملے گی اور مقصود اس سے یہ ہوگا کہ وہ اپنی غلط روش سے باز آئیں اور صحیح زندگی کی طرف پلٹیں ــــ اس 'عَذَابِ اَدنیٰ' کا سلسلہ قریش کے لیے غزوۂ بدر سے شروع ہوا جس میں ان کو پہلا چرکا لگا اور ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ پھر یکے بعد دیگرے اسی طرح کے حالات سے ان کو سابقہ پیش آتا رہا۔ یہاں تک کہ فتح مکہ کے موقع پر ان کی قوت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ ان کے اندر جو اچھے لوگ تھے وہ آہستہ آہستہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے اور جو اشرار و مفسدین تھے وہ بالتدریج ختم ہو گئے۔ چونکہ ان کی اکثریت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائی اس وجہ سے ان پر کوئی اس قسم کا فیصلہ کن عذاب نہیں آیا جس قسم کے عذاب پچھلی قوموں پر آئے بلکہ یہ صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیے گئے، جیسا کہ 'لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ' کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ (۲۲)

رسول کی تذکیر کے بعد عذاب لازمی ہے

اوپر کی آیت میں عذاب کی جو دھمکی دی ہے یہ اس کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ آخر ہم ان کو عذاب کیوں نہ دیں گے! ان سے بڑھ کر ظالم و مجرم کون ہو سکتا ہے جن کو ہماری آیات کے ذریعے سے تذکیر و تنبیہ کی جائے اور وہ ان سے رُوگردانی کریں! تذکیر و تنبیہ کا سب سے بڑا ذریعہ خدا کی کتاب اور اس کا رسول ہی ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اس آخری ذریعہ تذکیر و تنبیہ سے بھی نہ جاگے اب سنتِ الٰہی کے تحت ان کے جگانے کے لیے کوئی دوسری چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اب لاریب وہ مجرم ہیں اور ہم ایسے مجرموں سے لازماً انتقام لے کے رہیں گے۔ کسی قوم میں رسول کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ اس قوم کے ساتھ جو معاملہ کرتا ہے اس کی وضاحت ہم اس کتاب میں جگہ جگہ کرتے آئے ہیں۔ اس آیت کو اس کی روشنی میں سمجھیے۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۳-۳۰

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ اوپر کے پیرے میں قریش کو یہ دھمکی جو دی ہے کہ ہدایت کے آ جانے کے بعد اگر وہ اس پر ایمان نہ لائے تو لازماً وہ اس دنیا میں بھی خدا کے عذاب سے دوچار ہوں گے

اور آخرت میں بھی ان کو عذاب سے سابقہ پیش آئے گا۔ آگے کی آیات میں اسی حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں مبرہن کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو بشارت دی ہے کہ اگر وہ ثابت قدم رہے تو بالآخر کامیابی انہی کو حاصل ہوگی ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۳-۳۰

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَ
جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۳﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ
بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ
بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ
كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۗ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۗ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ
الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ
وَاَنْفُسُهُمْ ۗ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ
ع ۳ ۸ ۱۶ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾

ترجمہ آیات ۲۳-۳۰

اور ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب عطا کی تھی تو تم اس یوم موعود کے ظہور کے باب میں کسی شک میں نہ رہو۔ اور ہم نے اس کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا اور ہم نے ان میں پیشوا اٹھائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے جب کہ انھوں نے ثابت قدمی دکھائی۔ اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔ بے شک تیرا رب ہی قیامت کے دن ان کے درمیان ان چیزوں کے باب میں فیصلہ کرے گا جن میں یہ اختلاف

کرتے رہے ہیں۔ ۲۳-۲۵

کیا ان کے لیے یہ چیز ہدایت دینے والی نہ بنی کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چھوڑا جن کی بستیوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں۔ بے شک ان کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔ تو کیا یہ لوگ سنتے سمجھتے نہیں! ۲۶

کیا انھوں نے دھیان نہیں کیا کہ ہم پانی کے بادلوں کو چٹیل زمین کی طرف ہانک کرلے جاتے ہیں پس اس سے کھیتی اگاتے ہیں جس سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی۔ تو کیا انھیں سجھائی نہیں دے رہا ہے! ۲۷

اور وہ پوچھتے ہیں کہ یہ فیصلہ کا دن کب ظہور میں آئے گا اگر تم سچے ہو! کہہ دو کہ فیصلہ کے دن ان لوگوں کا ایمان نفع نہیں دے گا جنھوں نے کفر کیا ہوگا اور نہ ان کو اس کے بعد مہلت ہی دی جائے گی۔ تو ان سے اعراض کرو اور منتظر رہو، یہ بھی منتظر ہی ہیں۔ ۲۸-۳۰

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۣ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ (۲۳-۲۴)

'الکتاب' سے مراد تورات ہے

'اَلْكِتٰبَ' سے مراد تورات ہے۔ جن لوگوں نے اس کو جنس کتاب کے مفہوم میں لیا ہے ان کی رائے قرآن کی تصریح کے خلاف ہے۔ 'وَجَعَلْنٰهُ' میں ضمیر کا مرجع بہر حال یہی کتاب ہے اور اس کی تعریف یہ بیان ہوئی ہے کہ اس کو ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا۔ اس تعریف نے خود متعین کر دیا کہ یہ لفظ جنس کتاب کے مفہوم میں نہیں بلکہ تورات کے لیے استعمال ہوا ہے۔

'من لقاءہ' میں ضمیر کا مرجع یوم عذاب ہے

'مِنْ لِّقَآئِهٖ' میں ضمیر کا مرجع سیاق و سباق دلیل ہے کہ 'اَلْكِتٰبَ' نہیں بلکہ وہ یوم انتقام یا یوم عذاب ہے جس کی دھمکی اوپر کی آیات ۲۱-۲۲ میں دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کی تکذیب کرنے والوں کو ہم نے اس دنیا میں بھی عذاب دیا اور آخرت میں بھی ان کو عذاب دیں گے اسی طرح ہم نے تمھارے ذریعے سے جو کتاب اتاری ہے اس کی تکذیب کرنے والوں

کو بھی ہم دنیا اور آخرت دونوں میں سزا دیں گے۔

'فَلَا تَكُنْ فِىْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ' یعنی اس یوم انتقام اور یوم عذاب کے ظہور کے باب میں تم کسی شک میں نہ رہو۔ یہ فیصلہ کی گھڑی آکے رہے گی۔ اس جملہ کا خطاب اگرچہ ظاہر الفاظ کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں جو وعید ہے اس کا رُخ مخالفین و مکذبین کی طرف ہے، گویا بات ان سے منہ پھیر کر کہی گئی ہے۔

رسول کی بعثت کا ایک لازمی تقاضا

یہ بات ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ رسول کی بعثت اور کتاب کے نزول کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ جو لوگ اس کی تکذیب کریں وہ دنیا و آخرت دونوں میں اس کی سزا پائیں۔ اسی حقیقت کو اسی اختصار و جامعیت کے ساتھ دوسرے مقام میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ	اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کے ساتھ اس
وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۚ	کے بھائی ہارون کو اس کا وزیر بنایا اور ان کو حکم دیا کہ
فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا	تم دونوں ان لوگوں کے پاس جاؤ جنھوں نے ہماری
بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ؕ	نشانیوں کی تکذیب کی ہے۔ پس ہم نے ان کو پامال
(الفرقان: ۳۵-۳۶)	کر کے رکھ دیا۔

یہی مضمون سورۂ مومنون میں یوں آیا ہے:

فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ۝	پس ان دونوں کی (موسیٰ اور ہارون کی) انھوں
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ	نے تکذیب کر دی اور ہلاک ہونے والوں میں سے بنے
لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝	اور ہم نے موسیٰ کو کتاب سے نوازا کہ وہ ہدایت پانے
(المؤمنون: ۴۸-۴۹)	والے بنیں۔

یہی بات ایک کلیہ کے طور پر تمام رسولوں سے متعلق بھی ارشاد ہوئی ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا	اور ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے ان کی قوموں کی
اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ	طرف تو وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔
فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا	بالآخر ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو جرم کے مرتکب
عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (الروم: ۴۷)	ہوئے اور اہل ایمان کی مدد ہم پر واجب ہے۔

ان نظائر کی روشنی میں آیت زیر بحث پر غور کیجیے تو اس کا ہر جزو پوری طرح واضح ہو جائے گا۔ ہمارے مفسرین نے اس کو چونکہ اس کے سیاق و سباق اور اس کے شواہد کی روشنی میں نہیں دیکھا اس وجہ سے اس کی تاویل میں ان کو بڑی الجھن پیش آئی ہے۔

کتاب سے فائدہ اٹھانے والے

'وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ' یعنی تورات کے مکذبین تو اس انجام سے دوچار ہوئے جو کتاب الٰہی

کے مکذبین کے لیے ازل سے مقدر ہے البتہ بنی اسرائیل کے لیے، جنھوں نے اس کو قبول کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کو صحیفۂ ہدایت بنایا۔ بدقسمتوں نے اس سے ٹھوکر کھائی اور جنھوں نے اس کی قدر کی انھوں نے اسی سے ہدایت حاصل کی۔ اوپر سورۂ مومنون کی جس آیت کا حوالہ گزرا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

کتاب کا ثمرہ

'وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا' یہ اس کتاب کا ثمرہ بیان ہوا ہے کہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ان کو قوموں کی پیشوائی اور قیادت کے منصب پر سرفراز فرمایا اور ان کے اندر ایسے رہنما اٹھائے جو لوگوں کی رہنمائی اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیادت و امامت کتاب الٰہی کے لازمی ثمرات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ جس قوم کو اپنی کتاب سے سرفراز فرماتا ہے وہ جب تک اس کتاب پر قائم رہتی ہے اس کو قوموں کی امامت حاصل رہتی ہے اور اس کے دشمن اس کے آگے ذلیل و پامال رہتے ہیں۔

امامت و قیادت کے اوصاف

'يَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا' یہ اس امامت کے شرائط و اوصاف بیان ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی کتاب عطا کی تھی اس وجہ سے وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہی لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ بغل میں تو اللہ کی کتاب ہو اور آگے پیروی کے لیے سنت ابلیس ہو۔

'لَمَّا صَبَرُوْا' یہ اس بنیاد کا ذکر ہے جس پر ساری شریعت قائم ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کی توفیق انھوں نے اس وقت تک پائی جب تک وہ شریعت پر خوف و طمع سے بے نیاز ہو کر، جمے رہے۔

'وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ' یہ ان کے صبر کی اساس و بنیاد کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو اللہ کی آیات پر پختہ یقین تھا اور وہ جزا و سزا پر مضبوط عقیدہ رکھتے تھے۔ اس وجہ سے وہ صبر کے اس امتحان میں پورے اترے۔

ان آیات پر تدبر کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان میں مسلمانوں کے لیے بشارت اور مستقبل کی عظیم ذمہ داریوں کی یاد دہانی بھی ہے اور وقت کے یہود پر تعریض بھی کہ وہ کیا بنائے گئے تھے اور اب کیا بن کے رہ گئے ہیں!

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۲۵)

یعنی اس دنیا کے بعد ان کا معاملہ خدا کی اخروی عدالت میں بھی پیش ہو گا اور وہ ان تمام چیزوں کے باب میں آخری فیصلہ فرمائے گا جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ 'فیصلہ فرمائے گا' سے مقصود اس کا نتیجہ ہے کہ اس دن یہ اپنے اس اختلاف و نزاع کی سزا بھگتیں گے۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ (۲۶)

پچھلی قوموں کی طرف اجمالی اشارہ

حضرت موسیٰؑ کے مخالفین کے انجام کی طرف خاص طور پر اشارہ کرنے کے بعد یہ پچھلی قوموں کی طرف بھی اجمالاً اشارہ کر دیا کہ کیا ان کی رہنمائی کے لیے یہ چیز کافی نہیں ہوئی کہ ان سے پہلے ہم کتنی قوموں کو رسولوں کی تکذیب کے جرم میں ہلاک کر چکے ہیں جن کی بستیوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں۔ یہ اشارہ عاد و ثمود اور قوم لوط وغیرہ کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکی ہیں۔ قریش اپنے تجارتی سفروں میں ان قوموں کی برباد بستیوں پر سے برابر گزرتے تھے۔ اَوَلَمْ یَھْدِ لَھُمْ کے اسلوب کلام سے یہ بات نکلتی ہے کہ آخر یہ اپنے ہی ملک کی تاریخ سے سبق کیوں نہیں لیتے! کیوں یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ان پر گزرا وہی کچھ ان پر بھی گزر جائے!

'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ' یعنی ان سرگزشتوں کے اندر نشانیاں ہیں۔ اگر یہ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں تو انھیں ان نشانیوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

— پہلی نشانی اس کے اندر اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعے سے یاددہانی کرتا ہے اگر وہ اس سے اعراض کرتے ہیں تو وہ مجرم قرار پاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے ضرور انتقام لیتا ہے۔

— دوسری نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ اس قسم کے مجرموں کو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی عذاب دیتا ہے اور اس کے بعد آخرت میں بھی ان کو عذاب دے گا۔

— تیسری نشانی یہ ہے کہ مجرموں کو سزا دینے کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو قیادت و امامت کے منصب پر سرفراز فرماتا ہے جو پورے استقلال کے ساتھ حق کا ساتھ دیتے ہیں۔

'اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ' یعنی کیا یہ لوگ ان قوموں کی سرگزشتیں سنتے نہیں! مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی تذکیر و تعلیم ہی کی خاطر قرآن نے ان قوموں کی سرگزشتیں نہایت تفصیل کے ساتھ، ان کے نتائج عبر کی وضاحت کرتے ہوئے سنائی ہیں۔ اگر اب بھی یہ اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں تو ان کی بدقسمتی پر افسوس ہے۔ 'سننا' یہاں سمجھنے اور عبرت حاصل کرنے کے مفہوم میں ہے اس لیے کہ اصل سننا درحقیقت وہی ہے۔ گویا فعل یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَی الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِہٖ زَرْعًا تَاْکُلُ مِنْہُ اَنْعَامُھُمْ وَاَنْفُسُھُمْ ط اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ (۲۷)

'الماء' سے یہاں مراد چونکہ پانی والے بادل ہیں اس وجہ سے اس کے لیے لفظ 'نَسُوْقُ' کا استعمال موزوں ہوا۔ 'ارض جرز' چٹیل اور بنجر زمین کو کہتے ہیں۔

ؔ حضرت موسیٰؑ کے ذکر کی خصوصیت کے وجوہ پر ہم دوسرے مقام میں مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔

آخرت کے دلائل کی طرف اشارہ	اوپر کی آیات میں ان تاریخی آثار و واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس دنیا میں خدا کے قانون مجازات کے شاہد ہیں۔ اب یہ آخرت کی طرف توجہ دلائی کہ اس کے وقوع کو بھی بعید از امکان نہ سمجھو، وہ بھی واقع ہو کے رہے گی اور اس دن اللہ تعالیٰ اپنا آخری فیصلہ صادر فرمائے گا۔ فرمایا کہ کیا یہ لوگ خدا کی اس قدرت و ربوبیت کو نہیں دیکھتے کہ ہم پانی سے بوجھل بادلوں کو ہانک کر چٹیل زمینوں کی طرف لے جاتے ہیں اور پھر اس پانی سے مختلف قسم کی فصلیں اگاتے ہیں جو ان کے مویشیوں کے کام بھی آتی ہیں اور خود ان کے کام بھی!

'اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ'۔ اوپر کی آیت میں ان کو عدم سماعت پر ملامت کی ہے۔ یہ ان کی عدم بصارت پر ملامت ہے کہ جس طرح ان کے کان بہرے ہو چکے ہیں اسی طرح ان کی آنکھوں کی بصارت بھی سلب ہو چکی ہے۔ یہ اس زمین کو مردہ اور زندہ ہوتے آئے دن دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی یہ اس شک میں مبتلا ہیں کہ خدا ان کو اس سے دوبارہ اٹھا سکنے پر قادر نہیں ہے۔

اس آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور ربوبیت کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ اور یہ دونوں صفتیں قیامت کے وقوع اور اس کی ضرورت کی نہایت واضح دلیلوں میں سے ہیں۔ ان کی وضاحت پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ہٰذَا الْفَتْحُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲۸)

یعنی ان لوگوں کی بے بصیرتی اور بلادت کا حال یہ ہے کہ تاریخ اور آفاق کے ان سارے شواہد و آثار کی طرف جب ان کو توجہ دلائی جاتی ہے تو طنز و استہزا کے انداز میں یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر سچ مچ اسی طرح کے فیصلہ کا کوئی دن آنا ہے اور تم لوگ اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو وہ آخر آ کیوں نہیں جاتا! مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی چیز کو دلائل و شواہد کی روشنی میں ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ اس وقت مانیں گے جب آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

قُلْ یَوْمَ الْفَتْحِ لَا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِیْمَانُہُمْ وَلَا ہُمْ یُنْظَرُوْنَ (۲۹)

یہ ان کے مطالبے کا جواب ہے کہ اگر وہ فیصلہ کے دن کو دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہیں تو ان کو بتا دو کہ اس کے ظہور کے بعد ایمان لانا کسی کے لیے کچھ نافع نہیں ہو گا اور اس کے بعد کسی کو اس بات کی مہلت بھی نہیں دی جائے گی کہ وہ توبہ و اصلاح کر کے تلافیٔ مافات کر سکے۔ 'یوم الفتح' سے مراد فیصلہ کا دن ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو عذابوں سے آگاہ کیا ہے۔ ایک قیامت کے عذاب سے، دوسرے اس عذاب سے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں قوم پر فیصلہ کن عذاب کی شکل میں آتا ہے۔ اوپر جو سنت الٰہی بیان ہوئی ہے وہ ان دونوں ہی صورتوں سے متعلق ہے۔ جس طرح قیامت کے ظہور کے بعد کسی کا ایمان نافع نہیں ہو گا اسی طرح فیصلہ کن عذاب کے ظہور کے بعد بھی کسی کا ایمان نافع نہیں ہو گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول صرف وہ ایمان ہے جو عقل و بصیرت کی رہنمائی میں، اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ، لایا گیا ہو۔ مجبورانہ ایمان کی اس کے ہاں کوئی وقعت نہیں ہے۔ اگر مجبورانہ ایمان اس کو پسند ہوتا تو، جیسا کہ دوسرے مقام میں فرمایا ہے، وہ سب کو ایمان ہی پر پیدا کرتا۔ اس کے لیے ایسا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ إِنَّهُمْ مُنْتَظِرُونَ (۳۰)

یہ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ اگر یہ لوگ فیصلہ کا دن دیکھنے ہی کے لیے مچلے ہوئے ہیں تو اب ان سے کوئی مزید بحث و گفتگو بالکل بے سود ہے۔ اب ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اور تم بھی اسی فیصلہ کے دن کا انتظار کرو جس کے یہ منتظر ہیں۔ اللہ نے جتنی مہلت ان کے لیے مقدر کی ہے اس کے پورے ہو جانے کے بعد یہ گھڑی آ جائے گی۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔

ہفتہ۔ ۹ بجے دن
۱۷ اگست ۱۹۷۴ء
رحمان آباد

تدبّرِ قرآن

۳۳

الاحزاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود، گروپ کے ساتھ اس کا تعلق اور زمانۂ نزول

جس طرح سورۂ نور اپنے گروپ کے آخر میں پورے گروپ کے تکملہ و تتمہ کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح سورۂ احزاب اپنے پورے گروپ کا جو فرقان سے شروع ہوا ہے، تکملہ و تتمہ ہے۔ یہ گروپ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، قرآن و رسالت کے اثبات میں ہے۔ اس تعلق سے اس سورہ میں چند باتیں خاص طور پر نمایاں ہوئی ہیں۔

— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت رسول جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی تھی اس کی وضاحت اور بے خوف لومۃ لائم اس کو ادا کرنے کی تاکید۔

— انبیاء و رسل کے طبقہ کے اندر آپ کو جو امتیاز خاص اور جو مرتبہ و مقام حاصل ہے اس کا بیان۔

— امت کے ساتھ آپ کے تعلق کی نوعیت اور امت پر آپ کے حقوق اور ان کے مقتضیات کی وضاحت۔

— حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ کا درجہ امت کے اندر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے تعلق کی مخصوص نوعیت

— اس عظیم امانت کا حوالہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر ڈالی گئی ہے اور جس کی وضاحت کے لیے اللہ نے اپنی کتاب نازل فرمائی ہے۔ اس عظیم ذمہ داری کے حقوق و فرائض کی یاد دہانی۔

یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب منافقین و منافقات نے قرآن کی بعض اصلاحات کو بہانہ بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پراپیگنڈے کی ایک نہایت مکروہ مہم چلا رکھی تھی۔ یہاں تک کہ ازواج مطہراتؓ کے ذہن کو بھی انھوں نے مسموم کرنے کی کوشش کی۔ اس میں ان فتنوں کی طرف بھی اشارات ہیں جو منافقین نے غزوۂ احزاب کے دوران، جو ۵ھ میں واقع ہوا، مسلمانوں کو بددل کرنے کے لیے اٹھائے۔ اسی سلسلہ میں حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی اصل نوعیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس لیے کہ اس واقعہ کو بھی واقعۂ افک کی طرح جس کا ذکر سورۂ نور میں گزر چکا ہے، منافقین نے فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی تاکید کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر جو کچھ نازل کیا جاتا ہے بے خوف لومۃ لائم اس کی تبلیغ کریں اور کفار و منافقین کے مخالفانہ غوغا کی مطلق پروا نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا مددگار و کارساز ہے، اسی پر بھروسہ رکھیں۔

(۴-۶) ظہار اور منہ بولے بیٹے کے معاملے میں رسومِ جاہلیت کی اصلاح کہ ان رسوم کو عقل و فطرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مخالفین اس اصلاح کے خلاف کتنا ہی ہنگامہ اٹھائیں، ان کے شور و غوغا کی کوئی پروا نہ کی جائے۔ یہ لوگوں کی من گھڑت بدعات ہیں۔ اللہ تعالیٰ معاشرتی زندگی کو ان تضادات سے پاک کر کے اس کو فطرت کی صحیح راہ پر لانا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کو اس بات کی ہدایت کہ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں سے منسوب کرو۔ اگر ان کے باپوں کا علم نہ ہو تو ان کو اپنے موالی کے درجہ میں رکھو، اپنے صلبی بیٹوں کا درجہ دینے کی کوشش نہ کرو۔ اب تک رسومِ جاہلیت کے زیرِ اثر جو کچھ ہوا ہے اس سے اللہ تعالیٰ نے درگزر فرمایا لیکن اب، اس وضاحت کے بعد، اس کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اسلامی معاشرے میں سب سے اونچا درجہ اور سب سے بڑا حق نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے۔ اور ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کا درجہ امہات المومنین کا ہے۔ باقی اولوالارحام کا باہمی ترتب ولعدا س قانون کے مطابق ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

(۷-۸) اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی سے اس بات کا مضبوط عہد کر لیا ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کے دین کی دعوت دیں۔ اس معاملہ میں نہ کسی کا پاس و لحاظ کریں نہ کسی کی مخالفت کی پروا تاکہ یہ چیز کھرے اور کھوٹے، مخلص اور منافق کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بنے اور ہر شخص اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پائے۔

(۹-۲۷) غزوۂ احزاب کے واقعات پر اجمالی تبصرہ جس سے مقصود مسلمانوں کے اندر اس اعتماد علی اللہ اور توکل کو راسخ کرنا ہے جس کی تعلیم پہلی آیت میں دی گئی ہے۔ باوجودیکہ کفار اپنی تمام پارٹیوں کی مجتمع قوت کے ساتھ، مدینہ پر پل پڑے تھے اور منافقین نے بھی اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے مسلمانوں کے قدم اکھاڑ دینے کے لیے پورا زور لگایا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی غیبی فوجوں سے مسلمانوں کی مدد کی اور دشمنوں کو ذلیل و خوار ہو کر پسپا ہونا پڑا۔ اسی طرح اگر مسلمان مخالفوں کی مخالفت کے علی الرغم اللہ کے دین پر قائم اور اس کے رسول کے وفادار و جاں نثار رہے تو اللہ تعالیٰ ہر محاذ پر ان کی مدد فرمائے گا۔

(۲۸-۳۵) مسلمانوں کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر مجتمع کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجؓ کو خطاب کر کے ان پر ان کی منصبی ذمہ داریاں واضح فرمائی گئی ہیں کہ رسول کے ساتھ نسبت رکھنے کے سبب سے ان کے درجے بھی بہت اونچے ہیں اگر وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کریں گی اور ان کے لیے سزا بھی بڑی ہی سخت ہے اگر ان سے کوئی حکم عدولی صادر ہوئی۔ ان کا اصلی فریضہ پیغمبر کی اطاعت و وفاداری اور اس کتاب و حکمت کی روشنی کو پھیلانا ہے جس کی تعلیم ان کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مل رہی ہے۔ اس وجہ سے ان کے شایانِ شان بات یہ ہے کہ وہ وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور ان منافقین و منافقات کے اثر سے اپنے کو بچائیں جو ان کی کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر ان کے دلوں میں محبت دنیا کی تخم ریزی کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اہلِ بیتِ نبوت کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک اور صرف کتاب و حکمت کی تعلیم و دعوت کے لیے خاص رکھے۔

(۳۶-۴۰) حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی طرف ایک اجمالی اشارہ جس میں سب سے پہلے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ جب کسی معاملہ میں اللہ و رسول کوئی فیصلہ صادر فرما دیں تو کسی مومن یا مومنہ کے لیے اس میں کسی چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اللہ و رسول کا حق سب سے بڑا ہے۔ اس کے بعد حضرت زیدؓ کے واقعہ کا حوالہ ہے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت زینبؓ کے ساتھ ان کا نکاح کر کے ان کی عزت افزائی چاہی لیکن وہ نباہ نہ کر سکے اور آپ کی طرف سے بار بار روکے جانے کے باوجود انھوں نے طلاق دے چھوڑی۔ یہ نکاح حضورؐ ہی نے کرایا تھا جس کے بعد منافقین اور منافقات برابر حضرت زینبؓ کو یہ طعنہ دیتے رہے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ سخت ظلم کیا ہے کہ ایک معزز گھرانے کی خاتون کا عقد ایک آزاد کردہ غلام سے کر دیا ہے۔ ان طعنوں کے باوجود حضرت زینبؓ نہایت صبر و شکر کے ساتھ حضرت زیدؓ کے ساتھ نباہ کرتی رہیں۔ لیکن حضرت زیدؓ نے محض اپنے ذاتی احساس کی بنا پر، جس کی تفصیل تفسیر میں آئے گی، ان کو طلاق دے دی۔ اس سے فطری طور پر حضرت زینبؓ کو مزید صدمہ پہنچا۔ ان کے اس زخم کے اندمال کی واحد شکل آپؐ کو یہ نظر آئی کہ آپؐ خود ان کو اپنے حبالۂ عقد میں لے لیں لیکن اس سے ایک اور فتنہ کے اٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ تھا۔ حضرت زیدؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنیٰ کی حیثیت سے متعارف تھے اور متبنیٰ عرب جاہلیت میں حقیقی بیٹوں کی منزلت میں سمجھا جاتا تھا۔ حضرت زینبؓ کے ساتھ آپ کے نکاح کو مخالفین فتنہ انگیزی کا ذریعہ بناتے کہ اس شخص نے اول تو ایک شریف زادی کا نکاح اپنے ایک آزاد کردہ غلام سے کیا جس کو اپنا متبنیٰ بنا رکھا تھا اور اب اپنے متبنیٰ کی بیوی سے خود نکاح رچا لیا۔ علاوہ ازیں ازواج کے باب میں چار تک کی تحدید کا حکم نازل ہو چکا تھا اس وجہ سے بھی آپ اس معاملے میں متردد رہے لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہوا کہ آپؐ ان تمام اندیشوں سے بے پروا ہو کر یہ نکاح کر لیں تاکہ آپ کے عمل سے جاہلیت کی اس رسم بد کی اصلاح ہو۔

(۴۱-۴۸) مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رکھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت ان پر نازل ہوئی تاکہ انھیں کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکل کر ایمان و اسلام کی روشنی میں آنا نصیب ہو۔ اگر اس روشنی کی انھوں نے قدر کی تو ان کو دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت حاصل ہو گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپؐ کے فریضۂ منصبی کی یاد دہانی کہ آپ خلق کے لیے اللہ کے دین کی شہادت دینے والے ہیں، جو اس کو قبول کریں ان کو جنت کی بشارت دیں، جو اس کو رد کریں ان کو دوزخ سے آگاہ کر دیں۔ آپؐ اللہ کے داعی اور خلق کو کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے چراغ ہدایت ہیں۔ اس فرض کی ادائیگی میں آپ برابر سرگرم رہیں۔ کفار و منافقین کی مخالفتوں اور ان کی ایذا رسانیوں کو خاطر میں نہ لائیں۔

(۴۹-۵۲) اس امر کا اعلان کہ آپ کی تمام ازواج آپ کے لیے جائز ہیں۔ آپ پر چار کی قید اور وہ

پابندیاں نہیں ہیں جو عام امت کے لیے قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ البتہ بعض دوسری پابندیاں ہیں جو عام امت پر نہیں ہیں۔ اس خصوصیت کے بعض مصالح کی طرف اشارہ۔ ازواج نبی صلعم کو اس فیصلۂ الٰہی کی تعمیل کی ہدایت۔ منافقین کو تنبیہ کہ وہ ازواج نبی (رضی اللہ عنہن) کے معاملے میں ریشہ دوانیاں کر کے پیغمبر صلعم کے لیے اذیت کا سبب نہ بنیں۔

(۵۳-۶۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں بدون اجازت داخل ہونے کی ممانعت۔ گھروں سے باہر نکلنے کی صورت میں آپ کی ازواج اور عام مسلمان خواتین کے لیے پردے کی ہدایت تاکہ منافقین کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی اور مسلمان خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا کوئی موقع نہ ملے۔ اس سلسلہ میں منافقین کو یہ آخری دھمکی کہ اگر وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو بہت جلد ان کے قلع قمع کے لیے آخری ہدایات نازل ہو جائیں گی اور پھر ان کو کہیں پناہ نہیں ملے گی۔

(۶۳-۷۳) خاتمۂ سورہ جس میں پہلے قیامت کی یاد دہانی ہے کہ اس کو بہت دور نہ سمجھو، وہ سر پر آئی کھڑی ہے۔ اس دن کوئی کسی کے کام آنے والا نہ بنے گا۔ گمراہ لیڈر اور گمراہ پیرو سب ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے۔

منافقین کو تنبیہ کہ ان یہود کی روش کی تقلید نہ کرو جنھوں نے موسیٰ کو قدم قدم پر ایذا دی۔ بالآخر اللہ نے موسیٰ کو عزت و وقار سے اٹھایا اور ان لوگوں پر لعنت کر دی جنھوں نے ان کو ایذا دی۔ صحیح روش یہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور رسول کی ہر بات پر 'سمعنا واطعنا' کہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو سدھارے گا، تمہارے گناہوں کو بخشے گا۔ یہی راہ فوزِ عظیم کی راہ ہے۔

آخر میں اس عظیم عہد و امانت کی یاد دہانی جس کا اہل تمام مخلوقات میں سے صرف انسان بنایا گیا ہے۔ اسی عہد و امانت پر انسان کے تمام شرف کا انحصار ہے۔ اگر وہ اس کے حقوق ادا کر سکے تو اس سے زیادہ اونچا کوئی نہیں اور اگر وہ اس میں ناکام ہو جائے تو پھر اس سے بڑا بدقسمت بھی کوئی نہیں۔

سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ (۳۳)

مَدَنِيَّةٌ —————— اٰيَاتُهَا ۷۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ
۸-۱ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱﴾ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۲﴾ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ
كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۳﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ
جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ
وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ ﴿۴﴾ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ
هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِى
الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ؕ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ
وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵﴾
اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ
وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ
فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ
مِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا
مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ لِّيَسْــَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ
وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ ع

ترجمہ آیات ۱ - ۸

اے نبی، اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کی باتوں پر کان نہ دھرو، بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور پیروی کرو اس چیز کی جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے وحی کی جا رہی ہے، بے شک اللہ ان تمام چیزوں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور بھروسے کے لیے اللہ کافی ہے۔ ۱-۳

اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں رکھے اور نہ تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کر بیٹھتے ہو تمہاری مائیں بنایا اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے بیٹے بنا دیا۔ یہ سب تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں اور اللہ حق کہتا ہے اور وہ صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت کے ساتھ پکارو۔ یہی اللہ کے نزدیک قرین عدل ہے اور اگر تم کو ان کے باپوں کا پتہ نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے شریک قبیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس باب میں تم سے جو غلطی ہوئی اس پر تم سے کوئی مواخذہ نہیں البتہ تمہارے دلوں نے جس بات کا عزم کر لیا اس پر مواخذہ ہے۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۴-۵

اور نبی کا حق مومنوں پر خود ان کے اپنے مقابل میں اولیٰ ہے اور ازواج نبی کی حیثیت

مومنین کی ماؤں کی ہے اور رحمی رشتے رکھنے والے آپس میں، دوسرے مومنین و مہاجرین کے مقابل، اَولیٰ ہیں، اللہ کے قانون میں۔ یہ اور بات ہے کہ تم اپنے اولیا روا قربار کے ساتھ کوئی حسنِ سلوک کرنا چاہو۔ یہ چیز کتاب میں نوشتہ ہے۔ ۶

اور یاد کرو، جب ہم نے نبیوں سے ان کے عہد لیے اور تم سے بھی اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی، اور ہم نے ان سے نہایت محکم عہد لیا تاکہ اللہ راست بازوں سے ان کی راست بازی کی بابت سوال کرے (اور کافروں اور منافقوں سے ان کے کفر و نفاق کی نسبت)، اور کافروں کے لیے اللہ نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۷-۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ وَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا (۱)

خطاب کی نوعیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں 'یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ' سے جو خطاب فرمایا ہے یہ محض تعظیم و تکریم کے لیے نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ یہ لفظ آپ کے فریضۂ منصبی کی یاد دہانی کے لیے یہاں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ کے نبی و رسول ہیں اس وجہ سے آپ کو صرف اپنے رب کی پروا ہونی چاہیے۔ آپ صرف اللہ سے ڈریں، کافروں اور منافقوں کی مخالفتوں سے بالکل بے پروا ہو کر لوگوں کو اللہ کی بات پہنچائیں۔ اسی طرح کا خطاب سورۂ مائدہ میں گزر چکا ہے: 'یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ' (المائدۃ: ۶۷) (اے رسول تم اچھی طرح لوگوں کو وہ چیز پہنچا دو جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے)۔

'وَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ': آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تنبیہ و تاکید اس لیے نہیں فرمائی گئی کہ خدانخواستہ اس بات کا کوئی اندیشہ تھا کہ آپ کفار و منافقین کی باتوں سے متاثر یا مرعوب ہو جائیں گے بلکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے مخالفین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ اشرار کتنا ہی زور لگائیں اور کتنے ہی فتنے اٹھائیں لیکن تم ان کی باتوں پر ذرا کان نہ دھرنا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آگے بعض ایسی باتوں کا ذکر آ رہا ہے جن کو کفار و منافقین نے آپ کے خلاف فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

کفار و منافقین کا باہم رشتہ

یہاں کفار و منافقین کا ایک ساتھ ذکر اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ یہ دونوں اصلاً ایک ہی

چلے کے بیٹھے ہیں۔ اسلام دشمنی میں دونوں متحد ہیں۔ فرق ہے تو یہ ہے کہ ایک کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے دوسرا اسلام کا کلمہ پڑھتے ہوئے، مسلمانوں کے اندر گھس کر، اسلام کی بیخ کنی کی کوشش کرتا ہے۔ اس وجہ سے انجام کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔

توکل علی اللہ کی دلیل

'اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا' یہ اس بات کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ کیوں پیغمبر کو اپنے رب کے سوا سب سے بے خوف و بے پروا ہو کر صرف اس بات کی تبلیغ و تعمیل کرنی چاہیے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ فرمایا کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔ اس وجہ سے اس نے جس بات کا حکم دیا ہے وہی بات صحیح علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اس کے خلاف لوگ جو بکواسیں کر رہے ہیں ان کی خرافات لائقِ اعتنا نہیں ہیں۔ آگے آیت ۳۹ اور آیت ۴۸ سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

وَّاتَّبِعْ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۙ﴿۲﴾ وَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ﴿۳﴾ (۲-۳)

اوپر جو بات منفی اسلوب سے فرمائی گئی ہے وہی بات مثبت پہلو سے ارشاد ہوئی ہے کہ اشرار کی تمام شرانگیزیوں سے بالکل بے پروا ہو کر تم اس وحی کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی جانب سے آتی ہے اور یہ اطمینان رکھو کہ تمہارے ہر اقدام و عمل سے اللہ اچھی طرح باخبر رہتا ہے۔ اس آیت میں پہلا خطاب واحد ہے اور دوسرا 'بِمَا تَعْمَلُوْنَ' جمع ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو خطاب ہے یہ امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ دین کے معاملے میں یہی روش مسلمانوں کو بھی اختیار کرنی چاہیے۔

'وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا' یعنی جب اللہ تعالیٰ کی ہر بات علم و حکمت پر بھی مبنی ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر بھی ہے تو اسی پر بھروسہ رکھو اور اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اعتماد اور بھروسہ کے لیے اللہ کافی ہے۔ اس کے ہوتے تمہیں کسی دوسرے سہارے کی احتیاج نہیں ہے۔ لفظ 'وکیل' کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں کہ اس سے مراد وہ ذات ہے جس پر پورا اعتماد کر کے اپنے معاملات اس کے حوالہ کر دیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ بندوں سے یہی ہے کہ وہ خدا کے دیے ہوئے احکام کی ہر حال میں تعمیل کریں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں کہ اس راہ میں جو مشکلیں پیش آئیں گی ان سے عہدہ برآ ہونے کی وہ توفیق بخشے گا۔

مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَکُمُ الّٰٓیِٔ تُظٰہِرُوْنَ مِنْہُنَّ اُمَّہٰتِکُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَکُمْ اَبْنَآءَکُمْ ؕ ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاہِکُمْ ؕ وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَہُوَ یَہْدِی السَّبِیْلَ ﴿۴﴾

کفار و منافقین

اوپر کی تمہید کے بعد بعض ایسے امور کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن میں قرآن کی اصلاحات کو

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

فکر و ارادہ کا تضاد علامت فطرت ہے

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ۔ یہ ٹکڑا بعد کی باتوں کے ذکر کے لیے بطور تمہید ہے۔ چونکہ یہ باتیں فکر و ارادہ کے تضاد کا مظہر ہیں اس وجہ سے ان کے ذکر سے پہلے نفس تضاد ارادہ پر روشنی ڈالی کہ اللہ تعالیٰ کو اگر منظور ہوتا کہ انسان ہمیشہ متضاد و متناقض ارادوں کی کشمکش ہی میں گرفتار رہے تو اس کو دل بھی ایک سے زیادہ دیتا لیکن اس نے کسی شخص کے پہلو میں دو دل نہیں بنائے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس نے انسان کے لیے یہ پسند نہیں فرمایا کہ وہ دو بالکل متناقض ارادے اپنے اندر جمع کر رکھے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب کج فہمی ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کے بالکل خلاف وہ اپنے اندر متناقض ارادے جمع کرلیتا ہے۔ وہ خدا پر ایمان کا دعویٰ بھی رکھتا ہے اور ساتھ ہی دوسرے شریکوں کی بندگی بھی کرتا ہے۔ رسول سے اطاعت و وفاداری کا عہد بھی باندھتا ہے اور اس کے خلاف اس کے دشمنوں سے ساز باز اور اس کی تعلیمات کے خلاف سرگوشیاں اور سازشیں بھی کرتا ہے۔ حالانکہ اگر دل ایک ہے تو اس کے ارادوں میں تضاد و تناقض نہیں ہونا چاہیے بلکہ تمام ارادے بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہونے چاہئیں۔ اگر معاملہ اس کے خلاف ہو تو یہ دل کی خرابی و بیماری کی دلیل ہے اور ہر عاقل کا فرض ہے کہ وہ اس خرابی کی اصلاح کر کے اپنے ارادوں میں ہم آہنگی پیدا کرے۔

تناقض فکر کی ایک مثال

وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِىْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ۔ اب یہ اس تضاد فکر و ارادہ کی مثال کے طور پر ظہار کے معاملہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ظہار کر بیٹھتا ہے تو اس کی بیوی اس کی ماں نہیں بن جاتی لیکن لوگوں نے زمانہ جاہلیت میں اس طرح کی عورتوں کو ماؤں کی طرح محرمات میں شامل کر رکھا تھا۔ اب قرآن نے اس جاہلیت کی جو اصلاح کی تو منافقین و کفار جھاڑ کے کانٹوں کی طرح پیغمبر کے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ جو عورتیں ماؤں کی طرح حرام ہیں اس شخص نے اپنے پیروؤں کے لیے ان کو بھی جائز کر دیا۔

ظہار

'ظہار' عرب جاہلیت کی ایک اصطلاح ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہہ بیٹھتا کہ اَنْتِ عَلَیَّ کَظَهْرِ اُمِّیْ (اب تو میرے اوپر میری ماں کی پیٹھ کی طرح حرام ہے) تو اس کی بیوی اس کے اوپر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی۔ اسی لفظ 'ظہر' سے جس کے معنی پیٹھ کے ہیں 'ظہار' کی اصطلاح پیدا ہو گئی لیکن اس کا اطلاق انہی الفاظ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ کوئی شخص اپنی بیوی کے کسی اور حصہ جسم کو بھی بارادہ تحریم اپنی محرمات میں سے کسی سے تشابہ قرار دے دے تو اس کا حکم بھی ظہار ہی کا ہو گا۔ عرب جاہلیت میں یہ صورت ایک طلاق مغلظہ کی تھی جس کے بعد کسی شخص کے لیے اپنی بیوی سے مراجعت کی کوئی شکل باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ قرآن نے جیسا کہ سورۂ مجادلہ کی آیات ۲-۴ میں تفصیل آئے گی، اس طرح کی بات کو منکر اور جھوٹ قرار دیا اور یہ اجازت دے دی کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اس طرح کی بات کہہ بیٹھے اور وہ پھر اس کے ساتھ زن و شو کے تعلقات قائم کرنا چاہے تو ایسا کر سکتا ہے اس لیے کہ اس طرح کی بیہودہ بات کہہ دینے سے کسی کی بیوی

اس کی ماں نہیں بن جاتی لیکن اس نے چونکہ ایک منکر اور باطل بات کہی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ ملاقات سے پہلے وہ ایک غلام آزاد کرے، اگر غلام میسر نہ ہو تو لگاتار دو ماہ روزے رکھے اور اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اس اصلاح سے قرآن نے ان لوگوں کی گھریلو زندگی کو درہم برہم ہونے سے بچانے کی راہ بھی کھول دی جو غصہ اور جھنجھلاہٹ میں آکر، نتائج پر نگاہ کیے بغیر فضول باتیں زبان سے نکال دیا کرتے ہیں اور ساتھ ہی آئندہ کے لیے ان کو اور دوسروں کو محتاط رہنے کا سبق بھی دے دیا لیکن کفار و منافقین نے، جو ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے کسی شوشے کی تلاش میں رہتے تھے، اس چیز کو بھی فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا کر لوگوں میں یہ پھیلانا شروع کر دیا کہ اس شخص کو دیکھو، اس نے ماں اور بیوی کے درمیان کوئی فرق ہی باقی نہیں رکھا! اسی چیز کی طرف یہاں آیت میں اشارہ ہے کہ یہ لوگ دو دلی اور تضادِ فکر و ارادہ کی بیماری میں مبتلا ہیں ورنہ انھیں سوچنا چاہیے کہ مجرد ایک بدتمیزی و جہالت کی بات کہہ دینے سے کسی کی بیوی اس کی ماں کس طرح بن جائے گی! اس غلطی پر وہ تادیب و اصلاح کا مستحق تو ضرور ہے تاکہ اس کو بھی اور معاشرہ کے دوسرے لوگوں کو بھی سبق حاصل ہو لیکن اس سزا کا مستحق تو وہ نہیں ہے کہ اس کی عائلی زندگی کا شیرازہ بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ یہاں ہم صرف اشارہ پر کفایت کرتے ہیں اس لیے کہ قرآن نے بھی اشارہ ہی کیا ہے۔ ان شاء اللہ سورۂ مجادلہ کی تفسیر میں ہم اس پر مفصل بحث کریں گے اور بتائیں گے کہ اس طریقۂ طلاق میں شریعت کے قرار دادہ طریقہ کے مقابل میں کیا کیا مفاسد موجود ہیں جن کی قرآن نے اصلاح کی ہے۔

تضادِ فکر کی دوسری مثال

'وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ' اسی طرح کے تضادِ فکر میں لوگ منہ بولے بیٹوں کے معاملے میں بھی مبتلا تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں منہ بولے بیٹوں کو بالکل صلبی بیٹوں کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے متبنّیٰ کی منکوحہ سے اس کی وفات یا طلاق کے بعد نکاح کر سکے۔ یہ چیز اس فطری نظامِ عائلی کے بالکل خلاف تھی جس کو اسلام نے 'اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ' کے اصول پر قائم فرمایا ہے۔ اس وجہ سے جب اس کی اصلاح کا وقت آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ حضرت زیدؓ کی مطلقہ بیوی حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیں تاکہ اس غلط رسم کا خاتمہ ہو جائے۔ حضرت زیدؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّیٰ کی حیثیت حاصل تھی اس وجہ سے اس رسمِ جاہلی کی اصلاح کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے اقدام فرمائیں۔ لیکن کفار و منافقین نے اس کو بھی آنحضرت صلعم کے خلاف فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنایا کہ اس شخص نے اپنے منہ بولے بیٹے کی منکوحہ سے نکاح کر لیا۔ اسی فتنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ بھی ان لوگوں کی دو دلی کا کرشمہ ہے کہ یہ صلبی بیٹے اور منہ بولے بیٹے میں فرق نہیں کر رہے ہیں، دونوں کو ایک ہی درجے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس واقعہ پر مفصل بحث فصل ۲ میں آگے آ رہی ہے اس وجہ سے ہم یہاں

اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔

"ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۖ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ" یعنی اس قسم کی تمام باتیں تمہاری اپنی زبانوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ ان کو عقل و فطرت اور اللہ کی شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے اس وجہ سے یہ باطل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور اپنی کتاب کے ذریعے سے تمہیں حق بتا رہا ہے اور تمہاری رہنمائی فطرت کی صراطِ مستقیم کی طرف کر رہا ہے تو اس صراطِ مستقیم کو اختیار کرو اور جاہلیت کے رسوم و بدعات سے باہر نکلو۔

قرآن فطرت کی راہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۵)

"اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ" یعنی منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت کے ساتھ پکارو تاکہ ان کے نسب کا امتیاز باقی رہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ کے قانون میں حق و عدل سے اقرب و اوفق ہے۔ اگر اس کی خلاف ورزی کر کے منہ بولے بیٹوں کو بالکل بیٹوں کے درجے میں کر دیا گیا تو وہ سارا نظامِ وراثت و قرابت و معاشرت بالکل تلپٹ ہو جائے گا جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ نے رحمی رشتوں اور انسانی فطرت کے جذبات و داعیات پر رکھی ہے۔ اسلام کے تمام احکام و قوانین خواہ وہ کسی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے ہوں، اللہ تعالیٰ نے عدل و قسط پر قائم کیے ہیں اس وجہ سے اس میں کوئی بات اس عدل و قسط کے خلاف داخل نہیں ہو سکتی۔

اسلام کے نظام میں کوئی خلاف فطرت چیز داخل نہیں ہو سکتی

"فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ" یعنی اگر ان کے باپوں کا پتہ نہ ہو تو ان کی حیثیت دینی بھائیوں اور 'موالی' کی ہوگی۔ دینی اخوت کے رشتہ سے تو عربوں کو اول اول اسلام نے آشنا کیا، جاہلیت میں عرب اس سے بالکل نا آشنا تھے لیکن خاندانوں اور قبیلوں کے ساتھ وابستہ ہونے کا ایک طریقہ حلف اور ولا کا ان کے ہاں موجود تھا۔ خاندان یا قبیلہ سے باہر کا کوئی شخص اگر کسی خاندان یا قبیلہ میں شامل ہونا چاہتا اور اس خاندان والے اس کو شامل کر لیتے تو وہ اس خاندان کا 'مولیٰ' سمجھا جاتا اور جملہ حقوق اور ذمہ داریوں میں شریک خاندان و قبیلہ بن جاتا۔ اگر وہ قتل ہو جاتا تو جس خاندان یا قبیلہ کا وہ مولیٰ ہوتا اس کو یہ حق حاصل ہوتا کہ وہ اس کے قصاص کا مطالبہ کرے۔ اسی طرح اگر وہ کوئی اقدام کر بیٹھتا جس کی بنا پر کوئی ذمہ داری عائد ہونے والی ہوتی تو اس ذمہ داری میں بھی پورے خاندان و قبیلہ کو حصہ لینا پڑتا۔ مولی القوم منہم (قوم کا مولیٰ انہی کے اندر کا ایک فرد شمار ہوگا) عربوں میں ایک مسلّم سماجی اصول تھا اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بھی اس کو برقرار رکھا۔ کسی خاندان کے آزاد کردہ غلام کا ولا بھی آزاد کرنے والے خاندان کو حاصل ہوتا۔ مثلاً اگر وہ آزاد کردہ غلام مرتا اور اس کا کوئی وارث نہ ہوتا تو ولا کے تعلق کی بنا پر اس کی وراثت اس کے آزاد کرنے والوں کو پہنچتی۔

اہل عرب کا ایک معاشرتی اصول

آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر کسی کے تبنّٰی کے باپ کا علم نہ ہو تو اس کی حیثیت دینی بھائی اور مولا کی قرار پائے گی لیکن کسی صورت میں اس کو صلبی بیٹے کی حیثیت حاصل نہ ہوگی۔

غلطی اور جرم میں فرق

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ ۙ وَلَٰكِنْ مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا یعنی اس معاملے میں جو غلطی بربنائے جہالت اب تک ہوئی ہے اس پر تو کوئی مواخذہ نہیں ہے، اللہ غفور رحیم ہے، لیکن اب اس تنبیہ و تعلیم کے بعد بھی اگر اسی غلط بات پر اصرار قائم رہا تو اس کی نوعیت غلطی کی نہیں بلکہ جرم کی ہوگی اس لیے کہ یہ چیز تمھارے دلوں کے قصد و ارادہ اور دیدہ و دانستہ تعمد کا نتیجہ ہوگی جس پر اللہ تعالیٰ ضرور مواخذہ فرمائے گا۔

اَلنَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ ۖ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ ۗ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُمْ مَعْرُوفًا ۚ كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا (۶)

اسلامی معاشرے میں فرق مراتب

یہ اس فرق مراتب کو واضح فرمایا ہے جو اسلامی معاشرے میں مسلمانوں کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت ہوئی۔ اس وضاحت سے مقصود مسلمانوں کو اس خلط مبحث سے بچانا ہے جس کی بعض مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ

اَلنَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ ۔ اَوْلٰی کے معنی احق کے ہیں۔ مثلاً إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ (آل عمران: ۶۸) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہر مسلمان پر دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ خود اس کی اپنی جان سے بھی زیادہ ہے۔ اس مضمون کی وضاحت آگے اسی سورہ میں ان الفاظ میں ہوگئی ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ	جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا
إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ	فیصلہ کردیں تو کسی مومن اور مومنہ کے لیے ان
يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ	کے معاملے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہ جاتا اور
وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ	جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو
ضَلَالًا مُبِينًا (الاحزاب: ۳۶)	وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول کا کوئی فیصلہ صادر ہو جائے اس میں کسی مومن یا مومنہ کے لیے کسی چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ رسول جو کچھ فرماتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے فرماتا ہے اس وجہ سے ایمان کا لازمی تقاضا ہر مرد اور عورت کے لیے یہی ہے کہ وہ رسول کے احکام و ہدایات کی اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرح بے چون و چرا تعمیل کرے۔ نہ دوسروں کی مخالفت و مزاحمت کی کوئی پروا کرے نہ اپنے مصالح و مفادات کی اور نہ اپنے جان و مال کی۔

ازواج مطہرات کا درجہ

وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ ۔ یہ اس تعلق خاص کا فطری نتیجہ بیان ہوا ہے جو ہر امتی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔ اگر اس تعلق میں نفاق کی کوئی آلائش نہ ہو تو فطری طور پر ہر مسلمان کے جذبات ازواجِ مطہراتؓ کے معاملے میں وہی ہوں گے جو شریف بیٹوں کے اندر اپنی ماؤں کے لیے ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کی بنا پر ان کے لیے دلوں میں ایسا احترام اور ان کی عظمت کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص ان کے ساتھ نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس سے الگ ہو کر اگر سوچ سکتے تھے تو صرف منافقین سوچ سکتے تھے اور وہ اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے، تفصیل آگے آئے گی، ریشہ دوانیاں بھی کرتے رہتے تھے۔ اس آیت نے ان کی ریشہ دوانیوں کا سدِّباب کر دیا اور آگے اسی بنیاد پر صاف الفاظ میں یہ ممانعت آگئی:

'وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا (۵۳)'

(اور تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ اس کے بعد کبھی اس کی بیویوں سے نکاح کرو) یہاں اس اشارے پر قناعت کیجیے۔ آگے ان شاء اللہ ہم ان دینی مصالح پر روشنی ڈالیں گے جو اس ممانعت کے اندر مضمر تھے۔

مومنین کے باہمی حقوق کی بنیاد رحمی رشتوں پر

'وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواجِ مطہراتؓ کو امت میں جو امتیازی مقام حاصل ہے اور جس پہلو سے حاصل ہے اس کو بیان کرنے کے بعد بقیہ سب کے تعلقات کے لیے اساس اس اصول کو قرار دیا ہے جو سورۂ نساء میں بیان ہو چکا ہے۔ یعنی رحمی رشتے رکھنے والے الاقرب فالاقرب کے اصول پر ایک دوسرے کے حقدار ٹھہریں گے۔ 'فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ' سے مراد یہاں قرآن کی سورۂ نساء کی آیات ۷-۱۴ ہیں جن میں اسی فطری اصول کے مطابق تقسیمِ وراثت کا ضابطہ بیان ہوا ہے۔

مہاجرین و انصار کے درمیان حقوق کا جو عارضی نظم قائم کیا گیا تھا وہ ختم کر دیا گیا

'مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ' یعنی دوسرے مومنین و مہاجرین کے مقابل میں اولوالارحام ہی اولیٰ و اقرب ٹھہریں گے۔ اسلامی اخوت کی بنا پر مہاجرین و انصار کے درمیان حقوق میں شرکت کا جو عارضی نظم ابتداء میں قائم کیا گیا تھا اس ٹکڑے نے اس کو بھی ختم کر دیا۔

حسن سلوک کی گنجائش

'اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا' اس کے بعد صرف اتنی گنجائش باقی رہ گئی کہ آدمی کے جو اعزہ و احباب اس کی وراثت کے حقدار نہیں ہیں اگر ان کے ساتھ وہ کوئی حسنِ سلوک کرنا چاہے تو ان حدود کے اندر کر سکتا ہے جو شریعت نے مقرر کر دیے ہیں۔ ان حدود کی تفصیل بھی سورۂ نساء میں بیان ہو چکی ہے۔ 'كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا' میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (۷)

حضرات انبیاء کا مشترک مشن

آیات ۱-۳ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر خوف و اندیشہ سے بے پروا ہو کر صرف وحیِ الٰہی کی پیروی اور اسی کی دعوت کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے، پیرے کے آخر میں اسی بات کو حضرات انبیاء علیہم السلام کی

تاریخ سے مزید موثق کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہدایت ہم تمھیں کر رہے ہیں اسی کی ہدایت ہم نے اپنے تمام نبیوں کو کی اور ان سے یہ عہد لیا کہ اللہ کی طرف سے ان کو جو وحی کی جا رہی ہے خود بھی بس کی پیروی کریں اور بے کم و کاست اس کو لوگوں کو بھی پہنچائیں۔ فرمایا کہ یہ میثاق ہم نے تم سے بھی لیا، نوح سے بھی لیا، ابراہیمؑ سے بھی لیا، موسیٰؑ سے بھی لیا اور عیسیٰ ابن مریمؑ سے بھی لیا۔ عام کے بعد یہ خاص خاص جلیل القدر انبیاء کا حوالہ دے کر انبیاء کی پوری تاریخ سامنے رکھ دی گئی ہے تاکہ یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے کہ اس ذمہ داری کا بارِ گراں ہر نبی اور اس کے ساتھیوں کو اٹھانا پڑا ہے۔ اس خاص فہرست میں سب سے پہلے آنحضرت صلعم کا ذکر اس وجہ سے ہے کہ اصل مقصود آپؐ ہی کو یاد دہانی ہے۔

اس میثاق کا حوالہ قرآن مجید میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ خاص طور پر سورۂ مائدہ میں اس کی پوری تاریخ بیان ہو گئی ہے۔ یہاں ہر میثاق کا حوالہ دینے میں طوالت ہوگی۔ ہم بطور مثال صرف ایک میثاق کا حوالہ دیتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے: فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا (الاعراف - ۱۴۵) (تم خود بھی اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو بھی حکم دو کہ اس بہترین چیز کو پوری مضبوطی سے اختیار کرے)۔

وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا، یعنی اس میثاق کے معاملہ میں ہم نے ذرہ برابر بھی نرمی اور مداہنت نہیں برتی۔ بلکہ ہر ایک سے مضبوط عہد لیا۔ اور اس کو پوری مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم و استوار رہنے کی تاکید در تاکید فرمائی۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اول تو اس عہد کو میثاق سے تعبیر فرمایا ہے جو خود مضبوط و مستحکم عہد کے لیے آتا ہے پھر اس کے ساتھ 'غلیظ' کی قید بھی لگائی ہے جس سے اس کے اندر مزید استحکام پیدا ہو گیا ہے۔

لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا (۸)

میثاق لینے کی حکمت

یہ میثاق لینے کی حکمت و مصلحت بیان فرمائی کہ انبیاء علیہم السلام کی اس تبلیغ کے بعد ہی لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اتمامِ حجت ہوا جس کے بعد وہ مستحق ہوئے کہ اللہ تعالیٰ راستبازوں سے ان کی راستبازی سے متعلق اور کافروں اور منافقوں سے ان کے کفر و نفاق کے متعلق پوچھ گچھ کرے اور پھر ہر ایک کو ان کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے۔ اس اتمامِ حجت کے بغیر اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی گمراہی پر سزا دیتا تو یہ چیز اس کے عدل و رحمت کے خلاف ہوتی اور لوگ قیامت کے دن عذر کر سکتے۔

آگے آیات ۷۲ اور ۷۳ کے تحت اس کی مزید وضاحت آئے گی۔ سورۂ نساء کی آیت لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (۱۶۵) میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اور وہاں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

۲۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۹۔۲۷

آگے غزوۂ احزاب کے واقعات کا حوالہ ہے اور مقصود اس سے اسی مضمون کو واقعات کی روشنی میں مزید واضح کرنا ہے جو تمہید میں بیان ہوا ہے کہ پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو اللہ کے دین کی راہ میں مخالفوں کی مخالفت اور ان کی سازشوں کی کوئی پروا نہیں کرنی چاہیے بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے، اللہ بھروسے کے لیے کافی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں نصرتِ الٰہی کا یہ کرشمہ دیکھ چکے ہیں کہ ان کے تمام مخالفین اپنی پوری مجتمعہ قوت کے ساتھ ان پر پل پڑے تھے اور اندر سے منافقین نے بھی اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے ان کے قدم اکھاڑ دینے کی پوری کوشش کی لیکن اللہ کی تدبیر سب پر غالب رہی۔ دشمنوں کو بے نیل مرام پسپا ہونا پڑا۔

غزوۂ احزاب شوال ۵ھ میں واقع ہوا۔ یہود بنی نضیر کے کچھ لیڈروں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے خیبر کی طرف جلاوطن کر دیا تھا۔ انھوں نے مکہ جا کر قریش کے لیڈروں سے فریاد کی اور ان کو آمادہ کیا کہ وہ مدینہ پر حملہ کریں۔ قریش حملہ کے لیے پہلے سے پر تول رہے تھے، جب ان کو یہود کی شہ بھی حاصل ہو گئی تو گویا مانگی مراد مل گئی۔ اس کے بعد غطفان اور ہوازن کے لیڈروں کو بھی انھوں نے ہموار کر لیا۔ اس طرح تقریباً دس ہزار کا ایک لشکر جرار مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ قریش کا لشکر ابوسفیان کی سرکردگی میں تھا اور غطفان و ہوازن عینیہ بن حصن اور عامر بن طفیل کی قیادت میں نکلے۔ مزید برآں حیی بن اخطب نضری نے یہود بنی قریظہ کو بھی اس متحدہ محاذ میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا۔ اگرچہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدۂ امن و صلح کر رکھا تھا لیکن اس موقع کو انھوں نے غنیمت جانا اور معاہدے کی پروا نہ کی۔ ان کی تعداد کم و بیش آٹھ سو تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دشمنوں کی ان تیاریوں کی خبر ہوئی تو آپ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے مسلمانوں کو مدینہ کی ان سمتوں میں خندق کھودنے کا حکم دیا جن سے حملہ کا خطرہ تھا چنانچہ شہر کی شمال اور مغربی سمت میں ساڑھے تین میل لمبی ایک خندق کھود دی گئی اور یہ کام نہایت سرگرمی کے ساتھ ان تین ہزار مجاہدوں نے انجام دیا جو حضورؐ کے ساتھ تھے اور خود سرورِ عالمؐ نے بھی بہ نفس نفیس اس کام میں حصہ لیا۔

دشمنوں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا اور یہ محاصرہ تقریباً ایک ماہ رہا لیکن اس دوران میں سنگ باری اور تیر اندازی کے اکا دکا واقعات کے سوا دُو بدُو جنگ کی کوئی نوبت نہیں آئی۔ دشمن نے یہ اندازہ کر لیا کہ مسلمانوں نے مدافعت کی پوری تیاری کر رکھی ہے۔ پھر محاذ میں پھوٹ بھی پڑ گئی اور مزید برآں ایک طوفانی ہوا نے ان کے خیمے و شامیانے سب اکھاڑ کے پھینک دیے جس کے بعد ان کے حوصلے پست

ہو گئے اور ابوسفیان نے واپسی کا اعلان کر دیا ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹-۲۰ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَةَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُودٌ
فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا
تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿٩﴾ إِذْ جَآءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ
مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ ٱلْأَبْصَٰرُ وَبَلَغَتِ ٱلْقُلُوبُ ٱلْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ
بِٱللَّهِ ٱلظُّنُونَا۠ ﴿١٠﴾ هُنَالِكَ ٱبْتُلِىَ ٱلْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا۟ زِلْزَالًا
شَدِيدًا ﴿١١﴾ وَإِذْ يَقُولُ ٱلْمُنَٰفِقُونَ وَٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ
مَّا وَعَدَنَا ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ إِلَّا غُرُورًا ﴿١٢﴾ وَإِذْ قَالَت طَّآئِفَةٌ
مِّنْهُمْ يَٰٓأَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَٱرْجِعُوا۟ ۚ وَيَسْتَـْٔذِنُ فَرِيقٌ
مِّنْهُمُ ٱلنَّبِىَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِىَ بِعَوْرَةٍ ۛ ع
إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ﴿١٣﴾ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِم مِّنْ أَقْطَارِهَا
ثُمَّ سُئِلُوا۟ ٱلْفِتْنَةَ لَءَاتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا۟ بِهَآ إِلَّا يَسِيرًا ﴿١٤﴾ وَ
لَقَدْ كَانُوا۟ عَٰهَدُوا۟ ٱللَّهَ مِن قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ ٱلْأَدْبَٰرَ ۚ وَكَانَ
عَهْدُ ٱللَّهِ مَسْـُٔولًا ﴿١٥﴾ قُل لَّن يَنفَعَكُمُ ٱلْفِرَارُ إِن فَرَرْتُم مِّنَ
ٱلْمَوْتِ أَوِ ٱلْقَتْلِ وَإِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٦﴾ قُلْ مَن ذَا
ٱلَّذِى يَعْصِمُكُم مِّنَ ٱللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوٓءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۚ
وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٧﴾ قَدْ يَعْلَمُ
ٱللَّهُ ٱلْمُعَوِّقِينَ مِنكُمْ وَٱلْقَآئِلِينَ لِإِخْوَٰنِهِمْ هَلُمَّ إِلَيْنَا ۖ

وَلَا يَأْتُونَ الْبَأْسَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۱۸﴾ أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۖ فَإِذَا جَاءَ
الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَىٰ
عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوكُمْ بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ
أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۚ أُولَٰئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ ۚ
وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿۱۹﴾ يَحْسَبُونَ الْأَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوا ۖ
وَإِنْ يَأْتِ الْأَحْزَابُ يَوَدُّوا لَوْ أَنَّهُمْ بَادُونَ فِي الْأَعْرَابِ يَسْأَلُونَ
عَنْ أَنْبَائِكُمْ ۖ وَلَوْ كَانُوا فِيكُمْ مَا قَاتَلُوا إِلَّا قَلِيلًا ﴿۲۰﴾ لَقَدْ كَانَ ع
لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ
الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ ۙ
قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۚ
وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ﴿۲۲﴾ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ
صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَ
مِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ﴿۲۳﴾ لِيَجْزِيَ اللَّهُ
الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ
عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۲۴﴾ وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا
بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ
اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا ﴿۲۵﴾ وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ
مِنْ صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ

وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿٢٦﴾ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ

ع ۱۹ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢٧﴾

ترجمۂ آیات ۹-۲۷

اے ایمان والو! تم اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد رکھو کہ جب تم پر فوجیں چڑھ آئیں تو ہم نے ان پر ایک باد تند بھیجی اور ایسی فوجیں بھی بھیجیں جو تم کو نظر نہیں آئیں۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو برابر دیکھتے رہنے والا ہے۔ یاد کرو جب کہ وہ تم پر آ چڑھے، تمہارے اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی، اور جب کہ نگاہیں کج ہو گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے باب میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت اہل ایمان امتحان میں ڈالے گئے اور بالکل ہلا دیے گئے۔ ۹-۱۱

اور جب کہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے کیے وہ محض فریب نکلے اور جب کہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب والو! تمہارے لیے ٹکنے کا کوئی مقام نہیں ہے تو تم لوٹ جاؤ اور ان میں سے ایک گروہ نبی سے اجازت کا طلبگار تھا اور کہتا تھا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔ حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے، بس یہ لوگ بھاگنا چاہتے تھے۔ اور اگر ان کے اطراف سے ان پر حملہ ہو جاتا، پھر ان سے ارتداد کا مطالبہ کیا جاتا تو وہ اس پر راضی ہو جاتے اور اس میں بہت ہی کم توقف کرتے۔ حالانکہ اس سے پہلے انھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی پرسش ہونی ہے۔ کہہ دو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو گے تو یہ بھاگنا تمہارے لیے کچھ نافع نہیں ہو گا، تم کو کھانے ملنے کا تھوڑا ہی موقع ملے گا۔ پوچھو، کون ہے جو تم کو خدا سے بچا سکے گا اگر وہ تم کو کوئی گزند پہنچانا

چاہے یا اس کی رحمت کو روک سکے اگر وہ تم پر رحمت کرنا چاہے؟ اور وہ اپنے لیے خدا
کے مقابل میں نہ کوئی کارساز پائیں گے نہ کوئی مددگار۔ ۱۲-۱۷

اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا رہا ہے جو روکنے والے اور اپنے بھائیوں سے
یہ کہنے والے رہے ہیں کہ ہمارے پاس آجاؤ۔ اور وہ جنگ میں بہت کم حصہ لیتے رہے ہیں
تم سے جان چراتے ہوئے۔ پس جب خطرہ پیش آجاتا تو تم ان کو دیکھتے کہ وہ تمھاری طرف
اس طرح تاک رہے ہیں کہ ان کی آنکھیں اس شخص کی آنکھوں کی طرح گردش کر رہی ہیں جس
پر سکراتِ موت کی حالت طاری ہو۔ پھر جب خطرہ دور ہو جاتا تو وہ مال کی طمع میں تم سے بڑی
تیز زبانی سے باتیں کرتے۔ یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو اللہ نے ان کے اعمال ڈھا دیے اور
یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ یہ لوگ گمان کر رہے ہیں کہ دشمن کی جماعتیں ابھی گئی
نہیں ہیں اور اگر جماعتیں پھر آجائیں تو ان کی تمنا یہ ہوگی کہ وہ اہلِ بدو کے ساتھ دیہات
میں ہوں اور وہاں سے تمھاری خبریں معلوم کرتے رہیں۔ اور اگر تمھارے ساتھ ہوتے بھی
تو جنگ میں برائے نام ہی حصہ لیتے۔ ۱۸-۲۰

اور تمھارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ ان کے لیے جو اللہ کی
ملاقات اور روزِ آخرت کی توقع رکھتے ہیں اور اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔ اور
جب اہلِ ایمان نے جماعتوں کو دیکھا تو وہ بولے کہ یہ تو وہی چیز پیش آئی جس کا اللہ اور
اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کر رکھا تھا۔ اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ
کہا۔ اور اس چیز نے ان کے ایمان واطاعت ہی میں اضافہ کیا۔ ۲۱-۲۲

اہلِ ایمان میں وہ جانباز بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کر دکھایا۔

سو ان میں سے بعض تو اپنا عہد پورا کر چکے اور بعض منتظر ہیں۔ اور انھوں نے ذرا بھی تبدیلی نہیں کی ہے تاکہ اللہ راستبازوں کو ان کی راست بازی کا صلہ دے اور منافقوں کو عذاب دے اگر چاہے یا ان کی توبہ قبول کرے (اگر وہ توبہ کریں) بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ ۲۴-۲۱

اور اللہ نے کافروں کو ان کے غصہ کے ساتھ، بالکل بے نیل مرام، پسپا کر دیا اور جنگ کے لیے اللہ مسلمانوں کی طرف سے خود کافی ہو گیا اور اللہ قوی و غالب ہے اور اللہ نے ان اہل کتاب کو جنھوں نے کافروں کی مدد کی ان کے قلعوں سے اتارا اور ان کے دلوں کو مرعوب کر دیا، کچھ کو تم قتل کرتے ہو اور کچھ کو قید۔ اور ان کی زمین، ان کے گھروں اور ان کے مال کا وارث تم کو بنایا۔ علاوہ ازیں اور بھی زمین ہے جس پر تمھارے پاؤں ابھی نہیں پہنچے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۵-۲۷

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَةَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (۹)

تائید الٰہی کے کرشموں کی یاد دہانی

آیت ۲ میں اللہ ہی پر بھروسہ کرنے کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے اسی مضمون کو مؤکد کرنے کے لیے یہ تائید الٰہی کے ان کرشموں کی یاد دہانی کرائی جا رہی ہے جو ماضی قریب میں مسلمانوں کی نصرت کے لیے ظاہر ہوئے تھے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر تمام عرب مسلمانوں پر امڈ آیا تھا لیکن مسلمانوں کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ دشمنوں کی کُل بادل نوجیں اللہ تعالیٰ ہی نے اپنی پھونک سے اڑا دیں اور یہ حقیقت سب کے سامنے آگئی کہ اللہ تعالیٰ اعتماد کے لیے تنہا کافی ہے۔ اگر اس کی مدد حاصل ہو تو ساری دنیا کی مخالفت بھی کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

'فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا'۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصرہ کے آخری دنوں میں ایسی طوفانی آندھی آئی کہ خیموں کی چوبیں اور طنابیں اکھڑ گئیں، دیگیں الٹ گئیں، سواری کے جانور تتر بتر ہو گئے، سردی کی شدت کے باوجود آگ جلانا ناممکن ہو گیا، تاریکی کا یہ عالم کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

اس صورت حال نے دشمنوں پر مرعوبیت طاری کر دی اور ابوسفیان نے سلامتی اسی میں دیکھی کہ کسی طرح اس آفت سے جان بچا کر گھر کو واپس ہو جائے۔

'وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا' یعنی باد تند کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسی فوجیں بھی بھیجیں جو مسلمانوں کو نظر نہیں آئیں۔ یہ اشارہ ملائکہ کی افواج کی طرف ہے جو ہمیشہ اہل ایمان کے ہم رکاب رہتی ہیں۔ اگرچہ وہ خود نظر نہیں آتیں لیکن ان کے شاندار غیبی کارنامے ظہور میں آتے ہیں جن سے اہل ایمان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور ان کے دشمن مرعوب ہوتے ہیں۔ سورۂ انفال میں بسلسلہ غزوۂ بدر، اس مسئلہ پر ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ 'لَّمْ تَرَوْهَا' سے یہ بات تو معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو یہ فوجیں نظر نہیں آئیں لیکن اس سے یہ بات نہیں نکلتی کہ کفار نے بھی ان کو نہیں دیکھا۔ قرین قیاس یہی ہے کہ ان کو یہ فوجیں دکھائی دی ہوں جس سے ان کو یہ اندازہ ہوا ہو کہ مسلمانوں کی جمعیت بہت بڑی ہے اور یہ چیز ان کی مرعوبیت کا باعث ہوئی ہو۔

'وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا' یہ وہی مضمون ہے جو اوپر آیت ۲ میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے: 'اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا'۔ اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ کرنے کا اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس کو یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ 'خبیر' و 'بصیر' ہے۔ اس کے بندے اس کی راہ میں جو بازیاں کھیلتے اور جو مشقتیں جھیلتے ہیں وہ ان کو دیکھتا اور ان سے اچھی طرح باخبر رہتا ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا (۱۰)

'اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ' مدینہ کی مشرقی سمت بلند، مغربی سمت نشیبی ہے۔ چونکہ دشمن کا حملہ دونوں طرف سے تھا اس وجہ سے فوق اور اسفل دونوں کا حوالہ دیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ غطفان وغیرہ کا حملہ مشرق کی طرف سے ہوا تھا اور قریش اور ان کے حلیفوں کی فوجیں مغرب کی سمت سے آئی تھیں۔ — مغربی اور شرقی دونوں سمتوں سے حملہ

'وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ' کوئی منظر ہولناک و دہشت ناک ہو تو نگاہ اس پر نہیں ٹکتی۔ عربی میں اس کو 'زَاغَ الْبَصَرُ' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح خوف و دہشت اور پریشانی کی تعبیر کے لیے 'بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ' کا محاورہ بھی ہے۔ 'کلیجہ منہ کو آنا' ہماری اپنی زبان میں بھی خوف و دہشت اور گھبراہٹ کی تعبیر کے لیے معروف ہے۔ — صورت حال کا اثر ضعفائے قلوب پر

'وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا' یہ بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے لیکن اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ضعف ایمان اور نفاق کی بیماری میں مبتلا تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ خدا کی قدرت و نصرت، اس کے وعدوں اور اس کی شانوں کے متعلق اب تک ان کو جو کچھ بتایا اور سکھایا گیا تھا وہ

سب ان کے نزدیک مشکوک ہوگیا۔ کلام کے تدریجی ارتقاء سے یہ بات خود واضح ہوجائے گی کہ یہ اشارہ ضعفائے قلوب اور منافقین ہی کی طرف ہے۔ آگے سچے اہلِ ایمان کی عزیمت و استقامت کی تعریف قرآن نے ان الفاظ میں فرمائی ہے: 'وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ لا قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ز وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا' (اور جب مومنوں نے دشمن کی پارٹیوں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہ تو وہی صورتِ حال ہمیں پیش آئی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کر رکھا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات سچی ہوئی، اور اس چیز نے ان کے ایمان اور ان کی اطاعت ہی میں اضافہ کیا) جب سچے مسلمانوں کا یہ حال بیان ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت ایسے ہی سرفروشوں پر مشتمل تھی تو آیت زیرِ بحث کا اشارہ انہی لوگوں کی طرف ہو سکتا ہے جو ضعیف الایمان تھے۔ اس بنا پر ہم ان تفسیری روایات کو بالکل بے سروپا سمجھتے ہیں جن میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ العیاذ باللہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ایک آدھ آدمیوں کے سوا اور کوئی شخص مسلمانوں میں عزم و ہمت رکھنے والا نہیں نکلا۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (۱۱)

یعنی ان حالات نے اہلِ ایمان کو بڑی ہی سخت آزمائش میں ڈال دیا اور وہ نہایت ہی بری طرح جھنجھوڑ دیے گئے۔ ایک طرف ہر جانب سے دشمنوں کی یورش اور دوسری طرف اپنی صفوں کے اندر ایسے لوگوں کا وجود جو ان حالات کو دیکھ کر بالکل ہی ہمت ہار بیٹھے اور طرح طرح کے شبہات ظاہر کرنے لگے۔ لیکن کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کے لیے اہلِ ایمان کو اس قسم کے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا (۱۲)

اب اس اجمال کی تفصیل آرہی ہے جو 'تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا' کے اندر مضمر ہے۔ یعنی جو منافق اور اسلام کے خلاف بغض و عناد رکھنے والے تھے انھوں نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے، ان کے اندر یہ پھیلانا شروع کر دیا کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدے کیے وہ سب محض فریب ثابت ہوئے۔ روایات میں اس گروہ کے بعض اشرار کی یہ پھبتی بھی نقل ہوئی ہے کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہمیں یہ اطمینان دلا رہے تھے کہ ہم کسریٰ و قیصر کے خزانوں پر قبضہ کریں گے اور یہاں حال یہ ہے کہ گھر سے قضائے حاجت کے لیے نکلنا ناممکن ہو رہا ہے۔" غور کیجیے کہ ایک طرف دشمنوں کا ہر سمت سے شہر کا محاصرہ اور دوسری طرف منافقین کا مسلمانوں کے اندر یہ زہریلا پروپیگنڈا! اسی صورتِ حال کو قرآن نے 'ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

ایک علمی نکتہ

اس آیت میں ایک علمی نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ فرمایا ہے 'وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ

توضیح: یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دو گروہوں کا الگ الگ ذکر ہے یا یہ دونوں صفتیں منافقین کے ایک ہی گروہ کی بیان ہوئی ہیں؟ نظائرِ قرآن کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ 'مرض' قرآن میں جہاں اخلاقی مرض کے لیے استعمال ہوا ہے، دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک نفاق کے مفہوم میں، دوسرے کینہ و حسد کے مفہوم میں۔ جہاں یہ لفظ 'نفاق' کے ساتھ استعمال ہوا ہے، جس طرح یہاں ہے، تو یہ اپنے دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اگر تنہا استعمال ہوا ہے تو اس کے مفہوم کا تعین قرینہ سے ہوتا ہے، بعض جگہ تو یہ نفاق کے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور بعض جگہ کینہ و حسد اور بغض و عناد کے مفہوم میں۔ اس دوسرے مفہوم کے لیے نظیر اسی سورہ کی آیت ۳۲ میں موجود ہے اور اس سے زیادہ واضح نظیر سورۂ محمد کی آیت ۲۹ میں ملے گی۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ منافقین میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو محض ضعفِ عزم و ارادہ کے مریض تھے۔ دوسرے وہ جو اسلام کے خلاف اپنے دلوں میں بغض و عناد رکھتے تھے لیکن دشمنوں کی طرح کھلم کھلا مخالفت کرنے کے بجائے مارِ آستین بن کر اسلام کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ اسی گروہ کو عام منافقین سے ممیز کرنے کے لیے بعض جگہ 'الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ' کی صفت سے ذکر فرمایا ہے۔ جو لوگ ان دونوں گروہوں کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے وہ بعض مقامات میں قرآن کے الفاظ کا صحیح زور نہیں سمجھ سکتے۔

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۚ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا (۱۳)

منافقینِ اعراب — یہ منافقین کے ایک دوسرے گروہ کا ذکر ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اشارہ منافقینِ اعراب کی طرف ہے۔ مدینہ کے قرب و جوار کے دیہاتوں کے جو لوگ اسلام لائے تھے ان میں ایک گروہ نہایت کٹر منافقین کا تھا۔ ان کا ذکر تفصیل سے سورۂ توبہ کی تفسیر میں ہو چکا ہے۔ ان کے لیے خود قرآن میں 'اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت سے مرعوب ہو کر مسلمان ہونے کے مدعی تو بن بیٹھے تھے لیکن ان کی ساری دلچسپی اپنے مفادات سے تھی۔ کسی غزوہ میں شریک ہونے کا وقت آتا تو اول تو مختلف بہانوں سے کترا جاتے اور اگر محض نمائش کے لیے کسی جنگ میں شریک ہوتے بھی تو اسلام سے زیادہ اسلام کے دشمنوں کی مقصد برآری کا ذریعہ بنتے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر بھی ان میں سے کچھ لوگ اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے آ گئے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنا سارا زور مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے صرف کیا۔ یہاں چند آیتوں میں اسی گروہ کے کردار پر تبصرہ ہے۔

'یا اہل یثرب' کے خطاب کے مضمرات — يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا۔ ان لوگوں کا مدینہ کے مسلمانوں کو يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ کہہ

کے خطاب کرنا اس بات کا نہایت واضح قرینہ ہے کہ ان کا تعلق حوالی مدینہ کے بدوؤں سے تھا۔ اگر یہ خاص مدینہ ہی کے باشندے ہوتے تو اپنے ہی شہر کے بھائیوں کو اس خطاب سے مخاطب کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ 'یثرب' مدینہ منورہ کا سابق نام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد اس کا نام مدینۃ النبی اور پھر مدینہ ہو گیا لیکن دیہاتوں کے لوگ، بالخصوص منافقین اعراب، اس کو یثرب ہی کہتے رہے۔ یہ لوگ دیہاتی بھی تھے اور منافق بھی اس وجہ سے انھوں نے نئے نام کو قبول نہیں کیا تھا۔ ان کو گمان یہ ہو رہا ہوگا کہ اسلام اور مسلمانوں کا قبضہ اس شہر پر عارضی ہے، سابق حالات پھر لوٹ آئیں گے۔ ان کے اس خطاب کا حوالہ دے کر قرآن نے ان کے اس باطن سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

منافقین کی مفسدانہ مساعی کی ایک مثال

'لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا' یعنی انھوں نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے نہایت خیرخواہانہ انداز میں یہ کہنا شروع کیا کہ دشمنوں کی اس دل بادل فوج کے مقابل میں تمہارے لیے ٹک سکنا ناممکن ہے اس وجہ سے جنگ کے لیے محاذ آرائی بے سود ہوگی۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ جنگ کا خیال چھوڑ کر گھروں کو واپس ہو جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں تو اس بات کا امکان ہے کہ شاید تمہارے دشمن تمہارے ساتھ کچھ نرم معاملہ کریں لیکن نوبت اگر جنگ و قتال کی آگئی تو پھر تمہاری خیر نہیں ہے۔

منافقین کا ایک عذر لنگ

'وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ' الآیۃ۔ 'عورۃ' کے معنی غیر محفوظ کے ہیں۔ انہی منافقین اعراب کے ایک دوسرے گروہ کا یہ کردار بیان ہو رہا ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ عذر پیش کیے کہ چونکہ ان کے گھر تنہا اور غیر محفوظ ہیں اس وجہ سے انھیں اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت دی جائے۔ پہلے گروہ نے مدینہ والوں کو پست ہمت کر کے ان کو محاذ سے ہٹانے کی کوشش کی اور اس گروہ نے خود اپنے لیے راہِ فرار تلاش کرنے کی تدبیر کی تاکہ دشمن کے لیے میدان بالکل صاف ہو جائے۔ اس گروہ کا یہ عذر بھی کہ "ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں" اس بات کا قرینہ ہے کہ ان کا تعلق اطراف مدینہ کے دیہاتوں سے تھا۔ جہاں تک اہلِ مدینہ کا تعلق ہے ان کے لیے اس قسم کے کسی بہانے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس جنگ سے متعلق جو تفصیلات کتابوں میں مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کا انتظام پہلے سے کر لیا گیا تھا۔

'وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا' فرمایا کہ ان کا یہ عذر بالکل جھوٹا عذر تھا۔ ان کے مکانات غیر محفوظ یا کسی خطرے میں نہیں تھے۔ بلکہ یہ لوگ اس بہانے محاذِ جنگ سے فرار اختیار کرنا چاہتے تھے۔

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِم مِّنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا (۱۴)

'اَقْطَارِهَا' کی ضمیر کا مرجع 'یثرب' بھی ہو سکتا ہے لیکن قرائن کی روشنی میں میرے نزدیک اس کا مرجع 'بیوت' ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گھروں کی حفاظت کا بہانہ تو محض بہانہ ہے۔ اصل مقصد ان کا دین کی حفاظت

مدافعت سے فرار ہے۔ ان کے نزدیک سب سے زیادہ کم وقعت اور ارزاں چیز دین ہے۔ اگر ان کے گھروں کے اطراف سے ان پر اسلام کے مخالفوں کی چڑھائی ہو جائے اور وہ ان سے ارتداد یا مسلمانوں سے جنگ کرنے کا مطالبہ کریں تو یہ ان کے مطالبہ کو بے درنگ مان لیں گے۔ لفظ 'فتنہ' پر ہم جگہ جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہاں اس سے رجعت اور ارتداد یا مسلمانوں کے خلاف جنگ کا مطالبہ مراد ہے۔ صاحب کشاف نے یہی تاویل اختیار کی ہے اور ہمارے نزدیک یہ صحیح ہے۔ سورۂ نساء آیت ۹۱ میں اسی قسم کے منافقین کی طرف اشارہ ہے۔ سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَن يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ۔ یہاں فتنہ سے مراد، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اگر کوئی اسلام دشمن طاقت دباؤ ڈال کر ان سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی کام لینا چاہتی ہے تو بڑی آسانی سے لے لیتی ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون آیت زیر بحث میں بیان ہوا ہے۔

وَلَقَدْ كَانُوا عَاهَدُوا اللَّهَ مِن قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْأَدْبَارَ ۚ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا (۱۵)

منافقین کی بدعہدی

یوں تو اسلام میں داخل ہونے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرنے ہی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے مال اور اپنی جان کو اللہ کے دین سے دریغ نہیں رکھ سکتا بلکہ خدا کی راہ میں سب کچھ قربان کر دینے کے عہد کا پابند ہو جاتا ہے لیکن یہ منافقین اس عام عہد کے علاوہ ایک خاص عہد کی پابندی کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے چکے تھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کا حال یہ تھا کہ پچھلے غزوات میں انھوں نے لاطائل عذرات کی آڑ لے کر شرکت سے گریز کیا تھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو قسمیں کھا کھا کر اطمینان دلایا تھا کہ آئندہ کسی جہاد کی نوبت آئی تو وہ اس میں پورے جوش سے حصہ لیں گے۔ ان لوگوں کی ان اطمینان دہانیوں کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کو ملامت کی ہے کہ پہلے تو انھوں نے بہت بڑھ چڑھ کے وعدے کیے تھے کہ آئندہ جنگ کی نوبت آئی تو وہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے تو اب جب اس کی نوبت آئی تو رخصت کی عرضیاں اور گھروں کے غیر محفوظ ہونے کے بہانے لے کر کیوں اٹھ کھڑے ہوئے! 'وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا' یہ ان کو دھمکی ہے کہ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ سے کیے ہوئے ہر عہد کی پرسش ہونی ہے۔ پرسش تو ہر جرم کی ہوگی لیکن خاص طور پر اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ سورۂ صف میں ارشاد ہے: 'يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ، كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ' (الصف ۶۱: ۲-۳) (اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں! اللہ کے نزدیک یہ بات زیادہ غضب کی ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں)۔

قُل لَّن يَنفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِن فَرَرْتُم مِّنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ وَإِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا (۱۶)

موت سے ڈر کر ادائے فرض سے فرار حماقت ہے

مطلب یہ ہے کہ موت یا قتل سے ڈر کر ادائے فرض سے فرار کوئی دانشمندانہ پالیسی نہیں ہے بلکہ یہ نہایت احمقانہ روش ہے۔ زندگی اور موت تمام تر خدا کے اختیار میں ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کے کسی مقرر کیے ہوئے فرض سے اس لیے گریز اختیار کرتا ہے کہ اس میں اس کو موت یا قتل کا اندیشہ ہے تو دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خدا سے فرار اختیار کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا سے بھاگ سکنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر اس طرح بھاگ کر کسی نے اپنی زندگی، اپنی دانست میں، بچائی تو کب تک بچائے رکھے گا، بالآخر اس کو ایک دن مرنا اور اپنے اس رب کو منہ دکھانا ہے جس سے اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ اس آیت کے الفاظ 'وَإِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا' پر غور کیجیے تو ان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس طرح کے فراری ہر برکت سے بالکل محروم ہو جاتی ہے۔ وہ اس حیاتِ چند روزہ میں جتنے دن گزارتے ہیں بے برکت زندگی گزارتے ہیں، حالانکہ اگر وہ فرار نہ اختیار کرتے جب بھی وہ اپنی مدتِ حیات پوری کرتے اور اس چند روزہ زندگی کے بدلے حیاتِ جاوداں کی بادشاہی حاصل کرتے۔

قُلْ مَن ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُم مِّنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۚ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا (۱۷)

حذف کا ایک اسلوب

اس آیت میں عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق 'أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً' سے پہلے جملہ کا ایک حصہ محذوف ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی: 'أَوْ يُمْسِكُ رَحْمَتَهُ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً' (یا اس کی رحمت کو روک سکے اگر وہ تم پر رحمت کرنا چاہے) عربی میں حذف کے اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں 'متقلدا سیفا ورمحا' میں بھی یہی اسلوب ملحوظ ہے۔ قرآن میں اس کی جو بلیغ مثالیں ہیں ان کی طرف اس کتاب میں ہم اشارہ کرتے آئے ہیں۔ اردو میں یہ اسلوب موجود نہیں ہے اس وجہ سے ترجمہ میں اس حذف کو ہم نے کھول دیا ہے۔

رحمت اور نقمت دونوں صرف خدا کے اختیار میں ہے

'مِن دُونِ' مقابل کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اس کے محل میں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم خدا سے جان چراتے ہو تو بتاؤ کہ اگر خدا تم کو کوئی گزند پہنچانا چاہے تو کون ہے جو اس کی پکڑ سے تمہیں بچا سکے، اسی طرح اگر وہ تمہارے دشمنوں کے علی الرغم تم پر اپنی رحمت نازل کرنا چاہے تو کس کی طاقت ہے کہ اس کی رحمت کو روک سکے؟ رحمت ہو یا نقمت دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہے تو خدا سے بھاگنے اور جی چرانے کے کیا معنی!

'وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا' یہاں سیاقِ کلام چونکہ تنبیہ کا ہے اس وجہ سے تنبیہ کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں فرمایا کہ یاد رکھیں کہ اگر خدا کی پکڑ میں آگئے تو اس کے مقابل میں نہ ان کا کوئی کارساز ان کا سفارشی بن سکے گا نہ کوئی حامی و مددگار ان کی حمایت کر سکے گا۔ کسی کی مدد سعی و سفارش کے ذریعہ سے بھی ہو سکتی ہے، جس طرح کی مدد کی توقع مشرکین اپنے معبودوں اور شرکا و اولیاء سے رکھتے تھے،

اور جمعیت و عصبیت کے بل پر بھی ہو سکتی ہے جس کا غرّہ ہر صاحب جمعیت کو ہوتا ہے۔ یہاں ان دونوں ہی کی نفی فرما دی۔

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۸)

منافقین کی ایک اور سازش کی طرف اشارہ

'قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ' میں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں۔ اس میں نہایت سخت قسم کی تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اللہ تمہارے اندر سے ان لوگوں کو برابر جانتا رہا ہے جو اپنے بھائیوں کو جنگ سے روکتے اور ان سے یہ کہتے رہے ہیں کہ ہمارے پاس آجاؤ اور یہ لوگ جنگ میں عملاً بہت کم حصہ لیتے رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی ان سازشوں سے کوئی آگاہ نہیں ہے لیکن اللہ ان سے برابر آگاہ رہا ہے اور جب وہ ان سے برابر آگاہ رہا ہے تو ان کو سزا دیے بغیر بھی نہیں چھوڑے گا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ اشارہ ان منافقین کی طرف ہے جو نہ صرف یہ کہ خود دفاع میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ اپنے اعتماد و تعلق کے دوسرے لوگوں کو بھی اس سے روکتے اور ان سے کہتے تھے کہ جس جگہ ہم ہیں تم بھی اسی جگہ آجاؤ تاکہ تم پر کوئی گرفت نہ ہو سکے۔ یہ امر یہاں پیش نظر رہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر دفاعی لائن بہت طویل تھی اس وجہ سے منافقین کے لیے دفاع کی ذمہ داریوں سے گریز و فرار کے مواقع بہت تھے۔ وہ خود بھی اس سے گریز کرتے اور اپنے دوسرے ہم خیالوں کو بھی اپنا ساتھی بنانے کی کوشش کرتے۔

'وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا' یہاں بھی مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے اور 'باس' سے مراد دفاع ہے۔ یعنی یہ خود تو دفاع میں برائے نام محض نمائش کے لیے حصہ لیتے اور جو لوگ حصہ لیتے ان کے دل بٹھانے کی کوشش کرتے اور ان کو اپنے مورچوں پر بلاتے کہ ان کو بھی اپنا ساتھی بنا لیں۔

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۗ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۗ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (۱۹)

'اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ' کا تعلق اوپر والے جملہ 'وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا' سے ہے۔ یعنی اول تو وہ دفاع میں حصہ لیتے نہیں تھے اور اگر کبھی حصہ لیتے بھی تو تمہارے لیے جان یا مال کی کوئی قربانی کرنے کے معاملے میں نہایت بخیل تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ایک قطرہ خون بہائے بغیر وہ غازی و مجاہد سمجھے جائیں۔

زبان کے سورماؤں کا حال

'فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ

مِنَ الْمَوْتِ' چونکہ یہ کوئی قربانی دینے کے لیے نہیں بلکہ کوئی خطرہ مول لیے بغیر غازیوں کے رجسٹر میں اپنے نام درج کرانے گئے تھے اس وجہ سے جب کبھی محاذ پر کوئی خطرے کی حالت پیش آجاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ ان کی آنکھیں اس طرح گردش کر رہی ہیں گویا ان پر موت کی غشی طاری ہونے لگی ہے۔ موت کا مقابلہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ کرتا ہے جو شہادت کے عزم کے ساتھ گھر سے نکلتا ہے۔ محض نمائش کے لیے نکلنے والوں کا بھرم کوئی معمولی سے معمولی خطرہ بھی کھول دیتا ہے۔

'فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ' سلق کے معنی تیز زبانی اور چرب زبانی سے بات کرنے کے ہیں۔ اسی سے 'خطیب سلاق' اس خطیب کو کہتے ہیں جو نہایت تیز زبان ہو۔

یعنی جب کوئی خطرے کی حالت پیش آجاتی تب تو ایسا معلوم ہوتا کہ ان کے دم خشک ہو رہے ہیں اور ان پر موت کی جان کنی طاری ہے لیکن جب خطرے کی حالت گزر جاتی تو بڑی تیز زبانی سے باتیں کرتے گویا انہی کی شہامت و شجاعت کا یہ کرشمہ ہے کہ دشمن کو آگے قدم بڑھانے کی جرأت نہیں ہوئی ورنہ خطرہ بالکل سر پر آگیا تھا۔

'اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ' یعنی اس ساری تیز زبانی و طلاقت لسانی کا مظاہرہ وہ محض مال کی طمع میں کرتے ہیں کہ اگر تقسیم غنیمت کا موقع آئے تو اس میں زیادہ سے زیادہ حصہ بٹا سکیں۔

یہ 'اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ' اوپر والے 'اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ' کے بالکل ٹھیک ٹھیک مقابل میں ہے۔ یہ 'شحیح' کی جمع ہے۔ اس کے معنی بخیل کے بھی آتے ہیں اور حریص کے بھی اور یہ دونوں ہی مفہوم ایک ہی کردار کے دو پہلو ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں یہ بخیل کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے دوسرے میں حریص کے مفہوم میں۔ مطلب یہ ہوا کہ تمہارے معاملے میں ان کی بخالت و تنگ دلی کا تو یہ حال ہے کہ تمہاری خاطر نہ وہ ایک قطرہ خون بہانے کو تیار ہیں نہ اپنا کوئی دھیلا خرچ کرنے پر راضی ہیں لیکن اگر مال غنیمت ہاتھ آئے تو اس کی طمع میں یہ زبان کے غازی سب کو ہدف مطاعن بنا ڈالیں گے۔

'سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ' کے الفاظ کے اندر چرب زبانی کے ساتھ تند زبانی کا مفہوم بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ منافقین چونکہ مال ہی کی طمع میں غزوات میں شریک ہوتے اس وجہ سے ان کے حاصل کرنے کے لیے وہ دوسروں کو ہمز و لمز اور طعن و تشنیع کا نشانہ بھی بنانے سے گریز نہ کرتے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات، جیسا کہ سورۂ نساء، سورۂ توبہ اور سورۂ انفال وغیرہ میں گزر چکا ہے، خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تقسیم غنیمت کے معاملے میں یہ جانبداری کا الزام دیتے کہ لڑائی تو ہم جیتتے ہیں لیکن مال غنیمت میں سے حصہ دوسروں کو زیادہ دیا جاتا اور ہم کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

'اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا' یعنی یہ لوگ چونکہ محض

زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے رہے ہیں حقیقی ایمان ان کو نصیب نہیں ہوا اس وجہ سے اس نمائشی ایمان کے ساتھ انھوں نے جو کام بظاہر دین کے بھی کیے وہ سب اللہ نے حبط کر دیے۔ ان کا کوئی صلہ آخرت میں ان کو ملنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں عمل صرف وہی مقبول ہے جو ایمان کے ساتھ ہو۔

'وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا' یہ لوگوں کی بعض نہایت شدید قسم کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہے۔ بہت سے لوگ ارادے اور نیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ کسی کا کوئی عمل ان کی نگاہوں میں اچھا ہے تو وہ لازماً آخرت میں بھی اس کے صلہ میں، ان کے نزدیک، مراتب عالیہ کا سزاوار ٹھہرے گا۔ حالانکہ یہ بات حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کے بڑے سے بڑے عمل کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے اگر وہ اس کی رضا کے لیے نہ کیا جائے۔ خدا کسی کے عمل کا محتاج نہیں ہے۔ اپنے عمل کے محتاج خود عمل کرنے والے ہیں۔ ان کا نفع سرتاسر انہی کو پہنچتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ ہر اس عمل کو قبول فرمائے گا جو اس کے احکام کے مطابق اور خالص اس کی رضا جوئی کے لیے کیا جائے گا، خواہ عمل چھوٹا ہو یا بڑا۔ اگر کوئی عمل اس کی رضا جوئی کے سوا کسی اور کی رضا جوئی یا کسی اور غرض کے لیے کیا جائے گا تو ایسے عمل کو اللہ تعالیٰ عمل کرنے والے کے منہ پر پھینک مارے گا کہ اس کا صلہ وہ ان سے لے جن کی خوشنودی کے لیے اس نے کیا ہے، اگرچہ یہ حج اور جہاد کے درجہ ہی کا عمل کیوں نہ ہو۔ فرمایا کہ کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایسا کرنا ذرا بھی شاق گزرے گا۔ یہ ذرا بھی اس پر شاق نہیں گزرے گا بلکہ یہ اس کے لیے نہایت سہل ہے۔ وہ کسی کے عمل کا محتاج نہیں ہے کہ ہر قسم کا مال اپنے کھاتے میں جمع کرتا جائے کہ چلو، یہ بھی غنیمت ہے!

بعض لوگوں کو یہ مغالطہ بھی ہو جاتا ہے کہ خدا بڑا مہربان و کریم ہے اس وجہ سے جو کچھ بھی اور جس طرح بھی کوئی نیکی کا کام کر دے گا وہ اس کو قبول فرمالے گا۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ خدا بڑا ہی مہربان و کریم ہے لیکن ساتھ ہی وہ نہایت غیور و غنی بھی ہے اس وجہ سے لوگوں کے ایسے اعمال کو پامال کر دینا اس پر ذرا بھی گراں نہیں ہو گا جن کا قبول کرنا اس کی غیرت کے منافی ہو۔ یہود کو خدا کی صفت کریمی سے جو مغالطے پیش آئے ان کی تفصیل سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ۭ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا (۲۰)

منافقین کی بزدلی کی مزید وضاحت

ان لوگوں کی بزدلی کا ذکر اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے۔ یہ اسی کی مزید وضاحت ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ جماعتوں کے چلے جانے سے ان کے دلوں کا خوف بھی چلا گیا ہے۔ جماعتیں پسپا ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئیں لیکن ان کی ہیبت اس طرح ان کے دلوں پر مسلط ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی وہ یہیں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔

'وَاِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ ... الایۃ'، یعنی اب کے تو یہ کسی نہ کسی طرح، مارے باندھے، یہاں مدینہ میں رہ گئے لیکن اب اگر دوبارہ حملے کا کوئی اندیشہ ہوا تو ان کی خواہش یہ ہوگی کہ مدینہ میں ٹکنے کے بجائے اہلِ بدو کے ساتھ دیہاتوں میں جا رہیں اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے تمھاری خبریں دریافت کرتے رہیں کہ کیا گزر رہی ہے!

'وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا': یہ مسلمانوں کو تسلی ہے کہ اگر یہ ایسا کریں تو اس میں تمھارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ اگر یہ تمھارے پاس ہوں گے بھی تو یہ جنگ میں حصہ لینے والے اسامی نہیں ہیں۔ بہتر ہے کہ وہ باہر ہی رہیں کہ ان کی چھوت سے دوسرے متاثر نہ ہوں۔ اوپر آیت ۱۸ کے تحت جو کچھ گزر چکا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (۲۱)

عزیمت کے لیے نمونہ اور اس کے حصول کی تدبیر

یہ ان بزدلوں کو غیرت دلائی ہے کہ تمھارے اندر ہی محاذ پر خدا کا رسول بھی موجود تھا اور تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نے کس عزم و ہمت کے ساتھ تمام خطرات کا مقابلہ کیا تو آخر تم نے اس بہترین نمونے کی پیروی کیوں نہ کی، اس قدر بزدل اور ڈرپوک کیوں بنے رہے!

'لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا': یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ رسول کے اسوہ کی پیروی ہر مدعی کا کام نہیں ہے۔ اس راہ کی آزمائشوں سے وہی لوگ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو اللہ کی ملاقات اور روزِ آخرت کے منتظر و متوقع اور اللہ کی یاد سے ہر وقت اپنے دل کو آباد و شاداب رکھنے والے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ راہِ حق میں عزیمت و استقامت انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن کے اندر خدا اور آخرت پر مضبوط ایمان ہو اور وہ برابر اپنے اس ایمان کو خدا کی یاد سے تازہ رکھیں۔ نیز اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ ان منافقین کے اندر نہ خدا اور آخرت پر ایمان تھا اور نہ یہ خدا کو یاد رکھنے والے تھے اس وجہ سے ان کے خوف کا یہ حال ہے کہ دشمنوں کے پسپا ہو جانے کے بعد بھی ان کے دلوں پر سے ان کی ہیبت نہیں گئی۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (۲۲)

منافقین کے بالمقابل مخلصین کا رویہ

اوپر آیت ۱۲ میں منافقوں اور حاسدوں کا قول گزر چکا ہے کہ انھوں نے دشمنوں کے اس ہجوم کو دیکھ کر علانیہ مسلمانوں میں یہ پھیلانا شروع کر دیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جو وعدے ہم سے کیے گئے وہ سب فریب ثابت ہوئے۔ اب ان کے مقابل میں یہ سچے مسلمانوں کا تاثر بیان ہو رہا ہے کہ انھوں نے جب

دشمنوں کے اس نرغہ کو دیکھا تو اپنے ساتھیوں کو تسلی دی کہ یہ تو وہی امتحان ہمیں پیش آیا ہے جس کی اللہ اور اس کے رسول نے پہلے سے ہمیں خبر دے دی تھی۔ یہ اشارہ قرآن کی ان آیات کی طرف ہے جن میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ کامیابی کی منزل کو پہنچنے سے پہلے ان کو نہایت صبر آزما امتحانوں سے گزرنا پڑے گا۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (البقرۃ ۲: ۲۱۴)

کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں اس طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا ہی نہیں جس طرح کے حالات سے ان لوگوں کو سابقہ پیش آیا جو تم سے پہلے گزرے۔ ان کو فقر و بیماری کے مصائب پہنچے۔ اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہوگی! آگاہ، کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔

اسی سنت کی طرف سورۂ عنکبوت میں یوں اشارہ فرمایا ہے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (۲-۳)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ مجرد یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی جانچ نہ ہوگی اور ہم نے ان لوگوں کو جانچا جو ان سے پہلے گزرے۔ پس اللہ لازماً ممیز کر کے رہے گا ان لوگوں کو جو اپنے دعوائے ایمان میں راستباز ہیں اور ان لوگوں کو جو جھوٹے ہیں۔

'صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ' یعنی اللہ و رسول کا وعدہ جھوٹا نہیں ثابت ہوا بلکہ بالکل سچا ثابت ہوا۔ جو لوگ اس مرحلے میں ثابت قدم رہیں گے وہ آئندہ ظہور میں آنے والے وعدوں کی صداقت بھی دیکھ لیں گے کہ مسلمان قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے مالک ہوں گے۔

'وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا' یعنی اس امتحان نے ان کے اندر کوئی کمزوری پیدا کرنے کے بجائے ان کے ایمان و اطاعت کے جذبے میں مزید قوت پیدا کی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ راہِ حق میں جو آزمائش بھی پیش آتی ہے وہ جس طرح کمزوری کے کھوٹ کو نمایاں کرتی ہے اسی طرح صادقوں کے صدق کو بھی جلا بخشتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ٹھہرائی ہوئی سنت ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ

مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (۲۳)

سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ لفظ 'رجال' جب اس طرح استعمال ہوتا ہے تو وہ تفخیم شان پر دلیل ہوتا ہے' اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ 'مردان حق' یا 'مردان کار' کیا جائے تو یہ ترجمہ لفظ کی روح کے مطابق ہوگا۔

لفظ 'نحب' وسیع معنوں میں آتا ہے۔ عزم و ہمت، عہد و پیمان، نذر، سب اس کے مفہوم میں داخل ہے۔ امام بخاریؒ نے اس کی تفسیر 'عہد' سے کی ہے اور یہ تفسیر لفظ کی روح اور موقع و محل کے مقتضیات کے بالکل مطابق ہے۔

اوپر آیت ۱۵ میں منافقین کا حال بیان ہو چکا ہے کہ انھوں نے اللہ اور رسول سے یہ عہد کیا تھا کہ اب کسی جنگ کا موقع آیا تو وہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے لیکن جب موقع آیا تو محاذ سے فرار کے بہانے ڈھونڈنے لگے۔ یہ ان کے مقابل میں اللہ کے وفادار بندوں کا ذکر ہے کہ مسلمانوں کے اندر وہ مردان حق بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے باندھے ہوئے عہد کو اس کی راہ میں جانیں دے کر پورا کر دکھایا اور جو ابھی یہ عہد پورا نہیں کر سکے ہیں وہ سر ہتھیلی پر لیے کھڑے ہیں کہ کب موقع آئے کہ وہ اس فرض سے سبکدوش ہوں۔ 'وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا' اور انھوں نے اللہ سے باندھے ہوئے عہد میں سر مو تبدیلی نہیں کی۔

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۲۴)

یہاں قرینہ دلیل ہے کہ فعل محذوف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے احزاب کا یہ طوفان اس لیے اٹھایا کہ یہ راستبازوں اور منافقوں کے درمیان امتیاز کے لیے ایک کسوٹی بنے۔ اس پر پرکھ کر اللہ تعالیٰ اپنے راستباز بندوں کو راستبازی کا صلہ دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے اور ان کی توبہ قبول کرے اگر وہ توبہ کریں۔

منافقین کو توبہ کی دعوت — 'اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ' میں قرآن کے اس معروف اسلوب کے مطابق جس کی مثالیں گزر چکی ہیں، 'يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ' کے بعد بھی 'اِنْ شَآءَ' کے الفاظ ہیں اگرچہ تکرار سے بچنے کے لیے وہ حذف کر دیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کی حکمت اور اس کی سنت کے مطابق ہے' اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر وہ توبہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ وہ چاہے گا تو ان کو بخش دے گا۔ اس ٹکڑے میں منافقین کے لیے دعوت استغفار ہے کہ ان کے لیے اب بھی گنجائش باقی ہے۔ اگر وہ چاہیں تو استغفار و توبہ کے ذریعے سے پھر خدا کی رحمت کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ یاد دہانی بھی ہے کہ تمام امور کا انحصار اللہ واحد کی مشیت ہی پر ہے اس وجہ سے جھوٹے سہاروں پر تکیہ کرنے کے بجائے وہ اپنے آپ کو اللہ ہی کے حوالہ کریں۔ اس ٹکڑے سے جن لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو چاہے گا توبہ و استغفار کے بغیر ہی بخش دے گا،

انھوں نے توبہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت کو نہیں سمجھا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی مشیت کو کوئی دوسرا روک یا بدل نہیں سکتا لیکن اس نے اپنے عدل و حکمت کے تحت جو قاعدے ٹھہرائے ہیں اس کی مشیت ان قاعدوں کو باطل نہیں کرتی۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا (۲۵)

دشمنوں کی پسپائی اور اہل ایمان کی حوصلہ افزائی

'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا' سے مراد احزاب کے شرکاء ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ غصہ اور بغض و عناد سے بھرے ہوئے آئے تھے کہ مسلمانوں کو کچا ہی کھا جائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے غصہ کے ساتھ ہی ان کو پسپا کر دیا، وہ اس کا کوئی حصہ بھی نکال نہ سکے۔ 'لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا' یعنی ان کے منصوبے تو بڑے بڑے تھے لیکن ان کے کسی منصوبے میں ان کو ذرا بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

'وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ' یعنی دشمنوں کے اس خطرناک حملے کے دفاع کے لیے مسلمانوں کو خود کوئی لڑائی نہیں لڑنی پڑی بلکہ ان کی طرف سے لڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کافی ہو گیا۔ اس نے اپنی باد تند اور اپنے ملائکہ کی افواج قاہرہ کے ذریعہ سے دشمنوں کے قدم اکھاڑ دیے اور وہ مایوس و نامراد پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔

'وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا' یہ تمہید کے مضمون 'وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا' کی یاد دہانی ہے کہ اللہ تعالیٰ قوی اور غالب و مقتدر ہے اس وجہ سے اس کے بندوں کو چاہیے کہ اس پر پورا بھروسہ رکھیں۔ اگر وہ اس کے بھروسہ پر اس کی راہ میں اٹھیں گے تو وہ ان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا بلکہ عناصر کائنات اور اپنے ملائکہ کو وہ ان کی مدد کے لیے بھیج دے گا۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۚ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا (۲۶-۲۷)

بنو قریظہ کی عہد شکنی اور ان کا انجام

یہ بنو قریظہ کی طرف اشارہ ہے۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدۂ امن و صلح کر رکھا تھا لیکن جب احزاب نے اپنی مجتمعہ قوت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کیا کہ ان کو ہمیشہ کے لیے جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے رکھ دیں تو انھوں نے بھی معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر احزاب کا ساتھ دیا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مشہور یہودی لیڈر حیی بن اخطب نضری بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد سے ملا اور اس کو ساتھ دینے کے لیے اس نے ابھارا۔ پہلے تو اس نے معاہدہ کے سبب سے کچھ تذبذب کا اظہار کیا لیکن جب حیی بن اخطب نے یہ پٹی پڑھائی کہ میں تمھی لوگوں کی خاطر تو سارے عرب کو اکٹھا کر کے مدینہ پر چڑھا لایا ہوں، اگر تمھی نے اس مہم میں ساتھ نہ دیا تو پھر میری اس تمام دوڑ دھوپ کا حاصل کیا! مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دینے کا

یہ آخری موقع ہے، اگر موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پچھتاؤ گے اور اس پچھتانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا! حیی بن اخطب کا یہ جادو کارگر ہو گیا اور بنو قریظہ بھی معاہدہ توڑ کر حملہ آوروں میں شامل ہو گئے۔ مسلمانوں کے لیے یہ چیز مزید پریشانی کا باعث ہوئی۔ مدینہ کے بالکل قریب ان کے قلعے اور گڑھیاں تھیں اور لڑنے والے افراد کی بھی ان کے پاس کافی تعداد تھی۔ ان کی شرکت سے دشمنوں کا حوصلہ دوچند ہو گیا اور مسلمانوں کے لیے یہ آزمائش بہت ہی صبر آزما بن گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی تائید غیبی سے جس طرح تمام پارٹیوں کو پسپا ہونا پڑا اسی طرح انھیں بھی پسپا ہونا پڑا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محاذ سے واپسی کے معاً بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ آپ بنو قریظہ پر حملہ کریں۔ آپ نے مسلمانوں کو فوراً حملہ کر دینے کا حکم دے دیا اور بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ یہ محاصرہ تقریباً ۲۵ دن جاری رہا۔ بالآخر انھوں نے مرعوب ہو کر حضرت سعد بن معاذؓ کو حکم مان لیا کہ وہ جو فیصلہ کر دیں ان کو منظور ہوگا۔ حضرت سعدؓ نے فیصلہ کیا کہ ان کے تمام قابل جنگ افراد قتل کر دیے جائیں اور بقیہ کو لونڈی غلام بنا لیا جائے۔ اس فیصلہ کی فوراً تعمیل کی گئی۔ اسی واقعہ کی طرف آیت میں اشارہ ہے۔

'مِنْ صَيَاصِيهِمْ'۔ 'صِيصَة' مرغ کے پنجے کو کہتے ہیں۔ اسی سے جمع 'صَيَاصِی' ہے جو بیل کے سینگوں کے لیے بھی آتا ہے اور پھر ترقی کر کے دفاعی حصارات، قلعوں اور گڑھیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ بنو قریظہ پہلے تو اپنے قلعوں میں محصور ہو گئے لیکن محاصرے سے تنگ آکر بالآخر ان کو مجبوراً ان سے نکلنا پڑا اور اپنے آپ کو اپنے اہل و عیال سمیت مسلمانوں کے حوالہ کرنا پڑا۔ 'وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ' اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس طرح مسلمانوں کا رعب ڈال دیا کہ حضرت سعدؓ کے فیصلہ کے خلاف ان کو چوں کرنے کی بھی جرأت نہ ہو سکی۔ مسلمانوں نے بغیر کسی ادنیٰ مزاحمت کے، ان کے قابل جنگ افراد کو قتل کر کے بقیہ کو لونڈی غلام بنا لیا۔

'وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ' اور ان کا پورا علاقہ، ان کے تمام مکانات و حصارات اور ان کے ہر قسم کے اموال و اثاثات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے قبضے میں دے دیا۔

مسلمانوں کو بشارت

'وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا'۔ یہ بشارت ہے مستقبل کی فتوحات کی۔ فرمایا کہ یہ تو نقد انعام ہے جو کچھ تمھیں ہم نے بخشا وہ تم نے دیکھ لیا لیکن ابھی اور بھی علاقے تمھارے قبضہ میں آئیں گے جن تک تمھارے قدم ابھی نہیں پہنچے ہیں لیکن ان کی وراثت ہم نے تمھارے لیے مقدر کر رکھی ہے۔ یہ اشارہ خیبر، مکہ اور روم و شام وغیرہ کی فتوحات کی طرف ہے۔ 'وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا'۔ یعنی یہ جو کچھ تم نے اپنی آنکھوں دیکھا کافی ہے یہ اطمینان پیدا کرنے کے لیے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، کوئی اس کے ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتا اس وجہ سے اہل ایمان کو چاہیے کہ اس پر پورا پورا بھروسہ رکھیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۲۸ - ۳۵

اوپر کے پیرے میں عام مسلمانوں کو اللہ اور رسول کی اطاعت پر مجتمع کرنے کے بعد آگے ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ان کو منافقین اور منافقات کے فتنوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین فرمائی ہے کہ ان کی کوشش یہ ہے کہ ازواج نبی (رضی اللہ عنہم) کے دلوں میں بھی طلب دنیا کی بیماری پیدا کریں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے رسول کی رفاقت کے لیے اس لیے چنا ہے کہ وہ اس کتاب و حکمت کی تعلیم کا ذریعہ بنیں جو اللہ کے رسول سے انھیں حاصل ہو رہی ہے۔ اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ بہت اونچا ہے اگر انھوں نے اپنے فریضۂ منصبی کی ذمہ داریاں ادا کیں۔ اسی طرح ان کے لیے سزا بھی بہت ہی سخت ہے اگر ان سے کوئی جرم صادر ہوا ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸-۳۵ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا
وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿٢٨﴾
وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ
أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٢٩﴾ يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَن يَأْتِ
مِنكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَ
كَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿٣٠﴾ وَمَن يَقْنُتْ مِنكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ الجزء ۲۲
وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا
كَرِيمًا ﴿٣١﴾ يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ
فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ
قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿٣٢﴾ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ
الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ

تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِىْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ
ع إِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ
وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَ
الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ
وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ
وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ
مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

ترجمۂ آیات ۲۸-۳۵

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کی طالب ہو تو آؤ، میں تمھیں دے دلا کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو اطمینان رکھو کہ اللہ نے تم سے خوبی کے ساتھ نباہ کرنے والیوں کے لیے ایک اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ ۲۸-۲۹

اے نبی کی بیویو، تم میں سے جو کسی کھلی بے حیائی کی مرتکب ہو گی تو اس کے لیے دوچند عذاب ہے۔ اور یہ بات اللہ کے لیے آسان ہے۔ اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبردار بنی رہیں گی اور عملِ صالح کریں گی ہم ان کو دوہرا اجر دیں گے اور ہم نے ان کے لیے باعزت رزق تیار کر رکھا ہے۔ ۳۰-۳۱

اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو۔ تو تم لہجہ میں نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ کسی طمعِ خام میں مبتلا ہو جائے اور بات معروف کے مطابق کہو۔ ۳۲

اور اپنے گھروں میں ٹک کے رہو اور سابقہ جاہلیت کے سے انداز اختیار نہ کرو۔ اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے اے اہل بیتِ نبی! کہ تم سے آلودگی کو دور کرے اور تمہیں اچھی طرح پاک کرے اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا چرچا کرو۔ بے شک اللہ نہایت ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔ ۳۲-۳۴

اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں، راستباز مرد اور راستباز عورتیں، ثابت قدمی دکھانے والے مرد اور ثابت قدمی دکھانے والی عورتیں، فروتنی اختیار کرنے والے مرد اور فروتنی اختیار کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والی عورتیں — ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ ۳۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (۲۸-۲۹)

آیات کا پس منظر — قرآن کی روشنی میں

ہمارے مفسرین نے ان آیات کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ فتح خیبر کے بعد جب مسلمانوں کو فی الجملہ معاشی کشادگی حاصل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج نے بھی آپ سے مطالبہ کیا کہ ان کو بھی زندگی کی راحتوں

اور زینتوں سے متمتع ہونے کا موقع دیا جائے ۔ ان کے اس مطالبہ پر بطورِ عتاب یہ آیات نازل ہوئیں۔ ہمارے نزدیک کئی پہلوؤں سے یہ بات نہایت کمزور ہے ۔

اول تو قرینہ دلیل ہے کہ یہاں جن حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے وہ ہجرت کے چوتھے یا پانچویں سال سے تعلق رکھنے والے ہیں، اور غزوۂ خندق اور بنو قریظہ کے حالات زیر بحث آئے ہیں، آگے حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے ۔ ان تمام واقعات کا تعلق ۵ھ سے ہے ۔ خیبر ابھی فتح نہیں ہوا تھا ۔ اور آیت ۲۷ کے الفاظ وَّاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا کے تحت خود مفسرین ہی نے یہ تصریح کی ہے کہ یہ فتح خیبر کی پیشگی بشارت ہے ۔

دوسرا یہ کہ یہ مطالبہ اگر بجز نان نفقہ میں فی الجملہ توسیع کے لیے تھا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس پر ان کو یہ نوٹس دے دیا جائے کہ ان کو دے دلا کر ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا جائے ۔ اس طرح کی بات پر اول تو کسی تنبیہ کی سزاوار ہی نہیں تھیں اور اگر تھیں بھی تو زیادہ سے زیادہ اس نصیحت کی مستحق تھیں کہ نبی کی معیت مطلوب ہے تو انھیں صبر و قناعت کی زندگی اختیار کرنی پڑے گی ۔

تیسرا یہ کہ امہات المومنینؓ کے متعلق یہ سوءِ ظن نہیں کیا جا سکتا کہ ان پر دنیا کی راحتوں اور زینتوں کا شوق کسی دور میں بھی اتنا غالب آگیا ہو کہ وہ اس کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑی ہوتی ہوں اور معاملہ اتنا سنگین ہو گیا ہو کہ خود اللہ تعالیٰ کو اس میں مداخلت کرنی پڑی ہو اور نوبت اس نوٹس تک پہنچ گئی ہو جو ان آیات میں ان کو دیا گیا ۔

بہر حال یہ شانِ نزول ہمارے نزدیک قابلِ توجہ نہیں ہے نہ آیت کے الفاظ سے اس کی تائید ہوتی ہے نہ وقت کے حالات سے ۔ ہم یہاں اس سورہ کی روشنی میں وقت کے بعض خاص حالات کی طرف اشارہ کریں گے جن سے ان آیات کا صحیح موقع و محل سمجھنے میں مدد ملے گی ۔

اس پوری سورہ پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں منافقین کی ریشہ دوانیاں جس طرح عام مسلمانوں کو اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان و برگشتہ کرنے کے لیے بہت بڑھ گئی تھیں اسی طرح منافقات کے ذریعے سے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے سکون کو درہم برہم کرنے کے لیے بھی بڑی خطرناک مہم چلا رکھی تھی ۔ منافق عورتیں امہات المومنینؓ کے گھروں میں جاتیں اور نہایت ہمدردانہ انداز میں ان سے کہتیں کہ آپ لوگ شریف اور معزز گھرانوں کی بیٹیاں ہیں لیکن آپ لوگوں کی زندگی ہر راحت و لذت سے محروم، بالکل قیدیوں کی طرح گزر رہی ہے ۔ اگر آپ دوسرے گھروں میں ہوتیں تو آپ کی زندگی بیگمات کی طرح نہایت عیش و آرام اور ٹھاٹ باٹ کے ساتھ گزرتی ۔ ساتھ ہی وہ یہ وسوسہ اندازی بھی کرتیں کہ اگر یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو طلاق دے دیں تو بڑے بڑے رئیس اور سردار آپ لوگوں سے نکاح کریں گے اور آپ لوگوں کی زندگیاں قابلِ رشک ہو جائیں گی ۔ آگے کی آیات سے یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ منافقین

کو بھی جب کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں جانے اور آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ سے بات کرنے کا موقع ملتا تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان کے اندر کچھ نہ کچھ وسوسہ اندازی کی ضرور کوشش کرتے۔ ان کوششوں سے ان کا اصلی مقصد تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے اندر کوئی اس طرح کا فتنہ کھڑا کرنا تھا جس طرح کا فتنہ انھوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے متعلق کھڑا کر دیا تھا، جس کی تفصیلات سورۂ نور میں آپ پڑھ چکے ہیں، ورنہ ادنیٰ درجے میں یہ فائدہ تو ان کو یقینی طور پر نظر آتا تھا کہ اس سے ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کے اندر بے اطمینانی پیدا ہو گی اور کیا عجب کہ اس طرح کوئی ایسی شکل نکل آئے کہ وہ آپ کی ازواج کے ساتھ نکاح کرنے کا جو مذموم ارادہ رکھتے ہیں وہ پورا ہو جائے۔

منافقین و منافقات کی ان چالوں سے اگرچہ امہات المومنینؓ بالکل بے خبر نہیں تھیں، بعض تلخ تجربے ان کو ہو چکے تھے، لیکن شریف، کریم النفس اور با حیا لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص ان کے سامنے اگر ہمدردی و خیر خواہی کے انداز میں بات کرتا ہے تو وہ اس کے کھوٹ سے واقف ہوتے ہوئے بھی، اس کو جواب نرمی ہی سے دیتے ہیں۔ امہات المومنینؓ بھی اپنی کریم النفسی کے سبب سے ان لوگوں کو نرمی ہی سے جواب دیتیں جس سے یہ کمینے لوگ اس طمعِ خام میں مبتلا ہو جاتے کہ ان کا پروپیگنڈا کامیاب ہو رہا ہے اور وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یہ حالات تھے جن میں یہ آیات اتری ہیں۔ ان میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں ان کو سنانا تو مقصود ہے درا صل ان منافقین اور منافقات کو جن کی ریشہ دوانیوں کے تار و پود ان میں بکھرے گئے ہیں، لیکن وہ پسِ پردہ تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کو مخاطب کرنے کے بجائے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کو مخاطب کر کے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔

یہاں بلاغتِ کلام کے اس اسلوب کو یاد رکھیے کہ بسا اوقات ظاہر الفاظ کے اعتبار سے کلام میں خطاب کسی سے ہوتا ہے، لیکن اس میں کوئی عتاب مضمر ہوتا ہے تو اس کا رخ کسی اور طرف ہوتا ہے۔

آیات کا مفہوم

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر اب آیات کے مفہوم پر غور کیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے نبی! تم اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کے عیش اور اس کی زینتوں کی طالب ہو تو آؤ، میں تمھیں دے دلا کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ، اس کے رسول اور دارِ آخرت کی کامرانیوں کی طالب ہو تو یاد رکھو کہ تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کے حقوق کو اچھی طرح ادا کرنے والی اور آخرت کی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر پہچاننے والی ہوں گی، اللہ نے ان کے لیے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آزادی کا یہ اختیار نامہ ازواجِ مطہراتؓ کے سامنے رکھ دیا اور سب سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سامنے رکھا جو آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ آپؐ نے ان کو یہ ہدایت بھی فرمائی کہ وہ اس کے جواب میں جلدی نہ کریں بلکہ اپنے والدین سے بھی مشورہ کر لیں،

اس کے بعد جواب دیں۔ لیکن حضرت صدیقہؓ نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا کہ مجھے اس معاملے میں کسی کے مشورے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں! منافقین نے سب سے زیادہ جادو تو انہی پر چلانے کی کوشش کی ہوگی، جب ان کا جواب ان کی تمام توقعات پر پانی پھیر دینے والا ثابت ہوا تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

اس طرح قرآن نے ایک طرف تو منافقین کی ان ریشہ دوانیوں کا ہمیشہ کے لیے سدباب کر دیا جو وہ ازواجِ مطہراتؓ کے درمیان کر رہے تھے دوسری طرف اس امتحان کے ذریعے سے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ ازواجِ مطہراتؓ سب بلا استثناء اللہ و رسول اور آخرت کی طالب تھیں۔ اسی چیز نے ان کو اللہ کے رسول کے ساتھ وابستہ کیا تھا اور یہ وابستگی اتنی مستحکم تھی کہ اس دنیا کی کوئی طمع اس کو توڑ نہیں سکتی تھی۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ ان آیات میں ازواجِ مطہراتؓ پر دنیا طلبی کے جرم میں کوئی عتاب نہیں ہوا ہے جیسا کہ لوگوں نے سمجھا ہے بلکہ یہ اللہ و رسول کی طرف سے ان کو آزادی کا پروانہ دے کر ان کے اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کرایا گیا تاکہ ان منافقین کے حوصلے ہمیشہ کے لیے پست ہو جائیں جو اس طمعِ خام میں مبتلا تھے کہ ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہن) کو دنیا کی کسی طمع کے پھندے میں پھنسا کر اپنی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔ اس اعلانِ تخییر کے بعد گویا ہر ایک کو حوصلہ آزمائی کا موقع دے دیا گیا لیکن سب پر ثابت ہو گیا کہ اہلِ بیتِ رسالت کا انتخاب خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس حرم کے اندر کسی کے لیے کسی دراندازی کی گنجائش نہیں ہے۔

وَإِنْ كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا۔ لفظ 'احسان' یہاں حسن و خوبی اور اخلاص و راستبازی کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے حقوق اور طلبِ آخرت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے مفہوم میں ہے۔ اس آیت میں کچھ مضمون محذوف ہے جس پر اس کا اسلوبِ بیان دلیل ہے۔ اس اسلوب کا پورا حق ادا کیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی طالب اور دارِ آخرت کی کامرانیاں چاہنے والی ہو تو نہایت خوبی اور مستعدی کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور طلبِ آخرت کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں سرگرم رہو اور یہ اطمینان رکھو کہ تم میں سے جو ان حقوق و فرائض کو 'احسان' کے ساتھ ادا کرنے والی ہوں گی اللہ نے ان کے لیے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ اس سے ضمناً یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہن) کے لیے بھی مجرد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کوئی کام آنے والی چیز نہیں ہے بلکہ اصل چیز عمل و اطاعت ہے اور عمل و اطاعت بھی 'احسان' کے ساتھ۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَن يَأْتِ مِنكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۔ (۳۰)

سنّتِ الٰہی — اوپر کی بات تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے کہلائی گئی اس لیے کہ اس کا آپ کی زبان ہی سے کہلایا جانا موزوں تھا۔ اب آگے براہِ راست ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کو مخاطب کر کے ان پر یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ نبی کی بیویاں ہونے کے سبب سے اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا درجہ و مرتبہ بھی بہت اونچا ہے اور اس مرتبہ ہی کے اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت بھاری ہیں۔ پہلے ان کی ذمہ داری بتائی کہ وہ اس امر کو یاد رکھیں کہ اگر ان سے کوئی جرم صادر ہوا تو وہ اسی ترازو سے نہیں تولا جائے گا جس سے دوسروں کے جرم تولے جائیں گے بلکہ ان کے اعمال الگ باٹ اور الگ ترازو سے تولے جائیں گے اور دوسروں کی نسبت سے ان کو دونی سزا ملے گی۔ — باعتبارِ مرتبہ

'وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا' یعنی تم میں سے کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ رسول کی زوجیت میں ہونے کے سبب سے تم میں سے کسی کو سزا دینا اللہ پر ذرا بھی شاق گزرے گا۔ اللہ کا قانون بالکل بے لاگ ہے، وہ کسی کے ساتھ کسی نسبت و تعلق کی بنا پر کوئی رعایت نہیں کرے گا۔

اس تنبیہ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ العیاذ باللہ ازواجِ مطہراتؓ سے کسی سنگین نوعیت کے جرم کا اندیشہ تھا۔ یہ محض ان کی ذمہ داری اور ان کے مرتبہ و مقام کی یاد دہانی کر کے ان کو تنبیہ فرمایا گیا ہے کہ وہ شیاطین کی وسوسہ اندازیوں سے اچھی طرح ہوشیار رہیں۔ یہاں 'فاحشۃ مبینۃ' (کھلی بے حیائی) کے الفاظ جو استعمال ہوئے ہیں وہ منافقین و مفسدین کے مخفی ارادوں کو پیشِ نظر رکھ کر استعمال ہوئے ہیں۔ وہ رات دن اسی تگ و دو میں لگے کہ اہلِ بیتِ رسالت سے متعلق کوئی سکینڈل (SCANDAL) پیدا کریں، تاکہ ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو اور مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ برباد ہو۔ قرآن نے یہ لفظ استعمال کر کے ازواجِ مطہراتؓ کو آگاہ کر دیا کہ منافقین ہمدردی و خیر خواہی کے بھیس میں درحقیقت اپنے بہت بڑے شیطانی منصوبے کی فکر میں ہیں۔

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا (۳۱)

لیعنی جس طرح تمہارے کسی جرم کی سزا دگنی ہے اسی طرح تمہاری نیکیوں کی جزا بھی دگنی ہے۔ اس وجہ سے تم میں سے جو اللہ و رسول کی صدقِ دل سے فرمانبرداری اور عملِ صالح کرتی رہیں گی اللہ ان کو دہرا اجر دے گا اور ان کے لیے باعزت رزق اس نے تیار کر رکھا ہے۔ ہم دوسرے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ 'رزق' اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام کی تعبیر ہے اور اس کے ساتھ کریم کی صفت اس حقیقت کی تعبیر کے لیے ہے کہ یہ رزق و فضل ان کو بطور صدقہ نہیں ملے گا بلکہ ان کے حق کے طور پر ملے گا اور ہمیشہ کے لیے بلا کسی قید و شرط اور بغیر کسی اندیشۂ احتساب و مؤاخذہ کے ملے گا۔

ان آیات سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ خدا کے ہاں مؤاخذہ اتمامِ حجت کے اعتبار سے ہوگا اور — خدا کے ہاں مؤاخذہ اتمامِ حجت کے اعتبار سے ہوگا

اعمال کا صلہ ان حالات کے اعتبار سے ملے گا جن میں وہ انجام دیے گئے ہیں۔ ازواج نبی (رضی اللہ عنہن) کو چونکہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی معیت حاصل ہوئی اور رسول اتمام حجت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس وجہ سے ان سے مواخذہ سخت ہوگا۔ اسی طرح رسول کی رفاقت پوری وفاداری کے ساتھ چونکہ بڑا کٹھن کام ہے اس وجہ سے اس کا صلہ بھی دُگنا ہے۔ جرموں کے مواخذہ اور اعمال کے صلہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے اور یہ بالکل مبنی بر عدل و حکمت ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۳۲)

خاص حالات کی بنا پر ایک خاص ہدایت

'خضوع' کے معنی تواضع و خاکساری کے اظہار کے ہیں۔ 'فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ' کے معنی ہوں گے 'بات کہنے میں نرمی و تواضع نہ اختیار کرو'۔ عام حالات میں تو پسندیدہ طریقۂ کلام یہی ہے کہ آدمی تواضع کا انداز اختیار کرے لیکن بعض اوقات حالات و مصالح کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس سے مختلف روش اختیار کی جائے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس دور میں منافقین و منافقات رات دن اس تگ و دَو میں تھے کہ ازواج مطہراتؓ کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے کوئی ایسی بات نکالیں جس کو ایک فتنہ بنا سکیں۔ ان لوگوں کی باتیں ہمدردانہ رنگ میں ہوتی تھیں اس وجہ سے امہات المومنینؓ بھی ان کا جواب اپنی شرافتِ نفس کے سبب سے نرم انداز ہی میں دیتی تھیں جس سے یہ مفسدین دلیر ہوتے جا رہے تھے اور ان کو یہ توقع ہو چلی تھی کہ وہ بہت جلد اپنی سازش میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان خاص حالات کی بنا پر امہات المومنینؓ کو اپنا رویہ بدل دینے کی ہدایت ہوئی۔ فرمایا کہ اے نبی کی بیویو، تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو۔ نبی کے ساتھ نسبت کے باعث تمہاری نیکی اور بدی دونوں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ تمہاری نیکی دوسروں کے لیے مثال اور نمونہ بنے گی اور تم سے کوئی غلطی صادر ہوگی تو اس کو بھی اصحاب الاغراض حجت بنائیں گے اس وجہ سے تمہارے لیے احتیاط کی روش اولیٰ ہے۔ اگر منافقین تمہارے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنے کی کوشش کریں تو بربنائے مروت و شرافت ان کی بات کا جواب نرمی و تواضع سے نہ دو کہ جس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کے خلاف بغض و حسد ہے وہ کوئی غلط توقع کر بیٹھے، بلکہ صاف انداز میں اس سے اس طرح بات کہو کہ اگر وہ اپنے دل میں کوئی برا ارادہ لے کر آیا ہے تو اس کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے کہ یہاں اس کی دال گلنے والی نہیں ہے۔

ازواج نبیؐ کا مرتبہ

'لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ' یہ ازواج مطہراتؓ کے مرتبہ کی طرف اشارہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کی بنا پر ان کو دنیا کی تمام عورتوں کے مقابل میں حاصل تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد ان کے ہر قول و فعل کو امت کے لیے نمونہ و مثال کی حیثیت حاصل ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کا درجہ 'امہات المومنین' کا قرار دے دیا۔ 'اِنِ اتَّقَيْتُنَّ' کے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ مرتبۂ عالی

جوان کو حاصل ہے یہ تقویٰ کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر وہ تقویٰ پر قائم رہیں گی تو یہ سرفرازی ان کو حاصل رہے گی، اور اگر یہ شرط وہ پوری نہ کر سکیں گی تو، جیسا کہ اوپر گزرا، ان کی مسئولیت دوسروں کے بالمقابل دگنی ہے۔

'فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ' میں 'مَرَضٌ' سے وہ کینہ و حسد مراد ہے جو اشرار منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنے دلوں میں رکھتے تھے اور جس کے سبب سے رات دن ان کی کوشش یہ تھی کہ آپ کی ازواج مطہرات کو کسی طرح بدنام کریں۔ اسی گروہ کے سرغنہ نے 'افک' کا فتنہ کھڑا کیا تھا۔

'وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا' میں قول معروف' سے یہ مراد ہے کہ ایسے لوگوں سے اگر بات کرنے کی نوبت آئے تو بات بالکل صاف و سادہ انداز میں کی جائے جس طرح ایک عام آدمی سے کی جاتی ہے جس میں لگاوٹ کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ یعنی اُن کے ہمدردانہ لب ولہجہ سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ کوئی نرم انداز نہ اختیار کیا جائے۔ یہ کمینہ لوگ ہیں اس وجہ سے یہ شرافت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا (۳۳)

ازواج نبیؐ کو خطاب کر کے وقت کی بیگمات پر تعریض

اسی سلسلہ میں یہ مزید ہدایات دی گئی ہیں جن سے مقصود ازواج مطہراتؓ کو منافقین و منافقات کے فتنوں سے بچا کر ان کاموں میں لگانا تھا جو ان کے شایانِ شان تھے اور جن کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے ان کا انتخاب فرمایا تھا۔ ان ہدایات کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے اس بات کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ منافق عورتیں ازواج نبی (رضی اللہ عنہن) کے دلوں میں بھی اسی طرح کے ارمان پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں جس طرح کے ارمان ان کے اپنے دلوں میں تھے۔ مثلاً وہ کہتیں کہ اگر آپ لوگوں کو ان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی قید سے رہائی حاصل ہو جائے تو وقت کے بڑے بڑے سردار آپ لوگوں کو نکاح کے پیغام دیں گے اور آپ لوگ بھی اسی طرح بن ٹھن کر زیب و زینت کے ساتھ شاپنگ اور سیر سپاٹے کے لیے نکلا کریں گی جس طرح امرا کی بیگمات نکلا کرتی ہیں۔ قرآن نے منافقات کی انہی پس پردہ وسوسہ اندازیوں اور بدآموزیوں کی طرف تلمیح کرتے ہوئے ازواج مطہراتؓ کو یہ تلقین فرمائی کہ تم اپنے گھروں میں ٹک کے بیٹھو، زمانۂ جاہلیت کی عورتوں کی طرح اپنی زینتوں کی نمائش کرتی نہ پھرو۔

یہ ہدایت بالکل اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت کوئی نیک دل باپ اپنی سعادت مند اولاد کو اس وقت کرتا ہے جب اس کے علم میں یہ بات آتی ہے کہ کچھ برے لوگ اپنی بدآموزیوں سے اس کی اولاد کو غلط راہ پر ڈال رہے ہیں۔ اس وقت اگر وہ اپنے نیک بخت بیٹے سے یہ کہتا ہے کہ تم اپنی ساری توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کرو، آواروں کی طرح سڑکوں پر نعرے لگاتے نہ پھرو تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ فی الواقع اس کا لڑکا آواروں کی طرح سڑکوں پر پھر رہا تھا یا اس کے آوارہ ہونے کا اندیشہ تھا بلکہ یہ

محض وقت کے آواروں پر ایک تعریض اور ان کے طریقہ سے بچانے کے لیے ایک تنبیہ ہوتی ہے اسی طرح کی ہدایت ازواج مطہراتؓ کو دی گئی ہے۔ اس میں درحقیقت وقت کی بیگمات کے رویہ پر تعریض اور ان کی تحقیر ہے، لیکن بات ان کو خطاب کر کے کہنے کے بجائے ازواج نبی (رضی اللہ عنہم) کو خطاب کر کے کہی گئی ہے، ورنہ امہات المومنینؓ میں بھلا ایسا کون تھا جس کی نسبت یہ شبہ بھی کیا جا سکے کہ ان کے دل میں گھر سے باہر پھرنے یا جاہلیت کی عورتوں کی طرح اپنے بناؤ سنگار کی نمائش کا ارمان ہو گا!

جاہلی تہذیب کے ختم ہونے کی پیشین گوئی

'جاہلیت' کے ساتھ یہاں 'اولیٰ' کی صفت کی بنا پر ہمارے مفسرین نے اس سے حضرت نوحؑ یا حضرت ادریسؑ کے زمانہ کی جاہلیت مراد لی ہے۔ لیکن اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نہایت بلیغ طریقہ سے اس جاہلی تہذیب کے ختم ہونے کی طرف اشارہ ہے جس کو منافقین و منافقات اب تک اپنے سینوں سے لگائے یہ امید لیے بیٹھے تھے کہ اسلام کے ظہور سے اس کو جو دھکا لگا ہے یا لگنے کا اندیشہ ہے اس کے باوجود یہ باقی رہے گی۔ قرآن نے ان کی اسی امید پر ضرب لگانے کے لیے اس کو 'جاہلیت اولیٰ' سے تعبیر فرمایا کہ اب اس کو قصۂ ماضی سمجھو، اس کا دور اب ختم ہو چکا ہے، جو لوگ اس کے از سر نو فروغ پانے کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ جنت الحمقاء میں بس رہے ہیں۔ اسلام اور اسلامی تہذیب نے اس کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں اور اگر اس کے کچھ آثار باقی ہیں تو وہ بہت جلد مٹ کے رہیں گے۔ اب جو لوگ اس گھر کی دربانی کر رہے ہیں وہ ایک اجڑے گھر کی دربانی کر رہے ہیں۔ اگر انھوں نے اپنے رویہ میں تبدیلی نہ کی تو جس دن یہ گھر گرے گا یہ بھی اس کے نیچے دفن ہو کے رہ جائیں گے۔

کرنے کے کام

'وَاَقِمْنَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ وَاَطِعْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ'۔ یعنی کرنے کا کام وہ نہیں ہے جو جاہلی تہذیب کی علمبردار بیگمات کر رہی ہیں بلکہ یہ ہے کہ نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ ادا کرتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں پوری وفاداری کے ساتھ سرگرم رہو۔ یہاں نماز اور زکوٰۃ اور اطاعت اللہ و رسول کا حوالہ دین کی جامع باتوں کی حیثیت سے آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے دائرۂ کار یعنی گھروں کے اندر اسی نور کو تم پھیلاؤ جس نور کو باہر کی زندگی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ پھیلا رہے ہیں۔

بیگمات جاہلیت کے سامان زینت پر طنز

'اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا'۔ یہ اہل بیت کو کمال اہتمام کے ساتھ مخاطب کر کے، نہایت شفقت و محبت کے انداز میں تسلی دی ہے کہ یہ ہدایات جو تمہیں دی جا رہی ہیں ان سے مقصود تمہاری زندگی کو قید و بند میں جکڑنا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اہل بیت نبوت سے ہر آلائش کو دور رکھے اور ان کی نہایت اعلیٰ تربیت کر کے ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے رسول کی رفاقت کے لائق بنائے۔ لفظ 'رجس' میں یہاں بیگمات کے سامان زینت پر تعریض ہے کہ یہ زینت نہیں بلکہ گندگی کا بوجھ ہے جس کو یہ لادے پھر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کے

اہل بیت کو اس گندگی سے پاک رکھنا چاہتا ہے۔

چند قابل توجہ باتیں

اس آیت کی اصل تعلیم کی وضاحت تو اوپر کی سطروں میں ہو چکی ہے لیکن چند اور باتیں بھی اس میں قابل توجہ ہیں۔

عورت کا اصلی دائرہ کار

ایک یہ کہ عورت کا اصل دائرۂ کار اس کا گھر ہے۔ اس کو اپنی تمام سرگرمیاں اس کے اندر ہی محدود رکھنی چاہئیں اور اگر کبھی اس کو گھر کے حدود سے باہر قدم نکالنے کی ضرورت پیش آئے تو اسے ان حدود کی پابندی کرنی ہوگی جن کی تفصیل اسی سورہ میں آگے آرہی ہے۔

دوسری یہ کہ عورتوں کا بناؤ سنگھار کر کے گھروں سے باہر نکلنا تہذیب کی ترقی کی نشانی نہیں ہے بلکہ یہ جاہلیت اولیٰ کی طرف رجعت ہے۔

اصل اہل بیت ازواج نبیؐ ہیں

تیسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت ہونے کا شرف اصلاً آپ کی ازواج مطہراتؓ کو حاصل ہے۔ یہ آیت اس باب میں نص قطعی کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن میں اس کی نظیریں بھی موجود ہیں۔ یہاں اہل بیت سے ازواج نبی رضی اللہ عنہن کے سوا کسی اور کو مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسروں کی شمولیت اس میں ہو سکتی ہے تو اصلاً نہیں بلکہ تبعاً و ضمناً ہو سکتی ہے۔ اس وجہ سے ان غالی فرقوں کی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی جو اصل کے تو منکر ہیں لیکن فروع پر بڑا طوفان کھڑا کرتے ہیں۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا (۳۴)

ازواج نبیؐ کا اصل مقصد زندگی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو ان کا اصل مقصد زندگی بتایا گیا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کاموں کے لیے نہیں منتخب فرمایا ہے جن کی دعوت منافقات دے رہی ہیں بلکہ قرآن اور حکمت کی جو تعلیم ان کے گھروں میں دی جا رہی ہے وہ اس کا چرچا کریں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس طرح مردوں کی رہنمائی کے لیے ہوئی تھی اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ہوئی تھی۔ آپ جس طرح باہر لوگوں کو تعلیم دیتے رہتے تھے اسی طرح اپنے گھروں کے اندر بھی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ وحی جس طرح باہر آپ پر نازل ہوتی تھی اسی طرح گھر کے اندر بھی نازل ہوتی تھی۔ نیز جس طرح آپ کا ہر قول لوگوں کے لیے تعلیم و ہدایت تھا اسی طرح آپ کا ہر فعل بھی لوگوں کے لیے اسوہ و نمونہ تھا۔ آپ کی زندگی 'پرائیویٹ' اور 'پبلک' کے الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں تھی بلکہ آپ کی حیات مبارک کا ہر لمحہ امت کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف تھا، اس وجہ سے ضروری ہوا کہ جس طرح آپ کی باہر کی زندگی کی ایک ایک ادا کو محفوظ کرنے کے لیے آپ کے جاں نثار سایہ کی طرح آپ کے ساتھ ساتھ رہیں، اسی طرح آپ کے گھر کے اندر کی زندگی کا بھی ایک ایک پہلو محفوظ رکھنے کا انتظام ہو۔ یہ کام ظاہر ہے کہ آپ کی ازواج مطہراتؓ ہی کے ذریعہ سے ممکن تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم و عمل جتنا آپ کی ازواج مطہراتؓ کے ذریعے سے پھیلا ہے اس کی مقدار صحابہؓ کے ذریعے پھیلے ہوئے علم سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اور اس آیت سے

بیانات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اس مشن پر آپ کی ازواج مطہراتؓ کو اللہ تعالیٰ نے خود مامور فرمایا تھا کہ ان کا کام دنیا کے خزف ریزے جمع کرنا نہیں بلکہ علم و حکمت کے ان خزانوں کو خلق کے اندر لٹانا ہے جن کی بارش ان کے گھروں کے اندر ہو رہی ہے —— ہمارے نزدیک یہ مصلحت بھی من جملہ ان مصالح کے ہے جن کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعدد ازواج کی خاص اجازت دی گئی۔ اس مسئلہ پر آگے بحث آئے گی۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا یعنی یہ اطمینان رکھو کہ اگر تمہاری ڈیوٹی گھروں کے اندر سے متعلق ہے تو تمہاری کوئی خدمت تمہارے رب سے مخفی نہیں رہے گی۔ خدا بڑا ہی باریک بین اور بڑا ہی خبر رکھنے والا ہے۔ وہ تمہارے ہر عمل اور تمہاری ہر ضرورت سے اچھی طرح باخبر ہے۔ تم اس کے بھروسہ پر اپنا فرض انجام دو، اللہ تعالیٰ تمہاری ضروریات کا خود کفیل ہے۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (۳۵)

مسلمان مردوں اور عورتوں کے سامنے ایک آئینہ

اوپر جو باتیں متفرق طور پر، بعض منفی اور بعض مثبت پیرایہ میں، فرمائی گئی ہیں، آخر میں ان سب کو ایک جامع اسلوب میں سامنے رکھ دیا گیا ہے اور مقصد اس سے یہ بتانا ہے کہ اللہ اور رسول کو جو معاشرہ مطلوب و محبوب ہے اس کی صفات کیا ہونی چاہئیں۔ یہ گویا مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس کو سامنے رکھ کر اپنے آپ کو سنواریں اور ان منافقین و منافقات کے چکمے میں نہ آئیں جو ان کے چہروں پر جاہلیت کی وہی سیاہی پھر ملنے کی فکر میں ہیں جس کو اللہ کے رسول نے دھونے کی کوشش کی ہے۔ یہ ساری باتیں تعداد میں دس ہیں اور اوپر اس پیرے میں جو ہدایات متفرق طور پر دی گئی ہیں وہ بھی الگ الگ گنیے تو دس نکلیں گی۔ یہاں چونکہ خطاب خاص طور پر ازواج مطہراتؓ سے ہے نیز مقصود اسلامی معاشرہ کے اجزائے ترکیبی کو بتانا ہے اس وجہ سے عورتوں کا ذکر ضمناً نہیں بلکہ مردوں کے پہلو بہ پہلو مستقلاً آیا ہے اس لیے کہ عورتیں معاشرے کا بالکل نصف اور مساوی حصہ ہیں اور معاشرے کے بناؤ اور بگاڑ میں ان کا دخل مردوں سے شاید کچھ زائد ہے:

یہاں جو صفات گنائی گئی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اسلام	۲۔ ایمان	۳۔ قنوت
۴۔ صدق	۵۔ صبر	۶۔ خشوع
۷۔ صدقہ	۸۔ روزہ	۹۔ عفت و حیا
۱۰۔ ذکر اللہ		

یہ تعداد میں دس ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی اخلاق و کردار کے تمام پہلو ان کے اندر سمٹ آئے ہیں اور چونکہ ان کا ذکر صفت کے صیغوں سے ہوا ہے اس وجہ سے یہ بحیثیت عادت و صفت کے مطلوب ہیں، یعنی معاشرہ کے ہر فرد پر، عورت ہو یا مرد، ان کا رنگ چھایا ہوا ہو۔

ان صفات میں سے کچھ کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، کچھ کا تعلق حقوق العباد سے ہے؛ اور کچھ اصلاً اصلاحِ نفس سے تعلق رکھنے والی ہیں۔

اسلام اور ایمان پورے دین کی جامع تعبیر ہے۔ ایمان دین کا باطن ہے، اسلام اس کا ظاہر ہے اور یہ دونوں بیک وقت مطلوب ہیں۔

لفظ 'قنوت' اوپر آیت ۳۱ میں گزر چکا ہے۔ یہ خدا اور رسول کی اس فرمانبرداری کی تعبیر ہے جو دل کی پوری یکسوئی، پوری نیازمندی اور کامل اخلاص کے ساتھ دائماً ہو۔

'صدق' قول، فعل، ارادہ تینوں کی مطابقت اور استواری کی تعبیر کے لیے آتا ہے۔ اوپر آیت ۲۳ میں صَدَقُوْا مَا عٰھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ (اور انھوں نے اللہ سے جو عہد باندھا اس کو پورا کر دکھایا) کے الفاظ گزر چکے ہیں۔ اس پہلو سے یہ نفاق کے بالکل ضد کردار کی تعبیر ہے۔ ہمارے ہاں 'قول مرداں جاں دارد' اس کے اسی پہلو کی تعبیر ہے۔

'صبر' استقامت، استقلال، پامردی کے مفہوم میں آتا ہے۔ جو آدمی ہر خوف و طمع کے مقابل میں، خواہ وہ اس کے اندر سے سر اٹھائے یا باہر سے، موقف حق پر ڈٹا اور اپنے رب سے راضی و مطمئن رہے وہ صابر ہے اور اسی کردار پر درحقیقت تمام دین قائم ہے۔

'خشوع' کا مفہوم فروتنی اور خاکساری ہے۔ یہ چیز خدا کی ہیبت اور اس کی عظمت و جلال کے صحیح تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ صفت آدمی کو اس کے رب کے آگے بھی جھکاتی ہے اور خلق کے لیے بھی اس کو مہربان و حلیم بناتی ہے۔ یہ 'استکبار' کا ضد ہے جو تمام انفرادی و اجتماعی برائیوں کی، خواہ ان کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے، جڑ ہے۔

'تصدّق' کے معنی صدقہ کرنے کے ہیں۔ اس کا تعلق خاص طور پر حقوق العباد سے ہے۔ آدمی جب اپنی خواہشوں کو دبا کر اور اپنی ضروریات میں ایثار کر کے اپنا مال دوسروں کی ضروریات پوری کرنے پر خرچ کرتا ہے تو اس سے اس کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ چیز درجہ بدرجہ اس کے ایمان کو پختہ اور استوار کرتی جاتی ہے۔

'صَوم' ضبطِ نفس اور تربیتِ صبر کی خاص ریاضت ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۸۳-۱۸۷ کے تحت ہم اس کے اثرات پر بحث کر چکے ہیں۔ انسان کے تمام کردار کی بنیاد صبر پر ہے اور روزہ صبر کی تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

'حفظ فروج'، عفت کی تعبیر ہے جو ضبطِ نفس کا ثمرہ ہے۔ معاشرے میں خرابی پیدا کرنے کا سب سے زیادہ زود اثر نسخہ شیطان کے ہاتھ میں یہی ہے کہ وہ اپنے پروپیگنڈے کے ذریعے سے عورتوں اور مردوں کے اندر عفت کے احساس کو مردہ کر دیتا ہے۔ یہاں بھی اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے کہ منافقین و منافقات کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہراتؓ کے اندر زیب و زینت کی نمائش کا شوق ابھاریں تاکہ اس طرح مسلمانوں کا پورا معاشرہ بے حیائی کی راہ پر چل پڑے۔

'ذکر اللہ' تمام مذکورہ بالا صفات کا منبع اور ان کا محافظ ہے۔ بندہ جتنا ہی زیادہ اپنے رب کو یاد رکھتا ہے اتنی ہی یہ صفات اس کے اندر راسخ و پختہ ہوتی ہیں۔ سارے دین کی محافظ درحقیقت اللہ کی یاد ہی ہے۔ اور نماز اللہ کے ذکر ہی کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ نماز کا ذکر تمام دینی اخلاق کے محافظ کی حیثیت سے آیا ہے اور ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔

۶۔ آگے کا مضمون ـــ آیات ۳۶-۴۸

آگے حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور یہ بھی درحقیقت اوپر کے سلسلۂ بیان ہی کی ایک کڑی ہے۔ اس واقعہ کو بھی منافقین اور منافقات نے ایک فتنہ بنا لیا تھا جس سے طرح طرح کے سوالات اٹھ کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب سوالوں کے جواب دیے جن سے دین کے بعض نہایت اہم پہلو واضح ہوئے۔

مثلاً یہ کہ ....

- ـــ اللہ اور رسول کا حق سب سے بڑا ہے اس وجہ سے جب کسی معاملے میں اللہ و رسول کی مرضی واضح ہو جائے تو اس میں آدمی کی اپنی مرضی کالعدم ہو جاتی ہے۔
- ـــ رسول کا فریضۂ منصبی اللہ کے احکام کی دعوت اور ان کا اجرا و نفاذ ہے اس وجہ سے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم صادر ہو جائے تو اس کا فرض ہے کہ اس حکم کی تعمیل کرے اور اس معاملے میں کسی کی مخالفت یا ملامت کی مطلق پروا نہ کرے۔
- ـــ متبنّیٰ کی بیوی سے متعلق جو تصور زمانۂ جاہلیت سے چلا آ رہا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے عمل سے اس کی اصلاح کی ہدایت اور اس معاملے میں اشرار کے غوغا کی پروا نہ کرنے کی نہایت شدت سے تاکید۔
- ـــ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیین ہیں اس وجہ سے ضروری ہوا کہ آپ کے ہاتھوں دین کے ہر شعبہ کی تکمیل ہو جائے۔ اس کے کسی پہلو میں کوئی خلا نہ رہ جائے۔
- ـــ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے خلق پر جو عظیم فضل و احسان فرمایا اس کا

بیان اور امت پر آپ کے حقوق کی طرف اشارہ۔

یہ اشارات اگرچہ اس پیرے کے ربط و نظام کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں لیکن ہم بالاجمال حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کا واقعہ بھی ذکر کیے دیتے ہیں تاکہ آیات کے تحت جزئیات سے تعرض کی ضرورت پیش نہ آئے۔

حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی صحیح نوعیت

حضرت زید بن حارثہؓ کا تعلق قبیلۂ کلب سے تھا۔ یہ بچپن میں دشمن کی کسی غارت گری میں گرفتار ہوئے اور غلام بنا لیے گئے۔ حکیم بن حزام نے ان کو اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کے لیے خریدا۔ حضرت خدیجہؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقدِ نکاح میں آئیں تو انھوں نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا۔ اس طرح ان کو حضورؐ کی غلامی کا شرف حاصل ہوا۔ حضورؐ کی غلامی کی جو قدر و عزت ان کی نگاہوں میں تھی اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب ان کے والد اور چچا نے آنحضرت صلعم سے ان کی آزادی کا مطالبہ کیا تو حضورؐ نے ان کو اختیار دے دیا کہ وہ چاہیں تو اپنے باپ کے پاس چلے جائیں، چاہیں تو حضورؐ کی خدمت میں رہیں۔ اس موقع پر حضرت زیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی محبت کی جو مثال پیش کی وہ تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ انھوں نے آزادی کا اختیار نامہ پا جانے کے باوجود اس آزادی پر حضورؐ کی غلامی کو ترجیح دی۔ خواجہ حافظ نے شاید اسی واقعہ کو سامنے رکھ کر اپنا یہ لاجواب شعر کہا ہو۔

بولائے تو کہ گر بندہ خویشم خوانی
از سر خواجگیٔ کون و مکان برخیزم

اس کے بعد حضورؐ نے ان کو آزاد کر دیا۔ ان سے محبت تو ان کی خوبیوں کے سبب سے حضورؐ کو شروع ہی سے تھی، اس واقعہ کے بعد وہ دو چند ہو گئی۔ یہاں تک کہ حضورؐ کے غیر معمولی التفات و اعتماد کو دیکھ کر لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ آپ نے ان کو منہ بولا بیٹا بنا لیا ہے۔

واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں انتظامی اور فوجی صلاحیتیں بھی تھیں۔ متعدد مواقع پر آپ نے ان کو فوجی دستوں کی سرکردگی سپرد کی اور بعض مواقع پر، حضورؐ کی غیبت میں، وہ مدینہ پر امیر بھی رہے۔

حضورؐ نے ان کی عزت افزائی کے لیے ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن، حضرت زینب بنت جحشؓ کے ساتھ کر دیا۔ ان کا تعلق خاندان بنی اسد سے تھا۔ ان کی والدہ امیمہ بنت عبدالمطلب تھیں۔ جب حضورؐ نے حضرت زیدؓ کے لیے حضرت زینبؓ کو پیغام دیا تو ان کے عزیزوں کو اس رشتہ پر اعتراض ہوا کہ حضرت زیدؓ ایک آزاد کردہ غلام اور غیر کفو ہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ غلاموں سے متعلق، لوگوں کے تصورات میں تبدیلی پیدا ہو اس وجہ سے آپ نے اس نکاح پر اصرار فرمایا۔ بالآخر حضرت زینبؓ راضی ہو گئیں اور نکاح ہو گیا۔

نکاح کے بعد منافقین اور منافقات نے فتنہ اٹھایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک معزز گھرانے

کی ایک شریف خاتون کا دامن اپنے ایک آزاد کردہ غلام کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ اس قسم کی معاشرتی اصلاحات کو عوام کا ذہن آسانی سے قبول نہیں کرتا اس وجہ سے اس نکاح کے خلاف ایک مخالفانہ فضا پیدا ہوگئی۔ خاص طور پر منافقات نے حضرت زینبؓ کو ورغلانے کی پوری کوشش کی۔ ان کو غیرت دلائی کہ یہ سخت ظلم ہے کہ ان کو ایک ایسے شخص کے حبالۂ عقد میں دے دیا گیا ہے جو ابھی کل تک ایک زرخرید غلام تھا۔ آخر حضرت زینبؓ بشر ہی تھیں، کوئی فرشتہ نہیں تھیں، اس وجہ سے ان کے دل پر بھی ان باتوں کا اثر پڑا ہوگا۔

حضرت زیدؓ ایک حساس، خوددار، منکسر المزاج آدمی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام دلداریوں کے باوجود اپنی غلامی کے دور کو بھولے نہیں تھے۔ دوسری طرف سیدہ زینبؓ کے مزاج میں فی الجملہ تمکنت اور تیزی تھی۔ عام حالات میں تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو خوش گوار معاشرت میں خلل انداز ہو لیکن منافقین نے چونکہ فضا بدگمانی کی بنا دی تھی اس وجہ سے حضرت زیدؓ کو یہ احساس ہونے لگا کہ حضرت زینبؓ اپنے اندر ایک تفوق کا احساس رکھتی اور اس تعلق کو ناپسند کرتی ہیں۔ بالآخر انھوں نے ارادہ کیا کہ حضرت زینبؓ کو طلاق دے دیں کہ ان کی کبیدگی بھی رفع ہو جائے اور خود ان کے سر کا بوجھ بھی اتر جائے۔ لیکن کوئی اقدام کرنے سے پہلے انھوں نے چاہا کہ حضورؐ کا ایماء بھی معلوم کر لیں اس لیے کہ حضورؐ ہی نے یہ رشتہ کرایا تھا۔ جب حضورؐ سے انھوں نے اپنے ارادہ کا ذکر کیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا ان کی طرف سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی ہے جو تمہیں شک میں ڈالنے والی ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ایسی کوئی بات ہرگز نہیں ہے لیکن وہ اپنے خاندانی شرف کا احساس رکھتی اور اس کا اظہار بھی کرتی ہیں اور یہ چیز میرے لیے باعثِ اذیت ہے۔ حضورؐ نے اس پر سختی سے ان کو ارادۂ طلاق سے روکا اور خوفِ خدا یاد دلایا۔ اس لیے کہ مجرد اپنا ایک ذاتی احساس اس بات کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ بیوی کو طلاق دے دی جائے۔

حضرت زیدؓ کا یہ ارادہ مختلف وجوہ سے حضورؐ کے لیے پریشانی کا باعث ہوا۔

اوّل تو اس وجہ سے کہ حضورؐ ہی نے، جیسا کہ اوپر گزرا، ایک نہایت اعلیٰ مقصد سے یہ رشتہ کرایا تھا۔ قدرتی طور پر آپ کی آرزو یہی تھی کہ منافقین و منافقات کی ریشہ دوانیوں کے علی الرغم فریقین خوشگواری کے ساتھ نباہ کرتے رہیں اور یہ رشتہ کامیاب ہو۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اس طلاق سے حضرت زینبؓ کی حیثیت عرفی کو بڑا نقصان پہنچتا اور ان کا غم دُہرا ہو جاتا۔ پہلے تو انھوں نے منافقین و منافقات کے یہ طعنے سنے کہ ایک آزاد کردہ غلام کی بیوی ہیں اور اس طلاق کے بعد لوگ یہ طعنہ دیتے کہ ایک آزاد کردہ غلام کی مطلقہ ہیں۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ حضورؐ اس سارے واقعہ کی ذمہ داری اپنے اوپر سمجھتے تھے اس وجہ سے حضرت زینبؓ کی دلداری ضروری خیال فرماتے تھے۔ آپ کے دل میں یہ خیال تھا کہ اگر زیدؓ نے طلاق دے دی تو زینبؓ کی دلداری کی واحد شکل یہ باقی رہ جائے گی کہ حضورؐ ان کو خود اپنے نکاح میں لے لیں لیکن اس صورت میں اس

سے بھی بڑے ایک دوسرے نقلنے کے اندیشہ ہونے کا اندیشہ تھا کہ لوگ کہیں گے کہ آپؐ نے اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کر لیا۔ علاوہ ازیں اس میں یہ مشکل بھی تھی کہ عام مسلمانوں کے لیے ازواج کے باب میں چار تک کی تحدید کا حکم نازل ہو چکا تھا اور اس وقت حضورؐ کے نکاح میں چار بیویاں تھیں۔

ان مختلف وجوہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش یہی تھی کہ حضرت زیدؓ طلاق نہ دیں چنانچہ آپ برابر ان کو اس ارادہ سے روکتے رہے لیکن حضرت زیدؓ حالات کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ سارا ہنگامہ ان کے اس نکاح کے سبب سے اٹھا ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ وہ طلاق دے دیں تاکہ حضرت زینبؓ کی جان بھی ضیق سے چھوٹے اور ان کو بھی اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملے۔ چنانچہ انھوں نے طلاق دے دی۔ حضرت زینبؓ کو اس طلاق سے صدمہ ہوا۔ روایات میں آتا ہے کہ ان کو جب اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا۔

جب بات یہاں تک پہنچ گئی تو، جیسا کہ اوپر گزرا، حضورؐ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کر لینا چاہا لیکن منہ بولے بیٹے کے معاملے میں جاہلیت کی جو رسم تھی اس کے سبب سے اور تحدید نکاح کے سبب سے بھی آپ متردد رہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ہدایت ہوئی کہ لوگوں کی مخالفت سے بے پروا ہو کر آپؐ یہ نکاح کر لیں تاکہ آپ کے عمل سے ایک غلط رسم کی اصلاح ہو جائے اور دین فطرت کے اندر ایک خلاف فطرت چیز جو گھسی ہوئی ہے اس کا خاتمہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کے بموجب آپؐ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیا۔

یہ اصل واقعہ ہے جو میں نے تمام روایات کی تحقیق کے بعد آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس طول بیان کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ مستشرقین نے اس واقعہ کو اپنی رنگ آمیزیوں سے نہایت مکروہ بنا دیا ہے اور صدمہ کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اس رنگ آمیزی کے لیے سارا مواد ہماری تفسیر و سیرت کی کتابوں ہی سے لیا ہے ـــــ اب اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۶-۴۸

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾ وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ
حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ
اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿٣٧﴾ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ۭ
سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا
مَّقْدُوْرَا ﴿٣٨﴾ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ
اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿٣٩﴾ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ
مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ
ع ٥ ٢٠ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿٤٠﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿٤١﴾
وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿٤٢﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰۗئِكَتُهٗ
لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿٤٣﴾
تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ښ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿٤٤﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ
اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٤٥﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ
وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿٤٦﴾ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا
كَبِيْرًا ﴿٤٧﴾ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ
عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٤٨﴾

ترجمۂ آیات ٣٦-٤٨

کسی مومن یا مومنہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اس میں کوئی اختیار باقی رہ جائے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔ ٣٦

اور جب کہ تم اس سے، جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور تم نے بھی انعام کیا، یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو، اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا، اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے، حالانکہ اللہ زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو۔ پس جب زید نے اس سے اپنا رشتہ کاٹ لیا تو ہم نے اس کو تم سے بیاہ دیا کہ مومنوں کے لیے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں، جب کہ وہ ان سے اپنا تعلق بالکل کاٹ لیں، کوئی تنگی باقی نہ رہے۔ اور خدا کا فیصلہ شدنی تھا ۔ ۳۷

اور نبی کے لیے اللہ نے جو کچھ فرض کیا اس میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ یہی اللہ کی سنت رہی ہے ان لوگوں کے معاملے میں بھی جو پہلے گزرے ہیں۔ اور اللہ کے فیصلہ کے لیے ایک وقت مقرر تھا۔ وہ اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے تھے اور اسی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ اور اللہ حساب کے لیے کافی ہے۔ ۳۸-۳۹

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ ۴۰

اے ایمان والو! تم اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو اور اس کی تسبیح کرو صبح اور شام۔ وہی ہے جو تم پر اپنی رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے اور وہ مومنوں پر نہایت مہربان ہے۔ ان کی تحیت، جس دن وہ اس سے ملیں گے، سلام ہوگی اور اس نے ان کے لیے باعزت صلہ تیار کر رکھا ہے۔ ۴۱-۴۴

اے نبی! ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوش خبری پہنچانے والا اور آگاہ کرنے والا

بنا کر بھیجا ہے۔ اور اللہ کی طرف، اس کے اذن سے، دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر۔ اور مومنوں کو بشارت دو کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑا فضل ہے اور کافروں اور منافقوں کی بات کا دھیان نہ کرو اور ان کی ایذا رسانیوں کو نظر انداز کرو، اور اللہ پر بھروسہ رکھو، اور اللہ اعتماد کے لیے کافی ہے۔ ۴۵-۴۸

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا (۳۶)

ایک تمہید بطور ایک کلیہ

یہ آگے آنے والے واقعہ کی تمہید ہے اور اس میں جو بات فرمائی گئی ہے اس کا تعلق خاص حضرت زیدؓ و حضرت زینبؓ سے نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت ایک کلیہ کی ہے۔ اوپر آیت ۶ میں فرمایا ہے کہ 'اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ' (نبی کا حق مومنوں پر خود ان کے اپنے مقابل میں زیادہ ہے) اسی کی روشنی میں یہ قطعی اصول بیان فرما دیا کہ جب اللہ اور رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو اس میں کسی مومن یا مومنہ کے لیے کسی چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اللہ کا رسول جو فیصلہ بھی کرتا ہے وہ اللہ کے اذن سے کرتا ہے اس وجہ سے اس کی حیثیت مطاع مطلق کی ہوتی ہے، پھر کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اس پر معترض ہو یا اس کی خلاف ورزی کرے۔ جو اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ یہ حکم اس صورت سے متعلق ہے جب یہ واضح طور پر معلوم ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی ہے اس کی نوعیت ایک قطعی فیصلہ کی ہے ورنہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ آپؐ نے کوئی بات بطور تجویز یا مشورہ کے پیش کی ہے اور صحابہؓ کو معلوم ہوا ہے کہ یہ بات وحی پر مبنی نہیں ہے بلکہ حضورؐ کی رائے یا تجویز ہے تو صحابہؓ نے اس کے مقابل میں اپنی تجویزیں بھی پیش کی ہیں اور حضورؐ نے بعض اوقات ان کی تجویز مان بھی لی ہے۔

حضرت زیدؓ یا حضرت زینبؓ نے حضورؐ کے کسی فیصلہ کی مخالفت نہیں کی

حضرت زیدؓ و حضرت زینبؓ کے واقعہ کی جو تفصیل ہم نے اوپر پیش کی ہے اس سے یہ امر واضح ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی حضورؐ کے کسی فیصلہ کی مخالفت نہیں کی۔ حضرت زینبؓ کو جب حضورؐ نے حضرت زیدؓ کے لیے پیغام دیا تو ان کو معلوم تھا کہ یہ کوئی حکم نہیں بلکہ ایک پیغام ہے جس میں وہ اپنی پسند یا ناپسند کے اظہار کے لیے آزاد ہیں۔ بعد میں جب ان کو معلوم ہوا کہ حضورؐ کی خواہش یہی ہے کہ یہ رشتہ ہو جائے تو انھوں

نے اس کو منظور فرمالیا۔ اسی سے ملتی جلتی صورت اس وقت پیش آئی جب حضرت زیدؓ کے طلاق کے بعد خود حضورؐ نے اپنے لیے حضرت زینبؓ کو پیغام دیا۔ انھوں نے اس کو بھی کوئی حکم یا فیصلہ نہیں سمجھا بلکہ ایک پیغام ہی تصور کیا اور فرمایا کہ میں اس معاملے میں اپنے رب سے استخارہ کیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کروں گی۔ چنانچہ استخارہ کے بعد ہی اس کو انھوں نے منظور کیا۔

اسی طرح حضرت زیدؓ نے بھی حضورؐ کے کسی حکم یا فیصلہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔ طلاق نہ دینے کے باب میں حضورؐ کے ارشاد کو انھوں نے محض ناصحانہ مشورہ پر محمول کیا اس کو کوئی فیصلہ نہیں سمجھا۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ اگرچہ حضورؐ کی خواہش یہی ہے کہ طلاق کی نوبت نہ آئے لیکن یہ فیصلہ بہرحال انہی کو کرنا ہے کہ وہ نباہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ جب ان کو محسوس ہوا کہ اب ان کے لیے اس رشتہ کو زیادہ دیر تک نباہنا ممکن نہیں رہا، انھوں نے طلاق دے دی۔

رسول کے کسی فیصلہ کی خلاف ورزی جائز نہیں

ہمارے نزدیک اس حکم کی نوعیت یہاں ایک عام کلیہ کی ہے جس کے بیان کے لیے وقت کے حالات وواقعات نے مناسب فضا پیدا کر دی تھی۔ اس سے یہ بات بالکل واضح طور پر سامنے آگئی کہ رسولؐ کے کسی حکم اور فیصلہ کی خلاف ورزی کسی مومن یا مومنہ کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ بات ایمان کے مقتضیات کے بالکل خلاف ہے اور جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ صریح ضلالت کا مرتکب ہوتا ہے۔

ایمان کا یہ مقتضیٰ ان منافقین و منافقات پر واضح کرنا ضروری تھا جن کا رویہ شروع سے اس سورہ میں زیر بحث ہے تاکہ وہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت پر مجتمع ہوں اور اگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں تو اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہیں۔

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ج وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ ط فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ط وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا (۳۷)

حضرت زیدؓ کی عزت افزائی

یہ اصل واقعہ کی طرف اجمالی اشارہ ہے۔ حضرت زیدؓ کا ذکر یہاں أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ کی صفت کے ساتھ ہوا ہے یعنی اللہ اور رسول دونوں کے انعام یافتہ اور منظورِ نظر۔ اس صفت کے ساتھ ذکر کرنے کی یہاں خاص وجہ ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ منافقین و منافقات نے حضرت زیدؓ کو غلامی کا طعنہ دے کر لوگوں کی نگاہوں میں ان کو گرانے کی پوری کوشش کی تاکہ پیشِ نظر مہم میں ان کو کامیابی حاصل ہو جائے۔ حضرت زیدؓ کو اس سے جو تکلیف پہنچی ہوگی وہ ظاہر ہے لیکن انھوں نے پورے صبر کے ساتھ یہ توہین برداشت کی۔ اس صبر کا صلہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دیا کہ ان کا ذکر اس صفت کے ساتھ کیا تاکہ جن لوگوں نے ان کی توہین کرنے کی کوشش کی ان پر واضح ہو جائے کہ جس کو انھوں نے حقیر ٹھہرایا اس پر

اللہ نے بھی انعام فرمایا ہے اور اس کے رسولؐ نے بھی۔ ظاہر ہے کہ جو اللہ و رسول کا انعام یافتہ ہے وہ کسی دوسرے کی عزت بخشی کا محتاج نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا انعام یوں تو ہر فرد پر ہے۔ بندہ جو کچھ بھی پاتا ہے خدا ہی سے پاتا ہے لیکن حضرت زیدؓ کے حالات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے ساتھ بالکل اس طرح کا معاملہ ہوا جس طرح کا معاملہ حضرت یوسفؑ کے ساتھ ہوا۔ یہ ایک غارت گری میں گرفتار ہوئے (غالباً ایک نصرانی کے غلام رہے) پھر غلام ہو کر بکے، بالآخر درجہ بدرجہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کارسازی سے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا جس کے بعد ان کے لیے دین و دنیا کی سعادتوں کے دروازے کھل گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انعام ان پر یہ ہوا کہ آپ کے فیضِ خدمت سے ان کو اسلام کی نعمت حاصل ہوئی۔ آپ نے ان کو محبت و اعتماد کا وہ مقام بخشا کہ لوگ ان کو حضورؐ کا منہ بولا بیٹا سمجھنے لگے۔ آپ نے ان کو غلامی سے آزادی بخشی۔ اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن سے شادی کر دی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ نے ان کو اپنے اہلِ بیت میں شامل کر لیا جس سے بڑا خاندانی شرف کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

حضورؐ نے حضرت زیدؓ کو طلاق سے بار بار روکا

'اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ' سے پہلے 'اِذْ تَقُوْلُ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضورؐ نے یہ بات حضرت زیدؓ سے بار بار فرمائی کہ اپنی بیوی کو اپنے نکاح میں باقی رکھو اور اللہ سے ڈرو، اگر یہ بات ایک ہی مرتبہ کہنے کی نوبت آئی ہوتی تو 'قُلْتَ' کافی تھا۔ 'تَقُوْلُ' کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت زیدؓ نے اپنے ارادے کا اظہار حضورؐ کے سامنے کئی بار کیا اور حضورؐ نے ہر بار ان کو اس سے روکا اور خدا کا خوف یاد دلایا۔

'وَاتَّقِ اللّٰهَ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضورؐ نے حضرت زیدؓ کے ارادۂ طلاق کو محض ان کے شدتِ احساس پر محمول فرمایا، کوئی معقول وجہ اس اقدام کے لیے آپ نے نہیں پائی۔ اوپر گزر چکا ہے کہ جب آپؐ نے ان سے یہ سوال فرمایا کہ کیا زینبؓ کی طرف سے کوئی ایسی بات تمھارے سامنے آئی ہے جو شک پیدا کرنے کا موجب ہوئی ہے؟ تو انھوں نے صاف کہا کہ اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کو اگر کوئی شکایت تھی تو خود ان کے الفاظ میں بس یہ تھی کہ 'تتعظم علی لشرفھا' (وہ میرے مقابل میں اپنے شرفِ خاندانی کے باعث تفوق کا احساس رکھتی ہیں) ظاہر ہے کہ مجرد یہ بات بیوی کو طلاق دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس میں حضرت زینبؓ کے رویہ سے زیادہ خود حضرت زیدؓ کے شدتِ احساس کو دخل ہو سکتا ہے بالخصوص اس فضا میں جو اس وقت منافقین و منافقات نے پیدا کر دی تھی۔ اس وجہ سے حضورؐ نے ان کو خوفِ خدا یاد دلایا کہ وہ اس معاملہ میں جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نہ اٹھائیں بلکہ اللہ سے ڈریں لیکن حضرت زیدؓ مخالفین کے اٹھائے ہوئے طوفان سے متاثر ہو گئے اور اس تاثر میں زیادہ دخل ان کی شرافت اور حضرت زینبؓ کے جذبات کے لحاظ کو تھا۔ انھوں

نے محسوس فرمایا کہ میرے سبب سے حضرت زینبؓ ہدفِ مطاعن بنی ہوئی ہیں، اس کا علاج یہی ہے کہ طلاق دے کر ان کو نکتہ چینوں کی زبان درازیوں سے نجات دلائی جائے۔

آنحضرت صلعم کے دل میں کیا خیال تھا؟

وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ج وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ یہ جملہ حالیہ کے محل میں ہے یعنی زیدؓ سے جب تم یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو طلاق نہ دو، اللہ سے ڈرو، تو اس وقت تم اپنے دل میں ایک بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ بہرحال ظاہر کرنے والا تھا۔

اس ٹکڑے کے تحت ہمارے غیر محتاط مفسرین نے فضول قسم کی جو روایات نقل کر دی ہیں ان سے تعرض کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بالکل بے اصل ہیں۔ ابنِ کثیرؒ کا تبصرہ ان پر بالکل صحیح ہے کہ احببنا ان نضرب عنها صفحا لعدم صحتها فلا نوردها (یہ روایات بے اصل ہیں اس وجہ سے ہم نے ان سے صرفِ نظر ہی پسند کیا اور ان کو نقل نہیں کر رہے ہیں) ہمارا قول بھی ان کے باب میں یہی ہے۔ تردید کے لیے بھی ان کو نقل کرنا ہم معصیت سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ابن جریرؒ کو معاف کرے، وہ روایات نقل کرنے کے معاملے میں نہایت ہی غیر محتاط ہیں۔

اصل واقعہ وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ نکاح چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی ایک دینی مصلحت کے تحت کرایا تھا اس وجہ سے آپ کی دلی آرزو یہی تھی کہ یہ کامیاب ہو۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت زیدؓ کو ارادۂ طلاق سے بتاکید روکنے کی کوشش کی۔ آپ کے دل میں یہ خیال تھا کہ اگر زیدؓ نے طلاق دے دی تو زینبؓ کو دہرا غم ہوگا کہ انھوں نے اس نکاح کی بدولت دشمنوں کے طعنے بھی سنے اور بالآخر ایک آزاد کردہ غلام کی مطلقہ بن کر اپنی حیثیت عرفی بھی ہمیشہ کے لیے گنوا بیٹھیں۔ ان کی دلداری اور اس نقصان کی تلافی کی واحد شکل پھر صرف یہ رہ جاتی تھی کہ حضورؐ خود ان کو اپنے نکاح میں لے لیں لیکن ایسا کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ منافقین اس کو ایک اور اس سے بھی بڑے فتنہ کا ذریعہ بنا لیتے اور لوگوں میں یہ پھیلاتے کہ آپؐ نے اپنے متبنّٰی کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے۔ آپ اس فتنہ سے بچنا چاہتے تھے اس وجہ سے آپ کی دلی آرزو یہی تھی کہ طلاق کی نوبت نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی تھا کہ یہ نوبت آئے تاکہ آپ کے ہاتھوں جاہلیت کی ایک غلط رسم کی اصلاح ہو اور انبیاء علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری جو ڈالی ہے کہ وہ دین کے معاملے میں کسی کی ملامت و مخالفت کی کوئی پروا نہ کریں، آپ اپنے عمل سے اس کا مظاہرہ کریں۔

اقامتِ دین کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ

وَتَخْشَى النَّاسَ ج وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ میں اسی اصولی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو پیچھے آیات ۱-۳ اور آیت ۷ میں بیان ہوئی ہے اور آگے آیات ۳۸-۳۹ میں مزید وضاحت آ رہی ہے۔ اقامتِ دین کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ لوگوں کا خوف یا مصالح کا لحاظ ہے اس وجہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ دین کے معاملے میں اپنے رب کے سوا ہر خوف

مصلحت سے بے پروا ہوں، چنانچہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے خود اپنے ہاتھوں اس راہ کے ہر تیر کو توڑا اور اس مقصد کی خاطر بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کیا اور یہی نمونہ اپنے بعد آنے والے ان لوگوں کے لیے انھوں نے چھوڑا جو ان کے طریقہ پر دین کی خدمت کے لیے اٹھیں۔

حضورؐ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نکاح کیا۔

'فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا الاية' یعنی جو بات تم اپنے دل میں رکھتے تھے لیکن لوگوں کی ملامت کے اندیشہ سے اس سے گریز کرنا چاہتے تھے بالآخر اللہ نے اس کے اظہار کا سامان کر دیا کہ جب زیدؓ نے اپنا تعلق زینبؓ سے بالکل منقطع کر لیا تو ہم نے اس کو تمھارے ساتھ بیاہ دیا تاکہ منہ بولے بیٹوں کے معاملے میں ایک خلافِ فطرت رسم جو قائم ہو گئی ہے اس کی اصلاح ہو اور کوئی ناروا قسم کی پابندی لوگوں پر اس معاملے میں باقی نہ رہے۔

'وطر' کے معنی ضرورت و حاجت کے ہیں۔ یہیں سے اس کے اندر تعلق اور وابستگی کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان کو جس چیز کی ضرورت ہو اس کے ساتھ لازماً وابستگی بھی ہوتی ہے۔ 'قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا' کے معنی ہوں گے 'زید نے اس سے اپنا تعلق بالکل منقطع کر لیا'۔ لفظ طلاق سے اس مضمون کو ادا کرنے کے بجائے اس اسلوب سے ادا کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ اس سے زمانۂ عدت کے گزرنے کی طرف بھی اشارہ ہو گیا جس کے گزر جانے کے بعد طلاق دینے والے کا ہر تعلق عورت سے منقطع ہو جاتا ہے۔

'زَوَّجْنٰكَهَا' کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کے اندیشہ سے اس نکاح کی ذمہ داری سے گریز کرنا چاہتے تھے لیکن ہم نے اپنے حکم سے یہ نکاح تمھارے ساتھ کرا دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ نے یہ نکاح اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت کیا۔ روایات میں آتا ہے کہ عدت گزرنے کے بعد حضورؐ نے حضرت زیدؓ ہی کے واسطہ سے حضرت زینبؓ کو پیغام دیا۔ انھوں نے استخارہ کے بعد اس کو منظور کیا۔ حضرت زینبؓ کے بھائی ابو احمد بن جحشؓ نے حضورؐ کے ساتھ ان کا نکاح پڑھایا اور حضورؐ نے چار سو درہم مہر مقرر فرمایا اور نہایت اہتمام کے ساتھ ولیمہ کیا ——— بعض لوگوں نے لفظ 'زَوَّجْنٰكَهَا' سے یہ سمجھا ہے کہ یہ نکاح آسمان ہی پر ہو گیا تھا، زمین پر اس کی رسم ادا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن ابن ہشام میں وہ ساری تفصیل موجود ہے جو اوپر ہم نے نقل کی ہے اس وجہ سے صحیح بات یہ ہے کہ یہ نکاح اللہ تعالیٰ کے حکم سے بالکل اسی معروف طریقہ کے مطابق ہوا جو اللہ اور رسولؐ نے نکاح کے لیے پسند فرمایا ہے۔

'وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا' یعنی اللہ تعالیٰ نے اس رسم جاہلی کی اصلاح کے لیے جو وقت اور جو طریقہ مقرر کر رکھا تھا جب وہ وقت آگیا تو اسی طریقہ کے مطابق اس کی اصلاح ہو گئی اور دشمنوں نے اس راہ میں جو اڑنگے ڈالے اور اس کے خلاف جو فتنے اٹھائے وہ اس خدائی اسکیم میں ذرا بھی خلل انداز نہ ہو سکے۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ

قَبْلُ ط وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۨ الَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ط وَكَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیْبًا (۳۸-۳۹)

حضرات انبیاء کے لیے سنت الٰہی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ آپ کی زندگی کے پروگرام میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے مراحل جو رکھے ہیں یہ کسی زحمت کے لیے نہیں رکھے ہیں اور نہ یہ تنہا آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں بلکہ سابق انبیاء کو بھی اس طرح کے مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو اس نے اپنی حکمت کے تحت مقرر فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرات انبیاء کو اس طرح کی مشکلات جو پیش آتی ہیں یہ ان کی تربیت اور امتحان کے لیے پیش آتی ہیں اور ٹھیک ٹھیک خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق پیش آتی ہیں۔ انہی امتحانوں سے ان کے اوصاف اجاگر ہوتے ہیں اور انہی سے ان کے پیرووں کا اخلاص یا کھوٹ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔

'فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ' کا مفہوم 'فَرَضَ اللّٰهُ عَلَیْهِ' سے مختلف ہے۔ 'فَرَضَ اللّٰهُ عَلَیْهِ' کا مفہوم تو یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے اس پر فرض کیا ہے اور 'فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ' کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے اس کے لیے مقسوم کیا ہے کہ اس کی زندگی میں یہ یہ احوال و مراحل پیش آئیں گے۔

'سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا' میں زبان کا جو اسلوب ہے اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس اسلوب کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی 'سَنَّ اللّٰهُ ذٰلِكَ سُنَّةً فِی الْاَنْبِیَآءِ' (یہ اللہ نے اپنے نبیوں کے لیے ایک سنت مقرر کر رکھی ہے)۔

زندگی میں کوئی چیز اتفاق سے نہیں پیش آتی

'وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا' یعنی اللہ نے اپنے فیصلے کے ظہور کے لیے ایک وقت پہلے سے مقرر فرما دیا تھا، جب وہ وقت آگیا تو اس کا حکم صادر ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی میں کوئی چیز بھی اتفاق سے پیش نہیں آجاتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق پیش آتی ہے اس وجہ سے کسی امر کو اتفاق پر محمول کر کے نہ اس سے پریشان ہونا چاہیے نہ اس کو نظر انداز کرنا چاہیے بلکہ اس کو خدا کی طرف سے سمجھنا اور اس طرح اس کا مواجہہ کرنا چاہیے جو ایمان کا تقاضا ہے۔

حضرات انبیاء کا فرض منصبی

'اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ' یہ 'اَلَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ' یعنی انبیائے سابقین کی صفت ہے کہ وہ اللہ کے پیغاموں کی تبلیغ کرتے رہے ہیں، اس معاملے میں اس کے سوا کسی اور کی پروا انھوں نے نہیں کی۔ مطلب یہ ہے کہ جو ذمہ داری اللہ نے اپنے سابق نبیوں پر ڈالی اور انھوں نے وہ بے خوف لومۃ لائم ادا کی وہی اس نے آپ پر بھی ڈالی ہے اور آپ کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے پیش روؤں کی طرح بے خوف لومۃ لائم اس کو ادا کریں۔

لفظ حسیب کی تفسیر

'وَكَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیْبًا' میں 'حَسِیْبًا' کی تفسیر ابن کثیر اور کشاف نے ناصر اور معین کی ہے یعنی اللہ تمام خطرات سے حفاظت کے لیے کافی ہے۔ اگر یہ تاویل قبول کر لی جائے تو نظم کلام بالکل واضح

ہے اور اگر 'حسیب' کے معنی حساب کرنے والے کے کیے جائیں، جیساکہ معروف ہے، تو یہ ٹکڑا تنبیہ کے مفہوم میں ہو گا کہ اگر اللہ کے پیغام کی تبلیغ میں دوسروں کے خوف یا لحاظ کے سبب سے ادنیٰ کوتاہی بھی ہوئی تو یاد رہے کہ اللہ محاسبہ کے لیے کافی ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (۴۰)

نبی صلعم کا اصل مقام اور اس کے تقاضے

یہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زیدؓ کا باپ قرار دے کر آپ کی مخالفت کے اٹھانے والے بنے تھے۔ فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النّبیّین ہیں۔ نبی و رسول کی حیثیت سے ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ انھوں نے ادا کی اور چونکہ یہ خاتم النّبیّین ہیں اس وجہ سے ضروری تھا کہ انہی کے ذریعے سے اس رسم بد کی اصلاح ہو جائے۔ اگر ان کے بعد کوئی اور نبی آنے والا ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ اس معاملے کو اللہ تعالیٰ آئندہ پر اٹھا رکھتا لیکن اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، انہی کے ہاتھوں دین کی تکمیل ہونی ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ چیز درست کی جائے گی جو بگڑی ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ان کے معاملات کو اپنے مفروضات کی روشنی میں نہ دیکھو بلکہ ان کے اصل منصب اور اس کی ذمہ داریوں کی روشنی میں دیکھو۔ اگر ان کے اصل منصب کو تم نے نہ پہچانا تو اسی طرح دوسری اور بہت سی باتوں پر بھی تمھیں اعتراض ہوں گے حالانکہ انھیں وہ سارے کام بے خوف لومۃ لائم کرنے ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہدایت ہو گی۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ یہ تمھاری طرف اللہ کے رسول ہیں۔ اگر تم نے ان کی تکذیب کر دی تو اس سنت الٰہی کی زد میں آنے سے نہیں بچ سکو گے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے مکذبین کے لیے مقرر کر رکھی ہے اور جو ہمیشہ ظہور میں آئی ہے۔

'مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ' میں دراصل نفی تو اسی غلط فہمی کی ہے جس میں وہ لوگ مبتلا تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زیدؓ کا باپ بنا رکھا تھا لیکن صرف اتنا ہی نہیں فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) زیدؓ کے باپ نہیں ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ فرمایا کہ تمھارے مردوں میں سے کسی کے بھی وہ باپ نہیں ہیں۔ اس سے بات زوردار بھی ہو گئی اور یہ بیانِ واقعہ بھی ہے اس لیے کہ حضورؐ کی اولادِ ذکور میں سب کی وفات نابالغی میں ہوئی، 'رجال' کی عمر کو ان میں سے کوئی نہیں پہنچا۔

نبی اور رسول کے درمیان نسبت

'وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ'۔ نبی اور رسول کے فرق پر وضاحت سے ہم اس کتاب میں جگہ جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ نبی اور رسول کے درمیان نسبت عام اور خاص کی ہے۔ ہر رسول نبی لازماً ہوتا ہے لیکن ہر نبی کا رسول ہونا لازمی نہیں ہے۔ اس وجہ سے اگر حضورؐ خاتم الانبیاء ہیں تو 'خاتم الرسل' بدرجۂ اولیٰ ہوئے۔ بعض گمراہ فرقوں نے یہ شوشہ جو نکالا ہے کہ

قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء بتایا گیا ہے، 'خاتم الرسل' نہیں کہا گیا ہے اس وجہ سے سلسلۂ رسالت کے اجراء کی نفی نہیں ہوئی، یہ محض ان کی جہالت ہے۔

'خاتَم' اور 'خاتِم' دونوں لفظ اہلِ لغت کے نزدیک بالکل ہم معنی ہیں۔ قوم کا آخری فرد، کسی شے کا انجام، خط کے آخر کی مہر، یہ سب چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔

'وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا'۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے سارا غوغا برپا کیا ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ ساری چیزوں سے ان سے زیادہ باخبر ہے۔ وہ زیدؓ کو بھی جانتا ہے، زینبؓ کو بھی جانتا ہے، اپنے پیغمبرؐ سے بھی واقف ہے اور زیدؓ و زینبؓ کے ساتھ ان کے رشتہ کی نوعیت سے بھی باخبر ہے۔ ان باتوں میں سے کسی سے بھی وہ بے علم نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا ہے سب اس کے اذن و ایماء سے ہوا ہے اس وجہ سے اس کے خلاف ہنگامہ برپا کرنا جہالت و حماقت ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت پر بھروسہ کیا جائے اور جو اصلاح عمل میں آئی ہے اس کی قدر کی جائے۔ خدا کا محیطِ کل علم ہی ہر چیز کی باریکیوں اور حکمتوں کو سمجھ سکتا ہے، دوسرے اس کی ساری حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۙ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (۴۱-۴۲)

مسلمانوں کو ثابت قدمی کی تاکید

یہ مسلمانوں کو منافقین و مفسدین کی اس محاذ آرائی کے مقابل میں ثابت قدم رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے اور اس کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ ان اشرار کے غوغا سے بے پروا ہو کر تم زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔ یہ امر واضح رہے کہ شیطان اور اس کی ذریات کے مقابل میں مومن کی اصلی سپر اللہ تعالیٰ کی یاد ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں معاندین کے مقابل میں ثابت قدمی کی تلقین کی گئی ہے وہاں نماز کی خاص طور پر تاکید کی گئی ہے۔ صبر اور نماز کے باہمی تعلق پر اس کتاب میں جگہ جگہ ہم بحث کرتے آ رہے ہیں۔ (مثلاً دیکھیے سورۂ بقرہ۔ آیت ۴۵ کی تفسیر)۔

'وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا' میں 'تسبیح' نماز کی تعبیر ہے۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ 'ذکر' تو سانس کی طرح ہر وقت مطلوب ہے لیکن نمازوں کے لیے اللہ اور رسول نے اوقات مقرر فرما دیے ہیں جن کی جامع تعبیر صبح اور شام ہے۔ اس صبح و شام کے نقشہ کے اندر تمام نمازوں کے اوقات منضبط کر دیے گئے ہیں جس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ (دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۸، سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۱۳۰)۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (۴۳)

ذکرِ الٰہی کی برکت

یہ اللہ تعالیٰ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرنے کی برکت بیان ہوئی ہے کہ وہ اپنے باایمان بندوں پر

اپنی رحمت نازل فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ بھی برابر اہلِ ایمان پر رحمت کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔ ’لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ‘ یہ اس رحمت کی برکت بیان ہوئی ہے کہ یہ اسی کا فیض ہے کہ وہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ یہاں تاریکی سے مراد ظاہر ہے کہ عقائد و اعمال کی تاریکی اور روشنی سے مراد ہدایت و شریعت کی روشنی ہے۔ ’وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا‘ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ وہ اپنے باایمان بندوں پر نہایت مہربان ہے۔

’يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ‘ میں لفظ ’يُصَلِّيْ‘ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت سے رحمت کرنے کے مفہوم میں ہوگا اور ملائکہ کی طرف نسبت سے رحمت کی دعا کے مفہوم میں۔ نسبت کے بدل جانے سے الفاظ کے معانی میں تبدیلی کی مثالیں قرآن اور کلامِ عرب میں بہت ہیں۔ یہی لفظ اسی سورہ میں دو مختلف مفہوموں میں استعمال ہوا ہے۔ ’اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ‘ (بے شک اللہ اپنے نبی پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں تو اے اہلِ ایمان تم بھی اس پر درود بھیجو) آیت کے آخر میں ’وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا‘ بھی اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں یہ لفظ ’يُصَلِّيْ‘ اللہ تعالیٰ کے لیے رحمت نازل کرنے ہی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

اہلِ ایمان کے لیے فرشتوں کا استغفار

اہلِ ایمان کے لیے فرشتوں کے استغفار کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ بھی آیا ہے۔ مثلاً،

الَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (المؤمن: ۷)

وہ جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے اردگرد ہیں اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اہلِ ایمان کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کو وسیع ہے، تو ان لوگوں کی مغفرت فرما جنھوں نے توبہ اور تیرے راستہ کی پیروی کی اور ان کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

اسی طرح سورۂ شوریٰ میں بھی ہے

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ (الشوریٰ: ۵)

اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور جو زمین میں ہیں ان کے لیے وہ استغفار کرتے ہیں۔

اہلِ ایمان کے لیے آخرت میں اللہ تعالیٰ کا سلام و پیام

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا (۴۴)

اوپر کی آیت میں اس رحمت و برکت کا ذکر ہے جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے باایمان بندوں پر نازل ہوتی ہے۔ اس آیت میں اس سلام و پیام کا ذکر ہے جو آخرت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی طرف سے باایمان بندوں کے پاس آئے گا۔

فرمایا کہ ان کا خیر مقدم، جس دن وہ اس سے (اپنے رب سے) ملیں گے، سلام سے ہوگا اور اللہ نے ان کے لیے نہایت باعزت صلہ تیار کر رکھا ہے۔

لفظ 'تَحِیَّۃ' یہاں اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے اور اس کا صحیح مفہوم خیر مقدم ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی اس بات کا ذکر ہے کہ اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی سلام آئے گا اور فرشتے بھی ان کا خیر مقدم سلام کے ساتھ کریں گے۔

سورۂ فرقان میں ہے:

وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا (۷۵)	اور اس میں ان کا استقبال تحیت اور سلام کے ساتھ ہوگا۔

سورۂ یٰسٓ آیت ۵۸ میں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان لوگوں کو سلام کہلایا جائے گا:

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ ٥	اور ان کے لیے سلام ہوگا جو رب رحیم کی طرف سے ان کو کہلایا جائے گا۔

سورۂ زمر آیت ۷۳ میں یہ تصریح ہے کہ جنت کے دربان ملائکہ اہل جنت کا استقبال سلام سے کریں گے:

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خٰلِدِينَ ٥	اور ان سے جنت کے پاسبان کہیں گے، آپ لوگوں پر سلامتی ہو، خوش ہوں، اس جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جائیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (۴۵-۴۶)

نبی صلعم کا فریضۂ منصبی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپ کا منصب بتایا گیا ہے اور اس منصب کے ساتھ جو ذمہ داریاں وابستہ ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے تاکہ حضورؐ پر بھی یہ واضح ہو جائے کہ آپ کو کیا کام کرنے ہیں اور کس طرح کرنے ہیں اور دوسروں پر بھی آپ کی شخصیت کی اصلی نوعیت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ موافقین و مخالفین دونوں اس روشنی میں اپنے اپنے رویے کا جائزہ لے سکیں۔ فرمایا کہ اے نبی! ہم نے تم کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ 'شاھد' سے مراد ہے اللہ کے دین اور اس کے احکام و مرضیات کی گواہی دینے والا۔ رسول کی بعثت کا اصلی مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے لوگوں کو یہ بتائے کہ اللہ نے کن باتوں کا حکم دیا ہے، کن باتوں سے روکا ہے۔

'مُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا' سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے پیغام کو قبول کر لیں ان کو آپ ابدی فوز و فلاح کی خوش خبری دیں اور جو لوگ اس سے اعراض یا اس کی تکذیب کریں ان کو اس کے نتائج سے آگاہ

کردیں۔ اس انذار و تبشیر کے بعد اس شہادت سے متعلق آپ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اس امر کی آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگوں نے آپ کی دعوت قبول کی یا رد کی اور اگر قبول کی تو یکسوئی کے ساتھ قبول کی یا تذبذب کے ساتھ قبول کی۔ ان تمام امور کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔

'وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ' یہ اسی مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ تم کو اللہ نے اپنے حکم سے اپنی طرف لوگوں کو بلانے کے لیے مامور فرمایا ہے کہ لوگ شیطان اور اس کی ذریات کی پیروی چھوڑ کر اپنے رب کی طرف آئیں۔ اس کے ساتھ 'بِإِذْنِهِ' کی قید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور اطمینان دہانی کے لیے ہے کہ دعوت الی اللہ کی اس مہم پر خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو مامور فرمایا ہے اس وجہ سے وہ آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا بلکہ ہر قدم پر آپ کی مدد و رہنمائی فرمائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کوئی خود ساختہ نبی تو نہیں ہیں کہ اللہ آپ کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے بلکہ یہ ذمہ داری آپ پر اللہ نے ڈالی ہے تو وہ اس کے اٹھانے میں بھی آپ کی مدد فرمائے گا اور آپ مخالفوں کی تمام مخالفانہ سرگرمیوں کے علی الرغم اپنے مشن میں کامیاب ہوں گے۔

'وَسِرَاجًا مُّنِيرًا' یعنی اللہ نے آپ کو ایک روشن چراغ بنایا جو خود بھی علم و حکمت کے نور سے منور ہے اور لوگوں کو بھی تاریکیوں سے نکال کر اللہ کی صراط مستقیم کی طرف لانے کے لیے رہنمائی کر رہا ہے۔ اگر لوگ اس سراجِ منیر کی قدر نہیں کریں گے تو آپ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ خود اپنی ہی تباہی کا سامان کریں گے، اس دنیا میں گمراہیوں میں بھٹکتے رہیں گے اور آخرت میں جہنم کے ایندھن بنیں گے۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا (۴۷)

یہ آپ کے 'بشیر' ہونے کا پہلو واضح فرمایا کہ جو لوگ آپ کی دعوت پر ایمان لائیں ان کو خوش خبری دے دیجیے کہ وہ مخالفوں کی مخالفت اور حالات کی نامساعدت سے ہراساں نہ ہوں۔ ان پر اللہ کی طرف سے ایک عظیم فضل ہونے والا ہے اگر وہ اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔

وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا (۴۸)

یہ آپ کے 'نذیر' ہونے کے پہلو کی وضاحت ہے لیکن مخالفوں کو مخاطب کر کے ان کو کچھ کہنے یا کہلانے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو مخاطب کر کے بتا دیا کہ اس کو ان مخالفوں کے ساتھ آئندہ کے لیے کیا رویہ اختیار کرنا ہے۔ اس رویہ ہی کے اندر وہ انذار مضمر ہے جو پتہ دے رہا ہے کہ مستقبل قریب میں آپ کے یہ مخالفین کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ فرمایا کہ ان کافروں اور منافقوں کی باتوں کا ذرا دھیان نہ کرو، ان کی ایذا رسانیوں کو نظر انداز کرو، اللہ پر بھروسہ رکھو، اللہ اعتماد کے لیے کافی ہے۔ اس آیت کے اندر حضورؐ کے لیے جو تسلی ہے وہ بھی لفظ لفظ سے نمایاں ہے اور مخالفوں کے لیے جو قہر و غضب ہے وہ بھی حرف حرف سے ابلا پڑ رہا ہے۔

'وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ' میں لفظ 'اطاعت' کسی کی بات کا دھیان کرنے، اس کو اہمیت دینے اور اس

کی پروا کرنے کے مفہوم میں یہاں استعمال ہوا ہے۔ اس معنی میں اس لفظ کا استعمال معروف ہے۔ ہم اس کے محل میں اس مفہوم کی تائید میں شواہد نقل کر آئے ہیں۔

'وَدَعْ اَذٰىهُمْ' میں 'اَذٰی' سے اشارہ منافقین کی اس طرح کی ایذا رسانیوں کی طرف ہے جن کا مظاہرہ انھوں نے حضرت زینبؓ کے معاملہ میں کیا اور اس سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے معاملے میں کر چکے تھے۔ آگے اسی سورہ میں ان کی مزید ایذا رسانیوں کا ذکر آ رہا ہے۔ لفظ 'دَعْ' یہاں تحقیر کے مفہوم پر دلیل ہے یعنی ان کی ان خرافات کو چنداں نظر انداز کرو۔

'وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا' کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جتنی بڑی تسلی ہے اس سے بڑی کفار و منافقین کے لیے دھمکی ہے کہ اب تم ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو، اللہ ان سے نمٹنے کے لیے کافی ہے!

۸۔ مسئلہ ختم نبوت

اس مجموعۂ آیات کی تمام ضروری تعلیمات کی وضاحت آیات کے تحت ہو چکی ہے البتہ آیت ۴۰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا جو ذکر آیا ہے اس کے بعض پہلو مزید وضاحت کے طالب ہیں۔ ہم یہاں بالاختصار ان کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل توجہ چیز یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اور ان کی تعلیمات و ارشادات کا جو ریکارڈ قدیم صحیفوں اور قرآن مجید میں یا تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے، اس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا مسیحؑ تک کسی نبی کے متعلق نہ تو اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ خاتم الانبیاء ہے نہ کسی نبی نے خود اپنے خاتم الانبیاء ہونے کا دعویٰ کیا ہے، بلکہ اس کے برعکس ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی یا نبیوں کی بشارت دی ہے۔ حضرت آدمؑ اور ان کی ذرّیت کی خلافت پر فرشتوں کو جو اعتراض تھا، بقرہ کی تفسیر میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ان کے اعتراض کے جواب میں حضرت آدمؑ نے اپنی ذرّیت میں پیدا ہونے والے انبیاء کے نام ہی گنا کر ان کو قائل کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے انبیاء کے حالات زیادہ تفصیل سے تو کہیں مذکور نہیں ہیں لیکن آپ کے اور آپ کے بعد آنے والے انبیاء کے حالات تورات میں بھی موجود ہیں اور قرآن میں بھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذرّیت کے دونوں سلسلوں ـــــ بنی اسحاق اور بنی اسماعیل ـــــ میں انبیاء کی بعثت کے لیے جو دعا کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس دعا کی قبولیت کی جو بشارت دی ہے وہ قرآن میں بھی مذکور ہے اور تورات و تالمود میں بھی۔ ان کے حوالے ہم اس کتاب میں، ان کے محل میں، نقل کر آئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد بنی اسرائیل میں نبوت کا جو سلسلہ جاری ہوا اس کی تفصیلات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں یہ روایت رہی

ہے کہ ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی نہ صرف بشارت دی ہے بلکہ اکثر حالات میں خود اس کو، اسرائیلی روایت کے مطابق مسح کر کے نبی کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے۔ اسرائیلی سلسلہ کے سب سے زیادہ جلیل القدر نبی سیدنا موسیٰؑ ہیں۔ ان کی پیشین گوئیاں تورات میں بھی موجود ہیں اور قرآن نے بھی ان کی طرف اشارے کیے ہیں۔ انھوں نے حضرت خاتم النبیینؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بھی پیشین گوئی کی ہے جس کا حوالہ ہم سورۂ اعراف آیت ۱۵۷ کی تفسیر میں دے چکے ہیں۔ بنی اسرائیل کے دورِ آخر کے انبیاء میں سے حضرت یحییٰؑ ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا مشن ہی یہ بتایا کہ "میں اپنے بعد آنے والے کی راہ صاف کرنے آیا ہوں۔" ان کا یہ اشارہ سیدنا مسیحؑ کی طرف تھا۔ ان کی زندگی ہی میں جب حضرت مسیحؑ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو حضرت یحییٰ علیہ السلام اس وقت جیل میں تھے۔ انھوں نے وہیں سے حضرت مسیح علیہ السلام سے پچھوایا کہ "وہ جس کا انتظار تھا تو ہی ہے یا ہم کسی اور کا انتظار کریں؟" حضرت مسیحؑ نے جواب دلایا کہ "جا کے بتا دو کہ لنگڑے چل رہے ہیں اور اندھے دیکھ رہے ہیں، اب اور کیا چاہیے!" اس جواب کے بعد حضرت یحییٰؑ کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا مشن پورا ہو گیا، وہ جس کی راہ صاف کرنے آئے تھے وہ آ گیا۔ حضرت یحییٰؑ کے بعد اسرائیلی سلسلے کے آخری نبی و رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، انھوں نے اپنے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت دی اور آپ کے نام نامی کی تصریح کے ساتھ بشارت دی۔ سورۂ صف میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (الصف: ۶)	اور جب کہ عیسیٰ بن مریم نے دعوت دی کہ اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں ان پیشین گوئیوں کے مطابق جو مجھ سے پہلے سے تورات میں موجود ہیں اور ایک رسول کی خوشخبری دیتا ہوا آیا ہوں جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہو گا۔

انجیلوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو پیشین گوئیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق موجود ہیں ان کے حوالے سورۂ اعراف آیت ۱۵۷ کی تفسیر میں گزر چکے ہیں۔ استاذ امام مولانا فراہیؒ کا خیال تو یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے انجیلوں میں آسمانی بادشاہت کی جو بشارت دی ہے اور اس سے متعلق جو تمثیلیں بیان فرمائی ہیں وہ بھی تمام تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور اس کی خصوصیات ہی پر منطبق ہوتی ہیں۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کی روایت یہی رہی ہے کہ ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دی ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر یہ روایت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ نہایت واضح الفاظ میں خود اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو خاتم النبیین قرار دیا اور حضورؐ نے بھی نہ صرف یہ کہ

اپنے بعد کسی آنے والے کی بشارت نہیں دی بلکہ نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں بار بار اس حقیقت کا اظہار واعلان فرمایا کہ آپ آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ ہر معقول آدمی سمجھ سکتا ہے کہ حضورؐ کے بعد اگر کسی نبی کے آنے کی ادنیٰ گنجائش بھی ہوتی تو سابق انبیاء کی روایت کے مطابق حضورؐ اس کی پیشین گوئی فرماتے اور اگر پیشین گوئی نہ فرماتے تو کم از کم اس شدت کے ساتھ اس دروازے کو بند تو نہ کر دیتے کہ جو اس کو کھولنے کی جسارت کرے وہ لعنت زدہ کہلائے۔

۲- اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات منقول ہیں ان سب کے نقل کرنے میں طوالت ہوگی۔ ہم صرف بعض حدیثوں کا حوالہ دیں گے جن کی شہرت حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔ بخاری میں روایت ہے:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان مثلی	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اور مجھ سے پہلے
ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل	گزرے ہوئے انبیاء کی تمثیل یوں ہے کہ ایک شخص
بنیٰ بیتا فاحسنه واجمله الا موضع لبنة	نے ایک عمارت بنائی، نہایت حسین وجمیل، لیکن اس
من زاویة فجعل الناس یطوفون به	کے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی۔
ویعجبون له ویقولون هلا وضعت	لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی تحسین کرتے
هذه اللبنة فانا تلك اللبنة وانا	اور کہتے کہ یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی گئی! سو میں
خاتم النبیین (بخاری)	وہی اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔

اس حدیث کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کم وبیش انہی الفاظ میں حضرت مسیحؑ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔ ان کا ارشاد ہے کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا بالآخر وہی گھر کا آخری پتھر بنا۔ علمائے یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں پر جن جن طریقوں سے پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے ان کی تفصیلات سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہیں لیکن ان کی ان تمام کوششوں کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے لیے جو مقام مقدر فرمایا تھا وہ آپ کو حاصل ہو کے رہا۔ آپ قصر شریعت کے کونے کی آخری اینٹ بھی بنے اور انبیاء ورسل کے مبارک سلسلے کے خاتم بھی۔

یہ ختم نبوت اس تکمیل دین کا لازمی اور بدیہی تقاضا ہے جس کا ذکر اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ والی آیت میں ہوا ہے۔ اگر دین کوئی ایسی چیز ہوتا جس کی تکمیل کبھی ہونے والی ہی نہ ہوتی تب تو بے شک نبوت ورسالت کا سلسلہ بھی جاری رہتا لیکن جب دین کی تکمیل ہو چکی ہے، اور اس بدیہی حقیقت کے انکار کی جرأت کوئی بھی نہیں کر سکتا تو پھر اس کے اس لازمی نتیجہ کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبوت ورسالت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اسی حقیقت کو حضورؐ نے اس حدیث میں واضح فرمایا ہے اور اتنے مختلف طریقوں سے واضح فرمایا ہے کہ کسی معقول آدمی کے لیے اس میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

ترمذی میں روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا۔ اب میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا اور نہ کوئی نبی۔

جس مشہور حدیث میں آپ نے تمام انبیاء کے مقابل میں اپنے چھ فضائل گنائے ہیں آخری فضیلت ان میں یہ مذکور ہوئی ہے کہ ختم بی النبیون (مجھ پر انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا)۔

اسی طرح ایک روایت میں آپ نے اپنے مختلف اسماء کا ذکر فرمایا ہے جن میں آخری نام آپ نے 'عاقب' بتایا ہے اور اس کی خود ہی یہ شرح فرمائی کہ 'الذی لیس بعدہ نبی' (جس کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا)۔

۲- یہ امر بھی واضح رہے کہ نبوت کی بہت سی قسمیں نہیں ہیں۔ نبوت کی صرف ایک ہی قسم ہے جو اپنے تمام شرائط و خصوصیات کے ساتھ قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ البتہ نبی اور رسول میں ایک فرق ہے جس کی طرف ہم اوپر بھی اشارہ کر چکے ہیں اور اس کتاب کے دوسرے مقامات میں بھی پوری تفصیل سے اس کی وضاحت ہوئی ہے۔ بعض گمراہ فرقوں نے نبوت کے حرم میں نقب لگانے کے لیے اپنے جی سے نبوت کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں جس نبوت کے ختم ہونے کا ذکر ہے وہ الگ چیز ہے اور جس نبوت کے مدعی وہ ہیں وہ دوسری چیز ہے۔ نبوت کی یہ تقسیم ان کی طبع زاد ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ذکر تو درکنار اس کا کوئی ادنیٰ اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔ اس تقسیم سے انھوں نے بظاہر اپنے کفر کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ درحقیقت 'زیادۃٌ فی الکفر' ہے یعنی اپنے کفر کو انھوں نے اور زیادہ غلیظ بنا دیا ہے۔ اس لیے کہ اس تقسیم نے نبوت کے اس نظام ہی کو بالکل تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے جس پر سارے دین کی عمارت قائم ہے لیکن ہمارے لیے یہاں اس مسئلہ سے تعرض کرنے کی گنجائش نہیں ہے بس اتنی بات یاد رکھیے کہ حضورؐ نے جس صراحت کے ساتھ اپنے بعد نبوت کے ختم ہونے کا اعلان فرمایا ہے، اسی وضاحت کے ساتھ اس سوال کو بھی صاف کر دیا ہے کہ آپ کے بعد نبوت کا کوئی جزو باقی رہے گا یا نہیں؟ اور اگر باقی رہے گا تو اس کی نوعیت کیا ہوگی اور اس میں حصہ پانے والے کون لوگ ہوں گے۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی قال فشق ذلك على الناس فقال ولكن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد رسالت و نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب نہ کوئی رسول آئے گا اور نہ کوئی نبی۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ بات لوگوں کے دلوں پر شاق گزری تو حضورؐ نے فرمایا کہ 'مبشرات' باقی

المبشرات قالوا یارسول اللہ وما المبشرات؟ قال رویا الرجل المسلم ھی جزء من اجزاء النبوۃ۔

رہیں گی۔ لوگوں نے سوال کیا کہ یہ مبشرات کیا ہیں یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا کہ کسی مسلم مرد کے خواب اور یہ چیز نبوت کے اجزا میں سے ایک جزو ہے۔

بعض روایات میں 'مبشرات' کی وضاحت "الرؤیا الحسنۃ" اچھے خواب یا "الرؤیا الصالحۃ" نیک خواب سے بھی وارد ہوئی ہے۔

اس حدیث سے چند باتیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں۔

ایک یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی کا سلسلہ بالکل بند ہو گیا۔ اب نبوت کے اجزا میں سے صرف ایک جزو رویائے صالحہ کا باقی رہ گیا ہے۔ جو لوگ الہام اور کشف و مخاطبہ وغیرہ کے مدعی ہیں ان کی بھی اس حدیث سے تردید ہو جاتی ہے۔

دوسری یہ کہ یہ رویائے صالحہ کسی بھی مومن و مسلم کو نظر آ سکتے ہیں۔ یہ کسی کے لیے خاص نہیں ہیں۔ اس قسم کی رویائے صالحہ دیکھنے والے کو نبوت کا کوئی مقام حاصل نہیں ہو جاتا اور نہ اس قسم کے خواب کسی پر کوئی حجت ہوتے۔ ان کی حیثیت بس یہ ہوتی ہے کہ اگر خواب دیکھنے والے نے اچھے خواب دیکھے ہیں تو ان سے ایک قسم کی خوش خبری اور فال نیک حاصل کرے۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

تیسری یہ کہ ظلی اور بروزی نبوت کی اصطلاحات بالکل شیطانی ہیں۔ اگر ان کی کوئی حقیقت ہوتی تو اس موقع پر لوگوں کو اطمینان دلانے کے لیے حضور ضرور یہ فرماتے کہ لوگ نبوت کے ختم ہونے سے زیادہ ہراساں نہ ہوں، میرے بعد ظلی اور بروزی انبیاء آتے رہیں گے۔

۴۔ قرآن مجید کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو انتظام فرمایا وہ بھی درحقیقت ختم نبوت ہی کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے ان کی تعلیمات کی حفاظت کے لیے وہ انتظام نہیں کیا گیا جو قرآن کی حفاظت کے لیے کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء کی بعثت کا سلسلہ جاری تھا۔ اگر سابق نبی کی تعلیم کو اس کی قوم فراموش کر دیتی یا اس میں تحریف کر دیتی تو بعد میں آنے والا نبی اس کی بھی تجدید کر دیتا اور اس میں اللہ تعالیٰ جو اضافہ فرماتا اس سے بھی لوگوں کو آگاہ کر دیتا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور دین بھی کامل ہو گیا اس وجہ سے ضروری ہوا کہ قرآن مجید کو اس طرح محفوظ کر دیا جائے کہ قیامت تک شیاطین جن و انس اس میں کوئی دراندازی نہ کر سکیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ اس میں کسی زیر زبر کے فرق ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں رہا۔ حق و باطل کے امتیاز کے لیے اصل خدائی کسوٹی قرآن ہے۔ اگر وہ محفوظ ہے تو اب کسی وحی و الہام اور کسی مخاطبہ و مکالمہ کی حاجت باقی نہیں رہی اور نبی کی اصل ہونکہ اسی پہلو سے ہوتی ہے اس وجہ سے اب نبی کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ رہا شہادت علی الناس'

کا فریضہ اور لوگوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں کی اصلاح تو یہ ذمہ داری اصلاً اس امت پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے اور اس کے لیے عنداللہ مسئول علماء ہوں گے اور احادیث میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اس امت میں ایسے علماء و مصلحین برابر پیدا ہوتے رہیں گے جو مفسدین کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کرتے رہیں گے اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو۔

۵- اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اب قیامت تک کسی نبی کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ بات قرآن و حدیث کے نصوص سے بھی ثابت ہے اور عقل و فطرت کی شہادت بھی یہی ہے۔ اگر روایات و آثار میں کوئی ایسی چیز آپ کے سامنے آئے جو ان قطعی نصوص کے خلاف نظر آئے تو اس پر غور کیجیے۔ اگر تاویل کی راہ سے باہم توفیق و تطبیق ہو جائے تو فبہا، اگر توفیق و تطبیق نہ ہو سکے تو ترجیح بہر حال قرآن کے نصوص اور دین کے مسلمات کو حاصل ہوگی۔ میں نے اس پہلو سے تمام روایات و آثار کو جانچا ہے۔ میرے نزدیک ان کی تطبیق اس بنیادی اصول کے ساتھ نہایت عمدہ طریقے پر ہو جاتی ہے لیکن یہاں اس بحث کی تفصیلات میں جانے کا محل نہیں ہے۔

۹- آگے کا مضمون - آیات ۴۹-۵۲

آیات ۴۹-۵۲ اس مجموعۂ آیات کے پس منظر کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے اس لیے کہ اس میں بھی بڑا ایجاز ہے جس کے سبب سے مفسرین کو بڑی الجھنیں پیش آئی ہیں۔

کا پس منظر یہ آیات درحقیقت سورۂ نساء کی آیت ۳ پر، جس میں عام مسلمانوں کے لیے تحدید ازواج کا حکم بیان ہوا ہے، استدراک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نساء کی مذکورہ آیت کے نزول کے بعد جن مسلمانوں کے نکاح میں چار سے زیادہ بیویاں تھیں انھوں نے زائد بیویوں کو طلاق دے دی لیکن حضورؐ سے متعلق کسی بیوی کو طلاق دینا ثابت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت حضورؐ کے نکاح میں چار ہی بیویاں تھیں۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کیا تو منافقین نے اس پہلو سے بھی اس پر اعتراض کیا کہ انھوں نے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے اور، شریعت بنا رکھی ہے۔ ان منافقین کا منہ بند کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس خاص اجازت کی وضاحت فرمائی جو ازواج کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔

اس اجازتِ خاص کے نمایاں پہلو یہ ہیں:

- آپ کی وہ ازواج جن کے مہر آپ ادا کر چکے ہیں، بلا استثنا آپ کے لیے جائز کی گئیں۔
- ملکِ یمین جو بطور فَے آپ کو حاصل ہوں، اگر آپ ان میں سے کسی کو آزاد کر کے ان سے نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔
- آپ کے قریبی رشتہ کی خواتین میں سے اگر کسی نے دین کی خاطر اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کو چھوڑ کر آپ

کے ساتھ ہجرت کی ہے، آپ ان میں سے بھی کسی سے نکاح کر سکتے ہیں۔

- اگر کوئی مومنہ اپنے آپ کو ہبہ کر دے اور آپ اس کو اپنے نکاح میں لینا چاہیں تو اس کی بھی آپ کو اجازت ہے۔
- یہ نکاح چونکہ تمام تر مصلحتِ دین و ملت کی خاطر ہیں اس وجہ سے حقوقِ زوجیت کے معاملے میں آپ پر سے وہ پابندیاں اٹھالی گئیں جو دوسروں پر تھیں۔

ان آزادیوں کے ساتھ حضورؐ پر دو پابندیاں بھی عائد کی گئیں جو دوسروں پر نہیں تھیں۔

- ایک یہ کہ اس دائرہ سے باہر آپ کوئی نکاح نہیں کر سکتے۔
- دوسری یہ کہ ان ازواج کو دوسری ازواج سے بدل نہیں سکتے۔

یہ آزادی اور پابندی جن مصالح پر مبنی ہے چند اصولی باتیں ان سے متعلق بھی سمجھ لیجیے۔

حضورؐ نے جتنے نکاح بھی کیے حظِ نفس کے لیے نہیں بلکہ دعوتِ دین، تالیفِ قلب، دلداری اور مصالحِ ملت کی خاطر کیے۔ آیت ۳۴ کے تحت آپ پڑھ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس مشن کی ذمہ داری آپ پر ڈالی تھی اس میں ازواجِ مطہراتؓ بھی شریک کی گئی ہیں گویا یہی وہ اصل مقصد تھا جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی معیت کے لیے منتخب فرمایا۔ اس فرض کو ازواجِ مطہراتؓ نے جس اہتمام اور جس خوبی کے ساتھ انجام دیا اس پر ہماری حدیث و سیرت کی کتابیں شاہد ہیں۔ خاص طور پر حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت میمونہؓ کا حصہ اس خدمت میں اگر مردوں سے زیادہ نہیں تو ان سے کم بھی نہیں ہے۔ عورتوں سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات زیادہ تر انہی سیداتؓ کے ذریعے سے پھیلی ہیں اور انہی کے ذریعے سے پھیل سکتی تھیں۔

حضرت زینبؓ سے آپؐ نے جن حالات میں اور جن مصالح کے تحت نکاح کیا ان کی تفصیلات آپ پڑھ آئے ہیں۔ انھوں نے ایک اہم معاشرتی اصلاح کی خاطر اپنے بھائی اور دوسرے عزیزوں کی رائے کے خلاف اپنے آپ کو ہدفِ مطاعن بنانا گوارا کیا لیکن حضورؐ کی بات نہیں ٹالی۔ ان کی اس قربانی کا اگر کوئی صلہ ہو سکتا تھا تو یہی ہو سکتا تھا کہ حضرت زیدؓ کے طلاق دینے کے بعد حضورؐ خود ان کو اپنے رشتۂ زوجیت کا شرف بخشیں۔ پھر حضرت زیدؓ کی طرح حضورؐ کے ساتھ بھی ان کا نکاح ایک عظیم معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنا اور اس میں بھی ان کو منافقین و منافقات کی یاوہ گوئیوں کا ہدف بننا پڑا لیکن انھوں نے اللہ اور رسول کی خاطر یہ تمام باتیں برداشت کیں۔

ازواجِ مطہراتؓ میں سے حضرت ام حبیبہؓ کے نکاح کا واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے قریش کے ظلم و ستم سے تنگ آکر اپنے شوہر عبید اللہ کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی۔ وہاں ان کو یہ افتاد پیش آئی کہ کچھ عرصہ بعد ان کے شوہر نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اس عالم غربت میں انھوں نے اپنے شوہر سے علٰحدگی اختیار کر کے

تنہائی و بے کسی کی زندگی بسر کرنا گوارا کی لیکن اپنے ایمان پر ثابت قدم رہیں۔ ان کی اس عزیمت و استقامت کے صلہ میں حضورؐ نے ان کو نکاح کا پیغام دیا۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس استقامت کا کوئی صلہ اس دنیا میں اگر ہو سکتا تھا تو یہی ہو سکتا تھا کہ حضورؐ ان کو یہ عزت بخشیں۔

حضرت جویریہؓ اور حضرت صفیہؓ کے ساتھ آپ کے نکاح کی نوعیت یہ ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق اور غزوۂ خیبر میں یہ بطور فے حضورؐ کے حصہ میں آئیں۔ یہ سرداروں کی بیٹیاں تھیں۔ ان کی خاندانی وجاہت کو ملحوظ رکھ کر حضورؐ نے ان کو لونڈیوں کی حیثیت سے رکھنا پسند نہیں فرمایا بلکہ ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ ان نکاحوں کی دینی و سیاسی مصلحت بالکل واضح ہے۔

بعض صحابیاتؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف شرف نسبت کی خواہشمند تھیں اور وہ اپنے تئیں حضورؐ کو ہبہ کر دینا چاہتی تھیں۔ اس قسم کی خواتین میں سے حضرت میمونہؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ حضورؐ نے ان کی درخواست منظور فرمائی اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس درخواست کی منظوری میں زیادہ دخل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کی سفارش کو تھا۔

اس سے ملتا جلتا حال حضرت سودہؓ کا بھی ہے۔ ان کے حالات شاہد ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کے سوا اور کوئی خواہش ان کے اندر نہیں تھی۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ حضورؐ کے معاملہ کی نوعیت ایسی نہیں تھی کہ در باب نکاح و طلاق آپ کو اس تحدید کا پابند کر دیا جائے جو عام مسلمانوں کے لیے تھی۔ ایسا کرنے میں بہت سے مصالح کے فوت ہونے کا اندیشہ تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے ایک ایسا ضابطہ نازل فرمایا جس میں فی الجملہ وسعت بھی ہے تاکہ وہ دینی مصالح ملحوظ رکھے جا سکیں جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا اور ساتھ ہی اس میں حضورؐ پر بعض پابندیاں بھی ہیں جو دوسرے مسلمانوں پر نہیں ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضورؐ کو جو آزادی بخشی گئی وہ تمام تر مصالح پر مبنی تھی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۹-۵۲

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا ۖ فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿٤٩﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ وَ

بَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۫ وَامْرَاَةً
مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۤ
خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ
فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٥٠﴾ تُرْجِيْ مَنْ تَشَاۗءُ مِنْهُنَّ وَتُـــْٔوِيْٓ
اِلَيْكَ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۭ
ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ
كُلُّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ﴿٥١﴾
لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاۗءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ
وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي
كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ﴿٥٢﴾

ع ٦ ١٢ ٢

ترجمۂ آیات ۴۹-۵۲

اے ایمان والو، جب تم مومنہ عورتوں سے نکاح کرو پھر ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو ان کے بارے میں تم پر کوئی عدت واجب نہیں ہے جس کا تمہیں لحاظ کرنا ہو۔ پس ان کو کچھ دے دلا دو اور خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دو۔ ۴۹

اے نبی، ہم نے تمہاری ان بیویوں کو تمہارے لیے جائز کیا جن کے مہر تم دے چکے ہو اور تمہاری ان مملوکات کو بھی تمہارے لیے حلال کیا جو اللہ نے تم کو بطور غنیمت عطا فرمائیں اور تمہارے چچا کی بیٹیوں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیوں اور تمہارے ماموں کی بیٹیوں اور تمہاری خالاؤں کی بیٹیوں میں سے بھی ان کو حلال ٹھہرایا جنھوں نے تمہارے

ساتھ ہجرت کی ہے اور اس مومنہ کو بھی جو اپنے تئیں نبی کو ہبہ کر دے بشرطیکہ پیغمبر اس کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں۔ یہ خاص تمہارے لیے ہے، مسلمانوں سے الگ۔ ہم کو اچھی طرح معلوم ہے جو کچھ ہم نے ان پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے باب میں فرض کیا ہے تاکہ تم پر کوئی تنگی نہ رہے اور اللہ غفور رحیم ہے۔ تم ان میں سے جن کو چاہو دور رکھو اور ان میں سے جن کو چاہو اپنے پاس رکھو اور اگر تم ان میں سے کسی کے طالب ہو جن کو تم نے دور کیا تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ اس بات کے قرین ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غمگین نہ ہوں اور وہ اس پر قناعت کریں جو تم ان سب کو دو۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ علم رکھنے والا اور بُردبار ہے۔ ان کے علاوہ جو عورتیں ہیں وہ تمہارے لیے جائز نہیں ہیں اور نہ یہ جائز ہے کہ تم ان کی جگہ دوسری بیویاں کرو اگرچہ ان کا حُسن تمہارے لیے دل پسند ہو۔ بجز ان کے جو تمہاری مملوکہ ہوں اور اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے۔ ۵۰-۵۲

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (۴۹)

ایک ضمنی سوال کا جواب

آگے آیت ۵۰ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہاں جو وضاحت فرمائی گئی ہے اس کی نوعیت درحقیقت اس حکم پر استدراک کی ہے جو سورۂ نساء میں عام مسلمانوں کو تحدید ازواج سے متعلق دیا گیا ہے۔ اصل استدراک سے پہلے یہ آیت بطور تمہید ہے جس میں ایک ضمنی سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ اگر کسی نے ایک عورت سے نکاح کیا لیکن رخصتی اور ملاقات کی نوبت آنے سے پہلے ہی اس کو طلاق دے دی تو اس کے معاملے میں عدت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ سوال خاص طور پر اس زمانے میں اس وجہ سے پیدا ہوا ہوگا کہ تحدید ازواج کے حکم کی تعمیل میں طلاق کے واقعات بکثرت پیش آئے ہوں گے اور طلاق

دینے والوں نے زیادہ اولیٰ یہی سمجھا ہوگا کہ اپنی ان منکوحات کو طلاق دیں جن سے ازدواجی تعلقات ابھی قائم نہیں ہوئے ہیں۔ اس آیت نے ان کے لیے نہایت بنی بر عدل سہولت مہیا کر دی۔ ایسے لوگوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ اس قسم کی عورتوں کے معاملے میں عدت کے لحاظ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کو حسب استطاعت دے دلا کر با عزت طریقہ سے رخصت کر دیا جائے۔ اس دینے دلانے کی تفصیل بقرہ کی آیات ۲۳۶-۲۳۷ میں گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے تسریح جمیل کی اہمیت بھی واضح کی ہے کہ اسلام میں مطلوب یہ ہے کہ میاں بیوی میں جدائی کی نوبت بھی آئے تو حتی الامکان یہ خوبصورتی کے ساتھ ہو۔ فریقین کے لیے کسی فضیحتے کا موجب نہ ہو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۤ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۵۰)

حضرت زینبؓ کے نکاح پر منافقین کا ایک اعتراض

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جس وقت تحدید ازواج کا حکم نازل ہوا ہے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے نکاح میں چار ہی بیویاں ——— حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت ام سلمہؓ ——— تھیں[1]۔ اس وجہ سے نہ حضورؐ کے لیے کسی بیوی کو طلاق دینے کا سوال پیدا ہوتا تھا اور نہ اس باب میں منافقین یا معترضین کے لیے کسی نکتہ چینی کی گنجائش تھی۔ لیکن ۵ھ میں حضورؐ نے جب حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح کیا تب معلوم ہوتا ہے کہ منافقین نے جس طرح یہ فتنہ اٹھایا کہ آپ نے اپنے متبنّٰی کی منکوحہ سے نکاح کر لیا اسی طرح یہ اعتراض بھی اٹھایا کہ آپ نے اپنے لیے الگ شریعت بنا رکھی ہے، دوسرے مسلمانوں کو تو بیویوں کے معاملے میں چار تک کی قید سے پابند کر دیا گیا ہے لیکن آپ نے اپنے آپ کو اس پابندی سے بالا رکھا۔

نکاح کے باب میں نبی صلعم کے امتیازات

حضرت زینبؓ کے واقعہ کی تفصیلات اوپر گزر چکی ہیں جس سے آپ کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ حضورؐ نے یہ نکاح اپنی خواہش سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا[2] لیکن معترضین اس بات کو کب ماننے والے تھے اس وجہ سے انھوں نے اعتراض اٹھایا ہوگا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے پوری تفصیل کے ساتھ بتایا کہ نکاح کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے مسلمانوں کے مقابل میں کیا امتیازات حاصل ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ۔ سب سے پہلے ان ازواج کے متعلق

---

[1] یہ واضح رہے کہ حضرت زینب بنت خزیمہؓ کی وفات ۳ھ میں ہو چکی تھی۔ [2] ملاحظہ ہوں آیات ۳۷-۴۰ الاحزاب۔

جو آیت کے نزول کے وقت آپ کے نکاح میں تھیں، فرمایا کہ ہم نے تمھاری ان بیویوں کو جن کے مہر تم ادا کر چکے ہو، تمھارے لیے جائز ٹھہرایا۔ 'جائز ٹھہرایا' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی پہلو سے ان کو حرمت لاحق ہوگئی تھی، وہ دور کردی گئی بلکہ یہ بات منافقین و معترضین کا منہ بند کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے کہ وہ جو ژاژ خائی چاہیں کرتے رہیں تم ان کی پروا نہ کرو۔ قرائن دلیل ہیں کہ یہ آیات ۵ھ میں نازل ہوئی ہیں۔ مکی زندگی سے لے کر ۵ھ تک جو سیدات حضورؐ کے عقدِ نکاح میں آئیں ان میں سے حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینب بنت خزیمہؓ کا تو جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، انتقال ہو چکا تھا البتہ حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت ام سلمہؓ حیات تھیں۔ اور ان میں نیا اضافہ حضرت زینب بنت جحشؓ کا ہوا تھا۔ گویا ان سب کے باب میں ارشاد ہوا کہ اللہ نے ان کو تمھارے لیے جائز کیا۔ 'اٰتَیۡتَ اُجُوۡرَہُنَّ' کے الفاظ سے ان کا تعارف اس لیے فرمایا ہے کہ اس کے بعد ان خواتین کا ذکر آ رہا ہے جو بطریقِ فَے آپ کو حاصل ہوں۔ ان الفاظ نے آپ کی ان ازواج مطہراتؓ کو ان سے فی الجملہ ممتاز کر دیا اس لیے کہ مملوکات کے معاملے میں مہر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

بطریقِ فَے حاصل شدہ خواتین کا حکم 'وَمَا مَلَکَتۡ یَمِیۡنُکَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ' یعنی غنیمت کی راہ سے آپ کو جو ملکِ یمین حاصل ہوں ان کو بھی اللہ نے آپ کے لیے جائز کیا۔ یہاں 'وَمَا مَلَکَتۡ یَمِیۡنُکَ' کے بعد 'مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ' کے الفاظ خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عام لونڈیاں مراد نہیں ہیں بلکہ جنگ و جہاد میں جو عورتیں قید ہو کر آئیں وہ مراد ہیں۔ ان اسیرات میں لبا اوقات شریف خاندانوں اور سرداروں کی بہوئیں اور بیٹیاں بھی ہوتی تھیں۔ ان کے ساتھ فی الجملہ امتیازی سلوک کی روایت زمانۂ جاہلیت میں بھی تھی اور اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا چنانچہ اس طرح کی عورتیں تقسیم کے وقت عموماً سرداروں ہی کو دی جاتی تھیں۔ حضرت جویریہؓ اور حضرت صفیہؓ اسی طریقہ سے علی الترتیب غزوۂ بنی مصطلق اور غزوۂ خیبر کے موقع پر حضورؐ کے حصہ میں آئیں۔ آپؐ ان کو لونڈیوں کی حیثیت سے بھی رکھ سکتے تھے لیکن آپ نے ان کی خاندانی وجاہت کا لحاظ فرمایا اور آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ یہ نکاح آپؐ نے اسی اجازتِ خاص کے تحت کیے جو اس آیت میں آپ کو دی گئی۔ اگر یہ اجازت آپ کو حاصل نہ ہوتی تو آپ ان دونوں سیدات کو لونڈیوں کی حیثیت سے تو رکھ سکتے تھے لیکن بیویوں کی حیثیت سے نہیں رکھ سکتے تھے اس لیے کہ اس صورت میں ازواج کی تعداد اسلام کے عام ضابطہ سے متجاوز ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک قسم کی تنگی ہوتی جو آپ کے منصب کے اعتبار سے بعض اخلاقی و سیاسی مصالح میں مخل ہوتی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس طرح کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دے دی۔ یہ دونوں نکاح بالترتیب ۵ھ اور ۶ھ میں ہوئے۔ اس طرح ۶ھ تک آپ کی ازواج کی تعداد سات ہوگئی۔

[illegible] 'وَبَنٰتِ عَمِّکَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِکَ وَبَنٰتِ خَالِکَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِکَ الّٰتِیۡ ہَاجَرۡنَ مَعَکَ' یہ حضورؐ کے

نہایت قریبی رشتہ کی خواتین کی تفصیل ہے کہ تمہارے چچا اور پھوپھیوں، ماموؤں اور خالاؤں کی بیٹیوں میں سے اگر کسی نے دین کی خاطر اپنے خویش واقارب اور خاندان وقبیلہ کو چھوڑا اور تمہارے ساتھ ہجرت کی ہو اور تم اس قربانی کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کے طور پر ان میں سے کسی کو اپنے عقدِ نکاح میں لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔ حضرت زینبؓ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو نکاح کا حکم دیا اس میں جہاں جاہلیت کی ایک رسمِ بد کی اصلاح مدنظر تھی وہیں یہ بات بھی مدنظر تھی کہ وہ آپ کی پھوپھی کی لڑکی اور دین کی راہ میں اپنی قربانیوں کے اعتبار سے آنحضرت صلعم کی دلداری کی مستحق تھیں۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ کے ساتھ بھی آپ نے اسی اجازت کے تحت نکاح کیا۔ وہ آپ کے رشتہ کے چچا کی صاحبزادی تھیں اور دین کی راہ میں ان کی قربانیوں اور جانبازیوں کا جو حال تھا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

ننھیالی رشتوں میں اگرچہ حضورؐ کا کوئی نکاح ثابت نہیں لیکن ان کے اندر بھی اگر حضرت زینبؓ اور حضرت ام حبیبہؓ جیسی کوئی مثال موجود ہوتی تو اس آیت کے تحت آپ اس رشتہ کے اندر بھی نکاح کر سکتے تھے۔

ایثارِ نفس کی حوصلہ افزائی

'وَامْرَاَۃً مُّؤْمِنَۃً اِنْ وَّھَبَتْ نَفْسَھَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْکِحَھَا'۔ کسی خاتون کا اپنے آپ کو کسی کے لیے ہبہ کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ہر حق سے دست بردار ہو کر اپنے تئیں اس کے حوالہ کر دے اور حقوقِ زوجیت میں سے جو کچھ وہ بخش دے وہ اس پر قانع و راضی رہے۔ یہ ایک انتہائی ایثارِ نفس کی صورت ہے جس کا جذبہ، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محض شرفِ نسبت حاصل کرنے کے لیے متعدد صحابیاتؓ کے اندر موجود تھا اور انھوں نے حضورؐ سے اس کا اظہار بھی کیا۔ حضورؐ کی گھریلو زندگی ہر شخص کو معلوم ہے کہ فقر و فاقہ کی زندگی تھی۔ اوپر آپ پڑھ آئے ہیں کہ امہات المومنینؓ کی غریبانہ زندگی ہی کی بنا پر منافقات ان کے اندر وسوسہ اندازی کرتی رہتی تھیں کہ اگر وہ طلاق حاصل کر لیں تو وقت کے بڑے بڑے سرداران کو نکاح کے پیغام دیں گے اور ان کی یہ فقر و فاقہ کی زندگی عیش و عشرت کی زندگی سے بدل جائے گی۔ اس طرح کی غریبانہ زندگی کے لیے ظاہر ہے کہ کوئی عورت دنیا کی کوئی طمع پیشِ نظر رکھ کر یہ بازی نہیں کھیل سکتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ہبہ کر دے! یہ قربانی تو وہی خواتین کر سکتی تھیں جن کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عقیدت و فدویت کا ایسا جذبہ ہو کہ وہ حضورؐ کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی کا ہر ارمان قربان کر دینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ جذبہ ایک نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ جذبہ تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کا لحاظ فرمایا اور حضورؐ کو یہ اجازت دی کہ اگر کوئی مومنہ اپنے آپ کو اس طرح ہبہ کر دے اور حضورؐ اس کو اپنے عقدِ نکاح میں لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں۔ 'اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْکِحَھَا' کی قید سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہر چند یہ جذبہ نہایت محمود اور پاکیزہ ہے لیکن اس کی حوصلہ افزائی

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زیادہ ممکن نہیں ہے اس وجہ سے یہ معاملہ کلیتہً آپ کی صوابدید پر منحصر ہے کہ کسی کی اس طرح کی پیش کش کو آپ قبول کریں یا نہ کریں۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس طرح کی صرف ایک پیش کش، حضرت میمونہؓ کی، آپؐ نے قبول فرمائی۔ یہ نکاح عمرۃ القضاء کے موقع پر سنہ ۷ھ میں ہوا۔ اس کے بعد آپ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔

'خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ' یعنی یہ چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت خاص تمہارے لیے ہے، دوسرے مسلمانوں کے لیے اس کی اجازت نہیں ہے۔

نبی صلعم کے لیے خاص اجازت کی حکمت

'قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ' یہ سورۂ نساء کی آیت ۳ کی طرف اشارہ ہے جس میں مسلمانوں کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتے۔ فرمایا کہ ہم نے عام مسلمانوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے باب میں جو کچھ فرض کیا ہے وہ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کے باوجود ہم تم کو یہ خاص اجازت اس لیے دے رہے ہیں کہ تم پر اس باب میں کوئی تنگی باقی نہ رہے یعنی اللہ نے جن دینی و ملی مصالح کی خاطر یہ اجازت آپ کو عطا فرمائی ہے ان مصالح کو آپ بغیر کسی زحمت کے پورا کر سکیں۔ ان مصالح کی طرف ہم اوپر اشارہ کرتے آئے ہیں۔

'وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا' یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگرچہ اس اجازت نے آپؐ کے اوپر حقوق و فرائض سے متعلق بہت بھاری ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، وہ ان تقصیرات سے درگزر فرماتا ہے جو بلاقصد و ارادہ صادر ہو جایا کرتی ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس آیت کے متعلق بعض روایات کی بنا پر لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ حضورؐ کے تمام نکاحوں کے بعد نازل ہوئی اور اس کے ذریعہ سے گویا آپ کو یہ اطمینان دلا دیا گیا کہ آپؐ نے جتنے نکاح کیے سب جائز ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔

پہلی قابل توجہ بات یہ ہے کہ تحدید ازواج کا صریح حکم نازل ہو جانے کے بعد حضورؐ کے لیے یہ ممکن کس طرح تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر آپ کوئی نکاح اس ضابطہ کے خلاف کرتے۔ آپؐ کے شایانِ شان بات تو یہ تھی کہ آپؐ اس حکم پر سب سے بڑھ کر عمل کرنے والے بنتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اتنی ہی بات کہنی تھی کہ آپ کے سب نکاح جائز ہیں تو یہ رشتوں اور عورتوں کی اقسام کی تفصیل کی کیا ضرورت تھی۔ پھر تو یہ مختصر سا فقرہ بالکل کافی ہوتا کہ اب تک آپؐ نے جتنے نکاح کیے سب اللہ نے جائز کر دیے۔ اس پر کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے۔

بہرحال یہ رائے نہایت کمزور ہے۔ ہمارے نزدیک اصل صورت واقعہ وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جس وقت تحدید ازواج والی آیت نازل ہوئی ہے اس وقت تو آپؐ کے نکاح میں چار ہی بیویاں تھیں، اس وجہ سے کسی کو طلاق دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا البتہ بعد میں جب آپؐ نے

حضرت زینبؓ سے نکاح کیا تو یہ چیز معترضین کے لیے وجہ اعتراض بنی ہوگی اور اس اعتراض سے دوسرے نیک نیت لوگوں کے اندر بھی شبہات پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس امکان کے سدّباب کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت تفصیل سے واضح فرما دیا کہ حضرت زینبؓ سے نکاح اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے کرایا ہے اور اس معاملے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عام مسلمانوں سے الگ ضابطہ ہے۔ وہ فلاں فلاں اقسام کی خواتین سے آئندہ بھی نکاح کر سکتے ہیں۔ اس طرح حضرت زینبؓ کے نکاح کو بھی جائز فرما دیا اور آئندہ کے لیے ایک ضابطہ بھی مقرر کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ ہمارے نزدیک یہ آیت ۵ھ میں حضرت زینبؓ کے نکاح کے بعد نازل ہوئی ہے۔

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا (۵۱)

حقوقِ زوجیت کے معاملے میں آزادی

اوپر تفصیل سے یہ بات گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ سارے نکاح اصلاً مصلحتِ دین کے لیے تھے اس وجہ سے جس طرح ازواج کی تعداد کے معاملے میں آپ کو عام ضابطہ سے مستثنیٰ رکھا اسی طرح حقوقِ زوجیت کے معاملے میں بھی آپ کو آزادی دے دی کہ یہ چیز تمام تر آپ کی صوابدید پر ہے آپ جس کو چاہیں اپنے پاس بلائیں، جس کو چاہیں نہ بلائیں۔ اگرچہ بیویوں کے درمیان عدل کا معاملہ بڑی اہمیت رکھنے والا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پابندی سے بھی آزاد کر دیا اور اس کی دو وجہیں تھیں۔

اول تو وہی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ آنحضرت صلعم کے نکاحوں میں نکاح کے عام مقصد کی حیثیت بالکل ضمنی اور ثانوی تھی۔ اصل مقصد دین تھا اور اس مقصد کے لیے ان حدود و قیود کی پابندی کی ضرورت نہیں ہے جو عام میاں بیوی کے لیے مقرر ہیں۔

دوسری یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ اندیشہ نہیں تھا کہ آپ اس آزادی سے کوئی غلط فائدہ اٹھائیں گے۔ چنانچہ آپ کے تمام سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ اس آزادی کے باوجود آپؐ نے اپنے اوپر عدل کی پوری پابندی قائم رکھی اور آخر عمر تک کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کی۔

'وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ' یعنی آپ کو اس کی بھی اجازت ہے کہ آپ اپنی ازواج میں سے کسی کو چاہیں تو ازدواجی تعلق سے بالکل معزول رکھنے کے بعد پھر ان سے تعلق کو بحال کر لیں۔ اس معاملے میں بھی نہ آپ پر کوئی پابندی ہے اور نہ آپ کی ازواج میں سے کسی کو اس پر اعتراض کا حق ہوگا۔

ازواجِ نبیؐ کو تشویق

'ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ' یہ ازواجِ مطہراتؓ کو تشویق و ترغیب ہے کہ وہ اپنے اوپر پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تعلق کو عام میاں بیوی کے تعلق کی کسوٹی پر نہ پرکھیں۔

بلکہ پیغمبرؐ کی اصل ذمہ داری اور اپنی اصل حیثیت کو سامنے رکھ کر جانچیں۔ اصل چیز زاویۂ نگاہ ہے۔ اگر اس میں تبدیلی ہو جائے گی اور وہ یہ سمجھ جائیں گی کہ پیغمبرؐ کے ساتھ ان کا اصل تعلق صرف میاں بیوی کا نہیں بلکہ خدمت دین کا ہے تو پھر حقوق کے معاملے میں نہ باہم ازواج میں کوئی رقابت ہو گی اور نہ پیغمبرؐ ہی سے کوئی گلہ و شکوہ رہے گا بلکہ اپنے مصروف لمحات میں سے پیغمبرؐ جو کچھ جس کو بخش دیں گے وہ اسی پر قناعت کریں گی۔ زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کے بعد دینی خدمت کے اعتبار سے جس کا مرتبہ بلند ہو گا اس کی قدر جس طرح نبی کی نظروں میں ہو گی اسی طرح آپ کی ازواج کی نگاہوں میں بھی ہو گی اور باہمی رشک و رقابت کی تمام تلخیاں کافور ہو جائیں گی۔

'وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَلِيمًا'۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواجؓ کو یاددہانی ہے کہ ہر ایک کو یہ حقیقت مستحضر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے لیکن وہ واقف ہونے کے ساتھ علیم اور بُرد بار بھی ہے اس وجہ سے وہ درگزر بھی فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس علم و حلم کو مستحضر رکھنے ہی سے خدا کی خشیت اور اس کے عفو کا وہ صحیح تصور انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے جو امید و بیم دونوں کے اندر توازن پیدا کر کے انسان کی زندگی کو صحیح منہاج پر قائم رکھتا ہے۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا (۵۲)

در باب نکاح آنحضرت صلعم کے لیے پابندی

مذکورہ بالا اصناف کی خواتین کے سوا دوسری تمام عورتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حرام کر دی گئیں۔ ابن کثیرؒ نے ایک بڑے گروہ کی، جس میں ابی بن کعب، مجاہد، عکرمہ، ضحاک، ابو رزین، ابو صالح، حسن، قتادہؒ اور دوسرے رحمہم اللہ جیسے اکابر تفسیر شامل ہیں، یہ رائے نقل کی ہے کہ 'ما سوی ذلک من اصناف النساء فلا یحل لک' (اور ان کے سوا دوسری اقسام کی جو خواتین ہیں وہ تمھارے لیے جائز نہیں ہیں) گویا آنحضرتؐ کے لیے ایک خاص دائرہ جو آیت ۵۰ میں مذکور ہے، مخصوص کر دیا گیا اس سے باہر کوئی نکاح آپ نہیں کر سکتے تھے۔

'وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ'۔ اور اس کی اجازت بھی آپ کو نہیں تھی کہ اپنی ان ازواج میں سے کسی کو الگ کر کے ان کی جگہ دوسری بیوی آپ لائیں، اگرچہ وہ آپ کی نظروں میں کتنی ہی پسندیدہ ہوں۔ اس کے بعد صرف ملک یمین کی اجازت باقی رہ گئی چنانچہ اسی اجازت کے تحت حضرت ماریہؓ آپ کے قبضہ میں آئیں جن کے بطن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی ولادت ہوئی۔

'وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا'۔ یہ آیت ظاہر ہے کہ بطور تذکیر و تنبیہ ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مخاطب یہاں حضورؐ ہیں۔ اوپر والی آیت میں آپ نے دیکھا کہ اسی نوع کی تذکیر ازواج مطہراتؓ کو کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں ہر ایک مسئول ہے اور جو جتنا ہی بڑا ہے اتنا ہی زیادہ مسئول ہے۔ اس

وجہ سے ہر ایک کے لیے ضروری ہوا کہ خدا کے مواخذہ سے پہلے اپنا محاسبہ کرتا رہے اور یہ اس یقین کے ساتھ محاسبہ کرتا رہے کہ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی خدا کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔

اس آزادی اور اس پابندی پر، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اوپر کی آیات میں بیان ہوئی ہے، غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ ازواج کے معاملے میں چار کی قید سے آزاد کر دیا گیا لیکن دوسری طرف آپ پر جو پابندیاں عائد کر دی گئیں وہ ایسی ہیں کہ نکاح و طلاق دونوں ہی کے معاملے میں حضورؐ دوسرے مسلمانوں کے مقابل میں کہیں زیادہ پابند تھے۔

ایک عام مسلمان کو تو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ چار کی حد کو ملحوظ رکھتے ہوئے محرمات کے دائرے سے باہر، جس عورت سے چاہے نکاح کرے اور اپنی منکوحات میں سے جس کو چاہے طلاق دے کر اس کی جگہ کوئی دوسری بیوی اپنی پسند کی بیاہ لائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آزادی حاصل نہیں تھی۔ آپ اس حکم کے نازل ہونے کے بعد اگر نکاح کر سکتے تھے تو صرف تین قسم کی عورتوں سے۔

- اپنے نہایت قریبی رشتہ کی کسی ایسی خاتون سے جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو۔
- کسی جہاد کے نتیجہ میں بطور غنیمت حاصل شدہ کسی خاتون سے۔
- کسی ایسی خاتون سے جو اپنے آپ کو حضورؐ کو ہبہ کر دیں اور حضورؐ ان سے نکاح کرنا پسند فرمائیں۔

اس دائرے سے باہر نہ آپ کوئی نکاح کر سکتے تھے اور نہ ان ازواج میں، مجرد پسند و ناپسند کی بنا پر، کوئی ردو بدل فرما سکتے تھے۔ یہ اجازت جن دینی مصالح کی بنا پر آپ کو دی گئی ان کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

۱۱۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۵۳-۶۲

آگے منافقین کی ریشہ دوانیوں اور ایذا رسانیوں کے سدِ باب کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو بھی اور عام مسلمانوں کی بیویوں بیٹیوں کو بھی پردے سے متعلق بعض ہدایات دی گئی ہیں۔ کچھ احکام سورۂ نور میں بھی پردے سے متعلق بیان ہو چکے ہیں۔ اس سورہ میں اس باب کی تکمیل کر دی گئی ہے تاکہ اشرار و مفسدین کی دراندازی کے لیے کوئی رخنہ باقی نہ رہے۔ آخر میں منافقین کو یہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر اب بھی وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو ان کے بارے میں ایسے احکام دے دیے جائیں گے کہ ان کے لیے اس سرزمین میں سر چھپانا ناممکن ہو جائے گا ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے

آیات ۵۳-۶۲ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ

لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا

فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ
يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ؗ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَاِذَا
سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ
لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَاۤ اَنْ
تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ
عَظِيْمًا ﴿٥٣﴾ اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمًا ﴿٥٤﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْۤ اٰبَآئِهِنَّ وَلَاۤ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَاۤ اِخْوَانِهِنَّ
وَلَاۤ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا
مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
شَهِيْدًا ﴿٥٥﴾ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٥٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا
مُّهِيْنًا ﴿٥٧﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا
فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿٥٨﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ ع
لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ
جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٥٩﴾ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ

فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا معانقة ۱۲
تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ
لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾ الربع

اے ایمان والو نبی کے گھروں میں نہ داخل ہو مگر یہ کہ تم کو کسی کھانے پر آنے کی اجازت ترجمۂ آیات ۵۳-۶۲
دی جائے۔ نہ انتظار کرتے ہوئے کھانے کی تیاری کا۔ ہاں جب تم کو بلایا جائے تو داخل ہو، پھر جب کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور باتوں میں لگے ہوئے بیٹھے نہ رہو۔ یہ باتیں نبی کے لیے باعث اذیت تھیں لیکن وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے' اور اللہ حق کے اظہار میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ اور جب تم کو ازواج نبی سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگو، یہ طریقہ تمہارے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزہ ہے اور ان کے دلوں کے لیے بھی۔ اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم اس کی بیویوں سے کبھی اس کے بعد نکاح کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک بڑی سنگین باتیں ہیں۔ تم کسی چیز کو ظاہر کرو، خواہ چھپاؤ، اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ۵۳-۵۴

ان پر ان کے باپوں کے معاملے میں کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ ان کے بیٹوں کے بارے میں اور نہ ان کے بھائیوں کے بارے میں اور نہ ان کے بھتیجوں کے بارے میں اور نہ ان کے بھانجوں کے بارے میں اور نہ اپنے میل کی عورتوں کے بارے میں اور نہ ان کی لونڈیوں کے باب میں ہی اور اللہ سے ڈرتی رہو۔ بے شک اللہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ ۵۵

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو، تم بھی اس پر درود و سلام بھیجو اچھی طرح۔ بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں...

اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت دونوں میں لعنت کی اور ان کے لیے اس نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ مومنین اور مومنات کو ان چیزوں کے باب میں ایذا دیتے ہیں جن کا انھوں نے ارتکاب نہیں کیا، انھوں نے اپنے سر صریح بہتان اور گناہ کا بار لیا۔ ۵۶-۵۸

اے نبی! اپنی بیویوں، اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کر دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادروں کے گھونگٹ لٹکا لیا کریں۔ یہ اس بات کے قرین ہے کہ ان کا امتیاز ہو جائے، پس ان کو کوئی ایذا نہ پہنچائی جائے۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۵۹

یہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو مدینہ میں سنسنی پھیلانے والے ہیں اگر باز نہ رہے تو ہم تم کو ان پر اکسا دیں گے، پھر وہ تمہارے ساتھ رہنے کا بہت ہی کم موقع پائیں گے۔ ان پر پھٹکار ہو گی، جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے اور بے دریغ قتل کیے جائیں گے۔ یہی اللہ کی سنت رہی ہے ان لوگوں کے بارے میں جو پہلے ہو گزرے ہیں اور تم اللہ کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ ۶۰-۶۲

۱۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۡ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ۭ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْــَٔـلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاۗءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ۭ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا (۵۳)

پردے کے احکام کی وضاحت

مسلمانوں کے لیے ایک دوسرے کے گھروں میں آنے جانے سے متعلق ضروری آداب سورۂ نور میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں سے متعلق انہی آداب کی مزید وضاحت ہو رہی ہے اور اس وضاحت مزید کی ضرورت انہی منافقین کی وجہ سے پیش آئی جن کا رویہ اس سورہ میں زیر بحث ہے۔

منافقین کی بعض شرارتیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً فوقتاً صحابہ رضی اللہ عنہم کو کسی تقریب سے اپنے ہاں کھانے پر بلاتے رہتے۔ ایسے مواقع پر ان لوگوں کو بھی آپ ازراہِ کریم النفسی و تالیفِ قلب بلاتے جو مبتلائے نفاق تھے۔ اور اگر نہ بھی بلاتے تو بھی ان میں سے بعض ناخواندہ مہمان بن کر خود ہی پہنچ جاتے۔ یہ لوگ حضورؐ کی کریم النفسی سے نہایت غلط فائدہ اٹھاتے۔ اول تو یہ لوگ دعوت کا بہانہ پاکر کھانے کے وقت سے بہت پہلے ہی وہاں ڈیرا جما کر بیٹھ جاتے، پھر کھانا کھا چکنے کے بعد بھی وہاں سے کھسکنے کا نام نہ لیتے بلکہ باتوں میں لگے بیٹھے رہتے اور مزید شرارت یہ کرتے کہ کسی چیز کے مانگنے کے بہانے دراتے ہوئے ازواجِ مطہراتؓ کے سامنے چلے جاتے۔ مقصود ان ساری حرکتوں سے ان کا وہی ہوتا جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں کہ کوئی موقع ان کو ازواجِ مطہراتؓ کے اندر وسوسہ اندازی و ریشہ دوانی کا ہاتھ آئے۔ حضورؐ ان لوگوں کی ان حرکتوں کو محسوس فرماتے اور اس سے آپ کو تکلیف بھی پہنچتی لیکن آپ لحاظ و مروت کے سبب سے نظر انداز فرماتے۔ لیکن نظر انداز کیے جانے کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ لوگ اس کریم النفسی کے سزاوار نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس باب میں نہایت واضح احکام بھی دے دیے اور یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ اب بھی اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو اپنی قضائے مبرم کو دعوت دینے والے بنیں گے۔

بعض ضروری آداب متعلق دعوت

'یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ' خطاب اگرچہ عام ہے تاکہ اس تعلیم کا فائدہ عام رہے لیکن اس کے پس پردہ وہی منافقین ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابھی اس مرحلہ میں ان کا پردہ اٹھانا نہیں چاہا اس وجہ سے بات عام صیغہ ہی سے فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا کہ اے ایمان والو، نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو مگر یہ کہ تم کو کسی کھانے میں شرکت کے لیے اجازت دی جائے۔ 'یُؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ' کے اسلوب میں دو باتیں مضمر ہیں۔ ایک یہ کہ گھروں میں بدون اجازت نہ داخل ہو اور دوسری یہ کہ دعوت میں بن بلائے نہ جا دھمکو۔ 'غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ' یہ تیسری شرط ہے۔ 'نٰظِرِیْنَ' کے معنی 'مُنْتَظِرِیْنَ' کے اور 'اِنٰى' کے معنی کسی چیز کی تیاری اور پکنے کے وقت کے ہیں۔ یعنی یہ بھی جائز نہیں ہے کہ دعوت کا بہانہ ہاتھ آگیا ہے تو کھانے کی تیاری کے انتظار میں وہیں دھونی رما کر بیٹھ رہو۔ اول تو یہ چیز آدمی کی طماعی اور سفلہ پن کی دلیل ہے۔ ثانیاً اس زمانے میں عام طور پر صورت یہ تھی کہ زنانہ مکانوں کے ساتھ مردانہ بیٹھکیں نہیں تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا حال بھی یہی تھا۔ اس وجہ سے وقت سے پہلے لوگوں کا مجتمع ہو جانا اہلِ خانہ اور صاحبِ خانہ دونوں کے لیے موجبِ زحمت و اذیت تھا۔

'وَلٰكِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ'۔ یہ صحیح طریقہ ارشاد ہوا کہ جب بلائے جاؤ تو وقت کے وقت داخل ہو اور جب کھا چکو تو وہاں سے منتشر ہو جاؤ، باتوں میں لگے ہوئے وہاں بیٹھے نہ رہو۔ 'اِذَا دُعِیْتُمْ' میں اسی مضمون کو کھول دیا ہے جو 'اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ'

میں مضمر ہے، یعنی صرف اس صورت میں جانا چاہیے جب بلایا جائے، بن بلائے مہمان بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ 'وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ' بالکل اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت او پر 'غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ' والے ٹکڑے میں دی گئی ہے۔ یعنی جس طرح یہ بات ناپسندیدہ ہے کہ کھانے کی تیاری کے انتظار میں پہلے سے جا بیٹھو اسی طرح یہ بات بھی ناپسندیدہ ہے کہ کھانا کھا چکنے کے بعد کسی بات میں لگ کر وہیں جمے رہو۔

'اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ'۔ 'ذٰلِکُمْ' سے اشارہ ان ساری ہی باتوں کی طرف ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔ فرمایا کہ یہ باتیں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے باعثِ زحمت و اذیت تھیں لیکن وہ شرم و لحاظ کے سبب سے تم کو ٹوکتے نہیں تھے لیکن اللہ کو حق کے معاملے میں کسی کا لحاظ نہیں ہے اس وجہ سے وہ تم کو ان باتوں سے آگاہ فرما رہا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی کمزوری کا ذکر نہیں فرمایا ہے بلکہ آپ کی ایک پسندیدہ خصلت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ آپ نہایت کریم النفس و ذی مروّت ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ان غلطیوں پر تنبیہ فرما دیا ہے اور لحاظ و مروّت کو بالائے طاق رکھ کے نبی کو بھی ان کا اعلان کرنا ضروری ہوا۔

دل کی صحت کے لیے اہتمام

'وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْــَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ' ضمیر کا مرجع ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) ہیں۔ اوپر 'بُیُوْتَ النَّبِیِّ' کا ذکر ہو چکا ہے اس وجہ سے ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کے ذکر کے لیے نہایت واضح قرینہ موجود تھا۔ فرمایا کہ اگر کسی کو ان سے کوئی چیز مانگنے کی ضرورت پیش آئے تو یہ نہ کرے کہ دندناتا ہوا ان کے سامنے چلا جائے بلکہ پردے کی اوٹ سے مانگے 'ذٰلِکُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ' (یہی طریقہ تمہارے دلوں کو بھی زیادہ پاکیزہ رکھنے والا ہے اور ان کے دلوں کو بھی) یہ ایک دفع دخلِ مقدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر یہ بات ایک غیر ضروری تکلف محسوس ہوتی ہے کہ کسی کو ان سے ایک گلاس پانی مانگنے کی بھی ضرورت پیش آئے تو اس کے لیے بھی پردہ کا اہتمام کرے لیکن یہ کوئی تکلف نہیں بلکہ دل کو آفات سے محفوظ رکھنے کی ایک نہایت ضروری تدبیر ہے۔ انسان کا دل جس نے بنایا ہے وہ اس کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کن کن مخفی راستوں سے یہ دل برے اثرات قبول کرتا ہے اور دل ہی وہ چیز ہے جس پر انسان کی تمام اخلاقی صحت کا انحصار ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ جن کو اپنے دل کی صحت مطلوب ہو وہ اس کو ان تمام چیزوں سے محفوظ رکھیں جو اس کو غبار آلود کر سکتی ہیں۔ اس زمانے کے مدعیانِ تہذیب اپنے کپڑوں کی صفائی کا تو بڑا اہتمام رکھتے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ ان پر ایک شکن یا ایک دھبہ بھی پڑنے دیں لیکن ان کے دل جس گندگی سے بھی لت پت رہیں ان کی انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقی و روحانی صحت کی ان کے ہاں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ حالانکہ اصل اہمیت رکھنے والی چیز یہی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے: 'مضغۃ فی الجسد اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب' (انسان کے جسم میں ایک ٹکڑا گوشت کا ہے، اگر وہ تندرست ہے تو سارا جسم تندرست

ہے اور جب اس میں فساد پیدا ہو جاتا ہے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے، آگاہ ہو کہ سن لو کہ وہ دل ہے!) انسان کے جسم میں جو چیزیں جتنی ہی نازک اور قدر و قیمت رکھنے والی ہیں اتنی ہی زیادہ ان کی حفاظت کرنی پڑتی ہے دل سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھنے والا اور سب سے زیادہ حساس ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا سب سے زیادہ اہتمام فرمایا۔

منافقین کو ایک تنبیہ

'وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا' فرمایا کہ تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اپنی اس قسم کی حرکتوں سے، جو اوپر بیان ہوئیں، اللہ کے رسول کو اذیت پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد کبھی بھی ان کی ازواج سے نکاح کرو۔

اس ٹکڑے نے تدریجی انکشاف کے اصول پر ان لوگوں کے چہروں سے نقاب اٹھا دی جن کو پیشِ نظر رکھ کر یہ احکام دیے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ منافقین ہی تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانے کے لیے اس طرح کی حرکتیں کرتے تھے اور وہی تھے جو اپنے دلوں میں یہ ارمان بھی رکھتے تھے کہ آپ کی ازواج سے نکاح کریں تاکہ اس کو اللہ اور رسول کے خلاف فتنہ انگیزیوں کا ذریعہ بنائیں۔ اس آیت کا انداز تنبیہ کا ہے اس وجہ سے اس میں حضورؐ کا ذکر 'رسول اللہ' کے لفظ سے ہوا ہے حالانکہ اوپر کی آیات میں بار بار آپ کا ذکر 'نبی' کے لفظ سے ہوا ہے۔ اس کی وجہ اس تنبیہ کی شدت کو ظاہر کرنا ہے۔ اس لیے کہ رسول، جیسا کہ ہم اس کتاب میں بار بار واضح کر چکے ہیں، اپنی قوم کے لیے خدا کی عدالت ہوتا ہے۔ وہ جب آتا ہے تو صرف وعظ سنانے کے لیے نہیں آتا، بلکہ قوم کے نیکوں اور بدوں کے درمیان فیصلہ کر دینے کے لیے آتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے ساتھ مذاق یا اس کو اذیت پہنچانا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ آگ سے کھیل رہے ہیں۔ اس کے اس انجام کو وہ سامنے رکھیں۔

ازواجِ نبیؐ کا درجہ

'وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا' یہ ان کے اس ارمان پر بھی آخری ضرب لگا دی ہے جو ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہن) سے نکاح کے لیے وہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے فرمایا کہ تمہارے لیے یہ بات بھی جائز نہیں ہے کہ تم نبیؐ کی بیویوں سے آج یا کبھی بھی نکاح کرو۔ اوپر آیت ۶ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کی حیثیت امت کی ماؤں کی ہے اور ان کے ساتھ تعلق کی یہی نوعیت فطری بھی ہے اور عقلی بھی۔ فطری اس وجہ سے کہ حضورؐ کی ازواج کے لیے ہر امتی کے دل کے اندر (اگر اس کے اندر ایمان کی رمق ہے) احترام و عقیدت کا جذبہ اپنی ماں کے مقابل میں بھی بدرجہا زیادہ ہوتا ہے۔ اس جذبے کے ہوتے کوئی امتی ان کے ساتھ نکاح کے تصور کو اپنی ماں کے ساتھ نکاح کے تصور سے بھی بدرجہا گراں اور شرم انگیز محسوس کرتا ہے۔ اگر کسی کے اندر ان کے ساتھ نکاح کا جذبہ ابھرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ایمان میں فتور اور اس کی فطرت میں بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔

عقلی اس وجہ سے کہ ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہن) کی حیثیت، جیسا کہ آیت ۳۲ میں گزر چکا ہے، اس

امت کے ذکور و اناث، سب کے لیے، معلمات کی ہے اور اس منصب پر ان کو خود اللہ تعالیٰ نے مامور فرمایا ہے۔ اس منصب کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان کو ماؤں ہی کے درجے میں رکھا جائے۔ اسی درجے پر رہتے ہوئے ہی وہ اپنے اس فریضۂ منصبی کو صحیح طور پر ادا کر سکتی ہیں۔ اگر اس درجے سے ان کو گرا دیا جائے تو نہ وہ اپنے صحیح مقام کو قائم رکھ سکتی ہیں، نہ دوسرے ان سے اس طرح کسب فیض کر سکتے ہیں جس طرح معلمات امت سے کیا جانا چاہیے۔

ایک تنبیہ

'اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا' یہ تنبیہ ہے اور بڑی ہی سخت تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی ہی سنگین ہیں۔ یہاں اس کے وبال کی وضاحت نہیں فرمائی اور اس ابہام کے اندر جو تہدید و تخویف مضمر ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۵۴)

یہ بھی تنبیہ ہے جو اوپر والی تنبیہ کو مزید مؤکد کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا چونکہ دلوں کے بھید سے بھی واقف ہے اس وجہ سے اس سے کوئی بات چھپائی نہیں جا سکے گی۔ اس دنیا میں تو اپنی کسی نازیبا سے نازیبا حرکت کے لیے بھی نہایت حسین عذر تراشے جا سکتے ہیں لیکن یہ عذرات خدا کے ہاں نہیں کام آئیں گے۔ وہ دلوں کے مخفی کھوٹ بھی سب کے سامنے رکھ دے گا۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا (۵۵)

ان لوگوں کا ذکر جن کے لیے پردے کے احکام میں رعایت ہے

یہ آیت اسی محل میں ہے جس محل میں سورۂ نور کی آیت ۳۱ 'وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ الاية' ہے۔ دونوں میں الفاظ بھی اکثر مشترک ہیں۔ اوپر والی آیت میں ازواج نبی رضی اللہ عنہم کے گھروں میں دوسروں کے داخل ہونے پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، ان پابندیوں سے جو لوگ مستثنیٰ ہیں یہ ان کی تفصیل ہے۔ خاص اہم رشتوں کا ذکر کر دیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ جو رشتہ دار ان کے حکم میں داخل ہیں وہ سب اس پابندی سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے اوپر صرف وہی پابندیاں ہوں گی جو سورۂ نور میں مذکور ہوئی ہیں۔

'وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا'۔ یہ آخر میں ازواج نبیؐ کو بھی اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہات دوسروں کے لیے اوپر گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان احکام و ہدایات کی صرف خانہ پری مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ان کی تعمیل پوری خدا ترسی اور تقویٰ کے ساتھ کی جائے اور یہ حقیقت ہمیشہ دل میں مستحضر رہے کہ اللہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ کوئی جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں انسان خدا سے چھپ سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَي النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۵۶)

درود کی اہمیت و حقیقت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا و آزار پہنچانے کے بجائے اہل ایمان کو حضورؐ کے معاملے میں جو رویہ اختیار کرنا چاہیے، یہ اس کی ہدایت ہے۔ فرمایا کہ اللہ اپنے نبیؐ پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اہل ایمان کے لیے بھی صحیح روش، خدا اور اس کے فرشتوں سے ہم آہنگ و ہم رنگ، یہی ہے کہ وہ بھی نبیؐ پر زیادہ سے زیادہ درود و سلام بھیجیں نہ کہ اس کو ایذا پہنچانے کی تدبیریں سوچیں۔

اس آیت سے کئی حقیقتیں سامنے آتی ہیں جو نگاہ میں رکھنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ جس نبیؐ کا مرتبہ اللہ اور اس کے فرشتوں کی نظروں میں یہ ہے کہ اللہ اس پر رحمت نازل فرماتا ہے اور فرشتے اس پر رحمت کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں، حیف ہے اگر انسانوں میں سے کچھ لوگ اس کے درپے آزار ہوں درآنحالیکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی احسان انسانوں ہی پر ہے نہ کہ خدا اور اس کے فرشتوں پر۔

دوسری یہ کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجتے ہیں وہ نبی صلعم پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ خدا اور اس کے فرشتوں کی ہم نوائی کر کے وہ اپنے کو سزاوار رحمت بناتے ہیں۔ جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے جب آپ کو اللہ کی رحمت اور فرشتوں کی دعائیں حاصل ہیں تو وہ دوسروں کی دعاؤں کے محتاج نہیں ہیں۔

تیسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنا مرضِ نفاق کا علاج ہے۔ اس لیے کہ یہاں جس محل میں اس کی ہدایت فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ منافقوں کی طرح نبی کو ایذا پہنچانے کے بجائے اہل ایمان کو نبی پر درود بھیجنا چاہیے۔ اس سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ جو لوگ درود کا اہتمام رکھتے ہیں ان کے اندر نفاق راہ نہیں پاتا۔

چوتھی یہ کہ مقصود درود و سلام کی تکثیر ہے۔ موقع و محل بھی اس مفہوم کا متقاضی ہے اور آیت کے الفاظ بھی اسی کے شاہد ہیں۔ اس لیے کہ 'سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا' میں مصدر تاکید و تکثیر کے مفہوم پر دلیل ہے اس وجہ سے ہم ان فقہاء کی رائے کو صحیح نہیں سمجھتے جو کہتے ہیں کہ اگر عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی کوئی درود پڑھ لے تو اس آیت کا حق ادا ہو جائے گا۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا (۵۷)

رسول کو ایذا پہنچانے والوں کا انجام

یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو اللہ کے رسول کی دل آزاری اور توہین کے مرتکب ہو رہے تھے۔ فرمایا کہ رسول کو ایذا پہنچانا خود اللہ کو ایذا پہنچانا ہے۔ رسول خدا کا محبوب اور اس کا نمائندہ ہوتا ہے اور خدا اور اس کے فرشتے اس پر رحمت بھیجتے ہیں تو جن کا رویہ اس کے خلاف ہو گا وہ لازماً

خدا اور اس کے فرشتوں کے مخالف اور خدا کو ایذا پہنچانے والے ٹھہرے۔ ان کی اس حرکت کی پاداش میں ان پر دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ کی لعنت ہے۔ یہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوں گے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار ہے۔ یہ امر یہاں خاص طور پر ملحوظ رہے کہ ان کو آخرت کے عذاب سے پہلے اس دنیا میں بھی عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ یہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جو رسولوں کے مخالفین کے لیے بیان ہو چکی ہے۔ اس کی وضاحت آگے آیات ۶۰۔۶۱ میں آ رہی ہے۔ یہ بعینہٖ وہی سزا ہے جو یہود کو دی گئی اور ان کا بھی اصلی جرم یہی تھا کہ انھوں نے اللہ کے رسولوں کو ایذا پہنچائی۔ اس کی مزید وضاحت ان شاء اللہ سورۂ صف کی تفسیر میں آئے گی۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا (۵۸)

مسلمانوں کا اخلاق ساکھ مجروح کرنے کے لیے منافقین کی مہم

اوپر کی آیات میں منافقین کا وہ رویہ زیر بحث آیا ہے جو انھوں نے خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا۔ اب یہ عام مومنین و مومنات کو متہم کرنے کے لیے جو شرارتیں کر رہے تھے وہ ان کی طرف اشارہ ہے۔ سورۂ نور کی تفسیر میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ ان منافقین کے دلوں پر یہ بات بہت شاق تھی کہ مسلمانوں کو دوسرے تمام گروہوں کے مقابل میں غیر معمولی اخلاقی برتری حاصل ہے جو ان کی دعوت کی مقبولیت میں بڑے اہم عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے حسد کے جنون میں اس کا توڑ یہ نکالا کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے خلاف بے سروپا الزامات تراشیں اور لوگوں میں ان کو پھیلائیں تاکہ مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ مجروح اور ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ واقعۂ افک کی تفصیلات سورۂ نور کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہیں۔ وہ فتنہ بھی اسی مقصد سے اٹھایا گیا تھا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی اسی سعیٔ نامراد کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو لوگ مسلمان مردوں اور عورتوں کو جھوٹے الزامات میں ملوث کر رہے ہیں وہ صریح بہتان اور کھلے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی اس روش سے اگر یہ باز نہ آئے تو اس کا انجام دیکھیں گے!

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۵۹)

گھروں سے باہر نکلنے کی صورت میں پردے کے آداب

منافقین و اشرار کی ایذا رسانیوں سے محفوظ کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو بھی اور عام مسلمان خواتین کو بھی یہ ہدایت کر دی گئی کہ جب انھیں کسی ضرورت سے گھروں سے باہر قدم نکالنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ اپنی بڑی چادروں کا کچھ حصہ اپنے چہروں پر لٹکا لیا کریں۔ اس طرح ان کے اور دوسری غیر مسلم عورتوں اور لونڈیوں کے درمیان امتیاز ہو جائے گا اور کسی کو ان سے تعرض کے لیے بہانہ ہاتھ نہیں آئے گا۔

سورۂ نور میں، یاد ہوگا، اعزہ و اقربا سے متعلق یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جب وہ اجازت کے بعد گھروں میں داخل ہوں گے تو گھر کی خواتین سمٹ سمٹا کر رہیں، اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ کریں اور اپنے

سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکّل مار لیا کریں[۱]۔ یہاں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اپنی بڑی چادروں (جلابیب) کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں۔ اس کو اپنے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان بڑی چادروں سے گھونگٹ نکال لیا کریں۔ یہ واضح قرینہ اس بات کا ہے کہ یہ ہدایت اس صورت سے متعلق ہے جب عورتوں کو کسی ضرورت سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے۔ اس قرینہ کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اس کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ 'ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ' (یہ اس بات کے قریب ہے کہ ان کا امتیاز ہو جائے اور ان سے تعرض نہ کیا جائے) ظاہر ہے کہ یہ مقصد باہر نکلنے ہی کی صورت میں مدنظر ہو سکتا ہے۔ اس کا دوسرا واضح قرینہ یہ ہے کہ یہاں لفظ 'خمار' نہیں بلکہ 'جلباب' استعمال ہوا ہے۔ 'جلباب' کی تشریح اہلِ لغت نے یوں کی ہے کہ 'هو الرداء فوق الخمار' 'جلباب' اس بڑی چادر کو کہتے ہیں جو اوڑھنی کے اوپر لی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بڑی چادر کے لینے کی ضرورت گھروں کے اندر نہیں پیش آتی تھی بلکہ شرفائے عرب کی خواتین اس وقت اس کو لیتی تھیں جب انھیں گھروں سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش آتی۔ شعرائے جاہلیت کے کلام سے یہ بات ثابت ہے کہ شرفائے عرب میں 'جلباب' کا رواج تھا۔ یہاں بہت سے اشعار نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ قبیلۂ ہذیل کی ایک شاعرہ کا ایک شعر ہمارے دعوے کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ وہ اپنے کسی مقتول کے مرثیہ میں کہتی ہے:

تمشی النسور الیه وهی لاهیة — مشی العذاری علیهن الجلابیب

اس شعر میں جو نادر تشبیہ ہے اس پر گفتگو کا تو یہاں محل نہیں ہے، بات دوسرے گوشوں میں نکل جائے گی۔ بس اتنی بات یاد رکھیے کہ زمانۂ جاہلیت میں سب 'متبرجات' اور 'بیگمات' ہی نہیں تھیں بلکہ شرفا کے خاندانوں کی بہوئیں بیٹیاں بھی تھیں جو باہر نکلنے کی صورت میں اپنی اوڑھنیوں کے اوپر 'جلباب' ڈالا کرتی تھیں۔ قرآن نے اس 'جلباب' سے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ مسلمان خواتین گھروں سے باہر نکلیں تو اس کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں تاکہ چہرہ بھی فی الجملہ ڈھک جائے اور انھیں چلنے پھرنے میں بھی زحمت پیش نہ آئے۔ یہی 'جلباب' ہے جو ہمارے دیہاتوں کی شریف بڑی بوڑھیوں میں اب بھی رائج ہے اور اسی نے فیشن کی ترقی سے اب برقع کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس برقع کو اس زمانے کے دلدادگانِ تہذیب اگر تہذیب کے خلاف قرار دیتے ہیں تو دیں لیکن قرآن مجید میں اس کا حکم نہایت واضح الفاظ میں موجود ہے جس کا انکار صرف وہی برخود غلط لوگ کر سکتے ہیں جو خدا اور رسول سے زیادہ مہذب ہونے کے مدعی ہوں۔

مسلمان خواتین کے لیے ایک علامتِ امتیاز

'ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ'۔ یہ مسلمان خواتین کے لیے ایک علامتِ امتیاز مقرر کر دی

---

[۱] وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (النور: ۳۱) (اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکّل مار لیا کریں)۔

گئی تاکہ جہاں کہیں بھی وہ نکلیں ہر شخص ان کو دور ہی سے پہچان لے کہ یہ مسلمان خواتین ہیں اور تعرض کی جرأت نہ کرے اور اگر کرے تو اس کے عواقب دور تک سوچ کر کرے۔ اس زمانہ میں مدینہ میں غیر مسلم عورتیں بھی تھیں جن کے ہاں پردہ کی پابندیاں نہیں تھیں نیز لونڈیاں بھی تھیں جن کا معیارِ زندگی اور معیارِ اخلاق دونوں پست تھا اس وجہ سے شریر لوگوں کے لیے عذر کے مواقع بہت تھے۔ اگر وہ کسی مسلمان خاتون پر راہ چلتے کوئی فقرہ چست کرتے یا اس سے کوئی بات کرنے کی کوشش کرتے اور ان پر گرفت ہوتی تو وہ یہ جواب دے دیتے کہ ہم نے سمجھا کہ یہ فلاں کی لونڈی ہے اور اس سے فلاں بات ہم نے معلوم کرنی چاہی تھی۔ اس علامتِ امتیاز کے قائم ہو جانے کے بعد اس قسم کے بہانوں کی راہ مسدود ہو گئی۔

ایک غلط فہمی

اس ٹکڑے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ ایک وقتی تدبیر تھی جو اشرار کے شر سے مسلمان خواتین کو محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کی گئی اور اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اوّل تو احکام جتنے بھی نازل ہوئے ہیں سب محرکات کے تحت ہی نازل ہوئے ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ محرکات نہ ہوں تو وہ احکام کالعدم ہو جائیں، دوسرے یہ کہ جن حالات میں یہ حکم دیا گیا تھا کیا کوئی ذی ہوش یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس زمانے میں حالات کل کی نسبت ہزار درجہ زیادہ خراب ہیں البتہ حیا اور عفت کے وہ تصورات معدوم ہو گئے جن کی تعلیم قرآن نے دی تھی۔

'وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا' یہ فقرہ اس حکم تسہیل کے لیے ارشاد ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خواتین اپنی حد تک یہ احتیاط ملحوظ رکھیں۔ اگر اس کے باوجود کوئی بھول چوک ہو گئی تو اللہ غفور رحیم ہے۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ۚ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا (۶۰ - ۶۱)

منافقین کو آخری تنبیہ

یہ ان اشرار و منافقین کو دھمکی دی ہے کہ اگر یہ اپنی ان شرارتوں سے باز نہ آئے تو ان کے باب میں چشم پوشی و مسامحت کا جو رویہ اب تک رہا ہے وہ یکسر بدل جائے گا اور ہم تم کو (خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) ہر قدم پر ان کے محاسبہ و تعاقب کا حکم دے دیں گے۔ پھر ان کو اس شہر میں بہت کم رہنا نصیب ہو گا ــــ اس کے بعد جتنے دن بھی یہ یہاں جئیں گے ملعون ہو کر زندگی گزاریں گے۔ ہر قدم پر ان کی دار و گیر ہو گی۔ یہ پکڑے جائیں گے اور نہایت عبرت انگیز طریقوں سے قتل ہوں گے۔

'وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ' میں 'مرض' سے، جیسا کہ دوسرے محل میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے، حسد، کینہ اور بغض و عناد مراد ہے۔ منافقین کا یہ گروہ صرف ضعفِ عزم و ارادہ ہی کا مریض نہیں تھا بلکہ اس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام اور مسلمانوں پر سخت حسد تھا۔ لیکن بزدلی کے سبب سے اس نے کفار کی طرح کھلم کھلا مخالفت کرنے کے بجائے مسلمانوں کے اندر گھس کر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کیں۔

'اَلْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَۃِ' سے اشارہ منافقین کے اس گروہ کی طرف ہے جو مدینہ میں سنسنی پھیلانے اور بُری افواہیں اڑانے میں نہایت شاطر تھا۔ ان افواہوں سے اس کا مقصد مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنا اور ان کی اخلاقی ساکھ کو گرانا ہوتا تھا۔ پیچھے جنگِ احزاب اور حضرت زیدؓ و حضرت زینبؓ کے معاملے میں اس گروہ کا جو کردار بیان ہوا ہے وہ اس 'اِرجاف' کی نہایت واضح مثال ہے۔ لغت میں 'اِرجاف' کے معنی لوگوں کے اندر اضطراب و بے چینی پھیلانے کے ارادے سے بُری اور فتنہ انگیز خبروں کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ 'ارجاف' کے ماہرین صرف اسی دور کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ اس کے بڑے بڑے ائمہ ماضی میں بھی گزر چکے ہیں۔

'لَنُغْرِیَنَّکَ بِھِمْ' کے لغوی معنی تو یہ ہوں گے کہ ہم تم کو ان کے خلاف اکسا دیں گے، بھڑکا دیں گے، ابھار دیں گے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اب تک تو ہم نے تم کو ان کے معاملے میں عفو و صفح کی روش اختیار کرنے کی ہدایت کر رکھی ہے لیکن یہ اس کی قدر کرنے کے بجائے دن بدن دلیر ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ اپنی اس شرارت سے باز نہ آئے تو ہم تم کو ان کی دارو گیر کے احکام دے دیں گے جس کے بعد مدینہ کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہو جائے گی۔ اول تو ان کو تمہارے دامنِ امن میں پھٹکنا ہی بہت کم نصیب ہو گا اور اگر کچھ ہو گا بھی تو خدا کی لعنت اور پھٹکار کے ساتھ ہو گا۔ 'اَیْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا' اسی ملعونیت کی تصویر ہے۔ چنانچہ بعد کے ادوار میں ان منافقین کو اسی حشر سے سابقہ پیش آیا۔ ان میں سے جنھوں نے اپنی روش کی اصلاح نہیں کی ان کا انجام وہی ہوا جو قریش اور یہود کے اشرار کا ہوا۔ اس کی تفصیل سورۂ انفال اور سورۂ توبہ میں گزر چکی ہے۔

سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (۶۲)

یہ بعینہٖ وہی اسلوبِ کلام ہے جو آیت ۲۸ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء کی مخالفت کرنے والے اس سے پہلے جو منافقین و کفار گزر چکے ہیں ان کے ساتھ بھی اللہ نے یہی معاملہ کیا تو اللہ کی اس سنت کو تم پیشِ نظر رکھو، یہی معاملہ اللہ تمہارے ان دشمنوں کے ساتھ بھی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

۱۳۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۶۳-۷۳

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پہلے قیامت کی یاددہانی فرمائی ہے کہ مجرد اس بنا پر کہ اس کا وقت پیغمبر نہیں بتا سکتے یا لوگوں کے مطالبہ پر اس کو دکھا نہیں سکتے اس کو مذاق سمجھنا نہایت ناعاقبت اندیشانہ روش ہے۔ وہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کے ظہور کا وقت اگرچہ اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن وہ آ کے رہے گی اور اس دن کوئی کسی کا حامی و شفیع نہ بن سکے گا بلکہ ہر شخص اپنے اعمال اور اپنی ذمہ داریوں

سے تعلق خود مسئول ہوگا۔ اس دن کسی کا یہ عذر نافع نہیں ہوگا کہ اس نے اپنے لیڈروں اور بڑوں کی پیروی کی اور انھوں نے اس کو گمراہ کیا۔

اس کے بعد مسلمانوں بالخصوص منافقین کو تنبیہ فرمائی ہے کہ اپنے رسول کے معاملے میں ایذا رسانی کی وہ روش نہ اختیار کرو جو یہود نے حضرت موسیٰؑ کو ایذا پہنچانے کے لیے اختیار کی ورنہ اس کا انجام وہی ہوگا جس سے یہود کو دوچار ہونا پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ہر الزام سے بری کیا اور ان کے مخالفین پر ہمیشہ کے لیے لعنت کر دی۔ مسلمانوں کے لیے صحیح روش، جو دنیا و آخرت دونوں کی کامرانیوں کی ضامن ہے، یہ ہے کہ وہ رسولؐ کے ہر حکم پر 'سمعنا واطعنا' کہیں۔

آخر میں یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے عظیم شرف سے نوازا ہے کہ اس کو اپنی اس امانت کا امین بنایا ہے جس کا اہل آسمان و زمین میں اس نے صرف اسی کو ٹھہرایا۔ اس امانت کی ذمہ داریاں ادا کرنے ہی پر اس کے تمام شرف کا انحصار ہے۔ اگر وہ اس کا حق ادا کرے تو وہ فرشتوں کا مسجود ہے اور اگر حق نہ پہچانے تو پھر وہ اسفل سافلین کا سزاوار ہے۔ اس امانت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک دن وہ اس کی بابت مسئول ہو، وہ اس کی سزا بھگتیں اور جنھوں نے اس کی نگہداشت کی ہو وہ اس کا صلہ پائیں ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۶۳-۷۳

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۖ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَا
يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ
وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿۶۴﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا
وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۶۵﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِى النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَاۤ
اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا
وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿۶۷﴾ رَبَّنَاۤ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ
ع ۸ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا
كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۗ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ
وَجِيْهًا ﴿۶۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۷۰﴾

يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ
رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۱﴾ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا
الْاِنْسَانُ ۗ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ
وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ
وَالْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۳﴾ ع ۹ ۵

ترجمۂ آیات ۶۳-۷۳

لوگ تم سے قیامت کے وقت کو پوچھتے ہیں۔ کہہ دو، اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس
ہے۔ اور تمھیں کیا پتہ، شاید قیامت قریب ہی آ لگی ہو۔ ۶۳

بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کر چھوڑی ہے اور ان کے لیے اس نے آگ کا
عذاب تیار کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا اور نہ
کوئی مددگار۔ جس دن ان کے چہرے آگ میں اُلٹے پلٹے جائیں گے۔ وہ کہیں گے، اے
کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی! اور کہیں گے،
اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی بات مانی تو انھوں نے ہماری راہ ماری۔
اے ہمارے رب! ان کو دونا عذاب دے اور ان پر بہت بھاری لعنت کر! ۶۴-۶۸

اے ایمان والو، ان لوگوں کے مانند نہ بنو جنھوں نے موسیٰ کو ایذا پہنچائی تو اللہ نے اس
کو ان لوگوں کی تہمتوں سے بری کیا اور وہ اللہ کے نزدیک باوقار ٹھہرا۔ اے ایمان والو، اللہ
سے ڈرو اور درست بات کہو، اللہ تمھارے اعمال سدھارے گا اور تمھارے گناہوں کو
بخشے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہیں گے تو انھوں نے بہت بڑی

کامیابی حاصل کی۔ ۶۹-۷۱

اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے۔ تاکہ اللہ منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کو سزا دے اور مومنین و مومنات کو اپنی رحمت سے نوازے، اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۷۲-۷۳

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللَّهِ ۚ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا (۶۳)

قیامت ایک حقیقت ہے اگرچہ اس کا وقت معلوم نہیں۔

یعنی ان اشرار و مفسدین کو جب قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ ہم نہ جانے کب سے اس کا ڈراوا سن رہے ہیں لیکن نہ وہ آئی، نہ کبھی آئے گی۔ اگر اس کو آنا ہے تو آخر وہ آ کیوں نہیں جاتی! اس کے آنے کا وقت کب آئے گا! مطلب یہ ہے کہ یہ محض ایک دھونس ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور ہم اس دھونس میں آنے والے نہیں ہیں۔

'قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللَّهِ' فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ جہاں تک اس کے آنے کے وقت کا تعلق ہے اس کا علم تو بس اللہ ہی کو ہے۔ کائنات کے اس بھید کو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ نہ اس کو میں جانتا ہوں اور نہ کسی اور کو اس کا علم ہے۔ البتہ اس کا آنا یقینی ہے، جس سے میں تمھیں آگاہ کر رہا ہوں۔ اگر میں اس کا وقت نہیں بتا سکتا تو اس سے اس کی نفی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے مقام میں اس بات کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ کسی چیز کے ظہور کا وقت نہ معلوم ہونے سے نفس اس شے کا انکار ایک احمقانہ منطق ہے۔ قیامت تو در کنار ہماری روزمرہ کی زندگی کی کتنی عام اور روز حقیقتیں ہیں جن کا وقت اگرچہ معلوم نہیں ہوتا لیکن کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کرتا۔ انسان کے علم کی رسائی بہت محدود ہے۔ وہ ہر چیز کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے اندر قیامت کی شہادت موجود ہے تو مجرد اس بنا پر اس کا مذاق اڑانا کہ اس کا وقت نہیں بتایا جا سکتا، محض ابلہی و خود فریبی ہے۔

'وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا' یہ اسلوبِ کلام کسی شے کی عظمت، اہمیت اور اس کی

ہونا ہی کو ظاہر کرتا ہے۔ مخالفین کے سوال میں جو طنز و استہزاء مضمر ہے یہ اس کا جواب ہے کہ مجرد اس بنا پر کہ تم قیامت کا وقت نہیں بتا سکتے لوگ تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں، تمہیں کیا خبر، شاید وہ قریب ہی آ گئی ہوا ـــــ اس فقرے میں یہ اشارہ فرما دیا گیا کہ اب اس کے ظہور میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور قیامت کا مذاق اڑانے والوں کے لیے نہایت سخت انذار و تنبیہ ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی ہیں اس وجہ سے آپ کی بعثت کے بعد دنیا کی عدالت کے لیے آخری مرحلہ اب قیامت ہی کا باقی رہ گیا۔ اس پر مفصل بحث اس کے محل میں ان شاء اللہ آئے گی۔

إِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَأَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۶۴-۶۵)

منکرین قیامت کو انذار

اوپر کی آیت میں جو انذار مضمر تھا یہ اس کو کھول دیا کہ آج جو لوگ قیامت کا انکار کر رہے ہیں وہ کان کھول کر سن لیں کہ اللہ نے ان پر لعنت کر دی ہے اور ان کے لیے اس نے دوزخ کا عذاب تیار کر رکھا ہے جس میں ان کو ہمیشہ رہنا ہے اور اس میں کوئی ان کا کارساز و مددگار نہ بن سکے گا۔ نہ ان کے وہ شرکاء و شفعاء ان کے کچھ کام آنے والے نہیں گے جن کے اعتماد پر وہ پچنت بیٹھے ہیں اور نہ ان کی یہ جماعت و جمعیت ہی ان کی کچھ مدد کر سکے گی جس پر اس دنیا میں ان کو بڑا ناز ہے۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ أَطَعْنَا اللّٰهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۝ وَقَالُوْا رَبَّنَآ إِنَّآ أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَأَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا (۶۶-۶۸)

'تَقْلِیْبٌ' کے معنی الٹنے پلٹنے کے ہیں گوشت کو آگ پر بھونتے ہیں تو اس کو کبھی ایک جانب سے بھونتے ہیں کبھی دوسری جانب سے۔ فرمایا کہ یہی گت ان کی بننے والی ہے۔ یہ دوزخ کی آگ میں اپنے چہروں کے بل اس طرح گھسیٹے جائیں گے کہ دونوں طرف سے ان کے چہرے بھن جائیں گے۔ چہرے کا ذکر خاص طور پر اس وجہ سے فرمایا کہ اعترافِ حق سے اعراض و استکبار کی رعونت کا سب سے زیادہ نمایاں مظہر یہی ہوتا ہے جب اس کا حشر یہ ہونا ہے تو دوسری چیزیں اسی کے توابع میں داخل ہیں۔ فرمایا کہ آج جس قیامت کا یہ مذاق اڑا رہے ہیں جب اس طرح اس کی حقیقت ان کے لیے بے نقاب ہوگی تب وہ نہایت حسرت کے ساتھ یہ تمنا کریں گے کہ اے کاش! ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی اور اپنے لیڈروں اور بڑوں کے چکمے میں آ کر اپنے لیے یہ شامت نہ بلائی ہوتی! اس دن یہ کھلم کھلا اپنی گمراہی کی ساری ذمہ داری اپنے لیڈروں اور بزرگوں پر ڈالیں گے کہ ہم نے ان کی بات مانی اور انھوں نے صحیح راہ سے ہم کو بھٹکایا اور خدا سے یہ درخواست کریں گے کہ اے رب! چونکہ یہی ہماری گمراہی کے باعث ہوئے ہیں اس وجہ سے تو ان کو ہمارے مقابل میں دونا عذاب دے اور جو لعنت ان کے سبب سے ہم پر ہوئی ہے اس سے بڑی

لعنت کر ان پر کر۔ یہاں صرف ان لوگوں کی درخواست کا حوالہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس درخواست کا جو جواب دے گا اس کا ذکر سورۂ اعراف آیت ۳۸ میں آیا ہے کہ لِكُلٍّ ضِعْفٌ تم اور تمہارے لیڈر دونوں ہی دونے عذاب کے سزاوار ہو۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

کسی کی تقلید آنکھ بند کر کے جائز نہیں — یہاں 'سَادَتَنَا' اور 'كُبَرَآءَنَا' کے دو لفظ آئے ہیں۔ 'سادۃ' سے مراد تو ظاہر ہے کہ لیڈر اور سردار ہیں اور 'کبرآء' سے مراد ان کے خاندانی و مذہبی پیشوا ہیں۔ ان میں سے کسی کی بھی آنکھ بند کر کے اطاعت کرنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کو حق و باطل میں امتیاز کے لیے عقل عطا فرمائی ہے۔ اس وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اس کسوٹی سے کام لے۔ جو اس سے کام لے گا اگر وہ کہیں ٹھوکر بھی کھائے گا تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو سہارا دے اور معاف فرمائے لیکن جو شخص آنکھیں بند کر کے اپنی باگ دوسروں کے ہاتھ میں پکڑا دے گا اس کا حشر وہی ہوگا جو اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا (۶۹)

انبیاء کو ایذا پہنچانا یہود کی سنت ہے — قیامت کا ذکر بیچ میں تذکیر و تنبیہ کے طور پر آگیا تھا اوپر سے ذکر ان منافقین کا چل رہا تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین و مومنات کو اپنی ریشہ دوانیوں اور تہمت تراشیوں سے روحانی و قلبی اذیتیں پہنچانے میں سرگرم تھے۔ اس تنبیہ کے بعد اسی مضمون کو از سر نو لیا اور مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ ان یہود کی روش کی تقلید نہ کرو جنھوں نے قدم قدم پر حضرت موسیٰؑ کو اپنی تہمتوں، شکایتوں اور درپردہ سازشوں سے اذیتیں پہنچائیں لیکن اللہ نے ان کو ہر الزام و تہمت سے بری، نہایت عزت و آبرو کے ساتھ، اس دنیا سے اٹھایا البتہ وہ لوگ دنیا اور آخرت دونوں میں ذلیل و خوار ہوئے جنھوں نے ان کو ایذا پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن خاص طور پر منافقین کی طرف ہے۔

یہود کے ایذا کی بعض مثالیں — حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل نے جو اذیتیں پہنچائی ہیں اس کا شکوہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی بھی قرآن مجید میں مذکور ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (الصف ۶۱ - ۵)	اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میری قوم کے لوگو، تم مجھے کیوں دکھ پہنچاتے ہو درآنحالیکہ تمھیں اچھی طرح علم ہے کہ میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔

تورات کی کتاب تثنیہ باب ۹ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے جب بنی اسرائیل کو فلسطین پر چڑھائی کے لیے ابھارا اور انھوں نے اپنی روایت کے مطابق بزدلی دکھائی تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو ان الفاظ میں ملامت کی۔

"تو (خطاب بنی اسرائیل سے ہے) اس بات کو یاد رکھ اور کبھی نہ بھول کہ تو نے خداوند اپنے خدا کو بیابان میں کس کس طرح غصہ دلایا بلکہ جب سے تم ملک مصر سے نکلے ہو تب سے اس جگہ پہنچنے تک تم برابر خداوند سے

بغاوت ہی کرتے رہے ہوں۔

تورات میں بار بار اس بات کا ذکر آتا ہے کہ بنی اسرائیل کو جب کوئی آزمائش پیش آتی تو وہ اس کا الزام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ڈال کر ان کو ہدف ملامت بناتے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں بعض واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مصر میں حضرت موسیٰ کی دعوت کے بعد جب بنی اسرائیل کو آزمائشوں سے سابقہ پیش آیا تو انھوں نے ان سب کا سبب حضرت موسیٰ کو ٹھہرایا اور کہا کہ اس شخص کی بدولت ہم اس کی پیدائش سے پہلے بھی آفتوں میں مبتلا رہے اور اس کی پیدائش کے بعد بھی ہدف مصائب رہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ان کو ملک مصر سے لے کر نکلے اور مصریوں نے ان کا تعاقب کیا تو ساری قوم نے بڑبڑانا شروع کیا کہ یہ دیکھو، اس شخص نے ہمیں کہاں لا کر ہمارے مروانے کا سامان کیا ہے۔

دریا پار کرنے کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر تورات لینے گئے تو قوم کے ایک بہت بڑے حصہ نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ شخص تو ہمیں یہاں چھوڑ کر معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا اور اب وہ آنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے سامری سے ایک بچھڑا بنوایا اور اس کی پرستش شروع کر دی۔

قارون نے اپنی ایک پارٹی بنائی اور لوگوں میں یہ فتنہ پھیلایا کہ یہ شخص (حضرت موسیٰ) تنہا سارے دین کے جاننے اور لوگوں کی پیشوائی کا اجارہ دار بن بیٹھا ہے حالانکہ خدا کی نظر میں سب برابر ہیں۔ اس شخص کو ہم پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔

بیابان کی زندگی کے دور میں جب کھانے پینے کی تکلیف ہوئی تو انھوں نے علانیہ حضرت موسیٰ کو ملامت کی کہ کیا مصر میں ہمارے لیے قبروں کی جگہ نہیں تھی کہ تو نے ہمیں بھوک پیاس سے مرنے کے لیے یہاں بیابان میں لا کر ڈال دیا ہے۔

بیابان میں جب کھانے کے لیے منّ و سلویٰ اور پانی کے لیے اکٹھے بارہ چشموں کا انتظام ہو گیا تو انھوں نے پھر بڑبڑانا شروع کیا کہ اس منّ و سلویٰ سے تو ہماری جان سوکھ گئی، ہمیں تو مصر کے کھیرے، ککڑیاں اور لہسن پیاز یاد آتے ہیں۔

حضرت موسیٰ نے جب ان کو فلسطین پر حملہ کرنے کے لیے ابھارا تو انھوں نے کہا کہ تم وہاں کے زور آور اور جبار باشندوں کی تلواروں سے ہمارا قیمہ کرانا چاہتے ہو۔ ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔ لڑنا ہے تو تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

بنی اسرائیل کی اس روش پر حضرت موسیٰ نے جن دردانگیز الفاظ میں بار بار اپنے رنج و غم کا اظہار فرمایا ہے ان کو تورات میں پڑھیے تو کچھ اندازہ ہوگا کہ انھیں اپنی قوم کے ہاتھوں کیا کیا دکھ جھیلنے پڑے ہیں۔

بنی اسرائیل کی اسی طرح کی ایذا رسانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں مسلمانوں کو نصیحت فرمائی ہے کہ تم اپنے

رسول کے ساتھ اس طرح کا معاملہ نہ کرو جس طرح کا معاملہ بنی اسرائیل نے حضرت موسٰی علیہ السلام کے ساتھ کیا ورنہ اسی انجام سے دو چار ہو گے جس انجام سے وہ دوچار ہوئے۔

'فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا' یعنی اللہ تعالیٰ نے بالآخر حضرت موسٰی علیہ السلام کو ہر الزام سے بری کیا۔ ہر تہمت کے مقابل میں ان کی سچائی، نیک نیتی اور راست بازی آشکارا ہوئی اور ان کے دشمن ذلیل و رسوا ہوئے۔ وہ اللہ کے نزدیک باوقار، باآبرو اور سرخ رو ٹھہرے۔ ان کی وجاہت دنیا میں بھی چمکی اور آخرت میں بھی روشن ہوگی۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بالواسطہ بشارت ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۷۰-۷۱)

صحیح روش جو ایمان کا تقاضا ہے

یہود کی روش سے احتراز کرنے کی ہدایت کے بعد اس صحیح روش کے اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی جو اللہ اور رسول پر ایمان کا تقاضا ہے۔ فرمایا کہ اللہ سے ڈرو۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچانے والے نہ بنو۔ وہ مجرموں کو پکڑتا دیر میں ہے لیکن جب پکڑتا ہے تو کوئی اس کی پکڑ سے نہ بھاگ سکتا ہے، نہ کوئی اس سے رہائی دلا سکتا ہے۔

'وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا' یعنی ایمان لانے کے مدعی بنے ہو تو وہ بات کہو جو اس ایمان کا براہ راست تقاضا ہے اور اس کا سیدھا سادہ لازمی مطالبہ ہے۔ یہ اشارہ 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کے اعتراف و اقرار کی طرف ہے۔ اسی اقرار سے ایمان کی تصدیق ہوتی ہے اور آگے کے لیے ہدایت کی راہیں کھلتی ہیں۔ اس میں یہود کے قول 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' پر ایک لطیف تعریض بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہود کی بات بالکل الٹی تھی۔ وہ ایمان کے مدعی تھے لیکن ان کا کلمہ گویا 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' (ہم نے سنا اور نافرمانی کی) تھا۔ تم ایمان کی سیدھی روش اختیار کرنا چاہتے ہو تو اپنا کلمہ اور شعار 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' (ہم نے سنا اور مانا) بناؤ۔

صحیح روش اختیار کرنے کا ثمرہ

'يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ' یہ اس 'قول سدید' کا ثمرہ بتایا ہے کہ اگر تم اپنے قول و عمل کے تضاد کو دور کر لو گے تو اللہ تمہارے اعمال کو برومند کرے گا، تمہاری ہر کل سیدھی ہو جائے گی اور تمہارا ہر قدم صحیح سمت میں اٹھے گا۔ اس صورت میں اگر تم سے کوئی غلطی بھی صادر ہوگی تو اللہ تعالیٰ تمہاری غلطیوں سے درگزر فرمائے گا۔ اللہ ان لوگوں کو نفس اور شیطان کے حوالے نہیں کرتا جو سیدھی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

'وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا' اس ٹکڑے نے کلام کے تدریجی ارتقاء کے اصول پر واضح کر دیا کہ 'قول سدید' سے مراد 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا اقرار ہی ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ سمع و طاعت کا اقرار کرنے کے بعد زندگی کے ہر مرحلے میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں

وہ بہت بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ یہ ابدی بادشاہی کی کلید ہے تو جس کو بازی جیتنی ہو وہ جیتے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝ لِّيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا (۷۲-۷۳)

انسان کا اصلی شرف

اب یہ انسان کا اصلی شرف واضح فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عہدِ اطاعت کا امین ہے۔ یہ عہد اختیار و ارادہ کی آزادی پر مبنی ہے اس وجہ سے وہی اس کا سزاوار ٹھہرا۔ اس لیے کہ عہد کا اہل وہی ہوتا ہے جس کو اختیار و ارادہ کی آزادی حاصل ہو۔ جو مخلوقات مجبور و مقہور ہیں ان سے کسی عہد و میثاق کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ نے تمام ذریتِ آدم سے لیا ہے اور یہی عہد اس خلافت کی بنیاد ہے جو اس زمین میں آدمؑ اور ذریتِ آدم کو حاصل ہوئی اور اسی خلافت کے مقتضیات کو بروئے کار لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے اپنی ہدایت اور کتاب و شریعت نازل کرنے کا وعدہ فرمایا اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرمائی کہ جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے وہ جنت کے وارث ٹھہریں گے اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے وہ سب جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی وعدے کو پورا کرنے کے لیے اپنے نبی و رسول بھیجے جنھوں نے اپنی اپنی امتوں سے اس عہدِ اطاعت و بندگی کی تجدید کرائی اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس کے نتائج سے آگاہ کیا۔

اس عہد کی بنیاد چونکہ انسان کے ارادہ کی آزادی پر ہے اس وجہ سے اس کی حیثیت شمشیرِ دودم کی ہے۔ اگر انسان اپنے ارادہ کی آزادی کے ساتھ اپنے رب کی بندگی کے عہد کو پورا کرے تو اللہ کے نزدیک اس سے کوئی اونچا نہیں اور اگر وہ اس عہد کو پورا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے خدا کی بخشی ہوئی سب سے بڑی عزت کو اپنے لیے سب سے بڑی ذلت بنا لیا۔

• ہر عہد ایک امانت ہے اور ہر امانت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس کی بابت امانت رکھنے والا ایک دن پرسش کرے کہ اس کی امانت کا حق ادا کیا گیا ہے یا اس میں خیانت کی گئی ہے۔ یہ چیز ایک روزِ جزا و سزا کو مستلزم ہوئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو اکٹھا کرے گا اور ان کے اعمال کے ریکارڈ ان کے سامنے رکھ کر فیصلہ فرمائے گا کہ کون کون منافق ہیں جو دوزخ کے سزاوار ہیں اور کون مومن و مخلص ہیں جو جنت کے حق دار ہیں۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اطاعت بالاختیار کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے بھی پیش کی تھی لیکن وہ اس عظیم ذمہ داری کے اٹھانے سے ڈرے اور اپنی معذرت پیش کر دی کہ ان

کہ اس بارِ گراں سے معاف رکھا جائے۔ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کی یہ معذرت زبانِ حال سے بھی ہو سکتی ہے اور زبانِ قال سے بھی۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کی زبانِ حال و قال دونوں سمجھتا ہے۔ قرآن میں اس بات کی تصریح ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے لیکن ان کی تسبیح کو صرف اللہ تعالیٰ ہی سمجھتا ہے، دوسرے اس کو نہیں سمجھتے۔

اسی طرح ہر ذمہ داری کے تحمل کے لیے ایک خاص صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ اگر وہ صلاحیت موجود نہ ہو تو اس کا تحمل ممکن نہیں ہے۔ آپ ہر زمین میں ہر چیز کی کاشت نہیں کر سکتے۔ زمین کا ایک معمولی ٹکڑا آپ کے ایک تخم کا امین بن جاتا ہے اور وہ آپ کی امانت کو نہ صرف محفوظ رکھتا ہے بلکہ اس کو نشوونما اور فروغ دیتا ہے۔ لیکن وہی تخم اگر آپ ایک وسیع سمندر، ایک عظیم پہاڑ یا ایک لق و دق صحرا میں ڈال دیں تو وہ اس کو نشوونما نہیں دے سکتے بلکہ وہ تخم ضائع جائے گا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی چیز کے اندر ایک چیز کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ اس سے لازماً ابا کرے گی۔ مثلاً ہماری آنکھ ایک خاص درجے کی روشنی کا تحمل کر سکتی ہے، اگر روشنی کی مقدار اس سے بڑھ جائے تو نگاہ خیرہ ہو جائے گی۔ اسی طرح ہمارا جسم ایک خاص درجے کی حرارت یا برودت برداشت کر سکتا ہے، اگر حرارت یا برودت اس سے زیادہ ہو جائے تو ہمارا جسم اس کو قبول کرنے سے ابا بھی کرے گا اور اس سے ڈرے گا بھی۔ ہمارے معدے میں خاص طرح کی چیزوں کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے، اگر ہم ان کے سوا کوئی دوسری چیز اس میں ڈالنے کی کوشش کریں تو، خواہ بجائے خود وہ کتنی ہی قیمتی چیز ہو، معدہ اس کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ یہی حال آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کا اس امانت کے معاملے میں ہوا۔ ان کے اندر اس کے اٹھانے کا ظرف نہیں تھا اس وجہ سے انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا۔

'وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ' یہ انسان کا شرف بیان ہوا ہے کہ جس بارِ امانت کو آسمان و زمین، دریا اور پہاڑ نہ اٹھا سکے اس کو انسان نے اٹھا لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان اگرچہ اپنے وجودِ مادی کے اعتبار سے اس کائنات کی ایک نہایت حقیر ہستی ہے لیکن اپنی معنوی صلاحیتوں کے اعتبار سے آسمانوں سے اونچا، زمین سے وسیع اور پہاڑوں سے زیادہ مضبوط و سربلند ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز اس کے لیے مسخر کی گئی لیکن وہ کسی کے لیے بھی مسخر نہیں کیا گیا بلکہ ربِّ کائنات کے سوا کسی کے آگے اس کا جھکنا اس کے لیے باعثِ ننگ قرار پایا۔

'إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا' یہ انسان کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ ہے جس کی بنا پر وہ اس امانت کا اہل قرار پایا۔ وہ یہ ہے کہ یہ امانت مقتضی تھی کہ انسان کے اندر متضاد داعیے موجود ہوں تاکہ اس کی آزمائش ہو سکے کہ وہ ان متضاد داعیوں کی کشاکش کے اندر اپنے رب کی اطاعت بالاختیار کے عہد کو کس طرح نباہتا اور اس کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ظلوم و جہول بنایا گیا۔

ظلم، عدل و حق کا ضد ہے اور جہل، علم اور حلم کا ضد ہے۔ 'ظلوم' اس کو کہیں گے جو عدل و حق کا شعور رکھتے ہوئے ظلم کا مرتکب ہونے والا ہو۔ اسی طرح 'جہول' اس کو کہیں گے جو علم و حلم کی صلاحیت کے باوصف جہل اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہو۔ یہی کشمکش انسان کی آزمائش ہے اور یہی اس کے تمام شرف کی بنیاد ہے۔ اگر وہ ظلم کی راہ اختیار کرنے کی آزادی رکھنے کے باوجود محض اپنے رب کی رضا کی خاطر عدل کی راہ پر استوار رہتا ہے اور اپنے سفلی جذبات کے اتباع کی آزادی کے باوجود، محض اپنے رب کے خوف سے، اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے تو لاریب اس کا مرتبہ فرشتوں سے بھی اونچا ہوا اس لیے کہ ان کو خدا کی بندگی کی راہ میں کسی کشمکش سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ ان کا راستہ بالکل ہموار اور ان کا مزاج ظلم و جہل کے دواعی سے بالکل ناآشنا ہے لیکن انسان اگر بندگی کرتا ہے تو ہر قدم پر وہ اپنے نفس اور شیطان سے لڑ کر کرتا ہے اس وجہ سے اس کی بندگی فرشتوں کی بندگی سے اونچی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس انسان اپنے اس اختیار کے سبب سے جس طرح سب سے زیادہ اونچا ہے اسی طرح وہ سب سے زیادہ نیچا بھی ہو جائے گا اگر وہ اپنے اس اختیار کی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا نہ کر سکے۔ یہی حقیقت سورۂ تین میں اس طرح واضح فرمائی گئی ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ	اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا،
تَقْوِیْمٍ ۞ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ	پھر اس کو اسفل سافلین میں گرا دیا البتہ وہ لوگ
سٰفِلِیْنَ ۞ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ	اس سے محفوظ رہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۴-۶)	نیک اعمال کیے۔

حامل امانت ہونے کا لازمی نتیجہ

لِّیُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِیْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَیَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ یہ نتیجہ بیان ہوا ہے اس امانت کا کہ اس کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں انسان اس امانت سے متعلق مسئول ہو کہ اس نے اس کا حق ادا کیا یا نہیں۔ تاکہ وہ لوگ جنھوں نے اس کے معاملے میں منافقت کی روش اختیار کی ہو یا شرک کے مرتکب ہوئے ہوں وہ اپنی اس خیانت و بدعہدی کی سزا بھگتیں، خواہ مرد ہوں یا عورتیں اور وہ لوگ جنھوں نے رسوخِ ایمان کے ساتھ اس کا حق ادا کیا ہو وہ اپنے رب کی رحمت کے سزاوار ٹھہریں، عام اس سے کہ وہ مردوں میں سے ہوں یا عورتوں میں سے۔

ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ 'توبہ' کا صلہ جب 'علیٰ' کے ساتھ آتا ہے تو یہ 'رحم' کے مفہوم پر بھی متضمن ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے یہ اہل ایمان کے لیے بشارت ہے کہ ہر چند یہ ذمہ داری ہے تو بہت بھاری لیکن اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اس نے اپنے باایمان بندوں اور بندیوں کے لیے توبہ کی راہ بھی کھلی رکھی ہے۔ اگر وہ اپنی کسی کمزوری کے سبب سے کسی ظلم یا جہل کے مرتکب ہوں گے

اور پھر توبہ کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کر کے ان پر رحم فرمائے گا۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ یہ سورہ قرآن حکیم کی مشکل سورتوں میں سے ہے اور میں اس پر قلم اٹھانے سے گھبراتا رہا ہوں۔ اگرچہ اس کی مشکلات، اپنے علم کے حد تک، میں نے بہت پہلے حل کر لی تھیں لیکن یہ تردد برابر دامن گیر رہا کہ دل و دماغ میں جو کچھ ہے قلم اس کو ادا بھی کر سکے گا یا نہیں۔ اب یہ فیصلہ تو کتاب کے صاحبِ نظر قارئین کر سکیں گے کہ میں مشکلات سے عہدہ برآ ہو سکا یا نہیں اور ہو سکا تو کس حد تک لیکن میں نے کوشش بہت کی ہے۔ میری خواہش تھی کہ ابھی اس پر مزید غور و فکر جاری رکھوں، لیکن اب اس امانت کے ادا کرنے کا آخری وقت آچکا تھا اس وجہ سے جو کچھ ذہن میں تھا اس کو سپردِ قرطاس کر دیا ہے۔ جو باتیں صحیح معلوم ہوں ان کو قبول کیجیے اور جہاں کوئی لغزش محسوس ہو اس کو نظر انداز فرمائیے۔ انسان بہرحال ظلوم و جہول ہے۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، اس سے التجا ہے کہ غلطیوں سے درگزر فرمائے۔ وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

رحمان آباد ـــــ ۱۷ شوال ۱۳۹۴ھ
۳ نومبر ۱۹۷۴ء
اتوار ـــــ ۹ بجے صبح

تدبرِ قرآن

۳۴

سبا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورتوں کا پانچواں گروپ

سورۂ سبا سے سورتوں کا پانچواں گروپ شروع ہو رہا ہے جو سورۂ حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۱۲ سورتیں ——— از سبا تا الاحقاف ——— مکی ہیں۔ آخر میں تین سورتیں ——— محمد، الفتح، الحجرات ——— مدنی ہیں۔

ب۔ گروپ کا جامع عمود

مطالب اگرچہ اس گروپ میں بھی مشترک ہیں یعنی قرآنی دعوت کی تینوں اساسات ——— توحید، قیامت، رسالت ——— پر جس طرح پچھلے گروپوں میں بحث ہوئی ہے اسی طرح اس میں بھی یہ تمام مطالب زیر بحث آئے ہیں؛ البتہ نہج استدلال اور اسلوب بیان مختلف اور جامع عمود اس کا اثبات توحید ہے جو اس مجموعہ کی تمام سورتوں میں نمایاں نظر آئے گا۔ دوسرے مطالب اسی کے تحت اور اسی کے تضمنات کی وضاحت کے طور پر آئے ہیں۔

ج۔ سورۂ سبا کا عمود اور اس کے مطالب کا تجزیہ

اس گروپ کی پہلی سورہ سورۂ سبا ہے۔ اس کا عمود اثبات توحید و قیامت ہے۔ بنیاد اس کی شکر اور اس کے تقضیات پر ہے اور مخاطب مترفین قریش ہیں۔ ذیل میں ہم بالاجمال اس کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں جس سے اس کے تمام اجزاء کا ربط عمود کے ساتھ واضح ہو جائے گا۔

(۱-۹) تمہید، جس میں اللہ تعالیٰ ہی کے سزاوار شکر ہونے کی دعوت ہے۔ اس لیے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور آخرت میں بھی تمام اختیار و اقتدار اسی کا ہوگا۔ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس وجہ سے نہ کسی کا کوئی عمل اس سے مخفی رہے گا، نہ کوئی کسی کو اپنی باطل سفارش سے چھڑا سکے گا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت نہیں ہے وہ سخت گمراہی میں ہیں۔ آخرت ایک حقیقت اور خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے۔ جن کے اندر علم کی رتی ہے وہ جانتے ہیں کہ قرآن جس توحید و قیامت کی دعوت دے رہا ہے وہ بالکل حق ہے، صرف بے فکرے اور لاابالی لوگ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کی اصل بیماری یہ ہے کہ انابت اور عبرت پذیری کی صلاحیت ان کے اندر مفقود

ہے۔ اگر یہ صلاحیت ان کے اندر ہوتی تو وہ دیکھ لیتے کہ خدا ان کو جب چاہے اور جہاں سے چاہے پکڑ سکتا ہے۔

(۱۰-۱۴) حریفِ قریش کی تنبیہ کے لیے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی مثال کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام نعمتیں عطا فرمائیں لیکن وہ غرور و استکبار میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ اپنے رب کے شکر گزار و فرمانبردار رہے۔ انھوں نے دنیا کے فتنہ میں مبتلا ہو کر شیاطین کی پیروی نہیں کی بلکہ شیاطین سے بھی اپنی پیروی کرائی۔ جو اپنے رب کی فرمانبرداری کرتے ہیں اللہ تعالیٰ شیاطین کو بھی ان کی غلامی میں دے دیتا ہے اور جو اپنے رب کی ناشکری کرتے ہیں شیاطین ان پر مسلط ہو جاتے ہیں اور ان کو شیاطین کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔

(۱۵-۲۱) ملکِ سبا کی مثال جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خدا کی نعمتیں پا کر جو قومیں خدا کی ناشکرگزاری کے بجائے طغیان و فساد میں مبتلا ہو جاتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو نہایت عبرت انگیز سزا دیا کرتا ہے۔ اہلِ سبا نے اپنے بارے میں ابلیس کے گمان کو سچا ثابت کر دیا جس کی پاداش میں اللہ نے ان کو اپنے تمام افضال سے محروم کر کے ایک افسانۂ پارینہ بنا دیا۔

(۲۲-۲۷) شرک، شرکاء اور شفاعتِ باطل کے عقیدے کی تردید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ اگر یہ مشرکین بے دلیل، محض اپنی انانیت کے غرور میں، اپنی ضد پر اڑے رہنا چاہتے ہیں تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو، تم نے اپنی دعوت پہنچا دی۔ اب ان کا فیصلہ اللہ کرے گا۔ وہ ہر چیز سے باخبر اور ہر معاملے کا دو ٹوک فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۲۸-۳۳) مخالفین کے اس معارضہ کا جواب کہ ہم اس وقت تک اس قرآن کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک وہ عذاب نہ دکھا دیا جائے جس کی ہم کو دھمکی دی جا رہی ہے۔

(۳۴-۳۹) منکرین کے اصل سببِ انکار کی طرف اشارہ کہ ان کو اس دنیا میں جو مال و جاہ حاصل ہے اس کو وہ خدا کے منظورِ نظر ہونے کی دلیل بنا بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جس طرح اس دنیا میں وہ کامیاب ہیں اسی طرح آخرت میں بھی (اگر وہ ہوئی) وہی فائز المرام رہیں گے۔ حالانکہ اس دنیا کی نعمتیں اللہ تعالیٰ جس کو دیتا ہے آزمائش کے لیے دیتا ہے کہ وہ اس کو پا کر خدا کا شکرگزار بندہ بنتا ہے یا ناشکرا۔ آخرت میں اس کے ساتھ اللہ کا معاملہ اس کے عمل کے مطابق ہو گا۔

(۴۰-۴۳) یہ تنبیہ کہ اپنے جن معبودوں کی حمایت میں یہ لوگ قرآن اور پیغمبر کی مخالفت کے لیے آج آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں ان میں سے ملائکہ کا حال یہ ہو گا کہ جب خدا قیامت کے دن ان سے سوال کرے گا کہ کیا یہ لوگ تمھاری پوجا کرتے رہے ہیں تو وہ اس سے فوراً اظہارِ براءت کریں گے اور جواب دیں گے کہ یہ جنوں کو پوجتے رہے ہیں، ہم اس سے بالکل بری ہیں۔

(۴۴-۵۴) خاتمۂ سورہ جس میں پہلے تو اس عظیم احسان کی طرف توجہ دلائی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی صورت میں ان لوگوں پر فرمایا جو اس سے پہلے قرآن و کتاب سے بالکل ناآشنا تھے پھر نہایت ناصحانہ انداز میں ان کو معاملے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے فیصلہ کرنے کی دعوت دی اور آخر میں یہ دھمکی دی کہ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر بیٹھ کے پچھتاؤ گے لیکن گزرا ہوا وقت ہاتھ نہیں آئے گا۔

سُوْرَةُ سَبَاٍ (۳۴)

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــ اٰيَاتُهَا ۵۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ آیات
الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝۱ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی ۱-۶
الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ
وَهُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ ۝۲ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِیْنَا السَّاعَةُ ؕ
قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَیْبِ ۚ لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ
فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ
مُّبِیْنٍ ۝۳ لِّیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ
مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ ۝۴ وَالَّذِیْنَ سَعَوْ فِیْۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓىِٕكَ
لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ ۝۵ وَیَرَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِیْۤ
اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَیَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ
الْحَمِیْدِ ۝۶ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰی رَجُلٍ یُّنَبِّئُكُمْ
اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۝۷ اَفْتَرٰی عَلَی

اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي
الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ﴿۸﴾ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا
خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ
ع عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴿۹﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۹

شکر کا حقدار وہ اللہ ہی ہے جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی حمد آخرت میں بھی ہوگی اور وہی حقیقی حکیم و خبیر ہے۔ وہ جانتا ہے ہر اس چیز کو جو زمین کے اندر داخل ہوتی ہے اور جو اس سے برآمد ہوتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے اور وہی رحم فرمانے والا اور بخشنے والا ہے۔ ۱ - ۲

اور جنھوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آنے کی۔ کہہ دو، ہاں میرے خداوند عالم الغیب کی قسم، وہ ضرور تم پر آکے رہے گی! اس سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں ہے، نہ آسمانوں اور نہ زمین میں، اور نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز اور نہ بڑی۔ مگر وہ ایک واضح کتاب میں مرقوم ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو صلہ دے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے۔ وہی لوگ ہیں جن کے لیے مغفرت اور رزق کریم ہے۔ اور جو ہماری آیات کو زک پہنچانے کی سعی میں سرگرم ہیں وہی ہیں جن کے لیے دردناک عذاب کا خاص حصہ ہوگا۔ ۳ - ۵

اور جن کو علم عطا ہوا ہے وہ، اس چیز کو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے، سمجھتے ہیں کہ یہی حق ہے اور وہ خدائے عزیز و حمید کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ۶

اور جنھوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم تم کو ایک ایسا آدمی دکھائیں جو تم کو یہ خبر دے رہا ہے کہ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو از سر نو ایک نئی خلقت میں اٹھائے جاؤ گے! کیا اس

نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے یا اس کو کسی قسم کا جنون ہے! بلکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہی عذاب اور نہایت دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ۸

کیا انھوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان و زمین پر نظر نہیں ڈالی! اگر ہم چاہیں تو ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں یا ان پر آسمان سے ٹکڑے گرا دیں! بے شک اس کے اندر ہر اس بندے کے لیے بہت بڑی نشانی ہے جو متوجہ ہونے والا ہو!

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ (۱)

اس سورہ کی بنیاد شکر اور اس کے مقتضیات پر ہے

اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی بنیاد شکر اور اس کے لوازم و مقتضیات پر ہے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی ہے کہ شکر ہی پر توحید اور پھر پورے دین کی عمارت قائم ہے۔ منعم کے شکر کا واجب ہونا انسانی فطرت کی بدیہیات میں سے ہے۔ انسان پر جس کا بھی کوئی احسان ہوتا ہے وہ اس کا ممنون و شکر گزار ہوتا ہے۔ اگر کوئی اپنے محسن کا شکر گزار نہ ہو تو وہ لئیم و کمینہ ہے۔ اسی اصل پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آسمان و زمین کی تمام نعمتیں، جن سے انسان ہر لحظہ متمتع ہو رہا ہے اور جن کے اوپر ہی اس کے بقا کا انحصار ہے، کس کی پیدا کردہ اور کس کے قبضۂ قدرت میں ہیں؟ یہ سورج، یہ چاند، یہ ابر، یہ ہوا، یہ تارے اور ستارے کس کے بنائے ہوئے ہیں؟ یہ زمین، یہ دریا، یہ پہاڑ، یہ چرند و پرند، یہ اشجار و انہار اور یہ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا صحیح جواب یہی ہے کہ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ، اسی کی مملوک اور اسی کے دستِ تصرف میں ہیں۔ پچھلی سورتوں میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ ان سوالوں کا یہی جواب قرآن کے کٹر سے کٹر مخالفین بھی دیتے تھے۔ اس آیت میں قرآن نے اسی بدیہی حقیقت کی یاددہانی کی ہے کہ وہی اللہ جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا خالق و مالک ہے وہی ان تمام مخلوقات کے شکر کا حقیقی سزاوار بھی ہے جو اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں سے متمتع ہو رہی ہیں۔ اس شکر کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ سب اسی کی عبادت و اطاعت کریں اور اس عبادت و اطاعت میں کسی دوسرے کو شریک نہ کریں اس لیے کہ کسی دوسرے کو ان چیزوں کے خلق یا ان کی تدبیر میں کوئی دخل نہیں ہے۔ دوسروں سے انسان کو کوئی فیض

پہنچتا ہے تو محض ایک واسطہ و ذریعہ کی حیثیت سے پہنچتا ہے۔ اس وجہ سے اگر ان کا کوئی حق انسان پر قائم بھی ہوتا ہے تو وہ خدا کے حق کے تحت ہوتا ہے نہ کہ خدا کے حق سے بالاتر یا اس کے برابر۔

شکر کا اصل ظہور آخرت میں

'وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْآخِرَةِ'۔ اوپر کے ٹکڑے میں اللہ تعالیٰ کے اس حق کا ذکر تھا جو اس دنیا کی زندگی میں اس کے ہر بندے پر قائم ہوتا ہے۔ اب اس ٹکڑے میں اس کے اس حق کا ذکر ہے جو آخرت میں آشکارا ہوگا۔ فرمایا کہ اسی کی حمد آخرت میں بھی ہوگی۔ اس ٹکڑے سے کئی باتیں واضح ہوئیں۔

ایک یہ کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ربوبیت کا جو اہتمام فرمایا ہے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعد آخرت کا ظہور ہو۔ اگر آخرت نہ ہو تو یہ تمام ربوبیت بالکل بے معنی و بے غایت ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت متعدد مقامات میں ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں اشارے پر کفایت کیجیے۔

دوسری یہ کہ یہ اہل ایمان کے اس ترانۂ حمد کی طرف اشارہ ہے جو آخرت میں تمام حقائق کے ظہور اور اللہ تعالیٰ کے جملہ وعدوں کے ایفاء کے بعد ان کی زبانوں سے بلند ہوگا۔ اس کی طرف سورۂ یونس میں اشارہ ہے: 'وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ' (یونس: ۱۰) (اور ان لوگوں کی آخری صدا یہ ہوگی کہ شکر کا حقیقی سزاوار اللہ، عالم کا خداوند ہے)۔

تیسری یہ کہ یہ شرکاء و شفعاء کی کلی نفی ہے کہ یہ تمام مزعومہ دیوی دیوتا جن کی شفاعت کی امید پر مشرکین سچنت بیٹھے ہیں، آخرت میں سب ہوا ہو جائیں گے۔ ان میں سے کوئی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔ اس دن مشرکین اپنے معبودوں پر لعنت کریں گے اور معبود اپنے پجاریوں سے اعلان براءت کریں گے۔ سب کی پیشی اللہ واحد کے حضور میں ہوگی۔ اسی کا فیصلہ ناطق ہوگا اور سب پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ سزاوار حمد صرف اللہ رب العالمین ہے۔ اس حقیقت کی طرف سورۂ قصص میں یوں اشارہ فرمایا گیا ہے: 'لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ' (القصص: ۷۰) (وہی حمد کا حق دار ہے دنیا میں اور اسی کی حمد ہوگی آخرت میں اور اسی کے اختیار میں تمام امور کا فیصلہ ہے اور اسی کے آگے تمہاری پیشی ہونی ہے)۔

مذکورہ بالا دعاوی کی دلیل صفاتِ الٰہی سے

'وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ'۔ یہ اوپر کے تمام دعاوی کی دلیل اللہ تعالیٰ کی صفات سے پیش کی گئی ہے کہ وہ حکیم و خبیر ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں اپنے شکرگزار بندوں کو ان کی شکرگزاری کا صلہ دے اور ناشکرے اپنی ناسپاسی کی سزا بھگتیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال بلکہ ایک نہایت ظالمانہ کھیل بن کے رہ جاتی ہے اور العیاذ باللہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا خالق حکیم نہیں بلکہ ایک کھلنڈرا ہے حالانکہ اس کائنات کا ذرہ ذرہ یہ شہادت دے رہا ہے کہ اس کا خالق ایک حکیم ہے۔ اسی طرح اس کے حکیم ہونے کا یہ بھی تقاضا ہے کہ اس کے بے لاگ عدل کو کسی کی سفارش باطل نہ کر سکے اس لیے کہ اس صورت میں بھی اس کے حکیم ہونے کی نفی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ خبیر بھی ہے اس لیے کہ

جب اس نے ہر چیز پیدا کی ہے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ایک ایک ذرہ اور ایک ایک حرکت و سکون سے باخبر بھی ہو چنانچہ فرمایا ہے "اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ" (الملک : ۱۴) (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے سب کچھ بنایا ہے) اس کے اس محیطِ کُل علم کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی کے معاملے کا فیصلہ کرتے وقت نہ کسی دوسرے کے علم و خبر کا محتاج ہو اور نہ کوئی اس کو اپنی جھوٹی سفارش سے فریب دے سکے۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ ان تمام باتوں کو حصر کے اسلوب میں فرمایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جب حقیقی خالق و مالک اور حقیقی حکیم و خبیر وہی ہے تو اس کے سوا کوئی دوسرا حمد و شکر کا سزاوار کس طرح ہو سکتا ہے۔

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ۚ وَهُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ (۲)

خدا کی صفت خبیر کی وضاحت — یہ اسی صفت "خَبِیْرٌ" کی وضاحت ہے کہ اس کا علم اس کائنات کے ایک ایک ذرے اور ایک ایک حرکت و سکون کو محیط ہے۔ جو دانہ زمین میں ڈالا جاتا ہے وہ اس سے بھی باخبر ہوتا ہے اور جو پودا اس سے برآمد ہوتا ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے۔ اسی طرح آسمان سے جو خیر و شر نازل ہوتا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہوتا ہے اور جو چیزیں اس میں صعود کرتی ہیں ان سے بھی وہ آگاہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا علم تمام کلیات و جزئیات کو محیط ہے اور وہ ہر چیز کی نگرانی فرما رہا ہے۔ اس کی مملکت میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہ تو اس کے دائرۂ علم سے باہر ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ اس کے کسی گوشے میں اس کے علم و اذن کے بغیر کوئی کسی قسم کی نقل و حرکت یا دراندازی کر سکے۔ علمِ الٰہی کے اس احاطہ کی وضاحت اس مقصد سے کی گئی ہے کہ شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل مشرکین کا یہ مغالطہ ہے کہ بھلا اتنی ناپیدا کنار کائنات کے ہر کونے اور گوشے، ہر ایک کے قول و عمل اور ہر ایک کے دکھ اور درد سے خدا ہر لمحہ کس طرح واقف رہ سکتا ہے! اس وجہ سے اپنے تصور کے مطابق اس کائنات کے مختلف حصوں کو انھوں نے الگ الگ دیوتاؤں میں تقسیم کیا۔ اس کا تقرب حاصل کرنے اور اس کو اپنی ضروریات سے آگاہ کرنے کے لیے وسائل و وسائط ایجاد کیے۔ جنوں کو آسمان کی خبریں لانے والا مان کر ان کی پرستش کی، فرشتوں کو شفاعت کرنے والا سمجھ کر ان کو دیویوں کا درجہ دیا۔ اس آیت نے ان تمام توہمات پر ضرب لگائی کہ خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے اس وجہ سے کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ وہ اپنی پوری کائنات کے سارے نظام پر خود حاوی اور تنہا کافی ہے۔

مشرکین کے ایک مغالطہ کا ازالہ — "وَهُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ" یعنی خدا کوئی ظالم اور غیر منصف بھی نہیں ہے کہ اس کو راضی کرنے یا اس کی آفتوں سے اپنے کو بچانے کے لیے کسی دوسرے کی سعی و سفارش کی ضرورت پیش آئے بلکہ وہ نہایت مہربان اور نہایت بخشنے والا ہے۔ اس کی رحمت کو متوجہ کرنے اور اس کی مغفرت حاصل کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ بندہ اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور توبہ و اصلاح کرے۔ یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ شرک

کے حوالہ میں سے ایک اہم عامل مشرکوں کا یہ مغالطہ بھی ہے کہ انھوں نے خدا کا تصور ایک نہایت ہولناک ہستی کی حیثیت سے کیا اور پھر اس کو راضی رکھنے کے لیے انھوں نے اپنے تصور کے مطابق وسائل و ذرائع ایجاد کیے۔ اس ٹکڑے نے اسی واہمہ پر ضرب لگائی ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۖ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ عَالِمِ الْغَيْبِ ۖ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا أَصْغَرُ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (۳)

قیامت خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے

یعنی جب اللہ حکیم و خبیر ہے، اس کا علم ہر چیز کا احاطہ بھی کیے ہوئے ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ قیامت ضرور آئے لیکن جو ہٹ دھرم ہیں وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور بڑے غرور کے ساتھ انکار کرتے ہیں کہ قیامت ہرگز نہیں آئے گی۔

'قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ' جس طنطنہ کے ساتھ منکرین کا انکار تھا اسی زور کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بتقیید قسم، جواب دلوایا کہ ان کو سنا دو کہ ہاں، میرے رب کی قسم! وہ تم پر ضرور آکے رہے گی۔

'عَالِمِ الْغَيْبِ ۖ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ الآية' عالم الغیب 'وَرَبِّي' سے بدل واقع ہے یعنی میرے اس رب کی قسم جو تمام غیب سے واقف ہے، جس سے آسمانوں اور زمین میں، ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں ہے، بلکہ ہر چیز ایک نہایت واضح رجسٹر میں درج ہے۔

اس آیت میں علم الٰہی کی وسعت کا بیان منکرین کی تہدید کے مقصد سے ہے کہ وہ چوکنے ہوں کہ اس ڈھٹائی سے وہ قیامت کا جو انکار کر رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ نہ صرف یہ کہ وہ آئے گی بلکہ ہر ایک کو اپنے ایک ایک قول و عمل کا، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، حساب بھی دینا ہے۔ ساتھ ہی اس میں ایک مغالطہ کا ازالہ بھی ہے وہ یہ کہ منکرین کے نزدیک قیامت کے استبعاد کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ اتنی وسیع دنیا کے ایک ایک شخص کے ہر قول و فعل کا علم کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سب کا حساب کرنے بیٹھے گا! ان کے اس مغالطہ کو دور کرنے کے لیے یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے محیطِ کل علم کا حوالہ دیا جس طرح اوپر توحید کے سلسلہ میں دیا ہے۔

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِنْ رِجْزٍ أَلِيمٌ (۴-۵)

قیامت کا آنا کیوں ضروری ہے

یہ قیامت کی ضرورت واضح فرمائی کہ اس کا آنا کیوں ضروری ہے۔ فرمایا کہ اس لیے ضروری ہے کہ وہ نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہونے کہ خدا کے نزدیک نیک و بد دونوں یکساں ہیں حالانکہ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے اس وجہ سے لازمی ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اللہ تعالیٰ ایمان و عمل صالح والوں کو ان کی نیکیوں کا صلہ اور جنھوں نے اللہ کی باتوں کو شکست دینے کی کوشش کی ان کو

ان کی اس سعیِ نامراد کی سزا دے۔

قیامت کا اصل مقصد اہلِ ایمان کو صلہ دینا ہے کفار کو سزا دینا اس کے لوازم میں سے ہے

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قیامت کا اصل مقصد اہلِ ایمان کو صلہ دینا بتایا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کا اصل مقصود در حقیقت یہی ہے۔ مجرموں کو سزا دینا اس کے مقاصد میں سے نہیں بلکہ اس کے لوازم و نتائج میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا رحمت کے لیے بنائی ہے اور اس رحمت ہی کے لیے اس نے آخرت کا دن بھی رکھا ہے لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی نکلے گا کہ جو لوگ اپنے آپ کو اس رحمت کا سزاوار نہیں بنائیں گے وہ اس کی نقمت کے سزاوار ٹھہریں گے۔

اہلِ ایمان کے لیے دو چیزوں کا یہاں ذکر فرمایا ہے۔ ایک مغفرت، دوسری 'رزقِ کریم'۔ 'مغفرت' سے مراد یہ ہے کہ ایمان و عملِ صالح کی زندگی بسر کرتے ہوئے ان سے جو کوتاہیاں اور غلطیاں صادر ہوئی ہوں گی اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرمائے گا۔ 'رزقِ کریم' ان تمام افضال و عنایات کی ایک جامع تعبیر ہے جن کے وہ جنت میں وارث ٹھہریں گے۔

کفر کے سرغنوں کا انجام

کفار کا ذکر یہاں 'الَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ' کی صفت کے ساتھ فرمایا ہے۔ 'معاجزۃ' کے معنی ایک دوسرے کو شکست دینے کے قصد سے باہم مسابقت کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کی تگ و دو رات دن اللہ کی آیات اور اس کی باتوں کو شکست دینے کے لیے وقف رہی ہے ان کو اللہ تعالیٰ 'رجزِ الیم' کے عذاب میں سے حصہ دے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ کفر کے سرغنوں کی طرف ہے جن کے لیے عذاب بھی مخصوص ہوگا۔ اسی مخصوص عذاب کو 'عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ' سے تعبیر فرمایا۔ 'رجز' اس عذاب کو کہتے ہیں جو نہایت ہولناک ہو۔

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۶)

عاقلوں کی تائید آدمی کے اطمینان کے لیے بس ہے

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو علمِ حقیقی کی روشنی عطا ہوئی۔ عام اس سے کہ وہ ان اہلِ کتاب میں سے ہوں جنھوں نے اپنے نبیوں اور صحیفوں کے علم کو محفوظ رکھا یا ان سلیم الفطرت لوگوں[۱] میں سے ہوں جن کے قلوب ان کی سلامت روی کے باعث قرآن کی روشنی میں مستنیر ہوئے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اس چیز کو بالکل حق سمجھتے ہیں جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے۔ یعنی تم جس توحید کی دعوت دے رہے ہو اور جس قیامت سے لوگوں کو ڈرا رہے ہو، وہ اس کی تائید کر رہے ہیں کہ یہی حق ہے اور جو لوگ اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کے بل پر بڑے طنطنہ کے ساتھ توحید اور قیامت کی تکذیب کر رہے ہیں وہ یکسر باطل پر ہیں۔ یہ بات یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے فرمائی گئی ہے کہ اگر یہ متکبرین اور لاابالی لوگ تمھاری مخالفت کر رہے ہیں تو اس کی پروا نہ کرو، تمھارے اطمینان کے لیے یہ چیز بس کافی ہے کہ جن کے اندر علم و معرفت کی روشنی

---

[۱] اہلِ عرب میں جو لوگ حنیفیت کے پیرو تھے وہ بھی اسی زمرے میں شامل ہیں۔

ہے وہ تمھارے مرتد ہیں۔ آدمی کو پروا عاقلوں کی ہونی چاہیے نہ کہ احمقوں اور لاخیروں کی۔

'وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ' یعنی یہ اہل علم اس حقیقت کو برملا تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کتاب لاریب خدائے عزیز و حمید کے راستہ کی طرف رہنمائی کرنے والی ہے۔ یعنی دوسروں نے جو دین گھڑ رکھے ہیں وہ تو تمام تر ضلالت اور ہلاکت کے کھڈ میں گرانے والے ہیں البتہ یہ کتاب خدا کی راہ دکھانے والی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں مذکور ہوئی ہیں، ایک 'عَزِيْز' دوسری 'حَمِيْد'۔ 'عَزِيْز' سے اس کی عزت و قدرت کا اظہار ہو رہا ہے اور 'حمید' سے دنیا اور آخرت دونوں میں اسی کا سزاوار حمد ہونا۔ اور یہ دونوں صفتیں توحید اور قیامت کو مستلزم ہیں، جیسا کہ اوپر کے مباحث سے واضح ہو چکا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں حقیقی علم

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ حقیقی علم، قرآن کی اصطلاح میں، صرف خدا کی معرفت اور آخرت کا علم ہے۔ اگر یہ علم کسی کے اندر نہ ہو تو دوسرے کتنے ہی علوم وہ پڑھ ڈالے اس کا یہ سارا علم اس کے لیے بار اور دوسروں کے لیے خطرہ ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے علما صرف انہی کو کہا ہے جن کو خدا اور آخرت کی معرفت حاصل ہو:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ	اللہ سے اس کے بندوں میں سے بس وہی ڈرتے ہیں جو
الْعُلَمٰٓؤُا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ	علم رکھنے والے ہیں اور بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت
غَفُوْرٌ (فاطر: ۲۸)	رکھنے والا، بخشنے والا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰي رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۷)

کفار کا رویہ آنحضرت صلعم کی مخالفت میں

اہل ایمان کی روش کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اب یہ ان لوگوں کی روش بیان ہو رہی ہے جو علم کی روشنی سے محروم، کفر کے اندھیرے میں، بھٹک رہے ہیں۔ فرمایا کہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ تمھارا اور تمھاری دعوت کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لوگوں سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمھیں ایک ایسا سرپھرا دکھائیں جو خدا کا رسول بن کر یہ منادی کرتا پھر رہا ہے کہ لوگ مر کر جب بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو وہ از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے! ـــــ گویا ان کے نزدیک یہ بات اس قابل بھی نہیں کہ اس کی تردید میں کوئی دلیل دی جائے۔

اَفْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ (۸)

یہ ان کے اسی استہزا کی مزید تفصیل اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا برمحل جواب ہے۔

'اَفْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ' یعنی وہ کہتے ہیں کہ اس شخص کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو یہ مانا جائے کہ اس نے یہ خدا پر جھوٹ باندھا ہے کہ خدا نے اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کی طرف سے کہہ رہا ہے یا پھر یہ مانا جائے کہ یہ بھی جنون کی ایک قسم ہے جس میں

یہ شخص مبتلا ہو گیا ہے! مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں بیک وقت اس شخص میں موجود ہیں۔ یہ مفتری بھی ہے اور مجنون بھی!

متمردین کے استہزا کا باوقار جواب

بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ الْاٰیۃ۔ ان متمردین کے اس استہزاء کا جواب قرآن نے فوراً دیا اور دیکھیے کتنا باوقار اور موثر جواب دیا ہے۔

فرمایا کہ ان لال بجھکڑوں نے تشخیص بہت غلط کی۔ خرابی نہ داعی میں ہے نہ دعوت میں بلکہ ساری خرابی خود ان لوگوں کے اندر ہے جو آخرت پر ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ وہ عذاب اور نہایت دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ یعنی ایک گمراہی تو وہ ہوتی ہے جس سے پلٹ کر آنے اور اصلاح کا امکان باقی رہتا ہے، ہزار خرابی کے بعد بھی۔ لیکن جو آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوا اس کی بازگشت کا پھر کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کے لیے امید کے تمام دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے اس انجام کو مستقبل کے صیغہ سے بیان کرنے کے بجائے حال کے اسلوب میں بیان فرمایا اس لیے کہ ان کا یہ انجام ان کے رویہ کے اندر ہی مضمر ہے۔ گویا آج ہی وہ اپنی رعونت کے سبب سے اس سے دوچار ہیں۔

اَفَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَیْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ (۹)

اس کائنات کی کسی چیز کا نفع ذاتی بالاضطرار نہیں بلکہ خدا کے حکم سے ہے

اس مجموعۂ آیات کی پہلی آیت میں جو مضمون بیان ہوا ہے مجموعہ کے آخر میں اسی مضمون کا ایک نئے اسلوب سے اعادہ ہے۔ پہلی آیت میں فرمایا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے اس وجہ سے دنیا میں بھی شکر کا حقیقی سزاوار وہی ہے اور آخرت میں بھی اسی کی حمد ہوگی۔ یہاں فرمایا کہ کیا ان منکرین نے اس حقیقت پر کبھی غور نہیں کیا کہ یہ آسمان جو ان کے سروں پر شامیانے کی طرح تنا ہوا ہے اور یہ زمین جو ان کے قدموں کے نیچے فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے اور جن کے فوائد و برکات سے یہ متمتع ہو رہے ہیں! یہ ان کے تھامے ہوئے نہیں تھمے ہیں بلکہ ان کو اللہ ہی نے تھام رکھا ہے؟ اگر اللہ نے ان کو نہ تھام رکھا ہوتا تو یہ دونوں ان کے لیے نعمتوں کے بجائے نقمتوں کا ذریعہ بن جاتے۔ فرمایا کہ ہم جب چاہیں ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں اور جب چاہیں اسی آسمان سے ابر رحمت برسانے کے بجائے ان پر پتھر برسا دیں! اس کائنات کی کوئی چیز بھی انسان کو بالاضطرار نفع نہیں پہنچا رہی ہے بلکہ خدا کے حکم سے پہنچا رہی ہے اور کوئی چیز بھی براہ راست انسان کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ خدا کے حکم سے وہ اس کی نفع رسانی میں سرگرم ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جو انسان پر واجب کرتی ہے کہ وہ کسی نعمت پر اترائے نہیں بلکہ اپنے اس رب کا شکر گزار رہے جس نے اس کو یہ نعمت بخشی ہے اور اس کو خدا کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کو اسی کی خوشنودی اور فرمانبرداری میں استعمال کرے۔

یہی مضمون آگے والی سورہ ـــــ ـــــ سورۂ فاطر ـــــ میں، جو اس کا مثنیٰ ہے، یوں

ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَىِٕنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (فاطر: ۴۱)

بے شک اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ لڑھک نہ جائیں اور اگر وہ دونوں لڑھک جائیں تو کسی کی تاب نہیں کہ وہ خدا کے چھوڑ دینے کے بعد ان کو تھام سکے۔ بے شک وہ نہایت بردبار اور بخشنے والا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ - یعنی آسمانوں اور زمین کے اس پہلو پر اگر غور کرتے تو اس کے اندر اس بات کی بہت بڑی دلیل موجود ہے جس کی قرآن ان کو دعوت دے رہا ہے لیکن اس دلیل تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر حقیقت کی طلب، عبرت پذیری کی صلاحیت اور توجہ ہونے والا دل ہو۔ جن کے اندر یہ اوصاف نہ ہوں ان کے لیے کوئی نشانی بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔

۲- آگے کا مضمون - آیات ۱۰-۲۱

آگے تاریخ سے دو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ پہلی مثال حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے عظیم بادشاہی، عظیم علم و حکمت اور آسمان و زمین کی بے شمار نعمتوں سے نوازا اور وہ ان نعمتوں کو پا کر طغیان و فساد میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ برابر اپنے رب کے شکر گزار اور فرماں بردار رہے۔ ان کی اس شکر گزاری کا صلہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دیا کہ ان کے لیے نعمتوں میں برابر اضافہ پر اضافہ ہوتا رہا۔

دوسری مثال اہلِ سبا کی ہے۔ ان کو بھی ایک نہایت آباد و زرخیز ملک کی حکومت ملی لیکن وہ اس کو پا کر طغیان و فساد میں مبتلا ہو گئے بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سیلاب بھیج کر اس طرح ان کو تباہ کر دیا کہ وہ ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ گئے۔

یہ دونوں مثالیں قریش کے مترفین و متکبرین کے سامنے پیش کی گئی ہیں کہ ان کے سامنے بھی یہ دونوں راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ وہ چاہیں تو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح خدا کے شکر گزار رہ کر اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں کا حقدار بنا سکتے ہیں اور چاہیں تو اہلِ سبا کی روش اختیار کر کے اس کے قہر کو بھی دعوت دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس میں یہ تذکیر بھی ہے کہ جب اس دنیا میں خدا کے قانونِ مجازات کے ظہور کی یہ مثالیں موجود ہیں تو آخرت میں اس کے ظہور کو کیوں مستبعد خیال کرتے ہو! ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۰-۲۱

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴿١٠﴾ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا

صَالِحًا ۖ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١﴾ وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا
شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۖ وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ ۖ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ
يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ
مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿١٢﴾ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِيبَ
وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَاسِيَاتٍ ۚ اعْمَلُوا آلَ دَاوُودَ شُكْرًا ۚ
وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ﴿١٣﴾ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا
دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا
خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَنْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ
الْمُهِينِ ﴿١٤﴾ لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَنْ
يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ
وَرَبٌّ غَفُورٌ ﴿١٥﴾ فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ
بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِنْ سِدْرٍ
قَلِيلٍ ﴿١٦﴾ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوا ۖ وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ ﴿١٧﴾
وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً
وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۖ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ ﴿١٨﴾
فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ
أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ
شَكُورٍ ﴿١٩﴾ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا
مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٠﴾ وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا لِنَعْلَمَ

مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ۭ وَرَبُّكَ عَلٰي كُلِّ
ع ۱۲ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿٢١﴾

ترجمۂ آیات ۱۰-۱۱ اور ہم نے داؤد کو اپنے خاص فضل سے نوازا۔ اے پہاڑو، تم بھی اس کے ساتھ تسبیح میں شرکت کرو اور یہی حکم ہم نے پرندوں کو بھی دیا۔ اور ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا کہ ڈھیلی ڈھالی زرہیں بناؤ اور ان کے جوڑ پیوستہ رکھو اور سب نیک عمل کرو، بے شک تم جو کچھ کرتے ہو میں اس کو اچھی طرح دیکھ رہا ہوں۔ ۱۰-۱۱

اور ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا۔ اس کا جانا بھی مہینہ بھر کا ہوتا اور آنا بھی مہینہ بھر کا ہوتا اور ہم نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور جنات میں سے بھی اس کے لیے مسخر کر دیے جو اس کے رب کے حکم سے اس کے حضور خدمت کرتے (اور ان کے لیے ہمارا حکم یہ تھا کہ) جو ان میں سے ہمارے حکم سے سرتابی کرے گا تو ہم اس کو دوزخ کا عذاب چکھائیں گے۔ وہ اس کے لیے بناتے جو وہ چاہتا، محرابیں، مجسمے، حوضوں کے مانند لگن، اور لنگر انداز دیگیں ـــ اے آلِ داؤد، شکر گزاری کے ساتھ عمل کرو اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔ ۱۲-۱۳

پس جب ہم نے اس پر موت کا فیصلہ نافذ کیا تو ان کو اس کی موت سے نہیں آگاہ کیا مگر زمین کے کیڑے نے جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ پس جب وہ گر پڑا تب جنوں پر واضح ہوا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں نہ پڑے رہتے۔ ۱۴

اور اہلِ سبا کے لیے بھی ان کے مسکن میں بہت بڑی نشانی موجود تھی۔ دہنے بائیں دونوں جانب باغوں کی دو قطاریں۔ اپنے رب کے بخشے ہوئے رزق سے متمتع ہو اور اس کے شکر گزار رہو! زمین شاداب و زرخیز اور پروردگار بخشنے والا ہے!! تو انھوں نے سرتابی

کی تو ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے باغوں کو دو ایسے باغوں سے بدل دیا جن میں بدمزہ پھل والے درخت اور جھاؤ اور بیری کی کچھ جھاڑیاں رہ گئیں۔ یہ ہم نے ان کی ناشکری کا بدلہ دیا اور ہم برا بدلہ ناسپاسوں ہی کو دیا کرتے ہیں! ۱۵ - ۱۷

اور ہم نے ان کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان، جن میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں، سرِ راہ بستیاں بھی آباد کیں اور ان کے درمیان سفر کی منزلیں ٹھہرا دیں۔ ان میں رات دن بے خوف و خطر سفر کرو۔ پس انھوں نے کہا، اے رب ہمارے سفروں میں دوری پیدا کر دے اور انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے تو ہم نے ان کو افسانۂ پارینہ بنا دیا اور ان کو بالکل تتر بتر کر چھوڑا۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے، شکر کرنے والے کے لیے۔ ۱۸ - ۱۹

اور ابلیس نے ان کے اوپر اپنا گمان سچ کر دکھایا۔ سو انھوں نے اس کی پیروی کی۔ صرف اہلِ ایمان کا ایک گروہ اس سے بچ سکا۔ اور اس کو ان کے اوپر کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ بس یہ کہ ہم ممیز کر دیں ان لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے جو اس کی بابت شک میں ہیں اور تمھارا رب ہر چیز کا نگران ہے۔ ۲۰ - ۲۱

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۔ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ (۱۰)

حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ پر اللہ تعالیٰ نے جو فضلِ خاص فرمایا اس کی تفصیل سورۂ انبیاء اور سورۂ نمل میں گزر چکی ہے۔ یہاں ہم اپنی بحث صرف ضروری حد تک محدود رکھیں گے۔

حضرت داؤدؑ کا سوزِ گدازنہ — يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ۔ یہ اشارہ ہے اس سوز و گداز کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو عطا فرمایا تھا کہ جب وہ پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ کر اپنے خاص لاہوتی لحن میں اپنے رب کی حمد کا ترانہ چھیڑتے اور اپنی منظوم مناجاتیں پڑھتے تو شجر و حجر اور چرند پرند سب جھوم اٹھتے اور ان کی ہم نوائی کرتے۔

پہاڑوں اور پرندوں کی طرف سے ہم نوائی

'تَاْوِیْبٌ' کے اصل معنی 'ترجیع' کے ہیں یعنی کسی کے سُر میں اپنا سُر ملانا، اس کی آواز کو دہرانا، اس کی ہم آہنگی اور ہم نوائی کرنا۔ یوں تو اس کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے اور جب وہ تسبیح کرتی ہے تو لازماً تسبیح کرنے والوں کی ہم نوائی بھی کرتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت داؤدؑ کو خاص نوع کا لحن اور خاص قسم کا لحن عطا فرمایا تھا اسی طرح اپنے خاص حکم سے پہاڑوں اور پرندوں کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ جس وقت حضرت داؤدؑ اپنے رب کی حمد و تسبیح کریں، وہ بھی ان کے ساتھ اس میں شریک ہوں۔ سورۂ انبیاء میں یہی مضمون یوں ادا ہوا ہے۔ 'وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ' (۷۹) (اور ہم نے داؤدؑ کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا اور پرندوں کو بھی)۔

رزم کے بعد ان کی رزم کا حال

'وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ' ان کی بزم کا حال بیان کرنے کے بعد یہ ان کی رزم کا حال بیان ہو رہا ہے کہ ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا۔ اس کی وضاحت سورۂ انبیاء میں ہو چکی ہے کہ انھوں نے لوہے کو پگھلانے اور اس سے نہایت باریک کڑیوں کی زرہیں بنانے کے فن کو اتنی ترقی دی کہ لوہے کی زرہیں ایسی ڈھیلی ڈھالی بننے لگیں کہ معلوم ہوتا کہ کسی کپڑے سے بنائی گئی ہیں جن کا پہننا نہایت آسان ہوتا اور حفاظت کے پہلو سے وہ لوہے کا کام دیتیں۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱)

لوہے کی صنعت میں اولیت کا امتیاز

'سٰبِغٰتٌ' ڈھیلے ڈھالے لباس کو کہتے ہیں جو پورے جسم کو ڈھانک لے۔ یہاں یہ ڈھیلی ڈھالی زرہوں کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ 'قَدِّرْ فِي السَّرْدِ' میں 'سَرْد' کے معنی بناوٹ کے اور 'تَقْدِیْر' کے معنی بناوٹ میں پورے تناسب کو ملحوظ رکھنے کے ہیں۔

لوہے سے ایسا لباس تیار کر لینا جو ڈھیلا ڈھالا بھی ہو اور اس کی کڑیوں میں پورا تناسب بھی ملحوظ رہ سکے بغیر اس کے ممکن نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ پر لوہے کے پگھلانے کی ایسی اعلیٰ سائنس کا انکشاف فرمایا، جس کی اوّلیت کا سہرا انہی کے سر ہے۔ اپنی اس ایجاد سے انھوں نے دفاعی اسلحہ میں ایک نہایت بیش قیمت اضافہ کیا جس سے ان کی فوجی قوت ان کے حریفوں کے مقابل میں بہت بڑھ گئی۔

اس فن کا اخلاقی تقاضا

'وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ' اوپر کے ٹکڑے میں اس فن کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے حوصلہ افزائی فرمائی گئی ہے اس ٹکڑے میں اس فن کا اخلاقی تقاضا بیان ہوا ہے کہ اس کو پا کر بہک نہ جانا اور اس کو زمین میں فساد کا ذریعہ نہ بنانا بلکہ اس بات کو برابر یاد رکھنا کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ اور ان کے تمام آلِ و اتباع کو فرمائی۔ اس کا ذکر بار بار زبور اور امثال میں بھی آیا ہے۔

اس زمانے میں انسان نے سائنس میں جو ترقی کی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے بڑے بڑے فائدے پہنچے ہیں اور پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن دو باتیں

انسان بھول گیا ہے۔ ایک یہ کہ سائنس کا ہر انکشاف جو ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے ہوا ہے۔ دوسری یہ کہ ہر نعمت اور ہر قوت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ انسان اس کو خدا کی امانت سمجھے اور یہ یاد رکھتا ہوا اس کو استعمال کرے کہ جس خدا نے یہ بخشی ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ میں اس کو کہاں استعمال کرتا ہوں۔ ان دو حقیقتوں کے فراموش کر دینے کی وجہ سے اب سائنس انسان کے لیے ایک عظیم خطرہ بن گئی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ انسان اپنے ہی ایجاد کیے ہوئے اسلحہ سے کب خودکشی کر لے۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ (۱۲)

حضرت سلیمانؑ کی بحری قوت

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح لوہے کے استعمال کا نہایت اعلیٰ فن تعلیم فرمایا جس سے انھوں نے اپنی بری قوت میں بے مثال اضافہ فرمایا اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہوا کے کنٹرول کرنے کا فن عطا فرمایا جس سے انھوں نے اپنے بحری بیڑے کو اس قدر ترقی دی کہ ان کے جہازات مہینوں کا سفر بے روک ٹوک جاری رکھتے۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۸۱ کے تحت ہم ذکر کر آئے ہیں کہ ان کے بادبانی جہازات نہایت دور دور کے سواحل تک سفر کرتے اور ان کے بادبان ایسے سائنٹیفک طریقہ پر بنائے گئے تھے کہ ہوا کی قلت یا شدت یا مخالفت سے ان کے سفر میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا۔ سورۂ ص میں ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ (۳۶) (پس ہم نے ہوا کو اس کی خدمت میں لگا دیا تھا وہ نہایت سازگاری کے ساتھ اس کے حکم سے چلتی جہاں وہ پہنچنا) سورۂ انبیاء میں ہے: وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا (۸۱) (اور ہم نے سلیمان کے لیے باد تند کو بھی مسخر کر دیا تھا جو چلتی تھی اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں)۔

آیت زیر بحث میں انہی جہازوں کے طول سفر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ان کی ایک ایک ٹرپ مہینہ مہینہ بھر کی طویل مدت پر ممتد ہوتی۔ ذکر اگرچہ ہوا کا ہے لیکن مقصود جہازوں ہی کا جانا اور آنا ہے۔ گویا اصل عامل کا ذکر کر کے معمول کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس لیے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا اصل تصرف ہواؤں ہی پر ظاہر ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لمبے لمبے سفر اسی صورت میں ممکن تھے جب یہ جہازات نہایت بڑے بڑے بھی ہوں اور ان کے ساتھ ہوا کے کنٹرول کرنے کا نظام اتنا اعلیٰ اور مستحکم ہو کہ وہ ہر قسم کے سمندروں کے اندر ہر نوع کی ہواؤں کا نہایت خوبی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ فصیح عربی میں 'غدو' اور 'رواح' کے الفاظ صبح اور شام کی قید سے مجرد ہو کر صرف جانے اور آنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتے ہیں، مثلاً وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ (آل عمران: ۱۲۱) (اور جب کہ تم نکلے اپنے گھر سے مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں میں مامور کرنے) اسی طرح لفظ 'رواح' پر صاحب اقرب الموارد نے لکھا ہے کہ 'قد یستعمل لمطلق المضی والذھاب' (یہ لفظ مطلق آنے اور جانے کے مفہوم میں بھی

استعمال ہوتا ہے)۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہوا کی تسخیر سے مراد مجرد ہوا کی تسخیر نہیں بلکہ جس طرح اوپر حضرت داؤدؑ کے لیے لوہے کو نرم کرنے سے مقصود ان کی اسلحہ سازی اور جنگی قوت کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے: ’وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ‘ (الانبیاء: ۸۰) (اور ہم نے اس کو ایسے لباسوں کی صنعت سکھائی جو تمھاری جنگوں میں تمھیں محفوظ رکھے)، اسی طرح حضرت سلیمان کے لیے ہوا کی تسخیر سے مقصود ان کے بحری بیڑے کی قوت و شوکت کی طرف اشارہ مقصود ہے اور ان کے بحری بیڑے کی وسعت کا جو حال تھا اس کی طرف ہم سورۂ انبیاء کی تفسیر میں اشارہ کر چکے ہیں۔

تانبے کی صنعت

’وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ‘۔ ’قطر‘ تانبے کو کہتے ہیں۔ تانبے کو تمدنی ترقی میں جو دخل حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں تانبے کی بھی بہت بڑی مقدار برآمد ہوئی اور اس کو انھوں نے اپنی تمدنی و تعمیری ترقیوں میں نہایت خوبی کے ساتھ استعمال کیا۔ آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تانبا سیال شکل میں برآمد ہوتا اور پھر منجمد ہو کر مختلف ضرورتوں میں استعمال ہوتا۔ آگے بڑی بڑی دیگوں اور لگنوں کا ذکر آ رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ اسی کی بنتی تھیں۔ ہیکل کی تعمیر میں بھی، جیسا کہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس دھات کا بہت استعمال کیا۔ آج عربوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے تیل کے چشمے جاری کر دیے ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اس نے تانبے کا چشمہ جاری کر دیا تھا۔ زمین کے جتنے خزانے بھی ماضی میں دریافت ہوئے یا آج دریافت ہو رہے ہیں یا مستقبل میں دریافت ہوں گے وہ سب اللہ ہی کی بخشی ہوئی رہنمائی سے دریافت ہوئے اور ہوں گے۔ جن کی نگاہیں حقیقت بین ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر چیز کا منبع اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن جن کی نگاہوں کو سائنس نے خیرہ کر رکھا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کی اپنی کارستانی ہے۔

تسخیر جنات کا علم

’وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ‘۔ سورۂ نمل کی تفسیر میں ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا علم بھی عطا فرمایا تھا جس کے ذریعے سے وہ شریر جنوں کو قابو میں کر کے ان کو اپنے مختلف کاموں میں استعمال کرتے تھے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جن براہِ راست حضرت سلیمان علیہ السلام کے تصرف میں نہیں ہوتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ ان کی اطاعت کرتے تھے۔ اور اگر ان سے کوئی عدول حکمی صادر ہوتی تو اللہ تعالیٰ ہی ان کو سزا دیتا تھا: ’وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ‘ (ان میں سے جو ہمارے حکم کی سرتابی کرے گا تو ہم اس کو آگ کا عذاب چکھائیں گے)۔ بعض لوگوں نے جنوں سے دیو ہیکل اور طاقتور آدمی مراد لیے ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ سورۂ نمل میں صاف تصریح ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر جنوں، انسانوں اور پرندوں سب پر مشتمل تھا: ’وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ‘ (اور سلیمان کے ملاحظہ کے لیے اس کا لشکر — جنوں، انسانوں

اور پرندوں پر مشتمل ـــــ اکٹھا کیا گیا) اگر جن سے مراد انسان ہی ہوتے تو یہاں جنوں کے الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (۱۳)

حضرت سلیمانؑ نے جنات سے تعمیری کام لیے

یہ ان کاموں کی تفصیل ہے جن میں حضرت سلیمانؑ ان مسخر جنوں کو استعمال کرتے تھے۔ یہ سارے کام تعمیری، تمدنی اور اصلاحی ہیں۔ یہود اپنے دورِ زوال میں جب علوم سفلیہ میں مبتلا ہوئے تو ان خرافات کو انھوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا۔ یہاں قرآن نے واضح فرمایا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے جنات کو جس علم سے مسخر کیا وہ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے فضل سے ان کو بخشا تھا، اس کو سفلی علوم سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جنات سے جو کام انھوں نے لیے وہ سب تعمیری اور تمدنی کام تھے۔ ان کو انھوں نے فاسد اغراض کے لیے استعمال نہیں کیا۔ اس مضمون کی تفصیل سورۂ بقرہ میں آیت 'وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ ... الآیۃ' کے تحت گزر چکی ہے۔

'محاریب'، 'تماثیل'

'مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ' یعنی ان جنوں سے حضرت سلیمان علیہ السلام محرابیں اور مجسمے بھی بنواتے تھے۔ 'محراب' میرے نزدیک اپنے معروف معنی ہی میں یہاں استعمال ہوا ہے اس کے خاص طور پر ذکر کی وجہ یہ ہے کہ کسی عمارت کا سب سے زیادہ نمایاں حصہ اس کی محرابیں ہی ہوتی ہیں جو دیکھنے والوں کو سب سے پہلے نظر آتی ہیں۔ اس وجہ سے تعمیری آرٹ کا سب سے زیادہ مظاہرہ انہی پر ہوتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی تعمیر کرائی ہوئی عمارتوں میں سے ہیکل اور ان کے محل کی تعمیر کی تفصیل کتاب سلاطین میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی محرابوں پر تعمیری آرٹ کا پورا کمال صرف کیا گیا تھا۔ ان پر نہایت خوبصورت پھولوں کے نقش ابھارے گئے تھے۔

'تَمَاثِيْلُ'۔ 'تِمْثَال' کی جمع ہے۔ 'تِمْثَال' کسی چیز کی مصوّر یا کندہ کی ہوئی صورت، شبیہ یا اس کے پیکر اور مجسمہ کو کہتے ہیں۔ یہ صورت بے جان چیزوں کی بھی ہو سکتی ہے، مثلاً کسی دریا، پہاڑ، درخت، جھاڑی، پھول وغیرہ کی اور حقیقی یا فرضی جاندار چیزوں کی بھی ہو سکتی ہے، مثلاً انسان، فرشتے، جنات اور حیوانات وغیرہ کی ـــــ تورات کی کتاب سلاطین سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ان دونوں ہی قسموں کی تماثیل بنوائیں۔ مثلاً ان کے محل کے ذکر کے سلسلہ میں ہے:

"اور ان حاشیوں پر جو پٹڑوں کے درمیان تھے شیر اور بیل اور کروبی بنے تھے۔" سلاطین ۱: ب ۲۹۔

اسی طرح ہیکل کی تعمیر کے بیان میں ہے۔

"اور الہام گاہ میں اس نے زیتون کی لکڑی کے دو کروبی دس دس ہاتھ اونچے بنائے اور کروبی کا ایک بازو پانچ ہاتھ کا اور دوسرا بازو بھی پانچ ہی ہاتھ کا تھا۔"

"اور اس گھر کے اندر دیوار تھا جس پر لٹو اور کھلے ہوئے پھول کندہ کیے گئے تھے" سلاطین ۱ باب ۶ - ۱۸

"اس گھر کی سب دیواروں پر گرداگرد، اندر اور باہر کروبیوں اور کھجور کے درختوں اور کھلے ہوئے پھولوں کی صورتیں کندہ کیں" سلاطین ۱ باب ۶ - ۲۹

ایک اشکال کا جواب

جہاں تک بے جان چیزوں کی صورتوں اور مورتوں کا تعلق ہے ان کے جواز میں تو کوئی اختلاف رائے نہیں ہے لیکن جاندار چیزوں، بالخصوص فرشتوں کی مورتوں کا معاملہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو کس طرح جائز سمجھا۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے، جیسا کہ عام طور پر ہمارے مفسرین نے دیا ہے، کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں یہ چیزیں حرام نہیں تھیں تو یہ جواب تورات سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ تورات میں ان چیزوں کی حرمت نہایت واضح الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔ خروج ۲۰: ۲ - ۵ میں ہے:۔

"خداوند تیرا خدا جو تجھے زمینِ مصر سے، غلامی کے گھر سے، نکال لایا، مَیں ہوں۔ میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہووے۔ تو اپنے لیے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت، جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے سے مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر کیونکہ میں تیرا خدا غیور خدا ہوں"

دیکھیے اس میں نہایت واضح الفاظ میں صورت یا مورت بنانے کی ممانعت ہے۔ اس وجہ سے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ پچھلی شریعتوں میں یہ چیزیں جائز تھیں، صرف اسلام میں یہ حرام قرار دی گئی ہیں۔ یہ چیزیں پہلے بھی ناجائز تھیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے تورات کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس وجہ سے ہمارا خیال یہ ہے کہ انھوں نے اسی قسم کی تماثیل بنوائی ہوں گی جن کا تعلق کلچر و آرٹ سے ہے اور مذہبی تقدس کا جن کے اندر کوئی شائبہ نہیں تھا۔ لیکن جب یہود میں مورت پرستی کا رواج ہوا ہوگا تو اس قسم کی چیزیں ان کے بادشاہوں نے بنوائی ہوں گی اور ان کو سندِ جواز دینے کے لیے ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا گیا ہوگا۔ آخر تمام علوم سفلیہ بھی تو حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کی طرف یہود نے منسوب کیے جن کی تردید سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح کی خرافات ان کی طرف کتاب سلاطین میں بھی منسوب کر دی گئی ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ یہود نے حضرت سلیمانؑ کو ایک پیغمبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بالکل دنیا دار بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کی سیرت ہر پہلو سے انھوں نے داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت سلیمانؑ کا جود و کرم

'وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رّٰسِيٰتٍ'۔ 'جفان' 'جفنۃ' کی جمع ہے جس کے معنی تھال اور لگن کے ہیں اور 'جوابی' 'جابیۃ' کی جس کے معنی حوض کے ہیں۔ 'راسیات' پہاڑوں کی صفت کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ ان بڑی بڑی دیگوں کے لیے آیا ہے جو اتنی بھاری بھرکم ہوتیں کہ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کی جا سکتی تھیں۔ وہ ایک ہی جگہ چولہوں پر نصب رہتیں اور بیک وقت منوں کے حساب سے

ان میں کھانا پکتا۔

اوپر کے ٹکڑے میں سلیمانی تمدن کے آرٹ کے پہلو کو نمایاں کیا گیا تھا۔ اس ٹکڑے میں ان کے جود و کرم کو نمایاں کیا گیا ہے کہ جنات حضرت سلیمانؑ کے لیے بڑے بڑے لگن بناتے جو حوضوں کے مانند ہوتے اور بھاری بھرکم دیگیں بناتے جو ایک ہی جگہ لنگر انداز رہتی تھیں۔ یہ حوضوں کے مانند لگن اور بھاری بھرکم دیگوں کا ذکر حضرت سلیمانؑ کے جود و کرم کی تعبیر کے لیے ہے۔ اگر آپ کو یہ کہنا ہو کہ فلاں شخص بڑا فیاض ہے، اس کے خوانِ کرم سے ایک خلقِ عظیم کی پرورش ہو رہی ہے تو فصیح عربی میں اس کی تعبیر کے لیے یہ دو حرف کافی ہوں گے کہ لَهٗ قُدُوْرٌ رَّاسِيٰتٌ۔ عرب شعرائنے حاتم اور اپنے دوسرے فیاضوں کے لیے یہی استعارہ استعمال کیا ہے۔

رحمانی تمدن اور شیطانی تمدن

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں جو تمدن وجود میں آیا اس میں صرف سائنس، آرٹ اور شوکت کی نمائش ہی نہیں تھی بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو اس میں غربا پروری کا نہایت وسیع اور فیاضانہ اہتمام بھی تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس تمدن کی تحسین فرمائی۔ جس تمدن میں یہ دونوں پہلو، پورے توازن کے ساتھ موجود ہوں وہ مبارک تمدن ہے۔ اس کے برعکس جس تمدن میں آرٹ اور طمطراق کی نمائش تو ہو لیکن غربا فاقے کریں وہ تمدن شیطانی ہے۔

نعمت کا حق خدا کی شکرگزاری ہے

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا۔ یہ اس فضل و انعام کا حق بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ پر فرمایا۔ ان کو ہدایت ہوئی کہ اس علم و سائنس اور ان ارضی و سماوی برکات کو پاکر بہک نہ جانا بلکہ اپنے رب کی شکرگزاری کے ساتھ ہر چیز اس کے صحیح محل میں برتنا اور ہر قدم صحیح سمت میں اٹھانا۔ یہ نصیحت یوں تو اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت زبانِ حال سے بھی کرتی ہے لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام پیغمبر تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے بھی ان کو اس کی ہدایت فرمائی۔ اس کا ذکر زبور اور امثال دونوں میں بار بار آتا ہے۔ یہاں 'آلِ داؤد' سے خطاب کے اندر حضرت سلیمان علیہ السلام، ان کے آل و اولاد اور ان کے تمام اتباع کے لیے یہ یاددہانی ہے کہ خدا کی شکرگزاری میں اپنے باپ کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا اس لیے کہ یہ تمام عظمت و حشمت تم نے انہی سے وراثت میں پائی ہے اور ان کو اللہ نے یہ سب کچھ ان کی شکرگزاری کے صلہ میں عطا فرمایا تھا۔

ایک نہایت اہم تنبیہ

وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ یہ ایک مزید تنبیہ اور نہایت اہم تنبیہ ہے کہ شکر کی راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے بلکہ نہایت کٹھن راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں بخشتا بہتوں کو ہے لیکن ان کو پاکر ان کا حق ادا کرنے والے بہت تھوڑے نکلتے ہیں، زیادہ ایسے ہی نکلتے ہیں جو خدا کے باغی و نافرمان بن جاتے ہیں۔ اس سے حکمتِ دین کا یہ نکتہ واضح ہوا کہ صبر اور شکر میں سے زیادہ مشکل امتحان شکر کا امتحان ہے۔ حضرت مسیحؑ کے ارشادات سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا

کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا آسان ہے پر دولت مند خدا کی بادشاہی میں نہیں داخل ہو سکتا۔"

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ (۱۴)

جنات کے پاس علم غیب کا کوئی ذریعہ نہیں ہے

اوپر کی آیات سے ان لوگوں کی پوری پوری تردید ہو گئی جو اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ حضرت سلیمانؑ کی ساری کارفرمائیاں نعوذ باللہ جنات کی رہین احسان تھیں۔ اب آخر میں یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ جنات کے پاس غیب کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ وہ اس سے اسی طرح بے خبر ہیں جس طرح دوسری مخلوقات بے خبر ہیں۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے حضرت سلیمانؑ کی وفات کے واقعہ کا حوالہ دیا ہے کہ جس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات ہوئی وہ اپنے مسخر جنوں کے کام کی نگرانی کر رہے تھے لیکن جنات کو ان کی موت کی خبر نہیں ہوئی۔ وہ بدستور اپنی بیگار میں جتے رہے۔ بالآخر ایک طویل وقفہ کے بعد ان کو پتہ چل سکا کہ حضرت سلیمانؑ کی وفات ہو چکی ہے تب وہ ان کی غلامی سے رہائی حاصل کر سکے۔

واقعہ کی صورت

واقعہ کی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ اپنے اہم کاموں کی نگرانی، خصوصاً جو جنات کے ہاتھوں انجام پاتے، بنفس نفیس فرماتے۔ چنانچہ وہ اپنی عصا کی ٹیک لگائے ہوئے کسی تعمیری کام کی نگرانی کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں ان کی موت کا وقت آگیا اور فرشتۂ اجل نے ان کی روح قبض کر لی لیکن وہ جس طرح عصا کے سہارے کھڑے تھے اسی طرح بدستور قائم رہے اور جنات اس ڈر سے اپنے کام میں لگے رہے کہ حضرت سلیمانؑ موجود ہیں۔ بالآخر ان پر ایک عرصہ گزر گیا اور اس اثنا میں دیمک نے عصا کو نیچے سے کھا لیا، جس کے بعد ان کا جسد مبارک زمین پر گرا۔ تب جنات کو یہ احساس ہوا کہ اگر ان کو غیب کا علم ہوتا تو وہ اتنی دیر تک اس بیگار کی ذلت میں گرفتار نہ رہتے۔

'دابۃ الارض'

"دَآبَّةُ الْأَرْضِ" کا ذکر یہاں جن قرائن کے ساتھ ہوا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد دیمک ہے۔ 'مِنسَأَة' عصا کو کہتے ہیں۔ یہ تصریح تو یہاں نہیں ہے کہ حضرت سلیمانؑ اس حالت میں کتنی دیر کھڑے رہے لیکن نہ اس طرح جسم کا قائم رہنا ذرا مستبعد ہے اور نہ دیمک کا اس طرح عصا کو کھا جانا ذرا مستبعد ہے۔ دیمک بڑی ظالم چیز ہے۔ اگر یہ کسی چیز کو لگ جائے تو بہت جلد اس کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے، عصا تو ایک معمولی چیز ہے بالخصوص ایسی جگہوں میں جہاں یہ زیادہ ہو۔ پھر یہاں تو معاملے کی نوعیت بھی بالکل مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ حضرت سلیمانؑ کی موت اس طرح واقع ہو کہ لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ حضرت سلیمانؑ جو ہوا اور جنات پر تصرف رکھتے تھے، وہ بھی اپنے تئیں مرگِ ناگہانی سے نہ بچا سکے، اور جنات کے دماغ سے بھی یہ خبط نکل جائے کہ وہ غیب جانتے یا جان سکتے ہیں۔ ان حقائق کو واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کو یہ شکل دی اور اللہ تعالیٰ جس کام کو کرنا چاہے وہ اس کو جس طرح چاہے کر سکتا ہے۔

جنات پر کشفِ حقیقت

'تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اشرارِ جن، غیب کی ٹوہ میں ہمیشہ رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ آسمانوں میں بھی، جیسا کہ سورۂ جن اور قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، استراقِ سمع کے لیے بیٹھتے رہے ہیں۔ اور اپنے دامِ فریب میں آئے ہوئے انسانوں پر انھوں نے یہ دھونس بھی جما رکھی تھی کہ ان کے پاس غیب کے اسرار سے واقف ہونے کے ذرائع موجود ہیں لیکن اس واقعہ نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آسمان تو بہت دور رہے، انھیں تو اپنے سر پر کے اتنے بڑے واقعہ کی بھی خبر نہ ہو سکی جس کے باعث انھیں غلامی کے رسوا کن عذاب میں کچھ عرصہ مزید گرفتار رہنا پڑا۔

اس ٹکڑے سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی بیگار میں صرف شریر جنوں کو لگایا تھا اور ان کے علمِ تسخیر کا تعلق صرف انہی سے تھا۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْكَنِهِمْ اٰیَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ یَّمِیْنٍ وَّ شِمَالٍ ۬ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَیِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ (۱۵)

ناشکروں کا کردار اور ان کا انجام

'سبا' کا ذکر سورۂ نمل کی آیت ۲۲ کے تحت گزر چکا ہے۔ جو علاقہ اب یمن کہلاتا ہے وہی پہلے سبا کا علاقہ تھا۔ یہ نہایت زرخیز و شاداب خطہ تھا۔ اس کی اصل شاہراہ کے دونوں جانب نہایت شاداب باغوں کا سلسلہ تھا جو پورے علاقہ پر پھیلا ہوا تھا لیکن اس کے باشندوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر نہیں کی، جس کی پاداش میں اللہ نے ان پر ایک سیلاب بھیجا جس سے پورا ملک تباہ ہو کر رہ گیا۔ اوپر حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام کا کردار شکر گزار بندوں کے کردار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اب یہ ناشکروں کا کردار اور ان کا انجام پیش کیا جا رہا ہے۔ سورۂ نحل کی آیات ۱۱۲-۱۱۳ میں بھی ان کی مثال سے قریش کو عبرت دلائی گئی ہے۔

سبا اور اہلِ سبا

'لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْكَنِهِمْ اٰیَةٌ'۔ 'سَبَا' سے مراد یہاں اہلِ سبا ہیں۔ اور 'مسکن' یہاں خطہ اور علاقہ کے مفہوم میں ہے۔ لفظ 'اٰیَةٌ' کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ سبا کے لیے ان کے علاقے میں خدا کی رحمت و ربوبیت اور اس کے فضل و انعام کی بہت بڑی نشانی موجود تھی لیکن انھوں نے اس کی قدر نہیں کی۔ اس سے ان کو جو سبق حاصل کرنا تھا وہ سبق انھوں نے حاصل نہیں کیا۔

'جَنَّتٰنِ عَنْ یَّمِیْنٍ وَّ شِمَالٍ'۔ یہ اس نشانی کی وضاحت ہے کہ ان کے دونوں جانب، دہنے اور بائیں، باغوں کی دو قطاریں تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ کے وسط سے ان کی مرکزی شاہراہ گزرتی تھی اور اس شاہراہ کے دونوں جانب باغوں کی قطاریں تھیں۔ 'جَنَّتٰنِ' یہاں دو باغوں کے مفہوم میں نہیں بلکہ باغوں کی دو قطاروں کے مفہوم میں ہے۔ مثنیٰ کے اس طریقِ استعمال کی مثالیں عربی میں موجود ہیں اور یہاں اس کا قرینہ واضح ہے۔

'كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ'۔ خدا کی اس عظیم نشانی سے جو درس حاصل ہوتا ہے

اور جو اہلِ سبا کو حاصل کرتا تھا یہ اس کا بیان ہے کہ یہ عظیم رحمت و رفاہیت اپنی زبانِ حال سے ان کو درس دے رہی ہے کہ اپنے رب کے اس عظیم خوانِ کرم سے بہرہ مند ہوں اور اس کے شکرگزار رہیں۔

نعمت کا حق منعم کی شکرگزاری ہے 'بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ'۔ 'طَيِّبَة' یہاں زرخیز و شاداب کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے ـــــ یہ اسی درس کی مزید توضیح ہے کہ اگر وہ کھلی آنکھوں سے اپنے ملک کو دیکھتے تو اس وسیع خوانِ کرم کو، جس پر اس فیاضی کے ساتھ ان کے لیے نعمتیں چنی گئی تھیں، دیکھ کر ان پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی کہ جس نے یہ خوانِ کرم بچھایا ہے وہ بڑا ہی غفار و ستار آقا ہے جس نے بلا کسی استحقاق کے، ان کی ناقدریوں اور ناشکریوں کے باوجود، ان کے لیے اپنی نعمتوں کے یہ انبار لگا دیے ہیں ـــــ یہ حقیقت اس کتاب میں ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ نعمت پا کر منعم کی شکرگزاری کا شعور انسانی فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔ یہ چیز حیوانات کی جبلت میں بھی داخل ہے۔ اگر کوئی انسان اس شعور سے عاری ہے تو وہ حیوانات سے بھی بدتر ہے۔

فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُم بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِّن سِدْرٍ قَلِيلٍ (۱۶)

سدِ مآرب 'عَرِم' کے معنی بعض اہلِ لغت نے زوردار بارش کے لکھے ہیں اور بعض نے اس کو 'عَرِمَة' کی جمع بتایا ہے، جو تہ بہ تہ اکٹھا کیے ہوئے پتھروں کے لیے آتا ہے۔ پھر یہیں سے یہ اس سد یا بند کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جو کسی وادی کے درمیان پانی کو روکنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ اقرب الموارد میں ہے 'مسناة تبنى في عرض الوادی' (وہ بند جو وادی کے بیچ میں بنایا جاتا ہے) جس طرح ہمارے منگلا اور تربیلا ڈیم ہیں۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح کا ایک کئی میل لمبا چوڑا ڈیم اہلِ سبا کا بھی تھا جو ان کو سیلاب کے خطرات سے محفوظ بھی کیے ہوئے تھا اور آب پاشی کے لیے بھی بقدرِ ضرورت اس سے ان کو پانی حاصل ہوتا تھا۔ تاریخوں میں اس کا ذکر سدِ مآرب کے نام سے آتا ہے۔ 'مآرب' سبا کا دارالسلطنت تھا۔ یہ بند غالباً ۵۴۲ء میں ٹوٹا اور اس کے ٹوٹنے سے سارا ملک تباہ ہو گیا۔

ناشکری کا انجام 'فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ نعمتیں دیں تو ان کو پا کر وہ خدا کے شکرگزار رہنے کے بجائے طغیان و فساد میں مبتلا ہوئے۔ سورۂ نحل کی آیت ۱۱۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو انذار کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک رسول بھیجا لیکن انھوں نے اس کی پروا نہ کی بالآخر ان پر خدا کا عذاب اس شکل میں آیا کہ ایک عظیم سیلاب نے ان کے بند کو توڑ دیا جس سے ان کا سارا ملک تاراج ہو کر رہ گیا۔

'وَبَدَّلْنَاهُم الآیۃ'۔ 'خمط' بدمزہ اور کڑوے کسیلے پھلوں کو کہتے ہیں۔ یعنی اس سیلاب نے ان کے ملک کو اس طرح تلپٹ کر کے رکھ دیا کہ شاداب باغوں کی جگہ کڑوے کسیلے پھلوں کے کچھ درخت اور کچھ جھاؤ اور بیری کی جھاڑیاں رہ گئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیلاب نے صرف ان کے باغ ہی ویران نہیں کیے

بلکہ ان کے پورے علاقے پر کسی ایسی مٹی یا ریت کی تہ جما دی جس نے بچے کھچے درختوں کے مزاج بھی بدل دیے اور پورا علاقہ صرف جنگلی جھاڑیوں ہی کے لیے موزوں رہ گیا۔

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۭ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ (١٧)

'مجازات' کے معنی بدلہ دینے کے ہیں۔ بدلہ برا بھی ہوتا ہے اور اچھا بھی۔ اس وجہ سے اس کے صحیح مفہوم کا تعین موقع و محل سے ہوتا ہے۔ یہاں موقع برے بدلہ کا ہے اس وجہ سے یہاں یہ لفظ اسی معنی میں لیا جائے گا۔ فرمایا کہ ہم نے ان کو یہ سزا ان کے کفرانِ نعمت کی پاداش میں دی اور اس قسم کی سزائیں ہم ناشکروں کے سوا کسی اور کو نہیں دیتے۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ۭ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ (١٨)

اہلِ سبا کی رفاہیت کی مزید تفصیل

'اَلْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا' سے ملک شام وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جن کے ساتھ اہلِ سبا کے تجارتی تعلقات تھے۔ یہ ملک بہت زرخیز تھے اس وجہ سے ان کی صفت 'بٰرَكْنَا فِيْهَا' آئی ہے۔ زرخیز ممالک سے تجارتی تعلقات بجائے خود آمدنی اور رفاہیت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

'قُرًى ظَاهِرَةً' سے مراد وہ شہر اور قصبات ہیں جو اس شاہراہ پر واقع تھے جس کے دونوں جانب باغوں کی قطاریں تھیں۔ یعنی ان بستیوں کے علاوہ جو اندرونِ ملک واقع تھیں موزوں فاصلوں سے اس شاہراہ پر بھی بستیاں آباد تھیں جو ان کے لیے منزلوں کا کام دیتی تھیں۔ وہ ان میں بے خوف و خطر ٹھہرتے، آرام کرتے اور پھر آگے کی منزل کے لیے سفر کرتے۔

'وَقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ' یعنی یہ بستیاں ایسے مناسب فاصلوں پر واقع تھیں کہ گویا قدرت نے خود اپنے اہتمام سے ان کے لیے منزلیں مقرر کر دی تھیں۔

'سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ' یہ ان آسائشوں کی زبانِ حال کی تعبیر ہے کہ قدرت نے یہ سارا اہتمام کر کے گویا ان کے لیے ہر منزل پر یہ کتبہ لگا دیا کہ تمھاری خاطر یہ اہتمام ہم نے اس لیے کیا ہے کہ تم راتوں میں بھی اور دنوں میں بھی بے خوف و خطر سفر کر سکو ـــــــ یہاں اتنی بات حذف ہے کہ 'اور اپنے اس رب کے شکر گزار رہو جس نے تمھارے لیے یہ سارا اہتمام کیا ہے' ـــــــ اس کو حذف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر انعام کا یہ فطری تقاضا ہے اور اوپر آیت ۱۵ میں اس کا بیان ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے اس کو دہرانے کے بجائے بعد والی آیت میں ان کے اس رویہ کی طرف اشارہ فرما دیا جو انھوں نے اختیار کیا اور جس کے نتیجہ میں وہ ان تمام نعمتوں سے محروم ہوئے۔

اس زمانے کی تمام گمراہی کا اصلی سبب

یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام آسائشوں اور رفاہیتوں کے اہتمام کو براہِ راست اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ یہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو فتوحات بھی حاصل

ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن انسان اپنی ناشکری کے باعث ہر چیز کو اپنی سعی و تدبیر کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس زمانے کی عام گمراہی کا اصل سبب انسان کی یہی بے بصیرتی ہے اور سائنس کی ایجادات نے اس غرور میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ اب اللہ ہی اس کو دور کر سکتا ہے۔

فَقَالُوا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (۱۹)

زبانِ حال کی تعبیر

یہ ان کے زبانِ قال کی نہیں بلکہ زبانِ حال کی تعبیر ہے کہ انھوں نے یہ رفاہیتیں پاکر رویہ جو اختیار کیا اس سے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ ان آسائشوں کے حقدار نہیں ہیں بلکہ اس بات کے سزاوار ہیں کہ ان کی بستیاں ویران ہو جائیں، ان کی منزلیں کٹھن ہو جائیں اور ان کی یہ ساری رفاہیتیں ان سے چھین لی جائیں۔ زبانِ حال کی تعبیرات کی مثالوں کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی نظیریں پیچھے گزر چکی ہیں اور یہ حقیقت بھی ہم واضح کر چکے ہیں کہ اصل شہادت زبانِ حال ہی کی ہوتی ہے نہ کہ زبانِ قول کی۔ یہود کا قول 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' بھی ان کے حال ہی کی تعبیر ہے۔

'وَظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ' یعنی انھوں نے خدا کی ناشکری و نافرمانی کی اور اس طرح خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھائے کہ خدا کے قہر و غضب کو دعوت دی۔ خدا کا انھوں نے کچھ نہیں بگاڑا۔

'فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ' یہ ان کی ناشکری کا انجام بیان ہوا ہے کہ بالآخر وہ اس طرح پامال ہوئے کہ حاضر کے صفحہ سے مٹ کر صرف ماضی کی ایک داستانِ پارینہ بن کے رہ گئے۔ 'وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ' یعنی جو سیلاب کی آفت سے بچے بھی وہ بھی ملک کی معیشت برباد ہو جانے کے باعث بالکل پراگندہ ہو گئے۔ کوئی کہیں گیا کوئی کہیں۔

ایک قابلِ غور نکتہ

'إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ' اوپر آیت ۱۷ میں جس طرح اس سرگزشت کے اصل سبق کی طرف 'وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ' سے توجہ دلائی ہے اسی طرح یہاں اسی حقیقت کی طرف 'لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ' کے الفاظ سے توجہ دلائی ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اہلِ سبا کی سرگزشت یہاں دو مرتبہ دہرائی گئی ہے اور دونوں مرتبہ ان کے عبرت انگیز انجام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ پہلے ان کے علاقے کی زرخیزی و شادابی کے ذکر کے بعد ان کی ناشکری اور اس کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا پھر ان کی تمدنی و تجارتی ترقیوں کے ذکر کے بعد ان کے کفرانِ نعمت کے نتیجہ میں ان کے انتشار کی طرف۔ یہ اسلوبِ بیان اس لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ اصل مقصود جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی جا رہی ہے نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ قرآن میں اس اسلوبِ بیان کی متعدد نہایت بلیغ مثالیں موجود ہیں۔

'صبار' و 'شکور' کی نشانیاں

'صبار' اور 'شکور' دونوں توام ہیں۔ یہ دونوں بیک وقت مطلوب ہیں۔ جس کے اندر صبر نہ ہو وہ شکر کا حق ادا نہیں کر سکتا اور جس کے اندر شکر نہ ہو وہ صبر نہیں کر سکتا اور اس دنیا کے دارالامتحان میں ہر قدم پر بندے کا

امتحان ان دونوں ہی چیزوں میں ہوتا رہتا ہے اور اسی امتحان پر اس کی اُخروی کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے۔ فرمایا کہ اس سرگزشت میں صبر و شکر کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ مثلاً

- اس دنیا میں جو نعمتیں بھی حاصل ہوتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہوتی ہیں اس وجہ سے ان کو پاکر غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے انسان کو اپنے رب کا شکر گزار اور اس کا فرمانبردار رہنا چاہیے۔
- جو نعمتیں بھی ملتی ہیں وہ کسی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ امتحان کے طور پر ملتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو دے کر دیکھتا ہے کہ اس کے بندے اس کے شکر گزار رہتے ہیں یا ناشکری کرتے ہیں۔
- اس امتحان میں جو قومیں ناکام ہو جاتی ہیں وہ قومی حیثیت سے اس دنیا میں اس کا انجام دیکھ لیتی ہیں۔ آخرت میں ہر شخص کے سامنے انفرادی حیثیت سے اس کا انجام آئے گا۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (۲۰)

ناشکرے لوگ ابلیس کی توقعات پوری کرتے ہیں

یہ ابلیس کے اس گمان کی طرف اشارہ ہے جس کا اظہار اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس وقت کیا تھا جب آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا اس کو حکم دیا گیا اور اس نے اس کی تعمیل سے انکار کیا۔ اس وقت اس نے یہ کہا تھا کہ میں اولادِ آدم پر اس طرح گھیرے ڈالوں گا کہ ان کی اکثریت تیری جگہ میری پیروی کرے گی وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ (الاعراف: ۱۷) (اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکرگزار نہیں پائے گا) یہاں اس کا حوالہ دینے سے مقصود اس کے انجام کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جب انھوں نے اپنے بارے میں ابلیس کے گمان کو سچا ثابت کر دیا تو لازماً ان کے سامنے اس کا انجام بھی آیا اور آئے گا یعنی اس دنیا میں یہ سیلاب کے عذاب سے دوچار ہوئے اور آخرت میں یہ جہنم کے عذاب میں جھونک دیے جائیں گے۔ قرآن میں جہاں ابلیس کی مذکورہ بالا دھمکی کا ذکر ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ جواب بھی مذکور ہے کہ "جو تیری پیروی کریں گے خواہ جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے، میں ان سب کو جہنم میں بھر دوں گا۔"

إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ۔ پیچھے سورۂ نحل کی آیت ۱۱۳ کے حوالہ سے ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اہلِ سبا کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک رسول بھی بھیجا تھا۔ اس آیت سے واضح ہوا کہ ان کی اکثریت نے اس رسول کی تکذیب کر دی۔ صرف تھوڑے سے لوگ ان پر ایمان لائے اور وہی اس عذاب سے محفوظ رہے جو ان کی قوم پر آیا۔

وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يُؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِي شَكٍّ ۗ وَرَبُّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (۲۱)

ایک شبہ کا ازالہ

یہ ایک دفع دخل مقدر یعنی بر سر موقع ایک شبہ کا ازالہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ مبتلا رہے کہ شیطان کو لوگوں پر کوئی اختیار حاصل ہے کہ وہ جس کو چاہے گمراہ کر دے۔ فرمایا کہ شیطان کو اس طرح کا کوئی اختیار اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر نہیں دیا ہے۔ اس کو صرف اس بات کی مہلت ملی ہے کہ وہ لوگوں کو بدی کے راستہ کی دعوت دے سکتا ہے اور یہ مہلت اس کو اس لیے دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا امتحان کرنا

چاہتا ہے کہ کون آخرت پر ایسا مضبوط ایمان رکھتا ہے کہ شیطان کی ترغیبات کے باوجود جادۂ حق پر استوار رہتا ہے اور کون شک میں مبتلا ہے کہ شیطان کے بہکانے سے اس کی راہ پر لگ جاتا ہے۔ 'لِنَعْلَمَ' سے پہلے کوئی فعل 'انظرناہ' یا 'امھلناہ' کے معنی میں محذوف ہے اور اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'وَرَبُّكَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ' یعنی اللہ تعالیٰ اس رزم گاہِ امتحان میں شیطان اور انسان کو اتار کر خود الگ تھلگ ہو کر نہیں بیٹھ رہا ہے بلکہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ شیطان اپنے حدود سے متجاوز ہو سکے اور ممکن نہیں ہے کہ انسان اپنی کسی دادرسی سے محروم رہ جائے۔ اگر انسان اپنا فرض اپنے امکان کی حد تک ادا کرنے کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی اس دنیا میں بھی مدد فرمائے گا اور آخرت میں بھی اس کی ہر سعی کا بھرپور صلہ دے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان اور اس کی ذریات کے غلبہ سے مایوس ہو کر ادائے فرض سے دستکش ہونا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مہلت تو ضرور دی ہے لیکن اپنی دنیا اس کے حوالے نہیں کر دی ہے، بلکہ ہر چیز کی نگرانی وہ خود فرما رہا ہے۔

۴- آگے کا مضمون ـ آیات ۲۲ - ۲۷

اوپر کی آیات میں یہ حقیقت واضح فرمائی کہ تمام رحمت و نعمت اللہ ہی کے اختیار میں ہے اس وجہ سے شکرگزاری اور بندگی کا حقیقی سزاوار وہی ہے۔ اب آگے مشرکین کو چیلنج کیا ہے کہ تم اپنے جن معبودوں کو خدا کا شریک بنائے بیٹھے اور ان کی سفارش کی امید پر خدا کی پکڑ سے بے فکر ہو ان کے حق میں کوئی دلیل اپنے پاس رکھتے ہو تو اس کو پیش کرو۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرایا ہے کہ اگر تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، محض ضد اور مکابرت کی وجہ سے اپنی بات پر اڑے ہوئے ہو تو تمہارے ساتھ بحث میں ہم اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے بلکہ معاملہ اللہ کے حوالہ کرتے ہیں۔ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ
۲۲-۲۷ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ
وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا
لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ
رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّاۤ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَهُوَ
الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۶﴾ قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ
بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾

ترجمۂ آیات ۲۲-۲۷

بلاؤ ان کو جن کو تم نے خدا کے سوا معبود گمان کر رکھا ہے! وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کوئی اختیار رکھتے ہیں اور نہ زمین میں۔ اور نہ ان دونوں میں ان کا کوئی ساجھا ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار رہے۔ اور اس کے ہاں کوئی شفاعت کارگر نہیں ہوگی مگر اس کے لیے جس کے لیے وہ اجازت دے۔ یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے دہشت دور ہوگی وہ پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا حکم فرمایا؟ وہ جواب دیں گے کہ بالکل حق ارشاد ہوا! اور وہ نہایت عالی مقام اور عظیم ہے! ۲۲-۲۳

ان سے پوچھو، تم کو آسمانوں اور زمین سے کون رزق بہم پہنچاتا ہے؟ کہو، اللہ! اور ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گمراہی میں! کہہ دو، نہ ہم نے جو جرم کیے ان کی بابت تم سے پرسش ہونی ہے اور نہ تمہارے اعمال سے متعلق ہم سے سوال ہوگا۔ کہہ دو، ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان بالکل انصاف کے مطابق فیصلہ فرمائے گا اور وہی فیصلہ فرمانے والا اور علم والا ہے۔ ۲۴-۲۶

کہو، ذرا مجھے ان کو دکھاؤ تو جن کو تم نے شریک بنا کر اس کے ساتھ جوڑ رکھا ہے! ہرگز نہیں! بلکہ وہ اللہ عزیز و حکیم ہے! ۲۷

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ (۲۲)

مشرکین کو کھلا ہوا چیلنج

یہ مشرکین کو کھلا ہوا چیلنج ہے کہ جن کو تم نے خدا کا شریک گمان کر رکھا ہے ذرا ان کو بلاؤ، ہم بھی ان کی صورت دیکھیں وہ کیسے اور کہاں ہیں! اس قسم کا چیلنج مخاطب کو اس وقت دیا جاتا ہے جب اس کا دعویٰ بالکل ہی بے سر و پا ہو اور ہر پہلو سے اس پر حجت تمام کی جا چکی ہو۔ یہی اندازِ خطاب آگے آیت ۲۷ میں ہے: 'قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ۚ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' (ان سے کہو، ذرا مجھے ان کو دکھاؤ جن کو تم نے شریک بنا کر خدا کے ساتھ جوڑ رکھا ہے! ہرگز نہیں! بلکہ وہ اللہ عزیز و حکیم ہے)۔

'لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ'۔ یہ اسی چیلنج کی مزید وضاحت ہے کہ تم نے ان کو شریکِ خدا گمان کر رکھا ہے حالانکہ نہ وہ آسمانوں میں ذرہ برابر کوئی اختیار رکھتے نہ زمین میں۔ یہی بات اسی سورہ کی پہلی ہی آیت میں اس طرح واضح فرمائی گئی ہے 'لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ' (اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)۔

'وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ' یعنی ان دونوں کی خلقت میں ان کا کوئی بھی ساجھا نہیں ہے۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے: 'مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' (الکہف: ۵۱) (میں نے آسمانوں اور زمین کی خلقت کے وقت ان میں سے کسی کو نہیں بلایا کہ ذرہ برابر وہ میرا ہاتھ بٹائیں)۔

'وَمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ' یعنی زمین و آسمان کے انتظام و انصرام میں بھی خدا نے ان میں سے کسی کو اپنا معین و مددگار نہیں بنایا ہے بلکہ اپنی ساری خدائی کا انتظام تنہا وہ خود ہی سنبھالے ہوئے ہے اور یہ چیز ذرا بھی اس پر بار نہیں ہے۔ یہ مشرکین کے اس وہم کی تردید ہے کہ زمین چونکہ خدا کی مملکت کا نہایت دور دراز علاقہ ہے اس وجہ سے اس کا انتظام اس نے اپنے دوسرے شریکوں کے سپرد کر رکھا ہے۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۲۳)

مشرکین کے مزعومہ تصورِ شفاعت کی نفی

حق و اختیار کی نفی کے بعد یہ ان کے مزعومہ تصورِ شفاعت کی بھی نفی کر دی۔ فرمایا کہ اگر ان کی شفاعت کی امید پر ہی چپت بیٹھے ہو تو یاد رکھو کہ خدا کے حضور میں کسی کی شفاعت کسی کے لیے نافع نہیں ہوگی مگر اس کے لیے جس کے لیے خدا اجازت دے یعنی اول تو خدا کے اذن کے بدون کوئی کسی کی شفاعت کی جرأت

ہی نہیں کرے گا، پھر اجازت کے بعد بھی وہ شفاعت صرف اسی کے لیے کرے گا جس کے لیے اس کو اجازت مرحمت ہوئی ہوگی، کسی ایسے کے بارے میں وہ زبان نہیں کھول سکے گا جس کے لیے اس کو اجازت نہ ملی ہو۔ دوسرے مقامات میں یہ وضاحت بھی فرما دی گئی ہے کہ وہ وہی بات کہے گا جو حق ہوگی۔ خدائے علام الغیوب کے آگے نہ کوئی کسی باطل کو حق بنا سکے گا اور نہ کوئی بات حق کے خلاف زبان سے نکال سکے گا۔

یہ مشرکین کے اس گمان کی تردید ہے جو وہ اپنے معبود فرشتوں سے متعلق رکھتے تھے کہ وہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں اس وجہ سے وہ اپنے باپ سے جو بات چاہیں منوا سکتی ہیں اور خدا کو ان کی ناز برداری میں ان کی ہر بات ماننی پڑتی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا الْحَقَّ ۚ

'تفزیع' کے اصل معنی ڈرا دینے اور دہشت زدہ کر دینے کے ہیں لیکن جب اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی دہشت دور کر دینے کے ہو جاتے ہیں۔ 'فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ' کے معنی ہوں گے 'جب ان کے دلوں سے دہشت دور کر دی جائے گی'۔

قیامت کے روز فرشتوں کا حال

یہ حال بیان ہوا ہے قیامت کے دن فرشتوں کا کہ اس دن آگے بڑھ کر ناز و تدلل کے ساتھ کسی کی شفاعت کرنا تو الگ رہا تمام خلق کی طرح ان پر بھی اس دن ایسا ہول طاری ہوگا کہ انھیں کچھ خبر نہیں ہوگی کہ لوگوں کے باب میں رب العزت کی بارگاہ سے کیا حکم صادر ہوا۔ جب ان کی دہشت دور ہوگی تو وہ دوسروں سے سوال کریں گے کہ تمہارے رب کی طرف سے کیا حکم صادر ہوا؟ وہ جواب دیں گے کہ بالکل بجا حکم صادر ہوا ہے۔

فرشتوں سے متعلق مشرکین کے اسی تصور کی تردید کرتے ہوئے سورۂ زمر میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۔ (الزمر: ۶۷-۶۸)

اور انھوں نے اللہ کی صحیح شان نہیں پہچانی! اور وہ زمین کو قیامت کے دن مٹھی میں لے لے گا اور آسمان کی بساط بھی اس کے ہاتھ میں لپیٹی ہوئی ہوگی۔ وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے، مگر جن کو اللہ محفوظ رکھنا چاہے۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب اٹھ کھڑے ہوں گے تاکتے ہوئے۔

یہ باتیں احوالِ قیامت سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ ان کا صحیح تصور اس دنیا میں ممکن نہیں ہے لیکن یہ دونوں

آیتیں ایک ہی موقع و محل کی ہیں اس وجہ سے اگر آیت زیرِ بحث کا مفہوم سورۂ زمر کی مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ بات نکلتی ہے کہ جب پہلی دفعہ صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات بے ہوش ہو کر گر پڑیں گی۔ صرف وہی لوگ اس سے محفوظ رہ سکیں گے جن کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ انہی لوگوں کا ذکر دوسرے مقام میں یوں آیا ہے: لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (الانبیاء ۱۰۳) (ان کو سب سے بڑے ہول کا غم لاحق نہیں ہوگا) پھر جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور حیرت و دہشت کے ساتھ دیکھیں گے کہ یہ کیا ہو گیا اور کیا ہونے والا ہے! معلوم ہوتا ہے اسی مرحلے میں فرشتے وہ سوال کریں گے جو 'مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ' کے الفاظ سے یہاں مذکور ہے۔ اس سوال سے ان کی سراسیمگی اور دہشت زدگی کا اظہار ہو رہا ہے کہ ناز و اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ کر کسی کی سفارش کرنا تو درکنار صورتِ حال ایسی ہوگی کہ خود ان کے اپنے اوسان بجا نہیں رہیں گے۔ وہ دوسروں سے پوچھیں گے کہ بارگاہِ الٰہی سے کیا حکم صادر ہوا ہے؟ دوسرے جواب میں صرف یہ کہیں گے کہ جو حکم ہوا ہے وہ بالکل حق ہے۔ 'الحق' فعل محذوف سے منصوب ہے۔ یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے جن کے معاملات کا اس دن فیصلہ ہوگا اس لیے کہ اس دن حق اس طرح واضح ہو جائے گا کہ کوئی بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکے گا کہ اس کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہے اور امکان اس کا بھی ہے کہ یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے ہو جو اس دن کے ہول سے محفوظ رکھے جائیں گے اور جن کی طرف سورۂ زمر کی مذکورہ بالا آیت میں 'اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اگر یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دن اکثریت کا حال تو یہ ہوگا کہ ان کو خود اپنی پڑی ہوگی وہ دوسروں کی سفارش کیا کریں گے اور جو اس دن کے ہول سے امان میں رکھے جائیں گے ان کا حال یہ ہوگا کہ وہ پکاریں گے کہ ربِّ عادل و کریم نے جو فیصلہ فرمایا ہے وہ بالکل حق فرمایا ہے ــــــ مطلب یہ ہے کہ جب اصل حقیقتِ حال یہ ہے تو وہ کون لوگ ہیں جن کی شفاعت پر مشرکین تکیہ کیے ہوئے ہیں!

'وَهُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی ہی بلند و ارفع اور بڑی باعظمت و باجبروت ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے آگے اس کے اذن کے بغیر زبان کھول سکے اور نہ کسی کی یہ شان ہے کہ اس تک اس کی رسائی ہو سکے۔

فرشتوں میں سب سے زیادہ عالی مقام حضرت جبریل امین ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک رسائی کے معاملے میں ان کی بے بسی کا بھی یہ حال ہے کہ

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

اس مسئلہ پر مزید بحث ان شاء اللہ اگلی سورہ میں آئے گی۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۲۴)

ایک مسلّم حقیقت

یعنی ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین سے کون تم کو روزی دیتا ہے؟ کون آسمانوں سے پانی برساتا، سورج چمکاتا اور موسمی تغیرات پیدا کرتا ہے اور کون زمین سے بیجوں کو اگاتا، سبزوں کو نشوونما دیتا اور فصلوں کو بار آور کرتا ہے؟

قُلِ اللّٰهُ۔ فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے اور آسمانوں اور زمین کی یہ سازگاری اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ ان دونوں کے اندر ایک ہی خدائے قادر و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے۔

یہاں سوال کرنے کے بعد اس کا جواب بھی خود ہی دے دیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اس جواب سے مخاطب کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اہلِ عرب کے عقائد سے متعلق یہ بات ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ وہ اپنی دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کو خالق یا رازق نہیں مانتے تھے بلکہ صرف سفارشی اور ذریعۂ تقرب مانتے تھے۔ قرآن میں یہ تصریح موجود ہے کہ اگر ان سے پوچھو کہ تم کو آسمانوں اور زمین سے کون روزی دیتا ہے تو جھٹ جواب دیں گے کہ اللہ! چونکہ یہ بات مخاطب کو تسلیم تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہی مسلّم حقیقت یہاں ان کے سامنے رکھ دی ہے۔

ضدی مخاطب سے موادعت کا اسلوب

وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ مطلب یہ ہے کہ اسی مسلّم حقیقت پر ہماری دعوت کی بنیاد ہے۔ اگر تم اس پر ہم سے جھگڑ رہے ہو تو مزید کسی بحث و جدال کی ضرورت نہیں ہے۔ یا تو ہم ہدایت پر ہیں اور تم کھلی ہوئی گمراہی میں ہو یا تم ہدایت پر ہو اور ہم ضلالت پر ہوں گے ـــــ مطلب یہ ہے کہ جب تم ضد میں اس حد تک دھاندلی پر اتر آئے ہو کہ ایک ہی سانس میں ایک حقیقت کو مانتے ہو، پھر اسی کو جھٹلاتے ہو تو تم سے مزید بحث جاری رکھنا بے سود ہے۔ اب تمہارا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہی فیصلہ فرمائے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون ضلالت پر! ہمارے نزدیک یہ ٹکڑا موادعت کے مفہوم میں ہے نہ کہ ملاطفت کے مفہوم میں، جیسا کہ عام طور لوگوں نے سمجھا ہے۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲۵)

یہ وہی قطعِ حجت کا مضمون، جو اوپر والی آیت میں ہے، دوسرے الفاظ میں ہے۔ فرمایا کہ اگر تمہارے نزدیک ہم تمہارے معبودوں اور تمہارے آبائی رسوم کی مخالفت کے مجرم ہیں تو عنداللہ اس جرم کی مسئولیت ہمارے ہی اوپر ہے، تمہارے اوپر نہیں ہے۔ اسی طرح تم جو کچھ کر رہے ہو اس کی پرسش ہم سے نہیں ہونی ہے، تمہی سے ہونی ہے۔ ہمارے اوپر حق کو پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی، یہ فرض ہم نے ادا کر دیا۔ اب مزید بحث و جدال سے کچھ حاصل نہیں۔ تم اپنی راہ چلو، ہم اپنی راہ چلتے ہیں۔ کل کو اللہ تعالیٰ کے حضور فیصلہ ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ یہی مضمون سورۂ شوریٰ کی آیت ذیل میں

یوں آیا ہے:

لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (۱۵) — ہمارے ساتھ ہمارے اعمال ہوں گے اور تمھارے ساتھ تمھارے اعمال، اب ہمارے اور تمھارے درمیان کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

یہی قطعِ بحث کا مضمون سورۂ کافرون میں ہے لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (۶) (تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین)۔ قرآن مجید میں یہ مضمون، مختلف اسلوبوں سے، جگہ جگہ آیا ہے اور اس کا ایک خاص محل ہے۔ وہ یہ کہ جب مخاطب نے اپنی ضد اور مکابرت سے بالکل واضح حقائق کو جھٹلا دینے کی کوشش کی ہے تو اس سے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اب بحث و مناظرہ سے کچھ حاصل نہیں، تم اپنا کام کرو، ہم اپنا کام کرتے ہیں۔ اس طرح کی آیات کو عام طور پر لوگوں نے مخاطب کے ساتھ اظہارِ رواداری کے مفہوم میں لیا ہے لیکن یہ اظہارِ رواداری کے مفہوم میں نہیں بلکہ اظہارِ بیزاری کے مفہوم میں ہیں۔ سیاق و سباق پر نگاہ نہ رکھنے کے سبب سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ (۲۶)

یعنی ان سے کہہ دو کہ اگر یہاں تم ہماری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہو تو نہ مانو، ایک ایسا دن آنے والا ہے جس میں ہمارا رب ہم کو اور تم کو، دونوں کو، جمع کرے گا اور پھر بالکل ٹھیک ٹھیک فیصلہ فرمائے گا کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔ وہ بہت بڑا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس کے فیصلہ کے خلاف کوئی دھاندلی یا کسی کے بس میں نہ ہوگا اور وہ ہر چیز کا پورا پورا علم رکھنے والا ہے۔ کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔

قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ۚ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲۷)

ایک طنزیہ سوال اور اس کا جواب

وہی مضمون جو اس مجموعۂ آیات کی پہلی آیت میں آیا ہے آخر میں دوسرے اسلوب سے پھر ارشاد ہوا ہے۔ اس کا انداز طنز و تحقیر اور تہدید و وعید کا ہے۔ فرمایا کہ ان سے کہو کہ ذرا مجھے ان کو دکھاؤ تو سہی جن کو تم نے شریکوں کی حیثیت سے خدا کے ساتھ چپکا رکھا ہے! آخر وہ کون اور کہاں ہیں جو ایسے عالی مقام ہیں کہ وہ خدا کی خدائی میں ساجھی بنا دیے گئے ہیں!

'كَلَّا ۚ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' سوال کے بعد خود ہی اس کا جواب دے دیا کہ ہرگز نہیں! کسی کا بھی یہ درجہ و مرتبہ نہیں ہے کہ اس کو خدا کا شریک قرار دیا جا سکے۔ اس کے بعد اس نفی کی دلیل اللہ تعالیٰ کی مسلّمہ صفات سے دی ہے۔ فرمایا کہ وہ 'عزیز' و 'حکیم' ہے۔ 'عزیز' یعنی سب کی رسائی سے بالاتر اور ہر چیز پر غالب و مقتدر۔ 'حکیم' یعنی اس کا ہر فعل غایت و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ ان صفات کا ذکر حصر کے اسلوب میں فرمایا ہے یعنی وہ ان صفات سے کمال درجہ متصف ہے اور جب وہ ان سے کمال درجہ متصف ہے تو ان کے ساتھ شرک کا کوئی جوڑ نہیں ہے اس لیے کہ اگر کسی کو اس کا شریک

اس پہلو سے مانا جائے کہ اس کائنات کے خلق و تدبیر میں خدا اس کا محتاج ہے تو یہ اس کے 'عزیز' ہونے کی نفی ہے اور اگر اس پہلو سے مانا جائے کہ کوئی اپنی رسائی و تقرب سے اس کے بے لاگ عدل پر اثرانداز ہو سکتا ہے تو یہ اس کے 'حکیم' ہونے کی نفی ہوئی۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ مشرکین کے شرک میں اصل عامل کی حیثیت انہی دونوں غلط فہمیوں کو حاصل تھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفتوں کا حوالہ دے کر ان دونوں غلط فہمیوں کی بنیاد ڈھا دی۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۸-۳۹

آگے کی آیات میں مخالفین کے ان مطالبات و اعتراضات سے تعرض فرمایا ہے جو وہ قرآن کی دعوت اور اس کے انذار کی تکذیب کے لیے پیش کر رہے تھے۔ اعتراضات و مطالبات کے جواب بھی دیے ہیں اور اس انجام کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے جس سے وہ لوگ لازماً دوچار ہوں گے جو ان لاطائل اعتراضات و شبہات کی آڑ لے کر حقیقت کو جھٹلائیں گے ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸-۳۹

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾
ع ۳ ۹ النصف قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۰﴾
وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ
وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ښ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ
اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا
لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا
لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ
جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ
اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ
وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۭ

وَجَعَلْنَا الْأَغْلَالَ فِي أَعْنَاقِ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا
كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۳﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِنْ نَذِيرٍ إِلَّا قَالَ
مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ﴿۳۴﴾ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ
أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿۳۵﴾ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ
الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۶﴾
وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنْ
آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوا
وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُونَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ
أُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ ﴿۳۸﴾ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ ۚ وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ
شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿۳۹﴾

ترجمۂ آیات ۲۸-۲۹

اور ہم نے تو تم کو سب لوگوں کے واسطے بس بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جان رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ دھمکی کب ظاہر ہوگی، اگر تم لوگ سچے ہو! ان کو بتا دو کہ تمھارے لیے ایک خاص دن کی میعاد مقرر ہے جس سے نہ ذرا پیچھے ہٹو گے اور نہ آگے بڑھو گے۔ ۲۸-۳۰

اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ نہ تو ہم اس قرآن پر ایمان لانے کے اور نہ اس چیز ہی پر جس کی وہ آگے کو خبر دے رہا ہے اور اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب کہ یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے کیے جائیں گے! ان کے آپس میں تو تکار ہو رہی ہوگی۔ جو لوگ دبا کے رکھے گئے وہ ان لوگوں سے جنھوں نے تکبر کیا، کہیں گے کہ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو ہم ضرور

ایمان لانے والوں میں سے ہوتے۔ وہ لوگ جو بڑے بنے ان لوگوں کو جو دبا کے رکھے گئے، جواب دیں گے کہ کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روکا جب کہ وہ تمھارے پاس آچکی تھی! بلکہ تم خود ہی مجرم ہو۔ اور دبے ہوئے لوگ متکبرین سے کہیں گے بلکہ تمھاری رات دن کی سازشیں تھیں (جو قبولِ حق میں مانع ہوئیں) جب کہ تم ہمیں سمجھاتے تھے کہ ہم اللہ کا کفر کریں اور اس کے شریک ٹھہرائیں۔ اور وہ دلوں میں نادم ہوں گے جب دیکھیں گے عذاب کو۔ اور ہم کافروں کی گردنوں میں طوق ڈالیں گے۔ یہ وہی بدلہ میں پائیں گے جو وہ کرتے رہے تھے۔ ۳۱-۳۳

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نذیر بھیجا تو اس کے اغنیاء نے یہی کہا کہ ہم تو اس پیغام کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو۔ اور انھوں نے کہا کہ ہم تو تم سے مال و اولاد میں بڑھ کر ہیں اور ہم کبھی مبتلائے عذاب ہونے والے نہیں ہیں۔ ان سے کہہ دو۔ میرا رب ہی ہے جو رزق کشادہ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ اور تمھارے مال اور تمھاری اولاد وہ چیز نہیں ہے جو تم کو ہمارا مقرب بنا دینے والی ہو۔ البتہ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے وہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے ان کے اعمال کا مضاعف صلہ ہوگا اور وہ بالا خانوں میں چین سے براجماں ہوں گے۔ ۳۴-۳۷

اور جو زک دینے کے لیے ہماری آیات کے ابطال کی راہ میں سرگرم ہیں وہ لوگ عذاب میں داخل کیے جائیں گے۔ ۳۸

کہہ دو، میرا رب ہی ہے جو رزق کو کشادہ کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے اس کے لیے (اگر چاہتا ہے) اور جو کوئی چیز بھی تم خرچ

کروگے تو وہ اس کا بدلہ دے گا اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ ۳۹

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۸)

رسول کی ذمہ داری صرف انذار اور بشارت ہے

یہ اظہارِ افسوس ہے ان لوگوں کی حالت پر جو قرآن کی دعوتِ توحید اور اس کے انذارِ عذاب و قیامت کی تکذیب کے لیے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے تاکہ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرسکیں۔ فرمایا کہ ہم نے تم کو عذاب لانے والا نہیں بلکہ لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے کہ تم ان لوگوں کو نجات اور رحمت کی بشارت دے دو جو تمھاری دعوت پر ایمان لا کر ایمان و عملِ صالح کی زندگی اختیار کرلیں گے۔ اور ان لوگوں کو خدا کے اس قہر و غضب سے آگاہ کردو جس سے تمھاری تکذیب کی صورت میں ان کو لازماً سابقہ پیش آئے گا۔ تمھاری ذمہ داری اس انذار و بشارت کے بعد ختم ہوجاتی ہے۔ عذاب لانے یا نہ لانے کا معاملہ ہم سے متعلق ہے۔ جب اس کا وقت آجائے گا تو ہم یہ چیز بھی ان کو دکھا دیں گے۔

'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ'۔ یہ لوگوں کی بدبختی پر اظہارِ افسوس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو عذاب سے پہلے ایک آگاہ کرنے والا بھیج دیا کہ لوگ چاہیں تو ایمان و عملِ صالح کی زندگی اختیار کر کے اپنے لیے ابدی رحمت کی ضمانت حاصل کرلیں لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ رحمت کی جگہ عذاب ہی کے طالب ہیں۔ ان کو اس حقیقت کی خبر نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی طرف رسول بھیج دیتا ہے تو اس پر اللہ کی حجت تمام ہوجاتی ہے۔ اگر وہ قوم رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو سنتِ الٰہی کے بموجب وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ آگے والی سورہ، سورۂ فاطر میں اس حقیقت کی وضاحت یوں فرمائی گئی ہے:

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ	تم تو بس ایک آگاہ کردینے والے ہو۔ ہم نے
بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۭ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ	تو تم کو حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور آگاہ
اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ وَاِنْ	کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی
يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ	نہیں ہوئی ہے جس میں ایک نذیر نہ آیا ہو۔ اور اگر
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَاۗءَتْهُمْ	یہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ	سے پہلے جو قومیں گزری ہیں انھوں نے بھی جھٹلایا۔
وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝ ثُمَّ اَخَذْتُ	ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں، صحیفے اور
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ	روشن کتاب لے کر آئے۔ پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑا

نَكِيْرِ ﴿۲۴ - ۲۳ : ۲۰﴾ جنھوں نے کفر کیا تو دیکھو کیسی ہوئی میری پھٹکار۔

اہل کتاب کو ایک برمحل تنبیہ

اس آیت میں 'کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ' کے الفاظ بھی قابلِ غور ہیں۔ آنحضرتؐ سے پہلے جو رسول آئے صرف اپنی اپنی قوموں ہی کے لیے نذیر بن کر آئے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم الانبیاء و خاتم الرسل ہیں اس وجہ سے آپ کی بعثت تمام خلق کی طرف ہوئی۔ یہ حقیقت قرآن میں بھی مختلف پہلوؤں سے واضح فرمائی گئی ہے اور سابق صحیفوں میں آپ کی نسبت جو پیشین گوئیاں وارد ہیں، ان میں بھی آپ کی یہ حیثیت نمایاں ہے۔ ان کے حوالے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم نقل کر آئے ہیں۔ یہاں اس بات کی یاددہانی سے مقصود اہل کتاب کو متنبہ کرنا ہے۔ دعوت کے اس دور میں انھوں نے بھی درپردہ قریش کی پشت پناہی شروع کر دی تھی، اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفت کا حوالہ دے کر ان کو بھی آگاہ کر دیا گیا کہ جس رسول کی مخالفت میں وہ اپنی ذہانت و قابلیت صرف کر رہے ہیں وہ صرف قریش ہی کے لیے منذر و مبشر بن کر نہیں آیا ہے بلکہ اس کے ذریعے سے خود ان کی قسمت کا بھی فیصلہ ہونا ہے اس وجہ سے اگر وہ یہ خطرناک کھیل کھیلنا چاہتے ہیں تو اس کے نتائج بہت دور تک سوچ لیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾

استہزا کرنے والوں کو جواب

یعنی وہ رسول کے انذار بالعذاب سے متنبہ ہونے اور اس سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرنے کے بجائے رسول اور اس کے ساتھیوں کا استخفاف کرتے اور بانداز طنز سوال کرتے ہیں کہ اگر تم لوگ اپنے انذار میں سچے ہو تو یہ بتاؤ کہ یہ دھمکی کب ظہور میں آئے گی؟ مطلب یہ ہے کہ یا تو اس کو دکھاؤ یا اس کا وقت متعین کر دو ورنہ ہم اس کو محض لاف زنی سمجھتے ہیں۔

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۰﴾

فرمایا کہ ان کو جواب دے دو کہ اس چیز کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ اس کے ظہور کے لیے ایک خاص وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آجائے گا تو پھر نہ تو اس سے پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ آگے ہی بڑھ سکو گے۔ یہ حقیقت ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں اور باغیوں کو بھی اتنی مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں تاکہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور یہ بات صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کسی قوم کا پیمانہ کب لبریز ہوا۔ اس بھید سے اللہ کا رسول بھی واقف نہیں ہوتا۔ لفظ 'يَوْم' یہاں وقت کے مفہوم میں ہے اور لفظ 'سَاعَة' لمحہ، پل اور وقتِ قلیل کے مفہوم میں۔ اس اسلوبِ بیان کے اندر سوال کرنے والوں کے طنز کے جواب میں یہ طنز بھی مضمر ہے کہ آخر کس برتے پر اس عذاب کا وقت معلوم کرنا چاہتے ہو، وہ اٹل وقت جب آجائے گا تو پھر کسی کے ٹالے نہ ٹل سکے گا!

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِۨ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا

لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ (۳۱)

الذی بین یدیہ کی تاویل

'وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ' کی دو تاویلیں لوگوں نے کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد قرآن سے پہلے نازل ہونے والے آسمانی صحیفے ہیں، دوسری یہ کہ یہ اس عذاب اور قیامت کی طرف اشارہ ہے جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا تھا۔ ہمارے نزدیک یہ دوسرا قول سیاق و سباق سے زیادہ اوفق ہے۔ یعنی یہ کفار نہایت ڈھٹائی کے ساتھ قرآن کے انذار کا یہ جواب دیتے ہیں کہ نہ تو ہم اس قرآن ہی پر ایمان لانے والے ہیں اور نہ اس عذاب اور قیامت ہی کو ماننے کے لیے تیار ہیں جس کی وہ آگے کو خبر دے رہا ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم سے یہ بات منوانی ہے تو ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ یہ چیز ہمیں دکھا دی جائے۔ اگر یہ دکھائی نہیں جاتی تو پھر ہم اس دھونس میں آنے والے نہیں ہیں!

حذف کا ایک اسلوب

'وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ'۔ 'ظّٰلِمُوْنَ' سے مراد یہی شامت زدہ لوگ ہیں جو خدا کی رحمت کو ٹھکرا کر اس کی نقمت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جواب شرط یہاں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق محذوف ہے۔ حذف کا یہ طریقہ ان مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں صورت حال تعبیر و تصویر سے ماورا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ شامت زدہ لوگ قرآن اور اس کے بعد آنے والی قیامت کا نہایت جسارت سے انکار کر رہے ہیں لیکن اگر تم کہیں ان کی اس حالت کو دیکھ پاتے جب کہ یہ اپنے رب کے حضور میں کھڑے کیے جائیں گے تو .... اس 'تو' کے بعد اس منظر کا ذکر حذف کر دیا ہے جس سے یہ بات نکلی کہ اس کی ہولناکی تعبیر و تصویر کے حدود سے باہر ہے۔

لیڈروں اور اس کے پیروؤں کی تو تکار

'يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِۨالْقَوْلَ' کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ وہ آپس میں تو تکار کریں گے۔ اس کی تفصیل آگے کی آیات میں آ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو ان کے لیڈر اور پیرو دونوں قرآن اور قیامت کی مخالفت پر متفق ہیں۔ لیڈر مخالفت کے لیے پیش پیش ہیں اور عوام ان کی تائید کرتے ہوئے ان کے جھنڈے اٹھائے پھر رہے ہیں لیکن جب خدا کے حضور میں ان کی پیشی ہوگی تو پیرو لیڈروں کو اپنی گمراہی کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے اور لیڈر پیروؤں کو ملامت کریں گے کہ تم اپنی شامت کے خود ذمہ دار ہو کہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد تم نے حق کے بجائے ہماری پیروی کی۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو لیڈر عوام کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ وہ ان کی صوابدید پر اعتماد کریں، خیر و شر کی ذمہ داری ان پر ہے اور عوام آنکھ بند کر کے ان کے پیچھے چل رہے ہیں کہ کوئی خطرہ پیش آیا تو ان کے لیڈر اس سے ان کو بچا لیں گے لیکن جب اصل مرحلہ سامنے آئے گا تب معلوم ہوگا کہ ہر ایک اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، کوئی دوسرا کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا۔

'يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ' یہ اوپر والی بات کی وضاحت ہو رہی ہے۔ 'الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا' سے مراد وہ غربا اور عوام ہیں جو اپنی غربت اور بے مائگی

کے سبب سے بڑوں اور سرمایہ داروں کے زیردست اور ان کے آلۂ کار بنے رہے۔ اَلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا ' سے ان کے سرمایہ دار لیڈر اور سردار مراد ہیں جنھوں نے اپنی ذات کو حق و باطل کا معیار بنا کر لوگوں کو اپنے پیچھے چلایا یہاں تک کہ اللہ و رسول کی مخالفت کے لیے بھی ان کو استعمال کیا۔ فرمایا کہ اس دن غربا اور عوام اپنے لیڈروں اور سرمایہ داروں کو الزام دیں گے کہ یہ تم ہو کہ تمھاری بدولت ہم اس بدبختی سے دوچار ہوئے، تم نے ہماری راہ نہ ماری ہوتی تو ہم ضرور ایمان لانے والوں میں سے بنتے۔ مطلب یہ ہے کہ حق تو ہم سے مخفی نہیں رہا تھا اور ہمارے اندر اس کے اختیار کرنے کا جذبہ بھی ابھرتا تھا لیکن تمھارا دباؤ ہمارے اس جذبے کو دبا دیتا تھا اور ہم اپنی خواہش کے خلاف ایمان کی سعادت سے محروم رہ گئے اور بالآخر اس انجام کو پہنچے۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ (۳۲)

لیڈر اپنے پیرؤوں کو جھٹ جواب دیں گے کہ تمھارا الزام بالکل غلط ہے کہ تم کو ہم نے اللہ کی ہدایت سے روکا بلکہ مجرم تم خود ہو کہ نہایت واضح ہدایت آ جانے کے بعد بھی تم ہمارے پیرو بنے رہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق نہ تو ہم پر مخفی تھا نہ تم پر۔ اللہ کے رسول نے حجت تمام کر دی تھی۔ یہ بات نہ ہوتی ہوتی تب تو کسی حد تک ہم کو الزام دینے میں تم بجانب حق ہوتے لیکن جب تم نے پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی تو ہم کو مجرم ٹھہرانے کے بجائے اپنے سر پیٹو۔ ہم بھی مجرم ہیں اور ہماری ہی طرح تم بھی مجرم ہو ـــــ یہ بات ہے تو کفار کی لیکن قرآن نے یہ ایک سچی بات کی حیثیت سے نقل کی ہے اور اس میں ہر دور کے عوام کے لیے درس عبرت ہے کہ حق و ہدایت کے معاملے میں کوئی شخص مجرد اس عذر پر عند اللہ بری نہیں ہو سکتا کہ اس کو دوسروں نے گمراہ کیا بلکہ حق کی جستجو ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے اور اس کے واضح ہونے کے بعد اس کی پیروی تا حدِ امکان ہر فرد پر لازم ہے۔ اس کے بغیر کوئی عند اللہ بری نہیں ہو سکتا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۭ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۳۳)

عوام لیڈروں کے جواب میں کہیں گے کہ یہ تمھاری رات دن کی سازشیں تھیں کہ ہم حق کی پیروی سے محروم رہے۔ تم نے رسول کی ہدایت سے برگشتہ کرنے کے لیے پروپیگنڈے کی مہم چلا رکھی تھی اور ہمیں تم یہ سمجھاتے اور سکھاتے تھے کہ ہم برابر کفر و شرک پر جمے رہیں ـــــ اس جواب سے یہ بات نکلی کہ ان کو اس امر کا تو اعتراف ہو گا کہ حق ان پر واضح تھا لیکن وہ اس وجہ سے اس کی پیروی نہ کر سکے کہ ان کے لیڈروں

کی رات دن کی سازشوں نے انھیں اس کی پیروی سے محروم رکھا۔

'وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ'۔ 'اَسَرُّوا النَّدَامَةَ' اسی طرح کا محاورہ ہے جس طرح 'ابطن العداوۃ' ہے۔ 'ندامت' ایک کیفیت قلبی و باطنی ہے اس وجہ سے اس کے لیے 'اسرّ' استعمال ہوا ہے۔ مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس سوال و جواب کے بعد جب وہ دیکھیں گے کہ سامنے عذاب کھڑا ہے تو وہ اپنی بدبختی پر سخت پشیمان ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا یہ عذر مسموع نہیں ہوگا کہ وہ اپنے لیڈروں کی سازشوں کے سبب سے ہدایت کی پیروی سے محروم رہے بلکہ ان کو لازماً عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کی پشیمانی کی وجہ یہ ہوگی کہ اس وقت ان کے سامنے یہ بات بالکل کھل کر آجائے گی کہ فی الحقیقت انھوں نے بالکل اپنے ضمیر کے خلاف اپنے لیڈروں کی پیروی کی۔ جو آدمی اپنے ضمیر کے خلاف کسی باطل کی پیروی کرتا ہے جب اس کا نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے تو اس کو صرف نتیجہ کی تلخی ہی سے سابقہ نہیں پڑتا بلکہ اپنے ضمیر کی لعنت سے بھی اس کو دوچار ہونا پڑتا ہے اور یہ چیز اس کی مصیبت کو دوچند کر دیتی ہے۔ یہ مضمون احزاب کی آیات ۶۶-۶۸ میں گزر چکا ہے۔ مزید وضاحت مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

عمل اور جزا میں مشابہت

'وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْٓ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا'۔ فرمایا کہ ہم ان کافروں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے۔ یہ عمل اور جزا میں مطابقت کی طرف اشارہ ہے۔ جو لوگ اپنی عقل اور اپنے ضمیر کو بالکل معطل کر کے اپنی باگ دوسروں کے ہاتھ میں پکڑا دیں گے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو اس کی سزا یہ دے گا کہ ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے جائیں گے جن کو پکڑ کر دوزخ کے داروغے ان کو دوزخ میں گھسیٹیں گے۔

'هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'۔ یعنی ان کی گردنوں میں یہ طوق جو ڈالے جائیں گے تو یہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی بلکہ دنیا میں جو کچھ انھوں نے کیا اسی کی اصل حقیقت ان کے سامنے اس شکل میں آئے گی۔ انھوں نے دوسروں کی غلامی کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال کر اپنے رب کی نافرمانی کی جس کے نتیجہ میں ان کو دوزخ کے یہ اغلال اپنی گردنوں میں ڈالنے پڑیں گے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۴)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمھارے زمانے کے امرا و اغنیاء جو کچھ تمھارے ساتھ کر رہے ہیں یہی کچھ ہر زمانے کے مترفین نے اپنے اپنے زمانوں کے رسولوں کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے بھی نہایت رعونت کے ساتھ اپنے رسولوں کو یہ جواب دیا کہ جو پیغام تم دے کر بھیجے گئے ہو ہم اس سارے کے منکر ہیں۔ یعنی نہ تو تمھاری دعوت توحید و ایمان کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اور نہ تمھاری اس دھونس ہی میں آنے والے ہیں کہ اگر ہم نے تمھاری بات نہ مانی تو ہم پر کوئی عذاب آجائے گا۔

'اُرْسِلْتُمْ بِہٖ' کے اسلوب میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ جس رسالت کے تم مدعی ہو یہ بھی محض تمہارا زعم ہے جس کی ہمارے نزدیک کوئی حقیقت نہیں ہے۔

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (۳۵)

معترضین کا اصل مغالطہ

یعنی رسولوں کے انذار کی تکذیب کے حق میں جو دلیل انھوں نے پیش کی وہ یہی تھی جو تمہارے زمانے کے معترضین پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے رسول اور اس کے ساتھیوں کو جواب دیا کہ تم ہمیں ڈراتے ہو کہ ہمارا عقیدہ و عمل باطل ہے اور ہم خدا کے عذاب کے سزاوار ہیں اور حال یہ ہے کہ ہم مال و اولاد میں تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اگر تمہاری بات سچی ہوتی تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ مال و اولاد میں تم ہم سے بڑھ چڑھ کر ہوتے۔ 'وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ' یعنی جب صورت حال علانیہ تمہاری تکذیب کر رہی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ تم محض لاف زنی کر رہے ہو، ہم پر نہ اس دنیا میں کوئی عذاب آنے والا ہے اور نہ آخرت میں (اگر تمہارے زعم کے مطابق وہ ہوئی) ہمیں کسی عذاب کا کوئی اندیشہ ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۶)

مغالطہ کا ازالہ

فرمایا کہ ان کا یہ مغالطہ رفع کرنے کے لیے ان کو بتا دو کہ اس دنیا میں مال و اولاد کی زیادتی نہ تو خدا کے منظور نظر ہونے کی دلیل ہے اور نہ اس کی کمی خدا کی نظروں میں حقیر ہونے کی۔ بلکہ یہ کمی و زیادتی تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار اور اس کی حکمت پر منحصر ہے۔ وہ کسی کے رزق میں کشادگی دیتا ہے تو اس کے شکر کا امتحان کرتا ہے اور کسی کے رزق کو تنگ کرتا ہے تو اس کے صبر کو جانچتا ہے اور اصل کامیابی کا انحصار درحقیقت اس امتحان کے نتیجہ پر ہے جو آخرت میں سامنے آئے گا۔

'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ' لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ وہ اس حماقت میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کو جو مال و جاہ حاصل ہے یہ ان کی قابلیت و استحقاق کا کرشمہ اور خدا کے ہاں ان کے مقرب و منظور نظر ہونے کی دلیل ہے اس طرح وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کو اپنے لیے عذاب بنا لیتے ہیں۔

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۙ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ (۳۷)

'زُلْفٰى' مصدر ہے جس سے مقصود فعل کی تاکید ہے یعنی تقربكم قربة۔ مطلب یہ ہے کہ مال و اولاد ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جو خدا کے ہاں ذرا بھی وجہ قربت ہو سکیں۔ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ امتحان کے لیے دیتا ہے کہ ان کو پا کر بندہ اس کی ناشکری کرتا ہے یا ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرتا ہے اس وجہ سے خدا کے ہاں تقرب کا ذریعہ مال و اولاد نہیں بلکہ ایمان و عمل صالح ہے۔ اگر کسی نے ایمان و عمل صالح کی کمائی نہیں کی تو اس کے لیے مال و اولاد کی زیادتی صرف اس کے وبال میں

اضافہ کرے گی۔

'جزاء الضعف' کا مفہوم

'فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا' لفظ 'ضعف' عربی میں کسی شے کے مثل کے لیے بھی آتا ہے اور اس کے امثال کے لیے بھی، خواہ وہ امثال کتنے ہی غیر محدود ہوں۔ اس وجہ سے اس ٹکڑے کا مفہوم یہ ہوگا کہ البتہ وہ لوگ جو ایمان و عمل صالح کی روش اختیار کریں گے ان کے لیے ان کے اعمال کا مضاعف صلہ ہوگا۔ اس مضاعف صلہ کی وضاحت قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں ہوئی ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ اس کو دگنے اجر کے محدود مفہوم میں نہ لیجیے۔[1]

'وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ' یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں تو مال و اولاد کے لیے ہر وقت خطرات ہیں اور کوئی بھی ان خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں کر سکتا لیکن جو لوگ مال و اولاد کو آخرت کی فلاح کا ذریعہ بناتے ہیں ان کو اس کا جو صلہ ملے گا وہ ابدی اور لازوال ہوگا۔ اس باب میں پھر ان کو کبھی کوئی تشویش لاحق نہیں ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (۳۸)

یہ ان لوگوں کے انجام کا بیان ہے جنھوں نے مال و اولاد کی زیادتی کو اللہ کی آیات کو جھٹلانے اور رسول کو زچ کرنے کے لیے دلیل کے طور پر استعمال کیا۔ فرمایا کہ یہ لوگ پکڑ کر خدا کے عذاب میں لائے جائیں گے تاکہ اپنے کبر و غرور کی سزا بھگتیں۔ لفظ 'مُحْضَرُوْنَ' میں ان کی ذلت اور بے بسی کی جو تصویر ہے وہ ظاہر ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۳۹)

رزق و فضل کا صحیح مصرف

اس آیت کی تمہید اوپر کی آیت ۳۶ کی تمہید بعینہٖ ایک ہی ہے لیکن دونوں جگہ مدعا الگ الگ ہے۔ اوپر کی آیت میں یہ واضح فرمایا ہے کہ رزق کی کشادگی و تنگی تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اس وجہ سے نہ اس کی کشادگی پر کسی کو اترانے کا حق ہے اور نہ اس کی تنگی سے کسی کو مایوس ہونا جائز ہے، بلکہ ہر شخص کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ دونوں حالتیں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت پیش آتی ہیں اور دونوں سے وہ اپنے بندوں کے شکر یا صبر کا امتحان کرتا ہے۔ اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ ان مترفین کو یہ بتا دو کہ اللہ کے بخشے ہوئے رزق و فضل پر اکڑنے کے بجائے اس کو

---

[1] صاحب اقرب الموارد نے اس لفظ کی تشریح یوں کی ہے:

وجائز في كلام العرب ان يكون الضعف المثل الواحد وما زاد عليه من الامثال يقال لك ضعفه اي مثلاه وثلاثة امثاله لانه في الاصل زيادة غير محصورة۔

خدا کی خوشنودی کے کاموں میں صرف کریں کہ یہی شکر کا تقاضا ہے اور وہ اطمینان رکھیں کہ جو کچھ بھی وہ خدا کی راہ میں خرچ کریں گے وہ ضائع جانے والا نہیں ہے بلکہ وہ چھوٹے سے چھوٹے انفاق کا بھی بھرپور صلہ دے گا۔ اوپر صلہ کے معاملے میں 'جَزَآءُ الضِّعۡفِ' کا اصول بیان ہو چکا ہے اور اس کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔ آیت میں 'وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ' کے بعد 'فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ' کے الفاظ وضاحت قرینہ کی بنا پر حذف ہیں۔ 'اَخۡلَفَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ' کے معنی ہوں گے 'رَدَّ عَلَیۡکَ مَا ذَھَبَ' (تمھاری گئی ہوئی چیز خدا نے تمھیں لوٹا دی)۔

'وَھُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ' یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے اطمینان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ بہترین رزق دینے والا ہے۔ آج وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کے خرچ کیے ہوئے خزف ریزوں کے عوض میں کل وہ ان کو کیا کچھ بخش سکتا ہے اور کیا کچھ بخش دے گا۔ لفظ 'خَیۡرُ' یہاں ترجیح و تفضیل کے مفہوم میں نہیں بلکہ مطلق بیانِ صفت کے لیے ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۴۰ - ۴۵

آگے معترضین کو متنبہ کیا ہے کہ تم فرشتوں کو معبود بنا کر ان کی پرستش کر رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ آخرت کا مرحلہ پیش آیا تو وہ تم کو بچا لیں گے حالانکہ آخرت میں وہ تم سے اعلانِ براءت کریں گے اور خدا کے عذاب سے تم کو کوئی بچانے والا نہیں بنے گا۔ یہ اللہ نے تم پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے کہ تمھیں آگاہ کرنے کے لیے رسول بھیجا ہے لیکن تم بدبختی کے سبب سے اس کے کلام کو سحر قرار دے رہے ہو۔ بہتر ہے کہ ماضی کی قوموں کے انجام سے سبق لو۔ ان کو جو کچھ حاصل ہوا اس کا عشرِ عشیر بھی تم حاصل نہیں کر پائے ہو لیکن جب وہ اللہ کی پکڑ میں آ گئے تو پھر کوئی بھی ان کو پناہ دینے والا نہ بن سکا ــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۰-۴۵
وَيَوۡمَ يَحۡشُرُهُمۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ يَقُوۡلُ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمۡ كَانُوۡا
يَعۡبُدُوۡنَ ﴿۴۰﴾ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ اَنۡتَ وَلِيُّنَا مِنۡ دُوۡنِهِمۡ ۚ بَلۡ كَانُوۡا
يَعۡبُدُوۡنَ الۡجِنَّ ۚ اَكۡثَرُهُمۡ بِهِمۡ مُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۱﴾ فَالۡيَوۡمَ لَا يَمۡلِكُ
بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ نَّفۡعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ وَنَقُوۡلُ لِلَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ذُوۡقُوۡا
عَذَابَ النَّارِ الَّتِيۡ كُنۡتُمۡ بِهَا تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۴۲﴾ وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُنَا
بَيِّنٰتٍ قَالُوۡا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيۡدُ اَنۡ يَّصُدَّكُمۡ عَمَّا كَانَ

يَعْبُدُ اٰبَاۤؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَقَالَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاۤءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾
وَمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ
مِنْ نَّذِيْرٍ ﴿۴۴﴾ وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَاۤ
ع ۵ ۹ ۱۱ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۵﴾

ترجمہ آیات ۴۰-۴۵

اور اس دن کو یاد رکھو جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری پرستش کرتے رہے ہیں! وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے۔ ان کے بالمقابل تو ہمارا کارساز ہے! بلکہ یہ جنوں کی پرستش کرتے رہے ہیں، ان کی اکثریت انہی پر ایمان رکھتی تھی۔ ۴۱

پس آج تم میں سے کوئی ایک دوسرے کو نہ تو کوئی نفع پہنچا سکے گا اور نہ نقصان۔ اور ہم ان ظالموں سے کہیں گے کہ اب اس دوزخ کے عذاب کا مزا چکھو جس کو جھٹلاتے رہے ہو! ۴۲

اور جب ان کو ہماری روشن آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ تو محض ایک شخص ہے جو چاہتا ہے کہ تم کو ان چیزوں سے روک دے جن کو تمہارے باپ دادا پوجتے آئے اور انھوں نے کہا کہ یہ تو بس ایک من گھڑت جھوٹ ہے! اور ان کافروں نے حق کی بابت، جب کہ وہ ان کے پاس آگیا، کہا کہ یہ تو بس کھلا ہوا جادو ہے! اور ہم نے ان کو کتابیں نہیں دی تھیں جن کو وہ پڑھتے ہوں اور نہ ان کی طرف تم سے پہلے کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا۔ ۴۴

اور ان سے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا۔ اور یہ تو اس کے عشر عشیر کو بھی نہ پہنچے جو ہم

نے ان کو دیا۔ تو انھوں نے میرے رسولوں کی تکذیب کی تو دیکھو، کیسی ہوئی ان پر میری پھٹکار! ۴۵

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَیَوْمَ یَحْشُرُھُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اَھٰٓؤُلَآءِ اِیَّاکُمْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ (۴۰)

قیامت کے دن فرشتوں کی گواہی

'جَمِیْعًا' کی تاکید اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ قیامت کے دن کفار و مشرکین بھی اکٹھے کیے جائیں گے اور ان کے خلاف گواہی دلوانے کے لیے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بھی اکٹھا کرے گا جن کی عبادت کے وہ مدعی رہے ہوں گے یا جن کی طرف انھوں نے اپنی بدعات منسوب کی ہوں گی۔ سورۂ مائدہ میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی شہادت کا ذکر گزر چکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ان تمام بدعات سے اپنی براءت کا اعلان کریں گے جو ان کے اعیان کے مبتدع پیروؤں نے ایجاد کی ہوں گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھی اکٹھا کر کے ان سے سوال کرے گا کہ یہ مشرکین (اشارہ مشرکین عرب کی طرف ہے) مدعی ہیں کہ یہ تمھاری عبادت کرتے رہے ہیں تو کیا ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے؟ اس سوال کا مقصد ظاہر ہے کہ مشرکین پر اتمام حجت ہو گا کہ جن کو وہ شریک و شفیع سمجھ کر زندگی بھر پوجتے رہے ان کو نہ تو ان کی اس عبادت کی خبر ہے نہ انھوں نے اس کا ان کو حکم دیا اور نہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں کہ کوئی ان کو پروردگار عالم کا شریک بنا کر ان کی عبادت کرے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَکَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِہِمْ ۚ بَلْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَکْثَرُھُمْ بِہِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (۴۱)

فرشتے اس سوال کا فوراً یہ جواب دیں گے کہ 'سُبْحٰنَکَ'، تو اس سے پاک اور ارفع ہے کہ تیرا شریک و سہیم ہو!

فرشتوں کے جواب کے چند خاص پہلو

فرشتوں کے اس جواب سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ شرک ایک ایسی گھناؤنی چیز ہے کہ اس کا ذکر سنتے ہی وہ اس سے اپنی نفرت کا اظہار کریں گے اور اللہ جل شانہ کو اس سے ارفع قرار دیں گے کہ کوئی اس کا شریک و سہیم ہو۔

دوسری یہ بات واضح ہوئی کہ وہ اپنے اوپر اس کو ایک سنگین تہمت خیال کریں گے کہ کچھ ظالموں نے ان کو شرک کی گندگی میں ملوث کرنے کی کوشش کی۔

تیسری یہ بات نکلی کہ جن احمقوں نے ایسا کیا ہے اس کی ذمہ داری تمام تر انھی پر ہے۔ فرشتے اس سے بری ہیں کہ وہ کسی کو اپنی عبادت کا حکم دیں۔

'اَنۡتَ وَلِیُّنَا مِنۡ دُوۡنِہِمۡ' یہ فرشتوں کا اپنے رب سے استغاثہ ہوگا کہ ان ظالموں کے مقابل میں، جنھوں نے ہمیں اس جرم میں ملوث کرنے کی کوشش کی، تو ہمارا یاور و ناصر اور مولیٰ و مرجع ہے۔ ہم ان سے بری ہیں تو ہمیں ان کی تہمت سے بری فرما۔ 'مِنۡ دُوۡنِہِمۡ' یہاں مقابل کے مفہوم میں ہے۔

مشرکین کی جنات پرستی

'بَلۡ کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ الۡجِنَّ ۚ اَکۡثَرُہُمۡ بِہِمۡ مُّؤۡمِنُوۡنَ'۔ یعنی ان کا یہ زعم تو بالکل باطل ہے کہ یہ ہماری پرستش کرتے رہے ہیں البتہ یہ امر واقعی ہے کہ یہ لوگ جنوں کی پرستش کرتے رہے ہیں اس لیے کہ ان کی اکثریت انہی پر ایمان رکھنے والی تھی۔

فرشتوں کا یہ جواب بالکل حقیقت کے مطابق ہوگا۔ اس لیے کہ فرشتوں کے نام سے انھوں نے جو بت بنائے ــــ مثلاً لات، منات اور عزّیٰ وغیرہ ــــ یہ تو محض ان کے اپنے فرض کیے ہوئے نام تھے جن کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں تھا۔ البتہ اپنے کاہنوں کے توسط سے انھوں نے جنوں سے رابطہ قائم کیا تھا اور چونکہ ان کو وہ علم غیب کا ذریعہ سمجھتے تھے اس وجہ سے ان کے لیے چڑھاوے اور قربانیاں بھی پیش کرتے اور ان کی دہائی بھی پکارتے۔ 'اَکۡثَرُہُمۡ بِہِمۡ مُّؤۡمِنُوۡنَ' یعنی یہ ان پر اس حیثیت سے ایمان رکھتے رہے ہیں کہ وہ غیب کی خبروں کے لانے والے اور بذاتِ خود نافع و ضار ہیں۔

فَالۡیَوۡمَ لَا یَمۡلِکُ بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ نَّفۡعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ وَنَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ذُوۡقُوۡا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ بِہَا تُکَذِّبُوۡنَ (۴۲)

فرشتوں کی گواہی کے بعد ان کے پجاریوں کو فیصلہ

یعنی فرشتوں کے اس جواب کے بعد ان کے پجاریوں سے کہہ دیا جائے گا کہ تمھارا سارا اعتماد جن فرشتوں پر تھا ان کی گواہی تم نے علیٰ رؤس الاشہاد سن لی۔ پس آج کے دن کوئی بھی ایک دوسرے کے کام آنے والا نہ بن سکے گا۔ نہ وہ تمھیں کوئی نفع یا ضرر پہنچا سکتے اور نہ تم ان کو۔

'وَنَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ذُوۡقُوۡا ....'، یہاں 'اَلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا' سے مشرکین مراد ہیں جنھوں نے بے دلیل خدا کے شریک بنا کر 'ظلم عظیم' کا ارتکاب کیا اور جب پیغمبر نے ان کو خدا کے عذاب سے ڈرایا تو انھوں نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اس کی تکذیب کی۔ فرمایا کہ اس آخری اتمام حجت کے بعد ہم ان سے کہیں گے کہ اب اس دوزخ کا مزا چکھو جس کو جھٹلاتے رہے ہو۔

وَاِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوۡا مَا ہٰذَاۤ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیۡدُ اَنۡ یَّصُدَّکُمۡ عَمَّا کَانَ یَعۡبُدُ اٰبَآؤُکُمۡ ۚ وَقَالُوۡا مَا ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡکٌ مُّفۡتَرًی ؕ وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَہُمۡ ۙ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ (۴۳)

مخالفین کی ہٹ دھرمی پر اظہار تعجب

یہ ان لوگوں کی ہٹ دھرمی اور مکابرت پر اظہار تعجب اور ان کی محرومی و بدبختی پر اظہار افسوس ہے کہ یہ آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب ان کو ہماری نہایت روشن، محکم اور عقل و دل کو منور کر دینے والی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ اپنے عوام کو ان کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکاتے ہیں کہ یہ شخص

تمہارے ان معبودوں سے تم کو برگشتہ کرنا چاہتا ہے جن کو تمہارے بزرگ اسلاف برابر پوجتے آئے۔ حقائق کے خلاف عوام کو مشتعل کرنے کے لیے اسلاف کا حوالہ ہمیشہ سے مفسدین کے ہاتھ میں ایک کارگر حربہ رہا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ یہ واحد دلیل ہے جو ضلالت کے علمبردار لیڈروں نے اپنی ضلالتوں کے حق میں پیش کی ہے۔ 'مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ' کی تنکیر میں بھی ایک زہر چھپا ہوا ہے۔ یعنی وہ اپنے عوام کو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ شخص جو اپنے آپ کو ایک فرستادۂ الٰہی کی حیثیت سے تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے تم اس کے اس چکمے میں نہ آؤ، یہ محض ایک عام قسم کا آدمی ہے جس نے محض تمہارے دینِ آبائی سے تم کو منحرف کرنے کے لیے یہ روپ دھارا ہے کہ اس کو خدا نے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔

'وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى' یہ قرآن کے خلاف ان کے پروپیگنڈے کا حوالہ ہے کہ وہ اپنے عوام کو یہ باور کراتے ہیں کہ اس قرآن کے متعلق یہ دعویٰ جو کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اتارا ہے، یہ دعویٰ بالکل جھوٹ ہے جو محض تمہیں مرعوب کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک خود تراشیدہ کتاب ہے جو بالکل جھوٹ موٹ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کی جا رہی ہے۔

'وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ' یہ ان لوگوں کی اس ژاژخائی پر اظہارِ حیرت ہے کہ یہ لوگ حق کی مخالفت میں اس وقت یہ سخن سازیاں کر رہے ہیں جب حق ان کے سامنے ظاہر ہو چکا ہے۔ اگر سورج افق سے غائب ہو اور کوئی ہٹ دھرم اس کے متعلق کوئی سوال اٹھائے تو یہ ہٹ دھرمی چنداں حیرت انگیز نہیں، لیکن جب سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو اور کوئی اس کو جادو قرار دے تو یہ محض خرد باختگی ہے۔

'لِلْحَقِّ' میں 'حق' سے مراد قرآن ہے اور 'ل' یہاں 'فِيْ' کے مفہوم میں ہے۔ اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ اس کتاب میں اس کی مثالیں گزر چکی ہیں۔

'اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ' یہ ان کے قول کی تفصیل ہے کہ اس قرآن کو وہ جادو قرار دیتے ہیں۔ قرآن کو جادو قرار دینے کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت اور تاثیر و تسخیر کے قائل تو اس کے کٹر سے کٹر مخالفین بھی تھے لیکن وہ اپنے عوام کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ یہ تاثیر و تسخیر محض اس کے پیش کرنے والے کی جادو بیانی کا کرشمہ ہے، اس کو خدا اور فرشتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

'وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ (۴۴)'

یہ ان مخالفین پر اظہارِ احسان اور ان کی اس ناقدری و محرومی پر اظہارِ افسوس ہے۔ فرمایا کہ یہ امی اور قرآن و کتاب سے نا آشنا لوگ رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ اللہ نے ان کو کوئی کتاب دی تھی جو

ان کے لیے تعلیم و تعلّم اور ارشاد و ہدایت کا ذریعہ نبی اور نذیر ہے۔ پہلے ان کے پاس کوئی نذیر آیا تھا جو ان کو اس غفلت کی نیند سے جگاتا اور آگے کے خطرات سے آگاہ کرتا۔ اس صورتِ حال کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس عظیم نعمت کی یہ دل و جان سے قدر کرتے، آگے بڑھ کر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اس سے اپنی دنیا بھی سنوارتے اور آخرت کی بادشاہی بھی حاصل کرتے لیکن یہ اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس طرح خدا کے اس قہر کو دعوت دے رہے ہیں جو سنتِ الٰہی کے مطابق اس قوم پر آکے رہتا ہے جو اس کے بھیجے ہوئے نذیر کو جھٹلا دیتی ہے۔

'کُتُب' کے بعد 'یَدْرُسُوْنَھَا' کی صفت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اب تک ان کو اس طرح کے آسمانی صحیفے نہیں عطا ہوئے تھے جس طرح کے صحیفے بنی اسرائیل کو عطا ہوئے کہ یہ ان کو پڑھتے پڑھاتے۔ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ذریعہ سے ان کو جو تعلیم ملی تھی اس کی نوعیت دعوتیؔ کی تھی جو امتدادِ زمانہ سے تقریباً فراموش بھی ہو چکی تھیں اور بدعات کے غلبہ نے ان کا حلیہ بھی بالکل بگاڑ کے رکھ دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ ان کو اپنی کتاب دے کر ان پر اپنی نعمت تمام کر دے لیکن اُن کا حال ؔ ہے کہ یہ اس کو سحر اور افترا قرار دے رہے ہیں۔

وَکَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ لا وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَیْنٰھُمْ فَکَذَّبُوْا رُسُلِیْ قف فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ (۴۵)

خدا کے نذیر کی تکذیب کا لازمی نتیجہ

یہ ان لوگوں کو تنبیہ ہے کہ خدا کے رسول اور اس کے نذیر کی تکذیب کا لازمی نتیجہ اس قوم کی تباہی ہے اور پوری تاریخ انسانی اس سنتِ الٰہی کی شاہد ہے۔

'وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَیْنٰھُمْ' کلام کے بیچ میں ایک برمحل تنبیہ ہے کہ یہ ان قوموں کا حوالہ دیا جا رہا ہے جو کرّوفر، شان و شوکت اور اسباب و وسائل کی فراوانی کے اعتبار سے اس مقام پر پہنچ چکی تھیں کہ قریش کے یہ مترفین ان کی گردِ پا کو بھی نہیں پہنچے۔ لیکن جب انھوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی تو ان پر خدا کی پھٹکار جس طرح ہوئی اسی کی تفصیلات قرآن میں بیان ہو چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو اپنے اسباب و وسائل کا غرّہ ہے تو یہ غرّہ بالکل بے بنیاد ہے۔ بڑی صولت و شوکت کی قومیں خدا کی ایک پھونک میں اڑ گئیں تو ان کی کیا حقیقت ہے۔ ان کو تو ان کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں ہوا۔ یہ تو اپنی تنگ ظرفی کے سبب سے بہت تھوڑے میں بہک گئے ہیں۔

۱۰۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۶-۵۴

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں مخالفین کو نہایت دردمندی کے ساتھ نصیحت بھی ہے اور نہایت پُرزور وعید بھی کہ ابھی موقع ہے کہ سنبھل جاؤ۔ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر گیا وقت ہاتھ نہیں

آئے گا۔ اس وقت پچھتاؤ گے لیکن یہ پچھتانا بالکل بے سود ہوگا۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۴۶-۵۴
قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ
تَتَفَكَّرُوْا ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ
يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿۴۶﴾ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۚ
اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۴۷﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ
يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۴۸﴾ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ
الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ
اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ﴿۵۰﴾ وَلَوْ تَرٰٓى
اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۵۱﴾ وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا
بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾ وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ
قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ
وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا
فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾ ع ۶ ۱۲

ترجمہ آیات ۴۶-۵۴
ان سے کہو، میں تمھیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، وہ یہ کہ تم اللہ کی خاطر دو دو اور ایک ایک کر کے اٹھو پھر غور کرو۔ تمھارے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے۔ وہ تو ایک شدید عذاب سے پہلے تم کو آگاہ کرنے والا ہے۔ کہو، میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو تمھارے ہی لیے مانگا ہے۔ میرا اجر تو بس اللہ پر ہے اور وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ ۴۶-۴۷

میرا رب حق کو (باطل پر) مارے گا۔ وہ تمام بھیدوں کو خوب جاننے والا ہے۔

کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل نہ آغاز کرتا ہے اور نہ اعادہ۔ ۴۸ - ۴۹

کہہ دو، اگر میں گمراہی پر ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھی پر ہے اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ اس وحی کی بدولت ہے جو میرا رب میری طرف بھیج رہا ہے۔ وہ سننے والا اور نہایت قریب ہے۔ ۵۰

اور اگر تم دیکھ پاتے جب ان پر گھبراہٹ طاری ہوگی پس وہ کہیں بھاگ نہ سکیں گے اور پاس ہی سے دھر لیے جائیں گے اور وہ کہیں گے ہم اس پر ایمان لائے۔ اور اتنی دور سے ان کے لیے اس کا پانا کہاں! اور اس سے پہلے انھوں نے اس کا انکار کیا اور دور سے اٹکل کے تیر تکے چلاتے رہے اور ان کے اور ان کی چاہتوں کے درمیان دیوار حائل ہو جائے گی جس طرح اس سے پہلے ان کے ہم مشربوں کے ساتھ معاملہ ہوا۔ بے شک وہ بھی الجھن میں ڈالنے والے شک میں پڑے رہے۔ ۵۱ - ۵۴

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ ۖ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا ۚ مَا بِصَاحِبِكُم مِّن جِنَّةٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُم بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ (۴۶)

ایک دل دوز نصیحت

پیچھے آیات ۷ - ۸ میں گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی قوم کے متمردین کو عذاب قیامت سے ڈراتے تو وہ آپ کی اس بات کو ایک قسم کے خبط پر محمول کرتے۔ کہتے کہ اس شخص کو ایک قسم کا مالیخولیا ہے جس کے سبب سے آگے پیچھے اس کو عذاب ہی عذاب نظر آتا ہے۔ اسی کا جواب دیتے ہوئے نہایت ناصحانہ انداز میں فرمایا کہ ان سے کہو کہ میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، خدارا اس پر عمل کرو۔ وہ یہ کہ اپنے ذہن کو ضد، تعصب اور غرور سے پاک کر کے، دو دو، ایک ایک، کی صورت میں اٹھو، میری باتیں سنو اور معاملے پر سنجیدگی سے غور کرو۔ 'لِلّٰہِ' سے مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اب تک تو تمھاری روش تمام تر نفس اور شیطان کے تابع رہی ہے اس وجہ سے تم معاملے پر غیر جانبدار ہو کر غور نہ کر سکے لیکن آدمی پر سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے اور اللہ کو تم بھی مانتے ہو تو اس کی خاطر اپنے دوسرے

ملاحیات و حرکات سے آزاد ہو کر، اصل حقیقت پر غور کرنے کے لیے از سر نو اٹھو۔ 'اٹھو'، یعنی اس کا ارادہ کرو اور اس کے لیے کمر ہمت باندھو۔ تعصبات کی اس فضا میں یہ بات ہو گی تو تمہارے دلوں پر شاق، لیکن اللہ کے لیے اس شاق چیز کو گوارا کرو، یہی راہ سعادت کی راہ ہے۔

'مَثْنٰى وَفُرَادٰى' کی قید سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ بھیڑ کا ذہن حقائق کو سوچنے سمجھنے کا اہل نہیں ہوتا۔ اب تک تو تمہاری روش یہ رہی ہے کہ جہاں میری زبان سے کوئی بات نکلی تمہارے اشرار نے اس کے خلاف ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی کہ کوئی میری بات سننے سمجھنے نہ پائے۔ یہ طریقہ چھوڑو اور اس کی جگہ یہ طریقہ اختیار کرو کہ دو دو اور ایک ایک کر کے میرے پاس آؤ، میری باتیں توجہ سے سنو، میرے دلائل پر غور کرو، اپنے شبہات پیش کر کے مجھ سے ان کے جواب معلوم کرو اور پھر غور کرو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں جنون میں کہہ رہا ہوں یا تمہارے سامنے وہ انجام رکھ رہا ہوں جس سے کل تمہیں لازماً دوچار ہونا ہے۔

'مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ': یعنی اس طرح سنجیدگی کے ساتھ غور کرو گے تو تم پر یہ حقیقت خود واضح ہو جائے گی کہ تمہارے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے بلکہ خود تمہاری اپنی عقلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ تم اس کے خلاف جتھہ بندی کر کے اس کو زچ کرنے کے درپے ہو۔

لفظ 'صاحب' یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جس شخص کو تم خبطی اور دیوانہ قرار دے رہے ہو اس سے تمہیں کوئی نیا نیا سابقہ پیش نہیں آیا ہے بلکہ یہ تمہارے ہی اندر پیدا ہوا، تمہارے ہی سامنے پلا اور بڑھا اور تمہارے ہی آگے یہ اپنی اس عمر کو پہنچا۔ اس پورے زمانے میں تم نے دیکھا کہ یہ تمہارے ہر خیر میں شریک اور تمہارے ہر شر سے مجتنب رہا ہے۔ تم نے ہر آزمائش میں اس کو صادق اور امین پایا۔ اس کی سوجھ بوجھ اور اس کی عقل و بصیرت پر تم نے اعتماد کیا اور اس کو اپنے اندر سب سے بڑا عاقل و فرزانہ مانتے رہے لیکن آج اسی فرزانہ کو دیوانہ قرار دے رہے ہو! غور کرو، دیوانہ وہ ہے یا تم!

ایک بلیغ وقفہ

یہاں 'تَتَفَكَّرُوْا' کے بعد وقف ہے اور یہ وقف نہایت بلیغ ہے۔ گویا غور و فکر کی دعوت کے بعد لوگوں کو غور و فکر کے لیے تھوڑا سا وقت بھی دے دیا۔ اس کے بعد اس غور و فکر کا جو صحیح نتیجہ نکلنا چاہیے وہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ اس قسم کے وقف کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔

پیغمبر کی بے قراری کی اصل وجہ

'اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ'۔ یہ بات بھی یہاں نہایت برمحل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو تم دیکھتے ہو کہ اس کے دل و دماغ پر ایک ہی فکر، عذاب اور آخرت کی، ہر وقت سوار ہے۔ اٹھتے بیٹھتے ہر لحظہ وہ تم کو اسی سے ڈراتا اور اسی کے لیے تیاری کرنے کی نصیحت کرتا ہے۔ تمہاری تمام ناقدریوں، دل آزاریوں اور ستم رانیوں کے باوجود تمہارے پیچھے پھرتا ہے تو اس کی یہ بے قراری

بھی اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس کو کوئی جنون لاحق ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ جو عذاب تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے لیکن تمھیں وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ اس کی یہ ساری بے چینی و بے قراری تمھاری ہمدردی میں ہے لیکن تم اپنے اندھے پن کے سبب سے اس کی ان بے چینیوں اور بے قراریوں کو خبط و جنون پر محمول کرتے ہو۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ایک رسول کو اپنی قوم پر آنے والے عذاب کا نظر آنا کوئی مجاز نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ رسول اپنی قوم کے لیے رحمت کی گھٹا بن کر آتا ہے لیکن اس رحمت کی گھٹا کے اندر ہی اس کی قوم کے لیے صاعقۂ عذاب بھی پوشیدہ ہوتا ہے اگر قوم اس کی تکذیب کر دیتی ہے۔ یہی عذاب آخرت کے عذاب کا دیباچہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہر رسول نے اپنی قوم کو ان دونوں عذابوں سے ڈرایا ہے اور اس یقین کے ساتھ ڈرایا ہے کہ گویا وہ اپنی دونوں آنکھوں سے اس عذاب کو دیکھ رہا ہو۔ لیکن عقل کے اندھوں نے اس کے اس یقین کو جنون پر محمول کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر 'وا صباحاہ!' کا جو نعرہ لگایا وہ اسی یقین کا مظہر تھا لیکن قریش کے لیڈروں نے اس سے متنبہ ہونے کے بجائے اس کا مذاق اڑایا۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (۴۷)

ایک ہی حقیقت دو مختلف اسلوبوں سے

یہ مضمون قرآن میں دو اسلوبوں سے آیا ہے اور دونوں کا مفاد ایک ہی ہے۔

ایک اسلوب یہ ہے کہ میں نے اپنی خدمت پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے کہ تم مجھ سے بدک رہے ہو، میرا اجر تو بس میرے رب ہی کے ذمہ ہے۔

دوسرا یہ کہ اگر میں نے تم سے کوئی بات چاہی ہے جس کو تم اجر سمجھتے اور بار محسوس کرتے ہو تو وہ اپنے لیے نہیں بلکہ تمھاری ہی دنیا و آخرت کی بہبود کے لیے چاہی ہے۔

پہلے اسلوب کی مثالیں بکثرت ہیں۔ ان کے حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں یہ مضمون اس دوسرے اسلوب میں بیان ہوا ہے جس کی بعض نظیریں ہم نقل کرتے ہیں۔ سورۂ فرقان میں ہے :

قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ — کہہ دو کہ میں نے اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے،

شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا (۵۷) — مگر یہ کہ جو چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کرے۔

اگرچہ اس آیت کی تاویل پہلے اسلوب کے مفہوم میں بھی ہو سکتی ہے اور وہ بھی عربیت کے خلاف نہیں ہو گی لیکن اس کا یہ مطلب بھی بالکل واضح ہے کہ میں نے اپنی اس خدمت پر تم سے اپنے لیے کچھ نہیں چاہا ہے۔ اگر چاہا ہے تو تمھارے ہی لیے چاہا ہے کہ تم میں سے جو خدا کی راہ کا طالب ہو میں اس کو خدا کی صراطِ مستقیم دکھا دوں۔

اسی طرح سورۂ شوریٰ میں ہے:

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى (۲۳) — کہہ دو کہ میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا مگر یہ کہ قرابت مندوں کے معاملے میں حسن سلوک کی روش اختیار کرو۔

اگرچہ اس آیت کی تاویل بھی پہلے اسلوب کی روشنی میں ہو سکتی ہے، اس پر اس کے محل میں ہم بحث کریں گے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی بالکل واضح ہے کہ اگر تم میری دعوت انفاق و صلۂ رحم کو بار سمجھتے ہو تو یہ بھی میں اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے ہی لیے اور تمہارے رشتہ داروں و قرابت مندوں ہی کے لیے چاہتا ہوں۔

اسی اسلوب پر آیت زیر بحث میں فرمایا کہ اول تو میں نے اپنی اس دعوت و تعلیم پر تم سے کسی اجر کا مطالبہ کیا نہیں، میرا اجر میرے رب کے ذمہ ہے؛ لیکن اگر تم میرے کسی مطالبے کو اپنے اوپر بار اور اس کو میرا اجر تصور کرتے ہو تو یہ تمہاری غلط فہمی و کج اندیشی ہے۔ میں نے تم سے جو کچھ بھی چاہا ہے اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے ہی لیے چاہا ہے۔ میں تمہیں خدا اور آخرت سے جو ڈراتا ہوں، نیکی کی تلقین کرتا ہوں، انفاق فی سبیل اللہ، اطعام فقرا و یتامیٰ اور غلاموں کو آزاد کرنے پر ابھارتا ہوں تو ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں میرا کوئی ذاتی مفاد ہو بلکہ ان کا فائدہ، انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں سے، تمہی کو حاصل ہوگا۔ تم ان باتوں پر عمل کر کے اپنی دنیا بھی سنوارو گے اور اپنی آخرت بھی بناؤ گے۔

یہ بات قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی فرمائی گئی ہے مخاطبوں کو ملامت اور ان سے اظہار بے نیازی کے سیاق ہی میں فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان ناقدروں سے کہہ دو کہ میں نے اپنی دعوت پر کوئی ٹکٹ یا چندہ تو نہیں لگا رکھا ہے کہ وہ تمہارے لیے میرے پاس آنے اور میری بات سننے میں مانع ہو رہا ہو، تم ہر وقت میرے پاس آ سکتے ہو اور بے جھجک آ سکتے ہو۔ میری مجلس میں کسی پر کوئی قدغن نہیں۔ تمہارے امیر و غریب سب کے لیے میرا دروازہ کھلا ہوا اور میرا سینہ کشادہ ہے۔ اور اگر نہیں آتے تو یاد رکھو کہ میرا کچھ نہیں بگاڑو گے، اپنا ہی بگاڑو گے۔ میں نے کوئی دکان نہیں کھولی ہے کہ تمہاری بے التفاتی سے میری دکان بیٹھ جائے گی۔ میں نے تو اپنے رب سے مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہا ہوں۔

'وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ'۔ یعنی میرا اجر جس اللہ کے ذمہ ہے وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ مجھے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ میری کوئی حقیر سے حقیر خدمت بھی اس سے پوشیدہ رہے گی۔ وہ میری سرگرمیاں بھی دیکھ رہا ہے اور تمہاری ناقدریاں بھی اس کی نگاہوں میں ہیں۔ میں پورا بھروسہ رکھتا ہوں کہ وہ مجھے میری خدمات کا بھرپور صلہ دے گا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّىْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (۴۸)

'يَقْذِفُ بِالْحَقِّ' کے بعد 'عَلَى الْبَاطِلِ' کے الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں، جیسا کہ دوسرے مقام میں ایک تنبیہ:

فرمایا ہے "بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ" (الانبیاء: ۱۸) (ہم حق کو باطل پر ماریں گے پس وہ اس کا بھیجا نکال کے رکھ دے گا)۔

یعنی ان نادانوں کو بتا دو کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ یہ دنیا یوں ہی پیدا ہوئی، یوں ہی تمام ہو جائے گی بلکہ ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس دن اس کا خالق اس کے حق و باطل میں فیصلہ فرمائے گا اور حق کو باطل پر مارے گا جس سے باطل پاش پاش ہو کے رہ جائے گا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اصلاً تو یہ بات آخرت کی عدالتِ کبریٰ سے متعلق ہے لیکن یہی نتیجہ اس عدالتِ صغریٰ کا بھی برآمد ہوتا ہے جو ایک رسول کی بعثت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہم جگہ جگہ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جس قوم کی طرف رسول کی بعثت ہوئی اس قوم کے حق و باطل کا فیصلہ لازماً ہو گیا۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ نے اعلان فرمایا کہ "جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا" (حق آگیا اور باطل نابود ہوا، بے شک باطل نابود ہی ہونے والی چیز ہے)۔

"عَلَّامُ الْغُيُوبِ"۔ ہمارے نزدیک یہ مستقل جملہ ہے اور مبتدا یہاں محذوف ہے۔ یہ حق و باطل کے درمیان عدالت کی دلیل صفاتِ الٰہی سے پیش کی گئی ہے کہ اس کائنات کا رب تمام غیب کی باتوں کو جانتا ہے، کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہے، اس وجہ سے کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس کو کسی چیز کا فیصلہ کرنے میں کوئی زحمت پیش آئے گی۔ وہ ہر ایک کا پورا اعمال نامہ اس کے آگے رکھ دے گا جس میں اس کا ہر عمل درج ہو گا خواہ وہ کتنے ہی پوشیدہ گوشوں میں انجام دیا گیا ہو۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (۴۹)

جس طرح اوپر کی آیت میں "يَقْذِفُ بِالْحَقِّ" کے بعد "زَهَقَ الْبَاطِلُ" کے الفاظ حذف ہیں اسی طرح یہاں "جَآءَ الْحَقُّ" کے بعد "زَهَقَ الْبَاطِلُ" کے الفاظ حذف ہیں اور اس خلا کو "وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ" کے الفاظ نے بھر دیا ہے۔

باطل ایک بے ثبات چیز ہے

فرمایا کہ ان نادانوں کو بتا دو کہ اب حق قرآن کی شکل میں آگیا اور جب حق آگیا تو اس باطل کا نابود ہونا لازمی ہے جس کی وہ پرستش کرتے رہے ہیں۔ اب اگر وہ اس باطل کے ساتھ چمٹے رہے تو اس کے ساتھ وہ بھی پس جائیں گے۔

جن کا اس کائنات کے ابتداء میں دخل نہیں ان کا اس کے اعادہ میں بھی کوئی دخل نہیں

"وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ"۔ یہ باطل کی بے ثباتی کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ اس کارخانۂ کائنات کا آغاز اس کے خالق نے حق کے ساتھ فرمایا ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ اس کی انتہا بھی حق پر ہو۔ جب باطل کا کوئی دخل اس کے ابتداء میں نہیں ہے تو اس کے اعادہ میں اس کا دخل کس طرح ہو جائے گا! پس جو لوگ فرضی دیویوں دیوتاؤں کی سفارشوں پر تکیہ کیے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں یاد رکھیں کہ ان کے دیوتاؤں کے اختیار میں نہ کسی چیز کا ابداء ہے نہ اعادہ۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکینِ عرب اس کائنات

کے ابداء میں کسی کو شریک نہیں مانتے تھے لیکن وہ اس بات کے قائل تھے کہ اگر آخرت کا مرحلہ پیش آیا تو ان کی واپسی ان کے معبودوں کی طرف ہوگی جو اپنی سفارشوں سے ان کو وہاں بھی اعلیٰ مراتب دلائیں گے قرآن نے ان کی اسی غلط فہمی کے ازالہ کے لیے جگہ جگہ ان کے اس مغالطہ پر گرفت کی ہے کہ جب تم اس کائنات کے ابداء میں کسی کو شریک نہیں مانتے تو اس کے اعادہ میں کیوں شریک مانتے ہو؟

سورۂ یونس میں یہی مضمون اس طرح بیان فرمایا ہے:

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۭ (یونس: ۴)	اسی کی طرف تم سب کی واپسی ہونی ہے، یہ اللہ کا شدنی وعدہ ہے۔ بے شک وہی خلق کا آغاز فرماتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ فرمائے گا تاکہ وہ ان لوگوں کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے۔

پھر یہی مضمون دوسرے اسلوب سے یوں بیان ہوا ہے:

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ (یونس: ۳۴)	ان سے پوچھو، تمھارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا؟ کہہ دو اللہ ہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا۔ تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو!

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰي نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ (۵۰)

وحی الٰہی کی تکذیب کا انجام

اب یہاں لوگوں کو تنبیہ فرمائی کہ ان سے کہہ دو کہ اگر میں گمراہ ہوں، جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو اس گمراہی کا خمیازہ بہرحال مجھ ہی کو بھگتنا ہے، تم اس کے وبال سے محفوظ ہو اس لیے کہ تم اس میں میرا ساتھ نہیں دے رہے ہو۔ لیکن اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اس پر بھی اچھی طرح غور کر لو۔ وہ یہ کہ اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ ہدایت اس وحی کی بدولت مجھے حاصل ہوئی ہے جو میرا پروردگار مجھ پر نازل فرما رہا ہے۔ اس صورت میں میری تکذیب تمھارے لیے کوئی سہل چیز نہیں ہے بلکہ تم وحی الٰہی کے جھٹلانے والے ٹھہرتے ہو اور وحی الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام ہونا چاہیے اور ہوگا وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کو بہت دور تک سوچ لو!

تفویض الی اللہ

'اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ' یہ تفویض الی اللہ کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تم سے زیادہ بحث و جدال بے سود ہے۔ میں یہ آخری بات کہہ کے تمھارا معاملہ اپنے رب کے حوالے کرتا ہوں۔ تم نہ تو میری بات سننے کے لیے تیار ہو، نہ قریب آنے کے روادار ہو لیکن میرا رب میری باتیں سننے والا بھی ہے اور قریب بھی ہے۔ تو اب تمھارے پیچھے سر کھپانے کے بجائے اسی سے عرض معروض کروں گا جو سنتا اور قبول فرماتا ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ (۵۱)

فیصلہ کن گھڑی — یہاں جوابِ شرط محذوف ہے۔ اس کی مثال آیت ۳۱ میں گزر چکی ہے۔ اس طرح جوابِ شرط کا محذوف ہونا اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ جواب تعبیر و تصویر سے مافوق ہے۔ فرمایا کہ آج ان کے استکبار کا یہ حال ہے کہ پیچھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دے رہے ہیں لیکن اگر کہیں تم ان کے اس وقت کو دیکھ پاتے جب کہ وہ خدا کی اس گرفت میں آجائیں گے جس کو آج جھٹلا رہے ہیں تب تم کو ان کی بے بسی کا کچھ اندازہ ہوتا کہ کس طرح یہ ناک رگڑتے اور حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ فرمایا کہ جب یہ خدا کے عذاب کی پکڑ میں آئیں گے تو گھبرا کر بھاگنے اور بچنے کی کوشش کریں گے لیکن خدا کی گرفت سے کون بچ سکتا ہے جو یہ اس سے بھاگ سکیں گے۔ "وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ" یعنی یہ بھاگنا چاہیں گے لیکن پاس ہی سے دھر لیے جائیں گے۔ ان کے پاؤں کے نیچے یا ان کے سر کے اوپر سے اس طرح خدا کا عذاب ان کو اپنے قابو میں کر لے گا کہ کسی طرف بھی ان کو راہِ فرار سجھائی نہیں دے گی۔

وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ (۵۲)

یعنی اس وقت ان کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا اور وہ پکار اٹھیں گے کہ اب ہم اس قرآن پر ایمان لائے۔ ضمیر کا مرجع یہاں قرآن ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے۔ قرآن کو پیش کرنے والے یعنی آنحضرت ازخود اس میں شامل ہیں۔

بعد از وقت ایمان — "وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ" یعنی ایمان کا محل تو یہ دنیا ہے اور وہ بھی عذابِ الٰہی کے ظہور سے پہلے تو جب عذابِ الٰہی ظاہر ہو جائے گا اس وقت تو یہ ایمان کی منزل سے اتنی دور نکل جائیں گے کہ وہاں سے ان کے لیے اس کے پا سکنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جائے گا۔ عذابِ الٰہی کی گرفت میں آجانے کے بعد تو فرعون جیسا سرکش بھی پکار اٹھا تھا کہ میں موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لایا! لیکن اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب ملا کہ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ (اب ایمان لائے! حالانکہ جب ایمان لانے کا وقت تھا تو تم نے نافرمانی کی)۔

'تناوش' کے معنی پالینے کے ہیں اور 'اَنّٰى لَهُمُ' کا مفہوم یہ ہے کہ بھلا اس وقت اس کے پانے کا کیا امکان ہوگا!

دست کوتاہ است و خرما بر نخیل

وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ (۵۳)

'قذف بالحجارۃ' کے معنی ہیں پتھر پھینکا۔ 'قذف بالقول' تکلم بلا تدبر ولا تامل۔ یعنی بے سوچے سمجھے بات پھینک ماری۔ یہیں سے یہ 'رجماً بالغیب' یعنی اٹکل پچو بات کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب دیکھنے کے بعد وہ ایمان کا اقرار کریں گے حالانکہ اس سے پہلے وہ دور سے

بیٹھے ہوئے اٹکل کے تیر تکے چلاتے رہے تھے کہ یہ کتاب من گھڑت ہے، اس کا پیش کرنے والا (العیاذ باللہ) بر خود غلط ہے، عذاب کی دھمکی محض دھونس ہے، قیامت کا ڈراوا محض خلل دماغ کا نتیجہ ہے اور اگر قیامت کا کوئی مرحلہ پیش آیا تو ہمارے شرکاء کے طفیل ہمارا تفوق وہاں بھی قائم رہے گا۔ الغرض عقل کو بالائے طاق رکھ کے قرآن اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تکذیب کے جنون میں جو کچھ زبان پر آیا بکتے رہے لیکن جب حقیقت سامنے آجائے گی تو اس کا اقرار کریں گے لیکن یہ اقرار بعد از وقت اور بالکل بے سود ہوگا۔

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ (۵۴)

امید کے تمام دروازے بند

یعنی جب فیصلہ کن عذاب نمودار ہو جائے گا تو ان کے اور ان کی تمام چاہتوں کے مابین دیوار حائل ہو جائے گی۔ وہ ایمان لانا چاہیں گے لیکن ان کا یہ چاہنا بے سود ہوگا۔ وہ مہلت کی درخواست کریں گے لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ وہ اپنے شریکوں کو پکاریں گے لیکن ان کی طرف سے بھی ان کی کوئی فریاد رسی نہیں ہوگی۔ غرض امید کے تمام دروازے ان پر بند ہو جائیں گے اور ایک ابدی مایوسی سے ان کو سابقہ پیش آئے گا۔

'كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ' یعنی ان کو بھی اسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑے گا جس سے ان کے پیشرو ہم مشربوں کو دوچار ہونا پڑا۔ یہ اشارہ عاد، ثمود، اہل مدین اور فرعون وغیرہ کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں تفصیل کے ساتھ قرآن میں سنائی جا چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس سے پہلے پیش نہ آچکی ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان تمام قوموں کو اسی افتاد سے سابقہ پیش آیا جنھوں نے ان کی طرح اپنے رسولوں کے انذار کی تکذیب کی۔ اگر یہ ان کے حالات سے سبق نہیں لیتے تو لازماً انہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

'اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ' یعنی وہ بھی انہی کی طرح الجھن میں ڈالنے والے شک میں پڑے رہے یہاں تک کہ بالآخر فیصلہ کن گھڑی سر پر آہی گئی۔ 'شَكٍّ مُّرِيْبٍ' کی نوعیت پر ہود ۶۲-۱۱۰ میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے، ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد: ۳ر جنوری ۱۹۷۵ء

جمعہ - ۹ بجے دن

تدبّرِ قرآن

۳۵

فاطر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ــــــ سورۂ سبا ــــــ کی توام سورہ ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اس کا بھی اصل مضمون توحید ہی ہے۔ اس کا آغاز خدا کی حمد کے اثبات اور فرشتوں کی الوہیت کے تصور کے ابطال سے ہوا ہے۔ پھر توحید ہی کے تحت رسالت و معاد سے متعلق وہ باتیں بیان ہوئی ہیں جو مقصد انذار کے پہلو سے ضروری اور سورہ کے مزاج اور اس کے زمانۂ نزول سے مناسبت رکھنے والی ہیں۔ پچھلی سورہ میں، یاد ہوگا، جنوں اور ملائکہ کی الوہیت کے تصور کا ابطال فرمایا ہے۔ اس سورہ میں ملائکہ کی الوہیت کے تصور کی تردید نسبۃً زیادہ واضح الفاظ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکینِ عرب کے مزعومہ معبودوں میں سب سے زیادہ اہمیت فرشتوں ہی کو حاصل تھی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) شکر کا حقیقی سزاوار اللہ ہے۔ وہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اسی نے فرشتوں کو بھی وجود بخشا ہے اور ان کو، اپنی حکمت کے مطابق، جن صلاحیتوں اور قوتوں سے چاہا ہے بہرہ مند کیا ہے۔ ان کو بذاتِ خود کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں ہے۔ تمام رزق و فضل خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ بخشنا چاہے تو کوئی اس کی بخشش کو روک نہیں سکتا اور روکنا چاہے تو کوئی اس سے دلا نہیں سکتا۔ پس عبادت کا اصل حقدار وہی ہے۔ اس کے سوا دوسروں کی پوجا محض جہالت و حماقت ہے۔

(۴-۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ اگر تمہاری قوم کے لوگ تمہاری تکذیب کر رہے ہیں تو اپنی پیشرو قوموں کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے وہ دوچار ہوئیں۔ ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیے گئے ہیں اور یہ اللہ کے قانون کی زد میں آچکے ہیں تو ان کے غم میں اپنے کو گھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔

قریش کو انذار کہ پیغمبر جس چیز سے تم کو ڈرا رہا ہے وہ ایک امر شدنی ہے تو اپنی موجودہ دنیوی کامیابیوں سے کسی دھوکے میں نہ رہو اور شیطان کے پھندوں میں نہ پھنسو، وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے تو اپنے دشمن کو دشمن ہی سمجھو۔ بڑا ہی نادان ہے وہ جو اپنے دشمن کو دوست بنا بیٹھے۔

(۹-۱۰) حشر و نشر کی ایک واضح دلیل کی طرف اشارہ اور یہ تنبیہ کہ جو حشر کے دن خدا کے ہاں تقرب کا طالب ہو وہ جھوٹے سہاروں پر زندگی نہ گزارے۔ اس دن فرضی دیویوں دیوتاؤں کے بل پر کسی کو تقرب حاصل نہیں ہوگا۔ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز کلمۂ طیبہ ــــ کلمۂ توحید ــــ ہے اور اس کلمۂ طیبہ کو بلندی عمل صالح سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کو آخرت کی عزت مطلوب ہو وہ ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرے۔ اس سے ہٹ کر جو راہیں نکالی گئی ہیں وہ سب فریب نفس کی راہیں ہیں اور ان کا انجام ابدی تباہی ہے۔

(۱۱-۱۸) مال و اولاد اور رزق و فضل خدا کا عطیہ ہیں۔ عمر کی زیادتی و کمی خدا کے اختیار میں ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی کسی دوسرے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کائنات کے اضداد میں جو توافق ہے وہ اس بات کی کھلی ہوئی شہادت ہے کہ اس میں ایک ہی خدائے قادر و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے۔ اس کے سوا جن کو معبود بنایا گیا ہے نہ ان کو کوئی اختیار حاصل ہے اور نہ وہ قیامت کے روز کسی کے کچھ کام آنے والے بنیں گے۔

لوگوں کو یہ تنبیہ کہ تمہیں اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ اگر تم نے اس کی قدر نہ کی تو اپنا ہی بگاڑو گے خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے۔ خدا تمہارا محتاج نہیں ہے بلکہ تم ہی خدا کے محتاج ہو۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تمہاری دعوت انہی لوگوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے جن کے اندر زندگی کی کچھ رمق ہے۔ جو بالکل مردہ ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان کے لیے جو انجام مقدر ہو چکا ہے وہ اسی سے دوچار ہوں گے۔

(۱۹-۲۸) ایمان لانے اور نہ لانے والوں کی تفصیل اور اس کائنات میں جو اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اس کی حکمت کی طرف اشارہ کہ جس طرح اس میں اللہ نے نور و ظلمت کو پیدا کیا ہے اور ان دونوں کی خلقت حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اسی طرح ایمان و کفر کا یہ تصادم بھی خدا کی حکمت پر مبنی ہے۔ اس وجہ سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ سب ایمان سے بہرہ مند ہو جائیں گے۔ ایمان صرف وہی لائیں گے جن کے اندر علم و معرفت کی روشنی اور اس کی قدر ہے۔

(۲۹-۳۸) ان علمائے اہل کتاب کی تحسین و حوصلہ افزائی جو تمام بگاڑ اور فساد کے باوجود اللہ کی کتاب پر قائم ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ کہ جس طرح ان کو تورات پر قائم رہنے کی سعادت حاصل ہوئی اسی طرح قرآن پر بھی ایمان لانے کی ان کو سعادت حاصل ہوگی اس لیے کہ یہ انہی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے جو اس کی بابت تورات اور دوسرے صحیفوں میں وارد ہوئی ہیں۔ تورات کے بعد اس قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے امیوں پر عظیم احسان فرمایا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اس نے ان کو دنیا کی امامت بخشی ہے بشرطیکہ وہ اس کی قدر کریں۔ پھر فرمایا کہ اگرچہ ان میں ناقدرے اور ناشکرے بھی ہیں لیکن ساتھ ہی ان میں معقولیت پسند اور نیکی کی راہوں میں سبقت کرنے والے بھی ہیں۔ اس طرح کے لوگ اس پر ایمان لائیں گے رہے وہ لوگ جو اس نعمت کی ناقدری کریں گے تو وہ اس انجام سے دوچار ہوں گے جو اس طرح کے لوگوں کے لیے اللہ کے

ہاں متعذر ہے۔

(۳۹-۴۱) قریش کو تہدید و وعید کہ تم دنیا میں پہلی قوم نہیں ہو بلکہ پچھلی قوموں کے جانشین ہو اس وجہ سے خدا نے جس میزانِ عدل سے ان کو تولا کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس سے تم کو نہ تولے۔ خدا کے ہاں الگ الگ ترازو اور الگ الگ باٹ نہیں ہیں بلکہ سب کے لیے ایک ہی میزان ہے۔ تمھاری سرکشی کے باوجود خدا جو ڈھیل تمھیں دے رہا ہے اس کو اپنی کامیابی نہ سمجھو بلکہ یہ تمھارے خسارہ میں اضافہ ہے۔ خدا حلیم و غفور ہے اس وجہ سے تمھیں مہلت دے رہا ہے لیکن جب وہ پکڑے گا تو تمھارے یہ فرضی دیوی دیوتا تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ آسمان و زمین خدا کے تھامے تھمے ہوئے ہیں تمھارے ان دیوتاؤں نے ان کو نہیں تھام رکھا ہے۔

(۴۲-۴۵) قریش کو یہ یاد دہانی کہ رسول کی بعثت سے پہلے تو تم اس ولولہ کا اظہار کرتے تھے کہ اگر تمھارے اندر کسی رسول کی بعثت ہوئی تو تم دنیا کی سب سے زیادہ ہدایت یافتہ قوم ہو گے لیکن جب رسول آیا تو رات دن اس کے خلاف سازشوں میں سرگرم ہو اور خدا کے اسی قہر کو دعوت دے رہے ہو جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر ہمیشہ نازل ہوا۔ یاد رکھو کہ اگر خدا کسی قوم کو فوراً پکڑنا چاہے تو کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا لیکن اس نے ہر قوم کے فیصلہ کے لیے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا ہے۔

مطالب کے اس تجزیہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اس سورہ کا اندرونی نظام اور سابق سورہ سے اس کا تعلق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اب اللہ کا نام لے کر ہم سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وبیدہ اللہ التوفیق وھو الھادی الی الصواب۔

سُوْرَةُ فَاطِرٍ (۳۵)

مَكِّيَّةٌ ـــــــــ اٰيَاتُهَا ۴۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا آیات
اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ۚ ۱-۸
اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱﴾ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ
فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَهُوَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ هَلْ
مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ
فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳﴾ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ۚ
وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ٚ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۵﴾ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ
فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ
السَّعِيْرِ ﴿۶﴾ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۥ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۷﴾ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ ع ۱ ۱۳

عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ۭ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ڮ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ⑧

ترجمۂ آیات ۱-۸

شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے۔ آسمانوں اور زمین کا خالق، فرشتوں کو دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے پیغام رساں بنانے والا۔ وہ خلق میں جو چاہے اضافہ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱

اللہ لوگوں کے لیے جس رحمت کا فتح باب کرے تو اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جس کو روک لے تو اس کے بعد کوئی اس کو کھولنے والا نہیں اور وہی حقیقی عزیز و حکیم ہے۔ ۲

اے لوگو! تمھارے اوپر اللہ کا جو انعام ہے اس کا دھیان کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق بہم پہنچاتا ہو! اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو! ۳

اور اگر یہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو کچھ غم نہ کرو، تم سے پہلے بھی کتنے رسولوں کی تکذیب کی گئی ہے اور اللہ ہی کے سامنے سارے امور پیش کیے جائیں گے۔ ۴

اے لوگو! اللہ کا وعدہ شدنی ہے تو تم کو یہ دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ اللہ کے باب میں تم کو فریب کار شیطان فریب میں رکھے۔ بے شک شیطان تمھارا دشمن ہے تو تم اس کو دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنی پارٹی کو صرف جہنم کا ایندھن بنانے کے لیے بلاتا ہے۔ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔ ۵-۷

کیا وہ جس کی نگاہوں میں اس کا بُرا عمل کُھبا دیا گیا ہے، پس وہ اس کو اچھا خیال کرنے لگا ہے (ایمان لانے والا بن سکتا ہے!) پس اللہ ہی جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے تو ان کے غم میں تم اپنے کو ہلکان نہ کرو، اللہ باخبر ہے ان کاموں سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۸

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱)

دین کی بنیاد توحید پر ہے اور توحید کی حقیقت اللہ ہی کی شکرگزاری ہے

یاد ہوگا، پچھلی سورہ کا آغاز بھی 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ' ہی سے ہوا ہے۔ اس سے دونوں سورتوں کے مزاج کی مناسبت واضح ہوتی ہے۔ دین کی بنیاد توحید پر ہے اور توحید کی حقیقت اللہ ہی کی شکرگزاری ہے اس لیے کہ آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا اللہ ہی ہے اور بندوں کو جو ظاہری و باطنی نعمتیں بھی حاصل ہوئی ہیں سب اللہ ہی کا عطیہ ہیں۔

فرشتوں کی حیثیت قاصدوں کی ہے

ذکر مقصود کی

'جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ'۔ 'جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ' بدل ہے 'فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ' سے۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر اس کی اہمیت کے پہلو سے فرمایا کہ جو اللہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اسی نے فرشتوں کو بھی پیغام رسانی کے مقصد سے وجود بخشا ہے۔ فرشتوں کے خاص طور پر ذکر کی وجہ یہ ہے کہ عربوں کی میتھالوجی (MYTHOLOGY) میں سب سے زیادہ اہمیت فرشتوں ہی کو حاصل تھی۔ وہ ان کو خدا کی چہیتی بیٹیوں کا درجہ دیتے اور اسی حیثیت سے ان کی عبادت کرتے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ اگر یہ خوش رہیں تو ان کے واسطے سے سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ اس عقیدے نے ان کے ہاں خدا کے وجود کو بالکل معطل کر دیا تھا۔ وہ خدا کو رسمی طور پر مانتے تو تھے لیکن ان کی تمام شکرگزاری اور عبادت کے مرکز ان کے وہ اصنام ہی تھے جو انھوں نے اپنے زعم کے مطابق فرشتوں کے نام پر بنا رکھے تھے۔ یہاں ان کے اسی زعم باطل کی تردید کے لیے ارشاد ہوا کہ شکر کا سزاوار اللہ ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ اسی نے فرشتوں کو بھی پیغام بری کی ڈیوٹی پر مقرر فرمایا ہے یعنی یہ فرشتے نہ آسمان و زمین کی تخلیق میں کسی نوع سے شریک ہیں اور نہ الوہیت میں ان کا کوئی حصہ ہے بلکہ یہ صرف خدا کے پیغام رساں ہیں جن کے ذریعے سے خدا اپنے رسولوں کو اپنے احکام سے آگاہ کرتا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ جن لوگوں نے ان قاصدوں کو مقصود کا اور نامہ بروں کو محبوب کا درجہ دے کر انہی کی پرستش شروع کر رکھی ہے انھوں نے نہ خدا کی قدر پہچانی، نہ ان قاصدوں کی اور نہ اپنی ہی۔

فرشتوں کے درمیان فرق مراتب

'اُولِیۡۤ اَجۡنِحَۃٍ' صفت ہے 'رُسُلًا' کی۔ 'اَجۡنِحَۃ' جمع ہے 'جَنَاح' کی۔ 'جناح' آدمیوں کے بازوؤں کے لیے بھی آتا ہے اور پرندوں کے پروں کے لیے بھی جن سے وہ اڑتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ فرشتوں کے لیے استعمال ہوا ہے اس وجہ سے اس کی نوعیت متشابہات کی ہے یعنی ان کی اصل حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ مقصود اس سے یہاں ہم کو صرف اس حقیقت کا علم دینا ہے کہ سب فرشتے ایک ہی درجے کے نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی مصلحتوں کے تحت مختلف درجے کی قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ کسی کی قوتِ پرواز کم ہے کسی کی زیادہ۔ کچھ دو پروں کی قوت سے اڑتے ہیں، کچھ تین کی، کچھ چار کی۔

یہ پَر فرشتوں کے ہیں اس وجہ سے ان کی قوتِ پرواز کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور یہ چار تک کا ذکر بھی تحدید کے مفہوم میں نہیں ہے۔ مقصود یہاں صرف ان کے مراتب و منازل کے تفاوت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ اس وجہ سے اگر اللہ تعالیٰ کے پاس ایسے فرشتے بھی ہوں جن کی قوتِ پرواز اس سے زیادہ ہو تو اس آیت سے اس کی نفی نہیں ہوتی۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں حضرت جبریلؑ کے پروں کی تعداد اس سے زیادہ مذکور ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوتِ پرواز اور رسائی تمام فرشتوں سے زیادہ ہے۔ مقصود یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ جن نادانوں نے فرشتوں کو الوہیت کے زمرے میں داخل کر رکھا ہے ان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ بلند کا پتہ نہیں ہے۔ خدائی میں شریک ہونا تو درکنار اس کے قاصد اور سفیر ہونے میں بھی ان سب کا درجہ و مرتبہ ایک نہیں ہے بلکہ کسی کی رسائی کسی منزل تک ہے اور کسی کی پہنچ کسی مقام تک۔ اسی حقیقت کا اعتراف سورۂ صافات میں حضرت جبریل امینؑ کی زبان سے یوں منقول ہے۔

وَمَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعۡلُوۡمٌ ۝ وَّاِنَّا لَنَحۡنُ الصَّآفُّوۡنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحۡنُ الۡمُسَبِّحُوۡنَ ۝ (۱۶۴-۱۶۶)	اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک معین مقام ہے اور ہم ہر وقت صف بستہ رہنے والے ہیں اور ہم ہر وقت تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔

صفات اور صلاحیتوں میں کمی بیشی کرنا اللہ ہی کے اختیار میں ہے

'یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ' یعنی اللہ تعالیٰ جن صلاحیتوں اور قوتوں کی مخلوق چاہے پیدا کر سکتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس نے فرشتوں کو اگر اپنی پیغام بری کے لیے پیدا کیا تو یہ بھی اس کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے۔ اگر ان کے درجات میں تفاوت رکھا تو یہ بھی اسی کی قدرت کی ایک شان ہے کہ اگر وہ اپنی خلق یا اس کی صلاحیتوں میں کوئی مزید اضافہ کرنا چاہے تو اس پر بھی وہ قادر ہے۔ صفات اور صلاحیتوں میں کمی بیشی کرنا اللہ کے اختیار میں ہے۔ اگر کسی کی صفات اور

قوتوں میں اس نے افزونی عطا فرمائی ہے تو اس کے بھی متعین حدود ہیں۔ اس کی بنا پر نہ کسی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ خدا کی خدائی میں شریک ہونے کا مدعی بن جائے نہ یہ جائز ہے کہ دوسرے اس کو خدائی میں شریک بنا دیں۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲)

اس بات کی دلیل کہ کیوں اللہ ہی سزاوار شکر ہے

یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں خدا ہی شکر کا سزاوار ہے۔ فرمایا کہ اللہ تمھارے لیے جس فضل و رحمت کا بھی دروازہ کھولنا چاہے وہ اس کو کھول سکتا ہے، کوئی اس کے فضل و رحمت کو روک نہیں سکتا۔ اسی طرح اگر وہ کسی رحمت سے محروم کرنا چاہے تو کسی کی طاقت نہیں کہ وہ تمھیں اس سے بہرہ مند کر سکے۔ یہی مضمون سورۂ زمر میں یوں بیان ہوا ہے۔

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ۭ (الزمر: ۳۸)	اللہ کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو کبھی تم نے ان پر غور کیا ہے۔ اگر اللہ مجھے کوئی ضرر پہنچانا چاہے تو کیا وہ اس کے دفع کرنے والے بن سکتے ہیں! یا اللہ مجھے کسی رحمت سے نوازنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک سکتے ہیں!

مقصود یہ ہے کہ جب اصل حقیقت یہ ہے تو فرشتوں اور جنوں کو تم نافع و ضار سمجھ کر ان کی عبادت جو کرتے ہو یہ محض تمھاری حماقت ہے۔ نفع و ضرر تمام تر خدا ہی کے اختیار میں ہے اس وجہ سے شکر اور عبادت کا حق دار تنہا وہی ہے۔

آیت میں ایک ہی چیز (رحمت) کے لیے ضمیر پہلے تو مؤنث آئی، پھر اسی کے لیے مذکر آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک جگہ لفظ کا لحاظ ہے دوسری جگہ مفہوم کا۔ اس کی متعدد نظیریں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'مِنْۢ بَعْدِهٖ' یعنی مِنْۢ بَعْدِ اِمْسَاكِهٖ۔ آگے اسی سورہ میں فرمایا ہے 'وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ' (۴۱) (اگر وہ دونوں (آسمان و زمین) اپنی جگہ سے ٹل جائیں تو خدا کے بعد کوئی ان کو تھامنے والا نہیں بن سکتا)۔

'وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' یعنی اصل غالب و مقتدر وہی ہے۔ وہ کھولتا اور وہی روکتا ہے اور یہ کھولنا اور باندھنا تمام تر اس کی حکمت کے تقاضوں کے تحت ہوتا ہے اس لیے کہ وہ حکیم بھی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ڮ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۳)

اتمام حجت کے لیے ایک سوال

اوپر کی آیات میں جو مضمون اصولی طور پر بیان ہوا ہے اسی مضمون کو اتمام حجت کے انداز میں، لوگوں کو مخاطب کر کے، فرمایا کہ لوگو، اللہ کی جو نعمتیں تم کو حاصل ہیں ان میں سے ایک ایک کا دھیان کرو اور ان پر غور کرو۔ لفظ 'نعمت' یہاں جنس نعمت کے مفہوم میں ہے۔ غور کرنے کے لیے ان کے سامنے مسئلہ کو سوال کی صورت میں رکھا کہ یہ آسمان و زمین میں سے جو تمہیں روزی مل رہی ہے، آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین سے تمہاری معاش و معیشت کی گوناگوں چیزیں پیدا ہوتی ہیں، کیا تم کہہ سکتے ہو کہ خدا کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تمہیں یہ چیزیں بخشتا ہے۔

سوال کا جواب

'لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ' ان کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر خود اس کا جواب دیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ خود جواب دینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس سوال کا صحیح جواب اس کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا، دوسری یہ کہ مشرکین عرب، جو یہاں مخاطب ہیں، اس سوال کا یہی جواب، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، دیتے بھی تھے۔ فرمایا کہ جب اصل حقیقت یہ ہے اور تم کو بھی اس سے انکار نہیں ہے تو پھر کہاں تمہاری عقل الٹ گئی ہے کہ دوسری چیزوں کو تم معبود بنائے بیٹھے ہو!

وَاِنۡ یُّکَذِّبُوۡکَ فَقَدۡ کُذِّبَتۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِکَ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ (۴)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر ایسے سرپھرے لوگ تمہاری تکذیب کر رہے ہیں تو یہ کوئی تعجب یا غم کی بات نہیں ہے، تم سے پہلے جو رسول آئے اس طرح کے لوگوں نے ان کی بھی تکذیب کی۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں تمہاری کسی تقصیر کو دخل نہیں ہے بلکہ تمام تر دخل اس میں ان مکذبین کی مخصوص ذہنیت کو ہے۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ یہ اپنی پیش رو قوموں کی روش پر چل رہے ہیں تو اس روش کا جو انجام اُن کے سامنے آیا وہی اِن کے سامنے بھی آئے گا۔

'وَاِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ'۔ سارے امور خدا کی طرف لوٹتے ہیں اور اسی کی طرف لوٹیں گے۔ یعنی خدا اس معاملہ میں غیر جانبدار یا غیر متعلق نہیں ہے بلکہ ہر چیز اس کے سامنے آرہی ہے اور آئے گی اور آخری فیصلہ اسی کا ہوگا تو اسی کے بھروسہ پر اپنے کام میں لگے رہو اور ان کے معاملے کو اللہ پر چھوڑو۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو مولیٰ و مرجع بنائے بیٹھے ہیں ایک دن اپنی اس طمع خام کا انجام خود دیکھ لیں گے۔

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا ٝ وَلَا یَغُرَّنَّکُمۡ بِاللّٰہِ الۡغَرُوۡرُ (۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے بعد مخالفین کو دھمکی دی کہ تم کو پچھلی قوموں کے انجام سے جو ڈرایا جا رہا ہے اس کو ہوائی بات نہ سمجھو۔ اللہ کی یہ وعید شدنی ہے۔ اس وقت تمہیں دنیا کی زندگی کی

جو رفاہیت حاصل ہے وہ تمھیں دھوکے میں نہ رکھے۔ تم اپنی موجودہ رفاہیت کو اپنے رویہ کی صحت کی دلیل گمان کرتے ہو اور پیغمبر کی وعید کا مذاق اڑاتے ہو کہ بھلا تم پر عذاب کیوں اور کدھر سے آ جائے گا لیکن جب اللہ کے وعدے کے ظہور کا وقت آئے گا تو تم دیکھ لوگے کہ جس چیز سے تمھیں ڈرایا جا رہا تھا وہ بالکل تمھارے سامنے ہی موجود تھی۔

سب سے بڑے فتنہ سے آگاہی

وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ۔ 'غرور' کے معنی فریب کار کے ہیں اور یہاں اس سے مراد شیطان ہے اس لیے کہ سب سے بڑا فریب کار شیطان ہی ہے۔ فرمایا کہ خدا کے باب میں فریب کار شیطان تمھیں دھوکے میں نہ رکھے۔ خدا بڑا رحیم و کریم بھی ہے اور بڑا ہی منتقم و قہار بھی۔ تمھارے تمام طغیان و فساد کے باوجود اس نے تمھیں جو ڈھیل دے رکھی ہے تو اس سے اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تم اس کی گرفت سے باہر ہو یا تمھارے مزعومہ شرکا نے تم کو بچا رکھا ہے یا وہ تم کو اس کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ اللہ کا نہ کوئی شریک ہے نہ کوئی اس کی پکڑ سے بچانے والا بن سکتا۔ شیطان نے تم کو اس فریب نفس میں اس لیے مبتلا کیا ہے کہ اس طرح وہ تم کو سیدھے جہنم میں لے جا رہا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خدا کی صفات کے باب میں گمراہی دراصل تمام گمراہیوں کی جڑ ہے اس وجہ سے شیطان یہیں سے انسان پر گھات لگاتا ہے۔ اسی خطرے سے آیت وَمَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (الانفطار: ۶) میں آگاہ فرمایا گیا ہے۔

إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ۚ إِنَّمَا يَدْعُو حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ (۶)

یعنی شیطان تمھارا دشمن اور کھلا ہوا دشمن ہے تو اپنے دشمن کو دشمن ہی سمجھو اور اس کی چالوں سے بچ کے رہو۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ وہ تو تمھارا دشمن ہے لیکن تم نے اس کو اپنا مرشد سمجھ کر اپنی باگ اس کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے! اگر اپنی باگ اس کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے تو اس کا انجام سن لو کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اس کی پارٹی میں شامل ہو جائیں وہ ان سب کو جہنم کے گھاٹ پر لے جا اتارے۔

الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ (۷)

وعدۂ شدنی کی وضاحت

یہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدۂ شدنی کی وضاحت ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۵ میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے باب میں کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ یہ دنیا نیکی اور بدی، خیر اور شر میں کسی امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے گی جنھوں نے یہ گمان کر رکھا ہے ان کو شیطان نے خدا کی صفات کے باب میں سخت دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس دن وہ لوگ عذاب شدید سے دوچار ہوں گے جنھوں نے کفر کیا ہو گا اور جن لوگوں نے ایمان و عمل صالح کی زندگی گزاری ہوگی وہ مغفرت اور اجر عظیم

کے حق دار ٹھہریں گے۔

أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا ۖ فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ (۸)

جو لوگ خدا کے قانون کی زد میں آ چکے وہ ایمان نہیں لائیں گے

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس میں تمھاری کسی تقصیر کو دخل نہیں ہے بلکہ یہ قانونِ الٰہی کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں تو ان کے غم میں اپنے کو ہلکان نہ کرو۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے تو جب وہ باخبر ہے تو ان کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے وہ مستحق ہوں گے۔

'أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا' کے بعد جواب بر بنائے قرینہ محذوف ہے۔ اگر اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی۔ کیا وہ جس کی نگاہوں میں اس کی بدعملی کھبا دی گئی ہے اور وہ اپنی بدی کو نیکی سمجھنے لگا ہے، تم اس کو ہدایت دینے والے بن سکتے ہو؟ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا ہدایت پانا سنتِ الٰہی کے خلاف ہے تو ایسے لوگوں کی فکر میں اپنے کو گھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرنا چاہیے۔ سورۂ زمر کی آیت ۱۹ میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے۔

أَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ	کیا وہ جس پر عذاب کی بات پوری ہو چکی ہے! کیا تم
أَفَأَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ	اس کو بچانے والے بن سکو گے جو دوزخ میں پڑ چکا۔

اس ٹکڑے سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی برائی کے ارتکاب کی ایک حالت تو وہ ہے کہ آدمی اس کا ارتکاب کرتا ہے لیکن اس کے اندر اس کے برائی ہونے کا احساس زندہ رہتا ہے، دوسری حالت یہ ہے کہ اس کی برائی اس کی نگاہوں میں اس طرح کھبا دی جاتی ہے کہ وہ اسی کو ہنر، اسی کو فیشن، اسی کو ترقی کا زینہ اور اسی کو تہذیب و تعلیم کا مقتضی سمجھنے لگتا ہے۔ پہلی حالت میں یہ توقع رہتی ہے کہ اس کو اگر تذکیر و تنبیہ کی جائے تو وہ سنبھل جائے گا لیکن دوسری حالت دل کے مسخ اور عقل کے ماؤف ہو جانے کی علامت ہے جس کو قرآن نے 'ختم قلوب' یا 'رین' سے تعبیر فرمایا ہے۔ جو اس بیماری میں مبتلا ہوا، وہ خدا کے قانون کی زد میں آ چکا۔ اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

'فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ' یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے اور جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں۔ آگے اسی سورہ میں اس کی مزید وضاحت آ رہی ہے۔

'فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ' مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے غم میں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے خود عقلی و روحانی خودکشی کی ہے۔ اگر یہ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمھاری دعوت میں کوئی کسر ہے بلکہ ان کے دلوں پر

مہر ہو چکی ہے تو ان کا غم کھانے کے بجائے ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ وہ ان کی ساری کارستانیاں دیکھ رہا ہے، ان کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے یہ سزاوار ہوں گے۔

'حَسَرٰتٍ' حال بھی ہو سکتا ہے اور مفعول لہٗ بھی۔ کلامِ عرب میں دونوں کی نظیریں ملتی ہیں۔ اور 'عَلَيْهِمْ' کا تعلق میرے نزدیک 'حَسَرٰتٍ' سے ہے جس طرح 'يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ' میں ہے۔ اس کا جمع کی صورت میں آنا فرطِ غم کے اظہار کے لیے ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۹-۱۸

آگے اس وعدۂ شدنی کی، جس کا ذکر اوپر آیت ۵ میں ہوا ہے، بطورِ تمہید پہلے دلیل بیان فرمائی ہے، پھر بتایا ہے کہ جس کو خدا کا تقرب اور اس کی بارگاہ میں سرخ روئی مطلوب ہو وہ جھوٹے معبودوں کو تقرب کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کا صحیح طریقہ اختیار کرے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی ایمان اور عملِ صالح کی راہ پر چلے۔ ایمان خدا کی طرف صعود کرنے والی چیز ہے اور عملِ صالح اس کو سہارا دیتا اور رفعت بخشتا ہے۔ اس کے سوا خدا کے تقرب کی کوئی اور راہ نہیں ہے۔ جن لوگوں نے یہ راہ چھوڑ کر دوسری راہیں نکالی ہیں اور اصل راہ سے لوگوں کو ہٹانے کے لیے رات دن طرح طرح کی سازشوں میں سرگرم ہیں ان کی ساری سازشوں کے تاروپود ایک دن بکھر جائیں گے۔

پھر یہ واضح فرمایا کہ مال و اولاد میں بڑھوتری، عمر میں کمی بیشی اور اس طرح کی تمام باتیں اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں، فرشتوں یا جنوں یا دوسرے فرضی معبودوں کو ان میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کائنات کے اضداد میں جو توافق ہے وہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اس کے اندر صرف ایک ہی خدائے قادر و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے۔ اس کے سوا کسی کو ذرہ برابر بھی کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

اس کے بعد لوگوں کو متنبہ فرمایا کہ یہ دعوت جو تمھیں دی جا رہی ہے تمھارے ہی نفع کے لیے دی جا رہی ہے۔ خدا کو تمھاری کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمھی خدا کے محتاج ہو۔ یہ دعوت قبول کرو گے تو اپنی دنیا و عاقبت سنوارو گے اور اگر نہ کرو گے تو اپنے ہی کو تباہ کرو گے۔ ساتھ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ کس مزاج کے لوگ اس دعوت کو قبول کریں گے اور کس طرح کے لوگ اس سے محروم رہیں گے ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹-۱۸

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ﴿۹﴾ مَنْ كَانَ

يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ
وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۭ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ
شَدِيْدٌ ۭ وَمَكْرُ اُولٰۗىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝۱۰ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ
مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۭ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ
اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ
اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۱۱ وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ڰ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ
سَاۗىِٕغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۭ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا
وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا
مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ
النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ڮ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ
مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝۱۳ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَاۗءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا
اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۭ وَلَا يُنَبِّئُكَ
مِثْلُ خَبِيْرٍ ۝۱۴ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ ع ۲ ۱۴
الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۱۵ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۱۶
وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝۱۷ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَ
اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبٰى ۭ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا

الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

ترجمۂ آیات اور اللہ ہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو پس وہ ابھارتی ہیں بادلوں کو پھر ہم ان کو ہانکتے
۱۰۰۹ ہیں کسی خشک زمین کی طرف پس ہم اس سے اس زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو
زندگی بخش دیتے ہیں۔ اسی طرح لوگوں کا از سرِ نو زندہ ہو کر اٹھنا ہے۔ ۹

جو عزت کا طالب ہو تو یاد رکھے کہ عزت تمام تر اللہ ہی کے لیے ہے۔ اس کی طرف صعود کرتا ہے پاکیزہ کلمہ اور عملِ صالح اس کلمہ کو سہارا دیتا ہے۔ اور جو لوگ بری چالیں چل رہے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کی چال نابود ہو کے رہے گی۔ ۱۰

اور اللہ نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر پانی کی بوند سے اور پھر تم کو جوڑے جوڑے بنایا۔ اور کوئی عورت نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے۔ کسی عمر والے کی عمر میں نہ زیادتی ہوتی نہ کمی مگر یہ ایک کتاب میں نوشتہ ہے۔ یہ سب اللہ کے لیے آسان ہے۔ ۱۱

اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں۔ ایک شیریں، پیاس بجھانے والا، پینے کے لیے خوش گوار ہے اور ایک کھاری کڑوا ہے۔ اور تم دونوں سے تازہ گوشت کھاتے اور زینت کی چیز نکالتے ہو جس کو پہنتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کشتیوں کو اس میں پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو اور تاکہ تم شکر گزار بنو۔ وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، ہر ایک گردش کرتا ہے ایک معین وقت کے لیے۔ وہی اللہ تمھارا رب ہے، اسی کی بادشاہی ہے۔ رہے وہ جن کو اس کے سوا تم پکارتے ہو تو وہ ذرہ برابر کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتے۔

اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری فریاد نہیں سنیں گے اور اگر سنیں گے بھی تو تمہاری فریاد رسی نہیں کریں گے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کریں گے۔ اور ایک باخبر کی طرح کوئی دوسرا تمہیں آگاہ نہیں کر سکتا! ۱۲-۱۴

اے لوگو! تمہی اللہ کے محتاج ہو، اللہ تو بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق لا کھڑی کرے اور یہ اللہ کے لیے ذرا مشکل نہیں۔ ۱۵-۱۷

اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی اور اگر کوئی بوجھل جان اپنے بوجھ کے اٹھانے میں کسی سے طالبِ مدد ہو گی تو اس میں ذرا بھی اس کا ہاتھ نہیں بٹایا جائے گا اگرچہ وہ قرابت مند ہی کیوں نہ ہو۔ تم تو بس انہی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور جو پاکی حاصل کرتا ہے وہ اپنے لیے حاصل کرتا ہے اور اللہ ہی کی طرف سب کی واپسی ہے۔ ۱۸

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (۹)

یہ دنیا اپنے وجود میں ایک تعلیم گاہ ہے۔

اوپر آیت ۵ میں جس وعدۂ شدنی کی یاد دہانی فرمائی ہے کائنات کے شواہد سے یہ اس کی دلیل پیش کی ہے کہ اس کو مستبعد نہ سمجھو۔ مرنے کے بعد لوگوں کو قبروں سے اٹھا کھڑا کرنا اللہ کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ تم اس دنیا میں برابر دیکھتے ہو کہ زمین بالکل خشک پڑی ہوتی ہے، اس میں سبزہ اور روئیدگی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہوتا کہ اللہ کسی طرف سے ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ وہ تمہارے دیکھتے دیکھتے بادلوں کو ابھارتی اور جمع کرتی ہیں۔ پھر ہم ان کو اس مُردہ زمین کی طرف ہانک کے لے جاتے اور اس کو سیراب کر دیتے ہیں جس سے اس کے ہر گوشے میں از سرِ نو زندگی نمودار ہو جاتی ہے۔ فرمایا کہ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ اسی طرح قیامت کے دن لوگوں کا از سرِ نو جی کر اٹھنا ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ مرنے اور مرنے کے بعد زندہ ہونے کا

مشاہدہ تو تم کو اس دنیا میں اللہ برابر کرا رہا ہے تو تم قیامت کو ناممکن کیوں خیال کیے بیٹھے ہو! ـــــــ یہ حقیقت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم واضح کرتے آرہے ہیں کہ یہ دنیا اپنے وجود میں ان تمام حقائق کی تعلیم کے لیے ایک بہترین تعلیم گاہ ہے جن کی قرآن تعلیم دے رہا ہے۔ اگر انسان عقل و بصیرت سے کام لے تو قرآن کے ہر دعوے کی دلیل اس کو اپنے دہنے بائیں سے مل سکتی ہے۔

عربیت کا ایک اسلوب

اس آیت میں اسلوبِ کلام بھی قابلِ توجہ ہے۔ پہلے ماضی کا صیغہ 'اَرْسَلَ' استعمال ہوا ہے۔ پھر مضارع 'فَتُثِيْرُ' آگیا۔ اس کے بعد 'سُقْنٰهُ' اور 'اَحْيَيْنَا' متکلم کے صیغے آگئے۔ اسلوب کا یہ تنوع اپنے اندر گوناگوں خوبیاں رکھتا ہے جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ ماضی تو صرف بیانِ واقعہ کے لیے آتا ہے۔ مضارع میں تصویرِ حال کا پہلو بھی ہوتا ہے اور متکلم کا صیغہ التفات و عنایاتِ خاص پر دلیل ہوتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۭ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَمَكْرُ اُولٰۗىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ (۱۰)

خدا کے تقرب کا ذریعہ ایمان اور عمل صالح ہے

مطلب یہ ہے کہ قیامت تو بہرحال شدنی ہے اور ہر ایک کو اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ رہا یہ سوال کہ خدا کے ہاں کن کو عزت و سرخروئی حاصل ہوگی اور کن کو ذلت و نامرادی سے دوچار ہونا پڑے گا تو جن کو اس سوال کا صحیح جواب مطلوب ہے وہ یاد رکھیں کہ عزت تمام تر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اس وجہ سے جس کو بھی یہ حاصل ہوگی اسی کے تعلق اور اسی کی عزت بخشی سے حاصل ہوگی۔

'اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ' یہ اس عزت کے حاصل کرنے کا طریقہ ارشاد ہوا کہ بندوں کی طرف سے اللہ کی طرف صعود کرنے والی چیز کلمۂ طیب ہے، یعنی کلمۂ ایمان۔ اس کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں جو خدا سے توسل اور قربت کا ذریعہ بن سکے۔ اس کلمۂ ایمان کو جو چیز سہارا دیتی اور رفعت بخشتی ہے وہ عمل صالح ہے۔ عمل صالح کے بغیر کلمۂ ایمان مرجھا کے رہ جاتا ہے۔ گویا کلمۂ ایمان کی مثال انگور کی بیل کی ہوئی جو ہے تو بجائے خود نہایت ثمر بار لیکن اس کی شادابی و ثمر باری کا تمام تر انحصار اس امر پر ہے کہ اس کو کوئی سہارا ملے جس پر وہ چڑھے، پھیلے اور پھولے پھلے۔ یہ سہارا اس کو عمل صالح سے حاصل ہوتا ہے۔ عمل صالح ہی اس کو پروان چڑھاتا اور مثمر و بارآور بناتا ہے ورنہ جس طرح انگور کی بیل سہارے کے بغیر سکڑ کے رہ جاتی ہے اسی طرح ایمان بھی عمل صالح کے بدون مرجھا کے رہ جاتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے 'اَلْكَلِمُ الطَّيِّبُ' سے کلمۂ ایمان ہی مراد لیا ہے اور یہاں اس کے پہلو بہ پہلو عمل صالح کا ذکر خود اس بات کی شہادت ہے کہ اس سے کلمۂ ایمان ہی مراد ہے۔ لفظ 'طَيِّب' اس کلمہ کی زرخیزی و ثمر باری کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس لیے کہ فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے یہی کلمہ تمام علم و حکمت

کی جڑ ہے۔ جس نے اس کو پا لیا اس نے تمام علم و حکمت کے خزانے کی کلید پا لی اور یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ ایمان اور عمل صالح دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح ایمان کے بغیر عمل کی کوئی بنیاد نہیں اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے جان شے ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے سورۂ ابراہیم کی آیات ۲۴-۲۶ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

یہ بات یہاں مشرکین پر یہ حقیقت واضح کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے کہ تم اپنے معبود ملائکہ کو خدا کے ہاں عزت و سرفرازی کا واسطہ سمجھے بیٹھے ہو حالانکہ عزت صرف اللہ کے لیے ہے اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ وہ ایمان ہے جس کے ساتھ عمل صالح کی تائید موجود ہو۔ قرآن میں مشرکین کی نسبت یہ بات جگہ جگہ نقل ہوئی ہے کہ وہ اپنے معبودوں کو خدا کے ہاں عزت و سرخروئی کا ذریعہ خیال کرتے تھے مثلاً

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر: ۳)	ہم ان کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا سے قریب تر کر دیں۔

دوسری جگہ ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا (مریم: ۸۱)	اور انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے عزت کا ذریعہ بن سکیں۔

ان کے اسی واہمہ پر یہاں ضرب لگائی ہے کہ اس جنت الحمقاء سے نکلو اور خدا کے ہاں عزت کے طالب ہو تو اس کے لیے ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرو۔

'وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ' یعنی جو لوگ اس حقیقت کا مواجہہ کرنے کے بجائے اپنے پندار کے تحفظ اور اللہ کے دین اور اس کے رسول کو زک پہنچانے کے لیے طرح طرح کی بری چالیں چل رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ اس طرح ان کو عزت نہیں حاصل ہوگی بلکہ وہ اپنے لیے ایک سخت عذاب کا سامان کر رہے ہیں۔

اس ٹکڑے میں 'سَيِّاٰت' کا نصب کچھ بیگانہ سا محسوس ہوتا ہے اس لیے کہ فعل 'مکر' اس طرح متعدی نہیں ہوتا۔ صاحب کشاف نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ 'سَيِّاٰت' یہاں مصدر کی صفت ہے۔ یعنی 'یمکرون المکرات السیات' یہ توجیہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ آگے آیت ۴۳ میں اس کی نظیر موجود ہے۔

'وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ' یعنی جو لوگ اس فریب نفس میں خود بھی مبتلا اور دوسروں کو بھی مبتلا رکھنے کے لیے رات دن جوڑ توڑ میں سرگرم ہیں وہ یاد رکھیں کہ ایک دن ان کی یہ ساری سازشیں اور سرگرمیاں نابود ہو جائیں گی۔ یہاں مبتدا کے اعادے سے کلام میں یہ زور پیدا ہو گیا ہے کہ ان لوگوں کی ان ساری سازشوں سے کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ تباہی ان کی سازشوں ہی پر آئے گی اور وہ انہی کی خرابی کا باعث ہوں گی۔ آگے اس مضمون کو کھول دیا ہے۔ فرمایا ہے 'وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا

بِاَهْلِهٖ (اور بُری چالیں انہی کو تباہ کرتی ہیں جو بری چالیں چلتے ہیں) اس لیے کہ حق ایک متاعِ مشترک اور سب کی فلاح کا ذریعہ ہے۔ اگر کوئی اس کی مخالفت کرتا ہے تو خود اپنی ہی آنکھیں پھوڑتا اور اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۭ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۱۱)

مشرکین کے ایک واہمہ کی تردید

یعنی اولاد اور عمر میں جو کمی بیشی بھی ہوتی ہے وہ اللہ کے علم اور اسی کے حکم سے ہوتی ہے۔ ان چیزوں میں بھی تمہارے ان دیویوں دیوتاؤں کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کے لیے بھی تمہیں خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کا سہارا نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مال و اولاد اور صحت و زندگی اور اس قبیل کی دوسری مطلوبات ہمیشہ شرک کے عوامل میں سے رہی ہیں۔ جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، یا ہوتی ہے لیکن زندہ نہیں رہتی یا صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں، اولادِ نرینہ نہیں پیدا ہوتی اس طرح کے لوگ اگر وہمی ہوتے ہیں تو شیطان بڑی آسانی سے ان کا رُخ تھانوں، استھانوں، قبروں اور مزاروں کی طرف موڑ دیتا ہے۔ مشرکین عرب کے شرک میں بھی اس عامل کو بڑا دخل رہا ہے۔ وہ اپنے معبودوں کو آسمان و زمین کا خالق تو نہیں سمجھتے تھے لیکن رزق اور مال و اولاد وغیرہ کے معاملات میں ان کو ۔۔۔۔ خاص طور پر فرشتوں کو ۔۔۔۔ بہت دخیل سمجھتے تھے۔ اسی طرح بیماری اور موت وغیرہ کے معاملے میں وہ جنوں کو متصرف خیال کر کے ان کی پوجا کرتے۔ ہم سورۂ انعام کی تفسیر میں ذکر کر آئے ہیں کہ بعض جنوں کو وہ اتنا خطرناک سمجھتے تھے کہ ان کے لیے اپنی اولاد تک کی قربانی کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کسی بیٹے یا بیٹی کی قربانی دے کر ان کو راضی نہ رکھا جائے تو یہ ساری اولاد چٹ کر جاتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ کسی بیماری میں مبتلا ہوتے وہ بھی ان دیویوں دیوتاؤں کی طرف رجوع کرتے اور ان سے صحت اور طولِ عمر کی دعا کرتے۔ اس آیت میں انہی اوہام پر ضرب لگائی ہے۔

ایک اہم حقیقت کی یاددہانی

'وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا' یہ ٹکڑا آگے کے مضمون کے لیے بطور تمہید ہے۔ اس میں اس مسلّم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے ان کی نسل چلائی پھر تم کو جوڑے جوڑے بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ سارا گھر بنایا اور بسایا تو خدا نے اور یہ ایسی حقیقت ہے جس سے تمہیں بھی انکار نہیں ہے تو اس گھر کو بسا کر آخر خدا کو کیا مشکل پیش آئی کہ وہ اس کے رزق، اولاد اور عمر وغیرہ کے معاملات دوسروں کے سپرد کرنے پر مجبور ہو گیا ؟ کیا جو تمہیں مٹی سے بنا سکتا ہے، پانی کی ایک بوند سے تمہاری نسل چلا سکتا ہے، تمہیں میاں بیوی کی صورت میں آباد کر سکتا ہے، وہ تمہارے رزق، تمہاری اولاد اور تمہاری عمر کے معاملات کو سرانجام دینے سے قاصر ہے کہ ان کے لیے تمہیں دوسرے آستانوں کا محتاج بنائے!

ایک غلط فہمی کا ازالہ

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۔ یہ اوپر والی تمہید کے لازمی نتیجہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس نے آدم علیہ السلام کا یہ کنبہ بسایا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کون عورت کب حاملہ ہوئی اور اس کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کب اس کو جنے گی اور کس شکل میں جنے گی! —— یہاں علم کا حوالہ خاص طور پر اس وجہ سے دیا کہ مشرکین عرب خدا کے خالق ہونے کے منکر نہیں تھے ان کو وہم تھا تو یہ تھا کہ اتنی وسیع و عریض دنیا کے ہر معاملے کی خبر خدا کو کس طرح ہو سکتی ہے اس وجہ سے بہت سے معاملات، جو رزق و عمر اور اولاد وغیرہ سے متعلق ہیں، اس نے اپنے شرکاء کے حوالے کر دیے ہیں۔ قرآن نے 'اِلَّا بِعِلْمِهٖ' کے لفظ سے ان کے اسی واہمہ پر ضرب لگائی ہے کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اس دنیا میں ایسا نہیں ہوتا جو اس کے خالق کے دائرۂ علم سے باہر ہو۔

وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ ۔ لفظ 'مُعَمَّر' یہاں طویل العمر کے مفہوم میں نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کو کوئی عمر ملتی ہے خواہ طویل یا قصیر۔ صاحب کشاف نے اس کا یہی مفہوم لیا ہے اور ہمارے نزدیک یہ صحیح ہے۔

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ جس کو بھی کوئی عمر نصیب ہوتی ہے اور پھر اس عمر میں سے جو گھنٹے اور دن کم ہوتے ہیں وہ خدا کے حکم اور علم سے ہوتے ہیں۔ 'اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ' یہ اوپر کے الفاظ 'اِلَّا بِعِلْمِهٖ' کی جگہ پر ہے اور اس سے اوپر والا مضمون مزید محکم و موثق ہو گیا ہے۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ خدا ان ساری باتوں کو جانتا ہے بلکہ ان میں سے ہر چیز ایک عظیم کتاب میں مندرج ہے۔ اس وہم میں نہ رہو کہ خدا کسی چیز کو بھول جائے گا۔

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۔ یہ اسی شبہ کا ازالہ ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ اہل عرب اس وہم میں مبتلا تھے کہ بھلا خدا تن تنہا ان تمام جزئیات امور کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہے! اس وہم کے تحت انھوں نے خدا کی مدد کے لیے شرکاء و اعوان ایجاد کیے اور پھر ان کی عبادت میں اس طرح لگے کہ خدا ان کے ہاں ایک وجودِ معطل ہو کے رہ گیا —— یہ ان کے اسی واہمہ کی تردید ہے کہ خدا کے لیے ان کاموں میں سے کوئی کام بھی مشکل نہیں ہے کہ وہ کسی شریک و مددگار کا محتاج ہو۔

وَمَا یَسْتَوِی الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَی الْفُلْكَ فِیْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۞ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا یَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ (۱۲-۱۳)

کائنات کے اضداد میں توافق سے توحید پر استدلال

یہ ایک دوسرے پہلو سے شرک اور شرکاء کی تردید فرمائی گئی۔ اس کائنات میں اضداد کا جو تصادم ہے یہ بھی شرک کے نہایت اہم عوامل میں سے ہے۔ قرآن نے مختلف پہلوؤں سے اس کی تردید فرمائی ہے اور ہم

اس کی وضاحت کرتے آرہے ہیں۔ یہاں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں اضداد کا وجود اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کے اندر مختلف ارادے کارفرما ہیں اس لیے کہ اس کے اضداد میں ظاہری تضاد کے ساتھ ساتھ نہایت گہری سازگاری بھی پائی جاتی ہے جس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ کوئی بالاتر اور ہمہ گیر و ہمہ جہت قوتِ قاہرہ ان تمام اضداد پر حاوی ہے جو ان کو اپنی حکمت کے تحت اس کائنات کی مجموعی بہبود کے لیے استعمال کر رہی ہے۔

'وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ ۔ الأية' یعنی دیکھو، دو سمندر ہیں اور دونوں اپنی ظاہری خصوصیات و صفات میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک کا پانی شیریں، پیاس بجھانے والا اور خوشگوار ہے، دوسرے کا کھاری، کڑوا۔ یہ دونوں آپس میں ٹکراتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ کھاری سمندر میٹھے سمندر پر غالب ہو کر اس کو کھاری بنا دے یا شیریں سمندر کھاری کے مزاج کو بدل دے بلکہ ایک بالاتر قوت نے ان دونوں کو ٹکرانے کے باوجود ان کے حدود کا پابند کر رکھا ہے۔ سورۂ رحمان میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۔ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (الرحمان ۱۹-۲۰) (اس نے چھوڑے دو دریا، دونوں باہم دگر ٹکراتے ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان ایک اوٹ ہوتی ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے)۔

پھر یہ دیکھو کہ کس طرح یہ اپنے تضاد و اختلاف کے باوجود اپنے سے بالاتر مقصد کی خدمت بجا لاتے ہیں کہ تم دونوں ہی سے اپنے لمبے لمبے بحری سفروں میں جہاں تازہ گوشت حاصل کرنا ناممکن ہوتا، ان سے تازہ گوشت حاصل کر لیتے ہو اور غذا کے ساتھ اپنی زینت کے لیے ان سے قیمتی موتی بھی نکالتے ہو۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہارے لیے اس طرح مسخر ہیں کہ تمہارے جہازات ان کے سینے پر سے موجوں کو پھاڑتے ہوئے چلتے ہیں تاکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کر کے تم اللہ کے رزق و فضل کے طالب بنو اور اس کے شکرگزار رہو ۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کے ظاہری تضاد میں گم ہو کے نہ رہ جاؤ بلکہ ان اضداد کے باہمی توافق پر بھی نگاہ ڈالو تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ایک ہی خدائے قادر و قیوم نے اس دنیا کو وجود بخشا ہے اور اسی نے اپنی قدرت و حکمت سے اس کے تمام اجزائے مختلفہ کو انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے تاکہ انسان اپنے پروردگار کا شکرگزار رہے۔

'يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ الأية' یہ اسی حقیقت کی طرف ایک دوسری مثال سے توجہ دلائی ہے کہ یہی حال تمہارے سامنے روز آنے والی رات اور روز ظاہر ہونے والے دن کا بھی ہے۔ وہ بھی بظاہر ضدین کی نسبت رکھتے ہیں لیکن ان کے درمیان بالکل زوجین کا توافق پایا جاتا ہے۔ دونوں ہی اس دنیا کے بقا اور تمہاری راحت و معیشت کے لیے ضروری ہیں۔ یہی حال سورج اور چاند کا بھی ہے۔ نادانوں نے ان کو معبود بنا کر پوجا حالانکہ وہ اپنے وجود سے شہادت دیتے ہیں کہ خدا نے ان کو اپنی خلق کی خدمت کے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ چنانچہ دونوں اپنے معین نظام اوقات کے ساتھ برابر تمہاری خدمت میں سرگرم رہتے ہیں۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ۔ یہ خلاصہ ہے اوپر کی ساری بحث کا کہ یہی اللہ جس کی یہ شانیں، قدرتیں اور حکمتیں دیکھتے ہو تمہارا رب ہے اور اسی کے قبضۂ قدرت میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ۔ 'قِطْمِيْر' اس باریک غلاف کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے اوپر ہوتا ہے۔

یہ وہی بات منفی اسلوب سے فرمائی کہ رہے وہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے اور پوجتے ہو تو وہ اس دنیا کے خلق و تدبیر میں ذرہ برابر بھی دخل نہیں رکھتے۔

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۗ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۗ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ (۱۴)

'اِسْتَجَابَ لَهٗ' کے معنی ہیں اس کا جواب دیا یا اس کی فریادرسی کی۔

فرضی معبودوں کی بےبسی دنیا اور آخرت دونوں میں

یہ ان کے مزعومہ دیوتاؤں کی بےبسی اور بےحقیقتی واضح فرمائی ہے کہ اگر تم اپنی کسی مشکل میں ان کو مدد کے لیے پکارو گے تو اول تو وہ تمہاری فریاد سنیں گے نہیں اور سن بھی لیں تو وہ تمہاری کوئی فریادرسی نہیں کریں گے۔ ان کی یہ بےبسی اس دنیا میں بھی واضح ہے اور آخرت میں یہ مزید ہو جائے گی۔ مشرکین جن چیزوں کو پوجتے تھے اول تو ان کا کوئی شئی موجود ہی نہیں تھا اس وجہ سے ان کے سننے یا فریادرسی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر کچھ ایسی ہستیوں کو پوجتے تھے جن کا کوئی وجود ہے تو اول تو وہ آخرت میں اپنی بےخبری کا اظہار کریں گی کہ ہمیں علم نہیں کہ کچھ لوگ ہماری عبادت کرتے رہے ہیں۔ ثانیاً ان میں سے جو صالحین ہوں گے مثلاً ملائکہ اور انبیاء وہ تو صاف الفاظ میں اعلان براءت کریں گے۔ اور جو اشرار ہوں گے مثلاً جنات و شیاطین تو وہ ان فریاد کرنے والوں کو جواب دیں گے کہ یہ تمہاری بدبختی تھی کہ تم نے ہماری پرستش کی، اب اس کا انجام بھگتو۔ اب نہ تم ہمارے کچھ کام آ سکتے اور نہ ہم تمہاری کوئی فریادرسی کر سکتے ہیں۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ۔ یعنی اس دنیا میں تو وہ تمہاری فریاد سے بےخبر اور تمہاری فریادرسی سے بےبس ہیں اور قیامت کے دن وہ تمہارے شرک کا انکار کریں گے۔ چنانچہ فرشتوں کے انکار کی تفصیل سورۂ سبا میں بدیں الفاظ گزر چکی ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ	اور اس دن کا دھیان کرو جس دن وہ ان سب کو
لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا	اکٹھا کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ لوگ
يَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ	تمہاری پرستش کرتے رہے ہیں؟ وہ جواب دیں گے کہ
وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا	تو پاک ہے! ان کے مقابل میں تو ہمارا کارساز ہے بلکہ
يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ (سبا: ۴۰-۴۱)	یہ لوگ جنوں کی پوجا کرتے رہے ہیں۔

'وَلَا یُنَبِّئُکَ مِثْلُ خَبِیْرٍ' یہ آخر میں تنبیہ اور نہایت ہی زوردار اور بلیغ تنبیہ ہے۔ 'خَبِیْرٍ' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان باتوں کو سن لو اور اچھی طرح سن لو اس لیے کہ غیب کے پردوں میں کیا ہے اور کل کیا کچھ تمھارے سامنے آنے والا ہے اس کو ایک حقیقی باخبر ہی جانتا ہے۔ اس سے بڑھ کر تمھیں ان حقائق سے کوئی دوسرا باخبر نہیں کر سکتا۔ تمھاری بدقسمتی ہوگی اگر تم نے اس کی قدر نہ کی اور جھوٹی آرزوؤں میں پھنسے رہ گئے! نہایت بلیغ تنبیہ

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ ۝ اِنۡ يَّشَاۡ يُذۡهِبۡكُمۡ وَيَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِيۡدٍ ۚ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيۡزٍ (۱۵ - ۱۷)

یہ اسی تنبیہ پر اضافہ اور نہایت زوردار اضافہ ہے۔ خطاب بھی 'یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ' کے الفاظ سے ہے کہ سب کان کھول کر سن لیں کہ تعلیم و تذکیر کا یہ سارا اہتمام جو کیا گیا ہے، اور خدا کا رسول لوگوں کو جگانے اور جھنجھوڑنے کے لیے اپنے رات دن جو ایک کیے ہوئے ہے تو اس لیے نہیں کہ لوگوں کے ایمان نہ لانے سے خدا کا کوئی کام اٹکا ہوا ہے، خدا تو بالکل بے نیاز اور اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے، البتہ تم لوگ خود خدا کے محتاج ہو، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ خدا کی بے نیازی کا تو یہ عالم ہے کہ وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور تمھاری جگہ ایک دوسری نئی مخلوق لا بسائے۔ اگر وہ یہ کرنا چاہے تو یہ کام ذرا بھی اس کے لیے مشکل نہیں ہے۔ یہ محض تمھارے اوپر اس کی رحمت و عنایت ہے کہ تمھاری ان ناقدریوں اور ناشکریوں کے باوجود تمھیں مہلت دیے جا رہا ہے۔ بہتر ہے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ یاد رکھو کہ نہ خدا کا کچھ بگاڑو گے نہ اس کے رسول کا بلکہ اپنے ہی کو تباہ کرو گے۔

'هُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ' کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں کہ خدا اپنی ذات میں کامل ہے، اس کا یہ کمال اس کی ذات سے خارج کی کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ ساتھ ہی وہ حمید یعنی تمام صفات حمد سے متصف بھی ہے۔ خلق کے ساتھ اس کا تعلق کسی احتیاج پر نہیں بلکہ تمام تر اس کی رحمت و عنایت پر مبنی ہے۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ کردم خلق تا جودے کنم

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى ؕ وَاِنۡ تَدۡعُ مُثۡقَلَةٌ اِلٰى حِمۡلِهَا لَا يُحۡمَلۡ مِنۡهُ شَىۡءٌ وَّلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبٰى ؕ اِنَّمَا تُنۡذِرُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَيۡبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنۡ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفۡسِهٖ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الۡمَصِيۡرُ (۱۸)

یہ اسی اوپر والے مضمون کی مزید وضاحت دوسرے پہلو سے ہے۔ فرمایا کہ اس دن کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔

'وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَۃٌ اِلٰی حِمْلِھَا لَا یُحْمَلْ مِنْہُ شَیْءٌ وَّلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی'۔ 'مُثْقَلَۃٌ' سے پہلے موصوف محذوف ہے، یعنی 'نفس مثقلۃ' (اپنے بار گناہ کے نیچے دبی ہوئی جان)۔ اسی طرح 'الٰی حِمْلِھَا' میں 'حِمْل' سے پہلے مضاف محذوف ہے اور 'کان' کے بعد اس کا اسم 'المدعو' محذوف ہے۔ یہ تمام محذوفات اعلیٰ عربیت کے معروف قواعد کے مطابق ہیں۔

آنحضرت صلعم کو تسلی

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے گناہوں سے بوجھل جان کسی کو پکارے گی کہ ذرا وہ اس کے بوجھ کے اٹھانے میں اس کو سہارا دے دے تو کوئی اس کا ہاتھ بٹانے والا نہیں بنے گا اگرچہ جس کو وہ مدد کے لیے پکارے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ نیک تو اس لیے اس کا ہاتھ نہیں بٹائیں گے کہ جب وہ دنیا میں اس کے گناہوں میں اس کے ساتھی نہ بنے تو وہ آخرت میں اس کے ساتھی کیوں بنیں اور جو بد ہوں گے وہ خود اپنے بوجھ کے تلے دبے ہوں گے وہ کسی دوسرے کو کیا سہارا دے سکیں گے!

'اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ'۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ تم ان حقائق سے لوگوں کو باخبر کر دو۔ اگر یہ متنبہ ہوتے ہیں تو فبہا۔ نہیں ہوتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ تمہارا انذار صرف انہیں لوگوں پر کارگر ہو سکتا ہے جو اپنی عقل اور سمع و بصر و فؤاد کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں اور غیب ہی میں رہتے اپنے رب سے ڈریں اور نماز کا اہتمام کریں۔ یہ جو لوگ جو سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں تو ان کا علاج تمہارے پاس نہیں ہے۔ ان کا معاملہ ہمارے اوپر چھوڑ دو۔

'وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ' کا ذکر یہاں ایمان کے اولین ثمرہ اور خشیت رب بالغیب کی علامت کے طور پر ہوا ہے۔ جو شخص غیب میں خدا سے ڈرتا ہے وہ لازماً نماز کا اہتمام کرتا ہے۔ جو نماز سے بے پروا ہے وہ خدا سے بے پروا ہے اگرچہ وہ زبان سے ایمان کے کتنے ہی بلند بانگ دعوے کرے۔

'وَمَنْ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفْسِہٖ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ'۔ یہ نماز کے فائدے کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو شخص گناہوں کے بوجھ سے سبکدوش اور پاکیزہ ہونا چاہتا ہو وہ جھوٹے سہاروں پر اعتماد کرنے کے بجائے نماز کا اہتمام کرے۔ یہ چیز اس کو گناہوں سے پاک کرے گی اور جس نے پاکیزگی حاصل کی وہ اپنا ہی بھلا کرے گا اس لیے کہ اللہ کسی کی عبادت و اطاعت کا محتاج نہیں ہے بلکہ بندے خود ہی اس کے محتاج ہیں اور سب کی واپسی بہرحال اسی کی طرف ہونی ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۱۹-۲۸

آگے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ کس طرح کے لوگ ایمان لائیں گے اور کس قسم کے لوگ اس نعمت سے محروم رہیں گے۔ اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے اس کائنات کے اندر اضداد کے وجود کی طرف توجہ

دلائل کو دیکھتے ہو کہ اس کے اندر روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی، گرمی بھی ہے اور سردی بھی۔ اسی طرح زمین میں زرخیز قطعات بھی ہیں جو بارش کا چھینٹا پڑتے ہی لہلہا اٹھتے ہیں اور بنجر علاقے بھی ہیں جو ہزار بارش ہو لیکن ویران ہی پڑے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح اشخاص و افراد کے اندر بھی مختلف قسم کی صلاحیتیں رکھنے والے ہیں۔ جن کی صلاحیتیں زندہ ہیں وہ اس رحمت کی بارش سے، جو قرآن کی صورت میں نازل ہوئی ہے، فائدہ اٹھائیں گے اور جن کی صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہیں وہ اس کے فیض سے محروم رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح روشنی و تاریکی اور سردی و گرمی کو اس کائنات کی مجموعی مصلحت کے لیے پیدا کیا ہے اسی طرح اس کے اندر حق کے طالبوں کی طرح باطل کے پسند کرنے والوں کو بھی مہلت دی ہے اس لیے کہ حق و باطل کے اس تصادم ہی کے اندر اہلِ حق کے جوہر نکھرتے ہیں اور اہلِ باطل پر اللہ کی حجت تمام ہوتی ہے ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

یت وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ﴿٢٠﴾ وَ
۱ - ۲۵ لَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ﴿٢١﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ
إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَاءُ ۖ وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ ﴿٢٢﴾
إِنْ أَنتَ إِلَّا نَذِيرٌ ﴿٢٣﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ
وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴿٢٤﴾ وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ
الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالزُّبُرِ وَ
بِالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ فَكَيْفَ كَانَ
ع ۱۲ نَكِيرِ ﴿٢٦﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ
۱۵ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا ۚ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ
مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ﴿٢٧﴾ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ
وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ ۗ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ
الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿٢٨﴾

ترجمۂ آیات ۱۹-۲۸

نابینا اور بینا دونوں یکساں نہیں ہوں گے اور نہ تاریکی اور روشنی اور سایہ اور دھوپ یکساں ہیں اور نہ زندہ اور مردے یکساں ہوں گے۔ اللہ ہی جن کو چاہتا ہے سناتا ہے اور تم ان کو سنانے والے نہیں بن سکتے جو قبروں کے اندر ہیں۔ تم تو بس ایک نذیر ہو۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی ہے جس کے اندر ایک نذیر نہ آیا ہو۔ اور اگر یہ لوگ تم کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے جو لوگ ہوئے ہیں انھوں نے بھی جھٹلایا۔ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل، صحیفوں اور روشن کتاب کے ساتھ آئے تھے۔ پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑا تو دیکھو کیسی ہوئی ان کے اوپر میری پھٹکار! ۱۹-۲۶

تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا پس ہم نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کر دیے۔ اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ مختلف رنگوں کی دھاریاں ہیں اور بھجنگ کالی بھی۔ اور انسانوں، جانوروں اور چارپایوں کے اندر بھی مختلف رنگ کے ہیں۔ اسی طرح اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈریں گے جو علم رکھنے والے ہیں۔ بے شک اللہ غالب اور بخشنے والا ہے۔ ۲۷-۲۸

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ (۱۹)

ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں خدا کا قانون

'اَعْمٰی' سے مراد یہاں عقل و دل کے اندھے ہیں اور 'بَصِیْر' سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی عقل و دل کی صلاحیتیں زندہ ہیں اور وہ ان سے کام لیتے ہیں۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تمھاری دعوت قبول کرنے کے معاملے میں ہر ایک کا حال یکساں نہیں ہوگا۔ جن لوگوں نے اپنی عقل کی آنکھیں پھوڑ لی ہیں اور جن کے دل بے نور ہو چکے ہیں وہ لوگ تمھاری دعوت قبول کرنے والے نہیں

نہیں گے خواہ تم کتنے ہی جتن کرو۔ تمہاری روشنی سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھائیں گے جن کے اندر بصیرت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ اس کی بخشی ہوئی فطری صلاحیتوں کو زندہ رکھتے اور ان کی قدر کرتے ہیں ان کی بصیرت و ہدایت میں وہ مزید اضافہ فرماتا ہے اور جو لوگ ان صلاحیتوں کی قدر نہیں کرتے ان کو مزید عطا ہونا تو درکنار ان سے وہ بھی سلب کر لی جاتی ہیں جو ان کو عطا ہوئی ہوتی ہیں۔ سورۂ نمل میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ۝ وَمَآ أَنتَ بِهَٰدِي الْعُمْيِ عَن ضَلَٰلَتِهِمْ ۖ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِـَٔايَٰتِنَا ۝ (النمل: ۸۰-۸۱)

تم مردوں کو اپنی بات نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو سنا سکتے جب کہ وہ پیٹھ پھیر کے بھاگے جا رہے ہوں۔ اور تم اندھوں کو بھی ان کی ضلالت سے موڑ کر ہدایت پر نہیں لا سکتے۔ تم تو بس انھیں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان رکھنے والے ہوں۔

وَلَا الظُّلُمَٰتُ وَلَا النُّورُ ۝ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ (۲۰-۲۱)

مجموعہ کے اعمال میں بھی اس کائنات کی مصلحت ہے

فرمایا کہ جس طرح اس دنیا میں تاریکی بھی ہے اور روشنی بھی، سایہ بھی ہے اور گرمی بھی لیکن دونوں یکساں نہیں ہو سکتے، اسی طرح یہ دونوں قسم کے لوگ جن کا ذکر اوپر ہوا یکساں نہیں ہو سکتے۔ تاہم جس طرح تاریکی اور روشنی، سایہ اور گرمی دونوں میں اس دنیا کی مصلحت مضمر ہے اسی طرح اس قسم کے لوگوں کے وجود میں بھی قدرت کی مصلحت ہے۔ اس مصلحت کا ذکر قرآن کے دوسرے مقامات میں ہوا ہے۔ وہاں واضح فرمایا ہے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسان کے اختیار کے امتحان کے لیے پیدا کی ہے اس وجہ سے اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اس میں ایک خاص حد تک ان لوگوں کو بھی مہلت ملے جو اس کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کی قدر نہیں کرتے اور حق کی جگہ باطل ہی کے پرستار بن کے زندگی گزارتے ہیں۔

اس میں دوسرے 'لَا' کے اعادے کو بعض اہل ادب نے زائد مانا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ زائد نہیں بلکہ تاکید کے لیے ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَآءُ وَلَا الْأَمْوَٰتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَآءُ ۖ وَمَآ أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ (۲۲)

یہ وہی مضمون دوسرے الفاظ اور دوسرے اسلوب میں بیان ہوا ہے۔ اس دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی بیزاری سے بڑی پریشانی تھی۔ آپ کو اندیشہ تھا کہ مبادا اس میں آپ ہی کی کسی کوتاہی کو دخل ہو۔ آپ کی یہ پریشانی دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف اسلوبوں سے تسلی دی کہ تمہارا کام زندوں کو سنانا ہے، مردوں کو جگانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ جن کی صلاحیتیں زندہ ہیں

وہ تمھاری بات سن رہے ہیں اور مان رہے ہیں۔ رہے وہ جو عقلی و روحانی اعتبار سے بالکل مردہ ہو چکے ہیں اگر تم چاہتے ہو کہ یہ بھی تمھاری بات سننے والے بن جائیں تو یہ ہونے سے رہا۔

'اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ'۔ 'اسماع' یہاں بات کو سننے اور ماننے کی توفیق دینے کے مفہوم میں ہے۔ یعنی یہ اللہ ہی ہے جو سچی بات سننے اور اس کو ماننے کی، جس کو چاہتا ہے، توفیق دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہر چاہنا اس کی حکمت کے تحت ہے۔ اس معاملے میں اس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ اس کی بخشی ہوئی فطری صلاحیتوں کو زندہ رکھتے ہیں ان کو تو وہ مزید سننے سمجھنے اور ماننے کی توفیق بخشتا ہے اور جو لوگ اپنی فطری ہدایت کی قدر نہیں کرتے وہ اخلاقی اعتبار سے مردوں کے حکم میں ہیں ان کو زندہ کرنا خدا کے سوا کسی کے امکان میں نہیں۔

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۭ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۲۳-۲۴)

رسول کی ذمہ داری — یہ تبلیغ و دعوت کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کی حد واضح فرما دی کہ تم بس لوگوں کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر دینے والے ہو۔ یہ ذمہ داری تمھارے اوپر نہیں ہے کہ لوگ تمھاری بات مان بھی لیں۔ تم کو خدا نے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ جن باتوں کی تم خبر دے رہے ہو ان میں سے ہر بات شدنی ہے۔ پس تمھارا کام یہ ہے کہ جو لوگ تمھاری باتوں پر کان دھریں ان کو ان کے مبارک انجام کی خوش خبری سنا دو۔ اور جو لوگ تمھاری باتوں سے منہ موڑیں ان کو ان کے انجام بد سے آگاہ کر دو۔ اس سے زیادہ تمھاری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس وجہ سے تمھیں ان کے لیے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

'وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ' یعنی تم دنیا میں پہلے نذیر نہیں ہو، بلکہ ماضی میں جو قومیں گزری ہیں ان میں بھی اللہ نے اپنے نذیر بھیجے تو ان کی سرگزشت میں تمھارے لیے بھی سبق ہے اور تمھاری قوم کے لیے بھی درسِ عبرت ہے۔ تمھارے ساتھ اللہ وہی معاملہ کرے گا جو اس نے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا اور تمھاری قوم کے ساتھ بھی لازماً وہی معاملہ کرے گا جو پچھلی قوموں کے ساتھ اس نے کیا۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (۲۵-۲۶)

یہ اسی اجمال کی وضاحت ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ تمھاری تکذیب کر رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں اسی طرح انھوں نے بھی اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی۔ یہ روایت پہلے سے چلی آرہی ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ پہلی بار تمھاری ہی قوم نے تمھارے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ صورتِ حال پہلی بار پیش آئی ہوتی تب تو تمھارے لیے یہ وجہ تشویش ہو سکتی تھی کہ

مبادا اس میں تمھاری کسی کوتاہی کو دخل ہو لیکن جب ہر رسول کے ساتھ اس کی قوم نے یہی سلوک کیا ہے تو معلوم ہوا کہ رسولوں کے ساتھ ان کی قوموں کی روش ہمیشہ سے یہی رہی ہے۔

'جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ - الاٰية' یعنی یہ بات بھی نہیں تھی کہ ان کے رسول خالی ہاتھ آئے ہوں، بلکہ وہ نہایت واضح دلائل و معجزات، صحیفوں اور روشن کتاب کے ساتھ آئے لیکن ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ان کو قائل کرنے والی نہ بن سکی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے مخالفوں سے بھی تم یہ توقع نہ رکھو کہ اگر ان کی طلب کے مطابق ان کو کوئی نشانی دکھا دی جائے تو یہ ایمان لانے والے بن جائیں گے۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے ساری نشانیاں، سارے صحیفے اور تمام کتابیں بے سود ہیں۔

'بَیِّنٰت' اور 'زُبُر' تو عام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر رسول کو ان سے مسلح کر کے بھیجا۔ 'کتاب منیر' سے اشارہ تورات کی طرف ہے۔ قرآن مجید سے پہلے کتاب منیر کی حیثیت اسی کو حاصل رہی۔

مکذبین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

'ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' قوموں نے جو روش اختیار کی وہ اوپر مذکور ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا یہ اس کا بیان ہے۔ فرمایا کہ جب انھوں نے رسول کی تکذیب کر دی تو ہم نے ان کو پکڑا اور جب پکڑا تو دیکھو کس طرح پکڑا اور کیسی عبرت انگیز سزا ان کو دی! مطلب یہ ہے کہ اگر تمھاری قوم بھی اپنی اسی روش پر جمی رہی تو اس کے ساتھ بھی ہم یہی معاملہ کریں گے۔ ہمارا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (۲۷)

آیات ۲۰-۲۲ کا مضمون ایک نئے اسلوب سے

وہی حقیقت جو آیات ۲۰-۲۲ میں سمجھائی گئی ہے اس کائنات کی دوسری مثالوں کی روشنی میں سمجھائی جا رہی ہے۔ گویا آیات ۲۲-۲۰ بیچ میں بطور التفات آ گئی تھیں۔ ان کے ختم ہونے کے بعد کلام پھر اپنے اصل سلسلہ سے مربوط ہو گیا۔ فرمایا کہ دیکھتے نہیں کہ اللہ آسمان سے بارش نازل کرتا ہے تو اس سے ایک ہی قسم کی چیز نہیں اگتی بلکہ طرح طرح کی مختلف النوع اور مختلف الالوان چیزیں اگ پڑتی ہیں۔ اسی سے خوش نما، خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھلوں والی چیزیں بھی اگتی ہیں اور اسی سے ناقص زمینوں میں جھاڑ جھنکاڑ بھی اگتے ہیں۔ یہی حال اس قرآنی بارش کا بھی ہے۔ اس سے بھی صالح طبیعتوں کی صلاحیتیں بھی ابھریں گی اور جن کے اندر کھوٹ اور فساد ہے وہ بھی ابھر کر سامنے آئے گا۔ اس لیے کہ شیطان اس کو ٹھنڈے پیٹوں نہیں برداشت کرے گا بلکہ وہ بھی اپنی ذریات کو اس کے مقابلے کے لیے ابھارے گا۔ لفظ 'الوان' عربی میں صرف رنگوں ہی کے مفہوم میں نہیں آتا بلکہ انواع و اقسام کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ آگے بھی اسی آیت میں یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

سورۂ اعراف میں بارش کے اثرات کے اس پہلو کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ	اور جو زمین زرخیز ہوتی ہے تو اس کے
نَبَاتُهُ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ	رب کے حکم سے اس کی نباتات بھی اچھی اگتی ہیں
خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۔	اور جو ناقص ہوتی ہے تو اس کی نباتات بھی ناقص
(الاعراف : ۵۸)	ہی اگتی ہیں ۔

اس آیت کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں، اس مقام کی وضاحت کے لیے ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

'وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ' 'جُدَد' جمع ہے 'جُدَّۃ' کی۔ یہ لفظ اصلاً تو ہرنوں اور گدھوں کی پیٹھوں پر مختلف رنگوں کی جو دھاریاں ہوتی ہیں ان کے لیے آتا ہے لیکن یہاں یہ ان مختلف الالوان سلوں اور چٹانوں کے لیے آیا ہے جن کی دھاریاں یا قطاریں پہاڑوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔

اسلوب سے متعلق ایک سوال کا جواب

'غَرَابِيْب' جمع ہے 'غربیب' کی۔ اس کے معنی ہیں کالا بھجنگ۔ یہ لفظ عام طور پر 'اسود' کی تاکید کے لیے آتا ہے۔ مثلاً کہیں گے 'اسود غربیب'۔ فلاں چیز کالی بھجنگ ہے۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں یہ 'سود' سے پہلے کیوں آیا؟ تاکید کا مقدم آنا تو بلاغت کے خلاف ہے؟ اس سوال کے جواب مختلف اہلِ ادب نے مختلف دیے ہیں۔ بعض نے اس کو بدل کے مفہوم میں لیا ہے جو وضاحت کے طور پر آیا ہے۔ اگر یہ توجیہ مان لی جائے تو یہ اس پہلو سے صحیح ہے کہ جو بدل وضاحت کے طور پر آتا ہے وہ درحقیقت تاکید ہی کے لیے آتا ہے۔ اس صورت میں متکلم گویا اپنی بات سادہ الفاظ میں پھر مخاطب کے سامنے دُہرا دیتا ہے کہ اچھی طرح اس کے ذہن نشین ہو جائے۔ یہاں سیاہ قسم کے پتھروں کی طرف اس وضاحت کے ساتھ توجہ دلانے کی وجہ یہ ہے کہ مقصود یہ سمجھانا ہے کہ جس طرح پہاڑوں میں سیاہ پتھر ہوتے ہیں اسی طرح لوگوں کے اندر سیاہ قلب افراد ہوتے ہیں اور جس طرح سفید و سرخ اور سیاہ پتھروں کا الگ الگ مصرف ہے۔ اسی طرح سیاہ قلب افراد کا بھی ایک محل اور مصرف ہے جس کے لیے قدرت نے ان کو اس دُنیا میں مہلت دی ہے۔

'وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۭ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ' (۲۸)۔

فرمایا کہ جمادات کی طرح انسانوں، جانداروں اور چوپایوں میں بھی قدرت کی یہی گوناگونی و بوقلمونی نمایاں ہے۔ لفظ 'الوان' یہاں بھی صرف رنگوں کے مفہوم میں نہیں بلکہ انواع و اقسام کے وسیع مفہوم میں ہے، یعنی صورت، سیرت، صفات، مزاج، خصوصیات اور عادات و اطوار کے اعتبار سے ان میں بڑا فرق و اختلاف پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہر جانور سے دودھ کی توقع نہیں کی جا سکتی اسی طرح ہر آدمی سے خدا کی خشیت کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ اللہ کے بندوں میں سے اس

سے ڈرنے والے وہی بنیں گے جن کے اندر علم و معرفت کی روشنی ہوگی۔

لفظ 'عُلَمٰٓؤُا' یہاں اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ اوپر آیت ۱۸ میں جس طرح فرمایا ہے 'اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ' (تم تو بس انہی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرنے والے بنیں) اسی طرح یہاں فرمایا ہے 'کَذٰلِکَ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا'۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو محض ظاہر پرست ہوتے ہیں، محسوسات سے آگے نہ ان کو کچھ نظر آتا اور نہ اس سے آگے وہ کچھ دیکھنے کی کوشش ہی کرتے، دوسرے وہ ہوتے ہیں جن کے اندر ظاہر سے باطن اور مجاز سے حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اور جو اپنے بطن و فرج کی مطلوبات سے زیادہ اہمیت اپنی عقل اور روح کے مطالبات کو دیتے ہیں۔ درحقیقت یہی لوگ ہیں جو انسانیت کے گلِ سرسبد اور علماء کے لقب کے اصلی مستحق ہیں اور یہی لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے بنتے ہیں اور اللہ کے رسولوں کی دعوت ان کو اپیل کرتی ہے۔

'اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ'۔ جس طرح اوپر والی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے فرمائی گئی ہے اسی طرح 'عزیز' اور 'غفور' کی صفات کا حوالہ بھی آپ کی تسلی ہی کے لیے دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج جو لوگ تمہاری دعوت کو رد کر رہے ہیں خدا جب چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے لیکن وہ 'عزیز' ہونے کے ساتھ ساتھ 'غفور' بھی ہے اس وجہ سے جب تک اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے وہ اس طرح کے لوگوں کو مہلت دیتا ہے۔

صحیح علم کا منبع اللہ کی معرفت ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحیح علم کا منبع درحقیقت اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ جس کو خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوئی وہ علم سے بالکل محروم ہے اگرچہ وہ دنیا جہان کی کتابیں حفظ کر ڈالے۔ اسی طرح یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جس کو خدا کی معرفت حاصل ہے اس کے اندر لازماً خدا کی خشیت بھی ہوگی۔ اگر کوئی شخص خدا کی خشیت سے محروم ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کی معرفت سے بھی محروم ہے۔ یہی معرفت اور خشیت انسان کے تمام علوم و افکار میں حقیقی زندگی پیدا کرتی ہے جس سے علوم و فنون دنیا کے لیے موجب خیر و برکت بنتے ہیں۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو انسان کی ساری ذہانت شیطان کی مقصد برآری میں صرف ہوتی ہے اور وہ بالآخر تباہی کا موجب بنتی ہے۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو کہ مذکورہ بالا آیات سے تو یہ بات نکلتی ہے کہ جس طرح اس کارخانۂ کائنات میں اللہ تعالیٰ نے مختلف الانواع چیزیں پیدا کی ہیں اور ان سب کے پیدا کرنے میں اس کی حکمت و مصلحت ہے اسی طرح ان لوگوں کے وجود میں بھی حکمت و مصلحت ہے جو حق کے مخالف، خدا کی خشیت سے خالی اور باطل کے علم بردار ہیں۔ جب صورت واقعہ یہ ہے تو آخر یہ لوگ سزا وار ملامت اور مستحقِ عتاب و عذاب کس بنا پر ہیں؟ اگرچہ ہم اوپر کی سطروں میں اس شبہے کو صاف کرتے آتے ہیں

لیکن یہاں پھر اس کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے فطرت اللہ پر پیدا کیا ہے اس وجہ سے اس کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت کے داعیات کا ساتھ دے لیکن چونکہ وہ حیوانات و جمادات کی طرح مجبور نہیں بلکہ ذی اختیار ہے اس وجہ سے ان میں بہتیرے اپنی فطرت اور اپنے رب کے احکام کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں۔ اپنے اختیار کے اس سوءِ استعمال پر وہ مستحق سزا ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کو مہلت دیتا ہے تاکہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو جائے اور ان کی مخالفتِ حق اہلِ حق کے امتحان کا ذریعہ بن سکے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ایک پہلو سے ان کا وجود مطابق حکمت و مصلحت ہے اور قدرت اس حکمت و مصلحت ہی کی خاطر ان کو اس دنیا میں ایک خاص وقت تک کے لیے مہلت دیتی ہے لیکن دوسرے پہلو سے یہ مستحق سزا ہیں کہ انھوں نے اپنے سمع و بصر کی صلاحیتوں کی قدر نہیں کی اور نفس کی خواہشوں کی پیروی میں اپنے اختیار کو غلط استعمال کیا۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۹-۳۸

اوپر کے پیرے میں جو بات اصولی حیثیت سے بیان فرمائی ہے آگے کی آیات میں اسی کو واقعات حالات پر منطبق کیا ہے یعنی یہ واضح فرمایا ہے کہ پچھلی امتوں کے وارثین میں سے کون لوگ ہیں جو علماء کے لقب کے مستحق ہیں اور وہ اس قرآن پر ایمان لانے والے بنیں گے اور اب جس قوم کو اللہ نے اپنی کتاب کی وراثت کے لیے منتخب کیا ہے اس کے اخیار یا اشرار اس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کریں گے۔ پھر ان دونوں کے نتائج اعمال کی وضاحت فرمائی ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۹-۳۸
إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَٰبَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا
رَزَقْنَٰهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَٰرَةً لَّن تَبُورَ ﴿٢٩﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ
أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِۦٓ ۚ إِنَّهُۥ غَفُورٌ شَكُورٌ ﴿٣٠﴾ وَالَّذِىٓ
أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۗ
إِنَّ اللَّهَ بِعِبَادِهِۦ لَخَبِيرٌۢ بَصِيرٌ ﴿٣١﴾ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَٰبَ الَّذِينَ
اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۖ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِۦ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ
وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرَٰتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿٣٢﴾

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ
لُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ
عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ
مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا
يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴿۳۶﴾ وَهُمْ
يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا
نَعْمَلُ ۭ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاۗءَكُمُ النَّذِيْرُ ۭ
فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۳۷﴾ ع اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ ع ۱۱ / ۱۶
وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۳۸﴾

ترجمۂ آیات ۲۹-۳۸

بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے، نماز کا اہتمام کرتے اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایک ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس کے لیے کبھی کساد بازاری نہیں۔ تاکہ اللہ ان کو ان کے اعمال کا اجر بھی دے اور ان کے لیے اپنے فضل میں سے زیادہ بھی کرے۔ بے شک وہ بخشنے والا اور قبول فرمانے والا ہے۔ اور ہم نے تمھاری طرف جو کتاب وحی کی ہے، یہی حق ہے، ان پیشین گوئیوں کی مصداق جو اس کے پہلے سے موجود ہیں۔ بے شک اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۲۹-۳۱

پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا ان لوگوں کو جن کو اپنے بندوں میں سے منتخب کیا،

پس ان میں سے کچھ تو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں، کچھ ان میں سے میانہ رو ہیں اور کچھ ان میں سے اللہ کی توفیق سے بھلائیوں میں سبقت کرنے والے ہیں۔ یہی سب سے بڑا فضل ہے۔ ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے جن میں وہ داخل ہوں گے، ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور اس میں ان کا لباس ریشم ہوگا۔ اور وہ کہیں گے شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کیا۔ بے شک ہمارا رب بخشنے والا، قبول فرمانے والا ہے۔ جس نے ہمیں اپنے فضل سے اس اقامت کے گھر میں اتارا، اس میں نہ ہمیں کوئی کلفت پہنچے گی اور نہ کبھی تکان لاحق ہوگی۔ ۳۲-۳۵

اور جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے۔ نہ ان کی قضا ہی آئے گی کہ مر جائیں اور نہ ان سے ان کا عذاب ہی کچھ ہلکا کیا جائے گا۔ ایسا ہی ہم بدلہ دیں گے ہر ناشکرے کو اور وہ اس میں واویلا کریں گے۔ اے ہمارے رب! ہم کو اس سے نکال، اب ہم نیک عمل کریں گے، ان اعمال سے مختلف جو ہم اب تک کرتے رہے ہیں ——— کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی کہ جو یاددہانی حاصل کرنا چاہے اس میں یاددہانی حاصل کر سکے! اور تمھارے پاس آگاہ کرنے والا بھی پہنچا! تو اب اس عذاب کو چکھو۔ ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والا نہیں بنے گا۔ اللہ آسمانوں اور زمین کے غیب کو جاننے والا ہے۔ بے شک وہ سینوں کے بھیدوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے۔ ۳۶-۳۸

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَنْ تَبُورَ (۲۹)

علماء کی تفصیل

اوپر آیت ۲۸ میں جن لوگوں کو علماء کہا ہے اور جن کی تعریف میں فرمایا ہے کہ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈریں گے جو علم رکھنے والے ہیں) یہ انہی علماء کی تفصیل ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے، نماز کا اہتمام کرتے اور خدا کے بخشے ہوئے رزق و فضل میں سے فیاضی کے ساتھ سرًّا و علانیۃً راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں، یہ لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں اور ان کا یہ انفاق ایک ایسی تجارت ہے جس کے لیے مستقبل میں کسی کساد بازاری کا اندیشہ نہیں بلکہ اس کی برکات میں برابر اضافہ پر اضافہ ہوتا رہے گا۔

یہ اشارہ اگرچہ ان تمام صالحین کی طرف ہو سکتا ہے جو ان صفات سے متصف تھے لیکن میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ ان علمائے اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے جو قرآن پر ایمان لائے اور قرآن نے جگہ جگہ جن کی تعریف فرمائی ہے۔ میرے نزدیک اس کا قرینہ یہ ہے کہ ان کے ذکر کے بعد بنی اسماعیل کے اخیار و اشرار کا ذکر آیت ۳۲ میں مستقلاً آ رہا ہے اور ان کا ذکر ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا (پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا اپنے بندوں میں سے ان لوگوں کو جن کو اس کے لیے منتخب کیا) کے الفاظ سے ہوا ہے۔ یہاں لفظ ثُمَّ (پھر) اس بات کی دلیل ہے کہ اوپر جن لوگوں کا ذکر ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن سے پہلے کی کتاب کے وارث بنائے گئے تھے اور وہ اللہ کی توفیق سے اس پر قائم رہے جس کی برکت سے ان کو قرآن کے نازل ہونے کے بعد اس پر بھی ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوئی۔

یہاں ان صالحین اہل کتاب کی تعریف میں تین باتوں کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ تلاوتِ کتاب اللہ، اقامتِ صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی تین چیزیں دین کی حقیقی محافظ اور خشیتِ الٰہی کی اصلی علامت ہیں اور قرآن میں نہایت تصریح کے ساتھ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ یہود نے اپنی کتاب فراموش کر دی تھی، نماز ضائع کر بیٹھے تھے اور ان پر بخالت و زر پرستی کی بیماری مسلط ہو گئی تھی اس وجہ سے وہ قرآن پر ایمان لانے کی سعادت سے محروم رہے۔ ان کے اندر سے صرف وہ لوگ قرآن پر ایمان لائے جو ان بیماریوں سے محفوظ رہے۔

'یَرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جنھوں نے اس دنیا کی زندگی کو مقصود بنا کر حرام و حلال کی کمائی سے اپنی تجوریاں بھریں اور ہر ایک نے لاکھ پتی بننے کی کوشش کی ان کا حشر تو ایک دن یہ ہونا ہے کہ ان کی ساری دولت خاک اور راکھ ہو کر اڑ جائے گی۔ البتہ جو لوگ اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کریں گے وہ اپنا سرمایہ ایک ایسے کاروبار میں لگا رہے ہیں جس میں کبھی کسی خسارے کا اندیشہ نہیں ہے۔

لِیُوَفِّیَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۳۰)

یہ ان کے انفاق کے محرک کی طرف اشارہ بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بھرپور صلہ کا وعدہ بھی کہ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں نہ ریاء و نمائش کے لیے خرچ کرتے ہیں، نہ اس کا کوئی معاوضہ چاہتے اور نہ اس کا کوئی احسان جتاتے ہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں کہ وہ ان کو اس کا پورا پورا صلہ دے اور اپنے فضل سے اس پر مزید اضافہ فرمائے۔ چنانچہ ان کا رب ان کے ساتھ ان کی توقعات کے مطابق معاملہ کرے گا اس لیے کہ وہ کوتاہیوں اور غلطیوں کو معاف اور بندوں کے اعمال کی قدر فرمانے والا ہے۔ یہاں 'غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ' کی صفات کا حوالہ بندوں کی امید افزائی کے لیے ہے کہ ان کی نیکیاں قبول کرنے کے معاملے میں اللہ تعالیٰ بڑی چشم پوشی سے کام لے گا اور ان کے چھوٹے چھوٹے عمل کو بھی قدر و عزت کے ساتھ قبول فرمائے گا۔

وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ (۳۱)

صالحین اہل کتاب کو دعوت ایمان

یہ صالحین اہل کتاب کو دعوت ایمان ہے کہ جو کتاب ہم نے تم پر وحی کی ہے یہی حق ہے اس لیے تمام طالبین حق کو چاہیے کہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں اور حرزِ جاں بنائیں۔ 'هُوَ الْحَقُّ' میں حصر کا جو مضمون ہے وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے پہلے اللہ نے اہل کتاب کو جو کتاب دی اس کو انھوں نے اپنی تحریفات سے رطب و یابس کا مجموعہ بنا ڈالا اس وجہ سے وہ حق کی نعمت سے محروم ہو گئے تھے۔ اب اللہ نے اس کتاب کی صورت میں اس کو بالکل بے آمیز اور کامل شکل میں از سر نو اجاگر کیا ہے تاکہ یہ خلق کی ہدایت کا ذریعہ بنے۔

'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ' یہ اس کتاب کی حقانیت کی وہ دلیل ہے جو خاص طور پر اہل کتاب پر اتمام حجت کے لیے قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہوئی ہے کہ یہ کتاب ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہے جو سابق صحیفوں میں اس کے باب میں پہلے سے وارد ہیں۔ ان پیشین گوئیوں کا حوالہ ان کے محل میں ہم تفصیل سے دے چکے ہیں۔

'اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ' فرمایا کہ اللہ نے اس حق کی حفاظت کا یہ اہتمام اس لیے فرمایا کہ وہ اپنے بندوں کے حال کی خبر رکھنے والا اور ان کے بناؤ اور بگاڑ کو برابر دیکھتے رہنے والا ہے۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ جس ہدایت سے اس نے ان کو نوازا تھا پاسبانوں کی خیانت سے وہ اس سے محروم ہو گئے تو اس کی حفاظت کا اس نے از سر نو انتظام فرمایا۔ اگر وہ یہ انتظام نہ فرماتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ اپنی خلق کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق ہے۔ حالانکہ وہ بے تعلق نہیں بلکہ ایک ایک چیز سے باخبر اور ہر جزئیہ پر نظر رکھنے والا ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ

وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ (۳۲)

خلق کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کا انتظام

یہ اس انتظام کا ذکر ہے جو اپنی ہدایت سے خلق کو بہرہ یاب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ 'اَلَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا' سے یہاں بنی اسماعیل یا بالفاظ دیگر 'امیین عرب' من حیث الجماعت مراد ہیں جن کے اندر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنا وہ آخری رسول بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا جس کے ذریعے سے خلق کو آخری اور کامل شریعت ملنے والی تھی۔ فرمایا کہ ہم نے اپنے بندوں میں سے ایک دوسرے گروہ کو چنا اور اس کو اپنی کتاب کا وارث بنایا۔ 'وارث بنایا' کے الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس سے پہلے جو لوگ کتاب الٰہی کے وارث بنائے گئے تھے (یعنی بنی اسرائیل) ان سے یہ امانت چھینی اور ایک دوسرے گروہ کو جس کو اس شرف کے لیے منتخب کیا، یعنی بنی اسماعیل کو، یہ امانت بخشی۔

امیوں کے اسی شرف کی طرف اشارہ سورۂ جمعہ کی آیت 'هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (الأية)' میں ہے اور قرآن نے جگہ جگہ ان کے اس شرف کا حوالہ دے کر ان کو ایمان کی دعوت دی ہے کہ وہ اس کی قدر کریں۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو دنیا کی امامت کی جس عزت کے لیے اللہ نے ان کا انتخاب فرمایا ہے وہ اس سے اپنے کو محروم کر لیں گے۔ امیوں کی اس عزت افزائی کا ذکر سورۂ نساء میں یوں آیا ہے۔

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى	کیا (بنی اسرائیل) اس فضل کی بنا پر لوگوں پر (بنی اسماعیل
مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ	پر) حسد کر رہے ہیں جو ہم نے ان پر (بنی اسماعیل پر)
فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ	کیا؟ اگر وہ حسد کر رہے ہیں تو جتنا حسد کرنا چاہیں کر لیں!
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ	ہم نے تو آل ابراہیم (بنی اسماعیل) کو کتاب اور حکمت
مُّلْكًا عَظِيْمًا ۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ	بھی عطا فرمائی اور ان کو ایک عظیم بادشاہی بھی بخشی تو
بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ	ان میں سے (بنی اسماعیل میں سے) کچھ تو اس کتاب پر ایمان
وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۔	لائے اور ان میں سے کچھ اس سے اعراض کرنے والے بنے
(النساء : ۴: ۵۴-۵۵)	ہوئے ہیں اور دوزخ کی آگ ان کے لیے کافی ہے۔

اس آیت کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں آیت زیر بحث کو سمجھنے کے لیے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ جس طرح اس آیت میں بنی اسماعیل من حیث الجماعت مراد ہیں اور ان کو کتاب و حکمت اور ملک عظیم دیے جانے کا ذکر ہے اسی طرح آیت زیر بحث میں ان کی جس برگزیدگی کی طرف اشارہ ہے وہ من حیث الجماعت ان کو حاصل ہوئی۔ یہود کو ان کی اس برگزیدگی پر بڑا حسد تھا اور ان کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا ایک بڑا محرک یہی تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ آپ کی نبوت اگر قائم ہو گئی تو اس

طرح وہ مذہبی پیشوائی جو اب تک ان کو حاصل رہی ہے ان کے حریفوں یعنی بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ قرآن نے جگہ جگہ بنی اسرائیل کے اس کھوٹ سے عربوں کو آگاہ کیا ہے اور ان کو دعوت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جس شرف سے نوازا اور جس منصب عظیم کے لیے ان کا انتخاب فرمایا ہے اس کی قدر کریں، اس کی مخالفت کر کے اپنے دشمنوں کی مقصد برآری کا سامان نہ کریں۔ اسی طرح یہاں اس برگزیدگی کا حوالہ اس مقصد سے دیا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کی قدر کریں، اس سے محروم نہ رہیں۔

قرآن کے باب میں بنی اسمٰعیل کا رویہ من حیث الافراد

'فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ۚ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ' یہ من حیث الافراد ان کا وہ رویہ بیان ہوا ہے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کے جواب میں اختیار کیا۔ فرمایا کہ ان میں تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں یعنی اپنا ایڑی چوٹی کا زور اس کی مخالفت میں صرف کر رہے ہیں۔ نہ خود اس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں نہ کسی دوسرے ہی کو قبول کرنے دینا چاہتے ہیں۔ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں اسی گروہ کا ذکر 'وَمِنْهُم مَّن صَدَّ

پہلا گروہ

عَنْهُ' کے الفاظ سے ہوا ہے یعنی خود بھی اس سے اعراض کیے ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ لفظ 'صدّ' رُکنے اور روکنے دونوں معنوں میں آتا ہے اسی گروہ کو یہاں 'ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی یہ اپنی اس مخالفت سے اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں کہ اپنے لیے خدا کے سب سے بڑے فضل سے محرومی اور جہنم کے عذاب کا سامان کر رہے ہیں ورنہ جہاں تک خدا کے دین کا تعلق ہے اس کو ان کی مخالفت سے کوئی گزند پہنچنے والا نہیں ہے۔ لفظ 'ظلم' سے قرآن مجید میں بالعموم شرک کو تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ صافات میں ہے۔ 'وَمِن ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ (۱۱۳)' (اور ان دونوں (ابراہیم و اسحاق) کی ذریت میں نیکوکار بھی ہیں اور اپنی جانوں پر کھلا ہوا ظلم ڈھانے والے بھی) مفسرین نے عام طور پر 'الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا' سے امت مسلمہ کو مراد لیا ہے اور پھر اس سے یہ نتیجہ بھی، معلوم نہیں، کس طرح نکال لیا ہے کہ یہ ظالمین بھی بخش دیے جائیں گے۔ ہم نے آیت کا صحیح موقع و محل معین کر دیا ہے اس وجہ سے اس خیال کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ہماری تائید میں حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد سے روایات بھی ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو تفسیر ابن کثیر یا تفسیر ابن جریر میں دیکھ لیجیے۔ ان بزرگ مفسرین نے 'ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ' سے ان لوگوں کو مراد لیا ہے جن کا ذکر سورۂ واقعہ میں 'أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ' سے ہوا ہے۔

دوسرا گروہ 'وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ' یہ دوسرے گروہ کا ذکر ہے۔ 'مقتصد' میانہ رَو کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ مخالفت تو نہیں کرتے ہیں لیکن آگے بڑھ کر اس دعوت حق کی حمایت کا حوصلہ بھی نہیں کر رہے ہیں۔ ان کا مخالفت نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو اس دعوت کے حق ہونے کا احساس ہے لیکن

یہ احساس اتنا قوی نہیں ہے کہ وہ تمام پیش و عقب سے بالکل بے پروا ہو کر اس کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ قرآن نے ان کے لیے یہ لفظ استعمال کر کے فی الجملہ ان کے متعلق یہ امید دلائی ہے کہ یہ لوگ پہلے گروہ (ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ) کی طرح اس نعمت سے محروم رہنے والے نہیں ہیں بلکہ دیر سویر ان کا تردد رفع ہو جائے گا اور اللہ نے چاہا تو یہ اس دعوت کے پُرزور حامیوں میں بن جائیں گے۔

تیسرا گروہ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ: یہ تیسرے گروہ کا ذکر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر حق کا شعور اتنا قوی ہوتا ہے کہ ہر دعوتِ حق ان کو فوراً اپیل کرتی ہے اور ان کی قوتِ ارادی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ جب ان کو کوئی چیز اپیل کر لیتی ہے تو وہ اس کی خاطر راہ کے تمام عقبات ایک ہی جست میں پار کر جاتے ہیں اور اس کی حمایت یا مدافعت میں کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے بلکہ تمام رکاوٹوں کا پوری دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے نیکی اور بھلائی کے ہر میدان میں گوئے سبقت لے جانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یہ اشارہ اسلام کے سابقون اولون کی طرف ہے جن کے سرخیل سیدنا ابوبکر صدیقؓ تھے۔

اس گروہ کی 'سبقت بالخیر' کے ساتھ 'بِاِذْنِ اللّٰهِ' کی قید اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اس رتبۂ بلند کی سرفرازی ہر ایک کا حصہ نہیں ہے بلکہ اللہ ہی جس کو چاہے یہ رتبہ بخشتا ہے۔ یہ اس سنتِ الٰہی کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں تقدم اور تاخر کے لیے مقرر کر رکھی ہے اور جس کی طرف اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

'ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ': یہ اس مرتبۂ بلند کا بیان ہے جو ان سابقون بالخیرات کو حاصل ہوگا۔ اور اس میں نہایت بلیغ انداز میں 'مقتصدین' کے لیے دعوت بھی ہے کہ ابھی موقع ہے کہ وہ بھی اس فضلِ کبیر میں حصہ دار بننے کے لیے قسمت آزمائی کر سکتے ہیں تو وہ تذبذب کو چھوڑیں اور ہمت کر کے آگے بڑھیں۔ یہاں ہم ان اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ سورۂ واقعہ کی تفسیر میں اس کے تمام اطراف زیرِ بحث آئیں گے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (۳۳)

آخرت کا صلہ یہ آخرت میں ان جانبازوں کا صلہ بیان ہوا ہے کہ ان کے لیے اقامت کے باغ ہوں گے جن میں وہ داخل ہوں گے۔ یعنی ان باغوں میں ان کا داخل ہونا محض وقتی سیر و تفریح کے لیے نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ کے لیے ہوگا۔ 'يُحَلَّوْنَ' مجہول کا صیغہ تشریف و تکریم پر دلیل ہے۔ سونے کے کنگن، موتی اور ریشم وغیرہ کا ذکر تقریبِ فہم کے لیے ہے کہ جنت کی نعمتوں کا مخاطب کچھ تصور کر سکے۔ ان چیزوں کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ ان کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوگا جب یہ آخرت میں سامنے آئیں گی۔

پہلے زمانہ میں سلاطین سونے کے کنگن اور موتی پہنتے تھے، اس وجہ سے جنت کے لباس کا تصور دینے کے لیے یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ۝ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ (۳۴-۳۵)

اہل جنت کے احساسات اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے ظہور کے بعد

یعنی اہل جنت جب اللہ تعالیٰ کے تمام وعدوں کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو بے ساختہ ان کی زبانوں پر کلمۂ شکر جاری ہو جائے گا کہ الحمد للہ ہم اپنے رب کے جن وعدوں کے لیے جیسے اور مرے وہ سب ہماری امیدوں سے کہیں بڑھ کر پورے ہوئے۔ اس نے ہمارے سارے غم دور کر دیے۔ اب نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا باقی رہا نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔ ہمارا رب غفور و شکور ہے۔ اس نے ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرمایا اور ہماری ایک ایک نیکی کو شرفِ قبول بخشا۔ اہل جنت کے اسی کلمۂ شکر کا ذکر دوسرے مقام میں یوں ہوا ہے۔ 'وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ' (یونس: ۱۰) (اور ان کا آخری کلمہ یہ ہو گا کہ شکر ہے اللہ رب العالمین کے لیے)۔

'دَارَ الْمُقَامَةِ' سے مراد ہمیشگی کی اقامت کا گھر ہے یعنی اس سے پہلے تو ہم دنیا میں ایک سرائے فانی میں تھے اور ہم نے اس کو ایک سرائے فانی ہی سمجھا۔ اب ہمارے رب نے ہم کو اپنے فضل و رحمت کے ایک ایسے گھر میں اتارا ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اس میں نہ ہمارے لیے کوئی محنت و مشقت ہے اور نہ کوئی تکان اور افسردگی۔ یہ امر واضح رہے کہ بہتر سے بہتر عیش بھی حاصل ہو تو آدمی اس کے اندر بھی افسردہ ہو جاتا ہے اگر اس کی خواہش کے مطابق اس میں تجدد و تنوع نہ ہوتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت ایسی بنائی ہے کہ اس میں ایسا بے نہایت عیش اور تنوع عیش حاصل ہو گا کہ اہل جنت اس کے اندر اکتاہٹ نہیں محسوس کریں گے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۝ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاۗءَكُمُ النَّذِيْرُ ۭ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ (۳۶-۳۷)

کفار کے انجام کا بیان

یہ کفار کے انجام کا بیان ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ جہنم میں اتارے گا جہاں ان کا حال یہ ہو گا کہ نہ ان کو موت ہی آئے گی کہ مر کے اس عذاب سے رہائی پائیں، نہ ان کے عذاب میں تخفیف ہی کی جائے گی کہ ذرا دم لے لیں۔ 'مِنْ عَذَابِهَا' کے بعد 'فَيَسْتَرِيْحُوْا' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ بربنائے قرینہ محذوف ہے۔

'كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ' یعنی یہ جو کچھ ہم سنا رہے ہیں، یہ صرف دوسروں ہی کی سرگزشت نہیں ہے بلکہ ہر ناشکرے نابکار کو ہم اسی طرح سزا دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بھی اسی سزا کے مستحق

ٹھہریں گے جو آج ہماری کتاب اور ہمارے رسول کی تکذیب کر رہے ہیں۔ اس فقرے سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا ہے۔

وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيهَا الآية: وہ اسی جہنم میں پڑے فریاد کریں گے کہ اے رب، ہم کو یہاں سے ایک بار رہائی دے کہ ہم دنیا میں جا کر نیک عمل، اس سے بالکل مختلف، کریں جو ہم اب تک کرتے رہے ہیں۔ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيرُ: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جواب ملے گا کہ کیا تمھیں اتنی مہلت نہیں ملی جس میں ایک یاددہانی حاصل کرنے والا یاددہانی حاصل کر سکے؟ علاوہ ازیں تمھارے پاس ایک آگاہ کر دینے والا رسول بھی آیا! تو اب کس بات کے لیے مہلت مانگتے ہو! اب تمھارا کوئی مددگار نہیں بن سکتا، اب تو جس عذاب کے اسباب تم نے فراہم کیے اس کا مزہ چکھو۔

اس آیت سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے عمر بھی کافی دی اور ان پر کسی منذر کے ذریعے سے حجت بھی تمام کر دی گئی ان کے ساتھ تو کسی قسم کی رعایت نہیں ہو گی لیکن جو لوگ سن و سال کی پختگی کو پہنچنے سے پہلے ہی مر گئے یا قتل ہو گئے ان کے ساتھ معاملہ نسبۃً ذرا نرم ہو گا۔

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۳۸)

اس سے دو باتیں واضح فرمائی گئی ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے تمام بھیدوں کو جاننے والا ہے اس وجہ سے کوئی ان باتوں کو محض ڈراوا نہ سمجھے بلکہ یہ حقائق ہیں جو ایک دن سب کے سامنے ظاہر ہو کے رہیں گے۔

دوسری یہ کہ جو لوگ یہ فریاد کریں گے کہ اگر ان کو دوبارہ مہلت ملے تو وہ نیکی کریں گے، خدا ان کے جھوٹ کو بھی جانتا ہے ــــــ اس طرح کے لوگوں کو اگر پھر مہلت دی جائے تو وہ وہی کریں گے جو اب تک کرتے رہے ہیں۔

۸۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۳۹-۴۵

آگے کی آیات میں مشرکینِ عرب کو دھمکی ہے کہ تم اس ملک میں پہلی قوم نہیں ہو بلکہ پچھلی قوموں کے جانشین ہو تو ان کے حالات اور انجام سے سبق لو۔ اگر وہ قوت و شوکت میں تم سے بڑھ کر ہونے کے باوجود، رسولوں کی تکذیب کے جرم میں تباہ کر دی گئیں تو اسی جرم کا ارتکاب کر کے خدا کے قہر و غضب سے تم کس طرح بچ جاؤ گے؟ خدا کا قانون تو ہر قوم کے لیے ایک ہی ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یاد رکھو کہ آسمان و زمین تمھارے ان معبودوں کے تھامے نہیں تھمے ہوئے ہیں بلکہ خدا ہی کے تھامے تھمے ہیں۔ اگر خدا ان کو درہم برہم کر دے تو کوئی دوسرا ان کو نہیں سنبھال سکتا۔ تمھاری سرکشی کے باوجود اگر خدا نے تمھیں ڈھیل دے

دکھی ہے تو اس سے کسی غلط فہمی میں نہ رہو، خدا پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا لیکن جب پکڑتا ہے تو کوئی اس سے بھاگ نہیں سکتا۔

اسی ضمن میں یہ یاددہانی بھی کی گئی ہے کہ اس سے پہلے تو یہ قسمیں کھا کھا کے یہ وعدے کرتے تھے کہ اگر ان کے اندر کسی رسول کی بعثت ہوئی تو یہ دنیا کی سب سے زیادہ ہدایت یافتہ قوم بنیں گے لیکن جب رسول آیا تو محض استکبار کے سبب سے اس کی مخالفت اور رات دن اس کے خلاف سازشوں میں سرگرم ہیں حالانکہ حق کے خلاف جو سازشیں کی جاتی ہیں ان کے پھندوں میں وہی لوگ پھنستے ہیں جو سازشوں کے جال بُنتے ہیں۔

غور کیجیے تو اس پیرے میں، جس کو خاتمۂ سورہ کی حیثیت حاصل ہے، فواصل یعنی قوافی بدل گئے ہیں۔ قوافی کی یہ اچانک تبدیلی متکلم کے لب ولہجہ کی تبدیلی کی دلیل ہوتی ہے اور اس تبدیلی سے مقصود مخاطب کو ایک نئے پہلو سے متوجہ کرنا ہوتا ہے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۹-۴۵

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَلَا
يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِلَّا مَقْتًا ۖ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ
كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا ﴿٣٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ
مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ
فِي السَّمَاوَاتِ أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِنْهُ ۚ بَلْ إِنْ
يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ﴿٤٠﴾ إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ
أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿٤١﴾ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ
جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَهُمْ نَذِيرٌ لَيَكُونُنَّ أَهْدَىٰ مِنْ إِحْدَى
الْأُمَمِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُورًا ﴿٤٢﴾ اسْتِكْبَارًا
فِي الْأَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۚ فَهَلْ يَنْظُرُونَ
إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ

اللّٰهِ تَحْوِيلًا ﴿٤٣﴾ اَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَمَا كَانَ
اللّٰهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّهُ كَانَ
عَلِيمًا قَدِيرًا ﴿٤٤﴾ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ
عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا
جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيرًا ﴿٤٥﴾ ع ۵ ۱۷

ترجمۂ آیات ۳۹ - ۴۵

وہی ہے جس نے تم کو زمین میں جانشین بنایا تو جو کفر کرے گا اس کے کفر کا وبال اسی پر آئے گا اور کافروں کے لیے ان کا کفر، ان کے رب کے نزدیک، اس کے غضب کی زیادتی ہی کا موجب ہو گا اور کافروں کے لیے ان کا کفران کے خسارے ہی میں اضافہ کرے گا۔ ۳۹

کہو، ذرا تم دیکھو تو اپنے ان شریکوں کو جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو! مجھے دکھاؤ، انھوں نے زمین میں سے کیا پیدا کیا ہے! کیا ان کی آسمانوں میں کوئی حصہ داری ہے؟ آیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے تو وہ اس کی کسی واضح دلیل پر ہیں! بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے محض پُرفریب وعدے کر رہے ہیں۔ ۴۰

اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں۔ اور اگر وہ ٹل جائیں تو اس کے بعد کوئی اور ان کو تھامنے والا نہیں بن سکتا۔ بے شک وہ نہایت حلیم و غفور ہے۔ ۴۱

اور انھوں نے اللہ کی پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نذیر آیا تو وہ ہر امت سے زیادہ ہدایت اختیار کرنے والے بنیں گے۔ پس جب ان کے پاس ایک نذیر آیا تو

اس چیز نے، زمین میں ان کے تکبر کے باعث، ان کی بیزاری اور ان کی بری چالوں ہی میں اضافہ کیا۔ اور بری چال تو اسی کو گھیرتی ہے جو بری چال چلتا ہے۔ پس یہ نہیں انتظار کر رہے ہیں مگر اسی سنتِ الٰہی کا جو اگلوں کے باب میں ظاہر ہوئی۔ تو تم سنتِ الٰہی میں نہ کوئی تبدیلی پاؤ گے اور نہ تم سنتِ الٰہی کو ٹلتے ہی ہوئے پاؤ گے۔ کیا انھوں نے زمین میں سفر نہیں کیا کہ دیکھتے کہ کیسا ہو چکا ہے انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں حالانکہ وہ قوت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔ اور آسمانوں اور زمین کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ اللہ کے قابو سے باہر نکل سکے۔ وہ علم والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔ ۴۲-۴۴

اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو ایک معیّن مدت تک مہلت دیتا ہے۔ پس جب ان کی مدت پوری ہو جائے گی تو اللہ اپنے بندوں کو خود دیکھنے والا ہے۔ ۴۵

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا (۳۹)

خدا کا عدل ہر قوم کے لیے یکساں ہے

یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اس سرزمین میں آج جو اقتدار تم کو حاصل ہے یہ نہ تمہارا اپنا پیدا کردہ ہے اور نہ تم اس ملک میں پہلی بار برسرِ اقتدار آئے ہو بلکہ تم سے پہلے بھی قومیں گزر چکی ہیں جن کو خدا نے ان کے کفر و استکبار کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کی جگہ تم کو متمکن کیا تو اگر وہی روش تم نے اختیار کی تو اسی انجام سے دوچار ہونے کے لیے بھی تیار رہو جو ان کے سامنے آیا۔ خدا نے قوموں کے عزل و نصب کے لیے جو میزانِ عدل قائم کر رکھی ہے اس کا فیصلہ ہر قوم کے لیے بالکل بے لاگ ہے۔ جن قوموں کی سرگزشتیں تم کو سنائی گئی ہیں وہی تاریخ تم بھی دہراؤ گے اگر انہی کے نقشِ قدم پر چلو گے۔ یہ مضمون انعام آیت ۱۶۵ اور اعراف آیت ۱۰۰ کے تحت بھی تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔

[illegible]

'فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ الاٰية' یعنی یہ بھی یاد رکھو کہ کسی کے کفر سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ اس کا خمیازہ خود کفر کرنے والے ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ خدا کسی کا محتاج نہیں ہے بلکہ لوگ ہی اس کے محتاج ہیں۔ اگر وہ کفر کریں گے تو اس سے خدا کا کچھ بگاڑنے کے بجائے اس کے غضب میں اضافہ کریں گے اور یہ چیز دنیا اور آخرت میں انہی کی تباہی کا موجب ہوگی۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا (۴۰)

شرکاء کی بے حقیقتی

یہ ان کے شرکاء کی بے حقیقتی کی طرف توجہ دلائی کہ کیا ان کے بل پر خدا کی پکڑ سے نچنت بیٹھے ہو! ذرا ان کو دیکھو تو بھلا ان کی کیا حقیقت ہے! 'اَرَءَيْتُمْ' اس طرح کے مواقع میں اظہار تعجب اور تحقیر کے لیے آتا ہے۔ فرمایا کہ اگر زمین میں سے کوئی چیز انھوں نے پیدا کی ہو تو وہ مجھے دکھاؤ۔ یا آسمانوں میں ان کی کوئی حصہ داری ہو تو وہ مجھے بتاؤ۔

'اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا الاٰية' اس ٹکڑے میں اسلوب کلام بدل کر حاضر کے بجائے غائب کا ہو گیا ہے جس سے تعجب اور اظہار بیزاری کے مضمون میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ فرمایا کہ جب آسمانوں اور زمین میں کسی نوعیت سے ان کی کوئی حصہ داری ثابت نہیں تو آخر کس دلیل کی بنا پر ان کو خدا کی خدائی میں انھوں نے شریک بنایا ہے؟ کیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے جس میں ہم نے تسلیم کیا ہو کہ فلاں اور فلاں ہماری خدائی میں شریک ہیں اور انھوں نے اس کی سند پر ان کو ہمارا شریک بنایا ہے!

لیڈروں کا فریب عوام کے ساتھ

'بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا' یعنی ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے نہ کوئی سند۔ بلکہ یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے لوگ بس یوں ہی بے دلیل و سند ایک دوسرے کو سبز باغ دکھا رہے ہیں کہ ان کے فلاں بت کے قبضہ میں یہ یہ اختیارات ہیں اور فلاں کی عبادت سے یہ برکات حاصل ہوتی ہیں۔ ان کی یہ ساری باتیں محض فریب ہیں جس میں ان کے لیڈر ان کو مبتلا کیے ہوئے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (۴۱)

یعنی اگر یہ اس غلط فہمی میں ہیں کہ جس عذاب سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے اس سے ان کے مزعومہ دیوی دیوتا بچا لیں گے یا بچائے ہوئے ہیں تو انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ آسمانوں اور زمین کو ان کے محور و مدار پر خدا ہی ٹکائے ہوئے ہے۔ اگر وہ ذرا ان کی باگ ڈھیلی چھوڑ دے تو پھر کسی کی طاقت نہیں ہے کہ ان کو تھام سکے۔ پھر چشم زدن میں سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ۔ یعنی لوگوں کی سرکشی اور استکبار کے باوجود خدا لوگوں کو جو ڈھیل دیتا ہے تو اس وجہ سے دیتا ہے کہ وہ حلیم و غفور ہے۔ وہ قہر کرنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ لوگوں کے جرائم کے باوجود ان سے درگزر کرتا اور ان کو مہلت دیتا ہے۔ تاکہ جو شخص بھی اپنی اصلاح کرنی چاہے وہ کرلے۔

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِن جَاءَهُمْ نَذِيرٌ لَّيَكُونُنَّ أَهْدَىٰ مِنْ إِحْدَى الْأُمَمِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُورًا (۴۲)

اہل عرب کے اندر ایک رسول کی بعثت کی روایت

اہل عرب چونکہ امی یعنی کتاب و شریعت سے ناآشنا تھے اس وجہ سے اہل کتاب بالخصوص یہود ان کو حقیر خیال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے علماء نے یہ فتویٰ دے رکھا تھا کہ ان امیوں کی امانت ہڑپ کر جانے اور ان سے سود لینے میں ان کے لیے کوئی قباحت نہیں ہے۔ آیت لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ کے تحت ہم ان خانہ زاد فتووں کا حوالہ دے چکے ہیں۔ مشرکین جب یہود کی اس طرح کی باتیں سنتے تو فطری طور پر ان کے اندر ایک قسم کا احساسِ کہتری پیدا ہوتا اور وہ ان کے جواب میں قسمیں کھا کے، بڑے طنطنہ کے ساتھ، یہ کہتے کہ اگر ہمارے اندر کسی رسول کی بعثت ہوتی تو ہم دوسری تمام قوموں سے زیادہ ہدایت یافتہ قوم بن کے دکھا دیں گے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ سابق صحیفوں میں آخری رسول کی بعثت سے متعلق جو پیشین گوئیاں وارد ہیں ان میں، جیسا کہ تفسیر سورۂ اعراف میں ہم واضح کر چکے ہیں نہایت صریح الفاظ میں یہ بات موجود ہے کہ اس رسول کی بعثت بنی اسماعیل (امیوں) میں ہوگی۔ علمائے یہود اگرچہ یہ بات چھپاتے تھے لیکن ان کے اندر ایسے علماء بھی تھے، خاص طور پر نصاریٰ میں، جو امیوں کے اندر ایک رسول کی بعثت کے منتظر تھے۔ چنانچہ قرآن نے آیت وَإِذَا سَمِعُوا الْآيَةَ (المائدۃ: ۸۳) میں اس کا نہایت شاندار الفاظ میں حوالہ دیا ہے۔ اس قسم کے علماء کے ذریعے سے بنی اسماعیل کے اندر بھی یہ روایت موجود تھی کہ ان کے اندر ایک رسول کی بعثت ہونے والی ہے اور وہ یہود کے مقابل میں اس کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے کہ اگر ہمارے اندر کسی رسول کی بعثت ہوئی تو ہم تمہاری طرح کمزور اور بودے ثابت نہیں ہوں گے بلکہ ہدایت قبول کرنے کے معاملے میں سب پر بازی لے جائیں گے۔ ان کی اسی بات کی یاددہانی کرتے ہوئے قرآن نے ان کے حال پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ پہلے تو بہت بڑھ چڑھ کر آنے والے رسول کی حمایت و نصرت کے دعوے کرتے رہے لیکن جب وہ آیا تو ان کی ہدایت میں اضافہ ہونے کے بجائے ان کی نفرت و بیزاری میں اضافہ ہوا۔ ان کے اس رویے کا ذکر سورۂ صافات میں بھی ہوا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَإِن كَانُوا لَيَقُولُونَ ۝ لَوْ أَنَّ عِندَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْأَوَّلِينَ ۝ لَكُنَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۝ فَكَفَرُوا بِهِ ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (الصّٰفّٰت: ۱۶۷-۱۷۰)

اور بے شک یہ لوگ کہتے رہے ہیں کہ اگر ہمارے پاس اگلوں کی کوئی یاددہانی ہوتی تو ہم خدا کے مخصوص بندوں میں سے ہوتے تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا تو وہ جلد جان لیں گے۔

اِسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۭ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ڬ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (۴۳)

استکبار کے باعث رسول کی تکذیب

یہ رسول سے ان کی بیزاری کا سبب بیان ہوا ہے کہ اس کا سبب صرف استکبار ہے۔ حق ان پر اچھی طرح واضح ہے لیکن ملک میں جو قیادت و سیادت ان کو حاصل ہے اس کو یہ کسی قیمت پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس وجہ سے اس صریح حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر انھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت تسلیم کر لی تو ان کی سیادت ختم ہو جائے گی۔

'وَمَكْرَ السَّيِّئِ' کا عطف 'نُفُوْرًا' پر ہے۔ یعنی جس رسول کی ہدایت کے علمبردار بننے کے مدعی تھے جب وہ آیا تو اس کے دشمن بن کے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کو زک پہنچانے کے لیے اس کے خلاف مکروہ سازشوں میں سرگرم ہو گئے۔ لفظ 'مَكْر' چونکہ اچھے معنوں میں بھی آتا ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ 'سَيِّئ' کی قید لگا کر ان کے مکر کی نوعیت واضح فرما دی۔ پیچھے آیت ۱۰ میں بھی ان کی بری سازشوں اور اس کے انجام کا ذکر گزر چکا ہے۔

بری سازش کرنے والا خود اپنے کو تباہ کرتا ہے

'وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ'۔ حق کے خلاف جو شخص سازش کرتا ہے وہ درحقیقت خود اپنے خلاف سازش کرتا ہے۔ بظاہر تو وہ یہ جال دوسرے کے لیے بنتا ہے لیکن اس جال میں سب سے پہلے وہ خود پھنستا ہے۔ صحیح راہ بتانے والے کی مخالفت کرنا خود اپنی راہ گم اور اپنی عاقبت برباد کرنا ہے۔ دوسروں کو اس سازش سے کوئی ضرر اللہ کے اذن کے بغیر وہ نہیں پہنچا سکتا لیکن اپنے کو وہ بہرحال ہلاکت کے حوالہ کر دیتا ہے۔

حق کے خلاف سازش کرنے والوں کے لیے سنتِ الٰہی

'فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ'۔ 'يَنْظُرُوْنَ' یہاں انتظار کرنے کے معنی میں ہے اور 'سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ' کے اندر عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق کچھ الفاظ حذف ہیں۔ ان کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہو گی ــــ 'فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ اللّٰهِ فِي الْاَوَّلِيْنَ'۔ یعنی اگر یہ لوگ اپنے تکبر اور حق بیزاری کے باعث اب مخالفت اور سازش ہی کے درپے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب یہ منتظر ہیں کہ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں، اللہ کی جو سنت ان کے لیے ظاہر ہوئی وہ ان کے لیے بھی ظاہر ہو جائے اور جس طرح رسولوں کی تکذیب کے جرم میں وہ تباہ کر دی گئیں اسی طرح یہ بھی تباہ کر دیے جائیں۔

سنتِ الٰہی نہ بدلتی نہ ٹلتی ہے

'فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ڬ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا'۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت پُر زور الفاظ میں تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ اسی کے منتظر ہیں تو اطمینان رکھو کہ سنتِ الٰہی نہ بدلتی ہے، نہ ٹلتی ہے۔ 'نہ بدلنے' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہر قوم کے لیے بالکل یکساں اور بے لاگ ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ جو رویہ ایک قوم کے لیے باعثِ ہلاکت ہو چکا ہے وہی رویہ دوسری قوم اختیار کرے تو وہ اس انجام سے بچ جائے۔ 'نہ ٹلنے' کا مفہوم یہ ہے کہ جب اس کے ظہور کا وقت آ جائے گا تو وہ لازماً ظہور میں آ کے رہے گی۔ پھر اس کو ٹالنا یا اس کے رخ کو بدلنا کسی کے بس میں بھی نہیں ہو گا۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا (۴۴)

ملک کے آثار سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت

اللہ کی جو سنت پچھلی قوموں کے معاملے میں ظاہر ہوئی اور جس کے آثار خود ملکِ عرب میں موجود تھے یہ ان کی طرف توجہ دلائی کہ کیا ان لوگوں نے اپنے ملک کی سیاحت کبھی اس مقصد سے نہیں کی کہ اپنی ان پیشرو قوموں کے آثار و نشانات دیکھتے جو قوت و شوکت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں لیکن رسولوں کی تکذیب کی پاداش میں ان کا انجام نہایت عبرت انگیز ہوا!

'اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا' کے اسلوب سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس کی سیاحت تو انھوں نے بہت کی ہے۔ اپنے تجارتی سفروں میں برابر معذب قوموں کی بستیوں پر سے گزرتے رہے ہیں لیکن کبھی خاص اس مقصد سے انھوں نے ان کے آثار پر نظر نہیں ڈالی کہ وہ اس کیفرِ کردار کو کیوں پہنچیں، حالانکہ دیکھنے اور فائدہ اٹھانے کی اصل چیز یہی ہے۔ اب بھی موقع باقی ہے کہ اس نگاہ سے ان کے آثار دیکھیں اور ان کے انجام سے سبق حاصل کریں۔ قوت و شوکت میں قریش ان کے پاسنگ نہیں ہیں، لیکن خدا نے جب ان کو پکڑا تو وہ اس کی گرفت سے باہر نہ نکل سکیں۔ آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو خدا کی گرفت سے باہر نکل سکے۔ خدا کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔ ساتھ ہی وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، کوئی کام اس کی قدرت سے باہر نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو اپنے علم اور اپنی قدرت دونوں میں کامل ہے کوئی اس سے بھاگ کے کہاں جا سکتا ہے؟

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ وَلَٰكِن يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِعِبَادِهِ بَصِيرًا (۴۵)

سنتِ الٰہی کا ایک اور پہلو

یہ اسی سنتِ الٰہی کے ایک دوسرے پہلو کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ان لوگوں کی پکڑ تو لازماً ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ مجرمین کو ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً نہیں پکڑا کرتا۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہے تو کوئی اس کا ہاتھ تو نہیں پکڑ سکتا، وہ چشم زدن میں روئے زمین سے ہر زندہ کو ختم کر دے، لیکن وہ حلیم و غفور ہے اس وجہ سے ایک معین مدت تک لوگوں کو مہلت دیتا ہے تاکہ جس کو توفیق ہو وہ توبہ اور اصلاح کر لے اور جو اپنی ضد ہی پر مرنا چاہے اس پر اللہ کی حجت پوری ہو جائے۔ جب ان کی معین مدتِ مہلت پوری ہو جائے گی تو پھر اللہ ان کو دیکھے گا کہ وہ کس پاداش کے مستحق ہیں۔

'بِمَا کَسَبُوْا' کے بعد 'علیٰ عجل' یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔ 'وَلٰکِنْ یُّؤَخِّرُھُمْ' کے الفاظ سے اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔

بتوفیقِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

رحمان آباد
۴؍ فروری ۱۹۷۵ء

تدبرِ قرآن

۳۶

یٰسٓ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سورۂ یٰسٓ اور گروپ کی پچھلی دونوں سورتوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ پچھلی سورتوں میں توحید، معاد اور رسالت کے جو مطالب زیرِ بحث آئے ہیں انہی پر اس میں بھی بحث ہوئی ہے۔ البتہ تفصیل و اجمال اور نہجِ استدلال کے اعتبار سے فرق ہے۔ پچھلی سورہ کے بعض مطالب اس میں تاریخی اور فطری دلائل سے اچھی طرح محکم و مدلل کر دیے گئے ہیں۔ اس کا آغاز اثباتِ رسالت کے اسی مضمون سے ہوا ہے جس پر سابق سورہ تمام ہوئی ہے۔ اور فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی واضح طور پر نظر آئے گی کہ اس کی بنیاد بھی، پچھلی سورتوں کی طرح، شکر اور اس کے مقتضیات ہی پر ہے۔ آگے ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں جس سے اس کا عمود اور نظام ان شاء اللہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات اور آپ کو تسلی کہ یہ پُرحکمت قرآن خود اس بات کی سب سے بڑی شہادت ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ یہ قرآن، خدائے عزیز و رحیم کی طرف سے، ان لوگوں پر ایک عظیم احسان ہے جو اب تک خدائی تعلیم و ہدایت سے بالکل محروم ضلالت میں بھٹک رہے تھے۔ یہ محض ان کی بدقسمتی ہے کہ استکبار کے سبب سے یہ اس کو جھٹلا رہے ہیں۔ ان کی پچھلی روایات اور ان کی مستقبل کی آرزوئیں ان کے لیے حجاب بنی ہوئی ہیں اس وجہ سے نہ یہ ماضی سے کوئی سبق لے رہے ہیں اور نہ مستقبل کا کچھ دھیان کر رہے ہیں۔ آپ ایسے بے فکروں کے لیے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ جو خدا سے ڈریں اور نصیحت کو سنیں ان کو مغفرت اور اجرِ عظیم کی بشارت دیجیے۔ جو نہیں سنتے ان کا معاملہ ہمارے حوالے کیجیے۔ ان کا اگلا پچھلا سب ہمارے رجسٹر میں درج ہے۔ ہم ان سے نمٹ لیں گے۔

(۱۳-۳۲) قریش کی عبرت کے لیے ایک بستی کی تمثیل جس کے باشندوں کے انذار کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو

رسول بھیجے جب انھوں نے ان کی نہیں سنی تو اللہ نے ایک تیسرے بندے کو ان رسولوں کی تائید کے لیے اٹھایا، لیکن انھوں نے ان کی بھی کوئی پروا نہیں کی۔ ان کی تنبیہ کے لیے اس دوران میں جو نشانیاں ظاہر ہوئیں لوگوں نے ان کو ان رسولوں کی نحوست قرار دیا اور اس جرم میں ان کو سنگسار کر دینے کی دھمکی دی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اپنے عذاب سے اس بستی کو ہلاک کر دیا۔

(۳۳-۴۴) اس کائنات میں خدا کی قدرت، حکمت، پروردگاری اور رحمت کی جو نشانیاں ہیں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ اور اس امر کا بیان کہ یہ ساری نشانیاں اللہ تعالیٰ کے شکر کو واجب کرتی ہیں جس کا لازمی تقاضا توحید ہے اور ساتھ ہی یہ حشر و نشر اور جزا و سزا کو مستلزم ہیں۔

(۴۵-۵۰) اس امر کا بیان کہ جب لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے اور اس سے بچنے کے لیے اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت دی جاتی ہے تو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جن کو خدا نے اپنے فضل سے محروم رکھا ہم اپنا مال ان پر کیوں خرچ کریں! انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ خدا کو جب عذاب لانا ہو گا تو اس کے لیے اسے کوئی تیاری نہیں کرنی پڑے گی بلکہ وہ چشم زدن میں آ جائے گا جس کے بعد کسی کو لب ہلانے کی فرصت نصیب نہیں ہو گی۔

(۵۱-۶۵) قیامت کی تصویر اور اس دن ایمان لانے والوں اور اس کے جھٹلانے والوں کا جو حال ہو گا اس کی تفصیل۔

(۶۶-۶۸) عذاب کا مطالبہ کرنے والوں کو یہ تنبیہ کہ سمع و بصر کی جو صلاحیتیں خدا نے بخشی ہیں ان سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی عقل سے کام لو۔ اگر ان صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھایا تو خدا ان کو مسخ بھی کر سکتا ہے اور یہ کام خدا کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔

(۶۹-۸۳) خاتمۂ سورہ جس میں ابتدائے سورہ کے مضمون کو ایک نئے اسلوب سے لیا ہے۔ توحید اور قیامت کی بعض نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تمہارا کام زندوں کو جگانا ہے۔ جو لوگ اخلاقی اعتبار سے مردہ ہو چکے ہیں ان پر تمہارا کلام کارگر نہیں ہو سکتا۔

سُوْرَةُ يٰسٓ (۳۶)

مَكِّيَّةٌ — اٰيَاتُهَا ۸۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۲

يٰسٓ ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳﴾ عَلٰی
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴﴾ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۵﴾ لِتُنْذِرَ قَوْمًا
مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۶﴾ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓی اَكْثَرِهِمْ
فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۷﴾ اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ
فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿۸﴾ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ
سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۹﴾ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ
اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰﴾ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ
وَخَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۱﴾ اِنَّا نَحْنُ
(وقف غفران) نُحْیِ الْمَوْتٰی وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۣ وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَيْنٰهُ
فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۲﴾

ترجمۂ آیات ۱-۱۲

یہ سورۂ یٰسٓ ہے۔ شاہد ہے پُر حکمت قرآن کہ تم رسولوں میں سے ہو۔ ایک نہایت
سیدھی راہ پر۔ جس کو نہایت اہتمام سے اتارا ہے خدائے عزیز ورحیم نے کہ تم ان لوگوں کو آگاہ

کردو جن کے اگلوں کو آگاہ نہیں کیا گیا پس وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہتوں پر ہماری بات پوری ہو چکی ہے تو وہ ایمان لانے والے نہیں بنیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک ہیں پس ان کے سر اٹھے رہ گئے اور ہم نے ان کے آگے سے بھی ایک روک کھڑی کر دی ہے اور ان کے پیچھے سے بھی ایک روک کھڑی کر دی ہے۔ اس طرح ہم نے ان کو ڈھانک دیا ہے پس ان کو سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ اور ان کے لیے یکساں ہے، ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان نہیں لانے کے۔ تم تو بس انہی کو ڈرا سکتے ہو جو نصیحت پر دھیان کریں اور غیب میں خدائے رحمان سے ڈریں۔ سو ایسے لوگوں کو مغفرت اور باعزت صلہ کی بشارت دو۔ بے شک ہم مُردوں کو زندہ کریں گے اور ہم نوٹ کر رہے ہیں جو کچھ انھوں نے آگے کے لیے بڑھایا اور جو کچھ پیچھے چھوڑا اور ہم نے ہر چیز ایک واضح کتاب میں محفوظ کر لی ہے۔ ۱۲-۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰسٓ (۱)

یہ حروف مقطعات میں سے ہے جن پر ایک جامع بحث سورۂ بقرہ کی تفسیر کے شروع میں گزر چکی ہے۔ یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی 'یَآ اَیُّہَا الْاِنْسَانُ' کے لیے ہیں لیکن یہ بات بالکل بے دلیل ہے۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ۝ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۲-۳)

قرآن کے اعجاز میں اصل دخل اس کی حکمت کو ہے

'و' قسم کے مفہوم میں ہے اور قسم عربی میں، جیسا کہ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'الامعان فی اقسام القرآن' میں وضاحت فرمائی ہے، شہادت کے لیے آتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پر حکمت قرآن جو تم لوگوں کو سنا رہے ہو، خود اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ تم رسولوں کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہو۔ رسول کے سوا کوئی دوسرا اس طرح کا حکیمانہ اور معجز کلام پیش کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے اعجاز میں اصلی دخل اس کی حکمت، اس کے فلسفہ کو ہے۔ اس کی زبان کی بلاغت و جزالت

مزید برآں ہے۔

عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۴)

قرآن سے اعراض فطرت کے انحراف کا نتیجہ ہے

یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے اور اس کا بغیر حرف عطف کے آنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قرآن حکیم بیک وقت دونوں باتوں کا شاہد ہے۔ اس بات کا بھی کہ تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو اور اس بات کا بھی کہ تم بالکل سیدھی راہ پر ہو اور لوگوں کو سیدھی راہ پر چلنے کی دعوت دے رہے ہو۔ تنکیر یہاں تفخیم شان کے لیے ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ راہ عقل و فطرت اور خدا کی بتائی ہوئی نہایت سیدھی راہ ہے۔ جو لوگ یہ سیدھی راہ اختیار کرنے سے گریز کر رہے ہیں انھوں نے اپنی فطرت بگاڑ لی ہے اور اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیا ہے اس وجہ سے انھیں سیدھی چیز ٹیڑھی نظر آرہی ہے۔

تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ (۵)

قرآن انذار اور بشارت ہے

'تَنْزِیْلَ' فعل محذوف سے منصوب ہے۔ اس کے معنی کی وضاحت دوسرے مقام میں ہم کر چکے ہیں کہ یہ کسی چیز کو درجہ بدرجہ نہایت اہتمام کے ساتھ اتارنے کے لیے بھی آتا ہے۔ یہ قرآن کے ایک دوسرے پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس کو خدائے عزیز و رحیم نے نہایت اہتمام و تدریج کے ساتھ اتارا ہے کہ لوگ اس پر غور کریں، اس کو سمجھیں اور اس سے 'صراط مستقیم' کی رہنمائی حاصل کریں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی دو صفتوں کا حوالہ ہے۔ ایک 'عزیز' دوسری 'رحیم'۔ ان میں ایک صفت انذار کے لیے ہے اور دوسری بشارت کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس کی تکذیب کریں گے وہ یاد رکھیں کہ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ ایک عزیز و مقتدر کا فرمان واجب الاذعان ہے جو سرکشی کرنے والوں کو لازماً سزا دے گا۔ ساتھ ہی وہ رحیم بھی ہے اور اپنی اس رحمت ہی کے لیے اس نے یہ کتاب اتاری ہے تو جو اللہ کے بندے اس قرآن کی قدر کریں گے ان کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے گا۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (۶)

بنی اسماعیل کو تنبیہ

یہ قرآن کے اتارنے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ نے اس کو اس اہتمام سے اس لیے اتارا ہے کہ جن کے اندر تم سے پہلے کسی رسول کی بعثت نہیں ہوئی تھی اور وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے ان کو تم زندگی کے انجام سے اچھی طرح آگاہ کر دو۔ یہ اشارہ بنی اسماعیل کی طرف ہے اور یہ اس عظیم احسان کا بیان ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انہی پر کیا۔ اس میں ان کے لیے ترغیب کے ساتھ یہ ترہیب بھی ہے کہ اگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو اپنے لیے سب سے بڑی سعادت کی جگہ سب سے بڑی شقاوت کا سامان کریں گے۔ یہی مضمون دوسرے مقامات میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ 'لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ' (القصص: ۴۶) (تاکہ تم ان لوگوں کو آگاہ کر دو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا)۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۷)

سرکشوں سے اعراض کی ہدایت

'القول' سے اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف ہے جو اس نے ابلیس کے جواب میں اس وقت فرمایا تھا جب اس نے یہ دھمکی دی تھی کہ میں ذریت آدم کی اکثریت کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (میں ایسے تمام جنوں اور انسانوں سے جو تیری پیروی کریں گے دوزخ کو بھر دوں گا) اسی قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہارا فرض انذار کرنا ہے وہ کرتے رہو لیکن یہ توقع نہ رکھو کہ ان میں سے ہر شخص تمہاری دعوت قبول کرے گا بلکہ ان میں بہتیرے ایسے ہیں جن پر ہماری بات صادق آچکی کہ وہ ابلیس کی پیروی کے جرم میں جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ اس طرح کے لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کے درپے اور ان کے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۸)

منکرین کے استکبار کی تصویر

یہ ان ایمان نہ لانے والوں کے استکبار کی تصویر ہے کہ گویا ان کی گردنوں میں ایسے طوق پڑے ہوئے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچتے ہیں جس کے سبب سے ان کے سر اس طرح اٹھے ہوئے رہ گئے ہیں کہ نہ وہ نیچے کی طرف جھک سکتے ہیں اور نہ اوپر ہی کی طرف اٹھ سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ زمین کی نشانیاں دیکھ سکتے اور نہ آسمان کے عجائب ہی پر نگاہ ڈال سکتے۔ ان کی اس حالت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے کہ ہم نے ان کو ایسا بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم جگہ جگہ اشارہ کرتے آرہے ہیں، یہ ہے کہ کسی فرد یا گروہ کی یہ حالت اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق ہوتی ہے۔ جو لوگ حق سے انحراف و اعراض کی یہ روش دیدہ و دانستہ اختیار کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے آنکھیں بند کر کے زندگی گزارتے ہیں ان کے اوپر اللہ ان کی خواہشیں اور ان کے اعمال اسی طرح مسلط کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر کوئی تعلیم و تذکیر ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اسی حقیقت کی طرف كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (المطففین: ۱۴) میں اشارہ فرمایا ہے۔

'مقمح' اصل میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کا سر پیچھے کی جانب اس طرح باندھ دیا گیا ہو کہ اس کی گردن ایک خاص حد سے نہ نیچے ہو سکے نہ اوپر۔ بالکل یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جس کے گلے میں آہنی طوق ڈال دیا جائے، وہ بھی اپنا سر نہ نیچے کر سکتا ہے نہ اوپر بلکہ ایک خاص زاویہ پر اس کی گردن تنی رہتی ہے۔ یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، متکبرین کی تصویر ہے۔ اس طرح کے لوگ اپنے اوپر نیچے اور دہنے بائیں کی تمام نشانیوں سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ ان کو اپنی انا کے سوا اور کسی چیز کی طرف کبھی توجہ نہیں ہوتی۔

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۹)

یہ اوپر والے مضمون ہی کی وضاحت ہے کہ اس طرح ہم نے ان کے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے اوٹ کھڑی کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے جس کے سبب سے انھیں کچھ سجھائی نہیں

دے رہا ہے۔ ان کی اسی حالت پر سورۂ سبا میں اظہارِ تعجب فرمایا ہے ﴿أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾ (۹) (کیا ان لوگوں نے ان کے آگے اور پیچھے جو آسمان و زمین ہیں ان پر نگاہ نہیں ڈالی؟) اس طرح کے متکبرین کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ اپنی پچھلی روایات اور اپنے مستقبل کے مطامع کے غلام ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ان کی راہ میں اس طرح روک بن جاتی ہیں کہ ان سے ہٹ کر وہ کوئی چیز دیکھنے کے قابل رہ ہی نہیں جاتے۔

وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۰)

ظاہر ہے کہ اس طرح کے لوگ ایک سخت قسم کی عقلی و اخلاقی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا اصل مقصد کے لحاظ سے بالکل بے سود ہوتا ہے۔ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں بنتے۔ ان کو اگر انذار کیا جاتا ہے تو محض اتمامِ حجت کے لیے کہ قیامت کے دن یہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں ختمِ قلوب پر جو بحث گزر چکی ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ ۖ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ (۱۱)

قرآن ان پر کارگر ہو سکتا ہے جو عقل سے کام لیں

یعنی تمہاری تعلیم و تذکیر تو بس انہی کے اوپر کارگر ہو سکتی ہے جو تمہاری نصیحت سنیں، اس پر غور کریں اور اپنے دلوں کے دروازے اس کے لیے کھولیں نیز یہ کہ وہ اپنی عقل سے کام لیں، نرے محسوسات کے غلام بن کے زندگی نہ گزاریں کہ جب تک ان کو عذاب نہ دکھا دیا جائے اس وقت تک کوئی بات ماننے ہی کے لیے تیار نہ ہوں۔ ایمان معتبر وہ ہے جو سمع و بصر اور عقل و دل کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر لایا جاتا ہے نہ کہ حقائق کو آنکھوں سے دیکھ کر۔ فرمایا کہ جو لوگ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہیں ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ البتہ ان لوگوں کو مغفرت اور اجرِ کریم کی بشارت دو جو غیب میں رہتے خدائے رحمان سے ڈرتے ہیں۔

خدا کی خشیت اس کی رحمانیت کا تقاضا ہے

یہ حقیقت ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ خدا سے خشیت درحقیقت اس کی رحمانیت کا تقاضا ہے۔ وہ رحمان ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ نیکوں کو ان کی نیکی کا صلہ اور بدوں کو ان کی بدی کی سزا دے۔ اسی رحمانیت کے ظہور کے لیے اس نے جزا اور سزا کا دن مقرر کیا ہے جس میں اس کی کامل رحمت اور اس کے کامل عدل کا ظہور ہوگا۔

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ (۱۲)

روزِ جزا کی یاد دہانی

یہ اسی روزِ جزا کی یاد دہانی ہے جو اس کی رحمانیت کا لازمی تقاضا ہے۔ فرمایا کہ ایک دن آئے گا کہ ہم تمام مُردوں کو زندہ کریں گے اور اس دنیا میں انھوں نے آگے کے لیے جو کچھ کیا اور پیچھے کے لیے جو کچھ چھوڑا ہے، ہم اس سارے کو قلم بند کر رہے ہیں۔ مقصود اس سے اس کے لازم کو واضح کرنا ہے کہ جب ہم سب کو

زندہ بھی کریں گے اور ہر ایک کے اعمال نوٹ بھی کر رہے ہیں تو لازماً ہر ایک کے ساتھ اس کے اعمال کے مطابق معاملہ بھی کریں گے۔ اس لازمی نتیجہ کی یہاں وضاحت نہیں کی۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ یہ بغیر ذکر کے بھی واضح ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قیامت کے باب میں منکرین کا اصلی شبہ صرف دو پہلوؤں سے تھا۔ ایک اس پہلو سے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیسے جانے کو مستبعد سمجھتے تھے۔ دوسرا اس پہلو سے کہ اتنی وسیع دنیا کے تمام اعمال و اقوال کون محفوظ رکھ سکتا ہے کہ وہ ایک دن اس سارے کا حساب کرنے بیٹھے؟ یہ دونوں شبہات یہاں صاف کر دیے جس کے بعد اس کا لازمی نتیجہ خود بخود سامنے آ گیا۔

'مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ' میں وہی مضمون بیان ہوا ہے جو دوسرے مقام میں 'یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اس دنیا میں انسان بہت سے کام اپنے تصور کے مطابق، آخرت کے لیے کرتا ہے اور بہت سے کام اپنی اس دنیا کی زندگی یا اپنے بعد والوں کے لیے کرتا ہے۔ فرمایا کہ ہم اس کے ان دونوں ہی طرح کے کاموں کو نوٹ کر رہے ہیں۔

'امام مبین' سے مراد

'وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ'۔ 'اِمَام' کے اصلی معنی رہنما، ہادی، لیڈر اور مرجع کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ اس کتاب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو سب کے لیے رہنما اور مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتی ہو۔ چنانچہ ہود آیت ۱۷ اور احقاف آیت ۱۲ میں یہ لفظ تورات کے لیے آیا ہے۔ یہاں یہ اس مرکزی کتاب کے لیے استعمال ہوا ہے جس میں ہر شخص کے اعمال درج ہوں گے اور جس کے مطابق ہر شخص جزا یا سزا پائے گا۔ یہ اوپر والے ٹکڑے کی مزید وضاحت ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ لوگوں کے اعمال و اقوال کی تحریر میں ہم نے کسی غفلت و بے پروائی سے کام لیا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ ہر چیز ایک نہایت واضح دفتر میں ہم نے درج کر رکھی ہے جو سب کے سامنے اس کا سارا کچا چٹھا پیش کر دے گا۔

۲۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۱۳-۳۲

ایک بستی کی مثال

آگے قریش کے سامنے رسولوں کی تکذیب کا انجام واضح کرنے کے لیے ایک بستی کی مثال پیش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بستی والوں کے انذار کے لیے اپنے دو رسول بھیجے لیکن انھوں نے ان کی تکذیب کر دی۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے ایک تیسرے منذر سے اپنے رسولوں کو کمک پہنچائی لیکن بستی والوں نے اس کی بھی کوئی پروا نہ کی۔ ان کی تنبیہ کے لیے جو نشانیاں ظاہر ہوئیں ان کو انھوں نے رسولوں کی نحوست پر محمول کیا اور ان کو سنگسار کر دینے کی دھمکی دی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک فیصلہ کن عذاب بھیج کر ان کو بالکل پامال کر دیا۔

اس بستی سے کس بستی کی طرف اشارہ ہے؟

قرآن نے اس بستی کا نام نہیں لیا ہے اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے کون سی بستی مراد ہے؟ مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس سے مراد انطاکیہ ہے اور یہاں جن رسولوں کا ذکر ہے وہ اللہ کے رسول نہیں بلکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بھیجے ہوئے سفیر تھے جن کو حضرت مسیحؑ نے اپنے شاگردوں میں سے انتخاب کر کے انطاکیہ والوں کے انذار کے لیے بھیجا تھا۔ میرے سامنے بروقت جو تفسیریں ہیں ان سب میں یہی روایت نقل ہوئی ہے۔ ابن کثیرؒ نے اس پر متعدد شبہات وارد کر کے اگرچہ اس کو مجروح کر دیا ہے لیکن اس کے سوا کوئی اور قول چونکہ ان کو نہیں ملا اس وجہ سے انھوں نے بھی اختیار اسی کو کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قول متعدد وجوہ سے بے بنیاد ہے۔

۱- اس کے بے بنیاد ہونے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان رسولوں کا جس طرح ذکر ہوا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو جس حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ یہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بھیجے ہوئے رسول نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول تھے اور اسی حیثیت سے انھوں نے اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ مثلاً فرمایا ہے 'اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَیْهِمُ اثْنَیْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَیْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ' (یاد کرو جب کہ ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انھوں نے ان کو جھٹلا دیا تو ہم نے ایک تیسرے سے ان کو قوت پہنچائی تو انھوں نے لوگوں کے سامنے اعلان کیا کہ ہم تمھاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں) آگے اسی سلسلہ میں یہ بھی آیا ہے کہ جب لوگوں نے اس بنا پر ان کو جھٹلایا کہ وہ انھی کی طرح بشر ہیں تو انھوں نے تاکید قسم کے ساتھ کہا کہ 'رَبُّنَا یَعْلَمُ اِنَّآ اِلَیْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ' (ہمارا رب گواہ ہے کہ ہم تمھاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں)۔ اگر یہ لوگ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بھیجے ہوئے سفیر تھے تو ان کے بھیجے کو اللہ تعالیٰ نے اس صراحت و تاکید کے ساتھ اپنی طرف کیوں منسوب فرمایا؟ اور اگر انھوں نے اپنے آپ کو اللہ کے رسول کے بجائے حضرت عیسٰیؑ کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کو دعوت دی ہوتی تو لوگ ان کی بشریت کی بنا پر ان کی تکذیب کیوں کرتے؟ رسولوں کے مکذبین نے ان کی بشریت کو تکذیب کا بہانہ تو اس بنیاد پر بنایا کہ وہ خدا کے رسول ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس پر لوگ یہ اعتراض اٹھاتے تھے کہ اگر خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کیا وہ ہمارے ہی جیسے انسانوں کو رسول بناتا، آخر اس نے اپنے فرشتوں یا کسی اور برتر مخلوق کو اس منصب کے لیے کیوں نہیں انتخاب کیا؟

۲- دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا اور اس کا نتیجہ اہل انطاکیہ کی تباہی کی شکل میں ظاہر ہوا تو یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ انجیلوں اور بائیبل ہسٹری میں اس کا ذکر ضرور ہوتا لیکن نہ تو انجیلوں میں اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ تاریخوں ہی میں اس کی طرف کوئی اشارہ ہے بلکہ تاریخوں میں اس کے برعکس یہ اشارہ ملتا ہے کہ اہل انطاکیہ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام پر ایمان

لانے میں سبقت کی۔

۳- تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں اس واقعہ کا ذکر قریش کے سامنے ایک معروف واقعہ کی حیثیت سے ہوا ہے۔ چنانچہ یہاں قریہ پر الف لام عہد کا داخل ہے۔ 'اصحاب قریۃ' نہیں کہا ہے بلکہ 'اصحاب القریۃ' فرمایا ہے۔ اور موقع و محل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہاں کسی معروف واقعہ کا ذکر کیا جائے اس لیے کہ اس سے مقصود قریش کو انذار و تخویف ہے اور یہ مقصد صرف ایک مشہور واقعہ ہی سے حاصل ہو سکتا تھا نہ کہ ایک ایسے واقعہ سے جس سے وہ بالکل بے خبر ہوں۔

۴- چوتھی وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام بنی اسرائیل کے رسول تھے اس وجہ سے غیر قوموں کو نہ تو انھوں نے خود دعوت دی اور نہ ان کی طرف اپنے شاگردوں ہی کو بھیجا بلکہ انھوں نے غیر قوموں کے پاس جانے سے اپنے شاگردوں کو روکا۔ ان کا ارشاد ہے کہ 'میں صرف اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں ہی کی تلاش کے لیے آیا ہوں' غیر قوموں کے بارے میں ان کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ 'میرے پاس جو روٹی ہے وہ صرف بچوں ہی کے لیے ہے، کتوں کے آگے اس کو ڈالنا ٹھیک نہیں ہے۔' اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انطاکیہ میں انھوں نے اپنے شاگردوں کو کن کے پاس بھیجا؟ غیر قوموں کے پاس تو ظاہر ہے کہ وہ بھیج نہیں سکتے تھے۔ رہے بنی اسرائیل تو بشریت کی بنیاد پر تو انھوں نے حضرت عیسٰیؑ کی بھی تکذیب نہیں کی تو اس بنیاد پر وہ ان کے شاگردوں کی تکذیب کیوں کرتے؟ وہ جن نبیوں کے معتقد تھے ان کو وہ بشر مانتے تھے اس وجہ سے وہ یہ اعتراض نہیں اٹھا سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے خلاف ہر قسم کے فتنے اٹھائے لیکن یہ اعتراض نہیں اٹھایا کہ آپ بشر ہیں بلکہ قریش نے جب یہ اعتراض اٹھایا تو قرآن نے بنی اسرائیل ہی کو گواہ کی حیثیت سے پیش کیا کہ ان سے پوچھ لو کہ ہم نے جتنے نبی یا رسول بھیجے سب بشر ہی تھے۔

۵- پانچویں وجہ یہ ہے کہ آگے مذکور ہے کہ ان رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں ان کے اوپر ایسا فیصلہ کن عذاب آیا کہ وہ بالکل پامال ہو کے رہ گئے 'اِنۡ کَانَتۡ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً فَاِذَا ہُمۡ خٰمِدُوۡنَ (۲۹)' (بس ہماری ایک ڈانٹ ہی تھی کہ وہ چشم زدن میں پامال ہو کے رہ گئے) اس قسم کے فیصلہ کن عذاب سے متعلق ہم سنت الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ صرف رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں، کامل اتمام حجت کے بعد ہی، آیا ہے۔ یہود کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تکذیب کے نتیجہ میں ان پر اس طرح کا کوئی عذاب نہیں آیا جس طرح کا عذاب سابق رسولوں کے مکذبین پر آیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس جرم میں ان پر قیامت تک کے لیے لعنت کر دی۔ لعنت کا عذاب تمام عذابوں سے زیادہ سخت ہے جس کے سبب سے وہ دنیا میں بھی ہمیشہ ذلیل و پامال رہیں گے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ذلت و رسوائی ہے۔ اس کی وضاحت سورۂ اعراف اور سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں ہم کر

چکے ہیں۔

اس قول کے ضعف کے یہ وجوہ بالکل واضح ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اور وجوہ بھی ہیں جو آگے آیات کی تفسیر کے ذیل میں سامنے آئیں گے۔ ہمارے نزدیک اس قریہ سے اشارہ مصر کی طرف ہے جہاں حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام اور تیسرے مردِ حق کی تکذیب کے نتیجہ میں فرعون اور اس کی قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔ اس کے قرائن و دلائل کی تفصیل آیات کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی۔

اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۳-۳۲

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾
اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ
فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾
قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ
وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ
ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ
رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ
اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ
تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ
بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾ قِيْلَ ادْخُلِ
الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ

مِنَ الْمُكْرَمِينَ ﴿٢٧﴾ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ قَوْمِهِ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ جُنْدٍ
مِنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِينَ ﴿٢٨﴾ إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً
وقف غفران فَإِذَا هُمْ خَامِدُونَ ﴿٢٩﴾ يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ
إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٣٠﴾ أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ
الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿٣١﴾ وَإِنْ كُلٌّ لَمَّا جَمِيعٌ لَدَيْنَا
ع ۲ مُحْضَرُونَ ﴿٣٢﴾

ترجمۂ آیات ۱۳-۳۲

اور ان کو بستی والوں کی مثال سناؤ، جب کہ ان کے پاس فرستادے آئے۔ جب کہ ہم نے ان کے پاس دو رسول بھیجے تو لوگوں نے ان کی تکذیب کر دی تو ہم نے ایک تیسرے سے ان کی تائید کی تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ ہم تمھارے پاس بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ لوگوں نے جواب دیا کہ تم تو بس ہمارے ہی جیسے بشر ہو! اور خدائے رحمان نے کوئی چیز بھی نازل نہیں کی ہے، تم لوگ بالکل جھوٹ دعویٰ کرتے ہو۔ ۱۳-۱۵

انھوں نے کہا کہ ہمارا رب گواہ ہے کہ ہم تمھاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں۔ اور ہماری ذمہ داری بس واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے۔ لوگوں نے کہا، ہم تو تمھیں منحوس سمجھتے ہیں، اگر تم لوگ باز نہ رہے تو ہم تم کو سنگسار کر چھوڑیں گے اور تم کو ہمارے ہاتھوں بڑا دکھ پہنچے گا۔ رسولوں نے جواب دیا کہ تمھاری نحوست تمھارے ساتھ ہے۔ کیا اس چیز کو تم نے نحوست سمجھا کہ تمھیں یاد دہانی کی گئی! بلکہ تم خود حدود سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ ۱۶-۱۹

اور شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا۔ اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو، رسولوں کی پیروی کرو۔ ان لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتے اور وہ

راہِ راست پر بھی ہیں۔ اور میں کیوں نہ بندگی کروں اس ذات کی جس نے مجھ کو پیدا کیا اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے! کیا میں اس کے سوا دوسروں کو معبود بناؤں! اگر خدائے رحمان مجھے کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو نہ ان کی سفارش میرے کچھ کام آئے گی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں گے۔ بے شک میں اس وقت ایک کھلی ہوئی گمراہی میں ہوں گا۔ میں تمھارے رب پر ایمان لایا تو میری بات سنو ـــــ ارشاد ہوا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اس نے کہا کاش! میری قوم جانتی کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا اور مجھے عزت پانے والوں میں سے بنایا! ۲۰-۲۷

اور اس کے بعد اس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری اور نہ ہم اتارنے والے ہی تھے۔ بس ایک ڈانٹ تھی کہ دفعتہً وہ پامال ہو کے رہ گئے۔ افسوس ہے بندوں کے حال پر! جو رسول بھی ان کے پاس آئے وہ ان کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔ کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ کتنی قومیں ان سے پہلے ہوئی ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا، اب وہ ان کے پاس واپس آنے والی نہیں۔ بے شک وہ سب ہمارے ہی حضور میں حاضر کیے جائیں گے۔ ۲۸-۳۲

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ (۱۳)

قریش کی عبرت کے لیے مصر کی مثال

'لَهُمْ' میں ضمیر کا مرجع قریش ہیں اور 'اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ' میں 'قریۃ' پر الف لام اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ بستی مخاطب کے لیے ایک معہود و معلوم بستی تھی۔ آگے کے اشارات دلیل ہیں کہ اس سے مراد مصر ہے جس کی سرگزشت، مختلف اسلوبوں سے، قرآن میں، قریش کی عبرت پذیری کے لیے بیان ہوئی ہے اور جس کے حالات سے وہ واقف تھے۔ 'اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ' سے اس بات کی طرف اشارہ ہے

کہ یہاں مقصود مخاطب کو اس وقت کے حالات کی طرف توجہ دلانا ہے جب ان کی طرف رسولوں کی بعثت ہوئی ہے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کو اس بستی کی سرگزشت کی طرف توجہ دلاؤ کہ جو انجام اس بستی والوں کا ہوا وہی حال ان کا بھی ہوگا اگر انھوں نے انہی کی روش اختیار کی۔

ایک تیسرے بندے سے رسولوں کی تائید

إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَيْكُم مُّرْسَلُونَ (۱۴)

یہ 'إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ' کے اجمال کی وضاحت ہو رہی ہے کہ پہلے ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انھوں نے ان کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے ایک تیسرے بندے سے ان دونوں رسولوں کو کمک پہنچائی اور انھوں نے ان کو دعوت دی کہ ہم تمہارے پاس خدا کے بھیجے ہوئے آئے ہیں تو تم لوگ ہماری بات سنو اور مانو۔

'اثْنَيْنِ' سے مراد تو ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام ہیں۔ رسولوں کی تاریخ میں یہی ایک مثال ملتی ہے کہ کسی قوم کی طرف بیک وقت دو رسول اللہ تعالیٰ نے بھیجے۔ اس اہتمام خاص کے وجوہ کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ جب فرعونیوں نے ان کی تکذیب کر دی تو اللہ تعالیٰ نے ایک تیسرے بندے کو ان رسولوں کی تائید کے لیے اٹھایا۔

تیسرے سے کون مراد ہے؟

اس تیسرے سے کون مراد ہے؟ میرے نزدیک اس سے وہ مومن آلِ فرعون مراد ہے جس کی جانبازیوں کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کے ذیل میں یہاں بھی آگے ہوا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات، بالخصوص سورۂ مومن میں بھی ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید و حمایت میں اس مردِ حق نے جو کچھ کیا ہے اور جس بے خوفی و جانبازی کے ساتھ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں وہی تھی جو اس امت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہے۔ یہ اگرچہ اصطلاحی مفہوم میں رسول نہیں تھے لیکن جہاں تک رسولوں کی تائید و حمایت کا تعلق ہے اس کے لیے انھوں نے جان لڑا دی۔ چنانچہ الفاظِ قرآن سے خود یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا ذکر یہاں ایک رسول کی حیثیت سے نہیں بلکہ رسولوں کے ایک خاص مددگار کی حیثیت سے ہوا ہے۔

آگے آیت ۲۰ میں ان کا تفصیل کے ساتھ تعارف بھی قرآن نے کرایا ہے اور ان کی وہ آخری یادگار تقریر بھی آرہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید میں انھوں نے کی ہے۔

اس تقریر اور تعارف پر غور کیجیے تو اس سے میرے قیاس کی تائید ہوگی۔

مثلاً یہاں ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے 'وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَىٰ' (اور شہر کے دور کے حصہ سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا) بعینہٖ انہی الفاظ میں ان کا تعارف سورۂ قصص آیت ۲۰ میں ہوا ہے۔ 'وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يَا مُوسَىٰ إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ إِنِّي لَكَ مِنَ النَّاصِحِينَ' (اور ایک شخص شہر کے پرلے سرے سے بھاگا

ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ اے موسٰی! اعیانِ حکومت تمہارے قتل کے مشورے کر رہے ہیں تو تم یہاں سے نکل جاؤ، میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں)۔ یہ اس موقع کا ذکر ہے جب حضرت موسٰی علیہ السلام کے ہاتھوں ایک مصری کے قتل کا واقعہ صادر ہو گیا تھا اور فرعون کے آدمی ان کے قتل کے مشورے کر رہے تھے۔ اس وقت اسی مردِ حق نے حضرت موسٰی علیہ السلام کو دشمنوں کی سازش سے آگاہ کیا اور ان کو کہیں نکل جانے کا مشورہ دیا۔ جس کے بعد حضرت موسٰی علیہ السلام نے مدین کو ہجرت فرمائی۔

ان کی جس تائید و حمایت کا یہاں حوالہ ہے اس کی ایک مثال تو یہیں آگے آ رہی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے ان کے متعدد کارناموں کا حوالہ دیا ہے۔ سورۂ مومن کی آیت ۲۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرعون کے خاص شاہی خاندان کے ایک فرد تھے لیکن نہایت حق پرست تھے۔ ان کو حضرت موسٰی علیہ السلام سے ان کی بعثت سے پہلے بھی نہایت ہمدردی تھی چنانچہ اوپر سورۂ قصص کا جو حوالہ نقل ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انھیں پتہ چلا کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کی جان کو خطرہ ہے تو وہ چین سے بیٹھے نہیں رہے۔ بلکہ دور سے بھاگے ہوئے حضرت موسٰیؑ کے پاس پہنچے اور ان کو خطرے سے آگاہ کیا ـــ اسی طرح حضرت موسٰی علیہ السلام کے دعوائے نبوت کے بعد جب فرعون اور اس کے اعیان نے حضرت موسٰیؑ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو اس مردِ حق نے بھرے دربار میں جو تقریر حضرت موسٰی علیہ السلام کی تائید میں کی وہ قرآن نے سورۂ مومن میں نقل کی ہے۔ ہم یہ تقریر اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اس کو پڑھیے تو کچھ اندازہ ہو گا کہ ان کا مرتبہ و مقام کیا تھا اور ان کی اس تائید و حمایت (تعزیز) کی نوعیت کیا تھی جس کا قرآن نے یہاں حوالہ دیا ہے۔ سورۂ مومن کی آیات ۲۶ - ۴۵ ہم سامنے رکھ لیجیے۔

" فرعون نے درباریوں سے کہا کہ تم لوگ مجھے موسٰی کو قتل کر لینے دو، اگر وہ سچا ہے تو اپنی مدد کے لیے اپنے رب کو بلائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارا دین بدل دے گا یا ملک میں فساد برپا کر کے رہے گا۔ موسٰی نے کہا میں ہر متکبر سے، جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمہارے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔

اور ایک مردِ مومن، جو فرعون کے خاندان میں سے تھا اور اب تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، بولا کہ کیا تم لوگ ایک شخص کو محض اس گناہ میں قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے درآنحالیکہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نہایت واضح نشانیاں لے کر آیا ہے! اگر وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے تو اس کا وبال اسی پر آئے گا اور اگر وہ سچا ہے تو یاد رکھو کہ جس چیز سے وہ تم کو ڈرا رہا ہے اس کا کوئی حصہ تم کو پہنچ کے رہے گا۔ اللہ کبھی حد سے تجاوز کرنے والے اور جھوٹے کو بامراد نہیں کرتا۔ اے میری قوم کے لوگو! آج تم کو اس ملک میں اقتدار حاصل ہے لیکن کل اگر خدا کا عذاب ہم پر آ دھمکا تو خدا کے قہر سے ہم کو کون بچائے گا!

فرعون نے کہا، میں تمھیں وہی رائے دے رہا ہوں جو میری سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے اور یاد رکھو کہ میں بالکل ٹھیک راہ کی طرف تمھاری رہنمائی کر رہا ہوں۔

مرد مومن نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! میں تم پر اسی طرح کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں جس طرح کا عذاب پچھلی قوموں —— نوح، عاد، ثمود کی قوموں اور ان کے بعد والوں —— پر آیا۔ اللہ بندوں کے لیے ظلم کو پسند نہیں کرتا۔

اے میری قوم کے لوگو، میں تم پر ایک بڑی ہلچل کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں جس دن تم پیٹھ پیچھے بھاگو گے۔ اور کوئی تم کو خدا کے غضب سے بچانے والا نہیں ہوگا۔ یاد رکھو کہ جس کو خدا گمراہ کر دے اس کو کوئی دوسرا راہ دکھانے والا نہیں بن سکتا۔ اس سے پہلے تمھارے پاس یوسف کھلی نشانیوں کے ساتھ آئے لیکن تم ان کی دعوت کی طرف سے برابر شک ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہو گئی تو تم یہ سمجھ بیٹھے کہ اللہ اب کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔ اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں اور شکیوں کو اسی طرح گمراہی میں ڈال دیتا ہے۔ یعنی ان لوگوں کو جو بغیر کسی دلیل کے اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑتے ہیں، ایسے لوگ اللہ اور اہلِ ایمان کے نزدیک زیادہ مبغوض ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ہر متکبر و جبار کے دل پر مہر کر دیا کرتا ہے۔

فرعون نے ہامان کو مخاطب کرکے کہا، اے ہامان! میرے لیے ایک محل بنواؤ تاکہ میں آسمانوں کے اطراف میں جھانک کر دیکھوں کہ موسیٰ کا رب کہاں ہے! میں تو اس کو بالکل جھوٹا سمجھتا ہوں ....

مرد مومن نے کہا، اے میری قوم کے لوگو، میری پیروی کرو، میں تمھیں سیدھی راہ دکھا رہا ہوں۔ اے میری قوم کے لوگو! یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے، اصلی ٹھکانا تو آخرت ہے۔ جو کسی برائی کا ارتکاب کرے گا تو وہ اسی کے مطابق بدلہ پائے گا —— اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، تو یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر بے حساب فضل ہوگا۔

اے میری قوم کے لوگو! کیا بات ہے کہ میں تو تمھیں نجات کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی طرف بلا رہے ہو! تم مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور ایسی چیزوں کو اس کا شریک ٹھہراؤں جن کے باب میں مجھے کوئی علم نہیں اور میں تمھیں خدائے عزیز و غفار کی طرف دعوت دے رہا ہوں —— اس میں ذرا شبہ نہیں کہ تم جن کی طرف مجھے دعوت دے رہے ہو ان کی دہائی نہ دنیا میں کچھ نافع نہ آخرت میں۔ ہمارا لوٹنا اللہ کی طرف ہوگا اور حدود سے تجاوز کرنے والے جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کو بہت جلد تم یاد کروگے۔ میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔

بے شک اللہ اپنے بندوں کا نگرانِ حال ہے۔ تو اللہ نے اس کو لوگوں کی بری سازشوں سے محفوظ رکھا اور آلِ فرعون کو بُرے عذاب نے گھیر لیا؟

تین کا تیسرا

اس مردِ بزرگ کی یہ پوری تقریر پڑھیے۔ یہ تقریر انھوں نے مصر کے دارالامراء (HOUSE OF LORDS) میں اعیانِ حکومت کے سامنے اس وقت کی ہے جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے قتل کی تجویز پیش کی ہے اور اعیانِ حکومت کو اپنی تجویز سے متفق کرنا چاہا ہے۔ اس وقت تک انھوں نے اپنا ایمان پوشیدہ رکھا تھا لیکن جب یہ فیصلہ کن وقت آگیا تو انھوں نے پردہ اٹھا دیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید اور حق کی حمایت میں، فرعون اور قوم کے تمام اعیان و اکابر کے سامنے، انھوں نے جو کچھ کہا ہے، جن دلائل کے ساتھ کہا ہے اور جس جرأت و بے خوفی کے ساتھ کہا ہے، اس کی مثال انبیاء اور صدیقین کی تاریخ کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھیے کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ خاندانِ شاہی کے ایک رکنِ رکین تھے اس وجہ سے ان کی اس نصیحت کو اعیانِ حکومت کسی اسرائیلی عصبیت پر محمول نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ پر تو انھوں نے یہ الزام لگایا کہ یہ اسرائیلیوں کو بغاوت پر ابھارنا چاہتے ہیں لیکن یہ صدائے حق جو انہی کے اندر کے ایک مردِ بزرگ کی طرف سے اٹھی، اس کے خلاف وہ اپنے عوام کے اندر کیا بدگمانی پھیلا سکتے تھے! ـــــ اس مردِ جلیل کا یہی وہ شاندار اور زندۂ جاوید کارنامہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے 'فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ' کے الفاظ سے ذکر فرمایا۔ یہ اس معنی میں تو رسول نہیں تھے جس معنی میں حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ رسول تھے لیکن ان کے سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ جاں نثار اور سب سے بڑے وفادار و راستباز ساتھی ضرور تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو تین کے تیسرے کا درجہ دیا۔

'قَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ' یہ جمع کے صیغہ سے ان سب کا یہ کہنا کہ 'اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ' اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ یہ تینوں حضرات ایک ہی درجہ کے رسول تھے بلکہ یہ بات علی سبیل التغلیب ارشاد ہوئی ہے۔ ایک سفارت کے تمام ارکان ایک ہی درجہ و منصب کے نہیں ہوتے لیکن اصل ذمہ داری میں چونکہ سب شریک ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو اس طرح اپنے کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا حق ہوتا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اصل رسول کی حیثیت تو صرف حضرت موسیٰؑ کو حاصل تھی۔ حضرت ہارونؑ بھی اصل رسول نہیں بلکہ حضرت موسیٰؑ کے وزیر تھے۔ اسی طرح اس مردِ ثالث کی حیثیت رسول کی نہیں بلکہ ان رسولوں کے سب سے بڑے جاں نثار و مددگار کی تھی لیکن انھوں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی اور اپنی قوم کو غلط کار لیڈروں کی پیروی سے روک کر حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ اور انہی کی پیروی کی دعوت دے رہے تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی زمرے میں شمار فرمایا۔

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا

تَكْذِبُوْنَ (۱۵)

فرعونیوں کا پامال اعتراض

یہ وہی اعتراض ہے جو ہر رسول کے مکذبین نے اپنے اپنے رسولوں کے خلاف اٹھایا ہے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے انسان ہو تو تم خدا کے رسول کیسے ہوئے! اگر خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کسی برتر مخلوق کو رسول بناتا نہ کہ ہمارے ہی جیسے انسانوں کو۔ یہ اعتراض قرآن میں رسولوں کے مکذبین کی زبان سے بار بار نقل ہوا ہے۔ فرعون اور اس کے اعیان کو بھی حضرت موسیٰؑ پر یہ اعتراض تھا اور یہی اعتراض قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھی اٹھایا تھا۔

'وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ الْاٰيَةَ'۔ یعنی تمھارا یہ دعویٰ کہ خدا نے تم پر کوئی کتاب یا وحی نازل کی ہے، بالکل جھوٹ ہے۔ خدا نے کوئی چیز بھی نازل نہیں کی ہے۔

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ۝ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۱۶-۱۷)

اعتراض کا جواب اور تنبیہ

'رَبُّنَا يَعْلَمُ' قسم کے مفہوم میں آتا ہے۔ اس کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ ان کی تکذیب کے جواب میں انھوں نے قسم کے ساتھ فرمایا کہ ہم تمہارے پاس خدا کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ جس طرح آیت ۱۴ میں 'مُرْسَلُوْنَ' علیٰ سبیل التغلیب آیا ہے اسی اسلوب پر یہاں بھی جمع آیا ہے۔

'وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ'۔ یہ ان کی طرف سے لوگوں کو تنبیہ ہے کہ اگر تم ہم کو جھٹلاتے ہو تو جھٹلاؤ۔ ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ذمہ داری ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم تم کو خدا کی بات نہایت واضح طور پر پہنچا دیں۔ تمھارے دلوں میں ایمان اتار دینا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو اس کا انجام خود بھگتو گے۔ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۸)

لفظ 'تطیّر' کی تحقیق اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بُری فال لینے اور کسی کو منحوس سمجھنے کے مفہوم میں ہے۔

فرعونیوں کی طرف سے حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں پر نحوست کا الزام

یعنی ان رسولوں کی دعوت کے زمانے میں اہل مصر پر جو آفتیں، ان کی تنبیہ کے لیے نازل ہوئیں ان سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے انھوں نے ان کو حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیا اور کہا کہ یہ آفتیں ہمارے اعمال کے سبب سے ہم پر نہیں آرہی ہیں، جیسا کہ موسیٰؑ اور ان کے ساتھی دعویٰ کر رہے ہیں، بلکہ یہ ان کی اس گمراہ کن دعوت کے نتیجہ میں پیش آرہی ہیں جس سے ہمارے دیوتا ناراض ہیں۔ ساتھ ہی ان کو دھمکی بھی دی کہ اگر تم لوگ اس بدعقیدگی کی اشاعت سے باز نہ آئے تو ہم اپنے دیوتاؤں کی حرمت کی حفاظت کے لیے تم کو سنگسار کر دیں گے اور اس کے علاوہ بھی بہت سے دکھ تم کو ہمارے ہاتھوں جھیلنے پڑیں گے۔ یہ مضمون سورۂ اعراف میں بھی گزر چکا ہے۔ فرمایا ہے: 'وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ

قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ (۱۳۰-۱۳۱)

(اور ہم نے قوم فرعون کو قحط اور پھلوں کی کمی میں مبتلا کیا کہ وہ نصیحت حاصل کریں تو جب ان کے حالات اچھے ہوتے کہتے کہ یہ تو ہمارا حق ہی ہے اور اگر ان کو کوئی آفت پہنچتی تو اس کو موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے۔)

قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ (۱۹)

نحوست آدمی کے اپنے اعمال کے اندر ہوتی ہے

لفظ 'طَآئِر' کی تحقیق بھی اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے معنی نحوست کے ہیں۔ یہ ان رسولوں کا جواب ہے کہ تم اپنی بدبختی کے اسباب دوسروں کے اندر ڈھونڈتے ہو حالانکہ تمھاری نحوست خود تمھارے ساتھ ہے۔ یہ جو کچھ پیش آ رہا ہے تمھارے اپنے ہی عقائد و اعمال کا نتیجہ ہے اس وجہ سے دوسروں کو ملزم ٹھہرانے کے بجائے اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھو اور اپنے اعمال و عقائد کا جائزہ لو۔

'اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ' یعنی تم ہمیں جو منحوس ٹھہرا رہے ہو تو کیا اس گناہ میں کہ ہماری طرف سے تم کو یاددہانی کی گئی اور نیک و بد سے آگاہ کیا گیا ہے!

'بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ' یعنی یہ تمھاری سرکشی و بدبختی کی انتہا ہے کہ خدا کے حدود کو توڑ کر اپنے لیے خطرات کو دعوت دیتے ہو پھر خدا کے جو بندے تمھیں ان خطرات سے آگاہ کرتے ہیں ان کے شکرگزار ہونے کے بجائے اُلٹے انہی کو ان خطرات کا سبب قرار دیتے ہو۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۙ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۲۰-۲۱)

تیسرے منذر کی طرف سے تائید حق

اوپر آیت ۱۴ میں جس تیسرے مُنذر کی طرف اشارہ ہے یہ اس کی تائیدِ حق کی تفصیل ہے۔ اوپر سورۂ اعراف کی آیت کے حوالہ سے ہم بیان کر چکے ہیں کہ 'رَجُلٌ' سے مراد وہی مومنِ آلِ فرعون ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ سورۂ مومن میں ہوا ہے اور جس کی تقریر کا حوالہ ہم اوپر دے چکے ہیں — اس کا واضح قرینہ یہ ہے کہ جن الفاظ میں ان کا تعارف یہاں کرایا گیا ہے بعینہٖ انہی الفاظ میں سورۂ اعراف میں بھی کرایا گیا ہے۔

'جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى' سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ان کی ہمدردی محض لفظی نہیں بلکہ عملی تھی۔ اپنے خس خانوں میں بیٹھے بیٹھے تو بہت سے لوگ کسی متعدیِ حق اور مردِ حق کی تعریف و تحسین کر دیتے ہیں لیکن ایسے افراد، بالخصوص امرا و اغنیا کے طبقہ میں بہت کم نکلتے ہیں جو عملاً اس حق کے لیے سرگرمی دکھائیں۔ لیکن اس مردِ حق کا حال اس سے مختلف تھا۔ ان کا مکان شہر کے ایک بعید کنارے پر تھا، جیسا کہ لفظ 'اَقْصَا' سے واضح ہوتا ہے، لیکن جب کبھی انھوں نے یہ محسوس فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو کوئی خطرہ درپیش ہے تو وہ بھاگ کر، جیسا کہ لفظ 'يَسْعٰى' سے واضح ہوتا ہے، وہاں پہنچے ہیں اور اپنے تمام خاندانی

مفادات بلکہ اپنی جان تک خطرے میں ڈال کر ان کے لیے سپر بن گئے ہیں۔ اسی طرح کے ایک مرد حق کا حوالہ قرآن نے یہاں دیا ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہ وہی موقع ہے جب انھوں نے فرعون کے سامنے وہ تقریر فرمائی ہے جو پیچھے ہم نقل کر آئے ہیں۔ آگے کی آیات سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

مومن کی تقریر کا اجمالی حوالہ

'قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ' یہ اس تقریر کا اجمالی حوالہ ہے جو انھوں نے فرعون اور اس کے اعیان کے سامنے کی ہے۔ 'اِتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ' میں 'مُرْسَلِيْنَ' سے ان کا اشارہ زمرۂ مرسلین کی طرف ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنے کو بھی اصطلاحی مفہوم میں ایک رسول سمجھتے رہے ہوں۔ ان کے اس ارشاد میں اصل زور اس بات پر ہے کہ قوم کے لوگوں کو فرعون، ہامان، قارون اور اس قسم کے مفسد لیڈروں کے پیچھے چلنے کے بجائے ان لوگوں کے پیچھے چلنا چاہیے جن کو خدا نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجا ہے یا جو لوگ ان کا ساتھ دے رہے ہیں اور ان کی پیروی کر رہے ہیں۔

رسولوں کے حق میں دو واضح دلیلیں

'اِتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا' یہ رسولوں کی پیروی کے حق میں دو دلیلیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان رسولوں کا اس دعوت کے ساتھ کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے بلکہ وہ ہر غرض سے بالاتر ہو کر محض خلق کی ہدایت کے لیے یہ سارے دکھ جھیل رہے ہیں۔ برعکس اس کے دوسرے لیڈر جو اس دعوتِ حق کی مخالفت کر رہے ہیں وہ محض اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔

دوسری دلیل انھوں نے یہ دی کہ 'وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ'۔ یہ رسول بے غرض ہونے کے ساتھ ساتھ ہدایت پر بھی ہیں۔ اس دلیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ بے غرضی ایک شخص کی نیک نیتی کی شہادت تو ضرور ہے لیکن مجرد نیک نیتی اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ حق پر بھی ہے۔ اس وجہ سے کسی شخص کی نیک نیتی اور بے غرضی کے ساتھ ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس کی بات عقل و منطق کے معیار پر بھی پوری اترتی ہے یا نہیں۔ اگر وہ بے غرض بھی ہے اور اس کی دعوت عقل و منطق کی رو سے بھی صحیح ہے تو اس کی پیروی نہ کرنا بدبختی ہے۔

وَمَالِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ۝ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ (۲۲-۲۵)

قوم کے لیڈروں کی ملامت کا جواب

انداز کلام دلیل ہے کہ یہ بات انھوں نے قوم کے لیڈروں کی ملامت کے جواب میں فرمائی ہے۔ جب انھوں نے کھلم کھلا لوگوں کو رسولوں کی پیروی کی دعوت دی ہوگی تو ظاہر ہے کہ مفاد پرست لیڈروں نے ان کو قوم اور دین آبائی کا دشمن ٹھہرایا ہوگا۔ ان کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ آخر اس کی بندگی میں کیوں نہ کروں جس نے مجھے وجود بخشا اور جس کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے۔ 'وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ' میں خطاب کا صیغہ تنبیہ کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج جس رب کی بندگی سے تم لوگ اس شدومد کے ساتھ مجھے روک

رب ہے جو ایک دن پیشی سب کی اسی کے حضور میں ہونی ہے اور تمہیں اسی کے آگے جواب دہی کرنی ہے۔

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً الآیۃ، یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں تمہارے کہنے سے ایسی چیزوں کو معبود بناؤں جن کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ اگر خدا مجھے کوئی دکھ پہنچانا چاہے تو نہ ان کی سفارش میرے لیے کچھ نافع ہو سکتی ہے اور نہ وہ بذاتِ خود ہی یہ حیثیت رکھتے کہ مجھے اس دکھ سے نجات دے سکیں!

اِنِّیٓ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ، یعنی اگر میں ایسا کروں تو یہ ایسی کھلی ہوئی گمراہی ہوگی جس کے لیے میرے پاس کوئی عذر نہ ہوگا۔

اِنِّیٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ، یہ قوم کو فیصلہ کن اور دندان شکن جواب ہے کہ تم لوگ اچھی طرح کان کھول کر میری یہ بات سن لو کہ میں تمہارے رب پر ایمان لایا۔ مطلب یہ ہے کہ اب مجھے اس راہ سے ہٹانے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ تم خود بھی یہی راہ اختیار کرو جو میں نے اختیار کی ہے اور اسی رب پر ایمان لاؤ جس پر میں ایمان لایا ہوں اس لیے کہ فی الحقیقت وہی تمہارا بھی رب ہے۔ اگر تم اس سے مجھے برگشتہ کرنے کی کوشش کرو گے تو اپنے رب ہی سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرو گے۔

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ (۲۶-۲۷)

دشمنوں کے شر سے حفاظت کی بشارت

مذکورہ اعلان کے بعد ظاہر ہے کہ ان کی پوری قوم ان کی دشمن بن کر ان کے خلاف سازشوں میں لگ گئی ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو سازشوں کے شر سے محفوظ رکھا اور حمایتِ حق کی راہ میں انھوں نے یہ بازی جو کھیلی اس کے صلہ میں ان کو جنت کی بشارت دی گئی جس پر انھوں نے اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ کاش میری قوم بھی اس بات کی قدر و قیمت جانتی جس کے صلہ میں مجھے یہ مغفرت اور سرفرازی حاصل ہوئی۔

یہاں اس بات کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ بشارت ان کو کس موقع پر دی گئی ہے۔

کلام کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے تین امکان سامنے آتے ہیں۔

ایک یہ کہ ان کے اس اعلان کے بعد قوم کے اشرار نے ان کو شہید کر دیا اور اس وقت ان کو یہ بشارت دی گئی ہو۔

دوسرا یہ کہ اس کے بعد انھوں نے قوم کے رویہ سے مایوس ہو کر ہجرت فرمائی ہو اور اس وقت ان کو یہ بشارت ملی ہو۔

تیسرا یہ کہ اس کے بعد چونکہ ان کا مشن پورا ہو چکا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس بشارت کے ساتھ ان کو وفات دی ہو۔

ان میں سے پہلا امکان کلام کے سیاق و سباق کی روشنی میں اگرچہ زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے لیکن سورۂ مومن کے حوالے سے اوپر ہم نے ان کی جو تقریر نقل کی ہے اس کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے ان کو قوم کی سازشوں کے شر سے محفوظ رکھا۔ ان کے دعوتی کلمات کے بعد ان کی حفاظت کا ذکر یوں ہوا ہے:

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ	(اے میری قوم کے لوگو!) میں جو کچھ تم سے
وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ	کہہ رہا ہوں اس کو تم عنقریب یاد کرو گے۔ میں اپنا
اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ فَوَقٰىهُ	معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ بے شک اللہ تعالیٰ
اللّٰهُ سَیِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا	اپنے بندوں کے حالات کو دیکھنے والا ہے۔ پس اللہ
وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ	نے اس کو ان سازشوں کی آفات سے محفوظ رکھا جو
الْعَذَابِ ۝	لوگوں نے اس کے خلاف کیں اور آلِ فرعون کو
(المؤمن: ۴۴-۴۵)	برے عذاب نے گھیر لیا۔

اس آیت کی روشنی میں یہ امکان تو خارج از بحث ہو جاتا ہے کہ ان کو قتل کیا گیا ہو البتہ مذکورہ بالا دو امکان باقی رہ جاتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دو میں سے کون سی صورت پیش آئی۔ اس کا صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ بس اتنی بات یقینی ہے کہ حق کی حمایت میں جو جاں بازی انھوں نے دکھائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا انعام ان کو یہ ملا کہ اسی دنیا میں 'مبشر بالجنۃ' قرار پائے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِیْنَ ۝ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ (۲۸-۲۹)

'مِنْۢ بَعْدِهٖ' میں مذکورہ بالا دو باتوں کا امکان ہے۔ ان کی موت کے بعد یا ان کی ہجرت کے بعد۔

رسولوں کے مکذبین کے بیے سنتِ الٰہی — یہ اس سنتِ الٰہی کا حوالہ ہے جس سے مکذبین کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے جب کہ رسول اور اس کے ساتھی قوم کو چھوڑ کر ہجرت کر جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اس کے بعد ہمیں اس کی قوم کو پامال کرنے کے لیے آسمان سے کوئی فوج نہیں اتارنی پڑی بلکہ ہماری ایک ہی ڈانٹ میں وہ پامال ہو کے رہ گئے۔ لفظ 'صیحۃ' عذاب کی تعبیر ہے۔ 'وَمَا كُنَّا مُنْزِلِیْنَ' سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کے لیے آسمان سے کوئی فوج نہ اتارنے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے کاموں کے لیے ہم اپنی فوجیں نہیں اتارا کرتے، بس ہماری ایک ڈانٹ ہی کافی ہو جاتی ہے۔

یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہے کہ ہر چند یہ عذاب اصلاً حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کی تکذیب کے نتیجہ میں آیا لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کو اس بندۂ مومن کی تکذیب کے نتیجہ کی حیثیت سے ذکر فرمایا ہے۔ اس سے رسول کے ساتھیوں کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ان کا یہ درجہ ہوتا ہے کہ ان کی تکذیب رسول کی تکذیب کے ہم معنی بن جاتی ہے اور اس کا وہی انجام ہوتا ہے جو رسول کی تکذیب کا ہوتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ حضرت موسیٰؑ کے مکذبین ـــــ فرعون اور اس کی قوم ـــــ پر جو عذاب آیا اس کی شکل تو یہ ہوئی کہ فرعون اپنی تمام فوج سمیت دریا میں غرق کر دیا گیا لیکن یہاں جس عذاب کا ذکر ہے اس میں غـــرق کے واقعہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے بلکہ الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر بھی کوئی اسی طرح کا عذاب آیا جس طرح کا عذاب عاد و ثمود اور دوسری پچھلی قوموں پر آیا جس کا اندیشہ اس مردِ مومن نے اپنی اس تقریر میں ظاہر کیا تھا جو سورۂ مومن کے حوالے سے اوپر نقل ہوئی ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ فرعون اور اس کی قوم پر دونوں قسم کے عذاب آئے ـــــ ایک طرف، تو اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی فوجوں کو ایک سائیکلونی طوفان کے ذریعے سے سمندر میں غرق کر دیا، دوسری طرف، رعد و برق اور زلزلہ کے عذاب نے مصر کی تمام تعمیرات اور اس کے سارے باغ و چمن تاراج کر دیے۔ اس دوسرے عذاب کا ذکر تورات میں نہیں ہے لیکن قرآن میں اس کا ذکر نہایت واضح الفاظ میں ہے ـــ مثلاً فرمایا ہے:

وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (الاعراف: ۱۳۷)

اور ہم نے تاراج کر دیے وہ سب کچھ جو فرعون اور اس کی قوم کے لوگ بناتے رہے تھے اور ان کے انگوروں کے وہ باغ بھی جن کو وہ ٹٹیوں پر چڑھاتے تھے۔

یہی بات سنتِ الٰہی کے مطابق بھی ہے۔ رسول کی تکذیب کے نتیجہ میں جو عذاب کسی قوم پر آیا ہے اس نے قوم کے قومی وجود کی جڑ کاٹ دی ہے۔ یہ بات مجرد فرعون اور اس کی فوجوں کے غرق ہونے سے نہیں پوری ہو سکتی تھی۔ یہ اسی طرح کے کسی عذاب سے پوری ہو سکتی تھی جس کی طرف سورۂ اعراف کی مذکورہ بالا آیت اشارہ کر رہی ہے۔ اسی کا ذکر یہاں آیت زیرِ بحث میں ہے۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۰)

مکذبینِ رسول کی بدبختی پر اظہارِ افسوس

یہ مکذبینِ رسول کی بدبختی پر اظہارِ افسوس ہے کہ ہمیشہ سے لوگوں کا حال یہی رہا ہے کہ جب اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے کوئی رسول بھیجا تو لوگوں نے ان کا مذاق اڑایا ہے اور پھر اس کے انجام بد سے دوچار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جو روش فرعون اور اس کی قوم نے اپنے رسولوں کے ساتھ اختیار کی آج وہی روش قریش نے اپنے رسول اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ اختیار کی ہے اور لازماً یہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے ان کے پیشرو دوچار ہوئے۔ رسول، خدا کی سب سے بڑی رحمت بن کر آتا ہے لیکن اس کو مذاق نہ تو پھر اس سے بڑی نعمت بھی کوئی نہیں ہے۔

يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ

مُحْضَرُوْنَ (۳۱-۳۲) ۹

یہ قریش کو رسولوں کے ساتھ استہزا کا انجام دکھانے کے لیے ماضی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کھیل جو وہ کھیل رہے ہیں یہ ایک نہایت خطرناک کھیل ہے۔ یہ کھیل کھیلنے والی قومیں اس دنیا سے اس طرح مٹی ہیں کہ اب وہ کبھی واپس آنے والی نہیں ہیں۔ بلکہ اب ان سب کی حاضری ہمارے ہی سامنے ہونی ہے اور ہم ہی ان کا حساب کریں گے۔

'لَمَّا' کا خاص استعمال — وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا' میں 'لَمَّا' اسی طرح کا ہے جس طرح سورۂ طارق میں ہے اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (بے شک ہر جان پر ایک نگران مامور ہے)۔ یہ 'اِنْ' مخففہ ہے اور 'ل' اس کا قرینہ ہے چونکہ جملہ میں کچھ صوتی خلا رہ جاتا ہے اس وجہ سے اس کو بھرنے کے لیے اس کو 'لَمَّا' کر دیتے ہیں۔ معنی پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۳۳-۵۰

آگے آفاق کی نشانیوں سے رسول کی دعوت اور اس کے انذار کی تائید کی ہے اور ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی ہے جو کائنات کی ان تمام نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے کسی نئی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ گویا اوپر کی تاریخی شہادت کے بعد کلام از سرِ نو تمہید سے متصل ہو گیا ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی کہ ان کی اصلی بیماری یہ ہے کہ استکبار ان کو اوپر یا پیچھے کی کسی نشانی کی طرف متوجہ نہیں ہونے دے رہا ہے ورنہ ان کے آگے اور پیچھے نشانیوں کی کمی نہیں ہے۔ ان کے اس رویہ اور اس کے انجام کی مثال قومِ فرعون سے دینے کے بعد پھر ان کو آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۳۳-۵۰ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ

يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا

فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۚ

اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا

تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ

الَّيْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالشَّمْسُ

تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ وَالْقَمَرَ

قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿٣٩﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ
لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ
يَّسْبَحُوْنَ ﴿٤٠﴾ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ
الْمَشْحُوْنِ ﴿٤١﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَاِنْ نَّشَاْ
نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿٤٣﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا
وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿٤٤﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ
وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ
رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٦﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا
رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ
اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ڰ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٤٧﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا
الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٤٨﴾ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً
تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿٤٩﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى
اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٥٠﴾ ع ٣ ١٨ ٢

اور ایک بہت بڑی نشانی ان کے لیے مردہ زمین ہے۔ اس کو ہم نے زندہ کیا اور ترجمہ آیات
اس سے غلے اُگائے پس اس میں سے وہ کھاتے ہیں۔ اور اس میں ہم نے کھجوروں اور ۳۳-۵۰
انگوروں کے باغ لگائے اور اس میں چشمے جاری کر دیے کہ وہ اس کے پھل کھائیں، اور
یہ ان کے ہاتھوں کی کارگزاری نہیں ہے تو کیا وہ شکر نہیں کرتے! ۳۳-۳۵
پاک ہے وہ ذات جس نے تمام قسمیں پیدا کیں ان چیزوں میں سے بھی جن کو زمین اگاتی

ہے اور خود ان کے اندر سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو وہ نہیں جانتے ۔ ۳٦

اور ان کے لیے ایک بہت بڑی نشانی رات ہے ۔ ہم اس سے دن کو کھینچ لیتے ہیں پس وہ دفعتہً اندھیرے میں رہ جاتے ہیں اور سورج اپنے ایک معین مدار پر گردش کرتا ہے ، یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے ! اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کے مانند ہو کے رہ جاتا ہے ۔ نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت کر سکتی ۔ ہر ایک اپنے خاص دائرے میں گردش کرتا ہے ۔ ۳۷ ۔ ۴۰

اور ان کے لیے ایک بہت بڑی نشانی یہ ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور ان کے لیے اسی کے مانند (خشکی میں بھی) چیزیں پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں ۔ اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں پھر نہ ان کا کوئی فریاد رس ہوگا اور نہ ان کو نجات مل سکے گی ۔ بس یہ ہماری رحمت اور ایک وقتِ معین تک ان کو بہرہ مند کرنا ہے ۔ ۴۱ ۔ ۴۴

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز سے ڈرو جو تمہارے آگے اور پیچھے ہے کہ تم پر رحم کیا جائے (تو وہ اعراض کرتے ہیں) اور ان کے رب کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے پاس آتی ہے وہ اس سے اعراض ہی کرنے والے بنے رہتے ہیں ۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ تم کو رزق بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو تو جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ان لوگوں کو کھلائیں جن کو خدا چاہتا تو کھلاتا ! یہ تو تم لوگ ایک صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہو ! ۴۵ ۔ ۴۷

اور وہ پوچھتے ہیں کہ یہ دھمکی کب پوری ہوگی اگر تم لوگ سچے ہو! یہ لوگ بس ایک ڈانٹ ہی کے منتظر ہیں جو ان کو آ پکڑے گی اور وہ جھگڑتے ہی رہ جائیں گے! پس نہ تو وہ کوئی وصیت کر پائیں گے اور نہ اپنے لوگوں کے پاس لوٹ ہی سکیں گے۔

---

۴۸ - ۵۰

۵ - الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَۃُ ۚ اَحْیَیْنٰھَا وَاَخْرَجْنَا مِنْھَا حَبًّا فَمِنْہُ یَاْکُلُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا فِیْھَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِیْھَا مِنَ الْعُیُوْنِ ۝ لِیَاْکُلُوْا مِنْ ثَمَرِہٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْہُ اَیْدِیْھِمْ ۭ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ (۳۳-۳۵)

دلیل ربوبیت سے خدا کی شکرگزاری اور اس کی عبادت کا مطالبہ

یہ سب سے پہلے زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مردہ زمین کی ازسرِنو زندگی سے قیامت، توحید اور آسمانی ہدایت کے نزول پر جن گوناگوں پہلوؤں سے استشہاد کیا ہے اس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ یہاں ربوبیت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے اور پھر خدا کی شکرگزاری کے حق کا مطالبہ کیا ہے جو بندوں پر لازماً عائد ہوتا ہے۔ اس شکر کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندے تنہا اپنے رب ہی کی بندگی کریں اس لیے کہ ان نعمتوں میں سے کوئی نعمت بھی نہ تو انسان کی اپنی سعی و تدبیر سے وجود میں آئی ہے اور نہ کوئی دوسرا ان کو وجود میں لانے والا بنا ہے۔

'وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَۃُ' لفظ 'اٰیَۃٌ' کی تنکیر تفخیم شان پر دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو اگر کسی نشانی کی طلب ہے تو اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے لیے ایک سب سے بڑی نشانی ان کے پاؤں کے نیچے بچھی ہوئی یہ زمین ہی ہے۔ یہ بالکل مردہ ہوتی ہے، ہم اپنی بارش بھیج کر اس کو زندہ کرتے اور پھر اس سے غلے پیدا کرتے ہیں اور ان غلوں ہی پر ان کی معاش کا انحصار ہے۔ پھر یہ غور کریں تو ان کو معلوم ہوگا کہ ہم نے ان کی معاش کے لیے صرف غلے ہی کا انتظام نہیں کیا ہے بلکہ ہم نے اس میں ان کے لیے کھجور اور انگور اور دوسرے پھلوں کے باغ بھی اگائے ہیں اور ان باغوں کو شاداب رکھنے کے لیے چشمے بھی جاری کر دیے ہیں۔

'لِیَاْکُلُوْا مِنْ ثَمَرِہٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْہُ اَیْدِیْھِمْ ۭ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ' یہ اس تمام اہتمام ربوبیت کا حق بیان فرمایا ہے کہ یہ سارا اہتمام ہم نے اس لیے کیا کہ بندے ہماری نعمتوں سے بہرہ مند ہوں اور اس امر پر دھیان کریں کہ یہ ان کے ہاتھوں کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ ایک رب رحیم و کریم و منعم کی بخشش ہے

جس نے ان کو بغیر کسی استحقاق کے ان نعمتوں سے بہرہ مند کیا ہے کہ وہ اس کے شکرگزار و فرمانبردار بنیں۔ لیکن ان کی ناسپاسی کا یہ حال ہے کہ یہ تمام نعمتوں سے فائدہ تو اٹھا رہے ہیں لیکن جب ان کو خدا کی شکرگزاری کی دعوت دی جاتی ہے تو اکڑتے اور نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔

زبان کا ایک نازک اسلوب

'مِنْ ثَمَرِہٖ' کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں اہلِ تاویل کا اختلاف ہے۔ اکثر لوگوں نے اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کو مانا ہے۔ (یعنی لوگ اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے پھل کھائیں اور اس کے شکرگزار رہیں) اس تاویل میں مجھے تکلف محسوس ہوتا ہے۔ اوپر سے اسلوب کلام متکلم کا چلا آ رہا ہے اس وجہ سے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے یہاں 'مِنْ ثَمَرِہٖ' کے بجائے 'مِنْ ثَمَارِنَا' یا اس کے ہم مطلب کوئی اور اسلوب ہوتا اگرچہ یہ بھی کچھ موزوں نہ ہوتا۔ میرے نزدیک اس ضمیر کا مرجع 'ارض' ہی ہے جس کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے لیکن اس کے لیے یہاں ضمیر مذکر اس اسلوب پر آئی ہے جس کو اہلِ ادب 'علی سبیل التاویل' سے تعبیر کرتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ قاعدہ ہے کہ بعض مرتبہ ضمیر لفظ کے ظاہر کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کے مفہوم کے اعتبار سے آتی ہے۔ اس کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ یہاں 'ارض' کے لیے مذکر ضمیر استعمال کر کے یہ اشارہ فرما دیا کہ اس سے 'بلد طیب' مراد ہے۔ اس لیے کہ بارش ہونے کو تو ہر خشک و تر اور ہر بنجر اور زرخیز زمین پر ہوتی ہے لیکن بار آور وہی زمین ہوتی ہے جو زرخیز ہوتی ہے۔ یہ مضمون سورۂ اعراف میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ 'وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذْنِ رَبِّہٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا' (اعراف: ۵۸) (اور جو زمین زرخیز ہوتی ہے اس کی نباتات تو اس کے رب کے حکم سے خوب اگتی ہیں اور جو زمین ناقص ہوتی ہے اس سے ناقص ہی چیز اگتی ہے)۔

'وَمَا عَمِلَتْہُ اَیْدِیْھِمْ' یہ جملہ معترضہ کے محل میں ہے اور یہ ایک نہایت اہم یاد دہانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان پھلوں کو کھائیں اور یہ یاد رکھیں کہ ان کو وجود میں لانے والے وہ نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی حقیقت کا تذکر ہی آدمی کے اندر شکر کا جذبہ ابھارتا ہے اور یہی شکر تمام دین کی بنیاد ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں وہ اللہ کی نعمتوں کو اپنے استحقاق اور اپنی قابلیت و صلاحیت کا کرشمہ سمجھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خدا کے شکرگزار بندے بننے کے بجائے استکبار میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ استکبار اپنی فطرت کے اعتبار سے شرک اور تمام فساد فی الارض کا پیش خیمہ ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّھَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِھِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۶)

توحید پر استدلال

لفظ 'ازواج' انواع و اقسام کے معنی میں بھی آتا ہے اور جوڑے جوڑے کے مفہوم میں بھی۔ یہاں یہ دونوں ہی معنوں کا جامع ہے۔ زمین سے جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں ان کو دیکھیے تو ان کے اندر گوناگونی اور تنوع بھی ہے اور ہر چیز جوڑے جوڑے کی شکل میں بھی نظر آتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کو دیکھیے تو ان کی شکلوں، رنگوں، قامتوں اور زبانوں میں عظیم فرق نظر آئے گا اور ساتھ ہی ان کے اندر جوڑے جوڑے

ہونے کا وصف بھی پایا جاتا ہے۔ یہی حال اس عالم کے اس حصہ کا ہے جو ہمارے علم کی رسائی سے باہر ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھ کر غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی آپ پر واضح ہو گی کہ اس کے تنوع کے اندر مقصد کی ہم آہنگی اور اس کے تضاد کے اندر توافق کی سازگاری پائی جاتی ہے۔ یہ چیز اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کائنات پر ایک ہی خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ارادہ کارفرما ہے۔ کوئی دوسرا اس میں دخیل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہے اور اس کی اس پاکی کی شہادت اس کائنات کی ہر چیز دے رہی ہے۔

آخرت کی دلیل

نیز یہ بات بھی واضح ہوئی کہ جب ہر چیز جوڑا جوڑا ہے اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے تو لازم ہے اس دنیا کا بھی کوئی جوڑا ہو ورنہ یہ بالکل بے مقصد، بے غایت ہو کے رہ جاتی ہے اور یہ بات ایک حکیم خالق کی شان سے بعید ہے کہ وہ کوئی عبث اور بے مقصد کام کرے۔ چنانچہ اس دنیا کے اس خلا کو بھرنے کے لیے اس نے آخرت بنائی ہے۔

آیت کا مدعا یہ ہوا کہ یہ کائنات اپنے وجود سے توحید اور آخرت کی شہادت دے رہی ہے اور اس کا خالق اس بات سے پاک ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو یا اس نے یہ دنیا بالکل بے مقصد بنائی ہو۔ لفظ سُبْحٰنَ تنزیہہ کے لیے آتا ہے۔ یہاں اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الَّیْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْہُ النَّھَارَ فَاِذَا ھُمْ مُّظْلِمُوْنَ (۳۷)

شب اور روز کی نشانی

فرمایا کہ اگر یہ لوگ غور کریں تو ان کے لیے رات بھی خدا کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور توحید کی ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ ہم اس کے اوپر ایک نور کی چادر اوڑھا دیتے ہیں تو ان کے لیے روشن دن نمودار ہو جاتا ہے جس میں وہ اپنے کام کاج انجام دیتے ہیں۔ پھر ہم اپنی یہ نورانی چادر اس سے کھینچ لیتے ہیں تو وہ تاریکی میں ہو جاتے ہیں جس میں وہ آرام کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنی یہ نورانی چادر نہ اوڑھائیں تو ہمیشہ تاریکی ہی میں رہیں اور اگر اس چادر کو نہ کھینچیں تو ان کو کبھی شب کا سکون نہ میسر ہو۔ روز و شب کا یہ ایاب و ذہاب اور خلق کے مفاد کے لیے ان کی یہ سازگاری اس بات کی صاف دلیل ہے کہ یہ دنیا اضداد کی کوئی رزم گاہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک خالق کی بنائی ہوئی دنیا ہے جو اس کے تمام اضداد کو اس کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّھَا ؕ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۳۸)

سورج کی نشانی

یہ دن کے اندر ظاہر ہونے والی سب سے بڑی نشانی کی طرف توجہ دلائی کہ اس سورج کو دیکھیں کہ یہ پوری پابندی کے ساتھ اپنے ایک معین محور و مدار پر گردش کرتا ہے۔ مجال نہیں کہ اپنے محور و مدار سے ذرا ہٹ سکے یا اس کی پابندئ اوقات میں منٹ یا سیکنڈ کا بھی فرق پیدا ہو سکے۔ کیا یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے آپ سے آپ ہو رہا ہے، اس کے پیچھے کوئی مدبر

اور کارفرما طاقت نہیں ہے؟ یا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے ایک قاہر و مقتدر اور علیم و حکیم ہستی ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی باگ ہے اور وہ اپنے بنائے ہوئے نقشہ اور اپنے قرار داد منصوبہ کے مطابق ہر چیز کو استعمال کر رہی ہے؟ اس کا صحیح جواب، عقل و فطرت کے مطابق، صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ یعنی یہ دنیا نہ تو اتفاق سے وجود میں آئی ہوئی کوئی چیز ہے اور نہ یہ آپ سے آپ چل رہی ہے بلکہ یہ ایک ایسی ہستی کی پلاننگ کا کرشمہ ہے جو ہر چیز پر قادر و غالب اور ہر چیز کا علم رکھنے والی ہے۔

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ (۳۹)

چاند کی نشانی — فرمایا کہ یہی حال اس دنیا کی دوسری سب سے بڑی نشانی —— چاند —— کا ہے۔ وہ بھی نہ خود کار ہے، نہ خود مختار، بلکہ ہم نے اس کے لیے منزلیں ٹھہرا رکھی ہیں جو ہر ماہ اس کو طے کرنی پڑتی ہیں یہاں تک کہ یہ منزلیں طے کرتے کرتے وہ بالآخر کھجور کی پرانی ٹہنی کے مانند ہو کے رہ جاتا ہے۔

عُرْجُوْن، کھجور کی اس ٹہنی کو کہتے ہیں جس میں خوشے لگتے ہیں۔ یہ ٹہنیاں خشک ہونے کے بعد خمدار ہو کر بالکل وہ شکل اختیار کر لیتی ہیں جو شکل آخری اور ابتدائی تاریخوں میں چاند کی ہوتی ہے۔ یہ تشبیہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جس چاند کو نادان لوگ پوجتے ہیں اس غریب کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ ہر ماہ اس کو مختلف منازل فلکی طے کرنی پڑتی ہیں جس سے وہ سوکھ کے کانٹا اور اس طرح خمیدہ کمر ہو کے رہ جاتا ہے جس طرح کھجور کی سوکھی ٹہنی۔

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۴۰)

ساری کائنات ایک ہی خدا کے ہاتھ میں ہے — یعنی اس کائنات کا سارا نظام اس کے خالق نے اس طرح اپنے قابو میں کر رکھا ہے کہ نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ اپنے مدار سے نکل کر چاند کے مدار میں جا گھسے اور اس کو پکڑ لے اور نہ رات کی مجال ہے کہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی دن پر سبقت کر جائے بلکہ ان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے دائرے میں گردش کرنی پڑتی ہے —— یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز کی باگ ایک ہی خدائے قدیر و علیم کے ہاتھ میں ہے اور وہی تنہا ہر چیز کا مالک و مختار ہے۔ اگر اس کے سوا کسی اور کا بھی اس میں کوئی دخل ہوتا تو یہ دنیا اپنے اضداد کے تصادم میں تباہ ہو جاتی۔ خاص طور پر یہ حقیقت تو بالکل نمایاں ہے کہ جو چیزیں جتنی ہی زیادہ نمایاں ہیں اور جن کے نمایاں ہونے ہی کی بنا پر قوموں نے ان کو معبود مان کر ان کی پرستش کی وہ اپنے وجود ہی سے یہ اعلان کر رہی ہیں کہ وہ سب سے زیادہ مسخر و محکوم ہیں، مجال نہیں ہے کہ وہ اپنے دائرۂ کار سے ایک انچ بھی اِدھر یا اُدھر سرک سکیں۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۙ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا

یَرْکَبُوْنَ ۝ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِیْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ یُنْقَذُوْنَ ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ (۴۱-۴۴)

کشتی کی نشانی

'ذُرِّیَّتَهُمْ' میں 'هُمْ' سے مراد مخاطب بحیثیت انسان ہیں اور 'ذُرِّیَّة' نسل کے مفہوم میں ہے۔ 'مشحون' بھری ہوئی کشتی کو کہتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر ان کو مزید نشانی کی طلب ہو تو وہ اس بات کو دیکھیں کہ ہم نے نسلِ انسانی کے بحری سفر کے لیے یہ اہتمام کیا ہے کہ ان کی کشتیاں سمندر کے سینہ پر سے ہزاروں ٹن سامان لے کر چلتی ہیں اور نہیں ڈوبتیں۔

خشکی کے سفینے

'وَخَلَقْنَا لَهُمْ الْاٰیَة' فرمایا کہ جس طرح سمندر کے سفر کے لیے ہم نے کشتی بنائی ہے اسی طرح کی چیزیں ہم نے خشکی کے سفر کے لیے بھی بنائی ہیں مثلاً گھوڑے اور اونٹ وغیرہ۔ خاص طور پر اونٹ کو عرب میں سفینۂ صحرا کی حیثیت حاصل تھی۔ اسی حکم میں وہ سواریاں بھی داخل ہیں جو اب سائنس کی مدد سے ایجاد ہوئی ہیں یعنی موٹریں، لاریاں، بسیں، ہوائی جہاز وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں جن قوانین کے تحت کام کرتی ہیں وہ خدا ہی کے بنائے اور اسی کے سکھائے ہوئے ہیں۔ انسان انہی قوانین سے کام لے کر مختلف چیزیں ایجاد کرتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف منسوب فرمایا اس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔

ہر چیز اللہ کے فضل کا کرشمہ ہے

'وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِیْخَ لَهُمْ الْاٰیَة'۔ 'صریخ' فریاد اور فریاد رسی کے معنی میں بھی آتا ہے اور فریاد کرنے اور فریاد رسی کرنے والے کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ تمام معانی کے اعتبار سے موزوں ہے۔ فرمایا کہ یہ ہماری رحمت ہے کہ ان کی لدی پھندی کشتیاں سمندر کے سینہ پر دوڑتی ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ان کو کشتی سمیت غرق کر دیں پھر نہ وہ کوئی فریاد کر سکیں اور نہ کوئی ان کی فریاد رسی کر سکے اور نہ وہ اس ورطۂ ہلاکت سے کسی طرح نجات پا سکیں۔

'اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ' فرمایا کہ انسان کو یہ جو کچھ بھی حاصل ہے نہ اس کے اب وجد کی میراث ہے اور نہ اس کی اپنی قوت و قابلیت کا کرشمہ بلکہ یہ محض خدا کا فضل اور اس کی رحمت ہے جس سے ایک وقتِ خاص تک کے لیے اس نے اس کو بہرہ مند کیا ہے۔ بالآخر وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ تعالیٰ ان تمام نعمتوں سے متعلق پرسش کرے گا کہ ان کا شکر اور حق ادا کیا گیا یا نہیں!

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۴۵)

ناشکروں کو تنبیہ!

یعنی جب ان کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ تمہارے آگے اور پیچھے جو آسمان و زمین ہیں ان سے ڈرو کہ زمین تمہارے سمیت دھنسا نہ دی جائے اور آسمان سے تم پر ٹکڑے نہ گرا دیے جائیں تو وہ متنبہ ہونے کے بجائے اعراض کرتے اور عذاب کی نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ 'اِذَا' کا جواب یہاں بربنائے وضاحت قرینہ محذوف ہے اور 'مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ' کے بعد 'مِنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ' کے الفاظ محذوف ہیں۔ سورۂ

سبا میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔ اَفَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِھِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَیْھِمْ کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ (۹) (کیا وہ اپنے آگے اور پیچھے کے آسمان اور زمین پر غور نہیں کرتے! اگر ہم چاہیں تو ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں یا ان کے اوپر آسمان سے ٹکڑے گرا دیں)۔

وَمَا تَاْتِیْھِمْ مِّنْ اٰیَۃٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّھِمْ اِلَّا کَانُوْا عَنْھَا مُعْرِضِیْنَ (۴۶)

یعنی یہ اعراض و انکار اس طرح ان پر مستولی ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو آیت بھی ان کی تعلیم و تذکیر کے لیے آتی ہے وہ بالکل بے سود ہو کے رہ گئی ہے، کوئی چیز بھی ان کے اوپر کارگر نہیں ہوتی۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰہُ اَطْعَمَہٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۴۷)

ایک جاہلی فلسفہ

اوپر والی آیت میں ان کی جس بے حسی اور سنگدلی کی طرف اشارہ ہے یہ اس کی ایک مثال بیان ہوئی ہے کہ جب ان کو شکر کی دعوت دی جاتی ہے، جیسا کہ اوپر آیت ۳۵ میں ہے۔ لِیَاْکُلُوْا مِنْ ثَمَرِہٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْہُ اَیْدِیْھِمْ ؕ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ تو بر رعونت کے ساتھ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ چنانچہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رزق و فضل تم کو بخشا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ان غریبوں کی مدد کرو جو مدد کے محتاج ہیں تو وہ مسلمانوں کو یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ تمھاری صریح گمراہی ہے کہ جن کو اللہ نے محروم رکھنا چاہا ہے ان کو تم کھلانا چاہتے ہو۔ اگر اللہ ان کو بھی ہماری طرح کھلانا پہنانا چاہتا تو آخر اس کے پاس کس چیز کی کمی تھی لیکن جب اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس نے ان کے لیے یہی چاہا ہے اور جب اس نے ان کے لیے یہی چاہا ہے تو ہم ان کے اوپر کوئی احسان کر کے خدا کو خوش نہیں کریں گے بلکہ اس کی ناراضگی مول لیں گے! ـــــ اس فلسفۂ جاہلی کا حوالہ دے کر اس پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لیے کہ اس کی قساوت و سفاہت اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ مقصود بس یہ دکھانا ہے کہ جب دل بگڑتے ہیں اور عقل الٹتی ہے تو آدمی کا حال یہ ہو جاتا ہے!

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ہ مَا یَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً تَاْخُذُھُمْ وَھُمْ یَخِصِّمُوْنَ ہ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ تَوْصِیَۃً وَّلَآ اِلٰٓی اَھْلِھِمْ یَرْجِعُوْنَ (۴۸-۵۰)

یعنی اللہ کی جو آیتیں ان کو سنائی جاتی ہیں ان پر تو وہ کوئی دھیان نہیں کرتے، بس یہ مطالبہ ان کی طرف سے پیہم ہے کہ جس عذاب سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے وہ ان کو دکھا دیا جائے۔ اس کے بغیر وہ اس کی خبر دینے والوں کو سچا ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

’مَا یَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً الاٰیۃ‘۔ لفظ ’صَیْحَۃ‘ آیت ۲۹ میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ اس

طنطنہ کے ساتھ وہ اس عذاب کا جو مطالبہ کر رہے ہیں تو کس برتے پر کر رہے ہیں! خدا کو اس کے لیے کوئی سروسامان نہیں کرنا ہے۔ اس کی تو بس ایک ڈانٹ ہی ان کے لیے کافی ہوگی۔ وہ ان بحثوں ہی میں پڑے ہوں گے کہ وہ ان کو دبوچ لے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ نہیں آرہا ہے تو اس کے نہ آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کی تیاری نہیں ہو پائی ہے۔ اس کی تیاری میں کوئی کسر نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے سبب سے لوگوں کو مہلت دے رہا ہے۔

'فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ تَوْصِیَۃً الاٰیۃ' یعنی خدا کی وہ ایک ہی ڈانٹ ایسی ہوگی کہ جو جہاں ہے وہ وہیں دبوچ لیا جائے گا۔ اس کو اتنی فرصت بھی نصیب نہیں ہوگی کہ کسی کو کوئی وصیت کر سکے یا اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ سکے۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۵۱-۶۸

آگے واضح فرمایا ہے کہ جس طرح اس دنیا میں کوئی عذاب لانے کے لیے ہماری ایک ہی ڈانٹ کافی ہے اسی طرح جب ہم قیامت لانی چاہیں گے تو اس کے لیے بھی ہمیں کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا ہوگا بلکہ ایک ہی نفخ صور میں سب اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اس کے بعد روزِ قیامت کی تصویر ہے کہ اہل ایمان اس دن اپنی دلچسپیوں میں مگن ہوں گے اور کفار اپنے نتائجِ اعمال سے دوچار ہوں گے۔ اس دن کسی کو زبان سے کچھ بولنے کی اجازت نہیں ہوگی بلکہ ہر شخص کے ہاتھ پاؤں خود اس کے خلاف گواہی دیں گے۔

پھر دھمکی دی ہے کہ یہ لوگ اس ڈھٹائی کے ساتھ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ یہ ہمارے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ہم چاہیں تو ان کو ان کی جگہ ہی پر اس طرح مسخ کر دیں کہ یہ تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے چشم زدن میں بالکل محروم ہو کے رہ جائیں۔ اس کے آثار وہ اس دنیا میں دیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے پاس آنکھیں ہوں۔ اگر ہم نے ان کو مسخ نہیں کیا تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ کام ہمارے لیے مشکل ہے بلکہ یہ ہماری رحمت ہے کہ ہم لوگوں کو ان کی سرکشی کے باوجود مہلت دیتے ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے:

آیات ۵۱-۶۸

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا ھُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾
قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ ھٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ
وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ اِنْ کَانَتْ اِلَّا صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً فَاِذَا ھُمْ

جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿٥٣﴾ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا
تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥٤﴾ إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي
شُغُلٍ فَاكِهُونَ ﴿٥٥﴾ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ
مُتَّكِئُونَ ﴿٥٦﴾ لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُم مَّا يَدَّعُونَ ﴿٥٧﴾ سَلَامٌ
قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ ﴿٥٨﴾ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿٥٩﴾
أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ
عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ وقف غفران
وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ﴿٦٢﴾
هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٦٣﴾ اصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنتُمْ
تَكْفُرُونَ ﴿٦٤﴾ الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ
وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا
عَلَىٰ أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَأَنَّىٰ يُبْصِرُونَ ﴿٦٦﴾ وَلَوْ نَشَاءُ
لَمَسَخْنَاهُمْ عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوا مُضِيًّا وَلَا يَرْجِعُونَ ﴿٦٧﴾ ع ٤ ٣
وَمَن نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۖ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٨﴾

ترجمۂ آیات ۵۱-۶۸

اور صور پھونکا جائے گا تو وہ دفعۃً قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے
وہ کہیں گے، ہائے ہماری بدبختی! ہم کو ہماری قبر سے کس نے اٹھا کھڑا کیا! ـــــ یہ تو وہی
چیز ہے جس کا خدائے رحمان نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں کی بات سچی نکلی! بس وہ ایک ڈانٹ
ہوگی! بس وہ دفعۃً سب کے سب ہمارے حضور حاضر کر دیے جائیں گے۔ ۵۱-۵۳

پس آج کے دن کسی جان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ اور تم کو بس وہی بدلے میں ملے گا جو تم کرتے رہے ہو۔ بے شک اہل جنت آج اپنی دلچسپیوں میں مگن ہوں گے۔ وہ اور ان کی بیویاں، سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھیں گے۔ اور اس میں ان کے لیے میوے ہوں گے اور ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ مانگیں گے۔ ان کو سلام کہلایا جائے گا پروردگار رحیم کی طرف سے! ۵۴-۵۸

اور اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ۔ اور اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تمھیں یہ ہدایت نہیں کر دی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کیجیو، بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری ہی بندگی کیجیو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ اور اس نے تم میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر دیا، تو کیا تم سمجھتے نہیں تھے! یہ ہے وہ جہنم جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا ہے۔ اب اپنے کفر کی پاداش میں اس میں داخل ہو جاؤ۔ ۵۹-۶۴

آج ہم ان کے مونہوں پر مہر کر دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم کو بتائیں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ ۶۵

اور اگر ہم چاہتے تو ان کی آنکھیں مٹا دیتے پھر وہ راستہ کی طرف بڑھتے تو کس طرح دیکھ پاتے! اور اگر ہم چاہتے تو ان کی جگہ ہی پر ان کو مسخ کر دیتے تو نہ وہ آگے بڑھ سکتے اور نہ پیچھے لوٹ سکتے۔ اور جس کو ہم زیادہ عمر دیتے ہیں ہم اس کو اس کی خلقت میں پیچھے لوٹا دیتے ہیں تو کیا وہ سمجھتے نہیں؟ ۶۶-۶۸

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ (۵۱)

تاخیرِ عذاب کی حکمت

اوپر کی آیات ۴۸-۴۹ میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ رسول کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے اگر وہ ٹل رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے لیے کوئی خاص تیاری کرنی ہے جو ابھی نہیں ہو پا تی ہے۔ وہ عذاب بھیجنا چاہے تو اس کے لیے بس اس کی ایک ہی ڈانٹ کافی ہے۔ اب یہ فرمایا کہ یہی حال قیامت کا بھی ہے۔ اس کے لانے کے لیے بھی خدا کو کوئی خاص اہتمام و انتظام نہیں کرنا پڑے گا، بلکہ جوں ہی صور پھونکا جائے گا لوگ بھاگتے ہوئے اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے مطلب یہ ہے کہ جو لوگ رسول کو زچ کرنے کے لیے عذاب یا قیامت کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ ان کاموں میں سے کوئی کام بھی اللہ کے لیے ذرا مشکل نہیں ہے۔ یہ تو چشم زدن میں ہو جانے والے کام ہیں۔ اگر اس کے باوجود نہیں ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر توبہ اور اصلاح کر لیں۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ؀ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾

مذاق اڑانے والوں کا حال قیامِ قیامت کے وقت

یعنی یہ مذاق اڑانے والے لوگ اس وقت گھبراہٹ اور سراسیمگی میں اپنے سر پیٹیں گے اور کہیں گے کہ یہ کس نے ہم کو ہماری قبروں سے اٹھا کھڑا کیا! یہ سوال تحقیق کے لیے نہیں بلکہ اپنی بدبختی کے اظہار کے لیے وہ کریں گے کہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد اٹھنا نہیں ہو گا لیکن یہ تو واقعۃً ثابت ہوا!

'هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ'۔ یہ ان کے قول کا حصہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تو وہی بات ہوئی جس کی خدائے رحمان کی طرف سے ہم کو آگاہی دی گئی تھی، رسولوں کی بات بالکل سچی نکلی۔ اور اس کا بھی امکان ہے کہ یہ بات فرشتوں کی زبانی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وقت ان کی تذلیل کے لیے فرمائی جائے کہ اب اپنی بدبختی پر سر پیٹو، یہ وہی چیز تمہارے سامنے آئی ہے جس سے خدائے رحمان نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے تم کو آگاہ کر دیا تھا لیکن تم نے ان کی کوئی پروا نہیں کی۔ میرا رجحان اس دوسری بات کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے نظائر سے واضح تائید اسی کی نکلتی ہے۔ سورۂ صافات میں ہے۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ؁ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ؁ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۱۹-۲۱)	بس وہ ایک ڈانٹ ہی ہوگی کہ دفعتہً وہ اٹھ کے تاکنے لگیں گے اور کہیں گے۔ ہائے ہماری بدبختی! یہ تو جزا و سزا کا دن آگیا ___ یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

اس میں آخری فقرہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بالکل بروقت ان کی تفضیح کے لیے کہلایا جائے گا۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

یہ سب کچھ بالکل چشم زدن میں، محض ہماری ایک ڈانٹ سے ہو جائے گا۔ اس کے لیے نہ ہمیں وہ دھے

بنانے پڑیں گے، نہ توپیں نصب کرنی پڑیں گی۔ جس طرح ہم اپنے کلمۂ کُن سے جو چیز چاہیں وجود میں لا سکتے ہیں اسی طرح اپنی ایک ڈانٹ سے جو قیامت برپا کرنی چاہیں برپا کر سکتے ہیں۔ 'جمیع' تاکید کے لیے ہے مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ پھر کوئی ہم سے بچ کے نکل سکے گا۔ اس کے بعد ان کے سب چھوٹے اور بڑے، امیر اور مامور، عابد اور معبود پکڑ کر ہمارے حضور حاضر کر دیے جائیں گے۔ 'مُحْضَرُوْنَ' ان کی ذلت کی تصویر کے لیے ہے کہ وہ اس طرح ہمارے سامنے حاضر کیے جائیں گے جس طرح مجرم عدالت کے سامنے حاضر کیے جاتے ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۵۴)

ہر ایک کے سامنے اس کا اپنا ہی عمل آئے گا

اس آیت میں تصویرِ حال کا اسلوب ہے۔ گویا وہ دن سامنے ہے اور مخاطب سے یہ بات کہی جا رہی ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔

فرمایا کہ آج عدلِ کامل کے ظہور کا دن ہے۔ آج کسی جان پر ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔ 'وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ'۔ یہ اسی عدلِ کامل کا بیان ہے کہ آج جس اصول پر لوگوں کے ساتھ معاملہ ہوگا وہ یہ ہے کہ جس نے جو کچھ کیا ہوگا وہی وہ بدلے میں پائے گا۔ ظاہر ہے کہ جب اپنی ہی کمائی سامنے آنے والی ہے تو اس میں کسی ظلم و ناانصافی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فَاكِهُونَ ۝ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِئُونَ ۝ لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُمْ مَا يَدَّعُونَ ۝ سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبٍّ رَحِيمٍ (۵۵-۵۸)

اہلِ جنت کی تصویر

اس دن اہلِ جنت کا جو حال ہوگا یہ اس کی تصویر ہے۔ فرمایا کہ اس دن اہلِ جنت اپنی خاص دلچسپی میں مگن ہوں گے۔ 'شُغُل' کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے ہے۔

'هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ الآیۃ' یہ ان کی بیویوں کا ذکر آیا ہے کہ وہ بھی ان کی دلچسپیوں میں شریک ہوں گی۔ ان کا ذکر خاص اہتمام سے اس لیے ضروری ہوا کہ آدمی کی کوئی دلچسپی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس کے اہل و عیال بھی اس میں شریک نہ ہوں۔ 'عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِئُونَ' یہ سب سے اعلیٰ نشست کی تصویر ہے۔ اس زمانے میں بادشاہ اور ملکہ مزین تختوں ہی پر ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے۔ اہلِ جنت اپنی ابدی بادشاہی میں اسی طرح بیٹھیں گے۔

'لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ الآیۃ' اس میں ان کے آگے پھل پیش کیے جائیں گے اور مزید جو کچھ وہ طلب کریں گے 'مَا يَدَّعُونَ' یعنی 'مَا يَشْتَهُونَ' جو کچھ وہ چاہیں گے وہ سب ان کے لیے حاضر ہوگا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس دنیا میں کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی نہ اب تک یہ درجہ حاصل ہو سکا ہے اور نہ آئندہ کبھی حاصل ہو سکے گا کہ وہ جو کچھ چاہے اس کے لیے وہ فوراً حاضر کر دیا جائے۔ لیکن اہلِ جنت کو جنت میں یہ درجہ حاصل ہوگا اور ہمیشہ حاصل ہوگا۔

سب سے بڑی سرفرازی

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ۔ یہ اس سب سے بڑی سرفرازی کا ذکر ہے جو اہلِ جنت کو جنت میں حاصل ہوگی کہ ربِ رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہلایا جائے گا۔ میرے نزدیک جملہ کی تالیف یوں ہے: تَحِیَّتُھُمْ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ، مبتدا یہاں حذف کر دیا گیا ہے تاکہ مخاطب کی ساری توجہ خبر پر مرکوز ہو جائے۔ سورۂ احزاب میں ارشاد فرمایا ہے۔ تَحِیَّتُھُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَہٗ سَلٰمٌ (۴۴) (اور ان کا خیر مقدم جس دن وہ اس سے ملیں گے سلام سے ہوگا) احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے جنت کے تمام دروازوں سے داخل ہوں گے اور اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچائیں گے ـــــ کون اندازہ کر سکتا ہے اہلِ جنت کی اس سرفرازی کا کہ ان کو ربِ رحیم و کریم کی طرف سے سلام و پیغام موصول ہوں گے!

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست!

وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّھَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ۚ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ ۚ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْکُمْ جِبِلًّا کَثِیْرًا ۭ اَفَلَمْ تَکُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ (۵۹-۶۲)

مجرموں کا حشر

اہلِ جنت کا حال بیان کرنے کے بعد اب یہ مجرموں کا حشر بیان ہو رہا ہے۔ ان کو حکم ہوگا کہ اے مجرمو! دنیا میں تم میرے باایمان بندوں کے ساتھ رلے ملے رہے اس لیے کہ دنیا دار الامتحان تھی لیکن اب جزائے اعمال کا دن آگیا۔ اس وجہ سے اب تم میرے باایمان بندوں سے الگ ہو جاؤ اور اپنے اعمال کی سزا بھگتو۔ اب تمہاری دنیا الگ اور ان کی دنیا الگ ہے۔

اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ الاٰیۃ۔ عَھِدَ، کا صلہ جب اِلٰی، کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ضامن اور ذمہ دار بنانے کے ہوتے ہیں۔ مثلاً وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ (البقرۃ ۱۲۵) (اور ہم نے ابراہیم و اسمٰعیل کو اس بات کا ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھنا) یہ مجرموں کو اس وقت بطور ملامت یاد دہانی کی جائے گی کہ آدم کے بیٹو! کیا میں نے تم کو اس عہد کا پابند نہیں کیا تھا کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے بلکہ صرف میری ہی بندگی کرنا۔ یہ نہایت سیدھی راہ ہے جس پر چلنے والے مجھ تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن تم ایسے بدقسمت نکلے کہ اس نے تمہارے اندر سے ایک خلقِ کثیر کو گمراہ کر ڈالا! کیا تم اتنی عقل و تمیز نہیں رکھتے تھے کہ اپنے دوست اور دشمن میں امتیاز کر سکتے اور اس بات کو یاد رکھتے کہ اس نے اپنے فریب سے تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوایا اور اولادِ آدم کے ساتھ اس کی دشمنی قیامت تک کے لیے ہے۔

شیطان کی دشمنی، شیطان کے چیلنج، اولادِ آدم کو اللہ تعالیٰ کی یاد دہانی اور اس سلسلہ کے دوسرے امور جن کی طرف یہاں اشارہ ہے پچھلی سورتوں، خاص طور پر بقرہ اور اعراف میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں۔ ان اجمالات کو ان کی روشنی میں سمجھیے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۶۳-۶۴)

یعنی اگر تم نے میرے عہد اور میری تنبیہ کو یاد نہیں رکھا تو اس کا انجام اب اس جہنم کی صورت میں تمہارے سامنے ہے۔ اس سے میرے رسول اور میرے نیک بندے تم کو ڈراتے رہے لیکن تم برابر ان کی باتوں کا انکار کرتے رہے۔ اب اس میں داخل ہو، یہی تمہارا ٹھکانا ہے۔

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ (۶۵)

ہاتھ پاؤں کی گواہی

اوپر کی آیات میں اسلوبِ کلام خطاب کا تھا، اس آیت میں غائب کا ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر کی آیات میں زجر و ملامت ہے جس کے لیے موزوں اسلوب خطاب ہی کا ہے اور اس آیت میں ان کی بے بسی کی تصویر ہے جس کے لیے غائب کا اسلوب زیادہ موزوں ہے۔ فرمایا کہ آج کے دن ہم ان کے مونہوں پر مہر کر دیں گے اور ان کے ہاتھ اور پاؤں کو ناطق بنا دیں گے جو ان کی ساری کارستانیوں کی سرگزشت ہم کو سنا دیں گے۔ مونہوں پر مہر کر دینے کی وجہ یہ ہو گی کہ زبان جھوٹ بھی بول سکتی ہے اور عذر بھی تراش سکتی ہے لیکن ہاتھ پاؤں وہی بیان کریں گے جو انھوں نے کیا ہو گا۔ اس طرح انسان پر خود اس کے اعضاء و جوارح حجت قائم کر دیں گے اور یہ حجت تمام حجتوں پر بھاری ہو گی — یہ مضمون سورۂ رحمان میں بھی ہے — فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ (الرحمٰن: ۳۹، ۴۱) (پس اس دن کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بابت پرسش کی نوبت نہیں آئے گی۔ ۔ ۔ ۔ مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچان لیے جائیں گے پس ان کی چوٹیاں اور ان کی ٹانگیں پکڑ کے جہنم میں پھینک دیا جائے گا)۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓی اَعْیُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰی یُبْصِرُوْنَ (۶۶)

تنبیہ و تہدید

یعنی جب ان کا حال یہ ہے کہ اپنی ان صلاحیتوں سے جو اللہ نے ان کو بخشی ہیں کوئی کام ہی نہیں لے رہے ہیں تو یہ مستحق ہیں کہ ہم ان سے ان کو محروم کر دیں اور یہ کام ہمارے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ہم چاہتے تو ان کی آنکھیں مٹا دیتے، پھر یہ راستہ کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے لیکن ان کو راہ نہ ملتی۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا تو یہ ہماری رحمت ہے اور اب بھی ان کے لیے موقع ہے کہ یہ ہماری اس رحمت سے فائدہ اٹھائیں اور آنکھیں بند کر کے زندگی نہ گزاریں — 'لَوْ' شرط فی الماضی کے لیے آتا ہے اور ہمارے نزدیک یہاں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ یعنی 'وَلَوْ كُنَّا نَشَآءُ'۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰی مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِیًّا وَّلَا یَرْجِعُوْنَ (۶۷)

اسی طرح اگر ہم چاہتے تو ان کو ان کی جگہ ہی پر مسخ کر کے رکھ دیتے تو پھر نہ وہ آگے ہی کو بڑھ سکتے اور نہ پیچھے ہی کو پلٹ سکتے لیکن یہ ہماری عنایت ہے کہ ہم نے ایسا نہیں کیا بلکہ ان کو مہلت دیے ہوئے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو سنبھل جائیں اور خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کا حق پہچانیں، ان کی قدر کریں اور اپنے رب

کے شکر گزار بندے بنیں۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۖ أَفَلَا يَعْقِلُونَ (۶۸)

انسانی زندگی کے احوال سے اوپر کے دعوے کی دلیل — اوپر جو دھمکی دی گئی ہے یہ انسانی زندگی کے احوال و مشاہدات سے اس کی دلیل دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لوگوں کی قوتوں اور صلاحیتوں کو مسخ کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ انسان جب وجود میں آتا ہے تو وہ ایک مضغۂ گوشت ہوتا ہے پھر اللہ تعالیٰ درجہ بدرجہ اس کو قوت و توانائی بخشتا ہے یہاں تک کہ وہ جوانی کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے بھرپور ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے اوپر بڑھاپا طاری ہونا شروع ہوتا ہے اور درجہ بدرجہ وہ اسی ضعف و ناتوانی کی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے جس میں وہ اپنی ولادت کے وقت مبتلا تھا ـــــ قرآن نے اس حالت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔ "اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً" (الروم: ۵۴) (اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ناتوانی سے، پھر ناتوانی کے بعد اس نے توانائی بخشی پھر توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا) یہ عام حالت کی تصویر ہے۔ ہر شخص جو جوانی اور پیری کے مراحل سے گزرتا ہے اس کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ قوتوں اور صلاحیتوں کی ناتوانی کا اس سے کہیں زیادہ تجربہ ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کو ارذل عمر کے مرحلے سے سابقہ پڑتا ہے۔ قرآن نے ان کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔ "وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ إِلٰى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا" (النحل: ۷۰) (اور تم میں بعض وہ بھی ہوتے ہیں جو ارذل عمر کو پہنچا دیے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہیں جانتے)۔

آیت زیر بحث میں اسی صورت حال کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس دنیا میں تم دیکھتے ہو کہ جس کی عمر ہم زیادہ کرتے ہیں درجہ بدرجہ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں میں ہم اس کو پیچھے کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ یعنی جس ناتوانی کے دور سے وہ زندگی کا آغاز کرتا ہے اسی ناتوانی کی طرف پھر وہ واپس لوٹا دیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں خدا ہی کی بخشی ہوئی ہیں وہ جب چاہے ان کو واپس لے سکتا ہے اور اس طرح واپس لے سکتا ہے کہ کسی کو اپنے دہنے بائیں کا بھی کچھ ہوش باقی نہ رہے تو حیف ہے ان لوگوں پر جو اللہ کی ان نعمتوں کی قدر نہ کریں اور ان کو پا کر خدا کے شکر گزار ہونے کے بجائے استکبار میں مبتلا ہو جائیں۔

"تنکیس" اور "نکس" کو عام اہل لغت بالکل ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ یعنی کسی شے کو پیچھے کی طرف لوٹا دینا۔ لیکن میرے نزدیک تنکیس میں تدریج کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے یعنی درجہ بدرجہ کسی چیز کو پیچھے کی طرف لوٹانا۔ قرآن میں یہ دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں اور دونوں جگہ یہ فرق ملحوظ ہے۔ لفظ "خلق" یہاں "خلقت" کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں یہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۶۹-۸۳

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ خاتمہ میں تمہید کے مضمون کو، ایک نئے اسلوب سے پھر لے لیا ہے:

یاد ہوگا، سورہ کا آغاز قرآن حکیم کی قسم سے ہوا ہے اور اس حکیمانہ کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی دلیل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اس کتاب کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے امیوں پر عظیم احسان فرمایا ہے لیکن اس پر ایمان وہی لائیں گے جن کے اندر زندگی کی رمق ہوگی۔ اس تمہید کے بعد کلام کا رخ قرآن کے دعاوی کے اثبات کی طرف مڑ گیا ہے۔ یہاں بھی غور کیجیے تو وہی بات ایک نئے اسلوب سے آئی ہے۔ پہلے ان مخالفین کی تردید ہے جو قرآن کو شاعری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر قرار دیتے تھے۔ پھر یہ واضح فرمایا ہے کہ کن لوگوں پر یہ کلام اثر انداز ہوگا اور کون لوگ اس سے محروم رہیں گے۔ اس کے بعد ربوبیت کی بعض واضح آیات کی طرف اشارہ کر کے اس دعوتِ شکر کا اعادہ کیا ہے جس پر اس سورہ کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد کلام کا رخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کی طرف مڑ گیا ہے کہ لوگ تمہاری مخالفت میں جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا غم نہ کرو، جو لوگ اللہ پر بھی پھبتیاں چست کرنے سے باز نہیں آتے وہ اگر تمہارا مذاق اڑائیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۶۹-۸۳

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۶۹﴾ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۰﴾ اَوَلَمْ
يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾
وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ
وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ
يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾
فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَمْ وقف لازم
يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾ وَ
ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿۷۸﴾
قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۙ ﴿۷۹﴾
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ

تُوْقِدُوْنَ ﴿٨٠﴾ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ

وقف غفران عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۭ بَلٰى ۤ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿٨١﴾ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ

اِذَآ اَرَادَ شَـيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٨٢﴾ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ

ع ۵ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٨٣﴾

ترجمۂ آیات ۶۹-۸۳

اور ہم نے اس کو شعر کی تعلیم نہیں دی ہے اور یہ اس کے شایانِ شان بھی نہیں۔ یہ تو بس یاددہانی اور نہایت واضح قرآن ہے تاکہ وہ ان لوگوں کو آگاہ کر دے جن کے اندر زندگی ہے اور کافروں پر حجت تمام ہو جائے۔ ۶۹-۷۰

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ہم نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے چوپائے پیدا کیے، پس وہ ان کے مالک ہیں! اور ہم نے ان کو ان کا مطیع بنا دیا، پس ان میں سے بعض پر وہ سوار ہوتے ہیں اور بعض سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں اور ان میں ان کے لیے دوسری منفعتیں اور پینے کی چیزیں بھی ہیں۔ تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔ ۷۱-۷۳

اور انھوں نے اس توقع پر اللہ کے سوا دوسرے معبود بنائے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی۔ وہ ان کی مدد نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ وہ ان کی حاضر کی ہوئی فوج بنیں گے۔ تو ان کی بات تم کو مبتلائے غم نہ کرے، ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ ۷۴-۷۶

کیا انسان نے غور نہیں کیا کہ ہم نے اس کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا تو وہ ایک کھلا ہوا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا! اور اس نے ہم پر ایک پھبتی چست کی اور اپنی پیدائش کو بھول گیا! کہتا ہے کہ بھلا ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے جب کہ وہ بوسیدہ ہو جائیں گی! کہہ دو ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ اور وہ ہر مخلوق سے اچھی طرح باخبر ہے۔

وہی ہے جس نے تمہارے لیے سرسبز درخت سے آگ پیدا کر دی پس تم اس سے آگ جلا لیتے ہو۔ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ ان کی جیسی مخلوق پیدا کرنے پر قادر نہیں! ہاں وہ قادر ہے اور وہی اصل پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے۔ اس کا معاملہ تو بس یوں ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۷۷-۸۳

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (۶۹)

شعر و شاعری نبوت کے شایان شان نہیں ہے

ضمیر مفعول کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ ان لوگوں کے خیال کی تردید ہے جو قرآن کو شاعری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شاعر قرار دیتے تھے۔ فرمایا کہ نہ ہم نے اپنے رسول کو شعر کی تعلیم دی، نہ یہ چیز اس کے شایان شان ہی ہے۔ یہ ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو قرآن کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کو محض اس کے پیش کرنے والے کی شاعرانہ جادو بیانی کا کرشمہ قرار دیتے تھے تاکہ ان کے عوام پر یہ اثر نہ پڑنے پائے کہ وہ اس کی تاثیر و تسخیر سے مرعوب ہو کر اس کو آسمانی کتاب مان لیں۔ عوام کو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے برگشتہ کرنے کے لیے وہ کہتے تھے کہ قرآن ہے تو بے شک ایک نہایت فصیح و بلیغ کلام لیکن اس کی یہ فصاحت و بلاغت اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ کوئی آسمانی وحی ہے، جیسا کہ اس کا پیش کرنے والا دعویٰ کرتا ہے، بلکہ جس طرح ہمارے اونچے درجے کے شاعروں کے کلام میں تاثیر و تسخیر ہے اسی طرح اس شخص کے کلام میں بھی تاثیر و تسخیر ہے۔ اس وجہ سے اس شخص کو زیادہ سے زیادہ ایک اونچے درجے کا شاعر سمجھنا چاہیے نہ کہ ایک نبی اور رسول اور اس قرآن کو ایک شاعرانہ کلام ہی کا رتبہ دینا چاہیے نہ کہ وحی و الہام کا۔ قرآن نے ان کے اس خیال کی مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ تردید کی ہے۔ خاص طور پر سورۂ شعراء میں اس فرق کو نہایت تفصیل سے نمایاں فرمایا ہے جو ایک نبی اور ایک شاعر کے درمیان ایک عامی کو بھی نظر آ سکتا ہے۔ تفصیل کے طالب اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

'وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ' سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شاعری نبوت کی شان سے ایک فروتر چیز ہے۔ اس کے فروتر ہونے کے دو پہلو ہیں۔

ایک پہلو تو یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی روایات و خصوصیات اور شاعروں کی

روایات وخصوصیات میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ سورۂ شعرآء میں شاعروں کی تین خصوصیات بیان ہوئی ہیں اور یہ تینوں ہی شانِ نبوت کے منافی ہیں۔

ان کی ایک خصوصیت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کے غازی نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس نبی اپنی ہر بات پر سب سے اوّل اور سب سے بڑا عمل کرنے والا خود ہوتا ہے۔

دوسری خصوصیت ان کی یہ مذکور ہوئی ہے کہ ان کا کلام متضاد افکار کا مجموعہ ہوتا ہے۔ وہ ہر وادی میں ہرزہ گردی کرتے اور ایک ہی سانس میں کفر و اسلام دونوں کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس نبی کی ہر بات اپنی اصل اور فرع دونوں میں بالکل متحد و مربوط اور باہم دگر وابستہ و پیوستہ ہوتی ہے۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ بیان ہوئی ہے کہ ان کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ برعکس اس کے انبیائے کرام کے پیرو ہمیشہ سوسائٹی کے اخیار ہوئے ہیں۔

اگرچہ اس کلیہ میں بعض استثناء بھی ہیں جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے لیکن بہت کم۔ عام حالت یہی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو شعر و شاعری کی چھوت سے محفوظ رکھا۔

انبیاء کی شان سے اس کے فروتر ہونے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ شاعری کا تعلق تمام تر جذبات سے ہے۔ یہ جذبات ہی سے پیدا ہوتی ہے اور جذبات ہی پر عمل کرتی ہے۔ یہ اچھے جذبات ابھارتی ہے اگر اس کے اندر اچھے جذبات ظاہر کیے گئے ہوں اور برے جذبات بھی برانگیختہ کرتی ہے اگر اس کو برے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس دائرہ سے باہر اس کا وجود بالکل بے کار ہے۔ حضرات انبیائے کرام جس مشن پر مامور ہوتے ہیں اس کا تعلق صرف جذبات سے نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر پہلو سے ہوتا ہے اس وجہ سے ان کی اصل اپیل جذبات کے بجائے انسان کی عقل سے ہوتی ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کرتی ہے۔ انھیں لوگوں کو صرف ابھارنا ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کی تربیت بھی کرنی ہوتی ہے، ان کی غلطیوں کو درست کرنا ہوتا ہے، ان کو انفرادی و اجتماعی زندگی کے آداب و اصول سکھانے ہوتے ہیں، ان کو حکومت و ریاست کے قوانین و ضوابط بتانے ہوتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ انھیں دنیا اور آخرت دونوں کی حسنات سے لوگوں کو بہرہ مند کرنا ہوتا ہے۔ یہ سارے کام ظاہر ہے کہ شاعری کے بس سے باہر ہیں۔ ان کاموں کے لیے ضرورت کسی شاعر کے دیوان یا مجموعۂ کلام کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کتابِ مبین کی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو شاعر نہیں بلکہ اپنی کتابِ مبین کا حامل بنایا۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب شاعری حضرات انبیائے کرام کی شان اور ان کے مقصد سے ایک فروتر چیز ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور شعر کی شکل میں کیوں عطا فرمائی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس اصل رہنما کتاب زبور نہیں بلکہ تورات تھی۔ زبور کی حیثیت محض تورات کے ایک ضمیمہ کی سمجھیے جس میں حضرت داؤد علیہ السلام کی کچھ دعائیں، مناجاتیں، ان کے مواعظ اور

ان کی پُر حکمت نصیحتیں ہیں۔ تورات کے ساتھ مل کر تو یہ ایک نہایت بابرکت خزانۂ حکمت ہے۔ لیکن تورات کے بغیر یہ اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہے جس کے لیے حضرات انبیا کی بعثت ہوئی۔

قرآن کے ذکر ہونے کے مختلف پہلو

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ۔ یعنی یہ قرآن شعر و شاعری نہیں بلکہ ایک عظیم یاددہانی اور ایک واضح صحیفۂ ہدایت ہے تاکہ یہ خلق کی اصلاح اور لوگوں کی رہنمائی کا ذریعہ بنے۔ قرآن کے 'ذکر' ہونے کا مفہوم اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں۔ یہ ان تمام حقائق کی بھی یاددہانی کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے اندر ودیعت فرمائے ہیں، اس پوری تاریخ ہدایت کی بھی یاددہانی کرتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پھیلی ہوئی ہے اور ان تمام نتائج و عواقب کی بھی یاددہانی کرتا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں لازماً پیش آ کے رہیں گے اگر اللہ کے رسول کی تکذیب کی گئی۔

'قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ' یعنی ایک جامع صحیفۂ ہدایت جو زندگی کے ہر پہلو کے لیے اپنے اندر نہایت واضح، ٹھوس، محکم اور مدلل رہنمائی رکھتا ہے اور ہر حقیقت کو اس طرح کھول کر بیان کرتا ہے کہ کسی انصاف پسند کے لیے کسی شبہے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ایسی مدلل، مبرہن اور منضبط کتاب کو شعر و شاعری سے کیا تعلق! دنیا کی پوری تاریخ میں کس شاعر نے اس طرح کی کتاب پیش کی ہے!

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۷۰)

قرآن کے اتارے جانے کا مقصد

'يُنْذِرَ' کا فاعل نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ اس قرآن مبین کے اتارے جانے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر یہ قرآن اس لیے اتارا ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ ان لوگوں کو انذار کرے جن کے اندر حیاتِ عقلی و روحانی کی رمق باقی ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر حجت پوری ہو جائے گی اور وہ خدا کے ہاں یہ عذر نہیں کر سکیں گے کہ ان کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ورنہ وہ ہدایت اختیار کرنے والے بنتے۔

فعل 'انذار' یہاں اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے اور 'حیّ' سے دل کے زندہ مراد ہیں۔ ایک منذر انذار کرتا تو سب کو ہے لیکن اس کا انذار کارگر صرف انہی لوگوں پر ہوتا ہے جن کی فطرت زندہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بات پر دھیان وہی کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا ہے۔ 'اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ' (یٰس: ۱۱) (تم انہی کو ڈرا سکتے ہو جو نصیحت پر دھیان کریں) چونکہ حقیقت کے اعتبار سے زندہ وہی لوگ ہوتے ہیں اس وجہ سے قرآن نے انہی کو زندہ کہا ہے۔ جو اس وصف سے محروم ہیں وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی نسبت فرمایا ہے 'وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ' (فاطر: ۲۲) اس اسلوبِ بیان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی بھی ہے کہ تمہارا کام زندوں کو جگانا ہے، مردوں کو جگانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے قرآن میں بار بار بیان ہوا ہے۔

'القول' سے مراد وہ قول ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں فرمایا تھا کہ میں بنی آدم

کی ہدایت کے لیے اپنی کتاب اور اپنی ہدایت نازل کروں گا۔ پھر جو اس کے بعد بھی تیری پیروی کریں گے تو میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَہُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ اَنۡعَامًا فَہُمۡ لَہَا مٰلِکُوۡنَ ۔ وَ ذَلَّلۡنٰہَا لَہُمۡ فَمِنۡہَا رَکُوۡبُہُمۡ وَ مِنۡہَا یَاۡکُلُوۡنَ ۔ وَ لَہُمۡ فِیۡہَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ (۷۱ - ۷۳)

قرآن کی دعوت کی تائید میں آیاتِ ربوبیت کا حوالہ

ان آیات کا موقع و محل سمجھنے کے لیے اس سورہ کی آیات ۳۳ - ۳۵ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ جس طرح وہاں قرآن کے انذار اور اس کی دعوت توحید کا حوالہ دینے کے بعد بعض آیاتِ ربوبیت کی طرف توجہ دلائی ہے اور پھر خدا ہی کی شکرگزاری کا مطالبہ کیا ہے اسی طرح یہاں بھی قرآن کی دعوت کی تائید میں اپنی ربوبیت کی بعض نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد خدا ہی کی شکرگزاری کا مطالبہ کیا ہے۔ گویا تمہید کا مضمون خاتمہ میں ایک نئے اسلوب سے پھر سامنے آگیا۔

'اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَہُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ اَنۡعَامًا' فرمایا کہ کیا وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ہم نے اپنی قدرت و حکمت سے چوپائے بنائے اور پھر ان کو ان کا مالک بنا دیا۔ وہ ان پر پوری آزادی سے مالکانہ تصرف کرتے اور اپنی تمام ضروریات میں ان کا استعمال کرتے ہیں۔ 'مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ' میں وہی بات ایک دوسرے اسلوب سے فرمائی گئی ہے جو پیچھے آیت ۳۵ میں 'وَمَا عَمِلَتۡہُ اَیۡدِیۡہِمۡ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں خود اپنے وجود سے شاہد ہیں کہ صرف خدا ہی کی قدرت و حکمت نے ان کو وجود بخشا ہے، کسی دوسرے کی مجال نہیں تھی کہ ان کو وجود میں لا سکتا یا ان کو انسان کا مطیع و فرمانبردار بنا سکتا۔ یہ محض ربِّ کریم کی کریمی ہے کہ اس نے ان کو اپنی قدرت و حکمت سے بنایا اور پھر ان کو انسان کی غلامی میں دے دیا ۔۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ یہ صورتِ حال دعوت دیتی ہے کہ انسان غور کرے کہ قدرت کے اس بے پایاں انعام کے عوض میں اس پر کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ قرآن اسی سوال کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا اور اس کے نتائج سے آگاہ کرنا چاہتا ہے لیکن احمق لوگ حقیقت کی اس یاددہانی کو شاعری سمجھتے ہیں۔

'وَذَلَّلۡنٰہَا لَہُمۡ الآیۃ' یعنی یہ محض خدا کی ربوبیت و رحمت ہے کہ اس نے ان چوپایوں کو انسان کی معاشی ضروریات کے لیے سازگار بنایا اور پھر ان کو اس طرح انسان کا مطیع بنا دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے ان کو استعمال کرتا ہے۔ اگر خدا نہ چاہتا تو یہ چوپائے نہ تو انسان کی ضروریات کے لیے سازگار ہوتے اور نہ وہ ان کو اپنا مطیع بنا سکتا۔ آخر دنیا میں کتنے جانور ایسے ہیں جو نہ تو انسان کی ضروریات کے لیے کارآمد ہیں اور نہ وہ ان کو چوپایوں کی طرح اپنا غلام ہی بنا سکتا ہے۔ اگر وہ ان کو مسخر بھی کرلے جب بھی وہ ایک بوجھ تو اس کے لیے بن سکتے ہیں لیکن اس کا کوئی بوجھ اٹھانے والے نہیں بن سکتے۔ فرمایا کہ ان چوپایوں ہی میں سے بعض وہ ہیں جن سے وہ سواری کا کام لیتا ہے اور بعض وہ ہیں جن سے وہ اپنی غذائی ضروریات پوری کرتا ہے۔

وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ۔ یعنی سواری اور غذا کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد ان سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی کھال، ان کے بال، ان کی ہڈی، ان کے بول و براز، غرض ان کی کون سی چیز ہے جو انسان کے لیے نافع نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے دودھ اور اس دودھ سے بنی ہوئی پینے کی مختلف چیزیں ــــ دہی، لسی، چھاچھ ــــ سب انسان کے لیے لذیذ، خوش گوار اور صحت بخش ہیں۔ أَفَلَا يَشْكُرُونَ۔ تو کیا یہ نعمتیں ان کے اوپر کوئی حق نہیں عائد کرتیں اور ان سے یہ مطالبہ نہیں کرتیں کہ جس رب کی بخشی ہوئی نعمتوں سے وہ فائدہ اٹھا رہے ہیں اس کے شکر گزار و فرماں بردار بھی بنیں! یہ نعمتیں زبانِ حال سے انسان کو یہ سبق پڑھا رہی ہیں اور اسی سبق کی یاددہانی اللہ کی کتاب بھی کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی واضح حقیقت کو سمجھنے اور ماننے کے بجائے اس کو شاعری قرار دے کر اس سے گریز کی راہیں کیوں سوچ رہے ہو!

وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ ۝ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُندٌ مُّحْضَرُونَ (۷۴-۷۵)

حقیقت سے فرار کے لیے چور دروازے

یعنی اس واضح حقیقت کا مواجہہ کرنے کے بجائے انھوں نے حقیقت سے فرار کے لیے چور دروازے پیدا کیے ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ جس رب کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو رہے ہیں اس کے حقوق و فرائض پہچانتے اور ان کو ادا کرتے لیکن انھوں نے کیا یہ ہے کہ خدا کے سوا کچھ دوسرے معبود انھوں نے ایجاد کیے ہیں اور ان کے کچھ رسوم ادا کر کے یہ توقع کر رہے ہیں کہ اگر خدا کی طرف سے کوئی گرفت ہوئی تو ان کی مدد سے وہ چھوٹ جائیں گے۔

لَا يَسْتَطِيعُونَ الآیۃ۔ فرمایا کہ ان کی مدد تو وہ کیا خاک کر سکیں گے۔ البتہ یہ ہو گا کہ ان کے ساتھ یہ بھی ان کی فوج کی حیثیت سے خدا کے حضور میں حاضر کیے جائیں گے اور پھر اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا کہ یہ کس سزا کے مستحق ہیں۔

فَلَا يَحْزُنكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ (۷۶)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ جو کچھ بھی کہیں اس کو برداشت کرو، اس کا غم نہ کرو۔ یہ تمھیں شاعر، خبطی اور مفتری جو کچھ بھی کہتے ہیں کہنے دو اور یہ اطمینان رکھو کہ اللہ ان کی خفیہ سازشوں اور تجاویز سے بھی اچھی طرح واقف ہے اور جو کچھ یہ علانیہ کہہ اور کر رہے ہیں اس کو بھی جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا سب کچھ جانتا ہے تو تم کیوں غم کرو! تم خدا کا کام کر رہے ہو، کرتے رہو اور یہ بھروسہ رکھو کہ تمھارے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے تمھارا رب کافی ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ (۷۷-۷۸)

'انسان' سے مراد قریش ہی ہیں جن سے یہاں بحث ہے سب بے اتفاقی کے اظہار کے لیے لفظ عام استعمال فرمایا ہے۔

'ضرب مثل' کوئی مثال بیان کرنے یا حکمت کی بات کہنے کے لیے بھی آتا ہے اور موقع ہو تو کسی پر طنز یا پھبتی چست کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں یہ اس دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

یہ کلام اپنے ماسبق سے دو پہلوؤں سے ربط رکھتا ہے۔ اوپر کی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تسلی دی گئی ہے اس سے بھی اس کا تعلق ہے اور اُس سے اوپر کی آیات میں قریش کو خدا کی ربوبیت کے جو مقتضیات بتائے گئے ہیں اس سے بھی اس کا ربط ہے۔

تسلی کے مضمون سے اس کا ربط یوں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے کہ جو سرپھرے لوگ خدا پر بھی پھبتی چست کر رہے ہیں اور اپنی پیدائش کو بھول کر بڑے طنطنہ سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ بوسیدہ ہڈیوں میں کون زندگی پیدا کر سکتا ہے وہ اگر پیغمبر پر طنز کریں اور اس کو شاعر و مجنون قرار دیں تو ان سے کیا بعید ہے۔

ربوبیت کے مضمون سے اس کا تعلق یوں ہے کہ ربوبیت جس طرح شکر اور توحید کو مقتضی ہے اسی طرح ایک روزِ حساب و کتاب کو بھی مقتضی ہے (اس مضمون کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے) لیکن انسان کی بلادت کا یہ حال ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں سے متمتع ہونے کے باوجود یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ کوئی روزِ حساب و کتاب بھی آنے والا ہے جس دن اس سے ان نعمتوں کی بابت پرسش ہونی ہے اور اگر اس کو اس کی یاددہانی کی جاتی ہے تو وہ ایک حریف بن کر سامنے آتا ہے اور اپنی پہلی خلقت کو بالکل بھول کر طنزیہ انداز میں سوال کرتا ہے کہ بھلا بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے! فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا۔ اگر پہلی بار ان کو پیدا کرنے میں اس کو کوئی زحمت نہیں پیش آئی تو دوبارہ اس کو پیدا کرنے میں کیوں زحمت پیش آئے گی!

'وَنَسِیَ خَلْقَهٗ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ احمقانہ سوال وہی کر سکتا ہے جس کو اپنی پہلی خلقت یاد نہ رہی ہو۔ جس کو اپنی پہلی خلقت یاد ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو اسی مٹی سے وجود میں لایا ہے تو وہ یہ سوال نہیں کر سکتا اگر کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کا حریف بن کر اس سے لڑنے اٹھا ہے۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ (۷۹)

'وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ' 'خلق' یہاں مخلوق کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کو جانتا ہے 'اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ' (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا) کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ مٹی میں رل مل جانے کے بعد وہ ان کو بھول جائے گا۔ وہ ان کے وجود کے ایک ایک ذرے سے باخبر ہے۔ 'قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ' (ق — ۴) (زمین ان کے اندر سے جو کچھ کم کرتی ہے ہم اس کو جانتے رہے ہیں اور ہمارے پاس سارا ریکارڈ رکھنے والی ایک کتاب ہے)۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْہُ تُوْقِدُوْنَ (۸۰)

ضد سے ضد کا ظہور

یعنی اس بات کو مستبعد نہ خیال کرو کہ راکھ اور مٹی سے زندگی نمودار ہو جائے گی۔ ضد سے ضد کے نمودار ہونے کا کرشمہ تم برابر اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ تم سرسبز درخت کی دو شاخیں لیتے اور ان کو ایک دوسرے سے رگڑ کر ان سے آگ جلا لیتے ہو۔ جس خدا نے اپنی قدرت کی یہ شان دکھائی ہے اس کے لیے یہ کیا بعید ہے کہ وہ مٹی اور راکھ کے اندر سے زندگی نمودار کر دے۔ 'الشجر الاخضر' سے مراد وہ درخت ہیں جو عرب کے بعض علاقوں میں پائے جاتے ہیں اور صحراؤں کے مسافر ان کی شاخوں سے چقماق کا کام لیتے رہے ہیں۔

سلف میں سے بعض لوگوں نے اس آیت کی تاویل اس سے مختلف بھی کی ہے لیکن مجھے اس میں تکلف محسوس ہوتا ہے۔ یہ تاویل بالکل واضح ہے۔ عرب میں بعض درخت پائے جاتے تھے جن سے لوگ چقماق کا کام لیتے تھے۔ کتابوں میں ان کے نام بھی مذکور ہوتے ہیں۔ اگر اب یہ درخت نہ پائے جاتے ہوں یا بہت نایاب ہوں تو اس سے کچھ فرق نہیں پیدا ہوتا۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے برابر محو و اثبات ہوتا رہتا ہے۔ اگر قرآن کے مخاطبِ اول اس سے واقف تھے تو یہ استدلال بالکل برمحل ہے۔ اس کی اصل بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ضد سے ضد کے وجود کے شواہد اس دنیا میں موجود ہیں اور یہ ایک ایسی بات ہے جس سے انکار کی گنجائش کسی کے لیے بھی نہیں ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ سب سے زیادہ زوردار آگ پانی کے اندر پائی جاتی ہے!

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَھُمْ ط بَلٰی وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ (۸۱)

سوال کا جواب ایک دوسرے پہلو سے

اسی استبعاد کو ایک دوسرے پہلو سے رفع فرمایا ہے کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کر دیا اور اس کو اس میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی کیا وہ ان کی جیسی مخلوق کو دوبارہ پیدا کر دینے پر قادر نہیں ہو سکتا؟ بیرسوچیں کہ ان دونوں میں زیادہ مشکل کام کون سا ہے؟ 'بَلٰی وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ' یہ اس سوال کا خود ہی جواب دیا ہے کہ ہاں، وہ پوری طرح قادر ہے کہ ان کو دوبارہ پیدا کر دے۔ اس جواب سے مخاطب کے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے۔ 'وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ' یہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے مذکورہ دعوے پر دلیل ہے کہ اصل پیدا کرنے والا اور علم رکھنے والا تو خدا ہی ہے۔ اوپر آیت ۷۹ میں فرمایا ہے 'وَھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ' اسی مضمون کو یہاں زیادہ زوردار الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ خدا بڑا پیدا کرنے والا ہے، کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس دنیا کو پیدا کر کے وہ تھک گیا یا اس کی قوتِ تخلیق ختم ہو گئی بلکہ وہ اسی طرح تازہ دم ہے جس طرح پہلے تھا اور وہ اپنی ہر مخلوق کے اجزائے ترکیبی سے اچھی طرح باخبر ہے، وہ جب چاہے گا ازسرِ نو اس کے پور پور اور جوڑ جوڑ کو ٹھیک کر دے گا۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَن يَقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ (۸۲)

یعنی کوئی اس غلط فہمی میں بھی نہ رہے کہ کسی چیز کو پیدا کرنے کے لیے خدا کو کارخانے قائم کرنے پڑتے ہیں یا سرمایہ، میٹیریل، لیبر اور مشینوں کا اہتمام و انتظام کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کسی ارادے کی تکمیل میں کسی چیز کا بھی محتاج نہیں ہے۔ اس کا معاملہ بس یوں ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو حکم فرماتا ہے کہ وہ ہو جائے اور وہ اس کے حکم کے مطابق ہو جاتی ہے۔

فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۸۳)

'ملکوت' کے معنی اختیار و اقتدار کے ہیں۔ یہ آخر میں تنبیہ فرمائی کہ جس خدا کے ہاتھ میں ہر چیز کی زمام ہے اور جس کی طرف ہی تمہیں لوٹ کر جانا ہے وہ ہر نقص و عیب سے منزہ ہے تو اس کو ہر عیب سے منزہ مانو اور اس کی پاکی بیان کرتے رہو۔ اس کی ذات و صفات اور اس کے حقوق میں کوئی شریک نہیں، وہ ہر شرکت سے ارفع ہے، اس نے یہ دنیا عبث نہیں بنائی ہے اس وجہ سے ہر ایک کو خدا کے حضور حاضر ہونا اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ اس کے لیے لوگوں کو مرنے اور سڑ گل جانے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا مشکل نہیں، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ کوئی چیز بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں اور کسی کا کوئی قول و عمل بھی اس سے مخفی نہیں

اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی رہنمائی سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ والحمد للہ علی ذٰلک۔

رحمان آباد
۸؍ مارچ ۱۹۷۵ء

تدبّرِ قرآن

۳۷

الصّٰٓفّٰت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ سورہ یٰسٓ ـــــ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ توحید، قیامت اور رسالت کے اصولی مباحث جس طرح اس گروپ کی پچھلی سورتوں میں زیرِ بحث آئے ہیں اسی طرح اس میں بھی زیرِ بحث آئے ہیں البتہ نہج استدلال اور ترتیبِ بیان مختلف ہے۔ توحید جو اس پورے گروپ کی روح ہے، اس سورہ میں بھی نمایاں ہے۔ لیکن اس میں اس کے ایک خاص پہلو ـــــ اربیتِ ملائکہ کے تصور کے ابطال ـــــ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لیا ہے۔ احوالِ قیامت کی تصویر اس میں ایسے زاویہ سے پیش کی گئی ہے جس سے مشرکین کے عوام اور ان کے لیڈروں کی باہمی تو تکار سامنے آتی ہے۔ حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی پوری تاریخ بھی اس میں اجمالاً بیان ہوئی ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جن قوموں نے رسولوں کی تکذیب کی اللہ تعالیٰ نے ان کو مٹا دیا؛ فلاح صرف رسولوں اور ان کی پیروی کرنے والوں کو حاصل ہوئی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کا اجمالی تجزیہ یہ ہے۔

(۱-۱۰) ملائکہ خدا کے حضور میں ہمیشہ اس کے احکام کی تعمیل کے لیے حاضر اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتے ہیں۔ وہ اپنے عمل سے شہادت دے رہے ہیں کہ وہ خدا کے نہایت فرمانبردار اور اطاعت گزار بندے ہیں نہ کہ اس کے شریک، جیسا کہ نادانوں نے سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرب صرف ملائکہ کو حاصل ہے، جنّات و شیاطین کی رسائی ملاءِ اعلیٰ تک نہیں ہے۔ اگر وہ ملاءِ اعلیٰ کی باتوں کی کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتے ہیں تو ملائکہ ان کو دھتکارتے اور شہابِ ثاقب ان کا تعاقب کرتے ہیں اس وجہ سے وہ غائب کی باتیں جاننے سے قاصر ہیں۔ جو لوگ ان کو علم غیب حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے مرتبۂ بلند سے بے خبر ہیں۔

(۱۱-۳۹) ان لوگوں کو تنبیہ جو قیامت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ قیامت کے دن ان کا اور ان کے لیڈروں کا

جو حال ہوگا اس کی تصویر۔ مقصود اس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ ان کے مغرورانہ رویہ کو ابھی نظر انداز کرو۔ وہ دن آنے والا ہے جب ان کے عوام اپنے لیڈروں پر لعنت کریں گے کہ انھوں نے ان کو پیغمبر کی پیروی سے روکا اور لیڈر اپنے پیروؤں کو ملامت کریں گے کہ وہ خود شامت زدہ تھے کہ انھوں نے حق کے واضح ہو جانے کے بعد اس کا انکار کیا۔

(۴۰-۶۱) ان اہل ایمان کا صلہ جو گمراہ کرنے والے ساتھیوں اور لیڈروں کے علی الرغم رسول کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ان کو قیامت کے دن جو سرور ابدی حاصل ہوگا اس کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ۔

(۶۲-۷۰) باپ دادا کی اندھی تقلید کے جنون میں رسول اور اس کے طریقہ کی مخالفت کرنے والوں کو جس انجام سے سابقہ پیش آئے گا اس کی طرف اشارہ۔

(۷۱-۱۴۸) تاریخ کی شہادت کہ جن قوموں کو اللہ تعالیٰ نے کسی رسول کے ذریعہ سے انذار کیا اگر انھوں نے رسول کی تکذیب کر دی تو ہلاک کر دی گئیں، صرف وہ لوگ خدا کی پکڑ سے محفوظ رہے جنھوں نے رسول کی پیروی کی۔ اللہ کی رحمت و برکت، اللہ کے رسولوں اور ان کی پیروی کرنے والوں ہی کے لیے ہے۔

(۱۴۹-۱۸۲) خاتمۂ سورہ جس میں کلام تمہید کے مضمون سے پھر مربوط ہو گیا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی زبانی یہ شہادت دلائی گئی ہے کہ فرشتوں کی جماعت برابر خدا کے احکام کی تعمیل اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتی ہے اور ہم خدا کے فرمانبردار بندے ہیں نہ کہ اس کے شریک و شفیع۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اللہ کی مدد اور غلبہ تمھارے اور تمھارے ساتھیوں ہی کے لیے ہے، تمھارے مخالفین لازماً ناکام ہوں گے جو پہلے تو رسول کی بعثت کے منتظر رہے لیکن جب وہ آیا تو حسد و تکبر کے سبب سے اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تم ان سے درگزر کرو اور صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ سلامتی اللہ کے رسولوں ہی کے لیے ہے۔

سُوْرَةُ الصّٰٓفّٰتِ (۳۷)

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــــ اٰيَاتُهَا ۱۸۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ﴿۲﴾ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ﴿۳﴾ آیات
إِنَّ إِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ﴿۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَ ۱۰-۱
رَبُّ الْمَشَارِقِ ﴿۵﴾ إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ ﴿۶﴾
وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ﴿۷﴾ لَا يَسَّمَّعُوْنَ إِلَى الْمَلَإِ الْأَعْلٰى
وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ﴿۸﴾ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴿۹﴾
إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾

شاہد ہیں صفیں باندھے، حاضر رہنے والے فرشتے؛ پھر زجر کرنے والے (شیاطین کو) ترجمہ آیات
پھر ذکر کرنے والے (اپنے رب کا) کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ وہی خداوند ہے آسمانوں اور ۱۰-۱
زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا۔ اور وہی خداوند ہے سارے اطراف مشرق کا۔ ۵-۱
بے شک ہم ہی نے سجایا ہے سماء دنیا کو ستاروں کی زینت سے اور اس کو محفوظ کیا ہے
اچھی طرح ہر سرکش شیطان کی دراندازی سے۔ اور وہ ملاء اعلیٰ کی طرف کان نہیں لگانے پاتے
اور وہ ہر جانب سے دھتکارے جاتے ہیں، کھدیڑنے کے لیے اور ان کے لیے ایک دائمی عذاب

ہے۔ مگر یہ کہ کوئی اچک لے کوئی بات تو ایک دمکتا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ ۶-۱۰

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا (۱)

قسم شہادت کے لیے

'وَ' قسم کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو قسمیں کھائی ہیں یہ تعظیم کے لیے نہیں بلکہ مقسم علیہ پر شہادت کے لیے ہیں۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ 'الامعان فی اقسام القرآن' میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے۔ ہمارے قلم سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔ قسم کے اس مفہوم کی روشنی میں 'وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا' کا ترجمہ 'شاہد ہیں صفیں باندھے ہوئے حاضر رہنے والے فرشتے' کیا جائے تو یہ قسم کے مفہوم کو بالکل ٹھیک ٹھیک ادا کرنے والا ہوگا۔

صافات فرشتوں کی صفت ہے

'صٰٓفّٰتٌ' یہاں فرشتوں کی صفت کے طور پر آیا ہے اور اس کی وضاحت اسی سورہ میں خود حضرت جبریلؑ کی زبانی ہو گئی ہے۔ ان کا ارشاد نقل ہوا ہے: 'وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ' (۱۶۴-۱۶۶) (اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک معین مقام ہے اور ہم تو صف بستہ رہنے والے ہیں اور ہم تو تسبیح کرتے رہنے والے ہیں)۔

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فرشتوں کا ذکر ہے جو ملاءِ اعلیٰ کے زمرے سے تعلق رکھتے اور عرش الٰہی کے ارد گرد صف بستہ رہتے ہیں۔ سورۂ زمر میں ان کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: 'وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ' (۷۵) (اور تم دیکھو گے فرشتوں کو گھیرے ہوئے عرش کے ارد گرد اپنے رب کی تسبیح کرتے ہوئے اس کی حمد کے ساتھ)۔

وَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا (۲)

دوسری صفت

'زجر' کے معنی جھڑکنے، ڈانٹنے اور دھتکارنے کے ہیں۔ یہ انہی فرشتوں کی دوسری صفت بیان ہوئی ہے کہ اگر شیاطین ملاءِ اعلیٰ کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ان کو دھتکارتے ہیں۔ شیاطین کو ملاءِ اعلیٰ سے دور رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انتظام بھی فرمایا ہے جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا (۳)

تیسری صفت

یہ ان فرشتوں کی تیسری صفت ہے۔ تلاوتِ ذکر سے مراد وہی چیز ہے جو سورۂ زمر میں 'يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ' کے الفاظ سے اور اس سورہ میں 'وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ' کے الفاظ سے مذکور ہوئی ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔

صفات میں ترتیب

یہاں عربی زبان کا یہ قاعدہ پیش نظر رہے کہ جب صفات کا بیان اس طرح 'ف' کے ساتھ ہو جس

طرح بیان ہے تو یہ دو باتوں پر دلیل ہوتا ہے۔ ایک اس بات پر کہ یہ تمام صفات ایک ہی چیز کی ہیں اس وجہ سے جن لوگوں نے ان صفات کے الگ الگ موصوف قرار دیے ہیں ان کی رائے ہمارے نزدیک عربیت کے خلاف ہے۔ دوسری اس بات پر کہ ان صفات میں ایک تدریجی ترتیب ہے۔ ہم نے جو تاویل کی ہے اس سے پہلی بات تو بالکل واضح ہے کہ یہ تمام صفات ملائکہ کی ہیں۔ رہی دوسری بات تو غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان صفات میں اسی طرح کی ترتیب ہے جس طرح کی ترتیب ہماری نمازوں میں ہوتی ہے جس طرح ہم خدا کے سامنے صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں، پھر شیطان سے تعوذ کرتے ہیں، پھر اپنے رب کی حمد و تسبیح کرتے ہیں اسی طرح ملائکہ بھی عرش الٰہی کے اردگرد صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں، پھر شیاطین کو زجر کرتے ہیں، پھر اپنے رب کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔

اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ (۴)

مقسم علیہ

یہ اس قسم کا مقسم علیہ ہے۔ فرشتوں کی اس بندگی اور اس حمد و تسبیح کو شہادت میں پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ تمھارا رب ایک ہی ہے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ جن لوگوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر ان کو خدائی میں شریک کر رکھا ہے اور ان کی شفاعت کی امید پر ان کی پوجا کر رہے ہیں وہ بالکل حماقت میں مبتلا ہیں۔ فرشتوں کا خود اپنا طرزِ عمل ان نادانوں پر ایک کھلی ہوئی نکیر ہے۔ اس لیے کہ وہ برابر خدا کی بندگی اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم ہیں اور یہ احمق لوگ ان کو شریک خدا بنا کر ان کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (۵)

یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔ یعنی وہی اللہ واحد تمام آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا خداوند ہے اور وہی تمام مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس نے اپنی ناپیدا کنار مملکت کے دور دراز گوشوں کا انتظام اپنے دوسرے شریکوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اپنی کائنات کے ہر گوشے اور کونے کا مالک خود ہے اور خود ہی اپنے احکام کے تحت اس کا انتظام فرماتا ہے۔ اس کائنات میں فرشتوں کا اگر کوئی دخل ہے تو خدا کے شریک کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے فرمانبردار سفیروں اور کارندوں کی حیثیت سے ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اپنے رب کے احکام کی تعمیل میں کرتے ہیں۔

جمع کا استعمال کا ایک خاص محل

'رَبُّ الْمَشَارِقِ' میں 'مَشَارِق' جمع اپنے اطراف کی وسعت کے اعتبار سے ہے۔ سورۂ اعراف میں لفظ 'اعراف' کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ جمع بعض مرتبہ کسی شے کی وسعت اور اس کے طول کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتی ہے۔ قرآن میں 'مشارق' اور 'مغارب' کے الفاظ اسی اعتبار سے آئے ہیں۔ اسی طرح جہاں مقصود کسی شے کے دونوں کناروں کی طرف اشارہ کرنا ہو وہاں اس کو بعض اوقات مثنیٰ کی شکل میں لاتے ہیں چنانچہ

قرآن میں مشرقین اور مغربین، بھی استعمال ہوئے ہیں۔ رَبُّ الْمَشَارِقِ کے بعد رَبُّ الْمَغَارِبِ، بربنائے وضاحت قرینہ حذف ہے۔ اس لیے کہ مغارب، مشارق، کے تحت ہیں۔ جب اصل کا ذکر آ گیا تو فرع کا ذکر گویا خود بخود ہو گیا۔ بعض جگہ اس کو واضح بھی فرما دیا ہے۔ مثلاً: فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ (المعارج - ۴۰) (پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشارق اور مغارب کے رب کی کہ بے شک ہم قادر ہیں)۔ 'مشارق' کے خاص اہتمام کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دنیا میں مشرکوں نے سب سے زیادہ پرستش سورج کی کی ہے جو مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ ۙ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (۶-۷)

شیاطین جن کی تردید

اوپر کی آیات میں ملائکہ کا ذکر ہوا ہے کہ نادانوں نے ان کو خدائی کا درجہ دے رکھا ہے اور ان کے ملاءِ اعلیٰ تک کا حال یہ ہے کہ وہ برابر اپنے رب کے آگے صف بستہ اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتے ہیں۔ اب آگے کی آیات میں شیاطین جن کا ذکر آ رہا ہے کہ نادانوں نے ان کی نسبت یہ گمان کر رکھا ہے کہ ان کی رسائی ملاءِ اعلیٰ تک ہے اور وہ وہاں سے غیب کی خبریں حاصل کرتے ہیں چنانچہ اسی توقع پر ان کی پرستش کی جاتی ہے کہ یہ علم غیب کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ حالانکہ ملاءِ اعلیٰ تک کسی کی بھی رسائی نہیں ہے۔ اگر کوئی شریر جن وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر شہاب ثاقب کی مار پڑتی ہے۔

'وَحِفْظًا' فعل محذوف کی تاکید ہے۔ یعنی 'وَحَفِظْنٰهَا حِفْظًا' اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آسمان کو ہم نے شیاطین کی دراندازی سے اچھی طرح محفوظ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ستارے ایک طرف تو آسمانِ زیریں کی زینت ہیں، دوسری طرف قدرت ان سے یہ کام بھی لیتی ہے کہ جو شیاطین ملاءِ اعلیٰ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو انہی ستاروں کے ذریعے سے سرزنش کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ مثلاً: 'وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ' (الملک: ۵) (اور ہم نے سماء دنیا کو تاروں سے سجایا ہے اور ان کو شیاطین کے سنگسار کرنے کے لیے بھی بنایا ہے) دوسرے مقام میں ہے: 'وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۙ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۙ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ' (الحجر: ۱۶-۱۸)
(اور ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور اس کو دیکھنے والوں کے لیے تاروں سے مزین کیا ہے اور اس کو ہر شیطان رجیم سے محفوظ کیا ہے اور اگر کوئی چھپ کے ملاءِ اعلیٰ کی باتیں سننے کی کوشش کرتا ہے تو ایک دمکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے)۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۞ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ (۸-۹)

'لَا يَسَّمَّعُوْنَ' یہ نفی فعل، نفی فائدہ فعل کے پہلو سے ہے۔ یعنی شیاطین ملاءِ اعلیٰ کی باتیں سننے کی

کوشش کرتے تو ہیں لیکن وہ کان لگانے پاتے نہیں۔ جب وہ یہ کرنا چاہتے ہیں تو ہر جانب سے ان پر سنگ باری ہوتی ہے۔ "دُحُوْرًا" کے معنی دھتکارنے اور کھدیڑنے کے ہیں اور "وَاصِبٌ" کے معنی دائم کے۔ یعنی اس دنیا میں تو وہ اس طرح ملعون و مرجوم رہیں گے اور آخرت میں ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہے۔

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۱۰)

یعنی قدرت کے اس محکم انتظام کے بعد اس بات کا تو امکان ہے نہیں کہ کوئی شیطان ملاءِ اعلیٰ تک پہنچ سکے یا ان کی باتیں سن سکے۔ کوئی شریر جن اگر کچھ کر سکتا ہے تو یہ کر سکتا ہے کہ اچکوں کی طرح کوئی بات اچکنے کی کوشش کرے۔ سو اس کے سدباب کے لیے بھی یہ انتظام ہے کہ آسمان کی برجیوں سے ایک دہکتا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ نہ فرشتوں کو خدائی میں کوئی دخل ہے اور نہ جنات کی رسائی ملاءِ اعلیٰ تک ہے کہ وہاں سے وہ غیب کی کوئی خبر معلوم کر سکیں اس وجہ سے جو لوگ فرشتوں کو خدا کی چہیتی بیٹیاں سمجھ کر پوج رہے ہیں وہ بھی احمق اور جو جنات کو علم غیب کا وسیلہ سمجھ کر ان سے تعلق و توسل پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ بھی احمق۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عربوں کے شرک اور ان کی کہانت کی تمام گرم بازاری انہی دو مذکورہ تصورات پر تھی۔ قرآن نے یہاں جنوں اور فرشتوں دونوں کی حقیقت واضح کر کے ان کی ضلالت کے اس سارے کاروبار کو ختم کر دیا۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۱-۷۴

آگے احوالِ قیامت کی تفصیل ہے اور مقصود اس سے یہ دکھانا ہے کہ جو لوگ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں قیامت کے دن ان کا اور ان کے معبودوں کا کیا حال ہونا ہے۔ شرک کے علم بردار لیڈر اور ان کے پیرو کس طرح ایک دوسرے پر لعنت کریں گے! اور اہلِ ایمان، جو تمام مخالفتوں کے علی الرغم توحید اور قیامت کے عقیدے پر جمے رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان کو کس نوزِ عظیم سے نوازے گا! ـــــ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۱-۴۰

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ (۱۱) بَلْ عَجِبْتَ وَیَسْخَرُوْنَ (۱۲) وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا یَذْكُرُوْنَ (۱۳) وَاِذَا رَاَوْا اٰیَةً یَّسْتَسْخِرُوْنَ (۱۴) وَقَالُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۱۵) ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (۱۶) اَوَ اٰبَآؤُنَا

الْأَوَّلُونَ ﴿١٧﴾ قُلْ نَعَمْ وَأَنتُمْ دَاخِرُونَ ﴿١٨﴾ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ
وَاحِدَةٌ فَإِذَا هُمْ يَنظُرُونَ ﴿١٩﴾ وَقَالُوا يَا وَيْلَنَا هَٰذَا يَوْمُ
ع ٢/٥ الدِّينِ ﴿٢٠﴾ هَٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿٢١﴾
احْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿٢٢﴾
الربع مِن دُونِ اللَّهِ فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ ﴿٢٣﴾ وَقِفُوهُمْ
إِنَّهُم مَّسْئُولُونَ ﴿٢٤﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُونَ ﴿٢٥﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ
مُسْتَسْلِمُونَ ﴿٢٦﴾ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢٧﴾
قَالُوا إِنَّكُمْ كُنتُمْ تَأْتُونَنَا عَنِ الْيَمِينِ ﴿٢٨﴾ قَالُوا بَل لَّمْ تَكُونُوا
مُؤْمِنِينَ ﴿٢٩﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ ۖ بَلْ كُنتُمْ قَوْمًا
طَاغِينَ ﴿٣٠﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا ۖ إِنَّا لَذَائِقُونَ ﴿٣١﴾ فَأَغْوَيْنَاكُمْ
إِنَّا كُنَّا غَاوِينَ ﴿٣٢﴾ فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿٣٣﴾ إِنَّا
كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ﴿٣٤﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ
إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ﴿٣٥﴾ وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ
مَّجْنُونٍ ﴿٣٦﴾ بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٧﴾ إِنَّكُمْ لَذَائِقُو
الْعَذَابِ الْأَلِيمِ ﴿٣٨﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا
عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٠﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهُ ۖ
وَهُم مُّكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾ عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٤٤﴾
يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ ﴿٤٦﴾

لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ
عِيْنٌ ﴿۴۸﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ
يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ﴿۵۱﴾ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ
لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا
لَمَدِيْنُوْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ
الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ﴿۵۶﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ
لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى
وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۰﴾ لِمِثْلِ
هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿۶۲﴾
اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۳﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْ اَصْلِ
الْجَحِيْمِ ﴿۶۴﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۶۵﴾ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ
مِنْهَا فَمَالِئُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ
حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ
ضَآلِّيْنَ ﴿۶۹﴾ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
ع ۲ ۵۴ ۶ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۷۴﴾

ترجمہ آیات پس ان سے پوچھو کہ کیا ان کے پیدا کرنے کا معاملہ زیادہ سخت ہے یا ان چیزوں
۱۱-۱۲ کا جو ہم نے پیدا کی ہیں ! ہم نے ان کو تو چپکتی مٹی سے پیدا کیا ہے ! بلکہ تم تعجب کر رہے ہو

اور یہ لوگ مذاق اڑا رہے ہیں۔ اور جب ان کو یاد دہانی کی جاتی ہے تو وہ دھیان نہیں کرتے۔ اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس کا مذاق اڑاتے اور کہتے ہیں یہ تو بس ایک کھلا ہوا جادو ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو پھر ہم اٹھائے جائیں گے! اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی! ۱۱-۱۷

ان کو جواب دے دو کہ ہاں تم اٹھائے بھی جاؤ گے اور ذلیل بھی ہو گے۔ بس وہ تو ایک ہی ڈانٹ ہو گی پس وہ تاکنے لگیں گے۔ اور کہیں گے، ہائے ہماری شامت! یہ تو جزا کا دن ہے! یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے! ۱۸-۲۱

جمع کرو ان کو جنھوں نے ظلم کیا اور ان کے ہم مشربوں کو اور ان کو جن کی یہ اللہ کے سوا پرستش کرتے رہے ہیں پھر ان سب کو دوزخ کا رستہ دکھاؤ۔ اور ان کو ذرا روکو، ان سے کچھ پوچھنا بھی ہے! کیا بات ہے، اس وقت تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کر رہے ہو! بلکہ یہ تو آج بڑے ہی فرماں بردار بنے ہوئے ہیں! ۲۲-۲۶

اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے، پوچھتے ہوئے۔ کہیں گے، تم ہی ہمارے پاس آتے تھے داہنے سے ...... وہ جواب دیں گے، بلکہ تم لوگ خود ایمان لانے والے نہیں تھے۔ اور ہمارا تمھارے اوپر کوئی زور تو تھا نہیں بلکہ تم خود ہی سرکش لوگ تھے۔ پس ہمارے اوپر ہمارے رب کی بات پوری ہو کے رہی۔ ہم کو اس کا مزا چکھنا ہی ہو گا۔ ہم نے تم کو گمراہ کیا، ہم خود بھی گمراہ تھے۔ پس وہ سب اس دن عذاب میں شریک ہوں گے۔ ۲۷-۳۳

ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کریں گے۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب ان سے کہا جاتا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو یہ اکڑتے اور کہتے تھے کہ کیا ہم ایک شاعر دیوانہ کے کہنے

سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں! بلکہ وہ حق لے کر آیا ہے اور وہ رسولوں کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے۔ ۳۶،۳۴،۲۷

بے شک تم کو دردناک عذاب چکھنا پڑے گا۔ اور یہ تو تم اسی کا بدلہ دیے جا رہے ہو جو تم کرتے رہے ہو۔ پس اللہ کے مخصوص بندے ہی اس سے محفوظ رہیں گے۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے معلوم رزق ہوگا۔ میوے، اور وہ نعمت کے باغوں میں بڑی عزت سے ہوں گے۔ تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ان کے لیے شرابِ معین کے جام گردش میں ہوں گے۔ بالکل صاف شفّاف، پینے والوں کے لیے لذّت ہی لذّت! نہ اس میں کوئی ضرر ہوگا اور نہ وہ اس سے نڈھال ہوں گے۔ اور ان کے پاس باحیا، غزال چشم حوریں ہوں گی گویا کہ شتر مرغ کے محفوظ انڈے ہیں۔ ۳۸ - ۴۸

پس وہ ایک دوسرے کی طرف پوچھتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔ ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ساتھی تھا جو کہا کرتا تھا کہ کیا تم بھی قیامت کی تصدیق کرنے والوں میں ہو! کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو ہم بدلہ پانے والے بنیں گے! کہے گا ذرا جھانک کے دیکھو تو سہی! تو وہ جھانکے گا اور اس کو جہنم کے بالکل بیچ میں دیکھے گا۔ کہے گا، خدا کی قسم! تم تو مجھے تباہ ہی کر دینے والے تھے! اگر میرے رب کا فضل نہ ہوتا تو میں بھی آج پکڑا ہوا ہوتا۔ ہے نا یہ حقیقت کہ اب ہم پہلی موت کے بعد کبھی مرنے والے نہیں اور نہ ہم پر عذاب ہوگا! بے شک بڑی کامیابی یہی ہے! جس کو کوشش کرنی ہو وہ اس کے لیے کوشش کرے!! ۴۹-۶۱

ضیافت کے لیے یہ بہتر ہے یا درختِ زقّوم! ہم نے اس کو ظالموں کے لیے ایک

افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

المؤمن ۴۰ — الذریت ۵۱

تدبرِ قرآن

جلد ہفتم

ebooks.i360.pk

فہرست

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبّرِ قرآن

جلد ہفتم

تفاسیر

سورۂ مومن (۴۰) ــــ تا ــــ سورۂ ذاریات (۵۱)

امین احسن اصلاحی

فاران فاؤنڈیشن

لاہور ــــ پاکستان

اہتمام — حسن خاور

مطبع — کیو۔وائی پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت — نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ — فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

دیباچہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمدللہ تدبر قرآن کی چھٹی جلد بھی پریس کے حوالہ کی جا رہی ہے۔ خدا نے چاہا تو اختتام سال سے پہلے پہلے کتاب قدر دانوں کے ہاتھوں میں ہوگی۔ تفسیر کا کام سورۂ مزمل تک ہو چکا ہے جس کے معنی ہیں کہ ساتویں جلد بھی تیار اور آٹھویں ـــ یعنی آخری جلد ـــ زیرِ تکمیل ہے۔ صحیح علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن اپنا اندازہ یہ ہے کہ زندگی اور صحت حاصل رہی تو آنے والے سال کے اندر اندر، ان شاء اللہ اس طویل اور پُر مشقت سفر کی آخری منزل آ جائے گی۔

اب چودھویں صدی ہجری بھی قریبِ اختتام ہے۔ کتاب کے ناشر ـــ خاور صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ـــ دل میں یہ ارمان رکھتے ہیں کہ صدی کے اختتام کے ساتھ تدبر قرآن کا کام بھی تکمیل کو پہنچ جائے۔ ان کا خیال ہے کہ ان دونوں باتوں کا قِران ایک مبارک قِران ہوگا اور وہ نئی صدی ہجری کا خیر مقدم تدبر قرآن کے مکمل سیٹ کے ساتھ کر سکیں گے۔ ان کے اس مخلصانہ جذبۂ شوق سے مجھے بھی ہمدردی ہے۔ میں نے ان کی دل داری میں کام کی مقدار بھی بڑھا دی ہے اور اوقاتِ کار کی پابندی کا بھی خاص طور پر اہتمام کر رہا ہوں۔ اگرچہ ہوگا وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے گا اور جو وہ چاہے گا اسی میں حکمت ہے اور میں اس پر دل سے راضی و مطمئن ہوں لیکن ناشر اور مؤلف دونوں کے دل میں جو خواہش ہے وہ یہی ہے۔

آخری گروپ کی سورتوں میں، جیسا کہ جلد پنجم کے دیباچہ میں اشارہ کر چکا ہوں، زبان اور نظم کی مشکلیں زیادہ ہیں۔ بعض مقامات میں تعبیرِ مطلب کے لیے اردو میں موزوں الفاظ اور اسلوب نہیں ملتے لیکن الحمدللہ میں پوری دل جمعی سے کام کر رہا ہوں۔ محنت تو کرنی پڑ رہی ہے لیکن اب ہر قدم پر منزل قریب آتی جا رہی ہے اس وجہ سے بحمداللہ قلم کا حوصلہ اور طبیعت کا نشاط قائم ہے اور امید یہی ہے کہ، ان شاء اللہ، آخر تک یہ قائم رہے گا۔

---

۱ ترتیبِ نو ـــ جلد ہفتم

۲ ترتیبِ نو ـــ جلد ششم

اس دوران میں کتاب کے قدردانوں کے بہت سے خطوط مجھے موصول ہوئے ہیں جن میں میری توقعات سے بہت بڑھ کر اس خدمت کی تحسین کی گئی ہے۔ میں ان تمام مخلصین کا دل سے شکر گزار ہوں۔ اگر اصحاب علم اس خدمت پر مطمئن ہیں تو اس دنیا میں مجھے اس کا پورا پورا صلہ مل گیا۔ اب صرف یہ آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور میری نجات کا ذریعہ بنے۔ کتاب کے قدردانوں سے التماس ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں میری اس آرزو کو یاد رکھیں۔

رفیق عزیز خاور صاحب سلمہٗ کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کو مبارک باد بھی دیتا ہوں کہ جس کام کا انھوں نے بیڑا اٹھایا اس کو نہایت خوبی و نفاست سے انجام دیا۔ اگرچہ وہ اس کوچہ میں نو وارد تھے جس کے سبب سے قدردانوں کو مختلف قسم کے اندیشے لاحق ہوئے لیکن جلد پنجم کو دیکھ کر ہر صاحبِ ذوق نے ان کے سلیقہ کی داد دی۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی کتاب کی خدمت کے لیے خاص کرے اور علم صحیح اور عمل صالح کی برکتوں سے نوازے۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

رحمان آباد

۱۰ نومبر ۱۹۷۸ء

۸۔ ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ

تدبّرِ قرآن

۴۰

المؤمن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود

گروپ کی پچھلی سورتوں کی طرح اس سورہ کی بنیاد بھی توحید ہی پر ہے۔ قرآن کے دوسرے اصولی مطالب بھی اس میں زیر بحث آئے ہیں لیکن اصلاً نہیں بلکہ ضمناً توحید کے لوازم و مقتضیات کی حیثیت سے آئے ہیں۔

اس کا قرآنی نام حٰمٓ ہے اور یہی نام اس کے بعد کی چھ سورتوں کا بھی ہے۔ یہ ساتوں حوامیم کے نام سے مشہور ہیں اور اپنے ناموں کی طرح اپنے مطالب میں بھی مشترک ہیں۔ یہ تمام سورتیں دعوت کے اس دور سے تعلق رکھنے والی ہیں جب توحید و شرک کی بحث نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں پر مکہ میں عرصۂ حیات تنگ ہونے لگا تھا۔ ہجرت کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکا ہے۔ اب اس میں اور آگے کی سورتوں میں وقت کے یہ حالات بالتدریج نمایاں ہوتے جائیں گے اور ان کے تقاضے سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدۂ نصرت و حمایت بھی بالکل واضح ہوتا جائے گا۔ جو مسلمان اس وقت حالات سے نبرد آزما تھے ان کی اس میں حوصلہ افزائی کی گئی ہے، جو خطرات میں تھے ان کو تسلی دی گئی ہے اور جو دعوت کے ساتھ ہمدردی رکھنے کے باوجود کسی مصلحت سے، اب تک کھل کر اس کی حمایت کے لیے میدان میں نہیں اترے تھے ان کو یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ مصلحتوں سے بے پروا ہو کر وہ کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، اللہ تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہوگا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۶) اس کتاب کی تنزیل اس خدا کی طرف سے ہے جو غالب و مقتدر بھی ہے اور علیم بھی۔ گناہوں کو بخشنے والا، توبہ کو قبول کرنے والا بھی ہے اور سخت پاداش والا اور صاحبِ قدرت و اختیار بھی۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اسی کی طرف سب کا لوٹنا اور اسی کے آگے سب کو پیش ہونا ہے۔ اس قرآن کی مخالفت میں کج بحثی وہی لوگ کر رہے ہیں جو جزا و سزا کے منکر ہیں۔ اس وقت اس ملک میں یہ لوگ جو دندنا رہے ہیں اس سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔ ان سے پہلے جو قومیں گزر چکی ہیں ان کی تاریخ سبق آموزی کے لیے کافی ہے۔ ان قوموں نے بھی اسی طرح اپنی کج بحثیوں سے حق

کو پسپا کرنے اور رسولوں کو شکست دینے کی کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ وہ اللہ کے رسول پر ہاتھ ڈالیں ان کو عذاب نے آپکڑا۔ اسی طرح ان متمردین پر بھی اللہ کا قانونِ عذاب صادق ہو چکا ہے اور یہ اپنے طغیان و فساد کی پاداش میں جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔

(۷ - ۹) جو لوگ فرشتوں کی سفارش کے بل پر خدا اور اس کے روزِ جزا سے بے پروا بیٹھے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ خدا کے مقرب فرشتے خدا کے باغیوں کے سفارشی نہیں ہیں بلکہ وہ ہر وقت خدا کی حمد و تسبیح میں معروف رہتے ہیں۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتے اور ان اہلِ ایمان کے لیے برابر استغفار کرتے رہتے ہیں جو اپنی گمراہیوں سے توبہ کر کے خدا کے راستہ کی پیروی کریں۔

(۱۰ - ۱۲) قیامت کے دن مشرکین جس طرح اپنے جرم کا اقرار اور خدا سے فریاد کریں گے اور ان کی فریاد کے جواب میں خدا کی طرف سے ان پر جو پھٹکار ہو گی، اس کی طرف اجمالی اشارہ۔

(۱۳ - ۲۰) تمام رحمت اور نعمت اللہ ہی کے اختیار میں ہے اس وجہ سے بندگی اور اطاعت کا حق دار وہی ہے۔ وہ بہت بلند رتبہ اور عالی مقام ہے۔ اس کے بھیدوں سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔ قیامت کے دن تنہا وہی مالک ہو گا اور مشرکوں کی سفارش کوئی نہیں کر سکے گا۔

(۲۱ - ۲۲) تاریخ کی شہادت کہ جن قوموں نے توحید کی دعوت دینے والے رسولوں کو جھٹلایا ان پر اللہ کا عذاب آیا اور جب ان پر عذاب آیا تو ان کے مزعومہ شرکا ان کے کچھ کام نہ آ سکے۔ قریش کو تنبیہ کہ یہی حشر تمہارا بھی ہونا ہے اگر تم نے انہی کی روش اختیار کی۔

(۲۳ - ۵۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت کا ایک خاص حصہ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہؓ اور قریش کو مندرجہ ذیل امور کی یاددہانی کی گئی ہے۔

- قریش کو یہ تنبیہ کہ قوت و صولت میں فرعون اور اس کی قوم کے لوگ تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے، لیکن جب حضرت موسیٰؑ کی تکذیب کی پاداش میں ان پر عذاب آیا تو کوئی چیز بھی ان کے کام آنے والی نہ بن سکی۔
- نبیؐ اور آپؐ کے صحابہ کو یہ یاددہانی کہ دعوتِ حق کے مخالفین کے ہاتھوں جو آزمائشیں پیش آرہی ہیں، صبر و عزیمت کے ساتھ، ان کو برداشت کرو۔ اگر تم اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہے تو بالآخر کامیابی تمہی کو حاصل ہو گی۔
- اس سرگزشت کے ذیل میں خاندانِ فرعون کے ایک مردِ مومن کا کردار بھی بیان ہوا ہے، جو قریش کے لیڈروں کے لیے بھی نہایت سبق آموز ہے اور ان لوگوں کے لیے بھی نہایت ہمت افزا ہے جو دعوتِ حق سے ہمدردی رکھنے کے باوجود اب تک اس کے اظہار و اعلان میں ہچکچا رہے تھے۔

(۵۶ - ۸۵) توحید اور قیامت کے آفاقی و انفسی دلائل کا حوالہ۔ قریش کو نہایت کھلے الفاظ میں انذار اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے نہایت قطعی الفاظ میں فتح و نصرت کا وعدہ۔

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنِ (۴۰)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات : ۸۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۲۲ حٰمٓ ۝۱ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝۲ غَافِرِ
الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۳ مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۝۴ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ
نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ
لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ
فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝۵ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى
وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقف لازم الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝۶ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ
وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ
لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ
لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝۷
رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ
مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۸

وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ
وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٩﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ ع
اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ
فَتَكْفُرُوْنَ ﴿١٠﴾ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ
فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿١١﴾ ذٰلِكُمْ
بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ
فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴿١٢﴾ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ
لَكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ رِزْقًا ۭ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ﴿١٣﴾ فَادْعُوا
اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿١٤﴾ رَفِيْعُ
الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ
مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿١٥﴾ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ڬ لَا
يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۭ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ
الْقَهَّارِ ﴿١٦﴾ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۭ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿١٧﴾ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ
اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ڛ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ
وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴿١٨﴾ يَعْلَمُ خَاۗىِٕنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴿١٩﴾
وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ
بِشَيْءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿٢٠﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا ع

فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِن قَبْلِهِمْ ۚ
كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ
بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِن وَاقٍ ﴿٢١﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ
كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ
قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢٢﴾

ترجمۂ آیات ۱-۲۲

یہ حٰمٓ ہے۔ اس کتاب کی تنزیل خدائے عزیز و علیم کی طرف سے ہے، جو گناہوں کو بخشنے والا، توبہ کو قبول کرنے والا، سخت پاداش اور بڑی قدرت والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ ۱-۳

اللہ کی ان آیات میں وہی لوگ کج بحثیاں کر رہے ہیں جو جزا کے منکر ہیں۔ تو ملک میں ان کا دندنانا تمھیں کسی مغالطہ میں نہ ڈالے۔ ان سے پہلے نوح کی قوم نے تکذیب کی اور ان کے بعد کے گروہوں نے بھی اور ہر امت نے اپنے رسول پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا اور باطل کے ذریعہ سے کج بحثیاں کیں تاکہ اس سے حق کو پسپا کر دیں تو میں نے ان کو دھر لیا تو دیکھو میرا عذاب کیسا ہوا! اور اسی طرح تیرے رب کی بات ان لوگوں پر پوری ہو چکی ہے جنھوں نے کفر کیا ہے۔ یہ لوگ دوزخ میں پڑنے والے ہیں۔ ۴-۶

جو عرش کو اٹھائے ہوئے اور جو اس کے اردگرد ہیں وہ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، اس کی حمد کے ساتھ، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ اے ہمارے رب، تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے تو ان لوگوں کی مغفرت فرما جو توبہ کریں اور تیرے راستہ کی

پیروی کریں اور ان کو عذاب جہنم سے بچا۔ اور اے ہمارے رب! ان کو ہمیشگی کے ان باغوں میں داخل کر جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ اور ان کو بھی جو ان کے آباء اور ازواج و ذریات میں سے جنت کے لائق ٹھہریں۔ بے شک عزیز و حکیم تو ہی ہے۔ اور ان کو بُرے نتائجِ اعمال سے بچا اور جن کو تو نے اس دن بُرے نتائج سے بچایا تو وہی ہیں جن پر تو نے رحم فرمایا۔ اور یہی درحقیقت بڑی کامیابی ہے۔ ۷-۹

اور جنھوں نے کفر کیا ان کو منادی کی جائے گی کہ خدا کی بیزاری تم سے اس کی نسبت سے کہیں زیادہ رہی ہے جتنی تم کو اس وقت اپنے سے ہے جب کہ تم کو ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم کفر کرتے تھے۔ وہ کہیں گے، اے ہمارے رب! تو نے ہم کو دوبار موت دی اور دوبار زندگی دی تو ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا تو کیا یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے! یہ انجام تمھارے سامنے اس وجہ سے آیا کہ جب اللہ واحد کی دعوت دی جاتی تو تم اس کا انکار کرتے اور اگر اس کے شریک ٹھہرائے جاتے تو تم مانتے۔ تو اب فیصلہ خدائے بلند و عظیم ہی کے اختیار میں ہے۔ ۱۰-۱۲

وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا اور تمھارے لیے آسمان سے رزق اتارتا ہے۔ اور یاددہانی نہیں حاصل کرتے مگر وہی جو متوجہ ہونے والے ہیں۔ تو اللہ ہی کو پکارو اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ، کافروں کے علی الرغم۔ وہ بلند درجوں والا اور عرش کا مالک ہے۔ وہ ڈالتا ہے روح، جو اس کے امر میں سے ہے، اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو روزِ ملاقات سے آگاہ کر دے۔ جس دن وہ خدا کے آگے بالکل بے نقاب ہوں گے۔ ان کی کوئی چیز بھی خدا سے مخفی نہیں ہو گی۔ آج کی بادشاہی کس کے اختیار میں ہے!

خدائے واحد و قہار کے اختیار میں! آج ہر جان کو اس کے کیے کا بدلہ ملے گا۔ آج کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ بے شک اللہ جلد حساب چکا دینے والا ہے۔ ۱۴-۱۷

اور ان کو قریب آ لگنے والی آفت سے ڈرا جب کہ دل حلق میں آ پھنسیں گے اور وہ غم سے گھٹے ہوئے ہوں گے۔ اس دن ظالموں کا نہ کوئی ہمدرد ہوگا اور نہ کوئی ایسا سفارشی جس کی بات سنی جائے۔ وہ نگاہوں کی چوری بھی جانتا ہے اور ان بھیدوں کو بھی جو سینے چھپائے ہوئے ہیں۔ اور اللہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ نہیں کریں گے۔ اللہ ہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔ ۱۸-۲۰

کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں! وہ ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے قوت میں بھی اور ان آثار کے اعتبار سے بھی جو انھوں نے زمین میں چھوڑے۔ پس اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ان کو پکڑا اور کوئی ان کو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا نہ بنا۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آتے تھے تو انھوں نے انکار کیا پس اللہ نے ان کو پکڑ لیا، بے شک وہ طاقتور اور سخت پاداش والا ہے۔ ۲۱-۲۲

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۙ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۱-۳)

تمام حوامیم کا مزاج بھی بالکل یکساں ہے

'حٰمٓ' اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ حروف مقطعات پر مفصل بحث سورۂ بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔ بس اتنی بات یہاں یاد رکھیے کہ یہ سورہ اور اس کے بعد کی تمام مکی سورتیں، جو اس گروپ میں شامل ہیں، سب اسی نام سے موسوم بھی ہیں اور سب کا مزاج بھی بالکل یکساں ہے۔

مخالفین پر امتنان اور ان کو تنبیہ

'تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ ...... الاٰیۃ' یہ قرآن کے مخالفین پر امتنان بھی ہے اور ان کو تنبیہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب نہایت اہتمام سے جو اتاری ہے تو اس لیے اتاری ہے کہ لوگ اس کی قدر کریں، اس سے ہدایت حاصل کریں اور اپنے رب کے اس اہتمام کے شکرگزار ہوں جو ان کی ہدایت کے لیے اس نے کیا ورنہ یاد رکھیں کہ جس نے یہ کتاب اتاری ہے وہ 'عزیز' بھی ہے اور علیم بھی۔ 'عزیز' ہے اس وجہ سے وہ ہر چیز پر قدرت و اختیار رکھتا ہے۔ وہ مخالفت کرنے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں' ہر سزا دے سکتا ہے اور کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں بن سکتا۔ 'عزیز' ہونے کے ساتھ ساتھ وہ علیم بھی ہے اس وجہ سے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کتاب کی تنزیل سے جو کشمکش برپا ہوئی ہے وہ کس مرحلہ میں ہے، اس کے پیش کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے اور اس کی مخالفت کرنے میں جو لوگ پیش پیش ہیں ان کے ارادے کیا ہیں، وہ کہاں تک پہنچ چکے ہیں اور کب ان کا ہاتھ پکڑا جانا ضروری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں ہے بلکہ خدائے عزیز و علیم کا اتارا ہوا صحیفۂ ہدایت ہے اس وجہ سے اس کی موافقت بھی بڑی اہمیت رکھنے والی بات ہے اور اس کی مخالفت کے نتائج بھی نہایت سنگین اور دوررس ہیں۔

'غَافِرِ الذَّنۡۢبِ وَقَابِلِ التَّوۡبِ شَدِيۡدِ الۡعِقَابِ ذِي الطَّوۡلِ-الاٰیۃ'۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مزید صفات بیان فرمائیں کہ وہ گناہوں کو بخشنے والا اور توبہ کو قبول کرنے والا بھی ہے اور سخت پاداش والا اور بڑی قدرت والا بھی۔ 'طَوۡل' کے معنی فضل، غنیٰ، قدرت اور بخشش کے ہیں۔ یہاں تقابل کے اصول کو پیش نظر رکھ کر میں نے قدرت کے معنی کو ترجیح دی ہے۔

فیصلہ کن مرحلہ

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں قسم کی صفات سے متصف اور دونوں طرح کے اختیارات کا مالک ہے تو اس کتاب کی تنزیل کے بعد ہر شخص کے لیے راہ کھلی ہوئی ہے کہ وہ یا تو اس کو قبول کر کے خدا کی رحمت و مغفرت کا امیدوار بن جائے یا اس کی مخالفت کر کے اس کے عذاب اور اس کی قدرت کی شان کے ظہور کا انتظار کرے۔

'لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ اِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُ'۔ یعنی اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہو کہ خدا کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے تو وہ اپنی اس غلط فہمی کی اصلاح کرے۔ خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے۔ قیامت کے دن سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے اور سب کے معاملات کا فیصلہ وہی فرمائے گا، نہ کسی اور کی طرف لوٹنا ہو گا نہ کوئی اور خدا کے اذن کے بغیر کسی کے لیے سفارش کر سکے گا۔

مَا يُجَادِلُ فِيۡۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَلَا يَغۡرُرۡكَ تَقَلُّبُهُمۡ فِي الۡبِلَادِ (۴)

'اٰيٰتِ اللّٰهِ' سے مراد اس کتاب کی آیات ہیں جس کی تنزیل کا ذکر اوپر آیت ۲ میں ہوا ہے۔ یہاں اس کو 'اٰيٰتِ اللّٰهِ' سے تعبیر کر کے اس کے دلیل و حجت ہونے کے پہلو کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

'اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا' سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو اس عذاب کے منکر تھے جس سے قرآن آگاہ کر رہا تھا۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بات گزر چکی ہے کہ اللہ کے رسولوں نے جب اپنی قوموں کو خدا کے عذاب سے ڈرایا تو انھوں نے اس کو بالکل جھوٹ جانا اور اپنی دنیوی کامیابیوں کو دلیل بنا کر رسول کے اس انذار کی تکذیب کی اور اس کا مذاق اڑایا۔

انذار کی تکذیب کرنے والوں کو تنبیہ

اس آیت میں اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ آج قرآن کی مخالفت میں جو کج بحثیاں کر رہے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جو اس کے انذارِ عذاب کے منکر ہیں۔ ان کے کبر پر یہ چیز بہت شاق گزر رہی ہے کہ انھوں نے اس کتاب اور اس کے لانے والے کا انکار کیا تو ان پر کوئی عذاب آ جائے گا۔ وہ یہ بات اپنی رعونت کے سبب سے ماننی نہیں چاہتے اور ظاہری حالات کے اعتبار سے وہ اپنے کو کامیاب و خوش حال دیکھ رہے ہیں اس وجہ سے وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن ان کی موجودہ خوش حالی سے کسی کو مغالطہ نہ ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی ہی قوموں کو عین ان کے دورِ عروج و اقبال میں پکڑ لیا اور وہ اس کی پکڑ سے اپنے کو بچا نہ سکیں۔

'فَلَا یَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِی الْبِلَادِ' میں خطاب اگرچہ ظاہر الفاظ کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں جو زجر و عتاب ہے اس کا رخ قریش کے متکبرین کی طرف ہے جو اپنے اقتدار اور اپنی سیادت و امارت کے گھمنڈ میں یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ ان پر کوئی عذاب آنے والا ہے۔ وہ قرآن کی بار بار کی تنبیہ پر حیران تھے کہ بھلا ان پر عذاب کیوں اور کدھر سے آئے گا!

'تَقَلُّب' کے معنی چلت پھرت اور آزادانہ آمد و شد کے ہیں۔ موقع و محل سے اس کے اندر غرور و تکبر کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھنے کی میں نے کوشش کی ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۪ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ (۵)

مذکورہ دعوے پر تاریخ سے دلیل

یہ اوپر والی بات 'فَلَا یَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِی الْبِلَادِ' کی دلیل تاریخ سے پیش کی گئی ہے کہ ان سے (قریش سے) پہلے قوم نوح اور ان کے بعد آنے والی قوموں (اشارہ عاد و ثمود وغیرہ کی طرف ہے) نے بھی اسی طرح اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی اور ہر قوم نے اپنے رسول کو پکڑ لینا چاہا اور اپنی کٹ حجتیوں سے اس کے حق کو پسپا کرنے کی کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ وہ رسول پر ہاتھ ڈالیں اللہ نے انھیں کو پکڑ لیا، پھر دیکھو کہ خدا نے ان کے عمل کی پاداش میں ان کو کیسا سخت پکڑا! اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت 'شَدِیْدُ الْعِقَابِ' جو بیان فرمائی ہے یہ اس کی شہادت پیش کی گئی ہے اور عذاب کے لیے لفظ 'عقاب' جو یہاں آیا ہے اس سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کے متمردین پر جو عذاب بھیجتا ہے

وہ ان کے اعمال کا قدرتی ردِ عمل ہوتا ہے۔ وہ ہرگز ان کے اوپر کوئی ظلم نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ان کے انجام سے عبرت تو پکڑنی چاہیے لیکن وہ ہمدردی کے مستحق ہرگز نہیں ہوتے۔

قریش کو ایک بروقت تنبیہ — اس آیت سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب قریش کے لیڈر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ ڈالنے کے لیے مشورے کرنے لگے تھے۔ قرآن نے ان کو آگاہی دے دی کہ اگر وہ اس قسم کا کوئی اقدام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس کے نتائج پر دور تک نگاہ ڈال لیں! اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے لیے جو تسلی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ (۶)

'کَلِمَۃُ رَبِّ' سے وہی کلمۃ العذاب مراد ہے جس کا ذکر سورۂ زمر کی آیت ۷۱ میں گزر چکا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا وہ کلی فیصلہ جس سے اس نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں آگاہ فرما دیا تھا کہ جو اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر شیطان کی پیروی کریں گے، اللہ ان سب کو جہنم میں بھر دے گا۔ فرمایا کہ تیرے رب کا یہ فیصلہ جس طرح پچھلی قوموں پر صادق آیا اسی طرح ان کافروں (کفارِ قریش) پر بھی صادق آ چکا ہے اور یہ بھی انہی کی طرح جہنم میں پڑنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنا فرض انجام دو۔ ان کے لیے جو انجام مقدر ہو چکا ہے یہ اس سے دوچار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب چونکہ جہنم کا دیباچہ ہے اس وجہ سے عذاب کو تعبیر جہنم سے کیا۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ○ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ﹰالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۷-۹)

فرشتوں کی حیثیت کی وضاحت — اب یہ فرمایا کہ اگر ان لوگوں کو فرشتوں کی سفارش اور ان کی مدد پر بھروسہ ہے اور ان کے بل پر یہ پیغمبر کے انذار کی تکذیب کر رہے ہیں تو ان کا حال یہ لوگ کان کھول کر سن لیں کہ عام فرشتے تو درکنار، خدا کے جو خاص مقرب فرشتے ہیں یعنی حاملینِ عرش اور ان کے زمرہ سے تعلق رکھنے والے، وہ بھی برابر خدا کی خشیت سے لرزاں و ترساں اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتے ہیں۔

'وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ' وہ الوہیت کے کسی زعم میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ خدا کے بندوں کی طرح اس پر ایمان رکھنے والے ہیں۔

'وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' اور ان لوگوں کے لیے جو خدا پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ برابر

استغفار کرتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت دونوں کے عذاب سے محفوظ رکھے۔ گویا یہی استغفار ان کی سفارش ہے اور یہ اہل ایمان کے لیے مخصوص ہے۔

فرشتوں کی اس خشیت اور اہل ایمان کے لیے ان کے استغفار کا ذکر سابق سورہ کی آخری آیت میں بھی گزر چکا ہے اور سورۂ شوریٰ میں بھی بدیں الفاظ آیا ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ...... (الشوریٰ : ۵)	اور خدا کی خشیت و جلال سے قریب ہے کہ آسمان اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح اور زمین والوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔

فرشتوں کی اس خشیت کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ جن لوگوں نے ان کی نسبت یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ خدا کے لاڈلے چہیتے اور اس پر اتنا زور و اثر رکھنے والے ہیں کہ اپنے پجاریوں پر وہ کسی حال میں بھی خدا کو ہاتھ ڈالنے نہیں دیں گے وہ اس حقیقت سے باخبر ہو جائیں کہ فرشتے اس قسم کے کسی زعم میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ وہ ہر وقت خدا کے آگے سرفگندہ اور اس کے قہر و غضب سے پناہ مانگتے رہنے والے ہیں۔

فرشتوں کی سفارش کی نوعیت

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ۔ یہ فرشتوں کے استغفار کی وضاحت ہے کہ وہ کوئی بات اپنے رب سے ناز و تدلل کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ وہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے علم ہی کے حوالہ کرتے ہیں کہ تیری رحمت بھی ہر چیز پر حاوی ہے اور تیرا علم بھی ہر چیز کو محیط ہے اس وجہ سے تو ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جو تیری رحمت اور علم کے تقاضوں کے مطابق ہوگا۔ اس عقیدے کے ساتھ وہ ان لوگوں کے لیے مغفرت کی درخواست کرتے ہیں جو اپنی غلطیوں سے توبہ کر لیں اور ان کی اصلاح کر کے اللہ کے رستہ کے پیرو بن جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ فرشتے دعا اور سفارش تو برابر کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی دعا اور سفارش ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی جاہلیت کی بدعقیدگی و بدعملی سے توبہ کر کے اللہ کے رستہ کے پیرو بن جائیں نہ کہ ان لوگوں کے لیے جو اس کے رسول اور اس کے دین کے دشمن ہیں۔

فرشتے اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جنت توبہ اور اصلاح سے حاصل ہوگی

رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ یہ اسی استغفار کی مزید تفصیل ہے کہ وہ ان لوگوں کے لیے جنت کی دعا کرتے ہیں جو توبہ اور اصلاح کر کے اس کا حق پیدا کر لیتے ہیں اور جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ نیز وہ ان کے آباء، ازواج اور ذریات میں سے بھی صرف ان لوگوں کے لیے دعا کرتے ہیں جو توبہ و اصلاح سے

اس کے لیے استحقاق پیدا کریں۔ مطلب یہ ہے کہ فرشتے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ مجرد کسی کے طفیل اور کسی کے نسب و خاندان کی بنا پر کسی کو جنت حاصل ہونے والی نہیں ہے بلکہ جس کو بھی حاصل ہوگی اس کے استحقاق اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوگی۔

'إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ' یہ بعینہٖ وہی کلمہ شفاعت ہے جو مائدہ کی آیت ۱۲۰ میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے نقل ہوا ہے۔ وہاں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہ تفویض الی اللہ کا کلمہ ہے یعنی تو جو چاہے کر سکتا ہے لیکن ساتھ ہی تو حکیم بھی ہے اس وجہ سے وہی کرے گا جو عدل و حکمت پر مبنی ہوگا۔ فرشتوں کا یہ استغفار درحقیقت اہل زمین کے لیے سفارش ہے اور اس کی نوعیت یہی ہے جو قرآن نے بیان فرمائی ہے نہ کہ وہ جو جاہلوں نے سمجھی ہے۔

'وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ ۚ وَمَنْ تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهُ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ'۔ لفظ 'سیئات' یہاں نتائج سیئات کے معنی میں ہے۔ عمل اور نتیجہ کے لزوم کو ظاہر کرنے کے لیے بعض اوقات فعل، نتیجۂ فعل کے مفہوم میں بولتے ہیں یعنی فرشتے اہل ایمان کے لیے یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے رب، تو ان کو برائیوں کے نتائج سے محفوظ رکھ۔ یعنی ان کے گناہوں کو جھاڑ دے کہ وہ ان کے شر سے محفوظ رہیں۔

'وَمَنْ تَقِ السَّيِّئَاتِ ..... الآیۃ' فرشتوں کے اس فقرے سے روز حساب و کتاب کی ہولناکی کا اندازہ ہو رہا ہے کہ ان کی نگاہوں میں اصلی خوش قسمت وہ ہے جس کو اللہ نے اس دن اس کے گناہوں کے نتائج سے محفوظ رکھا۔ ان کے نزدیک سب سے بڑی کامیابی یہی ہے اور اصل خوش بخت وہی ہے جس نے یہ کامیابی حاصل کی۔

فرشتوں کے اس استغفار کے بیان سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ واضح کرنا ہے کہ فرشتے اہل زمین کے لیے سفارش تو ہر وقت کر رہے ہیں لیکن ان کی سفارش کی نوعیت یہ ہے جو بیان ہوئی ہے نہ کہ وہ جس کے بل پر لوگ آخرت سے بے فکر بیٹھے ہیں اور جب ان کو اصل حقیقت کی یاد دہانی کی جاتی ہے تو مناظرہ و مجادلہ کے لیے آستینیں چڑھا لیتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللَّهِ أَكْبَرُ مِنْ مَقْتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ إِذْ تُدْعَوْنَ إِلَى الْإِيمَانِ فَتَكْفُرُونَ (۱۰)

اصل صورت حال جس سے جھوٹی شفاعت پر تکیہ کرنے والوں کو سابقہ پیش آئے گا

یعنی یہ لوگ تو امید لگائے بیٹھے ہیں کہ ان کے سفارشی ان کو اللہ کے ہاں اونچے سے اونچے درجے دلوائیں گے لیکن وہاں ان کو منادی کے ذریعہ سے یہ آگاہی دی جائے گی کہ آج جتنا غم و غصہ تم کو اپنی بدبختی و محرومی اور اپنے لیڈروں کی کج اندیشی و ضلالت پر ہے اس سے زیادہ تمہارے حال پر غصہ و غضب خدا کو اس وقت تھا جب کہ تم کو رسول کے ذریعہ سے ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم نہایت رعونت کے ساتھ دعوت کو

ٹھکراتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اب اپنی اس دعوت اور خدا کے اس غصہ و غضب کا انجام بھگتو اور اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹو۔ اب یہاں کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ یہ جو کچھ تمہارے سامنے آیا ہے اللہ کی طرف سے اتمام حجت کے بعد آیا ہے اس وجہ سے تم اسی کے سزاوار ہو۔

'اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ' ظرف ہے 'لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ' کا۔ 'ایمان' سے خاص طور پر توحید پر ایمان مراد ہے۔ اس لیے کہ خدا کے ہاں معتبر ایمان وہی ہے جو توحید کے ساتھ ہو۔ سورۂ زمر آیت ۴۵ میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ منکرینِ آخرت کو سب سے زیادہ چڑ توحید کی دعوت سے ہے۔ یہاں بھی آگے والی آیت میں وضاحت فرما دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ غصہ ان پر اس وجہ سے ہوگا کہ جب ان کو توحید کی دعوت دی جاتی تو اس سے بدکتے اور شرک کو بڑی خوش دلی سے قبول کرتے۔ 'ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۚ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ' (۱۲) (یہ سب تمہیں اس وجہ سے پیش آیا کہ جب اللہ واحد کی دعوت دی جاتی تو تم اس کا انکار کرتے اور جب اس کے شریک ٹھہرائے جاتے تو تم مانتے تو اب تو فیصلہ خدائے بلند و عظیم ہی کے اختیار میں ہے)۔

قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ (۱۱)

اقرار بعد از وقت

اس وقت یہ لوگ بڑی سعادت مندی اور بڑی صفائی کے ساتھ کہیں گے کہ اے رب! اب ہم اپنے تمام جرائم کا اقرار کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ناممکن تھا اس وجہ سے ہم تیرے مواخذہ و محاسبہ سے بے خوف ہو کر تیرے رسول اور اس کی دعوت کا مذاق اڑاتے رہے لیکن اب تو نے ہمیں دو بار موت اور دو بار زندگی دے کر موت کے بعد کی زندگی کا اچھی طرح مشاہدہ کرا دیا تو کیا اب اس کی بھی کوئی سبیل ہے کہ اس دوزخ سے ہمیں نکلنا نصیب ہو کہ ہم از سرِ نو دنیا میں جا کر ایمان اور عمل صالح کی زندگی بسر کریں! دو بار موت، سے ایک تو وہ حالتِ موت مراد ہے جو اس دنیا میں وجود پذیر ہونے سے پہلے انسان پر طاری ہوتی ہے اور دوسری وہ موت ہے جس سے ہر زندہ کو لازماً دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح زندگی ایک تو وہ ہے جو اس دنیا میں حاصل ہوتی ہے اور دوسری وہ جو قیامت کو حاصل ہوگی۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۚ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۱۲)

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جواب دلوایا جائے گا کہ یہ جو کچھ تمہیں پیش آیا تمہاری اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ تمہیں توحید کی دعوت دی جاتی تو تم اس سے بدکتے اور شرک کے تم بڑے حامی بنے رہے تو اب فیصلہ خدائے برتر و عظیم ہی کے اختیار میں ہے اور اس کا فیصلہ تمہارے حق میں یہی ہے جس سے تم دوچار ہو۔

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ وَیُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ؕ وَمَا یَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ یُّنِیْبُ (۱۳)

رحمت اور عذاب دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہے

یعنی رحمت اور نقمت دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ اس وجہ سے ڈرنا بھی اسی سے چاہیے اور امید بھی اسی سے رکھنی چاہیے۔ وہ اپنی ان دونوں شانوں کا برابر مشاہدہ کراتا رہتا ہے۔ وہی آسمان سے رعد و برق اور صاعقہ کا بھی مشاہدہ کراتا رہتا ہے اور وہی بارش بھی نازل کرتا ہے جو زمین کے تمام رزق و فضل کے دروازے کھولتی ہے۔ یہ اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ آسمان اور زمین دونوں ایک ہی خدا کے تصرف میں ہیں اور اس کے ہاتھ میں صاعقۂ عذاب بھی ہے اور رزق و فضل کے خزانے بھی۔

نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس شے کی ضرورت ہے

'وَمَا یَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ یُّنِیْبُ' یعنی خدا کی یہ شانیں لوگوں کو تعلیم و تذکیر کے لیے ظاہر تو برابر ہوتی رہتی ہیں لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کا انحصار اس بات پر ہے کہ آدمی کے اندر متوجہ ہونے اور سوچنے سمجھنے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ اگر اپنی خواہشوں کے پیچھے کوئی ایسا اندھا بن جائے کہ ان سے ہٹ کر کسی اور چیز کی طرف دیکھنے اور اس سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا کوئی حوصلہ اس کے اندر پایا ہی نہ جاتا ہو تو ایسے شخص کی آنکھیں کوئی بڑی سے بڑی نشانی بھی نہیں کھول سکتی۔

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۱۴)

اہل ایمان کو دعوت عزم

یہ خطاب مسلمانوں سے ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ مشرکین آنکھیں کھولنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور تمھاری دعوت توحید سے یہ چڑتے اور تم سے لڑتے ہیں تو اب ان کی کوئی پروا نہ کرو بلکہ ان کے علی الرغم تم اپنے رب ہی کو بلا شرکت غیرے پکارو اور خالص اطاعت کے ساتھ اسی کی بندگی کرو۔

رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقِ (۱۵)

یعنی اللہ تعالیٰ بڑے بلند درجات والا اور تمام کائنات کے عرش حکومت کا مالک ہے۔ اس تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ یہ مشرکین جن کو اس کا شریک و سہیم اور اس کا مقرب بنائے بیٹھے ہیں، یہ سب ان کے خود تراشیدہ مقربین ہیں، خدا کی بارگاہِ بلند سب کی پہنچ سے بالا ہے۔

خدا کی مرضیات کے علم کا واحد ذریعہ وحی ہے

'یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ' 'رُوْح' سے مراد یہاں 'وحی' ہے۔ وحی کو 'روح' سے تعبیر کرنے کی وجہ واضح ہے کہ جس طرح روح سے جسم کو زندگی حاصل ہوتی ہے اسی طرح وحی سے انسان کی عقل اور اس کے دل کو زندگی، حرارت اور روشنی حاصل ہوتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے کہ 'انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔' 'مِنْ اَمْرِهٖ' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ یہ وحی امورِ الٰہیہ میں سے ہے جس کی پوری کیفیت و ماہیت ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، اس کی کیفیت وہی سمجھتا ہے جو اس کو نازل

کرتا ہے یا پھر وہ سمجھتا ہے جس کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ یہی حقیقت دوسرے مقام میں یوں واضح فرمائی ہے کہ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (الاسرآء : ۸۵) (وہ تم سے روح کی بابت سوال کرتے ہیں، کہہ دو، روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تم کو علم نہیں دیا گیا ہے مگر تھوڑا) سورۂ اسرآء کی مذکورہ آیت کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

یہاں اس ٹکڑے کے لانے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ خدا کی بارگاہِ بلند تک کسی جن و بشر کی رسائی نہیں ہے کہ وہ اس کے غیب سے واقف ہو سکے۔ اس کی مرضیات جاننے کا واحد ذریعہ صرف وہ وحی ہے جو وہ اپنے بندوں میں سے اس پر نازل فرماتا ہے جس کو اس کارِ خاص کے لیے انتخاب فرماتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان مشرکین نے اپنے زعم کے مطابق غیب کے جاننے کے جو ذرائع ایجاد کر رکھے ہیں وہ بالکل لا یعنی ہیں۔ خدا کی پسند و ناپسند جاننے کا ذریعہ بس وحی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر نازل فرماتا ہے لیکن بد شامت زدہ لوگ قرآن اور اس کے لانے والے کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کو زعم ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو رسول بنانے والا ہوتا تو ان میں سے کسی کو رسول بناتا۔ ان کو پتہ نہیں ہے کہ اس منصب کے لیے اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے منتخب فرماتا ہے اور وہ جس کو منتخب فرماتا ہے وہی اس کا اہل ہوتا ہے، ہر مدعی اس کا اہل نہیں ہوتا۔

لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ۔ 'يَوْمَ التَّلَاقِ' سے مراد روزِ قیامت ہے اس لیے کہ اس دن سب کی پیشی خدا کے آگے ہونی ہے۔ وحی اور رسالت کا مقصود در اصل اسی دن سے لوگوں کو آگاہ کرنا ہے۔ اصل مسئلہ جس کو سمجھنے کی ضرورت ہے یہی ہے۔ اگر یہ سمجھ میں آجائے تو دوسرے تمام مسائل کو سمجھنے کے لیے راہ کھل جاتی ہے۔ اگر یہ سمجھ میں نہ آئے تو انسان کا کوئی قدم بھی صحیح سمت میں نہیں اٹھ سکتا۔ اس وجہ سے انبیاء کرام کا اصل مشن اسی منزل کی رہنمائی رہا ہے۔

يَوْمَ هُم بَارِزُونَ ۖ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۚ لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۱۶)

نہ خدا سے کوئی چیز مخفی ہوگی اور نہ کوئی اس کے اقتدار سے باہر ہوگا

اس دن ہر شخص کا سارا ظاہر و باطن خدا کے آگے بالکل بے نقاب ہوگا۔ کسی کی کوئی بات بھی اس سے ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہوگی کہ کسی گواہی و ثبوت کی ضرورت پیش آئے یا کوئی غلط بیانی کر سکے یا کوئی اپنے کسی جرم کو چھپا سکے یا اس کی کوئی غلط تاویل کر سکے یا کوئی اس کے باب میں کوئی جھوٹی سفارش کر سکے۔

لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ۔ یعنی اس وقت جب کہ ہر شخص خدا کے آگے بالکل بے نقاب اور بے بس ہوگا مجرموں سے خطاب کر کے پوچھا جائے گا کہ اب بولو، آج بادشاہی کس کی ہے؟ تم جن کو خدا کا شریک و سہیم

بنائے بیٹھے تھے اور یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ تم کو خدا سے بچا لیں گے، وہ کہاں گئے؟

'لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ' چونکہ اس وقت کسی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوگا اس وجہ سے خود ہی جواب دیا کہ آج کے دن بادشاہی صرف خدائے واحد و قہار کی ہے۔ یہاں نہ کوئی کسی کا یار و ناصر بن سکے گا اور نہ کوئی خدا کے کسی فیصلہ کو بدل سکے گا۔ لفظ 'قہار' کی تحقیق اس کے محل میں بیان ہو چکی ہے۔

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۭ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۱۷)

یعنی آج کا دن خدا کے عدلِ کامل کے ظہور کا دن ہے۔ آج ہر شخص کو اس کے اپنے عمل کا بدلہ ملے گا۔ کسی کی کوئی حق تلفی یا کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی اور یہ سارا کام چشم زدن میں ہوگا۔ کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس میں بڑی مدت صرف ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ بڑی جلدی حساب چکا دینے والا ہے۔

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ڛ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (۱۸)

لفظ 'ازفۃ' کا مفہوم

'اٰزِفَة' کے معنی وہ چیز جو قریب آ لگی ہو۔ یہاں یہ لفظ قیامت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس صفت کے استعمال سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ قیامت کو بہت بعید نہ سمجھو، وہ بالکل پاس ہی کھڑی ہے۔ 'مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ' (جو مرا اس کی قیامت آ گئی) قیامت کے دن اس فاصلہ کا کسی کو بھی احساس نہیں ہوگا جو اس کے اور قیامت کے درمیان حائل ہے، بلکہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر شخص کی قیامت میں بس اتنے ہی دن باقی ہیں جتنے دن اس دنیا میں اس کی زندگی کے باقی ہیں۔ جس طرح ہر شخص کی موت اس کے پہلو میں کھڑی ہے اسی طرح قیامت بھی اس کے بغل میں موجود ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب کسی قوم کی طرف رسول کی بعثت ہوتی ہے تو وہ رسول اس کے لیے خدا کی عدالت کی منزلت میں ہوتا ہے۔ اگر قوم رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ یہ اس قوم کے لیے گویا قیامتِ صغریٰ ہوتی ہے جو تمہید ہوتی ہے قیامتِ کبریٰ کی۔ اس لفظ (ازفۃ) کے استعمال سے مقصود قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ وہ قیامت کو بعید نہ سمجھیں۔ ان کی عدالت کا وقت اب آ چکا ہے۔ ایک عدالت ان کے لیے قائم ہو چکی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ آخرت کی عدالت کا انتظار کریں جو سارے معاملات کا آخری فیصلہ کر دے گی۔

'اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ۥ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ' یہ اس قیامت کی ہولناکی کی تصویر ہے کہ اس دن مجرموں کے دل گویا حلق میں آئے ہوئے ہوں گے اور وہ غم و الم سے گھٹے ہوئے ہوں گے۔ نہ اس دن کسی کے اپنے حلق سے اپنی مدافعت میں کوئی آواز نکلے گی

اور نہ ان کا کوئی ہمدرد یا سفارشی ہوگا جو ان کی حمایت یا سفارش میں اپنی زبان کھولے۔

'شفیع' کے ساتھ 'یطاع' کی صفت مشرکین کے اس وہم پر ضرب لگانے کے لیے ہے کہ وہ اپنے معبودوں کے متعلق یہ تصور رکھتے ہیں کہ یہ خدا کے ایسے لاڈلے اور چہیتے ہیں کہ خدا ان کی ناز برداری میں ان کی ہر بات لازماً مانے گا۔ فرمایا کہ خدا کے ہاں ان کا کوئی سفارشی ایسا نہیں ہوگا جس کی کوئی شنوائی ہو۔

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (۱۹)

سفارش کے خلاف ایک دلیل

کسی کے باب میں کسی کی سفارش تو اس کے ہاں کچھ کارگر ہو سکتی ہے جو ساری صورتِ حال سے خود واقف نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ تو ہر شخص کی ہر چھوٹی بڑی بات سے خود واقف ہے۔ وہ تو نگاہ کی خیانتوں اور سینوں میں چھپے ہوئے رازوں سے بھی پوری طرح باخبر ہے تو اس کے آگے کسی کی کوئی سفارش کیا کارگر ہو سکے گی!

وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۲۰)

رہی یہ بات کہ کوئی اپنی سفارش سے حق کو باطل اور باطل کو حق بنا سکے تو اس کا بھی امکان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ حق کے مطابق ہوگا اور کوئی اپنی سفارش سے اس کے فیصلۂ حق کو باطل سے نہیں بدلوا سکتا۔

'وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ' رہے ان مشرکین کے معبودانِ باطل تو ان کے اختیار میں سرے سے کسی امر کا فیصلہ ہی نہ ہوگا کہ وہ کسی کی حمایت یا مخالفت میں کچھ کر سکیں۔

'اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ' یہ اوپر کی بات کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ حقیقی دیکھنے والا اور سننے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے تو اس کے سوا حق کسے ہے کہ وہ کوئی فیصلہ کرے اور جب وہ دیکھنے والا اور سننے والا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی اپنی سفارش سے اس کو دھوکا دے کر غلط فیصلے کرا سکے اور یہ معبودانِ باطل جو نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں آخر کس بنا پر ان کے متعلق یہ تصور کیا گیا ہے کہ یہ بھی کسی کے معاملہ کا فیصلہ کرنے والے بنیں گے!

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ (۲۱)

قریش کو صاف الفاظ میں تہدید

یہ قریش کو صاف الفاظ میں تہدید ہے کہ اس جسارت کے ساتھ رسول کے انذار کی جو وہ تکذیب کر رہے ہیں تو کیا کبھی اس ملک کی سیاحت انھوں نے اس قصد سے نہیں کی کہ دیکھتے کہ ان سے پہلے ان قوموں کا کیا حشر ہو چکا ہے جو اپنی قوت و جمعیت میں ان سے بڑھ کر اور تعمیر و تمدن کے آثار کے اعتبار

سے ان پر کہیں فوقیت رکھنے والی تھیں لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کے جرموں کی پاداش میں ان کو پکڑا تو نہ ان کی قوت و جمعیت ان کے کچھ کام آ سکی، نہ ان کی تعمیری و تمدنی ترقیاں آڑے آ سکیں اور نہ ان کے وہ اصنام و آلہہ ہی ان کی حفاظت کر سکے جن کو وہ اپنا حامی و ناصر سمجھتے تھے۔ یہ اشارہ عاد و ثمود اور اہلِ مدین وغیرہ کی طرف ہے جن کی قوت و جمعیت اور تمدنی و تعمیری ترقیوں کی تفصیلات پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔

لفظ 'شدۃ' یہاں اعظم و اکثر کے مفہوم پر بھی متضمن ہے اس وجہ سے 'قوۃ' کے ساتھ 'اثارا' کا ذکر بالکل موزوں ہے۔ 'اثار' سے مراد تمدنی و تعمیری ترقیوں کے آثار ہیں۔ دنیا میں انہی آثار کو ہمیشہ قوموں کی عظمت و شوکت کی دلیل سمجھا گیا ہے۔ لیکن قرآن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگر قوم ایمان سے عاری ہو تو یہ آثار اس کے زوال کی نشانی ہیں اور بالآخر یہی اس کے قومی وجود کے لیے مقبروں کی صورت میں تبدیل ہو کے رہتے ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۲۲)

یہ ان قوموں کی تباہی کا سبب بیان فرمایا ہے کہ ان کے پاس اللہ کے رسول نہایت واضح نشانیاں لے کر آئے لیکن انھوں نے اپنی قوت و جمعیت اور اپنی دنیوی ترقیوں کے زعم میں رسولوں کے انذار کی کوئی پروا نہ کی بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کو پکڑا اور جب پکڑا تو وہ اس کی پکڑ سے چھوٹ نہ سکے۔ اللہ تعالیٰ قوی اور سخت پاداش والا ہے۔ جب وہ پکڑتا ہے تو کوئی ساتھی اس سے چھڑا نہیں سکتی۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــ آیات: ۲۳-۵۵

آگے حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت آ رہی ہے جس سے اصل مقصود تو اس دعوے کی دلیل پیش کرنا ہے جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوا ہے کہ جب کسی قوم کی طرف رسول کی بعثت ہوتی ہے اور قوم اس کی تکذیب کر دیتی ہے تو وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے اگرچہ قوت و شوکت اور تعمیر و تمدن کے اعتبار سے وہ کتنی ہی برتر قوم ہو۔ یہ سرگزشت سنا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو تسلی دی گئی ہے کہ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ، یہی حشر قریش کے ان فراعنہ کا بھی ہونا ہے اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی۔ ساتھ ہی اس سرگزشت کے ضمن میں خاندانِ فرعون کے ایک مردِ مومن کی داستان بیان ہوئی ہے جو ایک مدت تک تو، بربنائے مصلحت، اپنے ایمان کو چھپائے رہے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ اور ان کی دعوت کے لیے آخری خطرہ پیش آگیا ہے تو کھل کر میدان میں آ گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمایت میں اپنی جان لڑا دی۔

اس مردِ مومن کی سرگزشت میں جو سبق مضمر ہیں ان کی وضاحت تو آیات کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی، یہاں اس کے چند نمایاں پہلو پیشِ نظر رکھیے۔

قریش کے لیڈروں کو یہ اس پہلو سے سنائی گئی ہے کہ اپنی قوم کی حقیقی خیر خواہی یہ ہے جو اس بندۂ مومن نے کی نہ کہ وہ جو اپنے زعم کے مطابق تم کر رہے ہو۔ اس مردِ مومن نے جب دیکھا کہ اس کی قوم تباہی کے راستہ پر چل پڑی ہے تو اپنے تمام مفادات کو بالائے طاق رکھ کر اس نے اس کو اس خطرناک اقدام سے روکنے کے لیے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیا اور تمھارا حال یہ ہے کہ تم اپنا سارا زور و وزر اپنی قوم کو عذابِ الٰہی کی طرف دھکیلنے میں صرف کر رہے ہو۔

جو لوگ کسی مصلحت سے اب تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے ان کو اس سرگزشت کے ذریعہ سے یہ سبق دیا گیا ہے کہ ایمان کے معاملے میں مصلحت کا لحاظ اسی وقت تک جائز ہے جب تک اس سے مقصود ایمان کی حفاظت اور اہلِ ایمان کی بہبود رہو۔ اگر ایمان اور اہلِ ایمان کے لیے آخری خطرہ پیش آجائے تو تمام مصالح کو بالائے طاق رکھ کے اس مردِ مومن کی طرح ہر شخص کو میدان میں آجانا چاہیے۔

کمزور اور مظلوم مسلمانوں کو اس سرگزشت کے ذریعہ سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جو لوگ کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے اس مردِ مومن کی طرح بازی کھیلتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کا یار و ناصر ہوتا ہے۔

اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۳-۵۵

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ
وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ
بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ
وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾
وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ
اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ وَقَالَ
مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ
بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖۤ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ ع ۳

يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ
بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ وَإِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ ۖ وَإِنْ
يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي
مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ يَا قَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ
ظَاهِرِينَ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنْ بَأْسِ اللَّهِ إِنْ جَاءَنَا ۚ
قَالَ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ
الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ
يَوْمِ الْأَحْزَابِ ﴿۳۰﴾ مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ
مِنْ بَعْدِهِمْ ۚ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَيَا قَوْمِ
إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ
مَا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۗ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ
هَادٍ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ
فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَبْعَثَ
اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ
مُرْتَابٌ ﴿۳۴﴾ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ
أَتَاهُمْ ۖ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ كَذَٰلِكَ
يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ
يَا هَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا لَعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ ﴿۳۶﴾ أَسْبَابَ

السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّىْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَكَذٰلِكَ
زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا كَيْدُ
فِرْعَوْنَ اِلَّا فِىْ تَبَابٍ ﴿۳۷﴾ وَقَالَ الَّذِىْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ ع ۴ ۱۰ ۹
اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا
مَتَاعٌ ؗ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِىَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى
اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾ وَيٰقَوْمِ مَا لِىْٓ
اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِىْٓ اِلَى النَّارِ ﴿۴۱﴾ تَدْعُوْنَنِىْ المنصف
لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِىْ بِهٖ عِلْمٌ ؗ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى
الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِىْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ
فِى الدُّنْيَا وَلَا فِى الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ
هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَاُفَوِّضُ اَمْرِىْٓ
اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا
مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ
عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۟ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ
فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِى النَّارِ فَيَقُوْلُ
الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ
مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا

كُلٌّ فِيهَآ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۸﴾ وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ
لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۴۹﴾
قَالُوٓا أَوَلَمْ تَكُ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُم بِالْبَيِّنٰتِ ۖ قَالُوا بَلٰى ۚ قَالُوا
ع ۱۲ فَادْعُوا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾ إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا
وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ﴿۵۱﴾ يَوْمَ
لَا يَنفَعُ الظّٰلِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾
وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدٰى وَأَوْرَثْنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ الْكِتٰبَ ﴿۵۳﴾
هُدًى وَّذِكْرٰى لِأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿۵۴﴾ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ
حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴿۵۵﴾

ترجمۂ آیات ۲۳-۵۵

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو، اپنی نشانیوں اور ایک واضح سند کے ساتھ، فرعون، ہامان اور قارون کی طرف۔ تو انھوں نے کہا کہ یہ تو ایک جادوگر لپاٹیا ہے۔ پس جب وہ آیا ان کے پاس، ہمارے پاس سے حق لے کر، انھوں نے کہا ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کرو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھو۔ اور ان کافروں کی چال بالکل رائگاں گئی۔ ۲۳-۲۵

اور فرعون نے کہا، مجھے چھوڑو، میں موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور وہ اپنے رب کو پکارے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ تمھارا دین نہ بدل ڈالے یا ملک میں بغاوت نہ پھیلا دے۔ اور موسیٰ نے کہا میں نے اپنے اور تمھارے رب کی پناہ لی ہر اس متکبر کے شر سے جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔ ۲۶-۲۷

اور آلِ فرعون میں سے ایک مردِ مومن نے، جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، کہا، کیا تم لوگ ایک شخص کو اس بنا پر قتل کرو گے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے درآنحالیکہ وہ تمھارے رب کی جانب سے نہایت واضح نشانیاں بھی لے کر آیا ہے! اور اگر وہ جھوٹا ہو گا تو اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر پڑے گا۔ اور اگر وہ سچا ہوا تو اس کا کوئی حصہ تم کو پہنچ کے رہے گا جس کی وہ تم کو وعید سنا رہا ہے۔ اللہ اس کو بامراد نہیں کرے گا جو حد سے گزرنے والا لپاٹیا ہو گا۔ اے میری قوم کے لوگو، آج تمھارے ہاتھ میں اقتدار ہے، تم ملک میں غالب ہو، تو اللہ کے عذاب کے مقابل میں ہماری مدد کون کرے گا اگر وہ ہم پر آ گیا! فرعون بولا کہ میں تم کو اپنی سوچی سمجھی رائے بتا رہا ہوں اور میں تمھاری رہنمائی ٹھیک سیدھی راہ کی طرف کر رہا ہوں۔ ۲۸ - ۲۹

اور جو ایمان لایا تھا اس نے کہا، اے میرے ہم قومو! میں تم پر اسی طرح کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں جس طرح کا عذاب گروہوں پر آیا۔ مثلاً وہ عذاب جو قومِ نوح، اور عاد اور ثمود اور ان لوگوں پر آیا جو ان کے بعد ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ بندوں پر کسی طرح کا ظلم نہیں چاہتا ـــ اے میرے ہم قومو، میں تم پر ہانک پکار کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے اور تم کو خدا سے بچانے والا کوئی نہیں ہو گا اور جس کو خدا گمراہ کر دے تو اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں بن سکتا۔ اور یوسف اس سے پہلے واضح تعلیمات کے ساتھ آئے تو تم ان کی لائی ہوئی باتوں کی طرف سے برابر شک ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہو گئی تو تم نے سمجھا کہ اب اللہ کسی کو رسول بنا کر نہیں بھیجے گا۔ اسی طرح اللہ ان لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے جو حدود سے تجاوز کرنے والے

اور شبہات ہی میں پڑے رہنے والے ہوتے ہیں۔ ۳۰-۳۴

جو اللہ کی آیات کے باب میں کٹ حجتی کرتے ہیں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، اللہ اور اہلِ ایمان کے نزدیک وہ نہایت مبغوض ہیں۔ اسی طرح اللہ مہر کر دیا کرتا ہے ہر متکبّر و جبّار کے دل پر۔ ۳۵

اور فرعون نے کہا، اے ہامان! میرے لیے ایک عمارت بنوا کہ میں اطراف میں پہنچوں، آسمانوں کے اطراف میں، پس موسیٰ کے رب کو جھانک کر دیکھوں، میں تو اس کو ایک بالکل جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ اور اس طرح فرعون کی نگاہوں میں اس کی بدعملی کھبا دی گئی اور وہ سیدھی راہ سے روک دیا گیا۔ اور فرعون کی چال برباد ہو کے رہی۔ ۳۶-۳۷

اور مردِ مومن نے کہا، اے میری قوم کے لوگو، تم میری پیروی کرو، میں تمھاری رہنمائی سیدھی راہ کی طرف کر رہا ہوں۔ اے میری قوم، یہ دنیا کی زندگی تو متاعِ چند روزہ ہے۔ اصل دارالقرار تو آخرت ہے۔ جو کسی برائی کا ارتکاب کرے گا وہ اسی کے مانند بدلہ پائے گا اور جو کوئی نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہوا، تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے جس میں وہ بے حساب رزق و فضل پائیں گے۔ اور اے میرے ہم قومو! کیا بات ہے، میں تمھیں نجات کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی دعوت دے رہے ہو! تم مجھے بلا رہے ہو کہ میں خدا کا کفر کروں اور اس کا شریک ایسی چیزوں کو ٹھہراؤں جن کے باب میں مجھے کوئی علم نہیں۔ اور میں تم کو خدائے عزیز و غفار کی دعوت دے رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن کی تم مجھے دعوت دے رہے ہو ان کی کوئی آواز نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں۔ اور ہم سب کی واپسی اللہ ہی کی طرف ہونی

ہے اور جو حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں وہی دوزخی ہوں گے تو تم عنقریب ان باتوں کو یاد کرو گے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالہ کرتا ہوں۔ بے شک اللہ ہی بندوں کا نگرانِ حال ہے۔ ۳۸-۴۴

پس اللہ نے اس کو ان کی چالوں کی آفتوں سے محفوظ رکھا اور فرعون والوں کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ آگ ہے جس پر صبح و شام وہ پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت ہوگی حکم ہوگا کہ فرعون والوں کو بدترین عذاب میں داخل کرو۔ ۴۵-۴۶

اور جب کہ وہ دوزخ میں، آپس میں جھگڑیں گے تو زیردست ان لوگوں سے جو بڑے بنے رہے کہیں گے کہ ہم آپ لوگوں کے پیرو بنے رہے تو کیا آپ لوگ عذاب دوزخ کا کچھ حصہ بھی ہماری جگہ اپنے سر لینے والے بنیں گے؟ جو بڑے بنے رہے وہ جواب دیں گے، اب تو ہم سب ہی اس میں ہیں۔ اللہ نے بندوں کے درمیان فیصلہ فرما دیا۔ اور اہل دوزخ، دوزخ کے داروغوں سے کہیں گے کہ اپنے رب سے درخواست کرو کہ ہمارے عذاب میں سے ایک دن کی تخفیف فرما دے، وہ جواب دیں گے، کیا تمہارے پاس تمہارے رسول واضح دلیلیں لے کر نہیں آتے رہے! وہ جواب دیں گے، ہاں، آتے تو ضرور رہے۔ وہ کہیں گے، تو اب تم ہی درخواست کرو۔ اور کافروں کی پکار بالکل صدا بصحرا ثابت ہوگی۔ ۴۷-۵۰

اور بے شک ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی اور اس دن بھی مدد کریں گے جس دن گواہوں کی رو بکاری ہوگی، جس دن اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کو ان کی معذرت کچھ نفع نہیں دے گی اور ان کے اوپر لعنت ہوگی

اوران کے لیے برا ٹھکانا ہوگا - ۵۱-۵۲

اور ہم نے موسیٰ کو ہدایت عطا فرمائی اور بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا، اہل عقل کی رہنمائی اور یاددہانی کے لیے - تو تم ثابت قدم رہو۔ یقیناً اللہ کا وعدہ شدنی ہے اور اپنے گناہ کی معافی چاہتے رہو اور شام و صبح اپنے رب کی تسبیح کرتے رہو اس کی حمد کے ساتھ - ۵۳-۵۵

---

۲ - الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۲۳)

'اٰیٰتٌ' سے مراد وہ احکام و ہدایات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس لے کر آئے اور 'سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ' سے اشارہ یہاں معجزۂ عصا کی طرف ہے جس کی نوعیت ایک خدائی سند کی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی کہ فرعون اور اس کے اعیان کو ان کے خدائی سفیر ہونے کے باب میں کسی شک کی گنجائش نہ رہے۔ لفظ 'سلطان' قرآن میں سند، اختیار نامہ، پروانہ اور اتھارٹی کے مفہوم میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے - مزید وضاحت سورۂ رحمان میں 'لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ' کے تحت آئے گی۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (۲۴)

فرعون اور اس کے دو بڑے لیڈروں کا ذکر

یہاں فرعون کے ساتھ اس کے ان دو بڑے لیڈروں کا بھی ذکر کیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ ان دونوں کا ذکر پچھلی سورتوں میں بڑی تفصیل سے ہو چکا ہے۔ ان میں سے ایک ــ قارون ــــ نسلاً اسرائیلی تھا لیکن اس نے فرعونی حکومت کے زیر سایہ بے شمار دولت اکٹھی کر لی تھی اور یہی دولت اس کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کا سب سے بڑا سبب بنی۔ اس کا ذکر سورۂ قصص میں ہو چکا ہے اور وہاں ہم نے یہ اشارہ کیا ہے کہ اس کے حالات اور ابولہب کے حالات میں بڑی مشابہت ہے۔ یہاں فرعون کے ان لیڈروں کا ذکر کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جس طرح تمہاری مخالفت میں قریش کے لیڈر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں فرعون اور اس کی قوم کے لیڈر اٹھے تھے، لیکن خدا نے ان کو ذلیل و پامال کیا۔ وہی حشر قریش کے ان لیڈروں کا بھی ہوگا اگر یہ اپنی روش سے باز نہ آئے۔

'فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ' یعنی انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو تو سحر پر محمول کیا اور ان کے اس دعوے کو کہ خدا نے ان کو رسول بنا کر بھیجا ہے بالکل جھوٹ قرار دیا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ۭ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (۲۵)

حضرت موسیٰؑ کی دعوت کا فرعونیوں پر الٹا اثر

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس جو پیغام حق لے کر آئے تھے اس کا حق تو یہ تھا کہ اس کو مانتے اور اپنے رویے کی اصلاح کرتے لیکن اس کا اثر ان کے اوپر اس کے بالکل برعکس پڑا۔ انھوں نے یہ محسوس کر کے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ایک منظم اور طاقتور قوم بنانا چاہتے ہیں بنی اسرائیل کے ذکور کو قتل کرنے اور عورتوں کو لونڈیاں بنانے کے لیے زندہ رکھنے کی اس پالیسی پر پوری شدت کے ساتھ عمل کرنے کے احکام جاری کر دیے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے بہت پہلے سے چل رہی تھی۔

'وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ' بنی اسرائیل کے ذکور کو قتل کرنے کی یہ پالیسی، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، اس مقصد سے اختیار کی گئی تھی کہ بنی اسرائیل کی تعداد کنٹرول میں رکھی جائے کہ وہ زیادہ بڑھ کر قبطیوں کے اقتدار کے لیے خطرہ نہ بن جائیں لیکن اس کو نافذ کرنے کے لیے جتنی تدبیریں اختیار کی گئیں وہ سب ناکام رہیں۔ بنی اسرائیل کی تعداد میں، جیسا کہ اس کے محل میں ہم حوالے نقل کر چکے ہیں، روزافزوں ترقی ہوتی گئی، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے کھلے ہوئے چیلنج کے ساتھ میدان میں آگئے اور فرعونیوں کو جس بات کا اندیشہ تھا وہ ایک حقیقت بن کر سامنے نظر آنے لگی۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (۲۶)

فرعون اور اس کے اعیان کی بدحواسی

اپنی اسکیم کی ناکامی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مطالبہ سے فرعون اور اس کے اعیان بالکل حواس باختہ ہو گئے۔ اس حواس باختگی کے عالم میں فرعون نے اپنے درباریوں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ لوگ مجھے اجازت دیجیے کہ میں موسیٰؑ کو قتل کر دوں۔ اگر اس کا کوئی خدا ہے جس نے اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ اپنی مدد کے لیے اس کو بلائے۔ اپنی اس تجویز کی تائید میں اس نے دلیل یہ پیش کی کہ اگر اب موسیٰ علیہ السلام کو مزید مہلت دی گئی تو مجھے ڈر ہے کہ وہ یا تو آپ لوگوں کے دین کو بدل کے رکھ دے گا یا ملک میں بغاوت کرا دے گا۔ یہ امر واضح رہے کہ فرعون اپنی قوم والوں کے نزدیک سورج دیوتا کا مظہر سمجھا جاتا تھا اور اس کی حیثیت ایک اوتار بادشاہ کی تھی۔ اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ کی دعوت توحید کی زد براہ راست اس کی خدائی پر پڑتی تھی۔ اگر قبطی اس کو قبول کر لیتے تو ان کا دین بدلتا اور اگر نہ قبول کرتے اور بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں منظم ہو جاتے تو اس کا لازمی نتیجہ (فرعون کے خیال کے مطابق) یہ تھا کہ ملک میں بغاوت پھوٹ پڑے گی۔ ان خطرات کی بنا پر اس نے قوم کے اعیان سے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی اجازت مانگی۔ لفظ ذَرُوْنِیْ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی دعوت نے اس دور میں اتنی قوت حاصل کر لی تھی کہ فرعون جیسے مطلق العنان کے لیے بھی اپنے اعیان کی تائید کے بغیر ان پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔

وَقَالَ مُوْسٰٓی اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ (۲۷)

حضرت موسیٰ کا رویہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے اس ارادہ کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اپنا معاملہ اپنے رب کے حوالے کیا کہ میں ہر اس متکبر کے شر سے جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا اپنے اور تمھارے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔ تمھارے رب کے الفاظ یہاں بطور تذکیر و تنبیہ ہیں یعنی یاد رکھو کہ وہی تمھارا بھی رب ہے، اس کے سوا کوئی اور رب نہیں ہے جس کے بل پر کوئی کچھ کر سکے۔

مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ: تکبر درحقیقت حق سے اعراض کا نام ہے جو نتیجہ ہے انانیت و خود پرستی کا اور یہ چیز پیدا ہوتی ہے آخرت پر ایمان نہ ہونے سے۔ جو شخص آخرت کو نہیں مانتا وہ ایک مطلق العنان ہے۔ وہ جو کچھ بھی کر گزرے اس سے بعید نہیں۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَکْتُمُ اِیْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَکُمْ بِالْبَیِّنٰتِ مِنْ رَّبِّکُمْ ۭ وَاِنْ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیْهِ کَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ (۲۸)

ایک مردِ مومن کی سرگزشت

یہاں سے ایک بندۂ مومن کی سرگزشت شروع ہو رہی ہے۔ یہ تھے تو فرعون کے خاندانِ شاہی سے لیکن نہایت حق پسند اور خدا ترس آدمی تھے اس وجہ سے ان کی تمام ہمدردیاں شروع ہی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھیں۔ ان کا ذکر سورۂ قصص میں بھی گزر چکا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ایک قبطی کے قتل کا اتفاقی واقعہ پیش آگیا اور اعیانِ حکومت نے ان کے قتل کے مشورے شروع کر دیے تو انہی نے حضرت موسیٰ کو اعیانِ حکومت کے اس ارادے سے باخبر کیا اور ان کو مصر سے کہیں باہر جانے کا مشورہ دیا، جس کے بعد حضرت موسیٰ مدین چلے گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی نبوت سے پہلے بھی ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اصلاحی سرگرمیوں سے پوری ہمدردی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے واپسی کے بعد جب نبوت کا اعلان کیا تو یہ ان کی دعوت پر ایمان لائے لیکن اپنے ایمان کو انھوں نے ایک عرصہ تک پوشیدہ رکھا۔ انھوں نے غالباً یہ محسوس فرمایا کہ اس دور میں ایمان کو پوشیدہ رکھ کر حضرت موسیٰ اور ان کی دعوت کی جو خدمت وہ کر سکتے ہیں وہ خدمت علانیہ نہیں کر سکتے۔ وہ شاہی خاندان کے ایک فرد اور تمام شاہی حقوق و مراعات سے بہرہ مند تھے۔ آگے کی آیات

سے واضح ہو جائے گا کہ وہ فرعون کے دارالامراء کے رکن بھی تھے۔ اگر اسی مرحلہ میں وہ اپنے ایمان کا اعلان کر دیتے تو فرعونی فوراً ان کے اوپر قومی غدار ہونے کا الزام لگا کر پوری قوم میں ان کو نکو بنا دیتے۔

دین کے مصالح، مصلحت کا لحاظ صرف اس وقت تک جائز ہے جب تک وہ دین کے لیے نافع ہو: لیکن دین و ایمان کے معاملے میں مصلحت کا لحاظ اسی وقت تک جائز ہے جب تک اس سے دین کو نفع پہنچنے کی توقع ہو۔ اگر معاملہ اس مرحلے سے گزر جائے اور دین کو کوئی فیصلہ کن خطرہ پیش آ جائے تو اس وقت اپنے ایمان کو چھپانا منافقت بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس بندۂ مومن نے بھی اسی وقت تک تو اپنے ایمان کو پردے میں رکھا جب تک اس کے چھپانے میں دین کی مصلحت دیکھی۔ لیکن جب دیکھا کہ حضرت موسیٰ کی زندگی ہی خطرے میں پڑ گئی ہے تو انھوں نے مصلحت کی نقاب اتار کر پھینک دی اور خم ٹھونک کر فرعون کے بھرے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمایت بھی کی اور اپنے ایمان کا علیٰ رؤس الاشہاد اعلان بھی کر دیا۔

یہ واقعہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے اس نازک مرحلہ میں اس لیے سنایا گیا کہ جو لوگ کسی مصلحت یا کسی اندیشہ کی بنا پر اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے ان پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ جب اعداء کی طرف سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں تو اب کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے ایمان کو چھپائے بلکہ اس بندۂ مومن کی طرح ہر شخص کو سر بکف ہو کر میدان میں آ جانا چاہیے۔

مردِ مومن کے ایک فقرے کے مضمرات: 'اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ'۔ یہ امر واضح رہے کہ یہ بات اس مردِ مومن نے فرعون اور اس کے تمام درباریوں کو مخاطب کر کے کہی ہے۔ فرمایا کہ کیا تم لوگ ایک شخص کو اس بنا پر قتل کرو گے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور وہ تمھارے رب کی طرف سے نہایت واضح نشانیاں بھی لے کر آیا ہے۔

اس ایک ہی فقرے میں انھوں نے فرعون اور اس کے اعیان کے سامنے کئی حقیقتیں رکھ دیں۔

ایک تو یہ کہ اللہ ہی کو اپنا رب ماننا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس میں کسی اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے تو وہ ایک نہایت روشن حق کا اظہار کر رہا ہے جس پر وہ تائید و تحسین کا سزاوار ہے نہ کہ قتل کا۔ بڑے ہی ظالم ٹھہریں گے وہ لوگ جو ایسے شخص کے قتل کی جسارت کریں گے۔

دوسری یہ کہ جو نشانیاں لے کر آئے ہیں وہ ان کے فرستادۂ الٰہی ہونے کی نہایت واضح دلیل ہیں۔ صرف اندھے ہی ان کے خدائی ہونے سے انکار کر سکتے ہیں۔

تیسری یہ کہ جس رب کے رسول کی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو پیش کر رہے ہیں وہ تمھارا بھی رب ہے۔ یہ تمھاری جہالت ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کو رب بنائے بیٹھے ہو۔

ایک تنبیہ

'وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ'

یہ انھوں نے ان کے اقدامِ قتل کے نتیجہ سے بھی آگاہ کر دیا کہ اگر وہ اپنے دعوائے رسالت میں جھوٹے ہوئے جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو اس کا وبال ان کے اوپر ہوگا اور اگر وہ سچے ہوئے (جیسا کہ فی الحقیقت ہے) تو یاد رکھو کہ جس عذاب کی وہ تم کو وعید سنا رہے ہیں اس کا کوئی حصہ تم پر نازل ہو کے رہے گا۔ یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو رسولوں کے مکذبین یا ان کے قتل کا ارادہ کرنے والوں کے لیے مقرر ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جذبات سے اندھے ہو کر معاملہ کے ایک ہی پہلو کو نہ دیکھو بلکہ اس کے دوسرے پہلو کو بھی نگاہ میں رکھو جو بڑا ہی سنگین ہے۔ تم نے ان کو جھوٹا فرض کر رکھا ہے اس وجہ سے ان کے قتل کر دینے کو ایک سہل بازی سمجھے ہوئے ہو، تمھیں کیا معلوم کہ وہ جھوٹے ہیں، اگر وہ سچے ہوئے تو پھر سمجھ رکھو کہ تمھارا یہ اقدام بڑا مہنگا پڑ جائے گا۔ اس وجہ سے سلامتی اسی میں ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ قتل کی جسارت کر کے اپنی تباہی کا سامان نہ کرو۔

زبان کا ایک اسلوب

'وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا' کے الفاظ انھوں نے مخاطب کے خیال کو سامنے رکھ کر فرمائے جس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ شرط کے اسلوب میں جس شک کا اظہار ہوتا ہے وہ شک کے مفہوم کے لیے صریح نہیں ہوا کرتا بلکہ اس سے شک کا صرف وہم ہوتا ہے۔ اس میں اصل فیصلہ کا انحصار موقع و محل اور سیاق و سباق پر ہوتا ہے۔ زبان کے اس اسلوب کو سامنے رکھنا ضروری ہے اس سے دوسری بعض آیتوں کے سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔

فرعون پر ایک بلیغ تعریض

'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ' 'هَدٰى يَهْدِيْ' کے مختلف معانی پر اس کے محل میں بحث ہو چکی ہے۔ یہاں یہ کسی کو اس کی جدوجہد اور مقصد میں بامراد کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ یہ نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ بظاہر تو یہ ایک حکیمانہ کلیہ ہے کہ جو حدود سے تجاوز کرنے والا اور جھوٹا ہوگا اللہ اس کو بامراد نہیں کرے گا، لیکن غور کیجیے تو اس میں فرعون پر نہایت بلیغ تعریض ہے جو انھوں نے عین اس کے منہ پر اس کے بھرے دربار میں اس پر کی۔

يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ۚ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ (۲۹)

مردِ مومن کی تقریر بالتدریج واضح ہوتی جا رہی ہے۔ انھوں نے قوم کے اعیان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آج آپ لوگوں کو ملک میں اقتدار حاصل ہے۔ آپ لوگ جو چاہیں کر سکتے ہیں، کوئی آپ کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے۔ لیکن اس سوال پر سنجیدگی سے غور کر لیجیے کہ اگر اس کے نتیجہ میں ہم پر خدا کا عذاب آ دھمکا تو خدا کی پکڑ سے ہم کو بچانے والا کون بنے گا!

فرعون کی ایک بے محل مداخلت

'قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ'۔ مردِ مومن کی یہ تقریر بھرے دربار میں، فرعون کے سامنے، ہو رہی تھی اس وجہ سے فرعون نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ

ہیں نے جو تجویز (درباب قتل موسیٰؑ) آپ لوگوں کے سامنے رکھی ہے وہ میری سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے اور یہ میں بالکل صحیح پالیسی کی طرف آپ لوگوں کی راہ نمائی کر رہا ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی یہ نہ گمان کرے کہ میں نے محض جذبہ سے مغلوب ہو کر عاجلانہ طور پر یہ تجویز رکھ دی ہے بلکہ خوب اچھی طرح اس کے نتائج و عواقب پر دور تک سوچ لیا ہے اور یہی پالیسی صحیح ہے اگر یہ فوراً نہ اختیار کی گئی تو اس کے نتائج اس ملک کے حق میں نہایت مہلک ہوں گے۔

'ظٰهِرِيْنَ' یہاں 'لَكُمُ' کی ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ ضمیر مجرور سے حال پڑنے کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

فرعون کی اس بے محل مداخلت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اس مردِ مومن کی تقریر بغیر کسی مداخلت کے جاری رہی تو اس سے اس کے بہت سے درباری متاثر ہو جائیں گے اس وجہ سے ہوشیار سیاسی لیڈروں کی طرح اس نے اپنی نیک نیتی، اصابت رائے اور مصلحت اندیشی کی دھونس جمانے کی کوشش کی۔

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۝ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (۳۰-۳۱)

مردِ مومن کی تقریر جاری رہی

مردِ مومن نے فرعون کی اس مداخلت کی کوئی پروا کیے بغیر اپنی تقریر جاری رکھی۔ فرمایا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں آپ کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ اگر موسیٰؑ کو گزند پہنچانے کی کوشش کی گئی تو آپ لوگوں پر اسی طرح عذاب آدھمکے گا جس طرح پچھلی قوموں یعنی قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد کی قوموں پر آیا۔ ان قوموں نے اپنے رسولوں کو گزند پہنچانے کی کوشش کی تو اس کے نتیجہ میں تباہ ہوئیں، اسی طرح آپ لوگ بھی تباہ ہو کر رہیں گے اگر انہی کے نقشِ قدم کی پیروی کریں گے۔

'وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ' اور یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی رحیم ہے اس وجہ سے کوئی عذاب بھیجنے سے پہلے آپ لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے اس نے اپنا رسول بھیج دیا ہے تاکہ جو لوگ توبہ و اصلاح کرنی چاہیں وہ توبہ و اصلاح کر لیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی اس رحمت و عنایت کی قدر کرنے کے بجائے اس کے رسول کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ لوگوں پر حجت تمام ہو گئی اور آپ لوگوں نے اپنی شامت خود بلائی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ فرعون عاد و ثمود وغیرہ کے بعد ہوا ہے اور یہ قومیں اس کے پاس پڑوس کی قومیں تھیں جن کے حالات اس طرح معلوم و معروف تھے کہ ان کو اس عہد کے لوگوں کے سامنے تذکیر و تنبیہ کے لیے پیش کیا جا سکتا تھا۔

وَیٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ یَوۡمَ التَّنَادِ ﴿ۙ﴾ یَوۡمَ تُوَلُّوۡنَ مُدۡبِرِیۡنَ ۚ مَا لَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ عَاصِمٍ ۚ وَمَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ (۳۲-۳۳)

یَوۡمَ التَّنَادِ کا مفہوم

'یَوۡمَ التَّنَادِ' کے لغوی معنی ہیں 'ہانک پکار کا دن' یہ اس یوم عذاب کی تعبیر کے لیے آیا ہے جس سے لوگوں کو ڈرایا جا رہا ہے۔ جب کوئی بڑی ہلچل برپا ہوتی ہے تو دوڑو، بھاگو، لیجیو، چلیو کا ہر طرف شور ہوتا ہے اس وجہ سے یوم عذاب کی تعبیر کے لیے یہ نہایت موزوں لفظ ہے۔ اس میں اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ ابھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت ملی ہوئی ہے اس وجہ سے آپ لوگ اللہ اور اس کے رسول پر حملہ آور ہونے کے منصوبے بنا رہے ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حملہ ہوگا تو 'تُوَلُّوۡنَ مُدۡبِرِیۡنَ ۚ مَا لَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ عَاصِمٍ' اس وقت پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے لیکن یہ بھاگنا بالکل بے سود ہوگا اس لیے کہ خدا کی پکڑ سے کوئی پناہ دینے والا نہیں بنے گا۔ اس وقت آپ لوگ ہانک پکار کریں گے لیکن یہ صدا بصحرا ہوگی۔

'وَمَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ' یعنی میرا کام آپ کو نیک و بد سے آگاہ کرنا ہے وہ میں کر رہا ہوں۔ میری نصیحت ماننا نہ ماننا آپ کے اختیار میں ہے۔ اگر آپ لوگوں نے وہی اقدام کیا جس کا ارادہ کر رہے ہیں تو میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو اللہ گمراہ کر دے ان کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس پر اس کتاب میں جگہ جگہ گفتگو ہو چکی ہے۔

وَلَقَدۡ جَآءَکُمۡ یُوۡسُفُ مِنۡ قَبۡلُ بِالۡبَیِّنٰتِ فَمَا زِلۡتُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّمَّا جَآءَکُمۡ بِہٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَا ہَلَکَ قُلۡتُمۡ لَنۡ یَّبۡعَثَ اللّٰہُ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ رَسُوۡلًا ؕ کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ مَنۡ ہُوَ مُسۡرِفٌ مُّرۡتَابُۨ (۳۴)

قوم کی ضلالت کی تاریخ اور اس کا فلسفہ

یہ قوم کی ضلالت کی انھوں نے تاریخ بیان فرمائی ہے کہ اس سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام بھی، نہایت واضح دلائل کے ساتھ، آپ لوگوں کے پاس آئے لیکن ان کی تعلیمات و ہدایات کے باب میں بھی آپ لوگ برابر شک ہی میں رہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بادشاہِ وقت کی غیر معمولی عقیدت کے سبب سے، جو اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ تھی، ان کے معاملے میں کوئی معاندانہ رویہ تو نہیں اختیار کیا گیا لیکن جن باتوں کی انھوں نے تعلیم دی ان کی کوئی خاص قدر بھی نہیں کی گئی۔ بلکہ ان کی تعلیمات کو نفس کی خواہشوں کے خلاف پا کر ان کے باب میں آپ لوگ بے پروائی اور شک میں مبتلا رہے۔

'حَتّٰۤی اِذَا ہَلَکَ قُلۡتُمۡ لَنۡ یَّبۡعَثَ اللّٰہُ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ رَسُوۡلًا' یعنی ان کو اور ان کی تعلیمات کو اللہ کی رحمت سمجھنے کے بجائے قوم کے لوگوں نے ایک بوجھ خیال کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہوگئی تو لوگوں نے ٹھنڈا سانس لیا کہ یہ بوجھ اترا اور مطمئن ہوگئے کہ اب اللہ کوئی اور رسول نہیں بھیجے گا جو ان

کی طرح آپ لوگوں کی خواہشوں کو لگام لگانے کی کوشش کرے گا۔

'کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ' یعنی آپ لوگوں کی موجودہ گمراہی اسی پچھلی گمراہی کا مولود فساد ہے۔ جو لوگ محض نفس کی خواہشوں کی پیروی میں اللہ کے حدود کو توڑنے والے اور اتباعِ نفس کے جنون میں علم و یقین کے بجائے شک کی راہ اختیار کرنے والے بن جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ان کی پسندکردہ ضلالت ہی کی ڈگر پر ہانک دیتا ہے۔ پھر ان کو کبھی ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔

بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ جس اصول پر مبنی ہے اس کی طرف اس کتاب میں جگہ جگہ ہم اشارہ کرچکے ہیں کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگوں کو خیر و شر کی جو معرفت اور عقل و فہم کی جو نعمت اس نے بخشی ہے، لوگ اس کی قدر کریں۔ جو لوگ ان کی قدر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے لیے ہدایت و معرفت کی مزید راہیں کھولتا ہے جو اس کی قدر نہیں کرتے بلکہ اپنے نفس کی خواہشوں سے مغلوب ہوکر واضح سے واضح حق کو بھی مشتبہ بنانے کی کوشش کرتے اور اسی مقصد کے لیے اپنی ساری ذہانت صرف کرتے ہیں ان کو مزید ہدایت دینا تو الگ رہا ان کی اس ناقدری کی پاداش میں اللہ تعالیٰ ان کا وہ نور بھی سلب کرلیتا ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہوتا ہے۔ یہاں اس بندۂ مومن نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور یہ چیز ان لوگوں کے لیے خاص طور پر قابلِ توجہ ہے جو اس زمانے میں نہایت واضح حقائق کو مشتبہ بنانے کے لیے رات دن خاکبازی کر رہے ہیں۔

الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۳۵)

دین کے معاملہ میں بے دلیل دخل و معقولات کا انجام

یعنی اللہ کی آیات اور اس کے احکام کے باب میں جو گفتگو بھی ہونی چاہیے وہ سند اور دلیل کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ جو لوگ بغیر اس طرح کی کسی دلیل و سند کے ان کی مخالفت کرتے ہیں وہ اللہ اور اہلِ ایمان کے نزدیک نہایت مبغوض ہیں۔

'کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ' اس ٹکڑے سے ایک بات تو یہ واضح ہوئی کہ جو لوگ اس طرح کی کٹ حجتی کرتے ہیں یہ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ مُہر کر دیا کرتا ہے جس کے سبب سے ان کی عقلیں الٹ جاتی ہیں اور وہ کوئی بات بھی اپنی خواہش کے خلاف ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے اگرچہ وہ کتنی ہی واضح کیوں نہ ہو۔

دوسری بات یہ واضح ہوئی کہ ان کے دلوں پر یہ مہر ان کے تکبر اور ان کی فرعونیت کے سبب سے لگتی ہے۔ یہ لوگ اپنے غرور کے سبب سے ہر اس بات کی مخالفت کرتے ہیں جو ان کی خواہش کے خلاف ہو۔ اگر کوئی نبی و رسول بھی ان کو کوئی بات سمجھائے تو اس کو بھی وہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ آخر وہ کیوں نبی ہوا جب کہ اس سے زیادہ نبوت کے اہل وہ خود ہیں! ـــــ اس زمانے میں بہت سے برخود غلط

اسلام کی نہایت واضح تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ انھیں دین کی الف، ب کی بھی خبر نہیں ہے۔ اگر کوئی ان کی اس جسارت پر ٹوکے تو وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ دین پر کسی گروہ کا اجارہ نہیں ہے وہ بھی اس پر کلام کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے ذہنوں میں بھی درحقیقت یہی غرور سمایا ہوا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۙ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۭ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ (۳۶-۳۷)

فرعون کا ایک شگوفہ

اوپر آپ نے دیکھا کہ مردِ مومن کی تقریر بالتدریج اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی جس سے قدرتی طور پر اہلِ دربار متاثر ہوتے نظر آئے ہوں گے۔ اس وجہ سے فرعون نے پہلے کی طرح پھر مداخلت کی اور درباریوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ایک شگوفہ چھوڑا۔ ہامان[۱] کو مخاطب کرکے اس نے حکم دیا کہ ہامان! ایک بلند عمارت بنواؤ، میں آسمانوں کے اطراف میں پہنچ کر ذرا موسیٰ کے اس رب کو جھانک کے دیکھنا چاہتا ہوں جس نے اس کے زعم کے مطابق اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ مجھے تو یہ شخص بالکل جھوٹا مدعی معلوم ہوتا ہے۔

'وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ' - یعنی اتنی واضح تقریر کے بعد بھی فرعون کو قبولِ حق کی توفیق نہیں ہوئی۔ فکر ہوئی تو اس بات کی ہوئی کہ کسی طرح اپنے درباریوں کو اس تقریر کے اثر سے بچا لے جائے۔ توفیقِ خیر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ دیدہ و دانستہ برائیاں کرتے کرتے دیدہ دلیر ہو جاتے ہیں بالآخر ان کی برائیاں اس طرح ان کی نگاہوں میں کھبا دی جاتی ہیں کہ ان کو چھوڑنے کا تصور بھی ان پر شاق گزرتا ہے۔ چنانچہ فرعون کو بھی یہی افتاد پیش آئی۔ اس کے آگے بھی اس کے برے اعمال سدِ راہ بن کر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے اس کو سیدھی راہ اختیار کرنے سے روک دیا۔

'وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ' فرعون نے یہ بات محض درباریوں کو فریب دینے اور حضرت موسیٰ کے استخفاف کے لیے کہی تھی اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'کید' سے تعبیر فرمایا اور یہ 'کید' اس کے لیے بھی موجب تباہی ہوا اور اس کی قوم کے لیے بھی۔

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ (۳۸)

فرعون کو جواب

مردِ مومن نے فرعون کی اس مداخلت کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔ بلکہ نہایت واضح الفاظ میں قوم کو دعوت دی کہ لوگو، میری پیروی کرو، میں تمھاری رہنمائی صحیح راستہ کی طرف کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ فرعون کی اس بات کا جواب ہے جو اوپر گزر چکی ہے کہ 'وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ' اس سے ثابت ہوا کہ انھوں نے قوم کو واضح الفاظ میں متنبہ کر دیا کہ فرعون کی پیروی میں قوم کی تباہی ہے۔ اگر فلاح مطلوب ہے تو

---

[۱] 'ہامان' پر بحث سورۂ قصص میں گزر چکی ہے۔

لوگوں کو ان کی پیروی کرنی چاہیے۔

يٰقَوۡمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا مَتَاعٌ ۙ وَّاِنَّ الۡاٰخِرَةَ هِىَ دَارُ الۡقَرَارِ (۳۹)

آخرت کی یاد دہانی — انھوں نے فرعون کو چیلنج تو کر دیا لیکن دنیوی لیڈروں کی طرح اپنی جمعیت و اکثریت کا رعب نہیں جمایا بلکہ انبیائے کرام کے طریقہ پر لوگوں کو آخرت کی یاد دہانی کی کہ اس دنیا کی زندگی اور اس کا تمام عیش و آرام چند روزہ ہے، اصل قیام کا گھر آخرت ہے تو اس چند روزہ عیش کی خاطر ابدی زندگی تباہ نہیں کرنی چاہیے۔

مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ يُرۡزَقُوۡنَ فِيۡهَا بِغَيۡرِ حِسَابٍ (۴۰)

اس عالم آخرت میں جزاء و سزا کا جو ضابطہ نافذ ہوگا یہ اس کا بیان ہے کہ اس میں جو لوگ گناہ کر کے پہنچیں گے ان کو تو ہر بدی کا بدلہ اسی کے مانند ملے گا تاکہ ان کے اوپر کوئی زیادتی نہ ہو لیکن جو نیکی کما کر جائیں گے وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اس میں ان کو بے حساب رزق و فضل ملے گا۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ مرد مومن کا یہ خطاب ارسٹوکریسی (ARISTOCRACY) کے اعیان سے ہے جن میں سے اکثر کا مدعا اس حیات چند روزہ کا عیش و آرام ہی رہا ہوگا اور اسی کی خاطر وہ فرعون کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے ہوں گے۔ ان کو انھوں نے توجہ دلائی کہ اس حیات چند روزہ کی خاطر ابدی زندگی کی بادشاہی کو قربان نہ کرو۔

وَيٰقَوۡمِ مَا لِىۡۤ اَدۡعُوۡكُمۡ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدۡعُوۡنَنِىۡۤ اِلَى النَّارِ ؕ تَدۡعُوۡنَنِىۡ لِاَكۡفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشۡرِكَ بِهٖ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ ۙ وَّاَنَا اَدۡعُوۡكُمۡ اِلَى الۡعَزِيۡزِ الۡغَفَّارِ (۴۱-۴۲)

قوم کے بعض اعیان کے اعتراض کا جواب — قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح فرعون نے ان کی تقریر میں بعض مداخلتیں کیں اسی طرح اس مرحلہ میں قوم کے بعض اعیان نے بھی ان پر بعض اعتراضات کیے۔ فرعون کی مداخلت کا تو، جیسا کہ آپ نے دیکھا، انھوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا اس لیے کہ اس سے انھیں کسی خیر کی امید نہیں تھی۔ لیکن قوم کے لیڈروں کی بات کا انھوں نے جواب دیا اور نہایت دلسوزی و ہمدردی کے انداز میں جواب دیا۔ ان لیڈروں نے ظاہر ہے کہ یہی اعتراض اٹھایا ہوگا کہ آپ کی ساری تقریر ہمارے ان معبودوں کے خلاف ہے جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے۔ آپ کو اپنے باپ دادا کے دین پر رہنا چاہیے نہ کہ کوئی الگ دین کھڑا کرنا چاہیے۔ مرد مومن نے نہایت دلسوزی کے ساتھ ان کو جواب دیا کہ یہ عجیب ماجرا ہے کہ میں تو آپ لوگوں کو نجات کی راہ کی طرف بلا رہا ہوں لیکن آپ لوگ مجھے دوزخ کی دعوت دے رہے ہیں۔ میں تو آپ لوگوں کو خدائے عزیز و غفار کی بندگی کی دعوت دے رہا ہوں، جو پکڑ بھی سکتا ہے اور بخشنے والا بھی ہے، اور آپ لوگ مجھے اس بات کی دعوت دے رہے ہیں کہ میں ایسی چیزوں کو اس کا شریک ٹھہراؤں جن کے شریک ہونے کے بارے میں مجھے

کوئی علم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک ایک خدائے عزیز و غفار کا تعلق ہے وہ تو ایک مسلم بات ہے۔ اس کو تو وہ لوگ بھی مانتے ہیں جو مشرک ہیں اور اس کے ماننے بغیر چارہ نہیں۔ رہی یہ بات کہ اس کے کچھ شریک بھی ہیں تو یہ چیز دلیل و شہرت کی محتاج ہے اور اس کی کوئی دلیل میرے پاس نہیں ہے۔ اگر میں بے دلیل کسی کو خدا کا شریک بناؤں تو خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا!

'لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شرک اور کفر میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ جو شخص خدا کے شریک ٹھہراتا ہے وہ درحقیقت اس کا کفر کرتا ہے اس لیے کہ دین میں خدا کا صرف مان لینا مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کی تمام صفات اور اس کے تمام حقوق کے ساتھ ماننا معتبر ہے اور ان حقوق میں سب سے بڑا حق اس کی توحید و یکتائی کا تسلیم کرنا ہے۔

لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْیَا وَلَا فِی الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ (۴۳)

'لَا جَرَمَ' کے معنی ہوں گے 'لابد'، 'لا محالہ'۔ یہ حقیقت ہے، اس میں کسی بحث یا کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ قسم کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔

'لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ' میں فعل کی نفی اس کے فائدہ کی نفی کے پہلو سے ہے۔ یعنی ان کو پکارنے کا کوئی فائدہ نہ اس دنیا میں ہے، نہ آخرت میں ہوگا۔ اس حقیقت کی وضاحت قرآن کے دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے۔

خلاصۂ بحث

مردِ مومن نے اوپر کی دلیل قائم کرنے کے بعد خلاصۂ بحث ان کے سامنے یہ رکھا کہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ آپ لوگ مجھے جن بتوں کی عبادت کی دعوت دے رہے ہیں وہ محض آپ کے وہم کی ایجاد ہیں۔ ان سے دعا و فریاد کا کوئی فائدہ نہ اس جہان میں ہے اور نہ آخرت میں ہوگا۔ اس دنیا میں بھی جو کچھ ملتا ہے خدا سے ملتا ہے اور آخرت میں ہم سب کی واپسی خدا ہی کی طرف ہونی ہے۔ ان فرضی دیویوں دیوتاؤں میں سے کوئی مولیٰ و مرجع بننے والا نہیں ہے۔

'وَاَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ'۔ 'مُسْرِفِیْن' سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے شرک کا ارتکاب کر کے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہوں گے ان کا کوئی سفارشی نہیں ہوگا بلکہ اس قسم کے سارے لوگ جہنم میں پڑیں گے۔

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ (۴۴)

آخری ہمدردانہ تنبیہ

یہ اس مردِ مومن کی تقریر کا آخری اور نہایت ناصحانہ و ہمدردانہ فقرہ ہے۔ فرمایا کہ آج تم لوگ میری بات مانو یا نہ مانو لیکن آگے جو مراحل آنے والے ہیں ان میں تم میری یہ باتیں یاد کرو گے مگر اس وقت ان کو

یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ اشارہ آخرت کی جزاء و سزا کی طرف بھی ہے اور اس عذاب کی طرف بھی جس سے رسول کی تکذیب کی صورت میں انھوں نے اپنی قوم کو ڈرایا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب عذاب نمودار ہو جائے گا یا آخرت سامنے آن کھڑی ہوگی تو اس وقت یہ باتیں یاد کر کے پچھتائیں گے تو سب لیکن یہ پچھتانا بالکل بے سود ہوگا۔

'وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ' یعنی میں نے تو جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔ اب تمھیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو۔ اگر تم اس کلمۂ حق کے سبب سے میرے دشمن بنتے ہو تو میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کا محافظ اور ان کا نگرانِ حال ہے۔ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ۔

فَوَقَاهُ اللَّهُ سَيِّئَاتِ مَا مَكَرُوا وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ (۴۵)

فرعون اور اس کے اعیان کی سازشوں کی ناکامی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس تقریر کے بعد فرعون اور اس کے تمام اعیان ان کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے خلاف طرح طرح کی سازشوں میں لگ گئے کہ کسی طرح ان کو اپنے دین میں واپس لائیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی سازشوں کے شر سے ان کو محفوظ رکھا۔ اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ فرعون اور اس کے درباریوں نے جو سازشیں ان کو دینِ حق سے پھیرنے کے لیے کیں ان میں کوئی کامیابی ان کو نہیں ہوئی۔ اسی طرح اللہ کے جو بندے حق کا اعلان کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دین و ایمان کی حفاظت فرماتا ہے۔

فرعون اور اس کے اتباع کا انجام

'وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ'۔ 'آلِ فِرْعَوْنَ' سے ظاہر ہے کہ یہاں اس کے آل و اتباع سب مراد ہیں۔ فرمایا کہ بندۂ مومن کو تو اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کے شر سے محفوظ رکھا البتہ فرعون اور اس کے اتباع کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ 'برے عذاب' سے مراد وہ فیصلہ کن عذاب ہے جس نے فرعون اور اس کی ساری فوجوں کو غرق کر دیا۔ اس کو برے عذاب سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے دوران میں متعدد عذاب اہلِ مصر پر آئے لیکن یہ عذاب تنبیہ و تذکیر کے لیے تھے جن میں مومن و کافر دونوں ہی آزمائے گئے لیکن یہ آخری عذاب جو آیا تو اس سے مومن تو محفوظ رکھے گئے لیکن فرعون اور اس کی نسل کی اس نے جڑ کاٹ دی۔ لفظ 'حَاقَ' اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس عذاب نے اس طرح ان کو اپنے احاطہ میں لے لیا کہ ان کے لیے کوئی مفر باقی نہیں رہا۔

اَلنَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ ۞ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ (۴۶)

فرعون اور اس کے اتباع کا حال برزخ میں

یہ اس عذاب کی تفصیل ہے کہ برزخی زندگی میں ان کو صبح و شام دوزخ کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے کہ دیکھتے رہیں کہ ان کا اصلی ٹھکانا یہ ہوگا اور جب قیامت کا دن آئے گا تو حکم ہوگا کہ فرعون اور اس کے تمام اتباع کو دوزخ کے شدید ترین عذاب میں جھونک دو۔ قرآن میں جگہ جگہ اس بات کی تصریح ہے کہ مرنے

کے بعد نیک ارواح پر ان کے اعمال کے اعتبار سے کیفیات کا صدور ہونے لگتا ہے اور ارواح خبیثہ پر ان کے اعمال کے اعتبار سے۔ یہ گویا ان کے لیے جنت یا دوزخ کی تمہید ہوتی ہے۔ پھر جب قیامت کا دن آئے گا تو جزا اور سزا اپنی اصلی شکل میں لوگوں کے سامنے آئے گی۔ حدیثوں میں عذاب قبر کا جو ذکر آیا ہے وہ اسی برزخی زندگی سے متعلق ہے۔

وَاِذْ یَتَحَآجُّوْنَ فِی النَّارِ فَیَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْٓا اِنَّا کُنَّا لَکُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِیْبًا مِّنَ النَّارِ ۝ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْٓا اِنَّا کُلٌّ فِیْهَآ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَکَمَ بَیْنَ الْعِبَادِ (۴۷-۴۸)

لیڈروں اور پیروؤں کا حال دوزخ میں

اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ مرد مومن کی سرگزشت ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بھی سنائی گئی ہے جو اپنے لیڈروں کے رعب کے سبب سے اظہار حق میں ہچکچا رہے تھے۔ اب یہ دکھایا ہے کہ دنیا کی مجالس میں جو لوگ اپنے لیڈروں کے ڈر سے حق کے اعتراف و اعلان کی جرأت نہیں کر رہے ہیں، ایک دن آئے گا جب یہ لیڈر اور ان کے پیرو دونوں دوزخ میں ہوں گے اور ایک دوسرے پر لعنت و نفرین کریں گے۔ کمزور اور دبے ہوئے لوگ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ دنیا میں ہم آنکھ بند کرکے آپ لوگوں کے پیرو بنے رہے تو کیا آج آپ لوگ اس عذاب دوزخ میں سے بھی کچھ اپنے سر لینے والے بنیں گے جو ہمارے حصہ میں آیا ہے؟ بڑے بننے والے جواب دیں گے کہ اب شکوہ و شکایت کا وقت گزر گیا۔ اب تو ہمیں اور تمہیں دونوں کو اسی میں رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بالکل عدل کے ساتھ بندوں کے درمیان فیصلہ فرما دیا ـــــ مطلب یہ ہے کہ یہ عذر کسی کے لیے کچھ نافع نہیں ہوگا کہ وہ دوسروں کے دباؤ میں تھا اس وجہ سے باطل کا پیرو بنا رہا۔ اپنے نفس کی ذمہ داری ہر شخص پر خود ہے۔ یہ ذمہ داری وہ دوسروں پر ڈال کر سبک دوش نہیں ہو سکتا اس وجہ سے ہر شخص خواہ وہ کتنا ہی دبا ہوا ہو، اللہ پر بھروسہ کرکے حق کا اعلان کرے اور یہ اعتماد رکھے کہ اللہ اس کی حفاظت فرمائے گا اور اگر اس راہ میں اس کی موت بھی آئی تو یہ موت شہادت کی موت ہوگی۔

فاسقانہ قیادت کی بنیاد استکبار پر ہوتی ہے

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ کفر و فسق کے ان لیڈروں کے لیے قرآن نے لفظ 'استکبروا' استعمال فرمایا ہے جس کے معنی ہوں گے، وہ جو بڑے بنے رہے، یا 'وہ جو بڑائی کے گھمنڈ میں رہے'، یہ فاسقانہ قیادت کی تعبیر کے لیے سب سے زیادہ موزوں و معنی خیز لفظ ہے۔ اس کائنات میں بڑائی صرف اللہ کے لیے ہے اس وجہ سے ہر وہ قیادت جو اللہ کے راستہ سے ہٹانے والی ہے وہ استکبار پر مبنی ہے اور اس کا انجام بالآخر دوزخ ہے اس قیادت کے مدعیوں کے لیے بھی اور اس کے پیروؤں کے لیے بھی۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ فِی النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّکُمْ یُخَفِّفْ عَنَّا یَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ۝ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَکُ تَاْتِیْکُمْ رُسُلُکُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰی ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (۴۹-۵۰)

اہلِ دوزخ کی آخری نامرادی اور ناکامی

جب دوزخی دیکھیں گے کہ یہاں نہ ان کے شرکاء و شفعاء کام آنے والے بنے اور نہ ان کے لیڈر ہی ان کی کوئی مدد کر سکے تو وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر دوزخ کے داروغوں ہی سے التجا کریں گے کہ آپ ہی لوگ اپنے رب سے درخواست کیجیے کہ ہمارے عذاب میں زیادہ نہیں تو ایک ہی دن کی تخفیف کر دی جائے کہ ہم ذرا دم لے لیں۔ وہ جواب دیں گے کہ کیا تم لوگوں کے پاس تمہارے رسول نہایت واضح دلیلیں لے کر نہیں آتے رہے ہیں؟ وہ کہیں گے، ہاں! یہ بات تو ضرور رہی ہے۔ وہ جواب دیں گے، اگر یہ بات ہے تو تم ہی درخواست کرو، ہم تمہارے جیسے لوگوں کے لیے کوئی درخواست نہیں کر سکتے۔

'وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ' یعنی اس وقت کافروں کی ہر دعا و فریاد اور ہر چیخ و پکار بالکل صدا بصحرا ہوگی۔ نہ ان کے مزعومہ دیوی دیوتا ان کی فریاد سنیں گے، نہ ان کے لیڈر ان کے کچھ کام آئیں گے اور نہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی کچھ شنوائی ہوگی۔ امید کے تمام دروازے ان کے لیے بند ہو جائیں گے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (۵۱)

رسولوں کے باب میں سنتِ الٰہی

اس آیت کا تعلق اوپر آیت ۴۵ سے ہے۔ بیچ میں پانچ آیتیں ضمنی طور پر اس عذاب کی وضاحت کے لیے آگئی ہیں جس سے فرعون اور اس جیسے متکبروں اور ان کے پیروؤں کو سابقہ پیش آئے گا۔ فرمایا کہ جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس مردِ مومن کی مدد فرمائی اسی طرح ہم اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس دن بھی کریں گے جس دن گواہ گواہی کے لیے کھڑے ہوں گے۔

اس آیت کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑی الجھن پیش آئی ہے۔ اس لیے کہ اس میں نہایت صراحت کے ساتھ اس بات کا وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی اس دنیا میں بھی مدد فرماتا ہے۔ اس الجھن کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے وہ فرق واضح طور پر نہیں ہے جو رسول اور نبی کے درمیان ہے۔ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس فرق کو واضح کرتے آرہے ہیں اس کو نگاہ میں رکھیے۔ رسولوں کے لیے سنتِ الٰہی یہی ہے کہ وہ جس قوم کی طرف بھیجے جاتے ہیں اس کے لیے وہ خدا کی عدالت ہوتے ہیں۔ اگر قوم ان کی تکذیب کر دیتی ہے تو وہ لازماً فنا کر دی جاتی ہے عام اس سے کہ وہ کسی خدائی عذاب سے تباہ ہو یا اہلِ حق کی تلوار سے شکست کھائے اور عام اس سے کہ یہ واقعہ رسول کے سامنے ہی پیش آئے یا رسول کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک ہر رسول کی زندگی اس سنتِ الٰہی کی شہادت دیتی ہے اور ہم برابر اس کی وضاحت کرتے آرہے ہیں۔

'يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ' سے مراد ظاہر ہے کہ قیامت کا دن ہے اس لیے کہ اس دن اللہ تعالیٰ ہر نبی اور رسول سے گواہی دلوائے گا کہ اس نے لوگوں کو کیا تعلیم دی۔ اسی طرح امتوں سے سوال ہوگا کہ انھوں نے اپنے رسولوں کو

کیا جواب دیا۔ خدا کے ملائکہ بھی لوگوں کے اعمال کے رجسٹر کے ساتھ پیش ہوں گے۔ ان احوال کی تفصیل سورۂ مائدہ اور بعض پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ الظّٰلِمِیْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (۵۲)

یہ اسی یَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ کی وضاحت ہے کہ اس دن خدائی گواہوں کی گواہی ایسی واضح، ایسی قطعی اور اتنی زکشن ہوگی کہ جن بدقسمت لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہوں گے ان کا کوئی عذر بھی کچھ کارگر نہیں ہو سکے گا۔ یہاں تک کہ جو لوگ اپنی گمراہی کا ذمہ دار اپنے لیڈروں کو بنانا چاہیں گے ان کا عذر بھی مسموع نہیں ہوگا۔ ان کے لیڈر خود ان کے منہ پر بات پھینک ماریں گے کہ تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے یہ جانتے ہوئے کہ ہم ضلالت پر ہیں تم نے ان کی پیروی نہیں کی تو اب ہم اور تم دونوں یکساں ہیں اور دونوں ہی کو اپنے اعمال کی سزا بھگتنی ہے۔

'وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ' یعنی ان کی معذرت کے جواب میں ان پر خدا اور اس کے فرشتوں کی پھٹکار ہوگی اور ان کے اعمال کی پاداش میں ان کے لیے بُرا ٹھکانا ہوگا۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْهُدٰی وَاَوْرَثْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْکِتٰبَ ۙ هُدًی وَّذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ (۵۳-۵۴)

وعدۂ نصرت کی وضاحت — یہ وضاحت ہے اس نصرت کی جس کا ذکر اوپر ہوا کہ فرعون اور اس کے آل و اتباع تو اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے بنی اسرائیل، ہدایت اور کتاب الٰہی کی وراثت سے نوازے گئے۔

'وَاَوْرَثْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْکِتٰبَ' کے اندر اس دنیا میں غلبہ و تمکن کا وعدہ خود مضمر ہے اس لیے کہ کتاب احکام و قوانین الٰہی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس ملت کو یہ عطا ہو اس کو زمین میں غلبہ و تمکن بھی حاصل ہو۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو یہ چیز حاصل رہی جب تک وہ اپنی کتاب پر عامل رہے۔

'هُدًی وَّذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ' یہ کتاب کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے دی کہ یہ لوگوں کو اللہ کی طرف رہنمائی اور اس کی باتوں کی یاددہانی کرتی رہے لیکن یہ فائدہ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جن کے اندر عقل و بصیرت ہے۔ جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہو جاتے ہیں ان کے لیے کوئی چیز بھی نافع نہیں ہوتی۔ اس میں تعریض ہے ان بنی اسرائیل پر جنھوں نے اپنی ضلالت پسندی و بے عقلی کے سبب سے اپنے کو اس کتاب کی برکات سے محروم کر لیا۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِکَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِ (۵۵)

خلاصۂ بحث — یہ بطور خلاصۂ بحث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ تم اپنی دعوت پر جمے رہو، اللہ کا وعدہ شدنی ہے۔ یہ اشارہ اس وعدے کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۵۱ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں

کو دنیا اور آخرت دونوں میں فتحمند کرے گا۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ ..... الآیۃ۔ یہ تدبیر ارشاد ہوئی ہے اس صبر و استقامت کے حصول کی جو اس وعدے کے ظہور کے لیے شرط لازمی ہے کہ برابر اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگتے اور اپنے رب کی تسبیح و حمد کرتے رہو۔ یہ بات اس کے محل میں واضح ہو چکی ہے کہ حصولِ صبر کے لیے وسیلۂ ظفر استغفار و نماز ہے۔ اور یہ بات بھی اس کے محل میں واضح ہو چکی ہے کہ اس طرح کے خطابات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم شخصاً مخاطب نہیں ہوتے بلکہ امت کے وکیل کی حیثیت سے مخاطب ہوتے ہیں۔ جو لوگ خطاب کی اس نوعیت اور اس کی بلاغت سے اچھی طرح آشنا نہیں ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف 'ذنب' کے لفظ کی نسبت سے متوحش ہوتے ہیں حالانکہ اس کا ایک خاص محل ہے جس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــ آیات: ۵۶-۸۵

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین کے ساتھ نہایت واضح الفاظ میں فتح و نصرت کی بشارت اور قریش کے لیڈروں کو دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اس بشارت اور وعید کے بیچ بیچ میں توحید اور قیامت کے ان آفاقی، انفسی اور اخلاقی دلائل کا حوالہ ہے جن پر یہ بشارت اور یہ وعید مبنی ہے۔

آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۵۶-۶۰ إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِيٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ
فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۖ اِنَّهٗ
هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۵۶﴾ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ
خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَمَا يَسْتَوِي
الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ۚ
قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ
اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ

ع ۱۱ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿٦٠﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ
وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦١﴾ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَآ
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۡ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿٦٢﴾ كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿٦٣﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَاۗءَ
بِنَاۗءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ ذٰلِكُمُ
اللّٰهُ رَبُّكُمْ ښ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٤﴾ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا
هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٥﴾
قُلْ اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا
جَاۗءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۡ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٦﴾
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ
ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ
وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ
تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا
ع ۱۲ يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٦٨﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ
اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴿٦٩﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ
اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ڕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٠﴾ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ
اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ﴿٧١﴾ فِي الْحَمِيْمِ ڏ ثُمَّ فِي النَّارِ

يُسْجَرُوْنَ ﴿٧٢﴾ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٧٣﴾ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـــًٔا ۭ
كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٤﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي
الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿٧٥﴾ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ
جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٧٦﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ
وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ
فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿٧٧﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ
قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۭ وَمَا كَانَ
لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ
بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿٧٨﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ ع ۸ ۱۳
الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ
وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ
تُحْمَلُوْنَ ﴿٨٠﴾ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ڰ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿٨١﴾ اَفَلَمْ
يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَآ
اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَلَمَّا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ
يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٨٣﴾ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ

كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا
بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ
ع ۱۴ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

ترجمۂ آیات ۵۶-۸۵

جو لوگ اللہ کی آیات کے باب میں، بغیر کسی سند کے جو ان کے پاس آئی ہو، کٹ حجتی کر رہے ہیں، ان کے دلوں میں بس ایک گھمنڈ سمایا ہوا ہے جس میں وہ کبھی بامراد ہونے والے نہیں ہیں تو تم اللہ کی پناہ مانگو، وہی حقیقی سننے دیکھنے والا ہے۔ ۵۶

آسمانوں اور زمین کا پیدا کر دینا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ مشکل ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اندھے اور بینا اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور وہ جو برائی کرنے والے ہیں دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ تم لوگ بہت کم سوچتے ہو! بے شک قیامت آکے رہے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں! اور تمھارے رب کا ارشاد ہے کہ مجھ کو پکارو، میں تمھاری درخواست قبول کروں گا۔ جو لوگ میری بندگی سے سرتابی کر رہے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں پڑیں گے۔ ۵۷-۶۰

اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے رات کو تاریک بنایا تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں کام کرو۔ اللہ لوگوں پر بڑا فضل والا ہے لیکن اکثر لوگ شکرگزار نہیں ہوتے۔ وہی اللہ تمھارا خداوند ہے، ہر چیز کا خالق، اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو تم لوگ کس طرح اوندھے ہو جاتے ہو! اسی طرح وہ لوگ بھی اوندھے ہو جاتے رہے ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں۔ ۶۱-۶۳

اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو مستقر اور آسمان کو چھت بنایا اور تمھاری

صورت گری کی تو تمہاری صورتیں اچھی بنائیں۔ اور تم کو پاکیزہ چیزوں کا رزق بخشا۔ وہی اللہ تمہارا خداوند ہے۔ پس بڑی ہی بابرکت ذات ہے اللہ، عالم کے خداوند کی! وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو پکارو، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ۔ شکر کا سزاوار اللہ ہے، عالم کا خداوند۔ ۶۴-۶۵

کہہ دو، مجھے اس بات سے روک دیا گیا ہے کہ میں ان کی بندگی کروں جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو جب کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے واضح آیتیں آ چکی ہیں۔ اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اپنے تئیں خداوند عالم کے حوالہ کروں۔ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا مٹی سے، پھر نطفے سے، پھر خون کی ایک پھٹکی سے۔ پھر وہ تم کو وجود میں لاتا ہے ایک بچہ کی صورت میں۔ پھر وہ تم کو پروان چڑھاتا ہے کہ اپنی جوانی کو پہنچو پھر وہ تم کو مہلت دیتا ہے کہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے بعض اس سے پہلے ہی مر جاتے ہیں اور بعض کو مہلت دیتا ہے کہ تم ایک مدت معین پوری کرو۔ اور یہ اس لیے ہے کہ تم سمجھو۔ وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور جو مارتا ہے۔ پس جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس کو حکم فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ ۶۶-۶۸

ذرا ان کو تو دیکھو جو اللہ کی آیات کے باب میں کٹ حجتی کرتے ہیں! وہ کہاں پھیر دیے جاتے ہیں! جنھوں نے اللہ کی کتاب کو جھٹلایا اور ان چیزوں کو بھی جن کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا، وہ عنقریب جانیں گے! جب کہ ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور (ان کے پاؤں میں) زنجیریں ہوں گی، وہ گرم پانی میں گھسیٹے جائیں گے پھر آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔ پھر ان سے پوچھا جائے گا، کہاں ہیں وہ جن کو تم اللہ کے سوا شریک ٹھہراتے تھے۔ وہ کہیں گے، وہ سب ہم سے کھوئے گئے بلکہ پہلے ہم کسی چیز کو بھی نہیں پوجتے رہے۔

اس طرح اللہ کافروں کے حواس گم کر دے گا۔ یہ اس سبب سے ہے کہ تم زمین میں ناحق اتراتے اور اکڑتے رہے۔ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو، اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے متکبرین کا! ۶۹-۷۶

پس ثابت قدم رہو، بے شک اللہ کا وعدہ شُدنی ہے۔ یا تو ہم تم کو اس کا کچھ حصہ جس کی ان کو وعید سنا رہے ہو، دکھا دیں گے یا تم کو وفات دیں گے پس ان کی واپسی ہماری طرف ہو گی۔ ۷۷

اور ہم نے تم سے پہلے رسول بھیجے جن میں سے کچھ کے حالات تم کو سنا دیے اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کے حالات تم کو نہیں سنائے اور کسی رسول کا بھی یہ مقدور نہ تھا کہ وہ کوئی نشانی اللہ کے اذن کے بدون لا سکے۔ پس جب اللہ کا حکم آجائے گا، عدل کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور اس وقت اہلِ باطل خسارے میں پڑیں گے۔ ۷۸

اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے چوپائے پیدا کیے کہ تم بعض سے سواری کے کام لو اور ان میں سے کچھ تمھاری غذا کے کام آتے ہیں اور ان میں تمھاری دوسری منفعتیں بھی ہیں اور اس لیے بھی بنائے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے اپنے دلوں کے کسی مقصد تک پہنچو اور ان پر اور کشتیوں پر تم سوار کیے جاتے ہو۔ ۷۹-۸۰

اور وہ تم کو اور بھی اپنی بے شمار نشانیاں دکھاتا ہے تو تم اللہ کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے؟ کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ وہ ان سے زیادہ تھے زمین میں اپنے آثار کے اعتبار سے اور بڑھ چڑھ کر تھے اپنی قوت و جمعیّت کے لحاظ سے تو ان کے یہ سارے کارنامے ان کے کچھ

کام نہ آئے۔ ۸۱-۸۲

پس جب ان کے پاس ان کے رسول نہایت واضح دلیلوں کے ساتھ آئے تو وہ اپنے اسی علم پر نازاں رہے جو ان کے اپنے پاس تھا اور ان کو گھیر لیا اس عذاب نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ پس جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا بولے کہ ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور ان چیزوں کے ہم منکر ہوئے جن کو ہم اللہ کا شریک گردانتے تھے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو اس کے بندوں میں پہلے ظاہر ہوتی رہی ہے اور اس وقت کفر کرنے والے نامراد ہوئے۔ ۸۳-۸۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ إِنْ فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَا هُمْ بِبَالِغِيهِ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (۵۶)

منکرین کے انکار کی اصل علت

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آج جو لوگ، بغیر کسی دلیل و سند کے، اللہ کی آیات کے باب میں تم سے جھگڑ رہے ہیں ان کی پروا نہ کرو۔ 'آیات' سے مراد توحید و آخرت کی وہ دلیلیں ہیں جو اوپر مختلف اسلوبوں سے مذکور ہوئیں۔ فرمایا کہ ان لوگوں کی مخالفت کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان سے حق مخفی ہے یا ان کے پاس اس کے خلاف کوئی دلیل ہے بلکہ یہ صرف اس وجہ سے مخالفت کر رہے ہیں کہ اگر انھوں نے تمھاری بات تسلیم کر لی تو یہ تمھاری برتری تسلیم کر لینا ہے جس سے ان کا پندار سیادت مجروح ہوتا ہے۔

منکرین کے عزائم غلبۂ حق کی بشارت

'مَا هُمْ بِبَالِغِيهِ' فرمایا کہ اپنے اس پندار میں یہ بامراد ہونے والے نہیں ہیں، اب فیصلۂ تقدیر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ہاتھوں اس کلمۂ حق کا بول بالا کرے گا اور تمھارے یہ مخالفین دنیا اور آخرت دونوں میں رسوا ہوں گے۔

مخالفین کے شر سے محفوظ رکھے جانے کی بشارت

'فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ' یعنی اپنے اس غرور کے سبب سے یہ تمھارے درپے آزار بھی ہوں گے لیکن تم اس کی پروا نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو اپنے اللہ کی پناہ میں دو اور اطمینان رکھو کہ اصل سننے دیکھنے والا وہی ہے۔ وہی تم کو ان متکبروں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۵۷)

لوگوں کو دوبارہ پیدا کر دینا اس خدا کے لیے کیا مشکل ہے

فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ مرکھپ جانے کے بعد لوگوں کا از سر نو پیدا کرنا ناممکن ہے تو یہ ان کی جہالت ہے۔ جو خدا اپنی قدرت سے آسمانوں اور زمین کو وجود میں لا سکتا ہے۔ آخر اس کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا! زیادہ مشکل کام پہلا ہے یا دوسرا! اگر اللہ تعالیٰ اتنے بڑے بڑے کام کر سکتا ہے اور ثابت ہے کہ کر سکتا ہے تو یہ کام کیوں نہیں کر سکتا جو ان سے کہیں چھوٹا ہے! 'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ' یعنی ہے تو یہ بالکل واضح حقیقت، ہر شخص کی سمجھ میں آنی چاہیے لیکن اکثر لوگ اتنی واضح حقیقت بھی نہیں سمجھ رہے ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۥ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ۔ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۵۸-۵۹)

آخرت کی اخلاقی ضرورت

یہ آخرت کی اخلاقی ضرورت واضح فرمائی کہ اگر آخرت نہیں ہے، جیسا کہ یہ لوگ گمان کیے بیٹھے ہیں، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے۔ اس کے خالق کے نزدیک عقل و دل کے اندھے اور عقل و بصیرت رکھنے والے دونوں یکساں ہیں اور نیکوکار اور بدکار میں اس کے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ اس سے خدا کی صفات عدل، حکمت، رحم اور قدرت کی نفی ہو جاتی ہے جو دوسرے الفاظ میں خود خدا کی نفی کے ہم معنی ہے۔ اس وجہ سے قیامت کا آنا لازمی ہے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے لیکن تعجب ہے کہ اکثر لوگ اس بدیہی حقیقت پر بھی ایمان نہیں لا رہے ہیں۔

'اَعْمٰى' یہاں عقل و دل کے اندھوں کے لیے استعمال ہوا ہے اور 'بَصِيْر' سے مراد وہ لوگ ہیں جو بصارت کے ساتھ بصیرت رکھنے والے اور اللہ کی نشانیوں پر غور کرنے والے ہیں۔

'قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ' سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ حقائق ایسے مخفی نہیں ہیں کہ کسی کی سمجھ میں آ ہی نہ سکیں۔ لیکن جو لوگ سرے سے اپنے سمع و بصر سے کام ہی نہیں لینا چاہتے ان کا کیا علاج۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ (۶۰)

لفظ 'اِسْتِكْبَار' یہاں اعراض کے مفہوم پر متضمن ہے۔ حرف 'عَنْ' اس پر دلیل ہے۔

اللہ سے مانگنے کے لیے کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں

آخرت کی یاد دہانی کے بعد یہ توحید کی یاد دہانی ہے کہ تمہارا رب یہ اعلان کر چکا ہے کہ مجھ سے مانگنے کے لیے کسی واسطہ اور وسیلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کو مانگنا ہو وہ مجھی سے مانگے، میں اس کی درخواست قبول کروں گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں نے اپنے دروازے پر کوئی پہرہ نہیں بٹھایا ہے تو دوسروں کو

سفارشی بنانے اور ان کی خوشامد کی کیا ضرورت ہے؟ یہ مشرکین کے اس وہم کی تردید ہے کہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ان کے زعم میں ان کے شفعاء ہی ہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان اس قسم کے وسائط حائل نہیں کیے ہیں بلکہ ہر بندہ اس سے براہ راست تعلق پیدا کر سکتا ہے اور اس سے دعا و التجا کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتا ہے۔

'اَسْتَجِبْ لَكُمْ' کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی ہر صحیح دعا ضرور قبول فرماتا ہے۔ اگر کوئی دعا قبول نہیں فرماتا یا اس کو مؤخر کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے قبول نہ کرنے یا اس کے مؤخر کرنے ہی میں اس کی حکمت ہے۔ بندے کو چاہیے کہ اس پر راضی رہے اس لیے کہ اسی میں اس کے لیے خیر ہے۔ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کا دامن پکڑنا بالکل بے سود ہے اس لیے کہ رد و قبول تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے اور اپنی حکمتوں کو صرف وہی جانتا ہے۔ قبولیتِ دعا کے باب میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے اس پر اس کے محل میں گفتگو ہو چکی ہے۔

'اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ ...... الآیۃ' فرمایا کہ میری اس منادیٔ عام کے باوجود جو لوگ محض اپنے غرور کے سبب سے میری بندگی سے اعراض کر رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ وہ عنقریب اس غرور کی پاداش میں ذلیل ہو کر جہنم میں پڑیں گے۔

اوپر آیت ۵۶ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ جو لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے وہ کسی دلیل یا کسی واقعی شبہ کی بنا پر ایسا نہیں کر رہے تھے بلکہ محض اس بنا پر کر رہے تھے کہ اس سے ان کے غرور سیادت کو ٹھیس لگ رہی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم نے ان کی بات مان لی تو ہم بیٹھے اور یہ ہم پر بالا ہو جائیں گے۔ انہی لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ حق سے اعراض، محض برنائے غرور کر رہے ہیں، وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں پڑیں گے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؗ فَاَنّٰی تُؤْفَكُوْنَ (۶۱-۶۲)

ان آیات میں 'الَّیْلَ' کے بعد 'مُظْلِمًا' اور 'مُبْصِرًا' کے بعد 'لِتَعْمَلُوْا' کے الفاظ برنبائے قرینہ محذوف ہیں۔ اس حذف کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

توحید اور معاد کے آفاقی دلائل

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو ایک ہی ساتھ توحید اور معاد دونوں کو ثابت کرنے والی ہیں۔ ربوبیت کے پہلو سے یہ قیامت پر دلیل ہیں اور آفاق کے پہلو سے توحید پر۔ فرمایا کہ اللہ ہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے خنک اور تاریک بنایا کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا کہ تم اس میں کام کرو۔ یہ لوگوں پر اللہ کا عظیم فضل و احسان ہے لیکن اکثر لوگ اس کے شکر گزار

نہیں ہوتے۔

مطلب یہ ہے کہ دوسری تمام نشانیوں سے قطع نظر کر کے اگر رات اور دن کی خلقت ہی پر غور کریں تو انھیں معلوم ہوگا کہ ان کا خالق نہایت ہی مہربان ہے۔ اس نے ان کی معاشی سرگرمیوں کے لیے دن بنایا تو آرام و سکون کے لیے رات بھی بنائی۔ حالانکہ اگر وہ برابر دن ہی دن رکھتا جب بھی کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا یا رات ہی رات مسلط رکھتا جب بھی کسی کی قدرت نہیں تھی کہ دن کی روشنی سے فیضیاب کر سکے۔ اس کی اس رحمت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ لوگ اس کے شکر گزار رہیں لیکن اکثر لوگ اس کے شکر گزار نہیں ہوتے۔

اللہ تعالیٰ کی اس رحمت و ربوبیت کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور اسی کے شکر گزار رہے اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کی نعمتوں سے فائدہ تو اٹھایا لیکن اس کی ناشکری کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ناشکرے اور شکر گزار دونوں اس کے نزدیک یکساں ہیں۔ یہ بات بالبداہت غلط اور اس کے عدل کے خلاف ہے۔

رات اور دن کی یہ سازگاری کہ دونوں مل کر انسان کی پرورش کرتے ہیں اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات میں جو چیزیں بظاہر اضداد کی شکل میں نظر آتی ہیں ان کے اندر بھی بڑی گہری وابستگی و پیوستگی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک بالاتر حکیم ہستی ان تمام اضداد کو اپنی حکمت کے تحت استعمال کر رہی ہے۔ اسی کا ارادہ سب پر حاکم اور وہی ہر چیز کا خالق و مالک ہے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ۔

كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِينَ كَانُوا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُونَ (۶۳)

ایک تنبیہ — یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ جس طرح تمھاری عقل الٹ گئی ہے کہ قرآن کی سیدھی سادی بات کا انکار کر کے الٹی راہ چل رہے ہو اسی طرح تم سے پہلے بھی قومیں گزری ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کر کے الٹی چال چلتی رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو انجام ان کا ہوا وہی انجام تمھارا بھی ہوگا اگر تم نے انہی کی روش اختیار کی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا وَالسَّمَآءَ بِنَآءً وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۖ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِينَ (۶۴)

توحید اور معاد کا ایک نئے اسلوب سے — توحید اور معاد کا وہی مضمون جو اوپر گزرا، ایک نئے اسلوب سے واضح فرمایا کہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو مستقر اور آسمان کو چھت بنایا اور اس طرح تمھارے لیے وہ گہوارہ تعمیر ہوا جس میں تم زندگی

بسر کرتے ہو۔ ان دونوں کا تلازم اور ان کی باہمی سازگاری اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ ان دونوں پر ایک ہی خدا کا تصرف ہے۔ اگر ان کے الگ الگ خدا ہوتے تو اس مکان کا تمہاری رہائش کے لیے موزوں ہونا تو درکنار اس کا وجود بھی میں آنا ہی ممکن نہیں تھا۔ پس ثابت ہوا کہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے یہ گھر بنایا ہے اور آسمانوں اور زمین دونوں میں اسی کی حکمرانی و کارفرمائی ہے۔

'وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ'۔ یعنی ایک آراستہ و پیراستہ گھر تیار کر کے اس میں تم کو وجود بخشا پھر تمہاری صورت گری کی اور اس صورت گری میں بھی تمہارے اوپر یہ خاص فضل فرمایا کہ اس دنیا کی دوسری مخلوقات کے مقابل میں تمہاری صورت نہایت اچھی بنائی۔ 'احسان' کے معنی کسی کام کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں۔ قرآن میں یہی مضمون دوسرے الفاظ میں یوں بیان ہوا ہے 'لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ' (التین: ۴) (ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا) بہترین ساخت سے مراد ظاہر ہے کہ صرف شکل و صورت کی ساخت نہیں ہے بلکہ ان مادی و معنوی قوتوں اور صلاحیتوں کی نہایت اعلیٰ ترتیب و تشکیل بھی ہے جن کی بدولت انسان کو اس دنیا کی دوسری مخلوقات پر برتری حاصل ہوئی۔

'وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ'۔ یعنی جس طرح اس نے تمہاری رہائش کے لیے نہایت اعلیٰ مکان آراستہ کیا اسی طرح تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا۔

'ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ ۖ فَتَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ'۔ پس لاریب وہی تمہارا بھی رب ہے اور اس عالم کا بھی رب ہے اور وہ بڑا ہی بافیض اور برکت والا ہے۔

هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۗ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۶۵)

یعنی حقیقی زندہ اور زندگی بخش وہی ہے۔ اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ، جیسا کہ دوسرے مقام میں ارشاد ہوا ہے 'اموات غیر احیاء' زندگی سے محروم مردے ہیں۔ وہ نہ سنتے ہیں نہ کسی کی مدد کر سکتے ہیں۔ ان کو پکارنا بالکل لاحاصل ہے تو اللہ ہی کو پکارو اور پورے اخلاص کے ساتھ اسی کی اطاعت کرو۔ اس لیے کہ شکر کا سزاوار اللہ ہی ہے جو تمام عالم کا رب ہے۔

قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَمَّا جَاءَنِيَ الْبَيِّنَاتُ مِن رَّبِّي وَأُمِرْتُ أَنْ أُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (۶۶)

مناظرہ بازوں کو فیصلہ کن جواب — یہ ان مناظرہ بازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے فیصلہ کن جواب دلوایا ہے جو آبائی دیوتاؤں کی حمایت میں آپ سے لڑ رہے تھے۔ فرمایا کہ ان کو خبردار کر دو کہ مجھے ان تمام دیوتاؤں کی پرستش سے روک دیا گیا ہے جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو۔ خواہ تم کتنا ہی زور لگاؤ میں ان کی پرستش نہیں کر سکتا بالخصوص

جب کہ میرے رب کے پاس سے اس باب میں نہایت روشن دلیلیں بھی میرے پاس آ چکی ہیں۔ مجھے یہ ہدایت ہوئی ہے کہ میں اپنے آپ کو کلیتہً عالم کے خداوند کے حوالہ کر دوں یعنی عبادت بھی اسی کی کروں اور اطاعت بھی اسی کی کروں ــــ یہ اعلانِ براءت اس لیے کیا گیا کہ مخالفین کے ذہن کے کسی گوشہ میں اگر یہ توقع ہو کہ وہ دباؤ ڈال کر آپ کو کچھ نرم کر لیں گے تو وہ اس سے بالکل ہی مایوس ہو جائیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّی وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۶۷)

اس آیت میں کلام کے بعض اجزاء عربی زبان کے معروف اسلوب کے مطابق محذوف ہیں۔ ترجمہ میں ہم نے وہ محذوفات واضح کر دیے ہیں اور دوسرے مقام میں ان کے نظائر بھی ہم پیش کر چکے ہیں۔

انسان کی خلقت کے بعض مخفی گوشوں کی طرف اشارہ

آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی خلقت جن ادوار و مراحل میں سے گزرتی ہے اگر انسان انہی پر غور کرے تو خدا کی قدرت و حکمت اور توحید و آخرت ہر چیز واضح کر دینے کے لیے وہی کافی ہیں۔ فرمایا کہ اس نے تمہاری خلقت کا آغاز مٹی سے کیا، پھر تمہاری نسل کا سلسلہ پانی کی بوند سے چلایا۔ پانی کی یہ بوند اولاً خون کی ایک پھٹکی کی شکل اختیار کرتی ہے پھر بتدریج نشوونما پا کر ایک جنین کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو ایک جیتے جاگتے بچہ کی صورت میں ماں کے پیٹ سے برآمد کرتا ہے۔

'ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا' یعنی پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ تم کو پروان چڑھاتا ہے کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور پھر تمہیں زندگی کی مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ تم بڑھاپے کو پہنچ جاتے ہو۔ گویا دونوں فعلوں سے پہلے پروان چڑھانے اور مہلت دینے کا مضمون محذوف ہے۔

'وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّی' یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ تم میں سے ہر ایک کو جوانی تک پہنچنا نصیب ہوتا ہو بلکہ تم میں کتنے ایسے ہوتے ہیں جو بچپن ہی میں فوت ہو جاتے ہیں اور کتنے ایسے ہوتے ہیں جن کو زندگی کی مہلت نصیب ہوتی ہے لیکن بس ایک وقت معین تک۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کسی کو غیر محدود زندگی حاصل ہو جائے۔ اس ٹکڑے میں بھی 'لِتَبْلُغُوْٓا' سے پہلے یہ مضمون محذوف ہے کہ تم میں سے کتنے ایسے ہوتے ہیں جن کو زندگی کی مہلت نصیب ہوتی ہے۔

'وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ' یہ علت بتائی ہے اس بات کی کہ اللہ نے تمہاری زندگی کو اتنے پیچ در پیچ مراحل سے کیوں گزارا ہے؟ کیوں ایسا نہیں ہوا کہ وہ بنے بنائے انسان زمین سے اٹھا کھڑے کرتا یا آسمان سے اتار دیتا؟ فرمایا کہ ایسا اس نے اس لیے کیا کہ تم اپنے وجود کے ان تمام مراحل پر غور کرو اور اپنے رب کی شانوں اور اس کی قدرت و حکمت کو سمجھو اور ان پر ایمان لاؤ۔ یہ اشارہ اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اس طرح بنائی ہے کہ یہ ان تمام حقائق کی تعلیم کے لیے ایک بہترین تعلیم گاہ بن

گئی ہے جن کا سمجھنا اور ماننا انسان کی صلاح و فلاح کے لیے ضروری ہے۔ یہاں بھی 'لَعَلَّكُمْ' سے پہلے یہ مضمون محذوف ہے کہ اللہ نے تمہاری خلقت جو اس طرح بنائی ہے تو اس لیے کہ تم اس خلقت پر غور کرو اور اپنے رب کی قدرت و حکمت کو سمجھو۔

جو خدا اتنی قدرت و حکمت کے ساتھ انسان کو وجود میں لاتا ہے، جس کو بلا شرکت غیرے ہر ایک کی زندگی اور موت، جوانی اور پیری پر کلی اختیار حاصل ہے، جس نے ہر ایک کے لیے زندگی کی ایک مدت ٹھہرا رکھی ہے، کیا وہ خدا لوگوں کو دوبارہ نہیں پیدا کر سکتا یا کوئی اور اس کے ارادے میں مزاحم ہو سکتا ہے! پس ثابت ہوا کہ وہ وحدہٗ لا شریک ہے اور وہ لازماً لوگوں کو ایک روز جزا و سزا کے لیے اکٹھا کرے گا اور اس کے لیے یہ کام ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ اس مضمون کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے سورۂ فاطر آیت ۱۱ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (۶۸)

یعنی زندگی اور موت تمام تر اسی کے اختیار میں ہے اور اس کی قدرت کا حال یہ ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو کوئی چیز اس کے ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتی۔ وہ فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے اور اسی طرح ہو جاتی ہے جس طرح وہ چاہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کو بھی یوں ہی سمجھو۔ جب وہ اس کو لانا چاہے گا تو اس کے ایک کلمۂ کن سے وہ چشم زدن میں آجائے گی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰی یُصْرَفُوْنَ (۶۹)

مخالفین کو دھمکی

یعنی یہ حقائق بالکل واضح ہیں لیکن ان شامت زدوں کو دیکھو، کس طرح ان کی مت ماری گئی ہے کہ وہ اللہ کی ان واضح آیات کی تکذیب کے لیے کٹ حجتی کر رہے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَاۤ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۛ۫ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (۷۰)

'کتاب' سے مراد قرآن مجید ہے۔ یہ ان کے جرم کا بیان ہے کہ انھوں نے قرآن کی بھی تکذیب کی اور ان تمام تعلیمات کی بھی جن کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا۔ تمام رسولوں کی تعلیم بنیادی طور پر یہی رہی ہے جو قرآن دے رہا ہے تو قرآن کی تکذیب سب کی تکذیب ہوئی۔ 'فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ' یہ دھمکی ہے۔ یعنی اگر انھوں نے یہ جسارت کی ہے تو عنقریب وہ اس کا انجام بھی دیکھیں گے۔

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ یُسْحَبُوْنَ ۙ فِی الْحَمِیْمِ ۙ۬ ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ (۷۱-۷۲)

'وَالسَّلٰسِلُ' کے بعد 'فِیْۤ اَرْجُلِهِمْ' کے الفاظ میرے نزدیک محذوف ہیں۔ ترجمہ میں ان کو میں نے کھول دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے استکبار کی بنا پر اللہ کی آیات کی تکذیب کی اس وجہ سے ان کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے اور ان کے پاؤں میں زنجیریں پہنائی جائیں گی۔ اس کے بعد

وہ گرم پانی میں گھسیٹے جائیں گے پھر دوزخ میں جھونک دیے جائیں گے۔ سَجَرَ التَّنُّورَ کے معنی ہیں تنور کو ایندھن سے بھر دیا۔

ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ تُشْرِكُونَ ۝ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا بَل لَّمْ نَكُن نَّدْعُو مِن قَبْلُ شَيْئًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ الْكَافِرِينَ (۷۳-۷۴)

مشرکین کی بدحواسی

اس کے بعد ان سے سوال ہوگا کہ اب بتاؤ، خدا کی پکڑ سے بچانے کے لیے اس کے مقابل میں دوسرے جو شریک تم نے ٹھہرا رکھے تھے، وہ کہاں گئے! اگر وہ ہیں تو ان کو بلاؤ، تمھیں اس عذاب سے چھڑائیں! مِن دُونِ اللَّهِ یہاں اللہ کے مدِمقابل کے مفہوم میں ہے اور اس مفہوم میں یہ آتا ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

وہ جواب دیں گے کہ وہ تو سب ہم سے کھوئے گئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے ہم کسی چیز کو پوجتے ہی نہیں تھے۔ یعنی پہلے وہلہ میں تو وہ اقرار کرلیں گے کہ ان کے کچھ معبود تھے جن کی وہ پرستش کرتے رہے تھے لیکن یہاں ان میں سے کوئی بھی ان کی مدد کے لیے موجود نہیں ہے لیکن پھر جب وہ یہ محسوس کریں گے کہ ان کی عبادت کی پاداش ہی میں ان کو اس ہولناک انجام سے دوچار ہونا پڑا ہے تو ان کا انکار کردیں گے کہ شاید یہ انکار ان کے لیے کچھ نافع ہو جائے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ قیامت کے دن مشرکین پر ایسی بدحواسی طاری ہوگی کہ وہ ایک ہی سانس میں اپنے معبودوں کا اقرار بھی کریں گے اور انکار بھی۔ سورۂ انعام کی آیات ۲۲-۲۴ کے تحت اس پر بحث گزر چکی ہے۔

وَكَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ الْكَافِرِينَ: یہ اشارہ ان کے اسی اقرار و انکار کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ان کو اس طرح حواس باختہ کردے گا کہ ان کو کچھ ہوش نہیں رہے گا کہ ابھی وہ کیا کہہ گزرے ہیں اور اب کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کی وضاحت پیچھے بھی ہو چکی ہے اور آگے یہ مضمون حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۴۸ میں بھی آ رہا ہے۔ وہاں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

ذَٰلِكُم بِمَا كُنتُمْ تَفْرَحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنتُمْ تَمْرَحُونَ (۷۵)

کبریائی صرف خدا کے لیے زیبا ہے

یعنی یہ جو کچھ تمھارے سامنے آیا ہے نتیجہ ہے اس بات کا کہ تم زمین میں بلا کسی حق کے اکڑتے اور اتراتے تھے۔ دنیا میں جو چیزیں بھی تمھیں ملیں ان میں سے کوئی چیز بھی تمھاری ذاتی نہیں بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی تھی اس وجہ سے ان کا حق یہ تھا کہ تم اپنے رب کے شکرگزار اور اس کے فرماں بردار بنتے لیکن تم نے اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنا ذاتی حق سمجھا اور غرور و تکبر میں مبتلا ہو کر اکڑنے اور اترانے لگ گئے اور اس غرور میں اللہ کے ان رسولوں کی بھی تم نے توہین و تکذیب کی جنھوں نے تمھیں اصل حقیقت کی یاددہانی کرنی چاہی۔

آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اور اسی کی ملکیت ہے اس وجہ سے صرف اسی کے

لیے تکبر زیبا ہے کسی دوسرے کے لیے یہ زیبا نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا تکبر کرتا ہے تو بِغَيْرِ الْحَقِّ ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خاص ردا اپنے اوپر ڈالنے کی جسارت کر رہا ہے جو شرک ہے۔ اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي میں اسی حقیقت کی یاد دہانی کی گئی ہے۔

اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۷۶)

متکبرین کا انجام

یعنی اب عذر و معذرت بالکل بے سود ہے۔ یہ جہنم کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اشارہ جہنم کے ان سات دروازوں کی طرف ہے جن کی تفصیل دوسرے مقام میں ہو چکی ہے۔ ارشاد ہو گا، ان میں داخل ہو جاؤ اور اب اسی میں ہمیشہ رہنا ہے، کبھی اس سے نکلنے کی توقع نہ رکھنا۔ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ۔ یہ ان سے منہ پھیر کر ارشاد ہو گا کہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہو گا جو ان متکبروں کے حصہ میں آئے گا!

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ (۷۷)

آنحضرت صلعم کے لیے تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ ان لوگوں کی ان حرکتوں پر صبر کرو۔ جس عذاب کی دھمکی ان کو دی جا رہی ہے، اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ لازماً ظہور میں آ کے رہے گا۔ یا تو تمھاری زندگی ہی میں اس کا کچھ حصہ ظہور میں آئے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو بالآخر انھیں ہمارے ہی پاس لوٹنا ہے، ہم آخرت میں ان کو اس کا مزا چکھائیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو قسم کے عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک وہ عذاب جو اسی دنیا میں پیش آتا ہے اگر قوم رسول کی تکذیب کر دیتی ہے اور دوسرا وہ عذاب جس سے آخرت میں سابقہ پیش آئے گا۔ یہاں بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ سے اسی دنیا کے عذاب کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسی عذاب آخرت کا ایک حصہ ہے جس سے تمام کفار و مشرکین کو لازماً آخرت میں سابقہ پیش آنا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کو، رسولوں کی عام سنت کے مطابق، بصورت تکذیب اسی دنیا میں بھی، عذاب کی وعید سنائی گئی تھی لیکن آپ کی قوم کی اکثریت اسلام لائی اس وجہ سے اس پر اس طرح کا کوئی عذاب نہیں آیا جس طرح کا عذاب سابق رسولوں کے مکذبین پر آیا بلکہ اس کے اشرار کا مواخذہ آخرت پر اٹھا رکھا گیا جس کی طرف فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۗ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ (۷۸)

تسلی کا ایک خاص پہلو

یہ وہی تسلی کا مضمون ایک خاص پہلو سے واضح فرمایا جا رہا ہے۔ رسولوں کے مکذبین کی یہ عام روش رہی ہے کہ جب ان کو رسول نے اللہ کے عذاب سے ڈرایا تو قوم نے رسول کو زچ کرنے کے لیے اس

عذاب کا کوئی نمونہ دکھانے کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبہ کا ایک جواب اوپر والی آیت میں دیا گیا اب اسی کا ایک اور پہلو واضح فرمایا گیا ہے کہ رسولوں کی تاریخ شاہد ہے کہ اس طرح کی نشانیاں دکھانے کا معاملہ رسولوں کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق تمام تر اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ہے۔ اگر اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے تو وہ عذاب بھیجتا ہے اور اگر نہیں ہوتا تو نہیں بھیجتا۔ اس چیز کا مطالبہ لوگوں کو نہ رسول سے کرنا چاہیے اور نہ رسول کو لوگوں کے اس مطالبہ سے پریشان ہونا چاہیے۔ البتہ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیے کہ جب اللہ کا حکم عذاب کے لیے صادر ہو جاتا ہے تو ٹھیک ٹھیک انصاف کے مطابق فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اس وقت شامت انہی لوگوں کی آتی ہے جو حق کو جھٹلاتے اور رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَیْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۝ وَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ ۖۗ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ (۷۹ - ۸۱)

ربوبیت کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اوپر کی آیت میں نشانیٔ عذاب کے مطالبہ کی طرف اشارہ گزرا۔ وہاں رسولؐ کو یہ اطمینان دلایا تھا کہ اس چیز کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اس وجہ سے معاملہ اسی کے سپرد کرنا چاہیے۔ اس آیت میں عذاب کی نشانی کا مطالبہ کرنے والوں کو ربوبیت کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ عذاب ہی کی کوئی نشانی کیوں مانگتے ہو، خدا کی ربوبیت کی بے شمار نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے جو تمہارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں! اس نے تمہارے لیے چوپائے پیدا کیے جن میں کچھ تمہاری سواری کے کام آتے ہیں اور بعض سے تم اپنی غذائی ضروریات پوری کرتے ہو، علاوہ بریں تمہارے دوسرے بہت سے مفاد بھی ان سے وابستہ ہیں۔ ان کو خالق نے ایسا بنایا ہے کہ ان پر سوار ہو کر تم اپنی مہمات کے لیے نکلتے ہو اور اپنے منصوبے بروئے کار لاتے ہو! یہ اشارہ اونٹ کی طرف ہے جو اہلِ عرب کے لیے ان کے صحرائی سفینہ کی منزلت میں تھا۔ فرمایا کہ تم اپنے صحرا کے طویل سفروں میں ان پر سوار ہوتے ہو اور اسی طرح سمندر میں کشتیوں سے سفر کرتے ہو۔ فرمایا کہ کیا یہ سب خدا کی نشانیاں نہیں ہیں! آخر کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے! مطلب یہ ہے کہ غور کرو کہ جس پروردگار نے تمہاری ضروریات کا یہ کچھ اہتمام کیا ہے کیا وہ تمہیں یوں ہی چھوڑے رکھے گا، ان نعمتوں کی بابت تم سے کوئی پرسش نہیں کرے گا! اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو اسی کی وعید تم کو پیغمبر سنا رہا ہے۔ پھر اس کی تکذیب کے لیے یہ کیا بہانہ تم نے تلاش کیا ہے کہ وہ تمہیں کوئی نشانیٔ عذاب نہیں دکھا رہا ہے! نشانیوں کی کمی تو نہیں ہے لیکن تمہارے پاس نشانیوں کو دیکھنے والی آنکھیں نہیں ہیں۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ (۸۲)

یہ عذاب کا مطالبہ کرنے والوں کو پچھلی قوموں کی تاریخ کی طرف توجہ دلائی کہ اگر خدا کی ربوبیت کے آثار ان کو نظر نہیں آتے تو کیا انھوں نے اپنے ملک کی بھی سیاحت نہیں کی کہ دیکھتے کہ ان سے پہلے کی ان قوموں کا کیا انجام ہو چکا ہے جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی، اگرچہ وہ اپنی قوت و جمعیت کے اعتبار سے ان سے کہیں زیادہ طاقتور اور اپنے تمدنی و تعمیری کارناموں کے لحاظ سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں لیکن جب اللہ کا عذاب آیا تو ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ان کے کام آنے والی نہ بنی جن کا اندوختہ وہ فراہم کرتے رہے تھے۔

لفظ 'اثار' کا تعلق 'اکثر' سے ہے۔ یہ عاد و ثمود کے ان تعمیری آثار کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر قرآن کے دوسرے مقامات میں ہو چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب قوم اخلاقی زوال میں مبتلا ہو جاتی ہے تو مجرد اپنی عددی اکثریت اور اپنے تمدنی آثار کے بل پر زندہ نہیں رہ سکتی

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۸۳)

فرمایا کہ جب اللہ کے رسول ان قوموں کے پاس توحید، آخرت اور جزا و سزا کی نہایت کھلی کھلی دلیلیں لے کر آئے تو انھوں نے ان کی باتوں کا مذاق اڑایا اور اپنے علم پر نازاں رہے۔ بالآخر اسی عذاب نے ان کو گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ یعنی اپنے تھوڑے سے علم کو اپنی تنگ ظرفی کے سبب سے انھوں نے بہت بڑی چیز سمجھا اور یہ خیال کر لیا کہ جو کچھ وہ دیکھتے ہیں بس دنیا کل اتنی ہی ہے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (۸۴-۸۵)

یعنی رسولوں کے دلائل سے تو وہ نہیں مانے لیکن جب انھوں نے اللہ کا عذاب دیکھ لیا تب وہ پکار اٹھے کہ ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور جن چیزوں کو اب تک خدا کا شریک گردانتے رہے تھے، ان کا ہم نے انکار کیا! فرمایا کہ ان کا یہ ایمان جو وہ عذاب دیکھ چکنے کے بعد لائے، ان کے لیے کچھ نفع دینے والا نہیں بنا بلکہ عذاب نے ان کو پامال کر کے رکھ دیا۔ ایمان معتبر وہ ہے جو عذاب دیکھنے سے پہلے دلائل کی روشنی میں لایا جائے۔ اگر اس کا وقت گزر گیا اور عذاب کی گھڑی سر پر آگئی تو اس وقت کا ایمان بالکل بے سود ہوتا ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہمیشہ سے اس کے بندوں میں جاری رہی ہے۔ جب عذاب آجاتا ہے تو اس وقت اس کا انکار کرنے والے

لازماً نامراد ہو کے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

لاہور

۲۴۔ اگست، ۱۹۷۵ء

۱۹۔ شعبان، ۱۳۹۵ھ

تدبرِ قرآن

۴۱

حٰمٓ السّجدة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس سورہ کا بھی اصل مضمون سابق سورہ کی طرح توحید ہی ہے۔ اس میں توحید کے دلائل بھی بیان ہوئے ہیں اور ان لوگوں کو انذار بھی کیا گیا ہے جو قرآن کی دعوتِ توحید کی مخالفت کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ان ایمان والوں کو ابدی کامیابی کی بشارت دی گئی ہے جو مخالفوں کی تمام مخالفانہ سرگرمیوں کے علی الرغم، توحید پر استوار رہیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ تمہارے دشمن خواہ کتنا ہی جاہلانہ رویہ اختیار کریں لیکن تم ان کی جہالت کا جواب صبر و بردباری سے دینا۔ یہی طریقہ بابرکت اور اسی میں تمہاری دعوت کی کامیابی مضمر ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۸) سورہ کی تمہید، جس میں یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ خدائے رحمان و رحیم نے اہلِ عرب پر یہ عظیم احسان فرمایا کہ قرآن کو عربی زبان میں ان کے لیے نذیر و بشیر بنا کر اتارا۔ اس احسان کا حق یہ تھا کہ لوگ اس کی قدر کرتے لیکن یہ نہایت رعونت سے اس نعمت کو ٹھکرا رہے ہیں اور ایمان لانے کے بجائے اس عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے۔ ان کے اس مطالبہ کے جواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ ان کو بتا دو کہ مجھے جس توحید کی وحی ہوئی تھی وہ میں نے تم کو پہنچا دی؛ رہا عذاب کا معاملہ تو یہ چیز میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں ایک بشر ہوں، خدا نہیں ہوں۔

اہلِ ایمان کو استغفار و استقامت کی تلقین اور اجرِ دائمی کی بشارت اور مشرکین کو ابدی تباہی کی وعید جو ایمان و انفاق کے بجائے محض اپنے مزعومہ شفعاء کے بل پر آخرت سے بالکل بےفکر بیٹھے تھے۔

(۹-۱۲) اس کارخانۂ کائنات میں جو قدرت و حکمت، جو رحمت و ربوبیت اور جو نظم و اہتمام کارفرما ہے وہ شاہد ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل یا مختلف دیوتاؤں کی بازی گاہ یا رزم گاہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی سے وجود میں آیا ہے اس وجہ سے جو لوگ شرکاء و شفعاء کے بل پر خدا اور آخرت سے غافل ہیں وہ صرف اپنی شامت کے منتظر ہیں۔

(۱۳-۱۸) قریش کو تہدید و وعید کہ اگر تم رسول کی دعوت کی تکذیب ہی پر تل گئے ہو تو رسولوں کی تکذیب کرنے والی

قوموں کے انجام سے دوچار ہونے کے لیے بھی تیار ہو جاؤ۔ تم سے پہلے عاد و ثمود نے بھی تمہاری ہی روش اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے عذاب نے ان کو تباہ کر دیا اور یاد رکھو کہ قوت و شوکت میں وہ تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔

(۱۹-۲۴) مشرکین جو اپنے شریکوں کی شفاعت کی امید لیے بیٹھے ہیں یاد رکھیں کہ قیامت کے دن ان کے کان، آنکھ اور ہاتھ پاؤں خود ان کے خلاف گواہی دیں گے اور کسی کی شفاعت ان کے کچھ کام نہیں آئے گی۔ اس دن ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ سب سے زیادہ ان کی تباہی کا سبب یہ چیز ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق اس وہم میں مبتلا رہے کہ اس کو بندوں کے سارے اعمال کی خبر نہیں ہوتی۔ اس دن ان کے لیے امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔ ان کا واحد ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ اگر وہ معافی کی درخواست کریں گے تو ان کو معافی نہیں ملے گی۔

(۲۵-۲۹) گمراہ لیڈروں اور ان کے گمراہ پیروؤں کو اللہ تعالیٰ دوزخ میں جمع کرے گا۔ قرآن کی دعوتِ توحید کی مخالفت میں انھوں نے آپس میں گٹھ جوڑ کیا اس بات کا انجام اس دن ان کے سامنے آئے گا۔ اس وقت وہ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے اور گمراہ ہونے والے عوام اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ اے رب! انسانوں اور جنوں میں سے جنھوں نے بھی ہمیں گمراہ کیا ہے تو ان کو ہمیں دکھا کہ ہم ان کو اپنے پاؤں سے روند ڈالیں۔

(۳۰-۳۲) جو لوگ تمام مخالفتوں اور سازشوں کے علی الرغم توحید پر جمے رہیں گے قیامت کے دن ان کے پاس فرشتے اللہ تعالیٰ کی ابدی رحمت و نعمت کی بشارت لے کر آئیں گے۔

(۳۳-۳۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی کہ تم نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ دعوت لے کر اٹھے ہو۔ اگر جاہل لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں تو ان کی جہالت کا مقابلہ شرافت اور عفو و درگزر سے کرو۔ اگرچہ یہ کام نہایت مشکل ہے لیکن یہ نہایت اعلیٰ حکمت ہے جو ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں اور نصیبہ ور درحقیقت وہی لوگ ہیں۔ اس وجہ سے تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے لیے یہی روش زیبا ہے۔ اور اگر کبھی شیطان کی وسوسہ اندازی سے اس کی کوئی خلاف ورزی ہو جائے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

(۳۷-۴۰) ابتدائے سورہ میں توحید اور معاد کی جو دلیل بیان ہوئی ہے بعض دوسرے دلائل آفاق سے اس کی تائید اور ان لوگوں سے اظہارِ بیزاری، جو ان واضح آیات کے بعد بھی توحید اور آخرت کی مخالفت کر رہے تھے۔

(۴۱-۴۴) قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب پر جو احسان فرمایا اور جس کی طرف سورہ کی تمہید میں اشارہ گزر چکا ہے، اس کی تائید ایک نئے اسلوب سے۔ قرآن کی شان اور اس کی عظمت کے بیان کے ساتھ ساتھ قرآن کے خلاف اہلِ کتاب کے القاء کیے ہوئے ایک اعتراض کا جواب اور مکذبین کی اصل بیماری کی نشان دہی۔

(۴۵-۴۶) یہود کے القاء کیے ہوئے اس سوال کا جواب کہ جب قرآن تورات کو آسمانی کتاب تسلیم کرتا ہے تو اس کے ہوتے ہوئے کسی اور آسمانی کتاب کی کیا ضرورت پیش آئی؟

(۴۷-۵۱) جو لوگ آخرت کا مذاق اس وجہ سے اڑا رہے تھے کہ اس کا ظہور نہیں ہو رہا ہے یا پیغمبر اس،

کی تاریخ نہیں متعین کر سکتے، ان کو جواب اور جو لوگ اپنے مزعومہ شرکا و شفعاء کے بل پر آخرت سے نچنت تھے ان کو تنبیہ کہ اس دن سب اپنے شریکوں سے برارت کا اعلان کریں گے۔ علاوہ ازیں قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کی تنگ ظرفی پر اظہار افسوس کہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ ذرا سا خدا کی گرفت میں آجاتے ہیں تو فوراً بلبلا اٹھتے ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ ان کو ذرا ڈھیل دے دیتا ہے تو شیخی بگھارنے اور عذاب کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔

(۵۲-۵۴) خاتمۂ سورہ جس میں تکذیب قرآن کے ہولناک انجام کی طرف اشارہ اور اس بات کی تہدید ہے کہ اب قرآن کی صداقت کی نشانیاں آفاق و انفس میں ظاہر ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے اور ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ جو لوگ شک میں مبتلا ہیں وہ عنقریب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

سُوْرَةُ حٰمٓ السَّجْدَة (۴۱)

مَكِّيَّةٌ ـــــــ اٰیات: ۵۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ آیات ۱-۱۲
اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ
فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۴﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ
اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَ
بَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴿۵﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ الثلثة
مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ
وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶﴾ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۸﴾ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ ع ۱۵
الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۚ ذٰلِكَ رَبُّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹﴾ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ
فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ﴿۱۰﴾ ثُمَّ اسْتَوٰٓى
اِلَى السَّمَاۗءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ

كَرْهًا ۖ قَالَتَآ أَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴿١١﴾ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ
يَوْمَيْنِ وَأَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ أَمْرَهَا ۚ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا
بِمَصَابِيْحَ ۖ وَحِفْظًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿١٢﴾

ترجمۂ آیات: ۱-۱۲ یہ حٰمٓ ہے۔ قرآن خدائے رحمان ورحیم کی تنزیل ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتوں کی تفصیل عربی قرآن کی صورت میں ان لوگوں کے لیے کی گئی ہے جو جاننا چاہیں، خوشخبری دینے والی اور آگاہ کر دینے والی۔ پس ان کی اکثریت نے اس سے اعراض کیا اور وہ اس کو نہیں سن رہے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل ان باتوں سے اوٹ میں ہیں جن کی تم ہمیں دعوت دے رہے ہو اور ہمارے کان اس چیز سے بہرے ہیں جو تم ہمیں سنا رہے ہو اور ہمارے اور تمھارے درمیان ایک حجاب حائل ہے تو جو کچھ تمھیں کرنا ہے وہ کر گزرو، ہم بھی جو کچھ کرنے والے ہیں کر کے رہیں گے۔ ۱-۵

ان سے کہہ دو، میں تو تمھارے ہی مانند ایک بشر ہوں۔ میرے پاس یہ وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود بس ایک ہی معبود ہے تو اسی کی طرف یکسو ہو کر اپنا رخ کرو اور اس سے مغفرت مانگو اور ان مشرکوں کے لیے تباہی ہے جو انفاق نہیں کرتے اور آخرت کے تو اصلی منکر وہی ہیں۔ البتہ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل بھی کیے ان کے لیے دائمی صلہ ہے۔ ۶-۸

ان سے پوچھو، کیا تم لوگ اس ہستی کا انکار کر رہے ہو جس نے دو دن میں زمین بنائی اور اس کے شریک ٹھہراتے ہو، وہی تو تمام عالم کا خداوند ہے! اور اس نے اس زمین میں اس کے اوپر سے پہاڑ گاڑ دیے اور اس میں برکتیں رکھیں اور اس میں اس کے غذائی ذخیرے ودیعت کیے سب ضرورتمندوں کے لیے یکساں طور پر، یہ سب ملا کر چار دنوں میں۔ پھر اس نے آسمان

کی طرف توجہ فرمائی، اور وہ اس وقت دھوئیں کی شکل میں تھا، پس اس کو اور زمین کو حکم دیا کہ تم ہمارے احکام کی تعمیل کرو، طوعاً یا کرہاً، وہ بولے کہ ہم رضامندانہ حاضر ہیں۔ پس ان کے سات آسمان ہونے کا فیصلہ فرمایا دو دنوں میں۔ اور ہر آسمان میں اس کے متعلقہ فرائض وحی کر دیے اور ہم نے آسمانِ زیریں کو چراغوں سے سنوارا اور اس کو اچھی طرح محفوظ کیا۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے۔ ۹-۱۲

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ ۚ تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱-۲)

'حٰمٓ' اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ پچھلی سورہ میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ جو سورتیں اس نام سے موسوم ہیں ان سب میں مضامین مشترک سے ہیں۔ تالیفِ کلام اگرچہ یوں بھی ہو سکتی ہے کہ اس کو مبتدا مان کر بعد کے جملہ کو اس کی خبر قرار دیجیے لیکن ہمارے نزدیک یہ مستقل جملہ ہے اور مبتدا اس میں محذوف ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔

'تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ' میں بھی مبتدا میرے نزدیک حذف ہے یعنی یہ قرآن خدائے رحمان

ظاہر کرنا بھی ہے جو قرآن جیسی عظیم رحمت کی ناقدری اور اس پر ایمان لانے کے بجائے اس عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا تھا۔ گویا ان کو بتایا جا رہا ہے کہ خدائے رحمان و رحیم نے تو ان کے لیے ایک عظیم برکت و رحمت نازل فرمائی لیکن وہ اپنی شامت کے باعث رحمت کی جگہ نقمت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ آگے کی آیات سے بالتدریج یہ مضمون واضح ہوتا جائے گا۔

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۙ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۳-۴)

اہل عرب پر قرآن کا خاص حق

یہ خبر کے بعد دوسری خبر اور اللہ تعالیٰ کی اس رحمت و عنایت کی تفصیل ہے جو قرآن کی صورت میں خاص طور پر اس نے اہل عرب پر فرمائی کہ اس کو عربی زبان میں اتارا تاکہ ان کو اس کلام کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ اعتراض اٹھاتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کی وضاحت ان کے لیے خود ان کی زبان میں کیوں نہیں فرمائی؟ چنانچہ آگے اسی سورہ میں اسی بات کی وضاحت یوں فرمائی گئی ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا — اور اگر ہم اس کو عجمی قرآن کی صورت میں اتارتے تو یہ
لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ — لوگ اعتراض اٹھاتے کہ اس کی آیتیں ہمارے لیے اچھی
وَّعَرَبِيٌّ ط (فصلت: ۴۴) — طرح کھولی کیوں نہ گئیں؟ کلام عجمی اور مخاطب عربی!

'لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ' میں فعل ہمارے نزدیک ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ہم نے یہ سارا اہتمام ان لوگوں کے لیے کیا جو جاننے اور سمجھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو جاننے کی خواہش ہی سے محروم ہیں ان کے لیے سارے جتن بیکار ہیں۔ اس اسلوب بیان میں عربوں کے لیے ایک تحریض و ترغیب بھی ہے کہ انھیں جاننے اور سمجھنے کا حریص ہونا چاہیے اس لیے کہ وہ امّی رہے ہیں اور اب پہلی بار اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کی تعلیم کے لیے ان کی زبان میں اپنی کتاب اتاری ہے۔

قرآن کے رد و قبول دونوں کے دوررس اثرات

'بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا' یہ قرآن کی دوسری صفت بیان ہوئی ہے کہ یہ بشیر و نذیر بن کر نازل ہوا ہے۔ جو لوگ اس کو قبول کریں گے ان کے لیے یہ دنیا اور آخرت دونوں میں فوز و فلاح کی بشارت ہے اور جو تکذیب کریں گے ان کے لیے یہ عذاب الٰہی کا پیش خیمہ ہے۔ یعنی کوئی اس کو سہل چیز نہ سمجھے۔ اب یہ سب سے بڑی رحمت بھی ہے اور سب سے بڑی نقمت بھی اس وجہ سے جو لوگ اس کی مخالفت کے درپے ہیں وہ اس مخالفت کے انجام کو دور تک سوچ لیں۔

قرآن محض وعظ نہیں بلکہ خدائی انذار ہے

'فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ' یعنی اکثر لوگوں نے اس کی اس اہمیت کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ انھوں نے اس کو ایک معمولی چیز سمجھ کر اس سے اعراض اختیار کر رکھا ہے اور اس کو سننے سمجھنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہو رہے ہیں۔ انھیں یہ اندازہ نہیں ہے کہ یہ محض کسی واعظ کا وعظ نہیں ہے بلکہ یہ خدائی انذار ہے اور یہ جن باتوں سے آگاہ کر رہا ہے ان میں سے ہر بات لازماً سامنے آ کے رہے گی۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ (۵)

یہ اس اعراض اور نہ سننے کی تفصیل ہے کہ وہ بڑی رعونت و تمکنت کے ساتھ کہتے ہیں کہ جن چیزوں کی طرف تم ہمیں دعوت دے رہے ہو ان کو قبول کرنے کے لیے ہمارے دل بالکل بند ہیں یعنی جس توحید اور آخرت کی تم دعوت لے کر اٹھے ہو یہ دعوت کسی طرح ہمارے دل پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ یہ بالکل وہی بات ہے جو یہود کی زبانی 'قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ' کے الفاظ میں نقل ہوئی ہے۔ لفظ 'اَكِنَّةٌ' پر اس کے محل میں گفتگو ہو چکی ہے۔

'وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ' کے بعد 'من استماع القرآن' یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہیں۔ 'مِمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ' کا تقابل اس حذف کی طرف اشارہ کر رہا ہے؛ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔ یعنی یہ قرآن جو تم ہم کو سنا رہے ہو اس کے سننے کے لیے ہمارے کان بہرے ہیں۔

'وَمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ'۔ یعنی ہمارے اور تمہارے درمیان عقائد و نظریات اور مسلک و مذہب کے اختلاف کی ایک ایسی دیوار حائل ہو گئی ہے کہ اب ہمارے مل سکنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

مخالفینِ قرآن کا آخری مطالبہ

'فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ' یعنی جب ہمارے درمیان ایسی دیوار حائل ہو چکی ہے کہ اب ہم ایک دوسرے سے کبھی مل ہی نہیں سکتے تو اب جو کچھ تم کر سکتے ہو وہ کر گزرو اور ہم بھی جو کچھ کرنے والے ہیں وہ اب بلا پس و پیش کر کے رہیں گے۔ اگرچہ الفاظ سے ظاہر نہیں ہے لیکن اوپر 'بشیر و نذیر' کے جو الفاظ وارد ہوئے ہیں ان کو سامنے رکھ کے غور کیجیے تو 'فَاعْمَلْ' کے اندر ان کی طرف سے عذاب کا مطالبہ مضمر ہے۔ یعنی تم اپنے قرآن میں جس عذاب کی روز دھمکی سنا رہے ہو اب ہمارے اس فیصلہ کن اعلان کے بعد اس کو لاؤ اگر اپنے دعوے میں سچے ہو ورنہ ہم تو بہر حال جو کچھ کرنے والے ہیں کر کے رہیں گے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا

اس کا شریک و سہیم نہیں ہے تو بالکل یکسو ہو کر اسی کی طرف توجہ کرو اور اب تک جس شرک میں آلودہ رہے ہو اس کی معافی مانگو اور اپنے ربِّ حقیقی کی طرف رجوع کرو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی سن لو کہ ان مشرکوں کے لیے ہلاکی و بربادی ہے جو اللہ کی راہ میں انفاق تو کرتے نہیں، بس اپنے مزعومہ سفارشیوں کے بل پر نچنت بیٹھے ہیں۔ فرمایا کہ آخرت کے اصلی منکر یہی ہیں۔

لفظ زکوٰۃ انفاق کے عام مفہوم میں

'لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ' میں 'زکوٰۃ' سے مراد 'انفاق فی سبیل اللہ' ہے۔ اس مفہوم کے لیے یہ لفظ اسلام کے مکی دور میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ مدنی دور میں آ کر اس کی ایک باضابطہ شکل معین ہو گئی اور پھر اس کا اطلاق اسی پر ہونے لگا۔ یہاں یہ لفظ اپنے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اس مفہوم میں اس زمانے میں معروف تھا۔

اس جواب کا مدعا یہ ہے کہ قرآن جس عذاب کی دھمکی سنا رہا ہے اس کو لانا تو میرا کام نہیں ہے بلکہ اللہ ہی کا کام ہے البتہ یہ انذار کان کھول کر سن لو کہ جو مشرکین ایمان و عمل صالح کے بجائے اپنے شرکاء و شفعاء پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں ان کی ہلاکی ہے!!

شرک و شفاعت کے ساتھ آخرت کو ماننا اس کے انکار کے حکم میں داخل ہے

'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ' اس جملہ میں مبتدا کے اعادہ سے حصر کا مضمون پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ یہ لوگ آخرت کے منکر ہیں بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہو گا کہ آخرت کے منکر یہی ہیں، اس حصر کا فائدہ یہ ہوا کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جب یہ آخرت کو مانتے ہیں، اگرچہ شرک و شفاعت کے تصور کے ساتھ سہی، تو کسی نہ کسی درجے میں ان کے اس ماننے کا بھی اعتبار ہونا چاہیے۔ فرمایا کہ ہرگز نہیں، جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے شفعاء و شرکاء ان کو بہرحال بخشوا ہی لیں گے خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں وہ آخرت کے ماننے والے نہیں بلکہ اس کے اصلی منکر و مکذب وہی ہیں۔ اس زور و تاکید کے ساتھ اس بات کے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے خدا کے اس عدل اور اس حکمت ہی کی نفی کر دی جس پر آخرت کی بنیاد ہے۔ دوسرے اگر منکر ہیں تو محض استبعاد یا شک میں مبتلا ہیں لیکن انھوں نے تو قیامت کا سارا فلسفہ ہی ہدم کر دیا۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے شرک کو بھی صاف صاف کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ شرک درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تمام بنیادی صفات کی نفی کر دیتا ہے جن کی نفی کے بعد خدا کو ماننا اور نہ ماننا دونوں بالکل یکساں ہو کر رہ جاتا ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (۸)

توحید خالص پر قائم رہنے والوں کے لیے بشارت

یہ اس انذار کے مقابل میں بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں غیر منقطع اجر صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان اور عمل صالح کی روش اختیار کریں گے یعنی بلا شائبۂ شرک توحید پر ایمان لائیں گے اور خدا کی بندگی اور اطاعت کے جو حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں ان کو پورے اخلاص اور کامل استقامت کے ساتھ ادا کریں گے۔

'غَيْرُ مَمْنُوْنٍ' کی تاویل بعض لوگوں نے اس سے مختلف بھی کی ہے لیکن قرآن کے نظائر سے تائید اسی

تاویل کی ہوتی ہے جو ہم نے اختیار کی ہے۔ قرآن میں بعض جگہ یہی مضمون عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی ایسی بخشش کے ہیں جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۹)

نظامِ کائنات میں توحید کے شواہد

اب یہ آسمان و زمین کے نظام کے اندر خالق کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور اس کی توحید کے جو آثار نمایاں ہیں ان کی طرف توجہ دلائی ہے اور آگے آیت ۱۲ میں اس بحث کا خلاصہ یہ نکالا ہے کہ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ یعنی جو شخص اس کائنات کے ان پہلوؤں پر غور کرے گا وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ یہ نہ تو ایک حادثہ کے طور پر آپ سے آپ وجود میں آ گئی ہے، نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے اور نہ یہ مختلف دیویوں دیوتاؤں کی بازی گاہ یا رزم گاہ ہے بلکہ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی اور اس کے علم و حکمت سے وجود میں آئی ہے۔ یہ مضمون چار آیتوں میں پھیلا ہوا ہے اس وجہ سے قارئین کی سہولت کے لیے ہم پہلے آیتوں پر الگ الگ بحث کریں گے پھر آخر میں خلاصۂ بحث پیش کر کے اس پر جو شبہات وارد ہوتے ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس سلسلہ کی پہلی آیت کریمہ جو اوپر نقل ہوئی ہے۔ فرمایا کہ کیا تم لوگ اس ذات کا انکار کر رہے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا اور اس کے شریک ٹھہراتے ہو! عالم کا خداوند تو وہی ہے!

خدا کو ماننا صرف وہ معتبر ہے جو اس کی تمام صفات کے اقرار کے ساتھ ہو

یہاں پہلی قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ خطاب اگرچہ مشرکین قریش سے ہے جو خدا کے منکر نہیں بلکہ اس کے شریک ٹھہرانے والے تھے لیکن قرآن نے ان کے اس شرک کو کفر (اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ) سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کو ماننا معتبر صرف وہ ہے جو اس کی تمام صفات اور ان کے تمام حقوق و مقتضیات کے ساتھ ہو۔ اگر کوئی شخص خدا کو مانے لیکن اس طرح مانے کہ اس سے خدا کی کل یا بعض صفات کی نفی ہو رہی ہو تو یہ ماننا دین میں معتبر نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت کفر ہی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے شرک کو جگہ جگہ کفر سے تعبیر اور مشرکین کو صریح الفاظ میں یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ سے خطاب فرمایا ہے۔ اوپر ہم نے مشرکین کے منکرِ قیامت ہونے کی جو توجیہ کی ہے اس کو بھی پیشِ نظر رکھیے۔ یہ دونوں باتیں درحقیقت ایک ہی اصول پر مبنی ہیں۔

خدائی ایام ہمارے دنوں سے مختلف ہیں

فِیْ یَوْمَیْنِ میں دو دنوں سے مراد ہمارے دن نہیں ہیں بلکہ، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، اس سے خدائی دن مراد ہیں جو ہمارے شمار سے ہزار سال بلکہ بعض صورتوں میں پچاس ہزار سال کے برابر بھی ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو ادوار کے مفہوم میں لینا چاہیے۔

آسمان و زمین کی خلقت کی تفصیل

قرآن کے دوسرے مقامات میں آسمان و زمین اور ان کے متعلقات کی خلقت چھ دنوں میں بیان ہوئی ہے۔ یہاں اس مجموعی تعداد کی تفصیل بیان ہو رہی ہے کہ کس چیز کی خلقت پر کتنے دن صرف ہوتے ہیں۔

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین دو دنوں میں پیدا کی۔ اس کے اس کام میں کوئی اس کا ساجھی اور شریک و مددگار نہیں ہوا لیکن تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو! حالانکہ جو اس کا خالق ہے وہی اس زمین اور تمام عالم کا خداوند بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہی خداوند ہے بھی اور اسی کو ہونا چاہیے بھی اس لیے کہ وہی خالق ہے لیکن تمھاری خرد باختگی کا یہ حال ہے کہ تم نے عقل و فطرت کے بالکل خلاف اور بالکل بے دلیل اس کے شریک اور مدِّ مقابل بنا رکھے ہیں! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین عرب آسمان و زمین بلکہ تمام چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن اس کے باوجود اس کے شریک بھی ٹھہراتے تھے یہاں ان کے اسی مسلّمہ پر دلیل قائم فرمائی ہے اور انداز ملامت کا ہے۔

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ ط سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ (۱۰)

زمین اور اس کے بعض آثار — یہ زمین کی برکات کی تفصیل بیان ہو رہی ہے کہ اللہ ہی نے اس کے اندر پہاڑ گاڑے۔ ان پہاڑوں کے گاڑنے کی ایک حکمت دوسرے مقام میں بیان فرمائی ہے کہ یہ زمین کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ تمام مخلوقات سمیت کسی طرف کو ڈھلک جائے۔ 'مِنْ فَوْقِهَا' کے الفاظ سے مقصود اس کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی یہ نشانیاں کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہیں بلکہ یہ زمین کے اوپر ہی موجود ہیں جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ سورۂ غاشیہ میں بھی پہاڑوں کی طرف اسی پہلو سے توجہ دلائی گئی ہے: 'أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ' (الغاشیۃ: ۱۷-۲۰) (کیا وہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح ان کی خلقت ہوئی ہے اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح اس کو بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح وہ گاڑے گئے ہیں اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح وہ مسطح کی گئی ہے!)

'وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا' یعنی اس میں برکتیں رکھیں اور اس میں تمام قسم کے غذائی ذخیرے ودیعت کیے۔

زمین اور اس کی برکات — اسی برکت کا کرشمہ ہے کہ یہ ہر قسم کی نباتات اگاتی ہے جن کے پھل اور پھول انسان اور دوسری مخلوقات کے کام آتے ہیں! یہ اسی کا فیض ہے کہ ایک دانہ انسان بوتا ہے اور زمین سینکڑوں دانوں کی شکل میں اس کا اصل اس کو واپس کرتی ہے۔ ایک گٹھلی یا ایک قلم آدمی زمین میں لگاتا ہے اور ایک مدتِ دراز تک اس کا پھل وہ اور اس کے اخلاف کھاتے ہیں۔ علاوہ بریں یہ اسی برکت کا ثمرہ ہے کہ انسان اپنی سائنس کے ذریعے سے اس کے جتنے پرت الٹتا جاتا ہے اتنے ہی اس کے اندر سے خزانے پر خزانے نکلتے آ رہے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ انسان کی سائنس تھک جائے گی لیکن زمین کے خزانے کم ہونے والے نہیں ہیں۔

'وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا' یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کی آغوش میں جتنی مخلوقات ڈالی ہیں یا ڈالنے والا ہے

حساب سے اس کے اندر غذائی ذخائر بھی مقدر کر دیے ہیں۔ یہ ذخائر قیامت تک انسان کی سعی و تدبیر سے برآمد ہوتے رہیں گے۔ ہر مخلوق جو اس زمین پر پیدا ہوگی اس کے حصے کا رزق اللہ تعالیٰ نے زمین کی تحویل میں دے رکھا ہے اور اس کے برآمد کرنے کی تدبیر بھی انسان کو الہام کر رکھی ہے۔

ایام کی مجموعی تعداد جو آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں لگے

'فِیْٓ اَرْبَعَۃِ اَیَّامٍ' یہ سارے کام چار دنوں میں انجام پائے۔ یعنی زمین کی خلقت کے دن اور اس کے اندر پہاڑ گاڑنے اور تقدیر اقوات کے دن سب ملا کر چار دن ہوئے۔ مذکورہ کاموں میں جتنے دن صرف ہوئے، یہ آخر میں ان سب کو جمع کر دیا ہے۔

اللہ نے ہر قسم کی مخلوقات کے لیے ان کے جبلی تقاضوں کے مطابق غذا فراہم کی ہے

'سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ' یعنی اللہ تعالیٰ نے جتنی قسم کی مخلوقات پیدا کی ہیں اور ان کے بقا کے لیے جس قسم کی غذا کی احتیاج ان کے اندر رکھی ہے، ان سب کی جبلی احتیاج کے اعتبار سے یہ غذائی ذخیرے ودیعت فرمائے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ کچھ مخلوقات تو وجود میں آگئی ہوں لیکن ان کی پرورش کے لیے جس غذا کی ضرورت ہے وہ وجود میں نہ آئی ہو۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر، زمین کی تہوں میں، سمندروں کی تاریکیوں میں، جہاں کہیں بھی کوئی چھوٹی یا بڑی مخلوق موجود ہے اس کے گرد و پیش میں اس کا طبعی رزق موجود ہے۔ ایک بکری گھاس کھا کر زندہ رہتی ہے اس کے لیے اللہ نے گھاس پیدا کی ہے۔ ایک شیر گوشت سے زندہ رہتا ہے اس کو اللہ نے شکار کے اسلحہ بھی دیے ہیں اور شکار کے لیے جانور بھی پیدا کیے ہیں۔ اور یہ بات بھی صاف نظر آتی ہے کہ کسی کو بھی اپنی مایحتاج سے زبردستی مناسبت نہیں پیدا کرنی پڑی ہے بلکہ جس کو جو کچھ بھی ملا ہے اس کے جبلی تقاضوں کے مطابق ملا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اللہ تعالیٰ نے توجہ دلائی ہے کہ یہ اللہ ہی کی شان ہو سکتی ہے کہ وہ اتنی بے شمار قسم کی مخلوقات پیدا کرے اور پھر ہر جنس و نوع کے جبلی تقاضوں کے متعلق ان کے لیے غذا فراہم کرے۔ خدا کے سوا اور کون ہے جو اس پر قادر ہو سکے!

لفظ 'سوال' ایک خاص مفہوم میں

لفظ 'سوال' یہاں اسی معنی میں ہے جس معنی میں سورۂ ابراہیم کی آیت ۳ میں ہے: 'وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ' (اور تم کو ان سب میں سے دیا جن کے تم محتاج ہوئے) یعنی تمہارے اندر اس نے جن چیزوں کی احتیاج رکھی وہ چیزیں بھی مہیا فرمائیں۔

اشتراکیت پسندوں کا ایک بے بنیاد استدلال

زیر بحث ٹکڑے سے اشتراکی حضرات نے غذائی مساوات کا ثبوت فراہم کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے آیت کی صحیح تاویل واضح کر دی اور یہی ہماری ذمہ داری ہے۔ لوگوں کے اندر صحیح بات سمجھنے اور اس کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دینا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىِٕعِیْنَ (۱۱)

پہلے آسمان پیدا ہوا یا زمین؟

'اِسْتَوٰٓی اِلَی الشَّیْءِ' کے معنی ہیں اس کی طرف توجہ کی، اس کا قصد فرمایا، اس کا ارادہ کیا۔ فرمایا

کہ تخلیقِ زمین کے ان مراحل کے بعد آسمان کی طرف توجہ فرمائی اور اس وقت وہ دھوئیں کی شکل میں تھا۔ دھوئیں سے مراد غبار ہے یا سائنسدانوں کی اصطلاح میں اس کو نیبولا (NEBULA) یا سحابیہ کہہ لیجیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت آسمان اپنی ایک ابتدائی اور ناتمام شکل میں موجود تھا۔ اس کی یہ شکل ظاہر ہے کہ انہی دو دنوں میں وجود پذیر ہوئی ہو گی جن میں زمین کی ابتدائی خلقت کا مرحلہ طے پایا ہے اس وجہ سے اس 'استواء' سے مقصود وہ توجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آسمان کو ایک تکمیلی شکل دینے کے لیے فرمائی۔ چنانچہ آگے کی آیات سے واضح ہے کہ اس مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے آسمان کو سات آسمانوں کی صورت میں متشکل کیا اور نظامِ کائنات میں ہر آسمان کا جو وظیفہ ہے اس کا اس کو پابند کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین دونوں کی خلقت کا آغاز تو ایک ہی ساتھ ہوا ہے لیکن جس طرح ایک وسیع الاطراف عمارت کے مختلف حصوں میں تعمیر کے مصالح کے تحت کبھی اس کے کسی گوشہ میں کام ہوتا ہے کبھی کسی گوشہ میں اسی طرح آسمان و زمین کی تعمیر کا کام بھی ہوا ہے اس وجہ سے یہ سوال غیر ضروری ہے کہ پہلے زمین پیدا ہوئی ہے یا آسمان؟ ایک مکان کی پلاننگ لازماً ایک ہی وقت میں ہوتی ہے۔ اس کے ہر حصہ کی تعمیر کے لیے ضروری میٹریل بھی فراہم کر لیا جاتا ہے۔ کام کا آغاز گرچہ بنیادوں اور دیواروں سے ہوتا ہے لیکن ابھی ان کی تکمیل کا مرحلہ باقی ہی ہوتا ہے کہ چھت کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ چھت سے متعلق ابھی کچھ مزید کام باقی ہی رہتے ہیں کہ دیواروں کے پلاستر کا کام سامنے آ جاتا ہے۔ اس سے فارغ ہوئے کہ چھت کا بقیہ کام تکمیل کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس سے فراغت حاصل ہوئی تو فرش کی تکمیل کی طرف توجہ ہوئی۔ غرض ایک مکان کی تعمیر کا معاملہ ایک مرکب اور مجموعی نوعیت رکھتا ہے اور اسی حیثیت سے اس پر غور کرنا پڑتا ہے۔

اگرچہ اس چھوٹی سی مثال کو آسمان و زمین سے کوئی نسبت نہیں ہے لیکن بات کو سمجھنے کے لیے اسی پر آسمان و زمین کو بھی قیاس کرنا پڑے گا اس لیے کہ قرآن نے ان دونوں کا ذکر ایک مکان ہی کی نوعیت سے کیا ہے۔ کبھی آسمان کا ذکر مقدم کیا ہے کبھی زمین کا۔ کہیں یہ خیال گزرتا ہے کہ چھت پہلے بنی ہے اور کہیں یہ شبہ دل میں پیدا ہوتا ہے کہ چھت سے پہلے فرش کی تکمیل ہوئی ہے حالانکہ اس قسم کے شبہات محض اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ آسمان و زمین دونوں کو ایک مجموعہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کو الگ الگ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں ان اشارات پر قناعت کیجیے۔ ان شاء اللہ سورۂ نازعات کی آیات ۲۰-۲۲ کے تحت ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

اس کائنات کی ہر چیز اپنی جبلت کے اعتبار سے مسلم ہے

'فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین دونوں کو وجود بخشنے کے بعد یہ ہدایت فرمائی کہ تم دونوں کو بہر حال میری اطاعت کرنی ہے، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم رضامندانہ اطاعت کے لیے حاضر ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کائنات کی جو چیزیں جبلی طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتی ہیں ان کی اطاعت بھی مجبورانہ نہیں بلکہ رضامندانہ ہے

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی جبلت اسلام ہی کے سانچہ پر بنائی ہے۔ گویا اس کائنات کی ہر چیز اپنی جبلت کے لحاظ سے مسلم ہے۔ فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی جو نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کی فرمانبرداری پر مجبور ہیں بلکہ ان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے اسلام کے رنگ میں اس طرح رنگی ہے کہ ان سے کبھی اس کی خلاف ورزی صادر نہیں ہو سکتی۔

'اِئْتِیَا طَوْعًا' اسی طرح کا اسلوب ہے جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو اپنے نامہ میں لکھا تھا کہ 'وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ'۔ جن لوگوں نے اس کے معنی اس سے الگ لیے ہیں انھوں نے اسلوب زبان سے ناواقفیت کے باعث بالکل غلط معنی لیے ہیں۔

جمادات بھی اپنے رب کے احکام کو سمجھتے اور ان کی تعمیل کے معاملہ میں عاقل ہیں

اس آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس کائنات کی جن چیزوں کو ہم لایعقل جمادات کے درجہ میں رکھتے ہیں وہ بھی اپنے رب کے حکموں کو سمجھنے، اس کی باتوں کا جواب دینے، اس کے ارشادات کی تعمیل کرنے اور اس کی تحمید و تسبیح کے معاملہ میں پوری طرح عاقل ہیں۔ چنانچہ یہاں آسمان و زمین کی زبان سے جو قول نقل ہوا ہے اس میں بھی لفظ 'طَآئِعِیْنَ' آیا ہے جو ذوی العقول اور ذی ارادہ چیزوں ہی کے لیے موزوں ہے۔ اگر ہم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے یا ان کو خطاب نہیں کر سکتے تو اس کی بنا پر ہم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم ان کو بالکل لایعقل خیال کریں بلکہ یہ محض ہمارے علم کی نارسائی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کے ایک ایک ذرّے کی تحمید و تسبیح کو سمجھتا ہے، اور ہر ذرہ اس کے حکموں کو سمجھ کر اس کی تعمیل کرتا ہے۔

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖۗ وَحِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۱۲)

ساتوں آسمانوں کی تکمیل

اس سے معلوم ہوا کہ جس وقت آسمان کی طرف توجہ فرمائی ہے اس وقت ساتوں آسمانوں کا ہیولیٰ تو موجود تھا اگرچہ ابھی وہ تکمیلی عمل (FINISHING TOUCH) کا محتاج تھا۔ اس کا اشارہ جمع کی ضمیر اور بعد کے قرائن سے نکلتا ہے۔ فرمایا کہ پس ان کا فیصلہ فرما دیا کہ وہ سات آسمان بن جائیں۔

'وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا': اور ان میں سے ہر آسمان کی اس کائنات کے مجموعی نظام میں جو ڈیوٹی ہے وہ اس کو وحی فرمائی۔

'وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ': اور آسمانِ زیریں کو ستاروں کے قمقموں سے سجایا۔ یہاں اسلوب کی یہ تبدیلی ملحوظ رہے کہ اوپر کی باتیں غائب کے اسلوب میں ہیں اور یہ بات متکلم کے اسلوب میں۔ اسلوب کی اس تبدیلی کی بلاغت کی طرف اس کے محل میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

'وَحِفْظًا': یہ مصدر فعل کی تاکید کے لیے ہے یعنی اس آسمانِ زیریں کو شیاطین جن کی دراندازیوں سے اچھی طرح محفوظ کیا۔ اس کی وضاحت اس کتاب کے متعدد مقامات میں ہو چکی ہے اور آگے سورۂ جن کی تفسیر میں اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ آئے گی۔ یہ سارے کام دو دنوں میں تکمیل کو پہنچے اور مجموعی طور پر یہ کل چھ

دن ہوئے۔ یہ اس اجمال کی تفصیل ہوگئی جو آسمان و زمین کی خلقت سے متعلق قرآن کے دوسرے مقامات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔

ساری تفصیل کا خلاصہ

ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ۔ یہ اس ساری تفصیل کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ جو شخص اس کارخانۂ کائنات پر غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ ایک عزیز و علیم کی منصوبہ بندی کا کرشمہ ہے۔ یعنی یہ کوئی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آجانے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے اندر نہایت حکیمانہ پلاننگ ہے اور یہ پلاننگ ایک ایسی ہستی کی کی ہوئی ہے جو ہر چیز پر غالب و مقتدر ہے۔ کوئی چیز بھی اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس کا علم محیط کل ہے کہ اس کائنات کے بعید سے بعید گوشوں کی ہر چیز سے بھی وہ باخبر، اس کی ضروریات سے واقف اور اس کائنات کے مجموعی نظام میں اس کا جو مصرف ہے اس سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ اس خلاصہ کو سامنے رکھتے ہوئے اب ابتدا کے سوال أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي ...... الآیۃ، کو اس کے ساتھ ملائیے تو گویا پوری بات یوں ہوگی کہ یہ کائنات اپنے وجود سے تو اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ یہ ایک عزیز و علیم کی بنائی ہوئی اور اسی کے تصرف میں ہے لیکن تمہاری جہالت کا یہ عالم ہے کہ بہت سے فرضی دیویوں دیوتاؤں کو اس کا شریک مان کر تم اس کا انکار کر رہے ہو۔ اس بات کو سوال کی صورت میں تعجب و کراہیت کے اظہار کے لیے رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی حماقت کے لیے کوئی وجہ جواز تو نہیں ہے لیکن جب عقل الٹ جاتی ہے تو انسان سے کوئی حماقت بھی بعید نہیں رہ جاتی۔

ان آیات کی تعلیم

ان آیات سے جو تعلیم نکلتی ہے اگرچہ آیات کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی طرف ہم اشارہ کرتے آرہے ہیں لیکن چونکہ اس کا تعلق دین کی بنیادی حکمت سے ہے اس وجہ سے آخر میں ہم اس کی پھر یاددہانی کیے دیتے ہیں۔

پہلی بات یہ نکلتی ہے کہ یہ دنیا نہایت تدریج و اہتمام کے ساتھ ایک طے کردہ پروگرام کے مطابق وجود میں آئی ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اس کو کسی نے بس یوں ہی کھیل تماشے کے طور پر بنایا ہے اور یہ یوں ہی چلتی رہے گی یا یوں ہی ختم ہو جائے گی۔ یہ اہتمام اس کے بامقصد و باغایت ہونے کی ناقابلِ انکار دلیل ہے اور اس بات کا باغایت و بامقصد ہونا لازماً آخرت کو مقتضی ہے۔

دوسری یہ کہ اس کا خالق بے نہایت قدرت اور غیر محدود علم کا مالک ہے اس وجہ سے اس کام میں نہ اس کو کسی کی مدد کی ضرورت ہوئی اور نہ کوئی اس کی مدد کر سکنے کا اہل ہے۔

تیسری یہ کہ آسمان و زمین دونوں نے مل کر ایک مکان کی شکل اختیار کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو فروکش کیا ہے اس وجہ سے یہ خیال بالبداہت غلط ہے کہ اس کی چھت پر کسی اور کا تصرف ہے اور اس کے فرش کا کوئی اور مالک ہے بلکہ آسمان و زمین دونوں کی سازگاری اس بات کی دلیل ہے کہ جس عزیز و علیم نے ان کو

پیدا کیا ہے وہی ان پر متصرف بھی ہے۔

چوتھی یہ کہ اس دنیا میں ربوبیت کا جو ہمہ گیر نظام ہے وہ اس بات پر شاہد ہے کہ یہ خدائے عزیز وعلیم ہی کا قائم کیا ہوا ہے، کوئی دوسرا اس نظام کو قائم کرنے پر قادر نہیں ہے اس وجہ سے بندوں کو چاہیے کہ اسی کے آگے دستِ سوال دراز کریں اس لیے کہ حقیقی نافع وضار وہی ہے۔

پانچویں یہ کہ ربوبیت کا یہ وسیع نظام اس بات کا مقتضی ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں لوگ اپنے منعم حقیقی کے روبرو حاضر ہوں۔ ان سے نعمتوں کے حق سے متعلق پرسش ہو۔ جنھوں نے ان کا حق پہچانا ہو وہ اس کا صلہ پائیں اور جنھوں نے ناشکری کی ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــ آیات: ۱۳-۲۴

آگے قریش کی تنبیہ کے لیے اس رسواکن انجام کی بعض تاریخی مثالوں کا ذکر فرمایا ہے جس سے رسولوں کے مکذبین کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے۔ نظمِ کلام بالکل واضح ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۳-۲۴

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ
ثَمُوْدَ ﴿۱۳﴾ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ
خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً
فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى
الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ
اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا
يَجْحَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِىْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ
لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْىِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ
الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ
فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ

الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝١٧ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا
ع ۲ ۱۶ يَتَّقُوْنَ ۝١٨ وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝١٩
حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ
وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝٢٠ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ
شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّ
هُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝٢١ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ
اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ
وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝٢٢ وَذٰلِكُمْ
ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝٢٣
فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ
مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ۝٢٤

ترجمۂ آیات ۱۳-۲۴

پس اگر وہ اعراض کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تمھیں اس طرح کے کڑکے سے آگاہ کرتا ہوں جس طرح کا کڑکا عاد اور ثمود پر نازل ہوا۔ جب کہ آئے ان کے رسول ان کے آگے اور ان کے پیچھے سے اس دعوت کے ساتھ کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ انھوں نے جواب دیا کہ اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے اتارتا تو ہم تو اس پیغام کے منکر ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو۔ ۱۳-۱۴

عاد کا معاملہ یوں ہے کہ انھوں نے زمین میں بغیر کسی حق کے گھمنڈ کیا اور بولے کہ ہم سے بڑھ کر طاقت میں کون ہے۔ کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جس

خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زور آور ہے۔ اور وہ ہماری نشانیوں کا برابر انکار کرتے رہے تو ہم نے ان پر چند منحوس دنوں میں ایک بادِ تند بھیجی تاکہ ان کو دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب چکھائیں اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں زیادہ رسوا کن ہوگا اور وہاں ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔ ۱۵-۱۶

رہے ثمود تو ہم نے ان کو ہدایت کی راہ دکھائی لیکن انھوں نے ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دی تو ان کو بھی عذابِ ذلّت کے کڑکے نے آدبوچا ان کے اعمال کی پاداش میں اور ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے اور ڈرنے والے تھے۔ ۱۷

اور اس دن کا دھیان کرو جس دن اللہ کے دشمن دوزخ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے پس ان کی درجہ بندی ہوگی۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس حاضر ہو جائیں گے تو ان کے کان، اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کے رونگٹے ان پر ان باتوں کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے رہے ہیں۔ اور وہ اپنے جسموں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے کہ ہمیں اسی اللہ نے گویا کر دیا جس نے ہر چیز کو گویا کیا اور وہی ہے جس نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا اور اب اسی کی طرف لوٹائے جا رہے ہو۔ ۱۸-۲۱

اور تم یہ اندیشہ نہیں رکھتے تھے کہ تمھارے خلاف تمھارے کان یا تمھاری آنکھیں یا تمھارے جسموں کے رونگٹے گواہی دیں گے بلکہ اس پر مزید تم نے یہ گمان کیا کہ اللہ بھی ان بہت سی باتوں کو نہیں جانتا جو تم کرتے ہو۔ اپنے رب کے بارے میں تمھارا یہی وہ گمان ہے جس نے تم کو غارت کیا اور تم خسارے میں پڑنے والے بنے۔ ۲۲-۲۳

پس اگر وہ صبر کریں تو دوزخ ہی ان کا ٹھکانا ہے اور اگر وہ معافی مانگیں گے تو

ان کو معافی نہیں ملے گی۔ ۴۴

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ (۱۳)

قریش کے اعراض کا ذکر اوپر آیات ۴-۵ میں گزر چکا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے اعراض ہی کا فیصلہ کر لیا ہے تو ان کو آگاہ کر دو کہ اگر تمہارا فیصلہ یہی ہے تو میں تم کو اسی طرح کے کڑکے کے عذاب سے ڈراتا ہوں جس طرح کا عذاب عاد اور ثمود اور ان کی ہم مشرب دوسری قوموں پر آیا۔ یہاں اسلوب بیان سے واضح ہے کہ عاد اور ثمود کا ذکر محض بطور مثال بیان ہوا ہے۔ مقصود ان تمام قوموں کے انجام کی طرف اشارہ کرنا ہے جو رسولوں کی تکذیب کی پاداش میں ہلاک ہوئیں اور جن کا ذکر پچھلی سورتوں میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔

صاعقہ کا ذکر بطور عذاب کی ایک نمایاں علامت کے

'صَاعِقَة' کا ذکر اس عذاب کی ایک نمایاں علامت کے طور پر ہوا ہے جس سے یہ قومیں ہلاک ہوئیں۔ دوسرے مقامات میں ہم تفصیل سے واضح کر چکے ہیں کہ ان قوموں پر جو عذاب آیا وہ شمال کی بادِ تند، ژالہ باری اور ہولناک رعد و برق کا مجموعہ تھا۔ چنانچہ قرآن میں اس کی تعبیر مختلف الفاظ سے ہوئی ہے۔ یہاں اس کے ایک نمایاں وصف 'صاعقة' سے اس کا ذکر فرمایا لیکن مقصود اس کے ان تمام لوازم کی طرف اشارہ کرنا ہے جو دوسرے مقامات میں مذکور ہوئے ہیں اور ان میں بعض کا ذکر یہاں بھی آگے آرہا ہے۔

إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ (۱۴)

لفظ رسل کے جمع لانے کی علت

ان قوموں کی طرف اگرچہ دو ہی رسولوں ـــــــ حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام ـــــــ کا مبعوث ہونا قرآن میں مذکور ہوا ہے لیکن یہاں لفظ 'رسل' بصورت جمع استعمال ہونے کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ ان قوموں کا ذکر یہاں بطور مثال ہوا ہے۔ مقصود ان تمام قوموں کی طرف اشارہ کرنا ہے جنھوں نے ان کی روشِ بد کی پیروی اور اپنے رسولوں کی تکذیب کی۔

رسولوں کی ہر جہت سے جد و جہد کی تعبیر

'مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ' یہ ان رسولوں کی اس انتھک، ہمہ جہت اور شبانہ روز جانفشانی کی تعبیر ہے جو انھوں نے اپنی اپنی قوموں کو دعوتِ توحید پہنچانے میں صرف کی۔ ابلیس نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے جو چیلنج دیا تھا اس کے الفاظ ہیں: 'لَآتِيَنَّهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ' (الاعراف: ۱۷) (میں ان پر ان کے آگے اور پیچھے سے گھیرے ڈالوں گا) قرآن نے یہاں رسولوں کا یہ وصف بیان کر کے گویا یہ واضح فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو ابلیس کے فتنوں سے بچانے کے لیے اپنے رسول بھی ایسے بھیجے جنھوں نے ان کو ہر جہت سے سمجھانے میں اپنے رات دن ایک کر دیے۔

'قَالُوۡا لَوۡ شَآءَ .... الآیۃ' لیکن رسولوں کی اس ساری تگ و دو کی انھوں نے قدر کی تو یہ کہ ان کی رسالت کی تکذیب کر دی کہ اللہ تعالیٰ ہماری طرف رسول بھیجنے والا ہوتا تو فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجتا نہ کہ ہمارے ہی جیسے آدمیوں کو اور تم چونکہ ہمارے ہی جیسے آدمی ہو اس وجہ سے ہم تمھاری رسالت تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ پس جو پیغام (اشارہ پیغامِ توحید کی طرف ہے) تم دے کر بھیجے گئے ہو ہم کو اس کے قبول کرنے سے صاف انکار ہے۔ قوموں کی طرف سے رسولوں کو جواب

'بِمَآ اُرۡسِلۡتُمۡ بِہٖ' کے اسلوب میں جو طنز ہے وہ اہلِ ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ آپ لوگ بزعمِ خویش جس پیغام کے حامل بن کر آئے ہوئے ہیں اس سے صاف انکار ہے یعنی نہ ہم آپ لوگوں کو رسول مانتے اور نہ آپ لوگوں کے پیغام کو پیغام۔ اس وجہ سے ہم پر اس قسم کی کوئی دھونس جمانے کی کوشش نہ کی جائے۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَقَالُوۡا مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً ؕ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَہُمۡ ہُوَ اَشَدُّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً ؕ وَکَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَجۡحَدُوۡنَ (۱۵)

یہ ان کے اس رویہ کی کسی قدر وضاحت ہے جو انھوں نے اپنے رسولوں کے انذار کے مقابل میں اختیار کیا۔ پہلے زمانی تقدم کی بنا پر عاد کو لیا ہے۔ فرمایا کہ عاد کو جو قوت و شوکت اللہ تعالیٰ نے بخشی اس کو پا کر خدا کے شکر گزار ہونے کے بجائے وہ خدا کی زمین میں اکڑنے والے بن گئے۔ ان کے اس 'استکبار' کو 'بغیر الحق' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ جیسا کہ اس کے محل میں ہم اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہے کہ تکبر صرف اس کے لیے زیبا ہے جو اس تمام کائنات کا خالق و مالک ہے اس کے سوا اور کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے۔ عاد کا رویہ

'وَقَالُوۡا مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً' یہ ان کے اسی تکبر کی وضاحت ہے کہ جب اللہ کے رسول نے ان کو ڈرایا کہ اگر وہ اپنی سرکشی کی اس روش پر جمے رہے تو جلد اللہ کی پکڑ میں آجائیں گے تو اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ اگر ہماری روش تباہی کی روش ہوتی تو کیا اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ آج اس سرزمین پر ہم قوت و شوکت میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے! اس وجہ سے ہمارا خیال تو یہ ہے کہ ہم تباہی کے راستہ پر نہیں جا رہے ہیں۔ بلکہ وہ لوگ دماغی خرابی میں مبتلا ہیں جو ہمیں عذاب سے ڈرا رہے ہیں۔

'اَوَلَمۡ یَرَوۡا .... الآیۃ' یہ ان کے مذکورہ احمقانہ چیلنج کا جواب ہے کہ اگر وہ ذرا بھی عقل سے کام لیتے تو وہ یہ بات آسانی سے سمجھ سکتے تھے کہ جس خدا نے ان کو اور اس ساری کائنات کو وجود بخشا ہے وہ زور و قوت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ وہ جب چاہے اور جہاں سے چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس سے مزاحم ہو سکے۔

'وَکَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَجۡحَدُوۡنَ' اس کا تعلق اصل سلسلۂ کلام سے ہے۔ بیچ میں 'اَوَلَمۡ یَرَوۡا .... الآیۃ' کا ٹکڑا ان کے چیلنج کے فوری جواب کے طور پر آگیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے استکبار کے سبب سے

کوئی بات بھی سننے سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اللہ کے رسول نے ان کو جو آیتیں سنائیں یا جو نشانیاں دکھائیں وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ ان کا انکار کرتے رہے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ (۱۶)

عاد پر عذاب — 'رِيْحًا صَرْصَرًا' سے مراد وہ بادِ تند ہے جو عرب میں شدید سردیوں کے زمانے میں شمال سے چلتی ہے اور جس کے ساتھ سرما کے بادل بھی ہوتے ہیں اور گرج چمک بھی۔

'اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ' سخت سردی کے ان دنوں کو بھی کہتے ہیں جن میں سردی کی شدت کے سبب سے ہر چیز پر اداسی، افسردگی، خشکی اور ایک قسم کی نحوست چھا جاتی ہے۔

فرمایا کہ چونکہ انھوں نے استکبار اور حق سے اعراض کی روش اختیار کر لی اس وجہ سے ہم نے ان کو دنیا کی زندگی میں ذلت کا عذاب چکھانے کے لیے، ان پر سرما کی نحوست کے ایام میں، بادِ صرصر مسلط کر دی جس نے ان کو بالکل تاراج کر کے رکھ دیا۔ اس طرح وہ ان لوگوں کی نگاہوں میں بھی ذلیل ہوئے جن کے انذار کے جواب میں وہ 'مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً' کا نعرہ لگاتے تھے اور اپنی دوسری ہم چشم قوموں کی نگاہوں میں بھی ایک نمونۂ عبرت بن کر رہ گئے اور اس عذابِ دنیا کے بعد ان کو عذابِ آخرت سے بھی سابقہ پیش آنا ہے جو اس عذاب سے بھی زیادہ رسوا کن ہوگا اس لیے کہ اس کی رسوائی ابدی اور تمام خلائق کے سامنے ہوگی۔

'وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ'۔ اور اس دن کسی طرف سے بھی ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔ نہ ان کی وہ قوت و جمعیت ان کے کچھ کام آئے گی جس پر وہ نازاں رہے اور نہ ان کے وہ دیوی دیوتا کچھ کام آئیں گے جن کی حمایت میں انھوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کی تکذیب کی۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۱۷)

ثمود کا رویہ اور ان پر عذاب — فرمایا کہ یہی حال عاد کے بعد ثمود کا بھی ہوا۔ ہم نے ان کے لیے بھی ہدایت کی راہ کھولی لیکن انھوں نے ہماری ہدایت پر اپنی ضلالت ہی کو ترجیح دی بالآخر ان کے اعمال کی پاداش میں ہم نے ان کو بھی ذلت کے عذاب میں پکڑا اور وہ بالکل پامال و ذلیل ہو کر رہ گئے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ ان کے عذاب کی نوعیت بھی کم و بیش وہی تھی جس کی وضاحت قوم عاد کے عذاب کے سلسلہ میں ہو چکی ہے۔ نظائر قرآن کی روشنی میں اس کی تفصیل اس کے محل میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۱۸)

یہ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ان عذابوں سے نجات دی۔ سنت الٰہی یہ ہے

کہ جو لوگ رسولوں پر ایمان لائے اور انذار سے متنبہ ہو کر انھوں نے تقویٰ کی زندگی اختیار کر لی اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب سے بچا لیا۔ اس آیت میں اشارہ عاد اور ثمود دونوں قوموں کے مومنین کی طرف ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں تفصیل ہے کہ ان قوموں میں سے جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ نے رسول کے ساتھ ان کو بھی عذاب سے محفوظ رکھا۔

وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ (۱۹)

دنیا کے عذاب کے بعد آخرت کی رسوائی

دنیا کے عذاب کے بعد اب یہ ان کی اس رسوائی اور عذاب کا ذکر آ رہا ہے جس سے ان کو قیامت کے دن سابقہ پیش آئے گا۔

'يُحْشَرُ' کے بعد 'اِلٰی' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ لفظ 'يُسَاقُوْنَ' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے۔ 'يُوْزَعُوْنَ' کی وضاحت سورۂ نمل کی آیت ۱۷ کے تحت ہو چکی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔ شاہ عبد القادر صاحبؒ نے اپنے ترجمہ میں لفظ کے اس مفہوم کا لحاظ رکھا ہے۔

فرمایا کہ اس دن کا بھی دھیان کرو جس دن اللہ کے یہ سارے دشمن ہانک کر جہنم کے پاس اکٹھے کیے جائیں گے اور وہاں ان کی درجہ بندی ہوگی۔ جو جہنم کے جس طبقہ کے سزاوار ٹھہریں گے وہ اپنے مخصوص دروازے سے اس طبقہ میں داخل ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ الگ الگ مجرمین کے ساتھ، ان کے اعمال کے اعتبار سے، الگ الگ معاملہ ہوگا۔

حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲۰)

فرمایا کہ جب دوزخ کے پاس سب اکٹھے ہو لیں گے تو یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کون کس درجہ کا مجرم اور جہنم کے کس طبقہ کا سزاوار ہے اللہ تعالیٰ کو کوئی زحمت پیش نہیں آئے گی اس لیے کہ اس دن کوئی اپنے کسی عمل کو چھپا نہیں سکے گا۔ آدمی کے کان، آنکھ، بلکہ اس کے جسم کے رونگٹے تک اس کے تمام اعمال کی گواہی دیں گے۔

لفظ 'جُلُوْدٌ' یہاں خاص کے بعد عام کی حیثیت سے آیا ہے۔ 'سمع' اور 'بصر' کا خاص گواہ ہونا تو واضح ہے کہ ہر چیز کے سننے اور دیکھنے والے یہی ہیں لیکن آدمی کے پاس اور بھی اعضاء و جوارح ہیں جن سے وہ بدی یا نیکی میں کام لیتا ہے۔ لفظ 'جلود' نے ان سب کا احاطہ کر لیا ہے۔ گویا اس دن آدمی کے بدن کا رواں رواں گواہی کے لیے زبان بن جائے گا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ لفظ 'جلود' قرآن مجید میں رونگٹوں کے مفہوم میں آیا ہے۔ آیت تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ ...... الاٰية (الزمر: ۲۳) کے تحت لفظ کے اس مفہوم پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔

وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲۱)

آدمی کے اعضاء کی گواہی خود اس کے خلاف

اپنے اعضاء کی گواہی خود اپنے خلاف سن کر وہ اپنے سر پیٹ لیں گے اور ان کو ملامت کریں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے کہ آج تو ہر چیز ناطق بن گئی ہے تو جس نے ہر چیز کو آج ناطق بنا دیا ہے اسی نے ہم کو بھی ناطق بنا دیا ہے۔ قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے یہ بات معلوم ہوتی

ہے کہ قیامت کے دن ہر چیز اپنی ساری سرگزشت سنا دے گی۔ مثلاً فرمایا ہے: 'اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا' (الزلزال: ۱-۴) (جب کہ زمین پوری شدت کے ساتھ ہلا دی جائے گی اور زمین اپنے سارے بار بوجھ نکال پھینکے گی اور انسان پکار اٹھے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے!! اس دن وہ اپنی سرگزشت سنا ڈالے گی)

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آسمان و زمین کی ہر چیز ناطق تو آج بھی ہے اس لیے کہ ہر چیز اللہ کی نشانی ہے اور اس کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی گواہ بن کر وہ انسان پر حجت قائم کر رہی ہے لیکن آج ان کی گواہی کو صرف وہی لوگ سن رہے ہیں جن کے دل بیدار ہیں۔ البتہ قیامت کے دن ان کی گواہی سب سنیں گے اور سب ان کی تصدیق کریں گے اس لیے کہ جو حجابات آج حائل ہیں وہ اس دن دور ہو جائیں گے۔

'وَهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ'۔ اگرچہ یہ بات بھی اسی بات کا ایک حصہ ہو سکتی ہے جو 'جُلُوْد' کی زبانی سے نقل ہوئی ہے لیکن میرے نزدیک اس کا عطف اصل سلسلۂ کلام پر ہے۔ 'جُلُوْد' سے سوال اور ان کے جواب کا ذکر بیچ میں بطور جملہ معترضہ آ گیا ہے۔ اصل بات جو اوپر فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس دن ان کے کان، آنکھ اور ان کے دوسرے تمام اعضا ان کے خلاف گواہی دیں گے اور مقصود اس سے اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ جب صورت حال یہ ہے کہ آدمی کے اپنے ہی اعضا اس کے سارے راز کھول دینے کے لیے ناطق ہو جائیں گے تو کسی اور کی گواہی اور شہادت و شفاعت اس کے لیے کیا نافع ہو سکے گی، مدعی کی اپنی گواہی تو لاکھوں کی گواہی پر بھاری ہو سکتی ہے۔ اسی پر عطف کرتے ہوئے فرمایا کہ اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ اسی نے تم کو اول بار پیدا کیا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ یعنی اگر تم نے یہ امید باندھ رکھی ہے کہ تمہاری واپسی تمہارے ان مزعومہ دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کی طرف ہو گی جن کی تم پرستش کرتے ہو تو یہ خیال محض وہم پر مبنی ہے۔ جن کو خلق و تدبیر میں کوئی دخل نہیں ہے آخر وہ مولا و مرجع کس طرح بن جائیں گے!

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲۲)

'تَسْتَتِرُوْنَ' کا مفہوم

'تَسْتَتِرُوْنَ' کی تاویل بعض اہل تاویل نے 'تَخَافُوْنَ' سے کی ہے۔ ان کے نزدیک مفہوم یہ ہے کہ تم یہ اندیشہ نہیں رکھتے تھے کہ تمہارے کان، آنکھ اور دوسرے اعضا تمہارے خلاف گواہی دیں گے۔ میرے نزدیک لفظ کی یہ تعبیر صحیح ہے۔ یہ لازم سے ملزوم پر استدلال کی نوعیت کی ایک چیز ہے جس کی مثالیں ہر زبان میں مل سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ یہ اندیشہ رکھتے ہوتے تو کوئی برا کام کرتے ہوئے ان سے چھپتے لیکن جب ان سے وہ نہیں چھپتے تھے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ ان سے کوئی اس نوعیت کا اندیشہ نہیں رکھتے تھے۔

'وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ ..... الاٰية'۔ 'لٰكِنْ' یہاں 'بَلْ' کے مفہوم میں ہے یعنی اعضا کی گواہی کا اندیشہ تو در کنار تمہاری بلادت کا تو یہ عالم رہا ہے کہ تم خدا کے متعلق بھی اس گمان میں مبتلا رہے ہو کہ اس کو بھی

تمھارے بہت سے اعمال کی خبر نہیں ہوتی۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــ آیات: ۲۵-۳۶

قیامت کے دن کفر کے سرغنوں اور ان کے پیروؤں کا جو حال ہو گا پہلے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ آج تو قرآن کی مخالفت کے لیے انھوں نے آپس میں بڑا گٹھ جوڑ کر رکھا ہے لیکن جب اس کا انجام سامنے آئے گا تو وہ ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن بن جائیں گے کہ عوام اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کریں گے کہ ان کے لیڈران کو دکھا دیے جائیں کہ وہ ان کو اپنے قدموں سے روند ڈالیں۔

اس کے بعد ان لوگوں کا حال بیان ہوا ہے جو ان تمام غوغا آرائیوں کے علی الرغم توحید پر ثابت قدم رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ملائکہ ان کے پاس بشارت لے کر آئیں گے کہ اب آپ کی آزمائشوں کا دور ختم ہو گیا۔ آگے اب آپ لوگوں کے لیے ابدی بادشاہی کی جنت ہے۔

اسی ذیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ سب سے زیادہ مبارک دعوت تم لے کر آئے ہو۔ اگر تمھارے نادان مخالفین اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں، اس کو گوش دل سے سننے کے بجائے، اس میں گڑبڑ پیدا کرنی چاہتے ہیں تو تم ان کی ان بدتمیزیوں کا مقابلہ عفو و درگزر سے کرو۔ تمھاری یہی کریمانہ روش تمھاری دعوت کے لیے موجب خیر و برکت ہوگی ــــ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۲۵-۳۶

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا
خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ
مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ ع
كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ
تَغْلِبُوْنَ ﴿۲۶﴾ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا
وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ جَزَآءُ
اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا
بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ

أَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ أَقْدَامِنَا لِيَكُونَا
مِنَ الْأَسْفَلِينَ ﴿٢٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا
تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا
بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٣٠﴾ نَحْنُ أَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ
ع ۱۸ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴿٣١﴾ نُزُلًا مِنْ غَفُورٍ رَحِيمٍ ﴿٣٢﴾ وَمَنْ أَحْسَنُ
قَوْلًا مِمَّنْ دَعَآ إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ
الْمُسْلِمِينَ ﴿٣٣﴾ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِي
هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ
حَمِيمٌ ﴿٣٤﴾ وَمَا يُلَقّٰهَآ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ إِلَّا
ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٣٥﴾ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ
بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٦﴾

ترجمۂ آیات ۲۵-۳۶

اور ہم نے ان پر بُرے ساتھی مسلط کر دیے تو انھوں نے ان کے آگے اور پیچھے کی ہر چیز ان کو خوشنما بنا کر دکھائی، بالآخر ان پر بھی وہی بات پوری ہو کے رہی جو جنّوں اور انسانوں کے ان گروہوں پر پوری ہوئی جو ان سے پہلے گزر چکے تھے. وہ نامراد ہونے والوں میں سے بنے! ۲۵

اور کفر کرنے والوں نے کہا کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس کے بیچ میں شور و شغب برپا کرو تاکہ تم غالب رہو۔ پس ہم ان کافروں کو سخت عذاب چکھائیں گے اور ان کو

ان کے عمل کا بدترین صلہ دیں گے۔ یہ اللہ کے دشمنوں کا بدلہ ہے: یعنی دوزخ! ان کے لیے اسی میں ہمیشگی کا ٹھکانا ہوگا، بدلے میں اس بات کے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے تھے۔ ۲۶-۲۸

اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہیں گے، اے ہمارے رب! ہمیں ان لوگوں کو دکھا جنھوں نے جنوں اور انسانوں میں سے ہم کو گمراہ کیا، ہم ان کو اپنے پاؤں کے نیچے ڈالیں گے' وہ ذلیل ہوں۔ ۲۹

بے شک ان لوگوں پر جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے، فرشتے اتریں گے کہ اب نہ کوئی اندیشہ کرو اور نہ کوئی غم اور اس جنت کی خوش خبری قبول کرو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی رہے اور آخرت کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی ہیں؛ اور تم کو اس جنت میں ہر وہ چیز ملے گی جس کو تمھارا دل چاہے گا اور تمھارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم طلب کرو گے۔ —— رب غفور و رحیم کی طرف سے سامان ضیافت کے طور پر! ۳۰-۳۲

اور اس سے بڑھ کر اچھی بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں! اور بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں ہیں۔ تم برائی کو اس چیز سے دفع کرو جو زیادہ بہتر ہے تو تم دیکھو گے کہ وہی، جس کے اور تمھارے درمیان عداوت ہے، گویا وہ ایک سرگرم دوست بن گیا ہے۔ اور یہ دانش نہیں ملتی مگر انہی لوگوں کو جو ثابت قدم رہنے والے ہوتے ہیں اور یہ حکمت نہیں عطا ہوتی مگر انہی کو جو بڑے نصیبہ ور ہوتے ہیں!! اور اگر شیطان تمھارے دل میں کوئی

اکساہٹ پیدا کرے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈو۔ بے شک حقیقی سننے والا جاننے والا وہی ہے۔ ۳۳-۳۶

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ (۲۵)

اللہ کی یاددہانی سے اعراض کا انجام

یعنی ان لوگوں کے اس انجام سے دوچار ہونے کا سبب یہ ہوا کہ انھوں نے اللہ کی یاددہانی سے اعراض کیا اور اس کے رسولوں کی تعلیم پر کان دھرنے کے بجائے اس کی ناقدری کی۔ اس کی سزا اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دی کہ ان پر نہایت برے لیڈر مسلط کر دیے جنھوں نے ان کو خوب خوب سبز باغ دکھائے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وہ وعدۂ عذاب ان کے بارے میں بھی پورا ہو کے رہا جو ان سے پہلے گزرنے والی نافرمان قوموں پر پورا ہوا۔

'وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ' میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر سورۂ زخرف میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے۔ 'وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ' (الزخرف: ۳۶) (اور جو اللہ کی تذکیر سے آنکھیں بند کر لیتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پس وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے) یہ شیطان جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی اور جب کوئی قوم اپنی خدا فراموشی کے سبب سے ایسے شیطانوں کو اپنے اوپر مسلط کر لیتی ہے تو پھر یہ شیاطین اس کی جان اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک اس کو عذابِ الٰہی میں گرفتار نہ کرا دیں۔

'فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ' یعنی وہ قوم کے ماضی و حاضر کو اس طرح مزین کر کے اس کے آگے پیش کرتے ہیں کہ اس کو اپنے اعمال و کردار اور عقائد و نظریات میں کسی پہلو سے کوئی خلا نظر نہ آئے تاکہ انبیاء اور مصلحین کی تذکیر و تنبیہ سے بالکل بے پروا ہو کر وہ اسی راہ پر چلتی رہے جس پر وہ اس کو چلانا چاہتے ہیں۔

'وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ' میں 'القول' سے مراد عذابِ الٰہی کی وہ دھمکی ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کو دی اور جو ان تمام قوموں پر پوری ہوئی جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔ ان میں سے بعض قوموں کے عذاب کا اجمالی حوالہ اوپر اس سورہ میں بھی گزر چکا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۲۶)

حق سے روکنے کے لیے گنڈوں کا ہتھیار

'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا' اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد کفر کے وہ سرغنے ہیں جو مشرکین عرب پر مسلط تھے اور جن کے رویہ پر اوپر والی آیت میں اجمالی تبصرہ ہوا ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ قرآن کی دعوت سے لوگوں کو روکنے کے لیے اپنے گنڈوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ جب دیکھو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو قرآن سنا رہے ہیں تو نہ اس کو خود سنو اور نہ دوسروں کو سننے دو بلکہ اپنے شور و شغب اور اپنی ہوٹنگ سے ایسا گھپلا پیدا کرو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات بالکل دب جائے اور تمہاری بات اونچی رہے۔

فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲۷)

فرمایا کہ یہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کریں ہم بھی ان کی ان حرکتوں کی پاداش میں ایک عذاب شدید کا مزا ان کو چکھائیں گے۔ اور ان کے اعمال کا وہ بدترین پہلو ان کے سامنے لائیں گے جن کا ان کو ابھی کوئی اندازہ نہیں ہے۔

اعمال کے اثرات کا صحیح اندازہ آخرت ہی میں ہوگا

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دنیا میں انسان اپنے اعمال کے اثرات و نتائج کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ انسان کا ہر عمل، خواہ وہ نیک ہو یا بد، اپنے اندر متعدی اثرات رکھتا ہے۔ اپنی اس صفت کے سبب سے بعض حالات میں انسان کی ایک چھوٹی سی نیکی بڑھتے بڑھتے اُحد پہاڑ کے برابر بن جاتی ہے۔ اسی طرح ایک برائی جو اپنے ابتدائی مرحلے میں معمولی نظر آتی ہے آہستہ آہستہ ایک خوفناک جنگل بن جاتی ہے۔ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر کے قتلِ ناحق کی جو طرح ڈالی وہ ایک ایسی متعدی برائی نکلی کہ دنیا کے ہر قتلِ ناحق میں سے ایک حصہ برابر اس کے کھاتے میں بھی جمع ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب قیامت میں ہر شخص کے سامنے اس کے اعمال کے نتائج آئیں گے تب ہی وہ صحیح صحیح اندازہ کر سکے گا کہ اس کی فلاں برائی کس درجہ کی برائی تھی۔ اسی حقیقت کی طرف یہاں 'وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے کہ ابھی ان نادانوں کو اندازہ نہیں ہے کہ قرآن سے لوگوں کو روک کر اور اس میں گھپلا پیدا کر کے یہ اپنے لیے کیسی بس بھری فصل تیار کر رہے ہیں جب اس کا پورا حاصل ان کے سامنے آئے گا تب وہ اس کا بدترین پہلو (اسوأ) دیکھیں گے اور اس وقت انھیں اندازہ ہوگا کہ اپنی تباہی کا کیا سامان کر کے وہ آئے ہیں۔

ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ۭ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ (۲۸)

'ذٰلِكَ' کا اشارہ اسی بدترین جزا (جزاء اسوأ) کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ 'اَعْدَآءِ اللّٰهِ' سے مراد یہاں قرینہ دلیل ہے کہ قریش کے وہی لیڈر ہیں جو اپنے گنڈوں کے ذریعہ سے قرآن کی دعوت دبا دینے کے درپے تھے۔ 'النَّارُ' مستقل جملہ ہے۔ خبر پر زور دینے کے لیے اس میں مبتدا

کو حذف کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جزا جو بیان ہوئی ہے ان لوگوں کے سامنے آئے گی جو آج اللہ اور اس کے دین کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اور اس بات کو خوب سمجھ لو کہ اس سے مراد دوزخ ہے۔ اسی میں ان کفر کے سرغنوں کے گھر ہوں گے جن میں ان کو ہمیشہ رہنا ہوگا۔ یہ سزا ان کو اس جرم میں ملے گی کہ وہ برابر اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے۔ نہ خود ان کی طرف توجہ کی اور نہ دوسروں کو ان کی طرف متوجہ ہونے دیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ (۲۹)

عوام کا غصہ اپنے لیڈروں کے خلاف

یہاں بھی الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اگرچہ لفظ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ عوام ہیں جو اپنے لیڈروں کے ورغلانے سے گمراہ ہوئے۔ نہ انھوں نے خود قرآن کی طرف توجہ کی اور نہ دوسروں کو، جہاں تک ان کا بس چلا، اس کی طرف متوجہ ہونے دیا۔ فرمایا کہ جو عوام آج اس وفاداری کے ساتھ اپنے لیڈروں کی پیروی کر رہے ہیں جب وہ دیکھیں گے کہ ان کے لیڈروں نے ان کو کس گھاٹ میں لا کر اتارا ہے تو وہ غصہ سے دانت پیسیں گے اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ اے رب! جن انسانوں اور جنوں نے ہم کو یہ راہ دکھائی ہے، ایک نظر تو ان کو بھی دکھا دے کہ ہم ان کو اپنے قدموں کے نیچے روندیں کہ ان کے استکبار اور ان کی لیڈری کا مزا ان کو چکھا دیں اور ان کو ذلیل کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۳۰)

ایمان پر ثابت قدم رہنے والوں کو بشارت

قیامت کے دن مخالفین حق کا جو حشر ہوگا اس کو سنانے کے بعد اب یہ ان لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے جنھوں نے رسول کی دعوت قبول کر لی اور پھر تمام مخالفتوں سے بے پروا ہو کر، پوری یکسوئی و دلجمعی کے ساتھ، اس پر جم گئے۔ فرمایا کہ قیامت کے دن فیصلہ امور سے پہلے ان کی دلداری و تسلی کے لیے ان کے پاس اللہ کے فرشتے آئیں گے جو ان کو اطمینان دلائیں گے کہ بس اب آپ لوگوں کی آزمائش کا دور ختم ہوا، اب آپ کے لیے نہ کوئی خوف ہے نہ کوئی غم، اب آپ لوگ اس جنت کی بشارت قبول کریں جس کا نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے دنیا میں آپ لوگوں سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (۳۱)

اہل ایمان کو اس دنیا میں بھی فرشتوں کی معیت حاصل ہوگی

یعنی کفار کے ساتھی تو شیاطین جن و انس بنے رہے اور انھوں نے بالآخر جہنم کے گھاٹ ان کو لا اتارا لیکن آپ کے ساتھی دنیا میں بھی ہم رہے ہیں اور آخرت میں بھی ہم آپ کے ساتھی ہیں۔ اب جو جنت آپ لوگوں کو ملنے والی ہے اس میں آپ کے لیے وہ سب کچھ ہے جس کو آپ کا جی چاہے گا اور مزید وہ چیزیں بھی آپ کو ملیں گی جو آپ طلب کریں گے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس دنیا میں بھی اہل ایمان کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ ان کو نیکی کی راہ بھی سجھاتے ہیں اور اس راہ میں جو مشکلیں پیش آتی ہیں ان میں ہمت بھی بندھاتے ہیں۔ ان کی مدد سے انسان اسی وقت محروم ہوتا ہے جب وہ ان کی رہنمائی و حوصلہ افزائی کی قدر کرنے کے بجائے اپنی باگ کلیۃً شیطان کے ہاتھ میں پکڑا دیتا ہے۔ فرشتوں کی مدد و معیت پر سورۂ انفال کی تفسیر میں ہم وضاحت سے لکھ چکے ہیں۔

نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ (۳۲)

'نُزُلٌ' مہمان کی ابتدائی ضیافت کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو جو کچھ آپ لوگوں کو ملے گا اس کی حیثیت ابتدائی ضیافت کی ہے۔ آگے جو کچھ ملنے والا ہے اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ (۳۳)

اسلام کی دعوت سے بڑھ کر کوئی دعوت نہیں

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور آپ کے ان مخالفین کے لیے ملامت بھی جو کہتے تھے کہ قُلُوۡبُنَا فِیۡۤ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ وَفِیۡۤ اٰذَانِنَا وَقۡرٌ وَّمِنۡۢ بَیۡنِنَا وَبَیۡنِکَ حِجَابٌ (حٰم السجدة ۴۱: ۵) (ہمارے دل تمہاری دعوت سے پردے میں ہیں اور ہمارے کان بہرے ہیں، ہمارے اور تمہارے درمیان ایک حجاب حائل ہے) مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ تمہاری بات نہیں سن رہے ہیں اور مخالفت کے جنون میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ لوگوں کو یہ سکھاتے پھر رہے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو اور جب اس کو سنانے کی کوشش کی جائے تو شور و شغب سے اس کو دبا دو، تو اب ان لوگوں کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ ساری خرابی خود انہی لوگوں کے اندر ہے، اس میں تمہارا یا تمہاری دعوت کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمہاری دعوت اللہ کی توحید اور اس کی بندگی کی دعوت ہے۔ آخر اس دعوت سے بڑھ کر اس آسمان کے نیچے اور کس بات کی دعوت ہو سکتی ہے! تم اس دعوت کے ساتھ ساتھ خود بھی عمل صالح کے پیکر ہو اور اسی کی دعوت دوسروں کو بھی دے رہے ہو، یہ اس بات کی ناقابلِ انکار شہادت ہے کہ تم کوئی مصنوعی قسم کے آدمی نہیں ہو اور نہ تم ملک میں کوئی فساد برپا کرنا چاہتے ہو۔ بلکہ تمہارے قول اور عمل میں پوری مطابقت ہے اور تم اس زمین میں نیکی اور عدل قائم کرنا چاہتے ہو۔ تمہارا قول یہ ہے کہ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ (میں اپنے رب کے فرمانبرداروں میں سے ہوں) اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ لوگوں پر تم اپنی حکومت و سیادت قائم کرنے کی فکر میں سرگرداں نہیں ہو بلکہ سب کو اللہ کا مسلم اور فرمانبردار بنانا چاہتے ہو۔ یہی اسلام اس تمام کائنات کی فطرت ہے اور اسی دین کی دعوت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی جن کے یہ لوگ نام لیوا ہیں۔ اگر ان واضح حقائق کے بعد بھی یہ لوگ تمہاری دعوت کی مخالفت پر کمربستہ ہیں تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ ان کے دلوں کے پردے اللہ کے سوا کوئی دوسرا

نہیں ہٹا سکتا۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ (۳۴)

ایک داعی کے لیے مخالفین کے ساتھ صحیح رویّہ

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رویّے کی تعلیم دی گئی ہے جو مخالفین کی بدتمیزیوں کے مقابل میں آپ کو اور آپ کے صحابہؓ کو اختیار کرنا ہے۔ فرمایا کہ اچھا رویّہ اور بُرا رویّہ دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ آخرت کے انجام اور مقصدِ دعوت کے اعتبار سے دونوں کے اثرات و نتائج میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اس وجہ سے لوگوں کی بدتمیزیوں کے جواب میں وہ رویّہ اختیار کرو جو زیادہ بہتر ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہارے دشمنوں میں سے جن کے اندر کچھ صلاحیت ہے، تمہاری دعوت کی معقولیت اور تمہارے شریفانہ رویّہ سے متاثر ہو کر تمہارے سرگرم حامی بن جائیں گے۔

'اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ'۔ لوگوں کی بدتمیزیوں کے مقابل میں احسن طریقہ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ کسی برائی کے جواب میں برابر سرابر کا طرزِ عمل اختیار کرنا آدمی کے لیے جائز ہے لیکن صبر اور عفو و درگزر کا رویّہ زیادہ بہتر ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسندیدہ ہے کہ اس کے صالح بندے یہی رویّہ اختیار کریں۔ یہ ہدایت بالکل اسی سیاق و سباق میں متعدد جگہ قرآن میں دی گئی ہے۔ ایک نظیر سورۂ نحل سے ہم پیش کرتے ہیں جس سے اس آیت کی وضاحت ہوتی ہے۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	اپنے رب کے راستہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور اچھی
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ	نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان سے اس طریقہ
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ	پر بحث کرو جو اس کا اچھا طریقہ ہے۔ بے شک تمہارا
هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ	رب خوب جانتا ہے ان لوگوں کو جو اس کی راہ سے
سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝	بھٹکے ہوئے ہیں اور وہ خوب جانتا ہے ان کو بھی جو
وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ	ہدایت یافتہ ہیں اور اگر تم ان کی کسی بات کا بدلہ لو تو
مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ	بس اسی کے مانند بدلہ لو جو تمہارے ساتھ کیا گیا ہے
صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝	اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے زیادہ
(النحل: ۱۲۵-۱۲۶)	بہتر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ مخالفین کی تعدّیوں کا جواب دینے کا حق ایک شخص کو حاصل ہے لیکن دعوت و اصلاح کے نقطۂ نظر سے صبر اور عفو و درگزر کا طریقہ زیادہ بہتر ہے اس وجہ سے اسی زیادہ بہتر طریقہ کو اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی گئی۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ رویّہ اہلِ ایمان کو اس وقت تک اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے

جب تک مخالفین پر اچھی طرح اتمام حجت نہ ہو جائے۔ اگر اتمام حجت ہو چکا ہو لیکن اس کے باوجود مخالفین اپنی روش مخالفت سے باز نہ آ رہے ہوں بلکہ اہل حق اور دعوتِ حق کو مٹا دینے کے درپے ہوں تو اس وقت واضح اعلانِ براءت کے بعد ان کی پوری سرکوبی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں عفو و درگزر کے بجائے زیادہ بہتر طریقہ بلکہ بعض حالات میں واحد طریقہ یہی ہوگا۔ چنانچہ جن اہلِ مکہ کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو یہ رویہ اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے انہی کے ساتھ اتمامِ حجت کے بعد، وہ رویہ اختیار کرنے کی ہدایت ہوئی جس کی تفصیلات سورۂ براءت میں زیر بحث آ چکی ہیں۔

سلیم الفطرت لوگ اپنے شریفانہ رویہ کا اچھا اثر پڑتا ہے

'فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ'۔ یہ بات انسان کی عام فطرت کو پیش نظر رکھ کر ارشاد ہوئی ہے۔ جن کی فطرت مسخ نہیں ہو چکی ہوتی ہے وہ جب دیکھتے ہیں کہ ایک شخص لوگوں کی بہی خواہی و ہمدردی میں اتنا بے چین ہے کہ ان کی تمام گستاخیوں اور بدتمیزیوں کے باوجود اپنے کریمانہ رویہ میں کوئی فرق آنے نہیں دیتا بلکہ لوگوں کی اینٹوں اور پتھروں کا جواب دعاؤں سے دیتا ہے تو ان کے دلوں میں اگر اس کے خلاف کسی غلط فہمی کے باعث عداوت بھی ہو تو اس کے اس طرزِ عمل سے متاثر ہو کر ان کی یہ عداوت محبت سے بدل جاتی ہے اور وہ اس کے جاں نثار ساتھیوں میں سے بن جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں سب سے زیادہ مؤثر عامل کی حیثیت آپ کے اسی کردار کو حاصل رہی ہے۔ آپ کے دشمنوں میں سے جن کے اندر شرافت کا جوہر موجود تھا وہ سب آپ کے اسی کردار سے متاثر ہو کر آپ کے وفادار اور اسلام کے جاں نثار بنے۔ صرف وہی اشقیا اس چیز سے متاثر نہیں ہوئے جن کی فطرت بالکل مسخ ہو چکی تھی۔

وَمَا یُلَقّٰہَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰہَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ (۳۵)

ایک گنج گراں مایہ

ضمیر مفعول کا مرجع یہاں الفاظ میں مذکور نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ حکمت و موعظت ہے جس کی ہدایت اوپر والی آیت میں فرمائی گئی ہے۔ عربی زبان میں اس طرح ضمیر لانے کا طریقہ معروف ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۴۵ 'وَاِنَّہَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ' کے تحت اس ضمیر کی نوعیت پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ فرمایا کہ اس حکمت کے حامل صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر صبر کی صفت ہوتی ہے اور یہ حکمت کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ ایک گنج گراں مایہ ہے، بڑے ہی نصیبہ ور ہیں وہ لوگ جو اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں!

اس آیت سے تین باتیں معلوم ہوئیں۔

ایک یہ کہ اوپر جو بات فرمائی گئی ہے وہ ایک عظیم حکمت ہے۔

دوسری یہ کہ اس حکمت کے حامل صرف وہ لوگ ہو سکتے ہیں جن کے اندر صبر کا جوہر ہو۔ جن کے

اندر یہ جوہر نہ ہو وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ اس وجہ سے اس کے طالبوں کو اپنے اندر صبر کی صفت راسخ کرنی چاہیے۔

تیسری یہ کہ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ ایک لازوال خزانہ ہے اس وجہ سے ہر ہمت ور کو اس کے حاصل کرنے کے لیے بازی کھیلنی چاہیے۔ بڑے ہی خوش بخت و بلند اقبال ہیں وہ لوگ جو اس بازی میں کامیاب ہو جائیں۔

شیطان کی اکساہٹ کا علاج

وَاِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ (۳۶)

یہ علاج بتایا ہے کہ اگر مخالفوں کی شرارت اور شیطان کی شر انگیزی سے طبیعت میں کوئی ایسا جذبہ ابھرے جو اس حکمت کے منافی ہو تو اس وقت آدمی کو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ آدمی اگر جذبات کی رو میں بہہ جانے کے بجائے صدق دل سے اللہ کی پناہ کا طالب ہو گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور اپنی پناہ میں لے لے گا اور شیطان کو اس پر قابو نہیں پانے دے گا۔ اللہ تعالیٰ ہی حقیقی سمیع و علیم ہے۔ کوئی بات اس سے مخفی نہیں رہتی۔ بندہ جب صدق دل سے شیطان کے مقابل میں اللہ تعالیٰ سے مدد کا طالب ہوتا ہے تو وہ ضرور اس کی مدد فرماتا ہے۔

۶۔ آگے کا مضمون ___ آیات: ۳۷ - ۴۶

سورہ کی ابتدا میں آفاق کی نشانیوں سے توحید اور معاد پر جو دلیلیں قائم فرمائی ہیں آگے کی آیات میں ان کی مزید وضاحت اور ساتھ ہی ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو اللہ کی آیات کی رہنمائی سے خود بھی منحرف ہیں اور دوسروں کو بھی منحرف کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کو آگاہ کیا گیا ہے کہ قرآن خدائے عزیز کا اتارا ہوا صحیفہ ہے۔ جو لوگ اس کی تکذیب کریں گے وہ نہ اللہ کا کچھ بگاڑیں گے نہ رسول کا بلکہ خود اپنی ہی ہلاکت کا سامان کریں گے۔ اسی ضمن میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ قرآن نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب اور اہل کتاب دونوں ہی پر ایک عظیم احسان فرمایا ہے۔ پھر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو اس کا انجام خود بھگتیں گے۔ اللہ نے ان پر حجت تمام کر دی ہے اس وجہ سے اب جس انجام سے بھی وہ دوچار ہوں یہ اسی کے سزاوار ہیں۔ یہ ان پر کوئی ظلم نہیں ہو گا ___ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۷ - ۴۶

وَمِنۡ اٰيٰتِهِ الَّيۡلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ ؕ لَا تَسۡجُدُوۡا لِلشَّمۡسِ وَلَا لِلۡقَمَرِ وَاسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ الَّذِىۡ خَلَقَهُنَّ اِنۡ كُنۡتُمۡ

إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿٣٧﴾ فَإِنِ اسْتَكْبَرُوا فَالَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ
يُسَبِّحُونَ لَهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ ﴿٣٨﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ
أَنَّكَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ
اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ
عَلَيْنَا أَفَمَن يُلْقَىٰ فِي النَّارِ خَيْرٌ أَم مَّن يَأْتِي آمِنًا يَوْمَ
الْقِيَامَةِ اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٤٠﴾
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ
عَزِيزٌ ﴿٤١﴾ لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ
تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿٤٢﴾ مَّا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ
لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِكَ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ
أَلِيمٍ ﴿٤٣﴾ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ
آيَاتُهُ أَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَ
شِفَاءٌ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ
عَمًى أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿٤٤﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا
مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ
لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ﴿٤٥﴾ مَّنْ عَمِلَ صَالِحًا
فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿٤٦﴾

ترجمۂ آیات ۳۷-۴۶

اور اسی کی نشانیوں میں سے رات اور دن، سورج اور چاند بھی ہیں۔ نہ سجدہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو، بلکہ سجدہ کرو اس اللہ کو جس نے ان ساری چیزوں کو پیدا کیا ہے اگر تم اسی کی بندگی کرنے والے ہو۔ ۳۷

پس اگر یہ تکبر کریں (تو کریں)، جو فرشتے تیرے رب کے پاس ہیں وہ اسی کی تسبیح کرتے ہیں شب و روز اور وہ کبھی نہیں تھکتے۔ ۳۸

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ چیز بھی ہے کہ تم زمین کو دیکھتے ہو بالکل بے جان، پس جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ متحرک ہو جاتی اور پھول جاتی ہے۔ بے شک جس نے اس کو زندہ کر دیا وہ مُردوں کو بھی زندہ کر دینے والا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۳۹

جو لوگ ہماری نشانیوں کے باب میں کج روی اختیار کر رہے ہیں وہ ہم سے مخفی نہیں ہیں۔ کیا وہ بہتر ہے جو دوزخ میں ڈالا جائے گا یا وہ جو قیامت کے دن امن کے سایہ میں آئے گا! کر لو جو تم چاہو۔ وہ اچھی طرح دیکھ رہا ہے جو تم کر رہے ہو! ۴۰

جن لوگوں نے اللہ کی یاد دہانی کا انکار کیا جب کہ وہ ان کے پاس آ گئی (ان کی شامت آئی ہوئی ہے)، بے شک یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ اس میں باطل نہ اس کے آگے سے داخل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ خدائے حکیم و حمید کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ اتاری گئی ہے۔ ۴۱-۴۲

تمھیں وہی باتیں کہی جا رہی ہیں جو تم سے پہلے آنے والے رسولوں کو کہی جا چکی ہیں۔ بے شک تمہارا رب بڑی مغفرت والا بھی ہے اور دردناک عذاب

دینے والا بھی۔ ۴۳

اور اگر ہم اس قرآن کو عجمی قرآن کی شکل میں اتارتے تو یہ لوگ یہ اعتراض اٹھاتے کہ اس کی آیات کی وضاحت کیوں نہیں کی گئی! کلام عجمی اور مخاطب عربی! کہہ دو، یہ ان لوگوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے جو اس پر ایمان لائیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لا رہے ہیں تو ان کے کانوں میں بہرا پن ہے اور یہ ان کے اوپر ایک حجاب ہے۔ اب یہ لوگ ایک دُور کی جگہ سے پکارے جائیں گے! ۴۴

اور ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب عطا کی تھی تو اس میں اختلاف پیدا کر دیا گیا اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور یہ لوگ اس کی طرف سے ایک الجھن میں ڈال دینے والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ جو نیک عمل کرے گا تو اپنے ہی لیے کرے گا اور جو برائی کرے گا تو اس کا وبال اسی پر آئے گا اور تیرا رب بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے ۴۵-۴۶

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمِنْ اٰیٰتِہِ الَّیْلُ وَالنَّھَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَھُنَّ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ (۳۷)

خدا کی نشانیوں کو خدا نہ بناؤ

سورہ کے شروع میں آیات ۹-۱۲ تک آسمان و زمین کی خلقت سے توحید و معاد پر جو استدلال کیا ہے، یہ آیت اسی سے متعلق ہے۔ بیچ میں جو مطالب تنبیہ و تذکیر یا تسکین و تسلی کی نوعیت کے آگئے ہیں وہ اسی مدعا کے تحت ہیں اس وجہ سے ان کے سبب سے کوئی بُعد نہیں پیدا ہوا ہے چنانچہ اسی پر عطف کرتے ہوئے فرمایا کہ جو خدا آسمان و زمین کا خالق ہے اسی خدا کی نشانیوں میں سے یہ رات اور دن، سورج اور چاند بھی ہیں۔ یہ خود اپنی گردش، اپنے ایاب و ذہاب، اپنے عروج و زوال سے اپنی تسخیر اور اپنی محکومیت کی شہادت دے رہے ہیں۔ یہ زبان حال سے گواہی دے رہے ہیں کہ

یہ نہ تو خدا ہیں اور نہ کسی پہلو سے خدا کی خدائی میں شریک ہیں بلکہ خالقِ کائنات نے اس کائنات کی مشین میں ان کو پرزوں کی طرح جوڑا ہے اور وہ اس کے حکم سے اپنی مفوضہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کی اس شہادت کے بعد ان کو خدا یا شریکِ خدا سمجھنا محض جہالت و حماقت ہے۔ ان کی حیثیت خدا یا شریکِ خدا کی نہیں بلکہ خدا کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کی ہے اور اس طرح کی نشانیاں صرف یہی نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار نشانیاں ہیں جن میں سے یہ بھی ہیں۔

'لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ' یہ اوپر والی بات کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جب یہ خدا یا شریکِ خدا نہیں بلکہ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے بنایا ہے تو ان کی عبادت اپنے رب کی بھی تحقیر ہے اور اپنی بھی۔ عبادت کا حق دار صرف اللہ تعالیٰ ہے جس نے رات اور دن، سورج اور چاند ہر چیز کو وجود بخشا اور ان کو انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے۔ 'سجدہ' یہاں عبادت کے مفہوم میں ہے اس لیے کہ یہ عبادت کے سب سے زیادہ نمایاں مظاہر میں سے ہے۔ سورج اور چاند کی عبادت کی ممانعت خاص طور پر اس وجہ سے فرمائی کہ مشرک قوموں نے ہر دور میں ان دونوں کی عبادت کی ہے۔ 'خَلَقَهُنَّ' کی ضمیر جمع ان تمام چیزوں کی طرف لوٹتی ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔

'اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ' یعنی اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کا حق صرف اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کو سجدہ نہ کیا جائے۔ 'سجدہ' بندگی کی سب سے بڑی علامت ہے اس وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین عرب اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری چیزوں کی جو بندگی کرتے تھے تو اس کے متعلق ان کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ صرف اس لیے وہ کرتے ہیں کہ یہ چیزیں خدا کی قربت کا ذریعہ ہیں۔ گویا ان کی بندگی، ان کے زعم میں، خدا ہی کی بندگی تھی۔ اس ٹکڑے میں ان کے اسی زعم کی تردید ہے کہ خدا کی بندگی اس طرح بلاشرکتِ غیرے ہونی چاہیے کہ اس کی بندگی کی مخصوص علامات میں بھی کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔

فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْـَٔمُوْنَ (۳۸)

خدا کسی کی عبادت کا محتاج نہیں ہے

یعنی اگر یہ لوگ بربنائے استکبار تمہاری بات نہیں سن رہے ہیں اور بڑے طنطنہ کے ساتھ کہتے ہیں کہ تمہاری باتوں کے لیے ان کے کان بہرے اور تمہارے اور ان کے درمیان حجاب حائل ہے تو تم ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں اور تم بھی ان کی کوئی پروا نہ کرو۔ یہ اگر خدا کی عبادت نہیں کریں گے تو اس سے خدا کی بزم نہیں اجڑ جائے گی۔ تیرے رب کے پاس جو

فرشتے ہیں وہ رات دن اس کی تسبیح میں سرگرم ہیں اور ان کے ذوق و شوق کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی اس کام سے نہیں تھکتے۔ 'اَلَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ' سے ملائکہ بحیثیت مجموعی مراد ہیں، صرف ملائکہ مقربین مراد نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ملائکہ کی جو صفت یہاں مذکور ہوئی ہے وہ تمام ملائکہ کی مشترک صفت ہے۔ 'عِنْدَ رَبِّکَ' کے الفاظ سے صرف اس قربِ الٰہی کا اظہار مقصود ہے جو ملائکہ کو جنوں اور انسانوں کے مقابل میں حاصل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ ناہنجار لوگ خدا کی بندگی سے گریز کر رہے ہیں تو کریں، جو ان سے اعلیٰ و اشرف ہیں اور جن کو یہ معبود بنائے بیٹھے ہیں ان کو خدا کی بندگی سے عار نہیں ہے، وہ شب و روز خدا کی حمد و تسبیح میں سرگرم ہیں اور اس طرح سرگرم ہیں کہ ان کی سرگرمی میں ایک پل کے لیے بھی کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنَّکَ تَرَی الْاَرْضَ خَاشِعَۃً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْہَا الْمَآءَ اہْتَزَّتْ وَرَبَتْ ؕ اِنَّ الَّذِیْٓ اَحْیَاہَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۳۹)

قیامت کی یاددہانی

توحید کے بعد یہ قیامت کی یاددہانی فرمائی کہ جو لوگ قیامت کو مستبعد خیال کر رہے ہیں وہ اس زمین میں اللہ کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں۔ دیکھتے ہو کہ زمین بالکل خشک، بے جان اور بے برگ و گیاہ ہوتی ہے کہ ہم اپنی عنایت سے اس پر رحمت کی گھٹا برسا دیتے ہیں تو دیکھتے دیکھتے اس میں زندگی کی حرکت نمایاں ہو جاتی ہے، اس کی پستی میں سبزہ اور نباتات سے ابھار پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے ہر گوشے میں روئیدگی اور نشو و نما کی بہار آجاتی ہے۔

'اِنَّ الَّذِیْٓ اَحْیَاہَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰی' فرمایا کہ جو خدا اپنی قدرت سے اس زمین کو بار بار مردہ اور بار بار زندہ کرتا رہتا ہے وہ ضرور اس بات پر قادر ہے کہ انسانوں کو بھی ان کے مر جانے کے بعد جب چاہے اٹھا کھڑا کرے۔ 'اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ' یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اگر وہ ہر چیز پر قادر نہ ہو تو خدا نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا ؕ اَفَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْٓ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۴۰)

اشرار کو تنبیہ

'الحاد' کے معنی انحراف اور کج روی اختیار کرنے کے ہیں۔ 'یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا' کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کی آیات اور اس کی نشانیاں تو کسی اور سمت میں رہنمائی کر رہی ہوں لیکن آدمی اپنی دھاندلی، ضد اور کج روی یا کج بحثی سے کوئی اور راہ اختیار کرے اور لوگوں کو بھی اس کی طرف موڑنے کی کوشش کرے۔

آیت ۲۵ میں برے ساتھیوں اور گمراہ لیڈروں کی اس سعی نامراد کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ اسی قسم کے اشرار کو اس آیت میں دھمکی دی ہے کہ جو لوگ اس طرح کی حرکتیں کر رہے ہیں ان کی حرکتیں ہم سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ ہم سب کچھ دیکھ اور سن رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ ہم سے مخفی نہیں ہیں تو ایک دن ہم ان کو اس کا مزا چکھائیں گے۔ یہ بات یہاں مبہم چھوڑ دی ہے اور اس ابہام میں جو غضبناکی مضمر ہے وہ محتاج وضاحت

نہیں ہے۔

'اَفَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْٓ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ'۔ یہ اسی ابہام کی وضاحت سوالیہ اسلوب میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ لوگوں کی ساری حرکتیں دیکھ رہا ہے تو لوگوں کو چاہیے کہ وہ جو روش بھی اختیار کریں اس سوال کا فیصلہ کر کے اختیار کریں کہ خوش انجام وہ ہے جو دوزخ میں جھونکا جائے گا یا وہ جو محشر میں اس طرح آئے گا کہ ہر خوف سے بالکل نچنت ہوگا؟ اللہ تعالیٰ کا سب کچھ دیکھنا اور لوگوں کو دوبارہ زندہ کر دینے پر قادر ہونا جزا اور سزا کو مستلزم ہے اس وجہ سے جس کو بھی اس دنیا میں جو کچھ کرنا ہے وہ یہ فیصلہ کر کے کرے کہ وہ اپنے لیے دوزخ کا انتخاب کرتا ہے یا جنت کا؟ ان دونوں کی راہیں ہر شخص کے لیے کھلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے جس راہ کو آدمی اپنے لیے بہتر سمجھے اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر کو واضح کر کے ان کے درمیان انتخاب کا فیصلہ ہر شخص کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

'اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ'۔ یہ اسی اختیار و آزادی کا بیان ہے کہ اللہ نے نیکی اور بدی اور ان دونوں کے انجام کو واضح کر کے تمھیں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ چاہے تم نیکی کرو یا بدی البتہ یہ یاد رکھو کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ اس آخری فقرے میں جو وعید ہے الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِالذِّکْرِ لَمَّا جَآءَھُمْ ۚ وَاِنَّہٗ لَکِتٰبٌ عَزِیْزٌ ۙ لَّا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ ؕ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ (۴۱-۴۲)

ایک بلیغ حذف

'ذکر' سے مراد قرآن مجید ہے اس کو ذکر سے تعبیر کرنے کے وجوہ پر اس کے محل میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ اسی مضمون کو از سر نو لیا ہے جو سورہ کے شروع میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ قرآن کا انکار کر رہے ہیں جب کہ وہ ان کے پاس آ چکا ہے، وہ .... اس کے بعد اس کی خبر حذف کر دی ہے اور اس حذف میں بڑی بلاغت ہے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ ان کی بدانجامی ظاہر کرنے کے لیے ان کے اس جرم کی سنگینی ہی کافی ہے۔ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ وہی روزِ بد دیکھیں گے جو ان سے پہلے رسولوں اور ان کی تعلیمات کے مکذّبین دیکھ چکے ہیں۔

ایک بلیغ وضاحت

'کَفَرُوْا بِالذِّکْرِ' کے بعد 'لَمَّا جَآءَھُمْ' کے الفاظ بھی خاص طور پر توجہ کے لائق ہیں۔ اس سے ان کے جرم کی غایت درجہ سنگینی کا اظہار مقصود ہے۔ ایک چیز اگر ایک شخص نے دیکھی نہ ہو اور اس کے حسن و قبح کو پرکھنے کا اس کو موقع نہ ملا ہو اور وہ اس کی ناقدری کرے تو اس کو ایک حد تک معذور قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جس نے قرآن کو دیکھ لیا، اس کے اعجاز کو پرکھ لیا اور اس کے دلائل کی قوت کو اچھی طرح آزما لیا وہ اگر قرآن کا انکار کرتا ہے تو وہ سورج کی تابانی کا اس وقت انکار کر رہا ہے جب وہ اس کے سر پر چمک رہا ہے۔

قرآن کی بعض صفات کا حوالہ

'وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ' میں یہاں دو پہلو ہیں۔ ایک تہدید و وعید کا، دوسرا قرآن کی پاکیزگی و طہارت کا۔ تہدید و وعید کے پہلو سے یہ سابق مضمون سے مربوط ہے اور دوسرے پہلو سے یہ آگے والی آیت کی تمہید ہے۔

'عزیز' کے ایک معنی غالب و مقتدر کے ہیں۔ اپنے اس مفہوم کے اعتبار سے یہ تہدید کے مضمون کی دلیل ہے کہ جو لوگ قرآن کا انکار کر رہے ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کریں کہ یہ قرآن کسی سائل کی درخواست نہیں ہے بلکہ اس کا بھیجنے والا بھی عزیز یعنی غالب و مقتدر ہے اور یہ کتاب خود بھی عزیز ہے اسی وجہ سے اس کی حیثیت ایک فرمانِ واجب الاذعان کی ہے۔ جو لوگ اس کا انکار کریں گے وہ یہ بات اچھی طرح یاد رکھیں کہ یہ کتاب ان کا فیصلہ کر کے رہے گی۔ یہاں اس سنتِ الٰہی کو ذہن میں رکھیے جو رسولوں سے متعلق جگہ جگہ بیان ہو چکی ہے۔

'عزیز' کے دوسرے معنی 'منیع' کے ہیں۔ 'منیع' اس چیز کو کہتے ہیں جو دسترس سے بالاتر ہو۔ اس کی وضاحت آگے والی آیت میں آ رہی ہے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ شیاطین جن و انس خواہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن وہ اس میں کوئی گڑبڑ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے۔ باطل نہ اس کے آگے سے اس میں گھس سکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے۔ اللہ تعالیٰ نے شیاطین کی دراندازی سے اس کو ہر جانب سے بالکل محفوظ بنایا ہے۔ یہ گویا جواب ہوا مخالفین کی اس سعی نامراد کا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ 'وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ' (اور کافر کہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں خلل پیدا کرو تاکہ تم غالب رہو)۔

'لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ'۔

یہ قرآن کی عظمت اور اس کے شرف کا ایک جامع بیان ہے جس کے دو پہلو خاص طور پر اہمیت رکھنے والے ہیں۔

ایں خانہ تمام آفتاب است

ایک یہ کہ قرآن اپنے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے بالکل محفوظ ہے۔ اس کو اتارنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اس کو لانے والے جبریل امین ہیں، اس کے حامل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس کو نقل و قبول کرنے والے اس خلق کے پاکیزہ ترین اخیار و صالحین ہیں۔ گویا ابتدا سے لے کر انتہا تک 'ایں خانہ ہمہ آفتاب است'۔ اس میں کہیں بھی شیطان کی دراندازی کے لیے کوئی روزن نہیں ہے، نہ اس کے آغاز کی طرف سے نہ اس کی انتہا کی طرف سے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا، جیسا کہ 'وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ' کے الفاظ سے واضح ہے، خود اہتمام فرمایا اور یہ قرآن مجید کا وہ امتیاز ہے جو اس سے پہلے نازل ہونے والے صحیفوں کو حاصل نہیں ہوا۔ تورات و انجیل وغیرہ کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے حاملین پر ڈالی گئی تھی جو اس کا حق ادا

نہ رکھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ صحیفے بالکل محرف ہو کے رہ گئے اور ان کے اندر حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہو گیا لیکن قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا اور اس کو قیامت تک کے لیے ہر قسم کی آمیزش سے بالکل محفوظ کر دیا۔

اس حفاظت کے کئی پہلو ہیں:۔

قرآن کی حفاظت کے بعض پہلو

ایک یہ کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کا خاص اہتمام فرمایا کہ قرآن کی وحی میں شیاطین کوئی مداخلت نہ کر سکیں۔ یوں تو اس نظامِ کائنات میں یہ مستقل اہتمام ہے کہ شیاطین ملأ اعلیٰ کی باتیں نہ سن سکیں لیکن، سورۂ جن کی تفسیر میں ہم واضح کریں گے کہ نزولِ قرآن کے زمانہ میں یہ اہتمام خاص طور پر تھا کہ شیاطین وحی الٰہی میں کوئی مداخلت نہ کر پائیں تاکہ ان کو قرآن میں اس کے آگے سے (مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ) گھسنے کا موقع نہ مل سکے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے اپنے جس فرشتہ کو منتخب کیا اس کی صفت قرآن میں ذِیْ قُوَّۃٍ، مطاع، قوی، امین اور عند ذی العرش مکین وارد ہوئی ہے۔ یعنی وہ فرشتہ ایسا زور آور ہے کہ ارواحِ خبیثہ اس کو مغلوب نہیں کر سکتیں، وہ تمام فرشتوں کا سردار ہے، وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو امانت اس کے حوالہ کی جاتی ہے وہ اس کو بالکل ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ اس میں زیر و زبر کا بھی فرق واقع ہو سکے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت مقرب ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے تمام مخلوقات سے برتر ہے ـــــ ظاہر ہے کہ یہ اہتمام بھی اسی لیے فرمایا گیا کہ قرآن میں اس کے منبع کی طرف سے کسی باطل کے گھسنے کا امکان باقی نہ رہے۔

تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس امانت کو اٹھانے کے لیے جس بشر کو منتخب فرمایا اول تو وہ ہر پہلو سے خود خیر الخلائق تھا ثانیاً قرآن کو یاد رکھنے اور اس کی حفاظت و ترتیب کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے تنہا اس کے اوپر نہیں ڈالی بلکہ یہ ذمہ داری اپنے اوپر لی۔ چنانچہ سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے: لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ ۝ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (القیٰمۃ ۱۶-۱۹) (اور تم اس قرآن کو حاصل کرنے کے لیے اپنی زبان کو تیز نہ چلاؤ، ہمارے اوپر ہے اس کے جمع کرنے اور اس کے سنانے کی ذمہ داری تو جب ہم اس کو سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی وضاحت) روایات سے ثابت ہے کہ جتنا قرآن نازل ہو چکا ہوتا اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقرب صحابہ یاد بھی رکھتے اور ہر رمضان میں حضرت جبریل کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا مذاکرہ بھی فرماتے رہتے تاکہ کسی سہو و نسیان کا اندیشہ نہ رہے اور یہ مذاکرہ اس ترتیب کے مطابق ہوتا جس ترتیب پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کو مرتب کرنا پسند فرمایا۔ یہ بھی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنی حیاتِ مبارک کے آخری رمضان

میں یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا۔ پھر اسی ترتیب اور اسی قراءت کے مطابق پورا قرآن ضبطِ تحریر میں لایا گیا اور بعد میں خلفائے راشدینؓ نے اسی کی نقلیں مملکت کے دوسرے شہروں میں بھجوائیں۔ یہ اہتمام پچھلے صحیفوں میں سے کسی کو بھی حاصل نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ تورات کے متعلق تو یہ علم بھی کسی کو نہیں ہے کہ اس کے مختلف صحیفے کس زمانے میں اور کن لوگوں کے ہاتھوں مرتب ہوئے۔

چوتھا یہ کہ قرآن اپنی فصاحتِ الفاظ اور بلاغتِ معنی کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ جس کے سبب سے کسی غیر کا کلام اس کے ساتھ پیوند نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام بھی، باوجودیکہ آپ اس قرآن کے لانے والے اور افصح العرب والعجم ہیں، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس وجہ سے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کسی غیر کا کلام اس کے ساتھ مخلوط ہو سکے۔ چنانچہ جن مدعیوں نے قرآن کا جواب پیش کرنے کی جسارت کی ان کی مزخرفات کے نمونے ادب اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ ان کو قرآن کے مقابل میں رکھ کر موازنہ کر لیجیے۔ دونوں میں گہر اور پشیز کا فرق نظر آئے گا ۔۔۔ اس طرح گویا پیچھے سے بھی (وَمِنْ خَلْفِهٖ) قرآن میں دراندازی کی راہ مسدود کر دی گئی۔

پانچواں یہ کہ قرآن کی حفاظت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی زبان کی حفاظت کا بھی قیامت تک کے لیے وعدہ فرما لیا۔ دوسرے آسمانی صحیفوں میں تو ان کی اصل زبانیں مٹ جانے کے سبب سے، بے شمار تحریفیں ترجموں کی راہ سے داخل ہو گئیں جن کا سراغ اب ناممکن ہے لیکن قرآن کی اصل زبان محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی اس وجہ سے ترجموں اور تفسیروں کی راہ سے اس میں کسی باطل کے گھسنے کا کوئی امکان نہیں ہے اگر اس میں کسی باطل کو گھسانے کی کوشش کی جائے گی تو اہلِ علم اصل پر پرکھ کر اس کو چھانٹ کر الگ کر سکتے ہیں۔

یہ ہم نے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس کے پہلو بعض اور بھی ہیں لیکن یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ ہمارے لیے یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ ان چند باتوں سے آپ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قرآن کی یہ شان کیوں ہے کہ باطل نہ اس کے آگے سے اس میں راہ پا سکتا اور نہ اس کے پیچھے سے۔

درشتی و نرمی بہم دربہ است

تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ۔ لفظ تنزیل کی وضاحت جگہ جگہ ہم کر چکے ہیں کہ اس کے اندر اہتمام اور تدریج کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ خدائے عزیز و حمید کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے یہاں دو صفتوں ۔۔۔ حکیم اور حمید ۔۔۔ کا حوالہ ہے۔ حکیم یعنی جس کی ہر بات اور جس کے ہر کام میں حکمت ہے چنانچہ اس نے یہ حکیمانہ کلام نہایت اہتمام کے ساتھ اتارا ہے۔ حمید یعنی جو سزاوارِ حمد، ستودہ صفات اور تمام سزاوارِ حمد کاموں کا منبع و سرچشمہ ہے چنانچہ اس نے اپنی اس عظیم نعمت سے اپنی خلق کو محض اپنے جود و کرم سے نوازا۔ اوپر والی آیت میں صفت عَزِيْزٌ کا حوالہ ہے جس میں تنبیہ و تہدید کا پہلو ہے۔ اس آیت میں حکیم و حمید کا حوالہ اپنے اندر

ترغیب کا پہلو رکھتا ہے۔ ع

درشتی و نرمی بہم دربہ است

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ - (۴۳)

آنحضرت صلعم کو تسلی — یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ یہ نہ گمان کرو کہ یہ خاص تمہاری ہی قوم نے تمہارے ہی ساتھ یہ رویہ اختیار کیا ہے بلکہ جس طرح کی باتیں تمہیں کہی جا رہی ہیں اسی طرح کی باتیں دوسری امتوں کے اشرار اپنے اپنے رسولوں کو کہہ چکے ہیں۔ رسولوں اور ان کی قوموں کی یہ ایک مشترک روایت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تمہاری کسی خامی کا نتیجہ نہیں ہے کہ قوم کے اشرار تمہارے دشمن بن گئے ہیں بلکہ ہمیشہ سے رسولوں کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے تو جس طرح دوسرے اولوالعزم رسولوں نے اپنی قوموں کی ایذا رسانیوں کا صبر کے ساتھ مقابلہ کیا اسی طرح تم بھی صبر کرو۔

إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ: یعنی یہ اطمینان رکھو کہ خدا کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ اگر اللہ ان لوگوں کی تمام تعدیوں کے باوجود ان کو ڈھیل دے رہا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کے ہاں جزا اور سزا کا کوئی قانون ہی نہیں ہے۔ وہ بڑی مغفرت فرمانے والا بھی ہے اور بڑا دردناک عذاب دینے والا بھی۔ وہ آخری حد تک ڈھیل دیتا ہے تاکہ جو اس کی مغفرت کا سزاوار بننا چاہیں وہ سزاوار بن جائیں لیکن جب اس مہلت سے لوگ فائدہ نہیں اٹھاتے یا غلط فائدہ اٹھاتے ہیں تو ان کو سزا بھی ایسی دردناک دیتا ہے کہ اس طرح کی دردناک سزا کوئی اور نہیں دے سکتا۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ۖ أَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ ۗ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ ۖ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۚ أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ (۴۴)

یہود کا القا کیا ہوا ایک اعتراض اور اس کا جواب — قرآن سے اعراض و فرار کے لیے مخالفین جو بہانے پیدا کرتے تھے ان میں سے بعض کو نقل کر کے ان کی لغویت واضح کی گئی ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے بعض دوسرے اعتراضات اصلاً یہود کے القا کیے ہوئے تھے جو بنی اسماعیل کو قرآن کی نعمت سے محروم کرنے کے لیے انھوں نے ایجاد کیے تھے لیکن قریش کے نادان لیڈر، ان کے حسد اور ان کی چالوں سے بے خبر ہونے کے باعث، محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے جوش میں، ان کے القا کیے ہوئے اعتراضات نقل کرنا شروع کر دیتے تھے۔

یہود کے سکھائے ہوئے متعدد اعتراضات جو قریش کے لیڈروں نے اپنا لیے تھے پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکے ہیں اور آگے کی سورتوں میں بھی آئیں گے۔ انہی میں سے ایک اعتراض یہ بھی ان کا تھا کہ وحی کی مخصوص زبان تو اب تک عبرانی رہی ہے جس میں وہ تمام صحیفے نازل ہوئے جن کے آسمانی ہونے کا اقرار قرآن کو بھی ہے

تو اب اللہ میاں نے اپنی زبان کیوں بدل لی اور یہ نئی وحی عربی میں کیوں نازل ہوئی!

قرآن نے اس کا جواب یہ دیا کہ ان لوگوں کا یہ اعتراض محض برائے اعتراض[1] قرآن کی مخالفت کے لیے ایک بہانہ ہے۔ اگر قرآن کسی عجمی زبان میں اترتا تو یہی لوگ یہ اعتراض اٹھاتے کہ اس کی آیتوں کی ہماری اپنی زبان میں اچھی طرح وضاحت کیوں نہیں کی گئی لیکن جب ہم نے اس کو عربی زبان میں اتار کر ان کے لیے اچھی طرح کھول دیا تو بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کے شکرگزار ہوتے یہ دشمنوں کا سکھایا ہوا یہ اعتراض لے کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ سابق روایت کے خلاف اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ وحی عربی زبان میں کیوں اتاری! گویا اللہ تعالیٰ کا یہ ایک عظیم احسان ان کے لیے وجہ اعتراض بن گیا!

'ءَاَعْجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ' یہ فقرہ ان کے اعتراض ہی کا حصہ ہے کہ اس وقت یہ لوگ یہ بات بناتے کہ پیغام عجمی اور مخاطب عربی!! یعنی یہ کیا بے تکا پن ہے کہ جو لوگ اس کتاب کے سب سے پہلے مخاطب ہیں وہ اس کی زبان سے بالکل نابلد ہیں! ع

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

'قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًی وَّ شِفَآءٌ' فرمایا کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ یہ نعمت ان لوگوں کے لیے ہے جو اس کی قدر کریں۔ جو اس پر ایمان نہیں لانا چاہتے وہ تو اس کی مخالفت کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر ہی لیں گے لیکن جن کے اندر ہدایت کی طلب اور جن کو اپنی عقلی و روحانی بیماریوں کا احساس ہے وہ اس کے اندر ہدایت بھی پائیں گے اور اپنے دکھوں کا مداوا بھی۔

'وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَیْهِمْ عَمًی' رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لا رہے ہیں تو ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں کوئی خرابی ہے جس کے سبب سے ان کے دلوں کو یہ اپیل نہیں کر رہا ہے بلکہ فی الواقع انہی کے دلوں کے کان بہرے ہیں۔ قبولِ حق کی صلاحیت ان کے اندر مردہ ہو چکی ہے اس وجہ سے اس کی صدائیں ان کے دلوں پر اثر نہیں کر رہی ہیں بلکہ ان کے کانوں سے ٹکرا کے واپس آ جاتی ہیں۔

'وَّهُوَ عَلَیْهِمْ عَمًی' اسی طرح جو لوگ اس سے راہ یاب نہیں ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہ نہیں ہے کہ یہ ہدایت کی روشنی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس روشنی نے ان کی نگاہیں خیرہ کر دی ہیں جس کے سبب سے یہ ان کے لیے رہنمائی کے بجائے اندھے پن کا ذریعہ بن گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی آنکھوں کو روشنی کے بجائے تاریکی ہی کا خوگر کر رکھا تھا اس وجہ سے جب یہ آسمانی روشنی نمودار ہوئی تو ان کی نگاہیں اس کی تاب نہ لا سکیں بلکہ ان کی رہی سہی

---

[1] جیسا کہ آیت ۳ میں فرمایا ہے: 'كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ'۔

روشنی بھی سلب ہوگئی۔ اس مقام کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے سورۂ بقرہ کی آیت ۲ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

جو قریب سے نہیں سن رہے ہیں وہ دور سے سننے پر مجبور ہوں گے

أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ۔ یعنی ابھی قرآن کو بہت قریب سے پکارا جا رہا ہے، اللہ کا رسول، اللہ کی کتاب اور اس کا پیغام لیے ہوئے، ان کے پیچھے پیچھے پھر رہا ہے لیکن یہ اپنی رعونت کے سبب سے بہرے بنے ہوئے ہیں، گویا کوئی بات سنتے ہی نہیں۔ لیکن یہ یاد رکھیں کہ عنقریب وہ دن بھی آنے والا ہے جب قیامت کا داعی بہت دور سے ان کو پکارے گا اور یہ اس کی پکار سنتے ہی اس کی طرف بھاگیں گے، مجال نہیں کہ ذرا بھی تاخیر یا سرِ مو انحراف اختیار کر سکیں۔ سورۂ طٰہٰ میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: يَوْمَئِذٍ يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ ۖ وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَٰنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا (۱۰۸) (جس دن پکارنے والے کے پیچھے وہ بھاگیں گے ذرا بھی اس سے انحراف نہ اختیار کر سکیں گے اور سب کی آوازیں خدائے رحمان کے آگے پست ہوں گی پس تم سرگوشی کے سوا اور کوئی چیز بھی نہ سنو گے)

اس آیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اسی سورہ کی آیات ۱-۵ بالخصوص آیت ۵ وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِن بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ منکرین تو بطور رعونت یہ بات کہتے تھے کہ ہمارے دل تمہاری دعوت سے پردے میں ہیں، ہمارے کان بہرے ہیں، ہمارے اور تمہارے درمیان حجاب حائل ہے لیکن قرآن نے ان کی ایک ایک بات کی تصدیق کر دی اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی فرما دی کہ ان کے بہرے پن، اندھے پن اور ان کے حجاب کی نوعیت کیا ہے اور ان کی ان بیماریوں کا علاج اب کس دن اور کس طرح ہوگا!

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ ۗ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ (۴۵)

یہود کا اٹھایا ہوا ایک اعتراض اور اس کا جواب

یہ آیت بعینہٖ سورۂ ہود میں بھی گزر چکی ہے، ملاحظہ ہو آیت ۱۱۰۔ وہاں ہم اس کی تفسیر کر چکے ہیں۔ یہ بھی درحقیقت اسی طرح کے اعتراض کا جواب ہے جس طرح کے اعتراض کا جواب اوپر والی آیت میں دیا گیا ہے۔ یہود یہ اعتراض بھی لوگوں کو سکھاتے تھے کہ جب تورات، اللہ کی کتاب موجود ہے اور اس کا کتابِ الٰہی ہونا قرآن کو بھی تسلیم ہے تو آخر ایک نئی کتاب نازل کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس اعتراض کا جواب قرآن نے مختلف پہلوؤں سے دیا جو مختلف سورتوں میں مذکور ہے۔ یہاں یہ جواب دیا ہے کہ یہ تو امرِ واقعہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اس میں اختلاف اور تناقض پیدا کر دیا گیا۔ فَاخْتُلِفَ فِيهِ سے مراد یہاں وہ تناقض ہے جو مختلف اسفارِ تورات میں بہت بھونڈے طور پر پایا جاتا ہے۔ اگر کسی چیز میں محض تاویل کا اختلاف ہو تو اس کا ازالہ

اصل کی مراجعت اور دوسرے شواہد و نظائر سے ممکن ہے لیکن جب اصل ہی میں کھلا ہوا تضاد و تناقض ہو تو پھر اس اختلاف کا ازالہ ناممکن ہے چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ تورات کے مختلف حصوں میں ایک ہی بات اتنے متضاد طریقوں سے بیان ہوئی ہے کہ اصل حقیقت تک پہنچنا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ ہماری اس کتاب میں تورات کے تضادات کی متعدد مثالیں گزر چکی ہیں۔ یہاں ہم اس کے صرف اس تضادِ بیان کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی پیشین گوئیوں سے متعلق تورات میں پایا جاتا ہے۔ اگر یہود نے تحریف کی راہ سے یہ تضادات پیدا کر دیے ہوتے تو ان کو اس حقیقت کے سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہ پیش آتی کہ تورات کے بعد قرآن کو اللہ تعالیٰ نے کیوں نازل فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دین کی کون سی کمی پوری کرنے کے لیے ہوئی۔ لیکن یہود نے اپنی بدبختی سے حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور اس طرح انھوں نے صرف اپنی ہی گمراہی کا سامان نہیں کیا بلکہ ایک خلق کثیر کی گمراہی کا وبال بھی اپنے سر لیا۔

تورات میں اس طرح کے تضادات کے پیدا ہونے کی وجہ کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں کہ حفاظت کا وہ اہتمام اس کو حاصل نہ ہو سکا جو قرآن کو حاصل ہوا۔ اس پر متعدد بار ایسی آفتیں آئیں کہ پوری تورات ناپید ہو گئی، بعد میں جن لوگوں نے اس کو مرتب کیا محض اپنی یادداشت سے مرتب کیا اور یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کے مرتب کرنے والے کون اور کن صفات کے لوگ تھے۔ اس کے بعض صحیفے بالکل صیغۂ راز میں رکھے جاتے تھے جن کے مندرجات سے خاص محرمانِ راز کے سوا دوسرے لوگ واقف نہیں ہو سکتے تھے اس لیے کہ ان میں ایسی باتیں بھی تھیں جن کی عام اشاعت علمائے یہود اپنے مصالح کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس طرح کی باتوں میں انھوں نے اپنے حسب منشا تحریفات بھی کیں اور وہ اس تحریف میں کامیاب ہو گئے۔ کسی ایسی کتاب میں تناقضات کا پیدا ہو جانا ذرا بھی تعجب انگیز نہیں ہے اور ان تناقضات کا بالکل بدیہی اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اصل حقیقت بالکل گم ہو جائے، لوگ اسی تاریکی میں پھر گھر جائیں جس سے نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ روشنی نازل فرمائی تھی اور ان کے درمیان ایسے اختلافات پیدا ہو جائیں جن کے دور کرنے کی کوئی سبیل باقی ہی نہ رہ جائے۔

ایک سخت دھمکی

'وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ'۔ یہ نہایت سخت دھمکی ہے اور چونکہ یہ اعتراض، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہود کا سکھایا ہوا تھا، اس وجہ سے دھمکی بھی انہی کی طرف اشارہ کر کے دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہود ابھی تک اپنے آپ کو تورات کا حامل سمجھے ہوئے بیٹھے اور اس خبط میں مبتلا ہیں کہ تورات کی بدولت جو امامت و سیادت ان کو حاصل ہوئی تھی وہ بدستور ان کو حاصل ہے، اس کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ حالانکہ اللہ کی کتاب کے ساتھ جو ظلم وہ کر چکے ہیں اس کے بعد وہ مستحق تو تھے کہ اللہ کی عدالت اور اس کے عذاب کے ذریعہ سے ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر

قیامت کے فیصلہ کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اس وجہ سے ان کو مہلت دی گئی لیکن یہ مہلت بہرحال مہلت ہے جو ایک دن پوری ہو جائے گی اور یہ اپنے اس ظلم کا مزا چکھیں گے۔

تورات میں اختلافات کا نتیجہ

وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ۔ یہ نتیجہ بیان ہوا ہے اس اختلاف و تناقض کا جو تورات میں پیدا کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تورات کی ہر چیز خود اہلِ تورات کی نگاہوں میں مشکوک ہو گئی جس سے حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہو گیا۔ ان کے اندر بے شمار فرقے پیدا ہو گئے اور ہر فرقے نے جو بات اپنی خواہش کے مطابق پائی اسی کو اپنا دین بنا لیا اور اصل دین ان تناقضات کے اندر گم ہو گیا۔

امام رازیؒ کے نزدیک 'مِنْهُ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے لیکن میرے نزدیک اس کا مرجع تورات ہی ہے اور اس کے مشکوک ہونے کا پہلو وہی ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

یہ مضمون آگے سورۂ شوریٰ میں بھی آئے گا۔ وہاں اس آیت کے بعض اجمالات کی وضاحت ہو جائے گی۔ الشوریٰ میں یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے۔

وَمَا تَفَرَّقُوٓا إِلَّا مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ ٱلْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِىَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّ ٱلَّذِينَ أُورِثُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ مِنۢ بَعْدِهِمْ لَفِى شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ (الشوریٰ: ۱۴)

اور یہ لوگ محض باہمی ضدم ضدا کے باعث متفرق ہوئے بعد اس کے کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی، ایک مدتِ معین کے لیے تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور جو لوگ ان کے بعد کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے الجھن میں ڈال دینے والے شک میں مبتلا ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَٰلِحًا فَلِنَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ أَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّٰمٍ لِّلْعَبِيدِ (۴۶)

مخالفین سے بے پروائی کا اعلان

یہ ان لوگوں سے بے پروائی کا اظہار ہے۔ فرمایا کہ نہ کسی کی نیکی سے خدا کو کوئی نفع پہنچنے والا ہے اور نہ کسی کی بدی سے اس کا کوئی نقصان ہے۔ جو نیکی کرے گا اس کا فائدہ اسی کو حاصل ہو گا اور جو برائی کرے گا اس کا وبال اسی پر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ جس کے جو اعمال ہوں گے اسی کے ثمرات و نتائج وہ اس کے سامنے رکھ دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو راہِ راست دکھانے کی یہ سرگرمی جو ہے اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ لوگوں کی ہدایت کے بغیر خدا کا کوئی کام اٹکا ہوا ہے بلکہ یہ ساری بھاگ دوڑ لوگوں ہی کی بھلائی کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ لوگ خدا کی پکڑ میں آئیں درآنحالیکہ ان پر اچھی طرح حجت تمام نہ ہوئی ہو۔ سورۂ جاثیہ کی آیت ۱۵ میں بھی یہ مضمون بالکل اسی سیاق و سباق میں آیا ہے۔

عربیت کا ایک اسلوب

عربیت کے اس اسلوب کی وضاحت ہم دوسرے محل میں کر چکے ہیں کہ جب مبالغہ پر نفی آئے تو اس سے

مقصود مبالغہ فی النفی ہوتا ہے اس وجہ سے وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ کے معنی ہوں گے: اور تیرا رب بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــ آیات: ۴۷-۵۴

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پہلے ان لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے جو عذاب یا قیامت سے اس بنا پر نچنت تھے کہ ان کو اس کا وقت تعین کے ساتھ نہیں بتایا جا رہا ہے۔ ان کو آگاہ کیا گیا ہے کہ کسی حقیقت کا انکار محض اس بنیاد پر کوئی دانشمندی نہیں ہے کہ اس کے ظہور کا وقت بتایا نہیں جا سکتا۔ کتنی پیش پا افتادہ حقیقتیں ہیں جن کے ظہور کا وقت اگرچہ کسی کو نہیں معلوم لیکن کوئی عاقل اس کا انکار نہیں کرتا۔

اس کے بعد عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کے حال پر اظہارِ افسوس کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کے تھڑدلے پن کا حال یہ ہے کہ اللہ نے اپنے فضل سے ان کو توبہ و اصلاح کے لیے جو مہلت دی ہے تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ محض ان پر دھونس جمائی گئی ہے اور عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں حالانکہ اگر ابھی ذرا خدا کی کسی گرفت میں آ جائیں تو اس سے نجات کے لیے لمبی لمبی دعائیں کرتے نہیں تھکیں گے۔

آخر میں قرآن کی تکذیب کے ہولناک انجام سے ڈرایا اور آگاہ فرمایا گیا ہے کہ اس کی صداقت کی جو دلیلیں بیان ہوئی ہیں اگر وہ ان کے لیے کافی نہیں ہیں تو عنقریب اس کی وہ آفاقی و انفسی نشانیاں ظاہر ہوں گی جن کے انکار کی کوئی بھی جرأت نہ کر سکے گا ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَمَا تَخْرُجُ مِن ثَمَرَاتٍ مِّنْ أَكْمَامِهَا آیات
وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ ۴۷-۵۴
أَيْنَ شُرَكَائِي قَالُوا آذَنَّاكَ مَا مِنَّا مِن شَهِيدٍ ﴿٤٧﴾ وَ
ضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَدْعُونَ مِن قَبْلُ ۖ وَظَنُّوا مَا لَهُم
مِّن مَّحِيصٍ ﴿٤٨﴾ لَّا يَسْأَمُ الْإِنسَانُ مِن دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِن
مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ ﴿٤٩﴾ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِّنَّا

مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ
قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ
فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۡ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ
غَلِيْظٍ ۝٥٠ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ
وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ۝٥١ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ
كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ
شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝٥٢ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝٥٣ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ ۭ
ع اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۝٥٤

ترجمۂ آیات ۴۷-۵۴

اور قیامت کے علم کا معاملہ صرف اللہ ہی سے متعلق ہے۔ اور کوئی میوہ اپنے غلاف سے باہر نہیں نکلتا اور نہ کوئی عورت حاملہ ہوتی اور نہ جنتی ہے مگر اسی کے علم سے۔ اور جس دن ان کو پکارے گا کہ میرے شریک کہاں ہیں تو کہیں گے کہ ہم نے تجھ سے عرض کر دیا کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا گواہ نہیں رہا۔ اور جن کو وہ پہلے پکارتے رہے تھے وہ سب ہوا ہو جائیں گے اور وہ جان لیں گے کہ اب ان کے لیے کوئی مفر باقی نہیں رہا۔ ۴۷-۴۸

اور انسان بھلائی کی دعا سے نہیں تھکتا اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر ہم اس کو اپنی رحمت کا مزا چکھا دیتے ہیں

اس تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی ہوتی ہے تو کہتا ہے یہ تو میرا حق ہی ہے اور میں قیامت کے ہونے کا گمان نہیں رکھتا اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا ہی گیا تو میرے لیے اس کے پاس بھی بہتری ہی ہے۔ پس ہم ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا ان کے اعمال سے ضرور آگاہ کریں گے اور ان کو ایک سخت عذاب کا مزا لازماً چکھائیں گے۔ ۴۹-۵۰

اور جب ہم انسان پر اپنا فضل کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا اور اپنا پہلو بدل لیتا ہے اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے والا بن جاتا ہے۔ ۵۱

ان سے کہو، بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہوا اور تم نے اس کا انکار کیا تو اس سے بڑھ کر گمراہ کون ٹھہرے گا جو ایک نہایت دور رس مخالفت میں جا پڑا! ۵۲

ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کے اندر بھی، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن بالکل حق ہے۔ اور کیا تیرے رب کا ہر بات کا شاہد ہونا کافی نہیں ہے! آگاہ، کہ یہ لوگ اپنے رب کے حضور پیشی کے باب میں شک میں ہیں! آگاہ، کہ وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے! ۵۳-۵۴

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَمَا تَخْرُجُ مِن ثَمَرَاتٍ مِّنْ أَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِي قَالُوا آذَنَّاكَ مَا مِنَّا مِن شَهِيدٍ (۴۷)

قیامت کا مذاق اڑانے والوں کو جواب

یہ ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو قیامت کے انذار کے جواب میں استہزا کے طور پر یہ سوال کرتے کہ مَتٰی ھُوَ، وہ کب نمودار ہوگی؟ اگر اس کو آنا ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتی؟ آخر یہ جہاز چلا تو کہاں رک گیا، وہ ساحل پر کب لنگر انداز ہوگا؟ اس قبیل کے مذاق اڑانے والوں کو قرآن میں جگہ جگہ یہ جواب دیا گیا ہے کہ قیامت کا آنا تو ایک حقیقت ہے۔ اس کائنات اور اس کے خالق

کی صفات کا یہ ایک بدیہی تقاضا ہے۔ آفاق و انفس اور عقل و فطرت اس کے گواہ ہیں۔ اس وجہ سے وہ آئے گی تو ضرور۔ رہا یہ سوال کہ وہ کب آئے گی تو اس کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے ہے، وہی جانتا ہے کہ وہ کب آئے گی۔ اس راز سے اس کے سوا کوئی دوسرا واقف نہیں ہے۔

'وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ'۔ اور صرف یہی ایک راز ایسا نہیں ہے جس سے خدا کے سوا کوئی اور واقف نہ ہو بلکہ اور بھی کتنی بیش پا افتادہ حقیقتیں ہیں جن کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ ہی کے علم سے ہے، انسان کا علم ان کے باب میں نہایت محدود ہے لیکن اس کے باوجود ان کے حقیقت ہونے سے کوئی عاقل انکار نہیں کرتا۔ گندم کا ایک خوشہ نمودار ہوتا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ اس کے پکنے کی نوبت آئے گی یا نہیں اور آئے گی تو اس میں کتنے دانے ناقص نکلیں گے، کتنے صحیح، کتنے ضائع جائیں گے، کتنے محفوظ رہیں گے، ان کے پکنے کی ٹھیک ٹھیک تاریخ کیا ہے اور ان میں سے کتنے دانے کسان کے نصیب کے ہیں جو اس کے کھتے تک پہنچیں گے اور کتنے چرند و پرند کی نذر ہو جائیں گے۔ ان ساری باتوں کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اس وجہ سے اگر انسان پر قیامت کے ظہور کا وقت واضح نہیں ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ قیامت تو بہت بڑی چیز ہے، انسان کا حال تو یہ ہے کہ اس کو اپنے سامنے کی روزمرہ مشاہدہ کی ہوئی چیزوں کی واقفیت بھی بہت تھوڑی ہی ہے۔

'وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى' ایک عورت حاملہ ہوتی ہے۔ کون جانتا ہے کہ یہ لڑکی جنے گی یا لڑکا، ناقص جنے گی یا سالم، مردہ جنے گی یا زندہ اور جنے گی تو کس دن اور کس وقت جنے گی؟ ان باتوں میں سے کسی بات کا بھی صحیح علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے۔ اگر ایک ایسی عامۃ الورود چیز سے متعلق انسان کا علم اتنا محدود ہے تو اس کو قیامت کے ظہور کا صحیح وقت نہ معلوم ہو سکے یا نہ بتایا گیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ ہاں اگر وہ یہ دعویٰ کر سکتا کہ بقیہ ساری چیزوں کا علم تو اس کو حاصل ہے، صرف یہی ایک چیز اس کے علم سے باہر رہ گئی ہے تب اس کے لیے یہ جائز ہو سکتا تھا کہ اس کی بنا پر وہ کسی شک یا انکار میں مبتلا ہو۔ یہی مضمون دوسرے مقام میں یوں بیان ہوا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ	قیامت کا علم صرف اللہ ہی کے پاس ہے
وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي	اور وہی بارش نازل کرتا ہے اور رحموں کے اندر
الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا	جو کچھ ہے اس کو جانتا ہے اور کسی جان کو
تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ	بھی یہ پتہ نہیں کہ کل وہ کیا کمائی کرے گی اور کسی کو
بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ	بھی یہ خبر نہیں کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔
خَبِيْرٌ (لقمان: ۳۴)	علیم و خبیر صرف اللہ ہی ہے۔

بہت سی چیزوں کا علم انسان کو نہیں

'وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِيْ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ'۔ یعنی اگر قیامت سے پہلے پرانی

ان لوگوں کو اپنے مزعومہ شرکاء کے بل پر ہے تو انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس دن جب اللہ تعالیٰ ان کو حکم دے گا کہ جن کو تم نے میرا شریک گمان کر رکھا تھا ان کو بلاؤ، وہ میری پکڑ سے تم کو چھڑائیں، تو یہ جواب دیں گے کہ ہم نے عرض کر دیا کہ اب ہم میں سے کوئی بھی اس اعتراف کے لیے تیار نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی بھی تیرا شریک ہے۔ یہ مضمون سابق سورہ — سورۂ مومن — میں بھی گزر چکا ہے۔

ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْئًا ۚ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ۝

(المومن ۴۰: ۷۳-۷۴)

پھر ان سے کہا جائے گا کہ وہ کہاں ہیں جن کو تم اللہ کے مقابل میں شریک گردانتے تھے۔ وہ جواب دیں گے کہ وہ تو سب ہم سے کھوئے گئے بلکہ ہم اس سے پہلے کوئی چیز پوجتے ہی نہیں تھے۔ اس طرح اللہ کافروں کو حواس باختہ کر دے گا۔

مطلب یہ ہے کہ اپنے جن مزعومہ شریکوں پر ان لوگوں کو ناز ہے ان کی عقیدت کا نشہ پہلی ہی پکار پر ہرن ہو جائے گا۔

بعض اہلِ تاویل نے 'اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ' کو ان کے مزعومہ شرکاء کا قول مانا ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ مشرکوں سے یہ مطالبہ کرے گا کہ تمھارے وہ شرکاء کہاں ہیں جن کو تم نے میرا شریک گمان کیا تو جن ملائکہ یا انبیاء یا صالحین کی انھوں نے پرستش کی ہوگی وہ سبقت کر کے اپنی صفائی پیش کر دیں گے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس بات کا گواہ بننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ کوئی تیرا شریک ہے۔ یہ تاویل غالباً مندرجہ ذیل آیت کی روشنی میں اختیار کی گئی ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًا بُوْرًا ۝

(الفرقان ۲۵: ۱۷-۱۸)

اور جس دن اللہ ان کو اور جن کو یہ اللہ کے سوا پوجتے رہے ہیں، اکٹھا کرے گا پس ان سے پوچھے گا کہ کیا تم لوگوں نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا یہ خود گمراہ ہوئے؟ وہ جواب دیں گے تو پاک ہے، ہمیں یہ حق حاصل نہیں تھا کہ ہم تیرے سوا کسی کو کارساز بناتے۔ بلکہ ہوا یہ کہ تو نے ان کو اور ان کے آباء و اجداد کو دنیا سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ تیری یاددہانی یہ فراموش کر بیٹھے اور ہلاک ہونے والے بنے۔

پہلی تاویل اختیار کرنے کی صورت میں لفظ 'اٰذَنّٰكَ' اظہارِ براءت کے مفہوم میں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اب ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھ کے اپنے جرم کا اعتراف کیا اور تجھ سے امیدوار ہیں کہ تو ہم پر رحم فرمائے گا۔

دوسری تاویل لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے جواب میں تو وہ بات کہیں گے جو سورۂ فرقان کی محولہ بالا آیت میں مذکور ہے لیکن جب ان کی عبادت کے مدعیوں سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مطالبہ ہوگا کہ تم اپنے مزعومہ شرکا کو بلاؤ تو وہ یہ جان کر کہ وہ بلائے جا رہے ہیں اپنے اس قول کا حوالہ دے دیں گے جو وہ پہلے کہہ چکے ہوں گے اور جو الفرقان کی آیت میں مذکور ہے۔

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ (۴۸)

عابد اپنے اپنے معبودوں سے اظہار براءت کریں گے یا معبود اپنے عابدوں سے۔ دونوں ہی صورتوں میں مشرکوں کی نامرادی یقینی ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے جن کے اعتماد پر آخرت کو نظرانداز رکھا وہ سب ہوا ہو جائیں گے اور ان کو یقین ہو جائے گا کہ اب خدا کے عذاب سے ان کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔

لفظ 'ظن' پر اس کے محل میں ہم بحث کر چکے ہیں کہ ان مواقع میں یہ یقین کے مفہوم میں آتا ہے جہاں مقصود مستقبل کی کسی ایسی حقیقت کا بیان ہو جو اگرچہ نادیدہ ہو لیکن متکلم کے نزدیک وہ یقینی ہو۔ مثلاً اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ (الحاقۃ: ۲۰) (مجھے یہ یقین رہا کہ مجھے بہرحال اپنے روزِ حساب سے دوچار ہونا ہے)۔

لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ (۴۹)

انسان کی ایک عجیب کمزوری

لفظ 'انسان' اگرچہ عام ہے لیکن اس سے یہاں مراد وہی منکرین و مستعجلین ہیں جو قیامت کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے کہ اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتی! ان کو خطاب کر کے یا ان کا حوالہ دے کر کہنے کے بجائے بات بصیغۂ عام کہہ دی گئی ہے تاکہ ان سے بیزاری اور کراہت کا اظہار بھی ہو جائے اور بات ایک کلیہ کی حیثیت بھی حاصل کر لے۔

فرمایا کہ یہ انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ اگر اس کو نعمت و رفاہیت حاصل ہو جائے تو ہمارا شکرگزار ہونے کے بجائے ہمیں چیلنج کرتا اور عذاب کا مطالبہ کرتا ہے اور اگر ذرا ہماری پکڑ میں آجائے تو اس سے چھوٹنے کے لیے لمبی لمبی دعائیں مانگتا اور یہ عہد کرتا ہے کہ اگر اس کو اس گرفت سے نجات مل گئی تو وہ ہمیشہ کے لیے ہمارا شکرگزار اور فرمانبردار بندہ بن جائے گا لیکن یہ محض اس کا فریب ہوتا ہے۔ جب ہم اس کو اس مصیبت سے نجات دے دیتے ہیں تو وہ پھر انہی خرمستیوں میں گم ہو جاتا ہے جن میں پہلے مبتلا رہ چکا ہوتا ہے۔ اور اگر ہم اس مصیبت سے نجات نہ دیں یا مصیبت دراز ہو جائے تو بجائے اس کے کہ اللہ کے فیصلہ پر راضی اور صابر رہے بالکل دل شکستہ و بے حوصلہ اور خدا سے مایوس ہو جاتا ہے۔

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس طرح کے لوگ اپنی دنیاوی کامیابیوں اور ترقیوں کے لیے دعا کرنے میں بڑے سرگرم ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک دعائے خیر سے مراد یہی دنیوی ترقیوں کی دعا ہے لیکن یہ بات عام تجربہ و مشاہدہ کے بالکل خلاف ہے۔ اس طرح کے لوگ جب تک ان کا سفینہ رواں دواں

رہتے کبھی خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ اپنے حوصلوں ہی میں مگن اور اپنے ارمانوں ہی میں کھوئے رہتے ہیں۔ البتہ جب کشتی کسی بھنور میں پھنستی ہے تب انھیں خدا یاد آتا ہے اور اس وقت بڑی لمبی لمبی دعائیں خود بھی کرتے اور دوسروں سے بھی کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ اگر کشتی بھنور سے باہر آگئی تو اس کے باہر آتے ہی ان کو خدا پھر بھول جاتا ہے اور اس چیز کو اپنی تدبیر و حکمت یا اپنی بلند اقبالی کا کرشمہ سمجھنے لگتے ہیں اور اگر مصیبت ذرا دراز ہو گئی تو پھر بالکل مایوس ہو کر ڈنگ ڈال دیتے ہیں۔

یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ لقمان میں ہے:

وَإِذَا غَشِيَهُم مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ	اور جب ان کو سائبانوں کی طرح موجیں
دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ	ڈھانک لیتی ہیں وہ اللہ کو پکارتے ہیں اسی کی خالص اطاعت
لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا	کا عہد کرتے ہوئے۔ پس جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی
نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم	پر پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کچھ تو میانہ روی اختیار کرتے
مُّقْتَصِدٌ وَمَا يَجْحَدُ	ہیں (اور زیادہ بدعہدی کرنے والے نکلتے ہیں) اور ہماری
بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ	آیات کا انکار وہی کرتے ہیں جو بالکل عہد شکن اور
كَفُورٍ (لقمان: ۳۲)	ناشکرے ہوتے ہیں۔

سورۂ یونس میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے:

وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا	اور جب انسان کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو ہم کو
لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا	پکارتا ہے لیٹے یا بیٹھے یا کھڑے۔ پس جونہی ہم نے
كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ	اس کا دکھ دور کر دیا وہ اس طرح چل دیتا ہے گویا کبھی
يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَّسَّهُ (یونس: ۱۲)	اپنے کسی دکھ کے ازالہ کے لیے ہم کو پکارا ہی نہیں تھا۔

یہی مضمون اسی سورۂ یونس میں بدلے الفاظ بھی وارد ہوا ہے:

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَ	اور وہی اللہ ہے جو تم کو خشکی اور تری میں سفر کراتا
الْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ	ہے یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ
وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا	ان کو سازگار ہوا کے ذریعہ سے لے کر چلتی ہیں اور وہ
بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ	اس سے مگن ہوتے ہیں، آجاتی ہے کسی سمت سے تند ہوا
وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ	اور ان پر موجیں اٹھنے لگتی ہیں ہر جانب سے، اور وہ
مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ	گمان کرنے لگتے ہیں کہ اب وہ ہلاک ہوئے تو اللہ کو پکارتے
دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ	ہیں اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہم کو
الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ	اس ورطۂ ہلاکت سے نجات بخشی تو ہم تیرے شکرگزار

هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ (یونس: ۲۲-۲۳)

بن کے رہیں گے۔ تو جب ان کو نجات دے دی تو وہ زمین میں سرکشی کرنے لگے بلا کسی حق کے۔

ان نظائر کی روشنی میں میرے نزدیک آیت زیر بحث کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے انسان جب کسی آزمائش میں پڑتے ہیں تب تو دعائے خیر سے نہیں تھکتے چنانچہ آگے آیت ۵۱ میں اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے، 'وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ' (اور جب اس کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے والا بن جاتا ہے)۔

'وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ'۔ یعنی مصیبت کے پہلے مرحلے میں تو لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے لیکن جب دیکھتا ہے کہ دعائیں نتیجہ خیز نہیں ہو رہی ہیں تو خدا کی رحمت سے مایوس ہو کر بالکل دل شکستہ اور بے حوصلہ ہو جاتا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ اس قماش کے لوگ نعمت میں تو خدا کو بھولے رہتے ہیں صرف مصیبت میں اس کو یاد کرتے ہیں اور مصیبت میں بھی خدا کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ جب مصیبت دور ہو جائے تو اس کو پھر بھول جاتے ہیں اور اگر دور ہوتی نظر نہ آئے تو خدا سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں کفر و ناشکری کی ہیں۔ صحیح مومنانہ کردار یہ ہے کہ آدمی نعمت و عافیت کی حالت میں اپنے پروردگار کا شکرگزار رہے اور جب کوئی آزمائش پیش آجائے تو صبر کے ساتھ اس کا مقابلہ کرے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار رہے۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نہ نعمت میں اکڑنے والا اور فخر کرنے والا بنے اور نہ مصیبت میں تھڑ دلا، پست ہمت اور مایوس بلکہ اللہ کے فیصلہ پر راضی و مطمئن رہے۔ یہی ایمان و توکل کی اصلی شان ہے اور ایسے ہی بندے نفسِ مطمئنہ کی بادشاہی اور راضیۃ مرضیۃ کا مقام پاتے ہیں۔

وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً ۙ وَّلَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۡ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ (۵۰)

ایک اور کمزوری

یعنی جس مصیبت سے چھوٹنے کے لیے لمبی چوڑی دعائیں کرتا ہے اگر وہ دور نہیں ہوتی تب تو، جیسا کہ اوپر والی آیت میں ہے، خدا سے مایوس ہو جاتا ہے اور اگر اس کی مصیبت دور کر کے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل سے نوازتا ہے تو اس کا شکرگزار رہنے کے بجائے، اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ تو میرا حق ہی تھا۔ میں اپنی عزت و شرف کے ساتھ پیدا ہوا ہوں اور اسی کے اندر جیوں گا۔ اب مجھے نہ اس سے کوئی محروم کر سکتا اور نہ اس کے لیے مجھے کسی کے شکرگزار ہونے

کی ضرورت ہے۔ رہی قیامت، جس سے بعض لوگ مجھے ڈرا رہے ہیں تو اول تو مجھے اس کے ہونے کا گمان نہیں اور بالفرض ہوئی اور مجھے اپنے رب کے پاس جانا ہی پڑا تو وہاں بھی میرا درجہ و مرتبہ ملحوظ رہے گا اور میرا انجام نہایت شاندار ہوگا اس لیے کہ میری دنیا شاندار ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس طرح کے لوگ زبان سے یہ باتیں کہیں (اگرچہ بہتیرے نہایت بے باکی سے یہ کہتے بھی ہیں) بلکہ ذہن کے اندر ان خیالات کا پایا جانا کافی ہے۔ قرآن میں آدمی کی ذہنیت کی تعبیر بھی 'قول' سے کی گئی ہے۔ اس لیے کہ آدمی کا رویہ اس کے باطن کی سب سے زیادہ صحیح غمازی کرتا ہے۔

خیالی جنت میں بسنے والوں کو تنبیہ

'فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... الاٰية' یہ نہایت سخت الفاظ میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو اس قسم کی جنت الحمقاء میں زندگی گزار رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ احمق لوگ یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ جس طرح دنیا میں ان کو عیش و آرام حاصل ہے اسی طرح آخرت میں بھی (اگر وہ ہوئی) ان کو سب کچھ حاصل ہوگا تو وہ یاد رکھیں کہ آخرت لازمی ہے اور اس میں ہم ان کو ضرور ان کے اعمال سے آگاہ کریں گے۔ "ان کے اعمال سے آگاہ کریں گے" سے مقصود اس کا لازم ہے جس کی وضاحت 'وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ' سے ہوگئی۔ یعنی ان کو ایک عذاب شدید کا مزا چکھائیں گے۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ (۵۱)

'نَاٰ بِجَانِبِهٖ' سے وہی مضمون ادا کیا گیا ہے جو دوسرے مقامات میں 'تَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ' یا 'ثَانِيَ عِطْفِهٖ' وغیرہ محاورات سے ادا کیا گیا ہے۔ یہ غرور و استکبار سے اعراض کرنے اور منہ پھیرنے کی تعبیر ہے۔ 'جانب' کے معنی پہلو کے ہیں۔ آدمی جب کسی سے غرور کے ساتھ منہ موڑتا ہے تو منہ کے جھٹک کر اپنا پہلو بدلتا اور وہاں سے چل دیتا ہے۔ اسی حالت کو یہاں 'نَاٰ بِجَانِبِهٖ' سے تعبیر فرمایا ہے۔

تنک ظرفوں کے کردار کا ایک خاص پہلو

اوپر کی آیات میں اس قبیل کے لوگوں کے کردار کا ایک پہلو پیش کیا گیا ہے۔ اب ان کے اسی کردار کا دوسرا پہلو دکھایا جا رہا ہے کہ ان سفلہ لوگوں (اشارہ قریش اور اہل طائف کے فراعنہ ہی کی طرف ہے) کا حال یہ ہے کہ جب ہم ان پر اپنا انعام کرتے ہیں تو یہ ہم سے اعراض کرتے اور غرور سے اکڑتے ہیں اور اگر ذرا ہماری گرفت میں آجائیں تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے والے بن جاتے ہیں۔ یعنی ان کے اس طنطنہ کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ ذرا میں بہک جانے والے اور ذرا ہی میں بلبلا اٹھنے والے ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ (۵۲)

مکذبین قرآن سے ایک سوال

یہ ان مکذبین سے علیٰ سبیل التنزل ایک سوال فرمایا کہ اس طنطنہ کے ساتھ جو قرآن کا انکار کر رہے ہو تو اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا تب کہاں جاؤ گے! اس صورت میں ان لوگوں سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو ایسی دور رس مخاصمت میں مبتلا ہو کر اپنی ہلاکت کی اس منزل کو پہنچ جائیں جہاں سے بازگشت کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہ جائے!

قرآن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت

یہ قرآن پر پوری سنجیدگی اور پوری اہمیت کے ساتھ غور کر کے اس کے باب میں کوئی فیصلہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس دعوت کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن اپنی تکذیب کرنے والوں کو جس انجام سے خبردار کر رہا ہے اور جن دلائل کے ساتھ آگاہ کر رہا ہے وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ سہل انگاری سے نظر انداز کر دی جائے یا ہنسی مسخری میں اڑا دی جائے بلکہ بڑے ہی قوی دلائل کی شہادت کے ساتھ یہ بڑے ہی ہولناک انجام کی خبر ہے اس وجہ سے جو لوگ نہایت ڈھٹائی سے اس کو جھٹلا رہے ہیں وہ کم از کم اس کے دعوے کی صحت کے امکان کے پہلو کو نظر انداز نہ کریں۔ اگر وہ اس کی صحت کا امکان محسوس کرتے ہیں (اور کوئی ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم بھی اس کے امکان سے انکار نہیں کر سکتا) تو دانشمندی کا تقاضا اور عاقبت بینی کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ اس قرآن پر سو بار غور کریں اور جو فیصلہ بھی کریں اس کے نتائج پر دور تک سوچ کر کریں۔ اگر وہ اس کو اختیار کریں گے تو کوئی چیز کھوئیں گے نہیں بلکہ پائیں گے اور سب کچھ پائیں گے اور اگر محض ضد اور مخاصمت کے جنون میں مبتلا ہو کر اس کا انکار کر دیں گے تو یہ مخاصمت ان کو اتنی دور لے جا کر پھینکے گی جہاں سے پھر لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہے گا ـــــ مطلب یہ ہے کہ اس معاملہ پر اس کی حقیقی اہمیت سامنے رکھ کے غور کرو۔ اگر ضد، انانیت، حسد اور مخاصمت کو اس میں دخیل ہونے دیا گیا تو یہ کشمکش نہایت تباہ کن انجام پر منتہی ہوگی۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۵۳)

قرآن کی صداقت کے آثار آفاق وانفس میں

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور مکذبین قرآن کے لیے تہدید و وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ قرآن کو، اس کے دلائل کی بنیاد پر، ماننے کے لیے تیار نہیں بلکہ اس کی تصدیق کے لیے ہماری نشانیاں ہی دیکھنے پر مصر ہیں تو عنقریب وہ وقت بھی آ رہا ہے جب مکہ کے اطراف میں بھی اور خود مکہ میں، قریش کے اندر بھی، اس کی حقانیت کی ایسی نشانیاں ظاہر ہوں گی کہ یہ لوگ پکار اٹھیں گے کہ بے شک قرآن بالکل حق ہے۔

'آیات' سے مراد غلبۂ حق اور ہزیمت باطل کے وہ آثار و شواہد ہیں جن کی قرآن نے پیشین گوئی کی ہے۔ یہ پیشین گوئی اس سورہ میں بھی پیچھے تاریخی دلائل کی روشنی میں گزر چکی ہے۔ ابتداءً تو قریش کے لیڈروں نے ان باتوں کو تعلّی پر محمول کر کے ان کا مذاق اڑایا لیکن جب مدینہ میں اور خود مکہ کے اندر اور اس کے

اطراف میں یہاں تک کہ خود قریش کے اچھے لوگوں کے اندر بھی اسلام جڑ پکڑنے لگا تب ان کو اور ان کے پشت پناہوں کو کچھ تنبہ ہوا۔ بالآخر ہجرت کے بعد غلبۂ اسلام کے ایسے واقعات پیش آئے کہ قریش تو درکنار روم و فارس کے لیے بھی اسلام کے مقابل میں ٹکنا ناممکن ہوگیا۔ یہ مضمون سورۂ نمل کی آیت ۹۳ میں بھی ہے ’سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا‘ (اور وہ اس کی نشانیاں تم کو دکھائے گا پس تم ان کو پہچان جاؤ گے)۔

’أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ‘ یعنی غلبۂ حق کی جو بشارت تمھیں دی جا رہی ہے اگرچہ مستقبل سے متعلق ہے لیکن تمھارا رب ماضی، حاضر اور مستقبل کی ہر چیز سے واقف ہے اس وجہ سے مطمئن رہو کہ ان میں سے ہر بات پوری ہو کے رہے گی۔

أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ ۗ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ (۵۴)

یہ آخر میں ان معاندین کی اصل علتِ فساد سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کی اصل بیماری یہ ہے کہ یہ اپنے رب کے حضور پیشی کے باب میں مشتبہ ہیں۔ ان کے اس اشتباہ نے انھیں زندگی کے معاملات میں عاقبت نا اندیش اور حق کی مخالفت میں دلیر بنا دیا ہے۔ انھیں اچھی طرح آگاہ کر دو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، کوئی چیز بھی اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر نہیں ہے۔ وہ جو کچھ چاہے گا اور جب چاہے گا، کر ڈالے گا۔ نہ کوئی اس کے قبضۂ قدرت سے باہر نکل سکتا اور نہ کوئی اس کے کسی ارادے میں مزاحم ہو سکتا۔

بتوفیقِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

رحمان آباد

۲۴- اکتوبر ۱۹۷۵ء

۱۸- شوال ۱۳۹۵ھ

تدبرِ قرآن

۴۲

الشّوریٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور زمانۂ نزول

اس سورہ کا بھی مرکزی مضمون توحید ہی ہے۔ اسی کے تحت قیامت سے بھی ڈرایا گیا ہے اس لیے کہ توحید کی اصلی اہمیت اسی وقت سامنے آتی ہے جب اس بات پر ایمان ہو کہ انصاف کا ایک دن لازماً آنے والا ہے اور اس دن ہر شخص کو سابقہ اللہ واحد و قہار ہی سے پیش آئے گا۔ کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ اس کی پکڑ سے کسی کو بچا سکے یا اس کے اذن کے بغیر اس کے سامنے زبان ہلا سکے۔

استدلال کی بنیاد اس میں دعوتِ انبیاء کی تاریخ پر ہے کہ آدمؑ و نوحؑ سے لے کر اب تک تمام انبیاء نے اسی دینِ توحید کی دعوت دی اور ان کو بھی اللہ نے اسی طرح وحی کے ذریعہ سے تعلیم دی جس طرح یہ قرآن وحی کیا جا رہا ہے۔ مختلف حلقوں نے دین کے معاملہ میں جو اختلاف کیا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے رسولوں نے الگ الگ دینوں کی تعلیم دی بلکہ اس کی وجہ صرف باہمی عداوت و رقابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صحیح علم آجانے کے باوجود مختلف گروہوں نے اپنی ضد اور اپنی برتری قائم رکھنے کے زعم میں حق سے اختلاف کیا اور اس طرح لوگ مختلف گروہوں اور حلقوں میں بٹتے گئے۔ یہ قرآن اسی اختلاف کو مٹانے کے لیے ایک میزانِ حق بن کر نازل ہوا ہے۔ اگر لوگ اس میزان کے فیصلہ کو قبول نہیں کریں گے تو اب قیامت کی میزانِ عدل لوگوں کا فیصلہ کرے گی۔

ورمکے مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مکی دور کے آخر میں، ہجرت سے متصل زمانے میں نازل ہوئی ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قریش کے لیڈروں کو اس میں جو خطاب ہے اس کی نوعیت دوداعی خطاب کی ہے، گویا ان سے متعلق پیغمبرؐ کی جو ذمہ داری تھی وہ پوری ہو گئی، اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔ اگر انھوں نے یہ ذمہ داری اب بھی محسوس نہ کی تو اس کے نتائج کے لیے تیار رہیں۔ اسی طرح مسلمانوں سے متعلق اس میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ اب وہ ایک ایسے دور میں داخل ہو رہے ہیں جس میں ان کو ایک ہیئتِ اجتماعی کی شکل میں اپنے فرائض ادا کرنے ہیں جس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے انھیں تیار رہنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں بار بار یہ تسلی دی گئی ہے کہ تمہاری ذمہ داری لوگوں کو واضح طور پر حق پہنچا دینے کی تھی وہ تم نے پوری کر دی۔ لوگوں کے دلوں میں ایمان اتار دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ اب ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ اسی ضمن میں بعض اعتراضات کے جواب بھی دیے گئے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر مخالفین کی طرف سے کیے گئے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ - ۱۰) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ جس دین توحید کی وحی اللہ نے تم پر کی ہے اسی دین کی وحی اس نے تم سے پہلے آنے والے رسولوں پر بھی کی اور وحی کا طریقہ بھی وہی ہے جو اس سے پہلے اختیار کیا گیا۔ اللہ کی ذات بہت بلند اور عظیم ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ آسمان اس کی خشیت سے پھٹا جا رہا ہے اور فرشتے برابر اس کی تسبیح اور اہل زمین کے لیے استغفار میں سرگرم ہیں جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں اللہ ان کو دیکھ رہا ہے۔ ان کے ایمان کی ذمہ داری تمہارے اوپر نہیں ہے۔ اللہ نے جو عربی قرآن تم پر اتارا ہے اس کے ذریعے سے اہل مکہ اور اس کے اطراف کے لوگوں کو اس دن سے آگاہ کر دو جس دن وہ سب کو اکٹھا کرے گا اور پھر ایمان لانے والوں کو جنت میں اور کفر کرنے والوں کو دوزخ میں داخل کرے گا۔ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس کی ذمہ داری تمہارے اوپر نہیں ہے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے وہ تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ہدایت وہی پائیں گے جو اس کے سزاوار ٹھہریں گے۔

(۱۱ - ۲۰) آسمان و زمین کا خالق خدا ہی ہے، ان کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اولاد اور رزق خدا ہی بخشتا ہے۔ اس کی خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی دین توحید کی تعلیم تمام نبیوں نے دی اور اسی پر قائم رہنے اور اس میں اختلاف نہ پیدا کرنے کی انھوں نے برابر تلقین کی۔ جن لوگوں نے اس میں اختلاف پیدا کیا انھوں نے خدا کی طرف سے صحیح علم آجانے کے بعد محض باہمی عناد اور تعصب کے سبب سے پیدا کیا۔ اگر اللہ نے اس جھگڑے کے فیصلہ کے لیے ایک وقت مقرر کر لیا ہوتا تو ان کا فیصلہ فوراً کر دیا جاتا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ تم اسی دین انبیاء کی دعوت دو اور اسی پر جمے رہو اور لوگوں کو آگاہ کر دو کہ اللہ نے جو کتاب میزانِ عدل بنا کر اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے یہ ہدایت ہوئی ہے کہ اسی میزانِ عدل کے ذریعے سے تمہارے درمیان فیصلہ کروں۔ جو لوگ اس کے بعد بھی تم سے جھگڑیں ان کے لیے عذاب شدید ہے۔ انھیں متنبہ کر دو کہ قیامت کو بہت دور نہ سمجھیں۔ اللہ نے جو مہلت بخشی ہے اس سے فائدہ اٹھالیں ورنہ یاد رکھیں کہ اللہ نہایت مہربان بھی ہے اور نہایت منتقم و قہار بھی۔ اگر وہ لوگوں کو، ان کے طغیان و فساد کے باوجود، مہلت دیتا ہے تو اپنی سنت کے مطابق دیتا ہے۔ اس مہلت کے بعد وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔

(۲۱ - ۲۶) اگر انھوں نے کچھ شرکا ایجاد کیے ہیں جنھوں نے اللہ کے رسولوں کے لائے ہوئے دین سے کوئی الگ دین ان کے لیے ایجاد کیا ہے تو یہ دین اور ان کے یہ شرکاء قیامت کے دن کچھ بھی ان کے کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ اس دن مشرکین اپنے انجام پر اپنے سر پیٹیں گے۔ اس دن کی کامیابی صرف ایمان اور عمل صالح والوں کے لیے ہوگی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ میں تمہاری ہدایت کے لیے جو اتنا فکرمند ہوں تو اس لیے نہیں کہ میں تم سے کسی صلہ کا طالب ہوں بلکہ یہ محض حق قرابت ہے جو تمہارے لیے مجھے بے چین کیے ہوئے ہے۔ اگر تم ایمان لاؤ گے

تو اس کا صلہ تم خود پاؤ گے۔ اگر یہ لوگ تمہاری وحی کو افترا بتاتے ہیں تو تمہارے اطمینان کے لیے یہ چیز بس ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ چشمۂ فیض تمہارے اندر خدا نے جاری کیا ہے، اگر وہ چاہے تو ابھی اس کو بند کر دے، پھر تم کسی طرح بھی اس کو جاری نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں دیکھنے کی چیز اس کے اثرات اور اس کی برکات ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے باطل کو مٹا اور حق کو سربلند کر رہا ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بھی کہیں اس کی پروا نہ کرو۔ جن کے اندر صلاحیت ہے وہ اس کو لبیک کہہ رہے ہیں۔ تمہارے اطمینان کے لیے یہ کافی ہے۔

(۲۷-۲۹) اگر یہ لوگ اپنی دنیوی برتری کو اپنے برحق ہونے کی دلیل بنائے بیٹھے ہیں تو ان کو بتا دو کہ آخرت کی نعمتوں کے مقابل میں اس دنیا کی بڑی سے بڑی دولت کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو شیطان کے فتنوں سے بچانا چاہا اس وجہ سے دنیا کے طالبوں کو بھی اتنا ہی دیتا ہے جتنا اس کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے ورنہ وہ ان کو پوری ڈھیل دے دیتا کہ وہ اس دنیا میں سے جتنا چاہیں اپنے دامن بھر لیں — اللہ کی ڈھیل سے کسی کو غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ہر چیز اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ جب چاہے لوگوں کو پکڑ سکتا ہے لیکن وہ لوگوں کی ناشکری اور ان کے طغیان کے باوجود ان سے درگزر کرتا ہے۔ انسان کی روزمرہ کی زندگی میں جو تجربات و مشاہدات ہوتے رہتے ہیں اگر کوئی دیدۂ بینا رکھتا ہو تو انہی کے اندر دیکھ سکتا ہے کہ انسان ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہے۔ اگر خدا حفاظت نہ کرے تو انسان کے تمام وسائل اس کی حفاظت سے قاصر ہیں۔ کافروں کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ عارضی و فانی ہے۔ خدا کے ہاں ابدی بادشاہی ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو ایمان لائیں گے اور خدا پر بھروسہ رکھیں گے۔

(۳۷-۴۳) اہلِ ایمان کی حقیقی صفات کا بیان اور ان کو چند خاص ہدایات جو موجودہ اور آئندہ پیش آنے والے حالات میں ان کی رہنمائی اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری تھیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ اس دور میں کفار کی تعدیاں بھی بہت بڑھ گئی تھیں اور مسلمان بھی ایک جماعت اور تنظیم کی شکل اختیار کر رہے تھے اس وجہ سے ان کو ضروری ہدایات سے آگاہ کر دیا گیا تاکہ اس نازک دور میں ان کا کوئی قدم غلط نہ اٹھ جائے۔

(۴۴-۵۳) خاتمۂ سورہ جس میں پہلے مخالفین کو تنبیہ ہے۔ اس کے بعد ان کو دعوت ہے کہ اب بھی موقع ہے کہ پیغمبر کی دعوت قبول کر کے اپنی عاقبت سنوار لو۔ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر یہ کبھی واپس آنے والا نہیں ہے۔ اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقینِ صبر ہے کہ اگر یہ لوگ تمہاری بات نہیں سن رہے ہیں تو ان کا پیچھا چھوڑو، تمہارے اوپر جو ذمہ داری تھی وہ تم نے ادا کر دی، ان کے دلوں میں ایمان اتار دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ انسان کی تنگ ظرفی کا حال یہی ہے اگر اللہ اس کو اپنی رحمت سے نوازتا ہے تو اتراتا اور اکڑتا ہے اور اگر اس کے اعمال کی پاداش میں اس کو کوئی مصیبت پیش آجائے تو مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنے مزعومہ شریکوں پر بڑا ناز ہے لیکن خدا کا کوئی شریک نہیں

ہے۔ اگر یہ لوگ اپنے غرور کے سبب سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ خدا ان سے رُو در رُو ہو کر بات کرے تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے سے بات کرتا ہے صرف وحی کے ذریعہ ہی سے کرتا ہے اور اس کے خاص طریقے ہیں۔ اسی طرح کی وحی اس نے تم پر بھی کی ہے اور یہ تم پر اور تمہارے واسطہ سے لوگوں پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہوا ہے ورنہ اس سے پہلے نہ تم کتاب سے آشنا تھے اور نہ ایمان کی تفصیلات اور اس کے مطالبات سے۔

سُوْرَةُ الشُّوْرٰى (۴۲)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيات : ۵۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ عٓسٓقٓ ﴿۲﴾ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ آیات
قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا ۱ - ۱۰
فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۴﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ
مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ
لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵﴾ وَالَّذِيْنَ
اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ڮ وَمَآ
اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶﴾ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا
عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ
لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ﴿۷﴾ وَلَوْ
شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ
يَّشَاۗءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۸﴾
اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ
الْمَوْتٰى ۡ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۹﴾ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ ع ۱

مِنْ شَیْءٍ فَحُکْمُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبِّیْ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ ۖۚ وَ اِلَیْہِ اُنِیْبُ ﴿۱۰﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۰

یہ حٰمٓ ۔ عٓسٓقٓ ہے۔ اسی طرح خدائے عزیز و حکیم وحی کرتا ہے تمہاری طرف اور اسی طرح وہ وحی کرتا رہا ہے ان کی طرف جو تم سے پہلے گزرے۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ بڑی ہی بلند اور عظیم ہستی ہے۔ قریب ہے کہ آسمان اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح اور زمین والوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔ آگاہ کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا اللہ ہی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں اللہ ان پر نگرانی رکھے ہوئے ہے اور تم ان پر داروغہ نہیں مقرر کیے گئے ہو۔ ۱ - ۶

اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف ایک عربی قرآن وحی کیا ہے تاکہ تم اہل مکہ اور اس کے گرد و پیش والوں کو آگاہ کر دو اور اس دن سے ڈرا دو جو سب کے اکٹھے کرنے کا دن ہو گا جس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس دن ایک گروہ جنت میں داخل ہو گا اور ایک گروہ دوزخ میں۔ ۷

اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ داخل کرتا ہے اپنی رحمت میں جس کو چاہتا ہے اور جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں نہ ان کا کوئی کارساز ہو گا اور نہ مددگار۔ کیا ان لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں تو یاد رکھیں کہ کارساز اللہ ہی ہے اور وہ مُردوں کو زندہ کرے گا اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور جس کسی چیز میں بھی تم نے اختلاف کیا ہے تو اس کا فیصلہ اللہ کے

حوالہ ہے۔ وہی اللہ میرا رب ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ ۸-۱۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ ۚ عٓسٓقٓ (۱-۲)

یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ یاد ہوگا، پچھلی دو سورتوں کا نام بھی 'حٰمٓ' ہی ہے۔ یہاں اس پر 'عٓسٓقٓ' کا اضافہ ہے۔ ناموں کا اشتراک عمود کی وحدت پر دلیل ہے اور یہ اضافہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سورہ میں کچھ خاص مطالب بھی ہیں جو پچھلی دونوں سورتوں میں نہیں ہیں چنانچہ مطالب کے تجزیہ پر ایک نظر ڈال کر ان خاص مطالب کو الگ کیا جا سکتا ہے۔

كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳)

تمام نبیوں کی تعلیم بھی ایک ہی رہی ہے اور طریقۂ تعلیم بھی ایک ہی رہا ہے

'كَذٰلِكَ' کا اشارہ ان مطالب کی طرف ہے جو اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں۔ ان مطالب کا ایک اجمالی تصور اس سورہ کے نام نے دے دیا ہے اس وجہ سے 'كَذٰلِكَ' کے ذریعہ سے ان کی طرف اشارہ بالکل موزوں ہے یعنی اس نام سے موسوم سورہ میں جو باتیں وحی کی جا رہی ہیں یہ جس طرح تمہاری طرف وحی کی جا رہی ہیں اسی طرح تم سے پہلے آنے والے نبیوں کو بھی وحی کی جا چکی ہیں۔ ادائے مطلب میں بتقاضائے بلاغت ایجاز ہے۔ پوری بات گویا یوں ہے کہ اس طرح اللہ تم پر وحی کر رہا ہے اور اسی طرح اس نے ان نبیوں پر بھی وحی کی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں؛ اس قسم کے ایجاز کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔

'كَذٰلِكَ' وحدتِ مدعا کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے اور طریقۂ وحی کی یکسانی کی طرف بھی یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں اور رسولوں کو تعلیم بھی انہی باتوں کی دی جن کی تعلیم تم کو دی جا رہی ہے اور اس تعلیم کے لیے طریقہ بھی وہی اختیار فرمایا جو تمہارے لیے اختیار فرمایا اس وجہ سے کسی پہلو سے بھی قرآن میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو لوگوں کے لیے باعث وحشت ہو۔ اگر یہ اس سے دہشت زدہ ہو رہے ہیں تو یہ ان کی اپنی طبیعت کا فساد ہے۔

وحدتِ مدعا کی طرف اشارہ

وحدتِ مدعا کی طرف آگے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ

تمہارے لیے اس نے اسی دین کو مقرر کیا جس کی تعلیم نوح کو دی اور اسی کی وحی ہم نے تم کو کی اور جس کی تلقین

إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۚ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ...... (۱۳)

ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو بھی کی کہ اللہ کے دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ برپا کرو۔ مشرکین پر وہ چیز شاق گزر رہی ہے جس کی تم دعوت دے رہے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس اسلام اور جس دینِ توحید کی دعوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اسی کی دعوت پر تمام انبیاء علیہم السلام مامور رہے لیکن مشرکین نے جو دینِ شرک ایجاد کیا اس کی عصبیت کے جوش میں اس دینِ حق کے مخالف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اسی قسم کی عصبیت کے جنون میں اہل کتاب بھی مبتلا ہو گئے۔

طریقہ کی یکسانی کی طرف اشارہ

طریقہ کی یکسانی کی طرف آگے اس سورہ میں اس طرح اشارہ فرمایا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ۝ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ (۵۱-۵۲)

اور کسی بشر کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے بات کرے مگر یہ کہ وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی اوٹ سے یا بھیجے اپنا کوئی فرشتہ پس وہ وحی کرے اس کے اذن سے جو وہ چاہے۔ بے شک وہ بڑا ہی بلند اور حکیم ہے۔ اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ایک روح کی اپنے امر میں سے۔ تم نہ کتاب سے آشنا تھے اور نہ ایمان سے لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنایا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ آج جو لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر خدا پیغمبر سے کلام کرتا ہے تو ان سے بھی کلام کرے یا وہ اس طرح نمودار ہو کہ وہ اس کو دیکھیں اور اس کا کلام سنیں، یہ محض ان کی خودسری اور بددماغی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح نہ کسی سے بات کرتا اور نہ اس طرح جلوہ نمائی کرنا اس کی شان ہے، بلکہ ہمیشہ سے اس کا طریقہ یہ رہا کہ اس نے اپنے جن بندوں کو نبوت کے کارِ خاص کے لیے منتخب فرمایا ان سے وحی کے ذریعہ سے بات کی اور اس وحی کا ایک خاص ضابطہ ہے۔

آنحضرت صلعم کے لیے تسلی اور مخالفین پر اتمام حجت

اس بات کے کہنے سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا بھی ہے اور مخالفین پر اتمام حجت بھی۔ ظاہر ہے کہ جب آپ اسی دینِ حق کی دعوت دے رہے ہیں جس کی دعوت تمام نبیوں اور رسولوں نے دی تو آپ کوئی ایسی بات نہیں پیش کر رہے ہیں جس سے لوگ وحشت زدہ ہوں۔ جو لوگ اس سے وحشت زدہ ہیں وہ تمام نبیوں کی دعوت کے مخالف اور تعصب و عناد میں مبتلا ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر آپ

لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ نہیں کرا سکتے یا اس کو کلام کرتے دوسروں کو سنا نہیں سکتے تو یہ چیز بھی آپ کی نبوت کا کوئی نقص نہیں۔ آپ اللہ کی وحی پیش کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ جس سے بھی بات کرتا ہے وحی کے ذریعہ ہی سے کرتا ہے۔ اس سے زیادہ وہ کسی کو بھی نہیں نوازتا۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے 'عزیز و حکیم' کا حوالہ یہاں تسلی کے مضمون سے بھی تعلق رکھتا ہے اور تہدید کے مضمون سے بھی۔ جب اللہ تعالیٰ 'عزیز' ہے تو وہ گردن کشوں کو جب چاہے دبا سکتا ہے۔ اگر وہ فوراً نہیں دباتا تو وہ اپنی حکمت کے تحت ان کو مہلت دے رہا ہے اس وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ربِّ عزیز و حکیم پر بھروسا رکھنا اور ان لوگوں کا معاملہ اسی کے حوالہ کرنا چاہیے۔

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ط وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (۴)

صفت 'عزیز' کی وضاحت

یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ 'عزیز' کی وضاحت ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ نہ کسی چیز میں کسی کا ساجھا ہے اور نہ کوئی چیز اس کے حیطۂ اقتدار و اختیار سے باہر ہے۔ وہ بڑی ہی بلند اور بڑی ہی عظیم ہستی ہے، کسی کا بھی یہ درجہ نہیں کہ اس کا کفو اور ہمسر ہو سکے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ لوگوں کو مہلت دے رہا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ لوگ اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو گئے اور اگر اس نے کسی کو عزت و شوکت بخشی ہے تو اس کو اتنا مغرور نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خدا کو دیکھنے اور اس سے ہم کلام ہونے کا حوصلہ کر بیٹھے۔ اللہ کی بارگاہ بہت بلند اور اس کی ہستی بڑی عظیم ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ ط أَلَآ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۵)

'علی و عظیم' کی وضاحت

یہ خدائے 'علی و عظیم' کے علو اور اس کی عظمت کا بیان ہے کہ اس کی عظمت کے بوجھ سے آسمانوں کا یہ حال ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوپر سے پھٹ پڑیں گے اور ملائکہ کا حال 'بایں ہمہ قربت' یہ ہے کہ اس کی خشیت کے سبب سے وہ ہر وقت اس کی تسبیح و تحمید میں لگے رہتے اور زمین والوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں یعنی نادانوں نے تو فرشتوں کو خدائی میں شریک بنا رکھا ہے اور یہ توقع لیے بیٹھے ہیں کہ خدا کی بارگاہ میں ان کو وہ مقام حاصل ہے کہ وہ اپنے پجاریوں کو بڑے بڑے مرتبے دلوائیں گے اور خود ان کا حال یہ ہے کہ وہ ہر وقت اس کی خشیت سے لرزاں و ترساں اور مصروفِ تسبیح و تحمید ہیں۔

'تسبیح' اور 'حمد' کے فرق پر اس کے محل میں گفتگو ہو چکی ہے۔ 'تسبیح' میں تنزیہ کا پہلو غالب ہے اور 'حمد' میں اثبات کا۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کو تمام خلافِ شان باتوں سے، جن میں سب سے زیادہ نمایاں شرک ہے، پاک اور تمام اعلیٰ صفات سے، جن میں سب سے مقدم توحید ہے، متصف ٹھہراتے ہیں۔

'وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ' میں وہی بات فرمائی گئی ہے جو سورۂ مومن میں بدیں الفاظ گزر چکی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ...... (۷)

جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے اردگرد ہیں وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے، اس پر ایمان رکھتے اور ایمان والوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔

ملائکہ کا استغفار اہلِ زمین کے لیے

اس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ اہلِ زمین میں سے ان لوگوں کے لیے استغفار کرتے ہیں جو اہلِ ایمان ہیں۔ چونکہ یہ بات واضح تھی اس وجہ سے آیت زیرِ بحث میں یہ حذف کر دی گئی ہے۔ ملائکہ کا یہی استغفار ان کی شفاعت ہے جو وہ اپنے رب کی بارگاہ میں اہلِ ایمان کے لیے کر رہے ہیں۔ اس سے مشرکین کی مزعومہ شفاعت کی تردید ہو گئی۔

'اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ' یہ مشرکین کو ایک برمحل تنبیہ ہے کہ کان کھول کر اچھی طرح سن لو کہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا اللہ ہی ہے۔ اگر یہ چیز فرشتوں کے اختیار میں ہوتی تو وہ اس تذلل کے ساتھ لوگوں کی مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے کیوں درخواست کرتے؟

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (۶)

مشرکین کو نہایت سخت وعید

یہ مشرکین کو نہایت سخت انداز میں وعید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ ان واضح دلائل کے بعد بھی جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں اور تمام تنبیہ و تذکیر کے باوجود اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں، اللہ ان کی کڑی نگرانی کر رہا ہے کہ جونہی وہ اپنی مہلت پوری کر لیں ان کو اپنے قہر و غضب کے پنجہ میں گرفتار کر لے۔ اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ خدا نے تم پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی ہے کہ لازماً تم ان کو ایمان کی راہ پر لگا ہی دو۔ تمہاری ذمہ داری تبلیغِ حق کی تھی وہ تم نے کر دی اور جب تک تمہارے رب کا حکم ہے، کرتے رہو۔ اگر یہ ایمان نہ لائے تو اس کی پرسش انہی سے ہونی ہے تم سے نہیں ہونی ہے۔ یہی مضمون آگے اسی سورہ میں یوں آیا ہے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ...... (۴۹)

پس اگر یہ اعراض کریں تو ہم نے تم کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا ہے، تمہارے اوپر ذمہ داری صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ (۷)

اس 'كَذٰلِكَ' کا اشارہ آیت ۳ کے مضمون کی طرف ہے کہ جس طرح ہم نے تم سے پہلے آنے والے نبیوں اور رسولوں کو اپنی وحی سے سرفراز کیا اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی یہ قرآن بزبانِ عربی اتارا ہے تاکہ

تم عرب کی مرکزی بستی اور اس کے گرد و پیش کے لوگوں کو آگاہ کر دو۔

قرآن کے ساتھ 'عربی' کی صفت بطور امتنان اور اتمامِ حجت ہے، جیسا کہ حٰمٓ السجدۃ ۴۱ کی آیت ۴۴ میں گزر چکا ہے کہ اہلِ عرب کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے کہ ان کے لیے اللہ کے دین کی پوری وضاحت نہیں کی گئی۔

'اُمّ القریٰ' 'اُمُّ الْقُرٰی' سے مراد مکّہ ہے اس لیے کہ 'اُمُّ الْقُرٰی' مرکزی بستی کو کہتے ہیں اور عرب میں مرکزی بستی کی حیثیت مکّہ ہی کو حاصل تھی۔ یہاں مکّہ کے بجائے 'اُمُّ الْقُرٰی' کے لفظ میں بھی اتمامِ حجت کا پہلو ہے۔ اگر ایک پیغام مرکزی بستی کے لوگوں کو پہنچا دیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک کے لوگوں کو ان کے سر پر چڑھ کر للکار دیا گیا ہے۔ اگر 'اُمُّ الْقُرٰی' کے بجائے عرب کے کسی گوشے سے یہ دعوت اٹھتی تو باتیں بنانے والے یہ بات بنا سکتے تھے کہ آخر ہمارے اکابر و سادات اور ہمارے ذہین طبقہ کو چھوڑ کر قرآن نے سب سے پہلے عوام کے طبقہ کو کیوں مخاطب کیا، اس کے حق و باطل کے اصلی پرکھنے والے تو مکّہ کے سادات ہو سکتے تھے!

میں اتمامِ حجت کا پہلو

'وَمَنْ حَوْلَهَا' سے کیا مراد ہے؟ 'وَمَنْ حَوْلَهَا' سے بعض لوگوں نے تمام عالم کو مراد لیا ہے۔ ان کے اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام عالم کے لیے ہوئی ہے، اس وجہ سے صرف اطرافِ مکّہ یا ملکِ عرب ہی کے شہر مراد نہیں ہیں، بلکہ پوری دنیا مراد ہے۔ یہ بات اگرچہ بجائے خود ایک حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ خاتم النبیین ہیں، اس وجہ سے آپ کی بعثت تمام عالم کے لیے ہوئی، لیکن 'مَنْ حَوْلَهَا' کی یہ تاویل الفاظ کے حدود سے اول تو صریح تجاوز ہے پھر اصل مقصد کے لیے اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ آپ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں۔ ایک بعثتِ خاص، دوسری بعثتِ عام۔ آپ کی بعثتِ خاص اہلِ مکّہ اور اہلِ عرب کی طرف ہوئی اور ان پر آپ نے براہِ راست حجت قائم فرمائی۔ رہی آپ کی بعثتِ عام تو وہ تمام عالم کی طرف ہے اور اہلِ عالم پر دینِ حق کی شہادت دینے کی ذمہ داری قرآن نے بھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی، قیامت تک کے لیے ملتِ مسلمہ پر ڈالی ہے اور اسی ذمہ داری کی بنا پر اس امت کو اللہ تعالیٰ نے 'شُهَدَآءُ اللّٰهِ فِی الْاَرْضِ' کے منصب پر سرفراز فرمایا ہے۔ یہ اس امت کا فریضۂ منصبی ہے کہ اللہ کے رسول نے دینِ حق کی گواہی جس طرح اس امت کے لوگوں پر دی اسی طرح یہ برابر دوسروں کے سامنے یہ گواہی دیتی رہے۔ اسی فریضہ کے تقاضے سے اس امت کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ ایک گروہ اس میں ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔ یہاں تک کہ یہ اس وقت بھی حق پر قائم رہے گا جب دنیا کی رگ رگ میں باطل کا زہر سرایت کر جائے گا۔[1]

---

[1] اس مسئلہ پر مفصل بحث ہم اپنی کتاب 'دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار' میں کر چکے ہیں۔ جن لوگوں کو دلائل کی تفصیل مطلوب ہو اس کی مراجعت کریں۔

عدالتِ عام سے انذار

'وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيهِ' انذارِ عام کے بعد یہ انذارِ خاص کا ذکر ہے کہ ان لوگوں کو خاص طور پر 'يَوْمَ الْجَمْعِ' سے ڈرا دو۔ 'يَوْمَ الْجَمْعِ' سے اشارہ ظاہر ہے کہ روزِ قیامت کی طرف ہے۔ روزِ قیامت کو 'يَوْمَ الْجَمْعِ' سے تعبیر کرنے میں اس بات کی آگاہی ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ بلا استثنا سب کو اکٹھا کریگا۔ عابدوں کو بھی اور معبودوں کو بھی، لیڈروں کو بھی، ان کے پیرؤوں کو بھی، انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو بھی، کفار اور ان کے حامیوں کو بھی۔ اور ان سب کی موجودگی میں، بھری عدالت میں، فیصلہ فرمائے گا کہ اللہ کے دین کے معاملے میں کس کا رول کیا رہا ہے؟ کس نے اس میں اختلاف برپا کیا اور فساد ڈالا اور کس نے اس کی وحدت و پاکیزگی قائم رکھنے کی کوشش کی۔ کون انعام کا مستحق ہے اور کون سزا کا؟

'فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ' یہ اس کھلی عدالت کے فیصلہ کا بیان ہے کہ اس دن ایک گروہ یعنی اہلِ ایمان کا گروہ لازماً جنت میں جائے گا اور دوسرا گروہ یعنی اہلِ کفر کا گروہ لازماً دوزخ میں۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۚ وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُمْ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۸)

ایک شبہ کا جواب

اب یہ ایک شبہ کا جواب دیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ایک ہی دین دیا تو اس نے یہ کیوں نہیں پسند فرمایا کہ سب اسی دین پر رہتے؟ اس نے یہ موقع کیوں دیا کہ لوگ اس میں اختلاف برپا کریں اور اس اختلاف کا نتیجہ بالآخر یہ نکلے کہ ایک گروہ تو جنت کا حقدار ٹھہرے اور دوسرا دوزخ کا سزاوار قرار پائے؟

اس کا جواب یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا۔ لیکن اس نے یہ نہیں پسند فرمایا کہ وہ لوگوں کو اپنی ہدایت قبول کرنے پر مجبور کرے بلکہ اس نے چاہا کہ لوگوں کو اختیار دے کر ان کے سامنے اپنی ہدایت رکھے کہ لوگ اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر، اپنی آزادیٔ رائے کے ساتھ، ہدایت کو اختیار کریں اور اللہ کی رحمت میں داخل ہونے کے سزاوار بنیں۔ 'يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ' میں اللہ تعالیٰ نے اپنی جس مشیت کا ذکر فرمایا ہے وہ اس کی رحمت اور اس کے عدل کے تحت ہے۔ اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جن کے لیے اس کا عدل متقتضی ہو کہ وہ اس کی رحمت میں داخل ہوں ان کو وہ اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ اس مضمون کو اس کے بعد 'وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُمْ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ' فرما کر واضح بھی کر دیا کہ جو لوگ ظالم یعنی کافر و مشرک ہیں نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا، نہ کوئی مددگار یعنی نہ ان کے مزعومہ اولیاء ان کے کام آنے والے بنیں گے اور نہ ان کی کوئی جمعیت و جماعت ہوگی جو ان کی کوئی مدد کر سکے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے صرف وہ لوگ محروم ہوں گے جو ظالم و مشرک ہوں گے اور ایسا اس لیے ہوگا کہ یہ اس کے عدل کا تقاضا ہے۔ اس کی مشیت اس کے عدل پر مبنی ہے اور کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کی مشیت کو بدل سکے۔

یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور اس کتاب میں بار بار اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ ہم مزید وضاحت کے لیے یہاں بھی چند آیات کا حوالہ دیے دیتے ہیں۔ سورۂ یونس میں فرمایا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ
كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ
حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۝ وَمَا كَانَ
لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ
وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا
یَعْقِلُوْنَ (یونس: ۹۹-۱۰۰)

اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں جو بھی ہیں
سب ایمان پر ہوتے تو کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے
کہ وہ مومن بن جائیں اور کوئی جان بھی ایمان
نہیں لا سکتی مگر اللہ کے اذن سے اور اللہ
ان لوگوں پر گندگی لاد دیتا ہے جو اپنی عقل سے
کام نہیں لیتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان و ہدایت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے اور اس کی مشیت ان لوگوں کو ایمان کی توفیق بخشتی ہے جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ جو عقل سے کام نہیں لیتے ان کی عقل ایسی گندگی کے ڈھیر کے نیچے دب جاتی ہے کہ ان کو ایمان و ہدایت کی روشنی نظر نہیں آتی۔

یہی مضمون سورۂ سجدہ میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ
هُدٰىهَا (السجدۃ: ۱۳)

اور اگر ہم چاہتے تو ہر جان کو اس کی ہدایت
دے دیتے۔

یعنی اگر ہم لوگوں کو ایمان پر مجبور کرنا چاہتے تو سب کو مومن بنا دیتے لیکن ہم نے لوگوں کو اختیار دے کر آزمایا ہے کہ کون ایمان کی راہ اختیار کرتا ہے، کون کفر کی۔ پس جو کفر کی راہ اختیار کریں گے ہم ان سب کو جہنم میں بھر دیں گے اور ان لوگوں کو جنت میں داخل کریں گے جو ایمان لائیں گے۔

یہی بات نہایت وضاحت سے سورۂ دہر میں اس طرح ارشاد ہوئی ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ
اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا ۝ وَمَا
تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۚ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۝
یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ۚ
وَالظّٰلِمِیْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا
اَلِیْمًا (الدھر: ۲۹-۳۱)

یہ قرآن تو بس ایک یاد دہانی ہے تو جس کا جی چاہے
اپنے رب کی راہ اختیار کرے اور تمہارا چاہنا
کچھ نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ بھی چاہے۔ بے شک
اللہ علیم و حکیم ہے۔ وہ اپنی رحمت میں داخل کرتا
ہے جس کو چاہتا ہے۔ رہے اپنی جانوں پر ظلم
ڈھانے والے تو ان کے لیے اللہ نے دردناک
عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو تسلی دی گئی ہے کہ لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی سے پریشان نہ ہو۔ یہ قرآن لوگوں پر زبردستی لادنے کی چیز نہیں ہے۔ یہ صرف ایک یاد دہانی ہے

تو اس کے ذریعہ سے لوگوں کو یاد دہانی کرو۔ جس کا جی چاہے ایمان لائے، جس کا جی چاہے کفر کی راہ اختیار کرے۔ اگر تم لوگ ان کے ایمان کے خواہشمند ہو تو تمہاری خواہش سے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک اللہ کی مشیت نہ ہو اور اللہ کی مشیت اس کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہے۔ وہ اپنی رحمت میں انہی کو داخل کرتا ہے جن کو چاہتا ہے اور وہ انہی کو چاہتا ہے جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے نہیں ہوتے بلکہ اللہ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے اور اس کی ہدایت کی قدر کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے بن کر چلتے ہیں تو ایسے ظالموں کے لیے اللہ نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۖ فَاللَّهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۹)

سوال یہاں اظہارِ تعجب اور انکار کے مفہوم میں ہے۔ اوپر والی آیت میں فرمایا ہے کہ ان کے لیے نہ کوئی کارساز ہو گا، نہ مددگار۔ یہ اسی کی مزید وضاحت ہے کہ اگر انھوں نے اللہ کے سوا کچھ دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں تو یہ محض ان کی بوالفضولی ہے۔ کارساز صرف اللہ ہی ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ وہی ہے جو مردوں کو زندہ کرے گا اور ہر ایک کی پیشی اس کے حضور میں ہونی ہے تو کارساز کوئی دوسرا کیسے بن جائے گا۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے تو اس کے ہوتے کسی کارساز کی ضرورت کیا رہی اور اس کے آگے کسی بڑے سے بڑے کارساز کی کارسازی کیا کارگر ہو سکتی ہے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (۱۰)

ان لوگوں کا معاملہ اللہ کے حوالہ جو اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے

اوپر آیت ۸ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی گئی ہے کہ مخالفین کی ضد اور مکابرت سے آپ پریشان نہ ہوں۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ نے جو سنت مقرر کر رکھی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی یہ لوگ اللہ کے قانون کی زد میں آئے ہوئے ہیں اس وجہ سے ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیجیے۔ اسی ہدایت کے بموجب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کا معاملہ اللہ کے حوالہ فرما دیا۔ چونکہ یہ بات اوپر والی آیت ہی کی تعمیل میں تھی اس وجہ سے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نئی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی بلکہ کہنے کی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلا دی گئی۔ فرمایا کہ اللہ کے بھیجے ہوئے دین کی جس بات میں بھی تم نے اختلاف کیا، خواہ وہ توحید ہو یا آخرت، میری ذمہ داری اس میں صرف حق پہنچا دینے کی تھی سو وہ میں نے تم کو پہنچا دیا۔ اب اس کا فیصلہ اللہ کے حوالہ ہے۔ وہ فیصلہ فرمائے گا کہ میں نے حق پہنچانے میں کوتاہی کی یا تم نے حق کو پہچان کر اس کو جھٹلایا! وہی اللہ میرا رب ہے اس وجہ سے میں نے اس پر بھروسہ کیا اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ وہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرمائے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات: ۱۱-۲۰

پہلے اسی توحید کے مضمون کی وضاحت فرمائی ہے جو اوپر سے چلا آ رہا ہے کہ کارسازِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ رزق اور اولاد سب اسی کا عطیہ ہیں۔ اور اس کائنات کے اضداد میں جو توافق ہے وہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اللہ واحد کی مشیت اور اس کے ارادہ کے سوا کوئی اور ارادہ اس کے اندر دخیل نہیں ہے۔

اس کے بعد پہلی آیت کے مضمون کی وضاحت فرمائی ہے کہ حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک تمام نبیوں نے اسی دینِ توحید کی دعوت دی اور اس میں اختلاف برپا کرنے سے لوگوں کو روکا لیکن ان کی امتوں نے خدا کی طرف سے واضح علم آ جانے کے باوجود اس میں اختلاف پیدا کیا اور اپنے آپ کو اللہ کی ہدایت سے محروم کر لیا۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ تم اسی دینِ انبیاء کی لوگوں کو دعوت دو اور اپنی اس دعوت پر جمے رہو۔ جو لوگ تمہاری مخالفت کر رہے ہیں ان کو آگاہ کر دو کہ میں اللہ کی کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اس نے تمہارے اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے، میزانِ عدل بنا کر، اتاری ہے۔ اگر تم اس کے فیصلہ کو قبول نہیں کرو گے تو قیامت کی میزان تمہارا فیصلہ کرے گی اور قیامت شدنی ہے۔ اپنی موجودہ رفاہیت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل نہ سمجھو۔ اللہ حق کے دشمنوں کو بھی دنیا کی نعمتیں دیتا ہے لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات: ۱۱-۲۰

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ۭ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۱۱﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَي الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ

يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ وَمَا
تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا
كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ
الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾
فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ
اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ
رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ
بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾ وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ
فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۶﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ
اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ
قَرِيْبٌ ﴿۱۷﴾ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ
يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۸﴾ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ
ع ۲ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۱۹﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ
الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا
نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿۲۰﴾

ترجمۂ آیات ۱۱ — ۲۰

وہی آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے

جوڑے پیدا کیے اور چوپایوں کی جنس سے بھی جوڑے پیدا کیے۔ اس مزرعہ کے اندر وہ تمھاری تخم ریزی کرتا ہے۔ اس کے مانند کوئی شے بھی نہیں ہے۔ اور وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں۔ وہ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لیے چاہتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۱۱-۱۲

اس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی ہدایت اس نے نوح کو فرمائی اور جس کی وحی ہم نے تمھاری طرف کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ پیدا کیجیو۔ مشرکین پر وہ چیز شاق گزر رہی ہے جس کی طرف تم ان کو دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف آنے کے لیے چن لیتا ہے اور وہ اپنی طرف رہنمائی ان کی کرتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ۱۳

اور یہ لوگ صحیح علم آچکنے کے بعد محض باہمی ضدم ضدا کے باعث متفرق ہوئے اور اگر تمھارے رب کی طرف سے ایک بات ایک مدتِ معین کے لیے طے نہ پا چکی ہوتی تو ان کے درمیان فوراً فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے ان کے بعد وہ اس کے باب میں ایک الجھن میں ڈالنے والے شک میں مبتلا ہیں۔ ۱۴

پس تم اسی دین کی دعوت دو اور اس پر جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیو۔ اور اعلان کر دو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے یہ حکم ہے کہ میں تمھارے درمیان فیصلہ کر دوں۔ اللہ ہی ہمارا بھی رب ہے اور تمھارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمھارے اعمال تمھارے لیے۔

ہمارے درمیان کسی بحث کی ضرورت نہیں رہی۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔ ۱۵

اور جو لوگ اللہ کے باب میں حجّت کر رہے ہیں بعد اس کے کہ اس کو مانا جا چکا ہے، ان کی حجّت ان کے رب کے آگے بالکل لچر ہے اور ان پر غضب اور ان کے لیے عذاب شدید ہے۔ ۱۶

اللہ ہی ہے جس نے اتاری کتاب قولِ فیصل کے ساتھ اور میزان اتاری اور کیا پتہ شاید قیامت بھی قریب ہی آ لگی ہو! اس کے لیے جلدی وہ لوگ مچائے ہوئے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے اور جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ترساں ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ شدنی ہے۔ آگاہ کہ جو لوگ قیامت کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں وہ بہت دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ۱۷-۱۸

اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ وہ رزق بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہ نہایت زور آور اور غالب ہے اور جو آخرت کی کھیتی کا طالب ہوتا ہے ہم اس کی کھیتی میں افزونی دیتے ہیں (اور دنیا میں سے بھی اس کا حصہ دیتے ہیں) اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہوتا ہے ہم اس کو اس میں سے کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں۔ ۱۹-۲۰

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۱۱)

اللہ تعالیٰ کی یکتائی کی دلیل

اوپر آیت ۱۰ میں یہ جو فرمایا ہے۔ 'ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ' اس کی یہ مزید وضاحت ہے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق اور تمام انسانوں اور دوسری مخلوقات کو وجود میں لانے والا وہی ہے۔ دوسرا کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس کی ذات یا صفات میں اس کا مثیل ہو سکے تو کوئی اور کس طرح خدا ہو سکتا ہے کہ اس کو اس کا شریک ٹھہرایا اور مولیٰ و مرجع بنایا جائے!

'يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ' میں ضمیر مجرور کا مرجع الفاظ کے اندر نہیں ہے بلکہ اس مفہوم کے اندر ہے جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے۔ الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور چوپایوں کے اندر ان کی جنس سے جوڑے پیدا کیے ہیں تو اس طرح گویا انسانوں اور چوپایوں کی تخلیق کے لیے ان کے اپنے نوعی نظام کے اندر ہی ایک فارم یا مزرعہ بنا دیا ہے جس میں وہ ان کی برابر تخم ریزی کرتا اور ان کو پروان چڑھاتا ہے۔ عربی زبان میں اس طرح ضمیریں آتی ہیں۔ اس کتاب میں اس کی بعض نہایت واضح مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ'۔ اوپر والے ٹکڑے میں خالقِ آسمان و زمین کی جس قدرت و حکمت کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ اس کا نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین جیسی عظیم چیزیں پیدا کیں، جس نے انسانوں اور چوپایوں کی نسل چلانے کے لیے یہ حیرت انگیز نظام قائم فرمایا آخر دوسرا کون ایسا ہو سکتا ہے جس کو اس کا مثل قرار دیا جا سکے؟ کوئی چیز بھی نہ اس کے مثل ہے، نہ ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی ذات اور صفات میں بالکل یکتا ہے۔ پھر اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ جب آسمانوں کا خالق وہ ہے تو ان سے جو کچھ اترتا ہے اس کا اتارنے والا بھی وہی ہے، جب زمین کا بنانے والا وہ ہے تو اس سے جو کچھ برآمد ہوتا ہے اس کا برآمد کرنے والا بھی لازماً وہی ہے۔ جب عورت اور مرد، نر اور ناری کا خالق وہ ہے تو جو خلق ان سے وجود میں آتی ہے ان کا وجود میں لانے والا بھی وہی ہوا مطلب یہ نکلا کہ جب آسمانوں اور زمین اور عورت و مرد کا خالق خدا کے سوا کسی دوسرے کو نہیں قرار دیا جا سکتا تو ان کے باہمی تفاعل سے وجود میں آنے والی چیزوں کو کس طرح کسی دوسرے کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے؟ کون ہے جس نے ان کاموں میں سے کوئی ایک بھی کیا ہو یا کر سکے جو خدا نے کیے ہیں کہ اس کو اس کا ہم پایہ بنا دیا جائے؟

'وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ'۔ یہ اس سبق سے نکلا ہوا آگے کا سبق ہے کہ جس طرح اس کائنات کے شواہد سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کوئی اس کا مثیل نہیں ہے اسی طرح یہ حقیقت بھی اس سے نکلتی ہے کہ حقیقی سمیع و علیم وہی ہے۔ ایک سمیع و علیم خالق ہی اتنی وسیع کائنات کو وجود میں لا سکتا ہے اور وہی اس کو برقرار بھی رکھ سکتا ہے ۔۔۔ تو جب اس کی قدرت بھی بے مثال اور اس کا علم بھی محیطِ کل تو سب اسی کی بندگی کریں اور اسی سے اپنی ضرورتیں مانگیں۔ وہ سب کی باتیں سنتا اور جانتا ہے۔ اس سے

مانگنے کے لیے کسی واسطہ اور وسیلہ کی ضرورت نہیں ہے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۚ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۱۲)

جو خالق ہے وہی مالک بھی ہے

جب اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ وہی ان کا مالک بھی ہو۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان کو پیدا تو کرے لیکن پیدا کرنے کے بعد ان کے خزانوں کی کنجیاں دوسروں کو پکڑا دے! اسی کے حکم سے بارش ہوتی ہے اور اسی کے حکم سے زمین اپنے خزانے اگلتی ہے اور وہی ہے جو اپنے علم اور اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں کشادگی دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اس کے رزق کو تنگ کر دیتا ہے۔ نہ رزق کے پیدا کرنے میں کسی دیوی دیوتا کا کوئی دخل ہے اور نہ اس کی تقسیم میں کسی کو دخل ہے۔ یہ تمام امور اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں اس وجہ سے شکر کا حقیقی سزاوار وہی ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے اس وجہ سے بندوں کو اسی سے امید بھی رکھنی چاہیے اور اسی سے ڈرنا بھی چاہیے اور اگر کسی کے رزق میں تنگی ہو تو اس بدگمانی میں اس کو نہیں مبتلا ہونا چاہیے کہ خدا کو اس کی خبر نہیں ہے یا اس نے اس کے ساتھ کوئی ناانصافی کی ہے بلکہ یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے خدا کے علم سے ہو رہا ہے اور اسی میں حکمت ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (۱۳)

یہی دین تمام نبیوں کا دین ہے

سورہ کی تمہید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ جو فرمایا ہے کہ تمہیں اسی دین حق کی وحی کی جا رہی ہے جس کی وحی تم سے پہلے آنے والے نبیوں اور رسولوں کو کی گئی، یہ اسی مضمون کی وضاحت قریش اور اہل عرب کو مخاطب کر کے کی جا رہی ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے وہی دین پسند فرمایا ہے جو اس نے نوح کو دیا تھا اور جس کی وحی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کی جا رہی ہے۔ اسی دین کی تلقین ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو بھی کی گئی تھی۔ یہ کوئی ایسا دین نہیں ہے جو تمہارے لیے انوکھا اور اجنبی ہو بلکہ شروع سے لے کر اس آخری نبی تک سب کا دین یہی رہا ہے اور یہی اللہ کا حقیقی دین ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا حوالہ یہاں اس طرح دیا ہے کہ پہلے ابتدائی اور آخری کڑی یعنی حضرت نوح اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرمایا، پھر بیچ کے انبیاء میں سے تین جلیل القدر نبیوں ـــــ حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام ـــــ کا نام خاص طور پر لیا۔ اس اہتمام خاص کے ساتھ ان کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ انہی تین نبیوں کی پیروی کے مدعی اس وقت قرآن کے سامنے تھے۔ مشرکین عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے مدعی تھے اور یہود و نصاریٰ

بالترتیب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے۔ اس طرح گویا نبیوں کی پوری تاریخ کی طرف بھی اجمالی اشارہ ہوگیا اور قابل ذکر امتیں بھی سامنے آگئیں۔

اس دین سے متعلق امتوں کو ہدایت

'اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ' یہ اس دین کا بھی بیان ہے جس کی تلقین ان نبیاء کو کی گئی اور اس ہدایت کا بھی جو اس دین سے متعلق ان نبیوں کے واسطہ سے ان کے پیروؤں کو کی گئی۔ 'الدِّیْنَ' پر الف لام اسی طرح کا ہے جس طرح 'الکتاب' پر ہے۔ جس طرح 'الکتاب' کے معنی اللہ کی کتاب کے ہیں اسی طرح 'الدین' کے معنی اللہ کے دین کے ہیں۔ اللہ کا دین شروع سے اسلام ہے، جیسا کہ ارشاد ہے 'اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ' (اصل دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے)۔ اس دین کی بنیاد خالص اور کامل توحید پر ہے۔ یہی دین اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی دیا اور یہی دین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نازل فرمایا۔ اس کے عقائد اور اس کی اساسات شروع سے آخر تک بالکل ایک ہیں۔ فرق اگر ہوا ہے تو جزئیات شریعت میں ہوا ہے جس کو قرآن نے 'شرعۃ ومنہاج' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس دین سے متعلق امتوں کو یہ ہدایت بھی فرمائی گئی تھی کہ اس کو قائم رکھنا اور اس میں اختلاف اور تفرق نہ برپا کرنا۔ یہ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح فرمایا ہے کہ 'وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا' (آل عمران: ۱۰۳) (سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑو اور متفرق نہ ہو)۔ قائم رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی جو باتیں ماننے کی ہیں وہ سچائی کے ساتھ مانی جائیں، جو کرنے کی ہیں وہ دیانتداری اور راستبازی کے ساتھ کی جائیں۔ نیز لوگوں کی برابر نگرانی کی جائے کہ وہ اس سے غافل یا منحرف نہ ہونے پائیں۔ اور اس بات کا بھی پورا اہتمام کیا جائے کہ اہل بدعت اس میں کوئی رخنہ نہ پیدا کرسکیں۔

'لَا تَتَفَرَّقُوْا' کا مطلب یہ ہے کہ یہی دین حبل اللہ ہے اس وجہ سے سب کا فرض ہے کہ سب مل کر اس کو تھامیں۔ ایسا نہ ہو کہ جس شخص کے ہاتھ میں جو رسی آجائے اسی کو وہ حبل اللہ سمجھ بیٹھے اور اس رسی کو چھوڑ دے۔ اگر اس حبل اللہ سے تعلق منقطع ہوا تو سارا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا۔ پھر کوئی چیز بھی لوگوں کی شیرازہ بندی نہ کرسکے گی۔

وہ خاص چیز جس سے مشرکین کو چڑھ تھی

'کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْھُمْ اِلَیْہِ' مشرکین سے مراد مشرکین قریش ہیں۔ فرمایا کہ ان کے لیے اللہ نے دین تو وہی اتارا جو تمام انبیاء کا دین ہے اور اسی دین کی تعلیم ان کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی دی ہے لیکن وہ چیز ان پر شاق گزر رہی ہے جس کی طرف تم ان کو دعوت دے رہے ہو۔

لہ حضرات انبیاء کی اصل تاریخ تو حضرت آدمؑ سے شروع ہوتی ہے لیکن قرآن نے بالعموم حضرت نوحؑ ہی سے آغاز فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نوحؑ سے پہلے کی تاریخ بالکل پردۂ خفا میں ہے۔

'مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ' اگرچہ باعتبار الفاظ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد توحید ہے۔ قرآن میں اس بات کی جگہ جگہ تصریح ہے کہ مشرکین کو سب سے زیادہ چڑ قرآن کی دعوتِ توحید ہی سے تھی۔

ہدایت کے باب میں سنتِ الٰہی

'اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ' یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کے معاملہ میں صبر کرو۔ تم ان کے ایمان کے کتنے ہی چاہنے والے بنو لیکن ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا۔ اور اللہ کا چاہنا اس کی حکمت اور اس کی سنت کے تحت ہے۔ وہ اپنی طرف رہنمائی انہی لوگوں کی کرتا ہے جو خود بھی اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے وہ توفیقِ ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ 'يَجْتَبِيْٓ' کے بعد 'اِلٰی' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں تضمین ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۱۴)

امتوں کو ملامت

یہ ان امتوں کو ملامت ہے کہ انھوں نے علمِ الٰہی کی روشنی پانے کے بعد محض اپنی باہمی ضد و ضدا کے باعث آپس میں اختلاف کیا اور گمراہی میں مبتلا ہوئیں۔ اگر رات کی تاریکی میں کوئی ٹھوکر کھا جائے تو اس کو ایک حد تک معذور قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جو شخص پورے دن کی روشنی میں، محض اپنی ضد کے سبب سے، ٹھوکر کھاتا ہے وہ اپنی اس حماقت کا خود ذمہ دار ہے۔ اس 'تفرق' کی نوعیت سمجھنے کے لیے یہ اشارہ غالباً یہاں کافی ہوگا کہ یہود کے علماء اور فقہاء میں بالکل اسی طرح کے اختلافات برپا ہوئے جس طرح کے اختلافات ہمارے ہاں برپا ہوئے۔ بس فرق یہ ہے کہ اس امت کے پاس قرآن محفوظ ہے اس لیے رفعِ اختلاف کی کسوٹی موجود ہے لیکن یہود نے تورات بھی ضائع کر دی اس وجہ سے ان کے اختلافات کے رفع ہونے کی کوئی شکل باقی ہی نہیں رہی۔

حضرت عیسٰیؑ کی دعوت سے جو امت ظہور میں آئی اس کے اور یہود کے درمیان شروع ہی سے ایک چپقلش برپا رہی اور اس میں اصلی دخل علمائے یہود کے عناد کو تھا۔ وہ محض ضد اور حسد کے باعث ان کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بعد میں خود نصاریٰ کے اندر بے شمار فرقے پیدا ہو گئے اور پال نے ان کو تورات اور انجیل دونوں کی روشنی سے محروم کر دیا۔ اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآن کی روشنی دکھانی چاہی تو یہود اور نصاریٰ اور قریش تینوں نے مل کر اس روشنی کو گل کرنے کی جو سعیٔ نامراد کی اس کی پوری تفصیل قرآن میں آپ پڑھ رہے ہیں۔ یہود کو قرآن سے اس بنا پر عناد تھا کہ مذہبی پیشوائی بنی اسماعیل کو منتقل نہ ہونے پائے اور قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ترخاش تھی اس کے وجوہ خود ان سورتوں سے واضح ہیں۔ اسی صورتِ حال کو قرآن نے 'وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ

الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے کہ جس امت نے بھی تفرق اور اختلاف کی راہ اختیار کی ہے محض اپنی شامتِ اعمال اور باہمی عناد کے سبب سے اختیار کی ہے۔ جہاں تک اللہ اور اس کے رسول کا تعلق ہے ان کی طرف سے برابر لوگوں کو صراطِ مستقیم ہی کی رہنمائی کی گئی۔

'وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ' یہ ان امتوں کو زجر و توبیخ بھی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی کہ چونکہ تمہارے رب کی طرف سے یہ بات طے ہو چکی ہے کہ اتمامِ حجت کے لیے ہر امت کو ایک خاص مدت تک مہلت دی جائے گی اس وجہ سے ان کو مہلت دی جا رہی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو بلا تاخیر ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔

'وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ' اس ٹکڑے کا تعلق اوپر والے جملے 'وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ' سے ہے۔ بیچ کا جملہ محض بطور جملہ معترضہ اور بغرضِ تنبیہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم آنے کے بعد ان ملتوں نے آپس میں جو اختلاف برپا کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد میں جو لوگ کتاب یعنی تورات کے وارث ہوئے وہ اس تورات کی طرف سے الجھن میں ڈال دینے والے شکوک میں مبتلا ہو گئے۔ یہ مضمون بعینہٖ سابق سورہ میں بھی بدیں الفاظ گزر چکا ہے، 'وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ ۗ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ' (حم السجدۃ: ۴۵) (اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تو اس میں اختلاف پیدا کر دیا گیا، اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کا جھگڑا چکا دیا جاتا، اور بے شک وہ اس کی طرف سے ایک الجھن میں ڈالنے والے شک میں پڑ گئے ہیں) لفظ 'مریب' کی تحقیق اس کے محل میں بیان ہو چکی ہے۔ 'الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ' سے مراد یہود ہی کے اخلاف ہیں جو اپنے اگلوں کے بعد تورات کے وارث ہوئے۔ چونکہ تورات ان کو بالکل متناقض شکل میں ملی اس وجہ سے ان کا اس کی طرف سے شکوک میں مبتلا ہو جانا ایک امرِ فطری تھا اور یہ چیز مقتضی تھی کہ وہ اس اختلاف کو رفع کرنے والی کتاب — قرآن — کی دل سے قدر کرتے لیکن انھوں نے محض ضد اور حسد کے سبب سے اس کی مخالفت کی۔ عام طور پر لوگوں نے 'کتاب' سے قرآن کو مراد لیا ہے لیکن اس کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ (۱۵)

نبی کو استقامت کی ہدایت

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ تم اسی دینِ حق کی دعوت دو جو تمام انبیاء کا مشترک دین ہے اور تمہارے یہ مخالفین خواہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم ان کی مطلق پروا نہ کرو، بلکہ ٹھیک ٹھیک اسی

طرح جس طرح تمھیں ہدایت ہوئی ہے اس پر جمے رہو۔

'وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ'۔ یہ اس استقامت کی وضاحت اس کے منفی پہلو سے ہے کہ ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ یعنی اپنی خواہشوں کو دین بنانے کے لیے انھوں نے اللہ کے دین میں جو بدعتیں گھسائی ہیں ان کی پیروی نہ کرو۔ 'اھواء' سے مراد، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، بدعات ہیں۔ اس لیے کہ بدعات تمام تر خواہشوں ہی سے وجود میں آتی ہیں۔

'وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ' یعنی ان لوگوں کو، جو تم سے اپنی ایجاد کردہ بدعات کی حمایت میں لڑ رہے ہیں، بتا دو کہ میں اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لایا ہوں تو تمھاری بدعات و خواہشات کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں؟

'وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ'۔ یعنی میں تمھاری بدعات و خواہشات کی پیروی کرنے نہیں بلکہ تمھارے درمیان انصاف کرنے آیا ہوں۔ تم نے اللہ کے دین میں جو جھگڑے پیدا کر دیے ہیں، مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں اس جھگڑے کا فیصلہ کر کے بتاؤں کہ اس میں کیا حق ہے اور کیا باطل؟ سو تم مجھ سے اپنی بدعات کی پیروی کی توقع نہ رکھو بلکہ اگر توفیق ہے تو مجھ سے یہ جاننے کی کوشش کرو کہ تم میں سے کس کے ساتھ کتنا حق ہے اور کتنا باطل اور اللہ کا اصلی اور بے آمیز دین کیا ہے؟

'اَللّٰہُ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ ... الاٰیۃ'۔ یہ تنبیہ و تحذیر ہے کہ یاد رکھو کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، وہی تمھارا بھی رب ہے۔ اسی کے آگے ہماری بھی پیشی ہونی ہے اور اسی کے حضور میں تمھاری پیشی بھی ہوگی۔ اس مغالطہ میں نہ رہنا کہ تمھارا مولیٰ و مرجع کوئی اور ہوگا۔ اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہوں گے اور تم اپنے اعمال کے۔ اگر ہم نے تمھیں حق پہنچا دیا تو ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے، اب خدا کے سامنے تمھاری ذمہ داری ہمارے اوپر نہیں ہے بلکہ خود تمھارے اوپر ہے۔ اس کے نیک و بد کو تم خود بھگتو گے۔ سورۂ یونس میں بھی یہ مضمون گزر چکا ہے: 'وَاِنْ کَذَّبُوْکَ فَقُلْ لِّیْ عَمَلِیْ وَلَکُمْ عَمَلُکُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِیْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ' (یونس: ۴۱) (اور اگر وہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو کہہ دو کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل۔ تم بری ہو میرے عمل سے اور میں بری ہوں تمھارے اعمال سے)۔

'لَا حُجَّۃَ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ' یعنی اتنی رد و قدح اور اتنی توضیح و تفصیل کے بعد بھی اگر بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی تو اب ہمارے اور تمھارے درمیان مزید طولِ کلام کی ضرورت نہیں رہی۔ اب معاملہ اللہ کے حوالہ ہے ——— وہ ہم سب کو اکٹھا کر کے فیصلہ کرے گا اور یاد رکھو کہ سب کا ٹھکانا اسی کی طرف ہے۔

وَالَّذِیْنَ یُحَآجُّوْنَ فِی اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَہٗ حُجَّتُھُمْ دَاحِضَۃٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَعَلَیْھِمْ غَضَبٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ (۱۶)

'مُحَاجَّۃ' کے معنی مجادلہ اور کٹ حجتی کرنے کے ہیں اور 'فِی اللّٰہِ' میں مضاف محذوف ہے یعنی 'فِی توحید اللّٰہ' اس لیے کہ جھگڑا جن سے بھی تھا اللہ کے باب میں نہیں بلکہ اس کی توحید ہی کے باب میں تھا۔ اہل کتاب تو درکنار مشرکین عرب بھی خدا کے منکر نہیں تھے۔ لیکن خدا کو شرک کے ساتھ ماننا دین میں معتبر نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کی توحید کے ساتھ اس پر ایمان لایا جائے۔ اگر کوئی توحید کے معاملہ میں جھگڑتا ہے تو وہ گویا خدا ہی کے باب میں جھگڑتا ہے اور اسی کی نفی کر رہا ہے۔

'مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَہٗ' کا مفہوم کم و بیش وہی ہے جو 'مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ' کا ہے یعنی یہ جھگڑا خدا کو ماننے کے بعد اٹھایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک تمام نبیوں کی تعلیم ایک ہی رہی ہے، سب نے توحید ہی کی دعوت دی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ قریش، یہود اور نصاریٰ سب کے اصل اسلاف اللہ تعالیٰ کی توحید کو مان چکے ہیں۔ اب اس ماننے کے بعد اگر خدا کی توحید میں ان امتوں کی طرف سے یہ جھگڑے اٹھائے جا رہے ہیں تو یہ حجت نہیں بلکہ کٹ حجتی ہے اور یہ کٹ حجتی خدا کے آگے کام آنے والی نہیں بلکہ یہ پسپا ہو کر رہے گی۔

اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ط وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ (۱۷)

قرآن میزان ہے

'الکتٰب' سے مراد قرآن اور 'المیزان' اسی کا بیان ہے۔ فرمایا کہ امتوں کے باہمی اختلاف کو رفع کرنے اور حق و باطل کو ممیز کر دینے کے لیے اللہ نے قرآن اتارا ہے جو درحقیقت ایک میزانِ عدل ہے۔ اوپر آیت ۱۵ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جو یہ اعلان کرایا گیا ہے کہ 'وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ' (اور یہ بتا دو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں) یہ وہی بات دوسرے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس کام پر مامور فرمایا کہ ملتوں کے درمیان اللہ کے دین کے بارے میں جو اختلاف ہے آپ اس کا فیصلہ کریں تو ضروری ہوا کہ آپ کو ایک ایسی کتاب بالحق عطا ہو جو میزانِ عدل کا کام دے اور آپ اس پر پرکھ کر بتا سکیں کہ کس کے پاس کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ قرآن کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کا ایک نام 'مُھَیْمِن' بھی ہے جس کے معنی کسوٹی کے ہیں۔ یہی مضمون سورۂ حدید میں بھی آیا ہے۔ 'وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ...' (۲۵) (اور ہم نے ان رسولوں کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری کہ لوگ ٹھیک نقطۂ عدل پر استوار رہیں)۔

'وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ' یہ فقرہ یہاں نہایت ہی جامع اور نہایت ہی بلیغ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جو اس میزانِ عدل کے فیصلہ کے مطابق اپنے حق و باطل میں امتیاز

اور اپنے اختلافات کو رفع کر لیں گے ورنہ قیامت تو بہرحال فیصلہ کر کے رہے گی اور اس کے فیصلہ سے کسی کے لیے بھی فرار کی گنجائش نہیں ہو گی اور قیامت کو بہت دور نہ سمجھو، کیا عجب کہ وہ بھی اب قریب آ گئی ہو۔ جو لوگ قرآن کی میزانِ عدل سے گریز کر رہے ہیں آخر قیامت کی میزان سے وہ کہاں بھاگیں گے!

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ (۱۸)

یعنی یہ لوگ قیامت کو محض ایک خیالی ڈراوا سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے بلکہ ڈھیٹ ہو کر یہ کہتے ہیں کہ اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتی؟ فرمایا کہ جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک وہ محض ایک مذاق ہے۔ مگر جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کی ہولناکی کو سمجھتے اور اس سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔

'اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ' یہ ان لوگوں کی محرومی پر اظہارِ حسرت ہے جو قیامت جیسی واضح حقیقت کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب ان کے کھلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ بلکہ ہر ایک کے سامنے اس کا انجام موجود ہو گا جس سے کسی کے لیے بھی مفر نہیں ہو گا۔

اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ (۱۹)

نافرمانوں کو ڈھیل دینے کی حکمت

یہ سبب بیان فرمایا ہے اس بات کا کہ کیوں اللہ تعالیٰ نافرمانوں اور شریروں کو اتنی ڈھیل دیتا ہے کہ وہ دلیر ہو کر عذاب اور قیامت کے لیے جلدی مچاتے اور اس کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے۔ وہ رحمت کرنے میں سبقت کرتا ہے، عذاب نازل کرنے میں جلدی نہیں کرتا۔ وہ نافرمانوں کی نافرمانی کے باوجود ان کو رزق دیتا رہتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر توبہ و اصلاح کر لیں اور اپنے رب کی ابدی رحمت کے سزاوار بن جائیں۔

'وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ' اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خدا نہایت ہی قوی و عزیز ہے۔ کسی کی تاب نہیں ہے کہ اس کی پکڑ سے بچ سکے تو جب کوئی اس کی گرفت سے باہر ہے اور نہ باہر ہو سکتا تو وہ جلدی کیوں کرے! جلدی کی ضرورت اسے پیش آتی ہے جس کو اندیشہ ہو کہ شکار اس کے قابو سے باہر نکل جائے گا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ (۲۰)

یہ اسی سنتِ الٰہی کی مزید وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ وہ اپنے رزق و فضل سے انہی کو نوازے جو اس کی بندگی کرنے والے ہوں بلکہ نیکوکاروں اور بدکاروں دونوں کو وہ روزی دیتا ہے

البتہ جو لوگ آخرت کی کھیتی کرتے ہیں اللہ ان کی آخرت کی کھیتی میں بھی برکت دیتا ہے اور اس دنیا کے رزق و فضل میں سے بھی جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو دنیا ہی کے طالب ہوتے ہیں، آخرت کی پروا انھیں نہیں ہوتی تو اللہ ان کو بھی اتنا دے دیتا ہے جتنا اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے۔ البتہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

'نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ' کے بعد 'نُؤْتِهٖ مِنَ الدُّنْيَا' کے الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں۔ تقابل اس حذف پر دلیل ہے اس لیے کہ دوسرے ٹکڑے میں 'نُؤْتِهٖ مِنْهَا' کے الفاظ موجود ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۸-۲۰)	جو دنیا ہی کے طالب ہوتے ہیں ہم ان کو اسی دنیا میں دے دیتے ہیں جو چاہتے ہیں اور جن کے لیے چاہتے ہیں۔ پھر ہم نے ان کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں وہ مذموم و مطرود ہو کر داخل ہوں گے اور جو آخرت کے طالب ہوتے ہیں اور اس کے شایانِ شان جد و جہد کرتے ہیں اور وہ مومن بھی ہیں تو درحقیقت وہ ہیں جن کی سعی مشکور و مقبول ہوگی۔ تیرے رب کی بخشش سے ہم اُن کی بھی مدد کرتے ہیں اور ان کی بھی۔ اور تیرے رب کی بخشش کا دروازہ کسی پر بھی بند نہیں ہے

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات: ۲۱-۳۶

اوپر کے پیرے میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تمام نبیوں اور رسولوں نے اسی دینِ توحید کی تعلیم دی ہے جس کی تعلیم یہ پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دے رہے ہیں۔ اب آگے یہ واضح فرمایا جا رہا ہے کہ اگر ان مشرکین کے مزعومہ شرکاء نے ان کے لیے کوئی الگ دین ایجاد کیا ہے تو یہ دین خدا کے ہاں کام آنے والا نہیں ہے۔ جزائے اعمال کے دن یہ لوگ اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے۔ اس دن کی کامیابی صرف ان لوگوں کا حصہ ہوگی جو ایمان و عملِ صالح کی راہ اختیار کر کے اس دن کے لیے کچھ کمائی کر لیں گے۔

اس کے بعد مخالفین کے تین اعتراضوں کے علی الترتیب جواب دیے ہیں۔

ایک اس اعتراض کا کہ اس جوش و گرمی کے ساتھ یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جو دعوت دے رہے ہیں تو اس لیے نہیں کہ ہماری بہبود ان کو عزیز ہے بلکہ اس میں سراسر ان کی اپنی غرض پوشیدہ ہے۔

دوسرے اس بات کا کہ جو کلام یہ پیش کر رہے ہیں یہ ہے تو تمام تر ان کا اپنا من گھڑت لیکن اپنا رعب جمانے کے لیے یہ اس کو خدا سے منسوب کر رہے ہیں۔

تیسرے اس بات کا کہ اگر ہم اپنی گمراہی پر سزا کے مستحق ہیں تو ہمارے حالات ان کے اور ان کے ساتھیوں کے حالات سے بہتر کیوں ہیں اور جس عذاب سے یہ ہم کو ڈرا رہے ہیں وہ آ کیوں نہیں جاتا؟ ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۱-۲۶ أَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللّٰهُ
وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌ
بِهِمْ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ
لَهُمْ مَّا يَشَاۗءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾
ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ
قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۭ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ
حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْـنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ
افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰي قَلْبِكَ ۭ وَ
يَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ
السَّـيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ
عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ

وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٢٧﴾ وَهُوَ
الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ
الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٢٨﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا
بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ ۭ وَهُوَ عَلٰي جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَاۗءُ قَدِيْرٌ ﴿٢٩﴾ ع ٣
وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ
كَثِيْرٍ ﴿٣٠﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ښ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٣١﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿٣٢﴾
اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰي ظَهْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿٣٣﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ
كَثِيْرٍ ﴿٣٤﴾ وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ
مَّحِيْصٍ ﴿٣٥﴾ فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ
وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ
يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٣٦﴾

ترجمۂ آیات ۲۱-۳۶

کیا ان کے کچھ شریک خدا ہیں جنھوں نے ان کے لیے وہ دین ٹھہرایا ہے جس کا اذن اللہ نے نہیں دیا؟ اور اگر فیصلہ کی مدت طے نہ پا چکی ہوتی تو ان کا فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور بے شک ان ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ تم ظالموں کو اس دن دیکھو گے کہ وہ اپنی کمائی کے وبال سے لرزاں ہوں گے اور وہ ان پر پڑ کے رہے گا۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے وہ بہشتوں کے باغیچوں میں ہوں گے۔

ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے۔ سب سے بڑا فضل درحقیقت یہی ہے۔ یہ چیز ہے جس کی بشارت اللہ اپنے ان بندوں کو دے رہا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے۔ کہہ دو کہ میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب تو ہوں نہیں بس قرابت کا حق ہے جو ادا کر رہا ہوں اور جو شخص کوئی نیکی کرے گا تو ہم اس کے لیے اس میں بھلائی کی افزونی کریں گے۔ بے شک اللہ بڑا ہی بخشنے والا اور بڑی قدر افزائی کرنے والا ہے۔ ۲۱-۲۳

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے! تو اللہ اگر چاہے تو تمہارے دل پر بند لگا دے اور اللہ اپنے کلمات کے ذریعہ سے باطل کو مٹاتا اور حق کو مستحکم کرتا ہے بے شک وہ دلوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور برائیوں سے درگزر فرماتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۲۴-۲۵

اور قبول کرتے ہیں وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور وہ ان کو اپنے فضل میں سے مزید عطا فرمائے گا۔ رہے یہ کافر تو ان کے لیے ایک سخت عذاب ہے۔ ۲۶

اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق کو کھول دیتا تو وہ زمین میں اودھم مچا دیتے بلکہ وہ ایک اندازے کے ساتھ اتارتا ہے جو چاہتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے باخبر اور ان کو دیکھنے والا ہے اور وہی ہے جو اتارتا ہے بارش بعد اس کے کہ لوگ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور وہی حقیقی کارساز اور ستودہ صفات ہے۔ ۲۷-۲۸

اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کیا جانا اور جو اس نے ان کے درمیان جانور پھیلائے ہیں اور وہ ان کے جمع کرنے پر بھی، جب وہ ان کو جمع کرنا چاہے گا قادر ہے۔ ۲۹

اور جو مصیبت بھی تم کو پہنچتی ہے تمھاری کرتوتوں ہی کی بدولت پہنچتی ہے اور تمھاری بہت سی برائیوں سے وہ درگزر بھی فرماتا ہے اور تم نہ زمین میں خدا کے قابو سے نکل سکتے (اور نہ آسمان میں) اور اللہ کے مقابل میں تمھارا نہ کوئی کارساز ہوگا اور نہ مددگار۔ ۳۰-۳۱

اور اسی کی نشانیوں میں سے ہیں سمندروں میں چلنے والے، پہاڑوں کے مانند، جہاز اور اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے پس وہ سمندر کی سطح پر ٹھہرے ہی رہ جائیں۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر صبر و شکر کرنے والے کے لیے۔ یا ان کو تباہ کر دے ان کے اعمال کی پاداش میں اور بہتوں سے درگزر فرمائے اور تاکہ جان لیں وہ لوگ جو ہماری آیات میں کٹ حجتی کر رہے ہیں کہ ان کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔ ۳۲-۳۵

پس جو کچھ بھی تمھیں ملا ہے وہ دنیوی زندگی کی متاع حقیر ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر اور پائدار ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ۳۶

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۱)

'امْ' یہاں استنکار و استعجاب کے مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کا دین، جو اس نے اپنے تمام نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے بھیجا، وہ تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوا تو یہ نیا دین کہاں سے آدھمکا! یہ دین شرک کہاں سے آنکلا

ان کے کچھ شرکاء ہیں جنھوں نے ان کے لیے ایک ایسا دین گھڑ دیا جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ یعنی اللہ کی منظوری کے بدون تو کوئی دین اللہ کا دین نہیں ہو سکتا تو یہ دین کہاں سے آیا؟ اگر ان کے کچھ شرکاء ہیں تو اللہ کا تو کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ محض ان کا وہم ہے۔

'وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ' یہ مضمون اوپر آیت ۱۴ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہ ان کو دھمکی ہے کہ اگر اللہ نے ان کے فیصلہ کے لیے ایک وقت نہ مقرر کر لیا ہوتا تو ان کا قصہ اسی دنیا میں ابھی پاک کر دیا جاتا۔ پس ان کو جو مہلت ملی ہوئی ہے اس سے مغرور نہ ہوں بلکہ اللہ کے شکرگزار رہیں کہ وہ ان کے پکڑنے میں جلدی نہیں کر رہا ہے۔ اگر انھوں نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو یاد رکھیں کہ اس طرح کے ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ 'ظالمین' سے مراد یہاں یہی مشرکین ہیں جنھوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے دین کو چھوڑ کر ایک نیا دین شرک ایجاد کیا اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔

تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ (۲۲)

آخرت میں آدمی کو اپنے اعمال سے سابقہ پیش آئے گا

یعنی آج تو یہ مشرکین اپنے مزعومہ شرکاء کے بل پر آخرت سے نچنت بیٹھے ہیں، سمجھتے ہیں کہ اگر آخرت ہوئی تو ان کے شرکاء ان کی مدد کریں گے، انھیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جب قیامت آجائے گی اور یہ دیکھیں گے کہ یہاں کوئی کسی کا شریک و شفیع نہیں ہے بلکہ ہر ایک کا واسطہ اس کے اعمال سے پڑنے والا ہے تو وہ اپنے اعمال کے وبال سے لرزاں ہوں گے لیکن ان کا یہ لرزاں و ترساں ہونا بالکل بے سود ہوگا۔ ان کے اعمال کا وبال لازماً ان کے سر پر پڑے گا اور کسی تدبیر سے بھی وہ اس کو دفع نہ کر سکیں گے۔

'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ......' البتہ جنھوں نے دیویوں دیوتاؤں پر اعتماد کرنے کے بجائے ایمان و عمل صالح کی زندگی گزاری ہوگی وہ جنتوں کے باغیچوں میں براجمان ہوں گے۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے۔

'رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ' میں 'رَوْضٰت' سے مراد وہ ضمنی باغیچے اور لان ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وسیع جنت میں اہل جنت کی تفریح اور سیر کے لیے بنے ہوں گے۔ 'روضات' بھی ایک سے زیادہ ہوں گے اور جنتیں بھی ایک سے زیادہ ہوں گی اس وجہ سے دونوں جمع کی صورت میں آئے ہیں۔

'ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ' اس ٹکڑے کا صحیح زور سمجھنے کے لیے اوپر آیت ۲۰ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہاں فرمایا ہے کہ اس دنیا کے طالب اپنی خزف ریزوں کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں جو ان کے آگے ڈال دیے گئے ہیں حالانکہ اصلی فضل، جس کا لوگوں کو طالب ہونا چاہیے، یہ ہے جو اللہ قیامت کے دن اپنے باایمان

بندوں پر فرمائے گا۔

ذٰلِكَ الَّذِیْ یُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى ۭ وَمَنْ یَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِیْهَا حُسْنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۲۳)

یہ اس فضلِ عظیم کی عظمت واضح فرمائی ہے کہ اللہ اپنے باایمان بندوں کو ایک ابدی بادشاہی کی بشارت دے رہا ہے تو وہ اس کے لیے جدوجہد کریں اور ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑیں جو اسی دنیا کے خزف ریزوں پر ریجھے ہوئے ہیں۔

قُلْ لَّآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى۔ یہاں استثنا میرے نزدیک منقطع اور ضمناً مصدر کے مفہوم میں ہے جس طرح 'زُلفٰی' اور 'بُشریٰ' وغیرہ اس وزن کے دوسرے الفاظ ہیں۔

قریش کے لیڈروں کو آگاہی

مطلب یہ ہے کہ قریش کے ان بزعمِ خود غلط لیڈروں کو آگاہ کر دو کہ تمھاری تمام ناقدریوں، بے زاریوں اور دل آزاریوں کے باوجود، میں اس طرح جو اپنے رات دن تمھارے پیچھے ایک کیے ہوئے ہوں تو یہ نہ سمجھو کہ اس میں میری کوئی ذاتی غرض پوشیدہ ہے۔ جس کے لیے خدا کی طرف سے اس فضلِ عظیم کی بشارت ہے جس کا اوپر ذکر ہوا وہ بھلا تم سے کسی صلہ و معاوضہ کا طالب کیا ہوگا! میری یہ ساری سرگرمیاں اور بے قراریاں اس وجہ سے ہیں کہ میں اس حقِ قربت و قرابت سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں جو تمھارے اور میرے مابین ہے۔ تم میرے خاندان اور میری قوم کے لوگ ہو اس وجہ سے مجھ پر یہ حق ہے کہ جو ہدایت اور آگاہی خدا کی طرف سے میں لے کر آیا ہوں اس سے سب سے پہلے تم کو آگاہ کروں اور جس رحمت کی منادی کر رہا ہوں اس میں سب سے پہلے تمھیں شریک کرنے کی کوشش کروں۔

حضرات انبیاء کی ایک سنت

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہمیشہ سے یہ سنت رہی ہے کہ انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز اپنے خاندان اور قبیلہ کے لوگوں سے کیا اور جب تک ان سے وہ مایوس نہیں ہو گئے ہیں اس وقت تک انھوں نے دوسروں کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ اسی سنت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اوّل اوّل یہ ہدایت ہوئی کہ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ (الشعراء ۲۶: ۲۱۴) (تم اپنے قریبی خاندان والوں کو آگاہ کرو) آپ کے یہ قریبی قریش تھے جن کو پورے عرب کی دینی و سیاسی پیشوائی حاصل تھی۔ آپ نے سب سے پہلے ان کو انذار کیا اور ان کی تمام تعدّیوں کے باوجود اس وقت تک آپ اس کام میں لگے رہے جب تک انھوں نے اپنی ہٹ دھرمی سے مایوس نہیں کر دیا بالآخر جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آپ کے قتل و اخراج کے مشورے ہونے لگے تب آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مدینہ کو ہجرت فرمائی۔

استاذ امامؒ کا نقطۂ نظر

استاذ امامؒ اس آیت کو ذرا مختلف زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس استثنا کو استدراک کے مفہوم میں لیتے ہیں اور اس آیت کی تاویل سورۂ سبا کی آیت ۴۷ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِیَ

إِلَّا عَلَى اللّٰهِ (کہہ دو کہ میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو تمہارے ہی لیے مانگا ہے۔ میرا اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے) کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ میں جو تمہیں صلۂ رحم، ادائے حقوق اور انفاق کی دعوت دیتا ہوں تو یہ نہ سمجھو کہ یہ میں کوئی ذاتی غرض سامنے رکھ کر کر رہا ہوں بلکہ یہ تمہاری ہی دنیا اور آخرت کی بہبود کے لیے ہے۔ یہ مال تمہارے اغنیاء سے لے کر تمہارے ہی غرباء میں تقسیم کر دیا جائے گا اور اس طرح میں تمہیں مَوَدَّت فی القربیٰ کی راہ دکھا رہا ہوں۔ اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اموالِ زکوٰۃ سے اپنے اور اپنے اقرباء کے لیے کسی قسم کا استفادہ جائز نہیں رکھا تھا تاکہ اس طرح کی بدگمانی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

ان دونوں تاویلوں میں زیادہ بُعد نہیں ہے اس لیے کہ انفاق اور استدراک دونوں ایک ہی نوع کی چیز ہے۔ تاہم دونوں میں کچھ فرق ہے۔ مجھے اگرچہ اپنی تاویل پر زیادہ اطمینان ہے تاہم میں مولاناؒ کی تاویل کو غلط نہیں کہتا۔

مؤلف کا نقطۂ نظر

میرے نزدیک آیت کی صحیح تاویل یہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ عام طور پر لوگوں نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر تو نہیں مانگتا، بس یہ چاہتا ہوں کہ میرے اور تمہارے درمیان جو قرابت ہے اس کی بنا پر میرے ساتھ حسنِ معاشرت کا برتاؤ رکھو۔ اس تاویل میں جو ضعف ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ حسنِ معاشرت کا سوال بھی ایک اجر ہی کا سوال ہے اور سورۂ شعراء میں تمام انبیاء ــــ نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، شعیب علیہم السلام ــــ کی زبان سے بالاتفاق منقول ہے کہ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ (میں تم سے اس چیز پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو بس خداوندِ عالم کے ذمہ ہے) کسی نبی نے بھی اپنی دعوت کے صلہ میں اپنی قوم سے اپنے ساتھ حسنِ معاشرت کی اپیل نہیں کی اس لیے کہ سارا جھگڑا تو دعوت ہی کی بنا پر تھا تو جب نبی کے لیے اس میں کوئی مداہنت برتنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی تو مخالفوں سے حسنِ معاشرت کی اپیل کرنے کے کیا معنی! قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو عناد تھا وہ محض آپ کی دعوت کی بنا پر تھا۔ وہ آپ کی ہر خواہش پوری کرنے اور آپ کا ہر حکم بجا لانے کو تیار تھے بشرطیکہ آپ اپنی دعوتِ توحید سے باز آجائیں لیکن آپ نے صاف صاف فرما دیا کہ میں اس دعوت سے باز نہیں آسکتا۔ اس کے بعد جب قریش کا رویہ مزید سخت ہوا تو آپ نے ان سے حسنِ معاشرت کی درخواست کرنے کے بجائے ان کو صاف الفاظ میں آگاہ کر دیا کہ تمھیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو، مجھے اگر اُحد کے برابر بھی سونا دے دیا جائے جب بھی میں اپنی دعوت سے باز آنے والا نہیں ہوں۔

بعض گمراہ فرقوں نے اس کے یہ معنی لیے ہیں کہ میں اس دعوت پر تم سے بس یہ اجر مانگتا ہوں کہ میرے اقرباء کے ساتھ محبت کرو۔ یہ تاویل آیت کے الفاظ، دوسرے نصوص اور عقل کے بالکل خلاف ہے لیکن

صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جن لوگوں نے یہ تاویل کی ہے انھیں شاید یہ بات بھی یاد نہیں رہی کہ یہ آیت مکی دور کی ہے جب آپ کے خاص اقربا میں اکثر آپ کے جانی دشمن تھے، ان کے لیے لوگوں سے محبت کی اپیل کرنے کے کیا معنی!

قریش کو ایک اہم تنبیہ

وَمَن يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ ۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو یہ بھی بتا دو کہ تمھاری نیکی اور پرہیزگاری سے اللہ کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے کہ تم نے اس کی بندگی نہ کی تو اس کی خدائی میں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے گا بلکہ اس میں سراسر تمھارا ہی نفع ہے اس لیے کہ تم جو چھوٹی بڑی نیکی بھی کرو گے اس میں اللہ افزونی اور بڑھوتری دے گا اور اس کا صلہ تم ایک ابدی بادشاہی کی شکل میں پاؤ گے۔ اللہ بڑا بخشنے والا اور لوگوں کی نیکیوں کی بڑی قدر افزائی فرمانے والا ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی نظر انداز نہیں کرے گا بلکہ اس کی پرورش کر کے اس کو بڑھائے گا اور ایک اجر عظیم کی صورت میں اس کو اپنے بندے کو عطا فرمائے گا۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۖ فَإِن يَشَإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَىٰ قَلْبِكَ ۗ وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۲۴)

ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار

یعنی اگر اس میزانِ عدل (قرآن) کے خلاف انھوں نے یہ فتنہ اٹھایا ہے کہ یہ ہے تو تمھاری ایجاد لیکن محض لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے تم نے اس کو جھوٹ موٹ اللہ سے نسبت دے رکھی ہے تو تمھارے اطمینان کے لیے یہ چیز بس کرتی ہے کہ نہ تم نے اپنی خواہش سے یہ چیز پائی ہے اور نہ اپنی خواہش سے اس کو پا سکتے ہو بلکہ خدا ہی نے اس چشمۂ فیض کو تمھارے اندر جاری کیا ہے اور وہ جب بھی چاہے اس کو روک سکتا ہے۔ یہی مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں یوں گزر چکا ہے۔

وَلَئِن شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ	اور اگر ہم چاہیں تو اس کو سلب کر لیں جو ہم نے
بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ	تمھاری طرف وحی کی ہے۔ پھر تم کسی کو ہمارے
ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا	مقابل میں، اس کو واپس دلانے کے لیے وکیل نہ
وَكِيلًا ۔ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ	پا سکو۔ یہ محض تمھارے رب کا، تمھارے اوپر
إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيرًا	ایک فضل ہے بے شک اس کا فضل تمھارے اوپر
(بنی اسرآءیل: ۸۶-۸۷)	بہت بڑا ہے۔

وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ۔ 'واو' حالیہ ہے اور 'يَمْحُ' کا عطف 'يَخْتِمْ' پر نہیں ہے بلکہ یہ الگ جملہ ہے۔ یہ دراصل 'يَمْحُو' ہے لیکن مصاحف کے رسم الخط میں اس طرح کی 'واو' بعض جگہ ساقط کر دی گئی ہے، مثلاً 'يَدْعُ الْإِنسَانُ' یا 'سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ' وغیرہ۔

مذکورۂ حقیقت کا ایک اور پہلو

یہ اس اوپر والی بات کا دوسرا پہلو ہے کہ جو لوگ اس قرآن کو افترا قرار دیتے ہیں کیا وہ اس کے

اثر کو نہیں دیکھتے کہ اللہ اپنے ان کلمات کے ذریعہ سے باطل کو مٹا اور حق کا اثبات کر رہا ہے۔ افترا ہمیشہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور شیطان کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ باطل کو مٹائے اور حق کو اجاگر کرے بلکہ اس کا کام اس کے بالکل برعکس ہے۔ ذرا مختلف الفاظ میں یہی بات سیدنا مسیح سے ان لوگوں کے جواب میں منقول ہوئی ہے جو آپ پر یہ الزام لگاتے تھے کہ آپ بدروحوں کو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے نکالتے ہیں۔ آپ نے ان معترضین کو یہ جواب دیا کہ اگر میں نے شیطانوں کو شیطان ہی کی مدد سے نکالا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ شیطان خود ہی اپنا دشمن بن گیا۔ یہی بات یہاں ارشاد ہوئی کہ اگر یہ کلام افترا اور اس کا پیش کرنے والا مفتری ہے تو اس کا اثر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی صورت میں نہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس نکلتا تھا۔ دنیا میں کس مفتری نے اس طرح کا فیض بخش اور ارواح و قلوب کو متاثر کرنے والا کلام پیش کیا ہے جس طرح کا کلام یہ قرآن ہے!

مخالفین کو تنبیہ

'إِنَّهُ عَلِيمٌۢ بِذَاتِ ٱلصُّدُورِ' یہ ان کو تنبیہ ہے جو قرآن کو افترا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مفتری قرار دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے یہ فتنہ اٹھایا تھا وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نہ قرآن افترا ہے اور نہ اس کا پیش کرنے والا مفتری ہے۔ ان کو قرآن کی جلالت کا بھی اچھی طرح اندازہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی عظمت کا بھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن حق ہے اور اس کا پیش کرنے والا ایک بے داغ کردار کا انسان ہے لیکن چونکہ وہ قرآن کو اللہ کی کتاب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اس وجہ سے اپنے دل کی آواز کے بالکل خلاف اس طرح کی باتیں گھڑتے اور پھیلاتے تھے۔ ان کی اسی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھمکی دی کہ خدا تمھارے دلوں کے بھیدوں سے اچھی طرح واقف ہے کہ تمھارے دلوں کے اندر کیا ہے اور زبان سے تم کیا کہہ رہے ہو!

وَهُوَ ٱلَّذِى يَقْبَلُ ٱلتَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِۦ وَيَعْفُوا۟ عَنِ ٱلسَّيِّـَٔاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ (۲۵)

توبہ اور اصلاح کی ترغیب

یہ ان لوگوں کو توبہ اور اصلاح کی ترغیب ہے کہ اب بھی موقع باقی ہے کہ تم چاہو تو توبہ و اصلاح کر کے اپنے کو خدا کے غضب سے بچا سکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نہایت ہی مہربان اور اپنے بندوں کے گناہوں سے درگزر فرمانے والا ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ جو تم کر رہے ہو اس سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔ اپنا کوئی جرم بھی اس سے چھپا نہ سکو گے۔

وَيَسْتَجِيبُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّـٰلِحَـٰتِ وَيَزِيدُهُم مِّن فَضْلِهِۦ ۚ وَٱلْكَـٰفِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ (۲۶)

یہ اہلِ ایمان کی روش اور ان کے انجام کو ان کے سامنے رکھا ہے کہ جس طرح انھوں نے اس دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق پائی اور اس کے صلہ میں ان پر دنیا و آخرت میں مزید افضال ہوں گے اسی طرح یہ لوگ بھی

چاہیں تو ان افضال کے سزاوار بن سکتے ہیں ورنہ یاد رکھیں کہ کفار کے لیے خدا کے ہاں سخت عذاب ہے۔ 'اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' یہاں میرے نزدیک مفعول کے محل میں نہیں بلکہ فاعل کے محل میں ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: 'اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ ط وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ' (الانعام: ۳۶) (قبول تو وہی کریں گے جو بات گوشِ دل سے سنتے ہیں۔ رہے مردہ دل تو اللہ ان کو اٹھائے گا ......)۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰکِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ (۲۷)

ایک مغالطہ کی اصلاح

یعنی یہ لوگ اگر اپنی دنیا کی دولت اور ثروت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھے بیٹھے ہیں اور اسی غرّے میں پیغمبرؐ اور اس کے غریب ساتھیوں کو خاطر میں نہیں لا رہے ہیں تو یہ محض ان کی خود فریبی ہے۔ دنیا کی دولت و ثروت کسی کے برحق ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ یہ چیز محض امتحان کے لیے ہے اور اللہ اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق کافر و مومن دونوں کو یہ دیتا اور دونوں کا امتحان کرتا ہے۔ یہ چیز تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ بندوں کے حالات و مصالح سے اچھی طرح باخبر ہے اس وجہ سے اپنی حکمت و مصلحت کے تحت جس کے لیے چاہتا ہے اس کو تنگ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور اس طرح ان کے صبر یا شکر کا امتحان کرتا ہے۔ وہ چاہتا تو اس کے دروازے سب کے لیے نہایت کشادہ کر دیتا کہ لوگ جتنا چاہیں اس میں سے سمیٹ لیں لیکن یہ چیز ان لوگوں کے لیے بہت بڑا فتنہ بن جاتی، لوگ اس کے نشہ میں سرکشی و بغاوت کے راستہ پر چل پڑتے۔ اس فتنہ سے لوگوں کو بچانے کے لیے اللہ نے یہ معاملہ تمام تر اپنے اختیار ہی میں رکھا ہے، وہی اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق جتنا رزق چاہتا ہے اتارتا ہے۔ اگر کسی کو اس نے زیادہ دیا ہے تو وہ اس گھمنڈ میں نہ مبتلا ہو کہ یہ اس کی اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ یا اس کا اور اس کے آباء و اجداد کا حق ہے بلکہ اس رب کا شکر گزار رہے جس کے اختیار میں بخشنا بھی ہے اور بخش کر چھین لینا بھی۔

یہ مضمون آگے والی سورہ ــــ زخرف ــــ میں جو اس کی توام سورہ ہے، اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ ۝ اَهُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّکَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ

اور وہ پوچھتے ہیں کہ یہ قرآن دونوں بستیوں ــــ مکہ یا طائف ــــ کے کسی بڑے سردار پر کیوں نہیں اتارا گیا! کیا تیرے رب کے فضل کے تقسیم کرنے والے یہ ہیں! دنیا میں ان کی معیشت کی تقسیم ہم نے کی ہے اور ان کے درجے ایک دوسرے پر بلند کیے ہیں تاکہ ان میں سے ایک دوسرے کا تعاون حاصل کر سکے اور

دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا ؕ
وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۝
وَلَوْلَآ اَنْ یَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً
لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ
لِبُیُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ
وَّمَعَارِجَ عَلَیْهَا یَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُیُوْتِهِمْ
اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَیْهَا یَتَّكِـُٔوْنَ ۝
وَزُخْرُفًا ؕ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا
مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ
رَبِّكَ لِلْمُتَّقِیْنَ (۳۱-۳۵)

تیرے رب کا فضل ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے جو
وہ جمع کیے ہوئے ہیں۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ
سب ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو ہم ان لوگوں
کے گھروں کی چھتیں، جو خدائے رحمان کا کفر کرتے ہیں،
چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی جن پر وہ چڑھتے۔
اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت بھی
جن پر وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے اور یہ چیزیں سونے
کی بھی بنا دیتے۔ یہ دنیوی زندگی کی چند روزہ متاع
ہے اور آخرت کی کامرانی تیرے رب کے پاس
متقیوں کے لیے ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَهُوَ الْوَلِیُّ
الْحَمِیْدُ - ۲۸

اوپر کی بات پر دلیل — یہ دلیل ہے اس بات کی جو اوپر ارشاد ہوئی ہے کہ اللہ ہی اپنے اندازے کے مطابق بندوں کے لیے رزق اتارتا ہے، نہ بندوں کو اس معاملے میں کچھ اختیار ہے نہ ان کے مزعومہ شرکاء کو۔ فرمایا کہ اللہ ہی اتارتا ہے بارش بعد اس کے کہ لوگ بالکل مایوس ہو جاتے ہیں۔ بارش کا ذکر خاص طور پر اس وجہ سے فرمایا کہ معاش کا تمام تر انحصار اسی پر ہے۔ اور 'مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا' سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان تمام لوگوں کو جن کو اپنی تدبیر، اپنے استحقاق، اپنے وسائل و ذرائع اور اپنے شرکاء و شفعاء پر ناز ہے، اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ آسمان کے بند دریچوں کو کھولنا اس کے خالق کے سوا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی یہ شان اسی لیے وقتاً فوقتاً دکھاتا رہتا ہے کہ کوئی اس غرّے میں نہ مبتلا ہو کر رزق و فضل کسی کی میراث ہے یا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور اس کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

'وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ' - یہ خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ آئے دن کا یہ مشاہدہ اس بات کی دلیل ہے کہ کارسازِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ حمید یعنی ستودہ صفات اور تمام سزاوارِ حمد و شکر کا منبع ہے۔ اس حیاتِ چند روزہ میں وہ ان لوگوں کو بھی اپنے رزق سے محروم نہیں کرتا جو اسی کے رزق پر پلتے اور اسی کو چیلنج کرتے ہیں۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰی جَمْعِهِمْ اِذَا
یَشَآءُ قَدِیْرٌ (۲۹)

ایک اور مغالطے کی اصلاح

یعنی کسی کو یہ مغالطہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ان کو عذاب و قیامت سے جو ڈرایا جا رہا ہے یہ محض دھمکی ہے۔ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ لوگوں کو دوبارہ پیدا کرنے پر بدرجۂ اولیٰ قادر ہے۔ یہ وہی دلیل ہے جو دوسرے مقام میں یوں ارشاد ہوئی ہے ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا (النّٰزعٰت: ۲۷) (کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے، یا اس آسمان کا جس کو بلند کیا)۔

لفظ 'دَآبَّۃٌ' زمین کی جاندار چیزوں کے لیے آتا ہے اس وجہ سے ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ کیا آسمانوں میں بھی اس طرح کی کوئی مخلوق پائی جاتی ہے جس پر 'دَآبَّۃٌ' کا اطلاق ہو سکے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو یہاں 'وَمَا بَثَّ فِیْہِمَا مِنْ دَآبَّۃٍ' میں تثنیہ کی ضمیر کیوں استعمال ہوئی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ لفظ 'سماء' جس طرح آسمان کے لیے آتا ہے اسی طرح اس فضا کے لیے بھی آتا ہے جس میں پرندے پرواز کرتے ہیں۔

اس آیت میں 'بَثَّ' اور 'جمع' کا تقابل بھی نہایت بلیغ اور قیامت کی ایک نہایت دلنشین دلیل ہے 'بثّ' کے معنی چھینٹنے، بکھیرنے اور پھیلانے کے ہیں اور 'جمع' کے معنی اکٹھا کرنے اور سمیٹنے کے۔ اس سے یہ اشارہ نکلا کہ جس نے زمین اور فضا میں یہ تمام جاندار پھیلائے ہیں وہ ان کو جب چاہے گا جمع کرنے پر بھی قادر ہے۔ جب وہ بکھیرنے پر قادر ہوا تو ان کو سمیٹنے سے کیوں قاصر رہے گا۔ جو کسان اپنے کھیت میں تخم ریزی کرتا ہے وہ ضائع کرنے کے لیے تخم نہیں بکھیرتا بلکہ وہ اس کا حاصل ایک دن جمع بھی کرتا ہے اور اس میں اس کو کوئی زحمت نہیں پیش آتی۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ ۝ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۚۖ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (۳۰-۳۱)

شبہ کا ازالہ ایک دوسرے پہلو سے

یہ اسی اوپر والے شبہ کا ازالہ ایک دوسرے پہلو سے ہے۔ فرمایا کہ خدا کے قانونِ مجازات کا تجربہ تو تم اپنی روزمرہ زندگی میں بھی کر سکتے ہو۔ اس دنیا میں تمہیں جو دکھ بھی پہنچتے ہیں وہ تمہارے اعمال ہی کے نتیجے میں پہنچتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ تمہاری بہت سی بداعمالیوں سے درگزر بھی فرماتا ہے۔ یہ دکھ جو تمہیں پہنچتے ہیں تمہاری تنبیہ و تذکیر کے لیے پہنچتے ہیں تاکہ تم اس دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھ کر اس میں لاابالیانہ زندگی نہ گزارو بلکہ ان تنبیہی واقعات سے یہ سبق حاصل کرو کہ اس کا خالق جزا اور سزا دینے والا ہے اور وہ ایک دن تم کو جمع کر کے تم سے ضرور مواخذہ فرمائے گا۔ اگر آج وہ تمہیں ڈھیل دے رہا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ اس کو تمہارے خیر و شر سے کوئی تعلق نہیں یا تمہارے شر ہی کو اس نے خیر کا درجہ دے دیا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے کامل جزا و سزا کے لیے ایک خاص یوم الفصل مقرر کر رکھا ہے جو لازماً آ کے رہے گا۔

'یَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ' میں لفظ 'عفو' درگزر کرنے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں اس کا استعمال جگہ جگہ ہوا ہے۔

فَمَآ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۔ یعنی یہ بھی تم اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ جب اللہ تعالیٰ تم پر اپنی کوئی آفت زمین میں نازل کرتا ہے تو تم اس کے تابر سے باہر نہیں نکل پاتے اور نہ تمہارا کوئی کارساز و مددگار تمہاری بگڑی بنانے یا تمہاری حمایت و مدافعت کے لیے اٹھتا ہے ۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اسی طرح آسمان میں بھی قیامت کے دن، تم کو خدا کی پکڑ سے نہ کوئی شریک و شفیع بچا سکے گا اور نہ کوئی حامی و مددگار۔

یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ خطاب کفار سے ہے جن کو اس دنیا میں جو تکلیفیں بھی پہنچتی ہیں ان کے اعمال کی پاداش ہی میں پہنچتی ہیں ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا خالق جزا اور سزا دینے والا ہے اس وجہ سے وہ ایک ایسا روز جزا ضرور لائے گا جس میں ان کے ان جرائم کی بھی وہ سزا دے گا جن سے اس دنیا میں وہ درگزر کر رہا ہے۔ اس آیت کا تعلق انبیاء اور صدیقین و صالحین سے نہیں ہے۔ ان کو جو مصائب پیش آتے ہیں وہ ان کے اعمال کی سزا کے طور پر نہیں بلکہ ابتلاء کے طور پر پیش آتے ہیں جن سے مقصود ان کے صبر کا امتحان ہوتا ہے اور یہ امتحان ان کے مدارج کی بلندی کا ذریعہ بنتا ہے۔

وَمِنۡ اٰیٰتِہِ الۡجَوَارِ فِی الۡبَحۡرِ کَالۡاَعۡلَامِ ۔ اِنۡ یَّشَاۡ یُسۡکِنِ الرِّیۡحَ فَیَظۡلَلۡنَ رَوَاکِدَ عَلٰی ظَہۡرِہٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ ۔ اَوۡ یُوۡبِقۡہُنَّ بِمَا کَسَبُوۡا وَ یَعۡفُ عَنۡ کَثِیۡرٍ ۔ وَّ یَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا ؕ مَا لَہُمۡ مِّنۡ مَّحِیۡصٍ (۳۲-۳۵)

دنیا کی کامیابی پر مغروروں کے لیے ایک تمثیل

یہ ان لوگوں کے سامنے ایک مثال پیش کی ہے جو اپنی دنیوی کامیابیوں پر مگن ہیں کہ اس دنیا کی زندگی کو کشتی کے سفر کی مانند سمجھو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے کہ پہاڑوں کے مانند بھاری بھاری جہازات سمندر کے سینہ پر دوڑتے پھرتے ہیں ۔ جن لوگوں کی نظر خدا کی قدرت پر نہیں ہوتی وہ جب جہاز کو رواں دواں دیکھتے ہیں تو مگن ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کو کوئی خطرہ بھلا کہاں سے اور کس طرح پیش آسکتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ چاہے تو ہوا کو روک دے اور یہ جہازات اپنے مسافروں سمیت سطح سمندر پر ہی پڑے رہ جائیں یا ان کو ان کے مسافروں سمیت ان کی جگہ ہی پر غرق کر دے اور کوئی ان کو بچانے والا نہ بنے۔ اس تمثیل میں اگرچہ پیش نظر بادبانی جہازات ہیں اس لیے کہ اس وقت تک بادبانی جہازات ہی وجود میں آئے تھے لیکن ٹھیک ٹھیک یہی تمثیل آج کے ترقی یافتہ جہازوں پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ آج سائنس کی ترقیوں نے انسان کو اسٹیم، بجلی اور ایٹم کو کنٹرول کرنے کا سلیقہ سکھا دیا ہے جس سے اس کی طاقت میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے لیکن آج بھی ہم آئے دن بڑے بڑے بحری جہازوں کے متعلق اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ بتاشہ کی طرح پانی میں بیٹھ جاتے ہیں، یا ان کی ساری مشینری اس طرح معطل ہو جاتی ہے کہ ایک لاشہ بے جان کی طرح ان کو دوسرے جہازات گھسیٹ کر ساحل پر پہنچاتے ہیں۔

'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ' یہ اس سبق کی طرف اشارہ ہے جو اس تمثیل میں مضمر ہے۔ فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرتیں پوشیدہ ہیں جو صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے ہیں۔ یعنی جو لوگ زندگی کے حالات و واقعات پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں وہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر کسی کو ناسازگار حالات پیش آئیں تو اس کو مایوس و دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنے رب کے بھروسے پر صبر کرنا چاہیے۔ اس دنیا میں انسان کو جو کچھ پیش آتا ہے خدا کے حکم ہی سے پیش آتا ہے اور خدا کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی کو سازگار حالات میسر آئیں تو اس کو اترانے اور فخر کرنے والا نہیں بن جانا چاہیے بلکہ اپنے رب کا برابر شکر گزار رہنا چاہیے اس لیے کہ بندے کو جو کچھ بھی ملتا ہے خدا ہی کے دیے ملتا ہے اور وہ جس طرح دینے پر قادر ہے اسی طرح چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں ان کو نعمت مغرور اور مصیبت مایوس بنا دیتی ہے وہ کبھی ایمان کی حلاوت سے آشنا نہیں ہوتے۔ آگے اسی سورہ میں اس طرح کے لوگوں کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے۔ 'وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ' (۴۸) (اور جب ہم انسان کو اپنے کسی فضل سے نوازتے ہیں تو وہ اس پر اتراتا ہے اور اگر اس کو اس کے اعمال کی پاداش میں کوئی مصیبت پہنچ جائے تو ناشکرا بن جاتا ہے۔)

'اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ' اس کا عطف اوپر والے جملے 'اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ' پر ہے۔ 'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ ... الاٰیۃ' والا فقرہ بیچ میں، بطور جملہ معترضہ، اس تمثیل کے مقصد کی طرف توجہ دلانے کے لیے آ گیا ہے۔ جملہ معترضہ کے بعد بات پوری کر دی گئی کہ جس طرح وہ قادر ہے کہ ہوا کو روک کر جہازوں کو سطح سمندر ہی پر ساکن کر دے اسی طرح وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ ان کو ان کے مسافروں کے اعمال کی پاداش میں غرق کر دے اور چاہے تو ان میں سے بہتوں کے گناہوں سے درگزر فرمائے اور وہ بھنور سے نکل کر بخیریت ساحل پر پہنچ جائیں۔ ان تینوں میں سے ہر بات اس کے اختیار میں ہے اس وجہ سے اس دنیا میں کسی کے لیے اپنی کسی کامیابی پر مغرور ہونا جائز نہیں ہے بلکہ کامیابی حاصل ہو تو اپنے رب کا شکر گزار رہنا چاہیے۔ اور کوئی افتاد پیش آئے تو اس کو اپنی کسی کوتاہی کا نتیجہ سمجھ کر صبر کرنا چاہیے اور اللہ سے خیر کی امید رکھنی چاہیے۔

حذف کی ایک مثال

'وَيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ' یہاں 'یعلم' حالت نصب میں ہے اس وجہ سے اس کا معطوف علیہ محذوف ماننا پڑے گا۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آ رہی ہیں۔ مثلاً 'وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ' (الجاثیۃ: ۲۲) (اور آسمانوں اور زمین کو اس نے غایت کے ساتھ پیدا کیا تاکہ وہ ایک روزِ عدل لائے)

اور تاکہ ہر جان کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے) اسی اصول پر یہاں کوئی مناسب تعلیل محذوف ماننی پڑے گی۔ گویا پوری بات یوں ہوگی کہ تاکہ اللہ ان سے انتقام لے اور تاکہ آیاتِ الٰہی میں کٹ حجتی کرنے والوں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ان کے لیے خدا سے بھاگ سکنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے آیا ہے۔ ہم ایک نظیر سورۂ یونس سے پیش کرتے ہیں فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ	وہی ہے جو تم کو سفر کراتا ہے خشکی اور تری میں۔
وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي	یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ سازگار
الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ	ہواؤں سے چلتی ہیں اور وہ مگن ہوتے ہیں، آپڑتی
وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ	ہے ان پر بادِ تند اور اٹھنے لگتی ہیں ان پر موجیں
وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَ	ہر جانب سے اور وہ گمان کرتے ہیں کہ اب ہلاک
ظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللَّهَ	ہوئے۔ اس وقت وہ اللہ کو پکارتے ہیں، اسی
مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ	کی خالص اطاعت کا عہد کرتے ہوئے کہ اگر تو نے
أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ	ہمیں اس ورطۂ ہلاکت سے نجات بخشی تو ہم تیرے
الشَّاكِرِينَ ۔ فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ	شکر گزار بندے بن کے رہیں گے۔ پس جب وہ
يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ	ان کو نجات دے دیتا ہے وہ پھر زمین میں بلا کسی
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنفُسِكُم ۖ	حق کے سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمہاری
مَّتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ إِلَيْنَا	سرکشی کا وبال تمہارے ہی اوپر پڑنے والا ہے۔
مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ	اس دنیا کی چند روزہ متاع سے فائدہ اٹھا لو۔
تَعْمَلُونَ (یونس: ۲۲-۲۳)	پھر ہم تم کو بتائیں گے جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔

فَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (۳۶)

خلاصۂ بحث

یہ آخر میں اوپر والی بحث کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ یہ دنیا کی جو نعمتیں تمہیں ملی ہیں، اترانے اور فخر کرنے کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ اس حیاتِ چند روزہ کی متاع ہیں۔ ایک دن بالآخر یہ زندگی بھی ختم ہو جائے گی اور اس کا یہ سروسامان بھی۔ البتہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے کہیں بہتر اور ابدی ہے جو ان لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حوصلہ ہے تو اس کے چاہنے والے بنو۔ اس دنیا کی متاعِ حقیر کے پیچھے کیوں اپنی عاقبت برباد کر رہے ہو۔

یہاں وَ عَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ کے الفاظ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جو لوگ آخرت کی ابدی بادشاہی کے طالب ہوں ان کے لیے اس راہ میں اصلی زادِ راہ توکل ہے۔ جب تک کسی کے اندر یہ حوصلہ نہ ہو کہ اس دنیا کی جو چیزیں خدا کی راہ میں مزاحم ہوں ان کو خدا کے بھروسہ اور آخرت کے صلہ کے اعتماد پر طلاق دے سکے اس وقت تک کوئی شخص یہ ابدی بادشاہی حاصل نہیں کر سکتا۔

۶۔ آگے کا مضمون ــــ آیات: ۳۷-۴۳

آگے کی آیات میں مذکورہ بالا اجر کے مستحقین کی کچھ اور صفتیں بیان فرمائی ہیں جن سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو مسلمان اس دور میں قریش کے مغروروں کے ہاتھوں ہر قسم کے مظالم کا ہدف بنے ہوئے تھے یہاں تک کہ ان کے مظالم سے تنگ آ کر اپنے گھر در چھوڑنے پر مجبور ہو رہے تھے، وہی اس کے اصلی حق دار ہیں۔ یہ سورہ، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، ہجرت کے بالکل قریب نازل ہوئی ہے اس وجہ سے ان صفات کے بیان کا انداز کچھ اس طرح کا ہے جس میں مسلمانوں کے لیے فتح باب کی بشارت بھی ہے اور آگے کے مراحل میں ان کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں سے متعلق بعض ضروری ہدایات بھی۔ گویا ہجرت سے پہلے ہی ان کو یہ بتا دیا گیا کہ اب تک وہ منتشر افراد کی صورت میں تھے لیکن اب اللہ تعالیٰ ان کو ایک ہیئتِ اجتماعی و سیاسی میں منظم کرنے کی شکل پیدا کر رہا ہے۔ اب تک وہ مظلوم تھے لیکن اب وقت آ رہا ہے کہ وہ اپنی مدافعت کی قوت بھی حاصل کریں گے اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے مجاز بھی ہوں گے ــــ ان پیش آنے والے حالات میں ان کو کیا رویہ اختیار کرنا ہے اس کی طرف ان آیتوں میں رہنمائی کی گئی ہے لیکن اس رہنمائی کا انداز امر و حکم کا نہیں بلکہ ایمان اور توکل کے لازمی مقتضیات کے بیان کا ہے ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۳۷-۴۳

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ

الظّٰلِمِيْنَ ۝٤٠ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ مَا عَلَيْهِمْ
مِّنْ سَبِيْلٍ ۝٤١ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَي الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ
وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ
ع ۴ ۵ اَلِيْمٌ ۝٤٢ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝٤٣

ترجمۂ آیات ۳۷-۴۳

اور وہ بچتے ہیں بڑے گناہوں اور کھلی ہوئی بے حیائیوں سے اور جب غصہ ہوتے ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں اور وہ جنھوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہی اور نماز کا اہتمام کیا اور ان کا نظام شوریٰ پر ہے اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ۳۷-۳۸

اور وہ کہ جو انتقام لیتے ہیں اس وقت جب ان پر تعدی ہوتی ہے اور کسی برائی کا بدلہ اس کے برابر کے عمل سے ہے۔ پس جس نے درگزر کی اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جنھوں نے اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیا تو ان کے اوپر کوئی الزام نہیں۔ الزام ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں بغیر کسی حق کے سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۳۹-۴۲

اور جس نے صبر کیا اور معاف کیا تو بے شک یہ عزیمت کے اوصاف میں سے ہے۔ ۴۳

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (۳۷)

برائیوں کے تین عنوان

یعنی یہ ان لوگوں کی طرح نہیں ہیں جو خدا کی نعمتیں پا کر ظلم، بے حیائی اور بغی و طغیان میں مبتلا ہو گئے ہیں بلکہ وہ حق تلفی، بے حیائی اور غصہ و انتقام کی قسم کے تمام بڑے جرائم سے اجتناب کرنے والے ہیں۔ اس اسلوب بیان میں مخالف گروہ پر جو تعریض ہے وہ وضاحت کی محتاج نہیں ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہاں تمام برائیوں کو تین عنوانوں کے تحت سمیٹ دیا گیا ہے: اثم، فحشاء اور غضب ۔۔۔

اثم سے مراد وہ برائیاں ہیں جو حق تلفی، ناانصافی اور ظلم کی نوعیت کی ہوں۔ فحشاء سے وہ برائیاں مراد ہیں جو شہوات اور خواہشات نفس کی راہ سے ابھرتی ہیں۔ غضب، انانیت، خودسری اور استکبار سے وجود میں آتا ہے اور طغیان و فساد اور بغی و جبر کو جنم دیتا ہے۔

یہاں ان برائیوں کے صرف کبائر سے بچتے رہنے کا ذکر ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان خیر و شر کے دو متضاد داعیات کی کشمکش کے اندر امتحان میں ڈالا گیا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ اس سے یہ نہیں ہے کہ وہ بالکل معصوم ہو کر زندگی گزارے۔ اگر یہ بوجھ اس پر ڈالا جاتا تو یہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صرف یہ چاہا ہے کہ وہ بڑے گناہوں سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔ اگر وہ بڑی برائیوں سے بچتا رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی چھوٹی غلطیوں سے درگزر فرمائے گا۔

دوسری یہ کہ چھوٹی برائیوں سے بچنے کا بھی صحیح طریقہ یہی ہے کہ آدمی بڑی برائیوں سے اجتناب کرے۔ جو شخص بڑی بڑی امانتیں ادا کرتا ہے اس کا ضمیر اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ وہ کسی کی چھوٹی سی امانت میں خیانت کر کے خائن کہلانے کا ننگ گوارا کرے۔ اسی طرح اللہ کا جو بندہ بڑی برائیوں سے اپنے کو بچاتا ہے وہ یہ نہیں پسند کرتا کہ چھوٹی چھوٹی برائیوں کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اجر کو برباد کرے۔ جو شخص اشرفیوں کی چوری سے اجتناب کرے گا وہ دھیلے اور پیسے کی چوری کرنے والا نہیں بنے گا۔ اگر اس طرح کی کوئی حرکت اس سے صادر ہو گی بھی تو سہواً ہی ہو گی، عمداً نہیں ہو گی۔ البتہ جو لوگ مچھر کو چھانتے ہیں ان کو اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اونٹ کو نگل جانے والے ہوتے ہیں۔

'وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ' کے اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک غصہ کے آنے کا تعلق ہے وہ تو ان کو آتا ہے اس لیے کہ غصہ انسان کی حمیت، غیرت اور عزت نفس کا ایک فطری تقاضا ہے لیکن یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس غصہ سے بے قابو ہو کر اپنی عقل سے دست بردار اور خدا کے حدود سے متجاوز ہو جائیں بلکہ وہ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھتے ہیں اور ان لوگوں کو معاف کر دیا کرتے ہیں جن کی حرکتیں اگرچہ غصہ دلانے والی ہوتی ہیں لیکن مختلف وجوہ سے وہ مستحق ہوتے ہیں کہ ان سے درگزر کی جائے۔ اس میں درپردہ مسلمانوں کو اس بات کی تلقین بھی ہے کہ ہرچند تمہارے دشمنوں کا رویہ نہایت اشتعال انگیز ہے لیکن ابھی یہی بہتر ہے کہ ان سے درگزر کرو

یہاں تک کہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔ آگے کی آیات میں اس کی وضاحت آ رہی ہے۔ یہاں ضمیر 'ھُمْ' کے اظہار سے جملہ میں یہ زور پیدا ہو گیا ہے کہ اگرچہ یہ کام ہے نہایت کٹھن لیکن مستحقِ آفرین ہیں وہ لوگ جو یہ کڑوے گھونٹ حلق سے اتارتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ص وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ ص وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (۳۸)

وہ صفات جن سے مذکورہ خوبیاں پیدا ہوئی ہیں

یہ ان صفات کا بیان ہے جن سے ان کے اندر وہ خوبیاں پیدا ہوئی ہیں جن کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ انھوں نے اپنے رب کی اس دعوت پر لبیک کہی ہے جو اس کے رسول کے واسطہ سے ان کو پہنچی ہے۔ قریش کے متکبرین کی طرح انھوں نے اس کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی اسی خوبی کی طرف اوپر آیت ۲۶ میں اشارہ فرمایا ہے 'وَیَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَیَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ' (اور اس کو قبول کر رہے ہیں وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور اللہ ان کے لیے اپنے فضل میں افزونی فرمائے گا)۔

ایمان کا اولین مظہر نماز ہے

'وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ' یہ اس قبول کرنے یا بالفاظِ دیگر ان کے ایمان کے اوّلین مظہر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ دین کی اس حقیقت کا اظہار اس کتاب میں ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں کہ ایمان کا سب سے پہلا عملی مظہر نماز ہے۔ یہی اس کا اوّلین مظہر بھی ہے اور پھر اسی سے دوسری نیکیاں ظہور میں بھی آتی اور اسی سے پروان بھی چڑھتی ہیں۔ اس وجہ سے جس نے نماز کا اہتمام نہیں کیا اس نے گویا ایمان کی دعوت بھی قبول نہیں کی۔ اگر وہ ایمان کا مدعی ہے تو اس کا یہ دعویٰ محض خود فریبی ہے۔

یہاں اس حقیقت پر بھی نظر رہے کہ 'اَقَامُوا الصَّلٰوةَ' کا مفہوم صرف نماز پڑھنا ہی نہیں بلکہ نماز کا اہتمام کرنا بھی ہے۔ یعنی وہ نماز پڑھتے بھی ہیں اور یہ اہتمام بھی کرتے ہیں کہ دوسرے بھی نماز پڑھیں۔ یہی نماز اور اہتمامِ نماز ان کی جماعتی زندگی کی خصوصیت اور اس دنیا میں ان کا اصلی امتیاز ہے۔ یہی نماز ان کو سکھاتی ہے کہ ان کو دنیا میں اپنے رب کی بندگی اور اس کے دین کی اقامت کے لیے کس طرح بنیانِ مرصوص بن کر زندگی گزارنی ہے اور یہی نماز اس فحشاء اور منکر سے ان کو روکتی ہے جن سے اجتناب کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ نماز کی اس حقیقت کی طرف دوسرے مقام میں یوں اشارہ فرمایا گیا ہے 'اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ' (نماز بے حیائی اور ناروا باتوں سے روکتی ہے) ——— اس میں بھی قریش کے لیڈروں پر تعریض ہے کہ نماز تو انھوں نے برباد کر دی لیکن اس کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے اس گھر کے وارث ہونے کے مدعی ہیں جو نماز اور اہتمامِ نماز کے ایک مرکز کی حیثیت سے تعمیر ہوا تھا۔

[illegible]

'وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ' ——— 'شُوْرٰى' مصدر ہے 'فُتْیَا' کے وزن پر اور اس کے معنی آپس میں مشورہ کرنے

کیے ہیں۔ لفظ "امر" عربی میں ہمارے لفظ "معاملہ" کی طرح بہت وسیع معنوں میں آتا ہے۔ اس کے صحیح مفہوم کا تعین موقع و محل اور سیاق و سباق سے کرتے ہیں۔ یہاں قرینہ پتہ دے رہا ہے کہ یہ لفظ جماعتی نظم کے مفہوم میں آیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کا جماعتی اور سیاسی نظم خودسری، انانیت، خاندانی برتری، نسبی غرور پر مبنی نہیں ہے بلکہ اہل ایمان کے باہمی مشورہ پر مبنی ہے۔ اس میں قریش کے نظم سیاسی و اجتماعی پر جو تعریض ہے وہ محتاج وضاحت نہیں ہے اس لیے کہ ان کا نظمِ اجتماعی تمام تر خاندانی اور نسبی امتیاز پر قائم تھا۔ اسلام کی مخالفت کا ایک بڑا سبب ان کے لیے یہ بھی تھا کہ وہ اس دعوت کے فروغ پانے کی صورت میں اپنے اس جاہلی نظام کی موت سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس آیت میں ایک طرف تو مسلمانوں کو یہ بشارت دے دی کہ ان کے لیے ایک ہیئتِ اجتماعی و سیاسی کی تشکیل میں منظم ہونے کا وقت آگیا اور یہ نظمِ اجتماعی نسب اور خاندان کی اساس کے بجائے اہل ایمان کے باہمی مشورہ پر مبنی ہوگا، دوسری طرف در پردہ قریش کے لیڈروں کو یہ آگاہی بھی دے دی کہ اب تم خواہ کتنا ہی زور اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں صرف کرو لیکن انہی کمزور و مظلوم مسلمانوں کے ہاتھوں وہ نیا نظام آرہا ہے جو تمہارے اس فاسد نظام کی بساط الٹ کر رکھ دے گا۔

شوریٰ کی اہمیت کا ایک خاص پہلو

یہاں شورائی نظام کی خصوصیات اور اس کے اصول و مبادی پر بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ہم اپنی کتاب ـــ اسلامی ریاست ـــ کی ایک مستقل فصل میں کر چکے ہیں۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔ البتہ ایک سوال یہاں قابلِ غور ہے کہ قرآن کا معروف اسلوبِ بیان تو یہ ہے کہ وہ نماز کے ساتھ بالعموم زکوٰۃ یا انفاق کا ذکر کرتا ہے لیکن یہاں اس معروف طریقہ کے خلاف نماز اور انفاق کے بیچ میں "شوریٰ" کا ذکر آگیا ہے۔ آخر شوریٰ کی اہمیت کا وہ خاص پہلو کیا ہے جس کی بنا پر اس کو نماز کے پہلو میں جگہ دی گئی؟

اسلام کا نظمِ اجتماعی نماز کی صورت میں متشکل کیا گیا

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے نظمِ اجتماعی کی روح اور اس کے قالب کی اصلی تشکیل نماز میں محفوظ کی گئی ہے۔ اسی کے اندر مسلمانوں کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ان کو اللہ کی بندگی کے لیے ایک بنیانِ مرصوص بن کر کھڑے ہونا ہے، کس طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ علم و تقویٰ والے کو اپنی امامت کے لیے منتخب کرنا ہے، کس طرح لوگوں کو حدودِ الٰہی کے اندر اس امام کی بے چون و چرا اطاعت کرنی ہے، اور کس طرح امام اس بات کا پابند ہے کہ لوگوں کو کسی ایسی بات کا حکم نہ دے جو اللہ اور رسول کے کسی حکم کے خلاف ہو اور کس طرح اس کے ایک ادنیٰ مقتدی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ کوئی غلطی کرے تو وہ اس کو ٹوک دے یہاں تک کہ عین نماز کے اندر بھی رکوع، سجود، قیام، قعود یا تلاوت میں کوئی ادنیٰ فروگزاشت بھی اس سے صادر ہو جائے تو اس کے پیچھے ہر نماز پڑھنے والا اس کو متنبہ کرنے کا ذمہ دار ہے اور امام کا یہ فرض ہے کہ اگر مقتدی کی تنبیہ مطابقِ شریعت ہے تو وہ اس کو قبول اور اپنی غلطی کی فوراً اصلاح کرے۔ گویا اس طرح ہمارا پورا نظمِ اجتماعی نماز کی صورت میں متشکل کر کے ہمیں یہ دکھایا گیا

کہ ہم اپنی سیاسی تنظیم میں اسی نمونہ کی پیروی کریں۔ اسی طرح اللہ کے دین کی اقامت کے لیے اپنی تنظیم کریں، اسی طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ اہل اور صاحبِ علم و تقویٰ کو اپنی قیادت کے لیے منتخب کریں، اسی طرح تمام معروف میں بے چون و چرا اس کی اطاعت کریں اور اگر اس سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو شریعت کے معروف کے خلاف ہو تو بے خوف لومۃ لائم اس کو متنبہ کر کے اس کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کریں۔

نماز اور ہمارے سیاسی نظام کا یہ تعلق ہے جس کے سبب سے قرآن نے ٹھیک اس وقت جب مسلمان ایک ہیئتِ اجتماعی کی شکل اختیار کرنے والے تھے، ان کی رہنمائی شوریٰ کی طرف فرمائی اور اس شوریٰ کا ذکر نماز کے پہلو بہ پہلو کر کے ایک طرف تو اس کی عظمت نمایاں فرمائی کہ دین میں اس کا کیا درجہ و مرتبہ ہے اور دوسری طرف اس کی تشکیل کی نوعیت بھی واضح فرما دی کہ اس میں امیر و مامور کے حقوق و فرائض کی صورت کیا ہو گی، کس طرح کے لوگ اس کی رکنیت کے لیے موزوں ہوں گے، جماعت اور خلقِ خدا سے متعلق ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوں گی اور ان کی اصلی مسئولیت کس کے آگے ہو گی۔

شوریٰ کی اہمیت اور نماز کے ساتھ اس کے تعلق کا یہی پہلو تھا کہ عہدِ رسالت اور خلفائے راشدین کے دور میں اس کا انعقاد مسجد ہی میں ہوتا تھا۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق تو سیرت کی کتابوں میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ وہ شوریٰ کے انعقاد کا اعلان 'الصلوٰۃ جامعۃ' کے الفاظ سے کراتے تھے، یعنی اہلِ شوریٰ نماز کے لیے جمع ہوں۔ جب اہلِ شوریٰ مسجد میں جمع ہو جاتے تو وہ دو رکعت نماز ادا کرتے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ نماز پڑھتے تھے تو دوسرے اہلِ شوریٰ بھی ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے رہے ہوں گے۔ نماز اور دعا کے بعد حضرت عمرؓ مسئلہ زیرِ بحث پیش کرتے اور اہلِ شوریٰ اس پر اپنی رایوں کا اظہار کرتے اور خلیفہ کی رہنمائی میں کسی متفق علیہ نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔

یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے حصول کے پہلو سے بھی نہایت بابرکت ہے اور اسلام کے نظمِ سیاسی کی اصل روح کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے بھی۔ لیکن اس دور میں مسلمانوں نے دوسری قوموں کی تقلید میں شورائی نظام کی جگہ نظام بھی دوسرے اختیار کر لیے اور مسجدوں سے بھی ان کا تعلق بالکل منقطع ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہو گئے اور ان کی باگ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اب پارلیمنٹوں کے ایوانوں میں جو دھینگا مشتی ہوتی ہے اس کی مثال بازاروں میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

'وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ'۔ نماز کے ساتھ انفاق یا زکوٰۃ کے تعلق پر اس کتاب میں جگہ جگہ مفصل بحث ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا ایک ستون تو یہ ہے کہ اس کی نماز پڑھی جائے

اور اس کا دوسرا ستون یہ ہے کہ اس کے بخشے ہوئے رزق میں سے اس کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ پہلی چیز بندے کا تعلق اس کے خالق سے استوار کرتی ہے۔ دوسری چیز خلق سے اس کو جوڑتی ہے۔ اور انہی دونوں اساسات پر تمام شریعت قائم ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (۳۹)

اوپر آیت ۳۷ میں یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ 'وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ' یہ اسی پر ایک قسم کا استدراک ہے کہ اوّل تو وہ مخالفوں کی غصہ دلانے والی باتوں سے درگزر کرتے ہیں اور اگر کوئی جوابی کارروائی کرتے بھی ہیں تو اُس وقت جب ان پر کوئی صریح زیادتی کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی تعدّی کے دفاع اور اس کے انتقام کا حق ہر شخص کو حاصل ہے اور اس حق سے وہ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن یہ نہیں ہے کہ ہر بات کو کسی اقدام کا بہانہ بنا لیں بلکہ وہ بدلہ لیتے ہیں تو کسی 'بغی' کا لیتے ہیں۔ 'بغی' مخالف کی کسی کھلی ہوئی تعدّی، سرکشی اور زیادتی کو کہتے ہیں۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (۴۰)

پھر یہ کہ بدلہ لیتے بھی ہیں تو یہ نہیں کرتے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کریں۔ انتقام میں
بلکہ وہ اس معاملے میں بھی پورا توازن قائم رکھتے ہیں۔ جواب میں صرف اتنی ہی کارروائی کرتے ہیں توازن
جو برائی کے ہم وزن ہو۔

کوئی انتقامی کارروائی کوئی برائی نہیں ہے بلکہ قصاص ہے لیکن یہاں اس کو 'سَيِّئَةٌ' کے لفظ سے عربی زبان کے اس اسلوب کے مطابق تعبیر کیا گیا ہے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے کہ بعض اوقات الفاظ مجانست کے اصول پر استعمال ہوتے ہیں، مثلاً 'دِنَّا هُمْ كَمَا دَانُوْا' ظاہر ہے کہ اس میں 'كَمَا دَانُوْا' بالکل 'كَمَا فَعَلُوْا' کے معنی میں ہے لیکن محض ہم آہنگی کے پہلو سے 'كَمَا فَعَلُوْا' کی جگہ 'كَمَا دَانُوْا' استعمال ہوا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کسی کے خلاف انتقامی کارروائی میں بھی کسی ایسے فعل کا ارتکاب جائز نہیں ہے جو شریعت میں ہر شکل ممنوع ہے۔

'فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ' یعنی ہر چند اس بات کا حق تو ہر شخص کو حاصل ہے انفرادی معاملات
کہ اس پر تعدّی کی گئی ہے تو وہ تعدی کے بقدر انتقام لے لے لیکن اس سے اعلیٰ رویہ ان لوگوں میں پسندیدہ روش
کا ہے جو درگزر کریں اور معاملہ کو اصلاح کی راہ سے طے کرنے کی کوشش کریں۔ اصلاح کی راہ اصلاح کی ہے
اختیار کرنے میں اگرچہ جذبات کی قربانی کرنی پڑتی ہے لیکن اس کا اجر بہت بڑا ہے جس کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام انفرادی واقعات میں زیادہ پسند اللہ تعالیٰ کو اصلاح ہی

کا طریقہ ہے، خواہ دونوں فریق خود باہمدگر اصلاح و تلافی کی کوشش کریں یا دوسروں کو اس کا ذریعہ بنائیں یا دوسرے از خود بیچ میں پڑ کر مصالحت کرادیں۔

انتقام صرف بقدر تعدی جائز ہے

'اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ'۔ یہ ایک جامع تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی پر تعدی کرے تو وہ بھی اللہ کے نزدیک مبغوض اور اگر کوئی کسی کی تعدی کا جواب اس سے بڑھ کر تعدی سے دینے کی کوشش کرے تو وہ بھی مبغوض۔ پسندیدہ روش اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ تعدی کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور اگر یہ نہیں تو بقدر تعدی اس کا انتقام لے لیا جائے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۴۱-۴۲)

'بَعْدَ ظُلْمِهٖ' میں مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے جس طرح سورۂ روم کی آیت 'وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ' (۳) میں ہے۔

ان لوگوں کے شبہ کا جواب جو انتقام کو دینداری کے خلاف سمجھتے ہیں

یہ ان لوگوں کے شبہ کا جواب ہے جو دینداری کا ایک تقاضا یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آدمی دوسروں کے ہاتھوں پٹتا رہے اور ان سے کوئی انتقام نہ لے۔ اگر کوئی انتقام لے تو یہ چیز دینداری کے خلاف سمجھی جاتی ہے اور اس کو بھی برابر کا مجرم سمجھ لیا جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس طرح کے معاملات میں الزام ان لوگوں پر نہیں ہے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیے جانے کے بعد انتقام لیا بلکہ الزام ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور بلا کسی استحقاق کے خدا کی زمین میں سرکشی اور طغیان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

'بِغَيْرِ الْحَقِّ' یعنی زمین کا خالق اور مالک تو خدا ہے، ان کا کوئی دخل نہ اس کی تخلیق میں ہے نہ تدبیر میں؛ لیکن ان کا مطالبہ یہ ہے کہ کوئی ان کے آگے سر اٹھا کے نہ چلے۔ فرمایا کہ اصل مجرم یہ لوگ ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اگر ان کے جواب میں مظلوموں کو بھی کوئی اقدام کرنا پڑے تو اس کی مسئولیت ان مظلوموں پر نہیں بلکہ ان ظالموں ہی پر ہے جنھوں نے اس کی طرح ڈالی۔ سورۂ مائدہ کی آیت 'اِنِّىْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ' (۲۹) کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۴۳)

خلاصۂ بحث

یہ آیت یہاں خلاصۂ بحث کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے کئی باتیں واضح ہوئیں۔

ایک یہ کہ اگرچہ تعدی کے بقدر انتقام کا حق ہر شخص کو حاصل ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعلیٰ یہی ہے کہ لوگ صبر اور درگزر سے کام لیں۔

دوسری یہ کہ یہ درگزر صرف وہی لوگ کر سکیں گے جن کے اندر صبر کی خصلت ہوگی۔ جن کے اندر یہ صفت نہیں ہے وہ یہ بازی نہیں کھیل سکیں گے۔ اس وجہ سے لوگوں کو اپنے اندر صبر کی صفت راسخ کرنی چاہیے۔

تیسری یہ کہ یہ کردار عزیمت کا کردار ہے۔ جو لوگ یہ کردار اپنے اندر پیدا کریں گے وہ اربابِ عزیمت میں ہیں۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ ان باتوں کی طرف مسلمانوں کی رہنمائی ان حالات کے مقابلے کے لیے کی گئی ہے جن سے وہ قریش کے ہاتھوں قربِ ہجرت کے زمانے میں دوچار تھے اس وقت تک مسلمان نہ تو ایک منظم سیاسی طاقت بنے تھے اور نہ ابھی قریش پر دین کی حجت ہی پوری طرح تمام ہوئی تھی۔ ہجرت کے بعد جب مسلمان ایک منظم طاقت بن گئے اور قریش پر حجت تمام ہوگئی تو مسلمانوں کو من حیث الجماعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ اب مسلمان ان سے کلیۃً اپنے تمام روابط منقطع کرلیں اور اس وقت تک ان سے جنگ جاری رکھیں جب تک یہ اسلام کے آگے سپر نہ ڈال دیں۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــ آیات: ۴۴-۵۰

آگے کی آیات کا تعلق اوپر آیت ۳۶ کے مضمون سے ہے۔ وہاں سلسلۂ کلام اس بات تک پہنچا تھا کہ یہ مخالفین جس زندگی پر ریجھے ہوئے ہیں یہ تو چند روزہ ہے، اصلی دولت جاودان ان اہلِ ایمان کے لیے ہے جو اس دنیا کی چند روزہ زندگی کی جگہ آخرت کی کامرانیوں کے لیے بازی کھیل رہے ہیں۔ اس کے بعد چند آیات میں اہلِ ایمان کا کردار بیان ہوا تاکہ کلام مطابقِ حال ہو جائے اور اس وقت کے مسلمانوں پر یہ واضح ہو جائے کہ یہ بشارت انہی کے لیے ہے۔ اور ان کے مخالفوں پر بھی واضح ہو جائے کہ آج جو لوگ ان کے ہاتھوں مظلوم ہیں اب ان کے لیے فتح باب کا وقت قریب ہے۔

اس کے بعد اوپر کے سلسلۂ مضمون کو از سرِ نو لے لیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے تسلی دی کہ جو لوگ خدا کے قانون کی زد میں آئے ہوئے ہیں ان کو کوئی دوسرا ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ ان لوگوں کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب پانی سر سے گزر جائے گا۔ پھر آخری تنبیہ کے طور پر مخالفین کو یاد دہانی کی کہ اب بھی موقع ہے اگر سنبھلنا ہے تو سنبھل جاؤ۔ یہ وقت نکل گیا تو پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ ساتھ ہی ان کے اصل سببِ غرور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح فرمائی ۔ جس کو جو کچھ بھی ملتا ہے خدا ہی کی عنایت سے ملتا ہے

لیکن انسان بڑا ہی ناشکرا ہے کہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو خدا ہی سے بغاوت کا ذریعہ بنا لیتا ہے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَتَرَى
الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ
سَبِيْلٍ ﴿۴۴﴾ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ
يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ
الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ
الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ
يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ
سَبِيْلٍ ﴿۴۶﴾ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ
لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا
لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ
اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً
فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ
فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿۴۸﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ
يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ
يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

ترجمۂ آیات ۴۴-۵۰

اور جس کو خدا گمراہ کر دے تو اس کے بعد اس کا کوئی کارساز نہیں بن سکتا اور

تم ان ظالموں کو دیکھو گے کہ جب وہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو کہیں گے ، ہے کوئی راہ دنیا میں پھر واپس جانے کی ! اور تم ان کو دیکھو گے کہ وہ دوزخ کے سامنے اس طرح لائے جائیں گے کہ وہ ذلت سے جھکے ہوئے ، کن انکھیوں سے دیکھتے ہوں گے ، اور اہل ایمان کہیں گے کہ حقیقی خاسر وہی ہیں جنھوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے لوگوں کو خسارے میں ڈالا ! آگاہ کہ یہ ظالمین ایک دائمی عذاب میں پڑیں گے ! اور وہاں ان کے اولیاء میں سے کوئی بھی نہیں ہوگا جو خدا کے مقابل میں ان کی کوئی مدد کر سکے - اور جس کو خدا گمراہ کر دے تو پھر اس کے لیے کوئی راہ نہیں ہے ! ۴۴ - ۴۶

اور اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہو قبل اس کے کہ اللہ کی طرف سے ایک ایسا دن آ دھمکے جو ٹالا نہ جا سکے گا - اس دن تمھارے لیے نہ کوئی پناہ ہوگی اور نہ تم کسی چیز کو رد کر سکو گے - ۴۷

اگر وہ اعراض کریں تو ہم نے تم کو ان پر کوئی داروغہ نہیں مقرر کیا ہے . تمھارے اوپر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے - اور انسان کو جب ہم اپنی کسی رحمت سے نوازتے ہیں تو اس پر اترانے لگتا ہے اور اگر اس کے اعمال کی پاداش میں اس کو کوئی افتاد پیش آ جائے تو وہ ناشکرا بن جاتا ہے - ۴۸

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کی ہے - وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے یا بیٹے اور بیٹیاں دونوں ملا کر ان کو بخشتا ہے - اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا

ہے۔ وہی علم رکھنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔ ۴۹-۵۰

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ وَلِيٍّ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ (۴۴)

پیغمبر صلعم کی تسلی کے لیے سنتِ الٰہی کا حوالہ

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے اس سنتِ الٰہی کا حوالہ ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر فرمائی ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ ان کی ضلالت پسندی کے سبب سے گمراہی کی راہ پر ڈال دیتا ہے وہ خدا کی توفیق بخشی سے محروم ہو جاتے ہیں اور جو خدا کی توفیق و دست گیری سے محروم ہو جائیں کوئی دوسرا ان کا کارساز نہیں بن سکتا۔ اب تم کتنا ہی زور لگاؤ لیکن جن پر خدا کی مار ہے وہ ہدایت کی راہ اختیار کرنے والے نہیں بنیں گے۔

'وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ ..... الاٰیۃ'۔ 'ظَالِمِیْنَ' سے مراد یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے گمراہی کے لیے چھوڑ دیا۔ ان کے لیے اس صفت کے استعمال سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ گمراہ کیے جانے کے مستحق اس وجہ سے قرار پائے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا، اس کی ہدایت کی قدر نہیں کی بلکہ آنکھیں بند کر کے اپنی خواہشوں کی پیروی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفر و شرک میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ فرمایا کہ یہ محروم القسمت لوگ آج تو اپنی روش پر بہت نازاں ہیں لیکن جب خدا کے عذاب سے دوچار ہوں گے تو بڑی حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ کیا دنیا کی طرف پلٹنے کی کوئی راہ اب بھی باقی ہے کہ وہاں جا کر وہ کچھ نیکی کی کمائی کریں کہ اس عذاب سے چھوٹ سکیں۔

وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ۗ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ (۴۵)

عربیت کا ایک اسلوب

'یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا' میں ضمیر کا مرجع وہی عذاب ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے، چونکہ اس سے مراد دوزخ یا نارِ جہنم ہے اس وجہ سے ضمیر علیٰ سبیل التاویل مؤنث آئی۔ اس طرح گویا لفظ 'عذاب' کے اجمال کی وضاحت ہو گئی۔ عربی زبان میں یہ اسلوب بہت معروف ہے۔

فرمایا کہ آج تو یہ لوگ اپنی کامیاب زندگی کے غرّے میں اس عذاب کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن جس دن یہ اس میں داخل کرنے کے لیے لے جائے جائیں گے تو ذلت سے اپنے سر نہوڑائے ہوئے

کن انکھیوں سے اس کو دیکھ رہے ہوں گے۔ کوئی مجرم جب مقتل کی طرف لے جایا جاتا ہے تو اس کے اندر مقتل اور جلاد کی تلوار کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا لیکن وہ کن انکھیوں سے دیکھتا ہے کہ کیا پیش آنے والا ہے۔

حقیقی خسارہ آخرت کا خسارہ ہے

'وَقَالَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا ..... الاٰیۃ' فرمایا کہ وہاں ان کی ذلت و خواری اور تباہی کو دیکھ کر اہل ایمان پکار اٹھیں گے کہ بے شک حقیقی نامراد وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو قیامت کے دن خسارے میں ڈالا اور ساتھ ہی اپنے اہل و عیال اور متعلقین کو بھی اپنے دباؤ یا بدآموزی سے برگشتہ کر کے اس خسارے میں مبتلا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نا عاقبت اندیش لوگ تو اپنی کامیاب دنیوی زندگی کے غرے میں ہم کو دنیا میں خسارے میں سمجھتے رہے لیکن وہ کوئی خسارہ نہیں تھا۔ حقیقی خسارہ یہ قیامت کے دن کا خسارہ ہے جس میں یہ بدقسمت لوگ مبتلا ہوئے ہیں۔

'اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ فِیْ عَذَابٍ مُّقِیْمٍ' یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں حقیقی خسارہ قیامت کے دن کا خسارہ ہے۔ فرمایا کہ آگاہ ہو کر سن لو! اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ ایک ابدی عذاب میں گرفتار ہوں گے جو کسی طرح ٹالا نہ جا سکے گا ــــ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں تو دکھ ہو یا سکھ بہرحال وہ عارضی ہے لیکن آخرت کا عذاب ابدی ہے اس وجہ سے حقیقی خسارہ ان لوگوں کا خسارہ ہے جو آخرت کے خسارہ سے دوچار ہوئے۔

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ (۴۶)

'مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ' یہاں 'اللہ کے مقابل میں' کے مفہوم میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جب یہ لوگ اللہ کے عذاب کی گرفت میں آ جائیں گے تو اپنے جن شرکاء اور حمایتیوں پر ان کو بڑا ناز ہے ان میں سے کوئی بھی اللہ کے مقابل میں ان کے کچھ کام نہ آ سکے گا۔

'وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ' وہی مضمون جو اوپر آیت ۴۴ میں گزر چکا ہے، الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ، پھر آ گیا ہے کہ، ان کی شامت اعمال کے سبب سے، اللہ نے ان کو گمراہی کے لیے چھوڑ دیا اور جن کو اللہ بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے ان کو کہیں بھی راہ نہیں ملتی، نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۗ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ (۴۷)

'مِنَ اللّٰهِ' کا تعلق میرے نزدیک 'اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ' سے ہے اور 'لَا مَرَدَّ لَهٗ' 'يَوْمٌ' کی صفت ہے۔

دعوت بطور زجر و تنبیہ

یہ دعوت بطور زجر و تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اب بھی وقت باقی ہے کہ اپنے رب کی دعوت قبول کر کے اپنی عاقبت سنوار لو۔ ورنہ یاد رکھو کہ جب تمہارے رب کی طرف سے وہ دن آ جائے گا جو اٹل ہے تو اس وقت تمہارا اس کو قبول کرنا اور نہ کرنا دونوں یکساں ہوگا۔ اس دن نہ تمہارے لیے کوئی پناہ ہوگی اور نہ اس دن تم کسی چیز کو رد کر سکو گے۔ جو کچھ تمہارا سامنے آئے گا بے چون و چرا اس کے آگے سر جھکا دینا پڑے گا۔ 'نَكِيْر' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے 'انکار' کیا ہے لیکن اس کا صحیح مفہوم کسی ناگوار چیز کو احساس غیرت کے ساتھ رد یا دفع کرنا ہے۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَآ أَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۭ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَإِنَّآ إِذَآ أَذَقْنَا الْإِنسٰنَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَإِنَّ الْإِنسٰنَ كَفُورٌ (۴۸)

یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ اگر یہ لوگ اس دعوت پر لبیک کہتے ہیں تو فبہا، نہیں قبول کرتے تو تم ان کی مطلق پروا نہ کرو۔ ہم نے تم کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں مامور کیا ہے کہ تم لازماً ان کو یہ دعوت قبول ہی کرا دو۔ تمہارے اوپر ذمہ داری صرف دعوت لوگوں تک پہنچا دینے کی ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون پیچھے آیت ۶ میں بھی گزر چکا ہے۔

اصل سبب اعراض کی طرف اشارہ

'وَإِنَّآ إِذَآ أَذَقْنَا الْإِنسٰنَ ...... الآیۃ' یہ ان لوگوں کے سبب اعراض سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ تنگ ظرف اور ناشکرے لوگ ہیں۔ اس طرح کے انسانوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ جب ہم ان کو اپنی رحمت و نعمت سے نوازتے ہیں تو یہ ہمارے شکرگزار ہونے کے بجائے اتراتے اور اکڑتے ہیں اور اگر ان کی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو ذرا کوئی اُفتاد پیش آ جائے تو مایوس، بے صبر اور ناشکرے بن جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ یہ کبھی صحیح راہ اختیار کریں گے۔ آج نعمت و رفاہیت حاصل ہے تو اس کا غرور ان کے لیے حجاب بن گیا ہے اور اگر ذرا ہم ان کو اس عذاب کا مزہ چکھا دیں جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں تو مایوس ہو جائیں گے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ يَهَبُ لِمَن يَشَآءُ إِنٰثًا وَيَهَبُ لِمَن يَشَآءُ الذُّكُورَ ۙ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَإِنٰثًا ۖ وَيَجْعَلُ مَن يَشَآءُ عَقِيمًا ۭ إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ (۴۹ - ۵۰)

تنگ ظرفی کا باعث سوء عقیدہ ہے

یہ اس عقیدے کا بیان ہے جس سے محروم ہونے کے باعث ان لوگوں کے اندر یہ تنگ ظرفی اور ناشکری پیدا ہوئی ہے۔ اگر یہ لوگ اس حقیقت پر ایمان رکھتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ وہی جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو جو کچھ چاہتا ہے بخشتا ہے

تو اس حالت میں مبتلا نہ ہوتے بلکہ نعمت پر اپنے رب کے شکرگزار ہوتے اور کوئی مصیبت پیش آتی تو اس پر صبر کرتے۔

'یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ' کے بعد 'یَھَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا ... الاٰیۃ' عام کے بعد خاص کا ذکر ہے کہ یہ خدا ہی ہے جو جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے بیٹے اور بیٹیاں دونوں ہی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد ہی رکھتا ہے۔ وہی علم اور قدرت رکھنے والا ہے اور جو کچھ کرتا ہے اپنے علم و قدرت کے مطابق کرتا ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس وجہ سے بندوں کا فرض یہ ہے کہ تمام معاملات میں خدا ہی پر بھروسہ رکھیں۔ نہ کبھی مغرور ہوں، نہ کبھی مایوس اور نہ کبھی اس کے سوا کسی اور سے لو لگائیں۔

۱۰- آگے کا مضمون ـــ آیات: ۵۱-۵۳

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں اور یہ خاتمہ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ پوری سورہ سے بحیثیت مجموعی بھی تعلق رکھتا ہے اور اوپر کے پیرے سے بھی اس کا نہایت واضح ربط ہے۔ قرآن کے اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ سورہ جس مضمون سے شروع ہوتی ہے بالعموم اسی مضمون کے کسی پہلو کی وضاحت پر ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سورہ میں بھی دیکھ لیجیے، اس کا آغاز 'کَذٰلِکَ یُوْحِیْٓ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ .... الاٰیۃ' سے ہوا تھا۔ یعنی یہ قرآن اسی طرح کی وحی ہے جس طرح کی وحی اس سے پہلے اللہ تعالیٰ دوسرے نبیوں اور رسولوں پر نازل فرما چکا ہے۔ پھر مقصداً و ذریعۃً دونوں کی یکسانی کی وضاحت فرمائی اور خاتمہ اس مضمون پر کیا جس سے آغاز فرمایا تھا۔ چنانچہ خاتمہ میں بھی تقریباً وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو تمہید میں آئے ہیں۔ فرمایا ہے: 'وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا .... الاٰیۃ' یہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ پوری سورہ از اوّل تا آخر ایک وحدت ہے۔

اوپر کے پیرے سے اس کا تعلق یہ ہے کہ اس کا خاتمہ مخالفین کے سبب اعراض کے بیان پر ہوا ہے۔ ان کے اعراض کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ کہتے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ ان پر اپنا کلام نازل کرتا ہے تو آخر وہ ہم سے کیوں کلام نہیں کرتا؟ ان کے اس اعتراض کا جواب ان آیات میں دیا اور آیات کی تفسیر سے واضح ہو جائے گا کہ یہ جواب نہایت جامع و مانع اور مسکت ہے ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۱-۵۳

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَآئِ حِجَابٍ
أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَآءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ﴿٥١﴾
وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ تَدْرِي
مَا الْكِتَٰبُ وَلَا الْإِيمَٰنُ وَلَٰكِن جَعَلْنَٰهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ
مَن نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَٰطٍ
مُّسْتَقِيمٍ ﴿٥٢﴾ صِرَٰطِ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَٰوَٰتِ
وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ أَلَآ إِلَى اللَّهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ ﴿٥٣﴾

ع ۵

ترجمۂ آیات ۵۱-۵۳

اور کسی بشر کی بھی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردے کی اوٹ سے یا بھیجے کسی فرشتہ کو پس وہ وحی کر دے اس کے اذن سے جو وہ چاہے۔ وہ بڑا ہی عالی مقام، بڑا ہی حکیم ہے۔ اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے۔ نہ تم یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنایا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں اور بے شک تم ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔ اس اللہ کے راستہ کی طرف جس کا ہی وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ آگاہ! سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۵۱-۵۳

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَآئِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ

رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۵۱)

آنحضرت صلعم کے مخالفین کے ایک اعتراض کا جواب

یہ جواب ہے مخالفین کے اس اعتراض یا مطالبہ کا جو قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے نقل ہوا ہے کہ 'لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ' اگر اللہ انسان سے (پیغمبر سے) بات کرتا ہے، جیسا کہ یہ دعویٰ کرتے ہیں، تو آخر وہ ہم سے رُو در رُو ہو کر بات کیوں نہیں کرتا؟ آخر ان کے ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ ان کو تو وہ اپنے شرف خطاب سے نوازتا ہے اور ہم کو لائق التفات نہیں سمجھتا حالانکہ ہم عزت و وجاہت میں ان سے کہیں بڑھ کر ہیں!

اس کے جواب میں فرمایا کہ کسی انسان کا یہ درجہ و مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رُو در رُو ہو کر بات کرے۔ وہ بات کرتا ہے تو وحی کے ذریعہ سے بات کرتا ہے، یا پردے کی آڑ سے بات کرتا ہے یا اپنا کوئی قاصد یعنی فرشتہ بھیج دیتا ہے جو اس کے اذن سے، جو کچھ وہ چاہتا ہے، اس کے کسی بندے کی طرف، جس کو وہ اپنے خطاب و کلام کے لیے منتخب فرماتا ہے، وحی کر دیتا ہے۔

'وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ خدا سے بالمشافہ کلام میں جو چیز مانع ہے وہ درحقیقت انسان کا اپنا ضعف اور اس کی اپنی نااہلیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی عالی مقام، ایسی باعظمت، اور ایسے انوار و تجلیات کا مظہر ہے کہ کوئی بشر اس سے رُو در رُو ہونے کی تاب نہیں لا سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی نسبت قرآن میں مذکور ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کی تو ان کو جواب ملا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ میری تجلی کی تاب پہاڑ بھی نہیں لا سکتے تو تم اس کا تحمل کس طرح کر سکو گے۔

'اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے اگر کسی سے خطاب کرتا ہے تو تین طریقوں سے خطاب کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے خطاب کی مختلف شکلیں

ایک طریقہ 'وحی' کا ہے۔ 'وحی' سے مراد دل میں بات ڈال دینے کے ہیں۔ اسی کو احادیث میں 'القاء فی الروع' یا 'نفث فی الروع' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے دل پر اپنا کلام القاء فرما دیتا ہے اور پیغمبر اس کو محفوظ کر لیتا ہے۔ الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ چیز مجرد فکر یا خیال کی شکل میں نہیں بلکہ کلام کی شکل میں نازل ہوتی ہے جس کو نبی سنتا بھی ہے، سمجھتا بھی ہے اور اس کو محفوظ بھی کر لیتا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نبیوں سے اپنے کلام کا طریقہ بتایا ہے اس وجہ سے ہمارے نزدیک ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ وحی مجرد فکر کی شکل میں دل پر القاء ہوتی ہے جس کو الفاظ کا جامہ پیغمبر پہناتا ہے۔

اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ پردے کی اوٹ سے بات کرتا ہے۔ یعنی نبی اللہ کا کلام اور اس کی آواز تو سنتا ہے لیکن اس کو دیکھتا نہیں۔ اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کا کلام و خطاب ہے۔ تورات اور قرآن دونوں میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات کی لیکن اس کو دیکھا نہیں اور قرآن میں یہ تصریح بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا اور کسی نبی سے اللہ تعالیٰ نے اس طرح کلام نہیں کیا۔ یہ شرف صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو حاصل ہوا۔

اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کوئی رسول یعنی فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے پیغمبر کے دل پر القاء کر دیتا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ	کہہ دو کہ جو جبریل کا دشمن ہے وہ اس بات کو یاد
فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ	رکھے کہ جبریل نے اس قرآن کو تمہارے دل پر اللہ کے
بِاِذْنِ اللّٰهِ (۹۷)	حکم سے اتارا ہے۔

یہی بات سورۂ نحل میں یوں ارشاد ہوئی ہے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ	کہہ دو اس قرآن کو روح القدس نے تیرے رب کی
رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (النحل: ۱۰۲)	طرف سے اتارا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلام و خطاب کے تین طریقے ہیں۔ ان میں سے دو طریقے، جو اوپر مذکور ہوئے، اس اعتبار سے ایک مخصوص نوعیت کے حامل ہیں کہ ان میں کلام بلا واسطہ نبی پر نازل ہوتا ہے ریعنی اللہ تعالیٰ اور نبی کے درمیان جبریل امین کا واسطہ نہیں ہوتا اور تیسرے میں جبریل امینؑ واسطہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو طریقے ــــ پہلا اور تیسرا ــــ معروف طریقے ہیں۔ دوسرا طریقہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخصوصات میں سے ہے۔ کسی اور نبی کے متعلق، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ چیز مذکور نہیں ہے۔ اگر الاقدم فالاقدم کے اصول کو سامنے رکھیے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ پہلے طریقہ کو مرتبہ کے لحاظ سے اوّلیت حاصل ہے۔

یہاں صرف تین طریقے مذکور ہوئے ہیں اس لیے کہ جس سوال کو پیش نظر رکھ کر یہ آیت وارد ہوئی ہے اس کا جواب انہی تین صورتوں کے ذکر کا مقتضی تھا لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین طریقوں کے علاوہ دو اور طریقے بھی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اپنے بعض ارادوں سے آگاہ فرماتا ہے۔

ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ فرشتہ بشری شکل میں متمثل ہو کر ظاہر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ

کا پیغام پہنچا دیتا ہے۔ اس کی مثال حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت مریمؑ کے ان واقعات میں موجود ہے جو قرآن میں تفصیل سے مذکور ہوتے ہیں۔

دوسرا طریقہ رؤیا کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو جو کچھ مطلوب ہوتا ہے وہ رؤیا میں امر فرما دیتا یا مشاہدہ کرا دیتا ہے مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم رؤیا میں ہوا۔ غزوۂ بدر سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے واقعات رؤیا میں مشاہدہ کرائے گئے۔ ایک نہایت اہم رؤیا کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں بھی گزر چکا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام و خطاب اور ایما و اشارہ کے پانچ طریقے ہیں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم براہِ راست کلام کے سوا، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخصوصات میں سے ہے، ان میں سے ہر طریقہ سے مشرف ہوئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ کو بھی یہ شرف صرف ایک آدھ بار ہی حاصل ہوا باقی تورات اسی طرح کی وحی ہے جس طرح کی وحی دوسرے صحیفے ہیں۔

'اِنَّہٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ' یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفتوں کا حوالہ دیا ہے۔ ایک اس کی عظمت، رفعت اور بالا تری کو ظاہر کرتی ہے۔ دوسری اس کی حکمت اور اس حکمت کے لوازم ـــــ رحمت، عدل اور ہدایتِ خلق ـــــ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ان دونوں کو جمع کرنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اتنی بلند و بالا ہے کہ نہ اس کو کسی سے کلام کی ضرورت ہے اور نہ کوئی یہ درجہ و مرتبہ رکھتا ہے کہ اس سے ہم کلام ہو سکے لیکن اس عظمت و رفعت کے ساتھ وہ حکیم، عادل اور رحیم بھی ہے اس وجہ سے وہ خلق کی رہنمائی اور اپنے بندوں کی اصلاح کے لیے ان کو اپنے خطاب و کلام سے بھی نوازتا ہے اور اس کے لیے اس نے وہ طریقے اختیار فرمائے جو اوپر مذکور ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے آگے بڑھ کر جو لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ خدا ان میں سے ہر ایک سے رُو در رُو ہو کر بات کرے تو اس قسم کے لوگ نہ خدا کی عظمت سے آگاہ ہیں، نہ اپنی بے حقیقتی سے!! ایسے احمق لوگ اپنی اس رعونت ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوں گے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ (۵۲-۵۳)

وحی کی تعبیر روح سے

یہ خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ اسی معروف طریقۂ وحی کے مطابق ہم نے تمہاری طرف بھی ایک رُوح اتاری ہے۔ 'رُوح' سے مراد وحی ہے۔ 'وحی' کو 'روح' سے تعبیر کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ یہ تمہارے لیے بھی حقیقی زندگی کا ذریعہ ہے اور ان لوگوں کے لیے بھی جو اس کو

اپنا لیں۔ تمام آسمانی صحیفوں میں اللہ کے کلام و الہام کے لیے یہ تعبیر موجود ہے اس لیے کہ بندوں کو حقیقی زندگی، جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے، روٹی سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ اس کلام و الہام سے حاصل ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔

'رُوحًا مِّنْ اَمْرِنَا' اس روح کی صفت کے طور پر، دفع دخل مقدر کے لیے آیا ہے۔ یعنی یہ روح اللہ تعالیٰ کے امورِ غیب میں سے ہے۔ اس کی حقیقت و ماہیت اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا وہ رسول جانتا ہے جس کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ ہر شخص اس کی حقیقت و کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے نہ تو ہر شخص کو اس کی کیفیت معلوم کرنے کے درپے ہونا چاہیے اور نہ اس بنیاد پر کسی عاقل کو اس کا انکار کرنا چاہیے کہ وہ اپنے اندر اس قسم کی کوئی چیز محسوس نہیں کرتا۔ جو شخص دردِ جگر کی لذّت سے آشنا نہیں ہے اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دردِ جگر کے وجود ہی سے انکار کر دے۔ یہ مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں بھی گزر چکا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرآءیل: ۸۵)	اور یہ لوگ تم سے روح (وحی) کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ ان کو بتا دو کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تم کو تھوڑا ہی علم دیا گیا ہے۔

یہ چیز یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے جب اپنی قوموں کے سامنے اس امر کا اظہار فرمایا کہ ان کے اوپر ان کے رب کی جانب سے ایک روح نازل ہوتی ہے تو نادانوں نے ان کا مذاق اڑایا کہ یہ روح کیا چیز ہے؟ آخر اس طرح کی کوئی چیز ہم اپنے اندر کیوں نہیں محسوس کرتے؟ اسی سوال کا جواب سورۂ بنی اسرائیل کی مذکورہ بالا آیت میں دیا گیا ہے اور اسی جواب کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں 'رُوحًا' کے ساتھ 'مِّنْ اَمْرِنَا' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال ہو تو اس کو اسی کلام ہی میں جواب مل جائے۔

اس امر کا ایک اور اہم پہلو بھی ہے جس پر ان شاء اللہ ہم سورۂ دخان کی آیات ۴-۵ کے تحت اور سورۂ قدر میں بحث کریں گے۔

'مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا'۔ یہ اس روح کا فیضان بیان ہوا ہے کہ یہ اسی کی حیات بخشی ہے کہ تم پہلے کتاب و ایمان سے ناآشنا تھے، لیکن اس وحی کے نور سے اللہ نے تمہارے سینہ کو اس طرح جگمگا دیا کہ تم اس خلق کے اندر ایک چلتے پھرتے منارۂ نور بن گئے اور اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس نور سے راہ یاب کر رہا ہے۔ 'جن کو چاہتا ہے'، یعنی جن کے اندر اس نور سے اکتساب کی صلاحیت پاتا ہے۔ اللہ ان کو اس سے بہرہ ور فرماتا ہے اس لیے کہ اللہ کا ہر چاہنا

اس کی حکمت اور اس کے عدل پر مبنی ہوتا ہے۔ یہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ جس طرح منصبِ نبوت کا اہل ہر شخص نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے انہی کو منتخب فرماتا ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں اسی طرح اس نور کے حامل بھی وہی ہوتے ہیں جن کے اندر اس کی صلاحیت ہوتی ہے۔ گویا اس میں ان لوگوں کا جواب بھی ہے جو کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہی کو (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) ہمارے اندر سے نبوت اور اپنے کلام و خطاب کے لیے کیوں منتخب فرمایا، ہمارے اوپر اس کی نظر کیوں نہ پڑی؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی بھی ہے کہ تم جو روشنی دکھا رہے ہو اس سے ہر شخص بہرہ یاب نہیں ہو سکتا، اس سے بہرہ یاب وہی ہوں گے جو اس کے اہل ٹھہریں گے، جو اس کے اہل نہیں ہیں ان کو یہ روشنی راہ دکھانے کے بجائے خیرہ کر کے چھوڑ دے گی۔

کتاب اور ایمان میں نسبت قالب اور روح کی ہے

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ کتاب اور ایمان میں وہی نسبت ہے جو نسبت قالب اور روح میں ہے۔ کتاب، تمام تر ایمان کا مظہر اور بروز ہے۔ سادہ الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کتاب درحقیقت ایمان کے مقتضیات کا بیان ہے اس وجہ سے دونوں میں جسم و جان کا رابطہ ہے۔ جہاں تک 'کتاب' کا تعلق ہے اس سے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ناآشنا تھے اس لیے کہ آپ امّی تھے لیکن ایمان سے ناآشنائی کی جو نفی کی گئی ہے یہ اس کی تفصیلات اور مقتضیات کے اعتبار سے ہے۔ یعنی آپ ایمان کے تمام لوازم و مقتضیات سے ناآشنا تھے ورنہ حضرات انبیاء علیہم السلام تو وحی سے پہلے بھی اپنی فطرتِ سلیم کی روشنی سے بہرہ ور ہوتے ہیں اس وجہ سے اجمالی ایمان ان کے اندر موجود رہتا ہے جو وحی کی روشنی سے جگمگا کر 'آفتاب' کی طرح ایک عالم کو منور کر دیتا ہے۔ فطرت کی روشنی اور وحی کی روشنی میں نسبت چونکہ ذرہ اور آفتاب کی ہے اس وجہ سے اس کے مقابل میں اس کی نفی کی گئی ہے لیکن ہے وہ اسی آفتابِ تاباں کا ایک ذرہ اور وہی لوگ نورِ نبوت سے اکتساب بھی کرتے ہیں جو اس ذرہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس سے محروم کر لیتے ہیں وہ نبی کے انوار سے محروم ہی رہتے ہیں۔

استاذ امامؒ یہاں ایمان سے حکمت مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایمان، قول، عمل اور حال تینوں کا مجموعہ ہے اور یہی حقیقت حکمت کی بھی ہے اس وجہ سے یہ جو فرمایا کہ تم کتاب اور ایمان سے ناآشنا تھے تو دوسرے الفاظ میں گویا یہ فرمایا کہ تم کتاب اور حکمت سے ناآشنا تھے۔ گویا ایمان کے لفظ سے یہاں حکمت کی تفسیر فرما دی گئی۔

وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ..... الآية۔ یہ اس نور کی برکت خلق کے اعتبار سے بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نور سے تم کو جو فیض یاب کیا تو تم جو ایک امّی تھے اب

لوگوں کی رہنمائی اس اللہ کی سیدھی راہ کی طرف کر رہے ہو جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ لوگوں کو اگر عاقبت کی فلاح مطلوب ہے تو چاہیے کہ تمہاری رہنمائی کی قدر کریں۔

'اَلَآ اِلَی اللّٰہِ تَصِیۡرُ الۡاُمُوۡرُ'۔ یہ آخر میں لوگوں کو تنبیہ ہے کہ اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ جس خدا کا سب کچھ ہے اسی کی طرف سارے معاملات لوٹیں گے بھی۔ اس وجہ سے اس کے آگے پیشی اور جواب دہی کے لیے تیار رہو۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔

رحمان آباد
۱۲- دسمبر ۱۹۷۵ء
۸- ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ

تدبّرِ قرآن

۴۳

الزّخرف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا- سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ گروپ کی دوسری سورتوں کی طرح اس کا بھی مرکزی مضمون توحید ہی ہے اور اس توحید ہی کی اہمیت واضح کرنے کے لیے اس میں قیامت کا بھی ذکر ہوا ہے۔ خاص طور پر ملائکہ کی الوہیت اور ان کی شفاعت کے تصور کا ابطال اس میں تفصیل سے ہے اور قریش کے اس دعوے کی تردید کی گئی ہے کہ وہ جس دینِ شرک کے پیرو ہیں یہ ان کو حضرت ابراہیمؑ سے وراثت میں ملا ہے۔

سابق سورہ میں قرآن کی عظمت ایک خاص پہلو سے نمایاں کی گئی تھی اس میں اس کے بعض دوسرے پہلو نمایاں کر کے قریش کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر محض دولتِ دنیا کے غرور میں تم نے اس عظیم نعمت کی قدر نہ کی تو یاد رکھو کہ پیغمبر کے اوپر ذمہ داری صرف اس حق کو پہنچا دینے کی ہے۔ اس کی تکذیب کے نتائج کی ذمہ داری خود تمہارے اوپر ہو گی۔

قرآن پر نفسِ وحی کے پہلو سے مخالفین کے جو اعتراضات تھے اور جن کو وہ اس کی تکذیب کا بہانہ بنا رہے تھے ان کے جواب پچھلی سورہ میں دیے گئے ہیں۔ اس سورہ میں انبیائے سابقین کی دعوت کے ساتھ اس کی ہم آہنگی واضح فرمائی گئی ہے کہ جس دینِ توحید کی دعوت یہ قرآن دے رہا ہے اسی کی دعوت تمام انبیاء نے دی ہے۔ جو لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں وہ اپنے لیے اسی ہلاکت کا سامان کر رہے ہیں جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی دوسری قومیں دوچار ہوئیں۔

ب- سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۸) قرآن کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے قومِ عرب پر جو احسان فرمایا اور اس کے ذریعہ سے ان پر اتمامِ حجت کا جو سامان کیا اس کا حوالہ اور اس بات کی یاددہانی کہ اگر انھوں نے بھی اپنے رسول کی تکذیب کی وہی روش اختیار کی جو ان سے پہلے کی قوموں نے اختیار کی تو اسی انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیں جس سے وہ دوچار ہوئیں اور یاد رکھیں کہ قوت و شوکت کے اعتبار سے وہ ان سے کہیں

بڑھ چڑھ کر ہیں۔

(۹ - ۱۵) مخالفین کے اس اعتراف کا حوالہ کہ آسمان و زمین کا خالق خدائے عزیز و علیم ہی ہے۔ لیکن اس اعتراف کے باوجود انھوں نے خدا کے بندوں میں سے اس کے شریک بنا رکھے ہیں حالانکہ اس کائنات میں قدرت، ربوبیت اور حکمت کے جو آثار و شواہد ہر قدم پر موجود ہیں وہ خدا کی توحید اور قیامت پر گواہ ہیں۔

(۱۶ - ۲۵) ملائکہ کی الوہیت کے تصور کا ابطال دو مختلف پہلوؤں سے۔

ایک اس پہلو سے کہ یہ لوگ ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں مانتے ہیں درآنحالیکہ خود اپنے لیے بیٹیاں پسند نہیں کرتے۔ ایک چیز کو اپنے لیے پسند نہ کرنا اور اس کو خدا کی طرف منسوب کرنا صریح حماقت اور رب عزیز و جلیل کی اہانت ہے۔

دوسرے اس پہلو سے کہ ملائکہ کو شریک خدا قرار دینے کی واحد دلیل ان کے پاس یہ ہے کہ ان کے باپ دادا ان کو شریک خدا مانتے رہے ہیں۔ حالانکہ کسی طریقہ کی صحت و صداقت کی یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ طریقہ ان کو اپنے باپ دادا سے ملا ہے۔ یا تو وہ اللہ کی کسی کتاب کی سند پیش کریں یا عقل و فطرت سے کوئی دلیل لائیں ورنہ اسی انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیں جس سے وہ قومیں دوچار ہوئیں جنھوں نے اس قسم کے لاطائل بہانوں کی آڑ لے کر اپنے رسولوں کی تکذیب کی۔

(۲۶ - ۲۸) تاریخ کی روشنی میں مشرکین کے اس دعوے کی تردید کہ یہ دینِ شرک ان کے باپ دادا کی وراثت ہے۔ ان کے اصل جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جنھوں نے اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم پوجتے ہو) کا یادگار کلمہ کہہ کر اپنی قوم کو چھوڑا اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں بسایا۔ ان کا یہ اعلانِ ہجرت ایک مقدس روایت کی حیثیت سے ان کی ذریت میں باقی رہا تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ یہ شرک ان کے باپ دادا کی وراثت ہے!

(۲۹ - ۴۵) مکذبین کی سرکشی کے اصل سبب کا بیان کہ یہ اپنی جہالت کے حق میں جو دلیلیں گھڑنے کی کوشش کر رہے ہیں یہ محض سخن سازی ہے۔ اصل چیز جو ان کے لیے فتنہ بنی ہوئی ہے وہ ان کی دنیوی رفاہیت ہے حالانکہ خدا کی میزان میں اس رفاہیت کا کوئی وزن نہیں ہے۔ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے اور یہ اس سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں۔ شیطان نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے اور یہ پٹی ان کی اس وقت کھلے گی جب اس کا کھلنا اور نہ کھلنا دونوں ہی بے سود ہو گا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ تم اپنی دعوتِ حق پر جمے رہو۔ ہم ان کا انجام یا تو تمہاری زندگی ہی میں دکھا دیں گے یا تمہارے بعد یہ اس سے دوچار ہوں گے۔ تم جس دین کی دعوت دے رہے ہو وہ دینِ حق ہی ہے، تمام انبیاء کی شہادت اسی کے حق میں ہے۔

(۴۶ - ۶۵) حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے دو نبیوں — حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ —

کی دعوت کا حوالہ کہ انھوں نے بھی بعینہٖ اسی دینِ توحید کی دعوت دی۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی رسالت کے حق میں، فرعون اور اس کے اعیان کو ایک سے ایک بڑھ کر نشانیاں دکھائیں لیکن وہ کسی نشانی سے بھی قائل نہ ہوئے۔ ان کی تکذیب کا سبب بعینہٖ یہی تھا جو قریش کے ان فراعنہ کی تکذیب کا ہے۔ بالآخر وہ کیفرِ کردار کو پہنچے، وہی انجام ان لوگوں کا بھی ہونا ہے۔

اسی توحید کی دعوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی دی۔ ان کا نام سنتے ہی قریش کے جھگڑالو تم سے مناظرہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ ان سے بہتر تو ہمارے ہی معبود ہیں گویا ان جاہلوں کے نزدیک قرآن ان کا ذکرِ خیر اس لیے کر رہا ہے کہ لوگ نصاریٰ کی طرح ان کو ابن اللہ مانیں حالانکہ قرآن ان کو ابن اللہ کی حیثیت سے نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ اس حیثیت سے پیش کر رہا ہے کہ ان کی دعوت یہ تھی کہ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ (اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور وہی تمہارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کرو) کی دعوت تھی۔ ان کی اس دعوتِ حق میں اختلافات تو بعد والوں نے پیدا کیے ہیں اور وہ عنقریب اس کا انجام دیکھیں گے۔

(۶۶ - ۸۹) خاتمۂ سورہ جس میں پہلے ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اس دعوتِ حق پر ایمان لائیں گے۔ پھر ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اس کی تکذیب کریں گے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان ضدی لوگوں سے اعراض کرو۔ یہ خود اپنا انجام دیکھ لیں گے اور فرشتوں کی جس شفاعت کے بل پر یہ اکڑ رہے ہیں اس کی حقیقت ان کے سامنے آجائے گی۔

اس تجزیۂ مطالب پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے کہ عمود کے ساتھ اس کے ہر جزو کا کیسا گہرا تعلق اور شروع سے لے کر آخر تک یہ پوری سورہ کس طرح مربوط ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں وبیدہ التوفیق۔

سُورَةُ الزُّخْرُفِ (۴۳)

مَكِّيَّةٌ ——— آيات : ۸۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۲۵

حٰمٓ ﴿١﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿٢﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا
لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٣﴾ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿٤﴾
اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ﴿٥﴾
وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ
نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٧﴾ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ
بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٨﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿٩﴾
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا
لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٠﴾ وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ
بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿١١﴾
وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ
وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ﴿١٢﴾ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا
نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ

سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا
لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ
ع لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ
بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا
ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ
وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿۱۸﴾ وَجَعَلُوا الْمَلٰۗىِٕكَةَ الَّذِيْنَ
هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ۭ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ۭ سَتُكْتَبُ
شَهَادَتُهُمْ وَيُسْــَٔلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا لَوْ شَاۗءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ
مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۤ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ
اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ
قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ
مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ
نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا
عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا
وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَاۗءَكُمْ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ
كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
ع الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾

ترجمۂ آیات ۱-۲۵ یہ حٰم ہے۔ شاہد ہے یہ واضح کتاب۔ ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا

ہے تاکہ تم سمجھو۔ اور بے شک یہ اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے نہایت بلند اور پُر حکمت۔ ۱-۴

کیا ہم تمھاری تذکیر سے اس لیے صرفِ نظر کر لیں کہ تم حدود سے تجاوز کر جانے والے لوگ ہو! اور ہم نے اگلوں میں کتنے ہی نبی بھیجے اور جو نبی بھی ان کے پاس آتا تو وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے۔ تو ہم نے ان سے زیادہ زور آوروں کو ہلاک کر چھوڑا اور اگلوں کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ ۵-۸

اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ لازماً یہی جواب دیں گے کہ ان کو خدائے عزیز و علیم نے پیدا کیا ہے۔ ۹

جس نے تمھارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمھارے لیے راستے رکھے کہ تم راہ پاؤ۔ اور جس نے آسمان سے پانی اتارا ایک اندازہ کے ساتھ۔ پس ہم نے اس سے حیاتِ تازہ بخش دی ایک مردہ زمین کو۔ اسی طرح تم بھی قبروں سے نکالے جاؤ گے! اور جس نے تمام گوناگوں قسم کی چیزیں پیدا کیں اور تمھارے واسطے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ تم ان کی پیٹھوں پر جم کر بیٹھو پھر تم اپنے رب کی نعمت کو، جب کہ تم ان پر بیٹھو، یاد کرو اور کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے ان چیزوں کو ہماری خدمت میں لگا دیا اور ہم تو ان کو قابو میں کر لینے والے نہیں تھے! اور بے شک ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں! ۱۰-۱۴

اور ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے اس کا ایک جزو ٹھہرایا۔ بے شک انسان کھلا ہوا ناشکرا ہے! کیا اس نے اپنی مخلوقات میں سے اپنے لیے بیٹیاں

پسند کیں اور تم کو بیٹوں سے نوازا! اور جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی بشارت دی جاتی ہے جس کو وہ خدا کی صفت بیان کرتا ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ گھٹا گھٹا رہنے لگتا ہے کہ کیا وہ پیدا ہوئی ہے جو زیوروں میں پلتی اور مخاصمت میں بے زبان ہے! ۱۵-۱۸

اور انھوں نے فرشتوں کو جو خدائے رحمان کے بندے ہیں، بیٹیوں کا درجہ دے رکھا ہے۔ کیا یہ ان کی ولادت کے وقت موجود تھے! ان کی یہ گواہی نوٹ رہے گی اور ان سے اس کی پرسش ہوگی! ۱۹

اور کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم ان کو پوجنے والے نہ بنتے۔ ان کو اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض اٹکل کے تیر چلا رہے ہیں۔ کیا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے تو وہ اس کی سند پکڑتے ہیں! بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی انہی کے نقشِ قدم پر راہ یاب ہیں۔ اور اسی طرح ہم نے جس بستی میں بھی تم سے پہلے کوئی منذر بھیجا تو اس کے خوش حالوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں گے۔ منذر نے کہا، کیا اگر میں اس سے زیادہ ہدایت بخش طریقہ لے کر تمھارے پاس آیا ہوں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے جب بھی تم انہی کے نقشِ قدم کی پیروی کرو گے! انھوں نے جواب دیا کہ ہم اس سارے کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو! تو ہم نے ان سے انتقام لیا تو دیکھو کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا! ۲۰-۲۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ (۱)

پہلی سورتوں کی طرح اس کا قرآنی نام بھی حٰمٓ ہی ہے۔ سورتوں کے ناموں کا اشتراک، ہم اشارہ کر چکے ہیں، ان کے مطالب کے اشتراک پر دلیل ہے۔ چنانچہ تمام حوامیم جو آپ پڑھتے آ رہے ہیں، ایک ہی قدرِ مشترک کی حامل ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو اسلوبِ بیان، نہجِ استدلال اور اجمال و تفصیل کا ہے۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۲)

قرآن اپنے ہر دعوے پر خود حجت ہے

یہ قرآن کی قسم کھائی ہے اور اس کی صفت یہاں 'مُبِیْن' وارد ہوئی ہے جس کے معنی ہیں واضح کر دینے والی کتاب، یعنی اپنے ہر دعوے پر یہ خود حجت ہے، کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ جو لوگ اس کی تکذیب کے لیے بہانے ڈھونڈھ رہے ہیں وہ آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ خود اپنی ہی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

یہاں مقسم علیہ محذوف ہے۔ جہاں قرینہ بالکل واضح اور قسم خود مقسم علیہ کو واضح کر رہی ہو، وہاں مقسم علیہ کو حذف کر دیتے ہیں اس کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ سورۂ قٓ میں بھی اس کی نہایت واضح مثال موجود ہے۔ یہاں لفظ 'مُبِیْن' نے خود مقسم علیہ کی طرف اشارہ کر دیا ہے اس وجہ سے اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ گویا آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۳)

قرآن کے مبین ہونے کا ایک خاص پہلو

یہ قرآن کے 'مُبِیْن' ہونے کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ہم نے اس کو عربی قرآن کی صورت میں اتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔ یہ مضمون اس گروپ کی پچھلی سورتوں میں بھی مختلف اسلوبوں سے گزر چکا ہے اور ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کا عربی میں اتارا جانا اہلِ عرب پر ایک عظیم احسان بھی تھا اور ایک فیصلہ کن اتمامِ حجت بھی۔ احسان کا پہلو تو بالکل واضح ہے کہ خدا نے اپنی آخری اور کامل ہدایت ان کی زبان میں اتاری کہ وہ بلا واسطۂ غیر اس سے کسبِ فیض کر سکیں، دوسروں کی تعلیم و تبلیغ کا انھیں رہینِ احسان نہ ہونا پڑے بلکہ دوسرے ان کے ممنونِ احسان بنیں۔ اتمامِ حجت کا پہلو یہ ہے کہ اللہ نے ان کی اپنی زبان میں اپنی ہدایت نازل کر کے ان کا ہر عذر ختم کر دیا ہے اب وہ عند اللہ یہ عذر نہیں کر سکتے کہ مخاطب عربی اور کلام عجمی!

وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۴)

قرآن کی عالی نسبی

اس قرآن کی عظمت واضح فرمائی کہ یہ کوئی ہنسی مسخری کی چیز نہیں ہے بلکہ نہایت ہی عالی نسب

اور عالی مقام چیز ہے۔ اس کی عالی نسبی کی وضاحت یوں فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو اُمُّ الکتٰب یعنی لوحِ محفوظ ہے یہ اس میں ہے اور اسی میں سے یہ تمہاری ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس کو جنّات کا القاء، کاہنوں کی کہانت، شاعروں کی شاعری اور خطیبوں کی لفّاظی گمان کر کے، اس کا مذاق اڑانے کی کوشش نہ کرے بلکہ یہ روشنی اس منبعِ نور سے نازل ہوئی ہے جس کے نور سے آسمان و زمین میں روشنی ہے اور جو تمام علم کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ بدقسمت ہوں گے وہ لوگ جو اس کی قدر نہ پہچانیں!

قرآن کی عالی مقامی

اس کی عالی مقامی کا اظہار یوں فرمایا کہ لَعَلِیٌّ حَکِیْمٌ' یہ قرآن بجائے خود نہایت برتر اور پرحکمت ہے۔ یاد ہوگا، پچھلی سورہ میں بعینہٖ یہی صفت آیت ۵۱ میں اللہ تعالیٰ کے لیے آئی ہے اور وحی و قرآن کے بیان ہی کے سلسلہ میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر کلام متکلم کی صفات و خصوصیات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ عَلِیٌّ و حَکِیْمٌ ہے اس وجہ سے اس کا کلام بھی علی و حکیم ہے۔ اس سے یہ اشارہ نکلا کہ جن کے اندر جوہر شناسی کی صلاحیت ہوگی وہ اس کلام کی قدر کریں گے، رہے بلید و بدذوق لوگ تو نہ وہ اس کے اہل ہیں نہ وہ اس کی قدر کریں گے۔

اس کی عالی مقامی کے ذکر سے مخالفین کو اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلادی گئی کہ یہ آسمان اور زمین کے خالق کا اتارا ہوا کلام ہے، کسی سائل کی درخواست نہیں ہے۔ اگر تم نے اس کی قدر نہ کی تو تمہیں اپنے کو محروم کرو گے، خدا یا اس کے کلام کا کچھ نہیں بگاڑو گے۔ ان کی عظمت اور برتری اپنی ذاتی ہے جو دوسروں کے ردّ و قبول سے بالکل بے نیاز ہے۔

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ (۵)

تمہاری ناقدری کے باوجود تم پر اتمامِ حجت ضروری ہے

یعنی ہرچند تم ہو تو ناشکرے اور ناقدرے کہ اس کلام بلند و برتر کی توہین و تکذیب کر رہے ہو اور شرک و کفر میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر جو ظلم تم نے ڈھائے ہیں ان کی اصلاح پر تمہاری طبیعتیں آمادہ نہیں ہو رہی ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا جاتا یا اب چھوڑ دیا جائے، تمہاری بیماریوں اور ان کے مہلک نتائج سے تم کو اچھی طرح آگاہ نہ کیا جائے۔ تمہاری یہ حالت اغماض کے بجائے اس بات کی متقضی ہے کہ تمہارا علاج کیا جائے چنانچہ اللہ نے تمہاری تعلیم و تذکیر کے لیے اپنی کتاب اتاری۔ تم اس کی قدر کرو یا نہ کرو، لیکن یہ تذکیر اس وقت تک جاری رہے گی جب تک تم پر اللہ کی حجت تمام نہ ہو جائے تاکہ جس کو زندگی کی راہ اختیار کرنی ہو وہ پوری بصیرت کے ساتھ زندگی کی راہ اختیار کر لے اور جس کو ہلاکت کی راہ پر جانا ہو وہ اتمامِ حجت کے بعد اس راہ پر جائے۔ تمہاری یہ تذکیر و تنبیہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت کے مطابق ہو رہی ہے۔ تم کتنی ہی نفرت اور رعونت کے ساتھ اس کو ٹھکرا دو لیکن اب یہ اپنے

آخری تاریخ تک پہنچ کے رہے گی۔

صَفْحًا میرے نزدیک مفعول لہٗ کے مفہوم میں ہے اور اس کے معنی چشم پوشی کے ہیں۔ ضرب عنہ الشئ کے معنی ہوں گے اس سے اس چیز کو ہٹا دیا۔ 'اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ' ان کی اصل بیماری کا بیان ہے اور 'مسرفین' یہاں 'اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ' کے مفہوم میں ہے یعنی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے' اور اپنی جانوں پر سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تم کفر و شرک کی آلودگیوں میں لتھڑے ہوئے ہو تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنا جامِ شفا ہٹائے رکھتا۔ دوا کے اصل مستحق تو مریض ہی ہوتے ہیں، خواہ وہ اس کی قدر کریں یا نہ کریں۔ اگر اس کی قدر کرو گے تو اپنا بھلا کرو گے، اگر نہ کرو گے تو اپنی ہی موت کو دعوت دو گے۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِى الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ (۶-۸)

مذکورہ بات کی تائید ماضی کی تاریخ سے

یہ اوپر کی بات کی تائید ماضی کی تاریخ سے پیش کی گئی ہے اور خطاب بغرضِ تسلی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ فرمایا کہ جو سلوک آج تمہارے مخالفین تمہارے ساتھ کر رہے ہیں یہی سلوک اس سے پہلے دوسرے نبیوں کے ساتھ ان کی قومیں کر چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلے بھی کتنے رسول اسی مقصدِ تذکیر و اصلاح کے لیے بھیجے لیکن ہر قوم نے اپنے رسول کا مذاق اڑایا اور اس کی نصیحتوں کی تحقیر کی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ کر دیا اور وہ قومیں کچھ کمزور نہ تھیں بلکہ وہ اپنی قوت و شوکت میں ان سے (قریش سے) کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں لیکن اللہ کے عذاب نے ان کی کمر توڑ کے رکھ دی۔ 'وَمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ' اور تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ اشارہ عاد و ثمود اور ان قوموں کی طرف ہے جن کی تباہی کی تفصیلات پچھلی سورتوں میں بھی بیان ہو چکی ہیں اور آگے کی سورتوں میں بھی آ رہی ہیں۔

مشرکین کے تضادِ فکر کی وضاحت

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (۹)

یہ قریش کے کفر و شرک اور ان کی اس ضد و مکابرت کی تفصیل بیان ہو رہی ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۵ میں 'اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ' کے الفاظ سے گزر چکا ہے۔ یہ بیان آگے دور تک جائے گا۔ فرمایا کہ یوں تو اپنے دینِ شرک کی حمایت میں تم سے لڑنے کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں لیکن یہ ایک شدید قسم کے تضادِ فکر میں مبتلا ہیں جس کی طرف ان کا جوشِ مخالفت ان کو متوجہ ہونے نہیں دے رہا ہے۔ اگر تم ان سے سوال کرو کہ آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے تو اس کا جواب لازماً وہ یہی دیں گے کہ ان کا خالق خدائے عزیز و علیم ہے لیکن دوسری طرف

ان کی سفاہت کا یہ عالم ہے کہ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا (اور انھوں نے اللہ کے بندوں میں سے اس کے شریک اور کفو و ہمسر بنا رکھے ہیں) یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکینِ عرب جیسا کہ پچھلی سورتوں میں تفصیل گزر چکی ہے، آسمان و زمین اور دوسری تمام مخلوقات کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی مانتے تھے کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں جو اس کی چہیتی اور اس کی ذات و صفات میں شریک ہیں اس وجہ سے ان کی عبادت خدا کے تقرب کا ذریعہ اور مال و اولاد کی فراوانی کا وسیلہ ہے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۱۰)

چار آیتیں بطورِ تضمین

یہ آیت اور بعد کی تین آیات مشرکین کے جواب کا حصہ نہیں ہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ تضمین اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہیں کہ جو شخص اس کائنات کی خلقت پر تدبر کی نگاہ ڈالے گا وہ اس میں خالق کی قدرت، ربوبیت اور حکمت کے ایسے آثار پائے گا کہ لازماً وہ اس کی توحید کا بھی اقرار کرے گا اور ایک روزِ جزا و سزا کا بھی۔ مقصد اس تفصیل سے یہ دکھانا ہے کہ مشرکین کا یہ اعتراف کہ آسمان و زمین کا خالق خدائے عزیز و علیم ہی ہے، اگر اپنی صحیح سمت میں آگے بڑھے تو اس کے تقتضیات یہ بھی ہیں جو آگے بیان ہو رہے ہیں، لیکن مشرکین پہلا قدم صحیح اٹھا کر پھر غلط سمت میں مڑ جاتے ہیں جس سے وہ اپنے مانے ہوئے عقیدہ کو باطل اور پائی ہوئی راہ کو گم کر دیتے ہیں۔

خدا کے خالق ہونے کے تقتضیات

فرمایا کہ وہی خدائے عزیز و علیم جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے (اور جس کا خالق ہونا تم کو بھی تسلیم ہے) اسی نے تمھاری بود و باش کے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا۔ اس گہوارہ بنانے کی مزید وضاحت قرآن کے دوسرے مقامات میں اس طرح فرمائی ہے کہ اس نے اپنی عظیم قدرت و حکمت سے اس میں پہاڑ گاڑ دیے ہیں کہ وہ تمھارے سمیت کسی طرف کو لڑھک نہ پڑے۔ پھر اس میں تمھارے لیے راستے رکھے ہیں یعنی زمین کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے پہاڑ گاڑے تو اس طرح نہیں کہ وہ ہر طرف سے تمھاری راہ روک کر کھڑے ہو جائیں بلکہ خشکی اور تری دونوں کے اندر ان پہاڑوں کے درمیان سے تمھارے لیے راستے بھی رکھے ہیں کہ تمھارے قافلے اور تمھارے جہازات ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کر سکیں۔

ایک معنی خیز ٹکڑا

'لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ' کا ٹکڑا یہاں نہایت معنی خیز اور بلیغ ہے۔ ایک مطلب تو اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں پہاڑوں کی فلک بوس دیواروں کے درمیان تمھارے لیے جو راستے رکھے ہیں وہ اس لیے رکھے ہیں کہ تم ان ناقابلِ عبور دیواروں کے اندر محبوس و محصور ہو کے نہ رہ جاؤ بلکہ ان سے باہر نکلنے کے لیے بھی راہیں کھلی رہیں۔ دوسرا نہایت لطیف اشارہ اس سے یہ نکلتا ہے کہ تم اپنے رب کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور اپنے حال پر اس کی ان بے پایاں عنایات پر غور کرو اور اس نتیجہ

تک پہنچو کہ جس پروردگار نے تمہارے لیے یہ کچھ اہتمام فرمایا ہے وہی تمہاری شکرگزاری اور عبادت و اطاعت کا اصل سزاوار ہے اور اگر تم نے اس کے اس حق کو نہ پہچانا تو ایک دن لازماً ایسا آئے گا جس میں تم کو اس ناسپاسی کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔

وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ ۚ فَأَنشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ (۱۱)

اللہ تعالیٰ کی کارسازی و ربوبیت

اور اسی خدائے عزیز و علیم کا یہ کرشمۂ ربوبیت بھی ہے کہ اس نے آسمان سے پانی اتارا ایک خاص اندازے کے ساتھ۔ پانی کا ایک خاص اندازے کے ساتھ اترنا اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ یہ محض ابر و ہوا کے تصرف سے نہیں بلکہ ایک عزیز و علیم کی تقدیر سے اترتا ہے جو اپنی حکمت کے تحت صرف اتنا ہی پانی اتارتا ہے جس کا زمین تحمل کر سکتی ہے۔ پھر اس سے یہ بات بھی نکلی کہ آسمان و زمین دونوں کے اندر ایک ہی خدائے عزیز و علیم کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ آسمان اور زمین میں ایسا توافق ہوتا کہ آسمان سے پانی اترتا اور زمین اس سے اپنی صلاحیتیں اجاگر کرتی۔ مزید برآں اس سے یہ بات بھی نکلی کہ وہ عزیز و علیم ہستی نہایت کریم و بندہ پرور ہے کہ ایک خاص اندازے کے ساتھ ہی پانی اتارتی ہے۔ اسی اندازے کے ساتھ زمین کی تمام برکتیں وابستہ ہیں۔ اگر اس میں کوئی خلل واقع ہو جائے تو یہ زمین پانی کی کمی سے بھی تباہ ہو سکتی ہے اور اس کی زیادتی سے بھی۔

بارش کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ

'فَأَنشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ' یہ بارش کے ایک اور خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی اور یہ پہلو چونکہ اس کائنات کی ایک بہت بڑی حقیقت کو آشکارا کرنے والا ہے اس وجہ سے اس کا ذکر متکلم کے صیغے سے فرمایا جو اہتمام خاص پر دلیل ہے۔ فرمایا کہ دیکھتے ہو کہ اسی پانی سے ہم ایک مردہ اور بے آب و گیاہ زمین کو زندہ کر دیتے ہیں اور وہ لہلہا اٹھتی ہے۔ اسی طرح ایک دن تم بھی مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد اس زمین سے اٹھا کھڑے کیے جاؤ گے۔

وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ ۝ لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ۝ وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنقَلِبُونَ (۱۲-۱۴)

بعض اور آثارِ قدرت کی طرف اشارہ

اسی خدائے عزیز و علیم کی پروردگاری کے بعض اور آثار کا ذکر کر کے ان کے مقتضیات کی طرف توجہ دلائی جن کا احساس ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر پیدا ہونا چاہیے جو ان سے بہرہ مند ہو رہا ہے۔

فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے تمہارے لیے دوسری نوع بنوع چیزیں پیدا کی ہیں۔ لفظ اَزْوَاج یہاں گوناگون اور نوع بنوع چیزوں کے مفہوم میں ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ قرآن مجید اور عربی ادب میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ کے الفاظ سے بھی قرآن میں یہی مفہوم ادا فرمایا گیا ہے۔ اشیاء اور انواع کی گوناگونی اور ان کا جوڑے جوڑے ہونا اس کائنات میں اسی لیے ہے کہ انسان کو اس کائنات کے خالق کی قدرت و حکمت اور اس کی رحمت و ربوبیت کی یاد دہانی ہوتی رہے۔ جوڑوں کے اندر جو توافق پایا جاتا ہے اس سے قرآن نے توحید پر جو دلیل قائم فرمائی ہے اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

'وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ'۔ یہ عام کے بعد دو خاص چیزوں کا ذکر فرما دیا کہ وہی خدا ہے جس نے تمہارے لیے کشتیاں اور ایسے چوپائے پیدا کیے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ قرآن کے زمانۂ نزول میں خشکی اور تری کی یہی سواریاں معروف تھیں اس وجہ سے انہی کا ذکر ہوا۔ اب سائنس کی برکت سے ان سواریوں کی فہرست گو بہت طویل ہو گئی ہے لیکن وہ سب انہی کے تحت ہیں اس لیے کہ جس سائنس کی مدد سے انسان ان کا موجد بنا ہے وہ خدا ہی کی ودیعت کردہ ہے۔

نعمتوں کا حق

'لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ...... الاٰیۃ'۔ یہ ان نعمتوں کا حق بیان ہو رہا ہے کہ خدا نے یہ سواریاں تمہیں اس لیے دی ہیں کہ تم ان سے فائدہ اٹھاؤ اور ان کے بخشنے والے کا حق پہچانو اور جب تم ان کی پیٹھوں پر بیٹھو تو اپنے رب کے اس فضل کو یاد کرو کہ اس نے بغیر کسی استحقاق کے یہ نعمتیں تم کو بخشی ہیں اس وجہ سے تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ تم ان پر سوار ہو کر اپنے غرور کا مظاہرہ کرو بلکہ اس وقت تمہیں یہ دعا کرنی چاہیے کہ پاک ہے وہ ذات جس نے ہماری مقصد برآری کے لیے ان کو ہمارے قابو میں کر دیا ہے ورنہ ہم تو ان کو قابو میں کرنے والے نہیں بن سکتے تھے۔

'لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ' میں لفظ 'ظُهُوْر' اگرچہ کشتیوں کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہے، اس کی واضح مناسبت گھوڑوں یا سواری کے دوسرے جانوروں ہی کے ساتھ ہے، لیکن یہاں یہ لفظ علیٰ سبیل التغلیب استعمال ہوا ہے۔ اس طرح کا استعمال عربی میں معروف ہے۔ مقصود یہی کہنا ہے کہ کشتی پر سوار ہو یا گھوڑے پر اس وقت غرور سے اکڑنے کے بجائے اپنے رب کی نعمت کا شکر ادا کرو لیکن خاص طور پر گھوڑوں کے ذکر کے ساتھ یہ تنبیہ اس لیے فرمائی کہ گھوڑے کا سوار عام پیدل چلنے والوں کے سامنے سے گزرتا ہے اس وجہ سے اس کے اندر اپنے تفوق کا احساس (خاص طور پر جب کہ وہ تنگ ظرف بھی ہو) زیادہ شدت کے ساتھ ابھرتا ہے یہاں تک کہ گھوڑے

کی طرح خود اس کی گردن بھی اکڑ جاتی ہے۔ یہی چیز اس زمانے میں موٹروں نے کہیں زیادہ بڑھا دی ہے۔ بہت کم خوش قسمت ایسے ہوتے ہیں جو موٹر میں بھلے آدمیوں کی طرح بیٹھیں۔ ان کی رعونت ان کی ہر ادا سے نمایاں ہوتی ہے اور اس قدر بدنما طریقے سے نمایاں ہوتی ہے کہ یہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی ہی ہیں یا کوئی اور مخلوق!

'سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ'۔ 'سُبْحٰنَ اللّٰہِ' اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کا کلمہ ہے یعنی وہ ہر قسم کے شرک اور ہر چھوٹے بڑے عیب سے پاک ہے۔ یہ تنزیہ آدمی کے اندر خدا ہی کے لیے تفویض و تسلیم کا جذبہ ابھارتی ہے اور یہی جذبہ انسان کو غرور و استکبار اور طغیان و فساد سے بچاتا اور اس کے اندر شکر و سپاس کی نیاز مندی و فروتنی پیدا کرتا ہے۔

'اِقْرَانٌ' کے معنی اپنے حریف پر غلبہ پانے اور اس کو مطیع کر لینے کے ہیں۔ یعنی اس وقت انسان کو پوری نیاز مندی کے ساتھ اپنے رب کے حضور میں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ اللہ ہی کی شان اور اسی کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس مرکب کو ہمارا مطیع و فرماں بردار بنا دیا ہے ورنہ ہم تو اس کو قابو میں کر لینے والے نہیں بن سکتے تھے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ اعتراف ایک حقیقت نفس الامری کا اعتراف ہے۔ اس دنیا میں جو چیزیں بھی ہماری خدمت گزاری میں لگی ہوئی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی تسخیر ہی سے لگی ہوئی ہیں۔ یہ تسخیر نہ ہو تو مجرد ہماری تدبیر کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بھی کمند نہیں ڈال سکتی۔ اونٹ جیسے بڑے جانور کی ناک میں آپ نکیل ڈال دیتے ہیں اور گھوڑے کے منہ میں لگام لگا دیتے ہیں۔ یہی کام اگر آپ جنگل کے درندوں کے ساتھ کرنا چاہیں تو ہزار خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد بھی آپ شیر پر سواری نہیں کر سکتے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی مہربانی ہے کہ اس نے ہماری خدمت کے لیے مختلف قسم کے جانور پیدا کیے اور ہمیں یہ صلاحیت بخشی کہ ہم ان کو مسخر کر کے اپنے مختلف مقاصد میں استعمال کرتے ہیں۔ اس زمانے میں بھاپ، بجلی اور ایٹم پر انسان کو جو تصرف حاصل ہوا ہے وہ بھی خدا ہی کی تسخیر سے حاصل ہوا ہے۔ ان فتوحات نے انسان کو بہت مغرور بنا دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک کون و مکان کا مالک سمجھنے لگا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ جب چاہے ان کو انسان کی قید سے آزاد کر کے رحمت کے بجائے عذاب بنا دے۔

یہاں جو دعا تلقین کی گئی ہے اس کا ظاہری تعلق تو اونٹ اور گھوڑے وغیرہ کی سواریوں ہی سے ہے لیکن یہی دعا اس زمانے کی دوسری ترقی یافتہ سواریوں کے لیے بھی موزوں ہے مثلاً موٹر اور ہوائی جہاز وغیرہ۔ البتہ بحری سواریوں کے لیے موزوں تر دعا 'بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا' والی دعا ہے جو حضرت نوحؑ سے منقول ہے۔

ایک بلیغ فقرہ

وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۔ اور جس طرح آیت ۱۰ میں لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ کے الفاظ نہایت معنی خیز گزرے ہیں اسی طرح یہاں یہ الفاظ بھی نہایت بلیغ، حقیقت افروز اور فلسفۂ دین کی ایک نہایت اہم حقیقت پر روشنی ڈالنے والے ہیں۔ یعنی انسان کو کسی سواری پر بیٹھے ہوئے صرف اتنی سی بات یاد نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم فلاں شہر سے فلاں شہر کو جانے والے ہیں بلکہ اس حقیقت کا بھی تذکر کرنا چاہیے کہ ایک دن ہمیں لازماً اپنے رب کی طرف لوٹنا اور اس کے آگے پیش ہونا ہے۔ اس تذکر کا محرک یہ ہے کہ ہر نعمت خدا کی پروردگاری کی شہادت ہے اور پروردگاری اس بات کو مستلزم ہے کہ پروردگار ایک دن سب کو جمع کر کے ان سے پرسش کرے کہ انھوں نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو کس طرح استعمال کیا۔ پھر ان کو انعام دے جنھوں نے ان کو صحیح استعمال کیا ہو اور ان سے انتقام لے جنھوں نے ان کو طغیان و فساد کا ذریعہ بنایا۔ یہ مسئولیت اور جزا و سزا اس ربوبیت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ تمام ربوبیت بے معنی اور یہ دنیا کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقت سے دوسری اعلیٰ حقیقت کی طرف گریز کی ایک نہایت خوب صورت مثال ہے جس کے متعدد شواہد اس کتاب میں پیچھے گزر چکے ہیں۔

وَجَعَلُوْا لَہٗ مِنْ عِبَادِہٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَکَفُوْرٌ مُّبِیْنٌ (۱۵)

مشرکین کے فکری تضادات پر تبصرہ

اس آیت کا تعلق اوپر کی آیت ۹ (وَلَئِنْ سَاَلْتَھُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ ..... الاٰیۃ) سے ہے۔ وہاں اس کے بعد تضمین کی آیتیں آگئی تھیں اس وجہ سے ان تضادات پر کوئی تبصرہ نہیں ہوا تھا جو اعتراف کرنے والوں نے اپنے اندر جمع کر لیے تھے۔ اب یہ ان تضادات پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ ایک طرف تو ان لوگوں کا اقرار یہ ہے کہ آسمان و زمین کا خالق خدا ہی ہے، دوسری طرف انھوں نے خدا کے بندوں ہی سے کچھ کو خدا کا جزو یعنی شریک ذات بنا رکھا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ان کے اپنے مسلّمہ کے خلاف ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہی تمام آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کا خالق ہے تو ہر چیز اسی کی مخلوق ہوئی، پھر کوئی چیز اس کا جزو کیسے ہو سکتی ہے! کسی چیز کے اس کا جزو ہونے کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ اس کی ذات کے اندر سے وجود میں آئی ہو اور پھر اس کا لازمی اقتضا یہ بھی ہے کہ وہ اس کی کفو اور ہمسر بھی ہو۔ اس بات کے ماننے کے بعد خدا کی یکتائی اور بے ہمگی کہاں باقی رہی! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین کے دیویوں دیوتاؤں میں کچھ تو وہ تھے جن کو وہ صرف خدا کی صفات یا اس کے حقوق میں شریک مانتے تھے اور کچھ ایسے تھے جن کو وہ اس کی ذات میں بھی شریک تصور کرتے تھے۔ مثلاً ملائکہ کے متعلق ان کا تصور یہ تھا کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں جو اس کی بڑی چہیتی ہیں، ان کی پرستش شفاعت اور نجات کا ذریعہ ہوگی۔ قرآن نے یہاں ان کے اسی زعم کی تردید کی ہے کہ خدا کے سوا جو بھی ہیں سب اس کی

مخلوق ہیں، کسی چیز کو بھی اس کے جزو ہونے کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ یہ انسان کا انتہائی ناشکراپن ہے کہ اس کو سب کچھ حاصل تو ہوا ہے خدا سے لیکن وہ دوسروں کو دیوی دیوتا بنا کر ان کے گن گاتا اور ان کی پرستش کرتا ہے۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت کی زد اس عقیدہ وحدت الوجود پر بھی پڑتی ہے جس کے اصل موجد تو ہندو فلسفی ہیں لیکن ہمارے صوفیوں کے ایک گروہ نے اسلام میں بھی اس کو لا گھسایا ہے۔ اس عقیدے کے بموجب تمام کائنات اور اس کی ہر چیز خدا کے جزو کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ تو جب مشرکین عرب کا فرشتوں کو خدا کا جزو بنانا شرک ٹھہرا تو ساری کائنات کو خدا کا جزو بنا دینا توحید کس طرح بن جائے گا۔

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا یَخۡلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصۡفٰکُمۡ بِالۡبَنِیۡنَ ۔ وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُہُمۡ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحۡمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجۡہُہٗ مُسۡوَدًّا وَّ ہُوَ کَظِیۡمٌ (۱۶-۱۷)

مشرکین کے عقیدے کا بھونڈا پن اخلاقی پہلو سے

'اَمْ' استنکار و استعجاب کے مفہوم میں ہے۔ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں جو قرار دیتے تھے، ان کے اس عقیدے پر ایک دوسرے پہلو سے نکیر فرمائی۔ اوپر والی آیت میں ان کے جزو خدا ہونے کی تردید تھی۔ اس آیت میں ایک نفسیاتی پہلو سے ان کے اس عقیدے کے بھونڈے پن کو واضح فرمایا کہ صرف یہی ستم نہیں ہے کہ خدا کی مخلوقات کو اس کا ایک جزو بنائے دے رہے ہیں بلکہ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ بیٹیوں کو اپنے لیے تو ایک نہایت نفرت کی چیز سمجھتے ہیں لیکن خدا کی طرف ان کو منسوب کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ جب خدا ہی سب کچھ پیدا کرتا ہے تو اس نے اپنے لیے بیٹیاں کیوں پسند کیں جب کہ ان کا اپنا حال یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جائے تو غم سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ برابر گھٹا گھٹا رہنے لگتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس عقیدہ کے گھڑنے میں صرف یہی نہیں کہ عقل سے انھوں نے کوئی کام نہیں لیا بلکہ یہ اس احساسِ شرافت کی بھی بالکل نفی ہے جو انسانی فطرت کا بالکل بدیہی تقاضا ہے۔ اگر ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا تو کم از کم وہ اتنا انصاف تو کرتے کہ خدا کی طرف وہ چیز نہ منسوب کرتے جس سے وہ خود اس درجہ بیزار و متنفر ہیں۔ یہ عقیدہ ایجاد کر کے انھوں نے صرف عقل ہی کی تذلیل نہیں کی ہے بلکہ احساسِ عدل سے اپنی بے مائگی کا ثبوت بھی دیا ہے۔

اَوَ مَنۡ یُّنَشَّؤُا فِی الۡحِلۡیَۃِ وَ ہُوَ فِی الۡخِصَامِ غَیۡرُ مُبِیۡنٍ (۱۸)

یہ ان کے اس احساس کی تعبیر ہے جو لڑکی کی ولادت کی خبر سن کر ان کے دل میں پیدا ہوتا اور ان

کی گھٹن کا باعث ہوتا ہے۔ فرمایا کہ وہ اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ کیا وہ وجود میں آئی ہے جو زیوروں میں پلتی اور مفاخرت کے مقابلوں میں بالکل بے زبان ہے۔

لفظ 'خِصَام' یہاں مبارزت اور مفاخرت دونوں معنوں پر مشتمل ہے اور عرب جاہلیت ان دونوں ہی چیزوں کے رسیا تھے۔ ان کے ہاں آئے دن جنگیں بھی برپا ہوتی رہتیں اور مفاخرت کے مقابلے بھی ہوتے رہتے جن میں ہر قبیلہ کے خطیب اور شاعر اپنے اپنے قبیلہ کے مفاخر بیان کرنے میں دادِ خطابت و شاعری دیتے۔ ظاہر ہے کہ عورت ان دونوں ہی میدانوں میں فروتر تھی، نہ وہ زرہ بکتر اور شمشیر و سناں کی مخلوق تھی اور نہ خطابت و شاعری کی اس وجہ سے اہل عرب کی نگاہوں میں اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی اور یہ بات کچھ اہل عرب ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس زمانے میں بھی عورت کو جو اہمیت حاصل ہوئی ہے وہ نمائش کی مجالس ہی میں ہوئی ہے۔ مبارزت اور مفاخرت کے اعتبار سے تو آج بھی وہ وہیں ہے جہاں عرب جاہلیت کے دور میں تھی۔ یہ امر یہاں اچھی طرح ملحوظ رہے کہ عورت پر یہ تبصرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ ان اہلِ عرب کی طرف سے ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ عام طور پر مفسرین نے یہ خیال کیا کہ یہ تبصرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ یہ غلط فہمی لوگوں کو کلام کے سیاق پر نہ غور کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ (۱۹)

ان واہمہ کی تردید ایک اور پہلو سے

ان کے اس واہمہ پر ایک اور پہلو سے بھی ضرب لگائی۔ فرمایا کہ انھوں نے فرشتوں کو جو عورتیں بنا کر رکھ دیا ہے تو آخر ان کے اس دعوے کی بنیاد کیا ہے؟ کیا جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیدا کیا تو یہ اس وقت موجود تھے! اس کے بعد نہایت سخت الفاظ میں دھمکی دی ہے کہ ان کا یہ دعوے نوٹ رہے گا اور ایک دن ان سے اس کی پرسش ہونی ہے۔ فرشتوں کے متعلق یہ پوری بحث سورۂ صافّات کی تفسیر میں بھی گزر چکی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ۝ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۲۰-۲۲)

[illegible]

اپنی اس حماقت کی تائید و تصویب میں مشرکین جو شرعی دلیل پیش کرتے یہ اس کا حوالہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان کو پوجنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کو ان کی عبادت پسند ہے۔

اگر یہ چیز اس کو پسند نہ ہوتی تو اس کی قدرت میں تو سب کچھ ہے، وہ اپنی مشیّت کے زور سے اس کو روک دیتا اور ہم ان کی عبادت نہ کر پاتے۔ جواب میں فرمایا کہ یہ محض ان کی اٹکل پچو باتیں ہیں۔ اس باب میں ان کو کوئی علم نہیں ہے۔ خدا کی پسند یا ناپسند کے جاننے کا یہ ذریعہ نہیں ہے کہ کسی شخص یا گروہ کو کسی برائی کے کرنے کی ڈھیل مل ہوئی ہے۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو یہ دلیل ہر چور، ہر زانی، ہر بدمعاش اپنی چوری اور بدمعاشی کے جواز بلکہ استحسان کی تائید میں پیش کر سکتا اور کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ بات خدا کی مرضی کے خلاف ہوتی تو وہ اپنی مشیّت کے زور سے اس کو روک دیتا لیکن جب اس نے اس کو نہیں روکا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم نے جو کچھ کیا اس کی مرضی سے کیا اور ہمارا یہ فعل اس کو پسند ہے۔

اَمْ اٰتَیْنٰھُمْ کِتٰبًا مِّنْ قَبْلِہٖ فَھُمْ بِہٖ مُسْتَمْسِکُوْنَ: فرمایا کہ خدا کی پسند اور ناپسند کے جاننے کا قابلِ وثوق ذریعہ اس کی کتابیں اور اس کے نبیوں کی تعلیمات ہیں تو کیا اس قرآن سے پہلے ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے جس کو وہ سند میں پیش کر سکتے ہوں؟ اگر ایسا نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو آخر وہ کس سند پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کو خدا کی تائید حاصل ہے؟

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّھْتَدُوْنَ (۲۲)

مشرکین کا روایتی دلیل اور اس کی تردید

اوپر مشرکین کی کلامی دلیل کی تردید فرمائی ہے۔ اس پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ مشرکین عرب کو بھی بالکل اسی طرح کا دھوکا پیش آیا جس طرح کا دھوکا ہمارے ہاں مجبرہ کو پیش آیا۔ اب یہ ان کی روایتی دلیل کا حوالہ ہے جس پر ان کو سب سے زیادہ اعتماد تھا اور چونکہ اس کی بنیاد تقلیدِ آباء پر ہے جس کا تعلق عقل کے بجائے مجرّد جذبات سے ہے اس وجہ سے ہر دور کے اشرار نے اس ہتھیار سے فائدہ اٹھایا اور عوام کے جذبات بھڑکا کر مصلحین کی مساعی اصلاح کو ناکام کرنے کی کوشش کی ہے۔

'اُمَّۃٌ' کے معنی، جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، کسی قوم کے مجموعی طریقہ اور مسلک کے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنی اس حماقت کی تائید میں یہ دلیل بھی لاتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک صحیح مسلک اور ایک اعلیٰ طریقہ پر پایا ہے اور ہم چونکہ انہی کے مسلک پر ہیں اس وجہ سے بالکل ہدایت کی راہ پر ہیں۔ انہی کے نقشِ قدم کی پیروی ہماری ہدایت کی ضامن ہو گی۔ اگر ہم اس سے ذرا منحرف ہوئے تو ہم ہدایت کی راہ سے بھٹک جائیں گے اس وجہ سے جو لوگ ہمیں اس راہ سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ ہماری تباہی کے درپے ہیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ لفظ 'اُمَّۃٌ' کی تنکیر اس کی عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۲۳-۲۴)

ہر دور کے مکذبین کا طریقہ ایک ہی رہا ہے

فرمایا کہ یہ لوگ جس طرح اپنے دین کے معاملے میں اندھے مقلد ہیں اسی طرح اپنی دلیل میں بھی پچھلے انبیاء کے مکذبین کے مقلد ہیں۔ تم سے پہلے جو منذر بھی کسی بستی میں ہم نے بھیجا اس کے انذار اور اس کی دعوتِ اصلاح کا جواب قوم کے مستکبرین نے یہی دیا کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک خاص طریقہ پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم کی پیروی پر جمے رہیں گے۔ رسول نے جب ان سے یہ سوال کیا کہ اگر میں تمہارے باپ دادا کے طریقہ سے بہتر طریقہ تمہارے پاس لے کر آیا ہوں جب بھی تم اپنے باپ دادا کے طریقہ ہی پر جمے رہو گے! اس کے جواب میں انھوں نے جھلا کر کہا کہ ہم تو اس سارے ہی کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو!

'اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ' سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ جواب انھوں نے جھلا کر اور آپے سے باہر ہو کر دیا۔ اس لیے کہ جواب اصل سوال سے کئی قدم آگے ہے۔ رسول کا سوال تو صرف یہ تھا کہ اگر میرا طریقہ، جس کی میں دعوت دے رہا ہوں تمہارے باپ دادا کے طریقہ سے بہتر ہوا تو کیا اس صورت میں بھی تم اپنی اسی ہٹ پر قائم رہو گے۔ جواب میں انھوں نے کہا کہ ہم تمہاری ہر بات کے منکر ہیں۔ یعنی مسئلہ 'اَھْدٰی' اور 'غیر ھدٰی' کے امتیاز کا نہیں ہے بلکہ ہم تمہاری کوئی بات سرے سے سننے اور ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔

دوسری یہ کہ کسی شے کے 'اَھْدٰی' اور 'غیر اھدٰی' میں امتیاز کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ودیعت فرمائی ہے بشرطیکہ انسان کے پاس گوشِ حقیقت نیوش ہو۔ وہ مغرور، ضدی اور ہٹ دھرم نہ ہو۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۲۵)

مطلب یہ ہے کہ جب قوموں کی ضد اور مکابرت اس حد کو پہنچ گئی کہ انھوں نے رسولوں کی بات سننے اور سمجھنے سے انکار کر دیا تب اللہ تعالیٰ نے ان سے کفرانِ نعمت کا انتقام لیا، پھر دیکھو کہ رسولوں کے جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا!!

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات: ۲۶-۵۰

آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت اور شرک سے ان کے اعلانِ براءت کا حوالہ ہے جس سے مقصود

کی حقیقت کا اظہار ہے کہ قریش کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہے کہ جس دینِ شرک کی وہ پیروی کر رہے ہیں یہ ان کو ان کے آباء و اجداد سے وراثت میں ملا ہے۔ ان کے اصل جدِّ امجد تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جنھوں نے شرک ہی کی بنا پر اپنی قوم کو چھوڑا اور ان کی اس ہجرت اور اعلانِ برارت کی ایت آج تک ان کی ذرّیت کی دونوں شاخوں میں موجود ہے۔ پھر قریش کس طرح یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے ،، و اجداد کے طریقہ پر چل رہے ہیں۔

اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد قریش کی سرکشی کے اصل اسباب پر روشنی ڈالی ہے ،رنبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تم اپنی دعوتِ حق پر جمے رہو۔ انبیاء کا اصل راستہ یہی ہے جس کی طرف تم لوگوں کو بلا رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو ابھی تمھارے اور تمھارے مخالفوں کے درمیان فیصلہ کر دے لیکن اس کی سنّت یہ ہے کہ ایک خاص حد تک وہ حق کے دشمنوں کو بھی مہلت دیتا ہے ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۶ - ۵۰ وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِۦٓ إِنَّنِى بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ ﴿٢٦﴾
إِلَّا ٱلَّذِى فَطَرَنِى فَإِنَّهُۥ سَيَهْدِينِ ﴿٢٧﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ
بَاقِيَةً فِى عَقِبِهِۦ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٢٨﴾ بَلْ مَتَّعْتُ هَٰٓؤُلَآءِ
وَءَابَآءَهُمْ حَتَّىٰ جَآءَهُمُ ٱلْحَقُّ وَرَسُولٌ مُّبِينٌ ﴿٢٩﴾ وَلَمَّا
جَآءَهُمُ ٱلْحَقُّ قَالُوا۟ هَٰذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِۦ كَٰفِرُونَ ﴿٣٠﴾ وَقَالُوا۟
لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ ٱلْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ﴿٣١﴾
أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ
فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ
لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا ۗ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا
يَجْمَعُونَ ﴿٣٢﴾ وَلَوْلَآ أَن يَكُونَ ٱلنَّاسُ أُمَّةً وَٰحِدَةً لَّجَعَلْنَا
لِمَن يَكْفُرُ بِٱلرَّحْمَٰنِ لِبُيُوتِهِمْ سُقُفًا مِّن فِضَّةٍ وَمَعَارِجَ

عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا
يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ع
ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَ
اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ
مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ
بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ
الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَفَاَنْتَ
تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾
فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَوْ نُرِيَنَّكَ
الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَاسْتَمْسِكْ
بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۳﴾ وَاِنَّهٗ
لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔــلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَسْـَٔــلْ مَنْ
اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ
اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾ ع

ترجمۂ آیات ۲۶-۴۵

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ میں ان چیزوں سے بالکل بری ہوں جن کو تم پوجتے ہو۔ میں صرف اسی کو پوجتا ہوں جس نے مجھ کو پیدا کیا۔ پس بے شک وہی میری رہنمائی فرمائے گا اور اس کو اس نے ایک پائدار روایت

کی حیثیت سے چھوڑا اپنے اخلاف میں تاکہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں۔ ۲۸-۲۹
بلکہ یوں ہوا ہے کہ میں نے ان کو اور ان کے آباء و اجداد کو دنیا سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور ایک واضح کر دینے والا رسول آیا اور جب ان کے پاس حق آ گیا، انھوں نے کہا یہ تو جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں۔ ۲۹-۳۰
اور انھوں نے اعتراض اٹھایا کہ یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کے فضل کو یہی تقسیم کرتے ہیں! دنیا کی زندگی میں ان کی معیشت کا سامان تو ہم نے تقسیم کیا ہے اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کیے ہیں تاکہ وہ باہم دگر ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اس سے بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔ ۳۱-۳۲
اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو جو لوگ خدائے رحمان کے منکر ہیں ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی چاندی کے جن پر وہ چڑھتے۔ اور ان کے گھروں کے کواڑ اور ان کے تخت بھی چاندی کے جن پر وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے۔ اور یہ چیزیں سونے کی بھی کر دیتے۔ اور یہ چیزیں تو بس دنیا کی زندگی کی متاع ہیں اور آخرت تیرے رب کے پاس متقیوں کے لیے ہے۔ ۳۳-۳۵
اور جو خدا کے ذکر سے اعراض کر لیتا ہے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور وہ ان کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہدایت پر ہیں۔ یہاں تک کہ جب یہ ہمارے پاس آئے گا تو

کہے گا کہ کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق کے دونوں کناروں کی دوری ہوتی! پس کیا ہی بُرا ساتھی ہو گا! اور جب کہ تم نے اپنے اوپر ظلم ڈھائے تو یہ چیز آج تم کو ذرا بھی نافع نہیں ہو گی کہ تم عذاب میں ایک دوسرے کے شریک ہو۔ ۳۶-۳۹

پس کیا تم بہروں کو سناؤ گے یا اندھوں کو راہ دکھاؤ گے اور ان کو جو کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں! پس یا تو یہ ہو گا کہ ہم تم کو اٹھا لیں گے پھر ان سے بدلہ لیں گے یا تم کو دکھا دیں گے وہ چیز جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے سو ہم ان پر پوری طرح قادر ہیں۔ پس اس کو مضبوطی سے تھامے رکھو جو تمہارے اوپر وحی کی گئی ہے۔ بے شک تم ایک سیدھی راہ پر ہو۔ اور یہ تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے یاددہانی ہے اور عنقریب تم سب سے پرسش ہونی ہے۔ اور پوچھو ان سے جن کو ہم نے تم سے پہلے بھیجا اپنے رسولوں میں سے کیا ہم نے خدائے رحمان کے سوا دوسرے معبود ٹھہرائے جن کی عبادت کی جائے! ۴۰-۴۵

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ إِنَّنِي بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ (۲۶)

حضرت ابراہیمؑ کے اعلانِ براءت کی یاددہانی

'بَرَآءٌ' مصدر ہے جو صفت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مصدر جب صفت کے مفہوم میں استعمال ہو تو اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے جیسے 'زید عدل' اس وجہ سے 'اِنَّنِیْ بَرَآءٌ' کے معنی ہوں گے 'میں تم سے یک قلم بری ہوں، میرے اور تمہارے درمیان اب کوئی رابطہ باقی نہیں رہا۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس اعلانِ براءت کا حوالہ ہے جس کا ذکر پچھلی سورتوں میں تفصیل سے ہو چکا ہے اور مقصود اس حوالہ سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، قریش پر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ اپنے شرک کی حمایت میں اپنے آباء و اجداد کا حوالہ جو دیتے ہیں تو آخر اپنے

اصل جدِّ امجد کو کیوں بھول جاتے ہیں جنھوں نے شرک سے بیزاری ہی کی بنا پر اپنے باپ اور اپنی قوم کو چھوڑا اور اپنی ذرّیت کو اس وادیٔ غیر ذی زرع میں بسایا! مطلب یہ ہے کہ ان کو اگر اپنے اجداد کے دین پر نازہی ہے تو سب سے زیادہ مایۂ ناز تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جن کی برکت سے ان کو دین اور دنیا دونوں کی نعمتیں ملیں تو آخر ان کو چھوڑ کر انھوں نے ان جاہلوں کی تقلید کیوں اختیار کی جنھوں نے ان کو اصل بزرگِ خاندان کے دین سے ہٹا کر شرک کے جوہڑ میں گرایا۔

یہ اعلان برات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے باپ کے سامنے کیا، جیسا کہ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ کے الفاظ سے واضح ہے۔ اس میں قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ وہ سوچیں تو ان کے جدِّ امجد نے ان کے لیے روایت تقلیدِ آبا میں شرک پرستی کی نہیں بلکہ مبتلائے شرک باپ دادا سے بیزاری کی چھوڑی ہے۔

اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ (۲۷)

میرے نزدیک یہ استثنا مِمَّا تَعْبُدُوْنَ سے ہے۔ جس طرح مشرکینِ عرب اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے تھے لیکن اس کے شریک ٹھہرا کر، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی خدا کی منکر نہیں تھی بلکہ اس کے شریک ٹھہراتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اس اعلان سے قوم پر یہ واضح فرمایا کہ اللہ کے سوا، دوسرے دیوی دیوتا جو تم نے بنا رکھے ہیں، وہ تو بالکل بے حقیقت ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی بندگی میں کرتا ہوں اور کروں گا اس لیے کہ وہ میرا خالق و فاطر ہے اس وجہ سے بندگی کا حق دار ہے۔

فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ کا تعلق ان کے اعلانِ برائت سے ہے یعنی میں اپنے باپ اور اپنی قوم کو چھوڑنے کا جو اعلان کر رہا ہوں تو یہ اعلان ہے تو نہایت کٹھن۔ میں اس کی مشکلات سے واقف ہوں لیکن اپنے جس رب کی خاطر میں یہ بازی کھیل رہا ہوں مجھے امید ہے کہ وہ تمام مشکلات میں میری رہنمائی فرمائے گا۔

وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۲۸)

ضمیر منصوب کا مرجع وہی اعلانِ برائت و ہجرت ہے جس کا ذکر اوپر گزرا۔ اس نوع کی ضمیریں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔

كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً سے مراد پائدار اور باقی رہنے والی روایت (TRADITION) ہے۔ اس اعلان برائت یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے قول و عمل اور اپنی تعلیم و تذکیر سے اپنے اس اعلان برائت و ہجرت کو اپنی ذریت میں ایک مستحکم روایت کی حیثیت دے دی۔ اسلاف، اخلاف کو یہ روایت ... ہدایت اخلاف میں باقی رہی

منتقل کرتے اور اس کو زندہ رکھنے کی برابر وصیت اور تاکید کرتے رہے۔ ذرّیت ابراہیمؑ کی ایک شاخ یعنی بنی اسرائیل میں اس کا چرچا ان کے صحیفوں اور ان کے اندر مبعوث ہونے والے انبیا رکی تعلیم و تذکیر سے قائم رہا۔ دوسری شاخ یعنی بنی اسماعیل میں چونکہ انبیا رنہیں مبعوث ہوئے اس وجہ سے اس کا چرچا کچھ مدت بعد کمزور پڑ گیا تاہم اس کے اندر بھی ایک گروہ برابر ان لوگوں کا باقی رہا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دینِ حنیفی کے پیرو، ان کی دعوتِ توحید کے حامل اور ان کی شرک بیزاری کی روایات کے امین رہے۔

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ یعنی یہ روایت انھوں نے اپنی ذرّیت میں اس لیے چھوڑی کہ ان کے لیے نشانِ راہ کا کام دیتی رہے۔ جب کبھی شیطان ان کو بھٹکانے لگے یا وہ بھٹک جائیں تو اس نشان کو دیکھ کر پھر صراطِ مستقیم کی طرف پلٹ سکیں۔

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۲۹-۳۰)

مخالفت کی اصل علت

'حق' سے مراد قرآن مجید ہے اور 'اٰبَآءَهُمْ' کے بعد فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ کے الفاظ بربنائے وضاحت قرینہ محذوف ہیں۔ سورۂ حدید آیت ۱۶ میں بالکل اسی سیاق میں مذکورہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ نیز سورۂ انبیا آیت ۴۴ میں یہی مضمون اس طرح آیا ہے: 'بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ' (بلکہ ہم نے ان کو اور ان کے آباء و اجداد کو دنیا کی نعمتوں سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ اسی حال میں ان پر ایک طویل مدت گزر گئی)۔

مطلب یہ ہے کہ یہ تو محض ان کی سخن سازی ہے کہ قرآن کی مخالفت وہ اس بنا پر کر رہے ہیں کہ اس کی دعوت ان کے دینِ آباء کے خلاف ہے بلکہ اس مخالفت کی اصل علت یہ ہے کہ اللہ نے ان کو اور ان کے آباء و اجداد کو دنیا کی نعمتوں سے بہرہ مند کیا اور اس رفاہیت پر ایک طویل مدت گزر گئی ہے جس کے سبب سے ان کے دلوں پر قساوت چھا گئی ہے۔ اب جو ان کے پاس قرآن اور حقائق کو روشن کر دینے والا رسول آیا تو یہ دعوت و تعلیم ان کے دلوں پر شاق گزر رہی ہے۔ وہ اس کے قبول کرنے میں اپنے دنیوی مفادات کے لیے خطرہ تصور کرتے ہیں اس وجہ سے اپنے عوام کو اس سے برگشتہ کرنے کے لیے اس کو سحر قرار دیتے ہیں۔

قرآن کو سحر کہنے کی اصل علت

قرآن کو قریش جو سحر کہتے تو اس کا ایک خاص پہلو تھا جس پر ہم دوسرے مقام میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ کوئی حقیقت اگر صحیح الفاظ میں سامنے آئے تو لازماً وہ دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ قرآن چونکہ سراسر حقیقت ہے، جیسا کہ لفظ 'حق' سے واضح ہے اور اس کا اسلوبِ بیان بھی معجزانہ ہے اس وجہ سے وہ قدرتی طور پر ان لوگوں کے دلوں پر اثر انداز ہوتا جو مفاد پرست نہیں تھے اور جن کو قریش کے

لیڈروں کی طرح یہ اندیشہ نہیں تھا کہ اس کے ظہور سے ان کی سیادت کو کوئی خطرہ لاحق ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو قرآن کے اثر سے بچائے رکھنے کے لیے قریش کے لیڈر یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ قرآن ایک لغو اور بے معنی کتاب ہے۔ اگر وہ یہ کہتے تو ان کے عوام خود ان کو بے وقوف ٹھہراتے کہ یہ سورج پر خاک ڈالنے کی کوشش ہے۔ البتہ وہ عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ قرآن میں جو بلاغت و معجزات ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ آسمان سے نازل ہوا ہے جیسا کہ اس کے پیش کرنے والوں کا دعویٰ ہے بلکہ یہ محض الفاظ کی جادوگری ہے جس میں ہمارے شاعروں اور خطیبوں کی طرح اس کو پیش کرنے والا بھی ماہر ہے۔ گویا ان کی کوشش یہ تھی کہ لوگوں کے دلوں پر یہ اثر پڑنے نہ پائے کہ قرآن خدائی وحی ہے بلکہ لوگ اس کو اسی درجے میں رکھیں جس درجے میں اپنے بڑے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کو رکھتے ہیں۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (۳۱)

عوام کو بہکانے کے لیے ایک اچھا شغلہ

قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے عوام کو برگشتہ کرنے کے لیے یہ بات بھی قریش کے لیڈر کہتے کہ اگر یہ کتاب خدا کی نازل کی ہوئی ہے تو آخر یہ مکہ یا طائف کے کسی بڑے سردار پر کیوں نہیں نازل کی گئی! 'مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ' سے مراد مکہ اور طائف ہیں اس لیے کہ یہی دو بستیاں عرب کے سیادت و اشراف کا مرکز تھیں۔ پشتہا پشت سے عرب کی سیادت و قیادت انہی لوگوں کو حاصل رہی تھی اس وجہ سے سادہ لوح عوام کو یہ بات آسانی سے باور کرائی جا سکتی تھی کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ کو اگر لوگوں کی رہنمائی کے لیے کوئی چیز اتارنی ہی ہوتی تو وہ انہی دونوں بستیوں میں سے کسی رئیس ابن رئیس پر اتارتا، ان کو چھوڑ کر، وہ ایک ایسے شخص کا انتخاب کیوں کرتا جو ایک غریب ابن غریب ہے اور جس کی بات سننے کے لیے امراء مشکل ہی سے تیار ہو سکتے ہیں۔

أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

معترضین کو جواب

یہ ان فراعنہ کی رعونت کا جواب ہے کہ ان کی یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا اجارہ دار وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ انہی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس نعمت سے جس کو چاہیں نوازیں اور جس کو چاہیں محروم رکھیں۔ حالانکہ اس دنیا میں بھی ان کو جو وسائلِ معیشت حاصل ہوئے ہیں، خدا ہی کی تقسیم سے حاصل ہوئے ہیں۔ انھوں نے خود نہیں حاصل کیے ہیں۔ اگر یہ خود حاصل کر لینے والے ہوتے تو ان اغنیاء کے درمیان درجات و مراتب کا تفاوت کیوں ہوتا؟ اپنے اختیار میں معاملہ ہوتے ہوئے کوئی خود اس بات پر کیوں راضی ہوتا کہ وہ کسی پہلو سے دوسرے سے فروتر ہو کر رہے۔ اپنی خواہش کے خلاف یہ فرقِ مراتب اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ تقسیم کا معاملہ ان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے جو اپنی صوابدید اور حکمت

کے مطابق جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے۔

'لِیَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا'۔ 'اِتَّخَذَ فُلَانٌ فُلَانًا سُخْرِیًّا' کے معنی ہیں فلاں نے فلاں کو اپنے کام یا اپنی خدمت میں لگایا۔

تفاوتِ درجات کی حکمت

یہ حکمت بیان فرمائی اس بات کی کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ذہنی اور مادی دونوں ہی اعتبار سے درجات و مراتب کا تفاوت کیوں رکھا ہے؟ فرمایا کہ ایسا اس نے اس وجہ سے کیا ہے کہ لوگ باہم دگر تعاون کی زندگی بسر کریں اور ایک دوسرے کو اپنے کام میں لگا سکیں۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے بنائی ہے اس وجہ سے اس کا نظام اس نے اس طرح کا رکھا ہے کہ اس میں ہر شخص دوسروں کا محتاج بھی ہے اور محتاج الیہ بھی۔ بڑے سے بڑا بادشاہ بھی دوسروں کا محتاج ہے اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی اس میں محتاج الیہ ہے۔ یہاں کوئی شخص بھی دوسروں سے مستغنی نہیں اور کوئی شخص بھی ایسا نہیں کہ معاشرہ میں کسی نہ کسی پہلو سے اس کی افادیت نہ ہو۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ خالق کائنات نے ہر شخص کو ایک ہی درجے کی صلاحیت، ایک ہی طرح کے ذوق، ایک ہی مرتبہ کی ذہانت اور ایک ہی حیثیت کے وسائل و ذرائع کے ساتھ نہیں پیدا کیا بلکہ ان اعتبارات سے لوگوں کے درمیان بڑا تفاوت رکھا ہے۔ یہ تفاوت معاشرہ کی تشکیل اس طرح کرتا ہے کہ اس میں ایک طرف متبحر عالم، نامور مصنف، یکتائے روزگار محقق، شہرۂ آفاق مدبر اور طاقتور حکمران بھی پیدا ہوتے ہیں، دوسری طرف کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور، گٹھڑیاں ڈھونے والے قلی، حاضر خدمت رہنے والے خادم، گلیاں اور نالیاں صاف کرنے والے مہتر بھی اس میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سارے طبقات معاشرہ کی تشکیل کے لیے ضروری بلکہ ناگزیر ہیں۔ ان سب کی خدمت کی نوعیت الگ الگ ہے مگر ان میں سے کوئی عنصر بھی نہ حقیر ہے اور نہ ان میں سے کسی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ معاشرہ کی مشین جاری رکھنے کے لیے اس مشین کے چھوٹے سے چھوٹے پرزے کی دیکھ بھال بھی، اس کی افادیت کی نسبت سے ضروری ہے۔

دنیا کو درجات و مراتب کے اس فرق کے ساتھ پیدا کر کے اللہ تعالیٰ امتحان کر رہا ہے کہ جو لوگ اعلیٰ صلاحیتوں اور بہتر وسائل کے امین بنائے گئے ہیں وہ اپنے وسائل اور اپنی صلاحیتیں کس طرح استعمال کر رہے ہیں؛ ان کو پا کر وہ غرور، خود سری، تغلب اور خالق کائنات کی نافرمانی میں مبتلا ہو گئے ہیں یا اس کے شکر گزار و فرمانبردار اور اس کی خلق کے غمگسار رہے ہیں؟ اسی طرح وہ ان لوگوں کو بھی دیکھ رہا ہے جو فروتر اور کمتر وسائل کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں کہ وہ اپنے اپنے دائرہ کار میں اپنے فرائض کو پہچاننے والے اور اپنے خالق سے ڈرنے والے، اپنی خودی اور خودداری

کی حفاظت کرنے والے ہیں یا اپنے فرائض چھوڑ کر اس خبط میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ انھیں ان لوگوں کو نیچا دکھانا چاہیے جو ان کے حاکم اور افسر بنے ہوئے ہیں۔

اگر ان میں سے پہلی صورت وجود میں آتی ہے تو اعلیٰ اور ادنیٰ کے صالح تعاون سے صالح معاشرہ اور صالح تمدن وجود میں آتا ہے اور اس کے تمام اجزاء بلا امتیاز اعلیٰ و ادنیٰ اس دنیا میں بھی عزت پاتے ہیں اور آخرت میں بھی ہر ایک اپنی اپنی خدمات اور اپنے حسن نیت کے مطابق صلہ پائے گا۔ اگر دوسری شکل ہوتی ہے تو معاشرہ کا نظام بالتدریج مائل بہ فساد ہونا شروع ہوتا ہے اور بالآخر فنا ہو جاتا ہے اور آخرت میں بھی اس کے تمام بڑے اور چھوٹے عناصر اپنی اپنی شرارت یا غفلت کے مطابق خدا کے عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔

اس زمانہ میں جو لوگ اس خبط میں مبتلا ہیں کہ وہ دنیا سے طبقات کے وجود کو مٹا کے رہیں گے وہ اس ارادے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ لوگوں کو ذہنی، مزاجی، طبعی اور عملی صلاحیتوں کے اعتبار سے مساوی درجہ کا بنانے میں کامیاب نہ ہو جائیں اور یہ چیز محال ہے۔ جن قوموں نے اس خبط میں مبتلا ہو کر خون کے دریا بہا دیے ان کا حال بھی یہ ہے کہ وہاں بڑے سے بڑے فراعنہ بھی موجود ہیں اور ان فراعنہ کے بوٹوں پر پالش کرنے والے اور گلیوں میں جھاڑو دینے والے بھی موجود ہیں۔ اور اگر وہ اس محال کو ممکن بنانے میں کامیاب ہو گئے یعنی انھوں نے پوری قوم کو صلاحیتوں اور ذہنی و مادی قوتوں کے اعتبار سے ایک درجہ پر کر دیا تو اسی دن باہمی تعاون کی بنیاد ختم ہو جائے گی اور قوم میں انارکی پھیل جائے گی۔ جب ہر شخص لینن یا سٹالن بننے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لے گا تو آخر وہ لینن یا اس کی کار چلانے والا ڈرائیور یا ان کے جوتوں پر پالش کرنے والا خدمت گار بننے پر کیوں قانع ہو گا؟ پھر تو ہر شخص خدا و مذہبی بننے کی کوشش کرے گا اور اتنے خداؤں کی کشمکش میں اس دنیا کا جو حشر ہو گا اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے!!

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ (۳۳-۳۴)

حذف کا ایک اسلوب

یہاں 'مِّنْ فِضَّةٍ' کے الفاظ جس طرح 'سُقُفًا' کے بعد آئے ہیں اسی طرح 'مَعَارِجَ'، 'اَبْوَابًا' اور 'سُرُرًا' کے بعد بھی آنے چاہئیں لیکن فصیح عربی کے معروف اسلوب کے مطابق وہ حذف کر دیے گئے اس لیے کہ قرینہ خود ان کو واضح کر رہا ہے۔

متاع دنیا کی بے حقیقتی

اب یہ اس متاع دنیا کی بے حقیقتی واضح فرمائی جا رہی ہے جس کے غرور نے کفار کو اس خبط میں مبتلا کیا کہ وہ سمجھنے لگ گئے کہ جب اس دنیا کی ساری شوکت و عظمت ہم کو حاصل ہوئی تو کیس

طرح ممکن ہے کہ خدا کو کوئی کتاب اتارنی ہوتی تو اس کے لیے وہ ہمارے سوا کسی اور کو تلاش کرتا!

فرمایا کہ دنیا کے جس سروسامان پر ان کو یہ ناز ہے اس کی حقیقت خدا کی نگاہوں میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو اللہ تعالیٰ کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں اور ان پر چڑھنے کے زینے اور ان کے کواڑ اور ان کے ٹیک لگانے کے تخت سب چاندی سونے کے کر دیتا لیکن اس نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ یہ آزمائش لوگوں کے لیے بہت سخت ہو جاتی۔ عام لوگ جب دیکھتے کہ خدا کے کفر کرنے والوں کو یہ کچھ حاصل ہے تو لوگ اندھے ہو کر کفر ہی کی راہ اختیار کر لیتے۔ کوئی بڑا ہی نصیبہ ور ہوتا تو وہ اپنے ایمان کو اس فتنہ سے بچا پاتا۔ خلق کو اس آزمائش سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں سے اہل ایمان اور اہل کفر دونوں ہی کو حصہ دیا ہے البتہ آخرت میں اہل کفر کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ بات جو فرمائی کہ لوگ ایک ہی ڈگر پر چل پڑتے، ایک کلیہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ عمومیت و اکثریت کے اعتبار سے فرمائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دنیا صرف کافروں ہی کو ملتی تو اس دنیا میں بہت تھوڑے لوگ نکلتے جو ایمان کی راہ اختیار کرتے تاہم نکلتے ضرور، خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہوتی۔ انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے کہ شدید سے شدید امتحان میں بھی ان کے اندر سے ایسے جوہر قابل نکل آتے ہیں جو آگ کے سمندر سے گزر جاتے ہیں لیکن اپنے رب کو نہیں چھوڑتے۔

وَزُخْرُفًا ۚ وَإِنْ كُلُّ ذَٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۳۵)

'زخرف' 'زُخْرُف' کے معنی زینت کے بھی آتے ہیں اور سونے کے بھی جو زینت کا ذریعہ ہوتا ہے۔

کا اعراب تالیف کلام کے اعتبار سے اس کو مِنْ فِضَّةٍ کے محل پر عطف بھی کر سکتے ہیں اور فعل بھی محذوف مان سکتے ہیں یعنی لَجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ زُخْرُفًا۔ مدعا میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوگا۔ یعنی اگر ہم چاہیں تو مذکورہ ساری چیزیں ان کے لیے سونے کی بھی بنا دیں یا ان کے لیے سونے کے ڈھیر اکٹھے کر دیں۔

'لمّا' کی تحقیق 'لَمَّا' یہاں 'اِلَّا' کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس 'ل' کی جگہ پر ہے جو 'اِنْ' مخففہ اور 'اِنْ' نافیہ کے درمیان بطور علامت فرق کے آیا کرتا ہے۔ بعض جگہ اس 'لَ' کو اشباع یعنی کلام کے صوتی خلا کو بھرنے کے لیے 'لَمَّا' کر دیتے ہیں۔ مثلاً سورۂ طارق میں ہے اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (۴) (بے شک ہر جان پر ایک نگران ہے) اصلاً تو یہ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَعَلَيْهَا

مُلْحَقْ ہے لیکن فقرے میں ایک قسم کا معنوی خلا رہ جاتا تھا اس وجہ سے آہنگ کو ٹھیک کرنے کے لیے اہل زبان کے معروف استعمال کے مطابق، اس کو لَمَّا کر دیا۔ حروف میں اس قسم کے اضافہ کی مثالیں عربی میں بہت ہیں لیکن یہاں ہمارے لیے زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں، جن پر یہ لوگ ریجھے ہوئے ہیں، بس اس حیات چند روزہ کی متاع ہیں۔ اصل غیر فانی نعمتیں تو آخرت میں ملنے والی ہیں اور آخرت تمام تر تیرے رب کے پاس صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو رب سے ڈرتے رہے ہیں۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (۳۶)

اصل حقیقت

یعنی ان کے یہ سارے شبہات و اعتراضات تو محض بناوٹی ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا کی یاد سے بالکل اعراض کر لیا ہے اور سنت الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی یاد سے منہ موڑ لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اوپر ایک شیطان مسلط کر دیتا ہے جو ان کا دن رات کا ساتھی بن جاتا ہے پھر وہ اس وقت تک ان کی جان نہیں چھوڑتا جب تک ان کو جہنم کا فرزند نہ بنا لے۔

'عشا عن الشئی' کے معنی کسی چیز سے اعراض کرنے کے آتے ہیں۔ انسان کے دل کی خصوصیت یہ ہے کہ جب تک خدا کی یاد سے آباد رہتا ہے اس وقت تک تو شیطان کو اس میں راہ نہیں ملتی لیکن جب انسان خدا سے غافل ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ شیطان اس کے دل پر قبضہ جما لیتا ہے اور جب وہ قبضہ جما لیتا ہے تو پھر اس کے چنگل سے نکلنا آسان نہیں رہ جاتا۔ بہتر سے بہتر تذکیر و موعظت بھی جو اس کے سامنے آتی ہے شیطان اس کے خلاف شبہات و اعتراضات ایجاد کر کے اس کو اس سے برگشتہ کر دیتا ہے۔ البتہ جو لوگ اپنے دل اپنے رب کی یاد سے آباد رکھتے ہیں شیطان کو ان کے اندر گھسنے کی راہ نہیں ملتی اور اگر کبھی کسی غفلت کے سبب سے اس کو دراندازی کا کوئی موقع مل بھی جائے تو اس کو وہاں ٹکنے کی جگہ نہیں ملتی بلکہ بندہ کے متنبہ ہوتے ہی شیطان کو وہاں سے بھاگنا پڑتا ہے۔

وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۳۷)

زبان کا ایک استعمال

اوپر والی آیت میں حرف 'مَنْ' چونکہ مبہم ہے، واحد اور جمع دونوں ہی کے لیے آ سکتا ہے، نیز لفظ 'شیطان' بھی عام ہے، اس سے شیاطین جن بھی مراد ہو سکتے ہیں اور شیاطین انس بھی، اس وجہ سے آیت زیر بحث میں ضمیریں جمع آئیں۔ یہاں حال ایک پورے گروہ کا بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اس طرح شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں ان کا حشر یہ ہوتا ہے کہ شیاطین ان کو سیدھی راہ سے روک دیتے ہیں لیکن ان کے پھندوں میں پھنسے ہوئے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ بالکل سیدھی راہ پر چل رہے ہیں۔

یہاں ضمیروں کا انتشار بھی قابلِ توجہ ہے۔ 'اِنَّھُمْ' کی ضمیر کا مرجع تو شیاطین ہیں اور 'یَحْسَبُوْنَ' کے فاعل وہ لوگ ہیں جو شیاطین کے پھندوں میں گرفتار ہیں۔ لیکن جہاں کلام کا مفہوم واضح ہو وہاں ضمیروں میں اس قسم کا انتشار کوئی عیب نہیں ہے۔ اس کی ایک نہایت واضح مثال سورۂ یوسف کی مندرجہ ذیل آیت میں گزر چکی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ	یہاں تک کہ جب رسول اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو
وَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا	جاتے ہیں اور ان کی قوم کے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں
جَآءَھُمْ نَصْرُنَا	کہ ان کو جھوٹ موٹ عذاب کا ڈراوا سنایا گیا تھا تو رسولوں
(یوسف - ۱۱۰)	کے پاس ہماری مدد آجاتی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَنَا قَالَ یٰلَیْتَ بَیْنِیْ وَبَیْنَکَ بُعْدَ الْمَشْرِقَیْنِ فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ (۳۸)

یعنی اس دنیا میں تو اس قسم کے ساتھیوں میں خوب گاڑھی چھنتی ہے لیکن جب آخرت میں ہمارے آگے پیشی ہوگی اور اس دوستی کا انجام سامنے آئے گا تو جس نے کسی شیطان کے پھندے میں پھنس کر اپنی عاقبت برباد کی ہوگی وہ اپنے ساتھی پر لعنت بھیجے گا اور کہے گا کاش میرے اور تیرے درمیان مشرقین کی دوری ہوتی!!

'فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ' یہ اس بُرے ساتھی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اظہارِ نفرت و لعنت ہے کہ کیا ہی برا ساتھی ثابت ہوا وہ جس نے بالآخر اپنے ساتھی کو اس کھڈ میں لا گرایا۔

زبان کا ایک اسلوب

'مشرقین' کا مفہوم عام طور پر مفسرین نے مشرق اور مغرب لیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ عربی میں بعض مرتبہ تثنیہ کسی شے کے دونوں کناروں کی وسعت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ اسی طرح جمع بھی کسی شے کے اطراف و اکناف کی وسعت کے اظہار کے لیے آتی ہے۔ قرآن میں 'مغربین و مشرقین' اور 'مشارق' و 'مغارب' وغیرہ الفاظ اسی پہلو سے استعمال ہوئے ہیں۔ اس کی وضاحت دوسرے محل میں ہو چکی ہے۔

وَلَنْ یَّنْفَعَکُمُ الْیَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّکُمْ فِی الْعَذَابِ مُشْتَرِکُوْنَ (۳۹)

'اِذْ ظَّلَمْتُمْ' یعنی اذ ظلمتم انفسکم فی الحیٰوۃ الدنیا۔

جب گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے ساتھیوں میں یہ جوتی پیزار ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بتایا جائے گا کہ جب دنیا میں تم ایک دوسرے کے تابع اور متبوع بن کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھا چکے اور تمھیں اس کے انجام پر غور کرنے کی توفیق نہ ہوئی تو اب ایک دوسرے پر لعنت کے ڈونگرے برسا کر کیا تسلی حاصل کرو گے؟ یہ چیز تم میں سے کسی کو بری کرنے والی نہیں بنے گی۔ اب تو بہرحال دونوں ہی کو یہ عذاب بھگتنا ہے تو اس کو بھگتو۔ اس لعن طعن کا موقع دنیا میں تھا لیکن وہاں تم ایک دوسرے

کے جاں نثار اور وفادار بنے رہے۔ جو وقت گزر چکا اب وہ ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِی الْعُمْیَ وَمَنْ كَانَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۴۰)

آنحضرت صلعم کو تسلی — یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہاری تذکیر و موعظت کارگر ہو سکتی ہے تو ان لوگوں پر ہو سکتی ہے جن کے اندر دیکھنے سننے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت زندہ ہے۔ ان لوگوں کو آخر تم کس طرح سنا سکتے ہو جن کے کان بہرے ہوں اور جنھوں نے اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہوں!

'وَمَنْ كَانَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ'، یعنی کسی کی گمراہی اگر کسی حقیقت کے خفا یا اس کی کم علمی و بے خبری کے سبب سے ہو تو اس کے ازالہ کی تدبیر کی جا سکتی ہے لیکن جو شخص بالکل کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو، جس کا گمراہی ہونا خود اس پر بھی واضح ہو، اس کو ہدایت دینا کس کے امکان میں ہے۔

فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۝ اَوْ نُرِیَنَّكَ الَّذِیْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَیْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ (۴۱-۴۲)

یہ بھی اسی تسلی کے سلسلہ کی بات ہے۔ فرمایا کہ ان ظالموں کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اب یا تو یہ ہوگا کہ ہم تم کو اٹھا لیں گے اس کے بعد ان سے انتقام لیں گے یا جس عذاب کی ہم ان کو دھمکی دے رہے ہیں وہ تمہارے ہوتے ہوئے آجائے گا اور تم بھی ان کا انجام دیکھ لو گے۔ ہم ان کو عذاب دینے پر پوری طرح قادر ہیں۔ یہ مضمون یونس آیت ۴۶ اور الرعد آیت ۴۰ میں بھی گزر چکا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ان آیات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیْۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۴۳)

یعنی ان لوگوں کی اس ژاژ خائی اور مخالفت کے علی الرغم تم اس دعوت توحید اور اس کتاب عزیز پر جمے رہو جو تمہاری طرف وحی کی گئی ہے، سیدھی راہ پر تم ہی ہو۔ 'صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ' سے اشارہ یہاں خاص طور پر توحید کی اس دعوت کی طرف ہے جو اس سورہ میں اوپر دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے مخالفین کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے وہ ایک بے بنیاد دعوے کے علمبردار ہیں اور تم ایک مضبوط بنیاد پر ہو۔ تم اپنے موقف پر جمے رہو۔ مخالفوں کے قدم بہت جلد اکھڑ جائیں گے۔

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ (۴۴)

رسول اور قوم دونوں کی ذمہ داری — یعنی یہ قرآن جو تمہاری طرف وحی کیا گیا ہے تمہارے لیے بھی یاد دہانی ہے اور تمہاری قوم کے لیے بھی یاد دہانی ہے اور ایک دن تم سب سے پرسش ہونی ہے۔ تم سے یہ پرسش ہوگی کہ تم پر جو وحی کی گئی وہ تم نے لوگوں کو ٹھیک ٹھیک، بے کم و کاست پہنچا دی یا نہیں اور قوم کی طرف سے تم کو کیا جواب ملا؟ قوم سے یہ پرسش ہونی ہے کہ کیا تمہارے پاس کوئی نذیر نہیں آیا کہ تم نے اپنی یہ شامت بلائی۔ سورۂ اعراف میں اس بات کا یوں ذکر ہوا ہے۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِیْنَ ۝ (الاعراف: ۶-۷)

پس لازماً ہم ان لوگوں سے پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور خود رسولوں سے بھی پوچھیں گے، پھر ہم ان کو پوری سرگزشت، اپنے علم کی روشنی میں سنائیں گے، ہم کہیں غائب نہیں رہے ہیں۔

رسولوں اور ان کی قوموں سے سوال جواب کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔

رسولوں پر بلاغ کی جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے، ان سے اس کے متعلق پرسش ہونی ہے اور ان کی قوموں سے یہ پرسش ہوگی کہ اللہ کی اتنی بڑی نعمت جو رسول کی بعثت کی شکل میں، ان کو ملی اس کی انھوں نے کیا قدر کی۔ پھر جس انعام و اکرام کے حقدار رسول اور ان کے ساتھی ٹھہریں گے وہ ان کو ملے گا اور جس نقمت و عذاب کے سزاوار ان کے مکذبین قرار پائیں گے وہ ان کے حصہ میں آئے گا۔ اس میں رسول اور صحابۂ رسولؐ کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے تہدید ہے کہ معاملہ یہیں ختم ہو جانے والا نہیں ہے بلکہ ایک دن یہ سارا مقدمہ خدا کی عدالت میں بھی پیش ہوگا اور وہاں معلوم ہوگا کہ کون جیتا اور کون ہارا۔

وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ (۴۵)

یہ مشرکین کے اس دعوے کی تردید ہے کہ جن کو وہ پوجتے ہیں ان کی عبادت کا حکم خدا نے دیا ہے۔ فرمایا کہ خدا کے امر و نہی کے معلوم کرنے کا ذریعہ اس کے رسول ہیں تو جو رسول تم سے پہلے آئے ہیں ان سے معلوم کرو کہ خدا نے اپنے سوا کچھ دوسرے معبود بھی عبادت کے حق دار ٹھہرائے ہیں؟

'وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا' ایک بلیغ اسلوب کلام ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں 'رُسُل' سے مراد ان کے صحیفے اور ان کی تعلیمات ہیں جو ان کی دعوت کے ترجمان ہیں۔ کلام کا یہ اسلوب پچھلے صحیفوں میں اکثر استعمال ہوا ہے اور اعلیٰ خطیبوں کے خطبات میں بھی اس کی نہایت بلیغ مثالیں ملتی ہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــ آیات: ۴۶-۵۶

آگے بالاجمال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جس سے مقصود ایک تو اس انتقام الٰہی کی تاریخی شہادت پیش کرنا ہے جس کا ذکر اوپر آیات ۴۱-۴۲ میں ہوا ہے کہ رسول کی تکذیب کے بعد اس کی قوم کا فیصلہ لازماً ہو جاتا ہے، خواہ رسول کی زندگی ہی میں ہو یا اس کی ہجرت یا موت کے بعد۔ اللہ کا یہ انتقام اس کی ایک مقررہ سنت ہے جس کی گرفت سے کوئی قوم بھی نہیں بچی۔ فرعون جیسا جبار بھی جب اس کی زد میں آیا ہے تو وہ بھی اپنی تمام افواج سمیت غرق

کر دیا گیا۔ اس کی قوت و صولت اس کے کچھ کام نہ آئی۔

دوسرے یہ اس حقیقت کی مثال ہے جو آیت ۴۰ میں بیان ہوئی ہے کہ جو لوگ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں برباد اور جان بوجھ کر گمراہی کی راہ اختیار کر لیتے ہیں ان کو کسی نشانی سے بھی ہدایت نہیں حاصل ہوتی۔ وہ بڑے سے بڑے معجزات دیکھنے کے بعد بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں صرف خدا کے فیصلۂ عذاب ہی سے کھلتی ہیں۔

تیسرے اس میں اس حقیقت کی بھی شہادت ہے جو آیت ۴۵ میں مذکور ہوئی ہے کہ اللہ نے جتنے رسول بھی بھیجے سب وہی دعوتِ توحید لے کر آئے جس کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ کسی رسول نے بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور معبود کی عبادت کی دعوت نہیں دی ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ آیات ۴۶-۵۶
اِنِّىْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ
مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِىَ اَكْبَرُ
مِنْ اُخْتِهَا ۡ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۸﴾
وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ
اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ
يَنْكُثُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ
مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ ۚ اَفَلَا
تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا
يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَآ اُلْقِىَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ
مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ
فَاَطَاعُوْهُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا

انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

ترجمۂ آیات ۴۶-۵۶

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان کے پاس بھیجا تو اس نے ان کو دعوت دی کہ میں تمہارے پاس عالم کے خداوند کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ تو جب وہ ان کے پاس ہماری نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ ان نشانیوں کا مذاق اڑاتے۔ اور ہم ان کو ایک سے ایک بڑھ کر نشانیاں دکھاتے رہے اور ہم نے ان کو عذاب میں بھی پکڑا تاکہ وہ رجوع کریں۔ ۴۶-۴۸

اور انھوں نے درخواست کی کہ اے ساحر، اپنے رب سے اس عہد کی بنا پر جو اس نے تم سے کر رکھا ہے، ہمارے لیے دعا کرو۔ اب ہم ضرور ہدایت پانے والے بن کے رہیں گے۔ تو جب ہم ان سے عذاب ٹال دیتے تو وہ اپنا عہد توڑ دیتے۔ ۴۹-۵۰

اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی۔ اے میری قوم کے لوگو! کیا مجھے مصر کی بادشاہی حاصل نہیں ہے! اور یہ نہریں ہیں جو میرے نیچے بہہ رہی ہیں! تو کیا تم لوگ دیکھتے نہیں! تو کیا یہ بہتر ہوا یا میں بہتر ہوں اس سے جو ایک حقیر آدمی ہے اور اپنی بات کھل کر کہہ بھی نہیں سکتا ہے! تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے لیے اوپر سے سونے کے کنگن اتارے گئے ہوتے یا اس کے ساتھ فرشتے پرے باندھے ہوئے آتے! پس اس طرح اس نے اپنی قوم کو بیوقوف بنا لیا اور انھوں نے اس کی بات مان لی۔ یہ لوگ نافرمان قسم کے لوگ تھے۔ تو جب ان لوگوں نے ہم کو غصہ دلا دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا اور ان کو ماضی کی ایک داستان

اور دوسروں کے لیے ایک نمونۂ عبرت بنا دیا۔ ۵۱-۵۶

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۠ئِہٖ فَقَالَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (۴۶)

'آیات' سے مراد وہ نشانیاں ہیں جن سے مسلح کر کے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا، یعنی عصا، اور ید بیضا وغیرہ۔

'مَلَا' سے مراد قوم فرعون کے وہ اعیان و اکابر ہیں جو اس کے دربار میں باریاب ہوتے۔ ان الفاظ کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔

'فَقَالَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ' یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت ہے جو انھوں نے فرعون اور اس کے اعیان کو دی۔ یہاں اس کی وضاحت نہیں ہے، صرف اجمالی اشارہ ہے لیکن دوسرے مقامات میں تفصیل ہے کہ انھوں نے فرعون اور اس کے درباریوں کو آگاہ کیا کہ وہ ان کے انذار کے لیے خدا کی طرف سے رسول ہو کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف سے نشانیاں بھی دی ہیں اور اللہ کے حکم سے ان کا مطالبہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جانے دیا جائے۔

فَلَمَّا جَآءَہُمۡ بِاٰیٰتِنَاۤ اِذَا ہُمۡ مِّنۡہَا یَضۡحَکُوۡنَ (۴۷)

یہاں اتنی بات بربنائے قرینہ محذوف ہے کہ جب فرعون اور اس کے اعیان نے سنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خداوند عالم کے رسول ہونے کے مدعی ہیں اور وہ اس دعوے کی تصدیق کی کچھ نشانیاں بھی اپنے پاس رکھتے ہیں تو انھوں نے مطالبہ کیا کہ جو نشانیاں وہ لے کر آئے ہیں، دکھائیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو نشانیاں دکھائیں لیکن ان کو ماننے کے بجائے انھوں نے ان کا مذاق اڑایا کہ بھلا یہ کیا نشانیاں ہیں، یہ تو ساحری کے کرتب ہیں اور ہمارے پاس بھی ایسے جادوگر ہیں جو ان سے بڑے کرتب دکھا سکتے ہیں۔

وَمَا نُرِیۡہِمۡ مِّنۡ اٰیَۃٍ اِلَّا ہِیَ اَکۡبَرُ مِنۡ اُخۡتِہَا ۫ وَاَخَذۡنٰہُمۡ بِالۡعَذَابِ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ (۴۸)

'نُرِیۡہِمۡ' سے پہلے فعل ناقص، زبان کے معروف قاعدے کے مطابق، محذوف ہے۔ تنبیہی
یعنی ہم ان کو ایک سے ایک بڑھ کر نشانیاں دکھاتے رہے کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے نشانیاں

ہیں۔ یہ ان نشانیوں کی طرف اشارہ ہے جو پہلی نشانیوں کی تکذیب کے بعد تنبیہی عذاب کے طور پر نازل ہوئیں تاکہ فرعونیوں کو خدا کی پکڑ کا کچھ اندازہ ہو اور وہ توبہ کی طرف مائل ہوں۔ یہ نشانیاں مختلف عذابوں کی شکل میں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوئیں اور قدرتی طور پر ہر نشانی اپنی ماسبق سے زیادہ عبرت انگیز شکل میں نمایاں ہوئی۔ لیکن ان کے دلوں پر ایسی قساوت چھا چکی تھی کہ کوئی نشانی بھی کارگر نہ ہو سکی یہاں تک کہ وہ فیصلہ کن عذاب کی زد میں آ گئے۔

وَقَالُوا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۴۹-۵۰)

جب وہ کسی عذاب کی گرفت میں آتے تو بھاگے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آتے اور نہایت لجاجت سے درخواست کرتے کہ آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ اس عذاب کو دور فرمائے، اگر یہ عذاب دور ہو گیا تو ہم سیدھی راہ پر آ جائیں گے اور آپ کی بات ضرور ہی مان لیں گے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ ان سے عذاب دور کر دیتا تو وہ عہد توڑ کر اپنی ضد پر اڑ جاتے۔

ان تنبیہی عذابوں کی تفصیل سورۂ اعراف کی آیات ۱۳۲-۱۳۵ کے تحت گزر چکی ہے۔ وہاں ہم تورات کی روشنی میں ہر بات کی وضاحت کر چکے ہیں۔ آیات ہم یہاں بھی نقل کیے دیتے ہیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو تدبر قرآن میں ان کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ	تو ہم نے ان پر بھیجے طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں
وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ	اور مینڈک اور خون، تفصیل کی ہوئی نشانیاں، تو
مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا	انھوں نے تکبر کیا اور یہ مجرم لوگ تھے اور جب آ جاتی ان
قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ وَلَمَّا وَقَعَ	پر کوئی آفت تو درخواست کرتے کہ اے موسیٰ تم اپنے
عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ	رب سے، اس عہد کے واسطے سے جو اس نے تم سے
لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ	کر رکھا ہے، ہمارے لیے دعا کرو۔ اگر تم نے ہم سے یہ
لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ	آفت دور کر دی تو ہم تمھاری بات ضرور مان لیں گے اور
لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝	تمھارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے تو جب ہم ان سے
فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ	دور کر دیتے آفت کو کچھ مدت کے لیے جس تک ان کو بہرحال
بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (الاعراف - ۱۳۳-۱۳۵)	پہنچنے والے ہی ہوتے تو وہ دفعۃً عہد توڑ دیتے۔

مصریوں کے نزدیک ساحروں کا درجہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو 'یٰٓاَیُّهَ السّٰحِرُ' سے مخاطب کرنا کسی تحقیر یا سوءِ ادب پر مبنی نہیں ہے۔ مصر میں اس وقت ساحروں کو سوسائٹی میں وہی مقام حاصل تھا جو کسی سوسائٹی میں علماء اور صوفیوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ اے ساحر! ہمارے لیے دعا کیجیے، تعظیم کا خطاب ہے۔

'بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ' کی وضاحت سورۂ اعراف میں ہو چکی ہے۔ یعنی چونکہ آپ کے رب نے آپ کی دعا کی قبولیت کا آپ سے وعدہ کر رکھا ہے اس وعدہ کے واسطہ سے آپ دعا کریں گے تو وہ ضرور ہی قبول ہوگی۔

'کَشَفْنَا' 'یَنْکُثُوْنَ' کے مفہوم میں ہے۔ اس کی وضاحت سورۂ اعراف میں ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے اس کے بعد 'اِذَا' کا استعمال جو مفاجات کے لیے آتا ہے، بالکل موزوں ہے۔

وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱)

فرعون نے اپنی قوم میں پکارا، یعنی اپنی قوم میں منادی کرائی۔

حضرت موسیٰ کے مقابل میں فرعون کا ہتھکنڈہ

اوپر آیات ۲۱-۲۵ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہاں قریش کے لیڈروں کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ 'لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ' (اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے اترا ہے تو مکہ یا طائف کے سرداروں میں سے کسی پر کیوں نہیں اتارا گیا) ٹھیک اسی طرح فرعون نے جب دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دلائل و معجزات سے قوم کی عقیدت اس کے ساتھ متزلزل ہو رہی ہے تو اس نے یہ منادی کرائی کہ ملک مصر کی بادشاہی اور اس کی بہتی ہوئی نہریں تو میرے قبضہ میں ہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا کسی کو رسول بنانے والا ہوتا تو میرے سوا کسی اور کو رسول بناتا۔

اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ ۥ وَّلَا یَکَادُ یُبِیْنُ (۵۲)

اس آیت میں کلام کا ایک حصہ محذوف ہے۔ پچھلی سورتوں میں متعدد مثالیں اس قسم کے استفہامیہ جملوں میں حذف کی گزر چکی ہیں۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جب مصر کی بادشاہی، اس کے دریا اور نہریں میرے قبضہ میں ہیں تو یہ شخص بہتر ٹھہرا جو ایک غلام قوم کا فرد ہے اور اپنی بات کھول کر بیان بھی نہیں کر سکتا یا میں بہتر ہوں جو اس پورے ملک اور اس کی تمام دولت و ثروت کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہوں! مطلب یہ کہ جب صورتِ حال یہ ہے تو آخر اس شخص میں ایسی کیا بات تھی کہ خدا نے اس کو رسول بنایا۔

'مَهِیْنٌ' سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک غلام قوم کے فرد ہیں اور 'لَا یَکَادُ یُبِیْنُ' سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوتِ بیانیہ کی کمزوری کی طرف اشارہ ہے۔ 'وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ' کے تحت ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لکنت وغیرہ کی قسم کا کوئی عارضہ تو نہیں تھا، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے گمان کیا ہے، البتہ وہ کوئی زبان آور خطیب نہیں تھے اور اس دور میں کسی شخص کو پبلک میں نمایاں ہونے کے لیے ساحری، شاعری اور خطابت میں سے کسی نہ کسی ایک چیز میں ممتاز ہونا ضروری تھا۔ فرعون نے ان کی اس کمزوری کا بھی طعنہ دیا کہ ایک طرف

تو یہ ایک غلام قوم کا فرد، دوسری طرف خطابت پر قادر نہیں تو میرے مقابل میں ایک ایسا شخص سیادت کا مدعی کیسے ہو سکتا ہے!

فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْہِ اَسْوِرَۃٌ مِّنْ ذَھَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ مُقْتَرِنِیْنَ (۵۳)

یعنی اس کے زعم کے مطابق اگر کوئی خدا ہے اور اس نے اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے تو ہونا یہ تھا کہ آسمان سے اس کی زینت کے لیے کنگن اتارے جاتے اور فرشتے پرے بنا بنا کر اس کے جلو میں چلتے لیکن یہ مدعی تو ہے خدا کے رسول ہونے کا اور اس کی کس مپرسی کا جو حال ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ غور کرو کہ کوئی خدا کا رسول ہوگا تو وہ اس حال میں کیوں آئے گا!

یہ امر ملحوظ رہے کہ اس عہد میں عام طور پر سلاطین، بالخصوص مصر اور ایران کے سلاطین، اظہار شان و شوکت کے لیے سونے کے کنگن پہنتے تھے اور فوجی دستوں کے جلو میں نکلتا تو جس طرح آج شکوہ خسروی کے اظہار کے لیے ضروری ہے اسی طرح اس زمانے میں بھی اس کا اہتمام تھا۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَہٗ فَاَطَاعُوْہُ ط اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ (۵۴)

'اِسْتَخَفَّ' ضد ہے 'اِسْتَثْقَلَ' کا۔ 'اِسْتِثْقَال' کے معنی کسی چیز کو بھاری بھرکم، وزن دار اور گراں سمجھنے کے ہیں اس وجہ سے 'استخفاف' کے معنی کسی کو بے وزن، بے حقیقت اور بے حیثیت سمجھنے کے ہوں گے۔ 'اِسْتَخَفَّ قَوْمَہٗ' کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اپنی قوم کو بالکل سادہ لوح پا کر اس کو پرفریب باتوں سے چٹکیوں میں اڑا دیا اور وہ بے وقوفوں کی طرح اس کے چکموں میں آگئی۔

انسان کا اندر وزن ایمان سے پیدا ہوتا ہے

'اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ' یعنی یہ لوگ خدا کے نافرمان اور اس کے ایمان سے محروم تھے اس وجہ سے بالکل بے وزن اور بے حقیقت تھے۔ اس طرح کے لوگ بڑی آسانی سے شیاطین کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور شیاطین ان کی ناکوں میں نکیل ڈال کر جدھر چاہتے ہیں لیے پھرتے ہیں۔ انسان کے اندر وزن اللہ تعالیٰ کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ پاسنگ اس کے پلڑے میں نہ ہو تو اس کی حیثیت خس و خاشاک کی ہے۔ ہوا کا معمولی جھونکا بھی اس کو اڑا لے جاتا ہے۔

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْھُمْ فَاَغْرَقْنٰھُمْ اَجْمَعِیْنَ (۵۵)

'اٰسَفَ' کے معنی ہیں 'اَغْضَبَ' یعنی اس کو غضبناک کر دیا۔ فرمایا کہ جب انھوں نے اپنی ان حرکتوں سے ہمیں غصہ دلایا تو بالآخر ہم نے بھی ان سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ کا تعاقب اپنی تمام عسکری طاقت اور اپنے جملہ اعیان و امراء کے ساتھ کیا تھا اس وجہ سے اس عذاب نے اس کی پوری جمعیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

فَجَعَلْنٰھُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ (۵۶)

'سَلَف' کے اصل معنی گزرنے کے ہیں۔ یہیں سے یہ گزرے ہوئے لوگوں کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ 'سلف' اچھے بھی ہو سکتے ہیں، برے بھی۔ یہاں یہ برے معنوں میں ہے یعنی ہم نے ان کو اس طرح مٹایا کہ وہ ایک داستانِ ماضی اور ایک افسانۂ پارینہ بن کے رہ گئے۔ یہی حقیقت بعض مقامات میں 'جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ' کے الفاظ سے بھی واضح فرمائی گئی ہے۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اگر تم نے بھی انہی کی روش اختیار کی تو انہیں کی طرح تمہارا نام بھی حاضر کی لوح سے مٹا دیا جائے گا، صرف ماضی کی ایک داستان بن کر رہ جاؤ گے۔ قریش کو تنبیہ

'وَ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ'۔ 'مَثَل' کے معنی مثال اور نمونہ کے ہیں۔ 'مثال' بھی اچھی اور بری دونوں ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ برے مفہوم میں ہے اس وجہ سے اس کے معنی نمونۂ عبرت کے ہیں یعنی ہم نے ان کو دوسروں کے لیے ایک مثالِ عبرت بنا دیا کہ لوگ ان سے سبق حاصل کریں کہ خدا سے اکڑنے والوں کا انجام یہ ہوا کرتا ہے۔

۶۔ آگے آیات ۵۷ - ۶۵ کا مضمون

جس مقصد سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں اسی مقصد کی تائید کے لیے آگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کا بھی ایک حصہ اجمالاً بیان ہوا ہے کہ انھوں نے بھی اللہ کی توحید ہی کی دعوت دی لیکن ان کی پیروی کے مدعی مبتدعین نے ان کی صریح تعلیمات کے خلاف بدعتیں ایجاد کر کے ان کو ابن اللہ بنا کر رکھ دیا۔

اس سرگزشت کا آغاز اس تمہید سے فرمایا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیا جاتا ہے تو قریش کے جھگڑالو لوگ یہ فتنہ اٹھاتے ہیں کہ یہ شخص عیسیٰؑ کی تعریف کرتا ہے، حالانکہ عیسیٰؑ سے اچھے تو ہمارے ہی معبود ہیں کہ وہ فرشتے اور خدا کی بیٹیاں ہیں جب کہ عیسیٰ (علیہ السلام) مریم (علیہا السلام) کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بیوقوف پیرؤوں پر یہ اثر ڈالنا چاہتے ہیں کہ قرآن جو ان کا ذکرِ خیر کرتا ہے تو گویا عیسائیوں کی طرح ان کو ابن اللہ تسلیم کر کے ان کی بندگی کی دعوت دیتا ہے حالانکہ قرآن ان کا ذکر اللہ کے ایک بندے اور اس کے ایک رسول کی حیثیت سے کرتا ہے کہ انھوں نے بھی اسی توحید کی دعوت دی جس کی دعوت تمام انبیاء لے کر آئے لیکن یہ شریر اور مناظرہ باز لوگ سیدھی سادی باتوں کو بھی فتنہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۷-۶۵

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ۝٥٧

وَقَالُوٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيۡرٌ اَمۡ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوۡهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ
بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ خَصِمُوۡنَ ﴿۵۸﴾ اِنۡ هُوَ اِلَّا عَبۡدٌ اَنۡعَمۡنَا عَلَيۡهِ
وَجَعَلۡنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۵۹﴾ وَلَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنَا
مِنۡكُمۡ مَّلٰٓئِكَةً فِى الۡاَرۡضِ يَخۡلُفُوۡنَ ﴿۶۰﴾ وَاِنَّهٗ لَعِلۡمٌ لِّلسَّاعَةِ
فَلَا تَمۡتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوۡنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَا
يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيۡطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۶۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ
عِيۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ قَالَ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِالۡحِكۡمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمۡ
بَعۡضَ الَّذِىۡ تَخۡتَلِفُوۡنَ فِيۡهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ﴿۶۳﴾ اِنَّ
اللّٰهَ هُوَ رَبِّىۡ وَرَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ﴿۶۴﴾
فَاخۡتَلَفَ الۡاَحۡزَابُ مِنۡۢ بَيۡنِهِمۡ ۚ فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡ
عَذَابِ يَوۡمٍ اَلِيۡمٍ ﴿۶۵﴾

ترجمۂ آیات ۵۷-۶۵

اور جب ابنِ مریم کی مثال دی جاتی ہے تو تمہاری قوم کے لوگ اس پر چیخنے لگتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارے معبود اچھے ہوئے یا وہ! یہ بات وہ محض کج بحثی کے لیے اٹھاتے ہیں بلکہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔ وہ تو بس ہمارا ایک بندہ تھا جس پر ہم نے اپنا فضل فرمایا اور بنی اسرائیل کے لیے اس کو ایک مثال بنایا اور اگر ہم چاہیں تو تمہارے اندر سے فرشتے بنا دیں جو زمین میں خلافت کریں۔ ۵۷-۶۰

اور بے شک وہ قیامت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے تو اس میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے اور شیطان تم کو اس سے روکنے نہ پائے۔

بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ۶۱-۶۲

اور جب عیسیٰ کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو اس نے دعوت دی کہ میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور تاکہ میں تم پر واضح کردوں بعض وہ باتیں جن میں تم نے اختلاف کیا ہے۔ تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ تو ان کے اندر سے پارٹیوں نے اختلاف برپا کیے۔ پس ہلاکی ہو ان لوگوں کے لیے جنھوں نے شرک کا ارتکاب کیا، ایک دردناک دن کے عذاب کی۔ ۶۳-۶۵

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ٥ وَقَالُوٓا ءَ أٰلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ ۚ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ (۵۷-۵۸)

قریش کے شریروں کی ایک فتنہ انگیزی

یعنی جب تمہاری قوم کے سامنے انبیاء کے سلسلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی دعوت کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے کہ وہ بھی اسی دین توحید کے داعی بن کر آئے جس کی دعوت تمام انبیاء نے دی تو تمہاری قوم کے جھگڑالو مجرد ان کے نام کے ذکر ہی کو فتنہ بنا لیتے اور چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لو، یہ شخص ہمارے بتوں کو تو برا کہتا ہے لیکن مسیح کی تعریف کرتا ہے۔ حالانکہ ہمارے معبود فرشتے ہیں اور مسیح بہرحال مریم کے بیٹے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن حضرت عیسیٰ کا ذکر کرتا ہے تو گویا ایک معبود کی حیثیت سے کرتا ہے اور یہ ایک سازش ہے اس غرض کے لیے کہ ہمارے ذہنوں سے ہمارے آبائی دیوتاؤں کی عقیدت ختم کر کے ان کی جگہ مسیح کی الوہیت کا عقیدہ راسخ کیا جائے۔

مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ۔ فرمایا کہ یہ شوشہ انھوں نے محض بحث جدال کے لیے چھوڑا ہے ورنہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن حضرت مسیح کا ذکر کرتا ہے تو معبود کی حیثیت سے نہیں بلکہ اللہ کے ایک بندے اور ایک رسول کی حیثیت سے کرتا ہے کہ دوسرے نبیوں اور رسولوں کی طرح انھوں نے بھی خلق کو توحید ہی کی تعلیم دی۔ یہ سب جانتے ہوئے انھوں نے محض

اس لیے یہ فتنہ اٹھایا ہے کہ قرآن اور نبی کی مخالفت کے لیے کوئی بہانہ ان کو ملے اور وہ لوگوں کو بھڑکا سکیں کہ یہ شخص ہمارے آبائی دین کو مٹا کر ہمارے اوپر مسیحیت کو مسلط کرنا چاہتا ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو، یہ شاخسانہ انھوں نے اتفاق سے نہیں کھڑا کیا ہے بلکہ فتنہ پردازی و شر انگیزی ان کے قومی مزاج کی خصوصیت بن چکی ہے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ قریش کے جھگڑالو لیڈروں نے اسی طرح کا فتنہ اسم 'رحمان' کی آڑ لے کر اٹھانے کی کوشش کی تھی جس کی وضاحت ہم سورۂ بنی اسرائیل کی آیت قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ...... (۱۱۰) کے تحت کر چکے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اللہ تعالیٰ کے اسم 'رحمان' سے قریش ناواقف نہیں تھے لیکن اس کا غالب استعمال چونکہ اہل کتاب، بالخصوص نصاریٰ کے ہاں تھا، اس وجہ سے انھوں نے اپنی قوم کو یہ کہہ کر بھڑکایا کہ یہ شخص دوسروں کے عقائد و نظریات ہمارے اوپر مسلط کرنا چاہتا ہے اور اس کے ثبوت میں انھوں نے دلیل یہ دی کہ جو صحیفہ یہ شخص پیش کر رہا ہے اس میں لفظ 'رحمان' کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح کی باتوں کی آڑ لے کر مشرکین یہ بھی کہتے تھے کہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ہیں جو اس شخص کو سکھاتے ہیں اور مقصود اس سازش کا ہمارے دین اور ہماری روایات کو مٹانا ہے۔

بدگمانی کی فضا میں اس طرح کے اشغلے بڑے کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ عوام کے ذہن بالکل خام ہوتے ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے اس طرح کی باتیں قبول کر لیتے ہیں اور جب قبول کر لیتے ہیں تو ان کو ذہنوں سے نکالنا آسان نہیں ہوتا۔

'صَدَّ مِنَ الشَّيْءِ' کے معنی ہوتے ہیں 'کسی شے سے بیزار ہو کر چیخ اٹھنا'۔ کسی بات سے خوش ہو کر شور و غل کرنے کے لیے اس لفظ کا استعمال معروف نہیں ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۵۹)

حضرت عیسیٰ کا اصل حیثیت — یعنی قرآن ان کی مثال جو پیش کر رہا ہے تو ایک معبود کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف اس حیثیت سے پیش کر رہا ہے کہ وہ اللہ کے ایک بندے تھے جن پر اس نے اپنا خاص فضل فرمایا اور بنی اسرائیل کے لیے ان کو ایک نمونہ بنایا کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ زندگی کی مثال یہ ہے۔ خاص فضل سے اشارہ ان خصوصیات کی طرف ہے جن کا ذکر قرآن کے دوسرے مقامات میں تفصیل سے ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بن باپ کے مجرد اپنے کلمۂ 'کن' سے پیدا کیا، تائید روح القدس سے ان کو نوازا، ابھی وہ گہوارے ہی میں تھے کہ نہایت دانائی و حکمت کی باتیں کرنے لگے، پھر اللہ نے ان کو نبوت و رسالت کے منصب پر سرفراز فرمایا۔ انھوں نے لوگوں کو حکمت کی تعلیم دی۔ نہایت حیرت انگیز معجزے دکھائے اور یہود کی کوئی سازش ان کے خلاف اللہ تعالیٰ نے کامیاب نہیں ہونے دی۔ یہاں تک کہ یہود اپنے

جس کارنامے پر بہت نازاں ہیں کہ انھوں نے آنجنابؐ کو سولی پر چڑھا دیا، قرآن نے اس کی بھی تردید کر دی کہ اس سازش میں بھی وہ کامیاب نہیں ہوئے۔

بنی اسرائیل کے لیے مثال

وَمَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ - یعنی اللہ تعالیٰ نے آں جنابؐ کو بنی اسرائیل کے لیے ایک نمونہ اور مثال بنایا کہ اس پاکیزہ مثال کو سامنے رکھ کر وہ اپنی زندگی کے تمام کج پیچ درست کر لیں۔ یوں تو ہر رسولؐ اپنی قوم کی اصلاح کے لیے ایک خدائی کسوٹی ہوتا ہے اور اس کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی میں قوم کی نجات مضمر ہوتی ہے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص نوع کی ولادت اور نہایت کھلے ہوئے معجزات کے ساتھ اس لیے بھیجا کہ بنی اسرائیل جو اپنے انبیاء کی تمام تعلیمات بھلا کر بالکل اندھے بہرے بن گئے تھے آنکھیں کھولیں لیکن وہ ایسے قسی القلب نکلے کہ اس مثال سے بھی انھوں نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا جس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ہمیشہ کے لیے لعنت کر دی۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ (۶۰)

مشرکین کے ایک مغالطہ کا ازالہ

اوپر مشرکین کا قول نقل ہوا ہے کہ ءَاٰلِهَتُنَا خَیْرٌ اَمْ هُوَ (ہمارے معبود اچھے ہوئے یا وہ؟) یہ اسی پر استدراک ہے کہ تم نے اگر مجرد اس بنیاد پر فرشتوں کو معبود بنایا ہے کہ ان کی خلقت ایک اعلیٰ عنصر (نور) سے ہوئی ہے تو یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کسی کو معبود بنا دینے کی دلیل بن سکے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حال تو یہ ہے کہ وہ جس طرح فرشتوں کو نور سے بنا سکتا ہے اسی طرح چاہے تو وہ خود تمھارے اندر سے فرشتوں کی صفات کے لوگ پیدا کر دے اور وہ زمین میں خلافت کا وہ فرض انجام دیں جو انسانوں کو سپرد ہوا ہے لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔ اس وجہ سے اس نے ایسا نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ مجرد کسی کا نور یا نار سے پیدا ہونا یا کسی کا بن باپ کے وجود میں آنا اس کے خدا یا شریکِ خدا ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ ساری باتیں ہیں اس وجہ سے مستحقِ عبادت وہی ہے جو اس ساری کائنات کا خالق ہے۔

وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝ وَلَا یَصُدَّنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (۶۱-۶۲)

حضرت عیسیٰؑ کے نشانِ قیامت ہونے کے بعض پہلو

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جھگڑنے والوں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ بات کا بتنگڑ بنانے کی کوشش نہ کرو۔ حضرت عیسیٰؑ کو جس حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ معبود یا ابن اللہ ہیں بلکہ وہ توحید کے داعی اور قیامت کا علم یعنی اس کی ایک قاطع حجت ہیں تو قیامت کے باب میں شک میں نہ پڑو اور مناظرہ بازی میں الجھنے اور الجھانے کے بجائے میری پیروی کرو۔ ہدایت اور فلاح کی سیدھی راہ یہی ہے۔

حضرت عیسیٰ کے قیامت کی بہت بڑی حجت ہونے کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عام ضابطہ کے خلاف ان کو بن باپ کے مجرد اپنے کلمۂ 'کن' سے پیدا کیا۔ مشرکین عرب کو قیامت کے باب میں سب سے بڑا شبہ یہی تھا کہ مر کھپ جانے کے بعد آخر لوگ قیامت کو کس طرح از سر نو پیدا ہو جائیں گے؟ قرآن نے ان کے اس شبہے کا ازالہ جگہ جگہ اس طرح فرمایا ہے کہ مرنے اور جینے میں اصلی دخل ظاہری اسباب کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت کو ہے۔ یہاں اسی چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ دیکھ لو، پیدائش کا عام ضابطہ تو یہ ہے کہ اولاد، باپ اور ماں دونوں کے زوجی تعلق سے پیدا ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو بن باپ کے صرف ماں سے پیدا کر دیا۔ اسی طرح وہ جب چاہے گا لوگوں کو ان کی قبروں سے اٹھا کھڑا کرے گا اور اس کو اس میں ذرا بھی زحمت پیش نہیں آئے گی۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں جو معجزے ظاہر ہوئے ان میں احیائے موتیٰ کے معجزے بھی ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مُردوں کو بھی زندہ کر دیتے اور مٹی سے پرندوں کی مانند مورتیں بنا کر ان میں بھی پھونک مار کر زندگی پیدا کر دیتے۔ ان کے اس قسم کے معجزات کا ذکر انجیلوں میں بھی ہے اور قرآن میں بھی ان کا حوالہ ہے۔ یہ معجزات اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں اس لیے ظاہر فرمائے کہ یہود قیامت کے باب میں جس بے یقینی میں مبتلا ہو گئے تھے اور جس کے سبب سے وہ بالکل دنیا کے کتے بن کر رہ گئے تھے، اس سے نکلیں اور از سر نو ایمان و ہدایت کی راہ اختیار کریں۔

تیسرا پہلو اس کا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آسمان کی بادشاہی اور ابدی زندگی کی منادی جس شان سے کی ہے یہ بس انہی کا حصہ ہے۔ آدمی اگر انجیلوں میں ان کے وہ مواعظ پڑھے جن میں انھوں نے آخرت کی تذکیر فرمائی ہے تو آخرت کے خوف اور شوق دونوں سے دل لبریز ہو جاتا ہے بشرطیکہ دل پر یہود کی طرح سیاہی نہ چھا گئی ہو۔

آنحضرت صلعم کی زبان سے قریش کو تنبیہ

'فَلَا تَمۡتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوۡنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ'۔ یعنی اس قیامت کے باب میں کسی شک میں نہ پڑو اور میری پیروی کرو۔ میں جس توحید کی دعوت دے رہا ہوں اور جس روز جزا و سزا سے آگاہ کر رہا ہوں یہی زندگی کی صحیح اور سیدھی راہ ہے اس وجہ سے تمہاری فلاح میری پیروی ہی میں ہے۔ اس آیت میں لفظ 'اتَّبِعُوۡنِ' (میری پیروی کرو) اس بات کی صاف دلیل ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قریش کو کہلائی گئی ہے۔ اگر بات براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہی گئی ہوتی تو لفظ 'اتَّبِعُوۡنِ' موزوں نہ ہوتا۔ قرآن میں یہ لفظ جگہ جگہ اپنی مختلف شکلوں میں استعمال ہوا ہے لیکن کہیں بھی یہ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوائی گئی ہے تو آیت سے پہلے 'قُلْ' یا اس مفہوم کا کوئی اور لفظ آنا تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ قرآن میں متعدد مثالیں موجود ہیں کہ اثنائے کلام میں کوئی بات حضرت جبریلؑ کی زبان سے یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یا کسی اور قائل کی زبان سے کہلا دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس طرح کی کوئی تشریح نہیں ہے کہ قائل کون ہے۔ صرف قرینہ قائل کو معین کرتا ہے۔ یہاں لفظ 'اِتَّبِعُوْنِ' اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ اس کے قائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں اس وجہ سے اس کی تصریح کی ضرورت نہیں ہے۔

'وَلَا یَصُدَّنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ ج اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ' یہ اس تنبیہ کا حصہ ہے کہ اس امر کو کبھی نہ بھولو کہ شیطان اس صراط مستقیم کا کھلا ہوا دشمن ہے جس کی طرف میں بلا رہا ہوں۔ وہ صاف صاف اللہ تعالیٰ کو یہ چیلنج دے چکا ہے کہ 'لَاَقْعُدَنَّ لَھُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ' (الاعراف: ۱۶) (میں لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے ان کی گھات میں تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا) مطلب یہ ہے کہ میری اس تنبیہ کے بعد بھی اگر تم ایک ایسے دشمن سے مار کھا گئے جس کی دشمنی ڈھکی چھپی نہیں ہے تو یہ تمہاری بدبختی کی انتہا ہوگی۔

وَلَمَّا جَآءَ عِیْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُکُمْ بِالْحِکْمَۃِ وَلِاُبَیِّنَ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْہِ ج فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ (۶۳)

حضرت عیسیٰ کی بعثت کا مقصد

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقصد بعثت اور ان کی دعوت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نہایت واضح نشانیوں کے ساتھ آئے اور بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ میں تمہارے پاس کوئی نیا دین نہیں بلکہ وہی دین لے کر آیا ہوں جس کی تعلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دی۔ البتہ حکمت دین، جس سے تم نے اپنے کو محروم کر لیا ہے وہ لے کر آیا ہوں تاکہ تم میں ایمانی زندگی پیدا ہو اور تاکہ بعض ان اختلافات میں امر حق واضح کر دوں جن میں تم مبتلا ہو گئے ہو۔ قرینہ دلیل ہے کہ 'وَلِاُبَیِّنَ' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی نئی شریعت کے داعی نہیں تھے بلکہ وہ تورات ہی کے مصدق تھے البتہ انھوں نے حکمت یعنی روح دین اور مغز دین سے بنی اسرائیل کو آشنا کرنا چاہا لیکن انھوں نے اس کی کوئی قدر نہیں کی۔ بلکہ اپنی اس ظاہر پرستی میں مبتلا رہے جس میں مبتلا تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصل دین تو ان کے اندر سے غائب ہو گیا البتہ کچھ رسوم رہ گئے جن کو ادا کر کے وہ مطمئن ہو جاتے کہ اللہ اور اس کے دین کے تمام حقوق سے وہ سبکدوش ہو گئے۔

اختلافات کو رفع کرنے والی چیز حکمت ہے

اگر دین کی حکمت غائب ہو جائے، صرف رسوم اور الفاظ باقی رہ جائیں تو اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ دین کے اندر طرح طرح کے اختلافات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کو دور کرنا ناممکن ہو جاتا

ہے۔ یہود بھی حکمتِ دین سے محروم ہو جانے کے بعد اسی فتنہ میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تعلیمِ حکمت کے ذریعہ سے ان کے ان مذہبی اختلافات کو دور کرنا چاہا لیکن یہود نے اس حکمت کی قدر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اختلافات برابر بڑھتے ہی رہے یہاں تک کہ وہ اپنے اس انجام کو پہنچ گئے جو ان کی ان ناقدریوں کا لازمی نتیجہ تھا۔

إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ (۶۴)

حضرت عیسیٰؑ کی اصل دعوت توحید ہے

بعینہٖ یہی مضمون صرف ایک لفظ کے معمولی فرق کے ساتھ آلِ عمران آیت ۵۱ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کی پوری وضاحت کر چکے ہیں۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل دعوت بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے بھی دوسرے تمام نبیوں اور رسولوں کی طرح توحید ہی کی دعوت دی، اپنی یا کسی اور کی بندگی کی دعوت نہیں دی۔ آلِ عمران کی محولہ بالا آیت کے تحت ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ انجیلوں میں جو یہ آتا ہے کہ میرا باپ اور تمھارا باپ، اسی کی تعبیر قرآن نے 'إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ' کے الفاظ سے فرمائی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو جس معنی میں اپنا باپ کہتے ہیں اسی معنی میں دوسروں کا باپ بھی کہتے تھے اور تنہا اسی کو سزاوارِ عبادت سمجھتے تھے۔ یہ حقیقت بھی آلِ عمران کی تفسیر میں واضح ہو چکی ہے کہ لفظ 'اَب' عبرانی میں 'باپ' کے معنی میں بھی آتا ہے اور 'رب' کے معنی میں بھی اور مشترک الفاظ کی طرح اس کا مفہوم موقع و محل سے معین ہوتا ہے۔

'هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ' یعنی خدا تک پہنچنے کی سیدھی راہ یہی ہے۔ اگر کسی اور کو خدا کا شریک بنا دیا جائے تو یہ سیدھی راہ کج یا مسدود ہو جاتی ہے۔

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ (۶۵)

عیسائیوں کے باہمی اختلافات

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعوت تو نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں توحید کی دی لیکن ان کی امت کے اندر سے مختلف گروہوں نے مختلف مذہب اختیار کر لیے۔ ان اختلافات کی نوعیت اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد شمعون کے پیروؤں کے سوا دوسرے تمام فرقوں نے تثلیث اور کفارہ وغیرہ کے طریقے ایجاد کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمِ توحید کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ موجودہ مسیحیت تمام تر پال (Paul) کی بدعات کا مجموعہ ہے اور ان بدعات کی تعبیر میں بھی مختلف گروہ ہو گئے ہیں۔

'فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ' 'الَّذِينَ ظَلَمُوا' سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے شرک میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے ایک دردناک دن کے عذاب کی ہلاکی ہے!

۸- آگے کا مضمون ـــ آیات: ۶۶-۸۹

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پہلے تو ایمان لانے والوں کے حسنِ انجام اور کفر کرنے والوں کے سوءِ انجام کی وضاحت فرمائی ہے اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے ان لوگوں سے اعراض کا حکم دیا ہے جو اللہ کی ہدایت کا مذاق اڑاتے اور اپنے انجام سے بے فکر رہے۔
آخر میں توحید کی بھرپور یاددہانی کر دی ہے کہ جو لوگ شفاعتِ باطل کے بل پر آخرت سے بےخوف ہیں وہ یاد رکھیں کہ اس دن ہر ایک کو سابقہ اللہ واحد ہی سے پیش آئے گا اور کسی کی سفارش کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں بنے گی ـــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۶-۸۹
هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَن تَأْتِيَهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا
يَشْعُرُونَ ﴿۶۶﴾ الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا
ع ۱۱/۱۲ الْمُتَّقِينَ ﴿۶۷﴾ يَا عِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنتُمْ
تَحْزَنُونَ ﴿۶۸﴾ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ ﴿۶۹﴾
ادْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ ﴿۷۰﴾ يُطَافُ
عَلَيْهِم بِصِحَافٍ مِّن ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ ۖ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ
الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۖ وَأَنتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۷۱﴾ وَتِلْكَ
الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۷۲﴾ لَكُمْ فِيهَا
فَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ مِّنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿۷۳﴾ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي عَذَابِ
جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ﴿۷۴﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ﴿۷۵﴾
وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا هُمُ الظَّالِمِينَ ﴿۷۶﴾ وَنَادَوْا يَا مَالِكُ
لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۖ قَالَ إِنَّكُم مَّاكِثُونَ ﴿۷۷﴾ لَقَدْ جِئْنَاكُم
بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ ﴿۷۸﴾ أَمْ أَبْرَمُوا أَمْرًا

فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ
نَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾ قُلْ اِنْ
كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ سُبْحٰنَ رَبِّ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَذَرْهُمْ
يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۸۳﴾
وَهُوَ الَّذِيْ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِى الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ
الْعَلِيْمُ ﴿۸۴﴾ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۵﴾
وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ
شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ
خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ
وقف لازم هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ
ع ۷ ۱۳ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

ترجمۂ آیات یہ لوگ تو بس قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ ان پر اچانک آ دھمکے اور انھیں
۶۶ - ۸۹ اس کی خبر بھی نہ ہو۔ اس دن تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے
بجز خدا ترسوں کے۔ ۶۶ - ۶۷

اے میرے بندو، اب تم پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے۔ جو ایمان
لائے ہماری آیتوں پر اور فرماں بردار رہے۔ جنت میں داخل ہو جاؤ تم اور تمھارے

ہم عقیدہ، تم شاد کیے جاؤ گے۔ ان کے سامنے سونے کی طشتریاں اور سونے کے پیالے پیش کیے جائیں گے اور ان میں وہ چیزیں ہوں گی جو دل کو پسند اور آنکھوں کے لیے لذت بخش ہوں گی۔ اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے اور یہ وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے اپنے اعمال کے صلے میں۔ اور تمھارے لیے اس میں بہت سے میوے ہوں گے جن میں سے تم کھاؤ گے۔ ۶۸-۷۳

بے شک مجرمین ہمیشہ عذاب دوزخ میں رہیں گے۔ وہ ان کے لیے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور وہ اسی میں مایوس پڑے رہیں گے۔ اور یہ ہم نے ان کے اوپر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ اور وہ پکاریں گے کہ اے مالک! اب تمھارا رب ہمارا خاتمہ ہی کر دے۔ وہ جواب دے گا کہ تمھیں اسی حال میں رہنا ہے۔ ۷۴-۷۷

اور ہم تمھارے پاس حق لے کر آئے لیکن تمھاری اکثریت حق سے بیزار رہی۔ کیا انھوں نے کوئی قطعی فیصلہ کر لیا ہے تو ہم بھی ایک قطعی فیصلہ کر لیں گے۔ کیا ان کا گمان ہے کہ ہم ان کے رازوں اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سُن رہے ہیں؟ ہاں، ہم سن رہے ہیں اور ہمارے فرستادے ان کے پاس لکھ رہے ہیں۔ ۷۸-۸۰

کہہ دو کہ اگر خدائے رحمان کے کوئی اولاد ہو تو سب سے پہلا اس کی عبادت کرنے والا میں ہوں گا۔ آسمانوں اور زمین کا خداوند، عرش کا مالک، ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ تو ان کو چھوڑ دو یہ بوالفضولی اور ہنسی مسخری کر لیں یہاں تک کہ وہ اس دن سے دوچار ہوں جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔ ۸۱-۸۳

اور وہی اکیلا آسمانوں میں بھی خداوند ہے اور وہی زمین میں بھی خداوند ہے اور وہی حقیقی حکیم و علیم ہے اور بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس کے اختیار میں آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کی بادشاہی ہے اور اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اور جن کو یہ اس کے علاوہ پکارتے ہیں وہ سفارش پر اختیار نہیں رکھیں گے مگر وہ جو حق کی گواہی دیں گے اور وہ جانتے بھی ہوں گے۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے تو پھر کہاں بھٹک جاتے ہیں! اور حق کی گواہی دینے والوں کا قول یہ ہوگا کہ اے رب! یہ لوگ خود ایمان لانے والے نہ بنے۔ تو تم ان کو نظر انداز کرو اور کہو، اچھا میرا اسلام لو۔ پس یہ عنقریب خود جان لیں گے۔ ۸۴-۸۹

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَن تَأْتِيَهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۶۶)

اوپر کے دلائل بیان کرنے کے بعد یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ تمہاری بات جو نہیں سن رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نگاہوں میں تمہاری تذکیر و موعظت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ان کا رویہ شاہد ہے کہ یہ لوگ متنبہ ہونے اور آخرت کے لیے کچھ کمائی کرنے کے بجائے چاہتے ہیں کہ قیامت ان کے اوپر اس طرح اچانک آدھمکے کہ اس کی ان کو خبر بھی نہ ہو۔ اگر یہی چاہتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اللہ نے تو یہ چاہا تھا کہ اس ہولناک دن کے آنے سے پہلے پہلے یہ اس کے لیے کچھ کمائی کر لیتے لیکن یہ اس کا استقبال اچانک ہی کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے فکرمند ہونا بے سود ہے۔ اپنی اس بے فکری کا انجام یہ خود دیکھ لیں گے۔

الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ (۶۷)

روز قیامت کی نفسی نفسی

یعنی اس دنیا میں تو ان کو اپنے دوستوں، مددگاروں، اپنی قوم و قبیلہ اور اپنے شرکاء و شفعاء پر بھروسا ہے اور اسی بھروسے نے انھیں آخرت سے بالکل بے فکر کر رکھا ہے لیکن آگے جو دن

آنے والا ہے اس دن کوئی قریبی سے قریبی رشتہ دار اور عزیز سے عزیز دوست بھی کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں بنے گا بلکہ یہ سارے دوست آخرت میں باہمدگر دشمن بن جائیں گے کہ ان کی یہ باہمی دوستی ہی ان کے لیے اس ابدی تباہی کا موجب ہوئی۔ اگر یہ ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملانے والے نہ ہوتے بلکہ اپنے خیر و شر پر آزادی و سنجیدگی سے غور کرتے تو نبی اور اس کے ساتھیوں کے کلمۂ خیر کی برکت سے محروم نہ رہتے۔ اس دن ہر شخص اپنی اس محرومی پر سر پیٹے گا اور اپنے ساتھی کو ملامت کرے گا لیکن یہ سارا نالہ و شیون بالکل بے سود ہوگا۔ پیچھے آیات ۳۶-۳۹ میں یہ مضمون نہایت عمدہ اسلوب سے بیان ہو چکا ہے۔

'اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ' یعنی خدا کے باایمان اور متقی بندے اس انجامِ بد سے محفوظ رہیں گے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو حق و عدل کی نصیحت کی اور اسی پر خود بھی عامل رہے اس وجہ سے قیامت کے دن وہ اپنی کامیابی پر شادماں ہوں گے اور اپنے ساتھیوں کا سلام و تحیت کے ساتھ خیر مقدم کریں گے۔

یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوْا مُسْلِمِیْنَ ۝ اُدْخُلُوا الْجَنَّۃَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ تُحْبَرُوْنَ (۶۸-۷۰)

الله تعالیٰ کی طرف سے متقی بندوں کو مبارکباد | یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان متقی بندوں کو مبارکباد دی جائے گی کہ اے میرے بندو! اب تم خوف اور حزن کے دارالابتلاء سے نکل کر اس ابدی بادشاہی میں داخل ہو گئے جس میں نہ تم کو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ تم کسی حزن میں مبتلا ہو گے۔ ہم دوسرے محل میں وضاحت کر چکے ہیں کہ 'خوف'، مستقبل کے خطرات کا ہوتا ہے اور 'حزن'، حاضر و ماضی کی ناکامیوں اور صدمات کا۔ جنت ایسی جگہ ہے جہاں اہلِ ایمان ان دونوں ہی چیزوں سے محفوظ ہوں گے اس وجہ سے جنت کی تعبیر کے لیے یہ ایک نہایت جامع اسلوب ہے۔

'اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوْا مُسْلِمِیْنَ' یہ متقی بندوں کی وہ صفات بیان ہوئی ہیں جن کی بنا پر وہ اس اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے ـــــ ان صفات کے بیان سے کلام بالکل مطابقِ حال ہو گیا ہے گویا اللہ تعالیٰ نے انگلی اٹھا کر اشارہ فرما دیا کہ اس مقامِ بلند کے حق دار وہی لوگ ہوں گے جو آج ہماری آیات پر ایمان لائے اور صدقِ دل سے ہمارے احکام پر عمل پیرا ہیں۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ ایمان کے مدعی ہیں لیکن خلوصِ دل سے اس کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہیں وہ اس بشارت کے اہل نہیں ہیں۔

'اُدْخُلُوا الْجَنَّۃَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ تُحْبَرُوْنَ'۔ 'حبر' کے معنی خوش اور شاد کرنے کے ہیں۔

لفظ 'ازواج' کی تحقیق | لفظ 'اَزْوَاج' قرآن مجید میں بیویوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور بعض دوسرے معنوں میں

بھی، مثلاً نوع بنوع اور گوناگوں کے معنی ہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰی (۵۳) (اور اس نے آسمان سے پانی اتارا، پس ہم نے اس سے اگائیں مختلف نباتات کی نوع بنوع قسمیں)۔

اسی طرح یہ ہم مسلک وہم مشرب جماعتوں کے مفہوم میں بھی قرآن میں آیا ہے۔ مثلاً

لَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡکَ اِلٰی مَا مَتَّعۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡہُمۡ .... (الحجر: ۸۸)

اور تم اپنی نگاہ ان چیزوں کی طرف نہ اٹھاؤ جن سے ہم نے ان کی بعض جماعتوں کو بہرہ مند کر رکھا ہے۔

اُحۡشُرُوا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا وَ اَزۡوَاجَہُمۡ وَ مَا کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ ﴿ۙ﴾ (الصّٰفّٰت: ۲۲)

جمع کرو ان لوگوں کو جنھوں نے شرک کیا اور ان کے ہم مشربوں کو اور ان چیزوں کو جن کی یہ عبادت کرتے رہے ہیں۔

وَّ کُنۡتُمۡ اَزۡوَاجًا ثَلٰثَۃً ؕ (الواقعۃ: ۷)

اور اس دن تم تین گروہوں میں تقسیم ہو گے۔

ان نظائر کی روشنی میں ہمارا خیال یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں بھی لفظ 'ازواج' ہم مسلک و ہم عقیدہ جماعتوں کے مفہوم میں آیا ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اسی مفہوم کا لحاظ رکھا ہے۔ اگرچہ مدارج ایمان و عمل کے اعتبار سے مختلف ہوں گے لیکن اللہ کے تمام باایمان بندے جنت کی نعمتوں سے محظوظ و مسرور ہوں گے۔ اوپر کفار کے ہم مشربوں اور ان کے دوستوں کا ذکر گزر چکا ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ ان کے مقابل میں اہل ایمان کا حال بیان ہوا کہ وہ مسرور و شادکام کیے جائیں گے۔

یُطَافُ عَلَیۡہِمۡ بِصِحَافٍ مِّنۡ ذَہَبٍ وَّ اَکۡوَابٍ ۚ وَ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡہِ الۡاَنۡفُسُ وَ تَلَذُّ الۡاَعۡیُنُ ۚ وَ اَنۡتُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ (۷۱)

'صِحَاف' کے معنی طشتریوں کے ہیں، 'اکواب' کے معنی پیالوں کے۔ لفظ 'ذھب' جس طرح 'صحاف' کے ساتھ آیا ہے اسی طرح 'اکواب' کے ساتھ بھی ہے لیکن تکرار سے بچنے کے لیے اس کو حذف فرما دیا ہے۔ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔ یعنی غلمان جنت ان کی تواضع و ضیافت کے لیے ان کے سامنے سونے کی طشتریاں اور جام لیے ہوئے ہر وقت گردش میں ہوں گے۔

'وَ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡہِ الۡاَنۡفُسُ وَ تَلَذُّ الۡاَعۡیُنُ'۔ ان طشتریوں اور پیالوں میں کھانے اور پینے کی وہ چیزیں ہوں گی جو دل پسند بھی ہوں گی اور باصرہ نواز بھی۔ بعض چیزیں ذائقہ کے لحاظ سے اچھی ہوتی ہیں لیکن دیکھنے میں اچھی نہیں لگتیں۔ اللہ تعالیٰ اہل جنت کی ضیافت ایسی

نعمتوں سے نوازے گا جو کام و دہن کے لیے بھی لذت بخش ہوں گی اور نگاہوں کے لیے بھی۔

وَاَنۡتُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ۔ اوپر کی بات غائب کے اسلوب میں فرمائی گئی ہے اور یہ حاضر کے اسلوب میں۔ اسلوب کی یہ تبدیلی التفاتِ خاص کی دلیل ہے۔ یعنی خاص اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کو بشارت دے گا کہ اطمینان رکھو، یہ جو کچھ تمھیں حاصل ہوا ہے یہ کوئی وقتی عزت افزائی نہیں ہے بلکہ اب تم اسی جنت میں ہمیشہ رہو گے۔ کسی بڑی سے بڑی نعمت کے متعلق بھی اگر یہ اندیشہ ہو کہ یہ وقتی اور عارضی ہے تو یہ چیز سارے عیش کو مکدّر کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو یہ اطمینان دلا دے گا کہ اب بے غل و غش اس جنت سے فائدہ اٹھاؤ۔ اب کوئی تمھیں اس سے محروم نہیں کر سکتا۔

وَتِلۡكَ الۡجَـنَّةُ الَّتِىۡۤ اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (۷۲)

جنت مجرد انعام کے طور پر نہیں بلکہ حق کے طور پر ملے گی

اوپر والی بشارت سے بھی بڑی بشارت اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو یہ دے گا کہ یہ جنت تمھارے اعمال کے صلہ میں تم کو عطا ہوئی ہے۔ یعنی یہ محض تم پر انعام نہیں بلکہ یہ تمھارا حق بھی ہے۔ اگر کوئی عزت افزائی بلا استحقاق ہو تو دل کو اس سے سچی خوشی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے اس پہلو کو بھی ملحوظ رکھا ہے اس وجہ سے اس نے جنت کو مجرد فضل و احسان کے بجائے اہلِ جنت کا حق اور ان کی ان محنتوں کا ثمرہ قرار دیا ہے جو حق کی راہ میں انھوں نے دنیا کے اندر جھیلی ہیں۔

لَـكُمۡ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ كَثِيۡرَةٌ مِّنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ (۷۳)

اوپر آیت ۷۱ میں اہلِ جنت کے ماکولات و مشروبات کا ذکر تھا۔ یہ ان کے تفکہات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی لطف اندوزی کے لیے بے شمار قسم کے میوے ہوں گے ان میں سے جس میوے سے چاہیں گے لطف اٹھائیں گے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہوگا کہ اس ذخیرے میں کوئی کمی ہو جائے گی۔

اِنَّ الۡمُجۡرِمِيۡنَ فِىۡ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ (۷۴)

اہلِ دوزخ کے لیے ابدی مایوسی

متقی بندوں کے انجام کے ذکر کے بعد اب مجرموں کا انجام بیان ہو رہا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ ہمیش دوزخ کے عذاب ہی میں رہیں گے۔ اس سے ان کو کبھی رہائی نہیں نصیب ہوگی۔

لَا يُفَتَّرُ عَنۡهُمۡ وَهُمۡ فِيۡهِ مُبۡلِسُوۡنَ‌ (۷۵)

یہ عذاب ان پر اس طرح مسلط ہوگا کہ اس سے نجات پانا تو درکنار کبھی عارضی اور وقتی طور پر بھی نہ وہ ٹالا جائے گا اور نہ اس میں کوئی تخفیف ہی ہوگی۔ 'وَهُمۡ فِيۡهِ مُبۡلِسُوۡنَ'۔ وہ اس میں بالکل مایوس ہوں گے۔ آخری درجے میں یہ موہوم امید بھی کبھی سہارا بن جاتی ہے کہ شاید اس عذاب سے کبھی رہائی حاصل ہو جائے یا کبھی اس میں کوئی تخفیف ہی ہو جائے لیکن ان بدبختوں کے لیے اس طرح کا کوئی موہوم سہارا بھی نہ ہوگا۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ (۷۶)

یعنی اس صورتِ حال سے ان کو جو سابقہ پیش آئے گا تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا بلکہ اس کے اسباب انھوں نے خود فراہم کیے اس وجہ سے وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔ ان کی ہدایت کے لیے جو اہتمام ضروری تھا وہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے فرمایا لیکن انھوں نے اس کی قدر نہیں کی بلکہ ساری زندگی اپنی خواہشوں کی غلامی میں گزاری جس کے نتیجہ میں اس انجام سے دوچار ہوئے۔

وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۗ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ (۷۷)

اہلِ دوزخ کی فریاد جہنم کے داروغہ سے اور اس کا جواب

آیت ۷۵ میں ان کی جس ابدی مایوسی کا ذکر ہے یہ اس کی وضاحت ہے کہ وہ دوزخ کے جیلر سے کہیں گے کہ اے مالک! اگر ہمارے لیے کسی رحم کی گنجائش نہیں رہی تو اپنے رب سے ہمارے لیے درخواست کرو کہ وہ ہمارا خاتمہ ہی کر دے۔ وہ فوراً جواب دے گا کہ تمھارا خاتمہ نہیں کیا جائے گا بلکہ تمھیں اسی حال میں پڑے رہنا ہے۔ مایوس کے لیے آخری سہارا موت کا سہارا ہوتا ہے لیکن یہ لوگ اس سہارے سے بھی محروم ہوں گے اور یہ ان کی سب سے بڑی محرومی ہوگی۔

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ (۷۸)

قریش کو تنبیہ

مجرمین کا انجام سنانے کے بعد یہ پھر قریش کو تنبیہ ہے کہ ہم نے قرآن کی شکل میں تمھارے سامنے حق پیش کر دیا ہے لیکن تمھاری اکثریت کا حال یہ ہے کہ حق تمھیں بہت ناگوار ہے۔ اگر یہ ناگوار ہے تو اس کا جو انجام تمھارے سامنے آنے والا ہے اس کو اچھی طرح سوچ لو۔ اب اس انجام سے تم کو دوچار ہونا پڑا تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر ظلم نہیں ہوگا بلکہ تم خود اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے ہوگے۔

اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ (۷۹)

ابرام کے معنی کسی امر کو محکم کرنے کے ہیں۔ ابرم الحبل کے معنی ہوں گے رسی کو اچھی طرح مضبوط بٹنا۔ یہاں یہ کسی بات کا قطعی فیصلہ کر لینے کے مفہوم میں آیا ہے۔

قریش کو فیصلہ کن عذاب کی دھمکی

یہ قریش کو فیصلہ کن عذاب کی دھمکی دی ہے اور دھمکی میں شدت پیدا کرنے کے لیے اسلوب اچانک حاضر سے غائب کا اختیار کر لیا ہے گویا وہ لائقِ خطاب و التفات نہیں رہے۔ فرمایا کہ اگر انھوں نے ایک قطعی فیصلہ کر لیا ہے تو لازماً ہم بھی ایک قطعی فیصلہ کر لیں گے۔ یعنی انھوں نے اگر قرآن اور رسول کی تکذیب کا فیصلہ کر لیا ہے تو یاد رکھیں کہ اس کے بعد اپنی سنت کے مطابق ہم بھی ان کو ہلاک کر دینے کا فیصلہ کر لیں گے۔

رسولوں کے باب میں اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکی ہے کہ جب

قوم رسول کے اخراج یا اس کے قتل کا فیصلہ کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو مزید مہلت نہیں دیتا بلکہ رسول اور اس کے باایمان ساتھیوں کو اپنی امان میں لے لیتا اور قوم کو ہلاک کر دیتا ہے۔ یہاں اسی سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ لوگ رسول کی تکذیب کے معاملے میں یکسو ہو گئے ہیں تو اب لازماً یہ سنت الٰہی کی زد میں بھی آ جائیں گے اور کوئی چیز اس سے ان کو بچانے والی نہیں بنے گی۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ قوم جب تک رسول کی دعوت کے باب میں مذبذب رہتی ہے اس وقت تک تو اللہ تعالیٰ اس کو مہلت دیتا ہے لیکن جب وہ داعی اور دعوت کو ختم کر دینے کا حتمی فیصلہ کر لیتی ہے تو اس کے باب میں خدا کا آخری فیصلہ بھی ظہور میں آ جاتا ہے۔

أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُم ۚ بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ (۸۰)

خفیہ سرگوشیوں کی طرف اشارہ — اللہ تعالیٰ یوں تو لوگوں کے ہر راز اور ان کی ہر سرگوشی کو جانتا ہے لیکن سیاق و سباقِ کلام یہاں دلیل ہے کہ اس سے خاص طور پر ان سرگوشیوں کی طرف اشارہ ہے جو قریش کے لیڈر دارالندوہ وغیرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل یا اخراج سے متعلق کر رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ خدا ان کی سازشوں اور سرگوشیوں سے بے خبر ہے۔ وہ ان کی تمام خفیہ حرکتوں سے اچھی طرح باخبر ہے اور اس کے فرشتے ان کی ایک ایک بات کا ریکارڈ رکھ رہے ہیں۔ یہ جس وقت پیغمبر کے باب میں اپنا آخری فیصلہ کر لیں گے خدا کا فیصلہ بھی ان کے باب میں ظہور میں آ جائے گا۔ پھر ان کے تمام منصوبے دھرے رہ جائیں گے اور خدا کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔

قُلْ إِن كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ ۝ سُبْحَانَ رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ (۸۱-۸۲)

ابتدائے سورہ کے مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فیصلہ کن بات — یہ آخر میں، ابتدائے سورہ کی اس بحث کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے جو فرشتوں کی الوہیت کے ابطال میں گزر چکی ہے، ایک فیصلہ کن بات کا اعلان فرمایا کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ خدا کوئی اولاد بھی رکھتا ہے تو تم سے پہلے اس کی عبادت کے لیے میں خود تیار ہوں لیکن آسمانوں اور زمین اور عرش کا مالک ان باتوں سے پاک ہے جو یہ اس کی طرف بغیر کسی دلیل کے منسوب کر رہے ہیں۔ وہی تنہا ان تمام چیزوں کا خالق اور وہی اکیلا اس ساری کائنات کا مالک اور اس کے عرشِ حکومت پر بلا شرکت غیرے حکمران ہے۔ نہ وہ کسی بیٹے کا محتاج ہے، نہ کسی بیٹی کا اور نہ کسی معاون یا شریک کار کا۔

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ (۸۳)

یعنی یہ فیصلہ کن چیلنج دے کر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جو باتیں یہ چاہیں بنا لیں اور جو ہنسی مسخری کرنی چاہیں کر لیں، یہاں تک کہ وہ دن ان کے سامنے آ جائے جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔

اس دن ان پر ساری حقیقت کھل جائے گی کہ جن کو انھوں نے خدا کی اولاد بنا کر پوجا وہ ان کے کچھ کام آنے والے نہیں بنے۔

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ (۸۴)

یعنی وہی تنہا آسمانوں کا بھی خداوند ہے اور وہی زمین کا بھی خداوند ہے اور تنہا اسی کا حکم و ارادہ ان دونوں کے اندر کارفرما ہے۔ ان کا باہمی توافق دلیل ہے کہ یہ ایک ہی قادر و قیوم کی مشیت کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اگر ان کے اندر متعدد ارادے کارفرما ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتے۔

'وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ' وہ حکیم و علیم ہے۔ نہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی ہوتا اور نہ وہ اپنی معلومات کے لیے کسی کی مدد کا محتاج ہے اس وجہ سے شفاعتِ باطل کا عقیدہ جس کی آڑ میں مشرکین آخرت سے نچنت بیٹھے ہیں، بالکل بے سود ہے۔ یہ عقیدہ اس کی حکمت اور اس کے علم کی نفی ہے۔

وَتَبَارَكَ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۸۵)

'تَبَارَكَ' میں خدا کی عظمت کا پہلو بھی ہے اور اس کے سراپا خیر و برکت ہونے کا پہلو بھی۔ اس کے باعظمت اور بابرکت ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اسی سے ڈرا بھی جائے اور اسی سے امید بھی رکھی جائے۔ وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا بادشاہ ہے اس وجہ سے کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے سامنے دم مار سکے یا اس کی مشیت میں کوئی دخل اندازی کر سکے۔ ساتھ ہی وہ عظیم رحمت و برکت والا ہے اس وجہ سے وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے لیے اس کی رحمت متقاضی ہو گی۔ اس رحمت کے لیے بندے کسی اور کی سفارش کے محتاج نہیں ہیں۔

'وَعِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ' قیامت کی گھڑی کا صحیح علم صرف اسی کے پاس ہے اگر پیغمبر اس کا وقت نہیں بتا سکتے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ آئے گی ہی نہیں۔ اس کا آنا برحق ہے اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھو کہ تم کو لوٹنا اسی کی طرف ہے اس کے سوا اس دن کوئی اور مرجع نہیں ہو گا کہ تم اس سے کوئی امید باندھو۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۸۶)

یہ 'وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ' کی وضاحت ہے یعنی مشرکین اس وہم باطل میں مبتلا ہیں کہ ان کے مولیٰ و مرجع ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء ہوں گے جو سفارش کر کے ان کو خدا سے چھڑا لیں گے۔ فرمایا کہ جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ شفاعت پر کوئی اختیار نہیں رکھیں گے۔ اس دن فیصلہ تمام تر اللہ کے اختیار میں ہو گا اور وہ بالکل حق کے مطابق فیصلہ فرمائے گا۔ 'وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَقْضُونَ بِشَيْءٍ' (المومن ۲۰) (اور اللہ بالکل حق کے مطابق فیصلہ فرمائے گا اور جن کو یہ خدا کے سوا

پکارتے ہیں وہ کسی بات کا بھی فیصلہ نہیں کریں گے)۔

اِلَّا مَنۡ شَہِدَ بِالۡحَقِّ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ۔ یہ استثنائے منقطع ہے۔ یعنی اس دن سفارش کا اختیار تو کسی کو بھی نہیں ہوگا البتہ اللہ تعالیٰ جن کو اجازت مرحمت فرمائے گا وہ حق بات کی گواہی دیں گے اور وہ گواہی اُسی بات کی ہوگی جس کو وہ جانتے ہوں گے۔ قرآن میں جگہ جگہ اس بات کی تصریح ہے کہ خدا کے سامنے سفارش کے لیے صرف وہ لوگ زبان کھولیں گے جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت مرحمت ہوگی اور اسی کے لیے زبان کھولیں گے جس کے باب میں ان کو اجازت ملے گی۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے 'یَوۡمَئِذٍ لَّا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ وَ رَضِیَ لَہٗ قَوۡلًا' (۱۰۹) (اس دن شفاعت کسی کو کوئی نفع نہیں پہنچائے گی مگر جس کے لیے خدائے رحمان اجازت دے اور اس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے)۔ اسی طرح اس بات کی بھی تصریح ہے کہ اس دن جو بھی بات کرے گا اوّل تو خدا کے اذن کے بعد ہی بات کرے گا۔ پھر وہ وہی بات زبان سے نکالے گا جو بالکل ٹھیک ہوگی۔ سورۂ نبا میں ہے۔ 'یَوۡمَ یَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا ۚ لَّا یَتَکَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا' (۳۸) (اور جس دن جبریل اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے، وہ نہیں بات کریں گے مگر جس کو خدائے رحمان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے گا)۔ اسی طرح اس بات کی بھی تصریح ہے کہ خدا کے مقرب بندے بھی زبان سے صرف وہی بات نکالیں گے جو ان کے علم میں ہوگی، جو بات ان کے علم سے باہر ہوگی اس کے باب میں وہ زبان کھولنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ سورۂ مائدہ آیت ۱۱۷ میں حضرت عیسیٰؑ کا قول گزر چکا ہے کہ 'وَکُنۡتُ عَلَیۡہِمۡ شَہِیۡدًا مَّا دُمۡتُ فِیۡہِمۡ' (میں ان کے اوپر گواہ رہا جب تک ان کے اندر رہا)۔ یعنی میرے بعد انھوں نے کیا بنایا اس کی مجھے کچھ خبر نہیں، اس کو تو ہی جانتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی گواہی صرف اس دور سے متعلق ہوگی جو ان کے سامنے گزرا ہے۔ بعد کے ادوار کے لوگوں کے متعلق وہ کچھ نہیں کہیں گے اس لیے کہ ان کے حالات سے وہ ناواقف ہوں گے۔ | جو گواہی دے گا سچی گواہی دے گا۔

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَہُمۡ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ فَاَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ (۸۷)

یہ مشرکین کے حال پر اظہارِ تعجب ہے کہ وہ اللہ کے مقابل میں دوسروں کو شفاعت کا مجاز سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر تم ان سے یہ سوال کرو کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے تو اس کا جواب بہر شکل وہ یہی دیں گے کہ اللہ نے! اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد معلوم نہیں ان کی مت کہاں ماری جاتی ہے کہ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ ان کے مزعومہ معبودوں کو خدا کے ہاں تقرب کا وہ مقام حاصل ہے کہ وہ جس کو چاہیں گے خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے اور جس کو چاہیں گے اپنی سفارش سے اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ پر فائز کرا دیں گے۔

وَ قِیۡلِہٖ یٰرَبِّ اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ قَوۡمٌ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ (۸۸)

'قِیۡلِہٖ' کا عطف اوپر والی آیت میں 'بِالۡحَقِّ' پر ہے۔ یعنی وہ صرف حق بات کہیں گے | 'وَقِیۡلِہٖ' کا معطوف علیہ

اور ان کی شہادت یہ ہوگی کہ اے رب! ان کے ایمان نہ لانے میں اصلی قصور انہی کا ہے، یہ خود ایمان لانے والے نہیں تھے۔ بیچ کی آیت محض استدراک کے طور پر بطور جملہ معترضہ آگئی تھی اس وجہ سے معطوف اور معطوف علیہ میں کوئی معنوی بُعد نہیں پیدا ہوا۔ اس کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔

یہاں یہ امر واضح رہے کہ مشرکین قیامت کے دن اپنے جن مزعومہ شرکاء کو اپنی ضلالت کے لیے بطور عذر پیش کریں گے وہ شرکاء ان کے اس الزام کو ان کے منہ پر پھینک ماریں گے۔ مثلاً فرشتوں کے متعلق قرآن میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ یہ مشرکین مدعی ہیں کہ وہ تمہاری پرستش کرتے رہے ہیں تو کیا ان کی یہ بات صحیح ہے؟ فرشتے اس سوال کے جواب میں صاف اظہار براءت کریں گے کہ یہ خود اس ضلالت کے ذمہ دار ہیں، ان کی اس گمراہی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ أَهٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ۝ قَالُوا سُبْحٰنَكَ أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُونِهِمْ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُونَ ۝ (سبا: ۴۰ - ۴۱)

اور اس دن کا خیال کرو جس دن ان سب کو اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں سے سوال کرے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری پرستش کرتے رہے ہیں؟ وہ جواب دیں گے کہ تو ہر عیب سے پاک ہے، تو ان کے مقابل میں ہمارا کارساز ہے، بلکہ یہ لوگ تو جنوں کو پوجتے رہے ہیں اور ان کی اکثریت انہی پر ایمان رکھنے والوں کی ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی شہادت حق ان الفاظ میں مذکور ہے۔

وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۝ (المائدۃ: ۱۱۶)

جب اللہ پوچھے گا، اے عیسیٰ بن مریم! کیا تم نے لوگوں کو یہ حکم دیا کہ مجھ کو اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بناؤ؟ وہ جواب دیں گے، تو پاک ہے! میرے لیے کس طرح ممکن تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے اس طرح کی کوئی بات کہی تو تو اس کو جانتا ہی ہوگا۔

یہی حقیقت سورۂ احقاف میں یوں واضح فرمائی گئی ہے۔

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوا مِنْ

اور ان سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اللہ کے سوا

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِیْنَ (الاحقاف: ۵-۶)

ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جو ان کو قیامت تک جواب دینے والی نہیں ہیں اور وہ ان کی بندگی سے بالکل بے خبر ہیں اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن بنیں گے اور ان کی بندگی کا انکار کریں گے۔

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (۸۹)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ یہ لوگ اگر اپنا آخری انجام ہی دیکھنے کے درپے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور ان سے اسی طرح درگزر کرو جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے درگزر کیا۔ 'سَلٰمٌ' یہاں 'وداع' کے مفہوم میں ہے۔ 'فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ' یعنی جس انجام کے یہ منتظر ہیں اس کے ظاہر ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ وہ اس کو عنقریب دیکھ لیں گے۔

بتوفیق ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ۔

رحمان آباد

۲۲-اپریل ۱۹۷۶ء

۲۱- ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ

تدبّرِ قرآن

۴۴

الدّخان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس سورہ کا قرآنی نام وہی ہے جو سابق سورہ کا ہے اور اس کی تمہید بھی اصل مدعا کے اعتبار سے تقریباً وہی ہے جو سابق سورہ کی ہے۔ البتہ دونوں میں یہ فرق ہے کہ سابق سورہ میں توحید کے دلائل کا پہلو نمایاں ہے اور اس میں توحید کے دلائل کے بجائے انذار کا پہلو غالب ہے۔ پوری سورہ پر تدبر کی نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ اس میں قرآن اور رسالت کا اثبات اس پہلو سے ہے کہ قرآن منکرین کو جس انجام کی خبر دے رہا ہے وہ دنیا میں بھی شدنی ہے اور آخرت میں بھی۔ تاریخ اس کی شہادت دے رہی ہے اور یہی عقل و فطرت کا تقاضا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سابق سورہ کی آخری آیت میں یہ جو فرمایا ہے کہ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (الزخرف ۔ ۸۹) (ان کو نظر انداز کرو اور کہو میرا سلام لو، پس یہ عنقریب جان لیں گے) اس سورہ میں اسی تہدید کے دلائل و قرائن کی وضاحت ہے۔ گروپ کی آگے کی سورتوں میں یہ مضمون زیادہ واضح ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ گروپ کے آخر میں جو مدنی سورتیں ہیں ان میں قریش کے عزل اور اہل ایمان کی نصرت اور ان کے غلبہ کا بالکل قطعی الفاظ میں اعلان فرما دیا گیا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ - ۱۶) قرآن کی عظمت و شان اور اس کے اہتمام نزول کی طرف اشارہ کہ یہ مبارک لیلۃ القدر میں اتارا گیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے تمام امور مصلحت کی تقسیم ہوتی ہے۔ یہ خدائے سمیع و علیم کی رحمت و ربوبیت کے تقاضوں سے ظہور میں آیا ہے جس کے سوا کوئی رب نہیں اور مقصود اس کے اتارنے سے انذار ہے کہ جو لوگ غفلت میں پڑے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں وہ جاگیں اور جو دن آنے والا ہے اس کے لیے تیاری کریں۔ جو لوگ رسول کی صداقت کے لیے یہ شرط ٹھہرائے بیٹھے ہیں کہ ان کو عذاب دکھا دیا جائے، ان کو تنبیہ کہ عذاب دیکھ لینے کے بعد جو ایمان لایا جاتا ہے وہ سودمند نہیں ہوتا۔ اگر عذاب کے آنے میں اس وقت تاخیر ہو رہی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عذاب کا ذکر محض دھمکی ہے۔ اگر اللہ نے یہاں لوگوں کو مہلت دے بھی دی تو اس سے وہ خدا کے عذاب سے محفوظ نہیں ہو جائیں گے۔ ان کی پکڑ لازماً آخرت میں

ہوگی اور وہ بڑی ہی سخت پکڑ ہوگی۔

(۱۷-۳۳) قریش کی عبرت کے لیے فرعون اور قوم فرعون کے انجام کی تمثال۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو انذار کیا لیکن وہ اپنے مال و جاہ کے غرّے میں مبتلا رہے۔ بالآخر اتمام حجت کی مہلت گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ کر دیا۔ ان کے تمام ملک و مال پر دوسرے لوگ قابض ہو گئے اور بنی اسرائیل، جو ان کی غلامی کے شکنجہ میں سسک رہے تھے، غلامی سے چھوٹ کر دنیا کی ایک عظیم قوم بن گئے۔

(۳۴-۵۰) قریش کے تمرّد کے اصل سبب کا بیان کہ یہ لوگ دنیا کی زندگی کے بعد کسی اور زندگی کا تصور نہیں رکھتے اس وجہ سے ان کو آخرت کا ڈراوا ایک مذاق معلوم ہوتا ہے۔ ان کی تنبیہ کے لیے جزا و سزا کے عقلی اور تاریخی دلائل کی طرف اجمالی اشارہ اور اس امر کی تفصیل کہ آخرت کے لیے پرواہو کر زندگی گزارنے والوں اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوئے زندگی بسر کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یکساں نہیں ہوگا بلکہ دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ ہوگا اور یہ بالکل مبنی بر انصاف ہوگا۔ اہل کفر اپنی ناشکریوں کی سزا بھگتیں گے اور اہل ایمان اپنی نیکیوں کا پورا پورا صلہ پائیں گے اور یہی اصل کامیابی ہے نہ کہ وہ جس پر یہ نادان ریجھے ہوئے ہیں۔

(۵۸-۵۹) خاتمۂ سورہ، جس میں اس احسانِ عظیم کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے جو قرآن کو عربی مبین میں نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے قریش اور اہل عرب پر فرمایا۔ واضح رہے کہ قرآن کی عظمت کے بیان ہی سے اس سورہ کا آغاز ہوا تھا اور اسی مضمون پر اس کا خاتمہ بھی ہوا ہے۔ اس میں قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ ان پر اتمام حجت کے لیے اللہ نے اس کتاب کو تمام ضروری لوازم سے آراستہ کر کے بھیجا ہے۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیں جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے لیے مقدر ہے۔ آخری آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی بھی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ اس نعمت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے عذاب ہی کے منتظر ہیں تو تم بھی ان کے لیے اب اس روزِ بد ہی کا انتظار کرو۔

سُوْرَةُ الدُّخَانِ

مَكِّيَّةٌ ______ آیات: ۵۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۶ حٰمٓ ۝١ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝٢ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ
اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝٣ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝٤ اَمْرًا مِّنْ
عِنْدِنَا ۭ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝٥ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّهٗ هُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝٦ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ وقف لازم
اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝٧ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ رَبُّكُمْ
وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝٨ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝٩
فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَاۗءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۝١٠ يَّغْشَى
النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝١١ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ
اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ۝١٢ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌ
مُّبِيْنٌ ۝١٣ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۝١٤ اِنَّا وقف لازم
كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَاۗىِٕدُوْنَ ۝١٥ يَوْمَ نَبْطِشُ وقف لازم
الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝١٦

ترجمۂ آیات ۱-۱۶

یہ حٰم ہے۔ قسم ہے واضح کر دینے والی کتاب کی۔ بے شک اس کو ہم نے

ایک مبارک رات میں اتارا ہے، بے شک ہم لوگوں کو آگاہ کر دینے والے تھے۔ اس رات میں تمام پرحکمت امور کی تقسیم ہوتی ہے، خاص ہمارے امر سے۔ بے شک ہم رسول بھیجنے والے تھے، خاص تیرے رب کی رحمت سے۔ بے شک سننے جاننے والا وہی ہے۔ اس رب کی رحمت سے جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کا خداوند ہے اگر تم یقین کرنے والے بنو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے، تمہارا بھی رب اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا بھی رب۔ ۱-۸

بلکہ وہ شک میں پڑے ہوئے کھیل رہے ہیں۔ پس انتظار کرو اس دن کا جس دن آسمان ایک کھلے ہوئے دھوئیں کے ساتھ نمودار ہوگا۔ وہ دھواں لوگوں کو ڈھانک لے گا۔ یہ ایک دردناک عذاب ہے! اے ہمارے رب! ہم سے عذاب دور کر دے، ہم ایمان لانے والے بنے۔ اب ان کے لیے نصیحت پکڑنے کا کہاں موقع باقی رہا! ان کے پاس تو ایک واضح کر دینے والا رسول آ چکا تھا تو انھوں نے اس سے منہ موڑا اور کہا کہ یہ تو ایک سکھایا پڑھایا خبطی ہے۔ ہم کچھ وقت کے لیے اس عذاب کو کھول بھی دیں تو تم لوٹ کر وہی کرو گے جو کرتے رہے تھے۔ یاد رکھو جس دن ہم پکڑیں گے بڑی پکڑ، اس دن ہم پورا بدلہ لے کر رہیں گے! ۹-۱۶

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ (۱)

یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے اور یہی نام سابق سورہ کا بھی ہے۔ ناموں کا اشتراک مطالب کے اشتراک کی دلیل ہوتا ہے چنانچہ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سابق سورہ کی آخری آیت میں قریش کو تکذیب رسول کے جس انجام کی دھمکی دی ہے اس سورہ میں اسی دھمکی کی تفصیل ہے۔ آگے کی آیات سے اس کی

پوری وضاحت ہو جائے گی۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۲)

'و' یہاں قسم کے لیے ہے اور یہ وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ عربی میں قسم کا اصل مقصد کسی دعوے پر شہادت پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مقسم علیہ کیا ہے؟ عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس کا مقسم علیہ بعد والی آیت 'اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ...' کو قرار دیا ہے۔ اگرچہ زبان کے قواعد کے اعتبار سے اس میں کوئی خامی نہیں ہے لیکن مجھے اس پر پورا اطمینان نہیں ہے۔ قسم اور مقسم علیہ میں تعلق دلیل اور دعوے کا ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآن کا کتاب مبین ہونا اس بات کی دلیل کس طرح بن سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک مبارک رات میں اتارا ہے۔ میرے نزدیک یہاں مقسم علیہ محذوف ہے، قرینہ اور موقع کلام اس محذوف پر دلیل ہے۔ بربنائے قرینہ مقسم علیہ کے محذوف ہونے کی نظیریں بہت ہیں۔ ایک واضح نظیر سورۂ قٓ میں موجود ہے۔ 'قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۚ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ...' (۱-۲) (یہ سورۂ قٓ ہے، شاہد ہے قرآن بزرگ! بلکہ انھوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک شخص منذر بن کر اٹھا) ظاہر ہے کہ یہاں مقسم علیہ محذوف ہے۔ اسی طرح آیت زیر بحث میں بھی مقسم علیہ محذوف ہے۔ اس حذف کا فائدہ یہ ہے کہ یہاں وہ ساری بات محذوف مانی جا سکتی ہے جس کے لیے موقع کلام مقتضی ہو۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو گویا پوری بات یوں ہوگی کہ یہ واضح کتاب، جو اپنے دعوے پر خود حجت قاطع ہے، اس بات کی شاہد ہے کہ یہ جھٹلانے والوں کو جس انجام بد سے ڈرا رہی ہے وہ ایک امر شدنی ہے، جو شخص اس کو پیش کر رہا ہے اس کو خبطی یا دیوانہ نہ سمجھو بلکہ وہ ایک رسول مبین ہے اس کی دعوت تمام تر حکمت پر مبنی ہے۔ اس کو قبول کرنا باعث رحمت اور اس کو رد کرنا باعث لعنت ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ان باتوں کی دلیل ڈھونڈنے کے لیے قرآن سے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں سے ہر حقیقت کو مبرہن کر دینے کے لیے یہ کتاب خود کافی ہے۔ جو لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں وہ اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ (۳)

یہ اس اہتمام خاص کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے اتارنے کے لیے فرمایا۔ مقصود اس اہتمام کے ذکر سے مخاطبوں پر یہ واضح کرنا ہے کہ اس کو کوئی ہنسی مسخری کی چیز یا کسی مجذوب کی بڑ نہ سمجھیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم الحکیم کا ایک نہایت عظیم حصہ ہے اور اس کے اتارنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وہ مبارک شب منتخب فرمائی جو اس کی طرف سے تمام امور حکمت کی تقسیم کے لیے خاص کی ہوئی ہے۔ مقصود اس کے اتارنے سے ان لوگوں کو انذار کرنا ہے جن کے آباء و اجداد کو انذار

نہیں کیا گیا تھا تاکہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے اور قیامت کے دن وہ یہ عذر نہ کر سکیں کہ ان کو انذار کے بغیر ہی پکڑ لیا گیا۔ اس اہتمام خاص کے بعض اور پہلو بھی ہیں جن کی تفصیل ان شاء اللہ سورۂ جن اور سورۂ قدر کی تفسیر میں آئے گی۔

'لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ' سے مراد ظاہر ہے کہ لیلۃ القدر ہے، چنانچہ سورۂ قدر میں یہ تصریح موجود ہے کہ اسی رات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن اتارا۔ 'اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ ۚ وَمَآ اَدْرٰىکَ مَا لَیْلَۃُ الْقَدْرِ ۚ لَیْلَۃُ الْقَدْرِ ۙ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ ۚ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْھَا بِاِذْنِ رَبِّھِمْ ۚ مِنْ کُلِّ اَمْرٍ ۚ سَلٰمٌ ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ' (۱-۵) (ہم نے اس کو اتارا ہے لیلۃ القدر میں۔ اور تم کیا سمجھے کہ لیلۃ القدر کیا ہے! لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ اس میں ملائکہ اور جبریل اترتے ہیں، ہر باب میں اپنے رب کے اذن کے ساتھ۔ وہ سلامتی ہی سلامتی ہے۔ وہ طلوع فجر تک ہے)۔

یہ لیلۃ القدر لازماً رمضان شریف ہی کی کوئی رات ہو سکتی ہے اس لیے کہ قرآن میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ رمضان ہی کے مہینہ میں قرآن نازل ہوا۔ 'شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ .....' (البقرۃ: ۱۸۵) (رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا)۔

رہا یہ سوال کہ یہ رمضان کی کون سی رات ہے تو اس کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ روایات کی روشنی میں صرف اتنی بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ رمضان کے آخری عشرہ کی کوئی رات ہے۔ تعیین کے ساتھ اس کے ظاہر نہ کرنے میں مصلحت الٰہی یہ معلوم ہوتی ہے کہ بندے اس کی جستجو کریں اور اس طرح ان کے ذوق و شوق اور طلب و تمنا کا امتحان ہو۔ بندوں کی اس طلب و تمنا کے اندر ہی اس لیلۃ القدر کی تمام برکتوں کا راز مضمر ہے۔

ان تصریحات سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ اس سے شعبان یا کسی اور مہینہ کی کوئی رات مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس رات میں قرآن کے اتارے جانے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ پورا قرآن اسی شب میں اتار دیا گیا ہو بلکہ یہ اس کے مبارک آغاز کا پتا دیا گیا ہے۔ جب ایک کام کا آغاز ایک مبارک ساعت میں ہو گیا اور اس کے پورے کیے جانے کا فیصلہ بھی ہو گیا تو گویا وہ کام اسی مبارک ساعت میں ہو گیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو کوئی دوسرا تبدیل نہیں کر سکتا۔ قرآن میں اس اسلوب تعبیر کی مثالیں موجود ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے مستقبل میں پورے ہونے والے وعدے ماضی کے صیغے سے بیان کیے ہیں۔

'لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ خاص خاص دنوں، مہینوں اور اوقات کا مبارک

ہونا ان کی روحانی زرخیزی اور فیض بخشی کے پہلو سے ہے۔ جس طرح ہماری اس مادی دنیا میں موسموں اور فصلوں کا لحاظ ہے، ہر موسم ہر چیز کی کاشت کے لیے موزوں نہیں ہوتا، اسی طرح روحانی عالم میں بھی ساعات و اوقات، سالوں اور مہینوں کا اعتبار ہے۔ جو عبادت اللہ تعالیٰ نے جس وقت، جس دن اور جس مہینہ کے ساتھ وابستہ کر دی ہے اس کی حقیقی برکت اسی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جب وہ اس وقت یا اس دن یا اس مہینہ کی پابندی کے ساتھ کی جائے۔ ورنہ جس طرح بے موسم کی بوئی ہوئی گندم بے حاصل رہتی ہے اسی طرح بے وقت کی نماز، بے وقت کے روزے اور بے موسم کے حج کا بھی کچھ حاصل نہیں اور اگر ہے تو بہت تھوڑا۔ ہمارے چوبیس گھنٹوں کے اوقات میں فجر، چاشت، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور تہجد کے اوقات روحانی اعتبار سے اپنے اندر ایک خاص برکت رکھتے ہیں۔ قرآن اور حدیث میں ان کی یہ برکت واضح فرمائی گئی ہے۔ اسی طرح ہفتہ کے دنوں میں سے جمعہ کے دن کو روحانی فیض بخشی کے اعتبار سے ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے جو کسی دوسرے دن کو حاصل نہیں — سال کے بارہ مہینوں میں سے رمضان یا حج کے مہینوں کو جو شرف خصوصی حاصل ہے اس میں دوسرے مہینے ان کے شریک و سہیم نہیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں میں سے ایک رات اللہ تعالیٰ نے مخصوص کر دی ہے جس میں وہ اپنے ملائکہ مقربین کے ذریعہ سے اس دنیا میں مامور ملائکہ کو اپنے سال بھر کے پروگرام سے آگاہ فرماتا ہے کہ وہ ہر حکم کو اس کے مقررہ وقت پر نافذ کریں۔ اسی طرح کی ایک رات میں رب العزت نے قرآن نازل فرمایا تاکہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو انذار کیا جائے اور اس دنیا کی ہدایت کے لیے ایک آخری رسول کی بعثت کی شکل میں جو رحمت مقدر تھی وہ ظہور میں آئے۔

اس کا حوالہ دینے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس قرآن کا نزول نہ کوئی اتفاقی واقعہ ہے، نہ یہ کوئی بے وقت کی راگنی ہے، نہ یہ بے موسم کا کوئی خودرَو پودا ہے، نہ یہ کوئی من گھڑت چیز ہے بلکہ یہ اس اسکیم کا ظہور ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی خلق کی اصلاح و ہدایت کے لیے پسند فرمائی ہے۔ چنانچہ اس مبارک رات میں اس کو اس نے اتارا ہے جو تمام امورِ حکمت کی تقسیم کے لیے خاص ہے۔ پس جن لوگوں کے لیے یہ اتاری گئی ہے ان کا فرض ہے کہ وہ اس کے شایانِ شان اس کی قدر کریں ورنہ یاد رکھیں کہ جو چیز اللہ نے اس شان و اہتمام کے ساتھ اتاری ہے اس کی ناقدری وہ کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔ یہ کوئی ہوائی چیز نہیں ہے کہ یہ اس کو مذاق میں اڑا دیں اور یہ بات اڑ جائے۔ اس کی تصدیق یا تکذیب دونوں ہی چیزیں نہایت اہم نتائج کی حامل ہیں اور یہ نتائج لازماً سامنے آکے رہیں گے۔

ابدی بادشاہی یا ابدی ہلاکت

'اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِيۡنَ': یہ قرآن کے مقصد نزول کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں یہ بات رہی ہے کہ جس طرح پچھلی قوموں کو ان کی نافرمانیوں پر ہلاک کرنے سے پہلے ان کو تمام خیر و شر سے آگاہ کر

دیا گیا اسی طرح اہلِ عرب کو بھی ان کی نافرمانیوں پر سزا دینے سے پہلے اچھی طرح آگاہ کر دیا جائے تاکہ ان میں سے جو ہدایت قبول کرنا چاہیں وہ ہدایت قبول کر لیں اور جو ہدایت نہ قبول کریں ان کے لیے کوئی عذر نہ باقی رہ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کا نزول اور اس رسول کی بعثت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمامِ حجت کے لیے ہے اور سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اتمامِ حجت کے بعد کسی قوم کو مہلت نہیں ملا کرتی اس وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ جو قدم اٹھائے یہ سوچ کر اٹھائے کہ ایک فیصلہ کن مرحلہ اس کے سامنے ہے۔ اس کو دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے ـــــ ابدی بادشاہی یا ابدی ہلاکت!!

فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ (۴)

ملائکہ کو ایک تنبیہ — یہ اسی شبِ مبارک کی تعریف ہے کہ اس میں تمام مبنی بر حکمت امور کی تقسیم ہوتی ہے۔ اس آیت کو اگر سورۂ قدر کی روشنی میں دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ مقربین کو زمین سے متعلق تمام امورِ کلیہ سے آگاہ فرماتا ہے اور وہ ان سے زمین میں مامور ملائکہ کو آگاہ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے نقشہ کے مطابق اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

'اَمْر' کے ساتھ 'حَکِیْم' کی صفت اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ کسی قوم پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ بھی اس کے عدل و حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور اگر کسی قوم پر اپنی رحمت نازل فرماتا ہے تو وہ بھی اس کے عدل و حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ مخاطبوں کو تنبیہ ہے کہ اس وقت جو مرحلہ تمھارے سامنے ہے اس کے ہر پہلو پر سنجیدگی سے غور کرو۔ اگر تم نے لاابالیانہ روش اختیار کیے رکھی اور خدا کی ایک مبنی بر حکمت اسکیم کے تقاضے پورے نہ کیے تو اس کے نتائج خود تمھارے حق میں نہایت مہلک ہوں گے۔

أَمْرًا مِّنْ عِندِنَا ۚ إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ (۵)

اللہ تعالیٰ کے خاص فرمان کی حیثیت سے — 'اَمْرًا' کا نصب علیٰ سبیل الاختصاص ہے اور مقصود اس سے اس تقسیم امور کی اہمیت و عظمت کو واضح فرمانا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے خاص امرِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ اس میں کسی اور کو دخل نہیں ہوتا اس وجہ سے بندوں پر واجب ہے کہ اس کائنات کے بادشاہِ حقیقی کے خاص فرمان کی حیثیت سے قبول کریں اور سچے جذبۂ انقیاد کے ساتھ اس کے ہر حکم کی اطاعت کریں۔ اگر انھوں نے اس کو رد کیا، اس کا مذاق اڑایا اور اس کی تکذیب کی تو یاد رکھیں کہ یہ اس کائنات کے بادشاہِ حقیقی سے بغاوت ہو گی جس کی سزا بڑی ہی ہولناک ہے۔

'اِنَّا کُنَّا مُرْسِلِیْنَ' یہ بالکل 'اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ' کے ہم وزن جملہ ہے جس طرح اوپر والی آیت میں قرآن کے نزول کا مقصد انذار بتایا ہے اسی طرح اس آیت میں یہ حقیقت واضح فرماتی ہے کہ

اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں یہ بات پہلے سے طے تھی کہ وہ بنی اسماعیل میں ایک رسول مبعوث فرمائے گا جو بنی اسماعیل کے لیے بھی باعثِ رحمت ہوگا اور تمام خلق کے لیے بھی۔ یہ اشارہ ان پیشین گوئیوں کی طرف ہے جو حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح علیہم السلام سے منقول ہیں اور جن کا حوالہ ان کے محل میں ہم دے چکے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اس رسول کی بعثت اسی اسکیم کے تحت ہوئی ہے اور ٹھیک اس رات میں ہوئی ہے جو اس طرح کے امورِ مہمّہ کے ظہور کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے۔

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶)

آنحضرت صلعم کے رحمت ہونے کی طرف اشارہ

یہ ارسالِ رسول کا مقصد واضح فرمایا اور خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ تمہارے رب نے تم کو اپنی جانب سے ایک عظیم رحمت کے طور پر مبعوث فرمایا ہے۔ اگر لوگ تمہاری قدر نہ کی تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے، اپنے ہی کو اللہ کی سب سے بڑی رحمت سے محروم کریں گے۔ آیت ۳ میں رسول کے منذر ہونے کا ذکر تھا، اس آیت میں اس کے رحمت و بشارت ہونے کی طرف اشارہ ہوگیا۔ اور یہ دونوں باتیں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ جو چیز سب سے بڑی رحمت ہوگی وہ سب سے بڑی نقمت بھی بن سکتی ہے اگر اس کی قدر نہ کی جائے۔

یہاں یہ امر پیشِ نظر رہے کہ انذار کے پہلو کو مقدم رکھا ہے درآنحالیکہ قرآن کے نزول اور رسول کی بعثت سے اصل مقصود خلق پر رحمت ہوتا ہے اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف سورہ کے عمود پر تقریر کرتے ہوئے، ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ کا اصل مزاج انذار ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سمیع و علیم کا لازمی تقاضا

'اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ' ان صفات کے حوالہ میں ایک پہلو یہ ملحوظ ہے کہ اس کائنات کا رب ایک دانا و بینا ہستی ہے، وہ اپنی خلق کو شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے دانا و بینا ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ خلق کے حالات پر پوری نظر رکھے۔ لوگوں کو اپنے احکام و اوامر سے آگاہ کرے۔ اگر وہ ان کی تعمیل کریں تو دنیا و آخرت دونوں میں اس کا انعام دے اور اگر سرکشی کریں تو اس کی سزا دے۔ دوسرا یہ کہ اس وقت اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے ساتھ قریش کے لیڈر جو کچھ کر رہے ہیں خدائے سمیع و علیم اس سے بے خبر نہیں ہے۔ ہر بات اس کے علم میں ہے اور جب ہر بات اس کے علم میں ہے اور کوئی چیز بھی اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے تو نبی اور اہل ایمان اطمینان رکھیں کہ جو کچھ اس کی حکمت کا تقاضا ہوگا وہ لازماً ظہور میں آئے گا۔ کوئی چیز بھی اس کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکے گی۔

ان آیات کے مقدرات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے سورۂ قصص کی آیات ۴۵-۴۶ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ (۷)

مخالفین کو ایک سخت وعید

یہ مخالفین کو وعید اور بڑی ہی سخت وعید ہے۔ فرمایا کہ اس انذار و تبشیر کو محض ہوائی بات نہ سمجھو جو محض تم پر دھونس جمانے کے لیے کہی جا رہی ہو بلکہ یہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کے خداوند کی طرف سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہی ہر چیز کا مالک اور خداوند ہے تو کس کے امکان میں ہے کہ اس کے کسی ارادے میں مزاحم ہو سکے۔ اگر وہ لوگوں کو پکڑنا چاہے تو جب چاہے پکڑ لے کوئی اس کو بچا نہیں سکتا اور اگر وہ کسی کو کچھ بخشنا چاہے تو جو چاہے بخش دے کوئی اس کو چھین نہیں سکتا۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ: یہ مخاطبوں کو ملامت ہے کہ ہے تو یہ حقیقت بالکل بدیہی لیکن کسی چیز کے ماننے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ بالکل واضح اور بدیہی ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے اندر اس کے ماننے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ اگر یہ ارادہ کسی کے اندر موجود نہ ہو تو بدیہی سے بدیہی حقیقت کا بھی وہ انکار کر بیٹھتا ہے اور کوئی بڑے سے بڑا منطقی بھی اس کو قائل کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (۸)

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید تاکید ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں جس کی سفارش تمہارے کچھ کام آ سکے۔ زندگی اور موت سب اسی کے اختیار میں ہے، وہی تمہارا بھی رب ہے اور وہی تمہارے اگلے آباء و اجداد کا بھی رب ہے۔ اگر تمہارے آباء و اجداد نے اس کے سوا کسی اور کو پوجا تو یہ ان کی سفاہت و جہالت ہے۔ ان کی تقلید کو اپنے لیے دلیل نہ بناؤ ورنہ پرائے شگون پر اپنی ناک کٹوا بیٹھو گے۔

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ (۹)

انکار کی اصل علت

یعنی یہ انذار و تبشیر ہے تو ایک امر واقعہ جس میں کسی ذی ہوش کے لیے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ لوگ اپنی خواہشوں کے ایسے غلام ہیں کہ جب تک اس چیز کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس وقت تک ماننے والے نہیں ہیں، اس وجہ سے شک میں پڑے ہوئے کھیل رہے ہیں اور اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ زندگی کے معاملات میں جن لوگوں کی روش لاابالیانہ ہے ان کو قائل کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔ یہ لوگ اس وقت قائل ہوں گے جب عذاب کا تازیانہ دیکھ لیں گے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَاۗءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ يَّغْشَى النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۰-۱۱)

ان کے فیصلہ کے دن کا انتظار کرو جس دن آسمان ہر ایک کو نظر آنے والے دھوئیں کے ساتھ نمودار

ہوگا جو سب پر چھا جائے گا اور وہ زبانِ حال سے اعلان کرے گا کہ یہ ایک دردناک عذاب ہے۔

یہ اس عذاب کی دھمکی ہے جس کا لوگ مطالبہ کر رہے تھے اور جس کو دیکھے بغیر نبی کے انذار کی تصدیق کے لیے تیار نہیں تھے۔

'دخان مبین' سے کیا مراد ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'دُخَانٍ مُّبِيْنٍ' سے کیا مراد ہے؟ دخان کے معنی دھوئیں کے ہیں اور اس کے ساتھ 'مبین' کی صفت کا واضح مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دھواں ایسا ہوگا کہ ہر کہ ومہ اور ہر چھوٹے بڑے کو بالکل نمایاں نظر آئے گا کسی کے لیے بھی اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہوگی۔

مفسرین میں سے ایک گروہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ دھواں ظہور قیامت کے وقت ظاہر ہوگا۔ اس کی تائید میں انھوں نے ایک روایت بھی نقل کی ہے لیکن ناقدین حدیث نے اس روایت کو قصہ گریوں کی روایت قرار دے کر اس کی تردید کر دی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ روایت آیات کے سیاق و سباق کے بھی خلاف ہے۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ سیاقِ کلام صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہ ذکر قیامت کا نہیں بلکہ کسی ایسے عذاب کا ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں ان کی قوموں پر آیا ہے، جس کی تفصیلات عاد، ثمود اور قومِ شعیب وغیرہ کی سرگزشتوں میں گزر چکی ہیں۔

ایک دوسرے گروہ نے اس سے ایک قحط مراد لیا ہے جو ان کے بیان کے مطابق، ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کے نتیجہ میں قریش پر آیا اور اس نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ لوگ مردار تک کھانے پر مجبور ہو گئے اور بھوک سے ہر شخص کا یہ حال ہوا کہ آسمان کی طرف لوگ نظر اٹھاتے تو وہ بالکل دھواں ہی دھواں نظر آتا۔

عام طور پر ہمارے مفسرین نے اسی دوسرے قول کو اختیار کیا ہے لیکن مجھے اس میں کئی باتیں کھٹکتی ہیں۔

اوّل یہ کہ اپنی پوری قوم کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس طرح کی بددعا کا ذکر صرف اس تفسیری روایت ہی میں ملتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور شہادت اس کی موجود نہیں ہے کہ حضورؐ نے اپنی قوم کے لیے بددعا فرمائی ہو۔ آپ کی دعا اپنی قوم کے لیے ہمیشہ یہی رہی کہ 'رَبِّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ' (اے میرے رب، میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ یہ لوگ جانتے نہیں)۔ سب سے زیادہ نازک موقع ہجرت کا تھا۔ ہجرت کے موقع پر بعض دوسرے رسولوں نے اپنی اپنی قوموں کے لیے بددعا کی بھی ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اس موقع پر بھی کوئی بددعا کا کلمہ نہیں نکلا۔ آپ نے فرمایا تو بس یہ فرمایا کہ 'اے مکہ! تو مجھے بہت عزیز ہے لیکن کیا کروں، تیرے فرزند مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے'۔ مختلف جنگوں کے مواقع پر بھی، جب کہ قریش اور مسلمانوں کی فوجیں آمنے سامنے ہوتی ہیں، آپ نے جو دعائیں کی ہیں وہ تمام تر اہلِ ایمان کے لیے ثباتِ قدم اور حق کے لیے نصرت کے مضمون پر مشتمل ہیں۔ دشمنوں کے خلاف کوئی کلمہ زبانِ مبارک سے نکلا ہے تو وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ان

کے دلوں میں اللہ رعب ڈال دے اور ان کے قدموں کو متزلزل کر دے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان مواقع پر بھی کبھی اپنی پوری قوم کے لیے آپ نے بد دعا فرمائی ہو۔

دوسری یہ کہ ہجرت کے بعد سب سے زیادہ نازک موقع حدیبیہ کا موقع ہے جب قریش کی عصبیت جاہلیت بالکل عریاں ہو کر سامنے آئی اور مسلمانوں کے جذبات ان کے خلاف آخری حد تک مشتعل ہو گئے۔ لیکن اس موقع پر بھی آپ نے قریش کے لیے کوئی بد دعا نہیں کی۔ صرف یہی نہیں کہ بد دعا نہیں کی بلکہ مسلمانوں کے مشتعل جذبات کو دبایا اور ان کو جنگ سے روک دیا اور قرآن نے، جیساکہ سورۂ فتح میں تفصیل آئے گی، اس جنگ کو روک دینے کی حکمت یہ واضح فرمائی کہ جنگ ہوتی تو اندیشہ تھا کہ اس سے ان لوگوں کو نقصان پہنچتا جو دل سے مسلمان تھے لیکن اپنی مجبوریوں کے باعث ابھی مکہ سے ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ غور کیجیے کہ جب مکہ کے ان مخفی مسلمانوں ہی کے خیال سے مسلمانوں نے اپنی کھینچی ہوئی تلواریں میانوں میں کر لیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کر لیا جو صحابہؓ کے عام جذبات کے خلاف تھا تو انہی اہل مکہ کے لیے کسی ایسے قحط کی بد دعا آپؐ کیسے کر سکتے تھے جس میں لوگ مردار کھانے تک پر مجبور ہو جائیں؟ اس قسم کا کوئی قحط نمودار ہوتا تو اس کی زد میں مکہ اور طائف کے سردار ہی تو نہ آتے! اس کا اصلی حملہ تو غربا اور عوام پر ہوتا جن کے اندر ایک بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی بھی تھی۔

تیسری یہ کہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ کسی دعا کی ہدایت کی گئی ہے نہ کسی بد دعا کی، بلکہ صبر کے ساتھ ایک ایسے دن کے انتظار کی ہدایت فرمائی گئی ہے جس دن آسمان ایک ایسے دھوئیں کے ساتھ نمودار ہوگا جو پوری قوم پر چھا جائے گا اور بزبانِ حال سے یہ منادی کرے گا کہ یہ وہی دردناک عذاب ہے جس سے لوگوں کو آگاہ کیا گیا لیکن لوگ اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ گویا اس کی نوعیت ایک وعید کی ہے اور وعید حالات کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔ قرآن میں قریش کو بار بار اس طرح کے عذاب سے ڈرایا گیا جس طرح کے عذاب عاد، ثمود، قومِ لوط اور قومِ شعیب وغیرہ پر آئے لیکن اس قسم کا کوئی عذاب ان پر نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کی اکثریت ایمان لائی۔ صرف تھوڑے سے اشرار اپنی شرارت پر اڑے رہے جو یا تو اہل ایمان کے ساتھ تصادم میں ختم ہو گئے یا فتح مکہ کے موقع پر انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔

چوتھی یہ کہ قحط کی تعبیر دخان مبین سے کوئی موزوں تعبیر نہیں ہے۔ قحط کا مضمون عربی شاعری کا ایک پامال مضمون ہے۔ جس زمانے میں شمال کی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں ملک میں ایک قحط کی سی حالت پیدا ہو جاتی۔ بعض علاقوں میں حالات نہایت سنگین بھی ہو جاتے۔ عرب شعرا اپنے قصائد میں ان حالات کی نہایت موثر تصویریں کھینچتے ہیں اور مختلف استعارات، کنایات اور تشبیہات سے پورے حالات نگاہوں کے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی شاعر نے بھی کسی شدید سے شدید

قحط کو بھی 'دخان مبین' سے تعبیر کیا ہو یا اس کے اثر کو بیان کرنے کے لیے یہ اسلوب بیان اختیار کیا ہو۔

ان وجوہ سے قحط والی روایت اگر صحیح بھی ہے تو اس کا تعلق اس آیت سے نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی قحط پڑا ہو، یہ بھی امکان ہے کہ یہ قحط بہت سخت ہو گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بھی رہی ہے کہ رسولوں کی بعثت کے دور میں ان کی قومیں ایسی آزمائشوں میں ڈالی گئی ہیں جن سے ان کے اندر تنبہ اور انابت پیدا ہو۔ اس سنت کے اشارات قرآن میں موجود ہیں۔ ان تمام امکانات کے باوجود اس آیت کا تعلق کسی ایسے قحط سے نہیں معلوم ہوتا جس کی شدت سے ہر شخص کا یہ حال ہو گیا کہ اس کو آسمان دھوئیں کی شکل میں نظر آنے لگا۔

'دخان مبین' کی تعبیر سے ذہن اگر منتقل ہوتا ہے تو قحط کی طرف نہیں بلکہ 'حاصب' کے عذاب کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ عرب کی پچھلی قوموں پر رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں بیشتر یہی عذاب آیا ہے۔ عاد، ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب وغیرہ کی جو سرگزشتیں پیچھے گزر چکی ہیں ان میں اس عذاب کی تفصیلات بیان ہو چکی ہیں۔ شعرائے عرب کے کلام اور قرآن سے اس کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ 'دخان مبین' کی تعبیر سے بہت ملتی جلتی ہوئی ہے۔ اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ سیاہ غبار کا ایک ستون سا آسمان کی طرف اٹھتا نظر آتا ہے۔ اس غبار میں جب تک سورج بالکل چھپ نہیں جاتا اس کی شعاعیں بھی اس کے اندر مخلوط ہوتی ہیں جس سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی جنگل میں آگ لگی ہوئی ہے جس کا دھواں آسمان تک اٹھ رہا ہے۔ پھر جب ہوا کا زور بڑھتا ہے اور یہ طوفان کسی طرف کا رخ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابر سیاہ چھا رہا ہے جو بس برسنے والا ہی ہے۔ پھر یہ ایک ہولناک شکل اختیار کر لیتا ہے اور بستیوں کی بستیوں کو ریت اور کنکر پتھر کی بارش سے ڈھانک دیتا ہے۔

قوم عاد پر جب عذاب آیا تو انھوں نے فضا کے سیاہ غبار کو ابر سیاہ خیال کیا۔ چنانچہ سورۂ احقاف میں ان کا ذکر یوں آیا ہے: فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۴) (پس جب انھوں نے اس عذاب کو ایک ابر کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے دیکھا تو بولے کہ یہ تو بادل ہے جو ہمیں سیراب کرنے والا ہے۔ نہیں بلکہ یہ وہی عذاب ہے جس کے لیے تم نے جلدی مچا رکھی تھی۔ ایک باد تند، جس کے اندر ایک دردناک عذاب ہے)۔ اسی عذاب کو قوم شعیب کی تباہی کے ذکر میں 'عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ' سے تعبیر فرمایا گیا: فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ... (الشعراء: ۱۸۹) (پس انھوں نے اس کی تکذیب کر دی جس کے نتیجہ میں ان کو یوم ظلہ کے عذاب نے پکڑ لیا)۔ 'ظلۃ' چھتری اور سائبان اور شامیانے وغیرہ کے لیے بھی آتا ہے اور ابر کے لیے بھی۔

'حاصب' کا عذاب اپنے ابتدائی مرحلہ میں اٹھتے ہوئے ابر یا دھوئیں ہی کی شکل میں نظر آتا ہے

اس وجہ سے قرین قیاس بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ اسی عذاب کی دھمکی ہو۔ یہ دھمکی نہایت واضح الفاظ میں قریش کو عاد اور ثمود وغیرہ قوموں کی سرگزشتیں سنا کر دی بھی گئی تھی۔ ہم نہایت وضاحت کے ساتھ پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ان قوموں کے عذاب کی نوعیت واضح کر چکے ہیں۔ آگے کی سورتوں کی تفسیر میں بھی یہ تفصیلات آئیں گی۔ وہاں ہم استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق بھی اس باب میں ان شاء اللہ پیش کریں گے۔

یہ دھمکی جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ اگر رسول کی تکذیب کر دیں گے تو ان پر عذاب آجائے گا لیکن مشرکین قریش کی اکثریت، جیسا کہ معلوم ہے، آہستہ آہستہ مسلمان ہو گئی اور صلح حدیبیہ کے بعد تو ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ بالتدریج معاندین کا زور بالکل ٹوٹ گیا، یہاں تک کہ فتح مکہ کے بعد یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (النصر: ۲) کی پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ اس کی صداقت کا مشاہدہ ہر شخص نے اپنی آنکھوں سے کر لیا۔ ظاہر ہے کہ جو دھمکی تکذیب کی شرط کے ساتھ مشروط تھی اس تصدیق کے بعد اس کے ظہور میں آنے کے لیے کوئی وجہ باقی نہیں رہی چنانچہ قریش بحیثیت مجموعی اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے۔ صرف ان کے وہ اشرار مسلمانوں کی تلواروں کی زد میں آئے جو ان پر حملہ آور ہوئے اور جو تلواروں سے بچ رہے انھوں نے فتح مکہ کے بعد گھٹنے ٹیک دیے۔

یَّغۡشَی النَّاسَ ؕ ھٰذَا عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (۱۱)

یہ اس عذاب کی شدت کی تعبیر ہے کہ وہ لوگوں کو اس طرح چھا لے گا کہ کسی کے لیے بھی اس سے فرار کی کوئی راہ باقی نہیں رہے گی۔ 'ھٰذَا عَذَابٌ اَلِیۡمٌ' یہ زبانِ حال یا صورتِ حال کی تعبیر ہے کہ ہر شخص پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ کوئی وقتی جھونکا نہیں ہے جو آیا اور گزر گیا بلکہ قہر الٰہی ہے جو سب کی کمر توڑ کے رکھ دے گا۔

رَبَّنَا اکۡشِفۡ عَنَّا الۡعَذَابَ اِنَّا مُؤۡمِنُوۡنَ (۱۲)

مشاہدۂ عذاب کے بعد منکرین کا حال

یعنی اس وقت تو یہ بہت اکڑ رہے اور بڑے طنطنہ سے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن جب اس کی لپیٹ میں آجائیں گے تو فریاد کریں گے کہ اے رب! اس عذاب سے نجات دے۔ اب ہم ایمان لائے۔

اَنّٰی لَھُمُ الذِّکۡرٰی وَقَدۡ جَآءَھُمۡ رَسُوۡلٌ مُّبِیۡنٌ ۙ ثُمَّ تَوَلَّوۡا عَنۡہُ وَقَالُوۡا مُعَلَّمٌ مَّجۡنُوۡنٌ (۱۳-۱۴)

یہ وہ جواب ہے جو ان لوگوں کو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا۔ فرمایا کہ عذاب آجانے کے بعد قبولِ نصیحت کا کہاں موقع باقی رہے گا! بالخصوص جبکہ ان کے پاس اتمام حجت کے لیے

اللہ نے اپنا ایک رسول بھی بھیج دیا تھا جس نے ہر بات کی اچھی طرح وضاحت کر دی تھی لیکن انھوں نے نہایت تکبر کے ساتھ اس سے منہ موڑا اور اس پر یہ الزام لگایا کہ یہ دوسروں کا سکھایا پڑھایا ہوا ہے جس کو عذاب و قیامت کا مالیخولیا ہو گیا ہے۔ اب توبہ کا وقت گزر چکا۔ توبہ کا وقت وہ تھا جب رسول توبہ کی منادی کر رہا تھا۔ وہ وقت انھوں نے کھو دیا تو اب وہ ان کے لیے واپس آنے والا نہیں ہے۔

اس قسم کا جواب عذاب کی گرفت میں آجانے والے مشرکین کے لیے جگہ جگہ نقل ہوا ہے۔ بعض مشرکین کو یہ جواب مخاطب کر کے دیا گیا ہے۔ مثلاً فرعون کو خطاب کر کے فرمایا: آٰلۡـٰٔنَ وَقَدۡ عَصَيۡتَ قَبۡلُ (یونس: ۹۱) (اب ایمان لائے! اس سے پہلے تو تم نے نافرمانی کی) دوسرے مقام میں ہے: فَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا رَبَّنَاۤ اَخِّرۡنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ ۙ نُّجِبۡ دَعۡوَتَكَ وَنَـتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمۡ تَكُوۡنُوۡۤا اَقۡسَمۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ زَوَالٍ (ابراہیم: ۴۴) (تو عذاب کی گرفت میں آجانے کے بعد وہ لوگ جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے پکاریں گے کہ اے ہمارے رب، ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے، ہم تیری دعوت قبول اور رسولوں کی پیروی کریں گے۔ اس وقت ان کو جواب ملے گا کہ کیا تم لوگ اس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے رہے کہ تم کبھی اپنے موقف سے ہٹنے والے نہیں ہو!) آیت زیر بحث میں یہی بات ان سے منہ پھیر کر غائبانہ اسلوب میں فرمائی گئی ہے۔ اسلوب کی یہ تبدیلیاں بلاغت کے تقاضوں کے تحت ہوتی ہیں اور اہل ذوق کے لیے یہ چیزیں محتاج وضاحت نہیں ہیں۔ خطاب کے اسلوب میں شدت اور غائب کے اسلوب میں اعراض کا مضمون نمایاں ہوتا ہے۔

قرآن اور پیغمبر سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لیے قریش کا ایک شغلہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قریش کا یہ الزام کہ آپ کو بعض دوسرے لوگ سکھاتے ہیں، اور یہ ان کی غلط سکھائی ہوئی باتیں وحی کے دعوے کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، بعض دوسرے مقامات میں بھی مذکور ہے۔ یہ الزام قریش نے محض ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے ایجاد کیا تھا جو قرآن کے محاسن بحث و استدلال سے متاثر ہو کر یہ سوچنے لگ گئے تھے کہ اس قسم کا پر مغز کلام کوئی اُمّی، غیبی رہنمائی کے بغیر، نہیں پیش کر سکتا۔ اس طرح کے لوگوں کو قرآن سے بدگمان کرنے کے لیے قریش نے یہ شغلہ ایجاد کیا کہ یہ کلام کسی وحی و الہام کا ثمرہ نہیں بلکہ کچھ پڑھے لکھے لوگوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ وہ لوگ در پردہ یہ کلام ایجاد کرتے ہیں اور یہ شخص اس کو وحی کے نام سے پیش کرتا ہے۔ مقصود سازش کرنے والوں کا یہ ہے کہ اس راہ سے وہ ہماری قوم میں تفریق پیدا کریں۔ یہ الزام لگاتے ہوئے وہ یہ بھی تاثر دیتے کہ اس سازش میں بعض اہل کتاب اور عجمی بھی شامل ہیں تاکہ اس طرح وہ قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عربوں کے قومی جذبات کو کامیابی کے ساتھ بھڑکا سکیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہنے کی اصل وجہ کی طرف اس کے محل میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قریش محسوس کرتے تھے کہ اول تو آپ کے دل پر خوفِ عذابِ آخرت کا ایسا غلبہ ہے کہ آپ اٹھتے بیٹھتے، ہر وقت اسی کی یاد دہانی کرتے ہیں۔ دوسرے آپ کے لب و لہجہ میں ایسا اذعان و یقین ہے کہ ہر شخص اس سے متاثر ہو کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ اگر یہ شخص اللہ کی طرف سے مامور نہ ہوتا تو اس کو کیا پڑی تھی کہ دوسروں کے غم میں اپنا خواب و خور حرام کر لیتا؟ لوگوں کے اس تاثر کو دور کرنے کے لیے قریش نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جس طرح بعض لوگوں کو بعض چیزوں کا سودا ہو جایا کرتا ہے، وہ اٹھتے بیٹھتے اسی چیز کی رٹ لگائے رہتے ہیں اور ہر جگہ ان کو وہی چیز نظر آتی ہے، اسی طرح اس شخص کو بھی عذاب کا سودا ہو گیا ہے۔ ہر گوشے سے اس کو وہی آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ محض ایک خبط و جنون ہے۔ بھلا عذاب ہم پر کدھر سے اور کیوں آجائے گا!

إِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيلًا إِنَّكُمْ عَائِدُونَ (۱۵)

جو خواہشوں کے بندے ہوتے ہیں ان کا یہی حال ہوتا ہے

یعنی ہو سکتا ہے کہ ہم تمہاری اس درخواست پر کہ ہم سے عذاب ٹال دیا جائے ہم ایمان لانے والے بن جائیں گے، کچھ وقت کے لیے عذاب ہٹا دیں لیکن تم پھر اسی راہ پر چلو گے جس پر عذاب سے پہلے چلتے رہے ہو۔ اپنی خواہشوں کے غلاموں کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب ان کو کوئی آزمائش پیش آجاتی ہے تو ناک رگڑ کے توبہ کرتے ہیں لیکن جب آزمائش گزر جاتی ہے تو اس طرح چل دیتے ہیں گویا کوئی بات پیش آئی، نہ انھوں نے کوئی قول و قرار کیا اور نہ آئندہ اب اس طرح کی بات پیش آئے گی۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنْتَقِمُونَ (۱۶)

یعنی اس دنیا میں پکڑ سے چھوٹ بھی گئے تو یہ چیز وجہِ اطمینان نہیں ہونی چاہیے۔ اس دن کو یاد رکھو جس دن ہم بڑی پکڑ پکڑیں گے۔ 'بڑی پکڑ' سے مراد قیامت کی پکڑ ہے۔ اس دنیا میں قوموں کی جو گرفت ہوتی ہے وہ قیامت کے مقابل میں بہرحال چھوٹی ہی ہوتی ہے۔ قیامت کی پکڑ ابدی اور دائمی ہوگی اور اس دن تمام مجرموں سے اللہ تعالیٰ پورا پورا انتقام لے گا۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــ آیات: ۱۷-۳۲

آگے اس بات کی تاریخی دلیل پیش کی گئی ہے جو اوپر کے پیرے میں بیان فرمائی گئی ہے۔ قریش کی تنبیہ کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت کا اتنا حصہ بالاجمال سنا دیا گیا ہے جس سے ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ فرعون نے خدا کے رسول کے ساتھ جو چال چلی تھی وہی چال قریش کے فراعنہ بھی خدا کے رسول کے ساتھ چل رہے ہیں۔ فرعونیوں کو اللہ نے ان کی چالوں کی سزا دی

اور ان کا سارا غرور پامال ہو کر رہ گیا۔ اسی طرح یہ لوگ بھی خدا کی پکڑ میں آ جائیں گے اگر یہ اپنی روش سے باز نہ آئے ۔۔۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۷-۳۳

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۷﴾
اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۸﴾ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا
عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّیْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹﴾ وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ
رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿۲۰﴾ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿۲۱﴾ فَدَعَا
رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَيْلًا اِنَّكُمْ الثلثة
مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾
كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾
وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۫ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۲۸﴾
فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۱۴
وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۳۰﴾
مِنْ فِرْعَوْنَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَلَقَدِ
اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلَی الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ
مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾

ترجمۂ آیات ۱۷-۳۳

اور ان سے پہلے ہم نے قوم فرعون کو آزمایا اور ان کے پاس ایک باعزت رسول آیا۔ اس پیغام کے ساتھ کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالہ کرو، میں تمہارے لیے ایک معتمد رسول ہوں اور یہ کہ تم خدا کے مقابل میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمہارے سامنے ایک واضح حجت پیش کرتا ہوں۔ اور میں نے اپنے اور تمہارے خداوند کی پناہ مانگی

اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو۔ اور اگر تم میری تصدیق نہیں کرتے تو میری راہ چھوڑ دو۔ ۱۷-۲۱

پس اس نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ یہ مجرم ہیں۔ حکم ہوا کہ میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ، آگاہ رہو کہ تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔ اور دریا کو ساکن چھوڑ دو، یہ ڈوبنے والی فوج بنیں گے۔ ۲۲-۲۴

انھوں نے کتنے ہی باغ اور چشمے، کھیتیاں اور راحت بخش ٹھکانے اور سامان عیش، جس میں وہ مگن رہتے تھے، چھوڑے۔ ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتے ہیں اور ان چیزوں کا وارث ہم نے دوسروں کو بنایا۔ پس نہ ان پر آسمان نے آنسو بہائے اور نہ زمین ہی نے اور نہ وہ مہلت پانے والے ہی بنے۔ ۲۵-۲۹

اور ہم نے بنی اسرائیل کو ذلیل کرنے والے عذاب سے نجات دی۔ یعنی فرعون سے۔ بے شک وہ بڑا ہی سرکش، حدود سے نکل جانے والا تھا۔ اور ہم نے ان کو دنیا والوں پر ترجیح دی جان بوجھ کر اور ان کو ایسی نشانیاں دیں جن میں کھلا ہوا انعام تھا۔ ۳۰-۳۳

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ (۱۷)

قریش اور قوم فرعون کی مشابہت

قریش اور قوم فرعون کے حالات میں مشابہت کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارے کیے ہیں یہاں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج جس طرح کے امتحان میں ہم نے قریش کو ڈالا ہے اسی طرح کے امتحان میں ہم نے اس سے پہلے قوم فرعون کو بھی ڈالا تھا۔ جس طرح ان کو سامان عیش و رفاہیت کی فراوانی حاصل ہوئی اسی طرح ان کو بھی دولت و نعمت کی کثرت عطا ہوئی تھی۔ پھر جس طرح

ان کی طرف ایک معزز رسول انذار اور اتمام حجت کے لیے آیا اسی طرح ان کی طرف بھی ایک باعزت رسول آیا ہے۔ اس مشابہت کے حوالہ سے مقصود ظاہر ہے کہ یہ دکھانا ہے کہ جو انجام ان کا ہوا، وہی انجام لازماً ان کا بھی ہونا ہے اگر انھوں نے بھی انہی کی روش اختیار کی۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس دنیا میں قوموں کو جو دولت و شوکت حاصل ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان کے لیے ہوتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ دے کر یہ دیکھتا ہے کہ اللہ کی یہ نعمتیں پاکر قومیں اس کی شکرگزاری اور بندگی کی راہ پر چلتی ہیں یا سرکشی اور طغیان کی راہ اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر وہ یہ دوسری راہ اختیار کر لیتی ہیں تو مہلت کی ایک مدت ان کو ملتی ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کا نام و نشان مٹا دیتا ہے۔

'رَسُوْلٌ' کے ساتھ 'کَرِیْمٌ' کی صفت اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ رسول چونکہ بادشاہِ کائنات کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کے پاس آتا ہے اس وجہ سے عزت و شرف اس کے اس منصب کا ایک لازمی تقاضا ہے اس کے متعلق یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ وہ امیر ہے یا غریب اور نہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ فرعون کے شاہی خاندان سے ہے یا بنی اسرائیل کے غریب خاندان سے جن کو فرعونی غلام اور ذلیل سمجھتے تھے۔ اس کا اصل وصف یہ ہے کہ وہ خدا کا سفیر ہے اور جو خدا کا سفیر ہے اس سے معزز خدا کے سوا کوئی اور ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ | عزت و شرف منصبِ رسالت کا خاصہ ہے

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ (۱۸)

'اَنْ' سے پہلے حرف جر محذوف ہے یعنی باعزت رسول اس پیغام کے ساتھ ان کے پاس آیا کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالہ کرو۔ یہ وہی بات ہے جو دوسرے مقامات میں 'فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ' (طٰہٰ: ۴۷) کے الفاظ سے نقل ہوئی ہے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ اس فقرے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے مطالبہ کی دلیل بھی سمو دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو اللہ کے بندے ہیں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ ان کو اپنا بندہ بنانے کی کوشش کرے اس وجہ سے ان کو میرے ساتھ جانے دو تاکہ ہم اپنے رب کی بندگی جس طرح کرنی چاہتے ہیں بغیر کسی روک ٹوک کے کر سکیں۔ یہ سوال کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے؟ اس تفسیر میں جگہ جگہ زیر بحث آ چکا ہے۔ اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اتنی بات واضح ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کے لیے اللہ کی بندگی کی پوری آزادی چاہتے تھے۔ فرعون کے لیے یہ حق تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ وہ لوگوں کو اپنا بندہ بنائے رکھے۔ | اللہ کے بندوں کو کوئی اپنا بندہ نہیں بنا سکتا

'اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ'۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے درباریوں کو اطمینان دلایا کہ میں کوئی مدعی اور مفتری نہیں ہوں بلکہ فی الواقع خدا کا رسول ہوں۔ پوری امانت و دیانت کے ساتھ تم کو وہی پیغام پہنچا رہا ہوں جو خدا نے دے کر مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام | ایک مخفی تہدید

نے یہ بات مجرد اپنی صفائی میں نہیں فرمائی بلکہ اس کے اندر ایک تہدید بھی مخفی ہے کہ اگر مجھے مفتری قرار دے کر میری تکذیب کی گئی تو اس کے نتائج نہایت مہلک ہوں گے۔ جس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے وہ ان لوگوں سے ضرور انتقام لے گا۔

وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَی اللّٰهِ ۚ اِنِّیْۤ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (۱۹)

رسول سے بغاوت خدا سے بغاوت ہے

یہ اسی پیغام کا حصہ ہے کہ مجھے یہ پیغام پہنچانے کی بھی ہدایت ہوئی ہے کہ خدا کے اس حکم کو سیدھے سیدھے مان لو۔ اگر تم نے سرکشی کی تو یہ سرکشی صرف میرے ہی مقابلہ میں نہیں ہو گی بلکہ یہ اصلاً خدا کے مقابل میں ہوگی اس لیے کہ میری اصلی حیثیت یہ ہے کہ میں خدا کا سفیر ہوں۔

'اِنِّیْۤ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ'۔ 'سلطان مبین' سے اشارہ عصا اور ید بیضاء کے معجزات کی طرف ہے۔ یعنی میں سفیر الٰہی ہونے کی اپنے پاس نہایت واضح سند رکھتا ہوں اور وہ میں تمھیں دکھاتا ہوں تاکہ میرے باب میں تمھیں کوئی شک باقی نہ رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ ایک نہایت سرکش اور جبار بادشاہ کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے ان کو ایسے معجزات سے مسلح فرما دیا تھا جو ان کے مخالفوں پر حجت ہو سکیں۔

وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ (۲۰)

ایک بلیغ دعوت اور مؤثر تنبیہ

یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت فرمائی ہے جب ان کے مطالبہ نے تمام قبطیوں میں ایک ہلچل برپا کر دی۔ اس وقت ان کو قتل کی دھمکی بھی دی گئی اور یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ سرپھری قوم بر کھلا آپ کو سنگسار ہی نہ کر دے۔ اس وقت آپ نے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تم لوگ مجھے سنگسار کرنے کی نیت رکھتے ہو تو میں اپنے کو اس رب کی پناہ میں دیتا ہوں جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے۔ 'وَرَبِّكُمْ' (اور تمھارا بھی رب ہے) کے الفاظ میں ایک مؤثر اپیل بھی ہے، نہایت بلیغ دعوت بھی ہے اور نہایت پُر وقار تنبیہ بھی اور ساتھ ہی اس میں یہ طنز بھی مخفی ہے کہ اس خناس کے کہنے میں آ کر جو تمھارا 'رب اعلیٰ' بنا ہوا بیٹھا ہے کوئی ایسی حرکت نہ کر گزرنا جو تمھاری ساری قوم کا بیڑا ہی غرق کر دے۔

وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ (۲۱)

یعنی اگر تم لوگ یہ باور کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو کہ میں خدا کا سفیر ہوں تو کم از کم مجھے قتل یا سنگسار کرنے کے مجرم نہ بنو بلکہ میری راہ چھوڑو۔ میں بنی اسرائیل کو لے کر جہاں جانا چاہتا ہوں چلا جاؤں۔ بہتر تو یہ تھا کہ تم میری بات باور کرتے اور مجھ پر ایمان لاتے۔ یہ چیز تمھاری دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت کی ضامن ہوتی۔ اگر یہ منظور نہیں ہے تو کم از کم میری راہ میں مزاحم ہونے کی کوشش نہ کرو۔

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوۡمٌ مُّجۡرِمُوۡنَ (۲۲)

حضرت موسیٰ کی فریاد اپنے رب سے

قبطیوں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس اپیل اور تنبیہ کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ بدستور اپنی سازشوں اور سرگرمیوں میں لگے رہے۔ بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے فریاد کی، 'اے رب، یہ لوگ سننے اور ماننے والے نہیں ہیں بلکہ یہ پکے مجرم ہیں، تو ہی ہے جو ان کے چنگل سے رہائی دلا سکتا ہے'۔

فَاَسۡرِ بِعِبَادِیۡ لَیۡلًا اِنَّکُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ (۲۳)

فریاد کی فوراً شنوائی ہوئی

یہ فریاد بالکل برموقع تھی اس وجہ سے فوراً شنوائی ہوئی۔ قبولیت کی بابت ظاہر کرنے کے لیے یہاں کوئی ایسا لفظ لانا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ دعا کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ہدایت ہوئی۔ حکم ہوا کہ میرے بندوں کو لے کر یہاں سے راتوں رات نکل جاؤ اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرما دی گئی کہ فرعونیوں کی طرف سے تمہارا تعاقب ہوگا۔ اس انتباہ کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ فرعون نے اگرچہ ان آفتوں سے تنگ آکر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاؤں کے نتیجہ میں مصر پر نازل ہوئیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چند دن کے لیے جانے کی اجازت دے دی لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی پوری قوم سمیت روانہ ہوئے تو اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ اجازت دینے میں اس نے غلطی کی ہے۔ چنانچہ وہ فوراً اپنی اور اپنے تمام علاقائی سرداروں کی فوجیں لے کر ان کے تعاقب میں روانہ ہوا کہ ان کو مجبور کر کے پھر واپس لائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس پیش آنے والی صورتِ حال سے پہلے سے آگاہ کر دیا تھا تاکہ کوچ و قیام میں کوئی غیر ضروری تاخیر پیش نہ آئے بلکہ وہ مقررہ پروگرام کے مطابق دریا کو عبور کرنے کی کوشش کریں۔

وَاتۡرُکِ الۡبَحۡرَ رَهۡوًا ؕ اِنَّهُمۡ جُنۡدٌ مُّغۡرَقُوۡنَ (۲۴)

حضرت موسیٰ کو ہدایت

'رھو' کے معنی ساکن کے ہیں یعنی تم اس ہوا کے رکنے سے پہلے پہلے دریا سے نکل جاؤ جس ہوا کے ذریعہ سے پانی کو قدرت ہٹائے اور تمہارے لیے راستہ صاف کرے گی تمہارے نکلتے ہی دریا پرسکون ہو جائے گا اور ہٹا ہوا پانی پھر اپنی جگہ گھیر لے گا۔ اس دوران میں مصری تمہارے تعاقب میں دریا کے بیچ میں ہوں گے۔ اور پانی ان پر اس طرح چھا جائے گا کہ وہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔

کَمۡ تَرَکُوۡا مِنۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ۙ﴿۲۵﴾ وَّ زُرُوۡعٍ وَّ مَقَامٍ کَرِیۡمٍ ۙ﴿۲۶﴾ وَّ نَعۡمَةٍ کَانُوۡا فِیۡهَا فٰکِهِیۡنَ (۲۵-۲۷)

یعنی جن باغوں اور چشموں، کھیتوں اور پرشوکت کوٹھیوں اور عیش کے سامانوں نے ان کو اتنا

میں مبتلا کیا، ان سے محروم ہو کر وہ سمندر کی موجوں کا لقمہ بنے۔ ان کا گمان تھا کہ یہ چیزیں ان کی کامیابی اور ترقی کی دلیل ہیں اور جو لوگ ان کو تباہی سے ڈراتے ہیں وہ بالکل بے خرد ہیں۔ لیکن ثابت ہو گیا کہ خدا کے خوف کے بغیر یہ چیزیں تباہی کا پیش خیمہ ہیں اور جب تباہی آتی ہے تو ان میں سے کوئی چیز بھی کام نہیں آتی۔

كَذٰلِكَ ۖ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (۲۸)

مجرموں کے لیے سنت الٰہی

'كَذٰلِكَ' کے بعد 'فَعَلَ بِالْمُجْرِمِيْنَ' کے الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں۔ یعنی ہم نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا مجرموں کے ساتھ ہم ایسا ہی کرتے آئے ہیں اور ایسا ہی آئندہ بھی کریں گے۔ 'وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ' اور ان چیزوں کا وارث ہم نے دوسروں کو بنایا۔ 'دوسروں' سے مراد یہاں بنی اسرائیل نہیں ہیں۔ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کا مصر آنا ثابت نہیں ہے۔ ممکن ہے اس سے مراد پڑوس کی وہ قومیں ہوں جن سے فرعونیوں کو برابر اندیشہ رہا کہ مبادا وہ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ ملا کر ملک پر قبضہ کر لیں۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ذکور کے قتل کی جو اسکیم چلائی گئی تھی اس کا محرک ان کا یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر بنی اسرائیل کی تعداد زیادہ ہو گئی تو وہ ان کے دشمنوں کے ساتھ مل کر ان کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (۲۹)

یعنی جب تک وہ اقتدار میں رہے اس وقت تک تو سمجھتے رہے کہ وہ ایک عظیم تمدن کے بانی ہیں اور ساری دنیا ہمیشہ ان کی کنوڈی رہے گی لیکن ان کی تباہی پر نہ آسمان رویا، نہ زمین ہی نے دو آنسو بہائے بلکہ ہر ایک نے اطمینان کا سانس لیا کہ خس کم جہاں پاک!

یہ امر یہاں واضح رہے کہ ایک مظلوم کی موت پر تو آسمان بھی کبیدہ خاطر ہوتا ہے اور زمین بھی فریاد کرتی ہے۔ تورات میں لکھا ہے کہ خداوند نے فرمایا کہ زمین سے مجھے ہابیل کا خون پکارتا ہے۔ لیکن ظالموں اور نافرمانوں کی بربادی پر آسمان اور زمین سب خوش ہوتے ہیں، خاص طور پر ان نافرمانوں کی تباہی پر جن پر اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ سے حجت تمام کر دی ہو۔

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۙ مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ (۳۰-۳۱)

'مِنْ فِرْعَوْنَ' بدل ہے 'الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ' سے۔ گویا اللہ نے خود فرعون کو ایک عذاب ذلت سے تعبیر فرمایا۔ فرعون تو حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کو ذلیل سمجھتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک خود فرعون نہ صرف ذلیل بلکہ ایک عذاب رسوائی تھا۔

'اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ' یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اسے ایک رسوا کن

عذاب سے تعبیر کیا گیا۔ فرمایا کہ اس وجہ سے کہ وہ نہایت سرکش اور اللہ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر جانے والوں میں سے تھا۔ جو لوگ اللہ کے آگے سرکشی کرتے ہیں وہ مظلوموں کے لیے عذاب اور عذاب اللہ ذلیل ہوتے ہیں۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۳۲)

جو قوم شریعت کی حامل ہوتی ہے وہی خلق کی رہنمائی کی اہل ہوتی ہے

یعنی فرعون اور اس کی قوم کو تو ہم نے غرق دریا کیا اور بنی اسرائیل کو، جو ان کے قدموں کے نیچے پامال ہو رہے تھے، اہل عالم کی رہنمائی کے لیے انتخاب کیا۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ جو قوم خدا کی شریعت کی حامل بنائی جاتی ہے فطری طور پر وہی اہل اور حقدار ہوتی ہے اس بات کی کہ وہ خلق کی رہنمائی کرے۔ اس کا یہ منصب مشروط ہوتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی منصبی ذمہ داری پوری دیانت کے ساتھ ادا کرے۔ اگر وہ یہ ذمہ داری ادا نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے یہ منصب چھین کر دوسروں کے حوالہ کر دیتا ہے۔ ایک خاص دور میں بنی اسرائیل کو یہ منصب حاصل ہوا لیکن جب وہ اس کے اہل نہیں رہے تو وہ معزول کر دیے گئے اور ہدایتِ خلق کی ذمہ داری ملتِ مسلمہ کے سپرد ہوئی۔

تاریخ کا ایک فلسفہ

'عَلٰى عِلْمٍ' کے الفاظ سے تاریخ کے اس فلسفہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں قوموں کا عزل و نصب اتفاقی واقعات کے طور پر نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی کسوٹی پر جانچ کر جس قوم کو اہل پاتا ہے اس کو منتخب کرتا ہے اور جس کو نااہل پاتا ہے اس کو رد کر دیتا ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جو معزول ہوئے ہیں وہ دوسروں کو الزام دینے کے بجائے اپنی نالائقی پر سر پیٹیں اور جو اقتدار پر آئے وہ فخر و غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے خدا کے شکر گزار رہیں اور اپنی ذمہ داریاں ادا کریں۔ اس دنیا کے عروج و زوال کا سارا نقشہ اللہ تعالیٰ مرتب کرتا ہے اور اس کی بنیاد تمام تر قوموں کے اخلاق و کردار پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم بے خطا اور اس کی حکمت بے لاگ ہے۔

بنی اسرائیل کے لیے ایک اہم تنبیہ

ان آیات کے اندر بنی اسرائیل کے لیے، جو ان آیات کے زمانۂ نزول میں قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے کمریں کس رہے تھے، نہایت اہم تنبیہ ہے جس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ ایک ہی نکتہ سمجھ گئے ہوتے کہ ان کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی بنیاد پر کیا تھا اور اب اس کے علم ہی کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اس کے اہل نہیں رہے تو وہ اس انجام بد سے بچ جاتے جو اسلام کی مخالفت کے نتیجہ میں ان کے سامنے آیا۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ (۳۳)

بنی اسرائیل کا امتحان انعامات کے ذریعہ سے

'بَلٰٓؤٌا' کے اصل معنی تو امتحان اور جانچ کے ہیں لیکن امتحان نعمت کے ذریعہ سے بھی ہوتا ہے۔ اور مصیبت کے ذریعہ سے بھی۔ نعمت کا امتحان شکر کی جانچ کے لیے ہوتا ہے اور مصیبت کا امتحان صبر و رضا کی جانچ کے لیے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ نعمت اور انعام کے مفہوم میں آیا ہے جس طرح الانفال آیت ۱۷ میں

میں مُبٰرَکَۃٌ کا لفظ تحیّۃً کی صفت کے ساتھ آیا ہے۔ یہ اشارہ ان انعامات کی طرف ہے جو سمندر سے پار کرانے ہوئے اور اس کے بعد صحرا کی زندگی میں اور فتح فلسطین اور اس کے بعد کے ادوار میں اللہ تعالیٰ نے گوناگوں شکلوں میں بنی اسرائیل پر فرمائے۔ جن کی تفصیلات سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۳۴-۵۷

آگے کی آیات میں قریش کی سرکشی کے اصل سبب پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ لوگ اس دنیا کی زندگی کے بعد کسی اور زندگی کا تصور نہیں رکھتے اس وجہ سے اپنے حاضر میں مگن اور مستقبل سے بے فکر ہیں۔ ان کی اس غلط فہمی کے ازالہ کے لیے پہلے قانون جزا و سزا کے عقلی و فطری دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اہل کفر و اہل ایمان دونوں کے انجام کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ﴿۳۴﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ آیات ۳۴-۵۷
بِمُنْشَرِينَ ﴿۳۵﴾ فَأْتُوا بِآبَائِنَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۶﴾ أَهُمْ
خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ أَهْلَكْنَاهُمْ ۖ إِنَّهُمْ
كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿۳۷﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا
بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ
أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۹﴾ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ
أَجْمَعِينَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَوْلًى شَيْئًا وَلَا هُمْ
يُنْصَرُونَ ﴿۴۱﴾ إِلَّا مَنْ رَحِمَ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۴۲﴾ ع ۲ ۱۴ ۱۵
إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الْأَثِيمِ ﴿۴۴﴾ كَالْمُهْلِ ۛ
يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ﴿۴۵﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ﴿۴۶﴾ خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ
إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ
الْحَمِيمِ ﴿۴۸﴾ ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ﴿۴۹﴾ إِنَّ هَٰذَا

مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾
فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ
مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۵۴﴾ يَدْعُوْنَ
فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ
اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۵۶﴾ فَضْلًا
مِّنْ رَّبِّكَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۵۷﴾ ع ۲ ۱۶

ترجمۂ آیات ۳۴-۵۷

یہ لوگ بڑے جزم کے ساتھ کہتے ہیں کہ بس یہ ہماری پہلی موت ہی ہے اور ہم اس کے بعد زندہ نہیں کیے جائیں گے تو لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو! ۳۴-۳۶ کیا یہ بہتر حالت میں ہیں یا قوم تبّع کے لوگ اور وہ لوگ جو ان سے پہلے گزرے؟ ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، بے شک وہ نافرمان لوگ تھے۔ ۳۷

اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں کھیل کے طور پر نہیں بنائیں۔ ہم نے ان کو نہیں پیدا کیا ہے مگر ایک غایت کے ساتھ لیکن ان کے اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ بے شک فیصلہ کا دن ان سب کا وقت موعود ہے۔ جس دن کوئی رشتہ دار کسی رشتہ دار کے کام نہیں آئے گا اور نہ ان کی کوئی مدد ہی ہو سکے گی۔ ہاں مگر وہ جن پر اللہ رحم فرمائے۔ بے شک وہی عزیز و رحیم ہے۔ ۳۸-۴۲

زقّوم کا درخت گنہگاروں کا کھانا ہوگا، تیل کے تلچھٹ کے مانند پیٹ میں کھولے گا جس طرح گرم پانی کھولتا ہے۔ اس کو پکڑو اور گھسیٹتے ہوئے جہنم کے بیچ تک لے جاؤ پھر اس کے سر پر گرم پانی کا عذاب بہاؤ۔ چکھو اس کو، تم بڑے مقتدر اور

باعزت بنے رہے! یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں تم شک میں پڑے رہے ہو! ۴۲-۵۰

ہاں جو خدا سے ڈرنے والے ہوں گے وہ مقامِ امن میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں۔ وہ سندس اور استبرق کے لباس پہنے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ خدا سے ڈرنے والوں کے ساتھ یہی معاملہ ہوگا! اور ہم ان سے بیاہ دیں گے غزال چشم حوریں، وہ اس میں طلب کریں گے ہر قسم کے میوے، نہایت چین سے۔ وہ اس میں پہلی موت کے بعد پھر موت سے آشنا نہیں ہوں گے اور اللہ نے ان کو جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھا یہ خاص تیرے رب کے فضل سے ہوگا۔ یہی ہے درحقیقت بڑی کامیابی! ۵۱-۵۷

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنشَرِينَ (۳۴-۳۵)

کفار کا زعم

یعنی یہ لوگ بڑے عزم و جزم کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ قیامت وغیرہ کا ڈراوا محض ایک ہوا ہے بس یہی موت، جس سے اس دنیا میں سابقہ پیش آتا ہے، یہی اوّل موت بھی ہے اور یہی آخری بھی۔ اس کے بعد نہ کوئی موت ہے، نہ کوئی زندگی۔

فَأْتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۳۶)

کفار کی واحد بے بنیاد دلیل

اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ اہل ایمان سے یہ مطالبہ کرتے کہ اگر موت کے بعد زندگی ہے تو تمہاری سچائی ہم اس وقت تسلیم کریں گے جب تم ہمارے وفات پائے ہوئے بزرگوں میں سے کسی کو زندہ کر کے دکھا دو۔ یہی مضمون سورۂ جاثیہ میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا ائْتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (الجاثیۃ: ۲۵) (اور جب ان کو موت کے بعد کی زندگی کے حق میں ہماری روشن دلیلیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو واحد دلیل جو وہ اس کے مقابل میں پیش کرتے ہیں وہ ان کا یہ قول ہوتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے دکھاؤ) قرآن نے اس دلیل کو ان کی واحد دلیل قرار دیا ہے اور اس کا حوالہ دے کر اس کو نظر انداز کر دیا ہے، کوئی تردید اس کی نہیں کی ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ان کی واحد دلیل، جس پر ان کو بڑا ناز ہے، بس اس کی لغویت اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ أَهْلَكْنَاهُمْ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ (٣٧)

'قَوْمُ تُبَّعٍ' سے مراد تبابعہ یمن ہیں جن کی مادی شوکت و عظمت اور ذہنی صلاحیتوں کی عرب میں بڑی شہرت رہی ہے۔ عرب شعراء ان کی عظمت کا چرچا بہت کرتے ہیں۔

قوموں پر جب خدا کا عذاب آتا ہے تو وہ اپنے ہی اسلحہ سے خودکشی کرتی ہیں

قرآن نے قریش کے مذکورہ بالا مطالبہ کے جواب میں ان سے یہ سوال کیا ہے کہ وہ بتائیں کہ مادی شان و شوکت اور ذہنی و عقلی صلاحیتوں کے اعتبار سے وہ برتر ہیں یا تبابعہ برتر تھے؟ اگر وہ برتر تھے اور اس برتری کے باوجود خدا نے ان کو تباہ کر دیا، نہ ان کی مادی قوت و دولت ہی خدا کی پکڑ سے ان کو بچا سکی نہ ان کی ذہانت ہی ان کے کچھ کام آئی تو آخر یہ کس بل بوتے پر اس غرّے میں مبتلا ہیں کہ کوئی ان کو ہلا نہیں سکتا؟ جب خدا نے ان سے زیادہ زور آوروں کی گردن توڑ دی تو ان کی گردن کیوں نہیں توڑ سکتا؟ یہی حال ان سے پہلے کی دوسری قوموں کا بھی ہوا۔ عاد و ثمود وغیرہ اور بعض دوسری قومیں ہر اعتبار سے ان سے برتر تھیں لیکن جب انھوں نے خدا سے سرکشی کی تو خدا نے ان کا نام و نشان مٹا دیا تو آخر ان کے لیے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ یہ خدا کے چہیتے بنے رہیں گے اگرچہ سرکشی میں ان سے بھی چار قدم آگے نکل جائیں؟ خدا کی میزان میں وزن قوموں کے اخلاق و کردار کا ہے، ان کی مادی دولت و ثروت اور ان کی شاندار عمارتوں کا نہیں ہے اور نہ ان کے میزائلوں اور ایٹم بموں کا ہے۔ جب قوموں کا کردار فاسد ہو جاتا ہے تو ان کے انہی بموں کو، جو وہ دوسروں کو تباہ کرنے کے لیے بناتی ہیں خود انہی کے سروں پر دے مارتا ہے اور وہ اپنے ہی بنائے ہوئے اسلحہ سے خودکشی پر مجبور ہوتی ہیں۔

دنیا میں قوموں کو سزا آخرت کے عذاب کی دلیل ہے

دنیا میں خدا کے قانونِ مجازات کی مثالیں موجود ہیں اور اتنی کثرت سے موجود ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں ہے تو آخر ایک ایسے روزِ جزاء و سزا کے بارے میں کیوں شک کیا جائے جس میں خالقِ کائنات افراد کو بھی اسی طرح جزا یا سزا دے جس طرح اس نے دنیا میں قوموں کو جزا یا سزا دی ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ۝ مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (٣٨-٣٩)

آخرت خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے

اوپر جزا و سزا کی دلیل تاریخ اور آفاق کے آثار و شواہد سے پیش کی گئی ہے۔ اب یہ خدا کی صفات اور ان کے اخلاقی و عقلی تقاضوں سے اس پر دلیل لائی جا رہی ہے۔ فرمایا کہ ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا ہے بلکہ ایک برتر غایت اور ایک مقصدِ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس مقصدِ حق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک دن یہ دنیا ختم ہو اور اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں اس کا خالق ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس میں

اس کی پسند کے مطابق زندگی بسر کی ہو اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کی نافرمانی کی ہو اگر اس طرح کا کوئی دن نہ آئے، یہ دنیا اسی طرح چلتی رہے یا یوں ہی ایک دن تمام ہو جائے، نہ اس کے نیکوں کو کوئی انعام ملے نہ بدوں کو کوئی سزا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کا خالق، نعوذ باللہ، کوئی کھلنڈرا ہے جو آسمانوں پر بیٹھا ہوا ظلم و مظلومی کا تماشہ دیکھ رہا ہے اور جب اس کا جی اس تماشے سے بھر جائے گا تو اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا یا یوں ہی یہ تماشہ جاری رہے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال اس کائنات کے حکیم و رحیم خالق سے متعلق ایک ایسا سوءِ ظن ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکثریت اس میں مبتلا ہے اور لوگ اس کے نتائج سے بالکل بے خبر ہیں۔

اس خیال کی گمراہیوں پر پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کر چکے ہیں اس وجہ سے یہاں اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ (۴۰)

اس کائنات کے باحق ہونے کا لازمی تقاضا

یہ اس کائنات کے باحق ہونے کا لازمی نتیجہ مذکور ہوا ہے کہ یہ بات خدا کے علم، عدل اور اس کی حکمت و رحمت کے بالکل منافی ہے کہ یہ دنیا یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی تمام ہو جائے بلکہ ضروری ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس دن خدا عدل کی کرسی پر بیٹھے اور ہر ایک کے معاملات کا فیصلہ کرے۔ جنھوں نے حق و راستی کی زندگی بسر کی ہو وہ اس کا صلہ پائیں اور جنھوں نے ظلم و تعدی کا ارتکاب کیا ہو وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں اور وہ دن عدل کامل کے ظہور کا دن ہو کہ کوئی بھی اس سے بچ نہ سکے۔ چھوٹے اور بڑے، امیر اور مامور، شاہ اور گدا سب کا انصاف ہو اور ایسا انصاف ہو کہ نہ کوئی حقیقت مخفی رہ جائے اور نہ کوئی کسی پہلو سے انصاف میں مزاحم ہو سکے۔ یہاں لفظ 'أَجْمَعِينَ' پر خاص طور سے نظر رہے۔

يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَوْلًى شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (۴۱)

لفظ 'مَوْلًى' خاندان اور قبیلہ کے ان افراد کے لیے آتا ہے جن کے ساتھ آدمی کا خون اور نسب کا رشتہ اور جن میں باہم عصبیت کا جذبہ ہو۔ فرمایا کہ وہ دن ایسا نفسی نفسی کا ہوگا کہ کوئی عزیز و قریب کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں بنے گا۔ 'وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ' اور نہ ان کی کسی اور ہی طرف سے کوئی مدد کی جائے گی۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس مدد کی نفی ہے جو مشرکین اپنے مزعومہ شرکا و شفعا سے رکھتے تھے۔

إِلَّا مَنْ رَحِمَ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۴۲)

اللہ کی رحمت کے حق دار

یعنی اس دن فائز المرامی صرف انہی کا حصہ ہوگی جن پر خدا اپنا فضل فرمائے اور اس کا فضل انہی پر ہوگا جو اس کے مستحق ٹھہریں گے۔ اللہ عزیز بھی ہے اور ساتھ ہی رحیم بھی۔ وہ جن کو پکڑے گا کوئی ان کو چھڑا نہ سکے گا۔ اور جن کو وہ اپنی رحمت کا مستحق پائے گا کوئی ان کو اس کی رحمت سے محروم نہیں

کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ بندوں کو ڈرنا بھی اسی سے چاہیے اور رحمت کی امید بھی اسی سے رکھنی چاہیے۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ۞ طَعَامُ الْأَثِيمِ ۞ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ۞ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ (۴۳-۴۶)

مجرموں کا حشر — اوپر یوم الفصل کا جو ذکر آیا ہے اس کے فیصلوں کے نتیجہ میں گنہگاروں کا جو حشر ہوگا یہ اس کی تصویر ہے۔ فرمایا کہ تھوہر کا درخت گنہگاروں کی غذا بنے گا۔ یہ تھوہر دوزخ کا تھوہر ہے اس وجہ سے اس کی اصل حقیقت کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ ہم اس دنیا کے تھوہر سے بس اس کا ایک ہلکا سا تصور ہی کر سکتے ہیں، اس کی اصل حقیقت نہیں سمجھ سکتے۔

لفظ 'مُهْل' کے مختلف معنی لوگوں نے بیان کیے ہیں۔ اشتقاق کے پہلو کو سامنے رکھ کر میں نے تیل کے تلچھٹ کے معنی کو ترجیح دی ہے۔ فرمایا کہ یہ تھوہر ان گنہگاروں کے معدہ میں جا کر اس طرح کھولے گا جس طرح تیل کا تلچھٹ کھولتا ہے۔ اور اس طرح جوش مارے گا جس طرح پانی جوش مارتا ہے۔

یعنی اس کا کھولنا حدت، شدت، جلن اور تلخی میں تو نہایت مکروہ اور کڑوے تیل کے تلچھٹ کے مانند ہوگا اور جوش کے اعتبار سے پانی کے کھولنے کے مانند۔ تیل پکتا ہے تو اس میں حدت تو نہایت شدید ہوتی ہے لیکن جوش نہیں ہوتا، پانی پکتا ہے تو اس میں جوش بھی ہوتا ہے۔ یہاں تشبیہ میں کھولنے کی دونوں صفتیں جمع کر دی گئی ہیں۔

خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۞ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ (۴۷-۴۸)

یہاں اتنی بات بربنائے قرینہ و بتقاضائے بلاغت محذوف ہے کہ ان لوگوں کے باب میں بارگاہِ خداوندی سے یہ حکم ہوگا۔ اس کے بجائے اصل حکم کا حوالہ دے دیا گیا ہے کہ دوزخ کے وارڈروں کو ہدایت ہوگی کہ ان کو پکڑو اور گھسیٹتے ہوئے جہنم کے بیچ میں لے جاؤ اور وہاں گرم پانی کے عذاب کے ڈونگرے ان پر برساؤ۔

ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ۞ إِنَّ هَٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ (۴۹-۵۰)

یہ قول عذاب کی زبانِ حال سے بھی ہو سکتا ہے اور عذاب دینے والوں کی زبانِ قال سے بھی۔ ایک ایک سے یہ کہا جائے گا کہ تم دنیا میں بڑے معتبر اور عزت والے بنے رہے اور اسی گھمنڈ میں تم نے اس دن کی پیشی کو جھٹلایا۔ آج اس کا مزہ چکھو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں تم طرح طرح کے شبہات پیدا کرتے تھے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ۞ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (۵۱-۵۲)

خدا ترسوں کا صلہ — گنہگاروں کے انجام کے بیان کے بعد یہ خدا ترسوں کے انجام کی تصویر ہے کہ وہ ایک مقام مامون میں

ہوں گے، نہ وہاں ان کو کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم۔ وہ باغوں اور چشموں میں ہوں گے اور اس بات کا ان کو کوئی اندیشہ نہیں ہوگا کہ ان چیزوں کو کوئی ان سے چھین سکے گا یا ان پر کوئی زوال آئے گا یا ان میں سے کسی چیز کے باب میں ان سے کوئی پرسش ہونی ہے۔

يَلْبَسُونَ مِنْ سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَقَابِلِينَ (۵۳)

'سُندُس' اور 'اِسْتَبْرَق' ریشمی کپڑوں کے نام ہیں۔ بعض لوگوں نے ان کے درمیان باریک اور دبیز کا فرق کیا ہے۔ لیکن یہ ذکر جنت کے 'سُندُس' اور 'اِسْتَبْرَق' کا ہے اس وجہ سے یہ بحث غیر ضروری ہے۔ ان کی اصل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔

'تقابل' کے معنی یہاں آمنے سامنے بیٹھنے کے ہیں۔ تالیف کلام کے پہلو سے یہاں فعل 'يَجْلِسُونَ' یا 'يَتَّكِئُونَ' محذوف ماننا پڑے گا۔ یعنی وہ سندس اور استبرق کے لباس پہنے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ آمنے سامنے بیٹھنا باہمی اعتماد و محبت کی دلیل ہے چونکہ انھوں نے دنیا میں ایک دوسرے کو نیک مشورے دیے اور اس کا نہایت مبارک انجام ان کے سامنے ہوگا اس وجہ سے وہ پوری خوشدلی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کے بیٹھیں گے۔ اس کے برعکس کفار اور ان کے لیڈر اس دن ایک دوسرے پر لعنت کے دونگڑے برسائیں گے۔

كَذَٰلِكَ وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ عِينٍ ۝ يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِينَ (۵۴-۵۵)

فرمایا کہ ان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ہم آہو چشم حوریں ان کی زوجیت میں دے دیں گے۔ عربی ادب میں عورت کے لیے یہ صفت اس کے کمال حسن کی ایک جامع تعبیر ہے۔

'يَدْعُونَ فِيهَا ...... الآیۃ' ان کے لیے ہر قسم کے میووں کی بہتات ہوگی وہ جو میوے چاہیں گے حاضر باش خدام سے طلب کریں گے۔ نہ ان کو میووں کی کمی کا کوئی اندیشہ ہوگا۔ نہ اس عیش سے محرومی کا کوئی خوف ہوگا اور نہ موت ہی کا کوئی کھٹکا ہوگا۔ ہر اندیشہ سے بےخوف وہ ابدی عیش کا لطف اٹھائیں گے۔

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۖ وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۝ فَضْلًا مِّن رَّبِّكَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۵۶-۵۷)

یعنی اس دنیا میں جو موت انھوں نے چکھ لی اس کے بعد پھر وہ موت سے آشنا نہیں ہوں گے۔ ان کی زندگی بھی جاوداں ہوگی اور ان کا عیش بھی۔ موت سے انھوں نے چھٹکارا پایا اور دوزخ سے ان کے رب نے ان کو بچا لیا۔ یہ خاص فضل ہے جو تیرے رب نے ان پر فرمایا اور یہی درحقیقت سب سے بڑی کامیابی ہے نہ کہ وہ جس پر اس دنیا کے پرستار ریجھے ہوئے ہیں اور اس کے عشق میں ایسے کھوئے گئے ہیں کہ سمجھتے ہیں کہ یہی دنیا کی زندگی بس کل زندگی ہے، اس کے بعد نہ جینا ہے نہ مرنا۔

۶- خاتمۂ سورہ ـــــ آیات: ۵۸-۵۹

یاد ہوگا اس سورہ کا آغاز قرآن کی عظمت کے بیان سے ہوا تھا کہ بڑی ہی عظیم نعمت ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب کو نوازا ہے۔ اگر وہ اس کی قدر کریں گے تو دنیا اور آخرت دونوں میں فوزِ عظیم کے وارث ہوں گے۔ اور اگر گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اس کی ناقدری کریں گے تو یاد رکھیں کہ یہ جتنی بڑی نعمت ہے اتنی ہی بڑی نقمت بھی بن جائے گا اور وہ دنیا و آخرت دونوں میں اپنی بربادی کا سامان کریں گے۔ اس تمہیدی مضمون کے بعد قرآن کے دعاوی کی صداقت کے دلائل مذکور ہوئے۔ اب آخر میں ایک نئے پہلو سے پھر اسی مضمون کی یاددہانی فرما دی گئی جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا۔ گویا سورہ اسی مضمون پر ختم ہوئی جس سے شروع ہوئی تھی۔ اس اسلوب کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ اعلیٰ خطیبوں کے خطبات میں بھی اس اسلوب کی نہایت بلیغ مثالیں ملتی ہیں۔ خطیب جس مضمون سے کلام کا آغاز کرتا ہے بالعموم اسی کی یاددہانی پر اس کو ختم کرتا ہے تاکہ آخر میں سامعین کو اصل بات کی مکرر یاددہانی ہو جائے۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۵۸-۵۹ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

۳ ع ۱۷ ۱۶

ترجمۂ آیات ۵۸-۵۹ پس ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں نہایت خوبی سے آراستہ کیا تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ تو تم بھی انتظار کرو، وہ بھی انتظار کر رہے ہیں۔ ۵۸-۵۹

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۵۸)

'ف' سابق کے ساتھ مضمون کے اتصال کو ظاہر کرتا ہے اور اتصال کا پہلو وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔

قرآن کی تیسیر کا مفہوم 'تَيْسِيْر' کے معنی کسی شے کو کسی مقصد کے لیے موزوں، سازگار اور ہر پہلو سے مستحکم و استوار بنانا ہے۔ 'یَسَّرْنَا الْفَرَسَ لِلرُّکُوْبِ' کے معنی ہوں گے 'گھوڑے کو زین، رکاب، لگام اور دوسرے تمام لوازم سے آراستہ کر کے سواری کے لائق بنا دیا'۔ اسی طرح 'یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ' کے معنی ہوں گے 'قرآن کو تعلیم و تذکیر کے مقصد کے لیے تمام ضروری لوازم سے آراستہ کر کے نہایت موزوں بنایا ہے' جن

لوگوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قرآن ایک نہایت سہل اور سپاٹ کتاب ہے۔ انھوں نے اس لفظ کی اصل حقیقت نہیں سمجھی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن نہایت سہل کتاب بھی ہے لیکن اس کی یہ سہولت اس اعلیٰ مقصد تعلیم و تذکیر کے اعتبار سے ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمائی ہے۔ یہ مقصد اپنے اندر گوناگوں پہلو رکھتا ہے اور قرآن چونکہ اس کے تمام پہلوؤں اور ان کے تمام ضروری لوازم کا جامع ہے اس وجہ سے اس کے اندر نہایت دقیق اور مشکل پہلو بھی ہیں اگرچہ ان مشکل پہلوؤں کو دلوں کے اندر اتارنے کے لیے قرآن نے جو طریقے اختیار کیے ہیں ان سے زیادہ دل نشین طریقے اختیار کرنا دوسروں کے امکان میں نہیں ہے۔ تاہم یہ چیزیں بجائے خود نہایت گہرے تدبر کی محتاج ہیں اس لیے کہ ان کا تعلق حکمت سے ہے اور حکمت گہرے تدبر کی مقتضی ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں کی طرف سورۂ مریم کی آیت ۹۷ کے تحت بھی ہم اشارہ کر آئے ہیں اور خدا نے چاہا تو اس پر مزید روشنی سورۂ قمر کی تفسیر میں ڈالیں گے۔

'بِلِسَانِكَ' سے مراد قریش کی وہ ٹکسالی زبان ہے جو فصیح عربیت کا سب سے اعلیٰ نمونہ تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کی فصاحت و بلاغت کے مظہر اتم تھے۔ یہ قرآن کی 'تیسیر' کے ایک نہایت اہم پہلو کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ قریش پر اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو تمھاری زبان میں اتارا ہے جو قریش کی زبان کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے۔ اگر اس زبان میں بھی یہ اس کتاب کو نہ سمجھے تو نہ اس کتاب کا قصور ہے اور نہ تمھارا بلکہ یہ خود ان کے دلوں کا فساد ہے جس کی ذمہ داری تمھارے اوپر نہیں ہے۔

'لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ' یہ قرآن کے اس اہتمام خاص کے ساتھ اتارے جانے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ 'یاددہانی حاصل کریں' یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ان کی عقل و فطرت کے اندر ودیعت فرمایا ہے اس کو یاد کریں، جو حقائق آفاق و انفس کے اندر مضمر ہیں ان سے سبق حاصل کریں اور جو تعلیم ان کو سابق نبیوں، خاص کر ان کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے سے ملی ہے اس کو یاد کریں۔ قرآن ان ساری باتوں کی نہایت بہترین زبان اور بہترین اسلوب سے یاددہانی کر رہا ہے۔ اس ٹکڑے کے اندر یہ تنبیہ بھی مضمر ہے کہ اگر وہ یہ یاددہانی حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر اس انجام کے لیے تیار ہو جائیں جو اس طرح کے سرکش لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر رہا ہے اور جس کی یاددہانی خود ان کے ملک کی پچھلی تاریخ ان کو کر رہی ہے۔

فَارْتَقِبْ إِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ (۵۹)

اس آیت میں اوپر والی مضمر تنبیہ واضح ہو کر سامنے آگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ منتظر ہیں کہ جس عذاب سے یہ ان کو ڈرا رہے ہیں اس کو دیکھ کر ہی اس کو مانیں گے تو تم بھی انہی کی طرح اب اس عذاب ہی کا انتظار کرو۔ اب فیصلہ کا انحصار اسی پر ہے۔ اوپر آیت ۱۰ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

رحمان آباد
۲۲ مئی سنہ ۱۹۷۶ء ۲۲ جمادی الثانی سنہ ۱۳۹۶ھ

تدبرِ قرآن

۴۵

الجاثیة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ نام، تمہید اور بنیادی مطالب میں سابق سورہ کا مثنیٰ ہے۔ فرق ہے تو اجمال و تفصیل کا ہے۔ اس میں قریش کو صاف الفاظ میں دھمکی دی گئی ہے کہ توحید اور قیامت کے دلائل سے آسمان و زمین کا ہر گوشہ معمور ہے اور ان کی تفصیل اللہ نے اپنی اس کتاب میں بھی بیان کر دی ہے اگر یہ دلیلیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں تو دنیا کی کوئی چیز بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اب تمہارا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہی تمہارا فیصلہ فرمائے گا۔

مسلمانوں کو اس میں صاف الفاظ میں فتح و غلبہ کی بشارت دی گئی ہے کہ کچھ دنوں صبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرو۔ اگر استقلال کے ساتھ تم اپنے موقف پر ڈٹے رہے تو آخری کامیابی تمہارا ہی حصہ ہے۔ اس راہ میں جو مصیبتیں بھی تم جھیلو گے وہ رائگاں نہیں جائیں گی بلکہ اللہ تعالیٰ ان کا بھرپور صلہ دے گا۔

یہ سورہ اس دور کی سورتوں میں سے ہے جب یہود کھلم کھلا قریش کی پیٹھ ٹھونکنے لگ گئے تھے۔ اس وجہ سے اس میں یہود کو بھی نہایت واضح الفاظ میں ملامت ہے کہ اللہ نے ان کو امامت کے جس منصب پر فائز فرمایا تھا اپنی شامتِ اعمال سے انھوں نے اس کو ضائع کر دیا۔ اب ان کا معاملہ اللہ کی عدالت میں پیش ہوگا اور وہی ان کا فیصلہ فرمائے گا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ تنبیہ ہے کہ اللہ نے جو روشن شاہراہ تم کو دکھائی ہے اس پر چلو اور ان دین بازوں سے ہوشیار رہو۔ یہ زور لگا رہے ہیں کہ اپنی ایجاد کردہ بدعات میں مبتلا کر کے تمہیں بھی اللہ کی راہ سے اس طرح محروم کر دیں جس طرح وہ خود محروم ہو بیٹھے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۶) یہ قرآن خدائے عزیز و حکیم نے نہایت اہتمام سے اتارا ہے۔ جس توحید کی یہ دعوت دے رہا ہے اور جس روزِ جزا و سزا سے یہ ڈرا رہا ہے اس کے دلائل آسمان و زمین کے چپے چپے میں موجود ہیں۔ انسان کی خلقت، رات اور دن کی آمد و شد، بارش کے نزول، زمین میں اس کی برکات کے ظہور اور ہواؤں کی گردش، ہر چیز کے اندر توحید اور معاد کی نہایت واضح نشانیاں موجود ہیں بشرطیکہ لوگ غور کریں اور غور کرنے کے بعد جو نتائج سامنے آئیں ان کو تسلیم کرنے کا ان کے اندر ارادہ پایا جاتا ہو۔ یہی حقائق قرآن پیش کر رہا ہے۔ اگر یہ واضح باتیں

لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہی ہیں قرآن کے بعد وہ کون سی بات ہے جس کو یہ سمجھیں اور مانیں گے!

(۷ - ۱۱) شرک کے سرغنوں کو وعید جنھوں نے بالکل جھوٹ موٹ ایک دین گھڑ کے کھڑا کیا اور اب اس کی حمایت میں ایسے اندھے بہرے بن گئے ہیں کہ اللہ کا کلام سننے کے روادار نہیں ہیں۔ اگر اللہ کا کلام ان کو سنایا جاتا ہے تو تکبر کے ساتھ اس طرح چل دیتے ہیں گویا کوئی بات انھوں نے سنی ہی نہیں۔ اگر کسی بات کے متعلق انھیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دلوں پر اثر انداز ہونے والی ہے تو اس کو مذاق بنا لیتے ہیں تاکہ اس طرح اس کو بے وزن کر دیں۔ یہ لوگ یاد رکھیں کہ ان کا یہ استکبار ان کے لیے باعث رسوائی ہوگا اور جب ان کو جہنم سے سابقہ پیش آئے گا تو اس وقت نہ ان کا وہ اندوختہ ان کے کچھ کام آئے گا جو حرام راستوں سے انھوں نے حاصل کیا ہے اور نہ ان کے وہ مزعومہ قہرمان ہی ان کی کوئی مدد کر سکیں گے جو اللہ کے سوا انھوں نے گھڑ رکھے ہیں۔

(۱۲ - ۱۵) توحید کے بعض دلائل کا بیان ایک نئے اسلوب سے اور مسلمانوں کو صبر واستقامت کی تلقین کہ وہ مشرکین کی ژاژخائی کی مطلق پروا نہ کریں بلکہ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں۔ اگر مخالفین ان کی بات نہیں مانیں گے تو اپنا ہی بگاڑیں گے، اس سے اہل ایمان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

(۱۶ - ۲۰) بنی اسرائیل کے حال پر اظہار افسوس کہ اللہ نے ان کو حکومت، نبوت، وسعت رزق سے نوازا اور قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز فرمایا لیکن انھوں نے ان نعمتوں کا حق ادا نہیں کیا بلکہ باہمی حسد و عداوت کے سبب سے خدا کے دین میں اختلاف برپا کیا۔ مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ اب اللہ نے بنی اسرائیل سے اپنی شریعت کی امانت واپس لے کر تمھارے حوالہ کی ہے تو تم ان کی گمراہیوں سے بچنا اور اللہ کے دین پر استوار رہنا۔ اس وقت یہود اور مشرکین نے تمھارے خلاف جو گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اس سے قدام مرعوب نہ ہونا۔ اللہ کی تائید بہرحال ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس سے ڈرنے والے ہیں۔

(۲۱ - ۳۷) قیامت کے باب میں منکرین قیامت کے بعض شبہات کا ازالہ۔ اس دن قیامت کے مکذبین کا جو حال ہوگا اس کی تصویر۔ آخر میں توحید کے مضمون کا پھر اعادہ۔

سُوْرَةُ الْجَاثِيَةِ

مَكِّيَّةٌ ——— آيات: ۳۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۱

حٰمٓ ۝۱ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۲
اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۳ وَفِيْ
خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝۴ وَ
اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ
رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ
اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۵ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ
بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶ وَيْلٌ
لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝۷ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ
مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۸ وَاِذَا
عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
مُّهِيْنٌ ۝۹ مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا
شَيْـًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۰
هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ

ع ۱۱/۱۷ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ
الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾
وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا
لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِۢمَا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ
فَعَلَيْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

ترجمۂ آیات یہ حٰمٓ ہے۔ اس کتاب کی تنزیل خدائے عزیز و حکیم کی طرف سے ہے۔
۱ - ۱۵ آسمانوں اور زمین میں ایمان لانے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور
اسی طرح خود تمھاری خلقت اور حیوانات کے اندر بھی، جو اس نے زمین میں پھیلا
رکھے ہیں، ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو یقین کرنا چاہیں۔ اور رات
اور دن کی آمد و شد میں اور اس ذریعۂ رزق میں جو اللہ آسمان سے اتارتا ہے،
پھر اس سے زمین کو زندہ کر دیتا ہے اس کے مر جانے کے بعد، اور ہواؤں کی گردش
میں بھی بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں۔ ۱ - ۵

یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمھیں بالکل حق کے ساتھ سنا رہے ہیں تو اللہ اور
اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے! ہلاکی
ہے ہر اس لپاٹیے گنہگار کے لیے جو اللہ کی آیتیں سنتا ہے، اس کو پڑھ کر سنائی
جا رہی ہیں، پھر وہ استکبار کے ساتھ اپنی روش پر ضد کرتا ہے گویا اس نے وہ سنی

ہی نہیں۔ تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ اور جب اس کو
ہماری آیات میں سے کسی بات کا علم ہوتا ہے تو اس کو مذاق بنا لیتا ہے۔ یہی
لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ آگے ان کے جہنم ہے اور جو
چیزیں انھوں نے کمائی ہیں وہ ان کے ذرا کام آنے والی نہیں بنیں گی اور نہ وہی ان
کے کام آنے والے بنیں گے جو اللہ کے سوا انھوں نے اپنے لیے کارساز بنا رکھے
ہیں۔ اور ان کے لیے ایک بڑا عذاب ہوگا۔ یہ اصل ہدایت ہے اور جنھوں نے
اپنے رب کی آیات کا انکار کیا تو ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے کپکپی
پیدا کر دینے والی نوعیت کا۔ ۹-۱۱

اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے سمندر کو سازگار بنا دیا تاکہ اس کے حکم
سے، اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کے شکر گزار رہو۔ اور اسی نے تمھاری
خدمت میں لگا رکھا ہے ان چیزوں کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب کو اپنی
طرف سے۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور
کرتے ہیں۔ ۱۲-۱۳

ایمان والوں سے کہہ دو کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو خدا کے بڑے دنوں
کے ظہور کے متوقع نہیں ہیں تاکہ اللہ ایک قوم کو اس کا پورا پورا بدلہ دے جو وہ کرتی
رہی ہے۔ جو کوئی نیک عمل کرے گا تو اس کا نفع اسی کے لیے ہے اور جو برائی
کرے گا تو اس کا وبال اسی پر آئے گا۔ پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے
جاؤ گے۔ ۱۴-۱۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ ۔ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ (۱-۲)

اس سورہ کا بھی قرآنی نام 'حٰمٓ' ہی ہے۔ اس نام سے موسوم سورتوں کے مطالب کے اشتراک اور ان کے مزاج کی ہم رنگی پر پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔

سورہ کی تمہید

'تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ .... الاٰیۃ' سابق سورہ کی طرح اس سورہ کی تمہید میں بھی قرآن کی عظمت و اہمیت کا حوالہ ہے البتہ اس میں اہمیت کے بیان کا پہلو سابق سورہ سے مختلف ہے۔ لفظ 'تَنْزِیْل' پر ہم اس کے محل میں بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ اس کے اندر تدریج و اہتمام کا مفہوم پایا جاتا ہے اور قرآن کے اتارے جانے کے معاملے میں اللہ نے جو اہتمام خاص ملحوظ رکھا ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اس اہتمام خاص کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنی دو صفتوں — عزیز اور حکیم — کا حوالہ دیا ہے۔ 'عزیز' کے معنی غالب و مقتدر کے ہیں اور 'حکیم' اس کو کہتے ہیں جس کے ہر قول و فعل میں حکمت ہو۔ ان دونوں صفتوں کے اجتماع سے یہاں دو باتیں واضح ہوئیں۔

صفات 'عزیز' و 'حکیم' کے مقتضیات

ایک یہ کہ جس خدا نے یہ کلام اس اہتمام کے ساتھ اتارا ہے وہ کوئی ضعیف و ناتواں اور عاجز و بے بس ہستی نہیں ہے بلکہ تمام کائنات کا اختیار و اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ تمام کائنات کے مالکِ حقیقی کا فرمانِ واجب الاذعان ہے اگر اس کا کما حقہٗ احترام نہ کیا گیا تو لوگ یاد رکھیں کہ جب وہ لوگوں کو پکڑے گا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ بن سکے گا۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ عزیز اور غالب و مقتدر ہونے کے ساتھ ساتھ 'حکیم' بھی ہے۔ اس وجہ سے اس کا ہر قول و فعل حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی حکمت کی شان اس کے اس حکیمانہ کلام سے واضح ہے بشرطیکہ لوگ اس پر غور کریں۔ اس کی حکمت ہی کی ایک شان یہ بھی ہے کہ اگرچہ ناقدرے اور ناشکرے اس کے کلام اور اس کے رسول کی توہین کر رہے ہیں لیکن وہ غالب و مقتدر ہونے کے باوجود ان کے پکڑنے میں جلدی نہیں کر رہا ہے بلکہ ان کو مہلت پر مہلت دیے جا رہا ہے تاکہ جن کے اندر کچھ صلاحیت ہے وہ اپنی اصلاح کر کے اپنے آپ کو اللہ کی رحمت کا مستحق بنا لیں اور جو اپنی صلاحیتیں برباد کر چکے ہیں ان پر اللہ کی حجت پوری ہو جائے، حساب کے دن وہ کوئی عذر نہ کر سکیں۔

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۳)

قرآن کی دعوت میں

یہ قرآن کی دعوت توحید اور اس کے انذارِ قیامت کے حق میں آفاق کے دلائل کی طرف اشارہ ہے تاکہ اس کا حکیمانہ کلام ہونا واضح ہو۔ فرمایا کہ قرآن لوگوں کو جس چیز کی طرف بلا رہا ہے اور جس چیز سے ڈرا رہا ہے اس کی نشانیاں آسمانوں اور زمین کے چپہ چپہ میں موجود ہیں لیکن یہ نشانیاں کارآمد ان

لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لانے والے ہوں۔ جو لوگ ایمان لانے والے نہ ہوں وہ سب کچھ دیکھ کر بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں اور روز نئی نئی نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور اگر ان کی طلب کے مطابق کوئی نئی نشانی دکھا بھی دی جائے تو اس سے بھی وہ قائل نہیں ہوتے بلکہ کسی دوسری نشانی کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں۔ اصل چیز انسان کا ارادہ ہے۔ اگر اس کے اندر حقیقت کی جستجو اور منزل کی طلب ہو تو خالقِ کائنات نے منزلِ مقصود کی نشان دہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ آسمانوں میں بھی جگہ جگہ سگنل اشارے دے رہے ہیں اور زمین بھی قدم قدم پر رستہ دکھا رہی ہے لیکن جو لوگ اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے بھٹکنا چاہتے ہیں ان کو نہ آسمان کے سگنل نظر آتے اور نہ زمین کے نشانات۔ وہ ہمیشہ آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں اور اسی آوارہ گردی میں ان کی زندگیاں گزر جاتی ہیں۔

وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِن دَابَّةٍ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۴)

انسان کی خلقت کے اندر جو نشانیاں ہیں ان کی طرف اشارہ

آسمانوں اور زمین کی نشانیوں کی طرف ایک جامع اشارہ کرنے کے بعد خود انسان کی خلقت اور اس کی پرورش کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں جو اہتمام فرمایا ہے اس کی طرف توجہ دلائی کہ انسان اگر اپنی ہی خلقت کے تمام اطوار و مراحل پر غور کرے تو اس پر خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے وہ حقائق واضح ہوں گے کہ اس کے لیے نہ خالق کی توحید میں کسی شبہ کی گنجائش باقی رہے گی نہ امکانِ معاد میں اور نہ جزا و سزا کے لازمی ہونے میں۔ جس خالق نے انسان کو مٹی اور پھر پانی کی ایک بوند سے ایسی اعلیٰ صورت بخش دی اس کے لیے اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیوں مشکل ہو جائے گا؟ جس پروردگار نے انسان کی پیدائش کے بالکل ابتدائی مرحلہ سے لے کر اس کے آخری مرحلہ تک پرورش کا یہ انتظام فرمایا آخر وہ اس کو بالکل غیر مسؤل کس طرح چھوڑ دے گا۔ جو انسان اتنی اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آیا ہے آخر اس کی صلاحیتوں کے باب میں اس سے پرسش کیوں نہیں ہوگی! پھر یہ کہ جس انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے تمام اضداد اور تمام اجزائے مختلفہ کو سازگار بنایا آخر اس کی کیا شامت آئی ہوئی ہے کہ وہ اس کی عبادت میں کسی دوسری چیز کو شریک کرے؟

سامانِ پرورش کی نشانیوں کی طرف اشارہ

'وَمَا يَبُثُّ مِن دَابَّةٍ' میں اشارہ اس سامانِ ربوبیت کی طرف ہے جو اللہ تعالیٰ نے چوپایوں کی شکل میں انسان کے لیے مہیا فرمایا ہے۔ اگر انسان غور کرے تو اس امر میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان چوپایوں سے جو گوناگوں فوائد حاصل کر رہا ہے یہ اس کو محض اتفاقی واقعہ کے طور پر نہیں حاصل ہو رہے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہی فوائد کے لیے ان چیزوں کو وجود بخشا اور ہر اعتبار سے ان کو ان کے فوائد کے لیے موزوں بنایا ہے۔ انسان کو سواری اور باربرداری کا محتاج بنایا تو سواری اور باربرداری کے لیے نہایت موزوں جانور پیدا کیے، اس کو دودھ اور گوشت اور

کھال اور اون کا ضرورتمند بنایا تو ان تمام ضروریات کے لیے الگ الگ نہایت مناسب چوپائے عطا کیے۔ یہ چیز اس بات کی صاف دلیل ہے کہ اس کائنات کا خالق نہایت مہربان ہے اور اس کی شکرگزاری واجب ہے۔ پھر اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ جب اس نے انسان کو اس اہتمام کے ساتھ اپنی نعمتوں سے نوازا ہے تو لازم ہے کہ ایک ایسا دن بھی آئے جس دن وہ ان نعمتوں کے متعلق لوگوں سے سوال کرے، جنھوں نے ان کا حق پہچانا ہو ان کو انعام دے اور جو ان کو پا کر خدا کو بھول بیٹھے ہوں ان کو اس کفرانِ نعمت کی سزا دے۔

ایمان لانے کے لیے اصل چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر ایمان کا ارادہ پایا جاتا ہو

'لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ' میں فعل 'يُوْقِنُوْنَ' ارادۂ فعل کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی مذکورہ چیزوں کے اندر توحید و معاد اور جزا و سزا کی دلیلیں تو بے شمار ہیں لیکن مجرد دلیلوں کا وجود اس کے لیے نافع نہیں ہے جس کے اندر دلیلوں کو قبول کرنے کا ارادہ نہ پایا جاتا ہو۔ جو شخص کسی بات کا یقین نہیں کرنا چاہتا وہ بدیہی سے بدیہی حقیقت کے خلاف بھی کچھ نہ کچھ شکوک ایجاد کر ہی لیتا ہے۔

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۵)

'اِخْتِلَاف' کے معنی یہاں یکے بعد دیگرے رات اور دن کی آمد و شد کے ہیں۔ ساتھ ہی یہ لفظ اس اختلافِ مزاج کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ کر رہا ہے جو رات اور دن کے اندر پایا جاتا ہے اور جو اس کائنات کی نشو و نما اور اس کی بہبود و بقا کے لیے ضروری ہے۔ 'مِنْ رِّزْقٍ' سے مراد یہاں پانی ہے جو ذریعۂ رزق بنتا ہے۔ گویا مسبّب سبب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ الفاظ کا یہ طریقۂ استعمال عربی بلکہ کم و بیش ہر زبان میں معروف ہے۔

رات اور دن کی آمد و شد کے اشارات

اختلافِ لیل و نہار کی دلیل قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہوئی ہے کہ باوجودیکہ ان دونوں کے اندر نسبت ضدین کی ہے، ایک خنک ہے دوسرا گرم، ایک پُرسکون ہے دوسرا پُرشور، ایک تاریک ہے دوسرا روشن، تاہم ان کے اندر انسان کی پرورش کے لیے زوجین کی سی سازگاری اور موافقت پائی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ دونوں ایک ہی خدا کے بنائے ہوئے اور اسی کے حکم سے برابر، پوری پابندیٔ وقت کے ساتھ، اپنے مفوضہ فرائض کی بجاآوری میں سرگرم ہیں۔ اگر یہ الگ الگ خداؤں کی ایجاد ہوتے تو ان کے اندر جو سازگاری پائی جاتی ہے اس کا وجود میں آنا ناممکن تھا اور اگر یہ سازگاری وجود میں نہ آتی تو اس کرۂ زمین کے باشندوں کے لیے زندگی ناممکن ہو جاتی۔

بارش کی نشانیاں

یہی حال بارش کا ہے کہ وہ ہوتی تو آسمان سے ہے لیکن زندگی زمین اور اہلِ زمین کو بخشتی ہے یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ آسمانوں اور زمین کے اندر ایک ہی ارادہ کارفرما ہے۔ اگر آسمان کے دیوتا الگ اور زمین کے دیوتا الگ ہوتے تو آسمان کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین والوں کے لیے

غذا کا ذخیرہ اتارتے! پھر یہ بات بھی ہر موسم میں، ہر خاص و عام کے مشاہدہ میں آتی ہے کہ زمین بالکل خشک اور بے آب و گیاہ ہوتی ہے، اس کے کسی گوشے میں بھی زندگی کی کوئی نشانی دکھائی نہیں دیتی کہ بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی دیکھتے دیکھتے زمین کا ہر گوشہ لہلہا اٹھتا ہے۔ تو جس خدا کی یہ شانیں ہر موسم میں ہم دیکھتے ہیں اگر وہ اس دنیا کے مرکھپ جانے کے بعد اس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہے تو کیا یہ کام اس کے لیے مشکل ہو جائے گا!

ہواؤں کی گردش کی نشانیاں

'وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ'۔ یعنی ہواؤں کی گردش میں بھی خدا کی قدرت، رحمت، ربوبیت اور اس کی نقمت کی نشانیاں موجود ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی مُتصرّف کے ہاتھ میں ان کی باگ ہے اور وہی اپنی حکمتوں کے تحت ان کو استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ ان کو روک دے تو چشم زدن میں ساری دنیا تباہ ہو جائے۔ وہ چاہے تو ایک قوم کے لیے اس کو رحمت بنا دے اور دوسری قوم کے لیے نقمت۔ اسی ہوا کی گردش سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات بخشی اور اسی کی گردش سے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کیا۔ آئے دن یہ بات مشاہدہ میں آتی رہتی ہے کہ کسان اپنی فصل کے مستقبل سے نہایت مطمئن ہوتے ہیں لیکن دفعتًہ کوئی ایسی ہوا چل جاتی ہے کہ مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ ملاح اپنی کشتیوں کے بادبان کھولے ہوئے اور کسان اپنی گندم صاف کرنے کے آلات لیے ہوئے سازگار ہوا کے انتظار میں چشم براہ ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں کہ سازگار ہوا چلا دے۔ اس زمانے میں سائنس کی بدولت اگرچہ انسان کے اندر یہ زعم پیدا ہو گیا ہے کہ اس نے ابر و ہوا کو بہت بڑی حد تک اپنے قابو میں کر لیا ہے لیکن قدرت ذرا سا جھنجھوڑ دیتی ہے تو اس ادّعا کا سارا بھرم کھل جاتا ہے۔ یہ باتیں اس بات کی صاف شہادت ہیں کہ ایک ہی ذات ہے جو اس کائنات کے تمام عناصر پر حکمران ہے۔ اس کے اذن کے بغیر ایک پتہ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔

'اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ'۔ یعنی نشانیاں تو قدم قدم پر توحید اور معاد کی موجود ہیں لیکن یہ نشانیاں نظر ان لوگوں کو آتی ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے یا کام لیتے ہیں تو بس اسی حد تک جس حد تک وہ ان کی مادی ضروریات کی تکمیل میں ان کا ہاتھ بٹا سکے، وہ لوگ ان نشانیوں کے اصل جمال کے مشاہدہ سے محروم ہی رہتے ہیں۔

یہاں قرآن نے ان نشانیوں کی طرف اجمالی اشارات کیے ہیں اس وجہ سے ہم بھی اجمالی اشارات ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ پچھلی سورتوں میں یہ باتیں تفصیل سے گزر چکی ہیں اور ہم بھی ان کی وضاحت پوری تفصیل سے کر چکے ہیں۔

[illegible]

اوپر کی تینوں آیات سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اہل ایمان کے لیے تو اس کائنات کا گوشہ گوشہ

توحید و معاد کی نشانیوں سے معمور ہے نہ ہے دوسرے تو ان سے بھی یہ نشانیاں مخفی نہیں ہیں بشرطیکہ ان کے اندر ماننے اور یقین کرنے کا حوصلہ اور اپنی عقل سے صحیح کام لینے کا داعیہ ہو۔ جو لوگ ایک حقیقت کو، خواہ وہ کتنی ہی واضح ہو، ماننا ہی نہیں چاہتے یا اپنی عقل سے وہ اصل کام لیتے ہی نہیں جس کے لیے وہ فی الحقیقت خلق ہوئی ہے، ایسے لوگوں کے اندھے پن کا کوئی علاج نہیں ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (۶)

آنحضرت صلعم کے لیے تسلی اور مخالفین کو ملامت

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آپ کے مخالفین کو ملامت ہے۔ 'تِلْكَ' کا اشارہ آفاق و انفس کی انہی نشانیوں کی طرف ہے جو اوپر کی آیات میں مذکور ہوئیں۔ فرمایا کہ اللہ کی توحید، اس کی قدرت و حکمت اور اس کے روز جزا و سزا کی یہ نشانیاں ہیں جو اس قرآن کے ذریعہ سے ہم تم کو، ان کے صحیح نتائج و لوازم کے ساتھ، پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ یہ نشانیاں اس قدر واضح ہیں کہ کوئی ذی ہوش ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ انہی کے واقعی نتائج و لوازم کو قرآن تسلیم کرنے کی دعوت دے رہا ہے اگر تمہارے یہ مخالفین ان نشانیوں کے بدیہی نتائج کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں تو اب ان سے زیادہ عقل اور دل کو مطمئن کرنے والی اور کون سی چیز ہو سکتی ہے جس پر ایمان لائیں گے!

'بالحق' کا مفہوم

'نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ' میں 'بِالْحَقِّ' سے مراد وہ قطعی اور حقیقی نتائج ہیں جو ان نشانیوں پر غور کرنے سے سامنے آتے ہیں۔ یہ قید اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جہاں تک ان نشانیوں پر غور کرنے کا تعلق ہے ان پر غور تو دوسرے بھی کرتے ہیں لیکن وہ اپنے مخصوص اور نہایت محدود زاویہ سے غور کرتے ہیں اس وجہ سے یا تو ان حقائق تک پہنچ نہیں پاتے جو ان کے اندر مضمر ہیں یا پہنچتے تو ہیں لیکن چونکہ وہ ان کے نفس کی خواہشوں کے خلاف ہیں اس وجہ سے ان کے اعتراف سے گریز کرتے ہیں۔ مثلاً آسمان و زمین کی نشانیوں پر فلکیات و ارضیات کے ماہرین بھی غور کرتے ہیں۔ انسان کی خلقت پر اناٹومی (ANATOMY) والے بھی تحقیق کرتے ہیں، حیوانات کے مختلف پہلوؤں پر علم الحیوانات والے بھی سر کھپاتے ہیں، رات اور دن کی گردش، بارشوں کے اوقات و اثرات اور ہواؤں کے تغیر و تبدل پر موسمیات والے بھی بہت کچھ ہوا باندھتے ہیں لیکن ان سب کا حال ان کی تنگ نظری کے سبب سے یہ ہے کہ یہ اپنی دوربینوں اور خوردبینوں سے تل کو تو دیکھ لیتے ہیں لیکن تل کے اوٹ کا پہاڑ ان کو نظر نہیں آتا۔ موسمیات والے یہ پیشینگوئی تو کر دیں گے کہ آگے چوبیس گھنٹے موسم گرم و خشک رہے گا اور اس کی کوئی الٹی سیدھی توجیہ بھی کر دیں گے۔ اکثر حالات میں ان کی پیشین گوئی صحیح بھی ثابت ہوتی ہے اور بعض حالات میں ان کی پیش کردہ توجیہ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی نگاہ صرف ہواؤں کے تصرف کی نوعیت اور اس کے اثرات کا اندازہ کرنے تک محدود رہ جاتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ اس سوال پر

غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے کہ ان تصرفات کے پس پردہ حقیقی متصرف کون ہے اور اس کے حقوق و فرائض کیا ہیں! حالانکہ کائنات کے اندر یہ تمام تصرفات و تغیرات جو ہوتے ہیں یہ اسی لیے ہوتے ہیں کہ انسان اس اصل سوال تک پہنچے، اس کا حل دریافت کرے اور اگر خدا کا کوئی بندہ اس کو اس سوال کا کوئی دلنشین حل بتائے تو اس کو قبول اور اس پر عمل کرے۔ قرآن نے ان نشانیوں کے انہی پہلوؤں کو خاص طور پر بے نقاب کیا ہے جو اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والے ہیں اس وجہ سے اس کو نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ سے تعبیر فرمایا ہے۔

دو اہم حقیقتیں — اس سے ایک بڑی اہم حقیقت یہ واضح ہوئی کہ قرآن کی دعوت جبر یا تحکم پر مبنی نہیں ہے بلکہ تمام تر آفاق و انفس کے واضح دلائل اور عقل و فطرت کے بینات پر مبنی ہے۔ جو لوگ ان کو نہیں مانتے ان کے نہ ماننے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ مخفی ہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ ان کو اپنے نفس کی خواہشوں کے خلاف پاتے ہیں اس وجہ سے ان سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں ظاہر ہے کہ وہ کوئی بھی ایسی بات ماننے کو تیار نہیں ہو سکتے جو ان کی خواہش کے خلاف ہے اگرچہ وہ سورج سے بھی زیادہ روشن ہو کر ان کے سامنے آئے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ اس کائنات میں سب سے زیادہ بدیہی بلکہ ابدہ البدیہیات اللہ اور اس کی نشانیاں ہیں۔ جو لوگ ان کے منکر ہیں وہ کسی بھی حقیقت کو ماننے کے اہل نہیں ہیں۔ وہ محض اپنی خواہشوں کے غلام، اپنے پیٹ اور تن کے پجاری ہیں۔ اس طرح کے لوگ اگر کچھ نئی نشانیوں اور معجزات کا مطالبہ کریں تو ان کے مطالبات لائق توجہ نہیں ہیں۔ اس طرح کے اندھوں کی آنکھیں کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی نہیں کھول سکتا۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا ۖ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۷-۸)

یہ اسی ملامت کے مضمون کی مزید توضیح ہے کہ جن لوگوں نے اس طرح تمام حقائق تلپٹ کر دیے ہیں تاکہ اپنی گنہگارانہ زندگی کے لیے سند جواز فراہم کریں ان کے لیے ہلاکی ہے۔

'اَفَّاک' اور 'اَثِیم' — 'اَفَّاکٍ' کے معنی ہیں حقائق کی قلب ماہیت کر دینے والا، یعنی خدا کی نشانیاں اور اس کی آیات تو کسی اور حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہوں لیکن وہ محض اپنی خواہشاتِ نفس کی بندگی میں اس حقیقت کی بالکل قلب ماہیت کر دے۔ اس کے مصداقِ اول تو قریش کے مشرکین تھے جنھوں نے محض اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی میں دینِ ابراہیم کو مسخ کیا لیکن اس کے عام مصداق میں ہر دور کے وہ محرفینِ دین شامل ہیں جو اللہ کی آیات اور اس کے احکام میں اپنی خواہشات کے تحت تحریف کے مرتکب ہوئے یا ہو رہے ہیں۔

'اَثِیْم' کے معنی گنہگار، خاص طور پر حقوق و فرائض کے تلف کرنے والے کے ہیں۔ 'اَفَّاکٍ' کے ساتھ اس صفت کا جوڑ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ حقائق کے قلب ماہیت کی اس سازش کے مرتکب وہی نابکار ہوتے ہیں جو خدا کے حقوق و فرائض کے ادا کرنے سے گریز اور اپنی معصیت کی زندگی پر اصرار کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا کہ ان بدبختوں کے لیے ہلاکی اور تباہی ہے اس لیے کہ اللہ کی آیات ان کو سنائی جا رہی ہیں لیکن یہ نہایت تکبر کے ساتھ ان کو سن کر اس طرح چل دیتے ہیں گویا کوئی بات انھوں نے سنی ہی نہیں۔ یہ اشارہ قریش کے لیڈروں کے اس رویے کی طرف ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے جواب میں اختیار کرتے۔ اول تو یہ لوگ مجلسِ نبوی میں جانے ہی کو عار خیال کرتے لیکن کبھی پہنچ بھی جاتے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے پاس جا کر ان کو قرآن سناتے تو اس طرح کان جھاڑ کر اٹھ جاتے گویا کوئی بات انھوں نے سنی ہی نہیں۔

'تُتْلٰی عَلَیْہِ' کے الفاظ سے ان کے جرم کی سنگینی کا اظہار ہو رہا ہے کہ اگر دعوتِ حق کسی کو پہنچی نہ ہو اور وہ اس سے غافل رہ جائے تو اس کے لیے کچھ عذر ہو سکتا ہے لیکن وہ بدبخت خدا کو کیا جواب دے گا جس کے کانوں میں رسول نے خود جا کر اذان دی لیکن وہ بیدار نہ ہوا!

اصرار علی الشرک کا اصل سبب استکبار ہے

'یُصِرُّ مُسْتَکْبِرًا' میں اصرار علی الشرک کے اصل سبب پر روشنی پڑتی ہے کہ ان کے اصرار کی اصل علت یہ نہیں ہے کہ ان پر حقیقت واضح نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ اس بات میں اپنی سبکی سمجھتے ہیں کہ قوم کے سردار اور اعیان و اشراف ہو کر ایک ایسے شخص کی بالاتری اپنے اوپر تسلیم کر لیں جو دنیوی وجاہت میں ان کا ہمسر نہیں ہے۔

'فَبَشِّرْہُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ' یہ اس 'وَیْلٌ' کی وضاحت ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا کہ اس طرح کے تمام متکبرین کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ یہ لوگ اگر اپنے غرور کے باعث نجات کی بشارت سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں تو بند رکھیں، عذاب کی خوش خبری بہرحال ان کو پہنچا دو جو اس طرح کے لوگوں کے لیے لازمی ہے۔

وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْئَا ِاتَّخَذَھَا ھُزُوًا ط اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ (۹)

حق کی مخالفت کا عامیانہ حربہ

اوپر کی آیت میں متکبرین کا وہ رویہ بیان ہوا ہے جو وہ اس وقت اختیار کرتے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود ان کو قرآن سنانے کی کوشش فرماتے۔ اب ان کا وہ رویہ بیان ہو رہا ہے جو اس وقت وہ اختیار کرتے جب قرآن کی کوئی بات ان کو کسی اور واسطہ سے پہنچتی۔ فرمایا کہ ان کو ہماری آیات میں سے کسی چیز کا علم ہوتا ہے تو اس کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دوسرے ان سے متاثر نہ ہونے پائیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں قریش

کے اندر ایسے لوگ بھی تھے جو غیر جانبدارانہ ذہن کے ساتھ قرآن کی آیتیں سنتے اور ان سے وہ متاثر بھی ہوتے۔ اس طرح کے لوگ ان آیتوں کو اپنے سرداروں کے علم میں بھی لانے کی کوشش کرتے تاکہ ان کے باب میں ان کی رائے معلوم کریں۔ ان کے سردار فوراً تاڑ جاتے کہ لوگ ان آیات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اس اثر سے لوگوں کو بچانے کے لیے وہ یہ تو کر نہیں سکتے تھے کہ دلیل سے قائل کر دیں کہ قرآن کی بات میں فلاں چیز عقل یا فطرت یا حقیقت کے خلاف ہے۔ واحد تدبیر جو وہ کر سکتے تھے وہ یہی تھی کہ قرآن کی بات کا مذاق اڑائیں تاکہ اس طرح بات ہوا میں اڑ جائے اور کسی پر اس کا کوئی اثر نہ ہونے پائے۔ اس قسم کی عامیانہ حرکت اگرچہ کچھ زیادہ کارگر نہیں ہوتی تاہم وقتی طور پر کمزور رائے کے لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ حربہ ہر دور کے شیاطین نے حق کے خلاف استعمال کیا ہے۔

سب سے زیادہ سخت عذاب وہ ہے جس کے ساتھ رسوائی ہو

'اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ'۔ ان لوگوں کے اس رویہ کا اصل محرک، جیسا کہ اوپر والی آیت میں مذکور ہوا، استکبار تھا اس وجہ سے فرمایا کہ ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ انھوں نے حق کے مقابل میں گھمنڈ کیا اس وجہ سے ان کے لیے آخرت میں رسوائی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اگرچہ اللہ کا ہر عذاب پناہ مانگنے کی چیز ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ سخت عذاب وہ ہے جس کے ساتھ رسوائی بھی ہو۔ یہ عذاب متکبرین کے لیے خاص ہے۔

مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰)

'مِنْ وَّرَآئِهِمْ' کا مفہوم ہمارے اردو کے ورے اور پرے کی طرح موقع و محل سے متعین ہوتا ہے۔ اس کا مطلب آگے بھی ہو سکتا ہے اور پیچھے بھی۔ فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے آگے جہنم ہے جس میں یہ پڑیں گے اور اس میں پڑنے کے بعد نہ ان کا وہ حرام اندوختہ ان کے کچھ کام آئے گا جو ان کے استکبار اور حق سے اعراض کا سبب بنا اور نہ ان کے وہ مزعومہ شرکاء و شفعاء ہی کچھ کام آئیں گے جن کو انھوں نے اللہ کے سوا اپنا کارساز بنایا۔

'وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ'۔ اور عذاب بھی کوئی ایسا ویسا نہیں ہوگا جو کسی طرح جھیلا جا سکے بلکہ بہت بڑا عذاب ہوگا۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ آج نہیں ہو سکتا۔

هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ (۱۱)

یعنی یہ قرآن اللہ کی نازل کردہ ہدایت ہے۔ یہ ہنسی مسخری کی چیز نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کی ان آیات کا انکار کریں گے یا مذاق اڑائیں گے وہ یاد رکھیں کہ ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہوگا۔

'مِنْ رِّجْزٍ' کے الفاظ اس عذاب کی نوعیت واضح کر رہے ہیں۔ 'رجز' اس سزا یا عذاب کو کہتے ہیں جو کپکپی پیدا کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی معمولی عذاب نہیں ہوگا بلکہ نہایت دردناک ہوگا جو دلوں کو

لرزا دے گا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۲-۱۳)

دلائل کا سلسلہ بیان

اوپر کی چار آیتیں توحید اور معاد کے دلائل کے بیچ میں بطور تنبیہ و تذکیر آ گئی تھیں تاکہ قریش کے لیڈروں کو بر سرِ موقع تنبیہ ہو جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے دی جائے۔ اب اس آیت میں اصل سلسلۂ کلام کو پھر لے لیا۔ فرمایا کہ اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو اس طرح تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے کہ وہ اپنے سینہ پر تمہاری کشتیوں کو چلاتا ہے۔ 'بِاَمْرِهٖ' یعنی یہ بات خاص خدا کے حکم سے ہوتی ہے۔ اگر خدا کا حکم نہ ہوتا تو دیکھتے ہو کہ کشتی سے کہیں زیادہ چھوٹی چھوٹی چیزیں سمندر کے اندر ڈالتے ہی ڈوب جاتی ہیں لیکن ہزاروں ٹن کا جہاز اس پر تیرتا ہے۔ یہ اللہ ہی کا بنایا ہوا قانون ہے کہ لوہے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تو ڈوب جائے لیکن جہاز اپنے اوپر ہزاروں ٹن لوہا لادے ہوئے نہ ڈوبے۔ 'وَلِتَبْتَغُوْا' سے پہلے قرینہ دلیل ہے کہ 'لِتَتَكَسَّبُوْا' یا 'لِتُسَافِرُوْا' یا ان کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ حرفِ عطف اس حذف کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے یہ اہتمام اس لیے فرمایا ہے کہ تم ایک مقام سے دوسرے مقام کا سفر کرو اور تجارت کی راہ سے اس کے فضل کے طالب بن سکو۔

شاہداتِ ربوبیت کی اصل تعلیم

'وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ' یہ وہ اصل سبق ہے جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے ان شاہدات سے ہر اس شخص کو ملتا ہے جس کے ضمیر اور جس کی عقل کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی ہے۔ فرمایا کہ اللہ نے اپنی پروردگاری کی یہ شانیں اس لیے تم کو دکھائی ہیں کہ تم اس کے شکرگزار بندے بنو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شکرگزاری کا یہ جذبہ ہی خدا کی بندگی کی اصل ہے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

'وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ' اوپر خاص طور پر سمندر کی تسخیر کا ذکر فرمایا تھا جو انسان کے مشاہدہ میں آنے والی چیزوں میں سب سے زیادہ زوردار اور بظاہر بالکل ناقابلِ تسخیر بھی ہے اور کم و بیش ہر شخص کو اس کے سفر کا تجربہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اب یہ خاص کے بعد اس کائنات کی عام چیزوں کا حوالہ دیا کہ اسی خدا نے آسمانوں اور زمین کی دوسری چیزوں کو بھی تمہاری منفعت رسانی میں لگا رکھا ہے۔ 'جَمِیْعًا مِّنْهُ' یعنی یہ ساری چیزیں اسی کے حکم سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تمہاری خدمت انجام دے رہی ہیں۔ 'جَمِیْعًا' کا تعلق ماسبق سے نہیں بلکہ 'مِّنْهُ' سے ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی نہ تم نے مسخر کیا ہے، نہ کسی اور نے مسخر کیا ہے اور نہ یہ چیزیں بطور خود تمہاری چاکری کر رہی ہیں بلکہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے تمہارے رب کی تدبیر سے ہو رہا ہے اس لیے کہ تنہا وہی ہے جو ان تمام چیزوں کا خالق اور ان پر متصرف ہے۔

'اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ' یعنی غور کرنے والوں کے لیے آفاق کی نشانیوں

ہیں توحید اور معاد کی گوناگوں دلیلیں موجود ہیں۔

—— ان کا مسخر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی یہ درجہ نہیں رکھتی کہ اس کو معبود مان کر اس کی پرستش کی جائے بلکہ ہر چیز اپنے وجود سے اس بات کی شاہد ہے کہ اس کی نکیل ایک بالاتر قوت کے ہاتھ میں ہے جو اس کو اپنی مشیت اور حکمت کے تحت استعمال کر رہی ہے۔

آفاق کی نشانیوں میں توحید اور معاد کی دلیلیں

—— ان کے اندر تضاد و تخالف کے باوجود اس طرح کی موافقت اور سازگاری بھی ہے جو ایک مشین کے پرزوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ یہ توافق اس بات کی دلیل ہے کہ ایک ہی ارادہ ہے جو اس کائنات کے پورے نظام پر حاوی ہے۔

—— اس نظام میں ربوبیت، رحمت اور حکمت کی ایسی شہادتیں موجود ہیں جو اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت ہیں کہ کوئی اندھی بہری قوت اس کو نہیں چلا رہی ہے۔ اس کا علم، اس کی رحمت اور اس کی حکمت مقتضی ہے کہ وہ ایک ایسا روزِ جزاء و سزا بھی لائے جس میں وہ ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کی ناقدری کی اور کفر و شرک میں مبتلا ہوئے اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ یا تو نعوذ باللہ بالکل بے اختیار ہے یا بالکل بے حس اور کھلنڈرا۔ یہ باتیں اس کی اعلیٰ صفات کے منافی ہیں۔

دلائل کی کمی نہیں ہے ضرورت تفکر کی ہے

آخر میں لفظ 'یَتَفَکَّرُوْنَ' اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے ان کی کمی نہیں ہے۔ کائنات کا چپہ چپہ ان سے معمور ہے اور قرآن نے بھی ان کی پوری تفصیل کر دی ہے۔ کمی جس چیز کی ہے وہ تفکر کی ہے۔ لوگ اللہ کی نشانیوں پر غور نہیں کرتے اور یہ غور کرنا انسان کا اپنا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰہِ لِیَجْزِیَ قَوْمًا بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۱۴)

'یَغْفِرُوْا' یہاں درگزر اور نظر انداز کرنے کے معنی میں ہے۔

'اَیَّامَ اللّٰہِ' سے مراد اللہ تعالیٰ کے عدل و انتقام کے وہ تاریخی دن ہیں جن میں اس نے رسولوں کے مکذبین کو صفحۂ ارض سے نیست و نابود کیا ہے۔ قرآن میں قوموں کی جو تاریخ بیان ہوئی ہے، اس میں ان ایام کا ذکر گزر چکا ہے اور آگے بھی ان کی تفصیل آئے گی۔ 'لِیَجْزِیَ قَوْمًا' میں 'قوم' سے مراد یہی مخالفین ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے۔ اس لفظ کی تنکیر اظہارِ نفرت و بیزاری کے لیے ہے جس طرح 'اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا' میں لفظ 'قُلُوْبٍ' کی تنکیر ہے۔ جن لوگوں نے اس سے مسلمانوں کو مراد لیا ہے انھوں نے سیاق و سباق کی دلالت اور اسلوب کی بلاغت پر غور نہیں کیا۔

مسلمانوں کے لیے تسلی

جس طرح اوپر آیت ۹ میں مخالفین کی ضد اور ہٹ دھرمی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی

ہے اسی طرح اس آیت میں اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ مخالفین کی اوچھی حرکتوں سے وہ دل برداشتہ نہ ہوں بلکہ ان کو ابھی نظرانداز کریں۔ ان لوگوں کو چونکہ یہ اندیشہ نہیں ہے کہ جس روزِ بد سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے وہ فی الواقع ظہور میں بھی آنے والا ہے اس وجہ سے یہ دلیر ہوتے جا رہے ہیں لیکن اللہ اس قابلِ نفرت قوم کو اس لیے ڈھیل دے رہا ہے کہ یہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں تاکہ یہ اپنے کیے کی بھرپور سزا پائیں۔ سنتِ الٰہی یہی ہے کہ وہ شریروں کو پوری مہلت دیتا ہے تاکہ ان پر اللہ کی حجت پوری ہو جائے اور جب وہ پکڑے جائیں تو ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (۱۵)

یہ اسی تسلی کے مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ اگر یہ لوگ نیکی کی راہ اختیار کریں گے تو اس کا نفع انہی کو پہنچے گا اور اگر بدی پر جمے رہ گئے تو اس کا وبال انہی پر آئے گا۔ اس کی کوئی ذمہ داری اہلِ ایمان پر نہیں ہوگی جب کہ انھوں نے حق لوگوں کو پہنچا دیا۔ پھر قیامت کے دن سب کی پیشی خدا کے سامنے ہوگی اور اس دن فیصلہ ہو جائے گا کہ کون حق پر رہا اور کون باطل پر اور کون کس انجام کا سزاوار ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۶ - ۲۳

آگے یہود کے اس رویہ سے بحث ہے جو اسلام دشمنی کے جوش میں، مشرکین کی حمایت میں انھوں نے اختیار کیا۔ اس دور میں، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں انھوں نے بھی کھلم کھلا مشرکین کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تھی۔ ان کو چونکہ ایک مذہبی گروہ کی حیثیت حاصل رہی تھی اس وجہ سے ان کی شہ نے مشرکین کا حوصلہ بہت بڑھا دیا تھا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ ان کا پول کھول دیا جائے "تاکہ مسلمانوں کے اندر ان کی مخالفت سے کوئی ہراس نہ پیدا ہو اور مشرکین بھی آگاہ ہو جائیں کہ جن کی شہ پر وہ بہت نازاں ہیں وہ ان سے بھی بڑے خدا کے مجرم ہیں۔ اگر ان کے کہے پر وہ چلے تو بالآخر دونوں کا انجام ایک ہی ہوگا۔ اسی ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے استقلال کے ساتھ اپنے موقف حق پر ڈٹے رہنے کی تاکید فرمائی گئی کہ اب خدا کی اصل شریعت پر تمھی ہو۔ نہ تمھیں یہود کی پروا کرنی ہے نہ مشرکین کی۔ اللہ کی تائید صرف تمھیں اور تمھارے ساتھیوں ہی کو حاصل ہے اور اللہ کی تائید ہی سب ہے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ آیات ۱۶-۲۳

وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ
بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ
الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ
مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾
اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ
وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ
اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا
يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ ع ۲ / ۱۸
لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ اَفَرَءَيْتَ
مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ
عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ
مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾

ترجمۂ آیات ۱۶-۲۳

اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور نبوت سے سرفراز کیا اور ان کو پاکیزہ رزق عطا کیا اور دنیا والوں پر ان کو فضیلت بخشی اور ان کو شریعت الٰہی کے کھلے کھلے احکام دیے۔ تو انھوں نے نہیں اختلاف کیا مگر بعد

اس کے کہ ان کے پاس علم آچکا تھا محض باہمی ضدم ضدا کے سبب سے۔ بیشک تیرا رب ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن ان تمام چیزوں کے بارے میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ پھر ہم نے تم کو اللہ کی ایک واضح شریعت پر قائم کیا تو تم اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ یہ لوگ خدا کے آگے تمھارے کچھ کام آنے والے نہیں بنیں گے اور اپنی جانوں پر یہ ظلم ڈھانے والے ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور اللہ اپنے ڈرنے والے بندوں کا کارساز ہے۔ ۱۶-۱۹

یہ لوگوں کے لیے بصیرت پیدا کرنے والی آیات کا مجموعہ اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین کریں۔ کیا وہ لوگ جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے، سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کی مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کی زندگی اور موت یکساں ہو جائے گی؟ بہت ہی برا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں! اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور تاکہ بدلہ دیا جائے ہر جان کو اس کے کیے کا اور ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ ۲۰-۲۲

کیا دیکھا تم نے اس کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور اس کو جس کو اللہ نے علم رکھتے ہوئے گمراہ کر دیا اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر کر دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا! بھلا ایسوں کو کون ہدایت دے سکتا ہے بعد اس کے کہ اللہ نے ان کو گمراہ کر دیا ہو! کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے! ۲۳

۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ (۱۶)

انعامات جو اللہ نے بنی اسرائیل پر کیے لیکن انھوں نے ان کی ناقدری کی

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جو عظیم احسانات فرمائے یہ ان کا حوالہ ہے اور مقصود ان کے حوالہ سے، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا اور آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا، یہ دکھانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر بڑے بڑے احسانات کیے لیکن یہ قوم ایسی ناہنجار نکلی کہ اس نے ہر احسان کی ناقدری کی یہاں تک کہ خود بھی اللہ کی نعمتوں سے محروم ہوئی اور اپنی ہی طرح دوسروں کو بھی اس سے محروم ہی دیکھنا چاہتی ہے۔

'الکتٰب' سے مراد ظاہر ہے کہ تورات ہے۔

'حکم' سے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ وہ حکومت مراد ہے جو بنی اسرائیل کو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے دور میں حاصل ہوئی اور ایک طویل مدت تک قائم رہی۔ کتاب اور حکومت میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ اللہ کی کتاب اس کے احکام و قوانین کا مجموعہ ہوتی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ جس قوم کو اپنے احکام و قوانین کا صحیفہ عطا فرماتا ہے اس کو لازماً حکومت بھی دیتا ہے اس لیے کہ احکام و قوانین کی تنفیذ کے لیے حکومت ناگزیر ہے۔ اس حکومت سے قوم اسی وقت محروم ہوتی ہے جب وہ اللہ کے احکام کو پیٹھ پیچھے پھینک دیتی ہے۔

'نبوۃ' کا مفہوم واضح ہے لیکن یہاں اس کے ذکر کا ایک خاص پہلو ہے وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے اندر نبوت کا ایک ایسا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا جو حضرت مسیح علیہ السلام تک بلا انقطاع جاری رہا۔ حضرت مسیح کے ساتھ اس قوم نے جو سلوک کیا اس کے نتیجہ میں یہ قوم ملعون ہوئی پھر حکومت اور نبوت دونوں نعمتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔

'وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ' سے رزق و فضل اور نعمت و رفاہیت کی اس فراوانی کی طرف اشارہ ہے جس کا آغاز ارض فلسطین پر ان کے قبضہ کے بعد سے ہوا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں یہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔

'وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ'۔ یہ فضیلت کسی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب دیے جانے کا لازمی نتیجہ ہے۔ کتاب الٰہی خلق کے لیے ہدایت کی روشنی ہوتی ہے۔ یہ روشنی جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو پکڑاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اس قوم کو اپنی خلق کی رہنمائی کے لیے چن لیا۔ بلاشبہ یہ ایک عظیم فضیلت ہے لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ یہ فضیلت مشروط ہے۔ جب تک

کوئی قوم خلق کی رہنمائی کا یہ فرض انجام دیتی ہے اس وقت تک اس کو یہ فضیلت حاصل رہتی ہے۔ جب وہ اس فرض کو ترک کر دیتی ہے اس فضیلت سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۱۷)

یہود کی رہنمائی کے لیے مزید اہتمام اور ان کی طرف سے اس کی ناقدری

'امر' سے مراد یہاں دین و شریعت ہے۔ فرمایا کہ مزید برآں ہم نے یہ کیا کہ شریعت کے احکام ان کو نہایت واضح، قطعی اور غیر مشتبہ شکل میں دیے تاکہ ان میں کسی اختلاف یا ان سے فرار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ لیکن اس سارے اہتمام کے باوجود انھوں نے اختلاف کیا اور یہ اختلاف اس وجہ سے نہیں کہ اس کے لیے کوئی وجہ موجود تھی بلکہ علم وحی کی روشنی موجود ہوتے ہوئے انھوں نے محض ضدم ضدا کے باعث یہ اختلاف برپا کیا جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ وہ اللہ کی روشنی سے محروم ہو بیٹھے۔ اب قیامت کے دن اللہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا کہ یہ کس حد تک حق بجانب تھے اور کس حد تک اس میں محض ان کی ضد، ہٹ دھرمی، بات کی پچ اور حریف کو شکست دینے کی خواہش کو دخل رہا ہے۔

مسلمانوں کو تسلی اور قریش کو تنبیہ

یہاں ان کے کردار کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود ایک طرف تو مسلمانوں کو تسلی دینا ہے کہ آج جو لوگ پنچ بن کر یہ فیصلہ کرنے اٹھے ہیں کہ قریش حق پر ہیں یا مسلمان، ان کا اپنا حال یہ ہے کہ آپس کے اختلافات اور باہمی عناد و حسد کے سبب سے اللہ کے دین سے محروم ہو چکے ہیں۔ ایسے محروم القسمت لوگ اگر تمھارے حسد میں مبتلا ہو کر تمھاری مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

دوسری طرف قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ جو لوگ خود اپنی آنکھوں میں دھول جھونک کر اندھے بن چکے ہیں ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ وہ تمھارے لیے سرمۂ بصیرت لے کر آئیں گے۔ وہ تو یہی چاہیں گے کہ جس طرح وہ اللہ کی روشنی گل کر کے اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں اسی طرح تم بھی، اس روشنی سے محروم، اسی اندھیرے میں بھٹکتے رہو جس میں اب تک بھٹکتے رہے ہو۔

اس آیت سے ایک نہایت اہم حقیقت یہ واضح ہوئی کہ دین کی کسی بات کے سمجھنے میں اختلافِ رائے ہونا نہ کوئی تعجب کی بات ہے اور نہ یہ دین اور اہلِ دین کے لیے کوئی نقصان دہ چیز ہے۔ اہلِ علم میں اس طرح کا اختلاف ہوا ہے اور ہو سکتا ہے لیکن اس اختلاف کی محرک اگر باہمی چشمک و رقابت اور ایک دوسرے کو زک پہنچانے اور پچھاڑنے کی خواہش ہو تو یہ چیز بلاشبہ سارے دین کا تیاپانچا کر کے رکھ دیتی ہے۔ اسی نوعیت کے اختلاف نے اہلِ کتاب کو اللہ کی روشنی سے محروم کیا اور اسی قسم کے اختلافات نے مسلمانوں کو تباہی میں ڈالا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۸)

نبی صلعم کو اللہ کے اصل دین پر جمے رہنے کی تاکید

'شریعۃ' کے معنی صاف راستہ اور واضح طریقہ کے ہیں۔ اور 'مِنَ الْاَمْرِ' جس مفہوم میں اوپر والی آیت میں استعمال ہوا ہے اسی مفہوم میں اس آیت میں بھی استعمال ہوا ہے۔ فرمایا کہ جب ان اہل کتاب نے اللہ کی بتائی ہوئی صراط مستقیم گم کر دی اور خلق کو صحیح راہ بتانے والا کوئی نہیں رہا تب اللہ نے تم کو اپنی ایک واضح شریعت پر مبعوث فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آج بنی اسرائیل تمھاری دعوت کے خلاف یہ دوسرا اندازی کرتے پھرتے ہیں کہ ان کے اور ان کی شریعت کے ہوتے کسی نئی کتاب اور نئی شریعت کی کیا ضرورت تھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نظر اپنی کرتوتوں پر نہیں ہے۔ اگر ان کی نظر اپنی کرتوتوں پر ہوتی تو وہ جان جاتے کہ تمھاری بعثت دین کے کن تقاضوں اور خلق کی کس ضرورت کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے۔ یہ مضمون 'حٰمٓ السجدۃ' کی آیت ۴۵ میں بھی گزر چکا ہے۔

'فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ'۔ 'اَهْوَآء' سے مراد، جیسا کہ اس کتاب میں جگہ جگہ ہم واضح کرتے آ رہے ہیں، بدعات ہیں۔ بدعات کی ایجاد چونکہ اپنی خواہشوں ہی کو دین کی سند دینے کے لیے لوگ کرتے ہیں اس وجہ سے قرآن نے ان کو 'اَهْوَاء' سے تعبیر کر کے ان کے اصل منبع کا پتہ دے دیا کہ وہ دین یا عقل سے نہیں وجود میں آتی ہیں بلکہ ان کو نفس کی خواہشیں جنم دیتی ہیں۔

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید ہے کہ تم کو اللہ نے جو واضح شریعت، تمام بدعات و خرافات سے پاک کر کے دی ہے اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی بدعات کی پیروی نہ کرو جو نہیں جانتے ہیں۔ ان نہیں جاننے والوں میں، مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب شامل ہیں۔ مشرکین عرب تو ظاہر ہے کہ کتاب و شریعت سے بالکل ناآشنا اُمّی تھے۔ وہ دینِ ابراہیمی کے وارث ہونے کے مدعی ضرور تھے لیکن ان کے حصہ میں صرف وہ بدعات آئی تھیں جو ان کے جاہل باپ دادا نے دین ابراہیم (علیہ السلام) کے نام سے گھڑ رکھی تھیں۔ انہی کی حمایت میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑتے کہ آپ اپنی دعوت سے ان کے آبائی دین کو مٹا رہے ہیں۔ یہود و نصاریٰ اگرچہ حامل کتاب ہونے کے مدعی تھے لیکن، جیسا کہ اوپر والی آیت میں بیان ہوا ہے، انھوں نے اللہ کے دین میں اتنے اختلافات پیدا کر لیے تھے کہ اصل حقیقت بالکل گم ہو گئی تھی۔ قرآن نے جب اصل حقائق واضح کیے اور وہ ان کی بدعات (اھواء) کے خلاف پڑے تو ان کے اندر بھی آگ لگ گئی کہ اس نئی دعوت سے تو ان کی دینداری کا سارا کاروبار معرض خطر میں ہے، حالانکہ قرآن کی دعوت سے نہ صرف انبیاء کا اصل دین نکھر کر سامنے آ رہا تھا بلکہ اس کی تکمیل بھی ہو رہی تھی لیکن یہود و نصاریٰ چونکہ اصل دین سے بالکل تاریکی میں تھے اس وجہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے بجائے قریش کے ساتھی بن کر اسلام کو مٹانے کے درپے ہو گئے۔

قرآن نے اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید فرمائی کہ اللہ کی اصل شریعت پر قائم رہو۔ یہ مخالفین خواہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم اسی پر جمے رہو اور ان لوگوں کی بدعتوں کی پیروی ہرگز نہ کرنا جو اللہ کے اصل دین سے بے خبر ہیں۔

اس تاکید کی ضرورت اس وجہ سے نہیں پیدا ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خدانخواستہ یہ اندیشہ تھا کہ آپ ان کی بدعات کی طرف مائل ہو جائیں گے بلکہ لوگوں کی بدعات سے یہ بالواسطہ اظہارِ نفرت کا ایک طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو مخاطب کرنا پسند نہیں فرمایا اس وجہ سے اپنے پیغمبر کو خطاب کر کے ان بدعات سے احتراز کی تاکید فرما دی۔ یہ اسلوب کلام قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ (۱۹)

یہ لوگ کتنا ہی زور لگائیں لیکن ان کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لوگ خدا کے حضور میں تمہارے کچھ کام آنے والے نہیں بن سکیں گے۔ جو ذمہ داری اللہ نے تم پر ڈالی ہے اس کی بابت پرسش تمہی سے ہونی ہے، ان سے نہیں ہونی ہے اس وجہ سے اللہ کا جو حکم ہے اس کی تعمیل کرو۔ یہ لوگ خواہ مخالفت کر کے تمہیں دبانے کی کوشش کریں خواہ ہمدردانہ انداز میں تمہیں کچھ نرم کرنا چاہیں کسی صورت میں بھی ان کی پروا نہ کرو۔

'وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ'۔ 'ظٰلِمِيْنَ' سے مراد یہاں اہل کتاب اور مشرکین دونوں ہی ہیں، اس لیے کہ دونوں ہی اللہ کے دین کے معاملہ میں اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ فرمایا کہ ان ظالموں نے قرآن کی مخالفت کے لیے آپس میں گٹھ جوڑ بے شک کر لیا ہے لیکن اس سے ذرا بھی ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ اپنے خدا ترس بندوں (یعنی مسلمانوں) کا کارساز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا اہلِ ایمان کا کارساز ہے تو پھر وہ کسی سے کیوں ڈریں یا دبیں۔ وہ اپنے طریقہ پر کام کریں اللہ ہر مشکل میں ان کی مدد فرمائے گا۔ اور جن کی مدد پر اللہ ہو کس کی طاقت ہے کہ ان کو شکست دے سکے!

هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۲۰)

قرآن کی آیات بصیرت بخش ہیں بشرطیکہ لوگ آنکھیں کھولیں

یہ اس قرآن کی طرف اشارہ ہے جس کی مخالفت کے لیے اہل کتاب اور مشرکین نے مذکورہ متحدہ محاذ بنایا تھا۔ اوپر آیت ۱۱ میں بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ 'ھٰذَا' سے اشارہ قرآن کی طرف بحیثیت مجموعی ہے اور لفظ 'بَصَاۗىِٕرُ' قرآن کی آیات کو پیشِ نظر رکھ کر استعمال ہوا ہے جن کا کفار مذاق اڑانے کی کوشش کرتے تھے۔ فرمایا کہ یہ قرآن لوگوں کے لیے بصیرت بخش آیات کا مجموعہ ہے۔ اگر لوگ اس کا

مذاق اڑاتے اور ان کی مخالفت کرتے ہیں تو خود اپنی ہی آنکھوں میں دصول جھونک رہے ہیں۔ اس آیت کے اسلوبِ بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جہاں تک اس قرآن کی آیات کی بصیرت بخشی کا تعلق ہے وہ سورج کی طرح ہر شخص کے لیے عام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مقصد سے اس کو اتارا ہے لیکن اس سے فیض انہی کو پہنچے گا جو اس سے کسبِ نور کے لیے اپنی آنکھیں کھولیں گے۔

'وَّهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوقِنُونَ'۔ فیضِ عام کے بعد یہ اس کے فیضِ خاص کا ذکر ہے کہ جو لوگ اس کے انذار اور اس کی بشارت کا یقین کریں گے ان کے لیے یہ ہدایت اور رحمت ہے۔ ہم دوسرے محل میں وضاحت کر چکے ہیں کہ ہدایت و رحمت کے الفاظ اس سیاق میں جہاں جہاں استعمال ہوئے ہیں دونوں الگ الگ مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی یقین کرنے والوں کے لیے یہ قرآن دنیا میں ہدایت اور آخرت میں رحمت ثابت ہوگا۔ دنیا میں یہ صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرے گا اور آخرت میں یہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتوں کے دروازے کھولے گا۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَن نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (۲۱)

قیامت کے منکرین کا تصور خدا کے متعلق بالکل باطل ہے

یعنی جو لوگ قرآن کے انذار اور اس کی تبشیر کا مذاق اڑا رہے ہیں ان کا تصور گویا یہ ہے کہ جہان کے خالق کے نزدیک مومن اور کافر، نیک اور بد، صالح اور طالح میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ دونوں کی زندگی اور موت بالکل یکساں ہے۔ فرمایا کہ اگر ان کا تصور یہ ہے تو یہ نہایت بُرا فیصلہ ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ یعنی یہ انسان کے اس شعورِ عدل کے بالکل منافی ہے جو انسان کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمایا ہے۔ کوئی شخص خواہ برائی کی زندگی گزارے یا بھلائی کی لیکن وہ اپنے دل کے اندر نیکی اور نیکی کا احترام ضرور رکھتا ہے۔ جو شخص معاملات پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالتا ہے وہ ہرگز اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ نیک اور بد دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جائے۔ ہر دور میں انسانوں نے جو قوانین جاری کیے ہیں ان میں یہ اصولِ عدل بنیادی طور پر ملحوظ رہا ہے۔ تو جو اصولِ عدل انسانوں کے اندر اس طرح مسلّم ہے اللہ تعالیٰ کے متعلق کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے عاری ہے؟ اگر نیک و بد دونوں اس کے نزدیک یکساں ہیں تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ یا تو نعوذ باللہ ظالم اور نا منصف ہے یا نیکی اور بدی کے معاملہ میں بالکل بے حس۔ اور یہ ایسی باتیں ہیں جن کا خدا کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر وہ عادل و منصف ہے تو ضروری ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں لوگوں کے درمیان بے لاگ انصاف کرے۔ ان لوگوں کو پورا پورا انعام دے جنھوں نے نیکی اور عدل کی زندگی گزاری اور ان لوگوں کو پوری سزا دے جنھوں نے فسق اور نافرمانی کی زندگی بسر کی۔ ایک ایسے دن کا ظہور اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ دنیا آزمائش کے قانون پر چل رہی ہے۔

اس میں نیک و بد دونوں کو مہلت ملی ہوئی ہے کہ خواہ وہ نیکی کی زندگی بسر کریں یا بدی کی، ضروری نہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سزا دے جو برائی کی زندگی بسر کریں یا ان لوگوں کو صلہ دے جو نیکی کی زندگی گزاریں۔ اس کے لیے اللہ نے ایک خاص دن مقرر کر رکھا ہے۔ قرآن اسی دن کی سزا یا اس دن کے انعام سے لوگوں کو آگاہ کرنے یا اس کی بشارت دینے آیا ہے۔ پس جو لوگ اس انذار اور بشارت کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ گویا یہ تصور رکھتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق محض ایک کھلنڈرا اور تماشائی ہے جو دنیا کو پیدا کر کے اس کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ اس کے خیر اور شر سے اس کو کچھ بحث نہیں۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲۲)

نادانوں کے زعم کے علی الرغم خالق نے یہ دنیا بالحق پیدا کی ہے

یعنی نادانوں نے تو یہ گمان کر رکھا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو ایک غایت اور نہایت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس غایت و نہایت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمائے اور ہر جان کو اس کے عمل کا بدلہ ملے، اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہو۔ اگر کوئی ایسا دن نہ آئے، یہ دنیا اسی طرح چلتی رہے یا چلتے چلتے یوں ہی ایک دن تمام ہو جائے، اس کے بعد نہ کوئی جزا ہو نہ سزا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ دنیا بالحق نہیں بلکہ ایک عبث اور باطل کارخانہ اور ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے اور اس کا خالق ایک تماشا پسند ہے جس نے بالکل بے مقصد اتنا بڑا کارخانہ کھڑا کر دیا ہے۔

'بِالْحَقِّ' کے بعد 'لِيَفْصِلَ بَيْنَهُمْ' یا اس کے ہم معنی الفاظ میرے نزدیک محذوف ہیں۔ 'لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ' اسی محذوف پر معطوف ہے۔

'وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ' کی قید سے مقصود یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس دن ہر جان کے ساتھ بالکل بے لاگ انصاف ہو، کسی پہلو سے کسی کی کوئی حق تلفی نہ ہو۔ اگر اس حق تلفی کے لیے کوئی گنجائش باقی رہ جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ دنیا پھر بالکل عبث اور باطل ہو کے رہ جاتی ہے۔ یہ قید شرک و شفاعت کے ان باطل تصورات کی نفی کے لیے بڑھائی گئی ہے جن میں مشرکین بھی مبتلا تھے اور اہل کتاب بھی۔ ان تصورات کے ساتھ آخرت کو ماننا یا نہ ماننا دونوں یکساں تھا۔ جب عقیدہ یہ ہو کہ آدمی کے اعمال خواہ کچھ ہی ہوں شفعاء و شرکاء اپنی شفاعت اور زور و اثر سے بخشوا ہی لیں گے تو بے لاگ انصاف کہاں رہا! پھر تو ہر ظلم و ناانصافی کے لیے راہ کھل گئی۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۗ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۗ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۳)

ایک برمحل اشارہ یہود کی طرف

اوپر کی آیت میں خاص طور پر مشرکین کے غلط تصورِ حیات پر ان کو ملامت تھی۔ اس آیت میں ان کی سرپرستی کرنے والے یہود کے بارے میں مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ یہ اللہ کی کتاب کے مدعی ہوتے ہوئے مشرکین اور ان کے دینِ شرک کی حمایت جو کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بدعملیوں کی پاداش میں اللہ نے ان کے کانوں اور دلوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پہ پردہ ڈال دیا ہے۔ تو جو خدا کے قانون کی زد میں آ چکے ہوں اب کس کے بس میں ہے کہ ان کو راہ راست پر لا سکے۔

'أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُۥ هَوَىٰهُ'۔ 'اَفَرَءَیْتَ' کا اسلوب کسی کی حالت پر تعجب یا افسوس کے ساتھ توجہ دلانے کے لیے آتا ہے جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں 'ذرا فلاں کو تو دیکھو' یا 'بھلا تم نے فلاں کو بھی دیکھا!' یہود کی حالت پر تعجب کے ساتھ اس لیے توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی کتاب و شریعت سے نوازا لیکن انھوں نے کتاب و شریعت کو تو پیٹھ پیچھے پھینکا اور اپنی خواہشوں اور بدعات کو معبود بنا بیٹھے۔ آدمی جب خواہشوں کا اس طرح فرمانبردار بن جائے کہ خدا کے صریح احکام کی بھی پروا نہ کرے، بلکہ خواہشوں ہی کے اندر اپنے لیے خیر و مصلحت سمجھنے لگے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کا بندہ نہیں بلکہ اپنی خواہشوں اور بدعتوں ہی کا بندہ ہے۔ یہود کی اس اہوا پرستی کا ذکر تفصیل سے سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

'وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ'۔ یعنی ان لوگوں کی محرومی یہ نہیں ہے کہ ان کو علم کی روشنی ملی نہیں بلکہ ان کی اصل بدبختی یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو علم دیا اس کی قدر کرنے کے بجائے انھوں نے اپنی خواہشوں اور بدعات ہی کی پیروی کی۔ اس ضلالت پسندی کی سزا ان کو یہ ملی کہ اللہ نے ان کو گمراہی کے لیے چھوڑ دیا۔ اوپر فرمایا ہے کہ 'وَآتَيْنَاهُم بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْأَمْرِ ۖ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ....' (۱۷) (اور ہم نے انھیں شریعتِ الٰہی کے نہایت واضح احکام دیے تو انھوں نے علم آ جانے کے بعد محض آپس کے عناد کے باعث اختلاف کیا) جو بات یہاں 'مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے وہی بات آیت زیر بحث میں 'عَلَىٰ عِلْمٍ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے۔ یعنی یہ لوگ روشنی پانے کے بعد اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں تو ان سے اب کسی خیر کی امید نہ رکھو۔

'وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً'۔ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ بقرہ آیت ۷ میں ان یہود ہی کے بارے میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم ختمِ قلوب کی حقیقت پر وضاحت سے بحث کر چکے ہیں۔ اس صفت کے ساتھ قرآن نے صرف یہود ہی کا ذکر کیا ہے۔

'فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ'۔ 'مِنْ' کے بعد ایک مضاف محذوف

ہے۔ یعنی مِنْ بَعْدِ اَنْ اَضَلَّهُ اللّٰهُ۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے دلوں پر سنت الٰہی کے تحت مہر ہو چکی ہو ان کو بھلا کون ہدایت دے سکتا ہے! ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ختم قلوب کی بحث پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ' یہ مسلمانوں کو نصیحت بلکہ ایک قسم کی تنبیہ ہے کہ تمھیں یہ حیرانی کیوں ہے کہ یہ پڑھے لکھے اور کتاب و شریعت کے مدعی لوگ قرآن کے دشمن اور مشرکین کے ساتھی بن کر کیوں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں! یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو ہدایت بخشتا ہے جو اس کی ہدایت کی قدر کرتے ہیں۔ جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے ان کے لیے وہ ہدایت ہی ضلالت کا پھندا بن جاتی ہے۔ 'یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا' کے تحت اس حقیقت کی وضاحت ہو چکی ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۲۴-۳۷

آگے منکرین قیامت کے اس احمقانہ مطالبہ پر تبصرہ ہے کہ جب ان کو قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ قیامت کا آنا برحق ہے تو ہمارے بزرگوں کو زندہ کر کے دکھا دو۔ اس مطالبہ کی تردید کرتے ہوئے اس انجام کی تصویر کھینچی ہے جس سے قیامت کے منکرین کو لازماً دوچار ہونا پڑے گا۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ جس دن اس انجام سے سابقہ پیش آئے گا اس دن کوئی شریک و شفیع بھی خدا کی پکڑ سے بچانے والا نہیں ہوگا۔ اس دن فوزِ عظیم صرف ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو آخرت اور توحید پر ایمان رکھنے والے اور شرک و شفاعت پر اعتماد کرنے کے بجائے عمل صالح کی کمائی کرنے والے ہوں گے۔ ___ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۴-۲۷ وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا
یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ
اِلَّا یَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا كَانَ
حُجَّتَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۵﴾
قُلِ اللّٰهُ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یَجْمَعُكُمْ اِلٰی یَوْمِ
ع ۳ ۱۴ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ
يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿٢٧﴾ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۣ كُلُّ اُمَّةٍ
تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٨﴾
هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٩﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿٣٠﴾ وَ
اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ
وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿٣١﴾ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ
وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ
اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَبَدَا لَهُمْ
سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٣٣﴾
وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَ
مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٣٤﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ
اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ
فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿٣٥﴾ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ
رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٦﴾ وَلَهُ
الْكِبْرِيَاۗءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٣٧﴾ ع ۴ ۱۱ ۲۰

ترجمۂ آیات ۲۷-۳۷

اور وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے۔ یہیں

ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو بس گردشِ روزگار ہلاک کرتی ہے۔ اور ان کو اس باب میں کوئی علم نہیں ہے محض اٹکل کے تیر تکّے چلا رہے ہیں! اور جب ان کو ہماری نہایت واضح آیات سنائی جاتی ہیں تو ان کا یہ قول ہی ان کی واحد حجّت ہوتا ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچّے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے ہمارے پاس لاؤ۔ ان کو بتا دو کہ اللہ ہی تم کو زندہ کرتا ہے پھر تم کو مارتا ہے پھر وہ تم کو روزِ قیامت تک، جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے، تم کو جمع کرے گا لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ ۲۴-۲۶

اور اللہ ہی کی ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور جس دن قیامت قائم ہو گی اس دن اہلِ باطل خسارے میں پڑیں گے اور تم دیکھو گے ہر گروہ کو دو زانو بیٹھے۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا اس کے دفترِ اعمال کی طرف۔ ان کو بتایا جائے گا کہ جو کچھ تم کرتے رہے ہو آج تم کو اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ ہمارا دفتر ہے جو تمہارے اوپر بالکل ٹھیک ٹھیک گواہی دے گا۔ ہم لکھواتے رہے ہیں جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ ۲۷-۲۹

پس جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یہی دراصل کھلی ہوئی کامیابی ہے۔ رہے وہ جنھوں نے کفر کیا تو ان سے کہا جائے گا کہ کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی رہی ہیں تو تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے! اور جب تم سے کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ شدنی ہے اور قیامت کے باب میں کوئی شک نہیں ہے تو تم جواب دیتے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا

کیا ہے۔ بس ایک گمان ہے جو ہم کرتے ہیں اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں۔ ۳۰ - ۳۲

اور ان پر ان کے ان کاموں کی برائیاں واضح ہو جائیں گی جو وہ کرتے رہے اور وہ چیز ان کو گھیر لے گی جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے اور ان سے کہا جائے گا کہ آج ہم تم کو نظر انداز کریں گے جس طرح تم نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا اور تمھارا ٹھکانا دوزخ ہے اور کوئی تمھارا مددگار نہیں بننے والا ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ تم نے اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا اور دنیا کی زندگی نے تم کو دھوکے میں ڈالے رکھا۔ پس آج نہ تو وہ اس سے نکالے جائیں گے اور نہ ان کو معذرت پیش کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ پس اللہ ہی، آسمانوں اور زمین کا خداوند، عالم کا رب، شکر کا سزاوار ہے اور اسی کے لیے ہے بڑائی آسمانوں اور زمین میں اور وہ عزیز و حکیم ہے۔ ۳۳ - ۳۷

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ (۲۴)

منکرین قیامت کا معارضہ اور اس کا جواب

پچھلے آیات ۲۱ - ۲۲ میں قیامت کے اخلاقی، اور انفسی اور آفاقی دلائل کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔ اب یہ اس معارضہ کا حوالہ ہے جو ان واضح دلائل کے مقابل میں منکرین قیامت پیش کرتے تھے۔ فرمایا کہ جب ان کو قیامت کی یاد دہانی کی جاتی ہے تو بڑی رعونت کے ساتھ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہے۔ اس زندگی کے بعد نہ زندگی ہے نہ موت۔ جو لوگ مرنے کے بعد پھر زندگی اور حساب کتاب کا ڈراوا سناتے ہیں وہ محض ایک ڈھونس جماتے اور ایک وہم میں مبتلا ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

'نَمُوْتُ وَنَحْيَا' یعنی ہمارا مرنا اور جینا بس اسی دنیا تک محدود ہے۔ مرجانے کے بعد سارا قصہ تمام ہو جاتا ہے۔

'وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ' اور یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ خدا ہمیں موت دیتا ہے اور وہ ہمیں اکٹھا کر رہا ہے، پھر ایک دن وہ ہمارا حساب کتاب کرنے بیٹھے گا اور ہمیں جزا یا سزا دے گا۔ خدا کو ان باتوں سے کیا تعلق! بس گردشِ روزگار ہے جو ہمیں فنا کرتی ہے۔ جس طرح ایک درخت اگتا ہے، اپنی پختگی کو پہنچتا ہے، اور ایک دن سوکھ کر فنا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی پیدا ہوتے ہیں، پھر گردشِ روزگار کے کسی تھپیڑے سے یا تو بچپن یا جوانی ہی میں فنا ہو جاتے ہیں یا بڑھاپے کو پہنچ کر مر جاتے ہیں۔

'وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ' یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی ان خرافات پر تبصرہ ہے کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کی بنیاد کسی علم پر نہیں ہے بلکہ محض اٹکل کے تیر تکے چلائے جا رہے ہیں۔ ان کا جی قیامت کو ماننے کو نہیں چاہتا۔ یہ چیز ان کی آزادی کو مقید اور ان کے عیش کو منغص کرتی ہے اس وجہ سے بالکل بے سوچے سمجھے یہ لا ابالیانہ باتیں کرتے اور ایک ایسی حقیقت کا انکار کر رہے ہیں جس کی شہادت انسان کی فطرت کے اندر ہے، جس کی گواہی اس کائنات کا پورا نظام دے رہا ہے، جو اس جہان کے خالق کی قدرت، حکمت، رحمت، ربوبیت اور اس کے عدل کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر وہ ظہور میں نہ آئے تو یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال اور ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عرب میں دہریوں کا بھی ایک گروہ تھا جو خدا اور قیامت وغیرہ کا قطعی منکر تھا۔ میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اشخاص و افراد کی بات اور ہے لیکن بحیثیت گروہ کے اس دور میں کوئی گروہ ایسا موجود نہیں تھا جو خدا اور آخرت کا صریح الفاظ میں منکر یا نرا مادہ پرست ہو۔ اہلِ عرب منکر نہیں بلکہ مشرک تھے اور اس شرک کے ذریعہ سے انھوں نے خدا کو دنیا کے نظام میں ایک عضوِ معطل بنا کے رکھ دیا تھا۔ آخرت اور حیات بعد الممات کے معاملہ میں بھی وہ قطعی انکار کے نتیجہ تک نہیں پہنچے تھے بلکہ تذبذب کے درجہ میں تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مرنے کے بعد از سرِ نو اٹھنا اول تو بہت مستبعد بات ہے اور اگر اٹھنا ہی پڑا تو ہمارا معاملہ خدا سے نہیں بلکہ ہمارے دیوتاؤں سے متعلق ہے۔ وہ ہمیں وہاں بھی اونچے سے اونچے درجے دلائیں گے۔ اور اگر خدا نے کوئی گرفت کی تو وہ اپنے زور و اثر سے ہمیں اس کی گرفت سے بچا لیں گے۔

ان کا یہ قول کہ ہمیں گردشِ روزگار ہلاک کرتی ہے انکارِ خدا کے معنی میں نہیں تھا بلکہ اس سے وہ قرآن کے اس فلسفۂ تاریخ کی نفی کرنا چاہتے تھے جو قرآن نے نہایت تفصیل کے ساتھ قریش کو سنایا

تھا کہ پچھلی قومیں اپنے عقائد و اعمال کے فساد اور رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں تباہ ہوئیں۔ اگر تم بھی انہی کی روش اختیار کرو گے تو انہی کے انجام سے دوچار ہو گے۔ یہ انذار چونکہ بالکل مبنی بر حقیقت تھا اس وجہ سے وہ لوگ اس سے متاثر ہوئے جن کے اندر کچھ عاقبت اندیشی تھی۔ ان کے اندر یہ ڈر پیدا ہوا کہ قرآن کی یہ بات صحیح ہے اور اگر ہم نے بھی عاد، ثمود، اہلِ مدین اور فرعون کی طرح اس دعوتِ حق کو جھٹلایا اور اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح نہ کی تو مبادا اسی طرح کے کسی عذاب کی زد میں آ جائیں جس سے قرآن ڈرا رہا ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو اپنی روش پر مطمئن رکھنے کے لیے قریش کے لیڈروں نے یہ فلسفہ تراشا کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ پچھلی قومیں اپنے عقائد و اعمال کے فساد اور رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں خدا کے عذاب سے تباہ ہوئیں۔ خدا کو ان باتوں سے کیا تعلق۔ ہم ہلاک ہوتے ہیں تو گردشِ روزگار سے ہلاک ہوتے ہیں۔ ایک شخص پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، پھر بوڑھا ہو کر ایک دن مر جاتا ہے اور اس کے اس مر جانے کا کوئی تعلق بھی اس کے عقائد و اعمال سے نہیں بلکہ تمام تر گردشِ روزگار سے ہوتا ہے۔ اسی طرح قومیں بھی وجود میں آتی ہیں، ترقی کرتی ہیں، تہذیب و تمدن کی بانی بنتی ہیں، فتح و تسخیر کے جال بچھاتی ہیں اور ایک دن اپنی طاقتیں اور صلاحیتیں نچوڑ کر گردشِ روزگار کی نذر ہو جاتی ہیں۔ اس دنیا کے اسٹیج پر یہ تماشا برابر ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہ گردشِ روزگار کے کرشمے ہیں۔ جو لوگ اس چیز کو عقائد و اعمال سے باندھتے ہیں وہ بالکل وہمی اور لوگوں کو خواہ مخواہ ایک وہم میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

قریش کے لیڈر اپنے اسی فلسفۂ باطل کو تقویت پہنچانے کے لیے اپنے عوام کو یہ سبق بھی پڑھاتے تھے کہ اگر کوئی قحط یا بلا یا طوفان آ جائے تو اس وہم میں نہ مبتلا ہو جایا کرو کہ یہ چیز تمہارے اعمال یا عقائد کے فساد کے نتیجہ میں تم پر خدا نے نازل کی ہے۔ اس طرح کے سخت اور نرم دن ہمارے اگلوں پر بھی آئے حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ بڑے ہی پاکیزہ اعمال و عقائد والے لوگ تھے۔ قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ کے تحت ان کے اس فلسفہ کی وضاحت ہو چکی ہے۔

یہ خیال نہ فرمائیے کہ یہ جاہلی فلسفہ اب نابود ہو چکا ہے۔ اس زمانے میں بھی ذہنوں پر یہی فاسد فلسفہ مسلط ہے اور ان لوگوں کے ذہنوں پر مسلط ہے جو قرآن کے حامل اور اسلام پر عامل ہونے کے مدعی ہیں۔ ان کو بھی اگر توجہ دلائیے کہ فلاں فلاں آفتیں جو آئیں یا آ رہی ہیں یہ سب ہمارے ایمانی و اخلاقی فساد کا نتیجہ ہیں، اگر یہ فساد باقی رہا تو ڈر ہے کہ کہیں یہ بیڑا ہی غرق نہ ہو جائے تو اس سے ان کا پندارِ ایمان و اسلام مجروح ہوتا ہے اور وہ بڑے دانش فروشانہ انداز میں جواب دیتے ہیں کہ اس طرح کی گردشیں تو قوموں پر آیا ہی کرتی ہیں۔ ہمارے اگلوں پر بھی آ چکی ہیں پھر کیوں سمجھا جائے کہ یہ ہمارے کسی فساد کا نتیجہ ہیں!

'وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ': یعنی یہ بات یہ لوگ کہتے تو ہیں بڑے ادعا و طنطنہ کے ساتھ لیکن اس باب میں ان کو کوئی علم نہیں ہے بلکہ محض ظن و گمان ہے جس پر اس فلسفہ کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ عقل و فطرت، آفاق و انفس اور انبیاء و حکما کی تعلیم تو وہی ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے لیکن یہ لوگ علم کی جگہ اپنے گمان کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ ان کی ہر خواہش کے جواز کی سند علم نہیں بلکہ ان کا گمان ہی دے سکتا ہے۔ یہ اسلوب کلام اظہارِ حسرت کا ہے کہ بڑے ہی بدقسمت ہیں یہ لوگ جنھوں نے ایسے عظیم معاملہ میں علم کی جگہ اپنے خیال و گمان کو اپنا رہنما بنایا ہے۔

وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّآ أَنْ قَالُوا ائْتُوا بِاٰبَآئِنَآ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۵)

قرآن کے دلائل کے مقابل میں کفار کی واحد ڈھال

یہ ان کے اس گمان کی وضاحت ہے جس کو انھوں نے قرآن کے واضح دلائل کے مقابل میں اپنا رہنما بنایا۔ فرمایا کہ جب قیامت کے باب میں ان کو ہماری نہایت واضح آیتیں سنائی جاتی ہیں تو واحد چیز جس کو وہ ان کی تردید میں اپنی حجت بناتے ہیں وہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھیوں سے ان کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ اگر تم لوگ اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو جو وفات پا چکے ہیں، زندہ کر کے لاؤ۔

'حُجَّتَهُمْ'، 'كَانَ' کی خبر ہے۔ یہی مضمون سورۂ عنکبوت میں بھی ذرا مختلف الفاظ میں آیا ہے 'فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ إِلَّآ أَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ' (۲۹) (ان کی قوم کا جواب صرف ان کا یہ قول ہوا کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کا عذاب ہم پر لا دکھاؤ) 'حُجَّتَ' سے مراد ان کا جواب ہی ہے لیکن اپنے زعم میں وہ اس کو ایک قاطع حجت خیال کرتے تھے اس وجہ سے 'بطورِ طنز' قرآن نے اس کو 'حُجَّت' سے تعبیر فرمایا۔ مقصد یہ دکھانا ہے کہ اتنے بڑے مسئلہ میں اگر انھوں نے سہارا لیا تو ایک ایسے جواب کا سہارا لیا جس کو نہ اصل بحث سے کوئی دور یا قریب کا واسطہ ہے اور نہ عقل و منطق سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ بلکہ یہ محض ان کا ایک بے بنیاد خیال ہے لیکن یہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ قرآن جس چیز سے ڈرا رہا ہے اس سے ان کی جان چھوٹ گئی۔

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۶)

قرآن کا جواب

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اصل دعوے کی از سرِ نو یاددہانی کرائی گئی اور ایسے اسلوب میں کرائی گئی ہے کہ دعوے کی دلیل خود بخود واضح ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ تم سے یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ آج جس کو کہو اس کو زندہ کر کے دکھا دیا جائے بلکہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ہی تمھیں زندگی دیتا ہے، پھر وہی تم کو موت بھی دیتا ہے پھر وہ تم کو جمع کرے گا اور یہ جمع کرنا قیامت کے دن تک جاری

رہے گا اور قیامت کے آنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

یعنی جب زندگی اور موت خدا ہی کے اختیار میں ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو یہ سوال تو خارج از بحث ہوا کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ لوگوں کو زندہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ آخر جس نے زندہ کیا ہے، وہ دوبارہ زندہ کیوں نہیں کر سکتا؟ اور جب اپنے پیدا کیے ہوئے کو موت بھی اسی نے دی ہے، کسی اور نے نہیں دی ہے تو وہ اگر اس کو دوبارہ پیدا کرنا چاہے تو اس کے اس ارادے میں کس کی طاقت ہے کہ مزاحم ہو سکے! مزاحمت تو جب ہو سکتی کہ زندگی پر کسی کا اختیار ہوتا اور موت پر کسی اور کا، لیکن ناقابلِ تردید دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ اس قسم کی ثنویت سے یہ کارخانۂ کائنات بالکل پاک ہے۔ یہ اپنے وجود سے شاہد ہے کہ اس کے اوپر ایک ہی ارادہ کارفرما ہے۔

'ثُمَّ یَجْمَعُکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ' یہ زندگی اور موت کے لازمی تقاضے کا بیان ہے کہ اس کے بعد اگر حساب کتاب اور جزا و سزا کا کوئی دن نہ آئے تو یہ سارا کارخانہ بالکل عبث اور بے مقصد ہو کے رہ جاتا ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو جمع کرے اور یہ جمع کرنا اس قیامت کے دن تک جاری رہے گا جس کا آنا اس زندگی اور موت کے بامقصد ہونے کے لیے ناگزیر اور جس کے آنے میں کسی پہلو سے کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

'یَجْمَعُکُمْ' کے بعد 'اِلٰی' کا صلہ اتصال اور تسلسل کو ظاہر کر رہا ہے۔ یعنی یہ جمع کرنا قیامت تک جاری رہے گا جس سے یہ بات بھی نکلی کہ مرنے والوں میں سے قیامت سے پہلے نہ کوئی اٹھے گا اور نہ کسی کے اٹھائے جانے کا قرآن یا پیغمبر کی طرف سے دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے باپ دادا کو زندہ کر کے دکھا دیا جائے، ان کا مطالبہ بے معنی ہے۔

'وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ' یہ منکرینِ قیامت کے حال پر اظہارِ حسرت ہے کہ جس چیز سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس میں کسی شک کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یعنی اس بات کو نہیں جانتے کہ اس واضح حقیقت کا انکار کر کے اپنے لیے کس ہولناک انجام کا دروازہ کھول رہے ہیں۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ (۲۷)

یعنی اگر ان لوگوں کا بھروسہ اپنے مزعومہ شرکاء پر ہے کہ قیامت ہوئی تو وہ ان کو بچا لیں گے تو یہ محض ایک خیالِ خام ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ کسی کی بھی مجال نہیں ہے کہ اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ وہ دن جب آئے گا تو جو لوگ اس غم کی جھوٹی آرزؤں میں مبتلا ہیں وہ سب خسارے میں پڑیں گے۔

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۸)

تصویر قیامت

اس دن لوگوں کو جس صورتِ حال سے سابقہ پیش آئے گا یہ اس کی تصویر ہے۔ فرمایا کہ اس دن ہر گروہ اپنا فیصلہ سننے کے لیے دو زانو بیٹھا ہوا ہوگا، ہر گروہ اپنے اپنے دفترِ اعمال کی طرف پکارا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ آج تمہیں بدلے میں وہی ملے گا جو تم دنیا میں کر کے آئے ہو۔

'تَرٰى' اگرچہ واحد کا صیغہ ہے لیکن 'اَلَمْ تَرَ' کی طرح اس کا خطاب بھی عام ہو سکتا ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہاں عام ہی ہے۔

'كُلَّ اُمَّةٍ' یعنی مومن اور کافر، ابرار اور فجار اس دن سب اکٹھے ہوں گے، کوئی بھی اس حاضری سے مستثنیٰ نہیں ہوگا۔

'جَاثِيَةً'، 'جثا یجثوا' سے ہے۔ 'جثا الرجل' کی تشریح اہلِ لغت نے یوں کی ہے کہ 'جلس علی رکبتیہ' آدمی اپنے دونوں زانوؤں پر بیٹھا۔ غلام، محکوم اور مجرم اپنے آقاؤں اور حاکموں کے حضور میں اپنا فیصلہ سننے کے لیے اسی طرح دو زانو بیٹھتے تھے۔

'کتاب' یہاں دفترِ اعمال کے مفہوم میں ہے۔ اس لیے کہ اس کتاب میں گروہوں اور امتوں کے تمام اعمال کا ریکارڈ ہوگا جس کی موزوں تعبیر دفتر ہی سے ہو سکتی ہے۔ سورۂ تطفیف کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کی وضاحت آئے گی۔ وہاں ان دفتروں کے نام بھی مذکور ہیں۔

'اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ'۔ 'اَلْيَوْمَ' سے پہلے 'قِيْلَ لَهُمْ' (ان سے کہا جائے گا) بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یعنی ہر گروہ کو ان کے اعمال سے متعلق دفتر کی طرف پکارا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم دنیا میں کر کے آئے ہو آج تم کو وہ بدلے میں ملے گا۔

مطلب یہ ہوا کہ جس نے کیا کرایا کچھ نہیں، صرف شرک و شفاعت کے بھروسہ پر وہ لذیذ خواب دیکھتا رہا ہے اس کے لیے یہاں محرومی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹)

یہ بھی اوپر والی بات ہی کا حصہ ہے۔ یعنی ان کو آگاہ کر دیا جائے گا کہ اس دفتر سے کسی ناانصافی یا کسی سہو و نسیان کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ٹھیک بتائے گا کہ کس نے کیا کیا ہے اس لیے کہ ہر ایک کا سارا ریکارڈ مکمل تحریری موجود ہے۔ تم جو کچھ کرتے رہے ہو ہم اس کو برابر فرشتوں سے لکھواتے رہے ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (۳۰)

ہر گروہ کو اس کے ریکارڈ سے آگاہ کر دینے کے بعد اب ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ انجام بیان ہو رہا ہے۔ پہلے اہل ایمان کا انجام بیان ہوا۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے ایمان اور عمل صالح کی زندگی گزاری ہو گی ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ لفظ 'رحمت' یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ان لوگوں کو صرف ان کے اعمال ہی کا بدلہ نہیں ملے گا بلکہ اس کے ساتھ ان کے رب کا بے پایاں فضل بھی ہو گا۔ اس کے بعد بطور تحسین فرمایا کہ کھلی ہوئی کامیابی یہ ہے جو یہ لوگ حاصل کریں گے نہ کہ اس دنیا کا وہ چند روزہ عیش جس کے عشق میں پھنس کر نادانوں نے یہ ابدی بادشاہی گنوا دی!

وَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۔ اَفَلَمْ تَکُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ فَاسْتَکْبَرْتُمْ وَکُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ (۳۱)

یہ کفار کے انجام کا بیان ہے اور ان کا انجام اہل ایمان کے مقابل میں تفصیل سے بیان ہوا ہے اس سورہ میں اصلی بحث کفار ہی سے ہے اور خاص طور پر ان کے متکبرین کے طبقہ سے۔ فرمایا کہ رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تو ان سے کہا جائے گا کیوں کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس دن سے آگاہ کرنے کے لیے جب تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں تو تم نے تکبر کیا اور ہماری تنبیہ و تذکیر کے باوجود تم بدستور اپنے جرم پر مصر رہے! اس تکبر اور اصرار کی تفصیل اسی سورہ کی آیات ۸-۹ اور ۲۴-۲۵ میں گزر چکی ہے۔ اس مرحلہ میں ان لوگوں سے یہ سوال ظاہر ہے کہ جواب حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا جائے گا بلکہ مقصود صرف ان کو ملامت کرنا ہو گا تاکہ ان کی رسوائی میں مزید اضافہ ہو۔

وَاِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّالسَّاعَۃُ لَارَیْبَ فِیْہَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِیْ مَا السَّاعَۃُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ (۳۲)

منکرین کا احمقانہ مطالبہ

یہ ان کے استکبار کی وضاحت ہے کہ تمھارا حال یہ ہو رہا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدۂ جزا و سزا شدنی اور قیامت کے واقع ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے تو تم بڑی رعونت سے یہ جواب دیتے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کس چیز کا نام ہے، بس ایک گمان ہے جو ہم رکھتے ہیں اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جہاں تک گمان کا تعلق ہے یہ منکرین بھی اپنے دل میں رکھتے تھے لیکن ان کا مطالبہ یہ تھا کہ جب ان کو اس کا پورا یقین ہو جائے گا تب وہ مانیں گے۔ اس یقین کے لیے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ 'ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ' (اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے دکھا دو) ظاہر ہے کہ یہ ایک بالکل ہی احمقانہ مطالبہ تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان صرف اسی چیز کو مانے جو اس نے آنکھوں سے دیکھی ہو۔ اس کے علاوہ کسی بات پر بھی یقین نہ کرے خواہ اس کے حق میں کتنے ہی واضح عقلی و اخلاقی دلائل موجود ہوں۔ اگر انسان اس حد تک سفاہت پر اتر آئے

تو پھر عقل ایک بالکل فالتو چیز بن کے رہ جاتی ہے بلکہ آدمی اور بیل میں پھر شکل و صورت کے سوا کوئی فرق ہی نہیں رہ جاتا۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ انسان اپنے اندر عقل کے وجود کو بھی تسلیم نہ کرے اس لیے کہ عقل کو بھی نہ اس نے دیکھا ہے نہ چھوا ہے۔ انسان کے پاس علوم کا جو سرمایہ ہے اس کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کا بہت بڑا حصہ عقلی اور اخلاقی اصولوں ہی پر مبنی ہے۔ اگر محسوس پرستی کا وہ نظریہ مان لیا جائے جو ان منکرین کے سامنے تھا تو دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ سارے علوم دفن کر دیے جائیں جو انسان نے اب تک پیدا کیے ہیں۔

دانش مندی کا راستہ

غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی آپ پر واضح ہوگی کہ اس طرح کے اہم اور دور رس نتائج رکھنے والے امور میں ظن غالب کی رہنمائی کافی ہے۔ ایک عظیم بند جس میں شگاف پڑنے سے پورا شہر خطرہ میں پڑ سکتا ہو ہماری توجہ کا طالب اسی وقت نہیں ہوگا جب اس میں شگاف پڑ جائے بلکہ عاقل لوگ اس طرح کے معاملات میں بہت پہلے سے چوکنے رہتے ہیں۔ آخرت کا معاملہ ایک نہایت اہم بلکہ اس پوری کائنات کا سب سے اہم معاملہ ہے۔ اس کے حق میں جو دلائل قرآن اور دوسرے صحیفوں میں بیان ہوئے ہیں وہ ناقابلِ تردید ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کوئی شخص کچھ کہہ سکتا ہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ اس پر اس کو اس طرح کا یقین نہیں ہے جس طرح کا یقین آنکھوں دیکھی چیز پر ہوتا ہے۔ اگر اس طرح کا یقین نہیں ہے تو نہ ہو یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا وہ پوری قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ آخرت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی موازنہ کرے کہ دونوں راہوں میں سے سلامتی کی راہ کون سی ہے۔ یہ کہ آدمی فکرِ آخرت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی خواہشوں کی پیروی میں زندگی گزارے اور اس بحث میں نہ پڑے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا یا یہ کہ آخرت کو مان کر، جزا اور سزا کو پیش نظر رکھتے ہوئے، زندگی گزارے اگرچہ اس کے لیے اس کو اپنی بعض خواہشوں کی قربانی بھی دینی پڑے۔ غور کیجیے تو دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی یہ دوسری راہ اختیار کرے اس لیے کہ پہلی صورت اختیار کرنے میں ایک ابدی اور دائمی خطرہ مضمر ہے اور فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ اپنے زعم کے مطابق اپنی خواہشوں کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہوں گے اگرچہ ان کا پورا ہونا آپ کے ارادہ پر منحصر نہیں ہے۔ برعکس اس کے اس دوسری راہ میں خطرہ کوئی نہیں ہے۔ اگر آخرت ہوئی تب تو ابدی بادشاہی حاصل ہوگی اور اگر منکرین کے خیال کے مطابق نہ ہوئی تو نقصان کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ یہی تو، کہ اس فانی زندگی میں چند فانی خواہشوں کی قربانی دینی پڑی اور ان کا پورا ہونا بھی اپنے اختیار میں نہیں بلکہ کسی اور ہی کے اختیار میں تھا۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۳)

بدعملوں کی بدعملیوں کے اصلی نتائج آخرت میں ظاہر ہوں گے

انسان جو عقلی و اخلاقی جرائم اس دنیا میں کرتا ہے ان کے بُرے نتائج اس کے سامنے فوراً نہیں

آتے اس وجہ سے ان کے معاملہ میں وہ دلیر ہوتا جاتا ہے اور ناصحوں کی نصیحت قبول کرنا تو درکنار وہ ان کو بے وقوف سمجھتا اور ان کی باتوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اعمال کے حقیقی نتائج سے پردہ اٹھا دے گا۔ اس دن اندھے سے اندھے کو بھی نظر آجائے گا کہ اس نے دنیا میں جو بیس بھری فصل بوئی اور جس کے انجام سے اس کے رسولوں اور اس کے نیک بندوں نے اس کو ڈرایا لیکن اس نے ان کی کوئی پروا نہ کی، اس کا حاصل کس ہولناک شکل میں اس کے سامنے آیا۔ اس دن وہ عذاب جس کا وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ مذاق اڑاتا رہا اس کو اس طرح گھیرے گا کہ اس کے سامنے کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہے گی۔

وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۳۴)

'نسی'، یہاں نظر انداز کرنے کے مفہوم میں ہے یعنی ان کو پہلے ہی مرحلہ میں آگاہ کر دیا جائے گا کہ جس طرح تم نے دنیا میں اللہ کے رسولوں اور اس کے نیک بندوں کے انذار کو نظر انداز کیے رکھا اور اس ہولناک دن کی پیشی سے انھوں نے تم کو آگاہ کیا تو تم نے سنی اَن سنی کر دی اسی طرح آج ہم تم کو نظر انداز کریں گے۔ تم کتنا ہی چیخو اور چلاؤ لیکن ہمارے ہاں تمھاری کوئی شنوائی نہیں ہونی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اگر تم کو اپنی جمعیت پر ناز تھا تو وہ بھی آج تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتی اور اگر اپنے شرکاء و شفعاء پر بھروسہ تھا تو وہ بھی تمھارے کچھ کام آنے والے نہیں بنیں گے۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ (۳۵)

یعنی تم اس رویہ کے سزاوار اس وجہ سے ٹھہرے کہ جب تم کو اس دن سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی تھیں تو تم ان کا مذاق اڑاتے اور اس طرح وہاں سے چل دیتے گویا تم نے کوئی بات سنی ہی نہیں۔ آیات ۸-۹ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

'وَغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا'، یعنی تم کو دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو رفاہیت و خوش حالی بخشی اس سے تم نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ تم اسی کے سزاوار و حقدار ہو اور تمھاری یہ خوش حالی اس بات کا ثبوت ہے کہ تمھارے عقیدہ یا عمل میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اس غرور میں مبتلا ہو کر تم نے ان لوگوں کا مذاق اڑایا، جنھوں نے تمھارے عقائد و اعمال کے فساد کی طرف تم کو توجہ دلانے کی کوشش کی اور ان کو یہ طعنہ دیا کہ بتاؤ ہمارے حالات اچھے ہیں یا تمھارے؟ جب ہمارے حالات تم سے بدرجہا بہتر ہیں تو ہم یہ کیوں نہ سمجھیں کہ ہمارے ہی عقائد و اعمال بھی اچھے ہیں اور خرابی ہمارے اندر نہیں بلکہ تمھارے ہی ماغوں کے اندر ہے۔

'فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ'، فرمایا کہ ان کے اس غرور کی پاداش میں نہ تو ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب ہوگا اور نہ ان کو یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے رب سے معافی مانگ کر اس

کو راضی کر سکیں تو راضی کر لیں۔ بلکہ ان کے لیے امید کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔

اس ٹکڑے میں اسلوب کی اچانک تبدیلی قابلِ توجہ ہے۔ اوپر کے ٹکڑے میں اسلوب خطاب کا تھا۔ اس میں دفعتہً غائب کا اسلوب آ گیا۔ گویا نظر انداز کیے جانے کی جو دھمکی ان کو دی گئی تھی اس کا عمل شروع ہو گیا یہاں تک کہ وہ اس قابل بھی نہیں رہے کہ ان کو خطاب کر کے کوئی بات کہی جائے۔ یہاں ملحوظ رہے کہ غائب کا اسلوب نظر انداز کیے جانے کے مواقع میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳۶-۳۷)

یہ آخر میں ساری بحث کا خلاصہ سامنے رکھ دیا کہ جب یہ سارے حقائق بالکل واضح ہیں تو بندوں کے شکر کا سزاوار وہی اللہ ہے جو آسمانوں کا خداوند، جو زمین کا خداوند اور جو عالم والوں کا خداوند ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھر اس کے سوا تم نے دوسرے ارباب کہاں سے نکال لیے؟ آسمانوں اور زمین کے الگ الگ الٰہ کس طرح ٹھہرا لیے؟ اور خدا کی مخلوق اور اس کے مربوب ہو کر تم نے اتنے دیوی دیوتا کس لیے ایجاد کر لیے؟

وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ ..... الاٰیۃ۔ یہ اوپر والی بات کا دوسرا لازمی نتیجہ بیان ہوا کہ جب اس ساری کائنات کا خداوند وہی ہے تو اصل مالک اور بادشاہ کے ہوتے آسمانوں یا زمین میں کسی دوسرے کی کبریائی اور بڑائی کے لیے گنجائش کہاں سے نکلی؟ پھر تو ساری کبریائی کا حق دار وہی ہوا، سب کو اسی کے آگے سرافگندہ ہونا اور اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ اگر کوئی اس کی مملکت کے اندر اس کے مقابل میں سر اٹھاتا ہے تو وہ اس کی کبریائی کو چیلنج کرتا ہے اور جو اس کی کبریائی کو چیلنج کرے گا وہ لازماً کیفرِ کردار کو پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ 'عزیز' یعنی غالب و مقتدر ہے اس وجہ سے کوئی اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا لیکن ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اگر اس نے لوگوں کو سرکشی کے لیے مہلت دے رکھی ہے تو اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ خدا کی گرفت سے باہر ہو گیا بلکہ اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور یہ حکمت ایک دن سب کے سامنے ظاہر ہو کے رہے گی۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی توفیق و رہنمائی سے تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ

رحمان آباد

۱۲؍ جون ۱۹۷۶ء

۲۲؍ جمادی الثانی ۱۳۹۶ھ

تدبرِ قرآن

۴۶

الأحقاف

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ اس گروپ کی آخری مکی سورہ ہے۔ اس کے بعد تین سورتیں مدنی ہیں جن میں انہی وعدوں اور وعیدوں کی تکمیل ہے جن کا پچھلی مکی سورتوں میں ذکر ہوا ہے۔ اس کا قرآنی نام وہی ہے جو پچھلی سورہ کا ہے اور اس کی تمہید بھی بعینہٖ وہی ہے جو پچھلی سورہ کی ہے۔ اس میں مخالفین قرآن کو نہایت آشکارا الفاظ میں آگاہ کیا گیا ہے کہ قرآن جس روزِ قیامت سے تم کو خبردار کر رہا ہے وہ ایک امر شدنی ہے۔ شرک و شفاعت کے بل پر اگر تم اس انذار کو نظر انداز اور پیغمبر ؐ کو ایک مفتری قرار دے رہے ہو تو یاد رکھو کہ تمہارے ان اوہام کے حق میں عقل و نقل کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ برعکس اس کے یہ قرآن ایک ایسی چیز ہے جس کی شہادت اس کے نزول سے پہلے ہی بنی اسرائیل کے ایک عظیم شاہد نے بھی دی ہے اور اس کی پیشین گوئیاں تورات میں بھی موجود ہیں جن کا یہ ٹھیک ٹھیک مصداق ہے اس وجہ سے تمہیں یہود و نصاریٰ کی شہ سے بھی کسی دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیے، یہ لوگ تو خود اپنے رسولوں اور اپنے صحیفوں کو جھٹلا رہے ہیں۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت واضح الفاظ میں تسلی دی ہے کہ ان مخالفین کی ذرا پروا نہ کرو۔ تمہاری ذمہ داری لوگوں تک اس کتاب کو پہنچا دینے کی ہے۔ اس پر ایمان وہی لوگ لائیں گے جن کی طبیعت میں سلامت روی، حق شناسی اور عاقبت بینی ہے۔ ان لوگوں سے کسی خیر کی امید نہ رکھو جو بالکل مادر پدر آزاد ہیں۔ تم جو چیز پیش کر رہے ہو اس کی اثر آفرینی کا حال تو یہ ہے کہ راہ چلتے جنوں کے کان میں بھی اس کے کلمات پڑ گئے ہیں تو وہ بھی اس پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ اگر ان لوگوں پر اس کا اثر نہیں پڑ رہا ہے تو یہ اس کلام کی کوئی خرابی نہیں بلکہ ان کے دلوں ہی کی خرابی ہے۔ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کرو اور ان کو ان کے انجام کے حوالہ کرو جس کے ظہور میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) قرآن خدائے عزیز و حکیم کا نازل کیا ہوا صحیفہ ہے لیکن جو لوگ آخرت کے منکر ہیں وہ اس سے اعراض کر رہے ہیں، حالانکہ یہ دنیا کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم غایت و مقصد کے

ساتھ اس کو پیدا کیا ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ ایک دن اس کی مدت پوری ہو اور اس کا انجام ظاہر ہو۔ ان لوگوں کا اعتماد اپنے شرکاء و شفعاء پر ہے۔ ان کا گمان ہے کہ قیامت ہوئی تو وہ ان کو بچا لیں گے حالانکہ ان شرکاء کے حق میں نہ کوئی نقلی دلیل موجود ہے نہ عقلی۔ یہ لوگ ان سے لَو لگائے بیٹھے ہیں اور ان کو خبر بھی نہیں کہ کوئی ان کی پرستش کر رہا ہے اور ان کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ وہ قیامت کے دن ان کے مددگار ہونے کے بجائے اُلٹے ان کے دشمن ہوں گے۔ یہ قرآن کے دلائل سے مرعوب ہو کر اس کو سحر کہتے اور پیغمبر کو مفتری قرار دیتے ہیں۔ ایسے ہٹ دھرم منہ لگانے کے قابل نہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ میں دنیا میں پہلا رسول نہیں ہوں، مجھ سے پہلے بھی رسول آ چکے ہیں۔ میں بھی انہی خصوصیات و صفات کے ساتھ آیا ہوں جن خصوصیات و صفات کے ساتھ وہ آئے۔ ان کو آگاہ کر دو کہ یہود و نصاریٰ کے چکے میں آ کر اگر تم میری مخالفت کر رہے ہو تو اس کے انجامِ بد کو اچھی طرح سوچ لو۔ بنی اسرائیل کا ایک عظیم شاہد میری گواہی دے چکا اور مجھ پر ایمان لا چکا ہے اور تورات کی پیشین گوئیوں کا بھی میں مصداق ہوں۔ اگر میرے اوپر غریب لوگ ایمان لائے ہیں تو اس کو بہانہ بنا کر اپنے کو اللہ کی رحمت سے محروم نہ کرو۔

(۱۵-۲۰) اس امر کا بیان کہ کس طرح کے لوگ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور کس طرح کے لوگ اس کی تکذیب کریں گے۔

اس پر ایمان وہ لائیں گے جو ان حقوق کو پہچانتے ہیں جن کا شعور فطرت کے اندر ودیعت ہے۔ جو اپنے ماں باپ کے احسان شناس اور ان کے فرمانبردار رہے ہیں۔ جوانی کے دور میں، اگرچہ جذبات کے غلبہ سے انھوں نے ٹھوکریں بھی کھائیں، لیکن اس طرح نہیں کہ گرے ہوں تو پھر اٹھنے کا نام ہی نہ لیا ہو بلکہ گرنے کے بعد سنبھلتے بھی رہے ہیں یہاں تک کہ جب وہ پختگی کے سن و سال یعنی چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو انھوں نے صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا کہ اے رب، اب تو ہمیں سنبھال کہ ہم تیرے ان انعامات کا شکر ادا کر سکیں جو تو نے ہم پر اور ہمارے ماں باپ پر کیے ہمیں عملِ صالح کی توفیق بخش اور ہماری اولاد کو بھی صالح بنا۔ ہم نے تیری طرف رجوع کیا اور تیرے فرماں برداروں میں سے بنتے ہیں۔ اس طرح کے سلیم الفطرت لوگوں کے گناہوں سے اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے گا اور ان کو اہلِ جنت میں شامل کرے گا۔

اس کو جھٹلانے والے وہ ہوں گے جنھوں نے اس کے بالکل برعکس مادر پدر آزاد زندگی گزاری۔ نہ ماں باپ کے حقوق انھوں نے پہچانے اور نہ خدا کے حقوق کا کبھی ان کو خیال آیا۔ اگر ماں باپ نے آخرت اور حساب کتاب سے ڈرایا تو انھوں نے جھڑک دیا کہ یہ سب اگلوں کے ڈھکوسلے ہیں، ہم اس طرح کی خرافات پر ایمان لانے کو تیار نہیں ہیں۔ اگر مرنے کے بعد پھر زندگی ہے تو آخر بے شمار خلقت جو مر چکی ہے وہ زندہ ہو کر کیوں نہیں واپس آتی۔

مذکورہ دونوں قسم کے لوگوں کے لیے اللہ کے ہاں ان کے اعمال کے اعتبار سے جزا یا سزا ہو گی۔ نیک اپنی نیکیوں کا بھرپور صلہ پائیں گے اور بد اپنی بدیوں کی سزا بھگتیں گے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرے گا۔

وہ متکبرین جو قرآن کے خلاف اس بات کو دلیل بنائے ہوئے ہیں کہ اس کو غریبوں نے قبول کیا ہے وہ جب دوزخ میں جھونکے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنے حصہ کی اچھی چیزیں دنیا میں لے چکے ۔ اب یہاں تمہارے لیے ذلت کے سوا کچھ نہیں ہے ۔

(۲۱-۲۸) قریش کی تنبیہ کے لیے قوم عاد کی مثال کہ ان کو بھی تمہاری ہی طرح اللہ کی پکڑ سے ڈرایا گیا لیکن انھوں نے اپنی قوت و صولت کے غرور میں اس کی کوئی پروا نہ کی بالآخر اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا دراں حالیکہ وہ قوت و شوکت اور تعمیر و تمدن کے اعتبار سے تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے لیکن ان کی ساری ذہانت و فطانت اللہ کے مقابل میں ان کے کچھ کام نہ آئی ۔

(۲۹-۳۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے قرآن سے متعلق جنوں کے ایک تاثر کا حوالہ کہ اگر قریش کے ناقدرے قرآن کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو اس میں قرآن کا یا تمہارا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ یہ انہی کے دلوں کی خرابی کا نتیجہ ہے ۔ قرآن کی تاثیر و تسخیر کا حال تو یہ ہے کہ جنوں کی ایک جماعت کے کان میں اس کی چند آیتیں پڑ گئیں تو وہ اس پر اس طرح فریفتہ ہو گئے کہ اپنی قوم کے اندر وہ اس کے داعی بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ۔

(۳۳-۳۵) خاتمۂ سورہ ۔ کفار کے لیے تہدید و وعید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و عزیمت کی تلقین ۔

سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ (۴۶)

مَكِّيَّةٌ ——— آیات: ۳۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ آیات ۱-۱۴
مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾
قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا
خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ
بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۴﴾ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ
دُعَاۗىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۵﴾ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَاۗءً
وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۶﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا
بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا
تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔا ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۭ

كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۸
قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ
وَلَا بِكُمْ ۭ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ
مُّبِيْنٌ ۹ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ
بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ
وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۱۰ وَقَالَ ع ۱
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ۭ
وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ۱۱
وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ وَهٰذَا كِتٰبٌ
مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ڰ وَبُشْرٰى
لِلْمُحْسِنِيْنَ ۱۲ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا
فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۱۳ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ
الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۱۴

ترجمۂ آیات ۱-۱۴

یہ حٰمٓ ہے۔ یہ کتاب نہایت اہتمام کے ساتھ خدائے عزیز و حکیم کی طرف سے اتاری گئی ہے۔ ۱-۲

ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو نہیں پیدا کیا مگر ایک غایت اور معین مدت کے لیے۔ اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، اس چیز سے اعراض کیے ہوئے ہیں جس سے ان کو آگاہ کیا گیا ہے۔ ۳

ان سے کہو کہ کبھی تم نے غور بھی کیا ان چیزوں پر جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو! مجھے دکھاؤ کہ زمین کی چیزوں میں سے انھوں نے کون سی چیز پیدا کی ہے یا ان کا آسمانوں میں کون سا ساجھا ہے! میرے سامنے اس سے پہلے کی کوئی کتاب پیش کرو یا کوئی ایسی روایت جس کی بنیاد علم پر ہو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ اور ان سے بڑھ کر گمراہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ کے سوا ان کی دہائی دیتے ہیں جو تا قیامت ان کو جواب دینے والے نہیں ہیں اور وہ ان کی دعاؤں سے بے خبر بھی ہیں! اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن اور ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔ ۴-۶

اور جب ان کو ہماری نہایت واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ کافر لوگ حق کی بابت، جب کہ وہ ان کے پاس آگیا، کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ کہہ دو کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو تم لوگ مجھے خدا سے ذرا بھی نہ بچا سکو گے اور تم جو سخن سازیاں کر رہے ہو وہ ان سے خوب واقف ہے، وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے اور وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔ ۷-۸

ان سے کہو کہ میں کوئی پہلا رسول تو نہیں ہوں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور نہ یہ جانتا کہ تمھارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ میں تو صرف اس بات کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور میں تو صرف ایک کھلا ہوا آگاہ کرنے والا ہوں۔ ۹

ان سے پوچھو کہ اس وقت کیا ہو گا اگر یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہوا اور تم نے اس کا انکار کیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک شاہد نے اس کے مانند کتاب کی گواہی بھی دی ہے سو وہ تو اس پر ایمان لایا اور تم نے تکبر کیا! بے شک اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا! ۱۰

اور کفر کرنے والوں نے ایمان لانے والوں کے باب میں کہا کہ اگر قرآن کوئی خیر ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم پر سبقت نہ پاتے اور چونکہ انھوں نے اس سے ہدایت نہیں حاصل کی تو اب کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔ ۱۱

اور اس کے پہلے سے موسیٰ کی کتاب موجود ہے، رہنما اور رحمت! اور یہ کتاب اس کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے، عربی زبان میں تاکہ ان لوگوں کو آگاہ کرے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اور یہ بشارت ہے خوب کاروں کے لیے۔ ۱۲

بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر جمے رہے تو ان کو نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہی لوگ اہل جنت ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے۔ یہ صلہ ہو گا ان کاموں کا جو وہ کرتے رہے۔ ۱۳-۱۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ ۝ تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ (۱-۲)

یہ دونوں آیتیں پچھلی سورہ کی تمہید میں بھی گزر چکی ہیں اور وہاں ان کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔ بعینہٖ اسی نام اور اسی تمہید سے اس سورہ کا آغاز نہایت واضح قرینہ اس بات کا ہے کہ دونوں میں نہایت واضح قدرِ مشترک موجود ہے۔ چنانچہ آگے کے مباحث سے ان کے اشتراک کا پہلو بھی سامنے آ جائے گا اور جملہ حوامیم کا، جو پیچھے گزر چکی ہیں، خلاصہ بھی معلوم ہو جائے گا۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ (۳)

یہ ان لوگوں کے حال پر اظہار افسوس ہے جو خدائے عزیز و حکیم کے اتارے ہوئے اس صحیفۂ گرامی کی تکذیب پر مُصر اور اس چیز سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے تھے جس سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ نے اس کو نازل کیا تھا۔

اس دنیا کے بامقصد ہونے کا تقاضا ہے کہ اس کے بعد روز جزا ہو

'عَمَّآ اُنْذِرُوْا' سے اشارہ ظاہر ہے کہ قیامت کی طرف ہے اور قیامت ایک ایسی حقیقت ہے جس کو نہ ماننے سے یہ سارا کارخانۂ عالم ایک بالکل عبث اور بے مقصد و بے غایت کھیل بن کے رہ جاتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ عالم 'بِالْحَقِّ' یعنی ایک غایت و مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ 'عزیز' یعنی غالب و مقتدر ہونے کے ساتھ 'حکیم' بھی ہے۔ اگر قیامت نہ ہو تو اس دنیا کو دیکھ کر یہ بات تو ثابت ہوگی کہ اس کے بنانے والے کی قدرت بے نہایت ہے لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ماننی پڑے گی کہ اس نے یہ ایک بالکل بے مقصد اور باطل کام کر ڈالا ہے۔ حالانکہ یہ بات اس کی ظاہر صفات کے بالکل منافی ہے۔ اس دنیا سے جس طرح اس کی قدرت ظاہر ہوتی ہے اسی طرح اس کی حکمت بھی مشاہدے میں آتی ہے اور یہ دونوں صفتیں بالکل پہلو بہ پہلو اس میں موجود ہیں۔ یہاں زبان کا وہ نکتہ یاد رکھیے جس کا ذکر اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کر چکے ہیں کہ جب صفات کا بیان بغیر حرف عطف کے ہو جس طرح 'العزیز الحکیم' میں ہے تو اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ صفات موصوف میں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔

'بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى' یعنی جس طرح اس کائنات کا 'بِالْحَقِّ' ہونا واضح ہے اسی طرح اس کے 'بالحق' ہونے کا ایک بدیہی تقاضا یہ بھی ہے کہ دنیا اسی طرح برابر چلتی نہ رہے بلکہ ضروری ہے کہ یہ ایک معین مدت تک کے لیے ہو جس کے بعد یہ ختم ہو۔ پھر اس کی عدالت قائم ہو۔ جس نے اس میں نیکی کمائی ہو اس کو اس کی نیکی کا صلہ ملے اور جس نے بدی کمائی ہو وہ اپنی بدی کی سزا بھگتے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہ بات تو معقول معلوم ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنی نیکی یا بدی کی جزا یا سزا پائے۔ لیکن اس کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ یہ پوری دنیا ایک معین مدت کے بعد ختم ہو جائے، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ برابر قائم بھی رہے اور جو مرتے جائیں ان کی عدالت بھی ہوتی رہے؟ یہ سوال یوں تو ذہن میں متعدد غلط فہمیوں کے موجود ہونے کے سبب سے پیدا ہوتا ہے جن پر یہاں بحث کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ لیکن ایک چیز کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔ وہ یہ کہ انسان کا ہر عمل خواہ نیکی کا عمل ہو یا بدی کا، اپنے اندر متعدی ہونے کی خصوصیات رکھتا ہے۔ ایک شخص ایک نیکی کا تخم بوتا ہے جس کی برکتوں سے صدیوں اور نسلوں تک اولاد آدم مستفید ہوتی ہے، اسی طرح ایک شخص ایک غلط اور گمراہ کن فلسفہ ایجاد کرتا ہے جس کی ضلالت ایک

خلقِ کثیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور پھر وہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اتنی مستحکم ہوتی جاتی ہے کہ اس کو اکھاڑنا تو درکنار، قوموں کے بعد قومیں اٹھتی اور اپنی صلاحیتیں ان کو پروان چڑھانے پر صرف کرتی ہیں۔ اس صورتِ حال کے سبب سے کسی کی نیکی یا بدی کا صحیح اندازہ اس کو کرانا ہو تو یہ ضروری ہوگا کہ ان کے بعید سے بعید اثرات اس کے سامنے لائے جائیں اور عناصرِ کائنات میں سے جو بھی اس کی کسی نیکی یا بدی کے گواہ ہوں ان کو پیش کیا جائے۔ اس کے بغیر کامل عدل ظہور میں نہیں آسکتا۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ ایک دن اس دنیا کی مدت پوری ہو اور اللہ تعالیٰ ایک ایسی عدالت میں لوگوں کا فیصلہ فرمائے جس میں سب حاضر ہوں۔ یہاں تک کہ آسمان اور زمین سے بھی اگر کسی معاملہ میں گواہی مطلوب ہو تو ان کو بھی ان کے سارے ریکارڈ کے ساتھ طلب کیا جائے۔ یہ چیز ظاہر ہے کہ اسی صورت میں ممکن ہے جب سب کا روزِ انصاف ایک ہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴)

شرک کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے

یہ ان لوگوں کے اعراض کے اصل سبب پر ضرب لگائی ہے کہ ان کا اعتماد چونکہ اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء پر ہے اس وجہ سے یہ قرآن کے انذار کی کوئی پروا نہیں کر رہے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اول تو قیامت محض ایک ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں اور اگر اس کی کچھ حقیقت ہے بھی تو ہم جن معبودوں کی پرستش کر رہے ہیں وہ ہم کو ہر خطرے سے بچا لیں گے۔ فرمایا کہ ان لوگوں سے کہو کہ تم اللہ کے سوا جن چیزوں کو پکارتے ہو کبھی ان پر غور بھی کیا ہے کہ ان کی کچھ حقیقت بھی ہے یا یہ محض تمہارے ذہن ہی کی ایجاد ہیں! اگر تم ان کی کچھ حقیقت سمجھتے ہو تو ذرا مجھے بھی دکھاؤ کہ انھوں نے زمین یا اس کی چیزوں میں سے کیا چیز پیدا کی ہے یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کا کیا حصہ ہے! مطلب یہ ہے کہ خدا کے شریک بننے کے حق دار تو صرف اسی شکل میں وہ ہو سکتے ہیں جب آسمان و زمین کی تخلیق میں ان کا کوئی حصہ ہو۔ اگر اس میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے تو آخر ان کو اس خدا کے حقوق میں شریک کرنے کے کیا معنی جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا خالق ہے۔ وہ خالق ہو کر کس طرح گوارا کرے گا کہ اس کی پیدا کی ہوئی دنیا کے مالک دوسرے بن بیٹھیں! اور تم نے یہ کس طرح جائز سمجھا کہ اس کی اجازت کے بغیر دوسروں کو اس کی حکومت اور اس کے حقوق میں شریک بنا دو! یہ امر یہاں واضح رہے کہ مشرکینِ عرب ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ اس وجہ سے اس دلیل کی بنیاد ایک ایسی حقیقت پر ہے جو ان کے نزدیک بھی مسلّم تھی۔

اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ 'اَثَارَةٌ' اس

روایت کو کہتے ہیں جو سلف سے منقول ہوتی چلی آ رہی ہو۔ الاثارۃ البقیۃ من العلم تؤثر وھم علی اثارۃ من العلم ای بقیۃ منہ یاثرونھا من الاوّلین (اقرب الموارد) اس کے ساتھ 'مِنْ عِلْمٍ' کی قید اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اس روایت کی بنیاد محض وہم وگمان پر نہیں بلکہ علم پر ہو۔

خدا کی گواہی کے معلوم کرنے کا قابل اعتماد ذریعہ

یعنی اگر تم مدعی ہو کہ خدا نے تمہارے معبودوں کو اپنی خدائی میں شریک بنایا ہے تو اپنے اس دعوے کی سچائی ثابت کرنے کے لیے یا تو اس قرآن سے پہلے کی کوئی کتاب پیش کرو یا کوئی ایسی روایت جس کی بنیاد وہم وگمان پر نہیں بلکہ علم پر ہو۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں؟ اس باب میں اصلی گواہی خود خدا ہی کی ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنا شریک کسی کو بنایا ہے یا نہیں اور بنایا ہے تو کس کو؟ خدا کی گواہی کو جاننے کا واحد ذریعہ اس کی نازل کردہ کتابیں ہیں یا وہ روایات و آثار جو اس کے نبیوں اور رسولوں سے صحیح طور پر سلف سے خلف کو منتقل ہوئے۔ فرمایا کہ اس طرح کی کوئی چیز ہو تو اس کو پیش کرو محض وہم کی بنیاد پر ایک ہوائی قلعہ تعمیر کر کے اپنی عاقبت نہ خراب کرو۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ علم یا تو اس کی کتابوں کے ذریعہ سے خلق کو منتقل ہوا ہے مثلاً تورات و انجیل وغیرہ کے ذریعہ سے یا روایات و آثار کے ذریعہ سے، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی تعلیمات بعد والوں کو روایات ہی کے ذریعہ سے پہنچیں۔ ان ذرائع سے جو علم منتقل ہوا اس میں کہیں شرک کے حق میں کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ تورات، انجیل اور دوسرے صحیفوں میں اگرچہ بہت سی تحریفات ہو چکی ہیں تاہم ان کے اندر شرک کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق جو روایات تورات، انجیل یا دوسرے صحیفوں میں نقل ہوئی ہیں ان میں بھی شرک کا کوئی جز موجود نہیں ہے۔ مشرکین عرب اپنے باپ دادا کے طریقہ پر ہونے کے مدعی ضرور تھے لیکن قرآن کے بار بار کے چیلنج کے باوجود وہ یہ ثابت کرنے سے قاصر رہے کہ ان کے باپ دادا کے طریقہ کی بنیاد کسی شرعی یا عقلی دلیل پر تھی۔ آخر تک وہ یہی کہتے رہے کہ جس طریقے پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اسی پر ہم چلتے رہیں گے، اس سے بحث نہیں کہ انھوں نے یہ طریقہ کہاں سے لیا۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَہٗٓ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَھُمْ عَنْ دُعَآئِہِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوْا لَھُمْ اَعْدَآءً وَّکَانُوْا بِعِبَادَتِہِمْ کٰفِرِیْنَ (۵-۶)

مشرکوں کے معبودوں کی بے حقیقتی اور بے خبری

یہ ان نادانوں کے حال پر اظہار افسوس ہے کہ ان لوگوں سے بڑھ کر گمراہ اور محروم القسمت کون ہو سکتا ہے جو اللہ کے سوا ان سے دعا و فریاد کر رہے ہیں جو قیامت تک ان کو کوئی جواب دینے والے نہیں ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ انھیں خبر بھی نہیں کہ کوئی ان سے دعا و فریاد کر رہا ہے! قیامت

کے دن ان کی طرف سے کوئی مدد ملنا تو درکنار وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان پر لعنت بھیجیں گے۔

مشرکین جن کی پرستش کرتے تھے وہ یا تو فرضی ہستیاں تھیں جن کا کوئی مسمّٰی سرے سے موجود ہی نہ تھا اس وجہ سے ان کے کسی چیز سے باخبر ہونے یا کسی دعا کے قبول کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی وہ ہستیاں جن کی کچھ حقیقت ہے مثلاً ملائکہ یا جنّات جن کی پرستش مشرکین عرب کرتے تھے یا حضرت مسیح علیہ السلام جن کی پرستش عیسائی کرتے تھے وہ تو بذاتِ خود کسی کی دعا و فریاد سے واقف بھی نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ اس کو قبول کر سکیں۔ سورۂ مائدہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قیامت کے دن سوال کرے گا کہ کیا تم نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ مجھ کو اور میری ماں کو معبود بنا لو؟ وہ جواب دیں گے کہ میں ایسی بات کیسے کہہ سکتا تھا جس کا مجھے کوئی حق نہیں تھا! میں نے ان کو وہی بتایا جس کا تو نے مجھے حکم دیا۔ میرے بعد انھوں نے کیا بنایا اس کی خبر مجھے نہیں ہے۔ اس کو تو ہی جانتا ہے۔

سورۂ فرقان میں فرشتوں کا جواب ان الفاظ میں منقول ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ۝ (الفرقان: ۱۷-۱۸)

اور اس دن کو یاد کرو جس دن اللہ ان کو اور ان سب کو جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، اکٹھا کرے گا۔ پس پوچھے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا انھوں نے خود راہ کھوئی؟ وہ جواب دیں گے تو پاک ہے۔ ہمارے لیے یہ زیبا نہ تھا کہ ہم تیرے سوا دوسرے کو کارساز بناتے۔ بلکہ یوں ہوا کہ تو نے ان کو اور ان کے آباء و اجداد کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ وہ تیری یاددہانی بھول بیٹھے اور ہلاک ہونے والے بنے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں تک انبیاء اور صالحین کا تعلق ہے وہ تو ساری ذمہ داری ان لوگوں پر ڈال دیں گے جنھوں نے ان کی تعلیم کے بالکل خلاف ان کو شریک خدا ٹھہرایا اور ان کی پرستش کی۔ رہے دوسرے معبود یعنی جنات و شیاطین وغیرہ تو وہ جس طرح اپنے پرستاروں سے اعلان براءت کریں گے اور ان کے پرستار جس طرح ان پر لعنت کریں گے اس کی تفصیلات مختلف سورتوں میں بیان ہوئی ہیں۔ ان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قیامت کے دن ان کا کچھ نافع ہونا تو درکنار سب سے زیادہ بدتر دشمن اپنے پرستاروں کے وہی ہوں گے۔ سورۂ قصص کی آیات ۶۲ - ۶۴ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ (۷)

قرآن سے فرار کے بہانے

اب یہ ان بہانوں کا ذکر ہو رہا ہے جو قرآن سے فرار کے لیے وہ ایجاد کرتے تھے۔ فرمایا کہ جب ہماری نہایت واضح آیتیں درباب توحید و قیامت ان کو سنائی جاتی ہیں اور ان سے ان کا کوئی جواب نہیں بن آتا تو وہ اس قرآن کے باب میں کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ قرآن کو جادو کہنے کی وجہ کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ قریش کے لیڈروں کے لیے جب اس کی تاثیر و تسخیر کا لوہا مانے بغیر چارہ نہیں رہا تو انھوں نے اپنے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہے تو یہ کلام نہایت پُرزور اور پُرتاثیر لیکن یہ زور و تاثیر اس کے خدائی کلام ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ محض الفاظ کی جادوگری ہے۔

'للحق' کے بعد 'لما جاءھم' کے الفاظ ان کے اس فعل کی شناعت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اس حق کو انھوں نے جادو اس وقت قرار دیا جب کہ وہ ان کے پاس آگیا۔ حق کے بارے میں کوئی مغالطہ اس وقت تک تو بعید نہیں ہے جب تک وہ سامنے نہیں آیا ہے۔ لیکن اس کے سامنے آجانے کے بعد وہی لوگ اس قسم کی باتیں بناتے ہیں جو خود بھی مغالطہ میں رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ ۖ كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۸)

یہ قرآن کے مخالفین کے ایک اور پروپیگنڈے کا حوالہ ہے۔ چونکہ یہ نہایت ہی لغو پروپیگنڈہ تھا جس کا لغو ہونا خود ان لوگوں پر بھی واضح تھا جو اس کے مرتکب ہو رہے تھے اس وجہ سے اس کا ذکر نہایت استعجاب و حیرت کے انداز میں فرمایا ہے کہ اس کا کوئی جواب دینے کے بجائے معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیا ہے کہ اگر تم لوگ میری مخالفت کے جنون میں اس حد تک اتر آئے ہو کہ اپنے ضمیر کے بالکل خلاف مجھے ایک مفتری قرار دینے میں بھی کوئی باک نہیں رہا تو اب تم سے کوئی بحث بے سود ہے۔ اس معاملہ کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا۔

'قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا' مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن ہے تو تمھاری اپنی تصنیف لیکن تم اس کو جھوٹ موٹ خدا کی وحی قرار دے رہے ہو تو ان سے کوئی بحث نہ کرو۔ بس یہ کہہ دو کہ اگر میں نے خدا پر اتنا بڑا افترا کیا ہے تو کوئی چیز مجھے اس کی پکڑ سے نہ بچا سکے گی اور اس وقت تم لوگ میرے کچھ کام آنے والے نہیں بنو گے کہ تم میرے اس جرم کا بار اپنے اوپر

محسوس کرو۔

'هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيْهِ ۔ اَفَاضَ فِي الحديث' کے معنی کی وضاحت دوسرے مقام میں ہم کر چکے ہیں۔ اس کا اصل مفہوم کسی بات میں نکتہ چینی کرتے کرتے اس کو اس حد تک بڑھا دینا ہے کہ رائی پربت بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ تم لوگ جو سخن سازیاں کر رہے ہو اللہ تعالیٰ ان سے اچھی طرح آگاہ ہے اس وجہ سے میں معاملہ اسی کے حوالہ کرتا ہوں۔ وہی فیصلہ فرمائے گا کہ فی الواقع میں کوئی مفتری ہوں اس وجہ سے تم مجھے کوئی وزن نہیں دے رہے ہو یا مجھے ایک راستباز اور امین جانتے ہوئے محض اس وجہ سے مفتری قرار دے رہے ہو کہ میری دعوت تمہارے نفس کی خواہشوں کے خلاف ہے۔

ہٹ دھرموں کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیا جائے

'كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ' اس قضیہ میں اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے مابین گواہی کے لیے کافی ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ جب معلوم ہو کہ فریق مخالف ضد اور دھاندلی پر اتر آیا ہے اور جان بوجھ کر وہ ایک ایسی بات کہہ رہا ہے جو خود اس کے اپنے ضمیر کے بھی خلاف ہے تو ایسی صورت میں واحد چارۂ کار ایک معقول انسان کے لیے یہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ معاملہ اللہ کے حوالہ کر کے بحث ختم کر دے۔ یہ شریفانہ طریقہ بعض اوقات ضدی مخاطبوں کو بھی اپنے رویہ پر نظر ثانی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ وہ اس سے متاثر نہ بھی ہوں جب بھی دعوت کے نقطۂ نظر سے بابرکت طریقہ یہی ہے۔ غیر جانبدار ذہن کے لوگ اس سے ضرور متاثر ہوتے ہیں اور مخالفوں کے دل میں بھی داعی کی عظمت اس کی اس خود اعتمادی کے سبب سے دوچند ہو جاتی ہے۔

'وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ' یعنی میں یہ معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ اس کا فیصلہ ضرور فرمائے گا اور یہ حقیقت سب پر واضح ہو جائے گی کہ میں مفتری ہوں یا تم لوگ جان بوجھ کر حق کو جھٹلانے والے ہو۔ اگر اس فیصلہ میں کچھ دیر بھی ہوئی جب بھی میرے لیے مایوسی اور پریشانی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔ وہ لوگوں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ آخری حد تک مہلت دیتا ہے تاکہ جو توبہ و اصلاح کرنا چاہیں وہ توبہ و اصلاح کر کے اس کی رحمت کے سزاوار بن جائیں۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ؕ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۹)

یعنی اگر تم میری مخالفت اس وجہ سے کر رہے ہو کہ میں تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں اور وہ عذاب دکھا نہیں سکتا جس سے تم کو ڈرا رہا ہوں تو یاد رکھو کہ میں دنیا میں پہلا شخص نہیں ہوں جو رسول بن کر آیا ہو۔ مجھ سے پہلے بھی بہت سے رسول آ چکے ہیں۔ وہ سب بشر ہی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی مافوق بشر نہیں۔ رسولوں کے باب میں سنت الٰہی یہی رہی ہے کہ انسانوں کے اندر رسول ہمیشہ انسانوں ہی کے

اندر سے آئے ہیں اور یہ بات بھی سن لو کہ اگر میں تمھاری طلب کے مطابق عذاب نہیں لا سکتا تو یہ چیز بھی میرے دعوائے رسالت کی نفی نہیں کرتی۔ میں نے رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، خدا یا عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ مجھے خود برملا یہ اعتراف ہے کہ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ کیا معاملہ کرے گا اور نہ یہ علم ہے کہ تمھارے ساتھ کیا معاملہ کرے گا۔ میں تو صرف اس چیز کی پیروی کر رہا ہوں جو مجھے وحی کی جاتی ہے اور اسی سے تم کو بھی آگاہ کر رہا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق تمھارے لیے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ بس اس سے زیادہ نہ میرے اوپر کوئی ذمہ داری ہے اور نہ میں اس سے زیادہ کچھ اور ہونے کا مدعی ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ سے اگر کوئی بحث کرنی ہے تو میرے اصل دعوے سے متعلق کرو، غیر متعلق سوالات چھیڑ کر نہ اپنے آپ کو الجھن میں ڈالو، نہ دوسروں کو۔

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِن كَانَ مِنْ عِندِ ٱللَّهِ وَكَفَرْتُم بِهِۦ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۢ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِۦ فَـَٔامَنَ وَٱسْتَكْبَرْتُمْ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّٰلِمِينَ (۱۰)

یہاں جوابِ شرط محذوف ہے اور یہ حذف اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جوابِ شرط ایسے خوفناک نتائج پر متضمن ہے کہ الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس کتاب کا انکار اور اس کو خدا کے اوپر میرا افترا قرار دے رہے ہو لیکن اگر یہ خدا کی طرف سے ہوئی تب کیا بنے گا!! ساتھ ہی یہ بات بھی تمھارے سوچ لینے کی ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شاہد اس طرح کی چیز کی گواہی دے چکا ہے، وہ تو اس پر ایمان لایا اور تم استکبار کی بنا پر اس سے اعراض کیے جا رہے ہو!

شاہد سے کون مراد ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہد سے کس کی طرف اشارہ ہے۔ اس سوال کے تین جواب ہمارے مفسرین نے دیے ہیں۔

عام رائے تو یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلامؓ ہیں لیکن ایک دوسرے گروہ نے اس پر یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ عبداللہ بن سلامؓ اس سورہ کے نزول کے بہت بعد مدینہ میں اسلام لائے تو اس مکی سورہ میں ان کے اسلام سے پہلے ہی ان کی گواہی کے حوالہ دینے کے کیا معنی، جب کہ کوئی ادنیٰ قرینہ بھی یہاں اس بات کا نہیں ہے کہ کم از کم اس آیت ہی کو مدنی قرار دیا جا سکے۔

دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے لیکن یہ قول بھی کچھ وزنی نہیں ہے۔ آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کا ذکر قرآن کے حق میں ان کی شہادت ہی کا حوالہ دینے کے لیے مستقلاً، نام کی تصریح کے ساتھ، آ رہا ہے تو یہاں اشارے کی صورت میں ان

کا حوالہ دینے کی کیا ضرورت ہے؟

ایک تیسرے گروہ نے اس کو اسم جنس کے مفہوم میں لے کر اس سے ان عام لوگوں کی شہادت مراد لی ہے جو بنی اسرائیل میں سے قرآن پر ایمان لائے۔ اس گروہ میں ابن کثیرؒ بھی شامل ہیں لیکن یہ قول بالکل ہی بے بنیاد ہے۔ اس کو اسم جنس کے مفہوم میں لینا قواعد زبان کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن ہم اس غیر ضروری بحث میں یہاں پڑنا نہیں چاہتے۔ اسلوب کلام بیان خود شاہد ہے کہ نکرہ تفخیم شان کے لیے ہے نہ کہ تحقیر و تعمیم کے لیے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ اشارہ کسی ایسے شاہد کی طرف ہو جس کی شخصیت اور شہادت دونوں کا مرتبہ ایسا ہو کہ اس کو بطور ایک دلیل کے پیش کیا جا سکے۔

ہمارے نزدیک یہ اشارہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی طرف ہے۔ اس کے وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی بعثت کا خاص مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ میں آنے والے کی راہ صاف کرنے آیا ہوں۔ آپ کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ آخری نبی بھی ہیں اور آخری رسول بھی۔ اس وجہ سے اس آنے والے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو مراد لینے کی کوئی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے۔ انجیلوں کا مطالعہ کیجیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ کو حضرت مسیح کی بشارت دینے کے لیے مبعوث فرمایا اسی طرح حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا کہ وہ آنے والے کی راہ صاف کریں۔ انجیلوں میں اصل مضمون جو گوناگوں اسلوبوں سے سامنے آتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ہی ہے۔ استاذ امامؒ نے خاص اس موضوع پر انگریزی میں ایک رسالہ لکھا ہے کہ انجیلوں کا اصل مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور تعارف ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے جس آسمانی بادشاہت کا بار بار ذکر کیا ہے اور اس کی جو تمثیلیں بیان فرمائی ہیں وہ تمام تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی دعوت ہی پر منطبق ہوتی ہیں۔

۲۔ دوسری اہم چیز یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اگرچہ تورات اور زبور وغیرہ میں بھی ہے جن کے حوالے ہم پچھلی سورتوں میں نقل کر آئے ہیں لیکن حضرت مسیح علیہ السلام نے نام کی تصریح کے ساتھ آپ کی بشارت دی ہے۔ سورۂ صف میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے۔

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ	اور یاد کرو جب کہ عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل
يَٰبَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ إِنِّي رَسُولُ ٱللَّهِ	میں اللہ کی جانب سے تمہاری طرف رسول ہو کر آیا ہوں،
إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ	مصداق بن کر ان پیشین گوئیوں کا جو میرے پہلے
مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُولٍ يَأْتِي	تورات میں موجود ہیں اور خوش خبری دیتا ہوا ایک
مِنۢ بَعْدِي ٱسْمُهُۥٓ أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا	رسول کی جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہوگا۔

جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (الصف: ۶)
پس جب وہ کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

قرآن نے اس آیت میں جس بشارت کا حوالہ دیا ہے وہ انجیلوں میں موجود ہے۔ بعض انجیلوں میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کی تصریح بھی بار بار وارد ہوئی ہے۔ مثلاً برنباس کی انجیل میں — عیسائی اسی وجہ سے اس انجیل کو مستند نہیں مانتے لیکن اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا، دوسری انجیلوں میں بھی آپ کا حوالہ موجود ہے۔ اگرچہ نام غائب کر کے صرف صفات کا حوالہ باقی رہنے دیا گیا ہے اور ترجموں کے ذریعہ سے ان صفات کو بھی مسخ و محرف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم جو شخص ایمان داری کے ساتھ ان پر غور کرے گا وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا ان کا مصداق نہیں ہو سکتا۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے۔ ان شاء اللہ سورۂ صف کی تفسیر میں اس مسئلہ پر ہم مفصل بحث کریں گے۔

۳- تیسری چیز یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی پیشین گوئیوں میں قرآن، قرآن کی دعوت، اس دعوت کے مزاج، دنیا پر اس دعوت کے غلبہ اور اس غلبہ کے مراحل و مدارج کا نہایت صاف الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم بعض چیزوں کا حوالہ دے چکے ہیں۔ آگے سورۂ فتح کی آیت ۲۹ کے تحت بھی ہم اس مسئلہ پر بحث کرنے والے ہیں۔ قارئین کے اطمینان کے لیے بعض حوالے یہاں بھی ہم نقل کرتے ہیں۔

"یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے؟ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔" متی: باب ۲۱: ۴۲-۴۴

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔" یوحنا: باب ۱۴: ۱۶

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" یوحنا: باب ۱۴: ۳۰

اسلامی دعوت کے تدریجی فروغ کی طرف بھی متعدد تمثیلوں میں اشارے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک تمثیل جس کی طرف سورۂ فتح میں قرآن نے بھی اشارہ کیا ہے، یہ ہے۔

"اس نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانے کی مانند

ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے مگر جب
بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر
اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں۔" متی، باب ۱۳: ۳۱-۳۲

۴۔ چوتھی اہم چیز یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس واضح شہادت کا یہ اثر تھا کہ عیسائیوں میں سے جو لوگ اصل نصرانیت پر قائم رہے یعنی ان کے خلیفہ صادق شمعون کے پیرو، وہ قرآن کے نزول کے بعد بڑے جوش و خروش سے اس پر ایمان لائے اور قرآن نے نہایت شاندار الفاظ میں ان کی تعریف کی ہے۔ سورۂ مائدہ میں اس گروہ کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۔ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۔ (المائدة: ۸۲-۸۳)

تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور اہل ایمان کی محبت میں سب سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان میں علماء اور راہب ہیں اور وہ تکبر کرنے والے نہیں ہیں۔ یہ لوگ جب اس چیز کو سنتے ہیں جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو حق کو پہچان لینے کے سبب سے تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے رب ہم ایمان لائے تو ہم کو حق کی گواہی دینے والوں میں لکھ۔

تدبر قرآن میں ان آیات کی تفسیر غور سے پڑھ لیجیے۔ نصاریٰ کی تاریخ سے لوگ اچھی طرح واقف نہیں ہیں اس وجہ سے ان آیات کا صحیح مفہوم ان پر واضح نہیں ہو سکا۔ یہ پال کے پیروؤں کی تعریف نہیں ہے بلکہ شمعون کے پیروؤں کی ہے۔ پال کے پیرو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے بھی نہیں۔ وہ اس لفظ کو حقیر سمجھتے ہیں اور اس کی جگہ انھوں نے اپنے لیے مسیحی کا لفظ اختیار کیا ہے۔ شمعون کے پیرو بے شک اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے تھے۔ یہ لوگ اس شہادت کے حامل رہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام نے آخری رسول کی بعثت کے باب میں دی تھی اور جب وقت آیا تو انھوں نے پورے جوش و خروش اور نہایت سچے جذبۂ ایمانی کے ساتھ اس کی شہادت دی۔ اسی چیز کی طرف رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اس تکبر میں مبتلا نہیں ہوئے جس میں پال اور اس کے پیرو مبتلا ہوئے اس وجہ سے اسلام کی دولت سے بہرہ مند ہوئے۔ انہی لوگوں کے باب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ "مبارک ہیں وے جو دل کے غریب

ہیں، آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے۔" اوپر سورۂ مائدہ کی آیت میں وَاَنَّھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ کے الفاظ سے ان کے اسی وصف کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی شہادت کی نوعیت ایک عام شہادت سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی بعثت ہی خاص اس مقصد سے ہوئی تھی کہ وہ آپ کی راہ صاف کریں اور خلق کو اس آسمانی بادشاہی کی بشارت دیں جس کا آپ کے ذریعہ سے ظہور ہونے والا تھا۔ اس حوالہ سے قرآن نے مشرکین پر بھی حجت قائم کی ہے اور اہل کتاب پر بھی۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ دعوت کے اس دور میں قریش کو اہل کتاب کی پشت پناہی بھی حاصل ہو گئی تھی اس وجہ سے ان کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ قرآن نے یہاں یہی دکھایا ہے کہ اسلام کی مخالفت کے جنون میں آج یہودی اور مسیحی جو حرکتیں چاہیں کریں لیکن بنی اسرائیل کا ایک عظیم شاہد اس حق کی نہایت آشکارا الفاظ میں شہادت دے چکا اور اس پر ایمان لا چکا ہے۔ اس کے ایمان اور اس کی شہادت کے بعد جو لوگ محض استکبار کی بنا پر اس حق کی مخالفت کر رہے ہیں وہ اپنا انجام اچھی طرح سوچ لیں۔

'اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ'۔ یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اس کتاب میں بار بار ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کبھی راہ یاب نہیں کرتا جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اور اس کی بخشی ہوئی روشنی کی ناقدری کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس نے عقل کی رہنمائی اور آفاق و انفس کی گواہی کے ساتھ ساتھ اپنے نبیوں اور رسولوں کی شہادت کے ذریعہ سے بھی حق کو بالکل آشکارا کر دیا۔ اب جو لوگ ان ساری چیزوں کو ہدایت کا ذریعہ بنانے کے بجائے ان کو اپنی ضلالت کا ذریعہ بنانے کی کوشش کریں ایسے لوگوں کو ہدایت کی راہ پر لا کھڑا کرنا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو وہ بھٹکنے ہی کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَوْ کَانَ خَیْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَیْہِ ط وَاِذْ لَمْ یَھْتَدُوْا بِہٖ فَسَیَقُوْلُوْنَ ھٰذَآ اِفْکٌ قَدِیْمٌ (۱۱)

منکرین کے استکبار کی — اوپر والی آیت میں ان منکرین کے جس استکبار کا حوالہ ہے یہ اس کی وضاحت ہے کہ ان ظالموں کی رعونت کا حال یہ ہے کہ اس حق کے خلاف ایک دلیل وہ یہ بھی لاتے ہیں کہ اس کو سب سے پہلے غریبوں نے قبول کیا ہے چنانچہ ان کے اغنیاء کہتے ہیں کہ اگر اس نئے دین میں کوئی خیر ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ فقیر لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت کر جاتے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی کوئی اور نعمت تو ان کے حصہ میں آئی نہیں تو یہ چیز اگر فی الواقع کوئی نعمت ہوتی تو یہ اس کی طرف سبقت کرنے والے نہ بنتے بلکہ ہم ہی اس کی طرف بھی سبقت کرتے۔ ان کا اس کی طرف سبقت کرنا دلیل ہے کہ اس میں کوئی

خیر نہیں ہے بلکہ یہ انہی چیزوں میں سے ہے جن کے درپے ادنیٰ درجے کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔

'وَاِذْ لَمْ یَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَیَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِیْمٌ' یعنی اب جبکہ اس روشنی سے ہدایت حاصل کرنے کے بجائے انھوں نے گمراہی اور خیرگی ہی حاصل کی ہے تو جو کچھ انھوں نے کہا ہے صرف اسی پر بس نہیں کریں گے بلکہ یہ بھی کہیں گے کہ یہ کوئی نیا جھوٹ نہیں ہے بلکہ یہ جھوٹ قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے، ہر دور میں کچھ لوگ رہے ہیں جو اسی قسم کے ڈراوے سنا کر لوگوں پر اپنی دھونس جماتے رہے ہیں لیکن ان کی بات آج تک سچی ثابت نہیں ہوئی۔ جس قیامت سے انھوں نے ڈرایا نہ وہ آئی نہ کبھی آئے گی۔ اس طرح کے لوگوں کا جھوٹ اب بالکل کھل چکا ہے اس وجہ سے ہم ان کی دھونس میں آنے والے نہیں ہیں۔

'اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا' سے قرینہ دلیل ہے کہ یہاں کفار کے اغنیاء مراد ہیں جن کے استکبار کا اوپر والی آیت میں ذکر ہوا ہے۔ 'لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' سے یہاں غربائے مسلمین مراد ہیں اور 'ل' یہاں 'فِیْ' کے مفہوم میں ہے یہ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

'وَاِذْ لَمْ یَهْتَدُوْا بِهٖ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ جب انھوں نے ایک بالکل واضح حق کا انکار کیا ہے تو اپنے ضمیر کو تسلی دینے اور لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے انھیں اور بھی باتیں بنانی پڑیں گی چنانچہ وہ یہ بھی کہیں گے کہ یہ جھوٹ تو بہت پرانا جھوٹ ہے۔ اس کو پرانا جھوٹ قرار دینے میں دلیل کا پہلو، ان کے زعم کے مطابق یہ ہے کہ اس کا جھوٹ ہونا بالکل ثابت ہو چکا ہے۔ اگر قیامت آنے والی ہے تو آخر وہ کہاں غائب ہے! ایک مدت دراز سے اس کا چرچا ہے لیکن جہاں تک اس کے ظہور کا تعلق ہے ہنوز روزِ اول ہے۔

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا لِّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِیْنَ (۱۲)

قرآن کے حق میں تورات کی شہادت کا حوالہ

یہ قرآن کے حق میں تورات کی شہادت کا حوالہ ہے اگرچہ زمانی ترتیب کے لحاظ سے اس کا ذکر مقدم ہونا تھا لیکن ان خاص وجوہ سے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا، حضرت مسیحؑ کی شہادت کا ذکر پہلے آیا۔ اب یہ تورات کا حوالہ دے کر اس شہادت کے تسلسل کو ظاہر فرما دیا کہ اس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب بھی 'امام' اور 'رحمت' بن کر آ چکی ہے۔ 'امام' کے معنی رہنما کے ہیں۔ یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو قرآن کے باب میں 'هُدًى وَّرَحْمَةً' کے الفاظ سے ارشاد ہوئی ہے اور ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ دونوں الفاظ دنیا اور آخرت دونوں کو پیش نظر رکھ کر استعمال ہوئے ہیں۔ اللہ کی کتاب دنیا میں رہنمائی کرتی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس کی اصل حیثیت امام کی ہے۔ جس طرح امام کی اقتدا لازمی ہے اسی طرح زندگی کے معاملات میں اس کتاب کی اقتدا واجب ہے۔ اگر

اس کی یہ حیثیت باقی نہ رہے تو خواہ زبان سے اس کا کتنا ہی احترام کیا جائے اور اس کو کتنا ہی چوما چاٹا جائے لیکن یہ ساری باتیں عنداللہ بے سود ہیں۔

قرآن تورات کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے

'وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا': یہ قرآن کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن عربی زبان میں تورات کی پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر نازل ہوا ہے۔ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کے باب میں شہادت دی ہے اسی طرح اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس کی پیشین گوئی کر چکے ہیں۔ یہ پیشین گوئیاں اپنے مصداق کی منتظر تھیں۔ قرآن کے نزول سے یہ مصداق سامنے آگیا اور اس طرح قرآن نے تورات کی تصدیق کر دی۔

عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ قرآن چونکہ تورات کو ایک آسمانی کتاب تسلیم کرتا ہے اس وجہ سے قرآن بھی ایک آسمانی کتاب ہوا۔ یہ بات بالکل لاطائل ہے۔ قرآن اگر تورات کو ایک آسمانی کتاب مانتا ہے تو یہ تورات کے آسمانی ہونے کی ایک دلیل تو بے شک ہوئی لیکن اس سے قرآن کا آسمانی ہونا کیسے ثابت ہو جائے گا؟ قرآن کے آسمانی ہونے کی تصدیق تورات کی زبان سے تو اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کے اندر قرآن اور اس کے حامل سے متعلق پیشین گوئیاں ہوں اور قرآن کے نزول اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ان پیشین گوئیوں کی اس طرح تصدیق ہو جائے کہ کسی منصف کے لیے اس سے انکار کی گنجائش باقی نہ رہے بلکہ ہر دیانتدار اور غیر جانبدار آدمی پکار اٹھے کہ بےشک ان پیشین گوئیوں کا حقیقی مصداق سامنے آگیا اور اس مصداق نے ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اسی پہلو سے پچھلے صحیفوں کا مصداق کہا ہے، نہ کہ اس پہلو سے جو لوگوں نے عام طور پر سمجھا ہے۔ قرآن ان صحیفوں کا آسمانی ہونا تو بے شک مانتا ہے لیکن ساتھ ہی ان کے محرف ہونے کا بھی اعلان کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ تصدیق مطلق نہیں بلکہ اس خاص مفہوم میں ہے جس کی ہم نے اوپر وضاحت کی ہے۔ اس مفہوم کے لیے لفظ تصدیق کا استعمال عربی میں معروف ہے۔ اس کے محل میں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

'لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا': یہ اہل عرب پر احسان کا اظہار بھی ہے اور اس میں تورات کی بعض پیشین گوئیوں کی طرف اشارہ بھی ہے۔ اہل عرب پر احسان کا پہلو تو واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب عربی میں نازل فرما کر ان کی زبان کی عزت بڑھائی، اس کو بقائے دوام کی سند عطا فرمائی، ان کو اپنے دین کی ترجمانی اور اس کی گواہی کے لیے چنا اور ان کے ہر عذر کا خاتمہ کر دیا۔

سابق پیشین گوئیوں کی طرف اس میں اشارہ کا پہلو یہ ہے کہ تورات میں آخری رسول سے متعلق یہ بات موجود ہے کہ اس کی بعثت امیوں یعنی بنی اسماعیل میں ہوگی۔ ان امیوں کی زبان ظاہر

ہے کہ عربی تھی اس وجہ سے ان کی زبان کا حوالہ گویا خود ان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

'لِیُنْذِرَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا' یہ اس کتاب کے نزول کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس لیے اتارا ہے کہ جن لوگوں نے شرک و کفر میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو اس کے انجام سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ جو اپنی اصلاح کرنی چاہیں وہ آخری نتائج کے سامنے آنے سے پہلے پہلے اپنی اصلاح کر لیں۔

قرآن کا اصل مقصد

'وَبُشْرٰی لِلْمُحْسِنِیْنَ' یہ اس کتاب کا دوسرا مقصد بیان ہوا ہے اور چونکہ اصل مقصود یہی ہے اس وجہ سے اس کا ذکر بشکل اسم ہے۔ فرمایا کہ یہ عظیم اور دائمی خوش خبری ہے خوب کاروں کے لیے۔ 'مُحْسِنِیْنَ' یہاں 'اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا' کے مقابل میں ہے جس سے لفظ کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی تمام توزن اور صلاحیتوں کی حفاظت کی اور اپنی زندگی کو اپنے خالق کے حدود و قیود کے اندر رکھا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ہ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا ج جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۳-۱۴)

'محسنین' کے کردار کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ

یہ اس بشارت کی وضاحت بھی ہے جس کا اوپر والی آیت میں ذکر ہوا اور 'مُحْسِنِیْنَ' کے کردار کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ بھی۔ فرمایا کہ ہمارے جن بندوں نے قرآن کی دعوت حق قبول کر کے یہ اعلان کر دیا ہے کہ ہمارا رب بس اللہ ہی ہے اور اپنے اس اقرار پر وہ تمام مخالفتوں سے بالکل بے خوف ہو کر ڈٹ گئے ہیں ان کے لیے ابدی جنت کی بشارت ہے۔ نہ ان کو مستقبل کا کوئی اندیشہ ہو گا اور نہ ماضی کا کوئی غم۔ وہی جنت کے مالک ہوں گے ہمیشہ کے لیے اور یہ چیز ان کو ان کے اعمال کے صلہ میں ملے گی۔

۲۔ آگے آیات ۱۵ــــــ ۲۰ کا مضمون

آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے اس بات کی وضاحت کی جا رہی ہے کہ کس طرح کے لوگوں کو یہ کتاب اپیل کرے گی اور کس طرح کے لوگ ہیں جو اس سے ہمیشہ بیزار ہی رہیں گے۔ اوپر 'اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا' اور 'مُحْسِنِیْنَ' کے الفاظ سے جن دو قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ گویا انہی کی تفصیل ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو لوگ سلیم الفطرت ہیں، جو ہوش گوش رکھنے والے ہیں، جو اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے اور اپنے ماں باپ کے حقوق پہچاننے والے ہیں وہ اپنے رب کے حقوق ادا کرنے والے بھی بنیں گے۔ قرآن کی دعوت ان کو اپیل کرے گی۔ رہے وہ لوگ جو بالکل مادر پدر آزاد زندگی گزارنے والے، اپنی ذمہ داریوں اور حقوق و فرائض سے بالکل بے پروا ہیں ان

سے کسی خیر کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ وہ اپنی ہی راہ چلیں گے اور اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو اس طرح کے لاابالیوں کے لیے مقدر ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۵-۲۰

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ
كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ
أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ
نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا
تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۖ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي
مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٥﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ
مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ
الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿١٦﴾ وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ
أُفٍّ لَكُمَا أَتَعِدَانِنِي أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُونُ
مِنْ قَبْلِي وَهُمَا يَسْتَغِيثَانِ اللَّهَ وَيْلَكَ آمِنْ إِنَّ وَعْدَ
اللَّهِ حَقٌّ فَيَقُولُ مَا هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٧﴾ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ
مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ﴿١٨﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا
عَمِلُوا ۖ وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٩﴾ وَيَوْمَ
يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي
حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ
عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ

ع ۲ ﴿الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ﴿٢٠﴾﴾

ترجمۂ آیات ۱۵-۲۰

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دُکھ کے ساتھ اس کو پیٹ میں رکھا اور دُکھ کے ساتھ اس کو جنا۔ اور اس کو پیٹ میں رکھنا اور اس کو دودھ چھڑانا تیس مہینوں میں ہوا۔ یہاں تک کہ جب وہ پہنچ جاتا ہے اپنی پختگی کو اور پہنچ جاتا ہے چالیس سال کی عمر کو وہ دعا کرتا ہے، اے رب! مجھے سنبھال کہ میں تیرے اس فضل کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمایا اور وہ نیک عمل کروں جو تجھے پسند ہیں۔ اور میری اولاد میں بھی میرے نیک بخت وارث اٹھا۔ میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں سے بنتا ہوں۔ یہ لوگ ہیں جن کے اچھے اعمال کو ہم قبول کریں گے اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے جنت والوں کے ساتھ۔ یہ سچا وعدہ ہے جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔ ۱۵-۱۶

رہا وہ جس نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ تم پر تُف ہے! کیا تم لوگ مجھے اس سے ڈراتے ہو کہ دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا، حالانکہ مجھ سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں! اور وہ اللہ سے فریاد کر رہے ہوتے ہیں کہ تیرا ناس ہو! ایمان لا، اللہ کا وعدہ شدنی ہے! پس وہ جواب دیتا ہے کہ یہ سب محض اگلوں کے فسانے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی وعید پوری ہوئی ان گروہوں کے ساتھ جو ان سے پہلے گزرے جنوں اور انسانوں میں سے۔ بے شک یہ نامراد ہونے والوں میں سے ہوئے! ۱۷-۱۸

اور ان میں سے ہر ایک کے لیے ان کے اعمال کے اعتبار سے درجے ہوں گے (تاکہ اللہ کا وعدہ پورا ہو) اور تاکہ وہ ان کے اعمال ان کو پورے کر دے اور ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اور اس دن کو یاد رکھو جس دن کفر کرنے والے جہنم کے سامنے لائے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنے حصہ کی اچھی چیزیں دنیا کی زندگی میں لے اور برت چکے تو آج تم ذلت کا عذاب بدلے میں پاؤ گے بوجہ اس کے کہ تم زمین میں بغیر کسی حق کے گھمنڈ کرتے رہے اور بوجہ اس کے کہ تم نافرمانی کرتے رہے۔ ۱۹-۲۰

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ
وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً
قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ
صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۖ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۱۵)

ایک سلیم الفطرت کے اندر حقوق کے شعور کا ارتقاء

یہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وضاحت ہو رہی ہے اس بات کی کہ ایک سلیم الفطرت اور صحیح المزاج انسان کے اندر حقوق و فرائض کے شعور کا فطری ارتقا کس طرح ہوتا ہے یا کس نہج پر اس کو ہونا چاہیے۔ فرمایا کہ ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی ہے۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر بھی ودیعت فرمائی ہے اور اسی کی تعلیم اس کے تمام نبیوں اور نیک بندوں نے بھی دی ہے۔ یہ حقیقت تمام مذاہب و ادیان میں ابتداء سے مسلّم رہی ہے کہ خدا کے بعد انسان پر سب سے بڑا حق اس کے ماں باپ ہی کا ہے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہے کہ جہاں تک شعور میں آنے کا تعلق ہے ماں باپ کا حق سب سے پہلے شعور میں آتا ہے۔ پھر اسی حق کے شعور سے انسان خدا اور اس کے حقوق کے شعور تک ترقی کرتا ہے۔ جب تک انسان بچہ رہتا ہے اس وقت تک وہ سب کچھ ماں باپ ہی کو سمجھتا ہے اس لیے کہ وہ جو کچھ بھی پاتا ہے انہی سے پاتا ہے لیکن جب وہ سن رشد کو پہنچتا ہے تو اس پر یہ حقیقت واضح ہوتی

ہے کہ اصل منعم و پروردگار وہ ہے جس نے ماں باپ کو بھی وجود بخشا۔ اس طرح وہ ماں باپ کی انگلی پکڑ کر خدا تک پہنچ جاتا ہے اور اس کے اندر ماں باپ کے حق سے بھی بڑے حق کا شعور بیدار ہوتا ہے اور یہی دو حق انسان پر سب سے بڑے ہیں اور پھر انہی دو سے بہت سے حقوق کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔

ماں باپ کا حق اولاد پر یہ ہے کہ جب اولاد ہاتھ پاؤں والی ہو جائے اور ماں باپ بڑھاپے کو پہنچیں تو وہ ان کو اپنے اوپر ایک بوجھ نہ محسوس کرے بلکہ یاد رکھے کہ ایک دن وہ ان کی گود میں ایک مضغۂ گوشت کی شکل میں ڈالا گیا تھا لیکن انھوں نے بوجھ سمجھنے کے بجائے اس کو اپنی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور سمجھا اور پال پوس کر اس کو جوان کیا۔ ان کے اس احسان کا حق یہ ہے کہ وہ اپنی اطاعت اور مہر و محبت کے بازو ان کے لیے ہمیشہ جھکائے رکھے۔ نہ ان کی کسی خدمت کو اپنے اوپر بار سمجھے نہ زبان سے کبھی ان کے لیے بیزاری کا کوئی کلمہ نکالے۔

ماں کی جاں بازیاں اپنی اولاد کے لیے

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا۔ یہ ان چند جاں بازیوں اور قربانیوں کی طرف اشارہ ہے جو ہر ماں کو اپنی اولاد کے لیے لازماً کرنی پڑتی ہیں۔ اس اشارے سے مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ کوئی اولاد خواہ کچھ ہی کر ڈالے لیکن وہ اپنے ماں باپ کے احسان کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ فرمایا کہ اس کی ماں مہینوں نہایت دکھ کے ساتھ اس کو اپنے پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہے، پھر وہ جان کی بازی کھیل کر اس کو جنتی ہے۔ اس کے بعد اس کی رضاعت کا دور آتا ہے اور پورے دو سال وہ اپنے خون کو دودھ بنا کر اس کو پلاتی اور پرورش کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کون ہے جو اس کے لیے اتنے دکھ خوشی خوشی جھیل سکے؟ پھر یہ کتنی بڑی ناسپاسی ہوگی اولاد کی اگر وہ اس احسان کو بھول جائے اور جب ماں باپ اس کے احسان کے محتاج ہوں تو ان سے بے پروائی برتے!

یہاں ایک بات قابلِ توجہ ہے کہ حسنِ سلوک کا مطالبہ تو ماں باپ دونوں ہی کے لیے کیا گیا ہے لیکن تین قربانیاں جو مذکور ہوئی ہیں وہ صرف ماں ہی کی ہیں، باپ کی کسی قربانی کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ اس کے وجوہ ہمارے نزدیک مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ فی الواقع اولاد کی ابتدائی پرورش و پرداخت میں جو حصہ ماں کا ہوتا ہے وہ باپ کا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدمت کے معاملے میں ماں کا حق باپ کے بالمقابل تین گنا رکھا ہے۔ یہ حدیث اسی آیت پر مبنی ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ماں کا تعلق جنسِ ضعیف سے ہے۔ اس کا یہ پہلو بھی متقاضی ہے کہ اولاد اس کی خدمت و اطاعت باپ سے بھی زیادہ کرے۔

۳- تیسری وجہ یہ ہے کہ باپ سے بالعموم اولاد کا مادی مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ ان کو اس سے جائداد و املاک وراثت میں ملنے والی ہوتی ہیں اس سبب سے اس کے معاملے میں کوتاہی یا نافرمانی کا اندیشہ کم ہے برعکس اس کے ماں سے عام حالات میں اس طرح کی توقع کم ہی ہوتی ہے اس وجہ سے وہ لوگ ماں کی حقیقی قدر نہیں کرتے جن کے اندر اس کی قربانیوں کا صحیح شعور نہیں ہوتا۔

ایک لطیف استنباط

'وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا' سے بعض فقہائے صحابہؓ نے یہ استنباط بھی کیا ہے کہ وضع حمل کی اقل مدت چھ مہینے ہے۔ اس لیے کہ یہاں حمل اور رضاعت دونوں کی مدت تیس مہینے بتائی گئی ہے اور قرآن کے دوسرے مقام میں یہ تصریح ہے کہ مدتِ رضاعت پورے دو سال ہے۔ اگر ان تیس مہینوں میں سے دو سال نکال دیے جائیں تو حمل کے چھ مہینے بچتے ہیں جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اقل مدتِ حمل چھ ماہ ہے۔ یہ استنباط لطیف ہے اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ جیسے اکابر صحابہ اس سے متفق ہیں۔

ماں باپ کے حقوق کا شعور خدا کے حقوق کے شعور کے لیے نشانِ راہ ہے

'حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ..... الآیۃ' یعنی جو شخص اپنے ماں باپ کے حقوق پہچانتا ہے وہ جب جوانی اور عمر کی پختگی کو پہنچتا ہے تو اس کی طبیعت کی یہ سلامت روی لازماً اس کے اندر ربِ حقیقی کے حق کا شعور بھی بیدار کر دیتی ہے۔ وہ ماں باپ کی شفقت و محبت اور ان کی پرورش و پرداخت کے اندر اپنے اصل خالق کی مہر و محبت اور اس کی ربوبیت کی ایک جھلک لیتا ہے اور یہیں سے اسے اس پروردگارِ حقیقی تک پہنچنے کی راہ مل جاتی ہے جس نے اس کی پرورش کے لیے ماں باپ کا سایۂ عاطفت مہیا فرمایا۔ گویا ایک حق کا احساس اس کو دوسرے اس سے بڑے حق کے ادا کرنے کے لیے اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ اگر کسی کے اندر ماں باپ کے حقوق کا احساس بیدار نہ ہو تو اس کی رسائی خدا کے حقوق تک نہیں ہو سکتی۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے نشانِ راہ دراصل ماں باپ کے حقوق ہی ہیں۔ جس نے اس دروازے کو نہیں کھولا اس کے لیے آگے کی راہ مسدود ہی رہے گی۔

فرمایا کہ اس طرح کا سلیم الفطرت انسان جب اپنی پختگی، خاص کر چالیس سال کی عمر کو، پہنچتا ہے تو وہ اپنے رب سے یہ دعا کرتا ہے کہ اے رب، تو مجھے سنبھال کہ میں تیری ان عنایات کے شکر کی توفیق پاؤں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمائیں اور ایسے نیک عمل کروں جو تجھے پسند ہیں اور میری اولاد میں بھی میرے صالح وارث اٹھا، میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں سے بننے کا عہد کرتا ہوں۔

اس شعور کے بیدار ہونے کا اصلی وقت تو جوانی یا سنِ رشد ہے جس کو یہاں 'بَلَغَ اَشُدَّهٗ' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے لیکن رشد کے پیدا ہونے میں اصلی عامل کی حیثیت صرف عمر ہی کو حاصل نہیں ہے بلکہ اس میں ماحول، تربیت اور دوسرے عوامل کو بھی بڑا دخل ہے اس وجہ سے ہر شخص کے

لیے کوئی ایک عمر رشد کی معین نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ ہمارے علماء کے درمیان اس باب میں اختلاف ہوا ہے اور اس اختلاف کے لیے معقول وجوہ موجود ہیں۔ میرے نزدیک اللہ تعالیٰ نے ہماری طبیعت کی کمزوریوں کا لحاظ کر کے اس میں وسعت رکھی ہے اور چالیس سال کی عمر (وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً) کا ذکر یہاں اس کی آخری حد کی حیثیت سے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جوانی کو پہنچ جانے کے بعد یہ شعور ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر بیدار ہو جانا چاہیے۔ کسی کے اندر اگر بعض موانع کے سبب سے بیدار نہ ہو یا پوری طرح بیدار نہ ہو تو چالیس سال کی عمر کو پہنچ کر تو اس کو لازماً بیدار ہو جانا چاہیے۔ اس عمر کو پہنچ کر بھی اگر کسی کے اندر یہ بیدار نہ ہو تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ اس شخص نے اپنی فطرت بگاڑ لی ہے۔

اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ رب رحیم و کریم نے ہماری طبیعت کی کمزوریوں کا لحاظ کر کے چالیس سال کی عمر تک فی الجملہ رعایت رکھی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ اس عمر تک جذبات و خواہشات کا نفس پر غلبہ ہوتا ہے۔ آدمی اگر اپنی اصلاح کی کوشش کرتا بھی ہے تو بسا اوقات خواہشوں اور جذبات سے مغلوب ہو کر راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے۔ چالیس سال کے بعد جذبات و خواہشات کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر آدمی ان کو غلط طریقہ پر بہنے سے پرہیز کرنے کی کوشش نہ کرے تو وہ اپنے رہوارِ نفس کو قابو میں کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے بعد اسے کسی مزید الاؤنس کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہاں جو بات فرمائی گئی ہے عام انسانی فطرت اور عام انسانی ماحول کو پیش نظر رکھ کر فرمائی گئی ہے، ایک خالص اسلامی معاشرہ اور اسلامی ماحول کو پیش نظر رکھ کر نہیں فرمائی گئی ہے۔ ایک بگڑے ہوئے معاشرہ کے اندر مزاحمتیں زیادہ ہوتی ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ خاص رعایت فرماتا ہے جو اس طرح کے معاشرے کے اندر اپنی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اسلامی معاشرہ میں یہ مزاحمتیں نہیں ہوتیں اس وجہ سے اس میں لوگوں کی مسئولیت بھی زیادہ ہے۔

توفیق رشد کی دعا

'اَوْزِعْنِیْٓ' کی وضاحت سورۂ نمل کی تفسیر میں ہم کر چکے ہیں۔ اس کے معنی ہیں 'مجھے روک۔ مجھے تھام' 'مجھے سنبھال۔' یعنی اب تک تو میں اپنے جذبات کی رو میں بہتا رہا ہوں لیکن اب تو مجھے توفیق دے کہ میں جذبات و خواہشات کی رو میں بہنے کے بجائے تیری ان بے پایاں عنایات کا شکر ادا کر سکوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ یہی شکر کا جذبہ تمام دین و شریعت کی بنیاد ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔

'وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ' شکر کا جذبہ لازماً عمل صالح کا محرک بنتا ہے اور عمل صالح وہ ہے جو نفس کی خواہشوں کی پیروی کے بجائے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے ہو۔ اس راہ میں بعض اوقات آدمی کو یہ مغالطہ پیش آتا ہے کہ وہ ایک کام اپنے گمان کے مطابق، خدا کی رضا جوئی کے لیے کرتا ہے لیکن وہ خدا کی خوشنودی کے بجائے اس کے غضب کا باعث ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کام ہوتی تو بظاہر نیکی کے ہوتے ہیں لیکن

ان کے اندر بدعت یا شرک کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے انسان کو یہ دعا بھی برابر کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کے ان کاموں کی توفیق بخشے جو اس کی پسند کے مطابق ہوں۔

'وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ' یعنی ساتھ ہی وہ اپنی اولاد کے لیے بھی دعا کرتا ہے کہ ان کے اندر بھی اس کے صالح وارث اٹھیں تاکہ دنیا میں بھی اس کے لیے سرخروئی کا باعث ہوں اور آخرت میں بھی ان کی نیکی اس کے لیے شفاعت بن سکے۔ یہی مضمون 'رَبَّنَا ہَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ ..... الآیۃ' والی آیت میں گزر چکا ہے اور ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

'اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ' یہ آئندہ کے لیے اس کا اقرار صالح ہوتا ہے کہ اب میں نے تیری طرف رجوع کیا اور تیرے فرمانبردار بندوں میں سے بننے کا عہد کرتا ہوں۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْہُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِہِمْ فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّۃِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ کَانُوْا یُوْعَدُوْنَ (۱۶)

فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جن کے اچھے اعمال کو ہم قبول اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے۔

'فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّۃِ' حال کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ان کے ساتھ وہ معاملہ ہوگا جو جنت کے مستحقین کے ساتھ ہوگا۔ یہ انہی کے زمرے میں شمار ہوں گے۔

'وَعْدَ الصِّدْقِ' مصدر مؤکد ہے یعنی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ سچا اور پکا وعدہ ہے جس کی خلاف ورزی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

یہ آیت جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، جوانوں، خاص طور پر چالیس سال کی عمر کو پہنچے ہوئے لوگوں کو تشویق و ترغیب بلکہ ایک قسم کی تنبیہ ہے کہ اب ان کے لیے بیدار ہونے کا آخری وقت آگیا ہے اگر اب بھی انھوں نے آنکھیں نہ کھولیں تو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اپنے کو محروم کر لیں گے۔

چالیس سال کی عمر کو پہنچنے والوں کو تنبیہ

وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْہِ اُفٍّ لَّکُمَآ اَتَعِدٰنِنِیْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ ۚ وَہُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰہَ وَیْلَکَ اٰمِنْ ڰ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ ۚ فَیَقُوْلُ مَا ہٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۱۷)

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو بالکل مادر پدر آزاد لاابالیانہ زندگی گزارتے ہیں۔

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ ذکر کر چکے ہیں کہ 'اَلَّذِیْ' جب تمثیل کے لیے آتا ہے تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس سے لازماً کسی خاص شخص ہی کو مراد لیا جائے بلکہ اس سے مراد ہر وہ شخص ہوگا جس پر تمثیل منطبق ہو۔ سورۂ نحل آیت ۹۲ میں اس کی نہایت واضح مثال گزر چکی ہے۔ یہاں بھی یہ عام ہی ہے۔ چنانچہ آگے والی آیت میں اس کا ذکر جمع کے صیغوں ہی سے ہوا ہے۔ جو لوگ عربیت کے اس اسلوب سے آشنا نہیں ہیں وہ ہر جگہ 'اَلَّذِیْ' سے کسی خاص شخص کو مراد لینے کی کوشش کرتے ہیں وہ آیت کے صحیح مفہوم

تمثیل میں 'الذی' سے فرد معین ہونا ضروری نہیں ہے

سے بہت دور نکل جاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی بعض لوگوں نے اس سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فرزند حضرت عبدالرحمانؓ کو مراد لیا ہے۔ اگرچہ مفسرین نے اس قول کو رد کیا ہے لیکن ان کی یہ تردید کسی محکم اصول پر مبنی نہیں ہے اس وجہ سے یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر 'اَلَّذِیْ' معرفہ کے لیے آتا ہے تو اس سے کون مراد ہے؟ ہم نے جو توجیہ کی ہے اس کے بعد یہ سوال نہیں پیدا ہوتا۔

لاابالیانہ روّیہ

یہ اوپر والے گروہ کے متقابل گروہ کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ جو نوجوان بالکل مادر پدر آزاد زندگی گزارتے ہیں ان کو اپنے رویّہ کا جائزہ لینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ ان کے ماں باپ ان کی بے راہ روی پر ان کو ٹوکتے اور خدا و آخرت کی یاد دہانی کرتے ہیں تو وہ ان کو بھی نہایت بے دردی سے جھڑک دیتے ہیں۔ ماں باپ نہایت شفقت اور دردمندی کے ساتھ سمجھاتے ہیں کہ بیٹے! ایمان کی راہ اختیار کر، خدا کا وعدہ شدنی ہے تو وہ ان کو بے وقوف بناتا ہے کہ کیا تم لوگ مجھے اس بات سے ڈراتے ہو کہ مر کھپ جانے کے بعد پھر زندہ کر کے قبر سے نکالا جاؤں گا؟ یہ ایک بالکل مہمل بات ہے۔ نہ جانے کتنی بے شمار خلقت مجھ سے پہلے گزر چکی ہے، ان میں سے کوئی بھی اب تک زندہ ہو کر واپس نہیں آیا تو میں کس طرح باور کروں کہ مرنے کے بعد میں دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا! یہ سب اگلوں کے فسانے ہیں۔ ہر دور میں کچھ لوگ اس طرح کی بے سروپا باتیں کرتے رہے ہیں کہ قیامت آ رہی ہے لیکن قیامت کو نہ آنا تھا، نہ آئی اور نہ کبھی آئے گی۔

'وَيْلَكَ اٰمِنْ'۔ لفظ 'ویل' اگرچہ لعنت کے الفاظ میں سے ہے لیکن بعض مواقع میں یہ دل سوزی، شفقت اور دردمندی کے اظہار کے لیے بھی آتا ہے۔ کلامِ عرب میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ یہاں بھی یہ اسی طرح کے محل میں ہے۔ بعض ماں باپ نہایت دل سوزی کے ساتھ اس کو سمجھاتے ہیں کہ تیرا ناس ہو! ضد نہ کر، بے راہ روی چھوڑ، ایمان کی راہ اختیار کر اور آخرت سے ڈر۔ لیکن وہ ان کی اس شفقت کی قدر کرنے کے بجائے نہایت نفرت کے ساتھ ان کو جھڑک دیتا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ (۱۸)

لاابالیوں کا انجام

یہ ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ یہاں اشارے، ضمیریں اور افعال سب جمع استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ 'اَلَّذِیْ' یہاں 'اَلَّذِیْنَ' ہو گیا ہے۔ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ اوپر والی آیت میں ذکر کسی خاص شخص کا نہیں بلکہ ایک خاص قماش کے لوگوں کا تھا۔ فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی بات پوری ہو گئی۔ 'اللہ کی بات' سے مراد وہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں فرمائی تھی کہ جنوں اور انسانوں میں سے جو بھی تیری پیروی کریں گے میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔ 'فِیْٓ اُمَمٍ' بالکل اسی موقع و محل میں ہے جس محل میں اوپر والی آیت میں 'فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ' ہے۔

مقصود اس سے ان کے زمرے کو بتانا ہے کہ یہ انہی جنوں اور انسانوں کے ساتھی نہیں گے جو ان سے پہلے انہی کی طرح لاابالیانہ زندگی گزار کے اپنی عاقبت برباد کر چکے تھے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۱۹)

'کُلّ' سے مراد یہاں وہی دونوں گروہ ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ فرمایا کہ ان دونوں گروہوں کو ان کے اعمال کے اعتبار سے درجے ملیں گے۔ جنھوں نے اپنے ماں باپ اور اپنے رب کے حقوق پہچانے اور ادا کیے وہ جنت کے مدارج حاصل کریں گے اور جنھوں نے بالکل شتر بے مہار زندگی گزاری وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے دوزخ کے جس طبقہ کے مستحق ہوں گے، اس میں جائیں گے۔ لفظ 'دَرَجَات' یہاں علیٰ سبیل التغلیب استعمال ہوا ہے۔ مذکورہ دونوں گروہوں کا انجام

'وَلِيُوَفِّيَهُمْ' کا معطوف علیہ یہاں محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ ترجمہ میں اس حذف کو میں نے کھول دیا ہے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ (۲۰)

اوپر 'وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا' میں اگرچہ اجمالاً دونوں گروہوں کے نتائج اعمال کا ذکر ہو چکا ہے لیکن یہاں مخاطب خاص طور پر متکبرین قریش ہیں اس وجہ سے ان کے انجام کی وضاحت خاص طور پر فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ اس دن کا خیال کرو جس دن یہ متکبرین جہنم کے سامنے حاضر کیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ تمہارے حصہ میں جو نعمتیں مقدر تھیں وہ تم دنیا میں برت چکے۔ اب تمہارے لیے صرف ذلت کا عذاب ہے اس لیے کہ تم بلا کسی حق کے خدا کی زمین میں تکبر اور اس کے احکام کی نافرمانی کرتے رہے۔

'اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ' کے معنی ہیں تم نے اپنے حصہ کی نعمتیں ختم کر لیں۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں جن لوگوں کو اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے اگر وہ اپنے رب کے شکرگزار رہتے اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتے ہیں تو وہ اپنی آخرت کے لیے بھی نعمتوں کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جو لوگ نعمتیں پا کر استکبار میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کا سارا ذخیرہ یہیں ختم ہو جاتا ہے، آخرت میں صرف ان کا وبال ان کے حصہ میں آئے گا۔

'اِسْتِكْبَار' کے ساتھ 'بِغَيْرِ الْحَقِّ' کا اضافہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ ساری نعمتیں بخشا تو اللہ تعالیٰ ہے تو ان کو پا کر کسی کو اکڑنے اور اترانے کا کیا حق ہے۔ آدمی اترائے تو جب کہ وہ کسی چیز کا خالق ہو اور خدا کے دیے بغیر اس نے محض اپنی ذاتی قابلیت سے کوئی چیز حاصل کی ہو۔

جب ہر چیز خدا ہی کی دی ہوئی ہے تو اترانا بالکل جہل و حماقت ہے اور اس سے بھی بڑی حماقت یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتیں اسی کی نافرمانی میں استعمال کرے۔

۴۔ آگے آیات ۲۱—۲۸ کا مضمون

آگے بالاجمال قوم عاد کی تکذیب اور ان کے انجام کا حوالہ ہے۔ مقصود اس حوالہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا اور قریش کے متکبرین کو تنبیہ کرنا ہے کہ اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو وہ بھی اسی طرح کے انجام سے دوچار ہوں گے جس سے وہ دوچار ہوئے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ آیات
النُّذُرُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا ۲۱-۲۸
اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۲۱﴾ قَالُوا أَجِئْتَنَا
لِتَأْفِكَنَا عَنْ آلِهَتِنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ
الصَّادِقِينَ ﴿۲۲﴾ قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِندَ اللَّهِ وَأُبَلِّغُكُم مَّا أُرْسِلْتُ
بِهِ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ﴿۲۳﴾ فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ
أَوْدِيَتِهِمْ قَالُوا هَٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُم
بِهِ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۲۴﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا
فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿۲۵﴾
وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا إِن مَّكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا
وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ
وَلَا أَفْئِدَتُهُم مِّن شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ
وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿۲۶﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا ع ۳

مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

ترجمۂ آیات ۲۱ - ۲۸

اور عاد کے بھائی کو یاد کرو، جب کہ اس نے اپنی قوم کو احقاف میں آگاہ کیا کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو، میں تم پر ایک ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اور اس کے آگے اور پیچھے آگاہ کرنے والے گزر چکے تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ جھوٹ بول کر ہم کو ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دو تو اگر تم سچوں میں سے ہو تو وہ چیز ہم پر لاؤ جس کی ہم کو دھمکی سنا رہے ہو۔ اس نے کہا کہ اس کا صحیح علم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ میں تو تمہیں وہ پیغام پہنچا رہا ہوں جو دے کر میں بھیجا گیا ہوں۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ بالکل جہالت میں مبتلا ہو۔ ۲۱ - ۲۳

پس جب انھوں نے اس عذاب کو بادل کی شکل میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے دیکھا تو بولے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم کو سیراب کرنے والا ہے! نہیں بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے تم نے جلدی مچا رکھی تھی! یہ باد تند ہے جس میں دردناک عذاب ہے، یہ تہس نہس کر دے گی ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے۔ پس وہ ایسے ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کسی چیز کا بھی نشان باقی نہیں رہا۔ ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ ۲۴ - ۲۵

اور ہم نے ان کے قدم ان رفاہیتوں کے اندر جمائے تھے جن کے اندر تمہارے قدم نہیں جمائے اور ہم نے ان کو کان، آنکھ اور دل دیے لیکن چونکہ وہ اللہ کی آیات

کے منکر رہے اس وجہ سے نہ ان کے کان ان کے کچھ کام آئے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل۔ اور ان کو گھیر لیا اس چیز نے جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے۔ اور ہم نے تمھارے گرد و پیش کی بستیاں بھی تباہ کر دیں اور ان کے لیے اپنی آیتیں گوناگوں پہلوؤں سے پیش کیں تاکہ وہ رجوع کریں۔ تو کیوں نہ ان کی مدد کی انھوں نے جن کو انھوں نے خدا کے تقرب کے لیے معبود بنا رکھا تھا بلکہ وہ سب ان سے کھوئے گئے اور یہ ان کا جھوٹ اور ان کا افترا تھا۔ ۲۶-۲۸

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۲۱)

'أَخَا عَادٍ' سے مراد حضرت ہود علیہ السلام ہیں جو قوم عاد کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ یہ قوم عاد ہی کے ایک فرد تھے اس وجہ سے ان کو عاد کا بھائی کہا۔ رسول کا اپنی قوم کے اندر سے ہونا اتمام حجت کے پہلو سے اپنے اندر گوناگوں اہمیتیں رکھتا ہے جن کی وضاحت ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

'الْأَحْقَاف' لغت میں تو ریگ کے مستطیل تودوں کو کہتے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد وہ ریگستان ہے جو عمان و یمن اور نجد و حضرموت کے درمیان الاحقاف کے نام سے موسوم ہے اور جو قوم عاد کا اصل مسکن رہا ہے۔ اس نام سے ذکر کر کے قرآن نے یہاں اس عظیم تباہی کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس علاقہ پر آئی۔ ظاہر ہے کہ جس دور میں قوم عاد یہاں اپنے عروج پر تھی اس زمانے میں یہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب اور ان عظیم تمدنی کارناموں سے معمور رہا ہو گا جن کے سبب سے قوم عاد کو تاریخ میں ایک خاص شہرت و عظمت حاصل ہوئی۔ لیکن اب وہی مقام ہے جہاں ایک لق و دق صحرا ہے جس کو دیکھ کر کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں تعمیر و تمدن کا بھی کوئی نقش قائم ہوا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ الاحقاف کے نام سے یہ علاقہ عاد کے زوال کے بعد موسوم ہوا ہے جب یہاں شاندار تعمیرات کی جگہ صرف ریت کے ٹیلے رہ گئے۔

'وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ' یہ سلسلۂ کلام کے بیچ میں جملہ معترضہ ہے۔ 'نُذُر' یہاں 'نَذِیْرٌ' کی جمع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام کا انذار کوئی انوکھا انذار نہیں تھا، آگے اور پیچھے کے علاقوں میں بھی اسی طرح کے منذر آچکے تھے اور انھوں نے اللہ کے جس عذاب سے لوگوں کو ڈرایا تھا اس کے آثار بھی موجود تھے لیکن جس طرح اگلوں نے کوئی سبق نہیں لیا اسی طرح ان پچھلوں نے بھی اپنے منذر کے انذار سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

تمام فساد کی جڑ شرک ہے

'اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ' یہ حضرت ہود علیہ السلام کا اصل انذار ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو آگاہ کیا کہ اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی نہ کرو۔ اگر تم اپنی روش سے باز نہ آئے تو مجھے ڈر ہے کہ تم پر ایک ہولناک دن کا عذاب آدھمکے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل فساد کی جڑ شرک ہے جس سے تمام دوسرے فسادات کی شاخیں پھوٹتی ہیں اس وجہ سے اللہ کے رسولوں نے سب سے پہلے اسی سے آگاہ کیا اور اس کا انجام یہ بتایا کہ اگر لوگوں نے اپنی روش کی اصلاح نہ کی تو خدا کے ہولناک عذاب کی زد میں آجائیں گے۔ شرک خدا کی زمین میں اس کے خلاف بغاوت ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ جس قوم پر اپنے رسول کے ذریعہ سے اتمام حجت کر دیتا ہے اور پھر بھی وہ اپنی اس سرکشی سے باز نہیں آتی تو اس کو مزید مہلت نہیں ملتی۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۲)

قوم کی طرف سے عذاب کا مطالبہ اور اس کا جواب

'اِفْک' کے معنی جھوٹ بولنے کے ہیں۔ اس کے بعد 'عَنْ' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ کسی ایسے فعل پر متضمن ہے جس کے معنی پھیرنے اور برگشتہ کرنے کے ہیں۔ یعنی انھوں نے حضرت ہودؑ کے اس انذار کا جواب یہ دیا کہ 'اچھا' آپ اس مقصد سے ہمارے پاس رسول بن کر تشریف لائے ہیں کہ جھوٹ موٹ اپنی رسالت اور ایک عذاب کی دھونس جما کر ہم کو ہمارے معبودوں سے برگشتہ کریں! اگر یہ بات ہے تو وہ عذاب ہمارے اوپر لاؤ جس سے ڈرا رہے ہو، اس کے بغیر ہم تمہارا سچا ہونا تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ڮ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (۲۳)

حضرت ہود علیہ السلام نے ان کے مطالبۂ عذاب کے جواب میں فرمایا کہ تم کو اس عذاب سے آگاہ کر دینے کا حکم مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے آگاہ کر دیا، رہی یہ بات کہ وہ عذاب کب آئے گا اور کس شکل میں آئے گا تو اس کا صحیح علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ نہایت ہی سخت جہالت

میں مبتلا ہو کر جس عظیم خطرے سے تم کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس کے سدباب کی تدبیر سوچنے کے بجائے تم اس کو دعوت دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہو۔ میں اس خطرے کو لانے والا نہیں بلکہ اس سے آگاہ کرنے والا ہوں۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۴)

عذابِ الٰہی کا ظہور اور مجرموں کا حشر

ضمیر مفعول کا مرجع وہی عذاب ہے جس کا اوپر والی آیت میں ذکر ہوا۔ 'عارض' کے معنی بادل کے ہیں اور یہ بیانِ حال کے محل میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس عذاب کے لیے وہ جلدی مچائے ہوئے تھے جب وہ ایک ابر کی شکل میں ان وادیوں کی طرف بڑھتا نظر آیا تو خوش ہو کر بولے کہ یہ ابرِ باراں ہے جو ہماری وادی کو جل تھل کر دے گا! 'بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ' یعنی وہ تو اس کو ابرِ باراں سمجھے لیکن صورتِ حال نے بتایا کہ ابرِ باراں نہیں بلکہ یہ وہ عذاب ہے جس کے لیے وہ جلدی مچائے ہوئے تھے۔ 'رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ' یہ اس عذاب کی نوعیت واضح فرمائی ہے کہ وہ ایک بادِ تند تھی جس کے اندر ایک دردناک عذاب چھپا ہوا تھا۔ اس بادِ تند کو دوسرے مقام میں صرصر سے تعبیر فرمایا ہے جو کئی دن تک ان پر مسلط رہی اور اس نے ان کو بالکل پامال کر کے رکھ دیا۔ سورۂ حاقہ میں اس کا ذکر یوں آیا ہے

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (الحاقۃ: ۶-۷)	اور رہے عاد تو وہ ایک بے قابو بادِ تند سے ہلاک کیے گئے۔ اس کو اللہ نے ان پر مسلط رکھا سات رات اور آٹھ دن اُن کی جڑ کاٹ دینے کے لیے۔ تم دیکھتے کہ وہ اس کے اندر اس طرح پچھڑے پڑے ہیں گویا کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔

تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۲۵)

یہ اس بادِ تند کی تباہ کاریوں کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے اس طرح کا ستھراؤ کر دیا کہ ان کے مکانوں کے آثار کے سوا اور کوئی چیز دیکھنے کے لیے باقی نہیں رہ گئی۔

'كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ' فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ یہ صرف ماضی کی ایک کہانی ہے بلکہ ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ اگر قریش نے بھی وہی روش اختیار کی جو عاد نے اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اللہ کا معاملہ ان کے ساتھ مختلف ہو۔ یہ بھی لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے۔ خدا کا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۲۶)

قریش کو تنبیہ

یہ قریش کو براہِ راست مخاطب کر کے ان کے سامنے وہ سبق رکھا ہے جو اس سرگزشت سے حاصل ہوتا ہے۔ فرمایا کہ اسباب و وسائل کی جو فراوانی اور تعمیر و تمدن کی جو عظمت و شوکت ان کو حاصل ہوئی وہ تم کو حاصل نہیں ہے لیکن دیکھ لو، جب ہم نے ان کو پکڑنا چاہا تو وہ ہماری پکڑ سے اپنے کو بچا نہ سکے! ہم نے ان کو کان، آنکھ اور دل کی تمام صلاحیتیں عطا فرمائیں لیکن چونکہ وہ ہماری آیات کی روشنی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اس وجہ سے ان کے کان، آنکھ، دل ان کے کچھ کام آنے والے نہ بنے بلکہ وہ ساری ذہانت و فطانت رکھتے ہوئے اس عذاب کی گرفت میں آ گئے جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے۔

کان، آنکھ اور دل کی صلاحیتیں آیات الٰہی سے بیدار ہوتی ہیں

اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ کان، آنکھ اور دل کے اندر بھی حقیقی روشنی اللہ تعالیٰ کی آیات ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ آیاتِ الٰہی کے نور سے یہ منور نہ ہوں تو ان کی ساری رسائی صرف محسوسات تک محدود رہتی ہے اور ان محسوسات پر بھی وہ اپنا سارا زور محسوس فوائد ہی کے حاصل کرنے کے لیے صرف کرتے ہیں۔ اس محسوس پرستی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی یہ ساری اصل صلاحیتیں بالکل کند ہو کے رہ جاتی ہیں۔ وہ اشیاء کے محسوس اور مادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو پر نہ غور کر سکتا اور نہ اس پر غور کرنے کی کوئی ضرورت محسوس کرتا حالانکہ غور کرنے کا اصل پہلو وہی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس طرح کے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان کے پاس کان ہیں لیکن وہ سنتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں، ان کے پاس دل ہیں لیکن وہ ان سے سمجھتے نہیں۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۲۷)

قریش کو ایک اور تنبیہ

یہ خطاب بھی قریش ہی سے ہے۔ فرمایا کہ عاد کا قصہ اگر کچھ دور کا سمجھتے ہو تو اپنے ماحول کی بستیوں پر نگاہ ڈالو۔ ان کی آنکھوں اور ان کے دلوں کے پردے ہٹانے کے لیے بھی ہم نے اپنی آیات ان کے سامنے گوناگوں پہلوؤں سے پیش کیں تاکہ وہ اپنے اصل خالق و مالک کی طرف رجوع کریں لیکن انھوں نے بھی ہماری آیات قبول کرنے سے انکار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ یہ اشارہ ان تباہ شدہ بستیوں کی طرف ہے جن پر سے قریش کو اپنے تجارتی سفروں میں گزرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔

فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۸)

ایک سوال

یہ قریش کے سامنے ایک سوال رکھا ہے کہ اگر تمہارا گمان یہ ہے کہ تمہارے یہ دیوی دیوتا تمھیں

خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے تو آخر ان کے معبودوں نے ان کو خدا کے عذاب سے کیوں نہیں بچایا، انھوں نے بھی تو تمھاری ہی طرح ان معبودوں کو خدا کے تقرب کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کیا تھا؟ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ یعنی وہ تو سب عین وقت پر کھوئے گئے، کوئی بھی ان کے کام آنے والا نہ بنا۔

'ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ' یعنی ثابت ہوا کہ یہ سب ان کا جھوٹ اور افترا ئے محض تھا، انھوں نے محض اپنے جی سے ان کو معبود بنایا اور پھر خدا پر یہ بہتان باندھا کہ یہ خدا کے چہیتے ہیں اور اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے۔

'قُرْبَانًا' مفعول لہ ہے۔ یہ مشرکین کے اس عقیدہ کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر ان کے قول مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (ہم ان کو صرف اس خیال سے پوجتے ہیں کہ ہمیں خدا سے زیادہ سے زیادہ قریب کر دیں) میں ہوا ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ مشرکین جن معبودوں کو پوجتے تھے ان کو خلق کا خالق و مالک سمجھ کر نہیں پوجتے تھے بلکہ اس خیال سے پوجتے تھے کہ یہ خدا کے چہیتے ہیں، ان کی عبادت خدا کے تقرب کا ذریعہ ہو گی۔ فرشتوں کے متعلق ان کا جو عقیدہ تھا وہ اس کتاب میں جگہ جگہ زیر بحث آ چکا ہے۔

۶۔ آگے آیات ۲۹ - ۳۵ کا مضمون

آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چند آیات میں تسلی دی گئی ہے کہ اگر تمھاری قوم کے لوگ اس کتاب کی ناقدری کر رہے ہیں تو اس کا غم نہ کرو۔ یہ اس کتاب کا یا تمھارا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ خود ان کی اپنی طبیعت کا فساد ہے ورنہ اس کتاب کی دل کشی اور اثر آفرینی کا حال تو یہ ہے کہ اگر صالحین جن کی کسی جماعت کے کانوں میں اتفاق سے بھی اس کی آواز پڑ گئی ہے تو وہ سراپا گوش ہو کر اس طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور پھر اس کی دعوت لے کر اپنی قوم کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ حیف ہے اگر یہ لوگ، جن کے لیے یہ کتاب اتاری گئی ہے، اس کی قدر نہ کریں۔

اس کے بعد خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں کفار کے لیے تہدید و وعید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و عزیمت کی تلقین ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۹-۳۵

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْ

بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَ
اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۰﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا
بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ
اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي
الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ
مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ
بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ
قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾ فَاصْبِرْ
كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ
كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً
مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع ۴

ترجمۂ آیات ۲۹-۳۵

اور یاد کرو جب کہ ہم نے جنوں کے ایک گروہ کو تمھاری طرف متوجہ کر دیا قرآن سننے کے لیے۔ تو جب وہ اس کے پاس آئے تو انھوں نے آپس میں کہا کہ خاموش ہو کر سنو! تو جب وہ تمام ہو چکا تو وہ اپنی قوم کی طرف انذار کرتے ہوئے لوٹے۔ انھوں نے کہا کہ اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس کے باب میں پہلے سے موجود

ہیں۔ یہ کتاب حق اور ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کے داعی کی دعوت پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لاؤ، اللہ تمہارے گناہوں کو بخشے گا اور تم کو ایک دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔ ۲۹-۳۱

اور جو اللہ کے داعی کی دعوت پر لبیک نہیں کہے گا وہ یاد رکھے کہ وہ زمین میں خدا کے قابو سے باہر نہیں نکل سکے گا اور اس کے لیے اس کے بالمقابل دوسرے مددگار بھی نہ ہوں گے۔ یہی لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں وہ مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ ہاں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۳۲-۳۳

اور اس دن کو یاد رکھو جس دن ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا ہے دوزخ کے سامنے لایا جائے گا۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے! وہ جواب دیں گے، ہاں! ہمارے رب کی قسم، یہ تو حقیقت ہے!! ارشاد ہوگا، تو چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں! ۳۴

پس ثابت قدم رہو جس طرح صاحب عزم رسول ثابت قدم رہے اور ان کے لیے جلدی نہ کرو۔ جس دن یہ لوگ اس چیز کو دیکھیں گے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے تو یہ محسوس کریں گے کہ گویا دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ پس پہنچا دینا ہے! بالآخر تباہ تو وہی ہوں گے جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔ ۳۵

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا

اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ (۲۹)

جنوں کے قرآن سننے کے واقعہ کی نوعیت

'صَرَفْنَآ اِلَیْكَ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جنوں کے قرآن سننے کا یہ واقعہ بالکل اتفاقاً، محض اللہ تعالیٰ کی کارسازی سے پیش آگیا۔ نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے کوئی اہتمام فرمایا اور نہ جنوں ہی نے اس کا پہلے سے کوئی ارادہ کیا تھا۔ بس اللہ نے پھیر لا ہے ان کی ایک پارٹی کو متوجہ فرما دیا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے ہوئے ذرا سن لیں۔ چنانچہ انھوں نے سنا اور اسی سننے کا اثر ان پر یہ پڑا کہ وہ اس کے گرویدہ ہو گئے اور ایسے گرویدہ ہوئے کہ اپنی قوم کو اس کی دعوت دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ طائف والوں کے رویّہ سے نہایت کبیدہ خاطر ہو کر واپس ہوتے ہیں تو راستہ میں نخلہ میں آپ نے رات گزاری ہے۔ وہیں شب کی نماز وں میں سے کسی نماز میں آپ قرآن پڑھ رہے تھے۔ اسی موقع پر جنوں کی اس پارٹی نے قرآن سنا اور اس پر وہ اثر پڑا جو اوپر مذکور ہوا اور جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ مقصود اس واقعہ کے ذکر سے اس حقیقت کو سامنے لانا ہے کہ جن کے لیے اور جن کی زبان میں یہ کلام اترا، جن کی اصلاح کے لیے اللہ کا رسول اپنے دن رات ایک کیے ہوئے ہے، جن کی تلاش میں وہ مکّہ سے سفر کر کے طائف تک پہنچا ہے وہ تو نہ صرف یہ کہ اس کلام کو سننے کے روادار نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول کے ساتھ نہایت بدسلوکی کا رویّہ اختیار کرتے ہیں اور جنّات کا حال یہ ہے کہ ان کے اندر جو سلیم الفطرت ہیں اگر وہ بیرراہے بھی قرآن کی کچھ آیتیں سن لیتے ہیں تو سن کر تڑپ اٹھتے ہیں اور اپنی قوم کے اندر اس کتاب کے داعی بن کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ خرابی قرآن اور اس کے پیش کرنے والے کے اندر نہیں بلکہ خود ان لوگوں کے اندر ہے جو اس سے گریز کر رہے ہیں۔

مکّہ اور طائف کے گنڈوں پر تعریض

'فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا' یعنی قرآن کی بھنک کان میں پڑتے ہی انھوں نے اپنے ساتھیوں کو یہ ہدایت کی کہ خاموش اور مؤدّب ہو کر اس لاہوتی کلام کو سنو کہ تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ ان کے اس حسنِ ادب کا حوالہ مکّہ اور طائف کے ان گنڈوں کی بدتمیزیوں پر تعریض ہے جن کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے کہ وہ اپنے کارندوں کو یہ سکھاتے کہ جب قرآن سنایا جائے تو اس میں خوب گڑبڑ پیدا کرو کہ اس کی آواز دب جائے اور تم غالب رہو۔ ان کے اسی رویہ کا ذکر سورۂ جن میں بدیں الفاظ ہوا ہے: 'وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا' (الجن ۱۹) (اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ، خالص اللہ ہی کی دعوت کے لیے اٹھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ٹوٹ پڑیں گے)۔

[illegible]

'فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ' یہ بات ان کے سچے اور حقیقی تاثر کی شہادت

کے طور پر بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے صرف واہ واہ، سبحان اللہ، ماشاء اللہ کہہ دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی قوم کو بھی اس خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے جس سے اس کتاب نے لوگوں کو آگاہ کیا ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ کسی اچھی اور سچی بات پر واہ واہ کر دینے والے تو بڑے سے بڑے زمانے میں بھی نکل آتے ہیں لیکن اس واہ واہ کی اس وقت تک کوئی قیمت نہیں ہے جب تک زندگی کے اندر اس سے کوئی عملی تبدیلی نہ واقع ہو۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت پر سر دھننے والے اور اس کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے ملانے والے اس زمانے میں بھی بہت ہیں لیکن اس پر عمل کرنے والے اگر آپ ڈھونڈھیں تو وہ عنقا ہیں۔ ان جنوں کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ ان پر اس کتاب کا یہ اثر پڑا کہ وہ اپنی بگڑی ہوئی قوم کے اندر، تمام خطرات سے بے پروا ہو کر، اس کی منادی کرنے اٹھ کھڑے ہوئے۔

قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۰-۳۲)

جنوں کی دعوت اپنی قوم کو

یہ وہ دعوت ہے جو انھوں نے اپنی گمراہ قوم کو دی۔ سب سے پہلے انھوں نے اس کتاب کا تعارف کرایا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر نازل ہوئی ہے جو اس کے باب میں سابق صحیفوں میں وارد ہوئی ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد صاحب شریعت نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ آپ سے پہلے جتنے بھی انبیاء بنی اسرائیل میں گزرے سب حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی شریعت کے پیرو تھے۔ اسی طرح قرآن سے پہلے اصل کتاب کی حیثیت صرف تورات کو حاصل رہی ہے، دوسرے آسمانی صحیفے اسی کے ضمیمے ہیں۔ تورات کے بعد مستقل کتاب کی حیثیت قرآن کو حاصل ہوئی اور اس کے آسمانی ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ ٹھیک ان پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر نازل ہوئی جو اس کے باب میں، پہلے سے تورات اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں موجود تھیں۔

'يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ' یہی بات سورۂ جن میں انہی جنوں کی زبان سے معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ یوں نقل ہوئی ہے۔ اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (الجن: ۱-۲) (ہم نے ایک عجیب و غریب قرآن سنا ہے، جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے تو ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم ہرگز کسی کو اپنے رب کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے) ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ 'حق' سے مراد یہاں عقیدۂ توحید ہے

جو خدا تک پہنچانے والا سیدھا راستہ ہے۔ لفظ 'حق' اس عقیدہ کے رسوخ و استحکام اور اس کے مطابقِ حقیقت و موافقِ عقل و فطرت ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور 'صراطِ مستقیم' سے اس کے آسان، ہموار اور کج پیچ سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ دونوں ہی باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ تنکیر یہاں تفخیمِ شان کے لیے ہے۔

'اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ وَاٰمِنُوْا بِہٖ ..... الاٰیۃ' یہ وہ اصل دعوت ہے جو انھوں نے اپنی قوم کو دی کہ اللہ کے اس داعی کی دعوت پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لاؤ۔ 'وَاٰمِنُوْا بِہٖ' اسی لبیک کہنے کی وضاحت ہے کہ اصل مطلوب شے ایمان ہے۔ جو ایمان لائیں گے اللہ ان کے گناہوں کو بخشے گا اور ایک دردناک عذاب سے ان کو نجات دے گا۔

حقوق العباد کے معاملات کی نزاکت

'مِّنْ ذُنُوْبِکُمْ' میں 'مِنْ'، تبعیض کے لیے ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ بعض گناہ ایسے بھی ہیں جن کی معافی کا معاملہ اس ایمان کے بعد بھی محوّل رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہ سنگین قسم کے گناہ ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ حقوق العباد کی معافی کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی ان کی تلافی کرے۔ اگر ان کی تلافی نہیں کی گئی ہے یا تلافی کا موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے تو اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا یہی ہے کہ یہ معاملہ فریقین کی موجودگی میں آخرت کی عدالت میں پیش ہو۔ وہاں کیا فیصلہ ہوگا، یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے لیکن اتنی بات واضح ہے کہ تلافی کا موقع ہوتے ہوئے اگر تلافی نہیں کی گئی ہے تو یہ چیز ایمان کے تقاضے کے خلاف ہے اور اگر تلافی کا موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے تو امید ہے کہ آدمی کا سچا احساس، سچی توبہ، سچی ندامت اور اس کی وہ نیکیاں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے لیے سفارشی بنیں جو وہ اپنے جرائم کی تلافی کے لیے اپنی بعد کی زندگی میں مرتے دم تک کرے گا۔

قنوطیت کی طرح بے جا رجائیت بھی فتنہ ہے

جن لوگوں نے اس آیت کے اندر 'مِنْ' کو ایک بالکل زائد چیز سمجھ کر اس کی تاویل کی ہے انھوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ قرآن میں ایک حرف بھی زائد نہیں ہے اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں جس طرح بے جا قنوطیت ناجائز ہے اسی طرح بے جا رجائیت بھی ایک فتنہ ہے۔ نقطۂ اعتدال بیم و رجا دونوں کے بیچ بیچ ہے۔

'وَمَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰہِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ وَلَیْسَ لَہٗ مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءُ ؕ اُولٰٓئِکَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ' یہ بات اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تضمین کے طور پر بھی ہو سکتی ہے لیکن نظائرِ قرآن کی روشنی میں میرے نزدیک یہ جنوں ہی کے قول کا ایک حصہ ہے۔ سورۂ جن میں ان کی یہی بات بدیں الفاظ نقل ہوئی ہے۔

وَاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰہَ ۔۔۔ اور یہ کہ ہم نے جان لیا ہے کہ نہ ہم زمین میں

فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۝ خدا کے قابو سے باہر نکل سکتے نہ آسمان میں بھاگ کر اس کو ہرا سکتے۔ (الجن: ۱۲)

'وَلَیْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءُ' کا تعلق آخرت سے ہے۔ یعنی جس طرح اس دنیا میں وہ خدا کے قابو سے باہر نہیں ہو سکتے اسی طرح آخرت میں بھی خدا کے مقابل میں ان کا کوئی مددگار و کارساز نہیں بنے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنات بھی قرآن کے اسی طرح مخاطب ہیں جس طرح بنی نوع انسان مخاطب ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنات کے بھی اسی طرح رسول ہیں جس طرح ہمارے لیے ہیں؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو جنوں کے اس قول کا کیا مطلب کہ 'یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ' (اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کے داعی کی دعوت پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لاؤ) اور اگر اثبات میں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسالت سے متعلق اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہمیشہ سے جاری ہے اور جو قرآن میں وضاحت سے بیان ہوئی ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں بدل دی گئی؟ رسولوں کے باب میں سنتِ الٰہی تو یہ رہی ہے کہ وہ اسی قوم کے اندر سے مبعوث ہوئے جس کی دعوت پر وہ مامور ہوئے۔ اسی زبان میں انھوں نے اپنی دعوت پیش کی جو پوری قوم کی زبان تھی۔ قوم ہی کے اندر انھوں نے اپنی زندگی گزاری اور اس کے ہر طبقہ کے پاس تو د جا جا کر، ان کو جھنجھوڑا، جگایا اور ان پر اللہ کی حجت تمام کی۔ اس کے بعد اگر قوم ایمان نہیں لائی تو انھوں نے اس سے اعلان براءت کر کے ہجرت کی اور قوم پر اللہ کا عذاب آیا۔ کیا یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کے اندر بھی یہ تمام ذمہ داریاں اسی طرح ادا فرمائیں جس طرح انسانوں کے اندر ادا فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ رسول کی ساری زندگی اس کے متبعین کے لیے اسوہ اور نمونہ ہوتی ہے۔ کیا جنات کے لیے کسی بشر کی زندگی کامل اسوہ اور نمونہ ہو سکتی ہے جب کہ یہ بات بالبداہت معلوم ہے کہ ہم انسانوں کے لیے کسی فرشتہ یا جن کی زندگی اسوہ اور نمونہ نہیں ہو سکتی؟ چنانچہ قرآن نے ان لوگوں کے جواب میں، جو مطالبہ کرتے تھے کہ ہماری رہنمائی کے لیے ہمارے ہی جیسے ایک بشر کو کیوں بھیجا گیا، کسی فرشتہ کو کیوں نہیں بھیجا گیا، کہا بھی ہے کہ انسانوں کی رہنمائی کے لیے کوئی فرشتہ کس طرح بھیجا جاتا۔ اگر فرشتہ بھیجا جاتا تو وہ بھی بہرحال انسانوں ہی کے بھیس میں آتا۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ جب جنوں اور انسانوں کی خلقت دو بالکل متضاد عناصر سے ہوئی ہے تو لازماً دونوں کی سرشت، دونوں کے مزاج، دونوں کی معاشرتی، سماجی اور تمدنی ضروریات اور دونوں کے احکام و شرائع میں بڑا فرق ہو گا۔ ان میں مشترک ہو سکتے ہیں تو توحید، معاد اور خیر و شر کے بنیادی کلیات ہی ہو سکتے ہیں، باقی امور تو بہرحال الگ الگ ہوں گے اس وجہ سے قرآن ان کی

رہنمائی کر سکتا ہے تو صرف عقائد اور اخلاقی کلیات کی حد تک ہی کر سکتا ہے۔ زندگی کے دوسرے ابواب میں لازماً وہ محتاج ہیں کہ ان کے اندر انہی کے اندر سے رسول آئیں جو ان کی رہنمائی ان کے فطری تقاضوں، ان کی ضروریات اور ان کے حالات و مسائل کے مطابق کریں تاکہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو سکے۔

یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے قرآن پر غور کیجیے تو یہی بات اس سے بھی نکلتی ہے۔ اوپر قرآن سے متعلق جنوں کا جو تاثر نقل ہوا ہے اس کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو براہِ راست نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے ہوا۔ بعینہٖ یہی تاثرات جنوں کے، زیادہ تفصیل کے ساتھ، سورۂ جن میں نقل ہوئے ہیں۔ وہاں بھی اس بات کی تصریح موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تاثرات کا علم وحی الٰہی کے ذریعہ سے ہوا۔ چنانچہ اس سورہ کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے: قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا (الجن: ۱) (لوگوں کو بتا دو کہ مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک پارٹی نے قرآن کو سنا تو انھوں نے اپنی قوم کو بتایا کہ ہم نے ایک عجیب و غریب کلام سنا ہے) اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بھی رسول ہوتے تو ان کے ان سارے تاثرات کا علم آپ کو براہِ راست ہونا تھا۔ آپ کو ان کے اندر اسی طرح تبلیغ و دعوت کا فرض ادا کرنا چاہیے تھا جس طرح آپ نے اہلِ عرب کے اندر یہ فرض ادا کیا لیکن قرآن سے اس طرح کی کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ بعض روایات سے یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ جنوں کے ایک آدھ وفود آپ کے پاس آئے اور خود آپ بھی بعض وفود کی دعوت پر ان سے ملنے گئے لیکن اول تو ان روایات میں ایسا اضطراب ہے کہ وہ روایت و درایت دونوں کی کسوٹی پر جانچے جانے کی محتاج ہیں، دوسرے ان سے زیادہ سے زیادہ جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض مرتبہ جنوں کے وفود آپ سے ملے یا ایک آدھ بار آپ ان کی دعوت پر ان کے پاس گئے۔ صرف اتنی سی بات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ آپ نے بحیثیت ان کے رسول کے ان کے اندر اپنا فرضِ رسالت ادا فرمایا۔

رہی یہ بات کہ ان جنوں نے قرآن کی تعریف کی اور اپنی قوم کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دی تو یہ بات بالکل صحیح ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ جہاں تک کلیاتِ دین کا تعلق ہے وہ انسانوں اور جنوں کے درمیان بالکل مشترک ہیں بلکہ ہمارے اور فرشتوں کے درمیان بھی مشترک ہیں بلکہ اس سے ایک قدم بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان میں چرند و پرند، شجر و حجر اور شمس و قمر سب شریک ہیں۔ اس وجہ سے جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے نغماتِ حمد میں پرندے اور پہاڑ ان کی ہمنوائی کرتے تھے، اسی طرح جنوں کے صالحین کی اس پارٹی نے قرآن سنا تو عش عش کر اٹھی اور اس نے اپنی قوم کو بھی توحید اور آخرت پر ایمان لانے اور خدا کے عذاب سے ڈرتے رہنے کی دعوت دی۔ جنوں کی جو دعوت اوپر

مذکور ہوئی ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے اور سورۂ جن پر بھی، جس میں ان کی دعوت پوری تفصیل سے نقل ہوئی ہے، ایک نظر ڈال لیجیے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے انہی باتوں کا ذکر کیا ہے جو ان کے اور انسانوں بلکہ تمام کائنات کے اندر مشترک ہیں۔ اس سے یہ بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کی بنیادی دعوت انسانوں اور جنوں دونوں کے لیے یکساں ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنوں کے لیے بھی اسی طرح رسول تھے جس طرح انسانوں کے لیے تھے۔ جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے ان کی بات اس سنتِ الٰہی کے خلاف ہے جو قرآن میں رسالت سے متعلق نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔

یہاں ایک اور ضمنی بات کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے۔

اوپر کی آیات میں جنّات کے اہلِ ایمان کے لیے چونکہ صرف عذابِ الیم سے نجات کا ذکر ہوا ہے، ان کو صریح الفاظ میں دخولِ جنت کی بشارت نہیں دی گئی ہے اس وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ وہ صالحینِ جن کے لیے دخولِ جنت کے قائل نہیں تھے یا کم از کم یہ کہ وہ یہ بات صریح الفاظ میں کہنے سے احتیاط کرتے تھے۔ ہماری سمجھ میں امام صاحبؒ کی یہ احتیاط کسی طرح نہیں آئی۔ جب جنّات کے بُروں کے لیے دوزخ لازمی ہے تو آخر ان کے صالحین جنت سے کیوں محروم رہیں گے؟ بعض متاخرین نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس مسلک کی تائید میں یہ دلیل دی ہے کہ خدا کے اوپر کسی کا حق قائم نہیں ہے اس وجہ سے اگر وہ کسی کے صلاح و تقویٰ کے باوجود اس کو جنت میں نہ داخل کرے تو یہ بات خلافِ عدل نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دلیل بالکل لایعنی ہے۔ خدا کے اوپر کوئی دوسرا تو کوئی حق قائم نہیں کر سکتا لیکن جو حقوق اس نے از خود اپنے عدل اور اپنی رحمت کی بنا پر اپنے اوپر قائم کر رکھے ہیں اور جن کو پورا کرنے کا نہایت قطعی اور حتمی الفاظ میں اس نے اپنے صالح بندوں سے وعدہ کیا ہے آخر ان سے اس کے نیک بندوں کو، خواہ وہ انسانوں میں سے ہوں یا جنّات میں سے، وہ کیوں محروم رکھے گا؟ ہمارا خیال ہے کہ امام صاحب نے اگر فرمائی ہوگی تو یہ بات فرمائی ہوگی کہ صالحینِ جن اس جنت میں نہیں جائیں گے جو انسانوں کے لیے ہے۔ اگر انھوں نے یہ بات فرمائی تو اس کا ایک محل ہے۔ اس مسئلہ پر ان شاء اللہ سورۂ جن کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کریں گے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی ؕ بَلٰٓی اِنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۳۳)

مکذبین کو انذار — یہ سورہ کے خاتمہ پر مکذبین کو انذار ہے کہ کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اس کام میں اس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی وہ مُردوں کو بھی زندہ کر کے اٹھا کھڑا کرنے پر قادر ہے۔ یہی سوال دوسرے مقامات میں بھی قرآن نے منکرینِ قیامت کے سامنے

رکھا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے۔ 'أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ (ق: ۱۵) (کیا ہم پہلی بار لوگوں کو پیدا کرنے سے عاجز رہے ہیں؟) بعض جگہ یہ سوال کیا ہے کہ بتاؤ، آسمان و زمین کو پیدا کر دینا زیادہ مشکل ہے یا مُردوں کو دوبارہ پیدا کر دینا؟

'بَلَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ' سوال کر کے خود ہی جواب دیا ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے عاجز نہیں رہا وہ نہ صرف مُردوں کو زندہ کر دینے پر قادر ہے بلکہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہم قرآن مجید کے اس اسلوبِ بیان کی طرف جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ مخاطب کے لیے جس جواب سے فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی بعض اوقات قرآن وہ خود ہی اس کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ ۖ أَلَيْسَ هَٰذَا بِالْحَقِّ ۖ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۚ قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ (۳۴)

یہ اسی انذار کی تصویر ہے کہ اس دن کی یاد کو ہمیشہ مستحضر رکھو جس دن کفر کرنے والوں کو دوزخ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور ان سے سوال ہوگا کہ بتاؤ قیامت ایک واقعہ اور حقیقت ثابت ہوئی ہے یا نہیں؟ اس وقت وہ اپنے رب کی قسم کھا کر جواب دیں گے، ہاں! ہمارے رب کی قسم، بلاشبہ یہ ایک امرِ واقعی ثابت ہوئی! ان کے اس اعتراف کے بعد حکم ہوگا کہ اب جاؤ، اپنے کفر کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قیامت کے دلائل آفاق و انفس کے اندر اتنے واضح ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ جن لوگوں نے بھی قیامت کا انکار کیا ہے کسی دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ محض اس لیے کیا کہ وہ اپنی نفس کی خواہشوں کو قربان کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے محض اپنی خواہشوں کی پیروی میں اپنی عقل، اپنی فطرت پھر تمام نبیوں اور رسولوں کی تکذیب کر ڈالی وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ ۚ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ ۚ بَلَاغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ (۳۵)

نبی صلعم کو استقامت کی تلقین

یہ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین ہے کہ جس طرح تم سے پہلے ہمارے اولوالعزم رسولوں نے عزم و جزم کے ساتھ تمام مخالفتوں کا مقابلہ کیا اور اپنے موقفِ حق پر جمے رہے اسی طرح دشمنوں کی تمام سازشوں اور ایذا رسانیوں کے علی الرغم تم بھی اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ 'مِنَ الرُّسُلِ' میں 'مِن'، میرے نزدیک تبعیض کے لیے نہیں بلکہ بیان کے لیے ہے۔ امتحان اللہ کے تمام رسولوں کو پیش آئے ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر، اور تمام رسولوں نے بلا استثناء

ان امتحانوں میں سو فی صد کامیابی حاصل کی ہے۔

وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ۔ یعنی اگر یہ لوگ تمھیں زچ کرنے کے لیے عذاب کی جلدی مچائے ہوئے ہیں تو ان کی جلد بازی سے پریشان ہو کر تم ان کے لیے عذاب کی جلدی نہ کرو۔ آج ان کو جو مہلت طویل معلوم ہو رہی ہے جب عذاب سامنے آئے گا تو یہ محسوس کریں گے کہ بس دن کی ایک گھڑی دنیا میں رہے ہوں گے۔

بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ 'بَلٰغٌ' مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ ساری توجہ خبر پر مرکوز کر دینے کے لیے مبتدا کو حذف کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارا کام بس لوگوں تک اپنے انذار کو اچھی طرح پہنچا دینا ہے تاکہ کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اس کے بعد اگر یہ لوگ تباہ ہوئے تو اس کی ذمہ داری خود ان پر ہو گی۔ اگر یہ نادان لوگ عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوتے ہیں تو مچائیں، جب وہ آئے گا تو اس کی برقِ خرمن سوز کن پہ گرے گی! انہی نافرمانوں ہی پر تو گرے گی!!

ربِ کریم و کارساز کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

رحمان آباد

۴ر اگست ۱۹۷۶ء

۷ر شعبان ۱۳۹۶ھ

تدبّرِ قرآن

۴۷

محمّد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور گروپ کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت

پچھلی سورہ ـــــ سورۂ احقاف ـــــ پر اس گروپ کی مکی سورتیں تمام ہوئیں۔ اب آگے تین سورتیں مدنی ہیں۔ سورۂ احقاف کے بعد یہ سورہ اس طرح بلا تمہید شروع ہو گئی ہے گویا احقاف کی آخری آیت میں کفار کے لیے جو وعید ہے اس میں اس کا عملی ظہور ہے۔ پچھلی سورتوں میں آپ نے دیکھا کہ یہ حقیقت اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے کہ قریش اور ان کے حامی اہل کتاب جس باطل کی حمایت میں لڑ رہے ہیں نہ آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے اندر اس کی کوئی بنیاد ہے نہ انبیاء کی تاریخ اور آسمانی صحیفوں میں اس کی کوئی شہادت ہے۔ یہ گھورے پر اگا ہوا ایک درخت ہے جس نے محض اس وجہ سے جگہ گھیر رکھی ہے کہ اس کو اکھاڑنے والا ہاتھ موجود نہیں ہے۔ اب اس سورہ اور اس کے بعد کی دونوں سورتوں میں یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ اس کو اکھاڑ پھینکنے والے ہاتھ اللہ نے پیدا کر دیے ہیں اور تقدیر کا یہ اٹل فیصلہ صادر ہو چکا ہے کہ کفار کی وہ تمام کوششیں رائگاں ہو کے رہیں گی جو انھوں نے خلق کو اللہ کے راستہ سے روکنے کے لیے صرف کی ہیں۔ ساتھ ہی اہل ایمان کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ ان کی مساعی اس دنیا میں بھی بارآور ہوں گی اور آخرت میں بھی وہی سرخرو ہوں گے بشرطیکہ وہ اپنے فرائض پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ ادا کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔ اسی ضمن میں منافقوں کو دھمکی دی گئی ہے جو مدعی تو ایمان کے تھے لیکن ان کی ہمدردیاں کفار اور اہل کتاب کے ساتھ تھیں۔ ان کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ اگر انھوں نے اس تعلق کو چھوڑ کر یکسوئی کے ساتھ اللہ اور رسول کا ساتھ نہ دیا تو ان کا بھی وہی حشر ہونا ہے جو کفار و مشرکین کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) اس فیصلۂ الٰہی کا اعلان کہ کفار نے چونکہ اپنی تمام جدوجہد باطل کی پیروی اور اس کی حمایت میں صرف کی ہے اس وجہ سے یہ بالکل رائگاں جائے گی۔ اس کے برعکس اہل ایمان نے اپنے رب

کی طرف سے آئے ہوئے حق کی پیروی کی ہے اور اس راہ میں قربانیاں دی ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی مساعی دنیا اور آخرت دونوں میں برومند کرے گا۔

(۴-۱۲) اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی کہ اگر ان کفار سے جنگ کی نوبت آئے تو تم ان سے ذرا مرعوب نہ ہونا۔ یہ بالکل بے ثبات و بے بنیاد ہیں۔ ان کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دینا۔ ان کا قافیہ اس طرح تنگ کر دو کہ یا تو تمہارے احسان کے طفیل رہائی پائیں یا فدیہ دے کر جان چھڑائیں۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ان سے نمٹنے کے لیے خود کافی ہے لیکن وہ تمہارا امتحان کرنا چاہتا ہے اس وجہ سے تم کو یہ حکم دے رہا ہے۔ اگر تم اللہ کی مدد کے لیے اٹھو گے تو اللہ تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے دشمن ذلیل و پامال ہوں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان سے پہلے جن قوموں نے حق کی مخالفت کی اللہ نے ان کو پامال کر دیا۔ یہی حشر تمہارے ان دشمنوں کا بھی ہونا ہے۔

(۱۳-۱۵) قریش کو قوت و شوکت کا جو غرّہ ہے یہ بالکل بے بنیاد ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اللہ نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا جو ہر اعتبار سے ان پر فوقیت رکھتی تھیں۔ یہی اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔ دلیل و برہان کی روشنی میں زندگی گزارنے والے اور اپنی خواہشوں کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلنے والے یکساں کس طرح ہو سکتے ہیں! لازم ہے کہ دونوں کا انجام مختلف ہو۔ چنانچہ دلیل و برہان کی روشنی میں چلنے والوں کا انجام جنت ہے جس میں ان کے لیے یہ یہ نعمتیں ہوں گی اور خواہشوں کی پیروی کرنے والوں کے لیے دوزخ ہے جس میں ان کا انجام یہ ہوگا۔ بالاجمال جنت اور دوزخ دونوں کے احوال کی تصویر۔

(۱۶-۱۹) مسلمانوں کے اندر کے مارِ آستین گروہ ــــــ منافقین ــــــ کی طرف اشارہ کہ یہ لوگ پیغمبرؐ کی باتیں بظاہر سنتے تو ہیں لیکن سمجھتے کچھ بھی نہیں۔ جن باتوں سے اہلِ ایمان کے ایمان اور ان کے تقویٰ میں افزونی ہوتی ہے ان سے ان کے نفاق میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ فیصلہ کی گھڑی کے منتظر ہیں حالانکہ پیغمبرؐ کی بعثت کے بعد اس کے ظہور کی شرطیں پوری ہو چکی ہیں۔ اگر وہ گھڑی اچانک آ دھمکی تو پھر اس موعظت سے فائدہ اٹھانے کا موقع کہاں باقی رہے گا جو اللہ نے ان کے لیے نازل فرمائی ہے؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ تم اپنے لیے اور اہلِ ایمان کے لیے اپنے رب سے مغفرت مانگو! کیا عجب کہ عذاب سر پر آیا کھڑا ہو۔

(۲۰-۳۱) منافقین کے باطن اور ان کی پسِ پردہ سازشوں کی پردہ دری کہ یہ محض زبان کے غازی ہیں۔ پہلے تو آگے بڑھ بڑھ کر مطالبہ کر رہے تھے کہ جہاد کا حکم کیوں نہیں دیا جاتا لیکن جب جہاد کا حکم دے دیا گیا تو ان پر خوف سے موت کی غشی طاری ہو رہی ہے۔ یہ لوگ درحقیقت دین سے منہ موڑ چکے ہیں۔ ان کا ساز باز اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ہے۔ یہ ان کو اطمینان دلا رہے ہیں کہ اگر آپ لوگوں پر کوئی سخت وقت آیا تو ہم آپ ہی کا ساتھ دیں گے۔ ان کے نفاق اور ان کی سازشوں سے اللہ تعالیٰ اچھی طرح باخبر ہے۔ اگر وہ چاہتا

تو ان کی پیشانیوں سے ان کے نفاق کی گواہی دلوا دیتا اور ہر شخص ان کو پہچان لیتا لیکن ابھی وہ ان کو مہلت دے رہا ہے تاہم وہ ایسے امتحانوں میں ان کو ڈالے گا جو ان کے ہر کھوٹ کو ظاہر کر دیں گے۔

(۳۲ - ۳۸) خاتمۂ سورہ جس میں ابتدائے سورہ کے مضمون کی یاددہانی کے بعد مسلمانوں کو عام طور پر اور منافقین کو خاص طور پر تنبیہ فرمائی ہے کہ اللہ اور رسول کے ہر حکم کی اطاعت کرو۔ اگر اس میں کمزوری دکھائی تو تمہارے تمام اعمال رائگاں جائیں گے۔ اب کفار میں کوئی دم خم باقی نہیں رہا ہے اس وجہ سے جو لوگ ان سے سمجھوتے کی سکیمیں سوچ رہے ہیں وہ گرتی دیوار کے سایہ میں پناہ ڈھونڈھ رہے ہیں۔ عزم و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھو۔ اگر تم آگے بڑھے تو بازی تمہاری ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے۔ اس دنیائے دنی کی محبت میں پھنس کر اللہ کی راہ میں انفاق سے جی نہ چراؤ۔ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے پیسہ پیسہ کا اجر دے گا۔ وہ تم سے تمہارے کل مال کا مطالبہ نہیں کر رہا ہے کہ تم اس سے جی چراؤ۔ اگر وہ ایسا کرتا تو جن لوگوں کے دلوں میں نفاق اور حسد ہے ان کا سارا بھرم کھل جاتا۔ یاد رکھو کہ جو اللہ سے بخل کرتا ہے وہ خود اپنی ہی جان سے بخل کرتا ہے۔ خدا کسی کے مال کا محتاج نہیں ہے وہ بالکل بے نیاز ہے۔ البتہ تم اللہ کے محتاج ہو۔ یہ تمہارا امتحان ہو رہا ہے۔ اگر تم اس امتحان میں فیل ہو گئے تو اللہ تمہاری جگہ دوسروں کو لائے گا جو تمہاری طرح نکمے نہیں ہوں گے۔

سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ

مَدَنِيَّةٌ ——— آیات: ۳۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات: ۱-۱۵

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴿١﴾
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى
مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ
بَالَهُمْ ﴿٢﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ
اَمْثَالَهُمْ ﴿٣﴾ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۭ حَتّٰى
اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا
فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ڔ ذٰلِكَ ڔ وَلَوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ
لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۭ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴿٤﴾ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ
بَالَهُمْ ﴿٥﴾ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ﴿٦﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ﴿٧﴾ وَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴿٨﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿٩﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي
الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ
دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۡ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ﴿١٠﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ﴿١١﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ ع
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ وَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ
مَثْوًى لَّهُمْ ﴿١٢﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ
الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿١٣﴾ اَفَمَنْ كَانَ
عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا
اَهْوَاۗءَهُمْ ﴿١٤﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ
مِّنْ مَّاۗءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ
مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ڬ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۭ وَلَهُمْ
فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي
النَّارِ وَسُقُوْا مَاۗءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَاۗءَهُمْ ﴿١٥﴾

ترجمۂ آیات ۱-۱۵

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا، اللہ نے ان کے تمام اعمال رائگاں کر دیے اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے اور ایمان لائے اس چیز پر جو محمد پر نازل کی گئی۔ اور وہی حق ہے ان کے رب کی جانب سے۔ اللہ نے ان سے ان کی برائیاں دور کر دیں اور ان کا حال سنوار دیا۔ یہ اس وجہ

سے ہوا کہ جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے باطل کی پیروی کی اور جو لوگ ایمان لائے انھوں نے اپنے رب کی طرف سے آئے ہوئے حق کی پیروی کی۔ اس طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کی مثالیں بیان کر رہا ہے۔ ۱-۳

پس جب ان کافروں سے تمھارے مقابلہ کی نوبت آئے تو ان کی گردنیں اڑاؤ یہاں تک کہ جب ان کو اچھی طرح چور کر دو تو ان کو مضبوط باندھ لو پھر یا تو احسان کر کے چھوڑنا ہے یا فدیہ لے کر یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔ یہ کام ہے تمھارے کرنے کا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے انتقام لے لیتا لیکن اس نے تم کو یہ حکم اس لیے دیا کہ ایک کو دوسرے سے آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے اللہ ان کے اعمال ہرگز رائگاں نہیں کرے گا، وہ ان کی رہنمائی منزلِ مقصود کی طرف کرے گا اور ان کا حال سنوار دے گا اور ان کو جنت میں داخل کرے گا، جس کی ان کو شناخت کرا دی ہے۔ ۴-۶

اے ایمان والو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم اچھی طرح جما دے گا۔ رہے وہ جنھوں نے کفر کیا تو ان کے لیے ہلاکی ہے اور اللہ نے ان کے اعمال رائگاں کر دیے۔ یہ اس سبب سے کہ انھوں نے اس چیز کو برا جانا جو اللہ نے اتاری پس اللہ نے ان کے اعمال ڈھا دیے۔ ۷-۹

کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ کیا انجام ہو چکا ہے ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ نے ان کو پامال کر چھوڑا اور ان کافروں کے سامنے بھی انہی کی مثالیں آنی ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ اللہ اہلِ ایمان کا کارساز ہے اور

کافروں کا کارساز کوئی بھی نہیں۔ ۱۰-۱۱

بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ اسی طرح بہرہ مند ہو رہے اور کھا رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں۔ دوزخ ان کا ٹھکانا ہے۔ ۱۲

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو قوت میں تمھاری اس بستی سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں جس نے تم کو نکالا ہے۔ ہم نے ان کو ہلاک کر چھوڑا پس کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ بن سکا۔ ۱۳

کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہیں ان لوگوں کے مانند ہو جائیں گے جن کی بدعملی ان کی نگاہوں میں کھبا دی گئی ہے اور انھوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے! اس جنت کی مثال جس کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ اس میں نہریں ہوں گی پانی کی جس میں ذرا بھی تغیّر نہ ہوا ہوگا، اور نہریں ہوں گی دودھ کی جس کا ذائقہ تبدیل نہ ہوا ہوگا اور نہریں ہوں گی شراب کی جو پینے والوں کے لیے یکسر لذت ہوں گی اور نہریں ہوں گی صاف شفاف شہد کی اور اس میں ان کے لیے ہر قسم کے پھل بھی ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت بھی! کیا یہ لوگ جن کو یہ نعمتیں حاصل ہوں ان لوگوں کے مانند ہوں گے جو ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہیں اور جن کو اس میں گرم پانی پلایا جائے گا پس وہ ان کی آنتوں کو ٹکڑے کر کے رکھ دے گا۔ ۱۴-۱۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (۱)

کفار قریش کو وعید

سورۂ احقاف کفار کے لیے جس تہدید و وعید پر ختم ہوئی ہے اسی مضمون سے یہ سورہ بلا کسی تمہید کے، اس طرح شروع ہو گئی ہے گویا اسی تہدید و وعید کا یہ عملی ظہور ہے۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکا اللہ نے ان کی تمام کوششیں رائگاں کر دیں۔ یہ اشارہ ظاہر ہے کہ مشرکین مکہ کی طرف ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ فتح کی آیت ۲۵ کے تحت آئے گی۔ 'اعمال' سے مراد ان کی وہ سرگرمیاں ہیں جو انھوں نے اللہ کے بندوں کو ایمان اور عمل صالح کی راہ سے روکنے کے لیے صرف کیں۔ لفظ 'اضلال' یہاں اسی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں سورۂ فیل میں لفظ 'تضلیل' استعمال ہوا ہے۔ وہاں فرمایا ہے: 'اَلَمْ یَجْعَلْ كَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ' (الفیل: ۲) (کیا ان کی ساری چال اللہ نے نابود نہ کر دی!) یہ مضمون اسی سورہ کی آیات ۴، ۳۲ اور ۳۴ میں بھی آئے گا۔

یہاں یہ امر خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ یہ وعید اگرچہ ہے تو مستقبل سے متعلق اس لیے کہ اس سورہ کے نزول کے وقت قریش ابھی مکہ پر مسلط تھے لیکن اس کا بیان ماضی کے صیغہ سے ہوا ہے اس کی وجہ وہی ہے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ جو بات اللہ تعالیٰ کے ہاں قطعی طور پر طے ہو گئی اور جس کا ظہور لازمی ہے وہ گویا واقع ہو چکی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو کوئی بدلنے پر قادر نہیں ہے۔ اس قطعیت کو ظاہر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے وعدے اور اس کی وعیدیں قرآن میں ماضی کے صیغوں سے بھی بیان ہوئی ہیں۔ یہ اسلوب ہر زبان میں معروف ہے اور اس کے فوائد بالکل واضح ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (۲)

اہل ایمان کے لیے بشارت

اوپر کی آیت میں کفار کے لیے جس درجے کی تہدید و وعید ہے اس آیت میں، اسی اسلوب بیان میں، اہل ایمان کے لیے، دنیا اور آخرت دونوں میں، فیروزمندی کی بشارت ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح بھی کیے، ان کے گناہ اللہ تعالیٰ نے دور فرما دیے اور ان کے تمام احوال بالکل درست کر دیے۔

جس طرح کفار کے لیے تہدید قطعیت کے اظہار کے لیے ماضی کے اسلوب میں بیان ہوئی ہے اسی طرح اہل ایمان کے لیے بشارت بھی ماضی کے اسلوب میں بیان ہوئی ہے۔

اس آیت میں 'وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ' کے الفاظ خاص

طور پر نگاہ میں رکھنے کے ہیں۔ صرف یہ نہیں فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح کیے ان کے ساتھ اللہ کا یہ معاملہ ہوگا بلکہ اس کے ساتھ یہ تصریح بھی ہے کہ اس چیز پر ایمان لائے جو محمدؐ پر اتاری گئی ہے، پھر مزید تصریح یہ ہے کہ اب خدا کی طرف سے حق یہی ہے۔ اس تصریح کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس دور میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی پیدا ہو گیا تھا جو کفر اور اسلام دونوں کے درمیان سمجھوتے کی باتیں کرنے لگا تھا۔ اس کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مسلمانوں کا اپنی انفرادیت پر اصرار ٹھیک نہیں ہے بلکہ کچھ گنجائش دوسروں کے لیے بھی تسلیم کرنی چاہیے۔ اہل کتاب کے اندر بھی ایک گروہ ان لوگوں کا تھا جو کہتا تھا کہ مومن تو ہم بھی ہیں، اس سے کیا فرق پیدا ہوا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان نہیں لائے۔ اس قسم کے باطل رجحانات کی بیخ کنی قرآن نے پچھلی سورتوں میں بھی کی ہے۔ یہاں بھی مذکورہ بالا تصریح نے اسی رجحان پر ضرب لگائی ہے کہ اب ایمان و ہدایت کا واحد راستہ وہی ہے جس کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں، اس سے ہٹ کر کوئی راہ نہیں ہے۔

'وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ' لفظ 'بال' ایک جامع لفظ ہے۔ یہ ظاہر و باطن دونوں قسم کے احوال پر حاوی ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر و باطن اور دنیا و آخرت دونوں کے تمام احوال درست کر دے گا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ (۳)

ثبات صرف حق کے اندر ہے

یہ وجہ بتائی ہے اس بات کی کہ کیوں کفار کی تمام مساعی رائگاں ہوں گی اور کیوں اہل ایمان اپنی کوششوں میں سرخرو اور فائز المرام ہوں گے فرمایا کہ ایسا اس وجہ سے ہوگا کہ کفار نے شیطان کے سکھائے ہوئے باطل کی پیروی کی ہے اور اہل ایمان نے اس حق کی پیروی کی ہے جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے۔ باطل کے لیے ان کی عقل اور اس کی فطرت کے اندر کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کی مثال خودرو جھاڑی کی ہے جو کسان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس کی زمین میں اُگ پڑتی ہے۔ اگر وہ اکھاڑی نہ جائے تو زمین میں جڑ پکڑ لیتی ہے اور اگر اکھاڑ دی جائے تو وہ بالکل بے ثبات ہوتی ہے۔ چنانچہ اب جب کہ اہل حق اس باطل سے نبرد آزمائی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو اس کا مٹ جانا یقینی ہے۔ 'جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا' (بنی اسرائیل: ۸۱) (حق آگیا اور باطل نابود ہوا، بے شک باطل نابود ہی ہونے والی چیز ہے)۔

اس کے برعکس اہل ایمان نے اس حق کی پیروی کی ہے جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے۔ حق کی فطرت میں ثبات و استحکام ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق حق ہے اور اس نے یہ دنیا 'بالحق' پیدا کی ہے۔ اس کا اصلی مزاج باطل کی پرورش نہیں بلکہ حق کی پرورش ہے

اب جب کہ حق آگیا ہے تو اس باطل کو لازماً ٹھکرا دے گی جو اکاس بیل کی طرح اس پر مسلط ہو گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصلی زور و قوت اسباب و وسائل کے اندر نہیں بلکہ حق کے اندر ہے۔ اگر کشمکش باطل اور باطل کے درمیان برپا ہو تب تو فیصلہ کی میزان اسباب و وسائل کے ہاتھ ہی میں ہوتی ہے لیکن کشمکش اگر حق اور باطل کے درمیان ہو تو اصلی فیصلہ کن اہمیت حق کو حاصل ہوگی، اسباب و وسائل کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی۔

'کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَھُمْ' مومنین اور کفار کا یہ انجام جو بیان ہوا ہے اس کی نوعیت چونکہ اس مرحلہ میں ابھی ایک پیشین گوئی ہی کی تھی، اس نے واقعہ کی شکل نہیں اختیار کی تھی اس وجہ سے اس کو تمثال بیان کرنے سے تعبیر فرمایا۔ 'لِلنَّاسِ' سے مراد یہی اہل ایمان اور کفار ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں گروہوں کے انجام کا یہ تمثیل بیان فرما دی ہے اور اس کی حقیقت عنقریب سب کے سامنے آکے رہے گی۔

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط حَتّٰٓی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْھُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ق فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا ج ذٰلِکَ ط وَلَوْ یَشَآءُ اللّٰہُ لَانْتَصَرَ مِنْھُمْ لا وَلٰکِنْ لِّیَبْلُوَا بَعْضَکُمْ بِبَعْضٍ ط وَالَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَھُمْ (۴)

کفار کے اندر ریڑھ کی ہڈی نہیں ہے

یہ مسلمانوں کو ابھارا ہے کہ کفار حق کے سہارے سے محروم ہیں اس وجہ سے ان کے اندر ریڑھ کی ہڈی گویا نہیں ہے تو جب جنگ میں ان سے مقابلہ ہو تو بے دریغ ان کی گردنیں مارو، اللہ نے ان کو تمہارے لیے شکار اور تمہاری تلواروں کے لیے ایک لقمۂ تر بنا دیا ہے۔ یہی بات سورۂ انفال میں یوں فرمائی گئی ہے: 'فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْھُمْ كُلَّ بَنَانٍ' (الانفال: ۱۲) (پس ان کی گردنوں پر مارو اور ان کے پور پور اور جوڑ جوڑ پر مارو)۔

'حَتّٰٓی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْھُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ'۔ 'اِثْخَان' کے معنی ہیں اچھی طرح خون ریزی کرنا اور 'وَثَاق' بندھن کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اچھی طرح خون ریزی کر کے ان کے کس بل نکال چکو تو جو بچ رہیں ان کو اچھی طرح بندھنوں میں باندھ لو۔ یہ تمہارے سامنے چوں نہیں کر سکیں گے۔

'فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا' یعنی اس کے بعد اگر یہ تمہارے ہاتھ سے چھوٹیں تو صرف دو ہی شکلوں سے چھوٹیں۔ یا تو تمہارے احسان کا قلادہ اپنی گردن میں لے کر یا فدیہ دے کر۔ اور تمہارا یہی معاملہ اس وقت تک ان کے ساتھ رہے جب تک ان کے اندر جنگ کا حوصلہ بالکل سرد نہ پڑ جائے اور یہ تمہارے آگے ڈگ نہ ڈال دیں۔ دوسرے مقام میں یہی بات یوں فرمائی گئی: 'وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّہٗ لِلّٰہِ' (الانفال: ۳۹) (اور ان سے جنگ

جاری رکھو یہاں تک کہ اس سرزمین سے فتنہ کا خاتمہ ہو جائے اور دین سارے کا سارا اللہ کا ہو جائے)۔

بنو اسمٰعیل کے معاملے کی خاص نوعیت

یہ امر واضح رہے کہ جہاں تک مشرکین عرب یا بالفاظ دیگر مشرکین بنی اسماعیل کا تعلق ہے ان پر اللہ تعالیٰ نے انہی کے اندر سے ایک رسول بھیج کر ان پر حجت تمام کر دی اس وجہ سے دوسرے غیر مسلموں کی طرح ان کے لیے یہ رعایت نہیں تھی کہ وہ اسلامی حکومت کے اندر ذمّی یا معاہدین کر رہ سکیں یا ان کو غلام بنایا جا سکے۔ ان کے لیے صرف دو ہی راستے تھے یا اسلام قبول کریں یا تلوار۔ اس کے وجوہ کی تفصیل سورۂ براءت کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ کسی مسلمان قیدی کے فدیہ میں یا نقد و جنس کی شکل میں فدیہ لے کر یا احساناً ان کے کسی قیدی کو چھوڑا بھی جا سکتا تھا اور اگر ان میں سے کوئی اپنے رویہ پر غور کرنے کے لیے امان کا طالب ہو تو اس کو امان بھی دی جا سکتی تھی لیکن بحیثیت جماعت ان کے ساتھ جنگ کی حالت اس وقت تک باقی رہنی تھی جب تک سرزمینِ حرم کفر و شرک کے ہر شائبہ سے پاک نہ ہو جائے۔ اس مسئلہ میں فقہاء کے اندر جو اختلافات ہیں وہ بڑی الجھن میں ڈالنے والے ہیں۔ اس کی وضاحت سورۂ براءت کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہاں معاملہ زیر بحث مشرکین بنی اسماعیل کا ہے، دوسرے غیر مسلموں کے مسئلہ پر یہاں بحث نہیں ہوئی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ جو یہ فرماتے ہیں کہ مشرکین کے قیدیوں کے باب میں احسان اور فدیہ کی اجازت منسوخ ہو گئی، وہ صرف قتل کیے جا سکتے ہیں یا غلام بنائے جا سکتے ہیں تو اس کا اتنا حصہ صحیح ہے کہ مشرکین عرب کے ساتھ یہ رعایت موقت تھی جو بالآخر فتح مکہ کے بعد ختم ہو گئی لیکن ان کا یہ فرمانا کہ وہ غلام بنائے جا سکتے ہیں ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ مشرکین عرب نہ غلام بنائے جا سکتے تھے نہ ذمّی نہ معاہد۔

امام شافعیؒ کے نزدیک امام کو اختیار ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کو پیش نظر رکھ کر اس قسم کے قیدیوں کے ساتھ چار باتوں میں سے جو بات بھی مناسب خیال کرے، کر سکتا ہے۔ چاہے قتل کرا دے، چاہے غلام بنا لے، چاہے فدیہ لے کر چھوڑ دے، چاہے احساناً چھوڑ دے۔ ہمارے نزدیک امام شافعیؒ کی یہ رائے عام غیر مسلم قیدیوں کے حد تک تو صحیح ہے لیکن مشرکین عرب کے باب میں یہ کلیہ صحیح نہیں ہے۔ وہ ذمّی یا غلام نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ یہاں اس مسئلہ کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ تفصیل کے طالب ہماری کتاب "اسلامی ریاست" میں باب "اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق" کا مطالعہ کریں۔

'ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ' ۔ 'ذٰلِكَ' ایک جملہ کا قائم مقام ہے۔ اس کی ایک سے زیادہ مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ یہ کام ہے جو تمہارے کرنے کا ہے۔ یا یہ کام ہے جس کے لیے کمر ہمت باندھو یا یہ کام ہے جس کے لیے تمہیں ہدایت کی جاتی ہے۔ اس قسم کے اجمال کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر تفصیل بھی سما جاتی ہے اور جملہ کے اندر زور بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

جہاد کی مصلحت

'وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ ...... الآیۃ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ان سے جنگ کا حکم جو دے رہا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ ان سے نپٹنے کے لیے تمہارا یا کسی کا محتاج ہے۔ وہ چاہتا تو خود ہی کوئی ارضی یا سماوی آفت بھیج کر ان کو ٹھکانے لگا دیتا۔ ان سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے چشم زدن میں اپنے کسی عذاب سے تباہ کر دیا۔ اسی طرح اللہ ان کو بھی تباہ کر دیتا لیکن اس نے تمہیں ان سے جنگ کا حکم اس لیے دیا کہ اس طرح تمہارا اور ان کا دونوں کا امتحان ہو۔ وہ اپنے باطل کی حمایت کے لیے جو جوش و جذبہ رکھتے ہیں وہ بھی سامنے آجائے اور تم اپنے حق کے لیے جو جذبہ فدویت و وفاداری رکھتے ہو وہ بھی بالکل ظاہر ہو جائے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو جائے کہ تمہارے اندر کتنے ہیں جو راستباز و وفا شعار ہیں اور کتنے ہیں جو محض منافقانہ اپنے مفادات کے لیے تمہاری صفوں میں آگھسے ہیں۔

ایک سنت الٰہی

یہاں اس سنتِ الٰہی پر بھی نگاہ رہے کہ رسولوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یوں رہا ہے کہ اگر رسول پر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہوئی ہے تو رسول اور اس کے ساتھیوں کو ہجرت کا حکم ہوا ہے اور اس کے تمام مکذبین کو اللہ نے کسی ارضی یا سماوی عذاب سے تباہ کر دیا ہے اور اگر رسول کے ساتھیوں کی تعداد بھی معتد بہ ہوئی ہے تو ان کو جہاد کا حکم ہوا ہے اور ان کے ہاتھوں اللہ نے ان کے دشمنوں سے انتقام لیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی معاملہ ہوا۔ آپ سے پہلے بھی نبیوں اور رسولوں کو جہاد کرنا پڑا ہے۔ فرعون کے مقابل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی مدد اللہ تعالیٰ نے سمندر کے طوفان سے کی۔ پھر دریا پار کرنے کے بعد ان کو متعدد چھوٹی بڑی جنگیں خود لڑنی پڑیں جن میں بنی اسرائیل کا اچھی طرح امتحان ہو گیا۔ وہ بیشتر امتحانوں میں ناکام رہے جس کی ان کو سزا بھگتنی پڑی۔

منافقین کے ایک گمان کی تردید

'وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ' فرمایا کہ اس جہاد میں جو لوگ شہید ہوں گے وہ اطمینان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی رائگاں نہیں کرے گا بلکہ اس قربانی کا بھرپور صلہ ان کو دے گا۔ 'فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ' کے الفاظ ان منافقین کے خیال کو سامنے رکھ کر ارشاد ہوئے ہیں جن کا ذکر تفصیل سے آگے آرہا ہے۔ یہ لوگ چونکہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے تھے اس وجہ سے ہر وہ قربانی ان کے نزدیک خسارہ کے حکم میں تھی جس کا نفع ان کو نقد نقد حاصل نہ ہو جائے۔ یہ الفاظ انہی کے خیال پر ضرب لگانے کے لیے ارشاد ہوئے ہیں۔ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے باب میں یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو، وہ زندہ ہیں، وہ بھی اسی قسم کے لوگوں کی تردید میں ہے۔

'وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا' میں مستقبل کی جگہ ماضی کا صیغہ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ یہ بشارت ان لوگوں

پر بھی حاوی ہو جائے جو راہ حق میں اس سے پہلے قتل ہوئے۔

سَیَهْدِیْهِمْ وَیُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ وَیُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (۵-۶)

اوپر والی آیت میں جو بات فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ کے منفی اسلوب میں فرمائی گئی ہے وہی بات یہ مثبت اسلوب میں ارشاد ہوئی تاکہ بات پوری طرح واضح اور مؤکّد ہو جائے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو راہ یاب کرے گا اور ان کے جملہ حالات سنوار دے گا۔ ہدایت یاب کرنے سے مقصود یہاں منزلِ مقصود کی ہدایت ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کی آخری منزل — جنّت — سے ان کو ہمکنار کرے گا۔ لفظ 'ہدایت' قرآن میں جگہ جگہ اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں، آگے بھی آئیں گی۔ یُصْلِحُ بَالَهُمْ کے اجمال کے اندر وہ ساری تفصیل مضمر ہے جو اہلِ جنت کی سرفرازی و فیروزمندی سے متعلق قرآن میں مذکور ہوئی ہے بلکہ اس اجمال کے اندر ایک نہایت لطیف اشارہ ان فیروزمندیوں کی طرف بھی ہے جن کا ذکر فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (السجدۃ: ۱۷) کے الفاظ سے ہوا ہے۔

جنت کا وعدہ کوئی مبہم وعدہ نہیں ہے

وَیُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ یہ اسی ہدایت کی تفصیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کرے گا۔ اس جنت کے باب میں فرمایا کہ عَرَّفَهَا لَهُمْ ' اللہ نے اچھی طرح اس کی شناخت کرا دی ہے۔ اس تصریح کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جنت کا یہ وعدہ ایک مجمل و مبہم وعدہ ہے، کچھ نہیں معلوم کہ اس اسم کا مسمّٰی کیا ہے! اگر کوئی معاہدہ مبہم ہو، اس کی تفصیلات واضح نہ ہوں تو کمزور فریق برابر اندیشہ میں رہتا ہے کہ معلوم نہیں وقت پر اس کی کیا تفسیر و تاویل سامنے آئے۔ جنت کے وعدے سے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس قسم کے اندیشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ کیا ہے کہ اس کی ساری تفصیلات سے ان کو قرآن میں آگاہ کر دیا ہے اور جو باتیں تعبیر و بیان کی گرفت میں نہیں آسکتی ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے تاکہ بندوں کو پورا اطمینان رہے کہ جس چیز کے عوض میں انھوں نے اپنی جانیں اپنے رب کے حوالہ کی ہیں وہ کوئی مبہم شے نہیں ہے بلکہ اس کی ساری تفصیلات طے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان میں سے ہر بات کے پورا کرنے کا ذمہ لیا ہے بلکہ ان پر مزید اضافوں کا وعدہ فرمایا ہے۔ جنت کی یہ تعریف یوں تو پورے قرآن ہی میں بیان ہوئی ہے لیکن خاص طور پر اس سورہ میں بھی اس کی تفصیل مذکور ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۱۵۔ یہ امر واضح رہے کہ عَرَّفَهَا لَهُمْ کے الفاظ یہاں 'جنت' کی صفت کے طور پر نہیں آئے ہیں۔ ایسا ہوتا تو لفظ 'جنت' کو نکرہ آنا تھا بلکہ ان کی حیثیت مستقل جملہ کی ہے اور اس کے مستقل جملہ ہونے ہی سے وہ مفہوم پیدا ہوتا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ وَالَّذِیْنَ

كَفَرُوا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ (۸-۹)

نصرتِ الٰہی کا ظہور کب ہوتا ہے

یہ مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ تمہارے کرنے کا کام یہ ہے کہ اللہ اور اس کے دین کی نصرت کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ اگر تم عزم و حوصلہ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تو آگے کا کام تمہارا رب سنبھال لے گا۔ وہ تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے قدم اس طرح جمائے گا کہ کوئی ان کو اکھاڑ نہ سکے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی راہ میں پہلا قدم وہ اٹھائیں۔ اگر انھوں نے یہ قدم اٹھا دیا تو اس کے بعد اس کی شانیں ظاہر ہوں گی۔ ان لوگوں کے لیے اس کی مدد نہیں نازل ہوتی جو گھروں میں بیٹھے بیٹھے اس کا انتظار کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے نازل ہوتی ہے جو اپنے آپ کو میدان میں ڈال دیتے ہیں پھر اس کی نصرت کا انتظار کرتے ہیں۔

'وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَّهُمْ'۔ یہ کفار کا حشر بتایا کہ ان کے لیے خدا کی پھٹکار ہے اور ان کے تمام اعمال برباد اور اکارت ہو کر رہیں گے۔ ان کو جو مہلت ملی وہ محض امتحان اور اتمامِ حجت کے لیے ملی۔ اب اگر تم ان سے نمٹنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوگے تو دیکھو گے کہ ان کی ساری کوششیں نابود ہو جائیں گی۔ 'تَعْسًا لَّهُمْ' لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے اور اس کا استعمال اسی طرح معروف ہے۔

کفار کی نامرادی کا سبب

'ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ'۔ یہ سبب بتایا ہے اس بات کا کہ کیوں یہ اس قدر بودے، بے ثبات اور خدا کی لعنت کے مستحق بن گئے ہیں؟ فرمایا کہ یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے اس چیز سے نفرت کی جو ان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اتاری اور اپنی بدعتوں اور ضلالتوں کے ساتھ چمٹے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے وہ اعمال بھی خدا نے اکارت کر دیے جو انھوں نے دین کے کام سمجھ کر کیے۔ یہ ان کاموں کی طرف اشارہ ہے جو ہوتے تو نیکی کے لیکن ان کے شرک کے سبب سے وہ بالکل لاحاصل ہو کے رہ گئے۔ اس طرح کے کاموں میں سے بعض کا قرآن نے سورۂ براءت میں حوالہ بھی دیا ہے۔ مثلاً حرم کا اہتمام و انتظام اور حجاج کی خدمت۔ مشرکین کو اپنی ان خدمات پر بڑا ناز تھا۔ لیکن یہ تمام دین داریاں خدا کی میزان میں بالکل بے وزن ثابت ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول صرف وہی اعمال ہوتے ہیں جو اس کے شرائط پر انجام دیے جائیں وہ کسی کی نیکی کا محتاج نہیں ہے کہ جس طرح بھی کوئی نیک عمل کر دیا جائے وہ ممنون ہو کر اس کو قبول کر لے۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ دَمَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۖ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَالُهَا (۱۰)

کفارِ قریش کی بے بصیرتی

یہ ان مشرکین کی کور چشمی اور بے بصیرتی پر اظہارِ افسوس ہے کہ کیا یہ لوگ اپنے ملک میں اس مقصد سے چلے پھرے نہیں کہ ان قوموں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں، اللہ نے ان کو بالکل پامال

کر دیا! آیت کے اسلوب سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ لوگ چلتے پھرتے تو ہیں، اپنے تجارتی سفروں پر برابر نکلتے رہتے ہیں لیکن ان بستیوں پر کبھی عبرت کی نگاہ انھوں نے نہیں ڈالی جو کسی زمانے میں عظیم قوموں کا مسکن تھیں لیکن اب وہ ویرانوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ یہ اشارہ ان قوموں کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں پچھلی سورتوں میں سنائی جا چکی ہیں۔

'وَلِلْکٰفِرِیْنَ اَمْثَالُهَا' فرمایا کہ کافروں کے لیے تو انھی کی مثالیں ہیں یعنی جب وہ اپنے کفر اور اپنی تکذیب کے نتیجہ میں اس انجام کو پہنچیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ (قریش) انھی کی روش اختیار کر کے اس سے کسی مختلف انجام سے دوچار ہوں۔ اللہ کا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔ اوپر آیت ۳ 'کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَهُمْ (۱۱)

کفار کا کوئی کارساز نہیں

یعنی اس کائنات کا حقیقی کارساز و کارفرما تو اللہ تعالیٰ ہے اور وہ اہل ایمان کے ساتھ ہے تو وہ کفار ان کے مقابل میں کیا وزن رکھتے ہیں جن کا کوئی کارساز نہیں۔ وہ جن کو اپنا کارساز سمجھے ہوئے ہیں وہ نہ تو اس دنیا میں ان کے کام آنے والے ہیں، نہ آخرت میں — اوپر آیت ۳ میں یہی مضمون ایک دوسرے اسلوب سے گزر چکا ہے۔ وہ بھی پیش نظر رہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّهُمْ (۱۲)

یہ اہل ایمان کے اعمال کے مثمر اور کفار کے اعمال کے رائگاں ہونے کی مزید وضاحت اور اس شبہ کا جواب ہے کہ جب کفار کے اعمال کی کوئی حیثیت نہیں تو اس دنیا میں وہ کیوں دندناتے پھر رہے ہیں؟ فرمایا کہ اہل ایمان کو تو اللہ تعالیٰ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ رہے یہ کفار تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اس دنیا میں ان کو کھانے پینے کی جو مہلت ملی ہے یہ کوئی خوش انجام چیز نہیں ہے۔ ان کا کھانا پینا جانوروں کے مانند ہے۔ یہ عقل و خرد سے عاری اور ان حقوق کے شعور سے بالکل نابلد ہیں جو اللہ کی نعمتیں ان پر عائد کرتی ہیں اس وجہ سے یہ چند روز ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا لیں لیکن یہ ان کے لیے موجب وبال ہوں گی اور ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہو گا۔

وَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ هِیَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْیَتِکَ الَّتِیْٓ اَخْرَجَتْکَ ۚ اَهْلَکْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ (۱۳)

یعنی کسی کو اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ آج قریش کو بڑا زور و دبدبہ حاصل ہے، جب انھوں نے رسول اور اس کے ساتھیوں کو مکہ سے نکال چھوڑا تو ایسے زور آور لوگوں کو کون زیر کر سکتا ہے! فرمایا کہ کتنی بستیاں تھیں جو قوت و شوکت میں اس سے بڑھ چڑھ کر تھیں لیکن اللہ نے ان کو تباہ کر

دیا اور کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ بن سکا۔ یہ عاد و ثمود وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جن کی سرگزشتیں پچھلی سورتوں میں سنائی جا چکی ہیں اور قریش کو جن کی شوکت و عظمت کا پورا اعتراف تھا۔ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ میں ان کی اس دنیوی جمعیت کی نصرت کی بھی نفی ہے جس پر ان کو بڑا ناز اور اعتماد تھا اور ان مزعومہ شرکاء کی نصرت کی بھی نفی ہے جن کو وہ خدا کے مقابل میں اپنی سپر سمجھے ہوئے تھے۔

أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ كَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُم (۱۴)

اہل ایمان کے حسن انجام پر عقل و فطرت کی گواہی

اوپر کی آیت میں ان کے دنیوی انجام کی طرف اشارہ تھا اور اس کی دلیل تاریخ کی مثالوں سے پیش کی گئی ہے۔ یہاں ان کے اخروی انجام کی طرف اشارہ ہے اور اس پر انسان کی عقل و فطرت کو گواہ ٹھہرایا گیا ہے۔ فرمایا کہ کیا وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہیں اور اس کی روشنی میں وہ چلتے ہیں اور وہ لوگ جن کی نگاہوں میں ان کی بدعملی کھبا دی گئی ہے اور وہ اپنی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ مطلب یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ بات عقل و فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے اور اس کا بنانے والا نعوذ باللہ ایک کھلنڈرا ہے!

لفظ 'بَيِّنَةٍ' پر سورۂ یونس میں مفصل بحث ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک حجت قاطع خود انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرمائی ہے اور اس کی مزید تائید اپنی وحی کی روشنی سے کی ہے۔ یہ دونوں چیزیں مل کر انسان کے باطن کو، جیسا کہ سورۂ نور کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے، 'نُورٌ عَلَىٰ نُورٍ' بنا دیتی ہے جس کی جگمگاہٹ لازماً اس کی ظاہری زندگی میں بھی نمایاں ہوتی ہے۔ برعکس اس کے جو شخص اپنی فطرت کے چراغ کو گل کر دیتا ہے وہ وحی کے نور سے بھی محروم رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن دونوں ہی تاریک ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے ظاہر اور باطن دونوں میں اتنا عظیم تفاوت ہے وہ اپنے انجام کے اعتبار سے یکساں کس طرح ہو سکتے ہیں!

اس آیت پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اہل ایمان کے ذکر میں تو صرف ان کے باطن کو نمایاں کیا ہے، ان کے ظاہر کا ذکر نہیں کیا ہے اور اہل کفر کے ذکر میں ان کے ظاہر کا حوالہ دیا ہے، ان کے باطن کو نظر انداز کر دیا ہے۔ آپ تقابل کے اس اصول کی روشنی میں، جس کی مثالیں ہم دیتے آ رہے ہیں، اس خلا کو بھر لیجیے تب اس آیت کی بلاغت واضح ہوگی۔

آیت میں 'مَنْ' کے لیے ضمیریں اور فعل واحد اور جمع دونوں شکلوں میں استعمال ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واحد جمع، مذکر و مؤنث سب میں مشترک ہے۔

مَّثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن

لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ ۚ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۖ وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ
وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ ۖ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ (۱۵)

جنت کی تمثیل

یعنی جب دونوں گروہوں کا انجام یکساں ہونا عقل و فطرت کے بالکل خلاف ہے تو لازم ہے کہ جس نے پاکیزہ فطرت اور اللہ کی ہدایت کی روشنی میں زندگی گزاری اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے نوازے اور جس نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی وہ اپنی ضلالت پسندی کی قرار واقعی سزا بھگتے۔ چنانچہ دونوں کا انجام بالکل مختلف ہوگا۔ اللہ نے اپنے متقی بندوں سے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے جس کی تمثیل یہ ہے کہ اس میں بے آمیز خالص پانی کی نہریں ہوں گی، غیر متغیر دودھ کے چشمے ہوں گے، شراب کی نہریں ہوں گی جو پینے والوں کے لیے ہر فساد و ضرر سے پاک، یکسر لذت ہی لذت ہوں گی، اسی طرح صاف شفاف شہد کی نہریں ہوں گی، مزید برآں ان کے لیے ہر قسم کے میوے بھی ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے مستقل مغفرت کی بشارت بھی۔ برعکس اس کے دوسرے گروہ کے لوگ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور ان کی پہلی ہی ضیافت ایسے گرم پانی سے ہوگی جو ان کی انتڑیوں کو کاٹ کر رکھ دے گا۔

نعمتوں کے پاکیزہ ہونے کے پہلو پر ایک نظر

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جنت کی جن نعمتوں کا ذکر ہوا ہے ان کے خالص اور بے آمیز ہونے کو خاص طور پر نمایاں فرمایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نعمتیں جتنی بھی ہیں سب کا اصل منبع جنت ہی ہے لیکن اس عالم ناسوت میں جب ہمیں وہ ملتی ہیں تو اتنے مراحل اور اتنے وسائل و وسائط سے گزر کر ملتی ہیں کہ ان کی حقیقت و ماہیت بھی بالکل بدل جاتی ہے اور ان کی شکل و صورت بھی بالکل مسخ ہو کے رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سب سے زیادہ عام چیز پانی ہی کو لیجیے، یہ فضاؤں، بادلوں، ہواؤں، دریاؤں، ندیوں، نالوں اور زمین کی تہوں کے کتنے مراحل طے کر کے ہم تک پہنچتا ہے! ظاہر ہے کہ ہر مرحلے کے اثرات سے یہ متاثر ہوتا ہے جس کے سبب سے اس کا وہ مزاج، جو اس کے اصل منبع یعنی جنت میں ہے، بالکل بدل جاتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس دودھ کو لیجیے۔ اس دنیا میں یہ جن راستوں سے گزر کر ہمیں ملتا ہے اس کے متعلق تو خود قرآن کا بیان ہے کہ وہ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ (النحل: ۶۶) یعنی گوبر اور خون کے درمیان سے ہو کر ہم تک پہنچتا ہے۔ غور کیجیے کہ جنت کی جو نعمت اس راستہ سے گزر کر ہم تک پہنچے گی وہ اپنی اصلی مزاجی خصوصیات پر کس طرح باقی رہ سکے گی۔ اس وجہ سے جنت کے دودھ اور شہد اور اس دنیا کے دودھ اور شہد میں اتنا ہی فرق ہے جتنا فرق آسمان و زمین میں ہے۔ یہاں کی نعمتوں سے وہاں کی نعمتوں کا ایک مبہم سا تصور تو آپ کر سکتے ہیں اور یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی بھی اسی لیے ہیں کہ ہم ان مجازی نعمتوں سے ان حقیقی نعمتوں کا تصور کر سکیں لیکن دونوں میں نسبت بہرحال حقیقت و مجاز ہی کی ہے۔ اس نسبت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔

خالص نعمتیں سلیم الفطرت لوگوں کے لیے خاص ہیں

آیت ۱۴ کے ساتھ اس آیت کے ربط پر اگر اچھی طرح تدبر کیجیے تو یہ حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں، ان کی اصل شکل میں، اپنے ان بندوں کے لیے خاص کر رکھی ہیں جو اپنی فطرت کو جس کو اللہ تعالیٰ نے 'فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا' (الروم: ۳۰) سے تعبیر فرمایا ہے، ہر قسم کے خلل و فساد سے محفوظ رکھیں گے اور قلب سلیم کے ساتھ اپنے رب کی طرف لوٹیں گے۔ رہے وہ لوگ جو اپنی فطرت کو مسخ کر کے اپنی خواہشوں کے غلام بن جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قلب سلیم کو گندگیوں سے آلودہ کریں گے تو ان کے لیے ان نعمتوں میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ انھوں نے جتنا فائدہ اٹھانا تھا اس دنیا میں اٹھا لیا۔ آخرت میں ان کے لیے وہ عذاب ہی ہے جو اپنی فطرت کو مسخ کرنے کا لازمی نتیجہ ہے۔

آیت کا مدعا سمجھ لینے کے بعد ایک نظر الفاظ اور جملوں کے در و بست پر بھی ڈال لیجیے۔

'اٰسِنٍ' صفت کے طور پر اس پانی کے لیے آتا ہے جس کا رنگ اور ذائقہ تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ فاسد پانی سے جو فسادِ نظامِ جسم میں پیدا ہوتا ہے اس کا علاج کسی طبیب کے پاس نہیں ہے۔

دودھ سے متعلق فرمایا کہ 'لَمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ' (اس کا ذائقہ تبدیل نہ ہوا ہو گا)۔ اس سے مراد ذائقہ کی وہ تبدیلی ہے جو اس کے فساد سے نمایاں ہوتی ہے۔ دودھ فطری غذا کی حیثیت رکھتا ہے اس وجہ سے اس کا فساد بھی ایک اہم فساد ہے۔

'خَمْرٌ' کی صفت 'لَذَّۃٍ' میں مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے جس طرح 'زَیْدٌ عَدْلٌ' میں مبالغہ کا مفہوم ہے۔ یعنی وہ یکسر لذت ہی لذت ہو گی۔ پینے والے اس سے نہ کسی قسم کی تلخی، ناگواری یا خمار کا احساس کریں گے نہ وہ بدمستی اور گناہ کی محرک ہو گی۔

'عَسَلٍ' کے ساتھ 'مُّصَفًّی' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اس دنیا میں جو شہد میسر آتا ہے وہ بہرحال مکھیوں ہی کے واسطہ سے میسر آتا ہے جو ان کے غل و غش سے پاک نہیں ہو سکتا۔ جنت کا شہد اپنے اصل منبع سے نکلا ہوا ہو گا۔ اس پر کوئی مگس کی قے ہونے کی پھبتی چست نہ کر سکے گا۔

'وَمَغْفِرَۃٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ' کا ذکر آخر میں جنت کی سب سے بڑی نعمت کی حیثیت سے آیا ہے اس لیے کہ خدا کی مغفرت اور خوشنودی ہی ہے جو ان تمام نعمتوں کی ضامن بھی ہو گی اور اسی سے آگے کے مدارج کی راہیں بھی کھلیں گی۔

'کَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِی النَّارِ' سے پہلے 'اَفَمَنْ کَانَ لَهٗ مِثْلُ هٰذِهِ الْجَنَّۃِ' یا اس کے ہم معنی الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں۔ استفہامیہ اور شرطیہ جملوں میں اس قسم کا حذف معروف ہے۔ پیچھے اس کی مثالیں گزر چکی ہیں۔

'مَآءً حَمِیْمًا' کا ذکر اہل دوزخ کے لیے 'نُزُلٌ' یعنی اولین سامانِ ضیافت کی حیثیت سے آیا ہے

قرآن میں جگہ جگہ یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اہل دوزخ کی پہلی ضیافت کھولتے پانی سے ہوگی۔ اس کے بعد ان کے لیے ہر قسم کے عذاب کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

۲۔ آگے آیات ۱۶ ــــــ ۳۸ کا مضمون

آگے منافقین کے رویہ پر تبصرہ ہے اور یہی مضمون سورہ کے آخر تک چلا گیا ہے۔ منافقین کا ذکر یہاں بھی بعینہٖ اسی تقریب سے آیا ہے جس تقریب سے سورۂ نساء، سورۂ مائدہ، سورۂ انفال اور سورۂ براءت وغیرہ میں گزر چکا ہے۔ جب مسلمانوں کو ایک عظیم مہم کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا گیا تو ضروری ہوا کہ ان کے اندر کے اس گروہ کو بے نقاب کر دیا جائے جو مارِ آستین بن کر چھپا ہوا تھا اور آگے کے مراحل میں جس کی کمزوریاں اور ریشہ دوانیاں مسلمانوں کے لیے خطرہ بن سکتی تھیں۔ یہ مضمون تین حصوں میں تقسیم ہے۔

پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو تمھاری بات سنتا تو ہے لیکن سمجھتا کچھ بھی نہیں۔ یہ لوگ تمھاری باتوں پر یقین کرنے کے لیے کسی نشانیٔ عذاب کے منتظر ہیں۔ ان کو پتہ نہیں ہے کہ رسول کی بعثت ان لوگوں کے لیے عذاب کا دیباچہ ہوتی ہے جو اس پر ایمان نہیں لاتے۔

اس کے بعد ان کی بزدلی سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ زبان سے تو یہ جہاد کے لیے بڑے ولولہ کا اظہار کرتے رہے ہیں لیکن اب جب کہ نہایت واضح الفاظ میں اس کا حکم دے دیا گیا تو خوف سے ان کے اوپر موت کی غشی طاری ہو رہی ہے۔ یہ لوگ درحقیقت دین سے منہ موڑ چکے ہیں اور دشمنوں کے ساتھ ساز باز رکھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اب آزمائشوں کے ذریعہ سے وہ ان کے دلوں کے کھوٹ اور نفاق کو ظاہر کر کے رہے گا۔

آخر میں ابتدائے سورہ کے مضمون کو دہراتے ہوئے مسلمانوں کو بالعموم اور منافقین کو بالخصوص آگاہ فرمایا کہ ان لوگوں کا سہارا ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرو جن کی تباہی مقدر ہو چکی ہے۔ اب ان لوگوں کے ساتھ سمجھوتے کی راہیں سوچنے کی جگہ عزم و حوصلہ کے ساتھ دین کو سربلند کرنے کے لیے اٹھو۔ اللہ تم کو سرفرازی بخشے گا۔ اگر تم دنیا کی محبت میں پھنس کر اللہ سے منہ موڑ لو گے تو اللہ کو تمھاری کوئی پروا نہیں۔ وہ تمھاری جگہ دوسرے لوگوں کو لائے گا جو تمھاری طرح بزدل اور منافق نہیں ہوں گے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۶-۳۸ وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۚ حَتَّىٰٓ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِكَ قَالُوا

لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۟ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ
اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۶﴾ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا
زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا
السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ
اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿۱۸﴾ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ
وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ ع ۸
سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ
رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ
الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ﴿۲۰﴾ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ
مَّعْرُوْفٌ ۣ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۣ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا
لَّهُمْ ﴿۲۱﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ
تُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ
وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ﴿۲۳﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ
اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا
تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۭ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ
بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ

الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ
ع ۳ ۴ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾
اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾
وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۭ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ
الْقَوْلِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ
الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ
مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ وَسَيُحْبِطُ
اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ
وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾
فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ ۖ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖ وَاللّٰهُ
مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ
وَّلَهْوٌ ۭ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْــَٔـلْكُمْ
اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ اِنْ يَّسْــَٔـلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ
اَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ
فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ
وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا

غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوٓا أَمْثَالَكُمْ ﴿٣٨﴾ ع ۱۰/۸

ترجمۂ آیات ۱۶-۳۸ اور ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تمھاری طرف کان تو لگاتے ہیں لیکن جب تمھارے پاس سے باہر نکلتے ہیں تو علم والوں سے پوچھتے ہیں کہ ابھی انھوں نے کیا بات فرمائی! یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کر دی اور انھوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے۔ اور وہ لوگ جنھوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی اللہ نے ان کی ہدایت میں افزونی بخشی اور ان کے حصہ کی پرہیزگاری ان کو عطا فرمائی۔ ۱۶-۱۷

یہ لوگ تو بس اسی بات کے منتظر ہیں کہ قیامت ان پر اچانک آ دھمکے۔ سو یاد رکھیں کہ اس کی علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں تو جب وہ گھڑی آ ہی جائے گی تو ان کے لیے نصیحت حاصل کرنے کا موقع کہاں باقی رہے گا! تو جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں پس اپنی اور با ایمان مردوں اور عورتوں کی خطاؤں کی معافی مانگتے رہو اور اللہ جانتا ہے تمھاری آمد و شد کی جگہوں اور تمھارے ٹھکانوں کو۔ ۱۸-۱۹

اور وہ لوگ جو ایمان لائے کہتے تھے کہ کوئی سورہ (در باب جہاد) کیوں نہیں اتاری جاتی؟ پس جب اتاری گئی ایک واضح سورہ اور اس میں جنگ کا بھی ذکر ہوا تو جن کے دلوں میں روگ ہے ان کو تم دیکھتے ہو کہ وہ اس طرح تمھاری طرف دیکھ رہے ہیں گویا ان پر موت کی غشی طاری ہو۔ پس ان کے حال پر افسوس ہے! ان کے لیے پسندیدہ روش اطاعت اور قول معروف کی تھی پس جب معاملہ کا قطعی فیصلہ ہو جاتا تو اگر وہ اللہ سے راست باز ثابت ہوتے تو ان کے لیے یہ بات بہت بہتر ہوتی۔ پس اگر تم نے منہ پھیرا تو اس کے سوا تم سے کچھ متوقع نہیں کہ تم زمین میں فساد برپا کرو اور اپنے

رحمی روابط پر چھری چلاؤ۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی پس ان کے کانوں کو بہرا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں! بے شک جو لوگ، بعد اس کے کہ ان پر ہدایت ظاہر ہوگئی، پیٹھ پیچھے پلٹ گئے شیطان نے ان کو فریب دیا اور اللہ نے ان کو ڈھیل دے دی۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے ان لوگوں سے، جنھوں نے اللہ کی اتاری ہوئی چیز کو برا جانا، کہا کہ بعض معاملات میں ہم آپ ہی لوگوں کی بات مانیں گے۔ اور اللہ ان کی اس رازداری کو جانتا ہے۔ تو اس وقت کیا ہوگا جب فرشتے ان کے مونہوں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے ان کی روحیں قبض کریں گے! یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے پیروی کی اس چیز کی جو خدا کو غصہ دلانے والی تھی اور نفرت کی اس کی خوشنودی سے۔ پس اللہ نے ان کے اعمال ڈھا دیے۔ ۲۰-۲۸

کیا ان لوگوں نے، جن کے دلوں میں روگ ہے، یہ گمان کر رکھا ہے کہ اللہ ان کے کینوں کو کبھی بے نقاب نہیں کرے گا؛ اور اگر ہم چاہتے تو تمھیں ان کو دکھا دیتے پس تم ان کی علامتوں سے ان کو پہچان لیتے اور تم ان کے لہجہ کے تذبذب سے تو ان کو پہچان ہی لوگے! اور اللہ تمھارے اعمال کو جانتا ہی ہے۔ ۲۹-۳۰

اور ہم لازماً تمھیں آزمائیں گے تاکہ تم میں سے جو مجاہد اور ثابت قدم ہیں ان کو ممیز کر دیں اور تمھارے حالات کو جانچ لیں۔ جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور ہدایت کے واضح ہو چکنے کے بعد رسول کی مخالفت کی وہ اللہ کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اللہ ان کے سارے اعمال ڈھا دے گا۔ ۳۱-۳۲

اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو

رائگاں نہ کرو۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا پھر اسی حالت کفر میں مرگئے، اللہ ان کو کبھی نہیں بخشے گا۔ تو تم کمزور نہ پڑو اور سمجھوتے کی دعوت نہ دو اور تم ہی غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال کے باب میں تمہارے ساتھ کوئی خیانت نہیں کرے گا۔ ۳۲-۳۵

یہ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا اور تمہارا مال سمیٹ کر تم سے نہیں مانگے گا۔ اور اگر وہ تم سے مانگے اور سمیٹ کر مانگے تو تم بخیلی کرو گے اور وہ تمہارے کینوں کو ظاہر کر دے گا۔ آگاہ! تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کی دعوت دی جاتی ہے تو تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بخیلی کرتے ہیں۔ اور جو بخیلی کرتا ہے تو وہ یاد رکھے کہ وہ اپنے ہی سے بخیلی کرتا ہے، اللہ بالکل بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔ اور اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ تمہاری جگہ دوسروں کو لائے گا، پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔ ۳۶-۳۸

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ (۱۶)

منافقین کے ایک گروہ کا فساد

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں سے خبردار کیا ہے جو بظاہر تھے تو مسلمانوں کے ساتھ لیکن ان کی ہمدردیاں تمام تر اسلام کے مخالفین کے ساتھ تھیں۔ ان لوگوں سے خبردار کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اوپر کی آیات میں مسلمانوں کو جس مہم کے لیے تیار ہونے کی ہدایت فرمائی گئی ہے اس کو سب سے زیادہ نقصان اسی طرح کے لوگوں سے پہنچ سکتا تھا۔ فرمایا کہ انہی میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو تمہاری بات سننے کے لیے کان تو لگاتا ہے لیکن سنتا سمجھتا کچھ بھی نہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ جب یہ تمہارے پاس سے اٹھتے ہیں تو مجلس کے دوسرے اصحاب علم سے پوچھتے ہیں کہ بھائی، ابھی ابھی انھوں

نے کیا فرمایا!

'مِنْهُمْ' کی ضمیر کا مرجع وہ گروہ ہے جس کا ذکر اوپر 'كَرِهُوا مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ یعنی ایک گروہ تو تمھارے پاس اپنی بیزاری کی شدت کے باعث پھٹکتا ہی نہیں اور انہی میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو تمھارے پاس آتا تو ہے لیکن سننے سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ بالکل منافقانہ آتا ہے۔

'مَاذَا قَالَ ءَانِفًا' کے سوال سے ایک تاثر تو وہ لوگوں کو یہ دینا چاہتے کہ جہاں تک بات سننے کا تعلق ہے وہ تو ہم نے بھی سنی اور اس پر عمل کرنے کے لیے بھی ہم جی جان سے حاضر ہیں لیکن ابھی تو بات ہی ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ فرمانا کیا چاہتے ہیں؟ اس طرح وہ اپنی منافقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے۔

دوسرا تاثر یہ دینا چاہتے کہ یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ بے سوچے سمجھے ان پر آمنّا وصدّقنا کہہ دیا جائے بلکہ ان پر اچھی طرح غور کرنے اور ان کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ گویا درپردہ وہ ان مسلمانوں کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات پر آمنّا وصدّقنا کہتے، اپنے اس فقرے سے دل شکنی کرتے کہ تم لوگ محض سادہ لوحی کے سبب سے ان کی ہر بات پر سرِ تسلیم خم کر دیتے ہو، ہم تو ان کی باتیں بہت توجہ سے سنتے ہیں لیکن ان کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ واضح رہے کہ یہ طریقہ کسی کی عمدہ سے عمدہ بات کو مشتبہ بنا دینے کے لیے ایک نہایت کارگر طریقہ ہے۔ اسی مقصد سے یہ منافقین بعض اوقات یہ بھی کرتے کہ جب کوئی سورہ نازل ہوتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سناتے تو یہ مجلس سے اٹھنے کے بعد طنزیہ انداز میں یہ سوال کرتے کہ بھئی! بتاؤ اس سورہ سے کس کس کا ایمان تازہ ہوا ہے! سورۂ توبہ میں ان کی اس شرارت کا ذکر یوں آیا ہے۔

وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِۦٓ إِيمَٰنًا ۚ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَزَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ كَٰفِرُونَ (التوبة: ۱۲۴-۱۲۵)

اور جب کوئی سورہ اتاری جاتی ہے قرآن میں بعض یہ کہتے ہیں کہ تم میں سے کس کس کا ایمان اس نے تازہ کیا ہے! تو جو ایمان لائے ان کے ایمان کو تو اس نے زیادہ کیا اور وہ اس پر بشارت حاصل کرتے ہیں۔ رہے وہ جن کے دلوں میں روگ ہے تو اس نے ان کی ناپاکی پر مزید ناپاکی کا اضافہ کیا اور وہ کفر ہی کے حال میں مرے۔

'أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ طَبَعَ ٱللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَٱتَّبَعُوٓا۟ أَهْوَآءَهُمْ'۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے اور انھوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے۔ یہ اوپر کی آیت ۱۴ 'كَمَن زُيِّنَ لَهُۥ سُوٓءُ عَمَلِهِۦ وَٱتَّبَعُوٓا۟ أَهْوَآءَهُم' کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی بدعملی ان کی نگاہوں میں کھبا دی گئی ہے اور یہ اپنی خواہشوں کے پیرو بن گئے ہیں اس وجہ سے اب یہ اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو اس طرح

کے لوگوں کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ اس طرح کے لوگ اپنے آپ کو اس نورِ بصیرت سے محروم کر لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ودیعت فرمایا ہے اس وجہ سے وہ وحی کے نور سے محروم ہی رہتے ہیں اور ان کی بدعملی کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کر دی جاتی ہے۔

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ (۱۷)

جنھوں نے اپنے نورِ فطرت کی حفاظت کی ان کے نور میں اضافہ ہوا

یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ توبہ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے کہ جن کا نورِ فطرت بجھا نہیں تھا بلکہ انھوں نے اس کو محفوظ رکھا اللہ نے اپنے نبی کی صحبت سے ان کی ہدایت میں اضافہ فرمایا اور ان کی استعداد اور طلب کے اعتبار سے ان کے تقویٰ میں برکت بخشی۔ رہے وہ لوگ جو اپنے اندر نفاق کی پرورش کرتے رہے تو ان سے وہ بھی چھین لیا گیا جو ان کو بخشا گیا تھا۔

فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَن تَأْتِيَهُم بَغْتَةً ۖ فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا ۚ فَأَنَّىٰ لَهُمْ إِذَا جَاءَتْهُمْ ذِكْرَاهُمْ (۱۸)

جو عذاب کے منتظر ہیں ان کے لیے عذاب ہی ہے

یعنی اگر پیغمبر کی باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اب فیصلہ کی گھڑی ہی کے انتظار میں ہیں کہ وہ اچانک ہی ان کے سر پر آ دھمکے۔ 'السَّاعَةَ' سے مراد قیامت بھی ہو سکتی ہے اور وہ فیصلہ کن عذاب بھی جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً اس کی قوم پر آ جاتا ہے۔ اللہ کے رسول ان دونوں ہی عذابوں سے اپنی اپنی قوموں کو آگاہ کرتے رہے ہیں اور ان دونوں میں نسبت مقدمہ اور تتمہ کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو ان لوگوں پر اپنا کرم فرمایا کہ خطرہ سے آگاہ کرنے کے لیے اپنا رسول بھیجا اور اپنی کتاب نازل فرمائی تاکہ جب وہ فیصلہ کی گھڑی آئے تو وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ان کے پاس کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ جان کر انجان بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر یہ انجان بن رہے ہیں تو بنیں اللہ تو اپنا رسول آخری اتمامِ حجت کے لیے بھیجتا ہے۔ اگر اس کی تذکیر سے بھی ان کے کان نہ کھلے تو اب آخری چیز عذاب اور قیامت ہی ہے۔ اب یہ اسی سے دوچار ہوں گے اور جب یہ پیشگی آگاہی کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اچانک ہی ان پر آ جائے۔

عذاب کی علامتیں

'فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا' یعنی عذاب کی گھڑی کا انتظار ہے تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی علامتیں اب نمایاں ہو چکی ہیں۔ یہ اشارہ اس سنتِ الٰہی کی طرف ہے جس کی وضاحت پچھلی سورتوں میں تفصیل سے ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ کن عذاب اس وقت تک کسی قوم پر نہیں بھیجتا جب تک اس کی مرکزی بستی میں اپنا رسول نہ بھیج لے۔ یہ چیز واقع ہو چکی اور اللہ تعالیٰ یہ دیکھ رہا ہے کہ قوم کے لوگ رسول کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔ اب تک قوم نے جو کچھ کیا ہے وہ متقضی تو عذاب ہی کا ہے لیکن اللہ تعالیٰ مزید مہلت دے رہا ہے کہ جس کو سنبھلنا ہو وہ چاہے تو اب بھی سنبھل جائے۔

اگر لوگ اب بھی نہ سنبھلے تو خدا کا قانون ظاہر ہو کے رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو الگ کر لے گا اور ان لوگوں کو تباہ کر دے گا جو سرکشی اور فساد میں اڑے رہ جائیں گے۔ اس انجام کے آثار آفاق اور انفس دونوں میں نمایاں ہو رہے ہیں اور آگے یہ مزید نمایاں ہوں گے۔ یہاں تک کہ ایمان لانے والوں اور کفر کرنے والوں کی عدالت اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کر دے گا اور یہ عدالت تمہید اور توطیہ ہوگی اس عدالتِ کبریٰ کی جو اس کے بعد آخرت میں قائم ہوگی۔ آخری رسول کی بعثت اور اس کی طرف سے اتمامِ حجت کے بعد اب آگے اسی کا مرحلہ ہے۔ چنانچہ بعض احادیث میں حضورؐ نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آپ نے اپنی دو انگلیوں کو اٹھا کر فرمایا کہ جس طرح ان دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے اسی طرح میری بعثت اور قیامت کے مابین بھی کوئی فاصلہ نہیں ہے۔

'فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ'۔ 'جَآءَتْ' کا فاعل 'اَلسَّاعَةُ' ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ رسول پر ایمان لانے کے لیے فیصلہ کی گھڑی کے منتظر ہیں تو خواہ وہ فیصلہ کن عذاب کی شکل میں ظاہر ہو یا قیامت کی صورت میں، اس وقت ان کے لیے یاددہانی اور نصیحت حاصل کرنے کا موقع کہاں باقی رہے گا! اس تذکیر سے فائدہ اٹھانے کا موقع تو اسی وقت تک ہے جب تک وہ پردے میں ہے۔ اس کے بے نقاب ہو جانے کے بعد تو کسی کے ایمان کی قیمت دو کوڑی کے برابر بھی نہ ہوگی۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ (۱۹)

یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اب فیصلہ کی گھڑی قریب آ لگی ہے تو تم اس بات کو اچھی طرح جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جو لوگ اپنے فرضی دیویوں دیوتاؤں کے بل پر اس سے بے خوف ہیں ان کو اس وقت اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ خدا کے مقابل میں کوئی بھی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہے۔

عذاب سے بچنے کے لیے تیاری کی ہدایت

'وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ'۔ یہ اس وقت کی آفات سے محفوظ رہنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تیاری کی ہدایت ہے کہ جو لوگ اس سے بے خوف ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑو، تم اپنی کوتاہیوں اور مومنین و مومنات کی کوتاہیوں کی اپنے رب سے معافی مانگتے رہو۔

یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے امت کے وکیل اور شفیع کی حیثیت سے ہے۔ اللہ کا رسول اپنے تمام ساتھیوں کا، خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں، بوجھ اپنے سر پر اٹھائے ہوئے برابر اپنے لیے بھی اور ان کے لیے بھی استغفار کرتا رہتا ہے۔ اس عمل کو مزید اہتمام و سرگرمی کے ساتھ جاری رکھنے کی یہ ہدایت ہوئی تاکہ فیصلہ کی گھڑی جب ظاہر ہو تو اہل ایمان اس کی آفتوں سے محفوظ رہیں۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ذنب کی نسبت اول تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے نہ کہ براہِ راست اس کے ذمہ دار کی حیثیت سے۔ پھر انبیاء علیہم السلام سے جو خطائیں صادر ہوتی ہیں وہ اتباعِ ہوا کی نوعیت کی نہیں ہوتیں بلکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وہ اتباعِ حق میں اس کے متعیّن حدود سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس قسم کا تجاوز بجائے خود کوئی معصیت نہیں ہے لیکن حضراتِ انبیاء علیہم السلام چونکہ حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح کی باتوں پر بھی گرفت اور ان کی اصلاح فرماتا رہتا ہے۔

پیغمبر اور مسلمانوں کی حفاظت کی ضمانت

'وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ'۔ 'مُتَقَلَّب'، مصدری معنی میں بھی ہو سکتا ہے اور ظرف کے مفہوم میں بھی۔ ہم نے لفظ 'مَثْوٰى' کی رعایت سے اس کو ظرف کے مفہوم میں لیا ہے۔ یعنی آمد و شد کی جگہ۔

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حفاظت کی ضمانت دی گئی ہے کہ اگر تم برابر اپنے رب سے استغفار کرتے رہے تو جہاں کہیں بھی ہو گے اللہ تعالیٰ تم کو اپنی حفاظت میں رکھے گا۔ وہ تمہارا آمد و شد کی جگہوں اور تمہارے ٹھکانوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ تم عذاب کی زد میں آجاؤ۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ (۲۰)

منافقین کا جہاد سے فرار

یہ انہیں منافقین کے اس رویے کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے جہاد کا حکم بالفاظ صریح (مذکورہ آیت نمبر ۴) سننے کے بعد اختیار کیا۔ فرمایا کہ پہلے تو یہ لوگ مسلمانوں پر اپنے دعوائے ایمان کی دھونس جمانے رکھنے کے لیے آگے بڑھ بڑھ کر مطالبہ کر رہے تھے کہ جہاد کے باب میں کوئی واضح حکم نازل نہیں ہوتا لیکن جب ایک سورہ نازل کر دی جاتی ہے اور اس میں نہایت غیر مبہم الفاظ میں جہاد کا ذکر آتا ہے تو جن کے دلوں میں نفاق اور حسد کا روگ ہے وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح وہ شخص دیکھتا ہے جس پر سکراتِ موت کی غشی طاری ہو۔

'يَقُوْلُ' سے پہلے ہمارے نزدیک عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق فعل ناقص محذوف ہے یعنی یہ مدعیانِ ایمان کہتے تھے۔

'اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' میں فعل دعوائے فعل کے مفہوم میں ہے اور فعل کا اطلاق دعوائے فعل پر عربی میں معروف ہے۔ مثلاً 'يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ' (النساء: ۱۳۶)

(اے وہ لوگو! جنھوں نے ایمان کا دعویٰ کیا، اللہ اور اس کے رسول پر سچا ایمان لاؤ)۔

'وَلَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ' کے بعد 'فِی الْجِهَادِ' یا 'فِی الْقِتَالِ' کے الفاظ محذوف ہیں۔ قرآن میں یہ اسلوب بھی معروف ہے کہ اگر ایک چیز کی تفصیل آگے آ رہی ہو تو پہلے اس کا ذکر اجمال کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آگے اسی سورہ کی آیت ۲۶ میں بھی اس کی مثال آ رہی ہے۔ لوگوں کے سوالات نقل کرنے میں بھی اجمال کا یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ 'يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ' (البقرۃ ۱۸۹) کے تحت ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے تو یہ لوگ بہت بڑھ چڑھ کر مطالبہ کر رہے تھے کہ صریح الفاظ میں کفار کے خلاف جہاد کا حکم کیوں نہیں نازل ہوتا لیکن اب جبکہ جہاد کا حکم دے دیا گیا اور بالکل قطعی الفاظ میں دے دیا گیا تو یہ مدعیانِ ایمان چھپتے پھرتے ہیں۔

لفظ 'سُوْرَةٌ' لفظ 'كِتَابٌ' کی طرح قرآن کی کسی سورہ کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے اور اس کے کسی اہم حکم کے لیے بھی۔ یہاں دونوں معانی بنتے ہیں۔ اس کے ساتھ 'مُّحْكَمَةٌ' کی صفت اس کی قطعیت اور مستغنی عن التاویل ہونے کو ظاہر کر رہی ہے۔ یعنی اس میں نہ کسی قسم کا اجمال وابہام ہے کہ وہ تعبیر و تاویل کا محتاج ہو، نہ وہ متشابہات کی قسم کی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اس کی تاویل معلوم نہ ہو۔

'رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ'۔ 'مَرَضٌ' سے مراد نفاق بھی ہے اور وہ کینہ و حسد بھی جو ان منافقین کے اندر اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھا۔ آگے اسی سورہ کی آیات ۲۹ اور ۳۰ کے تحت اس کی وضاحت آ رہی ہے۔ البقرۃ کی تفسیر میں اس کی تحقیق بیان ہو چکی ہے۔

یہاں ان منافقین کی جو تصویر پیش کی گئی ہے یہی تصویر ان کی سورۂ نساء میں بھی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ (النساء: ۷۷)	تم نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جن سے کہا جاتا تھا کہ ابھی اپنے ہاتھ جنگ سے روکے رکھو اور نماز کا اہتمام کرو اور زکاۃ دیتے رہو تو جب ان پر جنگ واجب کر دی گئی تو ان میں سے ایک گروہ کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اس طرح ڈر رہا ہے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہیے بلکہ کچھ اس سے بھی سوا۔

یعنی جب تک جہاد کا حکم نہیں ہوا تھا اس وقت تک تو اللہ و رسول کے ساتھ اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرنے کے لیے جہاد کا بڑا ولولہ ظاہر کرتے تھے لیکن جب جہاد کا حکم دے دیا گیا تو اللہ سے زیادہ ان کے اندر آدمیوں کا ڈر سمایا ہوا ہے اور چھپتے پھرتے ہیں۔

'فَاَوْلٰى لَهُمْ' لعنت اور اظہارِ نفرت کا کلمہ ہے۔ اس کا مفہوم وہی ہے جو 'وَيْلٌ لَّهُمْ' کا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ایمان کے دعوے کے ساتھ جب انھوں نے اپنے اندر اس نفاق اور بزدلی کی پرورش کی ہے تو ان پر خدا کی پھٹکار ہو!

طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۟ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۟ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (۲۱)

ایمان کا صحیح تقاضا

یعنی ان کے لیے صحیح روش تو یہ تھی کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس حکم جہاد کا 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کے قولِ معروف سے خیر مقدم کرتے۔ پھر جب جہاد کا فیصلہ ہو جاتا تو اپنے عمل سے ثابت کر دیتے کہ انھوں نے اپنے رب سے جو عہد باندھا اس میں سچے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو یہ روش ان کے لیے بہتر ہوتی لیکن انھوں نے اپنے لیے ہلاکت کی راہ اختیار کی۔

'طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ' مبتدا کے محل میں ہے اور خبر یہاں بربنائے قرینہ و بتقاضائے بلاغت محذوف ہے۔ ہم جگہ جگہ عربیت کے اس اسلوب کا حوالہ دیتے آ رہے ہیں کہ جب مخاطب کی توجہ پوری طرح مبتدا پر مرکوز کرانی ہو تو خبر کو حذف کر دیتے ہیں۔ 'قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ' سے مراد 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا کلمہ ہے۔ اللہ و رسول کے معاملے میں یہی کلمہ دستور اور اہلِ ایمان کی روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ کے مخلص اور وفادار بندوں نے ہمیشہ اسی کلمہ سے اللہ اور اس کے رسولوں کی ہر بات کا خیر مقدم کیا۔ یہی بات ان کے شایانِ شان بھی تھی جب کہ انھوں نے ایمان کا دعویٰ کیا تھا لیکن ان کا حال یہ ہوا کہ جہاد کا ذکر سنتے ہی ان پر موت کی غشی طاری ہونے لگی۔

فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ۔ 'عَزَمَ الْاَمْرُ' کے معنی ہیں معاملے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس کے لیے اقدام کا تہیہ ہو گیا۔

مطلب یہ ہے کہ ان کے شایانِ شان بات تو یہ تھی کہ جہاد کا ذکر سن کر 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کے معروف قول سے اس کا خیر مقدم کرتے پھر جب اللہ و رسول کی طرف سے اس کا حتمی اور آخری فیصلہ ہو جاتا تو اپنے عمل سے اس قول کی صداقت کا ثبوت دیتے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس سورہ کی آیت ۴ میں جو حکم دیا گیا ہے اس کی نوعیت حکمِ جہاد کی نہیں بلکہ جہاد کے لیے تیار رہنے کی ہدایت اور اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ عملی اقدام کی نوبت اس کے بعد آئی۔

'فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ' یعنی اب تک تو اللہ کے رسول کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا ہے اس کی نوعیت محض دعوے کی ہے۔ اس دعوے کی صداقت کے امتحان کا مرحلہ تو اب آیا تھا۔ اس مرحلے میں اگر یہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے کہ یہ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو یہ چیز ان کے لیے بہت بڑے خیر کا دروازہ کھولتی لیکن انھوں نے یہ راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے لیے بزدلی کی راہ پسند کی۔

فَهَلۡ عَسَيۡتُمۡ إِن تَوَلَّيۡتُمۡ أَن تُفۡسِدُواْ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَتُقَطِّعُوٓاْ أَرۡحَامَكُمۡ (۲۲)

منافقین کو نصیحت — اوپر کی آیات میں ان منافقین کے رویہ پر جو تبصرہ ہوا ہے وہ تمام ترغائب کے اسلوب میں ہے لیکن اس آیت میں ان سے براہِ راست خطاب ہے۔ اسلوب کی یہ تبدیلی اس موعظت کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے ہے جو اس میں ان کو کی گئی ہے۔ فرمایا کہ اگر تم نے اس دعوت سے اعراض کیا تو اس سے تم اپنے آپ کو یا اپنی قوم کو کوئی نفع نہ پہنچاؤ گے۔ بس یہی کرو گے کہ دورِ جاہلیت میں جس فساد فی الارض اور جس قطعِ رحم و برادرکشی میں مبتلا رہے ہو اسی میں پھر مبتلا ہو جاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اسی چیز کے خواہاں ہو تب تو تم آزاد ہو کہ جو راہ چاہو اختیار کرو اور اس کا انجام دیکھو لیکن اگر فساد کی جگہ حقیقی امن و عدل مطلوب ہے اور باہمی تعلقات کو اخوت و مودت کی صحیح بنیاد پر استوار دیکھنے کے خواہاں ہو تو واحد راہ اس کی یہی ہے کہ اس دین کو مستحکم کرنے کے لیے جی جان کی بازی لگا دو جو شرک اور قبائلی و گروہی عصبیاتِ جاہلیت کو ڈھا کر تمام بنی آدم کو اللہ کی بندگی و اطاعت اور وحدتِ آدم کے عقیدے پر جمع کر رہا ہے۔

امن اور صلح کی اصل راہ — ان منافقین کو خاص اہتمام کے ساتھ خطاب کر کے یہ نصیحت کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ ان کے اندر ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو کفارِ قریش کے ساتھ سمجھوتے کا خواہشمند تھا۔ سورۂ بقرہ میں بھی اس قسم کے ایک گروہ کا ذکر گزر چکا ہے اور اس سورہ کی آیت ۲۵ میں بھی اسی کا ذکر آ رہا ہے۔ یہ لوگ قریش اور یہود کو یہ اطمینان بھی دلاتے رہتے تھے کہ ہم اگرچہ مسلمانوں کے اندر شامل ہیں لیکن بعض معاملات میں ہم آپ ہی لوگوں کا ساتھ دیتے رہیں گے۔ آگے اسی سورہ کی آیت ۲۶ میں بھی اس گروہ کا ذکر آئے گا۔ یہ لوگ اپنی اس منافقانہ پالیسی پر اس وقت تک تو پردہ ڈالنے میں ایک حد تک کامیاب رہے جب تک جنگ کا مرحلہ سامنے نہیں آیا تھا لیکن جب یہ مرحلہ سر پر آ گیا تو ان کے لیے چھپنے کا موقع باقی نہیں رہا۔ قریش اور ان کے حلیفوں کے خلاف یہ لوگ تلوار اٹھانے پر تیار نہیں تھے اور اب مسلمانوں کے اندر شامل رہنے کے لیے اس چیز سے کوئی مفر باقی نہیں رہا تھا چنانچہ اپنے نفاق پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے ان لوگوں نے یہ وسوسہ اندازی شروع کر دی کہ ہم بھائیوں بھائیوں کے اندر خون ریزی پسند نہیں کرتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اور قریش اور اس ملک کے دوسرے عناصر سب مل جل کر صلح اور محبت کے ساتھ رہیں۔ یہی راہ اصلاح کی ہے۔ اگر اس سے ہٹ کر جنگ کی راہ اختیار کی گئی تو اس ملک میں ایسا فساد برپا ہو جائے گا جس کو دبانا ناممکن ہوگا۔ یہ لوگ اپنی اسی منافقانہ پالیسی کی وجہ سے اپنے کو مصلح اور امن پسند کہتے تھے اور ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ مسلمان ان کی یہ پالیسی اپنا لیں تاکہ ان کے نفاق پر پردہ بھی پڑا رہے اور اسلام کے دشمنوں کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔ ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر آیت زیرِ بحث میں فرمایا کہ یہ راہ جو تم نے اختیار کی ہے اور جس کو چاہتے ہو کہ دوسرے بھی اختیار کریں امن اور صلح کی راہ نہیں ہے بلکہ یہ اسی فساد اور برادرکشی کی طرف تمہاری رجعت ہے جس میں تم پہلے مبتلا رہے

ہو۔ امن اور اخوت کی راہ یہ ہے کہ سب ایک اللہ کے بندے اور ایک آدم کی اولاد کی حیثیت سے زندگی بسر کریں اور اس نظام زندگی کو اپنائیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور آدم کی وحدت کے عقیدے پر قائم ہے اور جس کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ یہ چیز اس جاہلی نظام زندگی کو برقرار رکھنے سے حاصل نہیں ہو گی جس میں قبیلہ قبیلہ کا خدا بھی جدا ہے اور ہر ایک کا باوا آدم بھی الگ الگ ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اسلام میں نظام اجتماعی کی بنیاد وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدم کے عقیدے پر ہے۔ اس مسئلہ پر سورۂ نساء کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ (۲۳)

فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی ہے۔ اس لعنت کے اثر سے ان کے کان بہرے اور ان کی آنکھیں اندھی ہو گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو روشنی دکھائی اور یہ بات ان پر اچھی طرح واضح بھی ہو گئی کہ یہ روشنی اللہ نے اتاری ہے لیکن یہ لوگ مڑ مڑ کر اپنی اسی جاہلیت کی تاریکی ہی کو دیکھنے اور اسی میں واپس جانے کے متمنی ہیں۔ ان کی اس ناقدری کے سبب سے اللہ نے ان پر لعنت کر دی اور اپنی روشنی ان سے سلب کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ان کے کان حق نیوشی کی صلاحیت سے اور ان کی آنکھیں بصیرت سے محروم ہیں۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (۲۴)

فرمایا کہ دلوں کو زندہ کرنے والی چیز قرآن ہے بشرطیکہ یہ اس پر تدبر کرتے لیکن یہ ناقدرے لوگ کبھی اس پر غور نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دلوں کو جو زنگ لگتے ہیں وہ اس طرح ان کے دلوں پر چڑھ گئے ہیں کہ جس طرح قفل سے دروازے بند ہو جاتے ہیں اسی طرح ان کے دل بھی اس زنگ سے بند ہو چکے ہیں۔

لفظ 'قُلُوبٍ' کی تنکیر یہاں اظہار نفرت و کراہت کے لیے ہے۔ اس کی مثال سورۂ نساء کی آیت ۴۷ میں گزر چکی ہے۔ وہاں اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا ہے 'آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبْلِ أَن نَّطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا' (ایمان لاؤ اس چیز پر جو ہم نے اتاری ہے تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو تمہارے پاس موجود ہے، قبل اس کے کہ ہم چہروں کو مٹا کر ان کے پیچھے کی طرف موڑ دیں) یہاں جس طرح 'وُجُوهًا' کی تنکیر اظہار نفرت و کراہت کے لیے ہے اسی طرح آیت زیر بحث میں لفظ قلوب کی تنکیر اظہار کراہت کے لیے ہے۔ گویا یہ دل ایسے قابل نفرت اور گھنونے ہیں کہ متکلم کو تعیین کے ساتھ ان کی طرف اشارہ بھی گوارا نہیں۔

'أَقْفَالُهَا' سے مراد وہ چیزیں ہیں جو دلوں کو روگ یا زنگ کی طرح لگتی ہیں۔ اس قسم کے روگوں کا ذکر اس سورہ میں بھی ہوا ہے (مثلاً اوپر آیت ۲۰ اور آگے آیت ۲۹ میں) اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی ان کا ذکر تفصیل سے موجود ہے۔ دنیا کی محبت، موت کا ڈر، بخل، بزدلی، کینہ، حسد، نفاق

منافقین کے دل زنگ آلود ہو چکے ہیں

دلوں کا زنگ قرآن کے تدبر سے دور ہوتا ہے

اور اس قبیل کی دوسری چیزیں اس کے نمایاں اجزاء ہیں۔ اگر ریاست و امارت حاصل ہو تو کبر و غرور کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور قساوت بھی اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ ان بیماریوں کا علاج قرآن کو سننا اور سمجھنا ہے، جیسا کہ سورۂ انفال کی آیات ۲۳-۲۴ کے تحت اس کی وضاحت ہو چکی ہے لیکن اس طرح کے لوگوں کو سب سے زیادہ وحشت قرآن ہی سے ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ان کا علاج ناممکن ہو جاتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ (۲۵)

نفاق ارتداد ہے

فرمایا کہ ان منافقین کی یہ روش ارتداد کی روش ہے۔ ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ راہ حق یہی ہے جس کی طرف پیغمبر دعوت دے رہے ہیں۔ چنانچہ آگے بڑھ کر انھوں نے اس کو قبول بھی کر لیا لیکن جب آزمائشوں سے سابقہ پڑا تو شیطان نے ان کو فریب دیا اور یہ اس کے فریب میں مبتلا ہو گئے اور خدا نے بھی ان کو ڈھیل دے دی اس لیے کہ جو لوگ جان بوجھ کر محض اپنی خواہشوں کی پیروی میں راہِ حق سے انحراف اختیار کرتے ہیں اللہ ان کو ڈھیل دے دیتا ہے کہ وہ جس وادی میں ہرزہ گردی کرنا چاہتے ہیں کریں۔

نفاق کا ارتداد ہونا قرآن کے دوسرے مقامات سے بھی واضح ہے۔ سورۂ مائدہ آیت ۵۴ میں انہی منافقین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: 'يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ' (اے ایمان لانے والو! جو تم میں سے اپنے دین سے برگشتہ ہونا چاہتا ہے وہ برگشتہ ہو جائے، خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے وہ عنقریب ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور جو اس سے محبت کریں گے)۔

'أَمْلَىٰ' کا فاعل یہاں اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن میں یہ فعل اللہ تعالیٰ ہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور اسی کے لیے اس کا استعمال موزوں ہے۔ شیطان کی طرف اس کی نسبت کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ قرینہ موجود ہو تو مجرد فعل ہی بتا دیتا ہے کہ اس کا فاعل کون ہے۔ اس کی متعدد نظیریں قرآن میں موجود ہیں۔ سورۂ یوسف کی آیت ۱۱۰ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِسْرَارَهُمْ (۲۶)

منافقین کے مائدۂ درگاہ ہونے کا سبب

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو اس وجہ سے شیطان کے حوالہ کر دیا کہ حق کے اچھی طرح واضح ہو چکنے کے بعد بھی ان کا ساز باز اسلام کے ان دشمنوں کے ساتھ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب سے سخت نفرت کرنے والے ہیں۔ یہ ان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ بعض معاملات میں ہم آپ ہی لوگوں کا ساتھ دیتے

رہیں گے۔ 'لِلَّذِیْنَ کَرِھُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ' سے اشارہ یہود اور قریش کے لیڈروں کی طرف ہے جن کی اسلام کے ساتھ دشمنی بالکل واضح تھی لیکن یہ منافقین ان کو اطمینان دلاتے رہتے تھے کہ ہر چند ہم مسلمانوں میں شامل ہو گئے ہیں لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ اب آپ لوگوں کے ساتھ ہمارا کوئی رابطہ باقی ہی نہیں رہا۔ اگر آپ لوگوں پر کوئی مشکل وقت آیا تو آپ دیکھیں گے کہ ہم آپ ہی کا ساتھ دیں گے اور اس معاملے میں ہم کسی کی بھی خوشی یا ناخوشی کی پروا کرنے والے نہیں ہیں۔ انہی منافقین کے متعلق سورۂ حشر میں بیان ہوا ہے کہ یہ یہود کے پاس جا جا کر ان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ اگر آپ لوگ یہاں سے نکالے گئے تو ہم بھی آپ لوگوں کے ساتھ نکل جائیں گے اور آپ کے معاملے میں ہرگز کسی کی بات کا لحاظ نہیں کریں گے۔ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَکُمْ وَلَا نُطِیْعُ فِیْکُمْ اَحَدًا اَبَدًا (الحشر: ۱۱) (اگر آپ لوگ نکالے گئے تو آپ لوگوں کے ساتھ ہم بھی نکلیں گے اور آپ لوگوں کے بارے میں ہم کسی کی بات بھی کبھی ماننے والے نہیں ہیں)۔

'وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِسْرَارَھُمْ'۔ 'اسرار' سے مراد ان کا یہی ساز باز ہے جس کی طرف اوپر والے ٹکڑے میں اشارہ ہوا ہے اور یہ جملہ مجرد خبر کا نہیں بلکہ تہدید و وعید کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ان رازداریوں سے اچھی طرح واقف ہے اور اس کا انجام عنقریب ان کے سامنے آئے گا۔

فَکَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَاَدْبَارَھُمْ (۲۷)

منافقین کا حالِ موت کے وقت

یہ ان کا انجام بیان ہوا ہے کہ اسلام کے خلاف اس طرح کی سازشیں کرنے والوں کو ان کے جرم کی سزا اسی وقت سے ملنی شروع ہو جاتی ہے جب فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے آتے ہیں تو یہ لوگ سوچ لیں کہ اس وقت یہ کیا کریں گے جب خدا کے سخت گیر فرشتے ان کی روحیں ان کے مونہوں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے قبض کریں گے اور کوئی بھی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہو گا۔

ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰہَ وَکَرِھُوْا رِضْوَانَہٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَھُمْ (۲۸)

یعنی ان لوگوں کے ساتھ یہ خاص معاملہ اس وجہ سے ہو گا کہ ان کی ساری بھاگ دوڑ اللہ تعالیٰ کی مخالفت میں رہی ہے۔ جو باتیں اللہ کو ناراض کرنے والی تھیں وہ انھوں نے اختیار کیں اور جو کام اس کو خوش کرنے والے تھے ان سے یہ بیزار رہے۔ اس کی پاداش میں فرشتے ان کی موت کے وقت ہی سے ان پر عذاب کی مار شروع کر دیں گے اور ان کے وہ سارے اعمال اللہ تعالیٰ حبط کر دے گا جو انھوں نے اسلام کے دعوے کے ساتھ بظاہر نیکی کے کیے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ یُّخْرِجَ اللّٰہُ اَضْغَانَھُمْ (۲۹)

منافقین کا پردہ اللہ چاک کر کے رہے گا

یہ بھی ان کو دھمکی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہ ریشہ دوانیاں جو کر رہے ہیں تو کیا ان کا گمان ہے کہ ان حرکتوں پر ہمیشہ پردہ ہی پڑا رہے گا، کبھی اللہ ان کو بے نقاب نہیں کرے گا؟ اگر

ان کا گمان یہ ہے تو بالکل غلط ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان کے چہرے کی نقاب الٹ دی جائے تاکہ سب ان کو اچھی طرح پہچان لیں، کسی کو یہ فریب میں مبتلا نہ کر سکیں۔

'مَّرَضٌ' سے مراد نفاق بھی ہے اور کینہ و حسد بھی جو ان منافقین کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تھا اور جس کے سبب سے وہ ان حرکتوں کا ارتکاب کرتے تھے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ نفاق بجائے خود بھی مرض ہے لیکن یہ مرض شدید تر ہو جاتا ہے جب اس کے اوپر حسد اور کینہ کا اضافہ ہو جائے۔ یہاں لفظ 'اَضْغَان' سے اسی حسد اور کینہ کی طرف اشارہ ہے۔ 'اَضْغَان' جمع ہے 'ضِغْن' کی جس کے معنی کینہ کے ہیں۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۭ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ (۳۰)

لفظ 'لَحْن' توریہ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یعنی آدمی بات اس طرح کرے کہ اپنے دل میں تو اس کا مفہوم کچھ اور رکھے لیکن دوسرے کو اس کا کچھ اور مفہوم سمجھانے کی کوشش کرے۔ منافقین اس فن میں بڑے مشاق تھے وہ بات ایسے ہیر پھیر سے کرتے کہ کفار اور مسلمانوں دونوں کو بیک وقت یہ باور کرانا چاہتے کہ ان کی تمام ہمدردیاں انہی کے ساتھ ہیں۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے منافقین کو دھمکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ذرا مشکل نہیں ہے کہ ان کو اس طرح بے نقاب کر دے کہ تم ان میں سے ہر ایک کو اس کی خاص علامت امتیاز سے پہچان جاؤ کہ یہ منافق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کر رہا ہے تو یہ اس کی ستاری ہے تاہم تمہارے لیے ان کا پہچان لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ تم ان کی باتوں کے ایچ پیچ، ان کے کلام کے دورخے پن اور ان کے لہجہ کے تذبذب سے ان کو نہایت آسانی سے تاڑ سکتے ہو۔

'وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ' یہ اسی سیاق میں منافقین کو براہ راست خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تم مسلمانوں کو اپنے کلام کے دورخے پن سے دھوکا دینے میں کامیاب بھی ہو جاؤ تو یہ کامیابی تمہارے لیے کوئی خوش انجام چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے ہی اور جب وہ باخبر ہے تو تم دوسروں سے چھپا کر کیا فائدہ اٹھا سکو گے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا۟ اَخْبَارَكُمْ (۳۱)

کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کے لیے امتحان

یعنی مختلف قسم کے نرم و گرم حالات کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ لازماً تمہارا امتحان کرے گا یہاں تک کہ وہ اچھی طرح پرکھ لے گا کہ تمہارے اندر اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور ثابت قدم رہنے والے کون ہیں اور کون محض زبان کے غازی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ تو نہیں ہے کہ وہ ہر منافق کی پیشانی پر لکھ دے کہ یہ منافق ہے لیکن اس کی یہ سنت بالکل لازمی اور قطعی ہے کہ وہ مختلف

امتحانات کے ذریعہ سے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کرتا ہے اور یہ بات چونکہ اس کی سنت کا تقاضا ہے اس وجہ سے اس امتحان سے تمہیں بھی لازماً گزرنا پڑے گا اور وہ لوگ اپنے کو زیادہ دنوں تک چھپائے رکھنے میں کامیاب نہیں ہوں گے جو محض فریب کے جامے میں مسلمانوں کے اندر گھسے رہنا چاہتے ہیں۔

اس آیت پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو اس سے اشارۃً یہ بات بھی نکلی کہ ان امتحانوں کا اصل مقصد تو مجاہدین و صابرین کو ممیز کر دینا ہے لیکن اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ان لوگوں کے حالات بھی کسوٹی پر آ جائیں گے جو محض فریب سے اپنے آپ کو اس زمرے کے اندر گھسائے رکھنے کے خواہشمند ہیں۔ 'وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ' میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ 'اخبار' سے مراد ان کے حالات ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ تو لوگوں کو اس لیے بلوتا ہے کہ ان کے اندر جو مکمن ہے وہ نکل کر سامنے آ جائے۔ لیکن اس کا یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ چھپا چور بھی سامنے آ جاتا ہے۔

یہ امتحان چونکہ سنتِ الٰہی کا تقاضا ہے اس وجہ سے اس کا بیان لامِ تاکید کے ساتھ ہوا ہے۔ اور 'نَعْلَمَ' کے معنی یہاں پرکھنے اور امتیاز کرنے کے ہیں۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ (۳۲)

منافقین کو تنبیہ

یہ سورہ کے آخر میں اس مضمون کا پھر اعادہ فرمایا ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا اور مقصود اس کے اعادے سے، جیسا کہ آگے کے مضمون سے واضح ہو گا، منافقین کو متنبہ کرنا ہے کہ اللہ اور رسول سے جو زور آزمائی کفار کر رہے ہیں اس سے وہ اللہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے بلکہ یہ خود منہ کی کھائیں گے۔ ان کی تمام کوششیں اس دنیا میں بھی رائگاں ہو کے رہیں گی اور آخرت میں بھی یہ خوار ہونے والے ہیں۔ تو ان کے پیچھے لگ کر تم اپنی دنیا اور آخرت برباد نہ کرو بلکہ پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اگر تم نے کمزوری نہ دکھائی تو اللہ تمہی کو سربلند کرے گا اور یہ مخالفین ذلیل و خوار ہوں گے۔

کفار قریش اور ان کے حلفاء کی تباہی لازمی ہے

'اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' کے الفاظ دلیل ہیں کہ یہاں قریش اور ان کے حلفاء مراد ہیں۔ آیت ۱ میں بھی انہی الفاظ سے ان کا ذکر ہوا ہے۔ 'وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى' انہی کی تعریف مزید ہے کہ ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اللہ کا رسول ان کو جس دین کی دعوت دے رہا ہے وہ بالکل حق ہے لیکن یہ محض اپنی سیادت کے زعم میں اس کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ مخالفت اللہ کے دین کو تو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی البتہ یہ خود اپنے کو تباہ کر لیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ اللہ کے رسول کو اس کا رسول جانتے ہوئے اور اس کی دعوت کو پہچانتے ہوئے اس کی مخالفت کے لیے اٹھے ہیں تو ان کا یہ بناوٹی دم خم کتنی دیر تک ان کا ساتھ

دے گا۔ بالآخر یہ ڈگ ڈال دیں گے اور ذلیل ہوں گے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (۳۳)

خدا کی اطاعت اپنے ذاتی مصالح سے بالاتر ہو کر کرو

خطاب اگرچہ عام ہے لیکن انداز کلام دلیل ہے کہ روئے سخن خاص طور پر ان کمزور قسم کے مسلمانوں ہی کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے۔ فرمایا کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمہارے اس ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں فعل 'اَطِيعُوا' اپنے کامل اور حقیقی مفہوم میں ہے اس وجہ سے اس کا صحیح مدعا یہ ہوگا کہ ہر طرح کے حالات میں اپنے ذاتی مفادات و مصالح سے بے پروا ہو کر، اللہ اور رسول کے ہر حکم کی اطاعت کرو۔

'وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ' یعنی اسی طرح کی اطاعت سے تمہارے اعمال مثمر اور نتیجہ خیز ہوں گے۔ اگر تم نے اس اطاعت کو اپنے مصالح کے تابع رکھا تو یاد رکھو کہ تمہارے تمام اعمال برباد ہو جائیں گے اگرچہ وہ اعمال دین ہی کے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایمان صرف وہی قبول ہوتا ہے جو اس کے شرائط کے مطابق ہو، جو لوگ اپنے شرائط پر ایمان لانا اور صرف اپنے مصالح کے حد تک اس کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں ان کی دینداری ان کے منہ پر پھینک ماری جاتی ہے تو اس طرح کی کوئی بات کر کے اپنے اعمال رائگاں نہ کرو۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ (۳۴)

یعنی ان کافروں کو اللہ تعالیٰ کبھی بخشنے والا نہیں ہے جنھوں نے خود بھی کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو بھی اللہ کی راہ سے روکا اور پھر اسی کفر پر جمے ہوئے مر گئے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی انجام ان لوگوں کا بھی ہونا ہے جو ان کا سہارا لیں گے اور ان کے ساتھ اپنی دوستی برقرار رکھنے کے لیے سازشیں کریں گے۔

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ ۖ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ ۖ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَن يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ (۳۵)

اپنی بزدلی پر پردہ ڈالنے کے لیے منافقین کی ایک تدبیر

'سَلْم' کے معنی صلح اور سمجھوتے کے ہیں۔ اوپر آیات ۲۲، ۲۳ کے تحت ہم ذکر کر آئے ہیں کہ منافقین چونکہ جنگ کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے اس وجہ سے صلح اور سمجھوتے کی باتیں بہت کرتے تھے۔ وہ مسلمانوں کو بھی مشورہ دیتے کہ جنگ کے بجائے صلح سے معاملات طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور یہی دعوت وہ قریش کو بھی دیتے۔ وہ اپنے آپ کو ایک صلح پسند پارٹی کی حیثیت سے پیش کرتے اور لوگوں کو یہ تاثر دیتے کہ یہی پالیسی اختیار کرنے میں اس ملک کی خیر ہے ورنہ یہاں بھائیوں کا خون بھائیوں کے ہاتھوں بہے گا اور پوری قوم کا شیرازہ ابتر ہو جائے گا۔ ان کی یہ پالیسی مبنی تو تھی تمام تر ان کی بزدلی اور مفاد پرستی

پر لیکن وہ اس کی دعوت صلح پسندی اور امن دوستی کے روپ میں دیتے اور ان لوگوں کو متاثر کر لیتے جن
کے اندر نفاق کے جراثیم ہوتے۔ اس آیت میں ان کی اسی کمزوری سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ تم بزدل ہو
کر صلح اور سمجھوتے کے داعی نہ بنو بلکہ عزم و ایمان کے ساتھ جہاد کے لیے اٹھو۔ اگر تم سچے ایمان کے ساتھ
جہاد کے لیے اٹھو گے تو تمہی سربلند رہو گے اور تمہارے دشمن ذلیل و خوار ہوں گے۔ اللہ تمہارے
ساتھ ہے اور جب اللہ تمہارے ساتھ ہے تو اس کی مدد و نصرت ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہو گی اور یہ
اطمینان رکھو کہ اللہ تمہارے اعمال کے صلہ کے معاملے میں کوئی خلاف وعدگی و بے وفائی ہرگز نہیں کرے گا
بلکہ تمہارے ہر عمل کا، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، بھرپور صلہ دے گا۔

زبان کا ایک نکتہ

'فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ' میں عربیت کا وہی اسلوب ہے جو البقرۃ کی آیت ۴۲ 'وَلَا
تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ' کے تحت زیر بحث آ چکا ہے۔ جہاں معطوف اور معطوف علیہ
دونوں میں ایک ہی حقیقت ظاہر کی گئی ہو وہاں لائے نفی کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی صورت
آیت زیر بحث میں بھی ہے۔ ان منافقین کی یہ دعوتِ صلح چونکہ ان کی بزدلی ہی کا نتیجہ تھی اس وجہ سے
'تَدْعُوا' کو 'فَلَا تَهِنُوا' پر عطف کر دیا اور 'لَا' کو حذف کر دیا تاکہ اسلوب کلام ہی سے یہ بات واضح ہو جائے
کہ یہ دعوتِ صلح اس لیے نہیں دے رہے ہو کہ تم بڑے صلح پسند ہو بلکہ یہ محض اپنی بزدلی پر پردہ ڈالنے
کی ایک ناکام سعی ہے۔

'وَتَرَهُ حَقَّهُ' کے معنی ہوں گے اس نے اس کے حق میں خیانت یا کمی کی۔ 'لَنْ يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ'
کے معنی ہوں گے کہ اللہ سے یہ اندیشہ نہ رکھو کہ وہ تمہارے اعمال کے صلہ کے باب میں تمہارے ساتھ
کوئی بے وفائی یا خیانت کرے گا بلکہ وہ بھرپور صلہ دے گا۔ جب ہر عمل کا بھرپور صلہ ملنے والا ہے
تو اس کی راہ میں قربانی سے جی چرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

إِنَّمَا الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ
وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ (۳۶)

بے حوصلہ لوگوں کی حوصلہ افزائی

یعنی دنیا کی محبت میں پھنس کر خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کرو۔ اس دنیا کے
مال و متاع کی قدر و قیمت اگر کچھ ہے تو اسی شکل میں ہے جب اس سے آخرت کی کچھ کمائی کر لی جائے
اگر کسی نے آخرت کی کمائی نہیں کی تو اس نے اپنی زندگی بوالہوسی و بے حاصلی میں گزار دی۔ اطمینان رکھو
کہ اگر تم ایمان اور تقویٰ کی زندگی اختیار اور اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرو گے تو یہ خسارے کا سودا نہیں
ہے بلکہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل کا بھرپور صلہ دے گا اور تم اس دنیا کے خزف ریزوں کے عوض
ابدی بادشاہی کا تخت و تاج حاصل کرو گے۔

'وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ' کے بعد لفظ 'اِحْفَاءً' محذوف ہے۔ بعد والی آیت میں اس کی وضاحت آ رہی

ہے اس وجہ سے یہاں بربنائے قرینہ اس کو حذف کر دیا۔ تفصیل سے پہلے اجمال کا اسلوب قرآن میں بہت معروف ہے۔ سوالوں کے نقل کرنے میں بھی اسی وجہ سے اجمال کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ جواب سے اس اجمال کی وضاحت خود ہو جاتی ہے۔ 'اِحْفَاءٌ' کے معنی کسی شے کو سمیٹ کر پوری کی پوری لے لینے یا کسی شے کا الحاح و اصرار کے ساتھ مطالبہ کرنے کے ہیں۔ یہ ان بے حوصلہ لوگوں کو اطمینان دہانی ہے کہ مطمئن رہو کہ اللہ تعالیٰ تمھیں اس امتحان میں کبھی نہیں ڈالے گا کہ تم سے تمھارا کل مال سمیٹ کر طلب کرے بلکہ وہ اس کا ایک حصہ ہی طلب کرے گا اور اس کا بھی وہ تمھیں بھرپور صلہ دے گا تو اس کی راہ میں انفاق سے ہراساں ہونے اور اس کی دعوتِ انفاق سے تنگ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

إِن يَسْأَلْكُمُوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوا وَيُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ (۳۷)

اللہ تعالیٰ بندوں کا امتحان لینے میں نہایت کریم ہے

یعنی اللہ تعالیٰ تم سے تمھارے کل مال کا مطالبہ اس وجہ سے نہیں کرے گا کہ وہ ایسا کرے تو تمھارا سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ پھر تم لازماً بخل کرو گے اور اس طرح تمھارا وہ حسد اور کینہ جو تم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہو سب پر آشکارا ہو جائے گا۔ اوپر آیت ۲۹ میں ان منافقین ہی کے لیے یہ دھمکی گزر چکی ہے کہ یہ اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ اللہ ان کے حسد و کینہ پر ہمیشہ پردہ ڈالے رکھے گا۔ وہ ان کو کسی آزمائش میں ڈال کر جب چاہے ان کا سارا پول کھول دے۔ وہی بات یہاں دوسرے پہلو سے ارشاد ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو تم سے یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ اپنا سارا مال یا اس کا بہت بڑا حصہ اس کے حوالہ کر دو اس لیے کہ یہ مال اسی کا عطا کردہ ہے لیکن وہ ایسا اس لیے نہیں کرتا کہ اس طرح کے امتحان سے ان لوگوں کا سارا بھرم کھل جائے گا جن کی بخالت اور نفاق پر ابھی پردہ پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس کریمی کے شکر گزار بنو کہ اس نے تمھیں اس قسم کے کسی کڑے امتحان میں نہیں ڈالا ورنہ وہ چاہے تو ابھی تمھارے چہرے کی نقاب نوچ کر پھینک دے۔

هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنكُم مَّن يَبْخَلُ ۖ وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ ۚ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ ۚ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (۳۸)

بخیلوں کو دھمکی

'هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ' کے اسلوب کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہ ان منافقین کے حال پر افسوس اور حسرت کا اظہار ہے کہ تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کی جو دعوت دی جاتی ہے تو تم بخالت کر رہے ہو گویا کسی اور کو دے رہے ہو حالانکہ خدا سے بخالت کرنا خود اپنے سے بخالت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے مانگتا ہے تو اپنے لیے نہیں بلکہ تمھارے ہی لیے مانگتا ہے کہ وہ اس کے صلہ میں تم کو ابدی بادشاہی بخشے۔ اللہ بالکل بے نیاز ہے، محتاج اگر ہو تو تم ہو، اللہ محتاج نہیں ہے۔

'وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم' یہ ان منافقین کو دھمکی ہے کہ تمھاری

یہ روش ارتداد کی روش ہے۔ اگر تم ارتداد کی راہ اختیار کرنی چاہتے ہو تو جاؤ کرو۔ اللہ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے، وہ تمہاری جگہ دوسروں کو اپنے دین کی خدمت کے لیے اٹھائے گا جو تمہاری طرح بیزار اور نکمے نہیں ہوں گے۔ سورۂ مائدہ میں یہی بات اسی قسم کے منافقین کو خطاب کر کے یوں فرمائی گئی ہے۔ وَيٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۵۴) (اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو! جو تم میں سے اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں گے تو برگشتہ ہو جائیں اللہ کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اللہ عنقریب ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور جو اس سے محبت کریں گے، وہ اہل ایمان کے لیے نرم خو اور کفار پر گراں ہوں گے)۔

سورۂ مائدہ کی اس آیت کی روشنی میں ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ کے اجمال کی وضاحت کیجیے تو مطلب یہ ہو گا کہ تم تو اللہ سے عناد رکھنے والے اور اس کی رضا طلبی سے بیزار ہو اس وجہ سے خدا بھی تم سے بیزار ہے۔ تمہارے برعکس وہ اللہ سے محبت کرنے والے اور اس کی رضا مندی کے طالب ہوں گے اس وجہ سے اللہ بھی ان سے محبت کرے گا۔ تمہارا حال تو یہ ہے کہ تم کفار کے لیے بہت ہی نرم چارہ ہو، تم ان سے دوستی کے طالب ہو اور وہ تم کو جس طرح چاہتے ہیں اپنے اغراض کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ برعکس اس کے وہ اہل ایمان کے لیے تو بے شک نہایت ہی کریم اور نیک خو ہوں گے لیکن کفار اگر ان کے اندر انگلی دھنسانے اور ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کریں گے تو ان کو پتھر کی چٹان پائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کی توفیق بخشی سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

رحمان آباد

۹ ستمبر ۱۹۷۶ء

۱۳ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ

تدبرِ قرآن

۴۸

الفتح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے ربط

سابق سورہ کی آیت ۳۵ میں اہلِ ایمان سے یہ وعدہ جو فرمایا ہے کہ اگر تم کمزور نہ پڑے تو تمہی سربلند ہو گے، تمہارے حریف ذلیل و پامال ہوں گے، اس سورہ میں اسی وعدہ کے ایفاء کی واقعاتی شہادت ہے۔ اس کا آغاز صلح حدیبیہ کے ذکر سے ہوا ہے جو فتح مکہ کی تمہید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت پر اتمام نعمت کا فتح باب ثابت ہوئی۔ اس میں فتح و غلبہ کی ان پیشین گوئیوں اور بشارتوں کا بھی حوالہ ہے جو اس امت کے باب میں تورات اور انجیل میں وارد ہوئی ہیں تاکہ اہلِ ایمان اور اہلِ کفر دونوں پر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے اور آگے ہو گا، ان میں سے کوئی بات بھی اتفاقی نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی سکیم میں پہلے سے طے ہے اور یہ سکیم پوری ہو کے رہے گی۔ کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس میں مزاحم ہو سکے۔

ب۔ سورہ کا پس منظر

اس سورہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر کو نگاہوں کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یہ نہایت مایوس کن حالات کے اندر امید کی روشنی اور شکست کے عام احساس کے اندر فتح مبین کی بشارت بن کر نازل ہوئی۔ اس نے نہایت نازک حالات کے اندر مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی اور دو سال سے زیادہ کی مدت نہیں گزری کہ اس کے ہر وعدہ اور اس کی ہر وعید کی سچائی اس طرح سامنے آ گئی کہ دوست اور دشمن کسی کے لیے بھی اس میں شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۶ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیا میں یہ بشارت ہوئی کہ آپ صحابہؓ کی ایک جماعت کے ساتھ عمرہ کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے ہیں۔ اس رؤیا کی بنا پر آپ نے منادی کرا دی کہ لوگ عمرہ کے لیے تیار ہوں۔ اگرچہ قریش کے ساتھ مسلسل جنگ کی حالت قائم تھی، نہایت قوی اندیشہ تھا کہ مسلمان جماعتی حیثیت سے عمرہ کے لیے نکلے تو وہ لازماً مزاحم ہوں گے اور جنگ کی نوبت آ جائے گی لیکن مسلمانوں پر بیت اللہ سے محرومی اتنی شاق تھی کہ وہ اس خطرے سے بے پروا ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لیے تیار ہو گئے۔ منافقین نے جن کا ذکر پچھلی سورہ میں گزر چکا ہے، مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کی بہت کوشش کی، ڈرایا کہ جو لوگ مکہ جائیں گے ان کو گھر پلٹنا نصیب

نہیں ہو گا لیکن مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیا پر پورا اعتماد تھا اس وجہ سے تقریباً چودہ پندرہ سو صحابہؓ ہم کابی کے لیے تیار ہو گئے۔

اس امر میں راویوں کا اختلاف ہے کہ مہینہ رجب کا تھا یا ذوقعدہ کا۔ بہرحال انہی دونوں مہینوں میں سے کوئی مہینہ تھا۔ یہ مہینے ہمیشہ سے حج و عمرہ کے لیے خاص رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس توقع کے لیے معقول وجہ موجود تھی کہ قریش ان کا احترام ملحوظ رکھیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے مکہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ذوالحلیفہ میں عمرہ کا احرام باندھا۔ قربانی کے لیے ستر اونٹ ساتھ لیے جن کی گردنوں میں علامتِ امتیاز کے طور پر پٹے بھی ڈال دیے گئے کہ ہر دیکھنے والے پر واضح ہو جائے کہ یہ ہدی کے جانور ہیں، کوئی ان سے تعرض نہ کرے۔ جنگ کا کوئی سامان ساتھ نہیں تھا صرف تلواریں تھیں وہ بھی میانوں کے اندر۔ غرض اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا کہ قریش جنگ کا کوئی بہانہ پیدا نہ کر سکیں لیکن ان کی نخوتِ جاہلیت نے گوارا نہیں کیا کہ یہ قافلہ مکہ میں داخل ہونے پائے۔ اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے انھوں نے چھیڑ چھاڑ کے مختلف بہانے پیدا کیے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے ان کی کوئی شرارت کامیاب نہ ہونے دی۔ حدیبیہ پہنچ کر آپ نے ایک شخص کو قریش کے لیڈروں کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ آپ صرف عمرہ کے قصد سے آئے ہیں، اس کے سوا کوئی اور غرض نہیں ہے لیکن انھوں نے قاصد کو قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ بڑی مشکل سے ایک دوسرے گروہ کی مداخلت سے اس کی جان بچی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے خاص سفیر حضرت عثمانؓ کو بھیجا۔ انھوں نے بھی قریش کو اطمینان دلانے کی پوری کوشش کی لیکن قریش اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ البتہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ انھوں نے کوئی بدسلوکی نہیں کی بلکہ عزت سے پیش آئے اور یہ پیش کش کی کہ اگر وہ تنہا طواف کرنا چاہیں تو کر لیں لیکن حضرت عثمانؓ نے ان کی پیش کش رد کر دی کہ رسول اللہ صلعم کے بغیر وہ طواف کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اسی بیچ بیچ میں حضرت عثمانؓ کی واپسی میں کچھ دیر ہو گئی اور ادھر مسلمانوں کے کیمپ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے۔ اس افواہ سے قدرتی طور پر مسلمانوں کے اندر ایک شدید قسم کا اشتعال پیدا ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے نہایت متاثر ہوئے۔ آپ نے لوگوں کو بیعتِ جہاد کی دعوت دی کہ اب ہم قریش سے جنگ کریں گے، تحت، یا تخنہ! صحابہؓ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ جب قریش کو خبر پہنچی کہ مسلمان مرنے مارنے پر تل گئے ہیں تو انھوں نے سہیل بن عمرو کی قیادت میں ایک وفد صلح کی بات چیت کے لیے بھیجا۔ اس وفد نے قریش کی آن رکھنے کے لیے اس بات پر بہت اصرار کیا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں، اگلے سال عمرہ کے لیے آئیں، اہلِ مکہ تین دن کے لیے شہر خالی کر دیں گے تاکہ کسی تصادم کا اندیشہ نہ رہے۔ اسی طرح اس بات پر بھی اصرار کیا کہ اگر کوئی ہمارا آدمی بھاگ کر مسلمانوں کے پاس چلا جائے تو مسلمان اس کو واپس کرنے کے پابند ہوں گے اور اگر مسلمانوں کا کوئی آدمی ہمارے پاس آ جائے تو ہم اس کو واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ صحابہؓ یہ شرطیں قبول کرنے پر کسی طرح بھی راضی نہیں تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارۂ غیبی کے تحت یہ مان لیں اور مندرجہ ذیل شرائط پر ایک معاہدہ طے پا گیا۔

۱۔ دس سال تک فریقین کے درمیان جنگ بند رہے گی۔ اس دوران میں کوئی فریق بھی ایک دوسرے کے خلاف

کوئی خفیہ یا علانیہ کارروائی نہ کرے گا۔

۲۔ اس دوران میں قریش کا کوئی آدمی اگر بھاگ کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جائے گا تو وہ اسے واپس کر دیں گے اور اگر مسلمانوں میں سے کوئی آدمی قریش کے پاس آجائے گا تو وہ اس کو واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔

۳۔ قبائل عرب میں سے جو قبیلہ بھی چاہے فریقین میں سے کسی کا حلیف بن کر اس معاہدہ میں شامل ہو سکتا ہے۔

۴۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔ آئندہ سال وہ عمرہ کے لیے آئیں۔ تین دن تک وہ مکہ میں ٹھہر سکتے ہیں۔ اسلحہ میں سے ہر شخص صرف ایک تلوار میان میں لا سکتا ہے۔ ان تین دنوں میں اہل مکہ ان کے لیے شہر خالی کر دیں گے تاکہ کسی تصادم کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔

ان میں سے دو شرطیں، جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا، مسلمانوں کو شدید ناگوار تھیں۔ لوگ ان کو قبول کرنا اعتراف شکست کے ہم معنی سمجھتے تھے اور کسی طرح بھی راضی نہیں تھے کہ کوئی بات قریش سے دب کر مانی جائے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے جذبات کا اظہار اس موقع پر ایسے تند الفاظ میں کیا کہ زندگی بھر ان کو اس کا پچھتاوا رہا۔ صلح نامہ طے پا جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ لوگ قربانی کر کے سر منڈوائیں اور عمرہ سے فارغ ہوں۔ لیکن لوگوں کی افسردگی و کبیدگی کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص بھی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ بالآخر حضورؐ نے خود پہل کی، جب لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ اب فیصلہ میں کسی تبدیلی کی گنجائش باقی نہیں رہی تب با دل ناخواستہ لوگ اٹھے اور عمرہ سے فارغ ہوئے۔ واپسی کے وقت لوگوں کا عام احساس تھا کہ ہم ناکام واپس ہو رہے ہیں اس وجہ سے قدرتی طور پر بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ سوال بھی تھا کہ نبی کی رؤیا سچی ہوتی ہے تو اس رؤیا کا کیا بنا جو حضورؐ نے دیکھی اور جس کی بنا پر گھر سے نکلے ـــــ یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ نازل ہوئی اور جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، فتح مبین کی بشارت بن کر نازل ہوئی۔ رہا یہ سوال کہ جس چیز کو عام مسلمانوں نے اپنی شکست تصور کیا وہ 'فتح مبین' کس طرح بنی تو اس کا جواب سورہ کی تفسیر سے سامنے آئے گا۔ پہلے سورہ کے مطالب پر ایک اجمالی نظر ڈال لیجیے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۷) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی بشارت کہ صلح حدیبیہ کی شکل میں تمہیں ایک فتح مبین حاصل ہوئی ہے۔ یہ فتح مبین تمہید ہے اس بات کی کہ اب وہ وقت قریب ہے جب فتح مکہ کی صورت میں تمہیں کفار پر کامل غلبہ حاصل ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنے دین کی نعمت تم پر تمام کرے گا اور تم اپنے مشن کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر اپنے رب کی کامل اور ابدی خوشنودی حاصل کرو گے۔ اس مہم کا یہ پہلو بھی نہایت مبارک ہے کہ اہل ایمان کے لیے اس نے ایمان میں افزونی اور حصول جنت کی راہ کھولی جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک فوز عظیم ہے اور ان منافقین و منافقات کے لیے یہ خدا کے غضب اور اس کی لعنت کا سبب بنی جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا رہے اور اس حقیقت کو نہ پا سکے کہ آسمانوں اور زمین کی تمام فوجیں خدا ہی کے حکم کے تحت ہیں اور وہ اپنے علم و حکمت کے تحت

جس طرح چاہے ان سے کام لیتا ہے اور لے سکتا ہے۔

(۸-۱۰) عام مسلمانوں کو خطاب کرکے اس حقیقت کی وضاحت کہ رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک شاہد اور بشیر و نذیر ہو کر آتا ہے۔ لوگوں کا فرض ہے کہ اس پر ایمان لائیں، اس کی توقیر کریں، تمام مہمات میں اس کے ساتھی اور مددگار بنیں۔ جو لوگ اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اگر وہ اس بیعت کا حق ادا کریں تو اس کا اجر بہت بڑا ہے اور اگر اس کا حق ادا نہ کریں تو یاد رکھیں کہ اس میں انہی کی تباہی ہے۔ اللہ کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

(۱۱-۱۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آگاہی کہ اس موقع پر جو منافقین پیچھے بیٹھ رہے ہے اب وہ تمھارے پاس یہ درخواست لے کر آئیں گے کہ گھر بار کی ذمہ داریوں نے ان کو مجبور رکھا اس وجہ سے وہ معافی اور پیغمبر کی دعائے مغفرت کے سزاوار ہیں۔ ان کو بتا دیجیو کہ تمھارے نہ اٹھنے کی وجہ تمھارا یہ گمان تھا کہ اب کے مسلمانوں اور پیغمبرؐ کو گھر پلٹنا نصیب نہ ہو گا تو تم نے اپنے اس گمان کے باعث خود اپنی تباہی کا سامان کیا۔ اب تمھارا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔ وہی جس کو چاہے گا معاف کرے گا، جس کو چاہے گا سزا دے گا۔

ان منافقین کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ یہ لوگ جب دیکھیں گے کہ کسی مہم میں بغیر کسی خطرے کے لقمۂ تر ہاتھ آنے والا ہے تو یہ پرزور درخواست کریں گے کہ انھیں بھی ساتھ نکلنے کی اجازت دی جائے لیکن ان کو ہرگز اجازت نہ دی جائے۔ ان کو آگاہ کر دیا جائے کہ آگے ایک طاقتور دشمن سے مقابلہ ہونے والا ہے اگر اس موقع پر تم نکلے تو خیر ہے اور اگر اس وقت بھی اسی طرح بہانہ سازی کرکے بیٹھ رہے تو تمھارے لیے بھی وہی عذاب مقدر ہے جو کفار کے لیے ہے۔

(۱۷) ان معذورین کا بیان جن کی جنگ سے غیر حاضری نفاق پر محمول نہیں ہو گی بشرطیکہ وہ دل سے اللہ اور رسول کے فرمانبردار رہیں۔

(۱۸-۲۱) ان جاں نثاروں کا بیان جنھوں نے بیعتِ رضوان میں شرکت کی۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی، فتوحات، غنیمت اور فتح مکہ کی بشارت۔

(۲۲-۲۵) اس امر کا بیان کہ حدیبیہ کے موقع پر قریش جنگ کرتے تو منہ کی کھاتے۔ مسلمانوں کے غلبہ کے پہلو کی طرف اشارہ۔ قریش کی کھلی ہوئی اخلاقی و مذہبی شکست۔ قریش کی مرعوبیت کے باوجود مسلمانوں کو جنگ کی اجازت نہ دینے کی حکمت۔

(۲۶) قریش کی اخلاقی شکست کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں کی طرف سے اخلاقی فتح کا جو مظاہرہ ہوا اس کی طرف اشارہ۔ حمیّتِ جاہلیت کے بالمقابل مسلمانوں نے تقویٰ اور اللہ و رسولؐ کی اطاعت کی جو شان نمایاں کی اس کا حوالہ۔

(۲۷) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیا کی تصدیق۔ اس کی تعبیر کے ظہور میں جو تاخیر ہوئی اس کی حکمت۔

(۲۸-۲۹) اسلام کا غلبہ تمام ادیان پر یقینی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی تصویر تورات میں اور حق کے تدریجی غلبہ کی تمثیل انجیل میں۔

سُورَةُ الْفَتْحِ

مَدَنِيَّةٌ ——— آيات ۲۹

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

آیات ۱ تا ۷

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ﴿١﴾ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ
مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ
صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿٢﴾ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا ﴿٣﴾ هُوَ
الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا
إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ ۗ وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ
وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٤﴾ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ
جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَيُكَفِّرَ
عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عِندَ اللَّهِ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٥﴾ وَيُعَذِّبَ
الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ الظَّانِّينَ
بِاللَّهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ۖ وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ
وَلَعَنَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٦﴾ وَلِلَّهِ جُنُودُ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٧﴾

ترجمۂ آیات ۱-۷

بے شک ہم نے تم کو ایک کھلی ہوئی فتح عطا فرمائی کہ اللہ تمہارے تمام اگلے اور پچھلے گناہوں کو بخشے، تم پر اپنی نعمت تمام کرے، تمہارے لیے ایک بالکل سیدھی راہ کھول دے اور تمہیں اپنی ناقابلِ شکست نصرت سے نوازے۔ ۱-۳

وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر طمانیت نازل فرمائی تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کی افزونی ہو اور آسمانوں اور زمین کی تمام فوجیں اللہ ہی کی ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے تاکہ اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور تاکہ ان سے ان کے گناہوں کو جھاڑ دے اور اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی یہی ہے! ۴-۵

اور تاکہ اللہ سزا دے منافق مردوں اور منافق عورتوں، مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو جو اللہ کے باب میں برے گمان کرتے رہے، برائی کی گردش انہی پر ہے! اور ان پر اللہ کا غضب ہوا اور ان پر اس نے لعنت کی اور ان کے لیے اس نے جہنم تیار کر رکھی ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے! اور اللہ ہی کی ہیں آسمانوں اور زمین کی فوجیں اور اللہ غالب و حکیم ہے۔ ۶-۷

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (۱)

[illegible]

'فتح مبین' سے یہاں مراد معاہدۂ حدیبیہ ہے۔ اس کے سوا کسی اور فتح کو مراد لینے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اس کو فتح مبین قرار دینے کے متعدد پہلو بالکل واضح ہیں۔ مثلاً

ایک یہ کہ یہ پہلا موقع ہے کہ قریش نے علانیہ بیت اللہ پر مسلمانوں کا حق تسلیم کیا اور یہ تسلیم کرنا بطور احسان نہیں بلکہ مسلمانوں سے دب کر ہوا۔ آگے آیت ۲۴ سے واضح ہوگا کہ اگر معاہدہ نہ ہوتا اور

جنگ چھڑتی تو مسلمانوں کی فتح یقینی تھی۔ قریش نے صورتِ حال کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا اس وجہ سے وہ معاہدہ کے دل سے خواہش مند تھے۔ البتہ اپنی ناک ذرا اونچی رکھنے کے لیے یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اسی سال عمرہ کرنے پر اصرار نہ کریں بلکہ آئندہ سال آئیں۔ مسلمانوں کو اس بات پر راضی کرنے کے لیے انھوں نے بہت بڑی رشوت بھی دی کہ تین دن کے لیے وہ شہر بالکل خالی کر دیں گے تاکہ کسی تصادم کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔ قریش کی طرف سے یہ پیش کش کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

دوسرا یہ کہ قریش نے اس معاہدے کی رُو سے مسلمانوں کو اپنے برابر کی ایک حریف قوت عرب میں تسلیم کر لیا۔ ان کی نظر میں مسلمانوں کی حیثیت اب باغیوں اور غداروں کی نہیں رہی تھی، جیسا کہ وہ علانیہ اب تک کہتے رہے تھے، بلکہ مساوی درجے کی ایک سیاسی قوت کی ہو گئی چنانچہ انھوں نے علانیہ ان کے لیے یہ حق تسلیم کر لیا کہ عرب کے جو قبائل ان کے حلیف بننا چاہیں وہ ان کو اپنا حلیف بنا سکتے ہیں۔

تیسرا یہ کہ قریش نے مسلمانوں کی جنگی صلاحیت کا لوہا بھی اس حد تک مان لیا کہ خود اصرار کر کے معاہدے میں دس سال کے لیے جنگ بندی کی شرط رکھوائی۔

چوتھا یہ کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ اور مسلمانوں کو جنگ کی اجازت جو نہیں دی تو اس کی وجہ مسلمانوں کی کوئی کمزوری نہیں تھی بلکہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں بہت سے ظاہر اور مخفی مسلمان تھے جو وہاں سے ابھی ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ اندیشہ تھا کہ جنگ کی صورت میں ان کو خود مسلمانوں کے ہاتھوں نقصان پہنچ جائے گا۔

غرض اس کے ایک فتح مبین ہونے کے گوناگوں پہلو واضح تھے جو مسلمانوں سے مخفی نہیں ہو سکتے تھے لیکن قریش نے اپنی حمیتِ جاہلیت کا مظاہرہ کچھ اس طرح کیا اور بعض واقعات نہایت اشتعال انگیز مثلاً ابو جندل کا واقعہ ـــــ اس دوران میں ایسے پیش آ گئے کہ مسلمانوں کے اندر عام احساس یہ پیدا ہو گیا کہ یہ معاہدہ دب کر کیا جا رہا ہے۔ جذبات کے ہیجان میں لوگ اس کے ہر پہلو پر غور کر کے یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ اس معاہدے کی رُو سے انھوں نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ اس سورہ نے جب اصل حقائق کی طرف توجہ دلائی تب لوگوں کو محسوس ہوا کہ فی الواقع انھوں نے معاہدے کے مضمرات سمجھنے میں غلطی کی اور جب اس کے نتائج سامنے آئے تو ہر شخص نے کھلی آنکھ سے دیکھ لیا کہ فی الواقع یہی معاہدہ فتح مکہ کی تمہید ثابت ہوا۔

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا (۲-۳)

اس فتح مبین کے چند نتائج

'لِ' یہاں غایت و نہایت کے مفہوم میں ہے یعنی اللہ نے یہ فتح مبین جو عنایت فرمائی ہے یہ تمہید ہے جو منتہی ہوگی مندرجہ ذیل باتوں پر جن سے اللہ تعالیٰ تمھیں سرفراز فرمانے والا ہے۔

ایک یہ کہ اب وہ وقت قریب ہے کہ تم اپنے مشن کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ تمھیں تمھارے اگلے پچھلے تمام گناہوں کو معاف کر کے اپنی رحمت سے نوازے گا۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی نعمت تمام کرنے والا ہے۔

تیسری یہ کہ ہدایت کی صحیح راہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کھول دے گا۔

چوتھی یہ کہ تمھیں اللہ تعالیٰ ایسا غلبہ عطا فرمائے گا جس کو چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔

یہ چاروں باتیں یہاں اجمال کے ساتھ مذکور ہوئی ہیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ قرآن کے نظائر کی روشنی میں ان کی وضاحت کی جائے۔

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی بشارت دی گئی ہے کہ اس فتح مبین کے بعد فریضۂ رسالت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کا وقت آپ کے لیے قریب آگیا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے آیا ہے۔ مثلاً سورۂ نصر میں فرمایا ہے۔

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝	جب اللہ کی مدد اور فتح ظاہر ہو جائے اور تم دیکھو کہ
وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي	لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے
دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ	ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور
رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ	اس سے مغفرت مانگو، بے شک اللہ بڑا ہی توبہ
تَوَّابًا (۱-۳)	قبول فرمانے والا ہے۔

اس سورہ میں فتح و غلبہ کی بشارت کے ساتھ یہ اشارہ بھی ہے کہ اس کے بعد فریضۂ رسالت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کا وقت آپ کے لیے قریب آجائے گا لیکن صاف الفاظ میں اس کی بشارت دینے کے بجائے اس کے لیے تیاری کرنے کی ہدایت فرمائی گئی کہ تسبیح، نماز اور استغفار سے اس کے لیے تیاری کرو۔ آیت زیر نظر میں یہی مضمون موقع و محل کے تقاضے سے نہایت واضح بشارت کے اسلوب میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ فتح مبین جو تمھیں حاصل ہوئی ہے اس کے بعد اب وہ وقت قریب ہے کہ تمھارے رب نے جو ذمہ داری تم پر ڈالی تھی اس سے فارغ فرمائے گا اور نہایت سرخروئی و سرفرازی کے ساتھ اس طرح فارغ فرمائے گا کہ تمھارے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سب سے بڑی بشارت کوئی ہو سکتی تھی تو لاریب یہی ہو سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس عظیم مشن پر مامور فرمایا تھا اس سے آپ کو اس طرح فارغ فرمائے کہ اس کے متعلق کوئی بھی چھوٹی یا بڑی مسئولیت آپ پر باقی نہ رہے بلکہ یہ اطمینان ہو جائے کہ آپ نے یہ فریضہ ٹھیک ٹھیک اپنے رب کی مرضی کے مطابق انجام دے دیا۔ اس ٹکڑے میں آپ کو خوشنودی کا بھی پروانہ عطا ہوا ہے

اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑا پروانہ کوئی اور آپ کے لیے نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی کی شکرگزاری نے آخری دور میں جب آپ کی عبادت کی سرگرمیوں میں بہت اضافہ کر دیا تو لوگ آپ سے سوال کرتے کہ یا رسول اللہ! آپ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ بخشے جا چکے ہیں تو آپ عبادت میں اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ اس کا جواب دیتے کہ اَفَلَا اَکُوۡنُ عَبۡدًا شَکُوۡرًا (کیا میں اپنے رب کا شکرگزار بندہ نہ بنوں؟)

انبیاء علیہم السلام سے کس طرح کے گناہ صادر ہوتے ہیں۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جس 'ذنب' کی نسبت کی گئی ہے اس سے متعلق یہ وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے اتباعِ ہوا کی نوعیت کے گناہ تو کبھی صادر نہیں ہوتے لیکن اقامتِ دین کی جدوجہد میں، نیک دواعی کے تحت، کبھی کبھی ان سے بھی ایسی باتیں صادر ہو گئی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کی گرفت فرمائی ہے۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس منافقین آتے اور کوئی بہانہ پیدا کر کے یہ چاہتے کہ ان کو جہاد میں شرکت سے رخصت دی جائے۔ آپ کو علم ہوتا کہ یہ لوگ محض بہانہ سازی کر رہے ہیں لیکن کریم النفسی کے سبب سے آپ ان کو رخصت دے دیتے کہ ان کا فضیحتا نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نرمی اگرچہ آپ کی کریم النفسی کا نتیجہ تھی، اس میں اتباعِ ہوا کا کوئی شائبہ نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر آپ کی گرفت فرمائی اس لیے کہ نبی ہر معاملے میں حق و عدل کی کسوٹی ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ شریفانہ سلوک کرنے کے معاملے میں بھی اس حد سے متجاوز نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے شریفانہ سلوک کے لیے ٹھہرا دی ہے۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی اپنی قوم کے سرداروں کی دلداری، اس خیال سے، زیادہ فرماتے کہ اگر یہ لوگ ایمان لائیں گے تو یہ دعوت کی تقویت و ترقی کا ذریعہ بنیں گے۔ یہ چیز بجائے خود کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ دین کی مصلحت کا ایک نہایت اہم تقاضا ہے لیکن اگر یہ اتنی زیادہ ہو جائے کہ اس سے اصلی حق داروں کے حق سے غفلت ہونے لگے یا نا اہلوں کی رعونت میں اس سے اضافہ ہونے لگے تو اس حد تک اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو اس سے روک دیتا ہے۔ سورۂ عبس میں ایک نابینا کا جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے۔

اسی طرح کے واقعات دوسرے انبیاء کی زندگیوں میں بھی پیش آئے جن کی وضاحت ہم نے اپنی اس کتاب میں ان کے محل میں کی ہے۔ آیت زیرِ بحث میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جس گناہ کی نسبت کی گئی ہے اس کی نوعیت یہی ہے۔ اس طرح کی تمام باتوں کے متعلق آپ کو بشارت دے دی گئی کہ یہ ساری چیزیں آپ کو بخش دی جائیں گی۔

'اگلے اور پچھلے' کے الفاظ اصلاً تو احاطہ کے مفہوم پر دلیل ہیں۔ لیکن ان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس بشارت سے پہلے کی غلطیاں بھی معاف اور اس کے بعد بھی اگر کوئی غلطی ہوئی تو وہ بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ اس کے لیے کسی نئی بشارت کی ضرورت نہیں ہے۔

وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ: یہ نعمت دین کے اتمام اور اس کی تکمیل کی بشارت ہے۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب اس نعمت کی تکمیل ہو گئی تو یہ اعلان کر دیا گیا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدۃ: ۳) (اب میں نے تمہاری رہنمائی کے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا)۔

تکمیلِ دین کی نعمت کا ثمرہ

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا: یہ تکمیلِ دین کی نعمت کا ثمرہ بیان ہوا ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہیں اس صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشے گا جس سے شیطان نے لوگوں کو ہٹا دیا تھا۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلق کی ہدایت کے لیے جو دین نازل فرمایا تھا یہود اور نصاریٰ نے بھی اس کو ضائع کر دیا تھا اور اہلِ عرب نے بھی، حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے تعمیر کردہ مرکزِ توحید کو ایک بت خانہ کی شکل میں تبدیل کر کے، اصل نشانِ راہ گم کر دیا تھا۔ جس سے خدا تک پہنچانے والی سیدھی راہ بالکل ناپید ہو چکی تھی۔ یہ راہ خلق کے لیے از سرِ نو اس وقت باز ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اپنے دین کی تجدید و تکمیل فرمائی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ مینارۂ توحید کفر کے نرغہ سے نکل کر اپنے اصل ابراہیمی جمال و شان میں نمایاں ہوا ہے۔ اس ٹکڑے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اب دین بھی نکھر کر سامنے آ جائے گا اور وہ مرکزِ نور بھی بے نقاب ہو جائے گا جو ہدایت کی اصل شاہراہ کی طرف رہنمائی کے لیے تعمیر ہوا تھا۔

یہاں یہ بشارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے دی گئی ہے۔ یہی بشارت اسی سورہ کی آیت ۲۰ میں تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے دی گئی ہے۔ وہاں ان شاء اللہ ہم اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

'نصرِ عزیز' کا صحیح مفہوم

وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا: 'نَصْرًا عَزِيْزًا' سے مراد کفر کے مقابل میں ایسی فتح و نصرت ہے جس کو چیلنج نہ کیا جا سکے۔ اس طرح کی نصرت ظاہر ہے کہ اسی شکل میں آپ کو حاصل ہو سکتی تھی جب کفر کا زور بالکل ہی ٹوٹ جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جب قریش کا زور بالکل ختم ہو جائے اور بیت اللہ مسلمانوں کی تحویل میں آ جائے۔ اب تک مسلمانوں کو قریش کے مقابل میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں وہ بھی اہم تھیں لیکن ایسی نہیں تھیں کہ ان کو چیلنج نہ کیا جا سکے۔ قریش جب تک کعبہ پر مسلط تھے اس وقت تک وہ بہرحال ایک طاقت تھے لیکن واقعۂ حدیبیہ نے ان کی یہ طاقت متزلزل کر دی اور وہ وقت اب دور نہیں رہ گیا تھا کہ ان کے اقتدار کی یہ کہنہ عمارت ایک ہی جھٹکے میں زمین بوس ہو جائے۔ یہ اسی 'نصرِ عزیز' کی بشارت دی گئی ہے۔ عزیز کے معنی غالب و مقتدر کے ساتھ منیع کے بھی ہیں یعنی جس تک کسی کی پہنچ نہ ہو سکے۔

ترتیبِ بیان کی ایک بلاغت

یہاں ان بشارتوں کے ظہور کی ترتیب میں جو بلاغت ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جو چیز سب سے

پہلے ظہور میں آنے والی ہے اس کا ذکر سب سے آخر میں ہوا اور جو چیز سب کا خلاصہ ہے اور سب سے آخر میں ظاہر ہوگی اس کا ذکر سب سے پہلے ہوا۔ یہ ترتیب نزولی ہے۔ یعنی بیانِ مطالب میں نیچے سے اوپر چڑھنے کی نہیں بلکہ اوپر سے نیچے اترنے کی ترتیب اختیار فرمائی گئی ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ یہ سورۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دینے کا تھا۔ فتح مکہ کی بشارت بھی اگرچہ اہم بشارت تھی لیکن اس سے بھی بڑی بلکہ سب سے بڑی بشارت آپ کے لیے یہ تھی کہ وہ انعام اخروی آپ کے سامنے رکھ دیا جائے جو آپ کو ملنے والا ہے اور جس کے ملنے میں اب زیادہ دیر نہیں رہ گئی ہے۔ لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ ۗ وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (۴)

وعدۂ نصرت کی دلیل

اوپر والی آیت میں جس نصرت کا وعدہ فرمایا گیا ہے یہ اس کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ یہ اللہ ہی کی نصرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے مومنوں کے دلوں میں یہ حوصلہ پیدا کیا کہ وہ تمہاری دعوت پر عمرہ کے لیے تمہارے ہم رکاب ہو گئے تاکہ جو دولتِ ایمان ان کو حاصل تھی اس پر وہ اپنی اس حوصلہ مندی اور نبی کی رفاقت سے مزید اضافہ کریں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ سفر اگرچہ عمرہ کے لیے تھا لیکن اس کا ارادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت خطرناک حالات میں فرمایا تھا۔ قریش سے برابر جنگ کی حالت قائم تھی اور اب تک ان کے حوصلہ کا یہ عالم تھا کہ وہ برابر امنڈ امنڈ کر مدینہ پر حملے کر رہے تھے۔ ایسی حالت میں کسی طرح بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ مسلمان جماعتی حیثیت سے عمرہ کے لیے جائیں گے تو وہ بغیر مزاحمت کے آسانی سے ان کو مکہ میں داخل ہونے دیں گے۔ چنانچہ آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ منافقین اسی بنا پر یہ گمان رکھتے تھے کہ مسلمان موت کے منہ میں جا رہے ہیں اور اب کے اس سفر سے ان کو گھر پلٹنا نصیب نہیں ہوگا۔ ایسے حالات کے اندر چودہ پندرہ سو صحابہؓ کا اپنے گھروں کو چھوڑ کر، ڈھائی سو میل دور کے سفر کے لیے اٹھ کھڑے ہونا اور وہ بھی بالکل غیر مسلح، کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان میں برکت دی، ان پر خاص اپنے پاس سے عزم و حوصلہ اتارا اور وہ اس سفر کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے تمہارے ساتھیوں کو اس موقع پر یہ حوصلہ عطا فرمایا وہ آگے کے مراحل میں بھی ان کی حوصلہ افزائی فرمائے گا اور اللہ تم سے جس 'نصر عزیز' کا وعدہ فرما رہا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔

اہلِ ایمان کو جو آزمائشیں پیش آتی ہیں وہ ان کے ایمان کی جانچ کے لیے پیش آتی ہیں

'لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ' میں دین کی اس حکمت کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں اہلِ ایمان کو جو آزمائشیں پیش آتی ہیں وہ درحقیقت ان کے ایمان کی جانچ کے لیے پیش آتی ہیں۔ اگر وہ اس جانچ میں پورے اترتے جاتے ہیں تو ان کے ایمان کی قوت میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ان کو نفسِ مطمئنہ کی بادشاہی حاصل ہو جاتی ہے اور اگر وہ فیل ہو جاتے ہیں اور برابر فیل ہی ہوتے رہتے ہیں تو بالآخر

ان کا نورِ ایمان بالکل ہی بجھ جاتا ہے۔

ایمان کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کا صحیح پہلو

اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں اور اس سنت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ ایمان ایک گھٹنے بڑھنے والی چیز ہے۔ اگر وہ کوئی جامد شے ہوتا تو اس امتحان کی ضرورت نہیں تھی۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے یہ بات جو منسوب کی جاتی ہے کہ وہ ایمان کے گھٹنے بڑھنے کے قائل نہیں تھے تو اس کا ایک خاص محل ہے۔ اس سے ان کی مراد وہ قانونی ایمان ہے جس پر ایک اسلامی ریاست میں ایک مسلمان کے شہری حقوق قائم ہوتے ہیں، نہ کہ وہ ایمان جس پر آخرت کے مدارج و مقامات مبنی ہیں۔ قانونی فقہی ایمان کے اعتبار سے ہر مسلمان جو ضروریاتِ دین کا قائل ہے، برابر ہے اور اسلامی ریاست سب کے ساتھ مسلمان ہی کی حیثیت سے معاملہ کرے گی۔ اس پہلو سے ایک بدوی اور ایک شہری میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ رہا آخرت کا معاملہ تو اس کا انحصار حقیقی ایمان پر ہے جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہو سکتا ہے اور وہی اس کا فیصلہ فرمائے گا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک بجائے خود ہمارے نزدیک بالکل صحیح ہے لیکن اس کی وکالت بھی بالکل غلط طریقہ پر کی جاتی ہے اور اعتراض کرنے والوں نے ان کی بات سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

جو رسول کی مدد کرتے ہیں وہ اپنے لیے کسبِ سعادت کی راہ کھولتے ہیں

'وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا'۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تمہاری رفاقت کے لیے جو آمادہ کر دیا تو یہ ان پر اس نے احسان فرمایا کہ وہ اپنی اس نیکی سے اپنے ایمان پر مزید ایمان کا اضافہ کر لیں ورنہ وہ اپنے رسول اور اپنے دین کی نصرت کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی تمام قوتیں اور تمام فوجیں اللہ ہی کے تصرف میں ہیں۔ وہ جب چاہے کفار سے اپنی ان فوجوں کے ذریعہ انتقام لے سکتا ہے لیکن اس نے اہل ایمان کو اپنے رسول کی نصرت کی دعوت دے کر یہ چاہا کہ ان کے لیے ایک فوزِ عظیم کے حصول کی راہ کھولے۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔ اس کا ہر کام علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور اس کے اس کام میں بھی اس کی عظیم حکمت ہے۔ اس مضمون کی مزید وضاحت مطلوب ہو تو سورۂ محمد کی آیت ۳ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ آگے یہی آیت ایک اور پہلو سے آ رہی ہے۔ وہاں اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا (۵)

ازدیادِ ایمان کا مقصد

یہ 'لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ' کا صلہ بیان ہوا ہے اور اسلوب بیان غایت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے نورِ باطن میں اضافہ کی راہیں جو کھولتا ہے تو اس لیے کہ اس طرح وہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور ان سے ان کے سارے گناہ دور فرما دے گا۔ یعنی یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں

ہے بلکہ تمام تر نفع ہی نفع ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ دخولِ جنت کا ذکر پہلے ہے اور گناہوں کے جھاڑنے کا ذکر بعد میں۔ حالانکہ لوگ جنت میں گناہوں کے جھاڑے جانے کے بعد داخل ہوں گے، ہمارے نزدیک یہ تقدیم و تاخیر محض ظاہری ہے۔ بشارت کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے دخولِ جنت کا ذکر پہلے کر دیا گیا ہے، مقصود یہی بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو گناہوں سے پاک کر کے جنت میں داخل کرے گا۔

منافقین پر تعریض

'وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا' یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصلی اور سب سے بڑی کامیابی یہی ہے تو مبارک ہیں وہ جنھوں نے یہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے تمام خطرات سے بے پروا ہو کر بازی کھیلی۔ یہ ٹکڑا تمہید ہے منافقین کے ذکر کی جو آگے آ رہا ہے اور جن کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ قریش کے ڈر سے گھروں میں دبک کر بیٹھ رہے اور سمجھ رہے ہیں کہ ان کی سیاست بڑی کامیاب رہی اور بڑی ہوشیاری سے انھوں نے اپنے کو ایک بہت بڑے خطرے سے بچا لیا ہے حالانکہ انھوں نے اپنے کو خطرے سے بچایا نہیں بلکہ خطرے میں جھونک دیا ہے جس کا اندازہ ان کو بہت جلد ہو جائے گا۔

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۶)

اللہ تعالیٰ کے امتحان کا دوسرا پہلو

یہ اس امتحان کے دوسرے پہلو کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ جس امتحان سے اہلِ ایمان کے لیے فوزِ عظیم کی راہ کھولتا ہے وہی امتحان لازماً منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کے لیے سب سے بڑی تباہی یعنی دوزخ کی راہ کھولتا ہے اس لیے کہ اس سے ان کے کھوٹ ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں اور اللہ کی حجت ان پر تمام ہو جاتی ہے۔

'اَلظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ' سے ان منافقین کے ان گمانوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر آگے آیت ۱۲ میں بدیں الفاظ آیا ہے: 'بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا' (بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ رسول اور مسلمانوں کو اس سفر سے اپنے گھر والوں کی طرف کبھی پلٹنا نصیب نہ ہوگا۔ یہ گمان تمھارے دلوں میں رچ بس گیا اور تم نے بُرے بُرے گمان کیے اور اس طرح تم ہلاک ہونے والے بنے)۔

منافقین اور مشرکین میں مماثلت

منافقین و منافقات کے ساتھ مشرکین و مشرکات کا جوڑ اس گہری قلبی و ذہنی مماثلت کی بنا پر ہے جو دونوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ جس طرح ایک مشرک اپنے رب کے ساتھ عہدِ بندگی کا مدعی ہوتے ہوئے دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا ہے، اسی طرح ایک منافق بھی اللہ و رسول کے ساتھ

عہدِ ایمان و اطاعت کا مدعی ہوتے ہوئے غیروں سے سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ (محمد ۲۶) (بعض معاملات میں ہم آپ ہی لوگوں کے ساتھ رہیں گے) کی سازشیں کرتا ہے۔ اسی اشتراک کی بنا پر قرآن نے نفاق کو شرک قرار دیا ہے جس کی وضاحت ہم نے اپنی کتاب "حقیقتِ شرک" میں کی ہے۔ یہاں منافقین کا ذکر مشرکین کے ساتھ کر کے قرآن نے ان کا درجہ معین کر دیا کہ اس طرح کے مدعیانِ ایمان کا حشر بالآخر ان مشرکوں کے ساتھ ہی ہو گا جن کے یہ ہم مسلک و ہم مشرب ہیں۔

ایک بلیغ جملہ معترضہ

'عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ' کا فقرہ بطور جملہ معترضہ ہے۔ جب اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے متعلق ان کے بُرے گمانوں اور ان کی بُری تمناؤں کا ذکر آیا تو سلسلۂ کلام کے بیچ میں بغیر توقف کے فرما دیا کہ یہ لوگ مسلمانوں کے اوپر بری گردش کے منتظر ہیں حالانکہ بری گردش درحقیقت خود انہی کے اوپر ہے اس لیے کہ یہ لوگ جن لوگوں سے لَو لگائے ہوئے ہیں ان کا انجام بہت جلد ان کے سامنے آ جانے والا ہے اور اسی انجام سے یہ بھی دوچار ہوں گے۔ ان پر اللہ کی لعنت ہے، ان کے لیے اللہ نے جہنم تیار کر رکھی ہے اور وہ نہایت ہی برا ٹھکانا ہے۔

مردوں کے پہلو بہ پہلو عورتوں کے ذکر کی حکمت

یہاں ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ اوپر اہلِ ایمان کے بیان میں بھی اور پھر منافقین و مشرکین کے ذکر میں بھی مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آزمائش کے دور کے حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ اس دور میں اگر کسی گروہ کے اندر نفاق پرورش پاتا ہے تو اس کی پرورش میں بڑا دخل بیوی بچوں کا ہوتا ہے۔ اس کی طرف اشارہ منافقین کے اس قول سے بھی ہو رہا ہے جس کا حوالہ آگے آیت ۱۱ میں ہے کہ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا (ہم کو ہمارے مال اور اہل و عیال نے پھنسائے رکھا) اور حدیث میں بھی ارشاد ہے کہ 'الولد مبخلة مجبنة' (آل و اولاد سب سے زیادہ بخل و بزدلی میں مبتلا کرنے والے ہیں) اسی طرح اگر کسی گروہ کے اندر ایمان مستحکم ہوتا ہے تو اس میں بھی بیوی بچوں کے عزم و صبر اور ان کے اعتماد علی اللہ کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال متقاضی ہوئی کہ اہلِ ایمان اور اہلِ نفاق دونوں کے ذکر میں عورتوں کا کردار بھی سامنے آ جائے تاکہ مومنات اور منافقات دونوں اپنی اپنی جگہ پر واقف ہو جائیں کہ ان کا رب نہ اپنی مومنہ بندیوں کی جاں نثاریوں سے بے خبر ہے اور نہ منافقات کی تن آسانیوں اور دنیا پرستیوں سے۔

وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۷)

منافقین سے اظہارِ بیزاری

یہی ٹکڑا صرف ایک لفظ 'عزیز' کے فرق کے ساتھ اوپر آیت ۴ میں بھی شامل ہے۔ وہاں یہ ایک خاص پہلو سے آیا ہے۔ یہاں یہ ان منافقین کے اظہار سے بیزاری و بے نیازی کے لیے وارد ہوا ہے کہ اگر یہ منافقین جہنم ہی کے ایندھن بننا چاہتے ہیں تو بن جائیں۔ خس کم جہاں پاک! اللہ کو ان بزدل لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آسمانوں اور زمین کے سارے لشکر اسی کے اپنے ہیں۔ وہ

ہر چیز پر غالب و مقتدر ہے اور ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے۔ اپنی حکمت کے تحت وہ ان لشکروں کو جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ کسی کی بزدلی اور پست ہمتی اس کے ارادوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

۵۔ آگے آیات ۸-۲۱ کا مضمون

آگے کی آیات میں پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ و مقام واضح فرمایا ہے پھر اس مرتبہ و مقام کے تقاضے سے اہلِ ایمان پر آپ کے جو حقوق قائم ہوتے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت سے جو ذمہ داریاں ان پر عائد ہوئیں ان کی تصریح فرمائی ہے۔ پھر ان منافقین کے رویہ پر تفضیح سے تبصرہ کیا ہے جو اس موقع پر جھوٹے بہانے پیدا کر کے اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔ عمرہ کے لیے اس توقع سے نہیں نکلے کہ مسلمانوں کو اس سفر سے پلٹنا نصیب نہیں ہوگا۔ پھر ان جاں باز مسلمانوں کا ذکر فرمایا ہے جنھوں نے نہایت بے سروسامانی کے حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی اور اپنے اخلاص و صدقِ نیت کے صلہ میں اللہ تعالیٰ کی ابدی خوشنودی کے حق دار اور دنیا میں اس کی تائید و نصرت کے سزاوار قرار پائے — آیات کی تلاوت فرمائیے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٨﴾ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ آیات ۸-۲۱
وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ ۚ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٩﴾
إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ
أَيْدِيهِمْ ۚ فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ
ع ۱ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٠﴾ سَيَقُولُ
لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا
فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلْ
فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ
نَفْعًا ۚ بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١١﴾ بَلْ ظَنَنْتُمْ
أَنْ لَنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ

ذٰلِكَ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚۖ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا
بُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَ مَنْ لَّمْ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا
لِلْكٰفِرِیْنَ سَعِیْرًا ﴿۱۳﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَغْفِرُ
لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۴﴾
سَیَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا
ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ
تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَیَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ
بَلْ كَانُوْا لَا یَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ
سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ یُسْلِمُوْنَ ۚ
فَاِنْ تُطِیْعُوْا یُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا
تَوَلَّیْتُمْ مِّنْ قَبْلُ یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۶﴾ لَیْسَ عَلَى
الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِیْضِ حَرَجٌ ؕ
وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ۚ وَ مَنْ یَّتَوَلَّ یُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ ع ۲ ۱۰
عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ
قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ﴿۱۸﴾ ۙ
وَّ مَغَانِمَ كَثِیْرَةً یَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ﴿۱۹﴾
وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِیْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ

وَّكَفَّ اَيۡدِىَ النَّاسِ عَنۡكُمۡ‌ۚ وَلِتَكُوۡنَ اٰيَةً لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَ
يَهۡدِيَكُمۡ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ۙ‏ ﴿۲۰﴾ وَّاُخۡرٰى لَمۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَيۡهَا
قَدۡ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرًا‏ ﴿۲۱﴾

ترجمۂ آیات ۸ - ۲۱ بے شک ہم نے تم کو گواہی دینے والا، خوشخبری پہنچانے والا اور آگاہ کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ لوگو، تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ رسول کی مدد اور اس کی توقیر کرو اور اللہ کی تسبیح کرو صبح و شام۔ ۸ - ۹

جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ تو جس نے عہد توڑا وہ اس نقضِ عہد کا وبال اپنے ہی سر لیتا ہے اور جو پوری کرے گا وہ بات جس کا اس نے اللہ سے عہد کیا تو اللہ اس کو ایک اجرِ عظیم دے گا۔ ۱۰

جو لوگ اہل بدو میں سے پیچھے چھوڑ دیے گئے وہ اب تم سے عذر کریں گے کہ ہم کو ہمارے مال مویشی اور اہل و عیال کی ذمہ داریوں نے پھنسائے رکھا اس وجہ سے آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا کیجیے۔ یہ اپنی زبانوں سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ ان سے کہو، کون ہے جو تمہارے لیے اللہ سے کچھ اختیار رکھتا ہو اگر وہ تم کو کوئی نقصان یا نفع پہنچانا چاہے؟ بلکہ اللہ ان سب باتوں سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔ بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ رسول اور ان کے ساتھیوں کو اب کبھی اپنے گھر والوں کی طرف لوٹنا نصیب نہ ہو گا اور یہ بات تمہارے دلوں میں رچ بس گئی ہے۔ اور تم نے بُرے بُرے گمان کیے اور بالآخر ہلاک ہونے والے بنے۔ اور جو ایمان نہ لایا اللہ اور اس کے رسول پر تو ہم نے ان کافروں

کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔ وہی بخشے گا جس کو چاہے گا اور سزا دے گا جس کو چاہے گا اور اللہ مغفرت فرمانے والا اور رحیم ہے۔ ۱۱-۱۴

جب تم غنیمتیں لینے کے لیے چلو گے تو یہ پیچھے چھوڑے ہوئے لوگ کہیں گے کہ ہمیں بھی اجازت دی جائے کہ ہم آپ لوگوں کے ساتھ چلیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی بات کو بدل دیں۔ کہہ دو، تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے۔ یہی بات تو اللہ نے تم کو پہلے بھی فرمائی تھی! تو وہ کہیں گے کہ بلکہ تم لوگ ہم پر حسد کرتے ہو۔ بلکہ یہی لوگ بہت کم سمجھتے ہیں۔ ۱۵

اہل بدو میں سے ان پیچھے چھوڑے ہوئے لوگوں سے کہہ دو کہ عنقریب تم لوگ ایک طاقتور حریف سے لڑنے کے لیے بلائے جاؤ گے، تم کو ان سے جنگ جاری رکھنی ہوگی یا وہ اسلام لائیں گے۔ تو اگر تم نے اس حکم کی اطاعت کی تو اللہ تم کو ایک اچھا اجر دے گا اور اگر تم نے منہ موڑا جیسا کہ تم نے پہلے منہ موڑا تو وہ تم کو ایک دردناک عذاب دے گا۔ ۱۶

نہ نابینا پر کوئی گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ مریض پر کوئی گناہ ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہے گا اللہ اس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور جو روگردانی کرے گا تو اللہ اس کو ایک دردناک عذاب دے گا۔ ۱۷

اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جب کہ وہ تم سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے تو اللہ نے ان کے دلوں کا حال جان لیا تو اتاری ان پر طمانینت اور ان کو ایک عنقریب ظاہر ہونے والی فتح سے نوازا اور بہت سی غنیمتوں سے بھی جن کو وہ حاصل کریں گے

اور اللہ غالب و حکیم ہے۔ ۱۹

اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جن کو تم پاؤ گے۔ پس یہ اس نے تم کو فوری طور پر دے دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے کہ یہ موجب طمانیت اور مسلمانوں کے لیے نشانی ہو اور تمہیں سیدھی راہ کی ہدایت بخشے۔ اور ایک دوسری فتح بھی ہے جس پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے ہو لیکن اللہ نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۰-۲۱

۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ ۚ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (۸-۹)

نبی صلعم کے مرتبہ و مقام کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہم نے تم کو لوگوں کی طرف اپنے دین کی گواہی دینے والا اور مبشر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ گواہی دینے والا یعنی اپنے دین کی گواہی دینے والا کہ ہم اپنے بندوں کو کس چیز کا حکم دیتے اور کس بات سے روکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس لیے بھی بھیجا ہے کہ ان لوگوں کو جنت کی بشارت دو جو تمہاری گواہی قبول کر کے اپنی زندگیاں سنوار لیں اور ان لوگوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈراؤ جو تمہاری گواہی کو رد کر دیں یا اس کو وہ اہمیت نہ دیں جس کی یہ سزاوار ہے۔ یہ بات اگرچہ ایک عام کلیہ کی حیثیت سے ارشاد ہوئی ہے لیکن کلام کے تدریجی ارتقاء سے یہ حقیقت آپ سے آپ واضح ہو جائے گی کہ روئے سخن منافقین کی طرف ہے جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا زبان سے اقرار تو کر لیا تھا لیکن اس اقرار کے تقضیات سے وہ گریز اختیار کرنے کی راہیں ڈھونڈتے رہتے تھے۔

شاہد کا مفہوم

'شَٰهِدًا' کے معنی ہیں گواہی دینے والا' یعنی لوگوں کے سامنے اللہ کے دین کی گواہی دینے والا۔ عام طور پر لوگوں نے اس سے وہ گواہی مراد لی ہے جو آپ آخرت میں دیں گے لیکن ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔ آخرت میں حضرات انبیاء علیہم السلام جو گواہی دیں گے وہ اسی بنا پر تو دیں گے کہ انھوں نے اس دنیا میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دی ہے۔ اس گواہی پر الاحزاب کی آیات ۴۵-۴۶ کے تحت ہم بحث کر آئے ہیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ حضرات انبیاء

جو گواہی آخرت میں دیں گے المائدۃ کی تفسیر میں اس پر مفصل بحث ہو چکی ہے۔

رسول اللہ صلعم کی بعثت کا مقصد اور امت پر آپ کا حق

لِّتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا - یہ مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہم نے اپنے رسول کو شاہد اور مبشر اور نذیر بنا کر اس مقصد سے بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، رسول کی مدد اور اس کی توقیر کرو اور اللہ کی صبح و شام تسبیح کرو۔ ایمان سے مراد ظاہر ہے کہ سچا اور پکا ایمان ہے اللہ پر بھی اور اس کے رسول پر بھی۔ اس کے بعد صعودی ترتیب سے یعنی نیچے سے اوپر کو چڑھتے ہوئے اس ایمان کے وہ تقاضے بیان ہوئے جو بالکل بدیہی ہیں۔ رسول پر ایمان کا یہ تقاضا بیان فرمایا کہ اللہ کے دین کی اقامت کے لیے جو جدوجہد وہ کر رہے ہیں اس میں ان کے دست و بازو بنو اور ان کی توقیر و تعظیم اللہ کے رسول کی حیثیت سے کرو۔ پھر اللہ پر ایمان کا تقاضا یہ بیان فرمایا کہ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔

مفسرین کی ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام طور پر لوگوں نے تُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ ہی سے مانا ہے۔ ان کے خیال میں اگر ضمیر مفعول کا مرجع رسول مانا جائے تو اس سے بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہاں ترتیب، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، صعودی ہے، اس وجہ سے بُعد نہیں پیدا ہوتا۔ اللہ و رسول پر ایمان کے مطالبہ کے بعد پہلے رسول کا حق اس نے بیان فرمایا کہ رسول کا ذکر ترتیب میں مؤخر تھا اس وجہ سے اس کے ذکر سے متصل ہی اس کا حق بیان فرما دیا پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا حق بیان فرمایا۔ یہ ترتیب بیان قرآن میں جگہ جگہ اختیار فرمائی گئی ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اگر تُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ مانا جائے تو اس سے کلام میں بعض خرابیاں پیدا ہو جائیں گی جن سے کلام کو پاک ہونا چاہیے۔ مثلاً

ایک یہ کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کے بیان کے سیاق و سباق میں ہے اس میں غایت بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کس مقصد سے شاہد و مبشر و نذیر بنا کر بھیجا لیکن یہ تاویل اختیار کر لی جائے تو آیت آپ کے حقوق کے ذکر سے خالی رہ جاتی اور سیاق و سباق سے کٹ جاتی ہے۔

دوسری یہ کہ یہاں روئے سخن اصلاً منافقین کی طرف ہے جن کی اصل کمزوری یہی تھی کہ وہ، ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، جہاد میں آپ کی نصرت اور آپ کی صحیح تعظیم و توقیر (جس کی وضاحت اگلی سورہ میں آئے گی) سے عاری تھے۔ یہ صورت حال مقتضی تھی کہ ان کو رسول پر ایمان کے یہ بدیہی تقاضے بتائے جائیں۔ اگر تُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ مانا جائے تو آیت اپنے موقع و محل سے بے تعلق ہو جائے گی۔

تیسری یہ کہ تعزیر اور توقیر کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے لیے موزوں نہیں ہیں، یہ اپنے مواقع استعمال کے لحاظ سے رسول ہی کے لیے موزوں ہیں۔ 'تُوَقِّرُوْهُ' کا لفظ تو اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل ہی ناموزوں ہے۔ 'تُعَزِّرُوْهُ' بھی کہیں قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں استعمال ہوا ہے۔ جہاں بھی استعمال ہوا ہے رسولوں ہی کے لیے ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو المائدۃ: ۱۲ اور الاعراف: ۱۵۷۔ الفاظ کی موزونیت پر ہم نے سورۂ محمد کی آیت ۴۵ کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ قرآن میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن میں مختلف افعال استعمال ہوئے ہیں اور صرف نظم سے یہ متعین ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی فعل کا فاعل یا مفعول کون ہے۔ اس چیز کا تعلق زبان کے ذوق سے ہے۔ اگر اس کا پورا لحاظ نہ رکھا جائے تو اس سے آیات کی تاویل میں بڑی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۚ فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (۱۰)

رسول کے ہاتھ پر بیعت کی ذمہ داریاں

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید تائید ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ تمہارے ہاتھ پر سمع و طاعت کی بیعت کرتے ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے بیعت نہیں کرتے بلکہ درحقیقت وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ بیعت کے وقت ان کے ہاتھوں کے اوپر جو ہاتھ ہوتا ہے وہ تمہارا نہیں بلکہ اللہ کا ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ بیعت کر کے اس کی ذمہ داریوں سے گریز اختیار کریں گے اور اپنے عمل سے اس عہد کو توڑیں گے جس کو اپنے قول سے انھوں نے باندھا ہے تو یاد رکھیں کہ اس کا وبال انھی کے اوپر آئے گا اس لیے کہ اس معاہدے میں اصل فریق اللہ تعالیٰ ہے اور اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے ساتھ بدعہدی کرنے والا خود ہی خسارے میں پڑتا ہے۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جو شخص وہ ذمہ داری پوری کرے گا جس کے اٹھانے کا اس نے عہد کیا ہے وہ ہرگز خسارے میں نہیں رہے گا بلکہ اللہ تعالیٰ کے پاس وہ اس کا بہت بڑا اجر پائے گا۔

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کو بیعتِ رضوان سے متعلق سمجھا ہے حالانکہ اس کو بیعتِ رضوان سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ بیعتِ رضوان کا ذکر آگے آیت ۱۸ میں آئے گا۔ یہ سمع و طاعت کی اس عام بیعت کا ذکر ہے جو ہر ایمان لانے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر کرتا تھا۔ یہاں اسی کی عظمت و اہمیت اور اس کی ذمہ داریاں منافقین کو غیرت دلانے کے لیے بیان کی گئی ہیں کہ وہ رسول کے ہاتھ پر بیعت تو کر بیٹھے لیکن جب اس کے مطالبات پورے کرنے کا وقت آیا تو منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ ان پر یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ رسول کے ہاتھ پر بیعت درحقیقت اللہ تعالیٰ سے معاہدہ ہے۔ اگر کوئی اس بیعت کی ذمہ داریوں سے گریز اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ سے کیے ہوئے معاہدہ کو توڑتا ہے۔

اور اس کا انجام دنیا اور آخرت دونوں میں رسوائی ہے۔

بے بنیاد نحوی شبہ کا ازالہ

اس آیت میں 'عَلَيْهُ اللّٰهَ' کی ضمیر مجرور پر جو ضمہ ہے اس کی بنا پر بعض مستشرقین نے قرآن کی نحو پر اعتراض کیا ہے۔ ان بیچاروں کو پتہ نہیں ہے کہ نحو کی کتابیں قرآن کے اسلوب و اعراب کو پرکھنے کے لیے کسوٹی نہیں ہیں بلکہ قرآن نحو کی کتابوں کے جانچنے کے لیے کسوٹی ہے۔ قرآن قریش کی ٹکسالی زبان کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے اور ہر پہلو سے بالکل محفوظ بھی ہے۔ اس وجہ سے اگر اس کی کوئی چیز نحو کے توجیہات کے خلاف نظر آئے گی تو اس کی بنا پر قرآن کو متہم نہیں کریں گے بلکہ اس کو اہل نحو کے تتبع کے نقص پر محمول کریں گے۔ سیبویہ فن نحو کا امام ہے۔ میرے استاذ مولانا فراہیؒ بھی اس کو امام مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس کے متعدد مسائل پر کلام عرب کی روشنی میں تنقید کر کے بتایا ہے کہ معروف اسلوب وہ ہے جو قرآن نے اختیار کیا ہے نہ کہ وہ جو سیبویہ نے قرار دیا ہے۔

فصیح عربی میں صرف آہنگ و صوت کے تقاضوں کے تحت بھی الفاظ، حروف اور ضمیروں پر ایسے ایسے تصرفات ہوئے ہیں کہ اگر کسی شخص کا علم صرف نحو کی کتابوں ہی تک محدود ہو تو وہ ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہ ضمیروں ہی کا مسئلہ لیجیے۔ قرآن میں متعدد مثالیں ایسی موجود ہیں کہ ضمیر لفظ کے اندر بالکل مدغم ہو کے رہ گئی ہے اور اس کی وجہ آہنگ و صوت کے تقاضے کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ مثلاً الاعراف کی آیت ۱۱۱ میں ہے: 'اَرْجِهْ وَاَخَاهُ' (اس کو اور اس کے بھائی کو ابھی ٹالو) اسی طرح سورۂ نور کی آیت ۵۲ میں ہے: 'وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ' (اللہ سے ڈرے اور اس سے تقویٰ اختیار کرے)۔

آیت زیر بحث میں جس طرح ضمہ لوگوں کو عجیب معلوم ہوتا ہے بعینہٖ یہی صورت سورۂ کہف آیت ۶۳ میں بھی ہے: 'وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ' (اور مجھے اس سے نہیں غافل کیا مگر شیطان نے) یہاں مثالوں کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ اس مسئلہ کی مزید تحقیق کے خواہش مندوں کو آخری گروپ کی سورتوں میں بہت سی مثالیں ملیں گی کہ صرف آہنگ و صوت کے تقاضے سے حروف، الفاظ اور ضمیروں کی ہیئت میں ایسی تبدیلیاں ہو گئی ہیں جن کی اہل نحو کوئی توجیہ نہیں کر پاتے۔ یہاں بھی وہی صورت ہے۔

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۚ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۚ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۱۱)

منافقین کی پردہ دری

اب یہ وہ اصل بات ارشاد ہوئی ہے جس کے لیے اوپر کی تمہید استوار کی گئی ہے۔ فرمایا کہ جب تم اس سفر سے بخیریت گھر پہنچو گے تو بدویوں میں سے وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے جھوٹے عذرات لے کر تمھارے پاس آئیں گے کہ مال مویشی کی ذمہ داریوں اور بیوی بچوں کی دیکھ بھال کی مصروفیتوں

نے ہمیں آپ کی ہمرکابی کے شرف سے محروم رکھا۔ ہماری مجبوریوں پر نگاہ فرما کر اس کوتاہی کی معافی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے۔ ان لوگوں کی یہ معذرت درخورِ اعتنا نہیں۔ یہ زبانوں سے وہ بات کہیں گے جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔

'قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا'۔ یعنی ان لوگوں سے پوچھو کہ اگر اپنے مفادات و مصالح کی اتنی اہمیت ہے کہ ان کی خاطر خدا اور رسول کے حقوق نظر انداز کرتے ہو تو بتاؤ کہ خدا اگر تمہیں کوئی ضرر یا نفع پہنچانا چاہے تو اس کے مقابل میں کون آڑے آئے گا!

'بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا'۔ یعنی اس قسم کے لاطائل عذرات کی آڑ میں چھپنے کی کوشش نہ کرو۔ اللہ تمہارے تمام کارناموں سے، جو پس پردہ تم کرتے رہے ہو، اچھی طرح باخبر ہے۔

لفظ مخلف کا مفہوم

یہاں ان منافقین کے لیے لفظ 'مُخَلَّفُونَ' استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے در آنحالیکہ یہ لوگ خود پیچھے رہ جانے والے تھے۔ اس کی وجہ ہم سورۂ براءت میں بسلسلۂ منافقین غزوۂ تبوک واضح کر چکے ہیں کہ جب ان لوگوں نے پیچھے بیٹھ رہنے ہی کو اپنی دانش مندانہ سیاست سمجھا تو اللہ نے بھی ان کو پیچھے پھینک دیا، جیسا کہ فرمایا ہے 'فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ' (الصف ۵) یعنی یہ لوگ اپنی بزدلی کے سبب سے آگے بڑھنے والے نہ بنے۔ اس وجہ سے خدا نے بھی ان کو پیچھے دھکیل دیا۔ یہ لوگ زیادہ تر اطرافِ مدینہ کے دیہاتوں سے تعلق رکھنے والے تھے اس وجہ سے ان کے لیے لفظ 'اعراب' استعمال ہوا ہے جو اہلِ بدو کے لیے معروف ہے۔

'قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا' میں 'يَمْلِكُ' متضمن ہے 'يَمْنَعُ' کے معنی پر اور 'مِنْ' کا صلہ اس تضمین پر دلیل ہے۔ ترجمہ میں ہم نے لفظ کے اس مضمر مفہوم کو کھول دیا ہے۔

بَلْ ظَنَنتُمْ أَن لَّن يَنقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ ذَٰلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنتُمْ قَوْمًا بُورًا (۱۲)

منافقین کے دلوں کا اصلی بھید

اوپر والی آیت میں ان کے دلوں کے جس بھید کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ اس کی وضاحت ہے کہ اصل چیز جس نے تم کو اس سفر سے روکا وہ تمہارا یہ گمان تھا کہ اب کے قریش ان مسلمانوں کو کچا ہی کھا جائیں گے اور کبھی ان کو اور ان کے پیغمبر کو اپنے اہل و عیال کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔

'وَزُيِّنَ ذَٰلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ'۔ یعنی یہ گمان چونکہ تمہارا ایک دل پسند گمان تھا اس وجہ سے تم نے اپنے دلوں میں اس کو اچھی طرح آراستہ کیا اور سنتِ الٰہی کے مطابق یہ تمہارے دلوں میں اچھی طرح کھبا دیا گیا۔ پھر اس کے زیر اثر تم نے اسلام کے مستقبل سے متعلق نہایت برے برے گمان کیے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ بس اب چند دنوں کے اندر اندر اس کا قصہ تمام ہوا جاتا ہے۔

'وَكُنتُمْ قَوْمًا بُورًا'۔ یعنی تم تو اسلام اور مسلمانوں کی تباہی کے منتظر رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے

تمھارے علی الرغم ان کو فتح مبین عطا فرمائی البتہ تم لوگ جو اس بات پر نازاں رہے کہ پیغمبر کا ساتھ نہ دے کر تم نے بڑی دانش مندانہ اور کامیاب سیاست اختیار کی، اپنے آپ کو ہلاکت کے کھڈ میں گرانے والے بنے۔

'بُوْرٌ' جمع ہے 'بَائِر' کی۔ اس کے معنی ہلاک ہونے والے کے ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا (۱۳)

منافقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

یہ انہی منافقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ سنایا ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہوئے اللہ و رسول کے حقوق ادا کرنے کے معاملے میں ایسے بزدل اور اسلام کے غلبہ کے بجائے اس کی تباہی کی آرزوئیں اپنے دلوں میں پرورش کر رہے ہیں وہ اللہ اور رسول پر ایمان رکھنے والے نہیں بلکہ کافر ہیں اور یہ کافر لوگ یاد رکھیں کہ ہم نے ان کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۱۴)

اور یہ لوگ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ خدا کی پکڑ سے کوئی اور بچانے والا نہیں ہو گا۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کی ہے۔ کوئی دوسرا اس کی اس بادشاہی میں شریک نہیں ہے۔ وہی جس کو چاہے گا بخشے گا، جس کو چاہے گا سزا دے گا۔

'وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا' البتہ یہ اطمینان ہر شخص کو رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ وہ لوگوں کو پکڑنا اور سزا دینا نہیں بلکہ ان پر مہربانی کرنا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے لوگوں کو چاہیے کہ وہ غلط سہارے ڈھونڈنے کے بجائے اس کی رضا طلبی کی وہ راہ اختیار کریں جو اس نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے لوگوں کے لیے کھولی ہے۔

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ۭ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۵)

یعنی اس موقع پر تو یہ بزدل لوگ بہانے بنا کر اپنے گھروں میں بیٹھے رہے لیکن آگے جب ایسے مواقع آئیں گے جن میں تم کو بغیر کسی جنگ کے بھرپور مال غنیمت حاصل ہونے کی توقع ہو گی تو یہ بھی بڑے شیر مرد بن کر تمھارے پاس آئیں گے کہ انھیں بھی ساتھ چلنے کی اجازت دی جائے۔ اس طرح وہ چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں جو فیصلہ فرمایا ہے اس کو بھی بدل دیں اور بغیر کوئی خطرہ مول لیے مالِ غنیمت بھی حاصل کر لیں۔ فرمایا کہ جب اس طرح کا موقع آئے تو ان سے کہہ دینا کہ تم لوگ ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے۔ اللہ نے اسی طرح کا حکم تمھیں اس سے پہلے بھی دیا لیکن اس وقت تم اپنے گھروں میں بیٹھ

رہے تو اب ہمارے ساتھ نکلنے کے لیے کیوں بے چین ہو۔

'إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا' سے خیبر وغیرہ کی ان غنیمتوں کی طرف اشارہ ہے جو واقعۂ حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کو حاصل ہوئیں۔ ان غنیمتوں کے لیے مسلمانوں کو کوئی خاص جنگ نہیں کرنی پڑی بلکہ دشمن نے مسلمانوں سے مرعوب ہو کر خود ہی میدان خالی کر دیا۔ خیبر کے یہودی بڑے مالدار تھے اس وجہ سے مسلمانوں کو کثیر تعداد میں مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ 'لِتَأْخُذُوهَا' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ گویا مسلمان گھروں سے نکلے ہی اس لیے کہ بغیر لڑے بھڑے مالِ غنیمت باندھ کر واپس آ جائیں۔

'يُرِيدُونَ أَن يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ' یعنی یہ منافقین اس طرح کے مواقع پر ساتھ دینے کی پیشکش کر کے یہ چاہیں گے کہ اللہ کی اس بات کو بدل دیں جو ان کے بارے میں اس نے فرمائی ہے۔ یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے جو اوپر آیت ۶ میں بدیں الفاظ ارشاد ہوئی ہے: 'وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ الظَّانِّينَ بِاللَّهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ۖ وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا' (اور تاکہ اللہ عذاب دے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرکین و مشرکات کو جو اللہ کے باب میں برے گمان رکھنے والے ہیں۔ بری گردش انہی پر ہے! اور ان پر اللہ کا غضب ہوا اور اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم اس نے تیار کر رکھی ہے! اور وہ برا ٹھکانا ہے) مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ انہیں دین کے لیے کچھ کرنا تو نہ پڑے لیکن دنیا اور آخرت دونوں میں اس کے فوائد ان کو حاصل ہوں لیکن ان کی یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں ہے۔ ان کے باب میں اللہ کی بات اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک وہ اپنی حالت دین کے صحیح تقاضوں کے مطابق بدل نہ لیں۔

'قُل لَّن تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِن قَبْلُ' یعنی اگر وہ تمہارے ساتھ نکلنے کی اجازت چاہیں گے تو ان کو اجازت نہ دیجیو بلکہ ان سے صاف صاف کہہ دیجیو کہ تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے۔ اسی طرح کا حکم تو اللہ نے تم کو پہلے دیا تھا لیکن تم نے اس کی تعمیل نہ کی بلکہ دبک کر گھروں میں بیٹھ رہے۔ ہمارے نزدیک یہ اشارہ عمرہ کی اس منادیٔ عام کی طرف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کرائی لیکن ان منافقین نے اس کی تعمیل سے، جیسا کہ اوپر تفصیل سے واضح ہوا، گریز اختیار کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس سے پہلے تم رسول اور مسلمانوں کے ساتھ نکلنے سے گریز اختیار کر چکے ہو تو اب اس کے لیے اتنے کیوں بے قرار ہو؟ کیا اس لیے کہ اب کے تمہیں بغیر کسی خطرے کے لقمۂ تر کی توقع ہے۔

ایک غلط فہمی بعض لوگوں نے 'كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِن قَبْلُ' سے اس قول کو مراد لیا ہے جس کا ذکر سورۂ توبہ کی آیت ۸۳ میں ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی۔ سورۂ توبہ میں ان منافقین کا ذکر ہے جنھوں نے غزوۂ تبوک کے موقع پر بزدلی دکھائی تھی۔ یہ غزوہ، حدیبیہ کے واقعہ کے بہت بعد پیش آیا اور یہاں اشارہ کسی ایسے واقعہ کی طرف ہے جو حدیبیہ سے پہلے پیش آیا ہو۔ 'مِن قَبْلُ' کے الفاظ اس پر دلیل ہیں۔

'فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ... الآية' یعنی اگرچہ یہ لوگ اجازت نہ دینے پر بہت بجز بز ہوں گے اور حسد کرنے کا طعنہ دیں گے لیکن ان کے اس طعنہ کی مطلق پروا نہ کی جائے اس لیے کہ یہ نہایت کم فہم لوگ ہیں۔ اپنی کم فہمی کے سبب سے یہ چاہتے ہیں کہ دین کے نام پر فوائد تو سب حاصل کریں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، لیکن قربانی ان کو کوئی نہ دینی پڑے۔ ان پر اب یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ ان کی اس طرح کی طفلانہ آرزوئیں پوری ہونے والی نہیں ہیں۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۱۶)

منافقین کے لیے امتحان کی ایک کسوٹی

یہ ان منافقین کے سامنے امتحان کے لیے ایک کسوٹی رکھ دی گئی ہے کہ ان کو آگاہ کر دیا جائے کہ اگر تم فی الواقع اللہ و رسول کے وفادار ہو تو اس کا ثبوت تم اس طرح نہیں پہنچا سکتے کہ بغیر کوئی خطرہ مول لیے مال غنیمت حاصل کرنے کی توقع کرو بلکہ آگے وقت آ رہا ہے جب تمہیں ایک طاقتور گروہ سے جنگ کی دعوت دی جائے گی جس سے تمہیں اس عزم کے ساتھ جنگ کرنی پڑے گی کہ یا تو وہ اسلام قبول کرے یا تلوار۔ اگر تم نے یہ دعوت قبول کی اور اس دشمن سے نبرد آزما ہونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں نہایت اچھا صلہ دے گا اور اگر تم اس وقت بھی بزدل ثابت ہوئے، جیسا کہ اس سے پہلے ثابت ہو چکے ہو تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہایت دردناک عذاب دے گا۔

بیت اللہ کی آزادی کے لیے قریش سے فیصلہ کن جنگ ناگزیر تھی

'قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ' سے مراد قریش ہیں۔ عرب میں انہی کی قوت و صولت ایسی تھی جس کی تعبیر کے لیے یہ الفاظ موزوں ہو سکتے ہیں۔ ان سے اگرچہ جنگ بندی کا معاہدہ ہو چکا تھا لیکن بیت اللہ کو ان کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ ناگزیر تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کی تکمیل اس کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔

مشرکین عرب کے لیے دو ہی راہیں تھیں، اسلام یا تلوار

'تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ' قریش کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چونکہ براہ راست ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث کر کے، انہی کی زبان میں، ان پر حجت تمام کر دی تھی اس وجہ سے ان کے لیے دو ہی راہیں باقی رہ گئی تھیں یا تو اسلام قبول کریں یا تلوار۔ دوسری قوموں کے لوگ ذمی اور معاہد بنائے جا سکتے تھے لیکن مشرکین بنی اسماعیل کے لیے اس قسم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں تک کہ وہ غلام بھی نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ بنی اسماعیل کے معاملے کی اس خاص نوعیت پر سورۂ براءت میں ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

'وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ' یعنی اگر اس وقت بھی تم نے وہی بزدلی دکھائی جو اس سے پہلے عمرہ کے موقع پر دکھا چکے ہو تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اسی طرح کا دردناک عذاب

دے گا جس طرح کا عذاب اس نے اسلام کے کھلے ہوئے معاندین کے لیے مقدّر کر رکھا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ ۗ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَمَن يَتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيمًا (۱۷)

معذورین کا بیان

یہ ان معذورین کا بیان ہے جن کی جہاد سے غیر حاضری نفاق پر محمول نہیں کی جائے گی۔ فرمایا کہ اندھے، لنگڑے اور مریض پر کوئی الزام نہیں ہے اگر وہ جہاد میں حصہ نہ لے سکیں، بشرطیکہ وہ صدق دل سے اللہ و رسول کی اطاعت کرتے رہیں۔ اگر وہ اللہ و رسول کی اطاعت کرتے رہیں گے تو اپنی اس مجبورانہ کوتاہی خدمت کے سبب سے جنت سے محروم نہیں کیے جائیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو بہشت میں داخل کرے گا اور اگر وہ اللہ و رسول سے اعراض کی روش اختیار کریں گے تو وہ بھی اسی دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے جو دوسرے کفار و معاندین کے لیے مقدّر ہو چکا ہے۔

ان معذورین کا بیان سورۂ توبہ کی آیات ۹۱-۹۳ میں بھی ہوا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہاں اس کے بعض وہ پہلو واضح ہو گئے ہیں جو یہاں واضح نہیں کیے گئے ہیں۔

لَّقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۱۸-۱۹)

جاں بازوں کا صلہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر چکنے کے بعد اس بیعت کے حقوق سے گریز اختیار کرنے والوں کے ذکر کے بعد یہ ان لوگوں کا بیان ہے جنھوں نے نہایت نازک حالات میں آپ کے ہاتھ پر حدیبیہ میں جہاد کی بیعت کی اور اس بیعت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان بیعت کرنے والوں کے ذکر کا آغاز ہی لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ کے الفاظ سے فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جاں بازوں کی اس بیعت ہی نے اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ایسی قدر کی جگہ پائی کہ ان کے لیے ابدی خوشنودی کا اعلان ہو گیا چنانچہ اسلام کی تاریخ میں یہ بیعت، بیعتِ رضوان کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بیعت جن حالات میں آپ نے کی اور مسلمانوں نے جس جوش و خروش کے ساتھ، عین دشمن کے مرکز میں، یہ بیعت کی، اس کی طرف ہم سورہ کی تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

اخلاص و وفاداری پر سکینت کا نزول

'إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ': روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیعت کیکر کے ایک درخت کے نیچے ہوئی تھی۔ 'الشَّجَرَةِ' سے اشارہ کیکر کے اسی درخت کی طرف ہے۔ اس اشارے سے مقصود غربت و مسافرت کی اس حالت کو سامنے لانا ہے جس میں اسلام کی تاریخ کا یہ عظیم واقعہ پیش آیا۔

'فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ': اس بیعت میں شرکت کرنے والے مسلمانوں

کی تعداد چودہ پندرہ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ عمرہ کی پابندیوں کے سبب سے وہ نہتے بھی تھے۔ صرف حمیتِ دینی کے تقاضے سے، اللہ تعالیٰ کی نصرت کے بھروسے پر، قریش کی زبردست طاقت سے ٹکر لینے کے لیے وہ کمربستہ ہو گئے۔ ایسے حالات میں ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ و انابت کی جو حالت طاری رہی ہو گی اس کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے سوا کون کر سکتا ہے! اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے ان کے دلوں کا حال جان لیا اور ان کی دلداری کے لیے خاص اپنے پاس سے ان پر سکینت و طمانیت نازل فرمائی۔ یہ بات اس سنتِ الٰہی کے مطابق ہوئی جس کا ذکر اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ جب اللہ کے بندے اس کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو ظاہری حالات خواہ کتنے ہی ناسازگار ہوں لیکن ربِ کریم ان کی حوصلہ افزائی فرماتا ہے اور یہی حوصلہ افزائی وہ اصل قوت ہے جس کو کوئی طاقتور سے طاقتور دشمن بھی شکست نہیں دے سکتا۔

حدیبیہ کے بعد کی فتوحات کی طرف اشارہ

'وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا'۔ یہ اشارہ فتح خیبر اور ان غنائم کی طرف ہے جو حدیبیہ سے واپسی کے بعد معاً مسلمانوں کو حاصل ہوئیں اور جن سے مسلمانوں کے دلوں کے اندر یہ اعتماد راسخ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فتح و نصرت کے جو وعدے فرمائے ہیں وہ پورے ہوں گے اور حدیبیہ کا معاہدہ ان کی شکست نہیں بلکہ فتح مبین ہے اور یہ فتح مبین ان شاء اللہ فتح مکہ کا دیباچہ ثابت ہوگی۔

'وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا'۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ان صفات کا حوالہ دیا ہے جو اس بات کی ضمانت ہیں کہ اس کے تمام وعدے ضرور پورے ہوں گے۔ ظاہری حالات خواہ کتنے ہی ناسازگار ہوں لیکن اس کی قدرت و حکمت ہر چیز پر غالب ہے۔

'وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا' (۲۰)

اوپر والی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمائی گئی تھی، یہ بات مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمائی گئی کہ اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا ہے جن کو تم مستقبل قریب میں حاصل کرو گے۔ ان وعدوں کی تصدیق کے لیے اللہ نے تمھیں یہ نقد نقد غنیمت بخش دی تاکہ تمھارے لیے یہ حوصلہ افزائی کا ذریعہ اور اسلام کے غلبہ کی ایک نشانی ہو۔

'فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ' سے مفسرین نے خیبر کی غنیمت مراد لی ہے۔ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ خیبر کی فتح کا واقعہ حدیبیہ سے واپسی کے معاً بعد ہوا ہے۔

'وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ'۔ 'النَّاس' سے مراد قریش ہیں۔ معاہدۂ حدیبیہ میں دونوں فریق، مسلمان اور قریش یہ پابندی قبول کر چکے تھے کہ دس سال تک ایک دوسرے کے خلاف کوئی جنگی اقدام نہیں کریں گے۔ اس سے مسلمانوں کو یہ فائدہ پہنچا کہ انھیں خیبر کے یہودیوں کے خلاف اقدام کے لیے ایک

اچھا موقع مل گیا اور یہ خیال کر کے کہ اب ان کو قریش کی پشت پناہی نہیں حاصل ہو سکے گی بڑی جلدی حوصلہ ہار بیٹھے۔ اس طرح معاہدۂ حدیبیہ نے مسلمانوں کے لیے ایک قریبی فتح کی راہ کھول دی اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ معاہدہ مسلمانوں کی شکست نہیں بلکہ درحقیقت ایک فتح عظیم اور آئندہ کی فتوحات کا دیباچہ ہے۔

'وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ' یہاں معطوف علیہ عربی کے معروف قاعدے کے مطابق محذوف ہے۔ یعنی اللہ نے خیبر کی یہ نقد نقد غنیمت مسلمانوں کو اس لیے عطا فرمائی کہ یہ ان کے لیے معاہدۂ حدیبیہ کے فتح مبین ہونے کی بھی ایک دلیل ہو اور مستقبل میں اسلام کے غلبہ و تمکن کی بھی ایک نشانی کا کام دے۔

فتح مکہ کی بشارت

'وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا' یہ ٹکڑا آیت ۲ کے تحت بھی گزر چکا ہے وہاں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اب وہ وقت قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تکمیل دین کی نعمت سے سرفراز فرمائے گا اور اپنے بندوں کے لیے ہدایت کی وہ صراط مستقیم پھر کھول دے گا جو اعدائے حق نے بند کر رکھی تھی۔ اس صراط مستقیم کے لیے اصلی نشان راہ کی حیثیت چونکہ خانہ کعبہ کو حاصل تھی اس وجہ سے اس میں کفار کے تسلط سے اس کے آزاد ہونے کی بشارت بھی مضمر ہے۔

وَأُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا (۲۱)

یہ فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا کہ ایک دوسری اور بھی بہت بڑی کامیابی ہے جس کا اللہ نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے۔ یہ کامیابی اگرچہ تم ابھی حاصل نہیں کر سکے ہو لیکن اس کے حصول میں بھی اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ اللہ نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے اور جس کا اللہ نے احاطہ کر رکھا ہو وہ چیز قابو سے باہر نہیں نکل سکتی۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے وہ بہت جلد یہ کرشمہ بھی اپنی نصرت کا دکھا دے گا۔

۷۔ آگے آیات ۲۲-۲۶ کا مضمون

آگے مسلمانوں کو اس بات کی اطمینان دہانی فرمائی گئی ہے کہ اگر قریش اس موقع پر جنگ کرتے تو وہ خود ہی منہ کی کھاتے لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ ابھی اس جنگ کی نوبت نہ آئے تاکہ ان مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے جو مکہ میں گرفتارِ بلا ہیں۔ اسی ضمن میں مسلمانوں کی وہ اخلاقی برتری نمایاں فرمائی ہے جو ان کو اس نازک موقع پر کفار کے مقابل میں حاصل ہوئی اور جس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اب قریش کی حمیت جاہلیت کی عمر بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۲-۲۶

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا

وَّلَا نَصِيرًا ﴿۲۲﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ
لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ﴿۲۳﴾ وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ
عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿۲۴﴾ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَنْ يَبْلُغَ مَحِلَّهُ ۚ وَلَوْلَا
رِجَالٌ مُؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُؤْمِنَاتٌ لَمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ تَطَئُوهُمْ
فَتُصِيبَكُمْ مِنْهُمْ مَعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِي رَحْمَتِهِ
مَنْ يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا
أَلِيمًا ﴿۲۵﴾ إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ
حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى
الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَ
ع أَهْلَهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿۲۶﴾

ترجمۂ آیات ۲۲-۲۶

اور اگر یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تم سے جنگ کرتے تو پیٹھ دکھاتے، پھر نہ کوئی کارساز پاتے نہ مددگار۔ یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی سنت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور اللہ کی سنت میں تم کوئی تبدیلی نہیں پاسکو گے۔ ۲۲-۲۳

اور وہی ہے جس نے روک دیے ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے وادیٔ مکہ میں بعد اس کے کہ تم کو ان پر غلبہ دے دیا تھا اور اللہ دیکھ رہا تھا جو کچھ تم کر رہے تھے۔ ۲۴

وہی ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی روکے رکھا کہ وہ اپنی جگہ پر نہ پہنچنے پائیں اور اگر ایسے مومن مرد اور مومنہ عورتیں نہ ہوتے جن کو تم لاعلمی میں روند ڈالتے پس ان کے باعث تم پر لاعلمی میں الزام آتا تو ہم جنگ کی اجازت دے دیتے لیکن اللہ نے یہ اجازت اس لیے نہ دی کہ جن کو وہ چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اور اگر وہ لوگ الگ ہو گئے ہوتے تو ہم ان لوگوں کو ان میں سے دردناک عذاب دیتے جنھوں نے کفر کیا۔ ۲۵

اس وقت کا خیال کرو جب کفر کرنے والوں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کی جاہلیت کی حمیت۔ تو اللہ نے اپنی طمانیت نازل فرمائی اپنے رسول اور ایمان والوں پر اور ان کو پابند رکھا تقویٰ کی بات کا اور یہ اس کے حقدار اور سزاوار تھے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ۲۶

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۲۲)

حدیبیہ میں قریش کی شکست یقینی تھی

یہ مسلمانوں کو تسلی اور قریش کو تنبیہ ہے کہ خدا نے حدیبیہ کے موقع پر تمھیں جنگ کی جو اجازت نہیں دی تو اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ جنگ میں تمھاری شکست کا کوئی اندیشہ تھا۔ اگر جنگ ہوتی تو تم نہیں بلکہ تمھارے یہ حریف ہی پیٹھ دکھاتے اور اس طرح پٹتے کہ کوئی کارساز و مددگار ان کو سہارا دینے والا نہ ملتا۔ اس وجہ سے ان کے لیے مغرور ہونے اور اس معاہدے کو تمھاری کمزوری پر محمول کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے بلکہ انھیں خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ان کو حالات پر غور کرنے کی کچھ مہلت دے دی۔

[illegible]

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۲۳)

یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ

نے ظہار رکھی ہے کہ جب ان کا پیمانہ بھر جاتا ہے تو ان پر ایسی مار پڑتی ہے کہ پھر کہیں بھی وہ پناہ نہیں پاتے اور یہ سنت ایسی حتمی اور اٹل ہے کہ کبھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ تمام رسولوں کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (۲۴)

حدیبیہ کے موقع پر جو کچھ ہوا تدبیر الٰہی سے ہوا

'بطن مکۃ' سے اشارہ حدیبیہ کی طرف ہے۔ یہ بالکل مکہ کے دامن میں ہے اس وجہ سے اس کو 'بطن مکہ' سے تعبیر فرمایا۔

یعنی اس موقع پر جنگ کی نوبت جو نہیں آئی تو یہ تدبیر الٰہی کا کرشمہ ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ان کے اوپر غلبہ دے دیا تھا، جنگ ہوتی تو ان کو منہ کی کھانی پڑتی، لیکن حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوا کہ ابھی یہ جنگ نہ ہو اس وجہ سے اس نے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے۔

'وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا' یعنی اللہ تعالیٰ سارے حالات کا خود جائزہ لے رہا تھا اس وجہ سے یہ جو کچھ ہوا اس کی حکمت کے مطابق ہوا اور اسی میں تمہاری بہتری ہے۔

مسلمانوں کے حوصلہ نے قریش کے اعصاب ڈھیلے کر دیے

'مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ' یعنی اخلاقی پہلو سے بھی تمہاری برتری ان کے مقابل میں نمایاں تھی اور عزم و حوصلہ کے اعتبار سے بھی تم ان پر حاوی رہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ جب قریش کو مسلمانوں کے اس جوش و جذبہ کی اطلاع ہوئی جس کا اظہار انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے کیا تو ان کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً وفد بھیج کر صلح کی بات چیت شروع کر دی۔ اس وفد نے اپنی آن رکھنے کی کوشش تو ضرور کی لیکن یہ بات بالکل واضح تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں سے لڑنے کا دم خم نہیں رکھتے تھے چنانچہ انھوں نے از خود معاہدے میں یہ بات تسلیم کر لی کہ اگلے سال جب مسلمان عمرہ کے لیے آئیں گے تو وہ تین دن کے لیے مکہ خالی کر دیں گے تاکہ کسی تصادم کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔

هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَن يَبْلُغَ مَحِلَّهُ ۚ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَن تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ لِّيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۲۵)

جنگ کی نوبت نہ آنے دینے کی حکمت

یہ حکمت بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے جنگ نہیں ہونے دی۔ فرمایا کہ اگرچہ قریش کی زیادتیاں بالکل کھلی ہوئی تھیں، انھوں نے دعوتِ حق کا انکار کیا، اہل ایمان کو مسجد حرام کی حاضری سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو ان کے قربان ہونے کی جگہ پہنچنے کی اجازت

نہ دی لیکن ان تمام گستاخیوں اور تعدّیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ ابھی مسلمان ان کے خلاف تلوار نہ اٹھائیں۔ اس کی سب سے بڑی مصلحت یہ تھی کہ مکہ میں ایسے بہت سے اہلِ ایمان تھے، مرد بھی اور عورتیں بھی، جن سے مسلمان واقف نہیں تھے، اندیشہ تھا کہ اگر وہ حملہ کرتے تو کفار کے ساتھ یہ مظلوم اہلِ ایمان بھی نادانستہ ان کی زد میں آجاتے جس سے ان کے اوپر اپنے بھائیوں کے خون کا الزام آتا۔ دوسری مصلحت یہ تھی کہ ان اہلِ مکہ میں ایسے لوگ بھی بہت سے تھے جو اگرچہ ابھی ایمان نہیں لائے ہیں لیکن وہ ایمان کے قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ان کو بھی اپنے دامنِ رحمت میں لے لے۔

'لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا' فرمایا کہ اگر یہ اہلِ ایمان ان سے الگ ہو چکے ہوتے تو اللہ تعالیٰ کفارِ قریش کو اپنے دردناک عذاب کا مزا چکھا دیتا۔

اس دردناک عذاب سے مسلمانوں کا حملہ بھی مراد ہو سکتا ہے اور اس طرح کا کوئی عذاب بھی جس طرح کا عذاب پچھلی قوموں پر آیا۔ ان کے حالات میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ جب انھوں نے رسول کی تکذیب کر دی تو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو ان کے اندر سے الگ کر لیا اور باقی پوری قوم کو تباہ کر دیا۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیت سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ اگر مسلمانوں کو کسی ایسی قوم سے جنگ کرنی پڑ جائے جس کے اندر مسلمان بھی ہوں تو انھیں حتی الامکان یہ کوشش کرنی ہوگی کہ مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ البتہ اگر دشمن اس سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے، مثلاً وہ مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے محاذ پر لا کھڑا کرے یا اپنے کو بچانے کے لیے ان کو سپر کے طور پر استعمال کرے یا مسلمان خود ہی وطنی عصبیت یا کسی دنیوی مصلحت سے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو ان حالات میں اسلام اور ملت کے مجموعی مفاد کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوگا اگرچہ اس سے مسلمانوں کے کسی گروہ کو نقصان بھی پہنچ جائے۔

قریش کی ایک سنگین گستاخی کی طرف اشارہ

آیت میں 'ھدی' کے ساتھ 'مَعْكُوْفًا' صورتِ حال کی نزاکت کے اظہار کے لیے ہے کہ باوجودیکہ قریش کی یہ حرکت نہایت گستاخانہ تھی کہ بادشاہِ کائنات کے حضور میں پیش کرنے کے لیے جو ہدیے لائے گئے ان کو انھوں نے روک دیا اور وہ قربان گاہ تک نہ پہنچنے پائے تاہم اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ ابھی ان کو اس گستاخی کی سزا نہ دی جائے تاکہ جو مسلمان ان کے اندر محصور ہیں ان کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔

آیت میں 'لَوْ' کا جواب محذوف ہے اور یہ حذف متکلم کے شدتِ غضب پر دلیل ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ آگے کے ٹکڑے 'لَوْ تَزَيَّلُوْا ... الآیۃ'

نے اس حذف کو کھول دیا ہے۔

'لَمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ' میں 'اَنْ تَطَئُوْهُمْ' ضمیر 'هُمْ' سے بدل پڑا ہوا ہے یعنی اندیشہ تھا کہ تم ان کو پامال کر دینے سے بے خبر رہ جاتے اور اس طرح بے خبرانہ تمہارے اپنے ہی بھائیوں کا خون خود تمہارے ہی ہاتھوں بہہ جاتا۔

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۲۶)

نہایت نازک حالات میں مسلمانوں نے اخلاقی برتری کا ثبوت دیا

یہ مسلمانوں کی اخلاقی برتری واضح فرمائی ہے کہ ہر چند قریش نے قدم قدم پر حمیت جاہلیت کا مظاہرہ کیا جس سے مسلمان مشتعل ہو سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو بھی اور مسلمانوں کو بھی یہ توفیق بخشی کہ وہ ان نازک حالات سے نہایت صبر و سکون اور حلم و تدبر کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے، حریف کی اوچھی حرکتوں سے متاثر ہو کر کوئی ایسا قدم انھوں نے نہیں اٹھایا جو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور دین کے مصالح کے خلاف ہو۔

'سَكِيْنَت' سے مراد یہاں صبر، حلم، متانت اور حکمت و تدبر ہے۔ اجتماعی زندگی میں ایسے مراحل بہت پیش آتے ہیں جب کسی جماعت کے حلم و تدبر کا نہایت سخت امتحان ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر اگر جماعت حریف کے رویہ سے مشتعل ہو کر کوئی عاجلانہ قدم اٹھا دے تو اس سے اصل مقصد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ ایسے امتحانات سے کوئی جماعت اور اس کے لیڈر حسن و خوبی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اور یہ توفیق ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ہر حال میں اپنے رب سے وابستہ رہتے ہیں۔

قریش کی طرف سے حمیت جاہلیت کا مظاہرہ

'حمیت جاهلیت' سے اشارہ قریش کے لیڈروں کی ان حرکتوں کی طرف ہے جو انھوں نے حق و عدل کے بالکل خلاف محض اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے کیں۔ مثلاً

ان پر یہ حقیقت واضح تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف عمرہ کے لیے تشریف لائے ہیں، جنگ کا نہ آپ کے دل میں کوئی خیال ہے، نہ اس کا آپ کے پاس کوئی سامان ہی ہے لیکن اس کے باوجود وہ کسی طرح آپ کو اللہ کے گھر میں داخل ہونے اور اس کے حضور میں اپنے لائے ہوئے ہدیے پیش کرنے کی اجازت دینے پر راضی نہ ہوئے۔

حضورؐ نے اپنے جو سفیر ان کے پاس اپنی آمد کی غرض سے آگاہ کرنے کے لیے بھیجے ان کی سفارتی حیثیت کا نہ صرف یہ کہ انھوں نے کوئی احترام نہیں کیا بلکہ ان میں سے ایک سفیر کے وہ قتل کے درپے ہو گئے اور دوسرے کو انھوں نے اس طرح لیت و لعل میں رکھا کہ مسلمانوں کے اندر

یہ افواہ پھیل گئی کہ اس کو بھی انھوں نے قتل کر دیا۔

معاہدۂ حدیبیہ کی شرائط طے کرنے میں انھوں نے بالکل بے ضرورت الجھنیں پیدا کیں اور ایسی شرطیں اس میں داخل کرنے پر اصرار کیا جن کا کوئی سیاسی فائدہ ان کو حاصل نہیں ہوا بس وقتی طور پر ان کو یہ تسلی ہو گئی کہ ان کی بات اونچی رہی۔

قریش کے اس رویہ کا قدرتی ردِ عمل مسلمانوں پر یہی ہو سکتا تھا کہ وہ اشتعال میں آ کر اینٹ کا مسلمانوں کا حلم
جواب پتھر سے دیں لیکن اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سکینت کے فیض سے وہ اللہ اور رسول کے فیصلہ اور تقویٰ
پر راضی رہے۔

'وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى' یعنی قریش کی ان تمام اشتعال انگیز حرکتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کلمۂ تقویٰ کا پابند رکھا۔ 'کلمۂ تقویٰ' سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جاں نثار صحابہؓ کا یہ اعتراف و اعلان ہے کہ 'رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا'۔ یہی کلمہ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کی وسوسہ اندازیوں کے مقابل میں ہمیشہ صداقت شعار اور باوفا مسلمانوں کی سپر رہا ہے۔ مسلمانوں کے سامنے جب کبھی ایسے حالات پیش آئے کہ انھیں رسول کی کوئی بات بظاہر خلافِ مصلحت محسوس ہوئی ہے تو انھوں نے اس کو ایک وسوسہ خیال کیا اور اس وسوسہ کو اسی اعتراف سے رفع کیا۔ یہی عظیم کلمہ اس نازک موقع پر بھی مسلمانوں کی ڈھال تھا اور وہ رسول کے فیصلہ پر راضی رہے اگرچہ ان کے جذبات اور ان کی امنگوں کا مطالبہ کچھ اور تھا۔

'وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا' یعنی اس کلمۂ تقویٰ پر استقامت ہر مدعی کو حاصل نہیں ہوتی بلکہ انہی کو حاصل ہوتی ہے جو اس کے حق دار اور اہل ہوتے ہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہؓ چونکہ اس کے حق دار اور اہل تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان نازک حالات کے اندر بھی استوار رکھا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ایمان کو ضائع نہیں ہونے دیتا جو اپنے ایمان کی قدر کرتے اور ہر قسم کے حالات کے اندر اس پر استوار رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

'وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا' یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حال سے بے خبر نہیں رہتا۔ وہ ان آزمائشوں سے بھی باخبر رہتا ہے جن میں وہ ڈالے جاتے ہیں اور ان حالات و احساسات سے بھی پوری طرح آگاہ رہتا ہے جن سے وہ گزرتے ہیں۔ اگر بندے اپنا وہ فرض ادا کرتے ہیں جو ان سے مطلوب ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ ہر گام پر ان کا مددگار و کارساز بنتا ہے۔

۹- آگے آیات ۲۷ - ۲۹ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پہلے یہ واضح فرمایا ہے کہ رسول نے جو رؤیا دیکھی وہ

بالکل سچی تھی۔ اس کی تعبیر کے ظہور میں جو تاخیر ہوئی وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے۔ اس کے بعد تورات اور انجیل میں اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کی جو پیشین گوئیاں ہیں ان کا حوالہ ہے تاکہ مسلمانوں کو تسلی بھی حاصل ہو اور وہ اپنے آپ کو ان صفات سے آراستہ بھی کریں جو پچھلے صحیفوں میں ان کی بیان ہوئی ہیں ۔۔۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۷-۲۹

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۲۸﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۖ

سالقرہا وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ

ع ۳ ۱۲ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

ترجمۂ آیات ۲۷-۲۹

اللہ نے اپنے رسول کو مبنی برحقیقت رؤیا دکھائی۔ بے شک اللہ نے چاہا تو تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے، امن کے ساتھ، اپنے سر منڈاتے اور کترائے ہوئے، تمہیں کوئی اندیشہ نہیں ہوگا، بس اس نے جانی وہ بات جو تم نے نہیں جانی تو اس سے

پہلے اس نے تمھیں ایک فتح قریب سے نوازا۔ وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ تاکہ اس کو غالب کرے سارے دینوں پر اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔ ۲۷-۲۸

محمد، اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت آپس میں رحم دل ہیں۔ تم ان کو اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں رکوع و سجود میں سرگرم پاؤ گے۔ ان کا امتیاز ان کے چہروں پر سجدوں کے نشان سے ہے۔ ان کی یہ تمثیل تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی تمثیل یوں ہے کہ جیسے کھیتی ہو جس نے نکالی اپنی سوئی، پھر اس کو سہارا دیا، پھر وہ سخت ہوئی پھر وہ اپنے تنہ پر کھڑی ہو گئی کسانوں کے دلوں کو موہتی ہوئی تاکہ کافروں کے دل ان سے جلائے۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے مغفرت اور ایک اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔ ۲۹

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا (۲۷)

نبی صلعم کی رؤیا بنی برحقیقت تھی

پیچھے یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمرہ کا ارادہ اپنی ایک رؤیا کی بنا پر فرمایا تھا اس وجہ سے لوگوں کو توقع تھی کہ ان کا یہ سفر بامراد رہے گا لیکن جب نتیجہ توقع کے خلاف نکلا تو بہتوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ نبی کی رؤیا تو غلط نہیں ہوتی تو آخر ہم کو اس سفر سے بے نیل مرام کیوں لوٹنا پڑا؟ اسی سوال کے جواب کے لیے صلح حدیبیہ کی مذکورہ بالا مصلحتیں واضح فرمائی گئیں۔ آخر میں یہ خاص اس رؤیا کا حوالہ دے کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو جو رؤیا دکھائی وہ بالکل

سچی اور مبنی بر حق رؤیا ہے۔ اس کے مبنی بر حق ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو تم مسجد حرام میں نہایت امن کے ساتھ، سر گھٹائے اور کترائے ہوئے داخل ہو گے اور تمھیں کسی کی طرف سے کسی مزاحمت کا کوئی اندیشہ نہیں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمھارے لیے عمرہ کی راہ خود معاہدے کی رُو سے صاف ہو گئی۔ بس صرف اتنا فرق پڑا کہ اس سال نہیں بلکہ اگلے سال یہ سعادت حاصل ہوگی اور یہ التوا بھی رؤیا کے خلاف نہیں ہوا۔ اس لیے کہ رؤیا میں یہ وعدہ نہیں تھا کہ یہ عمرہ اسی سال لازماً ہوگا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سوال پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ رؤیا میں یہ وعدہ تو نہیں کیا گیا تھا کہ ہم اسی سال عمرہ کریں گے۔ گویا رؤیا میں جو وعدہ فرمایا گیا وہ غلط نہیں ہوا بلکہ یہ ہوا کہ اس سال عمرہ کی راہ اچھی طرح ہموار کر دی گئی تاکہ آئندہ سال مسلمان آئیں تو انھیں کوئی خطرہ نہ پیش آئے۔ 'بِالْحَقِّ' کا تعلق 'رؤیا' سے ہے یعنی یہ رؤیا کوئی خواب پریشاں کے قسم کی چیز نہیں بلکہ مبنی بر حقیقت رؤیا تھی۔

'مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ' سر منڈانا یا کترانا حج و عمرہ کے آداب میں سے ہے۔ اس کی حکمت پر اس کے محل میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ ان دونوں میں سے افضلیت تو سر منڈانے کو حاصل ہے لیکن باعتبار حالات قصر کی بھی اجازت ہے۔ اس وجہ سے دونوں ہی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ مقصود یہ ہے کہ یہ جماعت دونوں ہی طرح کے زائرین پر مشتمل ہوگی جو عبدیت و تذلل کے اس نمایاں نشان کے ساتھ اللہ نے چاہا تو مسجد حرام میں داخل ہوں گے اور بے خوف و خطر داخل ہوں گے۔

التوائے عمرہ کی مصلحتوں کی طرف اشارہ

'فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا' یہ اشارہ التوائے عمرہ کی مصلحتوں کی طرف ہے جن کا ذکر آیت ۲۵ میں ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مصلحتیں تمھارے علم میں نہیں تھیں لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں تھیں اس وجہ سے اس نے یہ تو نہیں پسند فرمایا کہ تم اسی سال قریش پر فتحیاب ہو کر عمرہ کرو لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اس سال بھی تم عمرہ کے لیے نکلو تاکہ اللہ تعالیٰ تمھیں ایک 'فتح قریب' سے سرفراز کرے جو آگے حاصل ہونے والی فتوحات کی راہ بھی کھول دے اور تمھارا عمرہ بھی امن و اطمینان کی حالت میں ہو۔

'فتح قریب' سے مراد معاہدۂ حدیبیہ ہے

'فتح قریب' سے عام طور پر لوگوں نے 'فتح خیبر' کو مراد لیا ہے لیکن میرے نزدیک اس سے معاہدۂ حدیبیہ ہی مراد ہے جس کو اسی سورہ کی تمہید میں 'فتح مبین' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس 'فتح مبین' کی برکات پر، ہم قرآن کی روشنی میں، پیچھے جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہی 'فتح قریب'، فتح مکہ کا دیباچہ ثابت ہوئی۔ فتح مکہ ابھی کچھ دور تھی لیکن معاہدۂ حدیبیہ نے، جیسا کہ پیچھے تفصیل گزر چکی ہے، اس کی راہ ہموار کر دی تھی اس وجہ سے اس کو 'فتح قریب' سے تعبیر فرمایا۔ گویا اس کے بعد اب وہی اصلی فتح ظاہر ہونے والی ہے جو ابھی اگرچہ ظاہر نہیں ہوئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے

اس کو، جیسا کہ آیت ۲۱ میں اشارہ فرمایا، اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ (۲۸)

اسلام کے غلبہ کی بشارت

یہ آیت معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ سورۂ توبہ میں بھی گزر چکی ہے اور آگے سورۂ صف میں بھی آئے گی۔ سورۂ توبہ کی تفسیر میں ہم اس کے موقع و محل اور اس کے مدعا کی وضاحت کر چکے ہیں۔ یہ دوسرے الفاظ میں فتح مکہ کی بشارت ہے اس لیے کہ اسی کی فتح پر پورے ملک کے اندر دین حق کے غلبہ کا انحصار تھا چنانچہ اس کے فتح ہو جانے کے بعد تمام ادیان، جو عرب میں موجود تھے، اسلام کے آگے سرنگوں ہو گئے اور تھوڑی ہی مدت کے اندر وہ وقت آ گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا کہ اس ملک میں دو دین مجتمع نہیں ہو سکتے۔ فرمایا کہ اسی خدا نے، جس نے اپنی وہ شانیں دکھائی ہیں، جو اوپر بیان ہوئیں، اپنے رسول کو اپنی ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہ تقدیر کا اٹل فیصلہ ہے، نہ اس کو مشرکین بدل سکتے اور نہ یہود و نصاریٰ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ سب کے علی الرغم نافذ ہو کے رہے گا۔ سورۂ توبہ میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۳۲-۳۳)

(یہود و نصاریٰ) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھا دیں لیکن اللہ کا اٹل فیصلہ ہے کہ وہ ان کافروں کے علی الرغم اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا۔ وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے مشرکوں کے علی الرغم!

اس آیت کے سیاق و سباق پر نظر ڈالیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اوپر والی آیت میں اہل کتاب کو چیلنج ہے اور نیچے والی آیت میں مشرکین عرب کو۔ سرزمین عرب میں انہی گروہوں سے اسلام کا مقابلہ تھا۔ بعد میں یہ میدان مقابلہ بہت وسیع ہو گیا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمان اسلام کے حامل رہے ہر جگہ اللہ نے ان کے دین کو غالب کیا۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا۔ یعنی اس بشارت کو مخالفین خواہ کتنی ہی بعید از قیاس سمجھیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور اس کی صداقت کے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے۔ یہ مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ تم مخالفین کی مخالفت اور حالات کی نامساعدت سے ذرا بھی ہراساں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہو کے

رہے گا۔ سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیت میں جو بات 'وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ' اور 'وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ' کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے وہی بات یہاں دوسرے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا ۖ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (۲۹)

ان تمثیلات کا حوالہ جو اسلام کے تدریجی غلبہ سے متعلق سابق صحیفوں میں ہیں

یہ آخر میں ان تمثیلوں کا حوالہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی صفات اور اسلام کے تدریجی غلبہ سے متعلق تورات و انجیل میں وارد ہیں۔

اس حوالہ سے ایک مقصد تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو سابق صحیفوں کے آئینہ میں اس کی تصویر دکھا دی جائے تاکہ ان کو بشارت بھی حاصل ہو اور وہ اپنی ان صفات سے اچھی طرح آشنا بھی ہو جائیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو متصف دیکھنا چاہا ہے اور جو خلق میں ان کو متعارف کرانے والی ہیں۔

دوسرا یہ کہ اہل کتاب کو متنبہ کیا جائے کہ وہ جان کر انجان بننے اور حق کو چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو پہلے سے اس لیے آگاہ کیا تھا کہ جب وقت آئے گا وہ شہادت دینے والے بنیں گے۔ لیکن یہ ان کی بدبختی ہے کہ وہ شہادت دینے کے بجائے مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تیسرا یہ کہ مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس سرزمین میں ان کو غلبہ تو ضرور عطا فرمائے گا لیکن یہ غلبہ بالتدریج ظہور میں آئے گا۔ نہ انھیں جلد بازی کرنی چاہیے نہ حالات سے مایوس ہونا چاہیے۔ یہ بیج انھوں نے ڈالا ہے صبر و استقامت کے ساتھ اس کی آبیاری اور دیکھ بھال میں لگے رہیں۔ وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایسا تناور درخت بنائے گا کہ ایک دنیا اس کے سایہ میں پناہ لے گی۔

تورات میں وارد ایک تمثیل کی طرف اشارہ

'مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ' کا ترجمہ عام طور پر مترجموں نے مبتدا اور خبر کا کیا ہے لیکن میرے نزدیک 'رَسُولُ اللَّهِ' یہاں صفت اور عطف بیان کے حکم میں ہے۔ خبر اس کی آگے 'أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ ... الآیۃ' ہے۔ یہ تورات میں وارد ایک تمثیل کی طرف اشارہ ہے جس میں پورے زمرۂ مومنین کی تصویر اس طرح پیش کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں گل سرسبد کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر 'رَسُولُ اللَّهِ' پر وقف اور 'وَالَّذِينَ مَعَهُ' سے استیناف مان لیا جائے تو آیت کی یہ بلاغت ختم ہو جائے گی۔ اس پورے گروپ کا اصل جمال اسی صورت میں نمایاں ہو گا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں سرتاج کی حیثیت حاصل رہے جیسی کہ فی الواقع ہے۔

چٹان کی طرح سخت، ریشم کی طرح نرم

'وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ' یہ آپ کی اور آپ کے صحابہؓ کی ایک

امتیازی خصوصیت بیان ہوئی ہے کہ وہ کفار کے لیے ایک چٹان کی طرح مضبوط و سخت اور باہمدگر موم کی طرح نرم ہیں۔ یعنی ان کی تمام حمیت و عصبیت ایمان و اسلام پر قائم ہے۔ جو ایمان و اسلام میں ان کے شریک نہیں ہیں وہ اگر ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہیں تو ان کے اندر انگلی دھنسانے کی کوئی گنجائش نہیں پائیں گے۔ برعکس اس کے اپنے شریک ایمان بھائیوں کے لیے وہ سراپا رحمت و شفقت ہیں۔ یہی مضمون بعینہٖ اسی سیاق و سباق کے ساتھ سورۂ مائدہ کی آیت ۵۴ میں اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ چونکہ یہ دونوں آیتیں ایک ہی مضمون کی ہیں اس وجہ سے وہاں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ضروری حصہ یہاں بھی نقل کیے دیتے ہیں تاکہ اس ٹکڑے کا صحیح مفہوم اس کی نظیر کی روشنی میں واضح ہو جائے۔ 'اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ' کی وضاحت کرتے ہوئے ہم نے لکھا ہے

"'اَذِلَّةٌ'، 'ذَلِيْلٌ' کی جمع ہے۔ عربی میں یہ لفظ جیسا کہ آل عمران آیت ۱۲۳ کے تحت ہم بتا چکے ہیں، اچھے اور برے دونوں معنوں میں آتا ہے۔ جب یہ اچھے معنوں میں آتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے تو اس کے معنی نرم خو، نرم مزاج، فرمانبردار، متواضع اور سہل الانقیاد کے ہوتے ہیں۔ 'ذلول' کا لفظ بھی اسی معنی میں آتا ہے۔ فرمانبردار اونٹنی کو 'ناقۃ ذلول' کہتے ہیں۔"

'اَعِزَّةٌ'، 'عَزِيْزٌ' کی جمع ہے۔ یہ لفظ بالکل 'ذلیل' کے مقابل لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے معنی ہیں سخت، مشکل، بھاری، ناقابل شکست، ناقابل عبور، عسیر الانقیاد۔ اگر کسی چیز کے متعلق کہیں کہ 'هُوَ عَزِيْزٌ عَلَيَّ' تو اس کے معنی ہوں گے کہ وہ چیز مجھ پر بھاری اور مشکل ہے۔ اس کو رام کرنا اور قابو میں کرنا میرے لیے دشوار ہے۔"[1]

اسی ضمن میں ہم نے 'شَدِيْدٌ عَلَيَّ' کا مفہوم بھی اس طرح واضح کیا ہے۔

"یہی مفہوم 'شَدِيْدٌ عَلَيَّ' کا بھی ہوتا ہے۔ کسی حماسی کا نہایت عمدہ شعر ہے۔

اذا المرء اعیته المروۃ ناشئاً　　　　فمطلبها کہلا علیہ شدید

(اگر اٹھتی جوانی میں اولوالعزمی پیدا کرنے سے آدمی قاصر رہ جاتا ہے تو ادھیڑپن میں اس کا حاصل کرنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے)۔

"مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے تو وہ نہایت نرم خو، بھولے بھالے، ہر پہلو سے لچک قبول کرنے والے اور ہر سانچے میں ڈھل جانے والے ہوں گے لیکن کافروں کے لیے وہ پتھر کی چٹان ہوں گے۔ وہ اگر اپنے اغراض و مقاصد کے لیے ان کو استعمال کرنا چاہیں گے تو کہیں سے انگلی دھنسانے کی جگہ نہ پا سکیں گے ...... سیدنا مسیحؑ نے اپنے شاگردوں کو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ کبوتر کے مانند بے آزار اور

---

[1] تدبر قرآن، جلد دوم، صفحہ ۳۱۸

سانپ کی مانند ہوشیار بنو، اس میں بھی یہی دونوں پہلو ملحوظ ہیں۔[1]

یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ جس سیاق و سباق میں یہ سورۂ مائدہ والی آیت آئی ہے بعینہٖ اسی سیاق و سباق میں الفتح والی آیت بھی وارد ہوئی ہے۔ وہاں ہم واضح کر چکے ہیں کہ منافقین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ان کا کردار اسلامی کردار کے بالکل برعکس واقع ہوا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اہل ایمان کے لیے نہایت سہل الانقیاد اور کفار کے لیے عسیر الانقیاد ہوتے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ کفار کے ہاتھوں میں تو وہ کھلونا بنے ہوئے ہیں لیکن مسلمانوں کو دھوکا دینے میں بڑے شاطر ہیں۔ اسی طرح اس سورہ میں بھی یاد ہوگا، منافقین کا کردار آیات ۶-۱۸ میں تفصیل سے زیر بحث آیا ہے۔ آخر میں مسلمانوں کے اجتماعی کردار کا یہ پہلو اس لیے نمایاں کیا گیا ہے کہ منافقین اس آئینہ میں اپنی صورت دیکھیں کہ مسلمانوں کا کردار کیا ہونا چاہیے اور وہ کس کردار کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ پیغمبر اور اس کے جاں نثار ساتھیوں کے لیے تو روزِ بد کے منتظر ہیں اور کفار کو جا جا کر اطمینان دلا رہے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی طرف سے آپ لوگوں کو کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم آپ ہی لوگوں کا ساتھ دیں گے۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کے باعث بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اسلام روزمرہ زندگی کے سلوک و طرزِ عمل میں یہ چاہتا ہے کہ ہر مسلمان کا رویہ ہر غیر مسلم کے ساتھ کرخت اور بیزارانہ ہو حالانکہ یہ بات نہ قرآن کے الفاظ سے نکلتی ہے اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے طرزِ عمل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہم نے الفاظ اور نظائر کی روشنی میں آیت کی جو تاویل کی ہے امید ہے کہ وہ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے کافی ہوگی۔

خلق اور خالق دونوں کے ساتھ مربوط زندگی

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا۔ یہ ان کی توجہ الی اللہ، ان کی شب بیداری اور ان کی تہجد گزاری کی تصویر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو بھی ان کو دیکھے گا اس پر پہلی ہی نظر میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ دنیا کے عام انسانوں سے بالکل مختلف یہ ایسے قدسی صفت لوگوں کی ایک جماعت ہے جن کی زندگی کا اصلی نصب العین خدا کی رضا طلبی ہے۔ چنانچہ کبھی وہ ان کو رکوع میں پائے گا کبھی سجود میں۔ اوپر والے ٹکڑے میں ان کا وہ پہلو سامنے آیا ہے جن کا تعلق خلق سے ہے۔ اس ٹکڑے میں ان کی زندگی کے اس پہلو کی طرف اشارہ ہے جس کا تعلق خالق سے ہے یعنی خلق کے ساتھ بھی ان کا تعلق بالکل صحیح بنیاد پر قائم ہے کہ وہ اہلِ باطل کے مقابل میں نہایت سخت اور اہلِ حق کے لیے نہایت نرم خو ہیں اور خالق کے ساتھ بھی ان کا ربط نہایت محکم و استوار ہے کہ کسی وقت بھی وہ اس سے غافل نہیں ہوتے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں پسندیدہ زندگی وہی ہے جو خلق اور خالق دونوں سے بالکل صحیح بنیاد پر مربوط ہو۔

---

[1] تدبرِ قرآن، جلد دوم، صفحات ۳۱۸-۳۱۹

اگر اس میں کسی پہلو سے ذرا بھی خلل پیدا ہو جائے تو انسان کی ساری زندگی بے ہنگم ہو جاتی ہے۔

صحابہؓ کی ایک خاص علامتِ امتیاز

سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔ یہ ان کی خاص علامتِ امتیاز کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے چہروں پر سجدوں کے نشان نمایاں ہیں۔ الفاظ سے یہ بات صاف نکل رہی ہے کہ یہاں وہی نشان مراد ہیں جو کثرتِ سجود سے پیشانی پر پڑ جاتے ہیں اور یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ نشان بہت محبوب ہیں یہاں تک کہ وہ چاہتا ہے کہ اس دنیا کے اندر یہ امت اسی نشان سے دوسری امتوں کے مقابل میں پہچانی جائے۔ یہ ساری باتیں الفاظِ قرآن سے واضح ہیں اس وجہ سے ہم ان لوگوں کی رائے صحیح نہیں سمجھتے جنھوں نے ان الفاظ کو ان کے ظاہر معنی سے ہٹا کر ان کے مجازی معنی لینے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں اس امر سے انکار نہیں ہے کہ بعض لوگ محض ریا کے لیے بھی اپنی پیشانی پر گھٹا ڈالنے کی کوشش کرتے ہوں گے لیکن محض اس بنا پر کہ کچھ لوگوں کے گھٹے محض نمائشی ہوتے ہیں اہل ایمان کے اس عظیم نشانِ امتیاز کی وقعت کم نہیں کی جا سکتی۔ ریا کا امکان جس طرح اس چیز کے اندر ہے اسی طرح دین کے ہر اعلیٰ و ادنیٰ کام میں ہو سکتا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض لوگوں کو ٹوکا کہ انھوں نے اپنی پیشانیوں پر گھٹے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے حالات سے بہت باخبر تھے۔ اگر انھوں نے کسی شخص کو اس طرح کی کسی بات پر تنبیہ کی تو مسلمانوں کے ایک مربی و معلم ہونے کی حیثیت سے ان کا یہ حق تھا اور اس کا ایک محل ہے۔ اس سے امت کے اس نشانِ امتیاز کی بے وقعتی نہیں ہوتی جس کا آیت زیرِ بحث میں حوالہ ہے۔

پیشین گوئیوں میں یہود کی تحریفات

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ۔ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی یہ تمثیل تورات میں بیان ہوئی ہے۔ یہ اشارہ ان پیشین گوئیوں کی طرف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے باب میں تورات، زبور اور یسعیاہ نبی کے صحیفوں میں ہیں اگرچہ یہود نے قطع و برید کر کے ان کو بالکل مسخ کر دیا ہے اور مسخ کرنے کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ جن الفاظ کی نسبت بھی ان کو گمان ہو جاتا ہے کہ مسلمان ان کو اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں ان پر فوراً تحریف کی قینچی چلا دی جاتی ہے۔ تاہم آج بھی تورات اور انجیل دونوں میں ایسی چیزیں موجود ہیں جن کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ مثلاً استثنا باب ۳۳-۲ میں ہے:

> "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔"

اس پیشین گوئی کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ظاہر ہے کہ دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس میں جبل فاران کا ذکر بھی ہے اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آپ کے نمودار ہونے کا صریح الفاظ میں حوالہ بھی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں قرآن نے اس پیشین گوئی کا حوالہ مسلمانوں کے غلبہ و تمکن ہی کے پہلو سے دیا ہے اور یہ ایک مسلم تاریخی حقیقت ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار صحابہؓ آپ کے ہمرکاب تھے۔

یہ تو صرف خدائے علام الغیوب ہی کو علم ہے کہ اس پیشین گوئی میں کتنی تحریفیں ہو چکی ہیں لیکن ایک تازہ مثال اس میں تحریف کی یہ ہے کہ "دس ہزار قدوسیوں" کے الفاظ جو اس میں وارد ہیں اب بعض نسخوں میں بدل کر وہ "دس لاکھ" کر دیے گئے ہیں جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ مسلمان اس کو فتح مکہ پر منطبق نہ کر سکیں۔ تاہم اس پر اچھی طرح غور کیجیے تو اس میں ان تمام باتوں کی طرف اشارہ ہے جن کا قرآن نے حوالہ دیا ہے۔

اس میں 'دس ہزار قدوسیوں' کا حوالہ ہے۔ 'قدوسیوں' سے مراد ظاہر ہے کہ پاکیزہ صفات، نیک نہاد، خدا ترس اور عبادت گزار بندے مراد ہیں۔ قرآن میں اس کی جگہ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا ..... سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ کے الفاظ ہیں۔ اب یا تو یہ ہوا ہے کہ قرآن نے تورات کے لفظ 'قدوسیوں' کو قدوسیوں کی صفات بیان کر کے اچھی طرح شناخت کرا دی ہے تاکہ اہل کتاب پہچان لیں کہ جن قدوسیوں کا ان کے صحیفوں میں ذکر آیا ہے وہ یہی لوگ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں اور جو عنقریب دس ہزار کے لشکر کی صورت میں ظاہر ہو کر اس پیشین گوئی کی تصدیق کر دیں گے۔ یا پھر یہ ہوا ہے کہ تورات میں بھی یہ تمام صفات بیان ہوئی ہوں لیکن یہود نے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق دوسری پیشین گوئیوں کو چھپانے کی کوشش کی اسی طرح یہاں بھی تمام صفات کو غائب کر کے 'قدوسیوں' کا لفظ رکھ دیا تاکہ اس کی تاویل اپنے منشا کے مطابق کر سکیں۔ امکان ان دونوں ہی باتوں کا ہے لیکن کوئی منصف اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ تورات کی اس پیشین گوئی کے مصداق ہو سکتے ہیں تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ہی ہو سکتے ہیں۔

دوسری خاص بات جو اس پیشین گوئی میں ہے وہ یہ ہے کہ "اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی"۔ "آتشی شریعت" ہمارے نزدیک تعبیر ہے اس مضمون کی جو قرآن میں أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ اس کی وضاحت حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے الفاظ میں یوں فرمائی ہے کہ "اس کے ہاتھ میں (یعنی پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں) اس کا چھاج ہوگا، وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا، دانے کو بھس سے الگ

دے گا پھر دانے کو محفوظ کرے گا اور بھس کو جلا دے گا؟"

یہی حقیقت حضرت مسیح علیہ السلام نے دوسرے الفاظ میں یوں بیان فرمائی ہے:

"جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا ...... اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔" متی باب ۲۱: ۴۲-۴۴

کتاب استثنا کی مذکورہ بالا پیش گوئی میں یہ الفاظ بھی ہیں:

"وہ بے شک قوموں سے محبت رکھتا ہے۔ اس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں میں بیٹھے ایک ایک تیری باتوں سے مستفیض ہو گا۔"

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اگرچہ ترجمہ نے کلام کے رخ کو مبہم بنا دیا ہے تاہم یہ وہی بات فرمائی گئی ہے جس کا سراغ قرآن نے تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا کے الفاظ میں دیا ہے۔

انجیل کی تمثیل کا حوالہ

وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔ تورات کی تمثیل کے بعد یہ انجیل کی تمثیل کا حوالہ ہے۔ تورات کی تمثیل میں اہل ایمان کے زہد و تبتل، ان کے غلبہ و تمکن اور امتوں کے ساتھ ان کے عدل اور رحم کی تصویر ہے۔ انجیل کی تمثیل میں ان کے تدریجی ارتقاء کو نمایاں فرمایا گیا ہے کہ ان کی ابتدا اگرچہ نہایت کمزور ہو گی لیکن بالآخر وہ ایک ایسے تناور درخت کی شکل اختیار کریں گے کہ ان کے سایہ میں بڑی بڑی قومیں پناہ لیں گی۔ متی باب ۱۳: ۳۰-۹ میں یہ تمثیل یوں بیان ہوئی ہے:

"اس نے ایک اور تمثیل پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانے کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے لیکن جب بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آ کر اس کی ڈالیوں میں بسیرا کرتے ہیں۔"

یہ تمثیل معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ مرقس باب ۴ اور لوقا باب ۱۳ میں بھی آئی ہے۔ اسی تمثیل کی قرآن نے یوں وضاحت فرمائی کہ جو حال کھیتی کے نشو و نما کا ہوتا ہے وہی حال اسلام کے تدریجی عروج و کمال کا ہو گا، کھیت میں جو دانے بوئے جاتے ہیں اول اول وہ باریک سوئیاں سی نکالتے ہیں پھر ان کو مزید سہارا ملتا ہے جس سے سوئیاں موٹی اور قوی ہو جاتی ہیں اور کھیتی اپنے تنے پر

کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک دن آئے گا کہ جو تخمِ حق عرب کی سرزمین میں بو یا گیا ہے اس کی فصل شباب پر آئے گی جس سے اس کے بونے اور آبیاری کرنے والوں کے دلوں کو تو موہ لے گی اور ساتھ ہی ان لوگوں کے دلوں کو غم و غصہ سے جلائے گی جنھوں نے اس کے نشوونما کو روکنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

'لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ' میں 'ل' غایت و انجام کے اظہار کے لیے ہے اور لفظ 'کفار' تمثیل کے اصل مفہوم پر روشنی ڈال رہا ہے۔ تمثیل میں بیان مراد چونکہ اہل ایمان ہیں اس وجہ سے آخر میں یہ ظاہر کر کے کہ ان کا عروج بالآخر ایک دن کفار کے لیے باعث حسرت و حسد ہو گا گویا اس تمثیل کے ممثّل کو ظاہر کر دیا۔ عربی زبان میں تمثیلات و استعارات کے اندر یہ طریقہ معروف ہے کہ آخر میں کسی لفظ کے ذریعہ سے تمثیل یا استعارے کے ممثّل یا مستعار لہٗ کو واضح کر دیتے ہیں تاکہ اصل مدعا واضح ہو جائے۔ سورۂ نور والی تمثیل میں اس کی نہایت واضح مثال موجود ہے۔

'وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا'۔

یہ آخر میں اسی وعدۂ نصرت و مغفرت کی بشارت ہے جس کے اثبات کے لیے تورات و انجیل کی پیشین گوئیوں کا حوالہ دیا گیا ہے کہ جو لوگ ان صفات کے مصداق اور ایمان و عمل میں پختہ و راسخ رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت اور اجرِ عظیم سے نوازے گا۔ رہے وہ لوگ جو ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے لیکن ان کی ہمدردیاں اللہ و رسولؐ سے زیادہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ہیں اور جنھوں نے حدیبیہ کے موقع پر وہ کمزوری دکھائی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ اس انجام سے دوچار ہوں گے جو اسلام کے مخالفوں کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

رحمان آباد
یکم نومبر ۱۹۷۶ء
۸۔ ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ

تدبّرِ قرآن

۴۹

الحجرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ الفتح ـــــ کا ضمیمہ و تتمہ ہے۔ سورۂ فتح کی آخری آیت میں، تورات کے حوالہ سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ صفت جو وارد ہوئی ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (محمد اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں کفار کے لیے سخت اور باہمدگر نہایت مہربان ہوں گے) یہ پوری سورہ اسی ٹکڑے کی گویا تفسیر ہے۔ جہاں تک اس کی اہمیت کا تعلق ہے اس کی وضاحت سورۂ فتح کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ اس کی یہ اہمیت متقضی ہوئی کہ اس کے وہ مضمرات یہاں وضاحت سے بیان کر دیے جائیں جن کا بیان کیا جانا اس وقت مسلمانوں کے معاشرے کی اصلاح کے لیے نہایت ضروری تھا۔ یہ بات اپنے محل میں بیان ہو چکی ہے کہ قرآن میں احکام و ہدایات کا نزول حالات کے تقاضوں کے تحت ہوا ہے تاکہ لوگوں پر ان کی صحیح قدر و قیمت واضح ہو سکے۔ چنانچہ یہ سورہ بھی ایسے حالات میں نازل ہوئی ہے جب نئے نئے اسلام میں داخل ہونے والوں کی طرف سے بعض باتیں ایسی سامنے آئیں جن سے ظاہر ہوا کہ یہ لوگ نہ تو رسول کے اصلی مرتبہ و مقام ہی سے اچھی طرح واقف ہیں اور نہ اسلامی معاشرہ کے اندر اپنی ذمہ داریوں ہی سے۔ چنانچہ اس ضمیمہ میں ضروری ہدایات دے دی گئیں جو اس وقت کے حالات کے اندر ضروری تھیں۔ ان احکامات و ہدایات کا تعلق تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے باہمی حقوق ہی سے ہے۔ کفار کا معاملہ اس میں زیر بحث نہیں آیا۔ ان کے ساتھ مسلمانوں کو جو رویہ اختیار کرنا چاہیے اس کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔

سورہ کے تیسرے گروپ میں جس نوعیت کا تعلق سورۂ نور کا سورۂ مومنون کے ساتھ ہے اسی نوعیت کا تعلق اس سورہ کا سورۂ فتح کے ساتھ ہے۔ دونوں کا مزاج باہمدگر بالکل ملتا جلتا ہوا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۵) مسلمانوں کو تنبیہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے کو رسول کی رائے یا آپ کے حکم پر مقدم کرنے کی کوشش کرے یا گفتگو میں اپنی آواز کو آپ کی آواز پر بلند کرے یا آپ کو اس طرح پکارے جس طرح اپنے کسی معمولی درجہ کے آدمی کو پکارتا ہے۔ تقویٰ کی افزائش اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کے دلوں کے اندر کرتا ہے جو اس کے رسول کے ادب و احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے رسول اور اسلام کا محسن سمجھتے ہیں اور رسول کے سامنے خطاب و کلام میں اپنے تفوق کا اظہار کرتے ہیں انھیں ڈرنا چاہیے کہ اس طرح کی حرکت سے غیر شعوری طور پر وہ اپنے اعمال ہی نہ گنوا بیٹھیں۔

(۶-۱۰) مسلمانوں کا معاملہ مسلمانوں کے ساتھ اخوت کی بنیاد پر ہونا چاہیے نہ کہ پارٹی اور گروہ کی عصبیت کی بنیاد پر۔ یہ جائز نہیں ہے کہ کسی فاسق کی روایت پر اعتماد کر کے مسلمان مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف اقدام کر ڈالیں، جس پر بالآخر انھیں پچھتانا پڑے۔ تمام اہم معاملات میں رسول کی صوابدید اور اس کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے۔ کسی پارٹی کو رسول کی حمایت اپنے حق میں حاصل کرنے کے لیے اس پر غلط قسم کا دباؤ ڈالنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ چیز اس فضل و انعام کی ناقدری ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ایمان کی شکل میں اہلِ ایمان کو نوازا ہے۔ ایمان کا مزا چکھ لینے کے بعد کوئی ایسی بات کرنا جو اس کے منافی ہے کفر و عصیان کی طرف رجعت ہے جس سے لوگوں کو بچانے ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان کو دلوں میں رچانے اور کفر کو مبغوض بنانے کے لیے سارے جتن کیے ہیں۔ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ گروہی رجحانات کی بنا پر ان میں سے کسی گروہ کے ساتھی بن جائیں بلکہ انھیں معاملہ کو حق و انصاف کی نگاہ سے دیکھنا اور ان کے درمیان اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔ حق و عدل کا پہلو متعین ہو جانے کے بعد اگر ان میں سے کوئی گروہ اس حق کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہو تو اس کو بزور اس کے آگے جھکنے پر مجبور کرنا چاہیے۔

(۱۱-۱۲) ان باتوں سے بچنے کی ہدایت جو دلوں میں نفرت کی تخم ریزی اور معاشرے میں فساد کی آگ بھڑکانے والی ہیں۔ کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے کی تحقیر کرے یا اس کا مذاق اڑائے یا اس کو عیب لگائے یا اس پر پھبتیاں چست کرے یا اس کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرے یا اس کی غیبت کرے یا اس کے عیوب کی ٹوہ میں لگے۔ حسب نسب اور خاندان و قبیلہ کا تفوق

جاہلیت کی یادگار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو ایک ہی آدم و حوا سے پیدا کیا ہے۔ خاندانوں اور قبیلوں کی تقسیم محض تعارف کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت کا معیار صرف تقویٰ ہے نہ کہ نسب اور خاندان۔

(۱۴-۱۸) خاتمۂ سورہ، جس میں اس بات کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے جو سورہ کی تمہید میں اشارات کی شکل میں، فرمائی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی آیات میں جن لوگوں کا رویہ زیر بحث آیا ہے یہ اطراف مدینہ کے وہ اہل بدو تھے جو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن ایمان ان کے دلوں میں اچھی طرح اترا نہیں تھا اس وجہ سے وہ اس پندار میں مبتلا تھے کہ اسلام لا کر انھوں نے اسلام اور پیغمبر پر ایک احسان کیا ہے۔ ان کے اس پندار کا اظہار بعض اوقات اس طرح کی حرکتوں سے ہو جاتا تھا جن سے ابتدائی آیات میں مسلمانوں کو روکا گیا ہے۔ اب یہ آخر میں ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ ان کو بتا دو کہ وہ اپنے ایمان و اسلام کا احسان نہ جتائیں۔ اللہ ان کے ظاہر و باطن سے اچھی طرح واقف ہے۔ انھوں نے اطاعت تو ضرور کر لی ہے لیکن ابھی ایمان نے ان کے اندر جڑ نہیں پکڑی ہے۔ یہ ان کا احسان نہیں ہے کہ وہ پیغمبر پر ایمان لائے بلکہ یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے ان کو ایمان کی توفیق بخشی۔ اگر وہ اس کا حق ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے سارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

سُوْرَةُ الْحُجُرٰتِ

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰيات: ۱۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ آیات
رَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱﴾ يٰٓاَيُّهَا ۱-۱۰
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ
وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ
اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ
اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ
اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۳﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا
يَعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ
خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ
جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ
فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۶﴾ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ
رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ

اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ
الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۷
فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۸ وَاِنْ طَاۗىِٕفَتٰنِ
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ
اِحْدٰىهُمَا عَلَي الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْۗءَ
اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَاۗءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۹ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا
بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۱۰

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۰

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ اور رسول کے سامنے اپنی رائے مقدم نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۱

اے ایمان لانے والو! تم اپنی آواز نبی کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ اس کو اس طرح آواز دے کر پکارو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو، مبادا تمہارے اعمال ڈھے جائیں اور تم کو احساس بھی نہ ہو۔ یاد رکھو کہ جو لوگ نبی کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کی افزائش کے لیے منتخب کیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔ ۲ - ۳

بے شک جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ رکھنے والے نہیں ہیں۔ اگر یہ لوگ صبر کے ساتھ اتنا انتظار کر لیتے کہ تم خود

ان کے پاس نکل کے آجاتے تو یہ بات ان کے حق میں بہتر ہوتی اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۴-۵

اے ایمان لانے والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لائے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو مبادا کسی قوم پر نادانی سے جا پڑو، پھر تمہیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔ اور اچھی طرح جان رکھو کہ تمہارے اندر اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر بہت سے معاملات میں وہ تمہاری بات مان لیا کرے تو تم بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے لیکن اللہ نے تمہارے سامنے ایمان کو محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں کھبایا اور کفر و فسق اور نافرمانی کو تمہاری نگاہوں میں مبغوض کیا۔ یہی لوگ ہیں جو اللہ کے فضل و انعام سے راہ راست پانے والے بنے۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۶-۸

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان مصالحت کراؤ پس اگر ان میں سے ایک دوسرے پر تعدی کرے تو اس سے جنگ کرو جو تعدّی کرے تاآنکہ وہ اللہ کے فیصلہ کی طرف رجوع کرے۔ پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ مصالحت کرا دو اور ٹھیک ٹھیک انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ مسلمان باہمدگر بھائی بھائی ہیں تو اپنے بھائیوں کے مابین مصالحت کراؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۹-۱۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۱)

وہ حالات جن میں یہ سورہ نازل ہوئی

خطاب اگرچہ عام مسلمانوں سے ہے لیکن جن لوگوں کا رویہ اس سورہ میں زیرِ بحث آیا ہے وہ، جیسا کہ آگے کی آیات سے بالتدریج واضح ہوتا جائے گا اطراف مدینہ کے بدوی قبائل کے وہ لوگ ہیں جو اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن ابھی ایمان ان کے دلوں میں اچھی طرح رچا بسا نہیں تھا۔ اس کی وجہ اوّل تو یہ تھی کہ یہ لوگ اسلام کو سمجھ کر نہیں بلکہ اس سے مرعوب ہو کر اس میں داخل ہوئے، ثانیاً مرکز سے بے تعلق رہنے کے سبب سے ان کی تربیت بھی اچھی طرح نہیں ہوئی تھی۔ ان کے اندر ایک غلط قسم کا پندار بھی تھا کہ انھوں نے کسی جنگ کے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کر لی جو آپ پر ان کا ایک احسان ہے۔ اس پندار کا اثر یہ تھا کہ ان کے سردار جب مدینہ آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس انداز سے بات کرتے گویا وہ اسلام کے بڑے مربی و محسن ہیں۔ بغیر اس کے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملے میں ان کی رائے دریافت کریں آگے بڑھ بڑھ کر اپنی رائیں پیش کرتے اور مشورے دینے کی کوشش کرتے بات کرتے ہوئے حضورؐ کی آواز پر اپنی آواز، تفوّق کے اظہار کے لیے بلند رکھتے۔ جب کبھی آتے تو ان کی خواہش یہ ہوتی کہ حضورؐ بلا تاخیر سارے کام چھوڑ کر، ان سے ملاقات کریں اور اگر ذرا تاخیر ہو جاتی تو بے درنگ آپ کے حجروں کے باہر سے اس طرح آواز دینا شروع کر دیتے جس طرح ایک عام آدمی کو آواز دی جاتی ہے۔ آپس میں ان کے درمیان جو جاہلی رقابتیں زمانۂ جاہلیت سے چلی آ رہی تھیں، ان میں ہر ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرتا اور اس غرض کے لیے وہ اپنے حریفوں سے متعلق بعض اوقات ایسی خبریں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچاتے جو غلط فہمی پیدا کرنے والی ہوتیں۔ ان کی بنا پر مدینہ کے مسلمان اگر کوئی اقدام کر گزرتے تو یہ چیز مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے نہایت مضر ہوتی۔

یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ نازل ہوئی۔ اس میں رویہ تو زیرِ بحث، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک مخصوص گروہ ہی کا ہے لیکن قرآن نے خطاب عام ہی رکھا ہے تاکہ اس کا زیادہ فضیحتا بھی نہ ہو اور وہ رخنے بند بھی ہو جائیں جن سے شیطان کو معاشرہ کے اندر فتنہ انگیزی کی راہ مل سکتی ہے۔

ممانعت رسول کے سامنے رائے پیش کرنے کی نہیں بلکہ رائے پیش کرنے میں پہل کرنے کی ہے

یہ امر واضح رہے کہ یہاں ممانعت اللہ کے رسول کے سامنے اپنی رائے پیش کرنے میں پہل کرنے یا اپنی رائے کو اللہ اور رسول کے حکم پر مقدم کرنے کی ہے نہ کہ رسول کے سامنے مجرّد اپنی کوئی رائے پیش کرنے کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امورِ مصلحت میں صحابہؓ سے ان کی رائیں معلوم بھی فرماتے اور صحابہؓ اپنی رائے پیش بھی کرتے۔ اسی طرح صحابہؓ بعض اوقات عام امورِ مصلحت میں نبی صلی اللہ

علیہ وسلم کے سامنے یہ بھی عرض کرتے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فلاں اقدام وحی الٰہی پر مبنی نہ ہو تو اس کی جگہ فلاں تدبیر زیادہ قرینِ مصلحت رہے گی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات ان کی رائیں قبول بھی فرما لیتے۔ اس آیت میں اس طرح کی باتوں کی نہی نہیں ہے۔ حضورؐ نے خود اپنے طرزِ عمل سے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ سب سے زیادہ لوگوں سے مشورہ لینے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی، جیسا کہ آیت وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹) سے واضح ہے، آپ کو لوگوں سے مشورہ کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی گئی تھی۔

یہاں ممانعت اسی بات کی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ کوئی شخص اللہ کے رسول کو ایک عام آدمی یا مجرد ایک لیڈر سمجھ کر اور اپنے آپ کو ان سے زیادہ مدبر خیال کر کے، بغیر اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کسی معاملہ میں اس کی رائے دریافت کریں، حضورؐ کو اپنی رائے سے متاثر کرنے اور اپنی رائے کو حضورؐ کی بات پر مقدم کرنے کی کوشش کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے تو اس کا رویہ دلیل ہے کہ وہ رسول کے اصلی مرتبہ و مقام سے بالکل بے خبر ہے۔ اللہ کا رسول اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ جو کچھ کہتا یا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت کرتا یا کہتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنے کی جسارت کرتا ہے تو دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اپنی رائے کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر مقدم کرنا چاہتا ہے درآنحالیکہ یہ چیز اس کے تمام ایمان و عمل کو ڈھا دینے والی ہے اگرچہ اس کو اس کا شعور نہ ہو۔

اللہ اور رسول کا معاملہ الگ الگ نہیں ہے

بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ و رسول کا معاملہ الگ الگ نہیں ہے۔ اللہ کا رسول اللہ کا سفیر و نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کو بن پوچھے مشورہ دینا خود اللہ تعالیٰ کو مشورہ دینا ہے، اس کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنا اللہ کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنا ہے اور اس سے بڑھ کر اپنے کو مدبر سمجھنا خود خدائے علیم و حکیم سے بڑھ کر اپنے کو مدبر و حکیم سمجھنا ہے۔ یہ آدمی کے اس رویہ کے لازمی نتائج ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کو اس کی بلادت کے سبب سے ان نتائج کا احساس نہ ہو لیکن ان کے لازمی نتائج ہونے سے انکار ناممکن ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ یہ ان لوگوں کو تنبیہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ اور رسول سے زیادہ دانشمند اور مدبر ہونے کے خبط میں مبتلا نہ ہو۔ اللہ سمیع و علیم ہے۔ وہ تمہاری ساری باتوں کو سن بھی رہا ہے اور ان کے پیچھے جو محرکات کام کر رہے ہیں ان سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے تو اس کا مکافاتِ عمل کا قانون لازماً ظہور میں آئے گا۔ اس قانون کا ذکر آگے والی آیت میں آ رہا ہے۔

اس آیت میں ہمارے زمانے کے ان لوگوں کو بھی تنبیہ ہے جو اسلام کی خدمت کے دعوے

کے ساتھ اس کے اقتدار کو منع اور اس کے قوانین کی تحریف کر رہے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ اور رسول نے جس شکل میں اسلام دیا ہے اس شکل میں وہ اس دور میں نہیں چل سکتا۔ ضروری ہے کہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اس کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ وہ شریعت کے احکام میں اپنی رائے کے مطابق ترمیم کر رہے ہیں۔ بس یہ فرق ہے کہ آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو پہلے ہی سے سبقت کرکے چاہتے تھے کہ اللہ و رسول کے آگے اپنے مشورے پیش کر دیں، اس زمانے کے مدعیان اسلام کو یہ موقع نہ مل سکا اس وجہ سے وہ اب ان غلطیوں کی اصلاح کر رہے ہیں جو ان کے نزدیک اللہ و رسول سے العیاذ باللہ، دین کے معاملے میں ہوگئی ہیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۲)

جن کے اندر پندار سمایا ہوا ہو ان کا اخوان کے انداز کلام سے نمایاں ہوتا ہے

یہ اسی اوپر والی بات کے ایک دوسرے پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ خناس سمایا ہوا ہو کہ وہ اللہ و رسول کو مشورہ دینے کی پوزیشن میں ہیں یا جن کو یہ زعم ہو کہ ان کا اسلام قبول کر لینا اسلام اور پیغمبر پر ایک احسان ہے۔ ان کا طرز خطاب اور انداز کلام رسول کے آگے متواضعانہ و نیازمندانہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ ان کے اس پندار کا اثر ان کی گفتگو سے نمایاں ہونا ایک امر فطری تھا۔ چنانچہ یہ لوگ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے تو ان کے انداز کلام سے یہ واضح ہوتا کہ یہ اللہ کے رسول سے کچھ سیکھنے نہیں بلکہ ان کو کچھ سکھانے اور بتانے آئے ہیں۔ چنانچہ جس طرح یہ اپنی رائیں پیش کرنے میں سبقت کرتے اسی طرح ان کی کوشش یہ بھی ہوتی کہ ان کی آواز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر بلند و بالا رہے اور اگر آپ کو مخاطب کرتے تو ادب سے 'یا رسول اللہ' کہنے کے بجائے 'یا محمد' کہہ کر خطاب کرتے جس طرح اپنے برابر کے ایک عام آدمی کو خطاب کیا جاتا ہے۔ یہاں ان کو اس غیر مہذب طریقۂ کلام و خطاب سے روکا گیا ہے کیونکہ یہ چیز غمازی کر رہی تھی کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ رسول کا اصل مرتبہ و مقام نہیں پہچانا ہے بلکہ ان کے اندر اپنی برتری کا وہ زعم بھی چھپا ہوا ہے جو بالآخر قرآن کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دینے والا ہے۔

'اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ' میں 'ان' سے پہلے، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں کراھۃ' یا 'مخافۃ' یا ان کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس بے ادبی سے تمھیں اس لیے روکا جا رہا ہے کہ مبادا تمھاری یہ حرکت اس بات کا سبب بن جائے کہ عنداللہ تمھارے سارے اعمال ڈھے جائیں۔

'وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ' یعنی تم تو اس پندار میں مبتلا رہو گے کہ تم نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے اور نبی کو اپنی رایوں سے مستفید کرنے کے لیے تمھاری بے چینی بھی خدمت دین ہی کے عشق

یں ہے لیکن ادھر تمھارے وہ سارے اعمال ڈھے جائیں گے جو اپنے زعم میں تم نے دین کی خاطر انجام دیے اور تمھیں اس بات کا شعور بھی نہ ہوگا۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ایک شخص بہت سے کام اپنی دانست میں دین کے کام سمجھ کر دین ہی کی خدمت کے لیے کرتا ہے لیکن اس کے اندر اگر یہ پندار سمایا ہوا ہو کہ وہ اللہ و رسول پر یا اللہ کے دین پر کوئی احسان کر رہا ہے اور اس زعم میں نہ وہ اللہ تعالیٰ کی صحیح عظمت کو ملحوظ رکھے نہ اس کے رسول کے اصل مرتبہ و مقام کا احترام کرے تو اس کے سارے اعمال اکارت ہو کے رہ جائیں گے اور اس کو اپنی اس بے شعوری کا پتہ آخرت میں چلے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو اللہ و رسول کا محسن سمجھ بیٹھے۔ اس کے ہاں قبولیت کا شرف صرف انہی لوگوں کے اعمال کو حاصل ہوگا جو اس کے دین کی خدمت صرف اس کی رضا کے لیے، ٹھیک ٹھیک اس کے مقرر کردہ شرائط کے مطابق، انجام دیں گے اور ساتھ ہی دل سے اس حقیقت کے معترف رہیں گے کہ یہ خدمت انجام دے کر انھوں نے اللہ و رسول پر کوئی احسان نہیں کیا ہے بلکہ یہ اللہ کا فضل و احسان خود ان کے اوپر ہوا ہے کہ اس نے ان کو اپنے دین کی کسی خدمت کی توفیق بخشی۔ ایک نہایت اہم حقیقت

إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ ۚ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ (۳)

یہ اس صحیح ادب کی تعلیم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں ہر صاحب ایمان کو اختیار کرنا لازم ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے رسول کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی افزائش کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ لفظ 'امتحن' یہاں 'اصطفیٰ' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے۔ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر دل تقویٰ کی تخم ریزی اور اس کی افزائش کے لیے موزوں نہیں ہوتا بلکہ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ امتحان کر کے دلوں کا انتخاب کرتا ہے اور اس انتخاب میں اصل چیز جو ترجیح دینے والی بنتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر اللہ و رسول کے لیے انقیاد و اطاعت کا سچا جذبہ اور ان کے آگے فروتنی کا صحیح شعور ہے یا نہیں۔ یہ چیز جس کے اندر جتنی ہی زیادہ ہوتی ہے اس کو اتنی ہی زیادہ تقویٰ کی نعمت عطا ہوتی ہے اور جو لوگ جس درجے میں اس شعور سے عاری ہوتے ہیں وہ اتنے ہی تقویٰ سے بعید ہوتے ہیں۔ آواز بلند کرنے کا ذکر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، انسان کے باطن کے ایک مخبر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ جو شخص کسی کی آواز پر اپنی آواز بلند رکھنے کی کوشش کرتا ہے اس کا یہ عمل شہادت دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے اونچا خیال کرتا ہے رسول کے معاملے میں صحیح ادب کی تعلیم

یہ چیز اکتسابِ فیض کی راہ بالکل بند کر دیتی ہے۔ اگر استاد کے آگے کسی شاگرد کا یہ طرزِ عمل ہو تو وہ اس کے فیض سے محروم رہتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ کے رسول کے آگے کسی نے یہ روش اختیار کی تو وہ صرف رسول ہی کے فیض سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بھی محروم ہو جائے گا اس لیے کہ رسول، اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے۔

کتاب و سنت کے نیچے سے بہرہ مند ہونے کے لیے پہلا درجہ

یہی درجہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو تقویٰ کے لیے منتخب فرماتا ہے جو اس کی کتاب اور رسول کی سنت کے سامنے فروتنی کی یہی روش اختیار کرتے ہیں جس کی ہدایت رسول کے معاملے میں ہوئی ہے۔ جس شخص کے اندر اللہ و رسول کی ہر بات کے آگے سر جھکا دینے کا سچا جذبہ ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے تقویٰ کی راہیں کھولتا ہے اور ہر قدم پر غیب سے اس کی رہنمائی ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص اس خبط میں مبتلا ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی اصلاح کرنے کی پوزیشن میں ہے تو اس کا یہ پندار اس کے سارے عمل کو غارت اور اس کی آخرت کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔

لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ۔ اوپر والی آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر آواز بلند کرنے کا انجام یہ بتایا ہے کہ یہ روش اعمال کو برباد کر دینے والی روش ہے۔ اس کے مقابل میں یہ ان لوگوں کا صلہ بیان ہوا ہے جو اپنی آواز رسول کے آگے پست رکھیں گے۔ فرمایا کہ ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔ یعنی ان کی لغزشیں اور کوتاہیاں اللہ تعالیٰ بخش دے گا اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کے آگے فروتنی کی روش اختیار کی، کسی گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھنے کی جسارت نہیں کی۔ ان کی اس فروتنی کا انعام ان کو یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو تقویٰ کی افزائش کے لیے منتخب فرمایا جس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِن وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۴)

کم عقلوں کے ایک ناشائستہ طریقہ پران کو تنبیہ

یہ لوگ جس طرح مجلس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرنے میں غیر مہذب تھے اسی طرح یہ حرکت بھی وہ کرتے کہ جب دیکھتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں موجود نہیں ہیں تو آتے ہی ازواج مطہرات کے حجروں کے باہر ہی سے آپ کو چیخ چیخ کر پکارنا شروع کر دیتے۔ اس قسم کی حرکت بجائے خود بھی نہایت ناشائستہ ہے لیکن اس کا باطنی محرک اس کے ظاہر سے بھی زیادہ مکروہ تھا۔ یہ لوگ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا اور آگے اس کی پوری وضاحت آئے گی، اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ انھوں نے بغیر لڑے بھڑے جو اسلام قبول کر لیا تو یہ اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا بہت بڑا احسان ہے اس وجہ سے یہ اپنا حق سمجھتے تھے کہ جب یہ آئیں تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بلا تاخیر ان کا خیر مقدم کریں۔ اگر کسی وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف فرما نہ ہوتے تو انتظار کی زحمت گوارا

نہ کرتے بلکہ فوراً ازواجِ مطہراتؓ کے حجروں کا چکر لگانا اور چیخ چیخ کر نہایت بھونڈے طریقے سے، آپ کا نام لے لے کر، پکارنا شروع کر دیتے۔ فرمایا کہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ 'اَکْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ' کے الفاظ میں ان لوگوں کی ناسمجھی پر ملامت بھی ہے اور لطیف انداز میں ان کی اس نادانی سے درگزر کرنے کا اشارہ بھی کہ ہر چند ہے تو ان کی یہ حرکت نہایت ناشائستہ لیکن ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو نہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ و مقام سے آشنا ہیں اور نہ اپنی اس حرکت کے انجام سے، اس وجہ سے یہ تربیت کے محتاج اور درگزر کے لائق ہیں۔

'مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ' میں لفظ 'وَرَآءِ' جو آیا ہے اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ حجروں کے پیچھے سے پکارتے تھے اس وجہ سے ان کی یہ حرکت قابلِ اعتراض ٹھہری۔ لفظ 'وَرَآءَ' پیچھے یا پچھواڑے کے مفہوم کے لیے خاص نہیں ہے۔ عربی میں 'نَادَانِیْ مِنْ وَّرَآءِ الدَّارِ' کا مفہوم صرف یہ ہوگا کہ اس نے گھر کے باہر سے مجھے پکارا، قطع نظر اس سے کہ مکان کے پیچھے سے پکارا یا مکان کے سامنے سے۔ قابلِ اعتراض ان کا اس بھونڈے طریقہ سے پکارنا تھا۔ یہ امر واضح رہے کہ ایک عام مسلمان کو بھی اس طرح پکارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو۔ سورۂ نور کی تفسیر میں وہ طریقہ آپ پڑھ آئے ہیں جو کسی صاحبِ خانہ سے ملاقات کے لیے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۵)

یہ ان کو صحیح ادب کی ہدایت فرمائی گئی کہ اگر وہ صبر کے ساتھ تمہارے نکلنے تک انتظار کر لیتے تو یہ چیز ان کے لیے بڑے خیر و برکت کا موجب ہوتی! آیت کا اسلوب ان کی محرومی پر اظہارِ حسرت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جس چشمۂ فیض پر پہنچے تھے اگر انھوں نے اس کی صحیح قدر پہچانی ہوتی تو اس سے سیراب ہو کر لوٹتے لیکن یہ ان کی محرومی ہے کہ وہاں سے کچھ پانا تو درکنار اپنی نادانی و ناقدرشناسی کے باعث یہ کچھ کھو کے پلٹے!

'وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ' یہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی صفات 'غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ' کی یاد دہانی فرمائی ہے اور مقصود اس سے نہایت لطیف انداز میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اگرچہ ان کی یہ حرکتیں نہایت ناگوار ہیں لیکن یہ سمجھ رکھنے والے لوگ نہیں ہیں اس وجہ سے ابھی ان کی اس طرح کی باتوں سے درگزر کرو۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور یہی عفو و درگزر اس کے رسول کے بھی شایانِ شان ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ (۶)

خبر کے قبول کرنے کے معاملہ میں احتیاط کی تاکید

یہ مرکز (یعنی مدینہ) کے مسلمانوں کو اس طرح کے لوگوں کی طرف سے ایک سیاسی خطرہ سے آگاہ فرمایا گیا ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ اطرافِ مدینہ کے بدوی قبائل کے بعض سرداروں کا رویہ بیان ہوا ہے۔ ان کے اندر تربیت سے محرومی کے باعث جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا صحیح شعور مفقود تھا اسی طرح اسلامی اخوت کے صحیح احساس سے بھی یہ لوگ ابھی ناآشنا تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں ان کے اندر جو رقابتیں اور رنجشیں آپس میں تھیں ان کے اثرات ہنوز باقی تھے۔ یہ لوگ مدینہ آتے تو ان میں سے بعض اپنے حریفوں کے خلاف غلط صحیح اطلاعات دے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بدگمان کرنے کی کوشش کرتے اور صحابہؓ میں سے بھی، جن پر ان کا اثر کارگر ہوتا، ان کو اپنے حق میں ہموار کرتے تاکہ مدینہ کی مرکزی طاقت کو اپنے حریفوں کے خلاف اپنے حق میں استعمال کر سکیں۔ یہ صورتِ حال ایک نازک صورتِ حال تھی۔ مدینہ کی حکومت اول تو ابھی اچھی طرح مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ ثانیاً اس قسم کی بے بنیاد افواہ انگیزیوں کی بنا پر اس کا کوئی اقدام خاص طور پر مسلمانوں ہی کے کسی گروہ کے خلاف، عدل اور اجتماعی مصلحت دونوں کے خلاف ہوتا۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ مرکز کے مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی جائے کہ وہ اس طرح کے اہم معاملات میں فیصلہ کلیتہً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صواب دید پر چھوڑیں، غیر ثقہ لوگوں کی روایات پر اعتماد کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رائے سے متاثر کرنے کی کوشش نہ کریں۔ چنانچہ ان کو ہدایت ہوئی کہ اگر کوئی فاسق شخص کسی اہم بات کی خبر دے تو نفسِ واقعہ کی اچھی طرح تحقیق کیے بغیر اس کی بات پر اعتماد کر کے کوئی اقدام نہ کر بیٹھو، مبادا کہ تم جوش و جذبہ سے مغلوب ہو کر کسی بے گناہ گروہ کے خلاف اقدام کر گزرو جس پر تمھیں بعد میں پچھتانا پڑے۔

فاسق سے مراد شریعت کے حدود و قیود سے بے پروا لوگ ہیں۔ لفظ 'نبا' کی تحقیق اس کے محل میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد کوئی اہم خبر ہوتی ہے جس کو باور کر لینے یا اس پر عمل کرنے سے دُور رس نتائج کے پیدا ہونے کا امکان ہو۔ اس طرح کی اہم خبر اگر کوئی ایسا شخص دے جو دینی و اخلاقی اعتبار سے ناقابلِ اعتبار ہو تو عقل اور اخلاق دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی بات اس وقت تک باور نہ کی جائے جب تک خبر اور مخبر دونوں کی اچھی طرح تحقیق نہ کر لی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ خبر دینے والے نے فاسد محرکات کے تحت خبر دی ہو اور خبر یا تو بالکل جھوٹی ہو یا کسی بدنیتی سے اس میں ایسی کمی بیشی کر دی گئی ہو کہ سننے والوں کے جذبات میں اس سے جوش و اشتعال پیدا ہو۔ لفظ 'جہالت' یہاں جوش و ہیجان کے معنی میں ہے۔ اس کی تحقیق جگہ جگہ اس کتاب میں ہم کر چکے ہیں۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ
وَالْعِصْيَانَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً ۚ وَاللَّهُ
عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۷-۸)

صحیح رویہ

یہ اسی تنبیہ کی مزید تاکید ہے کہ جب تمہارے اندر اللہ کا رسول موجود ہے تو تمہیں اپنی رایوں اور اپنے مشوروں کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے کہ رسول کو اپنے پیچھے چلانے کی کوشش کرو بلکہ تمہیں ان کے پیچھے چلنا ہے۔ وہ جو قدم بھی اٹھاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں اٹھاتے ہیں اس وجہ سے تمہاری دنیا اور آخرت کی فلاح ان کی پیروی میں ہے نہ کہ اپنے جذبات کی پیروی میں۔ اگر تمہیں کوئی رائے پیش کرنی ہو تو ادب سے اپنی رائے پیش کر کے فیصلہ رسول کی صوابدید پر چھوڑ دو۔ یہ خواہش نہ کرو کہ تمہاری ہر رائے لازماً مان ہی لی جائے۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ تمہاری بہت سی رائیں خام ہوتی ہیں، اللہ کا رسول ان سب کو اگر مان لیا کرے تو تم بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے وہ تمہاری انہی رایوں کو مانتے ہیں جو صائب ہوتی ہیں۔ ان کی بدولت تمہیں ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی راہنمائی حاصل ہے تو اس نعمت کی قدر کرو اور اپنے رب کے شکرگزار رہو۔

'عنت' کے معنی زحمت اور مشقت کے ہیں۔ 'لَعَنِتُّمْ' یعنی تم بڑی مشقت و مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ اگر کوئی مریض طبیب کی صوابدید پر عمل کرنے کے بجائے چاہے کہ طبیب اس کے مشوروں پر عمل پیرا ہو تو ایسے مریض کا خطرے میں پڑ جانا ایک امر بدیہی ہے۔

زبان کے بعض لطائف

'وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ' یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس زحمت و مشقت سے بچانے ہی کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ ایمان کو تمہاری نگاہوں میں محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں رچایا بسایا اور کفر، فسق اور عصیان کو تمہاری نگاہوں میں مکروہ و مبغوض ٹھہرایا تو اس اہتمام کا حق یہ ہے کہ اب تمہارے اندر ایمان کی محبت و محبوبیت قائم و دائم رہے اور کبھی تمہارے کسی قول و فعل سے اس پر کفر و عصیان کا کوئی دھبہ نہ پڑنے پائے۔

'حَبَّبَ' اور 'كَرَّهَ' کے بعد 'اِلٰی' کا صلہ اس اہتمام خاص کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کی نگاہوں میں ایمان کو محبوب اور کفر و فسق کو مبغوض بنانے کے لیے اپنے رسول کے ذریعہ سے فرمایا۔ دورِ جاہلیت کی تاریکی میں تمام اقدار بالکل تلپٹ ہو گئے تھے۔ شیطان نے ایمان کو لوگوں کی نگاہوں میں مکروہ و مبغوض اور کفر و فسق کو محبوب و مطلوب بنا دیا تھا۔ ایمان اس طرح تہ بہ تہ پردوں کے اندر محجوب و مستور ہو گیا تھا کہ ان کو چاک کر کے ایمان کے حقیقی حسن و جمال کو خلق کے لیے بے نقاب کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف بن گیا تھا۔ اسی طرح کفر کو شیطان نے مصنوعی غازوں سے اس طرح

پُرفریب بنا دیا تھا کہ اس کی اصل گھنونی شکل و صورت لوگوں کو دکھانا ہفت خواں سطے کرنے کے برابر تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہوئی کہ اس نے اپنا رسول بھیجا جس نے ایک طویل جد و جہد اور جہاد کے بعد ایمان کو اس کی اصلی محبوب شکل میں لوگوں کو دکھایا اور اس کے جمال کو ان کے دلوں میں بسایا۔ اسی طرح کفر کے چہرے کے مصنوعی غازہ کو اتار کر اس کی اصل مکروہ اور گھنونی شکل سے لوگوں کو آشنا اور اس سے بیزار کیا۔ اسی مضمون کو یہاں 'حَبَّبَ اِلَی' اور 'کَرَّہَ اِلَی' کے الفاظ سے ادا فرمایا ہے۔ یعنی ایمان اور کفر دونوں کو ان کی حقیقی شکل و صورت میں تمہارے آگے پیش کیا جس سے تم ایمان کے دلدادہ بنے اور کفر سے بیزار ہوئے۔ گویا یہ دونوں فعل 'قدّم' کے مضمون پر متضمن ہیں اور حرف 'اِلَی' اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

یہاں 'حَبَّبَ' کے مفعول کی حیثیت سے تو صرف 'ایمان' کا ذکر ہے لیکن 'کَرَّہَ' کے ساتھ کفر، فسق اور عصیان تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جن لوگوں کے کردار پر تبصرہ ہو رہا ہے وہ ابھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ان باتوں سے اچھی طرح آشنا نہیں تھے جو ایمان کی ضد میں۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ ان کو وضاحت سے یہ بات بتائی جائے کہ صرف کفر ہی ایمان کے منافی نہیں ہے بلکہ فسق و عصیان کے قسم کی ساری باتیں بھی اسی شجرۂ ملعونہ کے برگ و بار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی مبغوض ٹھہرایا۔

لفظ 'فسق' یوں تو قرآن میں کفر کی جگہ بھی استعمال ہوا ہے لیکن یہاں چونکہ یہ کفر کے ساتھ آیا ہے اس وجہ سے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ حکم عدولی ہو گی جس کا ارتکاب کوئی شخص ایمان کا مدعی ہوتے ہوئے کرے۔ لفظ 'عصیان' یہاں موقع و محل اشارہ کر رہا ہے کہ رسول کی نافرمانی کے لیے آیا ہے۔ رسول کے خلفاء و امراء کی نافرمانی بھی چونکہ بالواسطہ رسول ہی کی نافرمانی ہے اس وجہ سے یہ چیز بھی اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔

'اُولٰٓئِکَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ﴿۷﴾ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ'۔

فرمایا کہ یہی لوگ، جن کے دلوں میں ایمان کا جمال گھر کیے ہوئے ہے اور جو کفر، فسق اور عصیان کے ہر شائبہ سے بیزار و نفور ہیں، درحقیقت اصل ہدایت پر ہیں اور یہ ہدایت ان کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے انعام سے حاصل ہوئی ہے اس وجہ سے ان کو اس پر اپنے رب ہی کا شکر گزار رہنا چاہیے، عام کاروں کی طرح اس وہم میں کسی کو نہیں مبتلا ہونا چاہیے کہ اس کو یہ چیز از خود مل گئی ہے اور وہ خدا اور رسول کا کوئی محسن بن گیا ہے۔ 'علیم' 'حکیم' کی صفات کا حوالہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل اس کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم کسی اندھے کی تقسیم نہیں ہے۔ وہ اپنے دین کی نعمت انہی کو دیتا ہے جن کو وہ اس کا اہل

پاتا ہے۔

یہ آیت مدینہ کے مسلمانوں کی تعریف میں ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے برابر فیضیاب اور اللہ کے رنگ میں اچھی طرح رنگے ہوئے تھے اور سیاق و سباق دلیل ہے کہ اس میں ان خام کار مسلمانوں پر تعریض بھی ہے جن کی خامیوں پر سورہ کی ابتدا ہی سے تبصرہ ہو رہا ہے اور جن کا تعلق اطرافِ مدینہ کے قبائل سے تھا۔

ایک بے بنیاد شانِ نزول

آیت ۶ کے تحت ہمارے مفسرین نے، اپنی عادت کے مطابق، ایک شانِ نزول کا بھی ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو تحصیلِ زکوٰۃ کے لیے بنی مصطلق کے پاس بھیجا۔ جب یہ وہاں پہنچے تو بنی مصطلق کے لوگ بشکلِ جلوس ان کے خیر مقدم کے لیے نکلے۔ ولید نے گمان کیا کہ یہ لوگ ان سے لڑنے کو نکلے ہیں۔ وہ ڈر کر فوراً وہاں سے واپس آ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ وہ لوگ مرتد ہو گئے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا۔[1] یہ خبر سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنی مصطلق پر نہایت برہم ہوئے اور ان کی سرکوبی کے لیے آپؐ نے ایک دستہ بھیج دیا یا بھیجنے کا فیصلہ فرما لیا کہ اتنے میں بنی مصطلق والوں کو اطلاع ہو گئی اور ان کے سردار نے فوراً مدینہ حاضر ہو کر بقید قسم حضورؐ کو اطمینان دلایا کہ ہم نے تو ولید کی شکل بھی نہیں دیکھی، زکوٰۃ روکنے کا کیا سوال؟ ان کی طرف سے صفائی کے بعد ان کا معاملہ تو رفع دفع ہو گیا لیکن ہمارے مفسرین کے نزدیک ولیدؓ کی اسی روایت کی بنا پر یہ آیت اتری اور مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ وہ کسی فاسق کی روایت پر اعتماد کر کے کوئی عاجلانہ قدم نہ اٹھایا کریں۔

ہمارے مفسرین کوئی نہ کوئی شانِ نزول تو تقریباً ہر آیت کے تحت درج کرتے ہیں، اوپر آیت اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ .... الآیۃ' کے تحت بھی انھوں نے ایک شانِ نزول کا حوالہ دیا ہے لیکن اس سے ہم نے اس وجہ سے تعرض نہیں کیا کہ بعض ناقدین نے اس پر جرح بھی کر دی ہے مگر اس شانِ نزول پر سب متفق ہیں اس وجہ سے اس سے تعرض ناگزیر ہے۔

شانِ نزول سے متعلق وہ اصولی حقیقت ہمیشہ مستحضر رکھیے جس کا ذکر ہم نے مقدمۂ تفسیر میں کیا ہے کہ سلف کسی آیت کے تحت اگر کسی واقعہ کا ذکر شانِ نزول کی حیثیت سے کرتے ہیں تو اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ بعینہٖ وہی واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب ہوا ہے بلکہ اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ آیت سے اس واقعہ کا حکم بھی مستنبط ہوتا ہے۔ یہ رائے اصولِ تفسیر

---

[1] بعض راویوں کا بیان ہے کہ ڈرے نہیں بلکہ ان کے دل میں پہلے سے بنی مصطلق کے خلاف رنجش تھی اسی وجہ سے ان سے ملے بغیر واپس آ گئے اور یہ بات بتائی کہ انھوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

کے ماہرین کی ہے اس وجہ سے میں نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی معلوم ہے کہ شانِ نزول سے متعلق روایات بیشتر ضعیف بلکہ بے بنیاد ہیں، اس وجہ سے ان کو عقل و نقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر مان لینے سے اسی فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے جس سے آیت زیر بحث میں اہلِ ایمان کو روکا گیا ہے۔

اس شانِ نزول کو درایت کی کسوٹی پہ جانچیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت میں فاسق کی روایت پر اعتماد کرنے سے روکا گیا ہے جب کہ ولیدؓ کے متعلق اس واقعے سے پہلے کوئی بات بھی ایسی لوگوں کے سامنے نہیں آئی تھی جس سے معلوم ہو سکتا کہ نعوذ باللہ وہ فاسق ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ ان کے فسق کی کوئی شہادت موجود نہیں تھی بلکہ ان کی ثقاہت و عدالت کا یہ مرتبہ تھا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تحصیل زکوٰۃ کے ذمہ دارانہ منصب پر مامور فرمایا۔ اگر ان کے اندر اس قسم کا کوئی کھوٹ ہوتا تو حضورؐ ان کو اس اہم خدمت کے لیے کس طرح منتخب فرماتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس شانِ نزول کو باور کر لیجیے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ سے اتنے ناواقف تھے کہ ایسے لوگوں کو ذمہ دارانہ مناصب پر مامور فرما دیتے تھے جو اپنی دروغ بافی سے حکومت اور رعایا دونوں کو خطرے میں ڈال دیں۔ اس قسم کی بے بصیرتی ایک عام معقول آدمی سے بھی بعید از قیاس ہے چہ جائیکہ اس کا صدور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر ولیدؓ استقبال کرنے والی پارٹی کو جنگجو پارٹی سمجھ کر اس سے ڈر کے واپس آ گئے تھے اور اپنا تاثر انھوں نے حضورؐ کے سامنے یہ بیان کیا کہ بنی مصطلق نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے تو ان کی یہ بات سادہ لوحی اور کمزوری کو قرار دی جا سکتی ہے لیکن از روئے شریعت اس کو فسق نہیں کہا جا سکتا۔ پھر تو اس مضمون کی آیت اترنی تھی کہ مسلمانو، تم اپنے ذمہ دارانہ عہدے ایسے سادہ لوحوں کے سپرد نہ کیا کرو جو استقبال کرنے والوں اور لڑنے والوں کے درمیان امتیاز کرنے سے بھی قاصر ہوں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ولیدؓ اتنے سادہ لوح ہوتے تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ایسی اہم مالی اور سیاسی ذمہ داری کا سپرد کر دیتے؟ کیا کسی شخص کے اندر سادہ لوحی کوئی ناگہانی طور پر پیدا ہو جانے والی چیز ہے جو لوگوں سے مخفی رہے یہاں تک کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا اندازہ نہ ہو سکے!

چوتھی بات یہ ہے کہ یہی ولیدؓ ہیں جن کو سیدنا عثمان غنیؓ نے اپنے دورِ خلافت میں کوفہ کا گورنر

بنایا۔ غور کیجیے کہ کیا حضرت عثمان غنیؓ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ یہ شخص از روئے نصِ قرآن فاسق قرار پا چکا ہے اور گورنری تو درکنار اسلامی قانون کی رو سے یہ کسی روایت یا شہادت کا بھی اہل نہیں ہے؟ اگر ناواقف تھے تو یہ ماننا ہے کہ حضرت عثمانؓ جیسے خلیفۂ راشد، جن کو جامع قرآن ہونے کا بھی شرف حاصل ہے، نعوذ باللہ، قرآن کا اتنا علم بھی نہیں رکھتے تھے جتنا علم شانِ نزول کی روایتیں کرنے والے ان راویوں کو تھا۔

میں نے اس شانِ نزول کے صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے، ورنہ اضطراب اس کے ہر پہلو میں ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تادیبی دستہ روانہ کر دیا تھا، بعض میں ہے کہ روانہ کرنے کا فیصلہ فرما لیا تھا اور بنی مصطلق کو الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر تم لوگ اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو میں تمھاری سرکوبی کے لیے ایسے شخص کو بھیجوں گا جو عندی کنفسی (جو میرے نزدیک میری اپنی ذات کی طرح ہے) ساتھ ہی حضرت علیؓ کے شانے پر تھپتھپاتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی کہ اس مہم کو یہ سر کریں گے۔ بعض روایات میں اس کے برخلاف یہ ہے کہ اس مہم پر آپ نے حضرت خالدؓ کو بھیجا۔ غرض جتنے منہ ہیں اتنی ہی باتیں ہیں، حالانکہ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح کی کوئی بات آئی بھی تو آپ نے ٹال دی اور لوگوں کو تنبیہ کر دی گئی کہ وہ پیغمبر کو اپنی رایوں سے متاثر کرنے کی کوشش نہ کریں۔

میرے نزدیک یہ شانِ نزول روافض کی ایجادات میں سے ہے جس سے انھوں نے صرف ولیدؓ ہی کو بدنام کرنا نہیں چاہا ہے بلکہ حضرت عثمانؓ کو بھی مطعون کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے یہ جانتے بوجھتے کہ یہ شخص فاسق ہے محض از راہِ کنبہ پروری[1] اس کو کوفہ کا گورنر بنا دیا۔ پھر کوفہ کی گورنری کے دوران میں ان ظالموں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا بلکہ ان کے فسق کے ایسے واقعات کی روایت کی ہے جن کو سن کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ ہنسی ان ظالموں کی ذہانت پر آتی ہے اور رونا اپنے مفسرین کی سادگی پر کہ اس قسم کی بے سروپا روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل کر دیتے ہیں حالانکہ آیت کے الفاظ اور اس کے سیاق و سباق سے ان کو کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۚ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (۹)

---

[1] یہ امر واضح رہے کہ حضرت ولیدؓ سیدنا عثمان غنیؓ کے رشتہ دار بھی تھے۔

اگر مسلمانوں کے دو گروہ باہم تصادم ہو جائیں تو دوسرے مسلمانوں کی ذمہ داری

اوپر کی آیت میں اس بات کی ممانعت فرمائی گئی ہے کہ کسی فاسق کی روایت پر اعتماد کر کے مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف کوئی اقدام کر بیٹھیں۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کے دو گروہ اگر آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمانوں یا ان کی حکومت کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ ان کے درمیان اصلاحِ احوال کی کوشش کرو۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک پارٹی مصالحت پر آمادہ نہ ہو یا مصالحت کے بعد مصالحت کے شرائط کے خلاف دوسری پارٹی پر تعدی کرے تو اس صورت میں دوسرے مسلمانوں یا ان کی حکومت کو تعدی کرنے والی پارٹی سے جنگ کرنی چاہیے یہاں تک کہ وہ حق کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جائے۔

'تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ' سے مراد اس فیصلہ کے آگے جھکنا ہے جو مصالحت کرانے والوں نے فریقین کے سامنے رکھا ہے۔ اگر کوئی پارٹی اس مصالحت سے گریز اختیار کر رہی ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھکنے سے گریز اختیار کر رہی ہے۔ اس لیے کہ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسی بات کا حکم دیا ہے اور جب اللہ نے اس کا حکم دیا ہے تو اس کی حیثیت 'أَمْرُ اللَّهِ' کی ہے۔

'فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا' یعنی مسلمانوں کے اس اجتماعی ایکشن کے بعد اگر وہ فیصلہ کے آگے سر جھکا دے تو اس بنیاد پر اس کے خلاف کوئی مزید کارروائی نہیں کی جائے گی کہ اس نے سرکشی کی روش اختیار کی، بلکہ فریقین کے درمیان انصاف کے تقاضوں کے مطابق صلح کرا دی جائے گی جس فریق کا نقصان ہوا ہے اس کی تلافی ٹھیک ٹھیک کرا دی جائے گی۔

لفظ 'أَقْسِطُوا' اسی عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ کسی کے ساتھ بے جا رعایت کی جائے نہ کسی کو انصاف کے خلاف دبایا جائے بلکہ بے رُو رعایت جو کچھ عدل کا تقاضا ہے وہ پورا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

چند اجتماعی اصول جو آیت سے نکلتے ہیں

اس آیت سے مندرجہ ذیل اجتماعی اصول نکلتے ہیں۔

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمان اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر نہ تو اس سے بالکل الگ تھلگ رہیں اور نہ ان کے لیے یہ جائز ہے کہ بغیر اس بات کی تحقیق کیے کہ کون حق پر ہے کون ناحق پر، محض خاندانی، قبائلی اور گروہی عصبیت کے جوش میں کسی کے ساتھی اور کسی کے مخالف بن جائیں بلکہ انھیں ساری صورتِ معاملہ سمجھ کر فریقین کے درمیان مصالحت کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر ایک فریق مصالحت پر راضی نہ ہو بلکہ جنگ ہی پر ضد کرے یا مصالحت کے لیے من مانے طور پر ایسی شرطیں پیش کرے جو عدل کے منافی ہوں تو اس صورت میں مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس کے خلاف طاقت استعمال کر کے اس کو مصالحت کے شرائط کے آگے جھکنے پر مجبور کریں۔

اس طرح کی نزاعات میں غیر جانبدار مسلمان اللہ و رسول کی ہدایات اور عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کے مصالحت کے لیے جو شرطیں طے کریں گے فریقین پر ان کی اطاعت اسی طرح لازمی ہوگی جس طرح شریعت کے احکام کی اطاعت لازمی ہے، یہاں تک کہ جو فریق اس سے انحراف اختیار کرے گا اس سے جنگ کی جائے گی۔

مصالحت ہو جانے کے بعد اس کی شرائط کے خلاف اگر کوئی فریق دوسرے فریق پر تعدی کرے گا تو وہ تعدی کرنے والا قرار پائے گا۔ مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ اس کی سرکوبی کریں۔

موجودہ زمانے کی ایک شکل

یہ امر واضح رہے کہ یہ ہدایات اس صورت حال کے لیے دی گئی ہیں جب نزاع مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان واقع ہو اور ان کی ایک مرکزی طاقت فریقین کے درمیان مداخلت کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ اس زمانے میں یہ پیچیدہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ بہت سی چھوٹی بڑی مسلمان حکومتیں الگ الگ "قائم" ہو گئی ہیں۔ ان کے درمیان اگر خدانخواستہ کوئی جنگ چھڑ جائے تو دوسری مسلمان حکومتوں کے لیے اس قضیہ سے بالکل الگ تھلگ رہنا تو جائز نہیں ہے، مصالحت کی کوشش، جس کا آیت میں حکم دیا گیا ہے، ہر ایک کو کرنی ہوگی البتہ عملاً مداخلت کا معاملہ صورتِ حال پر منحصر ہے۔ جس کا تعلق وقت کے سیاسی تقاضوں سے ہے۔ اگر صورتِ حال اجازت دے گی تو تعدی کرنے والے فریق کو حق کے آگے جھکانے کے لیے اس کے خلاف طاقت استعمال کرنا بالکل جائز ہوگا اور اگر اس سے مزید بین الملّی یا بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو عملی مداخلت سے تو گریز اختیار کیا جائے گا لیکن مصالحت کی جدوجہد سے گریز کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۱۰)

یعنی مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کے درمیان کسی نزاع کا برپا ہونا ہی اول تو ان کی باہمی اخوت کے منافی ہے لیکن شیطان کی انگیخت سے کوئی نزاع برپا ہو ہی جائے تو دوسرے مسلمانوں کو ان کے درمیان مصالحت کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ اس آگ کو مزید بھڑکانے کی۔

'وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ' یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اگر تمہارے ہاتھوں کوئی ایسا کام ہوا جو بھائیوں اور بھائیوں کے درمیان قتل و خون کا سبب ہوا یا تم محض قومی، قبائلی، علاقائی یا سیاسی

مصلحتوں کی خاطر کسی پہلو سے اس خون خرابے میں حصہ لینے والے بنے تو یاد رکھو کہ اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکو گے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق وہی ٹھہریں گے جو اس کی قائم کی ہوئی اس اخوت کو ہمیشہ استوار و پائدار رکھنے کی کوشش کریں گے، نہ خود اس میں کوئی رخنہ پیدا کریں گے نہ اپنے امکان کی حد تک کسی کو اس میں کوئی رخنہ پیدا کرنے کا موقع دیں گے۔

بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ میں مثنیٰ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ جنگ دو بھائیوں ہی کے درمیان ہو، بلکہ یہ مثنیٰ مسلمانوں کے دو گروہوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثنیٰ کا اس طرح استعمال عربی میں معروف ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

۲۔ قرآن میں جرح و تعدیل کا ماخذ

ہمارے محدثین اور فنِ رجال کے ائمہ نے سورۂ حجرات کی اسی آیت ـــــ اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا ـــــ کو ماخذ قرار دیا ہے راویوں پر جرح و تنقید کے علم کا جس کی بدولت اسماء الرجال کا عظیم الشان فن وجود میں آیا جو ان علوم میں سے ایک ہے جن کے بانی ہونے کا شرف دنیا میں سب سے پہلے مسلمانوں کو حاصل ہوا۔

آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جب کوئی فاسق کسی اہم واقعے کی خبر دے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ یہ حکم یوں تو عام ہے، ہر ایسی خبر کی تحقیق ضروری ہے جو دُور رس نتائج کی حامل ہو لیکن کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر کے کوئی روایت کرے تو اس کی تحقیق و تنقید بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور واجب الاطاعت ہادی ہیں۔ آپ کی ہر بات بلکہ ہر ادا امت کے لیے اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے منسوب کر کے کوئی غلط روایت کر دی جائے اور وہ تحقیق کے بغیر قبول کر لی جائے تو یہ چیز دنیا میں بھی موجبِ خسران بن سکتی ہے اور آخرت میں بھی۔

آیت میں اگرچہ فاسق ہی کی روایت کی تحقیق کا حکم ہے لیکن اس سے آپ سے آپ یہ بات بھی نکلی کہ اگر کوئی راوی مجہول ہو، نہ اس کا فسق معلوم ہو نہ اس کی ثقاہت، تو اس کی تحقیق بھی ضروری ہو گی، کیونکہ ایک مجہول راوی کی روایت قبول کر لینے میں اندیشہ ہے کہ ممکن ہے راوی فاسق ہو۔ چنانچہ محدثین نے مجہول راویوں کی بھی اچھی طرح تحقیق کی تاکہ ان کا فسق یا ان کی عدالت واضح ہو جائے۔ اگر کسی راوی کی تحقیق میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی تو اس کو مجہول قرار دے کر اس کی روایت انھوں نے رد کر دی۔

آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ یہ تحقیق اسی صورت میں ضروری ہوگی جب فاسق کوئی ایسی روایت کرے جو دُور رس نتائج کی حامل ہو، اس لیے کہ یہاں لفظ 'نبأ' وارد ہوا ہے جو کسی اہم اور دُور رس نتائج کی حامل خبر ہی کے لیے آتا ہے۔ عام خبر یا واقعہ کے لیے یہ لفظ نہیں آتا۔ چنانچہ روزمرہ زندگی کے عام معاملات میں فاسق یا کافر کی خبر مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

آیت میں راوی اور روایت دونوں کی تحقیق کا حکم دیا گیا ہے اس لیے کہ فرمایا گیا ہے کہ 'اے ایمان والو، اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو'۔ ظاہر ہے کہ یہاں 'تَبَیَّنُوْا' کا مفعول راوی بھی ہے اور روایت بھی بلکہ روایت کا مفعول ہونا زیادہ واضح ہے اس لیے کہ راوی کا فسق تو یہاں معلوم ہی ہے۔ کسی روایت کی تحقیق میں جس طرح راوی کی ثقاہت، عدالت اور فقاہت اہمیت رکھتی ہے اسی طرح خود روایت کے الفاظ، اس کا موقع و محل، دوسری روایاتِ باب کے ساتھ اس کی مخالفت یا موافقت، عقل و نقل کی کسوٹی پر اس کا مرتبہ اور سب سے زیادہ خدا کی کتاب کے ساتھ اس کی ہم آہنگی اور اس قبیل کی دوسری چیزیں بھی اس سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر صرف راوی کی تحقیق پر کفایت کر کے یہ چیزیں نظر انداز کر دی جائیں تو تحقیق کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ ہمارے محدثین زیادہ زور صرف راوی کی تحقیق پر صرف کرتے ہیں، نفسِ متن پر ان پہلوؤں سے غور کرنے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے حالانکہ ان پہلوؤں سے تحقیق کیے بغیر تحقیق کا حق، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ہرگز ادا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقہاء نے متنِ حدیث پر غور کرنے کے لیے اصول وضع کیے اور اس کا نام درایت رکھا۔ اس خدمتِ خاص میں سب سے بڑا حصہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ یہ خدمت انجام دے کر انھوں نے صرف فقہ ہی پر احسان نہیں کیا ہے، بلکہ فنِ حدیث کی بھی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، اگر ہمارے علماء ان اصولوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی توفیق پاتے تو حدیث کے خلاف وہ فتنہ ہرگز نہ اٹھ سکتا جو فتنہ پردازوں نے اٹھا دیا اور جس نے گمراہ فرقوں کے لیے دین میں دراندازی کی بہت سی راہیں کھول دیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے 'تدبرِ حدیث' پر اپنی پیش نظر کتاب لکھنے کی توفیق اور مہلت بخشی تو اس کے مقدمہ میں انشاء اللہ ان اصولوں کی قدر و قیمت میں واضح کروں گا۔

اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہمارے محدثین کرام نے فاسق اور مجہول راویوں کی جو پردہ دری کی ہے وہ قرآن کے اسی واضح اور قطعی حکم کی تعمیل میں کی ہے لیکن اس زمانے میں بعض خوش فہم حضرات نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ راویوں کے عیوب کھولنا ہے تو غیبت جس کو قرآن نے اسی سورہ کی آیت ۱۲ میں حرام قرار دیا اور اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے

تعبیر فرمایا ہے لیکن محدثین نے 'حکمتِ عملی' کے تحت اس حرام کو جائز بنایا تاکہ فاسق راویوں کی روایات سے دین کو بچائیں۔ پھر اس نکتہ سے ان حضرات نے ایک اور اس سے بھی زیادہ عمیق و دقیق نکتہ پیدا کر لیا کہ شریعت کی تمام حرمتیں ابدی نہیں ہیں اس وجہ سے ایک 'قائد تحریک اسلامی' کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ 'حکمتِ عملی' کے تقاضوں کے تحت جب ضرورت محسوس کرے کسی حرمت کو حلت سے بدل دیا کرے۔ ان نکات پر اپنے ناچیز خیالات ہم اپنے مقالات میں ظاہر کر چکے ہیں۔ یہاں ان پر تنقید کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ بس اتنی بات یاد رکھیے کہ جب قرآن نے فاسق اور مجہول راویوں کی پردہ دری اور ان کی روایات کی تحقیق کا حکم خود اس صراحت کے ساتھ دیا ہے تو محدثین اس خدمت کے لیے غیبت جیسی ناپاک چیز کو 'حکمتِ عملی' کے تحت جائز بنانے کی زحمت کیوں اٹھاتے۔

یہ بات بھی یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ راویوں پر جرح کو غیبت قرار دینے کا سہرا ہمارے ارباب تصوف کے سر ہے۔ تصوف کی ساری عمارت، چونکہ ضعیف اور بے بنیاد روایات ہی پر قائم ہے، اس وجہ سے جب محدثین نے راویوں کی چھان بین کا کام شروع کیا تو ان حضرات کو محسوس ہوا کہ اگر محدثین اسی بے خوفی کے ساتھ یہ کام کرتے رہے تو تصوف کی پوری عمارت زمین پر آ رہے گی۔ اس خطرے سے تصوف کو بچانے کے لیے ان حضرات نے یہ نکتہ نکالا کہ یہ محدث حضرات لوگوں کی غیبت کرتے پھرتے ہیں۔ صوفیوں کا یہ نکتہ ان کے اپنے حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ ان کے اسی نکتہ کو ہمارے اس دور کے بعض ذہنوں نے اپنی 'حکمتِ عملی' کے لیے اپنا لیا اور اس کے بل پر ایک ایسا اصول وضع کر دیا جو سارے دین ہی کا تیا پانچا کر کے رکھ دے۔

آخر میں اس آیت سے متعلق ایک بات اور یاد رکھیے۔ بعض محدثین اور فقہاء فاسق کی روایت قبول کرنے کے باب میں اس کے فسق عملی کو تو اہمیت دیتے ہیں لیکن اس کے عقائدی فسق کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی شخص اگر کسی عملی فسق مثلاً جھوٹ اور بدکرداری وغیرہ میں مبتلا ہو تو اس کی روایت یا شہادت تو بے شک قبول نہیں کی جائے گی، لیکن اگر وہ صرف کسی فاسقانہ عقیدہ میں مبتلا ہے تو مجرد اس کے فسادِ عقیدہ کی بنا پر اس کی روایت یا شہادت رد نہیں کی جائے گی۔ ہمارے نزدیک یہ رائے بالکل غلط ہے۔ تجربہ گواہ ہے کہ جتنی جھوٹی روایتیں فسادِ عقیدہ میں مبتلا راویوں نے گھڑی ہیں اتنی فسادِ عمل میں مبتلا راویوں نے نہیں گھڑی ہیں۔ یہ انہی کی گھڑی ہوئی روایتیں ہیں جو سیرت، تفسیر، تصوف اور تاریخ کی کتابوں میں بھری ہوئی ہیں اور جن سے اہلِ بدعت وضلالت نے اپنی دکانیں سجائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان علماء پر رحم فرمائے جنھوں نے فاسد العقیدہ راویوں کو یہ چھوٹ دے کر ملت کو ایک ایسے فتنہ سے دوچار کر دیا جس

سے اہلِ حق کے لیے عہدہ برآ ہونا نہایت دشوار کام ہوگیا ہے۔

ہمارے نزدیک فسقِ عملی و فسقِ عقائدی کی یہ تقسیم بے معنی ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اوپر جو کلیہ عام فاسقوں کے بارے میں بیان ہوا ہے وہی فاسد العقیدہ راویوں کے بارے میں بھی عقل و نقل کے موافق ہے یعنی ان کی روایت اور شہادت ان امور میں تو قبول کی جائے گی جن میں ایک کافر کی روایت بھی قبول کی جا سکتی ہے، لیکن اہم امور بالخصوص معاملاتِ دین میں ان کی روایت یا شہادت قبول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ آگے آیات ۱۱—۱۳ کا مضمون

اوپر آیت ۷ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اہتمامِ خاص کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے مسلمانوں کو کفر و فسق اور عصیان سے بچانے کے لیے خاص اپنے فضل سے فرمایا۔ اب آگے بعض ان باتوں سے روکا گیا ہے جو ایمان کے منافی اور داخلِ فسق ہیں اور جن سے دلوں کے اندر اس فساد کی تخم ریزی ہوتی ہے جو پورے معاشرے کو مسموم کر کے رکھ دیتا ہے اور جس کا سدِّباب نہ ہو تو جن کو اللہ تعالیٰ نے رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کے وصف سے ممتاز فرمایا ہے وہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱-۱۲ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُوا۟
خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيْرًا
مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا۟ بِٱلْأَلْقَٰبِ ۖ بِئْسَ
ٱلِٱسْمُ ٱلْفُسُوقُ بَعْدَ ٱلْإِيمَٰنِ ۚ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُو۟لَٰٓئِكَ
هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿١١﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱجْتَنِبُوا۟ كَثِيرًا مِّنَ
ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُوا۟ وَلَا يَغْتَب
بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ
مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿١٣﴾

ترجمۂ آیات: ۱۱-۱۳ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نہ مردوں کی کوئی جماعت دوسرے مردوں کا مذاق اڑائے، ممکن ہے وہ ان سے بہتر ٹھہریں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، کیا عجب وہ ان سے بہتر نکلیں۔ اور نہ اپنوں کو عیب لگاؤ۔ اور نہ آپس میں ایک دوسرے پر بُرے القاب چسپاں کرو۔ ایمان کے بعد فسق کا تو نام بھی بُرا ہے! اور جو لوگ توبہ نہ کریں گے تو وہی لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔ ۱۱

اے ایمان لانے والو، بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں اور ٹوہ میں نہ لگو اور نہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے! سو اس چیز کو تو تم نے ناگوار جانا! اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا، مہربان ہے۔ ۱۲

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی نر اور ناری سے پیدا کیا ہے اور تم کو کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے کہ تم باہمدگر تعارف حاصل کرو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ اشرف وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ بڑا ہی علیم و خبیر ہے۔ ۱۳

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۱)

منافیٔ ایمان باتوں سے اجتناب کی تاکید

'یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' کا خطاب یہاں صرف خطاب ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ آگے وہ برائیاں بیان ہو رہی ہیں جو داخلِ فسق اور منافیٔ ایمان ہیں۔ اس خطاب سے اہلِ ایمان کو گویا اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جو لوگ ایمان سے مشرف ہو چکے ہیں ان کے لیے زیبا نہیں کہ وہ ایمان کے بعد فسق کے داغ دھبوں سے اپنے دامن کو آلودہ کریں۔

فرمایا کہ ایمان میں داخل ہو جانے کے بعد نہ مردوں کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ دوسرے مردوں کو حقیر خیال کر کے ان کا مذاق اڑائیں نہ عورتوں کے لیے جائز ہے کہ وہ دوسری عورتوں کو تمسخر کا نشانہ بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرافت و رذالت کا انحصار آدمی کے ایمان و عمل پر ہے اور ایمان و عمل کا صحیح وزن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی میزانِ عدل سے معلوم ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھ رہا ہو لیکن قیامت کے دن کھلے گا کہ خدا کی میزان میں اس کا وزن پرِکاہ کے برابر بھی نہیں ہے۔ اسی طرح امکان اس کا بھی ہے کہ جس کو اہلِ دنیا نے کبھی اپنی آنکھوں میں جگہ نہیں دی قیامت کے دن پتہ چلے کہ خدا کی بادشاہی میں جو مقام اس کا ہے وہ ان لوگوں کا نہیں ہے جنھوں نے اس کو حقیر جانا۔

یہاں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا ذکر بھی خاص اہتمام سے ہوا ہے حالانکہ بظاہر اس کی ضرورت نہیں تھی۔ 'لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ' کے عام الفاظ ان کے لیے بھی کافی تھے۔ لیکن قرآن نے فضائل و رذائل دونوں کے بیان میں یہ اسلوب ملحوظ رکھا ہے کہ عورتوں کا ذکر ان مواقع میں خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے جہاں تاکید کے ساتھ ان کو کسی فضیلت کے لیے ابھارنا یا کسی فتنہ سے بچانا مقصود ہے۔ یہاں یہی دوسری صورت ہے۔ جس برائی سے یہاں مردوں کو روکا گیا ہے وہ عورتوں کے اندر اس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں پائی جاتی جتنی مردوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ جن عورتوں کے اندر اپنی خاندانی، نسبی اور مالی برتری یا اپنے ظاہری حسن و جمال کا غرور ہوتا ہے ان کا اندازِ خطاب و کلام ان عورتوں کے ساتھ حقارت آمیز ہوتا ہے جن کو وہ اپنے مقابل میں فروتر خیال کرتی ہیں۔

یہاں جن باتوں سے روکا گیا ہے ان کا ایک خاص باطن ہے اور مقصود درحقیقت اسی کی بیخ کنی ہے۔ پیرے کی آخری آیت میں اس باطن کی طرف اشارہ ہے۔ شیطان نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے جو فتنے ایجاد کیے ہیں ان میں ایک بہت بڑا فتنہ نسل و نسب، خاندان، برادری، کنبہ اور قبیلہ کے شرف و امتیاز کا فتنہ بھی ہے۔ جو لوگ اس فتنہ میں مبتلا ہوتے ہیں (اور بہت کم ایسے خوش قسمت نکلتے ہیں جو اپنے کو اس فتنہ سے محفوظ رکھ سکیں) ظاہر ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے مقابل میں حقیر خیال کرتے ہیں اور جب حقیر خیال کرتے ہیں تو لازماً ان کے قول، فعل اور رویہ سے اس کا اظہار بھی ہوتا ہے یہاں تک کہ یہ چیزیں پختہ ہو کر ان کے ہاں روایت کی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں بلکہ ان کا بس چلتا ہے تو وہ ان کو مذہب کا درجہ بھی دے دیتے ہیں۔ چنانچہ ہندوؤں میں برہمنوں نے، یہود میں بنی لاوی نے اور عربوں میں قریش نے اسی طرح تقدس کا ایک ایسا مقام اپنے لیے پیدا کر لیا جس کو چیلنج کرنا دوسروں کے لیے ممکن نہیں رہ گیا۔ یہی حال ہر قوم کا ہوا ہے اور مساواتِ انسانی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود آج بھی یہی ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان جو اس فتنہ کی بیخ کنی کے لیے برپا کیے گئے تھے وہ بھی آج نہ جانے کتنی برادریوں، قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہیں اور ہر ایک ہم چو من دیگرے نیست کے نشہ سے سرشار ہے۔ جس کا اظہار ہر قوم و قبیلہ کے عوام و خواص کے بیانات اور نعروں سے ہوتا رہتا ہے جس سے فطری طور پر دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و کدورت پیدا ہوتی ہے جو عداوت و بغضاء کی شکل اختیار کر کے بالآخر خون خرابے اور تقسیم و تفریق تک نوبت پہنچا دیتی ہے۔

یہاں قرآن نے مسلمانوں کو اسی آفت سے محفوظ رہنے کی ہدایت فرمائی کہ تم کو اللہ نے اپنے فضل سے جاہلیت کی تاریکی سے نکال کر ایمان کی روشنی بخشی ہے۔ تمہارا معاشرہ 'اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ' کی اساس پر قائم ہے اور تم آپس میں ایک دوسرے کے لیے 'رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ' بنائے گئے ہو تو اپنے دوسرے بھائیوں کو حقیر سمجھ کر یا ان کو اپنے طنزیہ اور حقارت آمیز الفاظ کا ہدف بنا کر اس معاشرہ کا حلیہ مسخ کرنے کی کوشش نہ کرو۔

'عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْہُمْ' یہ اس اصل حکمت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اس بات میں صحیح رہنمائی دینے والی ہے کہ عزت و شرف کی بنیاد نسل، نسب، خاندان، برادری، قوم، قبیلہ اور مال و دولت پر نہیں بلکہ آدمی کے دین و تقویٰ پر ہے اور اس بات کا فیصلہ کل کو قیامت کے دن ہوگا کہ کس کا تقویٰ زیادہ ہے اور وہ اللہ کے نزدیک اشرف و اعلیٰ ہے اور کون اپنے تمام ادعائے حسب و نسب اور غرورِ عز و شرف کے باوجود خدا کے نزدیک بالکل بے وزن اور بے حقیقت ہے۔

طنز اور پھبتی کی ممانعت

'وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'۔ 'لمز' کے معنی کسی پر طعن کرنا، آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے اس پر کوئی طنز آمیز فقرہ چست کر دینا ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ آیت ۹۰ میں منافقین کے بارے میں فرمایا ہے کہ 'اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ' یعنی جب غریب مسلمان اپنی گاڑھی کمائی میں سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو منافقین ان کی حوصلہ شکنی کے لیے ان پر باندازِ استخفاف طنزیہ فقرے چست کرتے ہیں کہ لو، آج حاتم کی قبر پر لات مارنے یہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس قسم کے زہر آلود فقرے قائل کے حسد کی بھی غمازی کرتے ہیں اور اس کے کبر و غرور کی بھی، اور ان کا اثر دوسروں پر یا تو حوصلہ شکنی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یا نفرت و عناد کی صورت میں اور یہ دونوں ہی چیزیں معاشرے کے اندر زہر پھیلانے والی ہیں۔

'اَنْفُسَكُمْ' یہاں اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح النسآء کی آیت ۲۹ میں 'لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ' (اپنے آپ کو قتل نہ کرو) آیا ہے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان پر طعن کرتا ہے وہ گویا اپنے ہی اوپر طعن کرتا ہے اس لیے کہ تمام مسلمان آپس میں 'اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ' کے اصول پر بھائی بھائی ہیں تو جس نے اپنے کسی بھائی کو اپنے کسی طعن و طنز کا ہدف بنایا اس نے گویا اپنے ہی سینہ کو اپنے تیر کا نشانہ بنایا اور اپنے ہی کو مجروح کیا۔

'وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ'۔ 'تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ' کے معنی آپس میں ایک دوسرے پر برے القاب چسپاں کرنا ہے۔ اچھے القاب سے ملقّب کرنا جس طرح کسی فرد یا قوم کی عزت افزائی ہے اسی طرح برے القاب کسی پر چسپاں کرنا اس کی انتہائی توہین و تذلیل ہے۔ ہجویہ القاب لوگوں کی زبانوں پر آسانی سے چڑھ جاتے ہیں اور ان کا اثر نہایت دُور رس اور نہایت پائدار ہوتا ہے۔ ان کی پیدا کی ہوئی تلخیاں پشت ہا پشت تک باقی رہتی ہیں اور اگر معاشرے میں یہ ذوق اتنا ترقی کر جائے کہ ہر گروہ کے شاعر، ادیب، ایڈیٹر اور لیڈر اپنی ذہانت اپنے حریفوں کے لیے برے القاب ایجاد کرنے میں لگا دیں تو پھر اس قوم کی خیر نہیں ہے۔ اس کی وحدت لازماً پارہ پارہ ہو کے رہتی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ دورِ جاہلیت میں عربوں کے اندر یہ ذوق بدرجۂ کمال ترقی پر تھا۔ قبیلہ کا سب سے بڑا شاعر اور خطیب وہی مانا جاتا جو دوسروں کے مقابل میں اپنے قبیلہ کے مفاخر بیان کرنے اور حریفوں کی ہجو و تحقیر میں یکتا ہو۔ ان کے ہجویہ اشعار پڑھیے تو کچھ اندازہ ہوگا کہ اس فنِ شریف میں انھوں نے کتنا نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان کی اس چیز نے ان کو کبھی ایک قوم بننے نہیں دیا۔ وہ برابر اپنوں ہی کو گرانے اور پچھاڑنے میں لگے رہے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام نے ان کو انسانی وحدت اور ایمانی ہم آہنگی سے آشنا کیا جس کی بدولت وہ دنیا کی ہدایت و قیادت کے اہل بنے۔ قرآن نے یہاں ان کو دورِ جاہلیت کے انہی فتنوں سے آگاہ کیا

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایمان و اسلام کی برکات سے نوازا ہے تو اس کی قدر کرو، شیطان کے ورغلانے سے پھر انہی لاف زنیوں اور خاک بازیوں میں نہ مبتلا ہو جاتا جن سے اللہ نے تمھیں بچایا ہے۔

'بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ'۔ 'بِئْسَ' اور 'نِعْمَ' کے اندر فی الجملہ مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس کا ٹھیک معنی خیز ترجمہ یہ ہو گا کہ 'نہایت ہی برا لفظ ہے فسق ایمان کے بعد'۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جس طرح کہیں 'اشریہ کا سبہ' شریہ کا تو لفظ بھی برا ہے پھر شریہ کے بیسے ہونے کا کیا ٹھکانا ہے! ہماری زبان میں بھی کسی شے کی انتہائی برائی کے اظہار کے لیے یہ اسلوب موجود ہے۔ مثلاً کہتے ہیں 'بھائی' اس چیز کے تو نام سے بھی گھن آتی ہے'۔

'بَعْدَ الْاِیْمَانِ' کے اضافہ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اگر تم ایمان سے آشنا نہ ہوتے ہوتے اور تم سے کوئی بات فسق کے قسم کی صادر ہو جاتی تو یہ چیز زیادہ تعجب انگیز نہ ہوتی لیکن جب تمھیں اللہ نے ایمان کی حلاوت سے آشنا کر دیا، جیسا کہ فرمایا ہے 'وَکَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ' تو اب تو تمھیں 'فسق' کے نام سے بھی گھن محسوس کرنی چاہیے چہ جائیکہ تم سے کسی عمل فسق کا صدور ہو!

اس ٹکڑے سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اوپر جن چیزوں سے روکا گیا ہے یہ سب فسق میں داخل ہیں اور اہل ایمان کی حس ایمانی اتنی بیدار رہنی چاہیے کہ ارتکاب فسق تو درکنار لفظ فسق سے بھی وہ نفور و بیزار رہیں۔

'وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ' یہ نہایت سخت الفاظ میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو اس وضاحت کے بعد بھی اس قسم کے کسی فسق کے مرتکب ہوں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ ان باتوں سے توبہ نہیں کریں گے وہ یاد رکھیں کہ ظالم وہی ٹھہریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے سامنے ایمان کی برکتیں بھی واضح کر دی ہیں اور ان کو کفر و فسق کے نتائج سے بھی اچھی طرح آگاہ کر دیا ہے۔ اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد بھی جو لوگ اپنی روش سے باز نہیں آئیں گے وہ اس کے نتائج سے لازماً دوچار ہوں گے اور یہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہو گا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ط اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ ط وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ (۱۲)

یہ اہل ایمان کو از سر نو خطاب کر کے بعض ایسی باتوں سے روکا گیا ہے جو بظاہر تو معمولی نظر

بعض معاشرتی برائیوں سے اجتناب کی ہدایت

آتی ہیں لیکن یہ انسان کے خود اپنے دل کو ایسے روگ میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ وہ تقویٰ کی روئیدگی کے لیے بالکل ناساز گار ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے جن کو ایمان عزیز ہو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان آفتوں سے اپنے کو محفوظ رکھیں۔

بدگمانی

پہلی بات یہ ارشاد ہوئی کہ انسان اپنے دل کو دوسروں سے متعلق بدگمانیوں کی پرورش گاہ نہ بنالے کہ جس کی نسبت جو برا گمان بھی دل میں پیدا ہو جائے اس کو کسی گوشے میں محفوظ کرے۔ انسان کو جن سے زندگی میں واسطہ پڑتا ہے ان کی بابت کوئی اچھا یا برا گمان دل میں پیدا ہونا ایک امر فطری ہے۔ یہی گمان آدمی کو آدمی سے جوڑتا یا توڑتا ہے۔ اس پہلو سے معاشرے میں یہ وصل و فصل کی بنیاد ہے۔ اس کی اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ آدمی اس کے رد و قبول کے معاملے میں بھی بے پروا و سہل انگار نہ ہو بلکہ نہایت ہوشیار اور بیدار مغز رہے۔ اہل ایمان کو اسلام نے اس باب میں یہ رہنمائی دی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے بارے میں ہمیشہ نیک گمان رکھے اِلّا آنکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اس نیک گمان کا سزاوار نہیں ہے۔ یہ نیک گمانی اس ایمانی اخوت کا لازمی تقاضا ہے جس پر اسلام نے معاشرے کی بنیاد رکھی ہے اور جس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

اگر کوئی شخص اس کے برعکس یہ اصول ٹھیرا لے کہ جو رطب و یابس گمان اس کے دل میں پیدا ہوتے جائیں ان سب کو سینت کے رکھتا جائے تو گمانوں کے ایسے شوقین کی مثال اس شکاری کی ہے جو مچھلیاں پکڑنے کے شوق میں ایسا اندھا ہو جائے کہ مچھلیاں پکڑتے پکڑتے سانپ بھی پکڑ لے۔ ظاہر ہے کہ مچھلیوں کے شوق میں جو شخص ایسا اندھا بن جائے گا اندیشہ ہے کہ اسی شوق میں کسی دن وہ اپنی زندگی ہی گنوا بیٹھے گا۔ قرآن نے یہاں اسی خطرے سے مسلمانوں کو روکا ہے کہ گمانوں کے زیادہ درپے نہ ہو کیونکہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں جو انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں۔ اس سے یہ تعلیم نکلی کہ ایک مومن کو بدگمانیوں کا مریض نہیں بن جانا چاہیے بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں سے حسن ظن رکھنا چاہیے۔ اگر کسی سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو بدگمانی پیدا کرنے والی ہو تو حتی الامکان اس کی اچھی توجیہ کرے اگر کوئی اچھی توجیہ نکل سکتی ہو۔ اس کے برے پہلو کو اسی شکل میں اختیار کرنا جائز ہے جب اس کی کوئی اچھی توجیہ نہ نکل سکے۔ اگر بدگمانی کے سزاوار سے آدمی کو خوش گمانی ہو تو یہ اس بات کے مقابل میں اہون ہے کہ وہ کسی خوش گمانی کے حقدار سے بدگمانی رکھے۔ حدیث شریف میں مومن کی تعریف یہ آئی ہے کہ اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِيْمٌ (مومن بھولا بھالا شریف ہوتا ہے)۔

اس زمانہ میں لوگوں کا عام پسندیدہ اصول یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھو اِلّا آنکہ وہ ثابت کر دے کہ وہ اپنے گوں کا آدمی ہے۔ اس چیز کو لوگ سیاست اور زیرکی خیال کرتے ہیں۔ دشمن کے مقابل میں تو یہ زیرکی و ہوشیاری ضروری ہے۔ 'اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ' کے تحت ہم اس کی وضاحت کر چکے

ہیں لیکن اہلِ ایمان کے مقابل میں یہ سیاست کس طرح صحیح ہو سکتی ہے جب کہ ان کو اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اور رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ہونے کی قرآن نے ہدایت فرمائی ہے؟

تجسس

دوسری بات آیت میں یہ فرمائی گئی ہے کہ وَلَا تَجَسَّسُوْا (ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ لگو)۔ جس طرح اوپر والے ٹکڑے میں اچھے گمان سے نہیں بلکہ برے گمان سے روکا گیا ہے اسی طرح یہاں ممانعت اس ٹوہ میں لگنے کی ہے جو بُرے مقصد سے ہو۔ یعنی تلاش اس بات کی ہو کہ دوسرے کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق کوئی بات ہاتھ آئے جس سے اس کی خامیوں سے آگاہی اور اس کے اندرونِ خانہ کے اسرار تک رسائی ہو۔ یہ چیز کبھی تو حسد کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے کہ حریف کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو سامنے آئے جس سے کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ کبھی بغض و عناد کی شدت اس کا باعث ہوتی ہے کہ کوئی ایسی بات ہاتھ لگے جس کی عند الضرورت تشہیر کر کے مخالف کو رُسوا کیا جا سکے۔ اس زمانے میں اس نے ایک پیشہ کی شکل بھی اختیار کر لی ہے جس کو جدید اخبار نویسی نے بہت ترقی دی ہے۔ بعض اخبار نویس رات دن کسی نہ کسی اسکینڈل کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ شاطر وہ اخبار نویس سمجھا جاتا ہے جو کسی نمایاں شخصیت کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق کوئی ایسا اسکینڈل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے جس سے اس کا اخبار یا رسالہ ہاتھوں ہاتھ بکے۔ اس طرح کا تجسس ظاہر ہے کہ اس اخوت اور باہمی ہمدردی کے بالکل منافی ہے جو اسلامی معاشرہ کی اساس ہے، اس وجہ سے اہلِ ایمان کو اس سے روکا گیا ہے۔ رہا وہ تجسس جو ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے حالات کا اس مقصد سے کرتا ہے کہ اس کی مشکلات و ضروریات میں اس کا ہاتھ بٹا سکے یا ایک اسلامی حکومت اس غرض سے کرتی ہے کہ رعایا کے حالات سے پوری طرح باخبر رہے تو یہ تجسس نہ یہاں زیرِ بحث ہے اور نہ یہ ممنوع ہے بلکہ ہر شریف پڑوسی کے لیے یہ نہایت نیکی کا کام ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے حالات و مسائل سے آگاہ رہے تاکہ ان کی مشکلات میں ان کی مدد کر سکے اور حکومت کے لیے تو یہ صرف نیکی ہی نہیں بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ وہ رعایا کے اچھے اور بُرے دونوں طرح کے حالات سے پوری طرح باخبر رہنے کا اہتمام رکھے تاکہ اپنی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو سکے۔

غیبت

تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا (تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے) غیبت کے معنی کسی کی اس کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنے کے ہیں۔ پیٹھ پیچھے کے مفہوم ہی میں یہ بات داخل ہے کہ غیبت کرنے والا چاہتا ہے کہ اس کے اس فعل کی خبر اس کو نہ ہو جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے۔ اسی خواہش کی بنا پر وہ یہ کام اس کے پیٹھ پیچھے صرف ان لوگوں کے سامنے کرتا ہے جو یا تو اس کے ہم راز و ہم خیال اور شریک مقصد ہوتے ہیں یا کم از کم ان سے یہ

اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ اس کے ہمدرد ہوں گے جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے اور اس کے سامنے یہ راز فاش کر دیں گے۔ غیبت کی یہی خصوصیت اس کو ایک نہایت مکروہ اور گھنونا فعل بناتی ہے اس لیے کہ اس سے نہ کسی حق کی حمیت و حمایت کا مقصد حاصل ہوتا نہ کسی اصلاح کی توقع ہو سکتی ہے بلکہ اس طرح ایک بزدل شخص کسی کے خلاف صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

بعض خوش فہم کسی کی برائی کے ذکر کی ہر صورت کو غیبت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک محدثین کا راویوں پر جرح کرنا، کسی کے خلاف عدالت میں گواہی دینا، کسی کے منکر پر نکیر کرنا، کسی کے خلاف تھانے میں رپٹ لکھوانا، کسی کے باب میں کسی مشورہ چاہنے والے کو اس کے کسی واقعی عیب سے آگاہ کرنا اور اس قبیل کی ساری ہی باتیں ہیں تو داخل غیبت، لیکن یہ غیبتیں حکمت عملی کے تحت جائز کر دی گئی ہیں۔ پھر وہ یہیں سے اپنے لیے ایک شرعی اصول یہ نکال لیتے ہیں کہ شریعت کی تمام حرمتیں ابدی نہیں ہیں اس وجہ سے انھیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ ان کی حکمت عملی کسی حرام کو مباح کرنے کی اگر مقتضی ہو تو وہ اس کو جائز قرار دے سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دین کے خلاف ایک نہایت شدید قسم کا فتنہ ہے جس سے بہت سے نئے فتنوں کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ اس وجہ سے ہم نے اس کی تردید میں مستقل مضامین بھی لکھے ہیں اور یہاں بھی ہم آگے ایک مستقل فصل میں اس کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

'اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ'۔ یہ غیبت کے گھنونے پن کو مثال سے واضح فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے کسی بھائی کی، اس کے پیٹھ پیچھے، برائی بیان کرتا ہے وہ گویا اس حال میں اس کا گوشت کھا رہا ہے جب کہ وہ مردہ پڑا ہوا اور اپنی مدافعت سے بالکل قاصر ہے۔ فرمایا کہ یہ چیز تو ایسی ہے کہ تم میں سے کوئی بھی اس کو پسند نہیں کرتا، تو جب تم اس کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو اسی طرح کی مکروہ چیز، غیبت کو کیوں گوارا کرو! 'مَیْتًا'، یہاں 'اَخِیْہِ' میں مضاف سے حال پڑا ہوا ہے اور یہ تصویر ہے اس کی اپنی مدافعت سے بے بسی کی۔

'وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ'۔ یہ تنبیہ بھی ہے اور توبہ و اصلاح حال کی ترغیب بھی۔ فرمایا کہ اللہ سے ڈرو جو لوگ اس طرح اپنے بھائیوں کا گوشت مفت کھانے کے عادی ہو جاتے ہیں ان کو اس کی ایسی چاٹ پڑ جاتی ہے کہ وہ اس کے پیچھے اپنا ایمان ہی گنوا بیٹھتے ہیں۔ اللہ نے تمھیں بروقت تنبیہ فرما دی ہے تاکہ توبہ اور اصلاح کر کے اپنے کو اس خطرہ سے محفوظ کر لو۔ اگر تم نے توبہ کر لی تو اللہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا اور اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں (۱۱-۱۲) میں جن چھ باتوں سے روکا گیا ہے ان پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اوپر کی تین باتیں ـــــ مذاق اڑانا، طعن کرنا اور برے القاب چسپاں کرنا ـــــ ان برائیوں میں سے ہیں جن کا ارتکاب انسان علانیہ پبلک میں کرتا ہے۔ باقی تین برائیاں ـــــ سُوءِ ظن، تجسس اور غیبت ـــــ انسان کی پرائیویٹ زندگی سے تعلق رکھنے والی ہیں جن کو وہ دوسروں سے چھپا کر یا اپنے محرمانِ راز کے اندر محدود رکھ کر کرتا ہے۔ ان دونوں ہی قسم کی برائیوں کی ممانعت اسلامی تزکیہ و تطہیر کے اس اصول پر مبنی ہے جو قرآن میں وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (الانعام: ۱۲۰) (اور گناہ کے ظاہر اور اس کے باطن دونوں ہی کو چھوڑ دو) کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ جب تک انسان اپنے آپ کو ان برائیوں سے پاک نہیں کرتا جو اس کے باطن سے تعلق رکھنے والی ہیں، اس وقت تک اس کے اندر اللہ تعالیٰ کے علّام الغیوب ہونے کا وہ شعور راسخ نہیں ہوتا جس کے بغیر دل کے اندر تقویٰ کی روئیدگی بالکل خارج از امکان ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (۱۳)

نسلی اور خاندانی غرور پر ضرب

ایک عام خطاب سے یہ اس نسلی، خاندانی اور قبائلی غرور کا یک قلم خاتمہ کر دیا جو ان برائیوں میں سے اکثر کا سبب بنتا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ فرمایا کہ اے لوگو! اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھو کہ ہم نے سب کو ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے پیدا کیا ہے۔ یعنی تمام بنی نوعِ انسان کا آغاز آدمؑ اور حوّا ہی سے ہوا ہے اس وجہ سے باعتبارِ خلقت کسی کو کسی پر کوئی شرف و تفوق حاصل نہیں ہے۔ خاندانوں اور قبائل کی تقسیم محض تعارف اور شناخت کے لیے ہے۔ کسی خاص خاندان یا قبیلہ کو اللہ تعالیٰ نے بجائے خود یہ امتیاز نہیں بخشا ہے کہ جو اس میں پیدا ہو وہ اللہ کے ہاں معزز بن جائے اور دوسروں کے مقابل میں وہ اپنے کو اشرف و اعلیٰ سمجھنے لگے۔ جس طرح اللہ نے لوگوں کی شکلوں، ان کے رنگوں اور ان کے قد و قامت میں فرق رکھا تاکہ لوگ ایک دوسرے کو شناخت کر سکیں اسی طرح خاندانوں اور قبیلوں کی حد بندیاں قائم کر دیں تاکہ لوگ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ اس سے زیادہ ان حد بندیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ کسی خاندان یا قبیلہ کے لوگ اس پندار میں مبتلا ہو جائیں کہ وہ اللہ کے نزدیک معزز ہیں، اس نے ان کو دوسروں پر کوئی برتری بخشی ہے۔ اللہ کے ہاں عزت کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ اس کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اس سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اس کی حدود کی سب سے بڑھ کر پابندی قائم رکھنے والا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ یعنی اس مقرر کردہ معیار پر لوگوں کو پرکھتے میں اللہ تعالیٰ کو کوئی

زحمت یا کوئی مغالطہ پیش آنے کا امکان نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو جاننے والا اور ہر ایک کے ہر قول و فعل کی خبر رکھنے والا ہے۔ جو عزت کا مستحق ہوگا وہ اپنا عزت کا مقام پا کے رہے گا، اگرچہ وہ کتنے ہی گمنام اور حقیر خاندان کے اندر سے اٹھا ہو اور جو اس کا مستحق نہیں ہوگا وہ خواہ کتنا ہی بڑا قرشی و ہاشمی یا سوری نسبی اور جاہ نسبی ہو لیکن اللہ تعالیٰ اس کو اسی کھڈ میں پھینکے گا جس کا وہ سزاوار ہوگا۔

۵۔ اس مجموعۂ آیات کی بعض ہدایات کی وضاحت

اس مجموعۂ آیات میں جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کی بقدر ضرورت وضاحت آیات کے تحت ہم کرتے آئے ہیں، لیکن تجسس اور غیبت کے بعض پہلو مزید وضاحت کے محتاج ہیں۔ یہاں ہم ان کو بھی صاف کر دینا چاہتے ہیں۔

کیا حکومت کے لیے بھی لوگوں کے حالات کا تجسس جائز نہیں ہے

اس زمانے میں چونکہ فرد کی آزادی کا تصور ذہنوں پر بہت غالب ہے اس وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے جس طرح عام افراد کو دوسروں کے احوال کے تجسس سے روکا ہے اسی طرح حکومت کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے حالات کا تجسس کرے۔ اس کو اپنا احتساب صرف ان معاملات تک محدود رکھنا چاہیے جو علانیہ طور پر اس کے نوٹس میں آجائیں۔ رہے اندرون خانہ کے معاملات تو وہ حکومت کے دائرۂ احتساب سے خارج ہیں۔ اس کی تائید میں بعض لوگوں نے حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ کا حوالہ بھی دیا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے رات میں ایک شخص کے گانے کی آواز سنی جو اپنے گھر میں گا رہا تھا۔ آپ کو شک گزرا تو آپ دیوار پر چڑھ گئے۔ دیکھا کہ وہاں شراب بھی موجود ہے اور ایک عورت بھی۔ آپ نے پکار کر کہا اے دشمنِ خدا، کیا تو نے گمان کر رکھا ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ تیرا پردہ فاش نہ کرے گا؟ اس نے جواب دیا، امیرالمومنین، جلدی نہ کیجیے، اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے اکٹھے تین گناہ کر ڈالے ہیں۔ اللہ نے تجسس سے منع کیا تھا اور آپ نے تجسس کیا۔ اللہ نے حکم دیا کہ گھروں میں دروازوں سے داخل ہو اور آپ دیوار چڑھ کر آئے۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ دوسروں کے گھروں میں اجازت کے بغیر نہ داخل ہو اور آپ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں داخل ہوئے۔ یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ اپنی غلطی مان گئے اور اس کے خلاف انھوں نے کوئی کارروائی نہ کی، البتہ یہ وعدہ لے لیا کہ وہ بھلائی کی راہ اختیار کرے گا۔

یہ روایت بعض حضرات نے مکارمِ اخلاق اور ترغیب و ترہیب کی نوعیت کی کتابوں میں درج کی ہے لیکن نہ سند کے اعتبار سے اس کا کوئی درجہ ہے اور نہ متن ہی کے پہلو سے یہ قابلِ اعتبار رہے۔ سند کے ضعف کے لیے تو یہی بات کافی ہے کہ بہت سے لوگ خاص طور پر ارباب تصوف اخلاق و عظت کی روایات میں تحقیق سند کی اہمیت کے قائل ہی نہیں ہیں، جس قسم کے قصوں سے ان کے

نزدیک کوئی مفید سبق حاصل ہوتا ہو ان کو بے تکلف بلا تحقیق سند و متن اپنی کتابوں میں درج کر دیتے ہیں۔ رہا اس کا متن تو اس پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ واقعہ بالکل ہی بعید از عقل و قیاس ہے۔

اول تو یہی بات ناقابلِ قیاس ہے کہ کوئی شخص مدینہ منورہ میں، اور وہ بھی حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں، ایسی جسارت کر سکے کہ شاہد و شراب کے ساتھ اس طرح رنگ رلیوں میں معروف ہو کر گانے کی آواز حضرت عمرؓ کو باہر گلیوں میں سنائی دے اور ان کو اس بزمِ عیش میں خلل انداز ہونا پڑے۔ اگر عین مرکزِ اسلام میں، فاروق اعظمؓ کے دور میں، شیطان کی جسارت کا یہ حال رہا ہے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ بھی شیطان کو مرعوب نہ کر سکے حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عمر (رضی اللہ عنہ) جس راستے سے گزرتے ہیں شیطان وہ راستہ ہی چھوڑ کر ہٹ جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت کو باور کیجیے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ کو قرآن و حدیث کے یہ احکام معلوم نہیں تھے کہ کسی کے گھر میں اس کی دیوار پھاند کر داخل ہونا جائز نہیں ہے، بلکہ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کر کے اجازت لینی چاہیے۔ اگر اجازت ملے تو داخل ہونا چاہیے ورنہ تین بار سلام کر کے چپکے سے الٹے پاؤں واپس ہو جانا چاہیے۔ کیا کوئی شخص عقل و ہوش رکھتے ہوئے یہ باور کر سکتا ہے کہ کتاب و سنت کے ان صریح احکام سے حضرت عمرؓ کو پہلی بار ایک رند شاہد باز نے آگاہ کیا! کیا حضرت عمرؓ کو کبھی سورۂ نور اور سورۂ حجرات کی تلاوت کا 'العیاذ باللہ' موقع نہیں ملا تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر حضرت عمرؓ نے اپنی یہ تینوں غلطیاں نہایت سعادت مندی سے تسلیم کر لی تھیں تو اپنے عمال اور گورنروں کو یہ ہدایت نامہ کیوں نہیں جاری فرمایا کہ اب تک میں غلطی پر تھا کہ لوگوں کے گھروں کا تجسس کیا کرتا تھا، اب مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس میں اکٹھی تین باتیں خلافِ شریعت ہیں اس وجہ سے تم لوگ اندرونِ خانہ کے معاملات سے تعلق نہ رکھو۔ لوگ اپنے گھروں میں جو اودھم چاہیں مچائیں، اگر تمہیں شبہ گزرے تو دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کر کے اجازت مانگو، اگر اجازت ملے تو گھر کے اندر جاؤ ورنہ تین بار سلام کر کے واپس لوٹ آؤ۔ جہاں تک ہمیں علم ہے حضرت عمرؓ نے نہ صرف یہ کہ اس قسم کا کوئی حکم نامہ جاری نہیں کیا بلکہ متعدد واقعات تاریخوں میں، ایسے موجود ہیں جو شاہد ہیں کہ ان کے عمال بھی تجسس کرتے رہے اور خود حضرت عمرؓ بھی اس حد تک تجسس کرتے تھے کہ راتوں میں دودھ پیتے بچے روتے، تو وہ ان کے رونے کا سبب معلوم کرنے کی بھی کوشش کرتے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اس روایت کو باور کیجیے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک اسلامی حکومت میں اگر کچھ لوگ اپنے گھروں میں شرابیں پئیں، بازاری عورتوں سے رنگ رلیاں منائیں، رقص و سرود کی محفلیں گرم کریں یہاں تک کہ بم اور اسٹین گن کے ذخیرے بھی جمع کر چھوڑیں، تو بھی حکومت کی پولیس کو یہ حق

حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کے گھروں میں گھس کر ان کے عیش کو مکدر کرے، یہاں تک کہ خلیفۂ وقت کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ بدون اذن وہ ان کے گھروں میں داخل ہونے کی جرأت کر سکے اور کبھی غلطی سے اگر ایسی جرأت کر بیٹھے تو بس اتنی ہدایت فرما دیا کرے کہ آئندہ آپ لوگ اس طرح کی باتوں سے احتیاط کریں۔

یہ روایت اس قابل تو نہیں تھی کہ اس سے تعرض کیا جاتا لیکن اس کو اس زمانے میں ان لوگوں نے بڑے اعتماد سے پیش کیا ہے جو رات دن اسلامی حکومت کا وظیفہ پڑھتے ہیں، اس وجہ سے اس سے تعرض کرنا پڑا۔ بہر حال یہ روایت ہمارے نزدیک بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔ ایک اسلامی حکومت لوگوں کے اخلاق و کردار کی بھی محافظ ہوتی ہے اور ملک کے امن، عدل اور اس کی سلامتی کی بھی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ جہاں کہیں اس کو کوئی شبہ گزرے وہ اس کا تجسس کرے لیکن ہر حق کے استعمال پر کچھ اخلاقی و قانونی پابندیاں ہوتی ہیں جن کا لحاظ حکومت کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ حکومت اگر ان کا لحاظ نہیں کرتی تو خواہ اس کا ہاتھ کوئی نہ پکڑ سکے لیکن عند اللہ وہ لوگ مجرم ٹھہریں گے جنھوں نے ایک ایسے حق کو پبلک کے بے گناہ افراد کو پریشان کرنے کے لیے استعمال کیا جو ان کو امن، عدل اور رعایا کی حفاظت کے لیے عطا ہوا تھا۔

مستحسن تجسس

رہے عام افراد تو ان کو اس باب میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

— جو تجسس کسی کی بھلائی کی خاطر، نیک ارادہ، نیک مقصد سے ہو وہ، جیسا کہ ہم آیت کے تحت عرض کر چکے ہیں، صرف یہی نہیں کہ ممنوع نہیں ہے بلکہ نہایت نیکی کا کام ہے۔ قرآن میں ہدایت ہے کہ خوددار مضطریوں کی مدد کے لیے ان کو ڈھونڈھ کر خود ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرو۔ یہ توقع نہ رکھو کہ وہ تم سے لپٹ کر سوال کریں گے۔

— اگر کسی شخص کے متعلق یہ شبہ ہو کہ اس کی درپردہ سرگرمیاں دوسرے بے گناہ افراد کے جان و مال اور آبرو کے لیے خطرہ ہیں یا ملک کے امن، عدل اور سلامتی کو ان سے نقصان متصور ہے تو اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر اس سے بے تعلق نہیں رہنا چاہیے۔ اگر اصلاح کر سکنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو ان لوگوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرے جو اس کی اصلاح کر سکتے ہوں یا اس کا ہاتھ پکڑ سکتے ہوں یہ حقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کشتی کے مسافروں والی تمثیل میں سمجھائی ہے۔

— اگر کسی شخص کی کوئی ایسی برائی علم میں آئے جو اس کی ذات ہی تک محدود ہو تو اس کو نصیحت کرے، اگر نصیحت کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ اگر اس پوزیشن میں نہ ہو تو اس سے غض بصر کرے اور پردہ ڈالے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے جو دوسروں کے عیوب پر پردہ ڈالتے ہیں لیکن اگر برائی متعدی نوعیت کی ہو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر عمل کرے جو انکار منکر

والی حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

قرآن و حدیث پر غور کرنے کا طریقہ

قرآن و حدیث کے سمجھنے میں لوگوں کو زیادہ مغالطہ اس وجہ سے پیش آتا ہے کہ آیات و احادیث کا موقع و محل معین کرنے میں لوگ تدبر سے کام نہیں لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض حدیثوں میں اپنے مسلمان بھائی کے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے لیکن کوئی صاحب مجرد اس حدیث کی بنا پر اگر یہ فتویٰ دے بیٹھیں کہ دوسروں کی نیکی بدی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں، ہمیں صرف اپنی ذات سے تعلق رکھنا چاہیے، کسی سے کوئی بدی ہمارے علم میں آئے بھی تو اس پر ہمیں پردہ ڈالنا چاہیے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہمارے گناہوں پر پردہ ڈالے گا، تو گو اس فتوے کی تائید میں ایک حدیث موجود ہے لیکن یہ فتویٰ ذہنوں میں بڑی الجھن پیدا کر دے گا، اس لیے کہ دوسری حدیثوں میں یہ بات بھی نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی برائی دیکھے تو وہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کر دے اگر اس کی طاقت رکھتا ہو، طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کرے، اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے اس کو برا سمجھے، اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

یہ الجھن ظاہر ہے کہ اس وجہ سے پیدا ہوگی کہ دونوں حدیثوں کا موقع و محل معین کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اگر دونوں کا موقع و محل معین ہو جائے تو کوئی الجھن نہیں پیدا ہوگی۔ ایک شخص کو اگر آپ دیکھتے ہیں کہ کھڑا ہو کر پیشاب کر رہا ہے تو یہ خیال کر کے "عفو" بھی کر سکتے ہیں کہ ممکن ہے کہ کوئی عذر ہو۔ اگر عذر نہ واضح ہو تو اس کو عمدہ طریقہ سے نصیحت بھی کر سکتے ہیں کہ یہ طریقہ تہذیب و شائستگی اور اسلامی آداب طہارت کے خلاف ہے۔ اگر نصیحت کر سکنے کی پوزیشن میں نہ ہوں تو اس کے اس اجڈپن پر پردہ ڈالیے، اس کا اشتہار نہ دیجیے۔ ان شاءاللہ آپ کی یہ پردہ پوشی آپ کے لیے عنداللہ موجب اجر ہوگی۔ لیکن ایک شخص کے متعلق اگر آپ یہ علم رکھتے ہیں کہ اس نے اپنے گھر میں شراب کی بھٹی بنا رکھی ہے یا حشیش کا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے یا اسلحہ چھپا رکھا ہے یا چکلہ قائم کر رکھا ہے اور آپ پولیس اور حکومت کو اطلاع دے سکنے کی پوزیشن میں ہونے کے باوجود اس خیال سے اس پر پردہ ڈالے ہوئے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آپ کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا تو میرے نزدیک یہ محض خوش فہمی ہے۔ اس طرح کی خوش فہمی میں پڑے ہوئے لوگ ثواب کمانا تو در کنار اپنے ایمان ہی گنوا بیٹھیں گے۔

غیبت کے باب میں بعض لوگوں کی غلط فہمی

غیبت کے باب میں بھی بعض لوگوں نے قلتِ تدبر کے سبب سے اسی نوع کا خلطِ مبحث پیدا کر دیا ہے۔ وہ غیبت کے حدود معین کرتے وقت بالکل بھول گئے کہ قرآن و حدیث میں جس طرح غیبت کی نہی وارد ہوئی ہے اسی طرح جرح و تعدیل، شہادتِ حق، انکارِ منکر، خیر خواہی

مسلمین کے احکام بھی نہایت مثبت اور قطعی الفاظ میں وارد ہوئے ہیں۔ جب ان دونوں میں تطبیق کا سوال پیدا ہوا اور کوئی تطبیق ان کی سمجھ میں نہیں آئی تو انھوں نے یوں تطبیق پیدا کر ڈالی کہ ہیں تو یہ ساری باتیں داخلِ غیبت لیکن یہ اس لیے مباح کر دی گئی ہیں کہ حکمت عملی ان کی متقضی تھی۔ حالانکہ جرح و تعدیل، شہادتِ حق، انکارِ منکر اور نصح مسلمین کے احکام مباحات میں سے نہیں بلکہ واجباتِ دین میں سے ہیں۔ اسلامی نظام کا سارا جمال و کمال انھی پر منحصر ہے۔ راویوں کی تحقیق اور جرح و تعدیل پر علم شریعت کی بنیاد ہے۔ شہادت حق اس امت کا وہ فریضۂ منصبی ہے جس کے لیے یہ دنیا میں برپا کی گئی ہے، انکارِ منکر کے ساتھ اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس امت کے قیام و بقاء کو وابستہ کیا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی خیر خواہی صرف اخوت ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ اسی سورہ میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ یہ ایمان کا بھی تقاضا ہے۔ یہ چیزیں امت پر غیبت کو مباح کر کے نہیں فرض کی گئی ہیں بلکہ ایمان کے تقاضوں کے تحت فرض کی گئی ہیں۔ رہی غیبت تو اس کا ایک خاص دائرہ ہے جس کی وضاحت آیت کے تحت ہم کر آئے ہیں۔ اس کی حرمت کسی پہلو سے بھی دین کے ان فرائض میں مخل یا مانع نہیں ہے کہ اس کو حکمتِ عملی کی خاطر مباح کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ نہ محدثین نے اس کو جائز قرار دیا ہے نہ مجددین و مصلحین نے اور نہ کسی مسلمان کو اپنے کسی دینی فرض کے ادا کرنے کے لیے کبھی اس کو مباح کرنے کی ضرورت پیش آسکتی۔ اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے تو ان لوگوں کو آسکتی ہے جو اسلامی شریعت کو اپنی حکمتِ عملی کی بازیگاہ بنانا چاہتے ہوں۔

۶۔ آگے آیات ۱۴-۱۸ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں ان لوگوں کے باطن سے پردہ اٹھایا ہے جن کے رویہ پر ابتدائی پانچ آیات میں نکیر فرمائی ہے۔ وہاں ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ اطراف مدینہ کے بعض قبائل اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر مسلمانوں میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن مرکز سے دور ہونے کے باعث ان کی تربیت اچھی طرح نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر ان کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ وہ بغیر لڑے بھڑے اسلام میں داخل ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو اللہ و رسول کا محسن گمان کیے ہوئے بیٹھے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ادب و احترام کس طرح ملحوظ رکھ سکتے تھے جو ایمان کا متقضی تھا۔ چنانچہ ان سے اس طرح کی باتیں صادر ہو جاتی تھیں جن پر ابتدائی آیات میں گرفت فرمائی گئی ہے لیکن اندازِ خطاب عام ہی رہا تاکہ جن کے اندر بھی یہ خامیاں ہوں وہ ان کی اصلاح کریں۔ چنانچہ یہ صورتِ حال جن باتوں کی تعلیم کی متقضی ہوئی وہ بتا دی گئیں۔ اب آخر میں ان کے نام کی تصریح کے ساتھ ان کی اصل بیماری کا پتہ دے

دیا تاکہ وہ اس کے علاج کی طرف متوجہ ہوں اس لیے کہ اس بیماری کے ہوتے ایمان کا نشوونما پانا ناممکن ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۴-۱۸

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

ع ۲ ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۴-۱۸

اہل بدو نے کہا کہ ہم ایمان لائے۔ ان کو بتا دو کہ تم ایمان نہیں لائے، ہاں یوں کہو کہ ہم نے اطاعت کرلی اور ابھی ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا ہے۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال میں سے ذرا بھی کم نہیں کرے گا۔ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔ ۱۴-۱۵

کہہ دو، کیا تم اپنے دین سے اللہ کو آگاہ کر رہے ہو! درآنحالیکہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ ۱۶

یہ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام لائے۔ کہہ دو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو بلکہ یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی توفیق بخشی، اگر تم سچے ہو۔ اللہ جانتا ہے آسمانوں اور زمین کے سارے غیب کو۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۷-۱۸

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۴)

ان لوگوں کے غرور پر ضرب جو اپنے کو اسلام کا محسن سمجھتے تھے

'اعراب' سے مراد اطراف مدینہ کے وہی دیہاتی لوگ ہیں جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرتے ہیں تو آپ کو اس طرح خطاب کرتے ہیں جس طرح کوئی شخص اپنے برابر کے آدمی کو خطاب کرتا ہے۔ اگر کبھی آپ سے ملنے آتے ہیں تو آتے ہی ان کی خواہش ہوتی ہے کہ بلا تاخیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملاقات کریں۔ یہاں تک کہ اگر آپ گھر کے اندر تشریف فرما ہوتے ہیں تو یہ انتظار کی زحمت اٹھانا گوارا نہیں کرتے بلکہ گھر کے باہر ہی سے آپ کو نام لے کر پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے اس گنوارپن میں جہاں تربیت سے محرومی کو دخل تھا وہیں اس بات کو بھی دخل تھا کہ یہ لوگ اس وہم میں مبتلا تھے کہ انھوں نے بغیر کسی جنگ و جدال کے اسلام میں داخل ہو کر آپ کے اوپر احسان کیا ہے جس کا صلہ ان کو یہ ملنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنا اور اسلام کا محسن سمجھیں اور ہر موقع پر ان کی ناز برداری فرمائیں۔ ان لوگوں کی اسی ذہنیت پر یہاں ضرب لگائی جا رہی ہے۔

'قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا' فرمایا کہ یہ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں! ان کے اس قول

کا حوالہ یہاں محض ان کے اقرارِ ایمان کی حیثیت سے نہیں دیا گیا ہے بلکہ آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ یہ بات وہ بطورِ اظہارِ احسان کہتے تھے۔ یعنی وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بات بات میں یہ احسان جتاتے تھے کہ انھوں نے ایمان قبول کر کے آپ کی عزت و شوکت بڑھائی ہے۔ اس وجہ سے وہ حقدار ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ ان کا لحاظ فرمائیں اور جو مشورے وہ دیں ان کو بسر و چشم قبول کریں۔

قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا ۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ان کو جواب دلوایا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ تمہارا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ تم ایمان لائے ہو البتہ یہ دعویٰ تم کر سکتے ہو کہ تم نے اطاعت کر لی ہے۔ لفظ 'اسلام' یہاں اپنے لغوی مفہوم یعنی ظاہری اطاعت کے معنی میں ہے۔ اسلام کا حقیقی مفہوم تو اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دینے کا ہے لیکن یہ مجرد ظاہری اطاعت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ان دونوں معنوں کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے یہاں یہ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان لوگوں کی نسبت ہم اوپر ظاہر کر چکے ہیں کہ دعوتِ ایمان سے زیادہ اسلام کی ابھرتی ہوئی سیاسی طاقت سے مرعوب ہو کر یہ لوگ مسلمانوں میں شامل ہو گئے تھے اس وجہ سے ایمان کی روح ان کے دلوں میں ابھی نہیں اتری تھی البتہ اسلام کے سیاسی اقتدار کے ماتحت یہ لوگ آ گئے تھے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے جواب دیا کہ ایمان کا دعویٰ تو ابھی تمھیں زیب نہیں دیتا البتہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم نے اسلام کے اقتدار کے سامنے سر جھکا دیا ہے۔ اس جواب کے اندر یہ بات مضمر ہے کہ جب تم نے اسلام کی سیاسی طاقت سے مرعوب ہو کر اطاعت کی ہے تو یہ چیز جتانے کی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ایک قسم کی مغلوبیت ہی ہے، بس یہ فرق ہے کہ تم بغیر مقابلہ کیے مغلوب ہو گئے اور یہ چیز ایسی نہیں ہے کہ اس کا احسان جتاؤ۔

ایمان کی حقیقت

وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ۔ یعنی ابھی اپنے ایمان کی حکایت زیادہ نہ بڑھاؤ۔ اس نے تمہارے دلوں کے دروازے پر دستک ضرور دی ہے لیکن وہ دلوں کے اندر گھسا نہیں ہے۔ یہ ایمان اللہ کے ہاں معتبر نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں معتبر ایمان وہ ہے جو رگ و پے میں اترے اور دل کو اپنے رنگ میں اس طرح رنگ لے کہ اس سے الگ ہو کر سوچنا اور کوئی عمل کرنا انسان کے لیے آسان نہ رہ جائے۔

وَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا ۔ یہ ان کے اظہارِ احسان پر تنبیہ ہے کہ اگر تم ایمان لائے یا تم نے اسلام کی کوئی خدمت کی تو اس کا احسان کیوں جتاؤ! اللہ تمہارے کسی عمل میں ذرا بھی کمی کرنے والا نہیں ہے بلکہ ہر چھوٹے بڑے عمل کا بھرپور صلہ دینے والا ہے۔ ایک کرو گے، دس پاؤ گے۔ تمہارا ہر عمل تمہارے ہی کام آنے والا ہے، خدا کے کام آنے والا

نہیں ہے تو جب تم اپنا ہی کام کر رہے ہو تو اس کا احسان اللہ اور رسول پر کیوں رکھتے ہو!

اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ 'اللہ تعالیٰ بڑا ہی غفور رحیم ہے'۔ وہ تمہاری کوتاہیوں اور خامیوں سے درگزر فرمائے گا، صلہ دینے میں ذرا بھی کمی نہیں کرے گا۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ تمہارے اعمال کی قیمت کم کرنے کے لیے تمہارے چھوٹے چھوٹے نقائص کو بہانہ بنائے۔

اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اگر اب تک تمہارے ذہن میں یہ غلطی سمائی رہی ہے کہ اسلام کے لیے تم نے جو کچھ کیا یہ اللہ اور رسول پر تمہارا احسان ہے تو اب اس تنبیہ کے بعد تم اس غلطی کی اصلاح کرو اور اللہ سے مغفرت مانگو، وہ تمہاری مغفرت فرمائے گا۔ وہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۱۵)

حقیقی ایمان کا اوصاف — فرمایا کہ ہر مدعی ایمان، اللہ کے نزدیک مومن نہیں بن سکتا۔ حقیقی مومن اللہ کے نزدیک وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر صدق دل سے ایمان لائے، پھر شک و تذبذب میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ مال و جان دونوں سے اللہ کی راہ میں برابر جہاد کیا۔ اپنا مال بھی دین کی تقویت و تائید کے لیے صرف کیا اور جان قربان کرنے کی نوبت آئی تو اس سے بھی دریغ نہیں کیا۔ فرمایا کہ یہی لوگ اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان کا دعویٰ تو بڑی بلند آہنگی سے کرتے ہیں لیکن اپنے تذبذب کے سبب سے اس راہ میں نہ کوئی چوٹ کھانے کے لیے تیار ہیں اور نہ جان و مال کی قربانی کا کوئی حوصلہ رکھتے ہیں، وہ محض دکھاوے کے مجنوں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ 'جٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ' کا ذکر ان کے عدم تذبذب کی شہادت کے طور پر ہوا ہے۔ ایک شخص اگر ایک نصب العین کے لیے جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا تو یہ ایک ناقابل انکار شہادت اس بات کی ہے کہ اس کو اس نصب العین کی صداقت پر پورا یقین ہے اور اگر وہ اس کی خاطر نہ مال قربان کرنے پر تیار ہے نہ اپنی جان کو کسی خطرے میں ڈالنے کا حوصلہ رکھتا ہے تو اگرچہ وہ اس کے عشق میں کتنی ہی لاف زنی کرے لیکن اس کا عمل گواہ ہے کہ وہ اس کے باب میں ابھی مبتلائے شک ہے۔

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰہَ بِدِیْنِکُمْ ؕ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۱۶)

یعنی یہ لوگ بڑے سرپرستانہ انداز میں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں تو ان سے پوچھو کہ کیا

تم لوگ اللہ کو اپنے دین سے آگاہ کر رہے ہو؟ اگر یہ لوگ اللہ کو آگاہ کر رہے ہیں تو ان کو بتا دو کہ اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کو جانتا ہے اور اللہ ہر بات سے با خبر ہے۔ وہ فعلاً بھی ہر چیز کو جانتا ہے اور صفتہً بھی ہر بات سے باخبر ہے۔ کوئی چیز بھی اس سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کو اپنے ایمان پر ناز ہے تو اس پر وہ کسی ایسے کے سامنے ناز کریں جو ان کے دین و ایمان سے بے خبر ہو۔ اس کے سامنے ناز کرنے سے کیا فائدہ جو اس کائنات کے ہر سر و علانیہ سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ کیا جو ہر چیز سے آگاہ ہے وہ ان کے ایمان کے طول و عرض سے آگاہ نہیں ہو گا۔

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُل لَّا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُم ۖ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۱۷)

مدعیانِ احسان کو جواب

ان لوگوں کے دعوائے ایمان کی قلعی کھولنے کے بعد ان کے دعوائے اسلام کی حقیقت واضح فرمائی کہ یہ لوگ تمہارے اوپر (خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) احسان جتاتے ہیں کہ وہ اسلام لائے۔ یعنی ان کا زعم یہ ہے کہ اسلام لا کر انھوں نے پیغمبر کی عزت بڑھائی اور اسلام کو قوت و شوکت بخشی اس وجہ سے وہ پیغمبر اور اسلام دونوں کے محسن ہیں اور پیغمبر کا فرض ہے کہ وہ ان کے اس احسان کا احترام کریں۔ فرمایا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم لوگ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ جتاؤ۔ اگر تم فی الواقع اپنے دعوے میں سچے ہو تو تمہارا احسان میرے اوپر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان تمہارے اوپر ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی توفیق بخشی۔ 'اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ' کے الفاظ پر نظر رہے، یعنی اول تو تمہارا ایمان و اسلام کا دعویٰ ہی محض لاف زنی ہے اور اگر تمہاری بات میں کچھ صداقت ہے تو تمھیں اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے تمھیں اس کی توفیق بخشی۔ 'ھدایت' کے بعد 'لِ' کا صلہ دلیل ہے کہ یہ لفظ یہاں توفیق کے مضمون پر متضمن ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ دین کی کوئی چھوٹی یا بڑی خدمت کر کے کوئی شخص نہ اللہ و رسول پر کوئی احسان کرتا ہے نہ دین پر بلکہ وہ خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے کہ اپنی عاقبت سنوارتا ہے۔ احسان، درحقیقت، اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے کہ وہ اس کو اپنے دین کی خدمت کی توفیق دے کر اس کے لیے ابدی فیروز مندی کی راہ کھولتا ہے۔ یہاں اس بات پر بھی نظر رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ جواب نہیں دلوایا گیا کہ تم لوگ اپنے ایمان و اسلام کا احسان مجھے نہ جتاؤ، بلکہ میرا احسان تمہارے اوپر ہے کہ میں نے تمہارے سامنے ہدایت کی راہ کھولی۔ اگر یہ جواب دلوایا جاتا تو اس کا ایک محل تھا، لیکن نبی جو کچھ کر سکتا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت

کی راہ پر لانے کے لیے اپنی ساری طاقت صرف کر دے لیکن لوگوں کو ہدایت کی توفیق دینا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ اس کی توفیق بخشنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے اور معاملہ کا سارا انحصار اسی توفیق بخشی پر ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۸)

وہی آیت ۱۶ والا مضمون ایک دوسرے اسلوب سے بیان فرمایا کہ اپنے ایمان و اسلام کو زیادہ جتانے اور جتلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ آسمانوں اور زمین کے سارے بھیدوں کو خود جانتا ہے اور یہ یاد رکھو کہ اللہ تمہارے سارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصل چیز دعویٰ نہیں بلکہ عمل ہے۔ اگر عمل کرو گے تو تمہارا دعویٰ بغیر اظہار و اعلان کے اللہ کے ہاں ثابت ہو جائے گا اور اگر عمل نہیں کرو گے تو زبان سے کتنا ہی دعویٰ کرو، یہ بالکل بے حقیقت و بے سود ہوگا۔

بتوفیقِ ایزدی ان سطور پر اس گروپ کی آخری سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

رحمان آباد
۱۳ر دسمبر ۱۹۷۶ء
۲۰ر ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ

تدبرِ قرآن

۵۰

قٓ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ گروپ پر ایک اجمالی نظر

سورۂ قٓ سے سورتوں کا چھٹا گروپ شروع ہو رہا ہے۔ اس میں کل سترہ سورتیں ہیں۔ جن میں سے سات سورتیں ـــــ قٓ، ذاریات، طور، قمر، رحمان اور واقعہ ـــــ بالترتیب مکی ہیں۔ صرف سورۂ رحمان کو بعض مصاحف میں مدنی ظاہر کیا گیا ہے، لیکن اس کی تفسیر سے واضح ہو جائے گا کہ یہ رائے بالکل بے بنیاد ہے۔ پوری سورہ کا مدنی ہونا تو درکنار اس کی کوئی ایک آیت بھی مدنی نہیں ہے۔

سورۂ واقعہ کے بعد دس سورتیں ـــــ حدید، مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون تغابن، طلاق اور تحریم ـــــ مدنی ہیں۔

اس گروپ کا جامع عمود بعث اور حشر و نشر ہے۔ اس کی تمام کی سورتوں میں یہ مضمون ابھرا ہوا نظر آئے گا۔ اگرچہ قرآن کے بنیادی مطالب، دوسرے گروپوں کی طرح، اس میں بھی زیرِ بحث آئے ہیں لیکن وہ اسی جامع عمود کے تحت آئے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جو مدنی سورتیں اس میں شامل ہیں وہ بھی اسی اصل کے تحت ہیں۔ بعث اور حشر و نشر پر ایمان کا لازمی نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت ہے۔ مدنی سورتوں میں اسی تسلیم و اطاعت کے وہ مقتضیات بیان ہوئے ہیں جن کے بیان کے لیے زمانۂ نزول کے حالات داعی ہوئے ہیں۔

مکی سورتوں میں تمام زدو قدح کفارِ قریش کے عقائد و مزعومات پر ہے اور وہی ان میں اصلاً مخاطب بھی ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے اگر خطاب ہے تو بطور التفات و تسلی ہے۔ مدنی سورتوں میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے ہے اور خاص طور پر ان لوگوں کی کمزوریاں زیرِ بحث آئی ہیں جو اللہ و رسول پر ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے تھے لیکن ایمان کے تقاضوں سے ابھی اچھی طرح آشنا نہیں ہوئے تھے۔ انہی کے ضمن میں اہلِ کتاب بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس دور میں اہلِ کتاب بھی قریش کی حمایت اور اسلام کی مخالفت کے لیے میدان

یہاں اتر آئے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر منافقین کا گروہ جو گھس آیا تھا وہ بیشتر انہی اہل کتاب کے زیر اثر تھا۔

اس گروپ کی پہلی سورہ ــــ قٓ ــــ ہے۔ اب اللہ کا نام لے کر ہم اس کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

ب۔ سورہ کا عمود

اس سورہ کا عمود بعث یعنی زندگی بعد الموت کا اثبات ہے۔ قرآن نے جب لوگوں کو آگاہ کیا کہ مرنے کے بعد لوگ ازسرِ نو زندہ کیے جائیں گے اور اپنے رب کے آگے اپنے اعمال و اقوال کی جوابدہی کے لیے پیش ہوں گے تو یہ چیز قریش کے لیڈروں پر بہت شاق گزری کہ انہی کے اندر کا ایک شخص مدعی نبوت بن کر ان کو اس بات سے ڈرا رہا ہے کہ مرنے کے بعد لوگ پھر زندہ کیے جائیں گے۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد لوگ ازسرِ نو زندہ ہوں! اس سورہ میں لوگوں کے اسی استبعاد کو موضوع بحث بنا کر ان کے شبہات کے جواب دیے گئے ہیں۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱ - ۵) قرآن کی عظمت و رفعت شاہد ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو لوگ اس کو شاعری یا کہانت کے قسم کی کوئی چیز سمجھتے ہیں، یہ انکارِ قیامت کے لیے انھوں نے ایک بہانہ تلاش کیا ہے۔ ان کو تعجب اس بات پر ہے کہ انہی کے اندر سے ایک شخص اٹھ کر انھیں ڈرا رہا ہے کہ مرنے کے بعد جب وہ سڑ گل کر مٹی ہو جائیں گے تو از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے۔ یہ بات ان کے نزدیک بہت مستبعد ہے۔ وہ قرآن کو استکبار کی بنا پر ماننا نہیں چاہتے، اس وجہ سے اس کو کہانت اور شاعری قرار دیتے ہیں۔ یہ کہانت و شاعری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جس کو جھٹلا کر وہ ایک شدید قسم کی ذہنی الجھن اور ایک کھلے ہوئے تناقض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مرنے کے بعد زمین ان کے جن اجزاء کو تحلیل کرتی ہے اللہ نے ان کو بھی جان رکھا ہے اور لوگوں کے اقوال و اعمال کا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لیے اس کے پاس ایک رجسٹر بھی ہے۔

(۶ - ۱۱) آسمان و زمین کی ان نشانیوں کی طرف اشارہ جو خدا کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی شہادت دے رہی ہیں اور جو اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین میں اسی لیے ودیعت فرمائی ہیں کہ جن کے اندر خشیت و انابت ہو وہ ان سے یاددہانی و رہنمائی حاصل کریں۔ یہ نشانیاں مرنے کے بعد دوبارہ

اٹھائے جانے کو بھی ثابت کر رہی ہیں اور ان سے جزاء و سزا اور توحید کی معرفت بھی حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

(۱۲-۱۴) کفارِ قریش کو تہدید کہ استکبار میں مبتلا ہو کر ایک واضح حق کی تکذیب نہ کرو۔ تم سے پہلے جن قوموں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی ان پر اللہ کی وعید پوری ہو کے رہی۔ اگر انہی کی چال تم چلو گے تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارا انجام ان سے مختلف ہو۔

(۱۵-۱۸) مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے اور حساب کتاب پر اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق اور صفتِ علم سے استدلال اور لوگوں کے افعال و اقوال کا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لیے اس نے جو اہتمام کر رکھا ہے اس کی طرف اشارہ۔

(۱۹-۳۵) قیامت کی تصویر۔ مکذبین کو جن حالات سے سابقہ پیش آئے گا ان کی تفصیل۔ قیامت پر ایمان رکھنے والوں کو اس روز جو سرفرازی حاصل ہوگی اس کا بیان۔

(۳۶-۳۷) قریش کو تنبیہ و تہدید کہ اپنی قوت و شوکت پر زیادہ نہ اتراؤ اور اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ ان پر زوال نہیں آسکتا، تم سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں جو تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ اللہ نے ان کو عین ان کے دورِ عروج میں پکڑا اور اس طرح پکڑا کہ خدا کی زمین، اپنی وسعتوں کے باوجود، ان کے لیے تنگ ہو گئی۔ ان سرگزشتوں میں ان لوگوں کے لیے بڑا سامانِ عبرت ہے جن کے پاس عبرت پذیر دل اور سننے والے کان ہیں۔

(۳۸-۴۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین۔ حصولِ صبر کے لیے اہتمامِ نماز کی تاکید۔ مخالفین کے معاملے کو اس دن پر محول کرنے کی ہدایت جس کا ظہور لازمی ہے۔ اس امر کی وضاحت کہ آپ کی ذمہ داری انذار تک محدود ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ایمان اتار دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ بس اسی قرآن کے ذریعہ سے ان لوگوں کو آگاہ کر دیجیے جو اللہ کی وعید سے ڈرنے والے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے تو اس کے نتائج سے خود دوچار ہوں گے۔

سُورَةُ قٓ

مَكِّيَّةٌ ـــــــ آيات: ۴۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝١ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ آيات
مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝٢ ءَاِذَا مِتْنَا ١-١٥
وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ ۝٣ قَدْ عَلِمْنَا مَا
تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝٤ بَلْ كَذَّبُوْا
بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝٥ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا
اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ
فُرُوْجٍ ۝٦ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا
فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝٧ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ
مُّنِيْبٍ ۝٨ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ
جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝٩ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ
نَّضِيْدٌ ۝١٠ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ
الْخُرُوْجُ ۝١١ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ

ثَمُوۡدُ ﴿۱۲﴾ وَعَادٌ وَّفِرۡعَوۡنُ وَاِخۡوَانُ لُوۡطٍ ﴿۱۳﴾ وَّاَصۡحٰبُ الۡاَیۡکَۃِ
وَقَوۡمُ تُبَّعٍ ؕ کُلٌّ کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِیۡدِ ﴿۱۴﴾ اَفَعَیِیۡنَا
ع ۱۵ بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ ؕ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ لَبۡسٍ مِّنۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴿۱۵﴾

ترجمۂ آیات ۱-۱۵ یہ سورۂ قٓ ہے۔ قسم ہے باعظمت قرآن کی! بلکہ ان لوگوں کو تعجب ہوا کہ ان کے پاس انہی کے اندر سے ایک آگاہ کرنے والا آیا تو کافروں نے کہا کہ یہ تو ایک نہایت عجیب بات ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ لوٹائے جائیں گے! یہ لوٹایا جانا تو بہت بعید ہے! ۱-۳

ہم نے جان رکھا ہے جو کچھ زمین ان کے اندر سے کم کرتی ہے اور ہمارے پاس ایک محفوظ رکھنے والی کتاب بھی ہے۔ بلکہ انھوں نے حق کو جھٹلایا ہے جب کہ وہ ان کے پاس آچکا ہے۔ پس وہ ایک صریح تضادِ فکر میں مبتلا ہیں۔ ۴-۵

کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا، کس طرح ہم نے اس کو بنایا اور اس کو سنوارا اور کہیں اس میں کوئی رخنہ نہیں! اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ گاڑ دیے اور اس میں ہر قسم کی خوش منظر چیزیں اگائیں، ہر متوجہ ہونے والے بندے کی بصیرت اور یاددہانی کے لیے! اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا جس سے ہم نے باغ بھی اگائے اور کاٹی جانے والی فصلیں بھی۔ اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت بھی جن میں تہ بہ تہ خوشے لگتے ہیں، بندوں کی روزی کے لیے۔ اور ہم نے اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیا۔ اسی طرح مرنے کے بعد زمین سے نکلنا بھی ہو گا۔ ۶-۱۱

ان سے پہلے قوم نوح، اصحاب الرس، ثمود، عاد، فرعون اور لوط کے بھائیوں اور اصحب الایکہ اور قوم تبع نے بھی جھٹلایا۔ ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو ہماری وعید ان پر واقع ہو کر رہی۔ کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے سے عاجز رہے! بلکہ یہ لوگ از سر نو پیدا کیے جانے کے باب میں مبتلائے شک ہیں۔ ۱۲-۱۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ (۱)

قرآن اپنی حقانیت پر خود گواہ ہے

'قٓ' اس سورہ کا نام ہے۔ مبتدا، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں، یہاں بھی محذوف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ سورۂ قٓ ہے۔

'مَجِيْد' کے معنی بزرگ، برتر اور باعظمت کے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی قرآن میں استعمال ہوا ہے اور قرآن کی صفت کے طور پر بھی۔ ہر کلام متکلم کی صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جس طرح اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر ہے اسی طرح اس کا کلام بھی بزرگ و برتر ہے اور یہ برتری و بزرگی قرآن کی ایک ایک آیت سے نمایاں ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی صاحب ذوق قرآن کو سنے یا پڑھے اور اس کی عظمت و شوکت سے متاثر و مرعوب نہ ہو۔ اگر کوئی اس کی عظمت و جلالت سے متاثر نہ ہو تو وہ یا تو نہایت ہی بلید ہے یا اس کا دل بالکل سیاہ ہو چکا ہے۔ آدمی تو درکنار اگر یہ قرآن پہاڑوں پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے، اللہ تعالیٰ کی خشیت سے پاش پاش ہو جاتے۔

'وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ' جملہ قسمیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اس باعظمت و برتر کتاب کی قسم کھائی ہے اور قسم سے متعلق ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں کہ قرآن میں اس طرح کی تمام قسمیں بطور شہادت ہیں۔ یعنی قسم مقسم علیہ پر دلیل کی حیثیت سے کھائی جاتی ہے۔ یہ قسم بھی مقسم علیہ پر دلیل ہے اگرچہ وہ محذوف ہے۔ مقسم علیہ ان مواقع میں حذف کر دیا جاتا ہے جہاں کلام کا سیاق و سباق اس کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہو۔ اس کی ایک نہایت واضح مثال سورۂ صٓ میں موجود ہے۔ فرمایا ہے: 'صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۝ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ' (۱-۲) (اس کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد پنجم، صفحات ۵۰۹-۵۱۰) تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے

کہ یہاں قرآن کی عظمت و جلالت کی قسم ان لوگوں کی تردید میں کھائی گئی ہے جو اس کو شاعری، کہانت سحر یا القائے شیطانی کے قسم کی چیز قرار دیتے تھے۔ قرآن کی عظمت، شہادت میں پیش کر کے ان کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ یہ اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ اپنے وجود سے شاہد ہے کہ اس کا منبع یہ سفلی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی ہے جس کا ذریعہ جبریل امین ہیں، اور جس کا منبع لوح محفوظ ہے۔ بعینہٖ اسی قسم کے سیاق و سباق کے ساتھ سورۂ بروج میں فرمایا ہے:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۲۱-۲۲)	بلکہ یہ باعظمت قرآن ہے اور اس کا منبع لوح محفوظ میں ہے۔

یہی بات سورۂ تکویر میں یوں فرمائی گئی ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۱۹-۲۷)	یہ ایک باعزت رسول کا اتارا ہوا کلام ہے۔ وہ قوت والا اور عرش کے مالک کے نزدیک باررسوخ ہے۔ وہ مطاع اور مزید برآں امانتدار ہے۔ اور تمہارا ساتھی کوئی دیوانہ نہیں ہے اور اس نے اس کو بالکل کھلے افق میں دیکھا ہے۔ اور وہ غیب کی باتوں کا کوئی حریص نہیں ہے۔ اور یہ کسی شیطان رجیم کا القاء نہیں ہے، تو کہاں بھٹکے جاتے ہو! یہ تو دنیا والوں کے لیے یاددہانی ہے۔

قرآن کی عظمت کے اسی پہلو کی طرف لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (حٰمٓ السجدۃ: ۴۲) (باطل نہ اس کے آگے سے اس میں آسکتا اور نہ اس کے پیچھے سے) اور لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعۃ: ۷۹) (اور اس کو صرف پاکیزہ ہی لوگ چھوتے ہیں) اور اس مضمون کی دوسری آیتیں بھی اشارہ کر رہی ہیں۔ سورۂ شعراء کے آخر میں قرآن کو کہانت اور شاعری کی تہمت سے بری کرنے کے جو دلائل بیان ہوئے ہیں ان کی وضاحت سورہ کی تفسیر میں ہو چکی ہے، خاص طور پر وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (الشعراء: ۲۱۰-۲۱۱) کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کے انذارِ قیامت کو یہ بہانہ بنا کر نظرانداز کر رہے ہیں کہ یہ وحی الٰہی نہیں بلکہ القائے شیطانی ہے ان کی تردید کے لیے قرآن کی معجزانہ بلاغت اور اس کی لاہوتی حکمت ہی کافی ہے۔ نادان ہیں وہ جو اس کو کسی جن یا شیطان کا کلام سمجھتے ہیں۔ یہ جن

یا شیطان کا کلام نہیں بلکہ خدائے عزیز و حکیم کا اتارا ہوا کلام ہے۔

بوہر پیامم جم از کاخِ جہانِ دیگر است

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ۚ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ (۲-۳)

مخالفین کی مخالفت کی اصل علت

یہاں 'بَلْ' اس بات پر دلیل ہے کہ قرآن نے اس اعتراض کو محض حقیقت سے فرار کے لیے ایک بہانہ قرار دیا ہے۔ اس 'بَلْ' کے مضمرات کھولیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جو لوگ قرآن کو جنات و شیاطین کا القاء قرار دیتے ہیں ان کی تردید کے لیے تو قرآن کی عظمت و جلالت ہی کافی ہے۔ ان کے انکار کی اصل وجہ وہ نہیں ہے جو وہ ظاہر کر رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ان کو اس بات پر تعجب ہے کہ ایک شخص انہی کے اندر سے ان کے لیے منذر بن کر اٹھا جو ان کو اس بات سے ڈرا رہا ہے کہ مرنے کے بعد وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اپنے اندر ہی کے ایک آدمی کو خدا کا رسول تسلیم کر لینا چونکہ ان کے دلوں پر بہت شاق ہے، اس وجہ سے اس کی تکذیب میں انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ مر کر، سڑ گل جانے کے بعد لوگ اٹھائے جائیں گے! یہ اٹھایا جانا بہت بعید از عقل ہے! اس آیت پر اچھی طرح غور کیجیے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ قرآن کے نزدیک ان کے اس فرار کی اصل علت ان کا استکبار ہے۔ وہ اپنے ہی اندر کے ایک شخص کو رسول ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، اس وجہ سے وہ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کے بھی منکر ہیں اور قیامت کو بھی ایک بعید از قیاس چیز قرار دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ استکبار میں مبتلا نہ ہوتے تو وہ اتنے بلید نہیں ہیں کہ اللہ کے کلام اور کاہنوں کی خرافات میں امتیاز نہ کر سکیں۔ اور قیامت کے اثبات کے جو دلائل قرآن ان کے سامنے پیش کر رہا ہے ان کو سمجھنے سے قاصر رہ جائیں۔

اس استکبار کی تفصیل پیچھے کی سورتوں میں گزر چکی ہے کہ یہ لوگ اوّل تو اپنی ہدایت کے لیے کسی رسول کی ہدایت کے قائل ہی نہیں ہیں اور اگر کسی درجے میں قائل ہیں بھی تو ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو وہ کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتا یا مکہ اور طائف کے سرداروں میں سے کسی کو رسول بناتا۔ ان سرداروں کے ہوتے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کو رسول بنا دے جو ایک بالکل غریب آدمی ہے۔

ان اعتراضوں کے جواب پیچھے کی سورتوں، بالخصوص چوتھے گروپ میں جس کا جامع عمود اثبات رسالت ہے اور جو الفرقان سے شروع ہوتا ہے، تفصیل سے دیے جا چکے ہیں۔ یہاں گروپ کے مضمون کے تقاضے سے ان کے ان شبہات سے تعرض کیا ہے جو وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے

جلنے کے امکان پر وارد کرتے تھے اور جن کو قرآن اور رسول کی مخالفت کے لیے، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا انھوں نے بہانہ بنا رکھا تھا۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (۴)

مخالفین کے شبہات کا جواب

فرمایا کہ دوبارہ زندہ کیا جانا اس وجہ سے ان کو بعید از امکان معلوم ہو رہا ہے کہ جسموں کے سڑ گل کر خاک میں مل جانے کے بعد ان کے اجزاء کو زمین کی تہوں سے فراہم کرنا، ان کے خیال میں، ناممکن ہے۔ یہ مغالطہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے علم کو اپنے علم پر قیاس کیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جسم انسانی کے جن اجزاء کو زمین تحلیل کرتی ہے، وہ ان سب کو جانتا ہے۔ کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔ جس نے ہر چیز کو خلق کیا ہے اور جس کے حکم ہی سے ہر چیز پر موت طاری ہوتی ہے، اس سے کوئی چیز کس طرح مخفی رہ سکتی ہے! 'اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ' (الملک: ۱۴) (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے؟) اور جب وہ جانتا ہے تو جب وہ چاہے گا ان تمام اجزاء کو فراہم کر کے ہر ایک کے جسم کو از سر نو تشکیل کر دے گا۔ اس کام میں اس کو ذرا بھی دشواری نہیں پیش آئے گی۔ جس نے ہر چیز کو عدم محض سے وجود بخشا اور اس کو اس میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، آخر دوبارہ اس کے منتشر اجزاء کو اکٹھا کر دینے میں اس کو کیوں دشواری پیش آئے گی!

'وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ'۔ یعنی اپنے ذاتی علم کے سوا اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا سارا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لیے ایک دفتر بھی قائم کر رکھا ہے جس میں یہ بھی درج ہے کہ کون شخص زمین کی کس پہنائی میں دفن ہے اور اس کے جسم کے اجزاء کہاں کہاں ہیں اور ہر شخص کے تمام اقوال و افعال بھی اس میں درج ہیں۔ نادانوں کو قیامت کے باب میں جس طرح یہ شبہ پیش آتا ہے کہ سڑ گل کر مٹی میں مل جانے کے بعد جسم انسانی کے اجزاء کو فراہم کرنا اور ان کو از سر نو جسم کی تشکیل میں تشکیل کرنا بھلا کس کے بس میں ہے اسی طرح یہ شبہ بھی پیش آتا ہے کہ ہر شخص کے ہر قول و فعل کا ریکارڈ کون محفوظ رکھ سکتا ہے کہ ایک دن وہ سب کا حساب کرنے اور سب کو سزا اور جزا دینے بیٹھے؟ اس ٹکڑے نے اس شبہے کو بھی صاف کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے تمام اقوال و اعمال کا ریکارڈ بھی ایک دفتر میں محفوظ کر رکھا ہے۔

یہ ریکارڈ محفوظ رکھنے کا معاملہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے لیے تو اچنبھے کا ہو سکتا تھا لیکن اس زمانے میں سائنس نے جو انکشافات کیے ہیں ان کو جاننے کے بعد، اگر کوئی شخص قرآن کے اس دعوے میں شک کرے تو ایسے ہٹ دھرموں کو کوئی بڑی سے بڑی دلیل بھی قائل نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ اس وقت مانیں گے جب ان کے ہاتھوں میں ان کے اعمال نامے پکڑا دیے جائیں گے۔

لیکن اس وقت کا ماننا بالکل بے سود ہو گا۔

بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَّرِيجٍ (۵)

لفظ 'حق' اسی سورہ کی آیت ۱۹ اور آیت ۴۲ میں قیامت کے لیے آیا ہے لیکن یہاں 'لَمَّا جَاءَهُمْ' کا قرینہ پتہ دے رہا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے جو قیامت سے لوگوں کو آگاہ کر رہا تھا لیکن لوگ اس کی تکذیب کر رہے تھے اور اس کی تکذیب کے لیے بہانہ کے طور پر قیامت کے خلاف وہ شبہات پیش کر رہے تھے جو اوپر بیان ہوئے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنے ان شبہات سے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ گویا قیامت فی الواقع ایک بہت بعید از امکان چیز ہے اور یہ اس کا انکار جو کر رہے ہیں تو اس کے لیے معقول وجوہ ان کے پاس ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ایک بالکل بدیہی حق کی تکذیب کی ہے اور وہ بھی اس وقت جب وہ ان کے سامنے بالکل واضح طور پر آ گیا۔

'لَمَّا جَاءَهُمْ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ قرآن مجید جس قیامت کی خبر دے رہا ہے وہ حق تو پہلے بھی تھی لیکن اب تک یہ لوگ اس کے باب میں اگر گرفتارِ شبہات رہے تو ان کے پاس کچھ عذر بھی تھا کہ یہ قرآن و کتاب سے ناآشنا امی تھے لیکن اب وہ کیا عذر کر سکتے ہیں جبکہ وہ ایک ایسے حق کا انکار کر رہے ہیں جو نصف النہار کے سورج کی طرح ان کے سروں پر چمک رہا ہے!

مکذبینِ قیامت کا تضادِ فکر 'فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَّرِيجٍ'۔ 'امر مریج' کی تشریح اہل لغت 'امر مختلط' یا 'امر ملتبس' کے الفاظ سے کرتے ہیں، یعنی ایک ایسی صورتِ حال جس میں نہایت واضح قسم کا تناقض و تضاد ہو۔ 'مرج' کے معنی 'خلط' یعنی گڈمڈ کر دینے کے ہیں۔ سورۂ رحمان میں ہے۔ 'مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ' (۱۹) (اس نے کھاری اور شیریں دونوں قسم کے دریا چھوڑے جو آپس میں ٹکراتے ہیں)۔ قرآن کی تکذیب کر کے مکذبین جس صورتِ حال سے دوچار ہوئے یہ اس کی ٹھیک ٹھیک تعبیر ہے کہ یہ لوگ ایک صریح قسم کے تضادِ فکر میں مبتلا ہو کے رہ گئے تھے۔ ایک طرف یہ خدا اور اس کی ان تمام صفات کا اقرار کرتے ہیں جو قیامت کو لازم کرتی ہیں، دوسری طرف قیامت کا انکار کرتے ہیں جو اس اقرار کا بالکل بدیہی تقاضا ہے۔ اس طرح وہ ایک ایسی ذہنی الجھن میں پھنس گئے ہیں جس سے نکلنے کی کوئی راہ ان کو سجھائی نہیں دے رہی ہے۔ اس الجھن سے نجات کی واحد راہ وہی ہے جو قرآن ان کو بتا رہا ہے، لیکن اس کو قبول کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں حالانکہ حق کی تکذیب کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ آدمی اپنی تکذیب کو جائز ثابت کرنے کے لیے جتنی دلیلیں ایجاد کرتا ہے وہ سب اس کے موقف کے بودے پن کو عریاں کرتی ہیں۔ قرآن نے ان کے اسی تضادِ فکر کی طرف سورۂ ذاریات میں، جو اس کی توام سورہ ہے، 'إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ' (۸) (بے شک تم لوگ

ایک شدید قسم کے تناقض میں گرفتار رہو) کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ اس مسئلہ کی پوری وضاحت سورۂ نمل کی آیت ۶۶ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ... الاٰیۃ کے تحت ہو چکی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان کی گمراہی میں سب سے زیادہ دخل اس کے اسی تضادِ فکر کو ہے۔ یا تو وہ اپنی سہل انگاری کے سبب سے رطب و یابس ہر قسم کے نظریات اپنے ذہن میں جمع کر لیتا ہے یا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں صحیح نظریات و عقائد کے ساتھ باطل نظریات بھی جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی زندگی مجموعۂ اضداد بن جاتی ہے۔ اگر انسان اپنے افکار کا برابر جائزہ لیتا رہے، تنقید کی صلاحیت مردہ نہ ہونے دے، اور خواہشاتِ نفس کی پیروی میں حق کے ساتھ باطل کا جوڑ ملانے کی کوشش نہ کرے تو وہ شیطان کے اس فتنہ سے محفوظ رہ سکتا ہے لیکن ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔

أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ ۝ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُنِيبٍ (۶-۸)

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی طرف اشارہ

یہ اللہ تعالیٰ نے مکذبینِ قیامت کو اپنی قدرت، ربوبیت اور حکمت کی ان بدیہی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو اوپر اور نیچے ہر جگہ نظر آتی ہیں اور ہر اس شخص کے اندر بصیرت اور یاددہانی پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں جس کے سینہ میں اثر پذیر اور متوجہ ہونے والا دل ہو۔

سب سے پہلے اپنی عظیم قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی کہ کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی کہ دیکھتے کہ کس طرح ہم نے اس کو بلند کیا، اس کو ستاروں سے سجایا اور ہماری قدرت و حکمت کا اعجاز ہے کہ ایسی ناپیدا کنار چھت میں کہیں کسی رخنہ کی نشان دہی وہ نہیں کر سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کی قدرت و حکمت کا یہ کرشمہ وہ اپنے سروں پر دیکھتے ہیں، کیا اس کے لیے ان کے مرنے کے بعد ان کو دوبارہ پیدا کر دینا مشکل ہو جائے گا!

اس کے بعد قدرت و حکمت کے ساتھ اپنی ربوبیت اور پرورش کے اہتمام کی طرف بھی توجہ دلائی۔ فرمایا کہ وہ اپنے نیچے دیکھیں کہ کس طرح ہم نے زمین کو ان کے قدموں کے نیچے بچھایا ہے اور اس کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے اندر پہاڑوں کی میخیں گاڑی ہیں اور اس میں طرح طرح کی چیزیں اگا رکھی ہیں جو ان کی غذا کے کام آتی ہیں اور جن کی خوش منظری ان کی باصرہ نوازی بھی کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس پروردگار کی قدرت و حکمت اور جس کی پروردگاری کی یہ شانیں وہ دیکھ رہے ہیں کیا اس کے لیے دشوار ہے کہ وہ ان کے مر جانے کے بعد، ان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے؟ کیا

جس پروردگار نے ان کی پرورش کا یہ اہتمام کر رکھا ہے وہ ان کو اس طرح چھوڑے رکھے گا کہ وہ کھائیں پئیں، عیش کریں، ان سے کبھی اس باب میں کوئی پرسش نہیں ہوگی۔

یہ دنیا اپنے وجود میں ایک درس گاہ معرفت ہے

'تَبْصِرَۃً وَّذِکْرٰی لِکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کے اندر اپنی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی یہ شانیں اس لیے نمایاں فرمائی ہیں کہ جو لوگ توجہ کرنے والے ہیں، ان کے اندر یہ بصیرت اور یاد دہانی پیدا کریں۔ 'تَبْصِرَۃً' سے مراد آنکھوں کے اندر بصیرت پیدا کرنا ہے کہ وہ ظاہر سے گزر کر اس حقیقت تک پہنچ سکیں جس کی طرف ظاہر رہنمائی کر رہا ہے۔ اور 'ذِکْرٰی' سے مراد غفلت کے حجاب کو دور کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کے چپے چپے کو ایسے عجائب اور کرشموں سے بھر دیا ہے جو آنکھوں کے پردے اٹھانے اور دلوں کے جھنجھوڑنے اور جگانے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن یہ کرشمے ان پر کارگر ہوتے ہیں جن کے اندر اثر پذیری کی حس موجود ہو۔ جو لوگ اپنی محسوس پرستی کی وجہ سے اپنی یہ حسِ لطیف مردہ کر چکے ہوں ان کے لیے یہ ساری کائنات ایک عالمِ ظلمات ہے۔ یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی طرف اس کتاب میں جگہ جگہ، ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ دنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام رنگا رنگیوں اور گلکاریوں کی محتاج نہیں تھی جو اس کے ہر گوشے میں نمایاں ہیں، لیکن قدرت نے اس فیاضی کے ساتھ اس کے اندر اپنی شانیں جو دکھائی ہیں تو اسی لیے دکھائی ہیں کہ انسان کی وہ حسِ لطیف جو قدرت، حکمت، حسن اور فیض و کرم سے اثر پذیر اور بیدار ہوتی ہے وہ بیدار ہو اور اس چمن کے ایک ایک پتہ پر جو درسِ حکمت ثبت ہیں وہ ان کو سیکھے اور سمجھے، لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ خالق نے ہر انسان کے اندر توجہ اور انابت کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے وہ اس کو بروئے کار لائے۔ اگر کوئی شخص اپنی اس صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کو ایسے بلید و بے حس جانوروں کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس نے انسان کو ذی ارادہ ہستی جو بنایا ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جو شعور اس کو عطا ہوا ہے اس کی قدر کرے اور اس کی رہنمائی میں آگے کے لیے قدم اٹھائے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کو خدا کی طرف سے مزید روشنی عطا ہوتی ہے ورنہ جو کچھ اس کو عطا ہوتا ہے وہ بھی اس کی ناقدری کی پاداش میں سلب ہو جاتا ہے۔

ان آیتوں میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔ اطمینانِ قلب اور شرحِ صدر کے لیے بعض حوالے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں، ان لوگوں کو خطاب کر کے، جو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو مستبعد خیال کرتے تھے، فرمایا ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیْ خَلَقَ — کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ جس اللہ نے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (بنی اسرآئیل: ۹۹)

آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ ان کی طرح پھر پیدا کر دے۔

منکرین قیامت کے اسی شبہ کا جواب سورۂ نازعات میں ان الفاظ میں دیا ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۭ بَنٰىهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۝ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۝ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝ (النّٰزعٰت: ۲۷-۳۳)

کیا تمہارا پیدا کیا جانا زیادہ کٹھن ہے یا آسمان کا؟ اس کو بنایا، اس کے گنبد کو بلند کیا، پھر اس کو اچھی طرح ہموار کیا، اور اس کی رات کو ڈھانک دیا اور اس کے دن کو بے نقاب کیا۔ اور اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ اس سے اس کا پانی اور چارہ برآمد کیا اور پہاڑوں کو لنگرانداز کیا۔ تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے برتنے کے لیے۔

ان آیات پر تدبر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں قدرت، عظمت، حکمت اور ربوبیت کے وہ سارے پہلو، کچھ مزید وسعت کے ساتھ، سمٹ آئے ہیں، جن سے سورۂ قٓ کی زیر بحث آیات میں قیامت کے وقوع، اس کی ضرورت اور اس کے مقتضائے صفات الٰہی ہونے پر استدلال فرمایا گیا ہے۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝ (۹-۱۱)

آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ ایک اور پہلو سے

یہ آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف ایک اور زاویہ سے توجہ دلائی جس سے آسمان و زمین کے درمیان توافق کے پہلو سے توحید کی شہادت بھی ملتی ہے۔ ان کے اندر ربوبیت کے جو اسباب ودیعت ہیں ان سے جزا و سزا کا لزوم بھی سامنے آتا ہے اور بارش سے مردہ زمین کے اندر جو حیات تازہ نمودار ہوتی ہے اس سے حیات بعد الممات کے وقوع کا بھی مشاہدہ ہر شخص کو ہوتا ہے۔

'مَآءً مُّبٰرَكًا' سے مراد وہ بارش ہے جو باعث زرخیزی و شادابی ہو۔ بعض مرتبہ ایسی بارش بھی ہوتی ہے جو زرخیزی کے بجائے تباہی کا باعث بن جاتی ہے اور وہ قوموں کے لیے عذاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں 'مبارک' کی صفت اسی شبہ کے ازالہ کے لیے ہے۔

'حَبَّ الْحَصِيْدِ' سے وہ اجناس مراد ہیں جن کا درو عمل میں آتا ہے اور جو ذخیرہ کی جاتی ہیں مثلاً گندم اور جو وغیرہ۔ باغوں کے ساتھ 'حَبَّ الْحَصِيْدِ' کے ذکر سے مقصود اس اہتمام ربوبیت کی طرف توجہ دلانا ہے جو اس کائنات کے رب نے اپنے بندوں کے لیے فرمایا ہے کہ اس نے لوگوں

کے لیے باغوں میں تازہ اور لذیذ پھل بھی پیدا کیے اور کھیتوں میں غذائی اجناس بھی اگائیں جو پکنے پر کاٹ کر ذخیرہ کر لی جاتی اور برابر کام آتی ہیں۔

'وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ' بظاہر جنّات کے بعد نخل کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ عام کے بعد خاص کا ذکر اس لیے ہوا کہ عرب کا خاص میوہ یہی تھا جو ان کے لیے بہترین پھل بھی تھا اور بڑی حد تک ان کی غذائی ضرورت بھی پوری کرتا تھا۔ اس کی درازقامتی اور اس کے تہ بہ تہ خوشوں کی طرف اشارہ مخاطب کے اندر مشاہدۂ کائنات کی حس اور شکرگزاری کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ہے کہ وہ قدرت کی ان نشانیوں کو دیکھے اور ان سے وہ اثر لے جو ایک حساس اور بیدار دل کو لینا چاہیے۔

'رِزْقًا لِّلْعِبَادِ' یعنی تہ بہ تہ خوشے خود اپنی صورت سے گواہی دے رہے ہیں کہ خالق نے ان پر اپنی قدرت، حکمت اور صناعی اس فیاضی کے ساتھ اس لیے صرف فرمائی ہے کہ اس کے بندے ان سے بہرہ مند ہوں، ان کے اندر اس کی حکمت و ربوبیت کی شانوں کا مشاہدہ کریں اور ان نعمتوں کا حق پہچانیں کہ ایک دن لازماً ان کی بابت اس سے پرسش ہونی ہے۔

'وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ' یہ وہ اصل مدعا ہے جس کو اس سورہ کے عمود کی حیثیت حاصل ہے۔ فرمایا کہ جس بارش کی یہ برکتیں دیکھتے ہو اسی بارش کا یہ کرشمہ بھی ہے کہ زمین جو بالکل مردہ اور بے آب و گیاہ ہوتی ہے، اس کے کسی گوشے میں بھی کسی سبزہ یا روئیدگی کا کوئی نشان نہیں ہوتا، بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی اس کے چپہ چپہ سے ایک حیاتِ تازہ نمودار ہو جاتی ہے اسی پر قیاس کرو مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کو بھی، جس سے تم کو آگاہ کیا جا رہا ہے، لیکن تم اس کو ناممکن خیال کر رہے ہو۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۙ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۙ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۭ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ (۱۲-۱۴)

قریش کو تہدید

یہ قریش کو تہدید ہے کہ ان سے پہلے قوم نوح، اصحاب الرس، ثمود، عاد، فرعون، قوم لوط، اصحاب الایکہ اور قوم تبع نے بھی اسی طرح تکذیب کی جب کہ اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے ان پر اچھی طرح حق کو واضح کر دیا۔ بالآخر اس تکذیب کے جس انجام سے ان کو آگاہ کیا گیا تھا وہ ان کے سامنے ظاہر ہو کر رہا۔ اسی طرح یہ لوگ بھی اگر اس تکذیب پر اڑے رہ گئے تو جس عذاب کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے وہ لازماً آ کے رہے گا اور آسمان و زمین کی کوئی طاقت ان کو خدا کی پکڑ سے بچا نہ سکے گی۔ یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو رسول کے ذریعہ سے اتمام حجت کے بعد لازماً

ظہور میں آتی ہے۔ اس کی وضاحت ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

اس تہدید کی طرف اشارہ اوپر آیت ۵ میں بھی ہو چکا ہے لیکن وہاں اس اشارے کے بعد کلام کا رُخ دلائل معاد کے ذکر کی طرف مڑ گیا تھا۔ دلائل کے بعد اس اشارے کی وضاحت فرما دی کہ اس جسارت کے ساتھ یہ لوگ جو تکذیب کر رہے ہیں تو اپنی ان پیش رو قوموں کے انجام کو سامنے رکھیں جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں کیفر کردار کو پہنچ چکی ہیں۔

اصحاب الرّس

یہاں جن قوموں کا ذکر آیا ہے ان سب کا حوالہ مختلف پہلوؤں سے پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکا ہے اور ہم بقدر ضرورت ان کی تاریخی حیثیت کی وضاحت کر چکے ہیں۔ اصحاب الرّس کا ذکر سورۂ فرقان کی آیت ۳۸ میں آیا ہے۔ اس کے تحت ہم ان کے بارے میں مفسرین کے اقوال کے حوالے بھی دے چکے ہیں اور اپنی رائے بھی ظاہر کر چکے ہیں۔ اگرچہ قوموں کے ذکر میں ترتیب یہاں تاریخی نہیں ہے لیکن قوم نوح کے بعد متصلاً اصحاب الرّس کا ذکر اس بات کا قرینہ ضرور ہے کہ ان کا تعلق قدیم اقوام بائدہ سے ہے جن میں اکثر کی تاریخ بالکل ناپید ہو چکی ہے۔

'کُلٌّ کَذَّبَ الرُّسُلَ' کے الفاظ سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ان کی طرف ایک رسول کی بعثت ہوئی جس کی انھوں نے تکذیب کی اور اس کے نتیجہ میں ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا جس نے ان کو فنا کر دیا۔ تفسیر کی کتابوں میں ایک روایت یہ بھی نقل ہوئی ہے کہ اس قوم نے اپنے رسول کو کنوئیں میں دفن کر دیا تھا۔ 'رَسٌّ' کنوئیں کو کہتے ہیں، اس وجہ سے ان کا نام اصحاب الرّس ہوا۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ رسولوں میں سے کسی کا اس کی قوم کے ہاتھوں قتل ہونا ثابت نہیں ہے۔ 'رسّ' کے معنی کنوئیں کے ہوں بھی تو اس کی طرف نسبت کے لیے اس واقعہ کی صحت ضروری نہیں ہے۔

'فرعون' کے ساتھ اس کی قوم کا ذکر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اصل مجرم کی حیثیت درحقیقت فرعون ہی کو حاصل تھی۔ اسی نے اپنی قوم کو گمراہ کیا۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے 'وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَہٗ وَمَا ھَدٰی' (۷۹) (اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور اس نے ان کو ٹھیک راہ نہ دکھائی) یہی بات دوسرے الفاظ میں یوں ارشاد ہوئی ہے 'اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی' (۲۴) (فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت سرکش ہو گیا ہے)۔

'قَوْمُ تُبَّعٍ' کا ذکر سورۂ دُخان کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ط بَلْ ھُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (۱۵)

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل

اوپر کی آیات ۶-۱۱ میں آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے خاص اہتمام کے ساتھ اپنی اس قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے جو آسمان و زمین کے ہر گوشے سے نمایاں ہے اور مقصود اس سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ان لوگوں کو قائل کرنا تھا جو مرنے کے بعد از سرِ نو اٹھا کھڑے کیے جانے کو بعید از امکان

تصور کرتے تھے۔ یہ انہی لوگوں کے سامنے سوال رکھا ہے کہ یہ لوگ ہمارے آسمانوں اور ہماری زمین کو دیکھ کر بتائیں کہ کیا پہلی بار ہم ان کو بنانے سے عاجز رہے ہیں! 'عَيِيَ بِالْأَمْرِ' کے معنی کی وضاحت اہل لغت نے 'اِذَا لَمْ يَهْتَدِ لِوَجْهِ عَمَلِهِ' کے الفاظ سے کی ہے۔ یعنی کوئی شخص ایک کام کرنے سے عاجز رہ جائے، اس کی سمجھ میں نہ آسکے کہ یہ کس طرح انجام دیا جائے۔

'بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ' یعنی یہ لوگ یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتے کہ ہم پہلی بار آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے قاصر رہے۔ ان کو اعتراف ہے کہ آسمانوں اور زمین کے خالق ہم ہی ہیں۔ البتہ ان کو اس باب میں تردد ہے کہ از سر نو ہم ان کو نہیں پیدا کر سکیں گے! ہمارے نزدیک اس جملہ کا انداز طنز یہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ پہلی بار پیدا کرنے میں ہم کو کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی تو دوبارہ کیوں رکاوٹ پیش آئے گی! ان لال بجھکڑوں سے کوئی پوچھے کہ کسی چیز کو پہلی بار بنانا مشکل ہوتا ہے یا دوسری بار! اگر ایک نقاش، نقش ثانی نقش اول کے مقابل میں زیادہ بہتر کھینچ سکتا ہے تو ہم دنیا کو از سر نو زیادہ آسانی سے کیوں نہیں پیدا کر سکتے!

۲۔ آگے آیات ۱۶-۳۵ کا مضمون

آگے کی آیات میں پہلے اس اہتمام کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے اقوال و اعمال کا ریکارڈ رکھنے کے لیے کر رکھا ہے۔ اس کے بعد قیامت کے ظہور اور مجرمین کے حاضر کیے جانے کی تصویر کھینچی ہے۔ اس کے بعد مجرمین کے جہنم میں ڈالے جانے اور ان کے باہمی لعن طعن کا بیان ہے۔ پھر اس فضل و انعام کی تفصیل ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے متقی بندوں پر فرمائے گا۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۶-۳۵

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ﴿١٦﴾ إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ﴿١٧﴾ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ﴿١٨﴾ وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذَٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ ﴿١٩﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ ﴿٢٠﴾ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ ﴿٢١﴾

لَقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ
الْيَوْمَ حَدِيدٌ ﴿٢٢﴾ وَقَالَ قَرِينُهُ هَٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ ﴿٢٣﴾
أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ ﴿٢٤﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ
مُّرِيبٍ ﴿٢٥﴾ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَأَلْقِيَاهُ فِي
الْعَذَابِ الشَّدِيدِ ﴿٢٦﴾ قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَلَٰكِن كَانَ
فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿٢٧﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ
إِلَيْكُم بِالْوَعِيدِ ﴿٢٨﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ
لِّلْعَبِيدِ ﴿٢٩﴾ يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ ع ۲ ۱۴ ۱۶
مِن مَّزِيدٍ ﴿٣٠﴾ وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ﴿٣١﴾ هَٰذَا
مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ﴿٣٢﴾ مَّنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ
وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ﴿٣٣﴾ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ۖ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ﴿٣٤﴾
لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴿٣٥﴾

ترجمۂ آیات: ۱۶-۳۵
اور انسان کو ہم نے پیدا کیا ہے اور ہم جانتے ہیں اس کے دل میں جو وسوسے گزرتے ہیں اور ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ ۱۶

دھیان رکھو جب کہ دو اخذ کرنے والے اخذ کرتے رہتے ہیں، ایک دائیں بیٹھا اور دوسرا بائیں بیٹھا۔ وہ کوئی لفظ بھی نہیں بولتا ہے مگر اس کے پاس ایک مستعد نگران موجود ہوتا ہے۔ ۱۷-۱۸

اور موت کی غشی شدنی کے ساتھ آپہنچی! یہ ہے وہ چیز جس سے تو کتراتا

رہا تھا! اور صور پھونکا جائے گا۔ وہ ہماری وعید کے ظہور کا دن ہوگا۔ اور ہر جان اس طرح حاضر ہوگی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہوگا اور ایک گواہ۔ تو اس سے غفلت میں پڑا رہا تو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا تو آج تو تیری نظر بہت تیز ہے! اور اس کا ساتھی کہے گا، یہ جو میری تحویل میں تھا، حاضر ہے۔ تم جھونک دو جہنم میں ہر ناشکرے، معاند، خیر سے روکنے والے، حدود کو توڑنے والے، مبتلائے شک کو جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود ٹھہرائے تو ڈال دو اس کو سخت عذاب میں۔ ۱۹-۲۶

اس کا ساتھی شیطان کہے گا، اے ہمارے رب میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا بلکہ یہ خود نہایت دور کی گمراہی میں پڑا رہا۔ ارشاد ہوگا، اب میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، میں نے پہلے ہی تمہیں اپنی وعید سے آگاہ کر دیا تھا۔ میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی اور میں بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔ ۲۷-۲۹

اس دن کو یاد رکھو جس دن ہم جہنم سے پوچھیں گے، کیا تو بھر گئی! اور وہ جواب دے گی کہ ابھی اور بھی ہیں! اور جنت متقیوں کے قریب لائی جائے گی، ذرا بھی دور نہ ہوگی۔ یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر رجوع کرنے والے اور حدودِ الٰہی کی حفاظت کرنے والے کے لیے جو خدائے رحمان سے ڈرا غیب میں، اور حاضر ہوا متوجہ رہنے والے دل کے ساتھ۔ داخل ہو جاؤ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ! یہ ہمیشگی کا دن ہے۔ ان کو ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔ ۳۰-۳۵

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (۱۶)

اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو محیط ہے

قیامت کے باب میں جہاں نادانوں کو یہ شبہ لاحق ہوتا ہے کہ انسان کے مرکھپ جانے اور زمین میں رل مل جانے کے بعد اس کے تمام اجزائے جسم کو فراہم کرنا اور از سرِ نو زندہ کر کے کھڑا کر دینا بھلا کس کے بس میں ہے اسی طرح یہ شبہ بھی بہتوں کو لاحق ہوتا ہے کہ ایک ایک شخص کے خلوت و جلوت کے تمام اقوال و افعال کا ریکارڈ کون رکھ سکتا ہے کہ ایک دن سب کا حساب کرنے بیٹھے اور ہر ایک کو جزا و سزا دے۔ یہ دونوں شبہات بالکل توام ہیں۔ اس وجہ سے اوپر آیت ۴ میں اجمالی طور پر دونوں کا جواب دیا ہے۔ پھر تفصیل کے ساتھ پہلے شبہ کی تردید فرمائی ہے۔ اب یہ دوسرے شبہے سے تعرض فرمایا ہے اور دلائل سے اس کا جواب دیا ہے۔ فرمایا کہ انسان کو ہم نے پیدا کیا ہے اور اس کے اقوال و اعمال تو درکنار اس کے دل میں جو وسوسے خطور کرتے ہیں ہم ان کو بھی جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ خالق ہے، اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے جوڑ جوڑ، بند بند کو استوار کیا ہے تو لازم ہے کہ وہ اس کے تمام چیزوں کے دروبست اور ان کے عمل سے اچھی طرح آگاہ ہو۔ اسی حقیقت کی طرف دوسرے الفاظ میں یوں توجہ دلائی ہے 'أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ' (الملک: ۱۴) (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا!) اگر خالق اپنی مخلوق کی تمام جزئیات سے باخبر نہ ہو تو وہ اس کی حفاظت اور اس کے بقاء کا انتظام کس طرح کرے گا؟

'وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ'۔ 'وَرِيدٌ' رگِ جاں کو کہتے ہیں۔ یہ عربی زبان کا ایک معروف محاورہ ہے جو غایت درجہ قرب کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ فرمایا کہ کوئی شخص اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اگر وہ ہم کو نہیں دیکھ رہا ہے تو ہم اس سے دور ہیں۔ ہم ہر شخص کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔ ہمارا علم اور ہماری قدرت ہر شخص کا ہر پہلو سے احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس کا تمام ظاہر و باطن ہر لمحہ ہماری نگاہوں میں ہے۔

إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (۱۷-۱۸)

لوگوں کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ رکھنے کے لیے مزید اہتمام

'عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ' میں تالیفِ کلام یوں ہے 'عن الیمین قعید وعن الشمال قعید' (ایک داہنے بیٹھا ہوا، دوسرا بائیں بیٹھا ہوا) عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق بتقاضائے ایجاز ایک جگہ لفظ 'قَعِيدٌ' محذوف ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

یہ اس مزید اہتمام کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اقوال و اعمال کا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لیے کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اول تو بذاتِ خود ہر شخص کے وساوس و خطراتِ قلب تک سے اچھی طرح باخبر ہے، مزید برآں اس نے اتمامِ حجت کے لیے یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ ہر شخص پر دو دو فرشتے مامور کر رکھے ہیں۔ جن میں سے ایک اس کے دہنے بیٹھا ہوتا ہے، دوسرا بائیں۔ جو بات بھی وہ کوئی لفظ بولتا ہے اپنے پاس ایک مستعد نگران اس کو نوٹ کرنے کے لیے حاضر پاتا ہے۔

یہاں اعمال کے نوٹ کیے جانے کا ذکر اگرچہ لفظوں میں نہیں ہے لیکن وہ علیٰ سبیل التغلیب اس میں داخل سمجھے جائیں گے، اس لیے کہ جب زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کے نوٹ کیے جانے کے لیے یہ اہتمام ہے تو ہاتھ پاؤں سے انجام دیے ہوئے اعمال کے نوٹ کیے جانے کا اہتمام تو بدرجۂ اولیٰ ہونا چاہیے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں فرشتوں میں تقسیمِ کار ہے۔ جو فرشتہ دائیں جانب مامور ہوتا ہے وہ نیک اعمال و اقوال کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ جو بائیں طرف ہوتا ہے وہ بُرے اعمال و اقوال کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ شہادت کے معاملے میں چونکہ دو گواہوں کی گواہی دین میں معتبر مانی گئی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی دو دو فرشتے مامور فرمائے۔

آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ آدمی کے وساوس و خطراتِ قلب ان فرشتوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ غیب صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور یہ اس کی ستاری ہے کہ اس نے بندوں کے دلوں کے بھیدوں کا علم اپنے ہی تک محدود رکھا ہے۔

اتمامِ حجت کے لیے ایک اور اہتمام

اس اہتمام کے علاوہ ایک اور اہتمام بھی اللہ تعالیٰ نے اتمامِ حجت کا کر رکھا ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کے ہاتھ پاؤں اور کان آنکھ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کے تمام اقوال و اعمال کی گواہی دیں گے۔ ہم جو کچھ زبان سے بولتے ہیں اس کا سارا ریکارڈ ہمارے کان محفوظ کر رہے ہیں اور جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی پوری فلم ہماری آنکھوں کی تحویل میں ہے۔ یہی حال ہمارے دوسرے اعضاء و جوارح کا ہے۔ ہم جو کچھ بھی کہتے یا کرتے ہیں سب خدا کے مامور کیے ہوئے پاسبانوں کے سامنے اور اسی کے بخشے ہوئے اعضاء و جوارح کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔ پھر یہ خیال کرنا کتنی بڑی حماقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ایک ایک قول و فعل کو کس طرح جان سکتا ہے کہ ان کا حساب کرنے بیٹھے گا!

'اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ' میں عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق 'اِذْ' سے پہلے ایک فعل محذوف ہے۔ یہاں چونکہ غافلوں کو ایک حقیقتِ نفس الامری کی یاددہانی کی جا رہی ہے اس وجہ سے کوئی ایسا فعل محذوف مانا جائے گا جس سے مخاطب کو تنبہ ہو۔ یعنی دھیان رکھو، خیال رکھو۔ میں نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ صاحبِ کشاف نے ایک دوسری شکل اختیار کی ہے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ط ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (۱۹)

قیامت ایک شدنی ہے

'حق' سے مراد وہی قیامت ہے جس کی قرآن خبر دے رہا تھا اور جس کی تکذیب کا ذکر اوپر آیت ۵ میں گزر چکا ہے۔ چونکہ وہ ایک شدنی اور ایک اٹل حقیقت ہے، اس وجہ سے اس کو 'حق' سے تعبیر فرمایا ہے۔ ماضی کا صیغہ اس کی قطعیت کے اظہار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو بہت دُور نہ خیال کرو بلکہ ایک آئی ہوئی چیز سمجھو۔ جتنے دن زندگی کے باقی ہیں بس اتنی ہی دیر قیامت کے آنے میں ہے۔ جونہی موت کی بے ہوشی طاری ہوئی قیامت گویا اس کے ساتھ ہی آ کھڑی ہے۔ اس وقت صورت حال خود تمھیں بتا دے گی کہ جس چیز سے تم کتراتے رہے تھے بالآخر وہ آ ہی گئی۔

قیامت ہر آدمی کی موت کے ساتھ لگی ہوئی ہے

'قیامت' کی یہی حقیقت احادیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے: مَنْ مَاتَ فقد قامت قیامتہ' (جو مرا اس کی قیامت آ گئی) اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے بعد برزخ کی جو زندگی ہے وہ درحقیقت قیامت ہی کا دیباچہ ہے۔ موت کے ساتھ ہی عالمِ آخرت کے احوال کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اہل ایمان کو ایمان کی حقانیت اور اس کے اچھے انجام کی شہادت مل جاتی ہے اور کفار کے سامنے اس انجام کے ظہور کا آغاز ہو جاتا ہے جس کی وہ دنیا کی زندگی میں تکذیب کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد کسی شک کی گنجائش کسی کے لیے بھی باقی نہیں رہ جاتی۔

قیامت کے باب میں اس کے منکرین کے ذہن کی صحیح تعبیر

'ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ' یہ بات زبانِ حال کی تعبیر بھی ہو سکتی ہے اور قولاً بھی ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت تم دیکھ لوگے کہ جس چیز سے تم کتراتے رہے وہ بالآخر سر پر آ ہی دھمکی۔ 'حَادَ یَحِیْدُ' کا صحیح مفہوم راستہ سے کترا کر چلنا ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک تعبیر ہے قیامت کے باب میں ان لوگوں کے رویے کی جو اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ قیامت سے بے پروا ہو کر زندگی گزارتے ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ قیامت کے دلائل ان سے مخفی ہیں، اس کے آثار تو ہر قدم پر موجود ہیں لیکن جو لوگ سیدھی راہ نہیں اختیار کرنی چاہتے وہ ان سے کترا کر چلتے ہیں، لیکن اس وقت یہ کیا کریں گے جب وہ ان کے سامنے آن کھڑی ہوگی۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ط ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ (۲۰)

یعنی اس کے بعد بس نفخ صُور ہی کا مرحلہ ہے۔ صُور پھونکا جائے گا اور وہ دن ظاہر ہو جائے گا جس سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے اور تم اس کی تکذیب کیے جا رہے ہو۔ اس کو بھی اس کی قطعیت کے اظہار کے لیے ماضی کے صیغہ سے ادا کیا ہے تاکہ نگاہوں کے سامنے مصوّر ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس مغالطہ میں نہ رہو کہ زندگی، پھر موت، پھر برزخ، پھر حشر و نشر بہت دُور کی بات ہے جب صور پھونکا جائے گا تو ایسا محسوس کرو گے کہ جس مدت کو تم بہت دراز سمجھتے تھے وہ پلک جھپکتے

گزر گئی۔

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ (۲۱)

روز قیامت کی پیشی کی تعبیر

یہ نفخ صور کے بعد کا مرحلہ ہے۔ اس دن ہر جان اپنے رب کے آگے پیشی کے لیے اس طرح حاضر کی جائے گی کہ ایک فرشتہ اس کے پیچھے سے اس کو ہانکنے کے لیے مامور ہوگا اور دوسرا اس کے اقوال و اعمال کے ریکارڈ کے ساتھ گواہی کے لیے۔ یہی مفہوم آیت سے متبادر بھی ہوتا ہے اور یہی سلف سے منقول بھی ہے۔ بعض لوگوں نے 'سائق' اور 'شہید' دونوں سے ایک ہی فرشتہ مراد لیا ہے کہ وہی ہانک کرلائے گا بھی اور وہی گواہی بھی دے گا۔ بعض لوگوں نے 'سائق' سے فرشتہ کو مراد لیا ہے لیکن 'شہید' سے آدمی اور اس کے عمل کو۔ یہ دونوں قول ہمارے نزدیک کمزور ہیں۔ پہلا عربیت کے پہلو سے کمزور ہے اور دوسرے میں صریح تکلف ہے جس سے آیت کے الفاظ ابا کر رہے ہیں۔

بعض لوگوں نے انہی دونوں فرشتوں کو مراد لیا ہے جن کا ذکر اوپر آیت ۱۷ میں گزرا ہے لیکن یہ بات بھی کمزور معلوم ہوتی ہے۔ یہ دونوں فرشتے، آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ آدمی کے اقوال و اعمال لکھنے پر مامور ہوتے ہیں۔ اگر انہی کو خدا کی عدالت میں پیش کرنے کے لیے آدمی کو حاضر کرنا بھی ہے تو دونوں کی ایک ہی حیثیت ہونی چاہیے۔ یعنی دونوں گواہ کی حیثیت سے پیش ہوں۔ اس بات کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ جب دونوں مامور ایک ہی حیثیت سے تھے تو ایک کی حیثیت تبدیل کیوں ہو جائے گی؟ بہرحال ان میں سے کوئی قول بھی ضعف سے خالی نہیں ہے۔ آیت کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے وہ وہی ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا کہ نفخ صور کے بعد ہر شخص کی پیشی اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اس طرح ہونی ہے کہ ایک فرشتہ اس کے پیچھے پیچھے اس کو ہانکنے کے لیے ہوگا اور دوسرا اس کے آگے آگے تمام اقوال و اعمال کے ریکارڈ کے ساتھ گواہی کے لیے۔

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (۲۲)

پیشی کے وقت ایک تنبیہ

اس وقت اس کو اللہ تعالیٰ متنبہ فرمائے گا کہ اس دن سے تم غفلت میں پڑے رہے تو آج ہم نے تمہاری آنکھوں کے آگے سے پردہ ہٹا دیا۔

'فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ' یہ فقرہ اس کی تفضیح کے لیے طنز کے انداز میں ہوگا کہ آج تو تمہاری نگاہیں بہت تیز ہیں! جس چیز کا امکان تمہیں کہیں دور دور تک نظر نہیں آرہا تھا آج اس کا ہر گوشہ کس طرح تمہارے آگے بے نقاب ہو گیا ہے!

یہ آیت اس آیت کے معارض نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ آیات الٰہی کے انکار کرنے والے قیامت کے دن اندھے اٹھائے جائیں گے۔ ان دونوں کا موقع و محل ہم واضح کر چکے ہیں۔

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ (۲۳)

مجرم کا پیشی عدالت میں

قرینہ دلیل ہے کہ 'قرین' سے مراد انہی دو میں سے کوئی ایک ہے جو 'سائق' اور 'شہید' کی حیثیت سے اس کو لے کر عدالتِ الٰہی میں حاضر ہوں گے۔ بعض لوگوں نے اس سے اس شیطان کو مراد لیا ہے جو اللہ تعالیٰ سے اعراض کرنے والے پر مسلط کر دیا جاتا ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ یہ شیطان نہ تو کسی کے بارے میں یہ کہہ سکنے کی پوزیشن میں ہوگا کہ یہ شخص جو میری تحویل میں تھا حاضر ہے، اور نہ وہ اس دن کسی کو بہکانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے گا۔ آگے اس کا قول آ رہا ہے کہ جب اس کے جال میں پھنسے ہوئے لوگ اپنی گمراہی کی ذمہ داری اس پر ڈالنی چاہیں گے تو وہ صاف اعلانِ براءت کرے گا کہ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ (قٓ : ۲۷) (اے ہمارے رب! میں نے اس کو گمراہ نہیں کیا بلکہ یہ خود نہایت دور کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا)۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس سے انہی دو میں سے کوئی ایک مراد ہے۔ یہ سوال کہ ان میں سے کون مراد ہے تو اس کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ اس سے 'شہید' بھی مراد ہو سکتا ہے اور 'سائق' بھی، اس لیے کہ یہ بات دونوں ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو میری تحویل میں تھا، حاضر ہے۔ چنانچہ اصحابِ تاویل نے اس میں اختلاف کیا بھی ہے۔ میرا رجحان اس طرف ہے کہ یہ بات 'سائق' کہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجرم اصلاً چارج میں اسی کے ہوگا اور اسی پر یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کو عدالت میں پیش کرے۔ چنانچہ جب وہ اس کو عدالت میں حاضر کر دے گا تو ایک فرض شناس سپاہی کی طرح اپنے فرض سے سبکدوشی کا اظہار ان الفاظ میں کرے گا کہ 'هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ' (یہ جو میری تحویل میں ہے، حضور کے سامنے حاضر ہے!)

اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ (۲۴)

ایک سوال اور اس کا جواب

'اَلْقِيَا' تثنیہ کا صیغہ ہے اس وجہ سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکم کن دو فرشتوں کو دیا جائے گا۔ عام طور پر اربابِ تاویل نے اس کا مخاطب انہی دو فرشتوں کو قرار دیا ہے جن کا ذکر اوپر 'سائق' اور 'شہید' کے الفاظ سے گزر چکا ہے۔ انہی کو حکم ہوگا کہ ہر ناشکرے معاند کو جہنم میں جھونک دو۔ اس تاویل میں بظاہر کوئی ضعف نظر نہیں آتا۔ ان دونوں کو یہ حکم دینے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہی اس کو جہنم میں ڈالیں بھی۔ یہ محض حکم کا بیان ہے۔ اس کی تعمیل میں وہ مجرم کو جہنم میں جھونکنے والے فرشتوں کے حوالہ کر دیں گے اور وہ اس کو جہنم کے اس طبقے میں، جو اس درجے کے مجرمین کے لیے خاص ہوگا، ڈال دیں گے۔

اس تثنیہ سے متعلق زمخشری نے ایک قول مشہور ادیب مبرّد کا بھی نقل کیا ہے کہ فصحائے عرب تثنیہ کا صیغہ بعض اوقات مجرد تکرارِ فعل کے مفہوم کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً امرؤ القیس

کے قصیدے کا مطلع ہے: 'قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرَى حَبِيبٍ وَمَنْزِلِ' اس کا ترجمہ عام طور پر تو لوگ یوں کرتے ہیں کہ 'میرے دونوں ساتھیو، ٹھہرو ذرا جاناں اور منزلِ جاناں کی یاد میں دو آنسو بہا لیں'۔ مبرّد کے اس قول کی روشنی میں 'قفا' کے معنی صرف 'ٹھہرو، ٹھہرو' کے ہوں گے۔ دو مخاطب فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح 'القیا' کا مفہوم آیت میں اس کے نزدیک 'ڈال دو، ڈال دو' ہوگا۔ مقصود اس سے اظہارِ غضب اور تاکیدِ حکم ہے، اس سے بحث نہیں کہ یہ حکم دو فرشتوں کو دیا جائے گا یا دو سے زیادہ فرشتوں کو۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہی بات سورۂ 'حاقہ' میں جمع کے صیغے سے بھی فرمائی گئی ہے: 'خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ' (۳۰-۳۲) (اس کو پکڑو اور اس کے گلے میں طوق ڈالو، پھر اس کو دوزخ میں داخل کرو، پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی پیمائش ستر گز ہے، اس کو جکڑ دو) میں نے اس قول کا حوالہ صرف غور و تحقیق کے مقصد سے دیا ہے۔ مجھے اس پر پورا جزم نہیں ہے۔ البتہ مزید تحقیق سے اس کے حق میں اطمینان بخش شواہد فراہم ہو جائیں تو اس سے بعض مشکلات کے حل میں مدد ملے گی۔ جہاں تک احوالِ آخرت کا تعلق ہے ان کے باب میں سلامتی کی راہ میرے نزدیک یہ ہے کہ الفاظِ قرآن سے جو مفہوم متبادر ہو آدمی اس پر ایمان رکھے۔ زیادہ کھوج کرید میں نہ پڑے۔

'كَفَّارٍ عَنِيْدٍ'۔ 'کفّار' کے معنی ناشکرے اور منکرِ حق کے ہیں اور 'عنید' کے معنی معاند کے۔ لفظ 'کفر' اصلاً خدا کی ناشکری اور اس کے حقوق کے انکار کے لیے آتا ہے۔ خدا کے حقوق میں کسی سلیم الفطرت کے لیے کسی بحث و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس وجہ سے ان کا منکر صرف کافر ہی نہیں بلکہ 'کفّار' ہے اور اس کی اس کفاری پر مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب وہ ان حقوق کا معاند مخالف بن کر اٹھ کھڑا ہو کہ دوسرے بھی ان کے ادا کرنے والے نہ بن سکیں۔

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبٍ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ (۲۵-۲۶)

خدا کے حقوق کے منکر لازماً بندوں کے حقوق کے بھی منکر ہوں گے

جو خدا کے حقوق کے منکر و معاند ہوں گے لازماً وہ اس کے بندوں کے حقوق کے معاملے میں بھی نہایت بخیل و ممسک اور دوسروں کو ان سے روکنے والے ہوں گے اور ساتھ ہی وہ 'معتدی' یعنی حدود سے تجاوز کرنے والے حقوق کو غصب کرنے والے بھی ہوں گے۔ لفظ 'خَير' یوں تو تمام نیکیوں اور بھلائیوں کے لیے عام ہے لیکن انفاق کی نیکی کے لیے یہ معروف ہے جس کا تعلق بندوں سے ہے۔ لفظ 'مَنَّاع' میں رکنے اور روکنے دونوں کا مفہوم موجود ہے۔ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ صرف خود ہی بخیل بننے پر قانع نہیں رہتے بلکہ دوسروں کو بھی بخیل بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی بخیلی کا راز فاش نہ ہو۔ مزید برآں اس طرح کے لوگ 'معتدی' بھی ہوتے ہیں۔ یہ صرف اتنے

پر صبر نہیں کرتے کہ دوسروں کے جو حقوق ان کے ذمہ ہیں ان کو دبائے بیٹھے رہیں بلکہ تعدّی کر کے یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسروں کے پاس جو کچھ ہے وہ بھی ان کے پاس نہ رہنے پائے بلکہ اس کے مالک بھی یہی بن بیٹھیں۔ 'مُرِیْبٍ' کے معنی مبتلائے شک کے ہیں۔ یوں تو یہ لفظ عام ہے۔ توحید یا آخرت جس باب میں بھی شک ہو وہ اس کے مفہوم میں داخل ہے لیکن قرآن میں اس کا معروف استعمال اس شک کے لیے ہوا ہے جو قیامت کے بارے میں ہو، جو اس سورہ میں موضوع بحث ہے۔ یہاں اس صفت کا ذکر ان تمام صفات کی اصل کی حیثیت سے ہوا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ قیامت کے باب میں شک ہی وہ چیز ہے جو آدمی کو ناشکرا، معاند، بخیل اور تعدّی کرنے والا بناتا ہے۔ چنانچہ ان تمام بیماریوں کے ذکر کے بعد اس اصل بیماری کا پتہ بھی دے دیا جس سے یہ تمام بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

'الَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ'۔ یہ آخر میں اسلوب بدل کر، خاص اہتمام کے ساتھ، شرک کا ذکر فرمایا۔ 'شرک' تمام دین و اخلاق کا ہادم اور تمام فساد فی الارض کی جڑ ہے۔ شرک کے ساتھ قیامت کو کوئی مانے بھی تو یہ ماننا بالکل بے اثر ہو کے رہ جاتا ہے۔ اگر آدمی اس وہم میں مبتلا ہو کہ فلاں خدا کا شریک یا اس کا ایسا چہیتا ہے کہ وہ جو بات چاہے خدا سے منوا سکتا ہے تو پھر اس کے لیے قیامت کا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہوا۔ وہ اپنے زعم میں اس کو راضی رکھ کے جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون بن سکتا ہے!

یہاں عربیت کے اس اسلوب پر بھی نظر رہے جس کا ذکر اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ جب صفات کا ذکر حرفِ عطف کے بغیر ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ یہ تمام صفات موصوف میں بیک وقت موجود ہیں۔ ساتھ ہی یہ نکتہ بھی نگاہ میں رہے کہ یہاں صفات کے بیان میں ترتیب فروع سے اصول کی طرف ہے۔ ناشکری اور بخل سے آغاز کیا ہے، انکار قیامت اور شرک پر ختم کیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ آدمی اگر قیامت کے باب میں مشتبہ اور شرک میں مبتلا ہو تو اس کا کردار وہ بنتا ہے جو ان آیات میں بیان ہوا۔

'فَاَلْقِیٰہُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ' یہ اسی اوپر والے 'اَلْقِیَا' کی تاکید ہے۔ اوپر فرمایا کہ اس کو جہنم میں جھونک دو۔ پھر اس کی صفات کا حوالہ دینے کے بعد مزید شدت و تاکید کے ساتھ فرمایا کہ اس کو جہنم کے 'عَذَابِ شَدِیْد' میں جھونک دو۔ 'جَھَنَّم' کے متعلق یہ وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ اس کے سات دروازے اور متعدد طبقات ہوں گے۔ مذکورہ صفات کے کردار کے لوگوں کے لیے اس کے عذابِ شدید میں داخل کرنے کا حکم ہوگا۔

قَالَ قَرِیْنُہٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَیْتُہٗ وَلٰـکِنْ کَانَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ ○ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْکُمْ بِالْوَعِیْدِ (۲۷-۲۸)

یہ جہنم کے بارے میں، داخل ہونے کے بعد کا ماجرا بیان ہو رہا ہے کہ اس میں داخل ہونے کے بعد ہر ایک اپنی گمراہی کا الزام اس شیطان پر تھوپنا چاہے گا جو سنت الٰہی کے مطابق ان لوگوں پر مسلط کر دیا جاتا ہے جو اللہ کی یاد سے غافل رہتے ہیں۔ شیطان جب دیکھے گا کہ اس کو مجرم بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے تو وہ آگے بڑھ کر اپنی صفائی پیش کرے گا کہ رَبَّنَا مَآ اَطْغَیْتُہٗ وَلٰکِنْ کَانَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ (اے ہمارے رب، میں نے اس کو طغیان میں نہیں مبتلا کیا بلکہ وہ خود ہی گمراہی میں اتنی دور نکل گیا تھا کہ وہاں سے اس کے لیے بازگشت کا امکان باقی نہیں رہا)۔ شیطان کے قول مَآ اَطْغَیْتُہٗ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ گمراہی کی دعوت دینے سے انکار کرے گا۔ قرآن میں تصریح ہے کہ وہ یہ اعتراف کرے گا کہ اس نے گمراہی کی دعوت ضرور دی لیکن اس دعوت کو قبول کرنے والا یہ خود بنا، اس پر اس کو اس نے مجبور نہیں کیا۔ دوسرے مقام پر اس کی وضاحت یوں ہوئی ہے۔

وَقَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰہَ وَعَدَکُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّکُمْ فَاَخْلَفْتُکُمْ وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُکُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَکُمْ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِکُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّ (ابراہیم: ۲۲)	اور جب معاملہ کا فیصلہ ہو جائے گا تو شیطان کہے گا کہ اللہ نے تم سے سچی بات کہی تھی وہ اس نے پوری کر دی اور میں نے تم سے جھوٹے وعدے کیے تھے سو میں نے خلاف ورزی کی اور مجھ کو تمہارے اوپر کوئی اختیار تو حاصل تھا نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہی تو مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے ہی کو ملامت کرو۔ اب تو نہ میں تمہارا فریادرس بن سکتا اور نہ تم میرے فریادرس بن سکتے۔

'وَلٰکِنْ کَانَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ گمراہی میں اتنی دور نکل جا چکا تھا کہ اس کے لیے حق کی طرف بازگشت کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جو لوگ نیکی کی راہ سے اپنے آپ کو بہت دور کر لیتے ہیں وہ بالآخر توفیق ہدایت سے محروم ہو کر شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ گویا شیطان نے اس بات کی دلیل بیان کی ہے کہ یہ شخص اگر اس کے ہتھے چڑھا تو اس وجہ سے کہ اپنی ضلالت پسندی کے سبب سے یہ سنت الٰہی کے مطابق اس کا مستحق بن چکا تھا۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح شیطان قیامت کے روز اپنے پیروؤں سے اظہار براءت کرے گا اسی طرح وہ لیڈر بھی ان لوگوں کی گمراہی کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کریں گے جو ان کی پیروی میں گمراہ ہوئے ہوں گے۔ یہ بات قرآن میں بار بار بیان ہوئی ہے۔ ہم سورۂ ابراہیم کے

ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ط قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ط سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ۝ (ابراھیم : ۲۱)	اور سب کے سب اللہ کے آگے پیش ہوں گے تو کمزور لوگ ان لوگوں سے جو بڑے بنے رہے، کہیں گے کہ ہم تو آپ لوگوں کے پیرو بنے رہے تو کیا آپ لوگ اللہ کے عذاب میں سے بھی کچھ حصہ بٹانے والے بنیں گے؟ وہ جواب دیں گے کہ اگر اللہ نے ہمیں ہدایت بخشی ہوتی تو ہم تمھیں بھی صحیح راہ بتاتے۔ اب تو یکساں ہے، خواہ ہم روئیں پیٹیں یا صبر کریں، ہمارے لیے اب کوئی مفر نہیں!

قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ۔ اس تو تکار پر اللہ تعالیٰ ان کو متنبہ فرمائے گا کہ اب میرے سامنے تمھارا یہ جھگڑا بالکل بے سود ہے۔ یہ الزام بازی کسی کو بھی اس کی گمراہی کی ذمہ داری سے بری قرار دینے والی نہیں بن سکتی۔ میں نے اپنی وعید سے ہر ایک کو پہلے سے آگاہ کر دیا تھا اس وجہ سے حجت تمام ہو چکی ہے اور کسی کے لیے بھی کسی عذر کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

'وعید' سے اشارہ اس وعید کی طرف ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے عین اس وقت آگاہ فرما دیا تھا جب ابلیس نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کیا تھا کہ اگر تو نے مجھے مہلت دی تو میں اولادِ آدم کی اکثریت کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جا، جس کو تو گمراہ کر سکے، گمراہ کر لے۔ میں بھی آگاہ کرتا ہوں کہ جو بھی تیری پیروی کریں گے، خواہ جنات ہوں یا انسان، میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔

اس وعید کے بعد اللہ تعالیٰ نے برابر اپنے نبی اور رسول بھیجے جو وقتاً فوقتاً کے ساتھ آ کر، لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے بھی آگاہ کرتے رہے اور شیطان اور اس کی ذریات کی پیروی کے انجام سے بھی جو گمراہی میں مبتلا ہوتے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد وہ جن نتائج سے دوچار ہوں گے ان میں انھوں نے جان بوجھ کر گویا خود چھلانگ لگائی ہے۔

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۲۹)

یہ اسی بات کی مزید وضاحت اور تاکید ہے۔ فرمایا کہ جس بات سے میں پہلے سے آگاہ کر چکا ہوں، اب تمھارے ایک دوسرے پر الزام دھرنے یا رونے دھونے سے وہ بدلی نہیں جا سکتی۔ اللہ کے وعدے اور اس کی وعیدیں بالکل قطعی اور اٹل ہیں۔ یہ جو کچھ تمھارے سامنے آ رہا ہے تمھارے اپنے ہی اعمال کا ثمرہ ہے اس وجہ سے اب اس کو بھگتو۔ میں اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم

کرنے والا نہیں ہوں۔

عربیت کے ایک اسلوب کی وضاحت

'وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ' میں عربیت کا جو اسلوب ہے اس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہم کر چکے ہیں کہ جب مبالغہ پر نفی آتی ہے تو اس سے مقصود مبالغہ فی النفی ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے معنی ہوں گے کہ میں بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔ ہمارے مفسرین اور مترجمین عام طور پر اس اسلوب سے چونکہ ناواقف ہیں اس وجہ سے وہ اس کو 'لَیْسَ بِظَالِمٍ' کے معنی میں لیتے ہیں اور مترجمین اپنے ترجموں میں انہی کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ یہ الفاظ قرآن سے صریح بے پروائی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر مقصود یہی کہنا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظالم نہیں ہے تو زبان کا سادہ اسلوب چھوڑ کر اس مطلب کے ادا کرنے کے لیے 'لَیْسَ بِظَلَّامٍ' کا اسلوب کیوں اختیار کیا جاتا؟ قرآن میں ہر لفظ اور ہر اسلوب کا ایک خاص مقام ہے جس کو اچھی طرح سمجھے بغیر آیت کی صحیح تاویل ممکن نہیں ہے۔

کلامِ عرب میں اس اسلوب کی مثالیں موجود ہیں۔ شعرائے جاہلیت میں سے امراؤالقیس نے اپنے اشعار میں 'اَلْمَرْءُ لَیْسَ بِقَتَّالٍ' اور 'اَلْمَرْءُ لَیْسَ بِقَتَّالٍ' کی ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ اس کے حریف نے اس کو جنگ اور قتل کی دھمکی دی تھی تو اس نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ یہ مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے حالانکہ اس بزدل میں قتل و قتال کا ذرا بھی داعیہ نہیں ہے۔ 'لَیْسَ بِقَتَّالٍ' اس کے اندر کچھ بھی کر سکنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ بعض دوسرے شعراء نے بھی، مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس طرح کی ترکیبیں استعمال کی ہیں لیکن افسوس ہے کہ دم تحریر میرے پاس دواوین نہیں ہیں۔ تاہم میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی صحت پر مجھے پورا اطمینان ہے۔

قرآن میں یہی بات دوسرے اسلوب میں بھی فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (۴۰) اللہ ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔

سورۂ یونس میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا (۴۴) اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا۔

اگر کسی شخص کو یہ شبہ ہو کہ 'مبالغہ فی النفی' کا جو ضابطہ ہم نے بیان کیا ہے وہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے تو اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ ہماری تاویل کی صحت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ یہ قاعدہ عربی میں، ایک جزئیہ کی حیثیت ہی سے سہی، موجود ہے۔ جب یہ قاعدہ موجود ہے تو قرآن کی تاویل میں تمام اہل فن کے نزدیک یہ اصول مسلّم ہے کہ کسی آیت میں دو تاویلوں کا امکان ہو تو اس تاویل کو ترجیح دی جائے گی جو احسن اور بظاہر قرآن کے مطابق ہو۔ یہاں ہماری تاویل کے حق میں کئی باتیں موجود ہیں۔

— یہ عربیت کے اسلوب کے مطابق ہے۔
— یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے شایان شان ہے اس لیے کہ وہ بہر حال ہر شائبۂ ظلم سے پاک ہے۔ وہ نہ نیکوں پر کوئی ظلم کرے گا نہ بدوں پر۔
— قرآن کے نظائر و شواہد سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

ہمارے مفسرین میں سے صرف صاحب کشاف نے اس آیت کے اشکال سے تعرض کیا ہے، لیکن انھوں نے جس طرح اس کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اس سے ان کے مسلکِ اعتزال کی تائید تو نکل آتی ہے لیکن ساتھ ہی بعض دوسرے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں جن سے انھوں نے تعرض نہیں کیا۔

ان کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اپنے اطاعت گزار بندوں پر ظلم کرے تو یہ بڑا ظلم ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا ظالم نہیں ہے۔

صاحبِ کشاف کی اس تاویل پر یوں تو بہت سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں لیکن ہم بخیالِ اختصار صرف دو باتوں کا ذکر کریں گے۔

ایک یہ کہ آیت میں اطاعت گزاروں یا نافرمانوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ 'عَبِیْد' (بندے) کا لفظ ہے جو تمام بندوں کو عام ہے، خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ ہر ایک سے متعلق یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر کوئی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ تحدید و تخصیص بالکل بے دلیل بلکہ قرآن کے الفاظ کے خلاف ہے۔

دوسری یہ کہ آیت کے سیاق و سباق پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات فرمائی ہی ہے ان لوگوں کو مخاطب کر کے جو جہنم کے مستحق ٹھہرے۔ ان کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ وہی معاملہ ہوا ہے جس کے تم سزاوار تھے۔ اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

کشاف کی اسی تاویل کو اس دور کے بعض لوگوں نے اس رنگ میں پیش کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ خالق ہے، وہ خالق ہو کر اگر اپنی مخلوق پر ظلم کرے تو یہ بہت بڑا ظلم ہو جائے گا درآنحالیکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی شان کے منافی ہے کہ وہ بہت بڑا ظالم بن جائے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے ظلّام ہونے کی نفی فرمائی۔

یہ بات کہنے والوں کو شاید علم نہیں ہے کہ ہمارے متکلمین کے سوادِ اعظم نے تو اسی دلیل کی بنا پر کہ خدا خالق ہے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ خدا کے کسی فعل پر ظلم و جور کا حکم لگایا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ اگر نیکوں کو جہنم میں ڈال دے تو یہ بھی عدل ہے اور اگر نافرمانوں کو جنت بخش دے تو یہ بھی عدل ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ پرانے متکلمین کی یہ بات غلط ہونے کے

باوجود اتنی غلط نہیں ہے جتنی غلط اس دور کے نئے متکلمین کی بات ہے۔

دوسرے ان حضرات نے اس پہلو پر بھی غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے ظلم و جور کی جو نفی کی ہے تو اپنی صفاتِ عدل، رحمت اور حکمت کی بنا پر کی ہے۔ اس بنیاد پر کہیں اس کی نفی نہیں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اس وجہ سے وہ بڑا ظالم نہیں بن سکتا۔

مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ان حضرات کی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا، وہ یہ کہ اگر یہ فلسفہ صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ غیر خالق کی طرف سے مخلوقاتِ الٰہی پر ظلم ہو تو خواہ وہ کتنا ہی بڑا ظلم ہو لیکن وہ ظلّام نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ فرعون و ہامان اور نمرود و شدّاد بھی ان کے نزدیک بڑے ظالم نہیں ہوں گے اس لیے کہ وہ خالق نہیں تھے اور بڑا ظلم صرف وہی ہوتا ہے جو خالق سے صادر ہو۔ معلوم نہیں یہ علم کلام ان حضرات نے کس مکتب میں پڑھا ہے کہ جو خالق و رازق ہے وہ اگر ظلم کرے تو وہ ظلّام ہو جائے اور جو نہ خالق ہیں نہ رازق وہ اگر ظلم ڈھائیں تو صرف ظالم رہیں؟

بہرحال یہ ساری موشگافیاں، خواہ قدیم متکلمین و مفسرین کی ہوں یا نئے مترجموں و مفسروں کی، عربی زبان کے اس اسلوب سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں جس کی ہم نے اوپر وضاحت کی ہے۔

یَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ (۳۰)

اللہ تعالیٰ کی بے نیازی

فرمایا کہ اس دن کو اچھی طرح یاد رکھو جس دن ہم دوزخ سے سوال کریں گے کہ تو اچھی طرح بھر گئی یا نہیں! وہ جواب دے گی ابھی اور بھی ہیں! یہ سوال و جواب صورتِ حال کی تعبیر بھی ہو سکتا ہے اور بیانِ واقعہ بھی۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں بنائی ہیں وہ سب اس کے سوالوں کو سمجھتی بھی ہیں اور ان کے جواب بھی دیتی ہیں۔ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ جب چاہے صامت چیزوں کو بھی ناطق بنا دے۔ قرآن میں ہے کہ جب مجرموں کے اعضاء و جوارح ان کے خلاف گواہی دیں گے تو وہ حیران ہو کر ان سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے کہ أَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حٰم السجدة: ۲۱) (ہمیں اسی خدا نے ناطق بنا دیا جس نے ہر چیز کو ناطق بنایا)۔

یہ سوال و جواب اللہ تعالیٰ کی بے نیازی اور اس کے بے پایاں غضب کی تصویر ہے کہ دوزخیوں کو دوزخ میں بھرتے ہوئے ذرا بھی اس کو تردد لاحق نہیں ہوگا بلکہ وہ پوری بے نیازی سے سب کو جہنم میں پھینکوا دے گا اور پھر جہنم سے پوچھے گا کہ کیوں تیرا پیٹ اچھی طرح بھر گیا یا نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اتنی بے شمار خلقت کو جہنم میں جھونکنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو کچھ تأسف ہوگا کہ اپنی پیدا کی ہوئی اتنی مخلوق کو میں نے آگ میں جھونک دیا بلکہ اس کے جوشِ غضب کا یہ حال ہوگا کہ اور بھی ہوں تو ان کو بھی وہ جہنم کا ایندھن بنا دے۔

'وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ'۔ جہنم کے اس جواب کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ جس جوشِ غضب کے ساتھ یہ سوال فرمائے گا اسی جوش کے ساتھ وہ بھی جواب دے گی کہ اور بھی ہوں تو میرے اندر بڑی سمائی ہے، ان کو بھی لائیے۔ دوسرا یہ کہ دوزخیوں کی اس کثرت کو دیکھ کر اس کا حوصلہ جواب دے جائے گا اور وہ بے حوصلہ ہو کر جواب دے گی کہ کیا اور بھی ہیں! اگرچہ آیت کے الفاظ سے یہ دونوں مفہوم نکل سکتے ہیں لیکن میں پہلے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ مفہوم لینے میں دوزخیوں پر اللہ تعالیٰ کے جوشِ غضب اور جہنم کے جوشِ غضب میں پوری مطابقت ہو جاتی ہے اور یہی بات دوزخ کے لیے موزوں ہے کہ وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل پورے جوش و ولولہ کے ساتھ کرے۔ دوسری یہ کہ قرآن میں جگہ جگہ دوزخ کی وسعت کا بیان اس انداز سے ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ان لوگوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بھلا اتنی مخلوق کو بھرنے کے لیے اتنی وسیع دوزخ کہاں سے لائی جائے گی۔ آیت 'لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ... الاٰية' (الحجر: ۴۴) کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔[1] تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض مقامات میں دوزخ کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے کہ جب دوزخی اس میں جھونکے جائیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ جوشِ غضب سے پھٹی پڑ رہی ہے۔ 'اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ہ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ' (الملک: ۷-۸) یہی مضمون سورۂ ہود کی آیت ۱۰۶ میں بھی ہے۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (۳۱)

متقیوں کی عزت افزائی

دوزخیوں کے بعد اب یہ متقیوں کا انجام بیان ہو رہا ہے کہ ان کی تشریف و تکریم اس طرح ہوگی کہ جنت، ایک پیشکش کی طرح، ان کے قریب لائی جائے گی۔ اس تک پہنچنے کے لیے انھیں کوئی زحمتِ سفر نہیں اٹھانا پڑے گی دراں حالیکہ وہ کچھ دور نہیں ہوگی۔ 'غَيْرَ بَعِيْدٍ' میرے نزدیک 'جنت' سے حال واقع ہے۔ اس حال کے لانے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ 'قریب لانے' کے الفاظ سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ وہ بہت دور سے قریب لائی جائے گی جس میں کچھ وقفہ صرف ہوگا؛ بلکہ وہ بالکل قریب ہی ہوگی لیکن اہل جنت کی عزت افزائی کے لیے مزید قریب لائی جائے گی۔ لفظ 'بعید' اگرچہ مذکر ہے لیکن اس کا مؤنث سے حال پڑنا عربیت کے خلاف نہیں ہے۔ زمخشری نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور مجھے اس کی رائے سے اتفاق ہے۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ (۳۲)

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد سوم، صفحات: ۶۰۶ - ۶۰۷

یعنی جنت کو قریب لا کر ان الفاظ کے ساتھ اہلِ جنت کو اس میں داخل ہونے کا پروانہ دیا جائے گا کہ یہ ہے وہ صلہ جس کا آپ لوگوں سے دنیا میں نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔ اب اس وعدے کا ایفاء ہو رہا ہے۔ مضارع سے پہلے عربیت کے قاعدے کے مطابق فعل ناقص محذوف ہے، یعنی 'مَا کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ'۔ 'هٰذَا' سے اشارہ اسی جنت کی طرف ہے لیکن یہاں عربیت کے قاعدہ کے مطابق اس سے علی سبیل التعجیل صلہ اور انعام مراد ہے اس اسلوب کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'لِکُلِّ اَوَّابٍ حَفِیۡظٍ' یہ اہلِ جنت کے اس کردار کا بیان ہے جس کی بنا پر وہ جنت کے حق دار ٹھہرائے گئے۔ اوپر اہلِ دوزخ کا کردار آیات ۲۵-۲۷ میں بیان ہو چکا ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اب یہ اس کے مقابل میں مستحقینِ جنت کا کردار بیان ہو رہا ہے کہ یہ اپنے رب کی طرف برابر رجوع رکھنے والے، اس کے حدود و قیود کی حفاظت کرنے والے تھے۔ ان دونوں صفتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایک کا تعلق دل سے ہے اور دوسری کا تعلق عمل سے۔ اگر آدمی کا دل زندہ و بیدار ہو تو زندگی کے تمام ہنگاموں کے اندر اس کا دل برابر اپنے رب کی طرف رجوع رہتا ہے۔ کسی وقت بھی اس پر ایسی غفلت یا سرکشی کی حالت طاری نہیں ہوتی کہ اسے خدا کے حدود و محارم کا بھی کچھ ہوش نہ رہے اور وہ ان کو توڑ تاڑ کے رکھ دے۔ نفس کی کسی اکساہٹ کے باعث اگر اس سے کبھی تجاوز صادر ہو جاتا ہے تو اس کا دل فوراً متنبہ ہوتا ہے اور وہ توبہ و استغفار کے ذریعے سے پھر اپنے رویہ کی اصلاح کر لیتا ہے۔ ان دو لفظوں کے اندر ایک صحیح مومن کا باطن و ظاہر دونوں بیان ہو گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ ایک باوفا مومن ہونے کے لیے ترکِ دنیا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی امتحان یہ ہے کہ وہ اس کارزارِ حیات میں رہتے ہوئے اپنے اوّاب و حفیظ ہونے کو ثابت کرے۔ یہ امر بھی یاد رکھیے کہ اسلام میں ہر شخص کے لیے شب و روز میں پانچ مرتبہ مسجد کی حاضری اسی اوابیت کو زندہ رکھنے کے لیے ہے۔ اس طرح گویا مومن اپنے مرکزِ ثقل سے وابستہ رہتا ہے اور شیطان اس پر کبھی اتنا قابو نہیں پاتا کہ اس کو فواحش و منکرات میں مبتلا کر دے۔ 'اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ' (العنکبوت: ۴۵)۔

مَنۡ خَشِیَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَیۡبِ وَجَآءَ بِقَلۡبٍ مُّنِیۡبِۨ (۳۳)

اوپر مستحقینِ دوزخ کے بارے میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے کہ وہ دربابِ قیامت مبتلائے شک رہے اور اللہ کے مقابل میں انھوں نے دوسرے سہارے بنا لیے۔ وہاں ہم نے بیان کیا ہے کہ یہی دونوں چیزیں درحقیقت ام الامراض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہاں اس کے مقابل میں اہلِ جنت کے باب میں فرمایا کہ یہ اس قسم کے کسی وہم میں نہیں مبتلا ہوئے بلکہ غیب میں رہتے، خدائے رحمان سے

ڈرتے رہے اور چونکہ انھوں نے خدا کے سوا کوئی اور سہارا تلاش نہیں کیا اس وجہ سے اپنے رب کے حضور میں ایک ایسے دل کے ساتھ حاضر ہوئے جس کی ساری توجہ اپنے رب ہی کی طرف رہی اس لیے کہ ان کی ساری امیدیں اسی سے وابستہ تھیں، کسی اور سے انھوں نے لو نہیں لگائی۔

دین کی ایک عظیم حکمت

'مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ' میں خدا کی صفت 'رحمٰن' کا حوالہ دین کی ایک عظیم حکمت کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ بالآخر ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ان لوگوں کو جزا دے جنھوں نے اس دنیا میں ایک 'اوّاب' اور 'حفیظ' کی زندگی گزاری اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے 'کفّار' اور 'عنید' بن کر اس میں دھاندلی مچائی۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نعوذ باللہ نیکی اور بدی، ظلم اور عدل دونوں اس کی نگاہوں میں یکساں ہیں۔ درآنحالیکہ یہ بات اس کی رحمانیت و رحیمیت کے بالکل منافی ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا یہ لازمی تقاضا بیان فرمایا ہے کہ وہ قیامت کا دن ضرور لائے گا۔ 'كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ' (الانعام: ۱۲) (اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے کہ وہ تم کو ضرور قیامت کے دن کے لیے جمع کر کے رہے گا) اہلِ ایمان چونکہ اپنے رب کی اس صفت اور اس کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتے رہے اس وجہ سے انھوں نے قیامت کو اٹل حقیقت سمجھا اور اس کے لیے برابر بیدار رہے۔

'بِالْغَيْبِ' میں 'ب' ظرفیہ ہے۔ منکرینِ قیامت کے باب میں تو اوپر ارشاد ہوا کہ قیامت کے دن ان کے سامنے جب حقائق آشکارا ہوں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ 'لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ' (قٓ: ۲۲) (تم اس دن سے غفلت میں رہے تو ہم نے تمھاری نگاہوں کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا تو آج تو تمھاری نگاہیں بہت تیز ہیں) اس کے برعکس ان اہلِ ایمان کا حال یہ رہا کہ اسی دنیا میں رہتے اور آخرت کے حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کیے بغیر، مجرد آفاق و انفس کے دلائل اور نبیوں کی تعلیم کی بنا پر وہ آخرت کو مانتے اور اپنے رب سے ڈرتے رہے۔

'قلب منیب' سے مراد وہ دل ہے جو رنج و راحت اور امید و بیم ہر حال میں اپنے رب ہی کی طرف متوجہ رہا۔ کسی حال میں بھی اپنے رب سے منہ موڑ کر کسی اور سے اس نے لو نہیں لگائی۔

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ (۳۴)

ابدی بادشاہی

یعنی ان سے کہا جائے گا کہ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ اب نہ اس میں تمھارے لیے ماضی کا کوئی پچھتاوا ہوگا نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔ ابدی بادشاہی کا جو وعدہ تم سے کیا گیا تھا اس کے دیے جانے کا وقت آگیا۔ یہ بادشاہی تم سے کبھی چھینی نہیں جائے گی اور نہ کبھی اس

میں کوئی خوف پیدا ہوگا۔ سورۂ حجر کی آیت ۴۶ میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے: اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ (اس میں داخل ہو جاؤ، کامل سلامتی کے ساتھ، ہر اندیشہ سے بے خوف ہو کر) قرآن میں اس بات کا ذکر بھی جگہ جگہ آیا ہے کہ فرشتے سلام کے ساتھ اہل جنت کا خیر مقدم کریں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کے سلام و پیام کا ذکر بھی آیا ہے، لیکن ان کا محل اور ہے۔ یہاں مدعا وہی ہے جس کی تائید سورۂ حجر کی آیت سے ہو رہی ہے۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (۳۵)

اس میں ان کو وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس مزید بھی ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ جو وہ چاہیں گے وہ تو ان کو ملے گا ہی لیکن ہمارے پاس ایسی نعمتیں بھی ہوں گی جن کا ان کو کوئی تصور بھی نہیں ہوگا کہ وہ ان کے ارمان کر سکیں لیکن ہم ان کے چاہے بغیر ہی وہ نعمتیں بھی ان کو دیں گے۔ اسی حقیقت کی طرف دوسرے الفاظ میں یوں بھی اشارہ فرمایا گیا ہے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (السجدۃ ۱۷) (پس کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس کے لیے آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے)۔

۴۔ آگے آیات ۳۶ - ۴۵ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ پہلے قریش کو تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اپنی موجودہ قوت و دولت کے غرّے میں خدا سے لڑنے کی جسارت نہ کرو۔ تم سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں جو قوت و صولت میں تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوئی ہیں لیکن جب خدا نے ان کو پکڑا تو وہ اپنے کو بچا نہ سکیں۔ اگر تمھارے پاس سمجھنے والے دل اور سننے والے کان ہیں تو ان کی سرگزشتوں میں تمھارے لیے بڑا درسِ عبرت ہے۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ مخالفین جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کرو۔ قیامت شدنی ہے۔ ہم آسمان و زمین کو پیدا کر کے تھک نہیں گئے کہ مرنے کے بعد لوگوں کو دوبارہ زندہ کر سکیں گے۔ پس کان لگائے ہی رکھو۔ وہ دن آہی رہا ہے جب خدا کا منادی پکارے گا اور سب قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ پس صبر کرو اور نماز کا اہتمام رکھو۔ تمھاری ذمہ داری لوگوں کو مومن بنا دینا نہیں ہے، بلکہ صرف اس قرآن کے ذریعہ سے ان لوگوں کو ہماری وعید سے آگاہ کر دینا ہے جو آگاہ ہونا چاہیں۔ ___ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا آیات ۳۶-۴۵

فَنَقَّبُوْا فِی الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٣٦﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی
لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴿٣٧﴾ وَلَقَدْ
خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ
وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿٣٨﴾ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ
بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿٣٩﴾
وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿٤٠﴾ وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ
الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿٤١﴾ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ؕ
ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿٤٢﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا
الْمَصِيْرُ ﴿٤٣﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ ذٰلِكَ حَشْرٌ
عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿٤٤﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ
بِجَبَّارٍ ۫ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿٤٥﴾ ع ۳ ۱۶ ۱۷

ترجمۂ آیات: ۳۶-۴۵

اور کتنی ہی قومیں ہم نے ہلاک کر چھوڑیں ان سے پہلے جو قوت میں ان سے بڑھ چڑھ کر تھیں تو جس کا جدھر سینگ سمایا ادھر کو، ملکوں میں، چل کھڑا ہوا کہ ہے کوئی پناہ کی جگہ! بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی یاد دہانی ہے جن کے پاس دل ہو یا وہ بات سننے کے لیے کان لگائیں، متوجہ ہو کر۔ ۳۶-۳۷

اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کو، چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہیں ہوئی۔ تو جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی تسبیح کرتے رہو، اس کی حمد کے ساتھ، سورج کے

طلوع اور اس کے غروب سے پہلے اور رات میں بھی اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کے ڈھلنے کے بعد بھی۔ ۳۸-۴۰

اور کان لگائے رکھو جس دن منادی بہت قریب کی جگہ سے پکارے گا جس دن یہ سنیں گے چیخ کو شدنی کے ساتھ۔ وہ دن نکل کھڑے ہونے کا ہو گا۔ بے شک ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف لوٹنا ہو گا۔ اس دن زمین ان کے اوپر سے کھل جائے گی اور وہ تیزی سے نکلتے ہوں گے۔ یہ اکٹھا کر لینا ہمارے لیے نہایت آسان ہے۔ ۴۱-۴۴

ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اور تم ان پر کوئی داروغہ مقرر نہیں ہو۔ پس اس قرآن کے ذریعے سے ان لوگوں کو یاددہانی کردو جو میری وعید سے ڈرتے ہوں۔ ۴۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ (۳۶)

قریش کو تنبیہ

یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ وہ اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ ان کو بڑی قوت و شوکت حاصل ہے، اپنی جگہ سے ہلائے نہیں جا سکتے۔ ان سے پہلے کتنی ہی قومیں گزری ہیں جو قوت و عظمت میں ان سے بڑھ چڑھ کر تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ ان میں سے اگر کچھ ہلاک ہونے سے بچ بھی رہے تو وہ مختلف ملکوں میں، جدھر جس کا سینگ سمایا، وہ ادھر کو کسی جائے پناہ کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے۔

'نَقَّبَ فِي الْاَرْضِ' کے معنی ہیں 'سَارَ فِيْهَا طَلَبًا لِّلْمَهْرَبِ' (اور وہ زمین میں کسی جائے پناہ کی تلاش میں چل کھڑا ہوا) 'هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ' ان کے چل کھڑے ہونے کے محرک کا بیان ہے کہ سر چھپانے کی جگہ کی تلاش میں جدھر کو جس کا منہ اٹھا وہ ادھر ہی کو چل کھڑا ہوا۔

جب کسی قوم پر تباہی آتی ہے تو اس کا حال یہی ہوتا ہے۔ قوم کے کارفرما عناصر، جو سارے فساد کے ذمہ دار ہوتے ہیں، وہ تو تباہ ہو جاتے ہیں، عوام میں سے جو بچ رہتے ہیں وہ قومی جمعیت کے پارہ پارہ ہو جانے کے بعد پراگندہ ہو کر جس کو جہاں پناہ ملنے کی توقع ہوتی ہے وہ اسی طرف کا رخ کر لیتا ہے۔

قوموں کی تباہی کی مختلف صورتیں

قرآن میں جن قوموں کے حالات بیان ہوئے ہیں ان میں سے بعض تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری کی پوری عذابِ الٰہی سے تباہ ہو گئیں، مثلاً قومِ نوح، عاد اور ثمود وغیرہ۔ بعض قوموں کا حال یہ ہوا کہ ان کے مترفین و مستکبرین تو تباہ ہو گئے، رہے ان کے اتباع و عوام تو وہ ادھر ادھر پراگندہ ہو گئے۔ فرعون اور اس کی قوم کی تباہی کی صورت یہی ہوئی۔ وہ خود تو اپنے اعیان اور پوری فوج سمیت دریا میں غرق کر دیا گیا۔ باقی جو پیچھے رہ گئے تھے وہ حکومت کی تباہی اور اپنے حریفوں کے ڈر سے پناہ کی تلاش میں تتر بتر ہو گئے۔

اسی سے ملتے جلتے حالات ملکِ سبا میں پیش آئے۔ بے شمار افراد تو اس سیلاب ہی کی نذر ہو گئے جو ان پر آیا۔ جو بچ رہے وہ علاقہ کے بنجر اور معاشی حالت بالکل ابتر ہو جانے کے باعث مجبور ہوئے کہ پناہ کی تلاش میں دوسرے علاقوں کا رُخ کریں۔ یہود پر جو تباہیاں آئیں ان کی نوعیت بھی یہی تھی۔ جو قتل و نہب سے بچے وہ دنیا کے کونے کونے میں آوارہ ہو کر پھرے۔ خود ہماری تاریخ میں بھی اس کی نہایت عبرت انگیز مثالیں موجود ہیں۔ بغداد پر، قرطبہ پر، دلی پر جو تباہیاں آئیں کیا ان کے احوال تاریخ میں مذکور نہیں ہیں؟ ان کو پڑھیے تو معلوم ہو گا کہ اس آیت میں صرف قریش ہی کو تنبیہ نہیں ہے بلکہ خود ہمارے لیے بھی اس میں بڑا درس ہے بشرطیکہ ہم اس سے سبق حاصل کریں!

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگوں نے 'نَقَّبُوْا فِی الْبِلَادِ' کے یہ معنی لیے ہیں کہ انھوں نے اپنے دورِ عروج میں اپنی فاتحانہ ترک تازیوں سے دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ لفظ 'تنقیب' عربی میں فاتحانہ جولانیوں کے لیے نہیں آتا بلکہ ڈر اور خوف سے، جائے پناہ کی تلاش میں، زمین میں نقب لگانے کے لیے آتا ہے۔ اہلِ لغت نے اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ اور ہم اس کا حوالہ دے چکے ہیں۔ کلامِ عرب کے شواہد سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے اور بعد کا ٹکڑا 'ھَلْ مِنْ مَّحِیْصٍ' نہایت واضح طور پر اس معنی کے حق میں ہے۔ ورنہ یہ جملہ بالکل بے محل ہو کر رہ جائے گا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (۳۷)

قریش کو تنبیہ اور آنحضرت کو تسلی

'ذٰلِكَ' کا اشارہ انہی قوموں کی سرگزشت کی طرف ہے جن کا بالاجمال اوپر کی آیت میں حوالہ دیا گیا ہے۔ فرمایا کہ ان قوموں کی سرگزشت میں کافی سامانِ عبرت موجود ہے بشرطیکہ عبرت حاصل

کرنے والے دل اور بات کو توجہ کے ساتھ سننے والے کان ہوں۔

لفظ 'قلب' اپنے حقیقی یعنی دلِ زندہ کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قلب کو احساس کرنے، عبرت حاصل کرنے اور سوچنے سمجھنے کے لیے بنایا ہے۔ جب تک آدمی کا دل یہ کام کرتا ہے اس وقت تک اس کا دل زندہ ہے اور جب تک دل زندہ ہے اس وقت تک آدمی بھی زندہ ہے۔ اس لیے کہ آدمی کی حقیقی زندگی اس کے دل کی زندگی ہی سے ہے۔ اگر دل یہ خصوصیات کھو بیٹھا تو پھر آدمی بھی مردہ ہے اگرچہ اس کی رگوں میں کتنا ہی خون دوڑتا پھرتا ہو۔

'اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ'۔ یعنی اگر دل پوری طرح بیدار نہ ہو تو کم از کم اتنی بات تو انسان کے اندر ہو کہ کوئی معقول آدمی اس کو کوئی بات سنائے تو وہ اس کو توجہ سے سنے۔ یہ توجہ بھی انسان کے لیے بڑی خیر و برکت کا باعث ہے۔ اس سے بھی بسا اوقات دل کی غفلت دور اور اس کی عبرت پذیری کی صلاحیت زندہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جو شخص ایسا بدقسمت ہو کہ نہ اس کا دل ہی بیدار ہو اور نہ وہ کسی معقول آدمی کی بات سننے ہی کے لیے اپنے کان کھولنے پر آمادہ ہو تو ایسے آدمی کے اندر کوئی معقول بات کدھر سے راہ پائے گی؟

اگرچہ سیاقِ کلام یہاں قریش کو تنبیہ و ملامت کا ہے لیکن اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی بھی ہے کہ تم جو قرآن سنا رہے ہو اگر قریش کے لیڈروں کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہا ہے تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ نہ تو ان کے دلوں کے اندر اثر پذیری کی صلاحیت ہی ہے اور نہ یہ کان کھول کر تمہاری بات توجہ سے سننے ہی کے لیے تیار ہیں تو آخر تم اپنی بات کس طرح ان کے دلوں میں اتار سکتے ہو؟

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْہُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (۳۸-۴۰)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین

اب کلام کا رخ واضح طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی اور تلقینِ صبر کے مضمون کی طرف مڑ گیا ہے۔ اس کی تمہید اس طرح اٹھائی ہے کہ ہم آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں تھک نہیں گئے ہیں کہ ان کو دوبارہ پیدا کرنے سے عاجز رہ جائیں گے۔ اطمینان رکھو کہ جس دن سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے وہ آکے رہے گا۔ ان کی باتوں پر صبر کرو اور اس صبر کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ نماز کا اہتمام رکھو۔

فی ستۃ ایام کا مطلب

'وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ'۔ آسمان و زمین کے چھ دنوں میں پیدا کیے جانے کا ذکر پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'اَیَّام' سے

یہاں مراد خدائی ایام ہیں اس وجہ سے یہ ادوار کے مفہوم میں ہیں۔ یہ بات بھی ہم واضح کر چکے ہیں کہ آسمانوں اور زمین کی خلقت کا ذکر چھ دنوں کی قید کے ساتھ ہوتا ہے تو اس سے مقصود اس اہتمام کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے جو اس کائنات کی تخلیق میں ملحوظ ہے اور جو اس بات پر دلیل ہے کہ یہ دنیا نہ تو کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آئی ہے نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے بلکہ یہ ایک بامقصد کارخانہ ہے اور اس کے بامقصد ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں اس کی غایت واضح ہو۔

'وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ' یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو کہ چھ دن مسلسل کام کرنے کی وجہ سے ہم کو تکان لاحق ہو گئی ہے اور اب دوبارہ اس دنیا کو پیدا کرنے کا حوصلہ ہم نہ کر سکیں گے۔ ہم جس طرح پہلے تازہ دم تھے اسی طرح اب بھی تازہ دم ہیں اور جس طرح پہلی بار پیدا کرنے سے عاجز نہیں رہے اسی طرح دوبارہ پیدا کرنے سے بھی عاجز نہیں رہیں گے۔ اس فقرے کا انداز کچھ طنزیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس دنیا کی از سرِ نو خلقت کو بعید از امکان سمجھ رہے ہیں وہ اطمینان رکھیں کہ ہمارا دم خم اسی طرح قائم ہے جس طرح پہلے تھا۔ اس میں سرِ مو فرق نہیں آیا ہے۔ اس میں ضمناً یہود کے اس خیال پر بھی تعریض ہے جو تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔

'فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ' یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین صبر ہے کہ یہ جو کچھ تمہاری تکذیب میں کر رہے ہیں اس پر صبر کرو۔ 'مَا یَقُوْلُوْنَ' سے اشارہ مکذبین کی اسی طرح کی باتوں کی طرف ہے جس کی ایک مثال آیات ۲-۳ میں گزر چکی ہے۔ 'فَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ ھٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ءَاِذَا مِتْنَا وَکُنَّا تُرَابًا ذٰلِکَ رَجْعٌ بَعِیْدٌ' (۲-۳) (تو کافروں نے کہا یہ تو نہایت عجیب بات ہے! کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو ہم از سرِ نو اٹھائے جائیں گے! یہ لوٹایا جانا تو نہایت مستبعد ہے!) مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا جو اللہ نے اس اہتمام سے پیدا کی ہے وہ لازماً اپنی غایت کو پہنچ کر رہے گی۔ ہم اس کو پیدا کر کے تھک نہیں گئے ہیں کہ اس کو دوبارہ نہ پیدا کر سکیں لیکن جو لوگ دل کے اندھے ہیں وہ اس حقیقت کو اسی وقت تسلیم کریں گے جب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اس طرح کے لوگوں کی مخالفت پر تمہیں بہرحال صبر کرنا ہے تو صبر کرو تاآنکہ ان کے سامنے حقیقت اس طرح ظاہر ہو جائے کہ انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

حصولِ صبر کی تدبیر

'فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ' یہ صبر حاصل کرنے کی تدبیر بتائی ہے کہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ نماز کا اہتمام رکھو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ گہرے تعلق کے بغیر وہ صبر پیدا نہیں ہو سکتا جو مخالفوں کی مخالفت کے علی الرغم آدمی کے قدم جادۂ حق پر استوار

رکھ سکے ۔ اسی حقیقت کی طرف دوسری جگہ یوں اشارہ فرمایا ہے کہ وَمَا صَبۡرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ (النحل: ۱۲۷) (اور تم صبر نہیں کر سکتے مگر اللہ کی استعانت سے) اللہ تعالیٰ سے استعانت کا واحد ذریعہ چونکہ نماز ہے اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفوں کے مقابل میں جہاں جہاں صبر کی ہدایت فرمائی گئی ہے وہاں نماز کے اہتمام کی تاکید ضرور فرمائی گئی ہے ۔ اس کی مثالیں پیچھے بھی جگہ جگہ گزر چکی ہیں اور آگے کی سورتوں میں بھی نہایت واضح اور موثر مثالیں آئیں گی ۔

'سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ' ۔ یہ نماز کی تعبیر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے پہلو سے ہے ۔ یہ ذکر دو عنصروں سے مرکب ہے ، ایک 'تسبیح' دوسرا 'حمد' ۔ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ان باتوں سے پاک و منزہ قرار دینا جو اس کی شان کے منافی ہیں ۔ 'حمد' میں اثبات کا پہلو نمایاں ہے یعنی اس کو ان صفات سے متصف قرار دینا جو اس کے شایانِ شان ہیں ۔ یہ نفی اور یہ اثبات دونوں مل کر اللہ تعالیٰ کے صحیح تصور کو دل میں راسخ کرتے ہیں اور اسی راسخ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا صحیح تعلق قائم ہوتا ہے جو تمام صبر و توکل کی بنیاد ہے ۔ اگر ان کے اندر کسی پہلو سے کوئی ضعف یا عدم توازن پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے متعلق آدمی کا تصور غلط ہو جاتا ہے اور یہ غلطی اس کے سارے نظامِ فکر و عمل کو بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے ۔

اوقاتِ نماز اور ان کی حکمت

'قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ الۡغُرُوۡبِ ۝ وَمِنَ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡہُ وَاَدۡبَارَ السُّجُوۡدِ' ۔ یہ ان خاص خاص اوقات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح خاص اہتمام سے مطلوب ہے ۔ یوں تو اللہ کی یاد ہر وقت زندگی بخش ہے ، اس کی یاد ہی سے دل زندہ اور اطمینان مطمئن رہتا ہے لیکن اس دنیا کے دوسرے کاموں میں جس طرح اوقات اور فصلوں و موسموں کا اعتبار ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی عبادات میں بھی اوقات و ساعات کا لحاظ ہے ۔ نمازوں کے لیے جو اوقات خاص کیے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شب و روز کے چوبیس گھنٹوں کے اندر جو اوقات اس کائنات میں کسی بڑے تغیر کی علامت ہیں ، جو عالم کے متصرفِ حقیقی کی عظمت و قدرت کی یاد دہانی کرنے والے ہیں اور جن میں اس کائنات کی دوسری نمایاں چیزیں بھی اپنے خالق کے آگے سرفگندہ ہوتی ہیں ، وہی اوقات ہماری نمازوں کے لیے مقرر کیے گئے ہیں ۔ ان میں سب سے نمایاں اور خاص الخاص وقت فجر کا ہے ۔ جب رات اپنی بساط لپیٹتی ہے ، تارے اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور نئے دن کی سحر طلوع ہوتی ہے ، اور پھر اس کے ٹھیک مقابل میں عصر کا وقت ہے جب دن کی سرگرمیاں اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوتی ہیں اور سورج اپنے رب کے آگے سربسجود ہو جانے کے لیے اپنا سر جھکا دیتا ہے ۔ چنانچہ آیت میں پہلے انہی دونوں وقتوں کی طرف اشارہ فرمایا ۔ 'قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ' سے

فجر کا وقت مراد ہے اور 'قَبْلَ الْغُرُوْبِ' سے عصر کی طرف اشارہ ہے۔ ان دونوں نمازوں کی ہمارے دین میں جو اہمیت ہے وہ قرآن اور حدیث دونوں میں واضح فرمائی گئی ہے۔

شب کی نمازیں — 'وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ' دن کی دو اہم نمازوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اسی طرح شب میں بھی اپنے رب کی تسبیح کرو۔ شب میں دو نمازیں ہیں۔ شب کے پہلے حصہ میں عشاء اور آخری حصہ میں تہجد۔ تہجد اگرچہ فرائض میں داخل نہیں ہے لیکن تربیتِ صبر کے پہلو سے سب سے زیادہ اہمیت اسی نماز کو حاصل ہے۔ اس کی وضاحت مختلف مقامات میں ہو چکی ہے اور سورۂ مزمل کی تفسیر میں، ان شاء اللہ، اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

'ادبار السجود' کا صحیح مطلب — 'وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ' 'ادبار' جمع ہے 'دبر' کی، جس کے معنی پیچھے کے ہیں۔ عام طور پر لوگوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ 'سجدوں کے بعد بھی اس کی تسبیح کرو'۔ لیکن میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہاں سجود مصدری معنی میں ہے اور اس سے مراد آفتاب کا سجود ہے۔ جس کے طلوع و غروب کے قبل کی نمازوں کا ذکر اوپر والے ٹکڑے میں ہو چکا ہے۔ یعنی جس طرح سورج کے طلوع و غروب سے پہلے نماز کے اوقات ہیں اسی طرح سورج کے سجود کے بعد بھی تسبیح کے اوقات ہیں۔ چونکہ سورج کا ذکر پہلے ہو چکا تھا اس وجہ سے دوبارہ اس کی تصریح کی ضرورت نہیں ہوئی۔ لفظ 'ادبار' کا قرینہ اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کافی تھا کہ یہاں اسی کے سجود کے بعد کی نماز کا ذکر ہے جس کے طلوع و غروب سے پہلے کی نمازوں کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ اگر دونوں ٹکڑوں کے بیچ میں 'وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ' کے الفاظ نہ آ گئے ہوتے تو بات کے سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہ آتی۔ اس صورت میں تالیف کلام یوں ہوتی کہ 'سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے اور اس کے سجود کے بعد کے اوقات میں تسبیح کرو'۔ اس تالیف میں ہر شخص کا ذہن آسانی سے اس طرف منتقل ہو جاتا کہ 'سجود' سے مراد سجودِ شمس ہے لیکن تالیفِ کلام یوں ہوتی تو اس سے حکمتِ دین کا ایک اہم نکتہ واضح نہ ہو سکتا جو اس آیت میں واضح فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس میں نمازوں کی ترتیب دین میں ان کی اہمیت و عظمت کے اعتبار سے بیان ہوئی ہے۔ یہ ترتیب مقتضی ہوئی کہ سب سے پہلے فجر کا ذکر آئے، اس کے بعد عصر کا، چنانچہ 'قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ' کے الفاظ سے ان دونوں کا ذکر ہوا۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ قرآن و حدیث دونوں میں ان نمازوں کی اہمیت پر خاص زور دیا گیا ہے۔ اس کے بعد 'وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ' سے عشاء اور تہجد کی نمازوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو شب کی نمازوں میں وہی اہمیت رکھتی ہیں جو دن کی نمازوں میں فجر اور عصر کی نمازوں کو حاصل ہے۔ اس کے بعد 'اَدْبَارَ السُّجُوْدِ' کے الفاظ سے ظہر اور مغرب کی نمازوں کی طرف اشارہ ہے جو دلوکِ شمس اور سجودِ شمس کے اوقات سے تعلق رکھتی ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۸ 'اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ' کے تحت ہم سورج کے 'دلوک' کے مختلف مراحل کی وضاحت کر چکے ہیں[1] یہاں لفظ 'سجود' ہے اور اس کے بھی مختلف درجے ہیں۔ سورج اور دوسرے کواکب کے لیے جب یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے ان کے زوال اور غروب کے تمام مراحل مراد ہوتے ہیں۔ یہاں بھی یہ سارے ہی مراحل مراد ہو سکتے ہیں۔ یعنی جب وہ سمت راس سے جھکتا ہے، جب وہ مرأی العین سے نیچے آتا ہے، پھر جب وہ افق سے غائب ہوتا ہے۔ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں انہی تین اوقات میں ہیں۔ یہاں عصر کی نماز کا ذکر، اسی حکمت کے تحت، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، خاص اہتمام کے ساتھ اوپر 'قَبْلَ الْغُرُوْبِ' کے الفاظ سے ہو چکا ہے اس وجہ سے دو نمازیں باقی رہ گئیں۔ ایک ظہر جو سورج کے سجود کے پہلے مرحلے کے بعد ہے اور دوسری مغرب جو اس کے سجود کے آخری مرحلے کے بعد ہے۔ گویا اس آیت میں ان تمام اوقات کی طرف اشارہ ہے جن میں ہماری پانچوں نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم سے انہی اوقات کی ضابطہ بندی فرما دی۔

یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور ہم ہر جگہ اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں، یہاں نظائر نقل کرنے میں طوالت ہو گی۔ قارئین کے اطمینان کے لیے صرف ایک آیت سورۂ طٰہٰ کی ہم نقل کرتے ہیں جس میں یہ سارا مضمون نہایت واضح الفاظ میں آ گیا ہے۔ فرمایا ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ (۳۰)

پس جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی تسبیح کرتے رہو اس کی حمد کے ساتھ، سورج کے طلوع سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے اطراف میں۔

'اطراف النہار' کے الفاظ کے مضمرات کی وضاحت سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں ہو چکی ہے تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے[2]

قیامت کے منادی کی صدا سب کے
کانوں تک پہنچے گی

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ (۴۱)

'استماع' کے معنی توجہ سے کان لگائے رکھنے کے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ اس دن کو جھٹلاتے

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد سوم، صفحات ۳۷۷ - ۳۷۷

[2] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد چہارم، صفحات ۲۴۴ - ۲۴۵

ہیں تو جھٹلانے دو، تم ان کی باتوں کی پروا نہ کرو۔ بلکہ اس منادی کی آواز سننے کے لیے برابر کان لگائے رکھو جو نہایت قریب کی جگہ سے پکارے گا۔ اس منادی سے مراد وہی نفخ صُور، کا منادی ہے جس کا ذکر اوپر وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ کے الفاظ سے ہو چکا ہے۔ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ، سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آج تو ان غافلوں کو یہ باتیں بہت دُور کی اور نہایت ہی بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں لیکن اس دن ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ گویا اس کے کانوں ہی میں پکارا جا رہا ہے۔ یہ اسلوب کلام بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح سورۂ دُخان میں فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ (۱۰) ہے۔ اس سے مقصود ایک تو واقعہ کی قطعیّت اور اس کی ہولناکی کا اظہار ہے، دوسرے اس سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ اس کے ظہور کا وقت آیا ہی سمجھو، معلوم نہیں کب منادی پکار دے۔

آیت میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور یہ خطاب نہایت بلیغ ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر یہ بلید لوگ اس عظیم ساعت سے تجنت ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ تم ہر لحہ اس کے ظہور کے انتظار ہی میں رہو۔ قیامت کے معاملے میں ایک عاقل کو جس طرح چوکنا رہنا چاہیے یہ آیت اس کی صحیح تصویر ہے۔ اوپر آیت ۱۹ میں یہ مضمون بیان ہو چکا ہے کہ اس کو ہر شخص اپنے سر پہ کھڑی ہی سمجھے۔ یہ ہر آدمی کی موت کے ساتھ ہی لگی ہوتی ہے اور موت نہ معلوم کس گھڑی آدھمکے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو اس کو بہت بعید سمجھتے ہیں۔

يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ (۴۲)

یہ يَوْمَ اوپر والے يَوْمَ، سے بدل ہے۔ اور صَيْحَةَ، سے مراد نفخ صُور کا صیحہ ہے۔ حق، سے مراد، جیسا کہ آیت ۱۹ میں وضاحت ہو چکی ہے، قیامت ہے۔ اس لفظ سے اس کی تعبیر اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ ایک اٹل حقیقت اور شدنی ہے۔

فرمایا کہ اس دن کی صدائے صُور کے لیے برابر کان لگائے رکھو جس دن یہ تکذیب کرنے والے اس کی چیخ، اس شُدنی کے ظہور کی منادی کی حیثیت سے سنیں گے۔ وہ دن ان کے قبروں سے نکلنے کا ہوگا۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ (۴۳)

یہ اس خروج کی دلیل بیان فرما دی کہ ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، تو ہمارے لیے ان کو دوبارہ زندہ کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا؟ یہ دلیل اوپر وضاحت سے بیان ہو چکی ہے۔

وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ، یہ اسی اوپر والی آیت کا ایک اور واضح نتیجہ سامنے رکھ دیا کہ جب ہم ہی

زندگی بخشنے والے اور ہم ہی موت دینے والے ہوئے تو اس سے نہ صرف یہ بات لازم آئی کہ ہم دوبارہ زندہ کر دینے پر بھی قادر ہیں بلکہ یہ بات بھی لازم آئی کہ سب کی واپسی بھی ہماری ہی طرف ہوگی۔ اگر کوئی اس مغالطہ میں مبتلا ہے کہ قیامت ہوئی تو وہ اس کے معبودانِ باطل اس کے کام آنے والے بنیں گے تو یہ مغالطہ وہ اپنے ذہن سے نکال دے۔ جن کو زندگی کے معاملے میں کوئی دخل نہیں، جو موت کے معاملے میں کوئی اختیار نہیں رکھتے وہ آخرت میں ملجا و ماویٰ کس طرح بن جائیں گے!

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ (۴۴)

یہ اس دن لوگوں کے قبروں سے نکلنے کی تصویر ہے۔ فرمایا کہ نفخِ صور کے بعد زمین ان کے اوپر سے پھٹ جائے گی اور وہ اس سے نہایت تیزی سے نکلتے ہوئے ہوں گے۔ 'سِرَاعًا' ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ اس تیزی سے نکلنے کی تصویر قرآن کے دوسرے مقامات میں اس طرح کھینچی گئی ہے کہ جس طرح پتنگے اور ٹڈیاں نکلتی ہیں اسی طرح لوگ قبروں سے نکلیں گے۔ قیامت کے دن قبروں سے نکلنے کی تصویر

'ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ' یعنی کوئی اس مغالطے میں نہ رہے کہ لوگوں کو زمین سے برآمد کرنے کے لیے کوئی بڑا اہتمام کرنا پڑے گا جو ہم نہیں کر پائیں گے یا اس میں بڑا وقت صرف ہوگا۔ یہ سارا کام چشم زدن میں چٹکی بجاتے ہوگا۔ یہ ہمارے لیے نہایت آسان ہے۔

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ (۴۵)

اوپر آیت ۳۹ میں فرمایا تھا 'فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُولُونَ' پس جو کچھ یہ کہتے ہیں اس کو ہم خوب جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم خوب جانتے ہیں تو تم کیوں غم کرو۔ معاملہ ہمارے اوپر چھوڑ دو۔ ہم اس کا مداوا کریں گے۔ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔

'وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ' اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ تم ان کو مومن بنا دینے کے کام پر مامور کر کے نہیں بھیجے گئے ہو کہ یہ ایمان نہ لائے تو اس کی پرسش تم سے ہو۔ تمہارا کام صرف لوگوں کو یاد دہانی کرنا ہے، وہ تم کرتے رہو۔ اگر یہ ایمان نہ لائے تو اس کا انجام یہ خود بھگتیں گے۔

'فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ' یہ اسی بات پر سورہ ختم فرمائی ہے جس سے اس کا آغاز فرمایا تھا۔ قرآن ہی کے ذکر سے یہ شروع ہوئی تھی اسی کی یاد دہانی آخر میں فرما دی کہ تمھاری ذمہ داری صرف تذکیر ہے اور تذکیر کے لیے یہ قرآن کافی ہے تو اسی کے ذریعہ سے ان لوگوں کو یاد دہانی کر دو جو میری وعید سے ڈرنا چاہتے ہیں۔ جو نہیں ڈرنا چاہتے اور تمھاری تصدیق جس مضمون سے سورہ کا آغاز ہوا اسی پر خاتمہ

کے لیے تم سے کسی عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کو ان کی تقدیر کے حوالے کردو۔ وہ اس کا انجام دیکھ لیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس سورہ کی تفسیر ان سطور پر تمام ہوئی۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

رحمان آباد
۱۸؍ جنوری ۱۹۷۷ء
۲۷؍ محرم الحرام ۱۳۹۷ھ

تدبرِ قرآن

۵۱

الذّٰریٰت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الف۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ ـــ قٓ ـــ کی مثنیٰ ہے۔ سورۂ قٓ کی تفسیر میں آپ نے دیکھا کہ ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو قرآن کے اس دعوے کو بعید از امکان قرار دیتے تھے کہ لوگ مرنے کے بعد از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ اس سورہ میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر قرآن کے انذارِ عذاب کو بھی ثابت کیا گیا ہے اور جزا و سزا کو بھی۔ سورہ کا عمود اس کی تمہید ہی میں ان الفاظ سے واضح فرما دیا گیا ہے ﴿إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ ۝ وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ﴾ (بے شک جو وعید تم کو سنائی جا رہی ہے وہ بالکل سچی ہے اور جزا و سزا لازماً واقع ہو کے رہے گی)۔

خطاب قریش کے مکذبین ہی سے ہے اور استدلال کی بنیاد تمام تر آفاق و انفس کے دلائل پر ہے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سورہ میں بھی اسی طرح تسلی دی گئی ہے جس طرح سابق سورہ میں دی گئی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۴) ہواؤں کے عجائب تصرفات اور سرما کے دھاریوں والے بادلوں کے حوالہ سے ان غفلت کے ماتوں کو انذار جو قرآن کی وعیدِ عذاب اور اس کے وعدۂ جزا و سزا کا مذاق اڑاتے اور بانداز استہزا مطالبہ کر رہے تھے کہ جس جزا و سزا کے دن سے ڈرایا جا رہا ہے وہ کہاں ہے، اس کو لایا کیوں نہیں جاتا! ان لوگوں کو تنبیہ کہ پیغمبر کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے وہ بھی ایک حقیقت ہے اور جس روزِ جزا و سزا سے آگاہ کیا جا رہا ہے وہ بھی ایک امرِ واقعی ہے۔ اس میں شک وہی لوگ کر رہے ہیں جن کی عقلیں الٹ گئی ہیں۔ اس دن کے لیے جلدی مچانے والے عنقریب اس کا مزا چکھیں گے۔ اس دن ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ دن جس کے لیے تم جلدی مچاتے ہوتے تھے!

(۱۵-۱۹) ان خدا ترسوں کے صلہ کا بیان جو غفلت کی سرمستیوں میں کھوئے رہنے کے بجائے نماز، استغفار اور انفاق کے ذریعہ سے اس دن کے لیے برابر تیاریوں میں سرگرم رہے۔

(۲۰-۲۳) جزا و سزا کی جو نشانیاں زمین و آسمان اور آفاق و انفس میں موجود ہیں ان کی طرف اشارہ اور آخر میں اصل دعوے کی بتقریبِ قسم اعادہ کہ جس طرح لوگوں کے لیے ایک لفظ کا بول دینا نہایت آسان ہے

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے اس دنیا کو اس کے فنا ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ کر دینا نہایت آسان ہے۔

(۲۴-۳۷) حضرت ابراہیم علیہ السلام اور قومِ لوط کے واقعہ کی طرف اشارہ کہ جو فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ایک ذی علم فرزند کی بشارت لے کر آئے وہی فرشتے قومِ لوط کے لیے عذاب کا تازیانہ لے کر آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو فنا کر دیا جنھوں نے حضرت لوط کی تکذیب کی اور ان لوگوں کو نجات بخشی جو ان پر ایمان لائے۔ یہ اس بات کی تاریخی شہادت ہے کہ اس کائنات کا خالق جزا اور سزا دینے والا ہے اور اس کے اس قانونِ مکافات کی ایک نشانی قومِ لوط کی سرزمین میں موجود ہے جس سے وہ لوگ عبرت حاصل کر سکتے ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

(۳۸-۴۶) فرعون، عاد، ثمود اور قومِ نوح کے واقعات کی طرف ایک اجمالی اشارہ کہ ان قوموں نے بھی مکافاتِ عمل کے قانون سے بے پروا ہو کر زندگی گزاری اور اپنے رسولوں کے انذار کی کوئی پروا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ قاہرہ سے سب کو تباہ کر دیا۔ اس کے لیے اس کو کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا بلکہ اس کی ہواؤں اور اس کے بادلوں نے ہی ان سب کا استھراؤ کر کے رکھ دیا۔

(۴۷-۶۰) خاتمۂ سورہ جس میں پوری سورہ کا مضمون سمیٹ دیا گیا ہے کہ جو اللہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور جس نے ہر چیز جوڑے جوڑے پیدا کی ہے اس کے لیے دنیا کو از سرِ نو پیدا کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا۔ جزا و سزا شدنی ہے اور سب کی پیشی خدا ہی کے آگے ہونی ہے تو خدا ہی کی طرف بھاگو۔ اس کے سوا کسی اور سے لو نہ لگاؤ۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم سے پہلے جتنے بھی رسول آئے سب ہی کے ساتھ ان کی قوموں نے یہی سلوک کیا جو تمھاری قوم تمھارے ساتھ کر رہی ہے۔ تو ان سرکشوں کو ان کے حال پر چھوڑو۔ صرف ان لوگوں کو یاد دہانی کرو جو یاد دہانی سے فائدہ اٹھانے والے ہیں۔ یہ اطمینان رکھو کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ نہ دوسروں کی رزق رسانی کی ذمہ داری ان پر ڈالی ہے اور نہ میں اس بات کا حاجتمند ہوں کہ لوگ مجھے کھلائیں۔ میں خود سب کا روزی رساں اور بڑی قوت و طاقت رکھنے والا ہوں۔ میرے جو بندے میری بندگی کا حق ادا کرنے کے لیے سب سے بے نیاز ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے ان کی کفالت اور نصرت کے لیے میں کافی ہوں۔ دوسرے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ رہے یہ ظالم لوگ تو اس دنیا میں سے ان کا جو حصہ مقدر ہے وہ پائیں گے۔ ان کے جلدی مچانے کے سبب سے اللہ تعالیٰ ان کو اس مہلت سے محروم نہیں کرے گا جو اتمامِ حجت کے لیے ضروری ہے، لیکن بالآخر ان کو اسی دن سے سابقہ پیش آنا ہے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے۔

سُوْرَةُ الذّٰرِيٰتِ

مَكِّيَّةٌ ——— آيات: ٦٠

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۴
وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝١ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝٢ فَالْجٰرِيٰتِ
يُسْرًا ۝٣ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝٤ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝٥
وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝٦ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝٧ اِنَّكُمْ
لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝٨ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝٩ قُتِلَ
الْخَرّٰصُوْنَ ۝١٠ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۝١١ يَسْـَٔلُوْنَ
اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۝١٢ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝١٣ ذُوْقُوْا
فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝١٤

ترجمۂ آیات ۱-۱۴
شاہد ہیں تند ہوائیں جو اڑاتی ہیں غبار۔ پھر اٹھا لیتی ہیں بوجھ۔ پھر چلنے لگتی ہیں آہستہ۔ پھر الگ الگ کرتی ہیں معاملہ۔ کہ جس عذاب کی تم کو وعید سنائی جا رہی ہے وہ سچ ہے اور جزاء و سزا بے شک واقع ہو کے رہے گی۔ شاہد ہے دھاریوں والا آسمان! بے شک تم ایک اختلاف میں پڑے ہوئے ہو۔ اس سے وہی رو گردانی کرتے ہیں جن کی عقل الٹ دی گئی ہو۔ اٹکل کے تیر تکے

چلانے والے ہلاک ہوں! غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، بالکل بے خبر۔ پوچھتے ہیں جزاء و سزا کا دن کب آئے گا! جس دن وہ آگ پر تپائے جائیں گے! چکھو مزا اپنے فتنہ کا، یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے! ۱-۱۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۙ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا (۱-۴)

'و' قسم کے لیے ہے اور قسم شہادت کے لیے — 'وَالذّٰرِيٰتِ' میں 'و' قسم کے لیے ہے اور اس بات کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ قرآن میں اس طرح اشیاء کی جو قسمیں کھائی گئی ہیں اس کا مقصود ان اشیاء کی تعظیم نہیں، بلکہ ان کو اس دعوے پر شہادت کے لیے پیش کرنا ہے جو قسم کے بعد مذکور ہوتا ہے یا سیاق کلام سے سمجھا جاتا ہے؛ چنانچہ یہ قسم بھی شہادت ہی کے لیے ہے۔ اس کا ترجمہ اگر شہادت کے لفظ سے کیا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ یہ زیادہ معنی خیز ہوگا۔

'ذٰرِيٰت' — 'ذَارِيَاتٌ' غبار اڑانے والی ہواؤں کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ ہواؤں کی صفت کے طور پر آتا ہے۔ لیکن یہ اپنے موصوف کے لیے اس طرح معروف ہو چکا ہے کہ اس کے قائم مقام کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے۔ 'ذَارِيَاتٌ' کے بعد لفظ 'ذَرْوًا' کے اضافے سے معنی میں اسی طرح کا اضافہ ہو گیا ہے جس طرح 'ضَرَبَ ضَرْبًا' کے اندر تاکید فعل کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ اس طرح کی تاکیدات کا مفہوم اردو ترجمے میں منتقل کرنا بعض اوقات مشکل ہوتا ہے۔ یہاں اگر ہواؤں کے ساتھ 'تند' کا اضافہ کر دیا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ یہ مفہوم ادا ہو جائے گا۔

'ف' کے ساتھ عطف کے فوائد — 'فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا' جب صفات کا عطف 'ف' کے ساتھ ہو تو یہ دو باتوں پر دلیل ہوتا ہے۔ ایک اس بات پر کہ ان کے اندر ترتیب ہے، دوسری اس بات پر کہ یہ تمام صفتیں ایک ہی موصوف کی ہیں۔ عربیت کے اس قاعدے کی رو سے یہاں جو تین صفتیں 'ف' کے ساتھ بیان ہوئی ہیں وہ لازماً ہواؤں ہی کی ہوں گی۔ جن لوگوں نے ان کو الگ الگ چیزوں کی صفت مانا ہے ان کی رائے عربیت کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے نظائر کے بھی۔

سورۂ عادیات میں ہے۔

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ فَالْمُوْرِيٰتِ	گواہی دیتے ہیں وہ جو ہانپتے دوڑتے ہیں،
قَدْحًا ۙ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ	پھر ٹھوکروں سے چنگاریاں نکالتے ہیں، پھر صبح
فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ فَوَسَطْنَ	کو دھاوا کرتے ہیں، پھر غبار اٹھاتے ہیں، پھر
بِهٖ جَمْعًا (١-٥)	غول کے اندر گھس جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام صفتیں الگ الگ چیزوں کی نہیں ہیں، بلکہ گھوڑوں ہی کی ہیں اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے بیان میں ترتیب بھی ملحوظ ہے۔

کلام عرب میں بھی اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ ہم صرف ابن زیابہ کا ایک مشہور شعر نقل کرتے ہیں۔

یا لہف زیابۃ للحارث المصابح ، فالغانم ، فالآئب

(زیابہ کی طرف سے افسوس ہے حارث پر، جس نے غارت گری کی، لوٹا اور چل دیا)

'وِقْرٌ' 'وِقْرٌ' کے معنی بوجھ اور بار کے ہیں۔ یوں تو اس سے ہر وہ بوجھ اور بار مراد ہو سکتا ہے جس کو ہوائیں اٹھاتی ہیں، مثلاً غبار اور کنکر وغیرہ لیکن اس کا معروف استعمال بادلوں کے لیے ہے۔ مثلاً

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ	اور وہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو خوش خبری بناکر
بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ	اپنے باران رحمت سے پہلے۔ یہاں تک کہ جب وہ بوجھل
حَتّٰٓي اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا	بادلوں کو اٹھالیتی ہیں ہم ان کو ہانکتے ہیں کسی مردہ
سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا	زمین کی طرف اور وہاں بارش برسا دیتے
بِهِ الْمَاۗءَ (الاعراف: ٥٧)	ہیں۔

'جاریات' کا مفہوم اور ایک غلط فہمی کا ازالہ

'فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا' یہ صفت بھی ہواؤں ہی کی ہے۔ جن لوگوں نے اس سے کشتیاں مراد لی ہیں ان کی رائے اس قاعدے کے خلاف ہے جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے۔ 'یُسْرٌ' کے معنی آہستہ اور نرم کے ہیں۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے تند اور غبار انگیز ہوائیں چلتی ہیں جو مختلف سمتوں سے بادلوں کو ہانک ہانک کر لاتی اور جس علاقہ کو سیراب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے، اس پر ان کو تہ بہ تہ جما دیتی ہیں۔ پھر ہوا کی رفتار نرم ہو جاتی ہے اور مینہ برسنا شروع ہو جاتا ہے۔

'تقسیم امر' کا مفہوم

'فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا'۔ 'قَسَمَ الْاَمْرَ' کے معنی ہوں گے کہ جس کے لیے جو بات طے تھی یا جو امر مقدر تھا وہ اس کو پہنچا دیا۔ یعنی یہ ہوائیں بادلوں کو لاد کر لانے کے بعد اپنے رب کے حکم کے مطابق تقسیم امر کرتی ہیں، یعنی جس علاقہ کے لیے جتنا پانی برسانے کا حکم ہوتا ہے اتنا برسا دیتی ہیں۔ بعض کو جل تھل کر دیتی ہیں، بعض کو نیم تشنہ اور بعض کو خشک چھوڑ جاتی ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ ان کو حکم دے

دیتا ہے تو بعض علاقوں پر وہ طوفان و سیلاب بن کر نازل ہوتی ہیں اور پورے علاقے کا علاقہ ان کی زد میں آکر تباہ ہو جاتا ہے۔ ہواؤں کے تصرفات اور ان کے فرق و امتیاز کی نیرنگیاں نہایت حیرت انگیز ہیں۔ ایک قوم کے ساتھ ان کا معاملہ کچھ ہوتا ہے، دوسری قوم کے ساتھ کچھ۔ کسی قوم کے لیے یہ ابرِ رحمت کی بشارت بن کر ظاہر ہوتی ہیں، کسی قوم کے لیے طوفانِ عذاب بن کر۔ آگے، ان شاء اللہ، اس کی تفصیل آئے گی۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ (۵-۶)

قسم کا مقسم علیہ　یہ اوپر کی قسم کا مقسم علیہ ہے۔ یعنی ہواؤں کے یہ عجائب تصرفات، جن کا تم برابر شاہدہ کرتے رہتے ہو، اس بات پر شاہد ہیں کہ جس چیز کی تم کو وعید سنائی جا رہی ہے وہ بالکل سچ ہے اور جزاو سزا لازماً واقع ہو کے رہے گی۔

'توعدون' کا مفہوم　اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ: استاذ امام فراہیؒ کے نزدیک تُوْعَدُوْنَ 'وعد' سے ہے جس کے تحت وہ تمام چیزیں داخل ہیں جن کا نبیوں کی زبانی وعدہ کیا گیا ہے، یعنی حشر نشر، جزا سزا اور رحمت و نقمت وغیرہ۔ وہ اِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ کو اسی پر عطف خاص علی العام کی حیثیت دیتے ہیں؛ لیکن میرا رجحان اس طرف ہے کہ تُوْعَدُوْنَ 'وعید' سے ہے اور یہاں اس سے مراد وہ عذاب ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً اس کے مکذبین پر نازل ہوتا ہے۔ گویا ہواؤں کے عجائب تصرفات کی قسم یہاں میرے نزدیک دو چیزوں پر کھائی گئی ہے۔ ایک اس بات پر کہ قریش کو جس عذاب کی بصورت تکذیب دھمکی دی جا رہی ہے اور جس کو وہ محض ایک دھونس گمان کر رہے ہیں وہ دھونس نہیں ہے بلکہ بالکل سچی دھمکی ہے اور اس طرح وہ جزاو سزا بھی ایک امر شدنی ہے جس کو وہ بہت بعید از امکان سمجھ رہے ہیں۔

میرے اس رجحان کے حق میں کئی باتیں جاتی ہیں، لیکن ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے صرف تین باتوں کی طرف اشارہ کافی ہے۔

ایک یہ کہ اس طرح مقسم علیہ کے دونوں اجزاء کا محل بالکل بے تکلف الگ الگ متعین ہو جاتا ہے۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا۔ ایک اس عذاب سے جو اس دنیا میں ان پر نازل ہوا اگر وہ اپنی تکذیب پر اڑی رہ گئیں، دوسرے اس عذاب سے جس سے لازماً ان کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا اگر ان کا خاتمہ کفر ہی پر ہوا۔ ان دونوں عذابوں کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور ہم اس کی وضاحت کرتے آرہے ہیں۔ یہ حقیقت مقتضی ہے کہ یہاں ان دونوں عذابوں کا ذکر ہو جب کہ قسم ان دونوں پر شاہد ہے۔ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔

تیسری یہ کہ آگے رسولوں کی تکذیب کرنے والی بعض قوموں کا حوالہ قرآن نے اسی وعید کی تصدیق کے طور پر دیا ہے۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ ان کی تباہی میں ہواؤں کے تصرفات کو قرآن نے خاص طور پر نمایاں فرمایا ہے۔

زبان کا ایک نکتہ

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ عذاب دنیا کی وعید کا ذکر تو فعل سے کیا ہے اور آخرت کی جزا و سزا کا ذکر اسم 'دین' سے کیا ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ اس دنیا میں قوموں پر جو عذاب آتا ہے وہ ایک امر حادث اور مشروط بشرائط و حالات ہوتا ہے۔ لیکن جزا و سزا کا قانون اس دنیا کی خلقت کی غایت اور اس کا لازمی نتیجہ ہے اس وجہ سے پہلے کو فعل سے تعبیر فرمایا اور دوسرے کو اسم سے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (۷)

'ذات الحبک' کی تحقیق

'سَمَآء' سے آسمان کو بھی مراد لے سکتے ہیں اور بادلوں کو بھی۔ یہ دونوں معنوں کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن آسمان کو مراد لیں گے تو یہاں لازماً 'ذات الحبک' کی صفت کے ساتھ ہی مراد لیں گے۔ اس وجہ سے اصل تحقیق طلب چیز یہ صفت ہی ہے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر سورۂ ذاریات میں اس لفظ کی تحقیق کلام عرب کے شواہد کی روشنی میں بیان فرمائی ہے۔ ہم اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں یہاں درج کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"حَبْكٌ کے معنی باندھنے اور گرہ لگانے کے ہیں۔ یہیں سے یہ اس مضبوطی و استواری کے لیے استعمال ہوا جو کسی چیز کی بناوٹ میں پیدا کی جائے۔ اسی سے 'حَبَاكٌ' ہے جس کی جمع 'حُبُكٌ' آتی ہے۔ 'حُبُكٌ' ان دھاریوں، شکنوں اور راہوں کو کہتے ہیں جو کسی گف اور مضبوط بناوٹ کے کپڑے میں نمایاں کی گئی ہوں۔ ...... فراء کی تحقیق یہ ہے کہ 'حُبُك' سے مراد وہ لہریں اور شکنیں ہیں جو ریت یا ساکن پانی میں، جب کہ اس پر ہوا چل گئی ہو، پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہیں سے یہ بادلوں کی تعریف میں استعمال ہونے لگا کیونکہ بادلوں کے ٹکڑے بھی آسمان میں تہ بہ تہ موجوں اور تو بر تو روئی کے گالوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ امرؤ القیس فلک بوس محلوں کی تعریف کرتے ہوئے، جن پر بادل چھائے ہوئے ہیں، کہتا ہے۔

مکللۃ حمراء ذات اسرۃ ۔۔۔ لہا حبک کانہا من وصائل

(ان محلوں پر سرخ دھاریوں والے بادل چھائے ہوئے ہیں گویا کہ دھاریوں والی چادریں ہیں)

یہ موسم سرما کے بادلوں کی تعریف ہے اور یہ ان کے رنگ اور ان کی تہوں کی نہایت صحیح تصویر ہے......"

جن لوگوں نے 'ذات الحبک' سے بروج کواکب مراد لیا ہے، خواہ اس کی مضبوطی و استواری کے پہلو سے یا اس وجہ سے کہ اس میں تارے ٹنگے ہوئے ہیں، ہمارے نزدیک ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔

...... یہ لفظ دھاریوں، شکنوں، لہروں اور خطوط کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔"

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحقیق کی روشنی میں یہ قسم سرما کے سرخ دھاریوں والے بادلوں کی ہے جو شمال کی باد تند کے ساتھ نمایاں ہوتے اور جن کو پچھلی معذب قوموں کی تباہی میں، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی، بڑا دخل رہا ہے۔ گویا ہواؤں کی قسم کے بعد یہ بادلوں کی قسم اسی قسم کی تکمیل ہے اس لیے کہ ہواؤں اور بادلوں میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ اس قسم کے اضافے سے ہواؤں کی ہلاکت انگیزی کے پہلو کی طرف خاص طور پر اشارہ مقصود ہے۔

إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ (۸)

مخالفین کو ملامت

قرینہ شاہد ہے کہ یہ ٹکڑا جوابِ قسم نہیں ہے بلکہ مخالفین کے رویہ پر ان کو ملامت ہے۔ جوابِ قسم اوپر گزر چکا ہے اور یہ دوسری قسم اوپر والی قسم ہی کی تکمیل ہے اس وجہ سے اس کے بعد جوابِ قسم کے اعادے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ مکذبین کو سرزنش کر دی گئی کہ تم لوگ ایک صریح قسم کے اختلاف اور تناقضِ فکر میں مبتلا ہو ورنہ ان شہادتوں کے ہوتے نہ وعیدِ عذاب کو جھٹلانے کی گنجائش ہے، نہ وعدۂ جزاء و سزا میں شک کرنے کی۔

قرآن مجید میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ وضاحتِ قرینہ کی بنا پر جوابِ قسم حذف کر کے اس کی جگہ کوئی سرزنش و ملامت کا جملہ رکھ دیا گیا ہے۔ اس کی ایک نہایت واضح مثال سورۂ قٓ میں گزر چکی ہے۔

قٓ ۚ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ ۞ بَلْ عَجِبُوا أَن جَاءَهُم مُّنذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكَافِرُونَ هَٰذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ (قٓ: ۱-۲)	یہ قٓ ہے۔ قرآن بزرگ و برتر کی قسم (یہ کلام الٰہی ہے) بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان کے پاس ایک آگاہ کرنے والا انہی میں سے آیا تو کافروں نے کہا یہ تو عجیب بات ہے!

اس آیت میں دیکھیے جوابِ قسم مذکور نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ مخالفین کو ان کی صریح دھاندلی پر ملامت کر دی گئی ہے۔ یہی اسلوب سورۂ بروج میں بھی اختیار فرمایا گیا ہے۔

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۞ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۞ وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ ۞ قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ (البروج: ۱-۴)	قسم ہے برجوں والے آسمان کی اور وعدہ کیے ہوئے دن کی اور شاہد و مشہود کی! ناس ہو آگ کی گھاٹی والے!

مخالفین کا تضادِ فکر

قولٍ مختلفٍ سے قیامت اور جزاء و سزا کے باب میں ان کے تضادِ فکر اور تضادِ قول کی طرف اشارہ ہے۔ مشرکین عرب کے بارے میں ہم جگہ جگہ یہ لکھ چکے ہیں کہ ان میں سب قیامت کے کھلے منکر ہی نہیں تھے بلکہ انکار کرنے والوں کے ساتھ ان کے اندر ایک گروہ مذبذبین کا بھی تھا جو صریح

طور پر انکار نہیں کرتے تھے بلکہ اس کو ایک مستبعد بات سمجھتے تھے۔ اسی طرح ان کے اندر ایک بہت بڑا گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو قیامت کو بعید از امکان تو نہیں سمجھتے تھے لیکن ان کا گمان یہ تھا کہ قیامت کے دن ان کا معاملہ ان کے شرکاء و شفعاء سے متعلق ہوگا، وہ اپنے پجاریوں کو اپنی شفاعت سے بچا لیں گے۔ یہ لوگ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کے لیے وہ تمام صفتیں تسلیم کرتے تھے جو اس کی بدیہی اور لازمی صفات ہیں اور جو جزاء و سزا کو لازم کرتی ہیں دوسری طرف ان کے بدیہی نتائج و لوازم کے بارے میں یا تو مبتلائے شک تھے یا ان کا انکار کرتے تھے۔ ان کی اسی ذہنی الجھن کی طرف یہاں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ مقصود ان کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ قرآن ان کو جس بات سے آگاہ کر رہا ہے وہ تو اس کائنات کی ایک بدیہی حقیقت ہے بشرطیکہ یہ لوگ اپنے ذہن کو سیدھی راہ پر سوچنے دیں، اس میں غیر فطری اڑنگے نہ ڈالیں۔ پچھلی سورہ میں فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔ ہمارے نزدیک دونوں جگہ ایک ہی حقیقت واضح فرمائی گئی ہے۔

يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ (۹)

یہ جملہ 'قول مختلف' کی صفت نہیں بلکہ ایک مستقل جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنے ذہن کو تناقض سے پاک کر کے سوچیں تو جزاء و سزا کا معاملہ بالکل بدیہی حقیقت ہے لیکن جن لوگوں کی عقل الٹ دی جاتی ہے وہ اس سے برگشتہ کر دیے جاتے ہیں۔ 'اَفَكَ' کے معنی الٹ دینے کے ہیں اور 'مافوك' اس شخص کو کہتے ہیں جس کی عقل الٹ دی گئی ہو۔ یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصف: ۵) اور اس مضمون کی دوسری آیات میں بیان ہوئی ہے یعنی ان لوگوں نے اپنی عقل صحیح طور پر استعمال نہیں کی اس وجہ سے قانونِ الٰہی کے مطابق ان کی عقل الٹ دی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کو وہ چیز بھی نظر نہیں آ رہی ہے جس کی شہادت اس کائنات کے ہر گوشے سے مل رہی ہے۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ (۱۰-۱۱)

گمان کا سہارا لینے والوں کی تباہکا

یہ جملہ بھی ملامت و سرزنش کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اٹکل کے تیر تکے چلانے والے لوگ ہیں۔ انھوں نے اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیا ہے اس وجہ سے آفاق و انفس اور ارض و سما کی وہ تمام دلیلیں جن کی طرف قرآن ان کو توجہ دلا رہا ہے، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ بصیرت سے محروم ہونے کے باعث اب ان کا تمام اعتماد قیاس و گمان پر رہ گیا ہے۔ اسی قیاس و گمان کے بل پر وہ اس واضح سے واضح حق کو بھی جھٹلانے پر کمربستہ ہیں جو ان کی خواہشوں کے خلاف ہے حالانکہ گمان کسی درجے میں بھی ان کے لیے حق کا بدل نہیں بن سکے گا بلکہ ایک دن ان پر واضح ہو جائے گا

کہ حق کے انکار کے لیے انھوں نے وہم و گمان کا جو سہارا لیا یہی ان کی تباہی کا اصل سبب بنا۔

جو امور جتنے ہی اہم ہیں ان کے لیے اتنا ہی اہتمام ہے

'خرص' کے معنی اندازہ اور تخمینہ کرنے کے ہیں۔ 'خرص النخل والکرم' کے معنی ہیں کھجور کے درخت یا انگور کی بیل کے پھلوں کا اندازہ کیا۔ 'خرص فی الحدیث' کے معنی ہوں گے کہ ایک امر پر غور کیے بغیر اس کے بارے میں ایک اٹکل پچو بات اڑا دی۔

انسان کی زندگی سے متعلق جو امور جتنے ہی اہم اور دُور رس نتائج کے حامل ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اتنا ہی زیادہ اہتمام فرمایا ہے۔ اٹکل اور اندازوں پر وہی امور اس نے چھوڑے ہیں جن کی انجام کار کے پہلو سے کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ جن امور کی خاص اہمیت ہے، جو دُور رس نتائج کے حامل ہیں اور جن پر انسان کی صلاح و فلاح کا انحصار ہے ان کو اللہ تعالیٰ نے قیاس و گمان پر نہیں چھوڑا ہے بلکہ ان میں ہر پہلو سے اس نے حجت تمام کر دی ہے تاکہ انسان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ ان امور میں اٹکل کے گھوڑے دوڑانا بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک شخص اندھیری رات میں اللہ کی بخشی ہوئی روشنی کو گل اور اپنی آنکھیں بند کر کے محض اٹکل سے راستہ معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

انسان کے لیے اس کی عاقبت کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے کسی پہلو کو بھی مبہم نہیں چھوڑا ہے بلکہ ہر جہت سے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرما دی ہے تاکہ گمراہی کا اندیشہ نہ رہے۔ آسمان و زمین میں اس نے قدم قدم پر نشانات راہ گاڑ دیے ہیں جو صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ آنکھیں دے دی ہیں جو ان نشانات کو دیکھ سکتی ہیں اگر انسان آنکھیں کھلی رکھے۔ عقل بخشی ہے جو ان اشاروں کو سمجھتی ہے یا سمجھ سکتی ہے بشرطیکہ انسان اس سے صحیح طور پر فائدہ اٹھائے۔ علاوہ ازیں انسان کی فطرت میں وہ تمام داعیات و محرکات ودیعت فرما دیے ہیں جو صحیح سمت میں قدم بڑھاتے، خطرات کا مقابلہ کرنے اور انسان کو برابر بیدار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ پھر مزید اور سب سے اعلیٰ و اشرف انتظام یہ فرمایا کہ اپنے نبیوں، رسولوں اور اپنی اتاری ہوئی کتابوں کے ذریعہ سے اچھی طرح واضح فرما دیا کہ زندگی کی صحیح شاہراہ کیا ہے اور اس راہ کے لیے کیا زاد و راحلہ مطلوب ہے۔

اتنے گوناگوں اہتمام کے بعد بھی اگر انسان ان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے محض اپنی اٹکل سے اپنے لیے کوئی اور راہ ڈھونڈنے کے درپے ہو تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسے روشنی سے نفرت ہے، وہ تاریکی ہی میں بھٹکنا چاہتا ہے۔

اٹکل کی پیروی کا سبب

'اَلَّذِیۡنَ ھُمۡ فِیۡ غَمۡرَۃٍ سَاھُوۡنَ'۔ یہ ان اٹکل کے تیر تکے چلانے والوں کی صفت بیان ہوئی ہے جس سے اس بات کی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے خدا کی روشنی چھوڑ کر اپنا رہنما اٹکل

کو کیوں بنایا ہے! فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خواہشاتِ نفس کے اندھیرے میں گھرے ہوئے ہیں اور ان پر ایسی غفلت طاری ہے کہ اس کا تسلسل کبھی ٹوٹتا ہی نہیں کہ اس سے نکلنے کی کوشش کریں۔ 'غَمْرَۃٌ' سے مراد خواہشاتِ نفس اور مطامعِ دنیا کی تاریکی ہے۔ 'سَاهُوْنَ' خبر کے بعد دوسری خبر ہے جس سے ان کی غفلت کا تسلسل ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چیز ان پر اس طرح مسلط ہے کہ وہ اس سے باہر نکلنے کا کبھی نام ہی نہیں لیتے۔ اگر کبھی کوئی ان کو جگانے اور حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ چیز ان کے دلوں پر شاق گزرتی ہے اور وہ اپنے کو مطمئن رکھنے کے لیے جو غلط سے غلط سہارا بھی مل جاتا ہے اس پر تکیہ کر لیتے ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ (۱۲)

منکرین جزا کا معارضہ — یعنی وہ جزا و سزا سے آگاہ کرنے والوں کا منہ بند کرنے کے لیے یہ سوال کرتے ہیں کہ جس یوم الجزاء سے ڈرایا ہے وہ کہاں ہے؟ اس کا ظہور کب ہوگا! اس سوال کے اندر انکار، استہزاء اور جلد بازی تینوں ہی باتیں موجود ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر فی الواقع اس طرح کا کوئی دن آنے والا ہے تو وہ آتا کیوں نہیں! اس کے ڈراوے سنتے سنتے تو ہمارے کان پک گئے لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ یہ محض ایک ہتوا ہے جس سے تم ہمیں مرعوب کرنا چاہتے ہو۔ اگر اس کی کوئی حقیقت ہے تو اس کو لاؤ۔ اس کو دیکھے بغیر ہم تمہاری ان خیالی باتوں سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں!

یہ سوال نقل کرنے سے قرآن کا مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ اس قماش کے لوگ حقائق سے گریز اختیار کرنے کے لیے اسی طرح کے بہانوں کی آڑ میں چھپتے ہیں حالانکہ انھیں اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ اگر یوم الجزاء کا آنا آفاق و انفس کے دلائل سے ثابت ہے اور اس کا ظہور اس کائنات کے خالق کی صفات کا لازمی تقاضا ہے تو اس دلیل سے اس کو نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ اس سے ڈرانے والے اس کو دکھا نہیں سکتے یا اس کا وقت نہیں بتا سکتے۔ اس قسم کا معارضہ ایک حقیقت کو ظن و تخمین سے جھٹلانے کے ہم معنی ہے اس وجہ سے قرآن نے ان لوگوں کے لیے 'خَرّٰصُوْنَ' کا لفظ استعمال فرمایا۔

يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ (۱۳)

جواب منکرین کی ذہنیت کے مطابق — یہ سوال تحقیق کے لیے نہیں بلکہ، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، انکار اور استہزاء کے لیے تھا، اس وجہ سے قرآن نے جواب ان کی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر دیا۔ یہ امر واضح رہے کہ جو لوگ اس طرح کے سوال کرتے تھے وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھے کہ اس کے ظہور کا وقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ کسی کو اس کا علم نہیں ہے اور اس کا علم نہ ہونے سے اصل حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کے وقت اور دن سے تعرض کرنے کے

بجائے اس صورتِ حال کی تصویر ان کے سامنے رکھ دی جس سے اس دن سابقہ پیش آئے گا کہ یہ جزا کا دن اس وقت ظہور میں آئے گا جب یہ آگ پر تپائے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں تو اڑا لیں لیکن یاد رکھیں کہ اس دن ان کا یہ حشر ہونا ہے۔

لفظ 'فتن' کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہ لفظ جلانے اور تپانے کے معنی میں بھی آتا ہے اور کسی کو امتحان میں ڈال کر جانچنے اور پرکھنے کے معنی میں بھی۔ یہاں 'یُفْتَنُوْنَ' سے دو مفہوم کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک تو جلانے اور تپانے کے معنی کی طرف، دوسرے اس حقیقت کی طرف کہ جس آگ پر یہ لوگ تپائے جائیں گے یہ ان شہوات و زخارف کی آگ ہو گی جن سے وہ دنیا میں آزمائے گئے اور جن کی محبت میں گرفتار ہو کر وہ جزا کے دن سے بے پروا ہوئے۔ آگے اس کی وضاحت آ رہی ہے۔

ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (۱۴)

لفظ 'فتنۃ' یہاں میرے نزدیک اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے یعنی دنیا کی وہ چیزیں جو تمہیں فتنہ میں ڈالنے والی بنیں اور جن کے عشق میں مبتلا ہو کر تم آخرت سے برگشتہ ہوئے، اپنی اصلی شکل و صورت میں وہ تمہارے سامنے نمایاں ہو گئیں، اب ان کا مزا چکھو۔ یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے۔

۲۔ ابر و ہوا کے تصرفات میں جزا اور سزا کی شہادت کے پہلو

یہاں تھوڑی دیر توقف کر کے اوپر کی قسموں اور ان کے مُقسم علیہ کے باہمی تعلق پر مزید غور کر لیجیے تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ قسمیں درحقیقت اپنے مُقسم علیہ پر دلیل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سورہ کی تمہید میں دو چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے اور ان قسموں کے بعد دو دعوے رکھے گئے ہیں۔ قسم ہواؤں کے عجائب تصرفات اور دھاریوں والے بادلوں کی کھائی گئی ہے اور دعویٰ ایک تو یہ کیا گیا ہے کہ جس عذاب کا تم کو ڈراوا دیا جا رہا ہے اس کو جھوٹ نہ سمجھو بلکہ یہ بالکل سچ ہے۔ دوسرا یہ کہ جس روزِ جزا و سزا سے تم کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس کو بعید از امکان نہ خیال کرو بلکہ وہ پیش آ کے رہے گا۔

اب دعوے اور دلیل میں مطابقت کے پہلوؤں پر غور کیجیے۔ پہلا دعویٰ یہ ہے کہ 'اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ' (بے شک جس عذاب کی تم کو وعید سنائی جا رہی ہے وہ بالکل سچ ہے)۔ اس ٹکڑے کی شرح کرتے ہوئے ہم واضح کر چکے ہیں کہ اس سے مراد وہ عذاب ہے جس سے ہر رسول نے

اپنی قوم کو ڈرایا کہ اگر اس نے اپنی تکذیب کی روش نہ بدلی تو وہ لازماً عذابِ الٰہی کی گرفت میں آجائے گی۔

اس دعوے پر ابر و ہوا کے تصرفات میں شہادت کا پہلو یہ ہے کہ کوئی قوم، خواہ کتنے ہی وسائل و ذرائع اور کتنی ہی قوت و جمعیت کی مالک ہو، وہ اپنے آپ کو خدا کی گرفت سے باہر نہ سمجھے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسے کوئی بڑی مورچہ بندی نہیں کرنی پڑتی بلکہ وہ اپنی ہواؤں اور اپنے بادلوں ہی کے ذریعہ سے جب چاہے اس کو فنا کر دے سکتا ہے۔ یہ جس طرح انسان کے وجود و بقا کے لیے ناگزیر ہیں اسی طرح اس کو فنا کر دینے کے لیے بھی بے پناہ ہیں۔ آگے تاریخ کی روشنی میں اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے اسی سورہ میں قومِ نوح، عاد، ثمود، قومِ لوط اور قومِ فرعون کی مثالیں پیش کی ہیں جن میں دکھایا ہے کہ ان قوموں کو بھی اپنی قوت و شوکت پر بڑا ناز تھا۔ اسی غرور میں انھوں نے اللہ کے رسولوں کی وعید کا مذاق اڑایا اور مطالبہ کیا کہ جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو وہ لاؤ، ہم اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ بالآخر وہ عذاب ان پر آدھمکا اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا۔ وہی ہوا جو زندگی کے لیے ناگزیر ہے ان کے لیے طوفانِ قیامت بن گئی اور وہی ابر جس کو دیکھ کر وہ خوشی سے ناچنے لگے کہ هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (الاحقاف ۲۴) (یہ ہم کو سیراب کر دینے والا بادل ہے) ان کے لیے قہرِ الٰہی بن گیا۔ یہاں اس اشارے پر قناعت فرمائیے۔ آگے ان قوموں کی تباہی کی تفصیلات آ رہی ہیں۔ وہاں قرآن نے دکھایا ہے کہ دنیا کی یہ عظیم قومیں اسی غرور میں مبتلا ہوئیں جس میں قریش مبتلا ہیں بالآخر ان کو اللہ تعالیٰ کی ہواؤں اور اس کے بادلوں ہی نے چشم زدن میں خس و خاشاک بنا کر اڑا دیا اور وہ ان کے مقابل میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹک سکیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہ لشکر آج بھی موجود اور اس کے حکم کے منتظر ہیں۔ تاریخ ان کے کارناموں پر شاہد ہے!

اسی طرح دوسرے دعوے یعنی جزا اور سزا کے حق ہونے پر بھی یہ متعدد پہلوؤں سے شاہد ہیں۔

ہوا اور بادلوں کے باہمی تعامل سے اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت، رحمت اور ربوبیت کی جو شانیں ظاہر ہوتی ہیں ان سے قرآن نے جگہ جگہ متعدد بنیادی حقائق پر استدلال کیا ہے۔ ان کے اندر کوئی ایک نشانی نہیں ہے بلکہ گوناگوں نشانیاں موجود ہیں بشرطیکہ انسان ان پر غور کرے۔ اس باب میں ایک جامع آیت یہ ہے۔ فرمایا ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ	بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ	اور دن کی گردش اور ان کشتیوں میں جو سمندر

الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ
النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ
مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ
مَوْتِہَا وَبَثَّ فِیْہَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ
وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ
بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ
لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝
(البقرۃ: ۱۶۴)

ہیں لوگوں کے نفع کی چیزیں لے کر چلتی ہیں اور
اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا ہے پس
اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد
زندہ کر دیا اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے
اور ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان و
زمین کے درمیان مسخر ہیں ان لوگوں کے لیے
بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لینے
والے ہیں۔

اس آیت میں ہواؤں اور بادلوں کے تصرفات کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے اور آخر میں فرمایا ہے کہ ان کے اندر غور کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ یہ نشانیاں توحید، معاد، رسالت ہر چیز پر ہیں جن کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف ان نشانیوں کا بالاجمال حوالہ دیں گے جن کا تعلق مُقسم علیہ یعنی جزا و سزا سے ہے۔

جزا و سزا سے متعلق ایک بہت بڑا شبہ منکروں نے یہ پیش کیا کہ مر جانے اور سڑ گل جانے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا بعید از قیاس ہے۔ یہ شبہ پچھلی سورہ میں تفصیل سے زیر بحث آ چکا ہے۔ اس شبہے کی تردید میں قرآن نے جو دلیلیں پیش کی ہیں ان میں ایک نمایاں دلیل، جس کا ذکر گوناگوں اسلوبوں سے بار بار ہوا ہے، ابر و ہوا کے تصرفات ہی سے تعلق رکھنے والی ہے۔ معاد کو مستبعد سمجھنے والوں کو جگہ جگہ یہ جواب دیا گیا ہے کہ تم آئے دن اس دنیا میں قدرت کا یہ کرشمہ دیکھتے ہو کہ زمین بالکل چٹیل اور بے آب و گیاہ ہوتی ہے اور اس کے کسی گوشے میں بھی زندگی اور روئیدگی کا کوئی نشان نہیں ہوتا کہ دفعۃً کسی گوشے سے ہوا اٹھتی ہے، وہ بادلوں کو ہانک کر لاتی ہے، ان کو ایک خاص علاقے کے افق پر تہ بہ تہ جماتی ہے۔ پھر بادلوں سے مینہ برسنے لگتا ہے اور دیکھتے دیکھتے تمام علاقہ جل تھل ہو جاتا ہے اور چند دن بھی گزرنے نہیں پاتے کہ وہی رقبہ جو بالکل مردہ تھا زندگی سے معمور ہو کر لہلہانے لگتا ہے۔ جس قدرت کی یہ شانیں آئے دن دیکھتے ہو تمھارے مر کھپ جانے کے بعد اگر وہ تمھیں زندہ کرنا چاہے گی تو یہ کام اس کے لیے کیوں ناممکن ہو جائے گا!

اسی طرح ابر و ہوا کے تصرفات سے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنی ربوبیت کا جو اہتمام فرمایا ہے اس سے بھی جگہ جگہ جزا و سزا کے لازم ہونے پر استدلال فرمایا ہے۔ اس کی تقریر بالاجمال یوں ہے کہ دیکھتے ہو کہ آسمان بھی بند ہوتا ہے اور زمین بھی بند ہوتی ہے۔ نہ آسمان پانی برساتا اور نہ

زمین کوئی چیز اگاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جانب سے سازگار ہوائیں چلاتا ہے جو بوجھل بادلوں کو لاد کر لاتی ہیں اور زمین کو سیراب کر دیتی ہیں جس سے زمین اپنے خزانے اگلنا شروع کر دیتی ہے۔ تمھارے باغ لہلہا اٹھتے ہیں، تمھارے کھیت شاداب ہو جاتے ہیں، تمھارے میدان سبزہ سے بھر جاتے ہیں، جن سے تم بھی بہرہ مند ہوتے ہو اور تمھارے جانور بھی۔ غور کرو کہ جس خدا نے تمھاری پرورش کا یہ اہتمام فرمایا ہے کہ اپنے آسمان و زمین اور اپنے ابر و ہوا سب کو تمھاری خدمت میں معروف کر رکھا ہے کیا وہ تم کو اپنے باغوں اور چمنوں میں عیش کرنے کے لیے اسی طرح چھوڑے رکھے گا، کوئی ایسا دن نہیں لائے گا جس میں وہ دیکھے کہ کس نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور شکر گزاری کی زندگی بسر کی اور کس نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اسی کے خلاف بغاوت کے لیے استعمال کیا! نعمت کا یہ حق ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے اور ہر نعمت کے ساتھ مسئولیت کا شعور اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ اس شعور سے عاری صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی فطرت کو بالکل مسخ کر لیتے ہیں۔

اسی طرح ابر و ہوا کے تصرفات سے اللہ تعالیٰ نے اپنے قانونِ مکافات پر بھی شہادت پیش کی ہے کہ انہی ہواؤں اور بادلوں کو دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کے لیے رحمت بنا دیتا ہے اور دوسری قوم کے لیے عذاب۔ انہی ہواؤں کے تصرف سے اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات بخشی اور انہی کی گردش سے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس خلق کا خالق دیّان ہے۔ وہ نیکوں اور بدوں کے ساتھ ایک ہی معاملہ نہیں کرے گا بلکہ ہر ایک کے ساتھ اپنے عدل اور اپنی رحمت کے تقاضوں کے مطابق معاملہ کرے گا۔ اوپر ہواؤں کی تعریف میں فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا کے جو الفاظ آئے ہیں ان کی تفسیر پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ان ہواؤں کی یہ صفت گویا ان کے خالق کی صفت عدل کا مظہر ہے جس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ ایک دن ایسا لازماً آئے گا جس میں اللہ تعالیٰ تقسیم امر فرمائے گا، جو نجات و رحمت کے حقدار ہوں گے ان کو رحمت و مغفرت سے نوازے گا اور جو عذاب و عقاب کے سزاوار ہوں گے ان کو جہنم میں جھونک دے گا۔

۳۔ آگے آیات ۱۵-۱۹ کا مضمون

اوپر ان لوگوں کا ذکر گزرا ہے جو جزا و سزا سے بالکل نچنت لاابالیانہ زندگی گزارتے رہے۔ اگر کسی نے اس خوابِ غفلت سے ان کو بیدار کرنے کی کوشش کی تو اس کا منہ انھوں نے اس جواب سے بند کرنے کی کوشش کی کہ جزا و سزا کا کوئی دن ہے تو وہ کہاں ہے؟ اس کو لاؤ!

اور دکھائیے۔ اب ان کے مقابل میں ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جو اس دن کو ایک حقیقت سمجھ کر برابر اس سے ڈرتے اور اس کے لیے تیاریوں میں معروف رہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۵-۱۹

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٥﴾ آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُحْسِنِينَ ﴿١٦﴾ كَانُوا قَلِيلًا مِنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ﴿١٧﴾ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿١٨﴾ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿١٩﴾

ترجمۂ آیات ۱۵-۱۹

بے شک پرہیزگار باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ پا رہے ہوں گے جو کچھ ان کے رب نے ان کو بخشا۔ بے شک وہ اس سے پہلے خوب کاروں میں تھے۔ وہ راتوں میں کم ہی سوتے تھے اور صبح کے وقتوں میں مغفرت مانگتے تھے اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق تھا۔ ۱۵-۱۹

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (۱۵)

تقویٰ کی روح

'مُتَّقِین' ایک جامع صفت ہے جو قرآن میں ان لوگوں کے لیے استعمال ہوئی ہے جو خدا کے مقرر کردہ حدود و قیود کے اندر زندگی گزارنے والے ہیں۔ یہاں بھی اصلاً مراد وہی ہیں لیکن اوپر کی آیات میں ان لوگوں کا ذکر ہوا ہے جو آخرت اور جزا و سزا سے بے فکر لاابالیانہ زندگی گزارتے ہیں اس وجہ سے یہاں، تقابل کے اصول پر، اس صفت کے اندر جزا و سزا کے اندیشہ کا پہلو نمایاں ہے یعنی اس سے خاص طور پر وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے زندگی میں جو قدم بھی اٹھائے یہ سوچ کر اٹھائے کہ ایک دن ہر قول و فعل کا حساب دینا اور حدود الٰہی سے ہر تجاوز کی سزا بھگتنی ہے۔ درحقیقت جزا و سزا کا یہی اندیشہ تقویٰ کی اصل روح ہے۔ جس تقویٰ کے اندر یہ روح نہ ہو وہ محض نمائشی اور کاروباری تقویٰ ہے جس کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔ ان لوگوں کی نسبت فرمایا کہ بے شک یہ لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ اوپر لاابالیانہ زندگی گزارنے والوں

کا انجام یہ بیان ہوا کہ وہ جن زخارف پر ریجھ کر آخرت سے بے پروا ہوئے انہی کی آگ پر تپائے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ اب ان زخارف کا مزہ چکھو۔ اس کے برعکس ان لوگوں نے چونکہ آخرت کے مقابل میں دنیا کے زخارف کو کوئی وقعت نہیں دی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو باغوں اور چشموں میں اتارے گا۔ 'جنّٰت' اور 'عیون' دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ آخرت کی نعمتوں کی جامع تعبیر ہیں۔ 'فِیْ' یہاں اس بات پر دلیل ہے کہ یہ لوگ جنت کی نعمتوں میں بالکل گھرے ہوئے ہوں گے۔ ان کے لیے ہر طرف نعمت ہی نعمت ہو گی۔

اٰخِذِیْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ (۱۶)

جنھوں نے دنیا میں خدا کی پابندیوں کا احترام کیا ان کے لیے آخرت میں آزادی

یہ ان نعمتوں سے ان کے آزادانہ متمتع ہونے کی تصویر ہے۔ 'اٰخِذِیْنَ' حال واقع ہے اس وجہ سے میرے نزدیک یہ صورت حال کی تصویر کا فائدہ دے رہا ہے یعنی وہ دمبدم وہ کچھ پا رہے ہوں گے جو ان کے رب نے ان کو عطا فرمایا۔ 'مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ' میں صیغۂ ماضی اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جہاں تک دیے جانے کا تعلق ہے اس کا فیصلہ اور وعدہ تو ان کے رب نے پہلے ہی سے کر رکھا ہے، اس بات میں ان کو کسی نئے فیصلے کا انتظار نہیں کرنا ہو گا۔ اب صرف ان نعمتوں سے متمتع و محظوظ ہونے کا دور ہو گا۔ وہ جس چیز کے خواہشمند ہوں گے اپنے رب کے بخشے ہوئے غیر فانی ذخائر میں سے لیں گے اور جتنا چاہیں گے اور جب چاہیں گے لیں گے۔ ان کے اوپر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔ انھوں نے دنیا میں اپنے رب کی عائد کردہ پابندیوں کا احترام کیا۔ اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ ان کو تمام نعمتیں بخش کر آزاد چھوڑ دے گا کہ اب ان سے جس طرح چاہو متمتع ہو، تم پر کوئی پابندی باقی نہیں رہی۔

تقویٰ کے اندر احسان کی روح

'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ' یہ ان کے اوپر اس بے پایاں انعام کی علت بیان ہوئی ہے کہ یہ لوگ اس سے پہلے دنیا کی زندگی میں 'محسنین' میں رہے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان پر یہ انعام فرمائے گا۔ 'محسنین' کا ترجمہ ہم نے اس کتاب میں جگہ جگہ 'خوب کار' کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے رب کے ہر حکم کی تعمیل اس طرح کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے۔ یہ صفت صرف ان لوگوں کے اندر پیدا ہوتی ہے جن کے اندر جزا و سزا کا عقیدہ راسخ ہو۔ یہ عقیدہ جن کے اندر راسخ ہوتا ہے وہ ہر کام اس طرح کرتے ہیں گویا وہ خدا کو دیکھ رہے ہیں، اس لیے کہ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر وہ خدا کو نہیں دیکھ رہے ہیں تو خدا تو بہرحال ان کو دیکھ رہا ہے۔

'متقین' کے لیے 'محسنین' کا لفظ استعمال کر کے ان کے باطن پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ لوگ چونکہ جزا و سزا پر یقین رکھنے والے تھے اس وجہ سے ان کا تقویٰ محض ظاہر دارانہ تقویٰ

نہیں تھا بلکہ اس کے اندر احسان کی روح تھی۔ اور پر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہی تقویٰ اللہ تعالیٰ کے ہاں قدر و قیمت رکھتا ہے اور یہ جزا و سزا کے راسخ اعتقاد سے پیدا ہوتا ہے۔

تقویٰ اور احسان کی بعض علامات

كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ (۱۷)

یہ ان کے تقویٰ اور احسان کی علامات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ راتوں کو کم سوتے تھے یعنی وہ بے فکروں اور لاابالیوں کی طرح اپنی راتیں عیش کے بستروں میں نہیں بلکہ روزِ حساب کی تیاری میں گزارتے تھے، ان کی راتوں کا زیادہ حصہ خدا کے آگے سجود و قیام اور ذکر و فکر میں بسر ہوتا۔

یہ فکرِ آخرت کا ایک لازمی اثر بیان ہوا ہے۔ جن کو آخرت کی فکر ہوتی ہے وہ گھوڑے بیچ کر نہیں سوتے۔ ان کو یہ اندیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ ممکن ہے یہ زندگی کی آخری رات ہو اس وجہ سے ان کی نیند کشمکش کی نیند ہوتی ہے۔ وہ راتوں میں اٹھ اٹھ کر اپنے رب کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ اسی طرح کے لوگوں کا حال دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: تَتَجَافٰى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُونَ (السجدۃ ۳۲: ۱۶) (ان کے پہلو بستروں سے دور رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو یاد کرتے ہیں، بیم و امید کے ساتھ، اور جو روزی ہم نے ان کو بخشی ہے اس میں سے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں)۔

اس جملہ کی تالیف کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں، لیکن مطلب ہر شکل میں ایک ہی ہو گا۔ ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ اَنَّهُمْ كَانُوا قَلِيلًا هُجُوعُهُمْ (ان کا شب میں سونا تھوڑا تھا) دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ كَانُوا يَهْجَعُونَ قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ (رات میں وہ تھوڑا سوتے تھے) الغرض نحوی تالیف کی صورتیں تو مختلف ہو سکتی ہیں لیکن مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں ہو گا۔ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم اس سے مختلف لیا ہے، لیکن ان کی رائے عربیت کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے نظائر کے بھی اس وجہ سے اس سے تعرض کی ضرورت نہیں ہے۔

'هُجُوع' کے معنی سونے کے ہیں اور اس آیت سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اہلِ تقویٰ اور اہلِ احسان کی یہ خاص علامت ہے کہ وہ رات میں کم سوتے ہیں، زیادہ حصہ اس کا وہ اللہ تعالیٰ کی یاد، ذکر و فکر اور توبہ و استغفار میں گزارتے ہیں۔ یہی بات قرآن کے نظائر سے بھی نکلتی ہے، مثلاً يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيلًا (المزمل: ۱-۲) (اے چادر میں لپٹنے والے، رات میں قیام کر، بجز تھوڑے حصہ کے) اس کے بعد مقدار کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ (المزمل: ۳-۴) (آدھی رات قیام کر یا اس سے کچھ کم کر دے یا اس پر کچھ اضافہ کر لے)۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ شب بیداری ان اہلِ تقویٰ کی خاص علامات میں سے ہے

جو مرتبۂ احسان پر فائز ہیں اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ جو لوگ اس مرتبہ کے حصول کی تمنا رکھتے ہیں ان کے لیے بھی اس کا اہتمام لازمی ہے۔ رہے ہما شما جو ان عقبات کو عبور کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو ان کے لیے بعض رخصتیں ہیں جن کی وضاحت ان شاء اللہ سورۂ مزمّل کی تفسیر میں آئے گی۔

وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (۱۸)

پُو پھٹنے سے کچھ پہلے کا وقت سحر کا وقت ہے۔ یہ ان کی تمام شب خیزی اور تمام رکوع و سجود کی نہایت بیان ہوئی ہے۔ یعنی آخری کام ان کا یہ ہوتا ہے کہ سحر کے وقت اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں کہ ربِ کریم جزا و سزا کے دن ان کے گناہوں سے درگزر فرمائے اور ان کو اپنے دامنِ عفو و کرم میں جگہ دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ نہ تو اس بات کے متوقع ہوتے کہ اس شب بیداری اور رکوع و سجود کے صلہ میں ان کو حضور و شہود کا کوئی بڑا مقام حاصل ہو گا اور نہ وہ اس طرح کی کسی چیز کے طلبگار ہی بنتے بلکہ ان کی طلب صرف یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ چنانچہ ان کی شب کی تمام عبادت و ریاضت کا اختتام استغفار پر ہوتا ہے۔

اسلام میں عبادت و ریاضت کا اصل مقصد — اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اسلام میں عبادت و ریاضت کا مقصود دوسرے مذاہب سے بالکل مختلف ہے۔ دوسرے مذاہب میں عبادت و ریاضت کا اصل مقصود کشف، مشاہدہ، تجلّی ذات، ذاتِ خداوندی میں انضمام اور اس قبیل کی دوسری چیزیں ہیں۔ جوگی، سنیاسی اور راہب جو ریاضتیں کرتے ہیں ان سے ان کے پیشِ نظر یہی چیزیں ہوتی ہیں، لیکن اسلام میں ریاضت و عبادت کا اصل مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی کی طلب ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری چیز اگر عبادت کے مقصد کی حیثیت حاصل کر لے تو اسلام میں اس عبادت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ہندوؤں کے فلسفہ سے متاثر ہو کر ہمارے ہاں صوفیوں کے ایک طبقہ نے بھی عبادت و ریاضت کا مطمحِ نظر انہی چیزوں کو بنا لیا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا اس وجہ سے ان کے تزکیۂ نفس کی ساری جدوجہد نے ایک بالکل ہی مختلف راہ اختیار کر لی۔ یہاں اس مسئلہ پر بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم نے اپنی کتاب 'تزکیۂ نفس' میں اس کے بعض پہلو واضح کیے ہیں۔

استغفار کے لیے سازگار ساعت — قرآن اور حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ استغفار کے لیے سب سے زیادہ سازگار وقت آخرِ شب اور سحر کا وقت ہے۔ اس وقت، جیسا کہ مشہور حدیث قدسی سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت استغفار کرنے والوں کے انتظار میں ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت سے فائدہ اٹھانے کا حوصلہ صرف طالبِ صادق ہی کر سکتے ہیں۔ ہر بوالہوس یہ حوصلہ نہیں کر سکتا کہ رات رکوع و سجود میں گزارے۔ پھر صبح کو مغفرت کا سائل بن کر اپنے رب کے دروازے پر حاضر ہو۔ اللہ کے جو بندے یہ حوصلہ دکھاتے

ہیں ان کا یہ حوصلہ ہی ان کے اخلاص کا ضامن ہوتا ہے، اس وجہ سے اللہ کی رحمت ان کی طرف فزوں تر متوجہ ہوتی ہے۔ اصل جالبِ رحمت تو بندے کا خلوص ہے۔ جب یہ چیز موجود ہے تو اللہ تعالیٰ کے پاس فضل و رحمت کی کیا کمی ہے!

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۱۹)

محسنین خدا کے حقوق کی طرح بندوں کے حقوق بھی پہچانتے ہیں — یعنی یہ محسنین جس طرح خدا کا حق پہچاننے والے تھے اسی طرح اس کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرنے والے تھے۔ وہ اپنے مالوں میں صرف اپنے نفس ہی کا حق نہیں، بلکہ سائلوں اور محروموں کا حق بھی سمجھتے تھے اور اس کو اسی طرح ادا کرتے تھے جس طرح اہلِ حق کے حقوق ادا کیے جاتے ہیں یعنی وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھے کہ ان کے پاس جو مال ہے وہ تنہا انہی کا ہے بلکہ وہ اس حقیقت کا ادراک رکھتے تھے کہ خدا نے اگر ان کو ان کی ناگزیر ضروریات سے ان کو زیادہ دیا ہے تو یہ دوسروں کا حق ہے جو ان کی امانت میں دیا گیا ہے۔ اس امانت کا یہ حق ہے کہ وہ اس کے مستحقین کو ادا کی جائے۔ اگر یہ امانت ادا نہ کی گئی تو یہ خیانت ہوگی اور ہر خیانت کی خدا کے ہاں پرسش ہونی ہے۔

'محروم' سے کون مراد ہیں؟ — 'محروم' سے مراد یوں تو ہر وہ شخص ہے جو مال سے محروم ہو لیکن اس کے مفہوم میں وہ لوگ خاص طور پر شامل ہیں جو پہلے صاحبِ مال رہے ہوں بعد میں کسی افتاد نے ان کو محروم بنا دیا ہو۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے قرآن میں لفظ 'غارمین' استعمال ہوا ہے اور ان کو صدقات کے مستحقین میں شامل کیا گیا ہے۔ محرومین میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو احتیاج کے باوجود سوال کرنے کا ننگ گوارا نہیں کرتے۔ خاص طور پر جو لوگ کبھی صاحبِ مال رہ چکے ہوں ان کو اپنی خودداری بہت عزیز ہوتی ہے۔ یہاں یہ لفظ چونکہ 'سائل' کے مقابل میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ محتاج ہیں جو سوال نہیں کرتے۔ اس طرح کے خودداروں کی خودداری کی لاج رکھنا بہت بڑی نیکی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اس طرح کے محتاجوں کی مدد کے لیے مال رکھنے والوں کو خود ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ مال داروں کے دروازوں پر سائل بن کر حاضر ہوں گے۔ سورۂ بقرہ میں اس طرح کے خودداروں کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ	یہ صدقات ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کی
سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ	راہ میں معروف ہیں، تلاشِ معاش کی جدوجہد
ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ	میں زمین میں نقل و حرکت نہیں کر سکتے۔ ان کے
الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ	حال سے ناواقف ان کی خودداری کے سبب
تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا	سے ان کو غنی سمجھتے ہیں۔ تم ان کو چہرے بشرے

يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط (البقرة ۲: ۲۷۳)
سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔

۵- آگے آیات ۲۰-۲۳ کا مضمون

آگے کی آیات میں سورہ کے اصل عمود یعنی جزا و سزا کے مضمون کو از سر نو لیا ہے۔ اوپر صرف ابر و ہوا کے تصرفات سے استدلال تھا آگے آفاق و انفس کے ان تمام دلائل کی طرف اشارہ فرمایا جو اس کائنات کے ہر گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں بشرطیکہ لوگ ان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں کھولیں اور ان سے جو نتائج سامنے آتے ہیں ان پر یقین کریں۔ فرمایا۔

آیات ۲۰-۲۳
وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ (۲۰) وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۲۱) وَفِي السَّمَاۗءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (۲۲) فَوَرَبِّ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ (۲۳)

ع ۲۲/۱۸

ترجمۂ آیات ۲۰-۲۳
اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمھارے اندر بھی، کیا تم دیکھتے نہیں؟ اور آسمان میں تمھاری روزی بھی ہے اور وہ چیز بھی جس کی تم کو وعید سنائی جا رہی ہے۔ پس آسمان و زمین کے خداوند کی قسم، یہ بات شدنی ہے، جس طرح تم بول دیتے ہو۔ ۲۰-۲۳

۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ (۲۰)

آسمان و زمین اور انسان کے اندر کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اوپر جزا و سزا کی جو نشانیاں مذکور ہوئی ہیں اس آیت کا عطف انہی پر ہے۔ ابر و ہوا کی نشانیوں کا تعلق زمین و آسمان کے درمیان کی نشانیوں سے ہے۔ اب آگے آسمان و زمین اور خود انسان کے اندر کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی اور اقرب فالاقرب کے اصول پر سب سے

پہلے زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ فرمایا، اس کے بعد انفس کی نشانیوں کی طرف، پھر آسمان کی نشانیوں کی طرف۔ یوں تو ان چیزوں سے قرآن نے اپنی دعوت کے تمام بنیادی حقائق ـــــ توحید، معاد، رسالت ـــــ پر استدلال کیا ہے جس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے لیکن یہاں سورہ کے عمود کے تقاضے سے صرف معاد اور جزا و سزا کی نشانیوں ہی کی طرف اشارہ ہے اس وجہ سے ہم بھی اپنی بحث صرف جزا و سزا کے دلائل ہی تک محدود رکھیں گے، اور جس طرح قرآن نے اشارے پر اکتفا کیا ہے اسی طرح ہم بھی اشارات ہی پر اکتفا کریں گے اس لیے کہ یہ تمام بحثیں پچھلی سورتوں میں پوری تفصیل سے گزر چکی ہیں۔

سب سے پہلے سورۂ نبا کی مندرجہ ذیل آیات پر ایک نظر ڈال لیجیے جن میں قرآن نے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی مختلف چیزوں سے معاد اور جزا و سزا پر استدلال فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا ۝ وَّ الْجِبَالَ أَوْتَادًا ۝ وَّخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا ۝ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَّجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝ وَّأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۝ لِّنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝ وَّجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۝ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝ (النبا: ۶-۱۷)	کیا ہم نے زمین کو ایک گہوارہ نہیں بنایا؟ اور اس میں پہاڑوں کی میخیں نہیں گاڑیں؟ اور تم کو جوڑے جوڑے نہیں پیدا کیا؟ اور تمھاری نیند کو دافع کلفت نہیں بنایا؟ اور رات کو پردہ پوش نہیں بنایا؟ اور دن کو معاش کا وقت نہیں ٹھہرایا؟ اور تمھارے اوپر سات محکم آسمان نہیں بنائے اور اس میں ایک روشن چراغ نہیں رکھا؟ اور بدلیوں سے دھڑا دھڑ برستا پانی نہیں برسایا تاکہ اس سے غلے اور نباتات اور گھنے باغ اگائیں؟ بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے!!

ان آیات میں اپنی قدرت، رحمت اور ربوبیت کے ان گوناگوں آثار سے، جو آسمان، زمین اور ان کے درمیان موجود ہیں اور جن کا مشاہدہ ہر شخص بادنیٰ توجہ کر سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت ثابت کی ہے کہ یہ کارخانہ بے مقصد اور عبث نہیں ہو سکتا اس وجہ سے لازم ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اس کا خالق نیکوں اور بدوں کے درمیان فیصلہ فرمائے۔ اس دلیل کے ہر پہلو کی وضاحت سابق سورتوں کی تفسیر میں ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں ہم مختصر الفاظ میں زمین کی چند نشانیوں کی طرف، جو جزا و سزا پر دلیل ہیں، اشارہ کریں گے۔

ـــــ امکانِ معاد پر قرآن نے زمین کے آثار سے یوں دلیل قائم کی ہے کہ دیکھتے ہو کہ زمین بالکل مردہ

اور بے آب وگیاہ ہوتی ہے، اس کے کسی گوشے میں بھی زندگی و روئیدگی کا کوئی نشان نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کی گھٹا بھیجتا ہے اور بارش کا ایک ہی چھینٹا اس کو زندگی اور شادابی سے معمور کر دیتا ہے۔ غور کرو کہ جو خدا اپنی قدرت کی یہ شان برابر دکھا رہا ہے وہ لوگوں کے مرکھپ جانے کے بعد ان کو دوبارہ زندہ کرنا چاہے گا تو کیا نہیں کر سکے گا۔

— اس زمین میں رب کریم نے اپنے بندوں کی پرورش کے لیے جو گوناگوں اہتمام کر رکھے ہیں ان کا حوالہ دے کر یہ سوال کیا ہے کہ کیا جس رب کریم نے تمہاری پرورش کے لیے یہ سامان کر رکھا ہے وہ تمھیں اس زمین میں یوں ہی مطلق العنان چھوڑے رکھے گا اور کوئی ایسا دن نہیں لائے گا جس میں وہ ان لوگوں سے بازپرس کرے جنھوں نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اسی کے خلاف بغاوت کا ذریعہ بنایا ہو اور ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا ہو! کیا تم ایسے حکیم و کریم پروردگار کے متعلق یہ گمان رکھتے ہو کہ وہ کوئی کھلنڈرا ہے جس کی نگاہوں میں نیکی و بدی یکساں ہے اور کیا تم اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو کہ تمہارے رب کی یہ بے پایاں نعمتیں تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتیں!

— اس زمین میں قوموں کی تباہی کے جو آثار ہیں قرآن نے ان کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور واضح فرمایا ہے کہ یہ قومیں اپنے طغیان و تمرد کے باعث اللہ کے عذاب سے تباہ ہوئیں۔ ان کی تباہی کے بعد ان کے آثار اس نے اس لیے محفوظ رکھے ہیں کہ ان کے بعد آنے والی قومیں ان سے سبق حاصل کریں کہ اس کائنات کا خالق اس دنیا کے خیر اور شر سے بے تعلق نہیں ہے بلکہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ جب کسی قوم کا طغیان حد سے متجاوز ہو جاتا ہے تو وہ لازماً اس کے قانونِ مکافات سے دوچار ہوتی ہے۔ قوموں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ ایک ایسا دن بھی وہ لائے گا جس میں اس کا ہمہ گیر عدل ظاہر ہوگا۔ ہر شریر اپنی شرارت کی سزا بھگتے گا اور ہر نیکوکار اپنی نیکی کا بھرپور صلہ پائے گا۔

یہ زمین کے چند نہایت واضح آثار کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے جو جزا و سزا پر دلیل ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی گوناگوں نشانیاں ہیں جن کی طرف قرآن نے توجہ دلائی اور ہم نے اس کتاب میں ان کی وضاحت کی ہے۔ یہاں ان کے اعادے میں طوالت ہوگی۔

حقائق بجائے خود کافی نہیں ہوتے — `لِّلْمُوْقِنِیْنَ` یعنی زمین میں نشانیوں کی تو کمی نہیں ہے۔ قدم قدم پر نشانیاں موجود ہیں۔ بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھیں، غور کرنے والی عقلیں اور غور و فکر کے نتائج پر یقین کرنے والے دل ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک حقیقت کو قبول کرنے کے لیے مجرد یہ چیز کافی نہیں ہے کہ اس کے دلائل موجود ہیں بلکہ اس کے لیے یہ چیز بھی ضروری ہے کہ مخاطب کے اندر دلائل پر غور کرنے

اور ان کے بدیہی نتائج کو تسلیم کرنے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ اگر آدمی کے اندر یہ ارادہ نہ ہو تو وہ واضح سے واضح حقیقت کو جھٹلا دینے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر ہی لیتا ہے۔ اس دنیا میں حقائق کی تکذیب صرف اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ ان کے حق میں دلائل نہیں تھے یا ان کو پیش کرنے والے موجود نہیں تھے بلکہ اکثر و بیشتر نہ ماننے کی خواہش ان کی تکذیب کی محرک ہوئی ہے اور یہ ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔

وَفِىٓ أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (۲۱)

انفس کے بعض دلائل کی طرف اشارہ

یہ روز جزا و سزا پر انفس کے دلائل کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن نے جس طرح آفاق سے اپنی دعوت کے تمام بنیادی اجزا پر استدلال کیا ہے۔ اسی طرح انفس سے بھی تمام اصولی مطالب پر دلیل قائم کی ہے جن کی وضاحت اس کتاب میں ان کے محل میں ہم کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں ہم بالاجمال صرف جزا و سزا سے متعلق چند باتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

— قرآن نے جگہ جگہ انسان کی خلقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو خدا حقیر پانی کی ایک بوند کو مختلف اطوار و مراحل سے گزار کر، ایک بھلا چنگا انسان بنا کھڑا کرتا ہے اور اس کو گوناگوں ظاہری و باطنی صلاحیتوں سے آراستہ کر دیتا ہے کیا اس کے لیے یہ ناممکن خیال کرتے ہو کہ تمھارے مرکھپ جانے کے بعد تم کو از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے اور تمھارے تمام اعمال و اقوال کا حساب کرے! جب پہلی بار تمھارا پیدا کیا جانا اس کے لیے ناممکن نہیں ہوا تو دوبارہ یہی کام اس کے لیے کیوں ناممکن ہو جائے گا! اسی ضمن میں جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ ہر آدمی ہر روز اپنے اندر زندگی، موت، برزخ اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے مشاہدات کو یوں ہی نہ گزر جانے دے بلکہ ان پر غور کرنے کی عادت بھی ڈالے۔

انسان کے مرتبۂ خلافت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ خدا کے آگے اس کی پیشی ہو

— انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل، ادراک اور علم کی جن صلاحیتوں سے آراستہ فرمایا ہے اور جن فطری قوتوں اور قابلیتوں سے اس کو مسلح کیا ہے، ان کی روشنی میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ انسان زمین کے دوسرے جانداروں کی طرح اس زمین ہی کی مخلوق نہیں ہے بلکہ اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ خدا کی طرف سے ایک خاص دائرہ میں اختیار و ارادہ کی امانت کا حامل ہو کر آیا ہے جس کی بنا پر خدا نے اس کو اپنی خلافت کے مرتبۂ بلند پر سرفراز فرمایا ہے۔ اس امانت و خلافت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ ایک دن وہ اپنے رب کے آگے پیش ہو تاکہ جس نے اس امانت و خلافت کا حق ادا کیا ہو وہ اس کا ابدی انعام حاصل کرے اور جس نے اس امانت میں خیانت اور خلافت پا کر بغاوت کا ارتکاب کیا ہو وہ اس کی ابدی سزا بھگتے۔ گویا جزا و سزا انسان کے مرتبۂ خلافت پر سرفرازی کا ایک لازمی اور بدیہی تقاضا ہے۔ یہ دلیل قرآن میں بھی بیان ہوئی ہے اور سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی اس کو نہایت

خوبصورت تمثیلوں سے واضح فرمایا ہے۔

انسان کے اندر نفس لوامہ کا وجود قیامت کے وجود کی دلیل ہے

—— تیسری اہم حقیقت جو سورۂ قیامہ میں خاص اہتمام کے ساتھ واضح فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک نفس لوّامہ ودیعت فرمایا ہے جو اس کو، جب وہ کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے، ملامت کرتا ہے۔ اسی نفسِ لوّامہ کی قسم کھا کر جزاء و سزا کے حق ہونے پر اس کو شہادت میں پیش کیا ہے کہ اگر انسان کو وجود میں لانے والا نیکی پر انعام اور بدی پر سزا دینے والا نہ ہوتا تو انسان کے اندر وہ اس نفسِ لوّامہ کو کیوں ودیعت فرماتا جو اس کو ہمیشہ ایک خلش میں مبتلا رکھے ؟ اس کا ودیعت کیا جانا تو اس بات کی نہایت واضح شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اس مجموعی کائنات کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو روزِ قیامت مقرر کر رکھا ہے اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہر انسان کے سینے میں رکھ دے جو اس کو برابر اس حقیقت کی یاد دہانی کرتا رہے کہ جس خدا نے اس کو وجود بخشا ہے وہ اس کی نیکی اور بدی سے بے تعلق نہیں ہے بلکہ وہ جزاء و سزا دینے والا ہے۔ گویا یہ انسان کے اندر ایک چھوٹی سی عدالت اس عدالتِ کبریٰ کی یاد دہانی کے لیے ہے جو قیامت کے دن قائم ہو گی۔ اسی بنا پر انسان کو عالمِ اصغر کہا گیا ہے اس لیے کہ اس پورے عالم کا ایک عکس اس کے آئینہ میں موجود ہے۔

سورۂ قیامہ میں فرمایا گیا ہے کہ جزاء و سزا کی شہادت ہر آدمی خود اپنے اندر پا رہا ہے اگرچہ وہ اس کی تکذیب کے لیے کتنے ہی بہانے پیدا کرے، 'بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ' (القیامۃ: ۱۴-۱۵) اسی طرح اسی سورہ میں یہ بات بھی فرمائی گئی ہے کہ جو شخص کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کی عدالت کے سامنے جرم کرتا ہے، 'بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ (القیامۃ: ۵) (بلکہ انسان چاہتا ہے کہ اس کے سامنے شرارت کرے) اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ خدا کی ایک چھوٹی سی عدالت اس کے ضمیر کے اندر ہی موجود ہے اس وجہ سے جو شخص بھی کوئی جرم کرتا ہے وہ درحقیقت اسی عدالت کے سامنے کرتا ہے اور یہ اس کی ایک کھلی ہوئی جسارت ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'نفسِ لوّامہ' انسان کو متنبہ کرنے کا فرض اس وقت تک برابر انجام دیتا رہتا ہے جب تک انسان اس کی مسلسل خلاف ورزی سے اس کو بالکل مردہ نہ بنا دے۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔

'اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ': انسان کا نفس چونکہ اس سے سب سے زیادہ قریب ہے اس وجہ سے فرمایا کہ کیا اتنی قریب کی نشانیاں بھی تم کو نظر نہیں آ رہی ہیں! یعنی اگر زمین کے اطراف و اکناف تمہارے احاطے سے باہر ہیں، اگر آسمان تمہاری دسترس سے بعید ہے تو کیا تمہارا نفس بھی تم سے دور ہے

کہ تم اس کے اندر جھانک کر ان نشانیوں کو نہیں دیکھ سکتے!

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (۲۲)

آسمان کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اب یہ آسمان کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ دیکھو اس کے اندر تمہارا رزق بھی ہے اور وہ عذاب بھی ہے جس سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے۔ 'رزق' سے مراد بارش ہے جو رزق کا ذریعہ بنتی ہے۔ سبب بول کر مراد اس سے مسبّب کو لیا ہے جو عربیت کا معروف اسلوب ہے۔ 'وَمَا تُوعَدُونَ' سے، جیسا کہ آیت ۵ کے تحت وضاحت ہو چکی ہے، وہ عذاب مراد ہے جس سے لوگوں کو پیغمبر کی تکذیب کی صورت میں آگاہ کیا جا رہا تھا۔ اس کی مثالیں قوموں کی تاریخ میں موجود ہیں اور ان میں سے بعض کا حوالہ آگے اسی سورہ میں آ رہا ہے۔

یعنی یہ آسمان تو آئے دن تمہارے سامنے جزا و سزا کی شہادت دیتا رہتا ہے اسی کے اندر سے اللہ تعالیٰ تمہارا رزق بھی برساتا ہے اور اسی کے اندر سے نافرمانی و سرکشی کرنے والوں پر جب چاہے عذاب بھی برسا دیتا ہے۔ نہ رحمت کے لیے اسے کوئی الگ اہتمام کرنا پڑتا اور نہ نقمت کے لیے کوئی الگ توپ نصب کرنی پڑتی۔ تو جس کا یہ جمال و جلال برابر دیکھتے ہو اس سے کیوں بعید سمجھتے ہو کہ وہ جب چاہے اسی چیز کو تمہاری تباہی کا ذریعہ بنا دے جو تمہاری زندگی کا ذریعہ ہے! پھر جس کی رحمت و نقمت کی یہ شانیں اس دنیا میں دیکھ رہے ہو آخر یہ کیوں یقین نہیں کرتے کہ وہ خیر و شر کے معاملے میں بے تعلق یا غیر جانبدار نہیں ہے بلکہ وہ بدوں کو لازماً سزا دے گا اور نیکوکاروں کو لازماً صلہ دے گا۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ (۲۳)

خلاصۂ بحث

اب یہ ان تمام نشانیوں کو سمیٹ دیا اور آسمان و زمین دونوں کے رب کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس روز جزا و سزا کی تم کو یاددہانی کی جا رہی ہے اور پیغمبر کی تکذیب کے جس نتیجہ سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے وہ شدنی ہے۔ اس میں خدا کو ذرا بھی مشکل نہیں پیش آئے گی۔ جس طرح تمہارے لیے زبان سے کوئی لفظ بول دینا نہایت آسان ہے اسی طرح خدا کے لیے یہ سب کچھ کر دینا نہایت آسان ہے۔ اس کے سارے کام اس کے کلمۂ 'کُن' سے ہو جاتے ہیں۔

'إِنَّهُ' میں ضمیر کا مرجع وہی مقسم علیہ ہے جو اوپر گزر چکا ہے یعنی 'إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ ۝ وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ' اس کا ذکر اوپر ہو چکا تھا اس وجہ سے اس کی طرف اشارہ کے لیے ضمیر کافی ہوئی۔ پہلے آسمان و زمین کی چند نشانیوں کا حوالہ دے کر اس کی قسم کھائی پھر پورے آسمان و زمین کے رب کی قسم کھا کر وہی بات دہرا دی جس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جس طرح ہر مصنوع سے اس کے صانع کے مزاج و مذاق کا اندازہ ہوتا ہے اسی طرح آسمان و زمین کی نشانیوں سے ان کے

خالق کی صفات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جزا و سزا دینے والا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس کے بنائے ہوئے آسمان اور زمین میں یہ چیز کہاں سے نمایاں ہوتی؟

قیامت کے وقوع کی وضاحت ایک مثال سے

'اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ'۔ لفظ 'حق' کے اندر دو مفہوم ہیں، ایک یہ کہ یہ جزا و سزا ایک حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ شدنی ہے، اس کے وقوع کو کوئی ناممکن نہ خیال کرے۔ جب اس کا وقت آجائے گا تو خدا اس کو پلک جھپکتے سامنے کر دے گا۔ اس کا ایک حقیقت ہونا اوپر کے دلائل آفاق و انفس سے واضح ہو چکا ہے۔ اب یہ اس کے وقوع کو ایک تمثیل سے واضح فرمایا ہے کہ یہ کام آسمان و زمین کے رب کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ جب اس نے آسمان و زمین پیدا کر دیے اور اس کام میں اس کو ذرا مشکل پیش نہیں آئی تو لوگوں کو حساب کتاب کے لیے دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اس کے لیے کیوں مشکل ہوگا؟ جس طرح تمھارے لیے ایک لفظ کو بول دینا آسان ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے کسی بڑے سے بڑے کام کو کر دینا آسان ہے۔ اس کو کسی کام کے لیے کوئی اہتمام یا سر و سامان نہیں کرنا پڑتا بلکہ وہ ہر کام اپنے کلمۂ 'کُن' سے چشم زدن میں کر دیتا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝ (النحل: ۴۰)	جب ہم کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمارا بس یہ کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔

دوسرے مقام میں ارشاد ہے۔

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰی ۗ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ۝ اِنَّمَآ اَمْرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝ (یٰسٓ: ۸۱-۸۲)	کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں ہوگی کہ ان کے مثل پیدا کر دے! ہاں، وہ اس بات پر قادر ہے۔ وہ بڑا ہی پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔ اس کی قدرت کا حال تو یہ ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

بعض مقامات میں یہ بات بھی واضح فرمائی ہے کہ اس دنیا کو دوبارہ پیدا کر دینا تو اس کے لیے اول بار پیدا کرنے سے بھی زیادہ آسان ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ	اور وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے اس سے بھی

عَلَيۡهِ (الملک: ۲۷) آسان ہے۔

یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھیے کہ یہ تمثیل بھی ہمارے سمجھانے کے لیے محض ایک تمثیل ہے ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لیے ایک لفظ کو بولنا بھی اتنا آسان نہیں ہے جتنا اللہ تعالیٰ کے لیے سارے جہان کو پیدا کر دینا۔ ہم ایک لفظ بولنے کے لیے نہ جانے کتنے ادوات و آلات کے محتاج ہیں جو سب کے سب خدا کے بخشے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی چیز کا بھی محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن میں بعض جگہ کَلَمۡحٍ بِالۡبَصَرِ، پلک جھپکنے کی تمثیل بھی آئی ہے۔ وَمَآ اَمۡرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمۡحٍۭ بِالۡبَصَرِ (القمر: ۵۰) (ہمارا حکم تو بس پلک جھپکنے کی طرح ہے) یہ بھی ایک تمثیل ہی ہے، جس سے ہمیں اس کے اختیار مطلق کا ایک تصور ہوتا ہے۔ ان تمثیلات و تشبیہات سے متعلق وہ حقیقت ہمیشہ مستحضر رکھیے جو سورۂ آل عمران میں بیان ہوئی ہے۔

استاذ امامؒ کا ایک نکتہ

یہاں استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نکتہ قابلِ ذکر ہے۔ اوپر زمین، نفس اور آسمان کی جن نشانیوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے ان کے باہمی نظم کی وضاحت اپنی تفسیر میں مولاناؒ نے یوں فرمائی ہے[1]:

"اس جامع کلام کے اندر جو خوبصورت ترتیب پائی جاتی ہے اور اقرب فالاقرب کا جو اصول اس میں ملحوظ ہے، پچھلے مباحث سے بڑی حد تک اس کی وضاحت ہو گئی ہے لیکن اس پر مزید غور کیجیے تو ایک اور لطیف نکتہ بھی سامنے آئے گا۔"

"اس ٹکڑے میں وَفِي الۡاَرۡضِ اٰيٰتٌ، سے لے کر وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ، تک پہلے زمین کا ذکر آیا ہے پھر نفس کا پھر آسمان کا۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ نفس ایک ایسی چیز ہے جو زمین اور آسمان دونوں کے درمیان ہے اور اس کے اندر دو پہلو ہیں۔ ایک مادی دوسرا روحانی۔ ایک پہلو سے یہ زمین کی طرف رجحان رکھتا ہے، دوسرے پہلو سے آسمان کی طرف۔ اس کے بعد ان تینوں کے اندر جو نشانیاں پائی جاتی ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا۔ پھر فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ (آسمان اور زمین کے رب کی قسم، یہ حق ہے) فرما کر اس جامع دلیل سے پردہ اٹھایا ہے جو انسان کے دوبارہ اٹھائے جانے اور جزا و سزا کی اصل دلیل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کی پروردگاری کی دلیل۔ پھر مِّثۡلَ مَآ اَنَّكُمۡ تَنۡطِقُوۡنَ (جس طرح تم بولتے ہو) کی تمثیل کے ذریعہ سے اس استدلال کو تقویت پہنچائی ہے اور تمثیل اسی نفس کی صفات سے ماخوذ ہے جو ایک عالم اصغر ہونے کے پہلو سے تمام زمین و آسمان کا ایک آئینہ ہے گویا اوپر والی بات وَفِيۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ کی طرف اشارہ ہوا۔"

---

[1] تفسیر سورۂ ذاریات فراہیؒ

۷۔ آگے آیات ۲۴ - ۴۶ کا مضمون

آگے قرآن نے انہی دعاوی کے حق میں، جو اوپر مذکور ہوئے، تاریخ کی شہادت پیش کی ہے اور قرآن کا یہ عام اصول ہے کہ وہ عقلی و انفسی دلائل کے پہلو بہ پہلو تاریخی شواہد بھی پیش کرتا ہے تاکہ مخاطب کے سامنے بات اچھی طرح مبرہن بھی ہو جائے اور اگر دلوں کے اندر اثر پذیری کی کچھ رمق ہو تو ان سے لوگ عبرت بھی حاصل کریں۔ ان واقعات پر غور کیجیے گا تو معلوم ہوگا کہ ان میں تین پہلو ملحوظ ہیں۔

— ایک یہ کہ جن قوموں کی ہلاکت بیان ہوئی ہے ان کی تباہی میں ابر و ہوا کے تصرفات کو خاص دخل رہا ہے۔ اس پہلو سے یہ واقعات گویا ان قسموں کی تصدیق ہیں جو اوپر کھائی گئی ہیں۔

— دوسرا یہ کہ ان میں چیزوں کے دونوں پہلو نمایاں ہوئے ہیں، رحمت بھی اور نقمت بھی۔ ایک ہی چیز اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک قوم کے لیے عذاب بن گئی اور دوسری قوم کے لیے ذریعۂ نجات۔

— تیسرا یہ کہ اللہ کی گرفت بالکل بے پناہ ہے۔ کوئی قوم کتنی ہی زور آور ہو لیکن اللہ تعالیٰ جب اس کو فنا کرنا چاہتا ہے تو چشم زدن میں فنا کر دیتا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿٢٤﴾ اِذْ دَخَلُوْا آیات ۲۴-۴۶
عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٢٥﴾ فَرَاغَ
اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَاۗءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿٢٦﴾ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا
تَاْكُلُوْنَ ﴿٢٧﴾ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ
بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا
وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿٢٩﴾ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ
الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٠﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٣١﴾
قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿٣٢﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ
حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿٣٣﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣٤﴾

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا
فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً
لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۳۷﴾ وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ
اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ
اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ
وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۴۰﴾ وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾
مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾
وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾ فَعَتَوْا عَنْ
اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَمَا
اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ
مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۴۶﴾ ع ۲۳

ترجمۂ آیات ۲۴-۴۶

کیا تمھیں ابراہیم کے معزز مہمانوں کی بات پہنچی! جب وہ اس کے پاس آئے تو انھوں نے السلام علیکم کہا۔ اس نے بھی سلام سے جواب دیا (اور دل میں کہا کہ) یہ تو اجنبی لوگ معلوم ہوتے ہیں! پھر وہ نظر بچا کر اپنے گھر والوں کے پاس گیا اور ان کے لیے فربہ بچھڑے کا بُھنا ہوا گوشت لایا اور اس کو ان کے سامنے پیش کیا۔ پھر بولا کہ آپ لوگ کھاتے نہیں! تو اس نے ان سے ایک قسم کا اندیشہ محسوس کیا۔ انھوں نے اس سے کہا، تم اندیشہ ناک نہ ہو اور اس کو ایک ذی علم فرزند کی خوش خبری دی۔ پھر اس کی بیوی حیران ہو کر بڑھی۔ اس نے اپنا ماتھا ٹھونکا اور بولی کہ کیا ایک

بڑھیا، بانجھ اب جنے گی! وہ بولے کہ ایسا ہی فرمایا ہے تیرے رب نے، وہ بڑا ہی حکیم و علیم ہے۔ اس نے پوچھا، اے فرستادو، اس وقت آپ کے سامنے مہم کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم مجرموں کی ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ان کے اوپر سنگِ گِل کی بارش کردیں جو نشان لگائے ہوئے ہیں تیرے رب کے پاس ان لوگوں کے لیے جو حدود سے آگے بڑھ جانے والے ہیں۔ پھر وہاں جتنے اہل ایمان تھے ان کو ہم نے نکال لیا۔ تو وہاں ہم نے بجز ایک گھر کے کسی کو مُسلم نہیں پایا اور ہم نے اس میں ایک بڑی نشانی چھوڑی ان لوگوں کے لیے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔ ۲۹-۳۷

اور موسیٰ کی سرگزشت میں بھی نشانی ہے جب کہ ہم نے اس کو فرعون کے پاس بھیجا ایک واضح سند کے ساتھ تو اس نے گھمنڈ کے ساتھ منہ موڑا اور بولا کہ یہ تو ایک جادوگر ہے یا خبطی۔ تو ہم نے اس کو اور اس کی فوج کو پکڑا اور ان کو پھینک دیا سمندر میں۔ اور اس کے لیے وہ خود سزاوارِ ملامت تھا۔ ۳۸-۴۰

اور عاد کی سرگزشت میں بھی نشانی ہے جب کہ ہم نے ان پر بادِ خشک چلادی۔ وہ جس چیز پر سے بھی گزرتی ریزہ ریزہ کر کے چھوڑتی۔ ۴۱-۴۲

اور ثمود کے واقعہ میں بھی عبرت ہے جب کہ ان سے کہا گیا کہ تھوڑی مدت کے لیے اور عیش کرلو۔ تو انھوں نے سرکشی سے اپنے رب کے حکم سے اعراض کیا تو ان کو پکڑ لیا کڑک نے اور وہ دیکھتے رہے۔ پھر نہ وہ اٹھ ہی سکے اور نہ اپنا بچاؤ ہی کر سکے۔ ۴۳-۴۵

اور قوم نوح کو بھی ہم نے اس سے پہلے پکڑا۔ یہ لوگ بھی نافرمان تھے۔ ۴۶

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ (۲۴)

تاریخی سرگزشتوں سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نقمت کی شہادت

اوپر آیت وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ کے تحت ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں رحمت اور نقمت دونوں ہی ہے۔ وہ ایک ہی چیز کو جس کے لیے چاہے رحمت بنا دے اور اسی چیز کو جس کے لیے چاہے عذاب بنا دے۔ آسمان سے بارش ہوتی ہے جو اہل زمین کے لیے ایک عظیم رحمت ہے لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اس کو عذاب بھی بنا دیتا ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے آگے کی تاریخی سرگزشتوں کی تمہید حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ سے اٹھائی ہے جس میں قوم لوط کے انجام سے پہلے یہ دکھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو فرشتے قوم لوط کے لیے قہر الٰہی لے کر آئے وہی فرشتے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ایک ذی علم فرزند کی بشارت لے کر پہنچے۔

'هَلْ اَتٰىكَ' کا خطاب ضروری نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو بلکہ اقرب یہ ہے کہ یہ خطاب انہی مکذبین سے ہے جن پر اس سورہ میں حجت تمام کی جا رہی ہے۔ جماعت کو جب واحد کے صیغہ سے خطاب ہوتا ہے تو، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں، مخاطب گروہ کے ایک ایک فرد کو متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ استفہامیہ اسلوب بیان بھی بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ آگے جو بات کہی جا رہی ہے وہ اہمیت رکھنے والی ہے، اس کو ہر شخص سنے اور گوشِ دل سے سنے۔

لفظ 'ضَيْف' واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے چنانچہ یہاں اس کی صفت 'مُكْرَمِيْنَ' آئی ہے۔ لفظ 'مکرمین' سے اشارہ اس آؤ بھگت، خیر مقدم، تواضع اور ضیافت کی طرف ہے جس کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان مہمانوں کے لیے فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ ان مہمانوں کی شرافت و وجاہت ان کی شکل و صورت ہی سے ظاہر تھی۔ اس کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے ناآشنا ہونے کے باوجود ان کی ضیافت کی تیاریوں میں لگ گئے اور انتہائی عجلت میں جو بہتر سے بہتر سامانِ ضیافت ممکن تھا، وہ انھوں نے کر ڈالا۔ لیکن یہی مہمان جب حضرت لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے تو ان کی قوم ان مہمانوں کی بے حرمتی کے درپے ہو گئی اور حضرت لوط علیہ السلام کو اپنے مہمانوں کی عزت بچانے کے لیے خود اپنی حرمت

واٹر پر لگا دینی پڑی۔ بالآخر ان مہمانوں کو اپنا اصلی رُخ ان ناہنجاروں کے لیے بے نقاب کرنا پڑا اور انھوں نے اس پوری قوم کا بیڑا غرق کر دیا۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ (۲۵)

حضرت ابراہیمؑ اور ان کے پاس آنے والے مہمان

یعنی ان مہمانوں نے شرفا اور صالحین کے طریقہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی ان کا جواب سلام سے دیا۔ ان کے اس سلام سے اجنبیت کا پردہ تو ایک حد تک اٹھ گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ اطمینان ہو گیا کہ شریف اور صالح مہمان ہیں لیکن ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کس مقصد سے آئے ہیں؟ یہ تو بالکل اجنبی لوگ ہیں!

'قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ' کے الفاظ انھوں نے زبان سے نہیں بلکہ اپنے دل میں کہے۔ دل میں سوال پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوئی ہو گی کہ اس علاقے میں اول تو شرفاء و صالحین کی تعداد تھی ہی نہایت محدود، پھر جو تھے بھی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلقین و متوسلین ہی میں سے تھے اس وجہ سے ان کو نہایت حیرت ہوئی کہ اس قحط الرّجال میں، اس دیار میں، ایسے ثقہ و شریف لوگ کہاں سے نکل آئے!

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ لفظ 'قول' جس طرح زبان سے کہی ہوئی بات کے لیے آتا ہے اسی طرح دل میں کہی ہوئی بات کے لیے بھی آتا ہے۔ اس کی مثالیں کلامِ عرب میں بھی موجود ہیں اور قرآن میں بھی موجود ہیں، جن میں سے بعض پیچھے گزر چکی ہیں اور بعض آگے آئیں گی۔ مہمانوں کے سلام کا جواب تو انھوں نے تو لادیا لیکن یہ بات انھوں نے دل میں کہی۔ اس لیے کہ یہ بات زبان سے کہنے کی نہیں تھی۔

فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ (۲۶)

لفظ 'رَوغ' کسی کام کو نظر بچا کر اور کاوا لگا کر کرنے کے لیے آتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ مہمانوں کو دیکھتے ہی، ان کی نظر بچا کر، اپنے گھر کی طرف گئے کہ ان کی ضیافت کا سامان کریں۔ مہمانوں کی نظر بچا کر اس لیے کہ انھوں نے یہ پسند نہیں فرمایا کہ ان کا یہ اہتمام مہمانوں کی طبیعت پر بار ہو۔ کریم النفس، شریف اور فیاض میزبان کی میزبانی کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ وہ مہمان کی ضیافت کا اہتمام اس طرح کرتا ہے کہ اس کو تکلف کا احساس نہ ہو۔

'فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ' یعنی ان مہمانوں کی ضیافت کے لیے انھوں نے گلے کا ایک فربہ بچھڑا ذبح کرا دیا اور اس کا بھنا ہوا گوشت ان کے آگے پیش کیا۔ 'عِجْلٍ سَمِيْنٍ' کے الفاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فیاضی کا اظہار ہوتا ہے کہ انھوں نے چند مہمانوں کی ضیافت کے

لیے ایک پورا بچھڑا ذبح کرا دیا۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ انھوں نے پورا بچھڑا مہمانوں کے آگے پیش کر دیا ہو۔ بعض اوقات کل بول کر اس سے جزمراد لیتے ہیں۔ یہ اسلوب جس طرح ہر زبان میں ہے اسی طرح عربی میں بھی ہے۔

فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ (۲۷)

حضرت ابراہیمؑ کا ایک اندیشہ

اس جملہ میں کچھ حذف ہے جس پر قرینہ دلیل ہے۔ پوری بات یوں ہے کہ سامانِ ضیافت ان کے سامنے پیش کیا لیکن جب دیکھا کہ مہمان کھانے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھا رہے ہیں تب انھوں نے نہایت محبت کے ساتھ ان کو کھانے کی دعوت دی۔ بعض دوسرے مقامات میں قرآن نے اس حذف کو کھول بھی دیا ہے۔

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (۲۸)

یعنی جب مہمانوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تو قدرتی طور پر وہ اجنبیت کچھ اور بڑھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بادّلِ وہلہ محسوس فرمائی تھی اور انھوں نے اپنے دل کے اندر ایک اندیشہ محسوس کیا۔ سورۂ ہود میں اشارہ موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اندر اندیشہ ضیافت قبول نہ کرنے کے سبب سے پیدا ہوا: فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً (ھود: ۷۰) (جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو اس نے ان کو بیگانہ محسوس کیا اور ان سے دل ہی دل میں ڈرا)۔

معلوم ہوتا ہے ان لوگوں کے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ یہ لوگ بشر نہیں ہیں، جیسا کہ انھوں نے گمان کیا ہے، بلکہ فرشتے ہیں۔ فرشتوں کا کھانا نہ کھانا ایک معروف بات ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے مخفی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر ان کے علم میں یہ بات بھی رہی ہوگی کہ فرشتے جب آتے ہیں تو کسی بڑی مہم ہی پر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں پاس ہی قومِ لوط کا فسادِ اخلاق اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا جس کے سبب سے وہ ہر وقت خدا کے عذاب کی زد میں تھی۔ ان حالات و قرائن کی موجودگی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہونا کچھ بعید نہیں تھا کہ شاید اب قومِ لوط کی شامت آ گئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تردد کو فرشتوں نے تاڑ لیا اور ان کو اطمینان دلایا کہ آپ کوئی اندیشہ نہ کریں اور مزید اطمینان پیدا کرنے کے لیے ان کو ایک ذی علم فرزند کی خوشخبری بھی دی۔ یہ ایک بہت بڑی خوش خبری تھی اس لیے کہ یہ مجرد فرزند کی نہیں بلکہ ذی علم فرزند کی خوش خبری تھی جس کے اندر یہ بشارت بھی مضمر تھی کہ یہ فرزند صاحبِ نبوت ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ خوش خبری پا کر خود اپنے باب میں تو مطمئن ہو گئے لیکن

فرشتوں کی مہم کے باب میں ان کے ذہن میں سوال باقی رہا جس کا اظہار انھوں نے بعد میں کیا جس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَ قَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِیْمٌ (۲۹)

فرزند کی خوشخبری پر حضرت سارہ کے تاثرات

یہ بشارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلند آواز سے دی گئی تھی اس وجہ سے ان کی بیوی سارہ نے جو پاس ہی کھڑی تھیں، سن لی۔ اس سے ان کو جو حیرت اور ساتھ ہی جو خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے! چنانچہ وہ یہ سنتے ہی اپنے تعجب کے اظہار کے لیے لپکیں اور خاص نسوانی انداز میں اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں کہ میں تو ایک بڑھیا بانجھ ہوں، کیا اب اس عمر اور اس حالت میں میں جنوں گی! حضرت سارہ کے اس فقرے کے ایک ایک لفظ کے اندر جو حیرت، جو خوشی اور اس کی بشارت کی تصدیق مزید کی جو خواہش جھلک رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

'فِیْ صَرَّةٍ' یعنی وہ تعجب اور حیرانی کی حالت میں لپکیں۔ عربی میں محاورہ ہے 'صَرَّ الفرسُ اذنیہ' گھوڑے نے اپنی کنوتیاں کھڑی کیں۔ اسی سے 'فِیْ صَرَّةٍ' کا محاورہ نکلا ہے جو تعجب اور حیرانی کی حالت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔

'فَصَكَّتْ وَجْهَهَا' یعنی انھوں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ یہ عورتوں کے اظہار تعجب کا طریقہ ہے۔ جب وہ کسی بات پر حیرت کا اظہار کرتی ہیں تو پیشانی پر ہاتھ مار کر بات کہتی ہیں۔ ان دو لفظوں میں قرآن نے ان کی حیرت اور خوشی کی پوری تصویر کھینچ دی ہے۔

قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِیْمُ الْعَلِیْمُ (۳۰)

فرشتوں کی اطمینان دہانی

فرشتوں نے جواب دیا کہ آپ مطمئن رہیں۔ آپ کے رب نے ایسا ہی حکم دیا ہے اور جب اس نے حکم دیا ہے تو یہ بات پوری ہو کے رہے گی۔ نہ آپ کا بڑھیا بانجھ ہونا اس میں مانع ہوگا اور نہ آپ کے شوہر کا بڑھاپا۔ اللہ تعالیٰ حکیم و علیم ہے۔ اس کی حکمت اور اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اسباب اسی کے پیدا کیے ہوئے اور اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ جب چاہے گا ان کو آپ کے لیے ساز گار کر دے گا۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَیُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (۳۱)

حضرت ابراہیم کا سوال اور اس کی نوعیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اپنے باب میں اطمینان ہو گیا اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یہ لوگ فرشتے ہیں تو انھوں نے ان سے سوال کیا کہ اے فرستادو! اس وقت آپ لوگوں کے سامنے مہم کیا ہے؟ یہ سوال انھوں نے اس وجہ سے کیا کہ ان پر یہ حقیقت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، واضح تھی کہ فرشتے جب اس طرح آتے ہیں تو کسی بڑی ہی مہم ہی پر آتے ہیں۔ مجرد فرزند کی

خوش خبری مقصود ہوتی تو اس کے لیے اس اہتمام کی ضرورت نہیں تھی۔ لفظ 'خَطْبٌ' عربی میں کسی بڑے اور اہم کام ہی کے لیے آتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں چونکہ قوم لوط سے متعلق اندیشہ موجود تھا اس وجہ سے انھوں نے چاہا کہ اگر یہی مہم ہے تو بات واضح ہو جائے۔ خاص طور پر ان کو حضرت لوط علیہ السلام، ان کے اہل بیت اور ان کے ساتھیوں کی بڑی فکر تھی کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں تفصیل بھی موجود ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ بات واضح ہوئی کہ قوم لوط پر عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے تو انھوں نے قوم لوط کے اہل ایمان کے باب میں اپنے رب سے بڑا مجادلہ کیا۔ اس مجادلہ کی اللہ تعالیٰ نے بڑی تعریف فرمائی ہے اور اس کو حضرت ابراہیم کی دردمندی کی شہادت میں پیش کیا ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ (۳۲)

فرشتوں کا جواب

فرشتوں نے جواب دیا کہ ہم مجرموں کی ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے قوم لوط کا ذکر نام کی تصریح کے ساتھ نہیں کیا لیکن سورۂ ہود میں ہے: قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ (ھود: ۷۰) (انھوں نے کہا تم نہ ڈرو، ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں) ان دونوں مواقع کو ملانے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فرشتوں نے قوم لوط کا ذکر ان کے کردار اور نام دونوں کے ساتھ کیا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس قوم کے مستحق عذاب ہونے کا پہلو واضح ہو جائے لیکن قرآن نے بہ تقاضائے بلاغت اس سورہ میں ان کے نام کا ذکر حذف کر کے صرف ان کے قوم مجرم ہونے کا ذکر کیا ہے تاکہ یہ پہلو واضح ہو سکے کہ قوم لوط کو جس عذاب سے دوچار ہونا پڑا اپنے عمل کی پاداش میں ہونا پڑا۔ یہ امر واضح رہے کہ یہی بات اس سورہ کا عمود ہے۔

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۙ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ (۳۳-۳۴)

یہ فرشتوں نے اپنے بھیجے جانے کا مقصد واضح فرمایا کہ ہم بھیجے گئے ہیں کہ اس مجرم قوم پر کنکروں کی بارش کر دیں۔ یہاں 'علیٰ' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان پر ایسی بارش کریں کہ بالکل پامال کر کے رکھ دیں۔

'حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ' سے مراد وہ کنکر ہیں جو مٹی سے پتھر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے لیے قرآن میں لفظ 'سجّیل' بھی آیا ہے۔ مثلاً سورۂ ہود میں: وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (ھود: ۸۲) (اور ہم نے اس پر سنگِ گل کی بارش کر دی)۔ 'سِجّیل' دراصل فارسی کے سنگِ گل سے معرب ہے۔ یہاں 'حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ' کے الفاظ سے اس کی وضاحت فرما دی ہے۔

'مُسَوَّمَةً' کے معنی نشان زدہ کے ہیں۔ یہ لفظ میرے نزدیک 'حجارۃ' سے حال پڑا ہوا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں یہ پتھر نشان لگا کر قوم لوط کے اشرار کے لیے خاص کیے ہوئے ہیں۔ بعض علاقو

یہ سرکوں کی تعمیر کنکروں سے ہوتی ہے وہاں دیکھا ہوگا کہ مزدوران کے چھٹے لگا کر ان پر نشان بھی لگا دیتے ہیں جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ بحق سرکار محفوظ ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ وقت کے وقت اتنے پتھر کہاں ملیں گے جو پوری قوم کی قوم کو تباہ کر دینے کے لیے کافی ہوں۔ ان کے چھٹے پہلے سے لگے ہوئے ہیں اور ان پر خدائی نشان بھی لگے ہوئے ہیں کہ یہ کارِ خاص کے لیے محفوظ ہیں، کوئی ان کو ہاتھ نہ لگائے۔ سورۂ ہود میں یہ تصریح بھی ہے کہ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ (ہود: ۸۳) (اور یہ پتھر ان ظالموں سے کچھ دور بھی نہیں ہیں) یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جس زمین پر وہ چلتے پھرتے ہیں وہیں سے بلکہ ان کے قدموں کے نیچے سے خدا کی مامور باد تند اس کو اٹھائے گی اور ان کے اوپر اس کی بارش کر دے گی۔

'لِلْمُسْرِفِيْنَ' سے اشارہ قومِ لوط کے اشرار کی طرف ہے۔ 'اسراف' کے معنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن میں بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے تجاوز کے لیے آیا ہے۔ یہاں اس سے مراد قومِ لوط کی وہ بے حیائی ہے جس میں وہ من حیث القوم مبتلا تھی۔ جو قوم اللہ تعالیٰ کے حدود کے معاملے میں دیدہ دلیری کی یہ روش اختیار کر لیتی ہے اللہ تعالیٰ اس کی سرکوبی کے لیے اپنی مسخر کی ہوئی چیزوں میں سے جس چیز کو چاہتا ہے ڈھیل چھوڑ دیتا ہے اور وہ اس کے طغیان و اسراف کا اس کو مزا چکھا دیتی ہے۔

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (۳۵-۳۷)

قومِ لوط کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

فرشتوں کی بات اوپر کی آیت پر ختم ہوئی۔ اب یہ آگے کی سرگزشت خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کہ اس کے بعد اس نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا؛ فرمایا کہ عذاب نازل کرنے سے پہلے ہم نے اس بستی کے اندر سے ان لوگوں کو نکال لیا جو اہلِ ایمان تھے۔ 'فِيْهَا' میں ضمیر کا مرجع قومِ لوط کی بستی ہے۔ چونکہ یہ مثالیں 'وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ' کے تحت بیان ہو رہی ہیں اس وجہ سے ضمیر بغیر مرجع کے آگئی۔ قرینہ کی موجودگی میں اس طرح ضمیر کا آنا عربی زبان میں معروف ہے۔ اس کی متعدد مثالیں گزر چکی ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کا ذکر اس کتاب میں بار بار ہو چکا ہے کہ رسول کے ذریعہ سے اتمامِ حجت کے بعد جب کسی قوم پر فیصلہ کن عذاب آیا ہے تو اس سے وہ لوگ بچا لیے گئے ہیں جو ظہورِ عذاب سے پہلے رسول پر ایمان لا چکے تھے۔ یہ سنتِ الٰہی تمام رسولوں کی سرگزشتوں میں واضح فرمائی گئی ہے۔ قومِ لوط کے باب میں دوسری جگہ تصریح ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے آل و اتباع کو ہدایت ہوئی کہ وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے ان حدود سے باہر نکل جائیں

جن کے لیے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اس طرح باہر نکلیں کہ کوئی پیچھے مڑ کے بھی نہ دیکھے۔

'فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ'۔ یعنی اس بستی میں ایک گھرانے کے سوا اور کوئی گھر مسلمانوں کا نہیں ملا۔ ظاہر ہے کہ یہ گھرانا حضرت لوط علیہ السلام ہی کا تھا اور اس کے اندر سے بھی، قرآن میں تصریح ہے کہ، ان کی بیوی الگ کر دی گئی اس لیے کہ اس کی ساری ہمدردیاں حضرت لوط علیہ السلام کے بجائے اپنی قوم ہی کے ساتھ تھیں۔

قومِ لوط کے اندر اہلِ ایمان کی اس کمی کی طرف، خاص اہتمام کے ساتھ، قرآن نے جو اشارہ کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ کن عذاب کسی قوم پر اس وقت نازل فرماتا ہے جب پوری قوم کا مزاج فاسد ہو جاتا ہے۔ اہلِ ایمان اس کے اندر یا تو بالکل معدوم ہو جاتے ہیں یا ان کی تعداد اتنی قلیل ہوتی ہے کہ وہ معدوم ہی کے حکم میں ہوتے ہیں۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو مجادلہ قومِ لوط کے بارے میں منقول ہے اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ عدل و رحمت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

ایک قابلِ توجہ بات

ایک خاص بات یہاں اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ اوپر والی آیت میں لفظ 'مُؤْمِنِينَ' استعمال ہوا ہے اور آیت زیرِ بحث میں 'مُسْلِمِينَ' ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اوپر والی آیت میں نجات کے باب میں سنتِ الٰہی بیان ہوئی ہے اور سنتِ الٰہی یہی ہے کہ عذاب سے نجات صرف سچے اہلِ ایمان ہی پاتے ہیں۔ اس دوسری آیت میں علاقے کا حال بیان ہوا ہے کہ ایک خاندان کے سوا وہاں مسلمانوں کا کوئی گھرانا سرے سے تھا ہی نہیں۔ اس گھرانے کے لیے لفظ 'مُسْلِمِينَ' استعمال فرمایا جس میں وسعت ہے۔ اس کے اندر پختہ اور خام، بالغ اور نابالغ سب سما سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ظاہری اعتبار سے حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی اس میں شامل تھی لیکن آخری وقت میں وہ اس سے خارج کر دی گئی۔

زمین کے بعض آثارِ عذاب

'وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ'۔ یعنی قومِ لوط کی بستی میں ہم نے ایک نہایت واضح نشانی ان لوگوں کی عبرت پذیری کے لیے چھوڑی جو اللہ کی زمین میں اس کے قہر و غضب کی نشانیاں دیکھنا اور ان سے سبق حاصل کرنا چاہیں۔ یہاں اوپر کی آیت 'وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ' (اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں) کو پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ یہ اسی دعوے کی شہادت زمین کے ان آثار سے پیش کی گئی ہے جو قریش سے مخفی نہیں تھے۔ ہم سورۂ حجر کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ قومِ لوط کے مساکن ـــــ سدوم اور عمورہ ـــــ حجاز اور شام کی گزرگاہ پر تھے جس سے قریش کے تجارتی قافلے برابر گزرتے رہتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان آثار کو دیکھتے ہوئے وہ پیغمبر کے انذار کی تکذیب کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ لوگ

اسی وقت مانیں گے جب یہ طوفان بلا خود ان کے سروں پر سے گزر جائے گا۔

اس سنگباری کی نوعیت جو قوم لوط پر ہوئی

اب یہاں مختصر طور پر اس سنگ باری کی نوعیت بھی سمجھ لیجیے جس کا ذکر آیت ۳۳ میں ہوا ہے تاکہ سورہ کی تمہید میں غبار انگیز ہواؤں اور دھاریوں والے بادلوں کی جو قسم کھائی گئی ہے، اس کے ساتھ اس سرگزشت کا ربط واضح ہو جائے۔

استاذ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ ذاریات میں اس عذاب کی نوعیت پر مفصل بحث کر کے خلاصۂ بحث ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو سخت ہو کر بالآخر حاصب (کنکر برسانے والی بادِ تند) بن گئی جس سے اول تو ان کے اوپر کنکروں اور پتھروں کی بارش ہوئی پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے۔ قوم لوط ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: 'فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا' (العنکبوت: ۴۰) (اور ان مکذبین میں وہ بھی ہیں جن پر ہم نے کنکر برسانے والی باد تند چلا دی) نیز انہی کے بارے میں فرمایا ہے کہ 'فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ' (الحجر: ۷۴) (پس ہم نے اس بستی کو بالکل تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر تہ بہ تہ سنگ گِل کی قسم کے پتھروں کی بارش کی) یعنی ایسی تند ہوا چلی کہ ان کے مکانات اور چھتیں سب زمین بوس ہو گئیں اور اوپر سے کنکروں اور ریت نے ان کو ڈھانک لیا، جیسا کہ فرمایا ہے: 'وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَىٰ ۝ فَغَشَّاهَا مَا غَشَّىٰ' (النجم: ۵۳-۵۴) (اور الٹی ہوئی بستیاں جن کو الٹ دیا، پھر ان کو ڈھانک دیا جس چیز سے ڈھانک دیا)"

آخر میں قوم لوط کے عذاب سے متعلق تورات کے بیان پر تنقید کر کے خلاصۂ بحث مولانا فراہیؒ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"اس سے معلوم ہوا کہ قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے سنگ ریزے برسانے والی آندھی کا عذاب بھیجا جس نے ان کو اور ان کے مکانوں کو ڈھانک لیا۔ اگر اس کے ساتھ تورات کا بیان بھی ملا لیا جائے تو مزید یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ان کے اوپر حاصب کے ساتھ رعد و برق کا عذاب بھی آیا۔"

اس تفصیل کی روشنی میں غور کیجیے تو قوم لوط کی سرگزشت میں ان دونوں قسموں کی شہادت موجود ہے جو اوپر کھائی گئی ہیں۔ یعنی غبار انگیز ہوا کے تصرفات کو بھی اس میں دخل ہے اور سرملکے دھاریوں والے بادلوں کو بھی۔

قوم لوط کا واقعہ سورۂ ہود اور سورۂ حجر میں بھی زیر بحث آیا ہے۔ اگر مزید تفصیل مطلوب ہو تو

ان سورتوں کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ ان شاء اللہ بحث کا ہر گوشہ صاف ہو جائے گا۔

وَفِیْ مُوْسٰٓی اِذْ اَرْسَلْنٰہُ اِلٰی فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (۳۸)

حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت کی طرف اشارہ

اس کا عطف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت پر ہے۔ یعنی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت میں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اس کے عدل و انتقام کی نشانیاں ہیں اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت میں بھی اس کی نشانیاں موجود ہیں۔

لفظ 'سُلْطٰنٌ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہ لفظ واضح سند کے معنی میں بھی قرآن میں آیا ہے اور رعب و دبدبہ کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ ان دونوں معنوں پر حاوی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو نشانیاں عطا فرمائیں ان کے خدائی سند ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی۔ فرعون نے محض استکبار کے سبب سے ان کو سحر قرار دیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معجزات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو دیکھ کر فرعون اور اس کے اعیان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایسا رعب جم گیا کہ انتہائی جوشِ انتقام کے باوجود وہ آخر وقت تک ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکے۔

فَتَوَلّٰی بِرُکْنِہٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (۳۹)

'رُکْنٌ' کے معنی مونڈھے کے ہیں اور 'ب' سے یہاں تعدی کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے۔ جب کوئی شخص کسی چیز سے تکبر کے ساتھ اعراض کرتا ہے تو شانے اور مونڈھے جھٹک کر منہ پھیرتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے معنی ہوں گے کہ اس نے غرور کے ساتھ منہ پھیرا۔ قرآن میں یہ اسلوب جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِہٖ (بنی اسرآئیل: ۸۳)	اور جب ہم انسان پر اپنا فضل کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا اور گھمنڈ سے منہ موڑتا ہے۔

سورۂ حج آیت ۹ میں اسی متکبرانہ اعراض کی تعبیر 'ثَانِیَ عِطْفِہٖ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے۔

'وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ'۔ یعنی کبھی ان کو ساحر کہہ کر ان کی تکذیب کی اور کبھی ان کو خبطی ٹھہرایا۔ جب ان کے معجزے دیکھے تو کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے اور جب ان کی دعوت سنی تو کہا کہ یہ شخص خبطی ہے جو ایک ایسے خدا کا رسول ہونے کا مدعی ہے جس کی شکل کسی نے نہیں دیکھی۔

فَاَخَذْنٰہُ وَجُنُوْدَہٗ فَنَبَذْنٰہُمْ فِی الْیَمِّ وَھُوَ مُلِیْمٌ (۴۰)

یعنی تب ہم نے اس کو اور اس کی فوجوں کو پکڑا اور ان کو سمندر میں پھینک دیا۔ یہاں فوجوں کا ذکر اس کے سرمایۂ غرور کی حیثیت سے ہوا ہے کہ اس لیے کہ انہی کا اعتماد اس کے تکبر کا اصل سبب تھا۔ فرعون اور اس کی فوجوں کے غرق ہونے کی جو شکل ہوئی اس کا ذکر پچھلی سورتوں

میں ہو چکا ہے۔ وہی بات یہاں اس طرح بیان فرمائی گئی ہے کہ گویا ان کی حیثیت خاک اور راکھ کی ایک مٹھی سے زیادہ نہیں تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بے پناہی کی تعبیر ہے کہ بڑے سے بڑے متکبر کا سارا سرمایۂ غرور اس کی قدرت کے آگے ایک مشتِ خس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

'وَهُوَ مُلِيْمٌ' یعنی اس انجام کے لیے سزاوار ملامت وہ خود ہی تھا، کسی دوسرے پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے سے اس کو نیک و بد سے اچھی طرح آگاہ کر دیا لیکن غرور نے اس کو عقل و ہوش سے اس طرح عاری کر دیا تھا کہ وہ کسی طرح سوچنے سمجھنے پر آمادہ نہیں ہوا اور اپنی پوری قوم کو اس نے ہلاکت کے گھاٹ پر لے جا اتارا۔

یہاں فرعون اور اس کی فوجوں کے غرق ہونے کے واقعہ کی نوعیت واضح نہیں فرمائی لیکن قرآن کے دوسرے مقامات اور تورات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی تباہی میں بھی اصل دخل ہوا کے تصرفات ہی کو تھا۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ ذاریات میں اس واقعہ پر بحث کرنے کے بعد خلاصۂ بحث ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

فرعون اور اس کی فوجوں کی تباہی کی نوعیت

"اس واقعہ میں ہوا کے عجیب و غریب تصرفات کو جو دخل ہے اور جس کی طرف قرآن نے سرسری اشارہ کیا ہے، تورات کی سفر خروج میں اس کی نوعیت یہ بیان کی گئی ہے:"

"پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا" (خروج: باب ۱۴-۲۱)

"یہ پوربی آندھی رات بھر چلتی رہی اور صبح کو ختم ہو گئی۔ ہوا کے زور نے سمندر کا پانی مغرب کی طرف خلیج سویز میں ڈال دیا اور مشرقی خلیج، خلیج عقبہ کو بالکل خشک چھوڑ دیا۔ پھر جب آندھی ختم ہو گئی تو پانی اپنی جگہ پر پھیل گیا اور موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کرنے والی فوج غرق ہو گئی۔ اس کی تصدیق قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔ سورۂ دخان میں ہے۔

فَأَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا إِنَّكُمْ	اور میرے بندوں کو راتوں رات نکال لے
مُّتَّبَعُوْنَ ۝ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۖ	جاؤ اور آگاہ رہو کہ تمہارا پیچھا کیا جائے گا اور
إِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝	سمندر کو ساکن چھوڑ دو۔ بے شک ان کی فوج غرق
(الدخان: ۲۳-۲۴)	ہونے والی فوج ہو گی۔"

"وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا" میں 'رَهْوًا' کے معنی سکون کے ہیں اور دریا کا سکون ظاہر ہے کہ ہوا کے سکون ہی سے ہوتا ہے۔ سورہ طٰہٰ میں ہے۔

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلٰى مُوْسٰى ۙ	اور ہم نے موسیٰ کو ہدایت کی، میرے بندوں کو

أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَىٰ ۝ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ (طٰہٰ: ۷۷-۷۸)

راتوں رات نکال لے جاؤ اور ان کے لیے راہ نکالو سمندر میں خشک۔ نہ تم کو پکڑے جانے کا خوف ہوگا نہ ڈوبنے کا اندیشہ تو فرعون نے اپنی فوجوں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا تو سمندر میں سے ان کے اوپر چھا گئی جو چیز چھا گئی۔"

"سفر خروج: باب ۱۵ - ۱۰ میں حضرت موسیٰؑ کا ترانۂ حمد یوں نقل ہوا ہے۔

"تو نے اپنی آندھی کو پھونک ماری تو سمندر نے ان کو چھپا لیا۔"

"سفر استثناء، باب ۱۱ - ۴ میں ہے:"

اور اس نے مصر کے لشکر اور ان کے گھوڑوں اور رتھوں کا کیا حال کیا اور کیسے اس نے بحر قلزم کے پانی میں ان کو غرق کیا جب وہ تمہارا پیچھا کر رہے تھے اور خداوند نے ان کو کیسا ہلاک کیا کہ آج کے دن تک وہ نابود ہیں۔"

"خلاصہ اس ساری تفصیل کا یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو تند ہوا کے ذریعہ سے نجات بخشی اور فرعون اور اس کی فوجوں کو نرم ہوا کے ذریعہ سے ہلاک کیا یعنی رحمت اور عذاب دونوں کے کرشمے ہوا ہی کے عجیب تصرفات سے ظاہر ہوئے۔"[1]

سورہ کے آغاز میں ہواؤں کی گردش سے جزا و سزا پر جو شہادت پیش کی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بھی اس کی ایک نہایت واضح مثال ہے اور یہ بھی منجملہ ان نشانیوں کے ہے جن کی طرف آیت 'وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ' میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ (۴۱)

قوم عاد کے انجام کی طرف اشارہ

یہ قوم عاد کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا کہ ان کی سرگزشت میں بھی عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے بڑا سامان موجود ہے جب کہ ہم نے ان کے اوپر ایک باد خشک مسلط کر دی۔ 'الریح العقیم' وہ ہوا جو بالکل بے فیض ہو، جو نہ بارش لائے نہ کوئی اور نفع پہنچائے۔ عربی میں بارش لانے والی ہواؤں کو 'لواقح' (بارآور) کہتے ہیں اور بے فیض و مضر ہواؤں کے لیے 'عقیم' (بانجھ) کی صفت آتی ہے۔ مراد اس سے سرما کی ٹھنڈی اور خشک ہوا ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے 'فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ' (حٰمٓ السجدۃ: ۱۶) (پس ہم نے ان کے اوپر ہوائے تند مسلط کر دی نحوست (سرما) کے دنوں میں)۔

---

[1] تفسیر سورۂ ذاریات فراہیؒ۔

مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ کَالرَّمِیْمِ (۴۲)

یہ اس ہوا کی ہلاکت انگیزی کی تصویر ہے کہ جس چیز پر بھی اس کا گزر ہوا اس کو اس نے ریزہ ریزہ کر چھوڑا۔ رَمِیْم لکڑی، رسی اور ہڈی وغیرہ کے بوسیدہ ٹکڑوں اور ریزوں کو کہتے ہیں۔ سرد ہوا کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنی ٹھنڈک اور خشکی کے سبب سے اشیاء کی قوت اور ان کی تازگی و زندگی ختم کر دیتی ہے اور وہ غیر معمولی طور پر تند بھی ہو تو فصلوں، نباتات اور تمام زندہ چیزوں کو توڑ پھوڑ کر بالکل خس و خاشاک کے مانند بنا دیتی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ یہی بات یوں بیان ہوئی ہے: اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۝ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ (القمر: ۱۹-۲۰) (ہم نے ان کے اوپر بادِ صرصر مسلط کر دی، قائم رہنے والی نحوست کے زمانے میں جو لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی گویا وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنوں کے کندے ہوں)۔

وَفِیْ ثَمُوْدَ اِذْ قِیْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ ۝ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ (۴۳-۴۴)

قوم ثمود کے انجام کی طرف اشارہ

عاد کے بعد یہ ثمود کے انجام کی یاددہانی ہے۔ فرمایا کہ ان کی سرگزشت میں بھی عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے سامان عبرت موجود ہے۔ 'اِذْ قِیْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ' یہ خاص طور پر اس وقت کی یاددہانی فرمائی ہے جب ان کے سرکش لیڈر نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور ان کے رسول حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو آخری تنبیہ فرمائی ہے کہ بس کچھ دیر اور اس دنیا کے عیش سے بہرہ مند ہو لو، اب تمہاری ہلاکت کی گھڑی سر پر آ گئی ہے۔ اس آیت میں جو بات 'حَتّٰی حِیْنٍ' کے مجمل الفاظ میں فرمائی گئی ہے سورۂ ہود میں اس کی وضاحت یوں ہوئی ہے: فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ (ھود: ۶۵) (تو انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں تو اس نے کہا کہ اپنے گھروں میں تین دن اور کھا بس لو۔ یہ دھمکی جھوٹی نہ ہوگی) اس سے معلوم ہوا کہ اونٹنی کے واقعہ کے بعد ان کو آخری دھمکی کے ساتھ تین دن کی مہلت اور ملی کہ اب بھی وہ چاہیں تو توبہ کر کے اپنے کو اس عذاب سے بچا لیں۔

'فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ'۔ 'عتو' کے معنی گھمنڈ اور نافرمانی کرنے کے ہیں۔ جب اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آئے تو اس کے اندر اعراض کا مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی اس آخری مہلت اور اس آخری تنبیہ کی بھی کوئی پروا نہ کی بلکہ نہایت تکبر کے ساتھ اپنے رب کے حکم سے اعراض کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو خدا کی ڈانٹ نے پکڑ لیا اور وہ دیکھتے رہ گئے۔

'صٰعِقَة' کے معنی ڈانٹ اور چیخ کے ہیں اور اس سے مراد وہ عذاب ہے جو ان کی سرکشی کی پاداش

میں ان پر آیا۔ سورۂ ہود میں ان کی سرگزشت جو بیان ہوئی ہے اس میں لفظ 'صَیْحَۃ' آیا ہے جس کے معنی ڈانٹ کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ڈانٹ ان کے لیے کس شکل میں ظاہر ہوئی اس کی وضاحت ہم آگے کریں گے۔

'وَهُمْ يَنظُرُونَ' میں کئی باتیں پوشیدہ ہیں۔

ایک یہ کہ یہ عذاب کھلم کھلا، ڈنکے کی چوٹ آیا، یہ لوگ اس کو دیکھتے رہے لیکن اپنا کوئی بچاؤ نہ کر سکے۔

دوسری یہ کہ عذاب دفعتہً ان پر آدھمکا جس کے بعد ان کو ایک لمحہ کی بھی فرصت نہ مل سکی۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے: اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ (القمر: ۳۱) (ہم نے ان کے اوپر ایک ہی ڈانٹ بھیجی تو وہ باڑے والے کے باڑے کی خشک اور ریزہ ریزہ لکڑیوں کے مانند ہو کے رہ گئے)۔

تیسری یہ کہ یہ اس کو دیکھ کر بالکل سراسیمہ ہو کے رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کریں۔ آگے کے ٹکڑے میں اس کی وضاحت آ رہی ہے۔

فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ (۴۵)

یعنی جب انھوں نے کڑک سنی تو ان پر دہشت اور کپکپی طاری ہوگئی۔ وہ کھڑے نہ رہ سکے بلکہ زمین پر گر پڑے۔ سورۂ اعراف میں ان کا حال یوں بیان ہوا ہے: فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (الاعراف: ۹۱) (پس ان کو کپکپی نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے)۔

'وَمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ'۔ 'انتصار' کے معنی مدافعت کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ اللہ کے عذاب سے اپنی مدافعت کرنے والے نہ بن سکے۔ اس معنی میں یہ لفظ معروف ہے۔ امرؤالقیس کا شعر ہے۔

فانشب اظفاره فی النسا　　　فقلت هبلت الا تنتصر

(کتے نے اس نیل گاؤ کی ران میں اپنے پنجے گاڑ دیے۔ تب میں نے اس سے کہا، کم بخت! اب تو اپنا بچاؤ کر!)

یہاں تھوڑی دیر توقف کر کے عاد اور ثمود کے عذاب کی نوعیت بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے تاکہ ابتدائے سورہ کی قسموں کے ساتھ ان سرگزشتوں کا تعلق بھی اچھی طرح واضح ہو جائے۔ استاذ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر سورۂ ذاریات میں ان کے عذاب کی یہ شکل بیان فرمائی ہے۔

عاد و ثمود کے عذاب کی نوعیت　　"قرآن مجید میں قوم عاد کی ہلاکت کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے اس پر جو شخص بھی غور کرے گا اس سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہے گی کہ جس تند ہوا سے وہ ہلاک کیے گئے اس کے ساتھ سرا

کے وہ بادل بھی تھے جو ہمیشہ رعد و برق کے ساتھ نمودار ہوا کرتے ہیں۔ قرآن میں جہاں ان کی تباہی کا ذکر ہوا ہے، ہوا کے ساتھ پانی سے خالی بادلوں اور صاعقہ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ سورۂ احقاف میں ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا (الاحقاف: ۲۴-۲۵)

جب انھوں نے عذاب کو ابر کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے دیکھا، بولے یہ تو بادل ہے جو ہمیں سیراب کرنے والا ہے۔ بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے۔ یعنی بادِ تند جس کے اندر ایک دردناک عذاب ہے۔ اکھاڑ پھینکے گی ہر چیز اپنے رب کے حکم سے۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام خصوصیات موسم سرما کی ہوا اور اس کے بادلوں کی ہیں۔ اُس زمانے میں بادِ شمال صرصر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ خشکی اور قحط کی ایک عام نحوست اور تباہی ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ سورۂ قمر میں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے: اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (۱۹) (اور ہم نے ان پر بادِ صرصر چلا دی تمام رہنے والی نحوست کے زمانہ میں)۔ اسی طرح حٰمٓ السجدۃ میں ہے: فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ (۱۶) (پس ہم نے ان پر بادِ صرصر چلا دی نحوست کے زمانے میں)۔

اس کے بعد مولانا نے اپنے دعوے کی تائید میں بعض شعرائے جاہلیت کے حوالے پیش کیے ہیں۔ پھر آگے فرماتے ہیں۔

"سرما کی یہ تند ہوائیں جب چلتی ہیں تو دھاریوں والے سرخ بادلوں کے ٹکڑے، اولے اور رعد و برق کی آفتیں اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ کلامِ عرب میں اس کی تمام تفصیلات ملتی ہیں۔۔۔۔"

"حٰمٓ السجدۃ میں قومِ عاد کے عذاب کے ذیل میں صاعقہ یعنی کڑک اور چمک کی بھی تصریح ہے: فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۱۳) (اگر وہ اعراض کریں تو ان کو باخبر کردو کہ میں تم کو اس طرح کی کڑک کے عذاب سے ڈراتا ہوں، جیسا عاد اور ثمود پر نازل ہوا)۔"

"اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے بادلوں، تند ہوا اور ہولناک کڑک کا عذاب نازل فرمایا لیکن اصل تباہی ہوا کے تصرفات سے واقع ہوئی اس وجہ سے اگر اثر سے اثر پر استدلال کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ثمود پر اللہ تعالیٰ نے دھاریوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ہولناک کڑک اور بہرا کر دینے والی چیخ بھی تھی جس طرح قوم

عاد پر ہوا کے ساتھ رعد و برق والے بادل بھیجے۔ چونکہ ثمود کی تباہی صاعقہ ہی کے ذریعے سے واقع ہوئی .... اس وجہ سے صرف اسی کا ذکر کیا، بادلوں کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن التزامی طور پر ثبوت ان کا بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح عاد کے ذکر میں ہوا کا ذکر بار بار کیا ہے لیکن بادلوں کا ذکر صرف ایک ہی جگہ کیا ہے[1]"

وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (۴۶)

قوم نوح کے عذاب کی طرف اشارہ

یہ عطف اس مفہوم پر ہے جو اوپر کی سرگزشتوں سے متبادر ہوتا ہے یعنی جس طرح ہم نے قوموں کو پکڑا یا ہلاک کیا اسی طرح ان سے پہلے قوم نوح کو بھی ہلاک کیا۔ مفہوم و معنی پر عطف کی مثالیں قرآن میں بہت ہیں۔ اس کے شواہد پیچھے گزر چکے ہیں۔

یہ آخر میں قوم نوح کے واقعہ کی طرف بھی اجمالی اشارہ کر دیا۔ اگرچہ تاریخی ترتیب کے اعتبار سے سب سے پہلے اسی واقعہ کا ذکر ہونا تھا لیکن قرآن نے یہاں ترتیب تاریخی اختیار نہیں کی بلکہ قریش کو ان واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے جن کی روایات اور جن کے آثار ان کے ملک میں موجود تھے اور جن کی طرف اوپر آیت 'وَفِي الْأَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ' میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہ مقصد مقتضی ہوا کہ پہلے قوم لوط اور قوم فرعون وغیرہ کا ذکر آئے جو زمانی و مکانی دونوں ہی اعتبار سے نسبتاً قریب کے واقعات تھے اس وجہ سے مخاطب پر زیادہ اثر انداز ہو سکتے تھے پھر سب سے آخر میں سب سے پہلے واقعہ کا بھی حوالہ دے دیا تاکہ مخاطب کے سامنے پوری تاریخ آجائے۔

اس واقعہ کی یاد دہانی کا یہ خاص پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ جس طرح مذکورہ بالا قوموں کی سرگزشتوں میں آپ نے دیکھا کہ ان کی تباہی میں اصل عامل کی حیثیت ہوا کے تصرفات کو حاصل ہے جس کی قسم سورہ کے شروع میں کھائی گئی ہے، اسی طرح قوم نوح کو بھی اللہ تعالیٰ نے ہوا ہی کے تصرف سے ہلاک کیا۔ استاذ امام فراہیؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں قوم نوح کی تباہی کی نوعیت پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کا ضروری حصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

" قرآن اور تورات میں قوم نوح کی تباہی سے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی تباہی میں بھی اصل دخل ہوا کے تصرفات ہی کا رہا ہے۔ سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہے۔

قوم نوح کی تباہی میں بھی اصل دخل ہوا کے تصرفات کا تھا

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ	اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور
فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا	وہ ان کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار سال

---

[1] تفسیر سورۂ ذاریات فراہیؒ

خَشِيْتُ عَامًا ۚ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (العنکبوت: ۱۴) رہا۔ پس ان کو پکڑا طوفان نے اور وہ ظالم تھے۔"

"اس آیت میں لفظ 'طوفان' خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ 'طوفان' کے لغوی معنی دوران یعنی گردش کرنے اور چکر کھانے کے ہیں۔ اہلِ عرب اس سے اس تند ہوا کو مراد لیتے ہیں جو تیزی سے چکر کھاتی ہوئی اٹھتی ہے۔"

اس معنی کی تائید میں کلامِ عرب کے بعض شواہد نقل کرنے کے بعد مولانا فرماتے ہیں۔

"دوسری زبانوں میں بھی اس قسم کی تند ہوا کے لیے اس کے ہم معنی اور اسی کے مشابہ الفاظ ہیں۔ فارسی میں اس کو گرد باد کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے سائیکلون (cyclone) کا لفظ ہے۔ مصریوں کے ہاں ہوا کا ایک خاص دیوتا تھا جس کو ٹائفون[1] کہتے تھے۔ اس ہوا کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے شدت کی بارش ہوتی ہے اور سمندر کا پانی جوش میں آ جاتا ہے۔ میں نے کراچی میں اس قسم کا طوفان بچشمِ خود دیکھا ہے۔ بحرِ ہند کے مشرق سے ایک طوفان اٹھا اور مغرب کی طرف گزر گیا۔ اس کے اثر سے نہایت سخت بارش ہوئی۔ جہاز پہاڑوں سے جا ٹکرائے۔ دوسرے جانی مالی نقصانات بھی بے شمار ہوئے۔ طوفانِ نوح کے جو حالات تورات و قرآن میں بیان ہوئے ہیں وہ بڑی حد تک اس سے مشابہ ہیں۔ سورۂ قمر میں ہے:

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (القمر: ۱۲) ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش کے ساتھ کھول دیے اور زمین کے تمام چشمے پھوٹ نکلے۔ پس پانی ٹھہرائے ہوئے اندازہ تک پہنچ گیا۔"

"تورات کی کتاب پیدائش، باب ۔ ۱۱ میں ہے۔

"بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں۔"

" سورۂ ہود میں ہے۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ (ھود: ۴۲) اور وہ کشتی ان کو لے کر ایسی موجوں کے اندر چل رہی تھی جو پہاڑوں کی طرح بلند ہو رہی تھیں۔

پہاڑ کی طرح موجوں کا اٹھنا اسی حالت میں ہوتا ہے جب تند ہوا چل رہی ہو۔"

آخر میں مولانا نے خلاصۂ بحث ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

---

[1] انگریزی میں (TYPHOON) سمندر کے سائیکلونی طوفانوں کے لیے ایک معروف لفظ ہے۔ (اصلاحی)

"اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قومِ نوح پر تُند اور چکر دار ہوا کا طوفان آیا جس سے سخت بارش ہوئی۔ پاس کے سمندروں کا پانی اُبل پڑا اور ہر طرف سے موجیں اٹھنے لگیں۔ اس طوفان کے اندر نوح علیہ السلام کا سفینہ کوہِ جودی پر جا کے ٹکا۔"

۹۔ واقعات کی ترتیب پر ایک نظر

اوپر جو واقعات بیان ہوئے ہیں، آیات کی وضاحت کے ضمن میں ہم ان کی حکمت کی طرف ضروری اشارات کرتے آئے ہیں لیکن استاذ امامؒ نے ان کی ترتیب پر ایک پوری فصل لکھی ہے جس میں نہایت لطیف نکتے بیان فرمائے ہیں۔ اس فصل کا ضروری حصہ ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

"حضرت ابراہیم و حضرت لوط علیہما السلام کی جو سرگزشت یہاں بیان ہوئی ہے اس کا ایک پہلو تو بالکل واضح ہے کہ اس میں بشارت اور انذار دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بعینہٖ یہی حال ہوا کا بھی ہے جس کی یہاں قسم کھائی گئی ہے۔ وہ بھی کبھی پیامِ رحمت بن کر ظاہر ہوتی ہے اور کبھی صورتِ عذاب بن کر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی یہ جامع حیثیت مقتضی ہوئی کہ یہاں وہی تمہید کی جگہ پائے۔"

"اس کے بعد قومِ لوط کی سرگزشت بیان ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں کو ان کی تباہ شدہ بستیوں پر سے گزرنے اور ان کے آثار و نشانات اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں قسم کے پہلے ٹکڑے 'وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۝ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا' (قسم ہے ان ہواؤں کی جو غبار اڑاتی چلتی ہیں پھر اٹھا لیتی ہیں بوجھ) سے سب سے زیادہ قریبی مناسبت قومِ لوط کی تباہی کے واقعہ ہی کو تھی۔ ان کی تباہی تند ہوا سے ہوئی تھی جس نے ریت اور سنگ ریزوں سے ان کو ڈھانپ دیا۔ اس کی اتنی مقدار ان کے اوپر لا ڈالی کہ اس کے نیچے ان کی بستیاں بھی چھپ گئیں۔"

"علاوہ بریں اوپر جو فرمایا ہے: 'وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ' (اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں) تو قومِ لوط کی سرگزشت میں اس دعوے کا بھی نہایت واضح ثبوت موجود تھا جس کی وضاحت پیچھے ہو چکی ہے۔"

"اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت ہے۔ یہ سرگزشت قرآن مجید میں بار بار بیان ہوئی ہے اور اس کے اندر نہایت اعلیٰ سبق ہیں۔ اس کو مقسم بہ کے دوسرے ٹکڑے 'فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا' (پھر بوجھ اٹھا لینے والی، پھر آہستہ چلنے والی) سے نہایت واضح مناسبت ہے۔ اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔"

"یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جن سرگزشتوں کو حضرات انبیاء علیہم السلام کے ناموں سے شروع کیا ہے ان کے اندر بشارت کا پہلو نمایاں ہے۔ اس کے بعد جو سرگزشتیں قوموں کے نام سے سنائی گئی ہیں ان کے اندر انذار کا پہلو غالب ہے۔ قوموں میں سے عاد اور ثمود کا ذکر خاص طور پر ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اوپر جو عذاب آیا وہ دھاریوں والے بادلوں (وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ) کی شکل میں آیا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جو ترتیب قسموں میں ملحوظ ہے وہی ترتیب قوموں کے ذکر میں بھی ہے۔ عاد اور ثمود کے ذکر میں عاد کو مقدم رکھا ہے اس کی وجہ تقدمِ زمانی کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ان پر جو عذاب آیا وہ ہوا اور بادل دونوں کے تصرفات کا نتیجہ تھا۔"

"رہی نوح علیہ السلام کی سرگزشت تو وہ تمام قوموں اور امتوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ایک غیر فانی نشانی ہے۔ یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ أُذُنٌ وَّاعِيَةٌ (الحآقّۃ: ۱۱-۱۲)

جب پانی حد سے بڑھ گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں اٹھا لیا تاکہ اس سرگزشت کو تمہارے لیے یاددہانی بنائیں اور محفوظ رکھنے والے کان اس کو محفوظ کر لیں۔

"اس سرگزشت کے اندر زمین، آسمان، ابر، ہوا، بادل، کشتی اور پانی سب کے کرشمے جمع ہو گئے ہیں۔ اس جامعیت کے سبب سے اس نے آفاقی و انفسی دلائل کے ایک مجموعہ کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ چنانچہ اوپر ہوا کی جو شہادتیں بیان ہوئیں اور بعد میں زمین و آسمان اور نفس کے جن آثار و دلائل کی طرف اشارے کیے گئے ان سب کے لحاظ سے مناسب ہوا کہ قومِ نوح کی یہ جامع سرگزشت سنا کر وہ ساری حقیقتیں ممثل کر کے نگاہوں کے سامنے رکھ دی جائیں۔"

"نیز عاد اور ثمود کو زمین کی خلافت قومِ نوح کے بعد ہی ملی تھی اس وجہ سے بھی مناسب ہوا کہ ان کے ذکر کے ساتھ قومِ نوح کا بھی حوالہ دیا جائے۔ قرآن مجید میں اس کی دوسری مثال بھی موجود ہے۔

وَأَنَّهٗٓ أَهْلَكَ عَادًا الْأُوْلٰى ۝ وَثَمُوْدَا۟ فَمَآ أَبْقٰى ۝ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْغٰى ۝ (النجم: ۵۰-۵۲)

اور اس نے عادِ اول کو ہلاک کیا اور ثمود کو بھی۔ پس ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا۔ اور اس سے پہلے قومِ نوح کو بھی ہلاک کیا۔ یہی لوگ ظالم و سرکش تھے۔"

"اس آیت میں وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ کے ٹکڑے پر خاص طور پر نگاہ رکھیے۔"

"چونکہ یہ سرگزشت مشہور اور قدیم ہونے کے علاوہ تمام قوموں کی مشترک سرگزشت ہے اس وجہ سے اول تو اس کی طرف اجمالی اشارہ کافی ہوا پھر اس کا ذکر ایک اتمامی سرگزشت کی حیثیت سے کیا گیا۔ نیز ایجاز کی خوبی دیکھیے کہ محض اسلوب کی تبدیلی سے ظاہر ہو گیا کہ ماقبل سے اس کو کسی قدر مستقل اور جداگانہ اہمیت حاصل ہے، چنانچہ 'وَفِیْ نُوْحٍ' نہیں کہا، جیسا کہ اوپر 'وَفِیْ مُوْسٰی' اور 'وَفِیْ عَادٍ' کہا ہے بلکہ اسلوب بدل کر 'وَقَوْمَ نُوْحٍ' فرمایا تاکہ بدلا ہوا اسلوب خود متنبہ کر دے کہ اس سرگزشت کی اہمیت کچھ اور ہے۔"

۱۰- آگے آیات ۴۷-۶۰ کا مضمون

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و ربوبیت کی نشانیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قیامت اور جزا و سزا سے ڈرایا ہے اور اسی ضمن میں توحید کی بھی یاد دہانی فرمائی ہے تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ سب کو ایک ہی خدا سے سابقہ پیش آنا ہے اکوئی دوسرا خدا کی پکڑ سے بچانے والا نہیں بنے گا۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ جو سلوک تمھاری قوم تمھارے ساتھ کر رہی ہے یہی سلوک ہر قوم نے اپنے رسول کے ساتھ کیا ہے تو تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ شریروں سے اعراض کرو۔ بس ان کو بات سناؤ جو سنتے ہیں۔ اللہ ہر قدم پر تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی مدد فرمائے گا۔ تم اللہ کے سوا کسی کی مدد کے محتاج نہیں ہو۔ جو عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں ان کو آگاہ کر دو کہ جلدی نہ مچائیں۔ ان کے لیے جو فرصت مقدر ہے جب وہ پوری ہو جائے گی تو عذاب آ جائے گا اور وہ بڑی سخت چیز ہوگا۔

آیات ۴۷-۶۰

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۭ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۱﴾ كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ

طَاغُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿۵۴﴾ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ
الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا
لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ
يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾
فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا
يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ
ع ۳ ۲
يُوْعَدُوْنَ ﴿۶۰﴾

ترجمۂ آیات ۴۷-۶۰

اور آسمان کو ہم نے بنایا قدرت کے ساتھ اور ہم بڑی ہی وسعت رکھنے والے ہیں اور زمین کو ہم نے بچھایا، پس کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں! اور ہر چیز سے ہم نے پیدا کیے جوڑے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ پس اللہ کی طرف بھاگو، میں اس کی طرف سے تمہارے لیے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ بناؤ۔ میں اس کی جانب سے تمہارے لیے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۴۷-۵۱

ایسے ہی ان کے اگلوں کے پاس جو رسول بھی آیا اس کو انھوں نے جادوگر یا دیوانہ ٹھہرایا۔ کیا انھوں نے آپس میں ایک دوسرے کو اس کی وصیت کر چھوڑی ہے! یہ ہیں ہی سرکش لوگ! پس ان سے تم اعراض کرو، اب تم پر کوئی الزام نہیں۔ اور یاددہانی کرتے رہو کیونکہ یاددہانی ایمان والوں کو نفع پہنچاتی ہے۔ ۵۲-۵۵

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔ نہ میں ان سے یہ چاہتا ہوں کہ وہ رزق کا سامان کریں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ بلاشبہ اللہ ہی روزی رساں، زور آور، قوت والا ہے۔ ۵۶-۵۸

پس ان ظالموں کے لیے بھی ویسا ہی مقرر پیمانہ ہے جیسا ان کے اگلے ہم مشربوں کے لیے تھا۔ تو جلدی نہ مچائیں۔ ان کافروں کے لیے ان کے اس دن کے سبب سے بڑی خرابی ہے جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔ ۵۹-۶۰

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۴۷)

قدرت کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ

'اَیْد' کے معروف معنی ہاتھ کے ہیں لیکن یہ قوت و قدرت کی تعبیر کے لیے بھی آتا ہے۔ تنکیر یہاں تفخیم شان کے لیے ہے۔ 'مُوْسِعُوْنَ' یعنی اس کا اقتدار و اختیار بہت وسیع ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا کام بھی اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں ہے۔

اوپر جزا و سزا کے اثبات کے لیے جو تاریخی دلیلیں بیان ہوئی ہیں انہی پر عطف کر کے یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس قدرت و عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص اپنے سر پر پھیلے ہوئے آسمان اور اس کے عجائب کے اندر کر سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا جو خدا اس عظیم اور ناپیدا کنار آسمان کو وجود میں لا سکتا ہے اس کے لیے انسان کو اس کے مرکھپ جانے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا مشکل ہو جائے گا! یہی مضمون دوسرے مقامات میں یوں بیان ہوا ہے 'ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا' (النّٰزعٰت ۷۹: ۲۷) (کیا تمہارا پیدا کیا جانا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا؟ اس کو بنایا ......)۔

'وَاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ' یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ اس عظیم آسمان کو پیدا کرنے میں ساری قوت نچڑ گئی ہے، اب کوئی اور کام ہم نہیں کر سکتے۔ ہمارے اندر بڑی سمائی اور بڑی قدرت ہے۔ ہم جو چاہیں اور جب چاہیں کر سکتے ہیں۔ کوئی چیز بھی ہمارے حیطۂ قدرت سے باہر نہیں ہے۔ بعض دوسرے مقامات میں یہی مضمون یوں بھی بیان ہوا ہے کہ ہم نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔

وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (قٓ: ۳۸) اور ہم کو ذرا بھی تکان لاحق نہیں ہوئی۔

وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ (۴۸)

آسمان کے بعد زمین کی طرف توجہ دلائی کہ اس کو دیکھو ہم نے کس خوبی سے بچھایا ہے اور ہم کتنے اچھے بچھانے والے ہیں! یعنی زمین پر غور کرو تو اس سے ہماری قوت و عظمت بھی واضح ہوگی اور ہماری ربوبیت بھی۔ جس سے ہر معقول آدمی اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ جس خدا نے یہ زمین بنائی ہے اور اس کے اندر انسان کی پرورش کے لیے گوناگوں وسائل پیدا کیے ہیں اس نے یہ کارخانہ عبث نہیں پیدا کیا ہے۔ یہ بات اس کی حکمت و ربوبیت کے منافی ہے کہ وہ کوئی عبث کام کرے۔ حکمت و ربوبیت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ہر شخص اس دنیا کی زندگی سے متعلق مسئول ہو کہ اس نے اس میں خالق کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کی یا اپنی مرضی چلائی، اگر اس نے خالق کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کی ہو تو وہ حقدار ہے کہ اپنی اس شکرگزاری کا صلہ پائے اور اگر اپنی من مانی کی ہو تو وہ سزاوار ہے کہ اپنی اس سرکشی کی سزا بھگتے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہو چکا ہے۔ یہاں زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ سورۂ نبا کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

آسمان کے بعد زمین کی طرف اشارہ

'فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ' سے مقصود اس دنیا کے ان عجائباتِ حکمت و ربوبیت کی طرف اشارہ کرنا ہے جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا خالق صرف ایک بے پناہ قدرت رکھنے والا ہی نہیں ہے بلکہ جس طرح اس کی قدرت بے پناہ ہے اسی طرح اس کی حکمت، رحمت، پروردگاری اور اس کے جود و کرم کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ پھر یہیں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی یہ صفات بھی متقاضی ہیں کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں وہ اپنے بندوں کے درمیان انصاف کرے اور اس کے کامل عدل اور اس کی کامل رحمت کا ظہور ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کی صفاتِ رحمت و ربوبیت کی نفی ہو جاتی ہے حالانکہ اس دنیا کا ہر گوشہ اس کی شہادت سے معمور ہے۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۴۹)

یہ اس کائنات کے ایک اور خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی اور یہ پہلو بھی اپنے اندر قیامت اور جزا و سزا کی دلیل رکھتا ہے۔

اس کائنات کا ایک خاص پہلو

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز جوڑے جوڑے پیدا کی ہے۔ چنانچہ اوپر آسمان و زمین کا ذکر ہو چکا ہے۔ ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر ہی اپنی غایت اور اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو توحید کی دلیل ملتی ہے کہ ایک مدبر و حکیم ہستی نے یہ دنیا پیدا کی ہے جو اس تمام کائنات سے بالاتر اور سب پر حاوی ہے اور اپنی قدرت

حکمت کے تحت اس کے اجزائے مختلفہ میں ملاپ پیدا کر کے ان کو صالح نتائج کے ظہور کا ذریعہ بناتی ہے۔ دوسری طرف یہ آخرت کی بھی ایک بدیہی دلیل ہے اس لیے کہ اس دنیا کی ہر چیز جب جوڑا جوڑا ہے اور ہر چیز اپنی غایت کو اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر پہنچتی ہے تو ضروری ہے کہ اس دنیا کا بھی جوڑا ہو تاکہ اس میں جو خلا نظر آتا ہے اس جوڑے کے ساتھ مل کر بھر جائے۔ یہ جوڑا آخرت ہے۔ آخرت کو مان لینے کے بعد یہ دنیا ایک بامقصد و باحکمت چیز بن جاتی ہے اور آخرت کو نہ مانیے تو ایک بالکل باطل و عبث چیز ہو کے رہ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے آخرت کو نہ ماننے والوں سے جگہ جگہ یہ سوال کیا ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے! اس دلیل کی پوری وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز کا جوڑے جوڑے ہونا اس امر کی یاددہانی کرتا ہے کہ اس دنیا کا بھی جوڑا ہے جس سے اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور وہ ہے آخرت!

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۵۰)

آخرت کی یاددہانی — یعنی جب آخرت ہے اور اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی مخالفت سے باز آؤ، اپنے رب کی طرف بھاگو اور اس دن کے لیے تیاری کرو جس دن ہر شخص سے اس کے اعمال کی بابت پرسش ہونی ہے اور جس دن خدا کے سوا کوئی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔

اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے ایک 'نَذِیْر مبین' کی حیثیت سے آیا ہوں کہ آخرت کے ظہور سے پہلے پہلے اس کے خطرات سے تمھیں اچھی طرح آگاہ کر دوں تاکہ کسی کے لیے اس دن عذر کی گنجائش باقی نہ رہے کہ اس کے پاس کوئی اس دن سے آگاہ کرنے والا نہیں آیا۔ میں نے ایک 'نذیر مبین' کی طرح تمھیں اس دن کے احوال اور اس کی ہولناکیوں سے اچھی طرح آگاہ کر دیا ہے۔ اب نتائج کی ساری ذمہ داری خود تمھارے اوپر ہے۔

'نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ' کے اندر جو تلمیح ہے اس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ 'مِّنْهُ' سے مراد یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تمہارے انذار ہی کے مشن پر مامور ہو کر آیا ہوں۔ بعض لوگوں نے 'مِّنْهُ' کو نَذِیْرٌ کے صلہ کے مفہوم میں لیا ہے، لیکن یہ رائے عربیت کے بھی خلاف ہے اور نظائر قرآن کے بھی۔

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۵۱)

اس حقیقت کی یاددہانی کہ خدا کا کوئی شریک نہیں

یہ اوپر کے مضمون کی تکرار نہیں ہے بلکہ ایک اور حقیقت سے آگاہ فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ جب آخرت کا مرحلہ آئے گا تو اس دن تمہارے مزعومہ شرکا و شفعاء تمہاری مدد کریں گے یا سفارش کر کے خدا کی پکڑ سے تمہیں بچا لیں گے۔ اس قسم کے خیالی سہاروں پر بھروسہ کر کے اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ اس دن سابقہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک سے پیش آئے گا، دوسرے سہارے سب بے حقیقت ثابت ہوں گے۔ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مشن پر بھی مامور ہوں کہ تمہیں اس حقیقت سے بھی اچھی طرح آگاہ کر دوں کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ مشرکین اول تو قیامت کو بہت بعید از امکان خیال کرتے تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجے میں مانتے بھی تھے تو ان کو گمان یہ تھا کہ ان کا معاملہ تو ان کے شرکاء کے سامنے پیش ہوگا، وہ اپنے زور و اثر سے ان کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ ان کے اس زعم نے قیامت کو ان کے نزدیک ایک بالکل بے اثر چیز بنا دیا تھا۔ ان کی اسی غلط فہمی پر ضرب لگانے کے لیے قرآن میں قیامت کے ساتھ توحید کا ذکر ضرور آتا ہے۔ پیچھے اس کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ اسی نوعیت کی تنبیہ یہاں بھی ہے۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (۵۲)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان لوگوں کی اس روش پر غم نہ کرو۔ اس صورت حال سے تمہی کو سابقہ پیش نہیں آیا ہے بلکہ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں انھوں نے اپنے اپنے رسولوں کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔

رسولوں کے ساتھ شریروں کی روش

'قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ'۔ یعنی انھوں نے جب ان کی طلب پر اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دکھائیں تو ان کو جادوگر ٹھہرایا اور جب ان کو عذاب و قیامت سے ڈرایا تو ان کو خبطی اور دیوانہ قرار دیا۔ 'ساحر' اور 'مجنون' کے الفاظ بطور مثال نقل ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی مخالفت کے لیے انھوں نے کوئی نہ کوئی بہانہ پیدا کر ہی لیا۔ اسی طرح تمہاری قوم کے اشرار بھی تمہیں مطعون کرنے کے لیے طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ رسولوں کے ساتھ اشرار کا سلوک ہمیشہ یہی رہا ہے۔ اس میں تمہاری کسی کوتاہی یا کمی کو کوئی دخل نہیں ہے اور نہ یہ صورت حال صرف تمہی کو پیش آئی ہے اس وجہ سے دل گرفتہ نہ ہو بلکہ صبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرو جس طرح تم سے پہلے اولوالعزم رسولوں نے کیا۔

اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۵۳)

یہ اشرار کی روش کی یکسانی اور اس کے تسلسل پر اظہارِ تعجب ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کے اشرار نے اپنے بعد آنے والی قوم کے اشرار کو یہ وصیت کر چھوڑی ہے کہ تمہارے پاس بھی کوئی رسول آئے تو اس سے وہی سلوک کرنا جو ہم نے اپنے رسول سے کیا ہے۔ چنانچہ ہر آنے والی نسل اپنے اسلاف

کی اس وصیت کی پوری وفاداری کے ساتھ تعمیل کرتی چلی جا رہی ہے۔

'بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ' یہ اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ عمل کی اس مشابہت کی اصل علت یہ ہے کہ یہ لوگ بھی (یعنی قریش) اسی طرح کے سرکش ہیں جس طرح کے سرکش پچھلے رسولوں کے مکذبین تھے۔ مزاج کی یہ یکسانی اس بات کا سبب ہوئی کہ یہ بھی وہی ٹیڑھی چال چلیں جو ان کے پیش رَو چلے اور پھر لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں جس سے وہ دوچار ہوئے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ (۵۴)

مفسدوں سے اعراض اور نیکوں کی طرف التفات کی ہدایت

یعنی اس قسم کے شریر لوگوں سے، جو مخالفت کے لیے ادھار کھائے بیٹھے ہوں، تم اعراض کرو۔ رسول کی حیثیت سے انذار و تبلیغ کی جو ذمہ داری تھی وہ تم نے ادا کر دی۔ اب تم عند اللہ بری ہو۔ اب کوئی پرسش ان کے باب میں تم سے نہیں ہونی ہے بلکہ یہ خود سزاوار ملامت ہیں اور اس کا انجام عنقریب دیکھیں گے۔

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۵)

یعنی شریروں اور سرکشوں سے تو اعراض کرو لیکن ان لوگوں کو سمجھاتے رہو جو تمہاری بات سنتے ہیں۔ ایمان کے طالبوں کو تمہاری تعلیم و تذکیر سے نفع پہنچتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اوپر کی آیت میں اعراض کی جو ہدایت ہے اس کا تعلق قریش کے ان سرکش لیڈروں سے ہے جو غرور کے سبب سے کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے ان کے ایمان کے لیے زیادہ فکرمند تھے کہ یہ ایمان لائیں گے تو اس سے دین کو تقویت حاصل ہوگی اور دوسروں کے لیے ایمان کی راہ کھلے گی۔ یہ مصلحت بجائے خود ایک اہم مصلحت تھی اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مدت تک ان کے پیچھے سرگرداں رہے لیکن جب ان پر حجت تمام ہوگئی اور واضح ہوگیا کہ یہ پتھر اپنی جگہ سے کھسکنے والے نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روک دیا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۶-۵۸)

دو اہم حقیقتوں کا بیان

قریش کے لیڈروں سے اعراض کے حکم کے بعد ان آیات میں دو نہایت اہم حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اول اس حقیقت کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو جو پیدا کیا ہے تو اپنی کسی احتیاج کے لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ ہر حال میں ان کی ناز برداری کرتا رہے۔ اس کی سلطنت اپنے بل بوتے پر قائم ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے بلکہ لوگ ہی اس کے محتاج ہیں۔ اس نے ان کو اس لیے پیدا کیا کہ اس کی عبادت و اطاعت کا حق ادا کر کے سعادت و کمال کے مدارج حاصل کریں جو اس نے ان

کے لیے مقدر کر رکھے ہیں۔ اسی مقصد کی یاددہانی کے لیے اس نے اپنے رسول بھیجے تاکہ لوگوں پر اصل حقیقت واضح ہو جائے۔ لیکن رسول کی ذمہ داری صرف حق کو واضح کر دینے کی ہے۔ یہ ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ لوگ اس حق کو لازماً قبول بھی کرلیں۔ رسول نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اگر لوگ اس کی دعوت کو قبول نہیں کر رہے ہیں تو اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں۔ خدا اور اس کے رسول کا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں کہ ان کو ہر قیمت پر کسی نہ کسی طرح راضی کرنے ہی کی کوشش کی جائے۔

گویا اوپر والی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے لیڈروں سے اعراض کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے ان آیات میں اس کی وجہ بیان فرما دی گئی ہے کہ ان متکبرین کے بغیر خدا کا کوئی کام بند نہیں ہو جائے گا کہ تم ان کے پیچھے اپنے کو ہلکان رکھو۔

دوسرے اس حقیقت کی طرف کہ اللہ کے دین کی دعوت اپنا زادِ راہ اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ جو لوگ اس دعوت کو لے کر اٹھیں ان کا سارا بھروسہ اپنے رب پر ہونا چاہیے۔ انھیں یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی عبادت و اطاعت کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہی چیز ان کی خلقت کی غایت اور ان کی زندگی کا نصب العین ہے جس کا پورا ہونا ہر شکل میں مطلوب ہے۔ اس کی خاطر تو وہ ہر چیز قربان کر سکتے ہیں لیکن اس کو کسی چیز پر بھی قربان نہیں کر سکتے۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ اس جرم میں ان کے دشمن ان پر تمام معاشی راہیں مسدود کر دیں گے تب بھی انھیں اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہنا اور یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ اگر انھوں نے اپنے مقصدِ حیات سے انحراف اختیار نہ کیا تو اللہ تعالیٰ دشمنوں کے علی الرغم ان کے لیے رزق کی ایسی راہیں کھولے گا جن کا گمان نہ ان کو ہو گا اور نہ ان کے دشمنوں کو۔ رزّاق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ بڑی ہی محکم قوت و تدبیر کا مالک ہے۔ کسی بڑے سے بڑے دشمن کی قوت بھی اس کی قوت پر غالب نہیں آسکتی۔

یہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو، دعوت کے اس دور میں جب کفار ان کو مکہ سے نکال دینے اور تمام معاشی راہیں ان پر بند کر دینے کی اسکیمیں سوچ رہے تھے، تسلی دی گئی ہے کہ تم اللہ واحد کی بندگی کے اس نصب العین پر ڈٹے رہو جس کے لیے تمہارے رب نے تم کو پیدا کیا ہے۔ رزّاقِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے وہ تمہارے لیے غیب سے رزق کی راہیں کھولے گا۔ بندوں کا فرض اپنے رب کی بندگی کرنا ہے۔ رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کے پورا کرنے میں کسی پہلو سے بھی عاجز نہیں ہے۔ یہ مضمون قرآن میں ان مواقع میں خاص طور پر بیان ہوا ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے اغنیاء سے بے نیاز ہو کر اپنے موقفِ حق پر ثابت قدم رہنے کی ہدایت فرمائی گئی۔ بعض آیتیں ہم بطور مثال نقل کرتے ہیں۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ   اور تم اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو،

عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (طٰہٰ: ۱۳۲) — ہم تم سے رزق رسانی کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ہم ہی تم کو روزی دیں گے اور انجام کار کی کامیابی تقویٰ ہی کے لیے ہے۔

یہی مضمون دوسرے الفاظ میں یوں آیا ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (الحجر۔ ۸۸) — اور ہم نے ان کفار کی بعض جماعتوں کو جن چیزوں سے بہرہ مند کر رکھا ہے اس کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ اور نہ ان کے حال پر غم کرو اور اپنی شفقت کے بازو اہل ایمان پر جھکائے رکھو۔

کلام کا موقع و محل سمجھ لینے کے بعد ایک نظر اس کے اجزا پر بھی ڈال لیجیے۔

'وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ'۔ اس آیت میں لفظ 'عبادت' اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی رب کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت۔ مقصود اس حقیقت کا پتہ بتا دینے سے زندگی کے اصل نصب العین کو سامنے رکھ دینا ہے تاکہ ہر انسان واضح طور پر جان لے کہ اسے کس مقصد کے لیے جینا اور کس مقصد کے لیے مرنا ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ خدا کی بندگی اس لیے مطلوب نہیں ہے کہ خدا کسی کی بندگی کا محتاج ہے بلکہ قرآن میں جا بجا یہ تصریح ہے کہ بندے ہی اس کی بندگی کے محتاج ہیں اس لیے کہ ان کی رفعت و بلندی کا زینہ یہ بندگی ہی ہے۔ اگر اس بندگی سے وہ منحرف ہو جائیں تو پھر ان کی حیثیت حیوانات سے زیادہ نہیں رہ جاتی بلکہ وہ ان سے بھی فروتر درجے میں گر جاتے ہیں۔ یہاں جنوں اور انسانوں دونوں کا ذکر ایک درجہ کی مخلوق کی حیثیت سے کیا ہے، اس لیے کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے اختیار کے شرف سے مشرف فرمایا ہے اور دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاں مساوی درجے میں مسئول اور بندگی رب کا حق ادا کرنے کی صورت میں یکساں اجر و شرف کے حق دار ہیں۔

'مَآ أُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ أُرِيْدُ أَنْ يُّطْعِمُوْنِ'۔ یہ اس امر کی وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو اپنی کسی ضرورت کے لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ ان کے بغیر اس کا کوئی کام بند ہو جائے۔ اس نے نہ تو اپنی مخلوق کی رزق رسانی کی ذمہ داری ان پر ڈالی ہے اور نہ وہ خود کھانے پینے کا محتاج ہے کہ ان سے یہ چاہے کہ وہ اس کو کھلائیں بلکہ وہ خود ہی سب کا روزی رساں ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ انسان خود اپنے یا اپنی آل و اولاد کے رزق کے لیے اس دنیا میں جو جدوجہد کرتا ہے اس میں اس کی حیثیت ایک آلہ اور ذریعہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس کی کوششوں کو بارآور کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اگر اس کا فضل نہ ہو تو آدمی کی ساری محنت اکارت ہو کے رہ جائے۔ چنانچہ فرمایا: أَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَأَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُوْنَ (الواقعہ: ۶۳-۶۴)

(غور کرو اس چیز پر جو تم بوتے ہو! کیا تم اس کو پروان چڑھاتے ہو یا ہم اس کو پروان چڑھانے والے ہیں!)

'وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ' میں مشرک قوموں کے اس وہم پر بھی ایک ضرب ہے جو وہ اپنے دیوتاؤں کی نسبت رکھتی ہیں کہ وہ ان کی پیش کردہ قربانیوں سے بہرہ مند اور محظوظ ہوتے ہیں۔

'اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ'۔ یعنی حالات کی ظاہری ناساعدت سے بددل ہو کر کوئی خدا کی رزق رسانی و کارسازی کے باب میں کسی شک میں مبتلا نہ ہو۔ رزّاق حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ بڑی ہی محکم قوت کا مالک ہے۔ حالات کی ناساعدت اور مخالفوں کی مزاحمت اس کی تدبیروں کو شکست نہیں دے سکتی۔

'ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ' کی وضاحت مولانا فراہیؒ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں فرمائی ہے۔

"لفظ 'متین' پر چونکہ وقف ہے اس وجہ سے اس کا اعراب ظاہر نہیں ہوتا اور جب اعراب ظاہر نہیں ہوتا تو اس کی قرارت میں کسی اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اعراب ہے کیا؟ بعض اس کو مجرور سمجھتے اور اس کو 'قوۃ' کی صفت قرار دیتے ہیں۔ 'قوت' دراصل رسی کی لڑ کو کہتے ہیں اور رسی کی مضبوطی کے لیے عربی میں لفظ 'متین' معروف ہے۔ ایک شبہ یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ لفظ 'قوت' مؤنث ہے اور 'متین' مذکر ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ 'متین' فعیل کے وزن پر ہے اور یہ وزن عربی میں مذکر اور مؤنث دونوں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں ارشاد ہے 'اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ' (الاعراف: ۵۶) (اللہ کی رحمت محسنوں کے قریب ہے)۔

"بعض اس کو حالتِ رفع میں سمجھتے اور اس کو 'ذوالقوۃ' کی صفت قرار دیتے ہیں لیکن لفظ 'متین' اللہ تعالیٰ کی صفت کی حیثیت سے قرآن میں کہیں اور نہیں استعمال ہوا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کا فاعل محذوف مانا جائے یعنی 'المتین قوتہ' اس طرح یہ اختلاف محض اعراب کا اختلاف ہوگا، معنی میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوگا۔"

فَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِھِمْ فَلَا یَسْتَعْجِلُوْنِ (۵۹)

قریش کو تنبیہ

'ذَنُوْب' بھرے ہوئے ڈول کو کہتے ہیں۔ خالی ڈول کے لیے یہ لفظ نہیں آتا۔ اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ حصہ اور نصیب کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ ابوذؤیب کا ایک شعر ہے۔

لعمرک والمنایا غالبات　　　　لکل بنی اب منہا ذنوب

(تیری جان کی قسم، موت سے مفر نہیں، ہر باپ کے بیٹوں کے لیے اس میں سے حصہ ہے)

آیت میں 'ذنوب' سے مراد زندگی کی وہ محدود مدت ہے جو ان کفار کے حصہ میں آئی ہے۔ 'لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا' سے مراد قریش کے وہی لیڈر ہیں جن کا رویہ یہاں زیر بحث ہے۔ فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے

ان کے پہلے ہم مشربوں کو (اشارہ عاد و ثمود وغیرہ کی طرف ہے) ایک مدت مہلت کی دی کہ اس کے اندر وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کر کے اپنا پیمانہ بھر لیں اسی طرح ان کو بھی ایک مہلت ہم نے عطا فرمائی ہے کہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔ بالآخر یہ مہلت تمام ہونی ہے اور وہ انجام ان کے سامنے آکے رہے گا جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے تو اس مہلت کو غیر محدود سمجھ کر اس عذاب کے لیے وہ جلدی نہ مچائیں جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ مثلاً وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَل لَّهُم مَّوْعِدٌ لَّن يَجِدُوا مِن دُونِهِ مَوْئِلًا (الکہف: ۵۸) (اور تیرا رب مغفرت اور رحمت کرنے والا ہے، اگر وہ ان کے جرموں پر فوراً مواخذہ کرنے والا ہوتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا۔ لیکن ان کے لیے ایک وعدے کا دن ہے جس سے وہ کہیں پناہ نہیں پائیں گے)۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ (۶۰)

'لِلَّذِينَ كَفَرُوا' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں مراد کفار قریش ہی ہیں جو رسول کے انذار کو محض دھونس خیال کر کے اس کو زچ کرنے کے لیے، مطالبہ کر رہے تھے کہ اگر اس طرح کا کوئی عذاب آنا ہے تو وہ آجائے، اس کو دیکھے بغیر ہم اس کو ماننے والے نہیں ہیں۔ فرمایا کہ اس دن کے لیے جلدی نہ مچائیں۔ وہ بڑا ہی کٹھن دن ہو گا۔ اس دن کے سبب سے ان کو جن ابدی ہلاکتوں سے سابقہ پیش آئے گا ان سے ان کو کوئی پناہ نہ دے سکے گا۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمدُ للہِ علیٰ ذٰلک۔

رحمان آباد

۱۸؍ اپریل ۱۹۷۷ء

۲۸؍ ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ

فہرست مضامین

تفسیر سورۃ الزخرف ـ ۴۳

تفسیر سورۃ الدخان - ۴۴

تفسیر سورۃ محمد - ۴۷

تفسیر سورۃ الفتح - ۴۸

تفسیر سورۂ ق - ۵۰

تفسیر سورۃ الذّٰریٰت ۵۱

افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

الطور ۵۲ — الجن ۷۲

تدبرِ قرآن

جلد ہشتم

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبّرِ قرآن

جلد ہشتم

تفاسیر
سورۂ طور (۵۲) — تا — سورۂ جن (۷۲)

امین احسن اصلاحی

فاران

فاران فاؤنڈیشن
لاہور — پاکستان

اهتمام — حسن خاور

مطبع — فلک شیر پرنٹرز، ابراہیم روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت — نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ — فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

(طبع اوّل)

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ تدبر قرآن کی ساتویں جلد[1] بھی پریس کے حوالہ کی جا چکی ہے۔ توقع ہے کہ اختتام سال سے پہلے پہلے ان شاء اللہ اس کی اشاعت کی خوش خبری قدر دانوں تک پہنچ جائے گی۔ کتاب کے ناشر ـــــ عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ـــــ میرے شکریہ اور کتاب کے قدر دانوں کی تحسین کے سزاوار ہیں کہ گوناگوں مشکلات کے باوجود، نہایت قلیل مدت میں، کتاب کی تین جلدیں ـــــ پنجم ششم اور ہفتم ـــــ نہایت اعلیٰ معیار پر شائع کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے اور یہ حوصلہ بھی رکھتے ہیں کہ سالِ آئندہ کے اندر اندر اس کی آٹھویں یعنی آخری جلد بھی ان شاء اللہ وہ شائع کر دیں گے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس ارادے میں کامیابی بخشے اور وہ اس سے بھی بڑے بڑے کاموں کو انجام دینے کی توفیق پائیں۔ اگرچہ میں اپنے رب کے ہر فیصلہ پر راضی ہوں لیکن دل میں یہ ارمان ضرور ہے کہ مرنے سے پہلے اس کتاب کو مطبوعہ صورت میں دیکھنے کی خوشی مجھے بھی حاصل ہو جائے۔

آٹھویں جلد کا معتد بہ حصہ بھی خدا کے فضل سے تیار ہے۔ اگرچہ گھر میں مسلسل علالت کے سبب سے ادھر عرصہ سے دل جمعی کے ساتھ کام کرنا نصیب نہیں ہوا تاہم وقفہ وقفہ کے ساتھ کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہوں اور یہ کوشش بھی کی ہے کہ جو کچھ قلم سے نکلے وہ کتاب کے معیار کے مطابق ہو اور کسی اہم بحث میں قارئین کسی پریشانی، خاطر یا بے توجہی کا کوئی اثر محسوس نہ کریں۔ آخری گروپ کی سورتوں میں، جیسا کہ جلد ششم کے دیباچہ میں عرض کر چکا ہوں، کمالِ ایجاز کے باعث مشکلیں بہت ہیں تاہم سورۂ غاشیہ (۸۸) تک کام ہو چکا ہے۔ جو کام رہتا ہے، زندگی اور صحت باقی ہے تو چند مہینوں میں پورا ہو جائے گا۔

یہاں ایک فتنہ کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے جو مستشرقین نے قرآن کے نظام اور اس کی خدائی ترتیب کو درہم برہم کرنے کے لیے اٹھایا ہے۔ انھوں نے اپنے زیرِ اہتمام قرآن کے ایسے نسخے چھاپے ہیں جن میں سورتوں کی وہ ترتیب، جو اللہ اور رسول کی قائم کی ہوئی ہے، بدل کر ایک نئی ترتیب اس دعوے کے ساتھ قائم کی ہے کہ اس طرح قرآن ایک منظم اور مرتب کتاب بن جاتا ہے اور ان کے نزدیک اس کے

---

[1] ترتیبِ نو ـــــ جلد ہشتم

اندر بے ترتیبی کا جو عیب ہے وہ ایک حد تک دور ہو جاتا ہے۔

اس نوعیت کا ایک اور فتنہ بعض مسلمان ملکوں میں اٹھ رہا ہے کہ وہاں ایسے قرآن مجید چھاپے جا رہے ہیں جن میں مصحف عثمانی کی معروف و متواتر قراءت (قراءت حفص) کو نظر انداز کر کے دوسری غیر معروف اور شاذ قراءتیں اختیار کر لی گئی ہیں۔

تدبر قرآن میں اس طرح کے فتنوں کا سر میں نے اچھی طرح کچل دیا ہے۔ جو لوگ غور سے اس کا مطالعہ کریں گے وہ ان شاء اللہ مستشرقین، یہود اور روافض کی اس طرح کی فتنہ انگیزیوں سے محفوظ رہیں گے جس ترتیب کے ساتھ مصحف ہمارے ہاتھوں میں ہے یہ ترتیب اللہ اور اس کے رسول کی قائم کردہ ہے۔ اس کی بنیاد تورات اور انجیل کی طرح تاریخ پر نہیں بلکہ فلسفۂ دین اور حکمت شریعت پر ہے۔ اس کے تمام گروپ باہم دگر بالکل وابستہ و پیوستہ ہیں۔ اس کی ہر سورہ اپنی سابق و لاحق سورہ سے اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ اس کے اندر معمولی تقدیم و تاخیر سے معنوی خلا پیدا ہو جائے گا۔ ہر سورہ کی آیات میں ایک خاص عمود کے تحت ایسا ربط و اتصال ہے کہ ایک آیت بھی اگر کہیں اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو اندیشہ ہے کہ پوری سورہ کا نظام مختل ہو جائے۔

قراءتوں کا اختلاف بھی اس تفسیر میں دور کر دیا گیا ہے۔ معروف اور متواتر قراءت وہی ہے جس پر یہ مصحف ضبط ہوا ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اس قراءت پر قرآن کی ہر آیت اور ہر لفظ کی تاویل لغت عرب، نظم کلام اور شواہد قرآن کی روشنی میں اس طرح ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی شک کا احتمال نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ میں نے ہر آیت کی تاویل اسی قراءت کو بنیاد بنا کر کی ہے اور میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ اس کے سوا کسی دوسری قراءت پر قرآن کی تفسیر کرنا اس کی بلاغت، معنویت اور حکمت کو مجروح کیے بغیر ممکن نہیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی کتاب کا صحیح فہم عطا فرمائے اور شیاطین کے فتنوں سے محفوظ رکھے۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

لاہور

۱۴۔ نومبر ۱۹۷۹ء

۲۳۔ ذوالحجہ ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۵۲

الطّور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سے تعلق

یہ سورہ اس گروپ کی تیسری سورہ ہے۔ پچھلی دونوں سورتوں ـــــ قٓ اور الذّٰریٰت ـــــ میں زندگی بعد موت، حشر و نشر اور جزاء و سزا کے عقلی و انفسی اور آفاقی و تاریخی دلائل بیان ہوئے ہیں اور انداز بیان عمومیت یعنی جزا اور سزا دونوں کے پہلو لیے ہوئے ہے چنانچہ الذّٰریٰت میں عمود کی حیثیت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۙ وَّ اِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ (بے شک جس چیز کی تم کو دھمکی دی جا رہی ہے وہ سچی ہے اور جزا و سزا واقع ہو کے رہے گی) کو حاصل ہے اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ جزا و سزا کے دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے، خواہ اس کا تعلق رحمت سے ہو یا عذاب سے۔ اس سورہ میں عذاب کے پہلو کو زیادہ نمایاں فرمایا ہے چنانچہ چند تاریخی اور آفاقی شواہد کا حوالہ دینے کے بعد قریش کو نہایت واضح الفاظ میں دھمکی دی ہے کہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ ۙ مَّا لَہٗ مِنۡ دَافِعٍ (۷-۸) (بے شک تیرے رب کا عذاب واقع ہو کے رہے گا اور کوئی بھی اس کو دفع کرنے والا نہ بن سکے گا) یہی دھمکی اس سورہ میں مقسم علیہ کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور یہی اس سورہ کا عمود بھی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ اپنے مطالب کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم ہے۔

(۱-۱۶) یہ حصہ تمہیدی ہے۔ پہلے بعض اہم تاریخی و آفاقی حقائق کو شہادت میں پیش کر کے قریش کے متمردین کو دھمکی دی گئی ہے کہ جس عذاب سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ، اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ پیش آ کے رہے گا اور کوئی بھی اس کو ٹالنے والا نہ بن سکے گا۔ اس کے بعد چند آیتوں میں اس عذاب کے دن کی تصویر کھینچی گئی ہے اور تکذیب کرنے والوں کا اس دن جو حشر ہو گا بالاجمال اس کا بیان ہے۔

(۱۷-۲۸) مکذبین کے بالمقابل متقین پر اللہ تعالیٰ اس دن جو فضل و انعام فرمائے گا اس کا بیان۔ اس انعام کا خاص پہلو جو یہاں نمایاں فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے جو بندے آل و اولاد کی دنیا بنانے سے زیادہ ان کی عاقبت سنوارنے کی کوشش کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی باایمان اولاد کو جنت میں ان کے ساتھ جمع کر دے گا، اگرچہ اولاد اپنے اعمال کے اعتبار سے ان کے درجہ کی مستحق نہ ہو۔ اس یکجائی کے لیے اونچے درجے کے متقین کے درجہ کو

نیچا نہیں کیا جائے گا بلکہ نیچے درجے والوں کا مرتبہ اونچا کر دیا جائے گا۔ اصل نتائج کا انحصار تو آدمی کے اعمال ہی پر ہوگا۔ اس وجہ سے نہ کسی کے عمل میں کوئی کمی ہوگی اور نہ کوئی ایمان سے محروم شخص جنت میں جا سکے گا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل کا دروازہ اس کے باایمان بندوں کے لیے کھلا رہے گا۔

(۲۹ - ۴۹) خاتمۂ سورہ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہاری تکذیب کے لیے کفار جو بہانے بنا رہے ہیں ان کی پروا کیے بغیر اپنا فرض تذکیر ادا کیے جاؤ تاکہ جن کو راہِ راست پر آنا ہو وہ راہ راست پر آ جائیں اور جو اپنی گمراہی پر اڑے رہنا چاہیں ان پر حجت تمام ہو جائے۔

اوپر آیت ۱۲ میں مخالفین کی جن سخن سازیوں اور تہمت تراشیوں کی طرف اشارہ ہے ان کی تفصیل اور ان کے مسکت جواب۔

متمردین کو تنبیہ کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ان کی ساری چالیں بیکار ہو جائیں گی اور آخرت کے عذاب سے پہلے وہ اس دنیا میں بھی عذاب سے دوچار ہوں گے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین کہ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور اطمینان رکھو کہ تم ہر وقت ہماری حفاظت میں ہو۔

صبر و استقامت کے حصول کے لیے نماز بالخصوص شب اور سحر کی نمازوں کے اہتمام کی تاکید۔

سُوْرَةُ الطُّوْرِ (۵۲)

مَكِّيَّةٌ ــــــــــ اٰيات : ۴۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالطُّوْرِ ﴿۱﴾ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ﴿۲﴾ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ﴿۳﴾ وَّالْبَيْتِ آيات ۱ - ۲۸
الْمَعْمُوْرِ ﴿۴﴾ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ﴿۵﴾ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ﴿۶﴾ اِنَّ
عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ﴿۸﴾ يَّوْمَ تَمُوْرُ
السَّمَآءُ مَوْرًا ﴿۹﴾ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ﴿۱۰﴾ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ
اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا
تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِصْلَوْهَا
فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ﴿۱۷﴾ فٰكِهِيْنَ
بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۱۸﴾
كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓــًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ مُتَّكِـِٔيْنَ
عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ

أَلَتْنٰهُم مِّنْ عَمَلِهِم مِّن شَيْءٍ ۚ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ﴿٢١﴾ وَ
أَمْدَدْنٰهُم بِفٰكِهَةٍ وَلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ﴿٢٢﴾ يَتَنٰزَعُونَ فِيهَا
كَأْسًا لَّا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ ﴿٢٣﴾ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ
كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ﴿٢٤﴾ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢٥﴾
قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ﴿٢٦﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ
عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُومِ ﴿٢٧﴾ إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلُ نَدْعُوهُ ۖ
ع ۲ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ﴿٢٨﴾

ترجمۂ آیات ۱-۲۸

شاہد ہے طور اور کتاب لکھی ہوئی، جھلّی کے کھلے ہوئے اوراق میں۔ اور شاہد ہے آباد گھر اور بلند چھت اور لبریز سمندر کہ تیرے رب کا عذاب واقع ہو کر رہے گا، کوئی اس کو ٹالنے والا نہیں بن سکے گا۔ ۱-۸

اس دن کو یاد رکھو جس دن آسمان ڈانواں ڈول ہو جائے گا اور پہاڑ چلنے لگ جائیں گے، پس بدبختی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی! اُن کی جو سخن گستری میں لگے ہوئے کھیل رہے ہیں۔ جس دن کہ وہ آتشِ دوزخ کی طرف دھکے دے دے کر لے جائے جائیں گے کہ یہ ہے وہ دوزخ جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے۔ کیا یہ جادو ہے یا تمھیں سجھائی نہیں دے رہا ہے! اس میں داخل ہو جاؤ، اب صبر کرو یا نہ کرو، تمھارے لیے یکساں ہے۔ تم وہی بدلے میں پا رہے ہو جو کرتے رہے تھے۔ ۹-۱۶

بے شک متقی بندے باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔ وہ محظوظ ہو رہے ہوں گے ان نعمتوں سے جو ان کے رب نے ان کو دے رکھی ہوں گی اور اس بات سے کہ

ان کے رب نے ان کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھا۔ کھاؤ اور پیو بے غلّ وغش اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے تھے۔ ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے صف بہ صف، تختوں کے اوپر اور ہم ان کو بیاہ دیں گے غزال چشم حوریں۔ ۱۷-۲۰

اور جو لوگ ایمان لائے، اور ان کی اولاد نے بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی ان کے ساتھ ہم ان کی اولاد کو بھی جمع کر دیں گے اور ان کے عمل میں سے ذرا بھی کمی نہیں کریں گے۔ ہر ایک اس کمائی کے بدلے میں گرو ہو گا جو اس نے کی ہوگی۔ اور ہم ان کی پسند کے میوے اور گوشت ان کو برابر دیتے رہیں گے۔ ان کے درمیان ایسی شراب کے پیالوں کے تبادلے ہو رہے ہوں گے جو لغویت اور گناہ سے پاک ہوگی اور محفوظ موتیوں کے مانند چھوکرے ان کی خدمت میں سرگرم ہوں گے۔ ۲۱-۲۴

وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے، دریافتِ حال کرتے ہوئے۔ کہیں گے: ہم اس سے پہلے اپنے اہل وعیال کے باب میں بڑے ہی چوکنّے رہے ہیں تو اللہ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا اور ہمیں عذابِ دوزخ سے محفوظ رکھا۔ ہم اس سے پہلے اسی کو پکارتے رہے تھے، بے شک وہ بڑا ہی باوفا اور مہربان ہے۔ ۲۵-۲۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالطُّوْرِ (۱)

قسم اور مقسم علیہ

'وَ' یہاں قسم کے لیے ہے اور یہ وضاحت اس کے محل میں تفصیل سے ہو چکی ہے کہ قرآن میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں بیشتر اس دعوے کی شہادت کے لیے کھائی گئی ہیں جو اس قسم کے بعد بطور مقسم علیہ مذکور ہوا ہے۔[۱] یہاں مقسم علیہ، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ (بے شک تیرے رب کا عذاب

---

[۱] ملاحظہ ہو اقسام القرآن مؤلفہ امام حمید الدین فراہیؒ

واقع ہو کے رہے گا) ہے۔ اس وجہ سے طُور کی قسم لازماً اس دعوے پر شہادت کے لیے کھائی گئی ہے۔ چنانچہ قسم کے اسی مفہوم کو پیشِ نظر رکھ کر ہم نے اس کا ترجمہ 'شاہد ہے طُور' کیا ہے اور یہ ترجمہ ہمارے نزدیک زیادہ معنی خیز ہے۔

'طُور' سے مراد وہی جبلِ طُور ہے جس کا ذکر مختلف پہلوؤں سے قرآن مجید میں بار بار ہوا ہے۔ اسی طُور کی ایک مقدّس وادی 'طوٰی' میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے واپس ہوتے ہوئے، پہلی بار خدا کی تجلّی کا مشاہدہ ہوا۔ یہیں وہ شرفِ رسالت سے مشرّف ہوئے اور حکم ہوا کہ وہ فرعون اور اس کی قوم کے پاس منذر بن کر جائیں اور اس کو آگاہ کر دیں کہ اگر وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آیا تو اپنی قوم سمیت اللہ کے عذاب کی زد میں آ جائے گا۔ پھر فرعون کی ہلاکت کے بعد اسی طُور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دینے کے لیے بلایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیبت کے دوران میں جب بنی اسرائیل گوسالہ پرستی کے فتنہ میں مبتلا ہوئے تو اسی طُور کے دامن میں اپنی قوم کے سرداروں کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اجتماعی توبہ کے لیے حاضر ہوئے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سارے طُور کو ہلا دیا اور بنی اسرائیل کو متنبہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب ــــــ تورات ــــــ دے کر تم سے جو عہد لے رہا ہے، اگر اس عہد پر تم استوار نہ رہے تو یاد رکھو کہ اس کی قدرت یہ بھی ہے کہ اسی پہاڑ سے تمہیں کچل کے رکھ دے گا۔

اپنی ان گوناگوں خصوصیات کے سبب سے جبلِ طُور اس دعوے کی صداقت و شہادت کا ایک عظیم تاریخی نشان ہے جو اس قسم کے بعد مذکور ہوا ہے۔ چنانچہ اسی خصوص کی بنا پر اس کی قسم سُورۂ تین میں بھی کھائی گئی ہے اور وہاں بھی، جیسا کہ سورۂ تین کی تفسیر میں ان شاء اللہ ہم واضح کریں گے، اسی جزاء و سزا ہی کے پہلو سے اس کی قسم کھائی گئی ہے۔

ایک غلط فہمی

بعض لوگوں نے لفظ 'طُور' کو یہاں عام پہاڑ کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن یہ قول مختلف وجوہ سے کمزور ہے۔ اول تو قرآن کی تاویل معروف معنی کے لحاظ سے کرنی چاہیے۔ لفظ 'طُور' عبرانی یا سریانی میں پہاڑ کے معنی میں ممکن ہے آتا ہو لیکن عربی میں یہ اس معنی میں معروف نہیں۔ قرآن میں یہ لفظ بار بار آیا ہے اور ہر جگہ علم ہی کی حیثیت سے آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ پہاڑ کے معنی لینے کی صورت میں مقسم علیہ کے ساتھ اس کی مطابقت باقی نہیں رہتی درآنحالیکہ یہ چیز ضروری ہے ورنہ قسم بے محل ہو جائے گی۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ (۲)

کتاب مسطور سے مراد تورات ہے

'وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ' سے مراد یہاں تورات ہے۔ اس کا ایک واضح قرینہ تو یہ ہے کہ اس کا عطف 'طُور' پر ہے اور یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طُور ہی پر عطا فرمائی۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ اس کی صفت 'فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ' آتی ہے۔ 'رَقّ' باریک کھال کو کہتے ہیں جو زمانۂ قدیم میں لکھنے کے مصرف میں آتی تھی اور تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات شروع شروع میں صاف کی ہوئی باریک کھالوں

بھی پر لکھی جاتی ہو طومار کی شکل میں لپیٹ کر رکھی جاتیں اور تلاوت کے وقت ان کو پھیلا لیا جاتا۔ ان قرائن کی موجودگی میں تورات کے سوا کسی اور کتاب کو مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے دفترِ اعمال کو مراد لیا ہے لیکن یہ اس کا محل نہیں ہے۔ اس کی شہادت اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں مؤثر ہو سکتی ہے۔

مُقسم علیہ کے ساتھ بھی اس کا تعلق بالکل واضح ہے۔ جس طرح طُورؔ اللہ تعالیٰ کے قانونِ مجازات کا ایک تاریخی نشان ہے اسی طرح تورات بھی ایک عظیم تحریری ریکارڈ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا قانونِ مجازات بھی نوشتہ ہے اور اس قانون کے تحت اس نے دنیا میں قوموں کے ساتھ جو معاملات کیے ہیں ان کی تاریخ بھی محفوظ ہے۔ اس تاریخ کو پڑھیے تو معلوم ہو گا کہ مکافاتِ عمل کا قانون حضرت آدمؑ کے وقت سے برابر جاری ہے اور اس کا یہ تسلسل اس امر کی دلیل ہے کہ یہ برابر جاری رہے گا، یہاں تک کہ ایک ایسا دن بھی آئے گا جس میں اللہ تعالیٰ کے عدلِ کامل کا ظہور ہو گا۔ اس دن جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی ہو گی وہ اس برائی کی سزا بھگتے گا اور جس نے رائی کے برابر بھی نیکی کی ہو گی وہ اس کا صلہ پائے گا۔

لفظ 'کِتٰب' کی تنکیر اس کی شان کے اظہار کے لیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن سے پہلے یہی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے خلق کی ہدایت اور آخرت کے عذاب سے ڈرانے کے لیے اتاری اور جس کے بنیادی احکام تحریری شکل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عنایت فرمائے۔ اس سے پہلے حضرات انبیاء علیہم السلام نے جو تعلیم دی وہ تمام تر زبانی دی۔ ان کی تعلیمات کو تحریری شکل میں لانے کا آغاز اسی کتاب سے ہوا اس وجہ سے اس کا ذکر خاص اہمیت کے ساتھ ہوا۔ اس تعلیم بالقلم سے خلق پر اتمامِ حجت کے جو پہلو ظہور میں آئے ان پر ان شاء اللہ سورۂ رحمٰن اور سورۂ علق کی تفسیر میں ہم روشنی ڈالیں گے۔

فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۳)

ایک کھلا صحیفہ — لفظ 'رَقّ' کی تحقیق اوپر بیان ہو چکی ہے۔ اس کتاب کے پھیلے ہوئے اوراق میں ہونے کا حوالہ یہاں خلق پر اتمامِ حجت کے پہلو سے ہے۔ یعنی یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے بلکہ ایک آشکارا حقیقت ہے جو بالکل کھلے اور پھیلے ہوئے اوراق میں بیان ہوئی ہے۔ جو شخص چاہے، اس کو پڑھ سکتا ہے اور اگر پڑھ نہیں سکتا تو اس کو پڑھوا کر سن سکتا ہے۔ بلکہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کتاب کے حاملین سے مطالبہ کرے کہ وہ اس کو بتائیں اور سنائیں کہ اس کتاب میں اللہ تعالیٰ نے کیا بیان فرمایا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اہلِ عرب دینی معاملات میں اہلِ کتاب کی برتری تسلیم کرتے رہے ہیں، چنانچہ جگہ جگہ قرآن نے ان کو توجہ دلائی ہے کہ اگر وہ نہیں جانتے تو اہلِ کتاب سے پوچھ لیں۔ پھر یہ

بات بھی ہے کہ تورات میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی تاریخ بھی بیان ہوئی ہے اور اہلِ عرب اس بات کے مدعی تھے کہ وہ جس دین پر ہیں وہ ان کو اپنے انہی اجداد سے وراثت میں ملا ہے، گویا ان کے لیے یہ ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ اس کتاب سے معلوم کر سکتے ہیں کہ ان کے اجداد نے ان کو جزاؤ سزا سے ڈرایا ہے یا نہیں۔

وقت کے یہود پر ایک لطیف تعریض

لفظ 'مَنْشُوْرٍ' میں وقت کے یہود پر نہایت لطیف تعریض بھی ہے۔ قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ یہود اپنے صحیفوں کی بہت سی باتیں چھپاتے ہیں۔ کتمانِ حق کی یہ بیماری یہود کے اندر ان کے دورِ زوال میں پیدا ہوئی اور اس کے پیدا ہونے کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ ان پیشین گوئیوں سے واقف ہوں جو تورات کے صحیفوں میں نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) سے متعلق وارد ہیں اور جن میں ان کو یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر انھوں نے اس نبی کی تکذیب کی تو وہ خدا کے مغضوب اور امامت سے محروم ہو جائیں گے۔ اس لفظ سے یہود کو تورات کی اصل نوعیت کی یاددہانی فرمائی گئی کہ یہ پھیلے ہوئے، صاف و شفاف اوراق میں تھی کہ لوگ اس کو پڑھیں اور سمجھیں اور اس کے اوراق ہر وقت لوگوں کے سامنے کھلے رہیں، لیکن وہ اپنی بدبختی سے ان کو چھپاتے ہیں۔ یہی حقیقت حضرت مسیح نے یہود کو خطاب کر کے یوں واضح فرمائی ہے کہ 'تم کو چراغ دیا گیا تھا کہ گھر میں اس کو بلند جگہ پر رکھو کہ سارے گھر میں روشنی پھیلے، لیکن تم نے اس کو پیمانے کے نیچے ڈھانک کر رکھا ہے'۔

وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ (۴)

'بیتِ معمور' سے مراد

'بیتِ مَعْمُوْر' سے عام طور پر مفسرین نے جنت کے اندر ایک گھر کو مراد لیا ہے جو فرشتوں کے لیے آسمان میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو زمین میں انسانوں کے لیے بیت اللہ الحرام کی ہے۔ لیکن یہ قول ہمارے نزدیک، یہاں غیر متعلق ہے۔ اس طرح کا کوئی گھر جنت میں ہے تو اس کی شہادت اس دعوے کے حق میں کیا وزن رکھتی ہے جو اس قسم کے بعد پیش کیا گیا ہے؟ ہمارے مفسرین کو چونکہ یہ غلط فہمی ہے کہ قسم جس چیز کی کھائی جائے وہ کوئی متقدس چیز ہونی چاہیے، اس وجہ سے وہ صرف مقسم بہ کے تقدس کو دیکھتے ہیں حالانکہ اصل دیکھنے کی چیز مقسم بہ کا تقدس نہیں بلکہ پیش کردہ دعوے پر اس کی شہادت کا پہلو ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو دعوے کے ساتھ اس کا کوئی تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔

بعض لوگوں نے اس سے بیت اللہ کو مراد لیا ہے۔ یہ قول اس پہلو سے تو وزن دار ہے کہ 'بلدِ امین' کی قسم سزا و جزا کے حق ہونے پر کھائی گئی ہے۔ بیت اللہ چونکہ اسی بلدِ امین میں واقع ہے اس وجہ سے اس کی شہادت بھی اپنے اندر ایک معنویت رکھتی ہے لیکن سیاق و سباق اس قول کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد 'سقف مرفوع' کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس 'سقفِ مرفوع' سے بیت اللہ کی چھت ظاہر ہے کہ مراد نہیں ہو سکتی۔ اس سے آسمان ہی مراد ہو سکتا ہے

اور مفسرین نے آسمان ہی کو مراد لیا بھی ہے۔ اگر اس سے آسمان ہی مراد ہے تو بیت اللہ کی قسم کے کے بعد آسمان کی قسم اور اس کے بعد دریا کی قسم یہ کچھ بے جوڑ سی قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ان کے اندر وہ ہم رنگی ہم آہنگی باقی نہیں رہتی جو طور اور کتابِ مسطور والی قسم میں پائی جاتی ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ بیتِ معمور سے مراد یہ زمین ہے جس پر آسمان کی چھت پھیلی ہوئی ہے۔ اس خیال کی تائید میں کئی باتیں پیش کی جا سکتی ہیں، مثلاً

ایک یہ کہ زمین کے لیے بیت کا استعارہ نہایت موزوں ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ اس کو 'مہاد' اور 'فراش' وغیرہ الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ نیز زمین کو فرش اور آسمان کو اس کی چھت سے تمثیل دے کر اس کے گھر ہونے کو نہایت خوبصورت طریقہ پر ممثل بھی کر دیا ہے۔

دوسری یہ کہ اس کے بعد آسمان کا ذکر اس بات کا نہایت واضح قرینہ ہے کہ اس سے زمین ہی مراد لی جائے۔ قرآن میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے زمین اور آسمان دونوں کا ذکر ساتھ ہوا ہے۔

تیسری یہ کہ قرآن میں جگہ جگہ اس حقیقت کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی پرورش کے لیے جو گوناگوں اسباب و وسائل مہیا فرمائے ہیں وہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہیں کہ انسان اس دنیا میں شترِ بے مہار نہیں ہے بلکہ وہ اپنے رب کے آگے جواب دہ ہے۔ لفظ 'معمور' یہاں زمین کے انہی اسباب و وسائل اور اس کے لازمی نتیجہ یعنی مسئولیت اور جواب دہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

چوتھی یہ کہ سابق سورہ ـــــ الذّٰرِیٰت ـــــ میں فرمایا ہے کہ 'وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ' (۲۰) (اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے) نیز فرمایا ہے کہ 'وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ' (۲۲) (اور آسمان میں تمہارا رزق بھی ہے اور وہ چیز بھی جس سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے) ان آیتوں کی تفسیر کرتے ہوئے ہم زمین و آسمان کی ان نشانیوں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قانونِ مجازات اور اس کے عذاب پر گواہ ہیں، بعینہٖ اسی چیز پر زمین و آسمان کی گواہی یہاں بھی پیش کی گئی ہے صرف اسلوبِ بیان کا فرق ہے۔

ان مختلف وجوہ سے ہمارے نزدیک اس سے مراد زمین ہے اور لفظ 'معمور' سے اس کا موصوف ہونا خدا کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی ان نشانوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس سے قرآن نے جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کے عدل اور جزا و سزا پر استدلال فرمایا ہے اور جس کی وضاحت اس کتاب میں ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ (۵)

۴ آسمان کی شہادت

زمین کے بعد یہ آسمان کی شہادت پیش کی گئی ہے۔ قرآن نے اپنے دعاوی کی تائید میں بالعموم زمین کی نشانیوں کے ساتھ آسمان کی نشانیوں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ سورۂ ذاریات کی آیت 'وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ' (۲۲) (اور آسمان میں تمھاری روزی بھی ہے اور وہ چیز بھی جس سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے) نیز اس میں 'وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُکِ' (۷) (دھاریوں والے آسمان کی قسم بھی ہے۔ اس کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ معتوب قوموں کی تباہی میں آسمان اور ابر و ہوا کے تصرّفات کو کتنا دخل رہا ہے۔

آسمان کا ذکر قرآن میں موقع و محل کی رعایت سے مختلف صفات کے ساتھ ہوا ہے۔ یہاں اس کو 'سقف مرفوع' سے تعبیر فرمایا ہے۔ لفظ 'سقف' اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، عنایت اور رحمت پر دلیل ہے کہ یہ محض اس کی کرم گستری کا کرشمہ ہے کہ اس نے یہ عظیم شامیانہ ہمارے سروں پر تان رکھا ہے اور لفظ 'مرفوع' اس کی قدرت، عظمت اور کبریائی کو ظاہر کر رہا ہے کہ جو ذات اس عظیم اور ناپیدا کنار چھت کے بلند کر دینے پر قادر ہے کون سا کام ہے جو اس کے دائرۂ قدرت سے باہر ہو سکتا ہے! اللہ تعالیٰ کی صفات کے یہ دونوں پہلو (یعنی اس کی عنایت اور قدرت) جن مختلف اعتبارات سے آخرت اور جزا و سزا پر دلیل ہیں ان کی تفصیل اس کتاب میں ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (۶)

'سجر' کے معنی بھرنے کے ہیں۔ 'سجر الرجل التنور' تنور کو ایندھن سے بھر دیا۔ 'سجر الماء النھر' پانی نے نہر کو لبریز کر دیا۔

سمندر کی شہادت

زمین اور آسمان کی شہادت کے بعد یہ زمین کی ایک سب سے بڑی نشانی سمندر کی قسم کھائی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی زمین اور آسمان کی نشانیوں کا حوالہ دینے کے بعد سمندر کی نشانیوں کا ذکر آیا ہے۔ ملاحظہ ہوں سورۂ رحمٰن کی آیات ۱۰-۲۴۔ ان آیات پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ زمین و آسمان کی نشانیوں میں سے سمندر اپنے اندر خدا کی توحید، اس کی قدرت، اس کی ربوبیت اور اس کی جزا و سزا کے اتنے شواہد رکھتا ہے کہ انسان ان کو شمار نہیں کر سکتا۔ ان شواہد کی تفصیل اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں۔ ان بحثوں کو ان کے محل میں دیکھیے۔ بعض اہم امور سورۂ رحمٰن کی تفسیر میں بھی ان شاء اللہ زیر بحث آئیں گے۔ یہاں سورہ کے عمود اور مقسم علیہ کے تعلق سے اتنی بات یاد رکھیے کہ ان قسموں کے بعد جس عذاب سے ڈرایا گیا ہے اس کی تاریخی شہادت قومِ نوح کے واقعہ میں بھی موجود ہے اور قومِ فرعون کے واقعہ میں بھی۔ یہ دونوں قومیں سمندر ہی کے عذاب میں گرفتار ہوئیں جس کی تفصیلات تورات میں بھی موجود ہیں اور قرآن میں بھی۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ ۙ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ (۷-۸)

یہ ہے وہ اصل دعویٰ جو اوپر کی قسموں کے بعد پیش کیا گیا ہے اور یہی اس سورہ کا عمود بھی ہے۔ یہی بات معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ، سابق سورہ میں ہواؤں کی قسم کے بعد یوں ارشاد ہوئی ہے: اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۙ وَّ اِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ (الذّٰریٰت ۵: ۶) (بے شک جس چیز سے تمھیں ڈرایا جا رہا ہے وہ سچی ہے اور بے شک جزا اور سزا ہو کے رہے گی) بس اتنا فرق ہے کہ اس میں عذاب کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ہم سابق سورہ میں اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ کی شرح کرتے ہوئے اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سے مراد درحقیقت وہ عذاب ہے جس سے اللہ کے رسولوں نے دنیا اور آخرت میں ڈرایا ہے۔ اس سورہ میں گویا وہی بات واضح فرما دی گئی ہے جو سابق سورہ میں مضمر تھی۔ اجمال کے بعد تفصیل اور اضمار کے بعد توضیح قرآن مجید کا معروف اسلوب ہے جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

اصل دعویٰ جو سورہ کا عمود ہے

اوپر قسموں کی وضاحت کرتے ہوئے ہم ان شواہد کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جو اس دعوے پر دلیل ہیں۔ ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہی کا حوالہ دے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم قریش کو جس عذاب سے ڈرا رہے ہو اور جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں وہ واقع ہو کے رہے گا، کوئی اس کو دفع کرنے والا نہ بن سکے گا۔ یعنی نہ تو ان کی اپنی قوت و جمعیت اس کے مقابل میں کچھ کام آئے گی اور نہ ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء ان کو اس سے چھڑا سکیں گے۔ نہ دنیا میں اس سے کوئی بچا سکے گا اور نہ آخرت میں کوئی سہارا دے سکے گا۔ طور پر موسیٰ (علیہ السلام) کو جو خبر دی گئی، تورات کے صحیفوں میں جو اس کا ذکر موجود ہے، یہ زمین جن آثار و شواہد سے معمور ہے، یہ سقف نیلگوں جن عجائبِ تصرفاتِ قدرت کی گواہی دے رہی ہے اور یہ سمندر جن آیاتِ الٰہی کے امین ہیں ان کو دیکھو اور ان پر غور کرو، وہ اس وعید کی تصدیق کے لیے کافی ہیں۔ ان کے علاوہ کسی اور نشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ ان نشانیوں سے جن لوگوں کی آنکھیں نہیں کھلیں گی وہ اگر آسمان کا کوئی ٹکڑا اپنے اوپر گرتا ہوا بھی دیکھیں گے تو اس کو بھی عذاب کے بجائے ابرِ باراں سمجھ کر خوشی سے ناچیں گے، یہاں تک کہ وہ ان کو تباہ کر کے رکھ دے گا لیکن وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

یَّوۡمَ تَمُوۡرُ السَّمَآءُ مَوۡرًا ۙ﴿۹﴾ وَّ تَسِیۡرُ الۡجِبَالُ سَیۡرًا ﴿ؕ۱۰﴾ فَوَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿ۙ۱۱﴾ الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ خَوۡضٍ یَّلۡعَبُوۡنَ ﴿ۘ۱۲﴾ (۹-۱۲)

یوم عذاب کی تصویر

یہ اس عذاب کی تصویر ہے کہ اس دنیا میں یہ آسمان جو نہایت ہی محکم اور اپنے مقام پر ٹکا ہوا نظر آتا ہے ڈانواں ڈول ہو جائے گا۔ 'مَوۡر' کے معنی مضطرب اور متردد ہو کر ادھر ادھر حرکت کرنے کے ہیں۔ یعنی اس کا کوئی ٹکڑا کسی سمت کو جاتا ہوا نظر آئے گا، کوئی کسی جانب کو۔ اسی طرح یہ پہاڑ جو اپنی جگہ گڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اکھڑ کر بالکل تگٹ ٹٹ چلنے لگیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن جب آسمان اور پہاڑوں کا یہ حال ہو گا تو انسانوں پر کیا گزرے گی! اس دن کسی کی قوت و جمعیت

اور کسی کے قلعے اور مورچے کیا کام آنے والے بن سکیں گے! یہاں یہ بات یاد رکھیے کہ جب قریش کے سرکشوں کو قیامت کے دن کسی ہلچل کی خبر دی جاتی تو وہ بانداز استہزاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے کہ اس دن ان پہاڑوں کا کیا بنے گا، کیا یہ بھی ٹوٹ پھوٹ جائیں گے! قرآن نے دوسرے مقام میں انہی لوگوں کے جواب میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ میرا رب ان کو بھی ریزہ ریزہ کر دے گا۔

'فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ'۔ فرمایا کہ اس دن ان لوگوں کے لیے ہلاکی ہی ہلاکی ہے جو اس کو آج جھٹلا رہے ہیں۔ 'الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ'۔ یہ انہی جھٹلانے والوں کی صفت ہے جس سے کلام بالکل مطابقِ حال ہو گیا ہے اور یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی کہ اس سے مراد وہی متمردین قریش ہیں جو مختلف قسم کی سخن سازیوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے اور آپ کے انذار کو ہوا میں اڑا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان سخن سازیوں کی تفصیل اسی سورہ میں آگے آیات ۲۹-۴۶ میں آئے گی۔

مخالفین کی خاک بازی

'خوض' کے معنی کسی چیز کے اندر گھسنے کے ہیں۔ 'خاض الماءَ' وہ پانی کے اندر گھس گیا۔ اسی سے 'خاض القوم فی الحدیث' کا محاورہ نکلا جس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ بات سے بات پیدا کرتے ہوئے کہیں سے کہیں جا نکلے۔ عام طور پر یہ محاورہ کسی باطل کی حمایت اور حق کی مخالفت میں سخن سازی اور دلیل بازی کے لیے آتا ہے۔ قرآن میں یہ اسی معنی میں جگہ جگہ آیا ہے۔ مثلاً 'وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا' (التوبۃ: ۶۹) (اور تم نے بھی اسی طرح کی دلیل بازیاں کیں جس طرح کی دلیل بازیاں انھوں نے کیں)؛ 'فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ' (الزخرف: ۸۳) (پس ان کو چھوڑ دو دلیل بازیاں اور سخن سازیاں کرتے رہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن سے دوچار ہوں جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے)۔

کسی بات کو حق سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت میں دلیلیں گھڑنے کی کوشش کرنا اپنی اور اپنے پیروؤں کی عقل کے ساتھ ایک قسم کی دل لگی ہے اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'لعب' سے تعبیر فرمایا ہے۔ خاک بازی کا یہ کھیل یوں تو ہر حال میں نہایت خطرناک ہے لیکن اس صورت میں آخری حد تک خطرناک ہو جاتا ہے جب اس کے نتیجے میں ایک ابدی خسران سے سابقہ پیش آنے والا ہو۔

اس 'خوض' کی پوری تفصیل آگے آ رہی ہے۔ اس سے اشارہ مخالفین کی اس طرح کی باتوں کی طرف ہے جو وہ اپنے ضمیر کے خلاف محض اس لیے کہتے کہ کسی طرح اس اثر کو مٹائیں جو قرآن کی دعوت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے لوگوں کے دلوں پر پڑ رہا تھا۔ مثلاً یہ کہ کوئی آپ کو کاہن کہتا، کوئی شاعر، کوئی آپ کو مفتری قرار دیتا اور کوئی شیخی باز۔ اسی طرح بعض یہ دعویٰ بھی کرتے کہ جس طرح کا کلام یہ پیش کر رہے ہیں اس طرح کا کلام ہم بھی پیش کر سکتے ہیں۔ غرض آپ کو زچ کرنے کے لیے جس کو جو بات

بھی سوجھ پاتی وہ بے دھڑک کہہ گزرتا۔ حق کی مخالفت میں یہ نکتہ آفرینیاں ان کے لیے محض دل لگی تھی۔ یہ سوچنے کی توفیق کسی کو نہ ہوتی کہ اس دل لگی سے اپنے اور اپنی قوم کے لیے وہ ابدی جہنم کا سامان کر رہے ہیں۔

یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَھَنَّمَ دَعًّا ۝ ھٰذِہِ النَّارُ الَّتِیْ کُنْتُمْ بِھَا تُکَذِّبُوْنَ (۱۳ - ۱۴)

آخرت کا مذاق اڑانے والوں کا انجام

اس دن ان دل لگی بازوں پر جو آفتیں نازل ہوں گی، یہ ان کی تفصیل ہے۔ 'دَعٌّ' کے معنی پوری شدت و نفرت کے ساتھ دھکا دینے کے ہیں اور اس کے بعد 'دَعًّا' اس کی مزید تاکید کے لیے ہے یعنی آج یہ دل لگی میں مصروف ہیں لیکن اس دن یہ جہنم کی طرف دھکے دے دے کر ہانکے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دوزخ جس کا دنیا میں تم مذاق اڑاتے اور جس کو جھٹلاتے تھے۔

اَفَسِحْرٌ ھٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ (۱۵)

یعنی دنیا میں جب اللہ کا رسول تم کو اس سے ڈرا رہا تھا تو تم اپنے آپ کو اور اپنے عوام کو اس سے بچنت رکھنے کے لیے قرآن کے انذار کو الفاظ کی جادوگری قرار دیتے تھے۔ اب بتاؤ، یہ الفاظ کی جادوگری ہے یا ایک حقیقت ہے لیکن جس طرح تم دنیا میں اس سے اندھے بنے رہے اسی طرح اب بھی تمھیں یہ دکھائی نہیں دے رہی ہے!

اِصْلَوْھَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَیْکُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶)

حکم ہوگا کہ جاؤ اس میں پڑو۔ تمھارے لیے اب کوئی مفر نہیں۔ خواہ صبر کرو یا رؤو چلاؤ، دونوں تمھارے لیے یکساں ہے۔ نہ صبر کی داد ملنی ہے اور نہ آہ و فریاد کی شنوائی ہونی ہے۔ 'اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ' یہ جو کچھ تمھارے سامنے آیا ہے تمھارے اپنے ہی اعمال ہیں۔ اگر تمھارے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہوتی اور تم فریاد کرتے تو شنوائی اور فریاد رسی کی توقع کر سکتے تھے لیکن جب تمھاری اپنی ہی کمائی تمھارے سامنے آرہی ہے تو فریاد کس کے خلاف کرو گے اور شنوائی کی توقع کس سے کرو گے!

'اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ' سے مراد یہ نہیں ہے کہ بعینہٖ وہ اعمال ان کے سامنے آئیں گے جو انھوں نے دنیا میں کیے ہوں گے بلکہ مراد ان اعمال کی حقیقتیں ہیں۔ دنیا میں انسان جو عمل بھی کرتا ہے، خواہ نیکی کا عمل ہو یا بدی کا، وہ اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک خاص شکل اختیار کرتا ہے اور اسی شکل میں وہ عمل کرنے والے کے سامنے آئے گا۔ اگرچہ اس کی شکل اس سے مختلف ہوگی جس شکل میں وہ اس دنیا میں انجام پایا لیکن چونکہ وہ اسی کی بوئی ہوئی فصل کا حاصل ہوگا اس وجہ سے فرمایا کہ تم وہی بدلے میں پا رہے ہو جو تم دنیا میں کر کے آئے ہو۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَعِیْمٍ (۱۷)

متقین کا صلہ

'مکذبین' کے انجام کی سنگینی کو واضح تر کرنے کے لیے ان کے مقابل میں 'متقین' کا صلہ و انعام بھی بیان فرما دیا۔ تقابل کا اصول دلیل ہے کہ 'متقین' سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے پیغمبر کے انذار کا مذاق اڑانے کی جگہ اس کی باتیں گوشِ دل سے سنیں، ان پر غور کیا اور ان کو حرزِ جاں بنایا۔ فرمایا کہ یہ لوگ بے شک باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔

فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (۱۸)

یہ ان باغوں اور نعمتوں سے ان کو بہرہ مند اور محظوظ ہونے کی تفصیل آ رہی ہے۔ فرمایا کہ ان کے رب نے ان کو جو کچھ بخش رکھا ہوگا اس سے وہ پوری آزادی کے ساتھ محظوظ ہو رہے ہوں گے۔ 'بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ' میں جو ابہام ہے وہ تفخیمِ شان پر دلیل ہے کہ آج کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ ان کا رب ان کو کیا کچھ بخش دے گا۔ ان کی حقیقت اس دن کھلے گی جس دن یہ عطا ہوں گی اور انھیں پر کھلیں گی جن کو عطا ہوں گی۔

'وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ' کا عطف میرے نزدیک 'بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ' پر ہے۔ یعنی وہ اپنے رب کی بخشی ہوئی بے پایاں نعمتوں سے محظوظ اور خاص طور پر اس کے اس فضل پر خوش ہو رہے ہوں گے کہ اس نے ان کو اپنی توفیق بخشی سے دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھا۔ لفظ 'فٰكِهِيْنَ' میں مسرت و ممنونیت کا مضمون خود مضمر ہے اس وجہ سے اس مفہوم کے لیے کوئی الگ لفظ لانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اس سے یہ بات نکلی کہ جس دوزخ کو اس کے مکذبین آج اپنے مذاق کا موضوع بنائے ہوئے ہیں اہلِ جنت قیامت کے دن اس سے نجات پانے کو اپنے رب کا سب سے بڑا فضل و احسان سمجھیں گے اور اس پر ان کا رواں رواں شکرگزار ہو رہا ہوگا۔ یہ مضمون آگے اسی سورہ میں یوں آیا ہے: 'قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ' (۲۶-۲۷) (وہ کہیں گے ہم پہلے اپنے اہل و عیال میں بڑے چوکنے رہے ہیں تو اللہ نے ہم پر احسان فرمایا اور ہم کو عذابِ سموم سے محفوظ رکھا)۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۹)

یعنی ان لوگوں کو ربِّ کریم کی طرف سے بشارت دی جائے گی کہ اب اپنے اعمال کے صلے میں بے خل و غش کھاؤ پیو۔ نہ اس سے کوئی ضرر لاحق ہوگا، نہ اس میں کمی واقع ہوگی اور نہ اس کے لیے تمھیں دکھ جھیلنا پڑے گا۔

'هَنِيْٓئً' فعیل کے وزن پر صفت ہے۔ اس کے معنی ہیں راس آنے والی چیز۔ یہاں یہ درحقیقت مصدرِ محذوف کی صفت واقع ہے۔ پورا جملہ یوں ہے: 'كُلُوْا وَاشْرَبُوْا اَكْلًا وَّشُرْبًا هَنِيْٓـًٔا'۔ بعض لوگوں نے اس کو حال کے مفہوم میں لیا ہے لیکن یہ رائے عربیت کے خلاف ہے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰي سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (۲۰)

'مُتَّكِـِٕيْنَ' دراصل 'فٰكِهِيْنَ' کی وضاحت، اور بیچ کا جملہ 'كُلُوْا وَاشْرَبُوْا ... الاٰیۃ' بطور جملہ معترضہ آ گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی نعمتوں سے محظوظ ہو رہے ہوں گے صف بہ صف تختوں پر بیٹھے ہوئے۔ صف بصف ہونا ان کی نشست گاہوں کے کمال درجہ آراستہ ہونے کی بھی تعبیر ہے اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ ان میں باہم کامل محبت اور بے تکلفی ہوگی اس وجہ سے رُو در رُو ہو کر بیٹھیں گے۔ بعض جگہ یہ مفہوم 'مُتَقٰبِلِيْنَ' کے لفظ سے بھی ادا کیا گیا ہے۔

'وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ'۔ انسان کا کوئی لطف و سرور بھی بیوی بچوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ جنت میں یہ نعمت بھی اہلِ ایمان کے لیے مہیا فرمائے گا۔ اس کی تعبیر کے لیے الفاظ وہ استعمال فرمائے ہیں جن سے ہم اس کا فی الجملہ تصور کر سکیں۔ رہی اس کی اصل حقیقت تو اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ یہ آخرت ہی میں واضح ہو گی۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِیءٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (۲۱)

اہل ایمان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ایک بشارت

جنت میں اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کی مسرت کی تکمیل کے لیے جو اہتمام فرمائے گا اسی سلسلہ میں یہ بشارت بھی دی گئی ہے کہ ان کی اولاد میں سے جس نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی ہو گی اللہ تعالیٰ ان کو بھی ان کے ساتھ ملا دے گا اگرچہ وہ ایمان و عمل کے اعتبار سے ان کے درجے کے مستحق نہ ہوں۔ اس یکجائی کے لیے ضابطہ یہ بیان فرمایا کہ 'وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ' اولاد کے ایمان کے کسر کا جبر ان کے والدین کے عمل میں کمی کر کے نہیں کیا جائے گا۔ وہ اپنے اسی مرتبہ پر سرفراز رہیں گے جس کے وہ اپنے ایمان و عمل کے اعتبار سے مستحق قرار پائے ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضلِ خاص سے ان کی اولاد کے درجے کو اونچا کر دے گا۔

'وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ' میں لفظ ایمان کی قید سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ رعایت صرف اسی اولاد کے لیے خاص ہے جس نے ایمان کے ساتھ اپنے بزرگ کی اتباع کی ہو۔ اگر وہ ایمان سے محروم ہو تو اس رعایت کی مستحق نہیں ہو گی اگرچہ وہ ان کے اتباع کی کتنی ہی بلند آہنگی کے ساتھ مدعی ہو۔

لفظ 'ایمان' کی تنکیر سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس کے مدارج ہیں۔ اگر اولاد کو ایمان کا وہ ادنیٰ درجہ بھی حاصل ہوا جو اس کو جنت کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کا بھی مستحق ٹھہراتا ہے تو وہ اس رعایت کی مستحق قرار پائے گی۔

نجات سے متعلق اصل ضابطہ

'كُلُّ امْرِیءٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ'۔ یہ نجات سے متعلق اللہ تعالیٰ نے اصل ضابطہ بیان فرما دیا ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کے عوض گرو ہے۔ عمل ہی چھڑائے گا، عمل ہی ہلاک کرے گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ ایمان و عمل کے بغیر محض نیکوں سے ظاہری نسبت رکھنے کے سبب سے کوئی جنت میں ان کے پاس پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل انہی پر فرمائے گا جو اپنے ایمان و عمل سے اس کا استحقاق پیدا کریں گے۔ اس میں یہود اور

مشرکین عرب دونوں کو تنبیہ ہے کہ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے دین کو تو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا لیکن محض ان سے نسبی رشتہ کے بل پر جنت کے اعلیٰ مقامات پانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

ایک شبہ کا جواب: یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں سوال پیدا ہو کہ جب نجات کے باب میں اصل ضابطہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کے عوض میں گرو ہے تو اولاد کا اپنے سے برتر درجے کے بزرگوں کی صف میں جا پہنچنا کس بنیاد پر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے تعلق رکھنے والا ہے جو اس نے اپنے باایمان بندوں کے لیے خاص رکھا ہے۔ اس سے اس ضابطہ کی نفی نہیں ہوتی جو کُلُّ امْرِیٔ بِمَا کَسَبَ رَہِیْنٌ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ نجات تو بے شک کسی کو ایمان و عمل کے بغیر حاصل ہونے والی نہیں ہے لیکن اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ اپنے باایمان بندوں کے مراتب و مدارج میں اپنے فضل سے اضافہ بھی نہیں فرمائے گا۔ ان دونوں چیزوں کے دائرے الگ الگ ہیں۔ ان میں باہدگر کوئی تناقض نہیں ہے۔

ایک اور استنباط: اس آیت سے یہ بات بھی مستنبط ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح والدین کی خوشی کی تکمیل کے لیے ان کی اولاد کو ان کے ساتھ جمع کر دے گا اگرچہ اولاد اپنے ایمان و عمل کے اعتبار سے ان کے مرتبہ کی سزاوار نہ ہو۔ اسی طرح بلند مرتبہ اولاد کی مسرت کی تکمیل کے لیے ان کے ساتھ ان کے باایمان والدین کو بھی جمع کر دے گا اگرچہ والدین اپنے ایمان و عمل کے لحاظ سے ان کے درجے کے حق دار نہ ہوں۔ اس استنباط کی دلیل یہ ہے کہ جو تعلقِ خاطر والدین اور ان کی اولاد کے درمیان پایا جاتا ہے وہی تعلقِ خاطر اس دوسری صورت میں بھی موجود ہے۔

اس بشارت کا موقع و محل: یہاں اس بشارت کا موقع و محل بھی قابل توجہ ہے۔ اگر کسی شخص کے اندر سچا ایمان ہے تو وہ اپنی اولاد سے متعلق سب سے زیادہ فکر مند اس بات کے لیے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آخرت کے ہول اور جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھے۔ یہ ارمان کہ اولاد کو دنیوی کامیابیاں حاصل ہوں اگر ہوتا بھی ہے تو اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضراتِ انبیاء اور صالحین نے اپنی اولاد کے لیے جو دعائیں فرمائی ہیں ان میں آخرت کی کامیابی کو مقدم رکھا ہے بلکہ اسی چیز کو اصل کی حیثیت دی ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا تھا جو اس دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان کے قلوب جب نورِ ایمان سے منور ہوئے تو ان کو سب سے زیادہ تشویش اپنی اولاد کے دنیوی مستقبل سے متعلق نہیں بلکہ اس کے اخروی انجام سے متعلق ہوئی۔ ان کی اس تشویش کا اظہار آگے اسی سورہ کی آیت ۲۶ اِنَّا کُنَّا قَبْلُ فِیْٓ اَہْلِنَا مُشْفِقِیْنَ (بے شک ہم اس سے پہلے اپنے اہل و عیال کے اندر چوکنے اور خبردار رہے ہیں) سے ہوتا ہے۔ اس آیت کے تحت ہم ان شاء اللہ واضح کریں گے کہ اس میں جس ڈر یا تشویش کا حوالہ ہے اس سے مراد ان کا یہ اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جس گلّے کا چرواہا بنایا ہے اس کی کوئی بھیڑ بھیڑیے کا لقمہ نہ بنے بلکہ

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو جاہلیت کی تاریکی سے نکال کر صراط مستقیم کی ہدایت بخشی ہے اسی طرح ان کی اولاد کو بھی ایمان کی توفیق نصیب ہو تاکہ ان کو جہنم کے ہول سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انہی باایمان بندوں کی تسلی کے لیے یہ بشارت دی کہ اگرچہ یہ ضابطہ تو بالکل اٹل ہے کہ کسی شخص کو نجات ایمان و عمل کے بدون حاصل نہیں ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ اپنے باایمان بندوں پر یہ فضل ضرور فرمائے گا کہ اگر ان کی اولاد نے ان کی پیروی کی تو گو ایمان کے اعتبار سے اس کا درجہ فروتر ہو لیکن اللہ تعالیٰ اولاد کو ان کے ساتھ جمع کر دے گا اور اس یکجائی کے لیے ان کے درجے کو نیچا نہیں کرے گا بلکہ اولاد کے درجے کو اونچا کر دے گا۔

اولاد کی اصلاح کے لیے فکرمند رہنے کی تعلیم

یہ اس بات کی تعلیم ہے کہ ہر شخص اپنی اولاد اور اپنے متعلقین کو ایمان کی راہ دکھانے کی کوشش، جس حد تک اس کے امکان میں ہو، ضرور کرے۔ ایمان کے بغیر کسی شخص کو بھی نجات حاصل نہیں ہوگی اگرچہ وہ کسی نبی اور رسول کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی کی اولاد نے اگر ایمان کی راہ اختیار کر لی تو گو اس کا ایمان ادنیٰ درجے کا ہی ہو لیکن اس کو اپنے رفیع المنزلت بزرگوں کی معیت جنت میں ضرور حاصل ہو جائے گی۔

وَاَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحۡمٍ مِّمَّا يَشۡتَهُوۡنَ (۲۲)

یعنی جس طرح ہم ان کی اولاد کو یکجا کر دیں گے اسی طرح ان کے لیے مطلوب فواکہ اور ان کے مرغوب گوشت میں بھی اضافہ کر دیں گے۔ لفظ 'اَمۡدَدۡنَا' اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ تعداد کے اضافے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے رزق و فضل میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

'فَاكِهَةٍ' اور 'لَحۡمٍ' کے دونوں لفظوں کے اندر تمام غذائی نعمتیں جمع ہو گئی ہیں، خواہ وہ تفکہات کی نوعیت کی ہوں یا غذا کی۔

يَتَنَازَعُوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا لَّا لَغۡوٌ فِيۡهَا وَلَا تَاۡثِيۡمٌ (۲۳)

جنت کا لطف و سرور

یہ اس لطف و سرور کا بیان ہے جس سے وہ جنت میں بہرہ مند ہوں گے۔ فرمایا کہ ان کے درمیان جام شراب کے تبادلے ہو رہے ہوں گے۔ 'تَنَازَعُوا الْكَاسَ' کے معنی ہیں 'تعاطوا' یعنی وہ آپس میں ایک دوسرے کی طرف شراب کے جام بڑھائیں گے۔ چھین جھپٹ اس لفظ کے لوازم میں سے نہیں ہے۔ لفظ 'كَاس' ظرف اور مظروف یعنی شراب اور جام شراب دونوں کے لیے آتا ہے۔

'لَا لَغۡوٌ فِيۡهَا وَلَا تَاۡثِيۡمٌ' یعنی یہ شراب ان برے اثرات سے بالکل پاک ہوگی جو دنیا کی شراب کے لوازم میں سے ہے۔ اس شراب سے آدمی نہ تو کسی لغوگوئی میں مبتلا ہوگا اور نہ کسی پر گناہ کی تہمت لگائے گا۔ 'اثمه تاثیما' کے معنی ہیں اس نے اس کو گناہ کی تہمت لگائی۔ اس دنیا کی شراب کے مفاسد میں سے یہ بھی ہے کہ اس بدمستی میں آدمی اپنے حریفوں اور ان کی بہو بیٹیوں پر ہر قسم کی تہمتیں جڑ دیتا ہے جس سے زمانۂ جاہلیت

میں بڑے بڑے خاندانی فتنے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ قرآن نے دوسرے مقام میں اسی فتنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کے ذریعہ سے شیطان تمہارے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکانا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس جنت کی شراب اہلِ جنت کے درمیان الفت و محبت کی عطر بیزی کرے گی، چنانچہ سورۂ واقعہ میں فرمایا ہے: لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۙ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (۲۵-۲۶) (اس میں کوئی لغو اور گناہ کی بات نہیں سنیں گے۔ صرف سلام اور جوابِ سلام کا چرچا ہوگا)

وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ (۲۴)

یعنی ان کی خدمت اور ان کی فرمائشوں کی تعمیل کے لیے ہر وقت ایسے چھوکرے ان کے سامنے حاضر رہیں گے جو اپنی پاکیزگی اور اپنے حسن و جمال کے اعتبار سے معلوم ہوگا کہ موتی ہیں جو صدف میں محفوظ رہے ہیں اور ان کی خدمت ہی کے لیے ان سے نکلے ہیں۔ اہلِ عرب کسی چیز کی غایت درجہ نفاست و نزاکت کی تعبیر کے لیے لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ کی تشبیہ استعمال کرتے ہیں۔ قرآن کے اندازِ بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان چھوکروں کو خاص اسی مقصد کے لیے پیدا کرے گا۔ بعض لوگوں کی رائے اس کے خلاف بھی ہے لیکن ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے اس وجہ سے اس پر تنقید کی ضرورت نہیں ہے۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (۲۵)

اہلِ جنت کا ایک دوسرے سے دریافتِ حال

جنت میں مجتمع ہو جانے کے بعد، جس طرح ایک دراز اور کٹھن سفر کے مسافر منزل پر پہنچ کر ایک دوسرے سے دریافتِ حال کرتے ہیں اسی طرح اہلِ جنت تڑپ کر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے اور پوچھیں گے کہ کیسے کیسے گزری، راہ میں کیسی گھاٹیوں سے گزرنا پڑا، منزل تک کس طرح پہنچنا ہوا اور یہ اہل و عیال کی یکجائی کیسے نصیب ہوئی۔

قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ (۲۶)

جواب دینے والے جواب دیں گے کہ ہم اس سے پہلے دنیا میں اپنے اہل و عیال کے اندر ڈرتے رہنے والے رہے ہیں۔ اپنی عاقبت کے ساتھ برابر ان کی عاقبت کی بھی ہمیں فکر رہی ہے۔ ہم اس غرور میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے کہ ہمارا بڑا خاندان اور بڑا کنبہ و قبیلہ ہے اور اس دنیا میں ہمیں جو کچھ حاصل ہے یہ ہمارا پیدائشی اور خاندانی حق ہے، اس کو کوئی ہم سے چھین نہیں سکتا۔ ہم نے آخرت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا اور اپنے رب سے برابر یہ دعا کی کہ قیامت کے دن وہ ہمیں صالحین کے سربراہ کی حیثیت سے اٹھائے، فساق کے پیشوا کی حیثیت سے نہ اٹھائے۔ ہم نے اپنی اولاد کو ہمیشہ نماز، زکوٰۃ اور خدا سے ڈرتے رہنے کی تاکید اور دینِ حق پر جینے اور اسی پر مرنے کی وصیت کی۔

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ (۲۷)

ہمارے اس خوف و اندیشہ کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا کہ ہم کو اور ہماری اولاد کو اس

بہشت میں یکجا کر دیا اور آتشِ دوزخ کی ہوائے گرم سے اس نے ہمیں محفوظ رکھا۔ سموم، ہوائے گرم اور آگ کی آنچ کو کہتے ہیں۔ یہ اسلوبِ بیان اللہ تعالیٰ کے غایت درجہ لطف و احسان کی تعبیر کے لیے وہ اختیار فرمائیں گے۔ مطلب یہ کہ دوزخ اور آتشِ دوزخ تو درکنار اللہ تعالیٰ نے اس کی ہوائے گرم سے بھی ہمیں محفوظ رکھا۔

اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ (۲۸)

اس جملہ کا تعلق اوپر والے جملہ 'اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ' سے ہے۔ یعنی ایک تو یہ کہ ہم اپنے اہل و عیال کے اندر ڈرتے رہے ہیں، دوسرے یہ کہ ہم خوف اور طمع، ابہام اور بیم ہر حال میں خدا ہی کو پکارنے والے رہے ہیں۔ اس کے سوا کسی اور کی کبھی ہم نے نہ دہائی دی اور نہ کسی کو اس کا شریک و سہیم جانا۔ اس جملہ کو اصلاً آنا تو اوپر والے جملہ ہی کے ساتھ تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کی جاودت ظاہر کرنے کے لیے 'فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ...... الآیۃ' کو اس پر مقدم کر دیا اور اس کو مؤخر کر دیا۔ اس تاخیر میں یہ بلاغت ہے کہ انسان کی نجات میں اصل عامل کی حیثیت عقیدۂ توحید کو حاصل ہے۔ جس نے اس کی حفاظت کی وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا مستحق ٹھہرا اور جس نے اس میں خرابی پیدا کی اس نے اپنی عاقبت برباد کی۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس عقیدے میں مستحکم رہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ احسان فرمایا۔

انسان کی نجات میں اصل عامل کی حیثیت عقیدۂ توحید کی ہے

'اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ'۔ یہ فقرہ غایت درجہ ممنونیت کے اظہار کے طور پر وہ فرمائیں گے کہ وہ بڑا ہی باوفا اور بڑا ہی مہربان ہے کہ اس نے نہ صرف وہ تمام وعدے پورے کیے جو اپنے بندوں سے کیے، بلکہ ان کو اپنے کرمِ مزید سے بھی نوازا۔ لفظ 'بَرّ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ جب یہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر آتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بندوں سے جو وعدے کیے ہیں وہ سب کو پورا کرنے والا ہے، صدق اور وفا اس لفظ کی اصل روح ہے۔ اس کے ساتھ 'رحیم' کا اضافہ اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ وہ صرف وعدے ہی پورے کرنے والا نہیں، بلکہ بندوں کی کوتاہیوں سے درگزر کر کے ان کو اپنے مزید افضال سے نوازنے والا بھی ہے۔

۲۔ آگے آیات ۲۹-۴۹ کا مضمون

آگے کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حوصلہ افزائی فرمائی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی یاوہ گوئیوں کی پروا کیے بغیر اسی قرآن کے ذریعہ سے تذکیر کرتے رہو۔ جو تمہاری تکذیب پر اڑے رہیں گے وہ خود اپنی شامت بلائیں گے۔ اسی ذیل میں مخالفین کی ان باتوں کے مسکت جواب بھی دیے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں وہ کہتے تھے اور جن کی طرف اوپر لفظ 'خوض' سے اشارہ فرمایا ہے۔ ان کی اس ساری سخن سازی کو قرآن نے محض ایک چال قرار دیا ہے اور یہ اطمینان دلایا ہے کہ اس چال سے وہ دعوتِ حق کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے بلکہ یہ انہی کے خلاف پڑے گی۔ آخر میں آپ کو تسلی دی ہے کہ ان کو کوئی بڑے سے بڑا معجزہ

بھی قائل کرنے والا نہیں بنے گا، یہ اسی دن قائل ہوں گے جس دن قیامت ان کے سر پر آ کھڑی ہوگی اور ہر پہلو سے ان کی بے بسی ان پر واضح ہو جائے گی تو تم صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور اس صبر کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ اپنے رب کی تسبیح کا اہتمام کرو ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۹-۴۹ فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ
شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ
مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿۳۱﴾ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ
قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۳۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْيَاْتُوْا
بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ
شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ
لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ﴿۳۷﴾
اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ
مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا
فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۱﴾
اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ
غَيْرُ اللّٰهِ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾ وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ
سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿۴۴﴾ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ
الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿۴۵﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْــًٔا
وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾ ع ۲

ترجمۂ آیات ۴۹-۲۹

پس تم یاددہانی کرتے رہو، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کوئی کاہن ہو اور نہ کوئی دیوانے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس کے لیے ہم گردش روزگار کے منتظر ہیں! ان سے کہہ دو کہ تم انتظار میں رہو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ کیا ان کی عقلیں یہی باتیں ان کو سجھاتی ہیں یا یہ ہیں ہی سرکش لوگ! کیا یہ کہتے ہیں کہ اس کو اس نے خود ہی گھڑا ہے! بلکہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ پس یہ اس کے مانند کوئی کلام لائیں، اگر یہ سچے ہیں۔ ۲۹-۳۴

کیا یہ بغیر کسی خالق ہی کے پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود ہی خالق ہیں! کیا انھی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے۔ ۳۵-۳۶

کیا انھی کے پاس تیرے رب کے خزانے ہیں یا وہ ان پر داروغہ مقرر ہیں! کیا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر وہ آسمان کی باتیں سن لیتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل پیش کرے۔ کیا اس کے لیے بیٹیاں ہیں اور تمھارے لیے بیٹے! ۳۷-۳۹

کیا تم ان سے کسی عوض کے طالب ہو کہ وہ اس تاوان کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں! کیا ان کے پاس علم غیب ہے، پس وہ خود ہی لکھ لیتے ہیں۔ کیا وہ کوئی چال چلنی چاہتے ہیں تو یاد رکھیں کہ جنھوں نے کفر کیا وہی اس چال میں گرفتار ہوں گے۔ کیا اللہ کے سوا اور کوئی معبود بھی ان کے لیے ہے؟ اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک گردانتے ہیں۔ ۴۰-۴۳

اور اگر یہ آسمان سے کوئی ٹکڑا بھی گرتا ہوا دیکھیں گے تو کہیں گے یہ تو تہ بہ تہ بادل ہے! تو ان کو چھوڑو، یہاں تک کہ یہ اپنے اس دن سے دوچار ہوں جس دن ان کے ہوش جاتے رہیں گے۔ جس دن نہ ان کی چال ان کے کچھ کام آئے گی اور نہ ان کی کوئی مدد ہی ہو گی۔ ۴۴-۴۶

اور ان ظالموں کے لیے اس کے سوا بھی عذاب ہے لیکن ان کی اکثریت اس کو نہیں جانتی۔ اور تم صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ بے شک تم ہماری آنکھوں میں ہو۔ اور اپنے رب کی تسبیح کرو، اس کی حمد کے ساتھ، جس وقت تم اٹھتے ہو۔ اور شب میں بھی اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کے پیچھے ہٹنے کے وقت بھی۔ ۴۷-۴۹

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (۲۹)

آنحضرتؐ کو تسلی

'ف' کے ذریعہ سے عطف دلیل ہے کہ یہ بات جو فرمائی جا رہی ہے متفرع ہے انہی باتوں پر جو اوپر گزر چکی ہیں۔ اوپر آپ نے دیکھا کہ قرآن کے انذارِ عذاب کی صداقت ثابت فرمائی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باندازِ تسلی خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ تم جو یاددہانی کر رہے ہو وہ کرتے رہو۔ مخالفین کے طعنوں اور رکیکوں کی پروا نہ کرو۔ اگر یہ تمھیں کاہن یا خبطی کہتے ہیں تو انھیں بکواس کرنے دو۔ تم اپنے رب کے فضل سے نہ کوئی کاہن ہو نہ کوئی دیوانے۔

'بِنِعْمَتِ رَبِّكَ' کے الفاظ یہاں دلیل کے محل میں ہیں۔ یعنی تم پر تمھارے رب کا جو فضل و انعام ہے وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ آنکھیں اور عقل رکھنے والوں سے وہ مخفی رہ سکے۔ تمھاری زبانِ فیض ترجمان سے اللہ تعالیٰ نے جو چشمۂ حکمت و معرفت جاری کر رکھا ہے اس کو کاہنوں کی خرافات سے کیا تعلق! تم جس کردار کے حامل ہو کس کاہن کے اندر اس کا کوئی ادنیٰ پرتو بھی پایا گیا ہے؟ تم راستبازی اور حق گوئی کے مظہر کامل ہو، اور کاہن دروغ گو اور لپاٹیے ہوتے ہیں۔ تم روح القدس سے فیض پاتے ہو اور کاہن شیاطین سے الہام حاصل کرنے کے لیے کان لگاتے ہیں اور اس میں بھی وہ بالکل جھوٹی نمائش کرتے ہیں۔

اس طرح تم کو جو دیوانہ کہتے ہیں وہ خود دیوانے ہیں، آخر تم سے بڑا فرزانہ، ذی ہوش، دانش مند اور حکیم انھوں نے کس کو پایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مخالفین کا یہ اتہام ان کے اپنے ضمیر کے بالکل خلاف تھا اس وجہ سے اس کی تردید میں زیادہ دلیلیں دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی لغویت خود اتہام لگانے والوں پر واضح تھی۔ وہ محض عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے اس طرح کی باتیں کہتے تھے۔ سورۂ شعراء کی تفسیر میں ہم نے اس کے تمام ضروری پہلو واضح کر دیے ہیں۔ ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ (٣٠-٣١)

مخالفین کے ایک الزام کا جواب

یہ ان کے دوسرے الزام کا حوالہ ہے۔ فرمایا کہ کیا یہ لوگ تمھیں شاعر کہتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ جس طرح دوسرے بہت سے شاعر اپنی اپنی بولیاں بول کر اٹھ گئے اسی طرح گردشِ روزگار ایک دن تمھیں بھی فنا کر دے گی۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس انتظار میں ہیں تو ان سے کہہ دو کہ تم لوگ انتظار کرو، میں بھی انتظار میں ہوں کہ میں جو وعید تم کو سنا رہا ہوں وہ پوری ہوتی ہے یا تم جو خواب دیکھ رہے ہو وہ سچا ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین آپ کو جو شاعر کہتے تھے تو اس کی وجہ، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں، یہ نہیں تھی کہ وہ فی الواقع آپ کو کوئی شاعر سمجھتے تھے، بلکہ اس الزام سے وہ اس اثر کو مٹانا چاہتے تھے جو قرآن کے زورِ بیان اور اس کی بلاغت وجزالت سے لوگوں کے دلوں پر پڑتا تھا اور جس کے سبب سے اس کے کلامِ الٰہی ہونے کی ہیبت لوگوں پر بیٹھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے پیروؤں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ قرآن میں جو زور ہے یہ اسی طرح کا ہے جس طرح کا زور ہمارے بعض بڑے شاعروں کے کلام میں ہے اس وجہ سے اس کو وحی والہام کا درجہ دے کر نہ تو کسی عذاب کے اندیشہ میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہے اور نہ اپنے دینِ آبائی سے مایوس ہونے کی۔ جس طرح ہمارے شاعروں کے کلام کی ان کے دور میں بڑی دھوم رہی ہے، لیکن پھر نہ وہ باقی رہے اور نہ ان کی شاعری، اسی طرح چند دن اس شخص کی فصاحت و بلاغت کا تماشا بھی دیکھ لو۔ بالآخر اس کو بھی گردشِ روزگار مٹا کے رکھ دے گی۔

'قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ'۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس انتظار میں ہیں تو ان کو بتا دو کہ تم لوگ بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کر رہا ہوں کہ تمھاری یہ طمعِ خام پوری ہوتی ہے یا میرے رب نے تم کو جس چیز سے ڈرایا ہے وہ ظاہر ہو کے رہتی ہے۔

'اَلْمَنُوْنُ' کے معنی 'الدھر' یعنی زمانہ کے ہیں۔ محاورہ ہے: 'دار علیہم المنون' وہ گردشِ روزگار کی نذر ہو گئے۔ 'رَيْبَ الْمَنُوْنِ' کے معنی ہیں حوادثِ روزگار۔

مخالفین کے اس الزام کی مفصل تردید قرآن نے سورۂ شعراء میں کی ہے۔ وہاں چند نہایت واضح

کسوٹیاں بھی قرآن نے لوگوں کے سامنے رکھ دی ہیں جن پر ہر عاقل پرکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن اور اس کے حامل کو شعر اور شاعری سے دور یا قریب کا کوئی واسطہ ہے یا نہیں۔ ہم نے بھی اس کے ہر پہلو پر وہاں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۳۲)

نبی کی مخالفت کا اصل سبب ان کی سرکشی ہے

یعنی معاملہ دو شکلوں سے خالی نہیں یا تو فی الواقع ان کی عقلیں ہی کچھ ان کو سمجھا رہی ہیں کہ تم اللہ کے رسول نہیں بلکہ ایک کاہن، مجنون اور شاعر ہو یا یہ بات ہے کہ یہ لوگ اپنی سرکشی کے باعث تمھاری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اس وجہ سے تکذیب کے بہانے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پہلی بات کا امکان تو بہت بعید ہے۔ آخر کوئی عاقل تمھارے جیسے صداقت شعار، راست باز، عاقل، فرزانہ، متین، رزین، مومن، مسلم، حنیف اور حکیم کو کاہن، مجنون اور شاعر کس طرح قرار دے سکتا ہے! اگر کوئی یہ جسارت کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عقل سے بالکل عاری ہے۔ اب صرف دوسرا امکان باقی رہ جاتا ہے کہ یہ لوگ نہایت سرکش ہیں اور اس سرکشی ہی کے سبب سے یہ سخن سازیاں کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ سرکشی ہی ان سے یہ باتیں کہلوا رہی ہے۔ عقل کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (۳۳-۳۴)

ایک الزام کا جواب

یہ ان کے ایک اور الزام کا تذکرہ اور اس کا جواب ہے۔ فرمایا کہ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو گھڑا تو انھوں نے خود ہے لیکن اپنی بڑائی کی دھونس جمانے کے لیے دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ سے ان پر اتارا ہے۔ 'تَقَوَّلَ' کے معنی کسی پر جھوٹا بہتان لگانے کے ہیں۔ یہی مضمون دوسرے مقامات میں 'بَلِ افْتَرٰىهُ' سے ادا کیا گیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ کتاب ہے تو ان کی اپنی طبع زاد لیکن عوام فریبی کے لیے جھوٹ موٹ یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے اتاری ہے۔

'بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ'، یہ اصل حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کا یہ الزام بھی ان کے اپنے ضمیر کے بالکل خلاف ہے۔ ان کو پورا یقین ہے کہ یہ کتاب تمھاری تصنیف نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح کا کلام نہ تم پیش کر سکتے ہو، نہ کوئی دوسرا پیش کر سکتا ہے لیکن یہ ایمان نہیں لانا چاہتے اس وجہ سے یہ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ سخن سازی کر رہے ہیں۔ یہاں فعل ہمارے نزدیک ارادۂ فعل کے معنی میں ہے۔ اس کی مثالیں اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکی ہیں۔

'فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ ...... الاٰية'۔ یہ ان کے الزام کے جواب میں ان کو چیلنج ہے کہ اگر فی الواقع وہ اس کو پیغمبر کی اپنی تصنیف گمان کرتے ہیں تو وہ اپنے خطیبوں اور شاعروں کے کلام میں سے کوئی چیز اس کے مانند پیش کریں، خواہ وہ ان کے پرانے ذخائر میں سے ہو یا اب وہ خود مل جل کر بیٹھیں اور کوئی چیز

اس کے جواب میں پیش کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکیں (اور ہرگز نہیں کر سکتے) تو پھر راستبازی کا تقاضا یہ ہے کہ اس الزام کو واپس لیں اور پیغمبر کو صادق و امین مان کر اس پر ایمان لائیں۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہ بات فرمائی تو ہے قریش کے جواب میں، اور انہی کے جواب میں یہ زمانے کی تحدی بھی لیکن یہ چیلنج آج بھی علیٰ حالہٖ قائم ہے۔ قرآن کے منکرین نہ تو اپنے قدیم ادبی و مذہبی ذخیرہ میں سے اس کے مانند کوئی چیز پیش کر سکے، نہ خود ہی کوئی چیز ایجاد کر سکے اور نہ بعد کی پوری تاریخ میں کوئی ایسی چیز سامنے آئی جس کو اس چیلنج کا جواب قرار دیا جا سکے۔ دنیا کی غیر عرب قوموں کے لیے یہ چیلنج براہِ راست نہیں ہے تاہم وہ بھی طبع آزمائی کر کے دیکھ سکتی ہیں کہ وہ کوئی چیز اس کے پائے کی لا سکتی ہیں یا نہیں۔ پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآن کی یہ تحدی کسی ایک ہی پہلو سے نہیں بلکہ بحیثیتِ مجموعی ایک صحیفۂ ہدایت ہونے کے پہلو سے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ اس کے شاعر کے پایہ کا کوئی شاعر یا اس کے خطیب کے درجے کا کوئی خطیب دنیا میں نہیں ہے لیکن اوّل تو یہ دعویٰ ہی محلِ نظر ہے، دوسری قوم اس کے جواب میں اپنے خطیب یا شاعر کے حق میں یہی دعویٰ کر سکتی ہے لیکن کسی کا یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ زیادہ سے زیادہ کسی ایک ہنر میں برتری کا دعویٰ ہو گا جس کو کوئی شخص نہ اپنے نبی ہونے کے ثبوت میں پیش کر سکتا اور نہ کوئی عاقل اس بنیاد پر اس کو نبی یا رسول مان سکتا۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ (۳۵-۳۶)

مکذبین سے چند سوالات

مکذبین کے اعتراضات و اتہامات کے جواب دینے کے بعد اب یہ ان سے چند سوالات کیے گئے ہیں کہ اگر وہ عذاب اور آخرت کے منکر ہیں تو یہ بتائیں کہ کیا وہ بغیر خالق ہی کے پیدا ہو گئے ہیں یا خود ہی اپنے خالق ہیں؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ کیا آسمانوں اور زمین کو انھوں نے پیدا کیا ہے؟

یہ امر واضح رہے کہ مشرکینِ عرب اپنا اور تمام آسمان و زمین کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ وہ اپنے مزعومہ شرکاء میں سے کسی کو کسی چیز کا خالق نہیں مانتے تھے۔ یہ سوال قرآن نے ان کے سامنے رکھ کے گویا ان سے یہ پوچھا ہے کہ جب وہ اپنا اور آسمان و زمین کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں تو اس کے عذاب اور اس کے روزِ جزاء و سزا کو کیوں بعید از امکان سمجھتے ہیں؟ کیا ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ ان کو پیدا کر کے اب دوبارہ پیدا کرنے سے عاجز ہو گیا؟ اگر وہ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ ایک کھلی ہوئی حماقت ہے۔ جو پہلی بار پیدا کرنے پر قادر ہوا وہ دوسری بار پیدا کرنے پر بدرجۂ اولیٰ قادر ہو گا۔

اسی طرح وہ یہ بھی سوچیں کہ جب وہ خود اپنے خالق نہیں ہیں بلکہ کسی اور نے ان کو پیدا کیا اور ان کی معاش و معیشت کا سامان کیا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ان کو یونہی چھوڑے رکھے اور کسی دن ان سے یہ نہ پوچھے کہ اس نے ان کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا تھا اس کو انھوں نے پورا کیا یا نہیں؟

علیٰ ہٰذا القیاس وہ یہ بھی سوچیں کہ جس زمین پر اور جس آسمان کے نیچے وہ رہتے ہیں اور جن کی گوناگوں نعمتوں سے وہ متمتع ہوتے ہیں، درآنحالیکہ نہ زمین ان کی پیدا کی ہوئی ہے نہ آسمان اور نہ ان کے درمیان کی نعمتیں، تو کیا جس نے ان کو پیدا کیا ہے اس کا کوئی حق ان پر قائم نہیں ہوتا اور اس کے بنائے ہوئے اس گھر میں اپنے رویے سے متعلق وہ اس کے آگے جوابدہ نہیں ہوں گے؟

اسی طرح وہ یہ بھی سوچیں کہ جب نہ زمین ان کی پیدا کی ہوئی ہے نہ آسمان تو آخر کس برتے پر آسمان و زمین کے خالق سے اپنے کو وہ بے خوف و مامون سمجھتے ہیں۔ وہ جب چاہے زمین کو ذرا سا ہلا دے اور یہ بالکل بے نام و نشان ہو کے رہ جائیں، اسی طرح جب چاہے آسمان سے طوفان بھیج دے، اولے برسا دے، پتھراؤ کر دے اور چشم زدن میں ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔

اصل علتِ انکار

'بَل لَّا يُوقِنُونَ'۔ یہ ان کے اعراض و انکار کی اصل علت سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ ان تمام اصول باتوں کو تو مانتے ہیں جو آخرت اور جزا و سزا کو لازم ٹھہراتی ہیں، ان میں سے کسی بات کے انکار کی وہ جرأت نہیں کر سکتے لیکن اس بات پر وہ یقین نہیں رکھتے کہ فی الواقع وہ عذاب کے مستحق ہیں اور اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو ایک دن وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت میں آ جائیں گے۔ یہاں 'يُوقِنُونَ' کا مفعول 'بالآخرۃ' یا 'بالعذاب' بربنائے قرینہ محذوف ہے۔

ہم یہ حقیقت جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ مشرکینِ قریش قیامت کے صریح منکر نہیں تھے اس کو وہ ایک نہایت مستبعد چیز سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ قیامت اور عذاب و ثواب کا قصہ اولاً تو محض ایک وہم ہے؛ ثانیاً اس کی کچھ حقیقت ہے بھی تو یہ اتنی دور کی چیز ہے کہ اس کے لیے ابھی سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے؛ ثالثاً اس کا مرحلہ بالفرض آیا بھی تو ہمارا معاملہ ہمارے دیوتاؤں سے متعلق ہوگا، وہ اپنی سفارش سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچا ہی لیں گے۔ اسی طرح وہ اس عذاب پر بھی یقین نہیں رکھتے تھے جس سے قرآن ان کو بصورتِ تکذیب اس دنیا میں آگاہ کر رہا تھا۔ وہ اپنی موجودہ خوشحالی کو اپنے عقیدہ و عمل کی صحت کی دلیل بنائے بیٹھے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ اگر فی الواقع وہ خدا کے غضب کے سزاوار ہوتے، جیسا کہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں، تو ان کا حال دنیوی رفاہیت کے اعتبار سے پیغمبرؐ اور ان کے ساتھیوں سے بہتر کیوں ہوتا؛ پھر تو صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہونی تھی۔

ان کی اس ذہنی حالت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اصلاً یہ عدمِ یقین ہی کی صورت ہے۔ اصل حقیقت سے تو ان کے لیے فرار کی کوئی گنجائش تھی نہیں۔ اس کے تمام مقدمات ثابت اور معلوم تھے۔ انفس، آفاق، تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے تمام شواہد اس کے حق میں موجود تھے اور قرآن نے وہ سب ان کے سامنے رکھ بھی دیے تھے لیکن چونکہ اس کو تسلیم کرنا ان کی خواہش کے خلاف تھا اس وجہ سے وہ جان کر انجان بنتے تھے۔ یہ یقین نہیں رکھتے تھے کہ فی الواقع یہ چیز ایک دن پیش آ کے رہے گی۔

مزید غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آئے گی کہ عدم یقین کی اس بیماری میں جس طرح قریش مبتلا تھے اسی طرح اس زمانے کے بہت سے مسلمان بھی مبتلا ہیں۔ ان کو قیامت اور جزا و سزا سے انکار تو نہیں ہے لیکن ان کی زندگی شاہد ہے کہ ان کو اس کا یقین نہیں ہے اور ان کے اس عدم یقین کے اسباب کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ بھی اسی طرح کی کسی نہ کسی غلط فہمی کے شکار ہیں جس طرح کی غلط فہمیوں میں مشرکین مبتلا تھے۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَیْطِرُوْنَ (۳۷)

ایک اور سوال

جس طرح کے سوال اوپر کی دو آیتوں میں کیے ہیں اسی طرح کا سوال یہ بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اپنے یا آسمان و زمین کے خالق نہیں تو کیا تیرے رب کے خزانوں کے مالک یا ان پر داروغہ ہیں کہ وہ خدا کی پکڑ سے بے فکر ہیں! یعنی جس طرح وہ آسمان و زمین کے خالق ہونے کے مدعی نہیں ہو سکتے اسی طرح اس بات کے بھی مدعی نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رزق و فضل کے خزانے ان کے حوالے کر دیے ہیں یا ان کی تقسیم پر ان کو مامور کر دیا ہے کہ جس کو چاہیں دیں، جس کو چاہیں نہ دیں۔ پھر ان کو یہ غرہ کیوں ہے کہ وہ خدا کی پکڑ میں نہیں آ سکتے یا جس عیش میں وہ ہیں اسی میں رہیں گے، نہ اس دنیا میں وہ اس سے محروم ہو سکتے اور نہ آخرت میں (اگر وہ ہوئی) اس سے ان کو کوئی محروم کر سکتا؟ قرآن نے جگہ جگہ قریش اور ان سے پہلے کی قوموں کے مترفین کے اس زعم کا حوالہ دیا ہے کہ انھوں نے اپنی رفاہیت کو اپنا پیدائشی حق سمجھا اس وجہ سے پیغمبر کے انذار کو خاطر میں نہ لائے۔ یہ ان کے اسی خنّاس پر ضرب لگائی ہے کہ جب نہ وہ خدا کے خزانوں کے مالک نہ ان کی تقسیم پر مامور تو اس خبط میں مبتلا ہونے کی کیا وجہ ہے؟ اللہ تعالیٰ جب چاہے چشم زدن میں ان کے سارے عیش کو خاک میں ملا دے سکتا ہے اور اپنی نعمتوں سے ان کو بہرہ مند کر سکتا ہے جن کو یہ کسی نعمت کا حق دار نہیں سمجھتے۔

قرآن نے یہی بات، معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ، قریش کے ان مغروروں کو بھی خطاب کر کے فرمائی ہے جو کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی بشر ہی کو رسول بنا کر بھیجنے والا ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو رسول بناتا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے غریب و نادار کو کیوں رسول بناتا؟ اسی طرح اگر یہ دین، جس کی یہ دعوت دے رہے ہیں، کوئی خدائی دین ہوتا تو اس کے حامل بننے کے لیے اللہ تعالیٰ ہم کو چنتا نہ کہ اس کے حامل وہ نادار، قلّاش اور غلام بنتے جن کو اس دنیا کی کوئی نعمت و عزت بھی حاصل نہیں ہوئی ——— اس آیت میں ان مغروروں کے غرور پر بھی ایک کاری ضرب لگا دی گئی ہے۔

اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ یَّسْتَمِعُوْنَ فِیْهِ ۚ فَلْیَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (۳۸)

کفار کے بے بنیاد اوہام

یعنی اگر ان کا زعم یہ ہے کہ وہ اسی طرح دنیا میں بھی عیش کریں گے اور آخرت ہوئی تو وہاں بھی سب پر بالا رہیں گے تو اس زعم کی بنیاد کیا ہے؟ کیا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس کو آسمان میں لگا کر اپنے حق میں اللہ کے فیصلے سن لیا کرتے ہیں؟ کیا ان پر کوئی کتاب نازل ہوئی ہے جس میں ان کی پسند کی سب باتیں

لکھی ہوئی ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کو کوئی براءت نامہ لکھ کر پکڑا دیا ہے کہ تم جو چاہے اودھم مچاتے پھرو، ہم نہ دنیا میں تم کو کچھ کہیں گے نہ آخرت میں تم سے کوئی بازپرس ہونی ہے؟ اگر اس طرح کی کوئی خبر ان کے کسی آسمانی مخبر نے ان کو پہنچائی ہے تو وہ اس کے حق میں کوئی واضح دلیل پیش کریں۔

یہاں یہ بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی ہے۔ سورۂ قلم میں یہ پوری وضاحت کے ساتھ آئی ہے۔ ہم نے آیت کی تفسیر سورۂ قلم کی روشنی ہی میں کی ہے اس وجہ سے متعلق آیات نقل کیے دیتے ہیں تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ہم نے تاویل میں تکلف سے کام لیا ہے۔ وہاں فرمایا ہے:

أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۙ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ۝ سَلْهُمْ أَيُّهُم بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ (القلم: ۳۷-۴۰)

کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں وہی باتیں مرقوم ہیں جو تم چاہتے ہو! کیا ہم نے تم سے قیامت تک کے لیے کچھ عہد کر رکھے ہیں کہ تم جو کہو گے وہی تمھیں ملے گا! ان سے پوچھو کہ کون ان چیزوں کا ضامن بنتا ہے!

زیر بحث آیت میں زبان کے معروف قاعدے کے مطابق کچھ محذوفات ہیں ان کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی: (ام لھم سلم منصوب الی السماء یستمعون صاعدین فیه...) جس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ انسان اپنی رہنمائی کے لیے آسمانی وحی کا محتاج ہے۔ اب یا تو ہر شخص اس بات کا ثبوت بہم پہنچائے کہ اس کے پاس آسمانی ہدایت معلوم کرنے کے ذرائع و وسائل موجود ہیں اور اگر ہر شخص اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور ظاہر ہے کہ نہیں کر سکتا تو اس پر واجب ہے کہ وہ ان لوگوں کی رہنمائی پر بھروسہ کرے جو ان وسائل سے بہرہ مند ہیں۔

أَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمُ الْبَنُونَ (۳۹)

شرکاء و شفعاء کا عقیدہ بالکل باطل ہے

یعنی مذکورہ باتوں میں سے اگر کوئی بات نہیں ہے تو کیا تمہارا غرّہ اپنے شرکاء و شفعاء کے بل پر ہے کہ وہ دنیا میں بھی تمھارے محافظ ہیں اور آخرت میں بھی وہ شفیع و مددگار رہیں گے۔ اگر یہ بات ہے تو اس زعم کا بھونڈا پن واضح کر دینے کے لیے تنہا یہی بات کافی ہے کہ تم نے خدا کے لیے تو لڑکیاں فرض کر رکھی ہیں، درآنحالیکہ اپنے لیے لڑکوں کو پسند کرتے ہو، لڑکیوں سے نفرت کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس سوال پر غور کرنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ خدا کا کوئی شریک و کفو ہو سکتا ہے یا نہیں تو کم از کم یہ احساس تو انسانی فطرت کا بالکل بدیہی تقاضا تھا کہ خدا کے لیے اس چیز کو پسند نہ کرتے جسے اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔ لیکن تم نے دہری حماقت کی۔ ایک تو بے دلیل خدا کے شریک ٹھہرائے، پھر شریک بھی بنایا تو ایسی چیزوں کو جن کو اپنا شریک بنانا انھیں گوارا نہیں ہے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ مشرکین عرب کے ہاں سب سے اونچا درجہ تین دیویوں کا تھا جن کے متعلق ان کا

گمان تھا کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں اور اپنے باپ سے جو چاہیں منوا سکتی ہیں۔ ان کا ذکر تفصیل سے آگے والی سورہ میں یوں آیا ہے۔

أَفَرَءَيْتُمُ اللَّٰتَ وَالْعُزَّىٰ ۝ وَمَنَوٰةَ
الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ۝ أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ
الْأُنثَىٰ ۝ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ ۝ إِنْ
هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم
مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ
(النجم: ۱۹-۲۳)

ذرا غور تو کرو لات، اور عزیٰ اور منات پر جو تین
کی تیسری اور درجے میں دوسری ہے۔ کیا تمہارے
لیے بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں ہیں! پھر تو یہ
بڑی ہی بھونڈی تقسیم ہوئی! یہ محض نام ہیں جو تم نے
اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں، اللہ نے ان
کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔

أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ (۴۰)

مخالفین کی حق بیزاری پر تعجب

یہ ان لوگوں کی حق بیزاری پر اظہار تعجب ہے کہ آخر یہ تمہاری بات سنتے کیوں نہیں؟ اپنی بات سنانے پر تم ان سے کسی تنخواہ یا معاوضہ کے طالب تو ہو نہیں کہ اس کے بوجھ تلے یہ دبے جا رہے ہوں! تم تو اپنے رب کی نعمت مفت بانٹ رہے ہو تو ان کو کیا حرج ہوتا ہے کہ وہ اس کے سننے کے بھی روادار نہیں۔

یہ امر واضح رہے کہ جہل کے مقابل میں علم بہرحال ایک محبوب و مطلوب شے ہے۔ کوئی سلیم الفطرت نہ یہ گوارا کرتا اور نہ اسے گوارا کرنا چاہیے کہ اس کے سامنے اس چیز کا علم پیش کیا جائے جس سے وہ بے خبر ہے اور وہ اس کے سننے کا بھی روادار نہ ہو۔ ایسے شخص کی مثال اس اندھے کی ہے جو ٹھوکریں کھا رہا ہے لیکن کوئی اس کو رستہ پر لانا چاہتا ہے تو اس کے ہاتھ وہ جھٹک دیتا ہے۔ اہل عرب امی، یعنی دین و شریعت سے بے خبر تھے۔ ان کی اس بے خبری کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اللہ کی ہدایت معلوم کرنے کے طالب بنتے بالخصوص جب کہ ان کے ہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانے سے یہ روایت بھی چلی آ رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے اندر سے ایک رسول اٹھائے گا جو لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے گا اور جس سے دنیا کی تمام قومیں ہدایت پائیں گی۔ ان پر واجب تھا کہ جب انہی کے اندر کے ایک بہترین شخص نے ان کو اللہ کے راستہ کی دعوت دی تو وہ اس کی بات سنتے اور سنجیدگی سے اس پر غور کرتے لیکن توقع کے خلاف انھوں نے اس کے بالکل خلاف روش اختیار کی۔ ان کی اسی حالت پر قرآن نے اس آیت میں تعجب کا اظہار فرمایا ہے۔

أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ (۴۱)

یعنی تم سے اور تمہاری پیش کردہ ہدایت سے یہ اس قدر بیزار ہیں تو کیا ان کے پاس غیب کے خود جان لینے کا کوئی ذریعہ موجود ہے جس سے وہ تمام ضروری باتیں معلوم کر کے لکھ لیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس طرح کا کوئی ذریعہ ان کے پاس موجود نہیں ہے۔ ایسی حالت میں حق تو یہ تھا کہ وہ تمہاری پکار پر لپکتے کہ تم اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے ان کو اس کے احکام اور اس کی مرضیات سے آگاہ کرنے کے لیے اٹھے ہو لیکن وہ تم سے تو بیزار ہیں البتہ

خود اپنے ہی سے انھوں نے شریعت گھڑ رکھی ہے جو ہے تو ان کی من مانی خواہشات اور ان کے اوہام کا مجموعہ لیکن ان کو انھوں نے اللہ کا اتارا ہوا دین سمجھ رکھا ہے۔ ان کی اسی طرح کی خواہشات و بدعات کی طرف سورۂ نجم آیت ۳۵ میں یوں اشارہ فرمایا ہے: اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى (کیا اس کے پاس علمِ غیب ہے پس وہ دیکھ رہا ہے) اس آیت میں اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو باعتبار ایمان و عمل تو بالکل صفر تھے لیکن ان کا زعم یہ تھا کہ وہ بزرگوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے ان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے بڑے درجے ملیں گے۔ اپنے اس پندار کے سبب سے وہ پیغمبر کے انذار کا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ یہ ہمیں عذاب سے ڈراتے ہیں حالانکہ بہت جلد گردشِ روزگار خود انھیں ختم کر دینے والی ہے اور ہم اس کے منتظر ہی ہیں۔

اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ؕ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ (۴۲)

اصل حقیقت کی پردہ کشائی

یہ سوال ہی کے پیرایہ میں اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے کہ یہ ساری دلیل بازیاں اور سخن سازیاں تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر کی دعوت کے فروغ میں ان کو اپنی سیادت کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ اس کو بچانے کے لیے یہ ساری باتیں وہ، اپنے ضمیر کے بالکل خلاف، گھڑتے اور پھیلاتے ہیں تاکہ ان کے عوام اس دعوت سے متاثر ہو کر ان کے ہاتھوں سے نکل نہ جائیں۔ فرمایا کہ کیا یہ کوئی چال چلنی چاہتے ہیں! اگر یہ بات ہے تو یاد رکھیں کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ خود اپنے دام میں گرفتار ہیں۔

حق کے خلاف سازش کرنے والے خود اپنے دام میں گرفتار ہوتے ہیں

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حق سے برگشتہ رہنے اور لوگوں کو اس سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنے ضمیر کے بالکل خلاف اس طرح کی چالیں چلتے ہیں وہ حق کی دعوت دینے والوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑتے بلکہ خود اپنے ہی کو تباہی کے کھڈ میں گراتے ہیں۔ نجات و فلاح کا راستہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے بتایا ہے۔ کوئی شخص اس سے ہٹ کر دوسری راہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی ضلالت کو ہدایت ثابت کرنے کے لیے صحیح راہ بتانے والوں پر خواہ کتنی ہی تہمتیں تراشے اور کج روی کی حمایت میں کتنی ہی دلیلیں گھڑے لیکن جب انجام اس کے سامنے آئے گا تب اس پر واضح ہو جائے گا کہ وہ خود اپنے ہی دام میں اسیر ہو کر اس منزل تک پہنچا ہے۔

اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۴۳)

خدا کے ساتھ شرک کا کوئی جوڑ نہیں

یعنی بالآخر تو سب کو اللہ ہی کے آگے حاضر ہونا اور اسی کے حضور جواب دہی کرنی ہے تو جو چالیں اس کے خلاف چلیں گے ان کے انجام سے ان کو کون بچائے گا! کیا ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ کے سوا ان کے کچھ اور معبود بھی ہیں جو ان کی مدد کریں گے تو یاد رکھیں کہ اللہ جل شانہٗ ان چیزوں سے پاک اور ارفع ہے جن کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

'سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ' میں دلیل کا جو پہلو ہے اس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی ایسی صفت منسوب نہیں کی جا سکتی جو اس کی تمام صفات کے منافی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات خود بیان فرما دی ہیں جن کو مشرکین عرب بھی مانتے تھے لیکن ساتھ ہی انھوں نے اپنی خواہشوں اور بدعات کو دین بنانے کے لیے اس کے ساتھ شرک کا جوڑ بھی لگا رکھا تھا حالانکہ اس جوڑ سے خدا کی تمام بنیادی صفات کی نفی ہو جاتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ان کی ان مشرکانہ نسبتوں سے بالکل پاک ہے۔

ان خرافات کا اس کی عظیم اور رفیع الشان ذات سے کوئی جوڑ نہیں ہے۔

وَإِنْ يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ (۴۴)

چال چلنے والوں کو قائل کرنا کسی کے بس میں نہیں

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جب ان کی ساری سخن سازیاں محض چال اور فریب کی نوعیت کی ہیں تو ان کو مطمئن کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ ان کو دلیلوں سے قائل کرنا تو درکنار اگر یہ اس عذاب کو بھی آسمان سے نازل ہوتا دیکھ لیں جس سے تم ان کو آگاہ کر رہے ہو تو اس کو بھی یہ تہ بہ تہ بادل کہیں گے اور اپنے کو مطمئن کر لیں گے کہ یہ ابرِ کرم بن کر ان کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرنے والا ہے۔

اس فقرے میں ثمود کے تاریخی واقعہ کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ ان کو جس عذاب سے ڈرایا گیا تھا جب وہ ان کے سروں پر آ دھمکا تب بھی انھوں نے اس کا یقین نہیں کیا بلکہ یہ کہہ کر اپنے کو مطمئن کر لیا کہ هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (الاحقاف: ۲۴) (یہ تو ہمیں سیراب کرنے والا بادل ہے)۔ مطلب یہ ہے کہ اسی طرح یہ لوگ عذاب کو دیکھ کر بھی ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ اسی وقت مانیں گے جب عذاب ان کو پامال کر دے گا، لیکن اس وقت ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہوگا۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی کو قائل کرنے کی توقع اسی حد تک کی جا سکتی ہے جب تک گمان ہو کہ اس کے ذہن میں فی الواقع کچھ شبہات و اعتراضات ہیں جو اس کے لیے قبولِ حق میں حجاب بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت تک ایک داعی کا فرض ہے کہ اس کے شبہات دور اور اس کے اعتراضات رفع کرنے کی کوشش کرے لیکن جب یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آ جائے کہ اس کی ساری دلیل بازی محض ایک چال (کید) اور مکر ہے جس کے پردے میں چھپ کر وہ حقیقت سے فرار اختیار کرنا چاہتا ہے تو پھر اس پر وقت ضائع کرنا بالکل بے سود ہے۔ پھر اس کا معاملہ اللہ ہی کے حوالے کرنا چاہیے۔

فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ۙ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۴۵-۴۶)

مطلب یہ ہے کہ جب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ لوگ چال چل رہے ہیں تو اب ان کے درپے ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب ان کو اس دن کے حوالے کرو جس دن صورِ اسرافیل سے ان پر غشی طاری ہو جائے گی۔ یہ اشارہ اس دن کی طرف ہے جس کے ہول کی تصویر سورۂ حج میں بدیں الفاظ کھینچی گئی ہے: وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ (۲) (اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے اور یہ مدہوشی شراب کی نہیں ہوگی بلکہ اللہ کا عذاب ہی بڑا سخت ہوگا)۔

يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ ...... الاٰیۃ۔ فرمایا کہ اس دن نہ ان کی یہ چالیں کچھ کام آئیں گی، نہ ان کے اعوان و انصار ان کی کچھ مدد کر سکیں گے اور نہ ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء ہی سے ان کو کچھ سہارا حاصل ہو سکے گا بلکہ ہر ایک کو سابقہ صرف اللہ ربّ العزت سے پیش آئے گا اور وہ سب کا کیا دھرا ان کے سامنے رکھ دے گا۔

وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۷)

اس عذاب کی طرف اشارہ جو مکذبین رسول پر دنیا میں آتا ہے — یعنی آخرت کا عذاب تو ہے ہی ان ظالموں کے لیے ایک عذاب اس سے پہلے بھی ہے لیکن ان کی اکثریت اس سے بے خبر ہے۔ یہ اشارہ اسی عذاب کی طرف ہے جو سنتِ الٰہی کے مطابق ان لوگوں پر ہمیشہ آیا ہے جنھوں نے اپنے رسول کی تکذیب کی اور اس پر اڑے رہ گئے۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں۔ یہ عذاب قریش کے مکذبین پر بھی آیا اور وہ سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ ہی میں ذلیل و پامال ہو گئے۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ (۴۸-۴۹)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی ہدایت — یہ نہایت دلنواز پیرایہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی ہدایت اور ساتھ ہی اس صبر کے حصول کی تدبیر تلقین فرمائی گئی ہے۔

'وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ'۔ 'صبر' کے بعد 'ل'، کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ لفظ 'صبر' یہاں انتظار کے مفہوم پر متضمن ہے۔ یعنی پوری استقامت کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ 'حکم' سے مراد ان باتوں کے ظہور کا حکم ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔

'فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا'۔ یہ نہایت ہی دل نواز فقرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم ہر وقت ہماری آنکھوں یعنی ہماری حفاظت میں ہو۔ یہ کتنی ہی چالیں چلیں لیکن مجال ہے جو تمھیں کوئی گزند پہنچا سکیں۔

حصولِ صبر کی تدبیر — 'وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ'۔ یہ اس صبر کے حصول کی تدبیر ارشاد ہوئی ہے کہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ نماز بالخصوص تہجد کی نماز کا اہتمام کرو۔ 'حِيْنَ تَقُوْمُ' کی تفسیر و وضاحت ہم سورۂ شعراء کی آیات ۲۱۷-۲۱۸: وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ (اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ رکھو جو تمھیں دیکھتا ہے جب تم اٹھتے ہو) کے تحت کر چکے ہیں۔ اسی طرح 'فسبح' کے ساتھ 'حمد' کی قید کی وضاحت بھی اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

'وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ'۔ یہ ٹکڑا معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ سورۂ قٓ آیات ۳۹-۴۰ میں بھی گزر چکا ہے۔ اس کی تفسیر وہاں دیکھ لیجیے۔ یہاں ساری بحث دہرانے میں طوالت ہوگی۔ قٓ کی آیات ہم نقل کیے دیتے ہیں: فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۚ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ۝

بفضلِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد

۱۵- مئی ۱۹۷۷ء

۱۲- جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ

تدبّرِ قرآن

۵۳

النَّجم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ الطّور ـــــ کی توام سورہ ہے۔ مرکزی مضمون دونوں کا ایک ہی ہے، یعنی جزا اور سزا کا اثبات۔ بس یہ فرق ہے کہ سابق سورہ میں عذاب کے پہلو کو نمایاں فرمایا ہے اور اس میں اس شفاعتِ باطل کی تردید ہے جس میں مشرکینِ عرب مبتلا تھے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ پچھلی سورتوں میں ہم واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اس عقیدۂ باطل کے باقی رہتے ہوئے مشرکین کے لیے بڑے سے بڑے عذاب کی دھمکی بھی بالکل بے اثر تھی۔ قرآن نے اسی وجہ سے قیامت اور توحید دونوں کا ذکر ہمیشہ ساتھ ساتھ کیا ہے تاکہ مشرکین کے لیے کوئی راہِ فرار باقی نہ رہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ پچھلی سورہ میں بھی ہے، اس سورہ میں اس اشارہ کی پوری وضاحت ہو گئی ہے۔ گویا ان دونوں سورتوں کا مشترک مضمون یہ ہے کہ منکرین و مکذّبین کے لیے اللہ کا عذاب لازمی ہے، اپنے جن معبودوں کی شفاعت پر یہ تکیہ کیے بیٹھے ہیں اول تو ان کی کوئی حقیقت نہیں، محض فرضی نام ہیں جو انھوں نے رکھ چھوڑے ہیں اور اگر کچھ حقیقت ہے تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ لوگوں کے ساتھ کامل علم اور کامل عدل پر مبنی ہوگا۔ اس بات کا وہاں کوئی امکان نہیں ہے کہ کسی کی شفاعت اس کے علم میں کوئی اضافہ کر سکے، یا اس کے فیصلہ کو تبدیل کر سکے یا باطل کو حق بنا سکے۔

عمود اور مضمون کے علاوہ سابق سورہ کے خاتمہ اور اس سورہ کے آغاز پر بھی ایک نظر ڈالیے تو دونوں میں بڑی واضح مناسبت نظر آئے گی۔ سورۂ طُور کی آخری آیت ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ﴾ ہے اور اس سورہ کی پہلی آیت ﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى﴾ ہے۔ گویا سابق سورہ کی آخری اور اس سورہ کی پہلی آیت نے دونوں میں ایک نہایت خوب صورت حلقۂ اتصال کی شکل پیدا کر دی ہے۔ اس قسم کا اتصال اکثر مقامات میں موجود ہے۔ بعض جگہ لفظی، بعض جگہ معنوی، اور بعض مقامات میں لفظی اور معنوی دونوں قسم کا۔ اس قسم کی بعض چیزوں کی طرف ہم نے پچھلی سورتوں میں اشارے کیے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۸) اس امر کا بیان کہ یہ قرآن جو تم کو سنایا جا رہا ہے یہ تمھارے کاہنوں اور نجومیوں کے قسم کا کوئی کلام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب ترین اور معتمد ترین فرشتہ کے ذریعہ سے اپنے پیغمبر پر یہ وحی فرمایا ہے۔

اس میں کسی ضلالت یا غوایت کا کوئی شائبہ نہیں ہے، بلکہ اس کی ہر بات مبنی بر حقیقت اور واقعہ ہے۔ اس مغالطہ میں نہ رہو کہ وحی اور جبریلؑ سے متعلق پیغمبرؐ اپنے جو مشاہدات و تجربات تمھارے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ کسی خیال آرائی یا فریب نظر پر مبنی ہیں۔ یہ سر تا سر حقیقت ہیں۔ پیغمبرؐ اپنے مشاہدات تمھارے آگے پیش کر رہے ہیں۔ ان مشاہدات کے باب میں ان سے لڑنے کے بجائے تمھاری سلامتی ان کی دعوت پر ایمان لانے میں ہے۔

(۱۹-۲۸) مشرکین کو یہ تنبیہ کہ تمھارے یہ خیالی اصنام، جن کے بل پر تم قرآن کے انذار سے بے پروا ہو، بالکل بے حقیقت ہیں۔ نہ اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل اتاری اور نہ تمھاری عقل و فطرت ہی کے اندر ان کے لیے کوئی جگہ ہے۔ یہ محض فرضی نام ہیں جو تم نے اپنے جی سے رکھ چھوڑے ہیں۔ حقیقت سے ان کو کوئی تعلق نہیں اور مفروضات حقیقت کے مقابل میں کچھ کام آنے والے نہیں بنیں گے، بالخصوص جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام کر دینے کے لیے تمھارے پاس اس کی نہایت واضح ہدایت بھی آ چکی ہے۔ یاد رکھو کہ تم نے جھوٹی آرزوؤں کے جو خیالی محل تعمیر کر رکھے ہیں یہ بالکل بے بنیاد ہیں۔ انسان کو سابقہ اپنی تمناؤں سے نہیں بلکہ حقائق سے پیش آئے گا تو حقائق کے مواجہ کے لیے تیاری کرو۔ دنیا اور آخرت کے سارے معاملات صرف اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں۔ ان میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں۔ آسمانوں میں بے شمار فرشتے ہیں لیکن ان کی سفارش ذرا بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہوگی۔ اللہ ہی جس کو چاہے گا اور جس کے لیے چاہے گا سفارش کی اجازت دے گا۔ آخرت کی مسئولیت اور قانون مکافات سے گریز کے لیے تم نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنا کر ان کی شفاعت کی جو آڑ لی ہے یہ محض تمھاری خیالی پناہ گاہ ہے۔ یہ چیز ذرا بھی کام آنے والی نہیں ہے۔

(۲۹-۳۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ ان سرگشتگانِ دنیا کو، جو اللہ کی یاد دہانی سے اعراض کر رہے ہیں، ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ان کے علم کی رسائی بس یہیں تک ہے۔ آخرت سے ان کی آنکھیں بند ہیں۔ اللہ نیکوں اور بدوں دونوں سے اچھی طرح باخبر ہے، وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے کے رہے گا۔ آسمانوں اور زمین کا بلا شرکت غیرے مالک اللہ ہی ہے، کسی کی مجال نہیں کہ وہ بروں کو اس کی پکڑ سے بچا سکے یا نیکوں کو ان کی نیکی کے صلہ سے محروم کر سکے۔ خدا کے ہاں اچھے صلہ کا حق دار ہر مدعی نہیں ہوگا بلکہ وہی ہوں گے جو بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے اجتناب کرتے رہے۔ یہ لوگ بے شک اس کی رحمت کے حق دار ہوں گے۔ اگر کبھی ان کے پاؤں کسی برائی پر پڑ گئے تو اللہ کا دامن مغفرت بہت وسیع ہے۔ وہ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے گا۔ رہے وہ برخود غلط جنھوں نے اپنے حسب و نسب اور اپنے خیالی معبودوں کی سفارش کے بل پر اپنے لیے خدا کے ہاں اونچے اونچے مراتب محفوظ کر رکھے ہیں، وہ اپنی پاک دامنی کی حکایت زیادہ نہ بڑھائیں۔ اللہ ان کی پیدائش کے تمام مراحل اور ان کے سارے اعمال سے اچھی طرح واقف ہے۔

(۳۳-۵۵) ایک تحقیر آمیز اشارہ ان لوگوں کی طرف جو اللہ کی راہ میں کچھ دینے دلانے یا کسی قربانی کا حوصلہ تو ذرا بھی نہیں رکھتے لیکن اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ جیسے جلیل القدر نبیوں

کے نام لیوا اور ان کی ذریت میں ہیں اس وجہ سے خدا کی جنت کے پیدائشی حق دار ہیں۔ ان کو ان جلیل القدر نبیوں کی تعلیمات اور ان کی عظیم قربانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ مرتبے ان کو گھر بیٹھے بٹھائے محض نسب و خاندان کی بنا پر نہیں مل گئے بلکہ ان کی ان بے مثال قربانیوں کی بنا پر ملے جو انھوں نے اللہ کی راہ میں پیش کیں۔ اللہ کے ہاں ہر ایک کا اپنا عمل تولا جائے گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ عمل تو کسی نے کیا اور اس کا صلہ کسی اور کو ملے۔

اسی ضمن میں یہ حقیقت بھی نہایت زوردار الفاظ میں واضح فرما دی گئی ہے کہ رنج و راحت، موت و زندگی، بیٹا اور بیٹی، دولت و ثروت سب خدا ہی کے اختیار میں ہے، اس وجہ سے ہر حال میں خدا ہی سے وابستہ رہنا چاہیے۔ جو قومیں دنیا میں پھنس کر خدا سے بے پروا ہو جاتی ہیں وہ اپنی تمام دولت و شوکت کے باوجود اسی طرح کے انجام سے دوچار ہوتی ہیں جس طرح کے انجام سے عاد و ثمود اور ماضی کی دوسری قومیں دوچار ہوئیں۔ ان قوموں کے آثار تمھارے گردو پیش میں موجود ہیں۔ ان کو دیکھو اور ان سے عبرت حاصل کرو۔

(۵۹-۶۲) خاتمۂ سورہ جس میں تمہید کے مضمون، یعنی قرآن کی عظمت کی یاددہانی ہے کہ یہ کاہنوں اور نجومیوں کے قسم کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ اسی طرح کا ایک نذیر ہے جس طرح کے نذیر اس سے پہلے آ چکے ہیں۔ اب تمھارے فیصلہ کی گھڑی سر پر آ چکی ہے اور یہ تم کو اسی سے بروقت متنبہ کرنے کو نازل ہوا ہے۔ اگر تم متنبہ نہ ہوئے تو یاد رکھو کہ خدا کی پکڑ سے تم کو کوئی بھی بچانے والا نہیں بنے گا۔ یہ جس حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے اس پر تعجب نہ کرو، بلکہ اپنی اصلاح کرو۔ تم اس پر ہنستے ہو حالانکہ یہ ہنسنے کی چیز نہیں بلکہ تمھارے لیے رونے کی چیز ہے۔ اپنے غفلت کے بستر سے اٹھو اور اپنے رب کے آگے سجدہ اور اس کی بندگی کرو۔

سورۃ النجم (۵۳)

مکیۃ —— آیات : ۶۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۸

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى ﴿١﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ﴿٢﴾ وَمَا
يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿٣﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿٤﴾ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ
الْقُوٰى ﴿٥﴾ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ﴿٦﴾ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰى ﴿٧﴾
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ﴿٨﴾ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى ﴿٩﴾ فَأَوْحٰى
إِلٰى عَبْدِهٖ مَا أَوْحٰى ﴿١٠﴾ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأٰى ﴿١١﴾ أَفَتُمٰرُوْنَهٗ
عَلٰى مَا يَرٰى ﴿١٢﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً أُخْرٰى ﴿١٣﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ
الْمُنْتَهٰى ﴿١٤﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى ﴿١٥﴾ إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ
مَا يَغْشٰى ﴿١٦﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿١٧﴾ لَقَدْ رَأٰى مِنْ اٰيٰتِ
رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿١٨﴾

ترجمۂ آیات ۱-۱۸

شاہد ہیں ستارے جب کہ وہ گرتے ہیں کہ تمھارا ساتھی نہ بھٹکا ہے اور نہ گمراہ ہوا ہے۔ اور وہ اپنے جی سے نہیں بولتا۔ یہ تو بس وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔ اس کو ایک مضبوط قوتوں والے، عقل و کردار کے توانا نے تعلیم دی ہے۔ وہ نمودار ہوا، اور وہ افق اعلیٰ

میں تھا، پھر قریب ہوگیا اور جھک پڑا، پس دو کمانوں کے بقدر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ پس اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔ جو کچھ اس نے دیکھا یہ دل کی خیال آرائی نہیں ہے تو کیا تم اس سے اس چیز پر جھگڑتے ہو جس کا وہ مشاہدہ کر رہا ہے! ۱ - ۱۲

اور اس نے ایک بار اس کو اور بھی سدرۃ المنتہٰی کے پاس اترتے دیکھا، اسی کے پاس جنت الماویٰ بھی ہے۔ جب کہ چھائے ہوئے تھی سدرہ کو جو چیز چھائے ہوئے تھی۔ نہ نگاہ کج ہوئی اور نہ بے قابو۔ اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں کے مشاہدے کیے۔ ۱۳ - ۱۸

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۱)

'النجم' سے مراد 'النجم' سے عام طور پر مفسرین نے ثریا کو مراد لیا ہے، لیکن اس کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔ اس سے زیادہ واضح قرینہ تو شعریٰ کا ہو سکتا ہے جس کا ذکر اسی سورہ میں آگے آیا ہے لیکن اس کو مراد لینے کا بھی، جیسا کہ وضاحت آئے گی، یہاں کوئی محل نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اسم جنس کے مفہوم میں ہے جس طرح 'وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ' (النحل: ۱۶) (اور ستاروں سے وہ رہنمائی حاصل کرتے ہیں) یا 'وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ' (الرحمٰن: ۶) (اور ستارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں) اور اس نوع کی دوسری آیات میں جگہ جگہ قرآن میں آیا ہے۔

'هَوٰى يَهْوِي' کا مفہوم 'هَوٰى يَهْوِي' کے اصل معنی کسی چیز کے اوپر سے گرنے کے ہیں۔ یہ لفظ ستاروں کے افق سے غائب ہونے اور ڈوبنے کی تعبیر کے لیے بھی موزوں ہے اور اس آتش باری کے لیے بھی موزوں ہے جو غیب کی ٹوہ لگانے والے شیاطین پر ستاروں سے ہوتی ہے اور جس کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔

'وَالنَّجْمِ' میں 'و' قسم کے لیے ہے اور قسم سے متعلق ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں کہ قرآن میں یہ بیشتر شہادت کے لیے آئی ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۲ - ۴)

یہ پوری بات مقسم علیہ کی حیثیت رکھتی ہے یعنی ستاروں کے غروب یا سقوط کی قسم کھا کر قریش کو مخاطب

کرکے فرمایا کہ تمھارے ساتھی (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو بھٹکے ہیں نہ گمراہ ہوئے ہیں۔ جو کلام وہ تمھیں سنا رہے ہیں، اپنے جی سے گھڑ کے نہیں سنا رہے ہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر وحی کیا جاتا ہے کہ وہ اس کو تمھیں سنائیں تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

موقع کلام دلیل ہے کہ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کہانت کا جو الزام لگاتے تھے یہ اس کی تردید ہے۔ قریش کے لیڈروں کو جب آپ قرآن سناتے اور وحی اور اس کے لانے والے فرشتہ سے متعلق اپنے تجربات و مشاہدات بیان فرماتے تو وہ اپنے عوام کو یہ باور کراتے کہ یہ بھی ہمارے کاہنوں اور منجّموں کے قسم کے ایک کاہن و منجّم ہیں۔ جس طرح ستاروں کے قِرآن، نکھتروں کے مشاہدات اور جنات کے القاء کی مدد سے وہ مسجّع و مقفّٰی کلام پیش کرتے اور غیب کی باتیں بتاتے ہیں اسی طرح یہ بھی مسجّع کلام سناتے اور مستقبل کی باتیں جاننے کے مدّعی ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرشتہ وحی لے کر آتا ہے محض دھونس ہے۔ جس طرح ہمارے کاہنوں پر جنات القاء کرتے ہیں اسی طرح کوئی جنّ ان پر بھی القاء کرتا ہے جس کو یہ فرشتہ سمجھتے ہیں۔

قریش کے اس الزام کی تردید قرآن میں جگہ جگہ ہوئی ہے۔ خاص طور پر سورۂ شعراء کے آخر میں اس کے بعض نہایت اہم پہلو زیر بحث آئے ہیں۔ یہاں اسی الزام کی تردید ایک مختلف نہج سے کی جا رہی ہے جس کا آغاز ستاروں کے غروب اور سقوط کی قسم سے ہوا ہے۔

ستاروں کے غروب اور سقوط کی شہادت

ستاروں کے غروب یا ان کے سقوط سے قرآن نے دو پہلوؤں سے عربوں کے اس تصور پر ضرب لگائی ہے جو وہ کاہنوں اور منجّموں سے متعلق رکھتے تھے۔

ایک تو اس پہلو سے کہ یہ سورج اور چاند اور یہ تمام نجوم و کواکب نہ خود اپنے اختیار سے کوئی تصرّف کرنے میں نہ بذاتِ خود مؤثر یا نافع و ضارّ ہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں مسخّر اور اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ ان کا پوری پابندی کے ساتھ، ایک مقررہ نظام الاوقات کے مطابق، طلوع و غروب خود اس بات کی شہادت ہے کہ یہ بذاتِ خود کسی اقتدار و اختیار کے مالک نہیں ہیں اس وجہ سے نہ تو یہ عبادت کے حق دار ہیں نہ اس بات کے کہ ان کو وحی و الہام کا مصدر سمجھ کر ان سے رجوع کیا جائے یا ان کو آفات کا منبع خیال کرکے ان کی دہائی دی جائے یا ان کو خیر و برکت کا مرکز مان کر ان سے دعا و التجا کی جائے، بلکہ یہ خود اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے اور اپنے عمل سے اللہ کے بندوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی انہی کی طرح اللہ ہی کی بندگی اور اسی کو سجدہ کریں۔ یہ مضمون قرآن میں یوں تو گوناگوں شکلوں میں بیان ہوا ہے لیکن خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کی وہ حجّت جو انھوں نے اپنی قوم پر تمام کی اس باب میں حرفِ آخر ہے۔

یہ امر یہاں پیش نظر رہے کہ کہانت کی گرم بازاری جس طرح جنات و شیاطین کے تعلق سے تھی اسی طرح ستاروں کی گردش اور اس کے اثرات سے بھی اس کا نہایت گہرا ربط تھا۔ قرآن نے یہاں وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی کہہ کر اس کے اسی پہلو پر ضرب لگائی ہے کہ ستارے تو خود اپنے عمل سے شہادت دیتے ہیں کہ وہ

خالق کائنات کے حکم کے تابع ہیں۔ اسی کے حکم سے وہ طلوع ہوتے اور اسی کے حکم سے ڈوبتے ہیں، تو احمق ہیں وہ لوگ جو ان سے الہام حاصل کرنے یا لوگوں کی تقدیر معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ احمق ہیں وہ جو اللہ کے رسول کو نجومی یا کاہن بتاتے ہیں ورنہ تیکہ ان کی ساری تعلیم ان خرافات پر ایک ضرب کاری ہے۔

دوسرے اس پہلو سے کہ کاہنوں کا یہ دعویٰ بالکل جھوٹ ہے کہ ان کا ربط ایسے جنوں سے ہے جو آسمان کی خبریں معلوم کر کے ان کو بتاتے ہیں۔ غیب تک کسی کی بھی رسائی نہیں ہے۔ جو جنات و شیاطین غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے آسمانوں میں گھات میں بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو کھدیڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ ان پر شہابِ ثاقب کی مار پڑتی ہے۔ سورۂ صٰفّٰت میں اس کا ذکر یوں آیا ہے۔

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝ (الصّٰفّٰت : ۱۰)	مگر جو کوئی کچھ اچک لینے کی کوشش کرے تو اس کا تعاقب کرتا ہے ایک شہابِ ثاقب۔

اللہ تعالیٰ کے اس انتظام کا اعتراف خود جنات نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ (الجن : ۹)	اور یہ کہ ہم آسمان کے ٹھکانوں میں غیب کی باتیں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے لیکن اب جو سننے کی کوشش کرے گا تو وہ اپنے لیے ایک شہاب کو گھات میں پائے گا۔

انہی ٹوٹنے والے ستاروں یا آسمانی راکٹوں کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے سورۂ واقعہ ۷۵-۸۰، سورۂ حاقّہ : ۳۸-۴۳ اور سورۂ تکویر ۱۵-۲۵ میں قرآن کریم کو شیطانی چھوت سے بالکل پاک اور بالاتر قرار دیا ہے اور یہ واضح فرمایا ہے کہ قرآن کی حریم قدس تک کسی جن و شیطان کو رسائی نہیں ہے۔ اگر کوئی وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر شہابِ ثاقب کی مار پڑتی ہے۔ شیاطین نہ اس لوحِ محفوظ تک پہنچ سکتے ہیں جس میں قرآن محفوظ ہے، نہ اس جلیل القدر فرشتہ کو متاثر کر سکتے جو اس کو لے کر اترتا ہے اور نہ اس رسول ہی کو گمراہ کر سکتے جس پر یہ نازل ہوتا ہے۔ شیاطین ان کاہنوں پر اترتے ہیں جو بالکل جھوٹے اور نابکار ہوتے ہیں اور بعض لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے جھگل بناتے اور غیب دانی کے دعوے کرتے ہیں۔

بعض الفاظ کی وضاحت

قسم اور مقسم علیہ کا تعلق سمجھ لینے کے بعد ان آیتوں کے الفاظ اور ان کے مفہوم کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے تاکہ بات پوری طرح ذہن نشین ہو جائے۔

'مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى'۔ 'ضَلَّ' عام طور پر انسان کی اس گمراہی کے لیے آتا ہے جس کا تعلق بھول چوک یا فکر و اجتہاد کی غلطی سے ہو اور 'غَوٰى' کا تعلق اس گمراہی سے ہوتا ہے جس میں نفس کی اکساہٹ اور آدمی کے قصد و تعمد کو بھی دخل ہو۔

لفظ 'صَاحِبُ' یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوا ہے اور ضمیر خطاب کے مخاطب قریش ہیں۔ ان کو خطاب کرکے کہا جا رہا ہے کہ یہ پیغمبر جو تمہارے اپنے دن رات کے ساتھی ہیں تمہارے لیے کوئی اجنبی نہیں ہیں۔ تم ان کے ماضی و حاضر، ان کے اخلاق و کردار اور ان کے رجحان و ذوق سے اچھی طرح واقف ہو۔ تم نے کب ان کے اندر کوئی ایسی بات دیکھی ہے جس سے یہ شبہ بھی ہو سکے کہ ان میں کہانت یا نجوم کا کوئی میلان پایا جاتا ہے۔ اس طرح کا ذوق کسی کے اندر ہوتا ہے تو دن رات کے ساتھیوں سے وہ عمر بھر چھپا نہیں رہتا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو چیز اتنی مدت تک تم نے ان کے اندر کبھی محسوس نہیں کی اب جب انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور تم کو اللہ کا کلام سنایا تو تم نے ان کو کاہن اور نجومی کہنا شروع کر دیا حالانکہ ان کی زندگی اور ان کا کلام شاہد ہے کہ ان کے اندر کسی ضلالت یا غوایت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

'وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى' 'عَنْ' یہاں منبع و منشا کا سراغ دینے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یعنی جو کلام وہ تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں اس کا کوئی تعلق نفس اور اس کی خواہشوں سے نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر وحی ہے جو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری ہدایت کے لیے اتاری جا رہی ہے۔ اس ٹکڑے میں کاہنوں اور نجومیوں پر تعریض ہے کہ ان کا کلام تو تمام تر ان کے نفس کی تحریک سے پیدا ہوتا ہے لیکن اس کلام کا منبع و مصدر اور ہے۔

جوہر جام جم از کان جہان دگر است

اس آیت میں اصلاً تو بیان قرآن کا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی وحی کی حیثیت سے پیش کر رہے تھے چنانچہ آگے کی آیت 'اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى' سے اس کی وضاحت بھی ہو گئی ہے۔ لیکن نبی چونکہ معصوم اور اس کا ہر قول و فعل لوگوں کے لیے نمونہ ہوتا ہے اس وجہ سے عام زندگی میں بھی اس کی کوئی بات حق و عدل سے ہٹی ہوئی نہیں ہوتی اور اگر کبھی اس سے کوئی فروگزاشت صادر ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح فرما دیتا ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى (۵)

حضرت جبریلؑ کی صفات

کلام اور صاحب کلام کی صفات بیان کرنے کے بعد یہ اس فرشتہ (حضرت جبریلؑ) کی صفت بیان ہو رہی ہے جس نے اس کلام کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دی۔ فرمایا کہ وہ 'شَدِيْدُ الْقُوٰى' یعنی تمام اعلیٰ صفات اور صلاحیتوں سے بھرپور اور اس کی ہر صفت و صلاحیت نہایت محکم و مضبوط ہے۔ اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی دوسری روح اس کو متاثر یا مرعوب کر سکے، اس سے خیانت کا ارتکاب کرا سکے یا اس کی تعلیم میں کوئی غلط مبحث کر سکے یا اس سے کوئی فروگذاشت ہو سکے یا اس کو کوئی وسوسہ لاحق ہو سکے۔ اس طرح کی تمام کمزوریوں سے اللہ تعالیٰ نے اس کو محفوظ رکھا ہے تاکہ جو فرض اس کے سپرد فرمایا ہے اس کو وہ بغیر کسی خلل و فساد کے پوری دیانت و امانت کے ساتھ ادا کر سکے۔ سورۂ تکویر میں اس فرشتہ کی تعریف یوں آئی ہے: 'اِنَّهٗ

لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۭ (۱۹-۲۱)

(یہ ایک باعزت فرستادہ کی وحی ہے، وہ بڑی قوت والا اور عرش والے کے نزدیک بارسوخ ہے۔ اس کی اطاعت کی جاتی ہے، مزید برآں وہ نہایت امین ہے)۔

'ذُوْ مِرَّۃٍ' یعنی وہ اپنی عقل اور اپنے کردار میں نہایت محکم ہے۔ اس کا امکان نہیں ہے کہ وہ کوئی دھوکا کھا سکے یا کوئی اس کو دھوکا دے سکے یا وہ کسی کے ہاتھ بک سکے اور کوئی اس کو خرید سکے۔ یہ لفظ اخلاقی و عقلی برتری کے لیے آتا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت جبریلؑ کی یہ صفات کاہنوں اور نجومیوں کے مصدرِ الہام کی تحقیر ہی کے لیے نہیں بیان ہوئی ہیں بلکہ یہود اور ان کے ہم مشرب روافض نے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم اشارہ کر آئے ہیں آپ پر نعوذ باللہ خیانت، جانب داری اور بے بصیرتی کا الزام لگایا ہے اور اسی بنا پر ان کو حضرت جبریل علیہ السلام سے ہمیشہ عداوت بھی رہی ہے جس کا حوالہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

ذُوْ مِرَّۃٍ فَاسْتَوٰى ۙ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۭ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (۶-۱۰)

جبریلؑ کا طریقِ تعلیم

'ذُوْ مِرَّۃٍ' کا تعلق 'شَدِيْدُ الْقُوٰى' سے ہے اس وجہ سے اس کی وضاحت ہم نے 'شَدِيْدُ الْقُوٰى' کے ساتھ ہی کر دی ہے۔ اب 'فَاسْتَوٰى' سے آگے اس تعلیم کے طریقہ کی وضاحت ہو رہی ہے جس کا ذکر اوپر 'عَلَّمَهٗ' کے لفظ سے ہوا ہے۔ فرمایا کہ اس مقرب فرشتے نے نبی کو نہایت اہتمام، توجہ اور شفقت سے اس وحی کی تعلیم دی جو اللہ نے اس پر نازل کرنی چاہی۔ 'فَاسْتَوٰى' میں 'ف' تفصیل کے لیے ہے، یعنی پہلے وہ اپنی اصل صورت میں، مستوی القامت ہو کر، نمودار ہوا۔ اس کے نمودار ہونے کی جگہ آسمان کی افقِ اعلیٰ میں تھی۔ 'افقِ اعلیٰ' سے مراد وہ افق ہے جو سمتِ راس میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی چیز سمتِ راس کے افق سے نمایاں ہوگی تو چودھویں کے چاند اور دوپہر کے سورج کی طرح وہ بالکل صاف شفاف، جلی اور غیر مشتبہ صورت میں نظر آئے گی۔ اس کے برعکس مشرق یا مغرب یا شمال یا جنوب کے افق سے اگر کوئی چیز نمودار ہوگی تو وہ مخفی صورت میں نمودار ہوگی جس طرح پہلی کا چاند نکلتا ہے۔ مقصود اس وضاحت سے یہ ہے کہ حضرت جبریلؑ اپنی اصل ہیئت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے افقِ اعلیٰ کے اسٹیج پر نمودار ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلی آنکھوں سے ان کا اچھی طرح مشاہدہ کیا۔

'ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى'۔ 'تَدَلّٰى' کے معنی جھک پڑنے یا لٹک آنے کے ہیں۔ یہ بیان ہے اس بات کا کہ اس کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دینے کے قصد سے آپ کے قریب آئے اور جس طرح شفیق اور بزرگ استاد اپنے عزیز و محبوب شاگرد پر غایت شفقت سے جھک پڑتا ہے اسی طرح وہ آپ کے اوپر جھک پڑے۔ یعنی یہ نہیں ہوا کہ دور سے اپنی بات پھینک ماری ہو اور اس امر کی پروا نہ کی ہو کہ

آپ نے بات اچھی طرح سنی یا نہیں اور سنی تو سمجھی یا نہیں بلکہ پورے التفات و اہتمام سے اس طرح آپ کے کان میں بات ڈالی کہ آپ اچھی طرح سن اور سمجھ لیں۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ کاہنوں کے شیاطین کا جو علم ہوتا ہے اس کو قرآن نے خَطِفَ الْخَطْفَةَ (الصّٰفّٰت: ۱۰) سے تعبیر کیا ہے یعنی اُچکی ہوئی بات، جس طرح چور اور اُچکّے کوئی چیز اُچک لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اُستاد اُچکّے ہیں تو وہ اپنے شاگردوں کو تعلیم بھی اُچکّوں ہی کی طرح دیتے ہوں گے۔ قرآن نے یہاں حضرت جبریل علیہ السلام کے طریقۂ تعلیم کا اس لیے نمایاں فرمایا ہے کہ دونوں کا فرق اچھی طرح واضح ہو سکے۔

'فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى'۔ 'قَاب' کے معنی بقدر کے ہیں یہ غایت قرب و اتصال کی تعبیر ہے۔ یعنی حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنے قریب ہو گئے کہ بس دو کمانوں کے بقدر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ اس تشبیہ میں اہلِ عرب کے ذوق کا بھی لحاظ ہے۔ اہلِ عرب تیر و کمان والے لوگ تھے اس وجہ سے غایتِ قرب کی تعبیر کے لیے ایک کمان یا دو کمانوں کے بقدر کی تشبیہ استعمال کرتے تھے، جس طرح ہم ایک گز یا دو گز کے الفاظ بولتے ہیں۔ 'اَوْ' یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ تشبیہ محض قُرب کی تعبیر کے لیے ہے۔ یہ فاصلہ اس سے بھی کم ہو سکتا ہے۔

'فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى'۔ 'اَوْحٰى' کا فاعل اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے اور حضرت جبریلؑ بھی۔ پہلی صورت میں مطلب بالکل واضح ہے کہ اس اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو وحی کرنی تھی وہ کی۔ دوسری صورت میں مضاف الیہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہو گا، یعنی اس توجہ اور اہتمام کے ساتھ جبریل علیہ السلام نے اللہ کے بندے کی طرف جو وحی کرنی تھی وہ کی یا وہ وحی کی جو اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ کو کرنے کے لیے ہدایت فرمائی۔ میرا رجحان پہلے قول کی طرف ہے، ویسے دوسرے قول میں بھی کوئی خاص قباحت نہیں ہے۔ بعض صوفیوں نے اس سے یہ بالکل غلط نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریلؑ کا بندہ قرار دیا ہے۔ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ، مثالوں کی روشنی میں، واضح کرتے آ رہے ہیں کہ ضمیروں کے مرجع کا تعین قرینہ سے ہوتا ہے۔ انتشارِ ضمیر ہر صورت میں عیب نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں اس سے ایجاز کا فائدہ ہوتا ہے جو کلامِ عرب میں داخلِ بلاغت ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (۱۱)

نبی صلعم کے مشاہدے کی تصدیق

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشاہدے کی تصدیق و تصویب ہے کہ کوئی اس مشاہدے کو دل کی خیال آرائی اور نفس کے فریب پر محمول نہ کرے، یہ فریبِ نفس اور دھوکا نہیں بلکہ فی الحقیقت نبی کو یہ مشاہدہ ہوا ہے۔

ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے ان مشاہدات کا ذکر کیا تو مخالفین نے آپ کا مذاق اڑایا کہ جس قسم کے ارمان اس شخص کے دل میں بسے ہوئے ہیں اسی قسم کے خواب اس کو نظر آتے ہیں اور

یہ خواب کو حقیقت گمان کر کے لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے ان کو سناتا پھرتا ہے، حالانکہ یہ تمام تر فریب نفس اور ذہن کی خیال آرائی ہے۔ قرآن نے اس الزام کی تردید مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ کی ہے، سورۂ تکویر کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس پر مفصل بحث آئے گی۔

اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا یَرٰى (۱۲)

یہ مخالفین کو مخاطب کر کے ان کو ملامت فرمائی ہے کہ کیا تم پیغمبر سے اس کے مشاہدات پر جھگڑتے ہو؟ وہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھتا ہے اور کانوں سے سنتا ہے اس سے تم کو آگاہ کر رہا ہے۔ اگر یہ چیز تم کو نظر نہیں آتی تو اس سے نفس حقیقت باطل نہیں ہو جائے گی۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ مخالفین اپنے کاہنوں کی تو ساری خرافات بے دریغ تسلیم کر لیتے تھے اس لیے کہ ان کی باتیں ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتی تھی لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ان کی خواہشوں کے خلاف تھی اس وجہ سے آپ کی مخالفت کے لیے طرح طرح کے شبہات پیدا کرتے تھے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۙ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (۱۳-۱۵)

دوسرا مشاہدہ

یعنی یہ بات نہیں ہے کہ پیغمبر کو یہ مشاہدہ صرف ایک ہی بار ہوا ہو اس وجہ سے اس کو کوئی واہمہ یا مغالطہ قرار دیا جا سکے بلکہ اسی طرح انھوں نے دوبارہ بھی جبریلؑ کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا جس کے پاس ہی جنت الماویٰ بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا جو مشاہدہ تمھارے سامنے وہ بیان کر رہے ہیں وہ مذاق اڑانے کی چیز نہیں بلکہ سنجیدگی سے غور کرنے کی چیز ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں صرف دو ابتدائی مشاہدوں کا حوالہ ان لوگوں کے جواب ہی دیا گیا ہے جنھوں نے شروع شروع میں آپ کے ان مشاہدات کا مذاق اڑانے کی کوشش کی، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو دو ہی بار دیکھا۔ ان دو ابتدائی مشاہدات کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام کا ظہور مختلف شکلوں اور مختلف اوقات میں تواتر کے ساتھ ہونے لگا، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حضرت جبریلؑ کی آمد سے زیادہ کسی کی آمد معلوم و معروف تھی نہ محبوب و مطلوب۔

سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى

'سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى' وہ مقام ہے جہاں اس عالم ناسوت کی سرحدیں ختم ہوتی ہیں۔ 'سِدْرَة' بیری کے درخت کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ بیری کا درخت عالم ناسوت اور عالم لاہوت کے درمیان ایک حد فاصل ہے۔ ہمارے لیے یہ سارا عالم نادیدہ ہے۔ نہ ہم عالم ناسوت اور عالم لاہوت کے حدود کو جانتے اور نہ ان دونوں کے درمیان کے اس نشان فاصل کی حقیقت سے واقف ہیں جس کو یہاں 'سدرۃ' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہ چیزیں متشابہات میں داخل ہیں اس وجہ سے قرآن کی ہدایت کے مطابق، ان پر ایمان لانا چاہیے، ان کی حقیقت کے درپے ہونا جائز نہیں ہے۔ ان کی حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جن کا علم راسخ ہوتا ہے ان کے علم میں ان چیزوں سے اضافہ ہوتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو ان کی حقیقت جاننے کے درپے ہوتے ہیں وہ ٹھوکر کھاتے اور گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

'عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى'۔ یہ 'سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى' کے مقام کی نشان دہی فرمادی کہ اس کے پاس 'جَنَّةُ الْمَاْوٰى' بھی ہے۔ 'جَنَّةُ الْمَاْوٰى' پر سورۂ سجدہ کی آیت ۱۹ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح 'سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى' عالمِ ناسوت کی آخری حد پر ہے اسی طرح 'جَنَّةُ الْمَاْوٰى' عالمِ لاہوت کے نقطۂ آغاز پر ہے۔ اس نشان دہی سے یہ بات واضح ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریلؑ کا دوبارہ مشاہدہ دونوں عالموں کے نقطۂ اتصال پر ہوا۔

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (۱۶)

مشاہدے کی کیفیت حیطۂ بیان سے باہر ہے

یہ اس مشاہدے کی کیفیت بیان ہوئی ہے کہ 'سدرۃ' کو چھپائے ہوئے تھی جو چیز چھپائے ہوئے تھی۔ یہ اسلوبِ بیان اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس وقت اس 'سدرۃ' پر انوار و تجلیات کا ایسا ہجوم تھا کہ ان کی تعبیر الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (۱۷)

تجلیات کے ہجوم میں پیغمبر کا قرار و سکون

جس طرح اوپر ارشاد ہوا ہے 'مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى' (۱۱) (جو کچھ اس نے دیکھا وہ دل کی خیال آرائی نہیں تھی) اسی طرح بیان فرمایا کہ اس مشاہدے کے موقع پر بھی نہ تو نگاہ بہکی اور نہ بے قابو ہوئی، بلکہ پیغمبر نے جو کچھ مشاہدہ کیا پورے قرار و سکون اور پوری دل جمعی کے ساتھ مشاہدہ کیا۔

'زیغ' کے معنی کج ہونے کے ہیں یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کسی جلوے کے مشاہدے میں اس کے صحیح زاویے سے کج نہیں ہوئی بلکہ آپ نے ہر چیز کا مشاہدہ اس کے بالکل صحیح زاویے سے کیا۔ 'طغٰی' کے معنی بے قابو ہونے کے ہیں۔ یعنی اگرچہ انوار و تجلیات کا ایسا ہجوم تھا کہ الفاظ اس کی تعبیر و تصویر سے قاصر ہیں لیکن آپ کی نگاہ ذرا بھی بے قابو نہیں ہوئی بلکہ آپ نے ہر چیز کا مشاہدہ اچھی طرح جم کر کیا۔

لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (۱۸)

اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ

یہ بیان ہے ان مشاہدات کا جو اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئے۔ فرمایا کہ اس نے اپنے رب کی بعض بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔ ان نشانیوں کی کوئی تفصیل نہیں فرمائی کہ نہ الفاظ ان کے متحمل ہو سکتے اور نہ وہ ہماری عقل کی گرفت میں آسکتیں تاہم لفظ 'کُبْرٰی' دلیل ہے کہ یہ نشانیاں ان نشانیوں سے بالاتر تھیں جن کا مشاہدہ، آفاق و انفس میں، ہر قدم پر، ہر صاحبِ نظر کو ہوتا رہتا ہے۔ مفسرین نے ان سے وہ مشاہدات مراد لیے ہیں جو حضورؐ کو معراج کے موقع پر ہوئے۔ ان کی اس رائے کے حق میں یہ قرینہ موجود ہے کہ سورۂ اسراء میں ذکر ہے کہ اس موقع پر آپ نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں کے مشاہدے کیے۔ تاہم یہ امر ملحوظ رہے کہ آپ کو مشاہدہ صرف اپنے رب کی نشانیوں ہی کا ہوا، خود اللہ تعالیٰ کے مشاہدے کا کوئی اشارہ یہاں نہیں ہے۔

اب اس تمہیدی بحث کا خلاصہ بھی سامنے رکھ لیجیے تاکہ آگے کے مباحث کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

جو لوگ قرآن کریم کو نجوم و کہانت کے قسم کی چیز قرار دے کر اس کی وقعت گھٹانی چاہتے تھے ان کو خطاب کر کے مندرجہ ذیل حقائق ان کے سامنے رکھے گئے ہیں۔

۱۔ یہ قرآن جس روزِ جزا و سزا سے تم کو آگاہ کر رہا ہے اس کو کوئی معمولی بات نہ سمجھو۔ یہ تمہارے کاہنوں اور نجومیوں کی ہفوات کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو اس کے پیش کرنے والے نے خود اپنے جی سے گھڑ لی ہو۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحی ہے جو اس نے سب سے زیادہ مقرب فرشتے کے ذریعے سے اپنے اس خاص بندے پر اس لیے نازل کی ہے تاکہ وہ تمھیں اس آنے والے دن سے، اس کے ظہور سے پہلے، اچھی طرح آگاہ کر دے۔

۲۔ جس فرشتہ کے ذریعہ سے یہ وحی آتی ہے وہ خدا کا نہایت مقرب فرشتہ ہے اس وجہ سے اس اہم ذمہ داری کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا انتخاب فرمایا۔ وہ نہایت امین ہے، خدا کی امانت میں وہ کوئی خیانت نہیں کر سکتا۔ وہ نہایت قوی ہے، مجال نہیں ہے کہ کوئی دوسری طاقت اس کو مرعوب یا مغلوب کر سکے۔ وہ تمام اعلیٰ علمی و اخلاقی صفات سے متصف ہے، اس وجہ سے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ وہ کسی مغالطہ میں مبتلا ہو سکے یا کوئی اسے دھوکا دے سکے یا وہ کسی کی جانب داری یا کسی کی ناحق مخالفت کرے۔

۳۔ اس فرشتہ کو پیغمبرؐ نے دو بار نہایت وضاحت سے دیکھا ہے۔ پہلی بار اس کا مشاہدہ افقِ اعلیٰ میں ہوا اور دوسری بار سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ اس شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ محض کوئی وہم تھا جو اس کو لاحق ہوا اور اس نے اس کو تمہارے سامنے بیان کر دیا۔

۴۔ فرشتے نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو تعلیم دی وہ ایک شفیق استاد کی طرح نہایت قریب سے، اس کے اوپر جھک کر دی جس کو پیغمبرؐ نے اچھی طرح سنا اور سمجھا۔ یہ نہیں ہوا کہ دور سے اس کے کانوں میں کوئی آواز آ پڑی ہو جس کے سننے یا سمجھنے میں کوئی شبہ یا تردد لاحق ہوا ہو۔

۲۔ آگے آیات ۱۹۔۳۰ کا مضمون

آگے مخالفین کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ تم کو اس اہتمام کے ساتھ روزِ جزا و سزا سے جو ڈرایا جا رہا ہے تو آخر کس بل بوتے پر اس سے نچنت بیٹھے ہوا کیا اپنی موہوم دیویوں ــــــ لات، عزّیٰ اور منات ــــــ کی سفارش کے بھروسہ پر! اگر اس وہم میں مبتلا ہو تو یاد رکھو کہ یہ تمہارے رکھے ہوئے محض فرضی نام ہیں جن کا کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ جزاء و سزا ایک حقیقت ہے، حقیقت کا مقابلہ تم محض اٹکل پچو مفروضات سے نہیں کر سکتے۔ تم نے جو جھوٹی آرزوئیں اپنے دلوں میں پال رکھی ہیں یہ محض تمہاری خواہشیں ہیں، ضروری نہیں کہ یہ پوری بھی ہو جائیں۔ دنیا اور آخرت کے سارے معاملات اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ کسی فرشتہ کا بھی یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس کے اذن کے بدون زبان ہلا سکے۔ جن لوگوں نے فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ چھوڑے ہیں اور ان کی سفارش کے بل پر قرآن کے انذار سے بالکل بے پروا ہیں انھوں نے

آخرت کی مسئولیت سے فرار کے لیے یہ ایک چور دروازہ نکالا ہے لیکن یہ چیز ذرا بھی ان کو نفع پہنچانے والی نہیں بنے گی۔ اللہ تعالیٰ نیک اور بد دونوں قسم کے لوگوں کو سب سے زیادہ خود جانتا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۹-۳۰

أَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿١٩﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى ﴿٢٠﴾ أَلَكُمُ
الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثٰى ﴿٢١﴾ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزٰى ﴿٢٢﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا
أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ
سُلْطٰنٍ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ ۖ وَلَقَدْ
جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿٢٣﴾ أَمْ لِلْإِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿٢٤﴾ فَلِلّٰهِ
الْآخِرَةُ وَالْأُولٰى ﴿٢٥﴾ وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ
شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضٰى ﴿٢٦﴾ إِنَّ
الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيُسَمُّونَ الْمَلٰئِكَةَ تَسْمِيَةَ
الْأُنْثٰى ﴿٢٧﴾ وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ
الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ﴿٢٨﴾ فَأَعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلّٰى
عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٢٩﴾ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ
الْعِلْمِ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۙ وَهُوَ
أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿٣٠﴾

ترجمۂ آیات ۱۹-۳۰

بھلا، کبھی غور کیا ہے لات اور عزّیٰ اور منات پر جو تیسری اور درجہ کے اعتبار سے دوسری ہے! تم اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور اس کے لیے بیٹیاں! یہ تو بڑی ہی بھونڈی تقسیم ہوئی! یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں،

اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری ۔ یہ لوگ محض گمان اور نفس کی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں ۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے نہایت واضح ہدایت آ چکی ہے ۔ ۱۹ - ۲۳

کیا انسان وہ سب کچھ پا لے گا جو وہ تمنا رکھتا ہے ! سو یاد رکھو کہ آخرت اور دنیا سب خدا ہی کے اختیار میں ہے ۔ اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش ذرا بھی کام آنے والی نہیں مگر بعد اس کے کہ اللہ اجازت دے جس کو چاہے اور جس کے لیے پسند کرے ۔ ۲۴ - ۲۶

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انہی نے فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ چھوڑے ہیں ۔ حالانکہ اس باب میں ان کو کوئی علم نہیں ۔ وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان کسی درجے میں بھی حق کا بدل نہیں ۔ تو تم ان لوگوں سے اعراض کرو جنھوں نے ہماری یاد دہانی سے اعراض کیا ہے اور جن کا مطلوب صرف دنیا کی زندگی ہی ہے ۔ ان کے علم کی رسائی بس یہیں تک ہے ۔ تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ یاب ہیں ۔ ۲۷ - ۳۰

---

۳ - الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى (۱۹ - ۲۰)

سوال یہاں تعجب اور استخفاف و تحقیر کے لیے ہے ۔ اوپر آپ نے حضرت جبریلؑ کی صفات ملاحظہ فرمائیں — تحقیر و مذمت
کردہ شَدِيدُ الْقُوٰى اور ذُو مِرَّةٍ ہیں ۔ دوسرے مقام میں ان کی تعریف مُطَاعٍ (التکویر: ۲۱) اور عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ (التکویر: ۲۰) کے الفاظ سے بھی آئی ہے ۔ ان صفات کے حضرات کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں ۔ یہاں ان کا ایک اور خاص پہلو بھی قابل توجہ ہے جو اس آیت کے تحقیر آمیز اسلوبِ کلام سے سامنے آتا ہے ۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت جبریلؑ کی یہ صفات نہایت اعلیٰ مردانہ صفات

ہیں۔ گویا قریش کو اس جلیل القدر فرشتہ کی ان صفات کا حوالہ دے کر ملامت کی گئی ہے کہ نادانو! کہاں یہ اعلیٰ مردانہ صفات کے ملائکہ اور کہاں تمہاری یہ دیویاں ـــــ لات، عزّٰی اور منات ـــــ جن کی نسبت تمہارا یہ گمان ہے کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں اور جن کے نام تم نے عورتوں کے نام پر رکھ چھوڑے ہیں!

مشرکین کی تین عالی مرتبہ دیویاں

آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ یہ تینوں فرشتوں کے بت تھے۔ فرشتوں کی نسبت، جیسا کہ جگہ جگہ اس کتاب میں وضاحت ہو چکی ہے، مشرکین عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی چہیتی بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ہر بات مانتا ہے اس وجہ سے وہ اپنے پجاریوں کو اس دنیا میں بھی رزق و اولاد دلواتی ہیں اور اگر آخرت ہوئی تو وہاں بھی یہ ان کو بخشوا لیں گی۔ خاص طور پر ان تینوں دیویوں کا ان کے ہاں بڑا مرتبہ تھا۔ ان کی سفارش بے خطا سمجھی جاتی تھی۔ ان کی نسبت ان کا عقیدہ تھا کہ 'تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ' یہ بڑے مرتبے کی دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی قبولیت کی پوری امید ہے۔

اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ قبائلِ عرب میں سے کون ان میں سے کس کو پوجتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص قبیلہ کو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ کچھ زیادہ خصوصیت رہی ہو لیکن ان کی عظمت تمام مشرکین کے نزدیک یکساں مسلّم تھی۔ قریش نے سارے عرب پر اپنی سیاسی و مذہبی پیشوائی کی دھاک جمانے کے لیے تمام دیویوں دیوتاؤں کی مورتیاں خانۂ کعبہ میں بھی جمع کر چھوڑی تھیں۔ ان تینوں دیویوں کے پجاریوں کی تعداد چونکہ سارے عرب میں سب سے زیادہ تھی اس وجہ سے قریش بھی ان کی سب سے زیادہ تعظیم کرتے تھے۔

ان دیویوں میں فرقِ مراتب

قرآن کے بیان سے یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ تینوں دیویاں اس اعتبار سے اگرچہ ایک ہی زمرہ سے تعلق رکھنے والی تھیں کہ یہ سب عالی مرتبہ خیال کی جاتی تھیں تاہم ان میں باہم فرقِ مراتب بھی تھا۔ لات اور عزّٰی کا مرتبہ سب سے اونچا تھا، 'منات' اگرچہ زمرہ میں انہی کے اندر شمار ہوتی تھی لیکن مرتبے کے لحاظ سے یہ ان سے فروتر تھی۔ چنانچہ قرآن نے اس کا ذکر دو صفتوں کے ساتھ کیا ہے۔ ایک 'ثالثۃ' اور دوسری 'اُخرٰی'۔ پہلی صفت اس کے زمرے کا پتہ دیتی ہے کہ یہ انہی تین کی تیسری ہے؛ دوسری صفت 'اخرٰی' اس کے درجے کا پتہ دیتی ہے کہ ہرچند یہ شامل تو انہی میں تھی لیکن یہ دوسرے نمبر پر تھی۔ 'اولیٰ' اور 'اخرٰی' کے الفاظ درجے کو واضح کرنے کے لیے عربی زبان میں بھی معروف ہیں اور اس مفہوم کے لیے قرآن میں بھی یہ آئے ہیں: 'وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ' (الاعراف: ۳۹) والی آیت میں اس کی نظیر موجود ہے۔

ان ناموں کے اشتقاق سے متعلق بعض تشریحات

ان ناموں کے اشتقاق اور ان کے معانی سے متعلق جو بحثیں تفسیر کی کتابوں میں آئی ہیں ان کا بیشتر حصہ بے بنیاد ہے۔ ہمارے نزدیک 'اللّات' 'اَلْاِلٰهَة' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جس طرح معبودِ اعظم کے لیے 'اللہ' تھا اسی طرح بڑی دیوی کے لیے انھوں نے 'اَلْاِلٰهَة' اختیار کیا جس کو عوام نے اپنے کثرتِ استعمال سے 'اللّات' بنا دیا۔ بعض لوگوں نے اس کو 'لَتٌّ' کے مادہ سے لیا ہے جس کے معنی گوندھنے اور لت کرنے کے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ یہ ایک شخص تھا جو زمانۂ حج میں حاجیوں کو ستو گھول کر پلایا کرتا تھا۔ اس کے

مرنے کے بعد لوگوں نے اس کی قبر کی پوجا شروع کر دی اور اس نام سے وہ ایک معبود بن گیا۔ یہ رائے اشتقاق کے قاعدے کی رو سے بھی غلط ہے اور قرآن کی تصریحات کے بھی خلاف ہے۔ قرآن کے بیان سے یہ بات واضح ہے کہ یہ دیویوں کے بت تھے اور یہ دیویاں فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ کر بنائی گئی تھیں۔

'عزّٰی' ظاہر ہے کہ عزیز اور اَعَزّ کی مؤنث ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں 'عزیز' ایک نمایاں صفت ہے جو اس کی عزت و عظمت کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی پہلو سے اس دیوی کے لیے 'عزّٰی' کا نام اختیار کیا گیا۔

'منات' میرے نزدیک 'مُنیۃ' کے مادہ سے بنایا ہوا نام ہے جس کے معنی ہوں گے وہ دیوی جس کے قرب کی آرزو کی جائے یا جو آرزوؤں کے بر آنے کا ذریعہ ہو۔

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (۲۱-۲۲)

ستم بالائے ستم: ان فقروں کا اسلوب طنز یہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے لیے تو لڑکے پسند کرتے ہو اور لڑکیوں سے اس درجہ نفرت کرتے ہو کہ جس کے ہاں لڑکی پیدا ہو جائے وہ شرم سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، تو جب لڑکیوں سے متعلق تمہارے احساسات یہ ہیں تو کم از کم اپنے رب پر اتنا کرم تو کیا ہوتا کہ جس چیز کو اپنے لیے اس درجہ ناپسند کرتے ہو وہ اس کی گود میں نہ ڈالتے! آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ پیدا تو ہر چیز اللہ نے کی لیکن بیٹیاں تم اس کے حصے میں ڈالو اور بیٹے اپنے حصہ میں۔ یہ تقسیم تو نہایت غیر منصفانہ اور بھونڈی تقسیم ہوئی! عدل و انصاف کا بدیہی تقاضا تو یہ تھا کہ جو چیز تم اپنے لیے ناپسند کرتے اس کو اپنے رب سے منسوب نہ کرتے۔

'ضیزٰی' کے معنی ہیں عدل و انصاف سے ہٹا ہوا معاملہ۔ 'ضَازَہٗ' کے معنی ہوں گے ظلمہٗ اس نے اس کے اوپر ظلم کیا، اس کے ساتھ ناانصافی کی۔

مطلب یہ ہے کہ اول تو خدا سے بیٹے بیٹیاں منسوب کرنا ہی اس کی شانِ الوہیت کے بالکل منافی اور عقل و فطرت کے بالکل خلاف ہے لیکن تم نے ستم پر ستم یہ کیا ہے کہ اس سے منسوب وہ چیز کی ہے جس کو خود اپنے لیے شرم کی چیز خیال کرتے ہو گویا اللہ کا مرتبہ تمہارے نزدیک تم سے بھی فروتر ہے۔

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَاۗءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (۲۳)

نام جن کا کوئی مسمّٰی نہیں ہے: یہ ان دیویوں کی حقیقت واضح فرمائی کہ یہ محض تمہارے اور تمہارے باپ دادا کے رکھے ہوئے نام ہیں جن کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں ہے۔ 'مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ' ان کے حق میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری جو تم اپنی تائید میں پیش کر سکو۔ اگر تم نے اپنے باپ دادا کو ان کو پوجتے پایا تو یہ بھی کوئی دلیل نہیں ہوئی۔ انھوں نے بھی اسی طرح اپنے اگلوں کی اندھی تقلید کی جس طرح تم کر رہے ہو۔ خدا کی اتاری ہوئی دلیل ہو سکتی تھی تو یہ کہ تمہاری عقل و فطرت میں ان کے لیے کوئی گواہی موجود ہوتی یا آفاق و انفس کے دلائل سے

ان کی تائید ہوتی یا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے یہ خبر دی ہوتی کہ فلاں اور فلاں میری چہیتی بیٹیاں ہیں، میں ان کی سفارش لازماً قبول کروں گا اور ان کی پرستش کرنے والوں کو ضرور بخش دوں گا۔ جب اس طرح کی کوئی چیز بھی ان کے حق میں موجود نہیں ہے تو یہ محض تمھاری اور تمھارے باپ دادا کی اپنی گھڑی ہوئی دیویاں ہیں جن کا کوئی وجود نہیں ہے۔

اللہ کی ہدایت کے مقابل میں خواہشِ نفس کی پیروی

'اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَی الْاَنْفُسُ ج وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰی'۔ اوپر کے ٹکڑے میں اسلوبِ کلام خطاب کا تھا۔ اس میں اسلوب غائب کا ہو گیا ہے۔ یہ ان کی محرومی اور بدبختی پر ان کو ملامت اور ان کی ذہنی پستی پر اظہارِ افسوس ہے کہ اللہ نے تو ان کی رہنمائی کے لیے خاص اپنے پاس سے ہدایت اتاری لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کی جگہ اپنے گمان اور اپنے نفس کی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔

لفظ 'الھدیٰ' یہاں اس ہدایت کے لیے استعمال ہوا ہے جو قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی اور جس کی عظمت و طہارت کا ذکر تمہید کی آیتوں میں ہوا ہے۔ 'ظن' اور خواہشِ نفس کی پیروی یوں تو کسی حال میں بھی خطرے سے خالی نہیں ہے لیکن خدا کی ہدایت کے موجود ہوتے ان کی پیروی کرنا اپنے آپ کو پورے دن کی روشنی میں ہلاکت کے کھڈ میں گرانا ہے۔

ہر بدعت خواہش نفس سے وجود میں آتی ہے

'مَا تَهْوَی الْاَنْفُسُ' سے یہاں اشارہ خاص طور پر ان کی اس بدعتِ شرک کی طرف ہے جو زیرِ بحث ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر بدعت کی بنیاد انسان کے نفس کی کسی نہ کسی خواہش پر ہوتی ہے۔ جب انسان کا نفس کسی حقیقت کے تقاضے پورے کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا اور اس کا انکار بھی اس کے لیے آسان نہیں ہوتا تو وہ کوئی ایسی شکل اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ بظاہر اس کا انکار بھی نہ ہو اور اس کے اقرار سے جو بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان سے فرار کی کوئی آسان راہ بھی نکل آئے۔ آپ جس بدعت پر بھی غور کیجیے اس کی تہ میں خواہشِ نفس کا یہ خناس آپ کو چھپا ہوا ملے گا۔

ان دیویوں کے حق میں ظاہر ہے کہ کوئی عقلی یا نقلی دلیل موجود نہیں تھی، لیکن جزا اور سزا کی ہر خلش سے مامون کر دینے کے لیے شیطان نے ان مشرکین کو یہ فریب دیا کہ فرشتے خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں۔ خاص طور پر اس کی فلاں اور فلاں بیٹیاں اس کو بہت محبوب ہیں۔ وہ ان کی ہر بات سنتا اور مانتا ہے۔ اس کے حضور میں ان کی ہر سفارش تیر بہدف ہے اس وجہ سے جو ان کی جے پکاریں گے اور ان کے تھانوں پر قربانی پیش کر دیا کریں گے، ان کو وہ خدا سے سفارش کر کے، اس دنیا میں بھی رزق و اولاد سے بہرہ مند کرائیں گی اور اگر آخرت کا کوئی مرحلہ پیش آیا تو وہاں بھی ان کو بڑے درجے دلوائیں گی۔ دیکھیے دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کی کیسی آسان راہ نکل آئی اور آخرت کے حساب و کتاب اور جزا و سزا کا ہر خطرہ کیسی آسانی سے دور ہو گیا!

رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی

لیکن غور کیجیے کہ خواہشِ نفس کے سوا اور کیا چیز ہے جس پر اس ساری میتھالوجی (MYTHOLOGY) کی بنیاد ہو۔ نفس نے چاہا کہ خدا کے تقرب اور اس کی جنت کے حصول کی کوئی ایسی راہ نکل آئے جس میں اپنی کسی خواہش کی قربانی نہ دینی پڑے۔ شیطان نے یہ راہ نکال دی۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی ۝ۖ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰی (۲۴-۲۵)

خواہشیں حقائق کو نہیں بدل سکتیں

یہ اسی اوپر والی بات پر اظہارِ تعجب بھی ہے اور اس پر تبصرہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی خواہشوں اور تمناؤں کی رہنمائی میں اپنے جی کو خوش رکھنے کو جو فلسفہ چاہو بنا ڈالو لیکن ضروری نہیں ہے کہ تمھاری ہر تمنا اور خواہش پوری بھی ہو جائے۔ حقیقت اور خواہش میں بڑا فرق ہے۔ جب اصل حقیقت سامنے آئے گی تب دیکھو گے کہ تم جو خیالی محل تعمیر کرتے رہے ہو اس کی بنیاد ریت پر تھی۔ تمھارے یہ معبود ذرا بھی کسی کے کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ ہر ایک کو سابقہ اپنے اعمال سے پیش آئے گا۔ جس کے نیک اعمال کی میزان بھاری ہوگی وہ جنت میں جائے گا اور جس کی میزان ہلکی ہوگی وہ دوزخ میں جھونک دیا جائے گا، خواہ کوئی ہو۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ جس طرح مشرکین نے اپنے ان دیویوں دیوتاؤں کے بل پر بہت سی بے بنیاد تمنائیں اپنے دلوں میں پال رکھی تھیں اسی طرح یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں نے بھی اپنے دلوں میں بہت سی جھوٹی آرزوئیں پال رکھی ہیں جو محض خواہشِ نفس کی ایجاد سے وجود میں آئی ہیں۔ یہود اور نصاریٰ کی ان بے بنیاد آرزوؤں کی، جس کو قرآن نے 'اَمَانِیّ' سے تعبیر کیا ہے، تفصیل سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران کی تفسیر میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ مسلمانوں نے ان کی تقلید میں جو عقیدے کتاب و سنت کے بالکل خلاف ایجاد کیے ہیں ان پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتابوں —— حقیقتِ شرک اور حقیقتِ توحید —— میں کی ہے۔ قرآن نے اس آیت میں لفظ 'انسان' سے خطاب کر کے گویا بلا استثنا سب کو آگاہی دی ہے کہ آرزوئیں اور تمنائیں جس کا جو جی چاہے پال رکھے لیکن یاد رکھے کہ کسی کی آرزوؤں کی خاطر نہ حقائق میں کوئی تبدیلی ہوگی اور نہ خدا کا قانون ہر موکسی کی جانب داری کرے گا۔

'فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰی' یعنی اگر کوئی اس طمعِ خام میں مبتلا ہے کہ کسی کی خواہشوں کی خاطر خدا کی کسی سنت یا اس کے کسی قانون میں کوئی تبدیلی ہو جائے گی تو وہ اچھی طرح کان کھول کر سن لے کہ دنیا اور آخرت دونوں کلیتہً خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔ کسی کا بھی یہ مرتبہ نہیں کہ اس کے اذن کے بدون کوئی سفارش کر سکے یا اس کے کسی قانون یا فیصلہ کو تبدیل کرا سکے۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (۲۶)

فرشتوں کی شفاعت بھی اذنِ الٰہی پر منحصر

یہ اسی اوپر والے ٹکڑے کی مزید وضاحت ہے کہ ان مشرکین کی ان دیویوں کا تو کیا ذکر آسمانوں میں

کتنے ہی فرشتے، بڑے اور چھوٹے، موجود ہیں جن کی شفاعت ذرا بھی کسی کے کام آنے والی نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ ان میں سے کسی کو کسی کے باب میں شفاعت کی اجازت دے۔ اول تو کوئی خدا کے اذن کے بغیر زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرے گا اور جو اذن کے بعد زبان کھولے گا بھی تو صرف اسی کے باب میں کھولے گا جس کے لیے خدا یہ پسند فرمائے کہ اس کی سفارش کی جائے۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيُسَمُّونَ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنْثَىٰ (۲۷)

شرک کی دیومالا کے مصنفین

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ کون لوگ ہیں جنھوں نے یہ ساری دیومالا گھڑی ہے۔ فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں اس کو مانتے بھی ہیں تو اس کی اصل حقیقت، یعنی اس بات پر ان کا ایمان نہیں ہے کہ وہ دن خدا کے کامل عدل کے ظہور کا دن ہوگا اور ہر ایک ٹھیک اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔ فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جنھوں نے فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ کر یہ دیومالا تصنیف کی ہے کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں، انھی کی سفارش سے اس دنیا کی نعمتیں بھی حاصل ہوتی ہیں اور اگر آخرت ہوئی تو یہی اس دن بھی ہمارا مرجع بنیں گی اور یہیں وہ سب کچھ دلوائیں گی جو ہم چاہیں گے۔

وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۲۸)

شرک کی تمام تر بنیاد ظن پر ہے

فرمایا کہ آخرت کی ذمہ داریوں سے اپنے کو بچانے کے لیے انھوں نے یہ افسانہ ایجاد تو کر ڈالا لیکن اس کی بنیاد کسی علم پر نہیں بلکہ محض ظن پر ہے۔ محض اپنی خواہش نفس کو حقیقت بنانے کے لیے یہ اٹکل کے تیر تکے چلائے گئے ہیں۔ ان نادانوں کو خبر نہیں کہ اٹکل بہرحال اٹکل ہے، یہ حق و حقیقت کا بدل کسی درجے میں نہیں ہو سکتی۔ جب حقیقت ظاہر ہوگی تب ان کو پتہ چلے گا کہ یہ عمر بھر محض خواب دیکھتے رہے ہیں۔

ظن اور علم میں فرق

لفظ 'ظن' آیت ۲۳ میں 'الھدیٰ' کے مقابل میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں یہ 'علم' کے مقابل کی حیثیت سے بھی استعمال ہوا ہے اور 'حق' کے مقابل کی حیثیت سے بھی۔ علم انسان کو اس کی فطرت اور عقل کی راہ سے بھی حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی سے بھی۔ جو علم اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے وہ دراصل 'الھدیٰ' کا درجہ رکھتا ہے اس لیے کہ وہ ہر شبہ سے بالا ہوتا ہے چنانچہ یہاں اس کو حق سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جس بات کے حق میں نہ فطرت اور عقل کی گواہی موجود ہو نہ وحی کی شہادت وہ سرتاسر ظن ہے اور یہ بالکل باطل ہے۔ قرآن نے یہاں 'وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ' فرما کر ان مشرکین کے اس ساری دیومالا کو علم کے ہر سہارے سے محروم، ایک بالکل من گھڑت افسانہ قرار دیا ہے۔ یعنی نہ اس کی تائید میں ان کے پاس عقل کی کوئی دلیل ہے اور نہ وحی کی۔ اہل عرب اس حقیقت سے اچھی

طرح واقف ہے کہ جس بات کے حق میں کوئی دلیل نہ ہو وہ علم نہیں بلکہ ظن ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔
ایک شاعر نے 'ظن' اور 'علم' کے اس فرق کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

'واعلم علمًا لیس بالظن انہ'

(اور میں ایک علم پر مبنی بات جانتا ہوں جو ظن نہیں کہ ....)

لفظ 'ظن' کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کی وضاحت ان شاء اللہ ہم آیت 'اِنِّیۡ ظَنَنۡتُ اَنِّیۡ مُلٰقٍ حِسَابِیَهۡ' (الحاقۃ: ۲۰) کے تحت کریں گے۔

فَاَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰی ۬ۙ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَ لَمۡ یُرِدۡ اِلَّا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا (۲۹)

ہدایت سے اعراض کرنے والوں سے اعراض کی ہدایت

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ ایسے سرپھرے ہیں کہ اللہ کی ہدایت کے مقابل میں اپنی ہوائے نفس کی، علم کے مقابل میں ظن کی اور حق کے مقابل میں باطل کی پیروی کرنا چاہتے ہیں، تم ان کے زیادہ درپے نہ ہو۔ جب انھوں نے ہماری یاددہانی سے منہ پھیر لیا تو تم بھی ان سے اعراض کرو۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب ذمہ داری ان کی ہے۔ یہ اس کا انجام خود دیکھیں گے۔

'ذکر' سے مراد یہاں قرآن مجید ہے۔ یہ لفظ قرآن کے لیے جگہ جگہ استعمال ہوا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کی طرف ہم مختلف مقامات میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں یہ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ قرآن ان لوگوں کو آخرت اور اس کی ذمہ داریوں کی یاددہانی کر رہا ہے جو چند فرضی دیویوں کی سفارش کے بل پر اس سے بالکل نچنت بیٹھے ہیں۔

'وَلَمۡ یُرِدۡ اِلَّا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا' یہ ان کے اس اعراض کی اصل علت کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا مقصود صرف اس دنیا اور اس کی مرغوبات کو بنا لیا ہے۔ ان سے ہٹ کر کسی اور چیز پر غور کرنے کا حوصلہ ان کے اندر نہیں ہے۔

ذٰلِکَ مَبۡلَغُہُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ۙ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اہۡتَدٰی (۳۰)

دنیا پرستوں کی تنگ نگاہی

یعنی ان لوگوں کے علم کی رسائی بس اس دنیا کے ظاہر ہی تک ہے، اس ظاہر کے پیچھے جو حقیقت پوشیدہ ہے اس تک ان کی رسائی نہ ہے اور نہ یہ اس کے طالب ہیں۔ حالانکہ اصل چیز وہی ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو یہ دنیا ایک اندھیر نگری اور ایک بازیچۂ اطفال بن کے رہ جاتی ہے۔ حالانکہ اس کے ہر گوشے سے اس کے خالق کی قدرت و حکمت ایسی واضح ہے کہ ایک ملحد کے سوا کوئی اس کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا اور ایک قدیر و حکیم ذات سے یہ بات بعید ہے کہ وہ اتنا بڑا کارخانہ محض ایک کھیل کے طور پر بنا ڈالے۔

'ذٰلِکَ مَبۡلَغُہُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ' کے اسلوب بیان سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ یہ محض ان کی تنگ نظری اور تنک ظرفی ہے کہ یہ اس کے ظاہر پر ریجھ کر اس کے باطن سے بے پروا ہو بیٹھے حالانکہ اس کی تمام ظاہری رونقیں

عارضی اور فانی ہیں۔ اصل ابدی بادشاہی تو اس کے پیچھے ہے جس کے لیے قرآن ان کو دعوت دے رہا ہے لیکن یہ اپنی پست ہمتی اور محرومی کے سبب سے اس کا حوصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ اس پہلو کی وضاحت 'یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا' (الروم: ۷) والی آیت میں ہوئی ہے۔

'اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ لا وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰی'۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور ان سرگشتگانِ دنیا کو تہدید و وعید ہے۔ حضورؐ کو خطاب کر کے ارشاد ہے کہ تم اب ان کو نظر انداز کرو۔ تمہارا رب ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور ان سے بھی اچھی طرح باخبر ہے جنھوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ اس کا علم سب کو محیط اور اس کی قدرت سب پر حاوی ہے۔ نہ وہ لوگ اس کی پکڑ سے بچ سکیں گے جو اس کی راہ سے برگشتہ ہیں اور نہ وہ لوگ اس کی نصرت و رحمت سے محروم رہیں گے جو اس کی راہ میں ہر قسم کے آلام کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ دنیا پرستوں کو تہدید

۴۔ آگے آیات ۳۱-۵۵ کا مضمون

آگے اسی مضمون کو جو اوپر والے پیرے میں بیان ہوا ہے مزید واضح اور مؤکد فرمایا ہے۔

پہلے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اللہ وحدہٗ لا شریک ہی کے قبضہ میں ہے۔ تمہارے مزعومہ دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کو بھی اس نے اپنا شریک نہیں بنایا ہے کہ وہ اس کے عدل و انصاف پر اثر انداز ہو سکے، چنانچہ وہ لازماً ان لوگوں کو سزا دے گا جو گناہوں کے مرتکب ہوں گے اور ان لوگوں کو صلہ دے گا جو نیکی کی زندگی بسر کریں گے۔ رہے وہ لوگ جو اپنے سفارشیوں یا اپنے حسب و نسب یا بزرگوں کے ساتھ اپنی نسبت کے بل پر یا حرم اور حجاج کی چند ظاہری خدمتیں انجام دے کر اپنے منہ میاں مٹھو بنے پھر رہے اور اپنے آپ کو جنت کا پیدائشی حق دار سمجھ رہے ہیں، ان سب کو خدا جہنم میں بھر دے گا۔ اس کی پکڑ سے صرف وہی بچیں گے جو کھلی ہوئی حق تلفیوں اور بے حیائیوں سے بچتے رہیں گے۔ اس طرح کے لوگوں سے اگر کوئی برائی وقتی طور پر صادر ہو جائے گی تو توبہ و اصلاح کے بعد اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا۔ اس کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔ جو لوگ اپنی برتری اور تقدس کے زعم میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں، اللہ تعالیٰ ان پر ہاتھ نہیں ڈالے گا، انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ جانتا ہے کہ ان کی خلقت کس چیز سے ہوئی ہے۔ مٹی، کیچڑ اور نجس پانی کی بوند سے پیدا ہوئی مخلوق کو اپنی پاک دامنی اور برتری کی حکایت زیادہ نہیں بڑھانی چاہیے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی بر خود غلطی پر تعجب کیا ہے جو خدا کی راہ میں دینے دلانے کا تو کوئی حوصلہ نہیں رکھتے لیکن ابراہیمؑ و موسیٰؑ سے نسبت رکھنے کے زعم میں یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ آخرت میں ان کے

لیے اونچے اونچے مراتب محفوظ ہیں حالانکہ ابراہیمؑ و موسیٰؑ کی تعلیمات میں سب سے زیادہ نمایاں تعلیم یہی ہے کہ آخرت میں کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، بلکہ ہر ایک کے آگے اس کی اپنی کمائی ہی آئے گی۔

اس کے بعد یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ خوشی اور غم، زندگی اور موت، رزق اور اولاد، غنیٰ اور فقر سب خدا ہی کے اختیار میں ہے اس وجہ سے ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ جن لوگوں نے موسم بہار میں طلوع ہونے والے شِعریٰ کو معبود بنا رکھا ہے کہ بہار کی رونقیں اس کی بخشش سے حاصل ہوتی ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شِعریٰ کا رب بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اس کے بعد پچھلی قوموں کا بالاجمال حوالہ دے کر قریش کو تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ قومیں بھی انہی گمراہیوں میں مبتلا ہوئیں جن میں تم مبتلا ہو تو ان کے انجام اور ان کی تاریخ سے سبق حاصل کرو اور خدا کے غضب کو دعوت نہ دو ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۱-۵۵ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ
اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿۳۱﴾
اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ
وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ
وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ
ع ۲ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ وَاَعْطٰى
قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿۳۴﴾ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾ اَمْ
لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ﴿۳۷﴾
اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا
سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ
الْاَوْفٰى ﴿۴۱﴾ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ
وَاَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ

الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ وَاَنَّ عَلَيْهِ
النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَاَنَّهٗ
هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾ وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا ۨ الْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾ وَثَمُوْدَاۡ فَمَآ
اَبْقٰى ﴿۵۱﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ
اَطْغٰى ﴿۵۲﴾ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ
اٰلَاۗءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾

ترجمۂ آیات ۳۱-۵۵

اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے کہ وہ بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے بُرے کام کیے ہیں ان کے کیے کا اور بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے اچھے کام کیے ہیں اچھا۔ یعنی ان لوگوں کو جو بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے بچتے رہے مگر یہ کہ کبھی کسی برائی پر پاؤں پڑ گئے۔ سو تیرے رب کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔ وہ تم کو خوب جانتا ہے جب کہ اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور جب کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں رہے۔ تو اپنے کو پاکیزہ نہ ٹھہراؤ۔ وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے۔ ۳۱-۳۲

بھلا اس کو دیکھا جس نے اعراض کیا، تھوڑا سا دیا پھر رک گیا۔ کیا اس کے پاس علمِ غیب ہے پس وہ دیکھ رہا ہے۔ کیا اس کو خبر نہیں ملی اس بات کی جو موسٰی اور ابراہیم کے، جس نے اپنے قول پورے کر دکھائے، صحیفوں میں ہے کہ کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی اور یہ کہ انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کمائی کی ہو گی اور یہ کہ اس کی کمائی عنقریب ملاحظہ کی جائے گی، پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور یہ کہ سب کا

منتہی تیرے رب ہی کی طرف ہے۔ ۴۲-۴۴

اور بے شک وہی ہے جو ہنساتا اور رلاتا ہے اور وہی ہے جو مارتا اور زندہ کرتا ہے اور وہی ہے جس نے جوڑے کے دونوں فرد، نر اور ناری پیدا کیے ایک بوند سے جب کہ وہ ٹپکا دی جاتی ہے اور بے شک دوبارہ اٹھانا اس کی ذمہ داری ہے اور اسی نے غنی اور سرمایہ دار کیا اور وہی شعریٰ کا بھی رب ہے۔ ۴۳-۴۹

اور اسی نے ہلاک کیا عادِ اوّل کو اور ثمود کو بھی، پس کسی کو بھی باقی نہ چھوڑا اور قومِ نوح کو بھی ان سے پہلے۔ بے شک وہ نہایت ظالم اور سرکش تھے اور الٹی ہوئی بستیوں کو بھی دے مارا، پس اُن کو ڈھانک لیا جس چیز نے ڈھانک لیا تو تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کے باب میں جھگڑتے رہو گے۔ ۵۰-۵۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (۳۱)

خدا کی بادشاہی میں کسی کی حصہ داری نہیں

اوپر کی آیات میں شرک و شفاعت کی جو تردید فرمائی ہے یہ اس کا نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ کسی اور کی حصہ داری ان کے اندر نہیں ہے کہ وہ خدا کے اقتدار کو چیلنج کر سکے یا اس کی مشیت میں کوئی مداخلت کر سکے یا اس کے ارادوں اور فیصلوں پر کسی پہلو سے اثر انداز ہو سکے۔

'لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ ..... الاية' یہ 'ل' بیانِ علت کے لیے نہیں بلکہ بیانِ نتیجہ کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تنہا وہی مالک و مختار ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ اپنے مزعومہ شرکاء اور سفارشیوں کے اعتماد پر میٹھی نیند سو رہے ہیں وہ محض فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ عادل و حکیم ہے، وہ ان لوگوں کو ضرور سزا دے گا جو گناہوں کے مرتکب ہوں گے اور کوئی نہیں ہے جو ان کو خدا کی پکڑ سے بچا سکے۔ اسی طرح لازماً وہ ان لوگوں کو، جنھوں نے نیکی اور نیکوکاری کی زندگی گزاری ہو گی، نہایت

ہی اچھا صلہ عطا فرمائے گا اور اس صلہ کے حصول کے لیے انھیں کسی دوسرے کی سفارش کی مطلق ضرورت نہیں ہوگی۔

اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ بروں کے سامنے تو صرف ان کے برے اعمال کی حقیقت آئے گی، جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا وہ بے کم و کاست ان کے سامنے رکھ دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس پر کوئی اضافہ نہیں کرے گا لیکن نیکوں کو صرف ان کی نیکیوں کا صلہ ہی نہیں ملے گا بلکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام بھی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ عادل ہے اس وجہ سے وہ کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کرے گا لیکن وہ صاحبِ جود و فضل بھی ہے اس وجہ سے اپنے نیک بندوں کو ان کے حق سے زیادہ بھی بخشے گا۔

اَلَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَ الۡفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّکَ وَاسِعُ الۡمَغۡفِرَۃِ ؕ هُوَ اَعۡلَمُ بِکُمۡ اِذۡ اَنۡشَاَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ وَ اِذۡ اَنۡتُمۡ اَجِنَّۃٌ فِیۡ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِکُمۡ ۚ فَلَا تُزَکُّوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ؕ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی (۳۲)

انسان سے اللہ تعالیٰ کا اصل مطالبہ

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیک وہ ہیں جو بڑے گناہوں اور کھلی ہوئی بے حیائیوں سے بچنے والے ہیں۔ ان سے اگر کوئی برائی صادر ہوتی ہے تو اس کی نوعیت بس یہ ہوتی ہے کہ گویا چلتے چلتے کسی گندگی پر پاؤں پڑ گئے۔ وہ کبھی ٹھوکر کھا کر کسی گناہ میں مبتلا تو ہو جاتے ہیں لیکن جس طرح کوئی صفائی پسند کسی گندگی پر اپنا بستر نہیں ڈال دیتا بلکہ جلد سے جلد اس سے دور ہونے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح یہ بھی یہ نہیں کرتے کہ اس گناہ ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیں، جلد سے جلد توبہ و اصلاح کے ذریعے سے اس سے پاک ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

'الماما' اور 'لمم' کے اصل معنی کسی جگہ ذرا دیر کے لیے اتر پڑنے کے ہیں۔ مجاہد اور ابن عباس سے 'لمم' کا مفہوم یہ نقل ہوا ہے کہ آدمی کسی گناہ میں آلودہ تو ہو جائے لیکن پھر اس سے کنارہ کش ہو جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ وہ معصوم بن کر زندگی گزارے۔ جذبات اور خواہشوں سے مغلوب ہو کر گناہ کا مرتکب ہو جانا اس سے بعید نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ اس سے ضرور ہے کہ اس کی حسِ ایمانی اتنی بیدار رہے کہ کوئی گناہ اس کی زندگی کا اس طرح احاطہ نہ کرلے کہ اس کے لیے اس سے پیچھا چھڑانا ہی ناممکن ہو جائے بلکہ جب بھی اس کا نفس اس کو ٹھوکر کھلائے وہ متنبہ ہوتے ہی توبہ کر کے اپنی اصلاح کرلے۔ جو لوگ اس طرح زندگی گزارتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ اس کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔

سورۂ نساء میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے

اِنَّمَا التَّوۡبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوۡبُوۡنَ	اللہ پر صرف ان کی توبہ کی قبولیت کی ذمہ داری ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر برائی کر بیٹھتے

مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (النساء ۴: ۱۷-۱۸)

ہیں پھر جلدی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور ایسے لوگوں کی توبہ، توبہ نہیں ہے جو برائی کرتے رہے یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوئی تو وہ بولا کہ اب میں نے توبہ کی اور ان لوگوں کی بھی توبہ نہیں ہے جو کفر ہی کی حالت میں مرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

'کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ' میں 'اثم' سے مراد وہ گناہ ہیں جن کا تعلق غصبِ حقوق اور ظلم و تعدی سے ہے اور 'فَاحِشَۃ' سے مراد کھلی ہوئی بے حیائیاں اور بدکاریاں ہیں۔ 'کبائر' سے بچنے کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صغائر پر کوئی گرفت نہیں ہے بلکہ اس میں حکمت، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، یہ ہے کہ جو لوگ کبائر سے بچتے ہیں ان کی حسِ ایمانی اتنی قوی ہو جاتی ہے کہ وہ صغائر کے ارتکاب پر کبھی راضی نہیں ہوتے۔ جو ہزاروں کی امانت ادا کرتا ہے وہ کسی کے دھیلے پیسے میں خیانت کر کے خائن کہلانے پر کس طرح راضی ہو گا!

ان لوگوں کو تنبیہ جو ایمان و عمل کے بغیر جنت کے خواب دیکھ رہے ہیں

یہ تنبیہ ہے ان لوگوں کو جو ہر قسم کی برائیوں اور بے حیائیوں میں لت پت تھے لیکن اپنے مزعومہ شرکاء کی شفاعت، اپنے آباؤ اجداد کی بزرگی اور اپنے حسب و نسب کی برتری کے بل پر جنت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ایمان اور عمل صالح ہے نہ کہ یہ جھوٹے سہارے۔

پیچھے ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ قریش اور اہل کتاب سب اسی قسم کے کسی نہ کسی وہم میں مبتلا رہے ہیں۔ قریش کو دیویوں دیوتاؤں کے سوا اپنے اولادِ ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) اور پاسبانِ حرم ہونے پر بھی بڑا ناز تھا۔ ان کے اسی ناز پر ان کو 'اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ...' (التوبۃ - ۹: ۱۹) والی آیت میں تنبیہ فرمائی گئی کہ حاجیوں کو پانی پلا دینا اور خانۂ کعبہ کی کچھ دیکھ بھال کر دینا نیکی ہے لیکن یہ وہ نیکی نہیں ہے جو ایمان و عمل صالح کی قائم مقام اور تمہارے دوسرے جرائم کے لیے پردہ پوش بن سکے۔ اسی طرح اہل کتاب کو یہ غرّہ تھا کہ وہ برگزیدہ امت اور ابراہیم و اسحاق علیہما السلام جیسے بزرگ نبیوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے دوزخ کی آگ ان پر حرام ہے۔ دوزخ میں اول تو وہ ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر کسی کو ڈالا بھی گیا تو صرف چند دنوں کے لیے۔ ابدی عذاب ان کے لیے بہر حال نہیں ہے۔ یہ چیز صرف دوسری قوموں کے لیے مخصوص ہے۔ ان کے اسی غرور پر سیدنا مسیحؑ نے ان کو سرزنش فرمائی کہ اولادِ ابراہیم (علیہ السلام) ہونے پر

ناز نہ کرو، میرا رب چاہے گا تو ان پتھروں سے ابراہیمؑ کے لیے اولاد پیدا کرے گا۔ انہی یہود کی پیروی ان کے بعد مسلمانوں نے کی اور اپنے کو امتِ مرحومہ قرار دے کر ایمان و عمل کی ساری ذمہ داریوں سے بری کر لیا۔ یہاں تک کہ ان کے اندر کتنے خاندان ہیں جن میں پیدا ہو جانا ہی جنت کی ضمانت ہے۔ اور کتنے قبرستان ہیں جن میں دفن ہونا ہی ابدی بادشاہی کی بشارت ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ پیدا ہونے والے اور مرنے والے کے عقائد و اعمال کیا رہے ہیں!

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔ اس زمین کے سارے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے یہ تنبیہ فرمائی جا رہی ہے کہ اپنی پاک دامنی کی حکایت زیادہ نہ بڑھاؤ، اور اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اس دور کو بھی سب سے زیادہ جانتا ہے جب اس نے زمین سے تم کو پیدا کیا اور اس دور کو بھی جانتا ہے جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی صورت میں رہے۔ مطلب یہ ہے کہ پانی، کیچڑ اور مٹی سے وجود میں آنے والی مخلوق، اور پھر ذلیل پانی کی ایک بوند سے رحمِ مادر کے اندر پرورش پانے والی ہستی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ بجائے خود اپنے وجود ہی کو بڑے سے بڑے مرتبہ کا مستحق سمجھ بیٹھے اور نیکی و تقویٰ کی راہ میں کسی جدوجہد کی ضرورت سے مستغنی ہو جائے۔ اس کا وجود، ہر شخص جانتا ہے کہ نہایت حقیر عنصر سے ہوا ہے اور اس کی ابتدائی پرورش رحمِ مادر کی تنگنائے میں ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مجرّد وجود کی بنیاد پر تو اس کو کسی خاص شرف کے حاصل ہونے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ اس کو شرف حاصل ہو سکتا ہے تو تقویٰ اور دین کی بنیاد پر ہو سکتا ہے اور اس چیز سے سب سے زیادہ واقف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہی اپنی میزان میں تول کر جس کو جس مرتبہ کا مستحق پائے گا اس پر سرفراز فرمائے گا۔ اس میزان کے فیصلہ سے پہلے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی عالی مقامی کی منادی کرتا پھرے۔ یہ مضمون سورۂ معارج کی آیات ۳۸-۳۹ میں بھی آئے گا، وہاں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت ہو گی۔

وحدۃ الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کی برخود غلطی

اس آیت میں انسان کے وجود کا جس حقارت آمیز انداز میں ذکر فرمایا گیا ہے اس پر بھی نگاہ رہے اور فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ میں اس کے دعوائے پاکی و برتری پر جو طنز ہے وہ بھی پیشِ نظر رہے۔ پھر غور کیجیے اپنے ان صوفیوں کے عقیدۂ وحدت الوجود پر جو مدعی ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ ہی کا ایک جزو ہے، جو بالآخر اپنے کُل میں مل جائے گا اور اس طرح قطرہ سمندر میں مل کر سمندر بن جائے گا۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ ہی کا ایک جزو ہے تو کیا اللہ تعالیٰ نے العیاذ باللہ اپنے ہی وجود کے ایک جزو کا اس حقارت آمیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

پھر اس بات پر بھی غور کیجیے کہ مجرّد وجود کی بنا پر کسی دعوائے برتری و پاکی کو قرآن نے اپنے

منہ میاں مٹھو بننے سے تعبیر فرمایا ہے لیکن صوفی حضرات بنکارتے ہیں کہ 'سبحانی ما اعظم شانی' (میں پاک ہوں، ہر عیب سے پاک! کیا کہنے ہیں میری عظمت کے! میری شان بڑی عظیم ہے!!) کیا کوئی انسان جس کے اندر ایمان کی رمق بھی ہو اپنی ذات کے بارے میں یہ فرعونی دعویٰ کر سکتا ہے؟ لیکن صوفیوں نے، چونکہ قرآن و حدیث کی جگہ باطنیہ، روافض اور برہمنوں سے رہنمائی حاصل کی ہے اس وجہ سے، ان فتنوں کو اسلام میں لا گھسایا اور آج کتنے کم سواد ہیں جو ان فقروں کو دہراتے ہیں حالانکہ وہ ان کے معنی سے بالکل بے خبر ہیں۔

أَفَرَءَيْتَ الَّذِي تَوَلَّىٰ ۝ وَأَعْطَىٰ قَلِيلًا وَأَكْدَىٰ ۝ أَعِندَهُۥ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرَىٰ (۳۳-۳۵)

معرفت کی جنت کے خواب دیکھنے والوں کی تمثیل

یہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے کردار کو ممثل کر کے پیش کیا ہے جو اس کی راہ میں دینے دلانے کا تو کوئی حوصلہ نہیں رکھتے اور کبھی کچھ دیتے بھی ہیں تو بس چھدا اتارنے کے لیے لیکن اپنے لیے اس کے ہاں بڑے اونچے اونچے مرتبوں کے مدعی ہیں۔ فرمایا کہ کیا ان کے پاس علم غیب کی دوربین ہے کہ وہ اس کی مدد سے ان مراتب و مقامات کو دیکھ رہے ہیں جو ان کے لیے محفوظ ہیں۔

'الَّذِي' سے ہمارے مفسرین نے عام طور پر قریش کے ایک سردار ولید بن مغیرہ کو مراد لیا ہے۔ اس سے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن اس کے ایک ساتھی کو جب اس کے ارادے کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس سے کہا کہ اگر تم آخرت کے ڈر سے اسلام لانا چاہتے ہو تو اس سے بے فکر رہو۔ اگر تم مجھے اتنی رقم دے دو تو آخرت کے خطرے سے تم کو بچانے کا ذمہ دار میں ہوں۔ ولید نے اس کی اطمینان دہانی کے بعد اسلام لانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس کو مطلوبہ رقم دینے کا وعدہ کر لیا لیکن بعد میں اس کو تھوڑی سی رقم دے کر باقی رقم دینے سے مکر گیا۔

یہ واقعہ اگرچہ تمام مفسرین نے بیان کیا ہے لیکن اوّل تو روایت ہی کے اعتبار سے اس کا کوئی درجہ نہیں، دوسرے یہ کہ اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہے تو اس کا تعلق کسی پہلو سے بھی ان آیات سے سمجھ میں نہیں آیا۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ ولید نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو کیا قرآن نے یہاں اس بات پر اس کو ملامت کی ہے کہ اس نے اپنا وعدہ کیوں نہیں پورا کیا!

اصل یہ ہے کہ 'الَّذِي' چونکہ عام طور پر معرفہ کے لیے آتا ہے اس وجہ سے ہمارے مفسرین جہاں کہیں 'الَّذِي' یا 'الَّتِي' دیکھ پاتے ہیں تو ان کو تلاش کسی خاص شخص کی ہوتی ہے جس پر اس کو منطبق کر سکیں۔ اس کوشش میں انھیں لازماً کوئی نہ کوئی واقعہ بھی بنانا پڑتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی بے تکا اور کلام کے موقع و محل سے کتنا ہی بے جوڑ ہو۔

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ مثالیں پیش کرتے آ رہے ہیں کہ 'الَّذِي' یا 'الَّتِي' ہر جگہ کسی خاص مرد یا کسی

معین عورت ہی کے لیے نہیں آتے بلکہ بعض مواقع میں تمثیل کے لیے بھی آتے ہیں یعنی مقصود تو کسی گروہ یا جماعت کے مجموعی کردار کو پیش کرنا ہوتا ہے لیکن وہ پیش اس طرح کیا جاتا ہے کہ گویا لوگوں کے سامنے اس کو ایک خاص شکل میں متشکل کر دیا گیا۔ ہم پچھلی مثالوں میں سے یہاں ایک مثال کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ سورۂ نحل آیت ۹۲ میں یہود کو تنبیہ فرمائی گئی ہے: 'وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا' کہ اس بڑھیا کی مانند نہ بن جاؤ جس نے اپنا سارا کاتا ہوا، اچھی طرح محکم کرنے کے بعد، ادھیڑ کے رکھ دیا۔ یہاں دیکھ لیجیے 'الَّتِي' آیا ہے لیکن اس سے کوئی معین بڑھیا مراد نہیں ہے کہ اس کے نام، خاندان، محلہ کا سراغ لگایا جائے اور اس بات کی تحقیق کی جائے کہ وہ کس طرح کاتتی اور کیوں اپنے کاتے ہوئے کو ادھیڑتی تھی۔ یہ ساری کاوشیں غیر ضروری ہیں اس لیے کہ یہاں اشارہ کسی معین بڑھیا کی طرف نہیں بلکہ ایک تمثیلی کردار کی طرف ہے۔

اسی طرح یہاں ان مشرکین کے سامنے جو اللہ کی راہ میں کچھ دینے دلانے کا حوصلہ تو نہیں رکھتے تھے لیکن اپنے زعمی معبودوں کی شفاعت اور اپنے خاندانی شرف کے زعم میں مدعی تھے کہ جس طرح دنیا میں وہ عالی مقام ہیں اسی طرح آخرت میں بھی، اگر وہ ہوئی، ان کے لیے مراتبِ عالیہ ہیں، ایک کردار تمثیل کی صورت میں رکھا گیا ہے جس کے آئینہ میں ولید بن مغیرہ بھی اپنی شکل دیکھ سکتا تھا، ابولہب بھی دیکھ سکتا تھا اور قریش کے وہ سارے اغنیاء و بخلاء بھی دیکھ سکتے تھے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ انفاق سن کر تو منہ پھیر لیتے لیکن مدعی تھے کہ جنت کی کنجیاں ان کے قبضہ میں ہیں۔

اسلوبِ کلام یہاں طنز و تحقیر کا ہے۔ یعنی ذرا ان لالفضولوں کو تو دیکھو جو خدا کی راہ میں کچھ خرچ کرنے سے تو جی چراتے ہیں، اگر ما شرمی میں کبھی کچھ دیتے بھی ہیں تو محض چھدّا اتارنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مدعی اپنے لیے اونچے اونچے درجوں کے ہیں، گویا ان کے لیے جنت میں جو سامانِ عیش مہیا ہے اس کو غیب کی عینک سے یہیں سے بیٹھے بٹھائے دیکھ رہے ہیں۔

بخیلوں کی عام روش — 'اَكْدٰى': 'اكدى الحافر' سے نکلا ہوا محاورہ ہے۔ 'اكدى الحافر' کا مفہوم یہ ہے کہ کھودنے والے کے آگے کھدائی کے وقت کوئی ایسی چٹان آگئی جس کو توڑنا اس کے لیے دشوار ہوگیا۔ یہ بخیلوں کی عام روش بیان ہوئی ہے کہ اگر مارے باندھے کبھی کچھ خرچ کرتے بھی ہیں تو تھوڑا سا خرچ کرتے ہی ان پر بخل کا ایسا دورہ پڑتا ہے کہ ان کی مٹھیاں بھنچ جاتی ہیں اور اگر کوئی ان کو اکسانے کی کوشش کرے تو وہ اس کا منہ نوچنے کو دوڑتے ہیں کہ کہاں تک خرچ کیے جاؤں، چلو ہٹو، میں تو ڈھیروں مال لٹا چکا ہوں۔ 'يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا' (البلد: ۶) والی آیت میں انہی بخیلوں کی تصویر ہے۔

أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ۝ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ ۝ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۳۶-۳۸)

قریش اور اہل کتاب دونوں کو ایک تنبیہ

یعنی یہ لوگ مفت میں، محض اپنے بزرگوں اور فرضی دیوتاؤں کی سفارش کے بل پر جنت کے خواب دیکھے جا رہے ہیں؛ کیا موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کے صحیفوں کی یہ تعلیم ان کو نہیں پہنچی کہ خدا کے ہاں کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں مخاطب اصلاً قریش اور ضمناً اہل کتاب ہیں۔ اہل کتاب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ، دونوں نبیوں کی پیروی کے مدعی تھے۔ اسی طرح قریش حضرت ابراہیمؑ کو اپنا خاندانی بزرگ بھی مانتے تھے اور دینی پیشوا بھی، اس وجہ سے ان دونوں جلیل القدر نبیوں کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ فرمایا۔

حضرت ابراہیمؑ کا ذکر یہاں 'اَلَّذِیْ وَفّٰی' کی صفت کے ساتھ ہوا ہے، یعنی وہ جس نے اپنے رب کے ہر حکم کی تعمیل کا حق ادا کر دیا، جس نے ہر عہد پورا کیا اور جو ہر امتحان میں صادق الوعد اور کامل العیار ثابت ہوا۔ دوسرے مقام میں ارشاد ہوا ہے: وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ (البقرۃ ۱۲۴) (یاد کرو، جب کہ ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں سے آزمایا تو اس نے وہ سب پوری کر دکھائیں)۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس صفت کی یاد دہانی میں قریش اور اہل کتاب دونوں کو تنبیہ ہے کہ ان کو دنیا اور آخرت میں جو مرتبۂ بلند ملا وہ اپنے رب کے ساتھ کامل وفاداری کے صلہ میں ملا اور تمہارا حال یہ ہے کہ کرنے کرانے کے تو کچھ نہیں لیکن ابراہیمؑ کے نام پر استخوان فروشی کی ایک دکان کھول رکھی ہے۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'صُحُف' کی اضافت حضرت ابراہیمؑ کی طرف بھی فرمائی ہے تو کیا حضرت ابراہیمؑ کا بھی کوئی صحیفہ تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصطلاحی مفہوم میں تو حضرت ابراہیمؑ کا کوئی صحیفہ نہیں تھا۔ ان کی تعلیمات زبانی تھیں جو بطریق روایت ان کی ذریت کی دونوں شاخوں میں نقل ہوتی رہیں۔ بنی اسرائیل میں یہ تعلیمات زیادہ روشن رہیں اس لیے کہ ان کے اندر برابر انبیاء آتے رہے۔ بنی اسمٰعیل امی تھے، اس وجہ سے ان کے اندر یہ دھندلی ہوتی چلی گئیں۔ بعد میں جب تورات مرتب ہوئی تو اس میں حضرت ابراہیمؑ کی تاریخ اور ان کی تعلیمات بھی جمع کر دی گئیں۔ ان میں یہود نے اگرچہ اپنے اغراض کے تحت بہت سی تحریف کر ڈالی جس کی طرف پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ہم اشارے کر چکے ہیں لیکن آپ کی بنیادی تعلیمات خاص طور پر وہ جن کا یہاں حوالہ ہے، اس میں موجود ہیں۔ اس وجہ سے اگر صحف ابراہیم سے وہ صحیفے مراد لیے جائیں جن میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات مذکور ہیں تو یہ نسبت بالکل صحیح ہوگی۔

ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں کی بنیادی تعلیم

'اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی' یہ اس تعلیم کا حوالہ ہے جو موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کے صحیفوں میں موجود ہے کہ خدا کے ہاں کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ یہ اسی شفاعتِ باطل کے تصور کی تردید ہے جو اس سورہ کا موضوع ہے۔ یہ تعلیم تورات اور انجیل دونوں میں اتنی کثرت سے بیان ہوئی ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ اتنی واضح ہدایات

کے باوجود ان کتابوں کے حاملین کو شیطان نے کس طرح شرک کے کھڈ میں گرا دیا۔ ہم ان کے حوالے اس کتاب میں جگہ جگہ نقل کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعۡیَہٗ سَوۡفَ یُرٰی ﴿۴۰﴾ ثُمَّ یُجۡزٰىہُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی ﴿۴۱﴾ (۳۹-۴۱)

یہ اسی اوپر والی بات کی شرح مزید ہے کہ یہ حقیقت بھی اس کے ساتھ واضح کر دی گئی تھی کہ انسان خدا کے ہاں صرف اپنی ہی محنت کا حاصل پائے گا، یہ نہیں ہو گا کہ نیکی تو کسی نے کی اور اس کا پھل کوئی اور کھائے، یا بدی تو زید نے کی اور اس کی سزا بکر بھگتے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارے آباو اجداد بڑے نیک تھے تو ان کی نیکی کا صلہ انہی کو ملے گا، یہ نہیں ہو گا کہ ان کے اعمال کے صلہ میں تم جنت میں جا براجو۔ یہی اصول دوسرے الفاظ میں یوں بھی بیان ہوا ہے: تِلۡکَ اُمَّۃٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَلَکُمۡ مَّا کَسَبۡتُمۡ (البقرۃ: ۱۳۴) (یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا ہے، اس کو ملے گا جو اس نے کمایا اور تمہیں ملے گا جو تم کماؤ گے)۔ اگر نیک باپ کے اعمال کے صلہ میں اس کی اولاد جنت میں جا سکتی تو حضرت نوحؑ سے زیادہ نیک کون ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کے باوجود ان کے بیٹے کو نہیں بخشا۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ جیسے خلیل اللہ نے اپنے باپ کے لیے دعا فرمائی لیکن وہ بھی قبول نہیں ہوئی۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی ایک جلیل القدر پیغمبر کی بیوی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون ایسا بے لاگ ہے کہ ایک پیغمبر کی بیوی ہونا اس کے کچھ کام نہ آیا۔ اس کے برعکس فرعون کی بیوی اللہ تعالیٰ کے ایک بہت بڑے دشمن کی بیوی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے سورۂ تحریم میں نہایت شاندار الفاظ میں اس کی تعریف فرمائی۔ باپ بیٹے اور میاں بیوی کے رشتے سب سے زیادہ محبوب رشتے ہیں اور پیغمبروں سے زیادہ خدا کا کوئی مقرب نہیں ہو سکتا لیکن آپ نے دیکھ لیا کہ جن کے پاس اپنی نیکی کا توشہ موجود نہیں تھا وہ ان رشتوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

دوسرے کی نیکی کے کام آنے کی صورتیں

آدمی کو دوسرے کی نیکی سے خدا کے ہاں کوئی فائدہ دو صورتوں میں پہنچنے کی توقع ہے۔ ایک یہ کہ یہ نیکی ایمان کے رشتۂ محبت پر مبنی ہو۔ مثلاً ایک مومن اپنے دوسرے مومن بھائی کے لیے دعا کرے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے۔ دوسری یہ کہ آدمی کو بلا واسطہ یا بالواسطہ اس نیکی میں کوئی دخل ہو، مثلاً یہ کہ اس نے اس کی تعلیم دی ہو یا اپنے عملی نمونہ سے اس کی مثال قائم کی ہو یا اس کے وسائل مہیا کرنے میں کسی نوع سے اس کا حصہ رہا ہو۔ اگر اس طرح کا کوئی دخل اس نیکی میں اس کا ہے تو یہ بھی درحقیقت ایک طرح سے اس کی سعی و کسب ہی میں داخل اور اس کے لیے یہ ایک خیر جاری ہے۔

اشتراکی ذہن کے لوگوں کا ایک بے بنیاد استدلال

بعض اشتراکی ذہن کے لوگ اس آیت سے یہ استنباط کرتے ہیں کہ قرآن اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ ہر شخص کو صرف اس کی محنت کے بقدر ہی ملنا چاہیے، لیکن یہ آیت جس موقع و محل میں ہے اس سے یہ استنباط اپنی ذہانت کا بالکل بے جا استعمال ہے۔ اسی وجہ سے یہاں ہم ایک غیر متعلق مسئلہ سے تعرض نہیں کرنا

چاہتے۔ البتہ نفسی اشتراکیت کے بنیادی فلسفہ پر اس کے محل میں ہم نے بحث کی ہے اور آگے بھی موزوں مقامات پر اس کے بعض پہلوؤں پر ان شاء اللہ ہم روشنی ڈالیں گے۔ بس اتنی بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ اس دنیا کا نظام امتحان و آزمائش کے اصول پر مبنی ہے اور آخرت میں معاملات عدل و انعام کے اصول پر طے ہوں گے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے کسی کو اس کے حق المحنت کے طور پر کوئی چیز نہیں دی ہے بلکہ کسی کو کم دیا کسی کو زیادہ اور اس طرح دونوں کے صبر و شکر کا امتحان کیا ہے۔ آخرت میں ان لوگوں کو ان کی نیکی کا صلہ ملے گا جو اس امتحان میں پورے اتریں گے اور وہ لوگ محروم رہیں گے جو امتحان میں ناکام رہے۔ ان کی یہی ناکامی ان کو جہنم میں لے جائے گی، اس لیے کہ اس طرح کے ناکاموں کا ٹھکانا آخرت میں جہنم ہی ہے۔

وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝ یعنی کوئی اس مغالطے میں نہ رہے کہ یہ کوئی ہوائی بات ہے بلکہ ہر شخص نے جو کچھ کمائی کی ہوگی وہ جلد اللہ تعالیٰ کے ملاحظے میں آئے گی اور پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ اہل ایمان کے لیے تسلی اور منکرین جزاء و سزا کے لیے تنبیہ ہے کہ اہل ایمان مطمئن رہیں کہ ان کی رائی کے دانے کے برابر نیکی بھی رائگاں نہیں جائے گی اور منکرین بھی آگاہ رہیں کہ ان کی چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی نظر انداز نہیں کی جائے گی۔

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (۴۲)

سب کا مرجع صرف اللہ تعالیٰ کا ہوگا

اور یہ بات بھی واضح رہے کہ سب کی بازگشت تیرے رب ہی کی طرف ہوگی۔ اس مغالطے میں کوئی نہ رہے کہ تیرے رب کے سوا کسی کا مولیٰ و مرجع کوئی اور بھی ہے جو اس کو خدا کی بازپرس سے بچا لے گا، یا خدا کے فیصلوں کے خلاف وہ کوئی مرافعہ اس کی عدالت میں کر سکے گا۔ خدا ہی کے حضور میں سب کی پیشی بھی ہوگی اور خدا کے فیصلے بالکل آخری اور حتمی بھی ہوں گے۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ۝ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ۝ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى (۴۳-۴۷)

یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں سب کا مولیٰ و مرجع اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ فرمایا کہ وہی ہے جس کے اختیار میں ہنسانا بھی ہے اور رلانا بھی۔ یعنی وہی خوشی کے اسباب بھی پیدا کرتا ہے اور وہی غم کے اسباب سے بھی دوچار کرتا ہے۔ اسی کے اختیار میں سکھ بھی ہے اور اسی کے اختیار میں دکھ بھی۔ رنج و غم اور نفع و ضرر سب اسی کے اختیار میں ہے تو اس کے سوا کوئی دوسرا کس حق کی بنا پر مولیٰ و مرجع بن جائے گا؟

اسی طرح وہی موت دیتا ہے اور وہی زندگی بخشتا ہے۔ تو جب کسی دوسرے کو نہ موت کے معاملے میں کوئی دخل نہ زندگی کے معاملے میں کوئی اختیار تو اس کے سوا کسی اور کو مولیٰ و مرجع بنانے کے کیا معنی؟

اسی نے جوڑے کے دونوں فرد ـــــ مرد اور عورت ـــــ پیدا کیے۔ یہ نہیں ہوا ہے کہ

مرد کو تو کسی نے پیدا کیا ہو اور عورت کہیں اور سے وجود میں آئی ہو، بیٹے کوئی بخشتا ہو اور بیٹیاں کہیں اور سے آ ٹپکتی ہوں۔ تو جب اس طرح کی کسی تقسیم کا امکان عورت اور مرد کی پیدائش میں نہیں ہے تو کسی اور کے مرجع بنانے کے کیا معنی؟

ان کی پیدائش پانی کی ایک بوند سے ہوتی ہے جو ٹپکا دی جاتی ہے۔ اس ٹپکا دینے کے بعد کسی کو بھی پتہ نہیں کہ اس کی نشو و نما کس شکل میں ہو گی۔ اس سے لڑکی پیدا ہو گی یا لڑکا، اس کی تکمیل ہو گی یا یہ ناتمام ہی رہے گا؛ اس کو شکل و صورت کیسی ملے گی؟ ان باتوں میں سے کسی بات کا بھی کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ یہ ساری باتیں صرف وہ خلاق و علیم ہی جانتا ہے جو گوناگوں پردوں کے اندر پانی کی اس بوند کی پرورش کرتا اور ایک معین مدت کے بعد اس کو ظہور میں لاتا اور پھر اس کو ایک مرد یا عورت کی حیثیت سے پروان چڑھاتا ہے۔ جب یہ سارے کام خدا ہی کے اختیار میں ہیں تو اولاد کے لیے درخواست کسی اور سے کیوں کی جائے؟

'وَاَنَّ عَلَیۡهِ النَّشۡاَۃَ الۡاُخۡرٰی'۔ یعنی جب خدا ہی سب کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کرتا ہے تو اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا کیوں دشوار ہو جائے گا؟ اس کا ممکن ہونا بھی واضح ہے اور خدا کے عدل اور اس کی رحمت کے ظہور کے لیے اس کی ضرورت بھی واضح ہے۔ تو جب یہ دونوں باتیں واضح ہیں تو اللہ تعالیٰ کی حکمت واجب کرتی ہے کہ وہ ایک ایسا دن ضرور لائے جس میں سب کو اٹھا کھڑا کرے۔ ان کی نیکی اور بدی کو جانچے اور ان کے اعمال کے اعتبار سے ان کو جزا و سزا دے۔

یہ ساری باتیں معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے اس اعلان براءت میں بھی موجود ہیں جو انھوں نے اپنی قوم سے علیحدگی کے وقت کیا ہے۔ سورۂ شعراء میں یہ یوں نقل ہوا ہے:

اَلَّذِیۡ خَلَقَنِیۡ فَهُوَ یَهۡدِیۡنِ ۙ﴿۷۸﴾ وَ الَّذِیۡ هُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَ یَسۡقِیۡنِ ۙ﴿۷۹﴾ وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ یَشۡفِیۡنِ ۪ۙ﴿۸۰﴾ وَ الَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ ۙ﴿۸۱﴾ وَ الَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓئَتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ ؕ﴿۸۲﴾ (الشعراء: ۷۸-۸۲)	جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہ میری رہنمائی فرماتا ہے۔ اور وہ کہ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے۔ جو مجھے موت دے گا، پھر زندہ کرے گا اور وہ کہ جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ وہ جزا کے دن میری خطائیں بخشے گا۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَغۡنٰی وَاَقۡنٰی ﴿۴۸﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعۡرٰی ﴿۴۸-۴۹﴾

مجمل الدار ین — یعنی وہی ہے جو آدمی کے فقر کو غنا سے بدل دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اس کی ضرورت سے اتنا زیادہ دے دیتا ہے کہ وہ اس کو جمع کر کے مالدار آدمی بن جاتا ہے۔ 'اَقۡنٰی' 'قُنیۃ' سے ہے جو جمع کیے ہوئے مال کے لیے آتا ہے۔ گویا 'اَغۡنٰی' یہاں ان لوگوں کے لیے استعمال ہوا جو فقر کے دائرہ سے نکل چکے — کو تنبیہ

ہیں اور 'اَقْنٰی' ان کے لیے استعمال ہوا ہے جو صرف فقر کے دائرہ سے نکل ہی نہیں چکے ہیں بلکہ مال داروں کے زمرے میں ہیں۔ اوپر آیات ۳۳-۳۴ میں ان مال داروں کا کردار بیان ہو چکا ہے جو خدا کی راہ میں دیتے دلاتے تو کچھ بھی نہیں لیکن جنت کے مراتب عالیہ کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ انہی کو تنبیہ ہے کہ جو مال و ثروت ان کو حاصل ہے یہ خدا کی دین ہے۔ اس میں شعریٰ کو کوئی دخل نہیں ہے، جیسا کہ انھوں نے گمان کر رکھا ہے۔ 'شعریٰ' کا رب بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

شعریٰ

'شِعْرٰی' ایک ستارے کا نام ہے جو موسم بہار میں طلوع ہوتا ہے۔ مشرکین عرب اس کو بہت مبارک سمجھتے تھے اور بیاہ کا تمام شادیاں اور تمام تجارتی سرگرمیاں اسی سے منسوب کرتے تھے۔ ایک جاہلی شاعر اپنے ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے:

شامس في القرّ حتى اذا ما ذكت الشعرى فبرد وظل

(وہ سردیوں کی ٹھنڈ میں لوگوں کو گرمی پہنچانے والا ہے اور جب شعریٰ طلوع ہوتا ہے (یعنی موسم بہار میں) تو وہ لوگوں کے لیے ٹھنڈک اور سایہ بن جاتا ہے)

یہاں اس بحث پر نظر رہے جو ابتدائے سورہ میں 'وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی' کے تحت گزر چکی ہے کہ یہ ستارے جن کو نادانوں نے اپنی قسمتوں کا مالک سمجھ رکھا ہے، اپنے سجود و ہبوط سے خود شہادت دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کا رب ہے۔

یہ امر ضروری نہیں ہے کہ یہ ساری باتیں بعینہٖ موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کے صحیفوں کے حوالوں ہی پر مبنی ہوں بلکہ ان کی نوعیت توسیعِ کلام کی ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک قول کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ایسے اضافے بھی کر دیے جاتے ہیں جو اگرچہ لفظاً تو اس قول کا جزو نہیں ہوتے لیکن معناً اسی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس سے بات کی پوری وضاحت بھی ہو جاتی ہے اور کلام مطابقِ حال بھی ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہی صورت یہاں بھی ہے۔ آیت ۴۲ سے آگے کی آیات توسیعِ کلام کی حیثیت رکھتی ہیں جس سے کلام قریش کے لیے گویا خود ان کی حکایت بن گیا ہے۔

وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ۝ وَثَمُوْدَا۟ فَمَاۤ اَبْقٰى ۝ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى (۵۰-۵۲)

قریش کو تنبیہ تاریخ کے حوالے سے

یہ بھی توسیعِ کلام ہی ہے۔ تاریخی حوالوں سے قریش کو تنبیہ کیا گیا ہے کہ جس طرح آج تمھیں انذار کیا جا رہا ہے اسی طرح تم سے پہلے اس ملک کی قوموں میں سے عاد اور ثمود کو بھی ان کے رسولوں نے انذار کیا اور ان سے پہلے قومِ نوح کو بھی، لیکن ان قوموں نے خدا کے انذار کی کوئی پروا نہ کی بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ہلاک کر دیا اور اس طرح ہلاک کیا کہ ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑا۔ مطلب یہ ہے کہ یہی انجام تمھارا بھی ہونا ہے اگر تم نے انہی کی روش اختیار کی۔ خدا کا قانون سب کے لیے یکساں ہے اور تمھاری اپنی تاریخ

اس کی گواہ ہے۔

عاد کو یہاں عادِ اولیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ثمود انہی کے بقایا میں سے تھے اور وہ عادِ ثانی سے مشہور تھے۔

'اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰی' کا تعلق صرف قومِ نوح ہی سے نہیں ہے بلکہ عاد اور ثمود سے بھی ہے۔ یعنی ان سب پر جو تباہی آئی یہ قدرت نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ یہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اور نہایت سرکش تھے۔ مطلب یہ ہے کہ قوموں پر جو تباہی آتی ہے اس کے اصل اسباب خارج میں نہیں ہوتے بلکہ وہ ان قوموں کے اندر ہی سے ابھرتے ہیں جو کبھی زلزلہ، سیلاب اور طوفان کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں کبھی کسی دشمن کے حملہ و ہجوم کی صورت میں۔

وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰی ۝ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰی (۵۳-۵۴)

یہ قومِ لوط کی طرف اشارہ ہے۔ 'مُؤْتَفِكَة' کی تحقیق لسان العرب میں یہ بیان ہوئی ہے[1]:

"'مُؤْتَفِكَات' سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو زمین کو بالکل تلپٹ کر دیتی ہیں جس طرح جوتنے والا کھیت کی زمین کو تلپٹ کر دیتا ہے۔ جب کوئی بڑا سیلاب آتا ہے اور وہ زمین پر مٹی اور ریت کی تہ پر تہ جما دیتا ہے تو اس کو بھی 'مُؤْتَفِكَة' کہتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جو تند طوفانی ہوا زمین کو ریت اور کنکر سے ڈھانک دیتی ہے وہ بھی 'مُؤْتَفِكَة' ہے۔"

قومِ لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو تند ہو کر بالآخر 'حاصب' یعنی کنکر پتھر برسانے والی طوفانی ہوا بن گئی۔ اس سے اول تو ان کے اوپر کنکروں پتھروں کی بارش ہوئی پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا (العنکبوت۔ ۲۹: ۴۰) (ان میں سے بعض قوموں پر ہم نے کنکر برسا دینے والی آندھی بھیجی)۔ نیز فرمایا ہے: جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (الحجر۔ ۱۵: ۷۴) (پس ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر سنگِ گِل کی بارش کی)۔

'فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰی'۔ اس اسلوب کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ یہ کسی ایسی صورتِ حال کی تعبیر کے لیے آتا ہے جس کی تعبیر سے الفاظ قاصر ہوں۔ یعنی ان کو ایسی چیز نے ڈھانک دیا جو الفاظ کی گرفت سے باہر ہے۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰی (۵۵)

قریش کو من حیث الجماعت ملامت

یہ خطاب قریش سے ہے۔ ضمیر اگرچہ واحد ہے لیکن مخاطب پوری جماعت ہے۔ جب جماعت کو واحد

---

[1] لسان العرب، جلد ۱، صفحہ ۳۹۱

کے صیغہ یا ضمیر سے خطاب کرتے ہیں تو مقصود جماعت کے ایک ایک فرد کو متنبہ کرنا ہوتا ہے۔ یہاں یہی صورت ہے۔ منکرین کو فرداً فرداً خطاب کر کے ملامت فرمائی ہے کہ جزاء و سزا کے یہ سارے دلائل جو عقل سے، نقل سے، موسیٰؑ و ابراہیمؑ کے صحیفوں اور قوموں کی تاریخ سے بیان ہوئے ہیں، تمہارے سامنے ہیں تو بتاؤ اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاتے اور ان کے باب میں جھگڑتے رہوگے۔

'آلاء'، 'اِلٰی' کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہمارے مفسرین و مترجمین نے عام طور پر نعمت کے لیے ہیں لیکن یہ اس لفظ کا ادھورا مفہوم ہے۔ اس کے اصل معنی کرشمے، نشانیاں، عجائبِ قدرت، کارنامے، نوادر اور آثارِ حکمت کے ہیں۔ نعمتیں بھی چونکہ انہی کے تحت ہیں اس وجہ سے وہ بھی اس کے مفہوم میں داخل ہیں، لیکن ہر جگہ اس کا ترجمہ نعمت صحیح نہیں ہے اس لیے کہ نعمت کی طرح اللہ تعالیٰ کی نقمت کی نشانیاں بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ لفظ سورۂ رحمان میں بار بار آیا ہے اور اس کے سارے پہلو اس میں واضح ہو گئے ہیں۔ وہاں ہم اس کی وضاحت اس کے مواقعِ استعمال اور کلامِ عرب کی روشنی میں کریں گے۔ استاذ امام حمید الدین فراہیؒ نے اپنی کتاب 'مفردات القرآن' میں اس پر نہایت محققانہ بحث کی ہے۔

۶۔ آگے آیات ۵۶ - ۶۲ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ خاتمہ میں قرآن کے معروف طریقہ کے مطابق اس مضمون کی پھر یاد دہانی فرما دی گئی ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا۔ یاد ہوگا کہ سورہ کا آغاز اس مضمون سے ہوا ہے کہ اس قرآن کو کاہنوں اور نجومیوں کے کلام کی قسم کی کوئی چیز خیال کر کے اس کے انذار کو ٹالنے کی کوشش نہ کرو، بلکہ یہ وحی الٰہی اور کلامِ ربانی ہے۔ اگلے زمانوں میں جس طرح نذیر آ چکے ہیں انہی کے زمرے کا نذیر یہ بھی ہے۔ یہ جس چیز سے تمہیں ڈرا رہا ہے اس کو دور نہ سمجھو، وہ آئی کھڑی ہے اور جب آ جائے گی تو اللہ کے سوا کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں بنے گا۔ اس کلام کا مذاق نہ اڑاؤ۔ یہ ہنسی مسخری کی چیز نہیں، رونے کی چیز ہے۔ ہوش میں آؤ۔ اللہ ہی کو سجدہ اور اسی کی بندگی کرو۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۶-۶۲
هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿٥٦﴾ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿٥٧﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿٥٨﴾ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَتَضْحَكُوْنَ
وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿٦١﴾ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿٦٢﴾ السجدة ع ۳

ترجمۂ آیات ۵۶-۶۲
یہ اگلے نذیروں ہی کے زمرے کا ایک نذیر ہے۔ قریب آنے والی قریب آ گئی ہے

اللہ کے سوا اس کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہو سکتا۔ تو کیا تم اس کلام پر متعجب ہوتے ہو! اور ہنستے ہو، روتے نہیں! اور تم مدہوش پڑے ہو! (ہوش میں آؤ!) اللہ ہی کو سجدہ اور اسی کی بندگی کرو۔ ۵۶-۶۲

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولَىٰ (۵۶)

ابتداء کے مضمون کی طرف اشارہ

'ھٰذا' سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے۔ چونکہ بحث کا آغاز قرآن ہی سے ہوا تھا اس وجہ سے مشارٌ الیہ کے ذکر کے بغیر بے تکلف آخر میں اس کی طرف اشارہ کر دیا جس سے تمہید اور خاتمہ کا ربط بالکل واضح ہو گیا۔ اگر کوئی اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لے تو بھی کوئی فرق واقع نہیں ہو گا اس لیے کہ پیغمبر اور اس کی دعوت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہوتیں۔ قرآن مجید میں بعض جگہ 'ذِکْرًا رَّسُولًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ 'ذکر' سے مراد قرآن ہے اور 'رسول' سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن اسلوب بیان ایسا اختیار فرمایا گیا ہے کہ نبی اور قرآن دونوں ایک ہی چیز کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

'نُذُر' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہاں یہ 'نذیر' کی جمع ہے۔ اس سے مراد پچھلے انبیاء اور پچھلے صحائف سب ہیں اور مقصودِ کلام تنبیہ ہے کہ اس کلام کو ہنسی مسخری کی چیز نہ سمجھو۔ یہ اسی طرح کا انذار ہے جس طرح کا انذار پچھلی قوموں کو کیا گیا۔ اگر تم نے اس کا مذاق اڑایا تو یاد رکھو کہ اس کا انجام تمہارے آگے بھی اسی شکل میں آئے گا جس شکل میں پچھلی قوموں کے سامنے آچکا ہے۔

أَزِفَتِ الْآزِفَةُ ۝ لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ (۵۷-۵۸)

ایک حقیقتِ نفس الامری کا بیان

'اٰزِفَۃٌ' کے معنی ہیں قریب آنے والی۔ مراد اس سے عذاب کی وہ گھڑی ہے جس سے قرآن لوگوں کو ڈرا رہا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر جس عذاب سے تمھیں آگاہ کر رہا ہے اس کو بہت دور نہ سمجھو۔ اب وہ تمہارے سروں پر منڈلا ہی رہا ہے۔

ہم اس سنتِ الٰہی کی طرف بار بار اشارہ کر چکے ہیں کہ جب کسی قوم کے انذار کے لیے اللہ تعالیٰ کا رسول آ جاتا ہے تو پھر اس کو اتنی ہی مہلت ملتی ہے جتنی اتمامِ حجت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اس مہلت کے گزرنے ہی وہ قوم تباہ کر دی جاتی ہے اگر رسول کی تکذیب پر وہ اڑی جاتی ہے۔ یہ عذاب اس قوم کے لیے قیامت کے عذاب کا دیباچہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ اسلوبِ بیان رسول کی زبان سے ایک حقیقتِ نفس الامری کا بیان ہوتا ہے، اس میں ذرا بھی مبالغہ کا شائبہ نہیں ہوتا۔

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ - یعنی اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ یہ گھڑی آئی تو تمھاری دیویاں ـــــ لات، منات اور عزّٰی ـــــ اور تمھارے دوسرے دیوی دیوتا تمھارے کچھ کام آنے والے بنیں گے اور اس کی پکڑ سے تمھیں بچالیں گے۔ یاد رکھو کہ اللہ کے سوا اس کو دُور کرنے والا کوئی بھی نہیں بن سکے گا۔

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ۝ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ (۵۹-۶۰)

ان کے حال پر اظہارِ تعجب ہے کہ جو کتاب تمھیں اتنے بڑے عذاب کے قرب کی خبر دے رہی ہے تم اس کے انذار پر تعجب کر رہے ہو کہ بھلا تم پر عذاب کدھر سے اور کیوں آجائے گا! آگاہ ہو جاؤ کہ یہ چیز ہنسنے اور مذاق اڑانے کی نہیں بلکہ رونے اور سر پیٹنے کی ہے لیکن تم رونے کی جگہ اس پر ہنس رہے ہو!

وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ (۶۱)

'سمد' اور 'سمود' کے معنی مدہوش ہونے کے ہیں۔ یعنی یہ کتاب تو تمھیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہی ہے لیکن تم غفلت کے بستروں پر پڑے سو رہے ہو۔

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۶۲)

یعنی خیریت چاہتے ہو تو جاگو اور دوسرے دیویوں دیوتاؤں کو چھوڑ کر اپنے رب ہی کو سجدہ اور اسی کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی اور اس آفت سے نجات دینے والا نہیں بنے گا۔

اس سورہ کا آغاز ستاروں کے ہبوط و سجود سے ہوا تھا اور اس کا اختتام اللہ ہی کے لیے سجدہ اور اس کی عبادت کی دعوت پر ختم ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی ذٰلک۔

رحمان آباد
۲۲- جولائی ۱۹۷۷ء
۶- شعبان ۱۳۹۷ھ

تدبرِ قرآن

۵۴

القمر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

اس سورہ کا آغاز اسی مضمون سے ہوا ہے جس پر سابق سورہ ختم ہوئی ہے۔ سابق سورہ اَزِفَتِ الۡاٰزِفَۃُ (۵۷) (قریب آپہنچی قریب آنے والی) کی تنبیہ پر تمام ہوئی۔ اس سورہ کا آغاز اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ (۱) (عذاب کی گھڑی قریب آن پہنچی اور چاند شق ہوگیا) سے ہوا ہے۔ گویا اَزِفَتِ الۡاٰزِفَۃُ کے اجمال کی اس میں تفصیل فرما دی گئی ہے۔ اس مناسبت کے علاوہ ایک اور ظاہری مناسبت بھی دونوں میں واضح ہے۔ پہلی سورہ میں ستاروں کے ہبوط و سقوط سے دعوے پر شہادت پیش کی گئی ہے اور اس میں چاند کے پھٹنے سے۔

اس میں آیت وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ بار بار دہرائی گئی ہے۔ جس سورہ میں کسی آیت کی ترجیع ہو اس کو سورہ میں خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ گویا متکلم تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اپنے دعوے پر دلائل بیان کرتے ہوئے ضدی مخاطب کو بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اپنی ضد ہی پر کیوں اڑے ہوئے ہو، اس واضح حقیقت پر کیوں نہیں غور کرتے جو تمہارے سامنے دلائل کی روشنی میں پیش کی جا رہی ہے۔

مخاطب اس میں وہ مکذبین ہیں جو قرآن کے انذار کی تصدیق کے لیے کسی ایسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے جو انھیں قائل کر دے کہ فی الواقع قرآن کی یہ دھمکی سچی ہو کے رہے گی اگر وہ اس کو جھٹلاتے رہے۔ ان کو پچھلی قوموں کی تاریخ، جس کی طرف پچھلی سورہ میں بھی اشارہ ہے، نسبتًہ تفصیل کے ساتھ سنا کر متنبہ فرمایا ہے کہ آخر ان قوموں کے انجام سے کیوں عبرت نہیں حاصل کرتے؟ کیوں مچلے ہوئے ہو کہ جب یہی کچھ تمہارے سروں پر بھی گزر جائے گا تب مانو گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے تمہیں عذاب کی نشانی دکھانے کی جگہ ایک ایسی کتاب تم پر اتاری ہے جو تمہاری تعلیم و تذکیر اور تمہارے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے ہر پہلو سے جامع و کامل اور تمام ضروری اوصاف و محاسن سے آراستہ ہے۔ لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جگہ تم اس کے عذاب کے طالب بنے ہوئے ہو۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ - ۸) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ ان ضدیوں کے مطالبۂ عذاب کی کوئی پروا نہ کرو۔ ان کو بڑی سے بڑی نشانی

بھی دکھا دی جائے گی تب بھی یہ ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ عقل کے پیرو نہیں بلکہ اپنی خواہشوں کے غلام ہیں۔ ان کے لیے تو ان کی تاریخ میں بڑا درسِ عبرت موجود ہے لیکن ان میں عبرت پذیری کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ تمھاری پکار سننے والے نہیں ہیں۔ ان کا معاملہ اب اس پکارنے والے پر چھوڑو جو قرآن کے بجائے ان کو جہنم کے لیے پکارے گا اور یہ اس کی پکار پر اس طرح قبروں سے نکلیں گے جس طرح پراگندہ ٹڈیاں برآمد ہوتی ہیں۔

(۹-۴۲) قریش کو قومِ نوح، عاد، ثمود، قومِ لوط اور قومِ فرعون کے انجام سے سبق لینے کی ہدایت کہ انھوں نے بھی تمھاری ہی طرح اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تو دیکھو کہ ان کا انجام کیا ہوا؟ وہی انجام تمھارا بھی ہوگا اگر تم نے بھی انھی کی روش اختیار کی۔ تمھارے اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے خطرے کے ظہور سے پہلے پہلے تم کو ہوشیار کر دینے کے لیے قرآن اتارا جو عبرت و نصیحت اور یاددہانی حاصل کرنے کے لیے ہر پہلو سے آراستہ ہے لیکن افسوس کہ تم اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے عذاب کے طالب ہو!

(۴۳-۵۵) قریش کو آگاہی کہ جب ماضی کے کفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ رہا ہے تو آخر تمھارے ہی کفار کو ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ وہ یوں ہی چھوڑے رکھے جائیں گے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں ان کے لیے معافی کا کوئی پروانہ لکھ دیا ہے! کیا ان کو گمان ہے کہ وہ ہمارے مقابل میں اپنی مدافعت کر لیں گے! اگر وہ اس حماقت میں مبتلا ہیں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں اور متقیوں کے ساتھ ایک معاملہ نہیں کرے گا، بلکہ کافروں کو وہ جہنم کی سزا دے گا اور مومنوں کو جنت کے صلہ سے نوازے گا۔

سُوْرَةُ الْقَمَرِ (۵۴)

مَكِّيَّةٌ ——— آيات : ۵۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۸ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝١ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا
وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝٢ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ
اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝٣ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝٤
حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝٥ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ
الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝٦ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ
الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۝٧ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ يَقُوْلُ
الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝٨

ترجمۂ آیات ۱-۸ عذاب کی گھڑی سر پر آگئی اور چاند شق ہوگیا، اور یہ کوئی سی بھی نشانی دیکھیں گے تو اس سے اعراض ہی کریں گے اور کہیں گے کہ یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے اور انھوں نے جھٹلا دیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ اور ان کو ماضی کی سرگزشتیں پہنچ چکی ہیں جن میں کافی سامانِ عبرت موجود ہے، نہایت دل نشین حکمت۔ لیکن تنبیہات کیا کام دے رہی ہیں! تو ان سے اعراض کرو اور اس دن کا انتظار کرو جس دن پکارنے والا ان کو ایک نہایت ہی نامطلوب چیز کی طرف پکارے گا۔

ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی اور یہ نکلیں گے قبروں سے جس طرح منتشر ٹڈیاں نکلتی ہیں، بھاگتے ہوئے پکارنے والے کی طرف۔ اس وقت کافر کہیں گے، یہ تو بڑا کٹھن دن آگیا! ۱-۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (۱)

رسول قوم کے لیے خدا کی عدالت ہوتا ہے

'اَلسَّاعَةُ' سے مراد فیصلہ اور عذاب کی گھڑی ہے جس سے قریش کو، یوں تو اس گروپ کی تمام ہی سورتوں میں آگاہ کیا گیا ہے لیکن سابق سورہ میں خاص اہتمام کے ساتھ ان کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ 'اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ' (۵۷) یہ قریب آنے والی قریب آ لگی ہے۔ اس کو بہت دور نہ سمجھو، جاگو اور اٹھو اور اس سے بچنے کی واحد تدبیر یہ، جو تمھیں سمجھائی جا رہی ہے، عمل کر کے اپنے کو اس کی آفتوں سے بچانے کی کوشش کرو۔

یہ بات ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ اللہ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک تو اس عذاب سے جو اس دنیا میں لازماً قوم پر آ کے رہتا ہے اگر وہ رسول کے انذار کو خاطر میں نہیں لاتی بلکہ اس کی تکذیب پر اڑ جاتی ہے۔ دوسرے اس عذاب سے جو آخرت میں پیش آئے گا۔ ان دونوں عذابوں میں فرق صرف آغاز و تکمیل یا تمہید اور خاتمہ کا ہے۔ رسول کی تکذیب کے عذاب میں جو قوم پکڑی جاتی ہے وہ درحقیقت آخرت کے عذاب ہی کے لیے پکڑی جاتی ہے اس وجہ سے لفظ 'اَلسَّاعَةُ' بسا اوقات ان دونوں ہی عذابوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ہر قوم جس کے اندر رسول آ گیا اس کے فیصلہ کی گھڑی سر پر آ گئی۔ گویا 'اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ' کا اسلوب بیان مبالغہ کا اسلوب نہیں بلکہ یکسر بیان حقیقت ہے۔

ظہور عذاب کی ایک نشانی

'وَانْشَقَّ الْقَمَرُ' یہ علامت بیان ہوئی ہے عذاب کی گھڑی کے قریب آنے کی۔ اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کا حوالہ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ دے چکے ہیں کہ یوں تو اس زمین و آسمان کے چپہ چپہ پر اس کی قدرت و حکمت کی نشانیاں موجود ہیں اور آئے دن نئی نئی نشانیاں بھی ظاہر ہوتی رہتی ہیں لیکن رسولوں کی بعثت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ خاص طور پر ایسی نشانیاں ظاہر فرماتا ہے جس سے رسول کے انذار اور اس کے دعوائے رسالت کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ قرآن میں اس سنتِ الٰہی کا ذکر جگہ جگہ ہوا ہے ہم ایک آیت بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ فرمایا ہے: 'سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ' (حٰمٓ السجدۃ ۴۱: ۵۳) (ہم عنقریب ان کو دکھائیں گے اپنی نشانیاں اس کائنات میں بھی اور خود

ان کے اندر بھی ان نشانیوں کا مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، رسول کے انذار کو تقویت پہنچانا ہوتا ہے۔ رسول جن باتوں کی منادی زبان سے کرتا ہے اس کی تائید کے آثار و شواہد اس کائنات میں بھی، مختلف شکلوں میں، ظاہر ہوتے ہیں تاکہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت اچھی طرح پوری ہو جائے۔ اسی طرح کی ایک نشانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار کی تائید کے لیے چاند کے پھٹنے کی صورت میں ظاہر ہوئی تاکہ منکرینِ عذاب و قیامت پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن ان کو جو ڈرا رہا ہے کہ زمین اس دن ہلا دی جائے گی، پہاڑ پاش پاش ہو کر فضا میں اڑنے لگیں گے، سمندر ابل پڑیں گے، سورج تاریک ہو جائے گا، یہ باتیں ان کو مرعوب کرنے کے لیے نہیں بیان ہوتی ہیں بلکہ یہ حقائق ہیں جو ایک دن پیش آکے رہیں گے اور یہ بعید از امکان بھی نہیں ہیں، ان کے شواہد کسی نہ کسی شکل میں اس دنیا میں بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔

اس طرح کی نشانیوں کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ رسول نے ان کو اپنے معجزے کے طور پر پیش کیا ہو بلکہ ان کا ظہور کسی اعلان و تحدی کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کفار نے بعینہٖ اسی نشانی کا مطالبہ کیا ہو جو ظاہر ہوئی بلکہ ان کی طرف سے کسی مطالبہ کے بغیر محض اس لیے بھی ان کا ظہور ہوتا ہے کہ کفار کے پیش کردہ شبہات کا ان کو جواب مل جائے۔ کفار قیامت کو جو بہت بعید از عقل چیز خیال کرتے تھے اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ یہ ساری کائنات ایک دن بالکل درہم برہم ہو جائے۔ پہاڑوں سے متعلق ان کا جو سوال قرآن میں نقل ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کو وہ بالکل اٹل، غیر متزلزل اور غیر فانی سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شقِ قمر کی نشانی دکھا کر ان کو بتایا کہ اس کائنات کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی خواہ وہ کتنی ہی عظیم ہو، نہ خود مختار ہے، نہ غیر فانی، نہ غیر متزلزل، بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے۔ وہ جب چاہے گا ان سب کو درہم برہم کر کے رکھ دے گا۔

ایک سوال کا جواب

رہا یہ سوال کہ اس طرح کا کوئی واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پیش آیا بھی ہے تو اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ سے، یہی بات نکلتی ہے کہ یہ پیش آیا اور حدیثوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ صورتِ واقعہ کے بارے میں تو حدیثیں ضرور مختلف ہیں لیکن نفسِ واقعہ کے بارے میں کوئی اختلاف منقول نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ قیامت کے دن پیش آنے والے واقعہ کی خبر ہے جس کو ماضی کے صیغہ سے اس کی قطعیت کے اظہار کے لیے بیان فرمایا گیا ہے۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ جائے گا۔ یہ قول اگرچہ اگلوں میں سے بھی بعض لوگوں سے نقل ہوا ہے اور اس زمانے میں بھی اس کو ایک گروہ کے اندر حسنِ قبول حاصل ہے لیکن سیاقِ کلام اس سے ابا کرتا ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ قیامت میں پیش آنے والے واقعات قرآن میں ماضی کے

اسلوب میں بیان ہوئے ہیں لیکن بیان یہ معنی لیے جائیں تو کلام آگے والی بات سے بے جوڑ ہو جاتا ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ یہ کوئی سی نشانی بھی دیکھیں گے تو اس سے اعراض ہی کریں گے اور کہیں گے کہ اس میں کوئی خاص ندرت نہیں، یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ غور کیجیے کہ چاند کے پھٹنے کا تعلق قیامت سے ہوتا تو اس کے بعد یہ بات کہنے کا کیا محل تھا؟ قیامت کے دن تو کٹر سے کٹر منکر بھی کسی چیز کو جادو نہ کہہ سکے گا بلکہ سب اعتراف کریں گے کہ رسولوں نے جو خبر دی وہ حرف حرف سچی نکلی۔ چنانچہ آگے بیان بھی ہوا ہے کہ يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَذَا يَوْمٌ عَسِرٌ (۸) (اس دن کافر کہیں گے کہ یہ تو بڑا ہی کٹھن دن آگیا)۔

یہ شبہ صحیح نہیں ہے کہ اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آیا ہوتا تو دوسری قوموں کی تاریخ میں بھی اس کا ذکر ہوتا۔ ہماری زمین اور دوسرے کُروں میں اس طرح کی شکست و ریخت اور ان کے ٹکڑوں کے درمیان انفصال و اتصال کے کتنے واقعات ہیں جو آئے دن ہوتے رہتے ہیں لیکن پہلے زمانہ میں ان کا مشاہدہ ایک خاص دائرہ ہی کے اندر محدود رہتا تھا۔ ہمارے زمانے میں اس طرح کے تغیرات کی تحقیق کے لیے بین الاقوامی ادارے اور رصدگاہیں وجود میں آگئی ہیں اس وجہ سے کوئی واقعہ ظہور میں آتا ہے تو اس کی تحقیق کے لیے فوراً ساری دنیا کے تحقیقاتی ادارے بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں اور برق کی رفتار سے اس کی اطلاع دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ جاتی ہے۔ پہلے تحقیق و اطلاع کے یہ وسائل موجود نہیں تھے اس وجہ سے اس کی خبر ایک خاص دائرے ہی میں محدود رہ گئی۔ لیکن یہ دائرہ نہایت ثقہ لوگوں کا ہے اس وجہ سے نفس واقعہ کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل کو سائنس دانوں کے لیے چاند کی تحقیق کی وسیع راہیں کھل جائیں اور علمی تحقیقات سے ثابت ہو جائے کہ چاند کا فلاں حصہ فلاں حصہ سے مربوط تھا لیکن اتنے سو سال پہلے وہ الگ ہو کر فلاں حصے سے جا ملا۔ اس طرح کے کتنے انکشافات ہیں جو ہمارے کرۂ زمین سے متعلق آج ہمارے سامنے آ رہے ہیں اور لوگ ان کو باور کر رہے ہیں تو آخر چاند سے متعلق قرآن کی اس خبر پر تعجب کی کیا وجہ ہے؟ سائنس نے اگر ابھی اس کی تصدیق نہیں کی ہے تو یہ اس کی نارسائی کی دلیل ہے۔ انتظار اور صبر کیجیے، شاید مستقبل میں وہ بھی اس کے اعتراف پر مجبور ہو جائے۔

وَإِن يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (۲)

پیغمبر صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور مکذبین کو ملامت ہے کہ ان لوگوں کی تکذیب کی اصل علت یہ نہیں ہے کہ ان کو کوئی نشانی نہیں دکھائی جا رہی ہے۔ نشانیاں تو قدم قدم پر موجود ہیں اور آئے دن ان کو نئی نئی نشانیاں بھی دکھائی جا رہی ہیں لیکن یہ ہٹ دھرم لوگ جزا و سزا کو ماننا نہیں چاہتے اس وجہ سے کسی بڑی سے بڑی نشانی سے بھی سبق نہیں لیتے۔ اگر پیغمبر نے ان کو شق قمر سے بھی بڑی کوئی نشانی دکھا

دی تو اس کو بھی یہ جادو کا کرشمہ قرار دے کر نظر انداز کر دیں گے۔

'سحر' کے ساتھ 'مستمر' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ وہ اس نشانی کو صرف جادو ہی نہیں 'مستمر'
کہیں گے بلکہ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ بھی کہیں گے کہ جادو ہونے کے اعتبار سے بھی اس میں کوئی کا مفہوم
ایسی ندرت و جدت نہیں ہے کہ اس کو کوئی خاص اہمیت دی جائے بلکہ یہ اسی قسم کا جادو ہے جس قسم
کے جادو پچھلے جادوگروں نے دکھائے اور سکھائے اور جو برابر منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ
اس نشانی کی وجہ سے ان کو خدا کا نذیر ماننا تو درکنار کوئی غیر معمولی جادوگر سمجھنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بعض
لوگوں نے 'مستمر' کے معنی فانی کے لیے ہیں لیکن اس معنی میں اس کا استعمال میرے علم میں نہیں ہے۔

وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ وَكُلُّ أَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ (۳)

یہ ان کی تکذیب، سببِ تکذیب اور اس کے انجام کا بیان ہے کہ انھوں نے (یعنی قریش نے) کفار کو ڈھیل
خدا کے نذیر اور اس کے انذار کی تکذیب کر دی اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی جس کے سبب سے وہ سنتِ دیے جانے کی حکمت
الٰہی کے مطابق عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر کام ایک معین پروگرام کے مطابق ہوتا
ہے۔ جب ان کی اجلِ معین پوری ہو جائے گی تو پکڑ لیے جائیں گے۔ یعنی ان کو جو ڈھیل مل رہی ہے تو اس
کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پیغمبر کا انذار محض ایک ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ ابھی
وہ وقت نہیں آیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہلاکت کے لیے مقرر کر رکھا ہے تاہم وہ بالکل قریب
آ گیا ہے۔

'وَكَذَّبُوا' کے بعد 'وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ' کے الفاظ سے ان کی تکذیب کی علت کی طرف اشارہ مقصود ہے تکذیب کی علت
کہ انھوں نے رسول کے انذار کی جو تکذیب کی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے پاس اس تکذیب کی
کچھ دلیلیں ہیں یا فی الواقع کچھ شبہات ہیں جو ابھی صاف نہیں ہوئے ہیں یا ان کو کوئی ایسی نشانی نہیں دکھائی
گئی ہے جو ان کو مطمئن کر دے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشوں کے غلام ہیں۔ اگر وہ جزا و سزا
کو مان لیں تو اپنی ان خواہشوں سے انھیں دست بردار ہونا پڑتا ہے جس کا حوصلہ ان کے اندر نہیں ہے
اس وجہ سے وہ مختلف قسم کی باتیں بنا رہے ہیں۔ یہ مضمون سورۂ نجم کی آیت ۲۹ کے تحت وضاحت سے
گزر چکا ہے۔

وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّنَ الْأَنبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ (۴)

یہ اسی اوپر والی بات ہی کی وضاحت ہے کہ اگر ان پر ابھی عذاب نہیں آیا ہے تو اس کے معنی یہ عاقل وہ ہے
نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہے۔ ان کو پچھلی قوموں کی جو سرگزشتیں سنائی گئی ہیں اگر جو دوسروں کے
وہ غور کریں تو ان کے اندر کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ ان سرگزشتوں سے انھیں معلوم ہو جائے گا کہ انجام سے سبق
جس قوم نے بھی رسول کے انذار کی تکذیب کی بالآخر وہ عذابِ الٰہی کی گرفت میں آ گئی۔ تاخیرِ عذاب سے وہ حاصل کرے

قومیں بھی انہی کی طرح اس مغالطے میں مبتلا ہوئیں کہ پیغمبر کی دھمکی محض خالی خولی دھمکی ہے لیکن وہ بالکل سچی ثابت ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے حق میں بہتر یہی ہے کہ تاریخ سے سبق لیں۔ اس انتظار میں نہ رہیں کہ جب سب کچھ ان کے اپنے سروں پر سے گزر جائے گا تب مانیں گے۔ اس وقت کا اعتراف نہ پہلوں کے لیے مفید ہوا ہے نہ ان کے لیے مفید ہو گا۔

قوموں کی یہ سرگزشتیں پچھلی سورتوں میں بھی اجمالاً و تفصیلاً گزر چکی ہیں اور اس سورہ میں بھی آیت ۹ سے وہ آرہی ہیں۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ ہر سرگزشت کے بعد 'فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ' کی آیت بار بار آئی ہے تاکہ مخاطب پر واضح کر دیا جائے کہ رسول کے انذار کی صداقت یوں ثابت ہو کے رہتی ہے اور اس کو جھٹلانے والے یوں عذاب میں پکڑے جاتے ہیں۔

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (۵)

یعنی ان سرگزشتوں کے اندر نہایت دل نشین حکمت موجود ہے، مگر دیکھ لو یہ تنبیہات کیا نفع دے رہی ہیں! 'ما' نافیہ بھی ہو سکتا ہے اور استفہامیہ بھی، لیکن استفہامیہ میں زیادہ زور بھی ہے اور موقع کلام سے زیادہ مناسبت بھی۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَىٰ شَيْءٍ نُّكُرٍ (۶)

نبی صلعم کو تسلی آمیز ہدایت

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی آمیز ہدایت ہے کہ ایسے اندھوں کی آنکھوں کی پٹی کھولنا اور ان کو راہ دکھانا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ اب تم ان سے اعراض کرو اور اس دن کا انتظار کرو جس دن اسرافیل صور پھونکیں گے اور یہ قیامت کے عذاب کی طرف پکارے جائیں گے۔

'فَتَوَلَّ' یہاں 'فَانْتَظِرْ' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ یہی مضمون دوسری آیت میں یوں آیا ہے 'وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ (ق: ۴۱)' (اور کان لگاؤ اس دن کی پکار کے لیے جس دن پکارنے والا نہایت قریب کی جگہ سے پکارے گا)۔ 'نکر' سے اشارہ ہول قیامت کی طرف ہے۔ اس کی ہولناکی کی شدت ظاہر کرنے کے لیے ابہام کا اسلوب اختیار فرمایا ہے۔ یعنی آج تو ان کو اس دن کے لیے تیاری کی جو دعوت دی جا رہی ہے اس کو خاطر میں نہیں لا رہے ہیں، لیکن جلد وہ وقت آرہا ہے کہ ایک داعی اس ہولناک چیز کی طرف پکارے گا اور سب اس کی طرف نہایت فرمانبرداری و خشیت کے ساتھ بھاگیں گے۔

خُشَّعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ مُّهْطِعِينَ
إِلَى الدَّاعِ يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ (۷-۸)

نفخ صور کے بعد قبروں سے نکلنے کا منظر

یعنی آج تو اللہ کا رسول ان کو اس دن کے ہول سے بچنے کے لیے تیاری کی دعوت دے رہا ہے تو یہ اس سے اکڑتے ہوئے اعراض کر رہے ہیں لیکن جب روز قیامت کا داعی پکارے گا تو یہ اس طرح قبروں سے نکلیں گے جس طرح ٹڈی دل نکلتا ہے اور ان کا حال یہ ہو گا کہ ان کی نگاہیں ذلت سے جھکی ہوئی ہوں گی

اور داعی کی طرف نہایت تیزی سے بھاگ رہے ہوں گے۔

'خُشَّعًا' اور 'مُّهْطِعِيْنَ' دونوں حال ہیں۔ کَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ نفخ صور کے بعد لوگوں کے قبروں سے نکلنے کی تمثیل ہے۔ برسات میں کبھی سرِ شام پتنگوں کو زمین سے ابھرتے دیکھا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے زمین سے پتنگوں کا طوفان اُبل پڑا ہے۔ یہی صورت ٹڈیوں کے ابھرنے کی بھی ہوتی ہے اور یہی شکل لوگوں کے قبروں سے نکلنے کی بھی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ نشانیاں دکھائی ہی اس لیے ہیں کہ انسان کو قیامت کی یاددہانی زمین و آسمان کے گوشے گوشے سے برابر ہوتی رہے۔

يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ یعنی آج تو جب اللہ کا رسول ان لوگوں کو اس دن کے ہول سے ڈراتا ہے تو ان کو ہر چیز انہونی اور ناممکن نظر آتی ہے اور نہایت ڈھٹائی سے اس کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن جب وہ دن سامنے آ جائے گا تو نہایت حسرت و یاس کے ساتھ پکار اٹھیں گے کہ لاریب وہ کٹھن دن آ گیا جس سے نبیوں اور رسولوں نے آگاہ کیا تھا!

۲- آگے آیات ۹-۱۷ کا مضمون

اوپر آیت ۴ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ میں قریش کو یہ تنبیہ جو فرمائی گئی ہے کہ آخر یہ لوگ عذاب دیکھنے ہی کے لیے کیوں مچلے ہوئے ہیں، ان کو پچھلی قوموں کی جو تاریخ سنائی گئی ہے اس سے سبق کیوں نہیں لیتے! اس کی وضاحت کے لیے آگے رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ سنائی جا رہی ہے کہ تمہاری ہی طرح ان قوموں نے بھی اپنے رسولوں کے انذار کا مذاق اڑایا۔ بالآخر وہ اس عذاب کی گرفت میں آ گئیں جس سے اللہ کے رسول نے ان کو ڈرایا تو بہتر ہے کہ ان قوموں کی تقلید کر کے اپنی شامت کو دعوت نہ دو بلکہ اللہ نے اپنے فضل خاص سے تمہاری تعلیم و تذکیر کے لیے جو کتاب اتاری ہے اس سے یاددہانی حاصل کرو۔ یہ کتاب مقصدِ تعلیم و تذکیر کے لیے ہر پہلو سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹-۱۷

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ
وَّازْدُجِرَ ﴿۹﴾ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴿۱۰﴾ فَفَتَحْنَآ
اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا
فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰۤى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿۱۲﴾ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ
وَّدُسُرٍ ﴿۱۳﴾ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿۱۴﴾ وَلَقَدْ

تَرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ ﴿۱۶﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾

ترجمۂ آیات ۹-۱۷

ان سے پہلے قومِ نوح نے بھی جھٹلایا۔ انھوں نے ہمارے بندے کی تکذیب کر دی اور کہا کہ یہ تو خبطی ہے اور وہ جھڑک دیا گیا تو اس نے اپنے رب سے فریاد کی کہ میں مغلوب ہوں، اب تو ان سے انتقام لے۔ پس ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش سے کھول دیے اور زمین کو چشمے ہی چشمے کر دیا۔ پس پانی جا ملا اس نشان پر جو ٹھہرا لیا گیا تھا اور ہم نے اس کو ایک تختوں اور میخوں والی پر اٹھا لیا جو چلتی رہی ہماری حفاظت میں۔ یہ ہم نے بدلہ لینے کے لیے کیا اس کا جس کی ناقدری کی گئی۔ اور ہم نے اس سرگزشت کو ایک داستانِ عبرت بنا کر چھوڑا (عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے) تو ہے کوئی عبرت حاصل کرنے والا! دیکھ لو کس طرح سچا ثابت ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا! اور ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے نہایت موزوں بنایا ہے تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا! ۹-۱۷

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ (۹)

قومِ نوح کے انجام کی طرف اشارہ

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ آیت ۴ میں قوموں کی تاریخ کی طرف جو اجمالی اشارہ فرمایا ہے یہ اسی کی تفصیل ہے۔ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے واقعہ کو لیا ہے اس لیے کہ یہاں بیانِ واقعات کی ترتیب تاریخی ہے۔ فرمایا کہ ان سے (یعنی قریش سے) پہلے قومِ نوح بھی اللہ کے رسول کے انذار کی تکذیب کر چکی ہے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تنہا تمھی کو اپنی قوم کی طرف سے تکذیب سے دوچار نہیں ہونا پڑا ہے؛ ان مکذبین کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ان سے پہلے قومِ نوح بھی اپنے پیغمبر کی تکذیب کر چکی ہے اور دوسری قومیں بھی جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے اپنے اپنے رسولوں

کی تکذیب کرتی آئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تاریخ کی ایک پرانی اور معروف حکایت ہے جو کچھ اگلے رسولوں کو پیش آیا ہے اس سے تمھیں بھی سابقہ پیش آئے گا اور تکذیب کے جس انجام سے دوسری قومیں دوچار ہوئی ہیں اسی سے تمھاری قوم بھی دوچار ہوگی اگر اس نے انہی قوموں کی تقلید کی۔

'فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ' 'ف' تفصیل کے لیے ہے۔ واقعہ کا اجمالاً حوالہ دینے کے بعد اب یہ اس کی تفصیل سنائی جارہی ہے کہ انھوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا، اس کو دیوانہ اور خبطی ٹھہرایا اور اس کو جھڑک دیا گیا۔

لفظ 'عَبْدَنَا' سے حضرت نوح علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ کی جس محبتِ خاص کا اظہار ہو رہا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ عزت وجاہ کے سرمستوں اور عیشِ دنیا کے متوالوں کو اللہ کے رسولوں نے جب عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت سے ڈرایا اور اس طرح ڈرایا کہ اس کے لیے اپنے رات دن ایک کر دیے تو یہ چیز ان پر بہت شاق گزری۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آخر ان پر عذاب کیوں اور کدھر سے آجائے گا؟ اگر وہ سزاوارِ عذاب ہیں تو انھیں جو دولت و عزت حاصل ہے وہ کیوں حاصل ہوئی؟ یہ عزت شوکت تو دلیل ہے کہ وہ خدا کی نظروں میں معزز ہیں اور اگر آخرت ہوئی تو وہاں بھی اسی طرح معزز رہیں گے جس طرح یہاں ہیں۔ اس مغالطہ میں پڑ کر وہ رسول کے ہر وقت کے انذارِ عذاب سے اس درجہ برافروختہ ہوئے کہ اس کو انھوں نے دیوانہ اور خبطی کہنا شروع کر دیا کہ اس شخص کو عذاب اور قیامت کا مالیخولیا ہو گیا ہے، اٹھتے بیٹھتے اس کو ہر طرف سے عذاب ہی آتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے دل کا غصہ بھی نکال لیتے اور اپنے عوام کو بھی اطمینان دلانے کی کوشش کرتے کہ رسول کے انذار سے وہ متاثر نہ ہوں۔ یہ کوئی رسول نہیں بلکہ ایک خبطی ہے جو ہر وقت عذاب عذاب کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔

'وَازْدُجِرَ' سے اشارہ قومِ نوح کی ان دھمکیوں کی طرف ہے جو حضرت نوح کو سنگسار کر دینے کی دی گئیں۔ مثلاً سورۂ شعراء میں آیا ہے 'قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يٰنُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ' (۱۱۶) (انھوں نے دھمکایا کہ اے نوح، اگر تم اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو سنگسار کیے ہوئے لوگوں میں سے ہو کے رہو گے!)

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (۱۰)

جب قوم کی عداوت اس حد کو پہنچ گئی کہ حضرت نوح علیہ السلام کو سنگسار کر دینے کی دھمکی دے دی گئی تب انھوں نے اپنے رب سے فریاد کی کہ اے رب! میرے اندر جتنا زور تھا وہ میں نے ان کو رام کرنے پر صرف کر دیا لیکن میں اپنی کوشش میں ناکام رہا۔ اب میری طاقت جواب دے چکی ہے۔ اس درجہ تجھ سے فریاد ہے کہ تو ان سرکشوں سے نمٹ!

'اِنْتِصَار' کے معنی مدافعت کرنے اور انتقام لینے کے ہیں۔ یعنی میری طرف سے مدافعت کر اور ان

کی سرکشی کا انتقام لے۔ حضرت نوحؑ کی اس دعا کی پوری تفصیل آگے سورۂ نوح میں آئے گی۔

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (۱۱-۱۲)

یہ اس سائیکلونی طوفان کی تصویر ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے بعد ان کی قوم پر آیا۔ اس کی تفصیل سورۂ ذاریات کی تفسیر میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ فرمایا کہ ہم نے ایک موسلا دھار بارش کے ساتھ ان پر آسمان سے تمام دروازے کھول دیے اور زمین کو چشمے ہی چشمے کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی طوفانی بارش جس کے لیے آسمان کے تمام گیٹ کھول دیے گئے ہوں تھوڑی ہی دیر میں زمین کو دریاؤں، ندیوں اور نالوں کی شکل میں تبدیل کر دے گی۔

'فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ' یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نشان پانی کے بلند ہونے کے لیے ٹھہرا لیا گیا تھا اس نقطہ پر زمین اور آسمان کا پانی باہم جا ملا اور اس نے پوری قوم نوح کو اس طرح چھا لیا کہ کسی کے لیے بھی اس سے بچنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ (۱۳)

اصل محافظ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے

'ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ' سے مراد ظاہر ہے کہ وہ کشتی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام نے، اللہ تعالیٰ کی خاص ہدایت کے تحت بنائی۔ اس کا ذکر اس کے اجزائے تعمیر کی تفصیل کے ساتھ یہاں، میرے نزدیک، اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت، عنایت، رحمت اور شان کے اظہار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طوفان نے پوری قوم کی قوم کا بیڑا غرق کر دیا، جس سے کوئی متنفس بھی نہ بچ سکا، اس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو بچانا چاہا ان کو میخوں سے جوڑے ہوئے لکڑی کے تختوں پر بچا لیا یعنی اصل چیز اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت ہے، وہ شامل حال ہو تو لکڑی کے چند تختے طوفانِ نوح سے بچا لیتے ہیں اور وہ شاملِ حال نہ ہو تو بڑے سے بڑے جنگی جہاز چشم زدن میں بلبلے کی طرح بیٹھ جاتے ہیں اور مضبوط سے مضبوط بند تنکوں کی طرح سیلاب کے زور میں بہ جاتے ہیں۔

تَجْرِیْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ (۱۴)

یعنی یہ کشتی چونکہ خاص ہماری حفاظت اور ہماری نگرانی میں تھی اس وجہ سے وہ بے خوف و خطر چلتی رہی، طوفان کے تھپیڑے اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کشتی اکیلے حضرت نوحؑ کے پاس ہی تو نہیں تھی، دوسروں کے پاس بھی کشتیاں رہی ہوں گی؛ لیکن ان کی کشتیاں ان کے کچھ کام نہ آ سکیں اس لیے کہ ان کو خدا کی حفاظت حاصل نہیں تھی۔

'جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ' یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ شان اپنی اس لیے دکھائی کہ اپنے اس بندے کی دادرسی فرمائے جس کی ناشکری اور ناقدری کی گئی، یہاں تک کہ اس کو مضطر ہو کر اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (۱۰)

کی فریاد کرنی پڑی۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۱۵)

نشانیاں بہت ہیں لیکن عبرت حاصل کرنے والے مفقود ہیں

ضمیر مفعول کا مرجع وہ سرزمین بھی ہو سکتی ہے جس کا ذکر اوپر 'وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا' (۱۲) کے الفاظ سے ہو چکا ہے اور قوم نوح کی یہ سرگزشت بھی ہو سکتی ہے جس کی تفصیل تورات کے صحیفوں میں بھی نقل ہوئی ہے اور جس کو ہر دور میں تواترِ عام کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے۔ عربی زبان میں ضمیروں کا اس طرح استعمال ایک معروف چیز ہے۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں ہم پیش کر چکے ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔ بعض لوگوں نے اس سے کشتیٔ نوح کے ڈھانچے کو مراد لیا ہے جس کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس امت کے بعض اگلوں نے کوہِ جُودی کے کسی حصہ میں اس کو دیکھا تھا۔ لیکن اس روایت کی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ سورۂ حاقہ کی تفسیر میں ان شاء اللہ ہم اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

'فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ' یعنی نشانیاں اور عبرت انگیز واقعات تو بہت ہیں جو صفحۂ ارض پر بھی ثبت ہیں اور تاریخ کے اوراق میں بھی محفوظ ہیں لیکن عبرت حاصل کرنے والے دل کہاں ہیں!

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ (۱۶)

'نُذُرِ' اصل میں 'نُذُرِىْ' ہے۔ 'ی' قافیہ کی رعایت سے گر گئی، کسرہ اس کی نشانی کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔ 'نُذُر' یہاں 'انذار' سے اسم ہے اور اس کے معنی ڈراوے، تنبیہ اور آگاہی کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس سننے والے کان اور عبرت پکڑنے والا دل ہو تو وہ اس سرگزشت میں دیکھ سکتا ہے کہ اللہ کا عذاب کیسا بے پناہ ہوتا ہے اور اس کی دھمکی کس طرح پوری ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۱۷)

یہ آیت ہر سرگزشت کے بعد، ٹیپ کے بند کے طور پر، بار بار آئے گی۔ اس کا مطلب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے تاکہ ہر جگہ وضاحت کی ضرورت پیش نہ آئے۔

'تیسیر' اور 'ذکر' کا مفہوم

اس آیت کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو حفظ کرنے یا نصیحت حاصل کرنے کے لیے نہایت آسان کتاب بنایا ہے۔ یہ بات اگرچہ بجائے خود صحیح ہے کہ قرآن حفظ کرنے کے لیے بھی آسان ہے اور نصیحت حاصل کرنے کے لیے بھی سہل ہے لیکن آیت کا مفہوم اس سے بہت وسیع ہے۔

لفظ 'تیسیر' عربی میں کسی چیز کو کیل کانٹے سے درست کرنے، پیشِ نظر مقصد کے لیے اس کو اچھی طرح موزوں بنانے اور جملہ لوازم سے اس کو آراستہ و پیراستہ کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً 'يُسِّرَ الْفَرَسُ لِلرُّكُوبِ' کے معنی ہوں گے گھوڑے کو تربیت دے کر، اس کو کھلا پلا کر، زین، لگام، رکاب سے آراستہ کر کے سواری کے لیے بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ یہیں سے یہ لفظ کسی شخص کو کسی مہم کے لیے تیار اور جملہ لوازم سے مسلح کر کے اس کو اس کا اہل بنا دینے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایک جاہلی شاعر کہتا ہے:

ونعين فاعلنا اذا ما نابه حتّٰی نیسّرہ لفعل السید

(اور جب ہمارے سربراہِ کار کو کوئی مہم پیش آتی ہے تو ہم اس کی مدد کرتے ہیں یہاں تک کہ سرداروں کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی راہ اس کے لیے ہموار کر دیتے ہیں)۔

لفظ 'ذکر' بھی یہاں وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی تعلیم، تذکیر، آگاہی، تنبیہ، نصیحت، موعظت، حصولِ عبرت، اور اتمامِ حجت سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ ان تمام مفہوموں میں یہ لفظ قرآن میں بھی آیا ہے۔ یہ حقیقت بھی یہاں پیشِ نظر ہے کہ قرآن مجید ہمارے اوپر کوئی چیز خارج سے نہیں لادتا بلکہ ہماری ہی فطرت اور ہماری ہی عقل کے اندر اللہ تعالیٰ نے علم و معرفت کے جو خزانے ودیعت فرمائے ہیں لیکن ہم ان سے غافل ہیں، انہی کو ہمارے سامنے اجاگر کرتا اور اس سے بہرہ مند ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

ان دونوں لفظوں کا صحیح مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب آیت کے موقع و محل اور اس کے مفہوم پر غور فرمائیے۔ اوپر یہ بات ارشاد ہوئی ہے کہ پیغمبر جس عذاب سے تمھیں آگاہ کر رہے ہیں وہ ایک امرِ شدنی ہے۔ آفاق و انفس سب اس کے گواہ ہیں۔ رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ اس کی شاہد ہے لیکن تم مچلے ہوئے ہو کہ جب اس عذاب کی نشانی دیکھ لو گے تب مانو گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری تعلیم و تذکیر کے لیے قرآن اتارا ہے جو ہر پہلو سے اس مقصد کے لیے جملہ لوازم سے آراستہ و مسلح ہے تو آخر اس عظیم نعمت سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے، عذاب کے تازیانے ہی کے لیے کیوں بے قرار ہو!!

۴۔ تیسیرِ قرآن کے چند پہلو

تیسیرِ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر ہم اپنی کتاب 'مبادیٔ تدبرِ قرآن' میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔ یہاں ان کے اعادے کی گنجائش نہیں ہے لیکن آیت کے تعلق سے چند ضروری باتوں کی طرف ہم یہاں بھی اشارہ کریں گے تاکہ ان لوگوں کی غلط فہمی رفع ہو جو اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ قرآن ایک سہل اور سپاٹ کتاب ہے جو صرف حفظ و تلاوت کے لیے نازل ہوئی ہے، اس کے سمجھنے کے لیے کسی تفکر و تدبر کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے زعم میں ہر شخص جو الٹی سیدھی عربی سمجھ سکتا ہے وہ بے تکلف قرآن بھی سمجھ سکتا ہے۔ یہ غلط فہمی فہمِ قرآن کی راہ کو مسدود کر دینے والی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ تیسیرِ قرآن کے جن پہلوؤں کی طرف خود اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے ہم ان کو یہاں بالاجمال یکجا کر دیں۔

- تیسیرِ قرآن کا سب سے نمایاں پہلو جس کا قرآن نے بار بار حوالہ دیا ہے یہ ہے کہ وہ 'عربی مبین' میں نازل ہوا ہے، یعنی قریش کی فصیح و بلیغ ٹکسالی زبان میں جس میں کوئی کج پیچ نہیں ہے تاکہ اہلِ عرب اس کو خوبی سے سمجھ سکیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو جائے۔
- دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے بالتدریج نازل فرمایا تاکہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بالتدریج سنائیں اور سکھائیں اور لوگ اس کو بالتدریج سنیں سمجھیں اور اس کی تعلیمات اچھی طرح ہضم کریں۔ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (بنی اسرآءیل: ۱۰۶) (اور قرآن کو ہم نے قسط قسط کر کے اتارا تاکہ تم لوگوں کو اس کی تعلیم ٹھہر ٹھہر کر دو) اگر پورا قرآن بیک دفعہ جُمْلَةً وَّاحِدَةً نازل کر دیا جاتا، جیسا کہ کفار کا مطالبہ تھا تو یہ چیز تیسیر قرآن کے منافی ہوتی۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن کی تمام بنیادی تعلیمات پہلے گٹھے ہوئے الفاظ اور فقروں اور چھوٹی چھوٹی جامع اور محکم سورتوں کی شکل میں نازل ہوئیں تاکہ لوگوں کے لیے ان کا اخذ کرنا، ان کو محفوظ رکھنا، ان پر عمل کرنا اور دوسروں تک ان کو پہنچانا آسان ہو۔ بعد میں جب لوگ مانوس ہو گئے تب اللہ تعالیٰ نے ان گٹھے ہوئے محکم فقروں کی وضاحت فرمائی کِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ (ھود: ۱) میں اسی تیسیر کی طرف اشارہ ہے۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ قرآن میں ہر بات گوناگوں پہلوؤں سے مختلف شکلوں، صورتوں، مختلف سوابق ولواحق اور نئے نئے اطراف و جوانب کے ساتھ بیان ہوئی ہے تاکہ ایک جگہ قاری کے ذہن میں بات نہیں آئی ہے تو دوسری جگہ آجائے اور ایک مقام میں کوئی دلیل دل میں نہیں اتری ہے تو دوسرے سیاق و سباق میں وہ ذہن نشین ہو جائے۔ قرآن نے اس چیز کو تصریف آیات سے تعبیر فرمایا ہے۔ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ (الاعراف: ۵۸)

پانچواں پہلو یہ ہے کہ قرآن میں مکی اور مدنی سورتوں پر مشتمل سات گروپ ہیں۔ یہ ساتوں گروپ مل کر قرآن عظیم کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ہر گروپ میں مطالب مشترک بھی ہیں اور فی الجملہ ایک دوسرے سے ممتاز بھی۔ ہر سورہ اپنے ساتھ ایک مثنیٰ بھی رکھتی ہے اور یہ دونوں مل کر اپنے زیر بحث موضوع کو ایک مکمل صورت میں پیش کرتی ہیں۔ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (الزمر: ۲۳) اور وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (الحجر: ۸۷)[1] کے تحت ہم ان اجمالات کی وضاحت کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ترتیب کا یہ اہتمام اللہ تعالیٰ نے تیسیر ہی کے مقصد سے اختیار فرمایا ہے۔

۵۔ آگے آیات ۱۸-۴۲ کا مضمون

جس مقصد سے اوپر حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کی سرگزشت بیان ہوئی ہے بعینہٖ اسی مقصد سے آگے عاد، ثمود، قوم لوط اور آلِ فرعون کی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں اور ان میں سے ہر سرگزشت بعینہٖ اسی ترجیع پر ختم ہوئی ہے جس پر قوم نوح کی سرگزشت تمام ہوئی ہے ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۸-۴۲

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۱۸ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد پنجم، صفحہ: ۵۸۰

[2] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد سوم، صفحات: ۲۲۲-۲۲۴

رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ
اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿۲۰﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۲۱﴾ وَلَقَدْ
ع ۲ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾
فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۲۴﴾
ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾ سَيَعْلَمُوْنَ
غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً
لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ
بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾
فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۰﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً
فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ
مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۢ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ
حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۭ
كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ﴿۳۵﴾ وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا
بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ
فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۷﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ
مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ
ع ۳ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾ وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾

ترجمۂ آیات ۱۸-۴۲

عاد نے بھی تکذیب کی تو دیکھو کس طرح واقع ہوا میرا عذاب اور میرا ڈراوا! ہم نے ان پر مسلط کر دی بادِ تند ایک مسلسل نحوست کے وقت میں جو لوگوں کو اکھاڑ پھینکتی گویا وہ اکھڑے ہوئے کھجوروں کے تنے ہوں۔ تو دیکھو، میرا عذاب اور میرا ڈراوا کس طرح پیش آ کے رہا! اور ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے نہایت سازگار بنایا ہے تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا! ۱۸-۲۲

ثمود نے بھی انذار کی تکذیب کی۔ انھوں نے کہا، کیا ہم اپنے ہی اندر کے ایک بشر کی پیروی کریں گے! اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم کھلی گمراہی اور جہنم میں پڑے! کیا ہمارے اندر سے اسی پر یاددہانی نازل کی گئی، بلکہ وہ ایک لپاٹیا اور شیخی باز ہے! وہ کل کو جان لیں گے کہ لپاٹیا اور شیخی باز کون ہے! ہم ناقہ کو بھیجنے والے ہیں ان کے لیے آزمائش بنا کر تو ان پر نگاہ رکھ اور صبر کر۔ اور ان کو آگاہ کر دے کہ اب پانی ان کے درمیان تقسیم ہے۔ باری باری پر حاضر ہونا ہے۔ تو انھوں نے اپنے سردار سے فریاد کی پس وہ بڑھا اور اس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ تو دیکھو، میرا عذاب اور میرا ڈراوا کس طرح واقع ہو کر رہا! ہم نے ان پر ایک ہی ڈانٹ بھیجی تو وہ باڑھ والے کی باڑھ کے چورے کی طرح ہو کر رہ گئے۔ اور ہم نے قرآن کو یاددہانی کے لیے نہایت موزوں بنایا ہے تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا! ۲۳-۳۲

قومِ لوط نے بھی تنبیہات کو جھٹلایا تو ہم نے ان پر سنگ ریزے برسانے والی ہوا مسلط کر دی۔ صرف آلِ لوط اس سے بچے۔ ہم نے ان کو نجات دی سحر کے وقت۔ خاص اپنے فضل سے۔ ایسا ہی صلہ ہم دیا کرتے ہیں ان کو جو شکر گزار رہتے ہیں۔ اور اس نے ان کو

ہماری پکڑ سے آگاہ کیا لیکن وہ تنبیہات میں مین میکھ نکالتے ہی رہے۔ اور انھوں نے اس کو اس کے مہمانوں کے بارے میں پھسلایا تو ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں تو چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا! اور ان پر آدھمکا سویرے ایک ٹک جانے والا عذاب۔ تو چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا! اور ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے نہایت آراستہ کیا تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا! ۳۳ - ۴۰

اور آلِ فرعون کے پاس بھی تنبیہات آئیں۔ انھوں نے ہماری ساری ہی نشانیوں کو جھٹلا دیا۔ تو ہم نے ان کو ایک غالب اور قوت والے کے پکڑنے کی طرح پکڑا۔ ۴۱ - ۴۲

۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ (۱۸)

عاد کی سرگزشت کا حوالہ

'كَذَّبَتْ عَادٌ' کے بعد 'بِالنُّذُرِ' برنباے قرینہ محذوف ہے۔ آگے کے ذکر میں اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے 'كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ'۔ 'نذر'، 'نذیر' کی جمع بھی ہے اور 'انذار' سے اسم یا حاصل مصدر بھی۔ اگر 'نذیر' کی جمع مانیے تو اس کے معنی ہوں گے ڈرانے والے رسول، آگاہی دینے والی نشانیاں، بیدار کرنے والی تنبیہات، اور اگر اس کو حاصل مصدر کے مفہوم میں لیجیے تو اس کے معنی ہوں گے ڈراوا، تنبیہ، آگاہی اور تہدید و وعید۔ قرآن میں یہ لفظ ان تمام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ کرتے وقت موقع و محل کی مناسبت کا لحاظ ضروری ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (۱۹)

یہ اس عذاب کی وضاحت ہے جو قوم عاد پر اللہ تعالیٰ نے مسلط کیا۔ فرمایا کہ ہم نے ان پر شمال کی باد تند مسلط کر دی۔ 'صرصر'، شمال کی اس بادِ تند کو کہتے ہیں جو سردیوں میں چلتی ہے، جس سے ہر چیز پر ایک عام نحوست و پژمردگی چھا جاتی ہے۔ یہ زمانہ عرب میں قحط کا زمانہ ہوتا اس وجہ سے اہل عرب اس کو 'یوم نحس' یا 'ایام نحسات' کہتے۔ آیت میں 'یوم نحس' سے کوئی معین دن مراد نہیں ہے بلکہ وقت اور زمانہ مراد ہے۔ عربی میں یہ اس معنی میں معروف ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں یہی مضمون 'ایام نحسات' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے اور بعض مقامات میں یہ تصریح بھی ہے کہ یہ بادِ تند دن برسات راتیں اور آٹھ دن

مسلط رہی۔ لفظ 'مُسْتَمِرٌّ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ ہوا وقتی جھونکے کی طرح نہیں چلی کہ لوگ اس کو سہ لے جاتے بلکہ سات آٹھ دن کے لیے وہ ان پر عذابِ الٰہی بن کر مسلط رہی۔

تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ (۲۰)

ہوا کے زور اور اس کی تہرمانیت کا یہ حال تھا کہ وہ لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی گویا وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں۔ سورۂ 'حَاقَّة' میں 'مُنْقَعِرٍ' کی جگہ لفظ 'خَاوِيَة' آیا ہے جس کے معنی کھوکھلے کے ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ اشارہ موجود ہے کہ جب بادِ تند چلنی شروع ہوئی تو جو جہاں تھا وہیں زمین سے چمٹ کر رہ گیا لیکن ہوا کا زور بڑھتا ہی گیا اس وجہ سے کسی کو اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اسی حال میں سب فنا ہو گئے اور ان کی لاشیں ہوا کے زور میں اس طرح لڑھکتی پھرتی تھیں جس طرح کھجوروں کے کھوکھلے تنے لڑھکتے پھرتے ہیں۔ ان کے عذاب کی پوری تفصیل سورۂ ذاریات کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۲۱-۲۲)

یہ آیتیں قومِ نوح کی سرگزشت کے آخر میں اوپر گزر چکی ہیں اور ان کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۝ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (۲۳-۲۴)

واقعۂ ثمود

یعنی قومِ ثمود نے بھی اسی طرح رسول کی تنبیہات کی تکذیب کی۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم اپنے ہی اندر کے ایک بشر کو رسول مان کر اس کی پیروی کریں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم گمراہی میں پڑے اور بھاڑ میں گئے۔ عام طور پر مترجموں نے 'سُعُر' کا ترجمہ جنون کیا ہے لیکن یہاں یہ لفظ جس اسلوب سے استعمال ہوا ہے وہ اس معنی سے اِبا کرتا ہے۔ میرے نزدیک یہ 'سَعِیر' کی جمع ہے اور آگ کے معنی میں آیا ہے۔ اسی سورہ کی آیت ۴۷ میں ہے: 'اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ' (بے شک مجرمین گمراہی میں ہیں اور جہنم میں پڑنے والے ہیں)۔ ظاہر ہے کہ یہ انذار حضرت صالح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو کیا ہو گا۔ انھی کی کہی ہوئی بات قوم نے ان کے اوپر الٹ دی کہ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ان کی بات نہ مانی تو ہم گمراہی میں ہیں اور جہنم میں پڑیں گے، حالانکہ اگر ہم ان کے پیرو بن گئے تب گمراہی میں مبتلا ہو کر جہنم کے سزاوار ٹھہریں گے۔ بھاڑ میں جانے اور جہنم میں پڑنے کے محاورے ہماری زبان میں بھی معروف ہیں۔ گمراہی اور جہنم میں سبب اور مسبب کا رشتہ واضح ہے لیکن گمراہی اور جنون میں اس طرح کا کوئی تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔

ءَاُلْقِیَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ (۲۵)

یعنی اول تو یہی بات عجیب ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر کو رسول بنائے لیکن اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ اس کارِ عظیم کے لیے ان کی نظرِ انتخاب ہماری پوری قوم کے اندر سے انھی کے اوپر پڑی! آخر ان کے کیا ایسے مرتی ٹکے ہوئے ہیں کہ اللہ کو اپنی ہدایت اتارنی ہوئی تو اس نے ان پر اتاری! جو لوگ پشتہا پشت

سے قوم کی سرداری و پیشوائی کر رہے ہیں آخر وہ کیوں نظر انداز کر دیے گئے! بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ یعنی یہ بالکل ناممکن ہے کہ یہ شخص اپنے دعوے اور دعوت میں سچا ہو بلکہ یہ بالکل جھوٹا ہے اور ساتھ ہی شیخی باز ہے اس وجہ سے رسول ہونے کا دعویٰ کر کے ہمارے اوپر دھونس جمانا اور اپنی برتری کا سکہ بٹھانا چاہتا ہے۔

سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ (۲۶)

یہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کا برسر موقعہ جواب دے دیا کہ یہ جو کچھ کرنی چاہتے ہیں کر لیں۔ فیصلہ کی گھڑی قریب ہے۔ اللہ کا عذاب آیا ہی چاہتا ہے۔ اس وقت یہ دیکھ لیں گے کہ جھوٹا اور شیخی باز کون ہے!

إِنَّا مُرْسِلُو النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ (۲۷)

یہ اس عذاب کی تمہید ہے جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہے۔ فرمایا کہ ہم ایک خاص اونٹنی کو ان کے لیے ایک آزمائش بنا کر بھیجنے والے ہیں تو تم ان پر نگاہ رکھو اور صبر کے ساتھ حالات کو دیکھتے جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ دیکھو یہ اونٹنی کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں اور پھر کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس اونٹنی کے آزمائش ہونے کی شکل آگے والی آیت میں بیان ہو رہی ہے۔

وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ (۲۸)

اللہ تعالیٰ نے ایک اونٹنی نامزد کر کے حضرت صالحؑ کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو آگاہ کر دو کہ پانی پینے کا جو گھاٹ ہے اب اس پر پانی پلانے کی باری تقسیم کر دی گئی۔ اب ہر ایک کو اپنی باری پر حاضر ہونا ہوگا۔ اور جو باری اللہ کی اونٹنی کے لیے مقرر کر دی گئی ہے کسی کو حق نہیں ہوگا کہ اس کی باری میں کوئی اس سے تعرض کرے۔ اگر اونٹنی کو کوئی گزند پہنچایا گیا تو یہ اللہ کے عذاب کا پیش خیمہ ہوگا۔ یہ امتحان اللہ تعالیٰ نے اس لیے مقرر فرمایا کہ ان کے اندر کا سارا کھوٹ باہر آجائے اور آشکارا ہو جائے کہ ان کی سرکشی کا پارا کتنا چڑھ چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تنبیہ کے بعد کہ یہ اونٹنی عذابِ الٰہی کا نشان ہے اس کو گزند پہنچانے کی جسارت وہی کر سکتے تھے جن کو خود پیغمبر پر ہاتھ اٹھانے میں کوئی خوف مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی قوم کے طغیان کی یہی حد ہے جس پر پہنچ جانے کے بعد وہ اللہ کے عذاب کی مستحق ہوتی ہے۔ اس کے بعد اتمام حجت کے لیے کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ (۲۹)

قوم کے لوگ بھلا اس پابندی کو کب گوارا کرنے والے تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ محض حضرت صالحؑ کی دھونس ہے۔ چنانچہ اپنے سردار سے انھوں نے فریاد کی۔ وہ بدبخت لپکا اور اونٹنی کی کونچیں اس نے کاٹ دیں۔ 'تَعَاطٰی' کے معنی پنجوں پر کھڑے ہو کر کسی کام کے لیے اقدام کرنے کے ہیں۔ یعنی اپنے زعم میں اس نے بڑی بسالت دکھائی اور اپنی قوم کے لیے ایک نہایت جرأت مندانہ قدم اٹھایا لیکن اس کی یہ

جسارت پوری قوم کو لے ڈوبی۔

لفظ 'عقر' اونٹ کی کونچیں کاٹ دینے کے لیے آتا ہے۔ کونچیں کاٹ دینے کے بعد اونٹ یا اونٹنی کا زندہ رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ (۳۰)

اس آیت کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اس واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ کے انذار کے مطابق ان پر عذاب آ دھمکا۔ قرآن کے دوسرے مقام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ان کو صرف تین دن کی مہلت ملی کہ اب بھی اگر وہ توبہ کرنی چاہیں تو کر لیں لیکن انھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ (۳۱)

یہ اشارہ اس عذاب کی طرف ہے جو ان پر آیا۔ 'صَيْحَة' کے معنی کڑک کے ہیں۔ دوسرے مقام میں لفظ 'صَاعِقَة' بھی آیا ہے۔ استاذ امامؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں اس عذاب کی نوعیت پر، قرآن کی روشنی میں، مفصل بحث کی ہے۔ آخر میں خلاصۂ بحث ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے سرما کے بادلوں، تند ہوا اور ہولناک کڑک کا عذاب مسلط کیا۔ لیکن اصل تباہی ہوا کے تصرفات سے واقع ہوئی۔ اس وجہ سے اگر اثر سے مؤثر پر استدلال کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ نے سرما کے دھاریوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ہولناک کڑک اور بہرا کر دینے والی چیخ بھی تھی۔"

یہ امر بھی واضح رہے کہ اس طرح کی گرج چمک کے لوازم میں سے ژالہ باری بھی ہے جو اگر شدت اختیار کر لے تو سنگ باری کے ہولناک عذاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ہر چیز کو بھس بنا کر رکھ دیتی ہے۔

'فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ'۔ 'مُحْتَظِر' باڑھ بنانے والے کو کہتے ہیں۔ چرواہے عام طور پر اپنے گلّوں کی حفاظت کے لیے میدانوں میں جھاڑ جھنکاڑ کی باڑھ بنا لیتے ہیں جس کے اندر شب میں گلہ کو محفوظ کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی باڑھ کچھ عرصہ کے بعد بارش، ہوا اور جانوروں کے روندنے سے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ 'هَشِيم' اسی طرح کی ریزہ ریزہ چیز کو کہتے ہیں۔ یہ ان کی تباہی کی تمثیل ہے کہ ہوا، بارش، سنگباری اور کڑک نے اس طرح اُن کو چور چور کر دیا جس طرح باڑھ والے کی باڑھ چور چور ہو کے رہ جاتی ہے۔ یعنی دیکھنے والا ان کے گھروں اور آبادیوں کو دیکھتا تو یہ گمان کرتا کہ کبھی یہاں کچھ لوگ بسے تو تھے لیکن اب صرف ان کے روندے ہوئے آثار باقی رہ گئے ہیں۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ (۳۲)

یہ وہی ترجیع کی آیت ہے جس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ ٭ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ ۖ نَّجَّيْنَاهُم بِسَحَرٍ (۳۳-۳۴)

واقعۂ قوم لوط

فرمایا کہ اسی طرح لوطؑ کی قوم نے بھی تنبیہات کو جھٹلایا تو اتمام حجت کے بعد ہم نے ان پر سنگ ریزے برسانے والی آندھی مسلط کر دی۔ حاصب کی نوعیت سورۂ ذاریات کی تفسیر میں واضح کی جا چکی ہے۔

'إِلَّا آلَ لُوطٍ' یعنی اس عذاب سے صرف آل لوط محفوظ رہے۔ لفظ 'آل' پر اس کے محل میں بحث گزر چکی ہے کہ اس کے مفہوم میں صرف آدمی کی صلبی ذریت ہی شامل نہیں ہے بلکہ اس کی معنوی ذریت یعنی اس کے اتباع بھی اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔

'نَّجَّيْنَاهُم بِسَحَرٍ' فرمایا کہ لوطؑ اور ان کے اتباع کو ہم نے عذاب کے ظہور سے پہلے ہی سحر کے وقت بستی سے نکال لیا۔ عذاب کا وقت آگے 'وَلَقَدْ صَبَّحَهُم بُكْرَةً' کے الفاظ سے واضح فرمایا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب صبح کو آیا اور یہ لوگ طلوع فجر سے پہلے پہلے عذاب کے علاقہ سے نکل چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ حفاظت ان کو اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت سے حاصل ہوئی۔

نِّعْمَةً مِّنْ عِندِنَا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَن شَكَرَ (۳۵)

ایسے ہولناک عذاب سے اس طرح بال بال بچا لیا جانا صرف اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی عنایت ہی سے ممکن ہے۔ کسی دوسرے کے لیے اس طرح کا پروگرام بنا لینا ممکن نہیں ہے۔

'كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَن شَكَرَ' میں حضرت لوطؑ کی غیر معمولی صفتِ شکر کی غیر معمولی داد بھی ہے اور اس امر کا اعلانِ عام بھی کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عنایت صرف حضرت لوطؑ ہی کے لیے خاص نہیں تھی بلکہ آج بھی جو لوگ اس کے شکر کرنے والے ہوں گے وہ اس کی عنایتِ خاص کے حقدار ہوں گے۔ اس کا دامن رحمت بہت وسیع ہے۔

وَلَقَدْ أَنذَرَهُم بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ (۳۶)

آیت ۳۵ بیچ میں بطور جملہ معترضہ آ گئی تھی۔ یہ ان کے اوپر عذاب نازل ہونے کا سبب بیان ہو رہا ہے کہ وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب اس کے سزاوار ٹھہرے۔ اللہ کے رسول نے ان کو ہر پہلو سے اچھی طرح آگاہ کر دیا کہ انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو خدا کی پکڑ میں آ جائیں گے اور اس کی پکڑ سے کوئی بچانے والا نہیں بنے گا، لیکن وہ ہر تنبیہ میں حجتیں نکالتے ہی رہے۔

وَلَقَدْ رَاوَدُوهُ عَن ضَيْفِهِ فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ (۳۷)

یہ ان کی اس آخری جسارت کی طرف اشارہ ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر آ دھمکا۔ فرمایا کہ جس بے حیائی میں وہ مبتلا تھے رسول کی تنبیہات سے اس سے باز آنا تو الگ رہا وہ اس میں دن بدن دلیر ہی ہوتے گئے یہاں تک کہ جب فرشتے خوبصورت مردوں کے بھیس میں حضرت لوطؑ کے پاس آئے

توہیان کے مکان پر چڑھ دوڑے اور ان کو راضی کرنا چاہا کہ وہ ان مہمانوں کو ان کی ہوس کاری کے لیے ان کے حوالہ کر دیں۔

جو لوگ اس طرح اندھے بہرے بن جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق وہ اندھے بہرے ہی کر دیے جاتے ہیں۔ پھر نہ کوئی موعظت وہ سننے کے اہل رہ جاتے، نہ کوئی بڑی سے بڑی نشانی دیکھنے کے۔ اس کے بعد واحد چیز جو ان کے لیے باقی رہ جاتی ہے وہ اللہ کا عذاب ہے چنانچہ یہ لوگ بھی اسی عذاب کے حوالہ کر دیے گئے۔

'فَطَمَسْنَآ اَعْیُنَھُمْ' کے الفاظ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ان کی ظاہری آنکھیں بھی مُوند دی گئی ہوں بلکہ یہ ان کے بصیرت سے کلیۃً محروم کر دیے جانے کی تعبیر بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن میں اس مفہوم کے لیے یہ اسلوب بیان جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ محمد میں ہے:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فَاَصَمَّھُمْ وَاَعْمٰٓی اَبْصَارَھُمْ (محمد: ۲۳)	یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی۔ پس ان کے کان بہرے کر دیے اور ان کی آنکھیں اندھی کر دیں۔

اس آیت کی روشنی میں 'طَمَسْنَآ اَعْیُنَھُمْ' کا مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ اپنی ہوائے نفس سے مغلوب ہو کر اس حد کو پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عاقبت بینی کی صلاحیت سے بالکل محروم ہو گئے۔ انسان کی آنکھوں کا اصلی جوہر ان گڑھوں میں نہیں ہے جو چہروں پر نظر آتے ہیں بلکہ آنکھوں کی بصیرت میں ہے۔ یہ چیز جس کے اندر ختم ہو گئی اس پر اللہ کی لعنت ہے اور جس پر اللہ کی لعنت ہوئی وہ ہر لمحہ خدا کے غضب کا ہدف ہے۔

ویسے یہ بات بھی معلوم ہے کہ جب ان اشرار نے حضرت لوطؑ کو ان مہمانوں کے لیے ورغلانا چاہا تو مہمانوں نے حضرت لوطؑ پر یہ راز کھول دیا تھا کہ آپ مطمئن رہیں، ہم بشر نہیں بلکہ خدا کے فرستادے ہیں۔ ان شیاطین کی مجال نہیں ہے کہ ہمارے پاس پھٹک سکیں۔ اس کے فوراً بعد انھوں نے حضرت لوط کو روانہ ہو جانے کی ہدایت فرمائی۔ حضرت لوط علیہ السلام کے روانہ ہو جانے کے بعد قرین قیاس یہی ہے کہ وہ اپنے اصل ملکوتی روپ میں آ گئے ہوں گے اور اس روپ میں ان کو بشری آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں۔

وَلَقَدْ صَبَّحَھُمْ بُکْرَۃً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ (۳۸)

صبح کے وقت ان پر کنکر برسا دینے والا ہوا کا عذاب آ دھمکا۔ عرب میں حملہ اور غارت گری کا وقت بالعموم صبح ہی کا وقت ہوتا تھا، اس وجہ سے لفظ 'صَبَّحَ' اس معنی میں آنے لگا۔ اوپر اشارہ گزر چکا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اپنے اتباع کے ساتھ سحر کے اول وقت بستی سے نکل چکے تھے، یہاں یہ وضاحت ہے کہ عذاب طلوع صبح کے بعد آیا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت لوطؑ کے بستی سے نکلنے کے بعد عذاب کے آنے میں اتنی دیر ہوئی کہ حضرت لوطؑ عذاب کے علاقہ سے باہر نکل گئے۔

'عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ' سے مراد ٹک جانے والا عذاب ہے۔ عذاب ایک تو وہ ہے جو محض تنبیہ کے لیے آتا ہے جس میں کافر و مومن دونوں بلا امتیاز حصہ پاتے ہیں۔ البتہ مومن اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور کافر اس سے اپنی قساوتِ قلب میں اضافہ کرتے ہیں۔ دوسرا عذاب وہ ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں مکذبین کا فیصلہ کر دینے کے لیے آتا ہے۔ یہ عذاب جس قوم پر آیا اس نے وہیں ڈیرے ڈال دیے۔ اہل ایمان تو اس علاقہ سے نکال لیے گئے لیکن جنھوں نے رسول کی تکذیب کی وہ سب وہیں فنا کر دیے گئے۔

'مُّسْتَقِرٌّ' سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ عذاب کوئی ایسا عذاب نہیں تھا جو ایک جھونکے کی طرح آیا اور گزر گیا بلکہ یہ وہیں ٹک کے رہ گیا۔

فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۳۹-۴۰)

یہ وہی ترجیع ہے جو اوپر والی سرگزشتوں کے ساتھ گزر چکی ہے اور جس کی پوری وضاحت ہو چکی ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۝ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ (۴۱-۴۲)

واقعۂ فرعون — یہ آخر میں فرعون اور اس کی قوم کے انجام کی طرف بھی بالاجمال اشارہ کر دیا۔ آلِ فرعون سے مراد ظاہر ہے کہ صرف فرعون کے اہل و عیال ہی نہیں بلکہ اس کی پوری قوم ہے۔ 'نُذُر' یہاں جمع کے مفہوم میں ہے اور 'كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا' کے الفاظ سے اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ یعنی یہ اشارہ انذار کی ان تمام نشانیوں کی طرف ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں مصریوں کو قہرِ الٰہی سے ڈرانے کے لیے ظاہر ہوئیں اور جن کی پوری تفصیل تورات میں بھی موجود ہے اور قرآن نے بھی ان کا حوالہ دیا ہے اور ہم ان کی وضاحت کر چکے ہیں۔ ان نشانیوں میں سے ہر نشانی آنکھوں کی پٹیاں کھول دینے کے لیے کافی تھی لیکن فرعونیوں کے دل اتنے سخت ہو چکے تھے کہ وہ ساری نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی اندھے ہی بنے رہے۔

'اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جب ہم نے ان کو پکڑا تو اس طرح پکڑا جس طرح ایک زبردست اور بے پناہ قدرت والا پکڑتا ہے جس کی پکڑ سے کوئی بھی کسی کو بچا نہیں سکتا۔

۷- آگے آیات ۴۳-۵۵ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ قریش کے لیڈروں کو براہِ راست خطاب کر کے ان کو متنبہ فرمایا ہے کہ رسولوں اور ان کی قوموں کی جو تاریخ تمھیں سنائی گئی ہے اسی کے آئینہ میں اپنا حشر بھی دیکھ لو۔ پچھلے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام ہو چکا آخر تمھیں کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ تمھارے سامنے وہ انجام

نہیں آئے گا۔ تم بھی انہی کی طرح اس دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہوگے اور آخرت میں جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ اس سے کہیں سخت ہوگا۔ آخر میں بالاجمال اس صلہ کا بھی ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو ملنے والا ہے۔

آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۳-۵۵

أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰٓئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ أَمْ يَقُولُونَ
نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ بَلِ
السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ﴿۴۶﴾ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ
فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا
مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا
وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا أَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِن
مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ
مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ﴿۵۴﴾ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ
عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۵۵﴾

ع ۳ ۱۵ ۱۰

ترجمۂ آیات ۴۳-۵۵

کیا تمھاری قوم کے کفّار ان قوموں کے کفّار سے کچھ بہتر ہیں یا تمھارے لیے آسمانی صحیفوں میں براءت نامہ لکھا ہوا ہے! کیا ان کا زعم ہے کہ ہم مقابلہ کی قوت رکھنے والی جمعیت ہیں! یاد رکھیں کہ ان کی جمعیت عنقریب شکست کھائے گی اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ ۴۳-۴۵

بلکہ ان سے جو وعدہ ہے اس کے پورے ہونے کا اصلی وقت تو قیامت کا دن ہے اور قیامت کا دن بڑا ہی سخت اور بڑا ہی کڑوا ہوگا! ۴۶

بے شک مجرمین گمراہی میں ہیں اور دوزخ میں پڑیں گے۔ اس دن کو یاد رکھیں جب

یہ اپنے چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے! چکھو مزا دوزخ کی لپیٹ کا! ۴۷-۴۸

ہم نے ہر چیز ایک اندازے کے ساتھ پیدا کی اور ہمارا حکم تو بس یک دفعہ پلک جھپکنے کی طرح پورا ہو گا اور ہم نے تمہارے ہم مشربوں کو ہلاک کر چھوڑا تو ہے کوئی ان کے انجام سے عبرت حاصل کرنے والا! ۴۹-۵۱

اور جو کچھ انھوں نے کیا ہے سب رجسٹروں میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات ان میں مرقوم ہے۔ ۵۲-۵۳

بے شک خدا سے ڈرتے رہنے والے باغوں اور نہروں کے عیش میں ہوں گے۔ ایک پائدار مقام عزت میں، ایک مقتدر بادشاہ کے پاس! ۵۴-۵۵

۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ (۴۳)

یہ قریش سے خطاب ہے جن سے اوپر سے بحث چلی آرہی ہے۔ ان کو براہ راست خطاب کر کے فرمایا کہ رسولوں کے انذار کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام ہوا اس کی تفصیل تم نے سن لی۔ اب بتاؤ کہ انہی کی روش جب تم نے اختیار کی ہے تو آخر اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ اس سے مختلف معاملہ کیوں کرے گا؟ کیا تمہاری قوم کے کفار ان سے بہتر ہیں یا آسمانی صحیفوں میں تمہارے لیے کوئی براءت نامہ لکھا ہوا ہے کہ تم جو چاہو کرو، تم سے کوئی پرسش نہیں ہونی ہے! اللہ کے عدل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ ایک ہی قانون کے تحت معاملہ کرے اور یہی بات اس نے اپنے صحیفوں میں لکھی بھی ہے تو آخر تم نے اپنے لیے یہ عفو عام کا پروانہ کہاں سے حاصل کر لیا! یہی مضمون دوسرے مقام میں یوں ارشاد ہوا ہے: 'أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ' (القلم: ۳۷-۳۸) (کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے اس میں وہی کچھ ہے جو تم چاہو گے)۔

أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ ۝ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (۴۴-۴۵)

یعنی اگر ان کو یہ زعم ہے کہ وہ ایک مضبوط جمعیت ہیں، کوئی ان کو ان کی جگہ سے ہلا نہیں سکتا تو یہ زعم بالکل

باطل ہے۔ اللہ کے عذاب کے آگے کوئی نہیں ٹک سکتا۔

جن کو اپنی جمعیت و قوت پر ناز ہوتا ہے وہ جس طرح اپنے حریفوں کی کسی تہدید و وعید کو خاطر میں نہیں لاتے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ رسولوں کے انذار کو وہ ناقابلِ التفات سمجھتے ہیں۔ اپنے مادی وسائل و ذرائع پر ان کو اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ ان کے اوپر عذاب کدھر سے اور کس طرح آ جائے گا! فرمایا کہ اگر ان کو یہ گھمنڈ ہے کہ انھوں نے تمام مورچے سنبھال رکھے ہیں اور مدافعت کی قوت سے بھرپور ہیں تو یاد رکھیں کہ خدا کی افواجِ قاہرہ کے مقابل میں ان کی قوت و جمعیت ذرا بھی کام آنے والی نہیں بنے گی۔ اس وقت ان کی جمعیت شکست کھائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَأَمَرُّ (۴۶)

عذابِ دنیا کے بعد عذابِ آخرت

یعنی اس ہزیمت و پامالی سے تو وہ اسی دنیا میں عنقریب دوچار ہوں گے لیکن ان کو جو وعید سنائی جا رہی ہے اس کے ظہور کا اصلی دن قیامت کا دن ہے جو ان کے لیے بڑا ہی کٹھن اور نہایت ہی کڑوا ہو گا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اوپر والی آیت میں اس عذاب و ہزیمت کا ذکر تھا جس سے رسولوں کے مکذبین کو لازماً اسی دنیا میں سابقہ پیش آتا ہے۔ اس آیت میں اس عذاب کا حوالہ ہے جو اصل روزِ حساب یعنی قیامت میں ان کے سامنے آئے گا اور جو بڑا ہی کٹھن ہو گا۔

اس کتاب میں جگہ جگہ ہم اس سنتِ الٰہی کا حوالہ دے چکے ہیں کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والے اس دنیا میں بھی لازماً شکست کھاتے ہیں اور آخرت تو ان کی رسوائی کی جگہ ہے ہی۔ اسی حقیقت کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے۔

'مَوْعِد' یہاں ظرف کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ان کو جو وعید سنائی جا رہی ہے اس کے ظہور کا اصل وقت یا جگہ۔

'ادھٰی' یعنی ایسی مصیبت کا دن ہو گا کہ اس دن کسی کو کچھ سجھائی نہیں دے گا، سب کی سٹی بھول جائے گی۔

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلٰلٍ وَسُعُرٍ (۴۷)

لفظ 'سُعُر' کے جمع لانے کا فائدہ

یعنی آج تو یہ بڑے طنطنہ سے کہتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنے ہی اندر کے ایک بشر کو رسول مان کر اس کی پیروی کی تو ہم گمراہی اور جہنم میں پڑ گئے! ایسے بنے لیکن اس دن یہ کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جنھوں نے رسول کے انذار کی تکذیب کی وہ سارے مجرمین گمراہی میں تھے اور اس گمراہی کا نتیجہ ان کے آگے جہنم کی شکل میں آیا۔ لفظ 'سُعُر' ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں، جنون کے معنی میں نہیں بلکہ جہنم ہی کے مفہوم میں ہے۔ اس کے جمع کی صورت میں لانے سے مقصود اس کے مختلف طبقات کی طرف اشارہ ہے۔ لفظ 'جنت' بھی اسی طرح قرآن میں جگہ جگہ جمع کی صورت میں آیا ہے۔

يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ (۴۸)

استکبار کی سزا

اس دن ان مجرمین کو جس ذلت سے سابقہ پیش آئے گا، یہ اس کی یاددہانی ہے۔ فرمایا کہ آج تو بہت اکڑ اکڑ اور تھنے پھلا پھلا کر جھٹلا رہے ہیں لیکن وہ دن آنے والا ہی ہے جب یہ دوزخ کی آگ میں مونہوں کے بل گھسیٹے جائیں گے۔ مونہوں کے بل گھسیٹے جانا انتہائی ذلت کی تصویر ہے۔ یہ سزا ان کو اس وجہ سے دی جائے گی کہ انھوں نے محض غرور کے سبب سے ایک واضح حقیقت کو جھٹلایا۔

ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ یہ قول زبانِ قال سے بھی ہو سکتا ہے اور زبانِ حال سے بھی۔ میں دوسری صورت کو ترجیح دیتا ہوں۔ ان کا اس طرح گھسیٹا جانا خود ہی انھیں سب سے زیادہ واضح طور پر بتا دے گا کہ ان کی یہ درگت کیوں بن رہی ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۴۹)

ہر کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں وقت مقرر ہے

یعنی اس عذاب اور قیامت کا آنا تو قطعی ہے۔ رہا یہ سوال کہ ان کا آنا قطعی ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز ایک خاص اندازے کے ساتھ پیدا کی ہے۔ اس نے ہر چیز کے لیے ایک اجل معین ٹھہرائی ہے جس میں وہ اس کو مہلت دیتا ہے تاکہ وہ اپنی غایت کو پہنچ جائے۔ قوموں کے ساتھ بھی اس کا معاملہ اسی اصول پر ہے۔ کوئی قوم سرکشی کی راہ اختیار کرتی ہے تو وہ اس کو فوراً نہیں پکڑ لیتا بلکہ اس کو اتنی مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنی خیر و شر کی تمام صلاحیتیں اجاگر کر سکے تاکہ اس پر حجت تمام ہو جائے اور قیامت کے دن اس کے پاس پیش کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ یہی معاملہ وہ تمھارے (یعنی قریش) ساتھ بھی کرے گا۔ تمھیں اتنی مہلت دے گا جتنی مہلت اس کے قانون کے مطابق تمھیں ملنی چاہیے تاکہ تم اصلاح کرنی چاہو تو رسول کی ہدایت کے مطابق اصلاح کر لو۔ اور اگر یہ نہیں تو اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لو تاکہ جب پکڑے جاؤ تو تمھیں یہ شکوہ نہ رہے کہ تمھارے ساتھ جلدی کی گئی، اگر مزید مہلت ملتی تو اصلاح یافتہ بن جاتے۔ پس فلاح کی راہ یہ ہے کہ اللہ نے تمھیں جو مہلت بخشی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ، عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ اس کا وقت مقرر ہے۔ جب وقت آ جائے گا تو کوئی اس کو روک نہ سکے گا۔

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ (۵۰)

ہر کام کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ کافی ہے

یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ عذاب اور قیامت کے لانے کے لیے ہمیں کوئی تیاری کرنی ہے اس وجہ سے اس کے آنے میں دیر ہو رہی ہے۔ اس طرح کی کوئی رکاوٹ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ جب ہم اس کو لانا چاہیں گے تو اس کے لیے ہمارا ایک ہی حکم کافی ہوگا۔ اس حکم کو دہرانے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور اس حکم کے لیے بھی ہمیں کسی اہتمام و انتظام کی ضرورت نہیں پیش آنے کی بلکہ یہ اس طرح بروئے کار آئے گا جس طرح چشم و ابرو کا اشارہ ظہور میں آتا ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۱)

عاقل دوسروں کے انجام سے سبق سیکھتے ہیں

یعنی آخر اس عذاب کی تاخیر سے تم اس مغالطے میں کیوں پڑ گئے کہ یہ محض دھونس ہے؟ اگر تم پر ابھی نہیں آیا تو تمہارے ان پچھلے ہم مشربوں پر تو آ چکا ہے جن کو ہم ہلاک کر چکے ہیں تو آخر ان کے حالات سے کیوں سبق حاصل نہیں کرتے؟ 'اَشْیَاعَکُمْ' سے اشارہ ان قوموں کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں اوپر سنائی جا چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے عاقل ہونے کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ دوسروں کے انجام سے سبق حاصل کرے نہ کہ جب سب کچھ اپنے اوپر گزر جائے تب مانے۔ اس ماننے سے کیا نفع پہنچے گا!

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ۝ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ (۵۲-۵۳)

اللہ کے ہاں سب کا ریکارڈ محفوظ ہے

یعنی اس مغالطے میں بھی نہ رہیں کہ ان کا کوئی قول و فعل خدا کے احاطۂ علم سے باہر ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی کیا ہے سب ریکارڈ کے دفتروں میں محفوظ اور ہر چھوٹی بڑی بات نوشتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے سامنے اس کا سارا کیا دھرا رکھ دے گا اور مجرم اس کو دیکھ کر پکار اٹھیں گے کہ عجیب ہے یہ رجسٹر کہ ہر چھوٹی اور بڑی بات اس نے محفوظ کر لی ہے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ (۵۴)

'متقین' کا انجام

'مُجْرِمِيْنَ' کے بعد یہ 'مُتَّقِيْنَ' کا ذکر ہے کہ وہ باغوں اور نہروں کے عیش میں ہوں گے۔ 'مُتَّقِيْن' یہاں مذکورہ بالا 'مجرمین' یعنی مکذبین جزاء و سزا کے بالمقابل ہے اس وجہ سے اس سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو اپنے رب کے حضور پیشی اور جزاء و سزا سے برابر ڈرتے رہے۔ لفظ 'جنت' کا جمع ہونا جنت کی وسعتِ اطراف کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے اور اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ہر شخص کو کئی کئی باغ ملیں گے اور ان کے اندر بھی بہت سے الگ الگ باغ باغیچے ہوں گے۔ اگلی سورہ میں اس کی وضاحت آئے گی۔ 'نَهَرٍ' کے بعد ایک مضاف، عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق، محذوف ہے یعنی وہ باغوں اور نہروں کے عیش میں گھرے ہوئے ہوں گے۔ باغ اور نہر دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بغیر نہر کے باغ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن میں جنت کے ساتھ نہر کا ذکر اسی وجہ سے تقریباً ہر جگہ آیا ہے۔

فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ (۵۵)

یہ ان متقیوں کی اصل سرفرازی کا بیان ہے کہ جنت کا یہ عیش جاوداں ان کو ایک پائدار عزت والی بارگاہ میں، عظیم قدرت والے بادشاہ کے قرب میں، حاصل ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قرب ہی ہے جو جنت کو جنت بناتا ہے ورنہ اس کی حیثیت ایک باغ سے زیادہ نہیں ہے۔

'مَقْعَد' کی اضافت 'صِدْقٍ' کی طرف اس کی عزت، پائداری اور ابدیت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس طرح 'لسان صدق' کی ترکیب میں یہ تمام مفہوم پائے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس دربارِ عظیم کے درباری ہونے کا جو شرف ان کو حاصل ہو گا، نہ اس کی عزت بناوٹی اور نمائشی ہو گی نہ چند روزہ کہ آج ہے اور کل کرسی چھن جائے تو کوئی بھی پوچھنے والا نہ رہے۔

'عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ'۔ 'مَلِيْك' میں 'مَلِك' کے بالمقابل زیادہ زور ہے۔ اس کے ساتھ 'مقتدر' کی صفت اس کو مزید زوردار بنانے کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کا بادشاہ محض نام کا بادشاہ نہیں ہے، جیسا کہ مشرکوں اور ان گمراہ فرقوں نے مانا ہے جو خدا کو ہر چیز سے بالاتر محض ایک وجودِ معطل قرار دیتے ہیں، بلکہ وہ ہمہ گیر اقتدار رکھنے والا ہے۔

لفظ 'عِنْدَ' سے ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ انسان کو بلند سے بلند رتبہ بھی جو حاصل ہوگا وہ صرف یہ ہے کہ وہ بادشاہِ حقیقی کے قرب میں عزت کی جگہ پائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ وہ خدا میں ضم ہو کر خود خدا بن جائے، جیسا کہ باطنی صوفیوں نے دعویٰ کیا ہے۔

ربِّ کریم کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ۔

رحمان آباد

۱۱۔ اگست ۱۹۷۷ء

۲۵۔ شعبان ۱۳۹۷ھ

تدبرِ قرآن

۵۵

الرّحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا مزاج، عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس سورہ کو بعض لوگوں نے مدنی قرار دیا ہے لیکن پوری سورہ کا مدنی ہونا تو الگ رہا اس کی ایک آیت بھی مدنی نہیں معلوم ہوتی۔ پوری سورہ بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہے اور پڑھنے والا صاف محسوس کرتا ہے کہ یہ بیک دفعہ نازل ہوئی ہے۔

اپنے مزاج اور مطالب کے اعتبار سے یہ سورتوں کے اس زمرے سے تعلق رکھتی ہے جو مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہیں جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے جوش میں مخالفین اس مطالبہ پر اڑ گئے ہیں کہ جب تک ان کو کوئی نشانیٔ عذاب نہ دکھا دی جائے گی اس وقت تک نہ وہ یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ اس نئی دعوت کی تکذیب کے نتیجہ میں ان پر کوئی عذاب آجائے گا اور نہ یہ تسلیم کرنے والے ہیں کہ فی الواقع آگے کوئی دن آنے والا ہے جس میں ان کو دائمی عذاب اور ابدی رسوائی سے دوچار ہونا پڑے۔

ضد اور ہٹ دھرمی کی اس ذہنیت کے سبب سے سابق سورہ میں بھی آپ نے دیکھا ہے کہ 'فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ' و 'وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ' کی تذکیر بار بار دہرائی گئی ہے اور اس سورہ میں 'فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ' کی تنبیہ بار بار آئی ہے۔ کسی ایک ہی بات کی طرف بار بار توجہ دلانے کا یہ اسلوب ظاہر ہے کہ اسی صورت میں اختیار کیا جاتا ہے جب مخاطب یا تو اتنا ضدی ہو کہ اپنی خواہش کے خلاف کوئی بات ماننے کے لیے تیار ہی نہ ہو یا اتنا غبی ہو کہ جب تک اس کو کان پکڑ پکڑ کر ایک ایک چیز کی طرف توجہ نہ دلائی جائے اس سے کسی معقول بات کے سمجھنے کی توقع ہی نہ کی جا سکتی ہو۔

کلام میں مخاطب کی ذہنیت اور اس کے مزاج کی رعایت ایک ناگزیر شے ہے۔ اگر متکلم یہ چیز ملحوظ نہ رکھ سکے تو اس کا کلام نہ مطابقِ حال ہوگا، نہ بلیغ۔ جو لوگ کلام کے ان تقاضوں سے نابلد ہوتے ہیں وہ اس نوعیت کے کلام کی خوبیاں اور نزاکتوں کے پرکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ ایک ہی آیت کے بار بار اعادے کو تکرار پر محمول کرتے اور اس تکرار کو ایک عیب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سورہ پر بھی بعض کم سوادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں ایک ہی آیت کا بار بار اعادہ ہے۔ حالانکہ اگر وہ یہ سمجھ جائیں کہ اس میں مخاطب کس ذہنیت کے لوگ ہیں تو وہ پکار اٹھیں کہ اس سورہ کی ایک ایک ترجیع اپنے محل میں اس طرح جڑی ہوئی ہے جس طرح انگشتری میں نگینہ ہوتا ہے۔

سورۂ قمر میں قریش کے ہٹ دھرموں کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ سے آخر کیوں سبق نہیں لیتے؟ کیوں اڑے ہوئے ہو کہ جب عذاب کا تازیانہ دیکھ لو گے تب ہی مانو گے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے تمھاری تعلیم و تذکیر کے لیے ایک ایسی کتاب اتاری جو ہر پہلو سے اس مقصد کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اس سورہ میں اسی مضمون کو ایک نئے اسلوب اور نہایت اچھوتے انداز سے لیا ہے اور انھیں یہ سمجھایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمانیت ہے کہ اس نے تمھاری تعلیم کے لیے قرآن اتارا۔ تمھاری فطرت کا تقاضا یہی تھا کہ اس مقصد کے لیے قرآن ہی اتارا جائے۔ جب اللہ نے تم کو نطق و بیان کی صلاحیت سے نوازا ہے تو تم بات سمجھ بھی سکتے ہو اور سمجھا بھی سکتے ہو۔ اس اعلیٰ صلاحیت کا حق یہی ہے کہ اسی کو تمھاری تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے نہ کہ عذاب کے ڈنڈے کو، لیکن تمھاری یہ بدبختی ہے کہ تم اس نعمت و رحمت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کوئی نئی نشانی دیکھنے کے لیے مچلے ہوئے ہو۔ اگر کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو آسمان و زمین اور آفاق و انفس کی نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے جو ہر روز تمھارے مشاہدے میں آتی ہیں اور تمھیں انہی حقائق کے درس دیتی ہیں جن کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ ان نشانیوں کے ہوتے کسی نئی نشانی کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے بعد زمین و آسمان کی ایک ایک نشانی پر انگلی رکھ کر اور گویا ان ضدیوں کے کان پکڑ پکڑ کر توجہ دلائی ہے کہ یہ نشانیاں نہیں ہیں تو کیا ہیں! آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاتے رہو گے!

ب ۔ اس سورہ کی بعض اہم مشکلات

اس سورہ میں زبان و اسلوب اور تاویل کی جو مشکلات ہیں ان سے تو ہم ان شاء اللہ متعلق آیات کے تحت ہی تعرض کریں گے لیکن دو باتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت ہم تمہید ہی میں کر دینی چاہتے ہیں تاکہ ان سے بار بار تعرض کی نوبت نہ آئے۔ ان میں سے پہلی چیز لفظ 'اٰلَاءُ' کی تحقیق ہے اور دوسری 'فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ' میں خطاب کی نوعیت۔

لفظ 'اٰلاء' جمع ہے 'اِلْیٌ'، 'اَلْیٌ' اور 'اِلًی' کی۔ اس کے معنی تمام ائمۂ لغت اور ارباب تاویل کے نزدیک نعمت کے ہیں، لیکن استاذ امام مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'مفردات القرآن' میں اہل لغت کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ مولاناؒ کے نزدیک یہ لفظ صرف نعمت کے معنی میں نہیں آتا بلکہ اس کے معنی اس سے وسیع ہیں۔ وہ اس بحث کی تمہید اس طرح اٹھاتے ہیں۔

> "ہر چند لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ 'اٰلاء' کے معنی نعمتوں کے ہیں لیکن قرآن اور کلام عرب سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ کلام عرب کے تتبع اور لفظ کے مواقع استعمال سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ تو یہ ہے کہ اس کے اصل معنی کارناموں، کرشموں اور عجائب قدرت و حکمت کے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے کرشموں اور اس کی نشانیوں کا غالب حصہ آیات رحمت پر مشتمل ہے اس وجہ سے لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ 'اٰلاء' کے معنی نعمت ہی کے ہیں۔"

اسی سلسلہ میں مولاناؒ نے اس روایت کی بھی توجیہ کی ہے جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے اس کے معنی نعمت کے بتائے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ سلف کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جب ان سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ سوال

کے موقع و محل کو سامنے رکھ کر جواب دیتے کہ اس خاص مقام میں لفظ کا کیا مفہوم ہے۔

اس تمہید کے بعد مولاناؒ نے شعرائے جاہلیت میں سے طرفہ، میہ بنت ضرار، مہلہل، ربیعہ بن مقروم، اجدع الہمدانی، فضالہ بن زید، خنساء اور بعض حماسی شعراء کے کلام سے اپنی تائید میں شواہد پیش کیے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ مشہور جاہلی شاعروں نے، جن کا کلام لغت اور نحو کا ماخذ ہے، اس لفظ کو صرف نعمت ہی کے معنی میں نہیں لیا ہے بلکہ وسیع معنوں میں لیا ہے جس کے اندر نعمت، قدرت، شان، نشانی، کرشمہ، کارنامہ، اعجوبہ اور اس نوع کے تمام مفہوم شامل ہیں۔

ہمارے لیے یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ قرآن مجید کے اس دور کے مترجمین و مفسرین مولاناؒ کی تحقیقات اپنی کتابوں میں (بلا حوالہ سہی) اب نقل کرنے لگے ہیں۔ لیکن مولاناؒ کی تصنیفات عربی میں ہیں اس وجہ سے جن کی عربی خام ہے بعض اوقات وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اوپر کی تصریحات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس لفظ کو نعمت کے معنی میں لینے سے مولاناؒ کو انکار نہیں ہے بلکہ صرف نعمت کے معنی میں اس کو محدود کر دینے سے انکار ہے۔

'فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ' میں خطاب سے متعلق یہ امر تمام اربابِ تاویل کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ یہ جن و انس دونوں سے ہے اس کی وضاحت خود قرآن نے اسی سورہ میں مختلف اسلوبوں سے کر دی ہے۔ البتہ دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کی دعوت جس طرح انسانوں کے لیے ہے کیا اسی طرح جنوں کے لیے بھی ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اللہ تعالیٰ کی حجت اپنی قوم پر تمام کی اسی طرح جنوں پر بھی کی۔

اس کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ رسولوں کی بعثت اور ان کی دعوت سے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو ضابطے قرآن میں بیان فرمائے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جنوں کی طرف بھی تھی اور جس طرح آپ نے انسانوں پر حجت تمام کی اسی طرح جنوں پر بھی کی۔ قرآن میں یہ بات گوناگوں اسلوبوں سے واضح فرمائی گئی ہے کہ رسول جس قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے وہ انہی کے اندر سے ہوتا ہے، انہی کی زبان میں کلام کرتا ہے، انہی کی فطرت کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے اور وہ اپنی عملی مثال سے ان کے خیر کو اجاگر کرتا اور ان کے شر کو مٹاتا ہے اس وجہ سے اس کی زندگی ہر شخص کے لیے اُسوہ اور نمونہ بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو جنوں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ظہور میں آئی ہو۔

یہ بات بھی اپنی جگہ پر واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو دعوت دینے اور اس کی اصلاح و تربیت کے لیے جو جدوجہد فرمائی اس طرح کی کوئی جدوجہد جنوں کے اندر آپ کی طرف سے ہمارے علم میں نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی دعویٰ کیا جا سکتا ہے تو بس یہ کہ ایک دو بار آپ جنوں کی کسی پارٹی سے ملے

ہوں یا ان کی کسی پارٹی نے آپ کی زبان مبارک سے قرآن پاک کا کوئی حصہ سنا اور اس کو پسند کیا ہو۔ سورۂ احقاف آیات ۲۹-۳۲ کے تحت گزر چکا ہے اور آگے سورۂ جنّ میں ذکر آئے گا کہ جنوں کی ایک پارٹی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے قرآن پاک کی کچھ آیتیں سنیں اور ان کو نہایت پسند کیا۔ لیکن وہاں بھی اس امر کی تصریح ہے کہ جنوں کی اس پسندیدگی کی اطلاع حضورؐ کو براہِ راست نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے ہوئی۔ اس طرح کی اتفاقی ملاقاتیں ظاہر ہے کہ اس دعوت اور اتمامِ حجت کے لیے کافی نہیں ہیں جو ہر نبی و رسول نے اپنی قوم کے لیے انجام دی ہیں اور جس کے لیے ہی درحقیقت کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے۔ قرآن میں جنوں سے اس طرح کے خطاب کہیں کہیں جو پائے جاتے ہیں اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ نہیں ہے کہ وہ بھی براہِ راست اس کے مخاطب ہیں بلکہ جب ابرِ رحمت برستا ہے تو جس طرح خشک و تر سب کو سیراب کر دیتا ہے اسی طرح کبھی کبھی قرآن کی رحمت کا فیض جنوں تک بھی متعدی ہو جاتا ہے۔ بالخصوص ان کلیاتی امور میں جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہیں۔ توحید، معاد، جزاء و سزا، حق اور عدل اور اس نوع کے امور ہمارے اور ان کے مابین بالکل یکساں ہیں، اختلاف ہو سکتا ہے تو ان امور میں ہو سکتا ہے جن کا تعلق ہماری اور ان کی نوعی خصوصیات سے ہے۔ اس سورہ کا اصل مقصد، جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کی یاد دہانی اور غافلوں کو جھنجھوڑنا اور جگانا ہے اس وجہ سے غافل انسانوں کے ساتھ ساتھ اس میں غافل جنوں کو بھی مخاطب کر لیا ہے جس سے اس کلام کی ہیبت تمام آفاق پر چھا گئی ہے۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اس تقریر کا نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ جس طرح انسانوں کے اندر انسانوں میں سے نبی اور رسول آئے اسی طرح جنوں کے اندر انہی کے اندر سے نبی و رسول آئے ہوں جنھوں نے ان کی زبان اور ان کی نوعی خصوصیات و ضروریات کے مطابق ان کی اصلاح و تربیت کی ہو۔ ہم اس نتیجہ کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ یہ بات عقل و فطرت کے ٹھیک مطابق اور اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے بالکل موافق ہے جو اس نے نبیوں اور رسولوں کی بعثت سے متعلق قرآن میں بار بار واضح فرمائی ہے۔ جنات جب ہماری ہی طرح مکلف، اور ہماری ہی طرح عنداللہ مسئول اور ہماری ہی طرح اپنے اعمال کی جزا یا سزا کے سزاوار ہیں تو سنتِ الٰہی کے مطابق ضروری ہے کہ ان کی ہدایت کے لیے نبی اور رسول بھی مبعوث ہوئے ہوں اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ انہی کے اندر سے اٹھائے گئے ہوں اور انہی کی زبان میں انھوں نے ان کو دعوت دی ہو۔ ہمارے نزدیک قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جو اس کے خلاف جاتی ہو بلکہ مختلف آیات سے نہایت واضح طور پر اس کی تائید ہوتی ہے۔

سورۂ بقرہ میں آدمؑ و ابلیس کا جو ماجرا بیان ہوا ہے اس کے آخر میں آدمؑ و ابلیس دونوں سے بحیثیت جماعت خطاب کر کے فرمایا ہے کہ

قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِيۡعًا ج   ہم نے حکم دیا کہ یہاں سے اترو سب۔ پس اگر تمہارے

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرۃ : ۳۸)	پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت بھیجنے کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ جس طرح آدمؑ و اولادِ آدم سے متعلق ہے اسی طرح ابلیس اور اس کی ذرّیت سے متعلق بھی ہے۔

اسی طرح دوسرے مقام میں تصریح ہے کہ جنوں کے اندر انہی کے اندر سے رسول مبعوث ہوئے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (الانعام : ۱۳۰)	اے جنوں اور انسانوں کے گروہ، کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول میری آیتیں بیان کرتے اور تمہیں اس دن کی پیشی سے ڈراتے نہیں آئے؟ وہ جواب دیں گے کہ ہاں ہم خود اپنے خلاف گواہ ہیں۔ اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا اور انھوں نے خود اپنے خلاف گواہی دی کہ وہ کافر رہے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

اس سورہ کا نظم بالکل واضح ہے۔ ابتدا میں یہ تمہید ہے کہ قرآن خدائے رحمان کی رحمت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اپنے فضلِ خاص سے اس کو نطق و ادراک اور گویائی کی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا۔ ان اعلیٰ صلاحیتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت اعلیٰ ترین آسمانی کلام ــــــ قرآن ــــــ کے ذریعہ سے کی جائے نہ کہ عذاب کے تازیانے کے ذریعہ سے۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اس کتاب سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے کسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

اس کے بعد آفاق و انفس کی نمایاں نشانیوں پر گویا انگلی رکھ رکھ کے انسانوں اور جنوں، دونوں کو بار بار جھنجھوڑا ہے کہ یہ ساری نشانیاں ہی تو ہیں، تو تم اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے!

ان نشانیوں کے بیان کی ترتیب یہ ہے۔

ان نشانیوں کی طرف اشارہ جو شہادت دیتی ہیں کہ خالقِ کائنات عدل پسند ہے۔ اپنی اس دنیا کے کسی گوشے میں وہ تعدّی، طغیان اور حدود سے تجاوز کو پسند نہیں فرماتا۔

ان نشانیوں کی طرف اشارہ جو شہادت دیتی ہیں کہ خالق نے اس دنیا میں ربوبیت کا جو وسیع انتظام فرمایا ہے وہ مقتضی ہے کہ انسان اس میں شترِ بے مہار بنا کر نہیں چھوڑا گیا بلکہ لازماً ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ لوگوں کا حساب کرے گا۔ جو انعام کے مستحق ٹھہریں گے ان کو انعام دے گا اور جو سزا کے سزاوار نکلیں گے ان کو سزا دے گا۔

- خدا ہی نے جنوں اور انسانوں کو آگ اور مٹی سے پیدا کیا اور وہ ان کو دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس کام میں اس کو کوئی زحمت نہیں پیش آئے گی۔
- یہ ساری کائنات خدا ہی کے تصرف میں ہے۔ مشرق اور مغرب، دونوں کا رب وہی ہے۔ جو طلوع ہوتے ہیں اسی کے حکم سے طلوع ہوتے ہیں اور جو ڈوبتے ہیں اسی کے حکم سے ڈوبتے ہیں۔
- اس کائنات کے اضداد میں ان کے اپنے وجود سے بالاتر مقصد کے لیے سازگاری پائی جاتی ہے جو اس بات کی شہادت ہے کہ ایک بالاتر ارادہ سب پر حاوی ہے جو ان تمام اضداد کے اندر توافق پیدا کرتا اور ان کو اس کائنات کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کائنات اپنے اضداد کے تصادم سے فنا ہو جاتی۔ اس کا باقی رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس پوری کائنات پر صرف ایک ہی قاہر و حکیم ارادہ کارفرما ہے۔
- اس بات کی نشانی کہ صرف وہی ایک ذات باقی رہنے والی ہے۔ اس کے سوا سب فانی ہیں۔
- اس حقیقت کا اظہار کہ اس کے سوا سب محتاج ہیں۔ وہی اکیلا محتاج الیہ ہے۔ سب کی ضرورتیں وہی پوری کرتا ہے۔ جو نادان دوسروں سے مانگتے ہیں وہ بھی پاتے اسی سے ہیں۔
- اس امر کا اعلان کہ حساب کتاب اور جزائے اعمال کا ایک دن ضرور آئے گا اور اس دن نہ کوئی انسان خدا کے قابو سے باہر نکل سکے گا نہ کوئی جن۔ اس دن کسی مجرم کا جرم ثابت کرنے کے لیے کسی ثبوت اور گواہی کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ مجرموں کی پیشانیاں خود ان کے مجرم ہونے کی گواہی دیں گی پھر وہ چوٹی اور پاؤں سے پکڑ کر جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔
- اس دن مقربین کو جو جنتیں ملیں گی ان کا بیان۔
- اصحاب الیمین کو ملنے والی جنتوں کی تصویر۔

سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ (۵۵)

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــ اٰيات: ۷۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۳۰

اَلرَّحْمٰنُ (١) عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (٢) خَلَقَ الْاِنْسَانَ (٣) عَلَّمَهُ
الْبَيَانَ (٤) اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (٥) وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ
يَسْجُدٰنِ (٦) وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (٧) اَلَّا تَطْغَوْا
فِى الْمِيْزَانِ (٨) وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (٩)
وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (١٠) فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ
الْاَكْمَامِ (١١) وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ (١٢) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (١٣) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (١٤)
وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (١٥) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ (١٦) رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ (١٧) فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (١٨) مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ (١٩) بَيْنَهُمَا
بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ (٢٠) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (٢١) يَخْرُجُ
مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (٢٢) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (٢٣)

النصف
وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا
ع ۲۵ ۱۱ تُكَذِّبَانِ ﴿۲۵﴾ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ
وَالْإِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۲۸﴾ يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ ۚ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴿۲۹﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۳۰﴾

ترجمۂ آیات ۱-۳۰

خدائے رحمان نے قرآن کی تعلیم دی۔ اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کو گویائی سکھائی۔ ۱-۴

سورج اور چاند ایک حساب سے گردش کرتے ہیں۔ اور ستارے اور درخت بھی سجدہ کرتے ہیں۔ اور اس نے آسمان کو اونچا کیا اور اس میں میزان رکھی کہ تم بھی میزان میں تجاوز نہ کرو اور ٹھیک تولو پورے انصاف کے ساتھ۔ اور وزن میں کمی نہ کرو۔ ۵-۹

اور زمین کو اس نے بچھایا خلق کے لیے اس میں میوے اور کھجوریں ہیں جن پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں اور بھس والے اناج بھی ہیں اور خوشبودار پھول بھی ـــــ تو اے جن اور انسانو! تم اپنے رب کی کن کن عنایتوں کو جھٹلاؤ گے! ۱۰-۱۳

اس نے پیدا کیا انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے اور پیدا کیا جنات کو شعلۂ آتش سے تو تم دونوں اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے! ۱۴-۱۶

وہی مشرق کے دونوں اطراف کا خداوند ہے اور وہی مغرب کے دونوں اطراف کا بھی خداوند ہے تو تم اپنے رب کی کن کن عظمتوں کو جھٹلاؤ گے! ۱۷-۱۸

اس نے چھوڑے دو دریا، دونوں ٹکراتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک پردہ حائل رہتا ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے تو تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے۔ ۱۹-۲۱

ان دونوں ہی سے نکلتے ہیں موتی اور مونگے، تو تم اپنے رب کی کن کن نیرنگیوں کو

جھٹلاؤ گے! ۲۲-۲۳

اسی کے اختیار میں ہیں سمندروں میں پہاڑوں کی طرح اٹھے ہوئے جہاز۔ تو تم اپنے رب کے کن کن عجائب کو جھٹلاؤ گے! ۲۴-۲۵

روئے زمین پر جو بھی ہیں سب فانی ہیں اور تیرے رب کی عظمت و عزت والی ذات باقی رہنے والی ہے تو اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۲۶-۲۸

اسی سے مانگتے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ وہ ہر وقت ایک نئی شان میں ہے تو تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۲۹-۳۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (۱-۲)

قرآن اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی رحمت ہے

یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ خاص مہربانی ہے کہ اس نے تمھاری تعلیم و تذکیر کے لیے قرآن کریم جیسی رحمت و برکت نازل فرمائی۔ وہ چاہتا تو تمھاری طلب کے مطابق تم پر عذاب بھی بھیج سکتا تھا، لیکن اس نے غایت رحمت کے سبب سے تم کو اپنے صحیفۂ رحمت سے نوازا کہ تم اس کو پڑھو، سمجھو اور اس کی روشنی میں اپنی عقل و عمل کج رویوں کی اصلاح کر کے اس دنیا میں بھی پھلو پھولو اور آخرت میں بھی فلاح پاؤ ـــــ مطلب یہ ہے کہ جب تمھارے رب رحمان نے تمھیں اپنی رحمت سے نوازا تو تم رحمت کی جگہ اس کی نقمت کے طالب کیوں بنتے ہو!

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۳-۴)

انسان کی فطرت مقتضی تھی کہ اس کی ہدایت کے لیے قرآن نازل ہو

یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے تقاضے کے ساتھ ساتھ انسان کی خلقت اور اس کی صفات کا تقاضا بھی یہی ہوا کہ اس کی رہنمائی کے لیے صحیفۂ ہدایت اترے نہ کہ تازیانۂ عذاب۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو نطق و گویائی کی تعلیم دی۔ یہ گویائی اس بات کی شہادت ہے کہ خالق نے اس کو ایک عاقل و مدرک ہستی بنایا ہے۔ وہ بات سننے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس کے خیر و شر میں امتیاز کر سکتا ہے اور دوسروں تک بھی اس کو پہنچا اور ان کو سمجھا سکتا ہے۔ جب ان گوناگوں صلاحیتوں سے وہ آراستہ ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ قدرت نے یہ چاہا ہے کہ اس کو کلام کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے نہ کہ جانوروں کی

کی طرح ڈنڈے کے ذریعے سے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان میں نطق کی صلاحیت اس کے اندر دوسری گوناگوں صلاحیتوں کی شاہد ہے۔ یہ نطق مستلزم ہے کہ انسان عاقل و مدرک ہے، وہ کلیات سے جزئیات اور جزئیات سے کلیات بنا سکتا ہے، وہ استدلال، استنباط اور اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ارسطو نے اسی وجہ سے انسان کی اسی صفت کو اس کے لیے حیوانات سے ممتاز کرنے والی صفت قرار دیا ہے۔ یہ صفت اس کے اندر نہ پائی جائے تو پھر وہ انسان نہیں بلکہ دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ جو لوگ کسی حقیقت کو دلائل کی روشنی میں سمجھنے کی جگہ اس کو آنکھوں سے دیکھ کر ماننے کے منتظر ہیں وہ بھی جانوروں ہی کے گلے میں شامل ہیں اگرچہ وہ رہتے شاندار بنگلوں میں ہوں۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (۵-۶)

کائنات کی نشانیوں کی طرف ایک اشارہ

یہ اس کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ اگر قرآن کے انذار کی تصدیق کے لیے نشانیوں ہی کی ضرورت ہے تو کسی نئی نشانی کے منتظر کیوں ہو؟ اپنے سروں کے اوپر آسمان کی نشانیوں کو دیکھو، یہ سورج اور چاند کس پابندیٔ اوقات اور کس نظم و ضبط کے ساتھ اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ کبھی منٹ اور سیکنڈ کا بھی کوئی فرق واقع ہونے پائے۔ پھر یہ دیکھو کہ یہ کس طرح ان حدود و قیود کی پابندی کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ٹھہرا دیے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ سورج اپنی سرحدیں لانگ کر چاند کے مدار میں گھس جائے یا چاند سورج کے حدود میں دراندازی کر دے۔ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰسٓ: ۴۰) (نہ سورج کے لیے یہ روا کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات کو یہ حق کہ وہ دن سے سبقت کر جائے۔ ہر ایک اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے) کیا یہ نشانی ہر روز انسان کو یہ درس نہیں دیتی کہ جب اس کائنات کے خالق نے سورج اور چاند جیسی عظیم مخلوقات کو اپنے حدود و قیود کا پابند کر رکھا ہے تو انسان کو وہ کیوں اپنے امر و نہی کی پابندی سے آزاد رکھے گا؟ اور اگر انسان اس کے حدود و قیود کو توڑ کر دنیا میں اودھم مچانے کی جسارت کرے گا تو وہ آخر اس کو کیوں سزا نہیں دے گا؟ جو قانون اس نے اس کائنات کے ہر گوشے میں نافذ کر رکھا ہے اس کی پابندی کا سب سے زیادہ سزاوار تو انسان ہے۔

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ۔ شمس و قمر کی پابندیٔ حدود، جس کو شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ سے تعبیر کرتے ہیں، کا حوالہ دینے کے بعد یہ آسمان کے ستاروں اور زمین کے درختوں کے سجدے کا ذکر فرمایا کہ یہ بھی اپنے خالق و مالک کو سجدہ کرتے اور اپنے عمل سے انسان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی اپنے رب سے سرکشی نہ کرے بلکہ نہایت فرمانبردارانہ اس کو سجدہ اور اس کی بندگی کرے۔

ستاروں اور درختوں کے سجدے کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس بحث کو اس کے محل

میں دیکھیے۔ یہاں اعادے میں طوالت ہوگی۔

النجم کا صحیح مفہوم

'اَلنَّجْمُ' سے بعض لوگوں نے زمین پر پیدا ہونے والے چھوٹے پودے، جھاڑ اور بیلوں وغیرہ کے قسم کی چیزیں مراد لی ہیں۔ غالباً نجم کے ساتھ ستاروں کی مناسبت ان حضرات کی سمجھ میں نہیں آئی اس وجہ سے انھیں یہ تکلف کرنا پڑا حالانکہ ان دونوں کے درمیان نہایت واضح وصفی اشتراک موجود ہے۔ قرآن میں دونوں کے سجدہ کا ذکر مختلف اسلوبوں سے بار بار آیا ہے۔ اسی اشتراک کی بنا پر یہاں بھی دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہوا۔ اس سے آسمان و زمین دونوں کی ہم آہنگی واضح ہوتی ہے کہ ان کا رب ایک ہی ہے جس کو آسمان کے ستارے بھی سجدہ کرتے ہیں اور زمین کے درخت بھی۔ یہ امر واضح رہے کہ مجاہدؒ، قتادہؒ اور حسنؒ وغیرہ 'نجوم' کو اس کے معروف معنی ہی میں لیتے ہیں۔ ابن کثیرؒ نے بھی انہی لوگوں کی تائید کی ہے اور آیت 'اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ' (الحج: ۱۸) (نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج، چاند اور ستارے بھی) کا حوالہ دیا ہے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (۷)

آسمان کی بعض روشن نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد خود آسمان کی طرف توجہ دلائی کہ اس کو دیکھو، ستونوں کے بغیر کس طرح تمہارے رب نے ایسی ناپیدا کنار چھت بلند کر دی جس کی وسعتوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ پھر دیکھو کہ اس بے پایاں عظمت و وسعت کے باوصف اس میں اس نے ایسا توازن رکھا ہے کہ اس کے کسی کونے گوشے میں نہ کوئی کسی جھول کا پتہ دے سکتا ہے نہ کسی رخنے اور دراڑ کا۔ دوسرے مقام میں اسی حقیقت کی طرف یوں توجہ دلائی ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (لقمان: ۱۰)

اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ایسے ستونوں کے جو تمھیں نظر آئیں اور زمین میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے کہ مبادا وہ تمھارے سمیت کسی سمت کو لڑھک جائے۔

سورۂ ملک میں فرمایا ہے:

اَلَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (الملک: ۳-۴)

وہی ہے جس نے تہ بر تہ سات آسمان بنائے اور تم خدائے رحمان کی اس کاریگری میں کوئی نقص نہیں پا سکتے۔ نگاہ دوڑاؤ، کیا دیکھتے ہو کہیں کوئی خلل! پھر نگاہ دوڑاؤ بار بار، نگاہ ناکام اور تھک کر واپس آ جائے گی۔

'بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا' سے یہ بات نکلتی ہے کہ آسمان کی چھت میں توازن (میزان) قائم رکھنے کے لیے

اللہ تعالیٰ نے جذب وکشش کے ایسے ستون استعمال کیے ہیں جو دوسروں کو نظر نہیں آتے۔

اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ (۸)

آسمان کے خالق کی پسند کا اظہار اس کی صنعت سے

یعنی جب خالق نے اس کے اندر میزان رکھی جس پر یہ قائم ہے، یہ نہ ہو تو آسمان درہم برہم ہو جائے تو اس سے خالق کا مزاج اور اس کا ذوق معلوم ہوا کہ وہ چاہتا ہے کہ انسان بھی اپنے دائرۂ اختیار کے اندر اسی طرح توازن، عدل اور قسط کو ملحوظ رکھے۔ اس میزان میں کوئی خرابی نہ پیدا کرے ورنہ سارے نظامِ معاش و معیشت میں فساد پھیل جائے گا۔ مطلب یہ نکلا کہ اسی عدل و قسط کی دعوت تمہیں قرآن دے رہا ہے جس کی شہادت تمہارے سروں پر پھیلے ہوئے آسمان کے ہر گوشے سے مل رہی ہے اور اسی کی خلاف ورزی کے نتائج سے تمہیں وہ ڈرا رہا ہے کہ اگر تم نے اپنے طغیان سے اندھے ہو کر یہ میزان درہم برہم کر ڈالی تو اس کی سزا اس دنیا میں بھی بھگتو گے اور آخرت میں بھی اس کا وبال تم پر آئے گا تو آخر یہ واضح بات جس کی شہادت آسمان و زمین کے گوشے گوشے سے مل رہی ہے، تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی! آفاق کی ان سبق آموز نشانیوں کو نظر انداز کر کے کسی صاعقۂ عذاب کے درپے کیوں ہو!

وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ (۹)

اوپر والی بات ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان ہوئی تھی۔ اسی کلیہ پر مبنی ایک دوسری حقیقت کی طرف توجہ دلائی جس کا تعلق ہماری روزمرہ زندگی سے ہے۔ فرمایا کہ جس خدا کے بنائے ہوئے آسمان کی چھت کے نیچے رہتے ہو جب وہ میزان رکھنے والا اور عدل پسند ہے تو اس کی دنیا میں ڈنڈی ماری کی زندگی نہ بسر کرو بلکہ ناپ تول میں پورے انصاف کے ساتھ وزن کو قائم رکھو اور ہرگز تول میں کوئی کمی نہ کرو۔ قوم شعیب کی سرگزشت کے سلسلہ میں ہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ ناپ تول میں کمی کوئی منفرد برائی نہیں ہے بلکہ یہ پورے نظامِ تمدن میں فساد کی ایک خوفناک علامت ہے۔ یہاں ایک مزید حقیقت واضح ہوئی کہ یہ برائی درحقیقت اس میزان کے منافی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین قائم فرمائے ہیں۔ اگر کوئی قوم اس فساد کو قبول کر لیتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اس بنیاد ہی کے ڈھا دینے کے درپے ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس عالم کی تعمیر فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی بنائی ہوئی زمین پر ایسے لوگوں کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔

یہاں یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ ایک ہی بات مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے فرمائی گئی ہے۔ قرآن مجید پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلوب ان مواقع پر اختیار فرمایا گیا ہے جہاں اصل حکم کی خلاف ورزی نہایت خطرناک نتائج پر منتہی ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناپ تول میں کامل انصاف کا حکم ایک عظیم حکم ہے۔ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس میزانِ عدل کی ایک فرع ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس عالم کا نظام قائم فرمایا ہے اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ جو قوم اس میں فساد برپا کر دیتی ہے وہ

سارے نظامِ تمدن میں فساد برپا کر دیتی ہے۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۙ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۖ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ (۱۰-۱۲)

زمین کے اسباب ربوبیت کی طرف اشارہ

آسمان کے عجائبِ قدرت کی طرف توجہ دلانے کے بعد یہ زمین کے اسباب ربوبیت کی طرف توجہ دلائی۔ آسمان کے لیے 'رفع' کا لفظ استعمال فرمایا تھا اس کے مقابل میں زمین کے لیے 'وضع' کا لفظ نہایت موزوں اور معنی خیز استعمال فرمایا کہ آسمان کو شامیانے کی طرح تان دیا اور زمین کو فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ اس کی مخلوقات کے لیے یہ ایک آرام دہ مکان بن جائے۔ پھر جس طرح آسمان پر سورج، چاند اور ستاروں کے چراغ اور قمقمے لگا دیے کہ اس گھر کو روشنی اور حرارت حاصل ہوتی رہے اسی طرح اس گھر میں مختلف قسم کے پھلوں، غلوں اور پھولوں کے انبار بھی لگا دیے کہ اس کے مکینوں کو غذا بھی حاصل ہو، اس کے پھلوں سے وہ لذت اندوز اور خوش کام ہوں اور اس کے پھول ان کے لیے باصرہ نوازی اور معطر مشامی کا سامان بھی مہیا کریں۔

یہاں غلے کے ساتھ پھلوں اور خاص طور پر پھولوں کا ذکر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے صرف پیٹ بھرنے ہی کا سامان نہیں کیا ہے بلکہ ان کے ذوقِ جمال، لذتِ کام و دہن اور شوقِ آرائش کا بھی سامان کیا ہے جو اس کی ربوبیت ہی کی دلیل نہیں بلکہ خاص اہتمامِ ربوبیت کی دلیل ہے۔ اسی طرح 'حب' کے ساتھ 'ذوالعصف' کی صفت اور 'نخل' کے ساتھ 'ذات الاکمام' کی صفت اس خاص عنایت پر دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرمائی ہے کہ اس نے غلے اور پھل جو دیے تو اس طرح نہیں کہ گویا پھینک مارے ہوں بلکہ ایک ایک دانے اور ایک ایک پھل کی پیکنگ کا ایسا اعلیٰ انتظام فرمایا ہے کہ انسان اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اہتمام اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ انسان اپنے رب کی اس پروردگاری کا حق پہچانے، اس کا شکر گزار رہے، اور یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے ہوئے زندگی گزارے کہ جس نے اس کے لیے یہ سارا اہتمام کسی استحقاق کے بغیر کیا ہے وہ اس کو یوں ہی شترِ بے مہار کی طرح چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ حساب کتاب کا بھی ایک دن وہ لائے گا۔

اس آیت میں لفظ 'ریحان' سے متعلق ایک تنبیہ بھی ضروری ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی 'پتوں' کے لیے ہیں لیکن اس معنی میں یہ لفظ نہ عربی زبان میں استعمال ہوا ہے اور نہ یہاں پتوں کے ذکر کا کوئی محل ہے۔ معلوم ہوتا ہے غلے کے ذکر کے ساتھ پھول کا ذکر ان حضرات کو بے جوڑ سا معلوم ہوا اس وجہ سے انھیں یہ انوکھی تاویل کرنی پڑی حالانکہ اس کے ذکر کا ایک محل ہے جس کی وضاحت ہم نے اوپر کر دی۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۱۳)

جنوں کو خطاب کرنے کی ایک خاص وجہ

یہ آیت آگے بار بار آئے گی اور یہ اس سورہ کی اہم ترین آیت ہے اس وجہ سے ہم نے تمہید ہی میں لفظ 'اٰلآء' کی تحقیق بھی بیان کر دی ہے اور اس میں جنوں اور انسانوں سے جو خطاب ہے اس کی نوعیت پر بھی

روشنی ڈالی ہے۔ البتہ ایک بات ہم یہاں واضح کریں گے وہ یہ کہ قریش کے مکذبین کے ساتھ جنات کے مکذبین کو بھی یہاں جو شامل کر لیا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ تکذیب کی یہ مہم اس دور میں پوری شدت اختیار کر گئی تھی اور شیاطینِ انس و جن، دونوں گٹھ جوڑ کر کے اپنا پورا زور صرف کر رہے تھے کہ دعوتِ حق کے قدم اکھاڑ دیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو براہِ راست خطاب کر کے ان کو سرزنش بھی فرمائی اور آگے کی آیات سے معلوم ہوگا کہ ان کو چیلنج بھی کیا ہے کہ وہ اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لیں، کلمۂ حق ان کے علی الرغم بلند ہو کر رہے گا۔

تمہید میں یہ بات ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ سورہ مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب قریش پر ضد اور مخاصمت کا بخار پوری شدت کے ساتھ چڑھا ہوا تھا۔ اس دور میں ظاہر ہے کہ ان کو شیاطینِ جن کی کمک بھی سب سے زیادہ حاصل ہوئی ہوگی۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ دونوں مخاطب کیے جائیں۔

منعم کی شکرگزاری فطرت کا تقاضا ہے

نعمت کے ساتھ منعم کی شکرگزاری اور ربوبیت کے ساتھ مسئولیت کا احساس انسانی فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں سے ایک شخص متمتع تو ہو رہا ہے لیکن وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ان کے عوض میں اس کے اوپر نعمتوں کے بخشنے والے کا کوئی حق بھی قائم ہوتا ہے یا ان کے باب میں اس سے کوئی پرسش بھی ہونی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ان تمام نعمتوں کا مکذب ہے۔ قرآن نے یہاں اسی تکذیب پر قریش اور ان کے ہم مشرب جنوں کو سرزنش فرمائی ہے کہ ہر قدم پر تمہارے سامنے تمہارے رب کی وہ نعمتیں موجود ہیں جو تمہیں روزِ بازپرس کی یاد دہانی کر رہی ہیں لیکن تم اس کا انکار کیے جا رہے ہو تو اس کی کن کن نعمتوں اور عنایتوں کی تکذیب کرو گے!

خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۱۴-۱۶)

انسانی خلقت کے مختلف مراحل سے قیامت پر استدلال

یہ جنوں اور انسانوں دونوں کو ان کی خلقت یاد دلا کر ان کی دوسری خلقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تمہارا رب ایک مرتبہ پیدا کرنے کے بعد تمہیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں رہا اس وجہ سے اب کسی روزِ حساب کا معاملہ خارج از امکان ہو گیا۔ یاد رکھو کہ جس میٹریل سے اس نے تم کو پیدا کیا ہے وہ میٹریل بھی پوری مقدار میں موجود ہے اور خدا کی قدرتِ تخلیق بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح تمہاری خلقتِ اوّل کے وقت موجود تھی تو اگر تم اپنی خلقت کا انکار نہیں کر سکتے تو اپنی دوبارہ پیدائش سے انکار کی بھی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

'صلصال' خالص مٹی کو کہتے ہیں اور 'فخار' اس مٹی کو کہتے ہیں جو ٹھیکرے کی طرح خشک ہو جائے۔ زندگی جن مراحل سے گزرتی ہوئی انسانیت کے مرحلے تک پہنچتی ہے قرآن نے جگہ جگہ ان تمام مراحل کا حوالہ دیا ہے۔ کہیں فرمایا ہے، انسان کو پانی سے پیدا کیا، کہیں مٹی کا حوالہ دیا ہے، کہیں سڑے ہوئے گارے کا ذکر کیا ہے۔ یہاں خشک مٹی کا ذکر ہے۔ اسی طرح سب سے آخری مرحلہ یہ بیان ہوا ہے کہ نطفہ سے اس

کی نسل جاری کی۔ یہ انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل ہیں جن کی وضاحت سورۂ حجر آیت ۲۶ کے تحت ہو چکی ہے۔ ان مراحل کے بیان سے مقصود انسان کو خود اس کے وجود کے اندر خدا کی شانوں، قدرتوں اور حکمتوں کا مشاہدہ کرانا ہے تاکہ انسان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ خدا ہی کی شان ہے کہ اس نے اس کو پانی اور کیچڑ سے نکالا، پھر میدانی علاقوں کی خشک و معتدل آب و ہوا میں اس کی پرورش کی، پھر درجہ بدرجہ اس کو ایک نیا ہیولیٰ بخشا اور اس کی نسل چلانے کے لیے ایک نیا نظام قائم فرمایا۔ ان باتوں کے بیان سے ظاہر ہے کہ مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ جس انسان کو اللہ تعالیٰ ان طویل راستوں سے گزار کر اس اہتمام سے یہاں تک لایا ہے اس کا وجود بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا اور ساتھ ہی یہ دکھانا بھی ہے کہ جو خدا ئے علیم و حکیم کیچڑ کے اندر پیدا ہونے والے ایک خلیہ کو انسان بنا سکتا ہے اس کی قدرت سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

جنّات کی خلقت آگ کے شعلہ سے ہوئی

'وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ'۔ 'مارج' کے معنی شعلہ کے ہیں۔ شعلہ آگ کا خلاصہ ہوتا ہے۔ جس طرح انسان مٹی کے خلاصہ اور جوہر سے پیدا ہوا ہے اسی طرح جنّات کی پیدائش آگ کے جوہر سے ہوئی ہے ان کے مدارجِ حیات کی زیادہ تفصیل قرآن نے نہیں کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک بالکل مختلف نوع کے تمام مدارجِ خلقت کو سمجھنا ہمارے لیے نہایت مشکل تھا۔

اس کے بعد وہی آیتِ ترجیع ہے جس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اس کا مطلب یہاں ہوگا کہ جب اپنے رب کی یہ شانیں اور یہ قدرتیں و حکمتیں خود اپنے وجود کے اندر مشاہدہ کرتے ہو تو اس بات کو کیوں بعید از امکان سمجھتے ہو کہ خدا تمہیں دوبارہ حساب کتاب کے لیے اٹھا کھڑا کرے، آخر اپنے رب کی کتنی نشانیوں کو جھٹلاتے اور نئی نشانیوں کا مطالبہ کرتے رہو گے!

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۱۷-۱۸)

مشرق اور مغرب کے تثنیہ لانے کی وجہ

یعنی مشرق و مغرب، سب کا رب اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ نہ کوئی اس کے حدودِ مملکت سے باہر ہے اور نہ کوئی اس کی خدائی میں حصہ دار ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مشرق و مغرب کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہے۔ اس کے آسمانوں اور زمین میں بالشت بھر علاقہ بھی کسی اور کے قبضہ میں نہیں ہے کہ وہ اس علاقہ والوں کو خدا کی پکڑ سے بچا لے۔ سورۂ معارج میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: 'فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۙ عَلٰٓي اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ' (۷۰-۴۰-۴۱) (پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے خداوند کی، ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ان سے بہتر صورت میں بدل کر ان کو اٹھا کھڑا کریں اور ہم اس کام میں عاجز ہونے والے نہیں ہیں)۔

'مشرقین' اور 'مغربین' کے تثنیہ لانے کی توجیہ عام طور پر ہمارے مفسرین نے یہ کی ہے کہ اس سے سردی اور گرمی کے مشرق و مغرب مراد ہیں لیکن یہ محض تکلف ہے۔ قرآن میں یہ الفاظ واحد، تثنیہ، جمع تینوں صورتوں

میں استعمال ہوئے ہیں اور ان تینوں ہی صورتوں میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ مثنیٰ کی صورت میں مقصود ان کے دونوں اطراف کا احاطہ ہوتا ہے اور جمع کی شکل میں ان کے اطراف و اکناف کی بے نہایت وسعت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ مثنیٰ اور جمع کے اس نوع کے استعمال کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔

اس کے بعد وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے یعنی جس خدا کی عظمت و شان کا حال یہ ہے کہ مشرق و مغرب سب اس کے زیرِ نگین ہیں، اگر اس کے انذار کو سمجھتے ہو کہ یہ ڈراوے محض ہوائی ہیں تو آخر اس کی کن کن عظمتوں کی تکذیب کرو گے!

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۱۹-۲۱)

توحید کی دلیل اضداد کے توافق کے پہلو سے

یہ اوپر کے دعوائے توحید کی دلیل اس کائنات کے اضداد میں توافق کے پہلو سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کے ہر گوشے میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے، طلوع کے ساتھ غروب، دن کے ساتھ رات، اور سردی کے مقابل میں گرمی ہے تو اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس کے اندر مختلف ارادے اور مشیتیں کارفرما ہیں۔ انسان، اگر اس کی تہ میں جھانک کر دیکھے تو معلوم ہوگا کہ اس کے ہر تضاد کے اندر نہایت گہرا توافق اور نہایت عمیق سازگاری ہے۔ ہر چیز اپنے مقابل کے ساتھ مل کر ایک بالاتر مقصد کی خدمت میں لگی ہوئی ہے جو اس بات کی شہادت ہے کہ درحقیقت ایک ہی ارادہ اس تمام کائنات پر حکمران ہے جو اس کے تمام اضداد کو اپنی حکمت کے تحت کائنات کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ فرمایا کہ دیکھو، وہ دو دریاؤں کو چھوڑتا ہے، ایک کھاری ہوتا ہے، دوسرا شیریں، دونوں آپس میں ٹکراتے ہیں لیکن خدائے قادر و حکیم دونوں کے درمیان ایک ایسا غیر مرئی پردہ ڈال دیتا ہے کہ وہ دونوں ملتے بھی ہیں اور الگ الگ اپنے مزاج پر قائم بھی رہتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ کھاری دریا شیریں یا شیریں دریا کھاری بن جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ظاہری تضاد کو دیکھ کر اس مغالطہ میں پڑ گئے کہ اس کے اندر متضاد ارادے کارفرما ہیں اور پھر انھوں نے اپنے اپنے تصور کے مطابق اپنے الگ الگ دیوتا بنا لیے ان کی نظر اس توافق پر نہیں پڑی جو ہر تضاد کے اندر موجود ہے اور جو توحید کی سب سے بڑی حجت ہے۔

آخر میں وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ یعنی ان روشن شواہد کے بعد بھی اگر اس مغالطہ میں مبتلا ہو کر خدا نے تم کو پکڑا تو تمھارے دیوی دیوتا تم کو بچا لیں گے، تو آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے۔

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۲۲-۲۳)

یہ ایک مشترک مجموعی فائدہ کی طرف اشارہ ہے جو باوصف تضاد ان سے حاصل ہوتا ہے کہ ان دونوں ہی سے موتی اور مونگے حاصل ہوتے ہیں جو انسان کے لیے دولت بھی ہیں اور زینت بھی۔

بعض مفسرین کا ایک غلط دعویٰ

بعض مفسرین نے یہاں یہ سوال اٹھایا ہے کہ مرجان اور موتی تو صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں اور قرآن کا بیان یہ ہے کہ دونوں سے نکلتے ہیں تو اس کا جواب کیا ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ موتی صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (ENCYCLO-PAEDIA BRITANICA) میں موتی پر جو مضمون ہے اس کا ایک ضروری اقتباس ہم یہاں درج کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرجان اور موتی میٹھے پانی سے بھی نکلتے ہیں۔ مضمون نگار لکھتا ہے:

"نصف کرۂ شمالی کے منطقہ معتدلہ میں میٹھے پانی کے سیپ کے گھونگے (FRESH WATERS MUSSELS) بہت قیمتی موتی پیدا کرتے رہے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے میٹھے پانی کے موتی زیادہ تر دریائے مسسی پی (MISSISSIPPI RIVER) سے نکلتے ہیں۔ برطانیہ میں موتی نکالنے کی صنعت اب زوال پر ہے، لیکن سکاٹ لینڈ کے دریاؤں، سپے (SPEY) اور طے (TAY) اور شمالی ویلز کے دریا کان وے (CONWAY) سے نکلنے والے موتیوں کی ایک زمانے میں بہت مانگ رہی ہے۔ چین میں میٹھے پانی سے موتی نکالنے کی صنعت ہزار برس قبل مسیح سے معروف ہے۔"[1]

اور بالفرض کھاری پانی ہی سے نکلتے ہوں جب بھی اس سے قرآن کے بیان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ قانونِ قدرت یہ ہے کہ اشیاء تضادات کے ملاپ سے پیدا ہوتی ہیں۔ بچہ مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے وہ پرورش اگرچہ ماں کے پیٹ میں پاتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ عورت اور مرد، دونوں سے وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح موتی شیریں اور کھاری، دونوں ہی پانیوں کے ملاپ سے پیدا ہوتے ہیں اگرچہ وہ پرورش کھاری پانی ہی کے اندر پاتے ہوں۔

اس کے بعد وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۲۴-۲۵)

تضاد کے اندر توافق کی ایک اور نشانی

تضاد کے باوصف توافق کی ایک اور نشانی کی طرف توجہ دلائی کہ یہ بھی خدا ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ پہاڑوں کی طرح اونچے اور بھاری بھاری جہاز سمندروں کے سینے پر دوڑتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ کوئی وزن رکھنے والی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی پانی کے اندر ڈالیے تو ڈوب جاتی ہے لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی کارسازی ہے کہ جہاز جیسی بھاری چیز، ہزاروں ٹن سامان اپنے اوپر لادے ہوئے، پانی کو چیرتی ہوئی چلتی اور ڈوبنے سے محفوظ رہتی ہے۔ 'لَهُ' سے مطلب یہاں یہ ہے کہ تضادات کے اندر اس قسم کی موافقت و سازگاری پیدا کرنا صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کے اختیار میں ہے۔ صرف اسی کی قدرت و حکمت سے ایسے کرشمے ظہور میں آتے ہیں اور تم ہر جگہ یہ دیکھ رہے ہو تو اپنے رب کے کن کن کرشموں کو

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مضمون: PEARL

جھٹلاؤ گے! یہ مضمون سورۂ فاطر میں اس طرح بیان ہوا ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ ۖ هَٰذَا
عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَ
هَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۖ وَمِن كُلٍّ
تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ
حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۖ وَتَرَى الْفُلْكَ
فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (فاطر: ۱۲)

اور دونوں دریا یکساں نہیں ہوتے۔ ایک شیریں اور
خالص، جس کا پانی پینے کے لیے خوش گوار ہوتا ہے
اور دوسرا کھاری تلخ۔ اور ان دونوں ہی سے تم تازہ
گوشت بھی کھاتے ہو اور آرائش کے سامان بھی نکالتے
ہو جن کو پہنتے ہو۔ اور کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ ان میں
پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم اس کا فضل چاہو اور تاکہ
اس کے شکر گزار رہو۔

سورۂ شوریٰ کی آیات کے تحت بھی یہ مضمون بیان ہو چکا ہے۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۲۶-۲۸)

مذکورہ بالا دلائل کا لازمی نتیجہ

ضمیر مجرور کا مرجع 'الارض' (زمین) ہے اس کا ذکر اوپر آیت ۱۰ سے چلا آ رہا ہے۔ زمین کے اندر اللہ تعالیٰ نے انسان کی پرورش کا جو سامان کیا ہے، اس کی خلقت میں اپنی جو شانیں اور حکمتیں دکھائی ہیں، اس کے ہر گوشے پر جس طرح اس کا اقتدار محیط ہے اور اس کے اضداد کے باہمی توافق سے جس طرح اس کے خالق کی یکتائی نمایاں ہو رہی ہے، یہ باتیں مستلزم ہیں کہ ایک دن یہ ساری چیزیں فنا ہو جائیں گی، صرف اللہ تعالیٰ کی باعظمت اور سزاوارِ تعظیم ذات ہی باقی رہ جائے گی، جس کے حضور سب کی پیشی ہونی ہے اور وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ سزاوار ہو گا، کسی کی مجال نہیں ہو گی کہ اس کے آگے دم مار سکے یا اس کے اذن کے بغیر کسی کی سفارش کے لیے زبان کھول سکے۔

'ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ' کے الفاظ اس سورہ کی آخری آیت میں بھی آئے ہیں۔ مقصود ان دونوں لفظوں کے لانے سے یہ ہے کہ درحقیقت وہی اپنی ذات میں باعظمت ہے اس وجہ سے وہی سب کی تعظیم و تکریم کا حقیقی سزاوار ہے۔ کوئی اور ان اوصاف میں اس کا شریک نہیں ہے۔ لفظ 'وجہ' یہاں اس کی ذات کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ چہرہ ذات کا سب سے اشرف حصہ ہے اس وجہ سے بعض اوقات اس سے پوری ذات کو تعبیر کر دیتے ہیں۔

آخر میں آیتِ ترجیع ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پیغمبر کے انذار کو سنو یا نہ سنو لیکن بالآخر یہ بات ہو کے رہے گی کہ ایک دن سب فنا ہو جائیں گے، صرف اللہ جلّ شانہٗ کی ذات ہی باقی رہے گی تو تم اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے!

يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ ۚ فَبِاَىِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۲۹-۳۰)

حقیقی مرجع اللہ ہی ہے

یعنی سب کا مرجع حقیقی وہی ہے۔ جو بھی پاتا ہے اسی کا دیا ہوا پاتا ہے۔ لفظ 'سوال' یہاں اپنے ثمر اور نتیجہ کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے۔ یعنی ہر مانگنے والا چونکہ پاتا اسی سے ہے اس وجہ سے خواہ کسی سے مانگے لیکن حقیقت کے اعتبار سے اسی سے مانگتا ہے۔ دوسروں سے اس کا مانگنا بالکل بے سود اور لاحاصل ہے۔ کوئی دوسرا نہ کچھ دے سکتا نہ کچھ لے سکتا۔ اس وجہ سے کسی اور کو مولیٰ و مرجع سمجھ کر اس کے آگے اپنی التجا و درخواست پیش کرنا محض سفاہت ہے۔ دنیا میں انسان کو جو کچھ ملتا ہے خدا ہی کا دیا ہوا ملتا ہے اور آخرت میں بھی جو کچھ ملے گا اسی کا دیا ہوا ملے گا۔

یہ لفظ احتیاج کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مثلاً سورہ 'حٰمٓ السجدۃ' میں ہے: سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۱۰) (تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں) یہ معنی لیے جائیں تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اسی کے محتاج ہیں۔

کائنات کا سارا انتظام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے

'كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ'۔ یعنی اس مغالطہ میں نہ رہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو پیدا کر کے اس کا انتظام و انصرام تمہارے فرضی دیویوں دیوتاؤں کے سپرد کر دیا ہے اور خود بالکل معطل ہو کر کسی گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھا ہے۔ جو لوگ اس مغالطہ میں ہیں وہ خدا کی شانوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی اس کائنات کا سارا انتظام خود سنبھالے ہوئے ہے۔ وہی آسمانوں میں سورج اور چاند کو حرکت دیتا ہے اور وہی زمین میں اپنے بندوں کی ضروریات پوری کرتا ہے اس وجہ سے اس کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں ہے۔ 'یوم' یہاں وقت کے مفہوم میں ہے اور قرآن میں یہ لفظ اس مفہوم میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس دنیا کا انتظام خود سنبھالے ہوئے ہے تو کسی اور وسیلہ و واسطہ کی ضرورت کہاں باقی رہی؟ پھر تو جس کو جو کچھ مانگنا ہو اسی سے مانگے۔

اس کے بعد آیت ترجیع ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی گوشۂ خلوت میں نہیں بیٹھا ہوا ہے بلکہ وہ ہر وقت اپنی دنیا کے انتظام و انصرام میں لگا ہوا ہے اور اس کی شانیں اس کائنات کے گوشہ گوشہ سے نمایاں ہیں تو اس کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے۔

۲- آگے آیات ۳۱-۴۵ کا مضمون

آگے اس دن کی تصویر آ رہی ہے جس سے لوگوں کو ڈرایا جا رہا ہے۔ نظمِ کلام بالکل واضح ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۱-۴۵

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿٣١﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٢﴾
يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿٣٣﴾ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٤﴾ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ڏ وَّ
نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿٣٥﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٦﴾ فَاِذَا انْشَقَّتِ
السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿٣٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٨﴾ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُسْــَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿٣٩﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٠﴾ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ
بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ﴿٤١﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٢﴾ هٰذِهٖ
جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٤٣﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا (وقف لازم)
وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿٤٤﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٥﴾ ع ۲ / ۱۲

ترجمۂ آیات ۳۱-۴۵

ہم تمہارے لیے فارغ ہی ہو رہے ہیں، اے دونوں جتھو! تو تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! اے جنوں اور انسانوں کے گروہ، اگر تم یہ کر سکو کہ نکل بھاگو آسمانوں اور زمین کے اطراف سے تو نکل بھاگو، تم پروانۂ راہداری کے بدون نہیں نکل سکو گے۔ تو تم اپنے رب کے کن کن اختیارات کو جھٹلاؤ گے! تم پر مارے جائیں گے آگ کے شعلے اور تانبے! تو تم اپنا بچاؤ نہ کر پاؤ گے۔ تو تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے! ۳۱-۳۶

پس یاد رکھو اس وقت کو جب آسمان پھٹ کر کھال کی مانند سرخ ہو جائے گا تو تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے! پس اس دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہ کی

بابت سوال کی ضرورت نہیں ہوگی، تو تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! مجرم پہچان لیے جائیں گے اپنی علامتوں سے پس پکڑے جائیں گے چوٹیا اور پاؤں سے (اور جہنم میں پھینک دیے جائیں گے) تو اپنے رب کی کن کن قدرتوں کی تکذیب کرو گے! یہ ہے وہ جہنم جس کی مجرم تکذیب کرتے رہے تھے۔ وہ اس کے اور اس کے کھولتے پانی کے درمیان چکر لگاتے ہوں گے تو اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۳۷-۴۵

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۱-۳۲)

جزا و سزا کی وعید

'ثقلان' سے مراد جن و انس، دونوں من حیث الجماعت ہیں۔ جماعتی حیثیت میں چونکہ دونوں بھاری بھرکم بن جاتے ہیں اس وجہ سے 'ثقلان' کا لفظ استعمال ہوا۔ اس لفظ کے استعمال سے اس چیلنج کی سنگینی واضح ہوتی ہے جو اس آیت میں جنوں اور انسانوں دونوں گروہوں کو بیک وقت دیا گیا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ خواہ تم کتنے ہی بھاری لشکر ہو لیکن اللہ جل شانہٗ تم سے تنہا نمٹنے کے لیے عنقریب فارغ ہوا چاہتا ہے۔ فارغ ہونے سے اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ ابھی تو اس دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ یہ اپنی مدت پوری کرے لیکن وہ وقت دور نہیں ہے جب یہ مدت پوری ہو جائے گی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اس دنیا کے نظم و نسق سے بالکل فارغ ہو کر بندوں کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوگا اور ایک ایک کا حساب کر کے جس کو جس جزا یا سزا کا سزاوار پائے گا اس کو وہ دے گا۔ اس اسلوبِ بیان سے یہ مضمون بھی نکلا کہ یہ کام اللہ تعالیٰ سرسری طور پر نہیں بلکہ پوری یکسوئی سے کرے گا۔ اس لیے کہ یہی کام درحقیقت اس دنیا کے پیدا کرنے کی اصل غایت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ دنیا بالکل بے مقصد بن کے رہ جاتی ہے۔

اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے۔ یہاں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس دنیا میں جو واضح دلیلیں تمہارے سامنے جزا و سزا کے حق ہونے کی پیش کی گئیں وہ تو تم نے رد کر دیں لیکن اس وقت کیا کرو گے جب دیکھو گے کہ فی الواقع روزِ حساب آ گیا اور اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہو گئی؟ کیا اس وقت بھی جھٹلاؤ گے؟ اگر جھٹلاؤ گے تو آخر اپنے رب کی کتنی نشانیوں کو جھٹلاؤ گے؟

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ؕ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۳-۳۴)

کوئی چیز خدا کی گرفت سے باہر نہیں ہے

یعنی اگر تمہارا گمان ہے کہ تم بالکل غیر مسئول اور مطلق العنان ہو تو ذرا اللہ کے بنائے ہوئے آسمانوں اور اس کی پیدا کی ہوئی زمین کے حدود سے باہر نکل کر دکھاؤ تاکہ ثابت ہو جائے کہ تم اس کی گرفت سے آزاد ہو یا ہو سکتے ہو۔

'لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ'۔ لفظ 'سُلْطٰنٌ' اختیار و اقتدار کے معنی میں بھی آتا ہے اور سند کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ اس دوسرے معنی میں ہے۔ یعنی تم لاکھ چاہو لیکن آسمانوں اور زمین کے حدود سے باہر نہیں نکل سکتے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب تمہارے پاس پاسپورٹ ہو۔ اور یہ چیز ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور تمھیں نہیں دے سکتا۔

آگے آیت ترجیع ہے۔ یہاں اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اگر تمہاری بے اختیاری و بے بسی کی یہ دلیل بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی تو آخر اپنے رب کی کن کن قدرتوں اور شانوں کو جھٹلاتے رہو گے۔

یُرْسَلُ عَلَیْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۵-۳۶)

یعنی اگر تم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے مقررہ حدود سے باہر نکلنے کی کوشش کرے گا تو اس پر آگ کے شعلوں اور پگھلے ہوئے تانبے کی مار پڑے گی اور وہ ایسی بے پناہ ہو گی کہ تم میں سے کوئی بھی اس سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکے گا۔

'شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ' سے مراد شہاب ثاقب ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں تصریح ہے کہ یہ ان شیاطین جن پر پھینکے جاتے ہیں جو ملاء اعلیٰ کے حدود میں دراندازی اور غیب کی باتوں کی ٹوہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن میں خود جنوں کی زبان سے اس امر واقعی کا اعتراف یوں نقل ہوا ہے: 'وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا' (الجن: ۱۲) (اور ہم نے اچھی طرح اندازہ کر لیا ہے کہ نہ ہم زمین میں چھپ کر اللہ کی گرفت سے بچ سکتے ہیں نہ آسمانوں میں بھاگ کر اس سے نکل سکتے)۔

مفسرین کی ایک غلط فہمی

'نُحَاسٌ' کے معنی عام طور پر ہمارے مفسرین و مترجمین نے دھوئیں کے لیے ہیں لیکن یہ لفظ اس معنی میں معروف نہیں ہے۔ بعض اہل لغت نے اگرچہ ایک شاذ معنی کی حیثیت سے اس کا ذکر کیا ہے اور نابغہ کے ایک شعر کا بھی حوالہ دیا ہے لیکن اول تو وہ شعر محل نظر ہے دوسرے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دھوئیں کے لیے معروف لفظ 'دُخَانٌ' چھوڑ کر، جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے، ایک غیر معروف لفظ لانے کی وجہ کیا ہے جب کہ قرآن عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ اس وجہ سے ہم کو نحاس کے یہ معنی قبول کرنے میں تردد ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اپنے معروف معنی ہی میں استعمال ہوا ہے اور یہ انہی شہابوں کی ایک قسم ہے جن کا ذکر 'شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سائنس کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بیشتر شہابیے تو گرتے ہی فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑے بڑے فلزاتی اور حجری گولوں کی شکل میں گرتے ہیں لیکن اشیاء کی حرکی توانائی (KINETIC ENERGY) غلافِ جوّی میں داخل ہوتے ہی زیادہ تر حرارت میں تبدیل ہو جاتی ہے جس سے شہاب پگھل کر آگ کے گولوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور زمین کی طرف گرنے کے دوران ان کا فلزاتی اور حجری مادہ بڑی حد تک ضائع ہو جاتا یا عملِ تبخیر اسے غبار کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ تاہم جو شہاب زمین پر پائے گئے ہیں ان کو تین گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ فلزاتی شہاب (SIDERITES)
۲۔ حجری شہاب (AEROLITES)
۳۔ حجری۔ فلزاتی شہاب (SIDEROLITES)

ان شہابوں کے اندر جس طرح لوہے اور پتھر کے اجزاء پائے گئے ہیں اسی طرح تحقیق سے ان کے اندر کانسی اور تانبے کے اجزاء بھی پائے گئے ہیں جن کا آیت زیرِ بحث میں 'نحاس' کے لفظ سے ذکر آیا ہے۔ یہ فلزاتی اجزاء زیادہ تر شدتِ حرارت سے تحلیل ہو جانے والے ہیں تاہم زمین پر گرنے والوں شہابوں میں ان کا پایا جانا قرآن کی بات کی تصدیق کرتا ہے۔[۱]

فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۚ فَبِأَيِّ آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۷-۳۸)

'دِهَان' کے معنی 'دھان' کے معنی لوگوں نے تیل کے تلچھٹ کے بھی لیے ہیں لیکن یہ لفظ کھال کے معنی میں بھی معروف ہے۔ سرخی کی تشبیہ کے لیے کھال زیادہ موزوں ہے اس وجہ سے ہم نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔ دوسرے مقام میں 'وَإِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ' (التکویر-۱۱) بھی آیا ہے جس کے معنی ہیں جب کہ آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی یعنی جس طرح کھال کھینچ لینے کے بعد جسم کا گوشت سرخ سرخ نظر آتا ہے اسی طرح آسمان بھی سرخ نظر آئے گا۔ یہاں اس کی سرخی کو سرخ کھال سے تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ نہایت موزوں ہے۔ یہ روزِ قیامت کے ظہور کی تصویر ہے کہ آج تو تم بڑی ڈھٹائی سے قیامت کا انکار کر رہے ہو لیکن وہ دن بھی آنے والا ہے جب آسمان شق ہو جائے گا اور یہ نیلگوں چھت سرخ کھال کی طرح نظر آئے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت کیا کرو گے؟ کیا اس وقت بھی انکار کرو گے؟ آخر اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے، اس کے عجائباتِ قدرت تو یکے بعد دیگرے ظاہر ہی ہوتے رہیں گے۔

---

[۱] شہابوں سے متعلق یہ تحقیق انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں فہرست شہب (CATALOGUE OF METEORITES) کے مصنف (MAX H. HEY) کے مضمون 'شہابِ ثاقب' سے ماخوذ ہے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ۝ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۹-۴۲)

مجرموں کا جرم بے تحقیق واضح ہوگا

یعنی اس معاملے میں نہ یہ ہو گا کہ اس دن تمہارے جرائم کی تفتیش و تحقیق کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ کو کوئی محنت کرنی پڑے گی۔ محنت تو درکنار کسی سے اس کے جرم کی بابت پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ اس دن ہر مجرم اپنی پیشانی سے پہچان لیا جائے گا کہ وہ کس درجے کا مجرم اور کس سزا کا مستحق ہے۔

سوال کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں۔ یہاں جس سوال کی نفی ہے وہ تحقیق و تفتیش کی نوعیت کا سوال ہے۔ اس کی ضرورت پیش نہ آنے کی وجہ قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ بیان ہوئی ہے کہ اس دن آدمی کے صرف ہاتھ پاؤں ہی نہیں بلکہ اس کے ایک ایک بن مُو سے اس کے جرائم کی شہادت ملے گی۔ رہا وہ سوال جو توبیخ یا ملامت یا استہزاء اور طنز کی نوعیت کا ہوتا ہے تو اس کی نفی یہاں نہیں کی گئی ہے اور قرآن میں جو سوالات مجرموں سے مذکور ہیں وہ اسی دوسری نوعیت کے ہیں۔ اس باب میں قرآن کے بیان میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ دونوں کے مواقع الگ الگ ہیں۔

دوزخ میں پھینکے جانے کی تصویر

'فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ' یہ ان کے دوزخ میں پھینکے جانے کی تصویر ہے کہ اپنے جرم کی علامت کے ساتھ یہ دوزخ کے سنتریوں کے پاس لائے جائیں گے اور وہ ان کی چٹیا اور ان کے پاؤں پکڑ کے اٹھائیں گے اور جس طرح لکڑی کے کندے دہکتی آگ میں پھینکے جاتے ہیں اسی طرح ان کو بھڑکتی دوزخ میں پھینک دیں گے۔ یہاں دوزخ میں پھینکے جانے کا مضمون محذوف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پکڑے جانے کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ پھینکے جانے ہی کی ہے۔ اس واضح قرینہ کی موجودگی میں اس مضمون کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔

آگے آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ تمہارے سامنے مرحلہ تو یہ بھی آنے والا ہے تو آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کی تکذیب کرو گے!

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ
اٰنٍ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۴۳-۴۵)

آگ اور کھولتے پانی کے درمیان گردش

فرمایا کہ یہ ہے اس جہنم کی تصویر جس کی مجرمین تکذیب کر رہے ہیں بالآخر وہ اس کی آگ اور اس کے کھولتے پانی کے درمیان پھیرے لگائیں گے۔ 'اٰنٍ' اس پانی کی صفت کے لیے آتا ہے جس کی گرمی اپنے آخری نقطہ پر پہنچی ہوئی ہو۔ یہ ان کی انتہائی بے کسی کی تصویر ہے کہ جب دوزخ کی آگ ان کو جھلسے گی تو وہ پانی کی تلاش میں بھاگیں گے لیکن پانی کا حال یہ ہو گا کہ وہ گرمی کے آخری نقطہ پر پہنچا ہوا ہو گا۔ انہی کے درمیان پھیرے لگانے میں ان کی زندگی گزرے گی۔ سورۂ غاشیہ میں ان کی اس حالت کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے:

'تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ' (الغاشیۃ ۸۸: ۴-۵) (وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے

اور جب پانی مانگیں گے تو ان کو آخری درجے میں گرم چشمہ کا پانی پلایا جائے گا)۔

آخر میں آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل واضح ہے کہ آج تو بڑی ڈھٹائی سے آخرت اور عذاب کا انکار کر رہے ہو لیکن جب یہ کچھ سامنے آئے گا تب کیا کرو گے! آخر اپنے رب کے کتنے مظاہر کو جھٹلاؤ گے!

۴- آگے آیات ۴۶-۷۸ کا مضمون

مجرموں کا انجام بیان کرنے کے بعد آگے اس صلہ کی تفصیل ہے جو اللہ سے ڈرتے رہنے والوں کو قیامت میں ملنے والا ہے۔ اس تقابل سے دونوں گروہوں کی پوری تصویر سامنے آگئی ہے۔ نظم کلام بالکل واضح ہے۔ بس اتنی بات یاد رکھنے کی ہے کہ آیات ۴۶-۶۱ میں مقربین کی حیثیت کا بیان ہے اور اس کے بعد کی آیات میں اصحاب الیمین کی جنت کا۔ ان دونوں گروہوں کے فرق مراتب کی تفصیل اس کے بعد والی سورہ ــــ الواقعۃ ــــ میں آئے گی جو اس کی توام سورہ ہے ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾ آیات ۴۶-۷۸
ذَوَاتَاۤ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ
تَجْرِیٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ
فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّکِـِٕیْنَ عَلٰی
فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَیِّ
اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ
قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ کَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ
وَالْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ
اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾ وَمِنْ دُوْنِهِمَا
جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٧﴾ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿٦٨﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٩﴾ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿٧٠﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧١﴾ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿٧٢﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٣﴾ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ
وَلَا جَآنٌّ ﴿٧٤﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٥﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى
رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿٧٦﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٧﴾ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٧٨﴾ ع ۳ ۱۳

ترجمۂ آیات ۴۶-۷۸

اور ان کے لیے جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرتے رہے دو باغ ہوں گے۔
تو تم اپنے رب کی کن کن عنایتوں کو جھٹلاؤ گے! دونوں نہایت کثیر شاخوں والے ہوں گے
تو تم اپنے رب کی کتنی رحمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان کے اندر دو چشمے جاری ہوں گے۔ تو تم اپنے
رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان میں ہر میوے کی الگ الگ قسمیں ہوں گی تو تم اپنے
رب کے کن کن افضال کی تکذیب کرو گے! وہ ٹیک لگائے ایسے بچھونوں پر بیٹھے ہوں گے
جن کے استر استبرق کے ہوں گے اور دونوں باغوں کے پھل ان کے سروں پر لٹک رہے ہوں گے
تو اپنے رب کی کتنی نعمتوں کی تکذیب کرو گے! ان میں باحیا حوریں ہوں گی جن کو ان سے پہلے
کسی انسان یا جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔ تو تم اپنے رب کی کتنی نوازشوں کو جھٹلاؤ گے!
وہ حوریں ایسی ہوں گی گویا یاقوت اور مونگے ہوں تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے!
نیکی کا صلہ تو آخر احسان ہی ہوگا! تو تم اپنے رب کے کن کن احسانوں کو جھٹلاؤ گے! ۴۶-۶۱
اور ان دو کے سوا اور بھی دو باغ ہوں گے تو تم اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے!

دونوں سبزی سے سیاہی مائل، تو اپنے رب کی کن کن رحمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان میں دو چشمے ہوں گے اُبلتے ہوئے تو اپنے رب کی کتنی رحمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان میں میوے، کھجور اور انار ہوں گے تو تم اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان میں نیک سیرت اور خوب صورت حوریں ہوں گی تو اپنے رب کی کتنی عنایتوں کی تکذیب کرو گے! حوریں، خیموں میں رہنے والیاں تو اپنے رب کے کتنے احسانات کو جھٹلاؤ گے! ان سے پہلے ان کو نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا، نہ کسی جن نے، تو اپنے رب کے کتنے افضال کو جھٹلاؤ گے! ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے سبز چاندنیوں اور خوب صورت قالینوں پر تو تم اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! بڑا ہی بابرکت ہے نام تیرے عظمت والے اور سزاوارِ تکریم رب کا! ۶۲-۷۸

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۴۶-۴۷)

متقیوں کا انجام

'مجرمین' کے انجام کے بعد یہ متقیوں کا انجام بیان ہو رہا ہے۔ ان کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ یہ اپنے رب کے حضور پیشی سے برابر ڈرتے رہے۔ اس دن کا حوالہ قرآن کے دوسرے مقام میں یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (المطففین: ۶) کے الفاظ سے آیا ہے، یعنی جس دن لوگ اپنے رب کے حضور میں پیشی کے لیے اٹھیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان کو جادۂ مستقیم پر استوار رکھنے والی واحد چیز بھی اللہ تعالیٰ کے آگے پیشی کا خوف ہے۔ یہ خوف دل سے نکل جائے تو پھر انسان کو بڑے سے بڑا جرم کرنے سے بھی کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ فرمایا کہ جو لوگ اپنے رب کے حضور جواب دہی سے ڈرتے رہے ان کے لیے دو باغ ہوں گے۔ قرآن میں لفظ 'جنت' تمام اُخروی کامیابیوں کی ایک جامع تعبیر ہے اور دو جنتوں کا ذکر تکمیلِ نعمت کے طور پر ہوا ہے کہ ایک نہیں بلکہ دو دو جنتیں ان کو ملیں گی۔ سورۂ کہف آیت ۳۲ میں باغ والے کا جو قصہ ہے اس میں بھی دو باغوں کا ذکر ہے: جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَیْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ (الکہف: ۳۲) (ان میں سے ایک کو ہم نے دو باغ انگوروں کے دے رکھے تھے اور ان کو گھیر رکھا تھا کھجوروں سے)۔ اس آیت کے تحت ہم نے لکھا ہے کہ یہ دو باغوں کا ذکر اتمامِ نعمت کے اظہار کے لیے

ہے کہ اللہ نے تو اپنے فضل سے اس کو دو دو باغ دے رکھے تھے لیکن یہ نعمت اس کے لیے شکرگزاری کے بجائے ناشکری کا سبب بنی۔

بلاغتِ کلام کا ایک نکتہ

اس کے بعد آیت ترجیع ہے اور آگے جنت کی ایک ایک نعمت کے ذکر کے بعد یہ ترجیع آئے گی۔ اس کے موقع و محل کی بلاغت سمجھنے کے لیے یہ بات یاد رکھیے کہ جن مکذبین سے یہاں خطاب ہے وہ اوّل تو قیامت کو بہت بعید از امکان چیز سمجھتے تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجے میں اس کو مانتے بھی تھے تو یہ ماننے کے لیے وہ کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھے کہ آخرت کی نعمتوں میں کوئی حصہ ان فقیر مسلمانوں کا بھی ہوگا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر جنت کی فی الواقع کوئی حقیقت ہے تو جس طرح اس دنیا کی تمام نعمتیں ان کو ملی ہیں اسی طرح آخرت کی نعمتیں بھی انہی کو ملیں گی۔ ان کی اس ذہنیت کو اچھی طرح کچلنے اور ان کے غرور کو بالکل پامال کر دینے کے لیے یہاں جنت کی ایک ایک نعمت پر ہاتھ رکھ رکھ کے فرمایا ہے کہ یہ ہم اپنے متقی بندوں کو دیں گے اور ساتھ ہی ان مکذبین سے سوال کیا ہے کہ بتاؤ تم ہماری کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! یہاں تو تم کہتے ہو کہ یہ محض جی کو خوش کرنے کی باتیں ہیں لیکن اس وقت کس طرح تکذیب کرو گے جب ہم یہ ساری چیزیں اپنے بندوں کو دیں گے اور تم اس وقت حسرت سے اپنے سر پیٹو گے۔

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۴۸-۴۹)

یہ ان دو باغوں کی زرخیزی، شادابی اور برگ و بار کی کثرت کی تعبیر ہے کہ وہ اجاڑ اور بے رونق نہیں ہوں گے بلکہ ایک ایک درخت شاخوں اور ٹہنیوں کی کثرت سے رشکِ چمن ہوگا۔ باغوں کی اس صفت کے بعد بھی آیتِ ترجیع ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب کے امراء و اغنیاء کا سب سے بڑا سرمایۂ ناز باغ ہی ہوتے تھے، اور ایک گرم و خشک ملک میں کسی کے پاس اگر سرسبز و شاداب باغ ہوں تو اس کی خوش بختی و بلند اقبالی کے کیا کہنے ہیں! ان کے اسی ذوق کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ ہم اس طرح کے باغ اپنے نیک بندوں کو دیں گے تو تم ہماری کن کن بخششوں کو جھٹلاؤ گے۔

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۰-۵۱)

اس کی شادابی و زرخیزی کی ضمانت کے لیے ان میں الگ الگ دو چشمے بھی رواں دواں ہوں گے۔ تو بتاؤ اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۲-۵۳)

یعنی دونوں باغوں میں ایک ہی قسم کے پھل نہیں ہوں گے بلکہ دونوں میں الگ الگ قسموں کے پھل ہوں گے۔ لفظ 'زوج' یہاں ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے جس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍؕ وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۴-۵۵)

یعنی یہ اہل جنت گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے ایسے تختوں پر بیٹھے ہوں گے جن پر بچھے ہوئے فرشوں کے استر استبرق کے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جن بچھونوں کے استر استبرق کے ہوں ان کے ابرے کا اندازہ کون کر سکتا ہے! مزید یہ کہ دونوں باغوں کے اندر پھلوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ سروں پر لٹک رہے ہوں گے۔ ان کے حاصل کرنے میں کسی کو کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِۙ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِۚ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۶-۵۹)

'فِيْهِنَّ' میں ضمیر جمع کا مرجع وہ تمام نعمتیں بھی ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے اور جنت کے وہ تمام لوازم اور محل بھی جو لفظوں میں مذکور نہ سہی لیکن لوازم کی حیثیت سے وہ بدیہی طور پر سمجھے جاتے ہیں۔ عربی میں اس طرح ضمیروں کا استعمال معروف ہے۔ اس کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ فرمایا کہ عیش دوام کے ان باغوں اور سامانوں کے اندر ان کے لیے شرمیلی اور باحیا نازنینیں بھی ہوں گی۔ انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہوئی ہے کہ وہ ان چیزوں سے اس وقت تک اچھی طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتا جب تک بیوی اس کے ساتھ نہ ہو جس کو قدرت نے اس کا شریک رنج و راحت بنایا ہے۔ چنانچہ تعریف میں فرمایا ہے کہ وہ نہایت شرمیلی اور باحیا ہوں گی۔ عورت کا یہ شرمیلا پن اس کا سب سے بڑا حُسن بھی ہے اور اس کے اخلاق کا سب سے بڑا محافظ بھی۔ جو عورت شرمیلی نہیں ہے وہ ہرجائی ہے۔ ہرجائی کسی کی وفادار نہیں ہو سکتی اور جب وہ وفادار نہیں ہو سکتی تو ایک عورت کی حیثیت سے اس کا وجود بے مقصد ہے اس لیے کہ وہ کسی خاندان کی تعمیر میں بنیاد کی اینٹ کا کام نہیں دے سکتی درآنحالیکہ یہی عورت کے وجود کی غایت ہے۔

'لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ' - یہ ان کے شوہر ناآشنا ہونے اور کنوارپن کی تعبیر ہے۔

'یاقوت' اور 'مرجان' سے ان کی تشبیہ ان کے حسن اور ان کی عصمت و محفوظیت کے بیان کے لیے ہے۔ ان صفتوں کے بعد بھی ترجیع والی آیت آئی ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۶۰-۶۱)

مقربین کی جنت کے اوصاف بیان کرنے کے بعد یہ آخر میں مخاطبوں کو متوجہ کر کے نہایت بلیغ بات ارشاد فرمائی ہے کہ اس بات پر تمھیں تعجب کیوں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو یہ ساری نعمتیں دینے والا ہے! آخر نیکی اور پاکبازی کا بدلہ کیا ہونا چاہیے، فضل و کرم ہی ہونا چاہیے یا کچھ اور؟ اگر اس کائنات کا خالق ایک ایسا دن نہ لائے جس میں بروں کو ان کی بدیوں کی سزا اور نیکوں کو ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ دے تو اس

جزا و سزا کے حق میں عقلی د... فطرت کی گواہی

کے معنی یہ ہوئے کہ اس کو نیکی اور بدی میں کوئی امتیاز ہی نہیں ہے بلکہ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ نعوذ باللہ وہ بدی کو زیادہ پسند کرتا ہے کہ اس نے شریروں کو سارے وسائل دے کر اس دنیا میں آزاد چھوڑ رکھا ہے کہ وہ اس میں جو اودھم چاہیں مچائیں۔ انسان کی عقل اور اس کی فطرت اپنے رب کے متعلق اس قسم کی مکروہ بدگمانی کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ اس کی فطرت کی شہادت یہی ہے کہ کائنات کا خالق نہایت ہی عادل اور رحیم ہے۔ وہ ان لوگوں کو سزا دے گا جو برائیوں کے مرتکب ہوں گے اور نیکوں کو ان کی ایک ایک نیکی کا بھرپور صلہ دے گا۔ یہ بات چونکہ انسانی فطرت میں راسخ ہے، کوئی عاقل، سلامتیِ عقل و ہوش کے ساتھ، اس کا انکار نہیں کر سکتا اس وجہ سے بات ایسے اسلوب میں فرمائی ہے جو ایک واضح حقیقت کے بیان کا ہے۔ لفظ 'احسان'، نیکی کے معنی میں بھی آتا ہے اور نیک صلہ کے معنی میں بھی۔ اس آیت میں یہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ دونوں ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع بیان یہ ہے کہ جب یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت اور مسلّم ہے تو اللہ تعالیٰ لازماً ہر نیکی کا نیک صلہ دے کے رہے گا، تم اس کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے!

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۶۲-۶۳)

اصحاب الیمین کی جنت

مذکورہ دو جنتوں کے سوا اب دو اور جنتوں کا ذکر آ رہا ہے جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے مذکورہ جنتوں کے ساتھ فی الجملہ اشتراک بھی رکھتی ہیں اور بعض اعتبار سے ان سے مختلف بھی ہیں۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں قسم کی جنتوں کے حق دار ایک ہی قسم کے لوگ ہوں گے یا الگ الگ قسم کے لوگ۔ اس کا صحیح جواب آگے آنے والی سورہ ـــــــ سورۂ واقعہ ـــــــ میں آئے گا۔ اس میں اہلِ ایمان کو دو گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے: 'اصحب المیمنۃ' اور 'السابقون' اور ان دونوں کے لیے الگ الگ جنتوں کا ذکر ہے جن کے اوصاف میں فی الجملہ اشتراک بھی ہے اور بعض پہلوؤں سے اختلاف بھی۔ اس وجہ سے قرینِ قیاس بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اوپر 'سابقین اوّلین' یا بالفاظ دیگر 'مقربین' کی جنت کا ذکر ہے اور اب یہ 'مِنْ دُوْنِهِمَا' کی جنت کا ذکر آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح دونوں گروہوں کے مرتبہ میں فرق ہے اسی طرح دونوں گروہوں کی جنتوں میں بھی فرق ہے، جس کا اندازہ اہلِ ذوق تو دکر سکتے ہیں۔ آگے ہم بھی اس فرق کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کریں گے۔ 'مِنْ دُوْنِهِمَا' کا ترجمہ 'ان دو کے سوا'، 'ان دونوں کے بالمقابل' بھی ہو سکتا ہے اور 'ان دونوں سے فروتر' بھی۔

اس ٹکڑے کے بعد وہی ترجیع ہے جو ہر نعمت کے ذکر کے ساتھ برابر آ رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انہی دو جنتوں پر تو بس نہیں ہے اور بھی دو جنتیں ہوں گی تو تم کن کن جنتوں کو جھٹلاؤ گے اور ان کا مذاق اڑاؤ گے!

مُدْهَآمَّتٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۶۴-۶۵)

یعنی ان کی سرسبزی کا حال یہ ہوگا کہ وہ مائل بہ سیاہی ہو جائے گی۔ شاداب باغ کا سب سے زیادہ خوبصورت رنگ یہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد آیت ترجیع ہے جس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۶۶ - ۶۷)

'نضخ' کے معنی جوش مارنے اور اُبلنے کے ہیں۔ یہ پہاڑی چشموں کی تصویر ہے۔ میدانی علاقوں کے چشمے تو، جیسا کہ اوپر لفظ 'تَجْرِيٰنِ' آیا ہے، صرف بہتے ہیں لیکن پہاڑی چشمے جوش کے ساتھ ابلتے ہیں۔ اس کے بعد آیت ترجیع ہے جس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۶۸ - ۶۹)

'فَاكِهَةٌ' کے بعد 'نَخْلٌ' (کھجور) اور 'رُمَّانٌ' (انار) کا ذکر عام کے بعد خاص کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ دونوں میوے عرب کے محبوب میووں میں سے ہیں۔ اوپر کی جنت میں 'مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی دونوں باغوں میں ہر پھل کی الگ الگ قسمیں ہوں گی۔ ان دونوں اسلوبوں میں جو فرق ہے وہ نگاہ میں رہے۔ اس کے بعد آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ حُورٌ مَقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۷۰ - ۷۵)

'خَيْرَاتٌ حِسَانٌ' کے معنی ہیں پاکیزہ سیرت اور پاکیزہ صورت۔ 'حُورٌ مَقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ' میں خاص عربی ذوق نمایاں ہے۔ خیموں کی رہائش اہل عرب کی پسندیدہ رہائش رہی ہے۔ امرائے عرب کے خیمے اور شامیانے شاندار محلوں کے لیے بھی قابل رشک ہوتے تھے اور یہاں ذکر جنت کے خیموں کا ہے۔ اوپر کی جنت میں شرمیلی نازنینوں کا ذکر ہے اور ان کو یاقوت و مرجان سے تشبیہ دی گئی ہے۔ دونوں جگہ صفات کا جو فرق ہے وہ نگاہ میں رہے۔ ہر صفت کے بیان کے بعد آیتِ ترجیع بھی آئی ہے اور اس کا موقع و محل واضح ہے۔

مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۷۶ - ۷۷)

یعنی اس قسم کی جنتوں میں سبز چاندنیوں اور خوبصورت نادر قالینوں پر گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے ہوئے وہ بیٹھے ہوں گے۔ لفظ 'عبقری' نادر اور قیمتی چیزوں کے لیے آتا ہے اور موقع و محل کی رعایت سے اس کا اطلاق مختلف چیزوں پر ہو سکتا ہے۔ ہم نے محض موقع کی مناسبت سے یہاں اس کو نادر قالین کے معنی میں لیا ہے۔ اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (۷۸)

خاتمۂ سورہ

جس طرح اوپر جزاء و سزا کے دلائل بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ 'كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ

وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ' اسی طرح جزاء و سزا کی تفصیلات سنانے کے بعد اسی آیت کا اعادہ فرمایا ہے اور مقصود اس اعادے سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ چونکہ تیرے رب ذوالجلال والاکرام کی ذات بڑی ہی خیر و برکت والی ہے اس وجہ سے اس کی یہ تمام برکتیں لازماً ظاہر ہوں گی۔ نادان ہیں وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا پیدا تو کر دی لیکن پیدا کر دینے کے بعد اس کے خیر و شر سے اسے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ جس طرح اوپر والی آیت میں لفظ 'وجہ' سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو تعبیر فرمایا ہے اسی طرح اس آیت میں لفظ 'اسم' سے اس کی ذات کو تعبیر فرمایا ہے۔ اسم اپنے مسمّٰی پر دلیل ہوتا ہے۔

مذکورہ جنتوں کے اوصاف پر غور کیجیے تو ایک بات واضح طور پر محسوس ہوتی ہے کہ اوپر کی جنتوں میں جو نعمتیں بیان ہوئی ہیں ان میں اہلِ عجم کا ذوق زیادہ نمایاں ہے اور بعد کی جنتوں میں اہلِ عرب کا ذوق زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ نعمتیں بطور تشبیہ بیان ہوئی ہیں، ان کی اصل حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے تاہم ان کی مدد سے کسی حد تک یہ ہمارے تصور کے قریب آجاتی ہیں اور یہی ان تشبیہات سے مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آج ۲۴۔ رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ کو ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحْسَانِہٖ ۔

لاہور
۱۰۔ ستمبر ۱۹۷۷ء
۲۴۔ رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ

تدبرِ قرآن

٥٦

الواقعة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورتوں سے تعلق

یہ اس گروپ کی ساتویں سورہ ہے جس پر گروپ کی مکی سورتیں تمام ہوئیں۔ اس میں اس ساری بحث کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے، جو جزاء وسزا سے متعلق، سورۂ قٓ سے لے کر سورۂ رحمٰن تک ہوئی ہے۔ پچھلی سورتوں میں اس موضوع کے تمام اطراف، آفاق وانفس اور عقل و فطرت کے دلائل کی روشنی میں، زیر بحث آئے ہیں، اس سورہ میں دلائل کی وضاحت کے بجائے اصل نتیجہ سے قریش کے متکبرین کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ قیامت ایک امر شدنی ہے جس میں ذرا شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔ تمھیں لازماً ایک ایسے جہان سے سابقہ پیش آنے والا ہے جس میں عزت و ذلت کے اقدار اور پیمانے ان اقدار اور پیمانوں سے بالکل مختلف ہوں گے جو اس جہان میں معروف ہیں۔ وہاں عزت و سرفرازی ان کے لیے ہوگی جنھوں نے اس دنیا میں ایمان اور عمل صالح کی کمائی کی ہوگی، وہ مقربین اور اصحاب الیمین کے درجے پائیں گے۔ جنت کی تمام کامرانیاں انہی کا حصہ ہوں گی۔ رہے وہ جو اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں اور اسی کے عشق میں مگن ہیں وہ اصحاب الشمال میں ہوں گے اور ان کو دوزخ کے ابدی عذاب سے سابقہ پیش آئے گا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۰) قیامت ایک امر شدنی ہے۔ اس کے واقع ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ لوگوں کو ایمان و عمل صالح کی کسوٹی پر پرکھے گی اور کتنوں کو پست اور کتنوں کو بلند کرے گی۔ اس جانچ پرکھ کے نتیجہ میں اس دن لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک گروہ اصحاب الیمین کا ہوگا، دوسرا اصحاب الشمال کا اور تیسرا گروہ سابقون الاوّلون کا۔

(۱۱-۲۶) اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرب سابقون اوّلون ہوں گے۔ ان کو قرب الٰہی کی جو سرفرازیاں اور جنت کی جو نعمتیں حاصل ہوں گی ان کی تفصیل اور اس گروہ میں شامل ہونے والوں کے اوصاف کا بیان۔

(۲۷-۴۰) دوسرے درجے میں اصحاب الیمین ہوں گے۔ ان کی جنت کی تفصیل اور اس گروہ میں

شامل ہونے والوں کا بیان۔

(۴۱ - ۴۸) اصحاب الشمال کے انجام کا بیان اور ان کے بعض خاص جرائم کی طرف اشارہ جن کے سبب سے وہ اس انجام کے سزاوار ٹھہریں گے۔

(۴۹ - ۷۴) قریش کے متکبرین کو خطاب کر کے یہ تنبیہ کہ اصحاب الشمال کا جو حشر بیان ہوا ہے یہی حشر تمہارا بھی ہونا ہے اگر تم گمراہی اور تکذیب کی اس روش پر اڑے ہوئے ہو۔ اسی ضمن میں باندازِ اتمامِ حجت قیامت اور جزاء و سزا کے بعض بدیہی دلائل کی طرف اشارہ جن کا انکار صرف ہٹ دھرم ہی کر سکتے ہیں۔

(۷۵ - ۹۶) قرآن کی عظمت اور شیطانی چھوت سے اس کے پاک اور بالاتر ہونے کا حوالہ اور قریش کو یہ تنبیہ کہ اس عظیم نعمت سے روگردانی کر کے اپنی شامت کو دعوت نہ دو۔ یہ کتاب جس انجام سے آگاہ کر رہی ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ جو آج مقربین اور اصحاب الیمین کا درجہ حاصل کرنے کی جدوجہد کریں ورنہ یاد رکھیں کہ جو لوگ ان درجوں سے محروم رہے وہ اصحاب الشمال میں ہوں گے اور ان کا انجام نہایت دردناک ہے۔

سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ (٥٦)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات: ٩٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ١-٩٦ إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿١﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿٢﴾ خَافِضَةٌ
رَّافِعَةٌ ﴿٣﴾ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ﴿٤﴾ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ
بَسًّا ﴿٥﴾ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا ﴿٦﴾ وَّكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ﴿٧﴾
فَأَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَا أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿٨﴾ وَأَصْحٰبُ
الْمَشْـَٔمَةِ ۙ مَا أَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ﴿٩﴾ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴿١٠﴾
أُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿١١﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿١٢﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِيْنَ ﴿١٣﴾
وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٤﴾ عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ﴿١٥﴾ مُّتَّكِـِٔيْنَ
عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿١٦﴾ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿١٧﴾
بِأَكْوَابٍ وَّأَبَارِيْقَ ۙ وَكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿١٨﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ
عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴿١٩﴾ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَ
لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٢١﴾ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴿٢٢﴾ كَأَمْثَالِ
اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿٢٣﴾ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٤﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ
فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيْمًا ﴿٢٥﴾ إِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿٢٦﴾ وَأَصْحٰبُ

الْيَمِينِ ۙ مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ ﴿٢٧﴾ فِي سِدْرٍ مَخْضُودٍ ﴿٢٨﴾ وَطَلْحٍ
مَنْضُودٍ ﴿٢٩﴾ وَظِلٍّ مَمْدُودٍ ﴿٣٠﴾ وَمَاءٍ مَسْكُوبٍ ﴿٣١﴾ وَفَاكِهَةٍ
كَثِيرَةٍ ﴿٣٢﴾ لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ ﴿٣٣﴾ وَفُرُشٍ مَرْفُوعَةٍ ﴿٣٤﴾
إِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ إِنْشَاءً ﴿٣٥﴾ فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا ﴿٣٦﴾ عُرُبًا أَتْرَابًا ﴿٣٧﴾
ع ۲ لِأَصْحَابِ الْيَمِينِ ﴿٣٨﴾ ثُلَّةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ ﴿٣٩﴾ وَثُلَّةٌ مِنَ
۱۴ الْآخِرِينَ ﴿٤٠﴾ وَأَصْحَابُ الشِّمَالِ مَا أَصْحَابُ الشِّمَالِ ﴿٤١﴾
فِي سَمُومٍ وَحَمِيمٍ ﴿٤٢﴾ وَظِلٍّ مِنْ يَحْمُومٍ ﴿٤٣﴾ لَا بَارِدٍ وَلَا
كَرِيمٍ ﴿٤٤﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُتْرَفِينَ ﴿٤٥﴾ وَكَانُوا
يُصِرُّونَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيمِ ﴿٤٦﴾ وَكَانُوا يَقُولُونَ أَئِذَا مِتْنَا
وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿٤٧﴾ أَوَآبَاؤُنَا
الْأَوَّلُونَ ﴿٤٨﴾ قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ﴿٤٩﴾ لَمَجْمُوعُونَ
إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَعْلُومٍ ﴿٥٠﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيُّهَا الضَّالُّونَ
الْمُكَذِّبُونَ ﴿٥١﴾ لَآكِلُونَ مِنْ شَجَرٍ مِنْ زَقُّومٍ ﴿٥٢﴾ فَمَالِئُونَ
مِنْهَا الْبُطُونَ ﴿٥٣﴾ فَشَارِبُونَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيمِ ﴿٥٤﴾ فَشَارِبُونَ
شُرْبَ الْهِيمِ ﴿٥٥﴾ هَٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّينِ ﴿٥٦﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۵۶ یاد رکھو، جب کہ واقع ہو پڑے گی واقع ہونے والی۔ اس کے واقع ہونے میں کسی جھوٹ کا شائبہ نہیں۔ وہ پست کرنے والی اور بلند کرنے والی ہوگی جب کہ زمین بالکل جھنجھوڑ دی جائے گی اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہو کر منتشر غبار بن جائیں گے۔

اور تم تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔ ۱-۷

ایک گروہ داہنے والوں کا ہو گا، تو کیا کہنے ہیں داہنے والوں کے! دوسرا گروہ بائیں والوں کا ہو گا، تو کیا حال ہو گا بائیں والوں کا! رہے سابقون، تو وہ تو سبقت کرنے والے ہی ہیں! وہی لوگ مقرّب ہوں گے۔ نعمت کے باغوں میں۔ ان میں بڑی تعداد اگلوں کی ہو گی اور تھوڑے پچھلوں میں سے ہوں گے۔ جڑاؤ تختوں پر، ٹیک لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ان کی خدمت میں غلمان، جو ہمیشہ غلمان ہی رہیں گے، پیالے جگ اور شرابِ خالص کے جام لیے ہوئے گردش کر رہے ہوں گے جس سے نہ تو ان کو دردِ سر لاحق ہو گا اور نہ وہ فتورِ عقل میں مبتلا ہوں گے اور میوے ان کی پسند کے اور پرندوں کے گوشت ان کی رغبت کے۔ اور ان کے لیے غزال چشم حوریں ہوں گی، محفوظ کیے ہوئے موتیوں کے مانند۔ صلہ ان کے ان اعمال کا جو وہ کرتے رہے۔ اس میں وہ کوئی لغو اور گناہ کی بات نہیں سنیں گے۔ صرف مبارک سلامت کے چرچے ہوں گے۔ ۸-۲۶

اور رہے دہنے والے تو کیا کہنے ہیں داہنے والوں کے! بے خار بیریوں، تہ بہ تہ کیلوں اور پھیلے ہوئے سایوں میں۔ اور پانی بہایا ہوا۔ میوے فراواں، نہ کبھی منقطع ہونے والے نہ کبھی ممنوع۔ اور اونچے بستر ہوں گے اور ان کی بیویاں ہوں گی جن کو ہم نے ایک خاص اٹھان پر اٹھایا ہو گا، پس ہم ان کو رکھیں گے کنواریاں، دلربا اور ہم سنین۔ یہ نعمتیں داہنے والوں کے لیے ہوں گی۔ ان میں اگلوں میں سے بھی ایک بڑا گروہ ہو گا اور پچھلوں میں سے بھی ایک بڑا گروہ۔ ۲۷-۴۰

اور بائیں والے تو کیا ہی بُرا حال ہو گا بائیں والوں کا! وہ لُو کی لپٹ، کھولتے پانی اور

دھوئیں کے سایہ میں ہوں گے جس میں نہ کوئی ٹھنڈک ہوگی اور نہ کسی طرح کی کوئی افادیت۔ یہ لوگ اس سے پہلے خوش حالوں میں تھے اور سب سے بڑے گناہ پر اصرار کرتے رہے۔ اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے! اور کیا ہمارے اگلے آباء و اجداد بھی! ۴۱ - ۴۸

کہہ دو! اگلے اور پچھلے سب جمع کیے جائیں گے، ایک معین دن کی مقررہ مدت تک۔ پھر تم لوگ، اے گمراہو اور جھٹلانے والو، زقّوم کے درخت میں سے کھاؤ گے اور اسی سے اپنے پیٹ بھرو گے، پھر اس پر کھولتا پانی تونسے ہوئے اونٹوں کی طرح پیو گے۔ یہ جزا کے دن ان کی پہلی ضیافت ہوگی! ۴۹ - ۵۶

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (۱-۲)

قیامت شدنی ہے

'وَاقِعَةٌ' سے مراد قیامت ہے۔ اس لفظ سے تعبیر اس کے ایک امرِ شدنی ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کے دلائل، پوری تفصیل کے ساتھ، گروپ کی پچھلی سورتوں میں، بیان ہو چکے ہیں اور ان شبہات و سوالات کا بھی ایک ایک کر کے جواب دیا جا چکا ہے جو منکرین نے اس کے امکان اور اس کے وقوع کے باب میں اٹھائے ہیں۔ اب یہ فرمایا کہ اس وقت کو یاد رکھو جب کہ وہ واقع ہونے والی، تمھارے ان تمام لایعنی شبہات و اعتراضات کے علی الرغم، واقع ہو کے رہے گی اور تم کسی طرح بھی اس سے بھاگ نہ سکو گے۔

'لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ' یہاں 'كَاذِبَةٌ' میرے نزدیک 'عَاقِبَةٌ' اور 'عَافِيَةٌ' کی طرح مصدر ہے یعنی اس کے واقع ہونے میں ذرا کسی شک و شبہ اور جھوٹ کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر تم اس وہم میں مبتلا ہو کہ تم کو جھوٹ موٹ ایک ہوّے سے ڈرایا جا رہا ہے تو اس میں جھوٹ کا ادنیٰ شائبہ بھی نہیں۔ یہ ایک امرِ واقعہ ہے جس سے تمھیں لازماً دوچار ہونا ہے تو عاقبت کی بہبود چاہتے ہو تو اس کے مواجہہ کے لیے تیاری کر و۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (۳)

قیامت میں عزت کا معیار ایمان ہوگا

یعنی اس وہم میں نہ رہو کہ تم کو جو سربلندی آج حاصل ہے وہ ہمیشہ حاصل رہے گی اور جن کو حقیر و مبتذل گمان کر رہے ہو وہ اسی طرح حقیر و پست حال رہیں گے بلکہ جب وہ واقع ہونے والی واقع ہوگی تو یہ آسمان و زمین نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ نمودار ہوں گے۔ آج عزت و شرف کے جو معیارات ہیں وہ یک قلم تبدیل ہو جائیں گے۔ اس دن تمام عزت و سرفرازی ایمان و عمل صالح کو حاصل ہوگی۔ وہ لوگ سربلند و سرفراز ہوں گے جن کے پاس ایمان و عمل صالح کا سرمایہ ہوگا اور وہ پست و ذلیل ہوں گے جو اس دولت سے محروم اٹھیں گے۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ فرمائی ہے۔ آگے آیت ۷ سے اس خفض و رفع کی تفصیل آرہی ہے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ اس کے لیے کسوٹی کیا ہوگی۔

إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ۙ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا (۴-۶)

قیامت کے دن کی ہلچل

یہ اس قیامت کی تصویر ہے کہ اس دن زمین بالکل ہلا دی جائے گی اور یہ اونچے اونچے پہاڑ جن کو نادان لوگ غیر فانی اور غیر متزلزل گمان کیے بیٹھے ہیں، غبار کی طرح پراگندہ ہو جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دن اس زمین کی ساری ہی بلندیاں پست کر دی جائیں گی۔ ایک ایسا زلزلہ آئے گا جو پوری زمین کو جھنجھوڑ کر اس کے تمام ایوانوں اور محلوں کو زمین بوس کر دے گا یہاں تک کہ یہ فلک بوس پہاڑ بھی غبار بن کر فضا میں اڑنے لگیں گے۔ یہی مضمون سورۂ حاقہ میں یوں بیان ہوا ہے: 'وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ' (الحاقة - ۶۹: ۱۴-۱۵) (اور اس دن زمین اور پہاڑ دونوں اٹھا کر بیک دفعہ پاش پاش کر دیے جائیں گے، پس اس دن واقع ہونے والی واقع ہو جائے گی)۔

وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۚ فَأَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَا أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۚ وَأَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَا أَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۚ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (۷-۱۰)

لوگوں کی تقسیم تین گروہوں میں

یہ اس خفض و رفع کی تفصیل ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۳ میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ اس دن تم تین گروہوں میں تقسیم کیے جاؤ گے۔ ایک گروہ اصحاب المیمنہ کا ہوگا، دوسرا گروہ اصحاب المشئمہ کا ہوگا اور تیسرا سابقون پر مشتمل ہوگا۔

'أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ' سے مراد، خود قرآن کی تصریح کے مطابق، وہ لوگ ہیں جن کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ چنانچہ سورۂ حاقہ میں فرمایا ہے: 'فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتٰبَهُ بِيَمِيْنِهِ ۙ فَيَقُوْلُ هَاؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۚ إِنِّيْ ظَنَنْتُ أَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ' (الحاقة - ۶۹: ۱۹-۲۰) (تو اس دن جس کا اعمال نامہ اس کے دہنے ہاتھ میں پکڑایا جائے گا وہ لوگوں سے خوش ہو کر کہے گا کہ یہ لو میرا اعمال نامہ پڑھو۔ میں دنیا میں برابر اندیشہ ناک رہا کہ بالآخر مجھے اپنے اعمال کے حساب سے دوچار ہونا ہے)۔

'اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ' سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ سورۂ حاقہ میں ان کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: "وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ ۚ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ۚ یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ ۚ مَاۤ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ ۚ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ" (الحاقۃ - ۶۹: ۲۵-۲۹) (رہا وہ جس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ کاش! میرا اعمال نامہ مجھ کو ملتا ہی نہ! اور مجھ کو یہ خبر ہی نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے! اے کاش! پہلی موت ہی فیصلہ کن بن گئی ہوتی! میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا! میرا اقتدار ہوا ہو گیا!)

'سَابِقُوْنَ' سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے دعوتِ حق کے قبول کرنے میں سبقت کی اور اس دور میں اپنے جان و مال سے اس کی خدمت کی توفیق پائی جب اس کی خدمت کرنے والے تھوڑے تھے اور اس کی مدد کے لیے حوصلہ کرنا اپنے آپ کو جوکھوں میں ڈالنا تھا۔ چنانچہ سورۂ حدید میں، جو اس کی مثنیٰ سورہ ہے، اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالی ہے: "لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی" (الحدید - ۵۷: ۱۰) (تم میں سے جو لوگ فتح مکہ سے پہلے اللہ کی راہ میں انفاق اور جہاد کریں گے اور دوسرے جو اس سعادت سے محروم رہیں گے، یکساں نہیں ہوں گے۔ پہلے انفاق و جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا ہے ان لوگوں سے جنھوں نے بعد میں انفاق و جہاد کیا اگرچہ اللہ کا وعدہ دونوں سے اچھا ہی ہے)۔

'مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ' میں جو استفہام ہے یہ اظہارِ شان و عظمت کے لیے بھی آتا ہے اور اظہارِ نفرت و کراہت کے لیے بھی۔ یہاں یہ اظہارِ شان و عظمت کے لیے ہے یعنی دہنے والوں کی شان و عظمت، ان کے عیش جاوداں، ان کی رفاہیت و خوش حالی اور ان کی عالی مقامی کا کیا پوچھنا ہے! بھلا اس کی تفصیل کس طرح بتائی جا سکتی ہے اور اس کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے! یہ اسلوبِ کلام اس صورت میں اختیار کیا جاتا ہے جب صورتِ واقعہ الفاظ کے احاطہ اور قیاس و گمان کی رسائی سے مافوق ہو۔ قرآن میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔

'مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ' میں وہی اسلوب اس کے برعکس یعنی اظہارِ نفرت و کراہت کے مفہوم میں ہے یعنی جس طرح 'اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ' کی خوش حالی و بلند اقبالی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح 'اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ' کی بدبختی، ان کی ذلت و مصیبت اور ان کی بد انجامی کا حال بھی کچھ نہ پوچھو! اس کی تصویر بھی الفاظ میں نہیں کھینچی جا سکتی۔ اس کا اندازہ انہی کو ہو گا جن کو اس سے سابقہ پیش آئے گا۔

'وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ' میں دوسرا 'سَابِقُوْنَ' خبر کے محل میں ہے اور اس ایجاز میں غایت درجہ بلاغت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ 'سَابِقُوْنَ' کی عالی مقامی کا کیا پوچھنا ہے، وہ تو 'سَابِقُوْنَ' ہی ہوئے!

جب وہ سابقون ہیں تو ان کے درجہ و مرتبہ کو کون پہنچ سکتا ہے! وہ لازماً وہاں تک پہنچیں گے جو انسانی شرف و مرتبت کا آخری نقطہ ہے اور اس نقطۂ کمال کا اندازہ بھلا اس عالمِ ناسوت میں کون کر سکتا ہے!

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ — اس تفصیل سے ایک تو یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ان لوگوں کا خیال غلط ہے جنھوں نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ دربارِ الٰہی میں جگہیں پانے والوں کی ترتیب بیان ہوئی ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ کے دربار سے متعلق اوّل تو دہنے بائیں اور آگے پیچھے کا تصور ہی ایک بے معنی تصور ہے اور اگر اس تصور کی گنجائش تسلیم بھی کر لی جائے تو یہ امر اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ اس دربار میں اصحاب الشمال کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں ہو گی نہ بائیں نہ پیچھے بلکہ ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا جس کی وضاحت آگے اس سورہ میں بھی آ رہی ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی آئی ہے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ 'اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ' عام مسلمانوں کے مفہوم میں نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے اعمال نامے بطورِ اعزاز داہنے ہاتھ میں دیے جائیں گے اور وہ اپنے شاندار کارناموں پر نہایت شاداں و فرحاں بھی ہوں گے۔ عام مسلمانوں میں تو بے شمار ایسے لوگ بھی ہیں جن کی نسبت یہ گمان کرنا بڑا ہی بیّنا حسنِ ظن ہو گا کہ ان کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے اور وہ جوشِ مسرت میں 'ھَآؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَهْ' کا نعرہ بھی لگانے کے لائق ہوں گے۔ رہا یہ سوال کہ 'اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ' اور 'سٰبِقُوْنَ' میں کس نوعیت کا فرق ہے تو اس کی طرف اوپر بھی ہم اشارہ کر چکے ہیں اور آگے بھی اس کی وضاحت آ رہی ہے۔

اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۝ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ (۱۱-۱۴)

سابقون کا صلہ — چونکہ گلِ سرسبد اور سرخیلِ قافلہ کی حیثیت انہی 'سٰبِقُوْنَ' کو حاصل ہو گی اس وجہ سے انہی کا مرتبہ اور صلہ سب سے پہلے بیان فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ انہی لوگوں کو مقربین کا درجہ حاصل ہو گا۔ 'مقربین' سے مراد ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقربین ہیں لیکن ان مقربین کا ٹھکانا 'جَنّٰتِ النَّعِیْمِ' ہی بتایا ہے، دربارِ الٰہی کے قسم کی کسی چیز کا کوئی تصور نہیں دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقربینِ الٰہی کے لیے خاص ان کے درجے و مرتبے کے لحاظ سے جنتیں ہوں گی جن میں وہ رکھے جائیں گے۔ آگے ان کی جنت سے متعلق بعض اشارات آ رہے ہیں۔

'ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ'۔ اب یہ واضح فرمایا کہ اس مبارک گروہ میں شامل ہونے کی سعادت کن لوگوں کو حاصل ہو گی۔ فرمایا کہ ان میں زیادہ تعداد تو اگلوں کی ہو گی اور ایک قلیل تعداد پچھلوں کی بھی ہو گی۔ 'ثُلَّةٌ' کے اصل معنی تو گروہ اور جماعت کے ہیں لیکن اس کے مقابل میں جو نکہ لفظ 'قَلِیْلٌ' استعمال ہوا ہے اس وجہ سے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اس کو گروہِ کثیر کے مفہوم

میں لیا جائے۔

'اوّلین' اور 'آخرین' سے مراد

'اوّلین' اور 'آخرین' سے مراد ہمارے نزدیک اسی امّت کے اوّلین و آخرین ہیں۔ اوپر ہم نے سورۂ حدید کا حوالہ دیا ہے جس سے واضح ہوا کہ ان لوگوں کے انفاق اور جہاد کا درجہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اونچا ہے جنہوں نے فتحِ مکہ سے پہلے جہاد و انفاق کی سعادت حاصل کی۔ بعد والوں کے جہاد و انفاق کا درجہ وہ نہیں ہوگا تاہم اللہ تعالیٰ کا وعدہ دونوں ہی سے اچھا ہے۔ یعنی بعد والے اگرچہ من حیث العموم اگلوں کے مرتبہ کو تو نہ پہنچ سکیں گے تاہم اپنے اخلاص و حسنِ عمل سے ان کے لیے اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ میں جگہ حاصل کرنے کی راہ کھلی ہوگی۔

'ثُلَّۃٌ مِّنَ الۡاَوَّلِیۡنَ' کے الفاظ سے یہ بات بھی نکلی کہ اگلوں میں سے لازماً سب ہی مقرّبین کا درجہ حاصل نہیں کر لیں گے بلکہ ان کی اکثریت کو یہ مقام حاصل ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس درجے کا تعلق مجرد زمانے ہی سے نہیں ہے بلکہ اس میں اصلی دخل اوصاف و اعمال کو ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اسلام قبول کرنے کے اعتبار سے تو اوّلین میں ہو لیکن اپنی عزیمت، رسوخ اور قربانیوں کے اعتبار سے مقرّبین کا درجہ نہ حاصل کر سکا بلکہ 'اَصۡحٰبُ الیمین' ہی کے درجے تک رہ گیا۔

ایک خاص نکتہ

اسی طرح 'قَلِیۡلٌ مِّنَ الۡاٰخِرِیۡنَ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس امت کے پچھلوں میں سے بھی ایسے لوگ نکلیں گے جو سابقون الاوّلون کے زمرے میں شامل ہونے کا شرف حاصل کریں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو فتنوں کے زمانے میں بھی حق پر قائم رہیں گے، حق ہی کی دعوت دیں گے اور حالات خواہ کتنے ہی صبر آزما ہو جائیں اور ان کی تعداد خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو لیکن وہ ہمت نہیں ہاریں گے۔ اسی قسم کا ایک گروہ اس امت میں، جیسا کہ احادیث میں بشارت ہے، ہر دور میں پیدا ہوتا رہے گا۔ یہ لوگ زمانے کے اعتبار سے تو آخرین میں ہوں گے لیکن اپنی خدمات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ہاں اوّلین کے زمرے میں جگہ پائیں گے۔ اسی حقیقت کی طرف سیدنا مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ "کتنے پیچھے آنے والے ہیں جو آگے ہو جائیں گے"۔

یہاں یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنے کی ہے کہ ہر چند ان آیات کا تعلق اسی امّت سے ہے لیکن اصولی طور پر یہ بات ہر نبی و رسول کی امّت پر منطبق ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں دوسری جگہ یہی بات ایک عام کلیہ کی حیثیت سے ارشاد ہوئی ہے۔ فرمایا ہے: 'ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَیۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ' (فاطر ۳۵: ۳۲) (پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جن کو اپنے بندوں میں سے اس کارِ خاص کے لیے منتخب کیا تو ان میں سے کچھ تو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے نکلے، کچھ میانہ رَو ہوئے اور کچھ اللہ کی توفیق سے بھلائیوں کی راہ میں سبقت کرنے والے ہوئے)۔

اس آیت پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ الفاظ بدلے ہوئے ہیں لیکن اس میں بھی انہی تین گروہوں کا ذکر ہے جن کا ذکر اوپر اصحب المیمنۃ، اصحب المشئمۃ اور سابقون کے الفاظ سے ہوا ہے۔

عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَۃٍ ۙ﴿۱۵﴾ مُّتَّکِـِٕیۡنَ عَلَیۡہَا مُتَقٰبِلِیۡنَ ﴿۱۶﴾ یَطُوۡفُ عَلَیۡہِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ﴿ۙ۱۷﴾ بِاَکۡوَابٍ وَّ اَبَارِیۡقَ ۬ۙ وَ کَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ ﴿ۙ۱۸﴾ لَّا یُصَدَّعُوۡنَ عَنۡہَا وَ لَا یُنۡزِفُوۡنَ ﴿ۙ۱۹﴾ وَ فَاکِہَۃٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوۡنَ ﴿ۙ۲۰﴾ وَ لَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَہُوۡنَ ﴿ؕ۲۱﴾ وَ حُوۡرٌ عِیۡنٌ ﴿ۙ۲۲﴾ کَاَمۡثَالِ اللُّؤۡلُـٔـوِ الۡمَکۡنُوۡنِ (۱۵-۲۳)

مقربین کی جنت کی تمثیل

یہاں مقربین کی جنت کی تمثیل ہے۔ پہلے ان کی نشست گاہ اور ان کے اندازِ نشست کی تصویر کھینچی ہے کہ وہ جڑاؤ اور زرنگار تختوں پر گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ 'مَوۡضُوۡنَۃ' کے معنی بعض لوگوں نے دوسرے بھی لیے ہیں لیکن میرے نزدیک اس کا صحیح مفہوم وہی ہے جو ہم اپنی زبان میں لفظ 'جڑاؤ' سے ادا کرتے ہیں۔ قدیم زمانے کے شاہانِ عجم اپنے درباروں میں اسی طرح کے زرنگار، سونے، ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے تختوں پر جلوہ افروز ہوا کرتے تھے۔

'مُتَّکِـِٕیۡنَ' کے لفظ کے اندر گاؤ تکیوں کا مفہوم خود مضمر ہے اس لیے کہ ٹیک لگانے کے لیے مسندیں اور گاؤ تکیے ضروری ہیں اور زمانۂ قدیم میں تختِ شاہی کے لوازم میں یہ شامل بھی رہے ہیں۔

'آمنے سامنے' بیٹھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے دل باہمی رنج و رقابت اور کینہ و حسد سے بالکل پاک ہوں گے۔ جن کے دلوں کے اندر کدورت ہوتی ہے وہ ایک دوسرے سے منہ پھیر کے بیٹھتے ہیں لیکن اہلِ جنت کے دل کینہ و حسد سے جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے، بالکل پاک ہوں گے اس وجہ سے وہ مخلص اور محبت کرنے والے عزیزوں اور ساتھیوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف رخ کرکے بیٹھیں گے۔

'یَطُوۡفُ عَلَیۡہِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ﴿ۙ﴾ بِاَکۡوَابٍ وَّ اَبَارِیۡقَ ۬ۙ وَ کَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ ﴿ۙ﴾ لَّا یُصَدَّعُوۡنَ عَنۡہَا وَ لَا یُنۡزِفُوۡنَ ﴿ۙ﴾ وَ فَاکِہَۃٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوۡنَ ﴿ۙ﴾ وَ لَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَہُوۡنَ'۔ یہ اس سامانِ ضیافت کی طرف اشارہ ہے جو ان کے لیے وہاں مہیا ہوگا۔ فرمایا کہ ان کی خدمت میں غلمان پیالے، جگ اور شرابِ خالص کے جام لیے ہوئے ہر وقت حاضر باش ہوں گے۔

'مُخَلَّدُوۡنَ' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایک ہی سن و سال کے رہیں گے۔ ان کی حیثیت دائمی خدام کی ہوگی۔ مجلسی خدمات کے لیے ایک خاص سن کے لڑکے ہی زیادہ موزوں، خوش آداب اور مستعد و سرگرم

خیال کیے جاتے ہیں اس وجہ سے ان کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایک ہی سن کا رکھے گا اور چونکہ مزاج شناس خادم ہی اپنے آقا کی سب سے زیادہ بہتر طریقہ پر خدمت کر سکتا ہے اس وجہ سے جو لڑکے جن کے ساتھ لگا دیے جائیں گے وہ برابر انہی کی خدمت میں رہیں گے۔ قرآن کے الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لڑکوں کو اللہ تعالیٰ خاص اسی مقصد کے لیے بنائے گا۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ کفار کے بچے، جو نابالغی میں وفات پا جائیں گے، ان کو اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کی خدمت میں لگا دے گا۔ اس رائے کے حق میں اگرچہ قرآن میں کوئی اشارہ نہیں ہے لیکن کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے جو اس کے خلاف جاتی ہو۔ اس لیے کہ کفار کے بچوں کے دوزخ میں جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ اس خدمت ہی میں لگائے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی جنت بہت وسیع اور وہ بڑا کریم ہے۔ وہ ان کو ان کی بے گناہی کے صلہ میں بھی جنت دے سکتا ہے۔

'اَکْوَابٌ'، 'کُوْبٌ' کی جمع ہے اور 'کوب' اور 'کپ' (Cup) ایک ہی چیز ہے۔ 'اَبَارِیْقُ' جمع ہے 'اِبْرِیْقٌ' کی۔ 'ابریق' فارسی کے 'آب ریز' سے معرب معلوم ہوتا ہے اور یہ چیز اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ عربوں نے بہت سے تمدنی الفاظ عجمیوں سے لیے ہیں۔ لفظ 'کَاْسٌ' ظرف اور مظروف یعنی شراب اور جامِ شراب دونوں کے لیے آتا ہے۔ 'مَعِیْنٌ' خالص پانی اور خالص پانی کے چشمہ کے لیے بھی قرآن میں آیا ہے اور شراب خالص کے ایک چشمہ کے لیے بھی جو جنت میں ہے۔ یہاں یہ اسی مفہوم میں ہے۔

'لَا یُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا یُنْزِفُوْنَ' یہ شراب ایسی ہوگی کہ اس سے شراب کا جو اصل فائدہ ہے یعنی سرور، وہ تو حاصل ہوگا لیکن اس دنیا کی شراب کے تمام مضرا اثرات سے وہ بالکل پاک ہوگی۔ یہاں کی شراب سے اعضاء شکنی، خمار اور دردِ سر بھی لاحق ہوتا ہے، جنت کی شراب میں یہ مفاسد نہیں ہوں گے۔ اسی طرح اس دنیا کی شراب کا سب سے بڑا مفسدہ یہ ہے کہ اس سے عقل جاتی رہتی ہے درآنحالیکہ عقل ہی انسان کا اصل جوہر ہے اور ایک منٹ کے لیے بھی اس کا فتور نہ جانے کن کن ہلاکتوں میں اس کو ڈال سکتا ہے۔ جنت کی شراب اس زہر سے محفوظ ہوگی۔
'نُزِفَ الرجل' کے معنی ہیں 'ذھب عقلہ' آدمی کی عقل جاتی رہی۔

'وَفَاکِھَةٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوْنَ ۝ وَلَحْمِ طَیْرٍ مِّمَّا یَشْتَھُوْنَ' شراب کے ساتھ ساتھ یہ دوسرے لوازم کا ذکر ہے کہ غلمان ان کے سامنے ان کے انتخاب کے پھل اور ان کی پسند کے پرندوں کے گوشت بھی لیے پھریں گے۔ کھانے کی چیزوں میں سرفہرست یہی دو چیزیں ہیں۔ ان کا ذکر آ گیا تو گویا سب ہی کا آ گیا۔ ان کے ساتھ 'مِمَّا یَتَخَیَّرُوْنَ' اور 'مِمَّا یَشْتَھُوْنَ' کی قید اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ ہر شخص کے ذوق اور انتخاب کا پورا پورا لحاظ ہوگا۔ پھل ان کے سامنے

وہ پیش کیے جائیں گے جن کا وہ انتخاب کریں گے اور گوشت ان پرندوں کے ان کے سامنے حاضر کیے جائیں گے جن کی وہ خواہش کریں گے۔

وَحُوْرٌ عِیْنٌ ۝ کَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَکْنُوْنِ کھانے اور پینے کی ساری لذتیں انسان کے لیے ادھوری ہیں اگر ان میں بیوی شریک نہ ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے سرمایۂ راحت و سکینت بنایا ہے۔ جس طرح اس دنیا میں آدمی اس شریکِ رنج و راحت کا محتاج ہے، جس کے بغیر اس کی بزم سُونی رہتی ہے اسی طرح جنت میں بھی اس کی لذّت ادھوری رہ جاتی اگر یہ اس میں شریک نہ ہوتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ وہاں اس کو غزال چشم اور دُرِّ مکنون کی طرح اچھوتی اور پاک حوریں دے گا۔ ان دو صفتوں کے اندر ان حوروں کے حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کے سارے پہلو جمع ہو گئے۔

جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۲۴)

یہ وہ اصل سرفرازی ہے جو ان جانبازوں کو حاصل ہوگی۔ فرمایا کہ یہ جو کچھ ان کو ملے گا ان کے اعمال کے بدلے میں ملے گا۔ اس کے وہ حقدار ہوں گے اور ربِّ کریم لازماً ان کا یہ حق ادا کرے گا۔ انسان کی فطرت کے اس پہلو پر یہاں نظر رہے کہ اس کی نگاہوں میں جو قدر و قیمت اس چیز کی ہوتی ہے جو اس نے اپنے حق کے طور پر حاصل کی ہو وہ قدر و قیمت اس چیز کی نہیں ہوتی جو اس کو اتفاقاً حاصل ہو گئی ہو یا بطور صدقہ ملی ہو، خواہ یہ پہلی کے مقابل میں کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا ۝ اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (۲۵-۲۶)

یہ ان کے بے خلل و غش عیش کی طرف اشارہ ہے کہ دشمنوں، معترضوں اور نکتہ چینوں کی جتنی ژاژخائیاں اور بکواسیں سننی ہیں وہ دنیا میں سن چکے ہوں گے اور جتنے چرکے سہنے ہیں وہ سہ چکیں گے۔ وہاں نہ کسی بکواس کرنے والے کی بکواس ہوگی اور نہ کوئی گناہ کی بات ان کے کانوں میں پڑے گی۔ وہاں ان کے لیے رحمت ہی رحمت اور سلام ہی سلام ہے۔ ربِّ رحیم و غفور کی طرف سے بھی سلام، فرشتوں کی طرف سے بھی سلام اور ساتھیوں کی طرف سے بھی سلام!! صبح بھی سلام اور شام بھی سلام!!

وَاَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ ۝ مَآ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ (۲۷)

اصحٰب الیمین کی جنت

یہ اصحاب الیمین کی جنت کا بیان آ رہا ہے۔ اوپر ان کا ذکر 'اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ' کے الفاظ سے ہوا ہے جس سے یہ بات متعین ہو گئی کہ قرآن میں 'اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ' اور 'اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ' کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی وہ لوگ جن کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں دیے جائیں گے۔

'مَآ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ' کا مفہوم بھی وہی ہے جو اوپر 'مَآ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ' کا بیان ہوا۔ یعنی کیا کہنے ہیں ان کے مرتبہ کے! کیا پوچھنا ہے ان کی عظمت و شان کا! کیا بیان ہو ان کے عیش و آرام کا!

فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ۝ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ۝ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۝ وَّمَآءٍ مَّسْکُوْبٍ ۝

وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۙ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ (۲۸ - ۳۳)

یہ ان کی جنت کے پھلوں، اس کے سایہ اور اس کی طراوت کا ذکر ہے۔

'فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ'۔ سِدْرٌ بیری کو کہتے ہیں۔ ہمارے علاقوں میں بیری کی کچھ زیادہ وقعت نہیں ہے اس وجہ سے ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں سوال پیدا ہو کہ یہ کیا ایسا پھل ہے جس کا قرآن نے ذکر فرمایا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اوّل تو ہر علاقے کی بیری یکساں نہیں ہوتی بعض علاقوں میں اس کے پھل نہایت لذیذ، خوشبودار اور خوش رنگ ہوتے ہیں۔ ثانیاً یہ جنت کی بیری ہے، جس کا ذکر اس دنیا میں صرف تمثیل ہی کے پیرایہ میں ہو سکتا ہے۔ اس کی اصل حقیقت جاننے کا یہاں کوئی ذریعہ نہیں ہے، صرف وہی لوگ اس حقیقت سے آشنا ہوں گے جن کو اصحاب الیمین میں شمولیت کا شرف حاصل ہو گا۔ ویسے قرآن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس درخت کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ سورۂ نجم میں فرمایا ہے: 'وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۙ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى' (النجم - ۵۳: ۱۳ - ۱۶) (اور پیغمبر نے جبریل کو دوبارہ بھی اترتے دیکھا آخری سرے کی بیری کے پاس، اسی کے پاس جنت ماویٰ بھی ہے، جب کہ بیری کو چھائے ہوئے تھی جو چیز چھائے ہوئے تھی!) سورۂ نجم کی ان آیات کے تحت، اشاراتِ قرآن کی رہنمائی میں، ہم نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ اس بیری کا ذکر ہے جو عالمِ ناسوت اور عالمِ لاہوت کے نقطۂ اتصال پر ہے، اسی کے پاس جنت الماویٰ ہے جہاں سے عالمِ لاہوت کی حدود شروع ہوتے ہیں۔ اس بیری پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انوار و تجلیات کا مشاہدہ فرمایا جس کا ذکر 'اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى' (النجم - ۵۳: ۱۶-۱۷) کے شاندار الفاظ میں ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی مشاہداتِ نبوت، جو تورات اور قرآن میں بیان ہوئے ہیں، میں بھی ذکر آتا ہے کہ انھوں نے ایک درخت سے اللہ تعالیٰ کی آواز سنی اور اس پر انوار و تجلیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کیا۔ اگرچہ قرآن میں کوئی اشارہ اس طرح کا نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ وہ درخت کس چیز کا تھا لیکن دونوں واقعات میں یکسانی واضح ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ درخت بھی بیری ہی کا ہو۔

'سِدْرٍ' کے ساتھ 'مَّخْضُوْدٍ' کی صفت اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ یہ بیری دنیا کی بیریوں کی طرح آزار پہنچانے والی نہیں ہو گی کہ کوئی ایک بیر لینے کی کوشش کرے تو اپنے ہاتھوں کو اس کے کانٹوں سے زخمی بھی کرائے، بلکہ بے خار اور بالکل بے آزار ہوں گی۔ اہل جنت جب چاہیں اور جہاں سے چاہیں گے ان کے پھل توڑ لیں گے۔ لفظ 'خضد' کسی کانٹوں والی چیز کے کانٹوں کو کاٹ دینے کے لیے آتا ہے۔ یہاں مقصود یہ بتانا ہے کہ ان کے پھلوں کی طرح ان کے درخت بھی

دنیا کی بیریوں سے مختلف مزاج کے ہوں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دنیا میں بھی بیریوں کی جو قسمیں جتنی ہی اچھی ہوتی ہیں اتنے ہی ان میں کانٹے کم ہوتے ہیں۔ کانٹے زیادہ جھڑبیریوں میں ہوتے ہیں۔ قرآن میں اہلِ سبا کے جس جنت نشان باغ کی تباہی کا ذکر ہے اس میں بیریوں کی تباہی کا بھی ذکر ہے کہ وہ جھاڑ بن کے رہ گئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پھل ان کے پسندیدہ پھلوں میں تھا اور اس کے درخت ان کے باغوں کی زینت بنتے تھے۔ اپنے خاندان کے اعتبار سے بھی بیر سیب کے خانوادہ سے نسبت رکھنے والا پھل ہے۔

'وَطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ'۔ 'طلح' کیلے کو کہتے ہیں۔ 'منضود' اس کے پھلوں کی تصویر ہے کہ وہ تہ بہ تہ ایک دوسرے سے پیوستہ ہوں گے۔ ان کی ترتیب اور ان کے چناؤ کا حُسن گواہی دے گا کہ خالق نے خاص اہتمام سے اپنے بندوں کی ضیافت کے لیے ان کو چنا ہے۔

'وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۙ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ'۔ یہ اس باغ کی شادابی اور اس کی طراوت کا بیان ہے کہ اس کے درخت اپنے زور اور شادابی کے سبب سے اس طرح ایک دوسرے کے متصل ہوں گے کہ ان کے اندر دھوپ کا گزر نہیں ہونے پائے گا اس وجہ سے ہر طرف سایہ ہی سایہ ہوگا اور اس میں دواماً پانی بھی بہایا جاتا رہے گا تاکہ اس کی رونق میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔

'وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۙ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ'۔ یعنی اوپر جن پھلوں کا ذکر ہوا ہے محض مثال کے طور پر ہوا ہے۔ دوسرے بہت سے پھل بھی ہوں گے اور ان کا حال بھی اس دنیا کے پھلوں سے بالکل مختلف ہوگا۔ اس دنیا کا حال تو یہ ہے کہ ایک خاص وقت پر درخت کے پھل توڑ لیے جاتے ہیں یا از خود ختم ہو جاتے ہیں لیکن وہاں کے درخت سدا بہار ہوں گے، ان کے پھل کبھی منقطع نہیں ہوں گے۔ اسی طرح اس دنیا کے باغوں کو یہ اُفتاد بھی پیش آتی ہے کہ ایک سال پھل آئے، دوسرے سال نہیں آئے یا بہت کم آئے۔ وہاں کے درختوں کو یہ آفت بھی کبھی پیش نہیں آئے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کو بار آوری سے کبھی محروم نہیں فرمائے گا۔

وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ۝ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۙ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۙ عُرُبًا اَتْرَابًا (۳۴-۳۷)

یہ ان کی نشست گاہوں اور ان کی بیویوں کا ذکر ہے۔ اوپر سابقین مقربین کے ذکر میں، یاد ہوگا، ترتیب بیان اس سے مختلف ہے۔ اس فرق کے بعض نفسیاتی وجوہ ہیں لیکن اس طرح کی تفصیلات میں یہاں جانے کا موقع نہیں ہے۔

فرمایا کہ ان کے بیٹھنے کے لیے اونچے بچھونے ہوں گے اور ان کے لیے بیویاں ہوں گی جن کو ہم نے ایک خاص اٹھان پر اٹھایا ہوگا۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیویوں کے لیے ضمیر بغیر کسی

مرجع کے آگئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ضمیر کے لیے لفظوں میں کوئی مرجع نہیں ہے لیکن قرینہ نہایت واضح موجود ہے۔ عربی میں مثل ہے کہ الشیٔ بالشیٔ یذکر 'بات سے بات یاد آتی ہے'۔ یہاں بچھونوں کے ذکر کے بعد بیویوں کا ذکر اسی نوع کی چیز ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں تختوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ بیویوں کا ذکر آیا ہے۔ اسی تعلق کی بنا پر یہاں ان کا ذکر محض ضمیر سے کر دیا جس میں ایجاز کی بلاغت بھی ہے اور خواتین کے ذکر میں پردہ داری کے لحاظ کی تعلیم بھی۔ یہ بات کہ تختوں اور بچھونوں کے ساتھ قرآن میں بیویوں کا ذکر آیا ہے محتاجِ حوالہ نہیں ہے۔ لیکن محض اطمینانِ خاطر کے لیے ہم بعض شواہد نقل کیے دیتے ہیں۔ سورۂ طور میں ہے:

مُتَّكِـِٔينَ عَلَىٰ سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ ۖ	وہ ٹیک لگائے ہوں گے صف بہ صف بچھے ہوئے
وَزَوَّجْنَٰهُم بِحُورٍ عِينٍ ۝	تختوں پر اور ہم ان کی شادیاں کر دیں گے غزال چشم
(الطور - ۵۲ : ۲۰)	حوروں کے ساتھ۔

اسی طرح سورۂ یٰسٓ میں ہے:

هُمْ وَأَزْوَٰجُهُمْ فِى ظِلَٰلٍ عَلَى	وہ اور ان کی بیویاں سایوں میں تختوں پر ٹیک لگائے
ٱلْأَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔونَ (یٰس - ۳۶ : ۵۶)	بیٹھے ہوں گے۔

إِنَّآ أَنشَأْنَٰهُنَّ إِنشَآءً۔ ان حوروں کی تعریف میں فرمایا کہ ہم نے ان کو ایک خاص اٹھان پر اٹھایا ہے اس وجہ سے ان کی خصوصیات و صفات اس دنیا کی عورتوں کی خصوصیات و صفات سے بالکل مختلف ہوں گی۔ اس دنیا کی عورت کا کنوارپن اور اس کی جوانی و دل ربائی ہر چیز وقتی اور فانی ہے۔ ع

اگر ماند شبے ماند شبِ دیگر نمی ماند

لیکن حورانِ جنّت کو اللہ تعالیٰ نے اس سے بالکل مختلف ساخت پر نشو و نما بخشی ہے اس وجہ سے ان کے کنوارپن اور حسن و جوانی پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔

فَجَعَلْنَٰهُنَّ أَبْكَارًا ۝ عُرُبًا أَتْرَابًا ۝ 'ف' یہاں اس خاص اٹھان کی وضاحت کے لیے ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کنواریاں رہیں گی۔ ان کے مرد جب بھی ان سے ملاقات کریں گے ان کی ملاقات اس اعتبار سے گویا پہلی ملاقات ہوگی۔

'عُرُب' جمع ہے 'عروب' کی۔ اس کے معنی ہیں محبوب اور دل ربا بیوی۔ ظاہر ہے کہ جب ان کے حسن، جوانی اور کنوارپن کسی چیز میں بھی فرق نہیں آئے گا تو شوہروں کی نظر سے ان کے گرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہوگی بلکہ وہ گُلِ تر کی طرح ہمیشہ مطلوب و محبوب بنی رہیں گی۔

'اتراب' جمع ہے 'ترب' کی۔ یہ لفظ ہم سن و ہم عمر کے معنی میں آتا ہے لیکن عربیت کا ذوق

رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس کا غالب استعمال عورتوں کے لیے ہے اس وجہ سے میرے نزدیک یہاں یہ ہم جولیوں کے معنی میں ہے۔ سورۂ نبا میں کَوَاعِبَ اَتْرَابًا (کنواری ہم جولیاں) کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل جنت کو جتنی حوریں بھی ملیں گی سب ہم جولیاں اور ہم سن ہوں گی اس وجہ سے نہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کا سوال پیدا ہوگا اور نہ ان حوروں کے اندر رشک و رقابت کے جذبات ابھریں گے۔ جس طرح وہ ہمیشہ جوان اور کنواریاں رہیں گی اسی طرح ان کے شوہر بھی جوان رعنا رہیں گے۔

لِّاَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ (۳۸)

اس کو اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً سے متعلق بھی مان سکتے ہیں اور مبتدائے محذوف کی خبر بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اگر پہلی صورت مانیں تو معنی یہ ہوں گے کہ اس خاص اٹھان اور ان خاص اوصاف کی حوریں ہم نے اصحاب الیمین کے لیے تیار کر رکھی ہیں۔ دوسری صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ یہ ساری نعمتیں جو اوپر بیان ہوئیں ہمارے ہاں اصحاب الیمین کے لیے ہیں۔ میرا رجحان پہلی صورت کی طرف ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں سے جو بھی اختیار کی جائے باعتبار مدعا کوئی خاص فرق نہیں ہوگا، صرف بلاغت بیان کے اعتبار سے نازک سا فرق واقع ہوگا جس کا اندازہ اہل ذوق خود کر سکتے ہیں اس وجہ سے وجوہ ترجیح کی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ (۳۹-۴۰)

اوپر 'سابقون' کے ذکر میں بتایا ہے کہ اس گروہ میں بڑی تعداد اگلوں ہی میں سے ہوگی، پچھلوں میں سے اس میں شامل ہونے کی سعادت کم ہی خوش بختوں کو حاصل ہوگی۔ یہاں بتایا کہ 'اصحٰب الیمین' میں اگلوں اور پچھلوں دونوں میں سے ایک ایک گروہ ہوگا۔ اوپر یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ اگلوں اور پچھلوں سے اسی امت کے اگلے اور پچھلے مراد ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قیام قیامت تک جتنے مسلمان اس دنیا میں آئیں گے ان میں سے ایسے لوگ برابر نکلتے رہیں گے جن کا شمار 'اصحٰب الیمین' کے طبقہ میں ہوگا اور قیامت کے دن وہ ایک ہی گروہ کی حیثیت حاصل کر لیں گے۔

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝ فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ ۝ وَّظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ ۝ لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ (۴۱-۴۴)

'اصحٰب الشمال' کا حشر

یہ 'اصحٰب الشمال' یعنی ان لوگوں کا حشر بیان ہو رہا ہے جن کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ فرمایا کہ وہ لوؤں اور شعلوں کی لپٹ اور گرم پانی کے بیچ میں ہوں گے۔ جب گرمی کی ایذا سے گھبرا کر وہ پانی کی طرف بھاگیں گے تو انھیں کھولتا پانی پینے کو ملے گا۔ اسی بھاگ دوڑ میں ان کی زندگی گزرے گی۔ یہی مضمون يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ

آنٍ' (الرحمٰن - ۵۵ : ۴۴) کے الفاظ سے بھی بیان ہوا ہے۔

'وَّظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ' یعنی ان کو کوئی سایہ نصیب نہیں ہو گا۔ صرف سیاہ دھوئیں کا سایہ وہاں ان کے لیے ہو گا۔ اور یہ ان تمام خوبیوں سے محروم ہو گا جو سایہ میں ہوتی ہیں۔ سایہ میں اصل چیز ٹھنڈک ہوتی ہے لیکن اس دھوئیں کے سایہ میں اذیتیں تو وہ ساری ہوں گی جو دھوئیں کے اندر ہوتی ہیں لیکن کوئی ٹھنڈک نہیں ہو گی۔ اسی طرح بعض دوسرے فوائد کا امکان بھی اس میں ہو سکتا ہے مثلاً شعلوں ہی کی لپیٹ سے ذرا اس کے سایہ میں امان نصیب ہو جائے لیکن یہ چیز بھی اس سے حاصل نہیں ہو گی۔ 'کریم' کے معنی فیض بخش کے ہیں یعنی اس سایہ میں نہ ٹھنڈک ہو گی نہ کوئی اور فائدہ۔ سورۂ مرسلات میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: 'لَّا ظَلِیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّھَبِ' (المرسلٰت - ۷۷ : ۳۱) (نہ سایہ دار اور نہ شعلوں سے بچانے والا)۔

اِنَّھُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُتْرَفِیْنَ ۝ وَکَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلَی الْحِنْثِ الْعَظِیْمِ ۝ وَکَانُوْا یَقُوْلُوْنَ ۵ اَئِذَا مِتْنَا وَکُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (۴۵ - ۴۸)

یہ ان کے ان بڑے جرائم کی طرف اشارہ ہے جن کے سبب سے وہ اس انجام بد کو پہنچے۔ اسلوبِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ دن لوگوں کے سامنے حاضر کر دیا گیا ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ بدقسمت لوگ اس انجام کو پہنچے تو کیوں پہنچے!

'اِنَّھُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُتْرَفِیْنَ'۔ فرمایا کہ یہ لوگ اس سے پہلے یعنی دنیا میں بڑے مالدار اور عیش و رفاہیت والے رہے ہیں۔ یہ بات ان کے جرم کی حیثیت سے نہیں بیان ہوئی ہے بلکہ اس سے ان کے ان جرائم کی سنگینی واضح ہو رہی ہے جو آگے بیان ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کو عیش و آرام اور دولت و ثروت سے نوازا جس کا حق یہ تھا کہ وہ اس کے شکرگزار و فرمانبردار بندے بنتے لیکن یہ اس سے استکبار میں مبتلا ہوئے اور سب سے بڑے گناہ پر برابر اصرار کرتے رہے۔

دوسرا مقصد اس سے اس پستی و بلندی کو نمایاں کرنا ہے جس کا ذکر قیامت کی صفت کی حیثیت سے ابتدائے سورہ میں 'خَافِضَۃٌ رَّافِعَۃٌ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ یعنی دیکھ لو، دنیا میں جو لوگ سب سے اونچے اور سربلند رہے وہ یہاں آ کر عذابِ الٰہی کے کس کھڈ میں گرے!

'وَکَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلَی الْحِنْثِ الْعَظِیْمِ'۔ 'حِنْث' کے معنی گناہ کے ہیں۔ اس کی صفت یہاں عظیم آئی ہے جس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس سے مراد شرک ہے۔ 'شرک' فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے بھی سب سے بڑا گناہ ہے اور قرآن نے بھی اس کو ظلمِ عظیم سے تعبیر کیا ہے۔

وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۵ اَىِٕذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۵ اَوَاٰبَاۗؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۔ یہ ان کے دوسرے بڑے جرم کا ذکر ہے کہ وہ آخرت اور جزا و سزا کے اس بنا پر منکر تھے کہ ان کے نزدیک مر کر مٹی گل جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ایک بالکل ناممکن بات تھی چنانچہ جب ان کو آخرت کے حساب کتاب سے آگاہ کیا جاتا تو وہ اس کا مذاق اڑاتے کہ کیا جب ہم مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اور ہمارے اگلے آبار و اجداد بھی، جو مدتوں پہلے خاک میں مل چکے ہیں، از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے! یعنی یہ بات انہونی ہے اور جو لوگ اس سے ڈرا رہے ہیں وہ محض ہم کو بے وقوف بنا رہے ہیں اور وہ خود بھی عقل سے بالکل عاری ہیں۔

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ۵ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۵ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۴۹-۵۰)

قریش کو تنبیہ

اَصْحٰبُ الشِّمَالِ کے جرائم بیان کرتے ہوئے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قریش کو جواب دلوایا کہ یہی استبعاد جو تم میری تذکیرِ آخرت کے جواب میں پیش کرتے ہو تو اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ جتنے بھی اگلے اور پچھلے ہیں سب ایک معین دن کی مقررہ میقات تک جمع کیے جاتے رہیں گے اور جب وہ میقات آجائے گی تو وہ جزاء و سزا کے لیے اٹھائے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مر جاتے ہیں یہ نہ سمجھو کہ جس طرح تمہارے اندر سے وہ ختم ہو گئے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں سے بھی وہ ختم ہو گئے۔ وہ سب اللہ تعالیٰ کے ذخیرہ میں جمع کیے جا رہے ہیں اور جب جزاء و سزا کا یوم موعود آجائے گا تو وہ سب اٹھائے جائیں گے ــــــ خواہ وہ اگلے ہوں یا پچھلے ــــــ 'لَمَجْمُوْعُوْنَ' کے بعد 'اِلٰى' اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح دوسری جگہ فرمایا ہے: كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (الانعام - ۶: ۱۲) (اللہ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے، وہ تم کو روزِ قیامت تک لازماً جمع کرتا رہے گا)۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّاۗلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ۵ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ۵ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۵ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ۵ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ (۵۱-۵۵)

یہ قریش کو براہِ راست خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ اے گمراہو اور جھٹلانے والو، جانتے ہو کہ اٹھائے جانے کے بعد کیا ہوگا؟ اس کے بعد تم زقوم کے خاردار اور کڑوے پتوں اور پھلوں سے اپنے پیٹ بھرو گے، پھر اس پر کھولتا ہوا پانی اس طرح پیو گے جس طرح تونسے ہوئے اونٹ پیتے ہیں۔

'ضَاۗلُّوْنَ' اور 'مُكَذِّبُوْنَ' کی دو صفتوں سے خطاب ان کے ان دو جرموں کے اعتبار سے ہے جو مذکور ہوئے۔ اوپر ان کے شرک اور تکذیبِ آخرت کا ذکر ہوا ہے، انہی کے لحاظ سے یہاں

خطاب 'ضَآلُّوۡنَ' اور 'مُکَذِّبُوۡنَ' کے الفاظ سے ہوا۔ یعنی اللہ کی توحید کے باب میں کج راہ اور آخرت کے جھٹلانے والے۔

اور ان کے 'مُتۡرَفِیۡنَ' یعنی امرار و اغنیار اور ارباب تنعم میں سے ہونے کا بھی ذکر ہوا ہے۔ اس مناسبت سے آخرت میں ان کی غذا تھوہر ہوگی۔ وہ اس کے تیتوں اور کانٹوں کو چابیں اور اس پر کھولتا پانی پئیں گے۔

'ھِیۡمِ' جمع ہے 'اَھۡیَمۡ' کی۔ 'اھیم' اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کو 'ھیام' یعنی تونس کی بیماری لاحق ہو۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ پانی پیتا چلا جاتا ہے لیکن اس کی پیاس کسی طرح نہیں بجھتی۔

هٰذَا نُزُلُهُمۡ يَوۡمَ الدِّيۡنِ (۵۶)

'نزل'، جیسا کہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں، اس سامانِ ضیافت کو کہتے ہیں جو مہمان کے مرکب سے اترنے کے بعد، سب سے پہلے اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کی اولین ضیافت تھوہر اور گرم پانی سے ہوگی کون اندازہ کر سکتا ہے کہ بعد میں ان کے سامنے کیا کچھ آئے گا!

۲- آگے آیات ۵۷-۷۴ کا مضمون

آگے بعث اور جزار کے دلائل آ رہے ہیں جن کے انکار کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اسلوب بیان زجر و ملامت کا ہے۔ نظم کلام بالکل واضح ہے۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۵۷-۷۴

نَحۡنُ خَلَقۡنٰكُمۡ فَلَوۡلَا تُصَدِّقُوۡنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا تُمۡنُوۡنَ ﴿۵۸﴾

ءَاَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ ﴿۵۹﴾ نَحۡنُ قَدَّرۡنَا

بَيۡنَكُمُ الۡمَوۡتَ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِيۡنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰٓى اَنۡ نُّبَدِّلَ

اَمۡثَالَكُمۡ وَنُنۡشِئَكُمۡ فِىۡ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ

النَّشۡاَةَ الۡاُوۡلٰى فَلَوۡلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۶۲﴾ اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ ﴿۶۳﴾

ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ ﴿۶۴﴾ لَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنٰهُ

حُطٰمًا فَظَلۡتُمۡ تَفَكَّهُوۡنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغۡرَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾ بَلۡ نَحۡنُ

مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۶۷﴾ اَفَرَءَيۡتُمُ الۡمَآءَ الَّذِىۡ تَشۡرَبُوۡنَ ﴿۶۸﴾ ءَاَنۡتُمۡ

اَنۡزَلۡتُمُوۡهُ مِنَ الۡمُزۡنِ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡزِلُوۡنَ ﴿۶۹﴾ لَوۡ نَشَآءُ جَعَلۡنٰهُ
اُجَاجًا فَلَوۡلَا تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۷۰﴾ اَفَرَءَيۡتُمُ النَّارَ الَّتِىۡ تُوۡرُوۡنَ ﴿۷۱﴾
ءَاَنۡتُمۡ اَنۡشَاۡتُمۡ شَجَرَتَهَاۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡشِـُٔوۡنَ ﴿۷۲﴾ نَحۡنُ
جَعَلۡنٰهَا تَذۡكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِيۡنَ ﴿۷۳﴾ فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ
الۡعَظِيۡمِ ﴿۷۴﴾

ع ۲ ۳۶ ۱۵

ترجمۂ آیات ۵۷-۷۴

ہم نے تم کو پیدا کیا ہے تو تم قیامت کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ کیا تم نے غور کیا ہے اس چیز پر جو تم ٹپکا دیتے ہو! اس کی صورت گری تم کرتے ہو یا صورت گری کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے تمہارے درمیان موت مقدر کی ہے اور ہم عاجز رہنے والے نہیں ہیں بلکہ قادر ہیں اس بات پر کہ ہم تمہاری جگہ تمہارے مانند بنا دیں اور تم کو اٹھائیں اس عالم میں جس کو تم نہیں جانتے۔ اور پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو تو اس سے کیوں یاددہانی نہیں حاصل کرتے! ۵۷-۶۲

کیا تم نے غور کیا ہے اس چیز پر جو تم بوتے ہو؟ اس کو تم پروان چڑھاتے ہو یا پروان چڑھانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اس کو ریزہ ریزہ کر چھوڑیں تو تم باتیں ہی بناتے رہ جاؤ۔ بے شک ہم تو تاوان میں پڑے! بلکہ ہم تو بالکل ہی محروم رہے! ۶۳-۶۷

ذرا غور تو کرو اس پانی پر جو تم پیتے ہو! کیا تم نے اس کو اتارا ہے بادلوں سے یا اس کے اتارنے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو بالکل ہی تلخ بنا دیں تو تم لوگ شکر کیوں نہیں کرتے! ۶۸-۷۰

ذرا غور تو کرو اس آگ پر جس کو جلاتے ہو! کیا تم نے پیدا کیا ہے اس کے

درخت کو یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں! ہم نے اس کو یاد دہانی اور صحرا کے مسافروں
کے لیے ایک نہایت نفع بخش چیز بنایا ہے۔ ۷۱-۷۳
تو تم اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو! ۷۴

۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ (۵۷)

خطاب انہی منکرینِ قیامت سے ہے جن کا قول 'اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ' اوپر نقل ہو چکا ہے۔ فرمایا کہ جب ہم ہی نے تم کو پیدا کیا اور اس حقیقت سے تمھیں مجالِ انکار نہیں ہے تو پھر قیامت کی تصدیق سے تمھیں کیوں گریز ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جب پہلی مرتبہ تمھیں پیدا کرنے سے ہم قاصر نہیں رہے تو دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں عاجز رہیں گے؟ اول بار پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا دوسری بار؟ یہ منطق عجیب ہے کہ جو کام زیادہ مشکل ہے اس کے واقع ہونے کو تو تم تسلیم کرتے ہو اور جو اس سے بالبداہت آسان ہے اس کو ناممکن قرار دیتے ہو! ___ 'تُصَدِّقُوْنَ' کے بعد اس کا مفعول 'بِالدِّيْنِ' یا 'بِالْبَعْثِ' بربنائے وضاحتِ قرینہ محذوف ہے۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ؕ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ (۵۸-۵۹)

انسان کی خلقت سے قیامت کی دلیل

یہ انسان کی خلقت کی طرف توجہ دلائی کہ اگر تمھیں یہ گمان ہے کہ تمھاری خلقت میں کچھ تمھاری تدبیر و حکمت کو بھی دخل ہے جس کے بغیر اللہ تعالیٰ تمھیں وجود میں نہیں لا سکتا تو آؤ دیکھو کہ اس میں تمھارا دخل کتنا ہے؟ فرمایا کہ تم جو کچھ کرتے ہو بس اس قدر ہے کہ پانی کی ایک بوند عورت کے رحم میں ٹپکا کر الگ ہو جاتے ہو۔ اس بوند کو تہ بہ تہ تاریکیوں کے اندر گوناگوں مراحل سے گزار کر، ایک بھلے چنگے بچہ کی صورت میں عورت کے پیٹ سے باہر لانا اور پھر اس کو بچپن، بلوغ، جوانی اور بڑھاپے کے مراحل سے گزارنا کس کا کام ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سارے کام اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت و حکمت سے ہوتے ہیں تو جو خدا پانی کی ایک بوند پر یہ تصرفات کر سکتا ہے اور اس کی صورت گری میں وہ کسی کا بھی محتاج نہیں ہے وہ اگر اس کے بغیر مجرد زمین کے ذرات ہی سے تمھیں دوبارہ متشکل کر کے اٹھا کھڑا کرے تو اس کے لیے کیا مشکل ہے!

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ (۶۰)

یعنی یہ گمان کرنے کی بھی ذرا گنجائش نہیں ہے کہ کوئی ہماری گرفت سے بچ کر کہیں نکل سکتا ہے۔ ہم نے لوگوں کے درمیان موت کا جال بچھا رکھا ہے اور یہ جال ایسا ہے کہ اس نے سب کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ہر بڑے چھوٹے اور امیر و غریب کے لیے موت لازمی ہے اور اس طرح ہم سب کو روزِ قیامت کی پیشی کے لیے جمع کر رہے ہیں۔ آگے آیات ۸۳-۸۷ میں یہ مضمون وضاحت سے آ رہا ہے۔

عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۶۱)

یعنی جب پیدا کرنا بھی ہمارے اختیار میں ہے اور مارنا بھی ہمارے اختیار میں ہے تو اگر تمھاری جگہ تمھاری مانند ہم پیدا کرنا چاہیں گے تو اس سے کیوں عاجز رہیں گے؟ ہم عاجز نہیں رہیں گے بلکہ اس بات پر قادر ہیں کہ تمھارے مانند پیدا کر دیں اور ایک ایسے عالم میں تمھیں اٹھا کھڑا کریں جس کو تم نہیں جانتے۔

'عَلٰی' یہاں اس بات کا قرینہ ہے کہ 'وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ' کو مثبت معنی یعنی 'قَادِرِیْنَ' کے مفہوم میں لیا جائے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم عاجز نہیں بلکہ قادر ہیں۔ صلہ کی تبدیلی سے عربی زبان میں حذف و ایجاز کے جو تصرفات ہوتے ہیں اس کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ یہی مضمون سورۂ معارج میں اس طرح آیا ہے: 'اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ' (المعارج ۷۰: ۴۰-۴۱) (بے شک ہم قادر ہیں اس بات پر کہ ان کی جگہ ان سے بہتر کو لائیں، ہم اس سے عاجز رہنے والے نہیں ہیں)۔

'وَنُنْشِئَكُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' یعنی ایک ایسے عالم میں تمھیں اٹھا کھڑا کریں جس کے نوامیس و قوانین اس عالم سے بالکل مختلف ہوں گے اور تم ان سے بالکل ناآشنا ہو۔ تمھیں حیرانی ہے کہ موت اور زندگی کے ان معروف ضوابط کے خلاف، جن سے اس دنیا میں تم آشنا ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ مرنے اور سڑ گل جانے کے بعد مجرّد ایک صدائے صُور سے ساری خلقت از سرِ نو وجود میں آ جائے، پھر ایک ایک فرد کا حساب ہو اور پھر وہ ابدی جنت یا ابدی دوزخ کا سزاوار قرار پائے! لیکن یہ سب کچھ ہو گا اور ایک ایسے عالم میں یہ تمھارے سامنے آئے گا جس سے تم ابھی ناآشنا ہو۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰی فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ (۶۲)

یعنی اگر تم نے اس عالم کو، جس میں ہم تم کو از سرِ نو پیدا کرنے والے ہیں، نہیں دیکھا تو یہ کوئی معقول دلیل اس بات کی نہیں ہے کہ تم اس کی تکذیب پر جم جاؤ۔ آخر اس جہان میں اپنی خلقت کو تو تم دیکھتے ہو تو اس سے کیوں نہیں سبق حاصل کرتے کہ جس نئی زندگی سے تمھیں آگاہ کیا جا رہا ہے اس میں ذرا بھی استبعاد نہیں ہے۔ جو خالق اس دنیا میں تمھیں لایا ہے اس کی قدرت کے دائرہ سے کوئی چیز بھی باہر نہیں ہے۔ وہ تمھیں دوبارہ بھی اسی طرح وجود میں لا سکتا ہے اور اس کی ربوبیت و حکمت کا یہ تقاضا

بھی ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ دنیا بالکل بے مقصد ہو کے رہ جاتی ہے اور خالقِ کائنات سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کوئی کارِ عبث کرے۔

اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ (۶۳-۶۴)

وسائلِ ربوبیت سے جزاء پر استدلال

انسان کی خلقت کے بعد یہ ان وسائلِ ربوبیت کی طرف توجہ دلائی جو ربِّ کریم نے اس کی پرورش کے لیے مہیا فرمائے ہیں اور جن کے مہیا ہونے میں نہ انسان کی تدبیر کو کوئی دخل ہے نہ اس کے کسی استحقاق کو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بلا استحقاق جو نعمتیں بخشی ہیں ان کو قرآن نے مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ جزاء و سزا کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے کہ ان کا بلا کسی حق کے عطا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ایک دن ہر نعمت کے باب میں لوگوں سے پرسش ہونی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی جگہ جگہ واضح فرمائی ہے کہ یہ نعمتیں اکثروں کے لیے استکبار کا سبب بن گئیں۔ اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو انھوں نے اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ اور اپنا حق سمجھا اور اس غرور میں آخرت سے آنکھیں بند کر لیں اور اگر کسی نے ان کو آنکھیں کھولنے کی دعوت دی تو اس کو وہی جواب دیا جو اوپر مترفین کی زبان سے نقل ہوا ہے۔

فرمایا کہ زمین میں جو کچھ تم بوتے ہو، کبھی اس پر بھی غور کیا؟ کیا اپنے بوئے ہوئے بیجوں کو تم پروان چڑھاتے ہو یا ان کو پروان چڑھانے والے ہم ہیں؟ جس طرح اولاد کی پیدائش میں تمھارا حصہ صرف اتنا ہی ہے کہ تم ہل چلا کر کچھ دانے زمین میں بکھیر دیتے ہو، اس کے بعد کے سارے مراحل تم دیکھتے ہو کہ براہِ راست قدرت کے اہتمام میں طے ہوتے ہیں۔ اسی نے زمین میں یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ اپنی آغوش میں دانے کی پرورش کرے۔ اسی نے بیج میں یہ صلاحیت ودیعت فرمائی کہ وہ زمین کی حرارت اور رطوبت سے فیض یاب ہو کر اپنے اندر سے سوئیاں نکالے اور ان نازک سوئیوں کے اندر یہ حوصلہ ودیعت فرمایا کہ وہ دھرتی کا سینہ چیر کر باہر نکلیں اور کھلی فضا میں پروان چڑھیں۔ پھر اللہ ہی ان نازک سوئیوں کو ڈنٹھلوں کا سہارا مہیا کرتا ہے۔ ان کے اندر برگ و بار پیدا کرتا ہے، خوشے نکالتا ہے، پھول اور پھل پیدا کرتا ہے، پھر وہ پک کر کسان کی جھولی بھرتے ہیں۔ غور کرو کہ ان میں سے کون سا کام ہے جو تمھارے کیے ہوتا ہے یا جس کو تم انجام دینے کی قابلیت رکھتے ہو۔

لَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنٰہُ حُطٰمًا فَظَلۡتُمۡ تَفَکَّہُوۡنَ (۶۵)

یعنی اس معاملے میں تمھاری بے بسی تو اس بات سے واضح ہے کہ ہم چاہیں تو تمھاری ہری بھری فصل کو، عین اس وقت جب کہ تم اپنی شاندار کامیابی پر پھولے نہ سما رہے ہو، کوئی بادِ تند بھیج کر یا ژالہ باری کر کے چشم زدن میں بالکل ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیں۔ پھر تم باتیں ہی بناتے رہ جاؤ۔

لفظ 'تَفَکَّہُوۡنَ' یہاں بطور طنز استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایسی بدحواسی طاری ہو کہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ اس حادثہ کی کیا توجیہ کرے اور اپنے نقصان کا اندازہ دوسروں کو کس طرح کرائے۔ کوئی کچھ

کہے کوئی کچھ۔ آگے اس کی تفصیل آ رہی ہے۔

إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ (۶۶ - ۶۷)

یعنی کوئی تو یوں فریاد کرے کہ بھائی ہم تو تاوان میں پڑ گئے، جو کچھ لگایا وہ بھی پلّے نہ پڑا۔ دوسرے بولیں کہ اس آفت نے تو ہمیں بالکل ہی محروم کر چھوڑا، اب بیوی بچوں کی پرورش اور گزارے کی کیا شکل ہوگی! سورۂ قلم میں ایک باغ والوں کی تمثیل بیان ہوئی ہے جس سے اس صورتِ حال کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا ہے:

إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ	ہم نے ان کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس
الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا	طرح باغ والوں کو آزمائش میں ڈالا جب کہ
مُصْبِحِينَ ۝ وَلَا يَسْتَثْنُونَ ۝ فَطَافَ	انھوں نے قسم کھائی کہ کل صبح صبح وہ اپنے باغ کے
عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ	پھل ضرور ہی توڑ لیں گے، اور ذرا بھی نہیں
نَائِمُونَ ۝ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ۝	چھوڑیں گے تو ابھی وہ سوئے ہی پڑے تھے کہ تیرے رب
فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ ۝ أَنِ اغْدُوا	کی جانب سے اس باغ پر ایسی گردش آئی کہ اس کا بالکل
عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِن كُنتُمْ صَارِمِينَ ۝	صفایا ہو گیا۔ انھوں نے صبح صبح شریکوں کو پکارا
فَانطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ ۝	کہ باغ توڑنا ہے تو سویرے سویرے کھیتوں پر پہنچو۔
أَن لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُم	تو وہ کانا پھوسی کرتے نکلے کہ کوئی مسکین آج باغ میں
مِّسْكِينٌ ۝ وَغَدَوْا عَلَىٰ حَرْدٍ	نہ پہنچنے پائے اور وہ بڑی امنگ اور حوصلہ سے نکلے
قَادِرِينَ ۝ فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا	تو جب باغ کو دیکھا تو بولے کہ معلوم ہوتا ہے ہم رستہ
لَضَالُّونَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝	بھول کر غلط جگہ آ گئے! نہیں بلکہ ہم تو بالکل ہی محروم
(القلم - ۶۸ : ۱۷-۲۷)	ہو کر رہ گئے۔

أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ (۶۸ - ۶۹)

سامانِ غذا کے بعد پانی کی نعمت کی طرف اشارہ

غذائی نعمتوں کے بعد یہ پانی کی نعمت کی طرف توجہ دلائی کہ بھلا کبھی اس پانی پر بھی غور کیا ہے جو پیتے ہو! کیا اس کو بادلوں سے تم نے اتارا ہے یا اس کے اتارنے والے ہم ہیں! یعنی یہ ہماری ہی قدرت و حکمت اور ربوبیت ہے کہ ہم سمندروں کے کھاری پانی کو بھاپ بنا کر اڑاتے اور پھر اس کو صاف، شیریں اور خوش گوار بنا کر تمھارے اوپر برساتے جس کو تم بھی پیتے ہو، تمھارے مویشی بھی پیتے ہیں اور ان سے تمھاری فصلیں بھی سیراب ہوتی ہیں۔ بھلا بتاؤ کہ ہے کسی میں یہ قدرت کہ بادلوں سے پانی برسا دے! یہ امر واضح رہے کہ اہلِ سائنس نے اب تک پانی برسانے کے جو تجربات کیے ہیں اس کی نوعیت بچوں کے کھیل سے

زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ بادلوں کے کسی ٹکڑے پر کچھ گرم و سرد اثرات ڈال کر چند بوندیں ٹپکا لینا اور چیز ہے؛ بادلوں کو بنانا، ان کو فضا میں پھیلانا، ان کو ایک جگہ سے ہانک کر دوسری جگہ لے جانے کے لیے سازگار ہوائیں چلانا اور جس علاقہ کو چاہنا اس کو جل تھل کر دینا ایک دوسری چیز ہے۔

لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ (۷۰)

یعنی ہم چاہیں تو اس پانی کو ایسا کھاری اور تلخ بنا دیں کہ یہ تمھارے کسی کام کا بھی نہ رہے۔ یعنی جب ہم ہی نے کھاری کو شیریں بنایا ہے تو ہمارے لیے کیا مشکل ہے کہ ہم پھر اس شیریں کو کھاری بنا دیں۔

ربوبیت کا تقاضا

فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ: یہ اسی ربوبیت کا تقاضا بیان ہوا ہے کہ یہ چیز تم پر واجب کرتی ہے کہ تم اپنے رب کے شکر گزار بندے بنو، ورنہ اپنی ناشکری کی سزا بھگتنے کے لیے تیار رہو۔ دین میں شکر کا جو مقام ہے اس کی وضاحت سورۂ فاتحہ میں ہو چکی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی تحریک سے بندہ اپنے رب کی راہ میں پہلا قدم اٹھاتا ہے اور منزل پر پہنچنے کے بعد اسی کا اظہار وہ اپنی جدوجہد کے نتائج دیکھ لینے کے بعد بھی کرے گا: وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ!

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ (۷۱-۷۲)

پانی کے بعد آگ کی طرف اشارہ

پانی کے بعد آگ کی بھی، ضروریاتِ زندگی میں، بڑی اہمیت ہے۔ بالخصوص ان قوموں کے لیے جن کو بڑے بڑے صحرائی سفر کرنے پڑتے تھے۔ جہاں نہ تو راہ میں آبادیاں ہوتیں جہاں سے ضرورت کے وقت بآسانی آگ دستیاب ہو سکے، نہ آگ چیز ہی ایسی ہے جس کو آدمی اپنے سامان میں باندھ کے ساتھ لے سکے اور نہ اس وقت تک دیا سلائی ہی کے قسم کی کوئی چیز ایجاد ہوئی تھی جس سے یہ ضرورت پوری کی جا سکے۔ اس قسم کے ضرورت مندوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کی یاد دہانی کے لیے بعض خاص قسم کے پتھر بھی پیدا کیے جن کو رگڑ کر آگ پیدا کی جا سکتی تھی اور اس سے عجیب تر اپنی قدرت و حکمت کی یہ شان دکھائی کہ وہ ایسے درخت بھی پیدا کیے جن کی دو ٹہنیوں کو ایک دوسری سے رگڑ کر آگ بھڑکائی جا سکتی تھی۔ ان کو مرخ اور عفار کہتے تھے۔ سورۂ یٰسٓ میں بھی اس درخت کا ذکر ہو چکا ہے۔ فرمایا کہ اس چیز پر بھی غور کرو کہ زندگی کی اتنی بڑی ضرورت کو مہیا کرنے والے تم ہو یا ہم ہیں!

نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (۷۳)

آگ کے ذکر کے بعض خاص پہلو

فرمایا کہ ہم نے اس کو یاددہانی اور منفعت کی چیز بنایا ہے صحرا کے مسافروں کے لیے۔ 'مقوین' صحراؤں اور چٹیل میدانوں میں سفر کرنے والوں کو کہتے ہیں، جہاں آگ کا حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ضمیر مؤنث کا مرجع 'شجرۃ' بھی ہو سکتا ہے اور وہ آگ بھی جو اس سے پیدا ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں باعتبارِ مفہوم کوئی فرق واقع نہیں ہو گا۔

'تذکرۃ' کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔ اس یاد دہانی کے ہیں تو متعدد پہلو لیکن ہم صرف دو خاص اہمیت رکھنے والے پہلوؤں کی طرف یہاں اشارہ کریں گے۔

اوّل یہ کہ ربِّ کریم کی پروردگاری کی یہ ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ ربوبیت انسان پر مسئولیت کی ذمہ داری عائد کرتی ہے جو جزا و سزا اور دوزخ یا جنت کو مستلزم ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آرہے ہیں۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر جو دی ہے کہ دوزخ میں آگ بھی ہوگی اور اس میں زقّوم کے درخت بھی ہوں گے، یہ ایک حقیقت ہے۔ اس کو خلافِ عقل سمجھ کر کوئی اس کا مذاق اڑانے کی کوشش نہ کرے۔ جو خدا مرخ اور عفار کی ہری شاخوں کے اندر آگ بھر سکتا ہے اس کے لیے دوزخ کے اندر زقّوم پیدا کر دینا کیا مشکل ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۶۰ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ قریش کے بے فکرے قرآن کا مذاق اڑاتے تھے کہ یہ دوزخ میں آگ کی بھی خبر دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اس میں زقّوم کے درخت بھی ہوں گے۔ وہاں ان کے اس استہزاء کا جواب ایک دوسرے پہلو سے دیا ہے جس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ اس سورہ کی آیات ۵۲-۵۳ میں بھی چونکہ زقّوم کا ذکر آیا ہے اس وجہ سے جب آگ پیدا کرنے والے اس درخت کا ذکر فرمایا تو اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ جو لوگ دوزخ میں آگ اور درخت کی یکجائی کو ناممکن بتاتے ہیں وہ اس درخت سے سبق حاصل کریں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح یہ دونوں چیزیں یکجا کر رکھی ہیں۔

فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الۡعَظِیۡمِ (۷۴)

نبی صلعم کو صبر اور نماز کی تاکید

یہ بحث کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہنے اور اپنے رب کی تسبیح کرتے رہنے کی تاکید فرمائی۔ اس تاکید کا یہ محل ہے کہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے وہ تو تمھارے ساتھ ہیں لیکن یہ ہٹ دھرم لوگ ماننے والے نہیں ہیں سو ان کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے رب کی تسبیح میں لگے رہو۔ تسبیح یہاں وسیع معنی یعنی پاکی بیان کرنے کے مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تماشوں کے اندھے پرستار تو یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا محض ان کے عیش کے لیے بنائی ہے۔ ان کو علم نہیں ہے کہ ربِّ عظیم اس بات سے پاک اور برتر ہے کہ وہ کوئی عبث اور محض کھیل تماشے کی قسم کا کام کرے۔ اس پر واجب ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں اپنے شکر گزار بندوں کو ان کی نا شکر گزاری کا صلہ دے اور جو ناشکرے ہیں وہ کیفرِ کردار کو پہنچیں۔

'بِاسۡمِ رَبِّکَ' میں 'ب' کا صلہ اس امر کا قرینہ ہے کہ 'سَبِّحۡ' یہاں استعانت کے مضمون پر بھی متضمن ہے جس سے معنی میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ اپنے رب کی تسبیح کرو اور اسی سے اس صورتِ حال کے مقابلہ کے لیے مدد مانگو۔

لفظ 'اسم' اس حقیقت کا سراغ دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بندے کے تعلق و توسل کا ذریعہ صرف اس کے اسمائے حسنیٰ ہی ہیں۔ انہی کی معرفت سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے جو تمام صحیح علم و عمل کا سرچشمہ ہے۔

۴- آگے آیات ۷۵-۹۶ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ قریش کے لیڈروں کو خطاب کر کے متنبہ فرمایا ہے کہ قرآن جس شدنی کی خبر دے رہا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ اس سے فرار اختیار کرنے اور اس کی تکذیب کرنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ کاہنوں کی خرافات کی قسم کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے محفوظ خزانۂ علم سے اترا ہوا باعزت کلام ہے جو نہایت پاکیزہ ذرائع سے اس کے پاکیزہ رسول پر نازل ہوا ہے۔ یہ شیاطین کی چھوت اور مداخلت سے بالکل محفوظ و مامون ہے۔ یہ تمھارے لیے ابدی ہدایت اور دائمی رزق ہے، اس کی ناقدری اور تکذیب کر کے اپنی شامت کو دعوت نہ دو۔ یاد رکھو کہ کوئی خدا کے قابو سے باہر نہیں نکل سکتا اور تمہیں جس 'خفض و رفع' سے آگاہ کیا جا رہا ہے وہ اپنے تمام لوازم و نتائج کے ساتھ سامنے آنے والا ہے۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۷۵-۹۶ فَلَآ أُقْسِمُ بِمَوَٰقِعِ ٱلنُّجُومِ ﴿٧٥﴾ وَإِنَّهُۥ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ ﴿٧٦﴾
إِنَّهُۥ لَقُرْءَانٌ كَرِيمٌ ﴿٧٧﴾ فِى كِتَٰبٍ مَّكْنُونٍ ﴿٧٨﴾ لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا
ٱلْمُطَهَّرُونَ ﴿٧٩﴾ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٨٠﴾ أَفَبِهَٰذَا
ٱلْحَدِيثِ أَنتُم مُّدْهِنُونَ ﴿٨١﴾ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ
أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ ﴿٨٢﴾ فَلَوْلَآ إِذَا بَلَغَتِ ٱلْحُلْقُومَ ﴿٨٣﴾ وَأَنتُمْ
حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ ﴿٨٤﴾ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَٰكِن
لَّا تُبْصِرُونَ ﴿٨٥﴾ فَلَوْلَآ إِن كُنتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ﴿٨٦﴾ تَرْجِعُونَهَآ
إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿٨٧﴾ فَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ ٱلْمُقَرَّبِينَ ﴿٨٨﴾
فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ ﴿٨٩﴾ وَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ

أَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٩٠﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ أَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٩١﴾ وَأَمَّآ
إِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٩٢﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿٩٣﴾
وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿٩٤﴾ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿٩٥﴾ فَسَبِّحْ
٣ ع ٢٢ ١٦ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٩٦﴾

ترجمۂ آیات ٧٥-٩٦

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے گرنے کے ٹھکانوں کی! اور بے شک یہ ایک بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو! بے شک یہ ایک باعزت قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں۔ اس کو صرف پاکیزہ ہی ہاتھ لگاتے ہیں۔ یہ عالم کے خداوند کا نازل کردہ ہے۔ تو کیا تم لوگ اس کلام سے اغماض برتتے ہو! اور جو تمہارے لیے رزق ہے، اس کی تکذیب کر رہے ہو! ٧٥-٨٢

اگر تمہارا یہ گمان ہے کہ تم کسی کے محکوم نہیں تو کیوں نہیں اس وقت جب کہ جان حلق میں پہنچتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم اس جان کنی میں مبتلا سے تمہاری نسبت زیادہ قریب ہوتے ہیں لیکن تم نہیں دیکھ پاتے۔ پس کیوں نہیں، اگر تم غیر محکوم ہو، اس جان کو لوٹا لیتے اگر تم سچے ہو؟ ٨٣-٨٧

پس اگر وہ ہوا مقربین میں سے تو اس کے لیے راحت اور سرور اور نعمت کا باغ ہے۔ اور اگر وہ اصحاب یمین میں سے ہوا تو تیرے لیے سلامتی ہے، اے صاحب یمین! اور اگر جھٹلانے والوں گمراہوں میں سے ہوا تو اس کے لیے گرم پانی کی ضیافت اور جہنم کا داخلہ ہے۔ ٨٨-٩٤

بے شک یہ ساری باتیں سچی اور یقینی ہیں تو اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کر۔

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ (۷۵)

'لا' نفی سے الگ ہے

یہاں 'لا' فعل 'اُقْسِمُ' سے متصل نہیں ہے بلکہ اس سے بالکل الگ ہے۔ اثبات سے پہلے یہ نفی مخاطب کے زعمِ باطل کی تردید کے لیے آئی ہے۔ اس طرح نفی کا لانا عربی زبان اور قرآن میں معروف ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا ہے: 'فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ' (النساء-۴: ۶۵) (پس نہیں، تیرے رب کی قسم، وہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات میں تمہی کو حکم نہ بنائیں) یعنی اگر ان منافقین کا گمان ہے کہ محض کلمہ پڑھ لینے سے یہ مسلمان بن گئے ہیں تو یہ گمان بالکل غلط ہے۔ اس کے بعد قسم کھا کر فرمایا کہ یہ اس وقت تک سچے مومن نہیں بن سکتے جب تک اپنی تمام نزاعات میں تمہی کو (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو) حکم نہ بنائیں۔ اسی طرح یہاں قسم سے پہلے 'لا' کے ذریعہ مخاطبوں کے اس زعم کی تردید فرما دی کہ قرآن العیاذ باللہ کاہنوں کی مزخرفات کی قسم کا کوئی شیطانی القاء ہے۔ اس کے بعد قسم کھا کر قرآن کی عظمت و تقدیس اور اس کے وحیِ الٰہی ہونے کا ذکر فرمایا۔ یہ اسلوبِ کلام ایک فطری اسلوبِ کلام ہے اس وجہ سے ہر زبان میں موجود ہے۔ ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔ جب آپ کہتے ہیں 'نہیں خدا کی قسم، اصل حقیقت یوں ہے' تو یہی اسلوب استعمال کرتے ہیں اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ اصل حقیقت کے اثبات سے پہلے مخاطب یا معترض کے خیال یا اعتراض کی تردید کر دیں۔ اس اسلوبِ کلام میں بلاغت یہ ہے کہ گویا معترض کا اعتراض اتنا لغو ہے کہ متکلم ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اتنا توقف بھی گوارا نہیں ہے کہ صحیح پہلو کی وضاحت کرنے کے بعد اس کی تردید کرے۔

اکثر لوگوں نے اس 'لا' کو زائد مانا ہے لیکن کسی فصیح کلام میں اوّل تو کوئی حرف زائد ہوتا نہیں اور بالفرض ہوتا بھی ہو تو حرف 'لا' بہرحال ان حروف میں سے ہے جس کو کہیں بھی زائد ماننے میں بڑے خطرات مضمر ہیں۔ کسی ضابطہ کے بغیر اگر اس کو زائد ماننے کی راہ کھول دی گئی تو اس سے دین کے اندر بہت سی منہیات کے جواز کی راہ کھل سکتی ہے۔ لیکن یہاں اس مسئلہ پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ اگلی سورہ ــــــ الحدید ــــــ میں آیت ۲۹ 'لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ ...... الاٰية' کے تحت ہم اس پر بحث کریں گے۔ اس 'لا' کو بھی مفسرین نے زائد قرار دیا ہے لیکن ان شاء اللہ ہم واضح کریں گے کہ یہ عربیت کے اسلوب کے بالکل مطابق ہے۔

وحیِ الٰہی کی حفاظت کے لیے ایک خاص انتظام

'مواقع' جمع ہے 'موقع' کی جس کے معنی کسی چیز کے واقع ہونے یا گرنے کی جگہ کے ہیں۔ یہاں یہ ان ٹھکانوں یا کمین گاہوں کے لیے آیا ہے جن پر ان شیاطین کے تعاقب کے لیے شہاب ثاقب پھینکے

جاتے ہیں جو ملأ اعلیٰ کے بھید معلوم کرنے کے لیے ان میں چھپ کر کان لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین جن نے کچھ خاص کمین گاہیں ایسی منتخب کر رکھی تھیں جن میں وہ ملأ اعلیٰ کی باتوں کی سن گن لینے کے لیے بیٹھا کرتے تھے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں وحیٔ الٰہی کو شیاطین کی مداخلت سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہ اہتمام فرمایا کہ جو شیاطین ان کمین گاہوں میں بیٹھنے کی کوشش کرتے ان پر شہابِ ثاقب کے راکٹ پھینکے جاتے۔ اس حقیقت کا اعتراف سورۂ جن میں خود جنوں کی زبان سے یوں نقل ہوا ہے:

وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا	اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو یہ پایا کہ وہ سخت
مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝	پہرہ داروں اور شہابوں سے بھر دیا گیا ہے۔ اور
وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ	یہ کہ ہم اس کے کچھ ٹھکانوں میں غیب کی باتیں سننے
لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ	کے لیے بیٹھا کرتے تھے لیکن اب جو کان لگانے
يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝	کی کوشش کرے گا تو وہ ایک شہابِ ثاقب کو
(الجن - ۷۲: ۸-۹)	اپنی گھات میں پائے گا۔

میرے نزدیک سورۂ جن کی اس آیت میں جن کمین گاہوں کو 'مقاعد' کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے انہی کو آیت زیرِ بحث میں 'مواقع' کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ البتہ 'مقاعد' میں ان کے کمین گاہ ہونے کا مفہوم پیشِ نظر ہے اور 'مواقع' میں شہابوں کے ہدف ہونے کا۔ لفظ 'نجوم' یہاں شہابوں کے مفہوم میں ہے۔ سورۂ ملک میں فرمایا ہے: 'وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ' (الملک - ۶۷: ۵) (اور ہم نے آسمانِ زیریں کو چراغوں سے سجایا اور ان کو شیطانوں کے سنگسار کرنے کے لیے بھی بنایا)۔ ان شہابوں پر سورۂ نجم کی آیات ۱-۵ اور سورۂ رحمٰن کی آیت ۳۵ کے تحت بھی بحث گزر چکی ہے۔ ان دونوں مقامات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ (۷۶)

ایک برمحل جملۂ معترضہ

یہ قسم اور مقسم علیہ کے درمیان ایک برمحل جملۂ معترضہ ہے۔ فرمایا کہ جس طرح تم محض ہٹ دھرمی سے قرآن کو القائے شیطانی قرار دیتے ہو اسی طرح اس قسم کے باب میں بھی کہو گے کہ بھلا شہابوں کے گرنے کو شیاطین کے رجم سے کیا تعلق! لیکن تم جان سکو تو یہ حقیقت تم پر آشکارا ہو گی کہ یہ قسم اپنے اندر ایک عظیم شہادت اس بات کی رکھتی ہے کہ جنات و شیاطین کو ملأ اعلیٰ تک کوئی رسائی حاصل نہیں ہے، جیسا کہ کاہنوں کا دعویٰ ہے۔ اگر کوئی وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو قدرت نے اس کی سرکوبی کے لیے نہایت عظیم پیمانے پر انتظام کر رکھا ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی خدا کے شہابوں کی زد سے بچ کے نکل سکے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس کو جان سکو یا نہ جان سکو اور مانو یا نہ مانو لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم میں

تمھاری آگاہی کے لیے اس کائنات کا ایک نہایت اہم راز بیان فرمایا ہے۔

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ﴿٧٧﴾ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ﴿٧٨﴾ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ﴿٧٩﴾ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ (۷۷ - ۸۰)

قرآن شیطانی چھوت سے بالکل پاک ہے

قسم کے بعد یہ مقسم علیہ ہے اور یہ حقیقت اپنی جگہ پر اچھی طرح واضح کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید میں قسمیں شہادت کے طور پر کھائی گئی ہیں۔ گویا شیاطین پر سنگ باری اور آتش باری کے مذکورہ بالا انتظام کا حوالہ دے کر مخالفوں کو متنبہ فرمایا کہ اس قرآن کو کاہنوں کے قسم کا کوئی شیطانی القاء نہ گمان کرو بلکہ یہ ایک نہایت باعزت اور برتر کلام ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک محفوظ کتاب میں ہے جس تک اس کے پاک فرشتوں کے سوا کسی کی بھی رسائی نہیں یعنی اس کو صرف ملائکہ مقربین ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں، جنات اور شیاطین وہاں نہیں پھٹک سکتے۔

'تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ'۔ پس یہ گمان نہ کرو کہ جس طرح کی شیطانی وحی کاہنوں پر آتی ہے اسی طرح کی وحی العیاذ باللہ یہ قرآن بھی ہے۔ یہ القائے شیطانی نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کا اتارا ہوا کلام ہے۔ اس کا سرچشمہ لوحِ محفوظ ہے جس تک ملائکہ مقربین کے سوا کسی کی بھی رسائی نہیں۔ اس کے لانے والے حضرت جبریل امینؑ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرب فرشتے ہیں اور شیاطین ان پر کسی پہلو سے بھی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اس کا نزول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ضلالات و غوائت کے ہر شائبہ سے بالکل پاک رکھا ہے۔

فقہاء کے بعض استنباط

'لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ' کے ٹکڑے سے ہمارے فقہاء نے طہارت کے بعض آداب بھی استنباط کیے ہیں جن کا اہتمام ان کے نزدیک قرآن مجید کو چھونے یا تلاوت کرتے وقت ضروری ہے لیکن یہ آیت جس سیاق و سباق میں ہے اس سے واضح ہے کہ ان مسائل سے ان کو براہ راست تعلق نہیں ہے اس وجہ سے فقہاء کے استنباطات کو ان کے اپنے دلائل کی روشنی میں جانچ کر رد یا قبول کیجیے یہ موضوع ہمارے دائرۂ بحث سے الگ ہے اس وجہ سے ہم اس سے تعرض نہیں کریں گے بس اتنا عرض کریں گے کہ جن فقہاء نے قرآن کی زبانی تلاوت یا اس کو ہاتھ لگانے تک کے لیے بھی طہارت کی وہ شرطیں عائد کی ہیں جو نماز کے لیے ضروری ہیں ان کے اقوال غلو پر مبنی ہیں۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اس وجہ سے وہ ہر پہلو سے لائق تکریم ہے لیکن وہ ہمارے لیے ہر قدم پر حق و باطل اور خیر و شر کے جاننے کا ذریعہ، اخذ و استنباط کا حوالہ اور استدلال کا مرکز بھی ہے۔ اگر اس کو ہاتھ لگانے یا اس کی کسی سورہ یا آیت کی تلاوت کرنے یا حوالہ دینے کے لیے بھی آدمی کا طاہر و مطہر اور باوضو ہونا ضروری قرار پا جائے تو یہ ایک ایسی تکلیف مالا یطاق ہو گی جو دینِ فطرت کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس طرح کی غیر فطری پابندیاں عائد کرنے سے قرآن کی تعظیم کا وہی تصور پیدا ہو گا جس کی تعبیر سیدنا مسیحؑ نے یوں فرمائی ہے کہ

"تمھیں چراغ دیا گیا کہ اس کو گھر میں بلند جگہ رکھو کہ سارے گھر میں روشنی پھیلے لیکن تم نے اس کو پیمانے کے نیچے ڈھانپ کر رکھا ہے۔"

أَفَبِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَنتُم مُّدْهِنُونَ (۸۱)

قرآن سے بے اعتنائی برتنے والوں کو تنبیہ

'اِدْهَان' کے معنی اغماض، سہل انگاری اور بے نیازی و بے اعتنائی برتنے کے ہیں۔ قرآن کی عظمت بیان کرنے کے بعد باندازِ تعجب سوال کیا ہے کہ کیا یہ قرآن، جس کو تمھارے رب نے اس اہتمام خاص کے ساتھ تمھاری ہدایت کے لیے اتارا ہے اس بے اعتنائی کا سزاوار ہے جو تم اس سے برت رہے ہو!

مطلب یہ ہے کہ تم اتنے بدذوق و بے بصیرت تو نہیں ہو چکے ہو کہ گہر اور پشیز میں کوئی تمیز نہ رہ گئی ہو۔ تمیز تو ہے لیکن تم قرآن کو قبول کرنا نہیں چاہتے اس وجہ سے اس کو کاہنوں کی طرح کا کلام قرار دے کر نظرانداز کر رہے ہو تو کر و لیکن یاد رکھو کہ تمھارے نظرانداز کرنے سے یہ حقیقت نابود نہیں ہو جائے گی۔ حقیقت بہرحال حقیقت ہے اور اس سے تمھیں سابقہ پیش آکے رہے گا۔ یہ تمھارے ہی حق میں بہتر ہوتا اگر تم اس کی قدر کرتے۔

وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ (۸۲)

رزق سے مراد قرآن ہے

یہاں 'رزق' سے مراد ہمارے نزدیک وحیِ الٰہی یا بالفاظِ دیگر قرآن ہے جس پر بحث چلی آرہی ہے۔ وحیِ الٰہی کو قدیم صحیفوں میں بھی جا بجا رزق سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور قرآن میں بھی۔ اس کے حوالے اس کے محل میں ہم دے چکے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ 'انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔' قرآن میں بھی اس کو زندگی سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اِسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (الانفال - ۸ : ۲۴) (اور لبیک کہو اللہ و رسول کی دعوت پر جب کہ رسول تمھیں بلا رہا ہے اس چیز کی طرف جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے)۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے تو تمھارے لیے مائدۂ آسمانی اتارا کہ تم اس سے حیاتِ جاوداں حاصل کرو لیکن تمھاری محرومی ہے کہ تم اس کی ناقدری اور تحقیر کر رہے ہو۔

فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ ۝ وَأَنتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ ۝ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَٰكِن لَّا تُبْصِرُونَ ۝ فَلَوْلَا إِن كُنتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ۝ تَرْجِعُونَهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۸۳-۸۷)

خدا کے قبضۂ قدرت سے کوئی باہر نہیں ہے

یعنی اس ڈھٹائی سے تم قرآن کا جو مذاق اڑا رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ جس جزا و سزا سے یہ تمھیں آگاہ کر رہا ہے وہ محض ایک ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، نہ تم کسی کے محکوم ہو اور نہ تمھیں کسی کے آگے اپنے کسی قول و فعل سے متعلق کوئی جواب دہی کرنی ہے تو اپنے آپ کو یا اپنے کسی محبوب سے محبوب کو موت کے پنجے سے کیوں نہیں بچا لیتے؟ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو اس وقت تو

تم اپنے آپ کو بالکل ہی بے بس پاتے ہو اور جان فرشتۂ اجل کے حوالہ کرنی پڑتی ہے تو اپنی اس بے بسی کا مشاہدہ کرتے ہوئے تم نے اپنے آپ کو مطلق العنان اور شتر بے مہار کیوں سمجھ رکھا ہے؟ اوپر آیت ۶۰ میں فرمایا ہے: نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ (ہم نے تمھارے درمیان موت مقدر کر رکھی ہے اور ہم کسی کو پکڑنے سے عاجز رہنے والے نہیں ہیں) وہی حقیقت یہاں دوسرے الفاظ میں ممثل کر کے سمجھائی ہے کہ کوئی اپنے آپ کو مطلق العنان نہ سمجھے۔ کوئی خدا کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ سب موت کے اسیر ہیں اور یہ موت اسی لیے مقدر کی گئی ہے کہ وہ ہر متنفس کو، ایک یوم موعود میں، خدا کے آگے پیش ہونے کے لیے جمع کرتی رہے۔

موت کے اسیر سب ہیں

'فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ'۔ 'بلغت' کا فاعل 'نفس' (جان) یہاں بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یعنی انسان کی جان جب نزع کے وقت حلق میں آ پھنستی ہے۔ سورۂ قیامہ میں بھی اسی طرح 'بلغت' کا فاعل محذوف ہے: فَإِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ (القيامة - ۷۵: ۲۶) (پس جب کہ جان ہنسلی میں آ پھنسے گی) بلاغت کے پہلو سے اس حذف کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ واقعہ کا ہول، ابہام کے سبب سے، زیادہ مؤثر ہو کر سامنے آتا ہے۔

'لولا' کا جواب آگے نہایت مؤثر انداز میں آ رہا ہے۔

'وَأَنْتُمْ حِينَئِذٍ تَنْظُرُونَ'۔ یعنی یہ نہیں ہوتا کہ یہ حادثہ دوسروں کی بے خبری میں پیش آ جاتا ہو بلکہ مبتلائے نزع کے اعزہ و اقربا، اس کے سارے محب و محبوب، اس کے معالج اور ڈاکٹر اس کے پاس موجود ہوتے ہیں لیکن موت کا فرشتہ ان سب کے سامنے سے اس کی جان نکال کے لے کر چلا جاتا ہے اور کسی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر وہ پاس موجود ہوتے تو فرشتۂ اجل کا ہاتھ پکڑ لیتے بلکہ ان کی ساری جاں نثاریاں اور تمام تدبیریں بالکل بے سود ہو کے رہ جاتی ہیں۔

'وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَٰكِنْ لَا تُبْصِرُونَ'۔ 'الیہ' میں ضمیر کا مرجع مبتلائے نزع شخص ہے۔ یعنی تم تو اس کے پاس ہوتے ہی ہو، تم سے زیادہ قریب اس کے ہم ہوتے ہیں لیکن تم ہم کو نہیں دیکھتے۔ تم کو اپنے ڈاکٹر کا ہاتھ نظر آتا ہے لیکن ہمارے فرشتہ کا ہاتھ نظر نہیں آتا کہ وہ کس چابکدستی سے اس کی جان نکال لیتا ہے۔

'فَلَوْلَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ۝ تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ'۔ یہ اس 'لولا' کا جواب ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ چونکہ شرط اور اس کے جواب میں دوری ہو گئی تھی اس وجہ سے اس کو پھر دہرا دیا ہے۔ فرمایا کہ اگر تم یہ گمان رکھتے ہو کہ تم کسی ایسے کے محکوم و مقہور نہیں ہو جو تم کو پکڑ سکے اور سزا دے سکے تو اس جان کو لوٹا کیوں نہیں لیتے جس کو تمھاری آنکھوں کے سامنے ہمارا فرشتہ نکال لیتا ہے۔ 'مدین' کے معنی محکوم اور مقہور (UNDER CONTROL) کے ہیں۔

فَاَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ۙ فَرَوۡحٌ وَّرَيۡحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيۡمٍ (۸۸-۸۹)

> موت کے بعد کے مراحل

یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ جو مر گیا اس کا قصہ ہمیشہ کے لیے تمام ہوا بلکہ اصل مرحلہ اس کے بعد سامنے آئے گا جو اوپر 'كُنۡتُمۡ اَزۡوَاجًا ثَلٰثَةً' (۷) کے الفاظ سے بیان ہوا۔ یعنی اس کا معاملہ تین شکلوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ مقربین میں سے ہوگا، یا اصحاب یمین میں سے یا اصحاب شمال میں سے۔ فرمایا کہ اگر وہ مقربین میں سے ہوا تو اس کے لیے ابدی راحت و سرور اور نعمت کا باغ ہے۔ 'رَوۡح' کے معنی راحت کے ہیں اور 'رَيۡحَان' یہاں سرور کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں اس لفظ پر بحث گزر چکی ہے۔ 'رَيۡحَان' کے اصل معنی تو پھول کے ہیں لیکن یہ اپنے لوازم یعنی خوشبو اور سرور کے لیے بھی آتا ہے۔

وَاَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ ۙ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ (۹۰-۹۱)

اور اگر وہ اصحاب یمین میں سے ہوا تو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی طرف سے داد ملے گی کہ اے صاحب یمین، تیرے لیے سلامتی اور مبارکی ہے۔

'فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ' میں 'مِنۡ'، سلام کے صلہ کے طور پر نہیں آیا ہے، جیسا کہ عام طور پر مفسرین نے سمجھا ہے۔ بلکہ ضمیر خطاب کے بیان کے لیے آیا ہے اس وجہ سے میرے نزدیک اس ٹکڑے کا یہ ترجمہ صحیح نہیں ہوگا کہ 'تیرے لیے اصحاب یمین کی جانب سے سلام پہنچے' بلکہ عربیت کے صحیح قاعدے سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ اے صاحب یمین تیرے لیے سلامتی ہو۔ اسی سلام و سلامتی کے اندر وہ سب کچھ ہے جو اوپر اصحاب یمین کے مرتبہ سے متعلق بیان ہوا ہے۔

وَاَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡمُكَذِّبِيۡنَ الضَّآلِّيۡنَ ۙ فَنُزُلٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ ۙ وَّتَصۡلِيَةُ جَحِيۡمٍ (۹۲-۹۴)

یہ اصحاب شمال کا انجام بیان ہو رہا ہے لیکن یہاں ان کا ذکر اصحاب شمال کے بجائے ان کے اصل جرم کے حوالہ سے 'الۡمُكَذِّبِيۡنَ الضَّآلِّيۡنَ' کے الفاظ سے ہوا ہے تاکہ ان کے انجام کے ساتھ ساتھ ان کے جرم کی نوعیت بھی واضح ہو جائے اور قریش کے مکذبین ضالین پر یہ پوری طرح منطبق بھی ہو جائے۔ اوپر آیت ۵۱-۵۴ میں قریش کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: 'ثُمَّ اِنَّكُمۡ اَيُّهَا الضَّآلُّوۡنَ الۡمُكَذِّبُوۡنَ ۙ لَاٰكِلُوۡنَ مِنۡ شَجَرٍ مِّنۡ زَقُّوۡمٍ ۙ فَمَالِــُٔوۡنَ مِنۡهَا الۡبُطُوۡنَ ۚ فَشٰرِبُوۡنَ عَلَيۡهِ مِنَ الۡحَمِيۡمِ' وہی بات یہاں اختصار کے ساتھ فرما دی ہے۔ 'ضَآلُّوۡنَ' اور 'مُكَذِّبُوۡنَ' میں جو فرق ہے اس کی وضاحت ہم اوپر کر چکے ہیں۔

'فَنُزُلٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ ۙ وَّتَصۡلِيَةُ جَحِيۡمٍ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان لوگوں کی اولین ضیافت تو کھولتے پانی سے ہوگی۔ اس کے بعد ان کو جہنم کے اصل عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔

إِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ۞ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (۹۵-۹۶)

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تلقینِ صبر و استقامت اور پیامِ تسلی ہے کہ جو باتیں اوپر بیان ہوئیں سب یقینی حقائق ہیں۔ ان میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر تمہاری قوم کے لوگ نہیں مان رہے ہیں تو تم ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور اپنے ربِّ عظیم کی تسبیح کرو۔ اس تسبیح کے موقع و محل اور اس کے مفہوم پر آیت ۷۴ کے تحت ہم بحث کر چکے ہیں۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى اِحْسَانِهٖ۔

رحمان آباد

۲۴۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء

۱۱۔ ذوالقعدہ ۱۳۹۷ھ

تدبرِ قرآن

۵۷

الحدید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ــــــ الواقعۃ ــــــ کی مثنیٰ ہے۔ اگرچہ دونوں میں مکی اور مدنی ہونے کے اعتبار سے فی الجملہ زمانی اور مکانی بُعد ہے لیکن معنوی اعتبار سے دونوں میں غایت درجہ ربط و اتصال ہے۔ سابق سورہ میں یہ اصولی حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ جزا و سزا کا دن لازماً آکے رہے گا اور اس دن لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک گروہ سابقون اوّلون کا ہوگا، دوسرا اصحاب یمین کا، تیسرا اصحاب شمال کا۔

اس سورہ میں خاص طور پر مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان کو سابقین اوّلین کی صف میں اپنی جگہ پیدا کرنے پر ابھارا ہے اور اس کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے پہلے جو لوگ جہاد و انفاق کریں گے وہ سابقین کے زمرے میں شامل ہوں گے اور ان کا مرتبہ ان لوگوں سے اونچا ہوگا جو فتح مکہ کے بعد جہاد و انفاق کی سعادت حاصل کریں گے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ دونوں ہی سے اچھا ہے تاہم تقرب الٰہی کے اعتبار سے دونوں میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اسی ضمن میں ان مسلمانوں کو جہاد و انفاق پر ابھارا ہے جو اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن ایمان کے مقتضیات سے اچھی طرح آشنا نہ ہونے کے سبب سے، اس کے مطالبات پورے کرنے کے معاملے میں کمزور تھے۔ ان کو تنبیہ فرمائی ہے کہ اگر دنیا کی محبت میں پھنس کر تم نے آخرت کی ابدی بادشاہی حاصل کرنے کا حوصلہ کھو دیا تو یاد رکھو کہ بالآخر یہود کی طرح تمہارے دل بھی سخت ہو جائیں گے اور تمہارا انجام وہی ہوگا جو ان کا ہوا۔

اس معنوی ربط کے ساتھ ساتھ دونوں سورتوں میں ظاہری ربط بھی نہایت واضح ہے۔ سابق سورہ کا خاتمہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ کے الفاظ پر ہوا ہے اور اس کا آغاز سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ... الآیۃ کے الفاظ سے ہوا ہے۔ گویا اس کی آخری اور اس کی پہلی آیت نے ایک حلقۂ اتصال کی شکل اختیار کر کے دونوں کو نہایت خوبصورتی سے باہم دگر مربوط کر دیا ہے۔ اس قسم کے ربط کی نہایت خوبصورت مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور یہ قرآن کے ایک منظم و مربوط کتاب ہونے کا ایک واضح قرینہ ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۶) سورہ کی تمہید جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات عزت، حکمت، قدرت، علم، خلق اور تدبیر کی طرف ایک جامع اشارہ ہے جس سے مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جو ان صفات سے متصف ہے وہی آخرت میں سب کا مرجع و مولیٰ بھی ہوگا اس وجہ سے وہی حمد و تسبیح کا سزاوار ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اسی کی تسبیح کر رہی ہے اور اپنے عمل سے انسانوں کو بھی دعوت دیتی ہے کہ وہ بھی اسی کی بندگی کریں اور اس بندگی میں کسی اور کو اس کا شریک نہ بنائیں۔

(۷-۱۰) مسلمانوں کو عموماً اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو خصوصاً یہ تنبیہ کہ رسول سے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا جو عہد انھوں نے کیا ہے اس کے تقاضے عزم و ہمت سے پورے کریں۔ آج اللہ کا رسول جہاد و انفاق کی جو دعوت دے رہا ہے اس پر لبیک کہنا ایمان کا بدیہی تقاضا ہے۔ یہی چیز لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے گی۔ جو لوگ آج انفاق و جہاد کریں گے ان کا مرتبہ ان لوگوں سے اونچا ہوگا جو اس وقت جہاد و انفاق کریں گے جب مکہ فتح ہو جائے گا۔ اگرچہ ان سے بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ اچھا ہی ہوگا۔

(۱۱-۱۵) اللہ کی راہ میں انفاق قیامت کے دن ان لوگوں کے لیے روشنی بنے گا جو اخلاص کے ساتھ انفاق کریں گے۔ اس روشنی سے وہ لوگ محروم رہیں گے جو نفاق کے سبب سے انفاق سے جی چراتے رہے۔ اس طرح کے لوگ ایمان والوں سے درخواست کریں گے کہ ذرا ہمیں بھی اپنی روشنی سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیجیے لیکن ان کو جواب ملے گا کہ اس روشنی کو حاصل کرنے کا وقت پیچھے تھا جو تم نے کھو دیا۔ اب یہ چیز تمھیں نصیب ہونے والی نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کے اور اہل ایمان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس کے ایک طرف اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوگی اور دوسری جانب اس کا عذاب بھڑک رہا ہوگا۔

(۱۶-۱۷) منافقین کو تہدید کہ اگر غلبۂ حق کی اتنی واضح نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی تمھاری آنکھیں نہ کھلیں تم اسی طرح تردد و تذبذب میں مبتلا اور خدا کی راہ میں انفاق سے جی چراتے رہے تو یاد رکھو کہ تمھارے دل بھی اسی طرح سخت ہو جائیں گے جس طرح یہود کے دل سخت ہو گئے اور پھر تمھارا انجام بھی وہی ہوگا جو ان کا ہوا۔ یاد رکھو کہ آخرت لازمی ہے۔ نہ اس کی جزا سے مایوس ہونا جائز ہے نہ اس کی سزا سے بے خوف ہونا۔

(۱۸-۱۹) جو لوگ اللہ کی راہ میں انفاق اور جہاد کرتے ہیں وہ اطمینان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو ضائع کرنے والا نہیں ہے بلکہ ان کی ہر قربانی کا صلہ ان کو مضاعف ہو کر ملے گا۔ یہی انفاق و جہاد ذریعہ ہے اس مرتبہ تک پہنچنے کا جو صدیقین و شہداء کے لیے خاص ہے اور اسی کے صلہ میں وہ روشنی ملے گی جس

سے منافقین محروم رکھے جائیں گے۔

(۲۰-۲۱) ان لوگوں کی پست حوصلگی اور تنگ دامنی پر اظہارِ افسوس جو اس دنیا کی چند روزہ لذّتوں پر فریفتہ ہو کر اپنے رب کی مغفرت اور اس وسیع جنت کو بھول بیٹھے جس کی وسعت، زمین و آسمان کی وسعت کے مانند ہو گی۔

(۲۲-۲۴) اس حقیقت کی یاد دہانی کہ فقر و غنا کا تعلق انسان کی اپنی سعی و تدبیر سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تقدیر سے ہے۔ انسان کے لیے صحیح رویّہ یہ ہے کہ وہ سختی و نرمی دونوں حالتوں میں اپنے رب سے راضی و مطمئن رہے۔ اگر اس کو اللہ نے مال دے رکھا ہے تو وہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھے کہ اللہ کے اختیار میں جس طرح بخشنا ہے اسی طرح چھین لینا بھی ہے۔

(۲۵-۲۷) ان لوگوں کے زعم کی تردید جو مذہب کے رہبانی تصوّر کے تحت جہاد بالسیف اور اس راہ میں انفاق کو دنیاداری سمجھتے اور مسلمانوں کے شوقِ جہاد پر طعن کر رہے تھے۔ نبیوں اور رسولوں کی تاریخ کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ جہاد انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور رہبانیت نصاریٰ کی ایجاد کردہ بدعت ہے جو انھوں نے اپنے دین میں غلو کی راہ سے پیدا کی ہے، حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۲۸-۲۹) مسلمانوں کو یہ تلقین کہ تم اللہ کے رسول کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے سرفروشانہ جہاد کے لیے اٹھو اور اس راہ میں پوری فیاضی سے اپنے مال خرچ کرو۔ اہل کتاب میں سے جو مفسدین تمھارے دلوں میں یہ وسوسہ اندازی کر رہے ہیں کہ جہاد ایک دنیادارانہ کام ہے ان کی وسوسہ اندازیوں کو نظر انداز کرو۔ قیامِ عدل کے لیے جہاد ابتداء سے انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور تم کو انہی کی سنت کی پیروی کی دعوت دی گئی ہے۔ نصاریٰ نے جو رہبانیت ایجاد کی ہے اس کو حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ حسد کا بخار ہے جو تمھارے خلاف نکال رہے ہیں لیکن ان کے حسد کے علی الرغم اللہ تعالیٰ تمھیں وہ مقام دے کر رہے گا جو اس نے تمھارے لیے مقدر کر رکھا ہے۔

سُوْرَةُ الْحَدِیْدِ (۵۷)

مَدَنِیَّةٌ ——— آیات: ۲۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱-۶ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱﴾
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰی
كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲﴾ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ
وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۳﴾ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ یَعْلَمُ
مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ
السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۴﴾ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ
اِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۵﴾ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ
النَّهَارَ فِی الَّیْلِ ؕ وَهُوَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۶﴾

ترجمۂ آیات ۱-۶ اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں ساری چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ غالب و
حکیم ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ وہی زندہ کرتا اور وہی مارتا
ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی اوّل بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی اور

باطن بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۱-۳

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا چھ دنوں میں پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ وہ جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی اور جو اس میں چڑھتی ہے اور وہ تمھارے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ سب کو دیکھتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام امور کا مرجع اللہ ہی ہے۔ ۴-۵

وہی داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور وہ سینوں کے بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔ ۶

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱)

تسبیح کی حقیقت اور اس کے مختلف پہلو

لفظ 'تسبیح' کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس کے اندر تنزیہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور بندگی و عبادت کا بھی۔ یہ چیز قول سے بھی ہوتی ہے اور عمل سے بھی۔ زبان سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا بھی تسبیح ہے اور نماز پڑھنا اور اس کے حضور میں قیام، رکوع اور سجود بھی تسبیح ہے۔ اس کی شکلیں مختلف ہیں۔ کائنات کی ہر چیز کسی نہ کسی صورت میں اپنے رب کی تسبیح کرتی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن میں یہ حقیقت بھی واضح فرمائی گئی ہے کہ جو انسان طوعاً تسبیح نہیں کرتے ہیں انھیں تکوینی دائرے میں کرھاً یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر لوگوں سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اختیار اور دائرۂ تکوین میں بے ربطی نہ پیدا کریں۔ اس نکتہ کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔

کائنات کی تمام چیزوں کی تسبیح کا حوالہ قرآن میں جہاں جہاں دیا گیا ہے وہ بالعموم تین مقاصد کو سامنے رکھ کر دیا گیا ہے۔

ایک یہ کہ لوگوں کو اس حق کی یاد دہانی کی جائے کہ جب اس کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز اپنے خالق و مالک کا حق پہچانتی اور اس کی تسبیح کرتی ہے تو انسان پر بدرجۂ اولیٰ یہ حق عائد ہوتا ہے

کہ وہ اپنے رب کی تسبیح کرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ بخشا اور اپنی خلافت کی خلعت سے نوازا ہے۔

دوسرا یہ کہ اس فرض کو ادا کرنے کے لیے اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ دنیا میں ناسپاسوں کی کثرت دیکھ کر بددل اور پست حوصلہ نہ ہوں۔ اگر انسانوں میں اپنے رب کا حق پہچاننے والے تھوڑے ہیں تو یہ چیز دل برداشتہ ہونے کی نہیں ہے۔ باقی ساری کائنات کی ہر چیز اپنے رب کی تسبیح و تقدیس میں سرگرم ہے۔ اس راہ کا مسافر تنہا نہیں ہے بلکہ قافلوں سے بھری ہوئی راہ یہی ہے۔

تیسرا یہ کہ ان لوگوں سے اظہار بے نیازی کیا جائے جو یاددہانی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی بندگی سے گریز کر رہے ہیں اور ان کو بتایا جائے کہ اگر وہ خدا کی تسبیح نہیں کرتے ہیں تو خدا ان کی تسبیح کا محتاج نہیں ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اس کی تسبیح کر رہی ہے، اگر کچھ بدقسمت انسان اس سے گریز کر رہے ہیں تو وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں بلکہ اپنا ہی بگاڑ رہے ہیں۔

قرآن میں بعض جگہ یہ تینوں مطالب پیش نظر ہیں، بعض جگہ ان میں سے ایک یا دو مدنظر ہیں۔ ان میں امتیاز کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے اگر سررشتۂ نظم پر نگاہ جمی رہے تو غور کرنے والا آسانی سے امتیاز کر لیتا ہے۔

صفات عزیز و حکیم کے تقاضے

'وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ' یعنی اللہ تعالیٰ چونکہ 'عزیز' اور ساتھ ہی 'حکیم' ہے اس وجہ سے وہی حق دار ہے کہ سب اسی کی تسبیح و بندگی کریں۔ 'عزیز' یعنی ہر چیز پر غالب، ہر اختیار کا مالک، کوئی نہیں جو اس کی دسترس سے باہر ہو، کوئی نہیں جو اس کو دبا سکے یا اپنے زور سے اس پر اثر انداز ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اس کا ہر فعل حکمت، عدل اور رحمت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے زور میں جو چاہے کر ڈالے خواہ اس میں کوئی حکمت و غایت ہو یا نہ ہو۔ یہ کائنات اس کی قدرت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے اور یہ اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ اس کو وجود میں لانے والا ہر چیز پر غالب ہے اور اس کے ہر کام میں اتھاہ حکمت پوشیدہ ہے۔ اس کی یہ حکمت مقتضی ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ان لوگوں کو صلہ عطا فرمائے جنھوں نے اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر زندگی گزاری اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کے حدود سے تجاوز کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو یہ اس کی عزت و قدرت کے منافی ہے اور اگر کر سکنے کے باوصف نہ کرے تو یہ اس کی حکمت اور اس کے عدل و رحمت کے منافی ہے۔ اس کے بغیر یہ دنیا بازیچۂ اطفال اور ایک اندھیر نگری بن کے رہ جاتی ہے اور ایک عزیز و حکیم کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ اتنا بڑا کارخانہ محض کھیل تماشے کے طور پر بنا ڈالے۔

لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲)

مزید صفات کا حوالہ

یعنی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے ہاتھ میں ہے، کوئی دوسرا اس کے اقتدار میں ساجھی نہیں ہے کہ کسی قسم کی مداخلت کر سکے۔ 'یُحْیٖ وَیُمِیْتُ' وہی زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے۔ یعنی جب زندگی اس کی بخشی ہوئی ہے اور موت بھی اسی کے حکم سے واقع ہوتی ہے تو اس کی بادشاہی میں کسی اور کی حصہ داری کی گنجائش کہاں سے نکلی!

'وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ' یعنی کوئی کام اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے کہ وہ کسی معاون و مددگار کا محتاج ہو۔ اپنی مملکت کے ایک ایک چپہ پر وہ خود قابض و متصرف ہے اور جو چاہے براہ راست اپنے کلمۂ کُن سے کر سکتا ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۳)

احاطۂ قدرت کے بعد یہ اس کے احاطۂ علم کا بیان ہے کہ وہی اوّل ہے اور وہی آخر ہے۔ جب کچھ نہیں تھا وہ تھا اور جب کچھ نہیں ہو گا تب بھی وہ ہو گا۔ اسی نے ہر چیز کا آغاز کیا ہے اور بالآخر ہر چیز کی وراثت اسی کو لوٹنے والی ہے۔

'وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ' کی تفسیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی ہے: 'انت الظاهر فليس فوقك شئ وانت الباطن فليس دونك شئ' (تو ظاہر ہے پس کوئی چیز تجھ سے اوپر نہیں اور تو باطن ہے پس کوئی چیز تجھ سے اوجھل نہیں) آیت ۳ میں یہ الفاظ بالکل اسی معنی میں استعمال ہوئے ہیں جس معنی میں ہم اندر باہر کے الفاظ بولتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کا علم اندر و باہر ہر چیز کو محیط ہے۔

'وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ' یہ ایک کلیہ کی شکل میں خلاصہ سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ اس کے لیے ظاہر و باطن سب یکساں ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۚ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۴)

یہ اس احاطۂ علم و قدرت کی مزید تفصیل ہے کہ اللہ ہی نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے اور ان کو پیدا کر کے ان کا انتظام دوسروں کے سر ڈال کر وہ کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے بلکہ وہ بذاتِ خود عرشِ حکومت پر متمکن ہو کر سارے انتظام کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ 'عرش' تعبیر ہے زمامِ اقتدار اور حکومت کی۔ 'فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ' کی وضاحت ہم دوسرے مقامات میں کر چکے ہیں کہ اس سے مراد ہمارے ایام نہیں بلکہ خدائی ایام ہیں۔

قرآن میں جہاں کہیں آسمانوں اور زمین کے چھ دنوں میں پیدا کیے جانے کا ذکر آیا ہے اس سے

مقصود اس اہتمامِ خاص کی طرف ہم کو متوجہ کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے پیدا کرنے میں ملحوظ رکھا ہے۔ اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے اس اہتمام سے پیدا کی ہے کس طرح ممکن ہے کہ اس کو پیدا کر کے وہ اس سے بالکل بے تعلق ہو کے بیٹھ رہے؟ نہ اس کے خیر سے اسے کوئی دلچسپی رہے، نہ اس کے شر سے اسے کوئی تعلق، لوگ جو دھاندلی چاہیں اس میں مچاتے پھریں اور وہ خاموش تماشائی کی طرح تماشا دیکھتا رہے! اگر وہ ایسا کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے یہ ساری کائنات محض ایک کھیل کے طور پر بنائی ہے جس میں اہتمام تو اس نے بہت صرف کیا مگر اس کا مقصد کچھ بھی نہیں۔

'یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ۭ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ'۔ یہ وضاحت ہے اس بات کی کہ وہ نہایت بیدار مغزی اور جُزرسی کے ساتھ اپنی مملکت کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ فرمایا کہ زمین میں جو چیز داخل ہوتی ہے وہ اس کو بھی جانتا ہے اور جو چیز نکلتی ہے اس کو بھی جانتا ہے۔ اسی طرح جو چیز آسمان سے اترتی ہے وہ بھی اس کے علم میں ہوتی ہے اور جو چیز اس میں چڑھتی ہے اس سے بھی وہ باخبر ہوتا ہے۔ نیز تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہوتا ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اس کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۵)

یعنی اللہ تعالیٰ صرف ہر چیز سے واقف ہی نہیں ہے بلکہ عملاً تمام امور کا مرجع و ماویٰ بھی وہی ہے۔ سارے امور اسی کے حکم سے جاری ہوتے ہیں اور پھر ان سب کی رپورٹ اسی کے آگے پیش ہوتی ہے۔ اس کے کارندے جملہ ہدایات کے لیے اسی سے رجوع کرتے اور اپنی کارگزاریاں اسی کے حضور میں پیش کرتے ہیں۔ نہ کوئی اپنی صوابدید پر کچھ کرنے کا مجاز ہے اور نہ کوئی اس کے آگے مسئولیت سے بری ہے۔

یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ ۭ وَهُوَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۶)

یعنی یہ رات اور دن کا چکر جو چل رہا ہے نہ اپنے آپ چل رہا ہے اور نہ کوئی اور اس کو چلا رہا ہے بلکہ یہ اللہ ہی ہے جو اس کو چلا رہا ہے۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور نکالتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے تعاقب میں برابر سرگرم تگاپو ہیں۔

'وَهُوَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ' یعنی جب دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں کا لانے والا وہی ہے، وہی دن کی روشنی نمودار کر کے رات کی عالم گیر تاریکی کو کافور اور اس کی ڈھانکی ہوئی ہر چیز کو بے نقاب کرتا ہے تو اس سے کوئی چیز کس طرح مخفی رہ سکتی ہے۔ وہ ہر مخفی سے مخفی راز یہاں تک کہ سینوں کے بھیدوں سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔

۲۔ آگے آیات ۷-۱۵ کا مضمون

آگے ان مسلمانوں کو مخاطب فرمایا ہے جو کلمہ پڑھ کر اور 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا اقرار کر کے مسلمانوں کے زمرے میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن جب انفاق و جہاد کا مرحلہ سامنے آیا تو وہ ایمان کے تقاضے پورے کرنے میں بودے ثابت ہوئے۔ اس طرح کے کمزور مسلمانوں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے آئینہ میں اپنے کردار کا جائزہ لیں اور جس ایمان کا انھوں نے اظہار کیا ہے اس کے مطالبے پورے کریں۔ آج اگر وہ چاہیں تو رسول کی دعوتِ انفاق و جہاد پر لبیک کہہ کے اپنا مقام سابقینِ اسلام کی صف میں محفوظ کر سکتے ہیں ورنہ یاد رکھیں کہ ان کا حشر منافقین کے ساتھ ہو گا اور جو فرصت آج وہ کھو دیں گے اس کے پا سکنے کا پھر کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔

آیات ۷-۱۵ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ
فِيْهِ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ (۷) وَمَا
لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ
وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸) هُوَ الَّذِيْ
يُنَزِّلُ عَلٰي عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۹) وَمَا لَكُمْ اَلَّا
تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ
لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ
اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۭ وَ
ع ۱ ۱۷ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۱۰) مَنْ
ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ
اَجْرٌ كَرِيْمٌ (۱۱) يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى

نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ
الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا
انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ
فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ
فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ يُنَادُوْنَهُمْ
اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ
وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ
اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ
فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۭ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

ترجمۂ آیات ۷ - ۱۵

ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو اس مال میں سے جس میں اس نے تم کو امین بنایا ہے۔ پس جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور خرچ کریں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ اور تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لا رہے ہو درآنحالیکہ رسول تم کو تمھارے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور وہ تم سے مضبوط عہد لے چکا ہے اگر تم مومن ہو! ۷ - ۸

وہی ہے جو اتار رہا ہے اپنے بندے پر واضح آیات تاکہ تمھیں نکالے تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور بے شک اللہ تمھارے حال پر نہایت ہی شفیق اور مہربان

ہے۔ اور تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو حالانکہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کو لوٹنے والی ہے! تم میں سے جو لوگ فتح مکہ سے پہلے انفاق و جہاد کریں گے اور جو بعد میں انفاق و جہاد کریں گے یکساں نہیں ہوں گے۔ ان لوگوں کا درجہ ان سے بڑا ہوگا جو بعد میں انفاق اور جہاد کریں گے۔ اگرچہ اللہ کا وعدہ ان میں سے ہر ایک سے اچھا ہی ہے۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۹-۱۰

کون اٹھتا ہے کہ اللہ کو قرض دے اچھا قرض کہ وہ اس کو اس کے لیے بڑھائے اور اس کے لیے باعزت صلہ ہے! اس دن کو یاد رکھو جس دن ایمان والوں اور ایمان والیوں کو دیکھو گے کہ ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کے داہنے چل رہی ہوگی ——— تمھارے لیے آج کے دن خوش خبری ہے باغوں کی جن میں نہریں جاری ہوں گی ان میں ہمیشہ رہو گے! یہی دراصل بڑی کامیابی ہے! جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں کو آواز دیں گے کہ ذرا ہمیں بھی موقع عنایت کیجیے کہ ہم آپ کی روشنی سے فائدہ اٹھا لیں! ان کو جواب ملے گا کہ تم پیچھے لوٹو اور وہاں روشنی تلاش کرو۔ پس ان کے اور اہلِ ایمان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اس کے اندر کی جانب میں رحمت ہوگی اور اس کے باہر کی طرف عذاب ہوگا۔ یہ ان سے فریاد کریں گے کہ کیا ہم آپ لوگوں کے ساتھ نہیں تھے ؟ وہ جواب دیں گے کہ ساتھ تو تھے لیکن تم نے اپنے کو فتنوں میں مبتلا رکھا، ہمارے لیے گردشوں کے انتظار میں رہے، شبہات میں مبتلا رہے اور آرزوؤں نے تمھیں دھوکے

میں رکھا یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو گیا اور فریب دینے والے نے تمھیں اللہ کے باب میں مبتلائے فریب ہی رکھا۔ پس آج نہ تو تم سے کوئی فدیہ قبول ہو گا اور نہ ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا۔ تم سب کا ٹھکانا آگ ہے۔ وہی تمھارا مرجع ہے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے!! ۱۱ - ۱۵

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَاَنْفَقُوْا لَھُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ (۷)

عام خطاب سے منافقین کو تنبیہ

'اٰمِنُوْا' کا خطاب اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن آگے قرائن سے واضح ہو جائے گا کہ روئے سخن درحقیقت خام قسم کے مسلمانوں اور منافقین کی طرف ہے جو اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ تو کر بیٹھے لیکن جب اس ایمان کے مطالبے، انفاق اور جہاد کی صورت میں، سامنے آئے تو ان سے کترانے اور منہ چھپانے لگے۔ اس طرح کے مدعیانِ ایمان سے خطاب کر کے فرمایا کہ اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ۔ ظاہر ہے کہ یہاں فعل 'اٰمِنُوْا' اپنے حقیقی اور کامل معنی میں ہے جس طرح یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا (اے وہ لوگو جو ایمان کے مدعی ہو سچا اور پکا ایمان لاؤ) میں ہے۔ فعل کے اپنے ابتدائی معنی اور اپنے کامل معنی میں استعمال کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

ایمان کا لازمی تقاضا

'وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ' یہ اس ایمان کا لازمی تقاضا بھی بیان ہوا ہے اور اس کی نہایت واضح عقلی اور فطری دلیل بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان کا حق صرف 'اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ' کے اقرار و اظہار سے نہیں ادا ہو جاتا بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جب اللہ کی راہ میں مال و جان کی قربانی کی دعوت دی جائے تو اس پر لبیک کہو۔ جو لوگ مال بھی خرچ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے ان سے جان کی قربانی کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے! اور جو نہ مال قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں نہ جان، ان کے دعوائے ایمان کی کیا وقعت ہے۔

مال اللہ تعالیٰ کی امانت ہے

'مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ' یعنی اس مال کے متعلق تمھیں یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ تم نہ تو اس کے خالق ہو نہ مالک بلکہ اللہ تعالیٰ ہی نے تمھیں اس میں خلیفہ بنایا ہے کہ تم اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر اس میں تصرف کرو اور اس کے حضور میں اس کی پائی پائی کی جواب دہی

کے بنے بیٹھے ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تم اس مال کے خالق و مالک نہیں بلکہ صرف اس کے امین ہو تو جب اس مال کے خرچ کرنے کا مطالبہ اسی کی طرف سے ہو رہا ہے جس نے تم کو اس کا امین بنایا ہے تو اس میں بخالت کرنے کے کیا معنی؟

انفاق ایمان کی تصدیق ہے۔ 'فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ'۔ یہاں 'اٰمَنُوْا' کے بعد 'اَنْفَقُوْا' ایمان کی تصدیق اور شہادت کے طور پر آیا ہے۔ یعنی جو لوگ ایمان کا اظہار کرنے کے بعد اپنے 'انفاق' سے اپنے اس اقرار کی تصدیق کر دیں گے وہ مطمئن رہیں کہ ان کا یہ سودا خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ اللہ کے ہاں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ وہ ایک کا دس پائیں گے تو ایسے نفع بخش کاروبار میں سرمایہ لگانے سے وہ کیوں گھبرائیں۔

یہاں وہ بات یاد رہے جس کی طرف اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ سورہ کی تمہید میں جو صفاتِ الٰہی بیان ہوئی ہیں وہ بمنزلہ ایک آئینہ کے ہیں تاکہ اس کو سامنے رکھ کر وہ لوگ اپنے اخلاق و کردار کو سنواریں جنھوں نے ایمان کا دعویٰ کیا ہے۔ اوپر ارشاد ہوا ہے کہ اللہ ہی اوّل و آخر ہے اور ساری چیزیں اسی کی طرف لوٹنے والی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اصل حقیقت یہ ہے تو اس دنیا میں انسان کو جو کچھ بھی حاصل ہوا ہے وہ اس کا مالک نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا امین ہے تو جب اصل مالک اللہ ہے تو اس کا مال اسی سے دریغ رکھنے کے کیا معنی!

وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۸)

یہ اس طرح کے کمزور مسلمانوں کے لیے نصیحت باندازِ ملامت ہے کہ جب تم رسول سے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا عہد کر چکے ہو تو اس عہد کا تقاضا تو یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم اترے اور رسول جس بات کی دعوت دیں اس پر 'اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا' کہتے ہوئے عمل کرو لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ رسول، اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت دے رہا ہے اور تم منہ چھپاتے پھر رہے ہو! تو یہ کس قسم کا عہد اور کس نوع کا ایمان ہے! اور جب آج تمہارے ایمان اور عہد کا یہ حال ہے جب کہ رسول تمہارے اندر موجود ہے اور بذاتِ خود تمھیں ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی دعوت دے رہا ہے تو کل تمہارا کیا حال ہوگا جب رسول تمہارے درمیان موجود نہیں ہوگا۔

اس آیت سے دو باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ آدمی ہر اس چیز پر ایمان لائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی اور رسول نے جس کی دعوت دی۔ ان میں سے کسی ایک چیز کا انکار بھی سب کے انکار کے ہم معنی ہے۔

دوسری یہ کہ ایمان عمل ہی سے متشکل اور وجود پذیر ہوتا ہے اور انفاق کو اس کے نشو و نما اور اس کے تغذیہ و تقویت میں خاص دخل ہے چنانچہ اسی بنا پر یہاں انفاق کی دعوت کو ایمان کی دعوت سے تعبیر فرمایا ہے۔

میثاق سے سمع و طاعت کا عہد مراد ہے

'میثاق' سے مراد میرے نزدیک یہاں سمع و طاعت کا وہ عہد ہے جو ہر مسلمان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کے وقت کرنا پڑتا۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان اس عہد کی طرف معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۸۰ میں ہے۔ میں نے اس پر غور کیا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ دوسرے سیاق و سباق کی بات ہے، یہاں اس کا محل نہیں ہے۔ میرے خیال کی تائید سورۂ مائدہ کی آیت ۷ سے بھی ہوتی ہے: 'وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙاِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' (پس اپنے اوپر اللہ کے فضل اور میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا اور تم نے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کہہ کر اس کا اقرار کیا)۔

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۹)

انفاق، تاریکی سے روشنی میں لاتا ہے

یعنی رسول تمھیں انفاق کی جو دعوت دے رہے ہیں اس کو گراں اور اپنے لیے نقصان رساں سمجھ کر اس سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر یہ روشن آیتیں اس لیے نازل فرما رہا ہے کہ تمھیں خواہشاتِ نفس اور حُبِّ دنیا کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان اور حُبِّ آخرت کی روشنی میں لائے۔ یہ نہ گمان کرو کہ اللہ تعالیٰ تمھیں نقصانات اور مشقتوں میں ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ رؤف رحیم ہے۔ وہ تمھاری دنیا اور آخرت دونوں کی بہبود کی راہ کھول رہا ہے نہ کہ تمھیں کسی زحمت و مشقت میں ڈال رہا ہے۔

'اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ' سے مراد یوں تو وہ ساری ہی تعلیمات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے لوگوں کو مل رہی تھیں لیکن یہاں خاص طور پر ان آیات کی طرف اشارہ ہے جو انفاق و جہاد سے متعلق ہیں اور جن کا ایک حصہ آگے اس سورہ میں بھی نہایت روشن دلائل کے ساتھ آ رہا ہے۔

'ظُلُمٰت' سے مراد شہواتِ نفس اور حُبِّ دنیا کی تاریکیاں ہیں جن کا واحد علاج اللہ کی راہ میں انفاق ہے اور 'نُوْر' سے وہ نور مراد ہے جو انفاق سے پیدا ہوتا ہے اور جس کا ذکر آگے آیت ۱۲ میں آ رہا ہے۔

'رَءُوْفٌ' اور 'رَّحِيْمٌ' کی وضاحت ان کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ پہلے میں دفعِ شر کا پہلو غالب ہے، دوسرے میں اثباتِ خیر کا۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ

وَقٰتَلُوۡا ؕ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الۡحُسۡنٰی ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ (۱۰)

ترغیبِ انفاق کی دو دلیلیں

یہ انہی کمزور قسم کے مسلمانوں کو انفاق پر ابھارا ہے اور اس مقصد کے لیے دو دلیلیں انفاق کے محرک کے طور پر بیان فرمائی ہیں۔ ایک وہی جس کی طرف اوپر آیت ۵ کے تحت اشارہ گزر چکا ہے کہ آسمان و زمین کی تمام چیزوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس دنیا میں انسان کو جن چیزوں پر بھی تصرف حاصل ہوتا ہے وہ بالکل عارضی طور پر، اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور امین کی حیثیت سے، حاصل ہوتا ہے۔ بالآخر ہر چیز اللہ ہی کی طرف لوٹ جانے والی ہے تو جب انسان کی حیثیت چند روزہ امین کی ہوئی تو امانت کے مال پر مارِ گنج بن کر بیٹھ جانے کے کیا معنی! پھر تو اس کے لیے صحیح رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ بخل کرے تو کرے لیکن جس نے اس کی تحویل میں اپنی امانت رکھی ہے اس کو، جب وہ طلب کرے، پوری فیاضی کے ساتھ دے۔

دوسرا یہ کہ حالات کے تغیر سے اعمال کی قدر و قیمت میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ آج جب کہ کفر اور اہلِ کفر کا مکہ پر غلبہ ہے (واضح رہے کہ یہ سورۂ فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے) اور قریش کی ہیبت بدستور عرب پر قائم ہے جو لوگ اسلام کو غالب کرنے کے لیے اپنے مال خرچ کریں گے اور جنگ میں حصہ لیں گے ان لوگوں کا درجہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان سے کہیں زیادہ بلند ہوگا جو فتح مکہ کے بعد، جب کہ قریش کا زور ٹوٹ جائے گا، انفاق اور جہاد کریں گے۔ بڑے ہی خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو آج کے کٹھن حالات میں اسلام کی خدمت کی توفیق پائیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمھیں یہ موقع حاصل ہوا ہے تو اس کو اپنی پست حوصلگی سے ضائع نہ کرو بلکہ ہمت کر کے اسلام کے سابقین اولین اور اللہ تعالیٰ کے مقربین میں اپنی اپنی جگہ محفوظ کرنے کی کوشش کرو۔

سورۂ واقعہ میں یہ حقیقت واضح کی جا چکی ہے کہ سابقین و مقربین کے زمرے میں زیادہ تعداد انہی لوگوں کی ہوگی جنھوں نے اسلام کی غربتِ اولیٰ کے دور میں اولوالعزمی کے ساتھ اس کی خدمت کی توفیق پائی۔ بعد کے ادوار کے لوگوں میں سے تھوڑے ہی لوگوں کو ان کے زمرے میں جگہ ملے گی اور یہ وہ لوگ ہوں گے جن کو بڑے سخت امتحانوں سے گزرنا پڑا ہو اور انھوں نے دین کی راہ میں کوئی بہت بڑی بازی کھیلی ہو۔

'وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الۡحُسۡنٰی ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ' یعنی وعدہ تو اللہ کا دونوں ہی سے اچھا ہے۔ فتح مکہ کے بعد بھی اسلام کے لیے قربانیاں کرنے والوں کے لیے ان کی خدمات کے اعتبار سے درجے اور مرتبے ہیں۔ حسنِ نیت اور اخلاص کے ساتھ جو لوگ بھی اسلام کی خدمت کریں گے وہ اپنی قربانیوں کا صلہ پائیں گے بلکہ ان میں سے ایسے لوگ بھی نکلیں گے جو اگلوں کی صف میں جگہ حاصل کر لیں گے تاہم فتح مکہ سے پہلے کا دور اور ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس دور کی قدر پہچانیں اور اس سے صحیح فائدہ اٹھا لیں۔

فتح سے فتح مکہ مراد ہے

یہاں 'فتح' سے مراد ظاہر ہے کہ فتح مکہ ہی ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے صلح حدیبیہ بھی مراد لی ہے لیکن صلح حدیبیہ کی حیثیت اصل فتح کی نہیں بلکہ فتح مکہ کی تمہید کی ہے۔ لفظ 'فتح' سے ذہن فتح مکہ ہی کی طرف جاتا ہے۔ اس جدوجہد کے دوران میں ہر مسلمان کے دل میں یہ بات بطور ایک عقیدہ کے راسخ تھی کہ بعثت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اصل مقصود بیت اللہ کو، کفر و شرک کی تمام آلودگیوں سے پاک کر کے، اس کے اصل ابراہیمی جمال میں خلق کے سامنے نمایاں کرنا ہے۔ چنانچہ ہر سچے مسلمان کو اس واقعہ کے ظہور کا ارمان بھی تھا اور انتظار بھی۔ صرف منافقین اپنے تھڑدلے پن کے سبب سے مذبذب تھے۔ ان کے اس تذبذب کا ذکر آگے ان کے نفاق کی دلیل کی حیثیت سے آ رہا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِیْمٌ (۱۱)

جہاد کے لیے مالی اعانت کی نہایت موثر اپیل

اب یہ نہایت واضح اور موثر الفاظ میں جہاد کے لیے مالی اعانت کی اپیل ہے کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دینے کے لیے اٹھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بڑھائے اور اس کو باعزت اجر عطا فرمائے۔ لفظ 'قرض' سے اگرچہ عام انفاق بھی مراد ہو سکتا ہے لیکن یہاں سیاق و سباق سے واضح ہے کہ اس سے جہاد کے لیے مالی اعانت ہی مراد ہے۔ آگے ہم اس کے بعض قرائن کی طرف ان شاء اللہ اشارہ کریں گے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے لیے قرض کے لفظ میں جو اپیل ہے وہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔ اوپر واضح ہو چکا ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی سپرد کردہ امانت ہے۔ اب یہ کتنا بڑا فضل ہے اس رب کریم کا کہ وہ اپنا ہی عطا کیا ہوا مال اپنی راہ میں خرچ کرنے کی جب بندوں کو دعوت دیتا ہے تو اس کو اپنے ذمہ قرض ٹھہراتا ہے جس کی واپسی کا وہ گویا اسی طرح ذمہ دار ہے جس طرح ایک قرض دار اپنے مہاجن کی رقم کی واپسی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

'فَیُضٰعِفَهٗ'، یعنی اللہ تعالیٰ یہ قرض اس لیے نہیں مانگ رہا ہے کہ اس کے خزانے میں کوئی کمی ہے۔ جب سب کچھ اسی کا پیدا کردہ اور اسی کا عطا کردہ ہے تو اس کے پاس کمی کا کیا سوال! بلکہ وہ تو صرف اس لیے مانگ رہا ہے کہ لوگوں کے عطا کردہ مال کو وہ اپنے بنک میں جمع کر کے اس کو اچھی طرح بڑھائے تاکہ اس کا منافع ایک ابدی زندگی میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سرمایہ کی صورت میں ان کے کام آئے۔ اس اسلوب بیان میں سود خواروں پر جو تعریض ہے وہ اہل ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو اپنا سرمایہ اس دنیا کے بنک میں جمع کرتا ہے تو یہ دنیا اور اس کا سرمایہ، ہر چیز چند روزہ ہے البتہ جو اپنا مال اپنے رب کے پاس جمع کرتے ہیں ان کا منافع ابدی اور ہر اندیشہ سے محفوظ ہے۔

'مُضٰعَفَةً' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے 'دگنا' کرنا کیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے معنی

بڑھانے کے ہیں۔ یہ بڑھانا دگنا، چوگنا، دس گنا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہوسکتا ہے۔ اس کا تعلق دینے والے کے خلوص اور ان حالات سے ہے جن میں وہ مال دیا گیا ہے اور سب سے زیادہ اس ربِّ کریم کے فضل سے ہے جس نے اپنے بندوں کے لیے ابدی منفعت کی یہ راہ کھولی ہے۔

قرضِ حسن کے شرائط

اس کے ساتھ یہاں صرف ایک شرط لگائی ہے کہ یہ قرض 'قرضِ حسن' ہو۔ قرآن میں اس کی وضاحت میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرض، 'قرضِ حسن' اس شکل میں بنتا ہے جب دل کی پوری فراخی اور بلند حوصلگی کے ساتھ دیا جاتا ہے، دل کی تنگی کے ساتھ محض مارے باندھے یا دکھاوے کے لیے نہیں دیا جاتا، اچھے مال میں سے دیا جاتا ہے، محض چھیدا اتارنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محض اللہ کی خوشنودی کے لیے دیا جاتا ہے، کسی غرض دنیوی کے لیے نہ دیا جاتا ہے اور نہ دینے کے بعد اس کے دیے جانے پر احسان جتایا جاتا یا کسی پہلو سے کوئی دل آزاری کی جاتی ہے۔

'وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ'۔ یعنی اس کے دیے ہوئے مال میں جو بڑھوتری ہوگی وہ تو ہوگی ہی، علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ خاص اپنے فضل سے بھی اس کو نہایت باعزت اجر دے گا۔ اس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۲)

انفاق قیامت کے دن روشنی بنے گا

یہ اسی باعزت صلہ کے ایک خاص پہلو کی وضاحت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں خرچ کرنے والوں کی رہنمائی جنت کی طرف روزِ حشر اس طرح کرے گا کہ ان کی روشنی ان کے آگے اور دہنے چل رہی ہوگی اور وہ اس روشنی میں جنت کی طرف بڑھیں گے جب کہ دوسرے لوگ جنھوں نے یہ روشنی اپنے اندر نہیں پیدا کی ہوگی تاریکی میں گھرے ہوئے ہوں گے۔

آیات کے سیاق و سباق پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ روشنی اسی انفاق کے فیض سے حاصل ہوگی جس کی یہاں دعوت دی جا رہی ہے۔ اوپر آیت ۹ 'هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰي عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ' کے تحت ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ 'اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ' سے اشارہ یہاں خاص طور پر ان آیات کی طرف ہے جو انفاق کی عظمت و اہمیت واضح کرنے کے لیے نازل ہوئیں اسی انفاق سے نفاق کی جڑ کٹتی ہے اور اسی سے وہ نورِ حکمت عطا ہوتا ہے جو اس دنیا کی تاریکیوں میں بھی انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور آخرت میں بھی یہ رہنمائی کرے گا۔

'سعی' یہاں دوڑنے کے مفہوم میں نہیں ہے۔ یہ لفظ کسی کام کے سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ ہونے یا اس کو مستعدی کے ساتھ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے بلکہ اس کا غالب استعمال اس معنی میں ہے۔ یہاں

یہ اسی مفہوم میں ہے۔ یہ نور صرف ان کے آگے اور ان کے داہنے پھیلے گا، بائیں جانب اس کا عکس نہیں پڑے گا تاکہ اصحاب الشمال اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ آگے ان کی اس نور سے محرومی کا ذکر آ رہا ہے۔

بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ یہ بشارت صورتِ حال کی تعبیر بھی ہو سکتی ہے اور فرشتوں کی زبانی بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن میں نظائر دونوں کی تائید میں موجود ہیں۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ یعنی اگر کسی کو اللہ نے مال بخشا ہے تو اس سے وہ سب سے بڑا فائدہ جو حاصل کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اپنے دل کے اندر وہ روشنی پیدا کرے جو قیامت کے اندھیرے میں اس کی رہنمائی کرے۔ اس کے سوا جتنے فائدے بھی ہیں وہ وقتی اور عارضی ہیں اور ان کے اندر جو ضرر مضمر ہے وہ دائمی اور ابدی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حوصلہ ہے تو اس فوزِ عظیم، کو حاصل کرنے کے لیے اپنے مال خرچ کرو۔

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَاۗءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ (۱۳)

منافقین کی نور سے محرومی

اس دن منافقین کا حال یہ ہو گا کہ وہ اندھیرے میں بھٹک رہے ہوں گے۔ انھوں نے اللہ کی راہ میں انفاق کر کے وہ روشنی اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جو آخرت میں ان کے کام آتی۔ وہ جب دیکھیں گے کہ ایک گروہ ان لوگوں کا جن کے اندر وہ دنیا میں رہے بسے، اپنے ساتھ ایسی روشنی رکھتا ہے جو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ان کی رہنمائی کر رہی ہے تو وہ نہایت حسرت کے ساتھ ان سے درخواست کریں گے کہ ذرا ہمیں بھی قریب پہنچ لینے دیجیے کہ ہم بھی آپ کی روشنی سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ان کو جواب ملے گا کہ اس روشنی سے فائدہ اٹھانے کی تمنا نہ کرو۔ پیچھے پلٹو اور وہاں روشنی تلاش کرنے کی کوشش کرو اگر کر سکتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس روشنی کے حاصل کرنے کی جگہ تو تم پیچھے چھوڑ آئے اب اس کو پانے کا وقت گزر چکا۔ تمھارے لیے اب حسرت، ندامت اور اس تاریکی کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس قول کو العیاذ باللہ محض ایک تحکمہ سمجھا ہے لیکن یہ تحکمہ نہیں بلکہ بیانِ حقیقت ہے۔ کسب و اکتساب کی جگہ یہ دنیا ہے۔ جس نے اس میں نیکی کی کمائی نہیں کی آخرت میں اس کا حصہ صرف محرومی ہے۔

اس جواب کے بعد فوراً ان کے اور اہلِ ایمان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں صرف ایک دروازہ ہو گا۔ اس کے اندر کے حصہ میں رحمت ہو گی اور اس کے باہر کی جانب

عذاب ہوگا۔ اہلِ ایمان اس دروازے سے رحمت والے حصہ میں چلے جائیں گے اور منافقین عذاب کی تاریکی میں گھر جائیں گے۔ اس قسم کی ایک دیوار کا ذکر سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو وہاں دیکھیے۔

یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَ

ارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۱۴)

منافقین کی فریاد اور ان کو جواب

منافقین جب دیکھیں گے کہ روشنی کی جو جھلک نظر آتی تھی وہ بھی اوجھل ہوگئی اور جن کے ساتھ دنیا میں رہے ان سے بالکل ہی رابطہ ٹوٹ گیا تو وہ دل شکستہ ہو کر فریاد کریں گے کہ بھائیو، آپ لوگوں نے ہمیں بالکل ہی کاٹ پھینکا! کیا دنیا میں ہم آپ لوگوں کے ساتھ نہیں رہے بسے! اپنے بھائیوں سے یہ بے اعتنائی و بے پروائی!!

جواب ملے گا کہ اس میں تو شبہ نہیں کہ دنیا میں تم لوگ بظاہر ہمارے ہی ساتھ رہے لیکن تمہارے دل ہمارے ساتھ نہیں تھے بلکہ تم انہی فتنوں میں مبتلا رہے جن سے اللہ نے تم کو نکالنا چاہا۔ تم نے ایمان کا دعویٰ بڑی بلند آہنگی سے کیا لیکن اس ایمان کے جتنے مطالبے تمہارے سامنے آئے ان میں سے ایک کو بھی پورا کرنے کا حوصلہ تم نے نہیں کیا۔ اپنے مال اور اپنی جان کو اللہ کے دین اور اس کے رسول سے تم نے زیادہ عزیز جانا، تمہاری وفاداریاں اسلام کے دشمنوں کے ساتھ رہیں اور حق کی جگہ ہمیشہ اپنے مفادِ ذاتی کو تم نے ترجیح دی۔

'وَتَرَبَّصْتُمْ' یعنی تم برابر ہمارے لیے گردشوں اور آفتوں کے منتظر رہے۔ سورۂ توبہ میں ان منافقین کا کردار ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: 'وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ' (التوبۃ - ۹: ۹۸) (اور ان بدوی منافقین میں وہ بھی ہیں جو اگر کبھی اسلام کی راہ میں کچھ خرچ کر بیٹھتے ہیں تو اس کو اپنے اوپر ایک تاوان خیال کرتے ہیں اور تمہارے لیے برابر گردشوں کے انتظار میں رہتے ہیں) انہی لوگوں کا کردار سورۂ نساء میں یوں بیان ہوا ہے:

'اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؗ' (النساء - ۴: ۱۴۱) (جن کا حال یہ ہے کہ وہ تمہارے لیے منتظر تو رہتے ہیں شکست کے لیکن ان کے علی الرغم اگر اللہ تمہیں فتح دے دیتا ہے تو غنیمت کی طمع میں بھاگے ہوئے تمہارے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا ہم آپ لوگوں کے ساتھ نہیں رہے ہیں؟)

'وَارْتَبْتُمْ' یعنی تم برابر شک اور تذبذب میں مبتلا رہے۔ اسلام اور پیغمبر کی حقانیت پر کبھی تمہارا دل نہیں جما۔ تم نے کفر اور اسلام دونوں سے تھوڑا تھوڑا تعلق جوڑے رکھنا چاہا کہ اس کشمکش میں جس کو غلبہ حاصل ہوا اپنا مستقبل اس کے ساتھ وابستہ کر لو گے۔ اس ذہنی کیفیت کی تصویر

دوسرے مقام میں اس طرح کھینچی گئی ہے: مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (النساء - ۴: ۱۴۳) (ان دونوں کے درمیان مذبذب، نہ یکسوئی کے ساتھ اِدھر نہ یکسوئی کے ساتھ اُدھر)۔

وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ أَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُم بِاللّٰهِ الْغَرُورُ۔ یعنی تم جھوٹی آرزوؤں میں برابر پھنسے رہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھیں جو ڈھیل ملی تو تم اس دھوکے میں مبتلا ہو گئے کہ تمھاری یہ دو رُخی پالیسی کامیاب ہے اور اس کو تم آخر تک کامیابی کے ساتھ نباہ لے جاؤ گے لیکن یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ شیطان نے تمھیں دھوکے ہی میں رکھا اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ حق کو غالب کرنے کے لیے صادر ہو گیا اور تمھیں یہ روزِ بد دیکھنا پڑا۔

وَغَرَّكُم بِاللّٰهِ الْغَرُورُ، میں لفظ 'غرور' شیطان کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے باب میں دھوکے میں رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں یہ آگاہی جو دی جاتی رہی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول اتمامِ حجت کے لیے بھیج دیا ہے، جو لوگ اس کے بعد بھی اپنے کفر پر اڑے رہیں گے یا نفاق کے پردے میں چھپنے کی کوشش کریں گے وہ لازماً خدا کی گرفت میں آ جائیں گے تو شیطان تم کو یہ سبق پڑھا دیتا تھا کہ یہ سب محض دھونس جمانے کی باتیں ہیں، جو نہ پہلے سچی ثابت ہوتی ہیں نہ آئندہ ہوں گی، ان سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ مَأْوَاكُمُ النَّارُ ۖ هِيَ مَوْلَاكُمْ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۱۵)

یعنی یہ صورتِ حال جو تمھیں پیش آئی ہے پوری آگاہی اور اتمامِ حجت کے بعد پیش آئی ہے اس وجہ سے اب اس سے چھوٹنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ یہاں کسی کے پاس نہ تو کوئی چیز فدیہ میں دینے کی ہے اور نہ کسی سے فدیہ قبول ہی ہوگا۔ نہ تم سے اور نہ ان کافروں سے جن کے ساتھ تمھارا یارانہ رہا ہے۔ تم چونکہ اسلام کی طرف یکسو نہیں ہوئے اس وجہ سے ایمان کے ادّعا کے باوجود تمھارا اور ان کفار کا حشر ایک ہی ساتھ ہوگا۔ تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہی تمھارا 'مولیٰ' یعنی مرجع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمھارے لیے نہ خدا کے سامنے کسی داد و فریاد کی گنجائش ہے اور نہ وہاں اب تمھاری کوئی شنوائی ہونی ہے۔ تمھارا مرجع اب دوزخ ہے۔ اب جو کچھ پاؤ گے اسی سے پاؤ گے اور یاد رکھو کہ وہ برا ٹھکانا ہے۔

۴۔ آگے آیات ۱۶-۲۴ کا مضمون

آگے کی آیات میں خطاب کا رخ ان منافقین ہی کی طرف ہے جن سے اوپر کے پیرے میں

خطاب ہے۔ ان کو پہلے تو اس تذبذب کی روش کے انجام بد سے ڈرایا ہے کہ رسولؐ کی تائید میں آتی واضح نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی اگر تمہارا تذبذب دور نہیں ہوا تو بالآخر تمہارے دلوں پر بھی اسی طرح کی قساوت چھا جائے گی جس طرح کی قساوت یہود پر چھا گئی تھی جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔

اس کے بعد ان کو کچھ ابھارا ہے کہ موجودہ حالات سے ہراساں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت و رحمت پر بھروسہ رکھو۔ جس اللہ کی یہ شان دیکھتے ہو کہ وہ اس سرزمین کو مردہ ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ کر دیتا ہے اس سے بعید نہیں ہے کہ وہ اس دعوتِ حق کو اتنا فروغ دے کہ یہاں کفر کا کوئی نشان باقی نہ رہ جائے۔ اسی ذیل میں ان کو یہ اطمینان بھی دلایا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے خسارے میں رہنے والے نہیں ہیں بلکہ ایک کا ستر پائیں گے اور یہی راستہ ہے اس امت کے صدّیقین اور شہداء میں داخل ہونے کا۔

پھر اس دنیا کی ان چیزوں کی بے ثباتی و بے حقیقتی کی تصویر کھینچی ہے جن کے عشق میں پھنس کر لوگ آسمانوں اور زمین کے برابر کی اس ابدی بادشاہی کو بھول بیٹھے ہیں جس کو وہ چاہیں تو اپنے جمع کردہ خزف ریزوں کے عوض خرید سکتے ہیں۔

آخر میں اس نکتہ کی طرف رہنمائی فرمائی ہے کہ اس دنیا میں یسر اور عسر، دکھ اور سکھ، فقر اور غنا انسان کی اپنی تدبیروں پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تقدیر پر ہے۔ اس وجہ سے نہ تو انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ فراخی حاصل ہو تو اس کو اپنی تدبیر کا کرشمہ سمجھ کر اس پر اترانے اور اکڑنے لگ جائے اور نہ یہ جائز ہے کہ کوئی ابتلاء پیش آجائے تو مایوس و دل شکستہ ہو کر واویلا شروع کر دے بلکہ وہ نعمت میں شکر اور مصیبت میں صبر کی روش اختیار کرے اور دونوں صورتوں میں اپنے رب پر اپنے دل کو جمائے رکھے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۶-۲۴

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَ

الْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ
اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿١٨﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ
وَنُوْرُهُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
الْجَحِيْمِ ﴿١٩﴾ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ع ۲ ۱۸
وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ
كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ
مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ
وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا
مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿٢٠﴾ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ
عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٢١﴾ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ
وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ
ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿٢٢﴾ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ
وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ﴿٢٣﴾
الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ
فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٢٤﴾

کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاددہانی اور اس حق کے آگے جھک جائیں جو نازل ہو چکا ہے اور ان لوگوں کی طرح نہ بن کے رہ جائیں جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی پس ان پر طویل مدت گزر گئی، بالآخر ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے بہتیرے نافرمان ہیں۔ ۱۶

یاد رکھو کہ اللہ زندہ کر دیتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد ہم نے تمھارے لیے اپنی آیتیں واضح کر کے بیان کر دی ہیں تاکہ تم سمجھو۔ ۱۷

بے شک اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے مرد اور عورتیں اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کو قرض دیا اچھا قرض، ان کا دیا ہوا ان کے لیے بڑھایا جائے گا اور ان کے لیے باعزت صلہ ہے اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر وہی لوگ اپنے رب کے ہاں صدیقوں اور شہداء کے زمرے میں ہوں گے۔ ان کے لیے ان کا صلہ بھی ہوگا اور ان کی روشنی بھی۔ رہے وہ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی جنھوں نے تکذیب کی وہ جہنم والے بنیں گے۔ ۱۸-۱۹

جان رکھو کہ دنیا کی زندگی ـــــ لہو و لعب، زیب و زینت اور مال و اولاد کے معاملے میں باہمی تفاخر و تکاثر ـــــ کی تمثیل اس بارش کی ہے جس کی اُپجائی ہوئی فصل کافروں کے دل کو موہ لے، پھر وہ بھڑک اٹھے اور تم اسے زرد دیکھو، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور آخرت میں ایک عذابِ شدید بھی ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی بھی، اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کی ٹٹی ہے۔ ۲۰

تم مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور ایک ایسی جنت کی طرف جس کا طول و

عرض آسمان و زمین کے طول و عرض کے مانند ہوگا۔ وہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، اس کو بخشے گا وہ جس کو چاہے گا اور اللہ بڑا ہی فضل والا ہے۔ ۲۱

اور تمھیں کوئی مصیبت بھی نہیں پہنچتی ہے، نہ زمین پیداوار میں اور نہ تمھارے اپنے نفوس کے اندر، مگر یہ کہ وہ لکھی ہوئی ہے ایک کتاب میں اس سے پہلے سے کہ ہم اس کو وجود میں لائیں اور یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ یہ بات تمھیں اس لیے بتائی جا رہی ہے کہ جو چیز جاتی رہے اس پر غم نہ کرو اور نہ اس چیز پر اتراؤ جو اس نے تمھیں بخشی ہے۔ اور یاد رکھو کہ اللہ اکڑنے والوں اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں۔ اور جو اعراض کریں گے وہ یاد رکھیں کہ اللہ بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ ۲۲-۲۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوٓا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ ٱللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ ٱلْحَقِّ
وَلَا يَكُونُوا۟ كَٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ ٱلْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ
وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَٰسِقُونَ (۱۶)

'لِلَّذِينَ آمَنُوا' سے مراد، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وہی منافقین ہیں جن کا رویہ یہاں زیرِ بحث ہے۔ چونکہ وہ ایمان کے مدعی تھے اس وجہ سے ان کے دعوے کے مطابق ان کا ذکر 'لِلَّذِينَ آمَنُوا' کی صفت سے کیا تاکہ وہ ان مطالبات پر سنجیدگی سے غور کریں جو اس دعوائے ایمان کے تعلق سے ان پر عائد ہوتے ہیں اور اگر ان کے اندر اس دعوے کی کچھ لاج ہے تو اس کا حق ادا کریں۔ (منافقین کے صاحبِ ایمان کے لقب کی وضاحت)

'أَلَمْ يَأْنِ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ سورہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب دعوتِ حق کی صداقت و حقانیت اور اس کے غلبہ کے اتنے آثار و شواہد نمایاں ہو چکے

تھے کہ جن کے اندر کچھ شکوک و شبہات تھے وہ دور ہو جانے چاہییں تھے۔ اگر اتنے آثار دیکھ لینے کے بعد بھی ان کے شبہات علیٰ حالہٖ باقی ہی رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس وقت تک شرحِ صدر کے ساتھ اسلام کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے جب تک وہ اس کے ہر دعوے کی صداقت اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ اس طرح کا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر نہیں ہے اس وجہ سے ان لوگوں کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر اب بھی وہ شبہات ہی میں مبتلا رہے تو ان کا وہی حال ہوگا جو یہود کا ہوا۔ وہ بھی برابر شبہات میں مبتلا رہے اور اسی حالت میں ان پر ایک مدت گزر گئی بالآخر ان کے دل سخت ہو گئے۔ یہاں تک کہ حق کی روئیدگی کی صلاحیت ہی ان کے اندر سے ختم ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی جس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

ایک سنت الٰہی

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی امرِ حق میں شبہ و تردد کا پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور نہ کچھ عرصے تک اس کا باقی رہنا کوئی قابلِ ملامت چیز ہے۔ ایک نیک نیت آدمی کے اندر بھی یہ حالت پیدا ہو سکتی ہے لیکن کوئی شخص اگر ان شبہات کی آڑ لے کر اپنے اندر حق کی آواز کو برابر دباتا ہی رہے اور اس کو باطل سے چمٹے رہنے کے لیے ایک بہانہ بنالے تو سنتِ الٰہی کے مطابق ایسا شخص قبولِ حق کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کی طرف سے حق کی ناقدری کو زیادہ عرصے تک گوارا نہیں فرماتا۔

شک کی بیماری مہلک ہے

'اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ' میں 'ذِكْرُ اللّٰهِ' اور 'حق' سے مراد تو قرآن مجید ہی ہے لیکن قرآن کے دو خاص پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے کے لیے دو الگ الگ لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'ذکر اللہ' سے مراد وہ تنبیہات ہیں جو ان خطرات و مہالک سے آگاہ کرنے کے لیے نازل ہوئی ہیں جن سے ان لوگوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں لازماً دوچار ہونا پڑے گا جو حق سے اعراض کے لیے بہانے ڈھونڈتے رہیں گے اور 'حق' سے وہ کلیات مراد ہیں جو قرآن نے از سرِ نو باطل سے الگ کر کے اجاگر کیے فرمایا کہ ان کی تائید میں اتنے شواہد و قرائن ظاہر ہو چکے ہیں کہ چاہیے تھا کہ لوگوں کے دل ان کے آگے سرفگندہ ہو جاتے۔ اگر اب بھی نہیں ہوتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اس بیماری میں مبتلا ہیں جس میں یہود مبتلا ہوئے۔

یہود کے متعلق پیچھے، مختلف سورتوں میں تفصیل سے یہ بات گزر چکی ہے کہ وہ شک کے ایسے مریض تھے کہ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں، قدم قدم پر، اس کے معجزات اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کو دیکھتے ہوئے، برابر بے یقینی اور تردد میں مبتلا رہے۔ یہاں تک کہ ان کی اسی بیماری نے ان کو تورات سے محروم کر دیا اور اسی کی پاداش میں ان کی اکثریت قرآن سے بھی محروم رہی۔ یہاں اسی روش بد اور اس کے انجام سے قرآن نے ان منافقین کو متنبہ کیا ہے کہ تم بھی یہود ہی کی طرح، اپنے رسول کی موجودگی میں، بے یقینی

کے مرض میں مبتلا ہو، ایسا نہ ہو کہ یہ مرض تمہارے لیے بھی اسی طرح مہلک بن جائے جس طرح ان کے لیے مہلک بنا۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۷)

یہ آیت یہاں نہایت ہی برمحل وارد ہوئی ہے اور اس میں دو مختلف پہلوؤں سے اس بے یقینی کا علاج مضمر ہے جس میں یہ منافقین مبتلا تھے۔

بے یقینی کا علاج — سب سے نمایاں پہلو تو یہ ہے کہ آدمی میں اگر آخرت کا یقین نہ ہو تو اس کے لیے جان یا مال کی قربانی نہایت کٹھن کام ہے۔ ان منافقین کی اصل بیماری یہی تھی کہ ان کے اندر آخرت کا یقین نہیں تھا اس وجہ سے وہ قرآن کے وعدوں کو محض ایک بہلاوا خیال کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ بے یقینی دور کرنے کے لیے اپنی ان نشانیوں اور دلیلوں کی طرف توجہ دلائی جو قیامت کے ایک معلوم و مشہود حقیقت ہونے پر اس نے نہایت تفصیل سے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہیں۔ یہاں چونکہ مقصود محض آخرت کے ایک امرِ واقعی ہونے کی یاددہانی ہے اس وجہ سے اس کے امکان کی ایک بدیہی دلیل کی طرف اشارہ کر کے بالاجمال یہ فرما دیا کہ اس کی دلیلیں ہم تفصیل سے قرآن میں بیان کر چکے ہیں، ان کو مستحضر کرو اور سمجھو تاکہ تمہارے اندر جان و مال کی قربانی کا حوصلہ پیدا ہو۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ منافقین مخالفینِ اسلام کی سطوت سے بہت مرعوب تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ مٹھی بھر مسلمان اعدا کی دَل بادل افواج سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکیں گے اور کس طرح مکہ سے قریش کی جمی جمائی حکومت اکھاڑ کر بیت اللہ کو پھر دعوتِ ابراہیمی کا مرکز بنا سکیں گے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بعض جنگیں ہو چکی تھیں جن میں مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا تھا لیکن منافقین کے دلوں سے ابھی ڈر نہیں نکلا تھا۔ اسلام کے مستقبل کی طرف سے وہ بدستور مایوسی و بے یقینی میں مبتلا تھے۔ ان کی اس مایوسی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین کی نشانی کی طرف توجہ دلائی کہ جس خدا کی یہ شان برابر دیکھتے ہو کہ وہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے اس کی قدرت سے بعید نہ سمجھو کہ وہ اس کفرستانِ عرب کو ازسرِنو ایمان و اسلام کی زندگی سے معمور کر دے۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ (۱۸)

یہ آیت ۱۱ کے مضمون کو ایک دوسرے پہلو سے لیا ہے اور منافقین کو ابھارا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا خسارے کا سودا نہیں بلکہ نہایت نفع بخش کاروبار ہے۔ جو لوگ برابر صدقہ کرتے رہتے ہیں اور جب کبھی کسی ہنگامی ضرورت کے موقع پر ان سے مدد کی اپیل کی جائے تو اس وقت بھی وہ فراخ دلی سے مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کی پائی پائی خدا کے ہاں محفوظ ہے۔ وہ ان کے لیے

اس کو بڑھا رہا ہے اور بڑھا کر ایک لازوال خزانے کی شکل میں ان کو واپس کرے گا۔ علاوہ ازیں ان کے لیے ایک بہت بڑا باعزت اجر بھی ہے۔ یعنی ان کا دیا ہوا تو کئی گنا بڑھ کر ان کو واپس کیا جائے گا ہی، اس کے علاوہ بھی رب کریم ان کو خاص اپنے پاس سے ایک اجر عظیم دے گا۔

صدقہ اور قرض

یہاں انفاق کے لیے صدقہ اور قرض کے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ پہلا فاعل یا صفت کی شکل میں دوسرا فعل کی صورت میں۔ اس اختلاف کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ایک انفاق تو وہ ہے جس کا مطالبہ ہر ذی استطاعت مسلمان سے عام حالات میں ہے اور جو تزکیہ نفس کے پروگرام کا ایک لازمی حصہ ہے۔ دوسرا وہ انفاق ہے جس کا مطالبہ کسی ناگہانی ضرورت کے موقع پر ملت کے تحفظ کے لیے کیا جاتا ہے۔ پہلے کو یہاں صدقہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کے لیے فاعل اور صفت کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اس لیے کہ وہ دواماً مطلوب ہے۔ دوسرے کو قرض سے تعبیر فرمایا ہے جو عند الضرورت دیا جاتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے فعل کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

مردوں کے ساتھ یہاں عورتوں کے خاص طور پر ذکر کی حکمت

ان آیات میں یہ امر بھی خاص توجہ کے لائق ہے کہ نفاق اور انفاق کے بیان میں قرآن نے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی ذمہ داری خاص طور پر نمایاں فرمائی ہے۔ اس کی وجہ، غور کرنے سے، یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیوی بچے بخل اور بزدلی کے بڑے اہم عوامل میں سے ہیں اور یہی دو چیزیں دراصل نفاق میں مبتلا کرنے والی ہیں۔ یہ حقیقت حدیث شریف میں بھی واضح فرمائی گئی ہے کہ بیوی بچے بخل و بزدلی کے سبب بنتے ہیں۔ اسی پہلو کے سبب سے یہاں منافقین کے ساتھ منافقات اور مصدقین کے ساتھ مصدقات کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے تاکہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں پر بھی یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر شخص اپنی ذمہ داریوں سے متعلق مسئول ہوگا، مرد ہو یا عورت۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۖ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۱۹)

قرینہ دلیل ہے کہ جس طرح آیت ۷ میں لفظ ایمان اپنے کامل مفہوم میں استعمال ہوا ہے اسی طرح اس آیت میں بھی اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

منافقین کو ایک تنبیہ

یہ منافقین کو بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیقین اور شہداء کے لیے جو درجے ہیں وہ صرف مدعیٔ ایمان کو نہیں حاصل ہو جائیں گے بلکہ یہ صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں پر سچا اور پکا ایمان لائیں گے اور اپنے عمل سے اپنے دعوائے ایمان کی صداقت ثابت کریں گے۔ یہاں چونکہ زیر بحث خاص طور پر انفاق ہے اس وجہ سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ دین کی نصرت کے لیے فراخ دلی سے اپنے مال خرچ کریں گے درحقیقت وہی لوگ اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں

اور وہی لوگ ہیں جن کو صدیقین اور شہداء کے زمرے میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوگی۔

صدیق کی تعریف — لفظ 'صدیق' کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ اس کی اصل روح قول و عمل کی کامل مطابقت اور اس کی پختگی ہے۔ عربی میں اس نیزے کو 'صادق الکعوب' کہیں گے جس کی گرہیں تجربہ سے بھی ویسی ہی محکم ثابت ہوں جیسے وہ دیکھنے میں نظر آتی ہیں۔ صادق اور صدیق اس شخص کو کہیں گے جو اپنے قول کا پکا ہو۔ اس پختگی کی اولین عملی شہادت یہ ہے کہ وہ اس مقصدِ حق کی خاطر اپنی محنت کی کمائی قربان کرنے والا ہو جس کا اس نے اقرار و اعلان کیا ہے۔ اسی قربانی سے وہ اس مقصدِ حق کی شہادت دینے والا بنتا ہے اور ایسے ہی مردِ حق سے یہ توقع ہوتی ہے کہ اس کو امتحان پیش آیا تو وہ اپنی جان دے کر بھی اس حق کی شہادت دے گا۔ اسلام میں اس وصف کے سب سے نمایاں مصداق حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ انھوں نے اپنے اقرارِ ایمان کی صداقت، نازک سے نازک زمانے میں، اپنے انفاق سے جس طرح ثابت کی ہے وہ ہماری تاریخ کا سب سے زیادہ روشن باب ہے۔

شہید — 'شُهَدَاء' یہاں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جس معنی میں 'كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا' (البقرۃ ۲: ۱۴۳) (اسی طرح ہم نے تم کو وسط راہ پر قائم رہنے والی امت بنایا کہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے) میں استعمال ہوا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس امت کو 'شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ' ہونے کا جو عظیم اعزاز حاصل ہے وہ مجرد ایمان کا دعویٰ کر دینے سے کسی کو نہیں حاصل ہو جائے گا بلکہ یہ صرف انہی کو حاصل ہوگا جن کا ہر عمل ان کے ایمان کی گواہی دے۔ یہاں یہ امر بھی واضح رہے کہ خدا کی راہ میں مارے جانے والوں کو جو شہید کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شہادت علی الناس کے فرضِ منصبی کا حق اس راہ میں اپنی جان قربان کر کے دیتے ہیں۔ یہ شہادت چونکہ سب سے بڑی شہادت ہے اس وجہ سے ان کو شہید کہتے ہیں۔

بعینہٖ یہی بات ان منافقین ہی کو خطاب کر کے سورۂ نساء میں یوں فرمائی گئی ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ	اور جو پوری وفاداری سے اللہ اور رسول کی
مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ	اطاعت کریں گے وہی لوگ اللہ کے انعام یافتوں:
النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ	انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ
وَالصّٰلِحِيْنَ (النسآء - ۴: ۶۹)	ہوں گے۔

'لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ' یعنی اوپر آیات ۱۱-۱۲ میں جو اجر اور جو نور بیان ہوا ہے وہ انہی جاں بازوں کے لیے ہے۔ ہر مدعی ان کا حق دار نہیں بن جائے گا۔

'وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ' یعنی وہ سارے لوگ جو کفر اور تکذیب

کے مرتکب ہوئے وہ جہنم میں پڑیں گے۔ یہاں مرتفع کلام دلیل ہے کہ یہی حکم ان لوگوں کا بھی ہوگا جنھوں نے اگرچہ زبان سے تکذیب نہ کی ہو لیکن اپنے عمل سے تصدیق بھی نہ کی ہو بلکہ ان کا عمل ان کے دعوے کے بالکل برعکس ہی رہا ہو۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۲۰)

زر پرستوں کو تنبیہ

یہاں مال پرست منافقین کو تذکیر و تنبیہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی، یعنی لہو و لعب، زینت و آرائش کا شوق، مال و اولاد کی تکثیر کی بھاگ دوڑ اور معیار زندگی اونچا کرنے کا باہم مقابلہ، جن میں جو تم ہر وقت ڈوبے ہوئے ہو، یہ کوئی خوش انجام سرگرمی نہیں ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ بارش اچھی ہو جائے جس سے فصل لہلہا اٹھے اور اس کو دیکھ کر ناشکرے لوگ پھولے نہ سمائیں لیکن پھر اس پر کوئی ایسی افتاد آ پڑے کہ وہ سوکھ کر زرد ہو جائے پھر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ یہی حشر تمھاری ان تمام سرگرمیوں کا ہونا ہے جو تم اس دنیا کے حاصل کرنے اور اس میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے کر رہے ہو۔ ان میں سے کوئی چیز بھی باقی رہنے والی نہیں ہے۔

وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ یعنی تم نے اپنی نادانی سے اس دنیا کی لذات کو زندگی کا مقصود، اپنی تمام مساعی کا حاصل اور گول قرار دے رکھا ہے حالانکہ یہ دنیا محض ایک سرمایۂ غرور اور دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اصل گول تو آخرت ہے اور وہاں دو چیزوں میں سے ایک سے سابقہ پیش آنا ہے۔ ایک طرف عذاب شدید ہوگا، دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی۔ اگر کوئی شخص اس دنیا کے مطامع کو قربان کر کے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور خوشنودی کے حصول کا حوصلہ نہیں کر پائے گا تو وہ لازماً اس کے عذاب شدید سے دوچار ہوگا۔

ایک خاص نکتہ

اس آیت میں تالیف کلام عام مفسرین کے نزدیک تو اس طرح ہے کہ وہ اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا کو مبتدا اور اس کے بعد کی ساری عبارت کو خبر قرار دیتے ہیں لیکن میرے نزدیک اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا کے بعد لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ کے الفاظ بطور بدل بیان آئے ہیں اور كَمَثَلِ غَيْثٍ ...... الاٰیۃ اس مبتدا کی خبر ہے۔ اس اسلوب کلام کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں، مثلاً لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ۝ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (العلق ۹۶: ۱۵-۱۶) (ہم اس کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے، جھوٹی، نابکار، گنہگار چوٹی) اس تالیف کلام سے معنی میں بڑا فرق پیدا ہو جائے گا۔ مفسرین کے نزدیک تو آیت کا مطلب یہ

ہے کہ یہ دنیا کی زندگی محض لہو و لعب، زینت و آرائش اور تفاخر و تکاثر ہے۔ میرے نزدیک مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی یعنی لعو و لعب، زینت و آرائش اور تفاخر و تکاثر کی تمثیل یوں ہے جس طرح ......

مفسرین کی تاویل کی رو سے یہ دنیا اور اس کی زندگی بحیثیت مجموعی ایک قابل نفرت و لعنت چیز ٹھہرتی ہے اور اس سے اسی رہبانی تصور کی تائید نکلتی ہے جس کی قرآن نے پوری شدت سے آگے اسی سورہ میں تردید کی ہے۔ اور اگر وہ تاویل لی جائے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے تو اس سے دنیا بحیثیت مجموعی نہیں بلکہ اس کا صرف وہ پہلو قابلِ نفرت قرار پائے گا جس پر کفّار و منافقین ریجھتے ہیں اور جو ان کو جہنم میں لے جانے کا سبب بنتا ہے۔

فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ دنیا اور اس کی زندگی بجائے خود لعنت نہیں ہے بلکہ اس کے لعنت یا رحمت ہونے کا تعلق انسان کے رویّہ سے ہے۔ اگر انسان ان حدود کے اندر زندگی گزارے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں تو اس دنیا کی حیاتِ چند روزہ اس کے لیے آخرت کی ابدی بادشاہی کی ضامن ہے اور اگر وہ ان حدود سے بے پروا ہو کر اس کو خود مقصود بنا بیٹھے اور اس کی لذتوں میں کھو جائے تو یہ اس کے لیے ابدی لعنت بن جاتی ہے۔ اس آیت میں اس کے اسی پہلو سے ہوشیار کیا گیا ہے۔

ایک اور نکتہ

آیت میں لفظ 'کفّار' بھی قابلِ غور ہے۔ اس کے معنی مفسرین نے عام طور پر 'زرّاع' یعنی کسانوں کے لیے ہیں لیکن دل اس پر نہیں جمتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ اس معنی میں معروف نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جس مادے سے ہے اس کے اندر یہ معنی لینے کی گنجائش بھی ہے لیکن محض اتنی بات ایک ایسے لفظ کو، جو ایک اصطلاح کی حیثیت سے، ایک خاص مفہوم میں قرآن میں کثرت سے استعمال ہوا ہے، ایک ایسے شاذ معنی میں لینے کے لیے کافی نہیں ہے جس معنی میں اس کی کوئی اور مثال قرآن میں نہیں ہے۔ سورۂ فتح کی آیت فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۲۹) (پس وہ کھیتی اپنے تنوں پر کھڑی ہو گئی کسانوں کے دلوں کو بھاتی ہوئی کہ ان سے کافروں کے دل آزردہ ہوں) میں دونوں لفظ اپنے اپنے خاص معنوں میں استعمال ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اپنے معانی میں معروف و متعیّن ہیں۔ اس وجہ سے میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہاں 'کفّار' اپنے اصل مفہوم ہی میں ہے۔ چونکہ اس تمثیل میں پیشِ نظر منکرینِ آخرت ہی کے رویّہ کو نمایاں کرنا ہے اس وجہ سے فرمایا کہ اس دنیا کی عارضی رونقیں منکرینِ آخرت کے دلوں کو لبھا لیتی ہیں، وہ انہی کے اندر پھنس کے رہ جاتے ہیں اور بالآخر اس عذاب سے دوچار ہوتے ہیں جو اس قسم کے محروم القسمت لوگوں کے لیے مقدر ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ تمثیل و تشبیہ میں بعض اوقات ایسے الفاظ داخل کر دیے جاتے ہیں جن سے مقصود ان لوگوں کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے جو اس تشبیہ یا تمثیل میں پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ اس طرح کی بعض چیزوں کی طرف

ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں ان پر نگاہ رکھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ تشبیہ یا تمثیل کا اصل حسن ظاہر نہیں ہوتا۔ یہاں یہ لفظ استعمال کر کے ان لوگوں کا سراغ دے دیا گیا ہے جو تمثیل میں پیش نظر ہیں۔

سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لا اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ ط ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (۲۱)

اصل میدانِ مسابقت

اوپر کی آیت میں بتایا کہ اہلِ کفر کی بھاگ دوڑ اور ان کا تکاثر و تفاخر بس اسی دنیا کی عارضی و فانی مطلوبات و مرغوبات کی راہ میں ہے، وہ ان سے آگے جانے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں رکھتے لیکن اہلِ ایمان کا نصب العین اپنے رب کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہونا چاہیے اور اس دنیا کی تنگنائے کی جگہ انھیں اس جنت کے حصول کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے جس کا طول و عرض آسمانوں اور زمین کے طول و عرض کے برابر ہے اور جو ان مومنین صادقین کے لیے اللہ نے تیار کر رکھی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر سچا اور پکا ایمان رکھنے والے ہیں۔

لفظ 'عَرْض' یہاں قرینہ دلیل ہے کہ طول و عرض یعنی وسعت اور پہنائی کے مفہوم میں ہے اور 'سَمَآء' جنس یعنی 'سَمٰوٰت' کے معنی میں ہے چنانچہ دوسرے مقام میں یہی مضمون جمع کے لفظ سے بیان ہوا ہے: 'وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ' (آل عمران - ۳ : ۱۳۳) (اور مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور ایک ایسی جنت کے لیے جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے مانند ہو گی)۔

'اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ' یعنی اس کو بہت دور کی چیز نہ سمجھو، یہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والوں کے لیے تیار کی ہوئی موجود ہے۔ جونہی اس دنیا کا امتحان ختم ہوا ہر ایک کے سامنے اس کی جنت بے نقاب ہو جائے گی۔ اور اس بات پر بھی تعجب نہ کرو کہ چند دنوں کی نیکیوں کے صلہ میں اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ایسی ناپیدا کنار جنتیں دے گا۔ اللہ بڑے فضل والا ہے، وہ جس کو چاہے بخشے۔ اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ط اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ (۲۲)

تقدیر کا نوشتہ اٹل ہے

یعنی یہ حقیقت بھی ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ جو مالی یا جانی مصیبت بھی تمھیں پیش آتی ہے وہ پیش آ کے رہے گی، تم اس سے بچنے کے کتنے ہی جتن کرو لیکن اس سے بھاگ نہیں سکتے۔ ہر دکھ اور سکھ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے ایک کتاب میں لکھ رکھا ہے اور یہ کسی کے امکان میں نہیں ہے کہ وہ نوشتۂ تقدیر کو بدل سکے۔ اللہ تعالیٰ کا علم حاضر و مستقبل سب پر محیط ہے اس وجہ سے اس کے لیے یہ کام ذرا

بھی مشکل نہیں ہے۔ تم اپنے محدود علم پر قیاس کر کے اس کو بعید از امکان خیال کرتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔ اس کے لیے یہ معمولی بات ہے کہ وہ جس کو وجود بخشے اس کے وجود سے پہلے ہی اس کی تقدیر بھی لکھ دے۔

یہاں دعوتِ انفاق کے ذیل میں اس نکتہ کی وضاحت اس وجہ سے ضروری ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں انفاقِ مال و جان سے جی وہی لوگ چراتے ہیں جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کو جو مال حاصل ہوتا ہے وہ ان کی اپنی تدبیر سے حاصل ہوتا ہے اور جو زندگی عطا ہوئی ہے اس کے محافظ وہ خود ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے فرمایا کہ مال، اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے اس وجہ سے یہ انتہائی نادانی ہے کہ اس کو خدا سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ جو چیز خدا ہی کی بخشش سے ملی ہے اس کو کوئی خدا سے کس طرح بچا سکتا ہے؟ اگر وہ اللہ کے حق میں بخالت کرے گا تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے کوئی آفت بھیج کر اس کا مال چھین لے۔ انسان کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے اور اپنے رب سے یہ امید رکھے کہ جس طرح اس نے آج اپنی مدد سے نوازا ہے اسی طرح آئندہ بھی ہر مشکل میں وہ مدد فرمائے گا۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں منافقوں اور بخیلوں کا یہ کردار بیان ہوا ہے کہ وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے اس اندیشہ سے جی چراتے ہیں کہ کل کو اگر کوئی افتاد پیش آئی تو کیا بنے گا۔ گویا وہ اپنی بخالت کو آئندہ پیش آنے والی مشکلوں اور گردشوں کا علاج سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جو کچھ پیش آنا ہے وہ اٹل ہے۔ اس کا علاج خدا سے بخالت نہیں بلکہ اس کی راہ میں انفاق اور اسی پر توکل ہے۔

'فِی الْاَرْضِ' سے یہاں اشارہ ان مالی قسم کی آفتوں کی طرف ہے جو زمین کی پیداوار کو لاحق ہوتی ہیں اور 'فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ' سے وہ تکلیفیں اور مصیبتیں مراد ہیں جو جسم اور جان کو لاحق ہوتی ہیں۔ اس دنیا میں انسان کو جو آزمائشیں بھی پیش آتی ہیں انہی دونوں راہوں سے پیش آتی ہیں۔ فرمایا کہ ان دونوں ہی راہوں سے جو کچھ بھی پیش آنے والا ہے وہ پہلے سے اللہ تعالیٰ کے ہاں نوشتہ ہے۔ اس وجہ سے انسان کے لیے نہ یہ جائز ہے کہ وہ اپنے رب سے اپنا مال چرائے اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ اس سے اپنی جان چرانے کی کوشش کرے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی وہ خدا سے بچا سکنے پر قادر نہیں ہے۔ انہی منافقین کو خطاب کر کے قرآن میں دوسری جگہ فرمایا ہے کہ آج تم خدا کی راہ سے جی چراتے اور موت سے ڈرتے ہو لیکن موت کا جو وقت مقرر ہے وہ اس وقت آ کے رہے گی اور تم کتنے ہی محکم قلعوں کے اندر چھپ کے بیٹھو لیکن وہ تم کو ڈھونڈ لے گی۔

'فِیْ کِتٰبٍ' سے مراد وہ کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی تقدیر رقم فرما رکھی ہے۔ اس کو لوحِ محفوظ سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے اور اس سے مراد درحقیقت علمِ الٰہی ہے۔

'اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ'۔ یعنی تمھارا علم بہت محدود ہے اس وجہ سے تمھارے لیے یہ تصور کرنا بڑا مشکل ہے کہ ایک ایک فرد کی زندگی میں جو کچھ پیش آتا ہے وہ لکھا ہوا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کام ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ وہ اس پوری کائنات کا خالق اور اس کا علم محیط کل ہے وہ ہر ایک کے متعلق جانتا ہے کہ وہ کن مراحل سے ہوتا ہوا کس منزل تک پہنچے گا۔

لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۙ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۗ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۲۳-۲۴)

تقدیر کا فلسفہ

یہاں 'لِكَيْ' سے پہلے کچھ حذف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ اس موقع پر تمھیں اس حقیقت کی یاددہانی اس لیے کرائی جا رہی ہے کہ نہ تم کسی چیز کے فوت ہونے پر غم کرو اور نہ کسی چیز پر جو تمھیں ملے اتراؤ اور فخر کرو، بلکہ اس عقیدے کی روشنی میں تمھارا کردار یہ ہونا چاہیے کہ تمھیں کوئی جانی یا مالی نقصان پہنچے تو اس پر صبر کرو کہ یہ نوشتۂ تقدیر کے مطابق پہنچا ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور اگر کوئی نفع پہنچے تو اس پر اپنے رب کے شکرگزار ہو کہ اسی نے تمھیں اپنے فضل سے نوازا ہے۔ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اترانے نہ لگو کہ یہ تمھاری تدبیر و قابلیت کا ثمرہ اور تمھارے استحقاق کا کرشمہ ہے۔

'وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ'۔ جو لوگ اللہ کی بخشی ہوئی نعمتیں پا کر اکڑنے والے بن جاتے ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ 'پسند نہیں کرتا' کے الفاظ اگرچہ بظاہر نرم ہیں لیکن باعتبارِ معنی بہت سخت ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ بسا اوقات اس طرح کے منفی اسلوب میں جو بات کہی جاتی ہے اس کو مثبت اسلوب میں کہیں تو وہ یوں ادا ہوگی کہ 'اِنَّ اللّٰهَ يبغض كلّ مختال فخور' لیکن متکلم صاف لفظوں میں بات کہنے کے بجائے اپنے تیور اور لب و لہجہ سے اپنی شدتِ نفرت کا اظہار کر دیتا ہے۔

'اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ'۔ یہ ان کے اسی کردار کے دوسرے پہلو کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کے لوگ چونکہ اس خبط میں مبتلا ہوتے ہیں کہ انھیں جو کچھ حاصل ہوتا ہے اپنی تدبیر سے حاصل ہوتا ہے اس وجہ سے وہ اپنی نمائش و آرائش اور تکاثر و تفاخر کے سوا دین و ملت کی راہ میں خرچ کرنے کو خسارہ اور تاوان سمجھتے ہیں۔ اس طرح کے کاموں میں وہ خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ ان کی بخالت پر پردہ پڑا رہے۔ بخیلوں کے کردار کا یہ پہلو قرآن میں بعض جگہ واضح فرمایا گیا ہے کہ ان کی خواہش اور کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ بخیل ہیں اسی طرح دوسرے بھی بخیل بنے رہیں تاکہ ان کی بخالت پر پردہ پڑا رہے۔

لفظ 'امر' یہاں مشورہ دینے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ معروف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ دوسروں کو دینی و ملّی کاموں میں خرچ کرتے دیکھتے ہیں تو ان کو خیر خواہانہ انداز میں مشورے دیتے ہیں کہ بہت شاہ خرچ مت بنو ورنہ کوئی سخت وقت آپڑا تو پچھتاؤ گے اور اس وقت کوئی مدد کرنے والا نہیں بنے گا۔

'وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ'۔ یہ اس طرح کے بخیلوں سے نہایت تہدید آمیز الفاظ میں اظہارِ بے نیازی و اعلانِ بیزاری ہے کہ اگر یہ لوگ اس تذکیر و تعلیم کے بعد بھی اعراض ہی کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو وہ یاد رکھیں کہ خدا بھی ان سے بالکل بے نیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو انفاق کی دعوت دے رہا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کے خزانے میں کوئی کمی ہے بلکہ اس نے یہ اپنے بندوں کے لیے (جیسا کہ آیت ۱۸ میں بیان ہوا) ایک ابدی نفع کمانے کی راہ کھولی ہے۔

'غنی' کے ساتھ صفت 'حمید' اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں بالکل بے نیاز و بے پروا ہے۔ اسے کسی کی حاجت نہیں۔ وہ لوگوں سے مانگتا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ ان کا محتاج ہے بلکہ وہ 'حمید' ہے اس وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ اس طرح وہ لوگوں کو اپنے افضال کا حق دار بنائے اور ان کے دیے ہوئے خزف ریزوں کو ایک لازوال خزانے کی شکل میں تبدیل کر کے ان کو واپس کرے۔

۶۔ آگے آیات ۲۵-۲۹ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کے اٹھائے ہوئے ایک اعتراض کا برمحل جواب دیا گیا ہے۔ اوپر کی آیات میں اہل ایمان کو جس انفاق کی دعوت دی گئی ہے اس کا تعلق، جیسا کہ سیاق و سباق سے واضح ہے، جہاد سے ہے۔ مسلمان جب تک مکہ میں مظلوم و مغلوب رہے اس وقت تک تو اہل کتاب اور قریش نے ان کی کمزوری اور بے بسی کو ان کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کیا لیکن جب انھوں نے مدینہ میں ایک منظم جمعیت کی شکل اختیار کر لی یہاں تک کہ انھوں نے قلتِ تعداد کے باوجود، قریش کو بعض جنگوں میں نہایت کھلی ہوئی شکست بھی دے دی تو قریش اور اہل کتاب دونوں نے مل کر ان کے جوشِ جہاد کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ یہ جماعت مذہبی جماعت کس طرح ہو سکتی ہے جب کہ اس کے نزدیک سب سے بڑا نیکی کا کام جنگ و خونریزی ہے، بھلا اللہ کے رسولوں اور اس کے نیک بندوں کو جنگ و خونریزی سے کیا تعلق، وہ تو دنیا میں امن و سلامتی اور صلح و محبت کے داعی ہوتے ہیں! اس دور میں مذہب کا رہبانی تصور ذہنوں پر غالب تھا اس وجہ سے قریش نے اہل کتاب کے اٹھائے ہوئے اس اعتراض کو اٹھا لیا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے موقع پر انھوں نے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنہ دیا کہ یہ اللہ کے رسول کس طرح ہو سکتے ہیں جب کہ انھوں نے بھائیوں کی تلوار بھائیوں ہی کی گردنوں پر چلوا دی۔ قرآن نے جگہ جگہ اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ سورۂ انفال اور سورۂ حج میں اس کے بعض اہم پہلو زیرِ بحث آ چکے ہیں۔ یہاں اس کے جواب میں انبیاء و رسل کی تاریخ کی روشنی میں تین باتیں واضح فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے نبی اور رسول بھی بھیجے اس لیے بھیجے کہ لوگ ان کی ہدایات کی روشنی میں حق و عدل کی شاہراہ پر چلنے والے بنیں۔ اسی مقصد کے لیے اللہ نے ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی تاکہ وہ کتاب ان کے لیے میزانِ حق کا کام دے اور وہ اس کسوٹی پر پرکھ کر لوگوں کو بتائیں کہ کیا حق ہے، کیا باطل، کیا عدل ہے، کیا ظلم؟

دوسری یہ کہ عدل و قسط کا قیام اس امر کو مستلزم ہے کہ ظلم و جور کا سدِ باب کیا جائے۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ کتاب و میزان کے ساتھ قوت و طاقت بھی ہو تاکہ عدل کی مزاحم طاقتیں اس کے قیام میں مانع ہوں تو ان کو دبایا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے کتاب کے ساتھ لوہا بھی اتارا جس میں خلق کے لیے دوسرے گوناگوں فوائد کے ساتھ یہ فائدہ بھی ہے کہ اس سے وہ قوت حاصل کی جا سکتی ہے جو قیامِ حق و عدل کی راہ میں جہاد کے لیے ضروری ہے۔ یہ جہاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کا ایک امتحان ہے جس سے وہ مخلصین و منافقین کو پرکھتا ہے کہ کون حق کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے سکتے ہیں اور کون محض دکھاوے کے مسلمان ہیں۔

تیسری یہ کہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی ذرّیت میں جتنے نبی و رسول بھی آئے سب اسی مقصدِ حق اور قیامِ عدل کے لیے آئے اور انہی کے طریقہ پر اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح ابن مریم کو بھی بھیجا۔ ان کے پیروؤں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر رافت و رحمت رکھی تھی جس کی آڑ میں ان کے بعد کے نام لیواؤں نے رہبانیّت ایجاد کر لی جو محض ان کی اپنی ایجاد کردہ بدعت ہے۔ ان پر جو چیز فرض کی گئی تھی وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی تھی جو تمام نبیوں اور رسولوں کی مشترک تعلیم ہے لیکن اپنی غلو پسندی کے سبب انھوں نے اس کے حدود ملحوظ نہیں رکھے اور رہبانیّت ایجاد کر کے خدا کے دین کا حلیہ بگاڑ ڈالا اور اب اسی بگڑے ہوئے دین کو دلیل بنا کر اسلام کے حکمِ جہاد پر اعتراض کر رہے ہیں۔

اس فتنۂ رہبانیّت کے سبب سے سب سے زیادہ گمراہی چونکہ نصاریٰ ہی کو پیش آئی اس وجہ سے آخر میں ان کو خاص طور پر اسلام کی دعوت بھی دے دی گئی کہ جو لوگ حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان کے مدعی ہیں وہ رہبانیت وغیرہ جیسی بدعات میں پھنس کر اسلام کی نعمتِ عظمیٰ سے محروم نہ ہوں۔ اگر وہ اللہ کے آخری رسول پر ایمان لائیں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق اپنی رحمت میں ان کو دو

حصے دے گا اور یہ یہود جو اللہ کے تمام فضل و رحمت کا اجارہ دار تنہا اپنے کو سمجھے بیٹھے ہیں حسد
کی اسی آگ میں جلتے رہیں گے جس میں وہ جل رہے ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۵-۲۹

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۖ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ
وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ ۚ
إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ ع ۳ ۱۹
وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ ۖ فَمِنْهُمْ مُهْتَدٍ ۖ
وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا
وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ وَجَعَلْنَا فِي
قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً ۚ وَرَهْبَانِيَّةً
ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا
رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۖ فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ ۖ
وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿۲۷﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ
وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيَجْعَلْ
لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۲۸﴾
لِئَلَّا يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَلَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِنْ
فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَأَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ
وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۲۹﴾ ع ۴ ۲۰

ترجمۂ آیات ۲۵-۲۹

بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ

کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں اور لوہا بھی اتارا جس میں بڑی قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے اس میں دوسرے فوائد بھی ہیں اور اس سے اللہ نے یہ بھی چاہا کہ وہ ان لوگوں کو ممیّز کرے جو اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد غیب میں ہوتے کرتے ہیں بے شک اللہ بڑا ہی زورآور اور غالب ہے۔ ۲۵

اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو رسول بنا کر بھیجا اور ان دونوں کی ذرّیت میں نبوّت اور کتاب کا سلسلہ جاری کیا۔ پس ان میں سے کچھ تو ہدایت پانے والے بنے اور زیادہ ان میں نافرمان نکلے۔ پھر انہی کے نقشِ قدم پر ہم نے اپنے اَور رسول بھی بھیجے اور انہی کے نقشِ قدم پر بھیجا عیسٰی ابنِ مریم کو بھی اور اس کو عنایت کی انجیل۔ اور ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے اس کی پیروی کی رافت و رحمت رکھی اور رہبانیت انھوں نے خود ایجاد کی۔ ہم نے ان کے اوپر صرف اللہ کی خوشنودی کی طلب فرض کی تھی تو انھوں نے اس کے حدود کما حقہٗ ملحوظ نہیں رکھے۔ تو ہم نے ان لوگوں کو جو ان میں سے ایمان پر جمے رہے ان کا اجر عطا فرمایا اور زیادہ ان میں نافرمان نکلے۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ وہ تم کو اپنی رحمت میں سے دو حصّے دے گا اور تمھارے لیے روشنی بنائے گا جس کو لے کر تم چلو گے اور تمھاری مغفرت فرمائے گا۔ اللہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔ تاکہ اہلِ کتاب نہ جانیں کہ وہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتے اور یہ کہ فضل تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے، وہ بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۲۶-۲۹

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۲۵)

رسولوں کی بعثت کا مقصد

یہ رسولوں اور کتابوں کے بھیجنے کا مقصد واضح فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں کہ لوگ زندگی کے ہر شعبہ میں حق و عدل کے اختیار کرنے والے بنیں۔ عقائد میں وہ راہ اختیار کریں جو ہر کج پیچ سے پاک، سیدھی اور بیچ (وسط) کی راہ ہو اور اعمال ہیں، خواہ وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہوں یا اجتماعی زندگی سے، وہ روش اختیار کریں جو حق و عدل پر مبنی اور ظلم و جور کے ہر شائبہ سے پاک ہو۔ معلوم ہوا کہ اللہ نے اپنے رسول محض وعظ سنا دینے کے لیے نہیں بھیجے اور نہ اپنی کتابیں محض تلاوت کے لیے نازل کیں بلکہ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کی رہنمائی میں حق و عدل پر قائم رہنے والے اور اس کو قائم کرنے والے بنیں۔

'کتٰب' کے ساتھ 'میزان' کا ذکر میرے نزدیک کتاب ہی کے سب سے بڑے مقصد کی وضاحت کے لیے ہے کہ وہ تول کر بتاتی ہے کہ کس کے ساتھ کتنا حق ہے اور اس میں کتنا غیر مطلوب اضافہ ہے۔ سورۂ شوریٰ میں کتابِ الٰہی کے اس پہلو کو نہایت وضاحت سے بیان فرمایا گیا ہے۔[1] وہاں پہلے یہ حقیقت واضح فرمائی گئی کہ اللہ کے تمام رسولوں نے صرف توحید کی تعلیم دی ہے اور اس راہ سے معمولی انحراف کو بھی نہایت شدت کے ساتھ رد کیا ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی ہے کہ تم اسی راہ کی لوگوں کو دعوت دو اور اپنے مخالفوں کو آگاہ کر دو کہ میں اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لایا ہوں تو تمہاری بدعتوں کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں۔ یہ کتاب دے کر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس منصب پر مامور فرمایا ہے کہ میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں اور اس میزان پر تول کر بتاؤں کہ تم میں سے کس کے پاس کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ اس بحث کا خاتمہ آیتِ ذیل پر ہوا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ	اللہ ہی ہے جس نے اتاری ہے کتاب حق کے
بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ؕ وَمَا	ساتھ اور جو فیصلہ کے لیے میزان ہے۔ اور تمہیں
یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِیْبٌ	کیا خبر کہ شاید قیامت کی گھڑی بھی (فیصلہ کے لیے)
(الشوریٰ - ۴۲: ۱۷)	قریب ہی آ لگی ہو۔

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد ششم، صفحات ۱۵۲-۱۵۷

اسی پہلو سے قرآن کو 'مہیمن' بھی کہا گیا ہے۔ 'مہیمن' کے معنی کسوٹی کے ہیں۔ یعنی قرآن ایک کسوٹی ہے جس پر پرکھ کر کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ عدل اور قسط کو قائم کرنے کے لیے میزان اور کسوٹی کا ہونا ضروری ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کی یہ دونوں صفتیں واضح فرمائی ہیں۔

قیام عدل کے لیے طاقت کی ضرورت

'وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡہِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ' یعنی جب رسولوں کی بعثت اور کتاب و شریعت کے نازل کرنے سے اصل مقصود قیامِ قسط ہوا تو یہ کام مجرد وعظ و تذکیر اور انذار و تبشیر سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو رسولوں کو بیّنات یعنی نہایت واضح دلائل کے ساتھ اور کتابوں کو میزان اور کسوٹی بنا کر بھیجا تاکہ لوگوں پر عقلی و اخلاقی پہلو سے اچھی طرح حجت تمام ہو جائے، دوسری طرف لوہا بھی اتارا کہ جو لوگ اتمامِ حجت کے بعد بھی حق کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہوں اور اپنے اغراض کے لیے خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے ہی پر تلے ہوں ان کو طاقت کے ذریعہ سے زیر کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہ سنت رہی ہے کہ جب اس نے کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجا تو اتمامِ حجت کے بعد اس کو دو صورتوں میں سے کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیش آئی۔ اگر اس کے اندر رسول پر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہوئی، اکثریت کفر پر جمے رہ جانے والوں ہی کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے کوئی ارضی و سماوی عذاب بھیج کر کفار کو تباہ کر دیا اور اپنے باایمان بندوں کو ان کے اندر سے نکال لیا اور اگر اس کے اندر ایمان لانے والوں کی تعداد بھی معتدبہ ہوئی تو رسول اور اس کے ساتھیوں کو کفار سے جہاد بالسیف کا حکم دیا گیا جس کے نتیجہ میں بالآخر کفار کا استیصال ہو گیا۔ قرآن مجید میں رسولوں کی جو تاریخ بیان ہوئی ہے وہ اس سنتِ الٰہی پر شاہد ہے اور ہم جگہ جگہ اس کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔

ہر خیر کا منبع اللہ ہے

لوہا اگرچہ نکلتا زمین ہی سے ہے لیکن اس کے لیے لفظ 'اَنۡزَلۡنَا' استعمال ہوا ہے۔ یہ اسی طرح کا استعمال ہے جس طرح چوپایوں کے پیدا کیے جانے کے لیے یہ لفظ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ مقصود اس سے ایک طرف تو اس عنایتِ خاص کی طرف توجہ دلانا ہے جو اس کے اندر انسانوں کی بہبود کے لیے مضمر ہے۔ دوسری طرف یہ لفظ ہر چیز کے اصل منبع و مصدر کا سراغ دیتا ہے کہ کوئی چیز کہیں سے حاصل ہو لیکن حقیقت میں وہ نازل خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ جب تک انسان کی نظر اس پہلو پر نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

ایک نکتہ

اس ٹکڑے میں یہ چیز بھی قابلِ توجہ ہے کہ لفظ 'بَاْس' مقدم ہے لفظ 'مَنَافِع' پر۔ جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوہے کی اصل افادیت جہاد کی قوت فراہم کرنا ہے۔ اس کے دوسرے تعمیری و تمدنی فوائد مزید برآں اور ضمنی ہیں۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہاں لوہے کا ذکر اصل ابتدائی ذریعۂ جنگ کی حیثیت سے

کیا ہے۔ اس زمانے میں بیشتر اسلحۂ جنگ اسی سے بنتے تھے۔ اب لوہے کی حیثیت ثانوی رہ گئی ہے، اصل اہمیت دوسری چیزوں کو حاصل ہو گئی ہے۔ حالات کی تبدیلی سے ان دوسری چیزوں کو اب وہی اہمیت حاصل ہو جائے گی جو پہلے لوہے کو حاصل تھی۔

جہاد کی حکمت

'وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ' یہ جہاد کی حکمت واضح فرمائی کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ خود قوی اور غالب ہے، وہ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو چشم زدن میں شکست دے سکتا ہے لیکن اس جہاد کے ذریعے سے وہ اپنے بندوں کا امتحان کرتا ہے کہ کون غیب میں ہوتے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے اور کون محض دکھاوے کا مجنوں ہے جو امتحان میں پھسڈی ثابت ہوتا ہے۔ 'عَلِمَ یَعْلَمُ' کے معنی کی وضاحت ہم کر چکے ہیں کہ یہ ممیز کر دینے کے معنی میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا تو سب کچھ ہے لیکن اس طرح کے امتحان کے ذریعہ سے وہ جھوٹے اور سچے میں امتیاز بھی کرا دیتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۲۶)

تاریخ انبیاء کا حوالہ

یہ تمام انبیاء کی تاریخ کا حوالہ ہے کہ اللہ نے جتنے نبی اور رسول بھی بھیجے اسی مقصد سے بھیجے کہ وہ لوگوں کو عدل و قسط کے قیام کی دعوت دیں لیکن ان کی ذریت میں سے تھوڑے ایسے نکلے جو اس مقصد پر استوار رہے، اکثریت اپنی بدعت پسندیوں کے سبب سے اس نصب العین سے منحرف ہو کر نافرمان بن گئی۔

رسولوں میں سے یہاں نام کی تصریح کے ساتھ صرف دو رسولوں ــــ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام ــــ کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی حیثیت آدم ثانی کی ہے اور بنی اسرائیل و بنی اسماعیل میں جو انبیاء آئے ان کے ابوالآباء حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ان دو کا ذکر ہو گیا تو گویا نبوت کے تمام سلسلوں کا ذکر ہو گیا۔ یہ آیت تمہید ہے اس مضمون کی جو آگے آ رہا ہے۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ڏ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۲۷)

رہبانیت دین میں کس طرح گھسی؟

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب تمام انبیاء کا طریقہ وہی رہا ہے جو اوپر بیان ہوا تو دین میں رہبانیت کی بدعت اور جہاد کو خلاف دینداری قرار دینے کی ضلالت کہاں سے اور کس طرح گھسی؟ فرمایا کہ نوح

اور ابراہیمؑ کے بعد جتنے نبی بھی ہم نے بھیجے انہی کے نقش قدم پر بھیجے یعنی سب نے لوگوں کو نقطۂ عدل پر استوار رہنے کی دعوت دی اور اگر ضرورت داعی ہوئی تو انھوں نے قیام قسط کے لیے سنت انبیاء کے مطابق جہاد بھی کیا۔ ان میں سے کسی رسول کا عمل بھی اس طریقہ کے خلاف نہیں ہوا۔ ٹھیک اسی مقصد کے لیے عیسیٰ ابن مریمؑ کی بھی بعثت ہوئی اور ان کو انجیل عطا کی گئی۔ وہ لوگوں کو رہبانیت کی تعلیم دینے کے لیے نہیں بھیجے گئے تھے۔ بس یہ بات تھی کہ ان کے پیرؤوں میں رافت و رحمت کا جذبہ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر رکھا تھا۔ اسی کا سہارا لے کر بعد کے مبتدعین نے رہبانیت کا ایک نظام کھڑا کر دیا حالانکہ ان پر رہبانیت نہیں فرض کی گئی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی فرض کی گئی تھی لیکن انھوں نے اس کے حدود ملحوظ نہیں رکھے بلکہ فطرت و شریعت کے حدود توڑ کر بالکل دوسری وادیوں میں بھٹک گئے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ دین میں رہبانیت کی بدعت داخل تو ہوئی ہے نصاریٰ کے ذریعہ سے لیکن اس میں سیدنا مسیحؑ کی تعلیم یا انجیل یا ان کے اصل خلفاء کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر بعد کے مبتدعین کی ایجاد ہے۔

وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ رَاْفَۃً وَّرَحْمَۃً۔ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اولین پیرؤوں کی تعریف فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رافت و رحمت رکھی تھی۔ اس تعریف سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ ان کے یہی بہترین انسانی اوصاف بعد والوں کے لیے رہبانیت کی دلیل بن گئے حالانکہ رافت و رحمت کی تعلیم جس طرح سیدنا مسیح علیہ السلام نے دی ہے اسی طرح اللہ کے ہر نبی و رسول نے دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے کہ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (التوبۃ - ۹ : ۱۲۸) (وہ تمھاری ہدایت کا حریص اور مومنین کے لیے نہایت شفیق و مہربان ہے) خود مسلمانوں کے باب میں رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ (آپس میں رحم دل ہیں) کے الفاظ وارد ہوتے ہیں۔ احادیث میں مسلمانوں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں وہ ان سے زیادہ واضح ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ اہل ایمان باہمی ہمدردی و دردمندی میں اس طرح ہیں جس طرح ایک جسم کے اعضا باہدگر ہوتے ہیں۔ سعدی نے ایک حدیث ہی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ ع

چو عضوے بدرد آورد روزگار دگر عضوہا را نماند قرار

رافت و رحمت عدل و قسط کے منافی نہیں ہے بلکہ اس کا اولین تقاضا عدل و قسط کا قیام ہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں قیامت کو، جو عدل کامل کے ظہور کا دن ہے، اپنی صفت رحمت ہی کا ایک لازمی نتیجہ قرار دیا ہے: کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ (الانعام - ۶ : ۱۲) (اللہ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے، وہ تمھیں قیامت کے دن کے لیے ضرور جمع کر کے رہے گا) سیدنا مسیح علیہ السلام کے پیرؤوں کو چونکہ آپ کی زندگی میں جہاد کا موقع

نہیں ملا اس وجہ سے بعد والوں نے ان کی رافت و رحمت کو رہبانیت کی دلیل بنا لیا۔ حالانکہ انھیں جہاد کا موقع ملا ہوتا جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو اس کی سعادت حاصل ہوئی، تو وہ بھی اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ کی تصویر ہوتے۔[1]

'وَرَهْبَانِیَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا کَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا' یعنی ان کے دلوں میں رافت و رحمت تو ہم نے ضرور رکھی لیکن اس کی آڑ میں یہ رہبانیت جو بعد والوں نے ایجاد کی اس کو مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے 'رَهْبَانِیَّةَ'، 'جَعَلْنَا' کے تحت نہیں ہے۔ اس کا نصب ایک فعل مضمر کے زیر اثر ہے جس کی وضاحت بعد کے فعل 'اِبْتَدَعُوْهَا' سے ہو رہی ہے۔ البتہ یہاں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رہبانیت کی ایجاد ہوئی تو ایک اچھے محرک سے لیکن ہے یہ خدا کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز، جن لوگوں نے یہ راہ اختیار کی وہ ایک اچھے محرک کے باوجود اپنی بدعت پسندی، غلو اور تشدد کے باعث بالکل غلط راہ پر جا پڑے۔ | رہبانیت بدعت ہے

'مَا کَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ' یعنی یہ رہبانیت جو انھوں نے اپنے اوپر لادی یہ ہماری فرض کردہ نہیں ہے بلکہ یہ ان کی اپنی ایجاد کردہ ہے۔ ہم نے ان پر جو چیز فرض کی تھی وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی کی جد و جہد تھی۔ اگر یہ رہبانیت اسی حد تک ہوتی تو ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں باعث خیر و برکت ہوتی لیکن انھوں نے اس کے حدود ملحوظ نہیں رکھے۔

'فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا' میں ضمیر مؤنث کا مرجع ظاہر ہے کہ 'رَهْبَانِیَّةً' ہی ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رہبانیت کے معاملے میں نصاریٰ کی اصل غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اس کے حدود کما حقہٗ ملحوظ نہیں رکھے جس کے سبب سے اس میں فطرت اور عقل کے خلاف باتیں داخل ہو گئیں۔ اگر وہ اس کے حدود ملحوظ رکھتے تو ابتغاء رضوان اللہ کے نصب العین سے یہ متجاوز نہ ہوتی اور یہ چیز ایسی ہے جو تمام انبیاء اور تمام آسمانی صحیفوں کی تعلیم میں مشترک ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد اور جنگ و قتال اس رہبانیت کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت سورۂ توبہ میں یوں فرمائی گئی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ	اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جانیں اور ان
اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط	کے مال جنت کے عوض میں خرید لیے ہیں۔ وہ

---

[1] جہاد کے باب میں سنت الٰہی کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط (التوبۃ - ۹ : ۱۱۱)

اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ یہ اللہ کے ذمہ قطعی وعدہ ہے، تورات، انجیل اور قرآن سب میں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رضا طلبی کے لیے جنگ و قتال تمام انبیاء اور تمام آسمانی صحیفوں کی مشترک تعلیم ہے۔ یہی تعلیم نصاریٰ کو انجیل میں بھی دی گئی تھی اس لیے کہ انجیل میں درباب احکام تورات کی پوری پابندی کی بار بار تاکید کی گئی ہے لیکن انھوں نے ایک ایسی رہبانیت ایجاد کر لی جس میں یہ اصل نصب العین غائب ہو گیا۔

یہاں ایک اور حقیقت بھی ذہن میں از سر نو تازہ کر لیجیے جس کی طرف سورۂ توبہ کی تفسیر میں لفظ 'سائحون' کے تحت[1] ہم توجہ دلا چکے ہیں کہ رہبانیت اور سیاحت وغیرہ کے باب میں ہمارے ہاں منفی اور مثبت دونوں ہی طرح کی باتیں ملتی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بجائے خود مطعون چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان میں خرابی ان کے حدود کی حفاظت نہ کرنے کے سبب سے پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن نے 'فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ اسلام نے سیاحت و رہبانیت کے وہ تمام اجزاء اپنے نظام میں داخل کر لیے ہیں جو فطرت کے موافق اور ابتغائے رضوان اللہ کے نصب العین سے ہم آہنگ ہیں البتہ وہ چیزیں اپنے نظام سے خارج کر دی ہیں جو مبتدعین نے عقل و فطرت کے خلاف ایجاد کی ہیں۔ اسلام کے نظام عبادت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ نماز، روزہ، حج، انفاق ہر عبادت کے اندر رہبانیت کے صالح اجزاء موجود ہیں۔ یہاں تک کہ بعض احادیث میں جہاد کو بھی رہبانیت کہا گیا ہے۔

سچے نصاریٰ کی تعریف

'فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ' قرینہ دلیل ہے کہ فعل 'اٰمَنُوْا' یہاں اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی حضرت مسیح کے نام لیواؤں میں سے جو لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم پر استوار اور ثابت قدم رہے ان کو تو ہم نے ان کے حصہ کا وہ اجر دیا جس کے وہ سزاوار ٹھہرے لیکن ان کی اکثریت نافرمان ہی نکلی جو اپنے کیفر کردار کو پہنچی۔ یہاں 'لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' سے مراد ظاہر ہے کہ حضرت مسیح کے سچے خلیفہ شمعون اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے نصاریٰ ہیں جو ہر قسم کے مخالف حالات کے باوجود اصل دین پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ جب اسلام کی دعوت بلند ہوئی تو یہی بقیۃ السلف کے صالحین تھے جنھوں نے نہایت دلی جوش

---

[1] یہ لفظ ہم نے یہاں معروف لغوی معنی میں نہیں بلکہ اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے۔

کے ساتھ اس دعوت کا خیر مقدم کیا۔ قرآن نے متعدد مقامات پر نہایت شاندار الفاظ میں ان لوگوں کی حق پرستی کی تعریف کی ہے۔

'وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ' سے اشارہ پال اور اس کے پیروؤں کی طرف ہے جنھوں نے تثلیث اور رہبانیت کی بدعتیں ایجاد کر کے دینِ مسیحی کا حلیہ بگاڑا اور رومیوں کی تمام ضلالتیں اپنے دین میں گھسا دیں۔ بعد میں منافقین و مضلّین کے اسی گروہ کو اکثریت حاصل ہو گئی یہاں تک کہ اصل نصرانیت کے جاننے اور ماننے والے بہت تھوڑے رہ گئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِن رَّحْمَتِهِ وَيَجْعَل لَّكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۲۸)

سچے نصاریٰ کو دعوتِ ایمان

یہاں 'الَّذِينَ آمَنُوا' سے خطاب انہی نصاریٰ سے ہے جن کا ذکر اوپر والی آیت میں 'فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ جب بات ان کے ذکر تک پہنچ گئی تو انہی کے حوالہ سے ان نصاریٰ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دے دی گئی جن کے اندر ایمان کی رمق موجود تھی۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے لوگو جو ایمان لائے (یعنی مسیحؑ پر ایمان لائے) اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ تو خدا تم کو اپنی رحمت میں سے دو حصے دے گا اور تمھارے لیے ایک نور نمایاں فرمائے گا جس کو لے کر تم آخرت میں چلو گے اور اللہ تمھاری مغفرت فرمائے گا وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔

سورۂ مائدہ میں نصاریٰ کے ایک گروہ کی تعریف ان الفاظ میں آئی ہے:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً	تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت
لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ	یہود اور مشرکینِ قریش کو پاؤ گے اور اہلِ ایمان کی
أَشْرَكُوا ۖ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم	دوستی میں سب سے زیادہ قریب ان لوگوں کو پاؤ گے
مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ	جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ بات اس وجہ سے
قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ	ہے کہ ان کے اندر علماء اور راہب موجود ہیں اور
بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا	یہ لوگ استکبار میں مبتلا نہیں ہیں۔ یہ لوگ جب
وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَإِذَا	اس کلام کو سنتے ہیں [illegible] گیا ہے تو اس
سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ	حق کو پہچان لینے کے سبب سے جو اس کے اندر
تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ	موجود ہے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو
مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ	جاتی ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے رب، ہم
رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝	ایمان لائے تو ہمیں آخری رسول کی گواہی دینے

(المائدۃ - ۵: ۸۲ - ۸۳) والوں میں لکھ۔

آیت زیر بحث میں ان تمام نصاریٰ کو جن کے اندر ایمانِ سابق کی رمق باقی ہے نبی امی پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اس کے اس رسول پر ایمان لاؤ جس کی بشارت دینے پر تم مامور کیے گئے تھے۔ اللہ سے ڈرنے کی تنبیہ اس لیے فرمائی گئی ہے کہ بہت سے نصاریٰ یہ سمجھتے تو تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی امی ہیں جن کی پیشین گوئی انجیل میں وارد ہے لیکن اسلام کے خلاف خاکبازی کرنے والوں سے یہ لوگ ڈرتے تھے کہ اگر انھوں نے اس حق کا اعتراف کر لیا تو یہ سارے لوگ ان کے دشمن بن جائیں گے۔ ان کے اس اندیشے کی بنا پر تنبیہ فرمایا کہ لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف اللہ سے ڈرو۔ لوگوں کے ڈر سے تم نے اللہ کے ڈر کو نظر انداز کر دیا تو اس کے انجام کو اچھی طرح سوچ لو۔

دُہرے اجر کا وعدہ

'یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِہٖ'۔ یہ اس وعدے کا اعادہ ہے جو سچے اور راست باز اہل کتاب کے لیے سورۂ قصص میں مذکور ہوا ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے کہ اہل کتاب میں سے جو اپنے دین پر بھی استوار رہے اور جب ان کے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کے مطابق ان کے پاس اللہ کا آخری رسول آیا تو انھوں نے اس کے موعود اور برحق ہونے کی بھی گواہی دی تو ان کو ان کا اجر دہرا ملے گا اس لیے کہ انھیں حق کی گواہی دینے کے لیے دو کڑے امتحانوں سے گزرنا پڑا اور وہ دونوں امتحانوں میں کامیاب رہے۔ فرمایا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰہُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِہٖ ہُمْ بِہٖ یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا یُتْلٰی عَلَیْہِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِہٖٓ اِنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلِہٖ مُسْلِمِیْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَہُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰہُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝

(القصص - ۲۸: ۵۲-۵۴)

جن کو ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب عطا فرمائی وہی اس (قرآن) پر ایمان لانے والے بنیں گے۔ اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔ بے شک یہ ہمارے رب ہی کی طرف سے ہے اور ہم پہلے سے اس کے ماننے والے رہے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن کو ان کا اجر دو مرتبہ ملے گا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور (لوگوں کی) ایذا رسانیوں کو اچھے سلوک سے دفع کرتے اور ہمارے بخشے ہوئے رزق میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہے۔

سورۂ قصص کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ 'اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰہُمُ الْکِتٰبَ' سے اچھے اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جس کی حق دوستی اور خشیت رب کا ذکر

سورۂ مائدہ کی محولہ بالا آیت میں ہوا۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ اہل کتاب کے صالحین کو دہرا اجر پانے کا یہ شرف اس بنا پر نہیں حاصل ہوگا کہ وہ اہل کتاب میں سے ہیں بلکہ اس وجہ سے ہوگا کہ انھوں نے اس حق کی بھی گواہی دی جو حضرت مسیح علیہ السلام اور سابق نبیوں پر نازل ہوا اور اس حق کی بھی شہادت دی جو نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ یہ امت چونکہ اس تمام حق کی بلاکسی تفریق و تحزب کے گواہی دینے والی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے، خواہ وہ سابق انبیائے کرام پر نازل ہوا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اس وجہ سے یہ دہرا اجر پانے کی حق دار ہے۔ چنانچہ جو لوگ بھی اس امت میں داخل ہوں گے وہ اس شرف سے بہرہ مند ہوں گے۔ احادیث میں اس کی وضاحت ہوئی ہے لیکن اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس وجہ سے ہم زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ: یہ اسی طرح کی بشارت ہے جس طرح کی بشارت اسی سورہ کی آیت ۱۲ میں بدیں الفاظ گزر چکی ہے: يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُورُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (جس دن تم مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں چل رہا ہوگا) وہی بشارت ان صالحین کو بھی دی گئی ہے کہ ان کو اللہ نے ایمان کی جو روشنی دی تھی اس کی انھوں نے حفاظت کی، اس سے خود بھی رہنمائی حاصل کی اور اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی راہ دکھائی۔ اس کے صلے میں ان کو آخرت میں ایک نور عطا ہوگا جس کو اس دن کے اندھیرے میں یہ لے کر چلیں گے اور وہ سارے لوگ اس سے کسب نور کریں گے جنھوں نے دنیا میں ان کا ساتھ دیا ہوگا۔

لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُونَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۲۹)

یہود کے حسد کی طرف اشارہ

یہ ان لوگوں کو ابھارا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے اس فضل عظیم کے حاصل کرنے کے لیے سبقت کرو اور حاسد یہود کو چھوڑو، وہ نبی امی اور ان پر ایمان لانے والوں کے خلاف حسد کی جس آگ میں جل رہے ہیں اسی میں جلتے رہیں۔ ان کے اس حسد کا سبب ان کی یہ جہالت ہے کہ وہ اللہ کے تمام فضل کا اجارہ دار اپنے کو سمجھتے ہیں۔ ان پر یہ حقیقت واضح نہیں ہوئی کہ اللہ کے فضل کے مالک وہ نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل کا مالک خود ہے۔ وہ اس کو بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہ بڑے فضل والا ہے، جس کو چاہے بخش دے۔

'اَهْلُ الْكِتٰبِ' اگرچہ باعتبار الفاظ عام ہے، یہود و نصاریٰ دونوں ہی اس سے مراد ہو سکتے ہیں۔ لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اس سے مراد یہود من حیث الجماعت ہیں اس لیے کہ وہی

اللہ تعالیٰ کے تمام فضل و انعام کے وارث و مورث ہونے کے خبط میں مبتلا تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ ان سے باہر نہ کسی کو نبوّت و رسالت مل سکتی اور نہ ان کے سوا کوئی خدا کے ہاں کسی اجر اور فضل کا حق دار ہے چنانچہ اپنے اسی پندار کے سبب سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے رسالت کے شدید مخالف تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی مخالفت کے علی الرغم یہ دعوت برابر بڑھتی جا رہی ہے یہاں تک کہ ان کی اپنی صفوں کے اندر سے بھی بہت سے اخیار ٹوٹ کر اس کے جاں نثار بنتے جا رہے ہیں تو ان پر حسد کا ایسا بخار چڑھا کہ بالآخر وہ ان کو ہلاک کر کے ہی اترا۔ اس حسد کے اسباب اور اس کے اثرات و نتائج پوری تفصیل سے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان ہو چکے ہیں۔

لِّئَلَّا يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتٰبِ ..... الاٰیۃ' سے مراد یہاں یہود کی اس جہالت و حماقت کے لازمی نتیجہ یعنی برابر مبتلائے حسد رہنے کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس حسد میں اس وجہ سے مبتلا تھے کہ وہ اپنے کو اللہ کے تمام فضل و انعام کا پشتینی حق دار اور اجارہ دار سمجھے بیٹھے تھے۔ اگر وہ اس حماقت میں مبتلا نہ ہوتے بلکہ اس حقیقت کو جانتے ہوتے کہ نبوّت و رسالت اور سیادت و امامت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، وہ جس کو چاہے بخشے تو ان کے لیے کسی غصہ اور حسد میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ سمجھ سکتے تھے کہ اب تک اللہ نے اس منصب پر ان کو سرفراز رکھا، اب اگر وہ اس کے لیے کسی دوسرے کو منتخب کر رہا ہے تو کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا اور ان کی سعادت اب حسد اور مخالفت میں نہیں بلکہ اپنے رب کے فیصلہ کو قبول کر لینے میں ہے لیکن وہ برابر اپنے اسی خبط میں مبتلا رہے جس میں مبتلا تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ وہ جس حسد و بغض کی آگ میں جل رہے تھے وہ برابر تیز سے تیز تر ہی ہوتی گئی۔ گویا اصل بات جو یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت کے ساتھ فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان لانے والے اللہ کے آخری رسول پر ایمان لا کر اپنے کو دہرے اجر کا حق دار بنائیں اور ان حاسد یہودیوں کو ان کے حال پر چھوڑیں، وہ برابر اپنے حسد کی آگ میں جلتے رہیں۔ اس بات کے بیان کرنے کے لیے اسلوب یہ اختیار فرمایا گیا ہے کہ یوں کہنے کے بجائے کہ ان یہودیوں کو ان کے حسد میں جلنے مرنے دو، تم اپنے آپ کو اپنے رب کے دہرے اجر کا حق دار بناؤ، بات یوں فرمائی گئی کہ یہود کو ان کی اس جہالت میں مبتلا رہنے دو کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی تمام سرفرازیوں کا حق دار سمجھتے ہیں حالانکہ یہ محض ان کی حماقت ہے اور یہی حماقت ان کے سارے رنج و حسد کا سبب ہے۔

اس اسلوب میں بات کہنے کا فائدہ یہ ہوا کہ یہود کی اصل بیماری بھی واضح ہو گئی اور اس کا اصل سبب بھی معلوم ہو گیا اور کلام میں کوئی تلخی بھی پیدا نہیں ہونے پائی۔

اس سورہ کی ان آخری آیات کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ اگر ان

کے اقوال نقل کر کے ہم ان پر تنقید کرتے تو اس میں بڑی طوالت ہوتی جس کا کچھ خاص فائدہ نہیں تھا۔ اس وجہ سے زبان، نظام اور نظائرِ قرآن کی روشنی میں ہمارے نزدیک جو تاویل صحیح ہے وہ ہم نے بیان کر دی ہے۔ امید ہے کہ تدبر کرنے والوں کو اس سے اطمینان ہو جائے گا۔

یہاں خاص طور پر زبان اور اسلوب سے متعلق دو باتیں پیش نظر رکھیے:

زبان کا ایک اسلوب

ایک یہ کہ بعض مرتبہ کلام میں مدنظر ظاہر کلام نہیں بلکہ اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ جو فرمایا کہ 'تاکہ اہل کتاب نہ جانیں کہ وہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتے'، تو مقصود اس سے اس کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی اس جہالت کے لازمی نتیجہ یعنی فضل والوں پر حسد میں مرتے رہیں۔

دوسری یہ کہ حرف 'لا' نہ یہاں زائد ہے اور نہ قرآن میں اس کے زائد ہونے کی کوئی مثال موجود ہے بلکہ جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، یہ ان حروف میں سے ہے جن کو زائد ماننے کی گنجائش کسی شکل میں نہیں ہے۔ ورنہ اس سے مفسدین اور اہل بدعت کے لیے دین میں فتنے پیدا کرنے کی راہیں کھل جائیں گی البتہ کبھی کبھی بنظر احتیاط تاکید کے لیے یہ دہرا دیا جاتا ہے اور یہ بات زبان کے معروف قاعدے کے مطابق ہوتی ہے جس کی مثالیں قرآن اور کلامِ عرب میں بہت ہیں، مثلاً 'مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ' (الاعراف ۷: ۱۲) یا 'وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ' (الانبیاء ۲۱: ۹۵) وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد
۱۵- دسمبر ۱۹۷۷ء
۴- محرم الحرام ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۵۸

المجادلة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

سابق سورہ کا خاتمہ اہل کتاب کے اس اعتراض کے جواب پر ہوا ہے جو انھوں نے جہاد کے خلاف اٹھایا۔ اس اعتراض سے تعرض کی ضرورت ظاہر ہے کہ اس وجہ سے پیش آئی کہ مخالفین کے یہ اعتراضات منافقین اٹھا لیتے اور پھر ان کو چپکے چپکے مسلمانوں کے اندر پھیلانا شروع کر دیتے کہ ان کے عقیدہ کو متزلزل اور ان کے جوشِ جہاد کو سرد کریں۔ اس سورہ کے زمانۂ نزول میں معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کی یہ سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ یہ صورتِ حال داعی ہوئی کہ اس خفیہ پراپیگنڈا کا سدِّ باب کیا جائے چنانچہ اس سورہ میں منافقین کی اس طرح کی حرکتوں پر نہایت شدّت کے ساتھ گرفت بھی کی گئی اور اس کے سدِّ باب کے لیے بعض ضروری تدبیریں اختیار کرنے کی بھی مسلمانوں کو ہدایت فرمائی گئی۔ ساتھ ہی ایک نہایت مؤثر عملی مثال سے یہ سبق بھی لوگوں کو دیا گیا کہ اگر کسی کو اسلام کے سبب سے زندگی میں کوئی مشکل پیش آئے تو اس کو نہایت خلوص کے ساتھ اللہ و رسول کے سامنے عرض کرے۔ امید ہے کہ اس کی مشکل حل ہونے کی کوئی راہ اللہ تعالیٰ کھول دے گا۔ رہے وہ لوگ جو کسی فرضی یا واقعی مشکل کو بہانہ بنا کر اسلام کے خلاف پراپیگنڈے کی مہم شروع کر دیتے ہیں وہ درحقیقت اللہ اور رسول کے خلاف محاذِ جنگ کھولنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ یاد رکھیں کہ وہ ذلیل ہو کے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہے کہ غلبہ اور سرفرازی صرف اللہ اور اس کے رسولوں کے لیے ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) ایک مومنہ کے ایک واقعہ کا حوالہ جس کو دین کے معاملہ میں ایک نہایت سخت مشکل پیش آئی لیکن اس نے دین سے بدگمان و مایوس ہونے کے بجائے اپنی مشکل، نہایت خلوص و اعتماد کے ساتھ اللہ و رسول کے سامنے پیش کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مشکل حل کرنے کی راہ کھول دی اور لوگوں کے سامنے اس کے اس مومنانہ اور شائستہ طریقہ کو بطورِ مثال پیش کیا کہ دین کے سبب سے کوئی مشکل کسی کو پیش آئے تو اس کے حل کا صحیح طریقہ یہ ہے نہ کہ وہ جو منافقین نے اختیار کیا ہے کہ شریعت کی جس بات کو اپنے نفس پر گراں محسوس کرتے ہیں اس کو اللہ و رسول کے خلاف خفیہ معاندانہ پراپیگنڈے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

(۵-۸) ان لوگوں کی روش سے اظہارِ بیزاری جو اللہ و رسول پر اعتماد کرنے کے بجائے دین کے خلاف محاذ آرائی میں سرگرم تھے، برابر دین کے خلاف پراپیگنڈا اور سرگوشیاں کرتے پھرتے، رسول کی توہین کرتے اور اللہ کی ڈھیل کو اپنے رویّہ کی صحت کی دلیل سمجھے بیٹھے تھے۔ ان کو متنبہ فرمایا گیا کہ یہ دنیا میں بھی ذلیل ہوں گے جس کی شہادت تاریخ میں موجود ہے اور آخرت میں بھی ان کا حصہ جہنم ہے جو ساری کسر پوری کر دے گی۔

(۹-۱۰) مسلمانوں کو گناہ، تعدی اور رسول کے خلاف سرگوشی کی ممانعت اور نیکی و پرہیزگاری کے لیے سرگوشی کی ہدایت۔ ساتھ ہی یہ اطمینان دہانی کہ منافقین ان کے خلاف جو سرگوشیاں کرتے پھر رہے ہیں ان کو وہ خاطر میں نہ لائیں، اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کسی کی سرگوشی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اہلِ ایمان کے شایانِ شان رویّہ یہ ہے کہ اس طرح کی باتوں سے مبتلائے رنج و تشویش ہونے کے بجائے اپنے رب پر بھروسہ رکھیں۔ اللہ مفسدین کے شر سے ان کو محفوظ رکھے گا۔

(۱۱-۱۲) مجلسِ نبوی کے آداب و احترام کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت اور اس کو نجویٰ کی جگہ بنانے کی ممانعت۔ ساتھ ہی نجویٰ کی بڑھتی ہوئی بیماری کو روکنے کے لیے مجلسِ نبوی سے متعلق بعض ہنگامی احکام کا اعلان۔

(۱۳) ہنگامی ضرورت پوری ہو جانے کے بعد وقتی حکم کی منسوخی کا اعلان اور اس امر کی ہدایت کہ عبادات میں سے ان چیزوں کا خاص طور پر اہتمام کیا جائے جو اس بیماری کے سدِباب کے لیے نافع ہیں جس کے لیے ہنگامی قانون نافذ کیا گیا تھا۔

(۱۴-۲۲) منافقین کے اصل مرکزِ وفاداری کی نشان دہی کہ وہ اللہ کے مغضوب یہودیوں کے ایجنٹ ہیں۔ یہ محض اپنے قول اور اپنی قسموں کے بل پر مسلمانوں کے ساتھی بنے ہوئے ہیں، ان کے دل اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ہیں۔ یہ مال و اولاد کی محبت میں گرفتار ہیں۔ شیطان نے ان کو اللہ کے خوف اور اس کی یاد سے غافل کر دیا ہے اور یہ اس کی پارٹی میں شامل ہو کر اللہ کے رسول کے خلاف محاذ آرائی میں سرگرم ہیں۔ یہ لوگ بالآخر نامراد ہوں گے۔ اللہ کا یہ حتمی فیصلہ ہے کہ غلبہ اللہ اور اس کے رسولوں کے لیے ہے۔ سچے اہلِ ایمان صرف وہی ہیں جو اللہ و رسول کے دشمنوں سے، خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے بھائی اور اہلِ قبیلہ ہی کیوں نہ ہوں، بالکل قطعِ علائق کر لیں۔ اللہ انہی لوگوں سے راضی ہے۔ یہی اللہ کی پارٹی ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

سُوْرَةُ الْمُجَادِلَةِ (۵۸)

مَدَنِيَّةٌ ــــــــــــ آيات : ۲۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۴ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى
اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ①
اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ
اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰۗـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا
مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ② وَالَّذِيْنَ
يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ
رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۭ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ③ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ
مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ
فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۭ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ
وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ④

ترجمۂ آیات ۱-۴

اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو تم سے جھگڑ رہی تھی اپنے شوہر کے بارے میں اور شکوہ کر رہی تھی اللہ سے اور اللہ سن رہا تھا تم دونوں کی گفتگو۔ اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ۱

تم میں سے جو اپنی بیویوں سے ظہار کر بیٹھتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں بن جاتی ہیں۔ ان کی مائیں تو وہی ہوں گی جنھوں نے ان کو جنا ہے۔ البتہ اس طرح کے لوگ ایک نہایت ناگوار اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔ اور اللہ درگزر فرمانے والا اور بخشنے والا ہے۔ اور جو لوگ ظہار کر بیٹھیں اپنی بیویوں سے پھر لوٹیں اسی چیز کی طرف جس کو حرام ٹھہرایا تو ایک گردن کو آزاد کرنا ہے قبل اس کے کہ وہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ یہ بات ہے جس کی تمھیں نصیحت کی جا رہی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔ پس جس کو غلام میسر نہ آئے تو اس کے اوپر لگاتار دو مہینے کے روزے ہیں، ہاتھ لگانے سے پہلے اور جو اس کی طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اس کے ذمہ۔ یہ اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسول پر تمھارا ایمان راسخ ہو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ۲-۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُکَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ (۱)

سننا 'قبول کرنے کے معنی میں'

'قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ' کے معنی موقع کلام دلیل ہے کہ یہاں صرف سن لینے کے نہیں بلکہ قبول کر لینے کے ہیں۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے اور عربی زبان میں بھی معروف ہے۔ بلکہ ہماری زبان میں بھی 'سننا' قبول کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

'تُجَادِلُکَ' سے پہلے عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق فعل ناقص محذوف ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جن خاتون کا واقعہ یہاں مذکور ہے ان کو اپنا معاملہ پیش کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بار بار حاضر ہونا پڑا۔

مجادلہ کا مفہوم

'مُجَادلۃ' قرآن میں اچھے اور برے دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ برے معنی اس کے کٹ حجتی کرنے اور جھگڑنے کے ہیں اور اچھے معنی اس کے کسی سے اپنی بات محبت، اعتماد، حسنِ گزارش، تذلل اور اصرار کے ساتھ منوانے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ اس میں جھگڑنا تو بظاہر ہوتا ہے لیکن یہ جھگڑنا محبّت اور اعتماد کے ساتھ ہوتا ہے جس طرح چھوٹے اپنی کوئی بات اپنے کسی بڑے سے، اس کی شفقت پر اعتماد کر کے منوانے کے لیے جھگڑتے ہیں۔ اس مجادلۂ محبّت کی بہترین مثال سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا وہ مجادلہ ہے جو انھوں نے قومِ لوط کے باب میں اپنے رب سے کیا ہے اور جس کی اللہ تعالیٰ نے نہایت تعریف فرمائی ہے۔ اس کی تفصیل ہم اس کے محل میں پیش کر چکے ہیں۔ یہاں ان خاتون کے جس مجادلہ کی طرف اشارہ ہے اس کی نوعیت بالکل یہی ہے۔ اردو میں اس کا مفہوم ادا کرنے کے لیے کوئی موزوں لفظ سمجھ میں نہیں آیا اس وجہ سے میں نے ترجمہ جھگڑنا ہی کیا ہے لیکن یہ جھگڑنا خاص مفہوم میں ہے اور اس مفہوم میں یہ لفظ اردو میں بھی مستعمل ہے بشرطیکہ آدمی موقع و محل کو ملحوظ رکھ سکے۔

جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کی نوعیت

آیت میں جن خاتون کی طرف اشارہ ہے روایات میں ان کا نام خولہ بنت ثعلبہؓ آیا ہے۔ ان کے شوہر اوس بن صامتؓ انصاری تھے۔ ایک مرتبہ غصہ میں آ کر وہ بیوی کو کہہ بیٹھے کہ اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ (اب تجھ کو کبھی ہاتھ لگایا تو گویا اپنی ماں کی پیٹھ کو ہاتھ لگایا) زمانۂ جاہلیّت میں بیوی کو اس طرح کی بات کہہ دینے سے ایسی طلاق پڑ جاتی جس کے بعد بیوی لازماً شوہر سے جدا ہو جاتی۔ اس وجہ سے حضرت خولہؓ کو سخت پریشانی پیش آئی کہ اس عمر میں شوہر اور بچّوں سے جدا ہو کر کہاں جائیں! بالآخر انھوں نے معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا اور باصرار و بالحاح آپ سے درخواست کی کہ آپ ان کی اس پریشانی کا کوئی حل بتائیں۔ آپ کے سامنے وحیِ الٰہی کی کوئی واضح رہنمائی اس بارے میں موجود نہیں تھی اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جواب میں کچھ توقّف فرمایا جس کے سبب سے ان کو بار بار اپنے معاملے کی طرف حضورؐ کو توجہ دلانی پڑی۔

الفاظِ قرآن سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ انھوں نے اس معاملے میں اپنے شوہر کی بھی کچھ مدافعت کی۔ حضرت اوسؓ کے مزاج میں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، کچھ تیزی تھی جس کے سبب سے غصہ میں ان کی زبان سے ایک ناروا فقرہ نکل گیا۔ مقصد ہرگز بیوی کو طلاق دینا نہیں تھا اس وجہ سے میاں بیوی دونوں کو سخت پریشانی پیش آئی۔ حضرت خولہؓ نے یہ صورتِ حال بھی حضورؐ کے سامنے رکھی ہو گی تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ فقرہ کہتے ہوئے ان کے شوہر کے ذہن میں طلاق کا کوئی خیال موجود نہ تھا محض اشتعال میں ایک فقرہ بلاقصد ان کی زبان سے نکل گیا۔

ایک سوال کا جواب

ظہار کا ذکر سورۂ احزاب میں بھی آیا ہے لیکن بالکل ضمناً صرف اتنا آیا ہے کہ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ (الاحزاب - ۳۳ : ۴) (اور تمہاری وہ بیویاں جن سے تم ظہار کرتے ہو خدا نے ان کو تمہاری مائیں نہیں بنایا ہے) لیکن اوّل تو یہ ضروری نہیں کہ سورۂ احزاب سورۂ مجادلہ سے پہلے نازل ہوئی ہو۔ دوسرے نازل ہوئی بھی ہو تو اس سے صرف اتنی ہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ظہار سے کسی کی بیوی اس کی ماں نہیں بن جاتی۔ یہ نہیں واضح ہوتا کہ کوئی شخص یہ حرکت کر بیٹھے تو اس سے اس کے اوپر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اس کی تلافی کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس وجہ سے حضورؐ کے سامنے سورۂ احزاب والی آیت رہی بھی ہو جب بھی آپ حضرت خولہؓ کے معاملے میں کوئی قطعی فیصلہ اسی صورت میں فرما سکتے تھے جب وحیِ الٰہی آپ کی رہنمائی فرمائے۔ چنانچہ آپ نے وحیِ الٰہی کے انتظار میں توقف فرمایا یہاں تک کہ ان خاتون کے اس شکوہ و مجادلہ کی برکت سے نہ صرف ان کے لیے بلکہ اللہ کے بے شمار بندوں اور بندیوں کے لیے جاہلیت کی ایک بے ہودہ رسم کے عواقب سے چھوٹنے کی ایک نہایت مبارک راہ کھل گئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرما کر ان کو اور ان کے اس مجادلہ کو زندۂ جاوید بنا دیا اور لوگوں کو سبق دیا کہ جن کو دین کے معاملے میں کوئی مشکل پیش آئے انھیں اس مومنہ خاتون کی طرح اپنی مشکل اپنے رب کے آگے پیش کرنی چاہیے، منافقوں کی طرح اس کو نکتہ چینی، سرگوشی اور اللہ و رسول کے خلاف محاذ آرائی (محادّہ) کا بہانہ نہیں بنا لینا چاہیے۔

ہر مشکل کی کلید اللہ تعالیٰ سے استعانت ہے

'وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا' یعنی یہ شکوہ و مجادلہ چونکہ خاص اللہ تعالیٰ ہی سے تھا اس وجہ سے وہ خاص توجہ و مہربانی سے اس کو سنتا رہا۔ چنانچہ اس نے اپنی اس بندی کی مشکل حل کرنے کی راہ کھول دی۔ اس سے یہ بات نکلی کہ جو لوگ اپنی کوئی مشکل اپنے رب سے عرض کرتے ہیں وہ اطمینان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو نہایت توجہ و شفقت سے سنتا ہے۔ وہ سمیع و بصیر ہے اور جب وہ سنتا ہے اور ہر چیز کی قدرت بھی رکھتا ہے تو بندہ اس سے مایوس و بدگمان کیوں ہو!

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ دنیوی و مادی مشکلات کی طرح روحانی و عقلی الجھنوں سے نکلنے کی بھی سب سے زیادہ کامیاب راہ یہی ہے کہ آدمی اس کو اپنے رب کے آگے پیش کرے۔ بسا اوقات کوئی ایسی علمی و عقلی مشکل پیش آ جاتی ہے جس کا حل کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور اس سے دین کے معاملے میں شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح کے حالات میں آدمی اگر اپنی مشکل اپنے رب کے آگے پیش کرے اور اس سے ہدایت کا طالب ہو تو ان شاء اللہ اس کو شرحِ صدر حاصل ہو جائے گا بشرطیکہ آدمی صبر کے ساتھ اپنے رب سے استعانت کرے۔ طالبینِ حق کا طریقہ ہمیشہ یہی رہا ہے لیکن جو لوگ سفلہ اور جلد باز ہوتے ہیں وہ یہ راہ اختیار کرنے کے بجائے یا تو اپنے اوہام و شکوک ہی کو دین بنا لیتے

ہیں یا ان کو دین پر نکتہ چینی کا ذریعہ بنا کر اس کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ وہی نکلتا ہے جس کا ذکر اسی سورہ میں آگے تفصیل سے آئے گا۔

اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (۲)

ظہار اور اس کا شرعی حکم

اس سلسلہ میں پہلی اصولی بات یہ فرمائی کہ جو لوگ اپنی بیویوں کو اس طرح کی کوئی بات کہہ بیٹھتے ہیں اس سے ان کی بیویاں ان کی ماؤں کے حکم میں نہیں داخل ہو جاتیں۔ ان کی مائیں تو وہی ہیں جنھوں نے ان کو جنا ہے۔ ان کو جو حرمت حاصل ہوتی ہے وہ جننے کے تعلق سے حاصل ہوتی ہے جو ایک فطری اور ابدی حرمت ہے۔ یہ چیز کسی دوسری عورت کو مجرد اس بنیاد پر نہیں حاصل ہو جائے گی کہ ایک شخص نے اس کو یا اس کے کسی عضو کو اپنی ماں یا اس کے کسی عضو سے تشبیہ دے دی۔ اس طرح کی بات کسی نے کہی ہے تو اس کی بات بھونڈی اور جھوٹی ہے جس پر وہ تنبیہ و تادیب کا مستحق ضرور ہے لیکن اس سے اس کی بیوی اس پر حرام نہیں ہو جائے گی۔

'وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ'۔ یعنی اس طرح کی منکر اور خلافِ حقیقت بات اشتعال میں آکر کوئی مسلمان اپنے منہ سے نکال بیٹھا پھر اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو اللہ تعالیٰ درگزر فرمانے والا اور معاف کرنے والا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی چونکہ غلطی کے مرتکب کو اپنی غلطی کا پورا پورا احساس ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس سے درگزر فرمایا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جاہلیت میں عربوں نے جس طرح منہ بولے بیٹوں کو بالکل صُلبی بیٹوں کا درجہ دے رکھا تھا اسی طرح ظہار کے معاملے میں بھی ان کا رویّہ نہایت متشددانہ تھا۔ کوئی شخص اپنی بیوی کو اس طرح کی بات کہہ گزرتا جس کا سوالہ اوپر گزرا تو رواجِ عام اس کی بیوی کو فی الواقع اس کی ماں ہی کی طرح حرام بنا دیتا! مجال نہیں تھی کہ کوئی شخص ظہار کے بعد بیوی سے زن و شو کا تعلق قائم کر سکے۔ کوئی اس طرح کی جسارت کرتا تو لوگ اس کو بالکل اسی نگاہ سے دیکھتے گویا اس نے اپنی ماں کو نکاح میں رکھ چھوڑا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے اس طرح کی خلافِ فطرت باتوں کی اصلاح کرتے ہوئے ہر جگہ اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ فطرت کے قانون میں جس چیز کے لیے جو جگہ ہے اس کو اسی جگہ رکھو۔ اس میں ردّ و بدل کر کے دینِ فطرت کو مسخ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ سورۂ احزاب کی تفسیر میں یہ بحث تفصیل سے گزر چکی ہے۔ یہاں بھی اس رسم بد کی اصلاح کرتے ہوئے معترضین کا منہ بند کرنے کے لیے پہلے ہی یہ بات واضح فرما دی کہ اس طرح کی ناروا باتوں سے فطرت کے قوانین نہیں بدل جاتے۔ بیوی محض کسی شخص کی ایک جھوٹی بات کی وجہ سے اس کی ماں نہیں بن جائے گی۔

ایک نحوی سوال

'مَا هُنَّ أُمَّهٰتِهِمْ' میں ایک سوال 'أُمَّهٰتِهِمْ' کے اعراب سے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس کو نصب کیوں ہے؟ میرے نزدیک یہاں 'مَا' معنی میں 'لَيْسَ' کے ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً سورۂ حاقّہ میں فرمایا ہے: 'فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ' (۴۷) (تو کوئی بھی تم میں سے اس کو بچانے والا نہیں بنے گا)۔

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۳)

ظہار کا کفارہ

یہ اس کا حل بتایا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی سے ظہار کر بیٹھے پھر وہ اس چیز کی طرف لوٹنا چاہے جس کو اس نے حرام ٹھہرایا تو اس کو اس سے پہلے کفّارہ کے طور پر ایک غلام آزاد کرنا ہو گا۔

یعنی اس کی بیوی اس کے ظہار کے سبب سے اس کی ماں کی طرح حرام تو نہیں ہو جائے گی لیکن چونکہ نکاح و طلاق کے اثرات معاشرتی زندگی پر نہایت دور رس ہوتے ہیں اس وجہ سے اس معاملے میں جدّ و ہزل دونوں ہی کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ چیز مقتضی ہے کہ ایسے شخص کو کچھ تنبیہ و تادیب کی جائے تاکہ وہ بھی آئندہ احتیاط کی روش اختیار کرے اور دوسروں کو بھی اس سے سبق حاصل ہو۔ چنانچہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کرے۔ یہاں لفظ 'رَقَبَة' آیا ہے جس کے معنی گردن کے ہیں۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ غلام یا لونڈی کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ بعض فقہاء نے تو مسلم اور غیر مسلم کی کوئی قید بھی ضروری نہیں سمجھی ہے۔ دونوں میں سے جو بھی میسر ہو اس سے کفّارہ ادا ہو جائے گا بس اتنی بات ہے کہ مسلم غلام میسر ہو تو اس کو ترجیح حاصل ہو گی۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ غلام کی آزادی کو مقدم رکھا ہے۔ اگر غلام میسر نہ آئے تو دوسری متبادل شکلیں، جو آگے مذکور ہیں، اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ اس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جس کا اظہار ہم نے سورۂ نور کی تفسیر میں کیا ہے کہ اسلام نے اپنے نظام میں غلاموں کی آزادی کی نہایت وسیع راہیں کھول دی تھیں یہاں تک کہ بہت سے چھوٹے بڑے گناہوں کا کفّارہ بھی غلام آزاد کرنا قرار دے دیا تاکہ اس مہم کو ہر پہلو سے تقویت حاصل ہو۔

منکرات کا ذکر ابہام کے ساتھ

'ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا' میں تھوڑا سا ابہام ہے۔ اس ابہام کی وجہ یہ ہے کہ جس بات کی طرف اشارہ ہے وہ بالبداہت بھی منکر ہے اور قرآن نے بھی اس کو 'مُنْكَرًا' اور 'زُوْرًا' قرار دیا ہے۔ ایک منکر بات کا ذکر صراحت کے ساتھ موزوں نہیں تھا اس وجہ سے قرآن نے مبہم الفاظ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ مطلب یہی ہے کہ ظہار کے بعد وہ پھر وہی کام کرنا چاہیں جس کو انھوں نے اپنی ماں کی حرمت کی طرح حرام ٹھہرایا تو ان کے لیے ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنے کا حکم ہے۔

اس ابہام کی وضاحت اوّل تو 'مِنْ قَبْلِ أَنْ يَّتَمَآسَّا' کے الفاظ سے بھی ہو جاتی ہے پھر بعینہٖ

یہی اسلوبِ کلام اسی سورہ کی آیت ۸ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ فرمایا ہے: ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا نُھُوْا عَنْہُ (پھر وہ کرتے ہیں وہی کام جس سے وہ روکے گئے) اسی طرح یہاں بھی اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر وہ کریں وہی کام جس سے رکنے کا انھوں نے عہد کیا یا جس کو اپنے اوپر حرام ٹھہرایا۔ 'قَالُوْا' اور 'یَقُوْلُ' وغیرہ کے الفاظ میں تقاضائے بلاغت وایجاز جو ابہام ہوا کرتا ہے اس کی ایک عمدہ مثال سورۂ مریم کی آیت ۸۰ میں بھی ہے۔ مزید وضاحت مطلوب ہو تو اس کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

'مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا' میں زور اس بات پر ہے کہ یہ کفّارہ ہاتھ لگانے سے پہلے پہلے ادا کر دیا جائے۔ آگے والی آیت میں بھی اس قید کا اعادہ ہے جس سے اس کا مؤکّد ہونا ظاہر ہوتا ہے اس وجہ سے یہ جائز نہیں ہے کہ غلبۂ نفس سے بے بس ہو کر کفّارہ ادا کرنے سے پہلے تعلق قائم کر لیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ حدود اللہ سے، جیسا کہ آگے ذکر آ رہا ہے، تجاوز ہوگا۔

تنبیہ 'ذٰلِکُمْ تُوْعَظُوْنَ بِہٖ ط وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ' یہ تنبیہ ہے کہ ان باتوں کی نصیحت تمھیں تمھارے رب کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ اگر تم نے درپردہ یا علانیہ ان کی خلاف ورزی کی تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے سارے اعمال کی خبر رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ خبر رکھتا ہے تو اس کی گرفت سے نہ بچ سکو گے۔ 'ذٰلِکُمْ' میں اشارہ ان تمام باتوں کی طرف ہے جو اوپر بیان ہوئیں۔ یعنی نہ تو ظہار کے معاملے میں جاہلیت کے رسوم پر اصرار کرو اور نہ کفّارہ سے متعلق جو ہدایت کی جا رہی ہے اس سے فرار کے لیے چور دروازے اور فقہی حیلے ایجاد کرو بلکہ ہر حکم کی تعمیل اس کی صحیح سپرٹ میں کرو۔ اسی میں دین و دنیا دونوں کی فلاح ہے۔

فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَھْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْکِیْنًا ط ذٰلِکَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ط وَتِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ ط وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۴)

یعنی غلام میسر نہ آئے تو لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے اور اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اس زمانے میں عملاً یہی دو شکلیں باقی رہیں گی اس لیے کہ غلامی ختم ہو چکی ہے اور یہ بات عین منشائے اسلام کے مطابق ہوئی ہے۔

لفظ 'مُتَتَابِعَیْنِ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر دو ماہ کے روزے تمام ہونے سے پہلے پہلے اختلاط کر لیا تو از سرِ نو پورے روزے رکھنے پڑیں گے۔

یہاں اگرچہ 'اِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْکِیْنًا' کے ساتھ 'مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا' کی قید نہیں ہے لیکن اس صورت میں بھی یہ قید مفہوم ہے۔ اس کے ذکر نہ کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ شکل اصل نہیں بلکہ اصل کی فرع ہے تو جب اصل کے ساتھ اس کا ذکر ہے تو فرع کے ساتھ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔

'ذٰلِکَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ' یہ ان ہدایات کا فائدہ بتایا ہے کہ یہ اس لیے دی گئی ہیں کہ اللہ اور

رسول پر تمہارا ایمان مستحکم ہو۔ 'لِتُؤْمِنُوْا' یہاں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق اپنے کامل معنی میں ہے جس کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ انسان اگر اپنی کسی غلطی یا کمزوری کی تلافی کے لیے کوئی مشقت اٹھاتا ہے تو اس سے اس کی غلطی کی تلافی بھی ہوتی ہے اور اصل مقصد میں اس کے قدم راسخ بھی ہوتے ہیں۔

'وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ' یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ 'ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ' کے الفاظ سے اوپر گزر چکی ہے۔ یعنی یہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود ہیں۔ ان کو توڑنے کی جسارت نہ کرنا ورنہ اس کا انجام نہایت برا ہوگا۔

'وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ' یعنی اللہ کے حدود کو توڑنے والے کافر ہیں اور ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے تو بدقسمت ہوں گے وہ لوگ جو اسلام کا دعویٰ رکھتے ہوئے اپنے کو کافروں میں شامل کرلیں۔

ظہار سے متعلق بعض اور سوالات بھی ہیں لیکن ان کا تعلق تفسیر سے نہیں بلکہ فقہ سے ہے اس وجہ سے ہم ان سے تعرض نہیں کریں گے۔ تفصیل کے طالب فقہی جزئیات کے لیے فقہ کی کتابوں کی مراجعت کریں۔

۲۔ آگے آیات ۵ - ۱۱ کا مضمون

مجادلۂ حسن کے بعد اب آگے ان لوگوں کا کردار بیان ہو رہا ہے جو 'محادّہ' یعنی اسلام دشمنی اور رسول دشمنی کے روگ میں مبتلا تھے۔ اگرچہ یہ لوگ بظاہر مسلمانوں کے اندر شامل تھے لیکن یہ ساختہ پرداختہ یہود کے تھے اور مسلمانوں کے اندر ان کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں کا مخصوص طریقۂ کار یہ تھا کہ کسی چیز کو بہانہ بنا کر اسلام اور پیغمبر کے خلاف مسلمانوں کے اندر سرگوشیاں کرتے تاکہ ان کے عقیدے کو متزلزل اور اسلام کے مستقبل سے ان کو مایوس کریں۔ یہاں ان کی انہی ریشہ دوانیوں سے پردہ اٹھایا اور ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ایک ایک سرگوشی سے اچھی طرح باخبر ہے اور بہت جلد اس کا انجام ان کے آگے آجائے گا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو ان کے شر سے محفوظ رہنے اور مجلس نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کی سرگوشیوں سے پاک رکھنے کی بعض تدبیریں بتائی گئی ہیں — آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵-۱۱

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ

عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٥﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا
أَحْصٰهُ اللّٰهُ وَنَسُوهُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿٦﴾ أَلَمْ تَرَ ع
أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَا يَكُونُ مِن
نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ
وَلَا أَدْنٰى مِن ذٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا
ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيمٌ ﴿٧﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُودُونَ
لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوٰنِ وَمَعْصِيَتِ
الرَّسُولِ وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ
وَيَقُولُونَ فِي أَنفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُولُ حَسْبُهُمْ
جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٨﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا إِذَا تَنٰجَيْتُمْ فَلَا تَتَنٰجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوٰنِ وَ
مَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَتَنٰجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ
الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٩﴾ إِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ
لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ
اللّٰهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٠﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ
اللّٰهُ لَكُمْ وَإِذَا قِيلَ انشُزُوا فَانشُزُوا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِينَ

اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾

ترجمۂ آیات ۵ - ۱۱

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف محاذ آرائی کر رہے ہیں وہ ذلیل ہوں گے جس طرح ان سے پہلے ان کے ہم مشرب ذلیل ہوئے اور ہم نے نہایت واضح تنبیہات اتار دی ہیں اور کافروں کے لیے نہایت سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اس دن کو یاد رکھیں جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا اور ان کو ان کے سارے اعمال سے آگاہ کرے گا۔ اللہ نے اس کو شمار کر رکھا ہے اور یہ لوگ اس کو بھلائے بیٹھے ہیں اور اللہ ہر چیز کے پاس حاضر ہے۔ ۵-۶

کیا سمجھتے نہیں کہ اللہ جانتا ہے اس سارے کو جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے! نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین کے درمیان مگر ان کا چوتھا اللہ ہوتا ہے اور نہ پانچ کے مابین مگر چھٹا وہ ہوتا ہے۔ اور نہ اس سے کم یا زیادہ کی مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں پھر وہ ان کو ان کے سارے کیے سے آگاہ کرے گا قیامت کے دن۔ بے شک اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔ ۷

کیا نہیں دیکھتے ان کو جو سرگوشیوں سے روکے گئے، پھر وہ وہی کام کر رہے ہیں جن سے روکے گئے اور یہ لوگ گناہ، تعدّی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو تم کو سلام کرتے ہیں ایسے لفظ سے جس سے اللہ نے تم کو سلام نہیں بھیجا اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ اللہ اس کی پاداش میں ہم کو عذاب کیوں نہیں دیتا جو ہم کہتے ہیں۔ ان کے لیے جہنم ہی کافی ہے۔ یہ

اس میں پڑیں گے۔ پس وہ برا ٹھکانا ہے۔ ۸

اے ایمان والو! جب تم سرگوشی کرو تو گناہ، تعدی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی نہ کرو بلکہ نیکی اور تقویٰ کی سرگوشی کرو اور اللہ سے ڈرو جس کے حضور میں تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے۔ ۹

یہ سرگوشیاں شیطان کی طرف سے ہیں تاکہ وہ ایمان والوں کو غم پہنچائے حالانکہ اللہ کے اذن کے بدون وہ ان کو ذرا بھی نقصان پہنچانے پر قادر نہیں۔ اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ ۱۰

اے ایمان والو، جب تم کو کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھو، اللہ تمہارے لیے کشادگی پیدا کرے گا اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ، اللہ ان لوگوں کے، جو تم میں سے اہل ایمان ہیں اور جن کو علم عطا ہوا ہے، مدارج بلند کرے گا۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ۱۱

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ كُبِتُوا كَمَا كُبِتَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ وَقَدْ أَنزَلْنَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۚ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ (۵)

'محادۃ' کا مفہوم

'مُحَادَّة' کے معنی مخالفت اور دشمنی کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ 'موادّة' کا مقابل ہے۔ اسی سورہ میں یہ دونوں لفظ ایک ہی آیت میں نہایت خوبی سے استعمال ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے مفہوم پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ فرمایا ہے: 'لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ' (۲۲) (تم کوئی ایسی قوم نہیں پا سکتے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہو پھر وہ ان لوگوں کو دوست بنائے جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہوں)۔

اوپر کے پیرے میں، جیسا کہ واضح ہوا، ان لوگوں کا کردار بیان ہوا ہے جن کو دین کے معاملے میں

کوئی مشکل پیش آتی تو وہ اس کو اللہ و رسول کے آگے ہی پیش کرتے اور اپنا شکوہ و مجادلہ اللہ و رسول ہی سے کرتے۔ اب ان کے مقابل میں یہ ان لوگوں کا کردار بیان ہو رہا ہے جو مدعی تو تھے ایمان و اسلام کے لیکن ان کا رویہ اللہ و رسول کے ساتھ مخالفت کا تھا۔ اسلام کی جو بات ان کو اپنے مفاد اور اپنی خواہشوں کے خلاف محسوس ہوتی اس کے خلاف سرگوشیوں اور خفیہ پراپیگنڈے کی مہم شروع کر دیتے تاکہ مخلص مسلمانوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے ان کے ایمان و اسلام کو بھی متزلزل کر دیں۔ ان کی ساری ہمدردیاں، جیسا کہ آگے واضح ہوگا، اسلام کے دشمنوں بالخصوص یہود کے ساتھ تھیں۔ یہ مسلمانوں کے اندر یہود کے ایجنٹ تھے اور انہی کے زیر ہدایت برابر اس کوشش میں رہتے کہ جو موقع بھی ملے اس سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت زینبؓ کے معاملے میں انھوں نے جو فتنے اٹھائے اُن کی تفصیلات سورۂ نور اور سورۂ احزاب کی تفسیر میں گزر چکی ہیں۔ ظہار کا مسئلہ بھی ان مسائل میں سے تھا جس کے بارے میں وہ قرآن کی رعایت کو نکتہ چینی کا ہدف بنا سکتے تھے جس سے سادہ لوحوں کے اندر غلط فہمیاں پھیل سکتی تھیں۔ دورِ جاہلیت میں، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، اس کو لوگوں نے طلاقِ مغلظ کا درجہ دے رکھا تھا۔ یہ اشرار آسانی سے لوگوں میں یہ سرگوشی کر سکتے تھے کہ اسلام نے نعوذ باللہ اپنے پیروؤں کے لیے ماں کے ساتھ نکاح کو بھی جائز کر دیا۔ یہ صورت متقضی تھی کہ اس موقع پر ان شریروں کو اچھی طرح بے نقاب کر دیا جائے تاکہ کوئی فتنہ اٹھانے کی کوشش وہ کریں تو اس کا سدِ باب ہو سکے۔

رسول کے مخالفین کا انجام

'کُبِتُوۡا کَمَا کُبِتَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ'۔ 'کبت' کے معنی ذلیل و خوار کر کے تباہ کرنے کے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ ذلیل و خوار ہو کر ان لوگوں کی طرح تباہ ہوں گے جس طرح ان سے پہلے ان کے ہم مشرب تباہ ہو چکے ہیں۔ 'وَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ' (اور اس دعوے کی صداقت کی نہایت واضح دلیلیں ہم قرآن میں اتار چکے ہیں)۔ یہ اشارہ ان تاریخی حقائق کی طرف ہے جو قرآن میں نہایت تفصیل سے یہ واضح کرنے کے لیے بیان ہوئے ہیں کہ اللہ کے رسولوں کی مخالفت کرنے والے بالآخر ذلیل و خوار ہو کر تباہ ہوتے ہیں۔

'وَلِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ' فرمایا کہ ان کافروں کے لیے بھی بالآخر ایک ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ یہ اشارہ ان کافروں کی طرف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں سرگرم تھے۔ فرمایا کہ یہ بھی بالآخر اسی طرح ذلیل و خوار ہوں گے جس طرح ان کے پیش رو ذلیل و خوار ہو چکے ہیں۔ جب ان کا کردار وہی ہے جو ان کا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی تاریخ ان سے مختلف ہو۔ اللہ تعالیٰ کا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔

قرآن کی یہ دھمکی اس وقت پوری ہو گئی جب قریش کی طاقت بھی ختم ہو گئی اور یہود بھی اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ اس وقت ان منافقین کے لیے بھی کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہی جو یہود کی زیر سرپرستی ریشہ دوانیاں کرتے تھے۔ ان کا حشر بھی وہی ہوا جو ان کے مرشد یہود کا ہوا۔ آگے کی سورتوں میں ان کے انجام کی عبرت انگیز

تفصیل آ رہی ہے۔

ان کے عذاب کو ذلیل کرنے والا عذاب اس لیے کہا گیا کہ ان کو نہایت رسواکن قتل و جلا وطنی اور غلامی کی سزاؤں سے دوچار ہونا پڑا اور کسی کو بھی ان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہوئی بلکہ سب نے ان پر لعنت ہی کی۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۶)

'یَوْمَ' کا نصب اگرچہ 'عَذَابٌ مُّهِيْنٌ' سے بھی ہو سکتا ہے لیکن میرے نزدیک یہ معروف ضابطۂ عربیت کے مطابق، فعل محذوف سے منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں تو جو پیش آئے گا آئے گا ہی، یہ لوگ اس دن کو بھی یاد رکھیں جس دن اللہ تعالیٰ ان سب کو اٹھائے گا اور جو کچھ انھوں نے کیا ہو گا وہ سب ان کے آگے رکھ دے گا۔ 'جَمِيْعًا' کی قید اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے کہ آج جو سازشیں اور سرگوشیاں ہو رہی ہیں ان کے تمام ارکان و عوامل جمع کیے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کے سامنے اس کے سارے راز بے نقاب کر دے گا کہ کس نے کیا مشورے دیے اور کس نے کس طرح اس کی تعمیل کی۔

'فَيُنَبِّئُهُمْ' سے مراد ظاہر ہے کہ اس کا لازم ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کے سارے کیے دھرے سے ان کو آگاہ کرے گا تاکہ وہ اس کے نتائج بھگتیں۔

ایک مغالطہ پر تنبیہ

'اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ' میں ایک بہت بڑے مغالطہ سے آگاہ فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ جس طرح یہ سب کچھ کر کے بھول گئے اللہ بھی اس کو بھول گیا ہے۔ ان لوگوں کو ان کی شرارتوں کی سزا نہیں ملی اس وجہ سے سمجھ بیٹھے کہ اللہ بھول گیا ہے لیکن اللہ نے ان کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رکھی ہے اور جزا اور سزا کے لیے ایک دن مقرر کر رکھا ہے جس دن سب کی نیکی بدی اس کے سامنے آ جائے گی۔

'وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ' یہ اس کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کہیں غائب نہیں ہوتا ہے، بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۷)

اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے

یہ اوپر والی بات کی مزید وضاحت ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اللہ تعالیٰ ایک ایک چیز سے باخبر ہے۔ وہ ہر ایک کے سامنے اس کا ایک ایک عمل رکھ دے گا۔ 'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب یہاں عام ہے اور یہ اسلوبِ بیان اس موقع پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ ایک ایسی بات ہے جو ہر شخص پر واضح ہونی چاہیے۔ جب اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین کا خالق ہے وہی اس سارے نظام کو چلا رہا

ہے، اس کے ایک ایک پرزے کی حرکت اس کے اذن سے ہوتی ہے اور اسی کے حکم سے اس کے ایک ایک متنفّس کی زندگی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ آسمانوں اور زمین کی کسی چیز سے بھی وہ بے خبر رہے۔ اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ (کیا وہ نہ جانے گا جس نے سب کو پیدا کیا ہے)۔

مَا یَکُوۡنُ مِنۡ نَّجۡوٰی ثَلٰثَۃٍ ...... الآیۃ: فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو محیط ہے تو یہ اللہ اور رسول کے خلاف سرگوشیاں کرنے والے یاد رکھیں کہ جب ان کے تین سرگوشیاں کر رہے ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ چوتھا اللہ ہوتا ہے اور جب ان کے پانچ سرگوشیاں کر رہے ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ چھٹا اللہ ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اس سے کم ہوں یا زیادہ اللہ ان کے پاس لازماً ہوتا ہے۔

اَیۡنَ مَا کَانُوۡا: اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ وہ جہاں کہیں بھی چھپ کر سرگوشی کریں گے، اللہ وہاں ان کے پاس موجود ہوگا۔ آسمانوں اور زمین میں کوئی گوشہ وہ ایسا نہیں تلاش کر سکتے جہاں وہ اپنے آپ کو خدائے عالم الغیب سے چھپا سکیں۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ نُہُوۡا عَنِ النَّجۡوٰی ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا نُہُوۡا عَنۡہُ وَ یَتَنٰجَوۡنَ بِالۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ وَ مَعۡصِیَتِ الرَّسُوۡلِ ۫ وَ اِذَا جَآءُوۡکَ حَیَّوۡکَ بِمَا لَمۡ یُحَیِّکَ بِہِ اللّٰہُ ۙ وَ یَقُوۡلُوۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ لَوۡ لَا یُعَذِّبُنَا اللّٰہُ بِمَا نَقُوۡلُ ؕ حَسۡبُہُمۡ جَہَنَّمُ ۚ یَصۡلَوۡنَہَا ۚ فَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ (۸)

سرگوشیوں کی اصل غایت

یہ ان کی حالت پر اظہارِ تعجب ہے کہ ذرا ان کی جسارت تو دیکھو کہ یہ جس نجویٰ سے روکے گئے ہیں اسی کا ارتکاب بار بار کر رہے ہیں اور اس سے بڑی جسارت یہ ہے کہ یہ گناہ، تعدّی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی کرتے ہیں اور ان کو نہ ذرا اپنی اس حرکت پر شرم آتی ہے اور نہ ان کو ذرا خوفِ خدا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب ان کی سرگوشیوں کا آغاز ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی حرکتوں پر توجہ دلائی لیکن اس کا انھوں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا بلکہ یہ شرارت بڑھتی ہی گئی۔ بالآخر ان آیات میں ان کو آخری تنبیہ فرمائی گئی۔

وَ یَتَنٰجَوۡنَ بِالۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ وَ مَعۡصِیَتِ الرَّسُوۡلِ: یعنی ان کی ساری سرگوشی میں خیر کا کوئی پہلو نہیں ہوتا حالانکہ سرگوشی، جیسا کہ آگے ذکر آ رہا ہے، خیر کی بھی ہو سکتی ہے لیکن ان کے سینے خیر سے بالکل خالی ہیں اس وجہ سے ان کی ہر سرگوشی گناہ و تعدّی اور رسول کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر ابھارنے کے لیے ہوتی ہے۔ 'اثم' ان گناہوں کو کہتے ہیں جن میں حق تلفی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور 'عُدۡوَان' ان گناہوں کے لیے آتا ہے جن میں تعدّی، سرکشی اور طغیان کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یہ دونوں لفظ جب ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں تو گناہ کی تمام اقسام پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ 'مَعۡصِیَتِ الرَّسُوۡلِ' کے الفاظ یہاں ان اشرار کی سرگرمیوں کے اصل ہدف کے اظہار کے لیے آئے

ہیں کہ ان کی اس تمام تگ و دو کا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر اللہ کے رسول کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھاریں تاکہ یہ شیرازہ درہم برہم ہو جائے۔

یہ منافقین، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا اور آگے تفصیل آرہی ہے، یہود کے ساختہ پرداختہ تھے اور ان کی تمام سرگرمیوں کا منتہا یہ تھا کہ صحابہؓ کے اندر کوئی ایسا فتنہ برپا کریں کہ یہ گروہ ایک ناقابلِ شکست ملت بننے سے پہلے پہلے ختم ہو جائے۔ ان کی ان فتنوں کی تفصیلات پیچھے بھی اس کتاب میں گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل و رسوا کیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے جو حزب اللہ منظم ہوئی وہ حق کے تمام دشمنوں پر غالب آگئی۔

اشرار کی کینہ توزی — 'وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ'۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان شریروں کی کینہ توزی کی ایک مثال بیان ہوئی ہے کہ جب یہ تمھارے پاس آتے ہیں تو تمھیں سلام کرتے ہوئے اس لفظ کے بالکل برعکس لفظ استعمال کرتے ہیں جو اللہ نے تمھارے لیے پسند فرمایا۔ اللہ اور اس کے ملائکہ تو تمھارے اوپر رحمت اور سلام بھیجتے ہیں[1] اور ان بدبختوں کا حال یہ ہے کہ تمھیں سلام کرتے ہوئے لفظ 'السلام' اس طرح بگاڑ کر نکالتے ہیں کہ 'اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ' 'اَلسَّامُ عَلَيْكَ'[2] بن جاتا ہے۔

'بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ' کے الفاظ سے مقصود ان کی شقاوت کو ظاہر کرنا ہے کہ ان لوگوں کی بدبختی و محرومی میں کیا شک کی گنجائش رہی جو اس ذاتِ اقدس کے لیے موت کی بددعا کریں جس پر اللہ اور اس کے فرشتے درود و سلام بھیجیں! اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیامِ تسلی بھی ہے کہ اگر یہ تمھارے لیے موت کے متمنی ہیں تو رہیں، تمھارے اوپر خدا کی رحمت اور اس کے فرشتوں کی دعائے رحمت ہے تو تمھیں کسی اور کی دعا و بددعا کی کیا پروا!

یہود اور ان کے ایجنٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے لیے اپنی زبان توڑ مروڑ کر الفاظ کو جس طرح بگاڑتے تھے اس کی مثالیں سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہیں۔ 'رَاعِنَا' اور 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' کے تحت ہم ان کی اس شرارت پر روشنی ڈال چکے ہیں[3]۔ اسی قسم کا تصرف لفظ 'اَلسَّلَامُ' میں کر کے اس کو وہ 'اَلسَّامُ' کر دیتے کہ سننے والے کو دھوکا 'اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ' کا ہوتا حالانکہ فی الحقیقت وہ 'اَلسَّامُ عَلَيْكَ' کہتے۔

---

[1] چنانچہ الاحزاب - ۳۳: ۵۶ میں ارشاد ہے: 'اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ..... الاٰية' (بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر سلام و رحمت بھیجتے ہیں)

[2] عربی میں لفظ 'سام' موت کے معنی میں آتا ہے۔

[3] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد اول، صفحات: ۲۵۰ - ۲۵۲ اور ۲۲۸

وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ۔ یہ ان کے اس مغالطے کی طرف اشارہ ہے جس کے سبب سے وہ اپنی ان شرارتوں میں دلیر ہوتے جا رہے تھے۔

فرمایا کہ ان کی ان شرارتوں پر چونکہ فوراً پکڑ نہیں ہو رہی ہے اس وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ رسول کی تکذیب و تضحیک میں یہ بالکل بجانب حق ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہوتے تو لازماً ان باتوں پر ہماری پکڑ ہو جاتی لیکن جب اس طرح کی کوئی بات نہیں ہو رہی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا دعویٰ محض دھونس ہے۔

حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ فرمایا کہ ان کے لیے جہنم ہی کافی ہے جس میں وہ لازماً پڑیں گے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ اس کے ہوتے اس دنیا میں اگر ان کے اوپر عذاب نہ بھی آئے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہی ساری کسر پوری کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ان اشرار کو اس دنیا میں بھی عذاب کی دھمکی دی گئی ہے، جیسا کہ اوپر آیت ۵ میں اشارہ گزر چکا ہے اور آگے بھی آ رہا ہے، لیکن اصل حقیقت یہی ہے کہ جب جہنم موجود ہے تو اس کے ہوتے دنیا کی پکڑ سے کوئی بچ بھی گیا تو اس میں اس کے لیے اطمینان کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

شریروں کا اصل مغالطہ

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان کی غفلت اور سرکشی میں سب سے زیادہ اضافہ اس کے اسی مغالطہ سے ہوتا ہے جو یہاں مذکور ہوا۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی شرارتوں پر اس دنیا میں کوئی گرفت نہیں ہو رہی ہے تو وہ مطمئن ہو بیٹھتا ہے کہ اس پر کہیں بھی اور کبھی بھی گرفت نہیں ہو گی اور رسلؑ جو ڈراوے سناتے پھر رہے ہیں یہ محض ان کی دھونس ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ حالانکہ یہ محض انسان کی بے بصیرتی ہے۔ اگر اعمال کے نتائج فوراً سامنے آ جانے والے ہوتے تو کس کی مجال تھی کہ وہ نیکی کے سوا کبھی بدی کی جرأت کر سکتا۔ پھر تو سبھی صالح و متقی بن کے رہتے۔ اس دنیا کا اصل بھید تو یہی ہے کہ یہ دار الجزاء نہیں بلکہ دار الامتحان ہے۔ دار الجزاء آگے ہے اور وہ اس کائنات کی سب سے زیادہ واضح اور اٹل حقیقت ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو یہ سارا عالم ایک اندھیر نگری اور کسی کھلنڈرے کا کھیل بن کر رہ جاتے گا حالانکہ اس عالم کا خالق کوئی کھلنڈرا نہیں بلکہ وہ بالبداہت ایک عزیز و حکیم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۹)

نجویٰ کی پاکیزہ قسم

یہ مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ نجویٰ بجائے خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ اجتماعی و معاشرتی زندگی میں ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں جب باہم دگر رازدارانہ مشورت کی ضرورت پیش آتی ہے۔

شوریٰ اجتماعی زندگی کی اساسات میں سے ہے اور اس میں رازداری کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔ اگر یہ مشورت نیکی، تقویٰ اور اصلاح ذات البین کے لیے ہے تو یہ نجویٰ باعث خیر و برکت ہے اور تم جب بھی کوئی رازدارانہ مشورت کرو تو کسی مقصدِ خیر ہی کے لیے کرو۔ البتہ وہ نجویٰ شیطانی نجویٰ ہے جو گناہ، تعدی اور معصیتِ رسول کے مقصد سے یہ منافقین کرتے ہیں۔ اہلِ ایمان کو اس سے بچنا چاہیے اور اس اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے جس کے حضور میں سب اکٹھے کیے جائیں گے اور جو سب کے نجویٰ سے اچھی طرح باخبر ہوتا ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۱۰)

اہلِ ایمان کو تسلی

یہ مومنین مخلصین کو تسلی دی گئی ہے کہ منافقین کی یہ ساری سرگوشیاں شیطان کی تحریک اور اس کی وسوسہ اندازی سے وجود میں آتی ہیں اور شیطان زیادہ سے زیادہ بس یہی کر سکتا ہے کہ اس طرح کی باتوں سے اہلِ ایمان کے دلوں کو ذرا رنج و ملال پہنچا دے۔ اس سے زیادہ اس کے امکان میں کچھ نہیں ہے۔ وہ اللہ کے اذن کے بدون اہلِ ایمان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا تو اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ شیطان کی ان وسوسہ اندازیوں کی کوئی پروا نہ کریں بلکہ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھیں کہ وہ ان کو ہر شریر کی شرارت سے محفوظ رکھے گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَإِذَا قِيلَ انشُزُوا فَانشُزُوا يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۱۱)

مجلسِ نبوی کو نجویٰ سے پاک رکھنے کے لیے بعض ہدایات

منافقین کی سرگوشیاں یوں تو ہر مجلس و مقام میں ہوتی تھیں لیکن مجلسِ نبوی میں اس شرارت کے لیے وہ خاص اہتمام کرتے اس لیے کہ اسلام پر طعن، مسلمانوں کی دل آزاری و حوصلہ شکنی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تضحیک کے مواقع سب سے زیادہ ان کو وہیں ملتے۔ چنانچہ وہ مجلسِ نبوی میں اپنے مخصوص جتھے بنا کر بیٹھتے اور اس امر کا اہتمام رکھتے کہ کوئی غیر ان کے درمیان نہ گھسنے پائے تاکہ وہ حضورؐ کی باتوں پر جو نقد و تبصرہ اور جو طعن و طنز کرنا چاہیں آسانی سے کر سکیں۔ بسا اوقات وہ یہ بھی کرتے کہ حضورؐ مجلس سے اٹھ جاتے یا مجلس کے برخاست ہونے کا اعلان ہو جاتا لیکن یہ لوگ اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے دھرنا دیے بیٹھے رہتے تاکہ لوگوں کے اندر کچھ وسوسہ اندازی کریں یا آپس میں کسی نئی شرارت کی کوئی سکیم بنائیں۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ مجلسِ نبوی سے متعلق کچھ ایسی ہدایات دے دی جائیں کہ منافقین اس کو اپنے شیطانی نجویٰ کے لیے استعمال نہ کر سکیں۔

بعض مجلسی آداب

'اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا'۔ قرینہ دلیل ہے کہ مجلس سے یہاں مراد اصلاً مجلسِ نبوی ہے لیکن لفظ جمع استعمال کر کے یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ یہاں جو آداب بتائے جا رہے ہیں وہ مسلمانوں کی تمام مجالس کے لیے عام ہیں تاکہ ان کی ہر مجلس میں مجلسِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عکس پایا جائے۔ قرآن میں اسی طرح بعض جگہ لفظ 'مساجد' جمع کی شکل میں استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ اصلاً اس سے مراد مسجد حرام ہے، جیسا کہ 'اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ' (التوبۃ - ۹: ۱۸) میں ہے لیکن لفظ جمع استعمال کر کے یہ تعلیم دی گئی کہ جو ہدایت اس مرکزی مسجد سے متعلق دی جا رہی ہے وہی حکم تمام مساجد الٰہی کا ہوگا اس لیے کہ وہ سب اسی کے تابع ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جب صدرِ مجلس کی طرف سے ہدایت کی جائے کہ لوگ مجلس میں کھل کر بیٹھیں تو اس حکم کی بے چون و چرا تعمیل ہونی چاہیے اور ایک دوسرے سے ہٹ ہٹ کر بیٹھنا چاہیے تاکہ دوسرے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو آسانی بھی ہو اور منافقین کے لیے مجلسِ نبوی میں جتھہ بندی کر کے بیٹھنے اور سرگوشیاں کرنے کی گنجائش بھی کم ہو جائے۔ اوپر ہم نے اشارہ کیا کہ منافقین مجلسِ نبوی میں، ایک پارٹی کی شکل میں اس طرح بیٹھتے کہ ان کے جتھے سے باہر کے کسی آدمی کے لیے ان کے اندر گھسنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے تاکہ وہ جس ردِ عمل کا اظہار کرنا چاہیں اس میں نہ دوسرے کوئی مزاحمت پیدا کر سکیں، نہ ان کی سرگوشیوں، ان کے اشاروں، کنایوں اور ان کے طنزیہ فقروں کی پردہ دری ہو سکے۔ اپنے اس طرزِ عمل سے انھوں نے بعض اوقات بڑی بڑی الجھنیں پیدا کر دیں جن کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں بھی موجود ہیں اور قرآن نے بھی ان کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس سورہ کے زمانۂ نزول میں، جیسا کہ واضح ہے، یہ فتنہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کے سدِ باب کے لیے ہدایت ہوئی کہ جب صدرِ مجلس کی طرف سے حکم دیا جائے کہ لوگ کھل کر بیٹھیں تو لوگوں کو اس حکم کی بے چون و چرا تعمیل کرنی چاہیے۔

'فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ'۔ یعنی اگر تم دوسروں کے لیے کشادگی پیدا کرو گے تو اللہ بھی تمھارے لیے کشادگی پیدا کر دے گا۔ اگرچہ اس کا ظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے جنت میں کشادگی پیدا کرے گا لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو انسان اپنا سینہ دوسروں کے لیے کشادہ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ دوسروں کے سینے اس کے لیے اس دنیا میں بھی کشادہ کر دیتا ہے۔ آدمی کا ہر عمل، ظاہری ہو یا باطنی، نیک ہو یا بد، اپنا ایک قدرتی اثر رکھتا ہے جس کا حقیقی ظہور تو آخرت ہی میں ہوگا لیکن اس کے برگ و بار اس دنیا میں بھی دیکھے جاتے ہیں بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھیں ہوں۔

'وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا'۔ یعنی اسی طرح صدرِ مجلس کی طرف سے اگر اٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا جائے تو اس کی بھی بے چون و چرا بغیر کسی احساسِ کمتری کے، تعمیل کی جائے۔

اس حکم کی نوعیت اجتماعی بھی ہو سکتی ہے، انفرادی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ پوری مجلس برخاست کر دی

جائے تو لوگ اس کو بھی بخوشی قبول کریں، یہ خیال کریں کہ ہمارے وقت کی ناقدری کی گئی، ذاتی آرام کو جماعتی کام پر ترجیح دی گئی، ہمیں اظہارِ خیال کا موقع نہیں دیا گیا، اس بارے میں ہماری رائے نہیں لی گئی۔

اسی طرح انفرادی طور پر بھی اگر کسی شخص کو ہدایت کی جائے کہ وہ مجلس میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کسی دوسری جگہ بیٹھ جائے، یا مجلس سے باہر چلا جائے یا اپنی جگہ کسی دوسرے کے لیے خالی کر دے تو وہ اس حکم کی بھی بغیر کسی نکیر کے تعمیل کرے۔ اجتماعی نظمِ زندگی کے احترام میں اگر وہ یہ کسرِ نفسی گوارا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے اس ایثار کو ذریعۂ رفعت بنائے گا۔

'فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ .... الاٰية' یہ بالکل مقابل میں ہے 'فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ' کے۔ یعنی اس کھڑے ہونے میں بظاہر ذلت بھی ہو تو اللہ اس کو ان لوگوں کے لیے باعثِ عزت و رفعت بنائے گا جو تم میں سے اہلِ ایمان ہیں۔

یہاں 'اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ' کے الفاظ بڑے معنی خیز ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے اندر جو منافقین گھسے ہوئے ہیں وہ تو اس قسم کے حکم پر بہت ناک بھوں چڑھائیں گے کہ ان کی توہین ہوئی کہ ان کو اٹھا کر دوسروں کو ان کی جگہ دی گئی۔ ان میں سے بعض یہ بھی محسوس کریں گے کہ کیا وہ باعتبارِ علم و عمل فلاں اور فلاں سے فروتر تھے کہ ان کو ان کے اوپر ترجیح دی گئی لیکن جو اہلِ ایمان و اصحابِ علم خوش دلی سے اس حکم کی تعمیل کریں گے اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کے مدارج پر مدارج بلند کرے گا۔

'وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ' یہ ان اصحابِ ایمان و علم کو تسلی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔ اس کو آگاہ ہونے کے لیے اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تمہاری خدمات کا اشتہار اخباروں میں چھپے تب ہی اس کے علم میں آئے۔ تم دین و ملت کے قیام اور نظمِ جماعت کے احترام کی خاطر جو ایثار بھی کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے اور وہ اس کا بھرپور صلہ دے گا۔

عصرِ حاضر کی مجالس کا حال

یہ ہدایت اگرچہ اصلاً مجلسِ نبوی سے متعلق دی گئی ہے لیکن، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی آداب مسلمانوں کی تمام مجالس میں ملحوظ ہونے چاہئیں۔ آج اہلِ مغرب کی کورانہ تقلید میں جو طریقے اختیار کر لیے گئے ہیں اگرچہ ان کو بہت ترقی یافتہ خیال کیا جاتا ہے لیکن یہ انہی کی برکت ہے کہ ہماری پارلیمنٹیں اور کونسلیں اکھاڑے بنتی جا رہی ہیں جن میں مختلف پارٹیاں جتھے بنا بنا کر آتی ہیں ایک دوسرے کو شکست دینے، اشارہ بازیاں اور سرگوشیاں کرنے، نقرے اور پھبتیاں چست کرنے کے لیے ہیں، یہاں تک کہ بسا اوقات ایک دوسرے کا منہ نوچنے اور ان پر جوتے اور کرسیاں پھینکنے تک بھی نوبت آ جاتی ہے اور صدرِ مجلس کو آدابِ مجلس کی یاد دہانی کے بجائے پولیس کی مدد حاصل کرنی پڑتی ہے۔

۴۔ آگے آیات ۱۲-۱۳ کا مضمون

اوپر کی آیات میں جس طرح مجلس نبوی کو سرگوشیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے بعض تدبیریں بتائی گئی ہیں اسی طرح آگے کی آیت میں خود ذاتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سرگوشیاں کرنے والوں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک ہدایت دی گئی۔ جب یہ فتنہ بڑھا اور اس پر قرآن میں نکیر بھی فرمائی گئی تو بہت سے منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رازدارانہ طور پر مل کر اپنی صفائی پیش کرنے اور اپنے سر کا الزام دوسرے بے گناہوں کے سر تھوپنے کی کوشش میں لگ گئے۔ یہ لوگ کھلی مجلس میں تو اپنی صفائی پیش کرنے کا حوصلہ کر نہیں سکتے تھے اس وجہ سے ہر ایک کی کوشش یہ رہی ہو گی کہ اس کو حضور سے خلوت میں بات کرنے کا موقع ملے۔ یہ صورت حال متقضی ہوئی کہ آپ سے ملاقات پر بعض پابندیاں عائد کر دی جائیں تاکہ ہر شخص آپ کا وقت ضائع نہ کر سکے۔ یہ حکم ایک ہنگامی حکم تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو یہ منسوخ کر دیا گیا اور منسوخ کرنے والی آیت کو بھی قرآن کی ترتیب میں ابتدائی حکم کے ساتھ ہی جگہ دی گئی تاکہ نظم کلام کے سمجھنے میں کوئی زحمت نہ پیش آئے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۲-۱۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

ع ۲

ترجمۂ آیات ۱۲-۱۳

اے ایمان والو، جب تمہیں رسول سے رازدارانہ بات کرنی ہو تو اپنی رازدارانہ بات سے پہلے کچھ صدقہ کرو۔ یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے۔ پس

اگر اس کی استطاعت نہ پاؤ تو اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۲

کیا تم اس بات سے اندیشہ ناک ہوئے کہ اپنی رازدارانہ باتوں سے پہلے صدقے پیش کرو۔ پس جب تم نے یہ نہیں کیا اور اللہ نے تم پر رحم فرمایا تو نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۱۳

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۲)

سرگوشیوں کو روکنے کے لیے ایک ہنگامی حکم

یہ حکم، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سرگوشیوں کی اس وبائے عام کے زمانے میں اس لیے دیا گیا کہ منافقین کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیزاوقات میں مداخلت سے روکا جائے۔ جب ان لوگوں کے رویہ پر گرفت ہوئی تو ان میں سے ہر ایک کو فکر ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی میں مل کر اپنی چکنی چپڑی باتوں سے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش بھی کرے اور ہو سکے تو اپنے گناہوں کا بوجھ کسی دوسرے بے گناہ کے سر تھوپ دے۔ حضورؐ نے اپنی ملاقاتوں پر چونکہ کوئی پابندی نہیں رکھی تھی اس وجہ سے اس طرح کے اصحاب الاغراض حضورؐ کی اس فیاضی سے بہت غلط فائدے اٹھاتے۔ اس دور میں انھوں نے اس سے خاص طور پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہوگی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ جو شخص آپ سے تنہائی میں کوئی رازدارانہ بات کرنی چاہے وہ اس سے پہلے راہِ خدا میں کچھ صدقہ کرے۔ اس حکم سے ان لوگوں کو مستثنیٰ رکھا گیا جو نادار ہوں تاکہ یہ حکم کسی غریب مسلمان کے لیے باعثِ زحمت نہ بنے اور صدقے کی کوئی مقدار بھی معین نہیں کی گئی تاکہ لوگ اس کو زیادہ گراں نہ محسوس کریں۔

اس سے اصل مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، منافقین کے بڑھتے ہوئے رجحانِ سرگوشی کی حوصلہ شکنی تھا۔ بخل اور حرصِ مال کی بیماری ان منافقین میں عام تھی۔ قرآن نے ان کی اس بیماری کی جگہ جگہ نشان دہی کی ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے یہ پابندی عائد کر دی تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

تنہائی میں ملاقات کا معاملہ ایک سنجیدہ معاملہ بن جائے کہ اس طرح کے لوگ اپنی نجاست کے سبب سے اول تو اس کا حوصلہ ہی نہ کریں اور اگر کریں تو ان کا انفاق ان کے لیے تطہیر و تزکیہ کا ذریعہ بنے اور فساد کی باتوں سے ان کو بچنے کی توفیق حاصل ہو۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ۔ اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ اگر تم اس پر نیک نیتی سے عمل کرو گے تو یہ تمہارے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں بھلائی کا ذریعہ اور تمہارے دلوں کو پاک کرنے کا وسیلہ ہوگا۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ حکم پیغمبر کے آرام و آسائش کے خیال سے نہیں بلکہ تمہاری صلاح و فلاح کے لیے دیا جا رہا ہے بشرطیکہ تم اس کی قدر کرو۔

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ یعنی غریبوں اور ناداروں کے لیے بدستور پیغمبر سے تنہائی میں ملنے اور عرض معروض کرنے کی راہ کھلی ہوئی ہے۔

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۳)

ناسخ اور منسوخ دونوں یکجا ہیں

یہ آیت کچھ عرصہ کے بعد سابق آیت کے حکم کو منسوخ کرنے کے لیے نازل ہوئی لیکن اس کو جگہ یہیں سورہ کے بیچ میں اصل ابتدائی حکم کے ساتھ ہی دی گئی تاکہ منسوخ اور ناسخ دونوں آیتیں یکجا ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں آیتوں کے درمیان اتنا وقفہ گزرا ہوگا کہ سابق حکم کا مقصد فی الجملہ پورا ہو گیا ہوگا یعنی منافقین کی سرگرشیوں کا وہ فتنہ دب گیا ہوگا جس کو دبانے کے لیے صدقہ کا مذکورہ بالا حکم نازل ہوا۔ لیکن بعض تفسیری روایات سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں کے درمیان بس صبح و شام کا فاصلہ ہے۔ غالباً اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں آیتیں قرآن میں ایک ہی جگہ ہیں لیکن یہ چیز اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ دونوں کے زمانۂ نزول میں سرے سے کوئی فرق ہی نہ ہو یا محض برائے نام فرق ہو۔ قرآن میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ناسخ آیت عرصہ کے بعد نازل ہوئی لیکن ترتیب میں اس کو جگہ منسوخ حکم کے ساتھ ہی ملی۔ اس کی ایک نہایت واضح مثال سورۂ مزمل میں موجود ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی کی ملاقاتوں پر جو پابندی عائد کی گئی وہ، جیسا کہ ہم نے وضاحت کی، ایک خاص فتنہ کے سدباب کے لیے، ایک خاص دور میں عائد کی گئی تھی۔ یہ پابندی اسی وقت اٹھائی گئی ہوگی جب یہ فتنہ یا تو دب گیا ہوگا یا لوگوں کے اندر اس سے احتراز کا احساس پیدا ہو گیا ہوگا۔ یہ مقصد چند گھنٹوں میں پورا نہیں ہو سکتا۔ اس میں لازماً کچھ وقت صرف ہوا ہوگا اس وجہ سے ان دونوں آیتوں کے زمانۂ نزول میں اتنا بُعد لازماً ہوگا جتنا اس طرح کے کسی مقصد کے حاصل ہونے کے لیے ضروری ہے۔

'ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ' سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنے کا رجحان جو بہت بڑھ رہا تھا وہ اس حکم کے بعد دب گیا۔ منافقین تو اپنی بخالت کے سبب سے رک گئے ہوں گے اور مخلصین غربت کے علاوہ اس وجہ سے بھی محتاط ہو گئے ہوں گے کہ انھوں نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رازدارانہ کوئی بات کرنی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ بہرحال اس ہنگامی حکم سے جو اصل مقصود تھا جب ایک حد تک وہ حاصل ہو گیا تو یہ منسوخ کر دیا گیا۔

'فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ' سے ایک تو یہ بات نکلتی ہے کہ لوگوں نے نہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رازدارانہ بات کرنے کی جرأت کی، نہ صدقہ دینے کی نوبت پیش آئی اور دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ لوگوں کے اندر فی الجملہ ندامت کا احساس ابھرا کہ اب تک ان کی جو روش رسول کے معاملے میں رہی وہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں پسندیدہ نہیں تھی اس وجہ سے وہ مستحق تادیب و تنبیہ ٹھہرے۔ 'تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ' کے معنی ہیں اللہ نے تمھاری توبہ قبول کی۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نظر کرم ان پر اس وجہ سے ہوئی کہ انھوں نے اپنے احساسِ ندامت سے اپنے آپ کو اس کا سزاوار بنایا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ سخت دل ایسے بھی رہے ہوں جو اس تنبیہ کے بعد بھی متنبہ نہ ہوئے ہوں لیکن آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیتِ مجموعی لوگوں کے اندر ندامت کا احساس پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جب جماعت کے اندر کوئی اچھا احساس بحیثیتِ مجموعی ابھرتا ہے تو اس کو وہ قبولیت سے محروم نہیں فرماتا۔ چنانچہ یہ پابندی اٹھالی گئی۔

'فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ...... الاٰية'۔ یہ بات بطور بدرقہ ارشاد ہوئی ہے کہ یہ پابندی اگرچہ اٹھالی گئی لیکن احتیاط کے طور پر ضروری ہے کہ نماز و زکوٰۃ اور اللہ و رسول کی اطاعت کا خاص اہتمام رکھو تاکہ معاشرے میں اس طرح کی بحرانی کیفیت پھر نہ پیدا ہونے پائے اور شیطان کو نجویٰ کا فتنہ اٹھانے کا موقع پھر نہ مل سکے۔

'وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ'۔ اور اس حقیقت کو ہمیشہ مستحضر رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔

۶۔ آگے آیات ۱۴-۲۲ کا مضمون

بیچ میں جو ناسخ آیت آ گئی تھی اس کی نوعیت جملہ معترضہ کی تھی۔ اس کے ختم ہوتے ہی سلسلۂ کلام پھر منافقین کے ذکر سے مربوط ہو گیا اور یہ بتایا گیا کہ ان منافقین کا اصل رشتہ اسلام کے ساتھ نہیں بلکہ اسلام کے دشمن یہود کے ساتھ ہے۔ یہ ان سے دوستی رکھتے ہیں اور اپنی جھوٹی قسموں کے بل پر

مسلمانوں کے اندر گھسے ہوئے ہیں۔ ان کی اصل بیماری دنیا کی محبت ہے جس کے سبب سے یہ شیطان کے ساتھی بنے ہوئے ہیں اور اللہ کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ غلبہ اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہوگا اور شیطان کی پارٹی شکست کھائے گی۔ ایمان باللہ کے ساتھ اعدائے دین کی دوستی جمع نہیں ہو سکتی۔ سچے اہل ایمان وہی ہیں جو اعدائے دین سے اپنے تمام تعلقات کاٹ لیں اگرچہ وہ ان کے کتنے ہی قریبی رشتہ دار اور عزیز ہوں۔ یہی لوگ اللہ کی پارٹی ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۴-۲۲

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۖ
مَّا هُم مِّنكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ
يَعْلَمُونَ ﴿١٤﴾ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ إِنَّهُمْ سَاءَ
مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٥﴾ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا
عَن سَبِيلِ اللَّهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿١٦﴾ لَّن تُغْنِيَ عَنْهُمْ
أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ
هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٧﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ
لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ ۖ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ أَلَا إِنَّهُمْ
هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٨﴾ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ
اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ
الْخَاسِرُونَ ﴿١٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ
فِي الْأَذَلِّينَ ﴿٢٠﴾ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ
عَزِيزٌ ﴿٢١﴾ لَّا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ

أَبْنَآءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰٓئِكَ كَتَبَ فِى قُلُوبِهِمُ
ٱلْإِيمَٰنَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِى
مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِىَ ٱللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا۟
عَنْهُ ۚ أُولَٰٓئِكَ حِزْبُ ٱللَّهِ ۚ أَلَآ إِنَّ حِزْبَ ٱللَّهِ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ ﴿٢٢﴾ ع ۳

ترجمۂ آیات ۱۴-۲۲

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اس قوم سے دوستی رکھتے ہیں جس پر اللہ کا غضب ہوا! یہ لوگ نہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے ہیں۔ اور یہ جھوٹی بات پر جانتے بوجھتے قسم کھاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے ایک سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ بے شک نہایت بُرا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے اور اللہ کی راہ سے رک گئے ہیں تو ان کے لیے ایک ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۱۴-۱۶

ان کے مال اور ان کی اولاد ان کو اللہ کے عذاب سے ذرا بھی بچانے والے نہیں بنیں گے۔ یہ لوگ دوزخ والے ہیں۔ یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ اس سے بھی اسی طرح قسم کھائیں گے جس طرح تم سے کھاتے ہیں اور گمان کریں گے کہ وہ ایک بنیاد پر ہیں۔ آگاہ ہو کہ یہ لوگ بالکل ہی جھوٹے ہیں۔ ان پر شیطان مسلط ہو گیا ہے پس اس نے ان کو خدا کی یاد بھلا دی ہے۔ یہ لوگ شیطان کی پارٹی ہیں۔ سن لو کہ شیطان کی پارٹی ہی نامراد ہونے والی ہے۔ ۱۷-۱۹

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے برسرِ مخالفت ہیں، وہی لوگ ذلیل ہونے والوں میں ہوں گے۔ اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ بے شک میں غالب رہوں گا اور میرے رسول

بے شک اللہ قوی و عزیز ہے۔ ۲۰-۲۱

تم کوئی ایسی قوم نہیں پا سکتے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتی ہو اور وہ دوستی رکھے ان سے جو اللہ اور اس کے رسول سے برسرِ مخالفت ہوں اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا اہلِ کنبہ ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت فرما دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک فیضانِ خاص سے ان کی تائید فرمائی ہے اور ان کو داخل کرے گا ایسے باغوں میں جن کے اندر نہریں جاری ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے یہی لوگ اللہ کی پارٹی ہیں۔ سن رکھو کہ اللہ کی پارٹی ہی فلاح پانے والی ہے! ۲۲

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا قَوۡمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ ؕ مَا ہُمۡ مِّنۡکُمۡ وَ لَا مِنۡہُمۡ ۙ وَ یَحۡلِفُوۡنَ عَلَی الۡکَذِبِ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ (۱۴)

منافقین اپنے مفاد کے سوا کسی کے ساتھ نہیں ہیں

یہاں منافقین کے حال پر اظہارِ تعجب ہے کہ ایک طرف تو یہ ان لوگوں کے دوست بنے ہوئے ہیں جو اللہ کے مغضوب ہیں دوسری طرف یہ تم کو (مسلمانوں کو) بھی قسمیں کھا کھا کے یقین دلاتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ فرمایا کہ مَا ہُمۡ مِّنۡکُمۡ وَ لَا مِنۡہُمۡ؛ نہ یہ لوگ تمہارے ساتھ ہیں اور نہ ان کے ساتھ ہیں۔ تمہارے ساتھ تو اس وجہ سے نہیں ہیں کہ اللہ اور رسول پر ایمان اور اللہ کے مغضوبوں کے ساتھ دوستی میں نسبت ضدین کی ہے۔ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں اور ان کے ساتھ یہ اس وجہ سے نہیں ہیں کہ ان کی دوستی اپنے مفاد کے ساتھ ہے۔ اگر ان پر کوئی سخت وقت آیا تو یہ ان کی خاطر کوئی چوٹ کھانے کو تیار نہیں ہوں گے بلکہ شیطان کی طرح اظہارِ براءت کر کے بھاگ کھڑے ہوں گے۔

'وَ یَحۡلِفُوۡنَ عَلَی الۡکَذِبِ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ'۔ یعنی وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اپنے مفاد کے سوا وہ کسی کے ساتھ نہیں ہیں لیکن وہ جھوٹی قسمیں کھا کھا کے تم کو بھی راضی رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کو بھی۔

'غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ' سے اشارہ یہود کی طرف ہے جن کو قرآن کی پہلی ہی سورہ میں 'مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ'

کہا گیا ہے۔ اگرچہ ان منافقین کی دوستی مشرکینِ مکہ سے بھی تھی جس کا ذکر تفصیل سے اگلی سورتوں میں آئے گا لیکن یہاں خاص طور پر یہود کے ساتھ ان کی موالات کی طرف اشارہ ہے۔ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ منافقین زیادہ تر یہود ہی کے ساختہ پرداختہ اور انہی کے ایجنٹ کی حیثیت سے مسلمانوں کے اندر گھسے ہوئے تھے۔

أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۵)

یعنی یہ بدقسمت لوگ سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے بڑی دانشمندانہ سیاست اختیار کی ہے کہ اپنی قسموں کے ذریعہ سے دونوں کو مطمئن کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہ دانشمندانہ سیاست نہیں بلکہ نہایت مہلک کھیل ہے جو یہ کھیل رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اللہ نے ان کے لیے ایک سخت عذاب تیار کر رکھا ہے جس سے یہ دوچار ہوں گے۔ اللہ اور رسول کے دشمنوں پر اس دنیا میں جو عذاب آئے گا یہ اس میں بھی حصہ پائیں گے اور آخرت میں ان کے لیے جو عذاب ہے وہ تو ہے ہی۔

اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ (۱۶)

جھوٹی قسموں کی آڑ میں چھپنے کی کوشش

انھوں نے قسموں کو اپنی ڈھال بنا رکھا ہے ان کی جس غلطی پر بھی گرفت کی جائے اس کے بارے میں جھوٹی قسموں سے یہ اطمینان دہانی کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح اپنی دانست میں اپنے کو بچا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان قسموں کی آڑ میں انھوں نے اپنے لیے جائے پناہ بنائی ہے تاکہ دین کے مطالبات سے اپنے کو بچائے رکھیں۔ ایمان کا اظہار کر کے اللہ کی راہ میں انھوں نے جو قدم اٹھایا تھا اس کو روک لیا اور اب آگے بڑھنے کے بجائے قسموں کے ذریعہ سے اپنی دینداری کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ اس طرح کب تک اپنا بھرم قائم رکھیں گے۔ بالآخر ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

لفظ 'صدّ' قرآن میں لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوا ہے۔ یہاں یہ لازم معنی میں ہے یعنی اللہ کی راہ میں آگے بڑھنے سے رک گئے۔

لَّن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۱۷)

یہ ان بیڑیوں کی طرف اشارہ ہے جو ان کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہیں اور جو اللہ کی راہ میں ان کو آگے نہیں بڑھنے دے رہی ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنے اموال و املاک اور بیوی بچوں کی محبت میں گرفتار ہیں اس وجہ سے دین کی راہ میں آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں ہے کہ ان کے مال اور ان کی اولاد خدا کے عذاب سے ان کو ذرا بھی بچانے والے نہیں ہیں۔ 'مِّنَ اللَّهِ' میں مضاف محذوف ہے یعنی مِنْ عَذَابِ اللَّهِ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اسی طرح مال و اولاد کی محبت میں گرفتار رہے تو یہ چیزیں ان کو جہنم میں لے جائیں گی اور پھر یہ اس سے کبھی نہیں چھوٹیں گے۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ ۖ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ

أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُونَ (۱۸)

اگر یہ اسی طرح مال واولاد کی محبت میں پھنسے ہوئے دین کے تقاضوں سے بھاگتے رہے تو اس دن کو یاد رکھیں جس دن اللہ ان کو اور ان کی اولاد کو اٹھائے گا اور اس دن بھی ان کے پاس اس جھوٹی قسم کے سوا کوئی اور سہارا نہیں ہوگا جس کا سہارا انھوں نے آج لے رکھا ہے۔ اس دن وہ اپنے رب کے سامنے اپنی برأت میں اسی طرح جھوٹی قسمیں کھائیں گے جس طرح تمھارے سامنے کھا رہے ہیں۔ سورۂ انعام کی آیت ۲۳ میں مشرکین کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ جب عذاب دیکھیں گے تو قسم کھا کر اپنی بے گناہی کا اظہار کریں گے کہ 'وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ' (اللہ ہمارے خداوند کی قسم ہم شریک ٹھہرانے والوں میں نہیں تھے)۔

'وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ' یعنی جھوٹی قسم کھا کر سمجھیں گے کہ اپنی بے گناہی کے ثبوت میں ایک بہت بڑی دلیل انھوں نے پیش کر دی اور گمان کریں گے کہ جس طرح اس دنیا میں انھوں نے جھوٹی قسموں سے بہتوں کو فریب دے رکھا ہے اسی طرح آخرت میں بھی ان کا فریب چل جائے گا لیکن وہاں ان کا یہ فریب کچھ کام نہ دے گا۔ اس دن اللہ مجرمین کی زبانوں پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں اور ان کے دوسرے اعضاء و جوارح ان کے جرائم کی خود گواہی دیں گے جس کے بعد کسی کے لیے کسی معذرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

'أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُونَ'۔ فرمایا کہ سب کان کھول کر اچھی طرح سن لیں کہ اگر کسی نے غلط فہمی سے ان کو سچا گمان کر رکھا ہے تو وہ اس گمان کو اپنے ذہن سے نکال دے۔ اصل جھوٹے یہی ہیں جنھوں نے یہاں بھی لوگوں کو اپنے جھوٹ سے مغالطہ دے رکھا ہے اور آخرت میں اپنے رب کو بھی دھوکا دینے کی جسارت کریں گے۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنْسَاهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ (۱۹)

جو خدا کو بھلا بیٹھتا ہے وہ شیطان کے جتھے میں جاتا ہے

'اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ' کے معنی ہیں 'تسلط علیھم' شیطان نے ان پر اپنا پورا تسلط جما لیا ہے۔ شیطان جن پر پورا تسلط جما لیتا ہے ان کو خدا کی یاد سے بالکل غافل کر دیتا ہے اور جو خدا کو بھلا بیٹھتے ہیں وہ شیطان کی پارٹی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جہاں تک وسوسہ اندازی کا تعلق ہے شیطان سب پر اپنا یہ ہنر آزماتا ہے لیکن اس کا تسلط انہی پر جمتا ہے جو اس کی وسوسہ اندازیوں کے لیے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیتے اور اس کو اپنا ناصح و مرشد سمجھنے لگتے ہیں۔ جو لوگ اس طرح اس کے مرید بن جاتے ہیں ان کے دلوں سے خدا کی یاد بالکل غائب ہو جاتی ہے پھر وہ اپنی عاقبت سے بالکل بے پروا ہو کر اپنی باگ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ سب شیطان کی پارٹی کے ممبر بن جاتے ہیں اور شیطان ان کا لیڈر بن کر ان کو جدھر چاہتا ہے آوارہ گردی کراتا ہے۔ انسان کی اصل محافظ خدا کی یاد ہے۔

اس سے محروم ہو جانے کے بعد وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور پھر اس کو اس کے چنگل سے چھوٹنا نصیب نہیں ہوتا۔

شیطان کی پارٹی کے لیے نامرادی مقدر ہے

أَلَآ إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ۔ فرمایا کہ اس دنیا میں اگرچہ ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت ایک خاص حد تک مہلتِ عمل ملی ہوئی ہے۔ چنانچہ شیطان کی پارٹی کو بھی مہلت دی جاتی ہے کہ وہ اپنا ہنر آزمالے لیکن ہر شخص اچھی طرح جان لے کہ بالآخر شیطان کی پارٹی ہی نامراد ہونے والی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ (۲۰)

شیطان کی پارٹی کا اصل کام اللہ و رسول کی مخالفت اور ان کے مقابل میں محاذ آرائی ہے۔ فرمایا کہ ان کو جتنی ڈھیل ملتی ہے یہ اللہ اور رسول کے خلاف زور آزمائی کرتے ہیں لیکن بالآخر یہ انہی ذلیل ہونے والوں میں شامل ہوتے ہیں جو ان سے پہلے یہ زور آزمائی کر کے ذلیل ہو چکے ہیں۔

كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ (۲۱)

رسولوں کے باب میں سنت الٰہی

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کا اعلان فرمایا ہے جو ازل سے اس نے لکھ رکھی ہے کہ جو کشمکش اللہ و رسول اور حزب الشیطان کے درمیان برپا ہوگی اس میں غلبہ اللہ اور اس کے رسولوں کو حاصل ہوگا، شیطان کی پارٹی ذلیل و خوار ہوگی۔ اس سنت اللہ کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں کہ رسول[1] جتنے بھی دنیا میں آئے وہ جس قوم کے اندر آئے اس کے لیے خدا کی عدالت بن کر آئے۔ اس کے بعد اس قوم کا لازماً فیصلہ ہو گیا۔ اگر قوم نے بحیثیتِ مجموعی رسول کی تکذیب کر دی تو اس کے اندر سے رسول اور اس پر ایمان لانے والے افراد کو الگ کر کے باقی قوم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی عذاب کے ذریعہ سے فنا کر دیا۔ اور اگر ایمان لانے والوں کی تعداد معتدبہ ہوئی تو اتمامِ حجت کے بعد اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا کہ وہ جہاد کے لیے تلوار اٹھائیں اور ان اعدائے حق سے مقابلہ کر کے ان کا زور توڑ دیں کہ زمین ان کے فتنہ سے پاک ہو جائے۔ قرآن نے رسولوں کی جو تاریخ پیش کی ہے ان میں سے اکثر کو پہلی صورت پیش آئی یعنی رسول اور اس کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد قوم پر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کن عذاب آ گیا۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں دوسری صورت پیش آئی کہ ہجرت کے بعد آپ کو جہاد کا حکم ہوا اور آپ کے اعدا نے آپ کے صحابہؓ کی تلوار سے شکست کھائی یہاں تک کہ ان کا بالکل قلع قمع ہو گیا۔

إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ۔ یہ اس دعوے کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ کیوں اللہ اور اس کے رسولوں کے لیے غلبہ لازمی ہے۔ فرمایا کہ اللہ کوئی کمزور ہستی نہیں ہے بلکہ وہ قوی و عزیز ہے۔ وہ

---

[1] یہاں نبی اور رسول کے درمیان وہ فرق ملحوظ رہے جو ہم نے اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کیا ہے۔

جب اپنے بندوں کے پاس اپنا رسول بھیجتا ہے تو وہ رسول، اللہ کا سفیر ہوتا ہے جو لوگوں کے پاس ان
کے حقیقی بادشاہ کے احکام سے آگاہ کرنے کے لیے آتا ہے۔ اگر لوگ اپنے مالکِ حقیقی کے احکام کی
بجا آوری کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ زمین میں ان کو اقتدار بخشتا اور ان کو اپنے افضال و عنایات
سے نوازتا ہے اور اگر وہ خود اللہ سے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ باغی قرار پاتے ہیں اور اتمامِ
حجت کے بعد اللہ تعالیٰ ان باغیوں کے وجود سے اپنی زمین کو پاک کر دیتا ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ
فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ
اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲۲)

منافقین کے سامنے ایک واضح کسوٹی

اب یہ آخر میں ایک نہایت واضح کسوٹی منافقین کے سامنے رکھ دی تاکہ حزب اللہ اور حزب الشیطان
کے درمیان کوئی التباس باقی نہ رہے اور وہ جس کا بھی ساتھ دیں علیٰ وجہ البصیرت ساتھ دیں۔ مطلب یہ ہے
کہ ان دونوں میں سے وہ ایک ہی کو اختیار کر سکتے ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ بیک وقت وہ دونوں کے ساتھ چل
سکیں۔ فرمایا کہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی قوم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان بھی رکھتی ہو اور ان لوگوں سے دوستی
بھی گانٹھے رکھے جو اللہ اور رسول سے نبرد آزمائی کر رہے ہیں۔ اگر کوئی جماعت اللہ و رسول کے مخالفین
کے ساتھ دوستی بھی رکھتی ہے اور ساتھ ہی ایمان کی بھی مدعی ہے تو وہ اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹی
ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں میں نسبت ضدین کی ہے اور انسان کے پہلو میں دل ایک ہی ہوتا ہے،
دو دل نہیں ہوتے کہ وہ دو متضاد و متحارب چیزوں کی محبت اپنے اندر جمع کر سکے۔

وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ یعنی دوسرے رشتے
اور روابط تو درکنار، باپ بیٹے، بھائی اور کنبہ و قبیلہ کے روابط جو سب سے زیادہ قریبی ہیں اور
جن کے ساتھ انسان کو فطری وابستگی ہوتی ہے، وہ بھی یہ درجہ نہیں رکھتے کہ وہ ایمان کے ساتھ متصادم
ہوں تو کوئی مومن ان کو اپنے دل میں جگہ دے۔

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ۔ یعنی جو لوگ اس کسوٹی
پر اپنے کو پرکھنے اور پرکھوانے کے لیے تیار ہوں درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں
اللہ نے ایمان ثبت فرمایا ہے اور ان کو اپنی طرف سے ایک خاص فیضانِ روحانی سے نوازا ہے۔
رہے وہ لوگ جو ایمان کے مدعی بھی ہیں اور اللہ و رسول کے دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہیں تو یہ لوگ
محض زبان کے مسلمان ہیں۔ ان کے دل ایمان سے آشنا نہیں ہوتے۔

'اَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ' کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ باپ، بیٹے، بھائی اور کنبہ و قبیلہ کے روابط دل کے ریشہ ریشہ میں رچے بسے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کو کاٹ دینا کوئی آسان بازی نہیں ہے لیکن جو لوگ ایمان کی غیرت و حمیت اپنے اندر زندہ رکھتے ہیں جب ان کو اس طرح کی کوئی نازک آزمائش پیش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے خاص روحانی فیض سے ان کو قوت بہم پہنچاتا ہے اور وہ اس آزمائش سے بھی سرخرو ہو کر نکلتے ہیں۔ ع

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

یہ اسی فیضِ روحانی کا کرشمہ تھا کہ ابوعبیدہ بن جراحؓ نے غزوۂ احد میں اپنے باپ عبداللہ الجراح پر تلوار چلائی، سیدنا ابوبکرؓ نے بدر میں اپنے فرزند کو للکارا، مصعب بن عمیرؓ نے احد میں اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا، حضرت عمرؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو قتل کیا اور علی، حمزہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہم نے عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ کو لقمۂ اجل بنایا۔

'وَیُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا' یعنی زندگی میں اللہ نے ان کو رسوخِ ایمان اور فیضانِ روحانی سے نوازا اور ان کو پا بر جا رکھا اور مرنے کے بعد ان کو جنت میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

'رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ' یہ سب سے بڑا اعزاز ہے جو ان کو اس دن حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا کہ انھوں نے جس ایمان کا اقرار کیا اس کا پورا حق ادا کر دیا، جس امتحان میں بھی وہ ڈالے گئے اس میں پورے اترے، اس دنیا میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے جس کردار کا مظاہرہ چاہتا ہے انھوں نے ہر امتحان میں اسی کردار کا مظاہرہ کیا اس وجہ سے ربِ کریم ان کو شاباش دے گا کہ ہم تم سے راضی ہوئے۔ ہم نے جو چاہا وہ تم نے پورا کر دکھایا۔ اب تم ہم سے جو چاہو گے وہ تمھیں ملے گا۔

'وہ اللہ سے راضی ہوئے' کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے جن وعدوں پر اس دنیا میں جیے اور مرے وہ سارے وعدے ان کی امیدوں اور ان کے گمانوں اور قیاسوں سے کہیں بہتر شکل میں ان کے سامنے آئیں گے اور وہ اس طرح نہال ہو جائیں گے کہ ان کے دل کا ہر ارمان پورا ہو جائے گا۔

'اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ط اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ' فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جن کو حزب اللہ میں ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہی لوگ فلاح پانے والے بنیں گے۔ اوپر حزب الشیطان اور اس کی خصوصیات کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب حزب اللہ کے ذکر پر یہ سورہ تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔ اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

رحمان آباد
۱۰۔ جنوری ۱۹۷۸ء
۲۹۔ محرم الحرام ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۵۹

الحشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ ——— المجادلۃ ——— میں فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کر رہے ہیں وہ بالآخر ذلیل و خوار ہو کے رہیں گے، غلبہ اللہ اور اس کے رسولوں کے لیے ہے۔ اس سورہ میں اسی دعوے کو بعض واقعات سے مُبرہن فرمایا ہے جو اس دوران میں پیش آئے اور منافقوں کو آگاہ کیا ہے کہ اگر وہ آنکھیں رکھتے ہیں تو ان واقعات سے سبق لیں کہ جن دشمنوں کو وہ ناقابل تسخیر خیال کیے بیٹھے تھے اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں اپنے گھروں کو اجاڑ کر جلاوطنی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے اور ان کے حامیوں میں سے کوئی ان کا ساتھ دینے والا نہ بنا۔

پوری سورہ میں خطاب منافقین ہی سے ہے۔ آخر میں یہ بات بھی ان پر واضح فرما دی گئی ہے کہ ان کے شبہات و شکوک دور کرنے اور ان کے دلوں کے اندر گداز پیدا کرنے کے لیے اس قرآن میں اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ نازل کر دیا جو ضروری ہے۔ اگر یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی اللہ کی خشیت سے پاش پاش ہو جاتا۔ اگر یہ تمہارے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں اور تم سزاوار ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ وہی معاملہ کرے جو تمہارے جیسے سنگ دلوں کے ساتھ وہ کیا کرتا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) یہود بنی نضیر کی جلاوطنی کی طرف اشارہ۔ نقض عہد اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کے جرم میں ان کو ان کے گھروں سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ پہلے تو وہ اس کی تعمیل پر راضی ہو گئے لیکن بعد میں، اپنے بعض حلیفوں کی شہ مل جانے سے، وہ اکڑ گئے۔ بالآخر حضورؐ نے فوج کشی کی اور ان کو جلاوطن ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ ان کو یہ اجازت دی گئی کہ اپنے جو سامان وہ اونٹوں پر لے جا سکتے ہیں لے جائیں۔ چنانچہ جو کچھ وہ لے جا سکے لے گئے۔ بقیہ سامان پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ لوگ جلاوطن ہو کر خیبر چلے گئے۔ یہ واقعہ ۴ھ میں پیش آیا۔ منافقین کو اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ تم سمجھتے تھے کہ ان کو نکالا نہیں جا سکتا حالانکہ یہ نکلے اور اس طرح نکلے کہ اپنے بنے بنائے گھروں کو انھوں نے خود اپنے ہاتھوں اجاڑا۔ اللہ کے رسول کے مخالفین کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ان کا سہارا لینے کی کوشش کی تو یہ اجڑے گھر کی دربانی ہو گی اور تمہارا

بھی وہی حشر ہو گا جو ان کا ہوا۔

(۵-۱۰) ایک جملہ معترضہ جس میں برسرِ موقع یہود اور منافقین کے بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ جو انھوں نے بنی نضیر کے باغوں کے اجاڑنے اور اموالِ فَے کی تقسیم سے متعلق اٹھائے۔ نیز انصار اور مہاجرین کے اس سیر چشمانہ رویہ کی تحسین فرمائی گئی ہے جو منافقین کے برعکس انھوں نے اموالِ فَے کے معاملے میں اختیار کیا۔

(۱۱-۱۷) منافقین کی ایک اور شرارت کی طرف اشارہ۔ انھوں نے بنی نضیر کے جلاوطن ہو جانے کے بعد بنو قریظہ کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی کہ ہم آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔ اگر بنی نضیر کی طرح آپ لوگ بھی نکالے گئے تو ہم بھی آپ کے ساتھ نکلیں گے اور اگر آپ پر حملہ ہوا تو ہم آپ کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ قرآن نے آگاہ کیا کہ یہ محض زبان کے سورما ہیں۔ نہ نکلنے میں ساتھ دینے والے ہیں نہ لڑنے میں۔ یہ وہی کریں گے جو شیطان کیا کرتا ہے کہ مجرم کو جرم پر ابھارتا ہے اور جب وہ جرم کر بیٹھتا ہے تو وہ اس سے براءت کا اعلان کر کے الگ ہو جاتا ہے۔ اگر ان کی شہ پر بنو قریظہ بھی نقضِ عہد کر بیٹھے تو ان کا حشر بھی وہی ہو گا جو بنی نضیر کا ہو چکا ہے۔

(۱۸-۲۴) خاتمۂ سورہ ـــ جس میں مسلمانوں کو عام طور پر اور منافقین کو خاص طور پر تنبیہ ہے کہ ہر وقت آخرت کو یاد رکھو۔ ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو خدا کو بھلا کر اپنے مقصدِ وجود اور اپنے انجام سے غافل ہو بیٹھے۔ دوزخ والوں اور جنت والوں میں بڑا فرق ہو گا۔ اس فرق کو کوئی معمولی فرق گمان کر کے اس کو نظر انداز نہ کرو۔ آسمان و زمین کی کامیابی صرف اہلِ جنت کا حصہ ہو گی۔ یہ بھی یاد رکھو کہ تم پر اتمامِ حجت کے معاملے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے۔ یہ قرآن وہ چیز ہے کہ کسی پہاڑ پر بھی اتارا جاتا تو وہ خشیتِ الٰہی سے پاش پاش ہو جاتا۔ اگر تمھارے دل اس سے اثر پذیر نہیں ہو رہے ہیں تو یہ قرآن کا قصور نہیں بلکہ تمھارے دلوں کا قصور ہے کہ وہ پتھروں سے بھی سخت ہیں۔

آخر میں اسمائے الٰہی کا حوالہ تاکہ اہلِ ایمان میں ان کے ذکر سے کامل تفویض و تسلیم، ضعفاء میں عزم و توکل اور منافقین کے اندر خوف و خشیت پیدا ہو۔ پھر سورہ کا خاتمہ اسی آیت پر ہوا ہے جس سے اس کا آغاز ہوا۔

سُورَةُ الْحَشْرِ (۵۹)

مَدَنِيَّةٌ ——— آیات: ۲۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۴

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ۝۱ هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ
اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۗ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ
يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ
اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ
يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا
يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۲ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاۗءَ
لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝۳
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ
فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۴

ترجمۂ آیات ۱-۴

اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہی غالب و حکیم ہے۔ وہی ہے جس نے نکالا ان لوگوں کو جنھوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا، ان کے گھروں سے حشرِ اوّل کے لیے۔ تمھارا گمان نہ تھا کہ وہ کبھی اپنے گھروں سے نکلیں گے اور ان کا گھمنڈ یہ تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ کی پکڑ سے بچائے رکھیں گے تو اللہ کا قہر ان پر وہاں سے آ دھمکا جہاں سے ان کو گمان بھی نہیں ہوا۔ اور اس نے ان کے

دلوں میں رعب ڈال دیا۔ وہ اپنے گھروں کو اجاڑ رہے تھے خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی۔ پس عبرت حاصل کرو اس سے، اے آنکھیں رکھنے والو! ۱-۲

اور اگر اللہ نے ان کے لیے جلاوطنی نہ مقدر کر رکھی ہوتی تو ان کو دنیا میں عذاب دیتا اور ان کے لیے آخرت میں دوزخ کا عذاب ہے۔ یہ اس جرم میں کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، جو اللہ کا مقابلہ کرتے ہیں تو اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۳-۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱)

اس آیت کی اہمیت اور حکمت

یہ آیت سورۂ حدید کے شروع میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے مضمرات کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں خاص توجہ کی چیز یہ ہے کہ اس سورہ کا آغاز اور اختتام دونوں، نہایت معمولی فرق کے ساتھ، اسی آیت پر ہوا ہے جس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں وہ اس آیت کے مضمرات کی تائید و تصدیق کرتے ہیں۔ گویا یہ سورہ اپنے اصل دعوے کو بھی ثابت کرتی ہے جو سابق سورہ میں بیان ہوا اور اللہ تعالیٰ کی ان صفات کی شہادت بھی فراہم کرتی ہے جو تمہید کی اس آیت میں بیان ہوئی ہیں۔

یہ آیت جس حقیقت کی یاد دہانی کرتی ہے وہ دراصل یہ ہے کہ یہ ساری کائنات اپنی تسبیح و تقدیس اور اپنی بندگی و سرافگندگی سے اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس کا خالق ہر عیب، ہر کمزوری اور ہر شائبۂ شرک سے بالکل پاک و منزّہ ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت و اختیار رکھتا ہے۔ اس کے کسی ارادے میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ اس وجہ سے بندوں کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کریں، اسی پر بھروسہ کریں، اسی کے احکام کی تعمیل کریں، اسی سے ڈریں اور اسی سے امید رکھیں۔ متصرف حقیقی وہی ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی چیز اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتی۔

اسی حقیقت کے ذہن میں راسخ ہونے سے صحیح ایمان پیدا ہوتا ہے جو تمام عزم و قوت کا سرچشمہ ہے اور اسی کے اندر رخنہ پیدا ہونے سے نفاق اور کفر و شرک کو دل کے اندر گھسنے کی راہ ملتی ہے جس سے علم و عمل کے ہر گوشے میں فساد پھیل جاتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ (۲)

بنی نضیر کی غداری اور ان کا حشر

'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ' سے مراد مفسرین کے نزدیک یہود بنی نضیر ہیں جو مدینہ منورہ کے قریب آباد تھے۔ بخاریؒ کے بیان کے مطابق مختصراً ان کا واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اگرچہ صلح و امن کا معاہدہ کر رکھا تھا لیکن بدر کے چھٹے مہینہ معاہدے کے خلاف انھوں نے اسلام کے دشمنوں سے ساز باز بھی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی ایک ناکام سازش کے بھی مرتکب ہوئے۔ ان کے اس جرم کی پاداش میں آپ نے ان کو مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ پہلے تو وہ اس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے لیکن بعد میں مشہور منافق عبداللہ بن اُبَیّ نے انھیں اکسایا کہ میرے دو ہزار آدمی تمھارے ساتھ ہیں نیز قریش اور غطفان بھی تمھاری حمایت کریں گے، تم نکلنے سے انکار کر دو۔ عبداللہ بن اُبَیّ کی ان باتوں سے وہ اس کے چکمے میں آ گئے اور نکلنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر فوج کشی کی۔ اس وقت نہ بنو قریظہ نے ان کا ساتھ دیا نہ قریش اور غطفان نے۔ ناچار انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ آپ نے ازراہِ عنایت یہ اجازت انھیں دے دی کہ جتنا سامان وہ اونٹوں پر لے جا سکتے ہیں اتنا لے جائیں۔ چنانچہ وہ جتنا سامان لے جا سکے لے کر خیبر اور اذرعات چلے گئے۔ ان کی باقی املاک و جائداد پر آپ نے قبضہ کر لیا۔

'لِاَوَّلِ الْحَشْرِ'۔ یعنی ان کا یہ اخراج پہلے حشر کے طور پر ہوا۔ اس کے اندر یہ تنبیہ ہے کہ اس کے بعد بھی انھیں اسی طرح کے حشر سے دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے عہد میں انھیں وہاں سے بھی نکلنا پڑا اور سب سے بڑا حشر ــــــ قیامت کا حشر ــــــ آگے آنے والا ہے۔

منافقوں سے خطاب

'مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ' یہ خطاب انہی منافقین سے ہے جن کا ذکر پچھلی سورہ میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ تم کو ان کی قوت و جمعیت اور ان کے حلیفوں کی حمایت و نصرت پر بڑا اعتماد تھا، تم سمجھے بیٹھے تھے کہ انھیں یہاں سے ہلایا نہیں جا سکے گا اور خود ان کو بھی اپنے قلعوں اور اپنی گڑھیوں پر بڑا ناز تھا کہ بھلا کسی کی مجال ہے کہ وہ

ان سے دو بدو ہونے کی جرأت کر سکے لیکن دیکھ لو ان کا غرور کس طرح پامال ہوا۔

مغروروں کی ذہنیت

'مِنَ اللّٰہِ' میں عربیت کے قاعدے کے مطابق مضاف محذوف ہے یعنی 'مِنْ بَاْسِ اللّٰہِ' یا 'مِنْ عَذَابِ اللّٰہِ' یا 'مِنْ بَطْشِ اللّٰہِ' مطلب یہ ہے کہ انھوں نے قلعے اور گڑھیاں بنا لیں تو اس زعم میں مبتلا ہو گئے کہ وہ صرف انسانوں ہی سے نہیں بلکہ خدا کی پکڑ سے بھی مامون ہو گئے۔ یہ مغروروں کی ذہنیت کی بالکل صحیح تصویر ہے۔ جن کو اس دنیا میں قوت و شوکت حاصل ہو جاتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ بھلا ان کے قلعہ کے اندر کہاں سے کوئی رخنہ پیدا ہو سکتا ہے! یہاں تک کہ اگر اللہ کا کوئی بندہ ان کو خدا کی پکڑ سے بھی ڈرائے تو بھی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ان کے اس محفوظ حصار کے اندر خدا کدھر سے آ جائے گا!

حملہ پیچھے سے

'فَاَتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا' یعنی انھوں نے تو اپنی دانست میں اپنے قلعوں کے اندر خدا کے در آنے کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی لیکن خدا وہاں سے ان پر آ دھمکا جہاں سے ان کو سان گمان بھی نہ تھا۔

'وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِہِمُ الرُّعْبَ' یہ نشان دہی فرمائی ہے کہ خدا نے کدھر سے ان پر تاخت کی۔ فرمایا کہ وہ اپنے اردگرد اینٹوں اور پتھروں کی دیواریں چن کر سمجھے کہ خدا کی پکڑ سے باہر ہو گئے لیکن اللہ نے ان کی دیواریں ہٹانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ براہ راست ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ قلعے اور گڑھیاں رکھتے ہوئے ایسے مرعوب ہوئے کہ اپنے بنائے ہوئے گھروں کو انھوں نے خود اپنے ہاتھوں اجاڑا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اصل طاقت اسلحہ اور قلعوں کی دیواروں کے اندر نہیں بلکہ دلوں کے اندر ہوتی ہے جو اللہ پر ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ طاقت موجود ہو تو فی الواقع بے تیغ بھی سپاہی لڑتا ہے اور اگر یہ نہ ہو تو ایٹمی آلات کی بڑی سے بڑی مقدار بھی بے سود ہے بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ یہ چیزیں دشمن کے بجائے خود اپنی ہی تباہی کا ذریعہ بن جائیں۔

'یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَہُمْ بِاَیْدِیْہِمْ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ' یہ ان کی مرعوبیت کی تصویر ہے کہ اپنے جو مکانات انھوں نے نہ جانے کتنے ولولوں اور ارمانوں سے بنائے تھے خود اپنے ہاتھوں سے اجاڑ رہے تھے۔ 'یُخْرِبُوْنَ' یہاں تصویر حال کے لیے ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ ان کو یہ اجازت دے دی گئی تھی کہ اپنے اونٹوں پر جتنا سامان لے جا سکتے ہیں اٹھا لے جائیں۔ اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے مکانوں کی شہتیریں، کڑیاں، دروازے اور کھڑکیاں بھی اکھاڑ کر اپنے اونٹوں پر لاد لینے کی کوشش کی۔ حرص مال کے علاوہ مسلمان دشمنی کا جذبہ بھی کارفرما تھا اس وجہ سے انھوں نے یہ کوشش بھی کی ہو گی کہ جو چیز بچ بھی رہے اس کو بھی اس طرح ناکارہ بنا دیں کہ مسلمان اس

سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

'وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ'۔ ان کی اس تخریب میں مسلمانوں نے بھی ہاتھ بٹایا ہو گا کہ یہ مفسدین جس قدر جلد ممکن ہو ان کے قریب سے دفع ہوں۔ علاوہ ازیں آگے کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض باغ مسلمانوں نے جنگی ضرورت کے لیے بھی کاٹے۔

'فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ'۔ یہ اس واقعہ سے ان تمام لوگوں کو عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے جن کے اندر عبرت پذیری کی صلاحیت ہے کہ دیکھ لو قرآن کی ہر بات کس طرح سچی ثابت ہوئی۔ اللہ و رسول کی مخالفت کرنے والوں کو کس طرح ذلت سے دوچار ہونا پڑا۔ حزب اللہ کے مقابل میں حزب الشیطان کو کس طرح شکست ہوئی۔ اگر اس کے بعد بھی کچھ لوگ اللہ و رسول کے دشمنوں سے دوستی رکھنے کے خواہش مند ہیں تو کر کے دیکھ لیں کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

وَلَوْلَآ اَنْ کَتَبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِی الدُّنْیَا ؕ وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ (۳)

یعنی یہ تو اللہ نے ان کے ساتھ رعایت فرمائی کہ ان کو جلا وطنی ہی کی سزا دی۔ اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ اسی تنبیہ پر کفایت کی جائے کہ ان کے اندر عبرت پذیری کی کچھ صلاحیت ہو تو وہ اپنے رویہ کی اصلاح کریں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس دنیا ہی میں ان پر اس طرح کا کوئی فیصلہ کن عذاب بھیج دیتا جس طرح کے عذاب عاد و ثمود اور فرعون وغیرہ پر آئے جن سے ان کا قصہ ہی پاک ہو گیا۔

'وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ'۔ یعنی اس سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو معاملہ اس جلا وطنی ہی پر ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ آخرت میں ان کے لیے دوزخ کا عذاب بھی ہے جو ساری کسر پوری کر دے گا۔

ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ یُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (۴)

یعنی یہ غضب ان پر اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور سنت الٰہی یہی ہے کہ جو اللہ کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس کی شدید پاداش سے دوچار ہوتے ہیں۔

اس آیت میں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ 'وَمَنْ یُّشَآقِّ اللّٰهَ' میں 'وَرَسُوْلَهٗ' کو حذف کر دیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رسول سے مخاصمت درحقیقت اللہ سے مخاصمت ہے اور جو اللہ سے مخاصمت کے لیے اٹھتا ہے وہ اچھی طرح سوچ لے کہ اس کا کیا انجام ہو سکتا ہے!

۲- آگے آیات ۵-۱۰ کا مضمون

آگے اصل سلسلۂ مضمون سے ذرا ہٹ کر، بطور جملۂ معترضہ، یہود اور منافقین کے بعض اعتراضات و شبہات کے جواب دیے ہیں جو اسی واقعۂ بنی نضیر کے تعلق سے پیدا ہوئے۔

ایک اعتراض تو یہود نے اٹھایا کہ مسلمانوں نے ان کے باغوں کے بہت سے بار آور درخت کاٹ دیے۔ یہ درخت اگرچہ جنگی مصلحت سے کاٹے گئے تھے لیکن یہود اور ان کے ہمدردوں نے اس کو یہ رنگ دینے کی کوشش کی کہ یہ افساد فی الارض ہے درآنحالیکہ مسلمان اصلاح فی الارض کے مدعی ہیں۔ اس اعتراض سے ان کا مقصود یہ تھا کہ اسلام کی دعوت کو لوگوں کی نگاہوں میں مشکوک بنائیں کہ یہ دین کی دعوت نہیں بلکہ حصولِ اقتدار کی کشمکش ہے، جس میں دین کا نام محض لوگوں کو، العیاذ باللہ، دھوکا دینے کے لیے لیا جا رہا ہے۔ اس نوعیت کے ایک اعتراض کا جواب سورۂ حدید میں بھی گزر چکا ہے جو اہل کتاب ہی کا اٹھایا ہوا تھا۔

دوسرا سوال منافقین نے بنی نضیر کے متروکہ اموال و املاک سے متعلق اٹھایا کہ ان کو بھی اموالِ غنیمت کی طرح، پانچواں حصہ الگ کر کے، باقی فوجیوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے لیکن قرآن نے اس کو مالِ غنیمت کے بجائے مالِ فے کی حیثیت دی اور اس کے متعلق یہ حکم دیا کہ یہ سب کا سب سرکاری خزانے میں جمع ہو گا تاکہ اس سے غربا و مساکین اور خاص طور پر ان مہاجرین کی مدد کی جائے جو صرف دین کی خاطر اپنے گھروں سے نکالے اور اپنی جائدادوں سے محروم کیے گئے ہیں۔ اسی ذیل میں انصار اور مہاجرینِ اولین کے ایثار اور ان کی سیر چشمی کی تحسین فرمائی کہ وہ اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے نہایت فراخ دل ہیں اور اپنی ضرورت پر ان کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی رویہ اہلِ ایمان کے شایانِ شان ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵-۱۰

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ
اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝٥ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ
فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ
رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٦ مَآ
اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَ

لِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ
دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ
فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ
شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٧﴾ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا نصف
مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا
وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴿٨﴾
وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ
هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا
وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ
يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٩﴾ وَالَّذِينَ
جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا
الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا
لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿١٠﴾ ع ۱ / ۱۰

ترجمۂ آیات ۵-۱۰

کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا جو سلامت چھوڑ دیے تو یہ اللہ کے حکم سے ہوا اور تاکہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔ ۵

اور اللہ نے ان کی طرف سے جو کچھ اپنے رسول کی طرف لوٹایا تو تم نے اس پر نہ اپنے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ بلکہ اللہ ہے جو اپنے رسولوں کو مسلط کر دیتا ہے جن پر چاہتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو کچھ اللہ بستیوں والوں کی طرف سے

اپنے رسول کی طرف لوٹائے تو وہ اللہ اور رسول اور قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ تاکہ اس کی گردش تمہارے مال داروں ہی کے اندر محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اور رسول جو تمھیں دے اس کو لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سخت پاداش والا ہے۔ یہ خاص طور پر ان محتاج مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی املاک سے نکالے گئے ہیں اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہوئے یہی لوگ اصل راستباز ہیں۔ ۶-۸

اور جو لوگ پہلے سے ٹھکانے بنائے ہوئے اور ایمان استوار کیے ہوئے ہیں وہ دوست رکھتے ہیں ان لوگوں کو جو ہجرت کر کے ان کی طرف آ رہے ہیں اور جو کچھ ان کو دیا جا رہا ہے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی خلش نہیں محسوس کر رہے ہیں اور وہ ان کو اپنے اوپر ترجیح دے رہے ہیں اگرچہ انھیں خود احتیاج ہو۔ اور جو خود غرضی سے محفوظ رکھے گئے تو درحقیقت وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۹

اور جو ان کے بعد آئے وہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو بھی بخش اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش جنھوں نے ایمان لانے میں ہم پر سبقت کی اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کینہ نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے رب، بے شک تو نہایت شفیق و مہربان ہے! ۱۰

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ (۵)

'لِیْنَۃٌ' کھجور کے مثمر درخت کو کہتے ہیں۔ یہ یہود اور ان کے حلیفوں کے ایک اعتراض کا برمحل جواب ہے۔ مسلمانوں نے جب بنی نضیر پر فوج کشی کی تو جنگی ضرورت و مصلحت کے تحت ان کے باغوں کے کچھ درخت انھیں کاٹنے پڑے۔ اس چیز کو انھوں نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا ذریعہ بنا لیا کہ مسلمان دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ ملک میں اصلاح کے لیے اٹھے ہیں لیکن ان کا حال یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے باغوں کے پھل لانے والے عمدہ درخت کاٹ کے ڈال دیے۔ بھلا مثمر درختوں کا کاٹنا بھی کوئی اصلاح کا کام ہوا، یہ تو صریح فساد فی الارض ہے!

ایک اعتراض کا برمحل جواب

'اَوْ تَرَکْتُمُوْهَا قَآئِمَةً' کے بظاہر ذکر کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی اس لیے کہ ان کا اعتراض درختوں کے کاٹنے پر تھا نہ کہ ان کے چھوڑنے پر لیکن اس کے ذکر سے ان کے اعتراض کے ایک خاص پہلو پر روشنی پڑتی ہے جس پر اس کے بغیر روشنی نہیں پڑ سکتی تھی۔ وہ یہ کہ جب انھوں نے یہ اعتراض اٹھایا ہوگا تو اس کو مؤثر بنانے کے لیے یہ بھی کہا ہوگا کہ اگر مسلمانوں کو صرف وقتی ضرورت کے لیے لکڑی مطلوب تھی تو وہ فلاں اور فلاں درخت کاٹ سکتے تھے جن کے کاٹنے سے کچھ زیادہ نقصان نہ ہوتا لیکن وہ درخت تو انھوں نے کھڑے چھوڑ دیے اور یہ اچھے بھلے، مثمر درخت انھوں نے کاٹ کے ڈھیر کر دیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقدام کسی واقعی ناگزیر ضرورت کے لیے نہیں بلکہ محض انتقام کے جذبہ کے تحت، معاشی تباہی پھیلانے کے لیے کیا گیا ہے جو اصلاح نہیں بلکہ صریح فساد ہے۔

'فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ'۔ یہ اس اعتراض کا جواب دیا ہے لیکن معترضین کو مخاطب کرنے کے بجائے صرف مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے کہ تم ان ناصحوں کی ملامت پر دھیان نہ کرو کہ تمھیں کون درخت کاٹنے اور کون چھوڑنے تھے۔ تم نے جو کچھ کیا رسول کی موجودگی میں، اس کی ہدایت کے تحت کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کام اللہ کے اذن کے تحت ہوا ہے اور جب اللہ کے اذن کے تحت ہوا تو اللہ سے بڑھ کر کوئی حکمت و مصلحت کو جاننے والا ہو سکتا اور نہ اصلاح و فساد کے درمیان امتیاز کرنے والا۔

'وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو اس لیے یہ اذن دیا کہ ان عہد شکنوں اور غداروں کو رسوا کرے اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ انھوں نے جو درخت بڑے ارمانوں سے لگائے وہ ان کے سامنے کاٹے جا رہے ہیں لیکن وہ اتنے بے بس ہیں کہ چوں بھی نہیں کر سکتے۔ لفظ 'فاسق' یہاں غدار اور عہد شکن کے مفہوم میں ہے اور اس مفہوم میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

یہاں معترضوں اور نکتہ چینیوں کو خطاب نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اعتراض ایک بالکل نامعقول اعتراض تھا جو انھوں نے محض اپنے دل کا بخار نکالنے کے لیے اٹھایا۔ اس وجہ سے وہ لائق خطاب نہ تھے البتہ مسلمانوں کو خطاب کر کے ان کے اس فعل کی تصویب فرما دی تاکہ غداروں کو اس سے رنج بھی پہنچے اور ساتھ ہی منافقوں کو بھی تنبیہ ہو جائے کہ وہ اس کو وسوسہ اندازی کا ذریعہ نہ بنائیں۔

رہا یہ سوال کہ مسلمان بحالتِ جنگ دشمنوں کے باغوں اور کھیتوں کو اجاڑ سکتے ہیں یا نہیں تو یہ کوئی اہم سوال نہیں ہے۔ اگر جنگ کی ضرورت داعی ہو تو وہ ان کے گھروں کو بھی مسمار کر سکتے ہیں چہ جائیکہ ان کے باغ اور کھیت۔ لیکن جنگ کی ضرورت داعی نہ ہو تو ان کی کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی نقصان پہنچانا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶)

ایک دوسرے سوال کا جواب: یہ دوسرے سوال کا جواب ہے جو بنی نضیر کی متروکہ املاک سے متعلق پیدا ہوا اور جس کو منافقین نے اپنی حرصِ مال کی وجہ سے زیادہ شدت کے ساتھ ہوا دی۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ بھی دشمن سے حاصل شدہ مال ہے اس وجہ سے اس کو بھی مالِ غنیمت کی طرح پانچواں حصہ نکال کر باقی ہر چیز فوجیوں میں تقسیم کر دی جائے۔ اس سے کچھ ہی پہلے جنگِ بدر کے موقع پر ایسا ہی کیا گیا تھا۔ اسی کو سامنے رکھ کر اس کے بارے میں بھی وہی مطالبہ کیا گیا لیکن قرآن نے دونوں صورتوں میں نمایاں فرق ہونے کی وجہ سے اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا۔ بدر کے موقع پر مجاہدین کو باقاعدہ جنگ کرنی پڑی تھی جس میں ان کو اپنے اسلحہ اور اونٹ گھوڑے کام میں لانے پڑے جب کہ اس موقع پر اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی بلکہ اللہ کے رسول کے دبدبہ سے مرعوب ہو کر دشمن نے اپنا علاقہ خود خالی کر دیا۔ اس فرق کی وجہ سے اس کے متعلق حکم ہوا کہ اس کی حیثیت مالِ فَے کی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے دشمنوں سے اپنے رسول کو دلوایا ہے چنانچہ یہ کل کا کل اللہ و رسول یا بالفاظ دیگر اسلامی حکومت کی ملکیت ہو گا اور اسلام اور مسلمانوں کی اجتماعی بہبود میں صرف ہو گا۔

مالِ فَے اور اس کا حکم: اسی 'مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ' سے اسلامی مالیات میں ایک مستقل اصطلاح مالِ فَے کی پیدا ہو گئی جس سے وہ مال مراد ہوا کرتا ہے جو دشمن سے بغیر جنگ کے حاصل ہوا ہو۔ 'فَے' کے معنی لوٹانے کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اس مال کو غاصبوں سے لے کر اس کے حقیقی حق داروں کو لوٹا دیتا ہے۔

'فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ' سے معلوم ہوتا ہے کہ فوجیوں کو مالِ غنیمت سے جو حصہ دیا جاتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں اپنے ذاتی اسلحہ، گھوڑے اور اونٹ جنگ میں استعمال کرنے پڑتے تھے یہاں تک کہ اپنا زادِ راہ بھی ساتھ رکھنا ہوتا تھا۔ اب صورتِ حال بالکل تبدیل ہو گئی ہے اس وجہ سے اس زمانے میں دشمن سے جو کچھ بھی حاصل ہو گا اس کی حیثیت فَے کی ہو گی، خواہ جنگ سے حاصل ہو یا صلح سے۔

'وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ' سورۂ مجادلہ کی آیت ۲۱ میں گزر چکا ہے کہ 'كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ' (اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب

رہوں گا اور میرے رسول) اس سنتِ الٰہی کے تحت رسول کے لیے غلبہ ضروری ہے۔ اس غلبہ کے لیے اللہ کا رسول اپنے رب کے سوا کسی اور کی مدد کا محتاج نہیں ہے اور اس کا رب ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ چاہے تو اس کو دشمنوں کے بڑے سے بڑے ملک پر بغیر کسی فوج ہی کے غالب کر دے۔ اہل ایمان سے اگر وہ مدد کا طالب ہوتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ ان کی مدد کا محتاج ہے بلکہ اس سے ایک مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ ان کے لیے حصولِ سعادت کی راہ کھلے اور دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخلص اور منافق میں امتیاز ہو جائے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَیْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۷)

مالِ غنیمت اور مالِ فے کے درمیان فرق واضح کرنے کے بعد یہ مالِ فے کا مصرف بتا دیا کہ یہ کل کا کل اللہ، رسول، رسول کے متعلقین، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہو گا یعنی اس میں جنگ کرنے والوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہاں جو مصارف بیان ہوئے ہیں وہ سب سورۂ انفال میں اموالِ غنیمت کے سلسلہ میں زیرِ بحث آ چکے ہیں۔ اس وجہ سے یہاں ہم صرف خاص خاص باتوں ہی کی طرف توجہ دلائیں گے۔ تفصیل کے طالب تفسیر سورۂ انفال کی مراجعت کریں۔

'لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ' میں جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے، وہ کسی مال و متاع کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے نام کا حصہ درحقیقت اس کے بندوں ہی کی طرف لوٹتا ہے اور اسلامی حکومت امین کی حیثیت سے اس کو مستحقین اور مسلمانوں کی اجتماعی بہبود کے کاموں میں صرف کرتی ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اس میں بحیثیت رسول کے نہیں بلکہ بحیثیت اسلامی حکومت کے سربراہ کے ہے۔ رسول کی حیثیت سے آپ کی کفالت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی تھی جس کی تصریح خود قرآن میں ہے البتہ جب اسلامی حکومت وجود میں آئی اور اس کے فرائض کا بوجھ بھی آپ کے کندھوں پر پڑا تو ضروری ہوا کہ سرکاری خزانے سے آپ کو بھی اپنی ضروریات کے مطابق لینے کا حق ہو۔ آپ کا یہ حق چونکہ بحیثیت سربراہ حکومت کے تھا اس وجہ سے آپ کی وفات کے بعد یہ آپ کے خلیفہ کی طرف لوٹ گیا۔ اس کی نوعیت کسی ذاتی ملکیت کی نہیں تھی کہ آپ کے بعد اس کی وراثت کا سوال پیدا ہو۔ حضرات انبیاء علیہم السلام دین کی وراثت چھوڑتے ہیں، اموال و املاک کی وراثت نہیں چھوڑتے۔

'وَلِذِى الْقُرْبٰى' سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقرباء مراد ہیں جن کی کفالت کی

آپ پر ذمہ داری تھی۔ یہ چیز درحقیقت آپ کی ذاتی ضرورت ہی کا ایک حصہ تھی۔ اس کی نوعیت بھی کسی ذاتی جائداد کی نہیں تھی کہ آپ کے بعد یہ وراثت کی حیثیت سے آپ کے خاندان کی طرف لوٹے۔ جس طرح اسلام پر کسی خاص خاندان کا اجارہ نہیں ہے اسی طرح اسلام کی حکومت یا اس کے بیت المال کے کسی حصہ پر بھی کبھی کسی خاندان کا اجارہ نہ ہوا نہ ہو سکتا۔ اس قسم کے خیالات یہودیوں کے زیر اثر مفسدین کے ایک گروہ نے مسلمانوں کے اندر پھیلائے لیکن ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرباء کے بعد معاً یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے حق کا ذکر اسلامی نظام میں ان کے مرتبہ و مقام کو واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کے حق کے ساتھ فرمایا ہے۔ اسلامی حکومت کی اوّلین ذمہ داری ان لوگوں کی کفالت و سرپرستی ہے جو معاشرہ کے اندر بے وسیلہ ہیں، اس کے دوسرے فرائض کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔ اگر حکومت اس مقدم ضرورت کو نظر انداز کر کے دوسری ضرورتوں پر بیت المال کی آمدنی خرچ کرتی ہے تو ہر چند وہ ضرورتیں رفاہی اور تمدنی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھنے والی ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ اصل حق داروں کے حقوق میں خیانت کی مجرم ہے۔ اور اس امر کے جواز کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے کہ کوئی اسلامی حکومت سرکاری خزانے کا ایک پیسہ بھی فضول قسم کی نمائشوں اور عیاشیوں پر صرف کرے۔ جو حکومت ایسا کرتی ہے وہ اسلامی حکومت نہیں بلکہ شیطانی حکومت ہے، اسی قسم کی حکومتوں کی بدولت اس دنیا پر وہ آفت نازل ہوئی جس کو اشتراکیت کہتے ہیں، جس نے انفرادی ملکیت کے تصور ہی کو سرے سے ایک جرم بلکہ تمام جرائم کی اصل قرار دے دیا۔ اور اس جرم کے استیصال کے لیے دنیا میں خون کی ندیاں بہا دیں۔

'كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ' 'دُوْلَةٌ' کے معنی گردش کے ہیں۔ 'دالت الایام' کے معنی ہوں گے 'دار الزمان' زمانہ نے گردش کی۔ اسی سے 'مداولت' ہے جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے: 'وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ' (آل عمران - ۳: ۱۴۰) (اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں)۔ مطلب یہ ہے کہ غرباء و یتامیٰ اور بے وسیلہ لوگوں کا حق اس لیے سرکاری بیت المال میں محفوظ کر دیا ہے کہ دولت صرف مال داروں ہی کے درمیان نہ گردش کرتی رہے بلکہ اس کو غریبوں تک پہنچنے کی بھی راہ ملے۔

اس سے اسلامی اقتصادیات کا یہ اصول واضح ہوا کہ اسلام یہ نہیں پسند کرتا کہ دولت کسی خاص طبقہ کے اندر مرتکز ہو کر رہ جائے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اس کا بہاؤ ان طبقات کی طرف بھی ہو جو اپنی خلقی کمزوریوں یا فقدانِ وسائل کے سبب سے اس کے حصول کی جدوجہد میں پورا حصہ نہیں لے سکتے۔ اس مقصد کے لیے اس نے افراد کو زیادہ سے زیادہ انفاق پر ابھارا ہے اور ان کے اس آزادانہ انفاق کو ان کی روحانی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ قرار دیا ہے اور قانون کے ذریعہ سے بھی ہر صاحب مال کے مال میں سے ایک

حصہ غریبوں کے حق کی حیثیت سے الگ کر کے حکومت کی تحویل میں دے دیا ہے۔

معترضین کو تنبیہ

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۔ یہ آخر میں تہدید و وعید ہے کہ رسول جو کچھ دے وہ لے لو اور جس چیز سے روکے اس سے رک جاؤ۔ کسی بات کو اعتراض و نکتہ چینی اور نجویٰ و سرگوشی کا بہانہ نہ بناؤ۔ اللہ سے برابر ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ اللہ بڑی ہی سخت سزا دینے والا ہے۔

یہ تہدید و وعید دلیل ہے کہ جن سوالوں کے جواب یہاں دیے گئے ہیں وہ منافقین کی طرف سے اٹھائے گئے تھے اور ان کے اٹھانے سے مقصود مسئلہ کی تحقیق نہیں بلکہ، ان کی عادت کے مطابق، اعتراض و نکتہ چینی تھا۔ اگر سوال محض تحقیقِ حق کے لیے مخلص مسلمانوں کی طرف سے ہوتا تو اس تہدید کا یہاں کوئی موقع نہیں تھا۔

ایک حکم خاص سے ایک کلیہ کا استنباط

یہاں رسول کا یہ درجہ جو واضح فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ وہ دے وہ لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ، اگرچہ اس کا ایک خاص محل ہے لیکن اس سے جو حکم مستنبط ہوتا ہے وہ بالکل عام ہوگا یعنی زندگی کے ہر معاملے میں رسول کے ہر حکم و نہی کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے گی اس لیے کہ رسول کی حیثیت، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے ایک واجب الاطاعت ہادی کی ہوتی ہے۔ فرمایا ہے 'وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ' (النساء - ۴ : ۶۴) (اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے) گویا اس ٹکڑے کے دو مفہوم ہوں گے۔ ایک خاص، دوسرا عام۔ اپنے خاص مفہوم کے پہلو سے یہ اپنے سابق مضمون سے مربوط ہوگا اور اپنے عام مفہوم کے اعتبار سے اس کی حیثیت اسلامی شریعت کے ایک ہمہ گیر اصول کی ہوگی۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۸)

اموالِ فے کا ایک ہنگامی مصرف

اموالِ فے کا عام مصرف بتانے کے بعد یہ اس کے ایک خاص مصرف کی طرف اشارہ فرمایا جو وقت کا سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا مصرف اور تمام مسلمانوں کی یکساں توجہ کا مستحق تھا۔ یعنی مہاجرین کی امداد جو اس وقت ہر طرف سے اپنے گھروں سے اجڑ اجڑ کر مدینہ آ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کو از سرِ نو بسانے اور ان کی معاشی زندگی کو پھر سے متحرک کرنے کی ذمہ داری اس چھوٹے سے اسلامی معاشرہ ہی پر عائد ہوتی تھی جو ابھی نیا نیا مدینہ کی سرزمین میں ابھر رہا تھا۔ یہ صورت بھی متقضی تھی کہ اموالِ فے کو حکومت کی تحویل میں دیا جائے تاکہ اس طرح کے ملی مسائل کے حل کے لیے اس کے پاس وسائل موجود رہیں۔

مہاجرین کی تعریف

ان مہاجرین کی تعریف میں فرمایا کہ یہ لوگ اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے مجبور کر کے نکالے گئے ہیں اور انھوں نے اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب اور اللہ اور اس کے رسول کی نصرت کے مقصد

سے اپنی املاک سے یہ محرومی اور اپنے گھر در سے یہ مہجوری برداشت کی ہے اس وجہ سے یہ مستحق ہیں کہ ان کے دینی بھائی پوری فراخ دلی اور سیر چشمی سے ان کی مدد کریں۔ 'يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا' سے اشارہ اس ایمانی زادِ راہ کی طرف ہے جس کے اعتماد پر یہ مہاجرین اپنے گھروں اور اپنی املاک سے بغیر اس بات کی پروا کیے اٹھ کھڑے ہوئے کہ کیا کھائیں گے اور کہاں سر چھپائیں گے۔ اور 'يَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ' سے اس مقصد کی طرف اشارہ ہے جس مقصدِ عزیز کے لیے یہ بازی انھوں نے کھیلی، یعنی انھوں نے یہ چاہا کہ وہ اللہ کے رسول کے ہم رکاب رہیں تاکہ ہر قدم پر اللہ اور اس کے رسول کی مدد کے لیے سر بکف رہ سکیں۔

'أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ'۔ فرمایا کہ یہی لوگ درحقیقت اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں کہ انھوں نے اللہ کی رضا طلبی اور رسول کی نصرت کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا، نہ کہ یہ منافقین جو مدعی تو ہیں ایمان کے لیکن اللہ کی راہ میں معمولی چوٹ کھانے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ بس یہ چاہتے ہیں کہ گھر بیٹھے بٹھائے انھیں لقمۂ تر ہاتھ آتا رہے۔ ان منافقین ہی کے بارے میں آگے اسی سورہ کی آیت ۱۱ میں فرمایا ہے کہ 'وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ' (اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین بالکل جھوٹے ہیں)۔

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۹)

انصار اور مہاجرین اولین کی سیر چشمی کی تحسین

یہ انصار و مہاجرینِ اوّلین کی سیر چشمی اور ان کی فراخ دلی کی تعریف ہے کہ اس بات سے ان کے دل تنگ نہیں ہو رہے ہیں کہ مہاجروں کے قافلے پہ قافلے ان کے غنائم و فَے میں حصہ بٹانے کے لیے چلے آ رہے ہیں بلکہ وہ بڑی فراخ دلی سے ان کا خیر مقدم کر رہے ہیں اور ان کی جو مدد کی جا رہی ہے اس سے اپنے دلوں میں کوئی رشک و حسد محسوس کرنے کے بجائے وہ اپنے اوپر ان کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انھیں خود ضرورت لاحق ہو۔

عربیت کا ایک ضابطہ

'تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ' اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح 'عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَمَاءً' (میں نے اس کو چارہ کھلایا اور پانی پلایا) یا 'زَجَّجْنَ الْحَوَاجِبَ وَالْعُيُونَا'، یا 'قَلَّدْنِي سَيْفًا وَرُمْحًا' وغیرہ مختلف ترکیبیں عربی میں معروف ہیں۔ اس طرح کی ترکیبوں میں ایک فعل، جو دوسرے مفعول سے مناسبت رکھنے والا ہو، محذوف ہوتا ہے جو قرینہ سے سمجھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تینوں مثالوں میں ایک ایک فعل محذوف ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بھی ایک فعل 'الایمان' سے مناسبت رکھنے والا محذوف ہے۔ اگر یہاں 'احکموا' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل محذوف مانئے تو پوری عبارت یوں ہوگی، 'تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَأَحْكَمُوا الْإِيمَانَ' یعنی جنھوں نے پہلے سے گھر ٹھکانا

بھی بنا رکھا ہے اور اپنے ایمان کو بھی مضبوط کر رکھا ہے۔

اس کے اوّلین مصداق تو ظاہر ہے کہ انصار ہی ہوں گے اس لیے کہ وہ پہلے سے اپنے گھر در بھی رکھتے تھے اور ایمان کی نعمت سے بھی متمتع تھے لیکن میرے نزدیک اس میں وہ مہاجرین اوّلین بھی شامل ہیں جو پہلے ہی ہجرت کر کے مدینہ پہنچ چکے تھے اور وہاں اللہ نے ان کے لیے قیام و معاش کی قابلِ اطمینان صورت بھی پیدا کر دی تھی۔ اس طرف ذہن 'مِنْ قَبْلِهِمْ' کے الفاظ سے جاتا ہے۔ اس لیے کہ مہاجرین اوّلین ہی کا یہ درجہ ہے کہ انھوں نے مہاجرین متاخرین کے مقابل میں ایمان اور ہجرت دونوں میں سبقت کی۔ جہاں تک انصار کا تعلق ہے ان کو گھر در والے ہونے کے معاملے میں تو تقدم ضرور حاصل تھا لیکن ایمان کے معاملہ میں یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ ان کو تمام مہاجرین کے مقابل میں تقدم حاصل تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعد کے مہاجرین کے مقابل میں ان کو بحیثیتِ مجموعی تقدم حاصل تھا۔ ہاں انصار کے ساتھ اگر مہاجرین اوّلین کو بھی شامل کر لیجیے تب ان کے اوپر اَلَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ کے الفاظ ٹھیک ٹھیک منطبق ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ دونوں مل کر بعد والوں کے مقابل میں باعتبارِ سکونتِ مدینہ بھی متقدم ہیں اور باعتبارِ قبولِ اسلام بھی۔

فرمایا کہ یہ لوگ نئے آنے والے مہاجرین سے محبت رکھتے اور پوری فراخ دلی سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ان کے دل اس بات سے تنگ نہیں ہو رہے ہیں کہ مہاجرین کے قافلے پر قافلے چلے آ رہے ہیں اور جو مال انھیں ملنا چاہیے تھا وہ سب ان پر صرف ہو رہا ہے یا اب وہ بھی اس میں حصہ دار بن جائیں گے بلکہ وہ نہایت سیر چشمی کے ساتھ اپنی ضروریات پر ان کی ضرورت کو ترجیح دے رہے ہیں۔

ان کی اس تعریف سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ اہلِ ایمان کو اسی طرح باہم دگر ہمدرد، فیاض اور ایثار کرنے والا ہونا چاہیے۔ یہ گویا ایک آئینہ رکھا گیا ہے ان منافقین کے سامنے جنھوں نے بنی نضیر کے چھوڑے ہوئے اموال سے متعلق یہ مطالبہ پیش کیا کہ اس کو مالِ غنیمت کی طرح لوگوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔ اس آئینہ میں انھیں دکھایا گیا ہے کہ مسلمان اپنے دوسرے بھائی کے لیے اس طرح فیاض ہوتا ہے تاکہ انھیں اپنی خود غرضی پر کچھ شرم آئے۔

'وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ' یہ ان انصار و مہاجرین کے لیے فلاح کی بشارت بھی ہے اور نفسِ انسانی کی ایک بہت خطرناک بیماری سے آگاہی بھی۔ 'شُحّ' کے معنی حرص و طمع اور لالچ کے ہیں۔ نفس کی طرف اس کی نسبت سے یہ بات تو نکلتی ہے کہ یہ نفس کے دواعی میں سے ایک داعیہ ہے لیکن ساتھ ہی اس سے بچتے رہنے کے لیے جو آگاہی دی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطرناک داعیہ ہے۔ اگر اس کو آدمی قابو میں نہ رکھ سکے تو یہ چیز اس کی آخرت کو برباد کر دیتی ہے۔ اس ٹکڑے میں منافقین کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اس بیماری میں مبتلا ہیں۔ اگر انھوں نے اس کے علاج کی فکر نہ کی تو

وہ ابدی خسران سے دوچار ہوں گے۔ میں نے اس کے اسی خطرناک پہلو کو واضح کرنے کے لیے اس کا ترجمہ خود غرضی کیا ہے۔ ایک حدیث میں اس کی وضاحت یوں آئی ہے: "ایاکم والشح فانہ اھلک من کان قبلکم امرھم بالظلم فظلموا وامرھم بالفجور ففجروا وامرھم بالقطیعۃ فقطعوا" (شح (خود غرضی) سے بچو! یہی چیز ہے جس نے تم سے پہلے کی قوموں کو تباہ کیا، اس نے ان کو ظلم کی راہ سجھائی تو انھوں نے ظلم کیے، اس نے ان کو فسق و فجور کا حکم دیا تو انھوں نے فسق و فجور کا ارتکاب کیا، اس نے ان کو قطع رحم پر ابھارا تو انھوں نے قطع رحم کیا)۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ایک اہم سوال اس آیت کے موقع و محل سے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہاں یہ کیا بات بتانے کے لیے وارد ہوئی ہے؟ ہمارے مفسرین کا خیال تو یہ ہے کہ اوپر کی آیت میں جس طرح یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اموالِ فئے میں مہاجرین کا حصہ ہے اسی طرح اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اس میں انصار کا بھی حصہ ہے، لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ مہاجرین کے ذکر کی ضرورت تو اس وجہ سے تھی کہ ان کے سبب سے اس وقت حکومت ایک ایسی صورت حال سے دوچار تھی جو متقضی ہوئی کہ حکومت کے پاس ایسے وسائل موجود ہیں کہ وہ اس طرح کی نازک صورت حال سے عہدہ برآ ہو سکے۔ گویا ان کا ذکر اموالِ فئے کے حکومت کی ملک میں دینے کی ایک دلیل کے طور پر آیا۔ اس ذیل میں انصار کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ یہ شبہ تو کسی کے ذہن میں تھا نہیں کہ انصار اس مال میں حق دار نہیں ہیں۔ جب تمام یتامیٰ، فقراء اور مساکین کا حق اس میں بیان ہوا تو ظاہر ہے کہ انصار کے فقراء و مساکین بھی اس میں حق دار ٹھہرے۔ پھر انصار کے خاص طور پر ذکر کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی اور وہ بھی وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ کی صفت کے ساتھ، جو ان کی احتیاج کو نہیں بلکہ ان کے مستغنی ہونے کو ظاہر کرتی ہے؟

ہمارے نزدیک مفسرین نے اس آیت کا موقع و محل بالکل نہیں سمجھا ہے۔ اس آیت کو اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ انصار اموالِ فئے میں حصہ دار ہیں یا نہیں۔ نہ کسی کے ذہن میں یہ سوال تھا، نہ اس کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ تھی اور نہ اس کے جواب کا کوئی فائدہ تھا۔ یہاں جو بات بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ انصار اور مہاجرین اولین (جو پہلے سے گھر در والے اور ایمان سے بہرہ مند ہیں) اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والے بھائیوں کو منافقین کی طرح اپنے لیے کوئی معاشی خطرہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کا محبت سے خیر مقدم کرتے اور ان کے لیے ہر قسم کا ایثار کرتے ہیں اور یہی رویہ ایمانی اخوت کا حقیقی تقاضا ہے۔ جو ہر سچے مسلمان کو اختیار کرنا چاہیے۔

وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۱۰)

مہاجرین متاخرین کی تحسین

انصار اور مہاجرین اولین کا رویہ بیان کرنے کے بعد یہ مہاجرین متاخرین کا رویہ بیان فرمایا جا رہا ہے کہ ان کے دلوں میں بھی اپنے ان سابق الایمان اور سابق الہجرت بھائیوں کے لیے بڑا اخلاص اور بڑی

محبت ہے۔ ان کو یہ حسد نہیں ہے کہ انھوں نے پہلے پہنچ کر تمام میسر وسائل و اسباب پر قبضہ جما لیا اور گھروں والے بن گئے جب کہ یہ ابھی ہر چیز سے محروم ہیں بلکہ یہ نہایت اخلاص کے ساتھ اپنے اور اپنے ان بھائیوں کے لیے دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم کو بھی بخش اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش جن کو ایمان و ہجرت میں ہم پر سبقت کی سعادت حاصل ہوئی اور اے ہمارے رب، ہمارے دلوں کے اندر ہمارے با ایمان بھائیوں کے خلاف کوئی کدورت نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے رب، تو نہایت شفیق و مہربان ہے۔

'وَلَا تَجۡعَلۡ فِىۡ قُلُوۡبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا' میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اپنے مقابل میں ان کے بہتر حالات دیکھ کر شیطان ہمارے دلوں میں کوئی کینہ و حسد کا جذبہ پیدا کرے۔ بلکہ تو اپنی شفقت و عنایت سے ان کے حق میں ہمارے دلوں کو مہر و محبت سے معمور رکھنا۔ یہاں منافقین کے دلوں کے اس روگ پر نظر ہے جو اوپر 'شُحّ' کے لفظ سے بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان اصحاب صدق و صفا کے دل اس قسم کے امراض سے بالکل پاک صاف ہیں۔

۴- آگے آیات ۱۱-۱۷ کا مضمون

بنو نضیر کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے ان یہود دوست منافقین کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ انھوں نے اس کے بعد بنو قریظہ کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی۔ یہود کی یہی ایک شاخ بنو نضیر کے بعد مدینہ کے قرب میں باقی رہ گئی تھی۔ قدرتی طور پر بنو نضیر کے واقعہ کے بعد ان کو اندیشہ ہو گیا ہو گا کہ اب شاید جلد ہی ان کی بھی باری آنے والی ہے۔ ممکن ہے اپنے ہمدردوں سے انھوں نے ساز باز بھی شروع کر دی ہو۔ منافقین نے ان کی ہمت بندھائی کہ آپ لوگ ہراساں نہ ہوں۔ بنو نضیر کی طرح اگر آپ لوگ بھی نکالے گئے تو ہم بھی آپ لوگوں کا ساتھ دیں گے اور آپ کے بارے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کی کسی بات کی ہرگز کوئی پروا نہیں کریں گے اور اگر جنگ کی نوبت آئی تو ہم آپ کے ساتھ شریک ہو کر لڑیں گے۔ قرآن نے مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ یہ بالکل بزدل اور جھوٹے ہیں۔ نہ یہ جلاوطنی میں ساتھ دینے والے ہیں نہ جنگ میں۔ اور اگر جنگ میں انھوں نے ان کا ساتھ دیا تو منہ کی کھائیں گے اور پھر کبھی ان کو منہ دکھانا نصیب نہ ہوگا۔ ساتھ ہی بنو قریظہ کو تنبیہ کر دیا کہ اگر وہ ان کے چکمے میں آئے تو ان کا حشر بھی وہی ہو گا جو بنو نضیر کا ہوا اور یہ شیطان کی طرح یہ کہہ کر الگ ہو جائیں گے کہ 'اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّنۡكَ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الۡعٰلَمِيۡنَ' (الحشر- ۵۹: ۱۶) (میں تم سے بری ہوں، میں اللہ، عالم کے خداوند سے ڈرتا ہوں) ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۱-۱۷

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا
نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ
وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۱﴾ لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ
مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ
لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً
فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۳﴾
لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَاۗءِ
جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ
قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۴﴾ كَمَثَلِ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۵﴾ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ
اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْۗءٌ مِّنْكَ اِنِّىْٓ اَخَافُ
اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ
ع ۵ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۷﴾

ترجمۂ آیات ۱۱-۱۷

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو نفاق میں مبتلا ہیں وہ اپنے ان بھائیوں سے جنھوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا ہے، کہتے ہیں کہ اگر آپ لوگ نکالے جاؤ گے تو ہم بھی لازماً آپ لوگوں کے ساتھ نکل جائیں گے اور آپ لوگوں کے بارے میں ہم

کسی کی بھی بات نہیں مانیں گے اور اگر آپ لوگوں سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور آپ لوگوں کی مدد کریں گے! اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر ان کی مدد بھی کریں گے تو پیٹھ دکھائیں گے پھر ان کی کوئی مدد نہیں ہو گی۔ ۱۱-۱۲

اللہ کے بالمقابل تمہاری دہشت ان کے دلوں میں زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سمجھ رکھنے والے لوگ نہیں ہیں۔ یہ تم سے کبھی اکٹھے ہو کر میدان میں نہیں لڑیں گے بلکہ قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کی اوٹ سے لڑیں گے۔ ان کے درمیان شدید مخاصمت ہے۔ تم ان کو متحد گمان کر رہے ہو حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۱۳-۱۴

(جن کو یہ شہ دے رہے ہیں) ان کا وہی حال ہو گا جو ان لوگوں کا ہوا جو ان سے کچھ ہی پہلے اپنے کیے کا وبال چکھ چکے ہیں اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب بھی ہے۔ (اور یہ شہ دینے والے) شیطان کے مانند ہیں جو انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر، پھر جب وہ کفر کر بیٹھتا ہے تو اس وقت وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں، میں اللہ ربّ العٰلمین سے ڈرتا ہوں۔ پس انجام کار دونوں ہی دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے بن کر پڑیں گے۔ اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا بدلہ یہی ہے۔ ۱۵-۱۷

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نَافَقُوْا یَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ

لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۱)

منافقین کا سازباز بنو قریظہ سے

'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب یہاں اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرا ان مدعیانِ ایمان کو تو دیکھو، ایک طرف ایمان کا دعویٰ ہے دوسری طرف ان اہل کتاب سے، جنھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت و رسالت کا انکار کیا ہے، محبت کی پینگیں بھی بڑھائی جا رہی ہیں۔

'لِاِخْوَانِهِمْ' کے لفظ سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جن منافقین کا ذکر ہے یہ یہودیوں ہی کے اندر سے آئے ہوئے تھے۔ اپنے مصالح کی خاطر یہ یہودیوں سے تو نکل آئے لیکن یہودیت ان کے اندر سے نہیں نکلی تھی۔ اپنے سیاسی و معاشی مفادات کے حد تک یہ مسلمانوں کے ساتھ تھے باقی ان کی اصل ہمدردی اپنے بھائیوں ہی کے لیے تھی۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ منافقین میں زیادہ تعداد انہی افراد کی تھی جو پہلے یہودی تھے اور انہی کا رویہ ان سورتوں میں زیر بحث ہے۔ عربوں میں سے جو لوگ اسلام لائے ان میں منافق بہت کم تھے اور ان کے نفاق کی نوعیت بھی مختلف تھی۔ آگے سورۂ ممتحنہ میں اس گروہ کا رویہ زیر بحث آئے گا۔

'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ' میں یہود کے جس گروہ کی طرف اشارہ ہے اس کے تعین میں لوگوں کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے لیکن میں اس بات پر مطمئن ہوں کہ یہ اشارہ یہود بنی قریظہ کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ کے جوار میں یہود کے تین ہی بڑے قبیلے آباد تھے: بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ بنو قینقاع کا قصہ پہلے ہی پاک ہو چکا تھا۔ بنو نضیر کا حشر اسی سورہ میں اوپر بیان ہوا۔ اس کے بعد صرف بنو قریظہ بچ رہے تھے جو مدینہ سے کچھ فاصلہ پر آباد تھے اس وجہ سے منافقین کے جس سازباز کا ذکر ہے وہ انہی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ان کا خاتمہ غزوۂ خندق کے متّصلاً بعد ہوا ہے جس کی تفصیل سورۂ احزاب میں گزر چکی ہے۔

'لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ' ان منافقین نے ان کو اطمینان دلانا شروع کیا کہ اگر آپ لوگوں کو بھی بنو نضیر کی طرح یہاں سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو ہم بھی آپ کے ساتھ نکل جائیں گے اور آپ لوگوں کے معاملے میں ہم کسی کے حکم یا مشورہ کی ہرگز کوئی پروا نہ کریں گے۔ اور اگر جنگ کی نوبت آئی تو ہم آپ لوگوں کی مدد کریں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو قریظہ کو یہ اندیشہ تھا کہ اب جلد ہی ان کی باری بھی آنے والی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان منافقین کے وعدوں پر ان کو کچھ زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔ وہ بنو نضیر کے معاملے میں اندازہ کر چکے تھے کہ یہ صرف زبان کے غازی ہیں۔ چنانچہ منافقین کو بڑی تاکید و توثیق کے ساتھ ان کو اپنے عہد پر مطمئن کرنے کی کوشش کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ یہ اطمینان بھی انھوں نے دلایا کہ وہ اس معاملے میں کسی کی پروا

نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمیں اپنے اس عہد کی خاطر ان لوگوں سے قطع تعلق بھی کر لینا پڑا تو ہم یہ بھی کر گزریں گے۔

'وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ' جس قسم و تاکید کے ساتھ ان منافقین نے بنو قریظہ کو اپنی حمایت کا یقین دلایا اسی تاکید و توثیق کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹا قرار دیا۔ 'وَاللّٰہُ یَشْھَدُ' کے الفاظ، ہم واضح کر چکے ہیں، کہ قسم کے مفہوم میں آتے ہیں۔

لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا یَخْرُجُوْنَ مَعَھُمْ ج وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا یَنْصُرُوْنَھُمْ ج وَلَئِنْ نَّصَرُوْھُمْ لَیُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ قف ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ (۱۲)

منافقین کی تردید — یہ قرآن نے ان کے ایک ایک قول و قرار کی تکذیب کر دی کہ وقت آنے پر یہ اپنی ایک بات میں بھی سچے ثابت نہیں ہوں گے۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کا ساتھ نہیں دیں گے، اگر ان پر حملہ ہوا تو یہ ان کی حمایت میں لڑنے والے نہیں ہیں اور اگر اٹھے تو منہ کی کھائیں گے اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ وقت پر کوئی بھی ان کے کام نہ آیا۔ ان کے عبرت انگیز انجام کی تفصیل سورۂ احزاب کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وقت پر بنو قریظہ کا کسی نے ساتھ نہ دیا — یہاں بالاجمال اتنی بات یاد رکھیے کہ بنو نضیر کی طرح انھوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امن و صلح کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ غزوۂ خندق کے موقع پر مشہور یہودی حیّی بن اخطب نے ان کو نقضِ عہد پر ابھارا۔ اس نے ان کو سمجھایا کہ اس وقت قریش اور غطفان اپنی پوری جمعیت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں، اگر تم بھی میدان میں آ جاؤ تو بس سمجھو کہ مسلمانوں کا خاتمہ ہے۔ اس کے چکمے میں آ کر بنو قریظہ بھی معاہدہ توڑ کر حملہ آوروں میں شریک ہو گئے۔ غزوۂ خندق کا جو انجام ہوا وہ معلوم ہے۔ اس سے فارغ ہوتے ہی حضورؐ نے بنو قریظہ کا رخ کیا اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت کسی نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا بالآخر انھیں مجبور ہو کر اپنی قسمت کا فیصلہ حضرت سعد بن معاذؓ کے ہاتھ میں دینا پڑا۔ اس فیصلہ کی تفصیل سورۂ احزاب میں گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سعدؓ کے ہاتھوں ان کی جڑ ہی کاٹ دی۔

'ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ'۔ یعنی پھر ان کے لیے امید کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ یہ اللہ کی فیصلہ کن پکڑ ہو گی اور جو لوگ اللہ کی پکڑ میں آ جاتے ہیں ان کو پھر کوئی بھی سہارا نہیں دے سکتا۔

لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَھْبَۃً فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِّنَ اللّٰہِ ط ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ (۱۳)

جو اللہ سے نہیں ڈرتے وہ بندوں سے ڈرتے ہیں — یعنی تمھارے مقابل میں یہ اپنے ان بھائیوں کی نصرت کے لیے اس وجہ سے نہیں اٹھیں گے کہ اللہ سے زیادہ تمھاری دہشت ان کے دلوں میں سمائی ہوئی ہے۔ اللہ کی مخالفت اور نافرمانی تو یہ سِرًّا بھی کرتے ہیں اور علانیۃً بھی لیکن تمھارے مقابل میں اٹھنے کا حوصلہ یہ کبھی کرنے والے نہیں ہیں۔

'ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ'۔ یعنی یہ بات ہے تو عجیب ہی کہ یہ خدا سے ڈھیٹ اور تم سے

دہشت زدہ ہیں لیکن جن کی مت ماری جاتی ہے ان کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ صاحب تازیانہ سے نہیں بلکہ صرف تازیانہ سے ڈرتے ہیں۔ اگر ان کے اندر ذرا بھی عقل و ایمان کی رمق ہوتی تو یہ سوچ سکتے تھے کہ جب وہ اپنے اصل مالک کو اپنے اوپر غضب ناک بنا چکے ہیں تو اس کے دربانوں اور نوکروں سے چھپ کر کتنے دن اپنے کو بچا سکیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عقل اور فطرت کے بدیہی حقائق کے سمجھنے سے دل اس وقت محروم ہوتا ہے جب بدیہیات کی خلاف ورزی کے جرم میں اللہ تعالیٰ اس پر مہر کر دیا کرتا ہے۔ چنانچہ منافقین ہی کے باب میں ارشاد ہوا ہے کہ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَفْقَھُوْنَ (المنٰفقون - ۶۳ : ۳) (یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ پہلے ایمان لائے پھر انھوں نے کفر کیا پس ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی، پس وہ سمجھنے سے رہ گئے)۔

لَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ جَمِیْعًا اِلَّا فِیْ قُرًی مُّحَصَّنَۃٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ط بَاْسُھُمْ بَیْنَھُمْ شَدِیْدٌ ط تَحْسَبُھُمْ جَمِیْعًا وَّقُلُوْبُھُمْ شَتّٰی ط ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ (۱۴)

یعنی ان بزدلوں کی ان گیدڑ بھبکیوں کو ذرا اہمیت نہ دو۔ ان میں اتنا بوتا نہیں ہے کہ یہ کبھی میدان میں نکل کر منظم فوج کشی کی صورت میں تم سے نبرد آزمائی کا حوصلہ کر سکیں۔ میدان میں نکلنا تو درکنار، ان پر اگر حملہ بھی ہوا تو یہ باہر نکل کر مدافعت کا حوصلہ نہیں کریں گے بلکہ بستیوں میں قلعہ بند ہو کر یا گھروں میں محصور ہو کر، دیواروں کی اوٹ ہی سے، اپنے کو بچانے کی کوشش کریں گے۔ یہ امر واضح رہے کہ قلعہ بند یا محصور ہو کر اوّل تو صرف دفاعی جنگ ہی لڑی جا سکتی ہے، جارحانہ جنگ کا اس صورت میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ثانیاً دفاعی پہلو سے بھی سب سے زیادہ کمزور جنگ یہی ہے۔ صرف مجبوری کی حالت ہی میں یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہود کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ یہ مسلمانوں کے خلاف قریش اور ان کے حلیفوں کو ابھارنے کے معاملے میں تو بڑے شاطر رہے ہیں لیکن یہ کبھی کھل کر میدان میں نہیں آئے اور جب مسلمانوں نے ان پر کبھی حملہ کیا تو انھوں نے ہمیشہ قلعہ بند اور محصور رہ کر مدافعت کی کوشش کی اور اس میں ناکامی بلکہ ذلت سے دوچار ہوئے۔

بزدلوں کی اصل کمزوری بَاْسُھُمْ بَیْنَھُمْ شَدِیْدٌ ط تَحْسَبُھُمْ جَمِیْعًا وَّقُلُوْبُھُمْ شَتّٰی۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو تم سے کھلے میدان میں مقابلہ کا حوصلہ تو جب ہو کہ ان کے دل آپس میں جڑے ہوئے ہوں۔ جہاں تک اسلام دشمنی کا تعلق ہے اس میں تو بے شک متحد ہیں جس سے آدمی کو دھوکا ہوتا ہے کہ ان کے اندر وحدت فکر ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مخالفتِ اسلام کے منفی مقصد کے سوا ہر معاملے میں ان کے دلوں کے اندر ایک دوسرے کے خلاف شدید بغض و عناد ہے۔ یہود کی مختلف شاخوں کے اندر بھی عداوت جاگزیں ہے اور قریش و قبائلِ مشرکین کے ساتھ بھی ان کی دوستی بالکل نمائشی محض اسلام کی مخالفت کی حد تک ہے۔ ایسے بے ثبات اور نمائشی اتحاد میں اتنا دم داعیہ کہاں کہ وہ کھلے میدان میں

ان لوگوں کے مقابل میں پا بر جا رہ سکے جن کے دلوں کو اللہ کے ایمان نے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ رکھا ہے۔

'ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ' یہ ان کی بیماری کے اصل سبب کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ عقل سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں۔ یعنی حقائق پر غور کرنے، سنجیدگی سے ان کا موازنہ کرنے اور پھر پورے عزم و ثبات سے ان کا مواجہہ کرنے کی جگہ انھوں نے اپنی باگ اپنی خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے اور جب کوئی قوم عقل کی جگہ اپنی خواہشوں کو امام بنا لیتی ہے تو وہ اسی طرح کے انتشار فکر میں مبتلا ہو کر تباہ ہو جاتی ہے۔

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۵)

بنو نضیر کے انجام کی مثال

یہ مثال دی ہے ان لوگوں کے انجام کی جن کو یہ منافقین ابھار رہے تھے کہ اگر آپ لوگ نکالے گئے تو ہم بھی آپ کے ساتھ نکل جائیں گے اور اگر آپ لوگوں پر حملہ ہوا تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ ان کی بھڑی میں آ کر کوئی غلط قدم اٹھا بیٹھے تو یاد رکھیں کہ ان کا انجام بھی وہی ہو گا جو ان لوگوں کا ہو چکا ہے جو ابھی جلدی ہی اپنی شرارت کا مزا چکھ چکے ہیں۔

'الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ' سے عام طور پر لوگوں نے قریش کو مراد لیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ اشارہ غزوۂ بدر کی طرف ہے کہ جس طرح بدر میں قریش کو منہ کی کھانی پڑی اسی طرح یہ لوگ بھی منہ کی کھائیں گے۔

یہ اشارہ اگرچہ قریش کی طرف بھی ہو سکتا ہے، بلکہ بنو قینقاع کی طرف بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ ابن کثیرؒ نے سمجھا ہے، لیکن میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ ان آیات میں اس سازش کی تفصیل بیان ہو رہی ہے جو بنو نضیر کی جلا وطنی کے بعد منافقین نے بنو قریظہ کے ساتھ کرنی شروع کی تھی، اس وجہ سے میرے نزدیک یہ اشارہ بنو نضیر کے انجام کی طرف ہے۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ بنو نضیر کی مثال بالکل تازہ تھی، جیسا کہ 'قَرِيْبًا' کے الفاظ سے واضح ہے۔ دوسری یہ ہے کہ یہود کے کسی گروہ کے لیے سب سے زیادہ مؤثر مثال یہود ہی کے کسی گروہ کی ہو سکتی تھی۔

'وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ' یعنی دنیا میں تو وہ اس طرح کے کسی انجام سے دوچار ہوں گے اور آخرت میں ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ بنو قریظہ دنیا میں بھی بنو نضیر کی نسبت کہیں زیادہ سخت انجام سے دوچار ہوئے اور آخرت میں ان کے سامنے جو کچھ آنے والا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۶)

منافقین کی مثال شیطان سے

یہ بنو قریظہ کو ابھارنے والے منافقین کی مثال بیان ہوئی ہے کہ یہ کہتے تو ہیں کہ آپ لوگ نکالے گئے

تو ہم بھی آپ کے ساتھ نکلیں گے اور اگر آپ لوگوں پر حملہ ہوا تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے اور اس معاملے میں ہرگز کسی کا کوئی دباؤ نہیں قبول کریں گے لیکن یہ شیطان کے بھائی ہیں اور اسی کا رویہ اختیار کریں گے۔ جس طرح وہ انسان کو خدا کی نافرمانی کی راہ سجھاتا ہے اور جب آدمی اس کے چکمے میں آکر کوئی جرم کر بیٹھتا ہے تو وہ ناصح بن کر اس کو ملامت کرتا اور اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح یہ منافقین بھی آج تو ان لوگوں کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں لیکن جب یہ کوئی اقدام کر بیٹھیں گے اور اس کا انجام بد ان کے سامنے آئے گا تو پیٹھ ٹھونکنے والے شیاطین دم دبا کر بھاگیں گے اور ان کے نتائج کی ذمہ داری قبول کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔

غزوۂ بدر میں یہود کی شرارت

سورۂ انفال آیت ۴۸ میں بسلسلۂ واقعات غزوۂ بدر، بیان ہوا ہے کہ جب قریش اور مسلمانوں کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو پہلے تو شیطان نے کفار کو شہ دی کہ شاباش، بڑھے چلو! لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ (لوگوں میں کسی کی تاب نہیں کہ آج تم پر غالب آسکے، میں تمھاری پشت پر ہوں) لیکن جب دونوں فوجیں بھڑ گئیں اور فرشتوں کی کمک سے میدانِ جنگ کا نقشہ بالکل بدلا ہوا نظر آیا تو اس نے فوراً پینترا بدل کر پکارا کہ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ (میں تمھارے اس اقدام کی ذمہ داری سے بری ہوں، میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت پاداش والا ہے)۔

ہم نے سورۂ انفال کی تفسیر میں واضح کیا ہے کہ بدر کی جنگ یہود کی سازش سے پیش آئی تھی۔ انہی نے قریش کو ابھارا اور اس کا سارا نقشہ بنا کر ان کو دیا اور اپنی مدد کا بھی ان کو اطمینان دلایا لیکن جب اصل وقت آیا تو یہ شیطان کی طرح ان سے بری الذمہ ہو گئے۔

شیطان لیڈروں کا معروف طریقہ

قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ قیامت کے دن جب مجرمین اپنے جرم کی ذمہ داری اپنے شیطان لیڈروں پر ڈالنی چاہیں گے تو وہ صاف کہہ دیں گے کہ تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی، ہمیں تمھارے اوپر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا کہ ہم تمھارے جرموں کے ذمہ دار ہوں۔ تم نے جو کچھ کیا خود کیا، اب اس کا خمیازہ بھگتو۔

اس دنیا میں بھی شیطان کے ایجنٹوں کا طریقۂ کار یہی ہے کہ وہ جرائم پر لوگوں کو ابھار تو دیتے ہیں لیکن جب ان کے نتائج سامنے آتے ہیں تو ان کی ذمہ داری سے اپنے کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ (۱۷)

یعنی جرم کر گزرنے کے بعد اس طرح اپنے کو بچانے اور دوسرے کو متہم کرنے کی جو کوشش کی جاتی ہے اس کا فائدہ کسی فریق کو بھی نہیں پہنچتا بلکہ دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں پڑتے اور اپنی جانوں پر

لہ قَالَ، مختلف معنوں میں آتا ہے مثلاً کہنا، سمجھانا، اشارہ کرنا، دعوت دینا، ابھارنا اور کسی اقدام پر آمادہ کرنا۔

ظلم ڈھانے والوں کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔

۶۔ آگے آیات ۱۸-۲۴ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں خطاب اگرچہ لفظاً عام مسلمانوں سے ہے لیکن روئے سخن خاص طور پر منافقین ہی کی طرف ہے۔ ان کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ ہر شخص کے لیے سب سے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ کل جو روزِ حساب آنے والا ہے اس کے لیے اس نے کیا کیا اور کیا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے ہر قول و فعل سے اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ ہر ایک کو اس کے ایک ایک عمل کا بدلہ دے گا۔ ساتھ ہی ان کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ یہود کی طرح اللہ کو بھلا نہ بیٹھو۔ جو لوگ اللہ کو بھلا بیٹھتے ہیں وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ وہ خود اپنے ہی خیر و شر سے بالکل اندھے بن کے رہ جاتے ہیں۔ یاد رکھو کہ اہل دوزخ اور اہل جنت کے درمیان جو فرق ہوگا وہ کوئی معمولی فرق نہیں ہوگا کہ اس کو سہل انگاری سے نظر انداز کر دیا جائے بلکہ یہ بہت بڑا فرق ہوگا۔ فوز و فلاح صرف اہلِ جنت کو حاصل ہوگی۔ دوسروں کے لیے ابدی خسران کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

پھر ان کو یہ آگاہی بھی دے دی گئی ہے کہ جہاں تک اتمامِ حجت کا تعلق ہے کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے کہ لوگ اللہ کے آگے کوئی عذر پیش کر سکیں۔ یہ قرآن، جو سنایا جا رہا ہے، ایسی چیز ہے کہ اگر یہ پہاڑ پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی، اپنی تمام سختی و صلابت کے باوجود، خشیتِ الٰہی سے شق ہو جاتا۔ جن کے دل اس سے متاثر نہیں ہو رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ یہ قرآن کا قصور نہیں ہے بلکہ یہ خود ان کے دلوں کی قساوت ہے کہ وہ اس سے پسیج نہیں رہے ہیں۔ اس طرح کے قسیّ القلب کسی چیز سے بھی متاثر ہونے والے نہیں ہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا آئینہ لوگوں کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے حاضر و مستقبل، اپنے خیر و شر، اپنے عقائد و اعمال اور اپنے مآل و انجام کا جائزہ لیں اور اپنے ظاہر و باطن کو اپنے رب کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بنائیں اور سنواریں ورنہ وہ اپنے وجود کو اپنے لیے لعنت بنا لیں گے ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۸-۲۴

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱتَّقُوا ٱللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَٱتَّقُوا ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٨﴾ وَلَا تَكُونُوا كَٱلَّذِينَ نَسُوا ٱللَّهَ فَأَنسَىٰهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولَٰٓئِكَ هُمُ

الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ
عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ
تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ اللّٰهُ
الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ
الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ
الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ
سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ
الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
ع ۳ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾

ترجمۂ آیات ۱۸-۲۴

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور چاہیے کہ ہر نفس اچھی طرح جائزہ لے رکھے اس کا جو اس نے کل کے لیے کیا ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ اور تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو اللہ کو بھول بیٹھے تو اللہ نے ان کو خود ان کی جانوں سے غافل کر دیا۔ یہی لوگ اصلی نافرمان ہیں۔ ۱۸-۱۹

دوزخ میں پڑنے والے اور جنت میں جانے والے یکساں نہیں ہوں گے۔ جنت والے ہی کامیاب ہونے والے بنیں گے۔ ۲۰

اگر اس قرآن کو ہم کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ خشیت الٰہی سے پست

اور پاش پاش ہو جاتا اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سوچیں۔ ۲۱

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب و حاضر کا جاننے والا، وہ رحمان و رحیم ہے۔ ۲۲

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بادشاہ، یکسر پاک، سراپا سکھ، امن بخش، معتمد، غالب، زور آور، صاحبِ کبریائی۔ اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۲۳

وہی اللہ ہے نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت گری کرنے والا۔ اسی کے لیے ساری اچھی صفتیں ہیں۔ اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور وہ غالب و حکیم ہے۔ ۲۴

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۸)

روزِ حساب کی یاد دہانی — خطاب، باعتبارِ الفاظ، اگرچہ عام مسلمانوں سے ہے لیکن موقع و محل بتا رہا ہے کہ روئے سخن اصلاً ان منافقین ہی کی طرف ہے جن کی کمزوریاں اس سورہ میں شروع سے زیرِ بحث ہیں۔ ان کو آخر میں گویا اُس حقیقت الحقائق کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جس سے غفلت نفس کی تمام بیماریوں کی جڑ اور جس کی یاد داشت ہی انسان کی تمام عقلی و روحانی اور اخلاقی بیماریوں کا واحد علاج ہے۔ فرمایا کہ اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، تمہارے ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اپنے رب سے ڈرتے اور اپنے اعمال کا برابر جائزہ لیتے رہو کہ کل جو روزِ حساب آنے والا ہے اس کے لیے تم نے کیا تیاری کی ہے۔ 'ڈرتے رہو' کی تاکید اس لیے فرمائی کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ پڑا رہے کہ یہ دنیا کوئی کھیل تماشا ہے جو یوں ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ یوں ہی نہیں ختم ہو گا بلکہ اس کے بعد جزا و سزا بھی ہے جو لازمی ہے۔ روزِ قیامت کو لفظ 'غد' سے تعبیر فرمایا ہے جس سے مقصود اس کے قرب اور اس کی قطعیت

کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے میں دفع الوقتی سے کام نہ لو کہ ابھی بہت دن پڑے ہیں، جب وقت قریب آجائے گا تو دیکھ لیں گے۔ وہ دن دور نہیں ہے۔ جس طرح آج کے بعد کل ہے اسی طرح اس کو بھی آیا ہی سمجھو۔

'وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ'۔ معاملہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے 'اتَّقُوا اللّٰهَ' کو پھر دہرایا اور اس کے بعد اس حقیقت کی یاددہانی فرمائی کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ خدا تمھارے کسی عمل سے بے خبر ہے۔ وہ تمھارے ایک ایک قول و فعل سے واقف ہے اس وجہ سے سلامتی اسی میں ہے کہ جو کچھ کرو یہ پیش نظر رکھ کر کرو کہ تمھارا یہ عمل خدا کے علم میں رہے گا اور ایک دن تمھیں اس کی جزا یا سزا ملنی ہے۔

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ط اُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۱۹)

فرمایا کہ ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنھوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے ان کو خود ان کے انجام سے غافل کر دیا۔ 'کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ' سے اشارہ یہود کی طرف ہے۔ یہود ہی ان منافقین کے مرشد تھے۔ قرآن نے ان کو آگاہ فرمایا کہ ان لوگوں کی طرح اگر تم بھی خدا کو بھلا بیٹھے تو یاد رکھو کہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے بلکہ اپنے ہی کو تباہ کرو گے۔

جو خدا کو بھلا دیتے ہیں وہ خود اپنے کو بھلا دیتے ہیں

'فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ' میں ایک بڑی اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جو لوگ خدا کو بھلا دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے خیر و شر اور اپنی عاقبت سے بالکل بے پروا ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی ساری قدر و قیمت اور اس کا سارا شرف و جمال اس حقیقت کے سمجھنے پر منحصر ہے کہ خالق نے اس کو محض چند روزہ عیش دنیا کے لیے نہیں بنایا ہے بلکہ اس لیے بنایا ہے کہ انسان اس کو خدا کے احکام کے تحت گزار کر اپنے کو ابدی بادشاہی کا سزاوار بنائے۔ یہ معراج ظاہر ہے کہ اسی کو حاصل ہو گی جو ہمیشہ اس حقیقت کو یاد رکھے کہ یہ زندگی اس کو اتفاقیہ نہیں مل گئی ہے بلکہ ایک بخشنے والے کی بخشی ہوئی ہے اور اس نے ایک خاص مقصد سے یہ اس کو بخشی ہے۔ اگر اس مقصد کے تحت میں اس کو گزارو گے تب تو یہ عظیم ابدی نعمت ہے اور اگر اس مقصد کو بھلا بیٹھا تو یہ آپ سے آپ ایک ابدی لعنت بن جائے گی۔

'اُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ'۔ فرمایا کہ خدا کے اصل نافرمان یہی لوگ ہیں۔ انھوں نے خدا کو بھلایا تو خدا کے ساتھ اپنی زندگی کے تعلق کی نوعیت بھی بھول بیٹھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خدا کے بالکل ہی نافرمان بن گئے۔

اس سے خدا کی یاد کی حقیقت بھی واضح ہوئی کہ اس کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی اس تعلق کی نوعیت کو ہمیشہ اپنے سامنے مستحضر رکھے جو اس کے اور اس کے رب کے مابین ہے۔ اسی کے استحضار سے

یہ یاد زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو یہ یاد کچھ نتیجہ خیز نہیں ہوتی بلکہ یہ بالکل رسمی سی چیز بن کے رہ جاتی ہے جس کا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہوتا ہے۔

لَا يَسْتَوِيٓ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِ وَأَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِ ۚ أَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِ هُمُ ٱلْفَآئِزُونَ (۲۰)

ایک نہایت اہم حقیقت

یہ ایک اور نہایت اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کو پیشِ نظر رکھنا زندگی کی حقیقی قدر و قیمت سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے درمیان جو فرق ہوگا وہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو اہمیت نہ دی جائے۔ آج خواہشاتِ نفس سے مغلوب ہو کر اگر کوئی جنت اور دوزخ کے تفاوت کو محسوس نہیں کر رہا ہے تو اس کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دونوں میں صرف ڈگری کا فرق نہیں ہے کہ کسی نہ کسی درجے میں اہلِ دوزخ کی زندگی پر بھی قناعت کی جا سکے۔ بلکہ دونوں کے درمیان ابدی نعمت اور ابدی زحمت کا فرق ہوگا۔ فوز و فلاح صرف اہلِ جنت کے لیے خاص ہوگی۔ اہلِ دوزخ کے لیے لعنت اور عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا ٱلْقُرْءَانَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُۥ خَٰشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ ٱللَّهِ ۚ وَتِلْكَ ٱلْأَمْثَٰلُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (۲۱)

ایک بلیغ تمثیل

یہ ان منافقین کو زجر و ملامت ہے کہ جہاں تک تعلیم و تذکیر اور اتمامِ حجت کا تعلق ہے اللہ نے تمہارے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ یہ قرآن ایسی چیز ہے کہ اگر پہاڑ جیسی سخت اور بے حس چیز پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی خشیتِ الٰہی سے سرنگندہ اور پاش پاش ہو جاتا لیکن تم ایسے سنگ دل اور نحس ہو کر تمہارے دل ذرا بھی اس سے متاثر نہیں ہو رہے ہیں۔

'وَتِلْكَ ٱلْأَمْثَٰلُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ' فرمایا کہ یہ تمثیلیں ہم اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ لوگ اپنے حال پر غور کریں کہ اگر ایسی مؤثر چیز بھی ان کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہی ہے تو اس میں قصور اس شے کا نہیں بلکہ صرف ان کے دلوں کی قساوت کا ہے اور پھر وہ اس معاملے پر بھی غور کریں کہ جب ان کے دلوں کی قساوت اس درجہ بڑھ گئی ہے تو ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنی سنّت کے مطابق ان کے دلوں پر بھی اسی طرح مہر کر دے جس طرح اس نے یہود کے دلوں پر کر دی۔

یہ مضمون، مختلف اسلوبوں سے، قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔ ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ اس کا اصل رخ نگاہوں کے سامنے آ جائے۔ سورۂ بقرہ میں یہود کے متعلق فرمایا ہے:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّنۢ بَعْدِ	پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو کر پتھر کے
ذَٰلِكَ فَهِىَ كَٱلْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ	مانند بن گئے بلکہ اس سے بھی سخت۔ اور پتھروں
قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ ٱلْحِجَارَةِ	میں سے تو بعض ایسے بھی ہیں جن سے نہریں

لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرۃ ۔ ۲: ۷۴)

پھوٹ پڑتی ہیں اور بعض ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی جاری ہو جاتا ہے اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ کی خشیت سے گر پڑتے ہیں اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔

اسی طرح سورۂ حدید میں انہی منافقین سے متعلق فرمایا ہے جن سے یہاں بحث ہے:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (الحدید ۔ ۵۷: ۱۶)

کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ابھی وقت نہیں آیا کہ اللہ کی یاددہانی اور جو حق نازل ہوا ہے اس کے آگے ان کے دل جھک پڑیں اور وہ ان لوگوں کی طرح ہو کے نہ رہ جائیں جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی تو ان پر ایک مدت گزر گئی اور ان کے دل سخت ہو کے رہ گئے اور ان میں بہتیرے نافرمان ہیں۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس آیت کو اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (الاحزاب ۔ ۳۳: ۷۲) (اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ بے شک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے) کی روشنی میں لیتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسی کے ایک پہلو کی وضاحت اس کی روشنی میں بھی ہوتی ہے لیکن البقرۃ اور الحدید کی مذکورہ بالا آیات سے اس کا ہر پہلو واضح ہو جاتا ہے۔

قرآن نے اس کو تمثیل سے تعبیر فرمایا ہے۔ تمثیل میں مبالغہ یا تخییل کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک معنوی حقیقت ایک مادی پیرایۂ بیان میں متشکل ہو کر سامنے آگئی یا نہیں۔ اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمثیل ایک نہایت ہی اعلیٰ اور بلیغ تمثیل ہے۔

'لَرَاَيْتَهٗ' میں خطاب عام بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کا مخاطب اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مانیے تو اس آیت کے اندر حضورؐ کے لیے بہت بڑی تسلی بھی ہے کہ اگر تمھاری دعوت سے یہ لوگ متاثر نہیں ہو رہے ہیں تو اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ہے۔ جو قرآن تم ان کو سنا رہے ہو یہ تو وہ چیز ہے

کہ اگر کسی پہاڑ پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی اللہ کی خشیت سے سرنگوں اور دو نیم ہو جاتا لیکن ان لوگوں کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں کہ وہ اس سے کوئی اثر نہیں لے رہے ہیں۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (۲۲)

صفاتِ الٰہی کا حوالہ

اوپر کی آیت میں جب اللہ تعالیٰ کی خشیت کا ذکر آیا تو اس آیت میں اور آگے کی آیات میں اس کے وہ اسمائے حسنیٰ بیان کر دیے گئے جن کی حیثیت بنیادی اسماء کی ہے تاکہ مومنین، کفار اور منافقین سب کو معلوم ہو جائے کہ جس رب سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے وہ کن اوصاف کا مالک ہے! انھیں کس طرح اس سے ڈرنا چاہیے، کس قدر اس سے محبت کرنی چاہیے، کس طرح اس سے امید کرنی چاہیے، کس طرح اس پر بھروسہ کرنا چاہیے اور کس طرح اسی کے لیے جینا اور اسی کی راہ میں مرنا چاہیے۔ فلسفۂ دین کی یہ حقیقت ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ تمام دین و شریعت کی بنیاد درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان کے مقتضیات ہی پر ہے۔ قرآن میں 'اَلْحَمْدُ' سے لے کر 'وَالنَّاسِ' تک جو کچھ بیان ہوا ہے وہ تمام تر صفاتِ الٰہی کے مظاہر و انوار اور ان کے تقاضوں ہی کا بیان ہے۔ انہی سے دین کا فلسفہ وجود میں آیا ہے اور انہی سے دین کے مظاہر و اشکال بھی ظہور پذیر ہوئے ہیں اس وجہ سے ان کا سمجھنا ضروری ہے لیکن ان کو سمجھنے کے لیے پورے قرآن کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہاں ہم بالاجمال صرف ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کریں گے جن سے ان صفات کے ابتدائی تقاضوں کے سمجھنے میں مدد ملے۔

'هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'۔ سب سے پہلے اپنی الوہیت کی یاددہانی فرمائی اور ساتھ ہی اس بات کی کہ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے اس وجہ سے امید و بیم دونوں حالتوں میں بندوں کو اسی سے رجوع کرنا چاہیے۔ اس کے سوا کوئی اور حق دار نہیں ہے کہ اس کو معبود مانا جائے یا اس کی پرستش کی جائے یا اس کو مرجع سمجھ کر اس سے امیدیں وابستہ کی جائیں۔

'عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ'۔ وہ غائب و حاضر دونوں کو جاننے والا ہے۔ لفظ 'غیب' یہاں بندوں کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر چیز شہادت (حاضر) کے حکم میں داخل ہے۔ اس صفت کے اندر امید و بیم دونوں کے پہلو ہیں۔ بیم کا پہلو یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، خواہ سرًّا یا علانیۃً، وہ اللہ کے علم میں ہے اور جب سب کچھ اس کے علم میں ہے تو وہ لازمًا ایک ایک چیز سے متعلق باز پرس کرے گا۔ پھر نہ تو کوئی اپنے کسی قول و فعل کو چھپا سکے گا اور نہ اس کا کوئی سفارشی خدا کے سامنے اس کے باب میں کوئی غلط بیانی کر سکے گا۔ امید کا پہلو اس میں یہ ہے کہ جب اس کا رب اس کے ہر غائب و حاضر سے واقف ہے تو اس کو اس پر پورا بھروسہ رکھنا

چاہیے اور اپنی ہر درخواست اسی کے آگے پیش کرنی چاہیے۔

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ۔ رَحْمٰن اور رَحِیْم کے فرق پر آیت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے تحت ہم بحث کر چکے ہیں۔ صفت رَحْمٰن کے اندر رحمت کے جوش کا اور رَحِیْم کے اندر رحمت کی پائداری کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ان صفات کے اندر بھی غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ امید و بیم دونوں کے پہلو موجود ہیں۔ امید کا پہلو تو واضح ہے کہ جب خدا رحمان بھی ہے اور رحیم بھی تو اس سے کسی ظلم یا ناانصافی کا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے ہاں کسی سفارشی کی ضرورت پیش آئے۔ اس نے جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ کرے گا رحمت ہی کے لیے کیا ہے اور رحمت ہی کے لیے کرے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ بیم کا پہلو اس میں یہ ہے کہ جب خدا رحمان اور رحیم ہے تو وہ کسی کے ظلم کو گوارا نہیں کرے گا بلکہ ہر شخص کے ظلم کا لازماً بدلہ لے گا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس نے قرآن میں جگہ جگہ قیامت کو اپنی صفت رحمت ہی پر مبنی کیا ہے کہ یہ اس کی رحمت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ قیامت لائے تاکہ ہر ایک کے ساتھ پورا پورا انصاف کرے۔ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (الانعام ۶: ۱۲)

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۲۳)

اس آیت میں پہلے تو اسی ٹکڑے کا اعادہ ہے جو اوپر والی آیت میں گزرا جس سے معلوم ہوا کہ شرک کی نفی اور توحید کا اثبات یہاں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ مدنظر ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ خدا کی صفات کے باب میں ساری گمراہی شرک ہی سے پیدا ہوتی ہے اور جب ان صفات ہی پر، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، تمام دین و شریعت کی بنیاد ہے، تو ضروری ہوا کہ اس بنیاد میں کجی کے ہر امکان کا سدباب کر دیا جائے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے آٹھ اسماء اتصال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں یعنی ان کے درمیان کوئی حرفِ عطف نہیں ہے۔ ہم عربیت کے اس قاعدے کی وضاحت اس کے محل میں کر چکے ہیں کہ جب صفات اس طرح بغیر حرفِ عطف کے آئیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ تمام صفات موصوف میں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔

اَلْمَلِكُ: یعنی وہ بادشاہ ہے۔ اسی نے یہ دنیا پیدا کی ہے اور وہی بلا شرکتِ غیرے اس کا مالک اور حکمران ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے اسی حق کی بنا پر اپنے رسول بھیجے تاکہ وہ اس کے بندوں کو اس کے احکام سے آگاہ کریں اور بندے ان کی تعمیل کر کے اپنے بادشاہِ حقیقی کی خوشنودی حاصل کریں۔

اَلْقُدُّوْسُ: وہ ہر عیب، ہر نقص اور برائی و خرابی سے بالکل پاک و منزہ ہے اس وجہ سے اس نے اپنے بندوں کو پاکیزہ بنانے کے لیے کتاب اتاری اور رسول بھیجے تاکہ بندے پاکیزہ بن کر اس کا قرب

حاصل کرنے کے اہل بن سکیں۔ سورۂ جمعہ میں 'ملک' اور 'قُدُّوس' دونوں صفتوں کا حوالہ دے کر ان کا مقتضیٰ واضح فرمایا ہے۔ پہلے اپنی صفات کا حوالہ ان الفاظ میں دیا: اَلْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۱) اس کے بعد اپنی ان صفات کا مقتضیٰ اس طرح واضح فرمایا: هُوَالَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ (۲) (وہی ہے جس نے اٹھایا اُمیّوں میں ایک رسول انہی میں سے جو اس کی آیتوں کی تلاوت اور ان کا تزکیہ کرتا ہے) غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ رسول اور کتاب تو اس نے اسے لیے بھیجے کہ وہ بادشاہ ہے، اس کے بادشاہ ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اپنی رعیت کے پاس اپنے سفیر بھی بھیجے اور اپنے احکام بھی اور اپنے بندوں کا تزکیہ اس وجہ سے اس نے چاہا کہ وہ قدوس اور پاک ہے۔ وہ یہ نہیں پسند کر سکتا کہ اس کے بندے گناہوں میں آلودہ رہیں۔ آگے 'عزیز' اور 'حکیم' کی صفتوں کے تقاضے بھی بیان ہوئے ہیں جن کی وضاحت ان کے محل میں ان شاء اللہ آئے گی۔

'اَلسَّلٰمُ' کے معنی سلامتی، سُکھ اور چین کے ہیں۔ کسی کو سلامتی کی دعا دینی ہو تو ہم یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ قرآن میں لیلۃ القدر کے متعلق فرمایا ہے: سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (القدر۔ ۹۷: ۵) (اس میں سلامتی ہی سلامتی ہے، وہ طلوع فجر تک ہے) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے ہر آفت اور ہر خطرے سے امان اور سپر ہے۔ بندہ جب اپنے کو اس کی پناہ میں دے دیتا ہے تو وہ سُکھ اور چین پاتا ہے۔ اس کی اسی صفت کا فیض ہے کہ اس کی یاد دلوں کو سکینت و طمانیت بخشتی ہے: اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد۔ ۱۳: ۲۸) (سن لو کہ اللہ ہی کی یاد سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے)۔

'اَلْمُؤْمِنُ' کے معنی ہیں امان دینے والا یعنی شیطان اور اس کے ایجنٹوں کے حملوں سے بچنے کے لیے جب بندہ اس کی پناہ ڈھونڈتا ہے تو وہ اس کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ یہ پناہ اس کے سوا اور کہیں بھی بندے کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ شیطان کی رسائی خدا کے دامن کے سوا ہر جگہ ہے۔

'اَلْمُهَيْمِنُ' کے معنی خلیل اور ابو علیدہ کے نزدیک نگران کے ہیں۔ ابن الانباری کے نزدیک القائم علی الناس یعنی لوگوں کے محافظ کے ہیں۔ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کے معنی معتمد اور وکیل کے ہیں۔ میرے نزدیک ان معانی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ جو محافظ و نگران ہوتا ہے وہی درحقیقت معتمد اور وکیل ہوتا ہے۔ قرآن بھی 'مُهَيْمِن' ہے اس لیے کہ تمام آسمانی صحیفوں کے لیے قابلِ اعتماد کسوٹی وہی ہے۔

'اَلْعَزِيْزُ' کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس کے اندر رسائی سے بالاتر اور دست رسی سے مافوق ہونے کا مفہوم بھی ہے اور غالب و قوی ہونے کا بھی یعنی اس پر کوئی حاوی نہیں ہو سکتا،

وہ سب کو شکست دے سکتا ہے۔

'اَلْجَبَّارُ' کے معنی زور آور اور زبردست کے ہیں۔ عربی میں یہ لفظ کھجور کے ان درختوں کے لیے بھی آتا ہے جو غیر معمولی طور پر اونچے ہوں۔ قرآن میں یہ ان زور آوروں کے لیے بھی آیا ہے جن سے ڈر کر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی تھی کہ اِنَّ فِیْھَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَھَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْھَا (المآئدۃ ۵ : ۲۲) (اس بستی میں بڑے ہی زور آور اور زبردست لوگ ہیں، جب تک وہ اس میں ہیں، ہم اس میں داخل ہونے کا حوصلہ نہیں کر سکتے) یہ صفت ان تمام تصورات الوہیت کی نفی کرتی ہے جن میں ساری اہمیت دیویوں کو دی گئی ہے۔

'اَلْمُتَکَبِّرُ' کے معنی ہیں اپنی بڑائی اور برتری کا احساس رکھنے والا۔ یہ احساس اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے اندر ہو تو باطل ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی کوئی ایسی بڑائی حاصل نہیں ہے جو اس کی ذاتی ہو بلکہ جس کو بھی کوئی بڑائی حاصل ہے وہ اللہ ہی کی بخشی ہوئی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے لیے تکبّر زیبا اور برحق ہے اس لیے کہ اس کی بڑائی ذاتی اور ازلی و ابدی ہے۔ اس کے اس احساس ہی کا یہ اثر ہے کہ وہ اپنی خدائی اور بادشاہی میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کے اس شعور کی تعبیر دوسرے آسمانی صحیفوں میں یوں کی گئی ہے کہ تمھارا خداوند خدا غیور ہے، جس طرح تم یہ گوارا نہیں کرتے کہ تمھاری بیوی کسی غیر کی بغل میں سوئے اسی طرح وہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ اس کا بندہ کسی غیر کی بندگی کرے۔ میرے نزدیک قرآن نے جو مضمون لفظ 'متکبر' سے ادا کیا ہے دوسرے آسمانی صحیفوں میں وہی مضمون 'غیور' سے ادا کیا گیا ہے۔

'سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ' یعنی کہاں اللہ تعالیٰ کی یہ صفات جمال و کمال اور کہاں ان مشرکوں کے یہ فرضی دیوی دیوتا! دونوں میں کیا نسبت!! جو خدا ان صفات سے متّصف ہے، وہ اس سے ارفع ہے کہ اس کے ساتھ اس طرح کی چیزوں کا جوڑ ملایا جائے۔ اگر اس طرح کا کوئی جوڑ اس کے ساتھ ملایا جائے گا تو اس کی دوسری بنیادی صفات اس کو قبول کرنے سے اِبا کریں گی اور اگر زبردستی اس کو چپکانے کی کوشش کی گئی تو اس کی صفات میں بے ربطی پیدا ہو جائے گی۔

ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ط یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۲۴)

یعنی یہ اللہ ہی ہے جو ہر چیز کے وجود کے تمام مراحل کو طے کراتا ہے۔ وہی ہر چیز کا خاکہ تیار کرتا ہے، وہی پھر اس کو وجود بخشتا ہے پھر وہی اس کی صورت گری کرتا اور نوک پلک سنوارتا ہے۔ ان میں سے کسی مرحلہ میں نہ وہ کسی سے طالب مدد ہوتا نہ کوئی اس کا ہاتھ بٹاتا یا بٹا سکتا ہے تو آخر کوئی دوسرا اس کا کسی چیز میں بھی شریک کس طرح بن جائے گا! ہر وجود کے اندر یہی تین اولین

مرحلے پیش آتے ہیں ۔ پہلا مرحلہ اس کے ڈیزائن کا ہوتا ہے جس کے لیے عربی میں لفظ 'خلق' ہے ۔ دوسرا مرحلہ اس کو وجود میں لانے کا ہے اس کے لیے لفظ 'بَرْء' ہے ۔ تیسرا مرحلہ اس کی نوک پلک سنوارنے کا ہے اس کے لیے لفظ 'تصویر' ہے ۔ اگر ہر شے کے یہ تینوں مرحلے اللہ طے کراتا ہے تو وہی ہر ایک کی تسبیح اور بندگی کا حق دار ہے ۔

'لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی' یعنی یہ تو چند بنیادی صفات ہیں جو بیان ہوئی ہیں ، ان کے علاوہ جتنی بھی اچھی صفتیں ہیں ان سب کا حقیقی موصوف وہی ہے ۔ لفظ 'اسماء' یہاں صفات کے معنی میں ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی نام ہیں وہ سب اس کی کسی نہ کسی صفت ہی کو تعبیر کرتے ہیں ۔

'یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' ۔ چونکہ ہر چیز کے وجود کے تمام مراحل اللہ تعالیٰ ہی نے طے کرائے ہیں اس وجہ سے آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہے ۔ انسان اگر اختیار سے بہرہ مند ہونے کے سبب سے اس سے اعراض کرتا ہے تو یہ اس کی حق ناشناسی اور سرکشی ہے ۔ اس کے لیے بھی صحیح رویہ یہی ہے کہ وہ اپنے رب ہی کی تسبیح و بندگی کرے ، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے ۔

'وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ' ۔ یہ آخر میں اپنی ان صفات کی پھر یاددہانی کرادی جن سے سورہ کا آغاز فرمایا تھا ۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ عزیز ہے اس وجہ سے وہ جو چاہے کر سکتا ہے ۔ اگر وہ چاہتا تو انسان بھی اسی طرح مجبورانہ اپنے رب کی بندگی و تسبیح کرتا جس طرح ساری کائنات کر رہی ہے لیکن وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اس نے یہ چاہا کہ وہ انسان کو اختیار دے کر آزمائے کہ وہ یہ شرف پاکر اپنے رب کا حق پہچانتا ہے یا شیطان کا مرید بن جاتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی ۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ ۔

رحمان آباد

۲- فروری ۱۹۷۸ء

۲۳- صفر ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

٦٠

الممتحنة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

پچھلی سورتوں میں منافقین کو اہل کتاب، بالخصوص یہود، سے قطع تعلق کا حکم دیا گیا ہے اور یہ منافقین تھے بھی، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، بیشتر اہل کتاب ہی میں سے۔ اس سورہ میں مشرکین مکہ سے قطع تعلق کا حکم دیا گیا ہے اور خطاب خاص طور پر ان لوگوں سے ہے جو اسلام میں داخل بھی تھے اور دین کی خاطر انھوں نے ہجرت بھی کی تھی لیکن اہل مکہ سے رشتہ و برادری کے جو تعلقات تھے اس کی زنجیریں ابھی انھوں نے نہیں توڑی تھیں اس وجہ سے امتحان کے مواقع پر ان سے ایسی کمزوریاں صادر ہو جاتیں جو ایمان و اخلاص کے منافی ہوتیں۔ گویا نفاق کی بیخ کنی یا تطہیر مومنین جو تمام مسبّحات کا مشترک مضمون ہے وہی مضمون اس سورہ کا بھی ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ اس میں روئے سخن ان مسلمانوں کی طرف ہے جنھوں نے ہجرت تو کی لیکن ہجرت کی اصل ابراہیمی حقیقت ابھی ان پر اچھی طرح واضح نہیں ہوئی تھی۔ ان کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کی یاد دہانی فرمائی گئی ہے کہ اگر ہجرت کی برکات سے متمتع ہونا چاہتے ہو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنے سابق ماحول سے ہر قسم کا تعلق منقطع کر کے کلیۃً اللہ اور رسول سے وابستہ ہو جاؤ۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) جو کمزور مسلمان ہجرت کے بعد مشرکین مکہ سے خفیہ روابط مودت قائم رکھے ہوئے تھے ان کو تنبیہ کہ جنھوں نے تم کو اور رسولؐ کو تمھارے گھروں سے اس جرم میں نکالا ہے کہ تم اللہ پر ایمان لائے ان سے محبت کی پینگیں نہ بڑھاؤ۔ تم تو ان سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو اور ان کا حال یہ ہے کہ اگر ان کا قابو تم پر چل جائے تو ان کی پوری کوشش یہ ہو گی کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ تم کو مرتد کر کے چھوڑیں۔ یاد رکھو کہ اپنے عزیزانہ تعلقات کی پاسداری میں اللہ اور رسولؐ سے بے وفائی کرو گے تو قیامت کے دن یہ رشتے تمھارے کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ اس دن تمام رشتے ناتے ختم ہو جائیں گے۔

(۴-۷) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعۂ ہجرت کی یاد دہانی اور اس سے سبق حاصل کرنے کی ہدایت کہ وہ اپنی پوری قوم سے اپنی ابدی بیزاری کا اعلان کر کے اٹھے کہ جب تک تم لوگ اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ گے اس وقت تک میرا تمھارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اسی ضمن میں اس دعائے ابراہیمی کی تلقین جو انھوں نے ہجرت کی آزمائشوں میں ثابت قدمی کے لیے فرمائی اور اس امر کی بشارت کہ کیا عجب کہ جن لوگوں سے تم کو آج قطعِ علائق کا حکم دیا جا رہا ہے وہ کل اسلام سے مشرف ہو کر تم سے گلے ملیں۔

(۸-۹) اس امر کی وضاحت کہ ممانعت ان لوگوں کے ساتھ دوستی بڑھانے کی کی جا رہی ہے جنھوں نے تمھارے ساتھ جنگ کی ہے اور رسول کو اور تم کو تمھارے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے کی ممانعت نہیں کی جا رہی ہے جنھوں نے اس طرح کی کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔

(۱۰-۱۱) ان عورتوں کے باب میں جو مکہ سے ہجرت کر کے آئیں یہ ہدایت کہ مجرد اس بنا پر کہ وہ آگئی ہیں، ان کو اپنے اندر شامل نہ کر لیا جائے بلکہ ان کے ایمان و اسلام کی تحقیق کی جائے۔ جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ فی الواقع انھوں نے اسلام ہی کی خاطر ہجرت کی ہے تب ان کو اپنے اندر شامل کیا جائے۔ اسی طرح جو مشرکات مسلمانوں کے عقد میں ہیں، ان کو بھی اپنے عقد میں باندھے رکھنا جائز نہیں ہے بلکہ وہ آزاد کر دی جائیں اور آپس میں مہروں کا تبادلہ کر لیا جائے۔

(۱۲) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ آپ کے پاس جو عورتیں اسلام کی خاطر آئیں اور خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کا عہد کریں، ان سے بیعت لے لیا کریں۔

(۱۳) آخر میں مسلمانوں کو تنبیہ کہ نہ یہود سے دوستی بڑھاؤ نہ کفار سے۔ ان دونوں کا حشر ایک ہی ہے۔ ان کی بنیادیں بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں۔

سُورَةُ الْمُمْتَحِنَةِ (٦٠)

مَدَنِيَّةٌ ـــــــ آیات : ۱۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۷
يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ عَدُوِّى وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ
تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِٱلْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا۟ بِمَا جَآءَكُم مِّنَ ٱلْحَقِّ ۖ
يُخْرِجُونَ ٱلرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ ۙ أَن تُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ رَبِّكُمْ ۚ إِن
كُنتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَٰدًا فِى سَبِيلِى وَٱبْتِغَآءَ مَرْضَاتِى ۚ
تُسِرُّونَ إِلَيْهِم بِٱلْمَوَدَّةِ ۚ وَأَنَا۠ أَعْلَمُ بِمَآ أَخْفَيْتُمْ وَمَآ أَعْلَنتُمْ ۚ
وَمَن يَفْعَلْهُ مِنكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ ٱلسَّبِيلِ ۝١ إِن
يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا۟ لَكُمْ أَعْدَآءً وَيَبْسُطُوٓا۟ إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ
وَأَلْسِنَتَهُم بِٱلسُّوٓءِ وَوَدُّوا۟ لَوْ تَكْفُرُونَ ۝٢ لَن تَنفَعَكُمْ
أَرْحَامُكُمْ وَلَآ أَوْلَٰدُكُمْ ۚ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۚ وَٱللَّهُ معانقة ۱۶
بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝٣ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِىٓ السابع الوقف علی القیمۃ ۱۲
إِبْرَٰهِيمَ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ إِذْ قَالُوا۟ لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءَٰٓؤُا۟ مِنكُمْ
وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا
وَبَيْنَكُمُ ٱلْعَدَٰوَةُ وَٱلْبَغْضَآءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ

وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ
لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا
وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۴ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۵ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ
فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ
وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۶ ع عَسَى اللّٰهُ اَنْ
يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۭ
وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷

ترجمۂ آیات ۱ - ۷

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو اور ان کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اس حق کا انکار کیا جو تمھارے پاس آیا، وہ رسول کو اور تم کو اس بنا پر جلا وطن کرتے ہیں کہ تم اللہ، اپنے خداوند پر، ایمان لائے! ـــــ اگر تم میری راہ میں جہاد اور میری رضا جوئی کو نکلتے ہو، ان سے رازدارانہ نامہ و پیام کرتے ہوئے، درآں حالیکہ میں جانتا ہوں جو تم چھپاتے اور جو ظاہر کرتے ہو، اور جو تم میں سے ایسا کرتے ہیں وہ راہِ راست سے بھٹک گئے۔ ۱

اگر وہ تم کو پا جائیں تو وہ تمھارے دشمن بن جائیں گے اور تم پر دست درازی بھی کریں گے اور زبان درازی بھی اور چاہیں گے کہ تم کافر ہو جاؤ۔ ۲

تمھارے رشتے ناتے اور تمھارے آل واولاد قیامت کے دن تمھارے کچھ بھی

کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ اس دن اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا۔
اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔ ۳

تمہارے لیے بہترین نمونہ تو ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ہے جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے، جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بالکل بری ہیں۔ ہم نے تمہارا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے مابین ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بیزاری آشکارا ہوگئی تاآنکہ تم اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ پر ایمان لاؤ۔ مگر ابراہیم کی اپنے باپ سے اتنی بات کہ میں آپ کے لیے مغفرت مانگوں گا اگرچہ میں آپ کے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتا ــــ اے ہمارے رب، ہم نے تیرے اوپر بھروسہ کیا اور تیری طرف رجوع ہوئے اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اے ہمارے رب، ہم کو ان لوگوں کا تختۂ مشق نہ بننے دینا جنھوں نے کفر کیا ہے اور اے ہمارے رب، ہم کو بخش، بے شک تو عزیز و حکیم ہے۔ ۴-۵

بے شک تمہارے لیے ان لوگوں کے اندر بہترین نمونہ ہے۔ ان کے واسطے جو خدا اور آخرت کے متوقع ہیں۔ اور جو اعراض کریں گے تو یاد رکھیں کہ اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے۔ ۶

توقع ہے کہ اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تم نے دشمنی کی، دوستی پیدا کردے۔ اللہ قدرت والا اور غفور رحیم ہے۔ ۷

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ عَدُوِّى وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم

بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي ۚ تُسِرُّونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۖ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ (۱)

مصلحت پرست مسلمان کو تنبیہ

خطاب اگرچہ باعتبارِ الفاظ عام ہے لیکن روئے سخن انہی مسلمانوں کی طرف ہے جو ہجرت کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد بھی مشرکین مکہ کے ساتھ اپنے سابق خاندانی اور عزیزانہ تعلقات کا لحاظ باقی رکھے ہوئے تھے۔ جب تک مشرکین سے عام جنگ کا حکم نہیں ہوا اس وقت تک تو ان کی اس کمزوری پر پردہ پڑا رہا لیکن جب ان کے عام تعاقب کا حکم ہو گیا تو ان کی یہ کمزوری ظاہر ہونے لگی۔ یہ لوگ اپنے خاندان اور قبیلہ والوں کے خلاف تلوار اٹھانے سے بھی جھجکتے تھے اور قریش کے لیڈروں کو خوش رکھنے کے بھی خواہش مند تھے کہ وہ ان کے عزیزوں کے درپے آزار نہ ہو جائیں۔ اگرچہ ان کی یہ روش نفاق سے زیادہ مصلحت پرستی پر مبنی تھی۔ ان کا گمان تھا کہ اگر انھوں نے اپنے ان مشرک عزیزوں سے اچھے تعلقات باقی رکھے تو ان کے رویے سے متاثر ہو کر وہ ایک دن سچے مسلمان بن جائیں گے۔ لیکن قرآن نے اس مصلحت کو ایمان کے منافی قرار دیا اور ان پر واضح فرمایا کہ جس ایمان کے تم مدعی ہو اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان لوگوں سے رشتۂ موالات نہ رکھو جو اللہ کے بھی دشمن ہیں اور تمھارے بھی۔

لفظ 'عَدُوّ' واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ 'فَعُول' کے وزن پر ہے اور عربی میں یہ وزن دونوں کے لیے یکساں ہے بلکہ اس میں مذکر و مونث کا بھی امتیاز نہیں ہے۔

'تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ'۔ یہ اوپر والی بات ہی کی وضاحت ہے کہ تم ان سے موالات و محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کے بھی دشمن ہیں اور تمھارے بھی۔ ان کی یہ دشمنی اس سے واضح ہے کہ جو دین تمھارے پاس آیا اس کا بھی انھوں نے انکار کیا اور رسول کو اور تم کو اس جرم میں جلاوطن کرنے کے درپے ہیں کہ تم اللہ پر جو تمھارا رب ہے، ایمان کیوں لائے۔

'تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ' اسی طرح کا اسلوب بیان ہے جس طرح 'وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ' (البقرۃ ۲: ۱۹۵) ہے۔ اس طرح کے کام نامہ و پیام اور وسائل و وسائط سے انجام پاتے ہیں اس وجہ سے تعبیرِ مطلب کے لیے یہ اسلوب نہایت موزوں ہے۔ ہم نے اسلوب کی معنویت ملحوظ رکھنے کے لیے ترجمہ 'محبت کی پینگیں بڑھانا' کیا ہے۔

'یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِیَّاکُمْ' میں حال کا صیغہ صورتِ حال کو نگاہوں کے سامنے کر دینے کے لیے ہے تاکہ ان لوگوں کو عبرت دلائی جائے جو ایسے بے درد لوگوں سے موالات کے خواہش مند تھے جنھوں نے رسول اور ان کے ساتھیوں کو ان کے وطن سے جلا وطن کیا۔ فرمایا کہ اگر اس کے باوجود تم ان سے دوستی کی پینگیں بڑھاتے ہو تو اپنے ایمان و اسلام کا جائزہ لو اس لیے کہ ان کا سارا غصہ تو اسی بات پر ہے کہ تم اللہ پر، جو تمھارا رب ہے، ایمان لاتے! 'رَبِّکُمْ' یہاں دلیل کے محل میں ہے کہ اللہ ہی جب رب ہے تو وہی ایمان کا حق دار ہوا۔ اگر تم اس پر ایمان لائے تو تم نے اصل حق دار کا حق پہنچایا لیکن تمھاری یہی حق شناسی ان کے غضب کا سبب بن گئی ہے۔

'اَنْ تُؤْمِنُوْا' کے اسلوب کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آرہے ہیں کہ 'اَنْ' سے پہلے بعض اوقات مضاف محذوف ہو جایا کرتا ہے۔ اگر اس کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہو گا کہ اس الزام یا اس گناہ پر تمھیں نکال رہے ہیں کہ تم اللہ پر، جو تمھارا پروردگار ہے، ایمان کیوں لائے؟ گویا تمھاری سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑی حق شناسی ان کے نزدیک تمھارا سب سے بڑا گناہ بن گئی ہے۔

'اِنْ کُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِیْ سَبِیْلِیْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِیْ تُسِرُّوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَیْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ط وَمَنْ یَّفْعَلْهُ مِنْکُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ'۔

ایک اسلوب کی وضاحت

اس ٹکڑے کی نحوی تالیف مفسرین پر اچھی طرح واضح نہیں ہوئی اس وجہ سے وہ اس کا مطلب واضح نہ کر سکے۔ پہلے اس کی تالیفِ نحوی سمجھ لیجیے، پھر ہم اس کا مطلب واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

مفسرین نے عام طور پر یہاں 'شرط' کا جواب محذوف مانا ہے اور قرینہ سے اس کو معین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میرے نزدیک یہاں 'اِنْ کُنْتُمْ' اور 'وَمَنْ یَّفْعَلْهُ' دونوں شرطوں کا جواب ایک ہی یعنی 'فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ' ہے۔ 'تُسِرُّوْنَ' ضمیرِ خطاب سے حال واقع ہوا ہے اور 'اَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَیْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ' جملہ معترضہ کے محل میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تم میری راہ میں جہاد اور رضا طلبی کے لیے اس حال میں نکلے کہ تم اپنے دلوں میں اللہ و رسول کے دشمنوں کے ساتھ موالات کی خواہش چھپائے ہوئے ہو، درآنحالیکہ میں تمھارے باطن اور ظاہر دونوں کو جانتا ہوں، تو یاد رکھو کہ جو تم میں سے ایسا کریں گے وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔

اللہ کی رضا طلبی اور رسول کے دشمنوں سے موالات ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں

سیدھی راہ سے بھٹک جانے کی وجہ ظاہر ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد اور اس کی رضا طلبی اور اللہ و رسول کے دشمنوں کے ساتھ دوستی، دو بالکل متضاد چیزیں ہیں۔ یہ دونوں بیک وقت کسی کے دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اگر اللہ ظاہر و باطن دونوں سے آگاہ نہ ہوتا تب تو اس کو دھوکا دیا جا سکتا تھا لیکن جب وہ ہر ایک کے ظاہر و باطن سے اچھی طرح آگاہ ہے تو اس کو کس طرح دھوکا دیا

جاسکتا ہے! جو لوگ اس طرح کی دو متضاد خواہشیں اپنے دلوں میں رکھ کے نکل رہے ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ خدا کی راہ میں نہیں بلکہ شیطان کی راہ میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ع

این رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

شانِ نزول سے متعلق ایک نکتہ

اس آیت کے تحت مفسرین نے حضرت حاطب بن بلتعہؓ کا ایک واقعہ بطور شانِ نزول نقل کیا ہے۔ شانِ نزول سے متعلق ہم مقدمۂ کتاب میں استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کی رائے نقل کر چکے ہیں کہ سلف جب کسی آیت کے تعلق سے کوئی واقعہ بطور شانِ نزول نقل کرتے ہیں تو اس کا مطلب لازماً یہی نہیں ہوا کرتا کہ بعینہٖ وہی واقعہ آیت کے نزول کا سبب ہے بلکہ اس سے ان کا مقصود صرف یہ رہنمائی دینا ہوتا ہے کہ اس آیت میں اس طرح کے واقعات کے لیے بھی حکم موجود ہے۔ اس آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ ایک خاص قسم کی صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے۔ جس کمزوری کی طرف آیت میں اشارہ ہے بعض لوگوں کے اندر اس کا پایا جانا کچھ عجیب بھی نہیں ہے بلکہ یہ عام بشری کمزوری کا نتیجہ یا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مصلحتِ خیر پر بھی مبنی ہو سکتی ہے اور یہاں یہی پہلو، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا، قرینِ عقل ہے۔ لیکن مصالح کا اصل جاننے والا خدائے علیم و حکیم ہی ہے۔ بسا اوقات آدمی نیک نیتی سے ایک رائے قائم کرتا ہے لیکن اس میں اس کے نفس کی کوئی کمزوری بھی چھپی ہو سکتی ہے جس تک اس کی نظر نہیں پہنچتی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کی کمزوریوں پر متنبہ فرمایا ہے تاکہ اس امت کے ہراول دستہ کا ہر عمل بعد والوں کے لیے نمونہ ہو۔

إِن يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَآءً وَيَبْسُطُوٓا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُم بِالسُّوٓءِ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ (۲)

کفار کے عناد کا حال

یعنی تم تو ان سے دوستی کے خواہشمند ہو لیکن ان کے دلوں میں تمھارے خلاف ایسا عناد بھرا ہوا ہے کہ اگر وہ تم پر کہیں قابو پا گئے تو نہ دست درازی سے باز رہیں گے نہ زبان درازی سے بلکہ ان کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ تمھیں مرتد کر کے چھوڑیں۔ یہی بات سورۂ توبہ میں اس طرح بیان ہوئی ہے: 'وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً' (التوبة - ۹: ۸) (اگر وہ تم پر قابو پا گئے تو پھر تمھارے معاملہ میں نہ وہ قرابت کا پاس کریں گے نہ کسی عہد کا) مطلب یہ ہے کہ تمھارے ساتھ ان کی دشمنی من حیث الجماعت ہے اور اس میں وہ اتنے سخت ہیں کہ کسی رشتہ و قرابت یا کسی عہد و پیمان کا لحاظ کرنے والے نہیں ہیں تو ان سے کسی نیکی کی توقع نہ رکھو بلکہ تمھارے لیے بھی صحیح رویہ یہی ہے کہ ان سے موالات کی ہر خواہش سے دست بردار ہو جاؤ۔

لَن تَنفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَآ أَوْلَٰدُكُمْ ۚ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳)

'ارحام' یہاں قرابات، یعنی رشتے ناتے کے مفہوم میں ہے۔ یہ تنبیہ ہے کہ جو لوگ دینی تقاضوں قیامت میں
کے مقابل میں اپنے رشتوں ناتوں کو زیادہ اہمیت دیں گے وہ یاد رکھیں کہ یہ چیزیں قیامت میں کام آنے رشتے کام نہیں
والی نہیں ہیں۔ اس دن اللہ تعالیٰ اس طرح کے تمام رشتہ داروں کے درمیان جدائی ڈال دے گا۔ آئیں گے
اس دن کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے:

وَلَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۗ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۝ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝ (المعارج - ۷۰: ۱۰-۱۴)

اور اس دن کوئی دوست کسی دوست کا پرسان حال نہیں ہوگا۔ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم کی تمنا یہ ہوگی کاش! اس دن کے عذاب سے وہ اپنے بیٹوں، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے اس خاندان کو جو اس کی پناہ گاہ رہا ہے اور تمام اہل زمین کو فدیہ میں دے کر اپنے کو بچالے۔

یہی حقیقت سورۂ عبس میں یوں واضح فرمائی گئی ہے:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝ (عبس - ۸۰: ۳۴-۳۶)

اس دن کو یاد رکھو جس دن آدمی اپنے بھائی، اپنے ماں باپ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔

اسی قسم کے مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہی تنبیہ سورۂ توبہ میں یوں فرمائی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ کفر کو ایمان پر ترجیح دیتے ہیں اور جو تم میں سے ان کو دوست بنائیں گے تو وہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔ کہہ دو، اگر تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارا خاندان، تمھارا وہ مال جو تم نے کمایا، وہ کاروبار جس کی کساد بازاری کا تمھیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جو تمھیں پسند ہیں، تمھارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں

فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۠ (التوبة - ۹ : ۲۳-۲۴)

جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔ اور اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔

آیت زیر بحث میں 'يَوْمَ الْقِيٰمَةِ' اس خوبصورتی سے بیچ میں آیا ہے کہ وہ آگے اور پیچھے آنے والے دونوں فعلوں کا ظرف بن گیا ہے۔

'وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ' یہ ایک دوسری تنبیہ ہے کہ اس مغالطہ میں نہ رہو کہ جو کچھ تم چھپا کر کرنے کی کوشش کر رہے ہو یہ اللہ سے بھی چھپا رہے گا۔ اللہ سے کوئی چیز بھی چھپی نہیں رہتی۔ تمہارا ہر عمل اس کی نگاہوں میں ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (۴)

اسوۂ ابراہیمی کی پیروی کی تلقین

فرمایا کہ اس معاملے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے تمھیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھارے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں تمھارے لیے بہترین قابلِ تقلید نمونہ پہلے سے موجود ہے۔ 'قَدْ كَانَتْ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے بلکہ پہلے سے تمھارے سامنے ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ اہلِ عرب کو اس بات پر ناز تھا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی اولاد ہیں۔ انھیں ان کی ہجرت اور قربانی کی روایات کا بھی علم تھا۔ اگرچہ امتدادِ زمانہ سے ان پر گرد و غبار کی تہیں بھی جم گئی تھیں اور بدعات نے ان کے بعض پہلوؤں کو مسخ بھی کر دیا تھا تاہم یہ بات نہیں تھی کہ وہ ان سے بالکل ہی ناآشنا ہوں، جیسا کہ بعض مورخین نے گمان کیا ہے۔

'وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ہجرت فرمائی ہے تو تنہا نہیں ہجرت فرمائی ہے بلکہ ان کی قوم کے کچھ لوگ جو ان پر ایمان لائے تھے، اس ہجرت میں ان کے ہم رکاب تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کا اعلانِ برائت

'اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ ...... الاٰية' یہ اس اعلانِ برائت کا حوالہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم کے سامنے کیا۔ انھوں نے ڈنکے کی چوٹ ان کو سنایا کہ ہم تم سے اور تمھارے ان تمام معبودوں سے، جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو، بالکل بری ہوئے۔ تمھارے مسلک و مذہب کا ہم نے انکار کیا اور اس اعلانِ برائت کے بعد ہمارے اور تمھارے درمیان دشمنی اور نفرت اس وقت تک کے لیے

آشکارا ہوگئی جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

'وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ'۔ یعنی اب تک تو ہم نے تمہارے ساتھ اس لیے رعایت برتی کہ تمھیں دین کی دعوت پہنچا دیں لیکن اب جب کہ تم پر حجت قائم ہو چکی ہے اور تم اپنی ضلالت پر اڑے ہوئے ہو، ہم تم سے اعلانِ براءت کر کے الگ ہو رہے ہیں۔ اب تمہارے ساتھ ہمارا تعلق کھلم کھلا عداوت ہی کا رہے گا تا آنکہ تم اپنے شرک سے تائب ہو کر توحید کی دعوت قبول کرلو۔

'إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ'۔ عام طور پر ہمارے مفسرین نے سمجھا ہے کہ یہ اسوۂ حسنہ سے استثناء ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ اعلانِ براءت سے استثنا ہے۔ یعنی اس کھلم کھلا اعلان براءت میں اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے ساتھ کوئی رعایت برتی تو صرف یہ کہ اپنے باپ سے انھوں نے یہ وعدہ کر لیا کہ میں آپ کے لیے اپنے رب سے مغفرت کی دعا کروں گا اگرچہ میں خدا کی طرف سے آپ کے معاملہ میں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ یعنی ہوگا تو وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے گا تاہم میں دعا کروں گا۔

اس رعایت کی وجہ، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے، یہ تھی کہ وہ نہایت دردمند اور بردبار تھے، انھوں نے خیال فرمایا کہ اگر وہ اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں تو یہ چیز اس اعلان براءت کے منافی نہیں ہوگی جو وہ اپنی پوری قوم سے کر رہے ہیں بلکہ یہ اس برّ و احسان کا مقتضی ہے جو ہر بیٹے پر اس کے والدین کا ایک واجبی حق ہے۔ اس وقت تک ان کو یہ اندازہ بھی پورا پورا نہیں تھا کہ دین کے ساتھ باپ کی دشمنی کس درجے کی ہے۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ باپ کا سارا غصہ اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے زعم کے مطابق اپنے بیٹے کو ایک گمراہی سے بچانا چاہتا ہے لیکن جب ان پر یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ ان کا باپ اللہ کے دین کا کٹر دشمن ہے تو انھوں نے اس سے کلیۃً اعلانِ براءت کر دیا۔

'وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ'۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے وعدۂ مغفرت کے ساتھ ہی توحید کی اصل حقیقت بھی واضح فرما دی کہ مجھے جو اختیار حاصل ہے صرف اتنا ہی ہے کہ میں تمہارے لیے مغفرت کی دعا کروں۔ رہا تمہارا بخشا جانا یا نہ بخشا جانا تو یہ کلیۃً اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ اس معاملے میں مجھے کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ کسی کے لیے استغفار اس کے حق میں ایک قسم کی سفارش ہے۔ اس سفارش کے معاملے میں جب حضرت ابراہیم خلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبر اپنی اس بے اختیاری کا اظہار فرماتے ہیں تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

'رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ'۔ اس دعا کا تعلق اعلانِ براءت سے ہے۔ بیچ میں 'إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ' کا ٹکڑا جملہ معترضہ کے طور پر آگیا تھا۔ اس کے ختم ہوتے ہی وہ دعا نقل ہوئی ہے جو اس نازک مرحلے پر حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں نے کی ہے۔ دوسرے مقامات میں

مرحلۂ ہجرت کی دعا

ہم اس حقیقت کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اعلانِ براءت کے بعد لازماً پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کے لیے ہجرت کا مرحلہ آجاتا ہے۔ یہ مرحلہ نہایت کٹھن ہوتا ہے۔ اپنی پوری قوم سے ابدی دشمنی اور بیزاری کا اعلان کر کے الگ ہو جانا کوئی سہل بازی نہیں ہے اس وجہ سے ہر رسول نے اپنی ہجرت کے وقت اپنا اور اپنے ساتھیوں کا معاملہ اپنے رب کے حوالے کیا ہے۔ ہجرت کے وقت اسی طرح کی دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی فرمائی اور اسی طرح کی دعا ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے۔ یہ دعا اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ بندے کا نیک سے نیک ارادہ بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے انجام پاتا ہے اس وجہ سے ہر قدم اسی کی مدد کے بھروسے پر اٹھانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی آزمائشوں میں وہی سُرخ رو ہوتے ہیں جن کے دل ہر وقت اس کی طرف جھکے رہتے ہیں اور جن کے اندر یہ یقین راسخ ہوتا ہے کہ بالآخر ان کو ایک دن اپنے رب ہی کی طرف پلٹنا ہے۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۵)

یہ بھی اسی دعا کا حصہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ 'فِتْنَةً' یہاں ہدفِ فتنہ کے معنی میں ہے اور اس سے مراد کفار کی وہ اذیتیں ہیں جو مسلمانوں کو وہ پہنچا سکتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو تیری توحید کی غیرت و حمیت میں ان مشرکوں سے اعلانِ براءت و عداوت کر دیا۔ اب ان کی طرف سے جو کچھ پیش آئے ہم اس کے لیے سینہ سپر ہیں۔ لیکن ہمارا بھروسہ تیری مدد پر ہے۔ ان کو اتنی ڈھیل نہ دینا کہ وہ ہم کو اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنا لیں۔

'وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا' اے ہمارے رب ہماری کمزوریوں اور ہمارے گناہوں کو بخش۔ ہمارے گناہ اس بات کا سبب نہ بن جائیں کہ ہمارے دشمن ہیں کمزور پا کر اپنی ستم رانیوں کا ہدف بنا لیں۔ اس فقرے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ہمیں کوئی آزمائش پیش آئی تو وہ ہمارے اپنے ہی اعمال کی پاداش میں پیش آئے گی اور تیرے اختیار میں سب کچھ ہے۔ تو ہمارے گناہوں کو بخش دے تو ہم ان کے وبال سے بچ جائیں گے۔

'إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ' یہ کامل تفویض کا کلمہ ہے۔ تو ہر چیز پر غالب ہے۔ جو چاہے کر سکتا ہے۔ کوئی تیرا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ ساتھ ہی تو حکیم بھی ہے۔ تیرا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے اس وجہ سے ہم اپنا معاملہ کلیتہً تیرے حوالے کرتے ہیں۔ تو جو کرے گا اسی میں خیر اور اسی میں حکمت و مصلحت ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ۚ وَمَن يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (۶)

ایک مزید تنبیہ — یہ 'قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ' کے بدل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے لیے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے اس اعلانِ براءت و عداوت میں نمونہ تو بے شک نہایت بہترین

ہے لیکن ان کے اس اسوہ کی پیروی کرنا ہر بوالہوس کا کام نہیں ہے۔ اس کا حوصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اللہ کی نصرت کی امید بھی رکھتے ہوں اور آخرت کے ظہور کے بھی متوقع ہوں۔ جن کے اندر یہ دونوں باتیں راسخ نہ ہوں وہ یہ بازی نہیں کھیل سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے گھر در، اموال و املاک، وطن اور قوم ہر چیز سے دست بردار ہو کر اٹھ کھڑے ہونا صرف انہی کے لیے ممکن ہے جو اپنے اس اقدام میں ہر قدم پر خدا کی نصرت کے متوقع ہوں اور جن کا اصل بھروسہ اس دنیا کے مال و متاع پر نہیں بلکہ آخرت کے فضل و انعام پر ہو۔ اس آیت سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ ہجرت کی راہ میں اصل زادِ راہ کیا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ جن لوگوں سے اس مرحلے میں کمزوریاں صادر ہو رہی تھیں ان کی کمزوریوں کی تہ میں کیا چیز چھپی ہوئی تھی۔

'وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ'۔ یہ ان لوگوں کو تنبیہ ہے کہ فلاح کا راستہ یہی ہے کہ تم ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے اسوہ کی پیروی کرو ورنہ یاد رکھو کہ جو اس سے اعراض کریں گے اللہ کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اللہ کسی کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ سب سے مستغنی اور خود اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے۔ اس کی خدائی دوسروں کے بل پر نہیں بلکہ خود اس کے اپنے بل پر قائم و دائم ہے۔

عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۚ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۷)

ایک عظیم بشارت

یہ ایک بہت بڑی بشارت ہے کہ آج اگر تم جی کڑا کر کے اپنے ان اقرباء سے اپنی دشمنی کا اعلان کر دو گے تو یہ نہ خیال کرو کہ یہ دشمنی ہمیشہ دشمنی ہی رہے گی بلکہ امکان اس کا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دشمنی کو محبت سے بدل دے اور جن سے آج تمہیں عداوت کرنی پڑ رہی ہے وہ ایمان و اسلام کی توفیق سے بہرہ مند ہو کر تم سے گلے ملیں۔

'وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ چاہے تو جانی دشمنوں کو جگری دوست بنا دے۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔ وہ لوگوں کو عذاب میں ڈالنے کے بہانے نہیں ڈھونڈتا بلکہ مغفرت و رحمت سے نوازنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ اس کے کٹر سے کٹر دشمنوں سے متعلق بھی یہ گمان نہیں رکھنا چاہیے کہ وہ ہمیشہ دشمن ہی رہیں گے، کیا عجب اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے لیے بھی توفیقِ خیر کی راہ کھول دے۔

یہاں 'غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ' کی صفت کے حوالے میں بشارت کا یہ پہلو بھی ہے کہ اب تک جو لوگ اللہ کے ان دشمنوں سے خفیہ روابط رکھتے ہیں اس تنبیہ کے بعد اگر وہ چوکنے ہو گئے اور اپنی روش کی انھوں نے اصلاح کر لی تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، وہ ان کی ان کمزوریوں کو معاف کر دے گا۔

ہجرت کا ایک نفسیاتی پہلو

اس آیت میں اہلِ مکہ کے قبولِ ایمان کی جو بشارت ہے اس کی ایک خاص نفسیاتی وجہ بھی ہے جو

یہاں ملحوظ رکھنے کی ہے۔ وہ یہ کہ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے بہت سے بھائی بہن، عزیز قریب محض دین کی خاطر اپنے گھر در، اپنے اہل و عیال اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر ان سے جدا ہو رہے ہیں در آنحالیکہ یہ لوگ ہر اعتبار سے ان کے اندر کے بہترین اشخاص تھے تو وہ سوچنے لگ گئے کہ اس دعوت کا مقابلہ ظلم و تعدی سے کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ ہمیں خود اپنے رویے کا جائزہ لینا چاہیے۔ شاید اسی کتاب میں یا اپنے کسی اور مضمون میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے عظیم شخص کو جس چیز نے سب سے پہلے اسلام کی طرف مائل کیا وہ کچھ مظلوم مردوں اور عورتوں کی حبشہ کی طرف ہجرت ہے۔ ہجرت کا یہ اثر ہر حساس مرد اور عورت پر پڑنا لازمی تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے بعد قبولِ اسلام کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ اس عمل کو اپنی فطری رفتار پر قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ مہاجرین میں سے کوئی گروہ اہلِ مکہ کے آگے اپنی کمزوری کا اظہار نہ کرتا. اگر ان کی طرف سے کسی کمزوری کا اظہار ہوتا تو اہلِ مکہ یہ خیال کرتے کہ مسلمان ہجرت تو کر گئے لیکن اب وہ اپنے اقدام پر پچھتا رہے ہیں اور ہم سے دوستانہ و نیاز مندانہ روابط قائم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ چیز ان کے اندر بھی اسلام کے احساس کو دبا دیتی اور مکہ میں گھرے ہوئے دوسرے مظلوم مسلمانوں کے حوصلے بھی پست کر دیتی۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کمزوری پر شدت سے گرفت کی اور لوگوں کو متنبہ کیا کہ دین کے دشمنوں کے ساتھ دوستانہ روابط نہ بڑھاؤ۔ آج اگر کفر میں لتھڑے ہوئے لوگوں کو سینے سے لگاؤ گے تو یہ تمہارے لیے موجبِ ہلاکت ہوں گے۔ البتہ اگر ان سے دشمنی پر جمے رہے تو توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو مسلمان بنا کر تمہارا دوست بنا دے۔ چنانچہ یہ بشارت اللہ تعالیٰ نے پوری کر دی اور فتحِ مکہ کے وقت خلق نے یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (النصر - ۱۱۰ : ۲) کا منظر اپنی آنکھوں دیکھ لیا۔

۲۔ آگے آیات ۸-۹ کا مضمون

آگے اس بات کی وضاحت فرما دی کہ ممانعت جس چیز کی کی جا رہی ہے وہ ان لوگوں سے موالات اور دوستی بڑھانے کی ہے جنھوں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالا ہے یا نکالنے والوں کی مدد کی ہے۔ جن لوگوں نے اس طرح کی کوئی زیادتی نہیں کی ہے ان کے ساتھ احسان اور انصاف کرنے کی ممانعت نہیں کی جا رہی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیتیں بعد میں اس وقت نازل ہوئی ہیں جب مذکورہ بالا حکم کی تعمیل میں کفار کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ غیر معتدل ہو گیا ہے حالانکہ اس طرح کی کوئی بات فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اوپر کی آیات میں خطاب، جیسا کہ واضح ہوا، ان لوگوں سے ہے جو اہلِ مکہ سے اپنے روابط قائم رکھنے کے خواہشمند تھے ان کو ایک ہی ساتھ یہ دونوں باتیں بتائی جا سکتی تھیں کہ دین

کے کٹر دشمنوں کے ساتھ دوستی بڑھانا تو اس ایمان کے منافی ہے جس کے تم مدعی ہو البتہ جن لوگوں کا رویہ جارحانہ نہیں ہے ان کے ساتھ اگر احسان و عدل کرو تو یہی تمہارے شایانِ شان ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۸-۹

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ⑧ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ⑨

ترجمۂ آیات ۸-۹

اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جنھوں نے دین کے معاملے میں نہ تم سے جنگ کی ہے اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ ۸

اللہ بس ان لوگوں سے تم کو موالات کرنے سے روکتا ہے جنھوں نے تمہارے ساتھ دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے نکالنے میں مدد کی ہے۔ اور جو اس طرح کے لوگوں سے دوستی کریں گے تو وہ اپنے ہی اوپر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔ ۹

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۸)

مخالفت کے حدود کی تعیین

'برّ' کی تحقیق سورۂ بقرہ کی آیت ۴۴ کی تفسیر کے تحت گزر چکی ہے۔[۱] اس کے معنی صلۂ رحم، احسان

---

[۱] ملاحظہ ہو تدبر قرآن جلد اول، صفحات ۱۴۳-۱۴۴

اور ادائے حقوق کے ہیں۔ 'اقساط' کے معنی عدل و انصاف کرنے کے ہیں۔ یعنی جس کا جو حق واجب ہے وہ پورا پورا ادا کیا جائے، اس میں کوئی کمی بیشی نہ کی جائے۔

فرمایا کہ تمہیں یہ حکم جو دیا گیا ہے کہ لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ (میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ) تو اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ تم ان کفار کے ساتھ احسان اور عدل بھی نہ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں نہ تم سے جنگ کی اور نہ تم کو تمھارے گھروں سے نکالا۔ ممانعت جس چیز کی کی جا رہی ہے وہ، جیسا کہ آگے والی آیت میں تصریح آ رہی ہے، موالات کی ہے نہ کہ عدل و احسان کی اور یہ ممانعت بھی تمام کفار کے حق میں نہیں بلکہ صرف ان کے حق میں ہے جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی اور تم کو جلاوطن کیا۔

'دین' کی قید سے مقصود اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ یہاں زیر بحث وہ نزاعات نہیں ہیں جو خاندانی و قومی مفادات کے تصادم سے آپس میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں بلکہ صرف وہ جنگ مراد ہے جو محض دین کی مخالفت میں کفار نے برپا کی اور جس سے مقصود ان کا لوگوں کو اللہ واحد کی بندگی سے روکنا تھا۔ دین تمام اہل ایمان کی مشترک متاع ہے اور اسی پر ان کی نجات و فلاح کا انحصار ہے اس وجہ سے کوئی مسلمان دین کے دشمنوں کے ساتھ دوستی رکھتا ہے تو وہ اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔ یہ انصاف کرنے والوں کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوپر جب 'برّ' اور 'قسط' دو چیزوں کا ذکر آیا ہے تو مناسب تھا کہ یہاں دونوں نیکیوں کے کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی، صرف عدل کرنے والوں ہی کی محبوبیت کا ذکر کیوں آیا؟ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ صلہ رحم وغیرہ کے قسم کی نیکیاں نفس پر اتنی بھاری نہیں ہیں جتنی عدل و انصاف کے قسم کی نیکیاں ہیں، بالخصوص جب کہ ان کا تعلق کفار سے ہو۔ کمزوروں کو سہارا دے دینا، محتاجوں کی مدد کر دینا اور اپنے کافر ماں باپ کے ساتھ صلۂ رحم کر دینا زیادہ مشکل کام نہیں ہیں۔ انسانی فطرت کے اندر ان کے لیے نہایت قوی محرکات موجود ہیں لیکن عدل و انصاف کا حق ادا کرنا اور وہ بھی اپنے دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں، کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے ان لوگوں کو اپنی محبوبیت کا خاص مقام بخشا جو یہ بازی کھیلیں گے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ قیام عدل و قسط اس امت کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ جو لوگ دوست اور دشمن دونوں کے ساتھ یکساں انصاف کریں گے وہی اس امت کے گل سرسبد ہیں اور وہی اللہ کو محبوب ہیں۔ یہ حق ادا کیے بغیر دوسری نیکیاں بالکل بے اثر ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَظٰھَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْھُمْ ۚ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۹)

روکا کن سے اور کس چیز سے گیا ہے؟

یہ صراحت کے ساتھ بتا دیا کہ اللہ تم کو کن لوگوں سے روکتا ہے اور خاص طور پر کس چیز سے روکا ہے۔ فرمایا کہ روک ان لوگوں سے رہا ہے جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی ہے اور تم کو تمھارے گھروں سے نکالا ہے یا تمھارے نکالنے میں تمھارے دشمنوں کی مدد کی ہے اور روک جس چیز سے رہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان کو اپنا دوست بناؤ۔ دوست بنانے سے مقصود ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ تم ملّت کے مفاد سے قطع نظر کر کے کسی معاملے میں اپنا دستِ تعاون اس غرض سے ان کو پیش کرو کہ وہ تمھاری کوئی ذاتی غرض پوری کرنے کا ذریعہ بنیں۔

اس آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں جو حصر ہے اس کا زور 'اَنْ تَوَلَّوْهُمْ' پر ہے یعنی ممنوع جو چیز ہے وہ 'تَوَلّی' یعنی ان کفار کو دوست اور کارساز بنانا ہے نہ کہ ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنا۔

نیکی ایک یک طرفہ عمل ہے۔ اس کا انحصار اس شخص کے رویّہ پر نہیں ہوتا جس کے ساتھ نیکی کی جاتی ہے۔ ایک شخص حاجتمند ہے تو ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ہم اس کی مدد کریں، خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان۔ اور ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس سے نہ کسی شکریہ کے طالب ہوں نہ کسی صلہ کے 'لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا' (الدھر - ۷۶ : ۹) یہاں تک کہ اگر کسی سبب سے اس کے خلاف ہمارے دل میں عداوت بھی ہو جب بھی ہمارے لیے صحیح رویّہ یہی ہے کہ ہم اس کے ساتھ نیکی کریں۔ اس طرح کی نیکی کا ہم کو، جیسا کہ قرآن و حدیث میں تصریح ہے، زیادہ ثواب ملے گا۔

رہا عدل و قسط کا معاملہ تو اس کی بنیاد قانون، معاہدے اور معروف پر ہوتی ہے۔ اس میں کافر و مومن یا دوست و دشمن کے امتیاز کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ قانون اور معاہدے کا جو تقاضا ہوگا وہ بہرحال پورا کرنا ہوگا اس سے بحث نہیں کہ معاملہ دوست کا ہے یا دشمن کا۔ آگے کفارِ قریش کے ساتھ چند تنازعات کا فیصلہ آ رہا ہے اور اس میں آپ دیکھیں گے کہ کس طرح قرآن نے بے لاگ فیصلہ کیا ہے اور اسی بے لاگ فیصلہ پر عمل کرنے کی مسلمانوں کو تاکید فرمائی ہے۔

'وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ' یعنی اس تنبیہ کے بعد بھی جو مسلمان ان کافروں سے موالات کریں گے وہ یاد رکھیں کہ نہ وہ خدا کا کچھ بگاڑیں گے نہ اسلام کا بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔

۴- آگے آیات ۱۰-۱۳ کا مضمون

آگے اسی 'لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ' والی ہدایت کی روشنی میں، جو پہلی آیت میں مذکور ہوئی، پہلے مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ مکّہ سے جو عورتیں ہجرت کر کے آئیں، ان کے ایمان و اسلام کی تحقیق کی جائے، مجرّد اس بنیاد پر ان کو اپنے اندر شامل نہ کر لیا جائے کہ وہ ان کے پاس آ گئی ہیں

اور ان کے اندر شامل ہونا چاہتی ہیں۔ ہاں تحقیق سے ثابت ہو جائے کہ ان کی ہجرت فی الواقع دین ہی کی خاطر ہے تب ان کو شامل کیا جائے ورنہ واپس کر دیا جائے۔ اسی طرح مہاجرین میں سے جن کی بیویاں مکہ میں ہیں اور وہ کافرہ ہیں ان کو اپنے عقدِ نکاح میں باندھے رکھنا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ ان کو آزاد کر دینا چاہیے کہ وہ جس سے چاہیں نکاح کر لیں اور ان کے مہروں کا آپس میں تبادلہ کر لیا جائے۔

دوسری ہدایت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے کہ جو عورتیں بیعت کے لیے آئیں ان سے اسلامی زندگی کے تمام معروفات پر عمل کرنے کی بیعت لی جائے۔ اگر یہ ذمہ داری اٹھانے کا وہ عہد کریں تب ان سے بیعت لی جائے ورنہ نہ لی جائے۔ اسلامی معاشرہ ہر قسم کے لوگوں کی بھرتی کے لیے نہیں ہے۔ اس میں شامل ہونے کا استحقاق صرف انہی کو حاصل ہے جو ایمان و اسلام کے مطالبات پورے کرنے کا عہد کریں۔

معاہدۂ حدیبیہ سے متعلق ایک اہم نزاع کا فیصلہ

یہ ہدایتیں اصلاً تو یہ بتانے کے لیے دی گئی ہیں کہ اسلام کے ساتھ غیر اسلام کا جوڑ خلافِ عقل و فطرت ہے جس کی جانچ پرکھ تعلقات کے ہر گوشے میں ہونی چاہیے تاکہ نفاق کی کوئی آلائش کہیں باقی نہ رہنے پائے۔ جس طرح مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ و رسول کے مخالفوں سے مودت رکھیں اسی طرح یہ بات بھی ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکات کے ساتھ کوئی رشتۂ مناکحت رکھیں۔ اگر اب تک اس طرح کا کوئی تعلق قائم رہا ہے تو اب وقت آگیا ہے کہ وہ کاٹ دیا جائے لیکن یہی مسئلہ مقتضی ہوا کہ یہاں ایک نزاع کا فیصلہ بھی کر دیا جائے جو معاہدۂ حدیبیہ سے متعلق قریش اور مسلمانوں میں شروع ہی سے چلی آرہی تھی اور اس دور میں اس نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ اس کا فیصلہ کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

یاد ہو گا، معاہدۂ حدیبیہ میں ایک اہم دفعہ اس مضمون کی تھی کہ قریش میں سے کوئی شخص مسلمانوں سے جا ملے گا تو اگرچہ وہ اسلام پر ہو لیکن مسلمان اس کو واپس کرنے کے پابند ہوں گے اس کے برعکس کوئی مسلمان اگر قریش سے آملے گا تو وہ اس کو واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ اس دفعہ کے الفاظ کے بارے میں اگرچہ راویوں کے درمیان اختلاف ہے لیکن عروہ، ضحاک، عبدالرحمٰن بن زید، زہری، مقاتل بن حیان اور سدی سے جو روایت ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: علی انہ لا یاتیک منا احد وان کان علی دینک الا رددتہ الینا (یعنی اس شرط پر صلح کی جاتی ہے کہ ہم میں سے (قریش میں سے) کوئی، خواہ وہ آپ کے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے) دین ہی پر ہو، اگر آپ کے پاس چلا جائے گا تو آپ اس کو لازماً واپس کریں گے۔

اس دفعہ کو مسلمانوں نے مردوں کی حد تک تو قبول کر لیا، چنانچہ اسی کی تعمیل میں حضرت ابو جندلؓ نہایت جذبات انگیز حالات میں عین اس وقت واپس کیے گئے جب کہ معاہدہ کی سیاہی ابھی خشک بھی نہیں ہوئی تھی، لیکن عورتوں کے باب میں مسلمانوں نے ان الفاظ کو واضح نہیں تسلیم کیا اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہے وہ اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ الفاظ عورتوں کی واپسی کے بارے میں

واضح ہیں بھی نہیں۔

معاہدے کے الفاظ جو اوپر نقل ہوئے ہیں اس میں 'احد' کا لفظ اپنے اندر اگرچہ عموم کا مفہوم رکھتا ہے لیکن غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ بعد میں جتنی ضمیریں اور فعل بھی آئے ہیں سب مذکر ہیں، ایسی صورت میں ایک شخص یہ تو کہہ سکتا ہے کہ 'احد' کے عموم میں عورتیں بھی داخل ہیں لیکن کوئی عاقل یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مردوں کی طرح عورتوں کے باب میں یہ الفاظ قطعی ہیں بلکہ اس کے برعکس یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر فریقین کا منشا یہ ہوتا کہ عورتوں پر بھی یہ دفعہ قطعی طور پر حاوی ہو تو 'احد' کے بعد 'ذکر کان او انثیٰ' یا اس کے ہم معنی کوئی تصریح ضرور بڑھائی جاتی۔ لیکن جب اس طرح کی کوئی تصریح نہیں بڑھائی گئی درآنحالیکہ معاہدہ کا مزاج اس کا مقتضی تھا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ معاہدہ کے وقت فریقین کے ذہن میں عورتوں کا مسئلہ نہیں تھا۔

اس اجمال نے قدرتی طور پر مسلمانوں اور قریش کے درمیان ایک قضیہ کی صورت اختیار کر لی اور یہ قضیہ، معلوم ہوتا ہے اس سورہ کے زمانۂ نزول میں زیادہ اہمیت حاصل کر گیا اس لیے کہ بہت سی عورتیں بھی ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں اور ضروری ہوا کہ مسلمان اس باب میں کوئی قطعی پالیسی اختیار کریں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک قطعی فیصلہ صادر فرمایا اور ساتھ ہی یہ تصریح بھی فرما دی کہ 'ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ' (یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو وہ تمہارے درمیان کر رہا ہے، اور اللہ علیم و حکیم ہے)۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے:

آیات ۱۰-۱۳ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ
فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ
مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۭ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا
هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۭ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ
تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۭ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ
الْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ۭ ذٰلِكُمْ
حُكْمُ اللّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑩ وَاِنْ فَاتَكُمْ
شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ

اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اَنْتُمْ بِهٖ
مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ
عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْـًٔا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا
یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ
اَیْدِیْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ
وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲﴾ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ قَدْ یَئِسُوْا مِنَ
الْاٰخِرَةِ كَمَا یَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾

ترجمۂ آیات ۱۰-۱۳

اے ایمان والو! جب تمھارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کرکے آئیں تو ان کی تحقیق کرو، یوں اللہ تو ان کے ایمان سے اچھی طرح واقف ہی ہے، پس اگر تم ان کو مومنہ پاؤ تو ان کو کفار کی طرف نہ لوٹاؤ، نہ وہ عورتیں ان کے لیے جائز ہیں اور نہ وہ ان عورتوں کے لیے جائز ہیں۔ اور انھوں نے جو کچھ خرچ کیا ہو وہ ان کو ادا کردو اور تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم ان سے نکاح کرلو بشرطیکہ ان کے مہر ان کو ادا کردو۔ اور کافرہ عورتوں کی عصمتوں پر قابض نہ رہو اور جو کچھ تم نے خرچ کیا اس کا مطالبہ کرو اور وہ بھی مطالبہ کریں اس کا جو انھوں نے خرچ کیا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو وہ تمھارے درمیان کر رہا ہے اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔ ۱۰

اور اگر تمھاری بیویوں کے مہر میں سے کچھ کافروں کی طرف رہ جائے تو جب تمھیں موقع ہاتھ آجائے تو جن کی بیویاں گئی ہیں ان کو ادا کردو جو کچھ انھوں نے خرچ

کیا ہے اور اس اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔ ۱۱

اے پیغمبر، جب تمہارے پاس مومنہ عورتیں اس بات پر بیعت کے لیے آئیں کہ وہ کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں گی اور نہ وہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کی مرتکب ہوں گی اور نہ وہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے متعلق کوئی بہتان تراشیں گی اور نہ کسی امرِ معروف میں تمہاری نافرمانی کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور اُن کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کرو، بے شک اللہ غفور رّحیم ہے۔ ۱۲

اے ایمان والو، ان لوگوں سے دوستی نہ کرو جن پر اللہ کا غضب ہوا۔ وہ آخرت سے نا امید ہوئے جس طرح کفّار قبر والوں سے نااُمید ہوئے۔ ۱۳

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا جَآءَكُمُ ٱلْمُؤْمِنَٰتُ مُهَٰجِرَٰتٍ فَٱمْتَحِنُوهُنَّ ۖ ٱللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَٰنِهِنَّ ۖ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى ٱلْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۖ وَءَاتُوهُم مَّآ أَنفَقُوا۟ ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَلَا تُمْسِكُوا۟ بِعِصَمِ ٱلْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوا۟ مَآ أَنفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوا۟ مَآ أَنفَقُوا۟ ۚ ذَٰلِكُمْ حُكْمُ ٱللَّهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۱۰)

ہجرت کر کے آنے والی عورتوں سے متعلق تحقیق کی ہدایت

مسلمانوں کو ہدایت فرمائی گئی کہ جو مسلمان عورتیں دارالکفر سے ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں ان کو کفّار کی طرف واپس کرنے کی ذمہ داری تو، جیسا کہ اوپر تمہیدی بحث میں اشارہ گزرا، تم پر نہیں ہے لیکن ان کے کفر و ایمان کی تحقیق کیے بغیر لوں ہی اپنے گھروں میں ان کو مفت کا مال سمجھ کر ڈال لینا بھی جائز نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ جو عورتیں آئیں ان کے باب میں اچھی طرح تحقیق کر لی جائے کہ فی الواقع ان کی ہجرت اسلام ہی کے لیے ہے یا کوئی اور غرض ان کے اس نقل مکان کا سبب

ہوئی ہے۔ اگر تحقیق سے اطمینان ہو جائے کہ ان کی ہجرت اسلام ہی کے لیے ہے تب تو ان کو واپس کرنا جائز نہیں ہے، لیکن یہ اطمینان وہ نہ دلا سکیں تو پھر ان کو روکنا بھی جائز نہیں ہے اس لیے کہ اسلامی معاشرہ طیبوں اور طیبات کا معاشرہ ہے، خبیثوں اور خبیثات کا معاشرہ نہیں ہے۔

اس امتحان و تحقیق کی نوعیت حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت سے واضح ہوتی ہے جو اس طرح نقل ہوئی ہے:

سئل ابن عباس کیف کان امتحان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) النساء قال کان یمتحنھن باللہ ما خرجت من بغض الزوج وباللہ ما خرجت رغبۃ عن ارض الی ارض و باللہ ما خرجت التماس دنیا و باللہ ما خرجت الا حبا للہ و رسولہ۔	ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی تحقیق کس طرح فرماتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ آپ قسم لیتے تھے کہ خدا کی قسم وہ شوہر سے بیزار ہو کر نہیں نکلی ہیں، خدا کی قسم محض جگہ کی تبدیلی کے شوق میں نہیں نکلی ہیں، خدا کی قسم کوئی اور دنیوی غرض بھی اس نکلنے کا محرک نہیں ہوئی ہے، خدا کی قسم وہ محض اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں نکلی ہیں۔

'اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ' یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم قسم اور دوسرے قرائن و حالات سے جس حد تک تحقیق کر سکتے ہو کرنے کی کوشش کرو۔ رہی اصل حقیقت تو وہ اللہ کو خوب معلوم ہے۔ اگر کوشش کے باوجود تم صحیح نتیجہ تک نہ پہنچ سکے تو عنداللہ تم معذور رہو اور اگر انھوں نے تم کو دھوکا دیا تو یاد رکھیں کہ اللہ ان کے ایمان و کفر سے اچھی طرح آگاہ ہے۔

'فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ' یعنی معتبر ذرائع تحقیق سے اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ وہ مومنہ ہیں تو ان کو کفار کے حوالہ نہ کرو، اس لیے کہ نہ وہ کفار کے لیے جائز ہیں اور نہ کفار ان کے لیے جائز ہیں بلکہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے حرام ہیں۔

منصفانہ فیصلہ

اس حکم سے قرآن نے اس نزاع کا فیصلہ کر دیا جو معاہدۂ حدیبیہ کی دفعہ کے بارے میں پیدا ہو گئی تھی اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ فیصلہ نہایت ہی منصفانہ ہے۔ اگر قرآن کا فیصلہ یہ بھی ہوتا کہ از روئے معاہدہ کسی عورت کی بھی واپسی کے مسلمان پابند نہیں ہیں تو یہ بھی بے جا نہ ہوتا یہ محض الفاظ سے فائدہ اٹھانے والی بات ہوتی۔ قرآن نے صرف الفاظ سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ایک ایسا فیصلہ کیا جس کی ایک نہایت محکم عقلی و اخلاقی بنیاد ہے یعنی ان عورتوں کو تو واپس کر دینے کی ہدایت فرمائی جن کی ہجرت اللہ و رسول کے لیے نہیں بلکہ کسی حقیر دنیوی مقصد کے لیے ہو

البتہ جن کا مومنہ ہونا ثابت ہو جائے ان کو واپس کرنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ ایک ایسی اصولی بات ہے جس کا کوئی عاقل انکار نہیں کر سکتا۔ انسان اپنی ایک عقلی و اخلاقی ہستی رکھتا ہے اس وجہ سے یہ اس کے اوپر صریح ظلم ہے کہ اس کو کسی ایسے معاشرے کے ساتھ بندھے رہنے پر مجبور کیا جائے جس کے اندر اس کا یہ اخلاقی و عقلی تشخص محفوظ نہ رہ سکے۔ بالخصوص عورتیں جنسِ ضعیف ہونے کے سبب سے اور بھی حق دار ہیں کہ ان کا تحفظ کیا جائے۔

وَآتُوهُم مَّا أَنفَقُوا۔ یہ ایک اور منصفانہ بات کی ہدایت فرمائی کہ جو مومنہ روک لی گئی ہے اگر وہ کسی کافر کی زوجیت میں رہی ہے تو مسلمانوں پر یہ ذمہ داری ہے کہ اس کے شوہر نے جو مہر اس کو ادا کیا ہے وہ مسلمانوں کی طرف سے اس کو واپس کر دیا جائے۔ اس کے واپس کیے جانے کی عملی شکل یہی ہو گی کہ اس کی واپسی کا ذمہ دار بیت المال ہو گا۔ 'مَا أَنفَقُوا' کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن میاں بیوی کی جدائی کی صورت میں مہر ہی زیر بحث آتا ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ وہی مراد ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ۔ یعنی ان مراحل کے طے ہو جانے کے بعد اگر کوئی مسلمان ان سے نکاح کرنا چاہے تو وہ بے تکلف کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ مہر ادا کرے۔ یعنی جو مہر سابق شوہر کو دیا گیا ہے اس کے علاوہ عورت کو بھی اس کا مہر دینا ہو گا جو نکاح کرنے والا ادا کرے گا۔

'لَا جُنَاحَ' کے الفاظ اس امر کے اظہار کے لیے ہیں کہ جو عورت اس طرح دار الاسلام میں آ کر اسلامی معاشرہ میں شامل ہو گئی اس کے ساتھ نکاح میں یہ چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی کہ وہ دار الکفر میں کسی کے نکاح میں رہی ہے یا اس کے ماں باپ یا دوسرے اولیاء ہیں جن کی اجازت کی ضرورت ہے۔ اب وہ اپنے کافر شوہر اور کافر اقربا کی جملہ پابندیوں سے آزاد اور اسلامی شریعت کے حدود کے اندر اپنی مرضی کی آپ مالک ہو گی۔

ایک اور فیاضانہ قدم

وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ۔ 'عِصَم' جمع ہے 'عِصْمَة' کی۔ یہ اسی سلسلہ میں اسلام نے ایک اور قدم بھی نہایت فیاضانہ اور بالکل یک طرفہ اٹھایا کہ مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ تم میں سے جن کی بیویاں دار الکفر میں ہیں اور وہ اپنے کفر پر قائم ہیں ان کی عصمتوں کے مالک نہ بنے رہو بلکہ ان کو اپنے نکاح کی قید سے آزاد کر دو، وہ جس سے چاہیں نکاح کر لیں۔

وَاسْأَلُوا مَا أَنفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوا مَا أَنفَقُوا۔ اس اعلان کے بعد گویا معاملہ کی شکل یہ ہوئی کہ جو عورتیں مسلمان ہو کر مسلمانوں کے پاس آ گئی ہیں ان کا نکاح ان کے کافر شوہروں کے ساتھ ختم اور جو عورتیں مسلمانوں کے نکاح میں تھیں لیکن وہ دار الکفر ہی میں رہ گئیں اور کفر ہی پر قائم ہیں ان کے نکاح مسلمانوں کے ساتھ کالعدم۔ رہا ان کے مہروں کا معاملہ تو ان کا مبادلہ اجتماعی طور پر کر لیا جائے۔

مسلمانوں نے جو مہر اپنی کافر بیویوں کو دیے وہ کفار مسلمانوں کو واپس کر دیں اور کفار نے جو مہر اپنی ان بیویوں کو دیے جو مسلمان ہو گئیں ان کے مہر مسلمان کفار کو واپس کریں۔

ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ؛ یہ آخر میں واضح فرما دیا کہ یہ اس نزاع کا فیصلہ ہے جو عورتوں کی واپسی سے متعلق، معاہدۂ حدیبیہ کی تشریح میں، تمھارے اور قریش کے درمیان ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن نے قریش کے اس مطالبہ کو تو تسلیم نہیں کیا کہ معاہدہ کی رُو سے مسلمانوں پر ان عورتوں کی واپسی لازمی ہے جو ہجرت کر کے ان کے پاس جائیں البتہ اس نزاع کا ایک معقول، مبنی بر انصاف اور جامع فیصلہ ایسا کر دیا جس سے اس وقت کی ایک بہت بڑی اجتماعی الجھن بھی دور ہو گئی اور آئندہ ابھرنے والے بعض جھگڑوں کا بھی سدّباب ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے اس وجہ سے بندوں کو چاہیے کہ اس کے فیصلوں پر اعتماد کریں۔

وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (۱۱)

عَاقَبْتُمْ کے معنی ہیں کہ صادفت العقبٰی لکم یعنی پھر تمھاری باری آگئی یا تمھیں موقع مل گیا۔

بدلے کی ایک منصفانہ شکل

مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کفار کی طرف سے وَاسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا کے اصول کی خلاف ورزی ہو، وہ کسی ایسی عورت کا مہر واپس نہ کریں جو اس کے مسلمان شوہر نے اس کو دیا تو اس صورت میں مسلمانوں کو حق ہوگا کہ اگر ان کو کسی عورت کا مہر کفار کو ادا کرنا ہے تو ان کو ادا کرنے کے بجائے اپنے اس بھائی کو ادا کر دیں جس کی چلی جانے والی بیوی کا مہر واپس نہیں ہوا۔ یہ گویا بدلہ لینے کی ایک منصفانہ اور مبنی بر عدل کارروائی ہوئی جس کی اجازت اس لیے دی گئی کہ ایک فریق نے ناانصافی کی راہ اختیار کی۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ؛ یہ اس اجازت سے فائدہ اٹھانے میں خاص احتیاط کی تاکید فرمائی کہ دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرنے میں اپنے اس اللہ سے ڈرتے رہو جس پر ایمان لائے ہو۔ بلا کسی وجہ معقول کے نہ کوئی انتقامی اقدام کرنے کے بہانے ڈھونڈے جائیں نہ اپنے واجبی حق سے زیادہ کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۲)

عام عورتوں سے متعلق ایک احتیاطی ہدایت

اور جس طرح مہاجرات کے امتحان کی ہدایت فرمائی اسی طرح اس آیت میں یہ ہدایت فرمائی کہ جو عورتیں اسلام میں داخل ہونے کے لیے آئیں وہ بھی یوں ہی داخل نہ کر لی جائیں بلکہ ان سے اسلام کے تمام معروفات کی پابندی کے ساتھ ساتھ خاص طور پر ان برائیوں سے بچتے رہنے کا اقرار لیا جائے جو جاہلی معاشرے میں عام رہی ہیں تاکہ اسلامی معاشرہ میں ان برائیوں کے جراثیم پھیلنے نہ پائیں۔

یہاں یہ امر واضح رہے کہ یہ ہدایت اس زمانے میں فرمائی گئی ہے جب مردوں کی طرح عورتوں کے بھی ہجوم کے ہجوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیعت کے لیے آنے لگے ہیں اور ان میں بہت سی عورتیں ان طبقات سے تعلق رکھنے والی بھی ہوتیں جن کا اخلاقی معیار زمانۂ جاہلیت میں بہت پست تھا۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ ان کو برائیوں سے بچتے رہنے کی خاص طور پر تاکید کی جائے تاکہ جس نئے معاشرے میں وہ داخل ہو رہی ہیں اس کی خصوصیات سے ان کو آگاہی ہو اور وہ اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کا ارادہ کر کے اس میں داخل ہوں۔ یہاں ان سے جن برائیوں سے بچنے کا اقرار لینے کی ہدایت فرمائی گئی ہے وہ یہ ہیں:

'عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا'۔ یہ کہ وہ کسی چیز کو بھی اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ تمام دین کی بنیاد توحیدِ خالص پر ہے اس وجہ سے سب سے پہلے شرک سے اجتناب کا اقرار لینے کی ہدایت فرمائی۔ ایک متوسط درجہ کے ذہن کے لیے توحید تک پہنچنے کا آسان راستہ شرک کی نفی ہی کی راہ سے کھلتا ہے۔ اگر شرک سے اجتناب کا شعور نہ ہو تو بہت سے لوگ شرک کی تمام آلودگیوں میں لتھڑے ہوئے بھی یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ توحیدِ خالص پر ہیں۔

'وَلَا یَسْرِقْنَ'۔ دوسری چیز یہ ہے کہ چوری نہ کریں یعنی جس طرح خدا کے حقوق میں کسی قسم کا غلط تصرف ناجائز ہے اسی طرح بندوں کے مال میں بھی بے جا تصرف ناجائز ہے۔

'وَلَا یَزْنِیْنَ' تیسری چیز یہ ہے کہ زنا کی مرتکب نہ ہوں۔ زنا اور شرک کی مشابہت کی طرف اس کتاب میں جگہ جگہ ہم اشارے کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

'وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ' چوتھی چیز یہ ہے کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی۔ زمانۂ جاہلیت میں قتلِ اولاد کا ارتکاب مشرکانہ توہمات کے تحت بھی ہوتا تھا، اندیشۂ فقر اور بے جا غیرت کے تحت بھی۔ اس زمانے میں اس کے دوسرے محرکات بھی پیدا ہو گئے ہیں جو معروف ہیں۔ یہ ممانعت ان سب پر حاوی ہے۔

'وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُھْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَہٗ بَیْنَ اَیْدِیْھِنَّ وَاَرْجُلِھِنَّ'۔ پانچویں چیز یہ ہے کہ کسی کے متعلق، خواہ مرد ہو یا عورت، کوئی ایسا بہتان نہ تراشیں جس کا تعلق ان کے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے متعلق ہو۔

'بَیْنَ اَیْدِیْھِنَّ وَاَرْجُلِھِنَّ' سے اشارہ میرے نزدیک جنسی اعضاء کی طرف ہے۔ یہ اعضاء ہاتھوں

اور پاؤں کے درمیان ہی ہوتے ہیں۔ ان کی طرف اشارہ کے لیے یہ ایک شائستہ اسلوبِ بیان ہے۔ اس میں پردہ پوشی کے ساتھ پورا احاطہ بھی ہے۔ نہایت مہذب اسلوب سے ان تمام تہمتوں کی طرف اشارہ ہو گیا ہے جو جنسی نوعیت کی ہو سکتی ہیں، مثلاً زنا، تقبیل اور ملامست وغیرہ۔

بہتان لگانا، کسی قسم کا بھی ہو، نہایت سنگین برائی ہے لیکن جس بہتان کا تعلق جنسی امور سے ہو اس کی سنگینی دو چند بلکہ دہ چند ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس طرح کا بہتان اس شخص کی (خواہ مرد ہو یا عورت) حیثیتِ عُرفی پر نہایت خطرناک حملہ ہے جس پر بہتان لگایا گیا ہے۔ اس سے معاشرے کے اندر بسا اوقات ایسے فتنے بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کو دبانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ بہتان کوئی مرد لگائے یا کوئی عورت، دونوں ہی کے لیے گناہ ہے اور شریعت میں دونوں ہی کے لیے اس کو جرم قرار دیا گیا ہے لیکن یہاں خاص طور پر عورتوں کو اس سے روکا گیا ہے اس لیے کہ عورتوں کا بہتان اور وہ بھی جنسی نوعیت کا ایک ایسا خطرناک وار ہے جس کا دفاع نہایت مشکل ہے۔

عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس ٹکڑے کا یہ مطلب لیا ہے کہ کوئی عورت کسی غیر مرد کے حمل کو اپنے شوہر سے منسوب نہ کرے لیکن اس کو اس قدر محدود کر دینے کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے اس کے الفاظ کی روشنی میں اس کی وسیع تاویل کی ہے جس کے اندر وہ ساری باتیں آجاتی ہیں جو اس کے تحت آسکتی ہیں۔

'وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ' چھٹی چیز یہ ہے کہ کسی معروف کی تعمیل میں وہ تمھاری نافرمانی نہیں کریں گی۔ 'معروف' یہاں 'منکر' کے مقابل میں ہے۔ اوپر جن جن باتوں کا حوالہ ہے ان سب کا تعلق منکرات کے باب سے ہے، ان میں معروفات یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور عدل و احسان کے قسم کی چیزوں میں سے کسی چیز کا بھی ذکر نہیں آیا ہے۔ اس کی وجہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ ہے کہ یہ ان عورتوں کی بیعت کا ذکر ہے جو فتح مکّہ کے دور میں بکثرت اسلام میں داخل ہو رہی تھیں اور جن کے اندر زمانۂ جاہلیت میں یہ برائیاں پائی جاتی تھیں جن کا یہاں ذکر ہے۔ یہ خاص صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ منکرات سے بچتے رہنے کا تو ان سے صراحت و تفصیل کے ساتھ اقرار کرایا جائے اور معروفات سے متعلق آخر میں ایک جامع اقرار لے لیا جائے کہ شریعت کے معروفات میں سے کسی معروف کی تعمیل میں وہ پیغمبرؐ کی نافرمانی نہیں کریں گی۔ شریعت کے معروفات معلوم و مشہور ہیں اس وجہ سے ان کی تفصیل کی ضرورت یہاں نہیں تھی۔

ایک غلط فہمی بعض لوگوں نے 'فِي مَعْرُوفٍ' کے الفاظ یہاں قید و شرط کے مفہوم میں لیے ہیں اور اس سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اسلام میں پیغمبر کی اطاعت بھی معروف کی قید سے مقید و مشروط ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد! ہمارے نزدیک یہ نکتہ محض ایک نکتۂ بارد ہے۔ پیغمبر نہ کسی منکر کا حکم دیتا ہے نہ

دے سکتا ہے۔ وہ دین کے معاملے میں وہی بات کہتا ہے جو معروف ہوتی ہے اس لیے کہ وہ خدا کی حفاظت میں ہوتا ہے اور اس کی حیثیت حق و باطل کے امتیاز کے لیے ایک کسوٹی کی ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے ہر حکم کی اطاعت لازمۂ ایمان ہے۔ جب وہ خود معروف و منکر کے امتیاز کی کسوٹی ہوا تو کسی دوسرے کے لیے اس کی کسی بات کو معروف کے خلاف قرار دینے کے کیا معنی! پیغمبر کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں صرف 'تا بہ حدِ استطاعت' کی قید ہو سکتی ہے اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ بیعت کرنے والوں کو خود یاد دہانی فرما کر یہ قید لگوا دیتے تھے لیکن اس کی اطاعت کے معروف کی قید سے مقید ہونے کی بات بالکل بے معنی ہے۔ البتہ پیغمبرؐ کے خلفاء و امراء کے ہاتھ پر جو بیعت ہو گی وہ 'اطاعت فی المعروف' کی قید سے مشروط ہو گی اس لیے کہ ان سے امکان ہے کہ وہ کوئی ایسا حکم دے بیٹھیں جو معروف کے خلاف ہو۔ چنانچہ رسول کے بعد کسی کی بھی مطلق اطاعت کا عہد کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔

عورتوں سے بیعت لینے کے طریقہ کی وضاحت روایات میں موجود ہے۔ اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں جو حدیثوں میں بیان ہوئی ہیں، البتہ یہ بات مسلّم ہے کہ عورتوں سے بیعت لینے میں حضورؐ نے ان کے ہاتھ کبھی اپنے ہاتھ میں نہیں لیے۔

'فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'۔ فرمایا کہ جو عورتیں ان تمام منکرات سے بچتے رہنے اور دین کے تمام معروفات کی پابندی کا اقرار کریں ان سے بیعت لو اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگو کہ اس سے پہلے ان سے جو غلطیاں صادر ہوئی ہیں وہ ان سے درگزر فرمائے۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، وہ ان پر رحم فرمائے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَىِٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَىِٕسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ (۱۳)

آخر میں ابتدائی مضمون کا اعادہ

اس آخری آیت میں اس مضمون کی پھر یاد دہانی ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوا ہے۔ قرآن میں ایسی مثالیں بہت ہیں کہ جس مضمون سے سورہ کا آغاز ہوتا ہے اسی پر اس کا اختتام بھی ہوتا ہے۔ یہ چیز قرآن میں نظم کی ایک بہت بڑی شہادت ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا ہے: 'يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاۗءَ' (اے ایمان والو، میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ) اللہ اور اہلِ ایمان کے دشمن یہود بھی تھے اور مشرکینِ قریش بھی۔ اس سورہ (الممتحنة) سے پہلے جو مسبّحات سورتیں گزری ہیں ان میں زیادہ تر یہود کی سازشوں اور ان کے ساتھیوں کا رویّہ زیرِ بحث آیا ہے اور مسلمانوں کو ان سے دور رہنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ اب اس کی آخری آیت میں دونوں دشمنوں کو جمع کر کے مسلمانوں کو

متنبہ فرمایا کہ نہ ان یہود کی دوستی تمہارے لیے کسی خیر کا باعث ہو سکتی نہ کفار کی۔ یہ دونوں ہی اپنے عقیدے اور عمل کے اعتبار سے ایک ہی سطح کے اور ایک ہی انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ جو ان کا ساتھی بنے گا اس کا حشر بھی وہی ہو گا جو ان کا ہونے والا ہے۔

'قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ' سے ظاہر ہے کہ یہود ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ صفت کی حیثیت سے قرآن میں یہ الفاظ یہود ہی کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ پہلی ہی سورہ میں ان کے لیے 'مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ' کی صفت آئی ہے۔

'قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ' یعنی اگرچہ زبان سے یہ آخرت کا اقرار کرتے ہیں لیکن ان کی دنیا پرستی، ان کی ہوسِ زر اور رموت سے ان کا فرار گواہ ہیں کہ یہ آخرت کی توقع نہیں رکھتے۔ اگر یہ آخرت کی توقع رکھتے ہوتے تو یہ ان حرکتوں کے مرتکب نہ ہوتے جن کے مرتکب ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی شدید تنبیہات کے بعد بھی ان سے باز نہ آئے۔

'كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ' یعنی جس طرح کفار اب ان مُردوں کے جی اٹھنے سے مایوس ہیں جو قبروں میں پہنچ چکے اور کہتے ہیں کہ 'ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ' (قٓ - ۵۰ : ۳) (کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ زندہ کیے جائیں گے، یہ لوٹایا جانا تو نہایت مستبعد ہے) اسی طرح یہ یہود بھی آخرت سے مایوس ہیں۔ آخرت کے معاملے میں دونوں ایک ہی سطح پر ہیں۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ قرآن نے جگہ جگہ یہود اور کفار کی مشابہت نمایاں فرمائی ہے تاکہ جو مسلمان اہل کتاب ہونے کی بنا پر ان سے کسی حسنِ ظن میں مبتلا تھے ان کی غلط فہمی رفع ہو اور ان پر واضح ہو جائے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بدتر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ۔

رحمان آباد
۴- مارچ ۱۹۷۸ء
۲۴- ربیع الاوّل ۱۳۹۸ھ

تدبّرِ قرآن

۶۱

الصّفّ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور اس کا خطاب

اس سورہ میں خطاب ان مسلمانوں سے ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع و طاعت کا عہد کر چکنے کے بعد اللہ کی راہ میں جہاد سے جی چرا رہے تھے۔ ان کو متنبہ فرمایا ہے کہ اگر عہدِ اطاعت میں داخل ہو چکنے کے بعد تمہاری روش یہی رہی تو یاد رکھو کہ تمہارا بھی وہی حال ہو گا جو یہود کا ہوا۔ انھوں نے اطاعت کا عہد کر چکنے کے بعد قدم قدم پر اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی۔ اس کج روی کی سزا ان کو یہ ملی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل اس طرح کج کر دیے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم ہو گئے۔ چنانچہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آخری نبی کی بشارت لے کر آئے اور نہایت کھلے ہوئے معجزات دکھائے تو انھوں نے سارے معجزات کو جادو قرار دیا اور ان کو جھٹلا دیا اور اب وہ اسلام کی مخالفت کے درپے ہیں حالانکہ اسلام، ان کے اور مشرکین دونوں کے علی الرغم، اس سرزمین کے تمام ادیان پر غالب آ کے رہے گا۔

اس کے بعد اس صحیح روش کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جو مسلمانوں کو اختیار کرنی چاہیے اور جو اس عہد کا لازمی تقاضا ہے جو اللہ کے رسول سے انھوں نے کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کو اس فتح عظیم کی بشارت دی ہے جو مستقبل قریب میں حاصل ہونے والی ہے اگر وہ اس عہد پر مضبوطی سے قائم رہے۔

آخر میں ان کے سامنے ان لوگوں کا نمونہ رکھا ہے جنھوں نے حق کی طرف سبقت اور اس کی تائید و رفاقت کی نہایت اعلیٰ مثال قائم کی اور دعوت دی ہے کہ پیروی کے قابل نمونہ ان کا ہے نہ کہ یہود کا جو ہمیشہ کے لیے اللہ کی ہدایت سے محروم ہوئے۔

ب۔ سابق سورتوں سے تعلق

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ جس طرح پچھلی مدنی سورتوں میں منافقین کا کردار زیرِ بحث رہا ہے اسی طرح اس سورہ میں بھی انہی کے ایک گروہ کا کردار زیرِ بحث ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ پچھلی سورتوں میں جن منافقین سے بحث ہے وہ اپنے نفس کی داخلی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ خارجی بندھنوں میں گرفتار تھے لیکن اس سورہ اور اس کے بعد کی مدنی سورتوں میں ان منافقین سے بحث ہے جن کی کمزوریاں بیشتر داخلی ہیں۔ مثلاً اس سورہ میں اور اس کے بعد سورۂ جمعہ میں، جو اس کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے، حبِ مال و جان کی بیماری

کی نشان دہی کی گئی ہے اور اس کو ان کے نفاق کا سبب بتایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے علاج کی تدابیر کی نشان دہی بھی فرمائی گئی ہے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) سورہ کی تمہید جس میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع و طاعت کا عہد کر چکنے کے باوجود اللہ کی راہ میں جہاد سے جی چرا رہے تھے۔ ان کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ روش زیادہ مبغوض ہے کہ آدمی وفاداری کا عہد کر چکنے کے بعد اس سے فرار اختیار کرے۔ اس کو محبوب وہ بندے ہیں جو اس کے ساتھ باندھے ہوئے عہد کی خاطر جب وقت آئے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح صف بستہ ہو کر سرگرم پیکار رہیں۔

(۵-۹) ایمان و طاعت کا عہد کر چکنے کے بعد جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد سے جی چراتے ہیں وہ درحقیقت یہود کے نقش قدم کے پیرو ہیں۔ وہ اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے یہود ہوئے۔ انھوں نے اپنے نبی کے ساتھ یہی روش اختیار کی۔ اطاعت کا عہد بڑے جوش و خروش سے کرتے لیکن جب امتحان کا وقت آتا تو بالکل پھسڈی ثابت ہوتے۔ ان کے اس رویہ کا شکوہ حضرت موسیٰ نے بڑے سوز و درد کے ساتھ کیا لیکن وہ اس روش سے باز نہ آئے۔ اس کج روی کی سزا اللہ تعالیٰ نے، اپنی سنت کے مطابق، ان کو یہ دی کہ ان کے دل کج کر دیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہدایت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ چنانچہ ان کی یہی کج روی حضرت عیسیٰ کے معاملے میں بھی ظاہر ہوئی۔ آپ کا ظہور تورات کی پیشین گوئیوں کے مطابق ہوا۔ آپ نے نہایت شاندار معجزے دکھائے اور دنیا کے آخری ہادی کے ظہور کی نہایت واضح الفاظ میں بشارت دی لیکن یہود کے دل اس قدر کج ہو چکے تھے کہ انھوں نے آپ کے سارے معجزات کو جادو کا کرشمہ بتایا اور آپ کی تکذیب کر دی اور اب اپنے جھوٹ اور افترا کے بل پر اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ ساری خاکبازی لا حاصل ہے۔ اسلام اللہ کا نور ہے اس کو یہ اپنے مونہوں کی پھونک سے نہیں بجھا سکتے۔ وہ ان کے اور مشرکین دونوں کے علی الرغم تمام دینوں پر غالب آ کر رہے گا۔

(۱۰-۱۳) کمزور مسلمانوں کو صحیح راہ اختیار کرنے کی تلقین کہ اب یہ تذبذب اور منافقت کی روش چھوڑو۔ اللہ اور اس کے رسول پر سچا اور پکا ایمان لاؤ۔ دین کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرو۔ فوز و فلاح کی راہ یہی ہے بشرطیکہ سمجھو۔ اگر یہ راہ اختیار کرو گے تو آخرت کی فلاح بھی حاصل ہو گی جو اصل کامیابی ہے اور اس دنیا میں بھی اللہ کی اس نصرت اور اس عنقریب ظاہر ہونے والی فتح سے سرفراز ہو گے جس کی تمنا رکھتے ہو۔

(۱۴) آخر میں حضرت عیسیٰ کے حواریین کی پیروی کی دعوت ہے۔ ابتدا میں یہود کی تقلید سے روکا ہے، یہ آخر میں ان حق پرستوں کی پیروی پر ابھارا ہے جن کی سبقت الی الخیر سے اس نصرت کی راہ کھلی جو بالآخر اہل ایمان کے غلبہ پر منتہی ہوئی۔

سُوْرَةُ الصَّفِّ (۶۱)

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰيَات ۱۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱﴾ آیات ۱-۹
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقْتًا
عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ
يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾
وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ
اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۚ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۵﴾ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ
يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ
مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ
اَحْمَدُ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۶﴾
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰۤى
اِلَى الْاِسْلَامِ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷﴾ يُرِيْدُوْنَ
لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ

الْکٰفِرُوْنَ ۝۸ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ
ع الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ ۝۹

ترجمۂ آیات ۱-۹ اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور وہی غالب و حکیم ہے۔ ۱

اے ایمان والو! تم وہ بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں! اللہ کے نزدیک یہ بات زیادہ غصہ کی ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔ اللہ تو محبوب ان لوگوں کو رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر اس طرح لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔ ۲-۴

اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میرے ہم قومو! تم مجھے کیوں دکھ پہنچاتے ہو حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہارے پاس اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں تو جب وہ کج ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل کج کر دیے اور اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔ ۵

اور یاد کرو جب کہ کہا عیسیٰ بن مریم نے، اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، مصداق ہوں تورات کی ان پیشین گوئیوں کا جو مجھ سے پہلے سے موجود ہیں اور خوش خبری دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا، تو جب وہ آیا ان کے پاس کھلی نشانیوں کے ساتھ تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ ۶

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھے درآنحالیکہ اس کو اسلام کی طرف بلایا جا رہا ہو! اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ وہ چاہتے ہیں

کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا ان کافروں کے علی الرغم۔ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو غالب کرے تمام دینوں پر اگرچہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔ ۷-۹

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۱)

آیت تسبیح کا آگے کے مضمون سے ربط

یہ آیت تشویق و تحریض کے محل میں بھی ہو سکتی ہے اور اظہار بے نیازی کے محل میں بھی۔ آگے جہاد سے جان چرانے والے منافقین کو ان کی بدعہدی و بزدلی پر ملامت کی گئی ہے۔ اس مضمون سے یہ آیت اپنے مذکورہ دونوں پہلوؤں سے ربط رکھتی ہے۔ اگر تشویق و ترغیب کے پہلو سے نگاہ ڈالیے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس خدا کی تسبیح و بندگی میں اس کائنات کی ہر چیز سرگرم ہے، جو ہر چیز پر غالب اور جس کے ہر کام میں حکمت ہے اس کی راہ میں جہاد سے اگر کوئی جان چرائے تو اس پر حیف ہے!

بے نیازی کے پہلو سے نگاہ ڈالیے تو مطلب یہ ہوگا کہ جب اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح و بندگی میں لگی ہوئی ہے اور حقیقی غالب و حکیم وہی ہے تو اس کو اس بات کی کیا پروا ہو سکتی ہے کہ کچھ بزدل اس کی راہ میں جہاد سے جان چراتے پھرتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس سورہ میں 'سَبَّحَ' آیا ہے اور اگلی سورہ میں 'یُسَبِّحُ' ہے، ان دونوں اسلوبوں میں یہ فرق ہے کہ ماضی بیانِ واقعہ اور بیانِ حقیقت کے لیے آتا ہے اور مضارع تصویرِ حال اور استمرار کا فائدہ بھی دیتا ہے۔

'اَلْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ' کی دو صفتوں کا بغیر حرفِ عطف کے بیان اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں صفتیں موصوف میں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔ یعنی وہ بیک وقت ہر چیز پر غالب و قادر بھی ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت و مصلحت بھی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جو ذات ان صفات سے موصوف ہے اس سے بڑھ کر بھروسہ کے قابل اور کس کی ذات ہو سکتی ہے! بدقسمت ہیں وہ جو ایسی ذات پر بھی بھروسہ نہ کریں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۲-۳)

زبان کے غازیوں کو تنبیہ

خطاب اگرچہ باعتبارِ الفاظ عام ہے لیکن روئے سخن انہی کی طرف ہے جو ایمان و اسلام اور

انفاق و جہاد کے دعوے تو بڑی بلند آہنگی سے کرتے لیکن جب آزمائش کا وقت آتا تو بالکل بزدل ثابت ہوتے۔ ان کو خطاب کرکے فرمایا کہ تم اس بات کا دعویٰ ہی کیوں کرتے ہو جو پورا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے! اگر تمھارا گمان یہ ہے کہ اس زبانی جہاد سے تم کوئی سعادت کی کمائی کر رہے ہو تو یہ خیال بالکل غلط ہے۔ تمھارا یہ رویّہ اللہ کے نزدیک تمھارے لیے موجبِ سعادت نہیں بلکہ مزید غضب کا باعث ہے کہ تم زبان سے تو بڑے غازی ہو لیکن عمل کے اعتبار سے بالکل صفر۔

آدمی کے قول و قرار کی ساری قدر و قیمت اس کی وفاداری و راستبازی ہی میں ہے۔ ایک شخص ایک طالبِ مدد کو پہلے ہی مرحلے میں اگر صاف جواب دے دیتا ہے کہ وہ اس کی مدد نہیں کرے گا تو گو اس کا انکار اگر وہ مدد کی اہلیت رکھتا ہے، فتوت، ہمدردی اور اسلامی اخوت کے منافی اور اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ فعل ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اللہ کے نزدیک مبغوض وہ ہوگا جس نے ایک ضرورت مند کو مدد کا اطمینان تو بڑی فراخ دلی سے دلایا لیکن جب وعدہ پورا کرنے کا وقت آیا تو اس کو دھوکا دیا۔

یہ رویّہ یوں تو ہر شکل میں مکروہ و مبغوض ہے لیکن معاملہ ایک نبی اور اس پر ایمان کے مدعیوں کا ہو تو اس کی سنگینی اور بڑھ جائے گی۔ جو لوگ ایک نبی کی دعوت قبول نہیں کرتے وہ اللہ کے غضب کے سزاوار ہوتے ہیں اور ان کو سزاوار ہونا چاہیے لیکن ان سے بھی زیادہ اللہ کے غضب کے سزاوار وہ ہیں جو ماننے کو تو اس کی ہر بات مان لیں لیکن عمل کسی بات پر بھی نہ کریں یا صرف ان باتوں پر کریں جو ان کے نفس کی خواہشوں کے موافق ہوں اور جب کوئی اہم مرحلہ پیش آئے تو اس وقت چھپتے پھریں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا رویّہ کھلے ہوئے دشمنوں کے مقابل میں دین کے لیے زیادہ خطرناک ہے اس لیے کہ انھوں نے اپنے کو دوست ظاہر کرکے دین کی دشمنی کی اور اس کی فوج میں بھرتی ہو کر اس کے ساتھ غداری کے مرتکب ہوئے۔

ان کے زیادہ معتوبِ الٰہی ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جب ایک مرتبہ انھوں نے دین کو مان لیا تو گویا انھوں نے اس امر کا اعتراف کر لیا کہ یہ چیز ان کے دل کو اپیل کرنے والی اور ان کی سمجھ میں آنے والی ہے۔ اس پہلو سے ان کا معاملہ ان لوگوں سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے جو اس کے مخالف اس بنا پر ہوں کہ ابھی بات ان کی سمجھ میں سرے سے آئی ہی نہ ہو۔ کسی بات کا سمجھ میں نہ آنا بہرحال ایک عذر ہے جس کی بنا پر ایک شخص رعایت کا مستحق قرار پاتا ہے لیکن جو لوگ سمجھ چکنے کا اعتراف کر چکے ہوں اگر وہ اس کے عملی تقاضوں سے گریز اختیار کریں تو اس کا سبب صرف ان کی اخلاقی کمزوری ہی ہو سکتی ہے جو کسی کے لیے بھی کوئی عذر نہیں بن سکتی بلکہ یہ بہرشکل ایک برائی ہے جو اللہ کے غضب اور اس کی نفرت ہی کی موجب ہوگی۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (۴)

منافقین کی اصل کمزوری — یہ ان منافقین کی اس کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے جس پر یہ نکیر فرمائی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کی

خاص کمزوری یہ تھی کہ اپنی وفاداری و جاں نثاری کی دھونس جمانے کے لیے وہ جہاد کے ولولہ کا اظہار تو بہت کرتے لیکن جب جہاد کا حکم دے دیا گیا تو چھپتے پھرتے تھے۔ سورۂ نساء میں ان کی کمزوری کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ	تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا جاتا
کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ	تھا کہ ابھی اپنے ہاتھ روکو اور نماز کا اہتمام کرو
وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ۚ فَلَمَّا کُتِبَ	اور زکوٰۃ دو (تو وہ جنگ کے لیے جلدی مچاتے تھے)
عَلَیْھِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ	لیکن جب جنگ ان کے اوپر فرض کر دی گئی تو ان
مِّنْھُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ	میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈر رہا
کَخَشْیَۃِ اللّٰہِ اَوْ اَشَدَّ	ہے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہیے، بلکہ اس سے
خَشْیَۃً ۚ (النساء - ۴ : ۷۷)	بھی کچھ زیادہ۔

سورۂ توبہ میں انہی لوگوں کو ان الفاظ میں ملامت فرمائی ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمھیں کیا ہو گیا
لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اثَّاقَلْتُمْ	ہے کہ جب تمھیں حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں
اِلَی الْاَرْضِ ۭ (التوبۃ - ۹ : ۳۸)	جہاد کے لیے اٹھو تو تم زمین پر ڈھیے پڑتے ہو۔

ان لوگوں کی بزدلی کا حال یہ تھا کہ اگر مارے باندھے جنگ کے لیے نکلتے بھی تو صف بستہ اور سینہ سپر ہو کر لڑنے کا حوصلہ نہ کرتے بلکہ ان کی کوشش برابر یہ ہوتی کہ کسی طرح جنگ کے خطرہ سے اپنے کو محفوظ رکھیں۔ سورۂ توبہ میں ان کی اس بزدلی کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے:

لَوْ یَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ	اگر وہ پا جائیں کوئی پناہ گاہ، یا غار یا
مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَیْہِ وَھُمْ	کوئی گھس بیٹھنے کی جگہ تو وہ رسی تڑا کر اس کی
یَجْمَحُوْنَ ۝ (التوبۃ - ۹ : ۵۷)	طرف بھاگیں گے۔

ان لوگوں کی انہی کمزوریوں کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ تم نے محض زبانی جمع خرچ سے اللہ کو خوش کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے یہ اس کو خوش کرنے کے بجائے اس کے قہر و غضب میں مزید اضافے کا موجب ہوگا۔ اللہ ان لوگوں کو کبھی پسند کرنے والا نہیں ہے جو ڈینگیں تو بہت ماریں لیکن قربانی کا کوئی حوصلہ اپنے اندر نہ رکھتے ہوں۔ وہ محبوب انہی لوگوں کو رکھتا ہے جو میدانِ جنگ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔

'بُنْیَانٌ' عمارت کو کہتے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد دیوار ہے۔ دیوار کی ایک اینٹ بھی اگر اپنی جگہ سے کھسک جائے تو پھر پوری دیوار کو اکھاڑ پھینکنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے

سورۂ انفال میں تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص منظم فوج کشی کی صورت میں صف سے اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگتا ہے تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹتا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے: فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (الانفال - ۸: ۱۶) (تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت ہی برا ٹھکانا ہے)۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۭ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۵)

منافقین کی روش کی مثال

منافقین کی اس روش کے انجام کو مثال سے واضح فرمایا ہے کہ یہی روش یہود کی رہی ہے۔ وہ جہاد کے لیے جوش و جذبہ کا اظہار تو بہت کرتے لیکن جب امتحان کا وقت آتا تو ڈگ ڈال دیتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب انھیں فلسطینیوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا تو وہ یہ جواب دے کر بیٹھ رہے کہ یہ بڑے زور آور لوگ ہیں، ہم ان کی تلواروں کا لقمہ بننے کے لیے تیار نہیں ہیں، آپ اپنے رب کے ساتھ جا کر ان سے لڑو، ہم تو جب تک وہ اس شہر کو خالی نہیں کریں گے اس میں داخل ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

ان کی یہی روش اس جنگ کے معاملے میں بھی رہی جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں ہوا ہے کہ جہاد کے لیے قائد کا انتخاب تو انھوں نے حضرت سموئیلؑ سے بڑے جوش و خروش سے کرایا لیکن جب قائد کا انتخاب ہو گیا تو اس کی قیادت میں جنگ سے انھوں نے انکار کر دیا۔

تورات کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ایک موقع بھی ایسا نہیں گزرا ہے جب انھوں نے پوری خوش دلی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کی ہو۔ ان کی اس روش پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بار بار نہایت دل سوزی کے ساتھ اپنے غم و غصہ کا اظہار بھی فرمایا ہے اور نہایت سخت الفاظ میں ان کو ملامت بھی کی ہے لیکن آخر وقت تک ان کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ ان کے دل کی سختی بڑھتی ہی گئی۔

'يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ' یہ حضرت موسیٰؑ کے انہی شکووں کا حوالہ ہے جو اپنی قوم کی بدعہدیوں اور نافرمانیوں پر انھوں نے بار بار کیے ہیں اور جن سے تورات بھری پڑی ہے۔ یہود کو حضرت موسیٰؑ کی نبوت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ انھیں اچھی طرح علم تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن اس کے باوجود محض اپنی پست ہمتی، دنیا طلبی اور دنائت کے سبب سے، یہ جانتے ہوئے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، ان کی برابر نافرمانی کرتے رہے۔

'فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ' یہ وہ سزا ہے جو اللہ تعالیٰ نے، اپنی سنت کے مطابق، ان کو دی کہ بار بار کی تنبیہ و تذکیر کے بعد بھی انھوں نے اپنے دل کے رخ کو سیدھا نہیں کیا تو اللہ نے

ان کے دل کو اسی رخ پر کج کر دیا جس کو انھوں نے اپنے لیے پسند کیا۔ انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ آدمی اسے جس رخ پر لگائے اسی رخ پر لگ جاتی ہے۔ اگر اس کو آپ عقل و فطرت کے خلاف کسی غلط رخ پر موڑیں گے تو وہ شروع شروع میں اس پر مڑنے سے اِباکرے گی لیکن آپ اسے موڑنے پر بضد رہیں گے تو بالآخر اسی سانچہ پر وہ ڈھل جائے گی۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

ہدایت و ضلالت کے معاملے میں انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اس کی طبیعت کے اسی اصول کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کو ہدایت پر مجبور کرتا نہ ضلالت پر۔ اس نے انسان کے اندر نیکی اور بدی کا شعور دے کر اسے آزادی بخشی ہے کہ چاہے وہ نیکی کی راہ اختیار کرے یا بدی کی۔ اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے تو وہ اس کو اس کی توفیق ارزانی فرماتا ہے اور اگر وہ بدی کی راہ پر جانا چاہتا ہے تو وہ اس کو اس کی ڈھیل بھی دے دیتا ہے، اگر چاہتا ہے۔

'وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ' یعنی اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ نہیں ہے کہ کوئی پسند تو کرے ضلالت لیکن وہ اس کے اندر زبردستی ہدایت ٹھونسے۔ ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اس کی قدر کرتا اور اس کا طالب بنتا ہے۔

یہ ان منافقین کو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ تم بھی یہود کی اسی روش کی پیروی کرو گے تو تمھارے دل بھی اسی طرح کج کر دیے جائیں گے جس طرح ان کے دل کج کر دیے گئے۔ پھر تم ہمیشہ غلط رخ ہی پر چلو گے، صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤ گے۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۶)

دل کی کجی کے اثرات جو ابد میں ظاہر ہوتے۔

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ ان کے دل کی اسی کجی کا اثر ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے بھی محروم رہے اور جس آخری رسول کی بشارت آنجنابؑ نے دی اس کی تکذیب کے لیے بھی آج رات دن خاکبازی میں مصروف ہیں حالانکہ ان کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم اللہ کا یہ نور کامل ہو کر رہے گا، نہ یہ اس کا کچھ بگاڑ سکیں گے نہ مشرکینِ قریش۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں۔ ان کے ذکر سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل نے جو سلوک کیا اور اس کی پاداش میں ان پر جو لعنت ہوئی، اس کا اثر بدان پر آخر تک مسلط رہا یہاں تک کہ اسی کے نتیجہ میں انھوں نے حضرت مسیحؑ کی بھی تکذیب کی اور اب اسلام کی جو مخالفت کر رہے ہیں یہ بھی اسی کا اثر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بیماری ایسی جان لیوا ہے کہ ایک مرتبہ لگ گئی تو پھر اس سے جان چھڑانا ناممکن ہے۔ سلامتی اسی میں ہے کہ اس کی چھوت نہ

لگنے دی جائے۔

'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ' یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی رسالت کی دلیل کے طور پر فرمائی کہ میرے ظہور سے ان پیشین گوئیوں کی تصدیق ہوتی ہے جو میرے باب میں تورات کے صحیفوں میں موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سب سے زیادہ واضح بشارت ان کے پیش رو حضرت یحییٰ نے دی۔ انھوں نے اپنا خاص مشن ہی یہ بتایا کہ وہ اپنے بعد آنے والے کی خوش خبری دینے آئے ہیں۔ اپنی اسی بشارت کے ضمن میں انھوں نے ان پیشین گوئیوں کا بھی حوالہ دیا جو حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں پہلے سے موجود تھیں اور جن کی بنا پر لوگوں کو ایک نبی کی بعثت کا انتظار تھا۔ یہ ساری چیزیں اپنے محل میں بیان ہو چکی ہیں۔ یہاں اعادے کی گنجائش نہیں ہے۔

'مُصَدِّقًا لِّمَا' کا صحیح مفہوم

'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ' کے لغوی مفہوم پر اس کے محل میں مفصل بحث ہو چکی ہے۔ جو لوگ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ 'میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں' انھوں نے نہ تو اس کلام کا موقع و محل سمجھا ہے نہ 'مُصَدِّقًا' کا صحیح لغوی مفہوم وہ متعین کر سکے ہیں۔ حضرت مسیح نے یہ بات اپنے کو مومن بالتوراۃ ظاہر کرنے کے لیے نہیں فرمائی ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اپنی نبوت و رسالت کی دلیل کے طور پر فرمائی ہے اور قرآن میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے اسی سیاق میں آیا ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ بات بالکل لاحاصل ہے کہ میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ اگر انھوں نے تورات کی تصدیق فرمائی تو اس سے جو بات ثابت ہوئی وہ صرف یہ ہے کہ وہ تورات پر ایمان رکھتے تھے لیکن اس سے ان کی نبوت و رسالت کس طرح ثابت ہو جائے گی؟ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ تورات کے ہر حصہ کی تصدیق نہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمائی ہے نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اس کی تحریفات سے پردہ اٹھایا ہے اور قرآن نے بھی۔ بلکہ قرآن نے تو اس کے اچھی طرح بخیے ادھیڑے ہیں۔

آنحضرتؐ کے باب میں حضرت مسیحؑ کی پیشین گوئی کی اہمیت

'وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ' یعنی ساتھ ہی حضرت مسیحؑ نے اپنا مشن بھی بتایا کہ میں ایک رسول کی خوش خبری دینے آیا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہو گا۔ جہاں تک اس رسول کی پیشین گوئی کا تعلق ہے وہ تو سیدنا ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آ رہی ہے جس کا ذکر اگلی سورہ میں بھی آ رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد حضرت موسیٰؑ نے بھی اس رسول کی خوش خبری دی۔ بعض دوسرے انبیاء سے بھی تورات کے مختلف صحیفوں میں پیشین گوئیاں موجود ہیں اور اہل کتاب ان کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مانیں یا نہ مانیں لیکن ایک غیر جانبدار ذہن یہ ماننے پر مجبور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر وہ منطبق نہیں ہو سکتیں۔ الغرض جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کا تعلق ہے اس میں حضرت مسیح علیہ السلام منفرد نہیں ہیں لیکن

آنجناب کی بشارت تین پہلوؤں سے دوسری سابق بشارتوں سے بالکل مختلف ہے۔

ایک یہ کہ آپ نے اس بشارت کو اپنا ایک ضمنی کام نہیں بلکہ اپنی بعثت کا خاص مقصد اور مشن بتایا ہے۔

دوسرا یہ کہ آپ نے اس کے ظہور کا زمانہ بھی بالکل قطعی طور پر متعین کر دیا ہے۔

تیسرا یہ کہ آپ نے یہ بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کی تصریح کے ساتھ دی ہے۔

یہ تینوں پہلو خاصے اہم ہیں اس وجہ سے ہم بالاختصار ان پر بیان گفتگو کریں گے۔

انجیل کا انجیل سے موسوم ہونے کی حکمت

پہلی بات یعنی حضرت مسیح کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت پر مامور ہونا ان کے الفاظ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی سے بھی واضح ہے لیکن اس سے بڑی دلیل خود اس صحیفہ کا نام ہے جو ان پر نازل ہوا۔ لفظ 'انجیل' بلا اختلاف یونانی ہے جس کے معنی مسلّم طور پر بشارت کے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ تمام آسمانی صحیفوں میں یہی صحیفہ خاص طور پر اس لفظ سے کیوں موسوم ہوا؟ عیسائی ممکن ہے نجات سے متعلق اپنے من گھڑت عقیدے کی بنا پر اس کی توجیہ یہ کریں کہ یہ بنی آدم کے لیے نجات کی بشارت ہے، لیکن یہ توجیہ بالکل طفلانہ ہے۔ نجات سے متعلق جو عقیدہ پال نے گھڑا ہے اس کی کوئی الٹی سیدھی دلیل پال کے لایعنی علم کلام میں ہو تو ہو لیکن ان انجیلوں میں اس کی کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا مشن جس طرح بشارت رہا ہے اسی طرح بلکہ کچھ اس سے زائد انذار بھی رہا ہے اور یہ دونوں فرض جس طرح ہر نبی نے انجام دیے اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی انجام دیے۔ انھوں نے ایمان لانے والوں کو فوز و فلاح کی بشارت بھی دی اور کفر کرنے والوں کو دوزخ سے ڈرایا بھی، پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان کے صحیفہ کا نام مخصوص طور پر بشارت (انجیل) ہی ہوتا۔ البتہ اس نام سے موسوم ہونے کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا امتیازی وصف اور خاص مشن تھا ہی یہ کہ وہ اپنے بعد آنے والے آخری رسول کی بشارت دیں۔ اس مشن پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کر کے بھیجے گئے تھے۔

اس وجہ سے ان کے صحیفہ کا نام ہی بشارت (انجیل) ہوا کہ نام ہی سے آپ کے مشن کا اظہار ہو اور یہ نام قیامت کے دن عیسائیوں پر حجت بنے کہ جس کی بشارت دینے پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوئے اس پر ایمان لانے سے خود محروم رہے اور سیدنا مسیح علیہ السلام کی کنواریوں والی تمثیل ان پر صادق آئی کہ رات بھر تو وہ شمعیں جلائے دولہا کا انتظار کرتی رہیں لیکن جب دولہا کے آنے کا وقت ہوا تو ان کی کپیوں کا تیل ختم ہو گیا اور وہ سو رہیں۔

انجیلوں کا تدبر سے مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان کا خاص مضمون آسمانی بادشاہت کی بشارت ہے۔ مختلف اسلوبوں، پیرایوں اور گوناگوں تمثیلوں سے یہی مضمون ان میں بار بار آتا ہے۔ اس آسمانی بادشاہی کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں، اس کے تدریجی نشوونما کا جو تصور دیا گیا ہے، اس میں داخل

ہونے والوں اور اس سے محروم رہنے والوں کے جو اوصاف مذکور ہوئے ہیں اگر ان پر اچھی طرح غور کیجیے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ یہ درحقیقت اس نبوت کی بشارت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں ظاہر ہوئی اور اس نظامِ صالح کی خوش خبری ہے جس کی برکتیں صحابہؓ کے ہاتھوں زمین پر پھیلیں۔

یہاں اس مسئلہ کی وضاحت کا موقع نہیں ہے ورنہ میں مثالیں دے کر اپنا نقطۂ نظر اچھی طرح واضح کر دیتا۔ تاہم مجھے امید ہے کہ جو لوگ انجیلوں پر اس پہلو سے غور کریں گے وہ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ ان کا اصل مضمون اس آسمانی بادشاہی کی بشارت ہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے قائم ہوئی۔

یہ پیشین گوئی تعیینِ زمانہ کے ساتھ ہے

اس پیشین گوئی میں زمانے کے تعیین کی بات بھی اس کی اہمیت کو بہت بڑھا دیتی ہے۔ اس سے پہلے جتنی پیشین گوئیاں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے انبیاء علیہم السلام کے باب میں وارد ہوئی ان میں سے کسی میں بھی اس تصریح کے ساتھ زمانے کا تعین نہیں ہے بلکہ سب ایک غیر معین مستقبل سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ لیکن اس پیشین گوئی میں یہ تصریح ہے کہ وہ رسول آپ کے بعد آئے گا اور آپ اس کی بشارت دینے اور اس آنے والے کی راہ صاف کرنے آئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ سیدنا مسیحؑ کے بعد وہ کون شخصیت اس پوری دنیا میں ظاہر ہوئی ہے جس پر وہ صفات یا وہ تمثیلات منطبق ہو سکیں جو آنجنابؑ نے اس کے باب میں یا اس کے ہاتھوں قائم ہونے والے نظام سے متعلق فرمائی ہیں؟ ضد اور ہٹ دھرمی کی بات اور ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے جواب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ اگر عیسائی یہ نام نہیں لینا چاہتے تو پھر انھیں انجیلوں سے بھی دست بردار ہو جانا چاہیے۔ آخر وہ کب تک ایک ایسی بشارت دیتے رہیں گے جس کا کوئی مصداق دو ہزار سال میں ظاہر نہیں ہوا۔

نام کی تصریح کے ساتھ بشارت

مسئلہ کا تیسرا پہلو بھی نہایت اہم بلکہ سب سے زیادہ اہم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت نام کی تصریح کے ساتھ دی ہے۔ نام کی صراحت کے ساتھ اس پیشین گوئی کا ظہور میں آنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس میں کسی قسم کا خفا نہ رہے بلکہ ہر چیز اس طرح کھل کر سامنے آجائے کہ جو لوگ اس کا انکار کریں ان کی ہٹ دھرمی بالکل بے نقاب اور ان پر اللہ کی حجت اچھی طرح قائم ہو جائے۔

ناموں کی تحریف میں اہلِ کتاب کی جسارت

لیکن ناموں کے اوپر تحریف کرنے والوں نے جو قیامت ڈھائی ہے وہ سب سے زیادہ دردناک ہے۔ انھوں نے یا تو ان ناموں کا حلیہ اس طرح بگاڑا کہ ان کی اصل صورت معلوم کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہ جائے یا ان کا ترجمہ اور پھر ترجمہ در ترجمہ کر کے ان کو حقیقت سے اتنا دور کر دیا کہ ان کی تحقیق کی کاوش جوئے شیر لانے کے مترادف بن گئی۔

اس کی مثال کے لیے ہم "مروہ" اور "بکہ" کو پیش کرتے ہیں۔ یہ دونوں نام تورات میں آئے ہیں۔ مروہ وہ قربان گاہ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی پیش کی اور بکہ (مکہ) وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا اور جن کی ذریت سے ایک رسول کی بعثت کی دعا فرمائی۔ چونکہ یہود یہ بات کسی قیمت پر گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کا کوئی تعلق مکہ سے ثابت ہو سکے یا یہ کہ قربان ہونے والا فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو قرار دیا جا سکے اس وجہ سے انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ ہر اس نشان کو تورات سے کھرچ کھرچ کر مٹایا جس کو انھوں نے اپنی خواہش کے خلاف پایا۔ چنانچہ "مروہ" کو ان کے علماء اور قاریوں نے زبان کے توڑ مروڑ سے مُورہ، مُوریا، مُریا اور نہ جانے کیا کیا بنایا۔ اسی طرح بکہ کو بکائے بنایا اور پھر اس کو وادیٔ بکائے کا نام دے کر مترجموں نے اس کا ترجمہ 'وادیٔ گریہ' کر دیا حالانکہ بکہ اور مکہ دونوں ایک ہی چیز ہے۔ اس کی تحقیق اس کتاب میں اس کے محل میں گزر چکی ہے۔[1]

ان دو مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تورات اور انجیل میں ان ناموں پر کیا گزری ہے جن کو یہودیوں یا عیسائیوں نے اپنے مقصد کے خلاف پایا ہے۔ خاص طور پر 'احمد' یا 'محمد' تو ایسے نام ہیں کہ ان کا کوئی حرف بھی وہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انجیلوں سے یہ بات تو صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے نام کی تصریح کے ساتھ حضورؐ کی بعثت کی بشارت دی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عیسائی علماء نے اس نام پر پردہ ڈالنے میں وہ کمالِ فن دکھایا ہے کہ یہود کے سوا کوئی اور اس کمال میں ان کا حریف نہیں ہو سکتا۔

پہلے ہم انجیل یوحنا سے وہ حوالے نقل کرتے ہیں جن میں حضورؐ کی بشارت دی گئی ہے، اس کے بعد ان کے خاص خاص پہلوؤں کی طرف توجہ دلائیں گے۔ سیدنا مسیحؑ فرماتے ہیں:

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۰ یعنی سچائی کا روح۔" (یوحنا - باب ۱۴: ۱۶-۱۷)

"لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمھیں یاد دلائے گا۔" (یوحنا - باب ۱۴: ۲۶)

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" (یوحنا - باب ۱۴: ۳۰)

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن - جلد اول، صفحات ۲۷۷-۲۸۰

روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا۔" (یوحنا۔ باب ۱۵: ۲۶)

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا۔" (یوحنا۔ باب ۱۶: ۷)

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمھیں آئندہ کی خبریں دے گا۔" (یوحنا۔ باب ۱۶: ۱۲-۱۳)

یہ حوالے ہم نے انجیل یوحنا سے لیے ہیں جو عیسائیوں کے تمام فرقوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ انجیل برناباس میں حضورؐ کی بشارت آپ کے نام نامی 'محمدؐ' کی تصریح کے ساتھ بار بار وارد ہوئی ہے لیکن اس کے حوالے ہم اس لیے نہیں دے رہے ہیں کہ موجودہ عیسائی، جو پال کے پیرو ہیں، اس کو مستند نہیں مانتے۔ مذکورہ بالا حوالوں پر غور کیجیے تو چند باتیں بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ایسی واضح صفات کے ساتھ دی ہے کہ وہ حضورؐ کے سوا کسی دوسرے پر منطبق نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً

"وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔"

"وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا۔"

"دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔"

غور کیجیے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہے جس کو ان صفات کا مصداق قرار دیا جا سکے؟

دوسری یہ کہ ان پیشین گوئیوں کے پیش و عقب میں اگرچہ ایسے بے جوڑ فقرے اور الفاظ گھسانے کی کوشش کی گئی ہے جن سے ان کے مطلب کو خبط کیا جا سکے لیکن اس کوشش میں تحریف کرنے والوں کو کامیابی نہیں ہوئی ہے بلکہ ان فقروں کا بے ربط ہونا بالکل نمایاں ہے۔

تیسری یہ کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں کوئی معیّن لفظ فرمایا جس کو بعد کے مترجموں اور شارحوں نے اپنی تحریف کا خاص طور پر ہدف بنایا اور اپنا پورا زور لگایا ہے کہ اس کو جس حد تک اس کے صحیح مفہوم سے دور کر سکیں کر دیں۔ کسی نے اس کا ترجمہ 'مددگار' کیا ہے۔ کسی نے 'وکیل'، کسی نے 'شفیع'، کسی نے 'سچائی کی روح'۔ رہا یہ کہ وہ لفظ کیا ہے تو یوحنا میں جو یونانی لفظ استعمال ہوا ہے وہ (PARACLETUS) بتایا جاتا ہے جس کے معنی بیان کرنے میں وہ موشگافیاں کی گئی ہیں جو اوپر بیان ہوئیں۔ یہ یونانی لفظ ظاہر ہے کہ کسی سریانی لفظ کا ترجمہ ہو گا اس لیے کہ انجیل کی اصل زبان سریانی تھی تو اب اس کی تحقیق کون کرے کہ وہ کیا تھا۔ جب ایک لفظ گم

کرنے کی جدوجہد میں صدیوں سے ایک پوری قوم کی قوم لگی ہو تو اس کا سراغ لگانا کس کے امکان میں ہے! یہ تو قرآن کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس کا کچھ سراغ دیا۔ بعض مسلمان مورخین کی تحقیق یہ ہے کہ اصل سریانی لفظ 'منحمنا' ہے جس کے معنی سریانی میں وہی ہیں جو 'محمد' اور 'احمد' کے ہیں۔

یہود کی شقاوت

'فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ' ۔ 'جَآءَ' کے فاعل حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ یعنی وہ سابق پیشین گوئیوں کے مصداق اور اپنے بعد آنے والے رسولِ خاتم کے مبشر بن کر، نہایت کھلے ہوئے معجزات کے ساتھ جب آئے تو یہود کے دل اس طرح کج ہو چکے تھے کہ انھوں نے آپ کے تمام معجزات کو جادو قرار دیا اور آپ کی تکذیب کردی۔ انجیل میں تصریح ہے کہ یہود نے آپ کے معجزات کو جادو کا کرشمہ بھی قرار دیا اور یہ بھی کہا کہ یہ جو کچھ دکھاتے ہیں اس میں روح القدس کی تائید کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ان کو ایک بھوت، بعلزبول کی مدد حاصل ہے۔ بعض لوگوں نے 'جَآءَ' کا فاعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے لیکن یہ سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہے۔

ایک دقیق پہلو

یہاں اس فرق کو بھی ملحوظ رکھیے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے اندازِ خطاب میں نمایاں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو بنی اسرائیل کو 'يٰقَوْمِ' سے مخاطب کیا لیکن حضرت مسیح نے ان کو 'يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ' سے مخاطب کیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ قومی تعلق نہ آپ کا بنی اسرائیل سے تھا نہ کسی اور قوم سے، بلکہ آپ عیسیٰ بن مریم تھے۔ قرآن نے خطاب کے ان باریک پہلوؤں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۷)

یہ یہود کی بدقسمتی پر اظہارِ افسوس ہے کہ اپنی جس کجی کے سبب سے انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تکذیب کی اسی کجی نے اب ان کو اسلام کی مخالفت پر ابھارا ہے۔ فرمایا کہ ان سے بڑھ کر اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا کون ہو سکتا ہے جن کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو اور وہ اسلام کی مخالفت کے بہانے پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ پر طرح طرح کے جھوٹ گھڑ رہے ہوں۔

یہود کے من گھڑت دعوے

'اِفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ' سے ان باتوں کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اپنی بزرگی و برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی شان میں گھڑ رکھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ہم ایک برگزیدہ اور خدا کی منظورِ نظر امت ہیں، ہم کسی ایسے نبی کی ہدایت کے محتاج کس طرح ہو سکتے ہیں جو امیوں کے اندر پیدا ہوا ہو؟ نبوت و رسالت کے لیے تو ہمیشہ سے اسرائیل کا گھرانا مخصوص رہا ہے، اس سے باہر کوئی نبی کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ اسی ضمن میں یہ بات بھی انھوں نے گھڑ رکھی تھی کہ ہمیں تو یہ ہدایت ہے کہ ہم کسی ایسے شخص کے دعوائے نبوت کی تصدیق ہی نہ کریں جس کی پیش کی ہوئی قربانی کو کھانے کے لیے آسمان سے آگ نہ اترے۔ قرآن

نے سورۂ بقرہ میں ان تمام من گھڑت باتوں کی تردید فرمائی کہ یہ سب افترا ہے، اللہ نے کہیں بھی اس طرح کی کوئی بات نہیں کہی ہے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں فرمایا کہ کتنے محروم القسمت ہیں وہ لوگ جن کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے اور وہ خود اپنی آنکھوں میں اپنی ہی گھڑی ہوئی خرافات کی دھول جھونک رہے ہیں۔

'وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ' یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف پھر اشارہ فرما دیا جو آیت ۵ میں بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا جو خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو ان پر یہ احسان فرمایا کہ آنے والے نبی کے باب میں ان کو پہلے سے رہنمائی دی کہ یہ اسے خود بھی پہچانیں اور دوسروں کو بھی پہچنوائیں لیکن جب انھوں نے اس احسان کی یہ قدر کی کہ اللہ کے بتائے ہوئے نشانات خود مٹا رہے ہیں تو ایسے شامت زدوں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۸)

یہود کی سعیٔ لاحاصل کی تمثیل

یہ اس سعیٔ لاحاصل کی تمثیل ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت کو اپنی من گھڑت باتوں اور اپنی ایجاد کردہ بدعات سے دبانے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے کہ سورج یا چاند کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھانے کی کوشش کی جائے۔ فرمایا کہ ان کی یہ کوشش لاحاصل رہے گی۔ اللہ اپنے اس نور کو کامل کر کے رہے گا۔ یہ بہت جلد ہلال سے بدر بنے گا، اگرچہ یہ چیز کفار پر کتنی گراں گزرے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹)

غلبۂ اسلام کا واضح اعلان

یہ 'وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ' کی وضاحت ہے کہ اسی خدا نے جس نے اپنے نور کو کامل کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے، اپنی ہدایت اور اپنے دینِ حق کے ساتھ اپنے رسول کو بھیجا ہے کہ اس دین کو اس سرزمین کے تمام ادیان پر غالب کرے، اور یہ بات لازماً ہو کے رہے گی اگرچہ مشرکین کو یہ کتنی ہی ناگوار گزرے، اور وہ اس کے خلاف کتنا ہی زور لگائیں۔

اوپر والی آیت میں 'وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ' فرمایا ہے جو فی الجملہ عام ہے، جس میں وہ سب شامل ہیں جو اس دینِ حق اور اس رسولِ برحق کے انکار کرنے والے تھے۔ اس آیت میں 'وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ' کے الفاظ ہیں جو خاص مشرکینِ قریش کے لیے ہیں۔ ان دونوں لفظوں نے مل کر ان تمام مخالف طاقتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے جو اس وقت عرب میں اسلام کی مخالفت کر رہی تھیں۔ گویا ان سب کو چیلنج کیا ہے کہ تمھیں جتنا زور لگانا ہے لگا لو لیکن تم اللہ کے دین کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکو گے۔ اللہ کا قطعی فیصلہ یہی ہے کہ اس رسول کے ذریعہ سے اس کا دینِ حق اس سرزمین کے تمام ادیان پر غالب ہو کے رہے گا۔ چنانچہ یہ

بات پوری ہو کر رہی۔ بہت جلد وہ وقت آگیا کہ پورے عرب کے متعلق یہ اعلان ہو گیا کہ اس سرزمین میں دو دین جمع نہیں ہوں گے بلکہ صرف اللہ کے دین ہی کی حکمرانی ہو گی۔ یہی مضمون سورۂ توبہ میں ان الفاظ میں گزر چکا ہے۔

يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝ (التوبة-۹: ۳۲-۳۳)	وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھا دیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا، ان کافروں کے علی الرغم۔ وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو سارے دین پر غالب کرے، اگرچہ یہ بات مشرکوں کو کتنی ہی بری لگے۔

۲- آگے آیات ۱۰-۱۴ کا مضمون

اوپر کے پیرے میں یہ بتایا ہے کہ اہل ایمان کے لیے یہ روش تو بالکل ہی غلط ہے کہ وہ رسول سے سمع و طاعت کا عہد کریں اور جب اس عہد کی ذمہ داریاں پوری کرنے کا وقت آئے تو جان و مال کی محبت میں پھنس کر اس سے فرار کی کوشش کریں۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ ان کے لیے صحیح روش کیا ہے جس کو اختیار کر کے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۰-۱۴ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ
عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ
تَعْلَمُونَ ﴿۱۱﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي
مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ۚ ذَٰلِكَ
الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۲﴾ وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۖ نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ
قَرِيبٌ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۳﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا

أَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنْصَارِي
إِلَى اللّٰهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰهِ فَآمَنَتْ طَائِفَةٌ
مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَتْ طَائِفَةٌ ۖ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا
ع ۲ عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ ﴿۱۴﴾

ترجمۂ آیات ۱۰ - ۱۴

اے ایمان والو! کیا میں تمھیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمھیں ایک دردناک عذاب سے نجات بخشے! تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ اللہ تمھارے گناہ بخشے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی اور عمدہ مکانوں میں داخل کرے گا جو ابد کے باغوں میں ہوں گے۔ درحقیقت بڑی کامیابی یہ ہے! اور ایک اور چیز بھی ہے جس کی تم تمنا رکھتے ہو۔ یعنی اللہ کی نصرت اور عنقریب ظاہر ہونے والی فتح! اور ایمان والوں کو بشارت دے دو! ۱۰ - ۱۳

اے ایمان والو! تم اللہ کے انصار بنو، جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے دعوت دی حواریوں کو، کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے انصار بنتے ہیں تو بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کیا۔ تو ہم نے ایمان والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابل میں مدد کی تو وہ غالب رہے۔ ۱۴

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ (۱۰)

یعنی ایمان لانے اور رسول سے سمع و طاعت کا عہد کر چکنے کے بعد اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ تمھارے

لیے صحیح روش کیا ہے تو آؤ میں تمھیں وہ سودا بتاتا ہوں جو تمھیں ایک دردناک عذاب سے نجات دینے والا بنے گا۔ یہاں جس چیز کو 'تجارۃ' (سودا) سے تعبیر فرمایا ہے اس کی وضاحت آگے آ رہی ہے کہ تم اپنی جان اور اپنا مال اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار رہو اور اس کے بدلے میں اللہ کی مغفرت اور اس کی جنت کے حق دار بنو۔ یہ سب سے بڑی کامیابی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے تمھیں بازی کھیلنی چاہیے۔

اہل ایمان کے لیے کامیاب تجارت

اس آیت میں تو اس کا صلہ یہی بتایا ہے کہ دوزخ کے دردناک عذاب سے نجات پاؤ گے لیکن آگے کی آیات میں وضاحت آ رہی ہے کہ اس کے صلہ میں تمھیں آخرت کی بھی تمام کامرانیاں حاصل ہوں گی اور اس دنیا میں بھی تمھیں وہ فتح عظیم حاصل ہوگی جس کے تم متمنی ہو۔ یہاں صرف عذاب سے نجات کا ذکر اس وجہ سے فرمایا کہ مومن کا اصل مطلوب یہی ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے۔ اگر یہ چیز حاصل ہوگئی تو گویا سب کچھ حاصل ہو گیا۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۱-۱۲)

عربیت کے ایک اسلوب کی وضاحت

عربیت کے اس اسلوب کی طرف جگہ جگہ ہم اشارہ کرتے آ رہے ہیں کہ جب امر یا نہی کے اندر موعظت اور ناصحانہ تلقین کا مضمون پیدا کرنا ہو تو ان کو خبر یہ اسلوب میں کر دیتے ہیں چنانچہ اس آیت میں 'تُؤْمِنُوْنَ' اور 'تُجَاهِدُوْنَ' بظاہر تو خبر کے اسلوب میں ہیں لیکن یہ معنی میں امر کے ہیں۔ اس اسلوب کا فائدہ یہاں یہ ہوا کہ گویا ان کو نہایت شفقت کے ساتھ یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ ہم تمھیں نہایت نفع بخش کاروبار بتا رہے ہیں کہ تم اپنا مال اور اپنی جان اللہ کے حوالہ کر دو اور اس کے بدلے میں ابدی بادشاہی حاصل کرو۔

'ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ'۔ یعنی بظاہر تو یہ سودا تمھیں خسارے کا سودا معلوم ہوگا اس لیے کہ تمھیں نسیہ کی خاطر اپنے نقد کی قربانی کرنی پڑے گی لیکن اصل حقیقت تک تمھاری نظر پہنچ جائے تو تم یہ دیکھو گے کہ اپنے چند خزف ریزوں اور عمر فانی کے چند مستعار لمحات کے بدلے میں تم نے دولتِ کونین حاصل کی ہے جس کے لیے کبھی زوال نہیں ہے۔

'ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ'۔ اس دولتِ کونین کی طرف بالاجمال اشارہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر سوچو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ یہ سب سے بڑی کامیابی ہے جو تمھیں حاصل ہوئی۔ اپنی حقیر متاع سے اس سے بڑی کوئی اور کامیابی تم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس نفع بخش کاروبار کا ذکر دوسرے مقام میں یوں آیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط (التوبۃ ۹: ۱۱۱)

(اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض میں خرید لیے ہیں)۔

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۳)

اس دنیا میں کامیابی اور غلبہ کی بشارت

یہ ایک ایسی کامیابی کی طرف بھی اشارہ فرما دیا جو ان کو عنقریب اس دنیا میں ظاہر ہونے والی ہے۔ فرمایا کہ ایک اور کامرانی بھی تم کو حاصل ہو گی جو عنقریب ظاہر ہونے والی ہے۔

یہ اشارہ ہمارے نزدیک فتح مکہ کی طرف ہے۔ ہجرت کے بعد سب سے بڑی تمنا جو ہر مسلمان کے دل میں جاگزیں تھی وہ فتح مکہ ہی کی تھی۔ اسی پر اسلام کے اصل دشمنوں کی شکست کا انحصار بھی تھا اور یہی غلبۂ حق کی سب سے بڑی شہادت بھی تھی۔ اس وجہ سے ہر مسلمان اپنی تمام جدّ و جہد کے اصل نصب العین کی حیثیت سے اس کا آرزومند تھا۔

فتح مکہ کی بشارت

'فَتْحٌ' کی صفت یہاں 'قَرِیْبٌ' آئی ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب فتح مکہ کے ظہور میں زیادہ دیر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بعض لوگوں نے سورہ کا زمانۂ نزول غزوۂ احد کے لگ بھگ بتایا ہے لیکن یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ سورہ کے زمانۂ نزول کا اندازہ کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ماخذ یہی آیت ہو سکتی ہے اور اس سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی ہے۔

'وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ'۔ جب زبان پر فتح مکہ کا ذکر آ گیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرما دی کہ اب تم مسلمانوں کو بشارت سنا دو کہ یہ مبارک ساعت دور نہیں ہے۔ اس کا ظہور جلد ہی ہونے والا ہے۔ لوگ حوصلہ بلند رکھیں اور اس کا انتظار کریں۔ فتح مکہ کی بشارت مختلف اسلوبوں سے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر وارد ہوئی ہے۔ اگرچہ قطعیت کے ساتھ کہنا تو مشکل ہے لیکن یہ بشارت اس طرح وارد ہوئی ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ شاید سب سے پہلی بشارت یہی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَكَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ ۚ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ (۱۴)

حواریوں کا قابلِ تقلید نمونہ

اوپر آیت ۵ میں مسلمانوں کو یہود کی روش کی تقلید سے روکا ہے کہ اگر ان کے نقشِ قدم پر چلو گے تو اسی زیغِ نظر میں مبتلا ہو کر رہو گے جس میں وہ مبتلا ہوئے۔ اب یہ بتایا کہ تمہارے لیے قابلِ تقلید نمونہ حواریین کا ہے جنھوں نے یہود کی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی تکذیب نہیں کی بلکہ جب حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو اللہ کے لیے اٹھنے کی دعوت دی تو وہ پورے جوشِ دل کے ساتھ اس راہ میں نصرت و رفاقت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اللہ نے بالآخر انہی جاں نثاروں کو غلبۂ حق کا ذریعہ بنایا۔

لفظ 'حواری' عربی میں اہلِ کتاب سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے معنی سرگرم و پُرجوش حامی و حمایتی کے ہیں۔ قرآن مجید اور انجیل دونوں سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب یہود کے علماء و فقہاء کے رویّہ سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے غربا و عوام اور دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کو دعوت دی کہ اے مچھلیوں کو پکڑنے والو! آؤ، میں تمھیں آدمیوں کے پکڑنے والا بناؤں۔ بالآخر انہی کے اندر سے ایک مختصر جماعت

تیں سو آدمیوں کی، پورے جوش دلی کے ساتھ، دعوت کے کام میں تعاون کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

'مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ' کے اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو خدا کی بتائی ہوئی صراط مستقیم پر اللہ کی طرف چل کھڑا ہوا ہوں، تم میں سے جن کے اندر اس راہ میں میری رفاقت کا حوصلہ ہو وہ اٹھے اور میرا ساتھ دے۔ حواریین نے 'نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ' کہہ کر اس دعوت پر لبیک کہی۔

'فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَکَفَرَتْ طَّآئِفَۃٌ' قرینہ دلیل ہے کہ یہاں لفظ 'طَائِفَۃٌ' کی تنکیر ایک جگہ تقلیل کے مفہوم میں ہے اور دوسری جگہ تکثیر کے مفہوم میں۔ یعنی بنی اسرائیل میں سے ایک مختصر گروہ (حواریین کا گروہ) تو ایمان لایا اور ایک بڑا گروہ اپنے کفر پر اڑا رہ گیا لیکن خدا کی تائید اہل ایمان کو حاصل ہوئی اور وہ بالآخر اہل کفر پر غالب ہو گئے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی دعوت کی تکذیب کے بعد سے آج تک یہود کو کبھی اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں وہ رومیوں کے محکوم تھے، پھر قسطنطین کے نصرانیت قبول کر لینے کے بعد سے وہ برابر نصاریٰ کے محکوم رہے اور آج بھی جب کہ بظاہر ان کی ایک آزاد حکومت ہے وہ عیسائیوں ہی کے زیر دست ہیں۔

قرآن مجید میں یہ مضمون دوسرے مقام میں اس طرح بیان ہوا ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ۭ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۚ وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ ۔ (آل عمران - ۳: ۵۲-۵۳)	پس جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے (علامات یہود کی طرف سے) کفر کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ اللہ کی طرف بڑھنے میں کون میرے مددگار بنتے ہیں! حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار بنتے ہیں۔ ہم اللہ پر ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے اس چیز پر جو تو نے اتاری اور ہم نے رسول کی پیروی کی تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ۔

اللہ تعالیٰ کی تائید سے اس سورہ کی تفسیر ان سطور پر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

رحمان آباد

۱۴- مارچ ۱۹۷۸ء

۳- ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۶۲

الجُمُعة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سورۂ صف اور سورۂ جمعہ کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ صرف اسلوب بیان اور نہج استدلال دونوں کے الگ الگ ہیں۔ سابق سورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق حضرت مسیح علیہ السلام کی پیشین گوئی کا حوالہ ہے۔ اس میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی طرف اشارہ ہے۔ بنی اسمٰعیل کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ان کو جس عظیم نعمت سے نوازا ہے اس کی قدر کریں، یہودیوں کی حاسدانہ سازشوں کا شکار ہو کر اپنے کو اس فضل عظیم سے محروم نہ کر بیٹھیں۔ اسی ذیل میں مسلمانوں کے ایک گروہ کو ملامت فرمائی ہے کہ اس نے دنیوی کاروبار کے طمع میں جمعہ اور رسول کا احترام ملحوظ نہیں رکھا۔ اگر تجارت کی طمع لوگوں کو جمعہ کے احترام اور رسول کی موعظت سے زیادہ عزیز ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اس بیع وشرا کی حقیقت نہیں سمجھی جو وہ اپنے رب سے کر چکے ہیں (جس کا ذکر سابق سورہ میں ہو چکا ہے)، ساتھ ہی اس ناقدری کے انجام سے بھی آگاہ فرمایا ہے کہ یہ روش اختیار کر کے یہود اللہ کی شریعت سے محروم ہو گئے۔ مسلمان فلاح چاہتے ہیں تو ان کی تقلید سے بچیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) بنی اسمٰعیل کو یہ یاد دہانی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر جو رسول مبعوث فرمایا ہے وہ تمہارے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مظہر ہے۔ یہ ایک عظیم فضل ہے جو اللہ نے تم کو جاہلیت کی تاریکی سے نکالنے کے لیے تم پر فرمایا ہے۔ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر کرو۔ یہودیوں کی حاسدانہ سازشوں کے شکار ہو کر ان کی تمنا بر آنے کا سامان نہ کرو۔

(۵-۸) یہود کے اس دعوے کی تردید کہ وہ اللہ کی برگزیدہ امت ہیں، ان کے سوا کوئی اور قوم نبوت و رسالت کے شرف کی حق دار نہیں ہو سکتی۔ ان کی ان نالائقیوں کی طرف اشارہ جن کے سبب سے وہ اللہ کی ہدایت سے محروم اور امامت کے منصب سے معزول ہوئے۔

(۹-۱۱) مسلمانوں کی ایک غلطی پر، جو جمعہ اور پیغمبر کے خطبہ کے احترام کے معاملے میں، کچھ لوگوں سے صادر ہوئی، گرفت۔ اگرچہ یہ غلطی بظاہر معمولی نظر آتی ہے لیکن اس نے ایک بہت بڑی کمزوری کی

نشان دہی کی تھی کہ ابھی مسلمانوں کے ایک گروہ نے دین کی اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ جو شخص اسلام میں داخل ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت و جنت کے عوض اپنی جان اور اپنے مال کو فروخت کر چکا ہوتا ہے۔ یہ بات اس کے ایمان کے منافی ہے کہ کسی اور دنیوی کاروبار کی طمع اس کو اللہ اور رسول سے بے پروا کر دے۔ یہ یہود کے نقش قدم کی پیروی ہے جس سے مسلمانوں کو سابق سورہ میں روکا گیا ہے۔ یہود نے اسی طرح کی غلطی کا ارتکاب سبت کے معاملہ میں کیا تو اللہ نے ان پر لعنت کر دی۔

سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ (۶۲)

مَدَنِيَّةٌ ——— آيات : ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ آيات ۱—۸
الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَ
اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲﴾ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا
بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳﴾ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ
مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۴﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا
التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ
بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ
اَنَّكُمْ اَوْلِيَاۗءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶﴾ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۷﴾ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ
مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ

ع ۱۱ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٨﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۸

تسبیح کرتی ہیں آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں اس اللہ ہی کی جو بادشاہ، قدوس، عزیز اور حکیم ہے۔ اسی نے اٹھایا ہے امیوں میں ایک رسول انہی میں سے جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ اور انہی میں سے اُن دوسروں میں بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں اور اللہ غالب و حکیم ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۱-۴

ان لوگوں کی تمثیل جن پر تورات لادی گئی پھر انھوں نے اس کو نہ اٹھایا اس گدھے کی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ کیا ہی بُری تمثیل ہے اس قوم کی جس نے اللہ کی آیتوں کی تکذیب کی!! اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان سے کہو کہ اے وہ لوگو! جو یہودی ہوئے، اگر تمھارا گمان ہے کہ دوسروں کے مقابل میں تم اللہ کے محبوب ہو تو موت کے طالب بنو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ اور یہ ہرگز اس کے طالب نہیں بنیں گے، بوجہ اپنی ان کرتوتوں کے جو وہ کر چکے ہیں! اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ان کو بتا دو کہ جس موت سے تم بھاگ رہے ہو وہ تم سے دوچار ہو کر رہے گی پھر تم غائب و حاضر کے جاننے والے کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے پس وہ تم کو ان سارے اعمال سے آگاہ کرے گا جو تم کرتے رہے ہو۔ ۵ - ۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿١﴾

یہ تمہیدی آیت معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکی ہے۔ سابق سورہ میں صیغہ ماضی 'سَبَّحَ' آیا ہے اس میں 'یُسَبِّحُ' ہے جو تصویر حال کا فائدہ دے رہا ہے۔ — تمہید

یہاں اللہ تعالیٰ کی چار صفات بیان ہوئی ہیں۔ 'اَلْمَلِکُ' جس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ 'اَلْقُدُّوْسُ' جس کے معنی ہر نقص و عیب سے پاک کے ہیں۔ 'اَلْعَزِیْزُ' جس کے معنی، جیسا کہ بار بار واضح کیا جا چکا ہے غالب و مقتدر کے ہیں۔ 'اَلْحَکِیْمُ' وہ ذات جس کے ہر قول و فعل میں حکمت ہے۔ یہ چاروں صفات آگے والی آیت کی تمہید کے طور پر بیان آئی ہیں۔ ان کی وضاحت آیت کی تفسیر کے تحت ہی مناسب رہے گی۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۲)

فرمایا کہ اسی خدا نے جو اس کائنات کا حقیقی بادشاہ ہے امیوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا کہ وہ ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو پاک کرے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔

تدبر کیجیے تو معلوم ہو گا کہ تمہید کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی جو صفات گنائی ہیں انہی کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے اس رسول کی بعثت ہوئی ہے جس کا یہاں ذکر ہے۔

وہی خلق کا بادشاہ حقیقی ہے۔ اس کی اس صفت کا تقاضا یہ ہوا کہ اس نے اپنی رعیت کو اپنے احکام و ہدایات سے آگاہ کرنے کے لیے اس کی طرف اپنا رسول بھیجا جس کی صفت یہ ہے کہ 'یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ' وہ لوگوں کو اس کی تعلیمات و ہدایات پڑھ کر سنا رہا ہے۔ — رسول اللہ صلعم کی بعثت اللہ تعالیٰ کی صفات کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے ہوئی

وہ پاک اور قدوس ہے اس وجہ سے اس نے یہ چاہا کہ وہ اپنے رسول اور اپنی تعلیمات کے ذریعہ سے لوگوں کو پاکیزہ بنائے چنانچہ اس کا رسول لوگوں کو عقائد و اعمال اور اخلاق کی خرابیوں سے پاک کر رہا ہے (یُزَكِّیْهِمْ)۔

پھر وہ 'عزیز' اور 'حکیم' ہے اس وجہ سے اس نے ایسا رسول بھیجا ہے جو اس کے بندوں کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دے رہا ہے۔ یہاں لفظ کتاب شریعت اور قانون کے مفہوم میں ہے۔ شریعت اور قانون کا موثر نفاذ اسی کی طرف سے ہوتا ہے جو غالب و مقتدر ہو لیکن اللہ تعالیٰ صرف غالب مقتدر ہی نہیں بلکہ 'حکیم' بھی ہے اس وجہ سے وہ اپنے رسول کے ذریعہ سے جس قانون کی تعلیم دے رہا ہے وہ مجرد اس کے زور اقتدار کا مظہر نہیں بلکہ اس کی حکمت اور بندوں کی دنیوی و اخروی مصلحت کا بھی مظہر ہے۔

یہ آیت بنی اسمٰعیل پر امتنان اور اظہار فضل و احسان کے محل میں ہے اس وجہ سے یہاں ان کے لیے لفظ 'اُمِّیّٖنَ' بطور ایک وصف امتیازی کے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ پر اس کے محل میں بحث ہو چکی ہے لیکن اتنی بات کی یاد دہانی یہاں بھی ضروری ہے کہ یہ اصطلاح اگرچہ اہل کتاب بالخصوص یہود کی وضع کردہ

تھی جس میں ان کے اندر مذہبی پندار کی جھلک بھی تھی اور اہلِ عرب کے لیے ان کا جذبۂ تحقیر بھی نمایاں تھا، لیکن بنی اسمٰعیل چونکہ کتاب و شریعت سے ناآشنا تھے اس وجہ سے بغیر کسی احساسِ کہتری کے انھوں نے اس لقب کو اپنے لیے خود بھی اختیار کر لیا۔ پھر جب قرآن نے ان کے لیے اور ان کی طرف مبعوث ہونے والے رسول کے لیے اس لفظ کو بطور ایک وصفِ امتیازی کے ذکر فرمایا تو اس کا رتبہ اتنا بلند ہو گیا کہ اہلِ عرب کے لیے اس نے گویا ایک تشریفِ آسمانی کی حیثیت حاصل کر لی جس سے قدرت کی یہ شان ظاہر ہوئی کہ جن کو ان پڑھ اور گنوار کہہ کر حقیر ٹھہرایا گیا وہ تمام عالم کی تعلیم و تہذیب پر مامور ہوئے اور جن کو اپنے حاملِ کتاب و شریعت ہونے پر ناز تھا وہ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا 'چارپائے برو کتابے چند' کے مصداق قرار پائے۔

یہاں یہ لفظ عربوں کے جذبۂ شکرگزاری کو ابھارنے کے لیے استعمال ہوا ہے کہ انھیں اپنے رب کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اس نے ان پر نظرِ کرم فرمائی۔ ان کی اصلاح و تربیت اور ان کو کتاب و حکمت سے بہرہ مند کرنے کے لیے انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرمایا اور جاہلیت کی اس تاریکی سے ان کو نکالا جس میں وہ اپنی امیّت کے سبب سے اب تک گھرے ہوئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو یہ نعمت مل گئی ہے وہ اس کو حرزِ جاں بنائیں اور کوشش کریں کہ دوسرے بھی اس کی قدر کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ناقدری کے سبب سے وہ اس سے محروم ہو کر رہ جائیں اور حاسدوں کا مقصد پورا ہو جائے۔

یہاں نبیِ امی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات مذکور ہوئی ہیں ان پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے تاکہ آپ کی بعثت کے مقاصد سے متعلق جو غلط فہمیاں منکرینِ حدیث نے پھیلائی ہیں وہ دور ہو جائیں۔ بنی اسمٰعیل کے اندر بعینہٖ انہی صفات کے پیغمبر اٹھائے جانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی۔ سورۂ بقرہ میں یہ دعا یوں مذکور ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ	اے ہمارے رب! اور تو بھیج ان کے اندر ایک
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ	رسول انہی میں سے جو تیری آیتیں ان کو پڑھ کر
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ	سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے
اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (البقرة - ۲: ۱۲۹)	اور ان کو پاک کرے۔ بے شک تو غالب و حکیم ہے۔

آنحضرتؐ دعائے ابراہیمی کے مظہر ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح یہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظہر ہیں اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے بھی مظہر ہیں جو آپ نے اولادِ اسمٰعیل سے متعلق فرمائی تھی۔ گویا گوناگوں صفتیں آپ کے اندر جمع ہیں۔ یہ نویدِ مسیح ہیں اور دعائے ابراہیم ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظہر ہیں، اور پھر یہ کہ وہ تمھارے ہی اندر کے ایک فرد ہیں۔ تمھارے اور ان کے درمیان اجنبیت و غیریت کا کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔ تمھیں حقیر ٹھہرانے والے تمھیں یہ طعنہ نہیں دے سکتے کہ تمھیں ان کے یا کسی اور کے واسطہ سے روشنی ملی بلکہ اللہ نے تمام خلق پر تم کو سربلند کیا کہ تمھارے ذریعہ سے سارے جہان میں اجالا کرنے کا سامان کیا۔

آنحضرتؐ کی بعثت تمام خلق کی طرف ہے

یہ امر یہاں واضح رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اگرچہ امیوں کے اندر ہوئی لیکن آپ کی دعوت تمام خلق کے لیے ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے: ایک بعثتِ خاص، دوسری بعثتِ عام۔ آپ کی بعثتِ خاص بنی اسمٰعیل کی طرف ہوئی اور اس بعثت کے فرائض کی تکمیل حضورؐ نے بذاتِ خود فرمائی۔ آپ کی بعثتِ عام، جو تمام خلق کی طرف ہوئی، اس کے فرائض انجام دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو 'شہداء اللہ فی الارض' کے منصب پر سرفراز فرمایا جو اب قیامت تک کے لیے اس فرض کی انجام دہی پر مامور ہے۔ 'شہداء اللہ فی الارض' کے ہراول دستہ کی حیثیت چونکہ امیوں ہی کو حاصل ہوئی اس وجہ سے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ جو امی تھے اللہ تعالیٰ نے انہی کے واسطہ سے تمام خلق کو روشنی دکھائی۔

'وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ'۔ یہ امیوں کے جذبۂ شکر و سپاس کو ابھارنے کے لیے اس تاریکی کی طرف توجہ دلائی ہے جو ماضی میں ان پر چھائی رہی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ جاہلیت کی اس گھٹاٹوپ تاریکی کا خیال کریں جس میں وہ گرفتار رہ چکے ہیں تب انھیں اپنے رب کے فضل و احسان کا کچھ اندازہ ہوگا کہ اس نے ان کو کس چاہِ ظلمت سے نکالا اور کس آسمانِ رفعت و عزت پر پہنچایا!

وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۳)

اُن امیوں کو بانداز لطیف دعوت جو ابھی اسلام سے محروم تھے

اس کا عطف 'اُمِّیّٖنَ' پر ہے۔ یعنی جن امیوں کے اندر اس رسول کی بعثت ہوئی ہے انہی میں سے وہ دوسرے بھی ہیں جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے ہیں۔ یہ اشارہ ان بنی اسمٰعیل کی طرف ہے جنھوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اس سے یہ بات نکلی کہ اوپر اگرچہ لفظ 'اُمِّیّٖنَ' عام استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مراد صرف وہ بنی اسمٰعیل ہیں جو مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ چنانچہ آیت کا آخری ٹکڑا 'وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ' اس پر دلیل بھی ہے۔ اب اس آیت میں نہایت خوب صورت اور بلیغ اسلوب سے بنی اسمٰعیل کے ان لوگوں کو بھی دعوت دے دی جو ابھی اسلام سے بیگانہ تھے۔ لفظ 'مِنْهُمْ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ انہی امیوں میں سے جن کے لیے یہ آسمانی نعمت اتری ہے، کچھ دوسرے بھی ہیں لیکن ابھی وہ اس سے بدکے ہوئے ہیں۔ گویا نہایت لطیف اسلوب سے ان کو دعوت دی گئی کہ جن کے لیے یہ خوانِ نعمت بچھایا گیا ہے اور جو سب سے پہلے مدعو ہیں، حیف ہے اگر وہ اس سے محروم رہیں۔

'لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ' (ابھی وہ ان سے ملے نہیں ہیں) کے الفاظ کے اندر یہ بشارت بھی مضمر ہے کہ گو ابھی وہ ملے نہیں لیکن عنقریب مل جائیں گے۔ گویا یہ مستقبل قریب میں ان کے قبولِ اسلام کی اسی طرح کی بشارت ہے جس طرح کی بشارت سورۂ ممتحنہ کی آیت ۷ میں گزر چکی ہے۔

ہدایت کے باب میں سنتِ الٰہی

'وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ'۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ایمان و ہدایت کے باب میں اس نے اختیار فرمائی ہے۔ وہ چاہے تو ساری خلق کو ہدایت بخش دے، وہ عزیز و غالب ہے،

لیکن وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے وہ ہدایت سے انہی کو سرفراز فرماتا ہے جو اس کی حکمت کے تحت سزاوار ہوتے ہیں۔ سورۂ دہر میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے: وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ڰ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَاۗءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ (الدھر ۷۶: ۳۰-۳۱) (اور تمھارا چاہا کچھ نہیں مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بے شک اللہ ہی علم و حکمت والا ہے۔ وہی اپنی رحمت میں جس کو چاہے گا داخل کرے گا)۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۴)

یہود کے حسد پر تعریض

یہ اسی فضلِ عظیم کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے امیوں پر فرمایا اور جس کا اوپر ذکر ہوا۔ ارشاد ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ اس پر کسی کا اجارہ نہیں ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے اس کے لیے انتخاب فرماتا ہے اور اس کا یہ چاہنا اس کی اپنی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ کسی دوسرے کو اس میں ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہود کو اس پر حسد ہے تو وہ جتنا حسد کرنا چاہیں کر لیں۔ اس سے وہ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ خدا نے امیوں کو اپنی چیز دی ہے، کسی دوسرے کی نہیں دی ہے کہ وہ اس پر غصہ کا اظہار کرے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵)

یہود کے پندار پر ضرب

یہ یہود کے پندار پر ضرب لگائی ہے کہ اگر وہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہیں کہ کتاب و شریعت کے حامل وہی ہو سکتے ہیں، کوئی دوسرا اس شرف میں ان کا حریف نہیں ہو سکتا تو یہ گھمنڈ اب وہ اپنے دماغ سے نکال دیں۔ اب ان کی مثال اس گدھے کی ہے جو کتابوں کا بوجھ تو اٹھائے ہوئے ہے لیکن اسے کچھ خبر نہیں کہ ان کتابوں میں کیا ہے۔

'حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا' یعنی اس میں تو شبہ نہیں کہ ایک زمانے میں ان کے اوپر تورات کا بوجھ لادا گیا لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہے کہ انھوں نے اس بارِ گراں کو اٹھایا نہیں۔ اس نہ اٹھانے کی وضاحت 'كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ' کے الفاظ سے فرما دی گئی کہ تورات کی تعلیمات اور اس کے احکام پر ان کا ایمان باقی نہیں رہا، عملاً انھوں نے ان کی تکذیب کر دی۔ ظاہر ہے کہ جب ان کتابوں کے احکام کی انھوں نے تکذیب کر دی تو ان کے اجر سے تو وہ محروم ہو گئے، صرف ان کا وزر اور گناہ ان کے سر باقی رہا اور وہ اس مثل کے مصداق ہیں کہ چارپائے بر او کتابے چند۔

'حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ' میں لفظ 'حُمِّلُوْا' نہایت بلیغ ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جس تورات کے حامل ہونے پر آج ان کو ناز ہے وہ انھوں نے اس وقت بھی شوق و رغبت سے نہیں قبول کی تھی جس وقت انھیں عطا ہوئی تھی بلکہ وہ گویا ان پر زبردستی لادی گئی تھی۔ اس زبردستی لادنے کی پوری تفصیل

سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے کہ تورات کے ایک ایک حکم کو قبول کرنے میں یہود نے کس کس طرح اپنی ضد و مکابرت کا مظاہرہ کیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس سوز و غم کے ساتھ ان کی اس حالت پر ماتم کیا ہے۔ اس کی طرف سرسری اشارہ سورۂ صف، کی آیت ۵ میں بھی ہے۔

'بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ' فرمایا کہ جن کی مثال اتنی مکروہ ہے ان کے لیے زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے تقدس و تقربِ الٰہی کے زعم میں مبتلا ہوں اور یہ سمجھ بیٹھیں کہ ان کے ہوتے خدا کسی دوسرے کو کتاب و شریعت کا حامل نہیں بنا سکتا!

جو کتاب پر عامل نہیں، وہ اس کا حامل بھی نہیں

'كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ' کے الفاظ سے اوپر کے الفاظ 'ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا' کی وضاحت ہو گئی کہ تورات کے نہ اٹھانے کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اس کے احکام کی اپنے عمل سے تکذیب کر دی۔ زبان سے تو دعویٰ ہے کہ وہ اس کے حامل ہیں لیکن جب اس پر عامل نہیں تو اس کے حامل کیسے ہوئے؟

'وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ' یہ ٹکڑا بعینہٖ سورۂ صف کی آیت ۷ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ان کی بداعمالیوں کے سبب سے ان پر لعنت ہو چکی ہے اور اللہ نے ان کے دلوں پر، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں تفصیل گزر چکی ہے، مہر کر دی ہے، اس وجہ سے اب ان کو ہدایت نصیب ہونے والی نہیں ہے۔ یہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے ہیں۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ ان کو تورات دی گئی تو اس کی انھوں نے تکذیب کر دی اور اب اسی تورات کے حامل ہونے کے زعم میں اللہ کے آخری رسول کی تکذیب کر رہے ہیں کہ بھلا ان کے ہوتے کسی اور قوم کے اندر کوئی رسول کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ فرمایا کہ ایسے بدبختوں کو خدا ہدایت نہیں دیا کرتا۔ اس طرح کے لوگ ہمیشہ اسی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۶)

یہود کے پندار پر ایک اور ضرب

یہ ان کے اسی پندار پر ایک اور ضرب لگائی کہ اگر تمھارا زعم یہ ہے کہ تم خدا کے محبوب ہو تو اس محبت و محبوبیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمھارے اندر خدا کی راہ میں جان دینے کا شوق و ولولہ ہو۔ محبت کو سب سے زیادہ آرزو محبوب کی ملاقات کی ہوتی ہے۔ وہ اس چیز سے جان نہیں چراتا جو محبوب سے ملاقات کی راہ کھولے لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ موت کا مقابلہ کرنے میں تم سے زیادہ بزدل کوئی نہیں۔ سورۂ صف کی آیات ۴-۵ میں ان کے حال پر جو تبصرہ فرمایا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ سورۂ حشر میں بنو قریظہ اور ان کے حلیفوں کی بزدلی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے:

لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ	ان کے سینوں میں تمھارا ڈر اللہ کے
صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ	خوف سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ لَا	کہ یہ سمجھ رکھنے والے لوگ نہیں۔ یہ کبھی تم سے

يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُّحَصَّنَةٍ أَوْ مِن وَرَاءِ جُدُرٍ ۚ بَأْسُهُم بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ ۚ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ ۝ (الحشر - ۵۹ : ۱۳-۱۴)

کھلے میدان میں لڑنے کا حوصلہ نہیں کرسکتے۔ لڑیں گے تو قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کی اوٹ سے۔ ان کے اپنے اندر شدید مخاصمت ہے۔ تم ان کو متحد گمان کر رہے ہو، حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عقل سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں۔

سورۂ بقرہ میں یہی مضمون نسبۃً تفصیل سے اس طرح بیان ہوا ہے:

قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِندَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ ۝ (البقرة ۲ : ۹۵-۹۶)

کہہ دو، اگر دار آخرت کی تمام نعمتیں اللہ کے پاس دوسروں کے مقابل میں، تمہارا ہی حق ہیں تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔ اور یہ کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اپنی ان کرتوتوں کے سبب سے جو انھوں نے کی ہیں اور اللہ ان ظالموں سے اچھی طرح باخبر ہے اور تم ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے، یہاں تک کہ یہ مشرکوں سے بھی زیادہ زندگی کے حریص ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی تمنا ہے کہ ہزار سال جیے۔

مِنْ دُوْنِ النَّاسِ سے بنی اسمٰعیل کی طرف اشارہ ہے

آیت زیر بحث میں مِنْ دُوْنِ النَّاسِ کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن یہاں اشارہ خاص طور پر بنی اسمٰعیل ہی کی طرف ہے۔ تورات کی پیشین گوئیوں اور نسلی رقابت کی بنا پر یہود کو سب سے زیادہ پرخاش انہی سے تھی۔ اس پرخاش کی پوری سرگزشت سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہ پرخاش تھی تو شروع ہی سے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد، جب انھوں نے تاڑ لیا کہ وہ خطرہ سر پر آگیا جس سے وہ اندیشہ ناک تھے تو یہ آگ پوری طرح بھڑک اٹھی۔

یہود کی بزدلی پر ان کی پوری تاریخ گواہ ہے

قرآن نے یہاں یہود کی جس بزدلی پر طنز کیا ہے اگرچہ وہ اس کے جواب میں بے حیائی سے کہہ سکتے تھے کہ ہم موت سے ڈرنے والے لوگ نہیں ہیں لیکن آدمی سے اپنا باطن مخفی نہیں ہوتا۔ انھیں محسوس ہوا کہ قرآن نے ان کی نہایت دکھتی رگ پکڑی ہے۔ چنانچہ انھوں نے خاموشی ہی میں سلامتی دیکھی۔ وہ ایک ایسی بات کی تردید کس طرح کر سکتے تھے جس کی شہادت ان کی ماضی کی تاریخ بھی دے رہی تھی اور حاضر کے واقعات بھی جس کے گواہ تھے۔

وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (۷)

یہ ان کی بزدلی کے سبب کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس چیز نے ان کو موت سے اتنا خائف کر رکھا ہے یہ ان کے اعمال ہیں۔ یہ نبیوں کے قاتل ہیں، یہ تورات کے محرّف ہیں، اللہ کی امانتوں میں خیانت کرنے والے ہیں اور انھوں نے ان تمام نشاناتِ ہدایت کو مٹایا ہے جن کو خلق کے سامنے اجاگر کرنے پر یہ مامور ہوئے تھے تو اب یہ کیا منہ لے کے اپنے رب کے سامنے جائیں گے! لیکن ان کو بہرحال اس کے حضور میں حاضر ہونا ہے اور وہ ان ظالموں سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ ہر ایک کو اس کے کیے کی بھرپور سزا دے گا۔

قُلۡ اِنَّ الۡمَوۡتَ الَّذِیۡ تَفِرُّوۡنَ مِنۡهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیۡكُمۡ ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰی عٰلِمِ الۡغَیۡبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (۸)

اوپر وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ میں جو تہدید مضمر تھی وہ اس آیت میں اچھی طرح کھل گئی ہے۔ فرمایا کہ موت سے بھاگتے ہو تو بھاگو، لیکن تم اس سے بھاگ کے کہاں جاؤ گے؟ وہ تمھیں پکڑ ہی لے گی۔ پھر تم اپنی تمام بداعمالیوں کے ساتھ اپنے اس خدا کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو تمام غائب و حاضر کا جاننے والا ہے۔ نہ اس سے تمھارا کوئی فعل مخفی ہے، نہ کوئی چیز تم اس سے چھپا سکو گے۔ وہ تمھارا سارا کچا چٹھا تمھارے سامنے رکھ دے گا اور تمھیں اپنے ہر جرم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

۲- آگے آیات ۹-۱۱ کا مضمون

آگے مسلمانوں کی ایک غلطی پر گرفت فرمائی جو نمازِ جمعہ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کے معاملے میں ایک جماعت سے صادر ہوئی۔ کوئی تجارتی قافلہ مدینہ میں داخل ہوا اس کی خبر سن کر کچھ لوگ عین اس وقت مسجد سے اٹھ کر چلے گئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ اگرچہ یہ فعل کچھ خام تربیت لوگوں ہی سے صادر ہوا لیکن اس سے جماعت کی بعض ایسی کمزوریوں کی نشان دہی ہوئی جن کی اصلاح ضروری تھی۔

ایک کمزوری تو یہ ظاہر ہوئی کہ معلوم ہوا کہ ابھی بہتوں کے اندر اس فضلِ عظیم کا کما حقہٗ شعور نہیں پیدا ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں امیوں پر فرمایا ہے۔

دوسری یہ کہ ابھی لوگوں نے اس بیع و شرا کی حقیقت اچھی طرح نہیں سمجھی ہے جس کا ذکر سورۂ صف کی آیات ۱۰-۱۳ میں ہوا ہے کہ جو لوگ رسول سے سمع و طاعت کا عہد کر چکے ہیں وہ اللہ کی مغفرت اور اس کی جنت کے عوض اپنی جان اور اپنے مال اللہ کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں۔ ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی اور بیع و شراء کو اتنی اہمیت دیں کہ اس کے شوق میں اللہ کے رسول کو خطبہ دیتا ہوا چھوڑ کر مسجد سے چل کھڑے ہوں۔

تیسری یہ کہ معلوم ہوا کہ ابھی لوگوں نے جمعہ کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا ہے۔ یہ دن مسلمانوں کے لیے بنی اسرائیل کے یوم السبت سے مشابہ ہے۔ بنی اسرائیل نے طمعِ دنیا اور حرصِ شکار میں مبتلا ہو کر یوم سبت کی حرمت کو بٹہ لگایا تو اس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر کے ان کی شکلیں مسخ کر دیں۔ اگر انہی کی طرح مسلمان اس تجارت کی ہوس میں جمعہ کی حرمت کو بٹہ لگا بیٹھے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے غضب سے محفوظ رہیں۔

یہ باتیں خاص اہمیت رکھنے والی ہیں۔ ان سے اس فضلِ عظیم کی نہایت کھلی ہوئی ناقدری ہوئی جو یہود کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے امیوں پر فرمایا اور جس کا نہایت اہتمام سے اس سورہ میں ذکر ہوا ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو سرزنش کی گئی جو ان حرکات کے مرتکب ہوئے۔ — اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۹-۱۱

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَوٰةِ مِن يَوۡمِ ٱلۡجُمُعَةِ فَٱسۡعَوۡاْ إِلَىٰ ذِكۡرِ ٱللَّهِ وَذَرُواْ ٱلۡبَيۡعَۚ ذَٰلِكُمۡ خَيۡرٞ لَّكُمۡ إِن كُنتُمۡ تَعۡلَمُونَ ۝٩ فَإِذَا قُضِيَتِ ٱلصَّلَوٰةُ فَٱنتَشِرُواْ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَٱبۡتَغُواْ مِن فَضۡلِ ٱللَّهِ وَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ كَثِيرٗا لَّعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ۝١٠ وَإِذَا رَأَوۡاْ تِجَٰرَةً أَوۡ لَهۡوًا ٱنفَضُّوٓاْ إِلَيۡهَا وَتَرَكُوكَ قَآئِمٗاۚ قُلۡ مَا عِندَ ٱللَّهِ خَيۡرٞ مِّنَ ٱللَّهۡوِ وَمِنَ ٱلتِّجَٰرَةِۚ وَٱللَّهُ خَيۡرُ ٱلرَّٰزِقِينَ ۝١١

ع ۲

ترجمۂ آیات ۹-۱۱

اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف مستعدی سے چل کھڑے ہو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کے طالب بنو اور اللہ کو زیادہ یاد رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب وہ کوئی تجارت یا دلچسپی کی چیز دیکھ پاتے ہیں تو اس کی طرف ٹوٹ پڑتے

ہیں اور تم کو کھڑے چھوڑ دیتے ہیں۔ کہہ دو، جو اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے کہیں بہتر ہے۔ اور اللہ بہترین روزی دینے والا ہے۔ ۹-۱۱

۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ط ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۹)

خطاب کا ایک حکیمانہ انداز — خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن انہی لوگوں کی طرف ہے جن کی کمزوری پر نکیر فرمائی گئی ہے۔ عام خطاب کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ زیادہ رسوائی کا احساس نہیں کرتے جن کا رویّہ زیر بحث ہوتا ہے بلکہ ان کے اندر سلامت روی ہوتی ہے تو وہ اس پردہ پوشی کو متکلم کی کریم النفسی پر محمول کرتے اور نصیحت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر تعیّن کے ساتھ نام لے کر ان کو سرزنش کی جائے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر ضد اور انانیت کا جذبہ ابھرے۔

جمعہ و... — 'لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ' میں 'مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ' کے الفاظ 'صلٰوۃ' کی وضاحت کے لیے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ یہاں زیر بحث خاص طور پر جمعہ کی نماز ہے۔ یہ جمعہ کی نماز ہی واحد چیز ہے جو جمعہ کے دن کو دوسرے دنوں سے ممتاز کرتی ہے۔

اذان جمعہ — یہاں جس اذان کا ذکر ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہی اذان مراد ہو سکتی ہے جو خطبۂ جمعہ سے پہلے دی جاتی ہے۔ روایات سے بلا اختلاف ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخینؓ کے عہد مبارک میں جمعہ کی اذان ایک ہی تھی جو خطبہ سے پہلے دی جاتی تھی۔ ایک اذان کا اضافہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں کیا جب مدینہ منورہ کی آبادی زیادہ ہو گئی۔ یہ مدینہ کے بازار میں حضرت عثمانؓ کے مکان سے دی جاتی۔ اگرچہ یہ اذان سیدنا عثمانؓ کا اضافہ ہے لیکن اس اضافے کو امت کے تمام اخیار نے بلا کسی نکیر کے قبول کیا۔

'فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ' 'سعی' کے معنی صرف دوڑنے کے نہیں آتے بلکہ یہ لفظ اصلاً کسی کام کو مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ جدّ و جہد و چوبند ہو کر کرنے کے لیے آتا ہے۔ غلام آقا کی پکار سن کر جب مستعدی سے اس کی طرف لپکتا ہے تو یہ سعی ہے۔ فرمایا کہ جب یہ اذان سنو تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔

خطبہ اور نماز جمعہ — 'ذِکْرِ اللّٰہِ' یہاں خطبہ اور نماز دونوں کے لیے ایک جامع لفظ ہے۔ نماز کا ذکر ہونا تو واضح

ہے، قرآن میں جگہ جگہ نماز کو ذکر ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رہا جمعہ کا خطبہ تو وہ درحقیقت نماز ہی کا حصہ ہے۔ جمعہ کی نماز ظہر کی نماز کے قائم مقام ہے جس کی چار رکعتیں جمعہ کے دن تخفیف ہو کر دو رہ جاتی ہیں اور ان کی جگہ خطبہ کی شکل میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ 'ذکر اللہ' امام حاضرین مسجد کو مخاطب کر کے کرتا ہے اس وجہ سے وہ ساری باتیں اس کے دائرہ میں آتی ہیں جو مسلمانوں کی صلاح و فلاح سے متعلق اور جن کے لیے وقت کے حالات مقتضی ہوں۔ اس کو چند رسمی دعاؤں کی شکل میں محدود کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

خطبہ اور نماز کا اہتمام و التزام

'وَذَرُوا الْبَیْعَ' لفظ 'بیع' اصلاً تو بیچنے کے معنی میں ہے لیکن یہ اپنے عام استعمال میں خرید و فروخت دونوں ہی کے لیے آتا ہے۔ اگرچہ یہاں ذکر 'بیع' ہی کے چھوڑنے کا ہے لیکن جب 'بیع' کے چھوڑنے کا ذکر ہوا جو نسبۃً زیادہ مرغوب ہے تو 'خرید' کا چھوڑنا تو بدرجۂ اولیٰ مطلوب ہو گا۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ دنیا کا ہر کام چھوڑ کر نماز کی طرف لپکو۔ 'بَیْع' کے ذکر کی وجہ صرف یہ ہے کہ جو واقعہ مسلمانوں کے لیے آزمائش کا سبب ہوا اور جس پر یہاں تنبیہ فرمائی گئی ہے، وہ بیع و شراء ہی سے متعلق تھا۔

'ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' یعنی بظاہر تو یہ حکم تم میں سے بعضوں پر گراں گزرے گا' تم اپنے کاروبار کا نقصان محسوس کرو گے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہی طریقہ تمھارے لیے موجب خیر و برکت ہے۔ رزق و فضل سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اس کی خوشنودی کے لیے تم کوئی نقصان گوارا کرو گے تو ابدی زندگی میں اس کا اجر اپنے رب کے پاس محفوظ کر لو گے اور ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں بھی وہ ایسی شکلیں پیدا کر دے کہ تمھارے ہر نقصان کی تلافی ہو جائے۔ 'اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' یعنی تمھیں اپنے نفع نقصان کا اندازہ اس دنیا کی محدود زندگی کو سامنے رکھ کر نہیں کرنا چاہیے بلکہ آخرت کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ لیکن آخرت ایسی چیز ہے کہ اس کو سمجھنا چاہو گے تب ہی سمجھو گے۔

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ
کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۱۰)

یہود کے احترامِ سبت کے بالمقابل جمعہ کی پابندی آسان ہے

یعنی یہ پابندی صرف اتنی ہی دیر کے لیے ہے کہ نماز سے فارغ ہو جاؤ۔ اس کے بعد تمھیں اجازت ہے کہ تم جہاں چاہو جاؤ اور جس شکل میں چاہو اللہ کے رزق و فضل کے طالب بنو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اتنے قلیل وقت کی پابندی بھی تم اپنے رب کی خوشنودی کے لیے گوارا نہیں کر سکتے تو پھر تمھارا ایمان و اسلام کیا ہے! یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ یہود پر سبت کے احترام کی پابندی پورے دن کے لیے تھی۔ لیکن اس امت پر جمعہ کے احترام کی پابندی صرف اذان سے لے کر ختم نماز تک کے لیے عائد کی گئی ہے، باقی پورے دن میں اسی طرح آزادی ہے جس طرح دوسرے دنوں میں ہے۔

'وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ' یعنی تمھارے لیے رزق و فضل کی جدوجہد پر کوئی پابندی نہیں ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر اس جدوجہد میں دنیا ہی مطمح نظر نہیں ہے، آخرت کی فلاح

بچنی مطلوب ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر قدم پر اللہ کو یاد رکھو۔ یہی یاد تمھیں شیطان کے فریبوں اور فتنوں سے بچائے گی ورنہ شیطان تمھیں اس طرح اندھا بنا دے گا کہ تم حرام و حلال کے امتیاز سے عاری ہو کر اس دنیا کے کتے بن کر رہ جاؤ گے اور پھر جہنم ہی کے ایندھن بنو گے۔

وَاِذَا رَاَوۡا تِجَارَۃً اَوۡ لَہۡوَۨا انۡفَضُّوۡۤا اِلَیۡہَا وَتَرَکُوۡکَ قَآئِمًا ؕ قُلۡ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ مِّنَ اللَّہۡوِ وَمِنَ التِّجَارَۃِ ؕ وَاللّٰہُ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ (۱۱)

واقعہ جو اس یہ آخر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو مذکورہ بالا تنبیہات و تعلیمات کے نزول کا سبب ہوا۔
تنبیہ کا سبب بنا روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر کا کوئی تجارتی قافلہ عین خطبۂ جمعہ کے وقت، مدینہ میں داخل ہوا۔ اس نے اعلان و اشتہار کے لیے، رواج کے مطابق، اپنے ڈھول اور دف جو بجائے تو کچھ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے چھوڑ کر اس کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس طرح کے قافلے اس زمانے میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ ضروری چیزوں کی خرید و فروخت انہی کے ذریعہ سے ہوتی اس وجہ سے لوگوں کو ان کا انتظار رہتا اور جب وہ آتے تو ہر شخص اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرنے اور اپنا مال فروخت کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ فعل جن لوگوں سے صادر ہوا ظاہر ہے کہ ان پر اسلامی تربیت کا رنگ ابھی اچھی طرح چڑھا نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ خطبۂ جمعہ کی اہمیت سے بھی اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ ان کے نزدیک اہمیت صرف نماز ہی کی تھی۔ انھوں نے خیال کیا ہو گا کہ نماز سے پہلے پہلے قافلہ کو دیکھ کر واپس آ جائیں گے۔ بہرحال ان سے جو غلطی ہوئی اس سے امت کو یہ فائدہ پہنچا کہ جمعہ، خطبۂ جمعہ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ایسی ہدایات نازل ہو گئیں جو اس سے پہلے نازل نہیں ہوئی تھیں۔

آیت میں بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے لیکن یہ امر واضح ہے کہ یہ فعل جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، صادر کچھ نا تربیت یافتہ لوگوں ہی سے ہوا۔ قرآن کا عام اندازِ موعظت یہی ہے کہ وہ تعیین کے ساتھ ملامت کرنے کے بجائے عام الفاظ ہی میں تنبیہ کرتا ہے تاکہ جماعت کا ہر شخص اس سے فائدہ اٹھائے اور کسی خاص گروہ کو اس سے رسوائی کا احساس نہ ہو۔

'وَتَرَکُوۡکَ قَآئِمًا' سے اس واقعہ کی سنگینی کا ایک خاص پہلو یہ واضح ہوتا ہے کہ خطبہ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ حضورؐ کے خطبہ کو اس طرح چھوڑ کر چل دینے میں سوءِ ادب اور دین کی ناقدری کے جو پہلو مضمر ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔ یہ بعینہٖ وہی روش ہے جو یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اختیار کی، جس کے نتیجہ میں اللہ نے ان کے دل، جیسا کہ سورہ صف میں بیان ہوا ہے، کج کر دیے۔ اس وجہ سے قرآن نے ان پر پہلے ہی مرحلہ میں گرفت فرمائی۔

'قُلۡ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ مِّنَ اللَّہۡوِ وَمِنَ التِّجَارَۃِ ؕ وَاللّٰہُ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ'۔ فرمایا کہ اللہ کے

پاس مخلص اہلِ ایمان کے لیے جو اجرِ عظیم ہے اس کے طالب بنو۔ وہ اس دنیا کے لہو ولعب اور اس کی تجارت سے کہیں بہتر ہے۔ اگر اس دنیا کا بڑے سے بڑا نقصان کر کے بھی تم نے خدا اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کر لی تو اپنے خزف ریزوں کے عوض ابدی بادشاہی کے مالک بن جاؤ گے اور اگر خدا و رسول کو ناراض کر کے تم نے ساری دنیا کی دولت بھی سمیٹ لی تو آخر کتنے دنوں کے لیے۔ پس دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ دنیا کے پیچھے مت بھاگو بلکہ جو چیز اللہ کے پاس ہے اس کے طالب بنو۔ اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ وہ وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا اور ایسا رزق دیتا ہے جو ہر اعتبار سے رزقِ کریم ہوتا ہے۔

'لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ' اور 'خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ' میں عربیت کے جو اسلوب ہیں ان کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔

۴۔ جمعہ، خطبۂ جمعہ اور مقامِ نبوت سے متعلق قرآن کے چند اشارات

اگرچہ آیات کے تحت ان سے مستنبط ہونے والی اہم باتوں کی طرف ہم توجہ دلاتے آرہے ہیں لیکن چند باتیں مزید توجہ کی مستحق ہیں۔

رسول کی تعلیم اللہ کی تعلیم ہے

ایک یہ کہ جمعہ کی نماز، اس کی اذان اور اس کے خطبہ سے متعلق یہاں مسلمانوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں اور ان کی ایک غلطی پر جس طرح تنبیہ فرمائی گئی ہے اس کا انداز شاہد ہے کہ جمعہ کے قیام سے متعلق ساری باتیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام پائی ہیں، حالانکہ قرآن میں کہیں بھی جمعہ کا کوئی ذکر نہ اس سے پہلے آیا ہے نہ اس کے بعد ہے بلکہ روایات سے ثابت ہے کہ اس کے قیام کا اہتمام ہجرت کے بعد مدینہ پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور لوگوں کو آپ ہی نے اس کے احکام و آداب کی تعلیم دی۔ پھر جب لوگوں سے اس کے آداب ملحوظ رکھنے میں کچھ کوتاہی ہوئی تو اس پر قرآن نے اس طرح گرفت فرمائی گویا براہِ راست اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے احکام و آداب کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول کے دیے ہوئے احکام بعینہٖ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں، ان کا ذکر قرآن میں ہو یا نہ ہو۔ رسول کی طرف ان کی نسبت کی تحقیق تو ضروری ہے لیکن نسبت ثابت ہے تو ان کا انکار خود اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

خطبۂ جمعہ نمازِ جمعہ کا ضروری رکن ہے

دوسری یہ کہ خطبۂ جمعہ، نمازِ جمعہ کا ایک ضروری رکن ہے۔ اس سے بے پروائی یا اس کی ناقدری کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔ اس خطبہ ہی کے لیے نمازِ جمعہ کی رکعتیں چار کی جگہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، صرف دو رکھی گئی ہیں اور دو رکعتوں کی جگہ خطبہ کو دی گئی ہے جو دو رکعتوں ہی کی طرح دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ پھر نماز ہی کی طرح خطبہ بھی، قرآن کی تصریح کے مطابق، ذکر اللہ ہے، یعنی خطبہ اور نماز دونوں کی روح ایک ہی بتائی گئی ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ نماز میں امام اور مقتدی سب اللہ کی طرف

متوجہ ہو کر ذکرِ الٰہی کرتے ہیں اور خطبہ میں امام لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر اللہ کی تذکیر کرتا ہے۔ اس زمانے میں یہ عجیب مصیبت ہے کہ اصل خطبۂ جمعہ چند معروف دعائیہ کلمات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور ائمہ حضرات اپنا سارا زورِ خطابت ان لمبی لمبی تقریروں پر صرف فرماتے ہیں جو وہ اصل خطبہ سے پہلے کرتے ہیں۔ ان تقریروں میں ذکر اللہ بہت کم اور دوسری غیر ضروری باتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں اور نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ سامعین یا تو اونگھتے ہیں یا سوتے ہیں اور جو سننے کی کوشش کرتے ہیں وہ طویل بیان سے تھک جاتے ہیں۔

ایک افسوسناک صورت حال

بہت سے لوگ ان لمبی تقریروں سے بچنے کے لیے مسجد میں اس وقت پہنچتے ہیں جب وہ خطبہ شروع ہوتا ہے جو ہے تو اصلی لیکن اس زمانے میں وہ بالکل ایک رسمی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ یہ صورت حال نہایت افسوس ناک ہے۔ ضروری ہے کہ اصل خطبہ کی اہمیت بحال کی جائے۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ لمبی لمبی تقریروں کی جگہ امام صاحبان اصل خطبہ ہی میں ضروری باتوں کی تذکیر کریں۔ خطبہ جامع، مختصر اور پُر حکمت ہو تاکہ لوگ دل چسپی سے سنیں اور مستفید ہوں۔ لوگوں کو تاکید کی جائے کہ خطبہ سننے کے لیے وہ ٹھیک وقت پر پہنچیں اور اس سے غفلت کے ان عواقب سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔

جمعہ کے روز مسلمان کے لیے پسندیدہ روش

تیسری یہ کہ قرآن کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ مسلمان کے لیے پسندیدہ روش، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ہے کہ جمعہ سے پہلے کا وقت وہ جمعہ کی تیاریوں میں صرف کرے۔ کوئی اور مصروفیت، بلا کسی شدید ضرورت کے، وہ ایسی نہ پیدا کرے جو اس تیاری میں مانع یا مخل ہو۔ یہ بات یوں نکلتی ہے کہ فرمایا ہے کہ، جب نماز ختم ہو جائے تب زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے رزق و فضل کے طالب بنو۔ ان الفاظ کے اندر یہ مضمون مضمر ہے کہ جمعہ کے دن کاروباری مصروفیت کے لیے موزوں وقت جمعہ سے پہلے کا نہیں بلکہ جمعہ کی نماز کے بعد ہی کا ہے بالخصوص اس طرح کی کاروباری مصروفیت جس کے لیے لوگوں کو بستی سے نکل کر زمین میں پھیلنے پر مجبور ہونا پڑے اور اندیشہ ہو کہ جمعہ کے لیے جو اجتماع مطلوب ہے اس انتشار سے اس کو نقصان پہنچے گا۔ ایک عام آدمی کو ہفتہ میں ایک دن ایسا ضرور ملنا چاہیے جس دن وہ حجامت بنوائے، کپڑے دھوئے، غسل کرے۔ ان کاموں کے لیے موزوں ترین دن جمعہ ہی کا ہو سکتا ہے اس لیے کہ یہ باتیں اس کے آداب میں سے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت فرمائی کہ جمعہ کے دن دوسری معاشی و کاروباری سرگرمیاں اگر ضروری ہوں تو جمعہ کے بعد ہی شروع ہوں۔ یہی طریقہ ہمارے سلفِ صالحین کا رہا ہے اور یہی طریقہ آج بھی ان حلقوں میں پسندیدہ ہے جن میں اسلامی شعائر اور اسلامی تہذیب کا شعور زندہ ہے۔

جمعہ سے متعلق جو باتیں براہِ راست قرآن مجید سے مستنبط ہوتی ہیں، ہم نے اپنے طریقہ کے مطابق،

اپنی بحث اسی نکتہ پر محدود رکھی ہے۔ دوسرے مسائل جن کا تعلق فقہ سے ہے، ہم نے ان سے تعرض نہیں کیا ہے۔ ان سطور پر اللہ تعالیٰ کی توفیق و رہنمائی سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی احسانہ۔

لاہور

۲۵۔ مارچ ۱۹۷۸ء

۱۴۔ ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۶۳

المنٰفِقُون

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(ا) سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ ــــ الجمعۃ ــــ کے تکملہ و تتمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سورۂ جمعہ کے آخر میں ان لوگوں کی کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے جو مدعی تو تھے ایمان کے لیکن اپنے دنیوی منافع اور کاروباری مصالح کے پھندوں میں اس طرح گرفتار تھے کہ کوئی تجارتی قافلہ آجاتا تو اس کی خبر پاتے ہی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خطبہ دیتے چھوڑ کر اس کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے۔ اس سورہ میں منافقین کے کردار سے بحث کی ہے کہ یہ ایمان کا کوئی مطالبہ پورا کرنے کا حوصلہ تو رکھتے نہیں لیکن یہ خواہش رکھتے ہیں کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نظر میں ان کا بھرم قائم رہے۔ اس کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ قسمیں کھا کھا کر پیغمبر کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ آپ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں لیکن اللہ بھی قسم کھا کر کہتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ان کے اعمال گواہ ہیں کہ یہ نہ اللہ پر ایمان رکھتے نہ رسول پر۔ یہ اپنی قسموں کو بطور ڈھال استعمال کر رہے ہیں اور ان کی آڑ میں اپنے نفاق کو چھپاتے ہیں۔ انھوں نے ایمان کی راہ میں جو قدم اٹھایا وہ مال و جان کی محبت میں پھنس کر واپس لے لیا اس وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے اور اب وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔

(ب) سورہ کے مطالب کی ترتیب

سورہ کے مطالب کی ترتیب بالکل واضح ہے۔ اس کے پہلے رکوع میں جو آٹھ آیات پر مشتمل ہے، منافقین کے کردار سے بحث ہے جس میں ان کی اصل بیماری یہ بتائی گئی ہے کہ یہ دنیا کی محبت میں گرفتار ہیں۔ دوسرے رکوع میں صرف تین آیتیں ہیں جن میں مسلمانوں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ وہ مال و اولاد کی محبت میں پھنس کر اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ اگر آج انھوں نے اللہ کی راہ میں انفاق کر کے اپنے مال سے صحیح فائدہ نہ اٹھایا تو مہلتِ حیات گزر جانے کے بعد اپنی محرومی پر پچھتائیں گے اور یہ پچھتانا بالکل بے سود ہوگا۔ گویا پہلے رکوع میں مرضِ نفاق کے اصل سبب کی نشان دہی کی گئی ہے اور دوسرے میں اس سے مسلمانوں کو بچنے کی تاکید ہے۔

سُوْرَةُ الْمُنٰفِقِيْنَ (۶۳)

مَدَنِيَّةٌ ______ آیات: ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ آیات ۱-۱۱
يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ (۱)
اِتَّخَذُوْٓا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ إِنَّهُمْ
سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲) ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا
فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۳) وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ
تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ؕ وَإِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَأَنَّهُمْ
خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ
فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ز أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۴) وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ
تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ
يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (۵) سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ
لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ إِنَّ اللّٰهَ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۶) هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا
عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۷﴾ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ
اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۚ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ
ع ۸ ۱۴ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ
يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹﴾ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا
رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ
رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ
الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۚ وَاللّٰهُ
ع ۲ ۱۴ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۱

جب منافق تمھارے پاس آتے ہیں، کہتے ہیں، ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک تم اس کے رسول ہو اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین بالکل جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور وہ اللہ کی راہ سے رک گئے ہیں۔ بے شک نہایت ہی برا ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ یہ پہلے ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا تو ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی پس یہ سمجھنے سے عاری ہو گئے۔ ۱-۳

اور جب تم ان کو دیکھتے ہو تو ان کے جسم تمھیں اچھے لگتے ہیں اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو تم ان کی بات سنتے ہو لیکن ان کی مثال ایسی ہے گویا وہ لکڑی کے کندے ہوں جنھیں دیوار سے ٹیک لگا دی گئی ہو۔ وہ ہر خطرہ اپنے ہی اوپر سمجھتے

ہیں۔ اصلی دشمن وہی ہیں، پس ان سے بچ کے رہو۔ اللہ ان کو غارت کرے! کس طرح ان کی عقل الٹ گئی ہے! ۴

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ، اللہ کا رسول تمہارے لیے استغفار کرے تو وہ اپنے سر مٹکاتے ہیں اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ غرور کے ساتھ اعراض کرتے ہیں۔ ان کے لیے یکساں ہے، تم ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو، اللہ ان کو ہرگز معاف کرنے والا نہیں ہے۔ اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ۵-۶

یہی ہیں جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر تم لوگ اپنے مال خرچ نہ کرو جو رسول اللہ کے ساتھ ہیں تاکہ وہ منتشر ہو جائیں۔ اور اللہ ہی کے ہیں آسمانوں اور زمین کے خزانے لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹے مدینہ کو تو جو غالب ہیں وہ وہاں سے ان کو نکال چھوڑیں گے جو بالکل بے حیثیت ہیں۔ حالانکہ غلبہ اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے لیکن یہ منافقین نہیں جانتے۔ ۷-۸

اے ایمان والو، اللہ کی یاد سے تمھیں غافل نہ کرنے پاویں تمھارے مال اور نہ تمھاری اولاد اور جو ایسا کریں گے تو یاد رکھیں کہ وہی لوگ گھاٹے میں پڑے اور ہم نے جو کچھ تمھیں بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ آدھمکے تم میں سے کسی کی موت، پھر وہ حسرت سے کہے کہ اے رب! تو نے مجھے کچھ اور مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ کرتا اور یوں نیکوکاروں میں سے بنتا! اور اللہ ہرگز کسی جان کو ڈھیل دینے والا نہیں جب کہ اس کی مقررہ مدت آپہنچے گی اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۹-۱۱

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (۱)

پختہ کار منافقین کا کردار

ایک گروہ کے منافقانہ طرزِ عمل کی طرف اشارہ پچھلی سورہ میں بھی ہوا ہے لیکن وہاں بات عام صیغہ سے درپردہ فرمائی گئی تھی، اس سورہ میں پردہ بالکل اٹھا دیا گیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس میں ان منافقین کا کردار زیرِ بحث ہے جو نفاق میں اتنے پختہ ہو چکے تھے کہ ان سے کسی اصلاح کی توقع باقی نہیں رہی تھی چنانچہ ان کے بارے میں آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا بھی ہے کہ ان کے لیے تم مغفرت مانگو بھی تو اللہ ان کی مغفرت کرنے والا نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے مقام میں یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر تم ستر بار بھی ان کے لیے مغفرت مانگو جب بھی اللہ ان کی مغفرت فرمانے والا نہیں ہے۔

فرمایا کہ یہ منافقین جب تمہارے پاس (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس) آتے ہیں تو قسم کھا کر اقرار کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن اللہ بھی قسم کھا کر کہتا ہے کہ یہ منافقین بالکل جھوٹے ہیں۔

ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ عربی میں 'نَشْهَدُ' اور 'وَاللّٰهُ يَشْهَدُ' کے الفاظ قسم کے مفہوم کے حامل ہوتے ہیں۔ یعنی منافقین قسمیں کھا کھا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مومن و مسلم ہونے کا یقین دلاتے ہیں۔ ان کو قسمیں کھانے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آتی کہ ان کی پیہم غلطیوں نے ان کو اس قدر ساقط الاعتبار بنا دیا تھا کہ وہ خود بھی محسوس کرنے لگے تھے کہ جب تک قسم کھا کے وہ بات نہیں کہیں گے کوئی اس کو باور نہیں کرے گا۔ جس آدمی کو اپنے عمل پر اعتماد ہوتا ہے وہ بے ضرورت قسم نہیں کھاتا لیکن جس کو اپنے عمل پر بھروسہ نہ ہو اس کا واحد سہارا قسم ہی ہوتی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ زیادہ قسم کھانے والے کی صفت قرآن میں 'مَهِيْن' آئی ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (القلم - ۶۸: ۱۰) (اور تم زیادہ قسمیں کھانے والے ذلیل کی بات پر کان نہ دھرو)۔

'وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ' یہ فقرہ غایت درجہ بلیغ اور برمحل ہے۔ فرمایا کہ جہاں تک تمہارے رسول ہونے کا تعلق ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان کی شہادت کی محتاج نہیں ہے۔ اللہ کو خوب علم ہے کہ تم اس کے رسول ہو۔ لیکن اللہ یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین اپنی اس شہادت میں جھوٹے ہیں۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲)

قسم کو سپر بنانے والوں کا انجام

لیکن انھوں نے تمھاری گرفت سے محفوظ رہنے کے لیے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہے کہ ان کی سازشوں اور شرارتوں کے سبب سے، جو وہ اسلام کے خلاف برابر کر رہے ہیں، تمھیں ان کے بارے میں کوئی شبہ نہ ہو، وہ اسلام کے برابر مخلص سمجھے جاتے رہیں۔ سورۂ مجادلہ آیت ۱۴ میں ان منافقین ہی کی یہ سازش بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے خدا کی مغضوب قوم یہود سے دوستی گانٹھ رکھی ہے۔ ایک طرف اپنی قسموں کے ذریعہ سے انھیں اطمینان دلا رکھا ہے کہ ہم آپ لوگوں کے ساتھ ہیں، دوسری طرف مسلمانوں کو بھی قسم کھا کر اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم تو آپ لوگوں کے ساتھی ہیں۔ اس کے بعد معمولی تغییر الفاظ کے ساتھ یہی آیت وہاں بھی آئی ہے۔ فرمایا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ (المجادلة - ۵۸ : ۱۶)

انھوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے پس وہ اللہ کی راہ سے رک گئے اور ان کے لیے ایک ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

یعنی اس سپر کی آڑ میں وہ بزعم خود اپنے کو یہود سے بھی محفوظ کیے ہوئے ہیں اور مسلمانوں سے بھی اور اس طرح انھوں نے اللہ کی راہ میں جو قدم اٹھایا تھا وہ روک لیا ہے لیکن یہ پناہ گاہ زیادہ عرصہ تک ان کی حفاظت نہ کر سکے گی بلکہ بہت جلد ان کو ایک ذلیل کرنے والے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، لفظ 'صَدٌّ' لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ لازم کے مفہوم میں ہے۔ یعنی پہلے اسلام کی طرف انھوں نے قدم بڑھایا لیکن قسموں کی آڑ میں اب رک گئے۔ ان کا گمان یہ ہے کہ جب مجرد قسموں کے بل پر بھی اپنی اسلامیت کی دھونس جمائی جا سکتی ہے اور مسلمانوں کو دھوکا دیا جا سکتا ہے تو اس سے آگے بڑھ کر اپنے لیے خطرات کو کیوں دعوت دی جائے۔ فرمایا کہ 'اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ' وہ اس کو بڑی دانشمندانہ سیاست سمجھ رہے ہیں لیکن یہ دانشمندانہ سیاست نہیں بلکہ نہایت ہی احمقانہ چال ہے جس کے نہایت مہلک نتائج ان کے آگے آئیں گے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۳)

فرمایا کہ یہ راہ انھوں نے اس وجہ سے اختیار کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے جس کے سبب سے وہ فکر سلیم کی نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس مہر کے لگنے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کی راہ اختیار کر لی۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جن کو وہ ایک مرتبہ اسلام کی روشنی دکھا دیتا ہے اگر وہ اس کی قدر کرتے ہیں تو ان کی روشنی میں اضافہ کرتا ہے اور اگر قدر نہیں کرتے بلکہ مڑ مڑ کر پیچھے ہی کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کی وہ روشنی بھی سلب ہو جاتی ہے اور ان کے دل پر مہر بھی کر دی جاتی ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ صحیح سوچنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ یہود کے دلوں پر جو مہر لگی اس کے وجوہ اور اثرات کی تفصیل سورۂ بقرہ میں بیان ہوئی ہے۔ اس پر ایک

نظر ڈال لیجیے۔ انہی لوگوں کے بارے میں حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ ان سے وہ بھی لے لیا جاتا ہے جو ان کے پاس ہوتا ہے۔

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۖ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۖ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۖ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ (۴)

منافقین کے ظاہر و باطن کی تصویر

یہ ان منافقین کی تصویر ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں ان کے ظاہر اور باطن دونوں کی اس طرح تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ کوئی پہلو بھی مخفی نہیں رہ گیا ہے۔ اوپر کے دو فقروں میں ان کے ظاہر کی تصویر ہے۔ بعد کے دو فقروں میں ان کے باطن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے ہوشیار رہنے کی تاکید اور ساتھ ہی ان کی حالت پر اظہارِ افسوس ہے۔

'وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ'۔ فرمایا کہ جب تم ان کو دیکھتے ہو تو ان کے پلے ہوئے جسم اور ان کی پالش کی ہوئی شکلیں تمھیں دل کش معلوم ہوتی ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ ان منافقین کے مالی حالات اچھے تھے۔ اوّل تو انھوں نے حرام و حلال، ہر راستہ سے، دولت اکٹھی کر رکھی تھی۔ دوسرے یہ انتہا درجہ کے بخیل تھے، اپنے ذاتی آرام و عیش کے سوا کسی دوسرے دینی و اجتماعی کام پر کوڑی بھی خرچ کرنے کے روادار نہ تھے۔ ان کی اس رفاہیت کا اثر ان کے جسموں اور ان کی شکلوں میں نمایاں تھا۔ ان کا سردار مشہور منافق عبداللہ بن اُبی بڑا دولت مند تھا۔ اس کے پیچھے کے دوسرے آدمی بھی خوش حال تھے۔

'وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ'۔ یعنی یہ بڑے چرب زبان بھی ہیں۔ جب باتیں کرتے ہیں تو اسلام کی محبت و حمایت میں اس طرح تقریر کرتے ہیں کہ مخاطب کا دل موہ لیتے ہیں اور وہ ان کی باتیں سننے لگتا ہے۔ اوپر ذکر آیا ہے کہ یہ لوگ اللہ و رسول کو اپنی وفاداری کا یقین اپنی قسموں اور جادو بیانی سے دلاتے ہیں۔ سورۂ محمد میں ان کی یہ خصوصیت بھی بیان ہوئی ہے کہ یہ زبان سے جوشِ جہاد کا اظہار بہت کرتے ہیں لیکن جب جہاد کا حکم دے دیا گیا تو چھپنے لگے۔ ان منافقین کو چونکہ اندازہ تھا کہ ان کی بزدلی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ظاہر ہے اور عام مسلمانوں پر بھی اس وجہ سے جب بھی یہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو کوشش کرتے کہ اپنے زورِ خطابت سے حضورؐ کو یہ باور کرا دیں کہ وہ اسلام کے فدائی اور اس کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے والے ہیں۔ حضورؐ اگرچہ زبان کے ان غازیوں سے اچھی طرح واقف تھے لیکن کریم النفسی کے سبب سے آپؐ ان کی باتیں سن لیتے جس سے ان کو اطمینان ہو جاتا کہ ان کی جادو بیانی کارگر ہوگئی۔

'كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ'۔ یہ ان کے باطن پر عکس ڈالا گیا ہے کہ ہر چند ان کے جسم اور ان کی شکلیں دل کش ہیں لیکن ان کے جسموں کے اندر جو دل ہیں وہ مردہ ہیں۔ ان پر، جیسا کہ اوپر وال

والی آیت میں فرمایا، اللہ تعالیٰ نے مہر کر دی ہے۔ اس روحانی اور قلبی مرض کے سبب سے تمہاری مجلس میں ان کی مثال بالکل ایسی ہوتی ہے کہ گویا لکڑی کے کھڑے کندے ہوں جنھیں لباس پہنا کر دیوار سے ٹیک لگا دی گئی ہو۔

'یَحْسَبُوْنَ کُلَّ صَیْحَۃٍ عَلَیْهِمْ'۔ 'صَیْحَۃ' کے لغوی معنی تو چیخ کے ہیں لیکن یہ خطرہ کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہاں اسی معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ لوگ اپنی طلاقتِ لسانی سے تمھیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ بڑے بہادر اور اسلام کی راہ میں ہر قربانی کے لیے تیار ہیں لیکن یہ پرلے سرے کے بزدل ہیں۔ کہیں بھی کوئی خطرہ نمودار ہو یہ اپنی بزدلی کے سبب سے خیال کرتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ بجلی انہی پر گرنے والی ہے۔ جن کی بزدلی کا یہ حال ہے ان سے اس وقت کیا توقع کی جا سکتی ہے جب فی الواقع انھیں کسی حقیقی خطرے کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔

'هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ'۔ یعنی یہ تو اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے تمہاری نظروں میں دوسروں کو مشکوک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اسلام کے اصلی دشمن درحقیقت یہی ہیں۔ ان سے ہر وقت چوکنے رہو۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ ان منافقین کی ایک چال یہ بھی تھی کہ یہ جن جرائم کا ارتکاب خود کرتے ان کا الزام دوسرے بے گناہ مسلمانوں کے سر تھوپتے تاکہ حضورؐ کے سامنے یہ بے گناہ بنے رہیں۔

'قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ'۔ یہ ان کو زجر و ملامت بھی ہے اور ان کے حال پر اظہارِ افسوس بھی۔ فرمایا کہ اللہ ان کو غارت کرے! یہ کس طرح اوندھے کر دیے گئے ہیں کہ ان کا ہر قدم الٹا ہی پڑ رہا ہے!

ان منافقین کے اس کردار کی تصویر قرآن میں جگہ جگہ کھینچی گئی ہے۔ ہم بخیالِ اختصار صرف ایک مثال سورۂ بقرہ سے پیش کرتے ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُکَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ

(البقرۃ - ۲ : ۲۰۴ - ۲۰۶)

اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جن کی بات دنیا کی زندگی کے باب میں تمہیں دل کش لگتی ہے اور وہ اپنے دل کے حال پر اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں حالانکہ وہ بدترین دشمن ہیں اور جب وہ تمہارے پاس سے ہٹتے ہیں تو ان کی ساری بھاگ دوڑ زمین میں اس لیے ہوتی ہے کہ اس میں فساد برپا کریں اور حرث و نسل کو تباہ کریں۔ اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا اور جب ان کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو عزت کا خیال ان کو گناہ میں گرفتار کر لیتا ہے تو ان کے لیے جہنم کافی ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْ لَکُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَیْتَهُمْ

يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (۵)

جھوٹی عزت نفس

یہ وہی بات ذرا مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہے جو سورۂ بقرہ کی مندرجہ بالا آیت میں 'وَاِذَا قِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی سازشوں اور شرارتوں کے نوٹس میں آنے کے بعد جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر توبہ کرو تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے لیے استغفار کریں اور آپؐ کا استغفار اللہ کے ہاں تمہارے لیے سفارش بنے تو اکڑتے اور اپنے سر مٹکاتے ہیں اور نہایت غرور کے ساتھ اس سے اعراض کرتے ہیں۔

ان کے مغرورانہ اعراض کا اظہار ان کے جوارح سے جس طرح ہوتا ہے اس کی تعبیر 'لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ' کے الفاظ سے کی گئی ہے اور یہ بلیغ ترین تعبیر ہے۔ باطن میں اس کا جو اثر مترتب ہوتا ہے اس کو 'يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ' کے الفاظ سے بیان فرمایا گیا ہے۔ گویا ان کا ظاہر و باطن دونوں سامنے کر دیا گیا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جن لوگوں کے اندر اخلاقی جرأت نہیں ہوتی وہ اپنے گناہوں کے ظاہر ہو جانے کے بعد بھی ان کا اعتراف یا ان پر اظہار ندامت نہیں کرتے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ایک بار اعتراف جرم کر لیا تو ہمیشہ کے لیے بھرم ختم ہو جائے گا۔ ان کی یہ کمزوری ان کو ان کے گناہوں کے ساتھ باندھے رکھتی ہے۔ اسی چیز کو سورۂ بقرہ والی آیت میں 'اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۶)

گناہوں پر اصرار کرنے والوں کو اللہ مغفرت سے محروم کر دیتا ہے

ان کے اس مغرورانہ اعراض کی سزا ان کو یہ ملی کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ان کے بارے میں یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ تم ان کے لیے مغفرت مانگو یا نہ مانگو، اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنی ہدایت سے نہیں نوازتا جو نافرمانی پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ ہدایت صرف انہی کو دیا کرتا ہے جو اپنے گناہوں پر شرمسار ہو کر اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سورۂ نساء میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ
اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ
لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝
(النساء: ۴: ۶۴)

اور اگر وہ، جب کہ انھوں نے اپنی
جانوں پر ظلم کیا تھا، تمہارے پاس آتے اور اللہ
سے مغفرت مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت
مانگتا تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربانؐ
پاتے۔

جو لوگ اللہ اور رسول سے اکڑتے ہیں سورۂ توبہ میں ان کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ (التوبة ۹: ۸۰)

ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو۔ اگر تم ستر بار بھی ان کے لیے مغفرت چاہو گے تو بھی اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۭ وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ (۷)

اللہ تعالیٰ کے غضب کا سبب

یہ سبب بتایا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے اس غضب کے مستحق کیوں ٹھہرے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے لیے ستر بار مغفرت مانگیں جب بھی اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمانے والا نہیں ہے۔ ارشاد ہوا کہ یہی لوگ ہیں جو لوگوں کو روکتے ہیں کہ رسول اللہ کے ساتھیوں پر خرچ نہ کرو تاکہ یہ منتشر ہو جائیں۔

روایات میں آتا ہے کہ ۶ھ میں غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چشمہ پر پڑاؤ ڈالا وہاں پانی کے بارے میں ایک غریب مہاجر اور ایک انصاری میں جھگڑا ہو گیا۔ مہاجر نے انصاری کے تھپڑ مار دی۔ انصاری نے انصار کی دہائی دی اور مہاجر نے مہاجرین کی۔ دونوں طرف کے آدمی تلواریں سونت سونت کر اکٹھے ہو گئے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بات زیادہ بڑھنے نہ پائی۔ لیکن عبداللہ بن اُبیّ نے جو اس طرح کے مواقع کی ہمیشہ گھات میں رہتا، موقع سے فائدہ اٹھا کر مہاجرین کے خلاف انصار کے جذبات بھڑکانے کے لیے نہایت زہر آلود فقرے کہے۔ اس نے کہا کہ "یہ ہمارے گھر میں پناہ پا کر اب ہمیں پر غرّانے لگے ہیں۔ سچ کہا ہے جس نے کہا ہے کہ کتے کو موٹا کرو بالآخر تمہی کو کاٹے گا۔ خدا کی قسم! اب ہم پلٹے تو جو با عزت ہیں وہ رذیلوں کو وہاں سے نکال کے رہیں گے۔"

انصار کے جو آدمی اس دوران میں اس کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے ان کو مخاطب کر کے اس نے کہا: "یہ تمہاری اپنی غلطی کا خمیازہ ہے جو تمہیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ تم نے اپنے گھروں میں ان کو اتارا اور اپنے مال میں ان کو حصہ دار بنایا۔ خدا کی قسم! اگر تم ان کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیتے تو یہ کب کے یہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے ہوتے۔"

آیت میں اس کے انہی فقروں میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جن کے دلوں کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہ بغض و حسد بھرا ہوا ہے اللہ تعالیٰ ان کو کیسے معاف کر سکتا ہے!

عبداللہ بن ابی کے طعنوں کا جواب

'وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ' یہ عبداللہ بن ابی کی بات کا جواب ہے کہ یہ منافق سمجھتا ہے کہ اگر وہ اور اس کے ساتھی مہاجرین کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیں گے تو ان کا کوئی سہارا باقی نہیں رہ جائے گا حالانکہ آسمانوں اور زمین کے سارے خزانے اللہ ہی کے قبضہ میں ہیں۔ وہی جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے لیکن ان منافقوں کے سر

پر چونکہ مہر لگ چکی ہے اس وجہ سے یہ اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۭ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۸)

یہ عبداللہ بن اُبی کے اس دوسرے زہر آلود فقرے کی طرف اشارہ ہے جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔ اس نے انصار کو مہاجرین کے خلاف اکسانے کے لیے یہ بھی کہا کہ اب مدینہ واپس ہوتے ہی پہلا کام یہ کرنا ہے کہ جو عزت و اقتدار والے ہیں (یعنی انصار) وہ ان لوگوں کو مدینہ سے نکال باہر کریں گے جو ذلیل ہیں۔ یہ اشارہ اس کا مہاجرین کی طرف تھا۔ یعنی اس نے وہی جاہلی نعرہ لگایا جو اہل عرب کا شعار تھا کہ اس سرزمین پر ہم ہمیشہ عزت و اقتدار والے رہے ہیں اور یہ ہمارا ہی حق ہے۔ ہم یہ کس طرح گوارا کر سکتے ہیں کہ جو ہمارے ہاں پناہ لینے آئے وہ ہمارے آدمیوں کو طمانچے لگائیں!

'وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ' یہ اس نعرۂ جاہل کا جواب ہے کہ عزت تو اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کے لیے ہے اور سنتِ الٰہی کے مطابق اب اس کے ظہور کا وقت آگیا ہے لیکن یہ منافقین اس کو نہیں جانتے۔ اس سنت کا حوالہ سورۂ مجادلہ میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت
وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰۗىِٕكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ○	کر رہے ہیں ذلیل ہونے والے وہی بنیں گے۔
كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ	اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا
اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ○	اور میرے رسول، بے شک اللہ قوی اور غالب
(المجادلۃ - ۵۸: ۲۰-۲۱)	ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۹)

مسلمانوں کو تنبیہ

یہ آخر میں مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی کہ تم ان منافقوں کی روش کی تقلید نہ کرنا۔ ان کو مال و اولاد کی محبت نے خدا سے غافل کر دیا ہے۔ اب ان کے اندر آخرت کے لیے کچھ کرنے کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔ اگر تم بھی انہی کی طرح مال و اولاد کی محبت میں پھنس کر خدا اور آخرت کو بھول بیٹھے تو یاد رکھو کہ اصل نامرادی و محرومی یہی ہے۔ جو لوگ اللہ کو بھلا بیٹھتے ہیں وہ خود اپنے انجام کو بھلا بیٹھتے ہیں اور شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ سورۂ مجادلہ میں منافقین کے بارے میں فرمایا ہے: اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ

الْخٰسِرُوْنَ' (المجادلۃ - ۵۸: ۱۹) (ان پر شیطان نے قابو پالیا ہے پس ان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ یہی لوگ شیطان کی پارٹی ہیں اور سن لو کہ شیطان کی پارٹی ہی بالآخر نامراد ہونے والی ہے)۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۱۰)

یہ اللہ تعالیٰ کی یاد کو زندہ رکھنے، مال و اولاد کے فتنہ سے بچنے اور نفاق کے حملے سے محفوظ رہنے کا طریقہ بتایا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمھیں بخشا ہے ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی موت سے پہلے پہلے اس میں آخرت کے لیے جو کمائی کرنی ہے کرلے۔ ایسا نہ ہو کہ موت آدھمکے تب وہ حسرت کے ساتھ کہے کہ اے رب! تو نے مجھے کچھ اور مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ کرتا۔ اگر ایسا کر سکتا تو میں بھی صالحین کے زمرہ میں ہوتا!

سورۂ توبہ میں منافقین کے کردار کا یہ پہلو خاص طور پر نمایاں ہوا ہے کہ وہ بخل کے سبب سے اپنی مٹھیاں بھینچے رہتے ہیں۔ جب یہ غریب تھے تو ہر جگہ یہ اپنے اس شوق اور اس تمنا کا اظہار کرتے تھے کہ اگر اللہ نے ہمارے حالات بھی سدھار دیے تو ہم اللہ کی راہ میں خوب خرچ کریں گے اور دین کی بڑی بڑی خدمتیں کر کے صالحین میں اپنا نام روشن کریں گے لیکن جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کی تمنا پوری کردی تو منہ پھیر کر چل دیے۔ اس بخل کی پاداش میں خدا نے ان کے دلوں کے اندر نفاق کی جڑ جما دی اور صدقہ کر کے صالحین میں سے بننے کا جو موقع خدا نے انھیں عطا کیا تھا وہ اس سے محروم ہو گئے۔ فرمایا ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا	اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنھوں نے عہد کیا
مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ	کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل سے نوازا تو ہم خوب
الصّٰلِحِيْنَ ۰ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ	صدقہ کریں گے اور صالحین میں سے ہوں گے۔ تو
بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ	جب اللہ نے ان کو اپنے فضل میں سے عطا
مُّعْرِضُوْنَ ۰ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا	فرمایا وہ اس میں بخیل بن بیٹھے اور برگشتہ ہو کر منہ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ	پھیر لیا تو اس کی پاداش میں خدا نے ان کے دلوں
(التوبۃ - ۹: ۷۵-۷۷)	میں نفاق جما دیا۔

سورۂ حدید کی تفسیر سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انفاق سے پہلو تہی کرنے والے اس دنیا ہی میں نفاق سے آلودہ ہو کر مومنین صالحین سے ممیز نہیں ہو جاتے بلکہ آخرت میں بھی وہ اس کے نتائج سے اس طرح دوچار ہوں گے کہ صورتِ حال ان کے لیے حسرت کا باعث ہو گی۔ دنیا میں صدقہ کرنے والے مردوں اور عورتوں کو اللہ تعالیٰ وہاں صالحین کے اس زمرہ کے ساتھ اٹھائے گا جس میں صدیقین اور شہدا

ہوں گے اور نور جن کا ہم رکاب ہو کر جنت کی طرف رہنمائی کرے گا۔ منافق مرد اور عورتیں اس نور سے حصہ نہ پا سکیں گے۔ ان کے اور صالحین کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی۔ وہاں ان پر واضح کر دیا جائے گا کہ صالحین کے زمرہ میں شامل ہونے کی شرط انفاق اور صدقہ تھا جس سے دنیا میں انھوں نے گریز کیا۔

اس آیت میں 'اَكُنْ' جو مضارع کی ساکن شکل ہے، کا عطف بظاہر 'فَاَصَّدَّقَ' پر ہے جو منصوب ہے لیکن ہمارے نزدیک اصل میں 'اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ' شرط محذوف کا جواب ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہو گا کہ اگر میں یہ صدقہ کر سکتا تو نیکوکاروں میں سے بنتا۔ 'فَاَصَّدَّقَ' کی صورت میں چونکہ اس شرط کا قرینہ واضح تھا اس وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا۔

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۱)

یعنی جب موت کی گھڑی سر پر آ جائے گی تو اس قسم کی حسرت، حسرت ہی رہے گی۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔ زندگی کی فرصت گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کسی کو مہلت نہیں دیا کرتا اور اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پتہ ہے کہ آج انفاق اور نیکی کی زندگی بسر کرنے کا جو عہد تم کر رہے ہو یہ بالکل بے حقیقت ہے۔ اگر تمھیں مزید مہلت بھی مل تو تم وہی کرو گے جو اب تک کرتے رہے ہو۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر بتوفیقِ ایزدی تمام ہوئی۔ فللّٰہ الحمد ولہ المنۃ۔

لاہور

۳۰۔ مارچ ۱۹۷۸ء

۱۹۔ ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

٦٤

التّغابن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ ـــــــ المنافقون ـــــــ اس تنبیہ پر ختم ہوئی ہے کہ مال و اولاد کی محبت میں پھنس کر اللہ کی یاد اور اس کے حقوق سے غافل نہ ہونا بلکہ جو رزق و فضل اس نے بخشا ہے اس میں آخرت کے لیے کمائی کرلو۔ ورنہ جب موت کی گھڑی آجائے گی تو غفلت کرنے والے حسرت سے کہیں گے کہ کاش اللہ تعالیٰ ان کو تھوڑی سی مہلت دیتا تو وہ اپنا مال اس کی راہ میں خرچ کرکے کچھ نیکی کی کمائی کر لیتے لیکن ان کی یہ حسرت، حسرت ہی رہے گی۔ گزرا ہوا وقت پھر واپس نہیں آتا۔ اس سورہ میں اسی مضمون کو عمود کی حیثیت سے لیا ہے اور یہ واضح فرمایا ہے کہ اس دنیا کی زندگی ہی کل زندگی نہیں ہے بلکہ اصل زندگی آخرت کی ہے جو شدنی ہے اور یہ فیصلہ وہیں ہونا ہے کہ اس دنیا میں آکر کون ہارا اور کون جیتا تو جو آخرت کی فوزِ عظیم حاصل کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو اس پر واجب ہے کہ وہ اللہ و رسول کی رضا جوئی کی راہ میں ہر قربانی کے لیے تیار رہے اور اس معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت اور کسی ناصح کی نصیحت کی پروا نہ کرے۔ بسا اوقات آدمی کے بیوی بچے اس راہ میں مزاحم ہوتے ہیں اور ان کی محبت بہتوں کو پست حوصلہ کر دیتی ہے۔ جو شخص اپنے ایمان کو سلامت رکھنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس راہ میں رکاوٹ بننے والے بیوی بچوں کو بھی اپنے لیے فتنہ سمجھے اور ان سے بچ کے رہے۔ اگرچہ ان کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ رکھے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) اللہ نے انسان کو اس دنیا میں بے غایت و بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ انسان کی تخلیق میں قدرت کا جو اہتمام نمایاں ہے وہ خود اس بات پر شاہد ہے کہ اس کے لیے جزا و سزا کا ایک دن مقرر ہے اور اللہ جو سارے جہان کا خالق و مالک ہے وہ ہر ایک کے ہر قول و فعل سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔

(۵-۷) تاریخ سے اس بات کی شہادت کہ جن قوموں نے رسولوں کے انذارِ قیامت کی تکذیب کی اور ان کے نہایت واضح دلائل اس غرور کی بنا پر رد کر دیے کہ کسی بشر کو رسول ماننا انھوں نے اپنی توہین خیال کیا، ان کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک کر دیا۔ وہ اس دنیا میں بھی کیفرِ کردار کو پہنچیں اور آخرت میں بھی ان کے

لیے دردناک عذاب ہے۔

(۸-۱۰) اللہ اور رسول اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت اور اس دن کے لیے تیار رہنے کی ہدایت جو ہار جیت کے فیصلہ کا اصلی دن ہوگا جس دن ایمان اور عمل صالح والوں کو اللہ تعالیٰ جنت کی فوزِ عظیم سے سرفراز فرمائے گا اور جنھوں نے کفر و تکذیب کا ارتکاب کیا ہوگا ان کو ہمیشہ کے لیے دوزخ کے عذاب میں جھونک دے گا۔

(۱۱-۱۳) دنیا میں جو مصیبتیں بھی پیش آتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے پیش آتی ہیں۔ اہلِ ایمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان سے ڈر کر اللہ اور رسول کی اطاعت سے منہ موڑ لیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ پر بھروسہ رکھیں کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا۔ اگر مصائب سے مرعوب ہو کر اللہ و رسول سے اعراض کریں گے تو اس کا خمیازہ وہ بھگتیں گے۔ رسول کا کام پہنچا دینا تھا، وہ اس نے کر دیا۔ اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔

(۱۴-۱۵) مسلمانوں کو یہ تنبیہ کہ آدمی کے بیوی بچے بسا اوقات اس کے لیے فتنہ بن جاتے ہیں۔ ان کی محبت میں پھنس کر وہ دین کے تقاضے پورے کرنے کا حوصلہ کھو بیٹھتا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہر شخص اس امر پر نگاہ رکھے کہ ان کی محبت یا ان کی خواہشیں دین کی راہ میں اس کے لیے زنجیر پا نہ بننے پائیں اگرچہ ان کے ساتھ معاملہ عفو و درگزر ہی کا رکھے۔

(۱۶-۱۸) اللہ و رسول کی تا حدِ مقدور اطاعت کی دعوت اور دین کی راہ میں فراخ دلانہ انفاق کی ترغیب۔ ان لوگوں کو بڑی فوز و فلاح کی بشارت جو اپنے آپ کو حرص و بخالت کی بیماری سے محفوظ رکھیں گے۔ جو لوگ اللہ کو قرض دیں گے، اللہ ان کے دیے ہوئے قرض کو قدردانی کے ساتھ قبول کرے گا۔ اس کو مضاعف کر کے ان کو لوٹائے گا۔ ان کی مغفرت فرمائے گا۔ وہ غائب و حاضر سب کا جاننے والا ہے۔ وہ کسی کی نیکی سے بے خبر نہیں ہے، اگرچہ وہ کتنی ہی پوشیدہ طور پر کی جائے۔

سُورَةُ التَّغَابُنِ (۶۴)

مَدَنِيَّةٌ ——— آیات: ۱۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ
آیات ۱-۱۸ الْحَمْدُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ
فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲﴾ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ
الْمَصِيْرُ ﴿۳﴾ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ
وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴﴾ اَلَمْ يَاْتِكُمْ
نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۡ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ
وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۶﴾ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ
قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۷﴾ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ
اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۸﴾ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ

الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۗ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا
يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ۗ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۹﴾ وَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ
ع ۱۵ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۰﴾ مَاۤ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَنْ
يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ وَاَطِيْعُوا
اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا
الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۲﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ
عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۗ
وَاللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا
وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ
لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
ع ۸ ۱۶ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

ترجمۂ آیات ۱-۱۸ اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ اسی کی
بادشاہی ہے اور وہی سزاوارِ شکر ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا تو کوئی تم میں کافر ہے اور کوئی مومن۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اللہ کی نظر میں ہے۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس نے تمھاری صورت گری کی تو اس نے تمھاری صورتیں اچھی بنائیں اور اسی کی طرف لوٹنا ہو گا۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو۔ اور اللہ باخبر ہے سینوں کے بھیدوں سے بھی۔ ۲-۴

کیا تمھیں ان لوگوں کا احوال نہیں پہنچا جنھوں نے اس سے پہلے کفر کیا! تو انھوں نے اپنے کیے کا وبال چکھا اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ یہ اس سبب سے کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیوں کے ساتھ آتے رہے تو انھوں نے کہا کہ کیا بشر ہماری رہنمائی کریں گے! پس انھوں نے کفر کیا اور منہ موڑا اور اللہ ان سے بے پروا ہو گیا اور اللہ بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ ۵-۶

جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ہرگز مرنے کے بعد اٹھائے نہیں جانے کے۔ کہہ دو، ہاں میرے رب کی قسم! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر تم کو بتایا جائے گا جو کچھ تم نے کیا ہو گا۔ اور یہ کام اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ تو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے باخبر ہے۔ ۷-۸

اس دن کو یاد رکھو جب اللہ اکٹھے کیے جانے کے دن کے لیے تم کو اکٹھا کرے گا۔ وہی دن درحقیقت ہار جیت کا دن ہو گا۔ اور جو ایمان لائے اور جنھوں نے

عمل صالح کیے ہوں گے اللہ ان کے گناہوں کو جھاڑ دے گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے بڑی کامیابی درحقیقت یہ ہے! اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی لوگ دوزخ والے ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہوگا۔ ۹-۱۰

جو مصیبت بھی آتی ہے اللہ کے اذن سے آتی ہے۔ اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کی رہنمائی کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ پس اگر تم اعراض کرو گے تو ہمارے رسول پر صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ بھروسہ کریں اہل ایمان۔ ۱۱-۱۳

اے ایمان والو! تمھاری بیویوں اور تمھاری اولاد میں سے بعض تمھارے لیے دشمن ہیں تو ان سے بچ کے رہو اور اگر تم معاف کرو گے، درگزر کرو گے اور بخشو گے تو اللہ غفور رحیم ہے۔ تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھارے لیے امتحان ہیں اور اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔ تو اللہ سے ڈرتے رہو جہاں تک ہو سکے اور سنو اور مانو اور خرچ کرو اپنی بھلائی کے لیے۔ اور جو حرص نفس کی بیماری سے محفوظ رکھے گئے وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ اگر تم اللہ کو قرض حسن دو گے تو وہ اس کو تمھارے لیے مضاعف کرے گا اور تمھیں بخشے گا اور اللہ قدردان اور بردبار ہے۔ جاننے والا ہے غائب و حاضر کا۔ عزیز و حکیم ہے۔ ۱۴-۱۸

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱)

یہ پوری کائنات خدا ہی کی بندگی کی دعوت دے رہی ہے

یہ آیت الفاظ کے معمولی رد و بدل کے ساتھ پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ یہاں یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ ہی کی تسبیح کرتی اور اپنے عمل سے انسانوں کو یہ درس دے رہی ہے کہ اس کائنات کی بادشاہی تنہا اللہ ہی کی ہے اور شکر کا سزاوار وہی ہے، نہ اس کی بادشاہی میں اس کا کوئی شریک و سہیم ہے اور نہ بندوں کے شکر کا اس کے سوا کوئی دوسرا حق دار ہے۔

خدا کا کوئی شریک نہیں

'وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ' اور یہ بات بھی واضح ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے، اپنے کسی کام میں، خواہ کتنا ہی بڑا ہو، کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے اس وجہ سے کسی کو اس کا شریک ٹھہرانا ایک بالکل بے معنی بات ہے۔ اس نے نہ دنیا کے پیدا کرنے میں کسی کی مدد حاصل کی اور نہ اس کے انتظام و انصرام میں وہ کسی کا محتاج ہوا بلکہ اس نے سب کچھ تنہا اپنے بل بوتے پر کیا ہے اور جس طرح پہلے کیا ہے اسی طرح آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ اس وجہ سے بندوں کے اعتماد کے لیے وہ تنہا کافی ہے۔ ان کو چاہیے کہ اسی پر بھروسہ کریں اور اس کی بندگی میں کسی دوسرے کو شریک نہ کریں۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲)

ان کے لیے اپنے اختیار کے سوء استعمال کی سزا بھگتنی لازمی ہے

یعنی اسی خدا نے، جس کی تسبیح تمام کائنات کر رہی ہے، تم کو بھی پیدا کیا ہے اس وجہ سے حق تو یہ تھا کہ تم بھی اسی کی تسبیح کرتے جس کی تسبیح آسمان کے تمام ستارے، فضا کے تمام پرندے اور زمین کے تمام شجر و حجر کر رہے ہیں لیکن تم کو خدا نے اختیار بخشا ہے اس وجہ سے تم میں کافر بھی ہیں اور مومن بھی چنانچہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے اور وہ ہر ایک کے ساتھ اس کے عمل کے مطابق ہی معاملہ کرے گا۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی نگاہوں میں کفر اور ایمان دونوں یکساں ہیں۔ یہ بات بالبداہت خدا کے عدل اور اس کی حکمت کے خلاف ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۳)

جزاء و سزا اہتمام ربوبیت کا لازمی تقاضا ہے

یہ اوپر والی بات کی دلیل بیان ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ایک مقصدِ حق کے ساتھ پیدا کی ہے اس مقصدِ حق کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعد لازماً ایک ایسا دن آئے جس میں حق پسندوں کو ان کی حق پسندی کا صلہ ملے اور جن کی زندگی اس مقصدِ حق کے خلاف گزری ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔

'وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ' یہ اس اہتمام کی طرف توجہ دلائی ہے جو ان کی خلقت میں خالق نے ملحوظ رکھا ہے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ انسان کی تخلیق بہترین سانچہ پر ہوئی ہے۔ چنانچہ سورۂ تین

میں فرمایا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (اور ہم نے انسان کو بہترین سانچہ پر بنایا ہے)۔ انسان کے ظاہر و باطن کی تشکیل جس طرح ہوئی ہے اور اس میں جو قوتیں اور قابلیتیں ودیعت کی گئی ہیں وہ صاف اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ اس دنیا کی تمام مخلوقات میں مقصود کی حیثیت اسی کو حاصل ہے۔ وہی سرتاج اور گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتا ہے باقی دوسری ساری چیزیں بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی کی خدمت اور نفع رسانی کے لیے ہیں۔

انسان کے لیے یہ اہتمام و انتظام اور اس کا نہایت اعلیٰ ظاہری و باطنی صلاحیتوں سے مسلح ہونا اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس کو خالق نے بے مقصد و عبث نہیں پیدا کیا ہے کہ بس وہ کھائے پیے اور ایک دن ختم ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو وہ سارا اہتمام بالکل بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے جو قدرت نے اس کی تخلیق اور اس کے قیام و بقا پر صرف کیا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن نے جگہ جگہ انسان کو یہ یاد دہانی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ربوبیت کے لیے جو اہتمام فرمایا، تمہارے لیے جو پاکیزہ خوانِ کرم بچھایا اور شکل و صورت کے اعتبار سے اپنی تمام مخلوقات میں جو امتیاز تم کو بخشا اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک دن تم اس کے سامنے حاضر کیے جاؤ اور تم سے تمہارے رب کی بخشی ہوئی نعمتوں سے متعلق سوال ہو۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (المؤمن - ۴۰ : ۶۴)	اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو مستقر اور آسمان کو چھت بنایا اور تمہاری صورت گری کی تو تمہاری صورتیں اچھی بنائیں اور تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق بخشا۔

مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے اچھی صورتوں کے ساتھ پاکیزہ رزق اور عالی شان مکان کا یہ اہتمام اس بات کی بدیہی دلیل ہے کہ تم اپنے رب کے آگے مسئول ہو۔

اسی دلیل کی بنیاد پر ان لوگوں کو دھمکی بھی دی گئی ہے جو آخرت اور جزا و سزا کے قائل نہیں تھے۔ فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۙ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۗ (الانفطار - ۸۲ : ۶ - ۸)	اے انسان، تجھ کو تیرے اس رب کریم کے باب میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے جس نے تیرا نقشہ بنایا، پھر تیرے جوڑ بند ٹھیک کیے پس تجھے متوازن کیا اور جس صورت پر چاہا تجھے ترکیب دے دیا۔

اس آیت میں اس اہتمام کی وضاحت بھی ہو گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے میں فرمایا ہے اور ساتھ ہی اس سے جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اس کی طرف بھی نہایت تہدید آمیز انداز میں اشارہ ہو گیا ہے۔

'وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ' یعنی جس خدا نے ایک عظیم غایت کو پیشِ نظر رکھ کر یہ دنیا پیدا کی ہے اور اس اہتمام کے ساتھ تمھیں اس میں وجود بخشا ہے لازم ہے کہ تم ایک دن اسی کی طرف جزا و سزا کے لیے لوٹائے جاؤ۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ سارا اہتمام بالکل بے معنی ہو کے رہ جائے گا۔

یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَیَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ط وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۴)

کوئی بات اللہ تعالیٰ کے علم سے باہر نہیں ہے

یعنی اس مغالطے میں نہ رہو کہ بھلا اللہ تعالیٰ کو ساری دنیا کے تمام خفیہ و علانیہ اعمال کی خبر کہاں ہو گی کہ وہ سب کا حساب کرنے بیٹھے گا اور سب کو جزا یا سزا دے گا! آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب سے واقف ہے اور تم کوئی کام خواہ پوشیدہ طور پر کرو یا علانیہ وہ تمھارے ہر قول و فعل کو جانتا ہے بلکہ جو کچھ تمھارے سینوں میں چھپا ہوا ہوتا ہے وہ اس سے بھی باخبر رہتا ہے۔

اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ز فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِہِمْ وَلَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۵)

مکافاتِ عمل کی شہادت تاریخ سے

فرمایا کہ کیا اس ملک کی پچھلی قوموں کی تاریخ تمھارے علم میں نہیں آئی کہ انھوں نے کفر کیا تو اس کفر کا وبال انھیں اس دنیا میں بھی چکھنا پڑا اور آخرت میں بھی ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے! یہ اشارہ عاد، ثمود، اہلِ مدین اور قومِ لوط وغیرہ کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں تفصیل سے پچھلی سورتوں میں سنائی بھی گئی ہیں اور قریش ان سے فی الجملہ واقف بھی ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض قوموں کی بستیوں کے کھنڈروں پر سے ان کو گزرنے کے مواقع بھی ملتے رہتے تھے۔ ان کی تاریخ کی طرف اشارہ کر کے متنبہ فرمایا کہ یہ واقعات دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کے خیر و شر سے غیر متعلق نہیں ہے بلکہ اس کی اصلاح کے لیے اس نے برابر اپنے رسول بھیجے ہیں اور جب قوموں نے رسولوں کی تکذیب کی ہے تو اس نے ان کو سزا بھی نہایت عبرت انگیز دی۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے قانونِ مجازات کی یہ مثالیں اپنی آنکھوں سے اس زمین میں دیکھتے ہو تو اس بات کو کیوں بعید سمجھتے ہو کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ساری دنیا کا انصاف کرے اور اس دن اس کے کاملِ عدل اور اس کی کامل رحمت کا ظہور ہو!

ذٰلِکَ بِاَنَّہٗ کَانَتْ تَّاْتِیْہِمْ رُسُلُہُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ یَّہْدُوْنَنَا ز فَکَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَی اللّٰہُ ط وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (۶)

رسولوں کی تکذیب کے لیے تکبر کا بہانہ

یہ سبب بتایا ہے کہ یہ قومیں کیوں خدا کے عذاب کی گرفت میں آئیں؟ فرمایا کہ اللہ کے رسول ان کی ہدایت کے لیے نہایت واضح نشانیوں اور دلائل کے ساتھ آئے لیکن یہ اپنی سرکشی کے سبب سے ان کو خاطر میں نہ لائیں۔ انھوں نے یہ بہانہ تراشا کہ اگر اللہ کو ہماری ہدایت کے لیے کوئی رسول بھیجنا ہی ہوتا تو وہ کسی برتر مخلوق کو رسول بنا کر بھیجتا۔ ہمارے ہی جیسے انسانوں کو رسول بنا کر بھیجنے کے کیا معنی؟

کیا ہم ایسے حقیر ہیں کہ ہمارے ہی جیسے انسان ہمیں ہدایت دینے والے بنیں گے! مطلب یہ ہے کہ اگر انسان ہی ہمیں ہدایت دے سکتے ہیں تو ہم کیا برے ہیں! ہم خود ہی اپنے کو ہدایت دے لیں گے، دوسروں کا بارِ احسان ہم کیوں اٹھائیں!

منکرین کے باب میں سنت الٰہی

'فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ'۔ یعنی اس طرح کے اعتراضات اور بہانے پیدا کر کے انھوں نے رسول کا انکار اور دعوتِ حق سے اعراض کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ بھی ان سے بے پروا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ہدایت سے بہرہ یاب کرنے کے لیے اہتمام کرتا ہے لیکن جب لوگ اس کی ناقدری کرتے ہیں تو وہ ان سے بے پروا ہو کر ان کو چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس ناقدری کا انجام دیکھیں۔

'وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ'۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں کی ہدایت مطلوب ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ اس میں اس کا کوئی نفع ہے۔ وہ لوگوں کی ہدایت و ضلالت سے بالکل بے نیاز اور خود اپنی ذات میں ستودہ صفات اور کامل ہے۔ وہ ہدایت کا انتظام کرتا ہے تو محض اس وجہ سے کرتا ہے کہ لوگوں کی فلاح اسی میں ہے لیکن جب وہ اس کی قدر نہیں کرتے تو وہ اس کو زبردستی لوگوں کے اوپر نہیں لادتا۔

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۷)

ترکی جواب

یعنی ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ مرنے کے بعد ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے اس وجہ سے وہ نبیؐ کی دعوت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

'قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ'۔ فرمایا کہ جس زور و تاکید کے ساتھ یہ لوگ مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا انکار کر رہے ہیں اسی زور و تاکید کے ساتھ، بقیدِ قسم، تم ان کو جواب دو کہ ہاں میرے رب کی قسم، تم ضرور اٹھائے جاؤ گے!

قسم کے اندر دلیل کا پہلو

اگرچہ اس فقرے میں دلیل کا پہلو نمایاں نہیں ہے، بلکہ دعوے کا جواب بظاہر دعوے ہی سے دے دیا گیا ہے، اس لیے کہ یہ بات منکرین کے بے دلیل دعوے کے جواب میں کہلائی گئی ہے لیکن 'وَرَبِّيْ' کی قسم میں دلیل کا بھی ایک لطیف پہلو مضمر ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، جس کی شانیں اس کائنات کے ہر گوشہ میں نمایاں ہیں، اس بات کو واجب کرتی ہے کہ وہ نیکوکار اور بدکار دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ نہیں کرے گا بلکہ لازماً وہ نیکوں کو ان کی نیکی کا صلہ دے گا اور بدوں کو ان کی بدی کی سزا۔ اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ وہ مرنے کے بعد لوگوں کو اٹھائے، ان کا حساب کرے اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزا یا سزا دے۔

'وَذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کر کے اس کام کو ناممکن یا مشکل

نہ سمجھو۔ دوسروں کے لیے تو یہ کام بے شک ناممکن ہے۔ ان کا علم بھی نہایت محدود ہے اور ان کی قدرت بھی نہایت محدود ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے یہ نہایت آسان ہے۔ وہ غیر محدود علم اور غیر محدود قدرت کا مالک ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۸)

دعوتِ ایمان بانداز تنبیہ

یہ باندازِ تنبیہ دعوتِ ایمان ہے۔ یعنی اس قسم کے بہانے پیدا کر کے رسول کی تکذیب نہ کرو بلکہ اللہ اور اس کے رسول پر اور اس روشنی پر ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل فرمائی ہے۔ 'روشنی' سے مراد ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے نازل فرمایا۔ یہ امر واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو روشنی اہل کتاب کو ہدایت و ضلالت میں امتیاز کے لیے عطا فرمائی تھی وہ انھوں نے، جیسا کہ پچھلی سورتوں میں تفصیل گزر چکی ہے، ضائع کر دی تھی، جس کے سبب سے ان کے لیے حق و باطل میں امتیاز ناممکن ہو گیا تھا لیکن جب اس نے از سرِ نو خلق کی رہنمائی کے لیے اپنی روشنی، اپنی کامل صورت میں، اتاری تو اس کی قدر کرنے کے بجائے انھوں نے پورا زور لگایا کہ اس کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھا دیں، نہ خود اس سے فائدہ اٹھائیں نہ دوسروں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دیں:

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (الصف - ۶۱ : ۸)

(یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھا دیں اور اس کا فیصلہ یہ ہے کہ ان کافروں کے علی الرغم وہ اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا)۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ یعنی اس مغالطے میں نہ رہو کہ اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر ہے۔ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ سب اس کے علم میں ہے اور ایک دن وہ سب تمہارے سامنے آ کے رہے گا۔

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۹-۱۰)

سلامتی کی راہ

یعنی بجائے اس کے کہ اپنے کو اس مغالطے میں مبتلا رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھیں مرنے کے بعد زندہ نہیں کر سکتا، سلامتی اس بات میں ہے کہ اس دن کو برابر یاد رکھو جس دن اللہ تعالیٰ تمھیں اکٹھا کیے جانے کے دن کے لیے اکٹھا کرے گا یعنی اس دن کے لیے اکٹھا کرے گا جو اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں طے شدہ ہے، جس کے دلائل آفاق و انفس میں موجود ہیں، جس کی شہادت تمام نبیوں اور رسولوں اور تمام آسمانی صحیفوں نے دی ہے، جس کا واقع ہونا اس دنیا کے بامقصد و باغایت ہونے کے لیے ضروری ہے اور جو واقع نہ ہو تو یہ دنیا بالکل عبث، بے حکمت ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے۔

دوسرے مقام میں فرمایا ہے: ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ (ھود - ۱۱: ۱۰۳) (وہ دن ہے جس کے لیے لوگ جمع کیے جائیں گے اور وہ حاضری کا دن ہوگا)۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ۝ لَمَجْمُوعُونَ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ (الواقعۃ - ۵۶: ۴۹-۵۰) (کہہ دو، تمام اگلے اور پچھلے ایک معین دن کے وقت مقرر پر حاضر کیے جائیں گے)۔ ان آیات میں ایک مقررہ وقت پر تمام اگلوں پچھلوں کے جمع کیے جانے پر جو زور ہے وہ ان نادانوں کے استبعاد کو رفع کرنے کے لیے ہے جو سمجھتے ہیں کہ بھلا اتنی بے شمار مخلوقات کو خشکی و تری، دریاؤں اور پہاڑوں کے کونے کونے سے کون جمع کر سکتا ہے؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دن اس جمع کے لیے مقرر کر رکھا ہے اور یہ بات لازماً ہو کے رہے گی۔ شکوک میں رہنے کے بجائے اس کے لیے تیاری کرو اور اس کو برابر یاد رکھو۔

ہار جیت کا دن

'ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ' - 'يَوْمُ التَّغَابُنِ' کا ترجمہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے 'ہار جیت کا دن' کیا ہے۔ یہ ترجمہ ہمارے نزدیک لفظ کی صحیح روح کے مطابق ہے۔ اس ہار جیت کی وضاحت آگے قرآن نے خود کر دی ہے۔ فرمایا ہے کہ جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو لغزشوں کے اثرات سے پاک کر کے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور جن کو یہ چیز حاصل ہوئی ان کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بالکل برعکس ان لوگوں کا حال ہوگا جنھوں نے اللہ کا کفر اور اس کی آیتوں کی تکذیب کی ہوگی۔ یہ لوگ دوزخ میں پڑیں گے اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور نہایت ہی برا ٹھکانا ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کے منکر ہیں انھوں نے تو اسی دنیا کو ہار جیت کا میدان سمجھ رکھا ہے۔ جن کو دنیا کی رفاہیتیں حاصل ہو گئیں وہ سمجھ بیٹھے کہ انھوں نے بازی جیت لی اور جن کو نہیں حاصل ہوئیں ان کو ناکام و نامراد سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ دنیا دارالانعام نہیں بلکہ دارالامتحان ہے۔ دارالانعام آخرت ہے جس میں بازی وہ لوگ جیتیں گے جو اس دنیا میں ایمان و عمل صالح کی زندگی گزاریں گے اگرچہ اس دنیا کی متاع میں سے انھیں کوئی چیز بھی حاصل نہ ہوئی ہو اور وہ لوگ وہاں بالکل محروم و نامراد ہوں گے جو ایمان و عمل صالح سے محروم اٹھیں گے اگرچہ دنیا میں انھیں قارون کے خزانے حاصل رہے ہوں۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ جو لوگ اسی دنیا کو ہار جیت کا میدان سمجھ بیٹھیں گے ان کے لیے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام کو قربان کر کے دوسروں کی خدمت و اعانت کی راہ میں اپنے مال صرف کریں۔ اگر کبھی وہ حوصلہ کرنا بھی چاہیں تو فوراً یہ اندیشہ ان کا حوصلہ پست کر دے گا کہ اگر کل کو کوئی ناگہانی آفت یا مشکل پیش آ گئی تو کیا بنے گا! البتہ جو شخص ہار جیت کا اصل میدان آخرت کو سمجھے گا اس کو اس

طرح کا کوئی اندیشہ پست حوصلہ نہیں کر سکتا۔ اگر کبھی کوئی دغدغہ دل میں پیدا ہوگا بھی تو وہ اس کو شیطانی دغدغہ سمجھے گا اور بے دھڑک اپنی آخرت کی کامیابی کے لیے اپنے رب کے بھروسہ پر بازی کھیل جائے گا۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۱۱)

ایک وسوسہ کا علاج

یہ اس دغدغہ کو دور فرمایا ہے جو آخرت کی بازی کھیلنے کی راہ میں مزاحم ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ اللہ و رسول کی اطاعت اور ان کی رضا طلبی کی راہ میں قدم اٹھاتے ہوئے اس وسوسہ کو کوئی اہمیت نہ دو کہ کل کو کوئی مشکل پیش آگئی تو کیا ہوگا! کوئی مصیبت بھی بندوں پر اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہیں آتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار کسی ایسے شخص کے لیے ممکن نہیں ہے جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو۔ تو بندے کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ جو کام وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں کرے گا وہ اس کے لیے کسی ایسی آزمائش کا سبب نہیں بن سکتا جو اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی قوتوں اور صلاحیتوں سے سب سے زیادہ واقف ہے۔ وہ کسی پر اس کی قوت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالے گا۔

وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ یہ اللہ کی راہ میں آزمائشوں کا مقابلہ کرنے والوں کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر تم اپنے ایمان میں مضبوط رہو گے تو کوئی آزمائش تمہیں پست حوصلہ نہیں کر سکے گی بلکہ اللہ تعالیٰ عین وقت پر روح القدس کے ذریعہ سے تمہارے دل کی رہنمائی فرمائے گا۔ تمہارا رب ہر چیز سے باخبر ہے، وہ اپنے بندوں کے احوال کو جانتا ہے اور ٹھیک وقت پر ان کی مدد کے لیے غیب سے سامان کرتا ہے۔ یہی بات سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی اپنے شاگردوں کو خطاب کر کے فرمائی ہے کہ جب لوگ تم کو میرے نام پر عدالتوں میں پکڑوائیں تو یہ فکر نہ کرنا کہ کیا کہو گے، میرا خداوند عین وقت پر روح القدس سے تمہاری مدد فرمائے گا۔ سورۂ حدید کی آیت ۲۲ میں بھی یہ مضمون گزر چکا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۱۲)

یعنی غلط قسم کے اندیشوں اور اوہام میں مبتلا ہو کر اللہ و رسول کی اطاعت سے جی نہ چراؤ اور یاد رکھو کہ رسول پر صرف یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات تم کو واضح طور پر پہنچا دے۔ یہ فرض اس نے ادا کر دیا تو وہ اللہ کے ہاں بری الذمہ ہوا۔ تمہارے ایمان کی بابت اس سے پرسش نہیں ہوگی بلکہ تم سے پرسش ہوگی کہ تم نے اس کی دعوت کیوں قبول نہیں کی۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۳)

فرمایا کہ آسمان و زمین میں کوئی اور الٰہ نہیں ہے جس سے کسی ضرر کا اندیشہ یا کسی نفع کی توقع ہو۔ صرف اللہ ہی ہے جو نفع یا ضرر پہنچا سکتا ہے۔ اہل ایمان کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔ یہی ان کے ایمان کا تقاضا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۴)

ایک بہت بڑی آزمائش سے آگاہی

یہ ان آزمائشوں میں سے ایک بہت بڑی آزمائش سے متنبہ فرمایا ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے حقوق و فرائض اور اس کی راہ میں انفاق جان و مال سے روکنے والی بنتی ہیں، یعنی بیوی بچوں کی محبت یہ محبت ہے تو ایک فطری چیز لیکن ساتھ ہی یہ انسان کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش بھی ہے۔ اس محبت میں اور خدا کی محبت میں بسا اوقات تصادم ہوتا ہے۔ اگر آدمی کا علم و ایمان پختہ نہ ہو تو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس پر بیوی بچوں کا مفاد اور ان کی محبت اس قدر غالب آجاتے کہ وہ خدا کی محبت کو نظر انداز کر بیٹھے درآنحالیکہ یہ چیز اس کے ایمان کو غارت کر دینے والی ہے۔ عرب شعراء جاں بازی اور فیاضی پر ملامت کرنے والیوں کی ملامت کا ذکر بہت کرتے ہیں اور ایک حدیث شریف میں بھی ہے کہ آدمی کے بیوی بچے اس کو سب سے زیادہ بخل و بزدلی پر مجبور کرنے والے ہیں۔ اسی چیز کی طرف اس آیت میں بھی اشارہ ہے کہ آدمی کے اہل و عیال میں سے بعض اس کے دشمن ہوتے ہیں۔ وہ اس کو خدا کے حقوق سے روکنے والے بن جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ یہ کام بظاہر خیر خواہانہ انداز میں کرتے ہیں لیکن یہ چیز انجام کار کے اعتبار سے باعث ہلاکت ہے اس وجہ سے وہ درحقیقت وہ کام کرتے ہیں جو دشمن کرتا ہے۔

'اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ' میں حرف 'مِنْ' تبعیض کے لیے ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کے بیوی بچے لازماً ایسے ہی ہوں۔ بہتوں کے بیوی بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جو راہ حق میں مزاحم ہونے کے بجائے معاون ہوتے ہیں لیکن اگر کسی کے اہل و عیال ایسے نہیں ہیں تو اس کو چاہیے کہ وہ ان سے بچ کے رہے کہ وہ اس کے لیے پھندا نہ بننے پائیں۔

'وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ' یہ بچ کے رہنے کی وضاحت ہے کہ تمھارے لیے یہ دیکھنا تو ضروری ہے کہ وہ تم کو اللہ کی راہ سے روکنے والے نہ بنیں لیکن ساتھ ہی یہ لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ حتی الامکان یہ چیز قطع تعلق اور مفارقت پر منتہی نہ ہو بلکہ جس حد تک گنجائش ہو عفو و درگزر اور چشم پوشی سے کام لو اور یہ امید رکھو کہ اللہ غفور رحیم ہے۔ وہ تمھاری کوتاہیوں سے بھی درگزر فرمائے گا اور ان کی کمزوریوں کو بھی معاف کرے گا۔

معلوم ہوا کہ جس کو اس طرح کی آزمائش سے سابقہ پیش آئے اس کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ

وہ اپنے آپ کو کسی فتنہ میں پڑنے سے تو بچائے اور اپنے قول و عمل سے اپنے اہل و عیال کی کمزوری کی اصلاح کی کوشش کرے لیکن جب تک کفر و ایمان کا کوئی سوال پیدا نہ ہو اس وقت تک ان سے قطع تعلق نہ اختیار کرے بلکہ عفو و درگزر سے کام لے۔ گویا ان کے ساتھ زندگی تو گزارے لیکن گھل مل کر نہیں بلکہ بچ بچا کر اس طرح کہ خود بھی محفوظ رہے اور ان کی بھی اصلاح ہو۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۱۵)

یہ اس مضمون کی مزید وضاحت ہے۔ 'فِتْنَةٌ' کے معنی امتحان و آزمائش کے ہیں۔ فرمایا کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہاری آزمائش کے لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے ذریعہ سے تمہارا امتحان کیا ہے کہ تم ان کی محبت میں پھنس کر خدا اور اس کے حقوق کو بھول جاتے ہو یا ان کو خدا کی محبت اور اس کی خوشنودی کے حصول کا ذریعہ بناتے ہو۔ اگر پہلی راہ اختیار کرو گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے امتحان میں تم ناکام رہے۔ اللہ کی محبت پر تم نے مال و اولاد کی محبت کو ترجیح دی حالانکہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ہر چیز سے زیادہ اللہ کو محبوب رکھے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرۃ ۲ : ۱۶۵) (اہل ایمان سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں) اور اگر دوسری راہ اختیار کرو گے تو یہی راہ فوز و فلاح کی راہ ہے۔ یہ راہ اختیار کر کے اس دنیا میں کوئی نقصان بھی اٹھاؤ گے تو اطمینان رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر نقصان کی تلافی آخرت میں اجر عظیم سے فرمائے گا۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۶)

فلاح کی راہ

یہ اس سلسلہ کی آخری نصیحت ہے کہ اللہ سے برابر ڈرتے رہو کہ شیطان تمہیں کسی فتنہ میں نہ ڈالنے پائے۔ یہ ڈرنا تا حد امکان ہو۔ تمہارے امکان میں جس حد تک ہے اگر اس حد تک تم اللہ سے ڈرنے کی کوشش کرو گے تو اللہ تعالیٰ شیطان کو تم پر قابو پانے نہیں دے گا ورنہ مال و اولاد کے کسی فتنہ میں پڑ کر تم اللہ کی راہ سے اتنے دور ہو جاؤ گے کہ تمہارے لیے بازگشت کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہے گا۔

'وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ'۔ یہ وہی اوپر والی بات مثبت انداز میں فرمائی کہ اللہ اور اس کے رسول کی بات سنو اور مانو اور خدا کی راہ میں جس انفاق کی دعوت دی جا رہی ہے اس پر لبیک کہو۔ اس انفاق کا اصلی نفع اللہ و رسول کو نہیں حاصل ہوگا بلکہ تمہی کو حاصل ہوگا اگر تم خلوص اور فیاضی سے خرچ کرو گے۔

'وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'۔ 'شُحّ' کے معنی بخل و حرص کے ہیں۔ فرمایا کہ انسان کے نفس کے اندر جو بخل ہے اگر وہ نفس پر غالب آ جائے تو وہ اس کے لیے تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ مبارک ہیں اللہ کے وہ بندے جو اس کے غلبہ سے محفوظ رکھے گئے۔ آخرت میں فلاح پانے

والے وہی بنیں گے!

'شُحَّ' کی اضافت 'نفس' کی طرف اس بات کی دلیل ہے کہ نفس انسانی جن داعیات سے مرکب ہے ان میں اس کا بھی ایک مقام ہے لیکن یہ ان دعاوی میں سے ہے جن سے اگر ہوشیار نہ رہا جائے تو یہ شہوت یا غضب کی طرح انسان کو ہلاکت میں ڈال سکتے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کو اتنی ڈھیل نہ دی جائے کہ یہ نفس پر غالب آ کر ایثار و قربانی کے جذبات کو دبا لے۔ اس کا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ جب یہ جذبہ غالب ہونے لگے تو انسان اس کے علی الرغم انفاق کر کے اس کو دباتا رہے یہاں تک کہ یہ اتنا کمزور ہو جائے کہ نیکی کے اقدامات میں مزاحم نہ ہو سکے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ اپنے اس جذبہ کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کوشش میں وہ کامیاب ہوتے ہیں اور جو اس کوشش میں کامیاب ہوں گے آخرت کی فلاح کے حق دار وہی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کی رضا جوئی کے اعمال میں انفاق کا درجہ سب سے اونچا ہے بالخصوص وہ انفاق جو آدمی اپنی ذاتی ضروریات کو نظر انداز کر کے کرتا ہے۔ 'یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ' (الحشر۔ ۵۹: ۹) (وہ اپنے اوپر ان کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوں)۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ (۱۷)

قرض حسن کا مرتبہ و محل اور اس کی حقیقت

یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ اوپر جس انفاق کا حکم ہے وہ اللہ کی راہ میں ہر قسم کے انفاق کے لیے ہے خواہ اس کا تعلق صدقات و زکوٰۃ سے ہو یا جہاد سے۔ اس آیت میں خاص طور پر جہاد کے لیے انفاق کی تاکید ہے۔ قرآن میں لفظ 'قرض' عام طور پر جہاد ہی کے انفاق کے لیے آیا ہے اور اس لفظ کے استعمال میں جو اپیل اور بلاغت ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ سورۂ مزمل میں فرمایا ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (المزمل۔ ۷۳: ۲۰)	اور نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو قرض دو اچھا قرض۔

اس آیت میں 'وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ' کے بعد 'وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ' سے مراد وہ انفاق ہے جو خاص حالات کے اندر اللہ کی راہ میں مطلوب ہوتا ہے۔

'يُضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ'۔ 'مُضَاعَفَة' کے معنی صرف دونا کرنے کے نہیں آتے ہیں بلکہ یہ مجرد بڑھانے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ خواہ یہ بڑھانا دوگنا کرنے کی نوعیت کا ہو یا 'اَضْعَافًا مُّضَاعَفَة' کی نوعیت کا۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ یہاں یہ اسی مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تم سے جو قرض مانگتا ہے تو اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس کے خزانے میں کوئی کمی ہو گئی ہے جس کے سبب سے قرض مانگنے کی نوبت آ گئی ہے۔ اس کا خزانہ بدستور بھرپور ہے۔ یہ قرض وہ اس لیے مانگ رہا ہے کہ تمہارے لیے نفع کمانے کی راہ کھولے کہ تم اس کی راہ میں ایک خرچ کر کے آخرت

میں دس گنا بلکہ ستّر گنا وصول کرو۔ اس کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ یہ قرض 'قرضِ حسن' ہو۔ 'قرضِ حسن' کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ یہ قرض اچھے مال میں سے دیا جائے، خوش دلی اور فیاضی سے دیا جائے اور خود ضرورتمند ہونے کے باوجود دیا جائے۔ جس قرض کے اندر یہ خوبیاں ہوں گی اللہ اس کو کئی گنا بڑھا کر قرض دینے والوں کو واپس بھی کرے گا اور ان کو اپنی مغفرت سے بھی نوازے گا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کا حوالہ

'وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ'۔ 'شَکُوْرٌ' کے معنی قدردانی کے ساتھ قبول کرنے والے کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی نیکیوں کا بڑا ہی قدردان اور ان کی بڑی پذیرائی فرمانے والا ہے۔ اگرچہ وہ غنی و حمید ہے، اس کے بندے اس کے حضور میں جو نذرانے پیش کرتے ہیں اسی کے دیے ہوئے مال میں سے پیش کرتے ہیں لیکن وہ ان کو حقیر نہیں خیال کرتا بلکہ وہ ان کو قدر کے ساتھ قبول کرتا اور ان کو پروان چڑھاتا ہے۔ ساتھ ہی وہ 'حَلِیْمٌ' ہے اس وجہ سے اپنے بندوں کے ساتھ نہایت فیاضانہ معاملہ کرتا ہے۔ اگر وہ بڑی برائیوں سے بچنے والے ہوتے ہیں تو ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے وہ چشم پوشی فرماتا ہے۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۱۸)

یعنی اللہ تعالیٰ تمام غائب و حاضر کا جاننے والا بھی ہے اور ساتھ ہی عزیز و حکیم بھی ہے۔ اس کی رضا جوئی کے لیے تم جو قربانی بھی کرو گے وہ اس سے مخفی نہیں رہنے کی اور یہ بھی اطمینان رکھو کہ اگر تم اس کا ساتھ دو گے تو وہ کوئی کمزور ہستی نہیں ہے بلکہ وہ ہر چیز پر غالب اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ اس پر بھروسہ کرنے والے کبھی نامراد نہیں ہوتے اور اس کے حکموں پر عمل کرنے والے کبھی ٹھوکر نہیں کھاتے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فللہ الحمد وبیدہ التوفیق۔

رحمان آباد

۱۳- اپریل ۱۹۷۸ء

۴- جمادی الاوّل ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

٦٥

الطّلاق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق و لاحق سے تعلّق

سابق سورہ ـــــــ التغابن ـــــــ کی آیات ۱۴-۱۶ میں یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ آدمی کے بیوی بچے اس کے لیے بڑی آزمائش ہیں۔ اگر وہ چوکنا نہ رہے تو ان کی محبت میں گرفتار ہو کر وہ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے جی چرانے لگتا ہے یہاں تک کہ یہ چیز اس کو بالآخر نفاق میں مبتلا کر دیتی ہے اور اس طرح ان کے ساتھ اس کی دوستی خود اپنے ساتھ دشمنی بن جاتی ہے۔ ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرمائی ہے کہ ان سے چوکنے رہنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بالکل ہی قطع تعلق کر لے بلکہ تا حدِّ امکان اس طرح عفو و درگزر کا معاملہ رکھے کہ ان کی اصلاح بھی ہو اور اپنے کو ان کے ضرر سے محفوظ بھی رکھ سکے۔

سورۂ تغابن کے بعد دو سورتوں ـــــــ الطلاق اور التحریم ـــــــ میں اسی نازک مسئلہ کی مزید وضاحت فرمائی اور نفرت و محبت دونوں طرح کے حالات کے اندر صحیح رویہ کے حدود معین کر دیے تاکہ کسی بے اعتدالی کی گنجائش نہ باقی رہے۔ سورۂ طلاق میں یہ بتایا ہے کہ اگر بیوی سے کسی سبب سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کے معاملے میں کس طرح حدود الٰہی کی پابندی کا اہتمام کرے اور سورۂ تحریم میں یہ واضح فرمایا ہے کہ محبت میں کس طرح اپنے آپ کو اور ان کو حدود الٰہی کا پابند رکھنے کی کوشش کرے۔ میاں بیوی کے رشتہ ہی پر تمام معاشرت کی بنیاد ہے اور ہر شخص کو اس سے سابقہ بھی پیش آتا ہے لیکن اس رشتہ کے نازک حدود و قیود کا اوّل تو سب کو علم نہیں ہوتا اور جن کو ہوتا بھی ہے وہ نفرت یا محبت کی ہلچل میں ان کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ کوئی سبب اگر اختلاف یا افتراق کا پیدا ہو گیا ہو تو وہ ایسی نفرت و عداوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ شریعت کے تمام حدود احکام پسِ پشت ڈال دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر تعلقات محبت پر قائم ہیں، جیسا کہ ہونا چاہیے، تو خدا کے حدود و آداب کا احترام اس محبت پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں ہی حالتیں حدودِ الٰہی سے تجاوز اور شریعت سے انحراف کی ہیں جن کا نتیجہ آخرت کی نامرادی ہے اس وجہ سے قرآن نے دو الگ الگ سورتوں میں تفصیل سے بتایا کہ نفرت اور محبت دونوں قسم کے حالات کے اندر

آدمی کا معاملہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ مجرد اندھے بہرے جذبات پر نہیں بلکہ خدا کے حدود پر مبنی ہونا چاہیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں سورتیں درحقیقت سورۂ تغابن ہی کے اجمال کی شرح کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان دونوں ہی میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور یہ خطاب بغیر کسی تمہید کے شروع ہو گیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ سابق سورہ ہی کا تکملہ و تتمہ ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست خطاب شخصاً نہیں بلکہ امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے۔ اس طرح کے خطاب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ اس براہ راست خطاب سے ان احکام کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے جو ان سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔ یہاں جن خرابیوں کی اصلاح کی گئی ہے وہ جاہلیت کی سوسائٹی میں عام رہی ہیں بلکہ شاید یہ کہنا بھی بے جا نہ ہو کہ اس تہذیب و تمدن کے دور میں بھی یہ عام ہیں۔ یہ صورت حال مقتضی ہوئی کہ ان کی اصلاح کے احکام براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے دیے جائیں تاکہ لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا ہو کہ جب پیغمبر کو بھی ان باتوں کی پابندی کی ہدایت ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورۂ طلاق حسب ذیل دو حصوں میں منقسم ہے۔

(۱-۷) اس امر کی وضاحت کہ اگر کسی کو طلاق دینے کی نوبت آئے تو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ بیوی کو طلاق کے دو بول کہہ کر فوراً گھر سے نکال باہر کرے بلکہ اس کے لیے اللہ کے مقرر کیے ہوئے متعین قاعدے اور ضابطے ہیں جن کی پابندی ہر امیر و غریب کے لیے ضروری ہے۔ جو لوگ اپنی مالی مشکلات کے باوجود اللہ کی رضا کے لیے اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کریں گے اللہ ان کی مشکل آسان کرے گا اور ان کے مال میں برکت دے گا۔ اور جو مال کی محبت میں اللہ کے حدود و قیود توڑیں گے تو وہ یاد رکھیں کہ وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔

(۸-۱۲) مسلمانوں کو تنبیہ کہ جن قوموں نے اللہ اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی ہے اللہ نے ان کو ہمیشہ نہایت سخت سزا دی ہے۔ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اللہ نے اس رسول کے ذریعہ سے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے کہ ان کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں کھڑا کیا ہے۔ اگر اس روشنی کی وہ قدر کریں گے تو اللہ ان کو جنت کی ابدی نعمتوں سے نوازے گا اور اگر انھوں نے اس کی ناقدری کی تو یاد رکھیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

○

سُوْرَةُ الطَّلَاقِ (۶۵)

مَدَنِيَّةٌ ——— آیات: ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۲ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ
وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ
بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ وَ
تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ
نَفْسَهٗ ۭ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ①
فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ
بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ
لِلّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۥ
وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ② وَّيَرْزُقْهُ مِنْ
حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ③ وَالّٰۗـِٔيْ
يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ
ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰۗـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ۭ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ

أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ
يُسْرًا ﴿٤﴾ ذَٰلِكَ أَمْرُ اللَّهِ أَنْزَلَهُ إِلَيْكُمْ ۚ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يُكَفِّرْ
عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُعْظِمْ لَهُ أَجْرًا ﴿٥﴾ أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ
سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ ۚ
وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ
فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۖ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُمْ
بِمَعْرُوفٍ ۖ وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ ﴿٦﴾ لِيُنْفِقْ
ذُو سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ ۖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ
مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ سَيَجْعَلُ
ع ۱ / ۱۷ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ﴿٧﴾ وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ
رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا وَعَذَّبْنَاهَا عَذَابًا
نُكْرًا ﴿٨﴾ فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا ﴿٩﴾
مع أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ
الَّذِينَ آمَنُوا ۚ قَدْ أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا ﴿١٠﴾ رَسُولًا يَتْلُو
عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ مُبَيِّنَاتٍ لِيُخْرِجَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا
يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا
أَبَدًا ۖ قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ رِزْقًا ﴿١١﴾ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ

سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾ ع ۲/۵/۱۸

ترجمۂ آیات ۱-۱۲

اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدّت کے حساب سے طلاق دو اور عدّت کا شمار رکھو اور اللہ سے، جو تمھارا پروردگار ہے، ڈرتے رہو اور ان کو ان کے گھروں سے نہ نکالو۔ اور نہ وہ خود ہی نکلیں الّا آنکہ وہ کسی کھلی ہوئی بدکاری کی مرتکب ہوں۔ اور یہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود ہیں اور جو اللہ کے حدود سے تجاوز کریں گے تو انھوں نے اپنی ہی جان پر ظلم ڈھایا۔ تم نہیں جانتے شاید اللہ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے۔ ۱

پس جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو ان کو یا تو دستور کے مطابق نکاح میں رکھو یا دستور کے مطابق جدا کر دو اور اپنے میں سے دو ثقہ آدمیوں کو گواہ بنا لو۔ اور گواہی کو قائم رکھو اللہ کے لیے۔ یہ نصیحت ان کو کی جاتی ہے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اللہ سے ڈریں گے تو اللہ ان کے لیے راہ نکالے گا اور ان کو وہاں سے رزق دے گا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ ہو گا اور جو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے تو اللہ اس کے لیے کافی ہے۔ اللہ اپنے ارادے پورے کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا رکھا ہے۔ ۲-۳

اور تمھاری عورتوں میں جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اگر ان کے باب میں شک ہو تو ان کی عدّت تین مہینے ہے اور اسی طرح ان کی بھی جن کو حیض نہ آیا ہو

اور حمل والیوں کی مدت وضع حمل ہے اور جو اللہ سے ڈرے گا تو اللہ اس کے لیے اس کے معاملے میں آسانی پیدا کرے گا۔ یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمھاری طرف اتارا ہے تو جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس سے اس کے گناہ دور کر دے گا اور اس کے اجر کو بڑھائے گا۔ ۴-۵

اور ان کو رکھو جس طرح اپنی حیثیت کے مطابق تم رہتے ہو اور ان کو ضیق میں ڈالنے کے لیے ضرر نہ پہنچاؤ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرو تا آنکہ وہ حمل سے فارغ ہو جائیں۔ پس اگر وہ تمھارے بچے کو دودھ پلائیں تو ان کو ان کا معاوضہ دو اور دستور کے مطابق ایک قرارداد کر لو۔ اگر تم کوئی زحمت محسوس کرو تو اس کے لیے کوئی اور دودھ پلائے گی۔ چاہیے کہ کشادگی والا اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے اور جس کو کم ہی رزق دیا گیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اس کو دیا ہے۔ جتنا جس کو اللہ نے دیا ہے اس سے زیادہ کسی پر وہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اللہ تنگی کے بعد کشادگی بھی پیدا کرے گا۔ ۶-۷

اور کتنی ہی بستیاں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اپنے رب کے حکم اور اس کے رسول سے سرکشی کی تو ہم نے ان کا سخت محاسبہ کیا اور ان کو نہایت ہولناک عذاب دیا تو انھوں نے اپنے کیے کا وبال چکھا اور ان کا انجام نامرادی ہوا۔ اللہ نے ان کے لیے ایک سخت عذاب بھی تیار کر رکھا ہے۔ تو اللہ سے ڈرو، اے عقل والو! اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ نے تمھاری طرف ایک یاددہانی اتار دی ہے۔ ایک رسول جو تمھیں اللہ کی واضح آیتیں پڑھ کر سناتا ہے تاکہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالے۔ اور جو ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے

ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ اللہ نے ان کو نہایت اچھی روزی دی۔ ۸-۱۱

اللہ ہی ہے جس نے بنائے سات آسمان اور انہی کے مانند زمین بھی۔ ان میں اس کے احکام نازل ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے جانو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ نے اپنے علم سے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔ ۱۲

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ج وَ اتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ج لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ط وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ط وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ط لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (۱)

نبی صلعم سے خطاب کی اہمیت

تمہید میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب شخصاً نہیں بلکہ امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کو خطاب کرنے کے بعد معاً 'طَلَّقْتُمُ' میں ضمیر خطاب جمع کی آگئی ہے جس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہاں جو احکام دیے جا رہے ہیں وہ ہیں تو تمام مسلمانوں کے لیے البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ احکام دینے سے ان کی اہمیت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بہت بڑھ گئی ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ لوگوں کے اندر ان کی عظمت کا احساس پیدا ہو کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ان باتوں کی پابندی لازمی ہے تو دوسروں پر تو بدرجہا زیادہ ہو گی۔

طلاق کے باب میں حدود الٰہی کا احترام

جاہلیت میں طلاق کا عام طریقہ یہ رہا ہے کہ جس کو بھی بیوی پر کسی سبب سے غصہ آیا وہ نتائج و عواقب کا لحاظ کیے بغیر، ایک ہی سانس میں تین ہی نہیں بلکہ ہزاروں طلاقیں دے ڈالتا اور ساتھ ہی اس کو گھر سے باہر بھی نکال دیتا کہ جب طلاق دے چھوڑی تو اب اپنے گھر میں اس کی ایک وقت کی روٹی کا بھی خرچ کیوں برداشت کرے! اس طرح طلاق دینے میں عورت، مرد، بچوں بلکہ پورے کنبہ کے لیے یہاں تک کہ اس بچہ کے لیے بھی، جو عورت کے پیٹ میں بصورت حمل ہو سکتا ہے، جو مضرتیں ہیں ان پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بحث ہو چکی ہے۔ یہاں انہی مضرتوں کو پیش نظر رکھ کر ہدایت فرمائی کہ غصہ اور نفرت کے جوش میں اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود و قیود کو نہ بھولو۔ جو

لوگ ایسا کرتے ہیں وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

'إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ'۔ فرمایا کہ جب کسی کو طلاق دینے کی نوبت آئے تو وہ عدت کے حساب سے طلاق دے اور اس عدت کا اہتمام سے شمار رکھے۔

اس کی وضاحت سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ وہاں فرمایا ہے: 'الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ' (البقرۃ ۲: ۲۲۹) جس سے معلوم ہوا کہ یہ جائز نہیں ہے کہ ایک ہی سانس میں تین یا تین سے زیادہ طلاقیں دے کر بیوی کو جدا کر دے بلکہ دو مہینوں میں، دو طہروں کے اندر طلاق دے اور پھر تیسرے طہر میں اگر چاہے تو مراجعت کر لے اگر اس کو حسن سلوک کے ساتھ بیوی کی طرح رکھنا مقصود ہو، ورنہ دستور کے مطابق رخصت کر دے اگر آخری فیصلہ قطع تعلق ہی کا ہے۔

اس عدت کا شمار میاں اور بیوی دونوں کے لیے ضروری ہے۔ بیوی کے لیے اس وجہ سے ضروری ہے کہ ان تین مہینوں کے اندر، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۸ میں بیان ہوا، وہ اس بات کی پابند ہے کہ کسی اور مرد کی زوجیت میں نہیں جا سکتی۔ میاں کے لیے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس مدت کے اندر اس کو حق حاصل ہے کہ اگر وہ اس کو بیوی کی طرح رکھنا چاہے تو مراجعت کر لے۔ اس مدت کے گزر جانے کے بعد اس کا یہ حق ختم ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ اس دوران میں اگر معلوم ہوا کہ عورت حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل تک ممتد ہو جائے گی اور اس دوران میں عورت کے نان نفقہ اور اس کی رہائش کی ساری ذمہ داری مرد پر ہو گی۔

'وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ' فرمایا کہ اللہ سے، جو تمہارا خداوند ہے، ڈرتے رہو۔ 'ڈرتے رہو' یعنی اس کے مقرر کیے ہوئے ان حدود کی پابندی، اس غصہ کے باوجود کرتے رہو جو تمہارے اندر بیوی کے خلاف پیدا ہو چکا ہے۔ اگر حدود توڑو گے تو یاد رکھو کہ اپنے اس خداوند کے حدود توڑو گے جس کی اطاعت تم پر واجب ہے اور جس کی پکڑ اور جس کے قہر و غضب سے تمہیں کوئی نہ بچا سکے گا۔

طلاق میں عدت کی پابندی کی بعض مصلحتیں

'لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ'۔ اس عدت کے دوران نہ تو تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ ان کو ان کے گھروں سے نکالو اور نہ انہی کے لیے جائز ہے کہ وہ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوں بلکہ دونوں یکجا ایک ہی گھر میں رہیں تاکہ باہمی سازگاری اور اصلاح احوال کی کوئی گنجائش ہو تو یہ یکجائی اس میں مددگار ہو۔ اللہ تعالیٰ کو میاں بیوی کا رشتہ ٹوٹنا پسند نہیں ہے۔ طلاق ایک مجبوری کا علاج ہے۔ اللہ نے بندوں کی مجبوریوں کے تحت اس کو جائز تو رکھا ہے لیکن یہ 'اکرہ المباحات' یعنی جائز چیزوں میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مکروہ ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بندوں کو اس سے بچانے ہی کے لیے طلاق پر عدت کی شرط عائد کی ہے اور یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ اس مدت میں میاں بیوی دونوں ایک ہی گھر میں رہیں تاکہ دونوں ٹھنڈے دل سے اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ

کر سکیں کہ آخری قدم اٹھانے سے پہلے سازگاری اور اصلاحِ احوال کا کوئی امکان ہے یا نہیں؟

زمانۂ عدت میں شوہر کا گھر بیوی کا بھی گھر ہے

'لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُيُوۡتِهِنَّ' میں لفظ 'بُيُوۡتِهِنَّ' اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ مرد کو یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ گھر اسی کا ہے بلکہ یہ گھر جس طرح اس کا ہے اسی طرح زمانۂ عدت میں بیوی کا بھی ہے اس وجہ سے نہ تو مرد کے لیے جائز ہے کہ بیوی کو اس کے گھر سے نکالے اور نہ بیوی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ برہم ہو کر گھر سے چل کھڑی ہو۔ یہاں نکلنے سے مراد وہ نکلنا نہیں ہے جو معمولاً اپنی چھوٹی موٹی ضروریات کے لیے ہوا کرتا ہے بلکہ وہ نکلنا ہے جو کسی گھر کے خیرباد کہنے کے معنی میں ہوتا ہے۔

ایک مستثنیٰ صورت

'اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ' یعنی اس سے صرف ایک شکل مستثنیٰ ہے وہ یہ کہ مرد نے عورت کو طلاق کسی ایسی حرکت کی بنا پر دی ہو جو 'فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ' کے حکم میں داخل ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ زنا یا اس کے لوازم و مقدمات ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان سے کم درجے کی برائی کے لیے اس لفظ کا استعمال معروف نہیں ہے اگر مرد کی نگاہ عورت کی کسی ایسی حرکت پر پڑی ہے اور اس سے مشتعل ہو کر اس نے طلاق دی ہے تو پھر نہ مرد سے یہ مطالبہ کرنا جائز ہے کہ وہ ایسی عورت کو اپنے گھر میں ڈالے رکھے اور نہ اس سے اس فائدہ کے حاصل ہونے ہی کی توقع ہے جس کے لیے شریعت نے یہ یکجائی ضروری قرار دی ہے۔ کسی باحمیت مرد سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ اس کے دل کے اندر کسی ایسی عورت کے لیے کبھی گنجائش پیدا ہو سکے گی جس کی بے وفائی اس کے علم میں آ چکی ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جن میاں بیوی کے درمیان لعان تک نوبت پہنچ جاتی ہے ان کے درمیان فقہاء جدائی کرا دینے ہی میں بہتری خیال کرتے ہیں اس لیے کہ جو مرد بقید قسم اپنی بیوی کو فاحشہ قرار دے چکا ہو چاہے اس کے الزام کا قانونی توڑ عورت کی جوابی قسم سے ہو جاتا ہو لیکن اس جوابی قسم سے مرد کے دل کو نہیں بدلا جا سکتا۔ اسی طرح اگر کسی نے اپنی بیوی کو ایسی بنیاد پر طلاق دی ہے جو 'فاحشہ مبینہ' سے تعلق رکھنے والی ہے تو اس سے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ اس کا دل کبھی عورت سے صاف ہو سکے گا۔

حدود الٰہی کی خلاف ورزی کا ضرر خلاف ورزی کرنے والوں کو پہنچتا ہے

'وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ' یہ تنبیہ اور نہایت اہم تنبیہ ہے فرمایا کہ یہ اللہ کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں تو جو ان کو لانگنے کی جسارت کرے گا وہ یاد رکھے کہ وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا بلکہ اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا۔ اللہ نے جو قیدیں اور پابندیاں بندوں پر عائد کی ہیں کسی اپنے نفع کے لیے نہیں عائد کی ہیں بلکہ بندوں ہی کی بہبود کے لیے عائد کی ہیں۔ جو لوگ ان کو توڑتے ہیں وہ یاد رکھیں کہ وہ ان کو توڑ کر اپنے ہی شخصی، زوجی، عائلی اور اجتماعی مصالح برباد کرتے ہیں۔

ایک عظیم حکمت

'لَا تَدۡرِىۡ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا' یہ اس مصلحت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو 'لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُيُوۡتِهِنَّ وَلَا يَخۡرُجۡنَ' کی ہدایت میں مضمر ہے۔ فرمایا کہ تم نہیں جانتے، شاید اللہ تعالیٰ اس طرح کوئی ایسی بات پیدا کر دے کہ میاں بیوی میں اختلاف کے بعد ملاپ کی صورت پیدا

ہو جائے۔ یعنی اس یکجائی کے دوران میں میاں اور بیوی دونوں کے اندر اپنے رویّہ کے جائزہ لینے کا احساس ابھرے اور ان کے پھٹے ہوئے دل ایک دوسرے سے از سرِ نو جڑ جائیں اور ان کا اجڑتا گھر پھر آباد ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت پسند ہے۔ وہ دلوں کو جڑا ہوا اور گھروں کو آباد دیکھنا پسند کرتا ہے یہ پسند نہیں کرتا کہ میاں بیوی میں ایسی ناچاقی پیدا ہو کر دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور صرف وہی جدا نہ ہوں بلکہ ان کے بچے ہوں تو وہ بھی اپنی ماں سے اور ماں بھی اپنے بچوں سے جدا ہو جائے۔

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ۚ ذَٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۚ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۲-۳)

مرد کو اپنا حق عورت کی ضرر رسانی کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے

فرمایا کہ جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں یعنی تیسرے طہر میں داخل ہو جائیں تب ان کے رکھنے یا الگ کر دینے کا آخری فیصلہ کرو۔ اگر ان کو رکھنا ہو تو دستور کے مطابق رکھو جس طرح ایک خدا ترس مسلمان اپنی بیوی کو رکھتا ہے اور جدا کر دینے ہی کا فیصلہ ہو تو یہ بھی شریفوں کے دستور کے مطابق یعنی کچھ دے دلا کر، احسان و مروّت کے ساتھ ہو۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۱ میں فرمایا ہے: 'وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا' یعنی اگر ان کو روکو تو یہ مراجعت اس قصد سے نہ ہو کہ وہ تمہارے پنجے میں اسیر رہیں اور تم ان کو تنگ کر سکو۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ایسا کرنا چاہے تو کر سکتا ہے اس لیے کہ اس کو مراجعت کا حق حاصل ہے لیکن یہ حق اگر کوئی عورت کو ضرر پہنچانے اور تنگ کرنے کے لیے استعمال کرے گا تو وہ خدا کے بخشے ہوئے ایک حق کو ایک نہایت ظالمانہ مقصد کے لیے استعمال کرے گا جس کا وبال بہت ہی سخت ہے۔

گواہ اور گواہی کی اہمیت

'وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ'۔ یعنی اس کو بیوی کی حیثیت سے رکھنا ہو تو اور جدا کرنا ہو تو دونوں صورتوں میں اس پر اپنے اندر سے دو ثقہ مسلمانوں کو گواہ بنا لو تاکہ اس واقعہ کی بنا پر کوئی نزاع پیدا ہونے کا امکان باقی نہ رہے ورنہ اندیشہ ہے کہ فریقین میں سے کسی کی موت پر وراثت وغیرہ کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس شہادت کے حکم کو فقہا نے تو عام طور پر استحسان ہی کے درجے میں رکھا ہے، اور ایک اچھے معاشرے میں اگر یہ استحسان ہی کے درجے میں رہے جب بھی کافی ہے، لیکن اس زمانے میں معاشرے کے فساد کے سبب سے جس طرح نکاح کے لیے رجسٹریشن کا طریقہ اختیار کر لیا گیا ہے اسی طرح طلاق کے لیے بھی یہ طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اس سے بہت سے نزاعات کا سدِّ باب ہو سکتا ہے۔

'وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ'۔ یہ مسلمانوں کو عام طور پر اور گواہوں کو خاص طور پر تاکید ہے کہ گواہی

کے فرائض کو اللہ کے لیے انجام دو۔ یعنی اول تو گواہی سے حتی الامکان کترانا نہیں چاہیے ثانیاً جب گواہی کی نوبت آئے تو بے رو رعایت اور بے خوف و خطر صرف اللہ کی خاطر گواہی دو۔ یہ بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مسلمانوں کو شُہَدَآءَ اللّٰہِ فی الارض کے منصب پر سرفراز فرمایا ہے اس وجہ سے مسلمان کسی معاملہ میں کسی شخص یا کسی فریق کا گواہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ کا گواہ ہوتا ہے اور اسی گواہی پر امت کے اندر اس کی حیثیتِ عرفی کا انحصار ہے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا لازمی تقاضا

ذٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ فرمایا کہ یہ تمام باتیں جو اوپر کی آیات میں بتائی گئی ہیں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے لازمی نتائج میں سے ہیں۔ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان کے مدعی ہیں ان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ان کو حرزِ جان بنائیں۔ ورنہ یاد رکھیں کہ ان کا ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا دعویٰ بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

حدود الٰہی کی پابندی کرنے والوں کو عظیم بشارت

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔ یہ حدود کی پابندی کرنے والوں کو اطمینان دلایا ہے کہ وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھیں کہ ان کو کوئی مشکل پیش آئی تو اللہ ان کے لیے راہ نکالے گا۔ وہ اپنے بندوں کا مشکلات کے ذریعہ سے امتحان کرتا ہے۔ جو ان سے پست حوصلہ ہو کر برگشتہ ہو جاتے ہیں خدا بھی ان کو چھوڑ دیتا ہے لیکن جو مشکلات کے علی الرغم خدا کے حدود کا احترام قائم رکھنے کا عزم کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ بالآخر ان کی راہ آسان کر دیتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ۲۹: ۶۹) (جو موانع کے علی الرغم ہماری راہ پر چلنے کی جدوجہد کریں گے ہم ضرور ان کے لیے اپنی راہیں کھولیں گے)۔

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔ یہ اوپر والی بات ہی کی مزید وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہو گا۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ ایک ہی سانس میں تین طلاقیں دے کر بیوی کو گھر سے نکال باہر کرنے کا ایک بڑا محرک، خاص طور پر غربا کے لیے، ان کا معاشی مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ جب ایک عورت کو طلاق دے چھوڑی تو اب اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری مفت میں کیوں اٹھائیں! اللہ تعالیٰ نے ان کو اطمینان دلایا ہے کہ اگر تم اللہ کے حدود کے احترام کے لیے یہ بوجھ اٹھاؤ گے تو وہ تمہیں وہاں سے رزق فراہم کرے گا جہاں سے تم کو گمان بھی نہ ہو گا۔ یہ خیال نہ کرو کہ خدا کی رحمت اور اس کی مدد کے راستے اتنے ہی ہیں جتنے تم نے سوچ رکھے ہیں یا جو تم قیاس کر سکتے ہو بلکہ اس کے بے شمار راستے ہیں جن کا علم اسی وقت ہوتا ہے جب وہ کھلتے ہیں۔ اس وقت انسان حیران رہ جاتا ہے کہ اس کے لیے خدا کی مدد اس گوشے سے نمودار ہوئی جدھر سے اس کے نمودار ہونے کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔ فرمایا کہ اس کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ خدا پر پورا بھروسہ رکھو۔ اگر تم خدا پر بھروسہ رکھو گے تو وہ تمہاری دست گیری کے لیے کافی ہے۔ وہ اسباب و وسائل

کا محتاج نہیں ہے۔ اسباب و وسائل سب اس کے تابع ہیں۔ بندے کو یہ اندیشہ نہیں رکھنا چاہیے کہ جن ناساعد حالات میں وہ گھرا ہوا ہے خدا ان کو بدلنے سے قاصر رہ جائے گا۔ جب وہ مدد کرنا چاہے گا تو اس کے ارادے میں کوئی چیز مزاحم نہ ہو سکے گی۔

اللہ کی مدد کے ظہور کے لیے ایک وقت مقرر ہوتا ہے

إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۚ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اسی طرح اس کی نصرت کے ظہور کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اس کے ظہور میں اگر کچھ دیر ہوتی ہے تو اس سے مقصود بندوں کے صبر کا امتحان ہوتا ہے۔ بندے کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ اللہ نے جو وعدہ کر رکھا ہے وہ ضرور پورا کرے گا۔ اگر اس میں دیر ہو گی تو اتنی ہی ہو گی جتنی اس کے صبر کے امتحان کے لیے ضروری ہے اور یہ امتحان اسی کی بھلائی کے لیے ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان آیات میں جو طریقہ طلاق دینے کا بتایا گیا ہے اگر کوئی شخص اس پر عمل نہیں کرتا بلکہ ایک ہی وقت میں تین یا اس سے زائد طلاقیں دے کر بیوی کو علیحدہ کر دیتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں حنفیہ اور دوسرے ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک تو اس طرح طلاق دینے والے کی ایک سے زیادہ طلاقیں ایک ہی کے حکم میں محسوب ہوں گی لیکن حنفیہ کے نزدیک اس طرح طلاق دینے والے کی طلاق تو واقع ہو جائے گی البتہ صحیح طریقہ اختیار نہ کرنے کے سبب سے وہ عنداللہ گنہگار ہو گا۔

ہمارے نزدیک ان دونوں ہی مسلکوں میں تھوڑی تھوڑی کسر ہے جس کی اصلاح، احترام شریعت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن کی اتنی واضح ہدایات کے باوجود، ایک ہی سانس میں کئی طلاقیں دے ڈالتا ہے اور اس کی اس جسارت پر اس کو کوئی تادیب نہیں ہوتی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دین کے ساتھ اس نے جو مذاق کیا اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ اس کا نوٹس لینا ضروری ہے ورنہ لفظ 'طلاق' ایک بالکل بے معنی لفظ بن کے رہ جاتا ہے حالانکہ شریعت میں نکاح و طلاق کے الفاظ نہایت اہم ہیں جن کو مذاق کے طور پر بھی استعمال کیا جائے تو یہ حقیقت بن جاتے ہیں۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو حنفیہ کا مسلک، احترام شریعت کے نقطۂ نظر سے، زیادہ قرین صواب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی طلاق کو واقع کر دیتے ہیں۔ لیکن ایک خامی اس میں بھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر اس کو کوئی تادیب و تعزیر نہ کی جائے تو مجرد اس بات سے کہ اس طرح طلاق دینے والا عنداللہ گنہگار ہو گا لوگوں کے اندر قرآن کے بتائے ہوئے طریقہ کا صحیح احترام پیدا نہیں کیا جا سکتا اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کی طلاق کو نافذ کرنے کے ساتھ دین کے ساتھ کھیل کرنے کی کوئی سزا بھی اس کو دی جائے تاکہ جو لوگ طلاق دینے کا یہ غلط طریقہ اختیار کرتے

ہیں ان کی حوصلہ شکنی ہو۔

حنفیہ کے اس فتوے کی بنیاد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک اجتہاد پر ہے اور ہمیں جہاں تک علم ہے ان کا اجتہاد یہ ہے کہ اس طرح طلاق دینے والے کی طلاق نافذ تو کر دینی چاہیے اس لیے کہ اس نے ضائع کیا ہے تو اپنا حق رجعت ضائع کیا ہے لیکن ساتھ ہی حدودِ الٰہی کی جو خلاف ورزی اس نے کی ہے اس کی سزا بھی اس کو ملنی چاہیے تاکہ دوسروں کو حدودِ شریعت کی خلاف ورزی کی جرأت نہ ہو۔ یہ اجتہاد نہایت حکیمانہ ہے۔ ہم نے اس کتاب میں فقہی جزئیات پر بحث کے لیے ایک خاص حد مقرر کر لی ہے، اس وجہ سے اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔ اپنے بعض فقہی مقالات میں ہم نے اس پر بحث کی ہے۔

وَالّٰٓئِیۡ یَئِسۡنَ مِنَ الۡمَحِیۡضِ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ فَعِدَّتُہُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشۡہُرٍ ۙ وَّالّٰٓئِیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ ؕ وَاُولَاتُ الۡاَحۡمَالِ اَجَلُہُنَّ اَنۡ یَّضَعۡنَ حَمۡلَہُنَّ ؕ وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مِنۡ اَمۡرِہٖ یُسۡرًا (۴)

عورتوں کے اختلافِ حالات کے سبب سے ان کی عدت میں فرق

اوپر ان عورتوں کی عدت بتائی ہے جن کو حیض آتا ہے اور جن کی عدت کی حد بندی حیض اور طہر سے ہو سکتی ہے۔ اب یہ ان عورتوں کی عدت بتائی جا رہی ہے جو آئسہ ہو چکی ہوں یا ابھی ان کو حیض آیا ہی نہ ہو یا وہ حاملہ ہوں جس کے سبب سے ان کو حیض نہ آ رہا ہو۔ فرمایا کہ جو آئسہ ہو چکی ہوں یا جن کو ابھی حیض آیا ہی نہ ہو ان کی عدت تو تین مہینے ہے اور حاملہ کی عدت وضعِ حمل ہے۔

اربابِ تاویل کی ایک الجھن اور اس کا حل

آئسہ عورتوں کے ساتھ 'اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ' کی جو شرط لگی ہوئی ہے اس کے سبب سے ہمارے اربابِ تاویل کو اس میں بڑا ارتیاب پیش آیا ہے۔ عام طور پر لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر تمہیں ان کی عدت کے بارے میں کوئی شبہ ہو تو ہم تم کو بتاتے ہیں کہ ان کی عدت تین مہینے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عورت کو خون تو آتا ہو لیکن یہ متعین نہ ہو رہا ہو کہ یہ حیض ہے یا استحاضہ تو اس کی عدت تین مہینے ہے۔

پہلا قول سعید ابن جبیرؒ سے مروی ہے اور ابن جریرؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے لیکن یہ قول کچھ قوی نہیں معلوم ہوتا۔ اگر مقصود محض لوگوں کے سوال کا حوالہ ہے تو اس مضمون کی تعبیر کے لیے موزوں ترین لفظ 'سوال' ہے جو قرآن میں اس طرح کے مواقع میں ہر جگہ استعمال ہوا ہے۔ اس کے لیے 'اِرۡتَبۡتُمۡ' کا لفظ موزوں نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر سوال ہوتا تو ان تینوں ہی قسم کی عورتوں سے متعلق ہوتا جن کا حکم یہاں بیان ہوا ہے، جیسا کہ روایات سے معلوم بھی ہوتا ہے، لیکن 'اِرۡتَبۡتُمۡ' اس طرح استعمال ہوا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آئسہ عورتوں کے ساتھ بطور ایک شرط مذکور ہوا ہے۔

دوسرا قول مجاہدؒ، زہریؒ اور ابن زیدؒ سے مروی ہے۔ اس میں ایک تو یہ بات کھٹکتی ہے کہ اگر یہ مسئلہ ایسی عورتوں کا ہے جن کو خون آتا ہے لیکن یہ شک پیدا ہو رہا ہے کہ یہ حیض ہے یا استحاضہ تو ان کو آئسہ سے تعبیر کرنا موزوں نہیں تھا حالانکہ یہاں ان کے لیے 'وَالّٰٓئِیۡ یَئِسۡنَ مِنَ الۡمَحِیۡضِ' کے

الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جس آئسہ کے بارے میں اس طرح کا شک نہ ہو اس کے لیے کوئی عدت نہیں ہے۔ وہ طلاق کے معاً بعد الگ ہو جائے گی حالانکہ جہاں تک ہمیں علم ہے غیر مدخولہ آئسہ کے لیے تو کسی عدت کی قید نہیں ہے لیکن جو آئسہ مدخولہ ہے اس کے لیے تین ماہ کی عدت کی قید بہر شکل ہے۔

ان شبہات کے سبب سے میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ اِنِ ارْتَبْتُمْ کی شرط یہاں آئسہ غیر مدخولہ اور آئسہ مدخولہ کے درمیان امتیاز کے لیے آئی ہے۔ یعنی آئسہ اگر مدخولہ ہے تو آئسہ ہونے کے باوجود اس کا امکان ہے کہ شاید یاس کی حالت عارضی ہو، پھر امید کی شکل پیدا ہو گئی ہو اور اس کے رحم میں کچھ ہو۔ یہی صورت اس کو بھی پیش آ سکتی ہے جس کو ابھی اگرچہ حیض نہیں آیا ہے لیکن وہ مدخولہ ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر آئسہ غیر مدخولہ اور صغیرہ غیر مدخولہ کے لیے تو کسی عدت کی ضرورت نہیں ہے لیکن آئسہ یا صغیرہ، جس کو حیض نہ آیا ہو، اگر مدخولہ ہوں تو ان کے بارے میں چونکہ شبہ کا امکان ہے اس وجہ سے ان کے لیے عدت ہے۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر بات یہی کہنی تھی تو صاف صاف یوں کیوں نہ کہہ دی کہ اگر آئسہ مدخولہ ہو تو اس کی عدت تین مہینے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بات یوں کہی جاتی تو اس سے عدت کی اصل علت واضح نہ ہوتی جب کہ اس کا واضح ہونا ضروری تھا۔ اس عدت کی اصل علت عورت کا مجرد مدخولہ ہونا نہیں بلکہ یہ اشتباہ ہے کہ ممکن ہے اس کے رحم میں کچھ ہو۔

'وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ'۔ فرمایا کہ اسی طرح وہ عورتیں جو حاملہ ہوں ان کی عدت وضع حمل ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس حکم کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۴ میں بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن بیان ہوئی ہے اور یہاں حاملہ کی عدت وضع حمل بیان ہوئی ہے تو اگر کسی حاملہ مطلقہ کا شوہر انتقال کر جائے تو وہ عدت کے چار مہینے دس دن پورے کرے گی یا وضع حمل کے ساتھ ہی اس کی عدت ختم ہو جائے گی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حاملہ کی عدت مہینوں اور دنوں کے حساب سے مقرر نہیں کی جا سکتی، وہ تو بہر حال وضع حمل ہی کے ساتھ مشروط ہو گی۔ یہ چار ماہ دس دن سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے اور کم بھی ہو سکتی ہے۔ اگر زیادہ ہو جائے تو عورت بہر حال اس کو گزارنے کی پابند ہو گی تو جب کم ہو تو عورت کو اس کمی سے فائدہ اٹھانے کا بھی حق ہونا چاہیے۔ گویا یہ دونوں حکم دو الگ الگ حالتوں سے متعلق ہیں اور دونوں اپنے اپنے دائروں میں نافذ العمل رہیں گے۔

حدودِ شریعت کی پابندی کرنے والوں کو اطمینان دہانی

'وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا'۔ وہی بات جو آیت ۲ میں فرمائی ہے معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ یہاں بھی دہرائی ہے۔ احکام کے ساتھ ساتھ یہ تنبیہات اس لیے ضروری ہیں کہ لوگ شریعتِ الٰہی کو بوجھ نہ محسوس کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ان مطلقات کے زمانۂ عدت کے قیام اور

مصارف کا بار بعضوں کی طبیعت پر گراں گزرے گا لیکن جو لوگ اللہ سے ڈریں گے اور حتی الامکان اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کو قائم رکھیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسانی پیدا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر جو بوجھ ڈالتا ہے اگر بندے اس کو اٹھانے کا حوصلہ کر لیتے ہیں تو وہ اس کے اٹھانے میں ان کی مدد فرماتا ہے اور جیسا کہ اوپر فرمایا ہے ان کی مدد وہاں سے کرتا ہے جہاں سے ان کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق نہ تو یہ سوءِ ظن ہونا چاہیے کہ وہ اپنے بندوں پر کوئی ایسا بوجھ ڈالے گا جو ان کی قوتِ برداشت سے زیادہ ہو اور نہ یہ اندیشہ ہونا چاہیے کہ وہ بندے پر بوجھ ڈال کر اس کو تنہا چھوڑ دے گا۔

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا (۵)

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید تاکید ہے کہ یہ اللہ کے احکام ہیں جو اس نے تمہاری طرف اتارے ہیں تو ان کو نہ گراں سمجھو، نہ ان کو حقیر جانو اور نہ یہ گمان کرو کہ وہ تم پر احکام اتار کر خود بے تعلق ہو جائے گا بلکہ وہ تمہاری مدد کرے گا اگر تم ان کو اٹھاؤ گے اور سزا بھی دے گا اگر ان کو پھینکنے کی کوشش کرو گے۔

'وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا' یہ تسلی دی ہے کہ اللہ کے جو بندے اپنی حد تک حدودِ الٰہی کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ کرے گا۔ چھوٹی موٹی غلطیاں اور کوتاہیاں جو ان سے صادر ہو جائیں گی ان کو معاف کر دے گا اور ان کی نیکیوں کے اجر کو بڑھائے گا۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَاۗرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ۭ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى (۶)

زمانۂ عدت میں عورتوں کو ساتھ رکھنے کا طریقہ

فرمایا کہ زمانۂ عدت میں ان عورتوں کو ساتھ رکھنے کا طریقہ ایسا نہیں ہونا چاہیے جس سے ان کی خودداری مجروح ہو بلکہ تمہاری آمدنی کے لحاظ سے رہائش کا جو معیار تمہارا ہو وہی معیارِ رہائش ان کے لیے بھی مہیا کرو اور اس دوران میں کسی پہلو سے ان کو تنگ کرنے کی تدبیریں نہ اختیار کرو کہ چند ہی دنوں میں پریشان ہو کر وہ تمہارا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔

'وُجد' کے معنی بانت کے ہیں۔ آدمی کا معیارِ زندگی اس کی آمدنی کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اسی کی ہدایت ان عورتوں کے باب میں فرمائی کہ ان کو اسی معیار پر رکھنا ہوگا جو معیار آدمی کا اپنا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ خود تو کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہیں اور بیوی کو نوکروں کے کسی کوارٹر یا گیراج میں ڈال دیں اور بچا کھچا اس کو کھانے کو بھیج دیں۔

'وَلَا تُضَاۗرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ' اگر کسی نے دل سے اللہ تعالیٰ کے یہ احکام قبول نہ کیے

ہوں تو وہ ظاہر میں ان کی خاطر مدارات کرتے ہوئے بھی تنگ کرنے کی ایسی تدبیریں اختیار کر سکتا ہے کہ عورت کے لیے چوبیس گھنٹے بھی اس کے گھر میں گزارنا محال ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو وہ ساری مصلحت یک قلم فوت ہو جائے گی جس کے لیے یہ احکام دیے گئے ہیں اس وجہ سے منفی پہلو سے بھی اس بات کی وضاحت فرما دی کہ اس دوران میں ان کو تنگ کر کے بھگا دینے کی تدبیریں نہ کی جائیں۔

'وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ'۔ یہ خاص طور پر حاملہ عورتوں کے بارے میں ہدایت فرمائی کہ ان پر اس وقت تک خرچ کرو جب تک وہ حمل سے فارغ نہ ہو جائیں۔ اس خاص اہتمام سے ذکر کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کی مدتِ قیام طویل بھی ہو سکتی ہے اور بعض حالات میں ان کے مصارف کی نوعیت بھی مختلف ہو سکتی ہے۔

بعض احکام دربابِ رضاعت

'فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۖ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوفٍ'۔ یہ وضعِ حمل کے بعد کا مرحلہ ہے کہ اگر وہ تمہارے بچے کو دودھ پلائیں تو ان کو اس کا معاوضہ دو اور اس معاوضہ سے متعلق باہمی مشورہ سے ایک قرارداد طے کر لو جو وقت کے دستور اور مرد کے معیارِ زندگی کے مطابق ہو۔

'وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ'۔ یعنی اس طرح کی قرارداد میں اگر فریقین زحمت محسوس کر رہے ہیں تو کسی دوسری عورت سے دودھ پلانے کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ یعنی اس کا انحصار فریقین کی باہمی رضامندی، سہولت اور مفاہمت پر ہے۔ کسی کو اس معاملے میں اس کی مرضی کے خلاف مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۳ کے تحت رضاعت سے متعلق بنیادی مسائل پر گفتگو ہو چکی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ہمارے لیے فقہی جزئیات کی تفصیل کا زیادہ موقع نہیں ہے۔

لِيُنْفِقْ ذُو سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ ۖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا (۷)

خرچ کا معیار

یہ خرچ کا معیار بتا دیا کہ کشادہ حال کو اپنی کشادہ حالی کے معیار پر خرچ کرنا پڑے گا اور تنگ حال کو اپنی آمدنی کے مطابق۔ نہ کشادہ حال کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے معیارِ زندگی سے ان کو فروتر حال میں رکھے اور نہ غریب پر اس کی حیثیت سے زیادہ بوجھ ڈالا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص پر ذمہ داری اس کی حیثیت کے اعتبار سے ڈالی ہے۔

غریبوں کو اطمینان دہانی

'سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا'۔ یہ غریبوں کو برسرِ موقع تسلی دی ہے کہ اگر وہ اپنی حالت پر قانع و صابر اور تنگ حالی کے باوجود خدا کے حدود کو قائم رکھنے کا اہتمام کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے تنگی کے بعد آسانی پیدا کرے گا۔ غربت اور احتیاج کے باوجود اللہ کی خوشنودی کے لیے جو لوگ ایثار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے رزق میں برکت دیتا ہے۔

وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا

وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا (۸)

ایک عام تنبیہ

اس آیت کا موقع و محل سمجھنے کے لیے سورۂ تغابن کی آیات ۶-۸ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہ ایک عام تنبیہ ہے جس کے مخاطب قریش اور مسلمان سب ہیں کہ اللہ نے تمھاری رہنمائی کے لیے اپنی ہدایات نازل کر دی ہیں۔ اگر تم نے ان کی قدر کی تو ان کا فائدہ تمھی کو پہنچے گا اور اگر نافرمانی کی تو یاد رکھو کہ تم سے پہلے کتنی قومیں گزر چکی ہیں جنھوں نے اپنے رب کے احکام اور اس کے رسولوں کی تعلیمات کی ناقدری کی تو اللہ نے ان کا سخت محاسبہ کیا اور ان کو نہایت ہولناک عذاب دیا۔ یہ اشارہ عاد و ثمود وغیرہ کی طرف بھی ہے جن کی سرگزشتیں قرآن میں سنائی گئی ہیں اور یہود کی طرف بھی جن کو اللہ نے اپنی شریعت سے نوازا لیکن انھوں نے اس کی قدر نہیں کی تو وہ اللہ کے نہایت سخت عذاب کی گرفت میں آئے۔

'عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا' میں 'عَنْ' اس امر کا قرینہ ہے کہ 'عَتَتْ' یہاں 'اَعْرَضَتْ' کے مفہوم پر متضمن ہے یعنی سرکشی کے سبب سے انھوں نے اپنے رب کے حکم سے اعراض کیا۔ 'حَاسَبْنٰهَا' یہاں محاسبے کے مفہوم میں ہے یعنی اللہ نے ان پر سخت گرفت کی اور ان کو ہولناک عذاب دیا۔ 'نُکْرٌ' کے معنی شدید اور ہولناک کے ہیں۔

فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا (۹)

یعنی جب وہ خدا کے محاسبہ کی زد میں آ گئیں تو انھیں اپنی سرکشی کا انجام بھگتنا پڑا اور ان کا انجام نامرادی ہوا۔ اس لیے کہ فلاح و بہبود کی واحد راہ وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے بتائی ہے۔ اگر قومیں اپنی سرکشی کے سبب سے اس سے انحراف اختیار کرتی ہیں تو لازماً نامرادی سے دوچار ہوتی ہیں۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۖۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۙ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا (۱۰-۱۱)

ایک مؤثر تنبیہ و ترغیب

یہ نہایت واضح الفاظ میں مسلمانوں کو تنبیہ بھی ہے ساتھ ہی نہایت مؤثر انداز میں ترغیب بھی کہ اللہ نے تمھاری طرف اپنی یاددہانی (قرآن) بھی نازل کر دی اور اپنا رسول بھی بھیج دیا ہے۔ اب آگے کا کام تمھارا ہے کہ تاریکی سے روشنی کی طرف نکلنے کے لیے جو اہتمام اللہ نے فرمایا ہے اس کی قدر کرتے ہو یا ان قوموں کی تقلید کرتے ہو جن کا انجام نامرادی ہوا اور جن کے لیے اللہ نے ایک سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

'فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۖۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' یعنی جب قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا

معاملہ اسی سنت کے مطابق ہوا جو مذکور ہوئی تو اے اہلِ عقل جو ایمان لائے ہو، دانش مندی کا راستہ یہی ہے کہ اپنے اللہ سے ڈرو۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے ایمان کی راہ میں جو قدم بڑھایا ہے اس سے یہ بات تو ثابت ہوئی کہ تم خواہشوں کے غلام نہیں بلکہ عقل سے کام لینے والے لوگ ہو کہ ایمان کی راہ اختیار کی تو اب تمھارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے اللہ سے ڈرو اور اس کے حدود سے انحراف نہ اختیار کرو ورنہ تمھارا انجام بھی وہی ہو گا جو ان قوموں کا ہوا جنھوں نے اللہ کی بتائی ہوئی راہ سے انحراف کیا۔

عقل و ایمان لازم و ملزوم ہیں

'یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ' کے بعد 'الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' سے یہ بات نکلتی ہے کہ عقل اور ایمان میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ جو شخص عاقل ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ایمان سے بہرہ ور ہو۔ اگر کوئی شخص ایمان سے بہرہ ور نہیں ہے تو خواہ وہ آسمان و زمین کا طول و عرض ناپنے میں کتنا ہی ماہر ہو لیکن اس کی عقل میں بہت بڑا فتور ہے۔

ہدایت کے لیے اہتمام

'قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ مُبَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ' یہ اس اہتمام کی طرف اشارہ ہے جو اللہ نے اپنی حجت تمام کر دینے کے لیے فرمایا ہے کہ تمھاری طرف اپنی یاددہانی بھی اس نے نازل کر دی ہے اور ایک رسول بھی بھیج دیا ہے جو ایمان و عملِ صالح کی راہ اختیار کرنے والوں کو اللہ کی آیات سنا رہا ہے تاکہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی شاہراہ پر لائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس اہتمام کے بعد بھی اگر تم نے روشنی پر تاریکی ہی کو ترجیح دی تو اس کی ذمہ داری تمھارے ہی اوپر ہو گی اور اس گمراہی کے لیے اپنے رب کے سامنے تم کوئی عذر نہ پیش کر سکو گے۔

رسول کی زندگی سراپا ذکر الٰہی ہوتی ہے

'ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا' میں 'ذکر' سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن کو 'ذِكْرٰی' اور 'ذِی الذِّكْرِ' کے الفاظ سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اس تعبیر کے مضمرات کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ انسانی فطرت کے تمام مضمرات کی یاددہانی کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خلق کی رہنمائی کے لیے جو ہدایات بھیجیں اور جن کو قومیں فراموش کرتی رہیں ان کی بھی یاددہانی کرتا ہے، رسولوں کی تکذیب کرنے والوں اور ان پر ایمان لانے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جو معاملہ کیا اس کی بھی یاددہانی کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر اس جزا اور سزا کی یاددہانی کرتا ہے جس کا ایک معین دن اس زندگی کے بعد لازماً ظہور میں آنے والا ہے جو اس دنیا کی غایت و نہایت ہے۔

'رَّسُوْلًا'، یہاں 'ذِكْرًا' سے بدل ہے اور اس کا بدل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان دونوں میں روح اور قالب کا رشتہ ہے۔ چنانچہ قرآن کے لیے جس طرح لفظ 'ذکر' آیا ہے اسی طرح رسول کے لیے 'مُذَكِّر' آیا ہے 'اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ' (الغاشیۃ ۸۸: ۲۱) (تم تو بس ایک مذکر ہو)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سراپا ان حقائق کی یاددہانی تھی جن کی یاددہانی کے لیے قرآن نازل ہوا۔ یعنی قرآن نے

جو کچھ بتایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ سب کچھ کر کے بھی دکھا دیا جس سے لوگوں پر اللہ کی حجت اس طرح پوری ہو گئی کہ اس میں کسی پہلو سے کوئی کسر باقی نہیں رہی۔

رزقِ آخرت کی بشارت

'قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا'۔ یعنی جو ایمان و عملِ صالح کی راہ اختیار کرے گا اور حدودِ الٰہی کی حفاظت کی خاطر ایثار کرے گا وہ مطمئن رہے کہ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ اللہ نے اس کے لیے آخرت میں نہایت اعلیٰ رزق تیار کر رکھا ہے۔ اوپر آیت ۳ میں ایثار و توکل کرنے والوں کو اس دنیا میں تائیدِ الٰہی کی بشارت دی ہے، یہ رزقِ آخرت کی بشارت ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (۱۲)

صفاتِ الٰہی کا حوالہ تاکہ لوگوں کا عقیدہ محکم ہو

یہ آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ قدرت اور صفتِ علم کی یاد دہانی فرمائی ہے تاکہ اوپر جو باتیں فرمائی گئی ہیں، خواہ ان کا تعلق تنبیہ و تہدید سے ہو یا تسکین و تسلی سے، ان کا اعتقاد لوگوں کے اندر راسخ ہو اور وہ یہ جانیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پناہ ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے اور اس کا علم بھی محیطِ کل ہے۔ سات آسمانوں اور سات زمینوں کی کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہے۔ اگر کسی نے کوئی نیکی کی ہے تو وہ بھی اس کے علم میں ہے اور اگر کسی نے کوئی بدی کی ہے تو وہ بھی اس کے علم میں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ سے متعلق یہ شعور اچھی طرح دلوں کے اندر راسخ نہ ہو اس وقت تک اس کی شریعت کے احترام کا صحیح حق ادا نہیں ہو سکتا۔

سات آسمان اور سات زمین

'اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ'۔ اپنی قدرت کی وسعت کا تصور دینے کے لیے فرمایا کہ یہ نہ گمان کرو کہ خدا کی کائنات کل اتنی ہی ہے جتنی تمھیں نظر آتی ہے۔ یہ تو اس کی کائنات کا ایک نہایت ہی حقیر اور محدود حصہ ہے۔ یہ آسمان جو تمھیں نظر آتا ہے اس جیسے سات آسمان خدا نے بنائے ہیں اور زمین بھی یہی نہیں ہے جس پر تم چلتے پھرتے ہو بلکہ زمینیں بھی ہر آسمان کے ساتھ الگ الگ سات ہیں۔

سات آسمانوں کا ذکر تو قرآن میں بھی بار بار ہوا ہے اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بھی ہے لیکن سات زمینوں کا ذکر صرف اس سورہ میں ہوا ہے لیکن جب سات آسمانوں کا ذکر ہوا ہے تو ان کے ساتھ سات زمینوں کا پایا جانا تو لازمی ہوا۔ آسمان اور زمین میں وہی نسبت ہے جو مکان اور اس کی چھت میں ہوتی ہے تو جب چھتیں سات ہیں تو مکان بھی سات ہونے چاہئیں۔ جس طرح آسمان کے بغیر زمین کا تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح زمین کے بغیر آسمان کا بھی کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بلندی کے لیے پستی کا وجود ناگزیر ہے۔

رہا یہ سوال کہ ان ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں میں ایک ہی طرح کے قوانین و نوامیس نافذ ہیں اور ایک ہی قسم کی مخلوق آباد ہے یا الگ الگ مخلوق اور الگ الگ نوامیس و قوانین ہیں تو مجرد 'مِثْلَهُنَّ'

کے لفظ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ہر عالم میں ایک ہی مخلوق اور ایک ہی قسم کے نوامیس و قوانین ہوں۔ اس تثلیث کا تعلق صرف پیدا کرنے سے ہے کہ اللہ نے جس طرح سات آسمان بنائے ہیں اسی طرح زمینیں بھی سات بنائی ہیں۔ رہے ان کے نوامیس و قوانین تو یہ چیز نہ اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے اور نہ ہماری اور آپ کی سمجھ میں آنے والی ہی ہے۔ ہمارے لیے یہ اجمالی ایمان بس ہے کہ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ہماری سائنس ابھی خلائے لا انتہا ہی میں آوارہ گردی کر رہی ہے۔ وہ ایک راز کا انکشاف کرتی ہے تو اس سے سینکڑوں معمّے دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں۔ تاہم مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگر سائنس سراغ نہ دے سکی تو آخرت میں ان شاء اللہ سارے راز کھل جائیں گے۔ اس دنیا میں انسان کو جو علم ملا ہے وہ بہت قلیل ہے۔ 'وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا' (بنی اسرائیل - ۱۷ : ۸۵)

'يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ' یعنی جس طرح تمہارے آسمان و زمین کے درمیان خدا کے احکام و قوانین کا نزول ہوتا ہے اسی طرح دوسرے آسمانوں اور زمینوں کے اندر بھی اس کے احکام نازل ہوتے ہیں۔

'لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ' یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات کا یہ راز تم پر اس لیے کھولا ہے کہ تم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ 'لِتَعْلَمُوْٓا' سے پہلے ایک مناسب موقع فعل محذوف ہے اور اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا' یہ اس کا دوسرا مقصد واضح فرمایا کہ جس طرح اس کی قدرت کی کوئی حد و نہایت نہیں اسی طرح اس کے علم کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ اس کا علم ان تمام عوالم کی ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فللّٰہ الحمد ولہ المنّۃ۔

رحمان آباد

۲۵ - اپریل ۱۹۷۰ء

۱۹ - جمادی الاول ۱۳۹۰ھ

تدبّرِ قرآن

٦٦

التَّحریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ کی تفسیر میں ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ دونوں سورتیں ـــــ الطلاق اور التحریم ـــــ علی الترتیب یہ تعلیم دے رہی ہیں کہ نفرت اور محبت دونوں طرح کے حالات کے اندر اللہ تعالیٰ کے حدود کی پابندی واجب ہے۔ چنانچہ سابق سورہ میں بتایا کہ نفرت کے اندر کس طرح حدودِ الٰہی کا احترام قائم رکھا جائے۔ اب اس سورہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ محبت کے اندر کس طرح اللہ کے حدود کی حفاظت کی جائے۔

نفرت کی طرح محبت کا جذبہ بھی انسان پر غالب ہو جائے تو اس کو بالکل یک رُخا بنا کے رکھ دیتا ہے اور وہ ان لوگوں کے ساتھ، حدودِ الٰہی کے معاملے میں، نہایت بے حس اور مداہنت کرنے والا بن جاتا ہے جن سے اس کو محبت ہوتی ہے۔ بیوی بچوں کو وہ علانیہ دیکھتا ہے کہ ان کا رویہ شریعت سے ہٹا ہوا ہے لیکن یا تو اس کو ان کے انحراف کا احساس ہی نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو وہ یہ فرض کر کے نظر انداز کر جاتا ہے کہ آہستہ آہستہ خود بخود ان کی اصلاح ہو جائے گی۔ حد یہ ہے کہ بہت سے لوگ اپنے متعلقین کی کھلی ہوئی زیادتیوں پر بھی، ان کو ٹوکنے یا روکنے کے بجائے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے کوئی عذر تلاش کریں۔ یہ کمزوری صرف عام لوگوں ہی کے اندر نہیں بلکہ ان لوگوں کے اندر بھی پائی جاتی ہے جو دوسروں کی اصلاح کے لیے خدائی فوجدار بنے پھرتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس طرح کے لوگوں پر یہ حقیقت واضح نہیں ہوئی کہ کسی کے ساتھ محبت کا صحیح تقاضا یہ نہیں ہے کہ اس کو اپنی مداہنت سے خدا کے غضب کے حوالہ کیا جائے بلکہ اس کا صحیح تقاضا یہ ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس کو خدا کی پکڑ سے بچایا جائے اگرچہ اس مقصد کی خاطر کچھ ناگواریاں بھی گوارا کرنی پڑیں۔ وہ شخص جو اپنے بیوی بچوں اور دوستوں کی خلافِ شریعت باتوں سے چشم پوشی کرتا ہے وہ درحقیقت ان سے محبت نہیں کرتا ہے بلکہ ان کو نہایت بے دردی کے ساتھ خدا کے غضب کے حوالے کر رہا ہے لیکن اس کو اپنے اس فعل کے نتائج کا شعور نہیں ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے احتساب جو اگرچہ صادر

ہوا تو کمزوروں پر رافت اور بیویوں کی دلداری کے جذبہ سے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر گرفت فرمائی کہ اللہ کا رسول تمام امت کے لیے نمونہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ معاملے میں بھی کوئی ایسی بات کرے جو اللہ کے حدود کے خلاف ہو، اگرچہ اس کا محرک نیک ہی ہو۔

اسی طرح ازواج نبی رضی اللہ عنہم کی ایک بات پر گرفت فرمائی گئی جو ہرچند صادر ہوئی باہمی حسنِ ظن واعتماد کی بنا پر لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر بھی احتساب فرمایا کہ ازواج نبی رضی اللہ عنہم تمام امت کی خواتین کے لیے نمونہ ہیں۔ دوسروں کی نسبت وہ اس بات کی زیادہ ذمہ دار ہیں کہ ان سے کوئی ایسی بات صادر نہ ہو جو شریعت کے حدود سے ہٹی ہوئی ہو اگرچہ اس کا سبب باہمی اعتماد و حسن ظن ہی ہو۔ ساتھ ہی یہ تنبیہ کہ اللہ کے ہاں مسئولیت درجہ و مرتبہ کے اعتبار سے ہے جن کے درجے جتنے ہی اونچے ہیں ان کی مسئولیت اتنی ہی زیادہ ہے۔

(۶-۸) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواجؓ کے احتساب کے بعد عام مسلمانوں کو یہ موعظت کہ آخرت کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنا اور اپنے متعلقین کا برابر احتساب کرتے رہو اور اس بات کو یاد رکھو کہ اللہ نے دوزخ پر جو فرشتے مامور کیے ہیں وہ نہایت سخت گیر ہیں۔ کسی کے ساتھ بھی وہ کوئی نرمی یا مداہنت کرنے والے نہیں ہیں۔ اس دن کسی کا بھی کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ ہر ایک کو صاف جواب ملے گا کہ آج ہر ایک کے سامنے اس کا عمل ہی آ رہا ہے، کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی ہے۔ اس دن فائزالمرام صرف وہ ہوں گے جو مخلصانہ توبہ کے ذریعے سے اپنے کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا حق دار بنا لیں گے۔ وہ دن پیغمبرؐ اور اس کے مخلص ساتھیوں کی سرفرازی کا دن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کے نور کو کامل کرے گا۔ باقی سب محروم و نامراد ہوں گے۔

(۹-۱۲) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو پر زور الفاظ میں تاکید کہ کفار و منافقین کو پوری سختی کے ساتھ جھنجھوڑ کر سنا دو کہ اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم ہی میں بنائیں گے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ آخر میں کفار کے سامنے حضرت نوحؑ و حضرت لوطؑ کی بیویوں کی مثال اور مسلمانوں کے سامنے فرعون کی بیوی اور حضرت مریمؑ کی مثالیں پیش کر کے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کام آنے والی چیز آدمی کا اپنا ایمان و عمل ہے۔ اگر یہ چیز موجود نہ ہو تو حضرت نوحؑ و حضرت لوطؑ جیسے جلیل القدر نبیوں کی بیویاں ہونا بھی کوئی نفع پہنچانے والی چیز نہیں ہے اور اگر یہ چیز موجود ہو تو فرعون کی بیوی ہو کر بھی ایک عورت آخرت کے بلند سے بلند درجات کی حق دار ہو سکتی ہے۔

سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ (۶۶)

مَدَنِيَّةٌ ـــــــــ آیات : ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۳ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ
اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ① قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ
اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ② وَاِذْ اَسَرَّ
النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ
اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا
بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ③
اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ
فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ
بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ④ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا
خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰۗىِٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ
سٰۗىِٕحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ⑤ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ
وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰۗىِٕكَةٌ
غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا

يُؤْمَرُونَ ۝٦ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۖ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ
ع ١ ١٩ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝٧ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً
نَصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّاتٍ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ
آمَنُوا مَعَهُ ۖ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ
يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيرٌ ۝٨ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ
وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝٩ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا
لِلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتَ نُوحٍ وَامْرَأَتَ لُوطٍ ۖ كَانَتَا تَحْتَ
عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا
عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِينَ ۝١٠
وقف لازم وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ
رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِنْ فِرْعَوْنَ
وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝١١ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ
عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا
ع ٢ ٥ ٢٠ وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ ۝١٢

ترجمۂ آیات ۱-۱۲ اے نبی، تم اپنی بیویوں کی دل داری میں وہ چیز کیوں حرام ٹھہراتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے جائز کی ہے! اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اللہ نے

تمھاری خلافِ شرع قسموں کا توڑ دینا تم پر فرض کر دیا ہے اور اللہ ہی تمھارا مولیٰ و مرجع ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ ۱-۲

اور جب کہ نبی نے اپنی ایک بیوی سے ایک راز کی بات کہی تو جب انھوں نے اس کی خبر کر دی اور اللہ نے اس سے پیغمبر کو آگاہ کر دیا تو پیغمبر نے کچھ بات جتا دی کچھ ٹال دی تو جب پیغمبر نے بیوی کو اس کی خبر کی تو وہ بولیں کہ آپ کو کس نے اس کی خبر دی؟ پیغمبر نے کہا، مجھے خدائے علیم و خبیر نے خبر دی۔ اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی تمھارے لیے زیبا ہے تمھارے دل تو خدا کی طرف مائل ہی ہیں اور اگر تم اس کے خلاف ایکا کرو گی تو اس کا حامی اللہ ہے اور جبریل اور تمام نیکوکار مسلمان اور مزید برآں فرشتے بھی اس کے مددگار ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ تمھیں طلاق دے چھوڑے تو اس کا پروردگار تمھارے بدلے میں تم سے بہتر بیویاں اس کو دے دے۔ اطاعت شعار، مومنہ، فرمانبردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، ریاضت کرنے والیاں، شوہر آشنا اور کنواریاں۔ ۳-۵

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ جس پر درشت مزاج اور سخت گیر ملائکہ مامور ہوں گے۔ اللہ ان کو جو حکم دے گا اس کی تعمیل میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کریں گے اور وہ وہی کریں گے جس کا ان کو حکم ملے گا۔ اے لوگو، جنھوں نے کفر کیا، آج عذر نہ پیش کرو، تم وہی بدلے میں پا رہے ہو جو تم کرتے رہے ہو۔ ۶-۷

اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اللہ کی طرف مخلصانہ رجوع کرو۔ امید ہے کہ

تمھارا پروردگار تمھارے اوپر سے تمھارے گناہ جھاڑ دے اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ جس دن کہ اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے، رسوا نہیں کرے گا۔ ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کے دہنے چل رہی ہو گی۔ وہ دعا کر رہے ہوں گے: اے ہمارے پروردگار، ہمارے لیے روشنی کو کامل کر اور ہماری مغفرت فرما، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ ۸

اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کر اور ان پر سخت ہو جا۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے! ۹

اللہ کافروں کے لیے مثال بیان کرتا ہے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی۔ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں تو انھوں نے ان کے ساتھ بے وفائی کی تو وہ اللہ سے ان کے کچھ کام آنے والے نہ بن سکے اور دونوں عورتوں کو حکم ہوا کہ جاؤ تم بھی دوزخ میں پڑنے والوں کے ساتھ دوزخ میں پڑو۔ ۱۰

اور اللہ ایمان والوں کے لیے مثال بیان کرتا ہے فرعون کی بیوی کی۔ جب کہ اس نے دعا کی: اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا اور مجھ کو نجات دے فرعون سے اور اس کے عمل سے اور مجھے نجات دے ظالموں کی قوم سے۔ اور مریم بنت عمران کی مثال بیان کرتا ہے جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی پس ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے رب کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرماں برداروں میں سے تھی۔ ۱۱-۱۲

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱)

پیغمبر صلعم کے ایک فعل پر احتساب

اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جن کے ساتھ محبت و مروّت کے تعلقات ہوں خدا کے حدود و حقوق کے معاملات میں ان کے ساتھ بھی کوئی مداہنت و رعایت جائز نہیں ہے بلکہ اس محبت ہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا احتساب زیادہ احتیاط کے ساتھ ہوتا رہے تاکہ خدا کے چھاج میں پھٹکے جانے سے پہلے ہی ممکن ہو تو ان کی اصلاح ہو جائے اور اگر اصلاح نہ ہو تو بدرجہ ادنیٰ آدمی اپنے حق نصیحت سے عند اللہ بری الذمہ ہو جائے۔

اس حقیقت کو مبرہن کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں سب سے پہلے اپنے پیغمبرؐ ہی پر گرفت فرمائی کہ آپ نے اپنی ازواجِ مطہراتؓ کی دلداری کے خیال سے اپنے اوپر ایک ایسی چیز حرام کیوں کر لی جو اللہ نے آپ کے لیے جائز کی؟

غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے پیغمبرؐ اور ان کی ازواجؓ سے زیادہ کون محبوب ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود آپ کی ایک معمولی سی فروگذاشت پر، جو خود قرآن کے بیان کے مطابق، ایک نہایت نیک محرک سے صادر ہوئی، آپ کو تنبیہ فرمائی گئی تاکہ ہر شخص کے سامنے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے کہ خدا کے حدود و قیود کی پابندی سے جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواجِ مطہراتؓ بھی بالا نہیں ہیں تو

تا بہ دیگراں چہ رسد!

واقعہ کی نوعیت

رہا یہ سوال کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج کی دلداری کے خیال سے اپنے اوپر کیا چیز حرام کر لی تھی تو اس کے جواب میں راویوں سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ ازواجِ مطہراتؓ میں سے کسی کے پاس شہد نوش فرمایا جس کی بُو پر آپ کی بعض ازواج نے ناگواری کا اظہار فرمایا۔ شہد کی بعض قسمیں ناگوار بُو کی ہوتی بھی ہیں اور نہ بھی ہوں تو جو لوگ زیادہ ذکی الحس ہوتے ہیں وہ ہر بُو کو پسند نہیں کرتے۔ خاص طور پر خواتین اس معاملے میں زیادہ شدید الاحساس ہوتی ہیں۔ وہ بسا اوقات اچھی بھلی اور اچھے خاصے ذائقہ کی چیزوں کو بھی پسند نہیں کرتیں۔ لوگوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ امہات المومنینؓ میں سے بھی بعض کو وہ شہد پسند نہیں تھا جس میں مغافیرؔ[1] کی بُو ہو۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس ناگواری کا اظہار حضورؐ کے سامنے فرمایا۔ حضورؐ چونکہ خود نہایت لطیف المذاق اور دوسروں

---

[1] یہ ایک خاص بوٹی کا نام ہے جس سے شہد کی مکھیاں شہد لیتی ہیں لیکن بعض لوگوں کو اس کی بُو ناگوار ہوتی ہے۔

بالخصوص جنسِ ضعیف، کے جذبات و احساسات کا بڑا پاس و لحاظ رکھنے والے تھے، اس وجہ سے آپ نے عہد کر لیا کہ اب کبھی شہد نوش نہیں فرمائیں گے۔

عام حالات میں تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی بلکہ ایک نیک محرک سے صادر ہونے کے سبب سے نہایت پسندیدہ بات تھی لیکن پیغمبر کا ہر قول و فعل دین میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا ہر عمل پوری امت کے لیے مثال و نمونہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے ذاتی ذوق و رجحان اور اپنے محبوب سے محبوب لوگوں کی خاطر سے بھی کوئی ایسی بات کہے یا کرے جو بال برابر بھی اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے حدود سے متجاوز ہو، ورنہ پوری امت کے لیے ایک غلط مثال قائم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہود کے متعلق معلوم ہے کہ انھوں نے اپنے اوپر اونٹ کو صرف اس بنا پر حرام کر لیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کسی سبب سے اونٹ کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے علم میں یہ بات آتی کہ حضورؐ نے شہد نہ کھانے کا عہد کر لیا تو کوئی متقی مسلمان مشکل ہی سے شہد کو ہاتھ لگاتا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ پر گرفت فرمائی اور فوراً اس کی اصلاح کے لیے ہدایت فرمائی۔

حضورؐ کے فعل کا محرک

تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ سے اس محرک کی طرف اشارہ ہے جو آپ کے اس اقدام کا باعث ہوا۔ اس محرک کا پتہ دینا اس لیے ضروری ہوا کہ اس سورہ کا مقصد ہی، جیسا کہ ہم نے تمہید میں بیان کیا، یہ تعلیم دینا ہے کہ جن کے ساتھ محبت کے تعلقات ہوں ان کے احتساب میں بھی آدمی کو مداہن نہیں ہونا چاہیے۔ نفرت کی طرح محبت بھی حدودِ الٰہی کے احترام سے آدمی کو غافل کر دیتی ہے۔ اس خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ اور آپ کی ازواج پر گرفت فرمائی، جن سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں کوئی دوسرا محبوب نہیں ہو سکتا، تاکہ مسلمانوں کو اس سے یہ سبق حاصل ہو کہ دین کے معاملے میں کسی محبوب سے محبوب کے ساتھ بھی کوئی رعایت جائز نہیں ہے۔

غلطی پر گرفت کے ساتھ ہی معافی کا اعلان

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ حضورؐ کے اس فعل کا محرک چونکہ نہایت نیک تھا، آپ نے محض جذبۂ رافت و محبت کے تحت، خاص اپنی ذات کے لیے ایک فیصلہ فرمایا تھا، امت کے لیے کسی چیز کو حرام کرنا مقصود نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے گرفت کے ساتھ ہی اس فروگزاشت کی معافی کا اعلان بھی فرما دیا۔

یہاں اس امر پر نگاہ رہے کہ معافی کے اعلان میں نہایت مبادرت پائی جاتی ہے۔ یعنی اس طرح کے کسی اقدام کا شرعی حکم بیان کرنے سے پہلے ہی معافی کا اعلان فرما دیا گیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتی ہے کہ حضورؐ کے سامنے اپنے اس فعل کا وہ پہلو بالکل نہیں تھا جس پر گرفت فرمائی گئی بلکہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، آپ نے محض جذبۂ رافت کے تحت، جنسِ ضعیف کی دلداری کے لیے، اپنی ذات پر ایک پابندی عائد فرمائی تھی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر گرفت تو فرمائی تاکہ اس سے وہ مضرتیں نہ پیدا ہوں جن کے پیدا ہونے کا امکان تھا لیکن ساتھ ہی اس کی معافی کا اعلان بھی فرما دیا تاکہ یہ گرفت

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر گراں نہ گزرے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام سے صادر ہونے والی لغزشوں کی نوعیت

یہاں وہ بات یاد رکھیے جو اس کتاب میں ہم بار بار بیان کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ نفس کی پاسداری میں نہیں ہوتی بلکہ کسی غیر کی پاسداری میں وہ حد مطلوب سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ بیویوں کی دلداری کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ یہ شرافت، مروت، فتوت کا تقاضا اور فطرت و شریعت کا مطالبہ ہے جس کی قرآن نے تاکید فرمائی ہے بشرطیکہ یہ شریعت کے حدود کے اندر رہے۔ اگر یہ اس سے متجاوز ہونے لگے تو یہ فتنہ بن جاتی ہے جس سے بچنا اور بچانا ضروری ہے لیکن جب کسی فروگزاشت کا محرک نیک ہو تو اس پر گرفت اس طرح ہونی چاہیے کہ عفو و درگزر اس کے ہم رکاب رہے۔

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۲)

ناجائز قسم کے بارے میں شریعت کا حکم

یہ حکم بیان فرمایا ہے اس صورت کے لیے جب کوئی شخص اپنے اوپر کسی جائز چیز کو حرام کر لینے کی قسم کھا بیٹھے۔ اوپر کی آیت میں خطاب صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اس آیت میں عام مسلمانوں سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لغزش پر ٹوکنے سے اصل مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی تھا کہ اس کے سبب سے امت کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ چنانچہ اس آیت میں تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے اوپر کسی جائز چیز کو حرام کر لینے کی قسم کھا بیٹھے تو اللہ نے اس کے لیے یہ ضروری ٹھہرایا کہ وہ اس قسم کو توڑ ڈالے اور حرام کردہ چیز کو جائز کرے۔

'وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ' یہ وجہ بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات کیوں ضروری ٹھہرائی ہے؟ فرمایا کہ اللہ ہی تمہارا آقا و مولیٰ ہے اس وجہ سے اسی کو حق حاصل ہے کہ وہ تمہیں بتائے کہ تمہارے لیے کیا حلال ہے اور کیا حرام؛ نہ کسی کو خود یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے جی سے کسی چیز کو حرام یا حلال ٹھہرائے اور نہ یہ جائز ہے کہ کسی دوسرے کے لیے وہ تحریم و تحلیل کا حق تسلیم کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے حق میں مداخلت کرے گا جو شرک ہے۔

'وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ' یہ اسی حقیقت کی مزید وضاحت ہے کہ حقیقی علیم و حکیم اللہ تعالیٰ ہی ہے اس وجہ سے اس نے بندوں کو جو حکم دیا ہے یا جس چیز سے روکا ہے وہ تمام تر علم و حکمت پر مبنی ہے۔ کسی دوسرے کو خدا سے زیادہ علیم و حکیم ہونے کے خبط میں نہیں مبتلا ہونا چاہیے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قسم توڑ دینے کا حکم تو دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ کسی کفارہ کا ذکر نہیں ہے تو کیا اس صورت میں کوئی کفارہ عائد نہیں ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قسم توڑنے پر کفارہ کا حکم المائدہ کی آیت ۸۹ میں بیان ہو چکا ہے اس وجہ سے اس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں تھی البتہ یہاں 'تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ' کے الفاظ سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ اگر کسی نے قسم کھا کر

کوئی چیز حرام ٹھہرائی ہو تب تو کفارہ ضروری ہوگا۔ لیکن قسم نہ کھائی ہو تو کفارہ ضروری نہیں ہے۔

وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ ۖ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَٰذَا ۖ قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ (۳)

ازواجِ نبیؐ کے احتساب کی ایک مثال

اوپر کی آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احتساب تھا۔ اس آیت میں ازواجِ نبیؐ میں سے ایک بیوی کی فروگزاشت پر گرفت فرمائی کہ انھوں نے حضورؐ کی کوئی بات، جو آپ نے بطورِ راز ان سے فرمائی، کسی دوسری بیوی پر ظاہر کر دی۔ پھر جب حضورؐ نے ان کی اس غلطی پر ٹوکا تو اس پر نادم ہونے کے بجائے انھوں نے اس ٹوکنے کو اپنی خودداری کے خلاف محسوس کیا اور جن بیوی پر راز ظاہر کیا گیا تھا انھوں نے بھی اس کو ناگوار جانا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بیویوں کو تنبیہ فرمائی تاکہ ہر شخص پر یہ واضح ہو جائے کہ دین کے معاملے میں ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) بھی احتساب سے بالاتر نہیں ہیں۔

واقعہ کی نوعیت

'وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا'۔ مفسرین نے عام طور پر اس واقعہ کو اوپر والے واقعہ ہی سے جوڑ کر ایک ناگوار داستان کی شکل دے دی ہے لیکن عربیت کے لحاظ سے یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ واقعہ اوپر کے واقعہ ہی کا ایک حصہ ہو بلکہ اقرب یہ ہے کہ یہ ایک دوسری بات کا حوالہ ہو جس کا صدور ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) میں سے کسی سے ہوا جس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی۔ زبان کا یہ نکتہ یاد رکھیے کہ 'وَإِذْ' سے بالعموم کسی دوسرے مستقل واقعہ ہی کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

یہاں قرآن نے اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے کہ حضورؐ نے کیا راز کی بات کہی اور کس بیوی سے کہی بلکہ اس کو پردے ہی میں رکھا ہے اس وجہ سے ہم اس راز کے درپے ہونا جائز نہیں سمجھتے۔ حضورؐ کی ازواجؓ ہمارے لیے ماؤں کی منزلت میں ہیں۔ بیٹوں کے لیے یہ بات کسی طرح پسندیدہ نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی ماؤں اور باپوں کے درمیان کے رازوں کے کھوج میں لگیں۔ بالخصوص جب کہ اس راز کے انکشاف سے اس آیت کے فہم میں کوئی مدد بھی نہ مل رہی ہو۔ یہاں راز کے افشا ہی پر تنبیہ فرمائی گئی ہے تو اگر ہم اس کے درپے ہوں گے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس چیز سے روکا گیا ہے ہم نے اس کا ارتکاب کیا البتہ اتنی بات اس آیت سے صاف واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہرات کو اپنا محرمِ راز بناتے تھے جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو ان کی رازداری اور ان کی فہم و بصیرت پر پورا اعتماد تھا۔

ازواجِ مطہرات پر حضورؐ کا اعتماد

میاں بیوی کے تعلقات کا سارا حسن و جمال اسی اعتماد میں ہے۔ اگر باہم یہ اعتماد نہ ہو کہ ایک دوسرے کو محرمِ راز بنا سکیں تو یہ اعلیٰ انسانی اقدار سے بالکل خالی زندگی ہوگی۔

'فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ'۔ یہاں اتنی بات بر بنائے قرینہ محذوف ہے کہ حضورؐ نے جن بیوی کو محرمِ راز بنایا انھوں نے یہ راز کسی دوسری بیوی پر،

ظاہر کر دیا۔ اگرچہ آیت میں جس طرح اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ کس بیوی سے یہ غلطی صادر ہوئی اسی طرح اس بات کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ یہ افشائے راز کس بیوی پر ہوا لیکن اتنی بات واضح ہے کہ معاملہ ازواجِ مطہراتؓ کے درمیان ہی کا ہے، کسی غیر کے سامنے کوئی افشائے راز نہیں ہوا۔ مفسرین نے عام طور پر حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ کے نام لیے ہیں۔ اگر اس قول پر اعتماد کیجیے تو اس سے یہ بات نہایت واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ ان سیدات کے باہمی تعلقات ایسے خوش گوار تھے کہ آپس میں اہم رازوں کے معاملے میں بھی کوئی پردہ نہ تھا۔ اس سے ان روایات کی تردید ہوتی ہے جن میں غیر محتاط راویوں نے ان کی باہمی چشمک و رقابت کے واقعات بیان کیے ہیں۔

حدودِ الٰہی کے معاملہ میں کوئی بھی احتساب سے بالا نہیں ہے

اس افشائے راز سے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو باخبر کر دیا جس کے بعد حضورؐ نے ان بیوی کو اس کی طرف توجہ دلائی جن سے یہ غلطی صادر ہوئی۔ یہ توجہ دلانا اس لیے ضروری تھا کہ میاں بیوی کے تعلقات میں رازداری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بیویوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شوہروں کے رازوں کی حفاظت کرنے والی بنیں۔ قرآن میں ان کی خاص صفت 'حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ' (رازوں کی حفاظت کرنے والیاں) بیان ہوئی ہے۔ بیوی، شوہر کے رازوں کی قدرتی امین ہوتی ہے۔ اگر وہ اس میں خیانت کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے گھر میں اسی نے نقب لگائی جس کو اس نے گھر کا پاسبان بنایا۔ امانت کی یہ صفت یوں تو ہر بیوی میں ہونی ضروری ہے لیکن ذمہ داریاں علیٰ فرقِ مراتب ہوتی ہیں۔ ازواجِ نبی رضی اللہ عنہن پر یہ ذمہ داری دوسروں کی نسبت بدرجہا زیادہ تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ایماء پر حضورؐ نے ان کو متنبہ فرمایا تاکہ یہ حقیقت کھل کر ہر شخص کے سامنے آ جائے کہ حدودِ الٰہی کے معاملے میں کوئی بھی احتساب سے بالا نہیں ہے۔

ایک نہایت لطیف حقیقت

'عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ' کے الفاظ ایک نہایت ہی لطیف حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ حضورؐ نے بیوی صاحبہ کا احتساب تو فرمایا کہ یہ دین کا تقاضا تھا لیکن اس طرح نہیں کہ ان کے لتے لے ڈالے ہوں بلکہ کچھ بات ظاہر فرمائی اور کچھ نظر انداز فرما دی۔ یہ طریقہ حضورؐ نے اس وجہ سے اختیار فرمایا کہ بیوی صاحبہ کو تنبیہ تو ہو جائے لیکن یہ تنبیہ ان کے دل پر زیادہ شاق نہ گزرے۔ حضورؐ کے اندر اولاً تو رافت تھی ہی بہت، منافقین و مخالفین کی غلطیوں پر بھی آپ کبھی درشت الفاظ میں نہیں ٹوکتے تھے۔ ثانیاً یہ معاملہ ازواجِ مطہراتؓ کا تھا جن کی نسبت یہ گمان نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان کی کوئی غلطی ارادی بدنیتی پر مبنی ہو گی۔ چنانچہ یہ غلطی بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، کسی بدنیتی کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ محض اس وجہ سے صادر ہو گئی کہ ان صاحبہ نے خیال فرمایا کہ دوسری بیوی صاحبہ بھی جب شوہر کی محبوب و معتمد ہیں تو یہ نجی کی بات ان کے سامنے ظاہر کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ یہ ازدیادِ محبت و اعتماد کا سبب ہو گی۔ یہ خیال نیک نیتی پر مبنی تھا۔ اس میں کسی قسم کے فسادِ نیت کو دخل نہیں تھا۔ لیکن ساتھ ہی

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک اہم پہلو اس میں نظر انداز ہو گیا کہ یہ افشائے راز اس کردار کے منافی ہے جو بیویوں کے لیے اللہ اور رسول نے پسند فرمایا ہے اور جس کا ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہن) کے اندر کمال درجہ پایا جانا اس وجہ سے ضروری تھا کہ وہ تمام امت کی خواتین کے لیے نمونہ ہیں۔ پھر معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا جو صرف ایک شوہر ہی نہیں بلکہ اللہ کے رسول بھی تھے۔ معاملہ کی اسی اہمیت کے سبب سے اس پر گرفت ہوئی لیکن اس طرح نہیں کہ کسی کا فضیحتا ہو بلکہ اشاروں کے انداز میں ہوئی اور یہی انداز ان حالات میں بابرکت ہے جب کہ غلطی کا صدور کسی برے ارادے سے نہ ہوا ہو۔

مفسرین کی بے احتیاطی — ہمارے مفسرین نے اس راز سے پردہ اٹھانے کی جو کاوش کی ہے ہم اس سے تعرض نہیں کرنا چاہتے۔ اس کی بنیاد اول تو ایسی روایات پر ہے جن میں نہایت واضح تضاد ہے۔ پھر یہ کاوش اس تعلیم کے بھی خلاف ہے جو اس آیت میں دی گئی ہے۔ جب خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو زیادہ کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ بات پسند فرمائی تو کسی دوسرے کے لیے یہ کس طرح جائز ہے کہ وہ اس کے بخیے ادھیڑنے بیٹھے بالخصوص جب کہ معاملہ اللہ کے رسول اور آپ کی ازواجِ مطہرات کے درمیان کا ہو۔

فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ۔ جب حضورؐ نے یہ بات اشارۃً بیوی صاحبہ کو بتائی تو وہ فوراً بولیں کہ آپ کو اس کی خبر کس نے دی؟ یعنی اس کی صحت سے تو انھوں نے انکار نہیں کیا لیکن اپنی فروگزاشت کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے انھیں فکر یہ ہوئی کہ یہ بات حضورؐ کو بتائی کس نے؟ ان کا ذہن اسی طرف گیا ہو گا کہ جن بیوی کو انھوں نے رازدار بنایا تھا انہی نے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دی ہے۔ اس طرف ذہن جانے کے لیے قرینہ موجود تھا کیونکہ ان کے سوا انھوں نے کسی اور پر یہ بات ظاہر نہیں کی تھی۔ ہو سکتا ہے انھیں کچھ غصہ بھی آیا ہو جیسا کہ ان کے اندازِ سوال 'مَنْ اَنْۢبَاَكَ' سے اشارہ ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کسی سے اپنے اعتماد کو ٹھیس پہنچے تو اس سے رنج ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ لیکن حضورؐ نے ان کی یہ غلط فہمی فوراً رفع فرما دی کہ یہ بات مجھے خدائے علیم و خبیر نے بتائی ہے، کسی دوسرے نے نہیں بتائی ہے۔ حضورؐ کی اس وضاحت سے بیوی صاحبہ کا سوءِ ظن دور ہو گیا ہو گا جس کا دور ہونا ضروری تھا۔ اسی مقصد سے حضورؐ نے یہ وضاحت بلا تاخیر ضروری سمجھی۔

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ (۴)

یہ ان دونوں بیویوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تم اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی بات تمھارے شایانِ شان ہے اس لیے کہ تمھارے دل تو اللہ کی طرف جھکے ہوئے ہیں ہی۔ اور اگر تم نے رسول کے خلاف

ایکا کیا تو یاد رکھو کہ رسول اپنی دل جمعی کے لیے تمھارا محتاج نہیں ہے بلکہ اس کی طمانیت کے لیے اللہ، جبریل اور مومنین صالحین کی معیت و رفاقت کافی ہے، مزید براں فرشتے بھی اس کے ساتھی اور مددگار ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فروگزاشت تو ایک بیوی صاحبہ سے ہوئی تھی تو یہاں خطاب دو سے کیوں ہوا اور دوسری بیوی صاحبہ سے کون سی غلطی صادر ہوئی تھی جس پر ان کو بھی توبہ کی ہدایت ہوئی، بظاہر تو وہ بالکل بے قصور نظر آتی ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیوی صاحبہ پر ان کے افشائے راز کے سبب سے ناخوشی کا اظہار فرمایا تو دوسری بیوی صاحبہ کو یہ گمان گزرا ہو گا کہ شاید اس ناخوشی کا سبب یہ ہے کہ یہ افشائے راز ان کے سامنے کیوں ہوا؟ انھوں نے خیال فرمایا ہو گا کہ بات میرے ہی سامنے ظاہر کی گئی تھی، کسی غیر کے سامنے نہیں، تو آخر اس پر عتاب کی کیا وجہ ہوئی! اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ مجھے غیر خیال کیا گیا، اگرچہ ان کا یہ احساس بالکل غلط فہمی پر مبنی تھا لیکن جہاں محبت و اعتماد کے معاملے میں تنافس ہو وہاں اس طرح کی غلط فہمی کا پیدا ہو جانا کچھ بعید نہیں۔

بے جا خودداری کے اظہار پر گرفت

بہرحال ان دونوں ہی سیدات نے اس گرفت کو اپنی خودداری کے خلاف محسوس کیا اور یہ چیز اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ یہ دونوں ہی بیویاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ روٹھ سی گئیں۔ عام حالات میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ میاں بیوی میں اس طرح کی باتیں آئے دن ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواجِ مطہراتؓ کا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر سختی سے گرفت فرمائی تاکہ ازواجِ نبی پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ دین کے معاملے میں کسی کو بھی بے جا خودداری کے اظہار کا حق نہیں ہے۔ ان سے فروگزاشت ہوئی ہے تو دوسروں سے زیادہ وہ سزاوار ہیں کہ اپنے رویے کی اصلاح کریں۔ یہی بات ان کے شایانِ شان اور ان کے ایمان و انابت کا مقتضیٰ ہے۔ اور اگر انھوں نے ضد سے کام لیا اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف ایکا کیا تو یاد رکھیں کہ اللہ کا رسول اپنی دل جمعی و طمانیت کے لیے ان کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہی اس کی محتاج ہیں۔

یہاں یہ بات ملحوظ ہے کہ ان بیویوں کی طرف سے جس رویے کا مظاہرہ ہوا اس کا محرک کوئی نفرت یا غصہ کا جذبہ نہیں بلکہ، جیساکہ واضح ہوا، محض اعتماد و محبت یا بالفاظِ دیگر تدلّل کا جذبہ تھا لیکن قرآن نے اس پر گرفت سخت الفاظ میں کی۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم تمہیدی مباحث میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں دراصل تعلیم دی ہی اس بات کی گئی ہے کہ محبت کے جذبات کے اندر بھی اللہ کے حدود اور اس کے احکام و اوامر کی پوری پوری پابندی کی جائے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ازواجِ نبی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اپنا شوہر ہی نہیں بلکہ ہر حال میں آپ کو اللہ کا رسول سمجھیں اور

ہر طرح کے حالات کے اندر اس خاص پہلو کو سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ مستحضر رکھیں۔ اس لیے کہ آپ کی یہ حیثیت دوسری تمام حیثیتوں پر بالا ہے۔

'اِنۡ تَتُوۡبَاۤ اِلَی اللّٰہِ فَقَدۡ صَغَتۡ قُلُوۡبُکُمَا'۔ اس ٹکڑے کی تاویل میں ہمارے مفسرین سے سخت لغزش ہوئی ہے۔ انھوں نے 'صَغَتۡ' کے معنی کج ہونے کے لیے اور تاویل یہ کی کہ اگر تم دونوں توبہ کرو تو یہی تمھیں کرنا چاہیے اس لیے کہ تمھارے دل تو کج ہو چکے ہیں۔

اس تاویل میں کئی غلطیاں ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم توجہ دلائیں گے۔

لفظ 'صغو' کی تحقیق

۱۔ اس میں پہلی غلطی تو یہ ہے کہ یہ تاویل عربیت کے بالکل خلاف ہے۔ لفظ 'صغو' عربی میں کسی شے سے انحراف کے معنی میں نہیں بلکہ کسی شے کی طرف جھکنے اور مائل ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر سورۂ تحریم میں اس لفظ کی لغوی تحقیق بیان فرمائی ہے۔ اس کا ضروری حصہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

"دنیا کی تمام زبانوں میں عموماً اور عربی زبان میں خصوصاً خاص خاص الفاظ ایک کلی معنی کے تحت ہوتے ہوئے بھی خاص خاص معانی کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ جو لوگ زبان کی ان خصوصیات سے ناواقف ہوتے ہیں وہ اس کے فہم سے بالکل محروم رہتے ہیں۔"

یہ کلیہ بیان کرنے کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مثلاً 'میل' جس کے معنی جھکنے اور ہٹنے کے ہیں، ایک کلی مفہوم ہے جس کے تحت عربی میں بہت سے الفاظ ہیں، مثلاً زیغ، جور، عدول، حیادۃ، انحراف وغیرہ لیکن یہ سب میل عن الشیٔ یعنی کسی چیز سے ہٹ جانے یا برگشتہ ہو جانے کے لیے آتے ہیں۔ پھر اسی کلی مفہوم کے تحت فَیٔ، ثوبۃ، التفات اور صغو وغیرہ الفاظ بھی ہیں جو سب کے سب میل الی الشیٔ یعنی کسی چیز کی طرف مائل ہونے اور جھکنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں......"

"لفظ کی اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد عربی زبان کے ایک طالب علم سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی کہ صَغَتۡ قُلُوۡبُکُمَا کے معنی انابت قلوبکما ومالت الی اللہ ورسولہ (یعنی تم دونوں کے دل اللہ اور رسول کی طرف جھک چکے ہیں) کے ہوں گے کیونکہ لفظ صغو کسی شے کی طرف جھکنے کے لیے آتا ہے، اس سے مڑنے اور ہٹنے کے لیے نہیں آتا۔"

"اس لفظ کی یہ حقیقت اس کے تمام مشتقات میں بھی موجود ہے۔ مثلاً صاغیۃ الرجل کسی شخص کے اتباع کو کہتے ہیں۔ 'صغوہ معک' کے معنی ہیں اس کا میلان تمھاری طرف ہے۔ اصغیت الی فلان کے معنی ہیں اس کی طرف تم نے کان لگایا۔ حدیث شریف میں ہے: 'ینفخ فی الصور فلا یسمعہ احد الا اصغی الیہ' (صور پھونکا جائے گا تو ہر شخص اس کی طرف متوجہ

ہو جائے گا) اسی طرح محاورہ ہے 'اصغی الیہ سمعہ' (اس نے اس کی بات پر کان لگایا) '
اصغت الیہ الوليد' (بچہ اپنی آغوش محبت کو خوب پہچانتا ہے) 'ھرۃ' (بلی) والی حدیث میں ہے 'کان یصغی لھا الاناء' (اس کے لیے برتن جھکا دیتے کہ وہ آسانی سے پانی پی لے)۔ برتن کے جوف کو 'صغو' کہتے ہیں کیونکہ چیز اس میں جمع ہو جاتی ہے۔"

ابن بری نے 'اصغاء سمع' (کسی کی طرف کان لگانا) کے ثبوت میں کسی شاعر کا مندرجہ ذیل شعر پیش کیا ہے:

ترى السفيه به عن كل مكرمة   زيغ وفيه للتسفيه اصغاء

(بے وقوف عزت و شرف کی باتوں سے منہ موڑتا ہے اور سفاہت کی باتوں کی طرف کان لگاتا ہے)

"شاعر اونٹنی کی تعریف میں کہتا ہے:

تصغي اذا شدّها بالكور جانحة   حتى اذا ما استوى في غرزها تثب

(جب وہ اس پر کجاوہ کستا ہے وہ گردن موڑ کر کان لگاتی ہے اور جب وہ رکاب میں پاؤں رکھ دیتا ہے وہ جھپٹ پڑتی ہے)"

"اعشی اپنی کتیا کی آنکھ کا ذکر کرتا ہے:

ترى عينها صغواء في جنب مؤقها   تراقب كفي والقطيع المحرما

(اس کی آنکھ گوشۂ چشم کی طرف جھکی ہوئی ہوتی ہے اور وہ میرے ہاتھ اور سخت کوڑے کو دیکھتی ہوتی ہے)

"نمر بن تولب نے 'صغا اماناء' کا محاورہ ایک خاص معنی میں استعمال کیا ہے لیکن لفظ کے اصل مفہوم کی روح اس کے اندر بھی موجود ہے:

وان ابن اخت القوم مصغى اناؤه   اذا لم يزاحم خاله باب جلد

(اور قوم کے بھانجے کی حق تلفی کی جاتی ہے اگر وہ اپنے ماموؤں کی مزاحمت ایک بہادر باپ سے نہ کرے)"

مولانا رحمۃ اللہ علیہ یہ محاورات و اشعار لسان العرب سے نقل کرنے کے بعد، نہایت گہرے تاثر کے ساتھ فرماتے ہیں:

"جن لوگوں کو حق کی تلاش ہے ان کے لیے یہ شواہد بس ہیں۔ وہ ان سے مطمئن ہو جائیں گے اور گمراہ کرنے والوں نے روایات و آثار میں جو زہر ملایا ہے اس سے وہ متاثر نہ ہوں گے۔ انھوں نے جب کتاب الٰہی میں کسی لفظی تحریف کی راہ مسدود دیکھی تو معنوی تحریف ہی کی کچھ

واہیں کھول لیں اور 'صغت' کے معنی 'زیغ' کے کر دیے حالانکہ دونوں کے درمیان آسمان و زمین کا فرق ہے۔ بعض روایات میں 'فقد صغت' کی جو قرارت آئی ہے وہ بالکل ہی ناقابلِ التفات ہے۔

ربوبیت کے ایک اسلوب کی وضاحت

۲- دوسری غلطی اس میں یہ ہے کہ اگر بات یہ کہنی ہوتی کہ تم دونوں توبہ کرو اس لیے کہ تمھارے دل کج ہو چکے ہیں، تو اس کے لیے یہ اسلوب بیان، جو قرآن نے یہاں اختیار کیا ہے، بالکل ہی ناموزوں ہے۔ 'ان' شرطیہ کے بعد 'قد' جو آتا ہے، جس طرح یہاں آیا ہے، اس کی متعدد مثالیں قرآن اور کلامِ عرب سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ پیش کرنے کے بعد اس اسلوب کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

"ان مثالوں پر غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ اس اسلوب میں 'قد' کے بعد جو جملہ آتا ہے وہ اس امر کی آسانی و سہولت کو بیان کرتا ہے جو 'ان' کے بعد کہی جاتی ہے۔ یعنی اسلوب کے اجمال کو کھول دیا جائے تو تقدیرِ کلام یوں ہو گی کہ اگر ایسا ایسا ہوا تو کچھ حرج نہیں، یا کوئی تعجب نہیں یا یہ معمولی بات ہے کیونکہ ایسا ایسا ہو چکا ہے۔ اس روشنی میں آیت کی تاویل یہ ہو گی کہ اگر تم پیغمبر کی رضا جوئی کے لیے خدا سے توبہ کرو تو یہی تم سے متوقع ہے اس لیے کہ تمھارے دل تو پہلے ہی سے اس کی طرف جھکے ہوتے ہیں۔"

نفسیاتِ انسانی کی ایک حقیقت

۳- اس میں تیسری غلطی یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات کو بالکل بلا سبب دل کے زیغ و انحراف کا گنہگار بنا دیا گیا ہے حالانکہ اوپر ہم نے الفاظِ قرآن کی روشنی میں واقعہ کی جو نوعیت بیان کی ہے اس سے صاف واضح ہے کہ اس میں کسی پہلو سے کسی فسادِ نیت کا کوئی شائبہ نہیں ہے بلکہ جو کچھ بھی ہوا باہمی اعتماد و محبت اور اخلاص کی بنا پر ہوا۔ حضورؐ نے ایک بات راز کے طور پر ایک بیوی سے کہی۔ انھوں نے وہ بات بربنائے محبت دوسری بیوی پر ظاہر کر دی۔ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے اس افشائے راز سے آگاہ فرما دیا تو آپ نے ان بیوی صاحبہ کو ٹوکا جن سے یہ کوتاہی صادر ہوئی لیکن انھوں نے اس ٹوکنے کو قرار واقعی اہمیت نہ دی بلکہ یہ خیال کیا کہ شوہر کی بات انھوں نے شوہر ہی کی دوسری معتمد و محبوب بیوی پر اگر ظاہر کی تو یہ ایسی غلطی نہیں ہے جس پر گرفت کی جائے۔ پھر ان کے اس رویے پر حضورؐ کچھ کھنچے کھنچے ظاہر ہوئے تو اس اعتماد کی بنا پر جو شوہر کی محبت پر تھا وہ بھی از راہِ تدلل روٹھ گئیں اور اس میں ان بیوی صاحبہ نے بھی ان کا ساتھ دیا جن پر راز ظاہر کیا گیا تھا۔ انھوں نے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس بات میں اپنی کچھ توہین سی محسوس فرمائی ہو گی کہ ایک ایسی بات پر عتاب ہوا جو ان پر ظاہر کی گئی۔ اس طرح کے احساسِ خودداری کا معزز گھرانوں کی سیدات کے اندر ابھرنا ذرا بھی عجیب نہیں ہے۔

یہاں نفسیاتِ انسانی کی یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ جب روٹھنے کا سبب محبت و اعتماد ہو تو خفگی محض ظاہر کا پردہ ہوتی ہے جس کے پیچھے نہایت گہری خواہشِ ملاپ کی موجود ہوتی ہے۔

یہاں بھی یہی صورت تھی۔ دونوں بیویاں بظاہر روٹھ گئیں لیکن دل کے ہر گوشے میں یہ بے قراری موجود تھی کہ حضورؐ کی طرف سے ذرا ملاطفت کا اظہار ہو تو وہ خفگی کا یہ مصنوعی پردہ اٹھا دیں لیکن حضورؐ اپنے رویہ میں کوئی نرمی اس وجہ سے پیدا نہیں کر سکتے تھے کہ آپؐ کو، جیسا کہ واضح ہوا، گھر والوں کو یہ تعلیم دینی تھی کہ محبت کے اندر بھی وہ اللہ و رسول کے احکام کو مقدم رکھیں۔ ناچار بیویوں ہی کو اپنی بے جا خودداری سے دست بردار ہونا تھا لیکن اعتماد و محبت کی زنجیر سخت ہوتی ہے۔ دل سے یہ چاہنے کے باوجود کہ کوئی ایسی بات ہو جائے کہ یہ بیگانگی دور ہو، وہ پہل کرنے سے ہچکچاتی رہیں۔ قرآن نے اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا کے الفاظ سے ان کی اسی باطنی کشمکش کی طرف نہایت خوبی سے اشارہ کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین اس کو سمجھ نہ سکے۔ اور دل کے اس پُرمحبت جھکاؤ کو العیاذ باللہ وہ دل کی کجی گمان کر بیٹھے۔

سیدہ عائشہؓ اور سیدہ حفصہؓ میں گہری محبت تھی

'وَاِنْ تَظٰھَرَا عَلَیْہِ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ مَوْلٰہُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَعْدَ ذٰلِکَ ظَھِیْرٌ'۔ 'تظاھر' کے معنی ہیں ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار رہنا۔ اس کے بعد 'علی' کے صلہ سے اس کے اندر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایکا یا اتحاد کر لینے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ اوپر ہم اس اتحاد کی نوعیت اور اس کے سبب کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ کسی جنگ و پیکار کا مظاہرہ نہیں بلکہ اعتماد و تدلل کا مظاہرہ تھا۔ انھوں نے یہ خیال کیا کہ اس معاملے میں انھیں اپنی خودداری کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ یہ حقیقت ان کی نگاہوں سے اس وقت اوجھل ہو گئی کہ دین کے معاملے میں احتساب سے کوئی بھی بالا نہیں ہے یہاں تک کہ اللہ کا رسول بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

اس امر پر نگاہ رہے کہ یہاں جن سیدات کے اتحاد کی طرف اشارہ ہے۔ مشہور روایت کے مطابق وہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما ہیں جن کی نسبت تفسیری روایات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کے درمیان سوکنوں کے قسم کی چشمک و رقابت برابر رہتی تھی لیکن قرآن کے اس مقام میں ان کا جو کردار بیان ہوا ہے وہ اس امر کی ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ ان میں ایسی گہری محبت تھی کہ وہ شوہر کے راز میں بھی ایک دوسری کو شریک کر لیتی تھیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایک دوسری کی ہمدردی میں شوہر سے روٹھ بھی جاتی تھیں۔

پیغمبر صلعم کی دلچسپی کا اصل مرکز

آیت میں خطاب اگرچہ دو ہی بیویوں سے ہے لیکن اس میں جو تنبیہ ہے وہ تمام ازواجِ مطہراتؓ سے متعلق ہے۔ ان کو یہ آگاہی دی گئی ہے کہ اگر وہ روٹھ جائیں گی تو یہ نہ سمجھیں کہ اس سے ہمارے پیغمبر کی بزم سونی ہو جائے گی۔ پیغمبر کو جو دلچسپی ان کے ساتھ ہے اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس کی اصل وابستگی اللہ سے ہے جو اس کا مولیٰ و مرجع ہے، پھر جبریلؑ اس کے ساتھی ہیں جو وحی لاتے ہیں، پھر مومنین صالحین ہیں جو اس کی توجہ و تربیت کے اصل حقدار ہیں۔ مزید برآں اللہ کے فرشتے ہیں جن کی

رفاقت و معیت اس کو ہر شکل میں حاصل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ازواج نبی (رضی اللہ عنہم) کو اپنے شوہر کے ساتھ معاملہ کرنے میں اس فرقِ عظیم کو ملحوظ رکھنا چاہیے جو ایک عام شوہر اور ایک پیغمبر میں ہوتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عظیم مصروفیات میں سے جو لمحے بچا کر انھیں بخش دیں اس کی قدر کریں۔ اس گمان میں نہ رہیں کہ پیغمبر ان کی محبت و رفاقت کے محتاج ہیں اس وجہ سے ہر معاملے میں لازماً ان کی دلداری ملحوظ رکھیں گے۔ وہ دلداری وہیں تک کریں گے جہاں تک اللہ تعالیٰ کے حدود کے اندر گنجائش ہوگی۔ اگر کسی معاملے میں ذرا بھی حدود سے تجاوز ہوگا تو اس پر احتساب بھی ان کے فرائض میں داخل ہے جس میں کوتاہی ان کے لیے روا نہیں ہے۔

عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا (۵)

ازواج نبی کے سامنے اعلیٰ صفات کا ایک آئینہ

یہ وہی اوپر والا مضمون، احتساب کے تقاضے سے کس قدر تیز ہو گیا ہے۔ ازواج مطہراتؓ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تمھیں یہ گمان نہیں ہونا چاہیے کہ اگر تم پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روٹھ گئیں تو پھر اس کی دلبستگی کا کوئی سہارا باقی نہیں رہے گا۔ آج اللہ نے اس کی رفاقت کے لیے جس طرح تمھارا انتخاب فرمایا ہے اگر وہ تمھیں طلاق دے چھوڑے تو اللہ تم سے بہتر بیویاں اس کے لیے منتخب فرما دے گا جن کے اندر وہ تمام اوصاف ہوں گے جو ہونے چاہئیں۔ یہاں ان بیویوں کے جو اوصاف گنائے ہیں وہ سب دوسرے مقامات میں زیر بحث آ چکے ہیں۔ خاص طور پر سورۂ احزاب آیت ۳۵ کے تحت جو بحث گزر چکی ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہاں اعادے میں طوالت ہوگی۔

کنواریوں کے ساتھ 'ثَیِّبٰتٍ' کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کو سامنے لانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصلی قدر و قیمت اعلیٰ اوصاف کی ہے، ثیبہ اور کنواری ہونا ثانوی چیزیں ہیں۔ اگر اوصافِ حمیدہ موجود ہوں تو ثیبہ کو کنواری پر تقدم حاصل ہے چنانچہ یہاں 'ثیبات' کا ذکر پہلے ہے۔

'سٰٓئِحٰتٍ' کا ترجمہ مترجمین نے 'روزہ رکھنے والیاں' کیا ہے لیکن ہمارے نزدیک لفظ کی یہ تعبیر ناقص ہے۔ یہ 'سیاحت' سے ہے جو ایک دینی اصطلاح ہے اور جس کا مفہوم وسیع ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۲ کے تحت اس کی پوری تحقیق ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس کی روح زہد اور ترک دنیا ہے اس وجہ سے اس سے وہ عبادات اور ریاضتیں مراد ہیں جو اسلام نے ترکِ دنیا اور زہد کے لیے پسند فرمائی ہیں، مثلاً روزہ، اعتکاف اور حج وغیرہ۔ یہ درحقیقت رہبانیت کے زمرہ کی عبادت ہے۔ جس طرح رہبانیت اسلام میں ایک خاص حد ہی تک جائز ہے اسی طرح سیاحت بھی ایک خاص حد ہی تک مطلوب ہے۔ روزہ اس ریاضت کے اہم ارکان میں سے فرد ہے لیکن اس کا ترجمہ روزہ کے لفظ سے صحیح نہیں ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ ریاضت کرنے والیاں کیا ہے جو نسبتہً جامع ہے اور ان

تمام عبادتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے جو اس کے تحت آتی ہیں۔ ان میں روزہ بھی شامل ہے۔

دین میں احتساب کی اہمیت

یہ آیات پڑھتے ہوئے یہ حقیقت مستحضر رہے کہ یہ احتساب ازواجِ نبی رضی اللہ عنہن کا ہو رہا ہے جن کی پاکی و طہارت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور جن کو تمام عالم کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ ان ہدایات کو محض اس بنا پر طلاق تک کی دھمکی دے دی گئی کہ ان سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تربیت قبول کرنے کے معاملے میں ذراسی بے پروائی ہو گئی اور وہ بھی بربنائے مخالفت و مکابرت نہیں بلکہ محض بربنائے محبت و اعتماد۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ دین میں احتساب و تربیت کا کیا درجہ ہے۔ گویا اسلامی معاشرہ میں وصل و فصل کی اصل بنیاد یہی ہے۔ جو محبت اس احتساب و تربیت سے خالی ہو وہ محبت نہیں بلکہ شیطان کا پھندا ہے۔ اہلِ ایمان کی محبت کا اصل جمال یہی ہے کہ وہ اللہ کے حدود کے تابع ہوتی ہے۔ اس معاملے میں وہ ایک دوسرے سے کبھی غافل نہیں ہوتے بلکہ جن سے جتنی ہی زیادہ محبت ہوتی ہے ان کے احتساب میں وہ اتنے ہی زیادہ بیدار ہوتے ہیں اس لیے کہ حقیقی محبت کا تقاضا یہی ہے۔ پھر جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے خیرخواہانہ کلمات کے لیے دلوں میں کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے تو وہ عزیز سے عزیز رشتوں کے کاٹ دینے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے اس لیے کہ روحانی تعلق کے ختم ہو جانے کے بعد مجرد جسمانی تعلق کی ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۶)

احتساب کی عام منادی

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواجِ مطہراتؓ کے احتساب کے بعد یہ عام مسلمانوں کو جھنجھوڑا ہے کہ تم بھی اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی اس آگ سے بچانے کی کوشش کرو جس کے ایندھن لوگ اور پتھر بنیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم نے دیکھ لیا کہ پیغمبرؐ اور ان کی ازواجؓ بھی اللہ تعالیٰ کے احتساب سے بالا نہیں ہیں تو دوسروں کا کیا ذکر! ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچانے کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے وہ اٹھا نہ رکھے۔ جب بھی دیکھے کہ ان کے اندر اللہ کی شریعت سے بے پروائی راہ پا رہی ہے فوراً اس کے سدِّ باب کی فکر کرے۔ یہ پروا نہ کرے کہ یہ چیز اس کی طبیعت پر شاق گزرے گی اور اس کے نتیجہ میں ان کی ناراضی و بیزاری مول لینی پڑے گی۔ یہ ناگواری و بیزاری اس امر کے مقابل میں آسان ہے کہ آدمی ان کو جہنم میں جانے کے لیے چھوڑ دے اور آخرت میں اس کی مسئولیت، جیسا کہ 'کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ[1]' والی حدیث میں وارد ہے، اپنے سر لے۔

آتشِ دوزخ کی اصل غذا

'وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ' کے الفاظ اس آگ کے مزاج کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اس کی اصل غذا

---

[1] تم میں سے ہر ایک چرواہا بنایا گیا اور ہر ایک سے اس کے گلے کے بارے میں پرسش ہونی ہے۔

لگ اور پتھر بنیں گے۔ اسی ایندھن سے وہ اپنے اصلی رنگ میں بھڑکے گی۔ 'لوگ' سے مراد ظاہر ہے کہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس دنیا میں اپنے آپ کو پاک نہیں کیا بلکہ انہی گندگیوں میں لتھڑے رہے جن سے پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت نازل فرمائی۔

'حِجَارَۃٌ' سے ہمارے نزدیک، جیسا کہ البقرۃ کی آیت ۲۴ کے تحت وضاحت ہو چکی ہے، وہ پتھر مراد ہیں جو اس دنیا میں شرک و کفر اور عبادت غیر اللہ کی علامت کی حیثیت سے پوجے گئے۔ انہی چیزوں کو جلانے کے لیے یہ آگ پیدا کی گئی ہے تو جب یہ ایندھن اس کو ملے گا تو اس کو گویا اس کا من بھاتا کھاجا ملے گا اور وہ 'ھَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ' کہتے ہوئے ایک ایک چیز کو نگلے گی اور جیسا کہ فرمایا ہے 'لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ' نہ کسی چیز پر ذرا ترس کھائے گی اور نہ کسی چیز کو چھوڑے گی۔

دوزخ پر مامور فرشتوں کا مزاج

'عَلَیْهَا مَلٰٓئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ'۔ یعنی اس دوزخ پر جو فرشتے مقرر ہوں گے وہ نہایت درشت مزاج اور سخت گیر ہوں گے۔ ذرا کسی کے ساتھ نرمی اور مداہنت نہیں برتیں گے۔ ان کو جو حکم ملے گا سر مو اس کی خلاف ورزی نہیں کریں گے بلکہ وہی کریں گے جس کا ان کو حکم ملے گا۔

اس ٹکڑے میں ان لوگوں پر تعریض ہے جو اپنے اہل و عیال کی کسی بڑی سے بڑی غلطی پر بھی ان کو ٹوکنا محبت کے منافی سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ آج اگر ان کی محبت ان کے احتساب سے تم کو روکے ہوئے ہے تو یاد رکھو کہ دوزخ پر جو فرشتے مامور ہیں وہ محبت کرنے والے نہیں بلکہ بڑے ہی درشت مزاج اور سخت گیر ہوں گے، بہتر ہے کہ ان سے سابقہ پڑنے سے پہلے پہلے تم ہی اپنے احتساب سے اپنے آپ کو بھی اور ان کو بھی جس حد تک عذاب کی گرفت سے بچانے کی کوشش کر سکتے ہو کر لو۔

'لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ'۔ یعنی آج تمھیں احتساب کی جو ہدایت دی جا رہی ہے اگر تمھارے دلوں پر شاق گزر رہی ہے تو شاق گزرے دوزخ کے داروغوں پر یہ ذرا بھی شاق نہیں گزرے گی۔ وہ اللہ کے کسی حکم کی ذرا بھی خلاف ورزی نہیں کریں گے بلکہ ہر حکم کی پوری پوری تعمیل کریں گے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷)

یعنی اس دن کسی کے لیے کسی عذر و معذرت کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔ جو لوگ کوئی عذر پیش کرنا چاہیں گے ان کو جواب ملے گا کہ آج کوئی عذر پیش نہ کرو۔ تمھارے سامنے جو کچھ آ رہا ہے تمھاری اپنی ہی بوئی ہوئی فصل کا حاصل ہے۔ دنیا میں تم نے جو کمائی کی ہے اب اس کے نتائج بھگتو۔ یہ کسی غیر کے کیے ہوئے جرائم نہیں ہیں جو تمھارے کھاتے میں ڈال دیے گئے ہوں بلکہ تمھارے ہی جرائم کی مکافات تمھارے سامنے آ رہی ہے تو اس پر تمھارا واویلا اب بے سود ہے۔ اس سے بچنے کے لیے تم جو کچھ کر سکتے تھے

دنیا میں کر سکتے تھے۔ اب اس کا وقت گزر گیا۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ تُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا ۚ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُكَفِّرَ عَنكُمْ
سَيِّـَٔاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ يَوْمَ لَا يُخْزِى ٱللَّهُ ٱلنَّبِىَّ وَٱلَّذِينَ
ءَامَنُوا۟ مَعَهُۥ ۖ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَٰنِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَآ أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا
وَٱغْفِرْ لَنَآ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ (۸)

توبہ اور رجوع الی اللہ کی دعوتِ عام

اوپر والی تنبیہ کے بعد اب یہ تمام مسلمانوں کو توبہ اور رجوع الی اللہ کی دعوت دی ہے کہ اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اپنے غفلت کے بستر چھوڑو اور اپنے رب کی طرف مخلصانہ رجوع کرو۔

'توبۃ نصوح' سے مراد وہ توبہ ہے جو دل کے پورے انقیاد اور سچے عزم کے ساتھ ہو جس کے بعد گناہ کی طرف مڑنے کی کوئی خواہش باقی نہ رہے بلکہ گناہ کو آخری طلاق دے کر آدمی اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دے۔ فرمایا کہ جو لوگ اس طرح توبہ کریں گے وہ توقع رکھیں کہ اللہ ان کے گناہوں کے اثرات ان کے اوپر سے دور کر دے گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

'عسٰی' کے متعلق اس کے محل میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو خطاب کر کے آئے تو اس کی نوعیت بندوں کے لیے وعدے اور بشارت کی ہوتی ہے بشرطیکہ بندے اپنے کو اس کا اہل ثابت کریں۔

'يَوْمَ لَا يُخْزِى ٱللَّهُ ٱلنَّبِىَّ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَعَهُۥ'۔ اس 'يَوْمَ' کو فعل 'يُدْخِلَ' کا ظرف بھی قرار دے سکتے ہیں اور اس سے پہلے کوئی فعل محذوف بھی مان سکتے ہیں۔ فرمایا کہ اس دن اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے باایمان ساتھیوں کو رسوا نہیں کرے گا اس لیے کہ وہ اس دنیا ہی میں اپنے احتساب کے چھاج میں پھٹک کر صرف ان لوگوں کو اپنی معیت کے لیے انتخاب کریں گے جو کفر و نفاق کی آلائش سے بالکل پاک اور صد فی صد کھرے ہوں گے۔ یہ ان لوگوں کے مانند نہیں ہوں گے جنھوں نے خود بھی منافقانہ زندگی گزاری اور اپنی مداہنت سے اپنے اہل و عیال اور دوسرے متعلقین کو بھی نفاق کی راہ دکھائی۔ یہ لوگ قیامت کے دن رسوا ہوں گے اس لیے کہ اس دن ان کو ان کے نفاق کی تاریکی گھیرے گی۔ جب کہ پیغمبرؐ اور ان کے اصحابؓ اپنے ایمان و اخلاص کی روشنی میں اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہوں گے۔

قیامت کے دن پیغمبرؐ اور ان کے ساتھیوں اور اہل ایمان کی سرفرازی

'نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَٰنِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَآ أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَٱغْفِرْ لَنَآ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ'۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی سرخروئی اور سرفرازی کا بیان ہے کہ اس دن سب اندھیرے میں بھٹک رہے ہوں گے لیکن پیغمبرؐ اور ان کے ساتھیوں کے آگے اور داہنے ان کی روشنی ہو گی جو ان کی رہنمائی کر رہی ہو گی اور وہ دعا کرتے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہماری روشنی کو کامل کر، ہماری مغفرت فرما، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اس روشنی کا ذکر سورۂ حدید میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ان لوگوں کا بھی ذکر آیا ہے جو اس دن رسوا ہوں گے۔ فرمایا ہے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِم بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِن نُّورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا ۚ فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ ۚ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِن قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝ يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنَّكُمْ فَتَنتُمْ أَنفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ ۝

(الحدید - ۵۷ : ۱۲ - ۱۴)

جس دن مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کے دہنے چل رہی ہوگی۔ ان کو خوش خبری دی جا رہی ہوگی کہ آج تمھارے لیے ایسے باغوں کی بشارت ہے جن میں نہریں جاری ہیں۔ ان میں ہمیشہ رہو گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ جس دن منافق مرد اور عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے کہ ذرا ہمیں بھی موقع دیجیے کہ ہم بھی آپ لوگوں کی روشنی سے فائدہ اٹھالیں۔ ان کو جواب ملے گا کہ پیچھے پلٹو اور وہاں سے روشنی تلاش کرو۔ پھر ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اس کے اندر کی جانب رحمت ہوگی اور اس کے باہر کی طرف سے عذاب۔ یہ منافقین ان کو پکاریں گے کہ کیا ہم آپ لوگوں کے ساتھ نہ تھے؟ وہ جواب دیں گے ساتھ تھے تو سہی لیکن تم نے اپنے کو فتنوں میں ڈالا، انتظار میں رہے، شک کیا اور آرزوؤں نے تمھیں دھوکے میں رکھا یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو گیا اور اللہ کے بارے میں شیطان نے تمھیں دھوکے ہی میں رکھا۔

'رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ' یہ روشنی ان لوگوں کو جنت میں داخل ہونے سے پہلے جنت کے راستہ کو طے کرنے کے لیے دکھائی جائے گی جب کہ ان کے دہنے اور آگے کے سوا ہر طرف اندھیرا گھپ ہوگا اس وجہ سے یہ لوگ گہرے جذبۂ شکر کے ساتھ یہ دعا کریں گے کہ اے رب، تو اس روشنی کو کامل کر اور ہماری مغفرت فرما۔ ظاہر ہے کہ جب راستہ طے کرنے کے لیے یہ روشنی عطا ہوگی تو اس سے قدرتی طور پر یہ توقع بھی پیدا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت سے نوازنے والا ہے اور وہ وقت لازماً اس روشنی کے کامل ظہور کا ہوگا۔ چنانچہ وہ اپنی اسی توقع کے پورے کیے جانے کے لیے دعا کریں گے۔

'إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ' یہ ان لوگوں کی زبان سے اس حقیقت کا اظہار ہوگا کہ ہم ایک

عقیدہ کے طور پر مانتے تو رہے ہیں کہ تو ہر چیز پر قادر ہے لیکن اب ہم نے اپنی آنکھوں سے بھی اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیا۔ لا ریب تو ہر چیز پر قادر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۹)

پیغمبر صلعم کو عام احتساب کی تاکید

مومنین و متعلقین کے احتساب کے بعد یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عام فریضۂ احتساب کی تاکید ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ مامور تھے۔ آیت میں جس جہاد کا حکم ہے وہ تلوار اور زبان دونوں ہی کا جہاد ہے۔ البتہ دونوں کے محل الگ الگ ہیں۔ جن لوگوں پر حجت تمام ہو چکی تھی اور وہ علانیہ حق دشمنی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے ان سے تو جہاد تلوار کے ذریعہ سے تھا جس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے اور جو لوگ بظاہر تو ایمان کے مدعی تھے لیکن ایمان کے تقاضوں سے گریزاں تھے ان کے بارے میں خاص طور پر ہدایت ہوئی کہ ان کا احتساب کیا جائے اور اب یہ احتساب نرم انداز میں نہیں بلکہ سخت انداز (وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ) میں کیا جائے۔

منافقین کے احتساب میں درشت رویہ اختیار کرنے کی ہدایت

یہ سخت انداز میں منافقین کے احتساب کی تاکید اس وجہ سے ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کریم النفسی کے سبب سے ان کی غلطیوں پر جب کبھی گرفت فرماتے نرم ہی انداز میں فرماتے تاکہ ان کی رسوائی نہ ہو۔ اس کریمانہ انداز کی انھیں قدر کرنی تھی لیکن منافقین اس کے اہل نہ تھے۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے دلیر ہوتے جا رہے تھے کہ ان کا فریب کامیاب ہو رہا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ انداز بدل دینے کا حکم دیا اور سختی کے ساتھ ان کے احتساب کی تاکید فرمائی تاکہ ان کے کان کھلیں اور اگر وہ اپنی اصلاح کرنی چاہیں تو کر لیں ورنہ ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۷۳ کے تحت اس مضمون کی وضاحت ہو چکی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ' یعنی تم اب ان کو اچھی طرح جھنجھوڑ کر سنا دو کہ اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو یاد رکھیں کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ (۱۰)

آدمی کے کام آنے والی چیز اس کا عمل ہے نہ کہ بڑوں سے نسبت

یہ آخر میں تمثیل پیش کی ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کام آنے والی چیز آدمی کا اپنا عمل ہے۔ جس کے پاس حسن عمل کی پونجی نہیں ہو گی اس کو کسی بڑے سے بڑے کی نسبت بھی کچھ نفع پہنچانے والی نہیں بن سکے گی۔ فرمایا کہ نوح (علیہ السلام) اور لوط (علیہ السلام) کی بیویاں ہمارے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں لیکن انھوں نے ان کا اسوۂ حسنہ اختیار کرنے کے بجائے ان کے ساتھ بے وفائی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسولوں کی بیویاں ہونے کے باوجود ان کو حکم ہوا کہ دوسرے جہنم میں پڑنے والوں کے ساتھ جاؤ تم دونوں

بھی جہنم میں پڑو۔

اس مثال کا حوالہ کفار کی عام سبق آموزی کے لیے دیا گیا ہے چنانچہ فرمایا بھی ہے: 'ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا' (اللہ نے یہ مثال کفار کی سبق آموزی کے لیے بیان کی ہے) اس کو ابتدائے سورہ میں بیان کیے ہوئے امہات المومنینؓ کے واقعات سے ربط ہے تو محض ایک کلی نوعیت کا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ خاص اسی تعلق سے یہ بیان ہوئی ہے۔ آخرت کی مسئولیت سے سب سے زیادہ بے پروائی خاص طور پر اہل مذاہب کے اندر، اس غلط وہم نے پیدا کی کہ انھوں نے خیال کیا کہ وہ اللہ کے محبوبوں اور برگزیدوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے ان کو دوزخ کی آگ کبھی نہیں چھوئے گی۔ یہود اور نصاریٰ اسی فتنہ میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوئے اور اب مسلمان بھی اسی فتنہ میں مبتلا ہیں۔

آیت میں ان دونوں عورتوں کے بارے میں لفظ 'خَانَتَا' آیا ہے جس سے یہ بات تو واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ یہ اپنے شوہروں کی رازدار و وفادار نہیں تھیں لیکن اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ان کے اندر فحشاء کے قسم کی کوئی برائی رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو اس قسم کی گندگی کے ہر شائبہ سے پاک رکھتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ لوط علیہ السلام کی بیوی ان کے پاس آنے والے مہمانوں کی خبر قوم کے گنڈوں کو کر دیتی تھی۔ ان کی اس قسم کی بے وفائیوں کو خیانت سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَکَ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِہٖ وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (۱۱)

برے سے برے ماحول کے اندر بھی اپنے ایمان کی حفاظت واجب ہے

یہ مثال اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی سبق آموزی کے لیے بیان فرمائی ہے کہ برے سے برے ماحول کے اندر بھی آدمی پر اپنے ایمان کی حفاظت واجب ہے۔ اگر اس ماحول کے اندر اسے عیش حاصل ہو جب بھی اس کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ محسوس کرے کہ گویا وہ اسے کاٹے کھا رہا ہے اور اگر وہ اس کے لیے دارالعذاب ہو جب بھی وہ ہر قسم کے مصائب جھیل کر اپنے ایمان کی حفاظت کرے۔ فرمایا کہ فرعون کی بیوی ملکہ تھیں اور محل میں رہتی تھیں لیکن ان کی دعا یہ تھی کہ اے میرے رب! تو خاص اپنے پاس جنت میں میرے لیے ایک گھر بنا اور فرعون اور اس کے عمل اور ظالموں کی قوم سے مجھے نجات دے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس ماحول کے اندر وہ اپنے آپ کو ایک دارالعذاب کے اندر محسوس کر رہی تھیں اس لیے کہ پورا ماحول ظلم اور معصیت کا ماحول تھا۔ ایک مومن اور ایک مومنہ کو کفر و معصیت اور ظلم و عدوان کے ماحول میں کبھی اطمینان کا سانس نہیں لینا چاہیے اگرچہ اس کے اندر ذاتی طور پر انھیں شاہی محل ہی حاصل ہو۔

'وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِہٖ وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ' سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ وہ اس ارض سے

اچھی طرح آگاہ تھیں کہ آدمی ایک برے ماحول کے اندر راضی و مطمئن ہو تو گو اس کے اندر ہونے والی برائیوں اور گندگیوں میں وہ براہِ راست ملوث نہ ہو لیکن ان کے وبال سے وہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ان کے وبال سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سے بیزار و نفور رہے اور جب بھی امکان دیکھے اس سے بھاگ کھڑا ہو۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ (۱۲)

برے ماحول کے اندر اپنا اعلیٰ تربیت کی عظیم مثال

یہ آخر میں حضرت مریم علیہا السلام کی مثال پیش کی ہے جو اگرچہ پیدا تو ہوئیں ایک برے ماحول میں لیکن انھوں نے اپنی ذاتی توجہ، محنت، ریاضت، انابت اور عبادت سے وہ مقام اللہ تعالیٰ کے ہاں حاصل کیا جو انہی کا خاص حصہ ہے۔

وہ جس دور میں پیدا ہوئیں بنی اسرائیل رومیوں کے غلام تھے اور اخلاقی و مذہبی اعتبار سے ان کا زوال جس حد تک پہنچ چکا تھا اس کا اندازہ ان ملامتوں سے ہو سکتا ہے جو ان کو حضرت یحییٰؑ اور ان کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کی ہیں۔ اس کے علاوہ بنی اسرائیل کے کردار کا اندازہ ان کے اس رویہ سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے حضرت یحییٰؑ و حضرت عیسیٰؑ اور وقت کے دوسرے صالحین و ابرار کے ساتھ اختیار کیا اور جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ہمیشہ کے لیے لعنت کر دی۔ اسی تاریک ترین دور میں حضرت مریمؑ پیدا ہوتی ہیں جن کو ماضی کا کوئی قابلِ ذکر سہارا حاصل نہ ہوا لیکن بچپن ہی سے ان کا حال یہ تھا کہ جس زمانے میں وہ بیت المقدس کے اندر معتکف تھیں حضرت زکریاؑ (جو ان کے خالو تھے) کبھی کبھی ان کے پاس جاتے تو ان کے روحانی کمالات کو محسوس کر کے عش عش کر اٹھتے۔ یہاں تک کہ ان کے انہی کمالات سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے لیے بھی ایک ایسے ہی باکمال فرزند کی دعا کی اور ان کی اس دعا کی قبولیت ان کے لیے حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

یہ حضرت مریمؑ اس حقیقت کی زندہ جاوید مثال ہیں کہ انسان کے اندر اگر سچی انابت ہو تو وہ بدتر سے بدتر ماحول کے اندر بھی اپنے کو ملائکہ کے لیے قابلِ رشک بنا سکتا ہے چنانچہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اس قابل پایا کہ ان کو اپنی ایک عظیم امانت کا حامل بنایا اور ان کے ناموس کو بدگویوں کی زبان درازیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی وہ شان ظاہر فرمائی جو اس آسمان کے نیچے کسی کے لیے بھی نہیں ظاہر فرمائی۔

'اَلَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا' یہ ان کے اس اصل کمال کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم امانت کی حامل ہونے کی اہل ٹھہریں۔ لفظ فرج عربی میں محدود معنی میں نہیں آتا۔ اس کے اصل معنی موضع مخافۃ (اندیشہ کی جگہ) کے ہیں۔ جن راستوں سے بھی انسان کے اندر کوئی برائی راہ پا سکتی ہے وہ سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ عورتوں

اور مردوں دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ 'اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا' کا مفہوم یہ ہے کہ انھوں نے اپنے وجود کے ان تمام حصوں پر پورا پہرہ قائم رکھا جہاں سے کوئی بدی راہ پا سکتی تھی، اس کا انعام اللہ نے ان کو یہ دیا کہ ان کے اندر اپنی روح پھونکی اور حضرت مسیح علیہ السلام کی شکل میں ان کے بطن سے اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانی ظاہر ہوئی۔

'وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ'۔ یہ ان کی مذکورہ خاص فضیلت کے بعد ان کے عام ایمانی فضائل کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو ان کے رب کی جانب سے جو حکم بھی ملا انھوں نے بے چون و چرا تصدیق و تعمیل کی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے صحیفوں کی ہر تعلیم پر بھی وہ قائم و دائم رہیں۔ وہ ہر لمحہ اپنے رب کی طرف دھیان رکھنے والی تھیں اس وجہ سے سخت سے سخت آزمائشوں کے اندر بھی انھیں اپنے رب کے احکام کی تعمیل کی توفیق ملی اور ان کے اوسان بجا رہے۔

ایک نکتہ خاص توجہ کے لائق

یہاں یہ امر خاص توجہ کے لائق ہے کہ برائی کی مثال کے لیے بھی عورتوں ہی کا انتخاب کیا ہے اور بھلائی کی مثال کے لیے بھی انہی کے نام لیے ہیں۔ اس سے مقصود اس عام غلط فہمی کو رفع کرنا ہے کہ تمام برائی کا سرچشمہ عورت ہی ہے۔ اپنی خلقت کے اعتبار سے عورت بھی خیر و شر دونوں صلاحیتوں کی حامل ہے۔ اگر وہ اپنے اختیار و ارادہ کو صحیح طور پر استعمال نہ کرے تو بہتر سے بہتر رفیق کی بدترین ساتھی بن سکتی ہے اور اگر وہ ایمان و قنوت کی حلاوت سے آشنا ہو جائے تو بدتر سے بدتر ماحول کے اندر بھی وہ حورِ جنت ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی فضلہ واحسانہ۔

رحمان آباد

۶- جون ۱۹۷۸ء

۲۸- جمادی الثانی ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۶۷

المُلک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورتوں کے ساتویں گروپ پر ایک اجمالی نظر

سورۂ ملک سے سورتوں کا ساتواں یعنی آخری گروپ شروع ہو رہا ہے۔ اس گروپ میں بھی سورتوں کی ترتیب اسی طرح ہے جس طرح پچھلے گروپوں میں آپ نے دیکھی۔ پہلے مکی سورتیں ہیں آخر میں چند سورتیں مدنی ہیں اور یہ مدنی سورتیں مکی سورتوں کے ساتھ اسی طرح مربوط ہیں جس طرح فرع اپنی اصل سے مربوط ہوتی ہے۔

اس گروپ کی چند سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں اختلاف ہے اس وجہ سے یہاں یہ بتانا مشکل ہے کہ کہاں سے کہاں تک اس کی سورتیں مکی ہیں اور کہاں سے کہاں تک مدنی۔ جب تمام مختلف فیہ سورتوں پر بحث ہو کر بات منقح ہو جائے گی تب ہی یہ قطعی فیصلہ ہو سکے گا کہ کتنی مکی ہیں اور کتنی مدنی تاہم میری اجمالی رائے یہ ہے کہ سورۂ ملک سے سورۂ کافرون تک ۴۳ سورتیں مکی ہیں اور سورۂ نصر سے سورۂ ناس تک پانچ سورتیں مدنی۔

اس گروپ میں بھی دوسرے گروپوں کی طرح قرآنی دعوت کی تمام اساسات ——— توحید، رسالت اور معاد ——— زیر بحث آئی ہیں اور دعوت کے تمام مراحل کی جھلک بھی اس میں موجود ہے۔ لیکن اس پورے گروپ کا اصل مضمون انذار ہے۔ اس کی بیشتر سورتیں مکی زندگی کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں انذار کا انداز وہی ہے جس انداز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر چڑھ کر انذار فرمایا تھا۔ اس انذار کے تقاضے سے اس میں قیامت اور احوالِ قیامت کی بھی پوری تصویر ہے اور اس عذاب کو بھی گویا قریش کی نگاہوں کے سامنے کھڑا کر دیا گیا ہے جو رسول کی تکذیب کر دینے والوں پر لازماً آیا کرتا ہے۔ استدلال میں بیشتر آفاق کے مشاہدات، تاریخ کے مسلمات اور انفس کی بدیہیات سے کام لیا گیا ہے اور کلام کے زور کا بالکل وہی حال ہے جس کی تصویر مولانا حالیؒ نے اپنے اس شعر میں کھینچی ہے۔ ع

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی

عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

ان سورتوں نے سارے عرب میں ایسی ہلچل برپا کر دی کہ ایک شخص بھی قرآن کی دعوت کے معاملے میں غیر جانبدار نہیں رہ گیا بلکہ وہ یا تو اس کا جانی دشمن بن کر اٹھ کھڑا ہوا یا سچا فدائی اور ان دونوں کی کشمکش کا نتیجہ بالآخر اس غلبۂ حق کی شکل میں نمودار ہوا جس کا ذکر ہر گروپ کی آخری سورتوں میں ہوا ہے اور اس

کے آخر میں بھی آئے گا۔

ساتویں گروپ کی تفسیر کا آغاز کرتے ہوئے میں سورۂ حجر کی آیت ۸۷ 'وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ' کا پھر حوالہ دیتا ہوں جس کا ذکر میں نے مقدمۂ کتاب میں، ساتوں گروپوں کے تعارف کے بعد، اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے کیا ہے کہ یہ تقسیم از روئے قرآن منصوص ہے۔ پھر سورۂ حجر کی تفسیر میں آیت کی وضاحت کرتے ہوئے مندرجۂ ذیل باتیں میں نے دلائل کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے:

—— ایک یہ کہ قرآن نے کسی خاص سورہ کو سبع مثانی نہیں کہا ہے بلکہ 'کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ' کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا قرآن 'سبع مثانی' ہے۔

—— دوسری یہ کہ مثانی کسی بار بار دہرائی ہوئی چیز کو نہیں بلکہ اس چیز کو کہتے ہیں جو جوڑا جوڑا ہو۔

—— تیسری یہ کہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ سات گروپوں میں تقسیم ہیں اور ہر سورہ اپنے ساتھ اپنا ایک جوڑا بھی رکھتی ہے جس کی طرف میں برابر اشارہ کرتا آرہا ہوں۔

یہاں اس بات کی یاددہانی سے مقصود یہ ہے کہ قرآن کے آخری گروپ میں پہنچنے کے بعد آپ بہتر طریقہ سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ رائے کچھ وزن رکھتی ہے یا نہیں اور قرآن کی اس ترتیب کے سامنے آنے سے فکر و نظر کے نئے دروازے کھلتے ہیں یا نہیں؟

میرے نزدیک قرآن کی اسی حقیقت کی طرف وہ حدیث بھی اشارہ کر رہی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ 'انزل القراٰن علی سبعۃ احرف' (قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے) سات حرفوں کے معنی اگر یہ لیے جائیں کہ قرآن کے تمام الفاظ سات طریقوں پر پڑھے جا سکتے ہیں تو یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ اس صورت میں قرآن ایک معمہ بن کے رہ جائے گا درآنحالیکہ قرآن خود اپنے بیان کے مطابق کتاب مبین ہے اور قریش کی ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے۔ جو لوگ قراءتوں کے اختلاف کو بڑی اہمیت دیتے ہیں وہ بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ قرآن کے کسی لفظ کی قراءت سات طریقے پر کی گئی ہو۔ ابن جریرؒ قراءتوں کے اختلاف نقل کرنے میں بڑے فیاض ہیں لیکن مجھے یاد نہیں کہ کسی لفظ کی انھوں نے دو تین سے زیادہ قراءتیں نقل کی ہوں۔

غور کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قراءتوں کا اختلاف دراصل قراءتوں کا اختلاف نہیں بلکہ بیشتر تاویل کا اختلاف ہے۔ کسی صاحب تاویل نے ایک لفظ کی تاویل کسی دوسرے لفظ سے کی اور اس کو قراءت کا اختلاف سمجھ لیا گیا حالانکہ وہ قراءت کا اختلاف نہیں بلکہ تاویل کا اختلاف ہے۔ ابھی سورۂ تحریم کی تفسیر میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ بعض لوگوں نے 'فَقَدْ صَغَتْ' کو 'فَقَدْ زَاغَتْ' بھی پڑھا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس نے بھی یہ پڑھا ہے اس نے یہ قراءت نہیں بتائی ہے بلکہ اپنے نزدیک اس نے 'فَقَدْ صَغَتْ' کے معنی بتائے ہیں جس کی غلطی، کلام عرب کے دلائل کی روشنی میں،

اچھی طرح ہم واضح کر چکے ہیں۔

پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ اگر قراءتوں کا اختلاف ہے بھی تو متواتر قراءت کا درجہ تو صرف اسی قراءت کو حاصل ہے جس پر مصحف، جو تمام امت کے ہاتھوں میں ہے، ضبط ہوا ہے۔ اس قراءت کے سوا دوسری قراءتیں ظاہر ہے کہ غیر متواتر اور شاذ کے درجہ میں ہوں گی جن کو متواتر قراءت کی موجودگی میں کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ میں نے اس تفسیر میں اختلافِ قراءت سے مطلق تعرض نہیں کیا بلکہ صرف مصحف کی قراءت کو اختیار کیا ہے اور مجھے تاویل میں کہیں تکلف نہیں کرنا پڑا بلکہ ہر جگہ نہایت صاف، دل نشین، سیاق و سباق اور نظائرِ قرآن سے قریں تاویل سامنے آگئی ہے جو اصل مطلوب و مقصود ہے۔ قراءتوں کے اختلافات میں پڑنے کے معنی تو یہ ہیں کہ آپ ان الجھنوں میں پڑنے کے خود خواہاں ہیں جن سے سیدنا ابوبکر اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہما نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امت کو محفوظ کرنے کی کوشش فرمائی۔

بہرحال اس حدیث میں 'سبعۃ احرف' سے سات قراءتیں مراد لینے کا کوئی قرینہ نہیں ہے البتہ اگر 'حرف' کو عبارت، بیان اور اسلوب کے معنی میں لیں، جس کی زبان اور لغت کے اعتبار سے پوری گنجائش ہے، تو اس کی تاویل یہ ہوگی کہ قرآن سات اسلوبوں یا عبارتوں میں نازل ہوا ہے اور اس سے اشارہ انہی سات گروپوں کی طرف ہوگا جو قرآن میں ہر تلاوت کرنے والے کو نظر آتے ہیں۔

ان گروپوں کی نوعیت، جیسا کہ ہم وضاحت کر چکے ہیں، یہ ہے کہ ہر گروپ میں ایک جامع عمود کے تحت قرآنی دعوت کے تمام بنیادی مطالب مختلف اسلوبوں سے اس طرح بیان ہوئے ہیں کہ ہر بات بار بار سامنے آنے کے باوجود پڑھنے والا ان سے کبھی تکان محسوس نہیں کرتا بلکہ طرزِ بیان اور نہجِ استدلال کے تنوع، پیش و عقب کی تبدیلی، اطراف و جوانب کے فرق اور لواحق و تضمنات کی گوناگونی کے سبب سے ہر بار وہ ایک نیا لطف و حظ حاصل کرتا ہے۔ قرآن کی اسی خصوصیت کا ذکر بعض حدیثوں میں یوں آیا ہے کہ اہلِ علم اس سے کبھی آسودہ نہیں ہوتے اور اس کی تازگی پر کبھی خزاں کا گزر نہیں ہوتا۔ یہی ساتوں گروپ مل کر قرآنِ عظیم کی شکل اختیار کرتے ہیں، جیسا کہ سورۂ حجر کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ 'وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ' میں 'و' تفسیر کے لیے ہے۔

ب۔ سورہ کا عمود

اس سورہ کا عمود انذار ہے اور اس انذار میں دونوں ہی عذاب شامل ہیں۔ وہ عذاب بھی جس سے رسولوں کے مکذبین کو لازماً اس دنیا میں سابقہ پیش آیا ہے اور وہ عذاب بھی جس سے آخرت میں دوچار ہونا پڑے گا۔ استدلال اس میں آفاق کی نشانیوں سے ہے۔ یعنی اس میں بتایا گیا ہے کہ کائنات کے مشاہدہ سے اس کے خالق کی جو صفات سامنے آتی ہیں وہ اس بات کو مستلزم ہیں کہ یہ

دنیا ایک دن اپنی انتہا کو پہنچے گی۔ جن لوگوں نے اس کے اندر بالکل اندھے بہرے بن کر زندگی گزاری وہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے اور جنھوں نے اپنی عقل و فہم سے کام لیا اور غیب میں ہوتے خدا سے ڈرتے رہے وہ اجرِ عظیم کے مستحق ٹھہریں گے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ - ۵) اس کائنات کے مشاہدے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس کے ہاتھ میں اس کی باگ ہے وہ بڑی ہی بابرکت اور بے نہایت قدرت والی ہستی ہے۔ اس نے موت اور زندگی کا یہ کارخانہ عبث نہیں بنایا ہے جو اسی طرح چلتا رہے یا یوں ہی ختم ہو جائے بلکہ لوگوں کے امتحان کے لیے بنایا ہے کہ کون اس میں نیکی کی زندگی اختیار کرتا ہے، کون بدی کی؟ اس امتحان کا لازمی تقاضا ہے کہ ایک جزا و سزا کا دن آئے جس میں نیکو کار اپنی نیکیوں کا صلہ پائیں اور بدکار اپنی بدیوں کی سزا بھگتیں۔ اس کائنات کے خالق کی عظیم برکت و قدرت کے مشاہدے کے لیے ان آسمانوں پر ایک نظر ڈالو اور غور سے مشاہدہ کرو، کیا اس عظیم و ناپیدا کنار چھت میں تم کہیں کسی معمولی خلل کی بھی نشان دہی کر سکتے ہو؟ بار بار نگاہ دوڑانے کے بعد بھی تم اس میں کوئی نقص نہ پا سکو گے۔ پھر تم اپنے آسمانِ زیریں کو دیکھو اس کو خالق نے ستاروں کے قمقموں سے کیسا سجایا ہے جن سے تمھیں رہنمائی بھی ملتی ہے اور شیاطین پر ان سے سنگ باری بھی ہوتی ہے۔

(۶ - ۱۱) اللہ تعالیٰ کی یہ قدرت و ربوبیت اس بات کی دلیل ہے کہ جو جزا و سزا کو جھٹلائیں گے ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ ان کو دیکھ کر جہنم بھوکے شیر کی طرح دھاڑے گی۔ جب جب ان کی کوئی بھیڑ جہنم میں جھونکی جائے گی اس کے داروغے ان کو ملامت کریں گے کہ بدبختو! کیا اس روزِ بد سے تمھیں کوئی خبردار کرنے نہیں آیا؟ وہ اعتراف کریں گے کہ ایک نذیر آیا تو سہی لیکن ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ خدا نے کوئی چیز نہیں اتاری ہے، جو لوگ اس کے مدعی ہیں وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں، وہ یہ اعتراف بھی کریں گے کہ ہم نے سننے سمجھنے کی کوشش نہیں کی ورنہ اس انجام سے دوچار نہ ہوتے۔

(۱۲ - ۱۴) ان لوگوں کے صلہ کا بیان جو اس دنیا میں اپنے رب سے ڈرتے رہیں گے۔ ان کو یہ اطمینان دہانی کہ ان کی ہر نیکی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور وہ ہر نیکی کا صلہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ خالق بھی ہے اور لطیف و خبیر بھی، اس سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں رہے گی۔

(۱۵ - ۱۸) اس زمین کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے نہایت مطیع و فرمانبردار بنایا ہے۔ یہ اپنے وجود سے انسان کو یہ رہنمائی دے رہی ہے کہ وہ اس میں چلے پھرے، اس کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو لیکن اس بات کو یاد رکھے کہ یہ سامانِ پرورش مقتضی ہے کہ ایک دن اس کو اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ ہر نعمت کے متعلق مسئول ہوگا۔ انسان کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے رب کی پکڑ سے بےخوف نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر

وقت یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے اس کے اوپر سے یا نیچے سے کوئی آفتِ ارضی و سماوی بھیج کر اس کو تباہ کر دے۔ تاریخ میں اس کی کتنی عبرت انگیز مثالیں موجود ہیں۔

(۱۹-۲۱) یہ تنبیہ کہ جو چیز بھی اس فضائے لامتناہی میں ٹکی ہوئی ہے خدا کے تھامے ٹکی ہوئی ہے۔ وہی ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔ اگر اس کے سہارے سے محروم ہو جاؤ تو کوئی بھی نہیں ہے جو تمہاری مدد کر سکے۔ اگر وہ اپنے رزق سے محروم کر دے تو کوئی بھی نہیں ہے جو رزق دینے والا بن سکے۔

(۲۲-۲۳) جو لوگ اپنی خواہشوں کے غلام بن کر زندگی گزاریں گے وہ منزل پر پہنچنے والے نہیں بنیں گے منزل پر وہی پہنچیں گے جو سیدھی راہ اختیار کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے سمع و بصر اور عقل و دل کی صلاحیتیں اسی لیے دی ہیں کہ لوگ سیدھی راہ اختیار کریں لیکن ان نعمتوں کی قدر کرنے والے بہت تھوڑے ہیں۔

(۲۴-۲۷) اللہ ہی نے اس زمین میں انسان کو پھیلایا اور وہ اس کو ایک دن ضرور اکٹھا کرے گا۔ رہا یہ سوال کہ یہ دن کب آئے گا تو اس کا جواب ان کو یہ دے دو کہ اس کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ میں اس سے آگاہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں، اس کا وقت بتانے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں۔ البتہ جب وہ دن ظاہر ہوگا تو ان سب کے چہرے اس دن بگڑ جائیں گے جو آج اکڑ رہے ہیں۔

(۲۹-۳۰) اگر یہ لوگ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے لیے گردشِ روزگار کے منتظر ہیں تو ان سے کہو کہ بالفرض ہمارے ساتھ وہی معاملہ ہوا جو تم سمجھ رہے ہو تو اس میں تمہارے لیے کیا اطمینان کا پہلو ہے؟ کافروں کو تو بہر حال اس عذاب سے دوچار ہونا ہے جس کی انھیں خبر دی جا رہی ہے۔

سُوْرَةُ الْمُلْكِ (۶۷)

مَكِّيَّةٌ ——— آیات: ۳۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مطالعہ آیات ۱-۳۰ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ ۝۱
الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝۲ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ
مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ
تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝۳ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ
خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝۴ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا
بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ
السَّعِيْرِ ۝۵ وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَ
بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۶ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّ
هِيَ تَفُوْرُ ۝۷ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ؕ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ
سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝۸ قَالُوْا بَلٰى قَدْ
جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚۖ اِنْ
اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝۹ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ

مَا كُنَّا فِيٓ أَصْحٰبِ السَّعِيرِ ﴿١٠﴾ فَاعْتَرَفُوا بِذَنۢبِهِمْ فَسُحْقًا
لِّأَصْحٰبِ السَّعِيرِ ﴿١١﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ
لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿١٢﴾ وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِۦٓ
إِنَّهُۥ عَلِيمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿١٣﴾ أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ
اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿١٤﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا ع ۱
فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِۦ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ ﴿١٥﴾ ءَأَمِنتُم
مَّن فِي السَّمَآءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ ﴿١٦﴾ أَمْ
أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَآءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُونَ
كَيْفَ نَذِيرِ ﴿١٧﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ
كَانَ نَكِيرِ ﴿١٨﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَ
يَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ إِنَّهُۥ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيرٌ ﴿١٩﴾ وقف لازم اختلاف ثبت غفران منزل
أَمَّنْ هٰذَا الَّذِي هُوَ جُندٌ لَّكُمْ يَنصُرُكُم مِّن دُونِ الرَّحْمٰنِ
إِنِ الْكٰفِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ ﴿٢٠﴾ أَمَّنْ هٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ
إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُۥ بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ﴿٢١﴾ أَفَمَن يَمْشِي
مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِۦٓ أَهْدَىٰٓ أَمَّن يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيمٍ ﴿٢٢﴾ قُلْ هُوَ الَّذِيٓ أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ
وَالْأَبْصٰرَ وَالْأَفْـِٔدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ﴿٢٣﴾ قُلْ هُوَ
الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾ وَيَقُولُونَ

مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ
اللّٰهِ ۪ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۶﴾ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ
وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ
تَدَّعُوْنَ ﴿۲۷﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ
اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾
قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ
مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ
ع ۲ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿۳۰﴾

ترجمۂ آیات ۱-۳۰

بڑی ہی عظیم اور بافیض ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں اس کائنات کی بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو تاکہ تمھارا امتحان کرے کہ تم میں کون سب سے اچھے عمل والا بنتا ہے۔ اور وہ غالب بھی ہے اور مغفرت فرمانے والا بھی۔ ۱-۲

جس نے بنائے سات آسمان تہ بہ تہ۔ تم خدائے رحمان کی صنعت میں کوئی خلل نہیں پاؤ گے۔ نگاہ دوڑاؤ، کیا تمھیں کوئی نقص نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمھاری نگاہ ناکام تھک کر واپس آجائے گی۔ ۳-۴

اور ہم نے آسمانِ زیریں کو چراغوں سے سجایا اور ان کو شیاطین کو سنگسار کرنے کا ٹھکانا بھی بنایا اور ان شیاطین کے لیے دوزخ کا عذاب بھی ہم نے تیار کر رکھا ہے۔ اور جنھوں نے اپنے رب کا کفر کیا ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ کیا

ہی برا ٹھکانا ہے! ۵-۶

جب وہ اس میں جھونکے جائیں گے اس کا دھاڑنا سنیں گے اور وہ جوش مار رہی ہوگی۔
معلوم ہوگا کہ غصہ سے پھٹی پڑ رہی ہے۔ جب جب ان کی کوئی بھیڑ اس میں جھونکی جائے گی
اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے، کیا تمھارے پاس اس دن سے کوئی خبردار
کرنے والا نہیں آیا تھا! وہ جواب دیں گے کہ ایک خبردار کرنے والا آیا تو سہی لیکن
ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری، تم لوگ بس ایک
بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو! اور وہ کہیں گے کہ ہم سننے والے یا سمجھنے والے ہوتے
تو ہم دوزخ والوں میں سے نہ بنتے تو وہ اپنے گناہ کا اعتراف کریں گے۔ پس لعنت ہو
دوزخ والوں پر! ۷-۱۱

بے شک جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں رہتے، ان کے لیے مغفرت
اور ایک بہت بڑا اجر ہے۔ اور تم اپنی بات کو چھپا کر کہو یا علانیہ کہو وہ اس کو جانتا ہے۔
وہ تو دلوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔ کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ
تو بڑا ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔ ۱۲-۱۴

وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو ایک فرمانبردار ناقہ کے مانند بنایا تو تم اس
کے مونڈھوں میں چلو پھرو اور اپنے رب کے بخشے ہوئے رزق میں سے برتو اور اسی
کی طرف پھر اکٹھے ہونا ہے۔ ۱۵

کیا تم اس سے جو آسمان میں ہے بے خوف ہو گئے کہ وہ تمھارے سمیت زمین کو دھنسا
دے اور وہ دفعتاً بگٹٹ چل پڑے! کیا تم اس سے جو آسمان میں ہے بے خوف ہو گئے

کہ وہ تم پر پتھر برسانے والی ہوا مسلط کر دے تو تم جان لو گے کہ میرا انذار کیسا ہوتا ہے۔ اور ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو ان سے پہلے گزرے تو دیکھو کیسی ہوئی ان پر میری پھٹکار۔ ۱۶-۱۸

کیا انھوں نے اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھا، وہ پروں کو پھیلائے اڑتے ہیں اور ان کو سمیٹ بھی لیتے ہیں۔ ان کو خدائے رحمان ہی سنبھالتا ہے۔ بے شک وہی ہر چیز کی نگرانی رکھنے والا ہے۔ ۱۹

بتاؤ، تمھارے پاس وہ کون سا لشکر ہے جو خدائے رحمان کے مقابل میں تمھاری مدد کر سکے گا! یہ کافر بالکل دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں! بتاؤ، وہ کون ہے جو تمھیں روزی دے گا اگر وہ اپنی روزی روک لے! بلکہ یہ لوگ سرکشی اور حق بیزاری پر اڑ گئے ہیں! ۲۰-۲۱

کیا وہ جو اوندھے منہ چل رہا ہے راہ یاب ہونے والا بنے گا یا وہ جو سیدھا ایک سیدھی راہ پر چل رہا ہے؟ کہہ دو کہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔ پر تم بہت ہی کم شکر ادا کرتے ہو! کہہ دو کہ وہی ہے جس نے تم کو زمین میں پھیلایا ہے اور تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے۔ ۲۲-۲۴

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ دھمکی کب پوری ہو گی، اگر تم لوگ سچے ہو! کہہ دو، یہ علم اللہ ہی کے پاس ہے، میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ پس جب وہ اس کو دیکھیں گے قریب آتے تو ان لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے جنھوں نے کفر کیا۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کا تم مطالبہ کر رہے تھے۔ ۲۵-۲۷

ان سے پوچھو، بتاؤ اگر اللہ مجھ کو اور ان لوگوں کو جو میرے ساتھ ہیں ہلاک کر دے یا ہم پر رحم فرمائے تو کافروں کو ایک دردناک عذاب سے کون پناہ دے گا! ۲۸

کہہ دو، وہ رحمان ہے۔ ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے بھروسہ کیا ہے تو تم عنقریب جان لو گے کہ کھلی ہوئی گمراہی میں کون ہے! ان سے پوچھو کہ بتاؤ اگر تمہارا یہ پانی نیچے اتر جائے تو تمہارے لیے صاف و شفاف پانی کون لائے گا؟ ۲۹-۳۰

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ذ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ (۱)

اس کائنات کے خالق سے متعلق صحیح تصور کی راہ

'تَبٰرَكَ' کے اندر عظمت اور برکت دونوں کے مفہوم پائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ صیغہ مبالغہ کا بھی ہے اس وجہ سے اس کے معنی یوں ہوں گے کہ بڑی ہی باعظمت اور بافیض ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں اس کائنات کی باگ ہے۔ 'وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ' اور باعظمت و بافیض ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ہر چیز پر قادر بھی ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا اور مشکل سے مشکل کام بھی ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا جو اس کے حیطۂ امکان سے خارج ہو۔[1]

یہ حال بیان ہوا ہے اس مشاہدے کا جو ایک عاقل اور صاحبِ فکر کے سامنے آتا ہے یا آنا چاہیے جب وہ اس کائنات کی نشانیوں پر غور کرتا ہے۔ اس کی دلیل آگے آ رہی ہے۔ یہاں خلاصۂ فکر پہلے بیان کر دیا ہے تاکہ ہر شخص کے سامنے یہ حقیقت آ جائے کہ اس کائنات پر غور کرنے والا کبھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اس کا خالق کوئی کھلنڈرا ہے یا وہ کوئی لاابالی اور غیر ذمہ دار ہے جس نے یہ دنیا پیدا تو کر ڈالی لیکن اس کو اس کے خیر و شر سے کوئی دلچسپی نہیں، یا وہ محض ایک محرکِ اوّل ہے جس سے ایک حرکت تو صادر ہو گئی لیکن اس حرکت کے نتائج سے اسے کچھ بحث نہیں، یا وہ صرف ایک خاموش علۃ العلل ہے جس کو اپنی معلولات سے علت ہونے کے سوا کوئی اور واسطہ نہیں ہے۔

اس کائنات کے خالق سے متعلق اس قسم کے تصورات میں جو لوگ مبتلا ہوئے یا تو اس وجہ

---

[1] لفظ 'تَبٰرَكَ' کے تحقیقات پر سورۂ فرقان کی آیات ۱، ۱۰ اور ۶۱ کے تحت بحث ہو چکی ہے۔

سے ہوئے کہ انھوں نے اس کا صحیح تصور کرنا ہی نہیں چاہا تاکہ ان کی ہوا پرستی میں یہ تصور خلل انداز نہ ہو سکے یا کرنا تو چاہا لیکن اس کی صفات کا عکس اس کی پیدا کی ہوئی وسیع و عظیم کائنات کے آئینہ میں دیکھنے کے بجائے انھوں نے اپنی ان چھوٹی چھوٹی عینکوں سے دیکھنے کی کوشش کی جو ان کے اپنے ہاتھوں کی ایجاد تھیں۔ حالانکہ اس کا صحیح طریقہ صرف ایک ہی تھا کہ بالکل بے لوث اور غیر جانبدار ہو کر اس کی پیدا کی ہوئی کائنات کا مشاہدہ کرتے اور اس کے اندر اس کی صفات کا جلوہ دیکھتے۔ اگر ایسا کرتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہوتی کہ اس کا خالق بڑا ہی عظیم بھی ہے اور بڑا ہی بافیض اور حکیم بھی اور ساتھ ہی اس کی قدرت بھی بے پناہ ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی کام بھی اس کے لیے مشکل یا ناممکن نہیں۔ اس تصور سے ظاہر ہے کہ ان تمام باطل تصورات کی جڑ بھی کٹ جاتی ہے جن میں مشرک قومیں مبتلا ہوئیں اور ان اوہام کے لیے بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے جن میں فلاسفرا ور سائنس دان مبتلا ہوئے۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ (۲)

صحیح تصور کے لازمی نتائج

یہ اوپر والی ہی بات دوسرے اسلوب میں فرمائی گئی ہے جس سے اس کی قدرت، حکمت اور فیض بخشی کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ فرمایا کہ وہی ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا ہے۔ ان میں سے کسی پر بھی کسی دوسرے کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ پھر موت زندگی پر مقدم ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور اسی کے فیض سے پردۂ عدم سے عالم وجود میں آئی ہے، وہ نہ چاہے تو کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی۔

عدم کے بعد زندگی اور زندگی کے بعد پھر موت اس بات کی شہادت ہے کہ اس دنیا کا کارخانہ بے غایت و بے مقصد نہیں ہے کہ یوں ہی چلتا رہے یا یوں ہی ایک دن ختم ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو یہ ایک کارِ عبث ہوگا جو ایک حکیم و قدیر اور بافیض ہستی کی شان کے خلاف ہے بلکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں جس کو زندگی بخشتا ہے اس امتحان کے لیے بخشتا ہے کہ دیکھے کون اس کی پسند کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور کون اپنی من مانی کرتا ہے۔ اس امتحان کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں لوگوں کو از سرِ نو زندہ کرے، ہر شخص کی نیکی اور بدی کا حساب ہو اور وہ اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پائے۔

علاوہ بریں وہ 'عزیز' ہے اس وجہ سے جو سزا کے مستحق ہوں گے ان کو اس کی پکڑ سے کوئی بچا نہیں سکتا اور وہ 'غفور' بھی ہے اس وجہ سے جو اس کی مغفرت کے مستحق ہوں گے ان کو وہ اس سے محروم نہیں فرمائے گا بلکہ وہ کسی کی سعی و سفارش کے بغیر اس کے حق دار ٹھہریں گے۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ ھَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ہ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا

وَهُوَ حَسِيْرٌ (۳-۴)

مشاہدۂ کائنات

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی جس قدرت و عظمت اور جس فیض بخشی و ربوبیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس آیت میں اس کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دی ہے کہ آؤ، دیکھو اس کائنات کے خالق کی عظمت و شان! اس کی بے مثال صنعت گری اور اس کا کمالِ فن کہ اس نے تہ بر تہ سات آسمان بنا ڈالے اور تم اس میں کہیں ڈھونڈھے سے بھی کوئی ناہمواری یا کوئی نقص و خلل نہیں پا سکتے۔ کیا کوئی چیز آسمانوں سے بھی بڑی ہو سکتی ہے لیکن اس وسیع و عریض اور ناپیداکنار چیز کے اندر بھی اس کے خالق کے کمالِ فن کا حال یہ ہے کہ مجال نہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا ماہرِ فن بھی کہیں انگلی رکھ سکے کہ اس جگہ کسی جوڑ بند کو ہموار کرنے میں کوئی کسر رہ گئی۔ لفظ 'تَفٰوُتٍ' کے معنی فرق و اختلاف اور ناہمواری کے ہیں۔ اسی مضمون کو آگے لفظ 'فُطُوْرٍ' سے بھی تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی نقص و خلل کے ہیں۔ اسی مضمون کی تعبیر کے لیے سورۂ قٓ آیت ۶ میں لفظ 'فُرُوْجٍ' استعمال فرمایا ہے۔ 'اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَزَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ' (کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا، ہم نے کیسا اس کو بنایا اور سنوارا اور کہیں اس میں کوئی دراڑ اور شگاف نہیں)۔

'ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ' اتمامِ حجت کے لیے پھر دعوت دی کہ ایک ہی بار نہیں بلکہ بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمھاری نگاہ تھک کر واپس آجائے گی لیکن کہیں کوئی نقص یا خلل نہیں پا سکے گی۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا کی یہ بے مثال قدرت و حکمت اپنے سروں پر اس طرح پھیلی ہوئی دیکھتے ہو کہ نہ تم اس کا احاطہ کر سکتے اور نہ اس میں کوئی معمولی سے معمولی نقص ڈھونڈھ سکتے اس کے لیے وہ کون سا کام ہے جو دشوار ہو سکتا ہے؟ کیا مر کھپ جانے کے بعد تم کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اور جزا و سزا دینا یا تم کو کسی آفتِ ارضی و سماوی سے چشم زدن میں یہیں تباہ کر دینا اس آسمان کے پیدا کر دینے سے زیادہ مشکل کام ہے؟

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ (۵)

قدرت کے پہلو بہ پہلو رحمت کے جلوے

سات آسمانوں کا حوالہ دینے کے بعد آسمانِ زیریں کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی جس کے عجائب کا نسبۃً آسانی سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ فرمایا کہ اس کو دیکھو کس طرح ہم نے اس کو قمقموں سے آراستہ کیا ہے! مطلب یہ ہے کہ ان قمقموں کو دیکھو گے تو تمھارے سامنے یہ پہلو بھی آئے گا کہ اس جہان کا خالق صرف قدرت والا ہی نہیں بلکہ عظیم رحمت والا بھی ہے، جس نے اس چھت کو ایسے قمقموں سے جگمگایا ہے جن کی حسن افروزی اور فیض بخشی کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اوپر 'مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ' میں صفتِ رحمان کا حوالہ آیا ہے۔ یہ اسی ایک پہلو کی طرف اشارہ ہے گویا یہ دنیا اپنے وجود سے صرف اس بات

کی شہادت نہیں دیتی کہ یہ ایک عظیم قدرت والے کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے، ساتھ ہی یہ اس بات کی بھی شہادت دیتی ہے کہ وہ نہایت رحمان، نہایت کریم اور نہایت ہی بندہ نواز بھی ہے جس نے اپنے بندوں کے لیے ایسے لاجواب قمقموں سے آراستہ چھت بنائی ہے۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمان کا حوالہ بار بار آئے گا۔ ہر جگہ اس کے اس خاص پہلو پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ کلام کا اصلی حسن نگاہوں سے اوجھل رہے گا۔

ستاروں سے ایک ضمنی فائدہ کی طرف اشارہ

'وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ' کے الفاظ سے ان ستاروں کے ایک اور ضمنی فائدہ کی طرف اشارہ فرما دیا کہ ان سے اللہ تعالیٰ شیاطین کو سنگسار کرنے کے لیے ڈھکانوں کا کام بھی لیتا ہے۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی ہے۔ اس کی تفصیل قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں آئی ہے کہ ان ستاروں کے اندر اللہ تعالیٰ نے دیدبان (بُرُوْجٌ) بنائے ہیں جن میں اس کے کروبی ہر وقت پہرہ دیتے ہیں۔ اگر شیاطین عالمِ بالا کی سن گن لینے کے لیے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ان پر شہابوں کے لاکٹ پھینک کر ان کو کھدیڑ دیتے ہیں۔ ان شہابوں کی نوعیت پر سورۂ رحمان کی تفسیر میں ہم بحث کر چکے ہیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔ اس ضمنی اشارہ سے یہاں مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس شان و اہتمام کے ساتھ پیدا کرنے کے بعد اس کو چھوڑ نہیں دیا ہے کہ شیاطین اس کو اپنی 'بازی گاہ' بنا لیں بلکہ اس نے اس کی نگرانی کا بھی سامان کیا ہے اور جب وہ حدود سے تجاوز کرتے ہیں تو ان کی سرکوبی بھی ہوتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خلق بے راعی کا گلہ نہیں ہے بلکہ جس نے اس کو خلق کیا ہے وہ پوری بیداری کے ساتھ اس کی نگرانی فرما رہا ہے اور ایک دن وہ تمام جن و بشر اپنے کیفر کردار کو پہنچیں گے جو اس میں دھاندلی مچائیں گے۔ ان کے لیے دوزخ کا عذاب تیار ہے۔ 'وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ'

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۶)

قیامت کا انکار خدا کے انکار کے ہم معنی ہے

اوپر شیاطین کے ساتھ جو معاملہ مذکور ہوا ہے اس سے یہ ان انسانوں کے انجام کے ذکر کی طرف گریز ہے جو اپنے رب کا کفر کریں گے۔ 'رب کے کفر' سے یہاں مراد قیامت اور جزاء و سزا کا انکار ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم جگہ جگہ اس کتاب میں تفصیل سے واضح کرتے آ رہے ہیں، یہ ہے کہ قیامت کے انکار سے اللہ تعالیٰ کی تمام بنیادی صفات ـــــ قدرت، عدل، رحمت اور ربوبیت ـــــ کی نفی ہو جاتی ہے۔ ان صفات کی نفی کر کے خدا کو ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہے۔ چنانچہ قرآن نے اسی بنیاد پر منکرین کو جگہ جگہ کفار سے تعبیر کیا ہے حالانکہ وہ خدا کے منکر نہیں تھے۔

'وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ' فرمایا کہ یہ نہایت برا ٹھکانا اور مرجع ہے جو انھوں نے اپنے لیے انتخاب کیا۔ اس کے برے ہونے کے بعض پہلوؤں کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔

اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ (۷)

فرمایا کہ جب یہ منکرین دوزخ میں جھونکے جائیں گے تو ان کو دیکھ کر جہنم اس طرح دھاڑے گی جس طرح

بھوکا شیر شکار کو دیکھ کر دھاڑتا ہے اور وہ جوش مار رہی ہوگی۔ یعنی اس کا بھڑکنا اپنے پورے شباب پر ہوگا۔

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ‎﴿٨﴾‏ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ (۸-۹)

جہنم کے جوش غضب کی تعبیر — یہ جہنم کے غصہ کی تعبیر ہے کہ معلوم ہوگا کہ وہ غضب سے پھٹی پڑ رہی ہے۔ اس کے اس غیظ و غضب کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی ہوگی کہ اس کے نزدیک اس ہولناک دن سے جن لوگوں نے بے پروا ہو کر زندگی گزاری انھوں نے بالکل آنکھیں اور کان بند کر کے زندگی گزاری۔ ورنہ اس دنیا میں نہ قیامت اور جزا و سزا کی نشانیوں کی کمی تھی اور نہ کبھی یہ منذروں سے خالی رہی۔ پس جن لوگوں نے آنکھیں اور کان رکھتے ہوئے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا وہ ہرگز کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جہنم کے داروغے ان کو ملامت کریں گے کہ بدبختو! کیا تمھارے پاس اس دن سے آگاہ کرنے کے لیے کوئی نذیر نہیں آیا کہ تم نے اپنی یہ شامت بلائی! اس وقت یہ لوگ اعتراف کریں گے کہ اس میں تو شبہ نہیں کہ اس سے آگاہ کرنے کے لیے نذیر ہمارے پاس آئے لیکن ہم نے ان کو جھٹلا دیا اور یہ کہہ دیا کہ خدا نے کوئی چیز نہیں اتاری ہے، تم محض ہم پر دھونس جمانے کے لیے یہ دعوے کر رہے ہو کہ تم کو خدا نے بھیجا ہے کہ ہمیں اس دن سے آگاہ کرو اور خدا کی خوشنودی کے لیے جن تیاریوں کی ضرورت ہے ان کی ہمیں تعلیم دو۔

'إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ'۔ یعنی یہی نہیں کہ ہم نے ان کی کوئی بات مانی نہیں اور اپنی گمراہی پر متنبہ نہیں ہوئے بلکہ الٹے ان کو گمراہ ٹھہرایا کہ ہم نہیں بلکہ تم ایک بہت بڑی گمراہی میں مبتلا ہو کہ ہمیں یہ ڈراوے سناتے ہو کہ مر کھپ جانے کے بعد ہم از سر نو زندہ کیے جائیں گے، ہمارے ایک ایک قول و فعل کا حساب ہوگا اور ہم اور ہمارے آبا و اجداد جہنم میں پڑیں گے۔

'أَنتُمْ' کی ضمیر جمع ہے حالانکہ اوپر لفظ 'نَذِيرٌ' واحد ہے اس سے یہ اشارہ نکل رہا ہے کہ یہ لوگ یہ اعتراف بھی کریں گے کہ یہی جواب ہم نے ہر اس شخص کو دیا جس نے ہمیں اس دن سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ خواہ وہ اللہ کا رسول رہا ہو یا اس کے ساتھی رہے ہوں۔

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ (۱۰)

جہنمیوں کا اعتراف کہ انھوں نے اپنی عقل سے کام نہیں لیا — اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر وہ یہ اعتراف بھی کریں گے کہ اگر وہ بات کے سننے والے اور اپنی عقل سے کام لینے والے ہوتے تو حقیقت اتنی واضح تھی کہ وہ بھی ہدایت پاتے اور جنت کے حقدار ہوتے، جہنم والوں کے ساتھی نہ بنتے۔ لیکن نہ ہم نے ناصحوں کی بات سننے کے لیے اپنے کان کھولے اور نہ خود اپنی عقل سے کام لیا اس وجہ سے اس انجام بد کو پہنچے۔

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۱۱)

فرمایا کہ اس طرح وہ اپنے گناہ کا اعتراف کر لیں گے اور خود اپنے اعتراف کی رو سے جہنم کے مستحق بن جائیں گے تو ان بدبختوں پر خدا کی پھٹکار ہو جنھوں نے جانتے بوجھتے اپنے لیے جہنم کا سامان کیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ (۱۲)

منکرینِ قیامت کے انجام کے بعد یہ ان لوگوں کا صلہ بیان فرمایا ہے جو قیامت کو آنکھوں سے دیکھے بغیر، اس دنیا میں اپنے رب سے ڈرتے رہے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے بے شک ایک عظیم رحمت و مغفرت اور ایک بہت بڑا اجر ہے۔

عقل سے کام لینے والوں کا صلہ

'يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ' کے الفاظ سے ان لوگوں کا صاحبِ عقل و بصیرت ہونا واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے کان اور آنکھیں بند کر کے زندگی نہیں گزاری اور نہ اس بات کے منتظر رہے کہ جب سب کچھ سامنے آ جائے گا تب مانیں گے بلکہ اس کائنات کی نشانیوں پر انھوں نے غور کیا، جن لوگوں نے ان کو ہوشیار کیا ان کی باتیں انھوں نے توجہ سے سنیں اور ان پر غور کیا اس وجہ سے یہ مستحق ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضلِ عظیم سے نوازے۔ اس دنیا میں انسان کا اصلی امتحان یہی ہے کہ وہ اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر ان حقائق پر ایمان لائے جن کی خبر اللہ کے رسولوں نے دی ہے۔ جس نے یہ امتحان پاس کر لیا وہ اللہ تعالیٰ کے ہر انعام کا حقدار ہے اور جو اس میں ناکام رہا وہ جانور بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہے اگرچہ وہ کتنا ہی بڑا فلسفی اور سائنس دان مانا گیا ہو۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۔ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۱۳-۱۴)

منکروں کو تہدید مومنوں کو تسلی

یہ آیتیں تہدید کے محل میں بھی ہو سکتی ہیں اور تسلی کے محل میں بھی۔ یہاں یہ دونوں ہی کے محل میں ہیں۔ اوپر جن منکرینِ قیامت کا ذکر ہوا ہے ان کے لیے ان میں تہدید و وعید ہے کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تمھارا رب، تمھارے کسی جلی یا خفی سے بے خبر رہ سکتا ہے۔ تم پوشیدہ طور پر اپنی بات کہو یا علانیہ طور پر، وہ سب کو جانتا ہے۔ وہ سینوں کے بھیدوں تک سے واقف ہے تو اس کے سامنے سرّ و علانیہ کا کیا سوال!

منکرینِ قیامت کے بعد غیب میں رہتے خدا سے ڈرنے والوں کا بیان ہوا ہے۔ ان کے لیے اس میں تسلی ہے کہ تمھارے کسی قول و فعل کا غیب یا شہادت میں ہونا خدا کے لیے بالکل یکساں ہے۔ رات کی خلوتوں میں تم اپنے رب سے راز و نیاز کی جو باتیں کرتے ہو وہ بھی اس کے علم میں ہیں اور دن کی جلوتوں میں جو کچھ تم کہتے ہو اور کرو گے وہ بھی اس کے سامنے ہے اور تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے وہ بھی اس سے مخفی نہیں تو جب اس سے کوئی چیز مخفی نہیں تو اطمینان رکھو کہ تمھاری رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی نیکی

رائگاں جانے والی نہیں بلکہ تم اپنے ہر عمل کا بھرپور صلہ پاؤ گے۔

'اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ وَ ھُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ'۔ یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ تمہارے ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے یا اسے آگاہ ہونا چاہیے۔ فرمایا کہ جب وہ تمہارا خالق ہے اور اس کے خالق ہونے سے کسی کے لیے مجالِ انکار نہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے ناواقف ہو، جس نے تمام قابلیتوں اور صلاحیتوں کو وجود بخشا اور جس کے حکم سے ساری مشینری حرکت کر رہی ہے وہ اپنی مخلوق کی کسی نقل و حرکت سے کس طرح بے خبر رہ سکتا ہے!

'وَ ھُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ'۔ 'لَطِیۡفٌ' کے معنی، جیسا کہ جگہ جگہ اس کی وضاحت ہو چکی ہے، باریک بین اور دقیقہ رس کے ہیں۔ فرمایا کہ حقیقی باریک بین اور باخبر تو وہی ہے۔ دوسرا اگر کسی کی زندگی کے کسی پہلو سے واقف ہوتا ہے تو اس کی واقفیت جزوی اور ناتمام ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ سب کو وجود میں لانے والا اور سب کو رزق و زندگی بخشنے والا ہے اس وجہ سے اس کا علم ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل وہ گمراہی بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم کے باب میں قوموں کو لاحق ہوئی۔ جب تک خدا کے علیم و خبیر ہونے کا صحیح تصور دل میں راسخ نہ ہو اس وقت تک انسان کے اندر نہ اس کی خشیت پیدا ہو سکتی اور نہ وہ خدا کے اعتماد و توکل کی حقیقی لذت سے آشنا ہو سکتا۔

ھُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ ذَلُوۡلًا فَامۡشُوۡا فِیۡ مَنَاکِبِھَا وَ کُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِہٖ ؕ وَ اِلَیۡہِ النُّشُوۡرُ (۱۵)

زمین کے آثارِ ربوبیت کی طرف اشارہ

اوپر آسمان کے عجائبِ قدرت و حکمت سے استشہاد کیا تھا، یہ زمین کے آثارِ ربوبیت سے قیامت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو نہایت مطیع و فرمانبردار بنایا ہے کہ تم اس کی بلندیوں اور پستیوں، اس کی وادیوں اور کوہساروں میں چلو پھرو اور اس میں تمہارے رب نے تمہارے لیے جو رزق پھیلا رکھا ہے اس سے بہرہ مند ہو اور اس حقیقت کو یاد رکھو کہ ایک دن اسی کے حضور میں سب کو اٹھ کے ہونا ہے۔

لفظ 'ذَلُوۡلٌ' اور 'مَنَاکِبُ' پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس آیت میں ایک تمثیل مضمر ہے۔ یعنی اس زمین کی مثال ایک فرمانبردار ناقہ سے دی گئی ہے۔ اس کے اندر جو درے اور راستے اور جو وادی و کہسار ہیں ان کو ناقہ کے 'مناکب' یعنی مونڈھوں اور کندھوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور انسانوں کو اس ناقہ کے جسم پر اس طرح فرض کیا گیا ہے گویا وہ اس کے مونڈھوں اور کندھوں میں جوئیں ہوں جن کی پرورش کا سارا سامان ناقہ کے مونڈھوں اور شانوں ہی میں موجود ہوتا ہے۔ وہ انہی کے اندر چلتی پھرتی بھی ہیں اور وہیں سے اپنی

غذا بھی حاصل کر لیتی ہیں۔

ربوبیت کا لازمی تقاضا

'کُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِہٖ ؕ وَ اِلَیۡہِ النُّشُوۡرُ' یہ وہ اشارہ ہے جو ربوبیت کا یہ اہتمام و انتظام زبانِ حال سے، انسان کو کر رہا ہے کہ اس رزق و امن سے فائدہ اٹھاؤ اور اس حقیقت کو یاد رکھو کہ جس خدا نے تمھارے لیے بلا استحقاق یہ اہتمام کیا ہے وہ تمھیں شترِ بے مہار اور غیر مسئول بنا کے چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ ایک دن تمھیں مرنا ہے اور مرنے کے بعد پھر اٹھنا اور اپنے رب کی طرف لازماً جانا ہے۔ اس لیے کہ یہ بات عقل اور فطرت کے بالکل خلاف ہے کہ انسان کو نعمتیں اور حقوق تو حاصل ہوں لیکن وہ مسئولیت سے بری رہے۔

ءَاَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمُ الۡاَرۡضَ فَاِذَا ہِیَ تَمُوۡرُ (۱۶)

ایک مورِ ناتواں کے لیے اپنی ہستی پر غرور جائز نہیں

اوپر کی آیت میں انسان کی ناتوانی اور بے حقیقتی کا جو ذکر ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ تنبیہ ہے کہ جو انسان اس زمین کے وسیع و عریض اطراف و اکناف میں جوؤں کی طرح رینگ رہا ہے اس کو اپنی طاقت اور اپنے وسائل پر اتنا غرہ نہیں ہونا چاہیے کہ اسے خدا کے عذاب سے ڈرایا جائے تو وہ اس کا مذاق اڑائے کہ اس پر کدھر سے عذاب آئے گا اور کون عذاب لائے گا! فرمایا کہ کیا تم اس عظیم ہستی سے جو آسمانوں میں ہے بالکل بے خوف اور نچنت ہو گئے کہ وہ زمین کو تمھارے سمیت دھنسا دے اور وہ بالکل بگ ٹٹ ہو کر کسی سمت کو چل پڑے!

'مَوۡرٌ' کے معنی تیزی سے حرکت کرنے کے ہیں، جیسا کہ 'یَوۡمَ تَمُوۡرُ السَّمَآءُ مَوۡرًا' (الطور - ۵۲ : ۹) سے واضح ہے۔ اس کے مختلف ترجمے لوگوں نے کیے ہیں لیکن میرا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ یہاں یہ بگ ٹٹ چل پڑنے کے معنی میں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ 'مَوۡرٌ' کے اصل معنی حرکتِ سریع ہی کے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اوپر اس زمین کو ناقۂ ذلول (فرمانبردار اونٹنی) سے تشبیہ دی ہے۔ اس تعلق سے دیکھیے تو یہ معنی یہاں زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو خدا کی عنایت ہے کہ اس نے زمین کو تمھارے لیے مسخر کر رکھا ہے اور وہ تمھاری خدمت کے لیے ایک فرمانبردار اونٹنی بنی ہوئی ہے لیکن خدا اس کی باگ ذرا ڈھیلی کر دے تو پھر دیکھو وہ کس طرح بھاگ کھڑی ہوتی ہے کہ کسی کے سنبھالے نہ سنبھلے۔

اَمۡ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یُّرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ کَیۡفَ نَذِیۡرِ (۱۷)

فضائی عذاب کی دھمکی

اوپر کی آیت میں قدموں کے نیچے سے کسی عذاب کے نمودار ہو جانے کا اشارہ تھا یہ سر کے اوپر سے کسی عذاب کے آدھمکنے کی دھمکی ہے کہ کیا تم اپنے اس خدا سے، جو آسمان میں ہے نچنت ہو کہ وہ تم پر کنکر پتھر برسا دینے والی ہوا مسلط کر دے۔

'حَاصِبٌ' کنکر پتھر برسا دینے والی طوفانی ہوا کو کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت ہم اس کتاب میں جگہ جگہ کر چکے ہیں۔ سورۂ ذاریات کی تفسیر میں ہم نے اس کے متعلق استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق بھی نقل کی ہے

پچھلی قوموں کی ہلاکت میں اس کو ایک اہم عامل کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ خاص طور پر قوم لوط تو اسی عذاب سے ہلاک ہوئی۔ قریش کو قوم لوط کی تباہ شدہ بستیوں پر سے گزرنے کے مواقع اکثر حاصل ہوتے رہتے تھے اس وجہ سے قوم لوط کی تمثیل ان کے لیے مؤثر ہو سکتی تھی۔

'نَذِیْرِ' یہاں مصدر کے معنی میں ہے اور اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ یعنی آج تو تمھیں میرا انذار مذاق معلوم ہوتا ہے لیکن جب وہ سامنے آجائے گا تب تمھیں پتہ چلے گا کہ جس چیز کا تم مذاق اڑا رہے ہو وہ کس طرح حقیقت بنتی ہے اور کیسی ہولناک شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ (۱۸)

تاریخ سے سبق لینے کی ہدایت

یہ قریش کو تاریخ سے سبق لینے کی ہدایت ہے کہ یہ عذاب اگر ان کے اوپر ابھی نہیں آیا ہے تو اس کے سبب سے اس کا مذاق نہ اڑائیں۔ یہ کوئی دانشمندی کی بات نہیں ہے کہ جو کچھ آدمی کے اپنے سر پر گزر جائے اسی کو مانے بلکہ دوسری قوموں کی سرگزشت سے انھیں سبق لینا چاہیے جن کو انہی کی طرح انذار کیا گیا لیکن انھوں نے اس کا مذاق اڑایا بالآخر وہ عذاب ان پر مسلط ہو کر رہا جس کا انھوں نے مذاق اڑایا۔

'فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ'، تو دیکھیں کس طرح ان پر میری پھٹکار رہی! یعنی میں نے کس نفرت و بیزاری کے ساتھ ان کو اپنے عذاب کا ہدف بننے کے لیے چھوڑ دیا اور کوئی ان کو بچانے والا نہ بن سکا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ ۚ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ (۱۹)

ہر چیز خدا ہی کے تھامے تھمی ہوئی ہے

یعنی اس دنیا میں کوئی چیز بھی، خواہ اوپر ہو یا نیچے، نہ خود کار ہے نہ اپنے بل بوتے پر ٹکی ہوئی ہے بلکہ اللہ ہی اس کو حرکت دیتا ہے اور وہی اس کو تھامتا ہے۔ زمین ہمارے قدموں کے نیچے ٹکی ہوئی ہے تو اس وجہ سے ٹکی ہوئی ہے کہ خدا نے اس کو ٹکا رکھا ہے۔ اگر وہ اس کو نہ تھامے رکھے تو جیسا کہ اوپر اشارہ ہے، وہ سب کے سمیت کہیں سے کہیں جا نکلے۔ اسی طرح آسمان اگر ہمارے سروں پر تھما ہوا ہے تو خود نہیں تھما ہوا ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے تھام رکھا ہے۔ اگر وہ اس کو چھوڑ دے تو کیا عجب وہ ہمارے اوپر ہی گر پڑے۔ اسی حقیقت کو یہاں تمثیل سے سمجھایا ہے کہ کیا یہ لوگ اپنے سروں پر پرندوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ پروں کو پھیلائے ہوئے بھی اڑتے ہیں اور پروں کو سمیٹ بھی لیتے ہیں۔ ان دونوں ہی حالتوں میں خدائے رحمان ہی ہے جو ان کو فضا میں تھامے رہتا ہے۔ وہ نہ تھامے تو وہ فوراً گر پڑیں۔ مطلب یہ ہے کہ انہی پر قیاس کرو اس فضائے لامتناہی کے کواکب و نجوم اور اس کے ثوابت اور سیاروں کو۔ وہ اگر ٹکے ہوئے ہیں تو اس وجہ سے کہ خدا نے ان کو سنبھال رکھا ہے ورنہ ان میں سے کوئی ایک بھی گر کر پورے کرۂ زمین کو تہ و بالا کر دے۔

'إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ' یعنی یہ خدائے رحمان ہی کی رحمت ہے کہ وہ ہر چیز کی دیکھ بھال کر رہا ہے

اور اس کو سنبھالے ہوئے ہے ورنہ کسی چیز کا کوئی ایک پیچ بھی ذرا سا ڈھیلا ہو جائے تو یہ سارا عالم چشم زدن میں تباہ ہو جائے۔

أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ جُندٌ لَّكُمْ يَنصُرُكُم مِّن دُونِ الرَّحْمَٰنِ ۚ إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ (۲۰)

کوئی فوج خدا کے حملہ کا دفاع نہیں کر سکتی

یعنی اگر تم عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو کہ تمھیں دکھا دیا جائے تو تمھارے پاس کون سا لشکر ہے جو خدائے رحمان کے مقابل میں تمھاری مدد کرے گا؟

إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ۔ یہ ان لوگوں کی بدبختی پر اظہار افسوس ہے کہ ان کے طنطنہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا ہی ناقابل تسخیر دفاعی حصار ان لوگوں نے تعمیر کر رکھا ہے جس کو کوئی طاقت بھی توڑ نہیں سکتی لیکن یہ لوگ سخت دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ عذاب الٰہی کا کوئی معمولی سا جھونکا بھی آ گیا تو ان کے سارے قلعے اور حصار خس و خاشاک کی طرح اڑ جائیں گے۔

أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ (۲۱)

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ 'رِزْقَهُ' یہاں بارش کی تعبیر ہے جو رزق کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ تعبیر قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوئی ہے۔ فرمایا کہ فرض کرو اللہ تعالیٰ اس بارش ہی کو روک لیتا ہے جو تمھارے لیے رزق رسانی کا ذریعہ ہے تو کیا تمھارے پاس ہے کوئی ایسا زور آور جو اس بند دروازے کو از سر نو کھول دے؟

بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ۔ یہ ان لوگوں کی ہٹ دھرمی پر اظہار افسوس ہے کہ اگرچہ ان میں سے کسی سوال کا جواب بھی یہ اثبات میں دینے کی جرأت نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود یہ اپنی سرکشی اور حق بیزاری پر بضد ہیں — مطلب یہ ہے کہ اگر یہ سوچنے سمجھنے والے ہوں تو ان کو بات سمجھائی جا سکتی ہے لیکن ضد اور ہٹ دھرمی کا کیا علاج!

أَفَمَن يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّن يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۲۲)

گمراہی کی اصل علت

اب یہ وضاحت فرمائی ہے اس بات کی کہ کیوں ان لوگوں پر ہدایت کی راہ نہیں کھل رہی ہے اور سمجھانے کے باوجود یہ گمراہی میں بھٹک رہے ہیں؟

فرمایا کہ یہ لوگ کتے کے مانند اپنی خواہشوں کے غلام ہیں جس طرح کتا زمین کو سونگھتا ہوا چلتا ہے کہ شاید کوئی چیز کھانے کو مل جائے اسی طرح ان لوگوں کی رہنما بھی عقل کی جگہ ان کی خواہش ہے اور یہ سر جھکائے آنکھ بند کیے، اپنی خواہش کے پیچھے چل رہے ہیں۔ خواہش کے پیچھے چلنے والا کبھی ہدایت کی راہ نہیں پا سکتا۔ ہدایت کی راہ اس کو ملتی ہے جو سیدھی راہ پر، سر اٹھا کر، دہنے بائیں اور آگے پیچھے کا جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ سے انسان کو مستوی القامت پیدا کیا، جانوروں کی طرح زمین کی طرف جھکا ہوا نہیں پیدا کیا، لیکن بہت سے انسان جانوروں ہی کی روش کی تقلید کرتے ہیں اور اس طرح وہ اس اعلیٰ خصوصیت کو کھو

بیٹھتے ہیں جو انسان کا اصلی شرف اور تمغۂ امتیاز ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خواہشوں کے پیچھے چلنے والوں کی مثال قرآن میں جگہ جگہ جانوروں بالخصوص کتوں سے دی گئی ہے۔

قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۲۳)

یہ ان لوگوں کی محرومی اور ناقدر شناسی پر اظہار افسوس ہے۔ فرمایا کہ اللہ نے تو تمھیں نہایت بلند مقصد کے لیے سمع و بصر اور دل و دماغ کی نہایت اعلیٰ صلاحیتوں سے آراستہ کر کے پیدا کیا لیکن تم نہایت ناقدرے اور ناشکرے نکلے کہ ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے تم نے کتوں اور چوپایوں کی تقلید کی اور عقل و دل کی جگہ اپنی خواہشوں کو اپنا امام بنایا۔

قُلْ هُوَ الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَاِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ (۲۴)

اصل حقیقت کی یاددہانی نشانِ سورہ سے

اب یہ اس اصل حقیقت کی پھر یاددہانی کر دی کہ اگر تم عقل سے کام لو تو یہ واضح حقیقت نہایت آسانی سے سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ جس خدا نے تم کو زمین میں بویا اور تمھاری پرورش کر رہا ہے وہ تم کو یونہی چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ وہ اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹ کر اپنے کھلیان میں جمع کرے گا۔ پھر اس کے دانے کو بھس سے الگ کرے گا اور اس کو کھتے میں جمع کر کے بھس کو جلا دے گا۔ ایک کسان جب اپنے کھیت میں کوئی فصل بوتا ہے، اس کو کھاد اور پانی دیتا ہے، چرند و پرند سے اس کی حفاظت کرتا ہے تو ہر شخص بن بتائے یہ جانتا ہے کہ ایک دن وہ اس کو کاٹے گا، اور اس کے دانے اور بھس کو الگ الگ کرے گا۔ آخر یہی واضح حقیقت خدا کے متعلق تمھاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟ کیا تم کو خدا نے بالکل عبث پیدا کیا ہے اور تمھاری ربوبیت کا یہ سارا سامان بالکل بے مقصد ہے؟

یہ امر واضح رہے کہ قرآن نے یہاں جو حقیقت نہایت سادہ لفظوں میں بیان کر دی ہے قدیم صحیفوں، خصوصاً انجیل میں، مختلف اسلوبوں سے، بیان ہوئی ہے۔

یہ آیت سورۂ مومنون میں بھی گزر چکی ہے اور ہم وہاں بھی اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو آیت ۷۹ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۪ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۲۵-۲۶)

منکرین کا ایک سخیف مطالبہ

یعنی یہ سب کچھ سننے کے بعد اگر دم کتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ اچھا یہ وعدہ کب پورا ہو گا؟ ان کے پاس قیامت کو جھٹلانے کی واحد دلیل یہی ہے کہ اس کا آنا ضروری ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتی اور اس سے ڈرانے والے ٹھیک ٹھیک اس کا وقت کیوں نہیں بتاتے؟ ان کے خیال میں چونکہ وہ اس کا وقت نہیں بتاتے یا بتا سکتے اس وجہ سے جھوٹے ہیں۔ فرمایا کہ ان نادانوں کو یہ جواب دے دو کہ میں تو بس صرف ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ اس کے وقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں جانتا

کر وہ کب آئے گی پر وہ آئے گی ضرور۔

یہ معارضہ چونکہ ایک بالکل ہی لغو معارضہ ہے اس وجہ سے یہاں اس کے جواب کی زیادہ تفصیل نہیں کی ہے لیکن دوسرے مقامات میں اس کی تفصیل بھی فرمائی ہے کہ کسی حقیقت کو محض اس بنیاد پر جھٹلانا کہ اس کے ظہور کا صحیح وقت نہیں بتایا جا سکتا، کھلی ہوئی سفاہت ہے۔ اس دنیا کے کتنے واقعات کا تجربہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں کرتے ہیں جن کے ظہور کا صحیح وقت اگرچہ کوئی نہیں بتا سکتا لیکن ان کے وقوع کو سب مانتے ہیں۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ (۲۷)

منکرین کے غرور کی بے ثباتی

یعنی ابھی تو بڑے طنطنہ اور غرور سے یہ عذاب کو دکھانے کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن یہ ساری شیخی اسی وقت تک ہے جب تک وہ سامنے نہیں آ جاتا۔ جب اس کو قریب آتا دیکھیں گے تو ان کے چہرے بگڑ جائیں گے اور سب کی سٹی بھول جائے گی۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کا مطالبہ کر رہے تھے تو اب اس کو دیکھتے ہی بدحواسی کیوں طاری ہو رہی ہے! یہ تو تمھاری مانگی ہوئی مراد ہے تو اب اس کا مزہ چکھو!

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۲۸)

طفل تسلیوں کے بجائے حقیقت کا سامنا کرنے کی دعوت

جب کفار کو عذاب سے ڈرایا جاتا تو وہ اپنے عوام کو مطمئن رکھنے کے لیے یہ بھی کہتے کہ اس شخص کی دھونس میں نہ آؤ۔ یہ عذاب وغیرہ کی دھمکی محض اس کی خطابت اور شاعری ہے۔ بہت جلد دیکھو گے کہ یہ بھی ختم ہو جائے گا اور اس کی یہ ساری باتیں بھی ہوا میں اڑ جائیں گی۔ یہ ہمیں عذاب سے ڈراتا ہے حالانکہ ہم اس کے اور اس کے ساتھیوں ہی کے لیے گردش روزگار کے منتظر ہیں۔ قرآن میں یہ مضمون جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ ہم سورۂ طور سے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ فرمایا ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ	کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے اور ہم اس کے لیے
بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ○ قُلْ تَرَبَّصُوْا	گردش روزگار کا انتظار کر رہے ہیں۔ کہہ دو، تم
فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ○	انتظار کرو میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں
(الطور - ۵۲ : ۳۰ - ۳۱)	میں سے ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ تم اپنے گمان کے مطابق ہمارے لیے گردش روزگار کے منتظر ہو اور ہم تمھارے لیے اس عذاب کے منتظر ہیں جس سے ڈرانے کے لیے خدا نے ہمیں ہدایت فرمائی ہے۔ ہم تمھارے گمان کے باب میں تم سے جھگڑنا نہیں چاہتے۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ ہمیں ہلاک کرے گا یا ہم پر رحم فرمائے گا۔ ہم نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اس وجہ سے امید یہی ہے کہ وہ ہم پر رحم فرمائے گا لیکن فرض کیا کہ تمھارا ہی گمان سچا ثابت ہوتا ہے اور ہم گردش روزگار کے شکار ہو جاتے ہیں تو اس میں تمھارے لیے تسلی کا کیا پہلو ہے! آخر تم کو خدا کے قہر و غضب سے بچانے والا کون بنے گا! قیامت بہرحال شدنی ہے۔ اس کے شدنی ہونے کے دلائل اٹل ہیں۔ جزا اور سزا یقینی ہے جس کے

انکار یا جس سے فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کافر اور مومن، نیکوکار اور بدکار دونوں یکساں نہیں ہو سکتے، یہ ایک مسلّم حقیقت ہے تو تھوڑی دیر کے لیے مان لو کہ ہم فنا ہو گئے تو اس سے تمہارا کیا بھلا ہو گا، تمھیں تو پھر بھی ان حقائق کا مواجہ کرنا پڑے گا جن سے ہم تمھیں آگاہ کر رہے ہیں! مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی طفل تسلیوں سے اپنی شامت کو دعوت نہ دو بلکہ ع

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۲۹)

یعنی ان لوگوں کو بتا دو کہ ہم اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کرتے کہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہو گا۔ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے، ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہم نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اس کی وجہ سے ہمیں امید یہی ہے کہ ہمارے حال پر وہ رحم فرمائے گا۔ اس معاملے میں اگر تم جھگڑتے ہو تو انتظار کرو جلد تم جان لو گے کہ کھلی ہوئی گمراہی میں کون ہے! ہم کہ تم!

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ (۳۰)

مَآءٍ مَّعِيْنٍ، صاف شفاف، خالص اور بے آمیز پانی۔

ایک قریب الفہم استدلال

پانی کے نیچے اتر جانے کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ پانی کی سطح ہی اتنی نیچی ہو جائے کہ زمین سے پانی حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے ہم معنی بن جائے۔ کتنے علاقے ہیں جہاں پانی کی سطح اتنی نیچی ہے کہ وہاں کنوئیں تو درکنار ٹیوب ویل سے بھی پانی حاصل کرنا ایک کارِ عظیم ہے۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ بارش نہ ہونے یا کم ہونے کے سبب سے نہروں، چشموں اور ندیوں کا پانی کم ہو کر گدلا ہو جائے۔ یہاں یہ دونوں مفہوم لینے کی گنجائش ہے۔ 'مَآءٍ مَّعِيْنٍ' کے لفظ کی وجہ سے میرا ذہن اس دوسرے مفہوم کی طرف جاتا ہے۔

عذابِ الٰہی کا مذاق اڑانے والے متمردین کو اوپر متعدد قریب الوقوع چیزوں سے ڈرایا گیا ہے کہ اس کو بعید از امکان نہ خیال کرو۔ خدا جہاں سے چاہے تمھیں پکڑ سکتا ہے۔ اسی سلسلہ کی یہ آخری بات فرمائی کہ دور کیوں جاتے ہو اپنے اس پانی ہی کو دیکھو کہ اگر اس کی سطح نیچی ہو جانے کے سبب سے یہ گدلا ہو جائے تو تمھیں صاف شفاف، تازہ و شیریں پانی کون فراہم کر سکتا ہے؟ تو جس خدا کے قبضہ میں تمھاری زندگی کی رگ رگ ہے اس سے نچنت اور بے خوف ہونے کے کیا معنی!

ربِ کریم و کارساز کی توفیق و عنایت سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی احسانہ۔

رحمان آباد

۲۲ - جون ۱۹۷۸ء

۱۵ - رجب ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۶۸

القلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور مطالب کا تجزیہ

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ الملک ـــــ کا مثنیٰ ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود اور موضوع میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ صرف طرزِ بیان، نہج استدلال اور لب ولہجہ میں فرق ہے۔ جس طرح سابق سورہ میں قریش کو عذاب اور قیامت سے ڈرایا گیا ہے اسی طرح اس سورہ میں بھی ان کو عذاب و قیامت سے ڈرایا گیا ہے لیکن اس سورہ کا لب ولہجہ سابق سورہ کے مقابل میں تیز ہے۔

سابق سورہ کے آخر میں قریش کو مخاطب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلوایا گیا ہے کہ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ کہ اس خبط میں نہ رہو کہ میں کوئی شاعر اور دیوانہ ہوں جس کو گردشِ روزگار بہت جلد فنا کر دے گی۔ تمھاری یہ توقع بالفرض پوری بھی ہو جائے جب بھی تمھارے لیے اس میں اطمینان کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ تمھیں خدا کے عذاب سے بچانے والا کون بنے گا؟ اس سورہ میں اسی مضمون کی تائید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، آپ کی پیش کردہ کتاب اور آپ کے اعلیٰ کردار کا موازنہ قریش کی فاسقانہ قیادت کے کردار سے کر کے یہ دکھایا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب موافق و مخالف دونوں پر واضح ہو جائے گا کہ کن کی باگ فتنہ میں پڑے ہوئے لیڈروں کے ہاتھ میں ہے جو ان کو تباہی کی راہ پر لے جا رہے ہیں اور کون لوگ ہدایت کی راہ پر ہیں اور وہ فلاح پانے والے بنیں گے۔

اس کے بعد باغ والوں کی تمثیل کے ذریعہ سے قریش کو متنبہ فرمایا ہے کہ آج جو امن و اطمینان تمھیں حاصل ہے اس سے اس دھوکے میں نہ رہو کہ اب تمھارے اس عیش میں کوئی رخنہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ جس خدا نے تمھیں یہ سب کچھ بخشا ہے اس کے اختیار میں اس کو چھین لینا بھی ہے۔ اگر تم اس سے نچنت ہو بیٹھے ہو تو یاد رکھو کہ وہ چشم زدن میں تم کو اس سے محروم بھی کر سکتا ہے۔ پھر تم کفِ افسوس ملتے ہی رہ جاؤ گے۔

آخر میں مکذبینِ قیامت کی اس فاسد ذہنیت پر ضرب لگائی ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو عیش و آرام انھیں یہاں حاصل ہے اگر آخرت ہوئی تو وہاں بھی انھیں یہی کچھ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حاصل ہوگا۔ ان سے سوال کیا ہے کہ آخر انھوں نے خدا کو اتنا نامنصف کس طرح سمجھ رکھا ہے کہ وہ نیکوں اور

بدوں میں کوئی امتیاز نہیں کرے گا؛ ساتھ ہی ان کو چیلنج کیا ہے کہ اگر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اس طرح کا کوئی عہد کرا لیا ہے یا کوئی ان کے لیے اس کا ضامن بنا ہے تو اس کو پیش کریں۔ اسی ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آج جو سخن سازیاں یہ لوگ کر رہے ہیں اس کا غم نہ کرو، جب قیامت کی ہلچل برپا ہو گی تب انھیں معلوم ہو جائے گا کہ جو خواب وہ دیکھتے رہے تھے وہ حقیقت سے کتنے دور تھے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کے استدراج کے پھندے میں پھنس چکے ہیں اور اس کی تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے۔ اس سے بچ نکلنے کا ان کے لیے کوئی امکان نہیں ہے۔ تو صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور اس طرح کی عجلت سے بچو جس میں یونس علیہ السلام مبتلا ہوئے اور جس کے سبب سے ان کو ایک سخت امتحان سے دوچار ہونا پڑا۔

سُورَةُ الْقَلَمِ (۶۸)

مَكِّيَّةٌ ــــــــ آیات : ۵۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۵۲ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۱) مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (۲)
وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (۳) وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۴)
فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ (۵) بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ (۶) اِنَّ رَبَّكَ
هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۷)
فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (۸) وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۹)
وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (۱۰) هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ (۱۱)
مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (۱۲) عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (۱۳)
اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ (۱۴) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ
اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۵) سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ (۱۶) اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ
كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ (۱۷)
وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ (۱۸) فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ
نَآئِمُوْنَ (۱۹) فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ (۲۰) فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ (۲۱)
اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ (۲۲) فَانْطَلَقُوْا

وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ ﴿٢٣﴾ أَن لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُم مِّسْكِينٌ ﴿٢٤﴾
وَّغَدَوْا عَلَىٰ حَرْدٍ قَادِرِينَ ﴿٢٥﴾ فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَضَالُّونَ ﴿٢٦﴾
بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ﴿٢٧﴾ قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ لَوْلَا
تُسَبِّحُونَ ﴿٢٨﴾ قَالُوا سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٢٩﴾ فَأَقْبَلَ
بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَلَاوَمُونَ ﴿٣٠﴾ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا
طَاغِينَ ﴿٣١﴾ عَسَىٰ رَبُّنَا أَن يُبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا
رَاغِبُونَ ﴿٣٢﴾ كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ وقف لازم
كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٣٤﴾ ع ١ ٣ ٢
أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ﴿٣٥﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿٣٦﴾
أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ﴿٣٧﴾ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ﴿٣٨﴾
أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۙ إِنَّ لَكُمْ
لَمَا تَحْكُمُونَ ﴿٣٩﴾ سَلْهُمْ أَيُّهُم بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ ﴿٤٠﴾ أَمْ لَهُمْ مع ۵
شُرَكَاءُ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ﴿٤١﴾ يَوْمَ
يُكْشَفُ عَن سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿٤٢﴾
خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ
إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ ﴿٤٣﴾ فَذَرْنِي وَمَن يُكَذِّبُ بِهَٰذَا
الْحَدِيثِ ۖ سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٤﴾ وَأُمْلِي
لَهُمْ ۚ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿٤٥﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ

مُّثْقَلُونَ ﴿٤٦﴾ أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿٤٧﴾ فَاصْبِرْ
لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ وقف لازم
مَكْظُومٌ ﴿٤٨﴾ لَّوْلَا أَن تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِّن رَّبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ
وَهُوَ مَذْمُومٌ ﴿٤٩﴾ فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٥٠﴾
وَإِن يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا
الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ﴿٥١﴾ وَمَا هُوَ إِلَّا وقف لازم
ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿٥٢﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱-۵۲

یہ سورۂ نٓ ہے۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو وہ لکھتے ہیں کہ تم اپنے رب کے فضل سے کوئی دیوانے نہیں ہو اور تمھارے لیے یقیناً ایک کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے اور تم ایک اعلیٰ کردار پر ہو۔ پس تم بھی عنقریب دیکھ لوگے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ فتنہ میں پڑا ہوا تم میں سے کس گروہ کے ساتھ ہے۔ تمھارا رب ہی خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ انھیں بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت یاب ہیں۔ ۱-۷

پس ان جھٹلانے والوں کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ ذرا تم نرم پڑو تو یہ بھی نرم پڑ جائیں گے۔ اور تم بات نہ سنو ہر جھوٹی قسمیں کھانے والے، ذلیل، اشارہ باز، لُترے، خیر سے روکنے والے، حد سے تجاوز کرنے والے، حق مارنے والے، سنگدل، مزید برآں بے نسب کی۔ یہ کردار اس وجہ سے ہوا کہ وہ مال و اولاد والا ہے۔ جب اس کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے، یہ تو اگلوں کے فسانے ہیں۔ ہم عنقریب

اس کے ناک پر داغیں گے۔ ۸-۱۶

ہم نے ان کو اس طرح امتحان میں ڈالا ہے جس طرح باغ والوں کو امتحان میں ڈالا جب کہ انھوں نے قسم کھائی کہ وہ صبح سویرے ضرور اس کے پھل توڑ لیں گے اور کچھ بھی نہ چھوڑیں گے۔ تو ابھی وہ سوئے پڑے ہی تھے کہ اس پر تیرے رب کی طرف سے گردش کا ایک جھونکا آیا تو وہ کٹی ہوئی فصل کے مانند ہو کر رہ گیا۔ صبح کو انھوں نے پکارا کہ پھل توڑنے ہیں تو سویرے اپنے کھیت پر پہنچو۔ پس وہ چلے اور آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے کہ دیکھنا آج باغ میں کوئی مسکین نہ گھسنے پائے اور وہ بڑے عزم و حوصلہ سے نکلے۔ پس جب اس کو دیکھا تو بولے کہ ہم تو راستہ بھول گئے! نہیں، بلکہ ہم تو محروم ہو کے رہ گئے! ان میں جو شخص کچھ معقول تھا اس نے کہا، میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم لوگ رب کی تسبیح کیوں نہیں کرتے! تب وہ پکار اٹھے، ہمارا رب پاک ہے، بے شک ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے! پھر وہ آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ انھوں نے کہا ہائے بدبختی! ہم ہی سرکشی میں مبتلا رہے! توقع ہے کہ ہمارا رب اس کی جگہ اس سے بہتر باغ ہمیں دے۔ اب ہم اپنے رب کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ اسی طرح عذاب آجائے گا اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ کاش! یہ لوگ اس کو جانتے! ۱۷-۳۳

بے شک متقیوں کے لیے ان کے رب کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔ کیا ہم فرماں برداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے! تمھیں کیا ہوا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو! کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو، اس میں تمھارے لیے وہی کچھ ہے جو تم پسند کرو گے! کیا تمھارے لیے ہمارے اوپر قسمیں ہیں قیامت تک باقی رہنے والی کہ تمھارے

لیے وہی کچھ ہے جو تم فیصلہ کرو گے! ان سے پوچھو، ان میں سے کون اس کا ضامن بنتا ہے؟ کیا ان کے کچھ شرکاء ہیں؟ تو وہ لائیں اپنے شریکوں کو اگر وہ سچے ہوں! ۳۴-۴۱

اس دن کو یاد رکھو جس دن ہلچل پڑے گی اور یہ لوگ سجدے کے لیے بلائے جائیں گے تو یہ نہ کر سکیں گے۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی۔ ان پر ذلت طاری ہو گی اور یہ سجدے کے لیے اس وقت بھی بلائے جاتے تھے جب وہ صحیح سالم تھے۔ ۴۲-۴۳

پس چھوڑو مجھ کو اور ان کو جو اس کلام کو جھٹلا رہے ہیں۔ ہم ان کو آہستہ آہستہ لا رہے ہیں وہاں سے جہاں سے وہ نہیں جانتے۔ اور میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں بے شک میری تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے۔ ۴۴-۴۵

کیا تم ان سے کوئی معاوضہ طلب کر رہے ہو کہ وہ اس کے تاوان سے دبے جا رہے ہوں! یا ان کے پاس غیب کا علم ہے پس وہ اس کو لکھ رہے ہیں تو اپنے رب کے فیصلہ تک صبر کرو اور مچھلی والے کی طرح نہ بن جائیو! جب اس نے اپنے رب کو پکارا اور وہ غم سے گھٹا ہوا تھا۔ اگر اس کے رب کا فضل اس کی دست گیری نہ کرتا تو وہ مذمت کیا ہوا چٹیل میدان ہی میں پڑا رہ جاتا۔ پس اس کے رب نے اس کو برگزیدہ کیا اور اس کو نیکوکاروں میں سے بنایا۔ ۴۶-۵۰

اور یہ کافر جب یاددہانی سنتے ہیں تو اس طرح تمھیں دیکھتے ہیں گویا اپنی نگاہوں کے زور سے تمھیں پھسلا دیں گے اور کہتے ہیں لاریب یہ ایک دیوانہ ہے، حالانکہ یہ عالم والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔ ۵۱-۵۲

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ (۱)

حرف 'نٓ' کے معنی

جس طرح قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ (قٓ - ۵۰ : ۱) میں 'قٓ' سورہ کا نام ہے اسی طرح یہاں 'نٓ' اس سورہ کا نام ہے۔ عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق مبتدا یہاں حذف ہوگیا ہے جس کو ہم نے ترجمہ میں کھول دیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے اس نظریہ کا حوالہ ہم دے چکے ہیں کہ ابتدأ یہ حروف معانی پر دلیل ہوتے تھے، اب ان کے معانی کا علم اگرچہ باقی نہیں رہا تاہم بعض حروف اب بھی معنی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں استاذ امامؒ نے جن حروف کا حوالہ دیا ہے ان میں یہ حرف بھی شامل ہے۔ جو اب بھی اپنے قدیم معنی (مچھلی) میں مستعمل ہے۔ اس سورہ کو اس نام سے موسوم کرنے میں اشارہ ہے حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی طرف جن کو مچھلی نے نگل لیا تھا، چنانچہ سورہ کے آخر میں 'صَاحِبُ الْحُوْتِ' (مچھلی والے) کے لقب سے آنجنابؑ کا ذکر آیا بھی ہے۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۸۷ میں 'ذَاالنُّوْنِ' کے لقب سے بھی آپ کو ملقب فرمایا گیا ہے جس کے معنی بعینہٖ وہی ہیں جو 'صاحب الحوت' کے ہیں۔

قلم کی شہادت تین دعاوی پر

'وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ' یہ 'وَ' قسم کے لیے ہے اور یہ بات ہم بار بار ظاہر کر چکے ہیں کہ قرآن میں قسمیں کسی دعوے پر شہادت کے لیے کھائی گئی ہیں۔ یہاں دعوے کے طور پر، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی، تین باتیں مذکور ہیں جن کو ثابت کرنے کے لیے یہ قسم کھائی گئی ہے۔

ایک یہ کہ مخالفین آپ کو (پیغمبر صلعم) جو دیوانہ کہتے ہیں یہ ان کی خود باختگی ہے۔ آپ دیوانے نہیں بلکہ اللہ کے فضل سے تمام فرزانوں سے بڑھ کر فرزانے ہیں۔

دوسری یہ کہ مخالفین جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ آپ کی یہ ساری سرگرمیاں چند روزہ ہیں جو بہت جلد ہوا میں اڑ جائیں گی، یہ بالکل غلط ہے۔ آپ کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں ایک غیر منقطع اجر مقدر ہے۔

تیسری یہ کہ آپ ایک اعلیٰ کردار کے مالک ہیں اس وجہ سے جو لوگ آپ کو شاعر، کاہن یا دیوانہ سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں وہ اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔

ان دعاوی پر قرآن میں جگہ جگہ خود قرآن ہی کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے اس وجہ سے قرینہ اسی بات کا ہے کہ یہاں بھی 'وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ' سے قرآن ہی مراد ہو۔ چنانچہ مجاہدؒ سے روایت بھی ہے کہ 'القلم' سے مراد وہ قلم ہے جس سے قرآن مجید لکھا جا رہا تھا اور 'وَمَا یَسْطُرُوْنَ' سے مراد قرآن مجید ہے۔

قلم کی اہمیت کے چند پہلو

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ تعلیم بالقلم، اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ' (العلق - ۹۶ : ۳ - ۵) (پڑھو اور تمہارا رب نہایت ہی بافیض رب ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی، انسان کو سکھایا وہ کچھ

جو وہ نہیں جانتا تھا) سابق انبیاء علیہم السلام نے جو تعلیم دی وہ زبانی تعلیم کی شکل میں تھی جس کو محفوظ رکھنا نہایت مشکل تھا۔ وہ بہت جلد یا تو محرف ہو کر مسخ ہو جاتی یا اس پر نسیان کا پردہ پڑ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے دین کو اس آفت سے محفوظ رکھنے کے لیے انسان کو قلم اور تحریر کے استعمال کا طریقہ سکھایا جس سے وہ اس قابل ہوا کہ زبانی تعلیم کی جگہ اس کو تحریر کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس کو تورات کے احکامِ عشرہ الواح میں لکھ کر دیے گئے۔ پھر دوسرے نبیوں کی تعلیمات بھی قلمبند ہوئیں اور سب کے آخر میں سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اس طرح محفوظ کی گئی کہ قیامت تک اس میں کسی تحریف و تغیر کا کوئی ادنیٰ احتمال بھی باقی نہ رہا۔

قلم سے مراد

'قلم' کی اسی اہمیت کے سبب سے یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے۔ ہمارے نزدیک اس سے یہاں کوئی خاص قلم مراد نہیں ہے بلکہ یہ لفظ تعبیر ہے تعلیماتِ الٰہیہ کے اس پورے مدوّن سرمایہ (WRITTEN RECORD) کی جو قلم کے ذریعہ سے محفوظ ہوا۔ یعنی تورات، زبور، انجیل وغیرہ۔ ان مقدس صحیفوں کی تعلیمات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتی ہیں اور ان کے اندر آپ کے ظہور کی ناقابلِ تردید شہادتیں بھی ہیں۔ ان ساری چیزوں کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔

'مَا يَسْطُرُوْنَ' کا مفہوم

'وَمَا يَسْطُرُوْنَ' سے مراد، قرینہ دلیل ہے کہ، قرآن مجید ہے جو اس وقت نازل بھی ہو رہا تھا اور صحابہؓ کے ہاتھوں لکھا بھی جا رہا تھا۔ پچھلے صحیفوں کی قسم کے بعد یہ خود قرآن مجید کی قسم ہے۔ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت، رزانت اور رسالت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ جو شخص ایسا اعلیٰ اور برتر کلام پیش کر رہا ہے۔ اس کا یہ کلام ہی دلیل ہے کہ یہ کوئی کاہن یا شاعر یا دیوانہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا رسول ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کفار کے اس قسم کے طعنوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بالعموم قرآن مجید ہی کو ان کے سامنے پیش کیا ہے کہ وہ اس کو دیکھیں اور انصاف سے فیصلہ کریں کہ یہ کسی دیوانے یا کاہن یا شاعر کا کلام ہو سکتا ہے یا اللہ تعالیٰ کا؟

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (۲)

قسم کا مقسم علیہ

یہ مُقسَم علیہ ہے۔ یعنی تمام پچھلے آسمانی صحیفے اور یہ قرآن، جو لکھا جا رہا ہے، سب اس بات پر شاہد ہیں کہ تم اللہ کے فضل سے کوئی دیوانے نہیں ہو۔ بلکہ تم انہی باتوں سے لوگوں کو آگاہ کر رہے ہو جن سے آدم علیہ السلام سے لے کر مسیح علیہ السلام تک ہر نبی نے آگاہ کیا اور جن کی صداقت پر تاریخ گواہ ہے۔ اگر یہ مدعیانِ دانش اس جرم میں تمھیں دیوانہ کہہ رہے ہیں تو اس کا غم نہ کرو، تم دیوانے نہیں بلکہ اپنے رب کے سب سے بڑے فضل سے بہرہ مند ہو البتہ ان دانش فروشوں کی عقل ماری گئی ہے کہ یہ دیوانے اور فرزانے میں امتیاز سے قاصر ہیں۔

آنحضرت صلعم کو مجنون کہنے کی وجہ — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہنے کی وجہ ہم اس کے محل میں ظاہر کر چکے ہیں کہ قریش کے لیڈروں کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی تھی کہ آپ جس عذاب سے ان کو اس شدومد اور اس جزم و یقین کے ساتھ ڈرا رہے ہیں گویا اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں آخر وہ کدھر سے آجائے گا؟ ان کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ آپ کے لب و لہجہ میں جو غیر معمولی جزم و یقین، آپ کے اندازِ دعوت میں جو ما فوق العادت بے چینی و بے قراری اور آپ کی تذکیر میں دلوں کو ہلا دینے والی جو دردمندی و شفقت ہے اس سے ان کے عوام متاثر ہو رہے ہیں۔ اس اثر کو زائل کرنے کے لیے انھوں نے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہا کہ اس شخص کی یہ ساری بے چینی و بے قراری اس وجہ سے نہیں ہے کہ فی الواقع کوئی عذاب آنے والا ہے جس سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو بھیجا ہے بلکہ بعض اشخاص کو جس طرح کسی چیز کا مالیخولیا ہو جاتا ہے اور وہ اٹھتے بیٹھتے اسی کی رٹ لگاتے رکھتے ہیں اسی طرح اس شخص کو بھی عذاب کا مالیخولیا ہو گیا ہے جو اس کو ہر طرف سے آتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس بات کو تقویت دینے کے لیے اس پر وہ یہ اضافہ بھی کر دیتے کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جس کے سبب سے اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں رہی ہے اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔

وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ (۳)

رسول کے لیے ابدی اجر و منزلت کی بشارت — یہ اسی بات کی وضاحت مثبت پہلو سے ہے کہ احمق ہیں وہ جو تمھیں دیوانہ سمجھ کر تمھارے لیے گردشِ روزگار کے منتظر ہیں جو ان کے خیال میں تمھیں تباہ کر دے گی۔ تباہی تمھارے لیے نہیں بلکہ خود ان کے لیے مقدر ہے۔ تمھارے لیے تو کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے اور مغروروں کو جو دنیا ملی ہے اور جس پر یہ نازاں ہیں یہ اب عذاب کی زد میں ہے اور بہت جلد یہ اس کا انجام دیکھ لیں گے لیکن تمھیں تمھاری حق پرستی کا جو صلہ ملنے والا ہے وہ ابدی ہے جس کے لیے کبھی زوال نہیں ہے۔

'غَيْرَ مَمْنُونٍ' کے معنی غیر منقطع کے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی اس سے مختلف بھی لیے ہیں لیکن وہ عربیت اور نظائرِ قرآن کے خلاف ہے۔

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (۴)

رسول کا کردار اس کی دعوے پر عظیم حجت ہے — یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام کی تاریخ نے اعلیٰ کردار کے جو نمونے پیش کیے ہیں تم اسی کی ایک نہایت شاندار مثال ہو اور تمھارا یہ کردار ان لوگوں کے خلاف سب سے بڑی حجت ہے جو تمھیں دیوانہ یا کاہن یا شاعر کہہ کر اپنے کو اور اپنے عوام کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ تمھاری یہ باتیں ہوا میں اڑ جائیں گی۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ کردار کو آپ کے دعوے کی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سورۂ شعراء میں نہایت تفصیل سے کاہنوں اور شاعروں کے اخلاق کی پستی، ان کی فکری ہرزہ گردی اور ان کے قول و عمل کی بے ربطی کا حوالہ دے کر ان لوگوں کو ملامت کی گئی ہے جو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ناپاک زمرے میں شامل کرتے تھے۔ ان سے سوال کیا گیا ہے کہ نبی کے اعلیٰ کردار کو ان کاہنوں اور شاعروں کے کردار سے کیا تعلق جن کا ظاہر و باطن دونوں ہی یکساں تاریک ہے۔

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ ۝ بِأَييِّكُمُ الْمَفْتُونُ (۵-۶)

اہل ایمان کے لیے بشارت اور مخالفوں کے لیے وعید

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے دھمکی ہے کہ اگر یہ تمھیں دیوانہ کہہ کر تمھاری باتوں کو بے وزن بنانا چاہتے ہیں تو کچھ دن صبر کرو۔ عنقریب تم بھی دیکھ لو گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ دونوں میں سے کس پارٹی کی باگ فتنہ میں پڑے ہوئے لیڈر کے ہاتھ میں ہے؟ اہل ایمان کی باگ، جن کی قیادت تم کر رہے ہو یا قریش کی باگ جن کی قیادت ابولہب اور ابوجہل کر رہے ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ اب فیصلہ کا وقت قریب ہے اور حقیقت کے ظاہر ہونے میں زیادہ دیر نہیں رہ گئی ہے۔ بہت جلد سب دیکھ لیں گے کہ کون لوگ شیطان کے فتنہ میں پڑے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنی قوم کو تباہی کے کھڈ میں گرایا اور کون شیطان کے فتنوں سے امان میں رہا اور اس نے اپنے پیروؤں کو دنیا اور آخرت کی کامیابی کی راہ دکھائی!

یہاں وہ حقیقت پیش نظر رکھیے جس کی بار بار یاد دہانی کی جا چکی ہے کہ رسولوں کے باب میں سنت الٰہی یہ ہے کہ جب وہ آتے ہیں تو اسی دنیا میں اپنی جماعت اور اپنے مخالفوں کے انجام کا فیصلہ کر کے جاتے ہیں۔ آیت میں اہل ایمان کے لیے جو تسلی اور اہل کفر کے لیے جو وعید ہے وہ جس طرح آخرت سے متعلق ہے اسی طرح اس دنیا سے بھی متعلق ہے۔ سابق سورہ کے آخر میں جو فرمایا ہے کہ 'فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ' یہ اسی کا اعادہ دوسرے الفاظ میں ہے۔

'بِأَييِّكُمُ الْمَفْتُونُ' میں 'ب' بظاہر 'تُبْصِرُ' اور 'يُبْصِرُونَ' کے ساتھ بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے لیکن یہاں تضمین ہے یعنی 'يُبْصِرُونَ' متضمن ہے 'يَعْلَمُونَ' کے معنی پر۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ زمخشری کی رائے یہی ہے اور میرے نزدیک یہ رائے اصول عربیت کے مطابق ہے۔ 'بِأَييِّكُمُ' کے معنی 'بِأَيِّ الحِزْبَيْنِ' کے ہیں۔

'مَفْتُونٌ' کے معنی 'مَجْنُونٌ' کے نہیں ہیں، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ 'مَفْتُونٌ' ہی کے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو دنیا اور شیطان کے جال میں پھنسا ہوا ہو۔ یہاں 'مجنون' کے بجائے 'مفتون' کا لفظ استعمال کر کے قرآن نے یہ رہنمائی دی ہے کہ جو لوگ دنیا اور شیطان کے چکر میں پھنسے ہوتے ہیں اصلی مجنون وہی ہوتے ہیں اور جس پارٹی کی باگ ایسے مفتونوں کے ہاتھ میں ہو وہ بالآخر جہنم میں گر کے رہتی ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (۷)

یہ اسی اوپر والے مضمون کی تائید و توضیح ہے کہ تمھارا رب نہ تو ان لوگوں سے بے خبر ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور نہ ان لوگوں سے ناواقف ہے جو ہدایت پر ہیں بلکہ وہ دونوں

بھی اچھی طرح واقف ہے۔ وہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ نہ یہ ہو سکتا کہ جو ذلّت کے مستحق ہیں وہ ہمیشہ عزت سے سرفراز رہیں اور نہ یہ ہو سکتا کہ جو سرفرازی کے حق دار ہیں وہ برابر ظالموں کے ظلم کے ہدف بنے رہیں۔ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ یہ ایک علیم و خبیر خالق کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لیے ایک روز انصاف آئے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے اس رب پر بھروسہ رکھو۔ وہ نیکوکاروں اور شریروں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ نہیں کرے گا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (۸)

یعنی جب اصل حقیقت یہ ہے جو بیان ہوئی تو عذاب اور قیامت کی تکذیب کرنے والوں کی باتوں کا دھیان نہ کرو اور ان کی ہفوات پر کان نہ دھرو۔ یہ لوگ اگر مطمئن ہیں کہ نہ عذاب ہے نہ قیامت تو انھیں مطمئن رہنے دو۔ اگر یہ مطلق ہیں کہ قیامت ہوئی تو وہاں بھی ان کو وہی کچھ حاصل ہوگا جو یہاں حاصل ہے تو انھیں یہ خواب خوش دیکھ لینے دو۔ یہ دنیا ان کی خواہشوں کے محور پر نہیں گھوم رہی ہے کہ جو کچھ یہ چاہیں گے انھیں مل جائے گا بلکہ یہ ایک حکیم و عزیز کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے اور یہ لازم ہے کہ ایک دن اس کی حکمت اور اس کا عدل اپنی کامل صورت میں ظاہر ہو۔

لفظ 'اِطَاعَۃٌ' یہاں کسی کی بات کا اثر لینے کے مفہوم میں ہے۔ اس مفہوم میں یہ لفظ کلامِ عرب میں بھی استعمال ہوا ہے اور قرآن میں بھی۔

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۹)

مخالفین کی اصل پالیسی

یہاں مکذبین کی مخالفت کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کی یہ ساری تگ و دو اس مقصد سے ہے کہ تم کچھ اپنے رویہ میں لچک پیدا کرو تو یہ بھی نرم پڑ جائیں۔ یعنی تمھاری باتوں کی صداقت میں انھیں شبہ نہیں ہے لیکن ان کو ماننا ان کی خواہشوں کے خلاف ہے اس وجہ سے انھوں نے یہ طوفان اٹھایا ہے کہ تم پر دباؤ ڈال کر تمھیں کچھ نرم کریں تاکہ تم کچھ باتیں ان کی مان لو اور وہ کچھ باتیں تمھاری مان لیں اور اس طرح 'کچھ لو اور کچھ دو' کے اصول پر باہم سمجھوتہ ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ مخالفت اپنے دینِ جاہلی کے ساتھ کسی اخلاص پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ محض ایک قسم کی (B A R G A I N I N G) کی کوشش ہے۔ جب تک انھیں توقع ہے کہ وہ تمھیں دبانے میں کچھ کامیاب ہو جائیں گے ان کی یہ کوشش جاری رہے گی۔ جب یہ توقع ختم ہو جائے گی ان کا حوصلہ پست ہو جائے گا۔

زبان سے متعلق ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال زبان سے متعلق پیدا ہوتا ہے کہ عربیت کے قاعدے سے تو یہاں 'وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْا' ہونا تھا لیکن ہے 'فَيُدْهِنُوْنَ'۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اسلوب مختلف اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں در اصل مبتدا محذوف کر دیا گیا ہے۔ یعنی اصل میں 'فَهُمْ يُدْهِنُوْنَ' ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ ان کی خواہش یہ ہے کہ جب تم کچھ نرم پڑ جاؤ گے تو وہ بھی

اپنے رویہ میں نرمی پیدا کریں گے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (۱۰)

قریش کی پوری قیادت کی اخلاقی تصویر

یہ اسی 'فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ' پر عطف کر کے تاکید کے ساتھ پھر تنبیہ فرمائی کہ تم ہر لپاٹیے ذلیل کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ اشارہ کسی خاص شخص کی طرف نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ قریش کی پوری قیادت کی اخلاقی پستی کی تصویر آگے کی چند آیتوں میں کھینچ دی گئی ہے اور مقصود اس سے یہ دکھانا ہے کہ ایک طرف پیغمبر کا وہ بے مثال خلقِ عظیم ہے جس کا آیت ۴ میں حوالہ ہے اور دوسری طرف قریش کے لیڈروں ــــ ابولہب، ولید بن مغیرہ، ابوجہل، اخنس بن شریق ــــ وغیرہ کا یہ کردار ہے جو بیان ہو رہا ہے۔ ان دونوں کو سامنے رکھ کر ہر منصف فیصلہ کر سکتا ہے کہ کون کس انجام سے دوچار ہونے والا ہے!

یہ بات کہ یہ کسی خاص شخص کا نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت کا کردار بیان ہو رہا ہے مختلف پہلوؤں سے واضح ہے۔

اول یہ کہ اس کا عطف 'فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ' پر ہے اور مکذبین سے مراد ظاہر ہے کہ کوئی معین شخص نہیں بلکہ موقع و محل دلیل ہے کہ قریش کی پوری قیادت ہے۔

دوسرا یہ کہ لفظ 'كُلَّ' بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں زیر بحث کسی معین شخص کا کردار نہیں بلکہ جماعت کا کردار ہے۔

تیسرا یہ کہ آگے 'إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ' کے الفاظ آئے ہیں جس میں جمع کی ضمیر 'هُمْ' اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مرجع کوئی فرد نہیں بلکہ جماعت ہے۔

چوتھا یہ کہ یہاں جو کردار بیان ہوا ہے وہ قریش کی پوری قیادت پر تو ٹھیک ٹھیک منطبق ہو جاتا ہے لیکن ہر بات کسی ایک معین شخص پر اگر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے تو تکلف کرنا پڑے گا۔

اس اصولی بحث کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب الفاظ پر غور فرمائیے۔

'حلاف'

'حَلَّافٍ' کے معنی بہت زیادہ قسم کھانے والے کے ہیں۔ لفظ 'حلف' جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، اول تو اچھے معنی میں آتا نہیں پھر اس کے ساتھ 'مَّهِينٍ' کی صفت بھی لگی ہوئی ہے جس کے معنی ذلیل کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زیادہ قسم وہی شخص کھائے گا جس کو اپنی عزت نفس کا خیال نہیں ہو گا۔ جو لوگ کردار کے اعتبار سے پست یا مطعون ہوتے ہیں وہ ہمیشہ احساس کمتری کے سبب سے شک میں مبتلا رہتے ہیں کہ مخاطب ان کی بات اس وقت تک باور نہیں کرے گا جب تک وہ قسم کھا کے اطمینان نہیں دلائیں گے اس وجہ سے وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں۔ چنانچہ منافقین کے متعلق قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ وہ اپنے کردار پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے قسموں کا سہارا لیتے ہیں۔ قریش کے لیڈروں کے پاس نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار پر حرف رکھنے کی گنجائش تھی اور نہ اسلام کے خلاف کوئی

مبنی بر دلیل بات کہنے کی، عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے واحد سہارا ان کے پاس یہی تھا کہ قسمیں کھا کھا کے لوگوں کو اطمینان دلائیں کہ العیاذ باللہ آپ شاعر، کاہن، مجنون اور مفتری ہیں۔

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ (۱۱)

ھماز — 'ھَمَّاز'، 'ھمز' سے مبالغہ ہے جس کے معنی اشارہ بازی کے ہیں۔ اشارہ بازی اور پھبتی اس قسم کے لوگوں کا خاص شیوہ ہوتا ہے جو کسی کو دوسروں کی نگاہوں سے گرانے کے درپے ہوں۔ یہ اشارہ بازی حرکات اور چشم و ابرو سے بھی ہوتی ہے، الفاظ اور فقروں سے بھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور غریب مسلمانوں کو قریش کے متکبرین جس قسم کے اشاروں اور فقروں کا ہدف بناتے تھے اس کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور ان کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ 'وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ' (الھمزۃ - ۱۰۴: ۱) میں اسی کردار کی طرف اشارہ ہے۔ متکبرین کے پاس دلیل کی قوت نہیں ہوتی اس وجہ سے وہ اسی اوچھے ہتھیار سے حق کو شکست دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس قسم کے تیر تکے حقیقت کی شمشیر براں کے مقابل میں کیا کام آسکتے ہیں!

مشّاءٍ بنمیم — 'مَشَّآءٍ بِنَمِيمٍ'۔ 'نمیمۃ' اور 'نمیم' کے معنی چغلی اور لگانے بجھانے کے ہیں۔ یہ اشارہ ان مفسدین کے جوڑ توڑ کی خصلت کی طرف ہے کہ یہ رات دن جوڑ توڑ میں سرگرم رہتے ہیں اور اس کے ذریعے چغلی کو ذریعہ بناتے ہیں، جس کو بھی دوسرے سے کاٹنا اور اپنے سے ملانا چاہا تو اس کے لیے سب سے بڑا حربہ ان کے پاس یہی ہوتا ہے۔

اسی نسخہ سے وہ اسلام کی مخالفت کا کام بھی لے رہے تھے۔ ان کی رات دن یہی کوشش تھی کہ مختلف قسم کی بے بنیاد و غلط فہمیاں مسلمانوں میں پھیلا کر ان کے درمیان پھوٹ ڈلوائیں تاکہ اسلام نے ان کے اندر جو اخوت و مودت پیدا کی ہے وہ مستحکم نہ ہونے پائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہو۔

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ (۱۲)

مناع، معتدی اور اثیم — اوپر کی آیات سے واضح ہوا کہ ان کی قیادت کی پوری عمارت جھوٹ، دوسروں کی تحقیر و توہین اور چغلی و نمامی پر قائم ہے۔ اب یہ واضح فرمایا جا رہا ہے کہ یہ نیکی کے کٹر دشمن، اللہ کے حدود کو توڑنے والے، بندوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے اور ان کو دبا بیٹھنے والے ہیں۔

'مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ' یوں تو عام ہے کہ وہ ہر نیکی اور بھلائی کی راہ میں ایک بھاری پتھر ہیں لیکن یہاں خاص اشارہ ان کی بخالت کی طرف ہے کہ وہ غربا و مساکین کی امداد میں نہ خود کوڑی خرچ کرنے کا حوصلہ رکھتے اور نہ دوسروں کو خرچ کرتے دیکھ سکتے بلکہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی انہی کی طرح مار گنج بنے بیٹھے رہیں تاکہ ان کی بخالت پر پردہ پڑا رہے۔ قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بخیلوں کے کردار کا یہ پہلو واضح فرمایا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی بخالت کی راہ سکھاتے ہیں تاکہ خود ان کی بخالت کا راز فاش نہ ہو۔

'مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ' یعنی صرف یہی نہیں کہ نہ خود خرچ کرتے نہ خرچ کرنے دیتے بلکہ وہ دوسروں کے حقوق پر تعدی کرنے والے بھی ہیں اور جو حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں ان کو دبا بیٹھنے والے بھی۔ ان دونوں لفظوں کی تحقیق اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'اعتداء' میں دوسروں کے حقوق پر دست درازی کا مفہوم پایا جاتا ہے اور 'اثم' میں حق تلفی کا۔

'عُتُلّ'

عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (۱۳)

'عُتُلّ' کے معنی سخت دل اور بے مروت کے ہیں۔ جو شخص بخیل ہوگا وہ لازماً سنگ دل بھی ہوگا۔ یہ گویا اوپر کے بیان کردہ کردار کا باطنی پہلو ہے۔ انہی لوگوں کے باب میں ارشاد ہوا ہے 'اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ہ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ' (الماعون ۱۰۷: ۱-۲) (ذرا دیکھو تو اس کو جو جزا کو جھٹلاتا ہے۔ وہی ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا ہے)۔

'زنیم'

'بَعْدَ ذٰلِکَ زَنِیْمٍ'۔ 'زنیم' کی وضاحت اہل لغت نے یوں کی ہے: الملحق بقوم لیس منھم ولا یحتاجون الیہ (وہ شخص جو کسی قوم کے نسب میں شریک بن بیٹھے درآنحالیکہ نہ وہ ان میں سے ہو اور نہ اہل قوم اس کی کوئی ضرورت محسوس کرتے ہوں) یہ لفظ 'زنمۃ' سے نکلا ہے۔ 'زنمۃ' اس غدود کو کہتے ہیں جو بعض بکریوں کی گردن میں لٹک آتا ہے اور جس کی حیثیت جسم میں ایک بالکل فالتو عضو کی ہوتی ہے۔ روایات میں اخنس بن شریق کے متعلق آیا ہے کہ اصلاً وہ ثقیف میں سے تھا لیکن مدعی تھا کہ وہ زہرہ میں سے ہے۔ اسی طرح ولید بن مغیرہ کے متعلق بھی مشہور ہے کہ وہ قرشی ہونے کا مدعی تھا حالانکہ وہ قریش میں سے نہ تھا۔ جو لوگ اپنے نسب کو حقیر سمجھ کر دوسروں کے نسب میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں وہ شیخی باز قسم کے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کا زیادہ اعتماد تملق، چاپلوسی اور قومی حمیت و حمایت کی جھوٹی نمائش پر ہوتا ہے تاکہ قوم کے اندر ان کا بھرم قائم رہے۔ چنانچہ اس طرح کے کھوٹے قرشی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں خاص طور پر پیش پیش تھے۔ وہ اپنی قوم پرستی کا مظاہرہ کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لوگوں کو اکساتے کہ آپ کی دعوت سے قریش کی وحدت و جمعیت میں انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ انہی شیخی بازوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا کہ اور رذالتیں ان کے اندر جو تھیں وہ تو تھیں ہی مزید برآں یہ بھی ہے کہ ان میں کچھ طفیلی بھی ہیں جو اہلِ قوم سے بھی زیادہ قوم کے وفادار ہونے کے مدعی اور اس کی جاہلی روایات کے محافظ بنے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ کڑوے کریلے تو تھے ہی ستم بالائے ستم یہ ہوا ہے کہ یہ نیم چڑھے بھی ہیں۔ قرآن نے یہ ضرب اس کردار پر لگائی ہے جو اس قسم کے لوگوں کے اندر لازماً پیدا ہو جاتا ہے جو احساس کہتری کے مریض اور خود اعتمادی سے محروم ہوتے ہیں۔

اَنْ کَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِیْنَ (۱۴)

فاسد کردار کا سبب

یہ سبب بیان ہوا ہے اس بات کا کہ ان کے اندر یہ کردار کیوں پیدا ہوا۔ فرمایا کہ اس وجہ سے پیدا

ہوا کہ یہ مال و اولاد والے ہوئے ۔ یہ فقرہ نہایت بلیغ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ نے ان کو مال و اولاد والا بنایا تو ہونا تو یہ تھا کہ یہ اپنے رب کے شکرگزار، فرمانبردار اور اس کے نازل کیے ہوئے حق کے علمبردار بن کر اٹھتے لیکن یہ اس کے برعکس بالکل ناشکرے اور نابنجار بن کر اٹھے ۔ قرآن میں یہ حقیقت جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں جن کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند فرماتا ہے وہ ان کا امتحان کرتا ہے کہ دیکھے اس کی نعمتیں پا کر وہ اس کے شکرگزار بنتے ہیں یا غرور میں مبتلا ہو کر شیطان کے ساتھی بن جاتے ہیں ۔ اسی امتحان میں اللہ نے ان لوگوں کو ڈالا لیکن یہ بالکل فیل ہو کر رہ گئے اور اللہ کی نعمت ان کے لیے نقمت کا سبب بن گئی ۔

إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۱۵)

غرور و استکبار کی تصویر

یہ اس غرور و استکبار کی تصویر ہے جس میں یہ لوگ مبتلا ہوئے ۔ فرمایا کہ جب ان کو ان قوموں کی سرگزشتیں سنائی جاتی ہیں جو انہی کی طرح غرور و استکبار میں مبتلا ہوئیں اور اس کے نتیجہ میں تباہ کر دی گئیں تو ان سے سبق لینے کے بجائے ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ تو پچھلی قوموں کے فسانے ہیں، ان کو حاضر سے کیا تعلق! مطلب یہ کہ اس قسم کے قصے سنانے والوں کو نہ ہم نبی ماننے کے لیے تیار ہیں اور نہ ان افسانوں سے ہم مرعوب ہی ہونے والے ہیں ۔ اس امر کو کسی کی تصدیق یا تکذیب سے کیا تعلق!

سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ (۱۶)

استکبار کی سزا

یہ ان متکبرین کے غرور و استکبار کی سزا بیان ہوئی ہے جو آخرت میں ان کو ملنے والی ہے ۔ فرمایا کہ جلد وہ وقت آ رہا ہے جب ہم ان کے ناکڑے پر داغ لگائیں گے ۔ 'خرطوم' اصل میں سونڈ کو کہتے ہیں ۔ یہاں یہ متکبرین کی ناکوں کے لیے بطریق استعارہ استعمال ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت درحقیقت اپنی ناک ہی اونچی رکھنے کے لیے کر رہے تھے ۔ اگر کسی کے اندر ناک اونچی رکھنے کا ایسا جنون پیدا ہو جائے کہ وہ اس کی خاطر بڑے سے بڑے اور واضح سے واضح حق کو بھی جھٹلانے پر کمربستہ ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ناک صرف ناک نہیں ہے بلکہ اس نے اس کو بڑھا کر اور پھلا کر سونڈ بنا لیا ہے ۔ فرمایا کہ اگر انھوں نے اپنی ناک کو ناکڑا بنا لیا ہے تو بنا لیں، ہم عنقریب ان کے ناکڑے پر ذلت کا داغ لگائیں گے جو سب دیکھیں گے ۔ یہ استکبار اور اس کی سزا کی بہترین تعبیر ہے جس کی بلاغت احاطۂ بیان میں نہیں آ سکتی ۔

إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ (۱۷)

قریش کے لیڈروں کے لیے ایک تمثیل

اوپر قریش کے قائدین کا جو کردار بیان ہوا ہے اس کا کھوکھلا پن واضح کرنے کے لیے یہ ان کے سامنے ایک تمثیل بیان فرمائی ہے جس میں ان کو یہ دکھایا ہے کہ اپنے جس اقتدار پر ان کو یہ ناز و اعتماد ہے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انذار کا مذاق اڑا رہے ہیں اس کی بنیاد بالکل ریت پر ہے ۔ اللہ تعالیٰ

جب چاہے گا چشم زدن میں اس کو خاک میں ملا دے گا۔ اس وقت وہ اپنی بدبختی پر سر پیٹیں گے اور توبہ و استغفار بھی کریں گے لیکن ان کا سارا نالہ و شیون بالکل بے سود ہوگا۔

'بَلَوْنٰهُمْ' میں ضمیر 'هُمْ' کا مرجع ظاہر ہے کہ وہی لوگ ہوں گے جن کا کردار اوپر زیر بحث آیا ہے۔ یہ اس بات کا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نہایت واضح قرینہ ہے کہ یہ کردار کسی معین شخص کا نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت کا ہے۔ اگر کسی ایک شخص کا کردار بیان ہوا ہوتا تو ضمیر جمع کی جگہ واحد کی آتی۔

اسی طرح یہاں زبان کا ایک دوسرا نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ 'اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ' میں لفظ 'الْجَنَّةِ' پر الف لام داخل ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص باغ والوں کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ تمثیلات میں لام تعریف یا 'الَّذِیْ' اور 'الَّتِیْ' وغیرہ جو آتے ہیں تو اس سے مقصود، جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مواقع میں وضاحت کر چکے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ کوئی معین ذات مدنظر ہے بلکہ اس سے مقصود صرف صورت حال کو مشخص و مصور کرنا ہوتا ہے تاکہ قاری کے سامنے واقعے کی پوری تصویر آ جائے۔ اس وجہ سے یہاں یمن یا صنعاء کے کسی خاص باغ کے مالکوں کے واقعہ کی جستجو کی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے مفسرین نے اٹھائی ہے، بلکہ یہ ایک خاکہ ہے جس میں قریش کے لیڈروں کے ذہن اور ان کے انجام کی تصویر اس طرح کھینچ دی گئی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ مخفی نہیں رہ گیا ہے۔

'اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ' یہ اس اعتماد کی طرف اشارہ ہے جو باغ والوں کو اپنی کامیابی پر تھا۔ وہ نہایت مطمئن اور پُر امید تھے کہ ان کا باغ موسموں کے تمام تغیرات سے گزر کر اب اس مرحلہ میں داخل ہو گیا جس میں اس پر کسی آفت کا کوئی اندیشہ نہیں رہا۔ ان کے خیال میں بس اتنا کام باقی رہ گیا تھا کہ کل صبح وہ جائیں اور پھل توڑ کر اپنے گھروں کو لائیں۔ چنانچہ انھوں نے قسم کھا کر یہ ارادہ کیا کہ صبح ہم اس کے پھل ضرور ہی توڑ لیں گے۔

وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ (۱۸)

ایک عام غلط فہمی

عام طور پر لوگوں نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ قسم کھاتے ہوئے انھوں نے 'اِنْ شَآءَ اللّٰهُ' نہیں کہا۔ ان کو اپنی کامیابی اتنی متیقن نظر آئی کہ یہ وہم بھی نہ گزرا کہ اس میں کوئی رخنہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس مطلب پر اگرچہ تمام مفسرین کا اتفاق ہے لیکن میرا دل اس پر نہیں جمتا۔ لفظ 'اِسْتِثْنَاءٌ' کے اندر اگرچہ اس مفہوم کی گنجائش ہے لیکن جس اسلوب میں یہاں بات فرمائی گئی ہے وہ اس کے لیے کچھ موزوں نہیں ہے۔ اگر یہ بات کہنی ہوتی تو 'وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ' کی جگہ 'وَلَمْ يَسْتَثْنُوْا' یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور اسلوب ہونا تھا۔ خود لفظ 'اِسْتِثْنَاءٌ' بھی 'اِنْ شَآءَ اللّٰهُ' کہنے کے مفہوم کے لیے کوئی واضح لفظ نہیں ہے۔

اس کا یہ مطلب جہاں بھی لیا جائے گا قرینہ ہی کی مدد سے لیا جائے گا۔ اور یہاں اس کا قرینہ ایسا واضح نہیں ہے کہ اس پر ذہن پوری طرح مطمئن ہو سکے۔

میرے نزدیک یہاں 'وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ' اپنے اصل لغوی مفہوم ہی میں ہے یعنی انھوں نے قسم کھائی کہ کل ہم اپنے باغ کے پھل ضرور ہی توڑ لیں گے اور اس میں سے کچھ بھی چھوڑیں گے نہیں۔ مطلب یہ کہ ہم ان لوگوں کا طریقہ نہیں اختیار کریں گے جو باغ کے پھل توڑتے ہیں تو کچھ غریبوں مسکینوں کے نام پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ باغوں سے متعلق دین دار اور فیاض لوگوں کے اندر یہ طریقہ قدیم زمانہ سے معروف چلا آ رہا ہے کہ جب باغ کے پھل توڑتے تو کچھ حصہ مسکینوں کے حق کے طور پر چھوڑ دیتے۔ انجیلوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ تعلیم مذکور ہے کہ جب تو اپنے باغ کے پھل توڑے تو کل نہ توڑ لے بلکہ اس کا کچھ حصہ غریبوں اور مسکینوں کے لیے بھی چھوڑ دے۔ اسی معروف طریقہ کو پیش نظر رکھ کر ان لئیموں نے قسم کھائی کہ ہم ایسا ہرگز کرنے والے نہیں ہیں۔ ان کو اپنی اسی بات کو مؤکد کرنے کے لیے قسم کھانے کی ضرورت پڑی ورنہ جملہ میں قسم کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اس تمثیل میں چونکہ قریش کے ان لیڈروں کا کردار نمایاں کیا جا رہا ہے جن کو اوپر 'مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ'، 'عُتُلٍّ' اور 'اَثِیْمٍ' کہا گیا ہے اس وجہ سے باغ والوں کی مذکورہ بالا قسم کا خاص طور پر حوالہ دیا گیا تاکہ دونوں کے کردار کی مشابہت پوری طرح واضح ہو جائے۔ قرآن میں ابولہب اور اس کے ہم مشربوں کی بخالت کی جو تصویر جگہ جگہ کھینچی گئی ہے اس کو بھی یہاں ذہن میں تازہ کر لیجیے۔

فَطَافَ عَلَیْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ہ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِیْمِ (۱۹-۲۰)

یعنی مذکورہ فیصلہ بڑے عزم و جزم اور بڑی تاکید و قسم کے ساتھ کر کے وہ رات میں سوئے لیکن ابھی سوتے ہی پڑے تھے کہ ان کے باغ پر کوئی خدائی گردش ایسی آئی جس نے باغ کا ستھراؤ کر دیا اور وہ بالکل کٹی ہوئی فصل کے مانند ہو کر رہ گیا۔ 'طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ' میں گردش کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ایک اس حقیقت کی طرف کہ یہ بالکل بے سان گمان نمودار ہوئی، دوسری اس کی بے پناہی کی طرف کہ اس نے چشم زدن میں وہ کرشمہ کر دکھایا کہ ہرا بھرا باغ بے نشان ہو کر رہ گیا۔

'مِّنْ رَّبِّكَ' میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تسلی کے لیے ہے۔ ابتدائی آیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ آج تم ان کو عذاب الٰہی سے ڈراتے ہو تو وہ اپنے ظاہری حالات کو بالکل ہموار و سازگار دیکھ کر تمھیں دیوانہ کہتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ بھلا ان پر عذاب کدھر سے آ جائے گا؟ اس تمثیل میں دکھا دیا کہ تیرے رب کا عذاب جب آتا ہے تو یوں آتا ہے کہ منصوبہ بندی کرنے والے سارے منصوبے، عہد و قسم کے ساتھ، دنیا کے سوتے ہی

لیکن جب صبح کو اٹھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ ۝ أَنِ اغْدُوا عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِن كُنتُمْ صَارِمِينَ (۲۱-۲۲)

یہ لوگ ساری اسکیم بنا کے رات میں سوتے اور صبح اٹھتے ہی تمام شرکا نے ہانک پکار مچائی کہ پھل توڑنے اور فصل اٹھانی ہے تو سویرے سویرے اپنے کھیتوں پر پہنچو۔ 'حَرْث' اگرچہ کھیتی کے معنی میں آتا ہے لیکن اس سے مراد وہ باغ ہی ہے جس کا ذکر اوپر سے آرہا ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ عرب میں باغوں ہی کے اندر مختلف چیزوں کی کاشت کے لیے قطعات بھی ہوتے تھے اس وجہ سے ان کو باغ (جنت) بھی کہہ سکتے تھے اور کھیتی (حرث) بھی۔

'إِن كُنتُمْ صَارِمِينَ' کے الفاظ شرکاء کو للکارنے اور آمادہ کرنے کے لیے ہیں۔ یعنی یہ کام کرنا ہے تو وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً چلو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔

فَانطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ ۝ أَن لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُم مِّسْكِينٌ (۲۳-۲۴)

یعنی گھر سے نکلے تو چپکے چپکے ایک دوسرے کو ہوشیار کرتے ہوئے نکلے کہ خیال رکھنا، آج کے دن کوئی فقیر نہ باغ میں گھسنے پائے۔ یہ ان کی اسی خست کی تعبیر دوسرے الفاظ میں ہے جو اوپر 'وَلَا يَسْتَثْنُونَ' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔

وَغَدَوْا عَلَىٰ حَرْدٍ قَادِرِينَ (۲۵)

لفظ 'حَرْد' کے اندر تیز گامی، جوش، امنگ اور نشاط کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غریبوں اور مسکینوں کے تعاقب سے بچنے کا پورا سامان کر کے وہ بڑے حوصلہ اور پورے اعتماد کے ساتھ باغ کی طرف چلے۔ 'قَادِرِينَ' یعنی ان کے دل اعتماد و حوصلہ سے معمور تھے کہ اب کیا اندیشہ ہے، باغ اپنا ہے اور پھل تیار ہے، اب ہمارے ارمانوں میں کون خلل انداز ہو سکتا ہے! غریبوں، مسکینوں کے ٹوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا سو اس کا بھی سدباب کر لیا ہے۔

فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَضَالُّونَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ (۲۶-۲۷)

یعنی جب باغ پر نظر پڑی تو گردش آسمانی نے اس کا حلیہ اس طرح بگاڑ دیا تھا کہ پہلے وہلہ میں اس کو پہچان نہ سکے۔ خیال ہوا کہ شاید اندھیرے میں کسی اور سمت میں نکل آئے۔ بولے کہ ارے! ہم تو راستہ بھول گئے۔ لیکن پھر اصل حقیقت سامنے آئی کہ راستہ نہیں بھولے ہیں بلکہ باغ ہی اجڑ گیا ہے تب نہایت حسرت کے ساتھ بولے کہ یہ تو ہم بالکل ہی محروم ہو کے رہ گئے! ہم کن ارمانوں اور حوصلوں کے ساتھ گھر سے نکلے لیکن یہاں تو خاک نہیں!

قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ (۲۸)

'اَوْسَطُهُمْ' سے مراد ان کے اندر کا سب سے زیادہ میانہ رو اور معقول آدمی ۔ برے سے برے معاشرے کے اندر بھی بعض سعید روحیں ہوتی ہیں جو لوگوں کو ان کی بے راہ روی پر ٹوکتی رہتی ہیں خواہ غفلت کے متوالے سنیں یا نہ سنیں ۔ اسی طرح کا کوئی اللہ کا بندہ ان کے اندر بھی تھا جو وقتاً فوقتاً ان کو یاد دہانی کرتا رہتا تھا کہ اپنے رب سے غافل نہ رہو بلکہ اس کی تسبیح کرتے رہو ۔ لفظ 'تَسْبِیْح' ایک جامع کلمہ ہے جو اللہ کی یاد اور اس کی بندگی کے پورے مفہوم پر حاوی ہے ۔ پہلے تو اس کا وعظ ان سرمستوں پر کارگر نہ ہوا لیکن جب ان کی غفلت کا انجام ان کے سامنے آگیا تب ان کو اندازہ ہوا کہ خدا بھی کوئی چیز ہے اور یہ اللہ کا بندہ غلط نہیں کہتا تھا !

قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ (۲۹)

فوراً بولے کہ ہمارا رب پاک ہے ، یہ اس نے ہمارے اوپر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے بنے کہ اپنی کامیابیوں کے نشہ میں اس کی شانوں کو بھول گئے اور اگر کسی نے ہمیں یاد دلانے کی کوشش کی تو سنی ان سنی کر دی ـــــ یہ اسی طرح کا اعتراف ہے جس طرح کا اعتراف فرعون نے اس وقت کیا جب وہ اپنی فوجوں سمیت موجوں کی لپیٹ میں آگیا ۔ اس طرح کی توبہ بعد از وقت ہونے کے سبب سے بالکل بے سود ہوتی ہے ۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَلَاوَمُوْنَ ۔ قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا کُنَّا طٰغِیْنَ (۳۰-۳۱)

جب انجام سامنے آگیا تو سب ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے ۔ کسی نے کسی پر الزام لگایا کہ اس نے صحیح راہ اختیار کرنے نہ دی ، کسی نے دوسرے کو مجرم ٹھہرایا کہ اس نے ناصح کی بات سننے نہ دی ۔ جو لوگ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے وہ اپنی بے عقلی کا انجام دیکھ لینے کے بعد اسی طرح ایک دوسرے کو ملعون کرتے ہیں حالانکہ مجرم سب ہی ہوتے ہیں ۔ بس یہ فرق ہوتا ہے کہ کچھ فساد کی راہ کھولتے ہیں اور کچھ آنکھ بند کر کے ان کی پیروی کرتے ہیں ۔ بالآخر ان سب کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جرم میں شریک سب ہی تھے ۔

عَسٰی رَبُّنَآ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ (۳۲)

یعنی ایک دوسرے پر لعن طعن اور اپنی نالائقی کا اعتراف کرنے کے بعد انھوں نے اس توقع کا بھی اظہار کیا کہ اب ہم اپنے رب کی طرف راغب ہوتے ہیں ۔ امید ہے کہ وہ اس باغ کی جگہ اس سے بہتر باغ ہمیں عطا فرمائے گا ۔

یہاں قرآن نے ان کی اس توقع پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے لیکن سنت الٰہی یہ ہے کہ وقت گزر جانے کے بعد جو لوگ توبہ کرتے ہیں ان کی توبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں درخورِ اعتنا نہیں ٹھہرتی ۔

جس مقصد سے قریش کو یہ تمثیل سنائی گئی ہے بعینہٖ اسی مقصد سے اسی طرح کی ایک تمثیل سورہ کہف

آیات ۴۲-۴۴ میں سنائی گئی ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۖ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۳۳)

تمثیل کے بعد قریش کو تنبیہ

تمثیل سنانے کے بعد یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اللہ کا رسول ان کو جس عذاب سے ڈرا رہا ہے وہ اسی طرح ان پر آدھمکے گا۔ آج وہ اپنے عیش میں مگن اور خدا کی پکڑ سے بالکل بےخوف ہیں۔ رسول ان کو خطرہ سے آگاہ کر رہا ہے تو اس کو خبطی کہتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ ان پر عذاب کدھر سے آجائے گا۔ وہ ادھر سے آئے گا جدھر سے اس کے آنے کا گمان بھی نہ ہوگا اور اس وقت ان کا وہی حال ہوگا جو باغ والوں کا ہوا لیکن اس وقت ان کا نالہ و شیون بالکل بے سود ہوگا۔

'كَذٰلِكَ الْعَذَابُ' میں 'عَذَاب' سے اس عذاب کی طرف اشارہ ہے جو سنتِ الٰہی کے مطابق کسی قوم پر اس وقت آیا ہے جب اس نے اپنے رسول کی تکذیب کر دی اور رسول اپنا فرضِ بلاغ ادا کر چکا ہے۔ یہ عذاب، جیسا کہ ہم جگہ جگہ وضاحت کر چکے ہیں اس قوم کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اس کو عذابِ آخرت سے سابقہ پیش آئے گا جو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگا۔ اللہ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو ان دونوں ہی عذابوں سے ڈرایا ہے۔

'لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ' اظہارِ حسرت و افسوس کا جملہ ہے کہ عقل کے ان اندھوں کو آخرت بہت بعید از قیاس چیز معلوم ہوتی ہے حالانکہ وہ ایک حقیقت اور اس کا عذاب بڑا ہی ہولناک ہے۔ بشرطیکہ یہ جانیں اور سمجھیں۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (۳۴)

نیکوکاروں کا انجام

مکذبین کا انجام بیان کر چکنے کے بعد یہ اللہ سے ڈرتے رہنے والوں کا انجام بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے اس دنیا میں آخرت کے حساب کتاب سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاری ان کے لیے ان کے رب کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔ یہ 'مُتَّقِيْنَ' کا ذکر ان مکذبین کے مقابل میں ہوا ہے جو اپنی دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں خدا کی پکڑ اور آخرت کے عذاب سے بالکل بےخوف تھے۔ اس تقابل سے اس لفظ کے اصل مفہوم پر روشنی پڑتی ہے کہ متقی وہ لوگ ہیں جو اس دنیا کی ظاہر فریبیوں میں گم نہیں ہوئے ہیں بلکہ اس کے پس پردہ جو حقیقت ہے اس پر بھی ان کی نظر ہے۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ (۳۵)

نیک اور بد میں امتیاز عدلِ الٰہی کا لازمی تقاضا ہے

یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں خدا سے ڈرنے والوں کے لیے نعمت کے باغ ہوں گے۔ فرمایا کہ ایسا ہونا خدا کے عدل اور اس کی رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دنیا کے خالق کے نزدیک نیکوکار اور بدکار، وفادار اور غدار، بے ایمان اور ایمان دار دونوں

یکساں ہیں۔ یہ بات بالبداہت اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ صفات کے منافی ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کی نظر میں نیک اور بد دونوں برابر ہوں۔

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ (۳۶)

جزاء و سزا کا انکار انسان کی فطرت اور عقل کے خلاف ہے

یہاں متکبرین سے بانداز تعجب سوال ہے کہ تمھیں کیا ہو گیا ہے، تمھاری عقل کہاں کھوئی گئی ہے کہ تم اس قسم کے فیصلے کرنے لگے ہو! مطلب یہ ہے کہ اگر تم آخرت اور جزاء و سزا نہیں مانتے، تمھارے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے، یہ یونہی چلتی رہے گی یا یونہی ایک دن تمام ہو جائے گی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اس کے خالق کو عدل اور رحم کی صفات سے عاری سمجھتے ہو جس کو اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ کس نے نیکی کی زندگی گزاری اور کس نے بدی کی۔ اگر تمھارا فیصلہ یہ ہے تو سوچو کہ یہ فیصلہ عقل اور فطرت سے کتنا بعید ہے! یہ کتنی بڑی تہمت ہے جو اس کائنات کے خالق پر، جس کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور رحمت کی شہادت اس کائنات کے گوشے گوشے سے مل رہی ہے، تم لگا رہے ہو!

قرآن کے اس انداز سوال سے یہ بات صاف نمایاں ہے کہ انسان کی عام عقل اور اس کی عام فطرت اس فیصلہ کو قبول کرنے سے ابا کرتی ہے۔ اگر کچھ لوگ یہ فیصلہ کرتے ہیں تو یہ چیز دو شکلوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ محض اپنی خواہشوں سے بے بس ہو کر اپنی عقل کی آنکھوں میں دھول جھونکتے اور اپنی فطرت کو جھٹلاتے ہیں یا یہ کہ انھوں نے اپنی یہ دونوں صلاحیتیں بالکل برباد کر لی ہیں۔

أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ (۳۷-۳۸)

متکبرین کے ایک مغالطہ پر ضرب

یہ قریش کے ان متکبرین کی ایک اور آرزوئے باطل پر ضرب لگائی ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ آخرت اول تو کوئی چیز ہے نہیں اور ہے تو ہمیں جو کچھ یہاں حاصل ہے اس سے بہتر وہاں حاصل ہو گا۔ ان کے اس مغالطہ کی بنیاد اس واہمہ پر تھی کہ اگر وہ خدا کے منظور نظر نہ ہوتے تو یہ عزت و سیادت انھیں اس دنیا میں کس طرح حاصل ہوتی! تو جب خدا کے منظور نظر ہوئے تو جو کچھ انھیں یہاں حاصل ہے اس سے بڑھ کر وہاں حاصل ہو گا۔ فرمایا کہ تم کو اس مغالطہ میں کس چیز نے ڈالا؟ کیا تمھارے پاس خدا کا اتارا ہوا کوئی صحیفہ ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ تمھاری ساری آرزوئیں پوری ہوں گی؟ مطلب یہ ہے کہ جن کی آرزوئیں تم نے اپنے دلوں میں پال رکھی ہیں عقل و فطرت کے اندر تو ان کی کوئی بنیاد ہے نہیں، ہاں اگر کوئی آسمانی صحیفہ تمھارے پاس ہے جس میں یہ باتیں لکھی ہوئی ہیں تو اس کو پیش کرو۔

أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۙ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ (۳۹)

فرمایا کہ کیا خدا نے تم سے قیامت تک کے لیے عہد کر رکھا ہے کہ جو تم چاہو گے تمھارے ساتھ وہی معاملہ ہو گا؟ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کسی عہد کی نشان دہی تم نہیں کر سکتے تو آخر وہ کیا چیز ہے جس کے بل پر تمھیں ناز ہے کہ نہ دنیا میں تمھیں کوئی ہلا سکتا اور نہ آخرت میں تم پر کوئی مسئولیت ہے!

یہ امر یہاں واضح رہے کہ قرآن سے اللہ تعالیٰ نے آخرت کی فوز و فلاح کے جو وعدے فرمائے ہیں وہ ایمان اور عمل صالح اور اس عہد کی پابندی کے ساتھ مشروط ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے واسطہ سے لوگوں سے لیے ہیں۔ کسی قوم سے بھی اس نے کوئی ایسا عہد نہیں کیا ہے جو بالکل غیر مشروط طور پر قیامت تک کے لیے ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کی دونوں شاخوں سے اللہ تعالیٰ نے امامت و پیشوائی کا جو عہد کیا وہ تورات میں بھی مذکور ہوا ہے اور قرآن میں بھی۔ اس میں بالکل واضح طور پر تشریح ہے کہ یہ عہد ان لوگوں سے متعلق نہیں ہے جو خدا کے عہد کو توڑ کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں گے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوموں کی امامت پر سرفراز فرمانے کی بشارت دی کہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرۃ - ۲ : ۱۲۴) (میں تم کو لوگوں کا ایک عظیم امام بنانے والا ہوں) تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا کہ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ (کیا یہ وعدہ میری ذریت سے متعلق بھی ہے؟) اللہ تعالیٰ نے اس کا فوراً جواب دیا کہ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ (میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو تمھاری ذریت میں سے میرے عہد کو توڑ کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں گے) اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ظاہر ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل سے متعلق ہے اسی طرح بنی اسماعیل سے بھی متعلق ہے۔ لیکن قریش نے بھی اولادِ ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) ہونے کے زعم میں عند اللہ ہر مسئولیت سے اپنے کو بری سمجھ لیا اور بنی اسرائیل نے بھی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ (المآئدۃ - ۵ : ۱۸) کے غرور میں مبتلا ہو کر یہ گمان کر لیا کہ وہ آخرت کی ہر مسئولیت سے بالاتر ہیں۔

سَلْھُمْ اَیُّھُمْ بِذٰلِکَ زَعِیْمٌ ﴿۴۰﴾ اَمْ لَھُمْ شُرَکَآءُ ۚ فَلْیَاْتُوْا بِشُرَکَآئِھِمْ اِنْ کَانُوْا صٰدِقِیْنَ (۴۰-۴۱)

فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ ان میں سے کون اس بات کا ضامن بنتا ہے کہ ان کے لیے خدا نے نجات و فلاح کا غیر مشروط ابدی پروانہ جاری کر رکھا ہے؟ اگر ان کے کچھ شرکاء ہیں جن کی نسبت ان کا گمان ہے کہ وہ ان کے اوپر خدا کو ہاتھ ڈالنے نہ دیں گے تو ان کو پیش کریں اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں۔ یعنی ان کو دکھائیں ورنہ کم از کم ان کے نام ہی کہ لیں تاکہ دوسروں کو بھی ان کی حیثیت و حقیقت کا کچھ اندازہ ہو ـــــ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین کو اپنے جن معبودوں پر ناز تھا کہ وہ خدا کے بڑے چہیتے ہیں وہ ان کو اس کی پکڑ سے بچا لیں گے ان کی بے حقیقتی قرآن نے ہر پہلو سے اس طرح واضح کر دی ہے کہ اس چیلنج کے جواب میں وہ ان میں سے کسی کا نام لینے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ تَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ ؕ وَقَدْ کَانُوْا یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ وَھُمْ سٰلِمُوْنَ (۴۲-۴۳)

کُشِفَ عن ساق کا مفہوم

کَشَفَ ساق شدتِ امر کی تعبیر کے لیے عربی زبان کا معروف محاورہ ہے۔ شعرائے جاہلیت

نے مختلف طریقوں سے اس کو استعمال کیا ہے۔ حاتم کا مشہور شعر ہے۔

اخو الحرب ان عضّت بہ الحرب عضّها　　وان شمرت عن ساقها الحرب شمرا

(ممدوح جنگ کا مردِ میدان ہے۔ اگر جنگ اس پر حملہ آور ہوتی ہے تو وہ بھی اس سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اور اگر گھمسان کا رن پڑتا ہے تو وہ بھی اس میں بے خطر کود پڑتا ہے)۔

اس شعر میں گھمسان کے رن کے لیے 'شمرت عن ساقها الحرب' کا محاورہ استعمال کیا ہے۔

شدتِ امر کی تعبیر کے لیے اس محاورے کے وجود میں آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب کوئی بڑی ہلچل برپا ہوتی ہے تو اس وقت کنواریاں اور شریف زادیاں بھی اپنے پائنچے اٹھا کر بھاگنے پر مجبور ہوتی ہیں جس سے ان کی پنڈلیاں اور ان کے پاؤں کے زیورات کھل جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

تذهل الشيخ عن بنيه　　وتبدي عن خدام العقيلة العذراء

(ایسی ہلچل جو بوڑھوں کو ان کی اولاد سے غافل کر دے گی اور کنواریوں کی پنڈلیوں اور ان کی پازیبوں کو بے نقاب کر دے گی)

مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ تو یہ لذیذ خواب دیکھ رہے ہیں کہ جس عیش میں یہ یہاں ہیں اسی عیش میں وہاں بھی رہیں گے لیکن وہ دن بڑی ہلچل کا ہوگا۔ آج تو ان کو خدا کے آگے سربسجود ہونے کی دعوت دی جاتی ہے تو اکڑتے ہیں لیکن اس دن سجدے کو کہا جائے گا تو سجدہ کے لیے جھکنا چاہیں گے لیکن ان کی کمریں اس طرح تختہ بن جائیں گی کہ کوشش کے باوجود نہیں جھک سکیں گے۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی اور ان کے اوپر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔ ان کا پورا سراپا ان کی ذلت اور بے بسی کی گواہی دے رہا ہوگا۔

سجدہ کا یہ حکم ظاہر ہے کہ محض اتمامِ حجت اور رسوا کرنے کے لیے دیا جائے گا کہ ان کی سرکشی اور ان کی محرومی پر خود ان کا وجود ایسی گواہی ثبت کر دے جس کا وہ انکار نہ کر سکیں۔

بعینہٖ یہی مضمون سورۂ معارج میں بدیں الفاظ بیان ہوا ہے۔

يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ	جس دن کہ وہ قبروں سے نکلیں گے تیزی سے،
سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ۝	گویا کہ وہ نشانوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ان کی
خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ	نگاہیں جھکی ہوں گی اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔
ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ۝	یہ وہ دن ہوگا جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی
(المعارج - ۷۰ : ۴۳-۴۴)	ہے۔

وہی مضمون جو سورۂ قلم میں 'يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے اس آیت میں 'يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے، اس طرح لغت اور نظیرِ قرآن دونوں سے اسی مطلب کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے لیا ہے۔

بعض لوگوں نے ایک روایت کی بنا پر اس کے معنی یہ بھی لیے ہیں کہ جس دن اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا، لیکن متعدد ائمہ تفسیر سے وہی تاویل منقول ہوئی ہے جو ہم نے اختیار کی ہے۔ عکرمہؒ اور ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "ھو یوم القیٰمۃ یوم کرب و شدۃ" (اس سے مراد قیامت کا دن ہے جو کرب و شدت کا دن ہوگا) ۔ ابن جریرؒ نے ابن مسعودؓ یا ابن عباسؓ کے حوالہ سے کسی شاعر کا قول بھی مذکورہ معنی کی تائید میں نقل کیا ہے جس نے 'شالت الحرب عن ساق' کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ مشہور امام تفسیر مجاہدؒ نے بھی اس کو شدتِ امر ہی کے مفہوم میں لیا ہے۔

فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِھٰذَا الْحَدِیْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۴)

یہ ان مکذبین قرآن کو دھمکی ہے جن کا ذکر آیت ۱۵ میں گزر چکا ہے کہ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (جب ان کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں کہتے ہیں یہ اگلوں کے فسانے ہیں) ان کو دھمکی کے ساتھ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس میں بہت بڑی تسلی بھی ہے۔ آپ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اب ان مکذبین قرآن کا معاملہ مجھ پر چھوڑو۔ تمہارے اوپر بلاغ کی جو ذمہ داری تھی وہ تم ادا کر چکے۔ اب تم بیچ سے ہٹو اور مجھے تنہا ان سے نمٹ لینے دو۔ میں درجہ بدرجہ ان کو وہاں سے ہلاکت کے کھڈ میں لے جاؤں گا جہاں سے ان کو علم بھی نہ ہوگا۔ اس وقت ان کو جو ڈھیل دے رہا ہوں اس کو وہ اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں حالانکہ وہ موت کے پھندے میں آئے ہوئے ہیں۔ مکذبین کو دھمکی

وَاُمْلِیْ لَھُمْ ؕ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ (۴۵)

یعنی میں اس استدراج کے دوران ان کو اس لیے ڈھیل دے رہا ہوں کہ یہ اپنی جولانیاں دکھا لیں اور اپنا زور صرف کر لیں۔ ان کی رسی دراز کرنے میں یہ اندیشہ نہیں ہے کہ یہ میرے قابو سے باہر نکل جائیں گے۔ میری تدبیر نہایت ہی محکم ہوتی ہے۔

اَمْ تَسْـَٔلُھُمْ اَجْرًا فَھُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (۴۶)

یہ قرآن سے ان لوگوں کے فرار پر تعجب کا اظہار بھی ہے اور ان کو ملامت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ آخر یہ لوگ تمہاری بات سنتے کیوں نہیں؟ سننے میں ان کا کیا حرج ہوتا ہے؟ تم ان سے سنانے کا کوئی معاوضہ تو مانگ نہیں رہے ہو کہ یہ اس کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں؟ اس میں ضمناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے کہ اگر یہ نہیں سن رہے ہیں تو اس کا غم نہ کرو۔ اگر یہ اس نعمت سے بھاگ رہے ہیں تو اس میں انہی کی محرومی ہے۔ تم اپنے رب کے ہاں سرخرو ہو کہ یہ دولتِ آسمانی مفت لٹا رہے ہو۔ مکذبین کی ان کی بوالہوسی پر ملامت

اَمْ عِنْدَھُمُ الْغَیْبُ فَھُمْ یَکْتُبُوْنَ (۴۷)

یہ بھی ان لوگوں کی اس بے پروائی اور بے نیازی پر اظہارِ تعجب ہے کہ آخر یہ کس بل بوتے پر اس انذار کو اس بے نیازی سے نظر انداز کر رہے ہیں؟ کیا ان کے پاس علمِ غیب ہے جو وہ لکھ

رہے ہیں کہ آخرت میں (اگر وہ ہوئی) ان کے لیے نہایت اعلیٰ مدارج ہیں، مطلب یہ ہے کہ بغیر کسی دلیل اور سند کے محض خواہشوں کی مدد سے اپنے لیے خیالی جنت آراستہ کر لینا اور زندگی کے حقائق سے آنکھیں موند لینا دانشمندی نہیں بلکہ اپنے لیے ابدی ہلاکت کا سامان کرنا ہے۔

یہ آیت سورۂ طور میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے سیاق و سباق کی روشنی میں ہم نے اس کی وضاحت کی ہے۔ سورۂ نجم میں یہ جس سیاق و سباق کے ساتھ آئی ہے اس سے اس کا پورا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

أَعِندَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرَىٰ ○	کیا اس کے پاس علم غیب ہے پس وہ دیکھ رہا ہے
أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ	(آخرت میں اپنے مدارج کو)؟ کیا موسیٰ کے صحیفوں میں
مُوسَىٰ ○ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي	جو بات بتائی گئی ہے اس کی خبر اس کو نہیں ملی؟ اور
وَفَّىٰ ○ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ	اس ابراہیم کی تعلیمات میں بھی جس نے اپنے رب کے
وِزْرَ أُخْرَىٰ ○	ہر حکم کو پورا کیا؟ کہ کوئی جان بھی کسی بھی دوسری جان کا
(النجم - ۵۳: ۳۵-۳۸)	بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ (۴۸)

نبی صلعم کو اپنی دعوت پر جمے رہنے کی تلقین

'فَاصْبِرْ' یہاں 'انتظر' کے مفہوم پر متضمن ہے اس وجہ سے اس کے بعد 'ل' کا صلہ آیا ہے۔ یہ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و ثبات کی تلقین کے ساتھ تسلی دی جا رہی ہے کہ تم ثابت قدم رہو اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور اس طرح کی جلد بازی سے بچو جو مچھلی والے (حضرت یونسؑ) سے صادر ہو گئی۔

'مچھلی والے' سے اشارہ ظاہر ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرف ہے۔ اس لقب سے ان کو ملقب کرنے میں ایک قسم کا پیار بھی ہے اور اس آزمائش کی طرف اشارہ بھی جو آنجناب کو پیش آئی۔

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی پوری تفصیل اس کے محل میں ہم پیش کر چکے ہیں کہ ان کی قوم نے ان کی دعوت کی جو ناقدری کی تو حق کی اس توہین سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس پر ان کو عتاب ہوا جس کے نتیجہ میں ان کو مچھلی والا امتحان پیش آیا۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین فرمائی گئی ہے کہ ہر چند تمھاری قوم بھی دعوت کی ناقدری اور تمھاری تکذیب پر مصر ہے لیکن تم میدان میں ڈٹے رہو اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو جب تک تمھارے رب کا حکم نہ ہو اپنی جگہ چھوڑنے کی غلطی نہ کرنا۔ مبادا تمھیں بھی اسی طرح کا کوئی امتحان پیش آ جائے جس طرح کا امتحان حضرت یونس علیہ السلام کو پیش آ گیا۔

'إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ' یہ اجمالاً اس رویہ کی طرف اشارہ ہے جو امتحان کے بعد حضرت یونس

نے اختیار فرمایا۔ وہ فوراً ہی اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے اور نہایت شدید قسم کے غم سے گھٹے ہوئے انھوں نے مچھلی کے پیٹ کے اندر اپنے رب سے فریاد کی۔ یہ فریاد جن زندۂ جاوید الفاظ[1] میں انھوں نے کی وہ دوسرے مقام میں نقل ہوئے ہیں اور ان کی بلاغت ہم واضح کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بات بطور بدرقہ ارشاد ہوئی ہے۔ تاکہ 'لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ' کے الفاظ سے حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ ہو بلکہ یہ واضح ہو جائے کہ اگرچہ شدتِ تاثر سے مغلوب ہو کر ان سے ایک غلطی صادر ہو گئی لیکن فوراً ہی توبہ سے انھوں نے اس کی اصلاح کر لی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو پھر برگزیدگی سے نوازا، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے۔

لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۝ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۴۹ - ۵۰)

'نِعْمَةٌ' سے یہاں مراد اللہ تعالیٰ کا وہ فضل ہے جو توبہ کے بعد ان کو قبولیتِ توبہ اور از سرِ نو فریضۂ رسالت پر ماموریت کی شکل میں حاصل ہوا۔ فرمایا کہ اگر ان پر اللہ کا یہ فضل نہ ہوا ہوتا تو جس ریت پر مچھلی نے ان کو ڈالا تھا اسی پر نہایت مذموم حالت میں وہ پڑے ہی رہ جاتے لیکن اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، ان کو اپنی رحمت سے نوازا، ان کو ان کے مقدس مشن کی تکمیل کے لیے از سرِ نو برگزیدہ کیا اور زمرۂ صالحین میں شامل فرمایا۔ یعنی اس دنیا سے وہ ناکام و نامراد نہیں گئے بلکہ بامرادوں کے زمرہ — صالحین — میں وہ شامل ہوئے۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ (۵۱)

اس آیت کا تعلق بھی تلقینِ صبر و ثبات کے اسی مضمون ہی سے ہے جو 'فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ' میں بیان ہوا ہے۔ یعنی اگرچہ حالات نہایت سخت ہیں۔ کفار جب قرآن سنتے ہیں تو تمھیں اس طرح گھورتے اور ایسی تیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کے زور سے تمھیں دھکیل کر تمھارے مقام سے تمھیں پھسلا دیں گے اور جوشِ غضب میں تمھیں خبطی اور مجنون بتاتے ہیں لیکن ان کے اس رویہ کے باوجود تم اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ یہاں ابتدائے سورہ کی آیت 'مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ' ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ سورہ جس مضمون سے شروع ہوئی تھی اسی پر ختم ہو رہی ہے۔

وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۵۲)

یعنی اگر اس بات کو سن کر یہ تمھیں دیوانہ کہتے ہیں تو کہیں، لیکن یہ یاد رکھیں کہ یہ کسی دیوانے

---

[1] لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (الانبیاء - ۲۱: ۸۷)

کی چیز نہیں بلکہ دنیا والوں کے لیے یاد دہانی ہے۔ اس یاد دہانی سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو پچھتائیں گے لیکن یہ پچھتانا بے سود ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

رحمان آباد
۲۰۔ جولائی ۱۹۷۸ء
۲۳۔ شعبان ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۶۹

الحآقّة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور نظم

اس سورہ پر تدبر کی نظر ڈالیے تو اس میں اور سابق گروپ کی سورۂ واقعہ میں مختلف پہلوؤں سے بڑی گہری مشابہت نظر آئے گی، مثلاً

——— دونوں میں قیامت کا اثبات اور اس کے ہول کی تصویر ہے۔

——— دونوں میں اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کے انجام کی تفصیل ہے۔

——— دونوں میں قرآن مجید کی صداقت و حقانیت پر قسم کھائی گئی ہے۔

سابق سورہ ——— القلم ——— سے بھی اس کو بڑی گہری مناسبت ہے۔ اس کا عمود وہی ہے جو سابق سورہ کا ہے یعنی اثبات غذاب و قیامت۔ البتہ نہج استدلال دونوں میں الگ الگ ہے۔ قرآن کی عظمت و صداقت جس طرح سابق سورہ میں واضح کی گئی ہے اور اس کی تکذیب کے نتائج سے ڈرایا گیا ہے اسی طرح اس سورہ میں بھی یہی مضمون زیر بحث آیا ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ سابق سورہ میں یہ مضمون تمہید کی حیثیت سے ہے اور اس سورہ میں خاتمہ کے طور پر اور تذکیر و تعلیم کے پہلو سے ان دونوں اسلوبوں کی اہمیت الگ الگ ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱ - ۱۲) تکذیب رسول کے نتیجہ میں غذاب اور قیامت کے شدنی اور اٹل ہونے پر رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ کی گواہی۔

(۱۳ - ۱۸) ہول قیامت کی تصویر۔

(۱۹ - ۳۷) اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کے انجام کی تفصیل۔

(۳۸ - ۵۲) قرآن کی عظمت و صداقت کا بیان کہ یہ کسی شاعر یا کاہن کا کلام نہیں ہے بلکہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے۔ جو لوگ اس کے انذار کی تکذیب کر رہے ہیں وہ اس کا انجام دور تک سوچ لیں۔

سُوْرَةُ الْحَآقَّةِ (۶۹)

مَكِّيَّةٌ ______ اٰيات: ۵۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ۱ - ۵۲ اَلْحَآقَّةُ ۝۱ مَا الْحَآقَّةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝۳
كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝۴ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا
بِالطَّاغِيَةِ ۝۵ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ
عَاتِيَةٍ ۝۶ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ
حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ
خَاوِيَةٍ ۝۷ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝۸ وَجَآءَ
فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝۹
فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝۱۰ اِنَّا لَمَّا
طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِى الْجَارِيَةِ ۝۱۱ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً
وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝۱۲ فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳
وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝۱۴
فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝۱۵ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِىَ يَوْمَئِذٍ
وَّاهِيَةٌ ۝۱۶ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۗ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ
فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝۱۷ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى

مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿١٨﴾ فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ
هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿١٩﴾ إِنِّيْ ظَنَنْتُ أَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿٢٠﴾
فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٢١﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿٢٢﴾ قُطُوْفُهَا
دَانِيَةٌ ﴿٢٣﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ
الْخَالِيَةِ ﴿٢٤﴾ وَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ
لَمْ أُوْتَ كِتٰبِيَهْ ﴿٢٥﴾ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ﴿٢٦﴾ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ
الْقَاضِيَةَ ﴿٢٧﴾ مَآ أَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ﴿٢٨﴾ هَلَكَ عَنِّيْ
سُلْطٰنِيَهْ ﴿٢٩﴾ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ﴿٣١﴾
ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿٣٢﴾
إِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿٣٣﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ
الْمِسْكِيْنِ ﴿٣٤﴾ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ﴿٣٥﴾ وَّلَا طَعَامٌ
إِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿٣٦﴾ لَّا يَأْكُلُهٗٓ إِلَّا الْخٰطِـُٔوْنَ ﴿٣٧﴾ فَلَآ أُقْسِمُ ع ٤٧ ٥
بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٣٩﴾ إِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ
كَرِيْمٍ ﴿٤٠﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿٤١﴾
وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٤٢﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٣﴾ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيْلِ ﴿٤٤﴾ لَأَخَذْنَا
مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿٤٥﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿٤٦﴾ فَمَا
مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿٤٧﴾ وَإِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ

لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَاِنَّهٗ
لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾ فَسَبِّحْ
ع ۱۵ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾

ترجمۂ آیات ۱-۵۲ شُدنی! کیا ہے شُدنی! کیا جانو کہ کیا ہے شُدنی! ۱-۳

ثمود اور عاد نے اس کھٹکھٹانے والی کو جھٹلایا۔ تو ثمود ایک حد سے بڑھ جانے والی آفت سے ہلاک کر دیے گئے۔ رہے عاد تو وہ ایک بے قابو بادِ تُند سے برباد ہوئے۔ اس کو اللہ نے سات رات اور آٹھ دن ان کی بیخ کنی کے لیے ان پر مسلّط رکھا۔ تم دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھاڑے پڑے ہیں گویا کہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں۔ تو کیا تم دیکھتے ہو ان میں سے کوئی بچ رہنے والا! ۴-۸

اور فرعون اور اس سے پہلے والوں اور الٹی ہوئی بستیوں والوں نے بھی اسی جرم کا ارتکاب کیا۔ انھوں نے اپنے رب کے رسولوں کی نافرمانی کی تو اس نے ان کو اپنی سخت گرفت میں دبوچ لیا۔ ۹-۱۰

اور جب پانی حد سے گزر گیا تو ہم ہی نے تم کو کشتی میں سوار کرایا تاکہ ہم اس واقعہ کو تمھارے لیے ایک درسِ موعظت بنائیں اور یاد رکھنے والے کان اس کو سنیں اور محفوظ رکھیں۔ ۱۱-۱۲

پس یاد رکھو جب کہ صُور میں ایک ہی بار پھونک ماری جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی بار میں پاش پاش کر دیا جائے گا تو اس دن واقع ہونے والی واقع ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور وہ اس دن نہایت پھُسپھُسا

ہوگا۔ اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے رب کے عرش کو اس دن آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے۔ اس دن تمھاری پیشی ہو گی۔ تمھاری کوئی بات بھی ڈھکی چھپی نہیں رہے گی۔ ۱۳-۱۸

پس جس کو دیا جائے گا اس کا اعمال نامہ اس کے دہنے ہاتھ میں تو وہ کہے گا، پڑھو میرا اعمالنامہ! میں نے گمان رکھا کہ مجھے اپنے حساب سے دوچار ہونا ہے۔ پس وہ تو ایک دل پسند عیش میں ہو گا، ایک بلند و بالا باغ میں۔ اس کے پھل قریب لٹک رہے ہوں گے۔ کھاؤ اور پیو، بے غل و غش، اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم نے گزرے دنوں میں کیے۔ ۱۹-۲۴

رہا وہ جس کو اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا، کاش میرا اعمال نامہ مجھے دیا ہی نہ گیا ہوتا اور میں جانتا ہی نہ کہ میرا حساب کیا ہے! اے کاش کہ وہی موت فیصلہ کن ہوئی ہوتی! میرا مال میرے کیا کام آیا! میرا اقتدار مجھ سے چھن گیا! — اس کو پکڑو، پھر اس کی گردن میں طوق ڈالو، پھر اس کو جہنم میں جھونک دو۔ پھر ایک زنجیر میں، جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے، اس کو جکڑ دو — یہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور نہ مسکینوں کو کھلانے پر لوگوں کو ابھارتا تھا۔ پس آج اس کا یہاں کوئی ہمدرد نہیں اور غسالہ کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا نہیں ہے۔ یہ کھانا صرف گنہگار ہی کھائیں گے۔ ۲۵-۳۷

پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے کہ یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے اور یہ کسی شاعر

کا کلام نہیں، تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو! اور یہ کسی کاہن کا بھی کلام نہیں، تم بہت ہی کم سمجھتے ہو۔ یہ خداوندِ عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ اور اگر یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا تو ہم اس کو قوی بازو سے پکڑتے پھر ہم اس کی شہ رگ ہی کاٹ دیتے پس تم میں سے کوئی بھی اس سے ہم کو روکنے والا نہ بن سکتا۔ اور یہ تو ایک یاددہانی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔ اور ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں اس کے جھٹلانے والے بھی ہیں۔ اور یہ کافروں کے لیے موجبِ حسرت ہو گا اور بے شک یہ ایک حقِ یقینی ہے تو تم اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔ ۳۸-۵۲

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلۡحَآقَّۃُ ۙ﴿۱﴾ مَا الۡحَآقَّۃُ ۚ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡحَآقَّۃُ ﴿۳﴾ (۱-۳)

'الحاقۃ' کا مفہوم

'اَلْحَآقَّۃُ' کے معنی ہیں وہ بات جو شدنی ہو، جس کا وقوع عقلاً و اخلاقاً لازم ہو، جو بالکل اٹل اور قطعی ہو۔ یہ ایک ہی لفظ جملہ کے قائم مقام ہے۔ جن لوگوں نے 'مَا الْحَآقَّۃُ' کو اس کی خبر قرار دیا ہے ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ یہ اسلوبِ بیان اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب مخاطب، خاص طور پر غافل مخاطب کو ہڑبڑا دینا مقصود ہو۔ ایسی صورت میں صرف مبتدا کا ذکر کافی ہوتا ہے، خبر کی ضرورت نہیں ہوتی تاکہ مخاطب کی پوری توجہ مبتدا ہی پر مرکوز ہو جائے۔ اس طرح جملہ میں جو ابہام پیدا ہوتا ہے وہ مخاطب کی توجہ جذب کرنے کا باعث بنتا ہے۔

'اَلْحَآقَّۃُ' قیامت کے ناموں میں سے ہے۔ یہ نام اس کے شدنی اور واقعی ہونے کو بھی ظاہر کرتا ہے اور عقلاً و اخلاقاً اس کے واجب ہونے کو بھی۔ اس کے ان دونوں پہلوؤں کے دلائل کی تفصیل پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکی ہے، بعض اشارات اس سورہ میں بھی ہیں اور آگے کی سورتوں میں بھی اس کے نہایت اہم پہلو واضح ہوں گے۔

اصلاً تو اس سے مراد قیامت ہی ہے لیکن ضمناً اس میں وہ عذاب بھی شامل ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً اس کی قوم پر آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عذابِ قیامت کی تمہید

بھی ہوتا ہے اور اس کی تصدیق بھی اور آتا بھی ہے درحقیقت قیامت کی تکذیب ہی کی یاد داشت میں۔ اللہ کے رسولوں نے بیک وقت دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک عذاب قیامت سے اور دوسرے اس عذاب سے جو تکذیب قیامت کا لازمی نتیجہ ہے۔ قوموں نے جب قیامت کو جھٹلایا اور رسول کی صداقت کی کسوٹی اس عذاب کو ٹھہرایا جس کی دھمکی انھیں تکذیب کے نتیجہ کے طور پر دی گئی تو اتمام حجت کے بعد یہ عذاب ان پر آگیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہر بات اور رسول کی ہر وعید سچی ہے اس وجہ سے یہ عذاب بھی حَاقَّۃٌ یعنی شدنی کی حیثیت رکھتا ہے۔

مَا الْحَآقَّۃُ: یہ سوال اس کے ہول، اس کی دہشت اور اس کی بے پناہی کی تعبیر کے لیے ہے جس کی مزید وضاحت بعد کے الفاظ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّۃُ سے ہوتی ہے کہ کون جان سکتا اور کون بتا سکتا ہے کہ یہ شدنی کیا ہے اور جب یہ ظہور میں آئے گی تو ان لوگوں پر کیا گزرے گی جو آج نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اس کو جھٹلا رہے ہیں!

یہی اسلوب کلام سورۂ قارعہ میں بھی ہے۔ وہاں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت ہوگی۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ (۴)

'القارعۃ' کا مفہوم

اور جس شدنی سے ڈرایا گیا ہے رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ سے یہ اس کی شہادت پیش کی جا رہی ہے کہ جس طرح قریش عذاب اور قیامت کو جھٹلا رہے ہیں اسی طرح ثمود اور عاد نے بھی جھٹلایا تھا جس کا انجام ان کے سامنے آیا۔ یہاں عذاب اور قیامت کی تعبیر کے لیے لفظ 'قَارِعَۃٌ' آیا ہے جس کے معنی ٹھونکنے اور کھٹکھٹانے والی کے ہیں۔ قرآن میں عذاب الٰہی اور قیامت دونوں کی یہ خصوصیت بیان ہوئی ہے کہ ان کے آنے کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔ یہ اچانک آدھمکیں گے اور جس طرح کوئی اچانک آکر دروازے کو کھٹکھٹاتا اور بے خبر سونے والوں کو ہڑبڑا دیتا ہے اس طرح یہ بھی ایک ہلچل برپا کر دیں گے۔

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ (۵)

'طاغیۃ' کا مفہوم

فرمایا کہ ان میں سے ثمود تو طَاغِیَۃ سے ہلاک کر دیے گئے۔ 'طَاغِیَۃٌ' کے معنی ہیں وہ شے جو اپنے حدود و قیود سے متجاوز ہو جائے۔ اس سورہ میں اس بارش کو جس نے قوم نوح کو غرق کیا 'طَغَا الْمَآءُ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ قوموں کو سزا ان کے رویہ کی مناسبت سے دیتا ہے۔ جب کوئی قوم طغیان کی روش اختیار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی کائنات کی انھی چیزوں میں سے، جو انسان کی نفع رسانی کے لیے مسخر ہیں، کسی چیز کو اس کے خلاف طغیان پر ابھار دیتا ہے جو طَاغِیَۃٌ بن کر اس کو ہلاک کر دیتی ہے۔ ثمود بھی، جیسا کہ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ (الشمس ۹۱: ۱۱) سے واضح ہے، اپنے رب کے خلاف طغیان میں مبتلا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک آفت (طاغیۃ) مسلط کر دی۔

یہ آفت کیا تھی؟ اس کی کوئی وضاحت یہاں نہیں ہے لیکن قرآن کے مختلف مقامات میں اس سے متعلق جو اشارات ہیں سورۂ ذاریات کی تفسیر میں ہم نے وہ بیان کر دیے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود کی تباہی صاعقہ کے ذریعہ سے ہوئی جو سرما کے دھاریوں والے بادلوں کے اندر سے نمودار ہوئی۔ اگرچہ سرما کے بادل اور ان کے ساتھ کڑک و چمک کا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہے ان کو قوموں کے لیے قیامت بنا دے۔

اس زمانے میں سائنس نے بہت ترقی کی ہے اور بظاہر انسان نیچر کی بہت سی قوتوں کو مسخر کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے لیکن آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے ساری سائنس اور تمام سائنس دانوں کی بے بسی ظاہر کر دیتا ہے۔

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهۡلِكُوۡا بِرِيۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِيَةٍ (۶)

'عاتیة' کا مفہوم

پھر عاد کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا کہ ان پر سرما کی تند باد صرصر چلی اور اس نے ان کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ جس طرح اوپر ثمود کے بیان میں 'صاعقة' کو 'طاغیة' سے تعبیر کیا ہے اسی طرح یہاں بادِ صرصر کی صفت 'عاتیة' آئی ہے جس کے معنی ہیں وہ ہوا جو سرکش اور بے قابو ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور یہ اس کی زندگی اور بقا کے لیے ناگزیر ہے لیکن جب انسان سرکشی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسی مسخر ہوا کو جب چاہتا ہے ذرا سی ڈھیل دے کر اس کے لیے عذاب بنا دیتا ہے۔

سَخَّرَهَا عَلَيۡهِمۡ سَبۡعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوۡمًا فَتَرَى الۡقَوۡمَ فِيۡهَا صَرۡعٰى ۙ كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِيَةٍ (۷)

ہوا کو عذاب بنا دینے کی تصویر

یہ ہوا کو عذاب بنا دینے کی تصویر ہے کہ جو ہوا اللہ نے انسان کی خدمت کے لیے مسخر کی ہے اسی کو اس نے عاد کے اوپر عذاب بنا کر مسلط کر دیا اور وہ سات راتیں اور آٹھ دن ان کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ دینے کے لیے ان پر چلتی رہی۔ 'حسم' اور 'حسوم' کے معنی استیصال کر دینے کے ہیں۔

'فَتَرَى الۡقَوۡمَ فِيۡهَا صَرۡعٰى ۙ كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِيَةٍ'۔ 'تَرٰى' کا خطاب اس طرح کے مواقع میں عام ہوتا ہے اور 'اَلۡقَوۡمَ' یہاں حریف اور مدمقابل کے مفہوم میں ہے۔ عاد اپنے 'عتو' (سرکشی) کے سبب سے گویا خدا کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اس وجہ سے اس لفظ کا استعمال یہاں نہایت موزوں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تم میں سے جو بھی ان کو دیکھتا تو وہ دیکھتا کہ اللہ کے عذاب نے ان کو اس طرح میدان میں پچھاڑ کے ڈال دیا ہے کہ گویا وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں جو ہوا کے زور سے ادھر ادھر لڑھکتے پھر رہے ہوں۔

'فِيْهَا' کی ضمیر مجرور کا مرجع ہوا بھی ہو سکتی ہے اور سرزمینِ عاد بھی۔ عربیت کے قاعدے سے یہ دونوں صحیح ہیں اور یہاں یہ دونوں معنی بنتے ہیں۔

فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ (۸)

عذابِ الٰہی کی بے پناہی — اس کا عطف اوپر والے 'فَتَرَى' پر ہے۔ گویا قوم عاد کی بستیوں کو مخاطب کی چشمِ تصور کے سامنے کر کے یہ سوال فرمایا ہے کہ ذرا دور دور تک نگاہ دوڑا کے دیکھو کوئی متنفس بھی پوری قوم میں سے زندہ بچا ہوا نظر آتا ہے؟ ـــــ مطلب یہ ہے کہ جب کسی قوم پر اللہ کا عذاب آتا ہے تو اس طرح اس کا ستھراؤ کر کے رکھ دیتا ہے! احمق ہیں وہ جو اس کے دیکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ چیز دیکھنے کی نہیں بلکہ پناہ مانگنے کی ہے۔

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ (۹)

فرعون اور قوم لوط کا حوالہ — 'مُؤْتَفِكَةٌ' کے معنی ہیں اُلٹی ہوئی۔ اس سے مراد یہاں قوم لوط کی بستیاں ہیں۔ وہ زلزلے سے الٹ دی گئی تھیں اور 'حاصب' یعنی کنکر برسانے والی ہوا نے ان کو ریت اور کنکروں سے ڈھانک دیا تھا۔

اوپر اقوامِ بائدہ میں سے دو قوموں کا ذکر ہوا تھا اب یہ فرعون اور قوم لوط وغیرہ کی بستیوں کی طرف اشارہ فرمایا جن کے آثار کے مشاہدہ کے مواقع قریش کو اکثر ملتے رہتے تھے۔ فرمایا کہ انھوں نے بھی اسی جرم کا ارتکاب کیا جس کا ارتکاب عاد و ثمود نے کیا اور ان کے سامنے بھی وہی انجام آیا جو ان کے سامنے آیا۔

فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً (۱۰)

یہ ان کے جرم کی نوعیت کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی تو اللہ نے ان کو ایسی پکڑ پکڑا جس سے پھر وہ چھوٹ نہ سکے۔

رسول کی نافرمانی خدا سے بغاوت ہے — 'فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ' کے الفاظ سے ان کے جرم کی سنگینی واضح ہوتی ہے کہ خدا کا رسول شاہِ کائنات کا سفیر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ اس کی نافرمانی کرتے ہیں وہ گویا شاہِ کائنات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہیں جس کی پاداش میں وہ باغیوں کی سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

فیصلہ کن عذاب — 'اَخْذَةً رَّابِيَةً' سے مراد وہ پکڑ ہے جس کی مدافعت نہ ہو سکے اور جو انسان کی برداشت سے زیادہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک پکڑ تو وہ ہوتی ہے جس کا مقصود صرف تنبیہ اور یاد دہانی ہوتا ہے۔ اس طرح کی پکڑ سے آدمی چھوٹ جاتا ہے لیکن جب کوئی قوم خدا کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی جسارت کرتی ہے تو وہ اس کو ایسی پکڑ پکڑتا ہے جس کی تاب لانا محال ہوتا ہے۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ (۱۱)

قوم نوح کی طرف اشارہ — یہ آخر میں قوم نوح کے واقعہ کی طرف بھی اشارہ فرما دیا جو مذکورہ واقعات سے بھی پہلے پیش آ چکا تھا۔ گویا اس طرح بالاجمال رسولوں کی پوری تاریخ مخاطب کے سامنے آ گئی۔

اس واقعہ کے ذکر کا انداز مخاطب (قریش) پر امتنان و اظہارِ احسان کا ہے۔ ان کو یاد دہانی فرمائی گئی ہے کہ تم جن اسلاف کے اخلاف ہو ان کو ہم ہی نے اپنے فضل سے نوح کی کشتی میں پناہ دی۔ اس پناہ کے مستحق وہ اس وجہ سے ٹھہرے کہ وہ اللہ کے رسول ۔۔۔ حضرت نوح علیہ السلام ۔۔۔ پر ایمان لائے۔ اگر وہ ایمان نہ لائے ہوتے تو وہ بھی اسی طرح غرق کر دیے گئے ہوتے جس طرح اُن کی پوری قوم غرق کر دی گئی۔ جب تم انہی کے اخلاف ہو تو ہمارا یہ احسان بالواسطہ تمھارے اوپر بھی ہوا۔ آج تمھیں اپنی یہ تاریخ بھولنی نہیں چاہیے۔ اگر تم یہ بھول گئے اور رسول کی پیروی کی جگہ اس کی نافرمانی کی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدا تمھارے ساتھ وہی معاملہ نہ کرے جو اس نے نوحؑ کی نافرمانی کرنے والوں کے ساتھ کیا۔

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ (۱۲)

سرگزشت سنانے کا مقصد

ضمیر مفعول کا مرجع صرف 'جَارِيَة' (کشتی) نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و نقمت کی یہ پوری سرگزشت ہے۔ اس طرح ضمیر لانے کی متعدد مثالیں اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ طوفانِ نوح سے بچ رہنے والوں کو ہم نے اپنی رحمت و نقمت کی یہ شان بھول جانے کے لیے نہیں بلکہ یاد رکھنے، نصیحت حاصل کرنے اور اسلاف کی طرف سے اس کو اخلاف کو منتقل کرنے کے لیے دکھائی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ تم اس کو بھول گئے اور آج اسی طرح اپنے رسول سے لڑنے کو اٹھ کھڑے ہوئے جس طرح قومِ نوح اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (۱۳-۱۵)

دنیا کے عذاب آخرت کے عذاب کی شہادت ہیں

عذاب کے تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد یہ ظہورِ قیامت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس طرح قوموں پر عذاب لانے کے لیے ہمیں کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑا بلکہ جب چاہا چشم زدن میں عذاب آ گیا اسی طرح قیامت کے لانے کے لیے بھی ہمیں کوئی تیاری نہیں کرنی پڑے گی۔ بلکہ صور میں صرف ایک پھونک ماری جائے گی جس سے قیامت کی ہلچل برپا ہو جائے گی۔

'وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً'۔ اور اس زمین اور اس کے پہاڑوں کو بھی کوئی ایسی چیز نہ سمجھو جن کو درہم برہم کرنے میں ہمیں کوئی زحمت پیش آئے گی بلکہ ہم دونوں کو ایک ہی ساتھ اٹھائیں گے۔ ایک ہاتھ میں زمین ہو گی دوسرے میں اس کے پہاڑ اور ان کو ایک ہی بار میں ٹکرا کر پاش پاش کر دیں گے۔ گویا دو شیشے کے گلاس تھے جو ایک ہی مرتبہ میں چورہ چورہ ہو گئے ۔۔۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کا حوالہ قرآن نے جگہ جگہ دیا ہے کہ منکرینِ قیامت جب قیامت کا مذاق اڑاتے تو یہ بھی کہتے کہ کیا جب قیامت آئے گی تو ان پہاڑوں کو بھی پاش پاش کر دے گی؟ مطلب

یہ کہ یہ بات انہونی ہے اس وجہ سے ان کے زعم میں قیامت بھی محض ایک خیالی ہوا ہے۔

فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ فرمایا کہ اس دن وہ واقع ہونے والی واقع ہو جائے گی جس کو تم بہت بعید از امکان خیال کیے بیٹھے ہو۔

اوپر کی آیات میں قیامت کو 'حَاقَّةٌ' اور 'قَارِعَةٌ' وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے یہاں اس کو لفظ 'وَاقِعَةٌ' سے تعبیر کیا ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی اس کو بعید از امکان چیز سمجھتا ہے تو سمجھے اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک امر واقعی ہے جو لازماً ایک دن پیش آ کے رہے گا۔

وَانشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ (١٦)

قیامت کے دن آسمان کا حال

زمین اور اس کے پہاڑوں کا حشر بیان کرنے کے بعد یہ آسمان کا حال بتایا کہ اس دن یہ بھی پھٹ جائے گا۔ 'فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ' یعنی آج تو یہ دیکھنے والوں کو نہایت ٹھوس اور محکم نظر آتا ہے، کہیں ڈھونڈے سے بھی اس میں کسی نقص یا شگاف کا کوئی نشان نہیں مل سکتا لیکن اس دن یہ بالکل بودا اور پھس پھسا ہو جائے گا اور روئی کے گالوں اور دھوئیں کی طرح اڑے گا۔

وَالْمَلَكُ عَلَىٰ أَرْجَائِهَا ۚ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ (١٧)

قیامت کے دن فرشتوں کا حال

آسمان کے پھٹ جانے کے بعد آسمان کے فرشتوں کا جو حال ہوگا یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس وقت وہ اس کے اطراف اور کناروں میں سمٹے ہوئے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس ہلچل سے ان پر بھی ایک سراسیمگی کی حالت طاری ہوگی۔ یہ ان مشرکین کی آگاہی کے لیے واضح فرمایا ہے جو فرشتوں سے کو لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ ان کے مرجع بنیں گے اور ان کی سفارش کریں گے۔

'وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ' یعنی اس انقلاب حال سے سارا عملہ تو اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر ایک طرف ہو جائے گا، بس عرشِ الٰہی کے اٹھانے والے رہ جائیں گے سو اس کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

قرآن مجید میں قیامت کے جو احوال بیان ہوئے ہیں ان کا تعلق متشابہات سے ہے۔ ہمارے فہم سے قریب لانے کے لیے ان کو ایسے لفظوں میں بیان کیا جاتا ہے جن سے فی الجملہ ان کا تصور ہمارے ذہن میں قائم ہو سکے۔ یہ احوال ایک نادیدہ عالم کے ہیں، ان کا تصور دینے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ان کی اصل حقیقت کا جاننا اس عالم میں ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے متعلق یہ ہدایت دی ہے کہ وہ جس طرح بیان ہوئے ہیں اسی طرح ان پر اجمالی ایمان رکھا جائے۔ ان کی اصل حقیقت کے درپے نہ ہوا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ آدمی کسی فتنہ میں پڑ جائے۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ (۱۸)

جزا و سزا کی تفصیل

فرمایا کہ اس دن تم سب پیش کیے جاؤ گے اور تمھاری کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی۔ پیش کیے جانے سے مراد ظاہر ہے کہ خدا کے حضور پیش کیا جانا ہے۔ اس دن آسمانوں اور زمینوں کی ساری بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے گی اس وجہ سے نہ تو کسی کے لیے کوئی جگہ چھپنے کی ہو گی اور نہ کوئی چیز چھپنے کی۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ (۱۹)

اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیشی کے بعد اب یہ اس جزا و سزا کی تفصیل آ رہی ہے جس سے ہر ایک کو سابقہ پیش آنا ہے۔ پہلے اہلِ ایمان کا حال بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ جس کو اس کا اعمال نامہ دہنے ہاتھ میں پکڑایا جائے گا وہ تو دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑے گا۔ دوسروں سے کہے گا، یہ لو، میرا اعمال نامہ پڑھو!

'ھا' کی حیثیت ہے تو مجرد ایک آواز کی جیسے 'ارے' یا 'اُف' وغیرہ لیکن یہ اس موقع پر بولتے ہیں جب کہنا ہو 'یہ لو'۔ یہاں 'ھا' اور 'اقْرَءُوْا' کے بیچ میں 'ؤُمُ' محض اس خلا کو بھرنے کے لیے آ گیا ہے جو دونوں کے بیچ میں ہے۔ اس طرح کے زوائد کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ 'كِتٰبِيَهْ' میں 'ہ' سکتہ کی ہے جو محض قافیہ کی رعایت سے آ گئی ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آ رہی ہیں۔

اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ (۲۰)

ساتھ ہی وہ اپنی اس عظیم کامیابی کا سبب بھی بتائے گا کہ میں نے ہمیشہ اپنے دل میں یہ گمان رکھا کہ مجھے ایک دن اپنے زندگی کے حساب کتاب سے دوچار ہونا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسی گمان نے میری حفاظت کی اور میں ایک ایسا اعمال نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا جس کو دوسروں کے سامنے نہایت خوشی کے ساتھ پیش کر سکوں۔

جزا اور سزا کو ماننے کے لیے ظن غالب کافی ہے

'ظَنَنْتُ' یہاں ظنِ غالب کے مفہوم میں ہے۔ آفاق و انفس اور انبیاء و حکماء کی تعلیم میں جزا اور سزا کے ایسے دلائل موجود ہیں کہ آدمی بالکل ہی بلید اور لاابالی نہ ہو تو اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ زندگی یوں ہی نہیں تمام ہو جائے گی بلکہ ایک دن جزا اور سزا سے سابقہ پیش آنا بھی لازمی ہے۔ اگرچہ اس بات پر اس کو اس طرح کا یقین تو نہیں ہوتا جو آنکھوں دیکھی چیز پر ہوا کرتا ہے لیکن ایسا ظنِ غالب ضرور ہوتا ہے جس کے بعد وہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ اس کو نظر انداز کر کے زندگی گزارے اور عاقبت کی کوئی پروا نہ کرے۔ اس ظنِ غالب سے آخرت پر جو ایمان پیدا ہوتا ہے

وہ بالتدریج ایمانی تجربات سے مضبوط ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ درجہ بدرجہ یقین کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اگر آدمی اس ظنِ غالب کو نظر انداز کر کے اس انتظار میں رہے کہ جب اس کو آخرت کا یقین ہو جائے گا تب اس کو مانے گا تو یہ انتظار اسی دن ختم ہوگا جس دن وہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لے گا اور اس دن کا ایمان اس کے لیے بالکل بے سود ہوگا۔

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۙ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ (۲۱-۲۳)

فرمایا کہ یہ لوگ اپنے پسندیدہ عیش میں ہوں گے۔ انھیں وہ سب کچھ حاصل ہوگا جو وہ چاہیں گے۔ وہ بلند باغوں میں ہوں گے جن کے خوشے بالکل ان کے سروں پر لٹک رہے ہوں گے۔

باغ بلند اور خوشے قریب 'عَالِيَةٍ' اور 'دَانِيَةٌ' کے تقابل پر نظر رہے کہ باغ تو بلند ہوں گے لیکن ان کے پھل اور خوشے جو اصل مطلوب ہیں، وہ نہایت قریب ہوں گے۔ اہلِ عرب کے باغوں میں کنارے کنارے کھجوروں کی قطاریں اور بیچ بیچ میں اناروں کے درخت اور انگوروں کی بیلیں ہوتی تھیں۔ ان کے لیے اس 'عَالِيَةٍ' اور 'دَانِيَةٌ' کے سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں تھی۔ یوں بھی باغ کا نمایاں حسن یہی ہے کہ وہ بلندی پر ہو اور اس کے خوشے سروں پر لٹک رہے ہوں اور دسترس کے اندر ہوں۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ (۲۴)

یعنی اس طرح کے باغوں میں انھیں اتار کر یہ کہا جائے گا کہ لو اب آرام سے کھاؤ پیو۔ یہ کھانا پینا تمھارے لیے رچتا پچتا اور راس آنے والا ہوگا۔ دنیا کی نعمتیں تو وبال بن سکتی ہیں اگر ان میں اعتدال ملحوظ نہ رہ سکے یا ان کا صحیح شکریہ ادا ہو سکے لیکن ان نعمتوں میں اس طرح کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ لفظ 'هَنِيْٓـًٔا' کی لغوی تحقیق اور نحوی حیثیت سورۂ طور کی تفسیر میں واضح کی جا چکی ہے۔

'بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ' یعنی یہ تمھیں جو کچھ ملا ہے یہ تمھارے دنیا میں کیے ہوئے اعمال کا صلہ ہے۔ یہاں تمھیں اب کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ تم اس کے پورے حقدار ہو اور یہ تمھارے لیے ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ اس میں اضافے تو دم بدم ہوتے رہیں گے لیکن کمی کا کوئی اندیشہ نہیں۔ جو محنت اس کے لیے تمھیں کرنی تھی وہ تم اٹھا چکے۔ اب صرف اس سے بہرہ مند ہونا ہے۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۚ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۚ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ (۲۵-۲۷)

اصحاب الشمال کا حال یہ ان لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے جن کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ وہ دیکھتے ہی اپنے سر پیٹیں گے، کہیں گے کاش! ہمارا اعمال نامہ ہمیں دیا ہی نہ گیا ہوتا اور ہمیں یہ معلوم ہی نہ ہوا ہوتا کہ ہمارا حساب کیا ہے! کاش! وہی موت، جو دنیا میں آئی تھی، فیصلہ کن ہو گئی ہوتی!

ضمیر کا مرجع موت ہے۔ قرینہ موجود ہو تو مرجع کے بغیر اس طرح ضمیر لانے میں کوئی عیب نہیں ہے اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ ﴿ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ (۲۸ - ۲۹)

یعنی وہ نہایت حسرت سے کہیں گے کہ جو مال اس اہتمام سے جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا، بھلا کس کام آیا! 'مَا' یہاں نافیہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اظہارِ حسرت کے پہلو سے اس کا استفہامیہ ہونا میرے نزدیک زیادہ موزوں ہے۔

'هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ'۔ 'هَلَكَ' کے بعد 'عَنِّیْ' اس بات کا قرینہ ہے کہ 'هَلَكَ' یہاں 'ذَهَبَ' یا 'بَعُدَ' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ 'سُلْطَانٌ' کے معنی اقتدار کے ہیں یعنی وہ نہایت حسرت سے کہیں گے کہ وہ اقتدار بھی چھن گیا جس پر ہمیں ناز تھا اور جس کے گھمنڈ نے آج کے دن سے ہمیں اندھا بنائے رکھا۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ﴿ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (۳۰ - ۳۲)

یعنی یہ نالہ و شیون وہ کرتے ہی ہوں گے کہ حکم ہوگا کہ اس کو پکڑو، اس کی گردن میں طوق ڈالو، پھر اس کو جہنم میں جھونک دو، پھر ایک زنجیر میں جس کا طول ستر ہاتھ ہوگا، اس کو جکڑ دو ۔۔۔ قرآن مجید کے بعض مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ دولت کو گن گن کر جمع رکھنے والے سرمایہ دار دوزخ میں ڈال کر بھاری زنجیروں میں ستونوں کے ساتھ باندھ دیے جائیں گے تاکہ جس دولت پر مایۂ گنج بن کر بیٹھے رہے اس کی تپش کا مزا اچھی طرح چکھیں۔ سورۂ ھمزہ میں اس کی تفصیل، ان شاء اللہ، آئے گی۔

اِنَّهٗ كَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ ﴿ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ (۳۳ - ۳۴)

یہ اس کے اس جرم کا بیان ہے جس کے سبب سے وہ اس غضب اور اس سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔ فرد جرم

فرمایا کہ یہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ اس کا یہ رویہ کہ یہ دولت کا پجاری بن کر بیٹھا رہا اور آج حسرت کر رہا ہے کہ 'مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ' (میری دولت میرے کیا کام آئی!) اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ خدا پر اس کا ایمان نہیں تھا۔ اگر خدائے عظیم پر اس کا ایمان ہوتا تو اس کو اس کی عظمت سے ڈرنا تھا کہ ایک دن اس کے حضور میں پیش ہونا اور اس کے بخشے ہوئے مال کا حساب دینا ہے اور وہ ایسی عظیم ہستی ہے کہ اس کی پکڑ سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

'وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ' یعنی نہ خود مسکینوں پر خرچ کرتا تھا اور نہ دوسروں کو اس نیکی کی راہ پر ابھارتا تھا۔ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ صرف یہی نہیں کہ خود اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے بلکہ

ان کی خواہش اور کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ دوسرے بھی خرچ نہ کریں تاکہ ان کی نجالت کا راز افشا نہ ہو۔

سورۂ ماعون میں یہی بات یوں فرمائی گئی ہے: "فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ" (۲-۳) (پس وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے پر لوگوں کو نہیں ابھارتا)۔ البتہ آیت زیر بحث میں یہ حقیقت بھی واضح فرمادی گئی ہے کہ جو لوگ دولت رکھتے ہوئے غریبوں اور مسکینوں کو دھکے دیتے ہیں وہ درحقیقت خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتے اگرچہ ایمان کا دعویٰ وہ کتنی ہی بلند آہنگی سے کرتے ہوں۔ اسی طرح سورۂ ماعون میں ان لوگوں کی نماز کو بالکل بے حقیقت ٹھہرایا ہے جن کی خست کا یہ حال ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے معاملے میں بھی تنگ دلی برتتے ہیں اور ضرورت مندوں کو نہیں دیتے۔ فرمایا ہے: "فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ" (۴-۷) (پس ان نماز پڑھنے والوں کے لیے ہلاکی ہے جو اپنی نمازوں کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ جو دکھاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں اور ضرورت کی معمولی چیزیں بھی مانگے نہیں دیتے)۔

ان دونوں مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو شخص مال رکھتے ہوئے یتیموں اور مسکینوں کی مدد نہیں کرتا نہ اس کا ایمان معتبر ہے اور نہ اس کی نماز کا کوئی وزن ہے اگرچہ وہ ایمان کا بھی مدعی ہو اور نماز کی بھی نمائش کرتا ہو۔

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ (۳۵)

یعنی اس کی اس خست و نجالت کی سزا اس کو یہ ملی کہ یہاں کوئی اس کا ہمدرد و مددگار نہیں۔ جس نے نہ خدا کا حق پہچانا اور نہ اس کی مخلوق کا، قیامت کے دن بھلا کون اس کے ساتھ ہمدردی کرنے والا ہو گا؟ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جو لوگ مال رکھتے ہوئے بخیل ہوتے ہیں ان کے ساتھ اس دنیا میں بھی کسی کو ہمدردی نہیں ہوتی تو جزائے اعمال کی دنیا میں ان کے ساتھ بھلا کون ہمدردی کرنے والا اٹھے گا۔

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ (۳۶)

'غِسْلِيْن' ناپاک اور گندی چیزوں کے غسالہ (دھوون) کو کہتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے اپنی دولت کا مصرف صرف اپنی تن پروری اور اپنے کام و دہن کی لذت ہی کو سمجھا اور اس حرص میں غرباء و مساکین کے حقوق ہڑپ کر کے اپنے سارے مال کو نجس بنایا اس وجہ سے قیامت کے دن ان کو ناپاک چیزوں کا دھوون ہی کھانے پینے کو ملے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ آدمی کا مال اللہ کی راہ میں انفاق سے پاک ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص انفاق نہیں کرتا تو اس کا سارا مال نجاست کا ڈھیر بن جاتا ہے جس کی اصل حقیقت قیامت میں اس کے سامنے اس شکل میں ظاہر ہو گی جو بیان ہوئی۔

لَّا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ (۳۷)

یعنی یہ غذا ان مجرموں ہی کے لیے خاص ہوگی، دوسرے اس کو نہیں کھا سکیں گے۔ اس کی وجہ غالباً وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ ان کا جرم چونکہ خاص نوعیت کا ہے اس وجہ سے ان کی غذا بھی خاص ہوگی۔ جرم اور سزا میں مشابہت کے پہلو پر پیچھے بھی اس کتاب میں اشارات گزر چکے ہیں۔

فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ ۙ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ ۙ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ (۳۸ - ۴۰)

قسم سے پہلے 'لا' کا موقع استعمال

قسم سے پہلے جو اس طرح 'لا' آیا کرتا ہے اس پر اس کے محل میں ہم بحث کر چکے ہیں کہ یہ نہ تو زائد ہوتا ہے اور نہ قسم کی نفی کے لیے بلکہ یہ قسم سے پہلے مخاطب کے اس خیال کی تردید کے لیے آتا ہے جس کی تردید کے لیے قسم کھائی گئی ہے۔ جس طرح عام بول چال میں کہتے ہیں "نہیں، خدا کی قسم، یہ بات نہیں ہے بلکہ یہ بات ہے"۔ اسی طرح یہاں بھی 'نہیں' سے کلام کا آغاز کیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ مخاطب کا خیال اتنا غلط ہے کہ متکلم اس کی تردید میں ایک لمحہ کا توقف بھی کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

مکذبین کے ایک بیہودہ خیال کی تردید

قسم سے متعلق ہم یہ حقیقت بھی واضح کر چکے ہیں کہ قرآن میں جہاں کوئی قسم کھائی گئی ہے بالعموم دعوے کی شہادت اور اس کی دلیل کے طور پر کھائی گئی ہے۔ یہاں اصل دعویٰ جس کو سورہ کے عمود کی حیثیت حاصل ہے اثبات جزاء و سزا ہے۔ منکرین اس دعوے کی تکذیب کر رہے تھے اور اس کی تکذیب کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ آفاق و انفس اور عقل و نقل کے جو دلائل قرآن پیش کرتا ان کا جواب دینے کے بجائے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مطعون کرنے کی کوشش کرتے کہ (العیاذ باللہ) آپ ایک شاعر یا کاہن ہیں اور جس طرح کاہنوں اور شاعروں پر جنات و شیاطین کلام القاء کرتے ہیں اسی طرح ان پر بھی کوئی جن اور شیطان کلام القاء کرتا ہے اور یہ اس کو اس دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ یہ کلام ایک فرشتہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاتا ہے۔ یہاں ان کے اسی بے ہودہ الزام کی تردید فرمائی ہے اور اس کے لیے اس عالم حاضر اور عالم غیب دونوں کی قسم کھائی ہے۔

قیامت کے حق میں عالم مشہود اور عالم غیر مشہود کی شہادت

قیامت اور جزاء و سزا پر قرآن نے جو دلائل دیے ہیں وہ پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکے ہیں اور اس سورہ میں بھی زیر بحث آئے ہیں، ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کا تعلق آفاق و انفس کے ان شواہد سے بھی ہے جو آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ان صفات اور آخرت کے ان احوال سے بھی جو آنکھوں سے تو نہیں دیکھے جا سکتے لیکن عقل سے سمجھے جا سکتے ہیں۔ اسی سورہ میں جزاء و سزا پر جو دلیل قائم کی گئی ہے وہ پہلے قوموں کی تاریخ اور ان کی تباہی کے آثار سے قائم کی گئی ہے پھر عالم غیب کے وہ احوال سنائے گئے ہیں جن سے اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کو سابقہ پیش آنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک کا تعلق اس عالم سے ہے جس کی گواہی تاریخ کے صفحات اور زمین کے آثار میں موجود ہے اور دوسرے کا تعلق اس نادیدہ عالم سے ہے جس کو ہر چند یہاں آنکھوں سے

تو نہیں دیکھا جا سکتا لیکن عقل اس کو تسلیم کرتی ہے اس لیے کہ خالق کی صفات اور اس جہان میں پیش آنے والے مکافاتِ عمل کے واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ انہی دونوں قسموں کی دلیلوں کو گواہی میں پیش کر کے یہاں جزا و سزا کے منکروں کو آگاہ فرمایا ہے کہ قرآن جس جزا و سزا سے تمھیں آگاہ کر رہا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ اس عالمِ مشہود اور عالمِ غیر مشہود کے دلائل اس کی تائید میں ہیں۔ اس کو کسی شاعر یا کاہن کا کلام قرار دے کر جھٹلانے کی کوشش نہ کرو۔ یہ کسی شیطان یا جن کا القاء نہیں ہے بلکہ یہ ایک باعزت رسول کی لائی ہوئی وحی ہے۔

قرآن کے لانے والے کی صفات

'اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ' میں 'رسولٍ کریم' سے جبریل امینؑ مراد ہیں۔ صفت 'کریم' کے لانے سے یہاں مقصود مخالفوں کے اس وہم کی تردید ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ فرمایا کہ جو یہ کلام لاتا ہے وہ کوئی جن یا شیطان نہیں ہے، جیسا کہ تم کہتے ہو، بلکہ اللہ کا باعزت رسول ہے۔ بعینہٖ اسی طرح کے سیاق و سباق میں یہی بات سورۂ تکویر میں بھی فرمائی گئی جس سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے:

اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ۙ	بے شک یہ ایک رسولِ گرامی کا لایا ہوا کلام ہے۔
ذِیۡ قُوَّۃٍ عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ	وہ قوت والا اور عرش والے کے نزدیک معتمد ہے۔
مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ ؕ	اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ مزید برآں وہ نہایت
(التکویر - ۸۱ : ۱۹-۲۱)	امانتدار ہے۔

سورۂ شعراء میں بھی منکرین کے اس الزام کی ہر پہلو سے تردید ہوئی ہے۔ مزید وضاحت مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

وَّ مَا ہُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ۙ وَ لَا بِقَوۡلِ کَاہِنٍ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ (۴۱-۴۲)

یہ وہی اوپر والی بات منفی اسلوب سے فرمائی ہے کہ نہ یہ کسی شاعر کا کلام ہے اور نہ کسی کاہن کا۔ اگر تم لوگ ایمان لانے والے اور یاد دہانی کی قدر کرنے والے ہوتے تو تم پر از خود یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ یہ کسی شاعر یا کاہن کا کلام نہیں ہو سکتا لیکن خرابی یہ ہے کہ تمھارے اندر ایمان کی خواہش اور بات کو سننے سمجھنے کی طلب ہی بہت کم پیدا ہوتی ہے اور جن کے اندر یہ طلب ہی نہ ہو وہ اسی طرح فرار کے بہانے تلاش کر لیتے ہیں۔

قرآن کو کسی شاعر یا کاہن کا کلام کیوں نہیں قرار دیا جا سکتا؟ اس کا مفصل جواب سورۂ شعراء میں دیا گیا ہے اور ہم نے اس کے تمام پہلوؤں کی وہاں وضاحت کی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

مکذبین کے باطن کی تعبیر

'قَلِیۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ' اور 'قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ' میں دونوں فعل میرے نزدیک ارادۂ فعل کے معنی میں ہیں اور فعل کا ارادۂ فعل کے معنی میں آنا ایک معروف چیز ہے جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

یہ ان کے اصل سببِ اعراض پر روشنی ڈالی ہے کہ اگر تمہارے اندر ایمان لانے کا ارادہ پایا جاتا یا یاددہانی سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ہوتی تب تو تم آسانی سے گمراہ درپیش میں اختیار کر لیتے لیکن یہ ارادہ شاذ و نادر ہی تمہارے اندر پیدا ہوتا ہے۔

یہ بالکل ٹھیک ٹھیک ان مکذبین کے باطن کی تعبیر ہے۔ آخر قریش کے یہ لیڈر اتنے بد ذوق اور غبی تو نہیں تھے کہ وہ اللہ کے کلام اور اپنے شاعروں اور کاہنوں کے کلام کے فرق کو نہ سمجھ سکیں۔ وہ اس فرق کو سمجھتے تھے اور گاہ گاہ ان کے اندر سچائی کے اعتراف کا جذبہ بھی ابھرتا رہا ہوگا لیکن نفس کی خواہشوں کے بوجھ تلے یہ جذبہ اس طرح دبا ہوا تھا کہ اول تو یہ ابھرتا ہی بہت کم تھا اور اگر کبھی ابھرتا بھی تو اتنا ضعیف ہوتا کہ وہ زندگی میں کوئی مؤثر تبدیلی نہ لا سکتا۔ بس کوئی ایسا ہی خوش قسمت ہوتا تو وہ اپنے نفس کے حجابات سے نکلنے میں کامیاب ہوتا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ حال قریش کے لیڈروں کا بیان ہو رہا ہے ان کے عوام کا حال نہیں بیان ہو رہا ہے۔ ان کی قیادت کے کردار کی تصویر پچھلی سورہ میں بھی سامنے آ چکی ہے۔

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۳)

قرآن کا اصل منبع

یہ وہی اوپر والی بات پھر مثبت پہلو سے فرمائی جا رہی ہے کہ یہ اللہ رب العلمین کی طرف سے اتارا ہوا کلام ہے۔ لفظ 'تنزیل' کے صحیح مفہوم کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ ان کے اندر اہتمام اور تدریج کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر شیاطین جن و انس کی دسترس سے اس کو محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو اہتمام فرمایا وہ جگہ جگہ قرآن میں بیان ہوا ہے اور ہم نے اس کی وضاحت کی ہے۔ ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت سورۂ جن میں آئے گی۔

'مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ' سے اس کی عظمت و شان بھی ظاہر ہو رہی ہے اور اس کی تکذیب کی بدانجامی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بادشاہِ کائنات کا اتارا ہوا کلام ہے۔ اگر تم نے اس کی ناقدری کی تو تمہاری محرومی اور بدانجامی پر افسوس ہے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۙ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۙ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۖ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ (۴۴-۴۷)

کفار کے الزام کا جواب

یہ جواب ہے کفار کے اس الزام کا جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگاتے تھے کہ یہ سب کچھ گھڑتے تو ہیں اپنے جی سے لیکن ہم پر دھونس یہ جماتے ہیں کہ یہ کلام ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس کو اپنا رسول بناتا ہے وہ اس کا سفیر اور وحی کی عظیم امانت کا حامل ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی نگرانی بھی نہایت کڑی ہوتی ہے۔ مجال نہیں ہے کہ وہ اپنے جی سے اس میں کوئی ردّ و بدل کر سکے۔ اگر وہ سرِ مو بھی کوئی بات ہم سے غلط منسوب کرے تو ہم اس کو اپنے قوی

بازو سے پکڑیں اور اس کی شہ رگ ہی کاٹ دیں پھر کوئی بھی اس کو ہم سے بچانے والا نہیں بن سکتا۔

یہ بات ایسے اسلوب میں فرمائی گئی ہے جس سے اس کڑی نگرانی کی بھی وضاحت ہو رہی ہے جو رسول کی، اس کی منصبی ذمہ داریوں کے سبب سے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور کفار کے اس مطالبہ کا جواب بھی اس میں آگیا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے تھے کہ اس قرآن کو اگر ہم سے منوانا ہے تو یا تو اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا کم از کم یہ کہ اس میں ایسی ترمیم کرو کہ یہ ہمارے لیے لائق قبول ہو سکے۔ سورۂ یونس میں ان کے اس مطالبہ اور اس کے جواب کا یوں حوالہ آیا ہے:

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ	اور جب ان کو ہماری نہایت واضح آیتیں پڑھ کر
قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا	سنائی جاتی ہیں تو جو ہماری ملاقات کی توقع نہیں رکھتے
ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ	ہیں وہ کہتے ہیں کہ یا تو اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ
قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ	یا اس میں تبدیلی کرو۔ ان کو جواب دے دو کہ مجھے کیا
مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ	حق ہے کہ میں اپنی جانب سے اس میں کوئی تبدیلی کروں۔
إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ	میں تو بس اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی
إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ	ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ایک ہولناک
عَظِيمٍ (یونس - ۱۰ : ۱۵)	دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

'لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے 'ہم اس کا (پیغمبر کا) دہنا پکڑتے' کیا ہے لیکن مجھے یہ ترجمہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ عربیت کے قاعدہ سے اس کا ترجمہ 'ہم اس کو اپنے قوی بازو سے پکڑتے' ہونا چاہیے۔ میں نے یہی ترجمہ کیا ہے اور تفسیر ابن جریر دیکھی تو اس سے بھی اسی کی تائید ہوئی۔

'ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ'۔ 'وتین' کے معنی شہ رگ، رگِ جان یا رگِ دل کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے کچھ دور نہیں ہیں۔ ہماری چٹکیوں میں تو اس کی شہ رگ ہے۔ ہم اسی کو مسل دیتے اور وہ چشم زدن میں ختم ہو جاتا۔

'فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ' یہ قریش سے خطاب ہے کہ قرآن میں اپنے حسب منشا ترمیم کا مطالبہ تو کر رہے ہو لیکن خدا کی گرفت سے اس کو تم میں سے بچانے والا کون بنے گا! لفظ 'أَحَدٍ' چونکہ جمع کے مفہوم میں آتا ہے جیسے 'لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ' (الاحزاب - ۳۳ : ۳۲) میں ہے۔ اس وجہ سے 'حَاجِزِينَ' کا جمع آنا عربیت کے بالکل مطابق ہے۔

رسولوں کی حفاظت ان کی ذمہ داری کے اعتبار سے ہوتی ہے

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس طرح کی کڑی نگرانی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی کرتا ہے جن کو وہ منصب رسالت پر مامور فرماتا ہے اس لیے کہ ان کی تحویل میں وحی کا خزانہ ہوتا ہے جس کی حفاظت ضروری ہے۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ جو شخص بھی خدا پر جھوٹ بولے اس کی گردن توڑ دی جائے۔ جھوٹ بولنا

تو درکنار کتنے ہیں جو خدا کو گالی دیتے ہیں لیکن اس دنیا میں ان کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے۔ وہ اپنا انجام آخرت میں بھگتیں گے۔ البتہ خدا کا کوئی سچا رسول نہ خدا پر کوئی افترا کر سکتا اور نہ کسی کے دباؤ سے اس کے پیغام میں کوئی کمی بیشی کر سکتا۔ رسولوں کو جو عصمت حاصل ہوتی ہے اس کی حکمت بھی یہی ہے کہ ان کی امانت میں خدا کی شریعت ہوتی ہے۔ ان کی معمولی بھول چوک اور غلطی پوری خلق کے لیے موجب فتنہ بن سکتی ہے اس وجہ سے ان سے کوئی معمولی فروگذاشت بھی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فوراً درست فرما دیتا ہے۔ دوسروں کو یہ حفاظت حاصل نہیں ہوتی کیونکہ وہ اس ذمہ داری پر مامور نہیں ہوتے جس پر حضرات انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں۔

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (۴۸)

رسول کو تسلی

یعنی لاخیرے اور محروم القسمت قسم کے لوگ اگر اس عظیم رحمت کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو یہ ان کی اپنی محرومی ہے۔ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں وہ اس سے یاد دہانی حاصل کرتے ہیں اور کریں گے اور وہی مقصود ہیں۔ یہ نعمت درحقیقت اللہ نے اتاری ہی انہی کے لیے ہے۔ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ اگر ناقدرے اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو اس سے دل برداشتہ نہ ہو۔ آخر اس کی قدر کرنے والے بھی تو ہیں!

وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ (۴۹)

مخالفین کو وعید

یہ مخالفین کو تہدید و وعید ہے کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمھارے اندر اس کے جھٹلانے والے ہیں اور وہ کون ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ جو تکذیب کر رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ ہم سے وہ مخفی نہیں ہیں۔ اور جب وہ مخفی نہیں ہیں تو وہ اپنا انجام دیکھیں گے!

وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۵۰)

یعنی آج تو اس کی تکذیب کر رہے ہیں اور اپنے اس کارنامے پر بہت مگن ہیں لیکن عنقریب وہ دن بھی آنے والا ہے جب یہ کافروں کے لیے سبب حسرت بنے گا اور وہ اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے کہ انھوں نے اس کی تکذیب کر کے کیوں اپنی یہ شامت بلائی!

وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ (۵۱)

یعنی یہ کوئی ہوائی بات نہیں بلکہ ایک حق یقینی ہے۔ یہ قرآن جس روز جزا و سزا سے خبردار کر رہا ہے وہ لازماً پیش آئے گا۔

ابتدائی آیات: اَلْحَاۗقَّةُ ۝ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝ وَمَاۗ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاۗقَّةُ (۱-۳) میں جو بات فرمائی ہے اسی کی یاد دہانی سورہ کے خاتمہ پر ایک دوسرے اسلوب میں کر دی۔ گویا سورہ جس مضمون سے چلی تھی اسی کی یاد دہانی پر ختم ہوئی۔ یہ اسلوب قرآن کی بیشتر سورتوں میں اختیار فرمایا گیا ہے اور یہ قرآن میں

نظم کے وجود کی ایک واضح دلیل ہے۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (۵۲)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ جو جھٹلا رہے ہیں ان کی روش سے بددل نہ ہو بلکہ صبر و انتظار اور اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔ یہ تسبیح تمہارے لیے حصولِ صبر اور قوت و اعتماد کا ذریعہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ بڑی قدرت و عظمت والا ہے۔ جب وقت آجائے گا تو وہ ان سرکشوں کو دکھا دے گا کہ اس کی ہر بات کس طرح پوری ہوتی ہے۔

ان سطور پر اللہ تعالیٰ کی مدد سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وبیدہ التوفیق۔

رحمان آباد

۱۴۔ اگست ۱۹۷۸ء

۱۰۔ رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

٧٠

المعارج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا- سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ——— الحاقۃ ——— کی مثنیٰ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ انذارِ عذاب و قیامت جس طرح سابق سورہ کا موضوع ہے اسی طرح اس کا بھی موضوع ہے۔ دونوں کے ظاہری اسلوب میں بھی بڑی مشابہت ہے جس طرح سابق سورہ میں اثباتِ جزاء و سزا پر، وسطِ سورہ میں، قسم کھائی گئی ہے اسی طرح اس سورہ کے وسط میں بھی اسی نوعیت کی قسم ہے۔ خاص پہلو اس کا یہ ہے کہ اس میں ان متمردین کو تنبیہ فرمائی ہے جو عذاب و قیامت کا مذاق اڑاتے اور اس کے لیے جلدی مچاتے ہوتے تھے۔ ان کے رد عمل پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ یہ بہت ہی تنگ ظرف اور تھڑدلے لوگ ہیں۔ اس وقت خدا نے ان کو جو ڈھیل دی ہے تو ان کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔ ذرا گرفت میں آ جائیں تو ساری شیخی بھول جائیں گے۔ ان سے چند دن درگزر کرو۔ ان کے فیصلہ کا وقت آیا ہی چاہتا ہے۔ جب وہ وقت آ جائے گا تب انھیں اندازہ ہو گا کہ جس چیز کے لیے جلدی مچاتے ہوئے تھے وہ کیسی ہولناک چیز نکلی۔

ب- سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۷) ان لوگوں کو سرزنش جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کو عذاب کے لیے جلدی مچاتے ہوئے تھے۔ ان کو آگاہی کہ کافروں کو جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے وہ ایک دن آ کے رہے گا اور کوئی اس کو دفع کرنے والا نہیں بنے گا، لیکن خدا کے دنوں کو لوگ اپنے پیمانوں سے نہ ناپیں۔ اس کی بارگاہ بہت بلند ہے۔ وہاں تک رسائی کے لیے تو فرشتوں اور جبریل کو بھی پچاس ہزار سال کے برابر کا ایک دن لگتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبرِ جمیل کی تلقین اور یہ اطمینان دہانی کہ جس دن کو یہ تنگ نظر بہت دور خیال کر رہے ہیں ہم اس کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔

(۸-۱۸) قیامت کے دن کی تصویر کہ اس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کے مانند سرخ اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کی مانند پراگندہ ہو جائیں گے۔ ہر ایک کی قوت و جمعیت بالکل منتشر ہو کر رہ جائے گی۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں

رہے گا۔ اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے آدمی اپنے سارے عزیزوں، محبوبوں، خاندان، قبیلہ بلکہ زمین کی ہر چیز کو فدیہ میں دے دینا چاہے گا۔ دوزخ کے شعلوں کی لپیٹ اس کی چمڑی ادھیڑ دے گی۔ وہ ان سب کو کھینچ بلائے گی جنھوں نے دعوتِ حق سے اعراض کیا اور دولت جمع کرنے اور سینتنے میں لگے رہے۔

(۱۹-۳۵) اس حقیقت کا اظہار کہ لوگوں کا عام حال یہ ہے کہ ذرا خدا کی کسی گرفت میں آ جائیں تو داویلا شروع کر دیتے اور مایوس ہو جاتے ہیں اور اگر ڈھیل مل جائے تو اس کے شکر گزار ہونے کے بجائے اترانے اور اکڑنے لگتے ہیں اور اس کے بخشے ہوئے مال پر خزانے کے سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس عام حالت سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جن کو خدا کی بندگی کی توفیق حاصل ہوئی۔ ان کے مال میں بے شک سائلوں اور محتاجوں کا حق ہوتا ہے۔ وہ روزِ جزا سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ خدا کا عذاب نچنت رہنے کی چیز نہیں ہے۔ وہ اپنی شہوات کو لگام لگاتے ہیں۔ وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھتے اور اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں۔ وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو جنت میں عزت کا مقام پائیں گے۔

(۳۶-۴۴) ان لوگوں کے حال پر اظہارِ تعجب جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے عذاب و قیامت کا ذکر سنتے ہی آپ کا منہ بند کر دینے کے لیے آپ پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ان کے اس زعم کی طرف اشارہ کہ ان کو اس دنیا میں جو عیش و آرام حاصل ہے آخرت ہوئی تو اس سے بڑھ کر وہاں ان کو عیش و آرام حاصل ہوگا۔ اس زعم کے سبب سے ان کے دلوں پر عذاب کی دھمکی بڑی شاق گزرتی تھی۔ ان کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی خلقت کو یاد رکھیں۔ نہ دوبارہ پیدا کیے جانے کو بعید از امکان سمجھیں اور نہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ جو مشرق و مغرب کا رب ہے وہ ان کو دوبارہ پیدا کرنے پر پہلے بھی زیادہ قادر ہے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقینِ صبر کہ یہ لوگ جو سخن سازیاں کر رہے ہیں کر لینے دو۔ وہ یومِ موعود دور نہیں ہے جس دن یہ قبروں سے نہایت تیزی سے نکلیں گے، ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔

سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ (۷۰)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات ۴۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ﴿۲﴾ آیات ۱-۴۴
مِّنَ اللّٰهِ ذِى الْمَعَارِجِ ﴿۳﴾ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِىْ
يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴿۴﴾ فَاصْبِرْ صَبْرًا
جَمِيْلًا ﴿۵﴾ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ﴿۶﴾ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ﴿۷﴾ يَوْمَ
تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ﴿۸﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴿۹﴾ وَلَا
يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِىْ
مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ بِبَنِيْهِ ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ﴿۱۲﴾ وَ
فَصِيْلَتِهِ الَّتِىْ تُـْٔوِيْهِ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ
يُنْجِيْهِ ﴿۱۴﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ﴿۱۵﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴿۱۶﴾ تَدْعُوْا مَنْ
اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۷﴾ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾
اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾
اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَ
الَّذِيْنَ فِىْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾

وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِينَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ
رَبِّهِمْ مُّشْفِقُونَ ﴿٢٧﴾ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ﴿٢٨﴾ وَالَّذِينَ
هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿٢٩﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ
رَاعُونَ ﴿٣٢﴾ وَالَّذِينَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ﴿٣٣﴾ وَالَّذِينَ
هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿٣٤﴾ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ
مُّكْرَمُونَ ﴿٣٥﴾ فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قِبَلَكَ مُهْطِعِينَ ﴿٣٦﴾ ع ۱ ۳۵ ۷
عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ ﴿٣٧﴾ أَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ
أَن يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ ﴿٣٨﴾ كَلَّا إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّمَّا يَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾
فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ إِنَّا لَقَادِرُونَ ﴿٤٠﴾ عَلَىٰ
أَن نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿٤١﴾ فَذَرْهُمْ
يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ﴿٤٢﴾
يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ
يُوفِضُونَ ﴿٤٣﴾ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ ذَٰلِكَ
الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿٤٤﴾ ع ۲ ۹ ۸

ربط آیات ۱-۴۴
جلدی کا مچائی جلدی مچانے والے نے کافروں کے لیے واقع ہونے والے عذاب کی۔ اس کا کوئی دفع کرنے والا نہیں بنے گا۔ وہ مدارج والے خداوند کی طرف سے ہوگا۔

اس کی طرف فرشتے اور جبریل صعود کرتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ تو تم خوبصورتی سے صبر کرو۔ وہ اس کو بہت دور خیال کر رہے ہیں اور ہم اس کو نہایت قریب دیکھ رہے ہیں۔ ۴ - ۷

جس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کے مانند ہو جائے گا اور پہاڑ دھنی ہوئی اُون کے مانند اور کوئی دوست بھی کسی دوست کو نہ پوچھے گا۔ وہ ان کو دکھائے جائیں گے، مجرم تمنّا کرے گا کہ کاش! اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے اپنے بیٹوں، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے اس کنبہ کو جو اس کی پناہ رہا ہے اور تمام اہل زمین کو فدیہ میں دے کر اپنے کو بچا لے۔ ۸ - ۱۴

ہرگز نہیں! وہ ایسی آگ ہو گی جس کی لپٹ چمڑی ادھیڑ لے گی۔ وہ ان سب کو کھینچ بلائے گی جنھوں نے پیٹھ پھیری اور اعراض کیا، مال جمع کیا اور اس کو سینت سینت کر رکھا۔ ۱۵ - ۱۸

انسان بے صبرا پیدا کیا گیا ہے جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ گھبرا جانے والا ہے اور جب اس کو کشادگی حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے۔ صرف نمازی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ جو اپنی نمازوں کی مداومت رکھتے ہیں اور وہ جن کے مالوں میں ایک معیّن حق ہوتا ہے سائلوں اور محروموں کا اور جو تصدیق کرتے ہیں جزا کے دن کی اور وہ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہنے والے ہیں۔ بے شک ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں ہے۔ اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے حد تک، سو اس باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔ ہاں، جس نے اس

سے آگے بڑھ کر چاہا تو وہی لوگ حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں اور وہ جو اپنی شہادتوں کو ادا کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ جنتوں میں، عزت کے ساتھ، رہنے والے ہوں گے۔ ۱۹ - ۳۵

تو ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ دہنے بائیں سے تم پر پلے پڑ رہے ہیں گروہ در گروہ! کیا ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ جنتِ نعیم میں داخل کر لیا جائے گا! ہرگز نہیں! ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں! ۳۶-۳۹۔

پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے خداوند کی کہ ہم قادر ہیں اس بات پر کہ ہم ان کو بدل دیں ان سے بہتر سے اور ہم اس سے عاجز رہنے والے نہیں ہیں۔ پس ان کو چھوڑو یہ سخن گستری اور ہنسی مسخری کر لیں یہاں تک کہ اپنے اس دن سے دوچار ہوں جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے، جس دن نکلیں گے قبروں سے سرعت کے ساتھ گویا کہ وہ نشانوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی اور ان پر ذلت چھائی ہو گی۔ یہ ہے وہ دن جس سے وہ ڈرائے جاتے رہے ہیں۔ ۴۰-۴۴

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (۱)

سوال باندازِ استعجال

'سوال' کے مختلف معانی پر اس کے محل میں بحث ہو چکی ہے یہاں اس کا صلہ 'ب' کے ساتھ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ استعجال یا استہزاء کے مفہوم پر متضمن ہے۔ یعنی ایک سوال کرنے والے نے واقع ہونے والے عذاب کی جلدی مچائی یا اس کا مذاق اڑایا۔ قریش کے متمردین کو جب عذاب سے ڈرایا جاتا تو وہ پوچھتے کہ وہ عذاب کہاں ہے؟ عذاب آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتا؟ ہم کب سے اس کے ڈراوے

سن رہے لیکن وہ چلا تو راہ میں کہاں لنگر انداز ہو گیا کہ اب تک وہ نہیں پہنچا؟ اس طرح کے سوالات ظاہر ہے تحقیق کے لیے نہیں بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے اور عذاب کا مذاق اڑانے کے لیے کیے جاتے تھے۔ ان سوالوں کے اندر جلد بازی اور استہزاء دونوں کے مفہوم پائے جاتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ اس جلد بازی کا مقصد ہی مذاق اڑانا ہوتا تھا۔ 'ب' کے صلہ نے 'سوال' کے اس مضمر مضمون کو واضح کر دیا۔ اس لیے استعجال اور استہزاء دونوں کا صلہ 'ب' کے ساتھ آتا ہے، مثلاً یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ (العنکبوت ۲۹: ۵۴) اسی طرح 'اِسْتِهْزَاءٌ' کا صلہ بھی 'ب' ہی آتا ہے۔

لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ (۲)

عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کی حماقت

'لِلْكٰفِرِيْنَ' کا تعلق 'وَاقِعٍ' سے بھی ہو سکتا ہے، یعنی اس عذاب کا مذاق اڑاتے ہیں جو کافروں کے لیے واقع ہونے والا ہے اور اس کو مستقل جملہ بھی قرار دے سکتے ہیں، یعنی وہ جس عذاب کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ کافروں کے لیے ہوگا اور کوئی اس کو دفع کرنے والا نہیں بنے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی شامت ہی ہے جو ڈھٹائی سے اس کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ وہ سیلاب فنا آیا تو آخر کس کے گھر جائے گا! انہی کے گھر تو آئے گا! اس کے مقابلہ کا کیا سامان انھوں نے کر رکھا ہے کہ اس طرح چیلنج کر رہے ہیں! اس کو دفع کرنے کا بوتا کسی میں بھی نہیں ہوگا، نہ ان کے اندر اور نہ ان کے مزعومہ معبودوں کے اندر، تو کس برتے پر اس کو دعوت دے رہے ہیں!

مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ (۳)

اللہ تعالیٰ کے دنوں کو اپنے دنوں پر قیاس نہ کرو

یعنی عذاب آئے گا تو ضرور، جس خدا نے اس کی دھمکی دی ہے اس کا ہر وعدہ اور اس کی ہر وعید شدنی ہے لیکن اس کی بارگاہ بہت بلند ہے۔ وہ بڑی بلندیوں، بڑے مدارج اور زینوں والا ہے۔ اس کے دربار سے جو احکام نازل ہوتے ہیں وہ اس کے اپنے پروگرام کے مطابق ہوتے ہیں اور ان سالوں اور دنوں کے اعتبار سے بنتے ہیں جو اس کے ہاں معتبر ہیں۔ اس کے ہاں کا ایک دن انسانی تقویم کے حساب سے ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے دنوں اور سالوں کو لوگ اپنے محدود پیمانوں سے نہ ناپیں۔ انسان کی یہی تنگ نظری اس کو خدا کے فیصلوں کے بارے میں بے صبرا اور جلد باز بنا دیتی ہے۔ وہ ہر معاملے میں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش کرتا اور اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے الگ الگ عالم بنائے ہیں اور ہر ایک کا مدار اور نظام الگ الگ ہے۔ ہم نہ تو اس کی کائنات کے سارے بھیدوں کو جان سکتے اور نہ اپنے دنوں اور اپنی گھڑیوں سے اس کے دنوں کا حساب کر سکتے۔ سورۂ حج میں اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَ	وہ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں،
لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ	حالانکہ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرنے والا

يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (الحج ۲۲: ۴۷)

نہیں ہے۔ اور واضح رہے کہ تمھارے رب کے ہاں کا ایک دن تمھارے شمار کے ہزار سالوں کے برابر ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تمھارے پیمانے بہت چھوٹے ہیں۔ تم ہر وعدے اور ہر وعید کو اپنے دنوں کے حساب سے جانچتے ہو اس وجہ سے تمھیں محسوس ہوتا ہے کہ فلاں وعدے پر بڑی طویل مدت گزر گئی اور وہ پورا نہیں ہوا حالانکہ خدائی دنوں کے حساب سے ابھی اس پر سیکنڈ یا منٹ سے زیادہ وقت نہیں گزرا ہوتا۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (۴)

اللہ تعالیٰ کے 'ذی المعارج' ہونے کا مفہوم

یہ اللہ تعالیٰ کے ذِی الْمَعَارِجِ ہونے کی وضاحت ہے کہ اس کی بارگاہِ بلند تک پہنچنے کے لیے فرشتوں اور جبریلؑ کو بھی پچاس ہزار سال کے برابر کا دن لگتا ہے۔ 'معارج' کے معنی زینوں اور سیڑھیوں کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ وراء الوراء اور وراء الوراء ہے۔ اس تک رسائی کے لیے دوسروں کا تو کیا ذکر ملائکہ اور جبریلؑ تک کا یہ حال ہے کہ اس راہ کے مراحل طے کرنے کے لیے انھیں پچاس ہزار سال کے برابر کا دن لگتا ہے۔

یہ باتیں تشابہات کی نوعیت کی ہیں۔ ان کی اصل حقیقت کا ادراک ہمارے لیے ناممکن ہے۔ مقصود ان سے صرف یہ تصور دینا ہے کہ خدا کے معاملات کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔ اس کے ہاں کا ایک دن تمھارے ایک ہزار سال کے برابر کا ہوتا ہے اور بعض کاموں کے لیے اس نے پچاس ہزار سال کے برابر کے دن بھی رکھے ہیں۔ آیت زیر بحث میں اسی خاص دن کی طرف اشارہ ہے۔

'روح' سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ان کی عظمتِ شان کے پہلو سے ہے اس لیے کہ وہ تمام ملائکہ کے سرخیل ہیں۔ یہ لفظ قرآن میں حضرت جبریل علیہ السلام کے لیے آیا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگوں نے اس دن سے مراد قیامت کے دن کو لیا ہے اور اس کا یہ طول ان کے نزدیک اس کے ہول اور شدت کی تعبیر ہے۔ ہمارے نزدیک یہ رائے موقع و محل کے بھی خلاف ہے اور عربیت کے بھی۔ یہاں مقصود اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کی بلندی کا اظہار ہے نہ کہ روزِ قیامت کی شدت کا۔ روزِ قیامت کی شدت اور اس کے ہول کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ہر چند خدا کی بارگاہ بہت بلند ہے، وہ تمام خلق سے وراء الوراء ہے لیکن وہ ساتھ ہی ہر شخص کی شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ وہ سب کو دیکھتا، سب کی سنتا اور سب کی نگرانی کر رہا ہے۔ ہم اگرچہ اس کو دیکھنے سے قاصر ہیں لیکن وہ ہم کو ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ ہماری نگاہیں اس کو

نہیں پا سکتیں لیکن وہ ہماری نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (الانعام - ۶ : ۱۰۳) اس وجہ سے نہ تو اس ... کو بے خوف ہونا جائز ہے نہ مایوس۔

یہی حال فرشتوں کا ہے۔ ان کو اگرچہ اس تک صعود کے لیے پچاس ہزار سال کے برابر کا دن لگتا ہے لیکن اس کے باوجود تمام ملائکہ ہر وقت اس کی نگاہوں میں ہیں۔ وہ جب چاہے ان کو حکم دے سکتا ہے اور جب چاہے ان کو پکڑ لے سکتا ہے۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا ۝ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيبًا (۵-۷)

پیغمبر صلعم کو صبر جمیل کی ہدایت

عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کے مقابلہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جو رویہ اختیار کرنا چاہیے یہ اس کا بیان ہے۔ فرمایا کہ ان کی جلد بازی اور ان کے استہزاء پر خوبصورتی اور وقار کے ساتھ صبر کرو۔ 'خوبصورتی کے ساتھ' کا مطلب یہ ہے کہ ان کے رویہ سے نہ تو دل شکستہ اور مایوس ہو نہ ان کے جواب میں کوئی عاجلانہ قدم اٹھاؤ اور نہ اپنے موقف میں کوئی کمزوری پیدا ہونے دو۔ مختلف صورتوں میں صبر کی ہدایت کے ساتھ ان باتوں کی طرف اشارے بھی فرما دیے گئے ہیں جو صبر کو صبر جمیل بنانے کے لیے ضروری ہیں۔

اہل بصیرت قیامت کو دور نہیں سمجھتے

'اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيبًا' یعنی ان لوگوں کی نظر بہت محدود ہے اس وجہ سے یہ اس عذاب کو جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے بہت دور خیال کر رہے ہیں حالانکہ ہم اس کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں اور اصل دیکھنا ہمارا دیکھنا ہے۔ اگر ان کے اندر بھی بصیرت ہوتی تو یہ بھی اس کو قریب ہی دیکھتے لیکن ان کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے اس وجہ سے انھیں قریب کی چیز دور دکھائی دے رہی ہے۔ وہ دن آئے گا تو یہ پٹی کھل جائے گی اور ہر شخص دیکھ لے گا کہ جس چیز کو وہ بہت دور سمجھتا تھا وہ نہایت قریب نکلی۔ 'فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ' (قٓ - ۵۰ : ۲۲) (پس آج تو تیری نگاہ بہت تیز ہے) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے ـــــ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جن کی نگاہوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت ہوتی ہے وہ اس مغالطہ میں مبتلا نہیں ہوتے۔ صاحب بصیرت اللہ کی روشنی سے دیکھتا ہے اس وجہ سے جس طرح اللہ تعالیٰ اس دن کو قریب دیکھتا ہے اسی طرح مومن بھی اس کو قریب ہی دیکھتا ہے۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (۸-۹)

قیامت کے ہول کی تصویر

یہ قیامت کی ہلچل اور اس کے ہول کی تصویر ہے تاکہ جو لوگ اس کو بصیرت کی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے ہیں وہ اس تصویر کو دیکھ کر اس سے کچھ عبرت پکڑیں۔ فرمایا کہ اس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کے مانند ہو جائے گا اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کے مانند۔

لفظ 'مُھْل' مختلف معانی میں آتا ہے۔ سورۂ کہف میں یہ لفظ گزر چکا ہے وہاں مناسب تع

معنی کی وضاحت ہم نے کر دی۔ یہ تیل اور تیل کی تلچھٹ کے معنی میں بھی آیا ہے۔ یہ معنی لیجیے تو مقصود آسمان کی رنگت کو تیل کی سرخ سیاہی مائل تلچھٹ سے تشبیہ دینا ہوگا۔ سورۂ رحمان میں بھی آسمان کی سرخی کا ذکر آیا ہے: فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (الرحمٰن - ۵۵ : ۳۷) (وہ کھال کی مانند سرخ ہوگا)

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ۔ لفظ 'عِهْن' کے معنی اون کے ہیں اور اس سے مراد یہاں دُھنی ہوئی اُون ہے، جیسا کہ سورۂ قارعہ میں فرمایا ہے: وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ (القارعۃ - ۱۰۱ : ۵) (اور پہاڑ دُھنی ہوئی اُون کے مانند ہو جائیں گے)۔

یہ احوالِ قیامت سے تعلق رکھنے والی باتیں ہیں جو از قبیلِ متشابہات ہیں۔ ان کی اصل حقیقت یہاں سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ لیکن ذہن اس طرف جاتا ہے کہ آسمان کی سرخی نتیجہ ہوگی جہنم کے شعلوں کے بھڑکنے کا اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کے مانند پراگندہ کر دیے جائیں گے تاکہ جو لوگ پہاڑوں کو لازوال سمجھتے رہے ہیں وہ ان کی بے ثباتی کا مشاہدہ کر لیں۔ ظاہر ہے کہ جب پہاڑوں کا یہ حال ہوگا تو دوسری چیزوں کا کیا ذکر! یہ باتیں ان نادانوں کی تنبیہ کے لیے سنائی گئی ہیں جن کو اپنی قوت و جمعیت اور اپنے قلعوں اور گڑھیوں پر بڑا ناز تھا ـــــ معلوم ہوا کہ اس دن سارا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا اور ایک نیا عالم بالکل نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ ظہور میں آئے گا۔

وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا (۱۰)

اس دن کی نفسی نفسی کی تصویر

یعنی اس دن ہر شخص پر ایسی نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی کہ جو عمر بھر اس دنیا میں باہم دگر جگری دوست بنے رہے اور جنھوں نے ایک دوسرے کی خاطر اپنی جان اور اپنے مال سب کچھ قربان کیے اس دن اس طرح آنکھیں پھیر لیں گے کہ کوئی کسی کا حال پوچھنے کا بھی روادار نہ ہوگا۔

يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۙ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۙ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۙ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنجِيهِ (۱۱-۱۴)

یعنی اس دن وہ ایک دوسرے سے اوجھل نہیں ہوں گے کہ ان کے اندر حمیت و حمایت کا جذبہ نہ ابھرے۔ بلکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے اور یہ ساری مصیبت ان پر ایک دوسرے کی آنکھوں کے سامنے گزرے گی لیکن وقت ایسی نفسی نفسی کا ہوگا کہ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ ہوگا۔ سورۂ عبس آیت ۳۴ میں بھی یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ وہاں، ان شاء اللہ، اس کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۙ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۙ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۙ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنجِيهِ۔ اس دن کا عذاب ایسا ہولناک ہوگا کہ گنہگار متمنی ہوں گے کہ کاش! اپنے محبوب سے محبوب عزیزوں کو فدیہ میں دے کر اس سے اپنے کو چھڑا سکیں تو چھڑا لیں۔ باپ اپنے بیٹوں کو فدیہ میں دے دینا چاہیں گے، شوہر اپنی بیوی

بھائی اپنے بھائی، صاحب کنبہ اپنے کنبہ و خاندان بلکہ زمین کی ساری مخلوق کو چاہے گا کہ فدیہ میں دے کر اس عذاب سے اپنی جان بچا لے جائے۔ لیکن یہ تمنا تمنا ہی رہے گی۔ اس دن نہ کسی کے پاس کوئی چیز فدیہ میں دینے کے لیے ہوگی اور نہ کسی کا کوئی فدیہ قبول ہوگا بلکہ ہر ایک کو وہ عذاب بھگتنا پڑے گا جس کا وہ مستحق ٹھہرے گا۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں وہ تمام رشتے مذکور ہوئے ہیں جن کے لیے آدمی میں فطری محبت اور حمایت و مدافعت کی گہری حمیت ہوتی ہے۔ کنبہ و خاندان کے ذکر کے ساتھ خاص طور پر اس کی صفت 'تُؤْوِیْهِ' آئی ہے یعنی جو خاندان زندگی بھر اس کا ملجا و ماویٰ رہا جس نے دشمنوں سے اس کی حفاظت کی اور جس کی مدافعت میں وہ خود عمر بھر سربکف رہا، اس کو بھی وہ فدیہ میں دے کر اپنے کو بچانے کی تمنا کرے گا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بدویانہ دور زندگی میں خاندان اور قبیلہ کی حفاظت و مدافعت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جو شخص قبیلہ و خاندان کی مدافعت میں سربکف رہتا وہ ہیرو سمجھا جاتا اور جو قبیلہ کے مفاد کو اپنے مفاد پر قربان کرتا یا کسی خطرے کے وقت اس کی مدافعت سے جی چراتا نہ وہ خود کہیں منہ دکھانے کے قابل رہتا نہ اس کی آئندہ نسلیں۔

كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ (۱۵-۱۶)

اس دن کسی کے لیے کوئی مفر نہ ہوگا

یعنی اس عذاب سے بچنے کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوگی۔ اس کے شعلے دور ہی سے مجرم کی چمڑی ادھیڑ لیں گے۔

'کَلَّا' ان مجرموں کی تمنا کی تردید کے لیے ہے جو مذکور ہوئی۔ یعنی ان کی عذاب سے بچنے کی یہ تمنا ہرگز پوری نہ ہوگی۔

'اِنَّهَا لَظٰی' میں 'اِنَّهَا' میں ضمیر کا مرجع وہی عذاب ہے جو مذکور ہوا۔ اس سے مراد چونکہ عذاب نار ہے اس وجہ سے ضمیر مؤنث آئی۔ 'لَظٰی' کے معنی شعلے کے ہیں۔ 'شَوٰی' سر اور اطراف بدن کی کھال کے لیے آتا ہے۔ یعنی اس آگ کے شعلوں کی لپٹ ایسی ہوگی کہ دور ہی سے مجرموں کی کھوپڑی کھینچ لے گی۔

'نَزَّاعَةً' کو خبر کے بعد دوسری خبر بھی مان سکتے ہیں اور حال بھی۔ دونوں ہی صورتوں میں کوئی قابل لحاظ فرق معنی میں پیدا نہیں ہوگا۔

تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ (۱۷)

یعنی آج تو اللہ کی بندگی، اس کے عذاب سے بچنے اور اس کی راہ میں انفاق کی دعوت دی جاتی ہے تو لوگ پیٹھ پھیرتے اور اعراض کرتے ہیں لیکن اس دن جہنم کے عذاب سے پیٹھ پھیرنے اور اعراض

کرنے کا کوئی امکان نہ ہوگا۔ جہنم سارے اعراض و انکار کرنے والوں کو کھینچ بلائے گی۔ لفظ 'تَدْعُوْا'
یہاں نہایت بلیغ ہے۔ یعنی پیغمبر کی پُرمحبت دعوت جن کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہی ہے وہ
یاد رکھیں کہ ان سنگ دلوں کو ایک دن جہنم بلائے گی اور اس طرح بلائے گی کہ کسی کے لیے بھی کوئی
راہِ فرار باقی نہیں رہے گی۔

وَجَمَعَ فَاَوْعٰی (۱۸)

بخیلوں کا انجام

یہ خاص طور پر بخیلوں کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ ایمان بالآخرت اور انفاق کی دعوت سب
سے شاق انہی کے دلوں پر گزرتی ہے۔ آخرت کی فلاح کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنا مال اس دنیا کی تجوریوں
میں بند رکھنے کے بجائے خدا کے بنک میں جمع کرے۔ بخیل اس کو خسارے کا سودا سمجھتا ہے۔ نہ وہ جزا
و سزا پر اعتقاد ہی رکھتا اور نہ آخرت کے نسیہ کی خاطر اپنا نقد مال قربان کرنے کا وہ حوصلہ ہی اپنے اندر
پاتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی مخالفت میں بخیل سب سے پیش پیش رہے ہیں۔
بخالت اور جزا و سزا کی تکذیب دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہے 'اَرَءَیْتَ الَّذِیْ
یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ہ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ہ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ' (الماعون ۱۰۷: ۱-۳)
(دیکھا اس کو جو جزاء کو جھٹلاتا ہے! وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے پر لوگوں
کو نہیں ابھارتا)۔

'جَمَعَ' کے ساتھ 'فَاَوْعٰی' کے لانے سے مقصود اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ انھوں نے آنکھیں
بند کر کے حرام و حلال ہر راہ سے مال جمع بھی کیا اور پھر اس کو نہایت اہتمام سے گن گن کر محفوظ بھی کیا۔
دوسرے مقام میں بخیلوں کی اسی خصلت کو 'جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ' (الھمزۃ ۱۰۴: ۲) (مال جمع کیا اور اس کو
گن گن کر رکھا) سے تعبیر کیا ہے ـــــ فرمایا کہ اس طرح کے بخیلوں کو بھی جنھوں نے جزا پر ایمان نہ رکھنے
کے سبب سے پیغمبر کی دعوتِ انفاق سے اعراض کیا اس دن جہنم کی آگ کھینچ بلائے گی۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (۱۹-۲۱)

'ھلوع' کے معنی جلد باز، بے صبرے اور تھڑدلے کے ہیں۔

عام لفظ سے خاص گروہ کی طرف اشارہ

لفظ 'انسان' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں اس سے اشارہ انہی انسانوں کی طرف ہے جن کا ذکر
اوپر سے چلا آ رہا ہے کہ اللہ نے ان کو مہلت دی تو اس کی قدر کرنے کے بجائے عذاب کی جلدی
مچائے ہوئے ہیں اور ابھی پکڑ میں آ جائیں تو داویلا شروع کر دیں گے۔ خدا نے مال دیا ہے تو اس سے
آخرت کی کمائی کرنے کے بجائے اس پر مارِ گنج بن کر بیٹھ گئے ہیں، اس کو اپنی قابلیت و ذہانت کا ثمرہ
اور اپنے استحقاق کا کرشمہ سمجھ رہے ہیں اور اس گھمنڈ میں مبتلا ہیں کہ یہ جو کچھ انھیں حاصل ہے اس بات
کی دلیل ہے کہ وہ خدا کے منظورِ نظر ہیں اس وجہ سے انھیں یہ برابر حاصل رہے گا اور اگر آخرت ہوئی تو

وہاں اس سے بھی زیادہ ان کے لیے محفوظ ہے۔ لیکن ابھی کوئی افتاد پیش آجائے تو فوراً مایوس اور دل شکستہ ہو کر واویلا شروع کر دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی شیخی اور اکڑ کی پروا نہ کرو۔ یہ نہایت اوچھے اور تھڑدلے لوگ ہیں۔

کسی خاص جماعت کو جب اس طرح کسی عام لفظ سے ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مقصود، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، بے اعتنائی بلکہ اس کی تحقیر کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا متکلم نے اس کو اس قابل نہیں سمجھا کہ اس کو مخاطب کرے یا اس کی طرف اشارہ بھی کرے۔ یہ اسلوب بیان ہماری اپنی زبان میں بھی معروف ہے۔

داعیات میں عدم توازن

'إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا' اسی طرح کا اسلوب بیان ہے جس طرح سورۂ انبیاء آیت ۳۷ میں 'خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ' یا سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱۱ میں 'وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا' آیا ہے۔ انسانی فطرت کے اندر جس طرح شہوت، غضب، حرص اور اس قبیل کے دوسرے داعیات کا ایک مقام ہے اسی طرح عجلت کا بھی ایک موقع و محل ہے۔ یہ شے بجائے خود مذموم نہیں ہے۔ مذموم اگر ہے تو اس کا بے محل یا غیر معتدل ظہور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو متضاد داعیات کی کشمکش میں پیدا کر کے اس سے یہ چاہا ہے کہ وہ خدا کے احکام کے مطابق، جن کی تعلیم اس کے نبیوں کے ذریعہ سے دی گئی ہے، ان کے اندر توازن و ہم آہنگی پیدا کرے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کے قوانین کا تابع بنائے۔ اس امتحان میں کامیابی ہی پر انسان کی تمام اخروی سعادت کا انحصار ہے۔ اختیار کا شرف بھی اس کو اسی امتحان کے لیے عطا ہوا ہے۔ یہ امتحان مقصود نہ ہوتا تو انسان کو اختیار سے مشرف کرنے کے کوئی معنی بھی نہ ہوتے اور اس کو دوسری مخلوقات پر برتری حاصل کرنے کی بھی کوئی وجہ نہ ہوتی۔

آیت میں جس چیز کو 'هلع' سے تعبیر فرمایا گیا ہے یہ بھی جلد بازی اور بے صبری ہی کی ایک شکل ہے۔ اگر یہ چیز انسان پر اس طرح غالب ہو جائے کہ دوسرے متقابل داعیات اس کے آگے مغلوب ہو جائیں تو ایسی صورت میں یہ کہنا بالکل مطابقِ حال ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق گویا اسی عنصر سے ہوئی ہے۔ ہانڈی میں نمک ناقابلِ برداشت حد تک زیادہ ہو جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہانڈی نمک ہی سے تیار ہوئی ہے۔

إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ (۲۲-۲۳)

عدم توازن سے پاک گروہ

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس عدم توازن یا بے راہ روی سے پاک ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا۔ فرمایا کہ نمازی اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفس کے متضاد داعیات میں صحیح توازن اور نقطۂ اعتدال پیدا کرنے میں اوّلین عامل کی حیثیت نماز کو حاصل ہے۔ جو شخص اپنی تربیت اس طرح کرنا چاہے کہ شیطان اس کو

کسی بے راہ روی میں مبتلا نہ کرنے پائے۔ اس کے لیے سب سے اول شے نماز کا اہتمام ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص اس مقصد میں کامیابی نہیں حاصل کر سکتا۔

نماز صحیح توازن پیدا کرتی ہے

رہا یہ سوال کہ نماز میں وہ کیا چیز ہے جس کے سبب سے اس مقصدِ تربیت میں اس کو اولیت حاصل ہے تو یہاں اس کے تفصیلی جواب کا محل نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ہم نے 'حقیقتِ نماز' کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے۔ تفصیل کے طالب اس کا مطالعہ کریں۔ یہاں ہم اس کے صرف انہی پہلوؤں کو زیرِ بحث لائیں گے جن کی طرف قرآن نے اس مقام میں اشارہ کیا ہے۔

عمل کے اندر روح مداومت سے پیدا ہوتی ہے

'الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ' فرمایا کہ اس مقصد کے لیے انہی نمازیوں کی نماز کارآمد ہے جو اپنی نمازوں کی مداومت رکھتے ہیں۔ یہ ایک نہایت اہم تنبیہ ہے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کا بھی مختلف پیرایوں سے ذکر ہوا ہے، جن کا حال یہ ہے کہ یوں تو ان کو کبھی ذکرِ الٰہی یا مسجد کی توفیق نہیں ہوتی لیکن ان پر کوئی مصیبت آ جائے تو بڑے نمازی اور بڑی لمبی لمبی دعائیں کرنے والے بن جاتے ہیں۔ پھر جونہی وہ مرحلہ گزر جائے وہ کان جھاڑ کے اس طرح اس سے الگ ہو جاتے ہیں گویا خدا سے نہ کبھی ان کو کوئی سابقہ پڑا ہے اور نہ اب آئندہ کبھی پڑنے والا ہی ہے۔ اس طرح کی نماز چونکہ اسی عدم توازن کا ایک مظہر ہے جس کا یہاں علاج بتایا جا رہا ہے اس وجہ سے یہ نماز ان کی تربیت میں کچھ نافع نہیں ہوتی۔ نافع وہ نماز ہوتی ہے جس کی مداومت کی جائے اور گرم و سرد ہر طرح کے حالات میں اس کی پابندی قائم رہے۔ پابندی کے ساتھ تھوڑا عمل اس عمل سے کہیں زیادہ بابرکت ہے جو اگرچہ مقدار میں زیادہ ہو لیکن وہ محض وقتی اور ہنگامی ہو۔ ایک زور کا دونگڑا برس کر اگر ابر طویل عرصے کے لیے غائب ہو جائے تو فصلیں سوکھ کر تباہ ہو جاتی ہیں، برعکس اس کے تھوڑی بارش بھی جھڑی کی شکل میں قائم و دائم رہے تو وہ کھیتوں کو شاداب رکھتی اور فصلوں کو بارآور کرتی ہے۔ یہی حال نماز کا بھی ہے۔ دین کا جو عام مطالبہ ایک مسلمان سے ہے اگر وہ اس کو پابندی اور تسلسل کے ساتھ پورا کرے تو اس کے عمل میں جو برکت ہو گی وہ ان لوگوں کے عمل میں نہیں ہو گی جو گاہ گاہ تو بڑے نمازی بن جاتے ہیں لیکن پھر اس طرح بھول جاتے ہیں کہ مسجد کی صورت بھی نہیں دیکھتے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو جھڑی سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی آپ جو عمل کرتے اس کی مداومت فرماتے اگرچہ اس کی مقدار تھوڑی ہو۔ عمل کی یہی مداومت اس کے اندر قوت، روح اور زندگی پیدا کرتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۲۴-۲۵)

نماز کے بعد انفاق دین کا دوسرا بازو ہے

یہ دین کے دوسرے بازو یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں انفاق کا بیان ہے۔ ہم جگہ جگہ یہ واضح کر چکے ہیں کہ دین کے اعمال میں نماز اور انفاق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ نماز بندے کو خدا سے

جو ترقی ہے اور انفاق سے اس کا تعلق بنی نوع آدم سے صحیح بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔

حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ کے الفاظ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اس سے زکوٰۃ ہی مراد ہو۔ زکوٰۃ کا سسٹم ایک معین شرحِ نصاب کے ساتھ تو مدنی دور میں نافذ ہوا اور یہ سورہ مکی ہے، بلکہ اس سے مراد اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کا انفاق محض رسمی طور پر چھدا اتارنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک حق واجب کی حیثیت سے، ایک معلوم مقدار میں، اپنے مال کا ایک حصہ خدا کی راہ میں دیتے ہیں۔

یہ امر بیاں واضح رہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی لوگ زکوٰۃ اور انفاق سے ناآشنا نہیں تھے۔ سورۂ انعام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین بھی خدا کا حق اپنے مال میں سے نکالتے تھے لیکن اپنے مشرکانہ مزعومات کے تحت اس میں انھوں نے اپنے معبودوں کو بھی شریک کر رکھا تھا۔ حنیفیت کے پیرو تو خالص موحد تھے اس وجہ سے وہ جو کچھ بھی نکالتے صرف اللہ تعالیٰ ہی کے حق کی حیثیت سے نکالتے۔ ان کے درمیان حضرت اسماعیل علیہ السلام سے متعلق یہ روایت موجود تھی کہ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (مریم - ۱۹: ۵۵) (اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے)۔ اس وجہ سے یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ اسلام سے پہلے اہلِ عرب انفاق فی سبیل اللہ کی کسی معین شکل سے بالکل ناآشنا تھے۔ مدنی دور میں زکوٰۃ کی جو شرح معین ہوئی وہ اس شرح سے مختلف تو ہو سکتی ہے جو لوگوں میں پہلے رائج رہی ہو لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زمانۂ جاہلیت کے نیکوں کے اندر بھی زکوٰۃ کی ایک معینہ شکل معروف تھی۔ چنانچہ اسی وجہ سے مکی سورتوں میں بھی زکوٰۃ کا لفظ بار بار آیا ہے۔ ملتِ ابراہیم کی دوسری تعلیمات کی طرح یہ زکوٰۃ بھی بدعات کے حجاب میں گم تھی لیکن اس کا نام باقی تھا۔ اسلام نے اس کو اجاگر اور از سرِ نو اس کی کامل صورت میں اسلامی معاشرے کے اندر نافذ کیا۔

زمانۂ جاہلیت میں زکوٰۃ کا تصور

لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ سَآئِلٌ سے مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کے آگے دستِ سوال پھیلاتا ہے۔ اس کا یہ عمل ہی گواہ ہے کہ وہ محتاج ہے اس وجہ سے مدد کا مستحق ہے۔ ایسے سائلوں کے متعلق زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ آدمی جو کچھ دے سکے وہ دے دے، نہ دے سکے تو شائستہ طریق سے معذرت پیش کر دے۔ ان کو جھڑکنا یا ملامت کرنا جائز نہیں ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ یہاں سچے نمازیوں کی یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ ان کے مال میں سائلوں کا ایک معین حق ہوتا ہے۔

'سائل' اور 'محروم'

مَحْرُوْمٌ سے مراد تو ظاہر ہے کہ وہ شخص ہے جو وسائلِ معاش سے محروم ہو لیکن یہاں یہ لفظ چونکہ سَآئِل کے ساتھ آیا ہے اس وجہ سے اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ وہ محروم ہونے کے باوجود لوگوں کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کا ننگ گوارا نہ کرتا ہو۔ بعض نادار ایسے خود دار ہوتے

ہیں جو فاقے کرتے ہیں لیکن سوال کی ذلت گوارا نہیں کرتے۔ خاص طور پر وہ مصیبت زدہ جو پہلے صاحب حیثیت رہے ہوں پھر گردشِ روزگار کے ہاتھوں نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے ہوں۔ اس طرح کے خوددار لفظ 'محروم' کے اصلی مصداق ہیں۔ ان کی مدد ان کو تلاش کر کے بلکہ ان کے آگے، جیسا کہ بعض آیات سے اشارہ نکلتا ہے، جھک کے کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے کہ ان کی بلند ہمتی کسی کے آگے جھکنا گوارا نہیں کرتی۔ ع

ہمت نہ خورد نیشتر لا و نعم را

وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ (۲۶-۲۷)

انفاق کا اصلی محرک — یہ ان کے اس انفاق کے محرک کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ چونکہ یہ لوگ روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں اس وجہ سے انھوں نے اپنے مال میں غریبوں اور محتاجوں کا ایک حق معین کر رکھا ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے لیے غریبوں اور محتاجوں کا حق پہچاننا نہایت مشکل ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۝ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ' (الماعون - ۱۰۷: ۱-۲) (بھلا دیکھا تم نے اس کو جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے، وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے)۔

'وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ' یہ اسی تصدیق بیوم الدین کی وضاحت ہے کہ وہ جزا اور سزا پر ایمان رکھتے ہیں اس وجہ سے اپنے رب کے عذاب سے برابر لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ ان کے اس باطن پر سورۂ دہر میں یوں روشنی ڈالی گئی ہے: 'یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا ۝ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا' (الدھر - ۷۶: ۷-۱۰) (وہ اپنی نذریں پوری کرتے اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہمہ گیر ہوگی اور مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں، اس کی کمیابی اور اس کے ضرورت مند ہونے کے باوجود۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تمھیں صرف رضائے الٰہی کے لیے کھلاتے ہیں، تم سے کسی بدلے یا شکرگزاری کے خواہاں نہیں ہیں۔ ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت منحوس قسم کے دن کا اندیشہ رکھتے ہیں)۔

انفاق کا یہی محرک فطری، بے ریا، بے غرض اور پاکیزہ محرک ہے اس وجہ سے قرآن نے اسی کو اجاگر کیا ہے۔ اس کے سوا جو دوسرے محرکات ہیں یا جو مصنوعی طور پر پیدا کیے جاتے ہیں وہ تمام تر کاروباری محرکات ہیں جن سے نہ تو نفس کی کوئی اصلاح ہوتی ہے اور نہ ان کے تحت کیا ہوا انفاق خدا کے ہاں مقبول ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت پیچھے بھی ہو چکی ہے اور آگے بھی اس کے بعض اہم

پہلو اِن شاءاللہ روشنی میں آئیں گے۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ (۲۸)

یہ اوپر والے ٹکڑے پر نہایت بلیغ استدراک ہے کہ جو لوگ اپنے رب کے عذاب سے اس طرح لرزاں و ترساں ہیں وہ بڑے ہی دانش مند ہیں۔ ان کے رب کا عذاب چیز ہی ایسی ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے بے خوف نہ رہا جائے۔ نہیں معلوم وہ کس وقت آ دھمکے اور جب بھی آ دھمکے کوئی نہیں ہے جو اس کو ٹال سکے یا تھوڑی دیر کے لیے اس کے رخ ہی کو موڑ سکے ۔۔۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رہنے کی سب سے مؤثر تدبیر کوئی ہے تو وہ غریبوں مسکینوں کو کھلانا پہنانا ہے۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ (۲۹-۳۱)

طہارتِ اخلاق — نماز، انفاق اور خشیتِ الٰہی کے بعد یہ ان کے اخلاق کی طہارت کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ وہ سانڈ بن کر تمام حدودِ الٰہی کو توڑ تاڑ کر رکھ دیں۔ وہ اپنی جنسی خواہشوں کو اپنی بیویوں اور لونڈیوں تک محدود رکھتے ہیں۔ اس حد سے تجاوز کرنے کی جسارت نہیں کرتے۔ اور جو لوگ اس سے تجاوز کرتے ہیں وہ یاد رکھیں کہ وہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ حدودِ الٰہی سے تجاوز کی سزا بھگتیں گے اس لیے کہ خدا اپنے حدود کی بے حرمتی کرنے والوں سے ضرور انتقام لے گا۔[1]

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ (۳۲)

ایک ہی بات جو نیکیوں کا شیرازہ ہے — یہ ایک ہی جامع بات بہت سی نیکیوں کا شیرازہ ہے۔ فرمایا کہ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں!

لفظ 'امانت' محدود معنی میں نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ انسان کی جتنی قوتیں اور صلاحیتیں ہیں اور جن اسباب و وسائل سے بھی اللہ تعالیٰ نے اس کو بہرہ مند فرمایا ہے، وہ سب اس کی تحویل میں امانت ہیں اور ایک دن ان میں سے ایک ایک کی بابت اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ ان کے استعمال میں کوئی خیانت تو نہیں کی گئی ہے؛ قرآن میں تصریح ہے کہ سمع و بصر اور عقل و دل کی تمام صلاحیتوں سے متعلق ایک دن پرسش ہونی ہے اور جس نے بھی کوئی خیانت کی ہو گی وہ اس کی سزا بھگتے گا۔ اسی طرح یہ بھی تصریح ہے کہ قیامت کے دن ہر نعمت سے متعلق سوال ہو گا۔

---

[1] لونڈیوں اور غلاموں کے مسئلہ پر سورۂ نور کی تفسیر میں مفصل بحث گزر چکی ہے۔

اسی طرح لفظ 'عہد' بھی یہاں وسیع معنوں میں ہے۔ وہ عہد بھی اس میں شامل ہے جو باہمی قول و قرار سے ہمارے اندر وجود میں آتا ہے، وہ عہد بھی اس میں شامل ہے جو اگرچہ قول و قرار سے وجود میں نہیں آتا لیکن ہر اچھے معاشرے میں وہ مسلّم اور معروف ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت سے جو عہد لیا ہے وہ بھی اس میں شامل ہے اور سب سے زیادہ اہم حصہ اس کا وہ عہد و میثاق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے ہم سے لیا ہے اور جس کی دفعات نہایت وضاحت سے شریعت میں مرقوم ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ (۳۳)

شہادت وسیع معنوں میں

جس طرح اوپر والی آیت میں امانت اور عہد کے الفاظ وسیع معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اسی طرح لفظ 'شہادت' اس آیت میں وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ہر شخص چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی اس شہادت کے ادا کرنے کا ذمہ دار ہے جس کا بار اس نے اپنے سر لیا ہے اور اس شہادتِ کبریٰ کے ادا کرنے کا بھی ذمہ دار ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو 'لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا' (البقرۃ ۲: ۱۴۳)[1] والی آیت میں مامور فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۳۴)

نماز ہی دین کے لیے حصار ہے

اب یہ آخر میں نماز کا پھر ذکر فرمایا۔ آیات ۲۲-۲۳ میں نماز ہی سے ان صفات کے بیان کا آغاز فرمایا تھا اور اب اسی پر اس باب کو ختم کیا جس سے یہ بات بالبداہت نکلتی ہے کہ نماز ہی ان تمام نیکیوں کا منبع بھی اور وہی ان کی محافظ بھی ہے۔ گویا تمام دین و اخلاق کے لیے نماز کی حیثیت حصار کی ہے۔ جس نے اس حصار کو محفوظ رکھا وہ اپنے دین کو محفوظ رکھے گا اور جس نے اس حصار کو توڑ دیا وہ اپنے سارے دین کو ضائع کر بیٹھے گا۔ اس حقیقت کی وضاحت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یوں فرمائی ہے کہ 'جو اپنی نماز کو ضائع کر دے گا وہ باقی دین کو بدرجۂ اولیٰ ضائع کر بیٹھے گا'۔

یہاں اس پہلو پر بھی نگاہ رہے کہ اوپر والی آیت میں نماز کی مداومت کا ذکر ہے اور اس آخری آیت میں اس کی محافظت کی تاکید ہے۔ محافظت سے مراد نماز کو ان آفات و خطرات سے محفوظ رکھنا ہے جو اس کی افادیت کو برباد کر دینے والے ہیں۔ مثلاً یہ کہ نماز پڑھی تو جائے لیکن اوقات کی پابندی یا جماعت کی حاضری کا اہتمام نہ رکھا جائے، یا نماز کے ساتھ ایسے افعال کا ارتکاب کیا جائے جو اس کے مقصد کے منافی ہوں۔ ان خطرات و آفات کی پوری وضاحت ہم نے اپنے رسالہ 'حقیقتِ نماز' میں بھی کی ہے اور اپنی کتاب 'تزکیۂ نفس' میں بھی۔ جن کو تفصیل مطلوب ہو

---

[1] تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔

ان کی مراجعت کریں۔[1]

أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ (۳۵)

فرمایا کہ یہ لوگ جو مذکورہ اوصاف کے حامل ہوں گے جنت کے باغوں میں عزت و اکرام کے ساتھ براجمان ہوں گے۔

قریش کے مغروروں کو تنبیہ

اس میں قریش کے ان مغروروں پر تعریض ہے جو اپنی موروثی سیادت کے پندار میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا منظورِ نظر سمجھے بیٹھے تھے۔ ان کا زعم یہ تھا کہ آخرت ہوئی تو جس طرح اس دنیا میں وہ نعمتوں کے مستحق قرار پاتے ہیں اسی طرح آخرت میں بھی مدارجِ عالیہ کے مستحق ٹھہریں گے اور جو لوگ یہاں مفلوک الحال ہیں وہ وہاں بھی اسی طرح مفلوک الحال رہیں گے۔ ان لوگوں کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ جنت وراثت میں منتقل ہونے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق آدمی کے کردار و اعمال سے ہے۔ جو لوگ وہ کردار اپنائیں گے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں وہ جنت میں جائیں گے، خواہ امیر ہوں یا غریب، اور جو اس کردار سے محروم ہوں گے وہ اس کی بو بھی نہ سونگھیں گے، خواہ وہ عرب کے صنادید میں سے ہوں یا عجم کے صنادید میں سے۔

فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قِبَلَكَ مُهْطِعِينَ ۝ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ ۝ أَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ (۳۶-۳۸)

قرآن کا یہ فیصلہ سن کر قریش کے مغروروں کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ یہ کس طرح سن سکتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے نادار و مفلوک الحال ساتھی تو جنت میں براجمان ہوں گے اور تمام عزتوں اور عظمتوں کے وارث و مورثِ ساداتِ قریش دوزخ کے ایندھن بنیں گے۔ اس غصہ میں وہ ٹولیاں[2] بنا بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تردید و توہین کے لیے دہنے بائیں سے آپ پر پل پڑتے[3]۔ ان آیات میں اسی صورتِ حال کی تصویر اور ان مغروروں کی خرد باختگی پر اظہارِ تعجب ہے۔ فرمایا کہ ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہر طرف سے تمھارے اوپر ٹولیاں بنا بنا کر پلے پڑ رہے ہیں! کیا ان میں سے ہر شخص یہ توقع لیے بیٹھا ہے کہ وہ جنت میں جا براجے گا!! یعنی اگر اس طمعِ خام میں یہ مبتلا ہیں تو ان کی یہ توقع کبھی پوری ہونے والی نہیں ہے۔

---

[1] معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ یہ آیتیں سورۂ مومنون کے شروع میں بھی گزر چکی ہیں۔ وہاں ان کے ہر جزو پر ہم نے تفصیل سے بحث کی ہے۔

[2] قرآن میں لفظ 'عِزِین' آیا ہے جو 'عِزَۃ' کی جمع ہے۔ اس کے معنی گروہ اور ٹولی کے ہیں۔

[3] لفظ 'اھطاع' کے معنی کسی طرف تیزی سے بڑھنے اور لپکنے کے ہیں۔

ان بزعمِ خود غلط اعتبار کی اس طبعِ خام کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ ہوا ہے۔

حٰمٓ السجدۃ میں ہے: وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى (۵۰) (اور میں اول تو یہ گمان ہی نہیں رکھتا کہ قیامت ہونے والی ہے اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف لوٹنا ہی ہوا تو میرے لیے اس کے پاس اچھا ہی صلہ ہے)۔

سورۂ قلم میں انہی مغروروں کی تردید ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے:

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝	کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح بنا دیں گے!
مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ اَمْ	تمھیں کیا ہو گیا ہے! تم کیسے فیصلے کرتے ہو!
لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝	کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے
اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ۝	ہو، اس میں تمھارے لیے وہی کچھ ہے جو پسند کرتے ہو!

(القلم - ۶۸: ۳۵-۳۸)

كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ (۳۹)

یہ ان مغروروں کے اس زعمِ باطل پر ضرب لگائی ہے کہ یہ اپنے تقدس اور بزرگی کی حکایت زیادہ نہ بڑھائیں۔ ان کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہونے والا نہیں ہے۔ ہم نے ان کو جس چیز سے پیدا کیا ہے وہ ان سے مخفی نہیں ہے۔ اس کو بھول نہ جائیں۔ یعنی پانی، کیچڑ، مٹی اور منی سے پیدا ہونے والی مخلوق کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ شرافتِ حسب و نسب کے غرور میں اپنے آپ کو جنت کا موروثی حقدار سمجھ بیٹھے! مجرد خلقت کے اعتبار سے کسی کو بھی کوئی شرف حاصل نہیں ہے۔ شرف اور استحقاق حاصل ہو سکتا ہے تو ان اعمال کی بنا پر حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ کو پسند ہیں۔ اگر یہ متاع کسی کے پاس نہیں ہے تو اجزائے خلقت کے اعتبار سے تو نہ صرف تمام انسان بلکہ ناپاک سے ناپاک حیوانات بھی اس کے مساوی ہیں۔ یہی مضمون سورۂ نجم میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے:

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ	وہ تم کو خوب جانتا ہے جب کہ اس نے زمین
الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ	سے تم کو پیدا کیا اور جب کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں
بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا	میں شکلِ جنین رہے تو اپنے آپ کو پاکیزہ نہ ٹھہراؤ،
اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝	وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جنھوں نے پرہیزگاری اختیار کی۔

(النجم - ۵۳: ۳۲)

سورۂ نجم کی تفسیر میں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ یہ آیت صوفیوں کے عقیدۂ وحدت الوجود پر بھی ایک ضربِ کاری ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝ عَلٰٓي اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا

مِنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِيْنَ (۴۰-۴۱)

یہ اسی طرح کی قسم ہے جس طرح کی قسم پچھلی سورہ کی آیات ۳۸ - ۳۹ میں گزر چکی ہے۔ — عربیت کا
قسم سے پہلے جو 'لا' ہے اس کی وضاحت سابق سورہ میں ہو چکی ہے۔ — ایک خاص
'مشارق' اور 'مغارب' کے الفاظ اپنے مقام پر زیر بحث آ چکے ہیں۔ قرآن میں یہ الفاظ واحد — اسلوب
تثنیہ اور جمع تینوں شکلوں میں استعمال ہوئے ہیں اور تینوں ہی صورتوں میں معنی کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ عربی زبان میں بعض مرتبہ تثنیہ کسی شے کے دونوں اطراف کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے جس طرح سورۂ کہف میں 'بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ' آیا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات جمع محض کسی شے کی وسعت اطراف کو ظاہر کرنے کے لیے آتی ہے جس کی وضاحت ہم نے سورۂ اعراف کی تفسیر میں کی ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم تمام مشرق و مغرب کے خداوند ہونے کی حیثیت سے کھا کر اپنی اس غیر محدود قدرت کا اثبات فرمایا ہے کہ وہ جب چاہے گا لوگوں کو ان کے مرکھپ جانے کے بعد از سر نو زندہ کر دے گا اور کوئی شکل بھی اس کے اس ارادے میں آڑے نہیں آئے گی۔ اس قسم میں شہادت کا پہلو، جو قسم کا اصل مدعا ہوتا ہے، بالکل واضح ہے۔ اس کائنات میں ہم روز یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ سورج، چاند اور کروڑوں اربوں کواکب و نجوم کائنات کے خداوند کے حکم سے طلوع اور غروب ہوتے ہیں تو کیا جس خدائے قادر و قیوم کے اختیار میں ان کو روز غائب کر دینے کے بعد پھر نمودار کر دینا بھی ہے اس کے لیے لوگوں کو ان کے مرکھپ جانے کے بعد از سر نو زندہ کر دینا مشکل ہو جائے گا؟ پہلا کام زیادہ مشکل ہے یا دوسرا؟ جو پہلے پر قادر ہوا تو وہ دوسرے سے کیوں قاصر رہ جائے گا!

سورۂ نازعات میں یہی دلیل زیادہ جامع اسلوب سے بیان ہوئی ہے:

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ط	کیا تمہارا دوبارہ پیدا کیا جانا زیادہ کٹھن ہے
بَنٰهَا ۞ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۞	یا آسمان کا؟ اس کو بنایا۔ اس کی چھت کو بلند
وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۞	کیا اور اس کو ہموار کیا۔ اور اس کی رات کو
وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۞ اَخْرَجَ	ڈھانک دیا اور اس کے دن کو بے نقاب کیا
مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۞	اور زمین کو اس کے بعد بچھایا اور اس سے اس
وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۞	کا پانی اور چارہ برآمد کیا اور پہاڑوں کو
(النّٰزِعٰت - ۷۹: ۲۷-۳۲)	گاڑ دیا۔

عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ یعنی ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ان کی

بعث بعد الموت پر دلیل

جگہ ان سے بہتر مخلوق لائیں جو اللہ کے دین کو ماننے والی ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ان کو دوبارہ اس سے بہتر صورت میں پیدا کر دیں۔ مطلب یہ کہ جب ہم ان سے بہتر صورت میں پیدا کر دینے پر بھی قادر ہیں تو بعینہٖ انہی کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ہمارے لیے اور بھی آسان ہے۔

عام طور پر لوگوں نے پہلے مطلب ہی کو اختیار کیا ہے اور زبان کے پہلو سے اس میں کوئی خرابی بھی نہیں ہے لیکن میرا رجحان دوسرے مطلب کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سورہ میں اصل زیر بحث موضوع وقوع قیامت ہے جس کو مستبعد سمجھنے کی بڑی وجہ منکرین کے لیے یہی تھی کہ مرکھپ جانے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو وہ خارج از امکان قرار دیتے تھے۔ آگے کی آیات سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ (۴۲)

یہ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور منکرین کے لیے وعید ہے کہ اگر یہ لوگ نہیں سمجھتے تو ان کو چھوڑو۔ یہ جن سخن سازیوں اور دلچسپیوں میں لگے ہوئے ہیں ان میں لگے رہیں یہاں تک کہ وہ دن ان کے آگے آجائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے اور وہ اس سے بحث رہے ہیں۔

يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلٰى نُصُبٍ يُوفِضُونَ (۴۳)

لفظ 'نُصُب' کی تحقیق

'نُصُب' جمع ہے 'نَصِیبٌ' کی جس کے ایک معنی گاڑے ہوئے پتھر کے ہیں۔ گاڑے ہوئے پتھر سے مراد وہ پتھر بھی ہو سکتے ہیں جو مشرکین اپنی نذریں اور قربانیاں پیش کرنے کے لیے گاڑتے تھے اور وہ پتھر بھی ہو سکتے ہیں جو دوڑ وغیرہ کے مقابلہ کے لیے نشان کے طور پر گاڑ دیے جاتے ہیں۔

ابن عباسؓ، مجاہدؒ اور ضحاکؒ اس سے علم مراد لیتے ہیں جس کو دوڑ لگانے کے لیے ایک نشان کے طور پر گاڑا جائے۔

ابوالعالیہؒ اور یحییٰ بن کثیرؒ اس سے 'غایت' (یعنی گول کا نشان) مراد لیتے ہیں جس کو نشان ٹھہرا کر اس کی طرف مقابلہ کی دوڑ لگائی جائے۔

'ایفاض' کے معنی 'اسراع' یعنی تیزی سے چلنے یا بھاگنے کے ہیں۔

میرے نزدیک لفظ 'نُصُبٌ' یہاں نشان اور علم ہی کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ متمردین اللہ کے داعی سے اکڑتے اور اس کی بتائی ہوئی راہ سے منحرف ہو کر دوسری راہوں پر چل رہے ہیں لیکن وہ دن بھی آنے والا ہے جب قیامت کا داعی اپنا صُور پھونکے گا اور یہ قبروں سے نکل کر تیزی سے اس طرح اس کی طرف لپکیں گے گویا وہ دوڑ کے معین نشانیوں کی طرف بھاگ رہے ہیں مطلب یہ ہے کہ اس دن ان کے سارے کس بل نکل جائیں گے اور یہ کج روی ان کی ختم ہو جائے گی۔ قیامت کے داعی کی پکار پر جس طرح لوگ اس طرف بھاگیں گے اس کی تصویر قرآن میں یوں کھینچی گئی ہے: يَوْمَئِذٍ

يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ (طٰہٰ ۲۰ : ۱۰۸) (جس دن وہ داعی کی پکار کی پیروی بغیر کسی کجی کے کریں گے) یعنی جس طرح تیر سیدھا اپنے معین ہدف کی طرف جاتا ہے اسی طرح یہ داعی کی طرف لپکیں گے۔ عام طور پر لوگوں نے 'نُصُب' سے معبودوں کے تھان اور استھان مراد لیے ہیں لیکن اول تو یہ اس لفظ کا معنی مفہوم ہے دوسرے تھان یا استھان کی طرف دوڑنے کا کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ مشرکین کے متعلق اس قسم کی کوئی روایت بھی میرے علم میں نہیں ہے۔

خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ (۴۴)

یعنی آج تو اللہ کا رسول اس دن سے ان کو ڈراتا ہے تو اس کا منہ نوچنے کو دوڑتے ہیں لیکن جب قیامت کا داعی ان کو پکارے گا تو یہ اس کی طرف اس طرح لپکیں گے کہ خوف سے ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی اور ان کے چہروں پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی ـــــ فرمایا کہ یہ وہ دن ہوگا جس کی ان کو وعید سنائی جاتی رہی ہے۔ یہاں اس سوال کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جو پہلی آیت میں 'سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ' کے الفاظ سے نقل ہوا ہے۔ اس کے ضروری پہلوؤں پر بحث اور اس کی تصویر کے بعد یہ آخری آیت میں اس کا جواب دے دیا کہ یہ ہے وہ عذاب کا دن جس سے ان کو ڈرایا جاتا رہا لیکن وہ اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ اس طرح شروع سے آخر تک تمام کلام مربوط ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد
۲۔ ستمبر ۱۹۷۸ء
۲۷۔ رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۷۱

نوح

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ ـــــ المعارج ـــــ میں آپ نے دیکھا کہ عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی تلقین ہے۔ اس سورہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے مراحل، ان کے طویل صبر و انتظار اور بالآخر ان کی قوم کے مبتلائے عذاب ہونے کی سرگزشت اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ اور مقصود اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھ دینا ہے جس میں آپ بھی دیکھ لیں کہ اللہ کے رسول کو اپنی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے صبر و انتظار کے کن زہرہ گداز مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ساتھ ہی آپ کی قوم بھی دیکھ لے کہ اللہ تعالیٰ جلد بازوں کی جلد بازی اور ان کے طنز و طعن کے باوجود ان کو ڈھیل اگرچہ ایک طویل مدت تک دیتا ہے لیکن بالآخر پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو اس طرح پکڑتا ہے کہ کوئی ان کو چھڑانے والا نہیں بنتا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اور ان کا نظم بالکل واضح ہے اس وجہ سے تجزیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک صرف حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے مراحل، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بیان ہوئے ہیں۔ صرف بعض آیات بیچ میں موقع کی مناسبت سے بطور تضمین آئی ہیں۔ ان کی نوعیت تفسیر میں، ان شاء اللہ، واضح ہو جائے گی۔

سورۃ نوح (۷۱)

مَكِّيَّةٌ ______ آیات : ۲۸

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ آیات
أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١﴾ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ ۱-۲۸
مُّبِينٌ ﴿٢﴾ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ ﴿٣﴾ يَغْفِرْ لَكُم مِّن
ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا
جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ ۖ لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ وقف لازم
قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ﴿٥﴾ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا ﴿٦﴾
وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ
وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ﴿٧﴾
ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ﴿٨﴾ ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ
إِسْرَارًا ﴿٩﴾ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ﴿١٠﴾
يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا ﴿١١﴾ وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَالٍ
وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَارًا ﴿١٢﴾
مَّا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ﴿١٣﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ﴿١٤﴾

أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا ﴿١٥﴾ وَّ
جَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿١٦﴾
وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ﴿١٧﴾ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا
وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ﴿١٨﴾ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ بِسَاطًا ﴿١٩﴾
لِّتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿٢٠﴾ قَالَ نُوحٌ رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي ع ۲۰ ۹
وَاتَّبَعُوا مَن لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا ﴿٢١﴾ وَمَكَرُوا
مَكْرًا كُبَّارًا ﴿٢٢﴾ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا
سُوَاعًا وَّلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴿٢٣﴾ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا
وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا ﴿٢٤﴾ مِّمَّا خَطِيئَاتِهِمْ أُغْرِقُوا
فَأُدْخِلُوا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوا لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَنصَارًا ﴿٢٥﴾
وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾
إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا
كَفَّارًا ﴿٢٧﴾ رَّبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ
بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ
إِلَّا تَبَارًا ﴿٢٨﴾ قف ع ۲ ۱۵

ترجمۂ آیات ۱ - ۲۸

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا کہ اپنی قوم کو، قبل اس کے کہ اس پر ایک دردناک عذاب آ جائے، ہوشیار کر دو۔ اس نے پکارا کہ اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لیے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں کہ اللہ کی بندگی کرو،

اس کے حدود کی پابندی کرو اور میری بات مانو۔ اللہ تمھارے (پچھلے گناہ) معاف کر دے گا اور تم کو مہلت دے گا ایک معین مدت تک۔ بے شک اللہ کی مقرر کی ہوئی مدت جب آ جائے گی تو وہ ٹالے نہیں ٹلے گی۔ کاش کہ تم اس کو سمجھتے! ۱-۴

نوح نے اپنے رب سے دعا کی، اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو شب و روز پکارا لیکن میری پکار نے ان کے گریز ہی میں اضافہ کیا۔ اور میں نے جب جب ان کو توبہ کی دعوت دی کہ تو ان کو بخشے، انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں، اپنی چادریں اپنے اوپر لپیٹ لیں، اپنی ضد پر اڑ گئے اور نہایت گھمنڈ کا اظہار کیا۔ پھر میں نے ان کو ڈنکے کی چوٹ پکارا۔ پھر میں نے ان کو کھلم کھلا بھی سمجھایا اور چپکے چپکے بھی میں نے کہا، اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو، بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر اپنے ابرِ رحمت کے ڈونگڑے برسائے گا اور مال و اولاد سے تمھیں فروغ بخشے گا اور تمھارے واسطے باغ پیدا کرے گا اور نہریں جاری کرے گا۔ ۵-۱۲

تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی عظمت کے ظہور کے متوقع نہیں ہو! حالانکہ اس نے تم کو خلقت کے مختلف مراحل سے گزارا! کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کس طرح اس نے بنائے تہ بہ تہ سات آسمان اور چاند کو ان کے اندر روشنی بنایا اور سورج کو چراغ اور اللہ ہی نے تم کو زمین سے اگایا خاص اہتمام سے۔ پھر وہ تم کو اسی میں لوٹاتا ہے اور اسی سے تم کو نکالے گا بے روک اور اللہ ہی نے تمھارے لیے زمین کو ہموار بنایا کہ تم اس کی کھلی راہوں میں چلو۔ ۱۳-۲۰

نوح نے دعا کی، اے میرے رب! انھوں نے میری نافرمانی کی اور ان لوگوں کی

پیروی کی جن کے مال اور جن کی اولاد نے ان کے خسارے ہی میں اضافہ کیا اور انھوں نے بڑی بڑی چالیں چلیں اور کہا کہ ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو اور ہرگز نہ چھوڑو ود کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو اور انھوں نے ایک خلقِ کثیر کو گمراہ کر ڈالا۔ اور اب تو ان گمراہوں کی گمراہی میں ہی اضافہ کر۔ ۲۱-۲۴

وہ اپنے گناہوں کی پاداش ہی میں غرق کیے گئے پانی میں، پھر داخل کیے گئے آگ میں۔ پس اللہ کے مقابل میں انھوں نے کسی کو اپنا مددگار نہیں پایا۔ ۲۵

اور نوح نے دعا کی، اے میرے رب! تو زمین پر ان کافروں میں سے ایک متنفّس کو بھی نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور نابکاروں اور کافروں ہی کو جنم دیں گے۔ اے میرے رب! میری مغفرت فرما، میرے ماں باپ کی مغفرت فرما اور جو میرے گھر میں مومن ہو کر داخل ہوں ان کی مغفرت فرما اور تمام مومنین و مومنات کی مغفرت فرما اور کافروں کی ہلاکت ہی میں اضافہ کر! ۲۶-۲۸

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦٓ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱)

قوموں کے معاملہ میں سنتِ الٰہی

یہ اس سنتِ الٰہی کا بیان ہے جس کی وضاحت قرآن مجید میں جگہ جگہ ہوئی ہے کہ جب کسی قوم کا اخلاقی فساد اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کن عذاب کی مستحق ہو گئی ہے تو عذاب بھیجنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر اپنا ایک رسول بھیج کر اس پر اپنی حجت تمام کر دی ہے تاکہ کسی کے پاس گمراہی میں پڑے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اسی سنت کے مطابق اس نے قومِ نوح پر عذاب بھیجنے سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا کہ اپنی قوم کو اچھی طرح آگاہ کر دیں کہ اللہ کا عذاب آیا ہی چاہتا ہے۔ اس سے نجات مطلوب ہے تو لوگ اپنی گمراہی کی روش چھوڑ کر اس

طریقہ کی پیروی کریں جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں ورنہ یاد رکھیں کہ اللہ کے قہر سے کسی کے بچنے کی بھی کوئی راہِ فرار نہیں ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۲)

'نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے[1]۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی قوم کو آگاہ کیا کہ جس طرح ایک نذیرِ عریاں اپنی قوم کو حملہ آور دشمن سے آگاہ کرتا ہے اسی طرح میں تمہارے لیے ایک نذیرِ مبین ہوں اور اللہ نے مجھے تمہاری طرف اس لیے بھیجا ہے کہ میں تمہیں اس عذاب سے ہوشیار کر دوں جو تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا انذار

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ (۳)

یہ اس انذار کی تفصیل ہے کہ اللہ کی بندگی کرو، اس کے مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی سے بچو اور میری اطاعت کرو۔

'اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ' یعنی اپنے خود تراشیدہ معبودوں کی (جن کی تفصیل اسی سورہ میں آگے آ رہی ہے) پوجا چھوڑو اور اپنے ربِ حقیقی، اللہ واحد کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

'وَاتَّقُوْهُ' یعنی اللہ نے جو حدود و قیود تمہاری زندگی کی رہنمائی کے لیے مقرر کیے ہیں ان کی پابندی کرو کہ اس کے غضب سے محفوظ رہو۔ 'تقویٰ' کا اصل مفہوم جیسا کہ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے، زندگی کے ہر شعبہ میں، اپنی شریعت کے ذریعہ سے جو حدود قائم فرما دیے ہیں، بندہ ان کا پورا احترام کرے اور ان کی خلاف ورزی سے برابر ڈرتا رہے۔ جو لوگ ان حدود کی خلاف ورزی میں بے باک ہو جاتے ہیں بالآخر وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی زد میں آ جاتے ہیں۔

'وَاَطِيْعُوْنِ' یعنی اپنے مفسد لیڈروں کی اطاعت چھوڑ کر میری اطاعت کرو۔

آگے اسی سورہ میں ان مفسد لیڈروں کا ذکر آ رہا ہے۔ حضرت نوحؑ نے قوم کو یہ آگاہی بھی دی کہ تمہارے لیڈر تمہیں خدا کے عذاب کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اگر اس عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو ان کی پیروی چھوڑو اور میں جس راہ کی دعوت دے رہا ہوں اس کو اختیار کرو۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے تین بنیادی ارکان اس آیت میں بیان ہوئے ہیں: توحید، شریعتِ الٰہی کی پابندی اور رسول کی اطاعت ــــ انہی تین ارکان پر تمام رسولوں کی دعوت مبنی رہی ہے۔ انہی کے استحکام پر دین کے استحکام کا انحصار ہے۔ جب تک کوئی قوم ان پر استوار رہتی ہے حضرت نوحؑ کی دعوت کے تین ارکان

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن جلد سوم، صفحہ ۳۸۲؛ تدبر قرآن جلد چہارم، صفحہ ۴۰۔

اس کے قدم جادۂ مستقیم پر استوار رہتے ہیں۔ جہاں اس سے قدم ہٹے اس کی راہ کج ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اصل راہ سے اتنی دور ہو جاتی ہے کہ اس کے لیے بازگشت کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ پھر وہ بہتر سے بہتر ناصحوں کی نصیحت بھی ٹھکرا دیتی ہے اور بالآخر خدا کے عذاب کی گرفت میں آجاتی ہے۔

يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ ۖ لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (۴)

زبان کی ایک بحث

یعنی اگر تم نے میری یہ تینوں باتیں مان لیں تو اللہ تعالیٰ تمہارے ان جرائم کو معاف کر دے گا جن کے سبب سے تم مستحقِ عذاب قرار پائے ہو اور ایک معین مدت تک کے لیے تم کو اس دنیا میں کھانے بسنے کی مہلت مل جائے گی۔

'يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ' میں حرف 'مِنْ' کو بعض لوگوں نے زائد قرار دیا ہے اور بعض لوگوں نے اس کو 'عَنْ' کے معنی میں لیا ہے لیکن یہ دونوں رائیں عربیت کے خلاف ہیں۔ قرآن میں کوئی حرف بھی زائد نہیں ہے۔ اگر کہیں کوئی حرف بظاہر زائد نظر آتا ہے تو وہ بھی زبان کے معروف ضابطہ کے تحت کسی خلا کو بھرنے کے لیے آیا ہے۔ اس طرح کے حروف مخصوص ہیں۔ ہر حرف کو بغیر کسی سند کے زائد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ 'مِنْ' کے زائد آنے کی کوئی مثال قرآن یا مستند کلام میں موجود نہیں ہے۔

اسی طرح اس کو 'عَنْ' کے معنی میں لینا بھی ایک بالکل بے سند بات ہے۔ اول تو اس کے 'عَنْ' کے معنی میں آنے کی کوئی قابلِ اعتماد مثال موجود نہیں ہے اور پھر بھی 'غَفَرَ' کا صلہ 'عَنْ' کے ساتھ نہیں آتا۔ آپ دعا میں کہتے ہیں: 'رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا' یوں نہیں کہتے کہ 'اغْفِرْ لَنَا عَنْ ذُنُوبِنَا'۔ اگر یوں کہیں گے تو اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہ تاویل کرنی پڑے گی کہ یہاں 'غَفَرَ' لفظ 'صَفَحَ' یا اس کے ہم معنی کسی ایسے لفظ پر متضمن ہے جس کا صلہ 'عَنْ' کے ساتھ آتا ہے۔ اس کے بغیر 'غَفَرَ' کے ساتھ 'عَنْ' کا استعمال عربیت کے خلاف ہو گا۔

میرے نزدیک یہاں 'مِنْ' اپنے معروف معنی یعنی تبعیض ہی کے لیے آیا ہے۔ پوری بات گویا یوں ہے کہ 'يَغْفِرْ لَكُمْ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذُنُوبِكُمْ' (اگر تم میری باتیں مان لو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے وہ سارے گناہ معاف فرما دے گا جو اب تک تم سے صادر ہوئے ہیں)۔ یہاں وضاحتِ قرینہ کی بنا پر 'مَا تَقَدَّمَ' کے الفاظ حذف ہو گئے ہیں اس لیے کہ یہ بات معلوم بھی ہے اور عقلاً معقول بھی کہ کفر کے بعد ایمان کی زندگی اختیار کرنے سے آدمی کے وہ گناہ، معاف ہو جاتے ہیں جو جاہلیت کی زندگی میں اس سے صادر ہوئے ہوتے ہیں۔ رہے وہ گناہ جن کا ارتکاب آدمی ایمان کی زندگی اختیار کرنے کے بعد کرتا ہے تو ان کے معاف ہونے کے لیے ایک مخصوص ضابطہ ہے جو آیت

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (النساء - ۴: ۱۷)

میں بیان ہوا ہے اور جس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس آیت میں حرف 'مِنْ' اسی حقیقت کے اظہار کے لیے آیا ہے کہ اگر تم اس دعوت کو قبول کر کے ایمان میں داخل ہو جاؤ گے تو دورِ جاہلیت کے تمہارے سارے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ اگر یہ 'مِنْ' یہاں نہ ہوتا تو آیت کے یہ معنی بھی نکل سکتے تھے کہ تمہارے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ درآنحالیکہ یہ بات صحیح نہیں ہے اس لیے کہ کفر کے بعد ایمان صرف پچھلے گناہوں ہی کا ہادم بنتا ہے، آگے کے گناہوں کا ہادم نہیں بنتا۔

اس دنیا کی ہر فرصت فانی ہے

وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى: یعنی میری یہ تینوں باتیں مان لو گے تو اللہ تعالیٰ اس عذاب کو جس سے میں ڈرا رہا ہوں، ٹال دے گا اور تمہیں اس دنیا میں جینے اور کھانے پینے کی ایک معین مدت تک مہلت دے دے گا۔

'معین مدت' کی قید اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ اس دنیا میں کوئی مہلت بھی غیر محدود نہیں ہے۔ یہ دنیا اور اس کی ہر چیز وقتی اور فانی ہے۔ آدمی ایمان و عمل صالح کی زندگی گزارے جب بھی اس کو یہاں غیر محدود زندگی نہیں مل جاتی بلکہ لازماً وہ ایک دن اپنی جان جانِ آفریں کے حوالہ کرتا ہے۔ البتہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے کسی عذاب سے نہیں ہلاک ہوتا بلکہ وہ اپنی مہلتِ حیات سے بہرہ مند ہونے کی فرصت پاتا ہے۔ اسی طرح کوئی قوم اگر ایمان، تقویٰ اور اطاعتِ رسول کی زندگی اختیار کرتی ہے تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ اسی وقت تک بہرہ مند رکھتا ہے جب تک وہ ایمان و تقویٰ پر استوار رہتی ہے۔ جوں ہی وہ اس سے منحرف ہوتی ہے اس پر زوال کے آثار طاری ہونے شروع ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ جب اس کا اخلاقی زوال اس نقطہ پر پہنچ جاتا ہے جو آخری ہے تو اس کی 'اجل مسمّی' پوری ہو جاتی ہے اور قومی حیثیت سے اس کا وجود صفحۂ ارض سے مٹ جاتا ہے۔ یہی حال اس مجموعی دنیا کا بھی ہے۔ اس کی مدت بھی معین و مقرر ہے۔ ایک دن آئے گا جب اس دارالامتحان کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور ایک نیا عالم نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ ظہور میں آئے گا جس کو دارِ آخرت کہتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے یہاں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس دنیا کی ہر فرصت بہرحال محدود اور فانی ہے۔ نیک اور بد دونوں ہی اس کو ہمیشہ مستحضر رکھیں۔ جو اس کو مستحضر رکھیں گے وہ اس زندگی کی مہلت سے فائدہ اٹھائیں گے جو اس کو بھول جائیں گے ان کے لیے یہ دنیا سرتاسر وبال اور خسران ہے۔

لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ اس زندگی کی فوز وفلاح کا اصل راز اسی نکتہ کے اندر مضمر ہے لیکن اس کو سمجھنے والے بہت تھوڑے ہیں اس وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ کاش! تم لوگ اس کو جانتے اور سمجھتے!

اس آیت میں جو سنتِ الٰہی بیان ہوئی ہے اس کا حوالہ سورۂ نحل آیت ۶۱ میں بھی گزر چکا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۙ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا (۵-۶)

حضرت نوحؑ کی دعوت کا دوسرا مرحلہ

یہاں سے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے دوسرے مرحلہ کا بیان آ رہا ہے جب آپ نے اپنے رب سے استغاثہ کیا ہے کہ ان کی شب و روز کی ساری تگ و دو جو دعوت کی راہ میں انھوں نے کی وہ قوم پر بالکل بے اثر رہی۔ یہ امر واضح رہے کہ جتنی طویل مدت تک حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دی ہے اس کی کوئی اور مثال معلوم نہیں ہے۔ قرآن میں تصریح ہے کہ 'فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا' (العنکبوت - ۲۹: ۱۴) (پس وہ اپنی قوم کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار سال رہا)۔

'دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا' کے الفاظ میں بھی ظاہر ہے کہ کسی مبالغے کا شائبہ نہیں ہو سکتا۔ رسول چونکہ اپنی قوم کے لیے عدالت بن کر آتا ہے، اس کی تصدیق یا تکذیب ہی پر اس کی قوم کی زندگی یا موت کا انحصار ہوتا ہے اس وجہ سے یوں تو ہر رسول نے دعوت کی راہ میں اپنے رات دن ایک کر دیے ہیں اور اپنی طاقت کا ایک ایک قطرہ نچوڑ دیا ہے لیکن حضرت نوح علیہ السلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ نے جتنی طویل مدت تک اپنی قوم کو جھنجھوڑا اور جگایا، اس کی کوئی مثال، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا جو حاصل رہا وہ خود آپ ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ 'فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا' (جتنا ہی زیادہ میں نے ان کو پکارا وہ اتنا ہی زیادہ مجھ سے بھاگے)۔ یہ گریز و فرار ظاہر ہے کہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت میں کوئی بات عقل و فطرت کے خلاف تھی یا ان کی قوم کے لوگوں کو ان کے خلوص اور ان کی راستبازی میں کوئی شبہ تھا۔ ان کی دعوت کی معقولیت بھی ہر شخص پر واضح تھی اور ان کی صداقت کا بھی ہر شخص اپنے دل میں معترف تھا لیکن ان کی دعوت چونکہ نفس کی خواہشوں کے خلاف تھی اور اس کے قبول کرنے سے قوم کے لیڈروں کے استکبار پر چوٹ پڑتی تھی اس وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام نے جتنا ہی ان کا تعاقب کیا اتنا ہی وہ بھاگے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ حضرت نوحؑ کی باتوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے اور اپنی زندگی کو بدلنا ان کے لیے ناممکن ہے تو سلامتی گریز و فرار ہی میں ہے تاکہ اپنے مجرم ضمیر کو احساسِ جرم کی اذیت سے بچا سکیں۔ اگرچہ یہ تدبیر ایک اچھی تدبیر ہے لیکن حقیقت سے

فرار اختیار کرنے والوں کے پاس اس کے سوا کوئی دوسری تدبیر اور کیا ہو سکتی ہے!

وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا (۷)

دعوت سے قوم کے فرار کی تصویر

یہ قوم کے گریز و استکبار کی تصویر ہے اور پیش نظر قوم کے مستکبرین ہیں۔ فرمایا کہ میں نے جب جب ان کو پکارا کہ وہ توبہ و استغفار کریں تاکہ تو ان کی مغفرت فرمائے تو انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں، اپنے اوپر اپنی چادریں لپیٹ لیں، اپنی بات پر اڑ گئے اور نہایت گھمنڈ کا اظہار کیا۔

'دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ' میں کلام کا کچھ حصہ بتقاضائے بلاغت حذف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جب جب میں نے لوگوں کو توبہ و استغفار کی دعوت دی تاکہ وہ استغفار کر کے تیری مغفرت کے مستحق بنیں تو انھوں نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیں۔ لیکن یہ بات یوں کہنے کے بجائے حضرت نوح علیہ السلام نے فعل کی جگہ ثمرۂ فعل کو رکھ دیا ہے تاکہ قوم کی بدبختی و محرومی پوری طرح واضح ہو جائے کہ میں نے تو ان کو تیری رحمت و مغفرت کا حقدار بنانے کے لیے بلایا لیکن یہ ایسے شامت کے مارے نکلے کہ انھوں نے میری بات سننی ہی گوارا نہ کی۔

'وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ' یہ لیڈروں کے غرور و استکبار کی تصویر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جوں ہی انھوں نے میری بات سنی نہایت بیزاری کے ساتھ اپنے اوپر اپنی چادر لپیٹی اور وہاں سے چل دیے۔

'وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا' 'اَصَرُّوْا' کے بعد بھی مصدر محذوف ہے یعنی 'اَصَرُّوْا اِصْرَارًا' چونکہ 'اسْتَكْبَرُوْا' کے بعد مصدر کی وضاحت ہو گئی ہے اس وجہ سے ایک جگہ اس کو حذف کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ میری دعوتِ استغفار قبول کرنے کے بجائے اپنے شرک و عصیان ہی پر جم گئے۔ اس کی وضاحت آیت ۲۲ میں آ رہی ہے۔

استکبار کا مفہوم

'اِسْتِكْبَارٌ' کا مفہوم جانتے بوجھتے حق کی مخالفت اور اس کے مقابل میں سرکشی ہے۔ حق چھوٹا ہو یا بڑا خدا کو محبوب و مطلوب ہے اس وجہ سے بندے کا فرض یہی ہے کہ اس کے آگے سر جھکا دے اگرچہ یہ نفس پر کتنا ہی شاق کیوں نہ گزرے۔ اگر کوئی شخص حق کے مقابل میں اکڑ دکھاتا ہے تو وہ سنتِ ابلیس کا پیرو ہے اور وہ اسی کا ساتھی بنے گا۔

یہ استکبار کا ذکر ان کی ان حرکتوں کی اصل علت کی حیثیت سے ہوا ہو اس سے پہلے مذکور ہوئی ہیں۔ یعنی کانوں میں انگلیاں دے لینا، اپنے اوپر اپنی چادریں لپیٹ لینا اور اپنے شرک پر اڑ جانا اس وجہ سے ہوا کہ ان کے اندر سخت استکبار تھا جس کا انھوں نے مظاہرہ کیا۔

ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۙ ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا (۸-۹)

دعوت کا تیسرا مرحلہ

یہ نہایت بلیغ الفاظ میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعوت کے تیسرے مرحلہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جب میں نے دیکھا کہ انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی ہیں اور اپنے اوپر اپنی چادریں بھی لپیٹ لی ہیں تو میں نے بھی اپنی دعوت کے لب و لہجہ کو تیز سے تیز تر اور بلند سے بلند تر کر دیا۔ ع

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی!

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقِ دعوت یہی رہا ہے کہ ان کی قوم کی بیزاری دعوت سے جتنی ہی بڑھتی گئی ہے اتنا ہی ان کا جوشِ دعوت مضاعف، ان کا لب و لہجہ بلند، جھنجھوڑنے والا اور پرجوش ہوتا گیا ہے۔ حق اور اہلِ حق کی فطرت یہی ہے، مزاحمت کی شدت حق کی سطوت کو نمایاں کرتی اور اہلِ حق کے ولولہ کو دبانے کے بجائے ابھارتی ہے۔ ع

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

'ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا' یعنی جہاں ڈنکے کی چوٹ بات کہنے کی ضرورت ہوئی وہاں میں نے بے دریغ ڈنکے کی چوٹ اپنی بات سنائی تاکہ بہروں تک بھی میری آواز پہنچ جائے اور جہاں دیکھا کہ ان کے اندر گھس کر کچھ سنانے سمجھانے کا موقع ہے تو میں نے یہ طریقہ بھی آزمایا تاکہ جن میں زندگی کی کچھ رمق باقی ہے وہ چاہیں تو فیصلہ کی گھڑی آنے سے پہلے پہلے اپنے انجام کی فکر کر لیں۔ غرض میں نے نرم و گرم اور پوشیدہ و علانیہ ہر پہلو سے لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کی ہے تاکہ فرضِ بلاغ میں کوئی کوتاہی نہ رہ جائے۔

'اَعْلَنْتُ لَهُمْ' کے بعد بھی میرے نزدیک مصدر محذوف ہے جس طرح اوپر 'اَصَرُّوْا' کے بعد محذوف ہے۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ وَّیُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَیَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّیَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (۱۰-۱۲)

دعوت میں دل سوزی

یہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی اس دعوت کی وضاحت فرمائی ہے جو نہایت دل سوزی اور محبت سے انھوں نے اپنی قوم کو دی۔ فرمایا کہ میں نے ان کو سمجھایا کہ لوگو، اپنے رب سے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگو، ہر چند تمہارے گناہ بہت ہیں لیکن اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو، وہ بڑا ہی مغفرت فرمانے والا ہے۔

'اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا' میں یہ مضمون بھی مضمر ہے کہ اس کی مغفرت حاصل کرنے کے لیے اس کی طرف تمہارا رجوع ہی کافی ہے، تمہارے مزعومہ دیویوں دیوتاؤں کی سفارش کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بڑا ہی غفار ہے۔ صدقِ دل سے مغفرت مانگنے والوں کو کسی سفارش کے بغیر وہ خود ہی اپنے دامنِ رحمت میں چھپا لیتا ہے۔

خدا سے بڑا کوئی غفار نہیں کہ اس کی سفارش چاہی جائے

یہ امر یہاں واضح رہے کہ ہر دور کے مشرکین اس غلط فہمی میں بھی مبتلا رہے ہیں کہ خدا کی سرکار چونکہ بہت بلند ہے اس وجہ سے جب تک کچھ سفارشی نہ ہوں ہر شخص کے لیے اس سے اپنی التجا و درخواست منظور کرانا ممکن نہیں ہے۔ 'مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى' (الزمر - ۳۹ : ۳) (ہم ان معبودوں کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب تر کر دیں) ان کے اسی خیال کی ترجمانی ہے۔ قرآن نے ان کے اس وہم کی مختلف پہلوؤں سے تردید کی ہے۔ یہاں 'اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا' میں بھی اسی کی تردید ہے کہ جب وہ خود ہی سب سے بڑا مغفرت فرمانے والا ہے تو اس سے بڑا غفار کون ہے جس کو اس کے پاس کوئی سفارشی بنا کر لے جائے گا۔

استغفار کی برکت

'يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا' لفظ 'سَمَآء' جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، ابرِ باراں کے لیے بھی آتا ہے۔ 'مِدْرَارًا' کے معنی 'کثیر الدر' یعنی خوب برسنے والے کے ہیں۔ یہ مذکر و مؤنث دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا استغفار تمہارے رب کی رحمت کو جوش میں لائے گا اور وہ تمہیں رزق کی فراوانی اور مال و اولاد کی کثرت سے بہرہ مند کرے گا۔

مشرکین کے بعض اوہام کی تردید

مشرکین اس وہم میں بھی مبتلا تھے کہ بارش ان کے دیوتا برساتے ہیں اور اولاد ان کی برکت و عنایت سے ملتی ہے اس وجہ سے وہ ان کے خلاف ایک لفظ بھی کہنے یا سننے سے بہت ڈرتے تھے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ اشارہ ہے کہ انھوں نے رسولوں کی مخالفت اس اندیشہ کی بنا پر بھی کی ہے کہ وہ بتوں کی ہجو کرتے ہیں جس سے وہ ناراض ہو جائیں گے اور اپنی عنایات سے خلق کو محروم کر دیں گے۔ یہاں تک کہ رسول کے دور میں اگر انھیں کوئی آزمائش پیش آئی تو اس کو انھوں نے العیاذ باللہ رسول اور اس کے ساتھیوں ہی کی نحوست پر محمول کیا کہ انھوں نے دیوتاؤں کو ناراض کر دیا ہے اس وجہ سے فلاں افتاد پیش آئی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے اس ارشاد سے ان کے اس وہم پر بھی ضرب لگائی کہ بارش اور مال و اولاد کے خزانوں پر تمہارے دیوی دیوتا قابض نہیں ہیں کہ تم نے ان کو چھوڑ دیا تو وہ تم کو ان نعمتوں سے محروم کر دیں گے۔ ان سب چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور اس کی رحمت توبہ و استغفار سے حاصل ہوتی ہے۔ تم یہ کام کرو اور پھر دیکھو کہ کس طرح اس کی رحمت کی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آتی اور تم پر برستی ہیں! سورۂ ہود آیت ۵۲ میں بھی یہ مضمون گزر چکا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

یہاں حکمتِ دین کا ایک نکتہ بھی حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے جو سیدنا عمر فاروقؓ کے افادات سے ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ نمازِ استسقاء میں صرف استغفار پر کفایت فرمائی، دعا میں بارش کا کوئی ذکر نہیں آیا تو لوگوں نے پوچھا کہ امیر المومنین! آپ نے دعا میں بارش کا تو کوئی ذکر کیا ہی نہیں! امیر المومنینؓ نے انہی آیات کی روشنی میں لوگوں کو بتایا کہ خدا کی رحمت کی کلید استغفار ہے اور یہ کام ہم نے کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ استغفار ہی جالبِ رحمت بنے گا۔ ہماری ضرورت اور

احتیاج کو ہمارا رب خود تم سے بہتر جانتا ہے۔

وَّيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (۱۲)

اسی اوپر والے مضمون کی یہ مزید توسیع ہے کہ مال، اولاد، باغ اور نہریں سب خدا ہی کے دیے ملتی ہیں۔ اگر تم توبہ و استغفار سے اپنے رب کو راضی رکھو گے تو یہ ساری چیزیں تمھیں ملیں گی۔ ان میں سے کوئی چیز بھی تمھارے یہ دیوی دیوتا نہیں دیتے کہ وہ راضی نہ رہے تو نہیں دیں گے یا دے کر چھین لیں گے۔

ہٹ دھرموں کی بلادت پر اظہارِ تعجب

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا میں فعل کے اظہار اور اس کی تکرار سے ان نعمتوں کی گراں قدری اور محبوبیت کا جو مضمون پیدا ہوتا ہے وہ عربیت کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (۱۳)

یہ قوم کے ہٹ دھرموں کی بلادت پر اظہارِ تعجب ہے کہ میں جو تمھیں اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر استغفار کی دعوت دے رہا ہوں تو آخر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم کانوں میں تیل ڈالے پڑے ہو اور میری سنی ان سنی کیے دے رہے ہو! کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اسی طرح اپنی دلچسپیوں میں مگن رہو گے اور جس رب نے تمھیں یہ سب کچھ دے رکھا ہے اس کا جلال، تمھاری بدمستیوں کے باوجود کبھی ظہور میں نہیں آئے گا! مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمھاری نگاہوں میں اس کی عظمت و جلالت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ تم اس کو العیاذ باللہ بالکل بے حس، بے حمیت اور بے بس خیال کیے بیٹھے ہو کہ اس کی دنیا میں جو دھاندلی چاہو مچاتے پھرو لیکن اس کی غیرت و حمیت کبھی جوش میں نہیں آئے گی۔ بعینہٖ یہی مضمون 'مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ' (الانفطار ۸۲: ۶) (اے انسان! تجھ کو تیرے ربِّ کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے) والی آیت میں بیان ہوا ہے۔ یعنی انسان جب اپنے دائیں بائیں نعمتوں کے انبار دیکھتا ہے اور یہ بھی دیکھتا ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے لیکن اس کی پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو وہ آہستہ آہستہ ڈھیٹ ہو کر خدا کی پکڑ سے بالکل نچنت ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ سوچتا تو آسانی سے سمجھ سکتا تھا کہ خدا نے اس کے لیے اپنی کریمی کی یہ شانیں دکھائی ہیں تو اس لیے نہیں دکھائی ہیں کہ وہ اس کی دنیا میں دھاندلی مچائے بلکہ ان نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار اور اس امر کا منتظر رہے کہ ایک دن ان نعمتوں کے باب میں اس سے پرسش ہونی ہے اور اس دن ناشکروں اور نافرمانوں کو اس کی پکڑ سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

'تَرْجُوْنَ' کے معنی یہاں منتظر اور متوقع رہنے کے اور 'وَقَار' کے معنی عظمت، شان اور جلال کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ میں جمال کی صفات کے ساتھ جلال کی صفات بھی ہیں جو ان لوگوں کے لیے ظاہر ہوتی ہیں جو اس کے رسولوں کی نافرمانی کرتے اور اس کے آگے اکڑتے ہیں۔ صراطِ مستقیم پر استوار رہنے کے لیے

ضروری ہے کہ انسان ان دونوں ہی قسموں کی صفات کی یادداشت تازہ رکھے۔ اگر ان میں عدم توازن پیدا ہو جائے تو آدمی کا ذہن صفاتِ الٰہی کے باب میں غیر متوازن ہو جاتا ہے جس سے اس کی ساری زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ یہاں خطاب چونکہ سرکشوں سے ہے اس وجہ سے صرف صفتِ جلال ہی کا حوالہ دیا ہے۔

وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا (۱۴)

عظمتِ الٰہی کے ظہور کی دلیل

یہ دلیل ہے اس بات کی کہ خدا کی عظمت کے ظہور کا دن کوئی مستبعد اور ناممکن چیز نہیں ہے۔ فرمایا کہ اگر تم اپنی ہی خلقت کے تمام مراحل پر غور کرو تو نہایت آسانی سے سمجھ سکتے ہو کہ جس خدا نے تو تمہارے وجود کے اندر اپنی قدرت کی یہ شانیں دکھائی ہیں اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ تمہارے مرکھپ جانے کے بعد از سرِ نو تمہیں اٹھا کھڑا کرے اور تم اپنی آنکھوں سے اس کا جلال دیکھو کہ سرکشوں اور باغیوں کو وہ کس طرح کیفرِ کردار کو پہنچاتا ہے۔ یہ دلیل بعینہٖ اسی سیاق و سباق میں، قیامت ہی کے اثبات کے پہلو سے، قرآن کے دوسرے مقامات میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔ سورۂ حج میں فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ	اے لوگو! اگر تم مرنے کے بعد اٹھائے جانے کے
مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ	بارے میں شک میں ہو تو سوچو کہ ہم نے تم کو مٹی سے
تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ	پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر خون کی پھٹکی سے،
ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ	پھر مضغۂ گوشت سے، کوئی کامل، کوئی ادھورا
مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَ	ہم نے اپنی یہ شانیں اس لیے دکھائیں کہ تم پر
نُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ	اپنی قدرت واضح کر دیں اور رحموں میں ہم ٹھہراتے
مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ	ہیں جو چاہتے ہیں ایک معیّن مدت تک۔ پھر ہم
لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ۖ وَمِنْكُمْ مَّنْ	تم کو ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں پھر ہم تم
يُتَوَفَّىٰ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ	کو مہلت دیتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں
الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ	کچھ پہلے ہی مر جاتے ہیں اور تم میں سے بعض ارذل
عِلْمٍ شَيْئًا ۚ وَتَرَى الْأَرْضَ	عمر تک پہنچائے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ جاننے
هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا	کے بعد کچھ نہیں جانتے اور تم زمین کو دیکھتے ہو کہ
الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَ	وہ بالکل خشک ہوتی ہے تو جب ہم اس پر برساتے
أَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۞	ہیں بارش تو وہ لہریں لینے لگتی اور پھول جاتی ہے
ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ	اور نوع بنوع کی خوش منظر چیزیں اگاتی ہے
وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ	یہ اس وجہ سے کہ اللہ ہی کارسازِ حقیقی ہے

عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۔ اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز
(الحج - ۲۲: ۵ - ۶) پر قادر ہے۔

یہی مضمون سورۂ مومنون کی آیات ۱۲-۱۶ میں بھی بیان ہوا ہے۔ تفصیل کے طالب اس پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا (۱۵-۲۰)

چند آیتیں بطور تضمین

یہ چھ آیتیں حضرت نوح علیہ السلام کی تقریر کا حصہ بھی ہو سکتی ہیں لیکن میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ بطور تضمین اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام کی تقریر کی تکمیل کے لیے ہیں۔ اس طرح کی تضمین کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ اس کے تضمین ہونے کا قرینہ یہ ہے کہ آیت ۲۱ سے حضرت نوح کی اس تقریر کا بقیہ حصہ آ رہا ہے جس کا آغاز 'قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ' سے ہوا ہے۔ اگر آیات ۱۵-۲۰ بھی حضرت نوح علیہ السلام کی تقریر ہی کا حصہ ہوتیں تو ان کے بعد 'قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ' کے اعادہ کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اعادہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کے لیے ہے کہ اوپر کی آیات بیچ میں بطور تضمین آ گئی تھیں۔ آگے کے حصہ کو حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے ساتھ مربوط کرنے کے لیے یہ ظاہر فرمایا کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی سب سے زیادہ واضح نشانی

'اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا' یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات کی سب سے زیادہ نمایاں نشانی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو خدا یہ تہ بہ تہ ساتوں آسمان پیدا کرنے پر قادر ہو گیا کیا اس کے لیے تم کو دوبارہ پیدا کر دینا ناممکن ہو جائے گا؟ یہ وہی دلیل ہے جو 'ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا' (النازعات - ۷۹: ۲۷) (کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا جس کو بنایا) کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے اور جو ذرا مختلف اسلوب میں پچھلی سورہ کی آیات ۴۰-۴۱ میں بھی گزر چکی ہے۔

'طِبَاقًا' یعنی تہ بہ تہ۔ اس لفظ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ کپڑے کی تہوں کی طرح آسمان کی بھی سات تہیں ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ الگ الگ ایک سے ایک بلند طبقات عالم ہیں اور ان کے الگ الگ سات آسمان ہیں۔ اس طرح کی باتیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت کا ایک اجمالی تصور دینے کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ ان پر اجمالی ایمان ہی کافی ہے۔ صحیح حقیقت اس دن ظاہر ہوگی جس دن پردہ اٹھے گا۔ اس پردے کو اٹھانا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے بس میں نہیں ہے۔ ابھی ہماری سائنس کی رسائی بہت محدود ہے اور جتنی بھی اس کی رسائی ہوتی ہے اس سے حقیقت کے انکشاف

کے بجائے انسان کی حیرت ہی میں اضافہ ہوا ہے۔ اصل حقیقت آخرت ہی میں کھلے گی۔

آسمانوں کے اندر کی دو نشانیوں کی طرف اشارہ

'وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا'۔ آسمانوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد ان کے اندر کی دو عظیم نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ یہ خدا ہی ہے جس نے ان آسمانوں کے اندر چاند کو روشن اور سورج کو چراغ بنا کر رکھا ہے جن سے ان کے اندر اجالا ہوتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کے ساتھ ساتھ اس کی بے نہایت حکمت اور عالم گیر ربوبیت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر اس نے ان میں چاند کا دیا اور سورج کا چراغ نہ رکھا ہوتا تو یہ عالم ظلمات ہوتا۔ ان روشن نشانیوں کے بعد بھی جن کو آخرت ناممکن نظر آئے ان کی آنکھیں کوئی چیز بھی نہیں کھول سکتی۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اس کائنات میں خدا کی رحمت اور ربوبیت کی جو نشانیاں ہیں وہ ایک روزِ عدل کے ظہور کو واجب کرتی ہیں۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث اس کے محل میں گزر چکی ہے۔

زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ

'وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا'۔ آسمان اور اس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد یہ زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی اور سب سے پہلے زمین کی سب سے اشرف مخلوق یعنی خود انسان کو لیا۔ فرمایا کہ اللہ نے تمھیں زمین سے اگایا اور اگانے کے بعد پھر اسی میں تمھیں مرنے کے بعد لوٹا دیتا ہے اور پھر اسی سے تمھیں ایک دن نکالے گا۔

دعویٰ ہی دلیل بھی ہے

یہ قرآن کی بلاغت کا اعجاز ہے کہ اس آیت میں جو دعویٰ ہے وہی اس دعوے کی نہایت واضح دلیل بھی ہے۔ اس کے مفہوم کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جس طرح زمین سے سبزہ اگتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمھیں اسی زمین سے اگایا ہے اور جس طرح زمین سے اگنے والی چیزیں فنا ہو کر زمین میں مل جاتی ہیں اسی طرح تم بھی مر کر زمین میں مٹی بن جاتے ہو۔ پھر جس طرح تم دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے فنا شدہ سبزوں کو از سرِ نو زندہ کر دیتا ہے اسی طرح جب چاہے گا تمھیں بھی بغیر کسی زحمت کے اٹھا کھڑا کرے گا۔

'نَبَاتًا' اور 'إِخْرَاجًا' تاکیدِ فعل کے لیے آئے ہیں اور تاکیدِ فعل کے پہلو مختلف ہوتے ہیں اس وجہ سے اردو میں ان کا ترجمہ مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً 'أَنْبَتَكُمْ نَبَاتًا' کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ تمھیں زمین سے اگایا نہایت قدرت و حکمت سے۔ یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ تمھیں زمین سے اگایا نہایت آسانی سے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تمھیں زمین سے اگایا نہایت اہتمام سے۔ میں نے ترجمہ میں اہتمام اور قدرت و حکمت کے پہلو کو اختیار کیا ہے اس لیے کہ قرآن کے نظائر سے اسی پہلو کی تائید ہوتی ہے۔ اوپر 'وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا' کے تحت اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ 'يُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا' میں سہولت کے پہلو کو میں نے مدنظر رکھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ جب چاہے گا تمھیں بالکل بے روک نہایت آسانی سے اٹھا کھڑا کرے گا۔ یہ پہلو اختیار کرتے میں بھی میں نے قرآن کے نظائر ہی کو ملحوظ رکھا ہے اگرچہ

امکان دوسرے پہلوؤں کا بھی ہے لیکن اردو میں ان کا کوئی ایسا ترجمہ سمجھ میں نہیں آیا جو تمام پہلوؤں پر حاوی ہو جائے۔

زمین بجائے خود ایک عظیم نشانی ہے

'وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۙ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا' - اب یہ خود زمین کی نشانی کی طرف توجہ دلائی جس سے اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت و حکمت کا بھی اظہار ہوتا ہے اور اس کی بے نہایت رحمت و عنایت کا بھی۔ فرمایا کہ ہم نے تمہارے لیے زمین کو ایک فرش کی طرح بچھایا۔ اس کو متوازن اور پابرجا رکھنے کے لیے اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دی ہیں اور پہاڑوں کے اندر درّے اور راستے نکال دیے ہیں تاکہ تم پہاڑوں کی دیواروں کے پیچھے محصور ہو کے نہ رہ جاؤ بلکہ درّوں سے گزر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ آ جا سکو۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ زمین کے گہوارہ یا فرش بننے کے لیے اس کے اندر توازن کا پایا جانا لازمی ہے چنانچہ قرآن میں یہ تصریح ہے کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے پہاڑ اسی لیے گاڑے ہیں کہ اس کا توازن قائم رہے 'اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ' (النحل - ۱۶: ۱۵) اور 'اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا' (النبا - ۷۸: ۶-۷) اور اس مضمون کی دوسری آیات میں اسی اہتمام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ پھر مزید عنایت اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ پہاڑ گاڑے تو اس طرح کہ ان کے اندر درّے اور راستے بھی رکھے تاکہ انسان کے لیے آمد و شد کی راہیں کھلی رہیں۔ آیت میں لفظ 'فِجَاج' استعمال ہوا ہے جو 'فَجّ' کی جمع ہے۔ یہ لفظ عام راستوں کے لیے نہیں بلکہ پہاڑی درّوں اور راستوں کے لیے آتا ہے۔ سورۂ حج میں 'فَجٍّ عَمِيْقٍ' کے تحت اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا (۲۱)

تضمین کے بعد حضرت نوحؑ کی دعا کی تکمیل

تضمین کی آیات ختم ہوئیں۔ یہاں سے کلام پھر حضرت نوحؑ کی دعا سے مربوط ہو گیا۔ چنانچہ 'قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ' فرما کر یہ واضح کر دیا گیا کہ اب حضرت نوحؑ کی دعا پھر آ رہی ہے۔

حضرت نوحؑ یہ اس ردِ عمل کا ذکر فرما رہے ہیں جس کا آپ کی قوم کی طرف سے، دعوت کے تیسرے مرحلہ میں، جو اتمام حجت کا آخری مرحلہ تھا، اظہار ہوا۔ فرمایا کہ اے رب! میں نے سارے جتن کر ڈالے لیکن ان سنگ دلوں نے میری کوئی بات بھی نہیں سنی بلکہ اپنے انہی لیڈروں کی پیروی کی جن کے مال و اولاد کی کثرت نے ان کے خسارے ہی میں اضافہ کیا ہے۔ یعنی مال و اولاد نے شکرگزاری کے بجائے ان کے استکبار کو بڑھایا ہے جس کے سبب سے وہ اپنی روش پر اڑ گئے اور میری کوئی بات سننی ان کو گوارا نہیں۔ سورۂ قلم میں فرمایا ہے: 'اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۗ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ' (القلم - ۶۸: ۱۴-۱۵) (یعنی چونکہ یہ مال و اولاد والے ہیں اس وجہ سے جب ان کو رسول کی تکذیب کے انجام سے ڈرایا جاتا اور تکذیب کرنے والی قوموں کی سرگزشتیں ان کو سنائی

جاتی ہیں تو نہایت غرور سے کہتے ہیں کہ یہ اگلے وقتوں کے فسانے ہیں، ہم ان قصوں سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں۔

وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا (۲۲)

'کُبَّارٌ' مبالغہ ہے 'کَبِیْرٌ' کا۔ یعنی اپنے استکبار کے سبب سے میری دعوت کو شکست دینے، اپنے عوام کو مجھ سے برگشتہ کرنے اور میرے خلاف بھڑکانے کے لیے انھوں نے بڑی بڑی چالیں چلیں۔ ان چالوں کی یہاں کوئی تفصیل نہیں ہے لیکن ان کو سمجھنا دشوار نہیں ہے۔ ہر زمانے کے مستکبرین لوگوں کو حق سے برگشتہ کرنے کے لیے جس طرح کی چالیں چلتے ہیں ان کو سامنے رکھ کر قومِ نوح کی چالوں کا بھی نہایت آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا ۥ وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا (۲۳)

اوپر آیت ۲۱ میں قوم کے لیڈروں کی جس ضد اور ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ ہے یہ اس کی تفصیل ہے کہ میری دعوتِ توحید کے خلاف انھوں نے اپنی قوم کے عوام کو بھڑکایا کہ اس شخص کے کہنے سے اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑو۔

قومِ نوح کے بتوں کی سخت جانی

'وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا ۥ وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا'۔ یہ ان کے خاص خاص بڑے بتوں کے نام ہیں۔ ان کی خدائی کا سکہ ان کے عوام کے دلوں پر جما ہوا تھا اس وجہ سے ان کے نام لے کر انھوں نے عوام کو للکارا کہ اپنے ان بزرگ دیوتاؤں پر مضبوطی سے جمے رہو۔ اگر تم ذرا کمزور پڑے تو تمھارا دینِ آبائی خطرے میں پڑ جائے گا۔

ان بتوں کے ناموں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عربی نام ہیں۔ قومِ نوح کا مسکن شمالی حجاز تھا اس وجہ سے اس کی زبان کا عربی ہونا بعید نہیں۔ ان بتوں کی سخت جانی قابلِ داد ہے کہ طوفان نے قومِ نوح کے ایک ایک نقش کو مٹا دیا لیکن ان بتوں کی خدائی پھر بھی باقی رہی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں مختلف قبائلِ عرب میں ان بتوں کی پرستش پھر رائج ہو گئی۔ چنانچہ وَدّ قبیلہ قضاعہ کی شاخ بنی کلب کا بت تھا۔ سُواع کی پرستش قبیلہ ہُذَیل کرتا تھا۔ یَغوث قبیلہ طے کی بعض شاخوں کا بت تھا۔ یَعُوق قبیلۂ ہمدان کی ایک شاخ کا دیوتا تھا۔ نَسر قبیلہ حِمْیَر کی ایک شاخ میں پجتا تھا۔ یہاں ان بتوں کا ذکر جس ترتیب سے آیا ہے اس سے گمان ہوتا ہے کہ قومِ نوح میں ان کے مراتب کی ترتیب یہی تھی۔ یعنی وَدّ اور سُواع کا مرتبہ سب سے اونچا تھا اور یَغوث، یَعُوق اور نَسر مرتبہ میں ان سے نیچے تھے۔

وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا ۖ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا (۲۴)

حضرت نوحؑ کی بددعا

یہ حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کے لیڈروں کی روش پر غم واندوہ کا اظہار فرمایا ہے اور

ساتھ ہی ان کی زبان سے بے ساختہ یہ بددعا بھی نکلی کہ اے رب، اب ان کی ضلالت ہی میں اضافہ کرتا کہ عذاب کی سمت میں ان کی تیز روی مزید بڑھ جائے اور جلد سے جلد ان کی عفونت سے زمین پاک ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین پر بار رہنے کے لیے نہیں پیدا کیا ہے بلکہ حصول سعادت کی جدوجہد کے لیے پیدا کیا ہے۔ زمین پر اس کو اسی وقت تک باقی رہنے کا حق ہے جب تک اس کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی رہے۔ یہ رمق بالکل ختم ہو جائے تو پھر اس کا وجود زمین کے لیے لعنت ہے۔ رسول، خلق پر اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے چھاج میں پھٹکے جانے کے بعد بھس اور دانے میں پورا امتیاز ہو جاتا ہے چنانچہ وہ دانوں کو الگ کر کے بھس کو جلا دیتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعوت کے تیسرے مرحلے میں پہنچ کر دیکھ لیا کہ اس قوم میں جتنا جوہر تھا وہ نکل آیا ہے۔ اب جو باقی ہے اس کی کوئی افادیت نہیں۔ اس کے مٹ جانے ہی میں خیر ہے۔

اسی مرحلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی قوم فرعون کے لیے بددعا کی جو سورۂ یونس میں بدیں الفاظ مذکور ہے:

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ	اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو مٹا دے
وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا	اور ان کے دلوں پر پٹیاں باندھ دے کہ اب
حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (یونس - ۱۰: ۸۸)	وہ دردناک عذاب دیکھ ہی کر ایمان لائیں۔

مِمَّا خَطِيْٓئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا (۲۵)

دعا کی فوری قبولیت

یہ آیت حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کا حصہ نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی دعا کے پہلے ہی فقرے کے بعد اس طرح کی ایک تضمین ہے جس طرح کی تضمین اوپر گزر چکی ہے۔ اس کے لانے سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا بالکل صحیح وقت پر، ایک صحیح مقصد کے لیے تھی اس وجہ سے پہلا فقرہ زبان سے نکلتے ہی پوری دعا قبول ہو گئی۔ اگر یہ بشارت حضرت نوح کی دعا کے آخر میں رکھی جاتی تو اس کی فوری قبولیت کا پہلو نمایاں نہ ہوتا اس وجہ سے اس کو دعا کے پہلے ہی فقرے کے بعد رکھ دیا۔ اس قسم کی تضمین کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔

'مِمَّا خَطِيْٓئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا'۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنے جرائم کے سبب سے پانی میں غرق اور آگ میں داخل کیے گئے۔ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ ان کو پانی اور آگ دونوں کے عذاب

سے سابقہ پیش آیا۔ اس دنیا میں وہ پانی میں ڈوبے اور آخرت میں دوزخ کی آگ میں پڑیں گے۔

فَلَمْ یَجِدُوْا لَھُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْصَارًا۔ یعنی جب ان کو عذاب سے ڈرایا جاتا تو وہ اپنی عزت و جمعیت اور اپنے مزعومہ دیوتاؤں کے بل پر اکڑتے لیکن جب اللہ کا عذاب آ دھمکا تو اس کے مقابل میں کوئی بھی ان کی مدد کرنے والا نہ اٹھا۔

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ۝ اِنَّکَ اِنْ تَذَرْھُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا (۲۶-۲۷)

دعا کی تکمیل

تضمین کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی دعا پھر شروع ہو گئی چنانچہ 'قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ' کے الفاظ نے اس کو تضمین سے ممتاز کر دیا۔ اگر تضمین بیچ میں نہ آگئی ہوتی تو ان الفاظ کے اعادے کی ضرورت نہ پڑتی۔ التباس سے بچنے کے لیے ان کا اعادہ ضروری ہوا۔

فرمایا کہ اے رب! اب تو زمین پر کافروں میں سے ایک متنفس کو بھی نہ چھوڑ۔ عربی میں اگر کہیں کہ مَا فِی الدَّارِ دَیَّارٌ تو اس کے معنی ہوں گے کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اس عمومیت کے ساتھ بددعا کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ رسول پوری قوم کو اپنے چھاج میں پھٹک لیتا ہے اور وہ اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے جس کے بعد سنت الٰہی کے مطابق عذاب ہی کا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے۔ فرمایا کہ اب اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو یہ کافروں اور نابکاروں ہی کو جنم دیں گے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اگرچہ ہر بچہ فطرۃ اللہ پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے بناؤ یا بگاڑ میں سب سے زیادہ دخل والدین کی تربیت اور معاشرہ و ماحول کے اثرات کا ہوتا ہے۔ ماحول اچھا ہو گا تو امید ہے کہ بچہ ایمان و اسلام پر پروان چڑھے گا اور اگر ماحول کافرانہ ہوا تو جیسا کہ 'ابواہ یھودانہ وینصرانہ' والی حدیث سے واضح ہے، بچہ بھی ماحول کے رنگ ہی میں رنگ جائے گا۔ حضرت نوحؑ نے اپنے معاشرہ کو اچھی طرح پھٹک کے دیکھ لیا تھا کہ اس میں ایمان اور نیکی کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے اس وجہ سے انھوں نے فرمایا کہ یہ لوگ اب صرف نابکاروں اور کافروں ہی کو جنم دیں گے۔ ان کی کوکھ سے اب کوئی مومن و مسلم جنم لینے والا نہیں ہے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ط وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا (۲۸)

آخر میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان کے ساتھ ان کے گھر میں پناہ گیر ہو جائیں اور تمام مومنین و مومنات کے لیے مغفرت کی دعا مانگی اور ان لوگوں کی تباہی پر یہ دعا ختم کی جنھوں نے شرک و کفر پر اصرار کر کے اپنے لیے اس تباہی کو دعوت دی۔

والدین کا عظیم حق

'وَلِوَالِدَیَّ' والدین کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعائے مغفرت سے والدین کے اس عظیم

حق کا اظہار ہوتا ہے جس کی تاکید قرآن میں بار بار آئی ہے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ یہ مومن تھے لیکن اس کی تائید میں کوئی اشارہ قرآن میں نہیں ہے۔ ممکن ہے ان کی وفات حضرت نوحؑ کی دعوت یا اتمام حجت سے پہلے ہی ہو چکی ہو۔ ان دونوں ہی صورتوں میں حضرت نوح علیہ السلام کا ان کی مغفرت کے لیے دعا کرنا جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی ممانعت بھی نہیں تھی، ان کے حق کا تقاضا تھا۔

'وَلِمَنۡ دَخَلَ بَیۡتِیَ مُؤۡمِنًا' سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری مرحلہ میں حضرت نوحؑ نے یہ اعلان بھی فرما دیا تھا کہ جو عذاب سے پناہ کے طالب ہوں وہ اس کے ظہور سے پہلے پہلے ان کے گھر میں پناہ گیر ہو جائیں۔

بتوفیقِ الٰہی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

رحمان آباد
۱۹ ستمبر ۱۹۷۸ء
۱۵۔ شوال ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۷۲

الجن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور مطالب کا تجزیہ

یہ سورہ سابق سورہ ——— نوح ——— کی توام سورہ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ قوم نوح کے لیڈروں نے جس ضد و مکابرت کا مظاہرہ کیا، پیغمبر کی دعوت سے جس طرح انھوں نے اپنے کان بند کر لیے اور پھر اس کا جو انجام ان کے سامنے آیا اس کی نہایت ہی مؤثر اور عبرت انگیز تصویر قریش کے لیڈروں کے سامنے سورۂ نوح میں رکھ دی گئی ہے۔ اب اس سورہ میں ان کو یہ دکھایا جا رہا ہے کہ جس قرآن سے وہ اس درجہ بیزار ہیں کہ اس کو سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے، منہ زرچ لینے کو جھپٹتے اور دامن جھاڑ کے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اسی کو سن کر جنوں کی ایک جماعت اس قدر اثر پذیر ہوتی ہے کہ وہ فوراً اپنی قوم کے اندر اس کی دعوت پھیلانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ جنوں کے جس واقعہ کا حوالہ یہاں ہے اس کا ذکر سورۂ احقاف کی آیات ۲۹-۳۲ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے ذکر کیا ہے کہ اس کو سنانے سے مقصود ایک تو قریش کو غیرت دلانا ہے کہ جنات، جو قرآن کے براہِ راست مخاطب بھی نہیں ان کا حال تو یہ ہے کہ کبھی سر راہے بھی ان کے کانوں میں اس کی بھنک پڑ گئی ہے تو وہ اس کو سن کر تڑپ اٹھے اور ایک تم ہو کہ خاص تمھارے ہی لیے یہ اترا اور تمھی کو اس کی دعوت دینے کے لیے اللہ کا رسول اپنے رات دن ایک کیے ہوئے ہے لیکن تم ایسے بدقسمت ہو کہ اس کی کسی بات کا تمھارے دلوں میں اترنا تو درکنار تم اس کے سنانے والوں کے جانی دشمن بن گئے ہو۔ دوسرا مقصد اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ اگر آپ کی قوم کے اشرار اس قرآن کی ناقدری کر رہے ہیں تو آپ اس سے آزردہ خاطر نہ ہوں۔ جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں وہ اس سے فیضیاب نہیں ہوں گے، خواہ آپ کتنے ہی جتن کریں۔ البتہ جن کے اندر کچھ صلاحیت ہو گی ان کے کانوں میں اگر اتفاق سے بھی اس کے کچھ کلمات پڑ جائیں گے تو وہ ان کے اندر گھر کر لیں گے، خواہ وہ اس کے مخاطب ہوں یا نہ ہوں اور خواہ ان کو سنانے کے لیے کوئی اہتمام کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔

جنوں کے جس تاثر کا اس وہ میں حوالہ دیا گیا ہے اس سے اگرچہ وہ لوگ متاثر نہیں ہوں گے جو صرف محسوسات کے غلام ہیں اور جو ان چیزوں کے سرے سے وجود ہی کے منکر ہیں جو ان کے محسوسات کے

دائرہ سے باہر ہیں لیکن اس طرح کے لوگ یہاں مخاطب بھی نہیں ہیں۔ یہاں مخاطب مشرکین قریش ہیں جو اتنے بلید نہیں تھے کہ صرف انہی چیزوں کو مانیں جنھیں چھوتے اور دیکھتے ہوں۔ وہ جنوں کو نہ صرف مانتے تھے بلکہ ان سے رابطہ رکھنے کے لیے انھوں نے کہانت کا پورا نظام قائم کر رکھا تھا اس وجہ سے قرآن نے ایک اہم واقعہ کی حیثیت سے ان کو جنوں کے یہ تاثرات سنائے کہ وہ چاہیں تو اس سے فائدہ اٹھائیں۔ کاہنوں کے واسطے سے وہ جنوں کے اشرار کی القا کی ہوئی جھوٹی خبریں سنتے تھے۔ قرآن نے ان کے سامنے ان کے اخیار کی ایک سچی رپورٹ رکھی تاکہ جن کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی کچھ صلاحیت ہے وہ اس سے ایمان کی طرف رہبری حاصل کریں۔ قرآن نے غیب کے جو حقائق بیان کیے ہیں وہ اسی مقصد سے بیان کیے ہیں کہ حق کے طالب ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اگرچہ محسوسات پرست اس کو داہمہ کی خلاقی قرار دیں گے لیکن نااہلوں کی ناقدری کے سبب سے قدرت خلق کو اپنی فیض بخشی سے محروم نہیں کرتی۔

سُوْرَةُ الْجِنِّ (۷۲)

مَكِّيَّةٌ ______ اٰيات : ۲۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا آیات ۱-۲۸
سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۱) يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ
وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (۲) وَّاَنَّهُ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ
صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا (۳) وَّاَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ
شَطَطًا (۴) وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ
كَذِبًا (۵) وَّاَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ
مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (۶) وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ
لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا (۷) وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا
مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا (۸) وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا
مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا
رَّصَدًا (۹) وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ
اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا (۱۰) وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ

ذٰلِكَ ۭ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ
فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى
اٰمَنَّا بِهٖ ۭ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾
وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ۭ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰۗئِكَ
تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾ وَّ
اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّاۗءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾
لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا
صَعَدًا ﴿۱۷﴾ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾
وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ
لِبَدًا ﴿۱۹﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾ قُلْ ع ۱ ۱۹ ۱۱
اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾ قُلْ اِنِّىْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ
اللّٰهِ اَحَدٌ ڏ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ
وَرِسٰلٰتِهٖ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا ﴿۲۳﴾ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ
اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا
تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا
يُظْهِرُ عَلٰي غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ
يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّيَعْلَمَ

اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾

ع ۲ / ۹ / ۱۴

ترجمۂ آیات ۱-۲۸

کہہ دو، مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن کو سنا تو انھوں نے اپنی قوم کو بتایا کہ ہم نے ایک نہایت دل پذیر قرآن سنا جو ہدایت کی راہ بتاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم ہرگز کسی کو اپنے رب کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے، اس نے اپنے لیے نہ کوئی بیوی بنائی ہے نہ کوئی اولاد اور یہ کہ ہمارا بے وقوف (سردار) اللہ کے بارے میں حق سے بالکل ہٹی ہوئی باتیں کہتا رہا ہے۔ اور یہ کہ ہم نے گمان کیا کہ انسان اور جن خدا پر ہرگز کوئی جھوٹ نہیں باندھ سکتے۔ اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو جنوں میں سے بعض کی دہائی دیتے رہے ہیں تو انھوں نے ان کی شامت ہی میں اضافہ کیا اور یہ کہ انھوں نے بھی تمھاری ہی طرح یہ گمان کیا کہ اللہ کسی کو مرنے کے بعد زندہ کرنے والا نہیں ہے اور ہم نے آسمان کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ وہ سخت پہرہ داروں اور شہابوں سے بھر دیا گیا اور ہم اس کے بعض ٹھکانوں میں کچھ سن گن لینے کو بیٹھا کرتے تھے پر اب جو بیٹھے گا تو وہ ایک شہاب کو اپنی گھات میں پائے گا۔ اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ یہ زمین والوں کے لیے کوئی برائی چاہی گئی ہے یا ان کے رب نے ان کے لیے بھلائی چاہی ہے اور یہ کہ ہم میں بھی نیک اور اس سے مختلف قسم کے لوگ ہیں، ہماری راہیں الگ الگ ہیں۔ اور یہ کہ ہم نے مان لیا کہ ہم اللہ کے قابو سے نہ زمین میں کہیں جا کر نکل سکتے اور نہ آسمان میں کہیں بھاگ کر۔ اور یہ کہ جب ہم نے ہدایت کی بات سنی ہم اس پر ایمان

لائے۔ پس جو اپنے رب پر ایمان لائے گا تو اس کو نہ کسی حق تلفی کا اندیشہ ہوگا نہ کسی زیادتی کا اور یہ کہ ہم میں فرمانبردار بھی ہیں اور بے راہ بھی تو جنھوں نے فرمانبرداری کی روش اختیار کی انھوں نے ہدایت کی راہ ڈھونڈی۔ اور جو بے راہ ہوئے تو وہ دوزخ کے ایندھن بنیں گے۔ ۱۰-۱۵

اور یہ مجھے وحی آئی ہے کہ اگر یہ (قریش) سیدھی راہ پر گامزن رہتے تو ہم ان کو خوب خوب سیراب کرتے کہ ہم اس میں ان کو آزمائیں اور جو اپنے رب کی یاددہانی سے منہ موڑیں گے تو وہ ان کو چڑھتے عذاب میں داخل کرے گا۔ اور یہ کہ مسجدیں اللہ کی عبادت کے لیے ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ صرف اللہ ہی کو پکارتا کھڑا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس پر پل پڑیں گے۔ کہہ دو کہ میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراؤں گا۔ کہہ دو، میں نہ تمھارے لیے کسی ضرر پر کوئی اختیار رکھتا نہ کسی نفع پر۔ کہہ دو، مجھے اللہ سے کوئی پناہ دینے والا نہیں بنے گا اور نہ میں اس کے سوا کوئی ملجا پا سکوں گا۔ بس اللہ کی طرف سے پہنچا دینا اور اس کے پیغاموں کی ادائیگی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریں گے تو ان کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے اس چیز کو جس سے ان کو خبردار کیا جا رہا ہے تب وہ جانیں گے کہ مددگاروں کے اعتبار سے سب سے زیادہ کمزور اور تعداد کے لحاظ سے سب سے حقیر کون ہے! کہہ دو، مجھے کچھ نہیں پتا کہ جس چیز سے تمھیں آگاہ کیا جا رہا ہے وہ قریب ہی ہے یا میرا رب ابھی اس کو کچھ مدت اُدھار لینے والا ہے۔ غیب کا

جاننے والا وہی ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ رہے وہ جن کو وہ رسول کی حیثیت سے انتخاب فرماتا ہے تو وہ ان کے آگے اور پیچھے پہرہ رکھتا ہے کہ دیکھے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے اور وہ ان کے گرد و پیش کا احاطہ کیے اور ہر چیز کو شمار میں رکھے ہوتا ہے۔ ۱۶-۲۸

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۱)

جنوں کے تاثرات کی اطلاع پیغمبر کو وحی کے ذریعہ ہوئی

'قُلْ اُوْحِیَ' کے الفاظ سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ جنوں کے جو تاثرات اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ راست جنوں کی زبانی نہیں بلکہ وحی الٰہی کے ذریعہ معلوم ہوئے۔ ان کی ایک جماعت نے سرراہے کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے سنا جس کی کشش نے ان کے دلوں کو اس طرح موہ لیا کہ وہ اس کے سنتے ہی ہمہ تن محو ہو گئے اور پھر اس دل پذیر کلام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ پلٹے تو اپنی قوم کو اس کی دعوت دینے اٹھ کھڑے ہوئے۔

واقعہ کو سنانے کا مقصد

یہ کس موقع کا ذکر ہے؟ اس کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسی واقعہ کی تفصیل ہے جس کا اجمالی ذکر سورۂ احقاف میں ہوا ہے۔ وہاں روایات کی روشنی میں اس کے موقع و محل کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ جنوں کے ان تاثرات کی آپ کو اس لیے اطلاع دی گئی کہ اپنی قوم کو آپ سنا دیں کہ جس کلام بلاغت نظام کے ساتھ تمھارا سلوک یہ ہے کہ اس کو سن کر تم کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے اور اس کے سنانے والے کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوتے ہو دراں حالیکہ یہ کلام تمھارے ہی لیے اترا ہے، اس کلام کو سن کر ذی صلاحیت جنات اس طرح اس کے عاشق ہو جاتے ہیں کہ اپنی قوم کو اس کی دعوت دینے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں حالانکہ وہ براہِ راست اس کے مخاطب بھی نہیں۔

لفظ 'قُلْ' اس بات پر دلیل ہے کہ جنوں کے ان تاثرات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مقصد سے آگاہ فرمایا گیا کہ آپ قریش کے لیڈروں کو یہ سنا دیں کہ ان کو کچھ غیرت آئے۔ ضمناً اس میں آپ کے لیے تسلی بھی ہے کہ نا اہلوں کی ناقدری سے آپ آزردہ نہ ہوں۔ اگر یہ لوگ اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو اس میں قصور نہ اس کلام کا ہے نہ آپ کا بلکہ یہ خود ان لوگوں کے اپنے دلوں کے فساد کا نتیجہ ہے۔

جنوں کی دعوت اپنی قوم کو

'فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا' یہ وہ دعوت ہے جو انھوں نے اس کلام کو سننے کے بعد اپنی

قوم کو دی۔ یعنی اس کو سن کر وہ صرف واہ واہ کر کے نہیں رہ گئے بلکہ انھوں نے حق کی قدر دانی اور اپنی قوم کی خیر خواہی کا یہ لازمی تقاضا سمجھا کہ جس نعمتِ آسمانی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بہرہ مند فرمایا اس سے وہ اپنی قوم کو بھی بہرہ مند کریں۔

'عَجَبٌ' مصدر ہے اس وجہ سے 'عجیب' کے مقابل میں اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ لفظ انھوں نے اس کلام کی دل پذیری، اثر انگیزی اور حکمت آفرینی کے پہلو سے استعمال کیا۔ عربی میں یہ لفظ صرف کسی شے کے انوکھے پن کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ اس کی دل پذیری اور اثر انگیزی کے پہلو کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ اسی پہلو سے آیا ہے۔ سورۂ احقاف میں یہی بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا	اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سنی
اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا	ہے جو موسیٰ کے بعد اپنے پہلے کی پیشین گوئیوں کی
بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى	مصداق بنا کر نازل کی گئی ہے جو حق اور ایک
طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ (الاحقاف - ۴۶ : ۳۰)	بالکل سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

اس سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوتی کہ جنات صرف اپنی ہی زبان نہیں بلکہ جس علاقہ سے وہ تعلق رکھتے ہیں اس علاقہ کے انسانوں کی زبان بھی سمجھتے ہیں اور ان کے اندر ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اس زبان کے حسن و قبح کے اچھی طرح پرکھنے والے بھی ہوتے ہیں۔

يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (۲)

قرآن کا دعوتِ رُشد

یہ قرآن کی اسی دل پذیری کی وضاحت ہے جس کی طرف لفظ 'عجب' اشارہ کر رہا ہے۔ یعنی یہ کتاب اس حق و ہدایت کی طرف رہنمائی کر رہی ہے جس کو ہر سلیم الفطرت کا دل قبول کرتا ہے۔ سورۂ احقاف کی مذکورہ بالا آیت میں 'يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں اسی مضمون کے لیے جامع لفظ 'رُشْدٌ' استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ ان تمام بنیادی عقائد اور نیکیوں پر حاوی ہے جو انسانی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔ انسان اپنے اختیار کے سوءِ استعمال سے اپنی فطرت بگاڑ نہ لے تو یہ اس کی رہنمائی صحیح سمت میں کرتی ہے اور اگر غفلت کے سبب سے ان پر کبھی حجاب بھی آجاتا ہے تو وہ معمولی تذکیر و تنبیہ سے دور ہو جاتا ہے بشرطیکہ انسان نفس کی خواہشوں کی پیروی میں اس کی ناقدری نہ کرے۔ اس 'رُشد' میں سب سے اونچا مقام توحید کا ہے۔ تمام بنیادی عقائد و اعمال کا منبع بھی وہی ہے اور اسی پر ان کی صحت کا مدار بھی ہے۔

رشد کا حق

'فَاٰمَنَّا بِهٖ'۔ یہ انھوں نے اس 'رُشد' کا حق بیان کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس ہدایت سے ہمیں آگاہ فرمایا تو ہم نے اس کا یہ فطری حق سمجھا کہ ہم اس پر ایمان لائیں چنانچہ ہم نے اس کو صدقِ دل سے

قبول کر لیا۔

رشد کا سرچشمہ 'وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا' تمام رشد کا سرنامہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، توحید ہی ہے چنانچہ انھوں نے اس رشد پر ایمان کا تقاضا یہ بیان کیا کہ اب ہمارے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ ہم کو اپنے رب کا شریک ٹھہرائیں۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ تمام بنیادی عقائد اور نیکیاں نہ صرف انسانوں اور جنوں کے درمیان مشترک ہیں بلکہ قرآن میں یہ وضاحت ہے کہ یہ تمام کائنات میں مشترک ہیں۔ ہمارے اور جنوں کے درمیان فرق ہے تو معاشرتی احکام میں ہے۔ توحید، معاد، جزا و سزا اور فضائل و رذائل میں فرق کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چنانچہ انہی چیزوں کا یہاں ذکر آیا ہے اور قرآن نے مکی زندگی کے ابتدائی دور میں انسانی فطرت کے انہی ابتدائی مطالبات کی لوگوں کو دعوت بھی دی۔

وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا (۳)

یہ انھوں نے اپنے قول 'وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا' کی مزید وضاحت کر دی کہ اب ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ ہمارے رب کی شان بیوی بچوں کی نسبتوں سے بالکل پاک اور نہایت ارفع ہے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو اس طرح کی چیزیں اس سے منسوب کرتے ہیں۔ اس نے نہ اپنے لیے کوئی بیوی بنائی اور نہ کوئی اولاد۔

'جد' کے معنی عظمت، شان اور رتبہ کے ہیں۔ یعنی اس کی ذات اتنی بلند ہے کہ کوئی چیز اس کی شریک وسہیم اور ہم رتبہ نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنی ذات میں بالکل یکتا، بے نیاز اور ہر چیز سے مستغنی ہے۔ کسی کا یہ درجہ نہیں کہ اس کا کفو اور ہم سر ہو سکے۔

یہ قول اگرچہ جنات ہی کا ہے اس وجہ سے اس کو 'فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا' کے تحت ہی ہونا چاہیے تھا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ باتیں براہ راست نہیں بلکہ وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوئیں اس وجہ سے اس کو 'قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ' کے تحت کر دیا گیا اور آگے جنات کے سارے قول اسی کے تحت آئیں گے۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا (۴)

سفیہ لیڈروں کی پیروی سے اجتناب کی دعوت 'سَفِيْهُ' کے معنی بے وقوف کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ جنوں نے اپنے سردار کے لیے استعمال کیا ہے اس لیے کہ قرآن سن لینے کے بعد اپنے سردار کی سفاہت ان پر واضح ہو گئی۔

'شَطَطٌ' حق و عدل سے نہایت دور ہٹی ہوئی بات کو کہتے ہیں۔

جنوں پر جب توحید کی حقیقت واضح ہو گئی تو انھوں نے اپنی قوم کو آگاہ کیا کہ ہمارا بدھو سردار اللہ تعالیٰ جل شانہٗ پر حق سے نہایت دور ہٹی ہوئی یہ تہمتیں جوڑتا رہا ہے کہ اس کے بیوی بھی ہے اور اولاد بھی ہے، فلاں اور فلاں اس کے بیٹے اور فلاں اور فلاں اس کی چہیتی بیٹیاں ہیں لیکن

ہم نے جو قرآن سنا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہمارے احمق سردار کی یہ باتیں بالکل بے بنیاد تھیں۔ چنانچہ ہم نے ان خرافات سے توبہ کر لی اور ہم قوم کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ لوگ اس طرح کی باتوں سے توبہ کریں اور اس سفیہ کے چکمے میں نہ آئیں۔

اس آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ جنات عوام کے طبقہ سے تھے۔ ان کے سردار جس ڈگر پر ان کو چلاتے رہے اس پر وہ چلتے رہے لیکن جب ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تو انھوں نے پوری ایمانی جرأت سے ان کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردنوں سے نکال پھینکا اور اللہ کی بتائی ہوئی صراط مستقیم پر چل پڑے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے قریش کے عوام کو یہ باتیں اس لیے سنائی گئیں کہ ان کے اندر بھی اپنے احمق لیڈروں کے پھندے سے نکلنے اور اپنی عقل و بصیرت پر اعتماد کرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔

وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنۡ لَّنۡ تَقُوۡلَ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا (۵)

مغالطہ پر تنبیہ

یہ اس مغالطہ کی طرف اشارہ ہے جس کے سبب سے وہ اپنے ان سرداروں کے چکر میں پھنسے رہے۔ کہا کہ ہم نے گمان کیا کہ بھلا انسان اور جنات اللہ تعالیٰ پر یہ تہمت باندھنے کی جسارت کس طرح کر سکتے ہیں کہ اس نے فلاں اور فلاں کو اپنا شریک بنایا اور ان کو مستحق عبادت ٹھہرایا ہے۔ لیکن انھوں نے یہ جسارت کی اور ہم اپنی سادگی کے سبب سے ان کے چکموں میں آ گئے۔

یہ ان کی طرف سے اپنی قوم کے عوام کو آگاہی ہے کہ اپنے ان پروہتوں کے تقدس کے فریب میں مبتلا ہو کر اپنی عقل کو معطل نہ رکھ چھوڑو بلکہ اپنی سمجھ سے کام لو۔ ایسا نہ ہو کہ مچھلی کے نام سے یہ تمھیں سانپ پکڑا دیں۔

وَّاَنَّہٗ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الۡاِنۡسِ یَعُوۡذُوۡنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الۡجِنِّ فَزَادُوۡہُمۡ رَہَقًا (۶)

اہلِ زمن کی معنی حماقتوں کی طرف اشارہ

اسی سلسلہ میں انھوں نے اپنی قوم کے سامنے اپنا یہ انکشاف بھی بیان کیا کہ اس قرآن سے ہمیں یہ علم بھی ہوا کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ افراد کی دہائی دیتے رہے ہیں لیکن اس سے ان کو کچھ نفع پہنچنے کے بجائے ان کی شامت اور بدبختی ہی میں اضافہ ہوا۔

'رَہَقٌ' کے اصل معنی کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے کے ہیں۔ یہیں سے اس کا استعمال زیادتی، گناہ، حق تلفی اور تعدّی کے معنی میں وسیع ہو گیا۔ چنانچہ آگے آیت ۱۳ میں یہ لفظ تعدّی کے معنی میں آیا ہے۔

عام طور پر لوگوں نے آیت کے معنی یہ لیے ہیں کہ کچھ بے وقوف انسانوں نے جنوں کی دہائی دے کر ان کے دماغ کو عرش پر پہنچا دیا ہے لیکن یہ تاویل صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اوّل تو اس کلام کا کچھ فائدہ سمجھ میں نہیں آتا ثانیاً لفظ 'رہق' کے اصل مفہوم سے اس میں تجاوز بھی ہے۔ میرے نزدیک 'زَادُوْا' کا فاعل 'رِجَالٌ مِّنَ الْجِنِّ' اور 'ھُمْ' کا مرجع 'رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ' ہے یعنی بے وقوف انسانوں نے تو

جنوں کی پناہ اس لیے ڈھونڈی کہ وہ ان کی آفتوں سے اپنے کو بچائیں لیکن جنوں نے جب دیکھا کہ کچھ انسان ان کے جال میں پھنسے ہیں تو انھوں نے اپنے شر سے محفوظ رکھنے کے بجائے ان کو اور سرکشی کا ناچ نچایا۔

عرب کے مشرکین میں جنات سے متعلق یہ وہم تھا کہ وہ غیب کی خبریں معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں چنانچہ اسی چیز نے ان کے ہاں کہانت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا جس کی بنیاد تمام تر، جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، جھوٹ اور فریب پر تھی۔ کاہن اپنے جال میں پھنسے ہوئے بے وقوفوں میں سے جس کو ڈرا دیتے کہ فلاں خطرناک جن تم پر بہت برہم ہے، اگر تم نے اس کے لیے فلاں چیز کی قربانی یا اتنی نذر نہ گزرانی تو وہ آفت میں مبتلا کر دے گا تو وہ لازماً ان کے حکم کی تعمیل کرتا۔ یہاں تک کہ انہی کاہنوں کے حکم سے بعض بے وقوف لوگ جنوں کو راضی کرنے کے لیے اپنی اولاد تک کو، جیسا کہ سورۂ انعام میں ذکر ہے، قربانی کر دیتے۔

اسی نوع کا ایک دوسرا وہم یہ پایا جاتا تھا کہ ہر وادی اور ہر پہاڑی جنوں کے کسی خاص گروہ کا مسکن ہوتی ہے۔ اگر اس وادی میں رات گزارنے کی نوبت آئے تو ضروری ہے کہ اس کے سردار جن کی پناہ حاصل کر لی جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ کسی آفت میں مبتلا کر دے۔ چنانچہ دورِ جاہلیت میں اہلِ عرب جب کسی وادی میں شب گزارتے تو اس وادی کے سردار جن کی دہائی دے کر اپنے گمان کے مطابق اس کی پناہ حاصل کر لیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک خواہ مخواہ کی مصیبت تھی جس میں جنوں کے وہم نے ان کو مبتلا کر رکھا تھا۔

اسی طرح کی باتوں کی طرف ان مومن جنوں نے اشارہ کیا ہے اور ان کا مقصود یہ دکھانا ہے کہ توحید کے شعور سے محرومی کے باعث بے وقوف انسانوں اور شریر جنوں میں کس طرح گٹھ جوڑ رہا ہے اور اس سے کیا کیا روحانی و مادی مفاسد ظہور میں آ رہے تھے جن کے سدِ باب کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ کتاب نازل فرمائی ہے۔

لفظ 'رِجَالٌ' کی تنکیر تحقیر اور تفخیم دونوں پر دلیل ہو سکتی ہے۔ آپ یہ معنی بھی لے سکتے ہیں کہ انسانوں کے اندر کے کچھ بے وقوف ہمارے اندر کے کچھ بے وقوفوں کی دہائی دیتے تھے اور یہ معنی بھی لے سکتے ہیں کہ انسانوں کے اندر کے کچھ شریر ہمارے اندر کے کچھ شریروں کی دہائی دیتے تھے بلکہ یہ معنی بھی اگر لیں کہ انسانوں کے اندر کے کچھ احمق ہمارے اندر کے کچھ شریروں کی دہائی دیتے ہیں تو یہ بھی عربیت کے خلاف نہیں ہوگا۔

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا (۷)

توحید کے بعد قیامت کا حوالہ

توحید کے بعد یہ قیامت کے باب میں انھوں نے دونوں گروہوں کی غلط فہمی کی طرف اشارہ

کیا کہ جس طرح تم اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہو کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کسی کو زندہ نہیں کرے گا اسی طرح انسان بھی اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن لوگوں کی اس غلط فہمی کو بھی دور کرنے کے لیے نازل ہوا ہے۔

بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب بھی لیا ہے کہ جس طرح تمھارے ہاں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کسی کو رسول بنا کر بھیجنے والا نہیں ہے اسی طرح انسانوں کے اندر یہ بھی غلط فہمی موجود تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کے نزول نے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا۔

اگرچہ آیت کے الفاظ کے اندر یہ معنی لینے کی گنجائش موجود ہے لیکن یہ بات کھٹکتی ہے کہ قرآن کے اولین مخاطبوں میں، خواہ بنی اسماعیل ہوں یا بنی اسرائیل، پچھلی پیشین گوئیوں کی بنا پر ایک رسول کی بعثت کا انتظار تھا۔ اگرچہ اہل کتاب نے ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کا انکار نہ کر سکے۔ بنی اسماعیل کے اندر، ان کی امیت کے سبب سے، اس رسول کا تصور کچھ واضح نہیں تھا لیکن قطعیت کے ساتھ انکار انھوں نے بھی نہیں کیا۔ چنانچہ قرآن کے بعض مقامات میں ان کو ملامت فرمائی گئی ہے کہ رسول کی بعثت سے پہلے پہلے تو تم بڑھ چڑھ کر دعوے کرتے تھے کہ تمھارے اندر اللہ نے کوئی رسول بھیجا تو تم اس کی دعوت کو سب سے پہلے قبول کرنے والے اور اس کی ہدایت پر سب سے زیادہ عمل کرنے والے ہو گے لیکن جب اللہ نے اس نعمت سے تمھیں نوازا تو تم اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۙ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (۸-۹)

ایک نئے تجربہ کا حوالہ

یہ انھوں نے اپنے ایک خاص تجربہ کا حوالہ دیا جو اس کتاب کے نزول کے دور میں بالکل پہلی بار اس کائنات کے نظام میں ان کو ہوا۔ انھوں نے اپنی قوم کو بتایا کہ اس دوران میں ہم نے آسمان کا جائزہ لیا تو یہ دیکھا کہ آسمان زبریں پہرہ داروں اور شہابوں سے بھر دیا گیا ہے اور ہم اس کے بعض ٹھکانوں میں عالم بالا کے اسرار کی کچھ سن گن لینے کے لیے جو بیٹھا کرتے تھے تو اب اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اگر کوئی اب اس کی کوشش کرے گا تو ایک شہاب کو اپنی گھات میں پائے گا۔

قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان فرمائی گئی ہے کہ شیاطین جن عالم غیب کی باتیں اچکنے کے لیے جب گھات لگاتے ہیں تو ان پر شہاب ثاقب کی مار پڑتی ہے۔ جنوں کے اس ذاتی تجربہ سے اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے اور مزید برآں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ پہلے تو گھات لگانے کی کچھ گنجائش تھی لیکن جس دور کا وہ یہ تجربہ بیان کر رہے ہیں اس دور میں آسمان کا ہر گوشہ پہرہ داروں اور شہابوں سے اس طرح بھر دیا گیا تھا کہ جنوں کے لیے دراندازی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔

جنوں نے کائنات میں اس اہم تغیر کا ذکر تو کیا لیکن قوم کے سامنے اس کا کوئی سبب وہ نہیں بتا سکے۔ اس کی وجہ آگے کی آیت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس اہم تبدیلی کی حکمت ان پر اچھی طرح واضح نہیں تھی۔ تاہم نزولِ قرآن کے واقعہ کے ساتھ اس واقعہ کو ملا کر انھوں نے لوگوں کو یہ تاثر دے دیا کہ آسمان کے نظام میں یہ تبدیلی بھی قرآن کے نزول ہی سے تعلق رکھنے والی بات ہے۔

ہمارے نزدیک ان کا یہ قیاس صحیح تھا۔ قرآن کے متعدد مقامات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آسمان میں جو پہرا اس کو شیاطین کی مداخلت سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قائم کر رکھا ہے وہ نزولِ وحی کے زمانے میں نہایت سخت کر دیا گیا تھا تاکہ ان کو وحی میں کسی دراندازی کی راہ نہ ملے۔ یوں تو یہ پہرا ہمیشہ ہی رہا ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے بھی شیاطین پر شہابوں کی مار پڑتی رہی ہے لیکن جس طرح حکومتیں اس شاہراہ کی ہر طرف سے ناکہ بندی کر دیتی ہیں جس پر سے شاہی خزانہ لے جایا جانے والا ہو یا بادشاہ کی سواری گزرنے والی ہو اسی طرح وحی کے نزول اور جبریلِ امینؑ کی آمد و شد کے دور میں معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی ہر طرف سے ناکہ بندی کر دی گئی تھی تاکہ اچکوں کی ہر راہ مسدود ہو جائے۔

جنوں کی اس اطلاع کا ذکر قرآن نے یہاں مشرکینِ عرب کے سامنے اس لیے کیا ہے کہ وہ قرآن پر یہ الزام جو لگاتے ہیں کہ یہ کاہنوں کے طرز کا کلام ہے جو نعوذ باللہ کوئی جن پیغمبرؐ پر القا کرتا ہے۔ یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کی تردید کے لیے خود جنوں کا یہ بیان کافی ہے کہ اس دور میں آسمان سے کوئی خبر لانا تو درکنار اس کے اندر ان کے جو ٹھکانے تھے اب ان تک پہنچنا بھی ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔

وَاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا (۱۰)

ان جنوں پر نظامِ کائنات میں اس اہم تبدیلی کی اصل علت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اچھی طرح واضح نہیں تھی اس وجہ سے انھوں نے اس کی کوئی قطعی وجہ بیان کرنے کے بجائے اس پر صرف اپنے تردد کا اظہار کیا کہ اگرچہ اس کا سبب ہم پر واضح نہیں ہے تاہم یہ زمین میں کسی اہم انقلاب کا پیش خیمہ ضرور ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ انقلاب اہلِ زمین کے لیے سببِ شر ہو گا یا اس میں ان کے رب کی طرف سے کوئی بڑا خیر مضمر ہے تو اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔ (اہلِ زمین کے لیے ایک بہارت قرآن کی طرف اشارہ)

اگرچہ انھوں نے بربنائے احتیاط اپنی رائے واضح نہیں کی لیکن اسلوبِ کلام شاہد ہے کہ اہلِ زمین کے لیے انھوں نے اس کو ایک فالِ نیک سمجھا۔ چنانچہ شر کا ذکر تو انھوں نے مجہول کے اسلوب میں کیا لیکن رشد و ہدایت کی توقع کا ذکر بصیغۂ معروف 'اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا' کے الفاظ سے کیا۔ ان دونوں اسلوبوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے ادب و احترام کے پہلو سے جو فرق ہے اس کی وضاحت سورۂ کہف کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ یہاں خاص طور پر جو بات نگاہ میں رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اگر

ان کا ظن غالب یہ نہ ہوتا کہ اس میں اہلِ زمین کے لیے خیر ہے تو اس دوسرے فقرے کو بھی پہلے فقرے کی طرح مجہول کے مبہم اسلوب ہی میں کہتے۔ لیکن قرآن اور اس تبدیلی کو پہلو بہ پہلو دیکھ کر ان کا ذہن اسی طرف گیا کہ یہ دونوں واقعے اہلِ زمین کے لیے ایک ہی نوع کے ہیں اور یہ قرانُ السعدین کی حیثیت رکھتے ہیں۔

وَاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ۭ كُنَّا طَرَاۗىِٕقَ قِدَدًا (۱۱)

وصل و فصل کی بنیاد ایمان و عمل پر ہونی چاہیے

یعنی اب تک تو نیکی اور بدی کے درمیان ہماری نگاہوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ برے اور بھلے دونوں ہماری نظروں میں یکساں تھے لیکن اس قرآن نے ہمارا یہ مغالطہ دور کر دیا ہے اور یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہم سب ایک ہی راہ پر چلنے والے نہیں ہیں بلکہ ہمارے طریقے اور راہیں الگ الگ ہیں اور ضروری ہے کہ ہم اس فرق کو ملحوظ رکھ کر لوگوں کے ساتھ معاملہ کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان وصل و فصل کی بنیاد ایمان اور کفر پر ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو ہماری قوم اور قبیلہ کا ہے وہ ہمارا ہے، خواہ وہ کافر ہو یا مومن، نیک ہے یا بد۔

یہ گویا انھوں نے اپنی قوم کے ان لوگوں سے اعلانِ برارت کیا ہے جو ان کی اس دعوتِ ایمان کے بعد بھی اپنے کفر و شرک پر اڑے رہنے کے لیے ضد کریں۔ اس طرح کا اعلان تمام انبیاء نے اپنی اپنی قوموں کے سامنے کیا اور ہر دور کے مصلحین نے بھی انبیاء علیہم السلام کی اس سنت کی پیروی کی جس کی ایک واضح مثال اصحابِ کہف کا رویہ ہے جو سورۂ کہف میں بیان ہوا ہے۔

'طَرَاۗىِٕقَ' کے معنی راستے اور مسلک و مذہب کے ہیں اور 'قِدَدًا' کے معنی متفرق کے۔

وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا (۱۲)

انسان ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہے

دعوت کے بعد یہ انھوں نے اپنی قوم کو انذار کیا کہ ہم پر یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہے کہ ہر وقت ہم خدا کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ جب چاہے ہمیں پکڑ سکتا ہے۔ نہ ہم زمین میں کہیں چھپ کر اس کی گرفت سے بچ سکتے اور نہ آسمانوں میں کہیں بھاگ کر اس کے قابو سے نکل سکتے۔

اس آیت میں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق، بعض متقابل الفاظ محذوف ہیں جو قرینہ سے سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً پہلے ٹکڑے میں 'فِي الْاَرْضِ' ظاہر کیا گیا تو دوسرے ٹکڑے میں 'فِي السَّمَاۗءِ' حذف کر دیا گیا۔ اسی طرح دوسرے میں 'هَرَبًا' کا لفظ آیا تو پہلے ٹکڑے میں اس کا مدمقابل حذف ہو گیا۔ ترجمے میں یہ محذوفات ہم نے کھول دیے ہیں۔ اردو میں یہ اسلوب غیر معروف ہے اس وجہ سے محذوفات کھولے بغیر مطلب ادا نہیں ہوتا۔

وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ۭ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا (۱۳)

ایمان قبول کرنے والوں کے لیے بشارت

یہ قوم کے سامنے انھوں نے اپنی مثال پیش کی ہے کہ جب یہ ہدایت بخش دعوت ہمارے کانوں

میں پڑی تو ہم نے اپنے اوپر یہ واجب سمجھا کہ اس کی قدر کریں چنانچہ ہم اس پر ایمان لائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی روش ان تمام لوگوں کو اختیار کرنی چاہیے جن کے اندر حق و ہدایت کے لیے احترام موجود ہے جو لوگ اس سے بھاگیں گے ان کا اعراض گواہی دے گا کہ وہ اپنی عقل کے بجائے اپنی خواہشوں کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔

'فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا'۔ 'بَخْس' کے معنی کمی کرنے اور 'رَهَق' کے معنی جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی ہے، زیادتی کرنے کے ہیں۔ یہی مضمون معمولی تغیر کے ساتھ 'فَلَا یَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا' (طٰهٰ - ۲۰: ۱۱۲) کے الفاظ میں بھی ادا ہوا ہے۔

یہ انھوں نے دعوتِ ایمان قبول کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں گے وہ اطمینان رکھیں کہ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ دے گا، نہ ان کو کسی حق تلفی کا اندیشہ ہو گا نہ کسی تعدی کا۔ جو کچھ جس نے کیا ہو گا وہی اس کے سامنے آئے گا۔ 'فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ' (الزلزال - ۹۹: ۷-۸)

وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ۭ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰۗىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (۱۴-۱۵)

خیر اور شر میں امتیاز کا بدیہی نتیجہ

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت بھی ہمارے اندر ودیعت فرمائی ہے، اپنے نبیوں اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے خیر اور شر دونوں کو اچھی طرح اجاگر بھی کر دیا ہے اور ایک امرِ واقعی کی حیثیت سے ہم اس صورتِ حال کا بھی مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ہمارے اندر خدا کے فرمانبردار اور نافرمان دونوں قسم کے لوگ ہیں تو اس کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ دونوں سے ایک ہی طرح کا معاملہ نہ کرے بلکہ جو اس کی اطاعت کی راہ اختیار کرنے والے ہوں وہ تو اس کے صلے میں جنت کے حق دار ٹھہریں اور جو حق سے منحرف ہوں وہ جہنم کے ایندھن بنیں۔ حق و باطل میں یہ امتیاز اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی حکمت کا لازمی تقاضا ہے، ورنہ یہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے جس کے خالق کے نزدیک معاذ اللہ نیکی اور بدی دونوں یکساں ہیں۔

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّاۗءً غَدَقًا (۱۶)

کلام کا رخ براہِ راست قریش کی طرف

جنوں کے تاثرات و اقوال کا حوالہ دینے کے بعد یہاں سے کلام کا رخ براہِ راست قریش کی طرف مڑ گیا۔ پہلی آیت میں لفظ 'قُلْ' کی وضاحت کرتے ہوئے ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ قرآن اور اس کی دعوت کے متعلق جنوں کی یہ باتیں آپ قریش کے ناقدروں اور مغروروں کو پہنچا دیں۔ اس کے بعد اب براہِ راست قریش کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ صراطِ مستقیم پر استوار رہتے تو یہ خسارے کا سودا نہیں تھا بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کی راہ یہی ہے۔ ہم اس کے صلے میں

ان پر اپنی رحمت کی گھٹائیں برساتے۔

'مَآءً غَدَقًا' کے لغوی معنی تو وافر پانی کے ہیں لیکن عربی میں یہ تعبیر ہے رزق و فضل کے بہتات کی ساماں کی مثالیں پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکی ہیں۔ سابق سورہ میں فرمایا ہے:

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ (نوح ۷۱: ۱۰-۱۲)

اپنے رب سے مغفرت مانگو۔ وہ نہایت بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر اپنے ابر کرم کے دونگڑے برسائے گا اور مال و اولاد سے تمھاری مدد فرمائے گا۔ اور تمھارے لیے باغ بھی پیدا کرے گا اور نہریں بھی جاری کرے گا۔

یہ قریش کے اس وہم کا ازالہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنی خوشحالی کو اپنے بتوں کا فیض سمجھتے اور ڈرتے ہیں کہ اگر قرآن کی دعوت انھوں نے قبول کر لی تو مال و اولاد کی جس فراوانی سے وہ بہرہ مند ہیں اس سے محروم ہو جائیں گے۔ فرمایا کہ یہ ان کی نادانی ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو انھوں نے اپنے فرضی دیوتاؤں سے منسوب کر رکھا ہے۔ یہ نعمتیں سب اللہ کی عنایت کردہ ہیں اور اس نے ان کی ناشکریوں کے باوجود جب ان سے ان کو بہرہ مند کیا تو شکرگزاری کی روش اختیار کرنے کے بعد بدرجۂ اولیٰ نہ صرف ان کو باقی رکھے گا بلکہ اس میں افزونی فرمائے گا۔

توحید کی راہ ایک جانی پہچانی راہ ہے

'عَلَى الطَّرِيْقَةِ' سے مراد توحید کی صراط مستقیم ہے۔ اس کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ گویا یہ ایک جانی پہچانی راہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اس لیے کہ انسان کی فطرت اس کی گواہ ہے، عقل اس کی طرف اشارہ کر رہی ہے، آفاق و انفس اس کی گواہی دے رہے ہیں اور اللہ کے رسولوں اور اس کی کتابوں نے اسی راہ کی دعوت دی ہے۔

لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۚ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا (۱۷)

ایک برمحل تنبیہ

یہ برسر موقع ایک تنبیہ ہے کہ اس دنیا میں ہم رزق و فضل سے کسی کو جو بہرہ مند کرتے ہیں تو اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ خدا کا منظور نظر ہے بلکہ اس سے مقصود اس کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی نعمتیں پا کر اس کا شکرگزار اور فرمانبردار رہتا ہے یا ناشکرا اور مغرور و متکبر بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قریش کے یہ مغرور لیڈر اس واضح حقیقت کو فراموش کر بیٹھے۔ انھوں نے ان نعمتوں کو اپنا موروثی حق جانا اور اس غرور کے نشہ میں انھوں نے اس یاددہانی سے منہ موڑا جو اللہ نے ان کو راہ راست دکھانے کے لیے نازل فرمائی۔

'وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا'۔ یہ اسی کے ساتھ کی دوسری تنبیہ ہے کہ اس دنیا کے غرور میں مبتلا ہو کر جو لوگ اپنے رب کی یاددہانی سے منہ موڑیں گے وہ یاد رکھیں کہ

اللہ ان کو ایک ایسے عذاب میں داخل کرے گا جو برابر ترقی ہی کرتا رہے گا۔

'ذِکْر' سے مراد یہاں قرآن ہے جس کی ناقدری پر قریش کو اوپر کی آیات میں ملامت کی گئی ہے۔ یہ لفظ قرآن کے لیے جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

'عَذَابًا صَعَدًا' کے معنی لوگوں نے عام طور پر 'عذاب شدید' کے لیے ہیں لیکن لفظ 'صَعَد' کا اصل مفہوم ترقی کرنا ہے۔ اس وجہ سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس میں اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اپنی کتاب کی تکذیب کی پاداش میں جن کو پکڑتا ہے ان کی سزا وقتی اور ہنگامی نہیں ہوتی بلکہ اس میں برابر ترقی ہی ہوتی رہتی ہے۔ اس دنیا میں جس عذاب سے وہ دوچار ہوتے ہیں اس سے بڑے عذاب سے ان کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا اور پھر آگے ان کے عذاب کی شدت میں ترقی ہی ہوتی رہے گی۔ اس کے ختم یا اس میں بالتدریج کمی ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (۱۸)

اوپر والی آیت میں کلام غائب کے اسلوب میں تھا۔ اس آیت میں براہِ راست خطاب کر کے متنبہ فرمایا کہ مسجدیں صرف اللہ کی عبادت کے لیے خاص ہوتی ہیں ان میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو اس کا شریکِ عبادت نہ بناؤ۔ یہ توحید کا مضمون اس انذار ہی کا حصہ ہے جو اوپر والے ٹکڑے میں مضمر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جب اعراض کرنے والوں کو پکڑے گا تو اس کی پکڑ سے یہ فرضی دیوی دیوتا بچانے والے نہیں بنیں گے تو اللہ کی مساجد کو ان کی پوجا سے آلودہ نہ کرو۔ — سجدہ گاہ صرف اللہ ہی کے لیے ہو سکتی ہے

عبادت کا سزاوار چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، کوئی دوسرا سزاوارِ عبادت نہیں ہے اس وجہ سے ہر مسجد اپنے مقصدِ تعمیر ہی سے اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہوتی ہے۔ نہ اس کے سوا کسی اور کے لیے مسجد تعمیر ہو سکتی، نہ کسی مسجد میں غیر اللہ کی عبادت ہو سکتی۔

لفظ 'مساجد' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں خطاب قریش سے ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ اس کا مصداقِ اوّل بیت اللہ ہے۔ اس کو جمع کے لفظ سے تعبیر کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہی تمام مساجد کا قبلہ اور ان کا شیرازہ ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جمع سے تعبیر کرنے کے سبب سے یہ حکم بالکل عام ہو گیا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۱۷ 'مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ' میں بھی یہی اسلوب بیان ہے۔ وہاں بھی 'مَسٰجِدَ اللّٰهِ' کا مصداقِ اوّل بیت اللہ ہی ہے لیکن حکم کو عام کرنے کے لیے اس کو تعبیر جمع کے لفظ سے فرمایا ہے۔

وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (۱۹)

یعنی ہونا تو یہ تھا کہ بیت اللہ میں غیر اللہ کا نام بھی سنا نہ جا سکتا لیکن اس کے بالکل برعکس صورتِ حال

سبب ہے کہ جب اللہ کا بندہ صرف اپنے رب ہی کی عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو مخالفین اس کو ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔

'لِبَدًا' جمع ہے 'لِبْدَۃٌ' کی، جس کے معنی کسی تہ بہ تہ اور گتھم گتھا شے کے ہیں۔ یہ تصویر ہے اس بات کی کہ جو گھر خالص اللہ واحد کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا اب اس میں بھی توحید ایک ایسی نامانوس چیز بن کے رہ گئی ہے کہ جب اللہ کا رسول اپنے رب کی عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور توحیدِ خالص کی تعلیم پر مشتمل سورتوں کی تلاوت کرتا ہے تو لوگ اس کو ایک اعجوبہ یا دیوانہ سمجھ کر ہر سمت سے گھیر لیتے ہیں۔ بعینہٖ یہی صورت اس وقت بھی پیش آتی جب آپ دعوت کے لیے نکلتے اور لوگوں کو توحید کی سورتیں سناتے۔ اس وقت بھی شریر افراد آپ کو گھیر لیتے اور آپ کی توہین کرنے اور ایذا پہنچانے کی کوشش کرتے۔

'عَبْدُ اللّٰہِ' سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لفظ میں آپ کے لیے پیار بھی ہے اور اس حقیقت کا اظہار بھی کہ اللہ کے بندے کے لیے سب سے زیادہ معقول اور فطری کام کوئی ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اللہ ہی کو پکارے لیکن دنیا کا ضمیر اس طرح بگڑ چکا ہے کہ یہی سب سے زیادہ صحیح اور اعلیٰ کام لوگوں کے لیے ایک نہایت انوکھا اور ناگوار کام بن کے رہ گیا ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَدْعُوا رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِهِ أَحَدًا (۲۰)

پیغمبر صلعم کی طرف سے فیصلہ کن اعلان

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ خواہ یہ لوگ کتنے ہی کان کھڑے کریں اور کتنا ہی برا مانیں لیکن تم ان کی مطلق پروا نہ کرو بلکہ ان کو صاف صاف سنا دو کہ میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکاروں گا، کسی کو بھی اس کا ساجھی نہیں ٹھہراؤں گا، خواہ تم نے ان کو کتنا ہی بڑا خدا کا شریک کیوں نہ سمجھ رکھا ہو۔

قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا (۲۱)

فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر تم میری دعوت سے نفور ہو، میری بات سننے کے لیے تیار نہیں تو اس کا علاج میرے پاس نہیں ہے۔ میں داعی بنا کر بھیجا گیا ہوں، تم پر داروغہ مقرر نہیں ہوا ہوں۔ نہ تمہارا نفع و ضرر میرے اختیار میں ہے نہ تمہاری ہدایت و ضلالت۔ میں صرف اللہ کی بات پہنچانے پر مامور ہوں سو یہ کام کر رہا ہوں۔ اس سے زیادہ میرے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہاں اسلوب کی یہ ندرت ملحوظ رہے کہ 'ضَرًّا' کے بعد 'نَفْعًا' اور 'رَشَدًا' کے مقابل 'غَیًّا' کو حذف کر دیا ہے اس لیے کہ تقابل خود اس پر دلیل ہے۔

قُلْ إِنِّي لَن يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ وَلَنْ أَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَدًا (۲۲)

یہ اوپر والی بات ہی کی مزید وضاحت ہے کہ اگر میں تمہاری نازبرداری میں یا تم سے مرعوب ہو کر کسی کو خدا کا شریک مان لوں تو یہ اپنے رب پر ایسے افترا کا ارتکاب کروں گا جو سب سے بڑا جرم ہے اور جس کی سزا سے نہ مجھے کوئی دوسرا پناہ دینے والا بنے گا اور نہ میں ہی اپنے لیے کوئی ملجا و ماویٰ اس کے مقابل میں پا سکوں گا۔

اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا (۲۳)

اس آیت کا تعلق اوپر والی آیت 'لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا' سے ہے۔ یعنی میں تمھارے مطالبہ پر تمھیں عذاب دکھا سکتا اور نہ تمھارے دلوں میں ہدایت اتار سکتا۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ اللہ نے جو پیغام دے کر مجھے بھیجا ہے وہ بے کم و کاست میں تمھیں پہنچا دوں اور اس کے حکموں سے تمھیں آگاہ کر دوں۔

'رِسٰلٰتِهٖ' کا عطف 'بَلٰغًا' پر ہے۔ 'بَلَاغ' کے بعد اس لفظ کے اضافہ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ میرا فریضۂ منصبی صرف بے کم و کاست پہنچا دینا ہے۔ نہ بلاغ کے سوا تمھاری ہدایت و ضلالت سے متعلق مجھ پر کوئی ذمہ داری ہے اور نہ مجھے یہ اختیار حاصل ہے کہ تمھاری خاطر خدا کے احکام میں سرِ مو کوئی رد و بدل کر سکوں۔

'وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا'۔ یعنی یہ فرضِ بلاغ ادا کر دینے کے بعد میں بری الذمہ ہو جاؤں گا۔ جو لوگ اس کے بعد بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی پر اڑے رہیں گے وہ یاد رکھیں کہ ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

حَتّٰۤی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا (۲۴)

یعنی آج تو ان لوگوں کو اپنی قوت و جمعیت پر بڑا ناز ہے لیکن جب اس عذاب کو دیکھیں گے جس کی وعید ان کو سنائی جا رہی ہے تو وہ اچھی طرح جان لیں گے کہ قوت اور جمعیت کے اعتبار سے کمزور و ناتوان کون ہے؟ وہ، یا اللہ کا رسول جس کے انذار کو انھوں نے حقیر جانا؟

'مَا یُوْعَدُوْنَ' کے مفہوم میں وہ عذاب بھی داخل ہے جو رسول کی تکذیب کی پاداش میں لازماً اس کی قوم پر اس دنیا میں آیا ہے اور وہ عذاب بھی جس سے قیامت میں سابقہ پیش آئے گا۔ سورۂ نوح کی آیت ۴۵ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا (۲۵)

یعنی جو لوگ عذاب یا قیامت کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں اور تمھیں زچ کرنے کو پوچھتے ہیں کہ اس کا ظہور کب ہوگا ان کو جواب دے دو کہ خدا نے مجھے اس سے صرف آگاہ کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ سو میں نے اس سے آگاہ کر دیا۔ رہی یہ بات کہ اس کا ظہور کب ہوگا تو اس کی کوئی خبر مجھے نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ بالکل قریب آ لگا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ میرا رب کچھ مدت کے لیے اس کو ابھی اور ٹالے۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا (۲۶)

یعنی حقیقی عالمِ غیب وہی ہے۔ اس نے جس غیب کے علم کو اپنے لیے خاص کر رکھا ہے اس کو

کسی پر بھی ظاہر نہیں کرتا۔ 'عَلٰی غَیْبِہٖٓ' میں ہر غیب مراد نہیں بلکہ وہ غیب مراد ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے ہی لیے خاص کر رکھا ہے، مثلاً عذاب و قیامت کے وقتِ مقررہ کا علم۔ اس طرح کی باتوں کا علم اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ اور رسولوں پر بھی ظاہر نہیں کرتا۔

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُکُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا (۲۷-۲۸)

رہے اللہ کے رسول جن کو وہ منصب رسالت کے لیے انتخاب فرماتا ہے تو ان کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں تمام اسرارِ غیب سے آگاہ کر دے۔ فریضۂ رسالت کے ادا کرنے کے لیے ان کا غیب داں ہونا ضروری نہیں ہے البتہ ان کے آگے اور پیچھے وہ اپنا پہرہ رکھتا ہے تاکہ وہ دیکھتا رہے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغام و احکام بے کم و کاست پہنچا دیے یا نہیں؟

یہ استثناء عام معنی میں استثناء نہیں ہے بلکہ یہ اس طرح کا استثناء ہے جس طرح کا سورۂ غاشیہ میں ہے۔ فرمایا ہے:

فَذَکِّرْ ۟ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ ۟ لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَۜیْطِرٍ ۟ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی وَکَفَرَ ۟ فَیُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَکْبَرَ (الغاشیة - ۸۸: ۲۱-۲۴)	پس تم ان کو یاددہانی کر دو۔ تم تو بس ایک یاددہانی کرنے والے ہو۔ تم ان کے اوپر داروغہ نہیں مقرر ہوئے ہو۔ رہا وہ جو پیٹھ پھیرے اور کفر کرے گا تو اللہ اس کو عذابِ اکبر کا مزا چکھائے گا۔

اسی طرح 'اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی' ہے۔ اہل نحو اس کو استثنائے منقطع کہتے ہیں یعنی یہ سابق سے الگ بات ہوتی ہے جس کی وضاحت اس خبر سے ہوتی ہے جو اس کے بعد آتی ہے۔

'لِّیَعْلَمَ' یہاں اسی مفہوم میں آیا ہے جس مفہوم میں 'حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِیْنَ مِنْکُمْ' (محمد ۴۷: ۳۱) اور اس مفہوم کی دوسری آیتوں میں آیا ہے۔ اسی مفہوم میں 'لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ' (یونس ۱۰: ۱۴) میں لفظ 'نَنْظُرَ' بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ یوں تو جانتا سب کچھ ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ جس کے باطن میں جو کچھ ہے وہ باہر آئے اور وہ اچھی طرح اس کا امتحان کرے۔

'وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا'۔ یعنی وہ رسول کی تحویل میں جو امانت اپنے دین اور اپنی وحی کی دیتا ہے اس کو پوری طرح اپنی نگرانی میں رکھتا ہے۔ ایک ایک چیز کو گنے ہوئے ہوتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس کے شمار سے رہ جائے۔

ربِّ کریم کی معونت اور توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی احسانہ۔

رحمان آباد
۲۰ - اکتوبر ۱۹۷۸ء
۱۷ - ذی قعدۃ ۱۳۹۸ھ

فہرست مضامین

تفسیر سورۃ القمر ۵۴

تفسیر سورۃ الطلاق - ۶۵

تفسیر سورۃ التحریم - ۶۶

خطاطی ـــــ عبدالغفور کیلانی

افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

المزمل ۷۳ — الناس ۱۱۴

تدبرِ قرآن

جلد نہم

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبرِ قرآن

جلد نہم

تفاسیر

سورۂ مزمل (۷۳) — تا — سورۂ ناس (۱۱۴)

امین احسن اصلاحی

فاران فاؤنڈیشن

لاہور — پاکستان

اہتمام ـــــ حسن خاور

مطبع ـــــ فلک شیر پرنٹرز، ابراہیم روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت ـــــ نومبر 2009ء ـــ ذیقعد 1430ھ

ادارہ ـــــ فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،

ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244

ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

(طبع اول)

الحمد للہ ۲۹ رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۲ اگست سنہ ۱۹۸۰ء کو تدبر قرآن کی آٹھویں یعنی آخری جلد کی آخری سطریں سپرد قرطاس ہوئیں۔ اس کتاب کی تحریر کا کام غالباً میں نے سنہ ۱۹۵۸ء میں شروع کیا اور اب سنہ ۱۹۸۰ء ہے۔ یعنی کم و بیش تیئیس ۲۳ سال کے طویل اور پُرمشقت سفر کے بعد قلم کا مسافر اپنی آخری منزل پر پہنچا ہے۔ اس طویل سفر میں جن مرحلوں سے گزرنا پڑا اور جن آزمائشوں سے سابقہ پیش آیا اور میرے رب نے جن جن طریقوں سے ان تمام مراحل میں میری دست گیری فرمائی ہے یہ ایک نہایت سبق آموز داستان ہے۔ لیکن اس وقت میں اس کے سنانے میں آپ کا وقت صرف کرنا نہیں چاہتا، اس کو میں نے اپنے اور اپنے رب کے درمیان ایک راز ہی رکھا ہے اور راز ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ البتہ ہر بُنِ مُو سے اس کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھ جیسے ہیچمیرز اور بے سروسامان کو اپنی کتاب عزیز کی ایک ایسی خدمت کی توفیق بخشی جو اس کی عنایت خاص ہی سے کسی کو حاصل ہو سکتی ہے۔

اس کتاب کی تاریخ — اس کتاب کی تحریر کا کام تو جیسا کہ عرض کیا، سنہ ۱۹۵۸ء میں شروع ہوا لیکن اس کے لیے فکری تیاریوں میں سنہ ۱۹۲۵ء ہی سے میں لگ گیا تھا۔ یہی سال ہے جس میں مجھے مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا جس کا سلسلہ پورے پانچ سال قائم رہا۔ اس کے بعد سے قرآن مجید میرے غور و فکر کا مستقل موضوع بن گیا۔ اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ یہ کتاب میری پچپن سال کی کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ لیکن اس میں صرف میرا ہی فکر نہیں ہے بلکہ میرے استاذؒ کا فکر بھی ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں ذکر کر چکا ہوں کہ میرا فکر میرے استاذؒ کے فکر سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ استاذ مرحوم ہی کے فکر کی توضیح و تکمیل ہے۔ ان کے فکر کے جس حصہ کا تعلق براہ راست قرآن مجید سے ہے میں نے اس کتاب میں اس کو واضح طور پر بیان بھی کیا ہے اور اگر کوئی پہلو مجھے اس کا تشنہ محسوس ہوا ہے تو اس کا خلا پُر کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اس فکر کی تاریخ، جہاں تک مجھے علم ہے یہ ہے کہ انھوں نے علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں قرآن مجید پر غور کا کام شروع کیا اور زندگی کے آخری لمحات تک یہ پوری باقاعدگی سے جاری

رہا۔ یہ مدت سرسری اندازے کے مطابق کم و بیش تیس پینتیس سالوں پر ممتد ہے۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ تدبر قرآن کے کم و بیش چھ ہزار صفحات میں تقریباً ایک صدی کا وہ فکری مواد آپ کے سامنے آیا ہے جس کو آپ فکرِ فراہی سے موسوم کر سکتے ہیں۔

اس کتاب کا منہج

اس کتاب کے منہج سے متعلق مقدمۂ کتاب میں تفصیل سے واضح کر چکا ہوں کہ اس میں قرآن مجید پر غور اور اس کی مشکلات حل کرنے کے لیے براہِ راست غور (DIRECT APPROACH) کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی تفسیر کا اصل ماخذ قرآن کی زبان، اس کی آیات کے نظام اور اس کے اپنے اندرونی نظائر و شواہد کو قرار دیا گیا ہے۔ مروجہ طریقہ کے مطابق صرف تفسیر کی کتابوں سے نقلِ اقوال پر اکتفا نہیں کر لیا گیا ہے۔ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور نحوی مشکلات میں بھی براہِ راست اصل عربی زبان سے رہنمائی حاصل کی گئی ہے۔ مجرد اہلِ تاویل کے اقوال پر اعتماد نہیں کیا گیا ہے۔ اسی طرح آیات کی تاویل و ترجیح میں بھی قرآن کی زبان، کلام کے نظام اور قرآن کے نظائر و شواہد کو پوری اہمیت دی گئی ہے۔ کسی قول کو مجرد اس دلیل پر نہیں اختیار کر لیا گیا کہ وہ اگلے اصحابِ تاویل سے منسوب ہے چنانچہ اس میں اقوال کی کثرت کے بجائے دلائل کی روشنی میں ہر آیت کی ایک متعین تاویل سامنے رکھی گئی ہے۔

قرآن کی منطق اور اس کی حکمت کی بنیادیں بھی اس میں نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ اس کا عقلی استدلال اور اس کی حجت دل نشین انداز میں سامنے آئے اور متکلمین کے فرسودہ اندازِ استدلال اور قرآن کے فطری طرزِ استدلال میں جو فرق ہے، وہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

تفسیر کی کتابوں، قدیم آسمانی صحیفوں، تاریخ کی کتابوں، اور شانِ نزول کی روایتوں سے بھی اس میں پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ لیکن ان کو قرآن کے تحت رکھ کر استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان کو قرآن پر حاکم بنا دیا گیا ہو اور قرآن کے الفاظ ان کو قبول کریں یا نہ لیکن ان کو قرآن میں گھسانے کی کوشش کی گئی ہو۔

کسی اعلیٰ کلام کا حسن و جمال اس کے نظام اور اس کی ترتیب کے اندر ہی مضمر ہوتا ہے اور اس کی قوتِ استدلال کا انحصار بھی بیشتر اسی چیز پر ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کتاب میں قرآن کا یہ پہلو سب سے زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ جو لوگ قرآن کے اندر کسی نظم و ترتیب کے قائل نہیں ہیں ان کا یہ سوئے ظن دور ہو۔ اس میں ہر سورہ کے مطالب کا تجزیہ (ANALYSIS) کر کے سورہ کا عمود، موضوع متعین کر دیا گیا ہے، جس سے ہر سورہ منتشر باتوں کے مجموعہ کے بجائے ایک متعین موضوع پر ایک جامع اور دل نشین خطبہ کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ مطالب کا تجزیہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کا باہمی منطقی ربط بھی خود بخود واضح ہو جائے اور عمود کے ساتھ ان کا تعلق بھی بے نقاب ہو جائے۔

علاوہ ازیں قرآن مجید میں سورتوں کی زمرہ بندی (GROUPING) جس حکمت پر مبنی ہے اس کا

اصلی حسن و جمال بالکل مخفی تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کا رمز اور فلسفہ اس تفسیر میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے دکھایا ہے کہ یہ سورتیں سات گروپوں (زمرات) میں تقسیم ہیں۔ ان میں کی اور مدنی کی تقسیم اس طرح ہے کہ کی سورتیں مقدم ہیں اور مدنی مؤخر۔ نیز ہر سورہ اپنا ایک مثنیٰ بھی رکھتی ہے۔ اگر کہیں اس اصول کی خلاف ورزی ہوئی ہے تو کسی خاص حکمت کے تحت ہوئی ہے، جس کی وضاحت میں نے کر دی ہے۔ جس طرح ہر سورہ کا ایک متعین عمود ہے اسی طرح ہر گروپ کا بھی ایک جامع عمود ہے جو پورے گروپ پر حاوی ہے۔ میرے نزدیک یہ ترتیب منصوص ہے، جس کے دلائل خود قرآن میں موجود ہیں اور میں نے ان کی وضاحت کی ہے۔

اس تفسیر کی یہ خصوصیات جب میں نے مقدمے میں بیان کی تھیں تو اس وقت اس کی صرف پہلی جلد لوگوں کے سامنے آئی تھی، اس وجہ سے ممکن ہے بہت سے لوگوں کو یہ باتیں انوکھی محسوس ہوئی ہوں، لیکن اب خدا کے فضل سے سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ ناس تک کی پوری تفسیر آپ کے سامنے ہے۔ اس کو پڑھ کر جانچیے کہ جن اصولوں کا میں نے مقدمہ میں حوالہ دیا ہے، ان پر یہ پوری اترتی ہے یا نہیں اور قرآن پر غور کرنے کے لیے یہ اصول بالکل فطری، عقلی اور سائنٹیفک ہیں یا نہیں۔ پھر اس بات پر بھی غور کیجیے کہ کیا ان اصولوں کو اپنائے بغیر قرآن کے اس خزانۂ حکمت تک رسائی ہو سکتی ہے جس سے بہرہ یاب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب نازل فرمائی ہے!

یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھیے کہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے امتیاز کے لیے ایک کسوٹی بنا کر ہمارے ہاتھوں میں دیا ہے۔ اگر یہ کسوٹی ہمارے پاس نہ رہے یا ہم اس کے استعمال سے ناآشنا ہو جائیں تو پھر حق و باطل میں امتیاز کے لیے ہمارے پاس کوئی روشنی باقی نہیں رہ جاتی۔ میں نہایت صدمہ کے ساتھ یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ اس وقت یہی صورت حال ہے۔ قرآن تو موجود ہے لیکن اس کا علم ہمارے اندر موجود نہیں ہے۔ اس وقت یہ یا تو حصول ثواب اور ایصال ثواب کی چیز بن کے رہ گیا ہے یا تجارت کی اور جو جتنی ہی بلند آہنگی سے اس کا نام لیتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ اس سے محروم و ناآشنا نظر آتا ہے۔ اگر اس امت کو بحیثیت امت مسلمہ زندہ رکھنا ہے تو یہ کام نہ وحدت امت کی مالا جپنے سے ہوگا نہ قرآن کا وظیفہ پڑھنے سے، بلکہ اس کے لیے سب سے مقدم شے قرآن کے صحیح علم کو اجاگر کرنا ہے۔ جن کے اندر اس کا صحیح علم ہوگا انہی کے اندر صحیح عمل پیدا ہوگا اور اس امت کی جب بھی اصلاح ہوگی انہی کے مبارک ہاتھوں سے ہوگی۔ لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا (اس امت کے آخر دور کے لوگ بھی اسی چیز سے اصلاح پذیر ہوں جس سے اس کے دور اول کے لوگ اصلاح پذیر ہوئے)۔

تصنیف کا اصل محرک

اس امر واقعی کا اظہار بھی غالباً نامناسب نہیں ہوگا کہ یہ کتاب میں نے شوق تصنیف کے جذبے کے تحت نہیں بلکہ مجرد ادائے فرض کے احساس سے مجبور ہو کر لکھی ہے۔ میں نے پچھلی جلدوں میں سے کسی جلد کے

دیباچہ میں ذکر کیا ہے کہ اس کا آغاز جب میں نے کیا تو اس وقت میرا احساس یہ تھا کہ گویا ڈوبنے اور تیرنے سے بے نیاز ہو کر ایک سمندر میں چھلانگ لگا دی ہے۔ اس کے لیے قلم اٹھانے سے پہلے میں نے اس کی مشکلوں اور نزاکتوں کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کیا لکھنا ہے، کس طرح لکھنا ہے اور جن کے لیے لکھنا ہے، ان کی طرف سے اس کی پذیرائی کی کس حد تک مجھے توقع کرنی ہے۔ اس وجہ سے اگرچہ میں اس کام پر اپنے کو مجبور پا رہا تھا لیکن ساتھ ہی دل کے مخفی گوشوں میں یہ خواہش بھی دبی ہوئی تھی کہ اس کے خیر و شر کی ذمہ داریوں سے میں بچا لیا جاؤں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ میں جب ۱۹۷۱-۱۹۷۲ء میں بیمار پڑا اور معالجوں نے میری اس بیماری کا سبب کثرت کار کو قرار دے کر مجھے دماغی محنت سے بالکل روک دیا تو مجھے اس بات کا مطلق افسوس نہیں ہوا کہ میرا کام ناتمام رہ گیا، بلکہ دل پوری طرح مطمئن رہا کہ جتنا میرے رب نے چاہا اتنا ہو گیا، اب آگے کا کام اگر اسے منظور نہیں ہے تو اسی میں حکمت ہے اور مجھے اس کے فیصلہ پر راضی ہونا چاہیے۔ میں دوستوں سے یہ بھی کہتا رہا ہوں کہ اگر سورۂ توبہ تک بھی لکھنے کی فرصت مجھے مل گئی تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصد پورا ہو گیا اس لیے کہ استاذ مرحوم کے اصولوں کی صداقت اور قدر و قیمت واضح کرنے کے لیے اتنی تفسیر بھی کافی ہے۔

بعد میں جب صحت کچھ ٹھیک ہوئی تو مجھے حالات سے مجبور ہو کر لاہور کی سکونت ترک کر کے ضلع شیخوپورہ کے ایک دیہات ——— رحمان آباد ——— میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ دیہات میں قرینہ کا کوئی مکان تھا نہ ابتدا کے چار سالوں میں بجلی وغیرہ کی سہولتیں میسر تھیں، اس وجہ سے شروع شروع میں نہایت صبر آزما حالات سے سابقہ پیش آیا۔ ایسے حالات میں لکھنے پڑھنے کے کسی سرسری کام پر بھی طبیعت کو آمادہ کرنا نہایت مشکل تھا چہ جائیکہ تدبر قرآن کا کام، لیکن میں نے مضبوط ارادہ کر رکھا تھا کہ قلم اٹھاؤں گا تو تدبر قرآن ہی کے لیے اٹھاؤں گا۔ اس کے سوا کسی اور کام پر اپنی قوت کو صرف کرنا اس رب کی ناشکری ہو گی جس نے مجھے از سرِ نو قلم ہاتھ میں لینے کی صلاحیت بخشی ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اس کتاب کی کتنی سورتوں کی تفسیر میں نے کسی سرسے یا شیشم کے نیچے بیٹھ کر اس حال میں لکھی ہے کہ اوپر سے چڑیوں اور بھڑوں کی یورش ہے، نیچے سے مکھیوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا ہے، مسودہ پسینہ سے بھیگ رہا ہے لیکن میں کسی آیت کی مشکلات حل کرنے میں اس طرح مستغرق ہوں کہ مجھے اپنے دین یا جی کا کچھ ہوش نہیں۔

کوئی مضائقہ نہیں ہو گا اگر یہ راز بھی برملا ظاہر کر دوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے لکھنے کی کچھ صلاحیت تو ضرور بخشی ہے لیکن اپنی لکھی ہوئی چیزوں کی طباعت و اشاعت کا کوئی سلیقہ میرے اندر نہیں ہے اور مجھے اپنی اس بے سلیقگی پر کچھ افسوس بھی نہیں ہے۔ میں مطمئن ہوں کہ میرا کام لکھنا تھا میں نے لکھ دیا۔ اس کو چھاپنا اور بیچنا میرا کام نہیں۔ رہا میری معاش کا مسئلہ تو اس کے لیے نہ میں نے کچھ کیا ہے، نہ اب کر سکتا ہوں

میں دوستوں سے مذاق کے انداز میں کہتا رہا ہوں اور آج سنجیدہ انداز میں لکھ رہا ہوں کہ دین اور دنیا دونوں کے معروف کے خلاف میرے نان ونفقہ کی ذمہ داری میری بیوی پر ہے۔ ان کے پاس ان کے والد مرحوم کے ترکے سے ملی ہوئی کچھ زمین تھی۔ میں اس کی کچھ دیکھ بھال کرتا رہا ہوں۔ اسی کی آمدنی سے اب تک ہمارا گزارا ہوتا رہا ہے اور چونکہ معیار زندگی کے فتنوں سے ہماری زندگی محفوظ رہی ہے اس وجہ سے اچھا گزارا ہوا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جس رب کریم نے بچپن میں پالا، جوانی میں کھلایا پہنایا؛ وہ بڑھاپے میں بھی بھوکا ننگا نہیں رکھے گا۔ بس یہ یقین میرا اصل سرمایہ ہے۔

کتاب کے مستقبل سے متعلق — اس کتاب کے مستقبل سے متعلق اگرچہ، جیسا کہ شروع میں عرض کر چکا ہوں، میں کچھ پرامید نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس دنیا نے امام فراہی علیہ الرحمۃ جیسے محقق کی کیا قدر کی ہے کہ وہ میری چیزوں کی قدر کرے گی، لیکن مجھے بہر حال اپنا فرض ادا کرنا تھا چنانچہ میں نے ستائش اور صلہ کی تمنا سے بے پروا ہو کر کام شروع کر دیا اور اب تیئیس سال کے بعد میرا اندازہ اس سے بالکل مختلف ہے جو پہلے تھا۔ اب میں نہایت واضح اور قابل اعتماد معلومات کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ یہ فکر اس تیزی سے اہل علم میں مقبول ہو رہا ہے کہ مجھے نہایت قوی امید ہے کہ یہ تمام ذہین لوگوں کے دلوں کو بہت جلد موہ لے گا۔ مجھے ہر مکتب فکر کے علماء سے بھی ملنے کے مواقع ملے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ حضرات سے بھی، میں نے سب کو اس کا معترف و مداح پایا ہے۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ یہی راستہ قرآن کو سمجھنے سمجھانے کا سب سے کامیاب راستہ ہے اور دعا کر رہے ہیں کہ یہ مکمل صورت میں ان کے سامنے آجائے تاکہ وہ درس و تعلیم میں اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ پاکستان اور بھارت میں کتنے دار العلوم اور کتنی مسجدیں ہیں جن میں اس کی روشنی میں درس ہو رہے ہیں۔ یورپ، امریکہ، عرب، افریقہ اور برما میں بھی جن ذہین لوگوں تک اس کا کوئی حصہ پہنچ چکا ہے وہ اس کو مکمل صورت میں حاصل کرنے کے لیے بے چین ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہی طریقہ قرآن پر غور کرنے کا سائنٹفک طریقہ ہے، اس کے سوا کوئی اور طریقہ اس زمانے کے لوگوں کو اپیل نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ اس کو انگریزی اور عربی میں منتقل کرنے پر بھی اصرار کر رہے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ جن تعلیم یافتہ غیر مسلموں تک اس کا کوئی حصہ پہنچا ہے وہ اس کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ مصر وغیرہ کی بعض یونیورسٹیاں فکر فراہی پر ریسرچ کرنے والوں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دے چکی ہیں۔ پاکستان کے بعض تحقیقاتی اداروں میں بھی فکر فراہی پر ریسرچ ہو رہی ہے۔

لوگوں کو یہ شکایت نہیں ہے کہ تدبر قرآن میں کوئی چیز مشکل یا فہم سے بالاتر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس تفسیر میں وہی کچھ ہے جو تفسیر میں ہونا چاہیے اور یہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں کے لیے یکساں نافع ہے، خواہ عالم ہو یا عامی۔ میرے پاس اس طرح کی رایوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ لوگ کتاب کو خود اس کی صلاحیتوں کی روشنی میں جانچیں اور پرکھیں، صرف دوسروں سے متاثر ہو کر کوئی

لائے نہ قائم کریں۔ اس وجہ سے میں نے ان کے مخطوطات کی اشاعت کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔

مولانا فراہی علیہ الرحمۃ کو میں نے اپنے علوم و افکار کی اشاعت کے باب میں کبھی فکر مند نہیں پایا، یہاں تک کہ انھوں نے کبھی اس بارے میں مجھ سے بھی ایک حرف نہیں کہا، لیکن یہ نصیحت وہ بار بار کرتے تھے کہ آدمی کو ہمیشہ پوری تحقیق اور کامل غور و فکر کے بعد بات کہنی یا لکھنی چاہیے۔ جو بات محکم ہوتی ہے وہ جڑ پکڑتی ہے، کمزور باتیں وقتی طور پر چاہے پھیل جائیں لیکن بالآخر وہ ہوا میں اڑ جاتی ہیں۔ مولانا کے اس قول کی صداقت الحمد للہ اب مجھ پر اچھی طرح واضح ہو رہی ہے۔

یہ کتاب ایک فکری انقلاب کی راہ ہموار کرے گی

اگرچہ میں نے اپنی پوری جوانی اور سارا بڑھاپا اسی کتاب کی تیاریوں اور اسی کی تحریر و تسوید پر صرف کیا ہے لیکن میں اس دعوے کے ساتھ اس کو پیش نہیں کر رہا ہوں کہ اس کے ذریعہ میں نے قرآن کو سمجھا دیا ہے یا اس کے سارے علوم اس میں جمع کر دیے ہیں۔ قرآن علم و حکمت کا ایک سمندر ہے، اس کے علوم کا احاطہ اس کے نازل کرنے والے کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ احساس میرا ضرور ہے کہ اس کتاب میں قرآن پر غور کرنے کی راہ میں نے کھول دی ہے۔ اگر آپ ان اصولوں کو جو اس کتاب میں بیان ہوئے ہیں رہنما بنا کر قرآن پر غور کریں گے تو مجھے پورا اعتماد ہے کہ حکمت کے ان خزانوں تک پہنچ سکیں گے جو اس میں موجود ہیں۔ اس سے زیادہ میرا کوئی دعویٰ نہیں ہے اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اگر آپ اس طرح قرآن کو سمجھنے کی اہلیت پیدا کر لیں گے تو لاریب آپ کے لیے قرآن مجید ایک ایسی کسوٹی بن جائے گا جس کے ذریعہ سے آپ اپنے تمام علوم و افکار کے حق و باطل اور ان کے غث و سمین میں امتیاز کر سکیں گے۔ آپ کے لیے یہ کام نہایت آسان ہو جائے گا کہ آپ احادیث، فقہ، کلام و فلسفہ اور تصوف و اسرار سب کو پرکھ کر بتا سکیں کہ ان میں کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ یہ چیز اس تقلید و جمود کو توڑے گی جس نے اس امت کو فرقوں اور گروہوں میں بانٹ رکھا ہے اور کیا عجب کہ اس طرح اس انقلاب کی راہ ہموار ہو جائے جو اس منتشر بھیڑ کو پھر اس دنیا میں ایک جہانی قوت بنا کر کھڑا کر دے۔ بہرحال میں نے قرآن کو سمجھنے کے لیے صرف راہ ہموار کی ہے، کرنے کا کام ابھی بہت ہے اور وہ آگے آنے والوں کو کرنا ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

قرآن کا صحیح علم آپ کو حاصل ہو جائے تو آپ کے لیے ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے۔ نہ کوئی قدیم چیز آپ کو گمراہ کر سکتی نہ کوئی جدید چیز۔ یہی اصل کلید ہے۔ یہ کلید اگر آپ کو نہ مل سکی یا ملی لیکن آپ نے اس کی قدر نہ کی تو اس تاریکی سے آپ کسی طرح نہیں نکل سکتے جس میں اس وقت گھرے ہوئے ہیں۔ میں اس دور کے نوجوانوں اور بڈھوں دونوں کو دعوت دیتا ہوں کہ اگر ان کو اپنا اور اس امت کا مستقبل عزیز ہے تو وہ

پر نہ دیکھیں کہ بات کس نے کہی ہے بلکہ صرف یہ دیکھیں کہ کیا بات کہی ہے۔ حق ایک متاعِ مشترک ہے جس پر کسی کا اجارہ نہیں اور کسی حق کی ناقدری کا خسارہ اسی کو ہوتا ہے جو اس کی ناقدری کرتا ہے نہ کہ حق کے پیش کرنے والے کو۔

دہرا احساس

۲۹۔ رمضان سنہ ۱۴۰۰ھ کو اس کتاب کی آخری سطریں حوالۂ قرطاس کرتے ہوئے میں نے صرف یہی نہیں محسوس کیا کہ یہ کتاب میں نے پوری کر دی بلکہ یہ بھی محسوس کیا کہ اپنی زندگی کا آخری ورق بھی الٹ دیا۔ ایک بھاری بوجھ جو تیئیس سال اٹھائے لیے پھرا اس سے سبکدوش ہونے پر ایک گہری مسرت کا احساس تو ایک فطری چیز ہے لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی ہے کہ اب کیا کام کرنے کی صلاحیت باقی رہ گئی ہے جس کے لیے جینے میں لذت ہو۔ میں نے آخری سطریں لکھ کر اپنا سر اپنے رب کے آگے ڈال دیا اور صرف یہ دعا کی کہ اے رب! اگر تو نے اپنی کتاب عزیز کی خدمت کی یہ توفیق بخشی تو اس کو قبول بھی فرما اور اس کو اپنے غلام کی نجات کا ذریعہ بنا، بس اس کے سوا میں کسی چیز کا متمنی نہیں۔ یہ سطریں جن کی نظروں سے بھی گزریں ان سے التماس ہے کہ وہ اس دعا پر آمین کہیں۔

ہمراہانِ سفر کا شکریہ

اس طویل سفر کا بیشتر حصہ میں نے تنہا ہی طے کیا لیکن کبھی کبھی بعض ہم سفر بھی ملتے رہے ہیں، جن کی رفاقت جس حد تک بھی مجھے حاصل ہوئی اس کی مسرت آمیز یاد میرے دل میں باقی ہے اور ان شاء اللہ باقی رہے گی۔ ان میں سے جن دوستوں کا ذکر سابق دیباچوں میں ہو چکا ہے ان کے ناموں کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن بعض دوسرے دوستوں کا شکریہ واجب ہے جن کا ذکر ابھی اس کتاب میں نہیں آیا ہے، حالانکہ خاص اس کتاب کے سلسلہ میں انھوں نے میرا بڑا ہاتھ بٹایا ہے اور میں ان کے اس بے غرضانہ تعاون کا نہایت ممنون ہوں۔ عزیزم غلام صمدانی صاحب سلمہٗ نے جو ان دنوں امریکہ میں زیر تعلیم ہیں، ایک زمانے میں خود میری خدمت بھی میرے بیٹوں سے زیادہ کی ہے اور اس کتاب کے مسودات بھی بڑی محنت اور بڑے سلیقے سے نقل کرتے رہے ہیں۔ برادرم عبداللہ غلام احمد صاحب، واپڈا میں ملازم ہیں؛ انھوں نے مسودات کی نقل و تبییض میں بھی بڑا حصہ لیا ہے اور بہت سی مشکلات حل کرنے میں بھی ان کی ذہانت سے میں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ کسی خاص مشکل کے حل کے سلسلہ میں حوالوں وغیرہ کی تلاش کا کام تو برادرم خالد مسعود صاحب پہلے سے کرتے رہے ہیں، لیکن ادھر بعض ضروری حوالوں کی تلاش میں عزیزم جاوید احمد صاحب نے بھی مدد کی ہے جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہٗ کا نام تو اس کتاب کی تاریخ کا اب ایک حصہ بن گیا ہے۔ کتاب کی طباعت و اشاعت کے سابق انتظام سے جب میں غیر مطمئن ہوا تو انھوں نے آگے بڑھ کر مجھے تسلی دی کہ اب آئندہ کی جلدوں کا انتظام وہ خود کریں گے اور ایک پروگرام کے مطابق کریں گے۔ مجھے ان کے حوصلہ سے

بڑی مسرت ہوئی۔ اگرچہ ان کے تجربہ پر مجھے ابتداء میں اطمینان نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ارادہ میں برکت دی۔ وہ ٹھیک مقررہ پروگرام کے مطابق اپنا وعدہ پورا کرنے میں کامیاب ہوئے اور نہایت شاندار طریقہ پر کامیاب ہوئے۔

میں ان تمام دوستوں کا دل سے شکرگزار اور ان کے لیے دعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سے دین کی کوئی ایسی خدمت لے جو دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے لیے سرخروئی کا باعث ہو۔

۹۔ دسمبر ۱۹۸۰ء
۳۰۔ ذوالحجہ ۱۴۰۰ھ

والسلام
امین احسن اصلاحی
لاہور

تدبرِ قرآن

۷۳

المزّمّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا زمانۂ نزول اور عمود

یہ سورہ اور بعد کی سورہ ـــــــ المدّثر ـــــــ دونوں بالکل ہم رنگ و ہم مزاج اور توام ہیں۔ عام مفسرین نے ان کو بالکل ابتدائی سورتوں میں سے شمار کیا ہے لیکن ان کے مطالب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس دور میں نازل ہوئی ہیں جب قریش کے امراء و اغنیاء کی طرف سے دعوت کی مخالفت اتنی شدت اختیار کر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس صورتِ حال سے نہایت مغموم و متفکر رہنے لگے ہیں۔

ایک انسان جب اپنے ماحول میں ہر شخص کی مخالفت اور اس کے طعن و طنز کا ہدف بن کر رہ جائے درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اس ماحول ہی کی اصلاح پر مامور ہو تو اس کے غم و الم کا جو حال ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس صورتِ حال سے قدرتاً اس پر خلوت پسندی اور خلق سے بے تعلقی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اٹھتا ہے تو اپنی چادر لپیٹ کر چلتا ہے تو اس میں لپٹ کر، بیٹھتا ہے تو اس میں گوشہ گیر ہو کر اور لیٹتا ہے تو اس میں چھپ کر، اس لیے کہ تنہا اس کی چادر ہی ہوتی ہے جس کے دامن میں فی الجملہ اس کو اپنے باطن میں غوطہ زن ہونے اور اپنے خالق سے تعلق و توسل کے لیے سکون و اطمینان ملتا ہے۔

اس کا تھوڑا بہت تجربہ تو ہر اس شخص کو ہوتا ہے جو خلق و خالق سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھنے والا ہو لیکن انبیاء علیہم السلام کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ وہ خلق کے لیے سراپا رحمت و شفقت اور اپنے رب کی ڈالی ہوئی ذمہ داریوں کے معاملے میں نہایت حساس ہوتے ہیں۔ وہ اپنی جان توڑ مساعی و اصلاح کے باوجود جب دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی مخاصمت بڑھتی جا رہی ہے تو ان کو گمان گزرتا ہے کہ مبادا اس میں انہی کی کسی کوتاہی کو دخل ہو۔ یہ چیز ان کے غم و فکر کو اور زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو مطعون کر کے اپنے دل کو تسلی دینے کے بجائے خود اپنے اندر خلوت گزیں ہو کر صورتِ حال کا صحیح حل ڈھونڈھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ذہنی کیفیت میں ان کو اپنی سب سے بڑی غم گسار اپنی چادر ہی محسوس ہوتی ہے جس میں چھپ کر گویا وہ اپنے ماحول سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

چادر میں لپٹنے والے کو عربی میں 'مزّمّل' کہتے ہیں۔ اس لفظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کی اسی فکرمندی کا سراغ دیا ہے۔ یہ نہایت پیار کا خطاب ہے۔ اس دلنواز خطاب سے مخاطب کر کے آپ کو

وہ طریقہ بتایا گیا ہے جو اس غم و الم کو دور کر کے آپ کے اندر وہ قوت و عزیمت پیدا کرے گا جو موجودہ اور آئندہ پیش آنے والے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے۔ گویا اس سورہ میں حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے آپ کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی گئی ہے اور ساتھ ہی وہ نسخہ بھی بتایا گیا ہے جو حوصلہ کو بلند اور کمرِ ہمت کو مضبوط رکھنے کے لیے نہایت کیمیا اثر ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۱۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی تاکید کہ شب میں قیام لیل کا اہتمام کرو جس میں قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ اس سے دل کو ثبات اور دماغ کو بصیرت حاصل ہو گی جو آگے کی بھاری ذمہ داریوں کے اٹھانے کا اہل بنائے گی۔ اسی طرح دن میں بھی تسبیح و تہلیل کے لیے بڑی گنجائش ہے تو اپنے رب کے ذکر میں معلق اور اس کے دامنِ رحمت میں پناہ گیر رہو۔ مشرق اور مغرب کا خداوند وہی ہے تو اپنا معاملہ اسی کے سپرد کرو۔ تمہارے اعداء جو بکواس کر رہے ہیں اس کو صبر کے ساتھ نظر انداز کرو اور ان کا معاملہ ہم پر چھوڑو۔ ہم ان سے نمٹنے کے لیے تنہا کافی ہیں۔

(۱۵-۱۹) قریش کے لیڈروں کو تہدید و وعید کہ جس طرح ہم نے اپنے دین کی گواہی دینے کے لیے فرعون کی طرف اپنا رسول بھیجا اسی طرح تمہاری طرف بھی ہم نے اپنا رسول بھیجا ہے تو رسول کی نافرمانی کا جو انجام فرعون اور اس کی قوم کے سامنے آیا اس انجام کو یاد رکھو۔ اگر تم نے اسی کی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارا انجام اس سے مختلف ہو۔ اس دن کو یاد رکھو جس کا ہول بچوں کو بوڑھا بنا دے گا اور جس کے بوجھ سے آسمان پھٹا پڑ رہا ہے۔ اس سے آگاہ کرنے کے لیے ہم نے یہ یاددہانی اتار دی ہے تو جو سلامتی چاہے وہ اپنے رب کی راہ اختیار کر لے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہے۔

(۲۰) آخر میں ایک مدنی آیت جس میں حالات کے تبدیل ہو جانے کے سبب سے اس حکم میں کسی قدر تخفیف کر دی گئی ہے، جو ابتدائی آیات میں دیا گیا ہے، اور اس کسر کے جبر کے لیے بعض ایسے بدل بتا دیے گئے جو اصل مقصد کی حفاظت کرنے والے اور بدلے ہوئے حالات کے مناسب ہیں۔

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات : ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۲۰ يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ
مِنْهُ قَلِيْلًا ۝۳ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴ اِنَّا
سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝۵ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ
وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝۶ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝۷
وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝۸ رَبُّ الْمَشْرِقِ
وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝۹ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا
يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝۱۰ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ
اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝۱۱ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝۱۲
وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۳ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَ
الْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ۝۱۴ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ
رَسُوْلًا ۥ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝۱۵
فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ۝۱۶ فَكَيْفَ
تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَا ۝۱۷ السَّمَآءُ

مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ۭ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ
ع ۱ ۱۹ ۱۴ شَاۗءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ
اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَاۗىِٕفَةٌ مِّنَ
الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ اَنْ لَّنْ
تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ عَلِمَ
اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ
يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ڮ
فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ
تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا
ع ۲ ۱ ۱۴ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾

ترجمۂ آیات ۱-۲۰

اے چادر میں لپٹنے والے! رات میں قیام کر مگر تھوڑا حصہ۔ آدھی رات یا اس میں سے کچھ کم کر دے یا اس پر کچھ زیادہ کر لے اور قرآن کی تلاوت کر ٹھہر ٹھہر کر۔ ہم تم پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ بے شک رات میں اٹھنا دل جمعی اور فہم کلام کے لیے نہایت خوب ہے۔ دن میں بھی تمھارے لیے کافی تسبیح کا موقع ہے اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور اس کی طرف گوشہ گیر ہو جا۔ وہی مشرق و مغرب کا خداوند ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو اپنا کارساز بنا اور یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کر اور ان کو خوبصورتی سے نظر انداز کر اور ان اہلِ نعم جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ اور ان کو کچھ دیر اور

مہلت دے۔ ہمارے پاس ان کے لیے بیڑیاں اور دوزخ کی آگ ہے اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور نہایت دردناک عذاب۔ اس دن جس دن زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑ بھربھرے ٹیلے بن جائیں گے۔ ۱-۱۴

ہم نے تم لوگوں کی طرف ایک رسول بھیجا ہے تم پر گواہ بنا کر جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تو فرعون نے رسول کی نافرمانی کی پس ہم نے اس کو پکڑا نہایت سخت پکڑنا تو اگر تم نے بھی کفر کیا تو اس دن کے عذاب سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا! آسمان اس کے بوجھ سے پھٹا پڑ رہا ہے اور اللہ کا وعدہ شُدنی ہے۔ یہ ایک یاددہانی ہے تو جو چاہے وہ اپنے رب کی راہ اختیار کرلے۔ ۱۵-۱۹

بے شک تمہارا رب جانتا ہے کہ تم شب میں دو تہائی رات کے قریب یا نصف یا تہائی رات قیام کرتے ہو اور ایک گروہ تمہارے ساتھیوں میں سے بھی۔ اور اللہ ہی رات اور دن کا اندازہ ٹھہراتا ہے۔ اس نے جانا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے تو اس نے تم پر عنایت کی نظر کی تو قرآن میں سے جتنا میسّر ہوسکے پڑھ لیا کرو۔ اس کے علم میں ہے کہ تم میں مریض بھی ہوں گے اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کے فضل کی طلب میں سفر کریں گے اور دوسرے ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھیں گے تو جتنا میسّر ہوسکے اس میں سے پڑھ لیا کرو اور نماز کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرض دو قرض اچھا اور جو کچھ بھی تم اپنے لیے پہلے سے بھیج رکھو گے اس کو اللہ کے پاس اس سے بہتر اور اجر میں برتر پاؤ گے۔ اور اللہ سے استغفار کرتے رہو بے شک اللہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔ ۲۰

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (۱)

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسے لفظ سے مخاطب فرمایا گیا ہے جس سے آپ کی وہ تصویر سامنے آتی ہے جو اس اندرونی کیفیت کی غماز ہے جو سورہ کے زمانۂ نزول میں آپ پر بیشتر طاری رہتی تھی۔

'مُزَّمِّل' دراصل 'متزمل' ہے۔ عربیت کے قاعدے کے مطابق 'ت' حرف 'ز' میں مدغم ہو گئی ہے۔ اسی طرح کا تصرف لفظ 'مدثر' میں بھی ہوا ہے۔ اس کے معنی جیساکہ ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں، اپنے اوپر چادر لپیٹے رکھنے والے کے ہیں۔ یہ حالت بالعموم ایسے شخص کی ہوتی ہے جو سامنے کے حالات سے فکرمند اور گردوپیش کے لوگوں کے رویہ سے بددل ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ایک ایسے عذاب سے ڈرا رہے تھے جو ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا لیکن لوگوں کی بے گانگی و بے زاری کا یہ حال تھا کہ بات سننا تو درکنار الٹے منہ نوچنے کو دوڑتے اور آپ کی بے قراری و ہمدردی کو خبط و جنون قرار دیتے۔ ایسے حالات میں آپ کا متفکر و مغموم رہنا ایک امر فطری تھا اور فکر و غم کی حالت میں آدمی کی چادر، جیساکہ ہم نے اشارہ کیا، اس کی بہترین غمگسار ہوتی ہے۔ وہ اس میں لپیٹ کر جب چاہتا ہے خلق سے منقطع اور خالق سے متصل ہو جاتا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ چادر اہل عرب کے لباس کا ایک نہایت اہم جزو بھی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ چادر رکھتے بھی تھے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثت سے پہلے بھی جب آپ جستجوئے حقیقت میں سرگرداں تھے، آپ پر اسی طرح کی خلوت گزینی کی حالت طاری رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے جیساکہ سورۂ ضحیٰ میں اشارہ ہے، آپ کو راہ دکھائی۔ پھر یہی کیفیت آپ پر مزید شدت کے ساتھ اس وقت طاری ہوئی جب آپ کو اپنی مریض قوم کی دوا بیزاری اور طبیب دشمنی کا ذاتی تجربہ ہوا۔ اس تجربہ سے آپ پر جو کیفیت طاری ہوئی لفظ 'متزمل' اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض مفسرین نے اس خطاب سے یہ مطلب سمجھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھے سوئے پڑے تھے کہ آپ کو وحی کے ذریعہ ہدایت ہوئی کہ اے چادر تان کر سونے والے اٹھ اور نماز پڑھ۔ یہ مطلب اگرچہ اس پہلو سے دلچسپ ہے کہ بعد کی آیات سے بظاہر اس کا جوڑ مل جاتا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات مبارک کے کسی دور میں بھی چادر تان کر غفلت کی نیند سونے والوں میں سے نہیں تھے۔ آپ ہمیشہ کھٹکے کی نیند سوتے اور دن کی طرح آپ کی شب بھی زیادہ تر ذکر و فکر ہی میں گزرتی۔ قرآن کی کسی آیت سے بھی یہ اشارہ نہیں نکلتا کہ آپ کو کبھی خدا سے غفلت

کی بنا پر کوئی تنبیہ فرمائی گئی ہو بلکہ اس کے برعکس آپ کو بار بار اس بات پر نہایت پُرمحبت انداز میں عتاب ہوا ہے کہ آپ نے اپنے اوپر اس سے زیادہ بوجھ اٹھا رکھا ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالا ہے۔ البتہ یہ بات قرآن میں جگہ جگہ ملتی ہے کہ دعوت کی راہ میں جب آپ کو مشکلات و مصائب سے سابقہ پڑا ہے اور آپ اس صورتِ حال سے فکر مند رہنے لگے ہیں تو آپ کے عزم و حوصلہ کو مضبوط اور پریشانی کو دور کرنے کے لیے نماز بالخصوص تہجد کی نماز کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں بھی یہی صورت ہے۔

قُمِ الَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا (۲-۴)

قیام لیل کی برکتیں

لفظ 'مزمل' میں حضورؐ کی جو فکر مندی اور پریشانی مضمر ہے یہ اس کا علاج بتایا جا رہا ہے اور یہ علاج صرف یہیں نہیں بتایا گیا ہے بلکہ جب جب دعوت کی راہ میں آپ کو پریشانیاں پیش آئی ہیں ان کا یہی علاج آپ کو قرآن نے بتایا ہے اور ہم ہر جگہ اپنے علم کے حد تک اس کی حکمت کی وضاحت کر چکے ہیں۔ یہاں چونکہ اس علاج کی تاثیر اور اس کی قدر و قیمت آگے خود واضح فرما دی گئی ہے اس وجہ سے ہم اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے صرف آیات کی تفسیر پر اکتفا کریں گے جس سے ان شاء اللہ خود یہ بات سامنے آ جائے گی کہ مومن کے لیے اللہ تعالیٰ نے قیام لیل میں کیا برکتیں ودیعت فرمائی ہیں اور وہ کن پہلوؤں سے اس کی صرف شدہ توانائی کو بحال اور اس کے عزم و ایمان کو مضاعف کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

قیام لیل کا وقت

'قُمِ الَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ' رات سے یہاں ظاہر ہے کہ رات کا نصف آخر ہے جب آدمی کچھ سو چکنے کے بعد اٹھتا ہے۔ اس کی وضاحت آگے 'نَاشِئَةَ الَّيْلِ' کے لفظ سے ہو گئی ہے۔ تہجد کے لیے یہی وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ثابت ہے اور یہی اصل مقصد کے اعتبار سے سب سے زیادہ بابرکت بھی ہے۔ یہ وقت رات کے نصف کے بقدر بھی ہو سکتا ہے، اس سے کچھ کم بھی ہو سکتا ہے اور اس سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ شب کے پچھلے پہر میں اٹھنا ایک کٹھن کام ہے، اس میں دیر سویر کے ہو جانے کا امکان ہے اس وجہ سے وقت کے معاملے میں وسعت رکھی گئی ہے تاکہ زیادہ مشقت کا موجب نہ ہو۔ اگرچہ الفاظ قرآن سے پوری نصف شب کے قیام کا ادنیٰ ہونا نکلتا ہے لیکن کمی بیشی کی گنجائش الفاظ میں موجود ہے۔

قرآن کی تلاوت کا طریقہ

'وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا' یہ قرآن کے پڑھنے کا طریقہ بتایا گیا کہ نماز میں اس کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ قرآن لحن اور لَے سے پڑھتے، آیت آیت پر وقف فرماتے، کبھی کبھی ایک ہی آیت شدتِ تاثر میں بار بار دہراتے۔ علاوہ ازیں کوئی آیت قہر و غضب کی

ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے غضب سے پناہ مانگتے اور جو آیت رحمت کی ہوتی اس پر اداے شکر فرماتے۔ بعض آیتیں جن میں سجدہ کا حکم یا اشارہ ہے ان کی تلاوت کے وقت، فوری امتثالِ امر کے طور پر آپ سجدہ میں بھی گر جاتے۔

"تلاوتِ قرآن کا یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق بھی ہے اور یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور و منقول بھی ہے۔ قرآن کے مقصدِ نزول کے پہلو سے بھی یہی طریقہ نافع ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں میں یہ طریقہ صرف اس وقت تک باقی رہا جب تک وہ قرآن کو فکر و تدبر کی چیز اور زندگی کی رہنما کتاب سمجھتے رہے۔ بعد میں جب قرآن صرف حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کی چیز بن کے رہ گیا تو یہ اس طرح پڑھا جانے لگا جس کا مظاہرہ ہمارے حفاظِ کرام تراویح اور شبینوں میں کرتے ہیں۔

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (۵)

'قولِ ثقیل' سے مراد — یہ اس مقصدِ عظیم کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے قیامِ لیل کی یہ ہدایت فرمائی گئی۔ ارشاد ہے کہ ہم عنقریب تم پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس بھاری بات کے تحمل کے لیے ایک پیشگی ریاضت اور تیاری کے طور پر آپ کو اس کا حکم ہوا۔ اس بھاری بات سے کیا مراد ہے؟ اس کے جواب میں اہلِ تاویل سے مختلف اقوال منقول ہیں لیکن ان کی بنیاد کسی دلیل پر نہیں ہے اس وجہ سے ان کے نقل کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ استاذ امامؒ اس سے اس انذارِ عام کو مراد لیتے ہیں جس کا حکم اگلی سورہ میں يَآ أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَأَنذِرْ (المدثر - ۷۴: ۱-۲) (اے چادر میں لپٹنے والے اٹھ اور انذار کر) اور اس کے بعد کی آیات میں دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی رائے قرینِ قیاس ہے۔ اس لیے کہ اسی انذارِ عام سے بعد میں براءت، ہجرت اور اعلانِ جنگ کے وہ مراحل سامنے آئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک کے شدید ترین مراحل ہیں جن میں آپؐ بھی اور آپؐ کے ساتھ صحابہؓ بھی ایسے کڑے امتحانوں سے گزرے کہ ان کے تصور سے بھی کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد کی امتیازی خصوصیت — اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامِ لیل کا حکم اس جہادِ عظیم کی تیاری کے لیے دیا گیا جس سے آگے آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو اقامتِ دین کی راہ میں سابقہ پیش آنے والا تھا۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کی یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اس کو دوسری تمام تحریکات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کے لیے دوسرے وسائل و ذرائع کے فراہم ہونے سے پہلے صحیح معرفتِ رب، مستحکم ایمان، غیر متزلزل صبر اور اپنے رب پر کامل اعتماد و توکل ضروری ہے۔ ان اوصاف کے حصول کا واحد ذریعہ نماز بالخصوص شب کی نماز ہے بشرطیکہ وہ اس طرح ادا کی جائے جس طرح اس کے ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی چٹان پر اقامتِ دین کی جدوجہد کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد کے بغیر اگر دین کی عمارت کھڑی

کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ کھڑی ہونے سے پہلے ہی زمین بوس ہو جائے گی۔

إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلًا (۶)

قیامِ لیل کی حکمت

یہ اللہ تعالیٰ نے حکمت بتائی ہے اس بات کی کہ آپ کو قیامِ لیل کا یہ حکم کیوں دیا گیا۔ فرمایا کہ اس لیے کہ یہ وقت سکونِ قلب و دماغ کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور فہمِ قرآن کے لیے سب سے زیادہ سازگار و مددگار ہے۔

'نَاشِئَةٌ' ہمارے نزدیک 'نشأ' سے، جس کے معنی اٹھنے کے ہیں 'عَاقِبَةٌ' اور 'عَافِيَةٌ' کے وزن پر مصدر یا حاصل مصدر ہے۔ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ کے معنی ہوں گے قیامِ لیل یا شب خیزی۔ اس لفظ ہی سے یہ بات نکلی کہ تہجد کا وقت درحقیقت شب میں کچھ سو کر اٹھنے کے بعد یعنی پچھلے پہر کا ہے۔ اس وقت اٹھنا اگرچہ اس اعتبار سے ایک مشکل کام ہے کہ اس وقت کی نیند بہت محبوب ہوتی ہے لیکن اس امتحان میں انسان اگر کامیاب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی کتاب کے سمجھنے کے لیے اس سے زیادہ بابرکت وقت اور کوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو اس ساعتِ میمون میں بستر سے اٹھنے کی توفیق دیتا ہے اول تو اس کو اپنے نفس کی خواہشوں پر غلبہ پانے کی ایسی قوت حاصل ہو جاتی ہے جو اس کے لیے اصلاحِ نفس کی راہ میں فتوحات کے بے شمار دروازے کھول دیتی ہے ثانیاً اللہ تعالیٰ نے، جو رات اور دن کو وجود میں لانے والا ہے، اس وقت کو اپنی رحمتوں کے نزول کے لیے مخصوص فرمایا ہے جن کے دروازے اس کے ان بندوں کے لیے کھلتے ہیں جو اس کی قدر و قیمت پہچانتے اور اس وقت اس کے دروازے پر سائل بن کر حاضر ہوتے ہیں۔

شب خیزی کی تاثیر

'أَشَدُّ وَطْأً' یہ اس وقت اٹھنے کی تاثیر بتائی ہے کہ جب آدمی اس وقت بستر سے اٹھ کر، وضو کر کے، نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اس کے قدم خوب جمتے ہیں۔ قدم خوب جمنا دماغ کی یکسوئی، دل کے اطمینان اور عقل کی بیداری کی تعبیر ہے۔ اگر دماغ پریشان اور قلب بے سکون ہو تو آدمی کے قدم نہیں جمتے، کوئی بڑا کام تو درکنار وہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی دلجمعی سے نہیں کر سکتا۔ گویا یہاں ظاہر سے ان کے باطن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے اس کے یہ معنی لیے ہیں کہ اس وقت اٹھنا نفس کو اچھی طرح کچلنے والا ہے۔ اگرچہ الفاظ میں اس معنی کی بھی گنجائش ہے لیکن آگے کے فقرے سے اسے مناسبت نہیں ہے۔ میں نے جو معنی اختیار کیے ہیں وہ دوسرے مفسرین نے بھی لیے ہیں لیکن انھوں نے اس حقیقت کی طرف اشارہ نہیں کیا کہ ثباتِ قدم درحقیقت قلبی و عقلی یکسوئی و دلجمعی کی تعبیر ہے۔

'وَأَقْوَمُ قِيلًا' یعنی یہ وقت چونکہ دماغ کے سکون اور دل کی بیداری کا خاص وقت ہے اس وجہ سے زبان سے جو بات نکلتی ہے تیر بہدف اور 'از دل خیزد بر دل ریزد'، کا مصداق بن کر نکلتی ہے۔ آدمی خود بھی اس کو اپنے دل کی گواہی کی طرح قبول کرتا ہے اور دوسرے سننے والوں کے دلوں پر

بھی اس کی تاثیر بے خطا ہوتی ہے۔ جنات کا جو واقعہ سورۂ جن میں بیان ہوا ہے روایات اور قرائن دونوں سے ثابت ہے کہ انھوں نے تہجد ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے سنا اور اس درجہ متاثر ہوئے کہ نہ صرف اس پر ایمان لائے بلکہ اپنی قوم کے اندر اس کے داعی بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے عظیم انسان کے دل کو بھی اسی طرح کے ایک واقعہ نے فتح کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تہجد میں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق تلاوتِ قرآن صرف اپنے ہی نفس کے تہذیب و تزکیہ کے لیے نہیں بلکہ بعض اوقات دوسروں کے ارواح و قلوب کو زندہ کر دینے کے لیے بھی ندائے غیب کی حیثیت رکھتی ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے۔

إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (۷)

'سبحِ طویل' کی تاویل

عام طور پر لوگوں نے اس کے معنی یہ لیے ہیں کہ دن میں تمھارے لیے اور بھی بہت سے کام ہیں یعنی دن میں چونکہ دوسرے بہت سے دھندے گھیرے رہتے ہیں، نماز کے لیے دلجمعی کا وقت مشکل ہی سے میسر آتا ہے، اس وجہ سے شب میں تم کو تہجد کے اہتمام کا حکم دیا گیا۔

لفظ 'سبح' کے اندر، از روئے لغت، اس معنی کی گنجائش موجود ہے لیکن ہمارا دل مختلف وجوہ سے اس تاویل پر نہیں جمتا۔

اول وجہ یہ ہے کہ قیام لیل کے لیے پچھلے پہر کا وقت اللہ تعالیٰ نے صرف اس وجہ سے نہیں منتخب فرمایا ہے کہ دن میں آدمی کے سامنے دوسری بہت سی مشغولیتیں ہیں بلکہ قرآن کے متعدد اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں اپنے مزاج و کیفیات کے اعتبار سے یہی وقت ان مقاصد کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہے جو قیام شب سے مقصود ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر یہ بات کہنی ہوتی تو اس کے لیے سادہ اسلوب بیان یہ ہوتا کہ 'إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ شُغُلًا كَثِيرًا' یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ ہوتے۔ لفظ 'سبح' تیرنے، چلنے وغیرہ کے معنی میں آتا تو ہے لیکن شغل اور مصروفیت کے معنی میں یہ ایسا معروف نہیں ہے کہ بغیر واضح قرینہ کے ذہن اس کی طرف منتقل ہو سکے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر لفظ 'سبح' یہاں اس معنی میں ہوتا تو اس کی صفت 'طَوِيلًا' کی جگہ 'كَثِيرًا' یا 'كَبِيرًا' زیادہ موزوں ہوتی۔

ان مختلف وجوہ سے اس تاویل پر دل پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ ہمارے نزدیک لفظ 'تسبیح' یہاں اپنے معروف معنی یعنی تسبیح کرنے ہی کے معنی میں ہے اور آیت کی تاویل یہ ہے کہ شب میں تمھیں جس اہتمامِ نماز کا حکم دیا جا رہا ہے اس کے علاوہ دن میں بھی تمھارے لیے کافی تسبیح کا موقع ہے جس کا اہتمام رکھو۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ حضورؐ دن میں بھی اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے

اور سوتے جاگتے اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام رکھنے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے آپ سے دعائیں منقول ہیں۔ آدمی ان کا اہتمام رکھے تو اس کا کوئی قدم بھی ذکر کے بغیر نہیں اٹھ سکتا اور ان کی برکت سے آدمی کے وہ کام بھی عبادت بن جاتے ہیں جو بظاہر دنیا کے کام خیال کیے جاتے ہیں۔

دین میں مطلوب ذکر دوام ہے — یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ دین میں مطلوب ذکر دوام ہے۔ اس مسئلہ پر اس کے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔ جس طرح انسان کی مادی زندگی کے لیے سانس ضروری ہے اسی طرح اس کی روحانی زندگی کے لیے اللہ کی یاد ضروری ہے۔ سانس رک جائے تو جسم مردہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ سے غفلت ہو جائے تو روح پژمردہ ہو جاتی ہے۔ دل ذکر کی جھڑی ہی سے زندہ رہتا ہے اور دل کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔

آیاتِ آفاق و انفس میں تفکر بھی ذکر ہے — یہاں وہ حقیقت بھی پیش نظر رہے جو اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں بیان ہو چکی ہے کہ اللہ کے دین کی دعوت اور آیاتِ آفاق وانفس میں تدبر و تفکر بھی ذکر ہی میں شامل ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ اس کو افضل الذکر کی حیثیت حاصل ہے اس لیے کہ اس تفکر ہی سے درحقیقت ذکر کے اندر حقیقی معنویت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو ذکر محض ورزشِ زبان بن کے رہ جاتا ہے۔ زندگی پر اس کا کوئی مفید اثر مترتب نہیں ہوتا۔ اس مسئلہ پر اَلَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران - ۳: ۱۹۱) کے تحت بحث گزر چکی ہے۔

وَاذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلۡ اِلَیۡہِ تَبۡتِیۡلًا (۸)

رب کے دامنِ رحمت میں پناہ گیر ہونے کا طریقہ — 'تَبَتُّلٌ' اور 'تَبْتِیْلٌ' دونوں کے معنی انقطاع الی اللہ کے ہیں یعنی خلق سے کٹ کر رب کے دامنِ رحمت میں پناہ گیر ہو جانا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو طریقہ بتایا اس بات کا کہ جب جب لوگوں کی حق بیزاری اور دل آزاری سے دل آزردہ ہو تو تم ان ناقدروں سے کٹ کر اپنے رب کے دامنِ رحمت میں پناہ گیر ہو جایا کرو اور اس کے لیے تمھیں اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے کہ تم اس کے نام کو یاد کرو۔ جب تم اس کے نام کے ساتھ اس کو یاد کرو گے تو وہ خود تمھیں اپنی پناہ میں لے لے گا۔

صفاتِ الٰہی کا استحضار — یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام اس کی صفات کی تعبیر ہیں اور ان صفات ہی پر تمام دین و شریعت اور سارے ایمان و عقیدہ کی بنیاد ہے۔ ان صفات کا صحیح علم مستحضر رہے تو آدمی کی پشت پر ایک ایسا لشکرِ گراں اس کے محافظ کی حیثیت سے موجود رہتا ہے کہ شیطان کی ساری فوجیں اس کی نگاہ میں پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں۔ وہ اپنے آپ کو پہاڑوں سے بھی زیادہ مستحکم محسوس کرتا ہے۔ اور اگر خدا کی صفات کی صحیح یادداشت اس کے اندر باقی نہ رہے یا کمزور ہو جائے تو پھر اس کا عقیدہ بے بنیاد یا کمزور ہو جاتا ہے جس کے سبب سے اس کو منافقین کی طرح ہر بجلی اپنے ہی خرمن

پر گرتی نظر آتی ہے۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا (۹)

یعنی اللہ کی پناہ کسی کمزور کی پناہ نہیں ہے بلکہ تمام مشرق و مغرب کے خداوند کی پناہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جو اس کا شریک و سہیم ہو یا اس کے ارادوں میں مزاحم ہو سکے۔ اس کو وکیل بناؤ گے تو وہ تمہارے لیے کافی ہے۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (النسآء - ۴ : ۸۱)

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (۱۰)

مخالفین کی باتوں پر صبر اور اس صبر کا طریقہ

اپنے جھٹلانے والوں کی بے ہودہ گوئیوں پر صبر کرو اور اپنے موقف پر ڈٹے رہو نہ ان کی باتوں کا غم کرو اور نہ زیادہ ان کے درپے ہو بلکہ ان کو خوبصورتی کے ساتھ چھوڑ دو۔ وہ اپنی اس روش کا خمیازہ خود بھگتیں گے۔

چھوڑنا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک چھوڑنا تو وہ ہے جو فضیحتا اور لعن طعن کے بعد، عناد و انتقام کے جذبہ کے ساتھ ہو۔ اس طرح کا چھوڑنا عام دنیا داروں کا شیوہ ہے۔ اخیار و صالحین یہ طریقہ نہیں اختیار کرتے۔ وہ خلق کی اصلاح کی کوشش اپنی کسی ذاتی منفعت کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی ہدایت اور اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔ لوگ ان کی ناقدری اور دل آزاری کرتے ہیں تو انھیں غصہ یا نفرت کے بجائے ان کے حال پر افسوس اور ان کی محرومی و بدانجامی پر صدمہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں وہ ان کے رویہ سے مجبور ہو کر ان کو چھوڑتے تو ہیں لیکن یہ چھوڑنا اسی طرح کا ہوتا ہے جس طرح ایک شریف باپ اپنے نالائق بیٹے کے رویہ پر خاموشی اور علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح کے چھوڑنے کو یہاں 'ھجر جمیل' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس طرح کی علیحدگی بعض اوقات مفید نتائج پیدا کرتی ہے جن کے اندر خیر کی کوئی رمق ہوتی ہے وہ اس شریفانہ طرزِ عمل سے متاثر اور اپنے رویہ کا جائزہ لینے کی طرف مائل ہوتے ہیں ورنہ کم سے کم انھیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ شخص ان کے باطل پر راضی ہونے والا نہیں ہے خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ جب تک پیغمبر اپنی قوم کے اندر رہتا ہے قوم کی زیادتیوں کا مقابلہ وہ اسی 'ھجر جمیل' سے کرتا ہے۔ البتہ جب قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو وہ اس کو اعلانِ براءت کے ساتھ چھوڑتا ہے اور اس کا یہ چھوڑنا قوم کی موت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا (۱۱)

تکذیب کرنے والوں کو سخت دھمکی

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے جھٹلانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے نہایت سخت دھمکی دی ہے کہ تم ان کا معاملہ مجھ پر چھوڑو اور تھوڑی سی مہلت ان کو اور دو۔ مطلب یہ ہے کہ پھر دیکھو کہ ان کا حشر کیا ہوتا ہے!

'وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ' کے اسلوب سے یہ بات نکلتی ہے کہ تم الگ ہو کر بیٹھو اور مجھے تنہا ان سرکشوں

سے منٹ لینے دو، تمھارے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ ان جھٹلانے والوں کی تباہی میں کچھ دیر ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ان کے اندر تم موجود ہو۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ جب تک پیغمبر قوم کے اندر موجود رہتا ہے اس وقت تک قوم پر عذاب نہیں آتا۔ تم چھوڑ دو تو چشم زدن میں ان سرکشوں کا تیا پانچا ہوا جاتا ہے۔ یہ ان ظالموں کی بدبختی ہے کہ وہ تمھارے درپئے آزار ہیں۔ ان کے لیے عذاب کے مقابل میں امان کی دیوار تمھی ہو۔ اگر اس امان سے انھوں نے اپنے کو محروم کر لیا تو عذاب سے ان کو کون بچائے گا۔

'اُولِی النَّعْمَۃِ' کے معنی ارباب تنعم و رفاہیت کے ہیں۔ لفظ 'نَعْمَۃٌ' رفاہیت و تنعم کے معنی میں آتا ہے۔ 'مُکَذِّبِیْنَ' کی اس صفت کے حوالہ سے مقصود ان کے سبب تکذیب کا سراغ دینا اور ان کی ناشکری پر ان کو ملامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تنعم و رفاہیت سے بہرہ مند فرمایا تھا تو اس کا حق یہ تھا کہ اپنے رب کے شکرگزار رہتے لیکن اللہ کی بخشی ہوئی خوشحالی ان کے لیے استکبار کا سبب ہوئی اور وہ اپنے رب کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اِنَّ لَدَیْنَآ اَنْکَالًا وَّجَحِیْمًا ۝ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّۃٍ وَّعَذَابًا اَلِیْمًا (۱۲-۱۳)

یعنی جب ہماری بخشی ہوئی رفاہیت اس دنیا میں اُن کے لیے استکبار اور رسول کی تکذیب کا سبب ہوئی تو یاد رکھیں کہ ان کے لیے ہمارے پاس آخرت میں بیڑیاں اور جہنم ہے۔ یعنی بیڑیوں اور زنجیروں کے اندر جکڑ کر جہنم کے اندر جھونک دیے جائیں گے۔

'اَنْکَالٌ' جمع ہے 'نِکْلٌ' کی۔ اس کے معنی بیڑی کے بھی ہیں اور آہنی لگام کے بھی۔ دوسرے مقام میں 'سَلٰسِلَ' اور 'اَغْلٰلٌ' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

'وَطَعَامًا ذَا غُصَّۃٍ وَّعَذَابًا اَلِیْمًا' یعنی ہم نے ان کو جو تر نوالے بخشے انھوں نے ان کا حق نہیں پہچانا تو یاد رکھیں کہ آخرت میں ان کو وہ کھانا ملے گا جو ان کے حلق میں پھنس کر رہ جائے گا اور اس عیش کی جگہ ان کو ایک دردناک عذاب سے سابقہ پیش آئے گا۔

یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَکَانَتِ الْجِبَالُ کَثِیْبًا مَّھِیْلًا (۱۴)

یہ اس دن کی یاددہانی ہے جس دن ان مغروروں کو مذکورہ حالات سے سابقہ پیش آئے گا۔ فرمایا کہ اس دن یہ زمین اور پہاڑ سب لرز اٹھیں گے اور امرا کے ایوان و محل تو درکنار پہاڑوں کا بھی یہ حال ہوگا کہ وہ بھربھرے ریت کے تودوں کے مانند ہو جائیں گے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا ۝ شَاھِدًا عَلَیْکُمْ کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝ فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰہُ اَخْذًا وَّبِیْلًا (۱۵-۱۶)

قریش کو تنبیہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضروری ہدایات دینے کے بعد اب یہ قریش کو تنبیہ فرمائی جا رہی ہے کہ

جس طرح ہم نے فرعون کی طرف اپنا ایک رسول بھیجا تھا اسی طرح تمہاری طرف بھی ایک رسول بھیج دیا ہے تاکہ وہ ہمارے خاص شاہد کی حیثیت سے تمہیں بتا دے کہ ہماری پسند اور ہمارے احکام کیا ہیں اور تم نے ان کو قبول کیا تو دنیا اور آخرت میں اس کا کیا صلہ ملے گا اور اگر اس کی نافرمانی کی تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ تم جس شخص کی تکذیب و توہین کر رہے ہو اس کے مرتبہ اور اس کی حیثیت کو اچھی طرح جان اور سمجھ لو کہ اس کی تکذیب کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔ وہ کوئی سائل یا محض واعظ نہیں ہے جس کے رد و قبول کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو بلکہ اللہ نے اس کو تمہارے اوپر حق کی گواہی دینے کے لیے بھیجا ہے اس وجہ سے اس کے ذریعہ سے لازماً حق و باطل کے درمیان فیصلہ ہونے والا ہے اور یہ فیصلہ اسی طرح ہوگا جس طرح موسیٰ اور فرعون کے درمیان ہوا۔ جس طرح فرعون نے رسول کی نافرمانی کی تو اللہ نے اس کو پکڑا اور اس طرح پکڑا کہ اس کو کوئی پناہ نہ مل سکی اسی طرح تمہیں بھی وہ اس طرح پکڑے گا کہ کوئی اس کے پنجہ سے تمہیں چھڑا نہ سکے گا۔

'شَاهِدًا عَلَيْكُمْ' کے مفہوم کی پوری وضاحت ہم 'لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا' (البقرۃ - ۲: ۱۴۳) کے تحت کر چکے ہیں۔

فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا (۱۷)

یعنی ابھی پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو یہ نہ سمجھو کہ کبھی نہیں ہوگی۔ اس دنیا میں نہ بھی ہوئی تو آخرت تو بہرحال شدنی ہے تو سوچ لو کہ اگر تم نے رسول کا انکار کیا تو اس دن کے ہول سے کس طرح بچو گے جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا! 'بچوں کو بوڑھا بنا دے گا' کسی ہول کی شدت اور بے پناہی کی تعبیر ہے۔ ہماری زبان میں بھی بولتے ہیں کہ فلاں صدمہ نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ روایات میں بھی آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ 'شیبتنی هود و اخواتها' مجھے سورۂ ہود اور اس کی ہم جنس سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔ عرب شعراء نے بھی مختلف اسلوبوں سے یہ محاورہ استعمال کیا ہے۔ یہ معروف ہے اس وجہ سے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صاحب کشاف نے بعض شواہد کا حوالہ دیا ہے جو قابلِ اعتماد ہیں۔

السَّمَآءُ مُنفَطِرٌۢ بِهِۦ ۚ كَانَ وَعْدُهُۥ مَفْعُولًا (۱۸)

یعنی روزِ قیامت کو کوئی اَن ہونی بات نہ خیال کرو۔ آسمان اس کے بوجھ سے پھٹا پڑ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پھٹ پڑے اور قیامت اس کے اندر سے نمودار ہو جائے اور تم اسی طرح اس سے غفلت ہی میں رہو۔ یہی مضمون سورۂ اعراف میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً ۗ (الاعراف - ۷: ۱۸۷)

آسمان و زمین دونوں اس کے حمل سے بوجھل ہیں، وہ تمہارے اوپر اچانک ہی آ دھمکے گی۔

یعنی آخرت کوئی محتاجِ ثبوت چیز نہیں ہے، اس کے ظہور کا وقت اگرچہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے

علم میں نہیں ہے لیکن اس کے شواہد آسمان و زمین میں اس طرح نمایاں ہیں جس طرح آخری دنوں میں حاملہ کا حمل ہوتا ہے۔ اس کے جننے کا صحیح وقت کوئی نہیں بتا سکتا لیکن ہر آنکھ رکھنے والا جانتا ہے کہ وہ جننے گی۔ اسی طرح قیامت کے آثار نمایاں ہیں اور آسمان اس کے بوجھ سے اس طرح پھٹا پڑ رہا ہے کہ ہر لمحہ اس کا ظہور متوقع ہے۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو صرف اس بنا پر اس سے بے خوف ہیں کہ ان کو اس کا صحیح وقت نہیں بتایا گیا۔

إِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهٖ سَبِيلًا (۱۹)

'ھٰذِہٖ' سے اشارہ قرآن کی ان آیات کی طرف ہے جو قریش کو آخرت کی تذکیر کے لیے سنائی گئیں۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب سے پہلے تذکیر و تنبیہ ضروری تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بھیج کر حجت تمام کر دی۔ اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے جس کا جی چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کر کے اس کی رحمت و رضوان کا مستحق بن جائے اور جس کا جی چاہے وہ اپنی گمراہی پر اڑا رہے اور اس کا انجام دیکھے۔ اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ
مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ
فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ ۙ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ
فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَاقْرَءُوا مَا
تَيَسَّرَ مِنْهُ ۚ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا
لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا ۚ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ
اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۲۰)

ابتدائے سورہ کے بعض احکام سے متعلق وضاحت

یہ اس سورہ کی آخری آیت ہے۔ اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی لیکن اس کا تعلق اسی حکم سے ہے جو ابتدائے سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام لیل سے متعلق دیا گیا ہے اس وجہ سے جگہ اس کو اسی سورہ کے آخر میں ملی تاکہ اس باب کے سابق اور لاحق دونوں حکموں کی نوعیت اور ان کا باہمی تعلق سمجھنے میں مدد ملے۔ اس کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں اور یہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ سورتوں میں آیات کی ترتیب ان کی معنوی مناسبت سے ہے اور یہ کام اللہ تعالیٰ کے حکم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے تحت ہوا ہے۔

'إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ'۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحسین فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خوب علم ہے کہ تمھیں شب میں قیام کا جو حکم دیا گیا تم پورے اہتمام کے ساتھ اس کی پابندی کر رہے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری یہ سرگرمیاں

اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور جب اس کے علم میں ہیں تو یہ رائگاں جانے والی نہیں ہیں بلکہ ان کا بھرپور صلہ پاؤ گے۔

'وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحسین کے بعد یہ ان مسلمانوں کی تحسین ہے جنھوں نے آپ کے اتباع کے شوق میں ازخود اس حکم کی پابندی اپنے اوپر لازم کر لی۔ یہ حکم تھا تو، جیسا کہ الفاظ سے واضح ہے، خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم ہر اس کام کے لیے سبقت کرتے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کاربند دیکھتے۔ اگرچہ ایمان بالرسول کا حقیقی تقاضا یہی ہے کہ رسول کے ہر نقش قدم کی پیروی کی جائے لیکن رسول کی قوت برداشت اور دوسروں کی قوت برداشت میں بڑا فرق ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کے لیے اس حکم کی نوعیت میں تبدیلی کر دی، جس کی وضاحت آگے کے ٹکڑے میں آ رہی ہے، تاکہ ان کے لیے یہ بوجھ ان کی قوت برداشت سے زیادہ نہ ہو جائے۔

عام مسلمانوں کے لیے تخفیف 'وَاللّٰہُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّہَارَ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْہُ فَتَابَ عَلَیْکُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ' فرمایا کہ رات اور دن کو مقدر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں، زندگی پر کن کن پہلوؤں سے یہ اثر انداز ہوتے ہیں، انسان ان میں سے کس کا کس حد تک محتاج ہے اور اس کو کن حالات و مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اپنے اسی علم کی روشنی میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ تم نصف شب یا ثلث یا دو ثلث شب کے قیام کی پابندی کا اہتمام نہ کر سکو گے تو جتنا بھی ممکن ہو سکے اتنا قرآن پڑھ لیا کرو۔

'فَتَابَ عَلَیْکُمْ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ 'تَابَ' کا صلہ جب 'عَلٰی' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی عنایت کی نظر کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

'فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ' کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن یہ بات قیام لیل کے سلسلہ میں فرمائی گئی ہے اس وجہ سے مدعا تہجد ہی میں قرآن پڑھنا ہے۔ اگرچہ تلاوت قرآن بجائے خود بھی عبادت ہے لیکن تہجد میں ترتیل کے ساتھ، اس کی تلاوت ہی سے وہ برکتیں ظہور میں آتی ہیں جن کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اہتمام کے ساتھ اس سورہ میں اس کا حکم دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ تخفیف درحقیقت عام مسلمانوں کے لیے اس بنا پر ہوئی کہ وہ اس بھاری بوجھ کو نہیں اٹھا سکتے تھے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بدستور اسی اصل حکم پر آخری لمحات حیات تک قائم رہے جو آپ کو دیا گیا۔ عام اہل ایمان کے لیے ایک فضیلت کے درجے میں یہ باقی ہے اور یہ بات ہر ایک کے شوق اور حوصلہ پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ اس میں کتنا حصہ لیتا ہے۔

'عَلِمَ اَنْ سَیَکُوْنُ مِنْکُمْ مَّرْضٰی لا وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ لا وَاٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ صلے فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْہُ لا'

یہ ان امکانات کی طرف اشارہ ہے جو پیش آسکتے ہیں اور جو اس تخفیف کے متقاضی ہوئے۔ تخفیف کے وجوہ
فرمایا کہ تم میں مریض بھی ہوں گے، مختلف دینی و دنیاوی ضروریات کے لیے سفر کرنے والے بھی ہوں گے،
اللہ کی راہ میں تمھیں جنگ کے لیے بھی اٹھنا ہوگا اس وجہ سے اس سعادت میں حصہ لینے کے لیے یہ
کافی ہے کہ تم جتنا وقت بھی پا جاؤ اور جتنا قرآن بھی پڑھ سکو پڑھ لیا کرو۔

یَضۡرِبُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ یَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ' سے مراد ہر وہ سفر ہے جو کسی نیک اور اعلیٰ
مقصد سے ہو، عام اس سے کہ وہ طلب علم کے لیے ہو یا حج کے لیے یا تجارت کے لیے۔ تجارتی سفر کے
لیے یہ الفاظ قرآن میں جگہ جگہ آئے ہیں۔

'وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا'۔ یہ اس کسر کے
جبر کی تدبیر بتائی ہے کہ اگر قیام شب کی برکتوں میں تم پورا پورا حصہ نہیں لے سکتے تو اپنے امکان کے حد
تک پنج وقتہ نمازوں کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کے کلمہ کو بلند اور دین و ملت کی ہنگامی ضروریات
میں فراخ دلی سے خرچ کرتے رہو۔ اس طرح تم اپنے رب کا قرب اور اس کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہو۔

'وَاَقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا' سے یوں تو ہر وہ انفاق مراد ہو سکتا ہے جو اللہ کی راہ میں فراخ دلی سے
کیا جائے لیکن جب اس کا ذکر ایتائے زکوٰۃ کے ساتھ ہو تو اس سے خاص طور پر وہ انفاق مراد ہوتا ہے
جو جنگ و جہاد یا کسی اہم ہنگامی ضرورت کے لیے کیا جائے۔

'وَمَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ہُوَ خَیۡرًا وَّاَعۡظَمَ اَجۡرًا'۔ یہ انفاق
کے لیے ترغیب و تشویق ہے کہ اللہ کی راہ میں جو خرچ کرو گے وہ کسی دوسرے کے لیے نہیں بلکہ اپنے ہی
لیے کرو گے۔ وہ خدا کے ہاں تمھارے ہی کھاتے میں جمع ہوگا اور اس کو نہایت بہتر اور نافع تر شکل میں
اپنے رب کے ہاں پاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں بلکہ سب سے زیادہ نفع بخش
تجارت ہے۔

'وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ' یعنی اس اہتمام کے علاوہ جو مذکور ہوا، برابر
اپنے رب سے اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کی معافی بھی مانگتے رہو اور یہ امید رکھو کہ وہ معاف فرمائے گا۔
وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وہ غلطیوں سے درگزر فرمائے اور اس کی صحیح
باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ واللہ ھو الموفق للصواب۔

رحمان آباد

۷۔ نومبر ۱۹۷۸ء

۵۔ ذوالحجہ ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۷۴

المدّثّر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ المزمل ـــــ کی توام ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ نام بھی دونوں کے بالکل ہم معنی ہیں۔ سابق سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس 'قولِ ثقیل' کے تحمل کے لیے تیاری کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے اس میں اس کا واضح الفاظ میں اظہار کر دیا گیا ہے کہ آپ کمربستہ ہو کر لوگوں کو انذار کریں، مخالفتوں کے علی الرغم اپنے موقف حق پر ڈٹے رہیں۔ دشمنوں کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑیں اور اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں کہ آپ کا فریضہ اس قرآن کے ذریعہ سے لوگوں کو صرف یاددہانی کر دینا ہے، ہر ایک کے دل میں اس کو اتار دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس کو قبول وہی کریں گے جو سنتِ الٰہی کے مطابق اس کے قبول کرنے کے اہل ہوں گے۔ جو اس کے اہل نہیں ہیں وہ اس سے بیزار ہی رہیں گے خواہ ان کی ہدایت کے لیے آپ کتنے ہی جتن کریں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۱۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ آپ کمربستہ ہو کر لوگوں کے انذار کے لیے اٹھیں۔ اپنے رب ہی کی عظمت و کبریائی کا اعلان کریں۔ اپنے دامنِ دل کو ہر قسم کے غبار سے پاک رکھیں۔ شرک کی ہر چھوت سے دور رہیں۔ اپنی جدوجہد برابر جاری رکھیں اور اپنے رب کی خاطر تمام مخالفتوں کے علی الرغم حق پر ڈٹے رہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو برومند کرے گا اور آپ کی دعوت پھلے پھولے گی۔

(۱۱-۱۷) لوگوں کو قیامت کے ہول سے اچھی طرح آگاہ کر دیں کہ وہ دن کافروں کے لیے بڑا ہی سخت ہوگا، اس کو آسان چیز نہ خیال کریں۔ جو اپنے مال و جاہ کے غرور میں مست اور اس گھمنڈ میں مبتلا ہیں کہ جو کچھ انھیں دنیا میں حاصل ہے آخرت ہوئی تو اس میں بھی انھیں حاصل رہے گا بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ پائیں گے، وہ اس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ جب اللہ نے ان کو پیدا کیا تو وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے تنہا اس دنیا میں آئے۔ مال و جاہ میں سے کوئی چیز بھی ان کے ساتھ نہ تھی۔ پھر اللہ نے ان کو مال و اولاد سے نوازا اور ان کے لیے کامیابیوں کی گوناگوں راہیں کھولیں لیکن وہ اپنے رب کے شکرگزار ہونے کے بجائے اس رعونت میں مبتلا ہو گئے کہ جو کچھ انھیں حاصل ہے وہ ان کا پیدائشی حق ہے، جس طرح یہ یہاں حاصل ہے آخرت ہوئی تو اس سے بڑھ چڑھ کر وہاں حاصل ہوگا۔

حالانکہ ان کا یہ زعم بالکل باطل ہے۔ اس میں پھنس کر وہ ہماری آیات کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تو یاد رکھیں کہ اس کی پاداش میں انھیں ایک بڑی ہی سخت چڑھائی چڑھنی پڑے گی۔

(۱۸-۲۵) قریش کے متمردین نے قرآن اور اس کے انذار کی تکذیب کے لیے جو بہانا تراشا اور جس استکبار کے ساتھ اس کا اظہار کیا اس کی تصویر اور ان کی بدبختی پر اظہارِ افسوس کہ انھوں نے قرآن کا بہت ہی غلط اندازہ کیا، وہ اس کو پیغمبر کی جادو بیانی کا کرشمہ اور اس کے انذار کو بالکل ناقابلِ التفات سمجھے حالانکہ اس کی ایک ایک بات حقیقت ہے جو ان کے سامنے آئے گی۔

(۲۶-۳۱) اس دوزخ کی تصویر جس سے اٹکل کے تیر تکے چلانے والوں کو سابقہ پیش آئے گا۔ ساتھ ہی ایک برسرِ موقع تنبیہ کہ یہ متکبرین چونکہ ہمہ دانی کے زعم میں بھی مبتلا ہیں اس وجہ سے دوزخ کا جو حال ان کو سنایا گیا ہے اس کی بعض باتوں کو وہ مذاق کا ہدف بنا لیں گے، کہیں گے بھلا اس طرح کی باتیں بیان کرنے کا کیا فائدہ؟ حالانکہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ خاص حکمت سے بیان فرما رہا ہے جس کے اندر صلاحیت اور علم کی طلب ہے وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، رہے وہ جو جہل کے باوجود غرورِ ہمہ دانی میں مبتلا ہیں وہ ان کے سبب سے فتنہ میں مبتلا ہوں گے اور اپنی عاقبت برباد کریں گے۔

(۳۲-۴۸) قیامت کی ایک آفاقی دلیل اور اس کی تکذیب کرنے والوں کی جہالت پر اظہارِ تعجب کہ وہ اس کائنات کے اس سب سے بڑے حادثہ سے کس طرح نچنت ہیں! قرآن لوگوں کو اس سے آگاہ کر رہا ہے تاکہ جو اس کے لیے تیاری کرنی چاہیں وہ کر لیں اور جو منہ موڑنا چاہتے ہیں ان پر حجت تمام ہو جائے کہ وہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں۔ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس دن ہر شخص اپنے اعمال کے عوض گرو ہوگا۔ اس کا عمل ہی اس کو چھڑائے گا اور عمل ہی جہنم میں لے جائے گا۔ اس دن کسی کی بھی سعی و سفارش ذرا بھی کسی کو نفع نہ پہنچائے گی۔ اس دن کی کامیابی صرف اصحاب الیمین کو حاصل ہوگی۔ وہ جنت میں براجمان گے اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے وہ دوزخ والوں سے معلوم کریں گے کہ وہ دوزخ میں کیوں پڑے تو وہ ان کے جواب میں برملا اپنے ان جرائم کا اعتراف کریں گے جو ان کی اس بدانجامی کے سبب ہوئے۔

(۴۹-۵۶) قرآن سے بدکنے والوں کے حال پر تعجب۔ ان کے بدکنے کے اصلی اسباب کی طرف اشارہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ آپ ان لوگوں کی پروا نہ کریں۔ آپ کا کام صرف یاددہانی ہے۔ جو لوگ اس یاددہانی سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے وہ اپنا حشر خود دیکھیں گے۔ اس سے فائدہ وہی اٹھائیں گے جو سنتِ الٰہی کے تحت اس کے سزاوار ہوں گے۔

سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات : ۵۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿۳﴾ وَثِيَابَكَ آيات ۱ - ۶
فَطَهِّرْ ﴿۴﴾ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴿۵﴾ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ﴿۶﴾ وَ
لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ﴿۷﴾ فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ﴿۸﴾ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ
يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ﴿۹﴾ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴿۱۰﴾ ذَرْنِيْ وَمَنْ
خَلَقْتُ وَحِيْدًا ﴿۱۱﴾ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿۱۲﴾ وَّبَنِيْنَ
شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ﴿۱۴﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ
اَزِيْدَ ﴿۱۵﴾ كَلَّا ۭ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ﴿۱۶﴾ سَاُرْهِقُهٗ
صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ
كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾
فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾
سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾
لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾ وَمَا جَعَلْنَآ
اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۠ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ

كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا
وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ
يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ
ع اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ (٣١) كَلَّا وَالْقَمَرِ (٣٢) وَالَّيْلِ اِذْ
اَدْبَرَ (٣٣) وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ (٣٤) اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ (٣٥) نَذِيْرًا
لِّلْبَشَرِ (٣٦) لِمَنْ شَاۗءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (٣٧) كُلُّ نَفْسٍۢ
مع بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (٣٨) اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ (٣٩) فِيْ جَنّٰتٍ
يَتَسَاۗءَلُوْنَ (٤٠) عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ (٤١) مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ (٤٢)
قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (٤٣) وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ (٤٤)
وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَاۗىِٕضِيْنَ (٤٥) وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (٤٦)
حَتّٰٓي اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ (٤٧) فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (٤٨)
فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ (٤٩) كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ (٥٠)
فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (٥١) بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ
يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (٥٢) كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ (٥٣)
كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ (٥٤) فَمَنْ شَاۗءَ ذَكَرَهٗ (٥٥) وَمَا
يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَ
ع اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ (٥٦)

اے چادر لپیٹے رکھنے والے! اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔ اور اپنے رب ہی کی کبریائی کی منادی کر اور اپنے دامن کو پاک رکھ اور ناپاکی کو چھوڑ اور اپنی سعی کو زیادہ خیال کر کے منقطع نہ کر۔ اور اپنے رب کی راہ میں ثابت قدم رہ۔ ۱-۷ 　ترجمۂ آیات ۱-۵۶

پس جب صور پھونکا جائے گا تو وہ وقت نہایت کٹھن وقت ہوگا! کافروں پر آسان نہ ہوگا! چھوڑ مجھ کو اور اس کو جس کو میں نے پیدا کیا اکیلا۔ اور اس کو بخشا مال فراواں۔ اور بیٹے دیے حاضر باش اور اس کے لیے خوب راہ ہموار کی۔ پھر وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ میں اس کے لیے اور زیادہ کر دوں گا۔ ہرگز نہیں! وہ تو ہماری آیتوں کا دشمن نکلا۔ میں اس کو عنقریب ایک سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔ ۸-۱۷

اس نے سوچا اور ایک بات بنائی۔ پس ہلاک ہو، کیسی بات بنائی! پھر ہلاک ہو، کتنی غلط بات بنائی! پھر اس نے نظر دوڑائی۔ پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بنایا۔ پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔ پس بولا یہ تو محض ایک جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے! یہ تو محض انسانی کلام ہے! ۱۸-۲۵

میں اس کو عنقریب دوزخ میں داخل کروں گا۔ اور کیا سمجھے کہ دوزخ کیا ہے! نہ ترس کھائے گی اور نہ چھوڑے گی۔ چمڑی کو جھلس دینے والی۔ اس پر انیس فرشتے مقرر ہوں گے۔ ۲۶-۳۰

اور ہم نے دوزخ پر نگران تو فرشتوں ہی کو بنایا ہے اور ہم نے ان کی یہ تعداد نہیں بیان کی مگر اس لیے کہ یہ آزمائش بنے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا تاکہ یقین حاصل کریں وہ جن کو کتاب عطا ہوئی اور اہل ایمان اس سے اپنے ایمان کو بڑھائیں اور اہل کتاب

اور اہل ایمان شک میں نہ پڑیں، اور تاکہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ اور کفر کرنے والے کہیں کہ بھلا اس سے اللہ کی کیا مراد ہے! اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور راہ یاب کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو صرف وہی جانتا ہے۔ اور یہ ماجرا محض انسانوں کی یاددہانی کے لیے ہے۔ ۳۱

ہرگز نہیں، شاہد ہے چاند اور رات جبکہ وہ پیٹھ پھیر لیتی ہے اور صبح جب روشن ہو جائے کہ یہ ماجرا ان بڑے ماجروں میں سے ہے جو انسان کی تنبیہ کے لیے بنایا گیا، ان کے لیے جو تم میں سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا چاہیں۔ ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گرد ہوگا۔ صرف دہنے والے اس سے مستثنیٰ ہوں گے، وہ باغوں میں ہوں گے، پوچھ گچھ کر رہے ہوں گے مجرموں کے باب میں۔ سوال کریں گے، تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟ وہ جواب دیں گے، ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے اور نہ غریبوں کو کھلاتے ہی تھے اور کٹ حجتیاں کرتے تھے اور ہم جزا و سزا کے دن کو جھٹلاتے رہے یہاں تک کہ یقین کی ساعت آگئی۔ ۳۲-۴۷

تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ نفع نہ دے گی۔ ان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ یاددہانی سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں! گویا کہ وہ بدکے ہوئے گدھے ہوں جو شیر سے ڈر کے بھاگے ہوں۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے صحیفے پکڑا دیے جائیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ وہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی ہے تو جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے ــــــ وہی اہل تقویٰ اور وہی سزاوار مغفرت ہیں۔ ۴۸-۵۶

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ (۱-۲)

'مزمل' اور 'مدثر' کے خطاب کی بلاغت

'مُدَّثِّر' اور 'مُزَّمِّل' دونوں کے معنی جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک ہی ہیں۔ 'مُدَّثِّرٌ' 'دِثَارٌ' سے ہے جو اس چادر کے لیے آتا ہے جو سونے والا اپنے اوپر لے لیا کرتا ہے۔

چادر لپیٹے رکھنا، جیسا کہ ہم نے سابق سورہ میں واضح کیا، آدمی کی فکر مندی کی ایک علامت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے بعثت میں جو مشاہدات و تجربات ہوئے اول تو وہ خود ہی گراں بار کرنے والے تھے پھر جب آپ نے ان کا اظہار اپنے خاندان والوں کے سامنے کیا اور انھوں نے ان کا مذاق اڑانا شروع کیا تو آپ کی فکر مندی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ایسی حالت میں آپ زیادہ تر چادر میں لپٹے ہوئے لوگوں سے الگ تھلگ رہتے جس طرح ایک فکر مند انسان رہتا ہے۔ آپ کی اسی فکر و پریشانی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت پیار سے آپ کو 'مزمل' اور 'مدثر' سے خطاب فرمایا تاکہ خطاب ہی سے آپ کو تسلی مل جائے کہ رب کریم آپ کے حال سے اچھی طرح واقف ہے اور جب اس نے اس شفقت سے مخاطب فرمایا ہے تو وہ آپ کی پریشانی دور بھی فرمائے گا۔ چنانچہ سابق سورہ میں آپ کو 'مزمل' سے خطاب کر کے قیام لیل کی تاکید فرمائی گئی جس میں اس فکر و پریشانی کا علاج بھی تھا اور اس مہم کے لیے تیاری بھی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

انذار عام کے لیے کھڑے ہونے کا حکم

'قُمْ فَاَنْذِرْ' یہ اس مہم کا بیان ہے جس کی طرف پچھلی سورہ میں 'اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا' (۵) (ہم تم پر آگے ایک بھاری ذمہ داری ڈالنے والے ہیں) کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی کمر بستہ ہو کر اٹھو اور پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنی قوم کو انذار کرو۔ مخالفت و مزاحمت، حالات کی ناسازگاری اور ماحول کی اجنبیت کی پروا نہ کرو۔ جب تم ہمت کر کے اٹھ کھڑے ہو گے تو اللہ تعالیٰ تمھاری راہ آسان کرے گا اور غیب سے تمھاری تائید کے اسباب فراہم ہوں گے۔ سابق سورہ میں یہ اشارہ ہم کر چکے ہیں کہ 'اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا' (۵) سے اسی انذار عام کے حکم کی طرف اشارہ ہے جو یہاں دیا گیا ہے۔ عام طور پر لوگوں نے 'قَوْلٌ ثَقِیْلٌ' سے خود وحی کو مراد لیا ہے لیکن وحی تو اس سے پہلے بھی نازل ہو چکی تھی تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ ہم عنقریب تم پر ایک قول ثقیل نازل کریں گے! البتہ انذار کا یہ حکم آپ کے لیے بلاشبہ ایک بہت ہی بھاری حکم تھا۔ مکہ اور طائف کے سرداروں کے کانوں میں توحید کی اذان دینا اور وہ بھی اس دعوے کے ساتھ کہ آپ اللہ کے رسول ہو کر آئے ہیں۔ اگر انھوں نے آپ کے انذار کی تکذیب کی تو اس کے عذاب کی زد میں آ جائیں گے کوئی سہل کام نہیں تھا۔

اس بھاری ذمہ داری سے آپ کا ہراس محسوس کرنا ایک امر فطری تھا۔ چنانچہ ابتداءً آپ نے اپنے کام کو اپنے خاص خاندان والوں ہی تک محدود رکھا اور ان پر بھی نہایت احتیاط کے ساتھ صرف اپنے بعض مشاہدات و تجربات کا اظہار فرما کر ان کا ردِعمل معلوم کرنا چاہا جو نہایت مخالفانہ صورت میں سامنے آیا۔ چنانچہ اس دور میں آپ پر نہایت شدید فکرمندی کی حالت طاری رہی۔ جس کی تصویر 'مُتَزَمِّل' اور 'مُدَّثِّر' کے الفاظ سے ہمارے سامنے آتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے آپ کو مبعوث فرمایا تھا وہ ہونا تھا چنانچہ پہلے (سورۂ مزمل میں) آپ کو اس صورت حال کے مقابلہ کے لیے تیاری کی ہدایت ہوئی پھر اس سورہ میں کمر باندھ کر انذارِ عام کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا حکم ہوا۔

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۳)

توحید خالص کی منادی

یہ اس انذار کا پہلا حکم ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں توحید کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے یعنی صرف اللہ ہی کی کبریائی و یکتائی کا اعلان۔ مفعول کی تقدیم سے یہاں حصر کا مضمون پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی اللہ کے سوا جو بھی کبریائی کے مدعی ہیں یا جن کی کبریائی کا بھی دعویٰ کیا جا سکتا ہے وہ سب باطل، تم صرف اپنے رب ہی کی عظمت و کبریائی کا اعلان کرو۔ ایک جاہلی معاشرہ میں یہ اعلان ساری خدائی سے لڑائی مول لینے کے ہم معنی تھا لیکن دین کی بنیاد چونکہ اسی کلمہ پر ہے اس وجہ سے ہر نبی کو بے درنگ یہ اعلان کرنا پڑا۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (۴)

لفظ 'ثیاب' کا مفہوم

لفظ 'ثِیَاب' جمع ہے 'ثَوْب' کی جس کے معنی کپڑے کے ہیں لیکن اس کے معنی دامن کے بھی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ کلامِ عرب کے شواہد سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس مفہوم میں بھی آتا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں 'دامنِ دل' سے تعبیر کرتے ہیں۔ امرؤالقیس کا مشہور شعر ہے۔

وان تك قد ساءتك منی خليقة

فسلی ثيابی من ثيابك تنسل[1]

اس شعر میں شارحین نے 'ثیاب' کو دل ہی کے معنی میں لیا ہے اور یہ معنی اس صورت میں لیے جا سکتے ہیں جب اس کو بطریق استعارہ 'دامنِ دل' کے مفہوم میں سمجھا جائے۔ امرء القیس ہی کا مصرعہ ہے۔

ثياب بنی عوف طهاری نقية[2]

لفظ 'ثیاب' کے اس مفہوم کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم بالکل بے خوف ہو کر اپنے رب

---

[1] اگر میری کوئی حرکت تجھے بری ہی لگ گئی ہے تو میرے دامنِ دل کو اپنے دامنِ دل سے جدا کر دے تو جدا ہو جائے گا۔

[2] بنی عوف کے دامن بالکل پاک صاف ہیں۔

کی کبریائی اور وحدت کی منادی کرو۔ مخالفین خواہ کتنی خاک بازی کریں اور کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم اپنے دامن دل پر نجاست شرک کا کوئی چھینٹا نہ آنے دو۔ یہ امر واضح رہے کہ قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں مشرکوں کو نجس اور شرک کو نجاست سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ ہدایت آپ کو اس لیے فرمائی گئی کہ بعد کے مراحل میں قریش کے لیڈروں نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ آپ کی سب باتیں مان لیں گے بشرطیکہ آپ بھی ان کے معبودوں کا کوئی مقام تسلیم کرنے پر راضی ہو جائیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ بات نہایت سختی سے رد فرما دی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی آپ کو نہایت تاکید کے ساتھ یہی ہدایت ہوئی کہ توحید بنیاد دین ہے، اس باب میں آپ کوئی لچک ہرگز قبول نہ کریں۔ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ (القلم - ۶۸ : ۹) (وہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرم پڑو تو وہ بھی کچھ نرم ہو جائیں) اور اسی مضمون کی ایک سے زیادہ آیتوں میں اس صورت حال کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح کی ایک نہایت اہم تنبیہ ہے۔ پیغمبر کو خطاب کر کے مشرکین پر گویا یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ شرک ایک ایسی نجاست ہے جس کا کوئی چھینٹا بھی اللہ کا رسول اپنے دامن پر گوارا کرنے والا نہیں ہے۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۵)

'رُجز' 'رِجز' اور 'رِجس' سب قریب المخرج اور تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس کا استعمال اس گندگی کے لیے ہوتا ہے جس کو دیکھ کر طبیعت میں ارتعاش اور گھن پیدا ہو۔ یوں تو اس سے ہر قسم کی گندگی مراد ہو سکتی ہے لیکن یہاں یہ خاص طور پر شرک کی گندگی کے لیے آیا ہے اور مقصود اسی مضمون کی تاکید ہے جو 'وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی اپنے دامن کو شرک کے چھینٹوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شرک کی ناپاکی سے دور رہو۔

اس ہدایت کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ العیاذ باللہ آپ کے کسی شرک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ تھا۔ آپ جس طرح دور اسلام میں طاہر و مطہر رہے اسی طرح جاہلیت میں بھی شرک کے ہر شائبہ سے پاک رہے۔ مقصود صرف کفار و مشرکین کو آگاہ کرنا تھا کہ وہ جان لیں کہ جو منذر ان کے پاس آیا ہے اس کا موقف ان کے دین شرک کے معاملہ میں کیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے اس باب میں کن ہدایات کے ساتھ مبعوث ہوا ہے۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۶)

تالیف کلام کی ایک شکل اور اس کا حل

'مَنّ' کے معنی جس طرح احسان کرنے کے آتے ہیں اسی طرح کسی چیز کو کاٹ دینے کے بھی آتے ہیں۔ سورۂ قلم میں فرمایا ہے 'وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ' (۳) (اور بے شک تمہارے لیے ایک کبھی نہ منقطع ہونے والا صلہ ہے) یعنی جس انذار و تبلیغ کی تمہیں ہدایت کی جا رہی ہے اس کو برابر جاری رکھنا۔ یہ خیال ترک کر کے کہ اب کافی انذار کیا جا چکا، مزید کی ضرورت نہیں رہی، اس عمل کو منقطع نہ کر بیٹھنا۔

تمھارے رب کی طرف سے جو حکم دیا جا رہا ہے اس پر اس وقت تک قائم و دائم رہو جب تک رب ہی کی طرف سے اس باب میں کوئی اور ہدایت تمھیں نہ ملے۔

'تَسْتَكْثِرُ' یہاں نہی کا جواب نہیں ہے۔ اگر جواب ہوتا تو اس پر جزم آنا تھا۔ اگرچہ بعض قاریوں نے اس کو جزم کے ساتھ بھی پڑھا ہے لیکن متواتر قراءت صرف مصحف کی ہے اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس کو ضمہ کے ساتھ ہی پڑھنا اولیٰ ہے اور اسی کے مطابق اس کی تاویل بھی ہونی چاہیے۔ اس صورت میں یہ لفظ یا تو حال کے محل میں ہوگا یا اس کو مستقل جملہ کی حیثیت دینی پڑے گی۔ میرے نزدیک یہ حال کے مفہوم میں ہے۔

لفظ 'اِسْتِكْثَار' دو معنوں میں معروف ہے۔ ایک کسی چیز کو زیادہ کرنے اور زیادہ چاہنے کے معنی میں، دوسرے کسی چیز کو زیادہ سمجھ لینے یا زیادہ گمان کر لینے کے معنی میں۔ پہلے معنی کے لیے لفظ 'وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ (الاعراف ۷: ۱۸۸)' والی آیت میں ہے۔ دوسرے معنی کی وضاحت اہل لغت نے یوں کی ہے: استكثر الشئ رآه كثيرًا او عده كثيرًا (استکثر الشئ کے معنی ہوں گے کسی چیز کو زیادہ خیال کیا یا شمار کیا)۔ صاحب اقرب الموارد نے اسی معنی کو پہلے لیا ہے۔ میرے نزدیک آیت میں یہ اسی معنی میں آیا ہے۔ مطلب، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، یہ ہوگا کہ انذار کا یہ فرض بغیر کسی نفع اور نقطاع کے برابر جاری رکھو، کبھی یہ گمان کر کے چھوڑ نہ بیٹھنا کہ کافی انذار ہو چکا، اب ضرورت نہیں رہی۔

یہ ہدایت اس لیے فرمائی گئی کہ رسول جس فرض انذار پر مامور ہوتا ہے اس کے متعلق سنت الٰہی، جیسا کہ جگہ جگہ ہم ذکر کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اگر قوم اس کے انذار کی پروا نہیں کرتی تو ایک خاص مدت تک مہلت دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو لازمًا ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ مہلت اتمام حجت کے لیے ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کسی قوم کو اس کے لیے کتنی مہلت ملنی چاہیے۔ رسول کا فرض یہ ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے کام میں لگا رہے جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس یہ ہدایت نہ آ جائے کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب وہ قوم کو اس کی تقدیر کے حوالہ کر کے اس علاقے سے ہجرت کر جائے۔ اگر رسول بطور خود یہ گمان کر کے قوم کو چھوڑ کر ہجرت کر جائے کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا تو اندیشہ ہے کہ حالات کا اندازہ کرنے میں اس سے اسی طرح کی غلطی صادر ہو جائے جس طرح کی غلطی حضرت یونس علیہ السلام سے صادر ہوئی جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ فرمائی اور ایک سخت امتحان سے گزارنے کے بعد ان کو پھر قوم کے پاس انذار کے لیے واپس بھیجا اور اس دوبارہ انذار سے اللہ تعالیٰ نے ان کی پوری قوم کو ایمان کی توفیق بخشی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کی عجلت سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مرحلہ میں یہ آگاہی دے دی کہ تم جس فرض پر مامور کیے جا رہے ہو اس میں برابر لگے رہنا، کبھی از خود یہ سمجھ کر چھوڑ

نہ بیٹھنا کہ اب وہ فرض کافی حد تک ادا ہو چکا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ فیصلہ تمھارے کرنے کا نہیں بلکہ ہمارے کرنے کا ہے۔ 'فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ' (القلم - ۶۸ : ۴۸) (پس صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور مچھلی والے کے مانند نہ بن جانا) اور اس مضمون کی دوسری آیات میں آپ کو صبر و ثبات کی تعلیم دی گئی ہے اور یہاں بھی آگے والی آیت میں یہی مضمون آرہا ہے۔

ہمارے مفسرین نے عام طور پر اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ تم کسی پر کوئی احسان اس خیال سے نہ کرو کہ اس کا بدلہ اس سے زیادہ احسان کی صورت میں حاصل کرو، اگرچہ آیت کے الفاظ سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے لیکن سوال کلام کے موقع و محل کا بھی ہے۔ آخر اس سیاق و سباق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نصیحت کرنے کا کیا موقع ہے! ہمارا خیال ہے کہ ان حضرات سے آیت کے دونوں لفظوں کے مفہوم معین کرنے میں مسامحت ہوئی۔ ہم نے ان کی وضاحت کر دی ہے جس سے آیت کا صحیح مفہوم واضح ہو گیا ہے اب اس پر مزید بحث کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (۷)

اس کا مفہوم وہی ہے جو آیت 'وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا' (الطور - ۵۲ : ۴۸) (اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو، تم ہماری آنکھوں میں ہو) کا ہے۔ 'صَبْر' کے ساتھ جب 'ل' آئے تو اس کے معنی صبر و استقامت کے ساتھ انتظار کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

اوپر والی آیت میں حضورؐ کو جو ہدایت ہوئی ہے اسی سے متعلق یہ ہدایت بھی ہے کہ اپنے کام کو کافی سمجھ کر کسی مرحلہ میں چھوڑ نہ بیٹھنا بلکہ صبر و استقامت کے ساتھ اس میں لگے رہنا اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرنا۔ اسی استقامت پر تمھاری کامیابی اور قوم پر اتمام حجت کا انحصار ہے۔

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ۝ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۝ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ (۸-۱۰)

انذار کا اصل موضوع

یہ ذکر ہے انذار کے اصل موضوع کا جس سے غفلت ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے قریش کی مخاصمت کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ قیامت کو ماننے کے نہ ماننا چاہتے تھے۔ وہ اول تو اس کو نہایت مستبعد اور بعید از امکان سمجھتے تھے اور اگر کسی درجے میں مانتے تھے تو اپنی دنیوی کامیابیوں کو دلیل بنا کر یہ دعوے کرتے تھے کہ قیامت ہوئی تو جس طرح ان کو یہاں سب کچھ حاصل ہے اسی طرح وہاں بھی حاصل ہوگا اور اگر خدا نے ان پر ہاتھ ڈالا تو ان کے معبود اپنی سفارش سے انھیں بچا لیں گے۔ فرمایا کہ اس ہولناک دن سے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دو کہ جب صور پھونکا جائے گا تو وہ دن بڑا ہی کٹھن ہوگا۔

'عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ' یعنی انھوں نے اس کو بہت آسان سمجھ رکھا ہے لیکن کافروں کے لیے

یہ دن آسان نہیں ہوگا۔

اوپر والی آیت میں مثبت پہلو سے کہنے کے بعد وہی بات منفی پہلو سے بھی فرمادی جس میں ان احمقوں پر نہایت بلیغ طنز بھی ہے جو اس کو ایک ناقابلِ اہتمام دن سمجھ کر مطمئن بیٹھے تھے کہ جب وہ آئے گا تو دیکھ لیں گے۔ فرمایا کہ وہ کوئی آسان دن نہیں ہوگا، بڑا ہی کٹھن دن ہوگا۔ اس کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا ہے آج ہی کیا جا سکتا ہے۔ جس نے آج نہیں کیا وہ ہمیشہ کے لیے پکڑا گیا اور اس طرح پکڑا گیا کہ اس کو کوئی بھی چھڑانے والا نہ بنے گا۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۙ وَّجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا ۙ وَّبَنِينَ شُهُودًا ۙ وَّمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا ۙ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ (۱۱ - ۱۵)

متکبر اور طائف کے لیڈروں کو تنبیہ — یہ مکہ اور طائف کے ان بر خود غلط لیڈروں کو نہایت تیز و تند لہجہ میں تنبیہ ہے جو اپنی خوشحالی دنیا کو اپنے عقیدہ و عمل کی صحت اور خدا کے منظورِ نظر ہونے کی دلیل سمجھتے اور یہ توقع رکھتے تھے کہ آخرت ہوئی تو ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں، جیسا کہ ان کو ڈرایا جا رہا ہے، بلکہ ان کو یہاں جو کچھ حاصل ہے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر وہاں حاصل ہوگا۔ فرمایا کہ ایسے سرپھروں کا معاملہ تم ہمارے اوپر چھوڑو۔ ہم ان سے نمٹنے کے لیے کافی ہیں۔ تم ان کی فکر میں زیادہ پریشانی نہ اٹھاؤ۔

'ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا' یہ وہی اسلوبِ بیان ہے جو سابق سورہ میں بالکل اسی موقع و محل میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے: 'وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا' (المزمل - ۷۳: ۱۱) وہاں اس اسلوب کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

'خَلَقْتُ وَحِيدًا' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اس کے ساتھ نہ اس کا مال و جاہ ہوتا ہے نہ اس کا لاؤ لشکر۔ یہ چیزیں ملتی ہیں تو خدا کی عنایت سے ملتی ہیں اور یہ اسی وقت تک ساتھ رہتی ہیں جب تک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ ان کا حق یہ ہے کہ انسان ان کو پا کر اپنے رب کا زیادہ سے زیادہ شکر گزار بنے نہ کہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے کہ وہ خدا کا بڑا چہیتا ہے اور آخرت ہوئی تو وہ اس سے بھی زیادہ پائے گا۔ یہ مضمون دوسری جگہ اس طرح ادا ہوا ہے: 'وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ' (الانعام - ۶: ۹۴) (اور تم ہمارے پاس آ گئے تن تنہا جس طرح ہم نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا)۔

مطلب یہ ہے کہ تم اس بر خود غلط مغرور کو جو دنیا میں آیا تو اسی طرح جس طرح ہر شخص اپنی ماں کے پیٹ سے تنہا آتا ہے لیکن ہم نے اس کو مال و جاہ عنایت کیا تو وہ اپنے کو بہت بڑی چیز سمجھنے لگا اور اب اس کو آخرت سے ڈرایا جا رہا ہے تو وہ اس رعونت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ آخرت میں اس سے بھی زیادہ کا حق دار ٹھہرے گا۔

اشارہ ایک خاص ذہنیت کی طرف نہ کہ خاص شخص کی طرف

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص شخص کی طرف اشارہ ہے یا مکہ اور طائف کے عام دولتمندوں کا ذہن بیان ہو رہا ہے؟ مفسرین نے اس سے قریش کے لیڈروں میں سے ولید بن مغیرہ کو مراد لیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس تخصیص کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ ذہن صرف ولید بن مغیرہ ہی کا نہیں بلکہ قریش کے تمام سرداروں اور دولت مندوں کا تھا اور قریش ہی کی کیا خصوصیت ہے آج بھی جن کو مال و جاہ حاصل ہو جاتا ہے ان کے اندر یہی خناس سما جاتا ہے۔ کوئی ایسا ہی باتوفیق ہوتا ہے جو اس فتنہ سے محفوظ رہتا ہے۔ اس وجہ سے یہ سمجھنا تو صحیح نہیں ہے کہ یہ آیتیں ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں البتہ ان آیات میں جس ذہن اور جس کردار کی تصویر ہے اس کا ایک مصداق اس کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہم مقدمۂ کتاب میں واضح کر چکے ہیں کہ سلف جب کسی آیت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ فلاں کے بارے میں ہے تو اس سے ان کی مراد لازماً یہی نہیں ہوتی کہ خاص اسی کے بارے میں نازل ہوئی بلکہ بسا اوقات اس سے ان کا مقصود آیت کے ایک مصداق کی طرف اشارہ کر دینا ہوتا ہے۔ یہ مضمون صرف یہیں نہیں بیان ہوا ہے بلکہ قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے مقصود متمردین کی عام ذہنیت کی طرف اشارہ کرنا ہے نہ کہ کسی خاص شخص کی طرف۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہاں حرف 'مَنْ' استعمال ہوا ہے جو واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کے لیے ضمیریں بھی دونوں ہی طرح آ سکتی ہیں۔

'وَّجَعَلْتُ لَہٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا' یعنی جب وہ دنیا میں آیا تو نہ مال کے ساتھ آیا نہ اولاد کے ساتھ بلکہ اسی طرح بے سر و سامان اور بے خدم و حشم آیا جس طرح دوسرے آتے ہیں۔ یہ اللہ کا اس کے اوپر احسان ہوا کہ اس نے اس کو پھیلا ہوا مال دیا۔ 'پھیلا ہوا مال' سے مراد یہ ہے کہ کہیں اس کے باغ ہیں، کہیں اس کے بنگلے اور کوٹھیاں ہیں، کہیں جانوروں کے گلّے اور ریوڑ ہیں، کہیں رقبے، تجارتی آڑھتیں اور دکانیں ہیں ــــ اس زمانے کے سرمایہ دار ہر ملک کے بنکوں میں اپنے حساب کھولتے اور ہر ملک کی کمپنیوں میں اپنا سرمایہ لگاتے ہیں ان کو بھی اسی ذیل میں شمار کیجیے۔

'وَّبَنِیْنَ شُہُوْدًا': مال کے ساتھ اللہ نے اس کو بیٹے بھی دیے جو ہر مجلس، ہر مقام اور ہر محاذ پر اس کے ساتھ کھڑے ہونے والے اور اس کے پھیلے ہوئے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹانے والے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قبائلی زندگی میں خاندانی عصبیّت و جمعیّت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مدافعت و مقابلہ کا تمام تر انحصار اسی پر تھا۔ قوم و قبیلہ میں سرداری کا مقام اسی کو حاصل ہوتا جس کے بیٹے زیادہ اور کنبہ بڑا ہو اور بیٹے ایسی صلاحیت و قابلیت رکھنے والے ہوں کہ ہر ضرورت کے موقع پر باپ کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑے ہو سکیں۔ لفظ 'شُہُوْد' اسی پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

'وَّمَہَّدْتُّ لَہٗ تَمْہِیْدًا' یعنی اس طرح مال و اولاد دے کر اس کے لیے عزت و وقار اور امارت و

سیادت کے حصول کے لیے اچھی طرح راہ ہموار کر دی۔

'ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ' یعنی اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کا حق تو یہ تھا کہ وہ اپنے رب کا شکرگزار و فرمانبردار بندہ بنتا لیکن ہوا یہ کہ وہ نعمتیں پا کر اکڑنے اور اترانے والا بن گیا۔ جب اس کو ڈرایا جاتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جو ناشکروں اور کافروں کے لیے نہایت سخت ہوگا تو وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اگر فی الواقع کوئی ایسا دن آیا تو اس دن وہ اس سے بھی زیادہ پائے گا جو اس کو یہاں حاصل ہے۔

كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا (۱۶)

برخود غلط مدعیوں کو جواب

یہ اس قسم کے برخود غلط لوگوں کے زعمِ باطل کی نہایت شدت کے ساتھ تردید ہے۔ فرمایا کہ ان کا یہ خواب ہرگز پورا ہونے والا نہیں ہے۔ اللہ نے ان کو جو نعمتیں دی ہیں نہ ان کے حق کی حیثیت سے دی ہیں نہ ان کے حاصل ہونے میں ان کی تدبیر یا ان کے تدبر کو کوئی دخل ہے بلکہ محض اپنے فضل و کرم سے یہ امتحان کرنے کے لیے دی ہیں کہ دیکھے وہ اپنے رب کے شکرگزار و فرمانبردار رہتے ہیں یا خودسر، مغرور اور خدا کے باغی اور زمین میں فساد برپا کرنے والے بن جاتے ہیں۔ اس امتحان سے ثابت ہو گیا کہ وہ نعمتیں پا کر اللہ کی آیتوں کے دشمن بن گئے۔ 'اٰیات' سے مراد بحیثیتِ مجموعی قرآن اور خاص طور پر اس کی وہ آیتیں ہیں جو عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت سے ڈرانے والی اور اس امرِ واقعی سے آگاہ کرنے والی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ اس دنیا میں کوئی معترف ہے اور نہ آخرت میں اس کے سوا کوئی مولیٰ و مرجع بنے گا۔

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا (۱۷)

نعمتوں کی ناشکری کرنے والوں کی سزا

'اِرْهَاقٌ' کے معنی کسی مشقت میں ڈالنے کے ہیں اور 'صَعُوْدٌ' کسی ایسی چوٹی یا گھاٹی کو کہتے ہیں جس کو عبور کرنا نہایت دشوار ہو۔

یہ سزا بیان ہوئی ہے اس انعام کی ناقدری کی جس کی طرف اوپر 'مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ نعمتیں پا کر چونکہ وہ انہی کے پرستار بن کر رہ گئے اور اصل منعم کو بھول کر اپنے نفس ہی کی بندگی میں اس طرح لگ گئے کہ اس کی کسی خواہش کا بھی مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے اس وجہ سے ان کو آخرت میں ایک نہایت پُرمشقت چڑھائی چڑھنی پڑے گی۔

نیکی اور بدی کے مزاج کا فرق

یہاں نیکی اور بدی کی یہ فطرت پیشِ نظر رہے کہ ان دونوں کا امتیاز تو اللہ تعالیٰ نے انسان کر دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس امتحان میں بھی اس کو ڈال دیا کہ بدی کی لذتیں تو عاجل رکھی ہیں اور تلخیاں اس کی آخرت میں سامنے آئیں گی۔ برعکس اس کے نیکی کی مشکلیں نقد ہیں اور نفع اس کا نسیہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس میں قدم قدم پر اس کو نفس کی مزاحمت کے سبب سے

چڑھائیاں چڑھنی اور گھاٹیاں پار کرنی پڑتی ہیں اور بدی کی راہ اختیار کرے تو اس کی لذت تو اس کو نقد نقد ملتی ہے اور اس کے انجام بد کا معاملہ اس کے نزدیک موہوم ہوتا ہے۔ اس کشش کے سبب سے اکثریت اسی راہ کو اختیار کر لیتی ہے۔ نیکی کی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ صرف وہی کرتے ہیں جن کے اندر صبر اور عزیمت ہو اور اس وصف کو پیدا کرنے کے لیے آدمی کو ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے یوں اشارہ فرمایا ہے کہ 'بدی کی راہ فراخ اور اس پر چلنے والے بہت ہیں اور نیکی کی راہ تنگ اور اس پر چلنے والے تھوڑے ہیں'۔

سورۂ بلد میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ (البلد - ۹۰: ۱۰ - ۱۷)	اور ہم نے انسان کو نیکی اور بدی دونوں کی راہیں سجھا دیں۔ پس اس نے گھاٹی پار کرنے کا حوصلہ نہ کیا اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے! غلام کی گردن چھڑانا یا بھوک کے زمانے میں کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک نشین مسکین کو کھلانا۔ مزید برآں یہ کہ وہ بنے ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور رحمت کی تلقین کی۔

قرآن نے آخرت کی فوز و فلاح کا حق دار صرف انہی کو ٹھہرایا ہے جو دنیا میں نیکی کی راہ کے عقبات کو پار کرنے کا حوصلہ کریں گے۔ جو یہاں ان کو پار کرنے کی ہمت نہیں کریں گے ان کو دوزخ کے عقبات سے سابقہ پیش آئے گا جن کو پار کرنے پر وہ مجبور کیے جائیں گے لیکن وہ ان کو پار نہ کر سکیں گے۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝ (۱۸ - ۲۵)

معاندین قرآن کے عناد کی تصویر

آیت ۱۶ میں یہ جو فرمایا ہے کہ 'وہ ہماری آیات کا شدید معاند ہے' یہ اسی عناد کی تصویر کھینچی گئی ہے اور غور سے دیکھیے کہ کیسی مکمل تصویر کھینچی گئی ہے۔

'اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ'۔ یعنی جب قرآن اس کو سنایا گیا تو اس نے اپنا ردِ عمل فوری طور پر ظاہر کرنے کے بجائے کچھ دیر غور کرنے کا تکلف کیا تاکہ دیکھنے والوں پر یہ اثر پڑے کہ ان کا لیڈر مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے اپنی رائے ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ 'وَقَدَّرَ' یعنی غور کرنے کے بعد جو رائے اس کے

ذہن میں آئی اس کو اس نے اپنے ذہن میں اچھی طرح تولا کر وہ ایسی بات کہے جو دلوں میں اتر جائے اور ہر شخص پکار اٹھے کہ جو رائے ظاہر کی گئی ہے نہایت صائب ہے۔

فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ۔ لیکن وہ غارت ہو کہ اس نے قرآن کا کتنا غلط اندازہ کیا! اور پھر غارت ہو کہ اس نے کتنی بے ہودہ رائے قائم کی۔ رائے کے ذکر سے پہلے دو مرتبہ اس تاکید کے ساتھ اس پر لعنت سے مقصود اس کی رائے کی شناعت کا اظہار بھی ہے اور سننے والوں کو متنبہ کرنا بھی کہ جب آدمی کی مت ماری جاتی ہے تو وہ اسی طرح پاگلوں کی سی باتیں کرتا اور گوہر کو پشیز ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے برابر کا مدبر کوئی دوسرا نہیں ہے۔

ثُمَّ نَظَرَ ۙ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۙ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ۔ یہ اس کے اس متکبرانہ انداز کی تصویر ہے جو اس نے رائے ظاہر کرتے ہوئے اختیار کیا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے ایسی مکمل تصویر کھینچی ہے کہ اگر اس کے بعد اس کی رائے کا ذکر نہ بھی ہوتا جب بھی ایک ادا شناس نہایت آسانی سے سمجھ لیتا کہ یہ انداز کس رائے کی غمازی کر رہا ہے۔ فرمایا کہ پہلے تو اس نے تفکر سے سر اٹھا کر لوگوں کے چہروں کا جائزہ لیا تاکہ ان کے موڈ کا اندازہ کر سکے کہ اس رائے کے اظہار کے لیے ساعت سازگار ہے یا نہیں۔ پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بنایا تاکہ دیکھنے والوں کو اس کے اس انداز ہی سے پتہ چل جائے کہ اس غور و فکر کے بعد اس نے قرآن کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ نہایت ہی مایوس کن ہے۔ پھر وہ نہایت استکبار کے ساتھ پیٹھ پھیر کر وہاں سے کچھ بڑبڑاتا ہوا چل کھڑا ہوا۔

فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ۔ اگرچہ اوپر کی تصویر و تمثیل کے بعد کسی مزید تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی بلکہ اداؤں اور حرکتوں ہی نے سارا راز کھول دیا تھا تاہم قرآن نے اس کے الفاظ بھی نقل کر دیے کہ وہ کیا زہر اگلتا ہوا نہایت استکبار کے ساتھ پیچھے مڑا۔ فرمایا کہ اس نے کہا کہ یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے اور یہ محض بشری کلام ہے۔

قرآن کو جادو کہنے کا ایک پہلو

قریش کے لیڈروں کی زبان سے قرآن کو جادو کہنے کی وجہ اس کتاب میں ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ اس کی بے مثل فصاحت و بلاغت اور اس کی بے پناہ تاثیر و تسخیر کا انکار جب ان کے لیے ممکن نہیں رہا تو اس کے خلاف انھوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ یہ جادو ہے تاکہ عوام کے دلوں پر اس کے الہامی و خدائی کلام ہونے کا رعب جو بیٹھتا جا رہا تھا اس کا توڑ کریں۔ اس کو جادو کہہ کر وہ لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ اس کے اندر جو تاثیر و تسخیر ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ آسمان سے اترا ہوا کلام ہے بلکہ یہ محض الفاظ و زبان کی جادوگری ہے اور یہ کوئی ایسی نادر چیز نہیں ہے جو پہلی مرتبہ ظہور میں آئی اور قرآن ہی کے ساتھ مخصوص ہو بلکہ یہ پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ

تمہارے اس ملک میں اس سے پہلے بھی ایسے خطیب و شاعر گزر چکے ہیں جن کے کلام میں یہ جادو موجود تھا لیکن ان کو نہ کسی نے خدا کا فرستادہ مانا نہ انھوں نے خود کوئی فرستادہ ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ ان کے کلام کو کسی نے کلام الٰہی سمجھا تو اسی کلام کی کیا خصوصیت ہے کہ اس کو خدائی ہونے کا درجہ دے دیا جائے!

'اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا قَوۡلُ الۡبَشَرِ' یعنی یہ محض بشری کلام ہے۔ اس کے ساحرانہ اسلوب بیان کو جتنی اہمیت چاہو دو۔ ہم کو اس سے انکار نہیں ہے لیکن اس کو آسمان پر چڑھانے کی کوشش نہ کرو۔

سَاُصۡلِيۡهِ سَقَرَ ۝ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبۡقِىۡ وَلَا تَذَرُ (۲۶-۲۸)

یہ انجام بیان ہوا ہے اس قسم کے متکبروں کا۔ فرمایا کہ ہم اس کو عنقریب دوزخ میں داخل کریں گے۔ متکبر کا انجام

'وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا سَقَرُ' یہ اس دوزخ کی ہولناکی کا اظہار ہے کہ تم کیا سمجھے کہ دوزخ کیا ہے! یعنی کوئی اس کو معمولی چیز نہ سمجھے۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ یہاں سے نہیں ہو سکتا۔ اس کو وہی جانیں گے جن کو اس سے سابقہ پیش آئے گا۔ بدقسمت ہے وہ جو اس سے بے پروا ہو کر زندگی گزارے! اس طرح کا خطاب عام ہوتا ہے اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

'لَا تُبۡقِىۡ وَلَا تَذَرُ' 'اَبۡقٰى عَلَيۡهِ' کے معنی ہوتے ہیں اس نے اس پر ترس کھایا اور رحم کیا۔ یہاں اگرچہ صلہ مذکور نہیں ہے، اس کے اظہار کا موقع نہیں تھا، لیکن یہ فعل استعمال یہاں اسی معنی میں ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دوزخ ایسی ظالم چیز ہوگی کہ نہ کسی پر ذرا ترس کھائے گی کہ اس کے عذاب میں کچھ تخفیف ہو جائے نہ کسی کو نظر انداز کرے گی کہ وہ اس سے بچ نکلے۔ یعنی نہ اس سے رحم کی کوئی امید نہ نظر انداز کیے جانے کی۔ وہ بالکل بے رحم بھی ہوگی اور پوری طرح چوکس بھی!

لَوَّاحَةٌ لِّلۡبَشَرِ (۲۹)

'بَشَرٌ' جسم کی کھال کے معنی میں ہے۔ یعنی اس کے شعلوں کی لپٹ کا یہ حال ہوگا کہ دور ہی سے مجرموں کی کھالوں کو جھلس دے گی۔ دوسرے مقام میں 'نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى' (المعارج - ۷۰: ۱۶) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یہ جہنم کی شدت تمازت کے وہ اثرات بیان ہوئے ہیں جو مجرموں پر اصل مقام عذاب تک پہنچنے سے پہلے ہی پڑنے شروع ہو جائیں گے۔ مقصود یہ دکھانا ہے کہ جس عذاب کی ابتدا یہ ہوگی اس کی انتہا کا اندازہ کون کر سکتا ہے!

عَلَيۡهَا تِسۡعَةَ عَشَرَ (۳۰)

آیات متشابہات سے متعلق ایک سوال کا جواب

فرمایا کہ اس کے اوپر انیس مامور ہوں گے۔ یہاں انیس کا معدود مذکور نہیں ہے لیکن آگے کی آیت میں اشارہ موجود ہے کہ یہ فرشتے ہوں گے۔ یہاں ان کے ذکر میں ابہام سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کی مزاجی خصوصیات، ان کی شکلیں اور ان کی قوتیں بالکل اس ڈیوٹی سے مناسبت رکھنے والی ہوں گی جس پر وہ مامور ہوں گے۔ مجرم ان کو دیکھ کر ہی یہ اندازہ کر لیں گے کہ یہ کسی پر نہ رتی برابر ترس کھانے والے ہیں اور نہ

ان کے چنگل سے چھوٹ سکنے کا کوئی امکان ہے۔

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں سوال پیدا ہو کہ دوزخ پر مامور فرشتوں کی تعداد انیس ہونے میں کیا حکمت ہے اور بالفرض ان کی تعداد انیس ہی ہے تو اس اہتمام سے اس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ اس سوال کا جواب آگے والی آیت میں خود قرآن نے دیا ہے لیکن اس جواب سے پہلے ایک ضروری تمہید ذہن نشین کر لیجیے۔

وہ یہ کہ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے اس کے دلائل عقل و فطرت اور آفاق و انفس میں موجود ہیں اور قرآن نے پوری وضاحت سے وہ بیان کر دیے ہیں۔ رہیں جنت و دوزخ کی تفصیلات تو ان کی نوعیت متشابہات کی ہے جن کی اصل حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ اس نے ان کو تمثیلات و تشبیہات کے پیرایہ میں سمجھایا ہے جن سے ہم فی الجملہ ان کا تصور تو کر سکتے ہیں لیکن ان کی اصل حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اگر آدمی ان کی اصل حقیقت جاننے کے درپے ہو تو وہ فتنہ میں پڑ جاتا ہے اور اس سے کچھ کرنا تو در کنار وہ اس اصل حقیقت کا بھی منکر بن جاتا ہے جس کی بنیاد عقل و فطرت کے قطعی دلائل پر ہوتی ہے۔ اس طرح کے معاملات میں ایک عاقل کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے اس کو مانے اور یہ ایمان رکھے کہ ان کی اصل حقیقت اس دن واضح ہو گی جس دن یہ سامنے آئیں گی۔ اس نکتہ کی وضاحت قرآن نے سورۂ آل عمران میں یوں کی ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ؔۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ج (آل عمران - ۳: ۷)	وہی خدا ہے جس نے تم پر کتاب اتاری ہے جس میں (عقل و فطرت کے دلائل پر مبنی) محکم آیات ہیں جن کو اصل کتاب کی حیثیت حاصل ہے اور کچھ متشابہ آیات بھی ہیں (جن میں کوئی بات تمثیلی رنگ میں سمجھائی گئی ہے) تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ جوئی اور اس کی اصل حقیقت کی دریافت کے زعم میں اس کی متشابہات ہی کے درپے ہوتے ہیں حالانکہ اس کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ رہے وہ لوگ جن کے قدم علم میں خوب جمے ہوئے ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ یہ متشابہات بھی محکمات ہی کی طرح ہمارے رب ہی کے پاس سے نازل ہوئی ہیں۔

اس قسم کے کج رو ذہن کے لوگ ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ قریش کے لیڈروں اور اہلِ کتاب کے

مفسدین میں بھی ایسے لوگ موجود تھے اس وجہ سے قرآن نے جب انیس فرشتوں کا ذکر کیا تو برسر موقع تنبیہ بھی فرما دی (جو آگے آرہی ہے) کہ اگرچہ فتنہ پسند طبیعتیں اس کو فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنائیں گی لیکن اللہ تعالیٰ اس قسم کے حقائق اس لیے بیان فرماتا ہے کہ اس سے ان لوگوں کے علم میں اضافہ ہو جو علم کے طالب ہیں اور جن کے اندر فتنہ جوئی کا ذوق ہے اور ان کا کھوٹ ابھر کر سامنے آئے ـــــ اس تمہید کو سامنے رکھ کر آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ (۳۱)

متشابہات کے ذکر کی حکمت

یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، برسر موقع ایک تنبیہ ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ آیت بہت بعد میں مدینہ کے دور میں نازل ہوئی۔ سابق آیت سے حرف عطف کے ساتھ اس کا اتصال قرینہ ہے کہ یہ ساتھ ہی نازل ہوئی ہے۔ بعد میں نازل ہونے والی آیتیں، جو اپنے سابق حکم کے ساتھ ملائی گئی ہیں، ان کا انفصال ہر جگہ نمایاں ہے۔ سورۂ مزمل میں اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ ..... (۲۰) والی آیت مدنی دور کی آیت ہے۔ چنانچہ سابق آیت سے اس کا انفصال نمایاں ہے۔ اس کو حرف ربط کے ذریعہ سے مربوط نہیں کیا لیکن یہاں یہ حرف عطف کے ذریعہ سے مربوط ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ آیت بھی ساتھ ہی نازل ہوئی اور مقصود اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مفسدین کے ذہن سے فی الجملہ آگاہ کر دینا ہے کہ جب تمہاری زبان سے وہ اس کی باتیں سنیں گے تو طرح طرح سے ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کریں گے لیکن تم ان کی یاوہ گوئیوں کی پروا نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ یہ باتیں اس لیے بیان فرماتا ہے کہ اس سے اہل ایمان کے علم میں اضافہ ہو اور جن کے اندر فتنہ جوئی کی بیماری ہے ان کا کھوٹ ابھر کر سامنے آجائے۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا

یعنی اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے کارخانۂ کائنات کے تمام شعبوں پر فرشتوں ہی کو مامور فرمایا، جنوں اور شیاطین کو نہیں مامور کیا، اسی طرح دوزخ پر بھی اس نے فرشتوں ہی کو مامور کیا۔ کسی دوسری مخلوق کو نہیں کیا ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کی پیدا کی ہوئی پاکیزہ مخلوق ملائکہ ہی کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے تاکہ کسی گوشے میں سر مو کوئی بات اس کے منشا کے خلاف نہ ہو۔ چنانچہ دوزخ کے جیل خانہ پر بھی اس نے فرشتوں ہی کو مامور فرمایا ہے۔

اس تعبیر میں نہایت لطیف طریقہ سے ان فتنہ پردازوں کا جواب بھی دے دیا جو بات بنا

سکتے تھے کہ یہ لوگ، جب مجرموں کے ساتھ فرشتے بھی دوزخ میں ہوں گے تو پھر کیا ڈر ہے، جس طرح وہ گزاریں گے ہم بھی گزار لیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح کی دل لگی کی باتیں وہ کرنی چاہیں تو کر لیں لیکن یاد رکھیں کہ جیل پر مامور افسروں اور جیل کے قیدیوں کے درمیان آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اس کا پتہ ان کو اس وقت چلے گا جب دوزخ کے جیل اور اس پر مامور فرشتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔

اللہ تعالیٰ نے زندگی کے ہر شعبہ میں امتحانات رکھے ہیں

وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا۔ یہ ان فرشتوں کی تعداد کے ذکر کی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا کہ اس کے اظہار سے مقصود یہ ہے کہ ان کی تعداد کا مسئلہ قیامت کے منکروں کے لیے ایک آزمائش بنے اور اس کی آڑ لے کر وہ جو کچھ اس کے خلاف کہنا چاہیں کہہ لیں۔ یہ امر واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے ہر گوشے میں امتحان رکھے ہیں جن کے ذریعہ سے بروں کی مخفی برائیاں اور اچھوں کی مستور نیکیاں ظہور میں آتی ہیں۔ یہ امتحان نہ ہوں تو انسان کی مخفی صلاحیتیں اجاگر ہو سکیں نہ نیک اور بد کے درمیان امتیاز ہو سکے۔ چنانچہ جنت اور دوزخ کی تفصیلات کے ذیل میں بھی اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی حقیقتوں کا ذکر فرمایا جو منکروں کے لیے فتنہ بن گئیں۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے جو مشاہدات بیان فرمائے یا دوزخ کے اندر قرآن نے زقوم کا جو ذکر کیا تو مخالفین نے ان کو موضوع بحث بنا کر طرح طرح سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مذاق اڑایا اور جنت و دوزخ کا بھی۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اس کی طرف یوں اشارہ ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ ۔	اور ہم نے جو رؤیا تم کو دکھائی تو اسی لیے دکھائی کہ وہ مخالفوں کے لیے آزمائش بنے، اسی طرح اس درخت کو بھی جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے۔
(بنی اسرائیل - ۱۷ : ۶)	

شیاطین جن و انس کو حق کے خلاف فتنے برپا کرنے کے اس طرح کے مواقع اللہ تعالیٰ جو دیتا ہے اس کی حکمت بھی قرآن میں جگہ جگہ واضح فرما دی گئی ہے۔ سورۂ حج میں فرمایا ہے:

لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ ۗ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ	اللہ یہ موقع اس لیے دیتا ہے کہ شیاطین جو کچھ حق کے خلاف کہیں وہ ان لوگوں کے لیے فتنہ بنے جن کے دلوں میں روگ ہے یا جن کے دل سخت ہو چکے ہیں اور یہ ظالم بہت دور کے جھگڑے میں پڑ چکے ہیں اور تاکہ وہ لوگ جن کو علم عطا ہوا ہے جان لیں کہ یہ جو قرآن نے بتایا ہے یہی حق ہے۔
(الحج - ۲۲ : ۵۳-۵۴)	

سورۂ حج کی اس آیت کے تحت اس مسئلہ پر ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ وضاحت مطلوب ہو تو

ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

اسی طرح یہاں بھی جب دوزخ کے فرشتوں کا ذکر انیس کی تحدید کے ساتھ فرمایا تو یہ آگاہی بھی دے دی کہ اگرچہ اشرار اس کو فتنہ کا ذریعہ بنائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق یہ امتحان ضروری ہے۔ اسی سے ان لوگوں کا کھوٹ ابھر کر سامنے آئے گا جن کے دلوں کے اندر خرابی ہے اور اسی سے ان لوگوں کے علم اور ایمان میں پختگی پیدا ہو گی جن کے اندر حق کی طلب اور حقیقت کی جستجو ہے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ متمردین قریش نے سنا کہ دوزخ پر کل انیس ہی فرشتے مامور ہوں گے تو انھوں نے مذاق اڑایا کہ اگر کل اتنے ہی ہوں گے تو پھر کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے ہم ان سے آسانی سے نمٹ لیں گے۔ بعض نے شیخی بگھاری کہ ان میں سے اتنے کے لیے تو یہ بندہ تنہا ہی کافی ہے، باقی رہے اتنے تو ان سے لے کر تم نمٹ لینا۔

'لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا'۔ 'ل' یہاں نتیجہ کے بیان کے لیے ہے۔ یعنی حق و باطل کی اس کشمکش کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ جو سچے اہل کتاب ہیں اس سے ان کا یقین محکم ہو گا اور جو ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں افزونی ہو گی۔

'أُوتُوا الْكِتَابَ' سے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اچھے اہل کتاب مراد ہیں۔ اہل کتاب میں سے جو اپنی کتابوں پر واقعی ایمان رکھتے تھے ان کے لیے قرآن کی اس طرح کی باتوں کا مذاق اڑانے کی گنجائش نہیں تھی۔ خود ان کے صحیفوں میں اس طرح کی باتیں موجود تھیں۔ قرآن سے ان کو تائید مل گئی جس سے ان کا یقین محکم ہوا۔ یہی اہل کتاب ہیں جو بعد میں قرآن پر ایمان لائے۔

تقلیدی ایمان ضعیف ہوتا ہے: اہل ایمان کے ایمان میں افزونی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس کے خلاف جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ ان کے آگے آ جاتا ہے اور وہ اچھی طرح پرکھ لیتے ہیں کہ مخالفین کی نکتہ چینیاں بالکل بے وزن ہیں۔ ضد کی صحیح شناخت اس کے ضد ہی سے ہوتی ہے۔ دونوں پہلوؤں کے سامنے آ جانے کے بعد آدمی جس پہلو کو اختیار کرتا ہے علیٰ وجہ البصیرت اختیار کرتا ہے۔ اگر وہ ایمان کے پہلو کو اختیار کرتا ہے تو اس کا ایمان تقلیدی نہیں ہوتا بلکہ سمجھ بوجھ کر ہوتا ہے۔ اس کو وہ پورے جزم کے ساتھ اختیار کرتا ہے اور ہر آزمائش اس کے ایمان میں اضافہ کرتی ہے۔ جن کا ایمان محض تقلیدی ہوتا ہے اس کی جڑ مضبوط نہیں ہوتی اس وجہ سے معمولی بادِ مخالف بھی بسا اوقات اس کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔

'وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ'۔ وہی بات منفی پہلو سے فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امتحان میں اس لیے ڈالتا ہے کہ جو سچے اہل کتاب ہیں وہ اور اہل ایمان شک کے حملوں سے محفوظ ہو جائیں۔ گویا یہ شک کے حملوں سے محفوظ کر دینے کے لیے ایک پیشگی احتیاطی تدبیر ہے۔

اچھے اہل کتاب سے ہم آہنگی: یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ اہل ایمان کے پہلو بہ پہلو اچھے اہل کتاب کا بھی ذکر آیا ہے حالانکہ یہ سورہ

جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا ابتدائی کی سورتوں میں سے ہے جب کہ اہل کتاب سے براہ راست سابقہ پیش نہیں آیا تھا چنانچہ جن لوگوں نے اس آیت کو مدنی قرار دیا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی انھوں نے بتائی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اچھے اہل کتاب مسلمانوں ہی کے حکم میں تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے ان کا ذکر اہل ایمان کے ہراول دستہ کی حیثیت سے کیا تاکہ پہلے ہی سے ان پر واضح ہو جائے کہ اس نبی کی بعثت کے دور میں انھیں کیا رول ادا کرنا ہے اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ان کی کیا جگہ ہے، آگے انھیں کن حالات سے گزرنا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو محکم رکھنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار فرما رہا ہے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے انھیں کس طرح بیدار رہنا چاہیے۔

حاسد یہود کا رد یہ

'وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا'
اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ حاسد یہود اور کفار پر ان متشابہات کا کیا اثر پڑے گا۔

'الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ' سے عام طور پر لوگوں نے منافقین کو مراد لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لفظ 'مَرَضٌ' قرآن میں نفاق ہی کے لیے آیا ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ حسد اور کینہ کی تعبیر کے لیے بھی آیا ہے اور ایسے مواقع میں اس سے مراد یہود ہوا کرتے ہیں اس لیے کہ ان کو بنی اسمٰعیل پر بھی حسد تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی۔ اس حسد کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اوپر اچھے اہل کتاب کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب ان کے مقابل میں حاسد یہود کے رویہ کا ذکر آ رہا ہے اور ساتھ ہی 'الْكَافِرُونَ' کے لفظ سے کفار قریش کی طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ یہ دونوں گروہ ان متشابہات کے بارے میں ایک ہی روش اختیار کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ 'مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا'۔

ان کے اس قول کی وضاحت سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶ کے تحت ہم کر چکے ہیں کہ اس طرح کی باتیں سن کر وہ ناک بھوں چڑھائیں گے اور متکبرانہ انداز میں کہیں گے کہ بھلا اس طرح کی تمثیلات سے اللہ کی مراد کیا ہے! یعنی یہ باتیں لایعنی ہیں اور اللہ تعالیٰ لایعنی باتیں نہیں کرتا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس طرح کی باتیں منسوب کر رہا ہے (العیاذ باللہ) وہ بھی لایعنی اور اس کا دعوائے رسالت محض افترا ہے۔

'كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ' یعنی اس طرح کی آزمائشوں اور امتحانوں میں ڈال کر اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت نصیب کرتا ہے۔ یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی وضاحت جگہ جگہ ہم کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مشیت اس کی حکمت کے تحت ہے۔ جن کو وہ گمراہی کا مستحق پاتا ہے ان کو گمراہ کرتا ہے اور جو اس کی سنت

کے تحت ہدایت کے سزاوار ہوتے ہیں ان کو ہدایت بخشتا ہے۔ بالکل اسی سیاق و سباق میں سورۂ بقرہ میں یوں فرمایا گیا ہے:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ
اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ
اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ
بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ
وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ
(البقرۃ - ۲ : ۲۶)

جو ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ یہی حق
ہے ان کے رب کی جانب سے۔ رہے
وہ جنھوں نے کفر کیا تو وہ کہیں گے کہ بھلا اس
طرح کی تمثیل سے اللہ کی کیا مراد ہو سکتی ہے!
اللہ اس سے بہتوں کو گمراہ کرتا اور بہتوں کو ہدایت
دیتا ہے اور وہ اس سے گمراہ انہی کو کرتا ہے
جو نافرمان ہوتے ہیں۔

نکتہ چینوں کے غرورِ ہمہ دانی پر ضرب

'وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ'۔ یہ ان نکتہ چینوں کے غرورِ ہمہ دانی پر ضرب لگائی ہے کہ وہ اس زعم میں نہ رہیں کہ اس کائنات کے تمام بھیدوں کو وہ جانتے ہیں یا ان کے پاس اتنا علم اور اتنی عقل ہے کہ ان کو جان سکتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ زعم بالکل باطل ہے۔ تیرے رب کی فوجوں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ وہی جانتا ہے کہ اس کی افواج کتنی ہیں، اس میں کس یونٹ کی صلاحیتیں کیا ہیں، کون سی رجمنٹ کن اسلحہ سے لیس ہے اور کون اور کتنے افسر کس محاذ پہ مامور ہیں۔ نہ کوئی ان ساری باتوں کو جانتا ہے اور نہ جان سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رموزِ سلطنت میں سے جن بھیدوں سے آگاہ کر دے انسان کو چاہیے کہ ان کی قدر کرے اور ان کو اپنے خزانۂ علم میں بیش بہا اضافہ سمجھے۔ اس گھمنڈ میں نہ مبتلا ہو کہ خدا کی کائنات اتنی ہی ہے جتنی اس نے دیکھی ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دور کے دانش فروشوں نے بھی قرآن کی جن باتوں پر شبہات وارد کیے ہیں یا جن کی من مانی تاویلیں کرنے کی کوشش کی ہے، اسی غرورِ ہمہ دانی میں مبتلا ہو کر کی ہے۔ جو باتیں ان کو اپنی محدود عقل کی گرفت سے باہر محسوس ہوئیں ان کا یا تو انکار کر دیا، اگر انکار کی جرأت ہوئی، ورنہ ان کی کوئی ایسی تاویل کرنے کی کوشش کی جو انکار سے بھی کچھ قدم آگے ہوتی۔

'وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ'۔ یہ مقصد بتایا ہے قیامت کے احوال پر مشتمل ان آیات کا۔ فرمایا کہ یہ انذار کرنے والی آیتیں ہم نے نکتہ چینی کے لیے نہیں نازل کی ہیں بلکہ لوگوں کی تذکیر و تنبیہ کے لیے نازل کی ہیں تاکہ جو اس ابدی عذاب سے بچنا چاہتے ہیں وہ اس کے ظہور سے پہلے پہلے تیاری کر لیں۔ اللہ نے بار بار منادی سنا کر خطرے سے آگاہ کر دیا۔ اس سے فائدہ اٹھانا لوگوں کا اپنا کام ہے۔ جو فائدہ نہیں اٹھائیں گے ان کے پاس خدا کے آگے کوئی عذر نہیں ہوگا۔ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ وہ نیک و بد سے لوگوں کو آگاہ کر دیتا ہے۔ بالجبر

ہدایت کی راہ پر چلا دینا اس کی سنت کے خلاف ہے۔

'ھی' کا مرجع عام مفسرین نے 'سقر' کو سمجھا ہے لیکن میرے نزدیک اس کا مرجع وہ آیات منذرات ہیں جن میں 'سقر' کے احوال سنائے گئے ہیں۔ اس لیے کہ 'ذکری' یعنی یاددہانی ہونے کی حیثیت درحقیقت ان آیات ہی کو حاصل ہے نہ کہ 'سقر' کو۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ ۝ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ (۳۲-۳۴)

آفاق کی بعض نشانیوں کا حوالہ

یہ آفاق کی چند نشانیوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس قیامت اور دوزخ سے لوگوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے وہ اس کائنات کے عظیم حوادث میں سے ہے اور اس کا ظہور قطعی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں تدریج و ترتیب ہے۔ جب اس کا وقت آ جائے گا تو وہ ظاہر ہو جائے گی۔ اپنے وقت سے پہلے نہیں ظاہر ہو گی۔ اس کے ظہور میں تاخیر سے یہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ ظاہر ہو گی ہی نہیں حماقت ہے۔ رات میں اگر کوئی صبح کے لیے جلدی کرے تو اس کی جلد بازی کے سبب سے صبح اپنے وقت سے پہلے نہیں آئے گی۔ یہی حال قیامت کا ہے۔ اس کا بھی ایک وقت مقرر ہے۔ ٹھیک اسی وقت پر ظاہر ہو گی۔

'كَلَّا وَالْقَمَرِ' آفاق کی نشانیوں میں سے پہلے چاند کی قسم کھائی ہے اور اس سے پہلے 'كَلَّا' کے ذریعے سے مخاطب کے زعم باطل کی پوری شدت سے تردید فرما دی ہے۔ قسم سے پہلے حرف نفی کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ اس طرح کے مواقع میں متکلم گویا مخاطب کے خیال کی تردید میں اتنا توقف بھی نہیں کرنا چاہتا کہ دلیل بیان کرنے کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ شدت نفرت کے اظہار کے لیے اس کی تردید ہی سے کلام کا آغاز کرتا ہے اور پھر بقید قسم اپنی دلیل بیان کرتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ اور اس نوع کی تمام قسمیں، جیسا کہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں، بطور شہادت یا بالفاظ دیگر اس دعوے کی دلیل کے طور پر کھائی گئی ہیں جو ان کے بعد مذکور ہوا ہے۔ یہاں مخاطب، جیسا کہ موقع و محل سے واضح ہے، مکذبین قیامت ہیں اور ان کا جو شبہ زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ قیامت آنی ہے تو آ کیوں نہیں جاتی۔ ان کے سامنے چاند کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے کہ جس طرح وہ درجہ بدرجہ ہلال سے بدر کے مقام تک پہنچتا ہے اسی طرح تم بھی مختلف اطوار و مراحل سے گزرتے ہوئے بالآخر ایک دن اس مقام تک پہنچو گے جہاں پہنچنے کی تمھیں خبر دی جا رہی ہے اور اپنے رب کے عدل کامل کے ظہور کا مشاہدہ کرو گے۔ جس طرح چاند کے سفر کے لیے منزلیں مقرر ہیں[۱]، ان کو طے کیے بغیر اس کا ظہور کامل نہیں ہوتا، خواہ اس کے لیے کوئی کتنی ہی جلد بازی کرے، اسی طرح اس روز جزا و سزا کے لیے بھی منزلیں مقرر ہیں جن سے گزرے بغیر اس کا ظہور نہیں ہو گا۔ کائنات

---

[۱] وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ (یٰس - ۳۶ : ۳۹) (اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں)۔

کے نظام میں ہر تغیر اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اسکیم کے مطابق ہوتا ہے۔ دوسروں کی طلب و تمنا اور ان کی عجلت یا تاخیر کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ دن آئے گا ضرور، اس کے آنے بغیر اس دنیا کی تخلیق کا مقصد پورا نہیں ہوگا لیکن یہ اسی وقت آئے گا جب اللہ تعالیٰ کی تقویم میں اس کا مقررہ وقت، سٹ اور سیکنڈ کے فرق کے بغیر پورا ہو جائے گا۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے چاند کے طلوع و غروب اور اس کے عروج و محاق سے دین کے مختلف حقائق پر استشہاد کیا ہے جن کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے اور آگے کی سورتوں میں بھی بعض اہم چیزیں آئیں گی جن کی ہم ان شاء اللہ وضاحت کریں گے۔ یہاں اس کے تدریجی ارتقاء کا پہلو پیش نظر ہے اور مقصود قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کو توجہ دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی کے ظہور کے لیے ایک معین پروگرام ہے جس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو وہی جانتا ہے۔ جو چیز اس کے عدل کا بدیہی مقتضی ہے اس کا ظہور لازماً ہوگا لیکن ہوگا اپنے وقت پر۔ سورۂ انشقاق میں بھی چاند کی قسم وارد ہوئی ہے اور ہمارے نزدیک وہاں بھی اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا ہے:

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ہ (الانشقاق - ۸۴ : ۱۸-۱۹) — شاہد ہے چاند جب کہ وہ کامل ہوتا ہے کہ تم بھی درجہ بدرجہ بڑھو گے۔

یعنی خدا کے مقرر کردہ روز جزا و سزا کے لیے تمھاری حاضری تو لازمی ہے لیکن جس طرح چاند درجہ بدرجہ اپنے آخری نقطہ پر پہنچتا ہے اسی طرح یہ دن بھی اپنے مراحل طے کر کے ظہور میں آئے گا۔

وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ہ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ۔ چاند کے بعد یہ رات کی قسم کھائی ہے جب کہ وہ پیچھے مڑتی ہے اور صبح کی قسم کھائی ہے جب کہ وہ ہویدا ہوتی ہے یعنی جس طرح رات کی تاریکی میں صبح کا کوئی نام و نشان نہیں ہوتا لیکن وقت آتا ہے کہ صبح نمودار ہو جاتی ہے وہی حال قیامت کے ظہور کا بھی ہوگا۔ یہ دنیا رات کے مانند ہے جس کی تاریکی صبح قیامت کو ڈھانکے ہوئے ہے لیکن وقت آئے گا کہ یہ تاریکی کافور ہوگی اور قیامت اچانک نمودار ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ جو ہر روز رات کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی دکھاتا ہے اور کسی کو بھی اس کائنات کے اس عظیم انقلاب پر تعجب نہیں ہوتا وہ جب چاہے گا قیامت کو بھی اسی طرح نمودار کر دے گا اور اس وقت سب دیکھ لیں گے کہ جس چیز کو وہ ناممکن سمجھتے تھے وہ سامنے آ گئی۔

بالکل یہی قسم، معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ، انذار قیامت کی تائید ہی کے مقصد سے سورۂ تکویر میں یوں آئی ہے:

وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ہ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ہ (التکویر - ۸۱ : ۱۷-۱۸) — شاہد ہے رات جب کہ جانے لگتی ہے اور شاہد ہے صبح جب کہ وہ سانس لیتی ہے۔

اس کائنات کے ہر گوشہ میں قیامت کی دلیل موجود ہے

اس تفسیر میں جگہ جگہ ہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنائی ہے کہ اس کے ہر گوشہ میں کسی نہ کسی شکل میں قیامت کا یہ سل برابر ہوتا رہتا ہے تاکہ انسان کو اس کے باب میں جو شبہ بھی لاحق ہو اس کو دور کرنے کے لیے اسے اپنے گرد و پیش ہی سے کوئی ایسی مثال مل جائے جو اس کے دل کو مطمئن کر دے بشرطیکہ اس کے اندر سلامت روی اور حق کی طلب ہو۔

إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ۝ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ (۳۵-۳۶)

یہ مذکورہ بالا قسموں کا مقسم علیہ ہے۔ یعنی قرآن کی یہ آیات جو دوزخ کے ہول سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے نازل کی گئی ہیں، ہنسی مذاق کی چیز نہیں ہیں بلکہ اس کائنات کے عظیم احوال و حوادث میں سے ہیں۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو ان سے سبق حاصل کرنے کے بجائے ان کو اپنے مذاق کا موضوع بنائیں۔

لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ (۳۷)

دلیلوں سے فائدہ اٹھانا لوگوں کا اپنا کام ہے

یعنی اس ہولناک دن سے سابقہ پیش آنے سے پہلے لوگوں کو اس سے آگاہ کرنا ضروری تھا تاکہ جب یہ آئے تو کوئی یہ عذر نہ کر سکے کہ اس کو اس سے آگاہ نہیں کیا گیا ورنہ وہ اس کے لیے تیاری کرتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے ذریعہ سے اتمام حجت کر دیا۔ رہا اس کو رد یا قبول کرنا تو یہ لوگوں کا اپنا کام ہے۔ جو اپنی عافیت کی خیر چاہے گا وہ اس کو قبول کرنے کے لیے آگے بڑھے گا اور جس کی شامت آئی ہوئی ہوگی وہ اعراض و استکبار کی روش اختیار کرے گا اور پیچھے ہٹ جائے گا۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (۳۸)

عمل ہی نجات دے گا عمل ہی ہلاک کرے گا

یعنی قانونِ الٰہی یہ ہے کہ جس طرح معلول اپنی علت کے ساتھ بندھا ہوا ہوتا ہے اسی طرح ہر شخص اپنے اعمال کے ساتھ بندھا ہوا ہوگا۔ جزا و سزا کے دن اس کا عمل ہی اس کو چھڑائے گا اور عمل ہی اس کو ہلاک کرے گا۔ اگر کوئی حسب و نسب اور شرک و شفاعت کے بل پر اس دن کی آفتوں سے چھوٹنے کے زعم میں مبتلا ہے تو وہ یاد رکھے کہ اس طرح کی کوئی چیز اس کے کام آنے والی نہیں ہے۔

إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ۝ فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝ عَنِ الْمُجْرِمِينَ (۳۹-۴۱)

اصحاب الیمین

اس دن نجات و فلاح صرف اصحاب الیمین کو حاصل ہوگی۔ اصحاب الیمین کی تفصیل اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کو پیش نظر رکھ کر زندگی گزاری اور جن کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ فرمایا کہ یہ لوگ بے شک نہ صرف اپنی نیکیوں کا پورا پورا صلہ پائیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے بھی ان کو نوازے گا۔ یہ لوگ بہشت کے باغوں میں ہوں گے اور وہاں آپس میں ان مجرموں کے انجام سے متعلق سوال و جواب کر رہے ہوں گے جن سے دنیا میں ان کو سابقہ رہا۔

اس سوال و جواب کی نوعیت سورۂ صافات کی مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہوتی ہے

اور اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپس میں سوال و جواب کرتے کرتے کس طرح وہ دوزخ میں پڑے ہوئے مجرمین کو بھی مخاطب کرنے اور ان کے دوزخ میں پڑنے کا سبب معلوم کرنے کا موقع نکال لیں گے۔ فرمایا ہے:

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ۝ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ۝ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝ (الصّٰفّٰت - ۳۷ : ۵۰ - ۵۵)	پس اہل جنت ایک دوسرے کی طرف سوال و جواب کرتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔ ان میں سے ایک کہے گا، دنیا میں میرا ایک ساتھی تھا جو کہا کرتا تھا کہ کیا تم بھی قیامت کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو! بھلا جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا جزا اور سزا کے لیے اٹھائے جائیں گے! کہیں گے بھلا جھانک کر دیکھو تو سہی! تو وہ جھانک کر دیکھے گا تو اس مجرم کو دوزخ کے بیچ میں دیکھے گا۔

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ (۴۲)

یعنی اہل جنت آپس میں مجرموں سے متعلق سوال و جواب کرتے کرتے اہل دوزخ کو مخاطب کر کے ان سے بھی پوچھ لیں گے کہ بتاؤ تمھیں دوزخ میں کیا چیز لے گئی!

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ (۴۳-۴۷)

اہل دوزخ کا اعتراف

اہل دوزخ ان کے جواب میں اعتراف کر لیں گے کہ ہمارے اعمال ہی ہمیں یہاں لانے والے بنے ہیں۔ قصور سارا ہمارا اپنا ہی ہے، کسی دوسرے کا نہیں ہے۔

سب سے پہلے وہ اپنے اس جرم کا اعتراف کریں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ دین کے عقائد میں جس طرح توحید کو سب پر تقدم حاصل ہے اسی طرح اعمال میں نماز کو سب پر تقدم حاصل ہے۔ ہر نبی نے سب سے پہلے اسی عمل کی دعوت دی ہے اور اسی کے اہتمام اور اسی کے ترک پر دین کو منحصر بتایا ہے۔

اس کے بعد وہ اپنے عدم انفاق کا اعتراف کریں گے کہ وہ مسکینوں کو کھلانے کے روادار نہ تھے۔ اعمال میں نماز کے بعد دوسرا درجہ انفاق کا ہے اور انہی دونوں پر تمام اعمالِ صالحہ کی عمارت قائم ہے۔ ہم جگہ جگہ اس حقیقت کی وضاحت کر چکے ہیں کہ نماز بندے کا تعلق خالق سے استوار کرتی ہے

اور زکوٰۃ (انفاق) اس کو خلق سے جوڑتی ہے اور انہی دو کی استواری پر آدمی کے دین کی استواری کا انحصار ہے۔

اس کے بعد وہ اس امر کا اعتراف کریں گے کہ قیامت اور جزا و سزا کے باب میں جس طرح کی نکتہ چینیاں اور موشگافیاں دوسرے کرتے تھے اسی طرح کی موشگافیاں کرنے والوں میں وہ بھی رہے ہیں اور انہی موشگافیوں کی آڑ سے کر انھوں نے جزا و سزا کے دن کو جھٹلایا یہاں تک کہ موت آگئی اور اس نے ان تمام چیزوں کا یقین دلا دیا جن کے بارے میں وہ شکوک پیدا کرتے رہے تھے۔

'کُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَ' سے اشارہ اس طرح کی باتوں کی طرف ہے جس کی ایک مثال دوزخ پر مامور فرشتوں کی تعداد کے بارے میں اوپر گزر چکی ہے۔

'خوض فی الحدیث' کے معنی ہیں کسی بات میں مین میکھ نکالتے نکالتے کہیں سے کہیں جا نکلنا اور اس کو فتنہ اور حق سے انحراف کے لیے بہانہ بنا لینا۔

'حَتّٰیٓ اَتٰنَا الْیَقِیْنُ' یقین کے اصل معنی تو یقین ہی کے ہیں لیکن چونکہ موت کے بعد تمام مابعد الموت حقائق آدمی پر روشن ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے یقین پر مجبور ہو جاتا ہے اس وجہ سے موت کو بھی یقین سے تعبیر کرتے ہیں جس طرح ایک شے کے لازم سے خود اس شے کو تعبیر کر دیتے ہیں۔

یہاں مجرموں کے جو اعترافات نقل ہوئے ہیں وہ اس حقیقت کے اثبات کے لیے نقل ہوئے ہیں جو اوپر 'کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے تاکہ جو نادان اپنے خاندان، اپنے حسب و نسب اور اپنے شرکاء و شفعاء کے بل پر جزا و سزا کا مذاق اڑا رہے تھے ان کے کان اور ان کی آنکھیں کھلیں اور ان پر یہ حقیقت خود ان کے ہم مشربوں کی زبان سے واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیک اعمال کے سوا کوئی چیز کام آنے والی نہیں ہے۔

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِیْنَ (۴۸)

مشرکین کی مزعومہ شفاعت کی نفی

یہ ان کے مزعومہ شفعاء اور ان کی مفروضہ شفاعت کی نفی فرمائی ہے کہ نہ وہاں ان کے مزعومہ شفعاء ہوں گے اور نہ ان کی شفاعت۔

یہاں کلام عربیت کے اسلوب پر ہے جس کو 'نفی الشیء بنفی لازمہٖ' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔ امرء القیس نے ایک صحرائی راستہ کی تعریف میں کہا ہے کہ 'لا یھتدی بمنارہٖ' اس کے منارہ سے رہنمائی نہیں حاصل کی جاتی۔ اس کا مطلب ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس میں منارے ہیں ہی نہیں کہ ان سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ مشرکین کو اپنے جن شفعاء پر ناز تھا ان کے متعلق قرآن نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ 'اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ' (النجم - ۵۳ : ۲۳) یہ

تو محض فرضی نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں، ان کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں)۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ (۴۹)

اعراض کرنے والوں کے حال پر تعجب

یہ ان کے حال پر تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ ان کو تو اپنے رب کا شکر گزار ہونا تھا کہ اس نے جزا و سزا کے یوم موعود سے پہلے ان کی یاددہانی اور اصل حقائق سے آگاہ کرنے کے لیے ایک کتاب بھی نازل کر دی اور ایک رسول بھی بھیج دیا لیکن ان کا حال عجیب ہے کہ وہ اس یاددہانی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔

'مُعْرِضِينَ' ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ یہ اسلوب عربیت میں معروف ہے۔ اس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُسْتَنْفِرَةٌ ۝ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (۵۰-۵۱)

یہ ان کی وحشت زدگی کی مثال ہے۔ فرمایا کہ ان کا حال ان بدکے ہوئے گدھوں کا ہے جو شیر سے ڈر کے بھاگے ہوں۔ 'قَسْوَرَةٌ' شیر کو کہتے ہیں۔ گدھے اور گورخر وغیرہ شیر کی آواز سن کر بھاگے ہوں تو وہ بڑی مشکل سے قرار پکڑتے ہیں، کسی طرف سے ذرا بھی کھٹکا ہو تو وہ اس طرح بھاگتے ہیں گویا شیر ہی آگیا۔ فرمایا کہ یہی حال ان لوگوں کا ہے۔ یہ اس یاددہانی سے ایسے سہمے ہوتے ہیں کہ اس کا ایک حرف بھی سننے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ایک حقیقت جب اتنی واضح ہو کہ آدمی کا دل اس کے انکار پر بھی مطمئن نہ ہو اور اس کو قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہو تو اس سے اس کے گریز و فرار کی شکل یہی ہوتی ہے جو اس مثال میں واضح فرمائی گئی ہے۔ اس کی خواہش اور کوشش ہر وقت رہتی ہے کہ کسی طرف سے اس کے کانوں میں کوئی ایسی آواز نہ پڑنے پائے جو اس حقیقت کو یاد دلا دے۔

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُنَشَّرَةً (۵۲)

اعراض کا بہانہ

یعنی اس یاددہانی سے فرار کے لیے انھوں نے یہ بہانہ بنایا ہے کہ اگر خدا کو کوئی کتاب ہی اتارنی تھی تو انہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ کیوں اتاری گئی! ایسا کیوں نہ ہوا کہ ہمیں بھی کھلے ہوئے صحیفے پکڑا دیے جاتے! آخر اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا کرنا کیا دشوار تھا! یہ وہی بات ہے جو دوسرے مقام میں یوں بیان ہوئی ہے:

وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا	اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو
لَنْ نُؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ	وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر اس وقت تک ایمان
مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۘ	نہیں لانے کے جب تک کہ ہمیں بھی اسی طرح

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام - ٦: ١٢٤)

نہ ملے جس طرح اللہ کے رسولوں کو ملی ــــــ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت سے کن کو سرفراز کرے!

كَلَّا ۚ بَل لَّا يَخَافُونَ الْاٰخِرَةَ (۵۳)

اصل حقیقت

یعنی نہ ایسا ہونا ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ ان کے گریز کی علت یہ نہیں ہے جو یہ ظاہر کر رہے ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت کے وقوع کے متوقع نہیں ہیں۔ 'يَخَافُونَ' یہاں 'يَرْجُونَ' کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ اس کے شواہد اس کے محل میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ آخرت سے نچنت ہیں اور ان کی دلی خواہش یہی ہے کہ اس سے نچنت ہی رہیں، اس کی فکر ان کے عیش کو مکدر کرنے نہ پائے تو ان کو کوئی نشانی بھی قائل نہیں کر سکتی۔ ان کی طلب کے مطابق ان کو کھلے صحیفے بھی پکڑا دیے جائیں جب بھی وہ کوئی نہ کوئی بات بنا ہی لیں گے۔

كَلَّا إِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهٗ (۵۴-۵۵)

نبی صلعم کے لیے تسلی

یہ ان ہٹ دھرموں سے اظہار بے نیازی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیغام تسلی ہے مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے ضدیوں کی زیادہ ناز برداری کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک یاد دہانی ہے جو انھیں کر دی گئی۔ جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور سیدھی راہ اختیار کرے۔ اگر وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے، نہ اللہ کا کچھ بگاڑیں گے نہ رسول کا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ پکڑنے سے پہلے لوگوں کو یاد دہانی کر دیتا ہے تاکہ اس کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور رسول کا فرض یہ ہے کہ وہ اس یاد دہانی کو لوگوں تک پہنچا دے۔ لوگوں کے دلوں میں ہدایت اتار دینا نہ رسول کی ذمہ داری ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ ان لوگوں کے دلوں میں اپنی ہدایت اتارے جو اس سے بیزار ہیں۔

وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللّٰهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ (۵۶)

ہدایت کے باب میں سنت الٰہی

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اس نے پسند فرمائی ہے اور جو اس کتاب میں جگہ جگہ زیر بحث آ چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت انہی کو بخشتا ہے جو اپنے سمع و بصر اور فواد کی صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں، جو فطرت کے نور کی قدر کرتے ہیں، جو آفاق و انفس کی نشانیوں پر غور کرتے ہیں اور ہر اس بات کو سننے اور سمجھنے کے لیے اپنے کان کھلے رکھتے ہیں جو معقول ہو اگرچہ وہ ان کے نفس کی خواہشوں کے کتنے ہی خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ہر مشیت اس کی حکمت کے تحت ہے۔ وہ انہی کو ہدایت بخشتا ہے جو ہدایت کی قدر کرنے والے ہوتے ہیں۔ جو اس کی قدر نہیں

کرتے ان کو ہدایت دینا تو درکنار اللہ تعالیٰ ان کی وہ صلاحیت بھی سلب کر لیتا ہے جو فطرت کی راہ سے ان کو حاصل ہوتی ہے۔ اس باب میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ارشاد کا حوالہ ہم جگہ جگہ دے چکے ہیں۔

'هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰی وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ' مفسرین نے عام طور پر 'هُوَ' کا مرجع اللہ کو قرار دیا ہے اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ ہی تقویٰ کا سزاوار ہے اور مغفرت کا اہل ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کا تعلق 'فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ' سے ہے۔ 'مَنْ' واحد، جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے ضمیریں دونوں قسم کی استعمال ہو سکتی ہیں۔ یہ بتایا گیا ہے کہ کون اس قرآن سے یاددہانی حاصل کرے گا اور اس کے صلہ میں اللہ کی مغفرت کا سزاوار ٹھہرے گا اور کون اس سے محروم رہیں گے۔ فرمایا کہ جن کے اندر خدا کا خوف ہو گا وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور وہ مغفرت کے اہل ٹھہریں گے۔ رہے وہ جن کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہیں وہ اس سے محروم ہی رہیں گے اور جب وہ اس سے محروم رہیں گے تو خدا کی مغفرت سے بھی محروم رہیں گے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز میں 'هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ' کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کا فیض کن لوگوں کو پہنچتا ہے اور کون لوگ اس سے محروم رہتے ہیں۔ اس سنتِ الٰہی کی تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔ تقویٰ کے مختلف مدارج ہیں۔ انسان کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو تقویٰ ودیعت فرمایا ہے اور جس کا ذکر 'فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا' (الشمس - ۹۱ : ۸) میں ہے، یہاں اسی تقویٰ کی طرف اشارہ ہے۔ آگے والی سورہ میں ان شاء اللہ اس فطری تقویٰ کی پوری وضاحت آپ کے سامنے آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کی تائید اور اس کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی اِحْسَانِهٖ۔

رحمان آباد
۱۸۔ دسمبر ۱۹۷۸ء
۱۷۔ محرم الحرام ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۷۵

القيٰمة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ بھی، گروپ کی سابق سورتوں کی طرح، انذارِ قیامت کی سورہ ہے۔ سابق سورہ کا خاتمہ اس مضمون پر ہوا ہے کہ اس یاددہانی سے اعراض کرنے والوں کے اعراض کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر نیکی اور بدی کا جو شعور اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمایا ہے یہ سرگشتگانِ دنیا اس کو ضائع کر بیٹھے ہیں۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو زندہ رکھتے ہیں ان کو مزید ہدایت و روشنی نصیب ہوتی ہے اور جو اس کو ضائع کر بیٹھتے ہیں وہ ایسے اندھے بہرے بن جاتے ہیں کہ ان پر کوئی تذکیر بھی کارگر نہیں ہوتی۔

اس سورہ میں اسی حقیقت کو اچھی طرح مبرہن کر دینے کے لیے نفسِ لوّامہ کی، جو ہر انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے، اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے اور اس کو قیامت کے ثبوت میں ایک دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ انسان کے اندر ایک مخفی زاجر کی حیثیت رکھتا ہے جو اس کو، جب وہ کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے، ملامت اور سرزنش کرتا ہے۔ انسان کے اندر اس کا پایا جانا نہایت واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ اس دنیا میں مطلق العنان اور غیر مسئول بنا کر نہیں چھوڑا گیا کہ چاہے وہ نیکی کرے یا بدی اس کے خالق کو اس سے کچھ بحث نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے اندر اس طرح کے کسی زاجر کو بٹھانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ انسان ایک عالمِ اصغر ہے اس کے اندر نفسِ لوّامہ کا پایا جانا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس عالمِ اکبر کے اندر بھی ایک نفسِ لوّامہ ہے جس کو قیامت کہتے ہیں۔ وہ ایک دن ظہور میں آئے گی اور ان تمام لوگوں کو ان کی بداعمالیوں پر سرزنش کرے گی جنھوں نے اپنے اندر کے مخفی زاجر کی تنبیہات کی پروا نہ کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کی عدالتِ کبریٰ کا ایک عکس ہر انسان کے اپنے وجود کے اندر نفسِ لوّامہ کی عدالتِ صغریٰ کی شکل میں موجود ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ جو شخص کوئی برائی کرتا ہے وہ کہیں پسِ پردہ نہیں کرتا بلکہ خدا کی عدالت کے دروازے پر اور اس کے مقرر کیے ہوئے کوتوال کے روبرو کرتا ہے۔ چنانچہ نفسِ لوّامہ کی شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَہٗ (۵) (بلکہ انسان اپنے ضمیر کے روبرو شرارت کرنا چاہتا ہے) اسی حقیقت کی وضاحت

آگے کی آیات میں یوں فرمائی ہے کہ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ (۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جدید فلسفۂ اخلاق کے ماہروں نے بھی چند بنیادی نیکیوں کا نیکی ہونا اور چند معروف برائیوں کا برائی ہونا بطور اصول موضوعہ تسلیم کر کے اپنی بحث کا آغاز کیا ہے۔ اگرچہ وہ یہ نہیں بتا سکے کہ ان نیکیوں کا نیکی یا ان برائیوں کا برائی ہونا انھوں نے کہاں سے جانا جس کے سبب سے ان کی ساری عمارت بے بنیاد رہ گئی ہے لیکن یہ حقیقت انھیں تسلیم ہے کہ بنیادی نیکیوں اور بنیادی برائیوں کے شعور سے انسان محروم نہیں ہے۔ قرآن نے اس سورہ میں اس حقیقت سے یوں پردہ اٹھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر نہ صرف نیکی اور بدی کا شعور ودیعت فرمایا ہے بلکہ اس کے اندر ایک مخفی زاجر (ضمیر) بھی رکھا ہے جو برائیوں کے ارتکاب پر اس کو سرزنش کرتا اور نیکیوں پر اس کو شاباش دیتا ہے اور پھر اسی نفسیاتی حقیقت پر اس نے قیامت اور جزا و سزا کی دلیل قائم کی ہے کہ جس خالق نے ہر انسان کے نفس کے اندر اس کی بدعملی پر سرزنش اور اس کی نیکی پر تحسین کے لیے یہ اہتمام فرمایا ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس مجموعی کائنات کے لیے کوئی ایسا دن نہ لائے جس میں اس پوری دنیا کا محاسبہ ہو اور ہر شخص اپنی نیکیوں کا صلہ اور اپنی بدیوں کی سزا پائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ میں مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۶) قیامت کی قسم خود قیامت کی قطعیت پر اور انسان کے اندر نفسِ لوامہ کے وجود سے قیامت کے حق میں ایک نفسیاتی شہادت اور اس حقیقت کا انکشاف کہ جو منکرین اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مرکھپ اور گل سڑ جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ممکن نہیں ہے، ان کا یہ خیال خود ان کے اپنے ضمیر کی شہادت کے خلاف ہے۔ ان کی مثال اس بے باک چور کی ہے جو کوتوال کے سامنے چوری کرتا ہے۔

(۷-۱۵) قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب کہ آج تو یہ ایک بدیہی حقیقت کو جھٹلانے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے قیامت کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن جب اس کی ہولناک ہلچل برپا ہو گی تو کہیں گے کہ اب کہاں بھاگیں! حالانکہ اس وقت کسی کے لیے خدا کے سوا کوئی اور ٹھکانا نہیں ہو گا۔ ہر ایک سے اس دن اس کے ایک ایک عمل کی بابت پرسش ہونی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان سے مخفی نہیں ہے اگرچہ وہ اس پر پردہ ڈالنے کے لیے کتنی ہی سخن سازیاں کریں۔

(۱۶-۱۹) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جلد بازی سے اجتناب کی ہدایت اور صبر کی تلقین کہ مخالفین خواہ

کتنی ہی جلدی مچائیں لیکن تم ان سے متاثر ہو کر قرآن کے اتارے جانے کے لیے جلدی نہ کرو بلکہ جس رفتار سے یہ اتر رہا ہے اس کو اطمینان سے اخذ کرو اور لوگوں تک اس کو پہنچاؤ۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی حکمت و مصلحت کے تحت نازل فرما رہا ہے اور اس کے جمع و ترتیب، حفاظت و صیانت اور اس کی توضیح و تبیین ہر چیز کی ذمہ داری اس نے اپنے اوپر لی ہے۔ ان معاملات میں کسی پہلو سے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲۰ - ۲۵) منکرینِ قیامت کو ملامت کہ تمھاری یہ ساری سخن سازیاں کسی دلیل پر مبنی نہیں ہیں۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو خود اپنے ضمیر کے خلاف محض اس وجہ سے کہہ رہے ہو کہ تم اس دنیا کا عشق رکھتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو حالانکہ آخرت ایک حقیقت ہے۔ اس دن بہت سے چہرے شاداب اور اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں گے اور بہتوں کے چہرے بگڑے ہوئے اور وہ یہ گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کوئی کمر توڑ دینے والی مصیبت ٹوٹنی ہے۔

(۲۶ - ۴۰) کوئی اس گمان میں نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے گا۔ ہر ایک کو موت کی جان کنی سے سابقہ پیش آنا ہے اور اسی بے بسی و بے کسی کے حال میں اپنے رب کی طرف جانا ہے۔ بدقسمت ہے وہ جس نے نہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا نہ نماز پڑھی بلکہ جب اس کو یاددہانی کی گئی تو نہایت رعونت سے منہ موڑ کر اپنے لوگوں میں چل دیا۔ ہر شخص کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس خدا نے انسان کو منی کے ایک قطرہ سے وجود بخشا اور اس کا تسویہ کر کے گوناگوں صفات سے اس کو آراستہ کیا اس کے لیے اس کے مرکھپ جانے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہو گا۔

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ

مَكِّيَّةٌ ——— آيات : ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۴۰ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝۱ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲
اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝۳ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى
اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝۴ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝۵
يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝۶ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝۷ وَخَسَفَ
الْقَمَرُ ۝۸ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝۹ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ
اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝۱۰ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝۱۱ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ ۝۱۲
يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝۱۳ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى
نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝۱۵ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ
لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝۱۶ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝۱۷ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ
قُرْاٰنَهٗ ۝۱۸ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝۱۹ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝۲۰
وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝۲۱ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝۲۲ اِلٰى رَبِّهَا
نَاظِرَةٌ ۝۲۳ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۝۲۴ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا
فَاقِرَةٌ ۝۲۵ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝۲۶ وَقِيْلَ مَنْ سكتة رَاقٍ ۝۲۷

وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ اِلٰى رَبِّكَ
ع ۳۰/۱۷ يَوْمَئِذِ ِالْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ
وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾
ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٥﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾
اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ
فَسَوّٰى ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿٣٩﴾ اَلَيْسَ
ع ۲/۱۸ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿٤٠﴾

ترجمۂ آیات ۱-۴۰

نہیں، میں قسم کھاتا ہوں روزِ حشر کی اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی! کیا انسان نے گمان کر رکھا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر پائیں گے! ہاں، ہم جمع کریں گے اس طرح کہ اس کے پور پور کو ٹھیک کر دیں گے۔ بلکہ انسان اپنے (ضمیر کے) آگے شرارت کرنا چاہتا ہے۔ پوچھتا ہے قیامت کب ہوگی؟ ۱-۶

پس جب نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی اور سورج گہنا جائے گا اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے تو اس وقت انسان کہے گا کہ کہاں بھاگوں! ــــ ہرگز نہیں، کہیں پناہ نہیں! اس دن تیرے رب ہی کی طرف ٹھکانا ہوگا۔ اس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔ ۷-۱۵

اس کو جلدی سیکھ لینے کے لیے اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کو جلدی نہ چلاؤ۔ ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا تو جب ہم اس کو سنا چکیں تو اس سنانے

کی پیروی کرو، پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔ ۱۶-۱۹

ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ اس دنیا ہی سے عشق رکھتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کیے ہوئے ہو۔ کتنے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے، اپنے رب کی رحمت کے متوقع اور کتنے چہرے اس دن اداس ہوں گے، گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کمر توڑ دینے والی مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔ ۲۰-۲۵

ہرگز نہیں، جب کہ جان ہنسلی میں آ پھنسے گی اور کہا جائے گا اب کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا! اور وہ گمان کرے گا کہ بس وقت چل چلاؤ کا ہے اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی اس دن تیرے رب کی طرف جانا ہوگا۔ ۲۶-۳۰

پس اس نے نہ تو سچ مانا اور نہ نماز پڑھی بلکہ جھٹلایا اور منہ موڑا پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں میں چل دیا۔ افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے پھر افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے! ۳۱-۳۵

کیا انسان گمان رکھتا ہے کہ وہ بس یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا! کیا وہ محض ٹپکائی ہوئی منی کی ایک بوند نہیں تھا! پھر وہ بنا خون کی ایک پھٹکی اور اللہ نے اس کا خاکہ بنایا اور اس کے نوک پلک سنوارے۔ پھر بنایا اس سے جوڑا، نر اور مادہ! کیا وہ خداوند قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے! ۳۶-۴۰

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (۱)

قسم سے پہلے 'لا' کے استعمال کی نوعیت

عربیت کے اس اسلوب کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے کہ قسم سے پہلے جب اس طرح 'لا' آیا کرتا ہے جس طرح یہاں ہے تو وہ قسم کی نفی کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے اس خیال کی نفی کے لیے آتا ہے جس کی تردید اس قسم سے مقصود ہوتی ہے۔ اس کی مثالیں جس طرح عربی زبان میں بکثرت موجود ہیں اسی طرح ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔ آپ جب کسی شخص کی بات کی فوری تردید کرنی چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: نہیں، خدا کی قسم، اصل حقیقت یوں ہے۔ اس اسلوب قسم سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ متکلم کے نزدیک مخاطب کی بات اتنی لغو ہے کہ وہ اس کی تردید میں اتنے توقف کا بھی روادار نہیں کہ قسم کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ اس سے پہلے ہی اس کی تردید بلکہ اپنی بیزاری کا اظہار ضروری سمجھتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس 'لا' کو زائد اور بعضوں نے اس کو فعل سے متصل مانا ہے لیکن یہ دونوں رائیں عربیت کے خلاف ہیں۔ ہم نے جگہ جگہ اس کتاب میں اس کی تردید کی ہے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر سورۂ قیامہ میں اس پر وضاحت سے بحث کی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس کی مراجعت فرمائیے۔

یہاں قسم کا مقسم علیہ مذکور نہیں ہے اس کی دو وجہیں ہیں۔

مقسم علیہ کے حذف کی بلاغت

ایک یہ کہ یہاں مقسم علیہ اتنا واضح ہے کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا قسم خود اپنے مقسم علیہ پر دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ اس کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ سورۂ قٓ اور سورۂ صٓ میں 'وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ' اور 'وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ' کی قسمیں بھی اسی طرح مقسم علیہ کے بغیر آئی ہیں۔ اس طرح کی قسموں سے مقصود مخاطب پر یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کی تردید یا تکذیب کر رہا ہے وہ خود اپنی صداقت پر ایسی شاہد عدل ہے کہ اس کے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد نفس لوامہ کی جو قسم ہے وہ قیامت کے حق ہونے پر ایسی بدیہی دلیل ہے کہ اس کی تکذیب، جیسا کہ آگے وضاحت آئے گی، آدمی کے خود اپنے قلب و ضمیر کی تکذیب کے ہم معنی ہے۔ اس شہادت کے ہوتے قیامت کسی دلیل کی محتاج نہیں رہ جاتی بلکہ وہ بجائے خود دعویٰ اور دلیل، قسم اور مقسم علیہ دونوں کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۲)

نفس لوامہ کی شہادت قیامت پر

یہ دوسری قسم ہے اور اس کا مقسم علیہ بھی مذکور نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقسم علیہ خود قسم کے اندر ہی مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر نفس لوامہ کا وجود شاہد ہے کہ قیامت حق ہے۔ گویا اس دوسری قسم نے قسم ہی کے پیرایہ میں دعویٰ اور دلیل دونوں کی وضاحت کر دی اور اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ قیامت کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ اس کا عکس ہر انسان کے اپنے باطن کے اندر موجود ہے اور وہ اس کو دیکھتا بھی ہے اگرچہ اس کی تردید میں کتنی ہی دلیل بازیاں کرے

'نفسِ لوامہ' سے مراد کوئی علیحدہ اور مستقل نفس نہیں ہے بلکہ یہ نفسِ انسانی ہی کا ایک پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور ودیعت فرمایا ہے اور اس کی سعادت و شقاوت کے لیے ضابطہ یہ ٹھہرایا ہے کہ جو اپنے نفس کو برائیوں سے پاک رکھے گا وہ فلاح پانے والا بنے گا اور جو اس کو برائیوں سے آلودہ رکھے گا وہ نامراد ہو گا۔ سورۂ شمس میں اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝	اور شاہد ہے نفس اور اس کی تشکیل۔
فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝	پس اس کو الہام کر دی اس کی بدی اور
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝	نیکی۔ جس نے اس کو پاک رکھا اس نے
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝	فلاح پائی اور جس نے اس کو آلودہ رکھا
(الشمس - ۹۱ : ۷ - ۱۰)	وہ نامراد ہوا۔

اپنی تشکیل کی اس نوعیت کے سبب سے نفس بعض اوقات اپنی خواہشوں سے مغلوب ہو کر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور وہ انسان کو کسی برائی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ نفس کے اس رجحان کو قرآن میں نفسِ امارہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے نفس کے اس پہلو کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ	اور میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتا۔
النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ	نفس بڑا ہی برائی کی راہ سجھانے والا
(یوسف - ۱۲ : ۵۳)	ہے۔

لیکن یہ نفس نیکیوں کا شعور بھی رکھتا ہے، اس وجہ سے جب تک اس کا توازن برقرار رہتا ہے اس وقت تک وہ اپنے کو بھی، اگر اس سے کوئی برائی صادر ہو جاتی ہے، ملامت کرتا ہے اور دوسروں کی برائیوں کو دیکھ کر بھی کڑھتا اور بسا اوقات ملامت کرتا ہے۔ نفس کے اسی پہلو کو یہاں نفسِ لوامہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

نفس کے توازن کو قائم رکھنے کی تدبیر

نفس کے توازن کو درست رکھنے کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ آدمی برابر اپنے رب اور روزِ جزاء و سزا کو یاد رکھے۔ یہ یاد نفس کے توازن کو درست رکھتی ہے اور وہ کبھی اس کی خواہشوں سے اتنا مغلوب نہیں ہوتا کہ بالکل ان کے آگے سپر انداز ہو جائے۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو نفسِ لوامہ اس کو فوراً ٹوکتا ہے اور وہ متنبہ ہو کر توبہ و انابت سے اس داغ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس نفس کے اندر یہ توازن پیدا ہو جائے قرآن نے اس کو نفسِ مطمئنہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ تربیتِ نفس کا سب سے اونچا مرتبہ یہی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دعوت دی ہے اور شریعت کے ذریعے سے جس کا اہتمام فرمایا ہے۔ اسی نفس کو آخرت میں رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

کا مقام حاصل ہوگا جو نفسِ انسانی کی معراج ہے۔

بدی کے بدی ہونے کا شعور انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ بدی کے بدی ہونے کا شعور انسان کی فطرت کے اندر روزِ اول سے ودیعت ہے۔ آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے حسد سے مغلوب ہو کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل تو کر دیا لیکن قتل کر دینے کے بعد اس کی لاش کو چھپانے کی بھی کوشش کی۔ یہ کوشش ظاہر ہے کہ اسی وجہ سے اسے کرنی پڑی کہ اس کے گناہ ہونے کا اسے احساس ہوا۔ برے سے برا آدمی بھی گناہ کرتا ہے تو اس کو نیکی سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ جذبات اور خواہشوں سے مغلوب ہو کر ہی کرتا ہے۔ اگر اس گناہ کے معاملے میں وہ اپنے نفس کو الاؤنس بھی دیتا ہے تو یہ بھی اپنی فطرت کے خلاف دیتا ہے اس لیے کہ وہی برائی اگر کوئی دوسرا اس کے ساتھ کر بیٹھتا ہے تو وہ اس کو برائی ٹھہراتا اور اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ بروں کے ضمیر کو ٹٹولیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر بھی احترام اور عزت نیکی ہی کے لیے ہے اگرچہ ان کا عمل اس کے خلاف ہے۔ انسان نے جب سے معاشرتی و اجتماعی زندگی کی کوئی شکل اختیار کی ہے اس کے اندر اس نے حق و انصاف کے قیام کے لیے لازماً ایک نظام بھی قائم کیا ہے۔ اگرچہ بسا اوقات بعض برائیوں نے معاشرے پر ایسا غلبہ پا لیا ہے کہ نیکیاں ان کے نیچے دب گئی ہیں، لیکن معاشرے کا مجموعی ضمیر اس پر کبھی راضی نہیں ہوا بلکہ اس کے اندر ایسے لوگ موجود رہے ہیں جنھوں نے معاشرے کے اندر وہی فریضہ انجام دیا ہے جو ہر صحیح الفطرت انسان کے اندر اس کا نفسِ لوامہ انجام دیتا ہے۔ اگر معاملہ اس حد سے گزر گیا ہے یعنی نیکی کی کوئی رمق سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے تو قانونِ قدرت نے اس معاشرے کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے۔

چند سوال اور ان کے جواب

اب سوال یہ ہے کہ جب انسان خود اپنے ضمیر کے اندر ایک نگران رکھتا ہے جو اس سے صادر ہو جانے والی برائیوں پر اس کو ٹوکتا رہتا ہے، تو اس کے لیے یہ تصور کرنا کس طرح معقول قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک شترِ بے مہار ہے، جس طرح کی زندگی وہ چاہے بسر کرے اور جس قدر چاہے اس نگران کی مخالفت کرے لیکن کوئی اس سے باز پرس کرنے کا حق نہیں رکھتا؟ اگر انسان شترِ بے مہار ہے تو یہ نفسِ لوامہ اس کے اندر کہاں سے آ گھسا؟ اگر اس کا خالق لوگوں کی نیکی اور بدی دونوں سے بے تعلق ہے تو اس نے نیکی کی تحسین اور بدی پر سرزنش کے لیے انسان کے اندر یہ خلش کیوں اور کہاں سے ڈال دی؟ پھر یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب اس نے ہر انسان کے اندر یہ چھوٹی سی عدالت قائم کر رکھی ہے تو اس پورے عالم کے لیے وہ ایک ایسی عدالتِ کبریٰ کیوں نہ قائم کرے گا جو سارے عالم کے اعمالِ خیر و شر کا احتساب کرے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے؟ ان سوالوں پر جو شخص خواہشوں سے آزاد ہو کر غور کرے گا وہ ان کا یہی جواب دے گا کہ بے شک انسان کا اپنا وجود گواہ ہے کہ وہ خیر و شر کے شعور کے ساتھ پیدا

ہوا ہے، وہ شتر بے مہار نہیں ہے بلکہ اس کے لیے لازماً ایک پرسش کا دن آنے والا ہے جس میں اس کو اس کی بدیوں کی سزا ملے گی اگر اس نے یہ بدیاں کمائی ہوں گی اور نیکیوں کا صلہ ملے گا اگر اس نے نیکیاں کی ہوں گی۔ اسی دن کی یاد دہانی ہی کے لیے خالق نے اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ خود انسان کے نفس کے اندر رکھ دیا ہے تاکہ انسان اس سے غافل نہ رہے اور اگر کبھی غفلت ہو جائے تو خود اپنے نفس کے اندر جھانک کر اس کی تصویر دیکھ لے۔ یہی حقیقت حکماء اور عارفین نے یوں سمجھائی ہے کہ انسان ایک عالم اصغر ہے جس کے اندر اس عالم اکبر کا پورا عکس موجود ہے، اگر انسان اپنے کو صحیح طور پر پہچان لے تو وہ خدا اور آخرت سب کو پہچان لیتا ہے۔ سقراط کا مقولہ مشہور ہے کہ "اے انسان! تو اپنے کو پہچان!"

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَلَّن نَّجْمَعَ عِظَامَهُ ۝ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَن نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ (۳-۴)

حقیقت سے فرار کے لیے منکرین قیامت کی سخن سازی

اگرچہ لفظ 'انسان' عام ہے لیکن روئے سخن قریش کے انہی منکرین قیامت کی طرف ہے جن کے شبہات پچھلی سورتوں میں زیر بحث آئے ہیں۔ ان سے اظہار بیزاری کے لیے بات عام لفظ سے فرما دی ہے۔ فرمایا کہ قیامت کو ثابت کرنے کے لیے یہ شہادت تو ہر انسان کے اپنے اندر ہی موجود ہے اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ لوگ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ ان کے مرنے اور سڑ گل جانے کے بعد ہم ان کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر پائیں گے۔ فرمایا کہ اگر یہ چیز ان کو بعید از امکان نظر آتی ہے اور اس بنا پر وہ اپنے ضمیر کی شہادت کے خلاف قیامت کو جھٹلا رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ ہم ان کی ہڈیوں کو صرف جمع ہی نہیں کریں گے بلکہ اس قدرت و کمال کے ساتھ جمع کریں گے کہ ان کے جوڑ جوڑ پور پور کو ٹھیک کر دیں گے۔ 'بنان' انگلیوں کے پور کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی حقیر سے حقیر جزو بھی ایسا نہ ہوگا جس کے جمع کرنے اور جوڑنے سے ہم قاصر رہ جائیں۔

'قٰدِرِيْنَ' حال واقع ہے 'نَجْمَعَ' کی ضمیر جمع سے۔

بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ (۵)

یعنی قیامت کا انکار اس بنا پر کہ ہڈیوں کو جمع کرنا ان کو بعید از امکان نظر آتا ہے محض حقیقت سے فرار کے لیے سخن سازی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنی خواہشوں کے ایسے غلام بن چکے ہیں کہ ان کی پیروی میں وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے محتسب کے سامنے شرارت کرنا چاہتے ہیں جو کہیں دور نہیں بلکہ خود ان کے اندر ہی بیٹھا ہوا ہے۔ ان کی مثال اس چور کی ہے جو کوتوال کی موجودگی میں چوری کرے۔

'اَمَامَهٗ' کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ انسان اپنی آگے کی زندگی میں برابر

اپنے گناہوں پر جما رہنا چاہتا ہے اس وجہ سے قیامت کے انکار کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے لیکن یہ مطلب لینے میں نہ نفس لوامہ کی شہادت سے اس کا کوئی تعلق واضح ہوتا اور نہ اس میں انسان پر اس کے اس رویہ کے خلاف کوئی حجت ہی قائم ہوتی۔ اپنے آگے سے مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ انسان اپنے ضمیر اور اپنے نفس لوامہ کے روبرو، اس کی تذکیر و تنبیہ کے علی الرغم شرارتیں کرنا چاہتا ہے۔ قیامت کی سب سے بڑی شہادت انسان کے نفس کے اندر ہی موجود ہے لیکن جو شخص خود اپنی تردید و تکذیب کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اس کا کیا علاج ہے!

اس میں دلیل کا پہلو یہ ہے کہ قیامت پر حجت قائم کرنے کے لیے تو انسان کا ضمیر ہی کافی ہے لیکن جو شخص دروغ گویم بروئے تو کی جسارت کرنے پر تلا بیٹھا ہو اس کا منہ نہیں بند کیا جا سکتا۔

اس سے یہ بات بھی نکلی کہ جو شخص اپنے نفس لوامہ یا دوسرے لفظوں میں اپنے ضمیر کے خلاف کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کے روبرو برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس لیے کہ ضمیر درحقیقت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، خدا کا مقرر کردہ محتسب اور قاضی ہے تو جس نے اس کے آگے برائی کی اس نے خدا ہی کے آگے برائی کی۔

یَسْـَٔلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ (۶)

ایک احمقانہ سوال اور اس کا مسکت جواب

یہ منکرین قیامت کی جسارت اور ڈھٹائی کا بیان ہے کہ باوجودیکہ خدا کا محتسب خود ان کے اندر ہی موجود ہے اور وہ اس کو محسوس بھی کر رہے ہیں لیکن جب ان کو قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ قیامت کہاں ہے؟ وہ کب آئے گی! اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتی! ہم اس کے ڈراوے سنتے سنتے تو تھک گئے لیکن اس کو نہ آنا تھا، نہ آئی تو اب ہم ان ڈراووں سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں۔ جو لوگ اس سے ڈرا رہے ہیں وہ اس کو لا کر ہمیں دکھائیں تو ہم اس کا حق ہونا مانیں گے۔ محض زبانی دھونس سے ہم ماننے والے نہیں ہیں۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ (۷-۱۰)

یعنی آج تو وہ اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں گویا اس کے مقابلہ کے لیے ہر قسم کی تیاری کیے بیٹھے ہیں لیکن جب اس کی ہونی سے سابقہ پیش آئے گا تو کہیں گے، اب کہاں بھاگیں؟

قیامت کے دکھا دیے جانے کا مطالبہ چونکہ ایک بالکل ہی احمقانہ مطالبہ ہے اس وجہ سے اس سے تو یہاں تعرض نہیں کیا لیکن اس کی ہولناکی کے بعض پہلو ان کے سامنے رکھ دیے۔ فرمایا کہ اس دن نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی، چاند گہنا جائے گا، سورج اور چاند، جو آج اپنے الگ الگ مداروں میں گردش کر رہے ہیں، ان کی حد بندیاں ٹوٹ جائیں گی اور وہ آپس میں ٹکرا جائیں گے۔

یہ قیامت کے دن کے احوال ہیں جن کا تعلق متشابہات سے ہے۔ اس جہان میں ان کی اصل حقیقت کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ یہاں مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ جو دن ایسی ہلچل کا ہوگا کہ چاند اور سورج اپنے مداروں سے ہٹ کر ایک ہی مدار میں جا پڑیں گے۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ کون کر سکتا ہے! مطلب یہ ہے کہ اگر عقل کا کوئی شائبہ تمھارے اندر ہے تو اس سے پناہ مانگو اور اس کی آفتوں سے بچنے کی جو راہ دکھائی جا رہی ہے اس کو اختیار کرو نہ کہ اس کے لیے جلدی مچاؤ۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہاں قیامت کے جو احوال بیان ہوئے ہیں وہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، صرف اس کا ہلکا سا تصور دینے کے لیے بیان ہوئے ہیں اور یہ اس کے بے شمار احوال میں سے صرف چند ہیں۔ آگے اسی گروپ کی سورتوں میں اس کے مختلف پہلو سامنے آئیں گے اور وہ بھی اس کے بے شمار پہلوؤں میں سے صرف چند ہی ہوں گے اس لیے کہ زبان ان کی تعبیر و تصویر سے قاصر ہے۔

كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ (۱۱-۱۲)

یہ جواب ہوگا ان کے قول 'أَيْنَ الْمَفَرُّ' کا، یعنی وہ پکاریں گے کہ اب کہاں بھاگیں! ان کو جواب ملے گا کہ ہرگز نہیں، اب کوئی ٹھکانا اور بھاگنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس دن تیرے رب ہی کی طرف سب کا ٹھکانا ہوگا۔ دوسری تمام راہیں فرار کی اس دن بند ہو جائیں گی۔

يُنَبَّأُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ (۱۳)

قیامت کی غایت

یہ مقصد بیان ہوا ہے اس دن کے آنے کا۔ فرمایا کہ اس دن ہر شخص کو آگاہ کیا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ آگاہ کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس دن اس کے سارے اعمال کے نتائج سامنے رکھ دیے جائیں گے۔ دنیا کی زندگی میں جو بدیاں اس نے کمائیں وہ بھی اس کے سامنے آ جائیں گی اور جن نیکیوں سے منہ موڑا ان کے نتائج بھی سامنے آ جائیں گے۔ قرآن میں جابجا یہ تصریح ہے کہ اس دن آخرت سے غافل رہنے والے اپنے سر پیٹیں گے کہ کاش ہم نے آج کے دن کے لیے فلاں اور فلاں کام کیے ہوتے اور یہ بھی کہیں گے کہ کاش ہم نے رسولوں کے انذار سے انحراف نہ کیا ہوتا بلکہ ان کی دعوت پر ایمان لائے ہوتے۔ 'قَدَّمَ' اور 'أَخَّرَ' کے الفاظ ان کے تمام اعمالِ بد اور ان کی ساری کوتاہیوں دونوں رویوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آخرت کی فیروزمندی کے لیے انسان کو بہت سے نیک کام کرنے اور بہت سے برے کام چھوڑنے پڑتے ہیں لیکن جو لوگ آخرت سے غافل یا اس کے منکر ہوتے ہیں وہ ان کاموں سے تو غافل یا منحرف رہتے ہیں جو وہاں کے لیے زادِ راہ کا کام دینے والے ہیں اور جو باتیں آخرت میں تباہی کا باعث بننے والی ہوتی ہیں، ساری زندگی وہ انہی کا ذخیرہ جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس آیت میں ایسے ہی محروموں کے لیے تذکیر و تنبیہ ہے۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (۱۴-۱۵)

انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے

یہ اسی بات کی وضاحت دوسرے الفاظ میں ہے جو اوپر 'بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ' کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ وہاں مخالفین قیامت کے سوال 'يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ' کے تعلق سے کلام کا رخ تصویر قیامت کی طرف مڑ گیا تھا۔ اس کے بعد اصل سلسلۂ کلام پھر عود کر آیا اور بات پوری کر دی گئی۔ فرمایا کہ انسان قیامت سے گریز کے لیے کتنے ہی بہانے بنائے لیکن وہ اپنے نفس پر خود حجت اور گواہ ہے۔ 'بَصِيْرَةٌ عَلٰى نَفْسِهٖ' کے معنی ہوں گے 'شَاهِدٌ عَلٰى نَفْسِهٖ' (وہ اپنے اوپر خود گواہ ہے) اس کی دلیل اوپر بیان ہو چکی ہے کہ انسان کے اندر اس کا نفس لوامہ قیامت کا شاہد ہے، اس کو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے ہی ضمیر کے آئینے میں اس کی صورت دیکھ سکتا ہے۔

'مَعَاذِيْرُ' جمع ہے 'مَعْذِرَةٌ' کی۔ یہ دراصل 'مَعَاذِرُ' ہے۔ اس میں 'ی' زیادہ ہو گئی ہے جس طرح 'مناکیر' میں زیادہ ہو گئی ہے۔ اس کے معنی جھوٹے عذرات اور لاطائل بہانوں کے ہیں۔ عربی میں مثل ہے 'اَلْمَعَاذِرُ مَكَاذِبُ'۔ بعض لوگوں نے اس کو 'معذار' کی جمع بتایا ہے۔ جس کے معنی اہل یمن کی بولی میں پردے کے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ قرآن قریش کی ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے، اہل یمن کی بولی میں نہیں اترا ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۗ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۱۶ - ۱۹)

آیات کا پس منظر

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کی جلد بازیوں اور ان کے نت نئے مطالبات کے مقابل میں صبر و انتظار کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر انذار عام کی جو بھاری ذمہ داری ڈالی تھی اس سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے آپ کے پاس واحد سہارا وحی الٰہی ہی کا سہارا تھا۔ آپ کی مثال محاذ پر مامور سپاہی کی تھی اور آپ کوئی بھی قدم اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ مخالفین آپ کو زچ کرنے کے لیے طرح طرح کے اعتراضات و مطالبات پیش کر کے آپ کو پسپا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ اوپر ان کا ایک مطالبہ مذکور ہوا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جس قیامت سے ڈرا رہے ہو وہ کہاں ہے؟ اگر اس کا آنا قطعی ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتی! اسی طرح قرآن میں ان کا یہ مطالبہ بھی مذکور ہوا ہے کہ اگر قرآن اللہ کا کلام ہے تو وہ پورا کا پورا بیک دفعہ کیوں نہیں نازل ہو جاتا۔ غرض ہر طرف سے آپ پر نئے نئے اعتراضات سوالات کی بارش تھی اور ہر سوال کے اطمینان بخش جواب کے لیے آپ کو برابر وحی الٰہی کا انتظار رہتا۔ اسی سے آپ کے قلب کو قوت، آپ کی روح کو حیات تازہ، عقل کو رہنمائی اور ارادے کو ثبات و استحکام

حاصل ہوتا۔ چنانچہ قرآن اور احادیث دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی حکمتِ الٰہی کے تحت وحی کے نزول اور جبریل امین کی آمد میں کچھ زیادہ وقفہ ہو جاتا تو آپ کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھ جاتیں۔ اسی شوق و اضطراب کا اظہار آپ سے اس وقت بھی ہوتا جب جبریل امین آپ پر وحی القاء فرماتے۔ آپ ایک پُرشوق طالب کی طرح چاہتے کہ جلد سے جلد ساری وحی سن لیں اور اس کو اچھی طرح محفوظ بھی کر لیں کہ مبادا اس ابرِ نیساں کا کوئی قطرہ ضائع ہو جائے

اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر اب آیات پر غور فرمائیے۔

نزولِ وحی کے وقت آنحضرت کے شوق و اضطراب کی کیفیت

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ: یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عجلت و بے قراری سے روکا گیا ہے جو آپ پر اس وقت طاری ہوتی جب وحی آتی۔ اگرچہ شوق و عجلت کا مضمون ادب کے پامال مضامین میں سے ہے لیکن اس عجلت و بے قراری کی تعبیر کون کر سکتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت طاری ہوتی ہوگی جب ایک طویل وقفہ کے انتظار کے بعد اور مخالفین کی ژاژ خائیوں کے طوفان کے اندر حضرت جبریل امینؑ اللہ تعالیٰ کے نامہ و پیام کے ساتھ نمودار ہوتے رہے ہوں گے۔ ایک بچہ بھوکا ہو اور ماں اس کو چھاتی سے لگائے تو وہ چاہتا ہے کہ ماں کی چھاتی کا سارا دودھ ایک ہی سانس میں سڑپ لے۔ صحرا کا مسافر پیاس سے تڑپ رہا ہو اور طویل انتظار کے بعد اس کو پانی کا ڈول مل جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ پورا ڈول ایک ہی دفعہ پیٹ میں انڈیل لینا چاہتا ہے۔ ایک فراق زدہ کو جدائی کی کٹھن گھڑیاں گزارنے کے بعد نامۂ محبوب مل جائے تو وہ چاہے گا کہ ایک ہی نظر میں اس کا ایک ایک حرف پڑھ ڈالے۔ اگرچہ یہ مثالیں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ناقص ہیں، تاہم ان سے کچھ اندازہ اس شوق، اس عجلت اور اس اضطراب کا کیا جا سکتا ہے جس کا اظہار آپ کی طرف سے بے اختیار اس وقت ہوتا رہا ہوگا جب آپ وحی سے مشرف ہوتے رہے ہوں گے۔

اس کا سبب کوئی ایک نہیں تھا بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، متعدد تھے۔ مثلاً

- یہ کہ آپ جس فریضۂ منصبی پر مامور تھے اس کا سارا پروگرام اسی سے معلوم ہوتا تھا۔
- آپ کی عقلی، ایمانی اور روحانی زندگی کا تمام تر انحصار اسی پر تھا۔
- حاضر اور مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے رہنمائی اسی سے ملتی تھی۔
- دشمنوں کے نت نئے اعتراضات و مطالبات کے فیصلہ کن جوابات اسی کے ذریعہ حاصل ہوتے تھے۔
- علم کا غیر معمولی شوق اور اس کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری کا صحیح احساس بھی اس کا ایک بہت بڑا سبب تھا۔

ان میں سے ہر محرک ایک پاکیزہ محرک ہے لیکن حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی تھا کہ قرآن جس تدریج سے نازل ہو رہا ہے اسی طرح نازل ہو۔ چنانچہ آپ کو بار بار اس معاملے میں صبر و انتظار کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۱۴-۱۱۵ میں بھی آپ کو اسی طرح کی تلقین فرمائی گئی ہے وہاں ہم اس کے بعض خاص پہلوؤں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں بھی اصلاً اسی بات کا ذکر ہے لیکن موقع و محل کے تقاضے سے آپ کو یہ اطمینان بھی، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہو رہا ہے، یہاں دلا دیا گیا کہ آپ قرآن کی حفاظت و صیانت کی طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔ اس کے جمع و ترتیب، اس کو سنانے، یاد کرانے اور اس کے محتاجِ وضاحت مقامات کی وضاحت کی ذمہ داری اللہ نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ جتنا جتنا قرآن اترتا جائے اس پر آپ قناعت کریں۔ نہ اس کے اتارے جانے کے لیے کسی عجلت و اضطراب کا اظہار کریں، نہ اس کی حفاظت کے باب میں کسی تشویش میں مبتلا ہوں۔ ان باتوں کو اپنے رب پر چھوڑیں، ہر کام اپنے صحیح وقت پر، ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے مطابق ہوگا۔

'إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ' یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تشویش کو رفع فرمایا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ چونکہ ایک عظیم آسمانی خزانہ آپ کی تحویل میں دیا جا رہا تھا اس وجہ سے قدرتی طور پر اس کو اپنی امانت میں لیتے ہوئے آپ ایک ایک لفظ کو اس طرح محفوظ کرنے کی کوشش کرتے کہ کوئی حرف ضائع نہ ہونے پائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلایا کہ اس کو محفوظ کرنے اور اس کو سنانے کی ذمہ داری ہم نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔

قرآن کے جمع و ترتیب اور اس کی حفاظت کا وعدہ

لفظ 'جمع' یہاں ایک جامع لفظ ہے۔ اس سے مراد اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں محفوظ کرنا بھی ہے اور ان منتشر موتیوں کو ایک لڑی میں پرونا بھی۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر رہنمائی حاصل ہوتی رہی کہ مختلف مواقع پر نازل ہونے والی آیات کو الگ الگ سورتوں میں کس ترتیب سے آپ جمع کرائیں۔ چنانچہ اس رہنمائی کی روشنی میں آپ نے الگ الگ سورتوں میں، ان کے مواقع کی تعیین کے ساتھ، جمع کرنے کی ہدایت فرمائی اور جمع کرنے والوں نے آپ کے اس حکم کی تعمیل کی۔

اس کے علاوہ مزید اہتمام اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہر رمضان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ اتنے قرآن کا مذاکرہ فرماتے جتنا نازل ہو چکا ہوتا تاکہ کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ مبارک کے آخری رمضان میں آپ نے یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا، اسی کی طرف 'قُرْآنَهُ' کے لفظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔

'فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ' یعنی تم اپنی طرف سے قرآن کے اتارے جانے کے لیے کوئی جلدی نہ کرو۔ یہ معاملہ اپنے رب پر چھوڑ دو۔ وہ اپنی حکمت کے مطابق جتنا چاہے گا نازل فرمائے گا اور اس کی حفاظت اور اس کے جمع و ترتیب کا اہتمام بھی فرمائے گا۔ تمہاری ذمہ داری

صرف یہ ہے کہ ہم جتنا قرآن سنا چکیں اس کے سنانے کی پیروی کرو۔ اسی کو پڑھو، اسی پر عمل کرو اور اسی کی دعوت دو۔ جو لوگ پورے قرآن کو یک دفعہ نازل کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کے مطالبہ کی کوئی پروا نہ کرو۔

'ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ' اسی سلسلہ میں مزید اطمینان یہ بھی دلا دیا کہ اگر قرآن کے کسی مقام میں کسی وضاحت کی ضرورت ہو گی تو اس کے باب میں بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کی ذمہ داری بھی ہمارے اوپر ہے، جب وقت آئے گا تو یہ کام بھی ہم کر دیں گے۔ یہ اشارہ ان آیات کی طرف ہے جو کسی سابق حکم کی توضیح و تبیین یا اس کے نسخ یا تکمیل کے طور پر نازل ہوئیں۔ ان توضیحی آیات کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں اور یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ ان کے بعد بالعموم 'کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ' کے الفاظ سے قرآن نے یہ رہنمائی بھی دے دی ہے کہ یہ اسی وعدے کی تکمیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے 'اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ' کے الفاظ میں فرمایا ہے۔

استاذ امامؒ کے بعض افادات

ان آیات کے تحت استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بعض حصے بھی ہم نقل کیے دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"مفسرین کا خیال ہے کہ ان آیات میں جس عجلت کا ذکر ہے اس کا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اندیشہ تھا کہ مبادا قرآن کی کوئی بات ضائع ہو جائے۔ ہم کو اس رائے سے اختلاف نہیں ہے، لیکن اس میں تھوڑی سی تفصیل ہے جس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔"

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ محسوس فرماتے کہ یہ ایک عظیم ذمہ داری اور بہت بڑی امانت ہے جو آپ کے سپرد کی جا رہی ہے، اس میں کوئی ادنیٰ کوتاہی بھی ہوئی یا اس کا ایک حرف بھی ضائع ہوا تو آپ کو اس کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔ ساتھ ہی آپ کو یہ تمنا بھی تھی کہ اس میں اضافہ ہو، شاید آپ کی قوم اس کے کسی حصہ کی برکت سے راہ یاب ہو جائے۔ معاملہ کے یہ دونوں ہی پہلو نہایت واضح تھے چنانچہ اس سورہ میں آپ کو جو تسلی دی گئی اس میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت ہے۔"

"قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اجمالاً اور تفصیلاً دونوں طرح فرمایا ہے۔ مثلاً

وَاِنَّہٗ لَکِتٰبٌ عَزِیْزٌ ۝ لَّا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ ؕ (حٰمٓ السجدۃ - ۴۱: ۴۱-۴۲)	اور یہ کتاب عزیز ہے جس میں باطل نہ اس کے آگے سے راہ پا سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔

دوسرے مقام میں ارشاد ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝	ہم ہی نے اسی یاددہانی کو نازل کیا ہے

(الحجر - ۱۵: ۹)   اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں کسی کمی بیشی یا تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ یہ باتیں اس وعدۂ حفاظت کے منافی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اوپر کی آیتوں میں فرمایا ہے۔ چنانچہ اسی امر پر پوری امت متفق ہے کہ قرآن بالکل محفوظ ہے۔ امامیہ کے متعلق جو مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا کچھ حصہ غائب کر دیا گیا تو یہ بات ان کے اکابر علماء کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ سید مرتضیٰ، شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسی، ابو علی طبرسی صاحب مجمع البیان، محمد بن علی بن بابویہ قمی، سب نے اس بے ہودہ خیال کی، پوری شدت کے ساتھ، تردید کی ہے۔ محمد بن علی بن بابویہ قمی کہتے ہیں کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا بعینہٖ وہی قرآن ہے جو ما بین الدفتین امت کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ قرآن ایک حرف بھی اس سے زیادہ نہیں ہے۔ جو شخص ہم سے یہ منسوب کرتا ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس سے زیادہ ہونے کے قائل ہیں، وہ جھوٹا ہے۔ اس باب میں ان کے ہاں جو روایات ہیں ان کے بارے میں سید مرتضیٰ کہتے ہیں کہ امامیہ اور حشویہ میں سے جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے ان کے اختلاف کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ان کے اختلاف کا تمام تر مدار چند ضعیف روایات پر ہے جن کو یہ صحیح سمجھتے ہیں حالانکہ ان روایات کا یہ درجہ نہیں ہے کہ ان کی بنیاد پر ایک ایسی بات کا انکار کر دیا جائے جس کی صحت قطعیت سے ثابت ہے۔"

آیت زیر بحث سے مولانا علیہ الرحمۃ نے جو استنباط کیے ہیں وہ یہ ہیں:

- قرآن حضورؐ کی زندگی ہی میں جمع کر کے، ایک خاص ترتیب پر آپ کو سنا دیا گیا۔ اگر یہ وعدہ آپ کی وفات کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس قراءت کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا، جیسا کہ دیا گیا ہے: فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کرو)۔
- آپ کو حکم تھا کہ جمع قرآن کے بعد جس طرح آپ کو قرآن سنایا جاتے اسی طرح آپ اس کو پڑھیں ...... اس حکم کا لازمی تقاضا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس ترتیب کے مطابق قرآن سنایا ہو جس پر اس کی آخری قراءت ہوئی۔ اور یہ ترتیب وہی ترتیب ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔ آخری قراءت کا اصل کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہونا ضروری ہے۔
- یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس جمع و ترتیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ باتیں بھی بیان فرما دیں جو تعمیم و تخصیص یا تخفیف و تکمیل کی نوعیت کی تھیں۔"

آگے مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہ ساری باتیں قرآن مجید سے ثابت ہیں اور ان کی تصدیق روایات سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی پوری پوری سورتیں لوگوں کو سناتے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ اس خاص ترتیب پر آپ کو سنائی گئی ہوں۔ صحابہؓ اسی ترتیب پر قرآن سنتے اس کو محفوظ کرتے اور اس کی پابندی کرتے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آپ آیتوں کو مخصوص سورتوں میں، معین مقامات پر لکھواتے، اور صحابہؓ اس حکم کی تعمیل کرتے۔ پھر جب کوئی توضیحی آیت اترتی تو آپ اس کو بھی قرآن مجید میں اس کے معین مقام میں لکھواتے اور ان کے لکھوانے میں دو اصول ملحوظ رکھے جاتے: یا تو وہ ان آیات کے ساتھ ملادی جاتیں جن کی وہ تشریح کرتیں یا سورہ کے آخر میں رکھ دی جاتیں اگر ان کا تعلق سورہ کے مجموعی مضمون سے ہوتا۔

"ان توضیحی آیات کی ایک اور نمایاں علامت بھی قرآن کے تدبر سے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ خود ان آیات کے اندر ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ توضیح و تشریح کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔ مثلاً ان کے ساتھ بالعموم اس طرح کے الفاظ ہیں: 'كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ' (اس طرح اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کھول رہا ہے)۔"

اسی طرح یہ بات بھی صحیح اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے کہ آخر میں حضرت جبریلؑ نے پورا قرآن، اس کی اصلی ترتیب کے مطابق آپ کو سنایا۔ اس سے نظامِ قرآن کے باب میں بہت سے شبہات خود بخود دور ہوجاتے ہیں۔[1]"

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۙ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (۲۰-۲۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی تلقین کے بعد پھر کلام اپنے اصل سلسلہ سے جڑ گیا۔ مکذبین قیامت کو مخاطب کرکے فرمایا کہ قیامت کے بارے میں تمہارا یہ رویہ اس بنا پر نہیں ہے کہ اس کی کوئی دلیل تمہارے سامنے نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی شہادت تو خود تمہارے اپنے قلب و ضمیر کے اندر موجود ہے۔ بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ تم دنیا اور اس کی مرغوبات سے عشق رکھتے ہو اور اس نقد کو چھوڑ کر آخرت کے نسیہ کے لیے بازی کھیلنے کا حوصلہ تمہارے اندر نہیں ہے۔

'تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ' کے معنی ہیں 'آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو'۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت تم سے مخفی نہیں ہے لیکن دنیا نقد ہے اس وجہ سے اس پر فریفتہ ہو اور آخرت نقد نہیں ہے اس وجہ سے جان بوجھ کر اس کو نظر انداز کر رہے ہو۔ تکذیب قیامت کی اصل علت

---

[1] ماخوذ از تفسیر سورۂ قیامہ مؤلفہ امام فراہیؒ

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۙ
تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ؕ (۲۲-۲۵)

اصل حقیقت — یعنی دنیا کے پیچھے آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو تو کرو لیکن اس حقیقت کو نہ بھولو کہ جس کو نظر انداز کر رہے ہو وہ آ کے رہے گی اور اس دن صورت حال بالکل مختلف ہوگی۔ جنھوں نے اس کو سامنے رکھ کر زندگی گزاری ہوگی ان کے چہرے تو اس دن تر و تازہ اور شاداب ہوں گے، وہ اپنے رب کی رحمتوں کے متوقع ہوں گے اور جنھوں نے اس کو نظر انداز کر کے زندگی گزاری ہوگی ان کے چہرے اترے ہوئے ہوں گے اور وہ گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کوئی کمر توڑ دینے والی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔

یہ جنت یا دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے کے حالات کی تصویر ہے۔ متقین جنت جب دیکھیں گے کہ ہر قدم پر ملائکہ سلام و تحیت اور اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کا خیر مقدم کر رہے ہیں تو اپنے روشن مستقبل کے تصور سے ان کے چہرے کھلے ہوئے ہوں گے اور وہ متوقع ہوں گے کہ اب رب کریم کی اس کامل رحمت و عنایت کے ظہور کا وقت آ گیا جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس کفار کے ساتھ قدم قدم پر جس طرح کا معاملہ ہوگا اس سے ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی کہ اب اس کمر توڑ دینے والی مصیبت سے دوچار ہونے کا وقت آ گیا جس سے ان کو آگاہ کیا گیا لیکن انھوں نے اس کو نظر انداز کیے رکھا۔

اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کا صحیح مفہوم — 'اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ' کے معنی ہیں وہ اپنے رب کی رحمت و عنایت کے متوقع و منتظر ہوں گے۔ 'نَظَرَ' کے بعد جب 'اِلٰى' کا صلہ آتا ہے تو اس کے معنی جس طرح کسی چیز کی طرف دیکھنے کے آتے ہیں اسی طرح کسی کی رحمت و عنایت کے متوقع و منتظر ہونے کے بھی آتے ہیں۔ ماہرین لغت نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص سے، جس سے اس کو عنایت کی توقع ہو، یہ کہے کہ 'اِنَّمَا اَنْظُرُ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ اِلَيْكَ' تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اللہ کے فضل اور اس کے بعد آپ کی عنایت کے متوقع ہیں۔[1]

کلام کا سیاق و سباق بھی یہاں اسی معنی کے حق میں ہے۔ دوزخ میں جانے والوں کی ذہنی حالت و کیفیت 'تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے یعنی وہ حالات دیکھ کر یہ گمان کریں گے کہ اب ایک کمر توڑ دینے والی مصیبت ان پر ٹوٹنے والی ہے۔ اور اس گمان کے سبب سے ان کے چہروں پر بدحواسی طاری ہوگی۔ ان کے اس گمان کے مقابل میں اہل ایمان کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے رب کی سب سے بڑی عنایت کے ظہور کے متوقع ہوں گے اور اس توقع کے سبب سے ان کے چہرے کھلے ہوئے ہوں گے۔

---

[1] اقرب الموارد

'اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ' کی تالیف زمخشریؒ نے یوں بیان کی ہے 'ای یفعل بہا فعل ھو فی شدتہ فاقرۃ' (یعنی اس کو ایسی سزا ملنے والی ہے جس کی شدت کمر توڑ دینے والی ہے)۔ اگرچہ اس کے سوا بھی اس کی تالیف کی بعض صورتیں ممکن ہیں لیکن میں اس کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی بعض مثالیں آگے کی سورتوں میں آئیں گی۔

'فَاقِرَةٌ' ایسی مصیبت کو کہتے ہیں جو ریڑھ کی ہڈیوں کو توڑ دینے والی ہو۔

رویت باری کے مسئلہ میں ہمارا نقطۂ نظر

'اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ' سے بعض لوگوں نے رویت باری تعالیٰ پر استدلال کیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک، جیسا کہ اس کی تاویل اور اس کے موقع و محل سے واضح ہے، یہ آیت اس مسئلہ سے تعلق رکھنے والی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بالکل ہی دوسرے موقع و محل کی آیت ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے رویت باری تعالیٰ کی مخالفت کی ہے اور اس مخالفت کے جوش میں 'اِلٰی' کے معنی ہی بدل دیے ہیں، ان کی رائے بھی ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے۔ رویت باری تعالیٰ کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ اس دنیا میں تو ہمارا ایمان، ایمان بالغیب ہے، ہم اپنے رب کو اس کی آیات اور نشانیوں کی اوٹ ہی سے دیکھ سکتے ہیں لیکن آخرت میں ہمارا ایمان بالمشاہدہ ہوگا اور ہر حقیقت کے باب میں ہمیں حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ اس مشاہدہ کی نوعیت کیا ہوگی تو اس کی حقیقت اس دنیا میں معلوم نہیں ہو سکتی۔ یہ چیز متشابہات میں داخل ہے اور متشابہات میں تعمق جائز نہیں ہے۔ اللہ جل شانہٗ ہی جانتا ہے کہ اس مشاہدے کی نوعیت کیا ہوگی؟

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۙ وَقِيْلَ مَنْ ٜ رَاقٍ ۙ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۙ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۣ الْمَسَاقُ (۲۶-۳۰)

عیش دنیا کے متوالوں کو حسرت اور آخرت کی یاد دہانی

عیش دنیا کے متوالوں کو یہ موت کی جان کنی اور اس وقت کی مایوسی و بے بسی کی یاد دلاتی ہے کہ قیامت کو بعید از امکان نہ سمجھو۔ وہ لازماً آئے گی اور تمھیں خدا کی طرف اس دن سفر کرنا ہوگا جب تمھاری ساری جولانیاں ختم ہو جائیں گی اور بے بسی کا یہ حال ہوگا کہ پنڈلی سے پنڈلی لپٹی ہوتی ہوگی۔ بہتر ہے کہ اس سے پہلے کہ جان ہنسلی میں آ پھنسے اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ کے رہ جائے خدا کی طرف بھاگو اور اس سفر کے لیے کچھ سامان کر لو۔

فراہیؒ کے چند نکات

ان آیات کے تحت استاذ امام علیہ الرحمۃ نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح تحقیق پر مبنی ہے۔ ان کی تفسیر سے ہم اس کا ضروری خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

'بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ' میں ضمیر نفس کے لیے ہے جو یہاں محذوف ہے۔ اس حذف کی مثال سورۂ واقعہ میں بھی ہے۔ فرمایا ہے 'فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ' (الواقعۃ - ۵۶ : ۸۳) (کیوں نہیں جب کہ جان حلق کو پہنچ جاتی ہے!) اس طرح کا حذف عربی میں معروف ہے اس وجہ سے 'نفس' کا ذکر

ضروری نہیں ہوا۔ کلامِ عرب میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ حاتم طائی کہتا ہے۔

اماوی ما یغنی الثراء عن الفتی	اذا حشرجت یوما وضاق بہا الصدر

(اے ماویہ! مال آدمی کے کیا کام آئے گا جب جان سینے میں پھنسے گی)

اس میں 'حشرجت' کا فاعل نفس ہے لیکن اسی قاعدے کے مطابق جو مذکور ہوا اس کو حذف کر دیا۔ قرآن مجید میں بھی اس حذف کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً 'مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ' (فاطر - ۴۵) (اور زمین کی پشت پر کوئی جاندار جیتا نہ چھوڑتا) اس میں دیکھ لیجیے ضمیر کا مرجع 'الارض' ہے جو محذوف ہے ....

'وَقِيْلَ مَنْ سَكْتَةٌ رَاقٍ' (اور پکاریں گے، ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا!) یہ فقرہ صورتِ حال کی شدت و نزاکت کی تعبیر کے لیے ہے اور مجہول کا صیغہ یہاں غایت درجہ بلیغ ہے۔ گویا ایسا سخت وقت ہو گا کہ کوئی شخص قائل کی طرف توجہ کرنے والا نہیں ہو گا، یا یوں کہو کہ اس قول کی اہمیت خود قائل کی ذات سے بالکل بے پروا کر دے گی۔ ہر شخص کی زبان پر بس یہی کلمہ ہو گا۔ نکرہ سے پہلے 'مَنْ' یا تو شدتِ طلب کے لیے آتا ہے یا غلبۂ یاس کی تعبیر کے لیے۔ طرفہ کا شعر ہے:

اذا القوم قالوا من فتی خلت اننی	عنیت فلم اکسل ولم اتبلد

(جب قوم پکارتی ہے کہ ہے کوئی جوان! تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ ان کا اشارہ میری ہی طرف ہے، پھر میں کسی سستی اور بودے پن کا اظہار نہیں کرتا)۔

....

اب دیکھیے کہ یہاں آیت کا کیا منشا ہے اور یہ اسلوب کس مقصد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں دو تاویلوں کا احتمال ہے اور ان دونوں میں فرق محض ظاہری ہے۔

پہلی تاویل یہ ہے کہ جب موت کی بے ہوشی طاری ہو گی اور جان سینے میں گھٹنے لگے گی تو تیماردار گھبرا کر پکاریں گے کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا جو اس جاں بلب کا علاج کرے!

دوسری تاویل یہ ہے کہ وہ کہیں گے کہ بس اب معاملہ آخر ہو چکا! اب کون اس کو شفا دے سکتا ہے! یہ اظہارِ یاس کا فقرہ ہے اور یہیں کہ مریض کو یقین ہو جائے گا کہ بس اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔ مشہور شاعرہ خنساء نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

لکن سہام المنایا من یصبن لہ	لم یشفہ طب ذی طب ولا راق

(جس کو موت کے تیر ترازو ہو گئے اس کو نہ کسی طبیب کی حذاقت شفا دے سکتی نہ کسی جھاڑ پھونک

والے کی جھاڑ پھونک)

یہ دو تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ ہم نے دونوں سامنے رکھ دی ہیں۔ جو چاہو اختیار کر سکتے ہو لیکن ہمارے نزدیک دوسری تاویل نظم کلام سے زیادہ لگتی ہوئی ہے۔"

'وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ' کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"پنڈلی سے پنڈلی لپٹنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی چل نہ سکے گا۔ یہ حالت شدت ضعف و بے بسی کے سبب سے ہوگی۔ آدمی جب تک زندہ اور طاقت ور رہے ہر میدان میں جولانیاں کرتا ہے۔ جب مر جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پنڈلیاں باہم دگر لپٹ گئی ہیں۔ . . .

. . . .

ضعف و بے بسی کی تعبیر کے لیے التفاف ساق (پنڈلی کا لپٹ جانا) نہایت موزوں تعبیر ہے۔ مدعا کلام کا یہ ہے کہ جب معالج مریض سے مایوس، اعزہ و اقربا و دوست بودار زبانیں وا اعضاء قابو سے باہر ہو جائیں گے اور ایک بھاری بوجھ کے ساتھ اس کو رب کی طرف جانا ہوگا، سہارا دینے والا کوئی نہ ہوگا، تو اس وقت اس کا کیا حال ہوگا!

بعض لوگوں نے 'ساق' کے معنی 'شدت امر' کے لیے ہیں۔ لیکن یہ قول ان لوگوں کا ہے جن کو عربی زبان سے کوئی مس نہیں ہے۔ یہ لوگ اجزا اور مجموعہ کی دلالت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ بلاشبہ 'کشف عن الساق' اپنی مجموعی صورت میں سرگرمی، مستعدی اور آمادگی کے مفہوم کے لیے عربی میں معروف ہے مگر جب یہ دونوں لفظ الگ الگ آئیں گے تو 'کشف' کے معنی کھولنے اور 'ساق' کے معنی پنڈلی کے ہوں گے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ الگ الگ بھی اسی مفہوم کو ادا کریں۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ 'ساق' سے مراد دنیا کا آخری دن اور آخرت کا پہلا دن ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ روایت کرنے والوں کو کچھ وہم ہوا ہے۔ اگر روایت صحیح ہے تو اس کو بیان واقعہ سمجھنا چاہیے نہ کہ 'ساق' کی تفسیر۔

پنڈلی لپٹنے کا ٹھیک مطلب سمجھ لینے کے بعد 'اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ' (اس دن تیرے رب کی طرف چلنا ہوگا) کا حسن موقع آپ سے آپ سمجھ میں آجاتا ہے۔ گویا اس سفر کی تیاریوں میں انسان سے جو غفلت ہوتی ہے یہ اس پر اس کو سرزنش ہے کہ وہ برابر دنیا ہی کی طلب میں سرگرداں رہا یہاں تک کہ اسی تگ و دو میں اس کی تمام طاقت نچڑ گئی اور اس کو جانا ہے اپنے رب کے پاس تو وہ یہ سفر کس طرح طے کرے گا!"[1]

---

[1] ماخوذ از تفسیر سورۂ قیامہ مولانا امام فراہیؒ۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ۙ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۙ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰۤی اَهْلِهٖ یَتَمَطّٰی ؕ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی ۙ ثُمَّ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی (۳۱-۳۵)

سفرِ دشوار اور زادِ راحلہ کچھ نہیں — یہ ان مکذبینِ آخرت کی محرومی کا بیان ہے کہ سفر تو ان کو آتنا کٹھن درپیش ہے لیکن زاد و راحلہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ نہ انھوں نے خدا کی راہ میں انفاق کیا نہ نماز پڑھی دراں حالیکہ یہی دو چیزیں اس سفر میں کام آنے والی تھیں۔

'صَدَّقَ' کے بعد 'بِالْحُسْنٰی' کا لفظ بربنائے وضاحت قرینہ محذوف ہے۔ سورۂ لیل میں اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے: 'فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۙ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۙ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی' (اللیل - ۹۲: ۵-۷) (پس جس نے اپنا مال راہِ خدا میں دیا اور اپنے رب سے ڈرا اور آخرت کی جزائے حسن کی تصدیق کی تو اس کو ہم سہج راہ چلائیں گے) یہ امر واضح رہے کہ خدا کی راہ میں انفاق ان لوگوں کے لیے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے جو آخرت اور اس کی جزائے حسن کے قائل نہ ہوں۔ یہ گھاٹی وہی لوگ پار کر سکتے ہیں جن کے دل مطمئن ہوں کہ دنیا میں جو کچھ وہ خرچ کریں گے آخرت میں ایک لازوال خزانہ کی صورت میں وہ ان کو ملنے والا ہے۔ آخرت کی جزا کا اعتقاد ہی ہے جو آدمی میں انفاق کا حوصلہ پیدا کرتا ہے، جو اس کو جھٹلانے والے ہوتے ہیں ان کی مٹھی انفاق کے لیے کبھی نہیں کھلتی۔ سورۂ لیل کی مذکورہ بالا آیت کے ساتھ ہی یہ حقیقت اس طرح واضح فرمائی گئی ہے: 'وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۙ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۙ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی' (اللیل ۹۲: ۸-۱۰) (رہا وہ جس نے بخیلی کی اور بے پروا ہوا اور جزائے حسن کی تکذیب کی تو ہم اس کو ایک کٹھن راہ چلائیں گے)۔

ان آیات کی روشنی میں 'فَلَا صَدَّقَ' کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس نے نہ آخرت کی جزائے حسن کی تصدیق کی اور نہ اپنے رب کی راہ میں خرچ کیا۔ گویا اس لفظ کے اندر تکذیبِ آخرت اور بخالت دونوں کا مفہوم مضمر ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ 'وَلَا صَلّٰی' (اور نہ اس نے نماز پڑھی) گویا انفاق اور نماز دونوں کا اصل محرک جزائے اعمال کا اعتقاد ہے اور جب یہ اعتقاد ہی معدوم ہے تو ان کے وجود پذیر ہونے کا کیا امکان باقی رہا۔

یہاں وہ بات بھی یاد رکھیے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہوتی آرہی ہے کہ نماز اور انفاق ہی دین کے وہ بنیادی اعمال ہیں جن پر پوری شریعت قائم ہے۔ اب اس آیت سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ ان دونوں کا انحصار آدمی کے عقیدۂ آخرت پر ہے۔ جن کے اندر یہ عقیدہ محکم نہ ہوگا وہ ان کا اہتمام نہیں کر سکتے۔

'وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی'۔ 'كَذَّبَ' یہاں 'صَدَّقَ' کے مقابل میں اور 'تَوَلّٰی' یہاں 'صَلّٰی' کے بالمقابل ہے۔ یعنی ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ رسول اور آخرت کی تصدیق کرتا اور خدا کی راہ میں انفاق کرتا۔

اور نماز پڑھتا لیکن اس نے تکذیب اور اعراض کی روش اختیار کی۔

اعراض کی تصویر اور اس کا سبب

'ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ' یہ اس اعراض کی تصویر بھی ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں اس کا سبب بھی بیان ہوگیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر مال و اولاد کا گھمنڈ ہوتا ہے ان کو خدا اور آخرت سے ڈرایا جائے تو یہ تذکیر ان پر کارگر نہیں ہوتی۔ وہ اپنی رفاہیت و جمعیت کو اپنی روش کے صحیح اور کامیاب ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان لوگوں کی نصیحتیں خاطر میں نہیں لاتے جو ان کی روش میں کسی غلطی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ وہ ان سے اثر پذیر ہونے کے بجائے اکڑتے ہوئے اپنے اہل و عیال کی طرف چل دیتے ہیں کہ جب ہمیں یہ سب کچھ حاصل ہے تو یہ ہماری اقبال مندی کی دلیل ہوئی یا خرابی کی! خرابی ہمارے اندر نہیں بلکہ انھیں لوگوں کے دماغوں کے اندر ہے جو خود تو ہر چیز سے محروم ہیں لیکن ہمیں ڈراوے سنا رہے ہیں کہ ہم تباہی کی راہ پر چل رہے ہیں۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جو قرآن میں، مختلف اسلوبوں سے، بار بار بیان ہوئی ہے کہ اہل ایمان کی روش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے اندر برابر خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں کہ مبادا اس گلے کی نگہبانی کا حق ادا نہ ہو سکے اور وہ خدا کی کسی پکڑ میں آجائیں۔ اہل ایمان کے اس احساس ذمہ داری کا اظہار قرآن میں یوں ہوا ہے 'إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ' (الطور - ۵۲ : ۲۶) (ہم پہلے سے اپنے اہل و عیال کے باب میں ڈرتے رہے ہیں)۔ اس کے بالکل برعکس روییہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کے سینے خوف خدا سے خالی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اہل و عیال کو اپنے لیے سرمایۂ فخر و ناز سمجھتے اور ان کو اپنی اقبال مندی کی دلیل سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان کے دماغ پر وہی نشہ سوار ہوتا ہے جو سورۂ کہف میں ایک باغ والے کے قصہ میں بیان ہوا ہے کہ 'مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَدًا' (الکہف - ۱۸ : ۳۵) (میں یہ گمان نہیں رکھتا کہ یہ کبھی تباہ ہو جائے گا)۔ اسی طرح کے لوگوں کی ذہنیت سورۂ مطففین میں بدین الفاظ بیان ہوئی ہے: 'وَإِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انقَلَبُوا فَكِهِينَ' (المطففین - ۸۳ : ۳۱) (اور جب وہ اپنے اہل کی طرف لوٹتے ہیں تو مگن ہو کر لوٹتے ہیں)۔

'أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ۝ ثُمَّ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ' 'أَوْلَىٰ' لفظ 'وَيْلٌ' سے ہے جو زجر، اظہار حسرت، ملامت اور اظہار نفرت و غضب کے لیے آتا ہے۔ اس معنی میں یہ کلام عرب میں بکثرت آیا ہے۔ خنساء کا مشہور شعر ہے:

همت بنفسي كل الهموم	فأولى لنفسي أولى لها

(میں نے اپنے نفس کے بارے میں طرح طرح کے ارادے کر ڈالے، پس افسوس ہے میرے نفس پر، افسوس ہے!)

معلوم نہیں بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ سزاوار کس طرح کر دیا ہے۔ یہ عربیت کے بھی خلاف ہے اور سیاق و سباق سے بھی بے جوڑ ہے۔

اوپر سے کلام غائب کے اسلوب میں آ رہا تھا، اس آیت میں اسلوب خطاب کا آ گیا۔ اسلوب کی یہ تبدیلی افسوس اور نفرت کے اظہار میں شدت پر دلیل ہے۔ اس کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی ؕ اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَۃً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰی ۙ ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ۙ فَجَعَلَ مِنۡہُ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّکَرَ وَ الۡاُنۡثٰی ؕ اَلَیۡسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی ۔(۳۶-۴۰)

جس مضمون سے سورہ کا آغاز ہوا اسی پر خاتمہ

اب اسی مضمون پر سورہ کو ختم فرمایا ہے جس سے آغاز ہوا تھا۔ شروع میں فرمایا ہے: اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ اس کے بعد کلام انسان کی خودسری دیدہ و دانستہ حق پوشی اور ہول قیامت کے ذکر کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب آخر میں اسی سوال کو لے کر اس کا جواب دیا کہ جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر تعجب کر رہے ہیں کیا وہ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ انسان غیر مسئول چھوڑ دیا جائے گا! اگر غیر مسئول چھوڑ دیا جاتا خدا کے عدل اور اس کی حکمت کے منافی ہے تو خدا کے لیے انسان کو دوبارہ پیدا کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا؟ کیا وہ خود اپنی خلقت کے مراحل پر غور نہیں کرتے کہ انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے جو رحم میں ٹپکا دی جاتی ہے۔ 'یُّمۡنٰی' مجہول کا صیغہ عدم اعتنا و اہتمام کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ٹپکا دینے والا ایک بوند ٹپکا کر الگ ہو جاتا ہے، پھر اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ بوند کہاں اور کس حال میں ہے۔ بعد کے سارے تصرفات اس پر قدرت کرتی ہے اور تہ بہ تہ تاریکیوں کے اندر وہ اپنی صنعت گری سے اس کو مختلف مراحل سے گزارتی ہے۔ پانی کی بوند خون کی ایک پھٹکی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ پھر اس کا خاکہ تیار ہوتا ہے۔ پھر اس کے نک سک سنوارے جاتے ہیں۔ بالآخر قدرت اس کو مرد یا عورت بنا کر وجود میں لاتی ہے۔ ان تمام مراحل میں قدرت کا قلم ہی اس پر سارے تصرفات کرتا ہے۔ کسی اور کا ہاتھ اس میں شریک نہیں ہوتا۔ اب غور کرو کہ جس خدا نے اپنی قدرت، حکمت اور صنعت گری کی یہ شانیں تمہارے وجود کے اندر تمہیں مشاہدہ کرائی ہیں کیا وہ تمہارے مر جانے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کر دینے پر قادر نہیں ہو گا!

اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کی توفیق بخشی سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔

وللہ الحمد فی الدنیا والاٰخرۃ۔

رحمان آباد
۱۹ر جنوری ۱۹۷۹ء
۱۹ر صفر ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۷۶

الدّھر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ القیٰمۃ ـــــ کی توام ہے۔ سابق سورہ جس مضمون پر ختم ہوئی ہے اسی مضمون سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ اس کی آخری چار اور اس کی ابتدائی تین آیتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ دونوں نے ایک حلقۂ اتصال کی شکل اختیار کر لی ہے اور یہ چیز توام سورتوں میں بالعموم نمایاں ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

دونوں کا عمود بالکل ایک ہی ہے، البتہ نہج استدلال اور طریق بحث دونوں میں الگ الگ ہے۔ پہلی میں قیامت کی دلیل انسان کے اندر نفس لوّامہ کے وجود سے پیش کی گئی ہے اور اس میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر سمع و بصر کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اور اس کو خیر و شر کے درمیان امتیاز کی جو قابلیت بخشی ہے اس کا بدیہی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں ان لوگوں کو داد ملے جنھوں نے ان اعلیٰ صلاحیتوں کا حق پہچانا اور اپنے پروردگار کے شکرگزار رہے اور وہ لوگ اپنے اندھے پن کی سزا بھگتیں جنھوں نے ان کی ناقدری کر کے کفر کی راہ اختیار کی۔ اگر یہ جزاء و سزا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک العیاذ باللہ شاکر اور کافر دونوں برابر ہیں۔

بعض مصاحف میں اس سورہ کو مدنی ظاہر کیا گیا ہے لیکن پوری سورہ کا مدنی ہونا تو الگ رہا اس کی ایک آیت کے بھی مدنی ہونے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔ سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے اصلی کسوٹی ان کے مطالب و مضامین ہیں۔ آگے مطالب کا تجزیہ بھی آپ کے سامنے آئے گا اور آیات کی تفسیر بھی۔ ان سے واضح ہو جائے گا کہ جن لوگوں نے اس کو مدنی خیال کیا ہے ان کے خیال کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

اس سورہ میں مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۳) انسان کی خلقت سے متعلق اس بدیہی حقیقت کی طرف اشارہ کہ ایک دور اس پر ایسا گزرا ہے جب

اس کی کوئی ہستی نہیں تھی ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو عدم کی ظلمت سے نکالا اور وجود کی روشنی بخشی ۔ پھر اس کی تخلیق کا سلسلہ پانی کی ایک بوند سے جاری فرمایا ۔ اس بوند کو مختلف اطوار و مراحل سے گزارتے ہوئے وہ اس درجے تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ سننے سمجھنے والی ہستی بن جاتی ہے ۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو خیر و شر دونوں کے راستے دکھا کر اس کا امتحان کرتا ہے کہ وہ شکر کی راہ اختیار کرتا ہے یا کفر کی ۔

(۴-۲۲) خیر و شر کا امتیاز دے کر خالق نے انسان پر جو انعام فرمایا ہے اس کے لازمی تقاضے کا بیان ۔ بالاجمال ان لوگوں کے انجام بد کی طرف اشارہ جو اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے اس شرف کی ناقدری کر کے کفر کی راہ اختیار کر بیٹھے پھر اس عظیم صلہ کا بیان جس سے اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو نوازے گا جنھوں نے اس کے انعام کی قدر کی اور اپنی زندگی جزا و سزا کو پیش نظر رکھ کر گزاری ۔

(۲۳-۲۸) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کہ تم ناشکروں اور نابکاروں کے اعتراضات و مطالبات کی پروا نہ کرو ۔ جس رب نے تمھارے اوپر قرآن نازل کیا ہے اس پر بھروسہ رکھو ۔ وہ ہر مشکل آسان کرے گا ۔ حصول صبر و استقامت کے لیے نماز اور ذکر الٰہی کی تاکید اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ کفار کی اصل بیماری یہ ہے کہ یہ دنیا کے نقدِ عاجل کو آخرت کے نسیہ پر قربان کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے ۔ اس بیماری پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے وہ قیامت کے خلاف طرح طرح کے شبہات گھڑ رہے ہیں حالانکہ ان پر واضح ہے کہ تم جس چیز سے ان کو ڈرا رہے ہو وہ ایک حقیقت ہے اور ہمارے لیے یہ ذرا مشکل نہیں ہے کہ جس طرح ہم نے ان کو پہلے پیدا کیا اسی طرح ان کے جوڑ بند ٹھیک کر کے دوبارہ اٹھا کھڑا کریں ۔

(۲۹-۳۱) مخالفین کو تہدید کہ اللہ کا رسول جو آگاہی تمھیں دے رہا ہے اس سے متعلق اس کی ذمہ داری صرف لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے ۔ اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا تمھارا اپنا کام ہے ۔ رسول یاددہانی کے بعد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے گا ۔ قبول ہدایت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی ایک معین سنت ہے ۔ اس کے قبول کرنے والے تم میں سے وہی بنیں گے جو اس سنت کے تحت اس کے سزاوار ٹھہریں گے ۔ جو اس کے سزاوار نہیں ہوں گے وہ اپنے کفر پر اڑے رہیں گے اور جہنم کے ایندھن بنیں گے ۔ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کے علم اور اس کی حکمت کے تحت ہوتا ہے ۔

سُوْرَةُ الدَّهْرِ

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــــــ اٰيات : ٣١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۳۱

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا (١)
اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا
بَصِيْرًا (٢) اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (٣) اِنَّآ اَعْتَدْنَا
لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا (٤) اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ
كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا (٥) عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا
تَفْجِيْرًا (٦) يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا (٧)
وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (٨) اِنَّمَا
نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (٩)
اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا (١٠) فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ
شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا (١١) وَجَزٰىهُمْ بِمَا
صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا (١٢) مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ
فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا (١٣) وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ
قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا (١٤) وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ

تو مفض بغیر الالف فی الوصل فیھما و تقف علی الاول بالالف و علی الثانی بغیر الالف ۱۲

اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ﴿۱۵﴾ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ﴿۱۶﴾
وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ﴿۱۷﴾ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى
سَلْسَبِيْلًا ﴿۱۸﴾ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ
حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا
كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۡ وَّحُلُّوْٓا
اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ اِنَّ هٰذَا كَانَ
ع ۲۲ / ۱۹ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ
الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا
اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾ وَمِنَ الَّيْلِ
فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ
وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَا
اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ
تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ
اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾ يُّدْخِلُ
ع مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۳۱

کیا گزرا ہے انسان پر کوئی وقت، زمانے میں، ایسا جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ
تھا! ہم نے انسان کو پیدا کیا پانی کی ایک مخلوط بوند سے۔ اس کو الٹتے پلٹتے رہے
یہاں تک کہ ہم نے اس کو دیکھنے سننے والا بنا دیا۔ ہم نے اس کو راہ سجھا دی۔ چاہے وہ

شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔ ۱-۳

ہم نے کفر کرنے والوں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے ہاں، وفادار بندے ایسی شراب کے جام نوش کریں گے جس میں چشمۂ کافور کی ملونی ہوگی۔ اس چشمہ سے اللہ کے خاص بندے پئیں گے اور اس کی شاخیں نکال لیں گے جدھر جدھر چاہیں گے۔ یہ اپنی نذریں پوری کرتے اور اس دن سے ڈرتے رہے ہیں جس کا ہول ہمہ گیر ہوگا اور وہ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے رہے ہیں۔ خود اس کے حاجتمند ہوتے ہوئے، (اس جذبہ کے ساتھ کہ) ہم تمھیں صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کھلاتے ہیں، نہ تم سے کسی بدلے کے طالب ہیں نہ شکریہ کے، ہم اپنے رب کی طرف سے ایک ایسے دن سے اندیشہ ناک ہیں جو نہایت عبوس اور سخت ترش رو ہوگا۔ تو اللہ نے ان کو اس دن کی آفت سے بچایا اور ان کو تازگی اور سرور سے نوازا۔ اور انھوں نے جو صبر کیا اس کے صلہ میں ان کو جنت اور ریشمیں لباس عطا فرمایا۔ ٹیک لگائے ہوں گے اس میں تختوں پر۔ نہ اس میں گرمی کے آزار سے دوچار ہوں گے نہ سردی کے۔ باغ جنت کے سائے ان پر جھکے ہوئے اور اس کے خوشے بالکل ان کی دسترس میں ہوں گے۔ اور ان کے سامنے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے۔ شیشے چاندی کے ہوں گے۔ ان کو انھوں نے نہایت موزوں اندازوں کے ساتھ سجایا ہوگا۔ ۴-۱۶

اور وہ اس میں ایک اور شراب بھی پلائے جائیں گے جس میں ملونی چشمۂ زنجبیل کی ہوگی۔ یہ اس میں ایک چشمہ ہے جو سلسبیل سے موسوم ہے اور ان کی خدمت میں غلمان گردش میں ہوں گے جو ہمیشہ ایک ہی سن پر رہیں گے۔ جب تم ان کو دیکھو گے تو ان کو بکھرے

ہوئے موتی گمان کرو گے۔ جہاں دیکھو گے وہیں عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے۔ ان کے اوپر سندس کا سبز اور استبرق کا لباس ہوگا اور وہ چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب ان کو پاکیزہ مشروب پلائے گا۔ بے شک یہ تمھارے عمل کا صلہ ہے اور تمھاری سعی مقبول ہوئی! ۱۷-۲۲

ہم ہی نے تم پر قرآن نہایت اہتمام سے اتارا ہے تو صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکرے کی بات کا دھیان نہ کرو۔ اور صبح و شام اپنے رب کے نام کی یاد رکھو اور رات میں بھی اس کو سجدہ اور اس کی تسبیح کرو رات کے طویل حصہ میں۔ ۲۲-۲۶

یہ لوگ صرف دنیائے عاجل سے محبت رکھتے اور اپنے آگے ایک بھاری دن کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ ہم ہی نے ان کو پیدا کیا اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے اور جب ہم چاہیں گے ٹھیک انہی کے مانند بدل دیں گے۔ یہ ایک یاد دہانی ہے تو جو چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کرلے اور تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۲۷-۳۱

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَكُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡكُوۡرًا (۱)

استفہامیہ اسلوب کی بلاغتیں

'ھَلْ' کے معنی مفسرین نے استفہام کے بجائے عام طور پر 'قَدْ' کے لیے ہیں لیکن کلام عرب میں اس معنی کے لیے مجھے کوئی نظیر نہیں ملی۔ بعض مثالیں جو اس معنی کی شہادت کے طور پر پیش کی گئی ہیں ان پر میں نے غور کر لیا ہے۔ میرے نزدیک ان میں بھی 'ھَلْ' استفہام ہی کے لیے ہے۔ البتہ استفہام جس طرح ہماری زبان میں مختلف معانی کے لیے آتا ہے اسی طرح عربی میں بھی اس کے مختلف مفہوم ہوتے ہیں۔ ان سب کی وضاحت کے لیے یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ پچھلی سورتوں میں اس کے بعض پہلو زیر بحث آ چکے ہیں اور بعض کے لیے آگے کی سورتوں میں موزوں مواقع آئیں گے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ استفہام کا ایک بلیغ موقع استعمال وہ بھی ہے جب مخاطب سے کسی ایسی بات کا اقرار کرانا ہو جس کی نوعیت ہو تو ایک بدیہی حقیقت کی لیکن مخاطب اس کو تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اس سے منحرف ہو۔ مثال سے یوں سمجھیے کہ کوئی ماں اپنے ناخلف بیٹے سے یوں کہے کہ 'کیا تجھے یاد نہیں کہ تو ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں میری گود میں ڈالا گیا تھا، میں نے اپنا خون دودھ بنا کر تجھ کو پلایا اور پال پوس کر جوان کیا!'

اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ محض ایک سادہ خبریہ جملہ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر بہت سے معانی مضمر ہیں۔ مثلاً،

- اس میں بیٹے کو ایک عظیم حق کی یاد دہانی ہے جو اس پر عائد ہوتا ہے اور جس سے اس کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کا رویہ اس کے منافی ہے۔
- اس میں ملامت، غصہ، رنج اور اظہار حسرت کے بھی گوناگوں پہلو ہیں۔
- اس میں نہایت جلی بر حقیقت گلہ و شکوہ بھی ہے اور نہایت مؤثر اپیل بھی۔

یہ سارے مفہوم اس استفہام ہی سے پیدا ہوتے ہیں جو اس جملہ کے اندر ہے۔ اگر اس کو الگ کر کے جملہ کو سادہ خبریہ اسلوب میں کر دیجیے تو یہ تمام معانی ہوا ہو جائیں گے۔ بالکل یہی حال زیر بحث آیت کا بھی ہے۔ اس میں جو 'ھَلْ' ہے اس کے اندر بہت سے معانی مضمر ہیں جو آگے مضمون کے تدریجی ارتقا سے کھلیں گے۔ اگر اس کو آپ 'قَدْ' سے بدل دیں تو یہ آیت ان مطالب کی تمہید کے لیے بالکل ناموزوں ہو جائے گی جو آگے آ رہے ہیں۔

معلقات کے ایک قصیدے کا مطلع ہے:

ھل غادر الشعراء من متردم　　　　ام ھل عرفت الدار بعد توھم

(کیا شاعروں نے شاعری میں کوئی خلا چھوڑ دیا تھا یا تجسس کے بعد تم نے منزل جاناں کا سراغ پا لیا ہے!)

یہ ایک بہترین مطلع ہے اور اس کا سارا حسن اس کے خاص قسم کے استفہامیہ اسلوب میں مضمر ہے۔ اگر اس 'ھَلْ' کو 'قَدْ' سے بدل دیجیے تو یہ حسن بالکل غائب ہو جائے گا۔ شاعر خود اپنے آپ کو مخاطب کر کے پوچھ رہا ہے کہ آج یہ قصیدہ کہنے کا

دلولہ دل میں کیوں ابھرا ہے؟ کیا شاعری میں خلا رہ گیا تھا جس کو آج بھر دینے کا ارادہ ہے یا منزلِ جاناں کے آثار نے آتشِ عشق بھڑکا دی ہے جس کا حق ادا کرنا ہے! مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں ہیں۔ شاعری میں بھی ایک بہت بڑا خلا رہ گیا تھا جس کو اس قصیدے سے پورا کرنا ہے اور منزلِ جاناں کے سراغ کا مضمون بھی اب تک کے شاعروں کی ساری خوش نشاتیوں اور مضمون آفرینیوں کے باوجود ہنوز تشنہ ہی تھا، آج اس کا بھی حق ادا کر دینا ہے۔

یہاں اس مطلع کے محاسن کی وضاحت مقصود نہیں ہے، دکھانا صرف یہ ہے کہ اسلوب اور اسلوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ باعتبار وزن تو یہ شعر لفظ 'قد' سے بھی پورا ہو جاتا لیکن معنی کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہ جاتی۔

آیت زیرِ بحث کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو قیامت اور جزا و سزا کے منکر تھے۔ ان کو مخاطب کر کے قرآن نے یہ سوال ان کے سامنے رکھا ہے کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایک وقت انسان پر ایسا بھی گزرا ہے جب اس کا وجود کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا بلکہ وہ پانی، کیچڑ، مٹی کے اندر رینگنے والی ایک حقیر مخلوق تھا۔ لیکن اسی حقیر مخلوق کو قدرت نے مختلف مراحل سے گزارا اور اس کی صلاحیتوں کو تربیت دے کر ایسے مرتبہ پر پہنچا دیا کہ وہ تمام مخلوقات سے اعلیٰ و اشرف بن گیا! اس سوال سے مقصود انسان کی قوتِ فکر کو حرکت میں لانا ہے کہ وہ سوچے کہ آخر قدرت نے اس پر یہ اہتمام کیوں صرف فرمایا، اس کو ان اعلیٰ صلاحیتوں سے کیوں نوازا؟ کیا محض اس لیے کہ وہ کھائے پیے اور ایک دن ختم ہو جائے! کیا ان صلاحیتوں سے متعلق اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ کیا جس نے اس اہتمام سے اس کو وجود بخشا اس کا کوئی حق اس پر قائم نہیں ہوتا؟ یہ سوالات ہر اس شخص کے اندر پیدا ہونے چاہئیں جو اپنے وجود پر غور کرے۔

اپنا وجود انسان سے سب سے زیادہ قریب بھی ہے اور اس کی ہر چیز انسان کو دعوتِ فکر بھی دیتی ہے۔ آیت کے استفہامیہ اسلوب نے اس حسِ فکر کو بیدار کرنا چاہا ہے کہ انسان کی نظر سے اگر خدا اوجھل ہے تو اس کا اپنا وجود تو اوجھل نہیں ہے، وہ خود اپنے اندر خدا کی قدرت و حکمت اور اس کے عدل و رحمت کی نشانیاں دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ غور کرے تو یہ حقیقت بھی اس پر روشن ہو جائے گی کہ ہر چند اس نے قیامت ابھی دیکھی نہیں لیکن خود اس کے نفس کے اندر قیامت کے شواہد اور اس کے دلائل اتنے واضح ہیں کہ وہ ان کا انکار نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ بالکل ہٹ دھرم اور کج رو نہ ہو۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (۲)

انسان کو مزید غور کی دعوت

اوپر کی آیت میں انسان کے اس تاریک ماضی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو زندگی کے نقطۂ آغاز سے تعلق رکھتا ہے۔ اب یہ اس کی پیدائش کے ان مختلف اطوار کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن کا ہر پہلو

اس کے سامنے ہے اور جو اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس کی طرف اوپر والی آیت اشارہ کر رہی ہے کہ انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے، اسی بوند کو مختلف اطوار و مراحل سے گزار کر قدرت اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ سننے سمجھنے اور عقل و ہوش رکھنے والے انسان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ انسان غور کرے کہ جس خدا نے پانی کی ایک بوند پر اتنے عجیب کرشمے دکھائے ہیں کیا اس کے لیے اس کو دوبارہ پیدا کرنا مشکل ہو جائے گا اور پھر اس بات پر بھی غور کرے کہ جس خدائے علیم و حکیم نے پانی کے ایک حقیر قطرے کو سمع و بصر کی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا اور اس کو خیر و شر اور شکر و کفر میں امتیاز بخشا، کیا اس نے یہ ایک کارِ عبث کیا ہے کہ وہ باز پرس اور جزا و سزا کا کوئی دن نہیں لائے گا۔

مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ' میں لفظ 'امشاج' جمع ہے 'مشج' اور 'مشیج' کی۔ اس کے معنی ملی جلی اور مخلوط چیز کے ہیں۔ 'امشاج' اگرچہ جمع ہے لیکن یہ ان الفاظ میں سے ہے جو جمع ہوتے کے باوصف مفرد الفاظ کی صفت کے طور پر آتے ہیں۔ نطفہ کے مخلوط ہونے سے اس کا مختلف قوٰی و عناصر سے مرکب ہونا بھی مراد ہو سکتا ہے اور مرد و عورت کے نطفوں کا امتزاج بھی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جہاں مختلف عناصر اور متضاد طبائع اور مزاجوں کا امتزاج ہو وہاں ان کے اندر ایسا اعتدال و توازن برقرار رکھنا کہ پیشِ نظر مقصد کے مطابق صالح نتیجہ برآمد ہو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ یہ کام ایک حکیم و قدیر کی نگرانی میں ہو۔ کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر اس طرح کے حکیمانہ کام کا وقوع ممکن نہیں ہے۔

لفظ 'ابتلاء' کا مفہوم

'نَّبْتَلِيْهِ' کو عام طور پر لوگوں نے بیانِ علت کے مفہوم میں لیا ہے۔ یعنی ہم نے انسان کو آزمانے کے لیے پیدا کیا۔ لیکن یہ علت کے مفہوم میں ہوتا تو اس پر لامِ علت آنا تھا حالانکہ یہ حال کی صورت میں ہے اور حال کا مفہوم علت کے مفہوم سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حال ہی کے مفہوم میں ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم نے انسان کو اس طرح پیدا کیا کہ درجہ بدرجہ اس کو مختلف اطوار و مراحل سے گزارتے ہوئے ایک سمیع و بصیر مخلوق کے درجے تک پہنچا دیا۔

'ابتلاء' کے معنی لغت میں جانچنے پرکھنے کے ہیں۔ آدمی جب کسی چیز کو جانچتا ہے تو اس کو مختلف پہلوؤں سے الٹ پلٹ اور ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے۔ یہیں سے اس کے اندر ایک طور سے گزار کر دوسرے طور میں لے جانے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ یہاں یہ لفظ اسی معنی میں ہے۔ اصحابِ تاویل میں سے بھی بعض لوگوں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

انسان کی خلقت کے مختلف مراحل

انسان کی تخلیق جن اطوار و مراحل سے گزر کر مرتبۂ تکمیل تک پہنچی ہے ان کی وضاحت قرآن میں جگہ جگہ ہوئی ہے۔ ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا	اے لوگو، اگر تم مرنے کے بعد اٹھائے جانے کے باب میں شک میں ہو تو اس بات پر غور کرو کہ ہم

خَلَقْنَٰكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ (الحج ۲۲: ۵)

نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر پانی کی ایک بوند سے پھر خون کی ایک پھٹکی سے پھر گوشت کی ایک بوٹی سے، کوئی تام اور کوئی ناتمام تاکہ ہم تم پر اپنی قدرت و حکمت اچھی طرح ظاہر کردیں۔ پھر ہم رحموں میں ٹھہراتے ہیں جتنا چاہتے ہیں ایک مدت معین تک پھر ہم تم کو بچے کی صورت میں باہر لاتے ہیں پھر ہم تم کو پروان چڑھاتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔

انہی اطوار و مراحل کی تفصیل سورۂ مومنون میں یوں آئی ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝

(المؤمنون ۲۳: ۱۲-۱۴)

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا مٹی کے جوہر سے پھر ہم نے اس کو رکھا پانی کی ایک بوند کی صورت میں ایک محفوظ ٹھکانے میں۔ پھر ہم نے پانی کی اس بوند کو خون کی پھٹکی کی شکل دی پھر خون کی پھٹکی کو مضغۂ گوشت بنایا پھر گوشت میں ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا پھر اس کو ایک بالکل ہی دوسری مخلوق کی صورت میں کھڑا کر دیا۔ پس بڑی ہی بابرکت ذات ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والے کی۔

ان آیات میں جن اطوار و مراحل کی تفصیل ہے انہی کی طرف بالا اجمال آیت زیر بحث میں اشارہ فرمایا ہے اور انہی مراحل سے درجہ بدرجہ گزارنے کے لیے لفظ 'نَّبْتَلِيهِ' آیا ہے جس سے یہ بات نکلی کہ اس قطرے کو گہر ہونے تک بہت سے مرحلے طے کرنے پڑے ہیں اور ہر مرحلہ میں قدرت نے اس کو اچھی طرح جانچا پرکھا ہے کہ جس دور میں جو صلاحیت اس کے اندر پیدا ہونی چاہیے وہ پیدا ہوگئی یا نہیں!

'فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا' یہ اس تمام اہتمام و تدبر کا خلاصہ سامنے رکھا ہے کہ یا تو انسان پانی، مٹی کیچڑ اور نطفہ کی شکل میں بالکل 'لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا' (ناقابل ذکر چیز) کا مصداق تھا یا وہ دور آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سمیع و بصیر کی اعلیٰ صفات سے متصف ہستی بنا دیا۔ سورۂ مومنون کی محولہ بالا آیت میں اسی چیز کی طرف 'ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔

'سَمِيعًا بَصِيرًا' انسان کی تمام اعلیٰ صفات کی نہایت جامع تعبیر ہے۔ انہی صفات کے فیض سے انسان کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ٹھہرا کہ اللہ تعالیٰ اس کا امتحان کرے کہ وہ خیر کی راہ اختیار کر کے اپنے رب کا شکرگزار بندہ بنتا ہے یا شر کی راہ اختیار کر کے ناشکرا اور کافرِ نعمت بن جاتا ہے۔ پھر اس سے لازماً یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جو اپنے سمع و بصر کی صلاحیتوں کی قدر کریں وہ اس کا صلہ پائیں اور جو ان کی ناقدری کریں وہ اس کی سزا بھگتیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس سارے اہتمام کا مقصد کیا جو انسان کی پیدائش کے لیے قدرت نے کیا!

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (۳)

سمع و بصر کا ثمرہ

یہ انسان کو سمیع و بصیر بنانے کا ثمرہ بیان ہوا ہے کہ پھر ہم نے اس کو راہ سجھا دی۔ 'راہ سجھانے' سے مراد یہ ہے کہ اس کو نیکی اور بدی کی راہ سجھا دی، جیسا کہ دوسرے مقام میں فرمایا ہے: 'وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ' (البلد ۹۰: ۱۰) (اور ہم نے اس کو دونوں راہیں سجھا دیں) سورۂ شمس میں فرمایا ہے: 'فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا' (الشمس ۹۱: ۸) (پس اس کو اس کی بدی اور پرہیزگاری الہام کر دی) ان دونوں راہوں کے سجھا دیے جانے کے سبب سے انسان خود اپنے اوپر خیر اور شر کا گواہ بن گیا اور اس کے پاس بدی کی راہ اختیار کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا۔ اس حقیقت کی طرف سابق سورہ میں یوں اشارہ فرمایا ہے: 'بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ' (القیامۃ ۷۵: ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان اپنے اوپر خود گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

اختیار کی نعمت

'إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا' یہ انسان کے اختیار و ارادہ کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نیکی و بدی کا امتیاز دے کر اس کو اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو نیکی کی راہ اختیار کرے، چاہے تو بدی کی راہ چلے۔ اگر نیکی کی راہ اختیار کرے گا تو وہ اپنے رب کا شکرگزار بندہ بنے گا اور اس کا انعام پائے گا اور اگر بدی کی راہ اپنائے گا تو وہ ناشکرا بنے گا اور اس کی سزا بھگتے گا۔

إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلَ وَأَغْلَالًا وَسَعِيرًا (۴)

خیر اور شر میں امتیاز کا لازمی نتیجہ

یہ خیر اور شر میں امتیاز بخشے جانے کا لازمی نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو شکر و کفر دونوں کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت بخشی ہے تو ضروری ہے کہ وہ ان لوگوں کو انعام سے نوازے جو شکرگزاری کی راہ اختیار کریں اور ان لوگوں کو سزا دے جو کفر کی راہ چلیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس صلاحیت کا دیا جانا لاحاصل رہا درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، اس کی شانِ حکمت سے یہ بعید ہے کہ وہ کوئی عبث کام کرے۔

کافروں کو سزا

فرمایا کہ چونکہ ہم نے انسان کو شکر اور کفر کا امتیاز بخشا ہے اس وجہ سے ہمارے ہاں شاکر اور کافر دونوں یکساں نہیں ہوں گے بلکہ ہم ان کے ساتھ الگ الگ معاملہ کریں گے۔ ناشکروں کے لیے ہم نے 'زنجیریں'

طوق اور بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ان کے پاؤں میں زنجیریں پہنائی جائیں گی، گردنوں میں آہنی طوق ڈالے جائیں گے اور پھر ان کو گھسیٹ کر جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِن كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۝ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا (۵-۶)

شکرگزاروں کا انعام

یہ کافروں کے مقابل میں شاکر بندوں کے صلہ کا بیان ہوا ہے اور ان کو 'ابرار' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس لفظ کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ 'بِرّ' کی اصل روح ایفائے عہد و ذمہ ہے اور لفظ 'شکر' کی اصل حیثیت نعمت کے حق کو پہچاننا اور اس کو ادا کرنا ہے۔ ان دونوں میں واضح قدرِ مشترک موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو بندے اس کی نعمتوں کا حق پہچانتے اور اس کو ادا کرتے ہیں وہی در اصل اس کے وفادار بندے ہیں۔

لفظ 'کَاْس' کی تحقیق بھی اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہ ظرف اور مظروف یعنی شراب اور جامِ شراب دونوں معنوں میں آتا ہے۔

'مِزَاج' کے معنی ملونی کے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں میں بعض اوقات لذت، خوشبو یا ان کے مزاج میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے بعض چیزیں ان کے استعمال کے وقت ملائی جاتی ہیں۔ شراب میں بھی اس طرح کی ملونیوں اور بعض دوسرے لوازم کا ذکر عرب شعراء کرتے ہیں۔ اہلِ جنت کی شراب میں یہ ملونی چشمۂ کافور کے آبِ زلال کی ہوگی۔

'کَافُوْر' سے مراد یہاں معروف کافور نہیں ہے۔ قرآن نے خود وضاحت فرما دی ہے کہ یہ جنت کا ایک چشمہ ہے جس کے کنارے بیٹھ کر اللہ کے خاص بندے شراب نوش کریں گے اور اس چشمہ کے پانی کی ملونی سے اس کے کیف و سرور کو دوچند کریں گے۔ رہا یہ سوال کہ اس کا نام کافور کیوں رکھا گیا ہے تو ناموں سے متعلق اس طرح کا سوال اگرچہ پیدا نہیں ہوتا تاہم ذہن اس طرف جاتا ضرور ہے کہ اسم اور مسمّیٰ میں کوئی مناسبت ہوگی۔ یہ مناسبت کس نوع کی ہے؟ اس کا تعلق متشابہات سے ہے۔ اس کی اصل حقیقت اسی دن اور انھیں خاص بندوں پر کھلے گی جن کو اس سے بہرہ مند ہونے کی سعادت حاصل ہوگی۔

لبِ جُو مے نوشی کا اہتمام

'يَشْرَبُ بِهَا' میں 'ب' میرے نزدیک ظرفیہ ہے جس طرح 'يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ' اور 'يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ' میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چشمہ اللہ کے خاص بندوں کی بزمِ مے نوشی کے لیے مخصوص ہوگا۔ 'عِبَادُ اللّٰهِ' سے مراد وہی ابرار ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا۔ انہی کو یہ خاص شرف حاصل ہوگا کہ ان کی مے نوشی کے لیے اللہ تعالیٰ ایک مخصوص چشمہ کا بھی اہتمام فرمائے گا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مے نوشی اور لبِ جُو میں بڑی مناسبت ہے۔

"یُفَجِّرُوْنَہَا تَفْجِیْرًا"۔ 'تَفْجِیْرٌ' کے معنی کسی چشمہ کی بہت سی شاخیں نکال نکال کر ان کے جال بچھا دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس چشمہ پر پہنچنے کے لیے اہلِ جنت کو کوئی شدِ رحال نہیں کرنا پڑے گا بلکہ جو جہاں چاہے گا اس کی شاخیں نکال لے گا اور اس کی لذتوں اور اس کی سیر سے بغیر کسی زحمتِ سفر کے خوش وقت اور شادکام ہوگا۔

یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا (۷)

ابرار کے وہ اعمال جن کے صلہ میں ان کو یہ سرفرازی حاصل ہوگی

یہ ان کے وہ اوصاف و اعمال بیان ہو رہے ہیں جن کے سبب سے ان کو رب کریم کی طرف سے یہ سرفرازی بخشی جائے گی۔

کوئی نیک کام کرنے کا عہد کر لینے کو 'نذر' کہتے ہیں۔ ان وفادار بندوں (ابرار) کے اوصاف میں اس لحاظ سے نذر کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ جو لوگ ان نذروں کے پورے کرنے کا بھی اہتمام رکھیں گے جو انھوں نے بطور خود اپنے اوپر واجب کی ہوں ان سے ان نیکیوں کے بدرجۂ اولیٰ اہتمام کی توقع ہے جو ان کے رب نے ان پر واجب ٹھہرائی ہیں۔ ہمارے مفسرین نے اس لفظ کے مفہوم کو وسیع کر کے تمام نیکیوں پر حاوی کر دیا ہے، خواہ بندے نے اپنے اوپر وہ از خود عائد کی ہوں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔ لیکن یہ اس لفظ کے حقیقی مفہوم سے تجاوز ہے۔

اسلام سے پہلے نذر کی اہمیت

یہاں یہ امر یاد رکھیے کہ 'نذر' کی اہمیت سابق ادیان میں بھی بہت رہی ہے اور عرب جاہلیت میں بھی اس کا بڑا اہتمام تھا۔ جو لوگ کوئی نیکی کا کام کرنا چاہتے، خواہ وہ حج و عمرہ کے قسم کی ہو یا قربانی و انفاق کے نوع کی، وہ اس کی نذر مانتے اور اہتمام سے اپنی نذر پوری کرتے۔ عربوں کے لئے نذر اس کی وجہ زیادہ تر ان کی امیت تھی۔ دین کے طریقے ان کو واضح طور پر معلوم نہیں تھے اس وجہ سے ان کے اندر کے نیک لوگ نذروں کے ذریعہ سے اس خلا کو بھرتے۔ اسلام کے آجانے کے بعد جب شریعت کے تمام اصول و فروع لوگوں کو معلوم ہو گئے تو اس کا دائرہ محدود ہو گیا۔ وہ نذریں جو مشرکانہ نوعیت کی تھیں وہ تو بالکل ہی ختم کر دی گئیں۔ جو نذریں تکلیف مالایطاق نوعیت کی تھیں وہ بھی یا تو متروک قرار پا گئیں یا ان کی اصلاح کر دی گئی۔ یہ سورہ چونکہ اس دور کی ہے جب شریعت کے احکام و آداب لوگوں کو تفصیل سے معلوم نہیں ہوئے تھے اس وجہ سے اس میں اس کا ذکر خاص اہمیت سے ہوا۔ بعد میں جب شریعت کا پورا میثاق نازل ہو گیا تو اس کا دائرہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نہایت محدود ہو گیا۔

خوفِ آخرت

"وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا"۔ 'مُسْتَطِیْرٌ' کے معنی عام اور ہمہ گیر کے ہیں۔ یہ ان کے اندیشۂ آخرت کا بیان ہے کہ وہ ہمیشہ اس دن کی پکڑ سے ڈرتے رہتے ہیں جس کی آفت عام و ہمہ گیر ہوگی۔ یعنی اس دن بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب، راعی اور رعایا یہاں تک کہ عابد اور معبود سب کو اس کے

ہول سے سابقہ پیش آئے گا۔ صرف وہی لوگ اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (۸)

غریبوں کی خدمت

یہ خلق کے ساتھ ان کے رویہ کا بیان ہے کہ وہ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کی ضرورتیں، خود اپنی ضرورتیں نظر انداز کر کے پوری کرتے ہیں۔ لفظ 'طَعَام' محدود معنی میں نہیں ہے۔ زندگی کی دوسری ناگزیر ضروریات کا اہتمام بھی اس میں شامل ہے۔ قرآن میں یہ لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

'عَلٰی حُبِّہٖ' میں ضمیر کا مرجع

'عَلٰی حُبِّہٖ' میں ضمیر کا مرجع عام طور پر لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو مانا ہے۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ وہ مسکینوں اور یتیموں کو اللہ کی محبت میں کھلاتے پہناتے ہیں۔ اگرچہ قاعدۂ زبان کی رو سے اس میں کوئی خرابی نہیں ہے لیکن شواہد قرآن کے پہلو سے میں ان لوگوں کے قول کو ترجیح دیتا ہوں جو اس کا مرجع 'طعام' کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوتے ہیں لیکن وہ اپنی ضرورت پر مسکینوں اور یتیموں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس قول کو ترجیح دینے کے مختلف وجوہ ہیں:

ایک وجہ یہ ہے کہ یہ ابرار کا کردار بیان ہو رہا ہے اور 'بِر' یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی وفاداری کا مقام حاصل کرنے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں وہ چیز خرچ کرے جو اس کو خود عزیز ہو، خواہ اس وجہ سے عزیز ہو کہ وہ بذاتِ خود قیمتی ہے یا اس وجہ سے کہ وہ اس کا ضرورت مند ہے چنانچہ فرمایا ہے 'لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ' (آل عمران - ۳ : ۹۲) (تم اللہ کی وفاداری کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک تم ان چیزوں میں سے اللہ کی راہ میں نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو)۔ یہی حقیقت دوسرے لفظوں میں یوں واضح فرمائی گئی ہے: 'وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ' (الحشر: ۵۹ : ۹) (اور وہ اپنے اوپر غریبوں اور مسکینوں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوں)۔

• دوسری وجہ یہ ہے کہ ان ابرار کا صلہ آگے آیت ۱۲ میں بدیں الفاظ بیان ہوا ہے، 'وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا' (اور ان کو اللہ نے ان کے صبر کے صلہ میں جنت اور حریر سے نوازا)۔ یہاں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان کے صبر کے کردار کو واضح کرنے والی واحد چیز یہی ہے کہ وہ یتیموں اور مسکینوں کو خود ضرورت مند ہونے کے باوجود کھلاتے پہناتے رہے ہیں۔ اگر 'عَلٰی حُبِّہٖ' کی تاویل اس سے مختلف کر دی جائے تو یہاں ان کے صبر کے کردار کو واضح کرنے والی کوئی چیز نہیں رہ جاتی حالانکہ کلام اس کا مقتضی ہے۔ اس وضاحت نے 'عَلٰی حُبِّہٖ' کے ضمیر کا مرجع خود متعین کر دیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جو انفاق عزیز و مطلوب مال میں سے، خود اپنی ضرورت کو قربان کر کے ہوتا ہے، درحقیقت وہی اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہوتا ہے۔ اس پہلو سے خدا کی محبت کا مضمون خود اس کے

اندر پیدا ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں مسکین و یتیم کے ساتھ اسیر کا ذکر زمانۂ نزول کے حالات کے اعتبار سے ہوا ہے۔ اس زمانہ میں کسی جرم یا مطالبہ میں گرفتار قیدی عموماً اپنی حاجات لوگوں سے سوال کر کے پوری کرتے تھے۔ قاضی ابو یوسفؒ کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عباسیوں کے زمانے تک یہی حال رہا ہے۔ اب جیل کے نظام میں بڑی تبدیلیاں ہو گئی ہیں اس وجہ سے اس انفاق کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی لیکن اب بھی قیدیوں اور ان کے متعلقین کی امداد کی ایسی بہت سی صورتیں ہیں جن میں انفاق اسی حکم میں ہوگا۔

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا (۹-۱۰)

انفاق صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے

یہ ان کے اس انفاق کے باطنی محرک کا بیان ہے کہ وہ جس کی مدد کرتے ہیں نہ اس سے اپنے اس انفاق کا کوئی معاوضہ چاہتے نہ اس بات کے خواہشمند ہوتے کہ وہ ان کا ممنونِ احسان اور شکر گزار ہو بلکہ وہ صرف اپنے رب کی رضا جوئی اور آخرت کے خوف سے ایسا کرتے تھے۔

یوم آخرت کی صفت یہاں 'عَبُوس' اور 'قَمْطَرِیر' آئی ہے۔ 'عبوس' کے معنی ترش رو اور روکھے پھیکے کے ہیں۔ 'قمطریر' اسی مضمون کی شدت کے اظہار کے لیے بطور تاکید آیا ہے یعنی وہ دن ایسا اکھڑ، اکل کھرا اور ترش مزاج ہوگا کہ اس میں کوئی بھی کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں بنے گا۔ اس دن سابقہ ہر ایک کو اپنے اعمال سے پیش آئے گا۔ خدا کی رحمت صرف انہی لوگوں کی طرف متوجہ ہوگی جنھوں نے اس کی رضا جوئی میں مسکینوں اور یتیموں کی سرپرستی اور ہمدردی کی ہوگی اور اپنی ضروریات نظر انداز کر کے ان کی احتیاج پوری کرنے پر اپنا مال صرف کیا ہوگا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ بات وہ قولاً ہر اس شخص سے کہیں بھی جس کی مدد کریں بلکہ یہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ان کے انفاق کے باطنی محرک کی تعبیر ہے کہ وہ جن حاجتمندوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں صرف للہ فی اللہ خرچ کرتے، اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور آخرت کے خوف کے سوا کوئی اور غرض ان کے سامنے نہیں ہوتی۔

فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا (۱۱)

یہ ان کا صلہ بیان ہوا کہ چونکہ وہ اس 'عبوس' اور 'قمطریر' دن سے اندیشہ ناک رہے اور اس کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنا محبوب مال انھوں نے خرچ کیا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو اس کی آفتوں سے محفوظ رکھے گا اور اس دن جب سب کے چہرے اترے ہوئے ہوں گے ان کے چہرے ہشاش بشاش اور مسرور ہوں گے۔

وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا (۱۲)

صبر کی صفت کا صلہ — اور چونکہ انھوں نے صبر کیا اس وجہ سے ان کو جنت اور حریر کا صلہ عطا ہوگا۔ 'بِمَا صَبَرُوْا' سے اشارہ ان کے اس صبر کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر 'وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ خود بھوکے ہوتے ہوئے اپنے آگے کی رکابی دوسرے بھوکے کے آگے وہی سرکائے گا جس کے اندر صبر کی صفت ہوگی۔

'جَنَّةً' ان کو اس لیے ملے گی کہ اس کے پھل کھائیں اور اس کے عیش دوام سے بہرہ مند ہوں اور 'حَرِيْرًا' اس لیے کہ اس کے لباس پہنیں۔ مکان، غذا اور لباس تینوں چیزیں اس کے اندر آگئیں۔

مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا (۱۳)

'شمس' اور 'زَمْهَرِيْر' نہ دیکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگ گرمی اور سردی دونوں کی اذیتوں سے بالکل محفوظ جنت کے تختوں پر براجمان ہوں گے۔ ان کے سورج میں روشنی اور قوت بخشی تو ہوگی مگر اس میں حدت و تمازت نہ ہوگی۔ اسی طرح وہاں کا موسم ہمیشہ خوش گوار، معتدل اور پربہار رہے گا، خزاں کی نحوست اور بادِ زمہریر کے آزار سے ان کو کبھی سابقہ نہیں پیش آئے گا۔

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا (۱۴)

یعنی ان کے باغوں کے سائے بالکل ان کے سروں پر پھیلے ہوئے ہوں گے اور پھلوں کے خوشے اس طرح لٹک رہے ہوں گے کہ بالکل ان کی دسترس کے اندر ہوں گے۔ کسی چیز کے حاصل کرنے کے لیے ان کو کوئی کاوش نہیں کرنی پڑے گی۔

وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۟ قَوَارِيْرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا (۱۵-۱۶)

یعنی ان کے سامنے ہر وقت چاندی کے ظروف اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے اور یہ شیشہ بھی دیکھنے میں شیشہ ہوگا، حقیقت میں یہ بھی چاندی ہی کے جوہر سے بنا ہوگا۔

لفظ 'تقدیر' کا مفہوم — 'قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا' یعنی یہ ظروف اور پیالے مختلف شکلوں، مختلف پیمانوں اور الگ الگ اندازوں کے بنے ہوں گے اور خدام نے ان کو نہایت قرینہ اور حسنِ سلیقہ سے الگ الگ خانوں میں سجا کر رکھا ہوگا تاکہ حالات، وقت، ضرورت اور مطلوب شے کی مناسبت سے جس قسم کے سیٹ کی ضرورت ہو، پیش کر سکیں۔ لفظ 'تقدیر' ان تمام معانی پر حاوی ہے۔ اردو میں مجھے کوئی لفظ ایسا نہ مل سکا جو ان تمام کا احاطہ کر سکے۔

وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۚ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا (۱۷-۱۸)

'زنجبیل' اور 'سلسبیل' — اوپر چشمۂ کافور کا ذکر ہوا۔ یہ ایک دوسرے چشمہ کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ اس میں ایک اور شراب بھی ان کو پلائی جائے گی جس میں چشمۂ زنجبیل کی ملونی ہوگی۔ یہ بھی جنت کے چشموں میں سے ایک چشمہ

ہے جس کا دوسرا نام 'سلسبیل' ہے۔ ناموں سے متعلق ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ ان میں لغوی مفہوم کا اعتبار نہیں ہوتا۔ زنجبیل کے مشہور معنی تو سونٹھ کے ہیں لیکن نام بادنیٰ مناسبت بھی رکھے جاتے ہیں۔ جنت اور دوزخ کی کتنی ہی چیزوں کے نام قرآن میں مذکور ہیں لیکن ان ناموں سے ان کے مسمّٰی کی حقیقت کا صحیح علم ممکن نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہ بہت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ناموں سے آگاہ کر دیا۔ ان شاء اللہ ایک دن ان کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی۔ اس چشمہ کا دوسرا نام 'سلسبیل' ہے۔ زجاج کے نزدیک اس کے معنی رواں دواں کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نام بھی محض اس کی روانی کی مناسبت سے رکھا گیا ہے جو اس کے گوناگوں اوصاف میں سے صرف ایک ہے۔

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۚ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا (۱۹)

غلمان اور ان کے اوصاف

یہ ان کی خدمت اور ان کے آگے جام پیش کرنے والے غلمان کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ یہ غلمان ہمیشہ ایک ہی سن و سال کے رہیں گے۔ مُخَلَّد کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ اس وصف کے ذکر سے مقصود دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ ایک اس بات کی طرف کہ نوخیز چھوکرے ہوں گے اس وجہ سے خدمت میں نہایت چاک و چوبند، چست اور سرگرم ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ ہمیشہ ایک ہی سن و سال کے رہیں گے جس سے ان کی مستعدی بھی برابر قائم رہے گی اور اپنے مخدوموں کی خدمت میں برابر رہنے کے سبب سے ان کے مزاج، عادت اور ذوق سے بھی اچھی طرح آشنا ہوں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ حسنِ خدمت میں تجربہ کو بڑا دخل ہے۔ بوڑھے خادم میں تجربہ ہوتا ہے لیکن اس کی مستعدی ختم ہو جاتی ہے۔ نئے خادم میں مستعدی ہو سکتی ہے لیکن تجربہ اور ذوق سے ناآشنائی کے سبب سے آقا کو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اہل جنت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے خدام مہیا کیے ہیں جن کی ہر خوبی دائمی ہو گی۔

'إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا'۔ یہ ان کے جمال، ان کی لطافت، ان کی خوش ادائی اور ان کی خوش لباسی کی تصویر ہے کہ جب تم ان کو دیکھو گے تو یہ گمان کرو گے کہ گویا ہر طرف موتی بکھرے ہوئے ہیں۔

وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا (۲۰)

یعنی جب دیکھو گے اور جہاں دیکھو گے وہیں ایک عظیم نعمت اور ایک عظیم بادشاہی کا جلوہ نظر آئے گا۔ گویا ہر قدم پر ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ ۖ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا (۲۱)

اہلِ جنت کا لباس

'عَالِیَ' میرے نزدیک حال کے محل میں ہے اور مراد اس سے اہلِ جنت کے بالائی کپڑے — عبا اور قبا وغیرہ — ہیں۔

ان کے بالائی جامے سبز سندس اور استبرق کے ہوں گے۔ سندس اور استبرق ایران کے بنے ہوئے مشہور ریشمی کپڑوں کے نام تھے۔ بعض لوگوں نے ان دونوں کے درمیان باریک اور دبیز کا فرق کیا ہے لیکن یہ تحقیق غیر ضروری ہے۔ یہاں مراد جنت کے سندس اور استبرق ہیں جن کی اصل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اہلِ عرب، ایران اور مصر ہی کے تمدن سے اس زمانہ میں زیادہ آشنا تھے اس وجہ سے جنت کی نعمتوں کی تمثیل کے لیے زیادہ تر انہی کی تمدنی چیزوں کے نام مستعار لیے گئے۔ اس دور کے سلاطین سندس اور استبرق کی عبائیں زیبِ تن کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جن کے اوپر کے جامے سندس اور استبرق کے ہوں گے ان کے زیریں جامے اور بھی نرم و نازک ہوں گے۔ یہاں اہلِ جنت کے بالائی لباس کا تصور دے کر بات ختم کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے قیاس کر لو کہ اور وہ کیا کچھ پہنیں گے۔

اہلِ جنت کے ذوق کا لحاظ

'وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ' اس زمانے کے سلاطین سونے اور چاندی کے کنگن بھی پہنتے تھے۔ فرمایا کہ ان کو چاندی کے کنگن بھی پہنائے جائیں گے۔ یہاں چاندی کے کنگنوں کا ذکر ہے۔ سورۂ کہف میں سونے کے کنگنوں کا ذکر ہے: 'یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّیَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ' (۳۱) (وہ اس میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سندس کے سبز لباس)۔ بعینہٖ یہی بات سورۂ حج آیت ۲۳ اور سورۂ فاطر آیت ۳۳ میں فرمائی گئی ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ تنوع کے اظہار کے لیے ہے کہ اہلِ جنت جب چاہیں گے سونے کے کنگن پہنیں گے اور جن کا جی چاہے گا چاندی کے پہنیں گے۔ تنوع پسندی اور اختلافِ مذاق ایک فطری چیز ہے جنت میں ہر شخص کے ذوق اور اس کے انتخاب کا پورا لحاظ ہوگا۔ 'لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ فِیْهَا وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ' (قٓ - ۵۰ : ۳۵) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

مفسرین نے عام طور پر یہی توجیہ کی ہے لیکن میرا ذہن ایک اور طرف بھی جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اہلِ جنت کے مراتب میں، جیسا کہ سورۂ واقعہ میں تفصیل سے آپ پڑھ چکے ہیں، فرق ہوگا۔ ایک گروہ سابقون اوّلون اور مقربین کا ہوگا۔ دوسرا طبقہ اصحابِ یمین کا۔ ان دونوں طبقوں کی جنتوں اور نعمتوں میں فرق ایک قدرتی امر ہے۔ قرآن نے اس فرق کو واضح بھی کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس فرق کی بنا پر قرآن نے کہیں سونے کا ذکر کیا اور کہیں چاندی کا۔

ایک خاص نکتہ

'وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا' اس ٹکڑے میں بھی ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ اوپر آیت ۵ میں ارشاد ہے: 'اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا' (اللہ کے وفادار

بندے ایک ایسی شراب میں سے پئیں گے جس میں چشمۂ کافور کی ملونی ہو گی) اس کے بعد آیت ۱۷ میں فرمایا: 'وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا' (اور وہ اس میں ایک ایسا جام پلائے جائیں گے جس میں چشمۂ زنجبیل کی ملونی ہو گی) اور یہاں ارشاد ہوا کہ 'وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا' (اور ان کا پروردگار ان کو ایک شراب طہور پلائے گا۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے آسانی سے اس فرق کو سمجھ سکتے ہیں جو ان تینوں اسلوبوں ـــــ 'يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ'، 'يُسْقَوْنَ كَأْسًا'، 'سَقَاهُمْ رَبُّهُمْ' ـــــ میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فرق کیوں ہے؟ میرے نزدیک یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ ابرار درجہ بدرجہ قرب الٰہی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جائیں گے کہ خود ربِّ کریم ان کو شراب طہور کا جام پلائے گا! یہ شرابِ طہور کیا ہے؟ اس کا تصور اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا اس وجہ سے اس کے لیے قرآن نے کوئی اس طرح کا تمثیلی اسلوب اختیار نہیں کیا جس طرح کا اسلوب اوپر چشمۂ کافور اور چشمۂ زنجبیل کے لیے اختیار فرمایا۔ اس کو صرف ربِ کریم ہی جانتا ہے۔ کبھی کبھی میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ اس مشک بُو، مہر بند شرابِ خالص کی طرف اشارہ ہے جو مقربین کے لیے خاص ہے اور جس کا ذکر سورۂ مطففین میں نہایت اہتمام سے بدیں الفاظ ہوا ہے:

يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ ۝	اور وہ مہر بند شراب خالص کے جام پلائے
خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۚ وَفِي ذٰلِكَ	جائیں گے۔ اس کی مہر مشک کی ہو گی اور یہ
فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝	ہے ایسی چیز کہ اس کی طلب میں طالبین
وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيمٍ ۝	باہم دگر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے
عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا	کی کوشش کریں اور اس میں ملونی چشمۂ تسنیم
الْمُقَرَّبُونَ ۝	کی ہو گی۔ یہ ایک چشمہ ہے جس پر مقربین خاص
(المطففین ۸۳ : ۲۵-۲۸)	سے نوشی کریں گے۔

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا (۲۲)

ربِ کریم کی طرف سے داد

یعنی یہ سب کچھ پاکر پروردگار کی طرف سے ان کو یہ داد بھی ملے گی کہ یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کا صلہ ہے، اللہ کے نزدیک تمہاری سعی مقبول ٹھہری! اس کے لیے تمہیں کسی دوسرے کی سعی و سفارش کا ممنونِ احسان نہیں ہونا پڑا۔ اس میں ان لوگوں پر ایک تعریض بھی ہے جو اپنے مزعومہ دیوتاؤں کی سفارشوں کے بل پر جزا اور سزا سے غافل رہے حالانکہ وقت پر ان میں سے کوئی بھی ان کے کام نہ آئے گا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ۚ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ

مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (۲۳-۲۴)

نبی صلعم کو صبر اور انتظار کی تلقین

جس محل میں سورۂ قیامہ میں آیت 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ' (۱۶) آئی ہے بعینہٖ اسی محل میں، اور اسی مقصد سے اس سورہ میں یہ آیت ہے۔ یعنی منکرین اور مومنین کا انجام بیان کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر اور انتظار کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ ان لوگوں کے سامنے وہ سب کچھ آکے رہے گا جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا ہے۔

'اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا' یعنی یہ قرآن نہ تم نے اپنے جی سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے اور نہ اس کو تم نے ہم سے مانگ کر اپنے اوپر نازل کرایا ہے کہ اس کی پیش کردہ صداقتوں اور حقیقتوں کو ثابت کرنے اور لوگوں کو ان کے دکھا دینے کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہو بلکہ یہ ہم ہیں جنھوں نے نہایت اہتمام سے اس کو تمہارے اوپر نازل کیا ہے۔ 'اِنَّا نَحْنُ' کے الفاظ میں جس زور اور جس عظمت و جلالت کا اظہار ہے اس پر نظر رہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے یہ قرآن تم پر اتارا ہے تو لوگوں کی مخالفتوں اور ان کی نازخرےیوں کی پروا تم کیوں کرو! ان سے نمٹنے کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور ہم سب سے نمٹ لینے کے لیے تنہا کافی ہیں۔

لفظ 'تَنْزِيْل' جس اہتمام کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ قرآن نہ تو کسی سائل کی درخواست ہے اور نہ یہ کوئی ہوائی بات ہے کہ ان لوگوں کی مخالفت سے یہ ہوا میں اڑ جائے بلکہ یہ نہایت اہتمام سے اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب ہے جس کی ہر بات پوری ہو کے رہے گی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

'فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا' 'فَاصْبِرْ' کے بعد 'ل' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ انتظار کے مضمون پر متضمن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ کتاب تم نے مانگ کر اپنے اوپر نہیں اتروائی ہے تو لوگوں کے اعتراضات و مطالبات سے تم کیوں پریشان ہو۔ تمہارے اوپر بلاغ کی ذمہ داری ہے وہ ادا کرتے رہو اور رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ ان نابکاروں اور ناہنجاروں کی ذرا پروا نہ کرو جو مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کو وہ عذاب دکھا دیا جائے جس سے قرآن ان کو ڈرا رہا ہے۔ لفظ 'اطاعت' یہاں پروا کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ آیت 'كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ' (العلق-۹۶-۱۹) میں بھی یہ اسی معنی میں آیا ہے۔

آثم اور کفور کی تحقیق

'اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا'۔ اوپر آیت ۳ میں 'شَاكِرًا' اور 'كَفُوْرًا' کے الفاظ گزر چکے ہیں۔ وہاں فرمایا ہے کہ 'اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا' (ہم نے انسان کو راہ دکھا دی ہے، چاہے وہ شکرگزار بنے یا ناشکرا)۔

یہاں 'شاکر' کے ضد کی حیثیت سے لفظ 'آثم' آیا ہے۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہ لفظ حقوق تلف کرنے والے کے لیے آتا ہے۔ حقوق دو طرح کے ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حقوق العباد تلف کرنے والوں کے لیے معروف لفظ 'آثم' ہے اور حقوق اللہ نہ ادا کرنے والے کے لیے معروف 'کفور' ہے۔ اگرچہ یہ دونوں صفتیں لازم و ملزوم سی ہیں، جو حقوق العباد کا منکر ہو گا وہ حقوق اللہ ادا کرنے والا بھی نہیں بن سکتا، تاہم اشخاص کے رجحانات و میلانات کے اعتبار سے یہ بیماری ان کے اندر دو مختلف شکلوں میں نمایاں ہوتی ہے۔ بعض کے اندر خسّت، بخالت اور طمعِ مال، قساوتِ قلب پیدا کر دیتی ہے جو ان کو نیکی کا دشمن بنا دیتی ہے۔ بعض کے اندر انانیت، خود پرستی اور استکبار پیدا ہو جاتا ہے جو ان کو حق کے آگے جھکنے نہیں دیتا۔ قریش کے اندر ان دونوں کرداروں کے نمونہ علی الترتیب ابولہب اور ابوجہل تھے۔ ان دونوں طرح کے کرداروں کو سامنے رکھ کر یہاں 'وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ تمہارے مخالفوں میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ یا تو وہ طمعِ دنیا کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اس وجہ سے تمہارے دشمن ہیں یا ان کے سروں پر انانیت کا بھوت سوار ہے جو ان کو حق کے آگے جھکنے نہیں دے رہا ہے اور یہ دونوں ہی قسم کے لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی باتوں کو کوئی اہمیت دی جائے۔ ان کا مرض لاعلاج ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا (۲۵-۲۶)

صبر کا نسخہ

اوپر جس صبر کی تلقین فرمائی ہے یہ اس کا نسخہ بتایا ہے کہ صبح و شام اپنے رب کے نام کو یاد رکھو۔ صبح و شام احاطۂ وقت کے مفہوم میں بھی بولے جاتے ہیں اور لفظ 'ذکر' یہاں عام ہے جو نماز اور ذکرِ دوام دونوں پر شامل ہے۔ 'وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا' کے الفاظ سے تہجد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ خاص طور پر سورۂ مزمل کی تفسیر میں اس کے تمام اطراف زیرِ بحث آئے ہیں۔

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا (۲۷)

مخالفین کی اصل بیماری

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے آپ کے مخالفین کی اصل بیماری کا پتہ دیا ہے کہ یہ لوگ تمہارے انذار پر جو شبہات وارد کر رہے ہیں یہ محض اصل حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے ان کی سخن سازی ہے۔ ان کی اصل بیماری یہ ہے کہ اس دنیا کی لذتِ عاجل کے پرستار ہیں۔ آخرت کی خاطر وہ اس نقد کو چھوڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، خواہ آخرت کا دن کتنا ہی کٹھن کیوں نہ ہو۔ اپنی اسی دنیا پرستی کو چھپائے رکھنے کے لیے وہ قیامت پر بعض بناوٹی قسم کے شبہات کا اظہار کرتے ہیں تاکہ دوسروں کو یہ تاثر دے سکیں کہ یہ لوگ تمہاری بات جو نہیں مان رہے ہیں تو اس کا سبب محض ضد اور انانیت نہیں بلکہ اس کے کچھ وجوہ ہیں۔

نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا (۲۸)

یہ ان مخالفین کے لیے دھمکی بھی ہے اور اس میں قیامت پر ان کے سب سے بڑے شبہ کا جواب بھی ہے۔

ان کا سب سے بڑا شبہ، جو قرآن میں بار بار نقل ہوا ہے، یہی تھا کہ مرنے اور مٹی میں رل مل جانے کے بعد یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ دوبارہ اٹھائے جائیں! فرمایا کہ ہم ہی نے ان کو پیدا کیا اور ہم نے ہی ان کے جوڑ بند اور رگ پٹھے مضبوط کیے تو جب ہم ہی نے یہ سب کچھ کیا ہے اور اس سے وہ انکار نہیں کر سکتے تو ہم جب چاہیں گے پھر ان کے رگ پٹھے از سر نو مضبوط کر کے ان کو اٹھا کھڑا کریں گے۔ جب پہلی بار ہم کو اس کام میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو وہی کام ہمارے لیے دوبارہ کیوں مشکل ہو جائے گا۔

'شَدَّ اَسْرًا' کے معنی ہڈیوں اور اعصاب کو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے جوڑنے کے ہیں۔ 'بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ' میں جس مثلیت کی طرف اشارہ ہے اس سے مراد یہی جوڑ بند از سر نو درست کرنے میں مثلیت ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۲۹)

آگاہی اور اعلان بے نیازی — یہ ان لوگوں سے اظہار بے نیازی ہے کہ یہ آگاہی جو سنائی جا رہی ہے محض ان لوگوں کی خیر خواہی کے لیے سنائی جا رہی ہے۔ اس میں نہ اللہ کا کوئی نفع ہے اور نہ رسول کی کوئی ذاتی غرض اس میں مضمر ہے۔ جس کا جی چاہے اس کو قبول کر کے اپنے رب کی راہ اختیار کرے ورنہ اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہے جس سے یہ کتاب آگاہ کر رہی ہے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۳۰-۳۱)

توفیق ایمان کے باب میں سنت الٰہی — یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے توفیق ایمان کے باب میں مقرر کر رکھی ہے اور جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ وہ ہدایت کی توفیق انہی کو بخشتا ہے جو اپنے سمع و بصر سے کام لیتے اور خیر و شر، حق و باطل کے درمیان امتیاز کی اس صلاحیت کی قدر کرتے ہیں جو اس نے ان کے اندر ودیعت فرمائی ہے اور جس کی طرف آیات ۲-۳ میں اشارہ فرمایا ہے۔ رہے وہ لوگ جو اپنی یہ صلاحیتیں ضائع کر کے اندھے بہرے بن جاتے ہیں تو ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے لیے خدا نے جہنم تیار کر رکھی ہے اور اس جہنم میں وہ اس وجہ سے پڑیں گے کہ انھوں نے اپنے اوپر خود ظلم کر کے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنایا۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔ وہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی احسانہ۔

رحمان آباد

۱۳- فروری ۱۳۷۹ء

۱۵- ربیع الاول ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

٧٧

المرسلٰت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ اپنے عمود، تمہید اور طرزِ استدلال کے اعتبار سے چھٹے گروپ کی سورۂ ذاریات سے اور اپنے اسلوبِ بیان اور مزاج میں سورۂ رحمان سے مشابہ ہے۔ سورۂ ذاریات میں بطریق قسم، ہواؤں کے عجائبِ تصرفات سے عذاب اور قیامت پر استدلال کیا گیا ہے اور عمود اس کا اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝ ہے۔ اسی طرح اس سورہ میں بھی ہواؤں کے عجائبِ تصرفات کی بطور شہادت قسم کھا کر فرمایا ہے کہ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ[1] (بے شک جس چیز کی تمھیں وعید سنائی جا رہی ہے وہ ایک امر شدنی ہے)۔

مزاج اور اسلوبِ کلام میں سورۂ رحمان سے اس کی مشابہت یوں ہے کہ جس طرح وہ ترجیع والی سورتوں میں سے ہے، آیت فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ اس میں بار بار آئی ہے، اسی طرح اس سورہ میں آیت وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ[2] دس بار آئی ہے۔ ترجیع والی سورتوں کے باب میں، یہ اصولی حقیقت سورۂ رحمان کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ ان میں خطاب بالعموم ان ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں سے ہے جو ایک واضح حقیقت کو محض مکابرت اور انانیت کی بنا پر، جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے کان اور آنکھیں کھولنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ متکلم صرف اپنے دلائل بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ہر دلیل کے بعد بطور تنبیہ ان کے جرم اور انجام سے ان کو آگاہ بھی کرتا رہے۔ مخاطب کے اس مزاج کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے تو جس طرح مریض کے مزاج سے ناواقف معالج کی دوا بے اثر رہ جاتی ہے اسی طرح مخاطب کے مزاج سے ناآشنا متکلم کا کلام بھی بے اثر ہو کے رہ جاتا ہے۔ مخاطبوں کے مزاج کا اختلاف ایک امر فطری ہے اس وجہ سے اس کا لحاظ بلاغتِ کلام کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ جو لوگ اس نکتہ سے ناآشنا ہیں وہ قرآن کی اس نوع کی ترجیعات کو تکرار پر محمول کرتے ہیں حالانکہ کلام کے

---

[1] جس عذاب کی تمھیں وعید سنائی جا رہی ہے وہ سچی ہے اور جزاء و سزا ایک امر شدنی ہے۔

[2] تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی۔

اداشناس جانتے ہیں کہ قرآن میں ہر ترجیع اپنے محل میں انگشتری پر نگینہ کا حسن رکھتی ہے۔

سابق سورہ سے اس کے تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ اس میں استدلال کی اصل بنیاد نفسِ انسانی کی شہادت پر ہے۔ فطرت کے اندر خیر و شر کے درمیان امتیاز کی جو صلاحیت ودیعت ہے اس کی اساس پر جزا و سزا کو ثابت کر کے ایک روزِ جزا سے ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو اس بدیہی حقیقت کو جھٹلائیں اور ان لوگوں کو بشارت دی گئی ہے جو اپنے باطن کی گواہی قبول کریں اور اپنی زندگیاں اس کے تقاضوں کے مطابق سنواریں۔ اس سورہ میں اصل استدلال آفاق کے آثار و شواہد سے ہے۔ کسی انفسی دلیل کا حوالہ ہے تو محض اشارۃً۔ گویا نوعیت استدلال دونوں میں الگ الگ ہے، موضوع کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ مزاج میں یہ فرق بالکل واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ سابق میں بشارت کا پہلو نمایاں ہے اور اس میں انذار کا۔ اس کی سب سے بڑی شہادت اس کی ترجیع سے ملتی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۷) ہواؤں کے عجائب تصرفات کی شہادت اس بات پر کہ لوگوں کو جس عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت سے ڈرایا جا رہا ہے وہ کوئی اَن ہونی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب چاہا اپنی ہواؤں اور بادلوں ہی کے ذریعہ سے پچھلی قوموں کو یہ کرشمہ دکھایا ہے اور جب چاہے گا قریش کو بھی یہ کرشمہ دکھا دے گا۔ اگر وہ سلامتی چاہتے ہیں تو خدا کی رحمت اور نقمت کے جو آثار ان کے آگے پیچھے موجود ہیں ان سے سبق حاصل کریں۔ خود اپنے لیے اس کو دعوت دینے کی جسارت نہ کریں۔

(۸-۱۵) ہولِ قیامت کی اجمالی تصویر جس میں یہ دکھایا ہے کہ اس آسمان و زمین کی بڑی سے بڑی چیز بھی غیر فانی اور اٹل نہ سمجھو، نہ کوئی شے بذاتِ خود قائم ہے نہ خود مختار ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم اور اسی کے اذن سے حرکت و عمل کرتی ہے۔ ایک دن آئے گا کہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کے سارے نظام کو درہم برہم کر دے گا۔ اسی دن رسولوں اور ان کی قوموں کے مقدمے کی روبکاری ہے۔ یہ دن بڑا ہی اہم دن ہو گا۔ اسی دن فیصلہ ہو گا کہ رسولوں نے لوگوں کو کیا بتایا اور ان کی قوموں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس دن ان لوگوں کی تباہی ہے جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔

(۱۶-۱۹) قریش کے سامنے تاریخِ ماضی کا درس سوالیہ صورت میں کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے اگلی قوموں کو ہلاک کیا اور بعد میں آنے والی قوموں میں سے بھی جنھوں نے ان کی روش بد کی تقلید

کی۔ ہم نے ان کو بھی انہی کے پیچھے چلتا کیا؛ اگر یہ واقعہ ہے اور اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو آخر آج کے مجرموں کے معاملے میں ہماری یہ سنتِ متواتر کیوں بدل جائے گی۔

(۲۰-۲۴) انسان کے وجود اور اس کی خلقت کے مراحل سے اللہ تعالیٰ کی قدرت، ربوبیت اور اس کی حکمت کی طرف اشارہ جس سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انسان کا اپنا وجود شاہد ہے کہ اس کے خالق کے لیے اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ایسا ضرور ہو گا اور اس دن ان لوگوں کی خرابی ہے جو اس کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں۔

(۲۵-۲۸) جو جیتے ہیں اور جو مرتے ہیں وہ خدا ہی کی پیدا کی ہوئی زمین پر جیتے اور مرتے ہیں۔ اسی کے اندر خدا نے ان کی پرورش کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔ نہ خدا کے احاطۂ قدرت سے کوئی باہر ہے نہ اس کی پرورش سے کوئی مستغنی۔ یہ صورتِ حال شہادت دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو ضرور جمع کرے گا۔ اس دن ان لوگوں کے لیے خرابی ہے جنھوں نے اس کی قدرت و ربوبیت کی شان نہیں پہچانی اور دنیا کی سرمستیوں میں کھوئے روزِ جزا و سزا کو جھٹلاتے رہے ہے۔

(۲۹-۳۴) اس عذاب کی تصویر جس سے ان مکذبین کو آخرت میں سابقہ پیش آنا ہے۔

(۳۵-۴۰) مکذبین کی بے بسی و بے کسی کی تصویر۔

(۴۱-۴۵) اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کی بامرادی کی تصویر۔

(۴۶-۵۰) قریش کے استکبار پر ان کو دھمکی اور ان کے ایمان سے مایوسی کا اظہار۔

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــــــــ اٰیات: ۵۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱-۵۰ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ
نَشْرًا ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِیٰتِ ذِكْرًا ﴿۵﴾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴿۶﴾
اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ﴿۸﴾ وَاِذَا السَّمَآءُ
فُرِجَتْ ﴿۹﴾ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ﴿۱۰﴾ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ﴿۱۱﴾
لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ ﴿۱۲﴾ لِیَوْمِ الْفَصْلِ ﴿۱۳﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ ﴿۱۴﴾
وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۱۵﴾ اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ
الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۸﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۱۹﴾
اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ﴿۲۱﴾ اِلٰى
قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحْیَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾
وَّجَعَلْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَیْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾
وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾
اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ

اللَّهَبِ ﴿٣١﴾ إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿٣٢﴾ كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ ﴿٣٣﴾
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٣٤﴾ هَٰذَا يَوْمُ لَا يَنطِقُونَ ﴿٣٥﴾ وَلَا
يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ﴿٣٦﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٣٧﴾ هَٰذَا
يَوْمُ الْفَصْلِ ۖ جَمَعْنَاكُمْ وَالْأَوَّلِينَ ﴿٣٨﴾ فَإِن كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ
ع ۱ فَكِيدُونِ ﴿٣٩﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٠﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ
فِي ظِلَالٍ وَعُيُونٍ ﴿٤١﴾ وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُونَ ﴿٤٢﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا
هَنِيئًا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿٤٤﴾
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٥﴾ كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُم
مُّجْرِمُونَ ﴿٤٦﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٧﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ
ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ ﴿٤٨﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٩﴾ فَبِأَيِّ
ع ۲ ۱۰ ۲۲ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٠﴾

ترجمۂ آیات ۱-۵۰

شاہد ہیں ہوائیں جن کی باگ چھوڑ دی جاتی ہے پس وہ اڑاتی ہیں غبار اندھا دھند اور شاہد ہیں ہوائیں پھیلانے والی (بادلوں کو)۔ پھر وہ معاملہ کرتی ہیں جدا جدا۔ پھر ڈالتی ہیں یاددہانی اتمام حجت کے طور پر یا آگاہ کر دینے کو۔ بے شک جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ شدنی ہے۔ ۱-۷

پس جب کہ ستارے بے نشان کر دیے جائیں گے، آسمان پھٹ جائے گا، پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے اور رسولوں کے لیے وقت مقرر ہو گا ـــ کس دن کے لیے وہ ٹالے گئے ہیں! ـــ فیصلہ کے دن کے لیے! اور تم کیا سمجھے کیا ہے فیصلہ

کا دن! تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی! ۸ - ۱۵

کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر ان کے پیچھے پچھلوں کو نہیں لگاتے رہے ہیں؟ ہم مجرموں کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں۔ ہلاکی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے! ۱۶ - ۱۹

کیا ہم نے تم کو ایک حقیر پانی سے نہیں پیدا کیا؟ پس ہم نے اس کو رکھا ایک محفوظ مقام میں۔ ایک معین مدت تک۔ پس ہم نے اس کو ٹھہرایا اور ہم کیا ہی خوب ٹھہرانے والے ہیں! خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی! ۲۰ - ۲۴

کیا ہم نے زمین کو سمیٹ رکھنے والی نہیں بنایا زندوں اور مردوں کو؟ اور گاڑے اس میں پہاڑ اونچے اونچے اور پلایا تم کو پانی خوشگوار؟ ـــــ ہلاکی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے! ۲۵ - ۲۸

چلو اس کی طرف جس کو جھٹلاتے رہے ہو۔ چلو تین شاخوں والے سایہ کی طرف۔ جس میں نہ چھاؤں ہے نہ شعلوں کی لپیٹ سے بچاؤ۔ وہ آگ اونچے محلوں کی طرح شعلے پھینکتی ہوگی ـــــ زرد اونٹوں کی مانند ـــــ اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے! ۲۹ - ۳۴

وہ دن منہ سے بات نکالنے کا نہ ہوگا اور نہ ان کو اجازت ہوگی کہ کوئی عذر پیش کر سکیں۔ اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے! ۳۵ - ۳۷

یہ ہے فیصلہ کا دن۔ ہم نے تم کو بھی اور اگلوں کو بھی جمع کر لیا۔ تو تمہارے پاس کوئی داؤ ہے تو وہ ہم سے کر دیکھو۔ اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے! ۳۸ - ۴۰

بے شک اللہ سے ڈرنے والے سایوں، چشموں اور اپنی چاہت کے میووں کے عیش میں ہوں گے۔ کھاؤ پیو راس آتا اپنے اعمال کے صلہ میں۔ ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیتے ہیں۔ اس دن ہلاکی ہے جھٹلانے والوں کے لیے! ۴۱-۴۵

تم بھی کچھ دن کھا برت لو، تم تو ہو گنہگار۔ اس دن تباہی ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۴۶-۴۷

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اپنے رب کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔ اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے۔ ۴۸-۴۹

اب اس کے بعد وہ بھلا کس چیز پر ایمان لائیں گے!! ۵۰

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا (۱)

عذاب کے شدنی ہونے پر شہادت

'مُرْسَلٰتٌ' کے معنی چھوڑی ہوئی کے ہیں۔ یہ لفظ یہاں ہواؤں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس سے ملائکہ کو بھی مراد لیا ہے لیکن بعد کی صفات، جیسا کہ واضح ہوگا، اس سے ابا کرتی ہیں۔ اس خیال کی بنیاد صرف اس غلط فہمی پر ہے کہ یہاں 'وَ' قسم کے لیے ہے اور عام خیال کے مطابق قسم کسی مقدس چیز کی ہونی چاہیے اس وجہ سے انھوں نے 'مُرْسَلٰتٌ' سے فرشتوں کو مراد لیا۔ لیکن ہم جگہ جگہ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ قرآن میں قسمیں بیشتر شہادت یعنی دعوے پر دلیل کی نوعیت کی ہیں۔ یہ قسم بھی اسی نوع کی ہے جس طرح سورۂ ذاریات میں ہواؤں کی قسم عذاب اور جزا و سزا کے حق ہونے پر کھائی گئی ہے اسی طرح یہ قسم بھی وعدۂ عذاب و قیامت کے شدنی ہونے پر کھائی گئی ہے۔

لفظ 'عُرْفٌ' گھوڑے کی ایال کے بالوں کے لیے آتا ہے جو پیشانی پر لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس معنی کے لیے یہ ایک معروف لفظ ہے۔ امرؤ القیس کا مشہور شعر ہے:

نمش باعراف الجیاد اکفنا اذا نحن قمنا عن شواء مضھب

(جب ہم شکار کا کچا پکا گوشت کھا کر اٹھتے تو گھوڑوں کی ایال میں اپنے ہاتھ پونچھ لیتے)

گھوڑوں کی ایال پکڑ کر ان کو روکا بھی جا سکتا ہے اور اس کو چھوڑ کر ان کو جولانی کے لیے چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ آیت میں ہواؤں کو گھوڑوں سے اور ان کے آزاد کرنے کو ان کی ایال چھوڑ دینے سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ تعبیر نہایت بلیغ ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ہوائیں نہ خود کار ہیں نہ خود مختار بلکہ ان کی پیشانی خدا کی مٹھی میں ہے۔ جب وہ چاہتا ہے ان کو روک لیتا ہے اور جب چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے۔ فرمایا ہے: 'مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا' (ھود - ۱۱ : ۵۶) (نہیں ہے کوئی جاندار مگر وہ اس کی پیشانی کے بال کو پکڑے ہوئے ہے)۔

فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا (۲)

'عَصْفٌ' کے معنی تگٹٹ اور اندھا دھند چلنے کے ہیں۔ فرمایا ہے: 'حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ' (یونس - ۱۰ : ۲۱) (یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ ان کو لے کر چلتی ہیں موافق ہوا کے ساتھ اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں دفعۃً نمودار ہو جاتی ہے بادِ تند اور ان کو گھیر لیتی ہیں موجیں ہر جانب سے)۔

یہاں ہواؤں کا دوسرا مرحلہ بیان ہوا ہے کہ چھوڑے جانے کے بعد وہ بگٹٹ ہو کر اندھا دھند چلنے لگتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو تند ہو کر بالآخر طوفان اور عذاب بن جاتی ہیں اور قوم کی قوم کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ان کے عجائب تصرفات کی تاریخ قرآن میں تفصیل سے بیان ہو چکی ہے اور آج بھی ان کی تباہ کاریوں کے تجربات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا (۳)

ابرِ رحمت والی ہوائیں

'نَشْر' کے معنی پھیلانے، چھینٹنے، ابھارنے، اگانے کے ہیں۔ یہ لفظ ان تمام معانی میں، قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو ابرِ رحمت لاتی ہیں۔ اس لیے کہ ان میں 'نشر' کے مختلف پہلو موجود ہیں۔ یہ بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر ان کو فضا میں پھیلاتی ہیں، پھر اپنے رب کی رحمت کو چھینٹتی اور نباتات اگا کر زمین کو سرسبز و شاداب بناتی ہیں۔ فرمایا ہے: 'وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ' (الشوریٰ ۴۲: ۲۸) (اور وہی ہے جو نازل کرتا ہے بارش بعد اس کے کہ لوگ اس سے مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور پھیلاتا ہے اپنی رحمت)۔

اوپر کی قسم تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، طوفانی ہواؤں کی ہے اور یہ قسم ابرِ رحمت والی ہواؤں کی ہے جن پر زندگی کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔

یہاں زبان کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ 'عٰصِفٰت' کو 'مُرْسَلٰت' پر 'ف' کے ساتھ عطف کر کے اس کی تدریجی ترقی کو واضح کر دیا۔ اس کے برخلاف اس آیت میں حرفِ عطف 'و' آیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سابق کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک مستقل وصف ہے۔

فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا (۴)

ہوائیں خود مختار نہیں بلکہ مسخر ہیں

یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ ذاریات میں 'فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے یعنی یہ ہوائیں فرق و امتیاز کرتی ہیں۔ کبھی بادلوں کو ہانک کر لاتی ہیں، کبھی ان کو اڑا کر لے جاتی ہیں۔ ایک علاقہ کو جل تھل کر دیتی ہیں، دوسرے کو تشنہ چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ خود کار یا خود مختار نہیں بلکہ ایک بالاتر قوت کے تابع فرمان ہیں۔ یہ فرق و امتیاز چونکہ 'نشر' کے ذریعہ سے اور اس کے بعد نمایاں ہوتا ہے اس وجہ سے عطف 'ف' کے ذریعہ سے ہوا۔

فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا (۵)

ہواؤں کی یاد دہانی

یعنی بارش کے ساتھ ساتھ یہ لوگوں پر یاد دہانی بھی اتارتی ہیں۔

بارش جن باتوں کی تذکیر کرتی ہے وہ قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہیں اور ان کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں چند نمایاں پہلو ذہن میں تازہ کر لیجیے۔

- یہ آسمان و زمین میں توافق کے پہلو سے توحید اور اللہ ہی کی شکرگزاری کی یاد دہانی کرتی ہے۔
- اس کے اندر خدا کی ربوبیت کی جو شان ہے وہ خدا کے آگے مسئولیت کی یاد دہانی کرتی ہے۔
- مردہ زمین کو زندہ کر کے یہ بعث اور حشر و نشر کی یاد دہانی کرتی ہے۔
- کسی کے لیے رحمت اور کسی کے لیے عذاب بن کر یہ خدا کے اختیارِ مطلق اور اس کے عذاب و ثواب کی یاد دہانی کرتی ہے۔

عُذْرًا اَوْ نُذْرًا (۶)

یہ مقصد بیان ہوا ہے ان کرشموں کا جو ہواؤں کے تصرفات سے ہر انسان کے مشاہدے میں آتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ کرشمے اللہ تعالیٰ لوگوں پر اتمامِ حجت یا ان کو بیدار کرنے کے لیے دکھاتا ہے۔ 'اَوْ' یہاں تقسیم کے لیے ہے۔ یعنی ان لوگوں پر حجت تمام ہو جاتی ہے جو غفلت کی سرمستی میں پڑے رہنا چاہتے ہیں اور ان لوگوں کو یاد دہانی حاصل ہوتی ہے جو یاد دہانی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سورۂ اعراف میں مصلحین کے ایک گروہ کا قول نقل ہوا ہے جس سے اس 'عُذْرًا اَوْ نُذْرًا' کی وضاحت ہوتی ہے:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّۃٌ مِّنْھُمْ لِمَ	اور جب کہ ان سے ایک گروہ نے کہا کہ
تَعِظُوْنَ قَوْمَا نِ اللّٰہُ مُھْلِکُھُمْ	ان لوگوں کو نصیحت کرنے سے کیا فائدہ جن
اَوْ مُعَذِّبُھُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا	کو اللہ تعالیٰ یا تو ہلاک کر دینے والا ہے یا
قَالُوْا مَعْذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمْ	ایک سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے۔
وَلَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ ہ	انھوں نے جواب دیا کہ تمھارے رب کے حضور
(الاعراف - ۷ : ۱۶۴)	معذرت کے لیے اور اس لیے بھی کہ شاید وہ ڈریں۔

یعنی یہ لوگ اگر ہماری نصیحت نہ مانیں گے تو ہم اپنے فرضِ نصیحت سے سبکدوش ہو جائیں گے، ہم پر کوئی ذمہ داری عنداللہ باقی نہیں رہے گی۔ پھر ذمہ داری ان کی ہو گی اور یہ قیامت کے دن اپنی گمراہی کے لیے کوئی عذر نہ پیش کر سکیں گے اور اگر ہماری بات مان کر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے بن گئے تو یہی مقصود ہے۔ یہ چیز ان کے لیے بھی باعثِ برکت و رحمت ہو گی اور ہمارے لیے بھی۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ (۷)

قسموں کا مقصود

یہ مذکورہ قسموں کا مقسم علیہ ہے۔ فرمایا کہ جس بات کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ واقع ہو کے رہے گی۔ 'تُوْعَدُوْنَ' یہاں عام ہے، اس میں وعدہ اور وعید دونوں شامل ہے لیکن یہ سورہ، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، انذار کی ہے اس وجہ سے یہاں وعید کا پہلو غالب ہے یعنی جس عذاب اور قیامت سے تمھیں ڈرایا جا رہا ہے وہ اٹل ہے، اس سے تمھیں سابقہ پیش آکے رہے گا۔

عذاب اور قیامت پر ہواؤں کے تصرفات کی شہادت گوناگوں پہلوؤں سے پچھلی سورتوں میں بیان

ہو چکی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو سورۂ ذاریات کی تفسیر پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب اور قیامت کے مکذبین کو ہواؤں کے تصرفات کی طرف توجہ دلا کر متنبہ فرمایا ہے کہ اپنی قوت و سطوت پر زیادہ ناز نہ فرماؤ۔ اللہ عذاب لانا چاہے تو اسے کوئی بڑا اہتمام نہیں کرنا ہے جس ہوا کی لائی ہوئی بارش سے جیتے ہو اسی کے پیچ ذرا سے ڈھیلے چھوڑ دے تو چشم زدن میں تمھاری ہستی کا نام و نشان ہی مٹ جائے۔ اس دنیا میں کتنی ہی قومیں گزری ہیں جن کو ہوا ہی نے خس و خاشاک کی طرح اڑا دیا۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (۸-۱۰)

قیامت کی ہلچل کی تصویر

ان آیتوں میں قیامت کی ہلچل کی تصویر ہے کہ اس دن اس کائنات کی وہ چیزیں جو بہت عظیم بڑی ہی پرشوکت اور بالکل غیر فانی اور لازوال نظر آتی ہیں اور جن کو دیکھ کر تم گمان کرتے ہو کہ بھلا ان کو ان کی جگہ سے کون ہلا سکتا ہے وہ بالکل بے نشان اور بے حقیقت ہو کے رہ جائیں گی ہواؤں کے لائے ہوئے طوفانوں سے بڑے بڑے شہروں، محلوں اور قلعوں کو جس طرح بے نشان ہوتے دیکھا ہے اسی طرح اس دن ایسی ہلچل برپا ہو گی کہ ستارے بے نشان ہو جائیں گے، آسمان پھٹ جائے گا اور زمین کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

'طمس' کے معنی کسی چیز کو مٹا دینے اور بے نشان کر دینے کے ہیں، فرمایا ہے: 'مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓی اَدْبَارِهَآ' (النساء ۴: ۴۷) (قبل اس کے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں اور ان کو ان کے پیچھے پھیر دیں)۔ 'فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ' کے معنی ہوں گے، پس جب کہ ستارے بے نور اور بے نشان کر دیے جائیں گے۔ یہی بات دوسرے مقام میں 'وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ' (التکویر ۸۱: ۲) اور 'وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ' (الانفطار ۸۲: ۲) کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔

'وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ' یعنی یہ آسمان جس میں کہیں کسی شگاف اور دراڑ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی، جو بالکل ٹھوس اور محکم نظر آتا ہے قیامت کے دن پھٹ جائے گا۔ قرآن کے دوسرے مقام میں فرمایا ہے: 'وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا' (اور آسمان کھول دیا جائے گا تو وہ دروازے دروازے بن کے رہ جائے گا)۔ سورۂ انفطار میں فرمایا ہے: 'اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ' (الانفطار ۸۲: ۱) (اس دن کو یاد رکھو جس دن آسمان پاش پاش ہو جائے گا)۔

'وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ'۔ 'نسف' کے معنی ریزہ ریزہ کر دینے، پیس دینے، پراگندہ کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ متعدد مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً 'وَانْظُرْ اِلٰٓی اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا' (طٰهٰ ۲۰: ۹۷) (اور اپنے اس دیوتا کو جس پر تو معتکف رہا ہے، دیکھ، ہم اس کو جلائیں گے پھر اس کو ریزہ ریزہ کر کے سمندر میں بکھیر دیں گے)۔

خود پہاڑوں سے متعلق، منکرینِ قیامت کے سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا (طٰہٰ ۲۰: ۱۰۵-۱۰۶) (اور وہ تم سے پہاڑوں کی بابت سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو، میرا رب ان کو ریزہ ریزہ کر دے گا اور زمین کو صفاچٹ چھوڑ دے گا)۔ بعض مقامات میں یہ بات بھی فرمائی گئی ہے کہ قیامت کے دن پہاڑ تودۂ ریگ (كَثِيْبًا مَّهِيْلًا) اور سراب کے مانند ہو جائیں گے۔

اوپر کی دو آیتوں میں آسمان کا حشر بیان ہوا تھا، اس آیت میں زمین پر جو کچھ گزرے گی اس کی طرف اشارہ ہے۔ زمین کی چیزوں میں استحکام اور وسعت و عظمت کے اعتبار سے، سب سے زیادہ اونچا درجہ پہاڑوں ہی کا ہے۔ چنانچہ کفار قیامت کا مذاق اڑاتے تو یہ سوال بھی کرتے کہ قیامت آئے گی تو ان پہاڑوں کا کیا بنے گا، کیا ان کو بھی وہ توڑ پھوڑ دے گی! یہاں پہاڑوں کا انجام بیان کر کے گویا اس پوری زمین کا حشر بیان کر دیا کہ جب پہاڑوں پر، جن کو لوگ اٹل خیال کرتے ہیں یہ گزرے گی تو دوسری چیزوں کا جو حال ہو گا اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ (۱۱)

رسولوں اور ان کی قوموں کے مقدمہ کی روبکاری

یہ اس اصل ہولناکی کا بیان ہے جس کی تمہید کے طور پر اوپر کی ہولناکیاں بیان ہوئی ہیں یعنی اس دن رسولوں کے لیے وقت مقرر ہو گا۔ ان کے لیے وقت مقرر کرنے سے مقصود ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ ایک مقررہ وقت پر وہ دربارِ الٰہی میں حاضر ہو کر اپنی قوموں کی موجودگی میں یہ بتائیں کہ جس فریضۂ انذار پر وہ مامور کیے گئے تھے وہ انھوں نے انجام دیا یا نہیں؟ اگر انجام دیا تو قوموں نے ان کو کیا جواب دیا؟ قرآن کے دوسرے مقامات میں رسولوں کے اس مقصد کے لیے جمع اور بارگاہِ الٰہی میں ان کی قوموں کے رویہ سے متعلق سوال کیے جانے اور ان کے گواہی دینے کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۰۹ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ کے تحت ہم اس کی تفصیل پیش کر چکے ہیں۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اس دن رسولوں اور ان کی قوموں کے مقدمہ کی روبکاری ہو گی۔ اللہ تعالیٰ رسولوں کی حاضری کے لیے بھی وقت مقرر فرمائے گا اور ان کی قوموں کی حاضری کے لیے بھی سمن جاری ہو گا۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو سورۂ اعراف کی آیت ۶-۷ کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

فیصلہ کے دن کی اہمیت

'اُقِّتَتْ'، دراصل 'وُقِّتَتْ' کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ عربی زبان میں الفاظ کے اندر اس طرح کا تصرف ہو جایا کرتا ہے۔ 'الرُّسُلُ اُقِّتَتْ' کے معنی ہوں گے رسولوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا۔ یہ اسی طرح کا اسلوب ہے جس طرح کہتے ہیں 'ابغنی خادمًا' یعنی ابغ لی خادمًا۔

لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ۝ لِيَوْمِ الْفَصْلِ (۱۲-۱۳) جب اس دن کے ذکر تک بات پہنچ گئی تو اس کی

عظمت و ہیبت کے بیان کے لیے یہ سوال مخاطبوں کے سامنے رکھ دیا کہ کچھ سمجھے کہ کس عظیم دن پر ہم نے ان رسولوں کی پیشی کو ٹالا ہے! اس کے بعد خود ہی جواب دیا ہے کہ نہ جانتے ہو تو کان کھول کر سن لو کہ 'لِیَوۡمِ الۡفَصۡلِ' فیصلہ کے دن پر ٹالا ہے یعنی وہ دن ہماری عدالت کا دن ہو گا۔

وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الۡفَصۡلِ (۱۴)

یہ اسلوب کلام، جگہ جگہ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ کسی چیز کی عظمت و ہیبت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ جس طرح 'لِاَیِّ یَوۡمٍ اُجِّلَتۡ' کے سوال سے اس کی عظمت کا اظہار ہو رہا ہے اسی طرح اس سوال سے اس دن کے فیصلہ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا اس کی عظمت دو بار یاد دلا دی گئی۔

وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ (۱۵)

یہ اس دن کے فیصلہ کے نتیجے کا بیان ہے کہ اس دن ان لوگوں کی تباہی ہے جو اس کے جھٹلانے والے بنے رہے!

زبان کا ایک اسلوب

یہ آیت، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، اس سورہ میں بار بار آئے گی اور ہر جگہ اپنے ماسبق سے گہرے ربط کے باوصف، اس کی حیثیت بالکل مستقل ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو اس شرط کا جواب قرار دیا ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہے لیکن یہ رائے عربیت کے خلاف ہے۔ اگر یہ جواب شرط کے محل میں ہوتی تو اس پر 'فَ' آنی تھی (الا آنکہ جواب جملۂ فعلیہ یا ظرفیہ ہو) مثلاً فرمایا ہے 'فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوۡرِ ۙ فَذٰلِكَ يَوۡمَئِذٍ يَّوۡمٌ عَسِيۡرٌ' (المدثر ۷۴: ۸-۹) دوسرے مقام میں ہے: 'يَّوۡمَ تَمُوۡرُ السَّمَآءُ مَوۡرًا ۙ وَّتَسِيۡرُ الۡجِبَالُ سَيۡرًا ؕ فَوَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ' (الطور ۵۲: ۹-۱۱) اس قاعدے کی وضاحت ہم نے اس لیے ضروری سمجھی کہ اس جملہ کو جواب شرط مان کر اس کی تاویل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کی تاویل صحیح نہیں ہو گی۔ آگے اس کے مواقع پر اس کی وضاحت ان شاء اللہ ہو جائے گی۔ یہاں جواب شرط محذوف ہے جس طرح 'اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ ۙ وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ ۙ وَاِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ ۙ وَاَلۡقَتۡ مَا فِيۡهَا وَتَخَلَّتۡ ۙ وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ ؕ يٰۤاَيُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدۡحًا فَمُلٰقِيۡهِ' (الانشقاق ۸۴: ۱-۶) میں محذوف ہے۔ جواب کے محذوف ہونے ہی کی وجہ سے یہ آیت اتنے گوناگوں پہلوؤں کی جامع بن گئی ہے کہ اس سورہ کے تقریباً ہر پیرے کے بعد یہ آئی ہے اور ہر جگہ اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

اَلَمۡ نُهۡلِكِ الۡاَوَّلِيۡنَ ؕ ثُمَّ نُتۡبِعُهُمُ الۡاٰخِرِيۡنَ ۙ كَذٰلِكَ نَفۡعَلُ بِالۡمُجۡرِمِيۡنَ ۙ
وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ (۱۶-۱۹)

دعوے کی تائید میں آفاقی شواہد

یہ اسی دعوے کی تائید میں جو 'اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَوَاقِعٌ (۷)' کے الفاظ میں اوپر مذکور ہوا، تاریخ کے آفاقی شواہد کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے اگلوں کو ہلاک کیا اور

انہی کے پیچھے ان کے بعد والوں کو بھی لگاتے رہے ؟ یہ اشارہ ظاہر ہے کہ قومِ نوح، عاد اور ثمود اور ان کے بعد آنے والی ان قوموں کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں تفصیل سے قرآن میں بیان ہوئی ہیں مثلاً قومِ لوط، مدین اور قومِ فرعون وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ جب تاریخ مسلسل اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جن قوموں نے رسولوں اور ان کے انذار کی تکذیب کی ہم نے ان کو ہلاک کر دیا تو آخر انہی کی روش پر چلنے والے آج کے مجرموں کے باب میں ہماری سنت کیوں بدل جائے گی !

ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِیْنَ: میں میرے نزدیک فعل ناقص محذوف ہے۔ اس حذف کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اگلوں کے بعد ان کی روش کی تقلید کرنے والے پچھلوں کو بھی ہم برابر ان کے پیچھے لگاتے رہے ہیں۔ سنت الٰہی کا یہ تسلسل اس بات کی دلیل ہے کہ اس متواتر سنت میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہی پہلے ہوا ہے اور یہی آئندہ ہو گا اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے جس فیصلہ کے دن یعنی آخرت سے لوگوں کو ڈرایا ہے وہ بھی لازماً ظہور میں آ کے رہے گا۔

کَذٰلِکَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ: اگرچہ یہ ایک کلیہ بیان ہوا ہے کہ ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کرتے آئے ہیں اور ایسا ہی کریں گے لیکن اس میں خاص طور پر قریش کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہم یہی معاملہ ان کے ساتھ بھی کریں گے۔ اگر یہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے اور قیامت کے دن جو حشر تمام مجرموں کا ہو گا وہی حشر ان کا بھی ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔

اس کے بعد وہی ترجیع والی آیت ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اس کا مرتبع و محل بالکل واضح ہے۔ لفظ 'وَیْلٌ' نے یہاں عذاب کی ان تمام قسموں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے جن سے مجرموں کو اس دن سابقہ پیش آئے گا اور جن کی تفصیل قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک مختصر لفظ ہے لیکن اس کے اختصار و ابہام کے اندر جو ہولناکی مضمر ہے وہ بڑی سے بڑی تفصیل کے اندر بھی نہیں سما سکتی۔

اَلَمْ نَخْلُقْکُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۙ فَجَعَلْنٰهُ فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۙ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۙ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۞ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ (۲۰-۲۴)

ایک انفسی دلیل

اوپر کی دلیل آفاقی تھی۔ اسی دعوے پر انسان کی خلقت سے یہ انفسی دلیل پیش کی گئی ہے۔ انسان کی خلقت سے قرآن نے قیامت پر متعدد پہلوؤں سے دلیل قائم کی ہے۔ مثلاً

- مٹی اور پانی کی ایک بوند سے اس کی پیدائش کا حوالہ دے کر امکانِ بعث اور امکانِ حشر و نشر کو ثابت کیا ہے۔
- اس کی خلقت کے اندر خدا کی قدرت، حکمت اور صنعت گری کے جو شواہد نمایاں ہیں ان سے جزا اور سزا کے لازم ہونے پر استدلال کیا ہے۔
- انسان کی پرورش کے لیے اس نے جو اہتمام فرمایا ہے اس سے بھی جزا اور سزا کے لزوم پر دلیل

قائم کی ہے۔

انسان کے اندر خیر و شر کے امتیاز کی جو صفت ودیعت فرمائی ہے اس سے ایک روزِ عدل کے لازمی ہونے پر دلیل پیش کی ہے۔

یہ مطالب یوں تو پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر قریب ہی کی دو سورتوں ——— القیٰمۃ اور الدھر ——— کے مطالب پر آپ ایک نظر ڈال لیں تو ان تمام نکات کے شواہد آپ کو مل جائیں گے۔

منکرینِ قیامت کے شبہ کا جواب

اَلَمۡ نَخۡلُقۡکُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّہِیۡنٍ ۙ فَجَعَلۡنٰہُ فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ ۙ اِلٰی قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ۔

یہ منکرینِ قیامت کے اس شبہ کا جواب ہے جو مرکھپ اور سڑگل جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے سے متعلق وہ ظاہر کرتے۔ ان کو براہِ راست مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے حقیر پانی کی ایک بوند سے تم کو پیدا کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا تو جب تم خود اپنے وجود کے اندر علانیہ مشاہدہ کرتے ہو کہ تمھارے خالق نے حقیر پانی کی ایک بوند کو انسان بنا کے کھڑا کر دیا تو تمھارے مرکھپ جانے کے بعد اگر وہ تمھیں ازسرِنو پیدا کرنا چاہے تو یہ کام اس کے لیے کیوں ناممکن یا مشکل ہو جائے گا۔ پہلی بار پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا دوسری بار!

'مَہِیۡنٍ' کے معنی حقیر و ناچیز کے ہیں۔ اس صفت کے لانے سے مقصود ایک تو یہ دکھانا ہے کہ انسان کی تخلیق کسی ایسے میٹریل سے نہیں ہوئی ہے جو نادرالوجود یا کمیاب ہو کہ اس کو دوبارہ پیدا کرنا ناممکن یا دشوار ہو جائے۔ وہ ایک بے قیمت اور حقیر چیز سے پیدا ہوا ہے جس کا نہایت وافر ذخیرہ قدرت کے پاس موجود ہے۔ دوسرے اس سے خالق کی عظیم و بے نہایت قدرت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جو خدا پانی کی ایک بوند کو انسان بنا دے سکتا ہے اس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

'فَجَعَلۡنٰہُ فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ'۔ یہ ان حیرت انگیز تصرفات کی طرف اشارہ ہے جو اس حقیر قطرے کو گہر بنانے پر قدرت صرف کرتی ہے۔ فرمایا کہ ہم اس کو ایک محفوظ و مامون جائے قرار میں رکھواتے ہیں۔

'قَرَارٌ' سکون اور جائے سکون دونوں معنوں میں آتا ہے۔ یہاں یہ جائے قرار کے معنی میں ہے اور اشارہ اس سے رحم کی طرف ہے جس کو قدرت نے خاص اسی مقصد کے لیے ایک گوشۂ مامون بنایا ہے۔ لفظ 'مَکِیۡنٌ' جب جگہ کی صفت کے لیے آتا ہے تو اس سے ایسی جگہ مراد ہوتی ہے جو اندیشوں، خطرات اور مداخلتِ غیر مطلوب سے بالکل محفوظ و مامون ہو۔

'اِلٰی قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ' یعنی ایک معین وقت تک ہم اس کو ایک محفوظ گوشہ میں رکھواتے ہیں تاکہ جو صلاحیتیں اس کے اندر پیدا کرنی مقصود ہیں وہ اپنے لیے جگہ بنا لیں۔ پھر یہ ہماری ہی قدرت و حکمت ہے

کہ اس مدتِ معین کے بعد اس کو اس گوشۂ ماموں سے باہر لاتے ہیں۔

'فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ'۔ میرے نزدیک اس میں پہلا لفظ قدر سے ہے اور دوسرا قدرت سے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے عجائبِ قدرت کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلا کر فرمایا کہ دیکھ لو، انسان کی پیدائش میں ہم نے اپنے کیا کیا کرشمے دکھائے ہیں اور ہم کتنی اعلیٰ اور برتر قدرت رکھنے والے ہیں! مطلب یہ ہے کہ جب ہماری قدرت کی یہ اعلیٰ شانیں انسان کی خلقت میں ظاہر ہیں تو ہم اس کو دوبارہ پیدا کرنا چاہیں گے تو اس سے کیوں عاجز رہ جائیں گے!

اس کے بعد آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع یہ ہے کہ دوبارہ پیدا کیے جانے پر جو شبہات وارد کیے جا رہے ہیں ان کی تردید کے لیے تو خود ان کی خلقت ہی کافی ہے۔ ایک دن وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور وہ دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہی خرابی کا دن ہوگا۔ سورۂ صافات میں یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے:-

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝ (الصّٰفّٰت - ۳۷: ۱۹ - ۲۱)	وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی کہ دفعتہً وہ تاکنے لگیں گے۔ کہیں گے ہائے ہماری بدبختی! یہ تو جزا کا دن آگیا! ہاں یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۝ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ۝ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۲۵ - ۲۸)

پرورش کا اہتمام جزا و سزا کی دلیل ہے

یہ اسی یوم الفصل پر اس اہتمام ربوبیت سے دلیل قائم فرمائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی پرورش کے لیے اس دنیا میں کر رکھا ہے۔ یہ دلیل قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے اور ہم ہر جگہ اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی پرورش کے لیے جو اہتمام فرمایا ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے زمین و آسمان کو جس طرح مسخر کر کے اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے اس کا لازمی اور بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ غیر مسئول اور شترِ بے مہار بنا کر نہ چھوڑے رکھا جائے بلکہ ایک ایسا دن بھی آئے جس میں اس سے پرسش ہو کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا حق ادا کیا یا نہیں۔ پھر جس نے ادا کیا ہو وہ انعام پائے اور جس نے ان کو طغیان و فساد کا ذریعہ بنایا ہو وہ اس کفرانِ نعمت کی سزا بھگتے۔

'اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۝ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا'۔ 'کفت' کے معنی جمع کرنے اور اکٹھا کرنے کے ہیں۔ عربی میں 'فِعَالٌ' کا وزن اس چیز کے لیے بھی آتا ہے جس سے فعل انجام پذیر ہو اس وجہ سے 'کِفَات' کے معنی جمع کر لینے والی کے ہوں گے۔ اسی معنی کے اعتبار سے اس میں فاعل کی قوت پیدا ہو گئی

ہے اور اس کے بعد مفعول لانا جائز ہوا۔

یہ ربوبیت اور احاطہ کے دو گونہ پہلوؤں سے معاد اور روز جزا و سزا کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ ربوبیت سے استدلال زیادہ وضاحت سے آگے والی سورہ میں ہے جو اس کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرمایا ہے:

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا ۝ وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا ۝ وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا ۝ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۝ وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۝ لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۝ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝ (النبا — ۷۸: ۶ - ۱۷)

کیا ہم نے زمین کو گہوارہ نہیں بنایا، پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا، اور تم کو جوڑے جوڑے نہیں پیدا کیا، تمہاری نیند کو دافع کلفت نہیں بنایا، رات کو پردہ پوش اور دن کو وقت معاش نہیں بنایا اور تمہارے اوپر سات محکم آسمان نہیں بنائے اور ایک روشن چراغ نہیں بنایا اور بدلیوں سے دھڑا دھڑ پانی نہیں برسایا تاکہ اس سے اگائیں غلے اور نباتات اور گھنے باغ! بے شک یہ چیزیں شاہد ہیں کہ فیصلہ کا دن مقرر ہے۔

احاطہ کے پہلو کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں 'اَحْيَاءً' کے ساتھ 'اَمْوَاتًا' کا بھی ذکر فرمایا۔ یعنی یہ زمین جس طرح اپنی آغوش میں تمام زندوں کو لیے ہوئے ہے اسی طرح تمام مردوں کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جو مرتے ہیں وہ اس کے حدود سے کہیں باہر نہیں چلے جاتے بلکہ اسی کے اندر دفن ہوتے ہیں۔ قدرت ان کو اسی زمین کی تحویل میں بطور امانت دے دیتی ہے جس کے گہوارے میں وہ پیدا ہوتے اور پلتے ہیں۔ یہ اہتمام قدرت نے اسی لیے فرمایا ہے کہ جب لوگوں کو جمع کرنے کا وقت آئے تو وہ زمین کو حکم دے کہ جو کچھ اس کی تحویل میں ہے اس کو حاضر کرے اور وہ فوراً اس حکم کی تعمیل کرے گی۔ چنانچہ فرمایا ہے: وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝ (الانشقاق - ۸۴: ۳ - ۴) (اور جب کہ زمین تان دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ اس کو باہر نکال کر فارغ ہو جائے گی)۔ اسی بات کی طرف اشارہ سورۂ زلزال میں وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا (۲) کے الفاظ سے فرمایا ہے۔ ان آیات سے اس حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ جو مرتا ہے وہ کہیں ناپید نہیں ہو جاتا ہے بلکہ زمین کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے گا اس کو اسی زمین سے، جس سے اس کو پیدا کیا، پھر اٹھا کھڑا کرے گا۔ چنانچہ سورۂ طٰہٰ میں فرمایا ہے: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (۵۵) (اسی

زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں ہم پھر تم کو لوٹا دیتے ہیں اور پھر اسی سے تم کو دوسری بار نکالیں گے)۔

ان تمام آیات پر تدبر کی نظر ڈالیے تو ایک اور واضح تر حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ انسان اصلاً زمین ہی کے رحم سے پیدا ہوا ہے اور جب وہ مرتا اور دفن ہوتا ہے تو گویا مرتا نہیں بلکہ اسی رحم میں واپس لوٹا دیا جاتا ہے جس سے پیدا ہوا ہے تو جب اس کا پہلی بار پیدا ہونا کسی کے نزدیک کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے تو اس کا دوسری بار پیدا ہونا کیوں تعجب انگیز ہو جب کہ بطنِ زمین میں اس کا تخم موجود ہے۔

وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا۔ یہ اسی ربوبیت کے مضمون سے متعلق ہے جو اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا میں بیان ہوا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں یہ اشارہ موجود ہے کہ انسان کی رہائش و پرورش کے لیے زمین کو گہوارہ بنانے میں پہاڑوں کے وجود کو بڑا دخل ہے۔ اور پر سورۂ نبا کی جس آیت کا ہم نے حوالہ دیا ہے اس میں بھی فرمایا ہے کہ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا (کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو گہوارا بنایا ہے اور اس گہوارے کو متوازن رکھنے کے لیے اس میں پہاڑوں کی میخیں ٹھونکی ہیں؟) دوسرے مقام میں اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے کہ وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (لقمان ۳۱: ۱۰) (اور اس نے زمین میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے کہ مبادا وہ تمہارے سمیت کسی جانب کو لڑھک جائے)۔

پہاڑوں کے ایک اور نفع کی طرف بھی اشارہ فرمایا جو ربوبیت کے پہلو سے بڑی اہمیت رکھنے والا ہے۔ وہ یہ کہ ان پہاڑوں کی بلندی ہواؤں اور بادلوں کو کنٹرول کرنے اور پانی کے قدرتی ذخائر جمع کرنے میں بڑی مؤثر ہے۔ انسان شیریں پانی کا محتاج ہے اور یہ نعمت مہیا کرنے کے لیے قدرت نے یہ اونچے پہاڑ بنائے ہیں جو اسی کے بنانے کے ہیں کوئی دوسرا ان کو بنانے پر قادر نہیں ہے۔

اس طرح کلام درجہ بدرجہ ایک یوم الفصل اور روزِ جزا و سزا کے ثبوت تک خود پہنچ گیا۔ اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ الفاظ میں بھی اس کو بیان کیا جائے۔ چنانچہ اس کے ذکر کو حذف کر کے ترجیع والی آیت سامنے رکھ دی۔ فرمایا: وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ یعنی جو لوگ خدا کی ربوبیت اور اس کی احاطۂ قدرت کے اتنے بدیہی شواہد کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کے دن سے بچنت اور اس کو جھٹلانے والے بنے ہوئے ہیں اس دن ان کی تباہی ہے۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۲۹)

اوپر والی آیت میں آپ نے دیکھا کہ اس فیصلہ کے دن کا مشاہدہ آفاق وانفس کے آثار و شواہد

کے اندر کرایا گیا ہے۔ اب چند آیتوں میں اس کی تصویر سامنے رکھ دی گئی ہے تاکہ جو چیز نگاہوں سے اوجھل ہے اس کا مشاہدہ ایک حاضر و مشہود چیز کی طرح منکرین کر لیں۔ چنانچہ اسلوب کلام ایسا اختیار فرمایا ہے گویا وہ چیز سامنے موجود ہے اور ان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اب تک جس چیز کو جھٹلاتے رہے ہیں اس کی طرف چلیں اور اس کا مزا چکھیں۔ فرمایا کہ چلو اس چیز کی طرف جس کو اب تک جھٹلاتے رہے ہو۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِىْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (۳۰)

'اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ' کے الفاظ میں جو ہولناک چیز چھپی ہوئی تھی یہ اس سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ ان تین شاخوں والے سایہ کی طرف چلو۔ 'ظِلٌّ' کے معنی تو سایہ کے ہیں لیکن یہاں ظاہر ہے کہ اس سے مراد معروف سایہ نہیں بلکہ دھوئیں کا سایہ ہے۔ سورۂ واقعہ آیات ۴۳-۴۴ میں فرمایا ہے: 'وَظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ○ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ' (اور سیاہ دھوئیں کا سایہ، نہ ٹھنڈا نہ نفع بخش)۔

دھوئیں کے اس سائے کی صفت 'ذی ثلث شعب' آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھواں ان کے آگے تمام سمتوں میں پھیلا ہوا ہوگا، صرف وہی سمت اس کی آفت سے محفوظ ہوگی جس سے یہ مکذبین جیسا کہ لفظ 'اِنْطَلِقُوْٓا' سے واضح ہے، کھدیڑ دیے جائیں گے جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے بعد ان کے لیے دھواں ہی دھواں ہوگا۔

اس ٹکڑے کی تاویل میں بعض اصحاب علم نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ کفر کی بنیادی خصلتیں تین ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ سے غفلت، (۲) مخلوق سے بے پروائی، (۳) روزِ جزا کا انکار۔ انہی تین خصلتوں کے مطابق عذاب کی تین شاخیں ان کی طرف بڑھیں گی اور ان کو چھا لیں گی۔ یہ نکتہ لطیف ہے لیکن یہ تینوں خصلتیں باہم دگر بالکل لازم و ملزوم بھی ہیں اور یہ تمام کفار میں مشترک بھی نہیں۔ ان کی بنیاد پر کفار کی الگ الگ درجہ بندی کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ واضح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ سمتیں بہرحال چار ہی ہوتی ہیں تو جب وہ اس سمت سے نکال دیے جائیں گے جو اس دھوئیں کے عذاب سے محفوظ ہوگی تو تین سمتیں بچ رہتی ہیں اور یہ تینوں اس دھوئیں کے احاطہ میں ہوں گی۔ گویا اس کے بعد وہ ہر طرف سے دھوئیں کے عذاب میں ہوں گے۔

لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِىْ مِنَ اللَّهَبِ (۳۱)

یہ بر سرِ موقع ایک مغالطہ کو رفع کیا ہے جو لفظ 'ظِلٌّ' سے پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا کہ اس سایہ میں نہ چھاؤں ہوگی نہ شعلوں کی لپیٹ سے وہ بچاؤ کرنے والا بنے گا۔ یہی بات ذرا مختلف الفاظ میں سورۂ واقعہ کی اس آیت میں فرمائی گئی ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ فرمایا ہے: 'وَظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ○ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ' (سیاہ دھوئیں کا سایہ، نہ ٹھنڈا نہ فیض بخش) گویا دھوئیں کے اذیت بخش پہلو تو اس کے اندر سارے ہوں گے لیکن نفع بخش پہلو، جن کی توقع ہو سکتی تھی، ان کی نفی کر دی گئی۔

إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (۳۲)

'اِنَّھَا' میں ضمیر کا مرجع وہ آگ ہے جو دھوئیں کے ذکر سے بطور اس کے لازم کے مفہوم ہوتی ہے۔ فرمایا کہ وہ گنبد کے برابر چنگاریاں اور شعلے پھینک رہی ہوگی۔ 'قصر' کی قرارت اور معنی میں بعض لوگوں نے اختلاف کیا ہے لیکن ہم نے اپنی اس کتاب میں ہر جگہ متواتر قرارت ہی کو ترجیح دی ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں یہ محل اور گنبد ہی کے معنی میں ہے اور یہ نہایت عمدہ تشبیہ ہے آگ کے کسی بڑے الاؤ سے اٹھتے شعلوں کی۔ یہ تشبیہ شعلوں کے پھیلاؤ، ان کی بلندی اور ان کے رنگ کی دی گئی ہے۔ محل بالعموم بلند جگہوں پر بنائے جاتے ہیں۔ دور سے دیکھیے تو وہ چمکتے ہوئے نظر آئیں گے اور اوپر کا رنگ نیچے کے رنگ سے مختلف ہوگا۔

كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ (۳۳)

یہاں ضمیر کا مرجع 'شرر' ہے اور رعایت لفظ کی کی گئی ہے۔ 'مشدد' اسم صفت ہے۔ مذکر، مؤنث واحد اور جمع سب کے لیے اس کا استعمال یکساں ہوتا ہے۔ یہاں یہ جمع کے مفہوم میں ہے اس لیے کہ اس کی تشبیہ جمالۃ صفر سے دی گئی ہے۔ 'جمالۃ' اونٹوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ یہ تشبیہ شعلوں اور چنگاریوں کے رنگ اور ان کی بڑائی دونوں کو نمایاں کر رہی ہے۔ صفرۃ (زردی) کی قید اس لیے لگائی ہے کہ دھوئیں کی آڑ سے شعلوں کا منظر ملگجے زرد رنگ کے اونٹوں کے رنگ سے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔

آگے وہی آیت ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ جس دن اس ہولناک منظر سے سابقہ پیش آئے گا اس دن ان تکذیب کرنے والوں کی تباہی ہے۔

هَٰذَا يَوْمُ لَا يَنطِقُونَ ۝ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ (۳۵-۳۷)

مجرموں کی بے بسی کی تصویر

روز قیامت کی ہولناکی کی تصویر کے بعد یہ مجرموں کی بے بسی اور درماندگی کی تصویر ہے کہ آج تو قیامت کی تکذیب میں ہر ایک آگے بڑھ بڑھ کر طلاقت لسانی کا ثبوت دے رہا ہے لیکن اس دن سب کی زبانیں گنگ ہوں گی، کسی کے منہ سے بات نہ نکلے گی۔ آگے کی سورہ میں جو اس کی مثنیٰ ہے فرمایا ہے 'لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا' (النبا - ۷۸: ۳۷) (اس دن مجرمین اس سے خطاب نہ کر سکیں گے)۔

قرآن میں یہ تصریح بھی ہے کہ اس دن مجرموں کے مونہوں پر مہر کر دی جائے گی اور اللہ تعالیٰ ان کے اعضاء کو ناطق بنا دے گا جو ان کے تمام جرائم کی گواہی دیں گے۔

'وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ' یعنی نہ تو وہ خود زبان کھولنے کی جرأت کریں گے اور نہ ان کو یہ اجازت ملے گی کہ ان کے پاس کوئی عذر ہو تو اس کو پیش کریں۔

'وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ' ان کی اس بے بسی کے بیان کے بعد وہی آیت ترجیع ہے اور

اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ جب حال یہ ہو کہ نہ وہ خود کوئی بات زبان سے نکالنے میں پہل کر سکیں گے اور نہ ان کو کوئی عذر پیش کرنے کی اجازت ہی ملے گی تو ہلاکی اور تباہی کے سوا ان کے لیے کیا چیز باقی رہی!

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ۝ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۳۸-۴۰)

یہ ان مجرموں کو براہِ راست خطاب کر کے ارشاد ہوگا کہ تم جس یوم الفصل کی تکذیب کرتے رہے تھے آج اس کی عدالت تمہارا فیصلہ سنانے کے لیے قائم ہو گئی۔ دیکھ لو، ہم نے تم کو بھی جمع کر لیا اور تمہارے اگلوں کو بھی۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ کفار جب قیامت کا مذاق اڑاتے تو یہ بھی کہتے کہ کیا جب قیامت آئے گی تو اس دن ہمارے آباء و اجداد بھی اٹھائے جائیں گے؟ وہ اس طرز کے سوال سے قیامت کو ناممکن سے ناممکن تر ثابت کرنا چاہتے کہ بھلا یہ بات کس طرح تصور کی جا سکتی ہے کہ ہمارے تمام اسلاف بھی ایک دن قبروں سے اٹھائے جائیں گے! ان کے اسی سوال کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ہم نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ کر دکھایا۔ تم بھی ہمارے سامنے موجود ہو اور تمہارے اگلے بھی!

فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ۔ یعنی دنیا میں تو تم نے ہمارے رسول کو شکست دینے کے لیے بڑی بڑی چالیں چلیں۔ اگر کوئی اور چال باقی رہ گئی ہو تو وہ بھی آزما دیکھو۔ یہاں تمہارے اگلے پچھلے سب موجود ہیں۔ اگر وہ مدد کریں تو ان کی مدد بھی حاصل کر و۔

یہاں اس امر پر نگاہ رہے کہ رسول کے انذار کی تکذیب کے لیے کفار نے جو کوششیں کیں ان کو اللہ تعالیٰ نے کَیْدٌ یعنی چال سے تعبیر فرمایا۔ اس کی وجہ جیسا کہ ہم بار بار واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اس راہ میں ان کی ساری بھاگ دوڑ محض اپنی سیادت کو بچانے کے لیے تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات حق ہے لیکن اپنی نفس پرستی اور انانیت کے سبب سے اس کے قبول کرنے پر وہ تیار نہیں ہوتے بلکہ طرح طرح کے شبہات و اعتراضات ایجاد کر کے اپنے عوام کو انھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ جو کر رہے ہیں دلیل کے ساتھ کر رہے ہیں اور ان کا مقصود اپنے آبائی دین کا تحفظ ہے۔ حالانکہ یہ محض ان کی چال تھی۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ آگے وہی آیت ترجیع ہے جو اوپر ہر ہر پیرے کے بعد آئی ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس مطالبہ کے بعد، جو مذکور ہوا، ان کی بے بسی ان پر بالکل واضح ہو جائے گی اور وہ اس تباہی سے دوچار ہوں گے جو اس تکذیب کے نتیجہ میں ان کے سامنے آئے گی اور جو بہت بڑی تباہی ہوگی۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ (۴۱-۴۲)

اس یوم الفصل میں مجرموں کا جو فیصلہ ہوگا وہ اوپر کی آیات میں بیان ہوا کہ وہ ایک ایسی آگ کی طرف بھیجے جائیں گے جس کا دھواں ان کو ہر طرف سے گھیر لے گا۔ ان کے مقابل میں ان متقیوں کا انجام اکرام بیان ہو رہا ہے کہ وہ سایوں، چشموں اور اپنی پسند کے میووں میں ہوں گے۔ اس اسلوب بیان میں جب نعمتوں کا بیان ہوتا ہے تو اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ یہ نعمتیں ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوں گی۔ قرآن میں بھی یہ اسلوب جگہ جگہ استعمال ہوا ہے اور کلام عرب میں بھی اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ — متقیوں کا انعام

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۳)

یہ ان کو خوش خبری دی جائے گی کہ اب چین سے کھاؤ پیو۔ تمہارا یہ کھانا پینا راس آنے والا اور ہر غل وغش سے پاک ہوگا۔ یہ تمہارے ان اعمال کا صلہ ہے جو تم نے دنیا میں کیے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ ناشکروں نے دنیا میں جو کھایا پیا وہ ان کے لیے آخرت میں راس آنے والا نہیں بنے گا بلکہ وہ ان کے لیے تباہی کا سبب ہوگا اس لیے کہ انھوں نے اس کھانے پینے کا حق نہیں ادا کیا لیکن تمہارا یہاں کھانا پینا راس آنے والا بنے گا اس لیے کہ تم اپنے حقوق و فرائض سے سبکدوش ہو کر آئے ہو۔

'هَنِيْٓـًٔا' کے معنی راس آنے اور ساز گار ہونے کے ہیں۔ یہ مفعول سے حال پڑا ہوا ہے جو فعل سابق سے مفہوم ہو رہا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے 'فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا' (النساء - ۴: ۴) جس میں ذوالحال واضح ہے۔ ذوالحال سے حال پڑنا عربی زبان میں معروف ہے۔ مثلاً مسافر کے لیے کہتے ہیں: راشدا مھدیا۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۴۴)

یہ آیت اوپر کی آیت ۱۸ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہاں فرمایا ہے: 'كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ' (ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں) یہاں اس کے مقابل میں فرمایا کہ ہم خوب کاروں کو اسی طرح دیا کرتے ہیں۔ لفظ 'مُحْسِنٌ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۴۵)

یہ آیت ترجیع ہے جس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔ ایک طرف تو خوب کاروں کے لیے یہ عیش جاوداں ہوگا، دوسری طرف منکرین اس عذاب میں جھونکے جائیں گے، جس کی تفصیل اوپر بیان ہوئی۔ تصور کیجیے اس بُعد کا جو دونوں کے درمیان ہوگا! جب آمنے سامنے یہ دونوں انجام نمایاں ہوں گے تب اپنی بدبختی کا ان لوگوں کو صحیح اندازہ ہوگا جنھوں نے عیش دنیا پر ریجھ کر اس کے انجام کا اندازہ نہیں کیا۔

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۴۶ - ۴۷)

قریش کے لیڈروں کو براہِ راست خطاب

یہ آخر میں قریش کے لیڈروں سے خطاب ہے۔ اوپر جو باتیں فرمائی گئی ہیں اگرچہ وہ بھی انہی کے لیے فرمائی گئی ہیں لیکن وہ اصولی رنگ میں ہیں۔ یہ ان کو براہِ راست مخاطب کر کے آگاہ کیا ہے کہ اس دنیا میں جو عیش تم کو حاصل ہے اس سے اس مغالطہ میں نہ رہو کہ آخرت ہوئی تو یہی کچھ تمھیں وہاں بھی حاصل ہوگا۔ تمھارا یہ عیش چند روزہ ہے۔ آخرت کی نعمتوں سے بہرہ مند ہونے کے لیے خوب کار بننا ضروری ہے اور تم ہو نابکار۔ مجرموں کو وہی ملے گا جس کی تفصیل سنا دی گئی۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۔ یہ آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ نابکاروں کے لیے اس دن بڑی تباہی ہے جس کا اندازہ اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ٥ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۴۸-۴۹)

ان کو تنبیہ کرنے کے بعد پھر خطاب کی جگہ غائب کا اسلوب آگیا جس میں ان کو ملامت ہے کہ یہ بدبخت لوگ اپنی موجودہ رفاہیت کو اس بات کی دلیل تو بنائے بیٹھے ہیں کہ آخرت ہوئی تو وہاں بھی ان کے لیے عیش ہی عیش ہے لیکن جب ان کو اس عیش و رفاہیت کا حق ادا کرنے کے لیے خدا کے آگے جھکنے کی دعوت دی جاتی ہے تو نہیں جھکتے بلکہ اکڑتے ہیں۔ 'رکوع' سے یہاں نماز کی تعبیر فرمائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کا سب سے اعلیٰ مظہر اور کبر و غرور کی سب سے بڑی قاطع ہے۔

اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے جس کا موقع بالکل واضح ہے کہ جو بر خود غلط اپنا فرض ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں لیکن حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کی آرزوئیں پوری ہونے والی نہیں ہیں۔ وہ دن آئے گا کہ یہ دیکھیں گے کہ وہاں ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے!

یہاں وہ بات بھی یاد رکھیے جو سورۂ قلم میں گزر چکی ہے کہ قیامت کے دن اس طرح کے متکبرین سجدہ کرنے کے لیے بلائے جائیں گے لیکن انھوں نے دنیا کی زندگی میں سجدہ نہیں کیا اس وجہ سے اس دن بھی وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ یہ چیز ثابت کر دے گی کہ یہ بھی متکبرین میں سے ہیں اس وجہ سے یہ اسی سزا کے مستحق ہیں جو متکبرین کے لیے خاص ہے۔

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (۵۰)

منکرین کی ہٹ دھرمی پر ملامت

یہ ان منکرین کی ہٹ دھرمی پر ملامت اور ان کے ایمان سے مایوسی کا اظہار ہے کہ جب یہ اس قرآن پر ایمان نہیں لا رہے ہیں جس کو قرآن اتنے واضح دلائل کے ساتھ سنا رہا ہے تو اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے! مطلب یہ ہے کہ نہ کوئی چیز حسنِ استدلال میں قرآن سے بڑھ کر ہو سکتی نہ حسنِ بیان اور قوتِ تاثیر و تسخیر میں، تو جب یہ ان کی عقلوں اور ان کے دلوں پر اثر انداز نہ ہو سکا تو اس سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی ہے جو اثر انداز ہو سکے گی؟ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ ان کا مرض لاعلاج ہے۔ یہ دلیل اور بیان سے سمجھنے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ اس وقت مانیں گے جب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ

ہیں گے لیکن اس وقت کا ماننا بے سود ہوگا۔

'بَعۡدَہٗ' کا مطلب بعض لوگوں نے یہ لیا ہے کہ اس دن کے آجانے کے بعد یہ لوگ کس چیز پر ایمان لائیں گے۔ ان کے نزدیک مدعا یہ ہے کہ اس انذار پر ایمان لانے کا نفع ہے تو آج ہے، جب وہ دن آجائے گا تو اس دن ایمان لائے تو کیا، نہ لائے تو کیا، اس وقت تو سب ہی ایمان لائیں گے لیکن اس سے کسی کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا۔ اگرچہ اس تاویل کا بھی احتمال ہے لیکن قرآن کے نظائر سے زیادہ واضح تائید اسی تاویل کی نکلتی ہے جو ہم نے اختیار کی ہے۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے 'فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَ اللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ' (الجاثیۃ ۴۵: ۶) (اور اللہ اور اس کی آیات سے بڑھ کر اور کون سی چیز ہو سکتی ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے)۔ احتمال اگرچہ دونوں ہی تاویلوں کی صحت کا ہے اور اصل مدعا میں بھی کچھ زیادہ بُعد نہیں ہے لیکن اس تاویل میں وسعت زیادہ ہے۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اوسع واحکم۔

بتوفیق ایزدی ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للّٰہ اولاً و اٰخراً۔

رحمان آباد
۸۔ مارچ ۱۹۷۹ء
۸۔ ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ

تدبّرِ قرآن

۷۸

النّبا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ــــــ المرسلٰت ــــــ کی توام سورہ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ جس طرح اس میں آفاقی، تاریخی اور انفسی دلائل سے یہ حقیقت ثابت کی گئی ہے کہ اس دنیا کے بامقصد و باغایت ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ یہ ایک دن ختم ہو اور اس کے بعد ایک ایسا فیصلہ کا دن آئے جس میں نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ ملے اور جو مجرم ہوں وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں اسی طرح اس سورہ میں بھی ایک یوم الفصل کا اثبات فرمایا ہے جس میں خدا کے باغی اپنی سرکشی کی سزا بھگتیں گے اور خدا ترس اپنی خدا ترسی کا انعام پائیں گے۔ استدلال اس میں خدا کی ربوبیت کے آثار و شواہد سے ہے جس سے آسمان و زمین کا چپّہ چپّہ معمور ہے۔

لب ولہجہ دونوں سورتوں کا بالکل ایک ہی ہے۔ کلام استفہام اقراری کے انداز میں شروع ہوا ہے جو ان متکبرین و مکذّبین کو خطاب کرنے کے لیے مخصوص ہے جو بالکل بدیہی حقائق کو جھٹلانے کے درپے ہوں۔ دلائل کے پہلو بہ پہلو زجر و ملامت اور تہدید و توبیخ ہر آیت میں نمایاں ہے۔ اہل ایمان کے لیے جو بشارت ہے وہ بھی گویا ان مکذّبین کی تہدید ہی کے پہلو سے آئی ہے کہ وہ اس کو سامنے رکھ کر اپنے انجامِ بد کا موازنہ کر لیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۵) منکرین قیامت کی ان چہ میگوئیوں پر زجر و توبیخ جو قیامت کا ذکر سن کر نہایت سفیہانہ انداز میں وہ آپس میں کرتے۔ ان کو آگاہی کہ یہ خبر وہ خبر ہے کہ ان کے اندر عقل کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو اس کی فکر ان کو راتوں کی نیند سے محروم کر دیتی چہ جائیکہ وہ اس کا مذاق اڑائیں۔

(۶-۱۷) اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، رحمت، حکمت اور قدرت کی ان نشانیوں پر غور کرنے کی دعوت جو زمین سے لے کر آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں اور جو شہادت دے رہی ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس

دنیا میں مطلق العنان اور غیر مسئول بنا کر نہیں چھوڑا ہے بلکہ اس کی عدالت کے لیے ایک دن مقرر ہے جو لازماً آ کے رہے گا۔

(۱۸-۳۰) ہولِ قیامت اور سرکشوں کے انجام کی تصویر، جس میں دکھایا ہے کہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی اٹل یا خدا کے کنٹرول سے باہر نہیں ہے بلکہ ہر چیز اس کے حکم کے تابع ہے۔ جب وہ چاہے گا ایسا صور پھونکے گا کہ سب قبروں سے نکل کر فوج در فوج اس کی طرف چل پڑیں گے۔ آسمان، زمین، دریا اور پہاڑ سب متزلزل، پراگندہ اور منتشر ہو جائیں گے۔ جہنم اس دن گھات میں ہوگی۔ وہی تمام سرکشوں کا ٹھکانا بنے گی۔ اس میں دکھ کی ساری چیزیں جمع ہوں گی لیکن لذت و راحت کا کوئی نشان بھی نہ ہوگا۔ ہر ایک کو اس کے اعمال سے سابقہ پیش آئے گا اور ہر شخص کا ہر عمل رجسٹر میں لکھا ہوا موجود ہوگا۔ اس سے کہا جائے گا کہ جو انجام تمہارے سامنے آیا ہے وہ تمہارے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اب اس کا مزا چکھو۔

(۳۱-۳۶) اس دن خدا ترسوں کو جو صلہ ملے گا اس کی طرف اشارہ کہ وہ اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے عمل کے صلہ سے بھی محروم نہیں رہیں گے بلکہ اپنی ہر نیکی کا اجر پائیں گے۔ حق کی خاطر انھوں نے مخالفین کے جو چرکے اور طعنے سہے ان سب کا ان کو اجر ملے گا اور ان کو ایسی پاکیزہ سوسائٹی نصیب ہوگی جس میں ان لغویات کا کوئی مذکور نہیں ہوگا جن سے ان کو دنیا میں سابقہ رہا۔

(۳۷-۴۰) ان لوگوں کو تنبیہ جو باطل شفاعت کے بل پر اس دن کی ہولناکیوں سے نچنت ہیں۔ ان کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ یہ دن آ کر رہے گا تو جو اپنے رب کی پناہ کا طالب ہے وہ اس کی راہ اختیار کرے۔ اللہ کے ہاں کوئی اس کی اجازت کے بغیر کسی کے لیے سفارش کا مجاز نہیں ہوگا اور اجازت کے بعد جو زبان کھولے گا وہ بالکل سچی بات کہے گا، کسی غلط بیانی کی جرأت کوئی نہیں کر سکے گا۔ اس دن ہر ایک کو اس کے اعمال سے سابقہ پیش آئے گا اور کافروں کے پلّے حسرت کے سوا کچھ پڑنے والا نہیں ہے۔

سُورَةُ النَّبَا

مَكِّيَّةٌ ———— آيات: ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۴۰

عَمَّ يَتَسَآءَلُونَ (١) عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ (٢) الَّذِي هُمْ فِيهِ
مُخْتَلِفُونَ (٣) كَلَّا سَيَعْلَمُونَ (٤) ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ (٥) أَلَمْ
نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَٰدًا (٦) وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا (٧) وَخَلَقْنَٰكُمْ
أَزْوَٰجًا (٨) وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (٩) وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا (١٠)
وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (١١) وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (١٢)
وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا (١٣) وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَٰتِ مَآءً
ثَجَّاجًا (١٤) لِّنُخْرِجَ بِهِۦ حَبًّا وَنَبَاتًا (١٥) وَجَنَّٰتٍ أَلْفَافًا (١٦)
إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَٰتًا (١٧) يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ
أَفْوَاجًا (١٨) وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ أَبْوَٰبًا (١٩) وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ
فَكَانَتْ سَرَابًا (٢٠) إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا (٢١) لِّلطَّٰغِينَ
مَـَٔابًا (٢٢) لَّٰبِثِينَ فِيهَآ أَحْقَابًا (٢٣) لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا
شَرَابًا (٢٤) إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا (٢٥) جَزَآءً وِفَاقًا (٢٦) إِنَّهُمْ
كَانُوا۟ لَا يَرْجُونَ حِسَابًا (٢٧) وَكَذَّبُوا۟ بِـَٔايَٰتِنَا كِذَّابًا (٢٨) وَكُلَّ

ع شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ﴿۲۹﴾ فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾
إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ﴿۳۳﴾
وَكَأْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾ لَّا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذَّابًا ﴿۳۵﴾ جَزَاءً
مِّن رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾ رَّبِّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا
الرَّحْمَٰنِ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ
صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾
ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ مَآبًا ﴿۳۹﴾ إِنَّا
أَنذَرْنَاكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا يَوْمَ يَنظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ
ع وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنتُ تُرَابًا ﴿۴۰﴾

ترجمۂ آیات ۱-۴۰

یہ لوگ کس چیز کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں؟ اس بڑی خبر کے بارے میں جس میں کوئی کچھ کہہ رہا ہے کوئی کچھ! ہرگز نہیں، وہ عنقریب جان لیں گے، پھر ہرگز نہیں، وہ جلد جان لیں گے!! ۱-۵

کیا ہم نے زمین کو گہوارہ اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا؟ تم کو جوڑے جوڑے نہیں پیدا کیا؟ تمھاری نیند کو دافعِ کلفت نہیں بنایا؟ رات کو تمھارے لیے پردہ اور دن کو وقتِ معاش نہیں بنایا؟ تمھارے اوپر سات محکم آسمان نہیں بنائے اور اس کے اندر ایک روشن چراغ نہیں رکھا؟ اور کیا ہم نے پانی سے لبریز بدلیوں سے موسلا دھار پانی نہیں برسایا کہ اس کے ذریعہ سے اگائیں غلہ اور نباتات اور گھنے باغ؟ ـــــ بے شک فیصلہ کے دن کا وقت مقرر ہے! ۶-۱۷

جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم آؤ گے فوج در فوج اور آسمان کھولا جائے گا تو اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلا دیے جائیں گے تو وہ بالکل سراب بن کر رہ جائیں گے۔ بے شک جہنم گھات میں ہے۔ سرکشوں کا ٹھکانا۔ اس میں رہیں گے مدتہائے دراز۔ نہ اس میں کوئی ٹھنڈک نصیب ہو گی، نہ گرم پانی اور پیپ کے سوا کوئی پینے کی چیز۔ بدلہ ان کے عمل کے موافق۔ یہ لوگ محاسبہ کا گمان نہیں رکھتے تھے اور انھوں نے ہماری آیتوں کی بے دریغ تکذیب کی اور ہم نے ہر چیز کو لکھ کر شمار کر رکھا ہے۔ تو چکھو، اب تمھارے عذاب ہی میں ہم اضافہ کریں گے۔ ۱۸ - ۳۰

بے شک خدا ترسوں کے لیے فائز المرامی ہے۔ باغ اور انگور۔ اٹھتی جوانیوں والی ہم سنیں، اور چھلکتے جام۔ نہ اس میں بک بک سنیں گے نہ بہتان طرازی۔ یہ تیرے رب کی طرف سے صلہ ہو گا، بالکل ان کے عمل کے حساب سے۔

آسمانوں اور زمین اور ان کے مابین کی ساری چیزوں کے ربّ رحمان کی طرف سے جس کی طرف سے یہ کوئی بات کرنے کا اختیار نہ رکھیں گے جس دن جبریل اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے کوئی بات نہیں کرے گا مگر جس کو ربِّ رحمان اجازت دے اور وہ بالکل ٹھیک بات کہے گا۔ یہ دن شدنی ہے تو جو چاہے اپنے رب کی طرف ٹھکانا بنا لے۔ ہم نے تم کو ایک قریب آ جانے والے عذاب سے آگاہ کر دیا ہے، جس دن آدمی اپنی اس کمائی کو دیکھے گا جو اس نے آگے کے لیے کی ہو گی اور کافر کہے گا کاش، میں مٹی ہوتا! ۳۷ - ۴۰

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

عَمَّ يَتَسَآءَلُوۡنَ (۱)

منکرین قیامت کا استہزاء

'عَمَّ' دراصل ہے 'عَنْ مَا' لیکن عام استعمال میں جس طرح بعض حروف کی آواز دب جاتی ہے اسی طرح 'عَمَّا' سے بھی 'الف' ساقط ہو گیا ہے اور یہ اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔

'تَسَاءُلٌ' کے معنی آپس میں کسی چیز سے متعلق پوچھ گچھ کرنے کے ہیں۔ پوچھ گچھ دریافتِ حال اور تحقیق کے لیے بھی ہوتی ہے اور بعض اوقات محض سخن گستری اور استہزاء کے لیے بھی یہاں یہ استہزاء کے مفہوم میں ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو جب انذارِ قیامت پر مشتمل سورتیں سنائیں تو لب و لہجہ کی حرارت، اندازِ بیان کی سطوت و ہیبت اور دلائل کی قطعیت نے ان کا چرچا بہت جلد ہر حلقہ میں پھیلا دیا۔ قریش نے اپنے عوام کو اس کے اثر سے بچانے کے لیے جہاں بہت سی احمقانہ تدبیریں اختیار کیں وہاں یہ اوچھی تدبیر بھی اختیار کی کہ اپنی مجالس میں اس کو اپنے مذاق اور طبع آزمائی کا موضوع بنا لیا تاکہ لوگوں پر یہ اثر ڈالیں کہ یہ چیز کسی سنجیدہ غور و فکر کے لائق نہیں ہے بلکہ محض خیالی ہوّا ہے جس سے متاثر ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بعض نے کہا کہ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ جب لوگ مر کر سڑ گل جائیں گے تو وہ از سرِ نو زندہ کیے جائیں! بعض نے اس پر گرہ لگائی کہ کیا بھلا ہمارے اگلے بھی اٹھائے جائیں گے جو نہیں معلوم کب پیوندِ زمین ہوئے اور ان کی قبروں کا کوئی نشان بھی باقی نہیں رہا! تیسرے نے پُر زور لہجہ میں اس کی تائید کی کہ ناممکن ناممکن، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، یہ سب محض خیالی باتیں ہیں۔

دوزخ اور اس کی آگ کا یوں مذاق اڑاتے کہ خوب ہو گی وہ آگ جس میں پانی بھی ہو گا اور درخت بھی! دوسرا اس نکتہ پر اس کو داد دیتا کہ بھلا یہ باتیں کسی کی عقل میں سمانے والی ہیں۔

جب قرآن نے ان کو آگاہ کیا کہ دوزخ پر انیس سرہنگ مامور ہوں گے تو اس کو انھوں نے اپنی طبع آزمائی کا موضوع بنا لیا۔ کوئی بولا کہ اگر اتنے ہی ہوں گے تو ان میں سے اتنوں سے تو میں تنہا نمٹ لینے کے لیے کافی ہوں۔ دوسرے نے ڈینگ ہانکی کہ پھر کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے، باقی سے نمٹنے کے لیے میں کمزور نہیں ہوں!

غرض قیامت اور اس کے احوال سے متعلق جو باتیں بھی ان کو سنائی گئیں ان سے سبق لینے کے بجائے انھوں نے ان کو مذاق میں اڑا دینے کی کوشش کی تاکہ ان کے عوام ان سے متاثر نہ ہونے پائیں۔

ان کی اسی طرح کی باتوں کو یہاں 'تساءل' سے تعبیر فرمایا ہے اور نہایت تیز و تند انداز میں پوچھا ہے کہ یہ لوگ کس چیز کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔

اس سوال سے اس سورہ کا آغاز اس کے مزاج کا پتہ دے رہا ہے کہ اس میں ان کو بتایا جائے گا کہ جس چیز کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں وہ مذاق اڑانے اور ہنسی دل لگی کی چیز نہیں بلکہ وہ سوچیں تو ان کے لیے سر پیٹنے اور خون کے آنسو بہانے کی چیز ہے۔

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۙ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (۲-۳)

زبان کا ایک اسلوب

'نبا' کسی بڑے واقعہ یا اہم خبر کو کہتے ہیں۔ اس آیت سے پہلے اگرچہ حرف استفہام لفظاً مذکور نہیں ہے لیکن معناً یہ بھی اسی استفہام کے تحت ہے جو پہلے آیا ہے۔ اس کی نہایت واضح مثال سورۂ انشراح میں موجود ہے۔ فرمایا ہے: 'اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ' (الانشراح ۹۴: ۱-۲) (کیا ہم نے تمہارے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تمہارے بوجھ کو اتار نہیں دیا؟) یہاں 'وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ' کا ٹکڑا دیکھیے لفظاً استفہام کے تحت نہیں ہے بلکہ بالکل سادہ خبریہ اسلوب میں ہے لیکن معناً یہ اسی کے تحت ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں بہت ہیں۔ اس سورہ میں بھی آگے اس کی مثالیں آ رہی ہیں۔ مترجمین عام طور پر اس اسلوب سے نا آشنا ہیں اس وجہ سے وہ اس طرح کے انشائیہ جملوں کا ترجمہ خبریہ اسلوب میں کر دیتے ہیں جس سے کلام کا اصل زور واضح نہیں ہوتا اس لیے کہ انشاء اور خبر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا یہ لوگ اس بے دردی اور جسارت سے اس عظیم خبر کا مذاق اڑا رہے ہیں جو قیامت اور روز جزا و سزا سے متعلق ان کو سنائی جا رہی ہے؟ یہ خبر تو ایسی ہے کہ حق تھا کہ اس کی فکر خواب و خور کی لذت سے ان کو محروم کر دیتی لیکن یہ ایسے شامت زدہ ہیں کہ اس سے ڈرنے اور اس کے لیے تیاری کرنے کے بجائے اس کو اپنے طنز و مذاق کا موضوع بنائے ہوئے ہیں۔

منکرین قیامت کا تناقض فکر

'اَلَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ'۔ لفظ 'اختلاف' بیک وقت دو معنوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک اختلاف رائے کو دوسرے تناقض فکر کو اور یہ دونوں معانی غور کیجیے تو معلوم ہوگا لازم و ملزوم ہیں۔ اختلاف رائے تناقض فکر ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ مشرکین عرب سے متعلق ہم جگہ جگہ اس حقیقت کا اظہار کر چکے ہیں کہ قیامت کے باب میں وہ نہایت شدید قسم کے تناقض فکر میں مبتلا تھے[1]۔ ایک گروہ ان کے اندر اس کا کھلم کھلا انکار کرتا تھا اور دوسرا جس کی تعداد زیادہ تھی، صریح انکار کے بجائے اس پر مختلف قسم کے شبہات وارد کرتا تھا۔ ان کا گمان تھا کہ اول تو اس کا ہونا ہی بہت مستبعد اور بعید از قیاس ہے

---

[1] مثلاً ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ نمل (۲۷) آیت ۶۶

اور ہوئی بھی تو اس کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا رُخ ہمارے دیوتاؤں کی طرف ہوگا جو ہمیں خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے اور اگر خدا سے سابقہ پڑا بھی تو اتنی بے شمار مخلوق کے سارے اعمال و اقوال کو کون جان سکتا ہے کہ وہ ان کا حساب کرنے بیٹھے۔ یہ اس خبط میں بھی مبتلا تھے کہ جب اس دنیا میں ان کا حال اچھا ہے جو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی نظروں میں اچھے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو عزت و سرفرازی اس نے ان کو اس دنیا میں دے رکھی ہے قیامت میں ان کو اس سے محروم کر دے۔

ان غلط خیالات کے ساتھ ساتھ وہ بہت سے ایسے صحیح عقائد کا اقرار بھی کرتے تھے جن سے ان باطل خیالات کی نفی ہوتی تھی لیکن قیامت اور جزا و سزا کو ماننا ان کی خواہش کے خلاف تھا اس وجہ سے وہ قرآن کی بار بار کی تذکیر کے بعد بھی اپنے فکری تناقض کا جائزہ لینے اور اس کو دور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے حالانکہ عقل اور فطرت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ انسان کو زندگی کے کسی ایسے معاملے میں اگر وہ یکسوئی حاصل نہ ہو جس میں اس کی ابدی فلاح یا ابدی ہلاکت کا راز مضمر ہے تو ان لوگوں کی بات توجہ سے سنے جو اس کے تضادِ فکر سے اس کو آگاہ کر رہے ہوں تاکہ ہلاکت سے محفوظ رہے۔ یہ درحقیقت اس کی اپنی ضرورت ہے نہ کہ یاددہانی کرنے والوں کی۔ قرآن نے یہاں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قرآن ان کو جس عظیم واقعہ کی خبر دے رہا ہے اس کے بارے میں ان کا فکری تناقض اور کسی ذہنی الجھن میں مبتلا رہنا کسی طرح ان کے لیے خوش انجام نہیں ہے۔ یہ ابدی ہلاکت یا ابدی سعادت کا معاملہ ہے۔ قرآن کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس نے اس تضاد و اختلاف سے نکلنے کی ان کو راہ دکھائی ہے۔ حق تھا کہ وہ اس کی قدر کرتے لیکن انھوں نے اپنی بدبختی سے اس کو تفریحِ طبع کا موضوع بنا لیا ہے۔

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (۴-۵)

منکرین کو تنبیہ

یہ نہایت زوردار الفاظ میں ان کو تنبیہ ہے کہ جو لذیذ خواب وہ دیکھ رہے ہیں یہ ہرگز پورے ہونے والے نہیں ہیں۔ قرآن جس انجام سے ان کو آگاہ کر رہا ہے وہ عنقریب ان کے سامنے آکے رہے گا۔ یہاں جملہ کی تکرار محض دعوے کو مؤکد کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ بیانِ حقیقت کے لیے ہے۔ اللہ کے رسولوں نے، جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مقامات میں لکھ چکے ہیں، اپنی قوموں کو بیک وقت دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ اول اس عذاب سے جو سنتِ الٰہی کے مطابق ہر اس قوم پر لازماً آیا ہے جس نے رسول کی تکذیب کر دی ہے۔ دوسرے اس عذاب سے جس میں وہ قیامت کے دن مبتلا ہوگی۔ ان دونوں عذابوں کو سامنے رکھ کر اس تنبیہی کلمہ کو دو بار دہرایا ہے۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّالْجِبَالَ أَوْتَادًا ۝ وَّخَلَقْنٰكُمْ أَزْوَاجًا ۝ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ

سُبَاتًاۙ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًاۙ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًاۙ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًاۙ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًاۙ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًاۙ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًاۙ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًاؕ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًاۙ (۶-۱۷)

آثارِ ربوبیت سے استدلال

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے ان آثار کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس کی قدرت، حکمت، رحمت، ربوبیت، توحید، قیامت اور ایک روزِ جزا و سزا کے لازمی ہونے پر ایسی واضح حجت ہیں کہ کوئی سلیم الفطرت ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ آخر میں یہ نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے کہ 'اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا' جو شخص بھی ان نشانیوں پر غور کرے گا وہ اس اعتراف پر مجبور ہو گا کہ اس کے بعد ایک فیصلہ کا دن ضرور آئے گا اور اس کا وقت اس کائنات کے خالق کے نزدیک معین ہے۔

'اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا' سب سے پہلے زمین اور اس کے پہاڑوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ انسان اگر روزِ جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے تو کیا وہ ربوبیت کے اس اہتمام پر غور نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے، بغیر کسی استحقاق کے، کر رکھا ہے کہ زمین کو اس کے لیے گہوارے کی طرح قرار و سکون کی جگہ بنایا ہے اور اس میں پہاڑوں کی میخیں ٹھونکی ہیں تاکہ یہ اپنی جگہ پر برقرار رہے، کوئی تزلزل اس میں نہ پیدا ہونے پائے۔

زمین کے اندر پہاڑوں کے لنگر انداز کرنے کی مختلف حکمتوں کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارے کیے ہیں۔ سابق سورہ میں بھی اس کی ایک عظیم مصلحت کی طرف اشارہ ہے۔ بعض مقامات میں اس کی یہ حکمت بھی بتائی ہے کہ زمین میں پہاڑ اس لیے گاڑے ہیں کہ وہ تمہارے سمیت کسی طرف لڑھک نہ جائے[1]۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اگر غور کرے تو یہ سمجھنے سے وہ قاصر نہیں رہے گا کہ جو رب اس زمین کے گہوارے میں اس اہتمام سے اس کی پرورش کر رہا ہے کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک ایسا دن نہ لائے جس میں ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس کی ربوبیت کا حق پہچانا اور اس کو ادا کیا ہو اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کی ناشکری اور نافرمانی کی ہو۔ ربوبیت کے ساتھ مسئولیت لازمی ہے۔ ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کائنات کے خالق کے نزدیک شکر گزار اور نابکار دونوں برابر ہیں۔ یہ ایسی بھونڈی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ سے متعلق اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

'وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا' اگرچہ اسلوبِ کلام باعتبارِ الفاظ خبریہ ہو گیا ہے لیکن معناً یہ 'اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا' ہی پر معطوف ہے۔ اس کی وضاحت اوپر آیات ۱-۲ کے تحت ہو چکی ہے۔

---

[1] وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ (النحل - ۱۶ : ۱۵) (اور زمین میں اس کے پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے کہ مبادا وہ تمہارے سمیت ڈھلک جائے)۔

یہ اشارہ ہے اس سب سے بڑے سامانِ تسلی کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں آدمی کے لیے مہیا کیا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے تمھیں تنہا نہیں پیدا کیا بلکہ تمھارے ساتھ تمھاری ہی جنس سے تمھارا جوڑا بھی بنایا تاکہ وہ تمھارے لیے طمانیت اور سکینت کا ذریعہ بنے۔ یہ امر واضح رہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز جوڑا جوڑا بنائی ہے اور یہ جوڑے آپس میں ایسی گہری وابستگی رکھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی تنہا اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا نہیں کر سکتا۔ ان میں بظاہر تو نسبت ضدین کی ہے لیکن قدرت نے ان کے اندر ایسے ظاہری و باطنی داعیات رکھے ہیں کہ وہ باہم مل کر رہنے ہی میں سکون و راحت پاتے اور ایک برتر مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت جس طرح اس دنیا کے تمام اضداد میں ہے اسی طرح میاں اور بیوی کے درمیان بھی ہے۔ اس چیز کی طرف قرآن نے سورۂ روم (۳۰) آیت ۲۱ میں یوں اشارہ فرمایا ہے: 'اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً' (اس نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تمھارے درمیان اس نے محبت اور غم گساری رکھی)۔ اضداد کے اندر اس توافق و سازگاری کو قرآن نے توحید اور قیامت کی دلیل کی حیثیت سے جگہ جگہ پیش کیا ہے جس کی وضاحت ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

'وَّجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا'۔ 'سبت' اور 'سبات' کے اصل معنی تو کاٹنے کے ہیں لیکن یہاں یہ دفعِ کلفت اور راحت و سکون کے معنی میں ہے۔ نیند کو 'سبات' اس وجہ سے کہا کہ یہ حرکت و عمل کے تسلسل کو منقطع کر کے کلفت سے نجات دیتی اور راحت و سکون حاصل کرنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے جس سے قویٰ تازہ دم ہو جاتے ہیں۔

'وَّجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا'۔ رات کو تمھارے لیے لباس بنایا۔ رات کے لباس ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح لباس آدمی کو اپنے اندر چھپا لیتا اور سکون و اطمینان بخشتا ہے اسی طرح شب کی چادر بھی اس کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے جس سے وہ خلل انداز ہونے والی چیزوں سے محفوظ ہو کر سکون حاصل کرتا اور از سرِ نو میدانِ عمل میں اترنے کے لیے صلاحیت بہم پہنچاتا ہے۔

'وَّجَعَلْنَا النَّھَارَ مَعَاشًا'۔ اور دن کو حصولِ معاش کی سرگرمیوں کا وقت بنایا۔

ان نشانیوں کی طرف توجہ دلانے سے مقصود یہ ہے کہ جو شخص بھی ان پر غور کرے گا اس میں بصیرت ہوگی تو وہ لازماً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ رات اور دن نہ از خود چکر کر رہے ہیں اور نہ ان کا یہ چکر بالکل بے غایت و بے مقصد ہے بلکہ ایک حکیم و تدبیر پروردگار اپنی خدمت کے لیے ان کو اس سرگرمی کے ساتھ معروف کیے ہوئے ہے تاکہ لوگ ان کی خدمت سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے اس رب کے شکرگزار رہیں جس نے ان کی معاش و معیشت اور راحت و آسائش کے لیے یہ عظیم اہتمام فرمایا ہے۔

ساتھ ہی یاد رکھیں کہ ربوبیت کا یہ اہتمام مستلزم ہے کہ ایک ایسا دن بھی آئے جس میں وہ دیکھے کہ کس نے اس دنیا میں آنکھیں کھول کر زندگی گزاری اور کون اندھے بہرے بنے رہے اور پھر دونوں کے ساتھ ان کے رویے کے مطابق معاملہ کرے۔

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا: زمین کی نشانیوں کے بعد آسمان کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا اب اوپر دیکھو ہم نے تمہارے اوپر سات محکم آسمان بنائے۔ آسمان کا ذکر اگرچہ یہاں الفاظ میں نہیں ہے لیکن جو صفات مذکور ہیں وہ خود دلیل ہیں کہ مراد آسمان ہی ہے۔ 'شداد' سے مراد وہی بات ہے جو سورۂ ملک میں یوں فرمائی گئی ہے:

الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰى فِيْ	جس نے پیدا کیے سات آسمان تہ بہ تہ۔ تم خدائے
خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ	رحمان کی کاریگری میں کوئی خلل نہیں پا سکتے۔ تو نگاہ
هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ	دوڑاؤ، کہیں اس میں کوئی شگاف دیکھتے ہو! پھر نگاہ
كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ	دوڑاؤ دوبارہ۔ نگاہ ناکام ہو کر تمہاری طرف پلٹ
هُوَ حَسِيْرٌ (الملک - ۶۷ : ۳-۴)	آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہو گی۔

مطلب یہ ہے کہ تم اس ناپیدا کنار چھت کو جہاں تک دیکھو گے اس کو محکم اور بالکل بے خلل پاؤ گے۔ کسی گوشے میں کسی ادنیٰ نقص کی بھی نشاندہی نہیں کر سکتے۔

وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا: اور آسمان میں ہم نے ایک روشن چراغ رکھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد سورج ہے۔ یہی سورج اس دنیا میں روشنی، حرارت اور قوت کا ذریعہ ہے۔ یہ نہ ہو تو یہ سارا عالم تیرہ و تار ہو جائے۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ آسمان اور زمین میں الگ الگ دیوتاؤں کی حکمرانی نہیں ہے بلکہ دونوں میں ایک ہی خدائے قادر و قیوم کی حکومت ہے ورنہ ان میں یہ سازگاری کس طرح وجود میں آتی کہ آسمان کا سورج زمین والوں کی اس طرح خدمت گزاری کرتا۔

وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا: 'مُعْصِرٰت' بادلوں کی صفت کے لیے معروف ہے۔ یہ صفت پانی سے لبریز بادلوں کے لیے بھی آتی ہے اور پانی نچوڑنے والی بدلیوں کے لیے بھی۔ دونوں صورتوں میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہو گا۔

'مَآءً ثَجَّاجًا': زوردار، کثیر اور موسلا دھار بارش کو کہتے ہیں۔

بارش سے قرآن نے اپنے تمام بنیادی دعاوی پر دلیل قائم کی ہے جس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔ یہاں اگرچہ آسمان و زمین کے توافق کے پہلو سے توحید کی دلیل بھی اس میں موجود ہے لیکن خاص طور پر ربوبیت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے جو مسئولیت اور جزاء و سزا کی نہایت اہم دلیلوں میں سے ہے۔

لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا: فرمایا کہ آسمانوں سے یہ بارش ہم اس لیے برساتے

ہیں کہ اس سے تمہارے لیے غلے اور تمہارے مویشیوں کے لیے گھاس اور سبزے اگائیں اور مزید برآں گھنے باغ۔

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا: یہ اوپر کی ساری بحث و تفصیل کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ یہ اہتمامِ ربوبیت اور آسمان سے لے کر زمین تک یہ انتظامِ پرورش صاف گواہی دے رہا ہے کہ جس پروردگار نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ انسان کو غیر مسئول نہیں چھوڑے گا بلکہ لازماً ایک فیصلہ کا دن اس نے مقرر کر رکھا ہے جس میں وہ سب کو جمع کرکے فیصلہ کرے گا کہ کس نے اس کی ربوبیت کا حق پہچانا اور کس نے اس کی ناقدری کی۔ پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔

یہاں یہ آیت اس طرح آئی ہے گویا یہ یوم الفصل اس کائنات کے نظام کے اندر سے خود اپنی منادی کر رہا ہے۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اس کو سن نہیں رہے ہیں۔ سعدیؒ نے کیا خوب بات کہی ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ۝ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۝ وَ
سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝ إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝ لِّلطَّاغِينَ مَآبًا ۝
لَّابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا ۝ لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ۝ إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا ۝
جَزَاءً وِفَاقًا ۝ إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ۝ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا ۝ وَكُلَّ شَيْءٍ
أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ۝ فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا (۱۸-۳۰)

قیامت کی ہلچل کی تصویر

اوپر کی آیات میں یوم الفصل کے دلائل بیان کرنے کے بعد اب ان آیات میں اس ہلچل کی تصویر کھینچی گئی ہے جو اس دن اس پوری کائنات میں برپا ہوگی اور ساتھ ہی وہ انجام بھی سامنے رکھ دیا گیا ہے جس سے سرکشوں اور نافرمانوں کو سابقہ پیش آئے گا۔

يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا: فرمایا کہ اس یوم الفصل کے لیے اللہ تعالیٰ تمہیں جمع کرنا چاہے گا تو اس کام میں اس کو ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ بس ایک صور پھونکا جائے گا اور تم فوج در فوج قبروں سے نکل کر اللہ کے داعی کی طرف چل کھڑے ہوگے۔ دوسرے مقام میں یہ تصریح بھی ہے کہ لوگ قبروں سے اس طرح نکلیں گے جس طرح ٹڈیاں نکلتی ہیں اور داعی کی طرف اس طرح بھاگیں گے کہ ذرا بھی راہ سے منحرف نہیں ہوں گے۔

وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا: اور یہ آسمان جو آج نہایت محکم اور ایک گنبد بے در کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اس دن اس طرح کھول دیا جائے گا کہ اس میں ہر طرف دروازے ہی دروازے نظر آئیں گے۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا: اور یہ پہاڑ جو آج زمین میں گڑے ہوئے ہیں اس دن اکھاڑ کر چلا دیے جائیں گے نیز آج وہ ٹھوس پتھر ہیں لیکن اس دن یہ ریت کے تودوں کی طرح پھس پھسے ہو جائیں گے۔

'اِنَّ جَهَنَّمَ کَانَتۡ مِرۡصَادًا ۙ لِّلطّٰغِیۡنَ مَاٰبًا': اس ہلچل کے بعد جہنم اچانک اس طرح نمودار ہو جائے گی گویا وہ سرکشوں کا ٹھکانا بننے کے لیے اس ہلچل کی آڑ میں گھات ہی میں بیٹھی ہوئی تھی، نہ اس کے لیے کوئی تیاری کرنی پڑے گی اور نہ سرکشوں کو اس کی تیاری کے انتظار میں کوئی مہلت ملے گی۔

'لّٰبِثِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَحۡقَابًا'۔ 'اَحۡقَابٌ' کے معنی قرنوں کے ہیں۔ اس کی وضاحت قرآن میں جگہ جگہ 'خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا' کے الفاظ سے ہو گئی ہے یعنی وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ بعض لوگوں نے اس سے طویل مدت مراد لے کر یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ جہنم بالآخر ایک دن ختم ہو جائے گی لیکن یہ رائے غلط ہے۔ زبان کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ مجمل کی شرح مفصل کی روشنی میں کرتے ہیں نہ کہ مفصل کی شرح مجمل کی روشنی میں۔ 'خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا' کے الفاظ ظاہر ہے کہ مفصل ہیں اور لفظ 'احقاب' مجمل۔ اس مجمل کو مفصل کی روشنی میں سمجھیں گے نہ کہ اس کے برعکس۔

علاوہ ازیں یہاں انجام باغیوں اور سرکشوں کا بیان ہوا ہے جس کے لیے قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ تصریح ہے کہ ان کو جہنم سے کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

'لَا یَذُوۡقُوۡنَ فِیۡهَا بَرۡدًا وَّ لَا شَرَابًا ۙ اِلَّا حَمِیۡمًا وَّ غَسَّاقًا': اس جہنم میں نہ ان کو کہیں ذرا ٹھنڈ نصیب ہوگی نہ کوئی پینے کی چیز۔ پینے کو ملے گا گرم کھولتا یا گندا پانی۔ لفظ 'غَسَّاقٌ' کی تشریح اہل لغت نے پیپ اور لہو سے بھی کی ہے اور گندے پانی سے بھی۔ ٹھنڈک کی یہاں مطلق نفی کی ہے۔ سورۂ مرسلات میں سایۂ 'ظلّ' کا لفظ آیا بھی ہے تو وہ دھوئیں کا سایہ ہے جس کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ نہ اس میں ٹھنڈک ہوگی نہ وہ شعلوں سے بچانے والا ہوگا۔

'جَزَآءً وِّفَاقًا'۔ یعنی یہ جو کچھ انھیں ملے گا ٹھیک ان کے اعمال ہی کا پورا پورا بدلہ ہوگا۔ دنیا میں جو کمائی انھوں نے کی اس کا انجام ان کے سامنے رکھا جائے گا۔ آخرت میں ہر نیکی اور بدی اپنی فطرت کے لحاظ سے پھل لائے گی اور وہی انسان کے سامنے آئے گا۔

'اِنَّهُمۡ كَانُوۡا لَا یَرۡجُوۡنَ حِسَابًا ۙ وَّ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا كِذَّابًا': یعنی ان لوگوں کو کسی حساب کتاب کا اندیشہ نہیں تھا اس وجہ سے بالکل نچنت رہے اور نہایت بے دردی سے ہماری آیات کو، جو اس دن سے آگاہ کرنے کے لیے سنائی گئیں جھٹلاتے رہے۔ 'كِذَّابًا' مصدر ہے جو تاکید فعل کے لیے آیا ہے، اگرچہ اس کا وزن مختلف ہے لیکن معنی میں 'تکذیب' ہی کے ہے۔ تاکید کے مضمون کو ظاہر کرنے کے لیے اگر ترجمہ یوں کیجیے کہ نہایت بے دردی یا نہایت بے باکی سے جھٹلایا تو اس کا صحیح مفہوم ادا ہو جائے گا۔

'وَ كُلَّ شَیۡءٍ اَحۡصَیۡنٰهُ كِتٰبًا'۔ یعنی وہ تو اس گمان میں رہے کہ نہ کوئی حساب ہے نہ کوئی سزا لیکن ہم نے ان کی ایک ایک بات لکھ کر شمار کر رکھی تھی۔ لکھ کر شمار کرنا پورے انضباط کی دلیل ہے۔ یعنی اس میں کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان نہیں ہے۔

'فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا'۔ یہ مستقبل کے ماجرے کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے حاضر کے اسلوب میں بدل دیا ہے۔ فرمایا کہ تم تو اس انجام سے بے فکر رہے لیکن یہ لو اپنے اعمال کا مزا چکھو۔ ساتھ ہی مستقبل سے ان کو بالکل مایوس کر دینے کے لیے یہ آگاہی بھی سنا دی کہ اب آگے تمھارے لیے عذاب ہی عذاب ہے۔ اس میں کسی کمی بیشی کی امید نہ رکھو۔ اب جو تبدیلی بھی تمھارے حال میں ہوگی اس کی نوعیت عذاب میں اضافے ہی کی ہوگی۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ۝ حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ۝ وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ۝ وَّكَاْسًا دِهَاقًا ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ۝ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا (۳۱-۳۶)

قیامت سے ڈرنے والوں کا صلہ

سرکشوں اور باغیوں کے انجام کے بعد یہ متقیوں کا صلہ بیان ہوا ہے تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آ جائے۔ فرمایا بے شک ان لوگوں کے لیے اس دن بڑی فیروز مندی و کامیابی ہے جنھوں نے روزِ جزا و سزا سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاری۔ یہ حقیقت یہاں ملحوظ رہے کہ زندگی کو جادۂ مستقیم پر استوار رکھنے والی چیز خوفِ آخرت ہی ہے۔ جس کے اندر یہ ہے وہ متقی ہے اور جس کا سینہ اس خوف سے خالی ہے اس کے اندر شیطان اپنا مسکن بنا لیتا ہے اور وہ خدا کی نافرمانی بالکل بے خوف ہو کر کرتا ہے۔

'حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا'۔ یہ اس کامیابی کی تفصیل ہے کہ ان کے لیے باغ ہوں گے اور انگور۔ 'حَدَآئِق' معروف تو کھجور کے باغوں کے لیے ہے لیکن کھجور کے باغوں کے لیے عمدہ طریقہ یہ تھا کہ کنارے کنارے کھجوروں کی باڑھ ہوا اور بیچ میں انگوروں اور دوسرے پھلوں اور سبزیوں کے قطعات۔ یہاں 'حَدَآئِق' کے بعد 'اَعْنَاب' کا ذکر عام کے بعد خاص کے ذکر کے طور پر ہے اور اس سے اگر انگورستان مراد لیں تو یہ بھی مراد لے سکتے ہیں۔

'وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا'۔ یہ حوروں کا ذکر ہے۔ ان کی تعریف میں فرمایا کہ یہ اٹھتی ہوئی جوانیوں والی اور باہم دگر بالکل ہم سن ہوں گی۔ ہم سنی آپس کی بے تکلفی، دل چسپی اور ہم طرحی و ہم مذاقی کے لیے ضروری چیز ہے۔

'وَّكَاْسًا دِهَاقًا ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا'۔ یعنی ان کے لیے شراب خالص کے چھلکتے جام ہوں گے لیکن یہ شراب ان لغویات اور لاف زنیوں سے بالکل پاک ہوگی جو اس دنیا کی شراب کے لوازم میں سے ہیں۔ کیف و سرور میں وہ سب سے بڑھ کر ہوگی لیکن عقل و ہوش کو ماؤف نہیں کرے گی کہ ترنگ میں آ کر آدمی یاوہ گوئی اور دروغ بافی پر اتر آئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شراب کی بدمستی میں بسا اوقات شرابی ایسی بے ہودہ تہمتیں بکسا دیتے ہیں جو خاندانوں اور قبیلوں میں مستقل عناد کا سبب بن جاتی ہیں۔ جن سوسائٹیوں میں غیرت کا احساس مردہ ہو جاتا ہے ان کے اندر تو اس طرح کی باتیں لوگ پی جاتے ہیں لیکن اہلِ عرب نہایت حساس و غیور تھے۔ شراب کی بدمستی میں بھی اگر کوئی زبان سے ایسا کلمہ نکال دے جس سے دوسرے کے ناموس پر حرف آتا ہو تو اس کے

نتائج اتنے دور رس ہوتے کہ ان کی تلافی ناممکن ہو جاتی۔ یہاں قرآن نے لفظ 'کِذّٰابٗ' سے اسی طرح کی باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا: جس طرح اوپر کفار کے بارے میں فرمایا ہے 'جَزَآءً وِّفَاقًا' ان کو ان کے اعمال کے بالکل ہم وزن اور ٹھیک ٹھیک ان کے موافق سزا ملے گی اسی طرح یہ اہل جنت کے باب میں فرمایا کہ ان کو ان کی نیکیوں کا پورے حساب سے صلہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اور اہل ایمان کے لیے فضل کا جو وعدہ ہے وہ مزید برآں ہے۔

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا یَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا (۳۷)

فرمایا کہ اہل ایمان کے لیے یہ صلہ (جو مذکور ہوا) اس خدائے رحمان کی طرف سے ہوگا جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری ہی چیزوں کا خداوند ہے، کوئی دوسرا کسی چیز میں اس کا شریک سہیم نہیں ہے کہ وہ کسی کو کچھ دے سکے۔

مزعومہ سفارشیوں کی نفی

لَا یَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا: یہ کفار اور ان کے مزعومہ معبودوں کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کے معبودوں کو خدا کے ہاں بڑی رسائی ہوگی۔ یہ جو چاہیں گے خدا سے کہہ سکیں گے اور جو چاہیں گے منوا سکیں گے، یہ خیال بالکل باطل ہے۔ کوئی بھی مجاز نہ ہوگا کہ اس سے کوئی عرض معروض کر سکے۔ اس کے سامنے وہی زبان کھولیں گے جن کو اس کی طرف سے اجازت مرحمت ہوگی اور وہی بات منہ سے نکالیں گے جو بالکل حق ہوگی۔

یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۗ لَّا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (۳۸)

مشرکین کو سب سے زیادہ اعتماد فرشتوں کی سفارش پر تھا جن کو وہ اپنے زعم کے مطابق خدا کی بیٹیاں فرض کر کے پوجتے تھے۔ فرمایا کہ اس دن ان کا حال یہ ہوگا کہ جبریلؑ اور دوسرے ملائکہ رب العزت کے سامنے اس طرح صف بستہ حاضر ہوں گے جس طرح خدام اپنے آقا کے حضور میں حاضر ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی زبان کھولنے میں پہل نہیں کرے گا بلکہ وہی بات کرنے کی جرأت کریں گے جن کو خدائے رحمان کی طرف سے اجازت مرحمت ہوگی اور وہی بات کہیں گے جو بالکل ٹھیک ہوگی ــــ یعنی اگر مشرکین اس خبط میں مبتلا ہیں کہ ان کے دیوی دیوتا خدا سے جو بات چاہیں گے ناز و تدلل سے منوا لیں گے اور ان کے حق میں جو سفارش چاہیں گے کر دیں گے تو یہ محض ان کی طمع خام ہے۔

یہاں روحؔ سے مراد حضرت جبریلؑ ہیں۔ ان کے لیے قرآن میں یہ لفظ جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ ملائکہ کے کُل سربسدی ہیں اس وجہ سے ان کا ذکر سب سے پہلے ہوا تاکہ واضح ہو جائے کہ جب اس دن

جبریلؑ کا یہ حال ہوگا تو تابہ دیگراں چہ رسد! بعض لوگوں نے اس کو عام ارواح انسانی کے مفہوم میں لیا ہے لیکن اس کا یہاں کوئی قرینہ نہیں ہے۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا (۳۹)

یہ براءتِ ذمہ کا اعلان ہے کہ لوگوں کو اس دن کی آمد سے آگاہ کرنا ضروری تھا سو یہ کام کر دیا گیا۔ اب لوگوں کی ذمہ داری اپنی ہے۔ فرمایا کہ جس دن کی آمد سے یہ ڈرایا جا رہا ہے وہ ایک امر شدنی ہے۔ وہ آکے رہے گا۔ نہ کوئی اس کو ٹال سکتا، نہ کوئی اس دن کسی کے کام آنے والا بنے گا تو جو اپنی خیر چاہے وہ اپنے رب کے پاس اپنا ٹھکانا بنالے۔

'فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا' سے ایک بات تو یہ نکلی کہ اس معاملہ میں اللہ اور رسول کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ لوگوں کو اس دن سے آگاہ کر دیا جائے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کا خوف اتار بھی دیا جائے۔

دوسری بات یہ نکلی کہ اس دن پناہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے گا، کسی اور کی پناہ اس دن کسی کو حاصل ہونے والی نہیں ہے۔

تیسری بات یہ نکلی کہ اللہ کو پناہ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اس کی بتائی ہوئی راہ اختیار کی جائے۔ جس نے یہاں اس کی راہ نہیں اختیار کی وہ آخرت میں اس کی پناہ نہیں حاصل کر سکے گا۔

اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا (۴۰)

یہ آخری تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ ہم نے ایک ایسے عذاب سے آگاہ کر دیا ہے جو بالکل قریب آچکا ہے۔ یعنی رسول کی بعثت کے بعد اب قوم کا فیصلہ ہونا تو سنتِ الٰہی کے مطابق قطعی ہے اور یہ عذاب منکروں کے لیے عذاب قیامت کا پیش خیمہ ہوگا۔ یوں بھی عذاب قیامت کو دور خیال کرنا نادانی ہے۔ اس لیے کہ یہ زندگی چند روزہ ہے اور جو مرا اس کی قیامت اس کے سامنے ہے۔ من مات فقد قامت قیامتہ۔

'وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا'۔ یعنی اس دن ہر شخص کے اعمال اس کے سامنے آئیں گے اور جنھوں نے اس دن کے لیے کوئی تیاری نہ کی ہوگی وہ اپنی محرومی اور بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے کہ کاش ہم مٹی ہی رہے ہوتے، ہمارا وجود ہی نہ ہوا ہوتا!!

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ اولاً و آخراً۔

رحمان آباد

۴۔ اپریل ۱۹۷۹ء

۶۔ جمادی الاول ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

79

النّٰزعٰت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود

اس سورہ میں بھی قریش کے ان متمردین کو انذار ہے جو عذاب اور قیامت کو بالکل بعید از امکان محض ایک دھمکی خیال کرتے تھے۔ ہواؤں اور بادلوں کے عجائب تصرفات شہادت میں پیش کر کے ان کو آگاہ فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے محفوظ نہ سمجھو اور رسول کو جھٹلانے کی جسارت نہ کرو۔ تم اسی وقت تک محفوظ ہو جب تک خدا نے تم کو مہلت دے رکھی ہے۔ جونہی یہ مہلت ختم ہوئی خدا کی پکڑ میں آ جاؤ گے اور اس کے لیے خدا کو کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑے گا۔ یہی ہوائیں اور یہی بادل جو ہر جگہ موجود اور تمھاری زندگی کے لیے ناگزیر ہیں، قہر الٰہی کی شکل اختیار کر لیں گے اور تمھیں جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔

تمہید اور مطالب کے اعتبار سے یہ سورہ، سورۂ ذاریات اور سورۂ مرسلات سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ دنیا میں خدا کی پکڑ اور اس کی قدرت و ربوبیت کی جو شانیں بالکل نمایاں ہیں وہ اس امر کی نہایت واضح دلیل ہیں کہ ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ ان سرکشوں کو سزا دے گا جنھوں نے اس کے حکموں سے سرتابی کی اور ان لوگوں کو اپنی ابدی رحمت سے نوازے گا جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرتے اور اپنی خواہشوں کو لگام لگاتے رہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۵) ہواؤں اور بادلوں کی شہادت اس امر پر کہ اللہ کا رسول دنیا اور آخرت کے جس عذاب سے آگاہ کر رہا ہے اس کا واقع ہونا ذرا بھی مستبعد نہیں ہے۔ جس خدا کے ہاتھ میں ہواؤں اور بادلوں کی باگ ہے وہ ان کو جس کے لیے چاہے رحمت اور جس کے لیے چاہے عذاب بنا دے۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز بھی بعید نہیں ہے۔ دنیا میں رسولوں کے مکذبین کی جو تاریخ موجود ہے وہ شہادت دیتی ہے کہ ایک دن سب کو اپنے رب کے آگے حساب و کتاب کے لیے پیش ہونا ہے۔

(۱-۱۴) قیامت کی دلیل اور اس دن اس کے جھٹلانے والوں پر جو گزرے گی اس کی تصویر۔

(۱۵-۲۶) قریش کے فراعنہ کی تنبیہ کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت کے اتنے حصہ کی یاددہانی جس کے لیے سورہ کا عمود مقتضی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت ناصحانہ انداز میں فرعون کو راہِ حق پر لانے کی کوشش کی لیکن اس نے اکڑ دکھائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی پکڑ میں آ گیا۔ اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو کوئی بڑا اہتمام نہیں کرنا پڑا۔ ہواؤں کے معمولی تصرّف ہی نے اس کا سارا بیڑا غرق کر دیا۔

(۲۷-۳۳) اس بات کی دلیل کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لوگوں کو از سرِ نو پیدا کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ جس نے آسمان و زمین پیدا کیے، رات اور دن نمودار کیے، لوگوں کی پرورش کے لیے طرح طرح کے سامان مہیا کیے اس کے لیے لوگوں کو دوبارہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے! اس کی قدرت دلیل ہے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے اور اس کی حکمت مقتضی ہے کہ وہ ایسا کرے۔

(۳۴-۴۱) باغیوں اور نافرمانوں کو اس دن جس انجام سے سابقہ پیش آئے گا اس کا بیان۔ ان کے بالمقابل اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو جو صلہ ملے گا اس کی بشارت۔

(۴۲-۴۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ جو لوگ تمھیں زچ کرنے کو قیامت کی تاریخ اور اس کے دن کی بابت سوال کرتے اور اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں تم ان کی باتوں کا دھیان نہ کرو۔ قیامت کے دن اور اس کی تاریخ کا معاملہ تم سے متعلق نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرو۔ تم اس کے ظہور کا دن معیّن کرنے نہیں آئے ہو، بلکہ اس سے لوگوں کو آگاہ کرنے آئے ہو۔ آج جن کو قیامت بہت بعید معلوم ہو رہی ہے جب وہ اس کو دیکھیں گے تو محسوس کریں گے کہ دنیا میں ایک سہ پہر یا ایک دوپہر سے زیادہ نہیں رہے۔

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ

مَكِّيَّةٌ ______ اٰيات : ٤٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ﴿١﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ﴿٢﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ آيات ١ - ٢٦
سَبْحًا ﴿٣﴾ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ﴿٤﴾ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴿٥﴾ يَوْمَ وقف لازم
تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ﴿٦﴾ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ﴿٧﴾ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ
وَّاجِفَةٌ ﴿٨﴾ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ﴿٩﴾ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ وقف لازم
فِي الْحَافِرَةِ ﴿١٠﴾ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ﴿١١﴾ قَالُوْا تِلْكَ
اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿١٢﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿١٣﴾ فَاِذَا وقف لازم
هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿١٤﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿١٥﴾ اِذْ نَادٰىهُ وقف لازم
رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿١٦﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ
طَغٰى ﴿١٧﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ﴿١٨﴾ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ
فَتَخْشٰى ﴿١٩﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿٢٠﴾ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿٢١﴾ ثُمَّ
اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿٢٢﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿٢٣﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿٢٤﴾
فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿٢٥﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً
لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿٢٦﴾ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰىهَا ﴿٢٧﴾ رَفَعَ ع

سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝٢٨ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝٢٩
وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝٣٠ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۝٣١
وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۝٣٢ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝٣٣ فَاِذَا جَآءَتِ
الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝٣٤ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝٣٥ وَ
بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝٣٦ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝٣٧ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا ۝٣٨ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝٣٩ وَاَمَّا مَنْ خَافَ
مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝٤٠ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ
الْمَاْوٰى ۝٤١ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۝٤٢ فِيْمَ
اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ۝٤٣ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ۝٤٤ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ
مَنْ يَّخْشٰىهَا ۝٤٥ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً
اَوْ ضُحٰىهَا ۝٤٦

ترجمۂ آیات ۱-۴۶

شاہد ہیں جبڑوں سے اکھاڑ پھینکنے والی ہوائیں، اور شاہد ہیں آہستہ چلنے والی ہوائیں اور شاہد ہیں فضاؤں میں تیرنے والے بادل، پھر ایک دوسرے پر سبقت کرنے والے اور خدا کے حکم نازل کرنے والے (کہ جس چیز سے تمھیں ڈرایا جا رہا ہے وہ شدنی ہے) ۱-۵

اس دن سے ڈرو جس دن کپکپی پڑے گی۔ اس کے پیچھے ایک دوسرا جھٹکا آئے گا۔ کتنے دل اس دن دھڑکتے ہوں گے۔ ان کی نگاہیں پست ہوں گی ۶-۹

پوچھتے ہیں کیا ہم پھر پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے! کیا جب کہ ہم کھنکھناتی

ہڈیاں ہو چکیں گے! کہتے ہیں، یہ لوٹنا یا جانا تو بڑے ہی خسارے کا ہو گا! ۱۰-۱۲

وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہو گی کہ دفعۃً وہ میدان میں آموجود ہوں گے۔ ۱۳-۱۴

کیا موسیٰ کی سرگزشت تمھیں پہنچی ہے؛ جب کہ اس کے رب نے وادیِ مقدس — طویٰ — میں اس کو پکارا کہ تم فرعون کے پاس جاؤ، اس نے بہت سر اٹھایا ہے۔ اس سے کہو کہ کیا تم میں کچھ اپنے کو سدھارنے کا جذبہ ہے؛ کیا میں تمھیں تمھارے رب کی راہ دکھاؤں کہ تم اس سے ڈرنے والے بنو؟ پس اس کو ایک بڑی نشانی دکھائی تو اس نے جھٹلایا اور بات نہ مانی۔ پھر پلٹا اپنی سرگرمیوں کو تیز کرتے ہوئے۔ پس جمع کیا اور اعلان کیا کہ تمھارا ربِ اعلیٰ تو میں ہوں۔ پس اللہ نے اس کو آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑا۔ بے شک اس میں سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو ڈر رکھنے والے ہیں۔ ۱۵-۲۶

کیا تمھارا بنانا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ اس کو اٹھایا، اس کے گنبد کو بلند کیا، پس اس کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ اس کی رات ڈھانک دی اور اس کے دن کو بے نقاب کیا اور زمین کو اس کے بعد ہموار کیا۔ نکالا اس سے اس کا پانی اور چارہ اور پہاڑوں کو اس میں گاڑا۔ تمھاری اور تمھارے مویشیوں کی نفع رسانی کے لیے۔ ۲۷-۳۲

پس جب وہ بڑا ہنگامہ برپا ہو گا (تو یہ سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا)، اس دن انسان اپنے کیے کو یاد کرے گا اور دوزخ ان لوگوں کے لیے بے نقاب کر دی جائے گی جن کو اس سے دوچار ہونا ہے۔ تو جس نے سرکشی کی اور آخرت

کے بالمقابل دنیا کی زندگی کو ترجیح دی اس کا ٹھکانا تو بس جہنم ہی بنے گی۔ اور وہ جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرا اور جس نے اپنے نفس کو خواہش کی پیروی سے روکا تو اس کا ٹھکانا لاریب جنت ہے۔ ۳۴-۴۱

وہ قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ وہ کب کھڑی ہوگی؟ تم اس بحث میں کہاں پڑے ہو! یہ معاملہ تو تیرے رب کے حوالہ ہے۔ تم تو بس ان لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے والے ہو جو اس سے ڈریں۔ جس روز وہ اس کو دیکھیں گے تو گویا انھیں ایک شام یا اس کی صبح سے زیادہ وقفہ نہیں گزرا۔ ۴۲-۴۶

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا (۱-۲)

'نازعات' سے مراد

'نَازِعَاتٌ' اور 'نَاشِطَاتٌ' کی تاویل میں یوں تو متعدد اقوال منقول ہیں لیکن غالب رائے یہ ہے کہ ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کفار کی جانیں سختی سے اور اہل ایمان کی جانیں نہایت نرمی سے نکالتے ہیں۔ اگرچہ اس قول کو شہرت حاصل ہے لیکن اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس باب میں جو روایات ہیں وہ بالکل تفسیری نوعیت کی ہیں، جن کا یہ درجہ نہیں ہے کہ ان کی بنیاد پر کوئی بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکے۔ قرآن میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے اس قول کے حق میں کوئی تائید نکلتی ہو۔ اہل کفر اور اہل ایمان کی جانوں کے نکالنے کا معاملہ تمام تر ایک روحانی و باطنی کیفیت سے تعلق رکھنے والا معاملہ ہے، وہ کوئی ایسی عام مشاہدے میں آنے والی چیز نہیں ہے کہ اس کو کسی دعوے پر بطور حجت پیش کیا جا سکے درآنحالیکہ یہ قسمیں یہاں بطور شہادت کھائی گئی ہیں۔ مفسرین کے نزدیک چونکہ ضروری ہے کہ قسم کسی مبارک و مقدس چیز کی ہو اس وجہ سے انھیں ان الفاظ سے فرشتوں کو مراد لینے کا تکلّف کرنا پڑا لیکن ہم برابر واضح کرتے آ رہے ہیں کہ قرآن میں قسمیں بالعموم کسی دعوے پر بطور شہادت آئی ہیں۔ ان کے اندر نمایاں پہلو دعوے پر دلیل کا ہوتا ہے۔ اس سے کچھ بحث نہیں کہ جس کی قسم کھائی گئی ہے وہ کوئی مقدس چیز ہے یا غیر مقدس۔

ہمارے نزدیک 'نازعات' سے مراد وہ تند ہوائیں ہیں جو درختوں، مکانوں اور گڑی ہوئی چیزوں کو اپنے زور سے اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ اس طرح کی ہواؤں کی صفت کے طور پر 'ذاریات'، 'مرسلات' اور 'عاصفات' وغیرہ الفاظ بھی قرآن میں استعمال ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ 'ذَرْوًا'، 'عُرْفًا' اور 'عَصْفًا' کے الفاظ بطور تاکید آئے ہیں۔ اسی طرح یہاں لفظ 'نازعات' ان تند ہواؤں کے لیے استعمال ہوا ہے جو درختوں اور مکانوں کو اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ اس کے ساتھ لفظ 'غَرْقًا' معنی کی شدت کے اظہار کے لیے بطور تاکید ہے۔

قوم عاد پر اللہ تعالیٰ نے باد تند کا جو عذاب مسلط فرمایا اس کی تصویر سورۂ قمر میں یوں کھینچی گئی ہے:

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۙ تَنزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنقَعِرٍ (القمر-۵۴: ۱۹-۲۰)

ہم نے ان پر ایک طویل نحوست کے زمانے میں بادِ صرصر مسلط کر دی جو لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی گویا وہ کھوکھلی کھجوروں کے تنے ہوں۔

یہاں فعل 'تَنۡزِعُ' استعمال ہوا ہے اسی سے اس سورہ میں 'نازعات' بطور صفت استعمال ہوا ہے۔

'ناشطات' سے مراد 'نَاشِطَاتٌ' 'نَشط' کے مادہ سے ہے جس کے معنی کسی کام کو نرمی سے کرنے کے بھی آتے ہیں اور کسی رسی کی گرہ یا کسی جانور کے بندھن کو چرنے چگنے کے لیے چھوڑ دینے کے معنی میں بھی۔ یہاں قرینہ بتا رہا ہے کہ یہ نرم رو اور آہستہ خرام ہواؤں کے لیے آیا ہے جس طرح سورۂ ذاریات میں 'فَالْجٰرِیٰتِ یُسۡرًا' کے الفاظ آئے ہیں۔

یہ امر واضح رہے کہ تند اور نرم رو ہواؤں کے عمل کی ظاہری نوعیت اگرچہ الگ الگ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے عجائبات تصرّف کی شانیں دونوں کے اندر نمایاں ہیں۔ سورۂ ذاریات میں سیاقِ کلام اور ہے اس وجہ سے ہوا کی نرم روی کا ذکر بارش کے مقدمہ کے طور پر آیا ہے۔ یہاں اس کا ذکر مستقلاً ہوا ہے اس وجہ سے یہ رحمت اور نقمت دونوں کو محتمل ہے۔ رحمت کے لیے اس کا محتمل ہونا تو بالکل واضح ہے کہ ہوا کی مروجہ جنبانی ہی زندگی اور راحت و نشاط کا ذریعہ ہے لیکن اس کا رحمت یا نقمت بننا کلیتہً اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہتا ہے تو بعض اوقات اس کی نرم روی کو بھی عذاب بنا دیتا ہے۔ چنانچہ آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جس سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے تند و تیز ہوا کے تصرف سے نجات دی اور اسی ہوا کے سکون کو فرعون اور اس کی فوجوں کی تباہی کا ذریعہ بنا دیا۔

وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا (۳-۵)

'سٰبِحٰتٌ' 'سَبۡحٌ' سے ہے جس کے معنی تیرنے کے بھی آتے ہیں۔ قرینہ اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں یہ بادلوں کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ اول تو ہواؤں اور بادلوں کا تعلق ہے ہی کچھ لازم و ملزوم سی چیز لیکن ایک واضح قرینہ یہاں یہ ہے کہ اس کے بعد اس کی دو صفتیں جو مذکور ہوئی ہیں وہ 'ف' کے ساتھ مذکور ہو عربیت کے قاعدے سے اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ صفتیں 'سٰبِحٰت' ہی کی ہیں اور ان میں باہم دگر ترتیب بھی ہے۔ اس قاعدے کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ 'فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا' کے الفاظ میں بادنیٰ تغیرِ الفاظ وہی بات فرمائی گئی ہے جو سورۂ ذاریات میں 'فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا ۙ فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا' کے الفاظ میں اور سورۂ مرسلات میں 'فَالۡفٰرِقٰتِ فَرۡقًا ۙ فَالۡمُلۡقِیٰتِ ذِكۡرًا' کے لفظوں میں فرمائی گئی ہے۔ مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ یہ بادلوں سے لدی ہوئی ان ہواؤں کی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس سرزمین کی طرف چلتی ہیں جس کے لیے حکم ہوتا ہے اور پھر وہاں وہ امرِ الٰہی کی تقسیم کرتی ہیں یعنی جس کے لیے جو حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتی ہیں۔ کسی علاقے پر وہ رحمت بن کر برستی ہیں اور کسی کے لیے عذاب بن جاتی ہیں۔ کسی جگہ جل تھل کر دیتی ہیں اور کسی جگہ کو خشک یا تشنہ چھوڑ

جاتی ہیں۔ گویا جو بات سورۂ ذاریات میں فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے وہی بات یہاں فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے۔

اس سے پہلے فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا کے الفاظ بادلوں کی اس بھاگ دوڑ کی تصویر پیش کر رہے ہیں جو فضا میں اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب ان کے مختلف دستے ایک دوسرے پر سبقت کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب اپنے غیبی حاکم کے حکم کی تعمیل میں سرگرم تگاپو ہیں اور ہر ایک اس بات کا آرزومند ہے کہ امتثالِ امر میں اول نمبر اسی کا رہے۔

مقسم علیہ محذوف ہے

ان قسموں کا مقسم علیہ یہاں لفظوں میں مذکور نہیں ہے بلکہ محذوف ہے۔ مقسم علیہ کے محذوف ہونے کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ سورۂ صٓ، سورۂ قٓ اور سورۂ قیامہ سب میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ مقسم علیہ حذف کر دیا گیا ہے۔ جہاں ذکر کی کوئی خاص ضرورت نہ ہو وہاں حذف ہی اولیٰ ہوتا ہے۔ یہاں چونکہ قیامت کی ہلچل کا ذکر آگے تفصیل سے موجود ہے، جو مقسم علیہ کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے، اس وجہ سے اس کے ذکر کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس محذوف کو کھولنا چاہیں تو سورۂ مرسلات کی روشنی میں اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ کے الفاظ یہاں محذوف مان سکتے ہیں۔ گویا تند و نرم ہواؤں اور بادلوں کے عجائب تصرفات کو شہادت میں پیش کر کے قریش کے متمردین کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ تمھیں جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے اس کو بعید از امکان نہ سمجھو۔ اللہ تعالیٰ جب اس کو لانا چاہے گا تو اس کے لیے کوئی خاص اہتمام اس کو نہیں کرنا پڑے گا۔ اس کی ہواؤں اور اس کے بادلوں کے تصرفات کی جو تاریخ موجود ہے اور جو تمھیں سنائی بھی جا چکی ہے اگر اسی سے سبق حاصل کرو تو وہی تمھارے لیے کافی ہے۔ تم سے کہیں زیادہ طاقتور قومیں اس زمین پر بسی ہیں جن کو خدا نے اپنی ہواؤں ہی کے ذریعہ سے خس و خاشاک کی طرح اڑا دیا۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ (۶-۷)

یہ مقسم علیہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا ہے، بلکہ اس دن کی یاد دہانی ہے جس دن اس عذاب سے سابقہ پیش آئے گا جس سے ان کو ڈرایا جا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک اس عذاب سے جس سے قیامت کے دن دوچار ہونا پڑے گا۔ دوسرے اس عذاب سے جس سے اسی دنیا میں قوم کو سابقہ پیش آتا ہے۔ اگر وہ اپنے رسول کی تکذیب کر دیتی ہے۔

قیامت کے دن کی یاددہانی

پہلے آیات ۶-۱۴ میں عذابِ قیامت کی تصویر ہے اس کے بعد آیات ۱۶-۱۷ میں اس عذاب کی تاریخی شہادت پیش کی گئی ہے جو تکذیبِ رسول کے نتیجہ میں اس دنیا میں پیش آتا ہے۔ عذابِ قیامت کا ذکر یہاں اس لیے مقدم کر دیا ہے کہ اصل عذاب وہی ہے جس سے ہر ایک کو ہوشیار

رہنا چاہیے۔ وہ دائمی اور ابدی ہے۔ اس کے ہوتے دنیا کا عذاب نہ بھی ہو جب بھی کسی کے لیے کوئی اطمینان کا پہلو نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید اہتمام ہے کہ وہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر اس دنیا میں بھی عذاب نازل کرتا ہے۔

یہاں 'یَوْمَ' سے پہلے فعل محذوف ہے۔ یعنی اس دن کو یاد رکھو یا اس کے ہم معنی کوئی فعل۔ 'رَاجِفَۃ' کے معنی کپکپی اور زلزلہ کے ہیں اور 'رَادِفَۃ' کے معنی پہلے جھٹکے کے بعد دوسرے جھٹکے کے۔ قیامت کی ہلچل، جیسا کہ دوسرے مقامات میں وضاحت ہو چکی ہے۔ صور کی دو پھونکوں میں مکمل ہوگی۔ یہاں انہی دونوں پھونکوں کے اثرات کی طرف اشارہ ہے۔ مقصود اس سے مکذبین قیامت پر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ قیامت کے ظہور کو بہت مستبعد اور ناممکن نہ سمجھو۔ بس دو جھٹکوں میں یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ (۸-۹)

اس دن کا اثر لوگوں کے دلوں پر

اوپر کی آیات میں اس دن کی ہلچل کے وہ اثرات بیان ہوئے ہیں جو اس کائنات میں نمودار ہوں گے۔ ان آیات میں اس کے ان اثرات کی طرف اشارہ ہے جو ارواح و قلوب پر طاری ہوں گے۔ فرمایا کہ اس دن کتنے دل ہوں گے جو دھڑک رہے ہوں گے اور ان کی نگاہیں سراسیمگی کے سبب سے جھکی ہوئی ہوں گی۔ یہ ان لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے جو اس دن سے نچنت رہے اور جب انھیں اس سے ڈرایا جاتا تو نہایت ڈھٹائی سے اس کا مذاق اڑاتے۔ رہے وہ لوگ جو اس دنیا میں، اس عذاب کو دیکھے بغیر، اس سے ڈرتے رہے وہ، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے، اس دن کی گھبراہٹ سے بالکل محفوظ ہوں گے۔

'اَبْصَارُھَا' میں ضمیر کا مرجع 'قُلُوْبٌ' ہے۔ آدمی کے اندر دل ہی وہ چیز ہے جس سے اس کی شخصیت عبارت ہے اور جس کی کیفیات کی ترجمانی اس کے بدن کا رواں رواں کرتا ہے۔ خاص طور پر اس کی آنکھ تو وہ چیز ہے جس کے آئینہ میں اس کے دل کی مخفی سے مخفی کیفیت بھی جھلکتی ہے۔ دل کے ساتھ آنکھوں کے اس تعلق کے سبب سے ان کی اضافت دل کی طرف کر دی ہے۔

يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۙ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۙ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ (۱۰-۱۲)

کفار کے استہزاء کی تصویر

یہ تصویر ہے ان کے اس مذاق کی جو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کا ذکر سن کر وہ نہایت بے باکی سے کرتے۔

'حَافِرَۃ' کے اصل معنی نقشِ قدم کے ہیں لیکن محاورے میں اگر کہیں کہ فلان رجع علی حافرتہ او فی حافرتہ تو اس کے معنی ہوں گے کہ فلاں شخص جس حال میں تھا اس سے نکل کر پھر الٹے پاؤں

اسی میں واپس آ گیا۔

یعنی جب انھیں ڈرایا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد حساب کتاب کے لیے زندہ کیے جاؤ گے تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور ایک دوسرے سے باندازِ استہزاء پوچھتے ہیں کہ کیوں جی! کیا مر جانے اور بوسیدہ ہڈیاں ہو جانے کے بعد پھر ہم زندگی کی حالت میں لوٹائے جائیں گے!

'ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً' میں استفہام کا اعادہ ان کی افزونیِ حیرت کو ظاہر کرتا ہے کہ اول تو مرنے کے بعد از سرِ نو زندہ کیے جانے کا تصور ہی عجیب ہے لیکن اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ جب ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو کر خاک میں مل جائیں گی تب لوگ زندہ کیے جائیں گے! ــــــ مطلب یہ ہے کہ بھلا ایسی بعید از عقل و قیاس بات کون مان سکتا ہے!

'قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ' یعنی مذاق اڑانے کے بعد ذرا سنجیدہ موڈ بنا کر یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ بات، جو یہ ملّا کہتے ہیں سچی نکلی تب تو یہ بڑی ہی نامرادی اور بڑے ہی خسارے کا لوٹنا ہوگا!

اگرچہ یہ بات سنجیدہ موڈ بنا کر کہتے وہ مذاق ہی کے طور پر لیکن یہ ان کے باطن کی غمازی بھی کرتی ہے کہ قیامت کی تکذیب پر ان کا دل مطمئن نہیں تھا۔ وہ اس کے دلائل کے وزن کو محسوس کرتے اور اس کے انکار کے عواقب سے ڈرتے لیکن زندگی کی لذتوں کو طلاق دے کر ان کی طبیعت ادھر آنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اس خطرے کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کرتے اور کہتے کہ قیامت ہوئی تو ہے تو یہ بہت بڑا خطرہ لیکن جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا، ابھی سے اس کی فکر میں اپنے اوپر نیند حرام کیوں کی جائے! یہ امر یہاں واضح رہے کہ بے فکروں کا اصلی فلسفہ یہی ہے جس پر وہ زندگی گزارتے ہیں حالانکہ آخرت کا گمان اگر کسی درجے میں بھی ہے تو پھر دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی اس کو پیش نظر رکھ کر اسی زندگی گزارے۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ (۱۳-۱۴)

یعنی جو سخن سازیاں یہ کرنی چاہتے ہیں کر لیں اور جتنے محالات پیدا کر سکتے ہیں کر لیں لیکن یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ جب ان کو اٹھانا چاہے گا تو نہ اس کو کوئی اہتمام کرنا پڑے گا، نہ اس میں ایک لمحہ کی تاخیر واقع ہوگی۔ صرف ایک ہی ڈانٹ میں یہ قبروں سے نکل کر میدانِ حشر میں موجود ہوں گے۔

'سَاهِرَةٌ' ہموار زمین اور کھلے میدان کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے میدانِ حشر مراد ہے۔ 'ایک ڈانٹ' سے اشارہ یہاں صور کے دوسرے نفخہ کی طرف ہے۔ اس کی وضاحت سورۂ زمر میں یوں فرمائی ہے:

'ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ' (الزمر ۔ ۳۹ : ۶۸) (پھر اس صور میں دوبارہ پھونک ماری جائے گی تو وہ دفعۃً اٹھ کر تاکنے لگیں گے)

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۘ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۱۵-۱۶)

تکذیبِ رسول کے نتیجہ میں جو عذاب آتا ہے اس کی شہادت

اوپر کے پیرے میں عذابِ قیامت کی تصویر تھی۔ اب یہ اس عذاب کی تاریخی شہادت کا حوالہ ہے جس سے رسولوں کے جھٹلانے والوں کو اس دنیا میں سابقہ پیش آیا ہے۔ اس کے لیے حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کا انتخاب فرمایا ہے جو سب سے زیادہ مشہور و معروف شہادت ہے۔

'هَلْ اَتٰىكَ' کا سوال محض سرگزشت کی عبرتوں کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے اور واحد کا خطاب ضروری نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہو بلکہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آرہے ہیں کہ یہ خطاب عام بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سرگزشت کے آخر میں فرمایا بھی ہے کہ 'اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰى' (۲۶) (بے شک اس سرگزشت کے اندر ان لوگوں کے لیے بڑا درسِ عبرت ہے جو خدا کی گرفت سے ڈرنے والے ہیں)۔

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشتِ حیات کے اس ماجرے کی طرف اشارہ ہے جب وہ مدین سے واپس ہوتے ہوئے طور کے دامن میں پہنچے ہیں اور آگ کی چمک دیکھ کر آگ لینے یا راستہ معلوم کرنے کے لیے راستہ کے اندھیرے میں، وادیِ طویٰ کی طرف گئے ہیں اور وہاں ان کو ایک درخت سے آواز آئی ہے کہ اے موسیٰ، میں تمہارا رب ہوں۔ میں نے تمھیں ایک کارِ عظیم کے لیے منتخب کیا تو تم فرعون کے پاس میرے رسول کی حیثیت سے جاؤ اور اس کو میرا پیغام پہنچاؤ۔

یہ سرگزشت یہاں چھوٹی چھوٹی کل بارہ آیتوں میں بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کے ایجازِ بیان کا اعجاز ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول ہونے سے لے کر فرعون کے غرق ہونے تک کے سارے مراحل اس میں اس طرح بیان ہو گئے ہیں کہ کوئی ایسا پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے جو مخاطبوں کی سبق آموزی کے لیے ضروری ہو۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِیَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (۱۷-۱۹)

یہ وہ پیغام ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے کر فرعون کے پاس بھیجا۔ فرمایا کہ فرعون کے پاس جاؤ اس نے بہت سر اٹھایا ہے۔ 'طَغٰى' سے مراد یہاں اس کے ربِ اعلیٰ ہونے کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کے ساتھ جابرانہ رویہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں کسی کا یہ دعویٰ کہ وہ لوگوں کا ربِ اعلیٰ ہے سب سے بڑی بغاوت ہے۔ اس بغاوت کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی خاص سند کے ساتھ اس کے پاس بھیجا کہ وہ پہلے اس کو نرمی کے ساتھ راہِ راست اختیار کرنے کی دعوت دیں، اگر سمجھ جائے تو فبہا ورنہ اس کے انجام سے اس کو آگاہ کر دیں۔

'فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى' یعنی اس سے کہو کہ کیا تم میں کچھ رغبت پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہے کہ میں تمھیں اس کا طریقہ بتانے کی کوشش کروں؟ اس فقرے پر غور فرمائیے تو معلوم ہو گا کہ اس میں بیک وقت انتہائی درجے کی ناصحانہ شفقت بھی ہے اور ساتھ ہی وہ عظمت و جلالت بھی جو اللہ تعالیٰ یا اس کے سفیر کے

کلام میں ہونی چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک تمھاری جو روش رہی ہے وہ تو یہی بتاتی ہے کہ تم سے کسی خیر کی توقع نہ رکھی جائے لیکن اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے۔ اب بھی گنجائش ہے کہ اگر تم سلامت روی کی زندگی اختیار کرنے کی رغبت ظاہر کرو تو یہ رستہ تم کو دکھانے کی کوشش کی جائے۔

فرعون کو حصول تزکیہ کی دعوت

لفظ 'تَزَکّٰی' یہاں وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی خودسری، انانیت اور ظلم اور جور سے پاک زندگی جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے بندے کی ہوتی ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد لوگوں کے نفوس کا تزکیہ ہی رہا ہے۔ یہ کام انھوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کی آیات کے ذریعہ سے انجام دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ارشاد ہے کہ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ (الجمعۃ-۶۲:۲) (وہی ہے جس نے بھیجا امیوں میں ایک رسول انہی میں سے جو ان کو سناتا ہے اس کی آیات اور ان کو پاکیزہ بناتا ہے) اپنے اسی مقصد کا اظہار حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے سامنے فرمایا کہ اگر تم خدائی کے پندار سے ذرا الگ ہو کر اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو تو میں تم کو اللہ کی کچھ باتیں سناؤں۔

'وَاَهْدِیَكَ اِلٰی رَبِّكَ فَتَخْشٰی' یعنی اس وقت تو تمھارے اوپر اپنی خدائی کا بھوت سوار ہے اس وجہ سے بالکل بگٹٹ چل رہے ہو لیکن بات سننے اور سمجھنے کا کچھ شوق ہو تو میں بتاؤں کہ تمھارا اور تمام جہان کا رب کون ہے جس سے سب کو ڈرنا چاہیے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ پاکیزہ زندگی خدا کی خشیت سے اور خدا کی خشیت اس کی صحیح معرفت سے پیدا ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان دو فقروں میں فرعون کو اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی۔

فَاَرٰىهُ الْاٰیَةَ الْكُبْرٰی (۲۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ باتیں چونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے فرمائیں اور ساتھ ہی فرعون کو اس بات سے بھی آگاہ فرمایا کہ وہ اپنے پاس خدا کے رسول ہونے کی سند بھی رکھتے ہیں تو فرعون نے کہا کہ میں تو اپنے سوا کسی اور رب سے واقف نہیں، اگر تمھارے پاس خدا کے رسول ہونے کی کوئی سند ہے تو وہ دکھاؤ۔ اس کے اس مطالبے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بڑی نشانی دکھائی۔ 'بڑی نشانی' سے اشارہ عصا کی نشانی کی طرف ہے۔ اس کو بڑی نشانی سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ ید بیضاء کے سوا ان کے سارے معجزات درحقیقت اسی کے اندر مضمر تھے اور اسی کے ذریعے سے ظاہر ہوئے۔

فَكَذَّبَ وَعَصٰی (۲۱)

فرعون کا سرگزشت

یعنی اس معجزہ کو دیکھنے کے بعد بھی فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا رسول تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو ساحر اور مفتری ٹھہرایا اور ان کی تکذیب کر دی۔ 'وَعَصٰی' یعنی اس دعوت کو جو اوپر آیات ۱۸-۱۹

میں مذکور ہوئی ماننے سے انکار کر دیا۔

ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰی (۲۲)

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات سن کر پٹھا تو ان کو شکست دینے کی سرگرمیوں میں معروف ہو گیا۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں ان سرگرمیوں کی تفصیل موجود ہے۔ اس نے چاہا کہ جادوگروں سے مقابلہ کرا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو شکست دی جائے لیکن درباریوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے یہ رائے دی کہ یہ دونوں (موسیٰ اور ہارون علیہما السلام) بڑے ماہر جادوگر ہیں، عام جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرانا شکست اور جگ ہنسائی کا سبب ہو سکتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مملکت کے تمام اطراف کے ماہر جادوگروں کو دعوت دی جائے اور ایک کھلے میدان میں ان دونوں سے ان کا مقابلہ کرایا جائے۔ چنانچہ اس مشورے پر عمل کیا گیا لیکن اس کا نتیجہ شدید ناکامی کی صورت میں نکلا۔

فَحَشَرَ فَنَادٰی ۞ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی (۲۳-۲۴)

یہ فرعون کی اس تدبیر کی طرف اشارہ ہے جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کے لیے سب سے آخر میں اختیار کی ہے۔ سورۂ زخرف سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مصر پر کوئی آفت آتی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کرتا کہ وہ اپنے رب سے دعا کریں کہ یہ بلا ٹل جائے، اگر ان کی دعا سے یہ بلا ٹل گئی تو وہ ان کا مطالبہ ضرور تسلیم کرے گا لیکن جب وہ بلا ٹل جاتی تو وہ پھر اپنے وعدے سے مکر جاتا۔ اس کی بار بار کی اس روش کا اثر یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سچائی کا اثر خود قبطیوں میں بہت بڑھنے لگا۔ اس سے گھبرا کر فرعون نے قوم کے تمام با اثر افراد کو جمع کیا اور ان کے اندر اپنا اثر بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر اس نے جو تقریر کی اسی کی طرف یہاں اجمالی اشارہ ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ زخرف میں ہے:

وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ	اور فرعون نے اپنی قوم میں پکار کر کہا، مصر
یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَ	کی بادشاہی اور یہ نہریں جو میرے نیچے
هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ	جاری ہیں، میرے لیے نہیں ہیں؟ کیا تم
اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۞ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ	لوگ دیکھ نہیں رہے ہو؟ تو یہ بہتر ہوا یا
هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ وَّلَا یَكَادُ	میں اس سے بہتر ہوں جو ایک حقیر آدمی ہے
یُبِیْنُ ۞ فَلَوْلَاۤ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ	اور اپنی بات کھل کر کہہ بھی نہیں سکتا! اگر یہ
مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ	خدا کا رسول ہے) تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس
مُقْتَرِنِیْنَ ۞ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ	پر سونے کے کنگن اتارے جاتے یا اس کے ساتھ
فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا	فرشتے پرے باندھ کر آتے! ان باتوں سے

قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ (الزخرف ۔ ۴۳ : ۵۴ - ۵۵)

اس نے اپنی قوم کو بے وقوف بنا لیا اور وہ تھے ہی نافرمان لوگ ۔ تو جب انھوں نے ہم کو غصہ دلا دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا ہیں ان سب کو غرق کر دیا ۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (۲۵)

'نَکَالٌ' کے معنی عبرت انگیز عذاب کے ہیں ۔ یعنی جب اس نے سب کچھ دیکھا درس لینے کے بعد بھی اپنی سرکشی ہی پر اصرار کیا تو اللہ نے اس کو آخرت اور دنیا دونوں کے عذاب میں پکڑا ۔ دنیا میں وہ سمندر کی موجوں کے حوالہ ہوا اور آخرت میں جہنم کے عذاب میں جھونک دیا جائے گا ۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰى (۲۶)

یہ وہ مقصد بیان ہوا ہے جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے ۔ فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لیے بڑا درس عبرت ہے جو خدا کی پکڑ سے ڈرنے والے ہوں ۔ بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے لیکن اشارہ خاص طور پر قریش کی طرف ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے اندر کچھ خوفِ خدا ہے تو وہ اس سے سبق حاصل کریں اور دانش مندو ہی ہے جو دوسروں کے انجام سے سبق حاصل کرے نہ کہ خود اپنے اوپر سیلاب بلا گزر جانے کا انتظار کرے ۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۭ بَنٰىهَا (۲۷)

آسمان و زمین کی نشانیوں سے استدلال

اب آگے کی سات آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور ربوبیت کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو آسمان و زمین کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں اور اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اس دنیا کا خالق ایسی عظیم قدرت والا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا کام بھی اس کے لیے مشکل نہیں ہے ۔ جب وہ آسمان جیسی عظیم چیز کو پیدا کر سکتا ہے تو لوگوں کے مرکھپ جانے کے بعد ان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اس کے لیے کیا دشوار ہے ؟ اسی طرح آسمان سے لے کر زمین تک اپنی ربوبیت کا جو اہتمام اس نے پھیلا رکھا ہے وہ اس بات کا شاہد ہے کہ وہ لوگوں کو غیر مسئول نہیں چھوڑے گا بلکہ ایک دن لازماً سب کو اکٹھا کرے گا اور یہ دیکھے گا کہ کس نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور کس نے ناشکری کی اور پھر ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزا یا سزا دے گا ۔ گویا منکرینِ قیامت کے جس شبہے کا آیات ۱۰ - ۱۲ میں حوالہ دیا گیا ہے اس کا جواب بھی دے دیا گیا اور ساتھ ہی قیامت کی ضرورت اور حکمت بھی واضح فرما دی گئی ہے ۔

'ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۭ بَنٰىهَا' ۔ فرمایا کہ اگر تمھیں اس بات پر تعجب ہے کہ مرنے اور ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے کے بعد تم دوبارہ کس طرح زندہ کیے جا سکتے ہو تو سوچو کہ یہ عظیم آسمان جو تمھارے سروں پر پھیلا ہوا ہے ، اس کو پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا تمھارا پیدا کیا جانا ؟ اگر اس کائنات کا خالق

اس آسمان کے بنانے پر قادر ہو سکتا ہے تو دوسرا کون سا کام ہے جو اس سے زیادہ مشکل ہے کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گا!

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۙ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا (۲۸-۲۹)

یہ آسمان کے اندر خدا کی عظیم قدرت و حکمت کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے تاکہ جو لوگ دوبارہ پیدا کیے جانے کو بعید از امکان سمجھ رہے ہیں وہ غور کریں کہ جس خدا کی قدرت کی یہ شانیں وہ ہر وقت دیکھ رہے ہیں اس کے لیے کسی کام کے ناممکن ہونے کا کیا سوال؟

'سَمْك' کے معنی چھت کے ہیں۔ فرمایا کہ اس نے آسمان کو بنایا، اس کی چھت کو بلند کیا اور پھر اس کو اس طرح ہموار کیا کہ کسی کے امکان میں نہیں کہ اس کے کسی کونے میں کسی خلل کی نشاندہی کر سکے۔

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا یعنی پہلے اس کے اندر رات ہی رات تھی۔ وہ جیسا کہ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں اشارہ ہے، دھوئیں کی شکل میں تھا۔ لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی رات ڈھانک دی۔ اس کے حصہ کی روشنی نمودار کی، رات اور دن دونوں کو ایک نظام کا پابند بنا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ جو خدا اس جہان پر رات طاری کر دینے پر قادر ہے، کیا اس کے لیے دنیا کے مرگھپ جانے کے بعد اس کو دوبارہ پیدا کرنا ناممکن ہو جائے گا؟ زیادہ مشکل پہلا کام ہے یا دوسرا؟

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ؕ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۪ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۙ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۳۰-۳۳)

آسمان کی نشانیوں کے بعد یہ زمین اور اس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی اور مقصود اس سے بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، خدا کی قدرت اور اس کی پروردگاری کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جس خدا نے زمین کو ہمارے لیے بچھایا، اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا، اس کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے اس کے اندر پہاڑوں کو گاڑا، کیا تم کو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا؟ جب اس نے یہ سارے کام کیے اور اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تو آپ اپنی ہی پیدا کی ہوئی مخلوق کو دوبارہ پیدا کر دینا کیوں دشوار ہو جائے گا!

'مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ' یہ اس ربوبیت کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس زمین کے چپے چپے پر نمایاں ہے۔ فرمایا کہ دیکھو تو معلوم ہوگا کہ تمھارے رب نے صرف تمھاری ہی ضرورت کا سامان نہیں کیا ہے بلکہ تمھاری خدمت کے لیے جو چوپائے پیدا کیے ہیں، ان کی ما یحتاج کا بھی پورا انتظام فرمایا ہے۔ اب غور کرو کہ جس پروردگار نے تمھاری پرورش کے لیے آسمان سے لے کر زمین تک یہ اہتمام فرمایا ہے کیا اس نے تمھیں محض اس لیے پیدا کیا ہے کہ کچھ عرصہ تک اس زمین میں کھاؤ پیو اور ایک دن ختم ہو جاؤ؟ اس سے اس کو کچھ بحث نہیں کہ تم میں سے کس نے نیکی کی زندگی بسر کی اور کس نے بدی کی؟ کس نے اپنے رب کی نعمتوں کا

حق پہچانا اور کس نے اندھے بہرے پن کی زندگی گزاری؟

غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یہ مفروضہ بالکل باطل ہے۔ یہ مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ دنیا محض ایک بازیچۂ اطفال ہے۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ العیاذ باللہ اس کا خالق حکیم نہیں، بلکہ ایک کھلنڈرا ہے جس کے نزدیک نیکی اور بدی میں کوئی امتیاز سرے سے ہے ہی نہیں ـــــ غور کیجیے کہ کیا اس کائنات کے عظیم خالق کے متعلق ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور کیا جا سکتا ہے!

ایک سوال اور اس کا جواب 'وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا' کے الفاظ سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زمین کی خلقت آسمان کے بعد ہوئی ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۱۱ میں زمین اور اس کی بعض اہم نشانیوں کی تخلیق کے بعد فرمایا ہے کہ 'ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ' (پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی اور وہ اس وقت دھوئیں کی شکل میں تھا) جس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ آسمان کی تخلیق زمین کے بعد ہوئی ہے ـــــ اس سوال کا جواب ہم حٰمٓ السجدۃ کی مذکورہ آیت کے تحت دے چکے ہیں۔ براہ کرم اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

یہاں اجمالاً صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ قرآن نے آسمان اور زمین کی تعمیر سے متعلق جو تصور دیا ہے وہ ایک مکان کی صورت میں دیا ہے جس میں آسمان کی حیثیت چھت کی اور زمین کی حیثیت فرش کی ہے۔ کسی مکان کا نقشہ جب بنایا جاتا ہے تو اس میں چھت اور فرش دونوں بیک وقت مدنظر ہوتے ہیں اور دونوں کا خاکہ ایک ہی ساتھ تیار کر لیا جاتا ہے لیکن تعمیر کے مختلف مراحل میں کبھی فرش اور اس کے متعلقات پر کام ہوتا ہے اور کبھی چھت اور اس کے اطراف پر۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلے آسمان پیدا ہوا یا زمین۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں اگرچہ بادیِ النظر ذہن اس طرف جاتا ہے کہ پہلے زمین کی تخلیق ہوئی لیکن ساتھ ہی اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جب خالق نے آسمان کی تعمیر کا قصد فرمایا تو وہ دھوئیں (یا سائنس دانوں کی اصطلاح میں سحابیے کی شکل میں) موجود تھا۔ اسی طرح یہاں زیر بحث آیت میں اگرچہ متبادر یہی ہوتا ہے کہ آسمان پہلے وجود میں آیا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ایک خاص مرحلۂ تعمیر کی بات ہو جس کے بعد زمین کی تعمیر کا آخری مرحلہ (یعنی اس کا بچھایا جانا) عمل میں آیا ہو۔ اس عظیم اور ناپیدا کنار کائنات کی تعمیر کا معاملہ ایسا نہیں ہے جو ہماری محدود عقل کی گرفت میں آ سکے۔ اس کے تمام مراحل کا احاطہ اللہ تعالیٰ کا محیطِ کل علم ہی کر سکتا ہے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى (۳۴)

'اَلطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى' کے معنی بڑی ہلچل اور بڑے ہنگامہ کے ہیں۔ مراد اس سے قیامت ہے۔ اس کے بعد اس شرط کا جواب برنبائے قرینہ محذوف ہے۔ اس طرح کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں اور اس کی بلاغت بھی ہم واضح کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ بڑا ہنگامہ برپا ہوگا تو یہ

آسمان و زمین سب درہم برہم ہو جائیں گے۔

یَوۡمَ یَتَذَکَّرُ الۡاِنۡسَانُ مَا سَعٰی (۳۵)

یہ 'یَوۡمَ' جواب شرط محذوف کا ظرف ہے جس طرح آیت ۶ میں 'یَوۡمَ' مقسم علیہ محذوف کا ظرف ہے۔ یعنی اس دن انسان اپنے کیے کو یاد کرے گا۔ آج تو اس کو غفلت کی سرمستی میں کچھ ہوش نہیں کہ وہ کیا بنا رہا ہے، جب اس کو اس دن سے ڈرایا جاتا ہے تو اس کا مذاق اڑاتا ہے، لیکن اس دن اس کو ہوش آئے گا اور وہ دیکھے گا کہ وہ دنیا میں کیا کمائی کر کے آیا ہے۔

وَبُرِّزَتِ الۡجَحِیۡمُ لِمَنۡ یَّرٰی (۳۶)

جہنم تیار ہے صرف پردہ اٹھنے کی دیر ہے

آج تو اسے آخرت اور جہنم بہت بعید از امکان نظر آتی ہے لیکن اس دن جہنم ان لوگوں کے لیے بے نقاب کر دی جائے گی جن کو اس سے دوچار ہونا ہے۔ 'بے نقاب کر دی جائے گی' یعنی وہ بالکل تیار ہے۔ بس پردہ اٹھنے کی دیر ہے۔ پردہ اٹھتے ہی وہ ان سب کے سامنے ہوگی جو اس کو آنکھوں دیکھے بغیر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

'لِمَنۡ یَّرٰی' یعنی جن کے لیے، ان کے اعمال کی پاداش میں، اس کا دیکھنا مقدر ہے وہ اس کو دیکھیں گے۔ رہے اللہ کے وہ بندے جو بن دیکھے ہی اس سے لرزاں و ترساں رہے ہیں۔ اللہ ان کو اس سے دور رکھے گا۔ وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے۔

فَاَمَّا مَنۡ طَغٰی ۙ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ۙ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الۡجَحِیۡمَ ہِیَ الۡمَاۡوٰی (۳۷-۳۹)

فرمایا کہ جس نے اس دنیا میں سرکشی کی ہوگی اور دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہوگی اس دن اس کا ٹھکانا بس جہنم ہی بنے گی جس سے اس کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ پیچھے آیت ۱۷ میں فرعون کے طغیان کا ذکر گزر چکا ہے یہاں 'اٰثَرَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا' سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس طغیان میں وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو آخرت کو نظر انداز کر کے اسی دنیا کے پجاری بن جاتے ہیں، اس سے الگ ہو کر وہ کسی چیز کو سوچنے اور ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔

'فَاِنَّ الۡجَحِیۡمَ ہِیَ الۡمَاۡوٰی' میں حصر کا مضمون ہے یعنی پھر ان کے لیے جہنم ہی جہنم ہے کوئی اور راہ ان کے لیے کھلنے والی نہیں ہے۔

وَاَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَہَی النَّفۡسَ عَنِ الۡہَوٰی ۙ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الۡجَنَّۃَ ہِیَ الۡمَاۡوٰی (۴۰-۴۱)

البتہ وہ لوگ جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرتے رہے اور دنیا کے پیچھے بھاگنے کے بجائے جنھوں نے اپنے نفس کو خواہشوں کی پیروی سے روکا تو ان کا ٹھکانا بس جنت ہی ہوگی وہ اس سے کبھی محروم نہ ہوں گے۔

'مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ' سے مراد خدا کے حضور پیشی سے ڈرنا ہے۔ سورۂ مطففین میں اس کی وضاحت یوں آئی ہے:

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (المطففین - ۸۳: ۴-۶)	کیا وہ یہ گمان نہیں رکھتے کہ وہ ایک بھاری دن کی حاضری کے لیے اٹھائے جانے والے ہیں؟ جس دن لوگ خداوند عالم کے حضور پیشی کے لیے اٹھیں گے!

اسی پیشی کا ڈر ہے جو انسان کو خواہشوں کی پیروی سے روکتا ہے۔ یہ ڈر نہ ہو تو نفس کو خواہشوں کے پیچھے بھاگنے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔

یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰھَا (۴۲)

نبی صلعم کو تسلی

یہ اور اس کے بعد خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی پروا نہ کرو جو تمھیں زچ کرنے کے لیے قیامت کے ظہور کا وقت پوچھتے ہیں۔ تمھارا کام اس سے لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے تاکہ جو متنبہ ہونا چاہیں وہ متنبہ ہو جائیں۔ رہے وہ جو اس کو دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں اور اس کے ظہور کا وقت معلوم کرنے کے درپے ہیں ان کو مطمئن کرنا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ انھوں نے محض اس کی تکذیب کے لیے ایک بہانہ بنایا ہے۔

'اَیَّانَ مُرْسٰھَا' یعنی یہ اس کے ظہور کے وقت سے متعلق سوال کرتے ہیں۔ 'اَیَّانَ' وقتِ مستقبل سے متعلق سوال کے لیے آتا ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ میرے نزدیک 'کہاں' صحیح نہیں ہوگا بلکہ 'کب' ہونا چاہیے۔

'مُرْسٰی' کے معنی لنگرانداز ہونے کے ہیں۔ اس لفظ میں یہاں ایک قسم کا طنز مضمر ہے۔ یعنی یہ منکرین پوچھتے ہیں کہ ہم کب سے یہ خبریں سن رہے ہیں کہ بس قیامت آیا ہی چاہتی ہے لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ آخر اس کا سفینہ ہمارے ساحل پر کب لنگرانداز ہوگا! اس کے انتظار میں تو ہماری آنکھیں پتھرا گئیں!

فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰىھَا ۝ اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَھٰھَا (۴۳-۴۴)

فرمایا کہ تمھیں اس بحث سے کیا تعلق؟ اس کا سرا تو صرف تمھارے رب کے پاس ہے۔ تم ان لوگوں کو یہ بتلانے نہیں آئے ہو کہ قیامت کس دن آئے گی۔ اس کا علم تمھارے رب کے سوا اور کسی کے پاس نہیں ہے تو جو سوال سرے سے تم سے متعلق ہے ہی نہیں تمھیں اس سے کیا واسطہ اور تم اس کی کھوج کرید میں کیوں پڑو! اس کو اللہ کے حوالہ کرو جو اس کا حقیقی علم رکھنے والا ہے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰھَا (۴۵)

جو لوگ قیامت کو دیکھ کر اس کو ماننا چاہتے ہیں ان کی ذمہ داری تمھارے اوپر نہیں ہے۔ ان کو

ان کے حال پر چھوڑ دو۔ تمھارا انذار صرف انہی پر کارگر ہوگا جو دلائل کی روشنی میں اس کو بن دیکھے ماننے اور اس سے ڈرنے کے لیے تیار ہوں۔

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا (۴۶)

یعنی آج اگر ان کو یہ دکھائی نہیں جاتی یا اس کی تاریخ نہیں مقرر کی جاتی تو اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ وہ اتنی دور ہے کہ اس کے لیے انھیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس دن اس کو دیکھیں گے اس دن کا احساس یہ ہوگا کہ گویا دنیا میں وہ ایک دن کے پچھلے یا اس کے پہلے پہر سے زیادہ نہیں رہے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اوّلاً و اٰخرًا۔

رحمان آباد

۲۷ / اپریل ۱۹۷۹ء

۲۹ / جمادی الاوّل ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۸۰

عبس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــــ النّٰزعٰت ـــــــ کے جوڑے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اسلوب بیان اور مواد استدلال میں بھی دونوں کے اندر نہایت واضح یکسانی ہے۔ مطالب کی ترتیب میں البتہ تبدیلی ہوئی ہے جس سے ایک نیا حسن اس میں پیدا ہو گیا ہے اور در اصل یہی وہ چیز ہے جو اس سورہ کو سابق سورہ سے ممتاز کرنے والی ہے۔ آپ دونوں کو سامنے رکھ کر آسانی سے ان کے مابہ الاشتراک اور مابہ الاختلاف کو معین کر سکتے ہیں۔

سابق سورہ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے یہ جو فرمایا ہے کہ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا (۴۵) (تم تو بس انہی لوگوں کو قیامت سے ڈرا سکتے ہو جو اس سے ڈرنے والے ہوں) اسی مضمون سے اس سورہ کی تمہید استوار فرمائی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو باندازِ عتاب قریش کے ان متمردین کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روک دیا ہے جو ایمان نہ لانے کے روز روز نئے نئے بہانے تلاش کرتے اور نازک مزاجی میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ آپ سے مطالبہ کرتے تھے کہ جب تک آپ اپنے غریب ساتھیوں کو اپنے پاس سے ہٹا نہیں دیں گے اس وقت تک وہ آپ کی مجلس میں بیٹھنے کے روادار نہیں ہوں گے۔ اس پوری سورہ میں انہی متمردین پر نہایت شدت سے عتاب ہے۔ اگرچہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن عتاب کا رُخ تمام تر قریش کے فراعنہ ہی کی طرف ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱ - ۱۰) ایک واقعہ کے تعلق سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ کہ جو لوگ اپنے کبر و غرور کے سبب سے تمھاری تعلیم و تذکیر سے مستغنی اور اس بات کے متمنی ہیں کہ تم اپنے غریب ساتھیوں کو اپنے پاس سے ہٹا دو تب وہ تمھاری مجلس میں بیٹھنے کے روادار ہوں گے، ان کی ناز برداری کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔

ان کے ایمان کی ذمہ داری تمھارے اوپر نہیں ہے کہ تم ان کی ناز برداری میں اپنے جاں نثار ساتھیوں کی حق تلفی کرو۔ تمھارے اوپر اصل ذمہ داری انہی کی تربیت کی ہے جو تمھارے پاس ذوق و شوق سے آتے ہیں۔ جو نہیں آتے اور اپنی ناز برداری کے طالب ہیں ان کے بارے میں تم مسئول نہیں ہو کہ ان کو پانے کے لیے اپنوں کو ضائع کر دو۔

(۱۱-۱۶) قرآن کی عظمت کا بیان کہ یہ اللہ کی نازل کی ہوئی یاددہانی ہے تو جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے۔ جو اس کی ناقدری کریں گے وہ اس کا نتیجہ خود بھگتیں گے یہ اللہ رب العٰلمین کا نازل کردہ واجب الاذعان ہے، کسی سائل کی درخواست نہیں ہے۔ اس کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرو جو اس کے شایانِ شان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن کی امانت میں اس کو محفوظ کیا ہے سب عالی مقام اور بلند مرتبہ لوگ ہیں اور تم بھی انہی کے زمرہ سے تعلق رکھنے والے ہو۔ سرکشوں اور مغروروں کی ناز برداری میں اتنا نہ جھکو جو تمھارے منصب اور تمھارے اس پیغام کے وقار کے خلاف ہے۔

(۱۷-۲۳) ان سرکشوں کی حالت پر اظہار افسوس جو قیامت کے انکار پر اڑے ہوئے ہیں۔ ان کو خود ان کی خلقت اور زندگی کے مراحل کی یاددہانی کہ جو انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے اور مختلف مراحل طے کرتا ہوا قبر تک پہنچتا ہے حیف ہے اگر وہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو ناممکن سمجھے! جو اتنے واضح دلائل کے بعد بھی سمجھنے اور ماننے پر تیار نہیں ہوا وہ کسی دلیل سے بھی قائل نہیں ہو سکتا۔

(۲۴-۳۲) خلقت اور مراحلِ زندگی کی طرف توجہ دلانے کے بعد ربوبیت کے اس وسیع اہتمام کی طرف اشارہ جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور چوپایوں کے لیے اس دنیا میں کر رکھا ہے اور جو اس امر کی نہایت واضح شہادت ہے کہ جس نے یہ سارا اہتمام کیا ہے وہ لوگوں کو غیر مسئول نہیں چھوڑے گا بلکہ ایک دن وہ سب سے ان نعمتوں کا حساب لے گا۔ اس دن فائز المرام وہی ہوں گے جنھوں نے نعمتوں کا حق ادا کیا ہوگا جنھوں نے ان کا حق ادا نہیں کیا ہوگا وہ سب اس دن ذلیل و نامراد ہوں گے۔

(۳۳-۴۲) قیامت کے دن کی تصویر۔ اس دن ہر شخص پر نفسی نفسی کی جو حالت طاری ہوگی اس کا نقشہ۔ جن لوگوں نے قیامت کی پیشی سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاری ان کی شادمانی اور جو اس سے بے فکر رہے اور اسی حال میں مرے ان کی بدبختی و سیہ روئی کا بیان۔

سُوْرَةُ عَبَسَ

مَكِّيَّةٌ ______________ اٰيات: ۴۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ۱-۴۲
عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ① اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ② وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ
يَزَّكّٰٓى ③ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ④ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ⑤
فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ⑥ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ⑦ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ
يَسْعٰى ⑧ وَهُوَ يَخْشٰى ⑨ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ⑩ كَلَّآ اِنَّهَا
تَذْكِرَةٌ ⑪ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ⑫ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ⑬ وقف لازم
مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ⑭ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ⑮ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ⑯
قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ⑰ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ⑱ مِنْ
نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ⑲ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ⑳ ثُمَّ
اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ㉑ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ㉒ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ
مَآ اَمَرَهٗ ㉓ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ㉔ اَنَّا صَبَبْنَا
الْمَآءَ صَبًّا ㉕ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ㉖ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا
حَبًّا ㉗ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ㉘ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ㉙ وَّحَدَآئِقَ
غُلْبًا ㉚ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ㉛ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ㉜ فَاِذَا

جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿۳۴﴾ وَأُمِّهٖ
وَأَبِيهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ
يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيهِ ﴿۳۷﴾ وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾
ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾
ع تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۴۲

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ آیا اس کے پاس نابینا اور تمھیں کیا معلوم شاید وہ اپنی اصلاح کرتا یا نصیحت سنتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی! ۱-۴

جو بے پروائی برتتا ہے اس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے اور جو تمھارے پاس شوق سے آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے تو تم اس سے بے پروائی برتتے ہو۔ ۵-۱۰

ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی ہے تو جو چاہے یاددہانی حاصل کرے۔ لائق تعظیم، بلند اور پاکیزہ صحیفوں میں، معزز باوفا کاتبوں کے ہاتھوں میں۔ ۱۱-۱۶

بُرا ہو آدمی کا، یہ کتنا ناشکرا ہے! اسے کس چیز سے پیدا کیا؟ پانی کی ایک بوند سے! اس کو پیدا کیا۔ پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھہرایا۔ پھر اس کے لیے راہ آسان کر دی۔ پھر اس کو موت دی۔ پھر اس کو دفن کرایا پھر جب چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔ ۱۷-۲۲

ہرگز نہیں، اس نے اس حکم کی تعمیل اب تک نہ کی جو اس کے رب نے اسے دیا۔ پس انسان اپنی غذا پر دھیان کرے کہ ہم نے برسایا پانی اچھی طرح، پھر پھاڑا

زمین کو اچھی طرح۔ پھر اُگائے اس میں غلّے، انگور، ترکاریاں، زیتون، کھجور، گھنے
باغ، میوے اور سبزہ، تمھاری اور تمھارے مویشیوں کی نفع رسانی کے لیے۔ ۲۴-۳۲
پس جب وہ کانوں کو بہرا کر دینے والی آواز آئے گی! (تب وہ شدنی ظاہر
ہو گی) اس دن آدمی اپنے بھائی، ماں باپ اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے بھاگے گا۔
اس دن ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہو گی۔ کتنے چہرے اس دن روشن ہوں گے،
ہشاش بشاش! اور کتنے چہروں پر اس دن خاک اڑتی اور سیاہی چھائی ہو گی۔ یہی
کافر و نابکار ہوں گے! ۳۳-۴۲

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ۙ اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی (۱-۲)

عبداللہ بن ام مکتوم کے واقعہ کی نوعیت

'عَبَسَ'، کا فاعل یہاں مذکور نہیں ہے لیکن آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ فاعل نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ 'اَعْمٰی' سے یہاں اشارہ، تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ عبداللہ بن ام مکتومؓ کی طرف ہے۔ یہ ایک نادار اور نابینا صحابی تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے لیڈروں میں سے کسی سے یا ان کی کسی جماعت سے باتیں کر رہے تھے۔ آپ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تھا اور وہ اپنے اعتراضات و شکوک پیش کر رہے ہوں گے کہ اسی اثنا میں عبداللہ بن ام مکتومؓ تشریف لائے اور موقع کی نزاکت کا اندازہ نہ کر سکنے کے باعث وہ بھی مجلس میں پہنچ گئے۔ ان کا یہ بے موقع آجانا حضورؐ کو ناگوار گزرا۔ اس ناگواری کی وجہ العیاذ باللہ یہ تو نہیں ہو سکتی کہ وہ نادار یا نابینا تھے، ناداروں اور نابیناؤں کی قدر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کر سکتا تھا، البتہ حضورؐ کو اندیشہ ہوا ہو گا کہ ان وحشیوں کو ذرا مانوس کرنے کا جو موقع میسر آیا ہے عبداللہ بن ام مکتومؓ کے آجانے سے وہ ضائع ہو جائے گا۔ یہ بدک جائیں گے اور کہیں گے کہ جب تم نے اس طرح کے منگلوں اور قلاشوں کو اپنے ارد گرد اکٹھا کیا ہے تو تمہاری مجلس میں بیٹھ کر کون اپنی عزت گنوائے گا۔

قریش کے لیڈروں کی نازک مزاجی

یہ امر واضح رہے کہ قریش کے فراعنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراضات تھے ان میں ایک بڑا اہم اعتراض یہی تھا کہ آپ کے ساتھی قلاش اور مفلس لوگ ہیں۔ اس چیز کو وہ آپ کی نبوت کے خلاف ایک دلیل بنائے بیٹھے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کے لیے یہ خیال بھی باعثِ تردد ہوا ہو گا کہ ممکن ہے یہ اپنی بڑائی کے نشہ میں آپ کے ایک محبوب صحابی کی کوئی توہین یا دل آزاری کر بیٹھیں جس سے مزید بدمزگی پیدا ہو۔

اسی واقعہ کو، جو بالکل اتفاق سے پیش آگیا، اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دینے کا ذریعہ بنا لیا کہ آپ اپنی توجہ کا اصل مرکز اپنے ان صحابہؓ کو بنائیں جو اپنی اصلاح و تربیت کے طالب اور شوق و ذوق سے آپ کی مجلس میں حاضر ہوتے ہیں، ان لوگوں کے درپے زیادہ نہ ہوں جو بے نیاز ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ ان کی ناز برداری کریں۔

مغروروں کو نظرانداز کرنے کی ہدایت

پچھلی سورتوں میں یہ بات جگہ جگہ واضح ہو چکی ہے کہ ابتدا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے لیڈروں کو دعوت دینے کا خاص اہتمام تھا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ آپ کو اول اول، جیسا کہ آیت

'وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ' (الشعراء ۲۶: ۲۱۴) سے واضح ہے انہی کو خطاب کرنے کا حکم ہوا تھا۔ دوسری یہ کہ ان لوگوں کو پورے عرب کی سیادت و قیادت حاصل تھی۔ توقع تھی کہ اگر یہ دعوت قبول کر لیں گے تو پورے عرب میں دعوت کی کامیابی کی راہ کھل جائے گی۔ چنانچہ کچھ عرصے تک حضورؐ نے اپنا سارا زور انھیں پر صرف فرمایا اور ان کی طرف سے انتہائی رعونت اور توہین و دل آزاری کے اظہار کے باوجود آپ ان کو دعوت دینے میں لگے رہے لیکن جب ان کی رعونت بہت بڑھ گئی اور یہ واضح ہو گیا کہ یہ ہٹ دھرم نہ صرف یہ کہ کوئی اصلاح قبول کرنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے جو وقت ضائع ہو رہا ہے اس سے ان غریب مسلمانوں کی حق تلفی ہو رہی ہے جو ایمان لا چکے ہیں اور جو اپنی تعلیم و تربیت کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کے ان ناقدروں سے زیادہ مستحق ہیں تو آپ کو ان کے زیادہ درپے ہونے سے روک دیا گیا اور اس کے لیے عبداللہ بن ام مکتومؓ کے واقعہ نے ایک نہایت مناسب موقع تقریب پیدا کر دی۔

وَمَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ۙ﴿۳﴾ اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَہُ الذِّکۡرٰی (۳-۴)

آنحضرت صلعم کو تنبیہ کی نوعیت

اوپر کی آیات سے صرف ایک واقعہ کی خبر سامنے آئی ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کس کا ہے اور نہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے ذکر سے مقصود کیا ہے لیکن یہاں 'یُدۡرِیۡکَ' کے خطاب سے یہ بات نکلتی ہے کہ واقعہ کا تعلق حضورؐ سے ہے اور آپ کو اس بات پر متنبہ فرمایا جا رہا ہے کہ آپ کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں بعض اوقات اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ گلے کی بھیڑوں کی دیکھ بھال میں کوتاہی ہو جاتی ہے۔

پہلے ٹکڑے میں خطاب کے نہ ہونے سے قاری کے ذہن میں یہ سوال تو پیدا ہوتا ہے کہ معلوم کرے کہ کس کا واقعہ بیان ہو رہا ہے لیکن چونکہ مخاطب واضح نہیں ہے اس وجہ سے اس کو اپنی ذات سے متعلق کوئی پریشانی پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چنانچہ حضورؐ کے اندر بھی واقعہ سے متعلق سوال تو فوراً پیدا ہوا ہو گا لیکن خطاب چونکہ براہِ راست نہیں تھا اس وجہ سے کچھ زیادہ پریشانی نہیں ہوئی ہو گی۔ برعکس اس کے اگر خطاب معین ہوتا تو یہ عتاب بہت سخت ہو جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں یہ بات متعین ہو جاتی کہ آپ پر عتاب ہوا اور وجہ عتاب یہ ہے کہ آپ نے ایک نابینا کے آنے پر ترش رویہ اختیار فرمایا اور آپ کا تیکھا واقعہ جیسا کہ اوپر واضح ہوا اور آگے آ رہا ہے، یہ نہیں ہے۔

حضرات انبیاءؑ کی لغزش کی نوعیت

آیاتِ زیر بحث میں خطاب اس لیے واضح فرما دیا ہے کہ یہاں وہ بات بھی بیان فرما دی گئی ہے جس پر عتاب ہوا ہے۔ یہ بات کسی فرض میں کوتاہی کی نوعیت کی نہیں بلکہ ادائے فرض میں حدِ مطلوب سے تجاوز کی نوعیت کی ہے۔ ہم یہ حقیقت جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ نفس کی خواہشوں کی پاسداری کی نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی

وہ اپنے رب کی رضا طلبی کے جوش میں اس حد سے آگے نکل جایا کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہوتی ہے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شریعت دینے کے لیے طور پر بلایا تو اس کے لیے ایک خاص تاریخ بھی مقرر فرمادی لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام فرطِ شوق میں مقررہ تاریخ کا انتظار نہ کر سکے بلکہ اس سے پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ ان کی اس عجلت پر گرفت ہوئی تو انھوں نے یہ معذرت پیش کی کہ اے رب، میں تیری رضا طلبی کے شوق میں جلدی چلا آیا ہوں۔ اس طرح کی لغزش ظاہر ہے کہ نہایت اعلیٰ جذبہ سے ہوتی ہے۔ لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام حق و عدل کی کامل میزان ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح کی لغزشوں پر بھی گرفت فرماتا ہے تاکہ میزان ہر پہلو سے درست رہے۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جس لغزش پر گرفت فرمائی گئی ہے وہ بھی اسی نوعیت کی ہے۔ سادات قریش کے ایمان لانے سے چونکہ آپ پورے عرب کے لیے دعوت کی راہ کھلنے کی توقع رکھتے تھے اس وجہ سے اس کام میں آپ کا انہماک اس قدر بڑھ گیا کہ نہ آپ کو اپنے ذاتی آرام کا کوئی فکر رہی، نہ اس امر کا کوئی خیال رہا کہ یہ لوگ آپ کی ذات اور آپ کی دعوت کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس انہماک سے یہ اندیشہ بھی پیدا ہوگیا کہ جو غریب مسلمان ایمان لاچکے ہیں ان کی تربیت کی جو ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے اس کو ادا کرنے کے لیے بھی آپ مشکل ہی سے کچھ وقت نکال سکیں گے۔ اس صورت حال پر قرآن نے جگہ جگہ آپ کو نہایت محبت آمیز انداز میں ٹوکا اور آگاہ فرمایا ہے کہ آپ نے قریش کے معاملے میں اس سے زیادہ ذمہ داری اپنے اوپر اٹھالی ہے جتنی اللہ نے آپ پر ڈالی ہے۔ آپ ان کے پیچھے اتنے ہلکان نہ ہوں۔ آپ پر اللہ کی بات پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی وہ آپ نے پہنچا دی، اب مزید ان کی ناز برداری کی ضرورت نہیں ہے۔ انہی حالات کے اندر عبداللہ بن ام مکتومؓ کا یہ واقعہ پیش آیا جس نے گویا اس بات میں ایک بالکل فیصلہ کن سورہ نازل کر دی۔ اس تمہید کی روشنی میں آیات زیر بحث اور آگے کی آیات پر غور کیجیے۔

'وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ'۔ یعنی تم پر اس نابینا کا آنا اس اندیشہ سے گراں گزرا کہ شاید اس کے آجانے سے ان سادات کے پندار کو چوٹ لگے اور وہ بدک جائیں حالانکہ ہوسکتا ہے کہ تم ان کی ناز برداری میں ایک سچے طالب کو نظر انداز کردو لیکن یہ پھر بھی نہ سنیں تو ایسے ناقدروں کے پیچھے اپنے ایک سزاوار تربیت ساتھی کی حق تلفی کس طرح جائز ہوسکتی ہے۔

رسول کی توجہ کے اصلی مستحق

اس سے معلوم ہوا کہ رسول کا اصل مقصد لوگوں کا تزکیہ ہے۔ جو لوگ اس کے پاس تزکیہ کے طالب بن کر آئیں اس کی توجہ و دلداری کے اصل حق دار وہی ہیں۔ دوسرے لوگ، خواہ بظاہر کتنی ہی اہمیت رکھنے والے ہوں، ان میں اگر اصلاح و تربیت کی طلب نہیں ہے تو رسول کے مقصد کے اعتبار سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

سچے طالب کی دو صفتیں

یہاں ایک سچے طالب کی دو صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ طالب تزکیہ ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ وہ یاددہانی سے فائدہ اٹھانے والا ہوتا ہے۔

بردر حقیقت تربیت گاہِ نبوی کے سچے شرکاء کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ ان میں بالعموم دو طرح کے لوگ ہوتے۔ ایک وہ جن کے سامنے اپنی اصلاح و تربیت سے متعلق کوئی سوال ہوتا اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آتے، دوسرے وہ جن کے سامنے اگرچہ کوئی خاص سوال تو نہ ہوتا لیکن وہ مجلس میں حاضر ہوتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بطور خود یا کسی سائل کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمائیں اس سے بہرہ مند ہوں۔ یہاں 'لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى' سے پہلی قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے اور 'يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى' کے الفاظ سے دوسری قسم کے لوگوں کی طرف۔ یہ دونوں ہی راہیں طلب علم کی ہیں اور مقصود ان دونوں کا حوالہ دینے سے یہ ہے کہ جس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آنا ہو وہ انہی میں سے کسی ایک مقصد کو سامنے رکھ کر آئے اور وہی پیغمبر کے التفات کے حق دار ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنی ناز برداری کے خواہاں ہیں ان کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور اپنے انجام کا انتظار کریں۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى (۵-۱۰)

اصل تنبیہ

یہ وہ اصل تنبیہ ہے جو اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائی گئی کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ جو اپنی اصلاح کے طالب بن کر آئیں اور ان کے اندر خدا کے حضور پیشی کا خوف ہو وہ آپ کی توجہ کے اصل مستحق قرار پائیں لیکن ہو یہ رہا ہے کہ جو بے پروا و بے نیاز ہیں آپ ان کو دعوت دینے کے لیے تو اپنے رات دن ایک کیے ہوئے ہیں حالانکہ وہ اگر اپنی اصلاح نہیں چاہتے تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ آپ پر اصل ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جو ذوق و شوق سے آپ کے پاس آتے ہیں لیکن آپ ان سے غفلت برتتے ہیں۔

'تَصَدّٰى' دراصل 'تَتَصَدَّدُ' ہے جو 'صَدد' کے مادہ سے ہے جس کے معنی متوازی اور مقابل کے ہیں۔ اس میں جو تغیر ہوا ہے وہ عربیت کے قاعدے کے مطابق ہوا ہے جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو بے نیازی برتتے ہیں ان سے تو آپ متعرض ہوتے اور ان کو پرچانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ یہ بوجھ اللہ تعالیٰ نے آپ پر نہیں ڈالا ہے۔

'وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى' یعنی آپ پر اصل ذمہ داری انذار و بلاغ کی تھی، وہ کر چکنے کے بعد آپ ان سے بری الذمہ ہوئے۔ یہ ذمہ داری آپ پر نہیں ہے کہ آپ انھیں لازماً مومن و مسلم بھی بنا دیں۔ یہ مضمون پیچھے کی سورتوں میں مختلف اسلوبوں سے گزر چکا ہے اور ہر جگہ اس کا مقصود

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری سے زیادہ بوجھ اپنے اوپر نہ اٹھائیں اور اپنے کو غیر ضروری مشقت میں نہ ڈالیں۔ اگر یہ محروم القسمت لوگ اپنی اصلاح نہیں چاہتے تو ان کو ان کی تقدیر کے حوالہ کریں۔

'جَآءَكَ يَسْعٰى'۔ 'سَعْیٌ' کا اصل مفہوم کسی کام کو ذوق و شوق اور سرگرمی و مستعدی سے کرنا ہے، دوڑنا اس کے لیے لازم نہیں ہے۔ 'فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ' کے معنی ہوں گے پس اللہ کے ذکر کی طرف سرگرمی اور مستعدی سے لپکو۔ آیت میں یہ لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے یعنی جو لوگ آپ کے پاس نہایت ذوق و شوق سے اس طرح آتے ہیں جس طرح تشنہ چشمہ کی طرف بڑھتا ہے۔

'وَهُوَ يَخْشٰى'۔ یہ مقابل میں ہے 'اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى' کے۔ یعنی ایک تو وہ لوگ ہیں جو اس دنیا کی مطلوبات و مرغوبات میں اس طرح کھوئے ہوئے ہیں کہ انھیں کبھی یہ فکر ستاتی ہی نہیں کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے اور اس کے لیے بھی کوئی تیاری ضروری ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو اپنے اندر آخرت کی پیشی کا خوف رکھتے ہیں۔ اسی گروہ سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ آپ کی باتیں سنے اور ان کو حرزِ جاں بنائے نہ کہ پہلے گروہ سے لیکن آپ کا حال یہ ہے کہ آپ پتھروں میں جونک لگانے کے لیے تو رات دن سرگرم ہیں لیکن جن کے اندر اثر پذیری کی صلاحیت ہے ان کی طرف پوری توجہ کرنے کی فرصت آپ کو نہیں ملتی۔

ان آیات سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوئیں:

ان آیات کی تعلیم

ایک یہ کہ ان میں بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو عتاب ہے اس کا اصل رخ آپ کی طرف نہیں بلکہ قریش کے ان نااہل لیڈروں کی طرف ہے جن سے کسی خیر کی امید باقی نہیں رہی تھی۔ اس وجہ سے ضروری ہو گیا تھا کہ آپ ان سے صرفِ نظر کر کے اپنی ساری توجہ کا مرکز ان غریبوں کو بنائیں جو اسلام لا چکے تھے اور آپ کی تعلیم و تربیت کے اصل حقدار تھے۔

دوسری یہ کہ حضورؐ کو کسی فرض کی ادائیگی میں کسی کوتاہی پر نہیں ٹوکا گیا ہے بلکہ اس بات پر ٹوکا گیا ہے کہ آپ نے اس سے زیادہ ذمہ داری اپنے اوپر اٹھالی ہے جتنی اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالی ہے۔ گویا یہ اسی طرح کا پُر محبت دل نواز عتاب ہے جو 'لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ'[1] (الشعرآء ۲۶: ۳) اور اس مضمون کی دوسری آیات میں گزر چکا ہے۔

تیسری یہ کہ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ اسلام کی اصل دولت وہ غریب ہیں جن کے اندر خدا کی خشیت ہے نہ کہ وہ امیر جن کے سینے خدا کی خشیت سے خالی ہیں۔ اس وجہ

---

[1] معلوم ہوتا ہے تم اپنے آپ کو ان کے پیچھے ہلاک کر کے رہو گے کہ وہ مومن نہیں بن رہے ہیں۔

سے آپ اپنی توجہ کا اصل مرکز انہی کو بنائیں جو اہل ہیں۔ ان کے پیچھے اپنا وقت نہ ضائع کریں جن کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے۔

اس عتاب کی ایک حقیقت افروز تمثیل

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ عبس میں اس عتاب کے رُخ کو ایک تمثیل سے سمجھایا ہے جو نہایت حقیقت افروز ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اس کو ایک مثال سے سمجھو۔ فرض کرو ایک نہایت مستعد اور فرض شناس چرواہا ہے۔ اس کے گلے کی کوئی فربہ بھیڑ گلے سے الگ ہو کر کھو جاتی ہے۔ چرواہا اس کی تلاش میں نکلتا ہے ہر قدم پر اس کی کھُر کے نشانات ملتے جا رہے ہیں۔ جنگل کے کسی گوشے سے اس کی آواز بھی آ رہی ہے۔ اس طرح وہ کامیابی کی امید میں دور تک نکل جاتا ہے اور اپنے اصل گلے سے کچھ دیر کے لیے غافل ہو جاتا ہے۔ جب وہ واپس لوٹتا ہے تو آقا اس کو ملامت کرتا ہے کہ تم پورے گلے کو چھوڑ کر ناحق ایک دیوانی بھیڑ کے پیچھے ہلکان ہوئے۔ اس کو چھوڑ دیتے، بھیڑیا کھا جاتا، وہ اسی کے لائق تھی۔ بتاؤ، اس میں عتاب کس پر ہوا؟ چرواہے پر یا کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ بالکل یہی صورت معاملہ یہاں بھی ہے۔ عتاب کا رخ بظاہر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ضرور ہے لیکن غصہ کا سارا زور منکرین و مخالفین پر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو اس عتاب کے اندر نہایت دل نواز شفقتیں مضمر ہیں۔"

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُۥ (۱۱-۱۲)

پیغمبر کی اصل ذمہ داری

'کَلَّا' یعنی اس طرح کے ناقدروں سے اس طرح چمٹنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ یہ قرآن بس ایک یاددہانی ہے۔ جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور جس کا جی نہ چاہے وہ اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہے جس سے یہ لوگوں کو آگاہ کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر پر ذمہ داری لوگوں تک اس یاددہانی کو پہنچا دینے کی ہے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں اس کو اتار بھی دے۔ اس پر ذمہ داری انذار کی ہے نہ کہ ایک ایک کی نازبرداری کی!

'اِنَّھَا' میں ضمیر کا مرجع 'ذِکْرٰی' ہے جو آیت ۴ میں ہے۔ اور 'ذَکَرَہٗ' میں بھی مرجع وہی ہے لیکن یہاں لحاظ معنی کا ہے اس وجہ سے ضمیر مذکر آئی۔ چونکہ 'ذِکْرٰی' اور 'تَذْکِرَۃٌ' دونوں سے مراد قرآن ہی ہے اس وجہ سے یہاں ضمیر مذکر لا کر ان کے اصل مفہوم پر روشنی ڈال دی۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

اس سے وہ حقیقت واضح ہو گئی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ یہاں اگر حضورؐ پر کوئی عتاب ہے بھی تو اس کی نوعیت عتاب محبت کی ہے کہ آپ نے اپنے اوپر وہ بوجھ کیوں اٹھا لیا ہے جو آپ کے رب نے آپ پر نہیں ڈالا۔

'فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ' کے بعد کلام کا ایک حصہ حذف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہو گی:

کہ جس کا جی چاہے اس یاددہانی سے فائدہ اٹھائے، جس کا جی چاہے وہ پرا بنا رہے۔ دوسرے مقام پر یہی بات یوں فرمائی ہے "فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ" (الکھف - ۱۸: ۲۹) (پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے)۔

فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ۙ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ (۱۳-۱۶)

کلام کی عظمت کا بیان

اوپر کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متکبرین سے اعراض اور بے پروائی برتنے کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے یہ اسی کی مزید وضاحت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمھارے شایانِ شان بات یہ نہیں ہے کہ ان مغروروں کے آگے تم اپنے آپ کو زیادہ جھکاؤ اسی طرح یہ کلام بھی، جو تم ان کو سنا رہے ہو، ایسی چیز نہیں ہے جو منت و سماجت کے ساتھ پیش کی جائے بلکہ یہ نہایت ہی اشرف، نہایت ہی بلند اور نہایت ہی پاکیزہ و برتر چیز ہے۔ یہ کوئی ناقص جنس نہیں ہے کہ تمھیں یہ فکر کرنی پڑے کہ کسی نہ کسی طرح یہ بک ہی جائے اگرچہ اس کی خاطر تمھیں خریداروں کی خوشامد ہی کرنی پڑے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے خزانۂ محفوظ کے لعل و گہر ہیں جو تم مفت لٹا رہے ہو۔ اگر یہ لوگ اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو تمھارا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں بلکہ اپنے ہی کو ابدی خسارے میں مبتلا کر رہے ہیں۔

'فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ' یہ اس کلام کی عالی نسبی اور عالی مقامی کی تعریف ہے۔ 'فِیْ صُحُفٍ' دراصل 'هُوَ فِیْ صُحُفٍ' ہے۔ یہاں مبتدا کو حذف کر دیا ہے۔ صفاتِ مابعد کے بیان میں مبتدا کا حذف عربیت میں معروف ہے۔

'صَحِيْفَةٌ' لکھے ہوئے ورق کو کہتے ہیں۔ جمع کی صورت میں یہ بعض اوقات کتاب کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں اس سے اشارہ لوحِ محفوظ کی طرف ہے۔ 'مُّكَرَّمَةٍ' یعنی وہ ایک عزیز، گراں مایہ اور قیمتی خزانہ ہے جس کی حفاظت اللہ کے فرشتے نہایت اہتمام سے کر رہے ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نہ اس تک ہر ایک کی رسائی ہے اور نہ ہر ایک اس کا اہل ہے کہ اس میں سے کچھ لے یا پا سکے بلکہ یہ اللہ ہی ہے کہ اس میں سے جس کو چاہتا ہے کچھ بخشتا ہے اور اسی نے تمھیں اس خزانے سے بخشا ہے تو اس نعمت سے انہی کو بہرہ مند کرو جو اس کے اہل ہیں۔ نااہلوں کے آگے ان موتیوں کو نہ ڈالو۔ یہ بات انجیل میں بھی نہایت موثر تمثیل کی صورت میں آئی ہے اور ہم کسی موزوں مقام میں اس کو نقل کر آئے ہیں۔

'مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ' یہ دونوں صفتیں بھی اس کے مکرم ہونے کے پہلو ہی کی وضاحت کے لیے آئی ہیں۔ صفت 'مَرْفُوْعَةٍ' معنی اور رتبہ دونوں قسم کی بلندیوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت یوں آئی ہے: 'وَاِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِیٌّ حَكِيْمٌ' (الزخرف ۴۳: ۴)

(اور یہ اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے، نہایت بلند اور پر حکمت)۔

'مُطَهَّرَةٍ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ قرآن مجید شیاطین اور ارواح خبیثہ کی دست رس سے بالکل محفوظ ہے۔ مثلاً فرمایا ہے: 'فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۝ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ' (الواقعۃ-۵۶: ۷۸-۷۹) (وہ ایک محفوظ کتاب میں ہے جس تک صرف پاکیزہ با کفولوں ہی کی رسائی ہے)۔

اس کلام کے حاملین کی صفات

'بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ' - یہ ان ملائکہ کی صفت بیان ہو رہی ہے جن کی امانت میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب عزیز کو محفوظ فرمایا ہے۔ اوپر 'لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ' والی آیت کا ہم نے حوالہ دیا ہے۔ اس میں جو بات منفی پہلو سے فرمائی گئی ہے وہی بات یہاں مثبت پہلو سے فرمائی گئی ہے۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ اس کتاب عزیز تک ارواح خبیثہ کی رسائی نہیں ہے بلکہ یہ ان پاک فرشتوں کی تحویل میں ہے جو نہایت باعزت اور نہایت باوفا ہیں۔

'سَفَرَةٍ' جمع ہے 'سَافِرٌ' کی جس کے معنی قاری وکاتب کے ہیں۔ 'سفر' پڑھنے اور لکھنے دونوں کے معنی میں آتا ہے۔ اس کے اشتقاق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل معنی ہیں تو لکھنے کے لیکن پڑھنے اور بیان کرنے کے مفہوم میں یہ وسیع ہو گیا ہے۔

لفظ 'کِرَامٍ' میں ان کی عالی مقامی اور بلند کرداری کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایسے بلند مرتبہ اور معزز ہیں کہ ان سے کسی خیانت کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ نہ وہ اس میں خود کمی بیشی کر سکتے، نہ یہ امکان ہے کہ جنات و شیاطین کو اس تک رسائی کا کوئی موقع دیں۔

'بَرَرَةٍ' جمع ہے 'بَارٌّ' کی۔ 'بَارٌّ' کہتے ہیں فرماں بردار، باوفا اور اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے والے کو۔ یہ صفت ان کی امانت داری کے وصف کو مزید نمایاں کرنے کے لیے آئی ہے مثلاً فرمایا ہے: 'نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ' (الشعراء-۲۶: ۱۹۳) (یہ کلام جبریل امین کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے)۔ دوسرے مقام میں اس کی مزید وضاحت ہے: 'إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ' (التکویر-۸۱: ۱۹-۲۱) (یہ کلام ایک باعزت رسول کے واسطہ سے القا ہوا ہے۔ وہ بڑی قوت والا اور عرش والے کے حضور میں نہایت مقرب ہے۔ اس کی بات مانی جاتی ہے۔ مزید برآں وہ نہایت معتمد ہے)۔

قرآن اور اس کے محافظین کی ان صفات کے ذکر سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ قرآن ایسی چیز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے منت و سماجت کے ساتھ پیش کی جائے بلکہ جس عظمت و شان کا وہ کلام ہے اسی وقار و خودداری کے ساتھ اس کی دعوت دی جانی چاہیے اور جس طرح کے باوقار ملائکہ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت اور اس کو نازل کرنے پر مامور فرمایا ہے چاہیے کہ اللہ کا رسول اور اس کے ساتھی بھی اس کی دعوت و تبلیغ میں اسی

کردار کا مظاہرہ کریں۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ وحی الٰہی کے اخذ و تلقّی کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس ذات کا انتخاب فرمایا اور پھر جن لوگوں پر اس کی حفاظت، دعایت اور تحریر و کتابت کی ذمہ داری ڈالی وہ کس کردار اور کن صفات کے لوگ تھے اور انھوں نے کس دیانت و امانت کے ساتھ اپنے اس فرض کو انجام دیا۔ گویا جن صفات کے ملائکہ کو اس خدمت پر آسمانوں میں مامور فرمایا گیا انہی صفات کے انسانوں کو اس زمین پر اس کے حمل و نقل کے لیے منتخب فرمایا گیا۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ (۱۷)

انسان کی بددماغی پر اظہار افسوس

اگرچہ لفظ 'اَلْاِنْسَانُ' عام ہے لیکن کلام کا رُخ انہی متکبرین کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ ہم پیچھے مناسب مواقع پر زبان کے اس اسلوب کی طرف توجہ دلا چکے ہیں کہ بعض مرتبہ کلام کا رخ ہوتا تو کسی خاص شخص یا کسی مخصوص گروہ ہی کی طرف ہے لیکن بات ان سے منہ پھیر کر عام صیغے سے کہہ دی جاتی ہے جس سے متکلم کی بیزاری کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ فرمایا کہ یہ انسان بھی عجیب مخلوق ہے! غارت ہو! کتنا ناشکرا بن کے رہ گیا ہے! اس کی بددماغی کا حال یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کو اللہ کا کلام اور پیغام بھی سنایا جائے تو اس کے آگے جھک کر اور ریا زمندین کر سنایا جائے!

درازدستی ایں کوتہ آستیناں بیں!

'مَآ اَكْفَرَهٗ' کا اسلوب اظہار تعجب اور اظہار نفرت دونوں کا حامل ہے۔

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ؕ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۙ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۙ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۙ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (۱۸ - ۲۲)

یہ ان مغروروں کے کبر و غرور پر ضرب لگاتی ہے لیکن مطالب کی ترتیب اس طرح ہے کہ چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں انسان کی خلقت، مادۂ خلقت، مراحل خلقت، وسائل معیشت، غرض زندگی، موت، قبر سے لے کر حشر و نشر تک ساری باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے تاکہ ان پر اپنے غرور کی بے ثباتی بھی واضح ہو جائے اور وہ خود اپنی زندگی کے آئینہ میں اس جزا و سزا کو بھی دیکھ لیں جس کی خبر قرآن ان کو دے رہا ہے۔

'مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ' یہ سوال تحقیر کے لیے بھی ہے اور زندگی بعد الموت کی طرف توجہ دلانے کے لیے بھی۔ ان متمردین کو زعم تھا کہ جس طرح اس دنیا میں وہ باعزت اور صاحب سیادت و قیادت ہیں اسی طرح آخرت ہوئی تو وہاں بھی ان کے لیے شایان شان مراتب ہوں گے۔ اس زعم کے سبب سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انذار ان کے دلوں پر بڑا شاق گزرتا تھا کہ

یہ ہم کو تو جہنم میں جھونکے جانے کے ڈراوے سنا رہے ہیں اور ان فقیروں کو جنت اور ابدی بادشاہی کی بشارت دے رہے ہیں جو ہمیشہ سے ہماری جوتیاں سیدھی کرتے آئے ہیں اور جن کو اپنے پہلو میں بٹھانا بھی ہم نے گوارا نہ کیا۔ ان کے اس زعم پر قرآن نے ان الفاظ میں ضرب لگائی ہے:

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ	پس ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ تمہارے
مُهْطِعِيْنَ ٥ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ	اوپر پلے پڑ رہے ہیں، داہنے بائیں سے
الشِّمَالِ عِزِيْنَ ٥ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ	ٹولیاں بنا بنا کر! کیا ان میں سے ہر شخص یہ توقع
مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ٥	لیے بیٹھا ہے کہ وہ نعمت کے باغ میں داخل
كَلَّا ط اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ٥	کر دیا جائے گا؟ ہرگز نہیں، ہم نے ان کو پیدا کیا
(المعارج - ۷۰: ۳۶-۳۹)	ہے اس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں!

ان آیات کا سیاق و سباق اور اس کی تفسیر تدبر قرآن کی روشنی میں سمجھ لیجیے۔ یعنی نجس پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوئی مخلوق کو اپنی برتری اور پاک دامنی کا یہ غرّہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو پیدائشی حق دارِ جنت سمجھ بیٹھے۔

اسی طرح قرآن نے جگہ جگہ انسان کی خلقت اور اس کے مادۂ خلقت سے قیامت پر اس پہلو سے استدلال کیا ہے کہ جو خدا پانی کی ایک حقیر بوند کو انسان بنا سکتا ہے اس کے لیے اس کو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے! یہ مضمون، مختلف اسلوبوں سے بار بار بیان ہوا ہے، ہم صرف چند جامع آیات یہاں نقل کرتے ہیں:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ	اور ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔
مِّنْ طِيْنٍ ٥ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً	پھر ہم نے اس کو پانی کی ایک بوند کی شکل میں ایک
فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ٥ ثُمَّ خَلَقْنَا	محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے بوند کو
النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ	ایک جنین کی شکل دی پھر اس جنین کو گوشت
مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا	کا ایک لوتھڑا بنایا اور اس لوتھڑے کے اندر
فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ق ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ	ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں کو گوشت کا جامہ
خَلْقًا اٰخَرَ ط فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ	پہنایا پھر اس کو ایک بالکل ہی دوسری شکل
الْخٰلِقِيْنَ ٥ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ	دے دی پس بڑا ہی بافیض و بابرکت ہے
ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ٥ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ	اللہ، بہترین خالق! پھر اس کے بعد لازماً
الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ٥	تم مرنے والے ہو پھر تم قیامت کے دن اٹھائے
(المؤمنون - ۲۳: ۱۲-۱۶)	بھی جاؤ گے۔

مِنْ نُّطْفَةٍ ط خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ۔ سوال کا جواب چونکہ بالکل واضح تھا جس سے کسی کے لیے بھی انکار کی گنجائش نہیں تھی اس وجہ سے جواب خود ہی دے دیا کہ پانی کی ایک بوند سے انسان کو پیدا کیا۔ اس پانی کی صفت قرآن کے دوسرے مقام میں 'مَّھِیْن' آئی ہے جس کے معنی حقیر و ذلیل کے ہیں۔ یعنی نہ اپنی کمیت کے اعتبار سے کوئی بڑی چیز نہ قدر و قیمت کے اعتبار سے کوئی گوہر گراں مایہ! تو ایسے نجس قطرے سے وجود میں آنے والے انسان کو زیادہ اِترانا کس طرح زیب دیتا ہے!

انسان کی خلقت میں تدبیر و حکمت کا پہلو

'خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ' تحقیر کے مضمون کے بعد کلام کا رخ اس تقدیر، تدبیر اور تیسیر کے بیان کی طرف مڑ گیا ہے جو انسان کی خلقت اور اس کی زندگی کے اطوار و مراحل میں نمایاں ہے اور جو اس بات کی ناقابلِ انکار شہادت ہے کہ قدرت جس قطرے کو گہر بنانے پر اپنے عجائبِ تصرّف کی اتنی شانیں دکھاتی ہے وہ کوئی عبث اور بے مقصد چیز نہیں ہو سکتی بلکہ لازم ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں وہ اس کی قدر و قیمت کو پرکھے، اس کے خیر و شر کو تولے اور پھر جس کو اپنی میزان میں باوزن پائے اس کو چھانٹ لے اور جس کو ناکارہ اور بے قیمت پائے اس کو خس و خاشاک کی طرح تنور میں جھونک دے۔

'فَقَدَّرَهٗ' میں اشارہ ان منازل و مراحل کی طرف ہے جو انسان کی تدریجی تشکیل میں نمایاں ہیں۔ جس طرح چاند کے عروج و محاق کی منازل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ لفظ آیا ہے، مثلاً 'وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ' (یٰسٓ - ۳۶ : ۳۹) (اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں) اسی طرح انسان کے تدریجی نشوونما اور اس کے بچپن، جوانی اور پھر زوال و فنا کی طرف توجہ دلانے کے لیے یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے۔ اوپر سورۂ مومنون کی آیات کا حوالہ گزر چکا ہے اس میں بھی یہ مضمون ہے اور یہاں آگے کی آیات میں بھی اس کے بعض پہلو واضح فرمائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تدریج و تقدیر خدا کی قدرت، حکمت اور اس اہتمام پر دلیل ہے جو انسان کی تخلیق میں نمایاں ہے اور یہ قدرت اور یہ اہتمام اس امر کی دلیل ہے کہ انسان کوئی عبث چیز نہیں ہے بلکہ اس کی خلقت ایک عظیم غایت کے لیے ہے جس کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد اٹھایا جائے، اس کا حساب ہو، اس کو جزا یا سزا ملے۔ ساتھ ہی انسان کی تخلیق میں خدا کی جو قدرت نمایاں ہے وہ اس بات کی ناقابلِ تردید دلیل ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ذرا بھی مستبعد نہیں ہے۔

تیسیر اپنے وسیع مفہوم میں

'ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ' مفسرین نے عام طور پر اس تیسیر سے وہ تدبیر مراد لی ہے جو قدرت نے بچے کے بطنِ مادر سے برآمد ہونے کے لیے خود عورت اور بچے کے نظامِ جسم میں ودیعت فرمائی ہے اور جو دردِ زہ کی مدد کے لیے عین وقت پر نمودار ہوتی ہے۔ یہ بات غلط نہیں ہے۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ قدرتی انتظام نہ ہو تو کوئی دوسری تدبیر اس کا بدل نہیں ہے بلکہ زچہ و بچہ دونوں کے گھٹ کر مر جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک تیسیر کے مفہوم کو اس قدر محدود کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بچہ جس طرح بطنِ مادر

کے اندر قدرت ہی کی تدبیر و تیسیر سے نشوونما پاتا ہے اسی طرح مہد سے لحد تک قدرت ہی کی تیسیر اور رہنمائی سے وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز طے کرتا ہے۔ یہ خدا ہی کی تیسیر ہے کہ بچہ کے پیدا ہونے کے بعد اس کی ماں کی چھاتیوں میں اس کے تغذیہ کے لیے دودھ اترتا ہے اور اس کو قدرت کی طرف سے جبلّی طور پر یہ رہنمائی ملتی ہے کہ ماں کی چھاتیوں کو چوسے۔ اسی طرح جوانی کے دور میں، وہ زندگی کے مختلف میدانوں میں جو سرگرمیاں دکھاتا اور جو فتوحات حاصل کرتا ہے ان میں بھی وہ خدا ہی کے بخشے ہوئے اعضاء و اسلحہ، خدا ہی کی عطا کردہ عقل اور خدا ہی کی بخشی ہوئی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ سورۂ اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی شان یہ بتائی ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (الاعلیٰ - ۸۷: ۲-۳) (جس نے خاکہ بنایا اور اس کے نوک پلک سنوارے اور جس نے صلاحیتیں ودیعت کیں اور پھر ان کے استعمال کی راہ دکھائی)۔

یہی حال انفسی اور اخلاقی عالم میں بھی ہے۔ سورۂ شمس میں فرمایا ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس - ۹۱: ۷-۱۰) شاہد ہے نفس اور اس کی ترکیب، پس اس کو الہام کی اس کی بدی اور نیکی تو جس نے اس کو پاک رکھا اس نے فلاح پائی اور جس نے گندا کیا وہ نامراد ہوا) غرض زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ روحانی ہو یا مادی اللہ تعالیٰ ہی نے انسان کی راہ ہموار کی۔ اگر وہ اس راہ پر چلے تو وہ کبھی ٹھوکر نہ کھائے لیکن اپنے اختیار کے سوءِ استعمال سے وہ سیدھی راہ کے بجائے ٹیڑھی راہ اختیار کر لیتا ہے جو اس کو کسی ہلاکت کے کھڈ میں لے جا پھینکتی ہے۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ۔ یہ زندگی کے آخری مرحلہ کی طرف اشارہ ہے کہ بالآخر وہ وقت آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو موت دیتا اور دفن کراتا ہے۔ ہر پیدا ہونے والے کے لیے پیدا ہونے کے بعد سب سے زیادہ یقینی چیز موت ہی ہے۔ قدرت نے اس کو ایسے ضابطوں کے اندر جکڑ رکھا ہے کہ موت سے کسی کے لیے بھی مفر نہیں ہے۔ اس کی کمند بالکل بے خطا ہے۔

آخری مرحلہ 'اَقْبَرَهٗ' کے معنی کسی کو قبر میں رکھوانا یا دفن کرانا ہے۔ اس لفظ میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ جو مرتا ہے وہ فنا نہیں ہو جاتا بلکہ قدرت اس کو زمین کی تحویل میں دے دیتی ہے۔ جو شے تحویل میں دی جاتی ہے وہ لازماً ایک دن واپس لی جاتی ہے چنانچہ جب وقت آئے گا اللہ تعالیٰ اس امانت کو زمین سے واپس لے گا۔

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ۔ 'اِنْشَارٌ' کے معنی کھول دینے، پھیلانے، چھینٹنے اور از سرِ نو اٹھا کھڑا کرنے کے ہیں۔ یعنی جب وہ چاہے گا اس کو اٹھا کھڑا کرے گا۔ اس کام میں اس کو ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ جب پانی کی ایک بوند کو رحم مادر کے اندر اس نے ایک انسان کی شکل دے دی اور

اس کام میں اس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو اسی انسان کو زمین میں دفن کرانے کے بعد اس سے از سرِ نو برآمد کر لینا کیوں محال ہو جائے گا!

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ أَمَرَهٗ (۲۳)

یہ آیت اوپر والی آیت قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ کے بالکل متوازی آیت ہے جس طرح اس میں ہٹ دھرموں کی ہٹ دھرمی پر اظہارِ تعجب اور پھر ان کے اپنے وجود سے اس قیامت پر دلیل ہے جس کو وہ ناممکن سمجھ رہے تھے اسی طرح اس آیت میں ان کی کج فہمی پر باندازِ زجر ملامت اور اس کے بعد قیامت اور جزا و سزا پر اس اہتمامِ ربوبیت سے دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے گرد و پیش میں پھیلا رکھا ہے اور جو زبانِ حال سے یہ شہادت دے رہا ہے کہ جس انسان کے لیے ربِّ کریم نے یہ خوانِ نعمت بچھایا ہے وہ غیر مسئول نہیں چھوڑا جائے گا بلکہ اس کے لیے لازماً ایک روزِ حساب آنے والا ہے۔

'لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک سمجھانے اور دلائل پیش کرنے کا تعلق ہے اس میں اب کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے لیکن ان ضدیوں کی ضد اور مکابرت کا وہی حال ہے جو پہلے تھا۔ جس دن کے لیے تیاری کی ان کو ہدایت کی جا رہی ہے اب بھی وہ اس سے بے پروا ہیں۔

'مَآ اَمَرَهٗ' میں وہ تمام احکام و اوامر بھی داخل ہیں جو فطرت کی بدیہیات میں سے ہیں اور وہ احکام بھی جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے۔ بدیہیاتِ فطرت کے امرِ الٰہی ہونے کی وضاحت ہم آیت فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ (البقرۃ ۲: ۲۲۲) کے تحت کر چکے ہیں۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ (۲۴)

غور کرنے والے کے لیے دلائل کی کمی نہیں ہے

یعنی اگر وہ دلیل ان کی سمجھ میں نہیں آئی جو بیان ہوئی تو دلیلوں کی کمی نہیں ہے۔ انسان اپنی غذا ہی کے مسئلہ پر ذرا غور کی نگاہ ڈالے جس پر اس کی زندگی کا انحصار ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اس کو پیدا کرتا پھر کس وسعت، کس تنوع اور ضروریات کی نوعیت کے لحاظ سے کتنی گوناگوں شکلوں میں اس کو پھیلا دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اس پر غور کرے گا تو ضد کی بات اور ہے لیکن اس کی عقل میں فتور نہیں ہے تو وہ نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لوگوں کو مرنے کے بعد زندہ کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ جو بارش اس کی غذا کا ذریعہ ہے وہی برابر اس کا مشاہدہ کراتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی یہ نکتہ بھی اس کی سمجھ میں آ جائے گا کہ ربوبیت کا یہ وسیع انتظام مستلزم ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہ ہو۔ ایک دن لازماً اس سے پرسش ہونی ہے کہ اس نے ان نعمتوں کا حق ادا کیا یا نہیں۔ ہر حق کے ساتھ ذمہ داری کا لزوم ایک امرِ فطری ہے۔

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا (۲۵-۲۶)

غور کرنے کا طریقہ

صرف غور کرنے کی دعوت ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ غور کی لائن بھی متعین کر دی کہ یوں غور کرے۔ فرمایا کہ یہ ہماری ہی قدرت و عنایت کا کرشمہ ہے کہ ہم اچھی طرح مینہ برساتے اور پھر زمین کے مسامات کو اس

سینہ سے سیراب ہونے کے لیے اچھی طرح کھول دیتے ہیں۔ نہ آسمان سے پانی برسانا کسی کے بس میں ہے اور نہ زمین کے مسامات کو کھولنا کسی کے امکان میں ہے درآنحالیکہ انہی دونوں چیزوں پر زمین کی تمام فیض بخشی کا انحصار ہے یہی مضمون سورۂ انبیاء میں یوں بیان ہوا ہے: اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء ۲۱: ۳۰) (آسمان اور زمین دونوں بند ہوتے ہیں پس ہم ان کو کھول دیتے ہیں)۔

اوپر کے پیرے میں انسان کی خلقت کی جو نوعیت بیان ہوئی ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور کیجیے تو دونوں دلیلوں کی مشابہت واضح ہو گی۔ وہاں بیان دلیل کا آغاز اس طرح ہوا ہے کہ بات اثباتِ امکانِ قیامت سے چلی پھر ربوبیت، مسئولیت اور جزاء و سزا تک پہنچی ہے۔ یہاں بھی آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ استدلال کی ترتیب وہی ہے۔ پہلے ایک جامع بات نے امکانِ معاد کی تمہید استوار کر دی۔ اس کے بعد ربوبیت کے آثار کی طرف توجہ دلائی گئی اور پھر مسئولیت اور جزاء و سزا کو ایک بدیہی نتیجہ کے طور پر سامنے رکھ دیا گیا ہے۔

فَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا حَبًّا ۙ‏ وَّعِنَبًا وَّقَضۡبًا ۙ‏ وَّزَيۡتُوۡنًا وَّنَخۡلًا ۙ‏ وَّحَدَآئِقَ غُلۡبًا ۙ‏ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ‏ (۲۷-۳۱)

زمین کی بعض برکتیں: آسمان و زمین یا بالفاظ دیگر بارش اور زمین کے باہمی تفاعل سے اللہ تعالیٰ کی پروردگاری کی جو برکتیں بھی زمین کے لیے ظہور میں آتی ہیں یہ ان میں بعض ایسی نمایاں چیزوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن سے قرآن کے اوّل مخاطب واقف بھی تھے اور جو انسان کی غذائی ضروریات میں بنیادی اہمیت رکھنے والی بھی ہیں۔

سب سے پہلے بعض ان چیزوں کی طرف توجہ دلائی جو زمین سے لگی ہوئی یا اس پر بچھی ہوئی پیدا ہوتی ہیں اور جن کو دیکھنے کے لیے نظر اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی، مثلاً غلہ، انگور اور ترکاریاں۔ غلہ غذائی چیزوں میں بنیادی اہمیت رکھنے والا ہے۔ دوسری ساری چیزیں اس کے تحت ہیں۔ اس وجہ سے اس کا ذکر سب سے پہلے کیا، غلہ کے بعد غذائی چیزوں میں دوسری اہمیت رکھنے والی چیز پھل ہے اور پھلوں میں راس الاثمار کی حیثیت انگور کو حاصل ہے اس پہلو سے بطور نمونہ اس کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد ترکاریوں کا ذکر فرمایا جو زمین پر پھیل ہوئی پیدا ہوتی اور غلہ کے ساتھ سالن کے طور پر کام آتی ہیں، بعض کچی حالت میں اور بعض پکا کر لفظ 'قضب' کا غالب استعمال اگرچہ انہی سبزیوں اور ترکاریوں کے لیے ہے جو کچی کھائی جاتی اور تبار سالن کے حکم میں داخل ہیں لیکن عام سبزیوں اور ترکاریوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس کے بعد بعض ان نعمتوں کا ذکر ہے جو فضا میں ابھرے ہوئے درختوں سے حاصل ہوتی ہیں اور جن کو دیکھنے کے لیے نگاہ اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بطور مثال ان میں سے زیتون اور کھجور کا ذکر فرمایا۔ زیتون کو روغن پیدا کرنے والی چیزوں میں جو اہمیت حاصل ہے وہ معلوم ہے۔ قرآن میں اس کے روغن کی غذائی اہمیت کا بھی ذکر ہے اور سورۂ نور میں اس سے جلنے والے روشن چراغوں کی تمثیل بھی بیان ہوئی ہے۔

پھر کھجور کا ذکر ہے۔ کھجور اہل عرب کے لیے بیک وقت گوناگوں فوائد و برکات کا مجموعہ ہے۔ یہ ان کے لیے غذا سے بھرپور میوہ بھی ہے اور ذخیرہ کیے جانے کے قابل نہایت پُرمنفعت غلہ بھی۔ علاوہ ازیں اس سے وہ نہایت لذیذ مشروب بھی حاصل کرتے۔

'وَحَدَآئِقَ غُلْبًا'۔ خاص خاص چیزوں کے ذکر کے بعد یہ عام باغوں کی طرف اشارہ فرما دیا۔ 'حَدِيقَة' گھرے ہوئے باغ کو کہتے ہیں۔ 'غُلْبٌ' جمع ہے 'اغلب' کی جس کے معنی موٹی گردن والے کے ہیں۔ لیکن جب یہ باغ کی صفت کے طور پر آئے تو اس سے مقصود درختوں کی شادابی کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ باغ شاداب ہو گا تو لازماً درختوں کا گھیراؤ بڑھ جائے گا اور ان کے اوپر کے حصے باہم دگر مل کر گھنے ہو جائیں گے۔

'وَّفَاكِهَةً وَّأَبًّا'۔ یہ اس عام کو عام تر کر دیا تاکہ قدرت کے اس خوانِ کرم کا دائرہ انسانوں کے ساتھ ان حیوانات تک وسیع ہو جائے جو بلاواسطہ یا بالواسطہ اس کے کام آتے ہیں۔

اوپر میووں میں سے صرف خاص خاص کا ذکر نام کی تصریح کے ساتھ ہوا تھا، یہاں لفظ 'فَاكِهَة' استعمال کر کے تمام میووں کی طرف اشارہ فرما دیا، خواہ عرب میں پیدا ہوتے ہوں یا عجم میں، خواہ وہ اعلیٰ درجے کے ہوں یا ادنیٰ درجے کے اور خواہ وہ پرندوں ہی کے لیے مخصوص ہوں یا انسان بھی ان سے فائدہ اٹھاتے ہوں۔

علاوہ ازیں اوپر صرف انہی نعمتوں کا ذکر ہے جو انسانوں کو حاصل ہیں درآنحالیکہ انسانوں کے ساتھ ان کی خدمت کرنے والے چوپائے بھی ہیں جن کا انسان محتاج بھی ہے اور جو اسی طرح پرورش کے حاجت مند ہیں جس طرح انسان ہے لیکن خاص ان کے لیے کسی چیز کا ذکر نہیں ہوا تھا۔ وہ کمی یہاں لفظ 'أَبّ' کا اضافہ کر کے پوری کر دی۔

'أَبّ' کے معنی نبات اور شاداب گھاس کے ہیں۔ چوپایوں کے کام آنے والی چیز تو وہ بھس بھی ہے جو غلہ سے الگ کیا جاتا ہے لیکن وہ عام اور معمولی چیز ہے جب کہ یہاں موقع کسی ایسی چیز کے ذکر کا تھا جو ان کے لیے وہی درجہ رکھتی ہو جو درجہ انسانوں کے لیے 'فواکہ' کا ہے۔ تازہ اور شاداب گھاس ان کے لیے عام بھی ہے اور ساتھ ہی ان کے وہ ان تمام میووں، سبزیوں اور ترکاریوں کا بہترین بدل بھی ہے جو انسان کو حاصل ہیں۔

لفظ 'أَبّ' پر استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ عبس میں مفصل بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ لفظ عربی کے معروف الفاظ میں سے ہے اس وجہ سے بعض روایات میں یہ بات جو نقل ہوئی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کو اس کے معنی کا علم نہیں تھا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ میرے نزدیک استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق نہایت تشفی بخش ہے۔ اگر کسی کو اس کے بارے میں کوئی خلش ہو تو وہ مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ عبس کی مراجعت کرے۔

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (۳۲)

فرمایا کہ یہ چیزیں ہم نے تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے برتنے کے لیے پیدا کی ہیں۔ مطلب یہ ہے

کہ ان چیزوں کا تمھاری نفع رسانی کے لیے ہونا تو بالکل واضح ہے اور اس امر میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ سب نعمتیں تمھارے پروردگار کے فضل سے حاصل ہوتی ہیں تو اب تم سوچو کہ ان انعامات کے بعد تمھارے اوپر خدا کی طرف سے کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ آخری بات اگرچہ لفظوں میں مذکور نہیں ہے لیکن سیاقِ کلام سے یہ خود واضح ہے۔ اس لیے کہ اوپر سے اصل بحث ہی یہی چلی آ رہی ہے کہ یہ ضدی اور مغرور لوگ اپنے رب کی ناشکری اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ ان پر خدا کے حقوق واضح نہیں ہیں یا یہ اپنی ذمہ داریوں کے شعور سے نابلد ہیں بلکہ یہ جان بوجھ کر محض اکڑ اور ضد کے سبب سے پیغمبر کی کوئی بات اپنی خواہشوں کے خلاف سننے اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّۃُ (۳۳)

قیامت کی یاددہانی

’صَآخَّۃُ‘ کے معنی بہری کر دینے والی کڑک یا چیخ کے ہیں۔ جس طرح سورۂ نازعات میں لفظ ’طَآمَّۃُ‘ آیا ہے اسی طرح اس سورہ میں لفظ ’صَآخَّۃُ‘ آیا ہے۔ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ صورِ قیامت کی پہلی کڑک ہی ایسی ہولناک ہوگی کہ کانوں کو بہرا کر دے گی۔

’اِذَا‘ کا جواب، جیسا کہ سورۂ نازعات کی آیات ۳۴-۳۵ کے تحت بیان ہو چکا ہے، بربنائے وضاحت قرینہ محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ پیغمبر کے انذار سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں لیکن اس دن کیا کریں گے جس دن خدا کا منادی اتنے قریب سے ان کو پکارے گا کہ اس کی آواز سب کے کانوں کے پردے پھاڑ دے گی!

یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ ۵ وَاُمِّہٖ وَاَبِیْہِ ۵ وَصَاحِبَتِہٖ وَبَنِیْہِ ۵ لِکُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْھُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْہِ (۳۴-۳۷)

یہ تفصیل ہے اس دن کی ہولناکی کی۔

’یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ ۵ وَاُمِّہٖ وَاَبِیْہِ ۵ وَصَاحِبَتِہٖ وَبَنِیْہِ‘ ’اِذَا‘ کا جواب نہیں ہے۔ اگر جواب ہوتا تو عربیت کے قاعدے سے اسلوبِ بیان اور ہوتا۔ جواب تو، جیسا کہ سورۂ نازعات کی آیت ’یَوْمَ یَتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰی‘ (النزعٰت - ۷۹: ۳۵) کے تحت گزر چکا ہے، محذوف ہے البتہ اس سے محذوف جواب پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج پیغمبر کے انذار سے انھوں نے اپنے کان جو بند کر رکھے ہیں تو اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ان کو اپنی خاندانی اور قبائلی قوت و عصبیت پر بڑا ناز ہے۔ اس زعم نے ان کو اندھا کر رکھا ہے کہ بھلا ان کو ان کے مقام سے کون ہلا سکتا ہے یا ہلا سکے گا لیکن اس بہری کر دینے والی چیخ کے بعد جو دن آئے گا وہ ایسا ہولناک ہوگا کہ ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ نہ بھائی اپنے بھائی کی فریاد سنے گا، نہ بیٹا اپنے ماں باپ کی دہائی پر کان دھرے گا اور نہ کوئی اپنی بیوی اور بیٹوں کی مصیبت میں ان کا شریک بننے کا حوصلہ کرے گا۔ اس دن ہر ایک کو اپنی ہی ایسی پڑی ہوگی کہ کسی دوسرے کی خبر لینے کا وہ کوئی تصور ہی نہ کر سکے گا اگرچہ وہ کتنا ہی قریبی عزیز ہو۔

یہی مضمون سورۂ معارج میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے:

وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ۝ يُبَصَّرُوْنَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَأَخِيهِ ۝ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُـْٔوِيهِ ۝ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنجِيهِ ۝ (المعارج ۷۰: ۱۰-۱۴)

اور اس دن کوئی سرگرم سے سرگرم دوست بھی اپنے دوست کا پرسان حال نہ ہوگا۔ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے لیکن مجرم چاہے گا کہ کاش وہ اپنے بیٹوں، اپنی بیوی، اپنے بھائی، اپنے خاندان کو جو اس کو پناہ دیتا رہا ہے اور تمام اہل زمین کو فدیہ میں دے کر اس دن کے عذاب سے اپنے کو بچا لے۔

ان دونوں آیتوں میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں رشتہ داروں کی ترتیب اَبعد سے اَقرب کی طرف ہے اور اس آیت میں اَقرب سے اَبعد کی طرف اور یہ دونوں اسلوب بلاغت کلام کے تقاضے سے اختیار کیے گئے ہیں اور یہ بلاغت بالکل واضح ہے۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝ (۳۸-۴۲)

اس دن اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان جو فرق ان کے چہروں سے نمایاں ہوگا، یہ آخر میں بالاجمال اس کی طرف اشارہ کر دیا تاکہ ان کے اس ظاہر سے ان کے باطن کا کچھ اندازہ ہو سکے کہ اہل ایمان کے دل اس دن کن امیدوں اور حوصلوں سے معمور ہوں گے اور اہل کفر کے دلوں پر اس دن کیا گزر رہی ہوگی۔

'مُسْفِرَةٌ' کے معنی روشن اور تابناک کے ہیں۔ یہ 'اسفر الصبح' کے محاورے سے ماخوذ ہے۔ مسرت کی جو چمک اہل جنت کے چہروں پر ظاہر ہوگی یہ لفظ اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

'ضَاحِكَةٌ' بھی مسرت اور خوشی کی تعبیر ہے یعنی ان کے چہرے ہنستے ہوئے ہوں گے۔

'مُسْتَبْشِرَةٌ' یعنی ہشاش بشاش ہوں گے۔

اہل کفر کے چہروں کا جو حال ہوگا اس کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ 'وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ' کہ ان پر خاک اڑ رہی اور سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ اس لیے کہ ان پر امید کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔

'أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ' یہ آخر میں ان کی فرد قرارداد جرم کی طرف اجمالی اشارہ ہے کہ ان کا یہ حشر اس وجہ سے ہوگا کہ یہ خدا کے ناشکرے اور اس کے باغی و نافرمان رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر اتمام کو پہنچی۔ وھو الموفق للصواب۔

رحمان آباد

۲۱ - مئی ۱۹۷۹ء

۲۴ - جمادی الثانی ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۸۱

التکویر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سے تعلق

پچھلی دونوں توام سورتوں ـــــ النّٰزِعٰت اور عبس ـــــ میں جس ہولِ قیامت سے 'طَآمَّۃ' اور 'صَآخَّۃ' کے ناموں سے ڈرایا گیا ہے اس سورہ میں اسی ہول کی پوری تصویر ہے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں پھر انسان کے قریب و بعید اور اس کے ظاہر و باطن کے ہر گوشہ میں اس ہول کے جو اثرات مترتب ہوں گے وہ اس طرح نگاہوں کے سامنے کر دیے گئے ہیں کہ انسان اگر سوچنے سمجھنے والا ہو تو ان آیات کے آئینے میں وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے جو ابھی پسِ پردہ ہے لیکن ایک دن وہ سب اس کے سامنے آنے والا ہے۔

اس کے بعد قریش کے مکذبین کو مخاطب کر کے آگاہ کیا گیا ہے کہ قرآن اس دن سے جو تمہیں ڈرا رہا ہے تو اس کو ایک حقیقت سمجھو اور اس کے لیے تیاری کرو۔ یہ خدا کا نازل کردہ کلام ہے جو اس نے اپنے سب سے مقرب و معتمد فرشتے کے ذریعہ سے اپنے رسول پر اتارا ہے۔ اگر تم نے اس کو کاہنوں کی کہانت اور شاعروں کی شاعری سمجھ کر رد کر دیا تو یاد رکھو کہ نہ خدا کا کچھ بگاڑو گے نہ رسول کا بلکہ اپنی ہی تباہی کا سامان کرو گے۔ رسول کا کام لوگوں تک اس یاددہانی کو پہنچا دینا ہے۔ اس کے بعد ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس پر ایمان لانے کی توفیق انہی کو حاصل ہو گی جو حق کے قدردان اور اس کے طالب ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

پہلے چھ آیتوں میں وہ احوال بیان ہوئے ہیں جو مردوں کو زندہ کیے جانے سے پہلے پیش آئیں گے۔

(۱-۳) اس کائنات کی بلند و بالا اور عظیم و پرشوکت چیزوں مثلاً سورج، چاند اور پہاڑوں کا اس دن جو حال ہو گا اس کی تصویر۔

(۱-۶) زمین کی ہر چیز پر اس دن نفسی نفسی کی جو حالت طاری ہوگی اس کا اجمالی بیان۔ محبوب ترین چیزیں چھوٹی پھریں گی لیکن ان کا کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ جنگلوں اور غاروں کے وحوش و بہائم سمندروں کی طغیانی سے فرار کے لیے اکٹھے ہو جائیں گے، شیر اور ہرن دونوں پاس پاس ہوں گے لیکن مشترک مصیبت کے سوا ان کو اور کسی چیز کا بھی کچھ ہوش نہ ہوگا۔

اس کے بعد آٹھ آیتوں میں وہ احوال بیان ہوئے ہیں جو اٹھائے جانے کے بعد مشاہدہ میں آئیں گے۔

(۷-۱۴) انسانوں کی ان کے عقائد و اعمال کے اعتبار سے درجہ بندی اور معصوم مظلوموں کی دادرسی ہوگی۔ لوگوں کے اعمالنامے کھلیں گے۔ آسمان سرخ ہو جائے گا، جہنم دھکائی جائے گی جنت اپنے حق داروں کے قریب لائی جائے گی اور ہر ایک اس دن دیکھ لے گا کہ وہ اپنے رب کے حضور کیا نذرانہ لے کر آیا ہے۔

(۱۵-۲۱) ستاروں کے ٹوٹنے اور شب کی تاریکی کے بعد صبح کے نمودار ہونے سے اس بات پر شہادت کہ یہ قرآن کاہنوں کی خرافات کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے ایک جلیل القدر فرشتے کا لایا ہوا کلام ہے جو عرش والے کے نزدیک بڑا ہی باعزت و با اقتدار ہے۔ تمام ملائکہ اس کی اطاعت کرتے ہیں، وہ نہایت معتمد اور امانت دار ہے۔

(۲۲-۲۶) قرآن کے مکذبین کو تنبیہ کہ جو رسول تم کو یہ کلام سنا رہا ہے وہ کوئی خبطی و دیوانہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا رسول اور نہایت فرزانہ ہے۔ وہ جس فرشتہ سے اپنی ملاقات کا دعویٰ کر رہا ہے یہ کوئی وہم نہیں بلکہ بیانِ حقیقت ہے۔ اس نے اس فرشتہ کو بالکل کھلے افق میں دیکھا ہے۔ وہ غیب دانی کا حریص نہیں ہے بلکہ اس پر جو وحی آتی ہے وہ بالکل غیر ارادی طور پر مبدأ فیض سے نازل ہوتی ہے۔ نادان ہیں جو اس کے کلام کو کسی شیطان رجیم کا القاء سمجھتے ہیں اور اس کے انذار کو جھٹلا رہے ہیں۔

(۲۷-۲۹) مکذبین کو مزید تنبیہ کہ اگر اسی طرح اپنی ضد پر اڑے رہ گئے تو یاد رکھو کہ نہ اللہ کا کچھ بگاڑو گے نہ اس کے رسول کا بلکہ اپنی ہی تباہی کا سامان کرو گے۔ جو کلام تم کو سنایا جا رہا ہے یہ تمھارے لیے یاددہانی ہے، اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا تمھارا اپنا کام ہے۔ نہ رسول کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو تمھارے دلوں میں زبردستی اتار دے اور نہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اس کو قبول کرنے پر مجبور کر دے۔ اس کے لیے انھی کے سینے کھلیں گے جو سیدھی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ رکھنے والے ہوں گے اور یہ حوصلہ انھی کے اندر پیدا ہوگا جو سنتِ الٰہی کے مطابق اس کے سزاوار ہوں گے۔

سُورَةُ التَّكْوِيرِ

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــ اٰيات : ۲۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ① وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ② وَإِذَا الْجِبَالُ
۱-۲۹ سُيِّرَتْ ③ وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ④ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ⑤
وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ⑥ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ⑦ وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ
سُئِلَتْ ⑧ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ⑨ وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ⑩
وَإِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ⑪ وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ ⑫ وَإِذَا
الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ⑬ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ أَحْضَرَتْ ⑭ فَلَآ أُقْسِمُ
بِالْخُنَّسِ ⑮ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ⑯ وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ⑰
وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ⑱ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ⑲ ذِي قُوَّةٍ
عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ⑳ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ㉑ وَمَا
صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ㉒ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ㉓ وَمَا
هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ㉔ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيمٍ ㉕
فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ ㉖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِينَ ㉗ لِمَنْ شَآءَ
مِنْكُمْ أَنْ يَّسْتَقِيمَ ㉘ وَمَا تَشَآءُونَ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

۲۹ع
رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٩﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱ - ۲۹
جب کہ سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ پہاڑ چلا دیے جائیں گے اور دس ماہہ گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی۔ وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر اُبل پڑیں گے۔ ۱-۶

جب کہ نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی اور زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی! جب کہ اعمال نامے کھولے جائیں گے اور آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔ جب کہ دوزخ بھڑکا دی جائے گی اور جنت قریب لائی جائے گی، تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ کیا لے کر آئی ہے! ۷-۱۴

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے، چلنے والے اور چھپ جانے والے ستاروں کی اور رات کی جب وہ جانے لگتی ہے اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے کہ یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے، وہ بڑی ہی قوت والا اور عرش والے کے نزدیک بڑا ہی بارسوخ ہے۔ اس کی بات مانی جاتی اور وہ نہایت امین بھی ہے۔ ۱۵-۲۱

اور تمھارا یہ ساتھی کوئی خبطی نہیں ہے۔ اور اس نے اس کو کھلے افق میں دیکھا ہے اور یہ غیب کی باتوں کا کوئی حریص نہیں ہے اور یہ کسی شیطانِ رجیم کا القاء نہیں ہے۔ ۲۲-۲۵

تو تم کہاں کھوئے جاتے ہو! یہ تو بس عالم والوں کے لیے ایک یاد دہانی ہے۔ اس کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ اختیار کرنی چاہے اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ، عالم کا خداوند چاہے۔ ۲۶-۲۹

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (۱)

'تکویر' کے معنی کسی شے کو لپیٹ دینے یا ایک گٹھڑ کی صورت میں باندھ لینے کے ہیں۔ 'کَوَّرَ العمامۃَ علٰی رأسہٖ' کے معنی ہیں اس نے عمامہ اپنے سر پر لپیٹ لیا۔

قیامت کے ظہور کے وقت سورج کا حال

قیامت کے ظہور کے وقت آسمانوں بلکہ اس پوری کائنات کی سب سے زیادہ نمایاں اور شاندار چیز — سورج — کا جو حال ہو گا یہ اس کی تصویر ہے کہ اس کی بساط بالکل لپیٹ دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جب سورج کی بساط ہی لپیٹ دی جائے گی تو وہ سارا عالم تیرہ و تار ہو جائے گا جو اس کی تابانی سے روشن ہے۔ اگرچہ سورج کے چھپنے کا مشاہدہ ہم آج بھی ہر روز کرتے رہتے ہیں لیکن اس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ یہ صورت صرف اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ہم اس سے اوٹ میں ہو جاتے ہیں البتہ جب قیامت کی ہلچل برپا ہو گی تو سورج کا سارا نظام ہی بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس تاریکی کا جب کہ سرے سے سورج ہی تاریک ہو جائے!

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (۲)

ستاروں کا حال

'انکدار' کے معنی دھندلے ہو جانے اور ماند پڑ جانے کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد ستاروں کا بے نور ہو جانا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب سورج ہی کی بساط لپیٹ دی جائے گی تو اس کے نظام سے وابستہ جتنے بھی بلب اور قمقمے ہیں وہ سب آپ سے آپ بے نور ہو جائیں گے۔

وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (۳)

پہاڑوں کا حال

آسمان کے بعد یہ زمین کی سب سے شاندار اور عظیم چیز — پہاڑوں — کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ پہاڑ جو زمینوں میں گڑے ہوئے ہیں، جن کو سمجھتے ہو کہ یہ بالکل غیر فانی اور اٹل ہیں، ان کی جگہ سے ان کو ہلایا نہیں جا سکتا،* یہ اس دن چلا دیے جائیں گے۔ یہاں صرف چلا دیے جانے کا ذکر ہے لیکن دوسرے مقامات میں اس کی تفصیل بھی ہے کہ وہ اس طرح اڑتے پھریں گے جس طرح بادل اڑتے پھرتے ہیں۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۴)

---

* یہ امر ملحوظ رہے کہ منکرین قیامت کو جب قیامت کی ہلچل سے ڈرایا جاتا تو وہ اس کا مذاق اڑانے کے لیے یہ سوال کرتے کہ قیامت آئے گی تو کیا وہ پہاڑوں کو بھی اکھاڑ پھینکے گی؟

محبوب چیزوں کی کس مپرسی

عِشَارُ، جمع ہے عُشَرَاءُ کی۔ یہ لفظ اس اونٹنی کے لیے آتا ہے جو دس ماہ کی گابھن یعنی بچہ جننے کے قریب ہو۔

عظیم چیزوں کی بے ثباتی کے بعد یہ محبوب چیزوں کی بے وقعتی واضح فرمائی ہے کہ اس دن کی ہلچل لوگوں پر ایسی نفسی نفسی کی حالت طاری کر دے گی کہ کسی کی نظروں میں اس کے محبوب سے محبوب مال کی بھی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی۔

یہ بات قرآن کے اولین مخاطب، اہل عرب کے خاص مذاقِ طبیعت کو پیش نظر رکھ کر فرمائی گئی ہے۔ ان کے مال میں سب سے زیادہ قدر کی جگہ ان کے اونٹوں کو حاصل تھی۔ خاص طور پر وہ اونٹنیاں ان کو نہایت عزیز و محبوب تھیں جن کے حمل پر دس ماہ گزر چکے ہوں اور بچہ جننے کا وقت اب قریب آ لگا ہو۔ اس طرح کی اونٹنیوں کے مالک ان کی نگہداشت کا قدرتی طور پر خاص اہتمام کرتے۔ ان کی مستقبل کی بہت سی آرزوؤں کا ان پر انحصار رہتا۔ انہی محبوب اونٹنیوں کو بطور مثال ذکر کر کے دنیا کی محبت میں پھنسے ہوئے غافلوں کو ہولِ آخرت کی یاد دہانی فرمائی ہے کہ اس کا پہلا ہی مرحلہ اتنا شدید ہوگا کہ اس وقت کسی کو اپنی محبوب سے محبوب چیزوں کا بھی کچھ ہوش نہیں رہے گا۔ گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی لیکن ان کے مالکوں کو خود اپنی اس طرح پڑی ہوگی کہ وہ کسی اور چیز کی طرف، خواہ وہ کتنی ہی محبوب و مطلوب کیوں نہ ہو، توجہ نہیں کر سکیں گے۔ یہی حقیقت دوسرے مقام تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ (الحج - ۲۲ : ۲) (جس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی) کے الفاظ سے سمجھائی گئی ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ یہاں اس دن کے ہول کی حقیقت محبوب مال کی ناقدری سے سمجھائی گئی ہے اور وہاں شفقتِ مادری کے مردہ ہو جانے سے درآنحالیکہ یہ جذبہ اتنا قوی ہے کہ اس دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کو مغلوب نہیں کر سکتی۔

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (۵)

وحشی جانوروں کا حال

یعنی انسان تو انسان اس دن کے ہول سے وحشی جانوروں پر بھی ایسی نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی کہ ان کو جس جگہ پناہ ملنے کی توقع ہوگی، آپس کی فطری دشمنیاں بھول کر سب اکٹھے ہو جائیں گے۔ جنگل میں آگ لگ جائے یا سیلاب کا پانی پھیل جائے تو جنگل جانور سراسیمگی کی حالت میں جس ٹیلے اور ٹیکرے پر ان کو پناہ ملنے کی توقع ہو وہاں اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مشترک مصیبت کا ہول ان پر ایسا طاری ہوتا ہے کہ بکری، شیر اور بھیڑیے پاس پاس کھڑے ہوتے ہیں لیکن کسی کو ہوش نہیں۔ حتیٰ کہ اس کا حریف یا شکار اس کی بغل میں ہے۔ یہی صورتِ حال خوفناک ترین شکل میں ظہورِ قیامت کے وقت پیش آئے گی۔ آگے والی آیت : وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۶) (اور جب کہ سمندر ابل پڑیں گے) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سمندر اپنی حدوں سے آزاد ہو کر زمین پر پھیل جائیں گے۔ یہ ہمہ گیر

مصیبت جنگلی جانوروں پر بھی نفسی نفسی کی حالت طاری کر دے گی۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۶)

سمندروں کی طغیانی — لفظ 'تَسْجِیْرٌ' اصلاً تنور کو ایندھن سے بھر کر بھڑکا دینے کے لیے آتا ہے پھر اسی مفہوم سے وسعت پاکر یہ دریاؤں اور سمندروں کی طغیانی کے لیے بھی آنے لگا۔ دریا جب بے قابو ہو کر اپنے حدود سے باہر نکل پڑیں اور زمین پر پھیل جائیں تو اس حالت کی تعبیر کے لیے یہ معروف لفظ ہے۔ اس معنی کو ادا کرنے کے لیے لفظ 'تَفْجِیْرٌ' بھی آیا ہے، چنانچہ بعد والی سورہ میں جو اس کی توام سورہ ہے، یہی بات وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ (الانفطار - ۸۲: ۳) کے الفاظ سے تعبیر فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ سمندر اپنے حدود کے اندر بند ہیں لیکن جب قیامت کی ہلچل برپا ہو گی تو یہ ابل کر تمام سطح پر چھا جائیں گے۔

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (۷)

ظہور قیامت کے بعد کے احوال — اوپر کی آیات میں وہ احوال بیان ہوئے جو ظہور قیامت کے وقت پیش آئیں گے۔ اب اس آیت اور بعد کی آیات میں وہ باتیں بیان ہو رہی ہیں جن کا تعلق ظہور قیامت کے بعد کے احوال سے ہے۔

فرمایا کہ جب نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی' جوڑیں ملانے سے مقصود لوگوں کی ان کے اعمال و عقائد کے اعتبار سے الگ الگ گروہ بندی ہے۔ یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے جس کی تفصیل سورۂ واقعہ کی آیت، وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً[1] سے لے کر آیت ۴۴ تک بیان ہوئی ہے۔ وہاں واضح فرمایا ہے کہ اس دنیا میں تو نیک و بد دونوں ایک ہی ساتھ زندگی گزارتے ہیں لیکن یہی حالت ہمیشہ نہیں رہے گی بلکہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جب لوگوں کی درجہ بندی ان کے ایمان و اخلاق کی بنیاد پر ہو گی۔ اس دن وہ لوگ فائز المرام اور ابدی بادشاہی کے حق دار ٹھہریں گے جو اس روز عدل کی میزان میں پورے اتریں گے اور وہ لوگ ابدی خسران و ذلت سے دوچار ہوں گے جو اس سے بے پروا ہو کر زندگی گزاریں گے۔ اس کے بعد لوگوں کو تین بڑے گروہوں ——— اصحاب الیمین، اصحاب الشمال اور سابقون و مقربون ——— میں تقسیم کیا جانا بیان کیا ہے اور ہر گروہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ ہو گا اس کی تفصیل ہے۔ اسی چیز کی طرف دو لفظوں میں یہاں اشارہ فرما دیا ہے اور مقصود لوگوں کو متنبہ فرمانا ہے کہ یہ دنیا آزمائش و امتحان کے لیے ہے۔ اس میں خیر و شر اور حق و باطل دونوں کو مہلت ملی ہوئی ہے لیکن قیامت کے بعد جو جہانِ نو پیدا ہو گا اس میں باطل

---

[1] اور اس وقت تم تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔

کے پرستار جہنم میں جھونک دیے جائیں گے اور ان لوگوں کو بڑی سرفرازی حاصل ہوگی جو امتحان میں پورے اتریں گے۔

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ﴿٨﴾ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (۸ - ۹)

معصوم مظلوموں کی دادرسی

یہ اس روزِ عدل کے عدل کی طرف اشارہ ہے اور اس کے بیان کے لیے بطور مثال زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کی دادرسی کا حوالہ ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دن سب سے پہلے وہ معصوم اپنی مظلومیت کی داد پائیں گے جو بالکل بے گناہ ان لوگوں کے ہاتھوں ظلم کے شکار ہوئے جن کو خدا نے ان کا محافظ بنایا۔ 'مَوْءُودَةٌ' زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کو کہتے ہیں۔ عرب جاہلیت کے بعض اجڈ قبائل میں سنگدل باپ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ بیشتر تو اس سنگ دلی کا سبب فقر کا اندیشہ ہوتا لیکن بعض حالات میں غیرت کی بے اعتدالی بھی اس کا باعث بن جاتی۔ ان مظلوم بچیوں کو زندہ درگور کرنے والے چونکہ ان کے باپ ہی ہوتے جن کو ان کے اوپر کلی اختیار حاصل ہوتا، اس وجہ سے ان کی داد فریاد کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

اخروی عدالت کا مزاج

قرآن نے یہاں ان بے زبان مظلوموں کی دادرسی کا ذکر کر کے اخروی عدالت کا مزاج واضح فرمایا ہے کہ اس میں سب سے پہلے ان کی دادرسی ہوگی جو اس دنیا میں سب سے زیادہ بے بس اور کمزور تھے اور جو اپنے اوپر گزرے ہوئے ظلم کی کسی کے آگے فریاد بھی نہ کر سکے۔ ان کو سب سے پہلے بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ انھیں کس گناہ پر مارا گیا؟ ان سنگدل باپوں کو یہ نہایت ہی سخت قسم کی تنبیہ ہے کہ اگر ان کی سنگ دلی کے خلاف یہ بے زبان و بے گناہ بچیاں فریاد نہ کر سکیں تو اس سے وہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ خدا کے ہاں بھی ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوگا۔ اس دن اللہ تعالیٰ خود ان کے خون کا مدعی بنے گا۔ وہ ان مظلوموں سے پوچھے گا کہ تمھیں کس جرم میں مارا گیا؟ اس سوال کا مقصد ظاہر ہے کہ یہی ہوگا کہ ان کے قتل ناحق کا مقدمہ جو دنیا کی کسی عدالت میں نہ جا سکا اس کو رب العزت خود اپنی عدالت میں لائے اور اس کا فیصلہ فرمائے۔

وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (۱۰)

ہر ایک کا کچا چٹھا اس کے سامنے

'صُحُفٌ' سے مراد لوگوں کے اعمالنامے ہیں اور ان کے کھولے جانے سے مقصود یہ ہے کہ ہر ایک کا سارا کچا چٹھا اس کے سامنے آجائے گا۔ آگے فرمایا ہے 'عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ' (یعنی ہر جان یہ جان لے گی کہ آج کے دن کے لیے اس نے کیا کیا)۔

وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ (۱۱)

آسمان سرخ ہو جائے گا

'كَشْطٌ' کے اصل معنی کسی چیز کے اوپر سے اس چیز کے اتار لینے کے ہیں جو اس کو ڈھانکے ہوئے ہو۔ یہیں سے یہ ذبیحہ کی کھال اتار لینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اونٹ کی کھال کھینچ لینے کے

لیے یہ عربی میں معروف لفظ ہے اور یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ ذبیحہ کی کھال اتار لینے کے بعد اس کا گوشت سرخ سرخ نظر آنے لگتا ہے۔ گویا یہ آسمان کے سرخ ہو جانے کی تعبیر ہے۔ سورۂ رحمٰن میں فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (۳۷) کے الفاظ آئے ہیں اور یہاں آگے کی آیت میں جہنم کے بھڑکائے جانے کا ذکر ہے جو نہایت واضح قرینہ اس بات کا ہے کہ آسمان کی یہ سرخی جہنم کے بھڑکائے جانے کے سبب سے ہوگی۔

وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ (۱۲)

'تَسْعِیْر' کے معنی بھڑکانے اور دہکانے کے ہیں۔ جہنم تیار تو پہلے سے ہوگی لیکن جب مجرموں کو اس میں ڈالنے کا وقت آئے گا تو وہ ان کو جلانے کے لیے خاص طور پر بھڑکا دی جائے گی پھر جب مجرم اس میں ڈالے جائیں گے تو وہ اپنا مطلوب ایندھن پا کر مزید قوت سے بھڑکے گی۔

وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ (۱۳)

متقیوں کے لیے جنت کی پیشکش

'اِزْلَاف' کے معنی قریب لانے کے ہیں۔ یعنی وہ ان متقیوں کے قریب لائی جائے گی جو اس کے مستحق قرار پائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ 'جنت' بھی پہلے سے تیار ہوگی، البتہ اس کی نقاب کشائی اس وقت ہوگی جب لوگوں کی درجہ بندی ہو جائے گی۔ سورۂ قٓ میں یہ وضاحت بھی فرما دی گئی ہے کہ اس قریب لانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ کہیں دور سے قریب لائی جائے گی، وہ دور نہیں ہوگی بلکہ پاس ہی ہوگی لیکن وہ قریب ہوتے ہوئے باوصف اور قریب لائی جائے گی تاکہ اہل جنت کی تشریف و تکریم کے لیے ایک پیش کش کے طور پر ان کے سامنے پیش کی جائے۔ فرمایا ہے 'وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ' (قٓ ۔ ۵۰ : ۳۱) (اور جنت خدا ترسوں کے لیے قریب لائی جائے گی درآنحالیکہ وہ کچھ دور بھی نہ ہوگی)۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ (۱۴)

تمام شرطوں کا جواب

اوپر جتنے 'اِذَا' گزرے ہیں یہ ان سب کا اکٹھے جواب ہے۔ یعنی جب یہ یہ احوال پیش آئیں گے تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ اپنے رب کے آگے پیش کرنے کے لیے کیا لے کر آئی ہے۔ اس جاننے سے مقصود ظاہر ہے کہ اس کے انجام کو جاننا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آج کے حالات میں اس کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ مذاق اڑا لیں لیکن یاد رکھیں کہ یہ دن آنے والا ہے اور ایک عظیم ہلچل کے ساتھ آنے والا ہے اور اس دن ہر ایک دیکھ لے گا کہ اس کے لیے اس نے کیا تیاری کی اور کیا چیز نظر انداز کی درآنحالیکہ وہ کرنے کی تھی۔ آگے والی سورہ میں، جو اس کی توام سورہ ہے، یہی مضمون زیادہ وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ فرمایا ہے، 'عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ' (الانفطار ۔ ۸۲ : ۵) (تب ہر ایک جان لے گا اس نے کیا کیا اور کیا چھوڑا)۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۙ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۙ وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۙ وَالصُّبْحِ

إِذَا تَنَفَّسَ ۝ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ (۱۵ - ۱۹)

قرآن کی تکذیب کے لیے ایک شگوفہ

یہ انذار کا مذاق اڑانے والوں کے اس وہم کی تردید ہے جو انھوں نے اللہ کے رسول اور اس کی کتاب سے متعلق ایجاد کیا اور جس کو دلیل بنا کر انھوں نے اپنے عوام کو ورغلانے کی کوشش کی کہ وہ قرآن کو کوئی خدائی وحی سمجھ کر اس سے مرعوب یا متاثر نہ ہوں۔ انھوں نے جب دیکھا کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے متاثر ہو رہے ہیں اور عذاب و قیامت کا ڈراوا ایک حقیقت بنتا جا رہا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکل سکتا ہے کہ وہ اس دعوت کے حامی بن جائیں تو انھوں نے ان کو اس سے بدگمان کرنے کے لیے یہ شگوفہ ایجاد کیا کہ نہ یہ قرآن خدائی وحی ہے اور نہ اس کے پیش کرنے والے اللہ کے رسول ہیں بلکہ یہ ہمارے کاہنوں کی طرح کے ایک کاہن ہیں۔ جس طرح کاہنوں کا تعلق جنات سے ہوتا ہے جو ان پر غیب کی باتیں القاء کرتے ہیں اسی طرح ان کا رابطہ بھی (العیاذ باللہ) کسی شیطان سے ہے جو ان پر اپنی باتیں القاء کرتا ہے اور وہ اس کو خدائی وحی کے نام سے پیش کرتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں جن کو اس نے ہمارے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ ہم ان کی اطاعت کریں اور اگر ہم نے ان کی بات نہ مانی تو اس دنیا میں بھی ہم پر عذاب آ جائے گا اور اس کے بعد آخرت میں بھی ہمارے لیے جہنم تیار ہے۔

قرآن نے ان کے اس پراپیگنڈے کی جگہ جگہ تردید کی ہے۔ خاص طور پر سورۂ شعراء اور سورۂ نجم میں اس کی تردید پوری وضاحت سے ہوئی ہے اور ہم نے بھی اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ یہاں بھی ان کے اسی پراپیگنڈے کی تردید ایک نئے پہلو سے ہے جس کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے عربوں میں مروّج کہانت کی اصل و بنیاد کو جان لینا ضروری ہے۔

اس کہانت کی بنیاد دو چیزوں پر تھی:

کہانت کی بنیاد دو چیزوں پر تھی

ایک تو ان کے مزعومہ علم نجوم پر۔ وہ ستاروں کے متصرف بالذات ہونے کے معتقد اور ان میں سے بعض کے سعد اور بعض کے نحس ہونے کے مدعی تھے۔ اسی طرح ان کے طلوع و غروب، ان کے گرنے اور چڑھنے اور ان کے چلنے اور چھپنے کے متعلق مختلف قسم کے اوہام انھوں نے ایجاد کر رکھے تھے جن کی بنیاد پر وہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے مختلف قسم کی مبارک یا منحوس پیشین گوئیاں کرتے اور اپنی غیب دانی کی دھونس جماتے۔ مثلاً بسا اوقات یہ افواہ پھیلا دیتے کہ فلاں ستارے کی الٹی گردش سے ایک بڑا خطرہ ظہور میں آنے والا ہے اس سے بچنے کی تدابیر معلوم کرنے کے لیے لوگ ان سے رجوع کریں۔ پھر جو بدقسمت ان کے دام میں آ جاتے ان کو وہ اچھی طرح بے وقوف بناتے۔

دوسری یہ کہ وہ جنات سے رابطہ رکھنے اور ان کے ذریعہ سے غیب کی خبریں معلوم کرنے کے مدعی تھے۔ سورۂ شعراء کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے کہ جب کوئی شخص ان سے کسی معاملے میں غیبی رہنمائی کا

طالب ہوتا تو وہ اس مقصد کے لیے مراقبہ کی نمائش کرتے اور پھر ایک مقفّٰی اور مسجّع کلام کی صورت میں جو اکثر بے معنی یا ذو معانی ہوتا، اپنی مزعومہ وحی پیش کرکے اس کے کچھ الٹے سیدھے معنی بیان کرتے اور دعویٰ کرتے کہ یہ وحی ان پر عالمِ غیب کے اسرار سے واقف ایک جن نے کی ہے۔

کہانت کے ستونوں پر قرآن کی ضرب

قرآن نے جگہ جگہ کہانت کے ان دونوں ہی ستونوں پر ضرب لگائی ہے۔ شمس، قمر اور ستاروں کے طلوع و غروب کو اس نے اس طرح پیش کیا ہے جس سے یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ ان میں سے کوئی مؤثر بالذات ہے اور نہ کوئی سعد یا نحس بلکہ ان کا طلوع و غروب خالقِ کائنات کے اختیار میں ہے۔ وہی جب چاہتا ہے ان کو مطلع پر نمودار کرتا ہے اور جب چاہتا ہے ان کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ وہ خود اپنے وجود سے شہادت دیتے ہیں کہ وہ آسمان و زمین کے رب کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ اسی کے حکم سے آتے اور اسی کے حکم سے جاتے ہیں۔ ع

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

سورۂ انعام آیات ۷۵-۷۹ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا جو تدریجی ارتقا نمایاں فرمایا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہ اس باب میں قرآن کے طریقِ استدلال اور اس کے منطقی نتیجہ کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔

اسی طرح کہانت کے دوسرے ستون پر ضرب لگانے کے لیے قرآن نے شہابِ ثاقب کا حوالہ دیا اور واضح فرمایا ہے کہ کسی جن کے لیے ملاءِ اعلیٰ تک رسائی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے وہ ٹوہ لگاتے ہیں تو ان کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ستاروں کے اندر یہ انتظام کر رکھا ہے کہ ان کی برجیوں سے ان کے اوپر شہابِ ثاقب کے راکٹ پھینکے جاتے ہیں۔ یہ مضمون یوں تو جگہ جگہ بیان ہوا ہے لیکن زیرِ بحث قسموں کو سمجھنے کے لیے سورۂ نجم اور سورۂ جن کی متعلق آیات پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہوگا۔

اس تمہید کی روشنی میں اب آیات کے الفاظ اور ان کے معانی پر غور کیجیے۔

آیاتِ قسم کے الفاظ کی تحقیق

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۙ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۙ یہ بحث اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکی ہے کہ قرآن مجید میں اس طرح کی قسمیں جو آئی ہیں وہ کسی دعوے پر شہادت کے مقصد سے آئی ہیں اور یہ بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ قسم سے پہلے اگر اس طرح 'لَا' آیا ہے جس طرح یہاں ہے تو وہ قسم کی نفی کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے اس زعم کی نفی کے لیے آیا ہے جس کی تردید اس قسم سے مقصود ہے۔

'خُنَّسٌ'، جمع ہے 'خَانِسٌ' کی۔ اس کے معنی آگے بڑھ کر پیچھے پلٹ جانے والے، ظاہر ہو کر غائب ہو جانے والے اور نمایاں ہو کر روپوش ہو جانے والے کے ہیں۔ یہ لفظ ستاروں کی صفت کے طور

پر آتا ہے اور ان کے لیے اس قدر معروف ہے کہ بسا اوقات موصوف کے ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مجرّد صفت ہی موصوف کو ظاہر کر دینے کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ بعض اہل لغت نے اس کو بعض خاص ستاروں کے ساتھ مخصوص کیا ہے لیکن یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔ یہاں ستاروں کی جو صفات مذکور ہوئی ہیں وہ تمام ستاروں پر یکساں منطبق ہوتی ہیں خواہ وہ ثوابت ہوں یا سیارے، زحل ہو یا عطارد اور ان کے قبیل کے دوسرے ستارے۔

'اَلْجَوَارِ الْكُنَّسِ' یہ انہی ستاروں کی مزید صفات کا بیان ہے اور ان کا بغیر حرفِ عطف کے آنا عربیّت کے اس معروف قاعدے سے، جس کی وضاحت اس کے محل میں گزر چکی ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے موصوف الگ الگ نہیں ہیں۔

'جَوَارِیْ' کے معنی چلنے والے کے ہیں اور 'كُنَّسٌ' جمع ہے 'كَانِسٌ' کی۔ 'كنس الظبی' کے معنی ہوں گے ہرن اپنے مامن میں چھپ گیا۔ 'كنست النجوم' کے معنی ہوں گے کہ ستارے اپنے مدار میں چلے اور چل کر اپنے ٹھکانوں میں روپوش ہو گئے۔ صاحب اقرب الموارد نے وضاحت کی ہے کہ یہ صفت تمام ستاروں کی مشترک صفت ہے۔

ستاروں کی قسم کہانت کے ابطال کے پہلو سے

ستاروں کی یہ قسم یہاں کہانت کے ابطال کے لیے کھائی گئی ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ کاہنوں کے مزعومہ علم غیب کی بنیاد دو چیزوں پر تھی۔ ایک ان ستاروں کے مؤثر بالذات ہونے کے تصور پر، دوسرے اس وہم باطل پر کہ آسمانوں کے اندر ایسے ٹھکانے (مقاعد للسمع) ہیں جن میں بیٹھ کر جنات غیب کی باتیں سنتے اور پھر ان کو پہنچاتے ہیں۔ ستاروں کی مذکورہ صفات کا حوالہ دے کر قرآن نے ان کے ان دونوں باطل تصورات کی نفی کر دی۔ طلوع کے بعد ان کے غروب اور آنے کے بعد ان کے جانے اور اس طلوع و غروب اور ایاب و ذہاب میں اوقات کی ایسی پابندی کہ منٹ اور سیکنڈ کا بھی فرق نہ پیدا ہونے پائے اس امر کی نہایت واضح شہادت ہے کہ وہ اس کائنات کے نظام میں مؤثر بالذات عناصر کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ایک بالاتر حکیم و قدیر کے ہاتھوں میں مسخر ہیں۔ اس وجہ سے اصل مولیٰ و مرجع اور نافع و ضارّ وہ ہے نہ کہ یہ محکوم و مقہور کواکب و نجوم۔

دوسرے وہم کے ابطال کے لیے قرآن نے اس کائنات کے ایک راز کو آشکارا فرمایا ہے کہ ان ستاروں کے اندر شیاطین کے استراقِ سمع اور تجسس غیب کے لیے ٹھکانے نہیں بنے ہوئے ہیں، جیسا کہ نادانوں نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر ایسی برجیاں اور دیدبان بنے ہوئے ہیں جہاں سے ان شیاطین پر مار پڑتی ہے جو ملاءِ اعلیٰ کی باتوں کی ٹوہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ستاروں کی یہ صفتیں یہاں قسم کے اسلوب میں بیان ہوتی ہیں اس وجہ سے بتقاضائے بلاغت ان میں غایت درجہ ایجاز ہے۔ تاہم الفاظ کے اندر ایسے اشارے یہاں بھی موجود ہیں جو غور کرنے والوں

کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں، مثلاً 'خُنَّس' کی صفت واضح طور پر ان کے افول و غروب کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ اس صفت کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ نادانوں نے صرف ان کے طلوع کو اہمیت دی اور ان کو معبود بنا بیٹھے حالانکہ ان کی پسپائی اور ان کے ڈوبنے کو بھی دیکھنا تھا جو ان کے محکوم و مسخّر ہونے کی نہایت واضح دلیل ہے۔

اسی طرح 'الْجَوَارِ الْكُنَّسِ' کے اندر ایک ہلکا سا اشارہ اس نقل و حرکت کی طرف بھی ہے جو یہ ستارے شیاطین کے تعاقب میں کرتے ہیں جب وہ استراقِ سمع کی کوشش کرتے نکلتے ہیں تو اس وقت ستاروں کا منظر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ایک برقِ خاطف تیر کی طرح نکلی اور اپنے ہدف پر پہنچ کر دفعتہً پھر اپنے ترکش میں چھپ گئی۔

وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ (۱۷-۱۸)

یہ دوسری قسم ہے جو اسی دعوے پر ایک دوسرے پہلو سے شہادت ہے۔

'عَسْعَسَ' کے معنی اہل لغت نے تاریک ہو جانے کے بھی لکھے ہیں اور پیچھے ہٹ جانے اور گزر جانے کے بھی۔ اگرچہ آیت کی تاویل دونوں معنوں کی روشنی میں ہو سکتی ہے لیکن میں دوسرے معنی کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعینہٖ یہی قسم، بالکل اسی سیاق و سباق اور معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ سورۂ مدثر کی آیات ۳۳-۳۴ میں بھی آئی ہے۔ وہاں 'عَسْعَسَ' کی جگہ لفظ 'اَدْبَرَ' آیا ہے۔ فرمایا ہے 'وَالَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ' (شاہد ہے رات جب کہ وہ پیچھے ہٹ جاتی ہے اور شاہد ہے صبح جب کہ وہ بے نقاب ہو جاتی ہے) وہاں بھی اس قسم کے بعد قرآن مجید کے انذارِ قیامت کی حقانیت ثابت کی گئی ہے اور یہاں بھی، جیسا کہ آگے وضاحت آرہی ہے، اسی دعوے کی تصدیق فرمائی گئی ہے۔

'وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ' میں لفظ 'تَنَفَّسَ' سے مقصود تو صبح کا نمودار ہونا ہی ہے لیکن اس طریقۂ تعبیر میں ایک خاص بلاغت ہے جو اصحابِ ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ یہ لفظ گویا یہ تاثر دیتا ہے کہ صبح رات کے بوجھ کے نیچے اس طرح دبی ہوتی ہے کہ اس کا دم گھٹ رہا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اوپر سے اس بوجھل لحاف کو سرکاتا ہے اور اس کو سانس لینے اور سر اٹھانے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ (۱۹)

اصل دعویٰ

یہ مذکورہ بالا دونوں قسموں کا مقسم علیہ یا بالفاظِ دیگر وہ اصل دعویٰ ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں۔ فرمایا کہ بے شک یہ قرآن ایک معزز و مکرّم فرستادۂ الٰہی کا لایا ہوا کلام ہے۔ 'رسول' سے یہاں مراد حضرت جبریلؑ ہیں۔ آگے جو صفات بیان ہوئی ہیں اور جن کی وضاحت آرہی ہے ان سے متعین ہو جائے گا کہ ان صفات کے موصوف حضرت جبریل علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں۔

یہی بات آگے آیت ۲۵ میں منفی پہلو سے بھی فرما دی گئی ہے جس سے لفظ کریم کا اصل موقع و محل واضح ہوتا ہے۔ فرمایا ہے: وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (اور یہ کسی راندۂ درگاہ شیطان کی القاء کی ہوئی بات نہیں ہے) مطلب یہ ہے کہ محروم القسمت ہیں وہ لوگ جو اس قرآن کو کاہنوں کی بکواس کی قسم کی کوئی چیز قرار دیتے اور اللہ کے رسول کو کاہن کہتے ہیں۔ کاہن جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ شیطانی القاء ہوتا ہے جس میں صداقت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ غیب دانی کے مدعی ہوتے ہیں لیکن ان کے شیاطین کی رسائی ملاءِ اعلیٰ تک ہوتا تو درکنار وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے مردود و مبغوض ہیں کہ وہ آسمانوں میں گھات لگانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان پر شہابوں کے ذریعے سنگ باری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس یہ کلام جو ان کو سنایا جا رہا ہے یہ اللہ کے ایک ایسے فرستادہ کا لایا ہوا کلام ہے جو خدا کی بارگاہ میں عزت پائے ہوئے اور نہایت مقرّب و مکرّم ہے۔

ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ؕ

(۲۰-۲۱)

حضرت جبریلؑ کی مزید صفات

یہ حضرت جبریل امینؑ کی مزید صفات بیان فرمائی گئی ہیں تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن کس محفوظ و مامون اور پاکیزہ ذریعہ سے اترا ہوا کلام ہے اور کاہن جس ذریعہ سے اپنا مزعومہ علم حاصل کرتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ باعزت رسول نہایت زور و قوت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسی اعلیٰ اور محکم صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ دوسری شیطانی طاقتیں اس کو مرعوب یا مغلوب یا متاثر نہیں کر سکتیں کہ اس کے فرائض مفوّضہ میں وہ مزاحم ہو سکیں یا اس سے کوئی چیز اچک سکیں یا اس کو دھوکہ دے سکیں۔ وہ صاحبِ عرش کے احکام پورے اختیار و اقتدار کے ساتھ نافذ کرتا ہے اس لیے کہ وہ اس کی بارگاہ میں نہایت تقرّب اور رسوخ رکھنے والا ہے۔ اس کو صاحبِ عرش تک براہِ راست رسائی حاصل ہے کوئی دوسرا اس کے اور صاحبِ عرش کے درمیان حائل نہیں ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی یہی صفت سورۂ نجم کی آیات ۵-۶ میں 'شَدِيْدُ الْقُوٰى' اور 'ذُوْ مِرَّةٍ' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے جس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

'مُطَاعٍ' یعنی جو ارواح و ملائکہ اس کی ماتحتی میں ہیں وہ سب بے چون و چرا اس کی اطاعت کرتے ہیں، مجال نہیں ہے کہ سرمو اس کے احکام سے انحراف کر سکیں یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکیں یا اس کے دیے ہوئے احکام میں کوئی تحریف یا ترمیم یا شیاطین کے ساتھ کوئی سازباز کر سکیں۔

'ثَمَّ' کی تحقیق

'ثَمَّ اَمِيْنٍ' کلامِ عرب کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ 'ثَمَّ' اور 'ثُمَّ' کے مواقعِ استعمال میں بڑا فرق ہے۔ 'ثَمَّ' کسی جگہ کی طرف خاص طور پر اشارہ کے لیے بھی آتا ہے اور کسی صفت سے پہلے اس پر خاص اہتمام سے زور دینے کے لیے بھی، مثلاً سورۂ شعراء میں فرمایا ہے: وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ (۶۴)

اس کا ترجمہ اگر ثَمَّ کے صحیح مفہوم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کیجیے تو یہ ہو گا کہ وہیں ہم لائے دوسروں کو بھی۔ یعنی جس راہ سے ہم نے بنی اسرائیل کو نجات دی وہیں ہم فرعونیوں کو بھی لائے تاکہ ان کو غرق کر دیں۔

اسی طرح سورۂ دھر کی آیت وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا (۲۰) میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ اس کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ ہمارے نزدیک یہ ہو گا کہ جہاں دیکھو گے وہیں عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے۔ ع

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

اسی طرح صفت سے پہلے جب یہ آتا ہے تو اس کی عظمت و اہمیت کو نمایاں کرنے کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ صفت 'امین' سے پہلے آیا ہے تو اس سے مقصود حضرت جبریل علیہ السلام کی اس صفت کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا ہے۔ یعنی مذکورہ صفات کے ساتھ ان کی خاص اہمیت رکھنے والی یا خاص طور پر ذکر کے لائق صفت یہ بھی ہے کہ وہ نہایت امانت دار ہیں۔

اس صفت کے خاص اہتمام کے ساتھ ذکر کی وجہ یہ ہے کہ ان کی یہی صفت اس امر کی ضمانت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول کے پاس جو کچھ لاتے ہیں اس میں نہ کسی ملاوٹ کا کوئی شائبہ ہو تا نہ کسی کمی بیشی کا کوئی اندیشہ۔ اس کے برعکس کاہنوں کے علم کا حال یہ ہے کہ وہ جن شیاطین سے علم حاصل کرتے ہیں وہ اُچکے اور چور ہوتے ہیں۔ اول تو ملاءِ اعلیٰ تک وہ پہنچ نہیں پاتے اور اگر کوئی بات اچکنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ بیشتر جھوٹ ہوتی ہے جس میں مزید جھوٹ ملا کر وہ اپنے کاہنوں پر القا کرتے ہیں اور یہ کاہن ان سے بھی بڑھ کر جھوٹے ہوتے ہیں جو اپنی کاہن داری کو فروغ دینے کی خاطر رائی کو پربت بناتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس ناپاک جوہڑ کو اس چشمۂ صافی سے کیا نسبت جس سے اللہ کا رسول فیض یاب ہوتا ہے!

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ (۲۲)

قریش کو تنبیہ

رسول کے ذریعۂ علم کی عظمت و طہارت واضح کرنے کے بعد یہ قریش کے لیڈروں کو مخاطب کر کے تنبیہ فرمائی کہ تمہارے یہ ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے تمہیں انذار کرنے پر مامور فرمایا ہے اور جو کچھ وہ تمہیں سنا رہے ہیں وہ اس کا کلام ہے جو اس نے اپنے سب سے زیادہ مقرب فرشتے کے ذریعہ سے ان پر نازل فرمایا ہے تو ان کی ان باتوں کو خبط و جنون پر محمول نہ کرو بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔

یہاں لفظ صَاحِبُكُمْ کے استعمال میں بڑی بلاغت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تمہارے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں۔ تمہارے ہی اندر یہ پیدا ہوئے، تمہارے ہی ساتھ یہ رہے ہیں اور تمہارے ہی

اندر ان کی اب تک کی زندگی کا ہر دور گزرا اور تم میں سے ہر شخص ان کی شرافت، رزانت، متانت، عفت، صداقت اور امانت کا گواہ رہا ہے۔ اب اگر ان کی کوئی بات تمھیں گراں گزر رہی ہے تو ان کے اب تک کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرو نہ کہ ان کو خبطی، دیوانہ، مجنون اور کاہن و منجم بنا ڈالو۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ (۲۳)

یعنی اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اس فرشتہ کو دیکھا ہے جو ان پر وحی لے کر آتا ہے تو یہ بھی کوئی جھوٹ یا فریبِ نفس نہیں ہے بلکہ بیانِ حقیقت ہے۔ انھوں نے فی الواقع اس فرشتے کو بالکل کھلے ہوئے اور صاف افق میں دیکھا ہے۔ 'افق مبین' سے مراد فضائے آسمانی کا وہ حصہ ہے جو نظر کے سامنے ہے، جس کا مشاہدہ بغیر کسی شائبۂ اشتباہ کے ہوتا ہے۔ سورۂ نجم میں اسی کو 'افق اعلیٰ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ	اس کو ایک بڑی مضبوط قوتوں والے، طاقتور
ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۙ وَهُوَ	نے تعلیم دی ہے۔ وہ سیدھا ہوا درآنحالیکہ وہ
بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ؕ ثُمَّ دَنَا	افق اعلیٰ میں تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور جھک پڑا۔
فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ	پس دو کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا
اَوْ اَدْنٰى ۚ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ	پس اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی
اَوْحٰى ؕ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى	کی۔ یہ مشاہدہ جو اس نے کیا وہ کوئی فریبِ نفس
اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى	نہیں ہے۔ تو کیا تم لوگ اس سے اس چیز پر
(النجم - ۵۳ : ۵ - ۱۲)	جھگڑتے ہو جس کا اس کو مشاہدہ ہوتا ہے۔

ان آیات کی تفسیر تدبر قرآن میں پڑھ لیجیے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مشاہدات کی طرف اشارہ ہے جو آپ کو آغازِ وحی میں ہوئے۔ جب آپ نے ان کا ذکر اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے کیا تو وہ آپ کے سر ہو گئے اور اس کی تردید میں طرح طرح کی باتیں انھوں نے بنائیں۔ کسی نے اس کو شیطانی القاء قرار دیا اور کسی نے محض واہمہ کی خلاقی۔ انہی جھٹلانے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ نہ یہ کوئی فریبِ نفس ہے اور نہ فریبِ نظر بلکہ یہ کھلے ہوئے افق کا ایک ایسا مشاہدہ ہے جس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ (۲۴)

اللہ کا رسول غیب کا حریص نہیں ہے

یعنی تمھارا رسول تمھارے کاہنوں کی طرح غیب کا حریص نہیں ہے کہ جو واہمہ دل میں گزر جائے اس کو حقیقت سمجھ کر غیب دانی کا مدعی بن بیٹھے اور اپنی دکان سجائے بلکہ اس کو جو مشاہدہ ہوتا ہے یا جو وحی اس پر آتی ہے وہ اضطراری طور پر آتی ہے جس کو وہ تمھارے سامنے پیش کرتا ہے۔ تمھارے

کاہن غیب جاننے کے لیے نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں اور اسی پر ان کی دکان داری کا انحصار ہوتا ہے اس وجہ سے کوئی سچی چیز ہاتھ نہیں آتی تو جھوٹ ہی سے اپنی دکان چمکاتے ہیں لیکن اپنے اس ساتھی کے متعلق تمھیں اچھی طرح علم ہے کہ وہ ان چیزوں کے پیچھے کبھی نہیں پڑے۔ یہ جو کچھ تمھارے آگے پیش کر رہے ہیں یہ غیب دانی کی نمائش یا طلبِ زر کا کوئی بہانہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت کا اظہار ہے جس کے اظہار پر وہ مضطر ہیں۔

'ضَنِیْنٌ' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے 'بخیل' کیا ہے لیکن میں نے حریص کیا ہے۔ بخل و حرص دونوں لازم و ملزوم ہیں اس وجہ سے ان میں فرق محض ظاہری ہے لیکن میں نے حرص کے معنی کو اس وجہ سے ترجیح دی ہے کہ لفظ 'ضَنٌّ' بخل کے معنی میں جب آتا ہے تو اس کا صلہ 'ب' آتا ہے اور یہاں 'عَلٰی' آیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ 'حرص' کے معنی پر متضمن ہے۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (۲۵)

اوپر جو بات 'اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ' کے الفاظ میں فرمائی ہے وہی بات یہ منفی پہلو سے مؤکد کر دی ہے کہ یہ کسی شیطانِ رجیم کا القاء نہیں ہے جو تمھارے کاہنوں پر ہوتا ہے۔

'رَجِيْمٍ' مقابل ہے 'كَرِيْمٍ' کے۔ مطلب یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جو فرشتہ وحی لے کر آتا ہے وہ تو اللہ کا ایک عالی مقام فرشتہ ہے اور تمھارے کاہنوں پر جو شیاطین اترتے ہیں وہ کھدیڑے اور راندے ہوئے ہیں۔ 'رَجِيْم' کے معنی سنگسار کیے ہوئے کے ہیں۔ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ جو شیاطین آسمانوں میں غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے چھپنے کی کوشش کرتے ہیں ان پر شہابوں کے ذریعہ سے سنگساری ہوتی ہے اس وجہ سے 'رجیم' ان کی مستقل صفت ہے۔

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ (۲۶)

یہ ان ہٹ دھرموں کی کور ذوقی اور ہٹ دھرمی پر اظہارِ تعجب ہے کہ کہاں یہ قرآن اور کہاں تمھارے کاہنوں اور شیاطین کی خرافات۔ دونوں میں کیا نسبت! آخر تم ضد کے جنون میں کہاں سے کہاں نکل جاتے ہو کہ گہر اور پشیز میں فرق نہیں کر پاتے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۙ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (۲۷-۲۸)

یہ آخر میں نہایت مؤثر تنبیہ و موعظت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا والوں کے لیے اس دن کے ظہور سے پہلے یاددہانی ہے جو بہرحال آنے والا ہے اور جس سے کسی کے لیے مفر نہیں ہے۔ اگر تم اس کو قبول کرو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، کسی دوسرے پر احسان نہیں کرو گے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس کو قبول کرنا یا رد کرنا تمھاری اپنی ہی ذمہ داری ہے خدا یا اس کے رسول کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اس کو تمھارے دلوں میں اتار دیں تو جس کو اپنی راہ سیدھی کرنی ہو وہ سیدھی کر لے ورنہ

اپنی کج روی کے اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار ہے جس سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۹)

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کا حوالہ دیا ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے باب میں ٹھہرا رکھی ہے کہ وہ ہدایت کی توفیق انہی کو بخشتا ہے جو اس کے طالب بنتے اور اس کے لیے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہیں۔ جو اندھے بہرے ہو کر زندگی گزارتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ان کی پسند کردہ ضلالت ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا کرتا ہے۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ سورۂ مدثر کی آخری آیات کے تحت بھی اس کی وضاحت ہوئی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

بتوفیقِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فللّٰہ الحمد علی احسانہ۔

رحمان آباد

۱۷ - جولائی ۱۹۷۹ء

۲۱ - شعبان ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۸۲

الانفطار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــــ التکویر ـــــــ کی توام ہے۔ دونوں کے ظاہر و باطن اور اسلوب و معنی میں نہایت واضح مشابہت ہے۔ جس طرح سابق میں پہلے اس ہلچل کی تصویر کھینچی گئی ہے جو ظہور قیامت کے وقت آسمانوں اور زمین میں برپا ہوگی اسی طرح اس کا آغاز بھی اسی ہول کے ذکر سے ہوا ہے۔ دونوں میں اصل مدعا بھی تقریباً ایک ہی طرح کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ پہلی سورہ میں ہول قیامت کی تصویر کے بعد فرمایا ہے: عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ (۱۴) (اس دن ہر جان اس چیز کو دیکھ لے گی جو اس نے پیش کی) اسی طرح اس سورہ میں، ٹھیک اسی محل میں، فرمایا کہ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ (۵) (اس دن ہر جان دیکھ لے گی جو اس نے آگے بڑھایا اور جو پیچھے چھوڑا)۔ سلف سے بھی یہ بات منقول ہوئی ہے کہ جس کو ہول قیامت کی تصویر دیکھنی ہو وہ ان سورتوں میں دیکھے۔ دونوں میں اصل مخاطب وہ اغنیاء و متکبرین ہیں جو قرآن کے انذار کو اس وجہ سے خاطر میں نہیں لا رہے تھے کہ ان کو اپنے قلعوں اور حصاروں میں دراڑ پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔

البتہ بنائے استدلال دونوں میں الگ الگ ہے۔ پہلی سورہ میں استدلال کی بنیاد قرآن کی صداقت و حقانیت پر رکھی گئی ہے۔ یعنی یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ اس کا منبع، اس کے نزول کا واسطہ اور اس کا حامل سب طاہر و مطہر اور نورٌ علیٰ نور ہیں۔ جو لوگ اس کا جوڑ کاہنوں اور منجموں کی اٹکل پچو باتوں سے ملانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ شبِ دیجور اور صبحِ صادق کے درمیان امتیاز سے قاصر ہیں۔

اس سورہ میں استدلال خالقِ کائنات کی صفاتِ خلق، قدرت، حکمت، عدل اور رحمت سے ہے۔ یعنی انسان کی خلقت کے اندر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت کی جو نشانیاں ظاہر ہیں ان کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک روزِ جزا و سزا بھی لائے جس میں اپنے نیکوکار و وفادار بندوں کو انعام اور نافرمانوں اور سرکشوں کو سزا دے۔ ایک ایسے دن کا آنا لازمی ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کام ذرا بھی دشوار نہیں۔ جب اس نے پہلی بار پیدا کیا اور اس میں اس کو کوئی مشکل نہیں پیش آئی تو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے کیوں مشکل ہو جائے گا؟ اگر اس دنیا میں وہ مجرموں کے جرائم سے چشم پوشی کر رہا ہے تو اس

کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ نیکی اور بدی کے معاملے میں گے حس ہے۔ بلکہ یہ محض اس کی کریمی ہے کہ وہ بندوں کو مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنے رویے کی اصلاح کرلیں، اگر چاہیں اور اصلاح نہ کریں تو ان پر اس کی حجت پوری ہو جائے اور قیامت کے دن وہ کوئی عذر نہ کرسکیں۔ اس تاخیر سے کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے کسی کا کوئی قول و عمل مخفی ہے۔ اس نے ہر شخص پر اپنے معزز فرشتے مامور کر رکھے ہیں جو اس کی ہر بات نوٹ کر رہے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۵) ظہور قیامت کے وقت آسمان اور اس کے ستاروں، زمین اور اس کی قبروں پر جو گزرے گی۔ اس کی اجمالی تصویر اور لوگوں کو یہ تنبیہ کہ اس دن سب کا کچا چٹھا اس کے سامنے آجائے گا۔

(۶-۸) انسان کی خلقت کے اندر خدا کی قدرت، حکمت، رحمت اور عدل کی جو شانیں ظاہر ہیں ان کی روشنی میں یہ یاد دہانی کہ نہ قیامت کے وقوع کو بعید از امکان سمجھو نہ اس مغالطہ میں رہو کہ تم یوں ہی شتر بے مہار بنا کر چھوڑے رکھے جاؤ گے۔ تمہاری صنعت گری میں اس نے جو اہتمام فرمایا ہے وہ دلیل ہے کہ تمہارا وجود بے مقصد اور بے غایت نہیں ہے۔

(۹-۱۲) اس مغالطہ میں نہ رہو کہ خدا کو تمہارے تمام اقوال و اعمال کا علم کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک دن وہ تمہارا حساب کرنے بیٹھے۔ اس نے تمہارے ہر قول و فعل کو لکھنے کے لیے تمہارے اوپر اپنے معزز فرشتے مامور کر رکھے ہیں جو ہر چیز نہایت احتیاط اور دیانت داری سے نوٹ کر رہے ہیں۔

(۱۳-۱۶) جزا و سزا کے دن نیکوکار اور وفادار بندے نعمت کے باغوں میں داخل ہوں گے اور نابکار و نافرمان دوزخ میں جھونک دیے جائیں گے۔ دوزخ میں پڑنے کے بعد پھر ان کو اس سے کبھی باہر نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

(۱۷-۱۹) جزا کے بالکل بے لاگ ہونے کا بیان کہ اس دن سارا زور و اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ کوئی دوسرا کسی کے معاملہ میں دخیل یا اثر انداز نہ ہو سکے گا۔

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَار

مَكِّيَّةٌ ——— آیات: ۱۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ﴿١﴾ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿٢﴾ وَإِذَا
۱-۱۹ الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿٣﴾ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ﴿٤﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ
مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ﴿٥﴾ يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ
الْكَرِيمِ ﴿٦﴾ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ﴿٧﴾ فِي أَيِّ صُورَةٍ
مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ﴿٨﴾ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ ﴿٩﴾ وَإِنَّ
عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ﴿١٠﴾ كِرَامًا كَاتِبِينَ ﴿١١﴾ يَعْلَمُونَ مَا
تَفْعَلُونَ ﴿١٢﴾ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿١٣﴾ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ﴿١٤﴾
يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ﴿١٥﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ﴿١٦﴾ وَمَا
أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ﴿١٧﴾ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ﴿١٨﴾
يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ ﴿١٩﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱-۱۹ جب کہ آسمان پھٹ جائے گا اور جب کہ ستارے بکھر جائیں گے اور جب کہ
سمندر پھٹ پڑیں گے اور جب کہ قبریں اگلوائی جائیں گی تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ
اس کے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ ۱-۵

اے انسان! تجھے تیرے ربِّ کریم کے باب میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے! جس نے تیرا خاکہ بنایا، پھر تیرے نوک پلک سنوارے اور تجھے بالکل موزوں کیا! جس شکل پر چاہا تجھے متشکل کر دیا! ۶-۸

ہرگز نہیں، بلکہ تم جزا کو جھٹلاتے ہو۔ حالانکہ تم پر نگران مامور ہیں، دبیرانِ گرامی۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ ۹-۱۲

بے شک نیکوکار عیش میں ہوں گے اور نابکار دوزخ میں۔ وہ جزا کے دن اس میں داخل ہوں گے اور پھر اس سے وہ اوجھل ہونے والے نہیں۔ ۱۳-۱۶

اور تم کیا سمجھے جزا کے دن کو! بولو، کیا سمجھے جزا کے دن کو! اس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے لیے کچھ نہ کر سکے گی۔ معاملہ اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا!! ۱۷-۱۹

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (۱)

'اِنْفِطَارْ' کے معنی پھٹ جانے اور شق ہو جانے کے ہیں۔ ظہورِ قیامت کے وقت آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ سورۂ انشقاق کی پہلی ہی آیت میں یہی مضمون 'اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ سورۂ رحمٰن کی آیت ۳۷ میں بھی لفظ 'اِنْشِقَاقٌ' استعمال ہوا ہے اور 'اِنْفِطَارٌ' اور 'اِنْشِقَاقٌ' دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔

ایک نیا عالم نئے نوامیس کے ساتھ

قیامت کے بعد ایک بالکل نیا عالم، نئے نوامیس و قوانین کے تحت ظہور میں آئے گا اس وجہ سے اس عالمِ کہن کی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی شکل کیا ہوگی؟ اس کا صحیح تصور آج نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی یاد دہانی اس لیے فرمائی گئی ہے کہ جو اغنیا و متکبرین اپنے قلعوں اور گڑھیوں کے اعتماد پر بالکل نچنت ہیں، سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ بنا رکھا ہے وہ ان کو ہر خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی ہے، ان کو جھنجھوڑا جائے کہ قیامت کی ہلچل ایسی ہوگی کہ تمھارے بنائے ہوئے گھروندوں کا تو کیا ذکر اس پورے عالم کی یہ محکم چھت جس میں تم ڈھونڈھے سے بھی کوئی رخنہ نہیں پا سکتے، بالکل رخنہ ہی رخنہ اور شگاف ہی شگاف بن کر رہ جائے گی۔

یہاں اس الجھن میں اپنے دماغ کو نہ ڈالیے کہ یہ آسمان جو ہمیں نظر آتا ہے یہ محض ایک خلا ہے یا کوئی ٹھوس چیز ہے بلکہ اس امر پر یقین رکھیے کہ جس طرح آج اس کا مشاہدہ آپ ایک محکم چھت کی شکل میں کر رہے ہیں جس میں کسی رخنہ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی اسی طرح قیامت کی ہلچل کے وقت اس میں شگاف ہی شگاف نظر آئیں گے۔

وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (۲)

ستاروں کا نظم درہم برہم

'اِنْتِثَارْ' کے معنی بکھر جانے اور منتشر و پراگندہ ہو جانے کے ہیں۔ یعنی آج تو ستارے ایک غیر مرئی شیرازے میں پروئے ہوئے آسمان کی چھت میں قمقموں کی طرح ٹنکے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اس دن یہ شیرازہ بکھر جائے گا اور وہ ٹوٹ ٹوٹ کر ادھر ادھر پراگندہ ہو جائیں گے۔ سابق سورہ میں ان کے بے نور ہو جانے کا ذکر ہوا ہے اس لیے کہ سورج کی بساط لپیٹ دیے جانے کے باعث نظامِ شمسی سے ان کا تعلق ختم ہو جائے گا۔ اس سورہ میں ان کے انتشار کا ذکر ہوا اس لیے کہ وہ شامیانہ ہی باقی نہیں رہے گا جس کی آرائش

کے لیے ان کو آویزاں کیا گیا تھا۔

وَاِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ۙ وَاِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ (۳-۴)

زمین کے سمندروں اور اس کی قبروں کا حال

آسمان اور اس کے ستاروں کا حال بیان کرنے کے بعد یہ زمین کی بھی دو چیزوں ـــــ سمندروں اور قبروں ـــــ کا حال بطور مثال بیان فرما دیا کہ اس دن سمندر اپنی حدوں کو توڑ کر نکلیں گے اور قبروں میں جو دفن ہیں وہ بھی ان سے اگلوا لیے جائیں گے۔

سابق سورہ میں 'وَاِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ' (۶) کے الفاظ آئے ہیں، یہاں وہی بات 'فُجِّرَتۡ' کے لفظ سے بیان ہوئی ہے۔ دونوں میں بس یہ فرق ہے کہ پہلے لفظ سے سمندروں کا جوش و ہیجان نمایاں ہو رہا ہے اور دوسرے سے ان کی آزادی و بے قیدی۔ یعنی وہ موجودہ حد بندیوں سے بے قید ہو کر ہر طرف پھوٹ بہیں اور ہر نشیب و فراز پر چھا جائیں گے۔ سورۂ دھر کی آیت 'یُفَجِّرُوۡنَہَا تَفۡجِیۡرًا' (۱۳) کے تحت اس لفظ کی وضاحت ہو چکی ہے۔

'وَاِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ'۔ 'بعثر الشیٔ' کے معنی ہوں گے، کسی شے کو پراگندہ و منتشر کر دیا۔ اس کو ادھیڑ ڈالا، اس کو کھول کر جو کچھ اس میں تھا برآمد کر لیا۔ اگرچہ یہاں خاص طور پر قبروں ہی کا ذکر ہے اس لیے کہ مقصد انذار کے پہلو سے زیادہ اہمیت انہی کے کھلنے اور ان کے اندر سے لوگوں کے نکالے جانے کی تھی۔ لیکن قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس دن زمین اپنا سارا بار بوجھ نکال پھینکے گی۔ سورۂ زلزال میں ہے: 'وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَہَا' (۲) (اور زمین اپنے بار بوجھ نکال پھینکے گی) اسی طرح سورۂ انشقاق میں ہے 'وَاِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ ۙ وَاَلۡقَتۡ مَا فِیۡہَا وَتَخَلَّتۡ' (۳-۴) (اور جب کہ زمین تان دی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے وہ اس کو نکال پھینکے گی اور خالی ہو جائے گی)۔

عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَاَخَّرَتۡ (۵)

یہ وہ اصل بات بیان ہوئی ہے جو اس دن سب کے سامنے آئے گی۔ یعنی جب اس کائنات میں یہ عظیم ہلچل برپا ہو گی جس کے بعض آثار مذکور ہوئے تب ہر شخص کو پتہ چلے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ مطلب یہ ہے کہ آج جو لوگ پیغمبر کے انذار کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ یہی دن ہمیشہ رہیں گے بلکہ اس دن کی عظیم ہلچل کو سامنے رکھ کر اپنے انجام پر غور کریں جس سے سابقہ پیش آنے والا ہے اور جس سے کسی کو بھی پناہ نہیں ملنی ہے، نہ کسی چھوٹے کو نہ کسی بڑے کو۔

'تقدم' اور 'تاخر' کی تاویل

'مَا قَدَّمَتۡ وَاَخَّرَتۡ' کی تاویل اگر ان مستکبرین کو سامنے رکھ کر کی جائے جو سورہ کے اولین مخاطب ہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جو ناکردنی کام اللہ و رسول کے خلاف انھوں نے کیے ان کا انجام بھی وہ دیکھیں گے اور جو کرنے کے کام انھوں نے نظر انداز کیے ان کی حسرت بھی چکھیں گے۔ سورۂ جمعہ میں یہود کے

متعلق فرمایا ہے کہ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ (اور وہ ہرگز موت کی تمنا کرنے والے نہیں ہیں بوجہ اپنی کرتوتوں کے جو وہ کر گزر رہے ہیں) یعنی جو زادِ راہ آخرت کے لیے انھوں نے بھیجا ہے وہ اس سے اچھی طرح واقف ہیں اس وجہ سے یہ خدا کو منہ دکھانے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ کفار قیامت کے دن نہایت حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ کاش، آخرت کی زندگی کے لیے انھوں نے کچھ کر لیا ہوتا۔ سورۂ فجر میں ان کا قول نقل ہوا ہے: يَقُولُ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي (۲۴) (وہ کہے گا، اے کاش! میں نے اپنی اُخروی زندگی کے لیے دنیا کی زندگی میں کچھ کر لیا ہوتا) اسی طرح سورۂ مومنون میں ہے: حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۝ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ (۹۹-۱۰۰) (یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آ دھمکے گی وہ کہے گا اے رب! مجھے پھر واپس بھیج کہ جو مال و متاع میں دنیا میں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں کچھ نیکی کی کمائی کروں)۔

اگرچہ ان حوالوں کی روشنی میں 'قَدَّمَ' اور 'أَخَّرَ' دونوں کا صحیح محل متعین ہو جاتا ہے لیکن بعض لوگوں نے اس کا یہ مفہوم بھی لیا ہے کہ 'ما قدم من الخیر والشر وما ترک بعدہ' (یعنی جو نیکی اور بدی اس نے کی اور جو چھوڑی) اسی طرح بعض دوسروں نے یہ مطلب لیا ہے کہ 'ما قدم من مالہا وما اخّر للعادثین' (جو اس نے اپنے مال میں سے اپنی اخروی زندگی کے لیے بھیجا اور جو وارثوں کے لیے چھوڑا) اگرچہ آیت کے عموم میں یہ باتیں بھی داخل ہیں لیکن اس کے موقع و محل کے پہلو سے اس تاویل کو ہمارے نزدیک ترجیح حاصل ہے جو ہم نے اوپر بیان کی۔

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (۶)

خدا کی کریمی سے مہلک مغالطہ

'انسان' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں روئے سخن انہی مکذبینِ قیامت کی طرف ہے جن کو اس سورہ میں انذار کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ آگے والی آیت میں ان کو براہِ راست مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ (ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ جزا و سزا کو جھٹلا رہے ہو) خاص مخاطب کو عام لفظ سے خطاب کرنے میں جو بلاغت ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں۔

'مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ' میں استفہام اسلوب اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمھارے رب کی اس کریمی نے تم کو جزا و سزا سے نچنت کیا کہ وہ تمھاری سرکشیوں پر فوراً گرفت نہیں کر رہا اور برابر ڈھیل پر ڈھیل دیے جا رہا ہے تو تم نے اس کریمی سے بہت سخت دھوکا کھایا۔ ہونا تو یہ تھا کہ تم اس کے لطف و کرم کی قدر کرتے، اس کے شکر گزار بندے بنتے اور اپنے آپ کو اس کی مزید عنایات کا حق دار بناتے لیکن ہوا یہ کہ تم اس کے آگے بالکل ڈھیٹ بن گئے۔ اس کے انذار کا مذاق اڑانے لگے، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ جو عافیت تمھیں حاصل ہے یہ تمھارا پیدائشی حق ہے اور رسول جس قیامت سے آگاہ کر رہا ہے یہ محض ایک ہوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

اَلَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ ۙ﴿۷﴾ فِیۡۤ اَیِّ صُوۡرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ؕ﴿۸﴾ (۷-۸)

اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا حوالہ جو جزا و سزا پر دلیل ہیں

یہ ربِّ کریم نے اپنی بعض ان صفات کا حوالہ دیا ہے جو خود انسان کی خلقت کے اندر ظاہر ہیں اور جو دلیل ہیں کہ جس رب نے انسان کے پیدا کرنے میں اپنی کاریگری، حکمت، قدرت اور اہتمام خاص کی شانیں دکھائی ہیں اس نے اس کو عبث نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ شترِ بے مہار کی طرح چھوٹا پھرے۔ بلکہ ایک دن وہ لازماً اس کو اپنے حضور میں بلائے گا، اس کا محاسبہ فرمائے گا، پھر جن کو وہ اپنا فرمانبردار پائے گا ان کو ابدی رحمتوں سے نوازے گا اور جو اس کے باغی ہوں گے ان کو جہنم میں جھونک دے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ سارا اہتمام بالکل بے معنی و بے مقصد ہو جاتا ہے جو انسان کے پیدا کرنے پر اس نے کیا اور اس کی اس قدرت و حکمت کی بھی نفی ہو جاتی ہے جو اس کے ہر فعل میں نمایاں ہے۔

'اَلَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ'۔ 'خلق' کے معنی ہیں کسی چیز کا خاکہ بنانا اور اس کو پیدا کرنا اور 'تسویۃ' کے معنی اس کی نوک پلک سنوارنے کے ہیں۔ گویا یہاں انسان کی پیدائش کے ابتدائی اور انتہائی دونوں مرحلوں کی طرف اشارہ فرما دیا کہ اسی ربِّ کریم نے تمہارا خاکہ بنایا اور اسی نے تمہارے نوک پلک سنوارے۔ 'فَعَدَلَکَ' اور اس طرح اس نے تمہیں ایک متوازن مخلوق بنایا۔

انسان کی خلقت میں حکمت کا پایا جانا دلیل ہے کہ وہ کھلونا نہیں ہے

مقصود اس بیان سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس اہتمام و عنایت کی طرف توجہ دلانا ہے جو انسان کی تخلیق میں نمایاں ہے۔ یہ اہتمام و عنایت اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کوئی کھلونا نہیں ہے جس کو قدرت نے اپنا جی بہلانے کے لیے وقتی طور پر بنا لیا ہو اور پھر جب چاہے اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ جس چیز پر جتنا ہی اہتمام صرف ہوتا ہے اس کے اندر اتنی ہی مقصدیت ہوتی ہے اور اسی قدر اس سے اس کو قدرت کے نظام میں اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ انسان برسات میں پیدا ہونے والے پتنگوں کی مانند نہیں ہے کہ پیدا ہوا اور فنا ہو جائے بلکہ وہ قدرت کی بہترین صناعی کا مظہر ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ وہ امتحانوں سے گزرتا ہوا اس مقام تک پہنچے جو اس کے لیے مقدر ہے اور اگر وہ اس کا حوصلہ نہ کرے تو یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی پست حوصلگی کی سزا بھگتے۔

'فَعَدَلَکَ' میں اس اعتدال و توازن کی طرف اشارہ ہے جو 'لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ' (التین-۹۵:۴) والی آیت میں بیان ہوا ہے۔ انسان اپنی ظاہری شکل و صورت اور اپنی روحانی و معنوی صلاحیتوں کے اعتبار سے عالم کی تمام مخلوقات میں بالکل نقطۂ وسط پر ہے اس وجہ سے وہ اس بات کا اہل ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائے، اس کرامتِ وسط کے منصب پر سرفراز فرمائے اور اگر وہ زمین میں خدا کی خلافت کا حق ادا کرے تو آسمان کی ابدی بادشاہی کا بھی حق دار ٹھہرائے۔

'فِیۡۤ اَیِّ صُوۡرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ'۔ یعنی ایک طرف تو اپنے رب کے اس اہتمام اور اس کی

اس عنایت پر نظر کرو کہ اس نے ہر آدمی کے لیے الگ الگ شکل و صورت تجویز کی اور اپنے کمال قدرت سے جس کے لیے جو صورت پسند فرمائی اسی پر اس کو پیدا کر دیا۔ اس میں ذرا بھی اس کو مشکل پیش نہیں آئی۔ مجال نہیں کہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے اندر سے بھی کوئی دو آدمی ایسے نکالے جا سکیں جو بالکل ایک ہی شکل و صورت کے ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ جس خدا کی قدرت و عنایت کا یہ حال ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک دن وہ تمہارے نیکوں اور بدوں میں امتیاز کرے اور اس کام کے لیے تمہیں وہ مرنے کے بعد اٹھائے اور یہ کام اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ (۹)

مکذبینِ قیامت کو زجر

'کَلَّا' یہاں مکذبین کے ان شبہات و اعتراضات کی نفی کے لیے ہے جو وہ قیامت کے خلاف پیش کرتے تھے اور جن کی تردید اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے فرمائی گئی ہے جو خود انسان کی خلقت کے اندر موجود ہیں۔ ان کو پیش کرنے کے بعد ان دلیل بازوں کو زجر فرمایا ہے کہ 'کَلَّا' یعنی تمہارے ان تمام شبہات و اعتراضات کی ہرگز کوئی بنیاد نہیں ہے، یہ ساری باتیں بناوٹی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ تم جزا و سزا کو ماننا نہیں چاہتے اس وجہ سے لایعنی شبہات پیش کر رہے ہو کہ بھلا مر کھپ جانے کے بعد وہ لوگ دوبارہ کیسے زندہ کیے جائیں گے، حالانکہ اگر جزا و سزا عقل، عدل، فطرت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و حکمت کی رُو سے واجب ہے تو اس کے لیے انسانوں کو قبروں سے اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے!

یہاں یہ بات یاد رکھیے کہ بعض اوقات انسان جھٹلانا تو کسی چیز کو چاہتا ہے لیکن اس کے خلاف کچھ کہنے کی گنجائش نہیں پاتا اس وجہ سے بعض غیر متعلق سوالات چھیڑتا ہے تاکہ اس کے باب میں کچھ شبہات پیدا کرنے کی راہ کھلے۔ قریش کے منکرین اسی طرح کی الجھن میں گرفتار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جزا و سزا کو جھٹلانا ایک امر بدیہی کو جھٹلانا ہے لیکن اس کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تھے اس وجہ سے بعض بناوٹی شبہات کی آڑ لے کر یہ نمائش کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ گویا ان کے پاس کچھ دلائل ہیں جن کی بنا پر وہ قرآن کے انذار کو نہیں مان رہے ہیں۔

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۙ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ (۱۰-۱۲)

اوپر والی آیت میں جو جھڑکی ہے اس سے بھی اس کا تعلق ہے اور مکذبین قیامت کے اس شبہ پر، جو وہ آخرت کے حساب کتاب سے متعلق محض مصنوعی طور پر اٹھاتے تھے اس میں تنبیہ بھی ہے۔

اعمال کا ریکارڈ رکھنے والوں کی ذمہ داری

فرمایا کہ اس مغالطے میں نہ رہو کہ تمہاری جلوت و خلوت کی ساری باتوں سے کون باخبر ہو سکتا ہے کہ ایک دن ان کا محاسبہ کرنے بیٹھے! اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ہر ایک کے اوپر اپنے نگران بٹھا رکھے ہیں

جو تمہارے ہر قول و فعل کو نوٹ کر رہے ہیں۔ جو کچھ بھی تم کہتے ہو یا کرتے ہو اس کو سنتے اور جانتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ نہایت معزز ہیں۔

ان فرشتوں کی صفت 'کِرَام' سے مقصود اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ یہ جس ڈیوٹی پر مامور ہیں اس کو نہایت فرض شناسی، پورے احساس ذمہ داری اور کامل غیر جانبداری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ نہ کام چوروں کی طرح یہ اپنے فرض میں کوئی غفلت برتتے، نہ احساس ذمہ داری سے محروم لوگوں کی طرح کبھی دفع الوقتی اور مداہنت سے کام لیتے اور نہ کسی کے دباؤ یا اس کی خوشامد میں آنے والے ہیں کہ کسی کے ساتھ جانبداری برتیں۔

'يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ' یعنی جو کچھ تم کرتے ہو اور جہاں کہیں بھی کرتے ہو وہ سب ان پر واضح ہوتا ہے۔ یہاں صرف افعال کے جاننے کا ذکر ہے لیکن سورۂ قٓ میں فرمایا ہے کہ 'مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ' (قٓ - ۵۰ : ۱۸) (نہیں بولتا ہے وہ کوئی بات مگر ایک مستعد نگران اس کے پاس موجود ہوتا ہے)۔ سورۂ قٓ میں یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ فرشتے دو ہوتے ہیں اور دائیں بائیں دونوں طرف سے نگرانی کرتے ہیں۔ احادیث سے یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ ان میں تقسیم کار ہوتی ہے۔ ایک نیکیاں لکھنے پر مامور ہوتا ہے دوسرا بدیاں۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ (۱۳-۱۴)

نتیجہ اس اہتمام و انتظام کا جو اوپر مذکور ہوا — یہ نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے اس اہتمام و انتظام کا جو اوپر مذکور ہوا کہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں اور بدکاروں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ نہیں کرے گا بلکہ وہ نیکوں کو جنت میں داخل کرے گا اور بدوں کو دوزخ میں۔ جو نادان یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد نہ موت ہے نہ زندگی یا یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ اگر مرنے کے بعد زندگی ہوئی تو وہاں بھی وہ اپنے شرکاء کی سفارش سے اس سے اچھی زندگی حاصل کر لیں گے جو یہاں حاصل ہے، تو وہ اپنے دماغ کا علاج کرائیں۔ اس کائنات کا خالق نیکی و بدی کے معاملے میں بے حس اور غیر جانبدار نہیں ہے کہ سب کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے، بلکہ وہ لازماً دونوں میں فرق کرے گا اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ العیاذ باللہ نیک اور بد دونوں اس کی نگاہ میں یکساں ہیں اور اس کی دنیا ایک اندھیر نگری ہے جس میں حق و عدل کا کوئی تصور نہیں ہے۔

يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ (۱۵-۱۶)

اصل حقیقت کا مواجہہ — یعنی اس طرح کے لذیذ خوابوں میں زندگی گزارنے کے بجائے بہتر ہے کہ لوگ اصل حقیقت کا مواجہہ کریں۔ جزا کے دن تمام نابکار جہنم میں داخل ہوں گے اور پھر ان کو وہاں سے ایک پل کے لیے

بھی اوجھل ہونا نصیب نہ ہوگا۔ 'وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ' کا اصل مدعا وہی ہے جو دوسرے مقامات میں 'خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال ہو کہ جگہ پسند نہ آئی تو وہاں سے فرار کی کوئی راہ ڈھونڈ لیں گے وہ یہ خیال دل سے نکال دیں۔ اس میں داخل ہونے کے بعد اس سے نکلنے کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۙ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (۱۷-۱۸)

یہ سوال اس جزا کے دن کی عظمت و اہمیت واضح کرنے کے لیے ہے اور اس کی تکرار نے اس کو مزید پُرہول بنا دیا ہے۔ 'اَدْرٰىكَ' میں واحد کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے بلکہ انہی لوگوں سے ہے جن سے 'مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ' اور اس کے بعد کی دوسری آیات میں ہے۔ جمع کو واحد کے صیغہ سے خطاب میں جو بلاغت ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ (۱۹)

سوال چونکہ جواب کے لیے نہیں بلکہ صرف اس دن کے ہول کا تصور پیدا کرنے کے لیے تھا اس وجہ سے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی جواب دے دیا کہ اس دن کوئی جان کسی دوسرے کے کام آنے والی نہیں بنے گی، سارا اختیار و اقتدار اس دن صرف اللہ وحدہٗ لا شریک ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس دن کوئی کسی کو کوئی نفع نہ پہنچا سکے گا۔ جن کو خدا کا شریک و شفیع سمجھا گیا اور اس امید پر ان کی عبادت کی گئی کہ وہ اپنے پوجنے والوں کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے وہ سب اس دن ہوا ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فللہ الحمد علی احسانہٖ۔

رحمان آباد
۲۹- جولائی ۱۹۷۹ء
۴- رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ

تدبّرِ قرآن

۸۳

المطفّفین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــــ الانفطار ـــــــ کا تکملہ و تتمہ ہے۔ دونوں کا عمود بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔ سورۂ انفطار کے آخر میں ابرار اور فجار کی جو تقسیم ہے اس سورہ میں اسی کی تفصیل ہے۔ صرف استدلال کی بنیاد دونوں میں الگ الگ ہے۔ سابق سورہ میں استدلال اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے ہے جو خود انسان کی خلقت کے اندر نمایاں ہیں۔ اس سورہ میں استدلال اس فطرت سے ہے جو فاطر نے انسان کے اندر ودیعت فرمائی ہے۔

اس استدلال کی تقریر بالاجمال یوں ہے کہ انسان بالطبع عدل اور خیر کو پسند کرنے والا اور ظلم و شر سے نفرت کرنے والا ہے۔ اس کی یہ پسند اور ناپسند اس بات کی شہادت ہے کہ فاطرِ فطرت عدل اور ظلم یا بالفاظ دیگر عادل اور ظالم میں فرق و امتیاز کرنے والا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ نیک اور بد دونوں اس کے نزدیک یکساں ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ انسان کی فطرت میں نیک اور بد میں یہ امتیاز کیوں رکھتا؟

رہا یہ سوال کہ انسان جب طبعاً نیکی پسند ہے تو وہ بدی کیوں کر گزرتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بدی اس وجہ سے نہیں کرتا کہ یہی اس کو طبعاً مرغوب ہے۔ طبعاً تو اس کو مرغوب نیکی ہی ہے لیکن بسا اوقات نفس کے دوسرے داعیات سے وہ مغلوب ہو کر، اپنی فطرت کے خلاف بدی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ اگر بدی اور ناانصافی اس کو طبعاً مرغوب ہوتی تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی اس کے ساتھ ناانصافی کرتا تو وہ اس پر بھی راضی رہتا لیکن ہر شخص دیکھتا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہی شخص جو دوسروں کے لیے ناپ اور تول میں بے ایمانی کرتا ہے جب دوسرے اس کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں تو وہ چیختا اور فریاد کرتا ہے۔

قرآن نے اس سورہ میں انسان کی اسی فطرت کو شہادت میں پیش کر کے یہ تذکیر فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ خود عادل ہے اور اس نے اپنے بندوں کے اندر بھی عدل اور خیر کی محبت ودیعت فرمائی ہے اس وجہ سے لازمی ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں ان لوگوں کو بھرپور انعام دے جو اپنی فطرت کے اس نور کی قدر کریں اور ان لوگوں کو سزا دے جو اس کی بے حرمتی کریں۔

قیامت کے حق میں یہ طریقِ استدلال قرآن نے جگہ جگہ اختیار کیا ہے اور ہم برابر اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔ خاص طور پر سورۂ قیامہ میں نفسِ لوّامہ کی قسم اور بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ (القیٰمۃ - ۷۵: ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرا تراشے) کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۶) ان لوگوں کے حال پر افسوس جو اپنے لیے تو چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے لیکن جب وہ دوسروں سے معاملہ کرتے ہیں تو ان کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ حالانکہ عدل پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ جو بات وہ اپنے لیے پسند نہیں کرتے دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کریں۔ ان کا یہ رویہ شاہد ہے کہ وہ اس عظیم دن کی توقع نہیں رکھتے جس دن لوگ اپنے رب کے حضور میں پیشی کے لیے اٹھائے جائیں گے۔

(۷-۱۷) ان فجّار کے انجام کی تفصیل جنھوں نے جزا و سزا کے دن کو جھٹلایا اور زندگی خدا کی نافرمانی میں گزاری۔

(۱۸-۲۸) ابرار کے انجام کا بیان جو روزِ جزا پر ایمان لائے اور جنھوں نے زندگی اس سے ڈرتے ہوئے گزاری۔

(۲۹-۳۶) اس انقلابِ حال کی تصویر جو ایک دن سب کے سامنے آنے والا ہے۔ آج کفار اپنے حال میں مگن ہیں اور اہلِ ایمان کا مذاق اڑا رہے ہیں، اس دن اہلِ ایمان اپنی فیروزمندی پر شادماں ہوں گے اور کفار کا مذاق اڑائیں گے۔

سُورَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات: ۳۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ۱-۳۶

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ
يَسْتَوْفُوْنَ ۝۲ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝۳
اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵
يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ
الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝۷ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝۸ كِتٰبٌ
مَّرْقُوْمٌ ۝۹ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ
بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝۱۱ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝۱۲ اِذَا
تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳ كَلَّا بَلْ
رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۱۴ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ
يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝۱۵ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝۱۶ ثُمَّ
يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝۱۷ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ
الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝۱۸ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝۱۹ كِتٰبٌ
مَّرْقُوْمٌ ۝۲۰ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۲۱ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝۲۲

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ
النَّعِيْمِ ﴿٢٤﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿٢٥﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ
وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿٢٧﴾
عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا
مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿٢٩﴾ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿٣٠﴾
وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿٣١﴾ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا
اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿٣٢﴾ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿٣٣﴾
فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿٣٤﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ
يَنْظُرُوْنَ ﴿٣٥﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾ ع ٣٦ ٨

ترجمۂ آیات ١-٣٦

برا ہو ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا! جو دوسروں سے نپوائیں تو پورا نپوائیں اور جب ان کے لیے ناپیں یا تولیں تو اس میں کمی کریں۔ کیا یہ لوگ یہ گمان نہیں رکھتے کہ ایک دن وہ اٹھائے جانے والے ہیں۔ ایک عظیم دن کی حاضری کے لیے جس دن لوگ اٹھیں گے خداوند عالم کے حضور پیشی کے لیے۔ ١-٦

ہرگز نہیں، فاجروں کے اعمال نامے سجّین میں ہوں گے۔ اور تم کیا جانو کہ سجّین کیا ہے! لکھا ہوا دفتر! اس دن تباہی ہے جھٹلانے والوں کی! جو روزِ جزا کو جھٹلا رہے ہیں۔ اس کو تو وہی جھٹلاتے ہیں جو تعدّی اور حق تلفی کرنے والے ہوتے ہیں۔ جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلوں کے فسانے ہیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ اس دن

وہ اپنے رب سے اوٹ میں رکھے جائیں گے۔ پھر وہ جہنم میں پڑنے والے بنیں گے تب کہا جائے گا، یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے ہو۔ ۱۷-۷

ہرگز نہیں، بے شک اچھوں کے اعمالنامے علّیّین میں ہوں گے۔ اور تم کیا سمجھے کہ علّیّین کیا ہے! لکھا ہوا دفتر۔ مقرّبوں کی نگرانی میں۔ بے شک نیک بندے عیش میں ہوں گے۔ تختوں پر بیٹھے سیر دیکھتے۔ ان کے چہروں پر آسائش کی بشاشت جھلک رہی ہوگی۔ سربمہر شراب خالص ان کو پینے کو ملے گی۔ جس پر مشک کی مہر ہوگی۔ یہ چیز ہے جس کی طلب میں طالبوں کو سرگرم ہونا چاہیے! اور اس میں تسنیم کی ملونی ہوگی۔ ایک خاص چشمہ جس پر مقرّبین بیٹھ کر پئیں گے۔ ۱۸-۲۸

جو مجرم رہے ہیں وہ ان لوگوں کے حال پر ہنستے رہے ہیں جو ایمان والے تھے۔ اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو کن انکھیوں سے اشارے کرتے اور اپنے لوگوں میں لوٹتے تو مگن ہو کر لوٹتے۔ اور جب ان کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ بالکل گمراہ ہیں، یہ ان پر کوئی نگران بنا کر تو نہیں بھیجے گئے ہیں! پس آج ایمان والے کفار کے حال پر ہنسیں گے، تختوں پر بیٹھے، سیر دیکھتے ــــ کیوں پایا نا کفار نے اپنے کیے کا بدلا!! ۲۹-۳۶

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ (۱)

ان لوگوں پر لعنت جو لینے کے باٹ کچھ اور دینے کے باٹ اور ہیں

یہ جملہ صرف خبریہ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر لعنت اور پھٹکار کا مضمون بھی مضمر ہے۔ 'تطفیف' کے معنی ناپ تول میں کمی کرنے کے ہیں یعنی جو لوگ ناپ اور تول میں کمی کرنے والے ہیں ان کے لیے تباہی اور ان پر خدا کی مار اور پھٹکار ہے۔

الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ (۲-۳)

یہ ان کمی کرنے والوں کی صفت بیان ہوئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں مجرد ناپنے اور تولنے میں کمی کرنا زیر بحث نہیں ہے بلکہ ایک خاص کردار زیر بحث ہے۔ وہ یہ کہ آدمی دوسروں سے اپنے لیے نپواتے اور تلواتے میں تو بڑا چوکس اور حساس ہو، ہرگز نہ چاہے کہ جو چیز اس کے لیے ناپی یا تولی جائے اس میں رتی برابر بھی کمی ہو لیکن وہی شخص جب دوسروں کے لیے ناپے اور تولے تو اس میں ڈنڈی مارنے کی کوشش کرے۔ یہ کردار اس امر پر شاہد ہے کہ انسان عدل کے تصور اور اس کے واجب ہونے کے شعور سے عاری نہیں ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لینے کے باٹ اور دینے کے باٹ الگ الگ نہیں ہونے چاہئیں بلکہ ان کا ایک ہونا ضروری ہے۔ نیز وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ جو چیز اسے اپنے لیے پسند نہیں ہے وہ اسے دوسروں کے لیے بھی پسند نہیں کرنی چاہیے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف محض اپنی خود غرضی سے مغلوب ہو کر کرتا ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی ناانصافی بھی ہے اور ایک سخت قسم کی دناءت بھی۔

عدل سے محبت کے باوجود ارتکاب ظلم کی وجہ

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر فاطر فطرت نے عدل اور ظلم کے درمیان امتیاز کے لیے ایک کسوٹی بھی رکھی ہے اور عدل کے ساتھ محبت اور ظلم سے نفرت بھی ودیعت فرمائی ہے۔ اس کے باوجود وہ ظلم کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ عدل اور ظلم میں امتیاز سے وہ قاصر ہے یا ظلم کا ظلم ہونا اس پر واضح نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، محض یہ ہے کہ وہ اپنی کسی خواہش یا کسی جذبہ سے مغلوب ہو کر اپنے نفس کے توازن کو قائم نہیں رکھ پاتا۔

ایک چور جو دوسروں کے گھروں میں نقب لگاتا ہے وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا اس کے گھر میں نقب لگائے، ایک قاتل جو دوسروں کو قتل کرتا ہے یہ نہیں پسند کرتا کہ کوئی اس کو یا اس کے کسی

عزیز و قریب کی جان کے درپے ہو، کوئی زانی جو دوسروں کی عزت و ناموس پر حملہ کرتا ہے اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی عزت و ناموس پر حملہ آور ہو۔ بلکہ انہی چوروں، انہی قاتلوں اور انہی زانیوں سے اگر ان کی غیر جانبدارانہ رائے معلوم کرنے کی کوئی شکل ہو تو وہ اس حقیقت کا بھی اعتراف کریں گے کہ چوروں، قاتلوں، زانیوں اور اس قبیل کے دوسرے مجرموں کے لیے معاشرے میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ معاشرے میں جگہ انہی کے لیے ہونی چاہیے جو جان و مال اور ان کے عزت و ناموس کی اسی طرح حفاظت کرنے والے ہوں جس طرح وہ اپنی جان اور اپنی عزت کی حفاظت چاہنے والے ہیں۔

انسان کی فطرت سے ایک روزِ جزا پر استدلال

انسان کا یہ طرزِ عمل اور اس کی فطرت کا یہ پہلو اس بات کی بدیہی شہادت ہے کہ نہ وہ نیک اور بد کو یکساں سمجھتا اور نہ اس بات پر راضی ہے کہ دونوں قسم کے لوگوں سے ایک ہی طرح کا معاملہ کیا جائے بلکہ اس کا غیر جانبدارانہ فیصلہ یہی ہے کہ دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ ہونا چاہیے۔ یہ چیز اس بات کو بھی مستلزم ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسا دن لائے جس میں نیکوں اور بدوں کے ساتھ ان کے اعمال کے مطابق معاملہ کرے۔ اگر ایک ایسا دن نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دنیا کے خالق کے نزدیک نیک اور بد دونوں یکساں ہیں درآنحالیکہ یہ چیز اس فطرت کے منافی ہے جو فاطر نے انسان کے اندر ودیعت فرمائی ہے۔ یہاں انسان کی اسی فطرت سے ایک روزِ جزا و سزا کے لازمی ہونے پر دلیل اور ان منکرینِ قیامت پر حجت قائم فرمائی ہے جو اپنی فطرت کی اس شہادت سے تو انکار نہیں کر سکتے تھے لیکن قرآن کے انذارِ قیامت کی تکذیب پر تلے ہوئے تھے۔

ایک ضعیف شانِ نزول

اس آیت کے تحت مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے کہ انصار میں ناپ تول میں کمی کی خرابی موجود تھی اس وجہ سے یہ آیت نازل ہوئی۔ لیکن اول تو یہ سورہ مکی ہے، مدنی نہیں ہے۔ پھر انصار میں یہ خرابی رہی بھی ہوگی تو اتنی ہی رہی ہوگی جتنی اہلِ مکہ میں رہی ہوگی بلکہ اہلِ مکہ کے اندر اس کے پائے جانے کے زیادہ امکان تھے اس لیے کہ وہ بالعموم تجارت پیشہ تھے جبکہ انصار کا اصل پیشہ زراعت تھا۔ پھر سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ آیت ناپ تول میں کمی کرنے کی مذمت کے سیاق میں نہیں ہے بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس حقیقت کے بیان میں ہے کہ انسان عدل و ظلم میں امتیاز سے قاصر نہیں ہے۔ وہ برائی کرتا ہے تو اپنی فطرت کی شہادت کے خلاف محض اپنے نفس کی کسی خواہش کی پاسداری میں کرتا ہے۔ انسان کی یہ فطرت لازم کرتی ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں نیکوں اور بدوں کے درمیان کامل امتیاز ہو۔ اگر وہ ایک ایسے دن کے آنے سے انکار کرتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ جزا و سزا کے مواجہے سے گریز کرنا چاہتا ہے حالانکہ یہ چیز اس کی اپنی فطرت کا مطالبہ ہے۔

أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۴-۶)

ان لوگوں کو ملامت جو اپنی فطرت کی شہادت سے کان بند کیے ہوئے ہیں

یہ اس طرح کے لوگوں کے حال پر اظہار تعجب بھی ہے اور ان کو سرزنش بھی کہ کیا یہ لوگ یہ گمان نہیں رکھتے کہ ایک ایسا عظیم دن آنے والا ہے جس میں لوگ اپنے رب کے حضور میں پیشی کے لیے اٹھائے جائیں گے، یعنی ایک ایسے دن کے ظہور کا اندیشہ ہر شخص کے دل کے اندر ہونا چاہیے اس لیے کہ اس کی شہادت ہر شخص کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ اگر کسی کا دل اس اندیشہ سے خالی ہے تو وہ خود اپنی فطرت کی آواز سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہے حالانکہ وہ دن کوئی معمولی دن نہیں ہوگا بلکہ ایک نہایت ہی عظیم دن ہوگا۔ اس دن لوگ اس لیے اٹھیں گے کہ خداوند کائنات کے سامنے پیش ہوں اور ان سے پرسش ہو کہ انھوں نے کیا بنایا اور کیا بگاڑا، پھر اپنے اعمال کے مطابق وہ جزا یا سزا پائیں۔

'رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' کے اندر اس دن کی عظمت، ضرورت اور اس کے فیصلوں کے ناطق ہونے کی جو دلیلیں مضمر ہیں ان کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے۔ ان کو ذہن میں تازہ کر لیجیے تب اس کا اصلی زور سمجھ میں آئے گا۔

كَلَّآ إِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ (۷)

مخاطبوں کے زعم کی تردید

'کَلَّآ' مخاطبوں کے اس زعم باطل کی تردید کے لیے بطور زجر آیا ہے جس کا اشارہ اوپر والی آیت میں موجود ہے۔ یعنی وہ اس فکر سے بالکل بے فکر ہیں کہ ان کے سامنے حساب کتاب اور جزا و سزا کا کوئی مرحلہ آنے والا ہے جس میں نیکوں اور بدوں کے درمیان اللہ تعالیٰ فرق کرے گا بلکہ وہ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ اول تو کوئی دن آنا نہیں ہے اور آیا بھی تو وہ اپنی خاندانی وجاہت اور اپنے دیوتاؤں کی بدولت وہاں بھی اس سے زیادہ عیش لوٹیں گے جو عیش یہاں لوٹ رہے ہیں۔ ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ہرگز نہیں، اس قسم کے طفلانہ خیالات میں اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ اس دن ابرار اور فجار میں مشرق و مغرب کی دوری ہوگی۔ 'فجار' کے اعمال نامے 'سجّین' میں ہوں گے اور ابرار کا ذکر آگے آ رہا ہے کہ ان کے اعمال نامے 'علّیّین' میں ہوں گے۔

وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۸-۹)

'سجّین' کی تحقیق

لفظ 'سِجِّیْن' اوپر والی آیت میں لغوی مفہوم میں نہیں بلکہ بطور ایک نام کے آیا ہے اس وجہ سے قرآن نے خود ہی اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔ اس طرح کے نام قرآن میں متعدد آئے ہیں اور ہر جگہ ان کی وضاحت بھی فرما دی گئی ہے۔ سورۂ دہر میں ان کی بعض مثالیں گزر چکی ہیں۔ آگے اس سورہ میں بھی 'عِلِّیُّوْنَ' اور 'تَسْنِیْمٌ' کے الفاظ اسی نوعیت سے آئے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ میں اصل اہمیت ان کے لغوی مفہوم کی نہیں بلکہ ان کے اصطلاحی مفہوم یا ان کے تسمیہ کی ہوتی ہے۔

'وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ' یہ اسلوب بیان 'سِجِّیْن' کے ہول کو ظاہر کرنے کے لیے اختیار فرمایا گیا۔

ہے کہ تم کیا سمجھے کہ 'سِجِّیْن' کیا ہے! اس کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو! وہ تباہ ہوا جس کا نام یا جس کے اعمال اس میں درج ہوتے!

'کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ' وہ لکھا ہوا دفتر ہے۔ یعنی اس میں تمام مجرمین کا سارا ریکارڈ بشکل تحریر محفوظ کیا جاتا ہے۔ 'بشکل تحریر' کی قید سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نہ اس میں کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان ہے اور نہ اس کے حجت ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش۔

معلوم ہوا کہ 'سِجِّیْن' اس دفتر کا نام ہے جس میں مجرموں کے اعمال کا سارا ریکارڈ تحریری صورت میں محفوظ کیا جا رہا ہے اور جس کی بنیاد پر قیامت کے دن فیصلہ ہوگا کہ کون دوزخ کے کس درجے میں داخل کیے جانے کا سزاوار ہے۔ 'سجین' کا مادہ 'سجن' ہے جس کے معنی قید یا قیدخانہ کے ہیں۔ اسی مناسبت سے مستحقینِ سزا کے ریکارڈ آفس کا نام 'سجین' رکھا گیا ہے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۱۰-۱۱)

یعنی اس گمان میں نہ رہو کہ جس طرح آج چھوٹے پھر رہے ہو اسی طرح برابر چھوٹے ہی پھرو گے، بلکہ جب وہ جزاء و سزا کا دن ظہور میں آئے گا تو ان لوگوں کی شامت آ جائے گی جو اس کو جھٹلاتے رہے ہیں۔ اس دن وہ دیکھ لیں گے کہ ان کا کوئی قول و عمل نہ ریکارڈ ہونے سے رہ گیا ہے اور نہ اب اس کے وبال سے بچنے بچانے کی کوئی صورت ہی باقی رہی۔ مجرم اس کو دیکھ کر پکار اٹھیں گے: 'مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا'[1] (الکہف ۱۸: ۴۹)۔

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (۱۲)

ان لوگوں کی نشانیاں جو تکذیب جزاء میں پیش پیش ہیں

اب یہ ان لوگوں کا سراغ دے دیا جو جزاء و سزا کے دن کو جھٹلانے میں پیش پیش ہیں۔ فرمایا کہ اس کی تکذیب وہی لوگ کر رہے ہیں جو حدود سے تجاوز کرنے اور حق تلفی کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی تکذیب کرنے کی جرأت کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جس کے اندر عدل اور رحم کی ادنیٰ رمق بھی ہو۔ اس کی شہادت ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے اس وجہ سے کسی خارجی دلیل کی اس کے لیے کوئی حاجت نہیں۔ ہر شخص اس کو اپنے دل کے آئینہ میں دیکھ سکتا ہے۔ البتہ ان لوگوں کو یہ چیز نظر نہیں آتی جن کے دلوں پر تعدی اور حق تلفی کا زنگ چڑھ چکا ہو۔

'عدوان' اور 'اثم' کی حقیقت پر ہم اس کے محل میں گفتگو کر چکے ہیں۔ 'عدوان' اور 'اعتداء' یہ ہے کہ کوئی دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرے اور 'اثم' یہ ہے کہ دوسروں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان کو دبا بیٹھے۔ دوسروں کے حقوق غصب کرنے یا دبا بیٹھنے کی جن کو چاٹ

---

[1] عجیب ہے یہ کتاب کہ اس نے نہ کوئی چھوٹی بات لکھے سے چھوڑی ہے نہ کوئی بڑی بات!

لگ جاتی ہے وہ جزا و سزا سے فرار کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکالنے کی ضرور کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کا ضمیر ان کی تعدیوں اور حق تلفیوں سے کوئی خلش نہ محسوس کرے۔

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ کسی حقیقت سے فرار انسان محض اس وجہ سے نہیں اختیار کرتا کہ اس کے حق میں اس کو کوئی دلیل نہیں ملی بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کو تسلیم کرنے سے اس کی خواہشوں اور عادتوں پر زد پڑتی ہے۔ جب ایک بات وہ ماننا نہیں چاہتا تو اپنے لیے کچھ عذرات تراشنے کی کوشش کرتا ہے اگرچہ وہ کتنے ہی لنگ ہوں۔ سورۂ قیامہ میں اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۙ وَّ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ﴾ (القیٰمۃ ۷۵: ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

﴿اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (۱۳)

یہ اس طرح کے مکذبین کے طریقۂ تکذیب کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ لوگ ایک واضح حقیقت کی تکذیب اپنے ضمیر کے بالکل خلاف کرتے ہیں۔ ان کے پاس اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی جگہ محض اپنی ہٹ دھرمی اور مکابرت کا اظہار کرتے ہیں۔ فرمایا کہ جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں: چلو چھٹو، سن لیا، اس میں ہے کیا، یہ تو محض اگلوں کے فسانے ہیں!

'اٰیٰتٌ' سے مراد وہ دلیلیں اور حجتیں ہیں جو قیامت اور جزا و سزا کے حق میں ان کو قرآن کے ذریعہ سے سنائی گئیں۔ ان دلیلوں کا بیان پچھلی سورتوں میں بھی ہوا ہے اور آگے کی سورتوں میں بھی آ رہا ہے۔ ساتھ ہی ان میں ان قوموں کی تاریخ کا بھی حوالہ ہے جو انذارِ قیامت کی تکذیب کے نتیجہ میں تباہ ہوئیں۔ ان چیزوں کو سن کر وہ بس ایک ہی فقرے میں ان کی تکذیب کر دیتے کہ یہ سب اگلوں کے فسانے اور پچھلوں کے قصے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو لائقِ اعتناء ہو۔

﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ﴾ (۱۴)

تکذیب کی اصل علت

یہ قرآن نے اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان بد دماغوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ اگلوں کے فسانے ہیں۔ یہ ہیں تو حقائق جن کے حق میں آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے ناقابلِ انکار دلائل موجود ہیں لیکن ان کے اعمال کا زنگ اس طرح ان کے دلوں پر چڑھ گیا ہے کہ اب حق کی کوئی کرن ان کے اندر نفوذ ہی نہیں کرتی۔

'مَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ' سے ان کے اسی طرح کے اعمال کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر اوپر عدوان اور اثم کے تحت ہم کر چکے ہیں اور جن کے متعلق قرآن کی شہادت یہ ہے کہ جو ان کے مرتکب ہوتے ہیں وہ جزا و سزا کی تکذیب کا کوئی بہانہ ضرور ڈھونڈھتے ہیں۔

'بَلْ سکتۃ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ' میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت کے اندر جو دلائل ودیعت فرمائے ہیں اور عقل و دل کے اندر سوچنے سمجھنے کی جو صلاحیت بخشی ہے یہ چیزیں کام اسی صورت میں آتی ہیں جب انسان ان کی قدر کرے اور ان سے فائدہ اٹھائے۔ اگر ان سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ ان کے مقابل میں نفس کی خواہشوں ہی کو اپنا رہنما بنا لے اور ان اعلیٰ صلاحیتوں کو ٹھکرا دے تو آہستہ آہستہ آدمی کی بدعملیوں کا زنگ ان پر چڑھنا شروع ہوتا ہے اور بالتدریج اس طرح ان کا احاطہ کر لیتا ہے کہ ان کے اندر کسی صحیح چیز کے داخل ہونے کی کوئی گنجائش سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتی۔

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۱۵)

یعنی یہ لوگ اپنے دلوں میں یہ ارمان لیے جو بیٹھے ہیں کہ آخرت ہوئی تو جس طرح دنیا میں ان کو عزت و شرف حاصل ہے اسی طرح وہاں بھی ان کو اعلیٰ مدارج حاصل ہوں گے، ان کے یہ ارمان پورے ہونے والے نہیں ہیں بلکہ اپنے عقل و دل کے دیدے انھوں نے جو پھوڑ لیے ہیں اس کی سزا ان کو یہ ملے گی کہ وہ اپنے رب سے اس دن اوٹ میں ہوں گے۔ اوٹ میں ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے قرب، اس کی نظرِ عنایت، اس کے افضال و عنایات اور اس کے انوار و تجلیات کے مشاہدے سے بالکل محروم رہیں گے۔ ان کو اتنا موقع بھی نہیں ملے گا کہ اپنے رب سے کچھ عرض معروض ہی کر لیں۔

ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۱۶-۱۷)

پھر وہ جہنم میں پڑیں گے۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے۔ 'ثُمَّ' کی تکرار سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ بات ان سے خاص اہتمام کے ساتھ کہی جائے گی اور مقصود اس سے ان کی تفضیح ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی میں جس چیز کی پورے شد و مد سے مخالفت کی اب اس کو دیکھ لو اور اس کا مزا چکھو!

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ (۱۸)

'علّیّون' کی تحقیق

'کَلَّا' یہاں بھی اسی طرح مکذبینِ قیامت کے زعمِ باطل کی تردید کے لیے ہے جس طرح آیت ۷ میں ہے۔ یعنی نیک و بد ہرگز یکساں نہیں ہوں گے بلکہ بدکاروں کے لیے جس طرح الگ رجسٹر اور الگ دفتر ہوگا اسی طرح نیکوکاروں اور وفاداروں کے لیے الگ رجسٹر اور الگ دفتر ہوگا۔ ان کے اعمال نامے 'علّیّین' میں ہوں گے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ (۱۹)

جس طرح اوپر اسی اسلوب بیان میں 'سجّین' کا ذکر اس کے ہول کے اظہار کے لیے ہوا ہے اسی طرح یہاں اسی اسلوب میں 'علّیّون' کا ذکر اس کی عظمت و شان کے اظہار کے لیے ہوا ہے۔ یعنی

اس کی عظمت و شان کا بھلا اس دنیا میں کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے! وہ عالی مقاموں کا دفتر ہے جس میں ان کے کارنامے درج ہوں گے۔

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۙ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (۲۰-۲۱)

لفظ 'عِلِّيُّوْنَ' چونکہ اپنے خاص لغوی مفہوم سے الگ ایک خاص اصطلاحی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے اس کی وضاحت فرما دی گئی ہے کہ یہ ایک دفتر ہے جس کی ہر چیز منضبط تحریر میں آئی ہوئی ہے اور جس کی نگرانی بھی اللہ تعالیٰ کے خاص مقرّب فرشتے کرتے ہیں۔

'يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ' کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دفتر چونکہ مقربین کے ریکارڈ کے لیے خاص ہو گا اس وجہ سے اس میں انہی کی آمد و شد ہو گی، دوسروں کی یہاں رسائی نہ ہو گی۔ آگے آیت ۲۸ میں مقربین کا ذکر ہے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۙ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ (۲۲-۲۳)

ابرار کا انعام — یہاں نعمتوں کا ذکر آ رہا ہے جو ابرار کو حاصل ہوں گی۔ 'فِيْ نَعِيْمٍ' کے اسلوب بیان کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ اس انداز میں جب بات کہی جاتی ہے تو مقصود یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ ہر جانب سے نعمتوں میں گھرے ہوں گے، ان کی نگاہیں جدھر اٹھیں گی نعمت ہی نعمت ان کو نظر آئے گی۔

'عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ' اوپر فجار سے متعلق تو فرمایا ہے، 'كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۱۵)' اس کے بالکل برعکس ابرار کا حال یہ ہو گا کہ وہ اپنے تختوں پر بیٹھے ہوئے اللہ تعالیٰ کے افضال و عنایات اور اس کی شانیں اور جلوے دیکھ رہے ہوں گے۔ آگے یہ وضاحت بھی ہوئی ہے کہ تختوں پہ بیٹھے بیٹھے ہی ان کو دشمنوں کا انجام بھی دکھایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ کیوں، کافروں کو ان کے کیے کا بدلہ مل گیا نا! 'عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ؕ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۳۵-۳۶)'

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ (۲۴)

'نَضْرَةٌ' اس تازگی و بشاشت کو کہتے ہیں جو نعمتوں میں گھرے ہوئے لوگوں کے چہروں پر جھلکتی ہے۔ فرمایا کہ جو بھی دیکھے گا ان کے چہروں پر نعمت کی تازگی اور بشاشت پائے گا۔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۙ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۲۵-۲۶)

ان نعمتوں میں سے یہ ایک نعمت کا بطور مثال ذکر فرمایا کہ ان کو شراب خالص کے جام پلائے جائیں گے۔ یہ شراب سربمہر ہو گی جو اول اول انہی کے لیے کھولی جائے گی اور یہ مہر مشک کی ہو گی۔

ظاہر ہے کہ یہ چند صفات محض اس کا ایک اجمالی تصور دینے کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ رہیں اس کی اصل صفات و کیفیات تو ان کا اندازہ انہی لوگوں کو ہوگا جو اس سے لطف اندوز ہوں گے۔ البتہ یہ فرما دیا کہ چاہنے کی چیز ہے تو یہ ہے جس کے لیے حوصلہ کرنے والوں کو حوصلہ کرنا چاہیے! یہ اہل ایمان کے لیے تشویق و ترغیب بھی ہے اور اس میں ان سگانِ دنیا پر طنز بھی ہے جو حیاتِ چند روزہ کی حقیر و فانی لذتوں کے حصول کی جدوجہد میں اپنے رات دن ایک کیے ہوتے ہیں اور چاہنے کی جو چیزیں ہیں ان کا چاہنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔

وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ ۝ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ (۲۷ - ۲۸)

'مِزَاجٌ' سے مراد وہ ملونی ہے جو پینے والے پیتے وقت شراب میں اس کے کیف میں اضافہ یا اس کے ' راعتدال پیدا کرنے کے لیے ملا لیتے ہیں۔ فرمایا کہ اس شراب میں ملونی تسنیم کی ہوگی۔ پھر تسنیم کی وضاحت فرما دی کہ یہ ایک چشمہ ہے جس کے کنارے بیٹھ کر مقربین اس شراب سے لطف اندوز ہوں گے۔

'عَيْنًا' کا نصب علیٰ سبیل الاختصاص ہے اور 'بِهَا' میں 'ب' میرے نزدیک ظرفیہ ہے۔ اس کی وضاحت 'عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا' (الدھر-۷۶: ۶) کے تحت کر چکا ہوں۔ مے نوشی کے لوازم میں سے ایک چیز اس کا لبِ جُو ہونا بھی ہے۔ اس دنیا میں اس خانہ خراب کے رسیا تو جہاں پائیں اور جس طرح بھی پائیں پی لیتے ہیں، یہاں تک کہ پیالہ نہیں ملتا تو چلو ہی سے پی لیتے ہیں، لیکن یہ مقربین کی بزم مے نوشی ہے اس وجہ سے اس کے آداب اور ہیں۔

ہمارے مفسرین اور مترجمین پر اس 'ب' کی نوعیت واضح نہیں ہوئی ہے اس وجہ سے وہ یا تو اس سے کترا گئے ہیں یا اس کی غلط توجیہ پر راضی ہو گئے ہیں۔ مترجمین نے عام طور پر اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ 'اس سے پیتے ہیں'۔ لیکن یہ ترجمہ بالکل بے معنی ہے۔ اس کا مطلب اگر یہ سمجھا جائے کہ اس چشمہ میں سے پیتے ہیں تو یہ بات 'مِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ' سے پوری ہو گئی اور نہایت واضح طور پر پوری ہو گئی پھر اس بات کو ایک بالکل مبہم انداز سے دہرانے کا فائدہ! یہ بات واضح رہے کہ ظرفیت کے لیے 'ب' کا استعمال اعلیٰ عربی میں معروف ہے، بالخصوص اس طرح کے مواقع میں تو ظرفیت کے سوا اور کوئی معنی لینے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ (۲۹)

نتائج اعمال کے ظہور کے بعد انقلابِ حال

یہ اس انقلابِ حال کی تصویر ہے جو نیکوں اور بدوں کے درمیان اس وقت نمایاں ہوگا جب دونوں کے نتائج اعمال سامنے آ جائیں گے۔ پہلے اس صورتِ حال کی تصویر کھینچی ہے جس سے اہل ایمان، بالخصوص غریب مسلمان مغرور دولت مندوں کے ہاتھوں اس دنیا کی زندگی میں دوچار رہے ہے۔ فرمایا کہ یہ مجرمین

جہاں ان کو پاتے اپنی نقرہ بازیوں اور پھبتیوں کا ہدف بنا لیتے۔

وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ (۳۰)

اور جب کبھی پاس سے گزرتے تو کن انکھیوں سے اشارہ کرتے۔

مَرُّوا بِهِمْ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا کہ جب کبھی مسلمان ان کے پاس سے گزرتے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جب کبھی ان فراعنہ کا گزر مسلمانوں کی طرف ہوتا تو کن انکھیوں کے اشاروں سے ان کے دلوں پر چرکے لگاتے۔ یہ امر واضح رہے کہ آنکھ کے اشاروں کے گھاؤ تیر اور تلوار کے گھاؤ سے بھی گہرے ہوتے ہیں اور تذلیل و تحقیر کا تو یہ خاص ہتھیار رہے۔ ان شاء اللہ سورۂ ھُمَزَہ کی تفسیر میں اس کے بعض خاص پہلو زیر بحث آئیں گے۔

وَإِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انقَلَبُوا فَكِهِينَ (۳۱)

یعنی اہل ایمان کے ساتھ یہ بدتمیزیاں کر کے جب اپنے گھر والوں میں لوٹتے تو بہت مگن لوٹتے گویا کوئی بڑا میدان جیت کر لوٹے ہیں۔ یہ اشارہ ان کے سفلہ پن کی طرف ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کو اپنی ان حرکتوں پر کچھ ندامت ہو وہ ان کا ذکر بڑے فخر سے اپنے گھر والوں میں کرتے کہ انھوں نے فلاں کے اس طرح لتے لیے اور فلاں کو یوں تاڑا۔ سورۂ قیامہ میں یہی بات یوں بیان ہوئی ہے وَلَٰكِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۝ ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ (القیمۃ - ۷۵: ۳۲-۳۳)

یہاں وہ بات یاد رکھیے جو قرآن میں اہل ایمان کے کردار سے متعلق مذکور ہوئی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے اہل اور متعلقین کے اندر ایک محتاط آدمی کی طرح زندگی گزارتے ہیں کہ ان کے کسی رویہ سے ان کو کوئی غلط سبق نہ ملے جو قیامت کے دن ان کے لیے تباہی اور ان کے لیے رسوائی کا باعث ہو۔ اس کے برعکس ان اشرار کا یہ کردار بیان ہوا ہے کہ یہ باہر اہل ایمان کے ساتھ جو غنڈہ گردی کر کے لوٹتے ہیں اس کی داستان فخر کے ساتھ گھر والوں کو بھی سناتے ہیں تاکہ ان کی پوری نسل غنڈوں کی نسل بن جائے۔

وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ (۳۲)

اور ان کی یہ کوشش بھی ہوتی کہ ان اہل ایمان سے متعلق کسی کے اندر کسی نوعیت کا کوئی حسن ظن نہ پیدا ہونے پائے۔ چنانچہ جب بھی وہ ان کو دیکھتے ان کے بارے میں لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے کہ یہ پکے گمراہ ہیں اس لیے کہ یہ دین آبائی کے دشمن ہیں اور اپنے سوا سب کو جہنم کا ایندھن سمجھتے ہیں۔ یہ امر یہاں پیش نظر رہے کہ مسلمانوں سے ذکر و فکر آخرت کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کے ذہن متاثر ہونے لگے تو قریش کے لیڈروں نے ان کا یہ توڑ نکالا کہ ان کو گمراہ اور بے دین ثابت کرنا شروع کیا۔ اس کے لیے جو دلیلیں انھوں نے ایجاد کیں ان کی تفصیلات اپنے محل میں گزر چکی ہیں۔

وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ (۳۳)

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ یہ کفار ان مسلمانوں پر کوئی نگران اور اتالیق تو نہیں مقرر کیے گئے تھے کہ ان کو ضالّ و مضل ٹھہرائیں اور ان کے اعمال و عقائد پر نکیر کریں، لیکن میرے نزدیک یہ کفار ہی کے قول کا ایک حصّہ نقل ہوا ہے یعنی پوری بات یوں ہے کہ جب وہ مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ پکّے گمراہ ہیں، یہ ہمارے اعمال و عقائد کو کفر و شرک قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ ہمارے اوپر داروغہ مقرر کر کے نہیں بھیجے گئے ہیں کہ ہماری ہر چیز پر اعتراض اٹھائیں اور ہماری اصلاح کے مدعی بن کر کھڑے ہوں۔

فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ (۳۴)

کفار کے رویہ کی تفصیل کے بعد اب یہ اس انقلابِ حال کا ذکر ہے جو قیامت کے دن واقع ہو گا۔ فرمایا کہ اب تک تو کفار مسلمانوں کے حال پر ہنستے رہے لیکن اب اہل ایمان کفار کے حال پر ہنسیں گے اہلِ ایمان کا یہ ہنسنا بالکل جائز ہو گا۔ جب انھوں نے کفار پر حجت تمام کر دی اور انھوں نے کوئی اصلاح قبول کرنے کے بجائے الٹے انہی کو مجرم ٹھہرایا تو وہ اسی کے سزاوار ہوں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو کوئی ہمدردی نہ ہو۔

عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ (۳۵)

یعنی وہ جس طرح اپنے تختوں پر بیٹھے بیٹھے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے جلوے دیکھتے ہوں گے اسی طرح اپنے تختوں پر بیٹھے ہی بیٹھے جب چاہیں گے جھانک کے دوزخ میں کفار کا حال بھی دیکھ لیں گے بلکہ ان سے سوال و جواب بھی کر لیں گے، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے۔

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۳۶)

یہ سب کچھ دیکھ دکھا لینے کے بعد اہلِ ایمان سے بطور طلبِ تصدیق یہ سوال ہو گا کہ کہیں کفار کو اپنے کیے کا پورا پورا بدلا مل گیا نا!

'مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ' میں کفار کی وہ بدتمیزیاں بھی شامل ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ فضلہ واحسانہ۔

رحمان آباد
۱۴ - اگست ۱۹۷۹ء
۲۰ - رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

٨٤

الانشقاق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس سورہ اور سابق سورہ ـــــ المطفّفین ـــــ میں نہایت واضح معنوی مشابہت موجود ہے۔ جزا اور سزا کے منکروں کو جس طرح اس میں متنبہ کیا گیا ہے اسی طرح اس سورہ میں بھی اسی گروہ کو جھنجھوڑا گیا ہے۔ اس میں بیان فرمایا ہے کہ ایک ایسا دن لازماً آنا ہے جس میں اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے ایمان اور عمل کی بنیاد پر الگ الگ گروہوں میں تقسیم کرے گا، جو خدا کے فرمانبردار نیکوکار رہے ہوں گے وہ ابدی بادشاہی میں داخل ہوں گے اور جو نافرمان و نابکار رہے ہوں گے وہ ابدی ذلّت سے دوچار ہوں گے۔ اس سورہ میں بھی لوگوں کا دو گروہوں میں تقسیم ہونا بیان ہوا ہے۔ ایک وہ جن کو ان کے اعمال نامے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے اور وہ ابدی کامیابی حاصل کریں گے دوسرے وہ جن کے اعمال نامے ان کے پیچھے ہی سے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیے جائیں گے اور وہ ابدی ذلّت سے دوچار ہوں گے۔

دونوں میں اصل مخاطب وہ مترفین و ارباب تنعّم ہیں جو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اول تو جزا و سزا کا کوئی دن آنے والا ہے نہیں اور ہے بھی تو ان کو جو عزت و سرفرازی یہاں حاصل ہے وہ وہاں بھی حاصل رہے گی۔ ان کو بتایا گیا ہے کہ انسان کی فطرت عدل کے شعور سے عاری نہیں ہے اور خالق نے یہ دنیا اندھیر نگری نہیں بنائی ہے، اس وجہ سے لازم ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں نیکوں اور بدوں کے درمیان امتیاز ہو۔ اس دن وہ لوگ ہلاک ہوں گے جو اس بدیہی حقیقت کو پس پشت ڈال کر زندگی گزاریں گے۔

استدلال کی بنیاد سابق سورہ میں، جیسا کہ وضاحت ہو چکی ہے، انسانی فطرت پر ہے اور اس سورہ میں، جیسا کہ آگے وضاحت ہو گی، آفاق کے بعض شواہد پر۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ میں مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۵) ظہورِ قیامت کے وقت آسمان و زمین میں جو ہلچل برپا ہوگی اس کا اجمالی تذکرہ اور اس امر کی وضاحت کہ اس دن نہ آسمان کی مجال ہوگی کہ وہ اپنے رب کے حکم سے سرتابی کر سکے اور نہ زمین کی۔ دونوں اپنے رب کی بے چون و چرا اطاعت کریں گے اور یہی ان کے لیے زیبا ہے۔ جب خدا نے ان کو پیدا کیا ہے تو ان پر یہ حق ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں۔

(۶-۱۵) انسان کو خطاب کر کے یہ تنبیہ کہ تجھے بھی کشاں کشاں اپنے رب سے ملنا اور اپنے انجام سے دوچار ہونا ہے۔ اس دن جن کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے وہ تو نہایت سستے چھوٹیں گے اور خوش خوش اپنے لوگوں سے ملیں گے۔ البتہ ان کی شامت ہے جنھوں نے اسی دنیا کو منزلِ مقصود بنا لیا اور اصل منزل سے غفلت سے زندگی گزاری۔ ان کو ان کے اعمال نامے ان کے پیچھے ہی سے پکڑا دیے جائیں گے۔ ان کے لیے ہر قدم پر ہلاکی ہی ہلاکی ہوگی۔

(۱۶-۲۱) اس کائنات کے بعض آثار کی شہادت اس بات پر کہ اس کی ہر چیز کے اندر ایک تدریج پائی جاتی ہے اور ہر چیز ہر لمحہ خدا کے قانون کی گرفت میں ہے۔ انسان بھی درجہ بدرجہ اپنے رب کی طرف بڑھ رہا ہے اور ایک دن اس کو اس سے دوچار ہونا ہے۔ اگر وہ قرآن کی اس بات کو نہیں مان رہا ہے تو یہ اس کی خرد باختگی ہے۔

(۲۲-۲۵) ان لوگوں کو وعید جو قرآن کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کو بشارت جو اس کے انذار کی تصدیق کر کے ایمان و عملِ صالح کی راہ پر چل پڑے ہیں۔

سُورَةُ الْاِنْشِقَاقِ

مَكِّيَّةٌ ——— آیات: ۲۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ ﴿١﴾ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿٢﴾ وَإِذَا آیات
الْأَرْضُ مُدَّتْ ﴿٣﴾ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ﴿٤﴾ وَأَذِنَتْ ۱-۲۵
لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿٥﴾ يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ
كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ ﴿٦﴾ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ﴿٧﴾ فَسَوْفَ
يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ﴿٨﴾ وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ﴿٩﴾
وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ﴿١٠﴾ فَسَوْفَ يَدْعُو
ثُبُورًا ﴿١١﴾ وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ﴿١٢﴾ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ﴿١٣﴾
إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحُورَ ﴿١٤﴾ بَلَىٰ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ﴿١٥﴾ معانقہ
فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿١٦﴾ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿١٧﴾ وَالْقَمَرِ إِذَا
اتَّسَقَ ﴿١٨﴾ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿١٩﴾ فَمَا لَهُمْ لَا
يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠﴾ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ﴿٢١﴾ السجدۃ
بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكَذِّبُونَ ﴿٢٢﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ﴿٢٣﴾
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٤﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

ع ۲۵ ۹ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۲۵

جب کہ آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے خداوند کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے یہی زیبا ہے۔ اور جب کہ زمین تان دی جائے گی اور وہ اپنے اندر کی چیزیں باہر ڈال کر فارغ ہو جائے گی اور وہ اپنے خداوند کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کو یہی چاہیے۔ ۱-۵

اے انسان، تو کشاں کشاں اپنے خداوند ہی کی طرف جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔ تو جس کو اس کا اعمال نامہ اس کے دہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب تو نہایت ہلکا ہوگا اور وہ اپنے لوگوں کے پاس نہایت شادمند لوٹے گا۔ رہا وہ جس کا اعمال نامہ اس کے پیٹھ پیچھے سے پکڑا دیا جائے گا تو وہ موت کی دہائی دے گا اور دوزخ میں پڑے گا۔ وہ اپنے لوگوں میں مگن رہا۔ اس نے گمان رکھا کہ اس کو کبھی لوٹنا نہیں ہوگا۔ ہاں، کیوں نہیں! اس کا رب تو اس کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ ۶-۱۵

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ پورا ہو جاتا ہے کہ تم کو لازماً چڑھنا ہے درجہ بدرجہ۔ ۱۶-۱۹

تو انھیں کیا ہو گیا ہے کہ ایمان نہیں لا رہے ہیں اور جب انھیں قرآن سنایا جاتا ہے تو سجدے میں نہیں گر پڑتے! بلکہ جنھوں نے کفر کیا وہ جھٹلا رہے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ جمع کر رہے ہیں تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ ہاں، جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے دائمی انعام ہے۔ ۲۰-۲۵

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (۱-۲)

قیامت کے دن کی ہلچل

قیامت کے بعد جو جہانِ نو وجود میں آئے گا وہ نئے نوامیس و قوانین کے تحت وجود میں آئے گا اس وجہ سے اس میں یہ آسمان و زمین جو آج موجود ہیں، ختم ہو جائیں گے اور ان کی جگہ، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، دوسرے آسمان و زمین نمودار ہو جائیں گے۔

'إِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ' کے الفاظ سے یہاں وہی مضمون بیان ہوا ہے جو سورۂ انفطار میں 'إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (۱)' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ کائنات کے اس سب سے بڑے حادثہ کا آج کوئی اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ قرآن نے اس ہلچل کا ذکر ان نادانوں کو جھنجھوڑنے کے لیے کیا ہے جو اپنے قلعوں اور محلوں پر بہت نازاں تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ بھلا ان میں کوئی دراڑ کہاں سے پڑ جائے گی؟ ان کو آگاہ فرمایا کہ قلعے اور گڑھیاں، ایوان اور محل تو درکنار، سرے سے یہ آسمان و زمین ہی پاش پاش ہو جائیں گے جن کے اندر یہ گھروندے تم نے بنائے ہیں۔

'وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ'۔ 'أَذِنَتْ لَهٗ' کے معنی ہیں 'اِسْتَمَعَ لَهٗ' اس نے اس کی بات مان لی، اس کے حکم کی تعمیل کی، اس کے آگے سر جھکا دیا۔

'حُقَّ لَهٗ' کے معنی ہیں کہ اس کے لیے واجب ہے کہ وہ ایسا کرے، اس کے لیے یہی زیبا ہے کہ وہ یہ کام کرے۔

مطلب یہ ہے کہ اس جہالت میں نہ پڑے رہو کہ بھلا آسمان و زمین جیسی چیزوں پر کس کا زور چل سکتا ہے کہ وہ ان کو پاش پاش کر کے رکھ دے۔ اس دن اپنے ربّ کے حکم سے یہ بھی پاش پاش ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو حکم دے گا اور بے چون و چرا وہ اس کے حکم کی تعمیل کریں گے۔

'وَحُقَّتْ' یعنی اس کے لیے یہی کرنا واجب ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے تو اس کے لیے یہ کس طرح زیبا ہے کہ وہ اپنے خالق کی نافرمانی کرے!

ایک برمحل تنبیہ

یہ فقرہ یہاں ان مغروروں کی تنبیہ و تعلیم کے لیے آیا ہے جو بات بات پر اللہ اور رسول کے خلاف محاذ قائم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ برسبیل تنبیہ ان کو توجہ دلا دی گئی کہ آسمان تو اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں پاش پاش ہو جائے گا اور یہی اس کے لیے زیبا ہے۔ اب وہ نادان جن کی حیثیت اس آسمان کے نیچے بالکل ایک ذرۂ بے مقدار کی ہے سوچ لیں کہ ان کا یہ رویہ کس طرح جائز

ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے رب سے لڑنے اٹھیں اور اس زعم میں مبتلا ہوں کہ کوئی ان کو ان کی جگہ سے ہلا نہیں سکتا!

وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (۳-۵)

قیامت کے دن زمین کا حال

آسمان کے بعد یہ زمین پر جو کچھ گزرے گی اس کا حال بیان ہو رہا ہے کہ زمین تان دی جائے گی۔ یعنی آج تو زمین میں بہت سی شکنیں اور سلوٹیں ہیں، نشیب و فراز ہیں، وادیاں اور کہسار ہیں، دریا اور پہاڑ ہیں۔ اس کی اونچ نیچ اور اس کی تہوں میں بے شمار چیزیں چھپی ہوئی ہیں جو نظر نہیں آ رہی ہیں لیکن اس دن یہ ایک چادر کی طرح تان دی جائے گی اور جو کچھ اس کی سلوٹوں میں ہے وہ اس کو باہر نکال کر فارغ ہو جائے گی۔ یہ اشارہ اگرچہ خاص طور پر مُردوں کے اٹھائے جانے کی طرف ہے لیکن اسلوب بیان عام ہے۔ وہ ساری چیزیں اس میں داخل ہیں جو زمین میں دفن ہیں، یعنی ان سرمایہ داروں کے خزانے بھی جو اس سورہ میں خاص طور پر مخاطب ہیں۔

'وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ زمین ان چیزوں کے بوجھ سے اسی طرح بوجھل ہے جس طرح ایک حاملہ اپنے حمل سے بوجھل ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس بوجھ سے فارغ ہونے میں وہی راحت و فراغت محسوس کرے گی جو ایک حاملہ وضعِ حمل کے بعد محسوس کرتی ہے۔

'وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ' اس آیت کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آسمان اور زمین دونوں اس دن اپنے رب کے حکم کی اطاعت کریں گے اور یہ اطاعت ہی ان کے لیے زیبا ہے اور یہ بالکل رضامندانہ ہوگی۔ قرآن میں دوسری جگہ آسمان و زمین کی اس رضامندانہ اطاعت کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے۔ 'فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ' (حٰم السجدۃ ۴۱: ۱۱) (پس اس نے آسمان اور زمین دونوں کو حکم دیا کہ حاضر ہو، رضامندانہ خواہ مجبورانہ۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم حاضر ہیں رضامندانہ)۔

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ (۶)

دنیا کے دیوانوں کو تنبیہ

خطاب باعتبارِ الفاظ اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن خاص طور پر انہی مغروروں کی طرف ہے جو اپنے عیش دنیا میں مگن اور آخرت سے بالکل بے فکر تھے۔ فرمایا کہ اے انسان تو بھی کشاں کشاں جا اپنے رب ہی کی طرف رہا ہے اور بالآخر اسی کے حضور تیری پیشی ہوتی ہے! تجھے اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔

دنیا کے پرستار اپنی دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں اپنی اصل منزل ہمیشہ بھولے رہتے ہیں۔ انھیں

کامیابیوں کے بعد کامیابیاں اور فتوحات کے بعد جو فتوحات حاصل ہوتی ہیں ان میں وہ اس طرح کھو جاتے ہیں کہ ان سے باہر ہو کر وہ کسی چیز پر غور ہی نہیں کر سکتے۔ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری کامیابی کے حصول کی بھاگ دوڑ میں انھیں کبھی اس سوال پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ان کی اصلی منزل ہے کیا؟ وہ اسی دنیا کی کسی کامیابی کو اپنی آخری منزل سمجھتے ہیں حالانکہ آخری منزل آخرت ہے جس کی طرف سب، خدا کے قانون کی زنجیر میں بندھے، نہایت بے بسی کے ساتھ، کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں۔ اگر ان کی نظر زندگی کے اس پہلو پر بھی ہوتی تو وہ جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہوتے بلکہ کھلی آنکھوں سے دیکھتے کہ جتنی تیز روی کے ساتھ وہ اپنی مرغوباتِ دنیا کی راہ میں بڑھ رہے ہیں اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ ان کی زندگی محاسبۂ اعمال کے لیے خدا کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ہر انسان کشاں کشاں خدا کی طرف جا رہا ہے

'اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا'۔ 'کَدْحٌ' کے معنی کسی کام میں پوری مشقت کے ساتھ کوشش کرنے کے ہیں۔ یہ نہایت بلیغ تعبیر ہے اس حقیقت کی کہ انسان جس دن سے وجود میں آتا ہے اسی دن سے اس کا سفر خدا کی ٹھہرائی ہوئی منزل یعنی موت کی راہ میں شروع ہو جاتا ہے اور یہ سفر بلا کسی توقف کے جاری رہتا ہے۔ موسم سخت ہو یا نرم، آدمی مریض ہو یا صحت مند، حالات ساعد ہوں یا ناساعد، کسی حال میں بھی یہ منقطع نہیں ہوتا۔ ولادت سے لے کر موت تک بچپن، مراہقہ، جوانی، ادھیڑ پن، پیری اور ناتوانی کے مختلف مراحل آتے ہیں لیکن اس میں ایک منٹ بلکہ سیکنڈ کے لیے بھی وقفہ نہیں ہوتا۔ انسان قانونِ قدرت کی زنجیروں میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ وہ اس راہ میں نہ بھی چلنا چاہے جب بھی اس کو چلنا پڑے گا اور اس بے بسی میں شاہ و گدا، شریف و وضیع، امیر و مامور، نیک اور بد سب یکساں ہیں۔

'فَمُلٰقِیْهِ'۔ یہ اس سفر کی غایت بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ انسان اس دنیا میں شترِ بے مہار نہیں ہے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ سب کشاں کشاں اپنے خالق کے حضور میں پہنچیں اور اس کے آگے پیش ہوں۔ اس پیشی کا مقصد ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد سے ان کو دنیا میں پیدا کیا اس سے متعلق ان سے سوال ہو کہ وہ انھوں نے پورا کیا یا نہیں، چنانچہ آگے اس کی تفصیل آ رہی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا (۷-۸)

یہ اوپر کے اجمال کی تفصیل ہے۔ فرمایا کہ اس دن جن کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے وہ تو سستے چھوٹیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال ناموں کا ان کے دہنے ہاتھ میں دیا جانا ہی اس بات کا ضامن ہو گا کہ وہ نجات کے حق دار ہیں، ان کی نیکیاں ان کی بدیوں پر غالب اور وہ عفو و صفح

کے حق دار ہیں۔ معلوم ہوا کہ جہاں تک حساب کا تعلق ہے وہ تو ان کا بھی ہوگا لیکن ان کے نیک اعمال کا وزن زیادہ ہوگا۔ اس وجہ سے ان کی معمولی غلطیوں سے درگزر کی جائے گی۔ برعکس اس کے جن کے برے اعمال کا وزن زیادہ ہوگا ان کی ایک ایک غلطی پر گرفت ہوگی اور وہ اس کی سزا بھگتیں گے۔

وَّيَنْقَلِبُ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦ مَسْرُورًا (۹)

ایک جامع اسلوب اور اس کے مضمرات — یہ ایک جامع اسلوب میں ان کا صلہ بیان ہوا ہے کہ اس دن وہ اپنے اہل و عیال میں خوش خوش لوٹیں گے۔ اس اسلوب بیان میں کئی باتیں سمٹ آئی ہیں جو خود بخود ظاہر ہیں، مثلاً

—— یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے باایمان اہل و عیال کو ان کے ساتھ جنت میں جمع کر دے گا اگرچہ اہل و عیال اس درجۂ بلند کے مستحق نہ ہوں جس کے وہ مستحق ہوئے تاکہ جنت کی کامیابی سے یک جا سرور و شادماں ہوں۔ سورۂ طور آیت ۲۱ میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ اس یک جائی کے لیے اللہ تعالیٰ ان کے درجے کو نیچا نہیں کرے گا بلکہ ان کے اہل و عیال کے درجے بلند کر دے گا۔

—— یہ کہ انھوں نے اپنے اہل و عیال کے اندر ان کی عاقبت سے بے فکر رہ کر زندگی نہیں گزاری بلکہ دنیا سے زیادہ ان کی اخروی کامیابیوں کی فکر رکھی۔ فکر آخرت سے غافلوں کا رویہ تو سابق سورہ میں یہ بیان ہوا ہے کہ جب وہ اپنے اہل و عیال میں ہوتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے کہ بھلا اس ہرے بھرے باغ پر خزاں کدھر سے آسکتی ہے! وَإِذَا انقَلَبُوٓا۟ إِلَىٰٓ أَهْلِهِمُ انقَلَبُوا۟ فَكِهِينَ (المطففین ۸۳: ۳۱) اس کے برعکس آخرت پر ایمان رکھنے والوں سے متعلق سورۂ طور آیات ۲۶-۲۷ میں یہ بیان ہوا ہے کہ قیامت کے دن جب وہ اپنے اہل و عیال کی یکجائی سے مسرور ہوں گے تو کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل ہوا کہ ہم ان کی اخروی فلاح سے غافل نہیں بلکہ اس کے لیے برابر فکرمند رہے جس کا صلہ ہمیں یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی ہمارے ساتھ جمع کر دیا۔
قَالُوٓا۟ إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِىٓ أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ۝ فَمَنَّ ٱللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَىٰنَا عَذَابَ ٱلسَّمُومِ

—— یہ کہ جو شخص اپنے اہل و عیال سے محبت رکھتا ہے اس کی اس محبت کا اصلی تقاضا یہ ہے کہ وہ ان کی عاقبت سنوارنے کے لیے خود بھی فکرمند رہے اور ان کو بھی فکرمند رکھنے کی کوشش کرے۔ اسی فکرمندی سے آخرت میں یکجائی اور محبت کا اصلی سرور حاصل ہوگا۔ اگر آخرت کو نظر انداز کر کے اسی دنیا کے لیے محبت کی گئی تو وہ محبت بالآخر دونوں فریق کے لیے موجب وبال و خسران ہوگی اور قیامت میں دونوں باہم دگر مسرور ہونے کے بجائے ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔

وَأَمَّا مَنْ أُوتِىَ كِتَـٰبَهُۥ وَرَآءَ ظَهْرِهِۦ (۱۰)

آخرت سے غافلوں کا انجام — یہ دوسرے گروہ یعنی ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جنھوں نے آخرت سے بالکل بے پروا رہ کر زندگی گزاری۔ فرمایا کہ ان کے اعمال نامے ان کے پیچھے ہی سے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیے

جائیں گے۔ اگرچہ الفاظ میں بائیں ہاتھ کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن قرینہ اس پر دلیل ہے۔ جب پہلے گروہ سے متعلق یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اس کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے تاکہ ان کی اوران کے اعمال نامے کی نامبارکی اس برتاؤ ہی سے واضح ہو جائے۔ علاوہ ازیں سورۂ حاقّہ آیت ۲۵ میں واضح لفظوں میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اس گروہ کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ فرمایا ہے 'وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ بِشِمَالِہٖ ۵ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَہْ' (رہا وہ جس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا، اے کاش اب مجھے میرا اعمال نامہ دیا ہی نہ گیا ہوتا)۔

زیر بحث آیت سورۂ حاقّہ کی مذکورہ آیت کی روشنی میں دیکھیے تو اس سے مضمون میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ اس گروہ کو بیک وقت دو فضیحتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔ ایک یہ کہ اس کے اعمالنامے بائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے۔ دوسری یہ کہ یہ کام بھی اس طرح ہو گا کہ سامنے سے دیے جانے کے بجائے پیچھے ہی سے ان کو پکڑا دیے جائیں گے۔ مزید غور کیجیے تو یہ بات بھی اس سے نکلتی ہے کہ ان کے دونوں ہاتھ مجرموں کی طرح پیچھے کی طرف بندھے ہوں گے۔

فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۵ وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا ۵ اِنَّہٗ کَانَ فِیْٓ اَھْلِہٖ مَسْرُوْرًا (۱۱-۱۳)

اوپر اہل ایمان کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کی طرف خوش خوش لوٹیں گے۔ اس کے ٹھیک مقابل میں ایک دوسرے گروہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ موت اور ہلاکت کی دہائی دیں گے۔ یعنی جس دوزخ میں وہ داخل ہوں گے اس سے نجات کی واحد شکل ان کو صرف یہ نظر آئے گی کہ موت آکر ان کا خاتمہ کرے لیکن وہ بھی ان کی پرسانِ حال نہ بنے گی۔

اگرچہ 'یَدْعُوْا ثُبُوْرًا' کو بظاہر 'یَصْلٰی سَعِیْرًا' کے بعد آنا چاہیے لیکن بتقاضائے بلاغت مسبّب کو سبب پر مقدم کر دیا ہے تاکہ سابق گروہ کی شادمانی اور اس دوسرے گروہ کی بدبختی و حرماں نصیبی دونوں کا ذکر ایک دوسرے کے بالمقابل ہو۔

'اِنَّہٗ کَانَ فِیْٓ اَھْلِہٖ مَسْرُوْرًا' یعنی یہ اہل وعیال کے ساتھ یکجائی کے سرور سے اس وجہ سے محروم رہیں گے کہ ان کو جتنا اس سے حظ اٹھانا تھا دنیا میں اٹھا چکے۔ جب دنیا میں نہ اپنی عاقبت کے لیے وہ فکرمند ہوئے نہ ان کی عاقبت کے لیے تو آخرت میں وہ کس طرح حق دار ہوں گے کہ جنت میں ان کی یکجائی کے سرور سے محظوظ ہوں۔ آخرت میں ہر نعمت سے بہرہ مند ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دنیا میں اس کی خاطر قربانی دی گئی ہو۔

اِنَّہٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ (۱۴)

یعنی وہ اس گمان میں رہے کہ مرنے کے بعد نہ انھیں جینا ہے نہ کسی کی طرف لوٹنا ہے تو آخر وہ اپنا یا اپنے متعلقین کا عیش کیوں مکدر کرتے؟ انھوں نے زندگی اور اس کے وسائل سے جو حظ اٹھانا تھا اٹھا لیا۔ نہ آخرت کے لیے انھوں نے کوئی فکر ہی کی اور نہ اس میں ان کا کوئی حصہ ہی ہے۔

بَلٰٓی ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا (۱۵)

ایک برموقع استدراک

یہاں کے اس ظن پر، جس کا اوپر حوالہ ہے، برموقع استدراک ہے کہ انھوں نے یہ گمان جو کیا تو بالکل غلط کیا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کا رب ان کو دیکھ رہا تھا، تو جب دیکھ رہا تھا تو آخر یہ کس طرح روا تھا کہ وہ ان کو اپنے حضور میں پیشی کے لیے نہ بلاتا؟ یہ بات تو اس کی قدرت، حکمت، عدل اور رحمت سب کے منافی ہوتی! قیامت اور جزا و سزا کے حق میں یہ دلیل قرآن میں جگہ جگہ بیان ہو چکی ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۱۶-۱۹)

اوپر کے دعوے پر بطریق قسم شہادت

اب آخر میں تین چیزوں کو بصورت قسم شہادت میں پیش کر کے اسی دعوے کو ثابت کیا ہے جو اوپر آیت ۶ میں گزر چکا ہے کہ 'اے انسان، تو کشاں کشاں اپنے رب ہی کی طرف جا رہا ہے اور تجھے اس کے آگے پیش ہونا ہے'۔ ان قسموں کا مُقسم علیہ 'لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ' ہے جس سے یہ بات نکلی کہ تیرا خدا کے آگے پیش ہونا ہے تو ایک امر شدنی لیکن یہ کام ایک ترتیب و تدریج کے ساتھ ہو گا اس لیے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی یہی سنت جاری ہے کہ ہر چیز اپنی غایت و نہایت کو ایک تدریج کے ساتھ پہنچتی ہے۔

اس خلاصۂ بحث کو سامنے رکھ کر اب اجزائے کلام پر غور کیجیے۔

'فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ' قسم سے پہلے یہاں 'لا' اسی طرح آیا ہے جس طرح 'لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ' اور متعدد دوسری قسموں سے پہلے آیا ہے۔ ہم اس کی وضاحت بار بار کر چکے ہیں کہ نہ یہ زائد ہوتا ہے اور نہ قسم کی نفی کے لیے بلکہ یہ قسم سے پہلے مخاطب کے اس زعم باطل کی پیشگی نفی کے لیے آتا ہے جس کی تردید قسم سے مقصود ہوتی ہے۔ اس اسلوب میں یہ بلاغت ہے کہ متکلم مخاطب کے زعم باطل کی تردید میں اتنا توقف بھی گوارا کرنے پر تیار نہیں ہے کہ دلیل بیان کرنے کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ کلام کا آغاز ہی اس کی تردید سے کرتا ہے۔ یہ اسلوب ایک فطری اسلوب ہے اور ہر قابل ذکر زبان میں موجود ہے۔

رات اور اس کے تضمنات کی قسم

یہاں پہلے 'شَفَق' کی قسم کھائی ہے، پھر رات اور اس کے تضمنات کی۔ 'شَفَق' اس سرخی کو کہتے ہیں

جو غروب آفتاب کے معاً بعد افق پر نمودار ہوتی ہے۔ یہی سرخی رات کی تمہید ہوتی ہے۔ جب تک یہ باقی رہتی ہے اس وقت تک سرِ شام ہے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ غائب ہوتی اور رات دنیا پر اپنا قبضہ جما لیتی ہے۔

'وَمَا وَسَقَ' رات کے بعد یہ ان چیزوں کی قسم کھائی ہے جن کو رات اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ اس کی تشریح اہلِ لغت نے 'مَا جَمَعَ وَضَمَّ اِلَیْہِ' سے کی ہے، یعنی وہ چیزیں جن کو رات اپنے اندر جمع کر لیتی ہے۔ ہمارے مفسرین نے اس سے عام طور پر حیوانات وغیرہ کو مراد لیا ہے اس لیے کہ رات میں وہ آرام کے لیے اس کے دامن میں پناہ گیر ہو جاتے ہیں۔ بعض نے اس سے دریاؤں، پہاڑوں اور درختوں وغیرہ کو مراد لیا ہے کہ رات ان سب پر اپنی چادر اڑھا دیتی ہے لیکن ان چیزوں کا تعلق اس مُقسم علیہ سے سمجھ میں نہیں آتا جو اوپر مذکور ہوا درآنحالیکہ قسم کھائی جاتی ہی ہے مقسم علیہ کو ثابت کرنے کے لیے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس سے وہ کواکب و نجوم مراد ہیں جو رات میں نمودار ہوتے اور جن سے اس کی بزم آراستہ ہوتی ہے۔ یہ چیزیں اول تو رات ہی کے مخصوصات میں سے ہیں اس وجہ سے ان کے لیے 'وَمَا وَسَقَ' کی تعبیر نہایت موزوں ہے۔ دوسرے قرآن نے جگہ جگہ ان کے طلوع و غروب، ان کے عروج و محاق اور ان کے سجود و رکوع کو اس حقیقت کی شہادت میں پیش کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں مسخر ہیں، اسی کے حکم سے طلوع ہوتی ہیں، پھر ایک معین راستہ پر ایک خاص تدریج کے ساتھ ان کا ارتقاء ہوتا ہے، پھر بالتدریج ان کا زوال شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ بالآخر وہ اپنے اسی خالق کی طرف لوٹ جاتی ہیں جس کے حکم سے وہ نمودار ہوتی ہیں۔ گویا ان کے اندر اس قانونِ الٰہی کی بے پناہ گرفت کی نہایت واضح شہادت موجود ہے جس سے انسان کو 'اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا' کے الفاظ سے آگاہ فرمایا گیا ہے۔

'وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ' یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ 'وَمَا وَسَقَ' تو تمام کواکب و نجوم اور تمام ثوابت و سیارات پر مشتمل ہے لیکن قمر کو ان کے خاص فرد یا گُلِ سرسبد کی حیثیت سے منتخب کر کے اس کے عروج و محاق اور کمال و زوال کو خاص طور پر نمایاں فرمایا اس لیے کہ 'یٰٓاَیُّہَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا' (۶) اور 'لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ' کی حقیقت کا مظاہرہ جس طرح اس کے کمال و زوال میں ہوتا ہے اس طرح کسی دوسری چیز میں نمایاں ہو کر سامنے نہیں آتا۔ چنانچہ قرآن نے دوسرے مقام میں اس کے اس پہلو کی طرف خاص طور پر اشارہ فرمایا بھی ہے۔ 'وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰہُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ' (یٰسٓ - ۳۶ : ۳۹) (اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا رکھی ہیں، وہ ان کے طے کرنے میں ایسا ہو جاتا ہے جس طرح کھجور کی پرانی ٹہنی ہو)۔

'اِذَا اتَّسَقَ' کے معنی ہیں جب کہ وہ پورا ہو جاتا ہے یہاں اشارہ اس کے پورے ہونے کی طرف فرمایا ہے کہ دیکھو کس طرح درجہ بدرجہ اس کو چڑھائی چڑھنی پڑتی ہے۔ مجال نہیں ہے کہ اس سے سرِمُو انحراف کر سکے اور اس نقطۂ کمال پر پہنچ کر اس کے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ وہیں ٹھٹک جائے بلکہ اسی طرح منزل کے بعد منزل طے کرتے ہوئے اسے اترنا بھی پڑتا ہے اور اس سے بھی اس کو مفر نہیں ہے۔

'لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ' یہ ان قسموں کا مقسم علیہ ہے۔ فرمایا کہ جس طرح یہ چیزیں خدا کے قانون میں بندھی ہوئی سب اسی کی طرف رواں دواں ہیں اسی طرح انسان بھی ایک مرحلہ کے بعد دوسرا مرحلہ طے کرتا ہوا کشاں کشاں جاتا خدا ہی کی طرف ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ اپنی جگہ ہی پر ٹکا رہ جائے اور نہ اس کا امکان ہے کہ کسی اور سمت میں نکل جائے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کی اسی سنت کے مطابق، جو اس پوری کائنات میں جاری ہے، درجہ بدرجہ اور مرحلہ بہ مرحلہ ہو گا اس وجہ سے نہ اس کو عجلت کرنی چاہیے اور نہ کسی حقیقت کی اس بنا پر تکذیب کرنی چاہیے کہ وہ اس کی طلب پر اس کو دکھائی نہیں گئی۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲۰)

یہ ان لوگوں کی حالت پر اظہارِ تعجب ہے کہ اتنے واضح شواہد کے بعد بھی آخر ان کی کیا مت ماری ہوئی ہے کہ یہ آخرت اور جزاء و سزا پر ایمان نہیں لا رہے ہیں!

وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ (۲۱)

انسان کی ناسپاسی پر اظہارِ تعجب

یعنی حق تو یہ تھا کہ جب قرآن ان کو ایسی عظیم حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے تو جب وہ ان کو سنایا جاتا تو وہ اس کی عظمت کے اعتراف اور اس کی بیان کردہ حقیقت کی تصدیق کے لیے بطورِ شکر اپنے رب کے آگے سجدہ میں گر پڑتے، لیکن ان کا رویہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ اکڑتے اور اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

یہاں عرب اور اہلِ مصر کی یہ روایت پیشِ نظر ہے کہ جب وہ کسی کی بات کی عظمت اور صداقت کا سچے جوش و جذبہ کے ساتھ اعتراف کرنا چاہتے تو اس کو دیکھتے یا سنتے ہی بے تحاشا سجدے میں گر پڑتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے فرعون نے جن ساحروں کو اکٹھا کیا تھا انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت اور ان کے معجزات کی عظمت کا اعتراف اسی طرح کیا۔ مشہور شاعر لبید کے قصیدے کے ایک شعر پر بھی وقت کے مشہور شعرائے عرب نے سجدہ کیا جس کی بنا پر ان کا قصیدہ خانہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا اور وہ وقت کے ملک الشعراء قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ قرآن اپنی بلاغت و صداقت میں ان چیزوں سے بدرجہا بلند ہے لیکن جو لوگ اس کی قدر و قیمت سے ناآشنا تھے وہ

سجدہ کرنے کے بجائے اکڑتے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ (۲۲)

یہ اس صورتِ حال کا بیان ہے جو عملاً تھی۔ یعنی سجدہ کرنا تو درکنار جو قیامت کے منکر ہیں وہ قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں کہ یہ محض پیش کرنے والے کا اپنا گھڑا ہوا کلام ہے جو قیامت کے ڈراوے سنا کر ہمیں مرعوب کرنا چاہتا ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ (۲۳)

یعنی اس گھر کو پھینک کر جو پشیز اور خزف ریزے یہ لوگ جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو اچھی طرح جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کے نقدِ عاجل نے ان کو قرآن کی تکذیب پر آمادہ کیا لیکن یہ جو کچھ جمع کر رہے ہیں اس کی اصل حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ اس کی حقیقت سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے۔ جس دن ان کا اندوختہ اپنی اصل صورت میں ان کے سامنے آئے گا تب انھیں پتہ چلے گا کہ انھوں نے کس چیز کو پھینکا اور کس چیز کے انبار جمع کیے! 'بِمَا يُوْعُوْنَ' کے اجمال میں ان کی دولت بھی داخل ہے، ان کے اعمال بھی شامل ہیں اور ان کے وہ نتائجِ اعمال بھی جو لازماً ظہور میں آنے والے ہیں لیکن ان کا حقیقی علم اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں ہوگا۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (۲۴-۲۵)

یعنی اگر یہ محبتِ دنیا میں پھنس کر، قرآن کی بتائی ہوئی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو ان کو اس دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو جس کے تمام اسباب انھوں نے فراہم کر لیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ نجات کی خوش خبری سننے پر آمادہ نہیں ہیں تو عذاب کی خوش خبری تو انھیں سنا ہی دو۔ اس عذاب سے صرف وہی محفوظ رہیں گے جو ایمان اور عملِ صالح کی وہ راہ اختیار کر لیں گے جس کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ ان لوگوں کے لیے بے شک ایک دائمی اجر ہوگا۔

ان سطور پر بتوفیقِ ایزدی اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ السعی منی والاتمام من اللہ و بیدہ الفضل کلہ وھو علی کل شیء قدیر۔

رحمان آباد
۱۰۔ ستمبر ۱۹۷۹ء
۱۷۔ شوال ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۸۵

البروج

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا زمانۂ نزول اور مضمون

یہ سورہ دعوت کے اس دور میں نازل ہوئی جب کفارِ قریش اول اول اسلام لانے والوں کو اس غصہ میں ہر قسم کے مظالم کا تختۂ مشق بنائے ہوئے تھے کہ انھوں نے آبائی دین چھوڑ کر یہ نیا دین کیوں اختیار کر لیا؟ ان کو اس میں آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر وہ اس ظلم و ستم سے باز نہ آئے تو بہت جلد خدا کی ایسی سخت پکڑ میں آجائیں گے جس سے کبھی نہ چھوٹ سکیں گے۔ ساتھ ہی مظلوم مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ ان مظالم سے وہ ہراساں نہ ہوں بلکہ دینِ حق پر جمے رہیں۔ حالات بظاہر کتنے ہی ناساعد ہوں لیکن جس رب پر وہ ایمان لائے ہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے، اس کے ارادوں میں کوئی بھی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ آخر میں کفار کو یہ تنبیہ بھی فرما دی گئی ہے کہ اس قرآن کو، جو ان کو اس خطرے سے آگاہ کر رہا ہے سحر و نجوم اور کہانت و شاعری کے قسم کی کوئی چیز نہ سمجھیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے اور اس کا منبع لوحِ محفوظ ہے۔ اس کی ہر بات پوری ہو کے رہے گی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۴) برجوں والے آسمان اور روزِ قیامت کی قسم اس بات پر کہ قیامت شدنی ہے اور ان لوگوں کے لیے ابدی تباہی ہے جو جہنم کے گڑھوں میں پھینکے جائیں گے۔

(۵-۱۱) جو اہلِ ایمان اس بنا پر ستائے گئے کہ آسمان و زمین کے رب پر ایمان لائے ان کی دادرسی کا وعدہ اور جنت کی بشارت بشرطیکہ ان مظالم کے باوجود وہ اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ ساتھ ہی ان ظالموں کو عذاب کی وعید جنھوں نے مسلمانوں کو ستایا اور اس جرم سے توبہ کی توفیق انھیں حاصل نہیں ہوئی۔

(۱۲-۱۶) ظالموں کے لیے خدا کی پکڑ کی بے پناہی اور اس جرم سے توبہ کرنے والوں کے لیے اس کی رحمت و مغفرت کی وسعت کا بیان، صفاتِ جلال و جمال کی روشنی میں۔

(۱۷-۱۸) ماضی کی بعض جبّار قوموں کی طرف اشارہ جو اہلِ ایمان پر اسی طرح کے مظالم کی مرتکب ہوئیں جس کے مرتکب قریش ہو رہے تھے اور جس کی پاداش میں وہ خدا کی پکڑ میں آگئیں۔

(۱۹-۲۲) قریش کی بدبختی پر افسوس کہ وہ قرآن کے انذار کی تکذیب پر اڑے ہوئے اور نشۂ اقتدار میں مست ہیں۔ حالانکہ یہ انذار ایک حقیقت ہے جس سے مفر نہیں۔ وہ خدا کی گرفت سے باہر نہیں ہیں۔ اس نے ہر طرف سے ان کا احاطہ کر رکھا ہے۔ قرآن کوئی شاعری اور کہانت کے قسم کی چیز نہیں ہے، جیسا کہ انھوں نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ یہ نہایت ہی اشرف و اعلیٰ کلام ہے جو خدا نے اتارا ہے اور اس کا سرچشمہ لوحِ محفوظ ہے۔

سُورَةُ الْبُرُوجِ

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــ آيات: ۲۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ﴿۱﴾ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ﴿۲﴾ وَشَاهِدٍ آيات
وَّمَشْهُوْدٍ ﴿۳﴾ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ ۱-۲۲
الْوَقُوْدِ ﴿۵﴾ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ﴿۶﴾ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ
بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ﴿۷﴾ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا
بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴿۸﴾ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا
الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ
وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ﴿۱۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ڛ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ﴿۱۱﴾ آیۃ حبیبۃ ۱۲
اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ﴿۱۳﴾ وَهُوَ
الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ﴿۱۴﴾ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ﴿۱۵﴾ فَعَّالٌ لِّمَا
يُرِيْدُ ﴿۱۶﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَ
ثَمُوْدَ ﴿۱۸﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿۱۹﴾ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ

۲ ع ۱۰ مُّحِيْطٌ ﴿۲۰﴾ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱-۲۲ قسم ہے برجوں والے آسمان اور وعدہ کیے ہوئے دن کی اور دیکھنے والے اور دیکھی ہوئی کی۔ ہلاک ہوئے ایندھن بھری آگ کی گھاٹی والے جب کہ وہ اس پر بیٹھے ہوں گے اور جو کچھ وہ اہلِ ایمان سے کرتے رہے اس کو دیکھیں گے۔ ۱-۷

اور انھوں نے ان پر محض اس وجہ سے غصہ نکالا کہ وہ ایمان لائے اس خدائے عزیز و حمید پر جس کی ہی بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین میں اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ ۸-۹

جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو ستایا، پھر توبہ نہ کی، ان کے لیے لازماً جہنم کی سزا اور جلنے کا عذاب ہے۔ البتہ جو بختہ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے باغ ہوں گے جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ بڑی کامیابی دراصل یہ ہے! ۱۰-۱۱

بے شک تیرے رب کی پکڑ بڑی ہی سخت ہے۔ وہی آغاز کرتا ہے اور وہی لوٹائے گا۔ اور وہ بخشنے والا پیار کرنے والا ہے۔ عرش بریں کا مالک۔ جو چاہے کر ڈالنے والا۔ ۱۲-۱۶

تجھے لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟ فرعون اور ثمود کے لشکروں کی؟ لیکن یہ کفار جھٹلانے ہی میں لگے رہیں گے۔ اور خدا ان کو ان کے آگے پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے۔ (یہ جھٹلانے کی چیز نہیں) بلکہ یہ بڑے مرتبہ کا کلام ہے۔ یہ لوحِ محفوظ کے اندر ہے۔ ۱۷-۲۲

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (۱)

لفظ بروج کی تحقیق

لفظ 'بروج' قلعوں اور گڑھیوں کے لیے آتا ہے۔ عربی زبان اور قرآن دونوں میں یہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آسمان کی صفت کے طور پر یہ جہاں آیا ہے اس سے مراد آسمان کے وہ قلعے اور دیدبان ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے فرشتے برابر مامور رہتے ہیں کہ وہ خدا کی ملکوت میں شیاطین کو ایک خاص حد سے آگے یعنی ملاء اعلیٰ کے حدود میں داخل نہ ہونے دیں۔ اگر اس حد سے وہ آگے بڑھنے کی جسارت کرتے ہیں تو، جیسا کہ آپ مختلف سورتوں میں پڑھ چکے ہیں، ان پر شہاب ثاقب کی مار پڑتی ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی جن یا انسان ملاء اعلیٰ کے حدود میں داخل یا غیب کے اسرار کی کچھ سن گن لے سکے۔

قسم کی نوعیت

قسم یہاں، جیسا کہ جگہ جگہ وضاحت ہو چکی ہے، بطور شہادت یا اس دعوے پر بطور دلیل کھائی گئی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اس سورہ میں مخاطب، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، مکہ اور طائف کے وہ فراعنہ ہیں جو نشۂ اقتدار میں کمزور مسلمانوں کو مظالم کا ہدف بنائے ہوئے تھے اور اپنے قلعوں اور ایوانوں پر ان کو اتنا ناز تھا کہ ان کو کبھی خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ جس خدائے علیم و قدیر پر ایمان لانے کے انتقام میں وہ اس کے کمزور بندوں پر ستم ڈھا رہے ہیں وہ کوئی کمزور ہستی نہیں ہے بلکہ وہی برجوں والے آسمان کا خالق و مالک ہے۔ وہ اپنی پیدا کی ہوئی اس دنیا سے غافل نہیں ہے بلکہ آسمانی قلعوں اور دیدبانوں سے اس کے کردیں ہر گوشہ کی نگرانی کر رہے ہیں۔ وہ جب چاہے آسمانی برجوں سے اپنی افواج قاہرہ بھیج کر یا زمین ہی سے کوئی آفتِ ارضی ابھار کر سارے قلعوں، گڑھیوں، ایوانوں کو مسمار اور ان پر ناز کرنے والوں کے غرور کو پامال کر کے رکھ دے۔

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ (۲)

قیامت کی قسم خود قیامت پر

یہ اس روزِ قیامت کی قسم ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر رکھا ہے۔ جس طرح سورۂ قیامہ میں اس کی قسم کھائی ہے اسی طرح یہاں بھی قسم کھائی ہے۔ قیامت کی قسم خود قیامت ہی سے ڈرانے کے لیے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جس سے کسی ذی ہوش کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے کہ اس کی شہادت خود انسان کے نفس ہی کے اندر موجود ہے، اس کو ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی شہادت کی ضرورت نہیں ہے

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (القيٰمۃ - ۷۵ : ۱۴ - ۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ (۳)

قیامت کے ان تمام شواہد کی طرف اشارہ جو آفاق میں موجود ہیں

نکرہ یہاں تعمیم کے لیے ہے جس سے قیامت اور جزا و سزا کے ان تمام دلائل و شواہد کی طرف اشارہ ہو گیا ہے جو آفاق کے ہر گوشے میں موجود ہیں بشرطیکہ انسان آنکھیں اور عبرت پذیر دل رکھتا ہو۔ مثلاً

— اس کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز خالق کی قدرت، حکمت، رحمت، ربوبیت اور دوسری اعلیٰ صفات کی گواہی دیتی ہے۔ ان صفات کا بدیہی تقاضا، جیسا کہ قرآن نے وضاحت فرمائی ہے، یہ ہے کہ یہ دنیا نہ یوں ہی چلتی رہے اور نہ یوں ہی ایک حادثہ کے طور پر تمام ہو جائے بلکہ واجب ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اللہ تعالیٰ اس کے نیکوں اور بدوں میں امتیاز کرے جنھوں نے اس کے منشاء کے مطابق زندگی گزاری ہو وہ انعام پائیں اور جنھوں نے شتر بے مہار کی زندگی گزاری ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کائنات کے خالق کے نزدیک خیر اور شر، نیک اور بد میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔

— قرآن نے جا بجا رسولوں اور ان کی قوموں کی کشمکش اور اس کشمکش کے نتیجہ کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ اس نے کس طرح ان لوگوں کو پامال کیا جنھوں نے اس کے رسولوں کی تکذیب کی اگرچہ وہ بڑی قوت و شوکت رکھنے والی قومیں تھیں۔ پھر ان کے آثار سے لوگوں کو سبق حاصل کرنے کی دعوت دی اور فرمایا ہے کہ ہم نے یہ آثار زمین میں محفوظ کیے ہی اس لیے ہیں کہ لوگ ان کو دیکھیں اور ان سے عبرت پکڑیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا ہے وہی ان کے ساتھ بھی کرے گا اگر انھوں نے بھی انہی کی روش اختیار کی اور انہی کی طرح اکڑ دکھائی۔

اس استدلالی پہلو کے ساتھ ساتھ 'شَاهِدٍ' اور 'مَشْهُوْدٍ' کے الفاظ کے اندر ایک تخویف کا پہلو بھی ہے جو قیامت کے دن لوگوں کے سامنے آئے گا۔ وہ یہ کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جو کچھ وہ دنیا میں کر رہا ہے ان میں سے کوئی چیز خدا سے مخفی ہے بلکہ وہ جو کچھ کرے گا ایک ایک کر کے وہ اس کے سامنے آئے گا اور ہر چیز وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ اس کے اعضاء و جوارح خود اس کے ہر قول و فعل کی گواہی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے 'کِرَامًا کَاتِبِیْنَ' اس کے جملہ نیک و بد اعمال و اقوال کی رپورٹ پیش کریں گے، حضرات انبیاء علیہم السلام اور صالحین و مصلحین بھی گواہی دیں گے کہ انھوں نے کیا بتایا اور سکھایا اور لوگوں نے ان کے اور ان کی تعلیمات کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ لا النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ (۴-۵)

منکرین قیامت کو تنبیہ

یہ مذکورہ قسموں کا جواب نہیں ہے بلکہ سورۂ قٓ اور بعض دوسری سورتوں میں جس طرح جواب قسم حذف ہو گیا ہے اسی طرح یہاں بھی جوابِ قسم حذف کر کے اس کی جگہ منکرینِ قیامت کے لیے تذکیر و تنبیہ کی آیتیں رکھ دی گئی ہیں۔ یہ طریقہ ان مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں جوابِ قسم اس قدر واضح ہو کہ ذکر کے بغیر بھی ذہن اس کی طرف بے تکلف منتقل ہو سکے۔ اس سے کلام میں ایجاز بھی پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ساری بات جوابِ قسم کی حیثیت سے محذوف بھی مانی جا سکتی ہے جس کے لیے کلام کا سیاق و سباق مقتضی ہو۔ یہاں مذکورہ قسموں کی روشنی میں مقسم علیہ کو کھولیے تو یہ ہو گا کہ قیامت شدنی ہے، اللہ تعالیٰ کے احاطۂ قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے، اس دن ہر شخص اپنے کیے کا انجام دیکھے گا۔

'اُخْدُوْد' کے معنی کھڈ، کھائی اور گڑھے کے ہیں۔ اس کی وضاحت 'النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ' سے فرما دی گئی ہے۔ یعنی یہ گڑھے ایندھن والی آگ سے بھرے ہوں گے۔ ایندھن والی آگ کی صفت سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اس آگ کے برابر بھڑکتے رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وافر ایندھن فراہم کر رکھا ہے، کوئی یہ توقع نہ رکھے کہ ایندھن کی کمی کے سبب سے کبھی یہ دھیمی پڑ جائے گی۔ اس ایندھن کی نوعیت سورۂ بقرہ آیت ۲۴ میں یوں واضح فرمائی گئی ہے: 'فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ' (پس اس آگ سے بچو جس کے ایندھن لوگ بنیں گے اور پتھر)۔

اصحٰب الاخدود

'اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ' کے تحت مفسرین نے ایک بادشاہ کا قصہ نقل کیا ہے لیکن اس کا کوئی نام یا زمانہ نہیں بتایا ہے۔ بس اتنا ہی بتاتے ہیں کہ اس نے اپنے دور کے بہت سے باایمان نصاریٰ کو محض اس جرم میں آگ کے گڑھوں میں پھنکوا دیا کہ انھوں نے اس کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ اہلِ کتاب کی عقائدی چپقلش کے دور میں ایک دوسرے کو جلانے کے بعض واقعات تاریخوں میں مذکور ہیں لیکن خاص اس واقعہ سے متعلق مفسرین نے جو عجیب و غریب باتیں نقل کی ہیں وہ کسی طرح بھی قابلِ اعتبار نہیں ہیں، اس وجہ سے ہم ان سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ یہاں مخاطب، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، قریش کے فراعنہ ہیں جو کمزور مسلمانوں کو ظلم و ستم کا ہدف بنائے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسے مجہول بادشاہ کے انجام سے کیا سبق حاصل کرتے جس کا نام تک نہ ان کو معلوم تھا نہ مفسرین کے علم میں ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ 'اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ' کے لیے یہاں جو زجر اور وعید ہے وہ آخرت سے متعلق ہے نہ کہ اس دنیا سے متعلق۔ اگر اس کو اس دنیا سے متعلق مانیے تو اس سے ان کے ظلم کی ایک ہلکی سی تصویر تو ضرور سامنے آتی ہے لیکن ان کا کوئی ایسا عبرت انگیز انجام قرآن نے نہیں بتایا ہے جو قریش کے لیے سبق آموز ہو سکتا۔ یہ بات کہ ان کی بھڑکائی ہوئی آگ نے خود ان کو اور ان کی بستیوں کو جلا کر راکھ بنا دیا صرف مفسرین

نے بیان کی ہے۔ قرآن نے کوئی اشارہ اس کی طرف نہیں کیا حالانکہ پیشِ نظر مقصد کے لیے اصل ظاہر کرنے کی بات یہی تھی۔

ہمارے نزدیک یہ قریش کے ان فراعنہ کو، جو مسلمانوں کو ایمان سے پھیرنے کے لیے طرح طرح کی اذیتوں کا تختۂ مشق بنائے ہوئے تھے، جہنم کی دھمکی ہے۔ ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ اگر وہ اس شقاوت سے باز نہ آئے تو وہ جہنم کی اس خندق میں پھینکے جائیں گے جو کبھی نہ بجھنے والی آگ سے بھری ہوگی۔

إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ۝ وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ (۶-۷)

اشقیاء کے انجام کی تصویر — یہ تصویر ہے ان اشقیاء کے انجام کی۔ فرمایا کہ یہ اس وقت کو یاد رکھیں جب وہ اس خندق کے کنارے بیٹھیں گے اور جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے ان کو اس آگ بھری خندق کے کنارے پر بٹھایا جائے گا تاکہ وہ اپنا ٹھکانا دیکھ لیں اور پھر وہ اپنی ایک ایک ظالمانہ حرکت کا مزہ چکھیں گے۔ گویا لفظ 'شھود' یہاں نتیجۂ فعل کے مفہوم میں ہے، جس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مجرم کو اس کا اصل ٹھکانا اگر پہلے سے دکھا دیا جائے اور پھر اس کو اس کا مزہ چکھایا جائے تو اس کا عذاب دونا ہو جاتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ مجرموں کو پہلے جہنم کے کناروں پر بٹھایا جائے گا تاکہ وہ دیکھ لیں کہ ان کو کہاں جانا ہے اور پھر ان کو اس میں پھینک دینے کا حکم دیا جائے گا۔ فرعون اور آلِ فرعون کے متعلق بھی قرآن میں یہ ذکر ہے کہ عالمِ برزخ سے ان کو صبح و شام دوزخ کی سیر کرائی جاتی ہے۔

ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ حرف 'اِذْ' گزرے ہوئے زمانہ کے کسی واقعہ کی یاددہانی کے لیے آتا ہے اور ہم نے مستقبل میں پیش آنے والی صورتِ حال کے بیان کے مفہوم میں لیا ہے لیکن اس شبہ کا ازالہ یوں ہو جاتا ہے کہ قرآن میں احوالِ قیامت کی تفصیل جا بجا ماضی کے صیغوں سے کی گئی ہے جس کی توجیہ علماء نے یہ کی ہے کہ مستقبل کی تعبیر ماضی کے اسلوب میں اس کی قطعیت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (۸)

ایمان والوں کی سب سے بڑی نیکی کافروں کے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے — یعنی مسلمانوں پر یہ غیظ و غضب اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان سے کوئی قصور صادر ہوا ہے، بلکہ ان کی سب سے بڑی نیکی ان اشقیاء کے نزدیک ان کا سب سے بڑا جرم ہے جس کے سبب سے وہ سزاوارِ تعذیب قرار پائے ہیں۔ ان کو سزا اس گناہ کی دی جا رہی ہے کہ یہ خدائے عزیز و حمید پر ایمان لائے۔ حالانکہ خدائے عزیز و حمید پر ایمان لا کر اللہ کے ان بندوں نے وہ سب سے بڑا حق ادا کیا ہے جو ان کے خالق و مالک کی طرف سے ان پر عائد ہوتا ہے۔ ان کا یہ اقدام لائقِ اعتراض

اکرام اور قابلِ تعلید تھا نہ کہ سزاوارِ عناد و انتقام لیکن جن کی مت ماری جاتی ہے وہ اپنے خیر خواہوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔

صفاتِ عزیز و حمید کے تقاضے

یہاں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے دو صفتوں ــــــ عزیز اور حمید ــــــ کا حوالہ ہے۔ صفت 'عزیز' اس کی عزت، قدرت، شان اور عظمت و جلال کو ظاہر کرتی ہے اور 'حمید' سے اس کی رحمت، ربوبیت اور سزاوارِ حمد و شکر ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے حوالہ سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جو ذات ان صفات سے متصف ہے وہی حق دار ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ جو اس پر ایمان لائے انھوں نے اس کا سہارا لیا ہے جس کا سہارا ہی اصل سہارا ہے اور وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ اس میں ضمناً مظلوم مسلمانوں کے لیے جو بشارت اور ان کے درپئے آزار کفار کے لیے جو وعید مضمر ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۹)

یہ مذکورہ بالا بشارت اور وعید دونوں پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جس کی بادشاہی ہے وہی حقدار ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور جو اس پر ایمان لائے ان کے لیے اسی کی پناہ کافی ہے۔

'وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ'۔ یعنی جو مسلمان اعدائے ایمان کے ہاتھوں دکھ اٹھا رہے ہیں وہ اطمینان رکھیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ان کے مصائب سے بے خبر نہیں ہے بلکہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ تو جب وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے تو اپنی بادشاہی میں اپنے باایمان بندوں پر اعداء کے ظلم و ستم کو کب تک گوارا کرے گا! ساتھ کفار کے لیے اس میں وعید ہے کہ خدا کی ڈھیل سے مغرور نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ستم رانیوں سے بے خبر نہیں ہے۔ وہ سارا تماشا دیکھ رہا ہے۔ وہ وقت دور نہیں ہے جب وہ اپنے مظلوم بندوں کا انتقام لے گا اور بھرپور انتقام لے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ (۱۰)

مسلمانوں کو ستانے والوں کو دو ٹوک الفاظ میں وعید

اوپر جو وعید اشارات کے پردے میں سنائی گئی ہے اس آیت میں وہ بالکل بے نقاب کر دی گئی ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لانے والے مردوں اور ایمان لانے والی عورتوں کو دین سے پھیرنے کے لیے نشانۂ ستم بنائیں گے اور پھر توبہ نہیں کریں گے وہ یاد رکھیں کہ ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے خاص کر آگ کا عذاب ہے۔

لفظ فتنہ یہاں خاص کر اس ظلم و ستم کے لیے آیا ہے جو کسی پر اس کے دین سے اس کو پھیرنے کے لیے کیا جائے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں بار بار آیا ہے جس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

'مُؤْمِنِينَ' کے پہلو بہ پہلو 'مُؤْمِنٰتِ' کا ذکر یہاں خاص اہتمام سے اس لیے ہوا ہے کہ جس دورِ ابتلاء سے یہ آیات متعلق ہیں اس میں سب سے زیادہ ظلم کمزور عنصر ہونے کے سبب سے عورتوں، بالخصوص لونڈیوں پر ڈھائے گئے۔ ان ظلم ڈھانے والوں کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ سلامتی مطلوب ہے تو جلد سے جلد توبہ اور اصلاح کرلیں ورنہ یاد رکھیں کہ اسی حال میں اگر ان کا خاتمہ ہوا تو سیدھے جہنم میں اتریں گے۔

'عَذَابُ جَهَنَّمَ' کے ذکر کے بعد بظاہر 'عَذَابُ الْحَرِيقِ' کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ 'جہنم' عذاب کی جملہ اقسام و انواع کا مرکز ہے جس میں سب سے بڑا عذاب جلنے کا عذاب ہے۔ گویا ان لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ جہنم کے دوسرے عذابوں کے ساتھ ساتھ ان کو جلنے کے عذاب کا بھی مزا چکھنا پڑے گا۔ اس انجام کو اچھی طرح سوچ رکھیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ (۱۱)

ثابت قدم رہنے والوں کو بشارت

یہ ان اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی ہے جو ان پرمحن حالات کے باوجود اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ فعل 'آمَنُوا' قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اپنے حقیقی اور کامل معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظالموں کے ان مظالم کے علی الرغم جو اہلِ ایمان اپنے ایمان پر جمے اور عملِ صالح کی روش پر قائم و دائم رہیں گے ان کے لیے بے شک ایسے باغ ہوں گے جن میں نہریں بہ رہی ہوں گی۔

'ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ' یعنی کوئی اس کامیابی کو معمولی کامیابی نہ سمجھے۔ یہ دائمی اور ابدی کامیابی ہے۔ جس کو حاصل ہو گی وہی جانے گا کہ اس نے چند دنوں کی آزمائشوں کے صلے میں کیسی عظیم بادشاہی حاصل کی۔

إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ ۝ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ۝ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۝ (۱۲-۱۶)

مذکورہ باتوں کی تائید میں صفاتِ الٰہی کا حوالہ

اوپر کی آیات میں اہلِ ایمان کے ستانے والے کفار کو جو دھمکیاں اور مظلوم مسلمانوں کو جو بشارتیں دی گئی ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مزید صفات کی یاددہانی سے ان کو مزید مؤکد و مدلل کر دیا ہے۔

'إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ' فرمایا کہ تیرے رب کی پکڑ بڑی ہی سخت ہے۔ کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ وہ اپنی جماعت و جمعیت یا اپنے شرکاء و شفعاء کے بل پر اس سے اپنے کو بچا لے گا۔ اللہ کی پکڑ سے نہ کوئی بچ سکتا نہ اس کو کوئی بچانے والا بن سکتا۔

'رَبِّكَ' کا خطاب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مانا جائے تو یہ خطاب آپ سے ان مظلوموں کے وکیل کی حیثیت سے ہو گا۔

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ۔ ظالموں کو اوپر جس عذاب جہنم کی دھمکی دی گئی ہے یہ اس کی دلیل بیان کر دی گئی ہے کہ کوئی اس مغالطہ میں بھی نہ رہے کہ آخرت اور جزا و سزا کا ڈراوا محض ڈراوا ہے، مرنے کے بعد نہ کوئی زندگی ہے نہ کوئی موت۔ فرمایا کہ خدا ہی ہے جو لوگوں کو اس دنیا میں پیدا کرتا ہے اور جب وہ پیدا کرتا ہے تو وہ از سر نو ان کا اعادہ بھی کر سکتا ہے۔ جب پہلی بار اس کو پیدا کرنے میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی تو دوبارہ یہ کام اس کے لیے کیوں مشکل ہو جائے گا؟

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۙ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۙ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۔ یعنی بخشنے والا اور محبت کرنے والا تنہا وہی ہے جس کو لو لگانی ہو تنہا اسی سے لگائے۔ کوئی اور نہیں ہے جو کسی کے کچھ کام آسکے۔ عرش کا مالک اور عظمت والا وہی ہے۔ کوئی اس کے اقتدار اور اس کی عظمت میں شریک نہیں ہے۔ وہ جو چاہے کر ڈالنے والا ہے۔ نہ وہ کسی کا محتاج ہے نہ کوئی اس کے کسی ارادے میں مزاحم ہو سکتا۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۙ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ (۱۷-۱۸)

تاریخ سے بعض مثالوں کا حوالہ

انہی حقائق کو ثابت کرنے کے لیے جو اوپر مذکور ہوئے، یہ تاریخ کی بعض مثالوں کی طرف اشارہ فرما دیا۔ خدا کی پکڑ میں آنے والی جن قوموں کی سرگزشت قرآن نے سنائی ہے ان میں قوم ثمود اور فرعون کے جبر و ظلم اور طغیان و فساد کا ذکر خاص اہتمام سے فرمایا ہے۔ قریش کے لیڈروں پر ان دونوں قوموں کی عظمت و شوکت کی بڑی دھاک تھی۔ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دیکھ لو، جب خدا نے ان کو پکڑا تو چشم زدن میں وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئے اور کوئی ان کو بچانے والا نہ بن سکا!

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ (۱۹)

انکار کا اصل سبب ضد ہے

اس 'بَلْ' سے پہلے کلام کا کچھ حصہ بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جو کچھ ان کو سنایا جا رہا ہے، ہے تو یہ حرف حرف حق۔ کسی کے لیے بھی اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ قیامت کے منکرین جان بوجھ کر جھٹلانے کے درپے ہیں اور اب ایسی پخ آپڑی ہے کہ کسی طرح اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ (۲۰)

لفظ 'وَرَآءَ' آگے اور پیچھے دونوں معنوں میں آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جھٹلانے ہی پر بضد ہیں تو اپنی ضد پر اڑے رہیں لیکن یاد رکھیں کہ ان کی تکذیب سے حقیقت جھوٹ نہیں ہو جائے گی۔ اللہ ان کے آگے پیچھے ہر طرف سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۙ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۲۱-۲۲)

اس 'بَلْ' سے پہلے بھی بربنائے وضاحتِ قرینہ کچھ محذوف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ یہ قرآن جس انجام سے تمھیں ڈرا رہا ہے یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ ایک بزرگ و برتر کلام ہے۔ یہ شاعروں اور کاہنوں کے کلام کی طرح کی کوئی ہوائی چیز نہیں ہے بلکہ یہ خدا کی نازل کردہ وحی ہے اور اس کا منبع لوحِ محفوظ ہے جس تک کسی جن و انس کی رسائی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

لاہور
۱۱۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء
۱۸۔ ذوالقعدہ ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

٨٦

الطارق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ کی توام ہے۔ دونوں کا عمود بالکل ایک ہے۔ صرف اسلوب بیان اور نہج استدلال الگ الگ ہیں۔ تمہید اور خاتمہ کے پہلو سے بھی دیکھیے تو دونوں میں حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے۔ آفاق و انفس کے شواہد اور خالق کائنات کی صفات کی روشنی میں یہ حقیقت ان میں بے نقاب فرمائی گئی ہے کہ قرآن جس روز جزاء و سزا سے ڈرا رہا ہے اس کو ہنسی مسخری نہ سمجھو۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کے ظہور میں جو دیر ہو رہی ہے تو اس کو تکذیب کا بہانہ نہ بناؤ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے ڈھیل ہے کہ اس کی حجت تمام ہو جائے اور تم اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لو۔ خدا کی تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے اس وجہ سے وہ سرکشوں کو پکڑنے میں عجلت نہیں کرتا۔ لیکن جب پکڑتا ہے تو کوئی اس کے پنجۂ عذاب سے چھوٹ نہیں سکتا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۴) آسمان اور اس کے ستاروں کی شہادت اس بات پر کہ خدا کی نگاہوں سے کوئی چیز بھی اوجھل نہیں۔ اس نے ہر جان پر پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ جن ہوں یا انسان سب کی نگرانی ہو رہی ہے۔ وہ جس کو جب چاہے پکڑ سکتا اور سزا دے سکتا ہے کوئی اس کے قابو سے باہر نہیں ہے۔

(۵-۸) منکرین قیامت کو اس حقیقت پر غور کرنے کی دعوت کہ انسان کی خلقت کسی ایسے نایاب جوہر سے نہیں ہوئی ہے جو خدا کی دسترس سے باہر ہو بلکہ وہ پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے جو اسی کے اندر سے نکلتی ہے۔ جب اسی کے اندر سے ٹپکی ہوئی ایک بوند کو اللہ تعالیٰ اپنی صنعت گری سے انسان بنا دینے پر قادر ہے تو اس کو دوبارہ پیدا کرنے اور اٹھا کھڑے کرنے سے کیوں عاجز رہ جائے گا!

(۹-۱۰) اس حقیقت کا اظہار کہ خدا ہر ایک کے ہر قول و فعل بلکہ دلوں کے بھید دں اور پس پردہ

رازوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے۔ ایک دن سارے راز پرکھے اور جانچے جائیں گے۔ اس دن کسی کے پاس نہ اس کی اپنی کوئی قوت وجمعیت ہوگی جو اس کے کام آسکے اور نہ کسی کی سعی وسفارش اس کو کچھ نفع پہنچانے والی بنے گی۔

(۱۱-۱۴) ایک عام آفاقی شہادت کا حوالہ اس امر کے حق میں کہ قرآن جس قیامت سے ڈرا رہا ہے وہ کوئی ہنسی مخری کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جو پیش آکے رہے گی۔ لوگوں کو چاہیے کہ اس کے لیے تیاری کریں نہ کہ اس کا مذاق اڑائیں۔

(۱۵-۱۷) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ مخاطبین تمھاری تکذیب کے لیے جو جو چالیں چل رہے ہیں اس سے مایوس نہ ہو بلکہ ان کو ابھی کچھ دن مہلت دو۔ تمھارے رب نے ان کے لیے استدراج کا جو دام بچھایا ہے یہ اس میں پھنس چکے ہیں۔ ان کا انجام اب ان کے سامنے آیا ہی چاہتا ہے۔

سُوْرَةُ الطَّارِقِ

مَكِّيَّةٌ ——— آیات: ۱۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱-۱۷
وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ﴿۲﴾ النَّجْمُ
الثَّاقِبُ ﴿۳﴾ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْهَا حَافِظٌ ﴿۴﴾ فَلْیَنْظُرِ
الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ﴿۵﴾ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ﴿۶﴾ یَّخْرُجُ مِنْۢ
بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآىِٕبِ ﴿۷﴾ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ﴿۸﴾ یَوْمَ
تُبْلَى السَّرَآىِٕرُ ﴿۹﴾ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴿۱۰﴾ وَالسَّمَآءِ
ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿۱۱﴾ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ
فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾ اِنَّهُمْ یَكِیْدُوْنَ كَیْدًا ﴿۱۵﴾ وَّ
اَكِیْدُ كَیْدًا ﴿۱۶﴾ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِیْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَیْدًا ﴿۱۷﴾ ع ۱۷/۱۱

ترجمۂ آیات ۱-۱۷
شاہد ہیں آسمان اور رات میں نمودار ہونے والے اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہیں
رات میں نمودار ہونے والے! دمکتے تارے! کہ کوئی جان نہیں کہ اس پر نگہبان
نہیں۔ ۱-۴

انسان غور کرے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے! وہ پیدا کیا گیا ہے
ذرا سے اچھلتے پانی سے جو نکلتا ہے ریڑھ اور پسلیوں کے بیچ سے۔ بے شک

وہ اس کے لوٹا سکنے پر پوری طرح قادر ہے۔ ۵-۸

اس دن ساری چھپی باتیں پرکھی جائیں گی تو اس وقت اس کے پاس کچھ زور نہ ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ ۹-۱۰

شاہد ہے آسمان، پُر از باراں اور زمین، پر شگاف کہ یہ دو ٹوک بات ہے اور یہ کوئی ہنسی مسخری نہیں۔ ۱۱-۱۴

وہ چل رہے ہیں ایک چال اور میں بھی کر رہا ہوں ایک داؤ۔ تو ان کافروں کو مہلت دے، ان کو چھوڑ ذرا دیر کو۔ ۱۵-۱۶

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ﴿۳﴾ (۱-۳)

آسمان اور ستاروں کی قسم

جس طرح سابق سورہ میں برجوں والے آسمان کی قسم کھائی ہے اسی طرح اس سورہ میں آسمان اور اس کے دمکتے ستاروں کی قسم کھائی ہے اور یہ قسم، جیسا کہ وضاحت ہو چکی ہے، بطور شہادت اس دعوے پر دلیل پیش کرنے کے لیے کھائی ہے جو آگے آ رہا ہے۔

'طارق' کے لغوی معنی تو شب میں آنے والے کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد شب میں نمودار ہونے والے ستارے ہیں۔ اس کی وضاحت خود قرآن ہی نے 'اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ' کے الفاظ سے کر دی ہے۔

'وَمَآ اَدْرٰىكَ' کا سوال اس شہادت کی عظمت و اہمیت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس شہادت کو معمولی شہادت نہ گمان کرے۔ یہ بہت بڑی شہادت ہے بشرطیکہ غور کرنے والے اس پر غور کریں اور سمجھیں، اس کو مذاق بنانے کی کوشش نہ کریں۔

'اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ' سے کوئی خاص ستارہ مراد نہیں ہے بلکہ جس طرح 'وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ' (النحل - ۱۶: ۱۶) اور بعض دوسری آیات میں یہ لفظ جنس کے مفہوم میں آیا ہے اسی طرح یہاں بھی یہ جنس ہی کے مفہوم میں ہے۔ البتہ 'ثَاقِبٌ' کی صفت سے یہ اشارہ فرما دیا ہے کہ اس سے مراد وہی ستارے ہیں جن کی روشنی از خود ہم تک پہنچتی ہے اور جن کی جستجو کے لیے ہمیں ترقی یافتہ دوربینوں کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ ہر دیکھنے والا ان کو دیکھ اور ان سے وہ سبق حاصل کر سکتا ہے جو قرآن یہاں دینا چاہتا ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ ستارے صرف اتنے ہی نہیں ہیں جتنے ہمیں نظر آتے ہیں۔ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کون جان سکتا ہے کہ کتنے جہان اور کتنے ستارے ہیں!

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴿۴﴾ (۴)

[illegible]

یہ مقسم علیہ یا اصل دعویٰ ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے مذکورہ بالا قسم کھائی گئی ہے۔ 'لَمَّا' کا استعمال یہاں ذرا نادر ہے اس وجہ سے اس کی توجیہ میں اہل نحو نے اختلاف کیا ہے۔ ہم اس کی تحقیق سورۂ ہود آیت ۱۱۱ اور سورۂ زخرف آیت ۳۵ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

ستاروں کی شہادت اس دعوے پر کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جان پر نگران مقرر کر رکھے ہیں ایک تو اس پہلو سے ہے کہ انسان سوچے کہ جب خدا کی مقرر کی ہوئی اتنی ان گنت آنکھیں رات بھر جاگتی اور

ٹکٹکی لگائے زمین والوں کو گھورتی رہتی ہیں کس کی مجال ہے کہ اس کے دام سے بچ کے نکل سکے۔ سائنس کی ایجاد کردہ بڑی سے بڑی دوربینوں کے اندر بھی وہ طاقت نہیں ہے جو آسمان کے معمولی سے معمولی ستاروں کے اندر ہے جن کی روشنی تہ بہ تہ فضاؤں کو چیرتی ہوئی زمین تک پہنچ جاتی ہے۔ جو خدا اپنی قدرت کی یہ شان ہر شب میں ہمیں دکھا رہا ہے اس کے متعلق یہ تصور کہ اس کی نگاہوں سے کوئی چیز بھی اوجھل رہ سکتی ہے صرف اس شخص کے اندر پیدا ہو سکتا ہے جو عقل سے بالکل عاری ہو۔

دوسرا پہلو اس کا وہی ہے جس کی طرف ہم سابق سورہ میں بھی اشارہ کر چکے ہیں اور جو قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے کہ انہی ستاروں کے اندر خدا نے ایسے برج بنائے ہیں جہاں سے ان شیاطین پر شہاب ثاقب کی مار پڑتی ہے جو خدا کے ممنوعہ حدود میں دراندازی کی جسارت کرتے ہیں۔ قدرت کا یہ انتظام اس بات پر شاہد ہے کہ یہ دنیا بے راعی کا گلہ نہیں ہے بلکہ اس کے چپہ چپہ پر خدا نے اپنے پہرہ دار بٹھا رکھے ہیں جو شب و روز ہر چیز کی نگرانی کر رہے ہیں اس وجہ سے لازماً اس کے بعد ایک یوم الحساب آنا ہے جس کے احتساب سے کوئی بھی اپنے کو بچا نہ سکے گا۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ ۝ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝ إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ (۵-۸)

انسان کا وجود خود شاہد ہے کہ خدا اس کو دوبارہ اٹھا سکتا ہے

یہ اس احساس ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی ہے جو ہر اس انسان کے اندر پیدا ہونا چاہیے جو اس حقیقت کو پا گیا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ اس کا خالق ایک ایک چیز پر نگاہ رکھے ہوئے ہے اور جب وہ نگاہ رکھے ہوئے ہے تو لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں نیکوں کے سامنے ان کی نیکی اور بدوں کے سامنے ان کی بدی اپنے حقیقی نتائج کی صورت میں بے نقاب ہو۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ۔ یہ انسان کو خود اس کے وجود کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر وہ اپنی ہی خلقت پر غور کرے تو خدا کی قدرت، حکمت اور اس کی صنعت گری کی ایسی شانیں ظاہر ہوں گی کہ وہ پکار اٹھے گا کہ جو خدا پانی کی ایک حقیر بوند سے اس کو ان اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کر سکتا ہے وہ مرنے کے بعد اس کو دوبارہ اٹھا سکنے پر بھی قادر ہے۔

جزا و سزا کے منکرین کا سب سے بڑا شبہ یہی تھا کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کیے جانے کو بعید از امکان تصور کرتے تھے۔ ان کے اس شبہ کو دور کرنے کے لیے قرآن نے جگہ جگہ ان کو خود ان کی خلقت پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ سورہ عبس میں اسی طرح کے لوگوں کو ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی ہے:

قُتِلَ الْإِنسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ۝ مِنْ أَيِّ

انسان غارت ہو کتنا ناشکرا ہے! اس کو خدا

شَيْءٍ خَلَقَهٗ ؕ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ
خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۙ ثُمَّ السَّبِيْلَ
يَسَّرَهٗ ۙ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۙ
ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ؕ
(عبس - ۸۰ ، ۱۷ - ۲۲)

نے کس چیز سے پیدا کیا؟ پانی کی ایک بوند سے
اس کو پیدا کیا، پھر اس کے لیے ایک
اندازہ ٹھہرایا، پھر اس کے لیے راہ آسان کی
پھر اس کو موت دی اور اس کو قبر میں رکھوایا۔
پھر جب چاہے گا اس کو اٹھا کھڑا کرے گا۔

'خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ'۔ یہ اس پانی کی نوعیت، اس کے خروج کی صورت اور اس کی جگہ کے حدود اربعہ کی وضاحت فرما دی تاکہ انسان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ پانی نہ کوئی جوہر نایاب ہے اور نہ یہ کسی ایسی ولایت سے آتا ہے جو خدا کی خدائی کے حدود سے باہر ہو بلکہ انسان ہی کی ریڑھ اور اس کی چھاتیوں کے بیچ سے اچھلتا ہے اور قدرت اسی کو اپنے سانچے میں جس شکل و صورت پر چاہتی ہے ڈھالتی ہے اور پھر اس کو بطنِ مادر سے باہر لاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا کی اس عظیم قدرت و حکمت کا مشاہدہ ہر شخص خود اپنے وجود کے اندر کر رہا ہے کیا اس کے لیے اس کو دوبارہ زندہ کرنا ناممکن ہو جائے گا! اسی حقیقت کی طرف سورۂ انفطار میں یوں توجہ دلائی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا
غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۙ
الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ
فَعَدَلَكَ ۙ فِيْٓ اَيِّ
صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ؕ
كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ
بِالدِّيْنِ ۙ
(الانفطار - ۸۲ : ۶ - ۹)

اے انسان، تجھے تیرے اس ربِ کریم کے باب
میں کس چیز نے مغالطے میں ڈال رکھا ہے؟ جس
نے تیرا خاکہ بنایا، پھر تیرے نوک پلک سنوارے
اور تجھے بالکل ٹھیک ٹھاک کیا، اور جس شکل
پر چاہا تجھے متشکل کر دیا! (اس خدا کی قدرت
کے باب میں کسی شک کی گنجائش) ہرگز نہیں
ہے لیکن تم جزاء و سزا کو جھٹلانا چاہتے ہو
(اس وجہ سے اس قسم کے شبہات ایجاد کر رہے ہو)۔

'اِنَّهٗ عَلٰی رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ'۔ یعنی جس خدا نے انسان کو پیدا کرنے میں اپنی قدرت و حکمت کی یہ شانیں دکھائی ہیں وہ اس کے مر کھپ جانے کے بعد اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی ضرور قادر ہے۔ 'رَجْعِهٖ' میں ضمیر کا مرجع انسان ہے جس کو آیت 'فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ (۵)' میں غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اگرچہ لفظ عام استعمال ہوا ہے لیکن اصل روئے سخن قریش ہی کی طرف ہے جو اس قسم کے لاطائل شبہات پیدا کر کے قرآن کے انذار کو غیر مؤثر بنا دینا چاہتے تھے۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (۹)

آخرت کے احتساب کی نوعیت

اس دن جس طرح کے احتساب سے لوگوں کو سابقہ پیش آئے گا یہ اس کا بیان ہے۔ فرمایا کہ اس دن مخفی باتیں بھی جانچی اور پرکھی جائیں گی۔ یعنی صرف ظاہری اقوال و اعمال ہی زیر بحث نہیں آئیں گے بلکہ مخفی اعمال، دلوں کے کھوٹ اور نیتوں کے فساد بھی پرکھے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے پاس ایسے آلات ہیں جو مخفی سے مخفی گوشوں میں چھپے ہوئے اعمال و اقوال کا بھی کھوج لگا لیں گے اور ہر عمل کو پرکھ کر بتا دیں گے کہ کس کے اندر کتنا کھوٹ ہے اور کتنا اخلاص۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دن آدمی کے اعضاء و جوارح بھی ان تمام اعمال کی گواہی دیں گے جو انسان نے کیے ہوں گے تو جب اعضاء و جوارح بھی گواہ بن کر اٹھ کھڑے ہوں گے تو کسی راز کے راز رہنے کا کیا امکان باقی رہا۔

فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ (۱۰)

اس دن آدمی کے پاس نہ اس کی اپنی ذاتی قوت ہوگی جس سے وہ مدافعت کر سکے اور نہ اس کے اعوان و انصار اور شرکاء و شفعاء میں سے کوئی اس کی حمایت کے لیے اٹھے گا۔ ہر ایک کا ظاہر و باطن کھلی کتاب کی طرح سامنے ہوگا اور صرف خدائے علیم و خبیر ہی کا فیصلہ بے چون و چرا نافذ ہوگا۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (۱۱-۱۲)

حیات بعد الموت پر آفاقی شہادت

اوپر حیات بعد الموت اور روز جزا پر انسان کی خلقت سے شہادت پیش کی ہے۔ اب اسی دعوے پر ایک آفاقی دلیل کی طرف توجہ دلائی ہے۔

'رَجْع' کی تشریح اہل لغت نے 'المطر بعد المطر' سے کی ہے۔ یعنی وہ بارش جو یکے بعد دیگرے ہوتی اور زمین کو زندگی و شادابی بخشتی ہے۔

'صَدْع' کے معنی پھٹنے کے ہیں۔ یعنی جب بارش ہوتی ہے تو زمین کے مسامات کھل جاتے ہیں اور وہ پانی جذب کر کے پھول جاتی اور دیکھتے دیکھتے لہلہا اٹھتی ہے۔ اگرچہ یہاں لہلہا اٹھنے کا ذکر لفظوں میں نہیں ہے لیکن قرینہ اس پر دلیل ہے۔ اسلوب قسمیہ ہے اس وجہ سے بات اشاروں میں کہہ دی گئی ہے۔

قرآن کے دوسرے مقامات میں مختلف اسلوبوں سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کو از سر نو زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ جو لوگ اس بات میں شک کر رہے تھے ان کو ملامت کی گئی ہے کہ تم ایک ایسی بات میں شک کر رہے ہو جس کا مشاہدہ آئے دن تمھیں ہوتا رہتا ہے۔ سورۂ انبیاء میں اسی طرح کے شکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۔۔۔ کیا جنھوں نے قیامت کا انکار کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں بند

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۚ (الانبیاء ۲۱ : ۳۰)

ہوتے ہیں پس ہم ان کو کھول دیتے ہیں اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا۔

اس آیت کی تفسیر اس کے محل میں دیکھ لیجیے۔ آسمان و زمین کے بند ہونے سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ نہ آسمان سے پانی برستا نہ زمین سبزہ اگاتی لیکن جب اللہ تعالیٰ آسمان کے دریچے کھول کر پانی برسا دیتا ہے تو زمین بھی اپنے خزانوں کے دروازے کھول دیتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ جب چاہے گا زمین سے ان سارے لوگوں کو زندہ اٹھا کھڑے گا جو اس میں دفن ہیں۔

إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۙ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۱۳-۱۴)

جس طرح سابق سورہ کے آخر میں مکذبین قیامت کو متنبہ فرمایا ہے کہ قرآن کے اس انذار کا مذاق نہ اڑاؤ، یہ لوح محفوظ سے اترا ہوا نہایت برتر کلام ہے، اسی طرح اس سورہ کے آخر میں بھی ایک نئے اسلوب سے آگاہ فرمایا کہ یہ قرآن جس روزِ حساب سے تمھیں آگاہ کر رہا ہے وہ ایک امرِ قطعی اور اٹل ہے جس سے تمھیں لازماً سابقہ پیش آنا ہے تو اس کو مذاق کا موضوع نہ بناؤ بلکہ دانشمندی اور عاقبت بینی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو توجہ سے سنو سمجھو اور آنے والے دن کی تیاری کرو۔ مکذبین قیامت کو تنبیہ

إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۙ وَأَكِيدُ كَيْدًا (۱۵-۱۶)

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمھارے انذار کا مذاق اڑانے کے لیے لوگ جو سخن سازیاں کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے دل میں فی الواقع کچھ شبہات ہیں جو کسی جواب یا کسی معجزہ دکھا دینے سے دور ہو جائیں گے۔ یہ شبہات محض حقیقت سے فرار کے لیے گھڑے جا رہے ہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ نہ یہ خود تمھاری بات مانیں نہ اپنے عوام کو ماننے دیں تاکہ ان کی سیادت قائم رہے اور اپنی جن خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں بدستور ان کی پیروی کرتے رہیں۔ پیغمبر صلعم کو تسلی

'وَأَكِيدُ كَيْدًا' فرمایا کہ ان کی اس چال کے توڑ کے لیے میں بھی ایک چال چل رہا ہوں۔ وہ یہ کہ ان کو پکڑنے میں جلدی کرنے کے بجائے ان کو ڈھیل دے رہا ہوں تاکہ یہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں اور جب پکڑے جائیں تو ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ یہ نادان اس ڈھیل کو اپنی کامیابی گمان کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں یہ خدا کے استدراج کے پھندے میں اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ جتنی ہی ان کی رسی دراز ہو رہی ہے اتنی ہی اس کی گرفت مضبوط ہو رہی ہے۔ یہ گویا اسی بات کی دوسرے الفاظ میں وضاحت ہے جو سابق سورہ میں 'وَاللّٰهُ مِن وَرَآئِهِم مُّحِيطٌ' (البروج - ۸۵ : ۲۰) کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔

فَمَهِّلِ الْكٰفِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (۱۷)

یعنی جب یہ ہر طرف سے اللہ تعالیٰ کے گھیرے میں ہیں تو خواہ ان کو کتنی ہی ڈھیل ملے اس بات

کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ یہ خدا کی گرفت سے باہر نکل جائیں گے تو تم بھی ان کو ڈھیل ہی دو یعنی ان کے طعنوں اور مطالبات سے تنگ آ کر یہ تمنا نہ کرو کہ اب ان کو کوئی نشانِ عذاب دکھا ہی دی جائے یا سرے سے ان کا قصہ ہی پاک کر دیا جائے۔

'اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا' یہ اوپر کے ٹکڑے ہی کی وضاحت ہے کہ اس ڈھیل سے یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی غیر محدود مدت کے لیے ان کو ڈھیل دی جائے بلکہ بس ذرا سی ان کی رسی دراز کر دی جائے تاکہ جو کھیلیں یہ کرنی چاہتے ہیں کر لیں بالآخر ان کو اپنے انجام سے دوچار ہونا ہی ہے۔

یہاں کلام کا یہ پہلو خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ڈھیل دینے کی ہدایت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائی جا رہی ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اب ان کی قسمت کی باگ دراصل پیغمبر ہی کے ہاتھ میں خدا نے دے دی ہے۔ البتہ وہ پسند یہ فرماتا ہے کہ پیغمبر ان کو ذرا سی ڈھیل مزید دے دیں۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی اِحْسَانِہٖ۔

لاہور :
۲۳ اکتوبر ۱۹۷۹ء
یکم ذوالحجہ ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۸۷

الاعلیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ ——— الطارق ——— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقینِ صبر و انتظار پر ختم ہوئی ہے۔ آپ کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ تمہاری تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے استدراج کے پھندے میں پھنس چکے ہیں، اب ان کے دن گنتی کے ہیں جو وہ پورے کر رہے ہیں۔ ان کو تھوڑی سی مہلت اور دو۔ ان کے طغیان کا انجام ان کے سامنے آیا ہی چاہتا ہے۔ اطمینان رکھو کہ یہ خدا کے قابو سے باہر نہیں جا سکتے۔ وہ ہر طرف سے ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اب اس سورہ میں قریش کے ہٹ دھرموں سے صرفِ نظر کر کے براہِ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرمایا ہے اور آپ کو یہ بشارت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں ایک ترتیب و تدریج ہے اور یہ ترتیب و تدریج تمام تر اس کی حکمت پر مبنی ہے تو اپنے رب پر بھروسہ رکھو۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ تمہاری سعی بامراد اور اللہ کی نعمت تم پر تمام ہوگی اور راہ کی ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ خطاب کی یہ تبدیلی آگے کی سورتوں میں (کم از کم دس سورتوں تک) نمایاں ہے۔ ان میں مخالفین سے کوئی بات کہی گئی ہے تو ضمناً۔ اصل خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے اور مختلف اسلوبوں سے آپ کی وہ تمام الجھنیں دور فرمائی گئی ہیں جو دعوت کے اس مرحلے میں پیش آئیں یا جن کے پیش آنے کا امکان تھا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی برابر تسبیح کرتے رہنے کی ہدایت اور اس کی ان صفات کی یاددہانی جو اس بات کی دلیل ہیں کہ اس کے ہر کام میں ایک ترتیب و تدریج ہوتی ہے۔ جس طرح زمین کی نباتات آہستہ آہستہ ہی گنجان و سرسبز ہوتی ہیں۔ اسی طرح انسان کی جسمانی و عقلی صلاحیتیں بھی تدریج کے ساتھ ہی کمال کو پہنچتی ہیں۔

(۶-۸) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت کہ قدرت کے اسی قانون کے مطابق آپ کے ساتھ بھی معاملہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی جو نعمت، وحی کی صورت میں نازل ہو رہی ہے وہ درجہ بدرجہ نازل ہوگی اور اس اہتمام کے ساتھ آپ کو تعلیم دی جائے گی کہ اس چیز کے سوا جس کو اللہ ہی نظر انداز کرانا چاہے آپ ایک حرف بھی نہ بھولیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر سرّ و علانیہ سے باخبر ہے۔ آپ کو جن حالات سے سابقہ ہے یا پیش آئے گا۔ وہ ان سے اچھی طرح واقف ہے۔ مشکلات کے اندر سے آپ کے لیے آسان راہ وہ نکالے گا۔

(۹-۱۳) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ ضدیوں اور ہٹ دھرموں کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو سننا نہیں چاہتے ان کو سنانا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ صرف وہ سنیں گے جو اللہ اور آخرت سے ڈرنے والے ہیں۔ جو محروم القسمت ہیں وہ اس سے گریز ہی کریں گے اور اپنا انجام دیکھیں گے۔

(۱۴-۱۵) ان خوش بختوں کو ابدی فائز المرامی کی بشارت جنھوں نے اپنے کو پاک کیا اور اپنے رب کو یاد کیا اور اس کی نماز پڑھی۔

(۱۶-۱۹) کفار کو خطاب کر کے یہ تنبیہ کہ تمھاری اصلی بیماری یہ ہے کہ تم دنیا کی زندگی اور اس کی لذات کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو اس وجہ سے تمھارے دلوں میں پیغمبر کی باتیں نہیں اترتی ہیں۔ حالانکہ بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے۔ تمام اگلے نبیوں اور صحیفوں کی تعلیم یہی ہے۔

سُورَةُ الْأَعْلَى

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــ آیات ۱۹

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ﴿١﴾ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ﴿٢﴾ وَالَّذِي آیات ۱-۱۹
قَدَّرَ فَهَدَى ﴿٣﴾ وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَى ﴿٤﴾ فَجَعَلَهُ غُثَاءً
أَحْوَى ﴿٥﴾ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَى ﴿٦﴾ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّهُ
يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَى ﴿٧﴾ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرَى ﴿٨﴾ فَذَكِّرْ
إِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرَى ﴿٩﴾ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَخْشَى ﴿١٠﴾ وَيَتَجَنَّبُهَا
الْأَشْقَى ﴿١١﴾ الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَى ﴿١٢﴾ ثُمَّ لَا يَمُوتُ
فِيهَا وَلَا يَحْيَى ﴿١٣﴾ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى ﴿١٤﴾ وَذَكَرَ اسْمَ
رَبِّهِ فَصَلَّى ﴿١٥﴾ بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿١٦﴾ وَ
الْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَى ﴿١٧﴾ إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَى ﴿١٨﴾
صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى ﴿١٩﴾ ع ۱ ۱۹ ۱۲

اپنے خداوند برتر کے نام کی تسبیح کر جس نے خاکہ بنایا پھر نوک پلک سنوارے ترجمۂ آیات ۱-۱۹
جس نے مقدر کیا اور ہدایت بخشی اور جس نے نباتات اگائیں پھر ان کو گھنی
سرسبز و شاداب بنایا۔ ۱-۵

ہم تمھیں پڑھائیں گے تو تم نہیں بھولو گے مگر وہی جو خدا چاہے گا۔ وہ جانتا ہے علانیہ کو بھی اور اس کو بھی جو چھپا ہوتا ہے۔ اور ہم تمھیں لے چلیں گے آسان راہ۔ ۶-۸

پس تم یاد دہانی کرو اگر یاد دہانی کچھ نفع پہنچائے۔ فائدہ اٹھالے گا وہ جس کو ڈر ہوگا اور گریز کرے گا وہ جو بدبخت ہوگا۔ وہ پڑے گا بڑی آگ میں۔ پھر نہ اس میں مرے گا اور نہ جیے گا۔ ۹-۱۳

کامیاب ہوا جس نے اپنے کو پاک کیا اور اپنے خداوند کا نام یاد کیا اور نماز پڑھی۔ ۱۴-۱۵

پر تم لوگ تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور پائدار ہے۔ یہی تعلیم اگلے صحیفوں میں بھی ہے۔ موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں میں۔ ۱۶-۱۹

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى (۱)

اللہ تعالیٰ کی یاد کی اہمیت

ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ لفظ 'تسبیح' میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ان تمام باتوں سے پاک اور برتر قرار دینا جو اس کی اعلیٰ شان کے منافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور ہی تمام علم و معرفت اور تمام قوت و اعتماد کا سرچشمہ ہے۔ اگر اس میں کوئی خلل پیدا ہو جائے تو انسان صحیح معرفت کی شاہراہ سے ہٹ جاتا اور شیطان کے پیچھے پڑ جاتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ اس کا دل ایمان و توکل کی نعمت، طمانیت، شرح صدر کے نور اور عزیمت و استقامت کی قوت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور اس کی یاد ہی ہے جو دل کو پا برجا اور مستقیم و مطمئن رکھتی ہے 'اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ' (الرعد ۱۳: ۲۸)۔

'تسبیح' کی سب سے اعلیٰ اور معیاری شکل تو، جیسا کہ ہم جگہ جگہ بیان کر چکے ہیں، نماز، بالخصوص شب کی نماز ہے لیکن جس طرح سانس انسان کی مادی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی یاد اس کی روحانی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے۔ اس وجہ سے صرف نمازوں کے اوقات ہی میں نہیں بلکہ زندگی کی دوسری سرگرمیوں کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل کو آباد رکھنا چاہیے تاکہ شیطان کو اس پر غلبہ پانے کا موقع نہ ملے۔ سورۂ مزمل کی آیت 'اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا' کے تحت اس حقیقت کی ہم وضاحت کر چکے ہیں۔ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت صبر و استقامت کے حصول کے لیے فرمائی گئی ہے اس وجہ سے یہ اپنے جامع مفہوم ہی میں ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى (۲)

اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں ایک تدریج ہوتی ہے جو اس کی حکمت پر مبنی ہوتی ہے

اب اس آیت اور آگے کی چند آیات میں خدائے برتر کی چند صفات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس کے ہر کام میں ایک ترتیب و تدریج ہوتی ہے جو یکسر اس کی حکمت پر مبنی ہوتی ہے اس وجہ سے بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے رب کے احکام کی تعمیل میں صبر و استقامت کے ساتھ لگا رہے اور یہ امید رکھے کہ جس راہ پر چلنے کا اس نے حکم دیا ہے اس کی آخری منزل اپنی تمام برکتوں کے ساتھ، بالآخر آ کے رہے گی۔ اس میں جو دیر ہو گی وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہو گی اور جو مشکلیں پیش آئیں گی ان کے اندر بھی دنیا اور آخرت دونوں کی مصلحتیں مضمر ہوں گی۔

خلق

'خَلَقَ' کے معروف معنی تو پیدا کرنے کے ہیں لیکن کسی چیز کا خاکہ یا پتلا بنانے کے معنی میں بھی یہ آیا

ہے، مثلاً أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ (آل عمران - ۳: ۴۹) (میں تمہارے لیے پرندے کی شکل پر ایک پتلا مٹی سے بناؤں گا پھر اس میں پھونک ماروں گا تو اللہ کے حکم سے وہ سچ مچ پرندہ بن جائے گا) یہاں یہ اسی معنی میں ہے۔

تسویہ

'تسویۃ' کے معنی ہیں کسی شے کو ٹھیک ٹھاک کرنا، اس کو ہموار کرنا، اس کے نوک پلک سنوارنا۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ اسی آخری مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اگر اپنی خلقت ہی پر غور کرے تو اس کو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یک بیک نہیں بنا کھڑا کیا ہے بلکہ اس قطرے کو گہر بنانے تک بہت سے مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ایک دور وہ ہوتا ہے جب اس کا ابتدائی خاکہ بنتا ہے پھر آہستہ آہستہ وہ دور آتا ہے جب قدرت اس خاکے میں رنگ بھرتی اور اس کا موقلم اس کے نوک پلک سنوارتا ہے۔

وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ (۳)

'قدّر فہدیٰ' کا وسیع مفہوم

یہی حال اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے نشوونما اور اس کے مادی و عقلی عروج و کمال کا بھی ہے۔ قدرت نے اس کی زندگی کو جن چیزوں کا محتاج بنایا ہے ان کے تقاضے بھی اس کے اندر رکھے ہیں، اس کے اسباب بھی فراہم کیے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے کا اس کو سلیقہ بھی الہام فرمایا ہے، مثلاً بچے کو دودھ کا محتاج بنایا ہے تو اس کی ماں کی چھاتی میں دودھ بھی پیدا کیا ہے اور بچے کو یہ رہنمائی دی ہے کہ وہ ماں کی چھاتی کو چوسے اور اس سے اپنی غذا حاصل کرے۔

بعد کے ادوار میں جب اس کی ضروریات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے تو ہر ضرورت کے لیے زمین میں ذخیرے محفوظ ہیں اور خالق نے انسان کو عقل دی ہے کہ وہ ان ذخائر کا سراغ لگائے، ان کے حاصل کرنے کی راہیں کھولے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے طریقے ایجاد کرے۔

اسی طرح اس کی روحانی و اخلاقی ترقی کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر خیر و شر کا شعور ودیعت فرمایا ہے اور پھر اس کی رہنمائی کے لیے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا کہ وہ بتائیں اور دکھائیں کہ زندگی کا کون سا طریقہ اس کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق اور اس کے اختیار کرنے میں اس کی فلاح ہے اور کون سا طریقہ اس کی فطرت سے بے جوڑ اور اس پر چلنے میں اس کی تباہی ہے۔

ولادت سے لے کر موت تک زندگی کے سارے مراحل و مقامات، تمام اطوار و ادوار اور جملہ مشکلات و عقبات بھی اللہ تعالیٰ نے مقدر فرما دیے ہیں جو لازماً پیش آ کے رہتے ہیں۔ پھر ان سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ بھی اس نے بتا دیا ہے۔ اگر انسان وہ طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کا سفینۂ حیات ہر منجدھار سے سلامتی کے ساتھ گزر جاتا ہے اور اگر وہ اس سے ہٹ کر اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ جاتا ہے تو یہ چیز اس کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے ــــــ 'الَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ' کے وسیع

لفظوں کے اندر یہ تمام معانی مضمر ہیں اور ان کی تفصیل بہت طویل ہے جس کو سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۵۰ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی کے تحت بھی ہم اسی مضمون کی وضاحت کر چکے ہیں۔

وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی (۴-۵)

ایک ادبی اشکال کا حل

اس ٹکڑے میں ایک ادبی اشکال ہے اس کو پہلے سمجھ لیجیے تب اس کا صحیح موقع و محل واضح ہو گا۔

'غُثَآءً اَحْوٰی' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے کالا کوڑا یا سیاہ خس و خاشاک کیا ہے لیکن عربی میں لفظ 'غثاء' تو بے شک جھاگ اور خس و خاشاک کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن 'اَحْوٰی' ہرگز اس سیاہی کے لیے نہیں آتا جو کسی شے میں اس کی کہنگی، بوسیدگی اور پامالی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ اس سیاہی مائل سرخی یا سبزی کے لیے آتا ہے جو کسی شے پر اس کی تازگی، شادابی، زرخیزی اور جوشِ نمو کے سبب سے نمایاں ہوتی ہے۔ یہ نباتات اور باغوں کی صفت کے طور پر بکثرت استعمال ہوا ہے اور بلا استثنا ہر جگہ ان کی سرسبزی کی شدت اور گھنے پن کو ظاہر کرنے ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ پھر یہیں سے بطور استعارہ یہ کڑیل، صحت مند، گلِ تر کی صورت کھلے ہوئے جوان کے لیے بھی استعمال ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن کی صحت بہت اچھی ہو اور ان کے بدن میں خون وافر ہو ان کے ہونٹوں پر سیاہی مائل سرخی نمایاں ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مشہور جاہلی شاعر تابط شرا اپنے ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے: ع

مسبل فی الحی احوی رفل   وَاِذا یغزو فلیث ابسل

(اپنے قبیلہ کے اندر تو وہ ایک خوش پوش، سرخ و سپید بانکا چھبیلا بنا رہتا ہے لیکن جب میدانِ جنگ میں اترتا ہے تو شیرِ نیستاں بن جاتا ہے)

لفظ 'غُثَآء' اگرچہ مکھن کے جھاگ اور سیلاب کے خس و خاشاک کے لیے بھی آتا ہے لیکن اس بنو کے لیے بھی اس کا استعمال معروف ہے جو زمین کی زرخیزی کے سبب سے اچھی طرح گھنا اور سیاہی مائل ہو گیا ہو۔ استاذ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب 'مفردات القرآن' میں اس کی تائید میں شعرائے جاہلیت کے متعدد اشعار نقل کیے ہیں۔ ہم بغرضِ اختصار صرف قطامی کا ایک شعر جو اس نے ایک وادی کی تعریف میں کہا ہے، پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: ع

حلوا باخضر قد مالت سرارته   من ذی غثاء علی الاعراض أنضاد

(وہ ایک سرسبز و شاداب وادی میں اترے جس کے بیچ گھنے اور شاداب سبزے اس کے کناروں پر باہم دگر گتھم گتھا اور ایک دوسرے پر تہ بہ تہ گرے ہوئے تھے)

آیت زیرِ بحث میں چونکہ 'غُثَآءً' کی صفت 'اَحْوٰی' آتی ہے اس وجہ سے لازماً یہ اس دوسرے معنی ہی میں استعمال ہوا ہے ورنہ صفت اور موصوف میں نہایت بھونڈی قسم کی بے ربطی پیدا ہو جائے گی اس لیے کہ 'اَحْوٰی' جیسا کہ ہم نے عرض کیا، اس سیاہی کے لیے ہرگز نہیں آتا جو کسی چیز میں اس کی کہنگی، فرسودگی اور پامالی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ کلامِ عرب میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہاں موقعِ کلام بھی، جیسا کہ آگے وضاحت آ رہی ہے، اس مفہوم سے اباء کر رہا ہے۔

پس 'اَلَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی' کا صحیح مطلب یہ ہو گا کہ اس خداوند کی تسبیح کرو جو نباتات کو زمین سے نازک سوئیوں کی شکل میں نکالتا ہے پھر ان کو گھنی اور سیاہی مائل سرسبز و شاداب بناتا ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى (۶-۷)

حقیقت جو پیغمبر کو سمجھائی گئی

یہ وہ اصل مدعا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھانے کے لیے اوپر کی تمہید بیان ہوئی ہے یعنی قدرت کا جو قانونِ تدریج و ترتیب انسان کے خلق اور اس کی تکمیل میں، قوتوں اور صلاحیتوں کو مقدر کرنے اور ان کو بروئے کار لانے میں، سبزے کو اگانے اور اس کو پروان چڑھانے میں کارفرما ہے اسی قانون کے تحت اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بھی معاملہ کرے گا۔ اس نے تمہیں جس منصب پر سرفراز فرمایا ہے اور جس وحیِ آسمانی سے نوازا ہے اس کے مرحلے بالتدریج طے ہوں گے اور جلد وہ وقت آئے گا کہ تم دیکھو گے کہ جس راہ پر تمہیں چلنے کا حکم دیا گیا اس کے تمام عقبات طے ہو گئے اور آخری منزل آ گئی۔

وحی الٰہی کے باب میں آنحضرت کو ایک اہم ہدایت

'سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى'۔ یہ آیت بالکل اسی محل میں آئی ہے جس میں سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۱۴ 'وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ'[1] یا سورۂ قیامہ کی آیت ۱۶ 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ'[2] آئی ہیں۔ ہم ان آیات کے تحت نہایت تفصیل سے واضح کر چکے ہیں کہ دعوت کے اس دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جن مخالفتوں اور مزاحمتوں سے سابقہ تھا ان میں آپ کے لیے واحد سہارا وہ آسمانی کمک ہی تھی جو وحیِ الٰہی کی صورت میں آپ پر نازل ہوئی۔ اسی سے آپ کو قوت و عزیمت کا زادِ راہ ملتا، اسی سے آگے کے لیے رہنمائی حاصل ہوتی، اسی میں مخالفین کے اعتراضات و مطالبات کے جواب ہوتے۔ ان گوناگوں وجوہ سے آپ کو ہر وقت وحی کا انتظار رہتا اور جب وہ

---

[1] تم قرآن کے لیے اپنی طرف اس کی وحی پوری کیے جانے سے پہلے جلدی نہ کرو۔

[2] تم جلدی کے خیال سے قرآن کے پڑھنے پر اپنی زبان نہ چلاؤ۔

نازل ہوتی تو اس کے اخذ کرنے میں آپ تدریجاً اس بے قراری اور اضطراب و عجلت کا اظہار کرتے جو ایک بھوکا بچہ اس وقت کرتا ہے جب ماں اس کو چھاتی سے لگاتی ہے۔ فرطِ شوق میں آپ چاہتے کہ پوری وحی ایک ہی سانس میں آپ کے سینہ میں اتر جائے اور چونکہ یہ خالقِ کائنات کی ایک عظیم امانت بھی تھی جو آپ کی تحویل میں دی جا رہی تھی اس وجہ سے آپ اس کا حرف حرف اپنی زبانِ مبارک سے دہراتے بھی کہ مبادا کوئی لفظ حافظہ کی گرفت سے باہر رہ جائے۔

آپ کے اس اضطراب و شوق اور اس عجلت و بے قراری پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلّی دی کہ اس وحی کے لیے تم جلدبازی نہ کرو۔ اس کے اترنے کے لیے جو پروگرام ہم نے مقرر کیا ہے اسی کے مطابق یہ اترے گی اور اسی میں حکمت و مصلحت ہے۔

ساتھ ہی یہ تسلّی بھی دے دی کہ اس کی حفاظت کے لیے بھی تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کا ایسا سامان کرے گا کہ تم اس میں سے ایک حرف بھی نہیں بھولوگے۔ سورۂ قیامہ میں یہی بات یوں فرمائی ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ — تم عجلت کے خیال سے اس پر زبان نہ چلاؤ۔
بِهٖ ؕ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ — ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو پڑھ
فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ — کر سنانا تو جب ہم اس کو پڑھ کے سنا دیں
ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ؕ — تو اس سنانے کی پیروی کرو۔ پھر ہمارے ہی
(القیٰمۃ - ۷۵: ۱۶-۱۹) — ذمہ ہے اس کی وضاحت۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ یعنی اس کلیہ سے مستثنیٰ صرف وہ چیزیں ہیں جو وقتی اور ہنگامی نوعیت کی ہیں۔ ان کی مدت پوری ہو جانے کے بعد خود اللہ تعالیٰ ہی بتا دے گا کہ ان کی مدت پوری ہو گئی۔ یہ اشارہ ان احکام کی طرف ہے جو وقتی اور عارضی تھے اور جو بعد میں منسوخ ہو گئے۔

صحیح تزکیہ کی تعلیم کے لیے خدا کے محیطِ کل علم کا حوالہ

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ؕ یعنی یہ گمان نہ کرو کہ تم جن حالات و مسائل سے دوچار ہو تمھارا رب ان سے بے خبر ہے۔ وہ بے خبر نہیں ہے بلکہ ان باتوں کو بھی وہ جانتا ہے جو ظاہر ہیں اور ان باتوں سے بھی آگاہ ہے جو پوشیدہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری پریشانیاں اور دعائیں سبھی اس کے علم میں ہیں اور دشمنوں کی کھلی ہوئی شرارتیں اور ان کی مخفی سازشیں بھی اس کے علم میں ہیں تو جب سب کچھ اس کے علم میں ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت اور اختیار بھی رکھتا ہے تو اطمینان رکھو کہ تمھیں جس قسم کی مدد اور رہنمائی کی ضرورت ہو گی اس سے محروم نہیں رہو گے۔ یہی مضمون سورۂ طٰہٰ میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ فرمایا ہے:

لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ — اسی کے اختیار میں ہے جو آسمانوں اور زمین میں

وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝ وَإِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَإِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفٰى ۝ (طٰهٰ - ۲۰ : ۶-۷)

اور ان کے درمیان اور جو کچھ زیر زمین ہے سب اسی کے ہیں۔ چاہے تم بلند آواز سے بات کہو یا پوشیدہ طور پر وہ کھلی ہوئی، پوشیدہ اور پوشیدہ تر باتوں کو بھی جانتا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ پر صحیح توکل و اعتماد اس کے محیط کل علم اور اس کی ہمہ گیر قدرت کے استحضار ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (۸)

یسریٰ کی منزل کی بشارت

یہ نہایت واضح لفظوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت ہے کہ یہی دن ہمیشہ نہیں رہیں گے بلکہ ہم ان مشکلات سے نکال کر جلد تمہیں آسان راہ پر لے چلیں گے۔ 'یُسْرٰی' صفت ہے جس کا موصوف 'طَرِیْقَۃ' یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ لفظ 'تیسیر' کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ یہ کسی چیز کو کسی برتر مقصد کے لیے تیار کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس سے یہاں یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس وقت تم جن مشکلات میں ہو یہ تمہاری تربیت کے لیے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ان افضال و عنایات کا اہل اور حق دار بنائے جن سے تمہیں مستقبل میں وہ بہرہ مند فرمانے والا ہے۔ اوپر 'قَدَّرَ فَهَدٰى' اور 'اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى' میں اپنی جس سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ اسی کا اقتضاء بیان ہوا ہے کہ اس وقت راہ میں جو عقبات حائل ہیں وہ سنت الٰہی کے تحت بغرض امتحان و تربیت ہیں۔ آگے راہ صاف ہے۔ اپنے رب کی رہنمائی پر بھروسہ رکھو۔ یُسریٰ کی منزل عُسر کے بعد ہی آتی ہے۔

فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (۹)

ہدایت اور ضلالت کے باب میں سنت الٰہی

یعنی لوگوں کی مخالفتوں اور ناقدریوں سے بددل اور مایوس نہ ہو۔ لوگوں کے دلوں میں بات اتار دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے کہ ان کے پیچھے پڑو۔ تمہارا فرض صرف تذکیر ہے۔ جب دیکھو کہ سننے کی طرف مائل ہیں تو سناؤ ورنہ ان کو ان کی تقدیر کے حوالہ کرو۔

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ۝ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝ (۱۰-۱۳)

یہ بتایا ہے کہ کون آپ کی بات پر کان دھریں گے اور کس مزاج کے لوگ اس سے گریز کریں گے۔ فرمایا کہ جن کے دلوں میں خدا اور آخرت کا کچھ خوف ہوگا وہ آپ کی بات سنیں گے اور جن کے دل اس خوف سے خالی ہیں ان پر آپ کا انذار بے اثر ہی رہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جو آپ کی دعوت سے بدک رہے ہیں ان کے بدکنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس دعوت میں یا اس کے داعی میں کوئی خرابی ہے بلکہ ان

بدبختوں کے دلوں میں ہی خرابی ہے۔ وہ اسی دنیا کی زندگی کو کل زندگی سمجھے بیٹھے ہیں۔ آخرت کا کوئی اندیشہ ان کے اندر سرے سے ہے ہی نہیں۔ ایسے محروم القسمت لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ اس بڑی آگ میں پڑیں گے جو ان کے لیے تیار ہے۔ پھر اس میں نہ یہ مریں گے نہ جئیں گے بلکہ اس کے ابدی عذاب میں گرفتار رہیں گے۔ اس میں وہ موت کی تمنا کریں گے لیکن وہ بھی ان کی پرسانِ حال نہیں ہوگی۔

یہاں اس سنتِ الٰہی کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جس کی وضاحت اس کتاب میں بار بار ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت کے اندر جو نور ودیعت فرمایا ہے جو لوگ اس کو باقی رکھتے ہیں ان کو پیغمبر کی دعوت اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ نور کچھ ضعیف بھی ہو چکا ہوتا ہے جب بھی دیر سویر پیغمبر کے جھنجھوڑنے سے وہ جاگ پڑتے ہیں لیکن جن کے اندر یہ نور بالکل بجھ چکا ہوتا ہے وہ مردوں کے حکم میں ہیں۔ ان کو صورِ اسرافیل کے سوا اور کوئی چیز بھی نہیں جگا سکتی۔

مذکورہ آیات میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ بعد والی سورہ ——— الغاشیۃ ——— میں جو اس کی مثنیٰ ہے زیادہ وضاحت سے آیا ہے۔ فرمایا ہے:

فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ۝ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ ٱللَّهُ ٱلْعَذَابَ ٱلْأَكْبَرَ ۝ إِنَّ إِلَيْنَآ إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ۝ (الغاشیۃ - ۸۸: ۲۱-۲۶)	تو یاد دہانی کرو، تم تو بس ایک یاد دہانی کر دینے والے ہو۔ تم ان پر کوئی داروغہ تو نہیں ہو (جو ایمان لائے گا وہ فلاح پائے گا) رہے جو پیٹھ پھیریں گے اور کفر کریں گے تو اللہ ان کو عذاب دے گا بڑا عذاب۔ ہماری ہی طرف ان کا لوٹنا ہے۔ پھر ہمارے ہی اوپر ان کا حساب لینا ہے۔

یہ بات یاد رکھیے کہ یہاں 'اَلْعَذَابَ الْاَكْبَرَ' آیا ہے اور آیتِ زیرِ بحث میں 'اَلنَّارَ الْكُبْرٰى' ہے۔ یہ ایک ہی بات دونوں توام سورتوں میں ذرا مختلف الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ اس کی وضاحت، ان شاء اللہ اگلی سورہ میں آئے گی۔

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ ۝ وَذَكَرَ ٱسْمَ رَبِّهِۦ فَصَلَّىٰ ۝ (۱۴-۱۵)

ان لوگوں کا انجام جن کے دل زندہ ہیں

اوپر کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے گریز اختیار کرنے والوں کا انجام بیان فرمایا۔ اب یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جن کا ذکر اوپر 'سَيَذَّكَّرُ مَن يَخْشٰى' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ فرمایا کہ بے شک ان لوگوں نے فلاح پائی جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تذکیر سے فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو کفر و شرک کی آلودگی سے پاک کر لیا۔ ان کے لیے دنیا میں بھی فلاح کے دروازے

کھلیں گے اور آخرت میں بھی یہ اپنے رب کی رحمت و رضوان سے نوازے جائیں گے۔

'وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی' یہ اس تزکیہ کی اولین علامت بھی ہے اور اس کا اصل طریقہ بھی۔

دین میں نماز کی اہمیت — ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ تمام علم کا سرچشمہ درحقیقت اسمائے الٰہی ہیں۔ انہی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارے رب کی صفات کیا ہیں اور پھر انہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان صفات کی روشنی میں ہمارے عقائد کیا ہونے چاہئیں اور وہ عقائد ہمارے اوپر ہمارے رب اور اس کے بندوں سے متعلق کیا حقوق و فرائض عائد کرتے ہیں۔ گویا نماز کا ذکر یہاں ایمان باللہ کے اولین مظہر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس نکتہ کی وضاحت کر چکے ہیں کہ ایمان کا اولین مظہر نماز ہے اور پھر یہی چیز تمام شریعت کی اساس بھی ہے اور اس کی محافظ بھی۔ اس نکتہ کی مزید تفصیل مطلوب ہو تو سورۂ مومنون کی ابتدائی آیات کی تفسیر تدبر قرآن میں پڑھ لیجیے۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۱۶-۱۷)

مخالفین کی مخالفت کی اصل علت — یہ آخر میں مخالفین یعنی قریش کے لیڈروں کو خطاب کر کے ان کے اصل سبب مخالفت سے پردہ اٹھا دیا کہ تمھاری ساری مخالفت کی علت محض تمھاری دنیا پرستی ہے۔ تم آخرت کو ماننے اور اس کی خاطر اپنے ناجائز دنیوی مفادات قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہو اس وجہ سے بے بنیاد شبہات ایجاد کرتے اور ان کو پھیلاتے ہو تاکہ اپنے عوام کو یہ فریب دے سکو کہ تمھارے گریز کے لیے فی الواقع کچھ وجوہ ہیں لیکن نادانو، یاد رکھو کہ تم اس دنیا کی چند روزہ زندگی کی محبت میں پھنس کر ابدی بادشاہی کھو رہے ہو! بہتر اور پائیدار چیز آخرت ہے۔ اگر تمھارے اندر کچھ ہے تو اس کے طالب بنو!

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى (۱۸-۱۹)

قرآن کی تعلیم تمام نبیوں کی تعلیم ہے — یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ تمھیں بتا رہے ہیں یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے۔ تمام اگلے نبیوں اور رسولوں نے بھی یہی تعلیم دی ہے کہ اصل زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے اور وہاں آدمی کا اپنا ہی عمل کام آئے گا، کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا۔ سورۂ نجم میں یہی حقیقت یوں بیان ہوئی ہے:

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ۝ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى ۝ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝	کیا اس کو اس تعلیم کی خبر نہیں ملی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے اور ابراہیم کے جس نے ہر بات پوری کر دکھائی کہ کوئی جان بھی کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی۔
(النجم-۵۳: ۳۶-۳۸)	

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے دوسرے متعدد نبیوں کے صحیفے اسفارِ تورات کی شکل میں موجود ہیں۔ ان میں اگرچہ بہت سی تحریفیں واقع ہو چکی ہیں اور ان کی حیثیت تاریخ کی کتابوں سے زیادہ نہیں ہے تاہم ان سب میں توحید اور قیامت کی تعلیم نہایت واضح اور مؤثر الفاظ میں اتنی کثرت سے موجود ہے کہ جس صحیفہ کو بھی پڑھیے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کو جو تعلیم دی اگرچہ وہ صحیفہ کی شکل میں نہیں تھی بلکہ زبانی تعلیم و تلقین کی صورت میں تھی، لیکن ان کی ذریت کی ایک شاخ یعنی بنی اسرائیل نے اس کو اپنے صحیفوں میں تحریری شکل میں بھی محفوظ کیا اور ان کے انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے دور میں برابر اس کی یاددہانی بھی کرتے رہے جس کی ناقابلِ تردید شہادت آج بھی ان کے صحیفوں میں موجود ہے اور قرآن نے بھی جا بجا اس کا حوالہ دیا ہے۔

آپ کی ذریت کی دوسری شاخ ——— بنی اسمٰعیل ——— نے اس کو تحریری شکل میں محفوظ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ تحریر و کتابت سے ناآشنا امی تھے۔ انھوں نے روایات کی صورت میں اس کو کچھ مدت تک باقی رکھا لیکن امتدادِ زمانہ سے اس پر رفتہ رفتہ ذہول کا پردہ پڑ گیا اور بدعات کے غلبہ نے اس کو بالکل ہی نسیاً منسیاً کر دیا۔ البتہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اس کی از سر نو تجدید ہوئی بلکہ اس کی تکمیل بھی ہوئی اور وہی اس دینِ کامل کی اساس قرار پائی جو اب قیامت تک کے لیے اللہ کا حقیقی دین ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

لاہور
۲۰- نومبر ۱۹۷۹ء
۱۱- ذوالحجہ ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۸۸

الغاشية

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ——— الاعلیٰ ——— کی مثنیٰ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ جس طرح سابق سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اسی طرح اس میں بھی آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ البتہ اندازِ خطاب، طریقِ استدلال اور تفصیل و اجمال کے پہلو سے دونوں میں فرق ہے۔ اس میں پہلے وہ فرق و اختلاف واضح فرمایا گیا ہے جو قیامت کے دن نیکوں اور بدوں، نا عاقبت اندیشوں اور عاقبت بینوں کے نتائجِ اعمال اور ان کی زندگیوں میں رونما ہوگا اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس کا رونما ہونا اس کائنات کے خالق کی صفاتِ قدرت، ربوبیت اور رحمت کا بدیہی تقاضا ہے۔ پھر آخر میں اس مضمونِ تسلی کی وضاحت فرما دی گئی ہے جو سابق سورہ کی آیت 'فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ' (الاعلیٰ - ۸۷: ۹) میں اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ آپ کی ذمہ داری لوگوں تک صرف حق پہنچا دینے کی ہے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اس کو لازماً قبول بھی کر لیں۔ جو ہٹ دھرم اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں ان کے درپے ہونے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیجیے۔ وہ ان سے نمٹنے کے لیے کافی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۶) جو لوگ قیامت سے بے فکر ہو کر زندگی گزار رہے ہیں، قیامت کے دن ان کو جس صورتِ حال سے سابقہ پیش آنے والا ہے، اس کا بیان۔

(۷-۱۶) جو لوگ قیامت سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاریں گے ان کو اس دن جو ابدی شادمانی و فائز المرامی حاصل ہوگی اس کی تصویر۔

(۱۷-۲۰) آفاق کی بعض نمایاں نشانیوں کی طرف اشارہ جو شہادت دیتی ہیں کہ اس کائنات کا خالق بڑی عظیم قدرت و حکمت والا، نہایت ہی مہربان، نہایت ہی کریم و بندہ نواز ہے۔ اس کی

اس قدرت، حکمت، رحمت اور ربوبیت کا بدیہی تقاضا ہے کہ وہ ایک روزِ عدل لائے جس میں نیکوں کو ان کی نیکیوں کا صلہ اور بدوں کو ان کی بدیوں کی سزا دے۔ اگر اس کے بغیر یہ دنیا یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی ایک دن تمام ہو جائے تو اس سے نہ صرف ان تمام صفات کی نفی ہو جاتی ہے بلکہ العیاذ باللہ یہ بات نکلتی ہے کہ اس نے ایک بالکل اندھیر نگری بنائی ہے اور اس کے نزدیک خیر و شر اور نیکی و بدی دونوں یکساں ہیں۔

(۲۱-۲۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین کہ آپ جس چیز سے لوگوں کو ڈرا رہے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اس کی نشانیاں بالکل واضح ہیں۔ ہٹ دھرموں کی روش سے آپ بددل اور مایوس نہ ہوں۔ آپ کا فرض صرف لوگوں تک حق کو پہنچا دینا ہے، لوگوں کے کفر و ایمان کے باب میں آپ مسئول نہیں ہیں۔ جو آپ کی بات سننے کو تیار نہیں ہیں ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیجیے۔ بالآخر ان کی واپسی خدا ہی کی طرف ہوتی ہے اور وہ ان کا حساب کر کے رہے گا۔

سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ

مَكِّيَّةٌ ———— اٰیات : ۲۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ﴿۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ خَاشِعَةٌ ﴿۲﴾ آیات ۱-۲۶
عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ﴿۳﴾ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ﴿۴﴾ تُسْقٰى مِنْ
عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴿۵﴾ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴿۶﴾ لَّا
يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ﴿۷﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿۸﴾
لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿۹﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۱۰﴾ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا
لَاغِيَةً ﴿۱۱﴾ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿۱۲﴾ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ﴿۱۳﴾ وقف لازم
وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ﴿۱۵﴾ وَّزَرَابِيُّ
مَبْثُوْثَةٌ ﴿۱۶﴾ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾
وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ
نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾ فَذَكِّرْ اِنَّمَا
اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى
وَكَفَرَ ﴿۲۳﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ اِلَيْنَا
اِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾ ع ۱ ۲۶ ۱۳

ترجمۂ آیات ۱-۲۶

کیا تمھیں چھا جانے والی آفت کی خبر پہنچی ہے! اس دن کتنے چہرے اترے اور تھکے ہارے ہوں گے۔ وہ دہکتی آگ میں پڑیں گے۔ کھولتے چشمہ کا پانی پلائے جائیں گے۔ ان کے کھانے کو صرف جھاڑ کانٹے ہوں گے جو نہ موٹا کریں گے نہ بھوک ہی کو ماریں گے۔ ۱-۷

کتنے چہرے اس دن شگفتہ ہوں گے۔ اپنی کوشش پر شاد و مطمئن۔ اونچے باغ میں۔ جس میں کوئی لغو بات نہیں سنیں گے۔ اس میں چشمہ ہوگا رواں۔ اس میں تخت ہوں گے اونچے بچھے۔ آبخورے قرینے سے دھرے اور غالیچے ترتیب سے لگے اور تکیے ہر طرف پڑے۔ ۸-۱۶

کیا وہ اونٹوں پر نگاہ نہیں کرتے، وہ کیسے بنائے گئے! اور آسمان کو نہیں دیکھتے، کیسا اونچا کیا گیا! اور پہاڑوں پر نظر نہیں ڈالتے، کس طرح کھڑے کیے گئے اور زمین کو نہیں دیکھتے، کس طرح بچھائی گئی! ۱۷-۲۰

تم یاد دہانی کر دو، تم بس ایک یاد دہانی کر دینے والے ہو۔ تم ان پر داروغہ نہیں مقرر ہو۔ رہا وہ جو منہ موڑے اور انکار کرے گا تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ بیشک ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے، پھر ہمارے ہی ذمہ ان سے حساب لینا ہے! ۲۱-۲۶

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ (۱)

قیامت اور احوالِ قیامت کی تصویر

اس انداز میں جو سوال ہوتا ہے وہ طلبِ جواب کے لیے نہیں بلکہ کسی چیز کے ہول و ہیبت یا اس کی عظمت و شان کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں جو خطاب ہے اگرچہ عام بھی ہو سکتا ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں چنانچہ اسی پر عطف کر کے آگے فرمایا ہے: فَذَكِّرْ ۟ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ (۲۱) (تم یاد دہانی کر دو، تم تو صرف ایک یاد دہانی کر دینے والے ہو)۔

'غَاشِيَة' کے معنی ڈھانک لینے والی اور چھا جانے والی کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ قیامت کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آفت ایک ہمہ گیر آفت ہو گی جو سب پر چھا جائے گی، کسی کو بھی اس سے مفر نہیں ہو گا۔ اس کا احوال (حدیث) یہاں سنایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گیا ہے لیکن مقصود، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہو گا، ان کفار کو آگاہ کرنا ہے جو اول تو آخرت کو مانتے ہی نہیں تھے اور اگر کسی درجہ میں مانتے بھی تھے تو اپنے اس گمان کی بنا پر اس سے بالکل نچنت تھے کہ ان کو جو کچھ یہاں حاصل ہے اس سے بڑھ کر وہاں حاصل ہو گا۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (۲-۳)

ان لوگوں کا حال جو قیامت سے نچنت رہے

اوپر کا سوال، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، طلبِ جواب کے لیے نہیں بلکہ صرف تنبیہ کے لیے تھا کہ سننے والے اس کو اچھی طرح سن لیں۔ اس کے بعد قرآن نے خود ہی اس کا جواب دیا کہ اس دن کتنے چہرے بالکل اترے اور تھکے ہارے ہوں گے۔

'خَاشِعَة' کے معنی جھکے ہوئے، پست اور اداس کے ہیں، 'عَامِلَة' کے معنی محنت سے نڈھال اور 'نَاصِبَة' کے معنی تھکے ہارے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اس دن جب ان کی توقع کے برعکس حقیقت سامنے آئے گی کہ ان کو اپنے اعمال کی پاداش میں جہنم میں پڑنا ہے تو ان کے چہرے فق ہو جائیں گے، ان پر ہوائیاں اڑنے لگیں گی۔

'وُجُوْه' سے مراد اگرچہ اشخاص ہیں لیکن ان کو تعبیر 'وُجُوْه' سے اس لیے کیا ہے کہ مقصود ان کی اندرونی کیفیات کو ظاہر کرنا ہے اور کیفیات کا اظہار سب سے زیادہ نمایاں طریقہ پر چہروں ہی سے ہوتا ہے۔

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ (۴-۵)

یہ اس چیز کا بیان ہے جو اس بدحواسی کا سبب بنے گی جو اوپر مذکور ہوئی یعنی وہ دوزخ کی بھڑکتی

آگ میں پڑیں گے اور کھولتے چشمے کا پانی پئیں گے۔ 'اٰنِیَۃ' کے معنی ہیں جس کی گرمی اپنے آخری نقطہ پر پہنچی ہوئی ہو۔

قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں مجرموں کی جس بدحواسی و پریشان حالی کا ذکر ہے اس کا تعلق اس وقت سے ہے جب ان پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ وہ دوزخ میں ڈالے جانے والے ہیں۔ سورۂ قیامہ میں تصریح ہے کہ

وَوُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَۃٌ ۙ تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِہَا فَاقِرَۃٌ ۝ (القیٰمۃ ۷۵: ۲۴-۲۵)

اور اس دن بہت سے چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے۔ وہ گمان کرتے ہوں گے کہ ان پر کمر توڑ دینے والی مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔

عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں کے دوزخ میں پڑنے کے بعد کے حالات بیان ہوئے ہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ دوزخ میں پڑنے کے بعد چہرے اداس ہی نہیں ہوں گے بلکہ وہ آگ پر گھسیٹے جائیں گے اور مزید وہ سب کچھ ہوگا جو دوزخ کے احوال سے متعلق قرآن میں بیان ہوا ہے۔

لَیْسَ لَہُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ ۙ لَّا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ (۶-۷)

دوزخیوں کی غذا

پانی کے بعد یہ اس کھانے کا ذکر ہے جو دوزخ میں ان کو ملے گا۔ فرمایا کہ ان کو کھانے کی کوئی چیز وہاں میسر نہیں آئے گی، صرف ضریع چابیں گے اور اس پر کھولتا ہوا پانی پئیں گے۔ 'ضَرِیْع' ایک خاردار زہریلی جھاڑی ہے جس کو کوئی جانور نہیں چھوتا۔

مقصودِ کلام یہاں حصر نہیں ہے کہ ان کا کھانا صرف 'ضریع' ہوگا۔ بلکہ یہ استثنائے منقطع ہے۔ حصر کا مضمون اس صورت میں پیدا ہوتا جب 'ضریع' کسی درجے میں بھی کوئی کھانے کی چیز ہوتی۔ جب وہ سرے سے طعام میں داخل ہی نہیں ہے تو استثناء سے صرف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کھانے کی کوئی چیز جب انھیں میسر نہیں آئے گی تو بھوک سے بے بس ہو کر وہ 'ضریع' زہر مار کریں گے جو دوزخیوں کے لیے وہاں موجود ہوگی۔ اس سے اسی نوع کی بعض دوسری چیزوں کی نفی نہیں ہوتی جو وہاں موجود ہوں گی اور دوزخی ان کو کھانے پر مجبور ہوں گے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں مذکور ہے کہ ان گنہ گاروں کا کھانا 'زقوم' بھی ہوگا۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۙ طَعَامُ الْاَثِیْمِ ۝ (الدخان ۴۴: ۴۳-۴۴)

بے شک زقوم کی جھاڑی گنہگاروں کی غذا ہوگی۔

اسی طرح ایک مقام میں 'غِسْلِیْن' کا بھی ذکر آیا ہے:

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ ۝

اور ان کی غذا زخموں کا دھوون ہوگی۔

لَّا یَاْکُلُہٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ﴿الحاقۃ - ۶۹: ۳۶-۳۷﴾ جس کو صرف گنہگار ہی کھا سکیں گے۔

اس سے واضح ہوا کہ دوزخیوں کو کوئی چیز کھانے کی نہیں ملے گی، صرف وہ چیزیں ملیں گی جو نہ صرف یہ کہ کھانے کی ہی نہیں بلکہ وہ ایسی ہیں کہ دوزخیوں کے سوا کوئی ان کو نگل بھی نہیں سکتا۔

'لَّا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ' غذا کے اصل فائدے دو ہیں۔ جسم کی توانائی کو قائم رکھنا اور بھوک کی اذیت کو رفع کرنا۔ اس سے نہ جسم میں توانائی آئے گی اور نہ بھوک ہی رفع ہو گی۔ گویا صرف اس کے چبانے اور نگلنے کی اذیت ان کے حصے میں آئے گی۔

وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَۃٌ ﴿۸﴾ لِّسَعْیِہَا رَاضِیَۃٌ ﴿۹﴾ فِیْ جَنَّۃٍ عَالِیَۃٍ ﴿۸-۱۰﴾

اہلِ ایمان کا بیان — اب یہ دوسرے گروہ، یعنی اہلِ ایمان کا بیان ہے۔ فرمایا کہ بہت سے چہرے اس دن شگفتہ شاداب ہوں گے۔

یہی بات سورۂ قیامہ میں 'وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ۝ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ' (۲۲-۲۳) کے الفاظ میں گزر چکی ہے۔ اوپر منکرینِ قیامت کے چہروں کی مایوسی، افسردگی اور تھکاوٹ کا ذکر ہوا۔ یہ ان کے مقابل میں ان لوگوں کا بیان ہے جنھوں نے دنیا کو آخرت کے لیے برتا اور اس امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے چہروں پر ابدی فتح مندی کی بشاشت اور شگفتگی جھلک رہی ہو گی۔

'لِّسَعْیِہَا رَاضِیَۃٌ' یہ بشاشت ان کے چہروں پر اس وجہ سے نمایاں ہو گی کہ انھوں نے دنیا میں آخرت کے لیے جو کمائی کی اس کا حاصل ان کے سامنے ہو گا اور وہ اس سے پوری طرح مطمئن ہوں گے کہ ان کے ہر عمل کا صلہ ان کو بھرپور ملا اور ان کے رب نے جو وعدے ان سے کیے وہ سب پورے کیے۔ اس کی تفصیل آگے کی آیات میں بھی موجود ہے اور اس کے بعد والی سورہ میں بھی اس کا ایک خاص پہلو بیان ہوا ہے۔ وہاں ان شاء اللہ ہم اس کے بعض دقیق مضمرات پر روشنی ڈالیں گے۔

'فِیْ جَنَّۃٍ عَالِیَۃٍ' یہ آخرت میں ان کے مستقر و مقام کا پتہ دیا ہے کہ وہ اونچے باغ میں ہوں گے۔ اونچے باغ، یعنی وہ باغ بلندی پر ہوں گے۔ ایک اچھے باغ کا تصور اہلِ عرب کے ہاں یہ ہے کہ باغ بلندی پر ہو، اس کے حاشیہ پر کھجوروں کے اونچے درخت ہوں تاکہ وہ دور ہی سے دلکش بھی معلوم ہو اور سموم و سیلاب وغیرہ سے محفوظ بھی رہے۔

لَّا تَسْمَعُ فِیْہَا لَاغِیَۃً ﴿۱۱﴾

اہلِ جنت کی مجلس ہر شر سے محفوظ ہو گی — اہلِ دوزخ سے متعلق قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ دوزخ کے باڑے میں پہنچتے ہی وہ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے کہ فلاں نے ہم کو گمراہ کیا، وہ گمراہ نہ کرتا تو ہم ہدایت پر ہوتے۔

لیڈروں اور ان کے پیرؤوں میں تو تکار ہو گی۔ پیرو لیڈروں کے لیے دونے عذاب کا مطالبہ کریں گے کہ انھوں نے ان کی راہ ماری اس وجہ سے یہ دگنے عذاب کے سزاوار ہیں۔ لیڈر جواب دیں گے کہ ہم نے تم کو وہی بنایا جو ہم خود بنے تھے، تم نے خود اپنی شامت بلائی کہ جان بوجھ کر ہماری پیروی کی۔ اس کے برعکس اہلِ جنت کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہونے کے بعد ایک فتح مندٹیم کی طرح ایک دوسرے کا خیر مقدم تحیت و سلام سے کریں گے، آپس میں مبارک سلامت کے تبادلے ہوں گے، نہایت خوش گوار موڈ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ ان کی مجلس محبت و اخلاص کی عطر بیزیوں سے معمور ہو گی۔ سورۂ واقعہ میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے:

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا	وہ اس میں کوئی لغو یا گناہ کی بات نہیں
إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا	سنیں گے۔ بس ہر طرف مبارک سلامت ہی
(الواقعۃ - ۵۶: ۲۵-۲۶)	کا چرچا ہو گا۔

یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ اہلِ جنت کی شراب بھی فتورِ عقل اور ہذیان پیدا کرنے والی نہیں ہو گی کہ اس کے نشہ میں وہ اتنے ازخود رفتہ ہو جائیں کہ زبان سے کوئی ناشائستہ کلمہ نکل جائے۔

فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (۱۲)

جنت کے خوش نما مناظر — جنت کے خوش گوار ماحول کے بعد یہ اس کے خوش نما مناظر کی طرف اشارہ ہے کہ اس میں چشمہ جاری ہو گا۔ یہ صرف اس چشمہ کا ذکر ہے جو باغ کی شادابی کے لیے ہو گا۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ چشمہ ایک ہی ہو گا۔ چنانچہ سورۂ دہر میں ایک سے زیادہ چشموں اور ان سے نکلی ہوئی متعدد شاخوں کا ذکر ہے لیکن ان رحمتوں کی نوعیت، جیسا کہ ان کی وضاحت ہو چکی ہے، بالکل مختلف ہو گی۔ ان دونوں بیانوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ۝ وَأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ۝ وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ۝ وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ (۱۳-۱۶)

جنت کا سامانِ آرائش — یہ اس سامانِ آرائش و زیبائش کا ذکر ہے جو اہلِ جنت کی آسائش کے لیے موجود ہو گا۔ اس کی تفصیلات بھی مختلف سورتوں میں مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہیں۔ یہ اختلاف زیادہ تر تو اجمال و تفصیل کی نوعیت کا ہے لیکن بعض مقامات میں وہ تفاوت بھی ملحوظ ہے جو اہلِ جنت کے درجات و مراتب میں ہو گا۔ نیز ان کو پڑھتے ہوئے یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھیے کہ یہ چیزیں تمثیل کی صورت میں بیان ہوئی ہیں۔ عالمِ غیب کی نادیدہ حقیقتیں تمثیل ہی کے پیرائے میں بیان ہو سکتی ہیں اور ان کے لیے الفاظ اسی زبان اور اسی تہذیب و تمدن سے مستعار لینے پڑتے ہیں جس سے مخاطب فی الجملہ آشنا ہوں۔

'سُرُرٌ مَّرْفُوْعَۃٌ': ان کے بیٹھنے کے لیے اونچے تخت ہوں گے۔ اس زمانے کے امراء و سلاطین کی نشست اونچے تختوں ہی پر ہوتی تھی اس وجہ سے تمثیل میں اسی کا ذکر ہوا ہے لیکن جنت ہر جنتی کی خواہش کے مطابق ہو گی۔ وہ جس شکل میں جنت کی آرائش چاہے گا اس کی جنت اسی شکل میں آراستہ ملے گی۔

'وَّاَکْوَابٌ مَّوْضُوْعَۃٌ'۔ 'اَکْوَابٌ' جمع ہے 'کُوْبٌ' کی۔ 'کُوْبٌ' اور 'کپ' (CUP) ایک ہی چیز ہے۔ یہ پیالے، آبخورے، جام سب کے لیے آتا ہے۔ 'مَّوْضُوْعَۃٌ' کے معنی ہیں قرینہ سے رکھے ہوئے۔

'وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَۃٌ'۔ 'نَمَارِقُ' قالینوں اور غالیچوں کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی ان کی ہر نشست گاہ میں قالین اور غالیچے ترتیب سے باہمدگر پیوستہ بچھے ہوں گے۔ کوئی جگہ خالی نہیں ہو گی۔

'وَّزَرَابِیُّ مَبْثُوْثَۃٌ'۔ 'زَرَابِیُّ' جمع ہے 'زُرْبِیَّۃٌ' کی، یہ تکیوں اور نہالچوں کے معنی میں آتا ہے یعنی قالینوں پر تکیے اور نہالچے ہر طرف بکھرے پڑے ہوں گے۔ بیٹھنے والا جہاں بیٹھے وہ اس کے لیے آسائش کا باعث ہوں گے۔ آج صوفوں کا دور ہے لیکن ان پر بھی گدیاں اور تکیے رکھنے کا رواج ہے۔

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾ (۱۷-۲۰)

قیامت کی بعض آفاقی نشانیوں کی یاد دہانی

یہ ان لوگوں کو جو مذکورہ جزا و سزا سے بالکل بےخوف زندگی گزار رہے تھے۔ آفاق کی بعض نہایت نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ آخر وہ ان چیزوں پر کیوں غور نہیں کرتے جو خالق کی صفاتِ ربوبیت و قدرت اور اس کی حکمت و عظمت کی اس طرح شہادت دے رہی ہیں کہ جس کے اندر ذرا بھی حق پسندی ہو وہ قیامت اور جزاء و سزا کا انکار نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ ان نشانیوں کے ہوتے وہ اس بات پر کیوں اڑے ہوئے ہیں کہ کوئی نشانیٔ عذاب ظاہر ہو یا قیامت آجائے تب ہی وہ پیغمبر کی بات مانیں گے۔

اونٹ کی طرف اشارہ

'اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ'۔ سب سے پہلے اونٹ کی طرف توجہ دلائی کہ آخر وہ اپنے سفر و حضر کے سب سے زیادہ خدمت گزار، وفا شعار اور جاں نثار ساتھی اونٹ ہی پر کیوں نہیں غور کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کن صفات و خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ کس طرح اس کو ان کا مطیع بنایا ہے کہ ایک عظیم الجثہ اور طویل القامت جانور ہونے کے باوجود اس کی ناک میں نکیل ڈال کر وہ جدھر چاہیں لیے پھرتے ہیں اور وہ بے چون و چرا ان کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ حضر میں ان کا رات دن کا ساتھی ہے، سفر میں ان کا باربردار رفیق، صحرا میں ان کا سفینہ

ہے۔ ہفتہ ہفتہ بھر بھوک سے اور پیاس کا مقابلہ کرتا ہے۔ خاردار جھاڑیوں سے اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور کسی بڑی سے بڑی مشقت سے بھی انکار نہیں کرتا۔ اس کا گوشت، پوست، دودھ، ہر چیز مالک کے کام آتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا بول و براز بھی رائگاں جانے والی چیز نہیں ۔۔۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اتنے گوناگوں فوائد و مصالح کے ساتھ یہ جانور آپ سے آپ پیدا ہو گیا اور انسان نے اس کو اتفاق سے پکڑ کر اپنے لیے سازگار بنا لیا ہے یا ربِّ کریم نے اپنی قدرت و حکمت سے اس کو پیدا کیا اور اس کو انسان کی خدمت میں لگایا ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل اس دوسری بات ہی کی گواہی دیتی ہے۔ اگر یہ دوسری ہی بات قابلِ قبول ہے تو کیا انسان پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ اپنے رب کا شکرگزار بندہ بن کر زندگی گزارے جس نے اس کے لیے بغیر کسی استحقاق کے زندگی کی یہ آسائشیں فراہم کی ہیں ورنہ ایک دن اپنے رب کے آگے جواب دہی اور اپنے کفرانِ نعمت کی سزا بھگتنے کے لیے تیار رہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اونٹ کا ذکر بطورِ مثال محض ان خصوصیات کی بنا پر ہوا ہے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ مقصود ان تمام جانوروں کی طرف توجہ دلانا ہے جو قدرت نے انسان کے لیے مسخر کیے ہیں اور جن پر اس کی معاش و معیشت کا انحصار ہے۔ دوسرے مقامات میں قرآن نے ان کا حوالہ بھی دیا ہے اور مدعا اس حوالہ سے اس حقیقت کو انسان پر واضح کرنا ہے کہ ہر نعمت منعم کا شکر واجب کرتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ ایک ایسا روز آئے جس میں شکرگزار اپنی شکرگزاری کا انعام پائیں اور ناشکرے اپنے کفرانِ نعمت کی سزا بھگتیں۔ ان شاء اللہ سورۂ عادیات کی تفسیر میں اس پر مفصل بحث آئے گی۔

آسمان کی طرف اشارہ

'وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ'۔ چونکہ مقصود یہاں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نمایاں چیزوں کی طرف متوجہ کرنا ہے اس وجہ سے اونٹ جیسے طویل القامت جانور کا ذکر آیا تو وہیں سے آسمان کی طرف توجہ دلا دی ہے کہ وہ آسمان پر کیوں نہیں غور کرتے کہ کس طرح یہ چھت بلند کی گئی! یعنی ایسی ناپیدا کنار چھت بلند تو ہو گئی لیکن کسی کو وہ ستون نظر نہیں آتے جن پر یہ قائم ہے۔ پھر اس کا بھی عجیب ماجرا ہے کہ نہیں معلوم کہ کب سے یہ قائم ہے، لیکن کوئی ماہر سے ماہر انجینئر کسی بڑی سے بڑی دوربین کی مدد سے بھی اس میں کسی معمولی سے معمولی رخنہ یا خلا کی نشان دہی نہیں کر سکتا۔ پھر اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ ہے تو یہ زمین سے اتنی دور کہ اس کی مسافت کا علم کسی کو نہیں لیکن اسی کے سورج، چاند ستارے اور سیارے زمین کی رونق اور اس کے لیے روشنی، حرارت اور زندگی کا ذریعہ ہیں۔ اسی سے بارش نازل ہوتی ہے جس سے زمین کی تمام مخلوقات کو روزی حاصل ہوتی ہے۔

انسان سوچے کہ جس خالق کی قدرت و حکمت کا یہ حال ہے کہ وہ آسمان کو بنا سکتا ہے، کیا اس کے مرکھپ جانے کے بعد دوبارہ اس کو اٹھا کھڑا کرنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا! چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ یہ سوال اللہ تعالیٰ نے کیا ہے کہ تمہارا پیدا کیا جانا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا؟

زمین کے عجائبات کی طرف اشارہ

وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ: آسمان اور اس کے عجائبات کی سیر کرانے کے بعد نگاہ کو پھر زمین کی طرف توجہ دلائی اور اس کی اس نشانی کی طرف اشارہ فرمایا جو زمین و آسمان کے مابین خالق کائنات کی قدرت و حکمت کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ فرمایا کہ پہاڑوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح نصب کیے گئے ہیں۔ وہ زمین کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں کہ مبادا وہ سب کے سمیت کسی سمت کو لڑھک جائے۔ وہ ہواؤں اور بادلوں کو بھی کنٹرول کرتے ہیں تاکہ بارش کی تقسیم قدرت کی حکمت اور اس کے منشا کے مطابق ہو۔ ہیں تو یہ پتھر کے لیکن قدرت نے ان کے اندر سے خلق کی سیرابی کے لیے شیریں پانی کے سوتے جاری کر رکھے ہیں۔ وہ قدرت کے بے شمار قیمتی خزانوں کے امین ہیں جن کو انسان برابر دریافت کرتا اور ان کو اپنے تمدن کی تعمیر و ترقی میں صرف کرنے میں رات دن سرگرم ہے۔ ان میں ایسے پہاڑ بھی ہیں جو ناقابلِ عبور ہیں لیکن قدرت نے ان کے اندر درّے اور راستے نکال دیے ہیں تاکہ وہ قوموں اور قوموں کے درمیان حجاب بن کے نہ رہ جائیں۔ انسان غور کرے کہ کیا یہ خالق کی عظیم قدرت، عظیم حکمت، اور اس کی عالم گیر ربوبیت پر شاہد نہیں ہیں! اور پھر غور کرے کہ کیا جو خالق ان صفات سے متصف ہے وہ انسان کو اس دنیا میں شترِ بے مہار بنا کے چھوڑے رکھے گا، کوئی ایسا دن نہیں لائے گا جس میں وہ سب کا حساب کرے اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے؟ کیا یہ اس کی ربوبیت اور اس کی حکمت کا بدیہی تقاضا نہیں ہے؟ کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ اس کی قدرت کے دائرہ سے خارج اور بعید از امکان ہے!!

پہاڑوں کے بعد ہموار زمین پر

وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ: اب یہ نگاہ کو پہاڑوں سے زمین پر اتارا اور دعوت دی کہ زمین کو دیکھیں کہ کس طرح یہ ان کے قدموں کے نیچے بچھائی گئی ہے۔ کس طرح اس کے گوشے گوشے میں ان کی پرورش کے لیے ضرورت کی چیزیں پیدا کی گئی ہیں۔ اس کی سطح زمینوں پر یہ اپنے گھر بنا لیتے ہیں۔ اس کے میدانوں میں ان کے کھیت اور ان کے باغ و چمن ہیں۔ اس کی نہریں، اس کے کنوئیں اور اس کے چشمے ان کے کھیتوں اور باغوں کو شاداب رکھتے ہیں، اس کے جنگلوں اور اس کی وادیوں میں ان کے چوپایوں اور گلوں کے پیٹ بھرنے کے غیر محدود وسائل موجود ہیں۔ ان ساری چیزوں کو دیکھیں اور سوچیں کہ جس نے ان کو اس سجے سجائے گھر میں اتارا اور اس کی ساری چیزیں وہ برت رہے ہیں کیا اس کو اس امر سے کوئی بحث نہیں ہے کہ کون گھر کے مالک کی پسند کے مطابق زندگی گزارتا ہے اور کون اس کو اپنے باپ دادا کی میراث سمجھ کر اس میں اکڑتا اور دھما چوکڑی مچاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ عقل یہی کہتی ہے کہ اس کو اس سے بحث ہے اور ہونی چاہیے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ العیاذ باللہ یا تو وہ بے حس و بلید اور خیر و شر کے شعور سے عاری ہے یا بالکل بے بس و مجبور ہے لیکن جس ذات کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور عظمت کی وہ نشانیاں آپ نے دیکھی ہیں، جن کا ذکر اوپر ہوا،

اس کو نہ بے حمیت و بے شعور فرض کیا جا سکتا نہ عاجز و بے بس تو لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اس گھر میں انسان کو آباد کر کے دیکھ رہا ہے کہ وہ کیا بناتا ہے۔ بالآخر ایک دن اس امتحان کی مدت پوری ہوگی اور وہ سب کو اپنے حضور میں جمع کر کے ان کی نیکی اور بدی ان کے سامنے رکھے گا۔ جس کی روش اس کی پسند کے مطابق رہی ہوگی اس کو وہ اپنی رحمت سے نوازے گا اور جس نے اس گھر میں فساد مچایا ہوگا وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔

'کَیْفَ خُلِقَتْ' اور 'کَیْفَ رُفِعَتْ' وغیرہ کے لفظوں میں جو سوالات کیے گئے ہیں ان کے اندر اجمال ہے، اس کی تفصیل قرآن کی دوسری سورتوں میں بیان ہوئی ہے۔ ہم نے اوپر جو وضاحت کی ہے انہی سورتوں کی روشنی میں کی ہے اور صرف اسی حد تک کی ہے جس حد تک اس سورہ میں ضروری تھی۔ مذکورہ چیزوں سے قرآن نے اپنے جن جن دعاوی پر دلیل قائم کی ہے اگر کوئی ان سب کو سمجھنا چاہے تو وہ قرآن کے ان تمام مقامات کا جائزہ لے جہاں زمین، آسمان، پہاڑ اور اونٹ کسی پہلو سے زیر بحث آئے ہیں۔

ترتیب بیان کی ندرت — یہاں ترتیب بیان میں بھی ایک خاص ندرت ہے کہ اس کے اندر صعودی اور ہبوطی دونوں ترتیبیں جمع ہوگئی ہیں۔ مقصود تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، چند نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلانا ہے تاکہ ضدیوں کو فرار کی کوئی راہ نہ ملے۔ چنانچہ سب سے قریب کی نمایاں چیز اونٹ کی طرف پہلے اشارہ فرمایا جس کی نفع بخشی سے مخاطبوں میں سے کسی کے لیے مجالِ انکار نہیں تھی۔ اونٹ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد وہیں سے آسمان کی طرف توجہ دلا دی کہ ایک نظر اس کو بھی دیکھیں۔ پھر زمین کی طرف بازگشت ہوئی تو بیچ میں پہاڑ آ گئے، ان کی طرف توجہ دلا دی۔ پہاڑوں کے بعد سطح زمین توجہ کے لیے اپنے اندر قدرتی کشش رکھتی ہے۔

ان میں سے دو نشانیاں ———— اونٹ اور زمین ———— ربوبیت کے پہلو سے زیادہ نمایاں ہیں اور دو ———— آسمان اور پہاڑ ———— خالق کی قدرت و حکمت کے پہلو سے۔ خالق کی انہی صفتوں پر قیامت، معاد اور جزاء و سزا کے پورے فلسفہ کی بنیاد ہے جس کی وضاحت اس کتاب میں ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔ اب دیکھیے اس ترتیب بیان نے نگاہ کی ایک ہی گردش میں کس طرح ان تمام نمایاں آثار کو سامنے کر دیا ہے جو اس فلسفہ کے حق ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔

فَذَكِّرْ ۟ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ۟ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (۲۱-۲۲)

نبی صلعم کی طرف التفات — انذار کے حق میں دلائل بیان کرنے کے بعد یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آپ کو تسلی دینے کے لیے التفات ہے کہ جو لوگ تمہارے انذار کو جھٹلا رہے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں جھٹلا رہے ہیں

کہ تمھارے انذار کے حق میں دلائل نہیں ہیں۔ دلائل تو زمین سے لے کر آسمان اور آسمان سے لے کر زمین تک چپہ چپہ پر ہیں لیکن ان سے فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جن کے اندر خشیت ہوتی ہے۔ انہی لوگوں کی طرف سابق سورہ میں سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَخْشَىٰ (الاعلیٰ - ۸۷ : ۱۰) کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے دلوں پر قساوت چھا چکی ہے وہ ان نشانیوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے چنانچہ سابق سورہ میں فرمایا ہے: وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى (الاعلیٰ - ۸۷ : ۱۱) مطلب یہ ہے کہ آپ ان کے رد و قبول سے بے نیاز ہو کر اپنی تذکیر و تبلیغ جاری رکھیں اور مطمئن رہیں کہ آپ کا فرض صرف تبلیغ و تذکیر ہی ہے۔ یہ ذمہ داری آپ پر نہیں ہے کہ لازماً آپ ان کے دلوں میں ایمان اتار ہی دیں۔ اللہ نے آپ کو یاددہانی کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ ان کے ایمان کا ٹھیکہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ ایمان نہ لانے کی پرسش آپ سے ہو۔

إِلَّا مَنْ تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ (۲۳-۲۴)

یہاں حرفِ استثناء سے پہلے کلام میں کچھ حذف ہے جو قرینہ سے سمجھا جاتا ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جو صاحبِ توفیق ہوں گے وہ آپ کی دعوت سے فیض پائیں گے، رہے وہ جو منہ موڑیں اور کفر کریں گے تو اللہ ان کو سب سے بڑے عذاب کا مزا چکھائے گا۔

'الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ' سے مراد جہنم کا عذاب ہے جو دنیا کے تمام عذابوں سے بڑا ہوگا۔ اس دنیا کا کوئی عذاب نہ شدت میں اس کا مقابلہ کر سکتا نہ پائیداری میں۔ سابق سورہ میں اس کو النَّارَ الْكُبْرَىٰ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے لیکن مدعا ایک ہی ہے۔

إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (۲۵-۲۶)

یعنی کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ یہ محض ایک دھمکی ہے۔ بلکہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ ہر جان کی واپسی ہماری ہی طرف ہوتی ہے کسی اور کی طرف نہیں ہوتی ہے اور یہ بھی ہم پر واجب ہے کہ ہم لوگوں کا حساب کریں اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزا و سزا دیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال اور ایک بالکل بے مقصد و بے حکمت کارخانہ ہے حالانکہ خالق کا کوئی کام بھی نہ حکمت سے خالی ہے نہ ہو سکتا ہے۔

بفضلِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وھوالموفق للخیر والسداد۔

لاہور
۱۱ - نومبر ۱۹۷۹ء
۲۰ - ذوالحجہ ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۸۹

الفجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ آسمان و زمین کی بعض نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس مضمون پر ختم ہوئی کہ جس خالق نے ان چیزوں کو وجود بخشا اس کی عظیم قدرت و حکمت اور اس کی غیر محدود ربوبیت سے کسی عاقل کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ مقصود اس سے اس حقیقت کو سامنے لانا ہے کہ جب وہ عظیم قدرت و حکمت رکھنے والا بھی ہے اور اس وسعت کے ساتھ اس نے اپنا خوانِ کرم بھی بچھا رکھا ہے تو اس کی ان صفات کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ان لوگوں سے باز پرس کرے جنھوں نے اس کی نعمتیں پا کر اس کی دنیا میں دھاندلی مچائی اور ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے شکر گزاری اور اطاعت شعاری کی زندگی بسر کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ اس کی رحمت و ربوبیت کے بھی منافی ہے اور اس کی قدرت و حکمت کے بھی۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تم جس چیز سے لوگوں کو آگاہ کر رہے ہو اس کے دلائل و شواہد آسمان و زمین کے چپہ چپہ پر موجود ہیں۔ اگر ان لوگوں کو نظر نہیں آ رہے ہیں تو تم اپنا فرضِ انذار ادا کر دو۔ اندھوں کو راہ دکھانا تمھارا کام نہیں ہے۔

اس سورہ میں آفاق اور تاریخ کے بعض نہایت نمایاں آثار و واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ ثابت فرمایا ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز کی باگ اس کے خالق و مالک کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جس کو جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک دیتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی شے اس کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھ سکے۔ قوموں کے ساتھ بھی اس کا یہی معاملہ ہے۔ ان کو جو ڈھیل ملتی ہے اسی کے اذن سے ملتی ہے اور جب ان پر گرفت ہوتی ہے تو اس کے حکم سے ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ ہر وقت قوموں کی نبض پر رہتے ہیں۔ اس دنیا میں ہر ایک کا امتحان ہو رہا ہے کہ وہ نعمت پا کر شکر کی روش اختیار کرتا ہے یا فخر و استکبار کی۔ اسی طرح مشکل حالات میں صبر و ثابت قدمی کا ثبوت دیتا ہے یا مایوسی و دل شکستگی کا۔ پہلی روش ابدی فتح و فیروز مندی کی ضامن ہے اور دوسری دائمی خسران و نامرادی کی۔ اللہ کا مبارک بندہ وہ ہے جو نفسِ مطمئنہ کے ساتھ اپنے رب کی طرف لوٹا۔ نہ نعمت پا کر مغرور ہوا اور نہ فقر کی آزمائش سے دل شکستہ۔ انھی کو

وَرَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کی بادشاہی حاصل ہوگی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی تقسیم اس طرح ہے:

(۱-۵) آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ جو اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز کی باگ اس کے خالق کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جس حد تک چاہتا ہے اس کو ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی شے اس کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے۔

(۶-۱۴) تاریخ کی بعض عظیم قوموں کا حوالہ اس حقیقت کے ثبوت میں کہ خالق کی یہی نگرانی دنیا کی قوموں پر بھی قائم ہے۔ جب وہ اپنے اختیار سے غلط فائدہ اٹھا کر خدا کے حدود کو لانگنے کی جسارت کرتی ہیں تو ان کو بس ایک خاص حد ہی تک ڈھیل ملتی ہے۔ اس کے بعد لازماً ان کی پکڑ ہوتی ہے اور ایسی سخت پکڑ ہوتی ہے کہ وہ اپنی تمام عظمت و شوکت کے باوجود اس کے آگے سپر انداز ہو جاتی ہیں۔

(۱۵-۲۰) انسان کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کہ جب اس کو نعمت ملتی ہے تو وہ اس کو اپنا حق سمجھتا اور اس مغالطہ میں پڑ جاتا ہے کہ وہ خدا کی نظروں میں عزت و شرف رکھنے والا ہے اس وجہ سے اس کی عزت افزائی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ نعمت سے محروم ہو جاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ خدا نے اس کی ناقدری کی ہے۔ حالانکہ نعمت ملے یا تنگیٔ رزق سے سابقہ پیش آئے دونوں ہی حالتیں بطور امتحان پیش آتی ہیں۔ پہلی حالت میں اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ انسان نعمت پا کر شکر کرنے والا اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے والا بنتا ہے یا اکڑنے والا اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے والا بن کے رہ جاتا ہے۔ دوسری صورت میں یہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے رب کی اس تقسیم پر قانع و صابر، راضی و مطمئن رہتا ہے یا خدا سے مایوس، شاکی اور پست ہمت بن جاتا ہے۔ حالانکہ خدا سے شاکی اور مایوس ہونے کے بجائے اسے اپنے اعمال پر نظر ڈالنی چاہیے کہ خدا کی نعمت پا کر یتیموں اور غریبوں کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہونا چاہیے تھا اور اس نے مال کی اندھی بہری محبت میں مبتلا ہو کر ان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا!

(۲۱-۲۶) قیامت کے دن ان لوگوں کی حسرت و مایوسی کی تصویر جو خدا کے بخشے ہوئے مال کو پا کر اس کے پجاری بن کر بیٹھ رہے، اس کو اپنی آخرت سنوارنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔

(۲۷-۳۰) ان لوگوں کی خوش حالی و فیروز مندی کا بیان جو یُسر و عُسر اور تنگی و فراخی دونوں میں اپنے رب سے راضی و مطمئن رہے۔ نعمت ملی تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے اپنے رب کے شکر گزار اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے والے رہے اور اگر تنگیٔ رزق سے آزمائے گئے تو مایوس و دل شکستہ ہونے کی جگہ اپنی حالت پر صابر و قانع اور اپنے رب کے فیصلہ پر راضی رہے۔

سُوْرَةُ الْفَجْرِ

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَات : ۳۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۳۰

وَالْفَجْرِ ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿۲﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿۳﴾ وَالَّيْلِ
اِذَا يَسْرِ ﴿۴﴾ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿۵﴾ اَلَمْ
تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿۶﴾ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿۷﴾ الَّتِيْ لَمْ
يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴿۸﴾ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ
بِالْوَادِ ﴿۹﴾ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي
الْبِلَادِ ﴿۱۱﴾ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ
رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا
الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ
رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ
فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾ وَلَا
تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ
اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾ كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ
الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾

وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۙ یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ
وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰىؕ ﴿۲۳﴾ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْۚ ﴿۲۴﴾
فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌۙ ﴿۲۵﴾ وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ
اَحَدٌؕ ﴿۲۶﴾ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْۤ اِلٰى
رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةًۚ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْۙ ﴿۲۹﴾
ع ۱۴ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۠ ﴿۳۰﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۳۰

شاہد ہے فجر اور دس راتیں اور جفت و طاق اور رات جب وہ چل کھڑی ہو۔ کیوں، ان میں تو ہے ایک عاقل کے لیے عظیم شہادت! (۱-۵)

دیکھا نہیں، کیا کیا تیرے خداوند نے عاد کے ساتھ! ـــــ ستونوں والے ارم کے ساتھ ـــــ جن کا ثانی نہ ہوا ملکوں میں۔ اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے وادی میں پتھر تراشے اور فرعون میخوں والے کے ساتھ! انھوں نے ملکوں میں سر اٹھائے اور ان میں بڑی اودھم مچائی تو تیرے خداوند نے ان پر عذاب کے کوڑے برسائے۔ ـــــ بے شک تیرا خداوند گھات میں رہتا ہے (۶-۱۵)

لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا خداوند اس کا امتحان کرتا اور اس کو عزت و نعمت بخشتا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ میرے رب نے میری شان بڑھائی ہے اور جب اس کو جانچتا اور رزق میں کمی کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے خداوند نے مجھے ذلیل کر ڈالا۔ ہر گز نہیں، بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے اور نہ مسکینوں کو کھلانے پر ایک دوسرے کو ابھارتے اور وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کرتے ہو۔ اور مال کے عشق

میں متوالے ہو۔ (۱۶-۲۰)

ہرگز نہیں، اس وقت کو یاد رکھیں جب زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی اور تیرا خداوند صف در صف فرشتوں کے جلو میں نمودار ہو گا اور جہنّم حاضر کی جائے گی۔ اس دن انسان سوچے گا مگر کیا حاصل اس سوچنے کا! کہے گا، کاش میں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ کر رکھا ہوتا! پس اس دن نہ اس کا سا عذاب کوئی دے سکتا اور نہ اس کا سا باندھنا کوئی باندھ سکتا۔ (۲۱-۲۶)

اے وہ جس کا دل (اپنے رب پر) جما رہا، چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ مل جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری بہشت میں۔ (۲۷-۳۰)

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ (۱-۴)

ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ یہاں جو قسمیں کھائی گئی ہیں وہ اس دعوے پر شہادت کے لیے کھائی گئی ہیں کہ اس کائنات کا مدبرِ حقیقی اللہ وحدہٗ لا شریک ہے۔ اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی باگ ہے۔ وہی جب چاہتا ہے ایک چیز کو نمودار کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اس کو اوجھل کر دیتا ہے۔ وہی جس کو جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک دیتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی شے اس کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھ سکے یا اس کے اختیار میں مداخلت کر سکے۔

فجر کی شہادت سے مقصود

'وَالْفَجْرِ'۔ 'فَجْرٌ' سے مراد وہ وقت ہے جب رات کی تاریکی کا پردہ چاک ہوتا اور دن کی روشنی مشرقی افق سے نمودار ہوتی ہے۔ روزے کے احکام کے ضمن میں سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے: كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (البقرۃ - ۲: ۱۸۷) (اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری شب کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے)۔ لفظ 'فجر' کے مقابل میں لفظ 'صبح' سے مراد جو وقت ہے وہ نہ صرف فجر پر بلکہ طلوعِ آفتاب کے بعد کے وقت پر بھی محیط ہے۔ اس لیے 'وَالْفَجْرِ' کے ہم معنی صبح کے لفظ سے جہاں قسم کھائی گئی ہے وہاں وضاحت کے لیے الفاظ بڑھائے گئے ہیں، مثلاً وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (التکویر - ۸۱: ۱۸) (شاہد ہے صبح جب وہ سانس لیتی ہے) یا وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ (المدثر - ۷۴: ۳۴) (شاہد ہے صبح جب وہ ہویدا ہو جائے)۔

یہ معین ہونے کے بعد کہ فجر سے مراد آغازِ صبح کا وہ وقت ہے جب شب کی تاریکی کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اس آیت میں قسم کا موقع ٹھیک وہی قرار پاتا ہے جو سورۂ مدثر میں بدیں الفاظ وارد ہوا ہے: وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۝ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ (المدثر - ۷۴: ۳۲-۳۴) (شاہد ہے رات جب وہ منہ موڑ چکے اور صبح جب وہ نمودار ہو جائے کہ یہ (قیامت) عظیم حوادث میں سے ہے)۔

ہم نے سورۂ مدثر کی تفسیر میں مذکورہ آیت کے ذیل میں واضح کیا ہے کہ رات کی تاریکی جب اپنے ڈیرے ڈالے ہوتی ہے تو اس میں صبح کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ فجر کا وقت ایک بڑے

تغیر کا پیغام لاتا ہے جس میں تاریکی کی بساط لپیٹ دی جاتی اور عالم ایک نیا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ ٹھیک یہی حال قیامت کے ظہور کا بھی ہوگا۔ یہ دنیا رات کے مانند ہے جس کی تاریکی صبح قیامت کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ جس طرح رات کے بعد فجر ایک متعین نظام الاوقات کے تحت نمودار ہوتی ہے اسی طرح ایک وقت آئے گا جب قیامت اچانک وارد ہو جائے گی۔ اس وقت سب دیکھ لیں گے کہ جس چیز کو وہ ناممکن سمجھتے تھے وہ سامنے آ گئی۔

یہاں 'وَالْفَجْرِ' کی قسم سے قرآن نے متنبہ کیا ہے کہ فجر کا وقت ہر روز ظہور قیامت کا مشاہدہ ایک تمثیلی رنگ میں کراتا ہے۔ جس طرح تم رات میں سوتے اور صبح کو آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھتے ہو اسی طرح مر جانے کے بعد تمھارے اوپر وہ وقت بھی آئے گا جب صور پھونکا جائے گا اور تم صبح قیامت کو اٹھ بیٹھو گے اور ایسا محسوس کرو گے کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے ہو۔ لہٰذا قیامت کے ظہور کو بعید از امکان نہ سمجھو۔ احادیث میں صبح کو اٹھنے کی جو دعا سکھائی گئی ہے اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

'وَلَيَالٍ عَشْرٍ' دس راتوں سے کون سی راتیں مراد ہیں؟ اس سوال کے مختلف جواب ہمارے مفسرین سے منقول ہیں لیکن ان میں سے کسی قول کی کوئی قابل قبول دلیل ان سے منقول نہیں ہے۔ ان کی بنیاد محض اس مفروضہ پر ہے کہ یہاں ان کی قسم کھائی گئی ہے اور جس چیز کی قسم کھائی جائے ضروری ہے کہ وہ کوئی مقدس چیز ہو حالانکہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ قرآن میں جو قسمیں وارد ہوئی ہیں ان میں سے بیشتر کسی دعوے پر دلیل کے طور پر کھائی گئی ہیں۔ ان کے اندر تقدس تلاش کرنے کے بجائے ہمیشہ ان کے استدلالی پہلو پر نظر جمانی اور دیکھنا یہ چاہیے کہ زیر بحث دعویٰ کیا ہے اور قسم کس پہلو سے اس پر شہادت ہے۔ نیز قرآن مجید کے ان دوسرے مواقع کو نگاہ میں رکھنا چاہیے جن میں اسی قسم کا مضمون انہی الفاظ یا ان کے ملتے جلتے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ (دس راتوں سے مراد)

اس سورہ کے عمود کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر غور کیا جائے تو عمود سے مطابقت رکھنے والی بات ہو سکتی ہے تو یہ ہو سکتی ہے کہ 'لَيَالٍ عَشْرٍ' سے چاند کے عروج و محاق کی دس راتیں مراد لی جائیں۔ چونکہ یہاں یہ لفظ نکرہ کی صورت میں ہے اس وجہ سے ایک ہی ساتھ دس راتیں عروج کی بھی مراد لی جا سکتی ہیں اور دس راتیں زوال کی بھی۔ گویا اس قسم میں چاند کے تدریجی عروج و زوال کی پوری تصویر سامنے رکھ دی گئی ہے۔ سادہ اسلوب میں یہ مضمون سورۂ یٰسٓ میں یوں بیان ہوا ہے:

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ	اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا رکھی ہیں
حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ؕ	یہاں تک کہ (ان منازل کو طے کرتے ہوئے) وہ کھجور

لی سوکھی ٹہنی کے مانند ہو کر رہ جاتا ہے (یٰسٓ - ۳۶ : ۳۹)

اس آیت میں چاند کی تصویر چشم تخیل کے سامنے اس طرح آتی ہے گویا وہ ایک فرمانبردار ناقہ ہے جس کی نکیل ایک غیبی ساربان کے ہاتھ میں ہے جو اس کو منزل بہ منزل ایک معین بلندی تک چڑھاتا اور پھر وہاں سے اس کو درجہ بدرجہ اسی طرح اتارتا ہے یہاں تک کہ قطع منازل کے اس پر مشقت سفر میں وہ سوکھ کر کانٹا بن کے رہ جاتا ہے۔

قسم کے اسلوب میں یہی حقیقت یوں بھی وارد ہوئی ہے:

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (الانشقاق - ۸۴ : ۱۸-۱۹)

شاہد ہے چاند جب وہ کامل ہو جائے کہ تم بھی درجہ بدرجہ چڑھو گے۔

یہاں قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی کے ظہور کے لیے ایک معین پروگرام اور تدریجی ارتقاء ہوتا ہے۔ قیامت اللہ تعالیٰ کے عدل کا بدیہی مقتضیٰ ہے۔ اس کا ظہور تو لازماً ہو گا لیکن ہو گا اپنے وقت پر۔

ان نظائر کی روشنی میں اگر آیت کی توجیہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قرآن نے چاند کے عروج و زوال کی ان دس دس راتوں کا حوالہ دیا ہے جن میں چاند کا تغیر نہایت نمایاں ہوتا ہے اور وہ دن پر دن سابقہ حالت سے مختلف نظر آتا ہے۔ یہ تغیر اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے شئون حوادث کے ظہور کے لیے ایک تدریج رکھی ہے۔ حاملہ کی بارآوری اور وضع حمل میں ایک متعین مدت صرف ہوتی ہے۔ کفار و مکذبین کے جرائم پر اللہ تعالیٰ فوری گرفت نہیں کرتا۔ بلکہ ان کی رسی دراز کرتا جاتا ہے اور جب یہ مہلت ختم ہوتی ہے تبھی ان پر عذاب آتا ہے۔ اسی طرح بحیثیت مجموعی دنیا بھی قیامت کی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور بالتدریج اس کی طرف پہنچے گی اور یہ ٹھیک اس نظام الاوقات کے مطابق ہو گا جو خدا نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔

جفت اور طاق سے مراد

'وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ'۔ 'شَفْع' کے معنی جفت اور 'وَتْر' کے معنی طاق کے ہیں۔ جفت اور طاق سے کیا مراد ہے؟ اس کے جواب میں مفسرین سے اتنے اقوال منقول ہیں کہ ان کا استقصار مشکل ہے۔ اقوال کی اس کثرت کی وجہ ہمارے نزدیک وہی ہے کہ لوگوں نے نظم کلام اور سیاق و سباق کو پیش نظر رکھنے کے بجائے ساری توجہ صرف اس امر پر مرکوز رکھی کہ کسی مقدس چیز کو ان الفاظ کا مصداق بنائیں۔ حالانکہ اگر نظر شہادت کے پہلو پر ہوتی تو غور کرتے اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی آسان راہ یہ بھی کہ ان مقامات پر نظر ڈالی جاتی جہاں قرآن نے ہر شے کے جوڑے جوڑے پیدا کیے جانے کا ذکر کیا ہے اور اس سے حکمت کے نہایت اہم حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (الذّٰریٰت - ۵۱ : ۴۹) (اور ہم نے ہر چیز کے اندر سے

جوڑے پیدا کیے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو)۔

ہر جوڑا دو طاقوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ ہر چیز ایک پہلو سے طاق ہے اور دوسرے پہلو سے جفت۔ اس امر واقعی کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن نے اس کائنات کے متعدد جوڑوں ــــ زمین و آسمان، ظلمت و نور، دھوپ اور چھاؤں، نر اور مادہ ــــ کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس سے نہایت اہم نتائج کی، جیسا کہ 'لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ' سے اشارہ نکلتا ہے یاددہانی فرمائی ہے، مثلاً اس حقیقت کی یاددہانی کہ جب ہر چیز اپنے وجود کے اندر ایک ایسا خلا رکھتی ہے جو اس جوڑے سے مل کر ہی بھرتا ہے، اس کے بغیر وہ اپنی غایت کو نہیں پہنچتی تو لازماً ایک ایسی کامل الوجود اور ہر نقص سے پاک ہستی ان اجزائے مختلفہ سے بالاتر موجود ہے جس کی حکمت و قدرت ان کے اندر ربط و اتصال اور سازگاری و ہم آمیزی پیدا کرتی اور ان کو باغایت و بامقصد بناتی ہے۔ اس ہستی کا اپنے وجود میں کامل اور ہر نقص سے پاک ہونا لازمی ہے۔ اگر اس میں کوئی کمی ہوگی تو وہ اپنے سے بالاتر کی محتاج بن جائے گی اور یہ سلسلہ کہیں منقطع نہیں ہوگا۔ دوسرے اس حقیقت کی یاددہانی کہ ہماری یہ دنیا بھی بحیثیتِ مجموعی اپنے وجود کے اندر اسی طرح ایک خلا رکھتی ہے جس طرح اس کے تمام اجزائے مختلفہ اپنے اندر رکھتے ہیں اور یہ خلا اس وقت تک نہیں بھرتا جب تک اس کے ساتھ آخرت کو نہ مانیے۔ اس کو نہ مانیے تو یہ دنیا ایک حکیم کا بنایا ہوا کارخانہ نہیں بلکہ ایک کھلنڈرے کا کھیل اور نہایت ظالمانہ کھیل بن کے رہ جاتی ہے۔

جفت و طاق کا ذکر دس راتوں کے ذکر کے بعد آیا ہے اور دس راتیں ہمارے نزدیک چاند کے عروج و محاق کی ہیں جو اس حقیقت کی شہادت دیتی ہیں کہ ہر چیز کی باگ اللہ وحدہٗ لاشریک کے ہاتھ میں ہے اس لیے کہ بعض مہینوں میں یہ راتیں جفت ہوتی ہیں بعض میں طاق لیکن کسی کے امکان میں نہیں کہ وہ جفت کو طاق یا طاق کو جفت بنا دے خواہ اس کی کتنی ہی تمنا رکھتا ہو۔ عید کے چاند کے لیے لوگ نہ جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں کہ انتیس کو نظر آ جائے لیکن وہ نعیں اپنے رب ہی کے حکم کی کرتا ہے، لوگوں کے جذبۂ شوق اور جوشِ استقبال کی اسے ذرا پروا نہیں ہوتی۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ (۴)

رات کی شہادت

یہ آخر میں رات کی تنہا شہادت پیش کی ہے اور اس کے ساتھ 'اِذَا يَسْرِ' کی قید ہے یعنی خاص طور پر اس کے اس وقت کی طرف توجہ دلائی ہے جب وہ رخصت ہونے کے لیے چل کھڑی ہوتی ہے اور افق میں فجر کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اس پر قرآن کے نظائر کی روشنی میں غور کیجیے تو یہ نہایت اہم حقائق کی یاددہانی کرتی ہے۔

ایک تو اس حقیقت کی یاد دہانی کہ اس کائنات کے تمام عناصرِ مختلفہ خالقِ کائنات کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ رات آتی ہے تو بظاہر اس کا تسلط ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ کسی طرف سے دن کے نمودار ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا لیکن بالآخر اس تاریکی کے اندر سے ایک سفید دھاری مشرق سے نمایاں ہونی شروع ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ رات پر اس طرح چھا جاتی ہے کہ سورج نمودار ہو جاتا ہے اور ظلمتِ شب کو اپنا بوریا بستر سنبھالنا پڑتا ہے۔ رات کے بس میں یہ نہیں ہے کہ اس کی راہ روک کر کھڑی ہو جائے۔

دوسری یہ کہ رات کے رخصت ہوتے اور دن کے جلوہ نما ہوتے میں ان لوگوں کے لیے ظہورِ قیامت کی ایک تمثیل ہے جو قیامت کو بعید از امکان سمجھتے ہیں۔ اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

تیسری ان لوگوں کو، جو قیامت کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ اگر یہ آنے والی ہے بھی تو ابھی اتنی دور ہے کہ اس کا خوف ذہنوں پر مسلط کر لینا کوئی دانش مندی نہیں، اس حقیقت کی یاد دہانی کہ خدا کے ہاں یہ دنیا اپنے انجام کے اسی طرح قریب آ لگی ہے جس طرح سحر کے وقت بس اتنی سی کسر رہ جاتی ہے کہ کب سپیدۂ صبح نمودار ہو اور رات کی گیرائی ختم ہو جائے۔ انسان اس معاملہ کو اپنی محدود نظر سے دیکھتا اور اپنے منٹ سیکنڈ کے پیمانے سے ناپتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دنیا پر جو نہیں معلوم کب سے انسان و حیوان، چرند و پرند سب کو ایک گہوارہ مہیا کیے ہوئے ہے، کوئی ایسی آفت آ سکتی ہے جو اس کے نظام ہی کو تہ و بالا کر کے رکھ دے۔ لیکن خدا کے نظام میں صورتِ حال بالکل مختلف ہے، وہ قیامت کو دنیا کے پشتِ پا پر دیکھ رہا ہے۔ اس کے پیمانوں کے لحاظ سے قیامت بس آیا ہی چاہتی ہے۔ اسی حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے کہ میں اور قیامت ساتھ ساتھ کی دو انگلیوں کی طرح ہیں۔

علاوہ ازیں اِذَا یَسۡرِ کے الفاظ کے اندر ایک لطیف شہادت بھی ہے کہ کسی آزمائش کو بھی ایسی بلا نہ سمجھو جو کبھی جان چھوڑے گی ہی نہیں۔ اس دنیا میں جس طرح فجر کا طلوع ہونا اور رات کا آنے کے بعد چلا جانا مشاہدہ کرتے ہو اور دیکھتے ہو کہ قدرت ان میں سے کسی کو بھی اس سے زیادہ ٹکنے کا موقع نہیں دیتی جتنا اس کی دنیا کی مصلحت کے لیے ضروری ہے اسی طرح یُسر اور عُسر، رنج اور راحت کی صورت میں جو آزمائشیں پیش آتی ہیں وہ بھی انسان کی ذہنی و اخلاقی تربیت کے لیے پیش آتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو بس اتنی ہی دیر کے لیے مہلت دیتا ہے جتنی بندے کی تربیت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ انسان کو ان میں سے نہ کسی سے مایوس ہونا چاہیے نہ مغرور، بلکہ ان کا مواجہہ صبر اور شکر کے ساتھ کرنا چاہیے اور یہ امید رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر آزمائش میں اس کے لیے خیر مضمر ہے۔

آیات ۱ تا ۴ پر مزید غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ 'وَالْفَجْرِ' اور 'وَالَّيْلِ إِذَا يَسْرِ' کی دونوں قسمیں دو متقابل چیزوں کی ہیں اور بیچ کی دو قسموں ــــ 'وَلَيَالٍ عَشْرٍ' اور 'وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ' ــــ کا تعلق ان دو متقابل چیزوں کے درمیان کی دو عظیم نشانیوں سے ہے جو اس دعوے پر دلیل ہیں جس کی طرف ہم نے آغازِ فصل میں اشارہ کیا ہے چونکہ ان آیات میں بنیادی حیثیت پہلی اور آخری دو قسموں کو حاصل ہے، باقی دو قسموں کی حیثیت ان کے توابع کی ہے، اس لیے بحث کی تکمیل کے لیے ہم ان دعاوی کی یاددہانی بھی ضروری سمجھتے ہیں جن پر قرآن نے رات اور دن، صبح اور شام، تاریکی اور روشنی کے تضادات سے استدلال کیا ہے۔

اضداد کی شہادت ● ــــ ان اضداد سے پہلی دلیل تو قرآن نے توحید پر قائم کی ہے اور جگہ جگہ یہ دکھایا ہے کہ یوں بظاہر تو یہ دنیا اپنے ہر گوشے میں اضداد کی ایک رزم گاہ ہے جس کا فطری نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ یہ وجود میں آہی نہیں سکتی اور آ بھی جاتی تو فوراً درہم برہم ہو جاتی لیکن تدبر و تفکر کی نظر سے دیکھیے تو یہ حقیقت بالکل روشن ہے کہ ان اضداد کے اندر باہم دگر نہایت گہری موافقت و سازگاری ہے۔ اسی کا یہ کرشمہ ہے کہ اس کے متضاد عناصر باہمی تفاعل و تعاون سے نہایت صالح نتائج پیدا کرتے ہیں جو اس کے قیام و بقا کا ذریعہ ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان اضداد میں یہ توافق کون پیدا کرتا ہے؟ اس کا واحد صحیح جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ایک علیم و خبیر، حکیم و بصیر اور قوی و مقتدر ہستی ان اضداد سے بالاتر ہے جو ان کو باہم دگر جوڑتی، ایک حکیمانہ تناسب سے ان میں باہم تالیف و امتزاج پیدا کرتی اور پھر ان سے وہ صالح نتائج وجود میں لاتی ہے جو اس دنیا کے قیام و بقا کا ذریعہ ہیں؛ اور لازماً وہ ایک ہی ہے اس لیے کہ اگر دوسرے ارادے بھی اس کی مزاحمت کرنے والے موجود ہوتے تو یہ دنیا تباہ ہو جاتی۔ 'لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا' (الانبیاء ۲۱: ۲۲)۔

● ــــ دوسری دلیل اس سے قرآن نے قیامت پر قائم فرمائی ہے۔ مختصر الفاظ میں وہ یوں ہے کہ اس دنیا میں اس کے خالق نے ہر چیز جوڑے جوڑے پیدا کی ہے اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی اپنی غایت کو پہنچتی ہے۔ بغیر اس کے نہ وہ اپنی غایت کو پہنچتی اور نہ اس کے بدون اس کے وجود کی کوئی معقول توجیہ ہو سکتی بلکہ اس کے اندر ایسا خلا محسوس ہوتا ہے کہ ایک عاقل مجبور ہو جاتا ہے کہ اس پر وہ ایک کارِ عبث ہونے کا حکم لگائے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی حکم اس دنیا پر بھی لگ سکتا ہے اگر اس کے ساتھ آخرت کو نہ ملائیے کیونکہ اس کے اندر ایک ایسا خلا رہ جاتا ہے جو آخرت کو مانے بغیر کسی طرح بھی نہیں بھرتا۔ اس میں نیکی اور بدی، عدل اور ظلم میں ہر وقت جو کشمکش برپا ہے اس کا فطری مطالبہ یہ ہے کہ اس کے لیے ایک ایسا روز انصاف اٹھے

جس میں اس کا خالق پورے اقتدار، کامل علم اور کامل عدل کے ساتھ لوگوں کا محاسبہ کرے۔ پھر اپنے اچھے بندوں کو صلہ دے اور وہ لوگ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں جنھوں نے اس کی دنیا میں دھاندلی مچائی۔ اگر اس کے بغیر یہ دنیا یوں ہی چلتی رہے، ایک دن یوں ہی ختم ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے خالق کے نزدیک خیر اور شر، نیک اور بد دونوں یکساں ہیں اور اس کا پیدا کیا جانا کوئی حکیمانہ فعل نہیں بلکہ ایک کارِ عبث اور کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر قیامت کے جھٹلانے والوں کے سامنے یہ سوال رکھا گیا ہے کہ اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ (القلم - ۶۸: ۳۵-۳۶) (کیا ہم اپنے اطاعت شعار بندوں اور مجرموں کو یکساں کر دیں گے، تم کو کیا ہو گیا ہے، کیسے بے عقلی کے فیصلے کرتے ہو!) اس مسئلہ پر سورہ مدثر کی آیاتِ قسم کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

— تیسری حقیقت اس سے اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمائی ہے کہ جس طرح انسان کے مادی وجود کی بقا کے لیے دن کی روشنی اور حرارت بھی ضروری ہے اور رات کی خنکی اور تاریکی بھی، اسی طرح اس کی اخلاقی و روحانی تربیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ یُسر و عُسر، تنگی و فراخی، صحت اور مرض کی آزمائشوں سے گزارا جائے تاکہ اس کے صبر و شکر کی تربیت ہو اور وہ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً کا مقام حاصل کرنے کا اہل بنے۔ قرآن میں یہ حکمت جگہ جگہ بیان ہوئی ہے۔ آگے اس سورہ میں بھی اس کی وضاحت آ رہی ہے اور خدا نے چاہا تو ہم سورۂ ضحٰی میں 'وَالضُّحٰی ﴿۱﴾ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی' (۱-۲) کے تحت بھی اس مسئلہ پر بحث کریں گے۔

— چوتھی حقیقت ان سے یہ واضح فرمائی گئی ہے کہ ان اضداد میں سے کسی کو بھی خدا نے بگٹٹ نہیں چھوڑا ہے بلکہ ہر ایک کی باگ اس کے ہاتھ میں ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی اپنے حدود سے سرمو تجاوز کر سکے۔ وہ خود اپنے وجود سے شہادت دیتے ہیں کہ وہ آزاد نہیں بلکہ خلق کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ رات آتی ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ڈیرے ڈال دے اور خلق کو دن کی روشنی اور آفتاب کی حرارت سے محروم رکھے بلکہ ایک مقررہ وقت کے اندر منٹ اور سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ لازماً اسے اپنے ڈیرے اٹھانے اور دن کی روشنی کے لیے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح سورج طلوع ہوتا ہے تو اسے بھی لازماً متعین گھنٹوں کے بعد افق سے غائب ہونا پڑتا ہے، وہ یہ نہیں کر سکتا کہ ہمیشہ کے لیے ہمارے سروں پر مسلط ہو جائے، شب کی خنکی اور اس کے سکون سے بھی محروم کر دے۔ یہ مشاہدہ ہر شخص کرتا ہے اور یہ بدیہی شہادت ہے اس بات کی کہ اس کائنات کی ہر چیز خدا کے کنٹرول میں ہے، وہی اس کو کھولتا بھی ہے اور وہی باندھتا بھی ہے۔ اس سے یہ بدیہی نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ کسی کو بھی، خواہ وہ کتنا ہی زور و اثر رکھنے والا ہو، خدا کی ڈھیل

سے اس گھمنڈ میں نہیں پڑنا چاہیے کہ وہ اس کی گرفت سے باہر ہے۔ جب سورج اور چاند، رات اور دن اس کے کنٹرول سے باہر نہیں تو انسان کی کیا حقیقت ہے کہ وہ اپنے کو اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر سمجھے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ سورۂ قصص میں اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ۭ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ ۔۔۔۔ (القصص - ۲۸ : ۷۱-۷۲)	کہہ دو، بتاؤ اگر اللہ تم پر قیامت تک برابر رات ہی مسلط کیے رکھے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لیے ذرا سی روشنی لا سکے! تو کیا تم سنتے نہیں!! پوچھو، اگر اللہ تمہارے اوپر دن کو برابر قیامت تک کے لیے مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لیے ایک ہی رات لا سکے۔

اس سورہ کی قسموں میں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ پہلو زیادہ نمایاں ہے اس وجہ سے اس کو خاص طور پر نگاہ میں رکھیے۔

هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ (۵)

انسان کے ذی عقل ہونے کا فطری تقاضا

'حِجْر' کے معنی عقل کے ہیں۔ لفظ 'حجر' اور 'عقل' دونوں کا لغوی مفہوم قریب قریب ایک ہی ہے۔ ان دونوں ہی کے اندر روکنے اور باندھنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ عقل انسان کو ان چیزوں سے باز رکھنے کے لیے ایک باطنی لگام ہے جو اس کے شایانِ شان نہیں ہیں اس وجہ سے اس کو 'حجر' سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

اس آیت کا استفہامیہ اسلوب اپنے اندر زجر و ملامت کا مفہوم بھی رکھتا ہے اور اتمامِ حجت کا بھی۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو جب اللہ تعالیٰ نے عقل جیسی عظیم نعمت عطا فرمائی ہے تو اس کے شایانِ شان بات یہ ہے کہ وہ ان نشانیوں سے سبق حاصل کرے جو اس کے گرد و پیش پھیلی ہوئی زبانِ حال سے اصلی راہ اور منزل کی نشان دہی کر رہی ہیں نہ کہ اس بات پر ضد کرے کہ جب وہ منزل سامنے آ جائے گی تب وہ مانے گا کہ بے شک جن لوگوں نے اس سے خبردار کیا تھا انھوں نے سچ کہا تھا۔ اس وقت ماننا بھی تو حسرت کے سوا اس کو اس سے کیا فائدہ پہنچے گا! یہ مضمون اسی سورہ کی آیات ۲۳-۲۴ میں آگے آ رہا ہے۔ وہاں، ان شاء اللہ، اس کی وضاحت ہوگی۔

اتمامِ حجت کا پہلو یہ ہے کہ نشانیاں تو بے شمار ہیں جن کی طرف ان کو توجہ دلائی جا چکی ہے لیکن

ان میں سے کوئی نشانی بھی ان کو قائل کرنے والی نہ بنی۔ اب یہ وہ نشانیاں ان کے سامنے رکھی گئی ہیں جو سب سے زیادہ واضح اور قریب ہیں اور اہل عقل کے لیے ان کے اندر بہت بڑی شہادت موجود ہے۔ لیکن یہ ہٹ دھرم ان سے بھی فائدہ اٹھانے والے نہیں ہیں۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (۶-۸)

تاریخ کی شہادت

اوپر کی آفاقی نشانیوں کی شہادت کے بعد یہ قوموں کی تاریخ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس کی شہادت بھی یہی ہے کہ اس دنیا کا خالق اس میں ابھرنے والی قوموں کے رویہ سے بے تعلق نہیں رہتا بلکہ وہ برابر گھات لگائے ان کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ جب وہ بے راہ ہوتی ہیں تو وہ اپنی حکمت کے تحت ایک خاص مدت تک ان کو مہلت تو ضرور دیتا ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح کرلیں، اگر اصلاح کرنی چاہیں ورنہ اپنا پیمانہ بھرلیں۔ پھر وہ ان کو پکڑتا ہے اور اس طرح پکڑتا ہے کہ ان کی ہستی ہی مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ اس بات کی صاف شہادت ہے کہ اس مجموعی دنیا کے لیے بھی ایک روز حساب آئے گا جس میں ایک ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہوگا۔ پھر جو انعام کے مستحق ہوں گے وہ بھرپور انعام پائیں گے اور جو سزا کے مستحق ٹھہریں گے وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے۔

'عاد' کا ذکر پچھلی سورتوں میں، بار بار مختلف پہلوؤں سے گزر چکا ہے، یہاں ان کا ذکر 'اِرَمَ' کی نسبت کے ساتھ ہوا ہے۔ 'اِرَمَ' ان کے ان اجداد میں سے ہیں جن سے ان کی عسکری اور تعمیری ترقیوں کا آغاز ہوا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو اِرَم بن سام بن نوحؑ سے چلی۔

'عِمَادٌ' اونچے ستونوں کو کہتے ہیں۔ یہ ان کی تعمیری ترقیوں کی تعبیر کے لیے اسی طرح کا کنایہ ہے جس طرح سورۂ سبا میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے جود و کرم کی تعبیر 'جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَّاسِيَاتٍ'[1] (سبا-۳۴:۱۳) کے الفاظ سے کی گئی ہے۔

قوم عاد نے سنگ تراشی کے آرٹ میں بہت ترقی کی۔ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر انھوں نے نہایت خوبصورت ایوان و محل بنوائے۔ ان کے امراء کا خاص ذوق یہ تھا کہ ہر اونچی جگہ پر ان کی کوئی یادگار تعمیر ہو جائے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام نے ان کے اس مسرفانہ اور نمائش پسندانہ شوقِ تعمیر پر ان کو ملامت بھی فرمائی۔

---

[1] حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حوضوں کے مانند لگن اور لنگر انداز رہنے والی دیگوں کا ذکر ان کی فیاضی اور غرباء پروری کی شہادت کے طور پر ہوا ہے۔

۔ 'اَلَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُھَا فِی الْبِلَادِ' تعمیری ترقیوں کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اپنے قد و قامت اور زور و قوت کے لحاظ سے بھی نہایت نمایاں تھے۔ ان سے پہلے یا ان کی معاصر قوموں میں سے کوئی قوم ان کی برابری نہ کر سکی۔

وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (۹)

عاد کے بعد یہ بالاجمال ثمود کی طرف بھی اشارہ فرما دیا۔ یہ لوگ عاد ہی کے بقایا میں سے تھے اور تعمیر و تمدن کے شوق میں ان کے وارث ہوئے۔ چنانچہ ان کو عاد ثانیہ بھی کہا گیا ہے۔ 'وادالقریٰ' ان کا مسکن تھی۔ اس کے پہاڑوں میں انھوں نے اپنے اسلاف کے طریقہ پر پہاڑوں کو تراش تراش کر اپنے لیے گھر بنائے جس کی طرف 'جَابُوا الصَّخْرَ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ (۱۰)

اقوام بائدہ کی تباہی کے بعد یہ فرعون اور اس کی فوجوں کی تباہی کی طرف توجہ دلائی۔ 'ذِی الْاَوْتَادِ' کے لفظی معنی تو میخوں والے کے ہیں لیکن یہاں 'اوتاد' بطریق کنایہ فرعون کی فوجوں کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ فوجیں بالعموم خیموں میں رہتی ہیں اور خیمے میخوں سے نصب کیے جاتے ہیں اس وجہ سے عربی میں یہ تعبیر معروف ہے۔ فرعون کی فوجوں کی کثرت کا ذکر تورات میں بھی ہے اور قرآن میں بھی جگہ جگہ مثلاً ——— یونس، طٰہٰ، القصص اور الذّٰریٰت ——— میں آیا ہے۔ قدیم زمانے میں مستقل فوجیں رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ حملہ یا دفاع کی ضرورت کے لیے قبیلوں اور خاندانوں کے نوجوان بالکل وقت کے وقت اپنی خدمات پیش کرتے اور ضرورت پوری ہو جانے کے بعد منتشر ہو جاتے لیکن فرعون نے، تورات سے معلوم ہوتا ہے، ملک کی حفاظت کے لیے مستقل فوج قائم کی جو مملکت کے مختلف حصوں میں برابر، اپنے ڈیروں خیموں کے ساتھ گشت کرتی رہتی۔ اس نے اپنے نوابوں اور امراء پر بھی یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ ایک خاص تعداد میں اسلحہ، گھوڑے اور رتھ تیار رکھیں تاکہ ضرورت پڑنے پر حکومت کی مؤثر خدمت کر سکیں۔ اسی خصوصی امتیاز کی بنا پر فرعون کو 'ذُو الْاَوْتَادِ' کہا گیا۔

اَلَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ ﴿۱۱﴾ فَاَکْثَرُوْا فِیْھَا الْفَسَادَ ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ عَلَیْھِمْ رَبُّکَ سَوْطَ عَذَابٍ (۱۱-۱۳)

قوموں کا طغیان

یہ ان قوموں کے اس رویہ کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی حکومت اور اس کے عطا کیے ہوئے وسائل و ذرائع کو پا کر اپنے اپنے ملکوں میں اختیار کیا۔ فرمایا کہ انھوں نے طغیان کی روش اختیار کر لی۔ یعنی وہ خدا سے بالکل بے نیاز و بے خوف ہو کر اس گھمنڈ میں مبتلا ہو گئیں کہ انھیں جو کچھ حاصل ہے یہ ان کی اپنی ذاتی قابلیت و کارکردگی کا کرشمہ ہے جس میں

وہ ہر قسم کے تصرف کی مجاز ہیں۔ مال و جاہ نہ ان کو کسی کا بخشا ہوا ملا ہے، نہ اس کو کوئی ان سے چھین سکتا اور نہ اس کے باب میں وہ کسی کے آگے مسئول ہیں۔

'فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ' یہ مذکورہ بالا طغیان کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جانے کے بعد ان کے قدم زندگی کی صراط مستقیم سے ہٹ گئے۔ انھوں نے اپنی باگ نفس اور شیطان کے ہاتھ میں پکڑا دی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد پھیل گیا۔

قوموں کے باب میں سنت الٰہی

'فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ' یہ اس فساد کے غلبہ کا انجام بیان ہوا ہے کہ جب ان کے ہر شعبۂ زندگی میں فساد سرایت کر گیا تو اس کا قدرتی انجام ان کے سامنے اس شکل میں آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب کے کوڑے برسا دیے۔ یہ عذاب جن جن شکلوں میں آیا اس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ جب کسی قوم کو اپنی زمین میں اقتدار و اختیار بخشتا ہے تو اس کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ نہیں دیا کرتا بلکہ وہ اس کی نگرانی کرتا رہتا ہے کہ وہ اس اقتدار کو کس طرح استعمال کرتی ہے۔ اگر وہ اس کو خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر استعمال کرتی ہے تو اس کو اس سے بہرہ مند ہونے کی سعادت حاصل ہوتی ہے اور اگر وہ طغیان میں مبتلا ہو کر خدا کے حدود سے باہر نکل جاتی ہے تو اس کو اصلاح یا اتمام حجت کے لیے ایک خاص حد تک مہلت ملتی ہے۔ اگر اس مہلت سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ اس کا طغیان و فساد بڑھتا ہی جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فنا کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا وجود نہ خود اس کے لیے نافع رہ جاتا نہ دوسروں کے لیے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ بالکل اٹل ہوتا ہے۔ جب یہ صادر ہو جاتا ہے تو کوئی قوم، خواہ وہ کتنے ہی وسائل و ذرائع کی مالک ہو، نہ اس کی راہ روک سکتی نہ اس کا رخ ہی بدل سکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی ہی قوموں کو ان کے دورِ عروج میں پکڑا اور پکڑ کر اس طرح مسل دیا کہ ان کا نام و نشان ہی صفحۂ دہر سے مٹ گیا۔

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (۱۴)

خلاصۂ بحث

یہ ان تمام قسموں کا جو سورہ کی تمہید میں آئی ہیں اور ان تاریخی سرگزشتوں کا جن کی طرف اوپر اشارہ فرمایا ہے، خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے۔ گویا موقع و محل اور مدعا کے اعتبار سے اس آیت کو سورہ میں مقسم علیہ کی حیثیت حاصل ہے جس کی تائید آفاق کے آثار بھی کر رہے ہیں اور تاریخ کے واقعات بھی۔

'مِرْصَادٌ' گھات لگانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آفاق اور تاریخ دونوں کے

شواہد اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ کائنات کا خالق اس کو پیدا کر کے اس سے الگ تھلگ نہیں جا بیٹھا ہے بلکہ اس کی نگاہ ایک ایک چیز کی نگرانی کر رہی ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اس سے اوجھل ہو سکے۔ ہر چیز کی باگ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کوئی قوم طغیان کی روش اختیار کرتی ہے تو وہ اس کو مہلت تو ضرور دیتا ہے لیکن اس کی ایک خاص حد مقرر ہوتی ہے جس کو لانگنے کی اجازت وہ نہیں دیتا۔ کوئی قوم اگر اس کو لانگنے کی جسارت کرتی ہے تو وہ فوراً اس کو دھر لیتا ہے اور پھر کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کی گرفت سے چھوٹ سکے۔

یہ صورت حال اس امر کی نہایت واضح دلیل ہے کہ یہ دنیا کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے بلکہ ایک حکیم و قدیر کا بنایا ہوا، ایک با مقصد و با غایت کارخانہ ہے۔ اس کی ایک ایک چیز کے ساتھ اس کے خالق کو جو تعلق ہے اور اس کے اندر قوموں کے عزل و نصب کا جو ضابطہ اس نے جاری کر رکھا ہے وہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے ساتھ ایک روزِ جزا و سزا ہے جو لازماً ظہور میں آئے گا اور اس دن ہر شخص جس نے اپنی زندگی اپنے رب کے احکام کے تحت گزاری اپنے رب کی خوشنودی سے نوازا جائے گا اور جس نے اس کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ کر اس میں فساد مچایا وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۗ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (۱۵-۱۶)

انسان کا ایک مغالطہ

یہ اس مغالطہ سے پردہ اٹھایا جس میں مبتلا ہونے والے نعمت پا کر طغیان و فساد کی راہ اختیار کر لیتے ہیں اور جو نعمت سے محروم رہتے ہیں وہ یاس و نا امیدی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ مغالطہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جس کو نعمت کی فراخی حاصل ہوتی ہے وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں بڑی قدر و قیمت والا ہے اس وجہ سے اس نے اس کی شان بڑھا رکھی ہے۔ اس کے برعکس جو تنگیٔ رزق میں مبتلا ہوتا ہے وہ گمان کرتا ہے کہ خدا کی نظروں میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اس وجہ سے اس نے اس کو ذلتیں جھیلنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اس مغالطہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پہلا فخر و غرور میں مبتلا ہو کر طغیان و فساد کی راہ پر چل پڑتا ہے اور دوسرا مایوسی و نامرادی کا شکار ہو کر یا تو صحیح زندگی بسر کرنے کا حوصلہ ہی کھو بیٹھتا ہے یا قسمت آزمائی کی ایسی راہیں اختیار کر لیتا ہے جو اس کو خدا سے نہایت ہی دور لے جا پھینکتی ہیں اور وہ بالکل شیطان کے پیچھے چڑھ جاتا ہے۔ حالانکہ اس دنیا میں انسان کو تنگی کی حالت پیش آئے یا فراخی کی، جو حالت بھی پیش آتی ہے، نہ اس کی سرفرازی کی خاطر پیش آتی نہ اس

کی تذلیل و توہین کے لیے بلکہ یہ دونوں ہی بطور امتحان پیش آتی ہیں۔ کسی کو اللہ فراخی بخشتا ہے تو اس سے مقصود اس کے شکر کو جانچنا ہوتا ہے کہ دیکھے وہ نعمتیں پا کر مغرور و متکبر اور دوسروں کو حقیر خیال کرنے والا بن جاتا ہے یا اپنے رب کا شکرگزار، فرمانبردار اور اس کے بندوں کا خدمت گزار بن کے زندگی بسر کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا رزق تنگ کر دیتا ہے تو اس سے مقصود اس کے صبر کا امتحان ہوتا ہے کہ دیکھے وہ اپنے رب کے فیصلہ پر قانع و مطمئن، حالات کے مقابلہ کے لیے مضبوط و استوار اور اپنے کردار میں پختہ و پائدار ثابت ہوتا ہے یا حوصلہ ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ انسان کے صبر و شکر کی پختگی ہی پر اس کے تمام دین کی پختگی کا انحصار ہے۔ اس وجہ سے ان دونوں چیزوں کا امتحان برابر ہوتا رہتا ہے جس نے اپنے اندر یہ دونوں صفتیں پیدا کر لیں تو اس کو نفس مطمئنہ کی دولتِ گراں مایہ حاصل ہو گئی اور آگے آپ دیکھیں گے کہ اسی کو اللہ تعالیٰ کے ہاں 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کی بادشاہی حاصل ہوگی۔

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۱۷-۲۰)

مغالطہ کا ازالہ

اوپر بات اصولی رنگ میں فرمائی ہے لیکن ان آیات میں مکّہ اور طائف کے مالداروں کو براہِ راست خطاب کر کے تنبیہ کی گئی ہے کہ تمھارا یہ گمان بالکل بے بنیاد ہے کہ جس کو مال کی فراوانی حاصل ہوتی ہے یہ اس کی عزت افزائی کی دلیل ہے۔ یہ عزت افزائی کے لیے نہیں بلکہ امتحان کے لیے ہوتی ہے کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی نعمت پا کر اپنی عزت کے پندار میں مبتلا ہو جاتا ہے یا اس کو یتیموں، مسکینوں کی خدمت اور ان کے اکرام و تواضع کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہ محض تمھاری سفاہت ہے کہ تم خدا کے فضل و احسان کا بالکل الٹا مفہوم لیتے ہو۔ ہونا تو یہ تھا کہ تم اپنے رب کے شکرگزار بنتے، یتیموں اور مسکینوں کی خدمت خود بھی کرتے اور دوسروں کو بھی اس پر ابھارتے لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ تم اپنی عزت کے گھمنڈ میں مبتلا ہو کر یتیموں کو حقیر سمجھتے اور مسکینوں کی مدد سے جی چراتے ہو۔

سوسائٹی میں یتیموں کا مقام

یتیموں کے لیے یہاں لفظ 'اکرام' استعمال ہوا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مطلوب صرف یہ نہیں ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں مالدار لوگ ان کی کچھ مدد کر دیا کریں بلکہ اصل مطلوب یہ ہے کہ سوسائٹی میں ان کو عزت کا مقام حاصل ہو۔ وہ دھکے کھاتے نہ پھریں بلکہ جہاں بھی جائیں لوگ ان کو احترام سے دیکھیں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ خدا نے ان کو جو مال عطا فرمایا ہے اس کی کوئی وقعت خدا کے ہاں ہے تو اسی شکل میں ہے جب یتیموں کی خدمت کر کے ان کا مال اپنے لیے شرف کا مقام پیدا کرے۔ ورنہ وہ شرف کا ذریعہ نہیں بلکہ وبال اور رسوائی ہے۔

'تَحٰٓضُّوْنَ' کے معنی ایک دوسرے کو کسی کام پر ابھارنے اور اکسانے کے ہیں۔ یعنی مسکینوں کے معاملے میں عنداللہ مطلوب صرف یہ نہیں ہے کہ لوگ ان کے آگے کچھ نوالے پھینک دیں بلکہ سوسائٹی کے اندر ان کی خدمت کے لیے یہ سرگرمی ہونی چاہیے کہ ہر صاحبِ مقدرت خود بھی ان کی خدمت کرے اور دوسروں کو بھی ابھارے۔ یہ نہ ہو کہ نہ خود دے اور نہ دوسروں کو کچھ دینے دے تاکہ اس کی بخیلی پر پردہ پڑا رہے۔

لفظ 'طَعَام' یہاں محدود معنوں میں نہیں بلکہ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ مقصود ان کی ضروریات کا اہتمام ہے۔

عربِ جاہلیت پر زور آور عصبات کا کردار

'وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا'۔ 'لَمٌّ' کے معنی جمع کرنے اور سمیٹنے کے ہیں اور 'تَاْكُلُوْنَ' یہاں ہڑپ کر جانے کے معنی میں ہے۔ یعنی مال کی محبت میں تم اس قدر اندھے ہو گئے ہو کہ تمھارے اندر جو زور آور عصبات ہیں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مورث کی چھوڑی ہوئی املاک و جائداد سب سمیٹ کر وہ تنہا ہڑپ کر جائیں، دوسرے کمزور وارثوں، یہاں تک کہ مورث کے یتیم بیٹوں بیٹیوں کو بھی اس میں سے حصہ نہ ملے۔ عرب جاہلیت میں بھی اگرچہ تقسیمِ وراثت کا ایک ضابطہ تھا لیکن جس طرح اس زمانے میں اسلام کے نہایت واضح ضابطہ کے باوجود زور و اثر رکھنے والے افراد دھاندلی سے باز نہیں آتے بلکہ کھلم کھلا کمزور وارثوں کی حق تلفی کرتے ہیں اسی طرح اس زمانے میں بھی زور آور لوگوں نے ایک من مانا ضابطہ بنا لیا تھا جس میں سارا حق اس کا تھا جو قوی ہو، کمزوروں کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔

'وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا'۔ اس گھنونے کردار کی تہ میں جو چیز چھپی ہوئی ہے یہ اس کا سراغ دیا ہے۔ فرمایا کہ تمھارے اندر ساری قدر و قیمت بس مال کی رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ انسانیت، شرافت، عدل اور رحم کے جتنے اقدار بھی ہیں وہ سب اس کے نیچے دب کر دم توڑ چکے ہیں۔ مال کی محبت تمھارے دلوں پر اس طرح چھا گئی ہے کہ اب کسی اور اعلیٰ قدر کی اس کے اندر راہ پانے کی کوئی گنجائش باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ وَجِایْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۝ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ۝ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ (۲۱-۲۴)

مال کے پرستاروں کو تنبیہ

یہ مال کے پرستاروں کو اس دن کی یاددہانی کی گئی ہے جب وہ چیتیں گے اور حسرت کریں گے کہ کاش انھوں نے اپنے مال کو اس دن کی تیاریوں میں صرف کیا ہوتا لیکن اس وقت کا چیتنا بالکل بے سود ہوگا۔ وہ وقت چیتنے کا نہیں بلکہ نتائجِ اعمال کے بھگتنے کا ہوگا۔

'كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا'۔ 'كَلَّا' یہاں ان کے اس زعم کی تردید کے لیے ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ جس کو مال ملتا ہے وہ اس خبط میں پڑ جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی سرفرازی اور عزت افزائی ہوئی ہے حالانکہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی کسی کو ملتی ہے تو سرفرازی کے لیے نہیں بلکہ صرف امتحان کے لیے ملتی ہے۔ ایک دن آئے گا کہ ہر چیز نیست و نابود کر دی جائے گی اور انسان کو صرف اپنے نتائجِ اعمال سے سابقہ پیش آئے گا۔

'دَكُّ الْاَرْضِ' کے معنی ہیں سَوّٰى صَعُوْدَهَا وَهُبُوْطَهَا زمین کی ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر اس کے تمام نشیب و فراز اور اونچ نیچ برابر کر دیے۔ قیامت کے دن زمین کا جو حال ہو گا اس کی تصویر سورۂ کہف میں یوں کھینچی گئی ہے:

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ	زمین کے اوپر جو کچھ بھی ہے ہم نے اس کے لیے
زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ	اس کو سنگھار بنایا ہے تاکہ ہم امتحان کریں کہ
اَحْسَنُ عَمَلًا ٥ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا	لوگوں میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے اور ایک
عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ٥	دن ہم اس سب کو جو اس کے اوپر ہے صفاچٹ
(الکہف - ۱۸ : ۷ - ۸)	میدان کر دینے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اس زمین کے اوپر جو کچھ بھی ہے محض وقتی سنگھار کے طور پر ہے مقصود اس سے لوگوں کا امتحان ہے کہ لوگ اسی پر ریجھ کر رہ جاتے ہیں یا اس کے ساتھ جو آخرت لگی ہوئی ہے اس کی فکر بھی کچھ کرتے ہیں۔ بالآخر ایک دن ایسا آنے والا ہے جب اس کا یہ سارا سنگھار چھین جائے گا۔ نہ اس کے دریا اور پہاڑ باقی رہیں گے، نہ وادی و کہسار، نہ باغ و چمن رہیں گے اور نہ ایوان و محل، صرف صفاچٹ میدان رہ جائے گا۔

'وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا' یعنی آج تو اللہ تعالیٰ پسِ پردہ بیٹھا ہوا لوگوں کا امتحان کر رہا ہے لیکن اس دن یہ پردہ اٹھا دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے کروبیوں کے جلو میں نمودار ہو گا۔ اس وقت اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر اس طرح لوگوں کے سامنے آ جائے گی کہ کسی کے لیے بھی اس میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ کا نمودار ہونا کس طرح ہو گا تو اس کا تعلق احوالِ آخرت سے ہے جن کی تفصیلات متشابہات میں داخل ہیں، ان پر اجمالی ایمان ہی کافی ہے۔ ان کی زیادہ کھوج کرید کی جائے تو اندیشہ فتنہ میں پڑ جانے کا ہوتا ہے۔

'وَجِایْٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى'۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ظہور کے ساتھ وہ جنت اور دوزخ بھی بے نقاب کر دی جائیں گی جو جزا اور

سزا کے لیے پہلے سے تیار رہیں۔ سورہ میں اصل خطاب چونکہ معاندین سے ہے اس وجہ سے پہلے جہنم کا ذکر فرمایا کہ وہ لائی جائے گی۔ اس کو دیکھتے ہی وہ سارے لوگ، جو آخرت سے بے پروا رہے اپنی محرومی پر سر پیٹ لیں گے اور حسرت سے کہیں گے کہ کاش ہم نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ کر لیا ہوتا۔ فرمایا کہ یہ چیز پہلے ہی سوچنے اور کرنے کی تھی۔ جب وہ یہاں اس کو نہ چیت سکیں گے تو اتنی دور جا کر وہ اس کو چیتیں گے تو اس سے حسرت کے سوا اور کیا حاصل ہوگا!

'یَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِیۡ قَدَّمۡتُ لِحَیَاتِیۡ' یہ وضاحت ہے اس چیتنے کی جس کی طرف اوپر والی آیت میں 'یَتَذَکَّرُ الۡاِنۡسَانُ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے کہ اس دن وہی لوگ جو آج قیامت سے آگاہ کرنے والوں کو بے وقوف ٹھہرا رہے ہیں نہایت حسرت و اندوہ کے ساتھ کہیں گے کہ کاش، اپنی اس زندگی کے لیے ہم نے دنیا کی زندگی میں کچھ کر لیا ہوتا! مطلب یہ ہے کہ وہ اس دن حسرت تو کریں گے لیکن ان کی یہ حسرت بے سود رہے گی۔ اس کی تلافی کا وقت گزر چکا ہوگا۔

فَیَوۡمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَہٗۤ اَحَدٌ ﴿ۙ﴾ وَّ لَا یُوۡثِقُ وَ ثَاقَہٗۤ اَحَدٌ (۲۵-۲۶)

یہ اس دن کے عذاب کی شدت اور بے پناہی کا بیان ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ جو عذاب دے گا اس طرح کا عذاب کوئی نہیں دے سکتا اور جس طرح کا باندھنا وہ باندھے گا اس طرح کا باندھنا کوئی نہیں باندھ سکتا ــــــ یہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے۔ اس لیے کہ اس دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کی طرح اس کی تکلیفیں اور اذیتیں بھی فانی اور وقتی ہیں۔ بڑی سے بڑی تکلیف بھی کوئی دے گا تو موت بہرحال اس کو ختم کر سکتی ہے اسی طرح طویل سے طویل قید میں بھی کوئی ڈالے گا تو موت کا فرشتہ اس سے بھی رہائی دلا سکتا ہے لیکن آخرت کے عذاب اور اس کی قید سے رہائی دلانے کے لیے وہاں موت بھی نہیں ہوگی۔

یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ ﴿٭ۖ﴾ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً ﴿ۚ﴾ فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ ﴿ۙ﴾ وَ ادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ (۲۷-۳۰)

مستحقین جنت کو براہِ راست بشارت

اس دن مستحقین جنت کو جو بشارت براہِ راست ربِ کریم کی طرف سے ملے گی یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں خاص توجہ کی چیز 'یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ' کا خطاب ہے جس سے جنت کے مستحقین کو نوازا جائے گا۔ اس خطاب سے ان کے نفس کی اس خاص صفت پر روشنی پڑ رہی ہے جس کی بنا پر وہ جنت کے حقدار قرار پائیں گے۔ اوپر آیات ۱۵-۱۶ میں ان تنگ ظرفوں اور تھڑدلوں کا حال بیان ہوا تھا جن کو نعمت ملتی ہے تو وہ بہک کر اترانے اور فخر کرنے والے بن جاتے ہیں اور جب ذرا تنگیٔ رزق کی آزمائش پیش آ جائے تو بالکل دل شکستہ ہو کر خدا سے مایوس اور ناشکرے بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا انجام بیان ہوا۔ اب اس کے مقابل میں ان لوگوں کا حال اور انجام بیان

ہو رہا ہے جن کے قدم تنگی اور فراخی دونوں طرح کے حالات میں جادۂ حق پر استوار رہتے ہیں
نعمت ملتی ہے تو وہ اس کو اپنے شکر کا امتحان سمجھتے ہیں اور طغیان و فساد میں مبتلا ہونے کے بجائے
کوشش کرتے ہیں کہ اپنے رب کے امتحان میں پورے اتریں اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان
فرمایا ہے وہ بھی اللہ کے بندوں پر احسان کریں۔ اسی طرح اگر ان کو تنگیٔ رزق سے سابقہ پیش
آتا ہے تو بے حوصلہ اور اپنے رب سے مایوس ہونے کے بجائے اس کو وہ اپنے صبر کا امتحان
سمجھتے ہیں اور جان کی بازی لگا کر کوشش کرتے ہیں کہ اس امتحان سے سرخرو نکلیں، نہ دنیا میں ان
کو اپنے ضمیر کے آگے شرمندہ ہونا پڑے نہ آخرت میں اپنے رب کے آگے۔ ان لوگوں کا دل چونکہ
عُسر و یُسر اور نرمی و سختی دونوں طرح کے حالات میں اپنے رب سے راضی و مطمئن اور ڈانواں ڈول
ہونے سے محفوظ رہتا ہے اس وجہ سے اس کو نفسِ مطمئنہ سے تعبیر فرمایا ہے اور یہی لوگ ہیں
جو جنت کے وارث ہوں گے۔

'اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً' یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین و آفرین کا کلمہ
ہے۔ ان لوگوں کو خطاب کر کے ارشاد ہوگا کہ شاباش! تمھارے رب نے جس میدانِ امتحان میں تمھیں
اتارا اس میں تمھاری بازی نہایت کامیاب رہی۔ اب تم اپنے رب کی طرف اس سرخروئی کے
ساتھ لوٹو کہ تم نے ثابت کر دیا کہ تم ہر طرح کے نرم و گرم حالات میں اپنے رب سے راضی و مطمئن
رہے اور ساتھ ہی تمھیں یہ سرفرازی بھی حاصل ہوئی کہ تم اپنے رب کی نظروں میں بھی پسندیدہ
ٹھہرے۔ جس طرح تم اپنے رب سے کسی مرحلے میں گلہ مند نہیں ہوئے اسی طرح تمھارے رب
نے تم کو بھی کسی مرحلے میں اپنے معیار سے فروتر نہیں پایا۔ تم اس سے راضی وہ تم سے راضی!
'فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۵ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ' یعنی تم امتحان پاس کر کے جنت کے مستحق
ٹھہرے تو اب میرے خاص بندوں کے زمرے میں اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔
توفیقِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہٖ۔

لاہور
۱۴- دسمبر ۱۹۷۹ء
۲۴- محرم الحرام ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۹۰

البلد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــــ الفجر ـــــــ کی توام ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ سابق سورہ میں انسان کی اس غلط فہمی پر تنبیہ فرمایا گیا ہے کہ جب اس کو نعمت ملتی ہے تو وہ یہ خیال کرکے اکڑنے اور اترانے لگتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی عزت افزائی فرمائی ہے اور اگر کوئی آزمائش پیش آجاتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے کہ یہ اس کی حق تلفی ہوئی ہے اور خدا نے اس کو ذلیل کر دیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی حالت بھی نہ عزت افزائی کے لیے پیش آتی نہ ذلیل کرنے کے لیے بلکہ ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ بندے کے شکر یا صبر کا امتحان کرتا ہے۔ انسان کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ نہ نعمت پاکر اکڑنے والا بنے نہ اس سے محروم ہو کر دل شکستہ و مایوس ہو بلکہ نعمت ملے تو اپنے رب کا شکرگزار بندہ بنے اور اس نعمت میں اللہ کے دوسرے حاجتمند بندوں کو شریک کرے اور اگر کوئی افتاد پیش آئے تو اپنی محرومی کا رونا رونے اور خدا کو کوسنے کے بجائے فیصلۂ تقدیر پر صابر و راضی رہے۔ جو بندہ یہ روش اختیار کرتا ہے اس کا نفس 'نفسِ مطمئنہ' ہے اور آخرت میں اس کو رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کی بادشاہی حاصل ہوگی۔

اس سورہ میں اسی کلیہ کو قریش پر منطبق کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ یہ سرزمین ـــــــ سرزمین مکہ ـــــــ اس زمانے میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہاں بسایا ہے، رزق کے وسائل سے بھی محروم تھی اور امن سے بھی۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کے لیے رزق اور امن کی جو دعا فرمائی اس کی برکت سے یہاں رزق کی بھی فراوانی ہوئی اور امن کے اعتبار سے بھی اس علاقے کا یہ حال ہوا کہ یہاں کسی انسان تو درکنار کسی جانور کو بھی دکھ پہنچانا گناہ ٹھہرا۔ اسی امن اور رزق کا یہ فیض ہے کہ اولادِ اسمٰعیل یہاں خوب پھلی پھولی اور اس پورے ملک پر اس کو سیادت و قیادت حاصل ہوئی۔ لیکن یہ نعمتیں پاکر اپنی پچھلی تاریخ یہ لوگ بھول بیٹھے۔ اب یہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ یہ جو کچھ ان کو

حاصل ہے ان کا پیدائشی حق ہے، خدا کی راہ میں خرچ کرنا ان کے دلوں پر بہت گراں گزرتا ہے۔ ان کی آنکھیں عبرت نگاہی سے محروم اور زبانیں حق و صبر اور نیکی و احسان کے ذکر سے گنگ ہو چکی ہیں۔ اب ان کا مال ان کی اپنی عیاشیوں اور فضول خرچیوں کے لیے ہے۔ کوئی نہیں ہے جو یتیموں اور مسکینوں کی خدمت کی راہ میں کوئی قربانی پیش کرنے اور آخرت کی ابدی فائز المرامی حاصل کرنے کا حوصلہ کرے بلکہ سب نے جہنم کی راہ اختیار کر لی ہے۔

یہ سورتیں چونکہ بالکل ابتدائی دور کی ہیں اس وجہ سے ان میں خطاب بھی بالعموم یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ سے ہے اور ان میں جو دعوت یا اپیل ہے وہ بھی تمام تر انسانیت اور اس کے فطری مبادی پر مبنی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۴) سرزمین حرم اور بنی اسمٰعیل کی ابتدائی تاریخ سے اس بات کی شہادت کہ یہ علاقہ بالکل بے آب و گیاہ تھا جس میں زندگی نہایت مشقت کی زندگی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے یہ ایک پُرامن علاقہ بن گیا اور اس کے باشندوں کو رزق و مال کی فراوانی حاصل ہوئی۔

(۵-۷) اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کا حق یہ تھا کہ لوگ اس کے شکرگزار اور اس کے غریب بندوں کے ہمدرد و مددگار بنتے لیکن حال یہ ہے کہ اگر راہِ خدا میں ان کو انفاق کی دعوت دی جائے تو کہتے ہیں کہ کہاں تک کوئی خرچ کرے؟ ڈھیروں مال تو اڑا چکے! گویا ان کو گمان ہے کہ خدا ان کی ان شاہ خرچیوں کو دیکھ نہیں رہا ہے!

(۸-۱۷) ان زرپرستوں کو ملامت کہ اللہ نے ان کو آنکھیں دی تھیں کہ ان سے عبرت حاصل کرتے، زبان اور ہونٹ دیے تھے کہ ان سے لوگوں کو یتیموں اور مسکینوں کی اعانت پر ابھارتے، نیکی اور بدی کا امتیاز دیا تھا کہ بدی کی ترغیبات کا مقابلہ کر کے نیکی کے کام کرتے، یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرتے، ایمان والوں اور صبر و ہمدردی کی دعوت دینے والوں میں سے بنتے لیکن یہ سب کچھ پا کر وہ اپنے رب کے شکرگزار بننے کے بجائے اپنے نفس اور مال کے پرستار بن کر بیٹھ رہے۔

(۱۸-۲۰) حالانکہ اگر یہ راہ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں بڑے اجر کے مستحق ٹھہرتے لیکن انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار اور اپنے لیے دوزخ کی آگ کا سامان کیا۔

سُورَةُ الْبَلَدِ

مَكِّيَّةٌ ـــــ آيات : ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۲۰
لَآ أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿١﴾ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿٢﴾ وَ
وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ﴿٣﴾ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ﴿٤﴾
وقف لازم أَيَحْسَبُ أَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ﴿٥﴾ يَقُوْلُ أَهْلَكْتُ
مَالًا لُّبَدًا ﴿٦﴾ أَيَحْسَبُ أَنْ لَّمْ يَرَهٗ أَحَدٌ ﴿٧﴾ أَلَمْ نَجْعَلْ
لَّهٗ عَيْنَيْنِ ﴿٨﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ﴿٩﴾ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿١٠﴾
فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿١١﴾ وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿١٢﴾ فَكُّ
رَقَبَةٍ ﴿١٣﴾ أَوْ إِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿١٤﴾ يَّتِيْمًا
ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿١٥﴾ أَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿١٦﴾ ثُمَّ كَانَ
مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿١٧﴾
أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿١٨﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ
ع ۱ ۲۰ ۱۵ أَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿١٩﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿٢٠﴾

ترجمۂ آیات ۱-۲۰
نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس سرزمین کی ـــــ اور تم اسی میں مقیم ہو ـــــ اور باپ اور اس کی ذریت کی کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا۔ ۱-۴

کیا وہ گمان رکھتا ہے کہ اس پر کسی کا زور نہیں! کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا! کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں! ۵-۷

کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے اور اس کو دونوں راہیں نہیں سجھا دیں! پر اس نے گھاٹی نہیں پار کی اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ گھاٹی! گردن کو چھڑانا یا بھوک کے زمانے میں کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھلانا ــــ پھر وہ بنے ان میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی۔ یہی خوش بخت لوگ ہیں۔ اور جنھوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہ کم بختی والے ہیں۔ وہ آگ میں موندے ہوئے ہوں گے۔ ۸-۲۰

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ (۱)

قسم سے پہلے 'لا' کا محل استعمال — یہاں 'لَا' اسی طرح آیا ہے جس طرح 'لَآ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ' (القیٰمۃ - ۷۵: ۱) اور بعض دوسرے مقامات میں آیا ہے۔ اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہ قسم سے پہلے مخاطب کے اس خیالِ باطل کی تردید کے لیے ہے جس کا سابق سورہ میں حوالہ ہے۔ سابق سورہ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ لوگوں کو جب مال و جاہ کی نعمت ملتی ہے تو اس کو اپنی تدبیر و تدبر کا کرشمہ سمجھ بیٹھتے اور اترانے ہیں کہ وہ خدا کی نظروں میں بلند مرتبہ ہیں اس وجہ سے اس نے دوسروں کے مقابل میں ان کو یہ سرفرازی بخشی ہے۔ اس خیالِ باطل کی تردید سابق سورہ میں ایک دوسرے پہلو سے ہوئی ہے۔ اس سورہ میں اس کی تردید ایک اور پہلو سے آ رہی ہے جس کا آغاز قسم سے ہوا ہے اور اس قسم سے پہلے 'لَا' ان کے زعمِ باطل کی تردید کے لیے ہے۔ گویا ان لوگوں کا یہ خیال اس قدر بے بنیاد اور لغو ہے کہ اس کی تردید میں اتنے توقف کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ دلیل بیان کر لینے کے بعد اس کی نفی کی جائے۔ یہ اسلوبِ کلام ہر زبان میں پایا جاتا اور اس موقع پر اختیار کیا جاتا ہے جب مقصود مخاطب کے خیال کی لغویت کا اظہار ہو۔

اصل دعویٰ جس پر قسم کھائی گئی ہے — قسم یہاں بطورِ شہادت اصل دعوے کی تائید میں کھائی گئی جو آگے 'لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِيۡ كَبَدٍ' (۴) کے الفاظ میں مذکور ہے۔

'بِهٰذَا الۡبَلَدِ' سے مراد سرزمینِ مکہ ہے۔ سورۂ تین میں بھی اس کی قسم 'وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِيۡنِ' (التین - ۹۵: ۳) کے الفاظ سے کھائی گئی ہے۔ قرآن مجید کی دوسری قسموں کی طرح یہ قسم بھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سرزمینِ حرم کے تقدس کے پہلو سے نہیں بلکہ اس دعوے پر دلیل کے پہلو سے کھائی گئی ہے جو آگے مذکور ہے۔

وَاَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ (۲)

ایک برمحل جملہ معترضہ — یہ جملہ قسم کے بیچ میں بطور جملہ معترضہ، قسم کی تائید و تصویب کے طور پر ہے۔ ضمیر خطاب کے مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہو سکتے ہیں اور قریش بھی۔ دونوں ہی صورتوں میں اصل مدعا کے اعتبار سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کسی ایسے دور دراز علاقے کی شہادت نہیں پیش کی جا رہی ہے جس کے حالات کا اندازہ کرنے اور جس کی تاریخ کا علم حاصل کرنے

کے لیے کوئی زحمتِ سفر اٹھانی پڑے بلکہ تم یہاں مقیم اور اس کے ماضی و حاضر سے اچھی طرح باخبر ہو۔ یہ تمھارا مامن و مستقر اور تمھارا محبوب وطن ہے۔ اس کی تاریخ تمھاری اپنی ہی تاریخ ہے۔ اس کے گرم و سرد اور خشک و تر دونوں سے تم گزرے ہوئے ہو۔ اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہو کہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ حرف حرف حق ہے یا اس میں کوئی مبالغہ یا آورد ہے۔

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ (۳)

حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کی شہادت

جملہ معترضہ کے بعد یہ ٹکڑا قسم سے متعلق اور اس کی تکمیل ہے۔ سرزمینِ مکہ کی قسم کے بعد اس میں بسنے والے باپ اور اس کی ذریت کی قسم ہے۔ 'وَالِدٍ' سے مراد ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام اور 'وَمَا وَلَدَ' سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذرّیت ہے جو سرزمینِ مکہ میں آباد ہوئی اور پھر تمام عرب میں پھیلی۔ لفظ 'وَالِدٍ' کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور اس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی مراد لیے جا سکتے ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی۔ اسی طرح 'وَمَا وَلَدَ' میں جو تعمیم ہے وہ تمام بنی اسماعیل پر حاوی ہے، خواہ ان کا تعلق بنی اسماعیل کی کسی شاخ سے بھی ہو۔

سرزمینِ مکہ کی پچھلی تاریخ کی طرف اشارہ

'لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ (۴)' 'کبد' کے معنی مشقّت اور شدّت کے ہیں۔ لفظ 'اِنْسَان' اگرچہ عام ہے اور اس کے عام ہونے کے کئی فائدے ہیں لیکن یہاں اس عام سے مراد خاص طور پر قرآن کے اولین مخاطب بنی اسماعیل بالخصوص قریش ہیں۔ سرزمینِ حرم میں ان کے بزرگ اجداد کی آمد اور سکونت اور ان کی ذریت کی ابتدائی تاریخ کا حوالہ دے کر قریش کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ آج اس سرزمین میں تم کو جو فراخیٔ رزق و رفاہیت حاصل ہے یہ نہ سمجھو کہ یہی حال ہمیشہ سے رہا ہے یا یہ حالت تمھاری ذہانت و قابلیت کی بدولت ہوئی ہے۔ جس زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا ہے اس وقت یہ علاقہ ایک بالکل بنجر، بے آب و گیاہ اور غیر مامون علاقہ تھا۔ یہاں کے لوگوں کی زندگی خانہ بدوشانہ اور نہایت مشقت کی زندگی تھی۔ معاش کا انحصار گلہ بانی پر تھا اور ہر شخص اپنی زندگی اور اپنے گلے کی حفاظت کا ذمہ دار خود تھا۔ لوگوں کی حفاظت کے لیے کوئی نظامِ عدل اور قانون موجود نہیں تھا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہاں بسایا تو ان کے اور ان کی اولاد کے لیے یہ دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس وادیٔ غیر ذی زرع میں ان کو رزق و فضل سے بھی بہرہ مند فرمائے اور امن سے بھی متمتع رکھے۔ یہ اسی دعا کی برکت ہے کہ رزق کے دروازے بھی کھلے اور بیت اللہ کی تولیت اور شہرِ حرم کی امن بخشی کی بدولت سفر و تجارت کی راہیں بھی فراخ ہوئیں جس سے ان کی معاشی حالت مشقت کی جگہ رفاہیت و خوش حالی میں

تبدیل ہوگئی یہاں تک کہ آج تم اس کے غرور میں نہ خدا کو خاطر میں لا رہے ہو نہ اس کے رسول کو بلکہ یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہ جو کچھ تمھیں حاصل ہے یہ تمھارا پیدائشی حق ہے، تم اس میں ہر قسم کے تصرّف کے مجاز ہو، کسی کی طاقت نہیں ہے کہ تمھارے اس عیش اور اس آزادی میں خلل انداز ہو سکے۔

قریش کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے قرآن نے جگہ جگہ حرم کی اس تاریخ کی یاد دہانی کر کے ان کو متنبہ فرمایا ہے کہ اگر وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمت پا کر طغیان میں مبتلا ہوگئے تو یاد رکھیں کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے ہی پاؤں میں کلہاڑی ماریں گے۔ سورۂ ابراہیم میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ (ابراھیم - ۱۴: ۳۵-۳۷)

اور جب کہ دعا کی ابراہیم نے اے میرے رب! اس سرزمین کو پُرامن سرزمین بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بچا کہ ہم بتوں کی پرستش کی نجاست سے آلودہ ہوں۔ اے میرے رب! ان بتوں نے تو لوگوں کے اندر سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے۔ تو جو میری پیروی کرے وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو مغفرت فرمانے اور رحم کرنے والا ہے۔ اے ہمارے رب! میں نے اپنی ذریت میں سے بعض کو ایک بن کھیتی کی زمین میں بسایا ہے، تیرے محترم گھر کے پاس، اے رب! اس لیے کہ یہ نماز کا اہتمام کریں تو لوگوں کے دل ان کی طرف تو مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما کہ یہ شکر گزاری کریں۔

ان آیات پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو ان سے مندرجہ ذیل حقائق سامنے آئیں گے:

قریش کو چند حقائق کی یاد دہانی

— یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ایک غیر آباد اور بنجر علاقے میں جو بسایا تو اس لیے کہ اس کو مشرکانہ ماحول سے دور اور محفوظ رکھیں۔

— اس علاقہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی تاکہ ان کی ذریت

اس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا مرکز بنائے اور ساتھ ہی یہ دعا بھی فرمائی کہ اس مرکز اور ان کی ذریت کو خلق کی مرجعیت حاصل ہو۔

۔۔۔ یہ علاقہ اس وقت زمینی پیداوار اور امن سے بالکل محروم علاقہ تھا۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے باشندوں کے لیے روزی کی فراخی کی بھی دعا فرمائی اور علاقہ کے لیے امن کی بھی۔

مقصود اس تفصیل سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ آج قریش کو جو مال و جاہ اور جو سطوت و اقتدار بھی حاصل ہے اس میں نہ ان کی ذاتی سعی و تدبیر کو کوئی دخل ہے اور نہ ان کے خاندانی استحقاق کو بلکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور بیت اللہ کی برکت ہے جس سے وہ بہرہ مند ہو رہے ہیں اور یہ برکت ان کے لیے غیر مشروط نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بندگی، بیت اللہ کے مقصد کی تکمیل اور ان کے اندر مبعوث ہونے والے رسول پر ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔[۱] اگر وہ ان شرطوں کے پابند رہیں گے تو ان کو یہ عزت و سرفرازی حاصل رہے گی ورنہ یہ سب چھن جائے گی۔

اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے قریش سے سورۂ قریش میں مطالبہ فرمایا ہے کہ اگر بیت اللہ کی برکتوں سے وہ بہرہ مند رہنا چاہتے ہیں تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اس گھر پر قابض اور اس کی برکتوں کے حقدار بنے رہیں۔ فرمایا ہے:

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۚ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۙ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ؕ (القریش ۱۰۶: ۱-۴)	بوجہ اس کے کہ قریش کو الفت بخشی گئی جاڑے اور گرمی کے سفر کی تو ان کو چاہیے کہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں جس نے قحط میں کھلایا اور خطرے سے بے خوف کیا۔

اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ (۵)

مطلب یہ ہے کہ جن کو اس سرزمین کی ابتدائی تاریخ معلوم ہے ان کے لیے تو اس کی موجودہ رفاہیت سے اس غلط فہمی میں پڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب ان کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی

---

[۱] بعض دوسری آیات سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے امامت و سیادت کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ مشروط بشرائط تھا۔ وہ لوگ اس سے مستثنیٰ کر دیے گئے تھے جو ان کے طریقہ کو چھوڑ بیٹھیں۔

ہیں کہ کوئی ان کو اکھاڑ نہیں سکتا۔ جس نے ان کو ایک بے آب وگیاہ زمین میں یہ فراوانی رزق بخشی وہ ان کو جب چاہے تباہ بھی کر سکتا ہے بالخصوص جب کہ انھوں نے اس مقصد کو بھی برباد کر دیا ہے جس کے لیے ان کو یہاں آباد کیا گیا اور جس کی خاطر ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعا فرمائی۔

یَقُوْلُ اَھْلَکْتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَہٗٓ اَحَدٌ (۶-۷)

فاسد ذہنیت سے فاسد کردار

اوپر کی آیت میں ان کی اس ذہنیت سے پردہ اٹھایا گیا ہے جس میں مال وجاہ کی فراوانی نے ان کو مبتلا کر دیا تھا۔ اس آیت میں ان کے اس کردار سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے جو اس فاسد ذہنیت نے ان کے اندر پیدا کیا۔

جن کے اندر یہ گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کو جو مال وجاہ حاصل ہے یہ ان کا پیدائشی حق اور ان کی قابلیت وہنر کا کرشمہ ہے، ان کے اندر انفاق کا جذبہ بالکل مردہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ ان کو نہ خدا کی پروا رہ جاتی نہ آخرت کی۔ اس طرح کے لوگ اپنی نجابت پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے مستحقین کے سامنے ہمیشہ اپنے وسیع مصارف کا رونا روتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انھیں ذاتی مصارف کے علاوہ قومی واجتماعی مصارف پر اتنا خرچ کرنا پڑتا ہے کہ وسیع ذرائع آمدنی رکھنے کے باوجود مشکل ہی سے کچھ پس انداز ہوتا ہے۔ یہی طریقہ وہ ان لوگوں کو چپ کرنے کا اختیار کرتے ہیں جو ان کو خدا اور آخرت کے نام پر انفاق کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کو وہ جواب دیتے ہیں کہ آخر کہاں تک خرچ کیے جائیں! ڈھیروں مال تو اس طرح کے مصارف پر اٹھا چکے ہیں! 'مَالًا لُّبَدًا' کے معنی ہیں کثیر اور ڈھیروں مال۔

'اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَہٗٓ اَحَدٌ' یہ اس طرح کے شیخی بگھارنے والوں کو جواب ہے کہ یہ لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کی ان فیاضیوں کو کوئی دیکھ نہیں رہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ دینے دلانے کو کوڑی بھی نہیں لیکن اپنی شاہ خرچیوں کا اشتہار بہت دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک دن ان کا یہ تمام زبانی جمع خرچ ان کے آگے بھی آ جائے گا اور خلق کے سامنے بھی۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ عَیْنَیْنِ ۙ وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ ۙ وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ (۸-۱۰)

نعمتوں کا صحیح مصرف

یعنی یہ لوگ مال ودولت پا کر اسی میں کھو کے گئے حالانکہ اللہ نے ان کو اس سے بھی بڑی نعمتیں دی تھیں، اگر یہ ان کے بھی قدردان ہوتے تو اس طرح خزف ریزوں کے عشق میں اندھے ہو کر اس ابدی بادشاہی کو نہ گنوا بیٹھتے جو اس فانی دولت کے ذریعے وہ حاصل کر سکتے تھے۔ فرمایا کہ وہ غور کریں کہ کیا ہم نے ان کو دو آنکھیں نہیں دیں کہ وہ ان سے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیں اور

دیکھیں کہ ایک طرف تو ہم نے ان کو مال و جاہ سے نوازا اور دوسری طرف ان کے آگے پیچھے ایسے یتیم و نادار، غریب و لاچار اور کمزور و بیمار بھی ہیں جو نانِ شبینہ کو محتاج، تن ڈھانکنے سے مجبور، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کی نعمت سے محروم ہیں۔ ہم نے آنکھیں دے کر ان کو یہ منظر اس لیے دکھایا کہ وہ اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے رب کے شکر گزار بنیں کہ اس نے محض اپنے فضل سے ان کو اس طرح کی کسی آزمائش سے محفوظ رکھا اور پھر اس شکر گزاری کا حق یوں ادا کریں کہ پوری فیاضی سے ان ضرورت مندوں پر اپنا وہ مال صرف کریں جو ان کے رب نے اس طرح کے لوگوں کے حق کی حیثیت سے ان کی تحویل میں دیا۔

مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کا کوئی صحیح مصرف ہے تو یہی عبرت نگاہی اور اثر پذیری ہے۔ اگر وہ یہ کام نہ کریں تو ان کے ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے۔

'وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ' یعنی آنکھوں کے ساتھ اس نے انسان کو ایک زبان اور دو ہونٹ بھی عنایت فرمائے تاکہ وہ جو کچھ دیکھے اور محسوس کرے اس پر خود بھی عمل پیرا ہو اور اپنی زبان سے دوسروں کو بھی اس پر ابھارے تاکہ اس کی تشویق و ترغیب سے دوسروں کے اندر بھی وہ نیکی پھیلے۔ سابق سورہ میں اسی چیز کی طرف 'وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ' (الفجر - ۸۹ : ۱۸) (اور تم مسکینوں کو کھلانے پر لوگوں کو نہیں ابھارتے) کے الفاظ سے توجہ دلائی ہے۔ اور اس سورہ میں آگے اسی مضمون کی تکمیل ان الفاظ میں کی ہے 'ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ' (۱۷) (پھر وہ بنے ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی)۔

اس آیت سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ انسان جس نیکی کا احساس کرے اس کے انجام دینے کے لیے خود بھی اقدام کرے اور دوسروں کو بھی اس کے لیے ابھارے۔ یہ چیز اس کے فرائض میں داخل ہے ورنہ اس کی نیکی ادھوری رہ جائے گی۔ معاشرہ سے متعلق بھی ہر شخص پر اس کی صلاحیت کے اعتبار سے ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس کو ادا کیے بغیر کوئی شخص عند اللہ بری نہیں ہو سکتا۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے، ان شاء اللہ سورۂ عصر کی تفسیر میں 'وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ' (العصر ۱۰۳ : ۳) کے تحت اس پر مفصل بحث آئے گی۔

ایک خاص نکتہ — یہاں ایک ضمنی نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ زبان کے ساتھ دو ہونٹوں کا ذکر فرمایا ہے جو زبان کو اوپر اور نیچے دونوں طرف سے محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جو چیز جتنی ہی قیمتی، جتنی ہی اثر آفرین اور جتنے ہی گہرے اور دور رس نتائج پیدا کرنے والی ہوتی ہے وہ اتنی ہی احتیاط سے محفوظ کی جاتی ہے تاکہ اس کے استعمال میں کوئی بے احتیاطی اور بے پروائی راہ نہ پائے۔

زبان بھی انسان کے نہایت قیمتی اور مؤثر اسلحہ میں سے ہے۔ یہ ایک شمشیر جوہر دار ہے اس وجہ سے قدرت نے اس کو میان میں چھپا کر انسان کو پکڑا دیا تاکہ وہ اس کو وہیں میان سے باہر نکالے جہاں وہ ضرورت پیش آئے جس کے لیے قدرت نے اس کو بنایا ہے لیکن یہ عجیب بدقسمتی ہے کہ بالعموم لوگ اس سے اصل کام لینے کے بجائے گھاس کاٹنے کی درانتی کا کام لیتے ہیں۔

نیکی اور بدی کا شعور انسان کی فطرت میں ہے

'وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ'۔ یعنی شاہدہ و شعور اور نطق و بیان کی صلاحیت دینے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر یہ فضل بھی فرمایا کہ اس کو دونوں راستے بھی دکھا دیے۔ دونوں راستے سے اشارہ انہی دونوں راستوں کی طرف ہے جن کا ذکر سورۂ دہر میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے:

إِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ إِمَّا شَاكِرًا وَّإِمَّا كَفُوْرًا ۝ (الدھر - ۷۶: ۳)	ہم نے اس کو راہ بھی دکھا دی۔ چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا ناشکرا بنے۔

اس سے زیادہ واضح لفظوں میں سورۂ شمس میں فرمایا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ (الشمس - ۹۱: ۷-۸)	اور شاہد ہے نفس اور اس کی اعلیٰ ساخت! پس ہم نے اس کو الہام کر دی اس کی بدی اور نیکی۔

یہ اسی حقیقت کا بیان ہے جس کی وضاحت ہم سورۂ قیامہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں کہ بدی کا بدی ہونا اور نیکی کا محبوب ہونا اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرما دیا ہے۔ انسان اگر بدی کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ بدی کے شعور سے محروم ہے بلکہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بدی کو بدی جانتے ہوئے اس کا ارتکاب کرتا ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ؗ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ؕ (۱۱-۱۲)

نعمتوں کی ناقدری پر اظہارِ افسوس

اب یہ مخاطبوں کی ناقدری و ناشکری کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شعور و ادراک، نطق و بیان اور ہدایت کی روشنی سے جو نوازا تو اس کا حق یہ تھا کہ یہ نیکی اور ہمدردئ خلق کی راہ کے عقبات عبور کرنے کی کوشش، اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں شامل ہونے کا شرف اور 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کی بادشاہی حاصل کرتے لیکن یہ اپنی زرپرستی اور پست ہمتی کے سبب سے یہ حوصلہ نہ کر سکے بلکہ ان کا مال ان کے لیے زنجیر پا بن گیا۔

نیکی اور بدی کے مزاج میں فرق

'عَقَبَةٌ' کے معنی گھاٹی اور 'اِقْتِحَامٌ' کے معنی چڑھائی چڑھنے یا کوئی مشکل کام کرنے کے ہیں۔ یہاں اس لفظ سے نیکی کے ان کاموں کی طرف اشارہ ہے جو ہمدردئ خلق اور بندگئ رب کے نہایت اعلیٰ کام ہیں اور جن کی بعض مثالیں آگے مذکور ہیں۔ ان کاموں کو انجام دینے کے لیے چونکہ انسان کو ایثار و قربانی سے کام لینا پڑتا ہے جو انسان پر شاق ہے اس وجہ سے اس کو 'اقتحام عقبۃ'

(گھاٹی پار کرنے سے) تعبیر فرمایا۔ یہاں وہ حقیقت ملحوظ رہے جس کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ جتنے بھی اعلیٰ کام ہیں ان کے لیے چونکہ نفس کو اس کی نقد لذتوں سے موڑ کر بالکل مختلف سمت میں لے جانا پڑتا ہے اس وجہ سے وہ بہت شاق گزرتے ہیں۔ اس کے برعکس ادنیٰ کاموں کی لذتیں نقد ہیں اس وجہ سے نفس ان کی طرف فوراً چل پڑتا ہے۔ اس حقیقت کو سیدنا مسیحؑ نے یوں واضح فرمایا ہے کہ نیکی کی راہ تنگ اور اس پر چلنے والے تھوڑے ہیں اور بدی کی راہ فراخ اور اس پر چلنے والے بہت ہیں۔ یہی حقیقت 'حُفَّتِ الجنۃ بالمکارہ' (جنت مشکلات سے گھیر دی گئی ہے) والی حدیث میں بھی واضح فرمائی گئی ہے۔

خدا کے مقرب بننے کے لیے بازیاں کھیلنی پڑتی ہیں

'وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ' میں جو اسلوب ہے اس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ یہ اندازِ سوال کسی چیز کی عظمت و شان یا اس کی ہولناکی کے اظہار کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں مقصود مخاطبوں کو یہ بتانا ہے کہ تم صرف چند رسوم ادا کر کے خدا کے مقرب اور چہیتے بننے کے خواب دیکھ رہے ہو حالانکہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے گھاٹیاں پار کرنی اور بازیاں کھیلنی پڑتی ہیں۔ مال کے پجاری بن کر تم اس مقام کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر یہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو آؤ سنو کہ اس کے لیے تمھیں کیا کیا کام کرنے ہیں۔

فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (۱۳-۱۶)

غلاموں کی آزادی اسلام کی سرفہرست نیکیوں میں ہے

اس سلسلہ میں سب سے پہلے 'فَكُّ رَقَبَةٍ' (گردن آزاد کرنے) یعنی غلام آزاد کرنے کا ذکر فرمایا۔ یہاں وہ بات پیش نظر رکھیے جس کی طرف ہم تمہیدی بحث میں اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سورتیں بالکل ابتدائی دور کی ہیں اس وجہ سے ان میں اہل عرب سے خطاب بھی بیشتر لفظ 'انسان' سے ہوا ہے اور جن باتوں کے ان سے مطالبے کیے گئے ہیں وہ بھی تمام تر انسانیت اور فطرت کے بدیہی تقاضوں پر مبنی ہیں۔ غلاموں کو آزاد کرنا اور کرانا بھی ان نیکیوں میں سے ہے جن کے نیکی ہونے میں کسی معقول آدمی کو شک نہیں ہو سکتا۔ اہل عرب بھی اس کو ایک نہایت اعلیٰ نیکی کا کام سمجھتے رہے ہیں۔ قرآن نے اپنی دعوت کے بالکل ابتدائی دور ہی سے اس انسانی خدمت کو اپنی سرفہرست نیکیوں میں شامل کر لیا اور اس وقت کر لیا جب دنیا کے دوسرے گوشوں میں لوگ اس نیکی کے لیے بیدار نہیں ہوئے تھے۔ ہم نے سورۂ نور کی تفسیر میں تفصیل سے بتایا ہے کہ قرآن نے کس طرح ابتدا ہی سے اس نیکی کی تبلیغ شروع کی اور پھر کس طرح بالتدریج اپنے نظام کے اندر غلامی کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے بعد یتیموں اور مسکینوں کو کھلانے کا ذکر فرمایا۔ 'کھلانا' ظاہر ہے کہ اپنے محدود مفہوم میں نہیں بلکہ وسیع معنوں یعنی ما یحتاج پوری کرنے کے مفہوم میں ہے۔ اس کے ساتھ 'فِيْ يَوْمٍ

ذِیْ مَسْغَبَۃٍ' (بھوک اور قحط کے زمانے میں) کی قید اپیل کو مؤثر بنانے کے لیے ہے۔ یہ کام ہے تو ہمیشہ نیکی کا لیکن قحط کے زمانے میں اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ 'یَتِیْمًا' کے ساتھ 'ذَا مَقْرَبَۃٍ' (قرابت مند) کی قید بھی دعوت کو مؤثر بنانے ہی کے لیے ہے۔ یوں حقدار تو ہر یتیم مدد کا ہے لیکن قرابت دار یتیم کا حق خاص طور پر دوچند ہو جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس 'مِسْکِیْنًا' کے ساتھ 'ذَا مَتْرَبَۃٍ' (خاک آلود) کی صفت بھی اس تلقین کو مؤثر بنانے ہی کے لیے ہے۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (۱۷)

یہ آگے کا قدم ہے جو ان لوگوں کو اٹھانا چاہیے۔

نیکی کرنے والوں کو نیکی کا داعی بھی بننا چاہیے

جن کی آنکھوں میں عبرت نگاہی اور دلوں میں اثر پذیری ہوتی ہے ان سے اوپر بیان کی ہوئی نیکیوں کی بھی توقع کی جاتی ہے اور یہ توقع بھی ان سے کی جانی چاہیے کہ وہ ایمان لانے والوں اور صبر اور ہمدردئ خلق کی دعوت دینے والوں میں سے بنیں گے۔ اگر وہ نہ بنیں تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ان کے روحانی و اخلاقی ارتقا کی راہ میں کوئی غیر فطری رکاوٹ ہے جس کو وہ عبور نہ کر سکے۔

نیکی کے کاموں کا خاص مزاج اور ان کے لیے صبر کی ضرورت

یہاں 'مَرْحَمَۃ' (ہمدردی) کے ساتھ 'صبر' کا ذکر اسی طرح آیا ہے جس طرح سورۂ عصر میں 'حق' اور 'صبر' کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔ اس کی وجہ نیکی کے کاموں کا وہ مزاج ہے جس کی طرف ہم 'اقتحام عقبۃ' کی وضاحت کرتے ہوئے اشارہ کر چکے ہیں کہ نیکی کے کام بالعموم نفس کی خواہشوں کے خلاف ہیں اس وجہ سے ان کے انجام دینے کے لیے انسان کو نفس کی مزاحمت کرنی اور ایک چڑھائی سی چڑھنی پڑتی ہے۔ یہ چڑھائی وہی لوگ چڑھ سکتے ہیں جن کے اندر 'صبر' کی خصلت مستحکم ہو۔ 'صبر' کا اصل مفہوم عزیمت و استقامت ہے۔ جن کے اندر یہ وصف نہ ہو وہ کوئی کام بھی پامردی کے ساتھ نہیں کر سکتے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ جن کو نیکی کا درس دیا جائے ان کو ساتھ ہی صبر و استقامت کی بھی تلقین کی جائے۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے، سورۂ عصر کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کے تمام اطراف بحث میں آئیں گے۔

أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ أَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ (۱۸-۲۰)

نیکوں اور بدوں کے انجام کا فرق

یہ آخر میں ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو نیکی کے مذکورہ کاموں کا حوصلہ کریں گے اور جو ان سے محروم رہیں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ یہ کام کریں گے تو وہ خوش بخت اور بامراد ہیں اور جو اللہ کی باتوں کی تکذیب ہی پر اڑے رہیں گے وہ بدبخت و نامراد ہیں، وہ آگ کے اندر بند کر دیے جائیں گے۔ یہاں تقابل کے اصول پر پہلے ٹکڑے میں اتنی بات محذوف ہے کہ 'اصحٰب المیمنۃ' جنت

کے بالاخانوں میں ہوں گے۔

لفظ 'مَیۡمَنَۃ' 'یمین' (داہنے) سے بھی ہو سکتا ہے اور 'یمن' (مبارکی اور خوش بختی) سے بھی لیکن یہاں یہ 'مَشۡـَٔمَۃ' کے مقابل میں آیا ہے جو لازماً 'شوم' (نحوست اور بدبختی) سے ہے۔ اس وجہ سے اس کو بھی 'یمن' سے لینا پڑے گا۔ میں نے ترجمہ میں اسی پہلو کو اختیار کیا ہے۔ ویسے یہ فرق محض لفظی ہوگا۔ اصل مدعائے کلام کے اعتبار سے کوئی بڑا فرق نہیں ہوگا۔ قرآن میں ان دونوں گروہوں کو 'اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ' اور 'اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ' سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے۔ سورۂ 'حاقّۃ' میں اس تعبیر کی وجہ بھی بتا دی گئی ہے کہ نیکوں کو ان کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے اور بدوں کو ان کے بائیں ہاتھ میں۔ ان دونوں تعبیروں میں بس یہ فرق ہے کہ ایک میں ان کی ظاہری تقسیم کا اعتبار ہے، دوسری میں ان کی معنوی تقسیم کا۔ جن کو ان کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے ظاہر ہے کہ وہ خوش بخت ہوں گے اور جن کو ان کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیے جائیں گے ان کی بدبختی اور محرومی بھی امر بدیہی ہے۔

'عَلَیۡہِمۡ نَارٌ مُّؤۡصَدَۃٌ'۔ 'اوصد الباب' کے معنی ہیں 'دروازہ بند کر دیا'۔ مطلب یہ ہوا کہ ان کو آگ میں موند کر اوپر سے دروازے بند کر دیے جائیں گے۔ اعاذنا اللہ من ذلک۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فللّٰہ الحمد۔

لاہور
۳۱- دسمبر ۱۹۷۹ء
۱۱- صفر ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۹۱

الشّمس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلّق اور مطالب کا تجزیہ

سابق سورہ ـــــ البلد ـــــ میں قریش کے لیڈروں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ جب تم اس وادی مکہ میں بسائے گئے اس وقت یہاں زندگی نہایت مشقت کی زندگی تھی۔ یہ ایک بے آب و گیاہ علاقہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے یہاں تم کو رزق و فضل کی فراوانی حاصل ہوئی اور تم پھلے پھولے۔ تو یہ نعمتیں پا کر خدا سے اکڑنے والے اور اس کی زمین میں فساد برپا کرنے والے نہ بنو ورنہ یاد رکھو کہ جو خدا یہ سب کچھ دے سکتا ہے وہ جب چاہے اس کو چھین بھی سکتا ہے اور کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔

اس سورہ میں ان کو طغیان و سرکشی کے انجام سے ڈرایا ہے۔ اس کی تمہید یوں استوار فرمائی ہے کہ دیکھتے ہو کہ کائنات بظاہر اضداد کی ایک رزم گاہ ہے لیکن خدائے قادر و قیوم ان اضداد میں سے کسی کو ان کے حدود سے تجاوز نہیں کرنے دیتا جس کا فیض یہ ہے کہ یہ اضداد نہ صرف یہ کہ آپس میں ٹکراتے نہیں بلکہ پوری سازگاری کے ساتھ اس کائنات کی خدمت کرتے ہیں اور ان کی اس سازگاری ہی پر اس کے بقا کا انحصار ہے ورنہ یہ دنیا چشم زدن میں درہم برہم ہو جاتی۔

اس کے بعد نفسِ انسانی کی تشکیل کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو حال اس عالمِ اکبر کا ہے وہی حال عالمِ اصغر یعنی نفسِ انسانی کا بھی ہے۔ یہ بھی خیر و شر کے متضاد داعیات و محرکات سے مرکّب ہے اور خالق نے انسان کی فطرت میں خیر و شر کا امتیاز بھی ودیعت فرمایا ہے اور خیر سے محبت اور شر سے نفرت کا ذوق بھی بخشا ہے۔ اس کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کے توازن کو قائم رکھے اور برے داعیات کو خیر کے داعیات پر غلبہ نہ پانے دے ورنہ وہ طغیان و فساد میں مبتلا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنی دنیا میں طغیان و فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اس کو وہ اسی حد تک ڈھیل دیتا ہے جس حد تک وہ اس دنیا کی مصلحت کے مطابق پاتا ہے۔ جب یہ اس حد سے متجاوز ہونے لگتا ہے تو خالقِ کائنات اس کا سر کچل دیتا ہے اور ان لوگوں سے اپنی دنیا کو پاک کر دیتا ہے جن کا وجود بحیثیتِ مجموعی اس کے لیے زہرناک بن جاتا ہے۔

آخر میں اپنی اس سنت کے ظہور کی شہادت کے طور پر عرب کی پچھلی قوموں میں سے ایک ایسی قوم کی تباہی کا ذکر فرمایا ہے جس کی شوکت و صولت سے قریش واقف تھے اور جس کے طغیان و فساد کا ذکر ان کے لٹریچر میں موجود تھا۔ ان کی مثال سے قریش کو عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے اور ڈرایا ہے کہ اگر انہی کی طرح تمھارا مزاج بھی فاسد ہو گیا تو تم بھی خدا کے بے امان عذاب کی زد میں آجاؤ گے اور پھر کوئی تمھاری مدد کے لیے نہیں اٹھے گا۔

اس روشنی میں پوری سورہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

سُوْرَةُ الشَّمْسِ

مَكِّيَّةٌ ——— آیات : ۱۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۵ وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۝١ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝٢ وَالنَّهَارِ اِذَا
جَلّٰىهَا ۝٣ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝٤ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝٥
وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝٦ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝٧ فَاَلْهَمَهَا
فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝٨ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝٩ وَقَدْ
خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝١٠ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝١١ اِذِ انْۢبَعَثَ
اَشْقٰىهَا ۝١٢ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝١٣
فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ
ع ۱/۱۵ ۱۶ فَسَوّٰىهَا ۝١٤ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝١٥

ترجمۂ آیات ۱-۱۰

شاہد ہے آفتاب اور اس کا چڑھنا اور چاند جب اس کے پیچھے لگے اور دن جب اسے چمکا دے اور رات جب اسے ڈھانک لے اور شاہد ہے آسمان اور جیسا کچھ اس کو اٹھایا اور زمین اور جیسا کچھ اس کو بچھایا اور نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا۔ پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔ ۱-۱۰

ثمود نے جھٹلایا اپنی سرکشی کے باعث۔ جب کہ اٹھ کھڑا ہوا ان کا سب سے بڑا بدبخت تو اللہ کے رسول نے آگاہ کیا کہ اللہ کی اونٹنی اور اس کے پینے کی باری سے خبردار! تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا اور اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں تو اللہ نے ان کے گناہ کی پاداش میں ان پر اپنا عذاب الٹ دیا اور ان کا ستھراؤ کر دیا اور وہ نہیں ڈرتا کہ اس کے پیچھے کیا ہوگا۔ ۱۱-۱۵

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۝ وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰهَا (۱-۴)

اضداد کی باہمی سازگاری کا درس

یہ آفاق کی بعض نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو باہم دگر جوڑے جوڑے ہونے یا دوسرے الفاظ میں زوجین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اشیاء کے جوڑے جوڑے ہونے سے قرآن نے توحید، معاد اور جزا، و سزا پر جو دلیلیں قائم کی ہیں ان کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔ یہاں جس خاص پہلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ہر چند سورج اور چاند، دن اور رات میں سے ہر چیز کی شکل و صورت، ان کے ظہور کے طریقے، ان کے مزاج اور اس کائنات پر ان کے اثرات میں بڑا فرق ہے جس کے سبب سے یہ دنیا اضداد کی ایک رزم گاہ معلوم ہوتی ہے لیکن مدبر کائنات نے ان اضداد کو اس طرح اس عالم کی مشین میں فٹ کیا ہے کہ مجال نہیں کہ کہیں ان میں کسی قسم کا تصادم واقع ہو بلکہ یہ نہایت سازگاری کے ساتھ اپنے اپنے دائروں میں کائنات کی مجموعی مصلحت میں رات دن سرگرم ہیں۔ نہ سورج چاند کے حدود میں مداخلت کرتا، نہ چاند اپنے وقت سے پہلے ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتا، نہ دن کی یہ تاب کہ وہ اپنے وقت سے پہلے برآمد ہو جائے اور نہ رات کی یہ مجال کہ وہ دن کو اس کی ڈیوٹی پوری کرنے سے پہلے ہی برخاست کر دے: لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ (یٰسٓ - ۳۶ : ۴۰) (نہ سورج کے لیے روا کہ وہ چاند کو جا لے اور نہ رات ہی دن سے سبقت کرنے والی بن سکتی ہے)۔

ان اضداد کی یہ باہمی سازگاری ہی ہے جس پر اس کائنات کے بقاء کا انحصار ہے۔ اگر اس سازگاری و فرمانبرداری کے بجائے ان کے اندر طغیان و سرکشی پیدا ہو جائے تو یہ عالم چشم زدن میں درہم برہم ہو جائے۔ اس وجہ سے خالق کائنات نے ان کو ان کے حدود کا پابند کر رکھا ہے اور یہ اپنے وجود سے زمین پر بسنے والوں کو یہ درس دیتے ہیں کہ وہ بھی خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کریں۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کریں گے تو زمین میں فساد برپا کریں گے اور زمین کا خداوند ان لوگوں کو گوارا نہیں کرے گا جو اس کے ملک میں فساد برپا کریں۔

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۝ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (۵-۶)

یہ آسمان اور زمین کی ساخت، ان کی عظمت اور ان کی فیض بخشی کی طرف توجہ دلائی کہ یہ بھی

اپنے بنانے والے کی عظیم قدرت، بے نہایت حکمت اور غیر محدود ربوبیت کی شہادت دیتے ہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا کام بھی اس کے لیے ناممکن نہیں ہے، اس کی حکمت اتھاہ اور اس کی رحمت و ربوبیت ہمہ گیر ہے۔ اس کی اس قدرت، حکمت اور ربوبیت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ لوگوں کو اس میں شتر بے مہار بنا کے نہ چھوڑے بلکہ دیکھے کہ جن کے لیے اس نے یہ سب کچھ بنایا وہ اس میں کیا بنا رہے ہیں اور پھر ان کے رویہ کے مطابق ان کو جزا یا سزا دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی یہ تمام قدرت و حکمت اور یہ ساری ربوبیت و رحمت بے معنی اور یہ سارا کارخانہ ایک کارِ عبث بن کے رہ جائے گا۔

'مَا' موصولہ اور 'مَا' مصدریہ

'وَمَا بَنٰىهَا' اور 'وَمَا طَحٰىهَا' میں 'مَا' سے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مصدریہ ہے یا موصولہ؟ ہمارے نزدیک یہ مصدریہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو موصولہ مانئے تو اس سے خدا کو مراد لینا پڑے گا درآنحالیکہ یہ قسمیں خدا کی نہیں بلکہ اس کی آیاتِ قدرت و حکمت کی ہیں اور خاص طور پر ان کے ان پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو انسان کے اندر اس عبرت نگاہی کو پیدا کریں جو اس تعلیم کے قبول کرنے کے لیے راہ کھولے جو سورہ میں دی گئی ہے۔ اوپر کی قسمیں سورج، چاند، دن اور رات کی ہیں اور ان کے ساتھ 'اِذَا تَلٰىهَا'، 'اِذَا جَلّٰىهَا'، 'اِذَا يَغْشٰىهَا' وغیرہ کی قیدیں نگاہ کے زاویہ کو ٹھیک رکھنے کے لیے لگائی گئی ہیں۔ اس سیاق میں اگر یہ بات کہی جائے کہ 'اور میں قسم کھاتا ہوں آسمان کی اور اس اللہ کی جس نے اس کو بنایا'، تو اس قسم کی نوعیت اوپر کی قسموں سے بالکل مختلف ہو جائے گی۔ اس کا ایک ٹکڑا تو شہادت کے مفہوم میں اور دوسرا تعظیم و تقدیس کے مفہوم میں لینا پڑے گا جس کا یہاں کوئی محل نہیں ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کی شہادت پیش کی ہے، اپنی ذات کی شہادت نہیں پیش کی ہے۔ علاوہ ازیں 'مَا' اللہ تعالیٰ کے لیے موزوں بھی نہیں ہے۔

'مَا' مصدریہ کے متعلق یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ یہ فعل کو صرف مصدر کے معنی میں کر دینے ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ اس فعل میں جو قدرت، جو شان، جو حکمت، جو فیض بخشی، جو ندرت اور جو حیرت انگیز صنعت گری مضمر یا ظاہر ہوتی ہے ان سب کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ مثلاً آسمان کے ساتھ 'وَمَا بَنٰىهَا' جو فرمایا تو اس کے معنی ہوں گے 'اور شاہد ہے آسمان اور اس کی حیرت انگیز ساخت'، اور اس کے اندر آسمان کے وہ تمام عجائب اور کرشمے مضمر ہوں گے جن کی طرف قرآن نے گوناگوں اسلوبوں سے توجہ دلائی اور اپنے مختلف بنیادی دعاوی پر ان سے دلیل قائم کی ہے۔ ظاہر ہے کہ 'مَا' موصولہ کے اندر ان استدلالی پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے کی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی۔ 'مَا' مصدریہ، کی اسی وسعت و جامعیت کے سبب سے اردو میں

اس کا ترجمہ نہایت مشکل ہے۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے بعض فاضل مترجموں نے اس کا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اردو میں یہ اسلوب موجود نہ ہونے کے سبب سے پورا مفہوم ادا نہیں ہو سکا۔ میں نے بھی اپنے ترجمہ میں اس کی کوشش کی ہے لیکن مجھے اپنی تقصیر کا اعتراف ہے کہ میں بھی اس کا حق ادا نہیں کر سکا۔

'وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا' کو بھی اسی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ سورۂ غاشیہ میں فرمایا ہے: 'وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ' (الغاشیۃ - ۸۸: ۲۰) اور اس کے تحت ہم نے واضح کیا ہے کہ اس اجمال کے اندر وہ ساری تفصیل مضمر ہے جو قرآن نے دوسرے مقامات میں زمین کے آثار و عجائب سے متعلق بیان فرمائی اور اس سے اپنے مختلف دعاوی پر دلیل قائم کی ہے۔ گویا جن حقائق پر غور کرنے کے لیے سورۂ غاشیہ میں 'کَیْفَ' سے ابھارا ہے انہی پر غور کرنے کے لیے یہاں 'مَا مصدریہ' سے کام لیا ہے۔ لیکن دونوں کے محلِ استعمال میں ایک دقیق فرق بھی ہے جس پر گفتگو کا یہاں موقع نہیں ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (۷-۱۰)

آفاقی شہادتوں کے بعد نفسیاتی شہادت | آفاقی شہادتوں کے بعد نفسیاتی شہادت کی طرف توجہ دلائی کہ انسان اگر خود اپنے نفس پر غور کرے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ خالق نے اس کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور ودیعت کر دیا ہے۔ یہ شعور ظاہر ہے کہ اسی لیے ودیعت ہوا ہے کہ انسان ان میں سے نیکی کو اختیار کرے اور بدی سے اپنے کو بچائے۔ اور اس سے یہ بات بھی بدیہی نتیجہ کے طور پر نکلی کہ فلاح وہی پائے گا جو اپنے کو بدی سے پاک رکھے گا اور وہ نامراد ہوگا جو اس کو گناہوں سے آلودہ کرے گا۔ اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ اپنے آپ کو غیر مسئول اور شترِ بے مہار سمجھنے کا تصور انسان کے خود اپنے نفس کی شہادت کے خلاف ہے۔

'نَفْسٍ' کی تنکیر تقلیل، تکثیر اور تفخیم سب کے لیے ہو سکتی ہے لیکن میرے نزدیک یہاں یہ تفخیم شان کے لیے ہے۔ پیچھے قسموں ہی کے سلسلہ میں اس کی نہایت واضح مثالیں گزر چکی ہیں۔ مثلاً سورۂ بروج میں فرمایا ہے: 'وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ' (۳) سورۂ بلد میں ہے: 'وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ'۔ ان کی وضاحت متعلق سورتوں میں ہو چکی ہے۔ اسی طرح یہاں 'وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا' ہے جس سے نفسِ انسانی کی حیرت انگیز حکیمانہ تشکیل اور اس کی نہایت اعلیٰ ظاہری و باطنی صلاحیتوں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

'وَمَا سَوّٰىهَا' میں بھی 'مَا' مصدریہ ہے اور یہ، جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی، نفسِ انسانی کی اس

حکیمانہ تشکیل و تقویم کی طرف توجہ دلا رہا ہے جس کی وضاحت قرآن نے جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے فرمائی اور اس سے استدلال کیا ہے کہ قدرت ان اعلیٰ صلاحیتوں کی چیز محض ایک کارِ عبث اور کھلونے کے طور پر نہیں بنا سکتی اس وجہ سے لازم ہے کہ ایک دن یہ اپنی صلاحیتوں اور نعمتوں سے متعلق اپنے خالق کے آگے جواب دہ ہو۔

لفظ 'تَسْوِیَۃٌ' پر ہم مختلف مقامات میں بحث کر چکے ہیں کہ کسی چیز کی تخلیق میں جو تکمیلی مرحلہ ہوتا ہے یہ اس کی تعبیر کے لیے بھی آتا ہے، جیسے فرمایا ہے: 'اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی' (الاعلیٰ - ۸۷: ۲) (جس نے خاک بنایا پھر اس کے نوک پلک سنوارے) اس سے معلوم ہوا کہ یہاں قسم میں نفسِ انسانی کی تخلیق کا صرف ابتدائی مرحلہ پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ وہ تکمیلی مرحلہ بھی مدنظر ہے جب وہ قدرت کے ایک شاہکار کی حیثیت سے نمایاں ہوا اور خود اپنے وجود سے اس حقیقت کا شاہد بن گیا کہ وہ اس دنیا میں ذمہ داریوں کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں وہ خدا کا خلیفہ اور اس کے آگے مسئول ہے۔

'فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا'۔ یہ عملِ تسویہ کی تفصیل ہے۔ انسان کی تخلیق کا تکمیلی مرحلہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایک نورِ یزدانی ودیعت فرمایا جس سے اس کے اندر یہ شعور پیدا ہوا کہ کیا چیز اس کے لیے نیکی اور خیر ہے اور کیا چیز بدی اور شر۔ سابق سورہ میں اسی حقیقت کی طرف 'وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ' (البلد - ۹۰: ۱۰) کے الفاظ سے اشارہ گزر چکا ہے اور اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو سورۂ قیامہ اور سورۂ دھر کی تفسیر میں اس کے ہر پہلو پر جامع بحث ملے گی۔

الہام خیر و شر کا لازمی تقاضا

'قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا'۔ یہ الہامِ خیر و شر کا لازمی اور بدیہی تقاضا بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر میں امتیاز بخشا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ خیر کو اختیار اور شر سے اجتناب کرے۔ یہی طریقہ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں فلاح و کامرانی کی راہ کھولے گا۔ اگر اس کے برعکس اس نے شر و فساد کی راہ اختیار کی تو یہ چیز اس کی بدبختی و نامرادی کا سبب بنے گی۔

'دَسّٰىهَا' دراصل 'دَسَّسَهَا' 'دَسٌّ' کے مادہ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کو خاک میں ڈھانک دینے اور مٹی میں ملا دینے کے ہیں۔ یہی لفظ بدل کر 'دَسّٰىهَا' ہو گیا ہے اور اس تبدیلی سے اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے یعنی اس کو بالکل خاک میں ملا دیا۔ عربی میں اس طرح کے تغیر کی مثالیں موجود ہیں مثلاً 'تَظَنَّنَ' سے 'تَظَنّٰی'۔

ہم نے اس کو الہامِ خیر و شر کا بدیہی تقاضا اس وجہ سے قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو نعمت بھی بندے کو عطا فرماتا ہے اس کا حق واجب یہ ہے کہ بندہ اس کو اس کے صحیح مصرف میں استعمال

کرے۔ اسی میں اس کی بہبود اور درحقیقت یہی اس نعمت کا شکر ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو گویا خود اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں گراتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جس کو خدا نے دو آنکھیں بخشی ہیں اس پر واجب ہے کہ وہ آنکھیں کھول کر راہ کے عقبات اور نشیب و فراز دیکھتا ہوا چلے۔ اگر وہ آنکھیں موند کر چلے گا تو اس کا کسی کھڈ میں گرنا بعید نہیں اور اس کی ذمہ داری خود اسی پر ہوگی، کسی دوسرے پر نہیں ہوگی۔

ان قسموں کا مقسم علیہ کیا ہے؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان قسموں کا مقسم علیہ کیا ہے؟ بعض لوگوں نے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا کو مقسم علیہ قرار دیا ہے لیکن صاحب کشاف کو اس سے انکار ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا انکار بے جا نہیں ہے۔ یہاں جو قسمیں مذکور ہیں ان میں سورج، چاند، دن اور رات کی قسمیں تو، جیسا کہ ہم نے وضاحت کی، اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ اس کائنات کے تمام عناصر کی باگ ایک قادر و قیوم کے ہاتھ میں ہے جو ان میں سے کسی کو اس کے محور و مدار سے سرمو تجاوز کی اجازت نہیں دیتا ورنہ یہ سارا عالم اپنے اضداد کے تصادم سے درہم برہم ہو جائے۔

اس کے بعد آسمان و زمین کی قسمیں اس عالم کے صانع کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں اور مقصود ان سے اس حقیقت کو سامنے لانا ہے کہ اس کی ان صفات کا لازمی تقاضا ہے کہ اس دنیا میں وہ کسی کو شتر بے مہار بنا کے چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ ہر ایک کے سامنے اس کے محاسبہ کا دن آنا لازمی ہے۔ یہ خدا کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔

تیسری قسم نفس انسانی کی تشکیل کی قسم ہے جو ایک انفسی شہادت کی حیثیت رکھتی ہے، جس کی وضاحت خود قرآن نے یوں فرمائی ہے کہ جب خالق نے خود انسان کی فطرت کے اندر خیر اور شر کا امتیاز ودیعت فرمایا ہے تو لازماً اس کے معنی یہی ہیں کہ جو اپنے کو خیر سے آراستہ کرے گا وہ فلاح پانے والا بنے گا اور جو اپنے اوپر شر کو مسلط کرے گا وہ نامراد ہونے والوں میں سے ہوگا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا یہاں مقسم علیہ کے طور پر نہیں بلکہ آخری قسم کے ایک خاص پہلو کی وضاحت کے طور پر ہے۔ مقسم علیہ یہاں ایسا ہونا چاہیے جو تمام قسموں کے لازمی نتیجہ کو اپنے اندر سموئے اس وجہ سے مجھے صاحب کشاف کی رائے قوی معلوم ہوتی ہے کہ یہاں جواب قسم محذوف ہے۔ اس کے حذف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس آخری ٹکڑے نے مقسم علیہ کی طرف ایک اشارہ کر دیا اس وجہ سے اس کے اظہار کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مقسم علیہ کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ساری بات مقسم علیہ کی حیثیت سے محذوف مانی جا سکتی ہے جو قسموں سے متبادر ہوتی ہے۔ یہاں اس کو جامع الفاظ میں بیان کرنا تو مشکل ہے لیکن ایک نمایاں پہلو کی تعبیر یوں کی جا سکتی

ہے کہ خالق کائنات کسی قوم کے طغیان کو برداشت نہیں کرتا بلکہ وہ لازماً اس کو تباہ کر دیتا ہے۔

یہاں قرآن کے اس فلسفۂ تاریخ کو ذہن میں رکھیے جس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ جہاں تک قوموں کا تعلق ہے وہ اپنے طغیان کی سزا قومی حیثیت سے اسی دنیا میں پا جاتی ہیں۔ آخرت میں افراد کا محاسبہ ان کی انفرادی حیثیت میں ہوگا اور ہر ایک اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا (۱۱-۱۴)

ایک تاریخی شہادت — آفاقی و انفسی شواہد کے بعد یہ ایک تاریخی شہادت اسی دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کی گئی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ جو قوم طغیان میں مبتلا ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اتمام حجت کے بقدر مہلت دینے کے بعد لازماً تباہ کر دیا کرتا ہے۔ آفاقی و انفسی دلائل کا تعلق غور و فکر سے ہوتا ہے اس وجہ سے عاقلوں کے لیے تو وہ مفید ہوتے ہیں لیکن عام لوگوں پر ان کا وہ اثر نہیں پڑتا جو پڑنا چاہیے۔ اس طرح کے لوگوں پر واقعاتی شہادتیں زیادہ کارگر ہوتی ہیں بشرطیکہ ان کے اندر کچھ صلاحیت ہو۔ اس وجہ سے قرآن نے آفاقی و انفسی دلائل کے پہلو بہ پہلو تاریخی شواہد کا بھی التزام رکھا ہے تاکہ اتمام حجت کے پہلو سے دعوت میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔¹

دوسرے مقامات میں تو قرآن نے اس مقصد سے متعدد قوموں کا ذکر کیا ہے لیکن یہاں صرف ایک ہی قوم ——— ثمود ——— کا ذکر ہے۔ اس کے بعض وجوہ بالکل ظاہر ہیں۔

ثمود کے خاص طور پر ذکر کرنے کے بعض وجوہ — ایک وجہ تو یہ ہے کہ عرب کی اقوام بائدہ میں سے قریش ان کے حالات اور ان کے انجام سے نسبتاً زیادہ واقف تھے۔ استاذ امام مولانا فراہیؒ نے سورۂ شمس کی تفسیر میں ان کے حالات اور قریش سے ان کی مشابہت پر مفصل بحث کی ہے۔ ہم اس کے بعض ضروری حصے نقل کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

> اہل عرب جن قوموں سے اچھی طرح واقف تھے انہی کے حالات اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے عبرت کے لیے پیش کیے ہیں۔ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ کے الفاظ سے جیسا دھندلا تصور ہمارے سامنے آتا ہے ویسا ہی قریش کے سامنے بھی آتا ہوگا۔

---

¹ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ تاریخی شواہد بھی تو آفاقی دلائل ہی کا ایک حصہ لیکن ان کی خاص اہمیت کے سبب سے میں نے یہاں ان کا ذکر الگ کیا ہے۔

اس سورہ میں ثمود سے متعلق جو اشارات ہیں وہ قریش کے سامنے ان کی پوری تاریخ رکھ دینے کے لیے کافی تھے۔ یہ عرب بائدہ میں سے ہیں جن کی بستیاں اور جن کی روایات اہل عرب کو وراثت میں ملیں۔ ان سے متعلق ان کی روزمرہ کی گفتگوؤں میں بہت سی مثلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ قرآن مجید ہمارے اس دعوے پر خود سب سے بڑی حجت ہے۔"
قرآن کے دلائل نقل کرنے کے بعد مولانا فرماتے ہیں:

"شعراء نے بھی ان کا ذکر ایک جانی پہچانی ہوئی قوم کی حیثیت سے کیا ہے ..... ان کی شوکت و عظمت ضرب المثل تھی۔ خنساء نے کہا ہے:

ولاقاه من الایام یوم كما من قبل لم يخلد قدار

(اور اس کو گردش روزگار نے فنا کر دیا جس طرح اس سے پہلے قدار کو دوام حاصل نہیں ہوا)

شعر میں قدار سے مراد احمر ثمود ہے جو قوم کا سردار تھا اور جس نے اونٹنی کو گزند پہنچایا۔ جس طرح عاد میں قیل بن عمر گزرا ہے اسی طرح قوم ثمود میں یہ نہایت سرکش اور مطلق العنان سردار تھا۔ مشہور جاہلی شاعر افوہ اودی نے ایک قصیدے میں اپنی قوم کے پاجیوں کو قیل اور قدار سے تشبیہ دی ہے:

فينا معاشر لم يبنوا لقومهم وان بنى قومهم ما افسدوا عادوا

(ہم میں کچھ ایسے اشرار ہیں جنھوں نے اپنی قوم کے لیے بنایا تو کچھ بھی نہیں اور اگر ان کی قوم نے ان کے بگاڑے ہوئے کو بنایا تو انھوں نے اس کو پھر بگاڑ دیا)

لا يرشدون ولن يرعوا لمرشدهم والجهل منهم معا والغي ميعاد

(نہ خود راہ دیکھتے اور نہ راہ دکھانے والوں کی سنتے، جہالت اور سرکشی، دونوں ان میں ساتھ ساتھ موجود ہیں)

اضحوا كقيل بن عمرو في عشيرته اذ اهلكت بالذي سدى لها عاد

(وہ اپنی قوم میں قیل بن عمر کی مثال ہیں جس کی کرتوتوں کی بدولت عاد تباہ ہوئے)

او بعده كقدار حين تابعه على الغواية اقوام فقد بادوا

(یا اس کے بعد وہ قدار کی مثال ہیں جس کی پیروی لوگوں نے گمراہی میں کی اور تباہ ہوئے)"

اس سے معلوم ہوا کہ ثمود کی سرکشی، ان کے لیڈروں کی گمراہی اور ان کے عبرت انگیز انجام کی تفصیل اہل عرب میں اس طرح معلوم و معروف تھی کہ ان کے شعراء بے تکلف اپنے اشعار میں ضرب المثل کی طرح ان کا ذکر کرتے۔ اس وجہ سے قرآن کا یہ اجمالی حوالہ اہل عرب کے لیے اجمالی نہیں تھا

وہ انہی چند لفظوں سے ان کے طغیان کے برے انجام کی پوری تفصیل سمجھ سکتے تھے۔

'کَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ بِطَغۡوٰىہَاۤ' میں لفظ 'طَغۡوٰی' پر خاص طور پر نظر رہے اس کے معنی سرکشی اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے کھلم کھلا بغاوت کے ہیں۔ خاص طور پر وہ سرکشی جس کی مرتکب کوئی قوم اس وقت ہوتی ہے جب کہ حق اس پر اچھی طرح واضح ہو چکا ہو۔ اس لفظ پر نگاہ رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق سورہ کے عمود سے ہے۔ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں قریش کو یہ آگاہی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں کسی قوم کے طغیان کو پسند نہیں کرتا۔ جو قوم یہ روش اختیار کرتی ہے، ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ اس لفظ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ثمود نے اپنے رسول کی تکذیب اس وجہ سے نہیں کی کہ ان پر حق واضح نہیں تھا بلکہ انھوں نے حق کے واضح ہونے کے باوجود محض سرکشی کے سبب سے تکذیب کی۔

'اِذِ انۡۢبَعَثَ اَشۡقٰىہَا' یہ ان کے طغیان کی تفصیل ہے۔ 'اَشۡقٰی' سے اشارہ ثمود کے لیڈر قدار کی طرف ہے جس کی شقاوت پوری قوم کی تباہی کا سبب ہوئی۔ 'انبعاث' کے معنی اٹھنے اور کمربستہ ہونے کے ہیں اور اس سے مراد اس کا اس جرم کے لیے کمربستہ ہونا ہے جس نے پوری قوم پر قہر الٰہی کے دروازے کھول دیے۔ اس اجمال کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے[1]۔ جب قوم ثمود کے پیغمبر ——— حضرت صالح ——— نے لوگوں کو عذاب سے ڈرایا تو قوم نے سرکشی کے سبب سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کو اس عذاب کی کوئی نشانی دکھا دی جائے ورنہ وہ ان کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان کے مطالبہ پر ایک اونٹنی نامزد کر دی کہ یہ عذاب کی نشانی ہے۔ اگر تم نے اس کو کوئی نقصان پہنچایا تو عذاب تم پر ٹوٹ پڑے گا۔ ساتھ ہی ان کے لیے ایک امتحان بھی مقرر کر دیا کہ گھاٹ پر پانی پینے کی باری اس کے لیے مخصوص ہو گی۔ ایک دن یہ پانی پیے گی اور ایک دن تم اپنے جانوروں کو پلاؤ گے۔ بھلا یہ پابندی وہ کب گوارا کرنے والے تھے۔ انھوں نے اپنے لیڈر سے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ وہ جوش میں اٹھا اور اونٹنی کی کونچیں اس نے کاٹ دیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تین دن کی ان کو مہلت دی کہ اب بھی اگر وہ توبہ کرنی چاہیں تو کر لیں لیکن وہ اس مہلت سے اور بھی مغرور ہو گئے بالآخر عذاب نے ان کو بے نام و نشان کر دیا۔

'فَقَالَ لَہُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ نَاقَۃَ اللّٰہِ وَ سُقۡیٰہَا' جب حضرت صالح علیہ السلام نے دیکھا کہ فی الواقع یہ بدبخت عذاب کی دیوار توڑ دینے پر تل ہی گیا ہے تو انھوں نے آخری تنبیہ فرمائی کہ اللہ کی اونٹنی اور اس کی پانی پینے کی باری سے خبردار رہو، ورنہ عذاب الٰہی آ دھمکے گا۔

---

[1] ملاحظہ ہو آیات ۲۷-۲۹ کی تفسیر سورۂ قمر میں۔

'نَاقَةَ اللّٰهِ' کا نصب بربنائے تحذیر ہے۔ یعنی یہاں کوئی فعل محذوف مانیں گے جو آگاہ اور خبردار کر دینے کے معنی میں ہوگا۔ فعل کے حذف کر دینے میں یہ بلاغت ہے کہ سامع کی پوری توجہ اصل بات پر مرکوز کر دی جائے۔ کسی خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے یہ اسلوب ہماری زبان بلکہ ہر زبان میں موجود ہے۔

'فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا' یعنی انھوں نے جس طرح پہلے عذاب کی دھمکی کو جھٹلایا تھا اسی طرح پیغمبر کی اس آخری وارننگ کی بھی کوئی پروا نہیں کی بلکہ ان کی تکذیب کر دی کہ یہ محض ایک دھونس اور ڈراوا ہے۔ چنانچہ جو کچھ کرنا تھا بے دھڑک کر گزرے۔

'عقر' کے معنی اونٹ کی کونچیں کاٹ دینے کے ہیں۔ اس کے بعد اونٹ لازماً مرجاتا ہے اس وجہ سے لازم معنی کے طور پر قتل کر دینے کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن لفظ کا اصل مفہوم وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔

قرآن کے فلسفۂ تاریخ کا ایک نکتہ — یہاں ایک بات خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ اونٹنی کے قتل کا ارتکاب قوم کے اندر سے اگرچہ ایک ہی شخص نے کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا مجرم پوری قوم کو ٹھہرایا اور اس کی سزا بھی پوری قوم کو دی۔ اس سے قرآن کے فلسفۂ تاریخ کا یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کے جرم میں پوری قوم کو سزا دیتا ہے اگر قوم اس جرم پر راضی ہو۔ اس کے وبال سے صرف وہی لوگ بچتے ہیں جو اپنی استطاعت کی حد تک اس کی اصلاح کے لیے جو کچھ کر سکتے ہوں کر گزریں اور اگر کچھ نہ کر سکتے ہوں تو ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس سے بیزار اور کنارہ کش رہیں۔ اس سے نیچے نہ ایمان کا کوئی درجہ ہے نہ خدا کی پکڑ سے بچنے کی کوئی سبیل۔

ثمود کے عذاب کی نوعیت — 'فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ'۔ 'دَمْدَمَة' کے معنی ہلاک کر دینے کے ہیں لیکن اس کے اندر عذاب کی شدت اور بے پناہی کا مضمون بھی مضمر ہے جو مجرد 'ہلاک کر دینے' کے لفظ سے واضح نہیں ہوتا۔ اگر اس کو ٹھیک ٹھیک تعبیر کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ تب ان کے خداوند نے ان کے اوپر دھادھم عذاب برسا دیا۔ قرآن میں 'فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ' (الفجر ۸۹: ۱۳) (اور ان پر تیرے خداوند نے عذاب کے کوڑے برسا دیے) کا اسلوب بیان بھی استعمال ہوا ہے، وہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ سورۂ قمر کی آیت ۳۱ کے تحت ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان پر جو عذاب آیا وہ سر ما کے بادل، ژالہ باری، ہولناک کڑک، دمک اور طوفانی ہوا کا مجموعہ تھا۔ اس طرح کے عذاب کے لیے لفظ 'دَمْدَمَ' نہایت موزوں ہے۔

اونٹنی عذاب کی نشانی تھی — 'بِذَنبِهِمْ' یعنی یہ عذاب ان کے اوپر ان کے اس جرم کے سبب سے آیا کہ انھوں نے اللہ اور رسول کی تنبیہ کے باوجود اونٹنی کو گزند پہنچانے کی جسارت کی۔ یہ اونٹنی عذاب الٰہی کی نشانی تھی اور جیسا کہ سورۂ قمر کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے، یہ بطور امتحان مقرر کی گئی تھی کہ اندازہ ہو جائے کہ قوم

کا طغیان کس درجے تک پہنچ چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جرم کے بعد اگر ان کو ڈھیل ملتی تو وہ خود اللہ کے رسول پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کر گزرتے اور یہ وہ جرم ہے جس کی مہلت اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نہیں دیتا بلکہ جب کسی قوم نے رسول کے قتل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ لازماً تباہ کر دی گئی ہے۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب قریش کے لیڈروں نے دارالندوۃ اور اپنی نجی مجلسوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے مشورے شروع کر دیے تھے۔ یہ مشورے چونکہ خفیہ تھے اس وجہ سے قرآن نے بھی علانیہ کی بجائے اشارات کی زبان میں ان کو آگاہی دے دی کہ اگر وہ کوئی ارادۂ بد اپنے دل میں پرورش کر رہے ہیں تو دور تک اس کے نتائج پر نگاہ ڈال لیں۔

'فَسَوّٰىهَا' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا عذاب برسایا تو ان کا بالکل ستھراؤ کر کے رکھ دیا۔ ضمیر مفعول کا مرجع ثمود اور ارضِ ثمود دونوں ہو سکتے ہیں۔

نہ نادر بجا ماند و نے نادری!

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (۱۵)

یعنی اللہ تعالیٰ جب اسی طرح کسی قوم کو تباہ کرتا ہے تو اپنی اس سنت کے مطابق کرتا ہے جو اس نے اس دنیا کی مصلحت اور بہبود کے لیے اپنے محیطِ کل علم اور اتھاہ قدرت کے تحت ٹھہرا رکھی ہے اس وجہ سے نہ اس کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ نتیجہ کے اعتبار سے اس کے اس فیصلہ میں کوئی غلطی ہو سکتی ہے اور نہ یہ ڈر ہوتا ہے کہ کوئی اس کو چیلنج کر سکتا ہے۔ وہ کسی کے آگے نہ مسئول ہے اور نہ کسی کا اس پر زور ہے۔

اس سے ضمناً ان لغو بیانات کی بھی نفی ہو جاتی ہے جو تورات کی کتاب پیدائش میں اس کے راویوں نے ملائے ہیں، مثلاً

اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال سدا بُرے ہی ہوتے ہیں۔ تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا۔" (پیدائش۔ باب ۶: ۵-۶)

اسی طرح طوفانِ نوح کے ذکر کے بعد ہے:

"اور خداوند نے اپنے دل میں کہا کہ انسان کے سبب سے میں پھر کبھی زمین پر لعنت نہیں بھیجوں گا کیونکہ انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے بُرا ہے اور نہ پھر سب جانداروں کو جیسا اب کیا ہے، ماروں گا۔" (پیدائش۔ باب ۸: ۲۱)

ان سطور پر اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

لاہور

۱۶- جنوری ۱۹۸۰ء

۲۷- صفر ۱۴۰۰ھ

تدبّرِ قرآن

۹۲

الّیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ الشمس ـــــ کی مثنیٰ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ ان کے ظاہر اور باطن میں اتنی گہری مشابہت و مماثلت ہے کہ ایک عام آدمی بھی ان کی یکسانی و ہم رنگی کو محسوس کر سکتا ہے۔

سابق سورہ میں نفسِ انسانی سے متعلق فرمایا ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس-۹۱: ۹-۱۰) (فلاح پائی جس نے اس کو پاکیزہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا) اس سورہ میں اسی بنیادی مسئلہ کو لیا اور بتایا ہے کہ نفس کو کیا چیز آلودہ کرتی اور اس سے اس کو بچانے کی کیا تدبیر ہے اور کیا چیز اس کو پاکیزہ بناتی ہے اور یہ پاکیزگی اس کو کس طرح حاصل ہوتی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۴) آفاق و انفس کی شہادت اس بات پر کہ قیامت حق ہے۔ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی ہے اور ہر چیز اپنی غایت کو اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر ہی پہنچتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس دنیا کا بھی جوڑا ـــــ آخرت ـــــ ہے جو اس کو بامقصد بناتا ہے ورنہ یہ بالکل اندھیر نگری بن کے رہ جائے گی جس میں خیر و شر دونوں یکساں ہو جائیں گے درآنحالیکہ ان میں فرق ایک امر بدیہی ہے۔

(۵-۷) وہ کردار اور عقیدہ جو آدمی کو آخرت کی کامرانیوں کا اہل اور اس راہ کو اس کے لیے آسان بناتا ہے۔

(۸-۱۰) وہ عقیدہ و عمل جو اس کے لیے ہلاکت کی راہ کھولتا اور جہنم کے کھڈ میں گراتا ہے۔

(۱۱ - ۱۴) قریش کو تنبیہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری صرف تمھیں ہدایت کی راہ دکھا دینا ہے سو یہ کام اس نے کر دیا۔ یہ ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ وہ اس راہ پر تمھیں چلا بھی دے۔ یہ راہ اختیار کرو گے تو اس میں تمھارا اپنا ہی بھلا ہے ورنہ یاد رکھو کہ دنیا اور آخرت دونوں خدا ہی کے قبضہ میں ہیں۔ نہ یہاں کوئی خدا سے بچا سکے گا اور نہ وہاں کوئی کام آنے والا بنے گا۔

(۱۵ - ۲۱) اس امر کی وضاحت کہ کس کردار کے لوگ دوزخ میں پڑیں گے اور کس کردار کے لوگ اس سے محفوظ رکھے جائیں گے اور ان کو کیا صلہ ملے گا؟

سُورَۃُ الَّیْلِ

مَکِّیَّۃٌ —————— آیات : ۲۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱-۲۱ وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی ﴿۱﴾ وَالنَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی ﴿۲﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ
وَالْاُنْثٰٓی ﴿۳﴾ اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی ﴿۴﴾ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ﴿۵﴾
وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ﴿۶﴾ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْۢ
بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ﴿۸﴾ وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ﴿۹﴾ فَسَنُیَسِّرُہٗ
لِلْعُسْرٰی ﴿۱۰﴾ وَمَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗٓ اِذَا تَرَدّٰی ﴿۱۱﴾ اِنَّ
عَلَیْنَا لَلْہُدٰی ﴿۱۲﴾ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی ﴿۱۳﴾ فَاَنْذَرْتُکُمْ
نَارًا تَلَظّٰی ﴿۱۴﴾ لَا یَصْلٰہَآ اِلَّا الْاَشْقَی ﴿۱۵﴾ الَّذِیْ کَذَّبَ
وَتَوَلّٰی ﴿۱۶﴾ وَسَیُجَنَّبُہَا الْاَتْقَی ﴿۱۷﴾ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ
یَتَزَکّٰی ﴿۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَہٗ مِنْ نِّعْمَۃٍ تُجْزٰٓی ﴿۱۹﴾
ع ۲۱ ۱۷ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی ﴿۲۰﴾ وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ﴿۲۱﴾

ترجمۂ آیات ۱-۲۱ شاہد ہے رات جب کہ چھا جاتی ہے اور دن جب کہ چمک اٹھتا ہے اور
شاہد ہے نر و مادہ کی آفرینش کہ تمہاری کمائی الگ الگ ہے۔ ۱-۴
سو جس نے انفاق کیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ مانا

اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بخالت کی اور بے پروا ہوا
اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم ڈھیل دے دیں گے کٹھن منزل کے لیے۔ ۵-۱۰
اور اس کے کیا کام آئے گا اس کا مال جب وہ کھڈ میں گرے گا! ہمارا کام
سمجھا دینا ہے! اور ہمارے ہی اختیار میں ہے آخرت بھی اور دنیا بھی۔ سو میں
نے تم کو آگاہ کر دیا دہکتی آگ سے۔ ۱۱-۱۴

اس میں وہی پڑے گا جو نہایت بدبخت ہوگا، جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا۔
اور اس سے محفوظ رکھا جائے گا وہ خدا ترس جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کو
دیتا ہے اور جس کی کسی پر کوئی عنایت بدلے کے لیے نہیں بلکہ صرف اپنے خدائے
برتر کی خوشنودی کے لیے ہے۔ اور وہ نہال بھی ہو جائے گا۔ ۱۴-۲۱

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی ۙ وَالنَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۙ وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰۤی (۱-۳)

ہر چیز کے جوڑے جوڑے ہونے سے غایت پر استدلال

یہ رات اور دن، نر اور مادہ کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس طرح کی قسمیں جو قرآن میں آئی ہیں ان کی ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں کہ یہ کسی دعوے پر شہادت کے لیے آتی ہیں۔ رات اور دن، نر اور مادہ میں نسبت زوجین کی ہے اور یہ دونوں مل کر اس مقصد کو پورا کرتے ہیں جس کے لیے خالق نے ان کو پیدا کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے اندر خلا ہے جو جوڑے کے ساتھ مل کر ہی پورا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر ان کے وجود کی نہ کوئی افادیت باقی رہتی اور نہ ان کی صلاحیتوں کی کوئی توجیہ ہو سکتی۔ قرآن نے ان اضداد کے اندر توافق کے پہلو سے توحید پر بھی دلیل پیش کی ہے جس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے اور قیامت پر بھی شہادت پیش کی ہے جو یہاں مقصود ہے۔ مثلاً سورۂ ذاریات میں فرمایا ہے: 'وَمِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ' (الذّٰریٰت - ۵۱: ۴۹) (اور ہم نے ہر چیز میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو) یعنی اس بات کی یاد دہانی حاصل کرو کہ اس دنیا کا بھی جوڑا ہے اور یہ اپنی غایت کو اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر پہنچے گی۔ اس نکتہ کی وضاحت سورۂ ذاریات کی مذکورہ آیت کے تحت ہو چکی ہے اور اس کتاب کے دوسرے مقامات میں بھی اس پر مفصل بحث ہوئی ہے۔ آگے مقسم علیہ کی وضاحت کرتے ہوئے بھی ہم اس پر روشنی ڈالیں گے۔

'وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰۤی' میں 'مَا' ہمارے نزدیک مصدریہ ہے۔ سابق سورہ کی آیت 'وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰہَا' (الشمس - ۹۱: ۵) کے تحت ہم اس پر بحث کر چکے ہیں، یہاں اس کے دہرانے میں طوالت ہوگی۔

اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی (۴)

نیک اور بد دونوں کی کمائی یکساں نہیں ہوگی

یہ وہ اصل دعویٰ ہے جو اوپر کی شہادتوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ یعنی کائنات میں ہر چیز کا جوڑا جوڑا ہونا اور اپنے جوڑے ہی کے ذریعہ سے ہر چیز کا اپنی غایت اور مقصد کو پہنچنا چاہتا ہے کہ اس دنیا کا بھی جوڑا ہے اور وہ ہے آخرت جو لازماً ظہور میں آئے گی تاکہ یہ دنیا اپنی غایت اور اپنے مقصود کو پہنچے ورنہ یہ بالکل عبث اور بے غایت بن کے رہ جائے گی۔ اگر آخرت نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خالق کے نزدیک نیکی کرنے والے اور بدی کرنے والے دونوں یکساں ہیں۔ ایک حکیم خالق کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ نیک اور بد دونوں کی جدوجہد اور کمائی کو یکساں کر دے۔

لفظ 'سعی' جدوجہد کے معنی میں بھی آتا ہے اور نتیجۂ جدوجہد یعنی کمائی کے معنی میں بھی۔ یہاں

اسی دوسرے معنی میں ہے۔ قرآن میں اس معنی کی نظیر موجود ہے۔ مثلاً فرمایا ہے "وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی" (النجم ۵۳: ۳۹-۴۰) (اور یہ کہ انسان کو نہیں ملے گی مگر اپنی کمائی اور بے شک اس کی کمائی عنقریب ملاحظہ میں آئے گی)۔

قیامت کا اثبات اس کی ضرورت کے پہلو سے

'شَتّٰی' جمع ہے 'شَتِیْتٌ' کی جس کے معنی متفرق اور الگ کے ہیں یعنی عقل اور فطرت کا بدیہی تقاضا ہے کہ نیکوں اور بدوں دونوں کی سعی کا نتیجہ ایک ہی شکل میں نہ برآمد ہو بلکہ ان کی جدوجہد کے اعتبار سے الگ الگ ہو۔ جنھوں نے نیکی کمائی ہو وہ اس کا صلہ فضل و انعام کی شکل میں پائیں اور جنھوں نے بدی کمائی ہو وہ اس کے انجام سے دوچار ہوں۔ گویا قیامت کا ذکر یہاں اس کی اصل ضرورت کے پہلو سے سامنے رکھا ہے کہ اس کا آنا اس وجہ سے ضروری ہے کہ قیامت اور جزاء و سزا کے بغیر یہ دنیا ایک اندھیر نگری اور ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے چنانچہ قیامت کو نہ ماننے والوں سے اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کیا ہے کہ "اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّاَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ" (المومنون ۲۳: ۱۱۵) (کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بالکل عبث پیدا کیا ہے، تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے!) یہی سوال منکرین قیامت ہی سے، دوسرے مقام میں بانداز تعجب، یوں کیا گیا ہے "اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ ۝ مَا لَکُمْ وقفة کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ" (القلم ۶۸: ۳۵-۳۶) (کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے مانند کر دیں گے؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے فیصلے کرتے ہو!)

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی (۵-۷)

اس فرق کی تفصیل جو نیکوں اور بدوں کی کمائی میں ہوگا

یہ تفصیل ہے اس فرق و اختلاف کی جو لازماً نیکوں اور بدوں کی کمائی میں رونما ہوگا اور جس کو رونما ہونا چاہیے بھی۔ فرمایا کہ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا، اپنے رب سے ڈرے گا، اچھے انجام کو سچ مانے گا اس کو تو ہم آسان راہ چلائیں اور آسانی کی منزل تک پہنچائیں گے۔

'اَعْطٰی' کے بعد 'اِتَّقٰی' کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس انفاق سے مقصود ریاء و نمائش یا کوئی اور دنیوی چیز نہ ہو بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی تمنا اور ایک ایسے دن کا خوف ہو جس دن نیک عمل کے سوا کوئی چیز کام آنے والی نہیں بنے گی۔ اس کی وضاحت سورۂ دہر میں یوں ہوئی ہے:

یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا	وہ اپنی نذر پوری کرتے ہیں اور ایک ایسے دن
کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا ۝ وَیُطْعِمُوْنَ	سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہمہ گیر ہوگی۔ وہ ضرورتمند
الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا	ہونے کے باوجود، مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلاتے
وَّاَسِیْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ	ہیں۔ اس نیت کے ساتھ کہ ہم تم کو صرف اللہ کی
لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ۝	خوشنودی کی خاطر کھلاتے ہیں، نہ کہ تم سے کسی بدلے

إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ﴿الدھر ۷۶: ۱۰﴾ — کے طالب ہیں، نہ کسی شکریہ کے۔ ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اکل کھرے دن کے ظہور سے ڈرتے ہیں۔

'وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ'۔ 'حُسْنٰی' کا موصوف لفظ 'عاقبۃ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے یعنی وہ انفاق اور نیکی کے اچھے انجام پر ایمان رکھتے ہیں یہ ان کی نیکی کے اصل محرک کا پتہ دیا ہے کہ آخرت کے خوف کے ساتھ ان کے اندر یہ ایمان بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی ہر نیکی کا بھرپور صلہ ہے۔ جس شخص کے اندر نہ آخرت کا خوف ہو نہ وہ یہ ایمان رکھتا ہو کہ آخرت میں اس کی رائی کے برابر کی نیکی کا بھی صلہ ملنے والا ہے، وہ اول تو کچھ خرچ کرنے کا حوصلہ کر سکتا ہی نہیں اور کرے گا بھی تو لازماً اپنے کسی دنیوی مفاد کو سامنے رکھ کر کرے گا۔ یہ انفاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک بالکل بے برکت ہے۔ سورۂ ماعون میں فرمایا ہے 'أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ' (الماعون ۱۰۷: ۱-۳) (تم نے دیکھا اس روز جزا کے جھٹلانے والے کو! یہی ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا اور مسکینوں کو کھلانے پر نہیں ابھارتا)۔

'فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ'۔ 'یُسْرٰی' کا موصوف بھی 'حُسْنٰی' کے موصوف کی طرح محذوف ہے۔ یعنی 'العاقبۃ الیسرٰی' یہ اس سنتِ الٰہی کا حوالہ ہے جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ جو شخص نیکی کی راہ اختیار کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس راہ کی مشکلات آسان کرتا اور اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے کی توفیق بخشتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے 'وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا' (العنکبوت ۲۹: ۶۹) (جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کریں گے ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت بخشیں گے)۔ یہاں اس کی منزل کو 'یُسْرٰی' سے اس لیے تعبیر فرمایا ہے کہ اس کا حساب آسان ہوگا، چنانچہ فرمایا ہے 'فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا' (الانشقاق ۸۴: ۷-۸) (رہا وہ جس کا اعمال نامہ اس کے دہنے ہاتھ میں پکڑایا جائے گا تو اس کا حساب نہایت آسان ہوگا)۔

وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ (۸-۱۰)

مقابل گروہ کے انجام کا بیان

یہ مقابل گروہ یعنی ان لوگوں کا بیان ہے جو اسی دنیا کی زندگی کو کل زندگی سمجھتے ہیں۔ جو اپنے مال پر مار گنج بن کر بیٹھے اور آخرت سے بالکل نچنت ہیں، جو نہ کسی جزا و انعام کے قائل اور نہ اس کے لیے کوئی بازی کھیلنے کا حوصلہ رکھتے۔ فرمایا کہ ان کا حشر مذکورہ بالا گروہ سے بالکل مختلف ہوگا۔ ان کو اللہ تعالیٰ اس راہ پر چلنے کے لیے ڈھیل دے دے گا جو ان کو نہایت کٹھن منزل پر لے جا چھوڑے گی۔ یہاں بھی 'عُسْرٰی' کا موصوف محذوف ہے اور 'تیسیر' امہال یعنی ڈھیل دینے کے مفہوم میں ہے۔

قرآن میں یہ سنتِ الٰہی جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ جو لوگ نیکی کی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ ان کی باگ ان کے نفس کے حوالے کر دیتا ہے۔ ان کو اپنے نفس سے کوئی مزاحمت نہیں کرنی پڑتی اس وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی راہ نہایت ہموار ہے، نفس کی پیروی کرتے ہوئے وہ خوش خوش زندگی کی آخری منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو اس مرحلہ سے سابقہ پیش آتا ہے جس کو قرآن نے سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا (المدثر ۷۴: ۱۷) (میں اس کو چڑھاؤں گا ایک کٹھن چڑھائی) سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں اسی مرحلے کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بالکل برعکس ان لوگوں کی زندگی ہوتی ہے جو ایمان اور عمل صالح کی راہ پر چلنے کا حوصلہ کر لیتے ہیں۔ ان کو قدم قدم پر اپنے نفس کی خواہشوں سے لڑائی کرنی پڑتی ہے اور اس لڑائی ہی سے ان کو بالتدریج وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو راہ کے عقبات عبور کرنے میں ان کو مدد دیتی ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان کے سامنے فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ[1] (الفجر ۸۹: ۲۹-۳۰) کی آخری منزل آ جاتی ہے۔

وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى (۱۱)

بخیلوں کو تنبیہ

یہ 'مَا' نافیہ بھی ہو سکتا ہے اور سوالیہ بھی۔ دونوں صورتوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہو گا لیکن سوالیہ میں زیادہ زور ہے اس وجہ سے میں نے اسی مفہوم کو لیا ہے۔ یہ بانداز سوال ان لوگوں کو تنبیہ اور ملامت ہے جو مال رکھتے ہوئے خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے جی چراتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے شخص کو اس کا مال اس وقت کیا نفع پہنچائے گا جب وہ جہنم کے کھڈ میں گر جائے گا! ــــ مطلب یہ ہوا کہ مال کا اگر کوئی مستقل فائدہ ہے تو یہ ہے کہ آدمی خدا کی راہ میں خرچ کر کے اس کو اپنی ابدی زندگی کے لیے محفوظ کر لے۔ اگر ایسا نہ کیا تو یہ مال اس کے لیے نہ صرف یہ کہ کچھ نافع نہ ہوا بلکہ ہمیشہ کے لیے موجب وبال بنا۔

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (۱۲-۱۳)

یہ وہی تنبیہ نسبتۃً زوردار لفظوں میں ہے کہ ہمارا کام لوگوں کو راہ دکھانا ہے سو یہ کام ہم نے پیارسول بھیج کر اور اپنی کتاب نازل کر کے کر دیا۔ یہ ذمہ داری ہماری نہیں ہے کہ ہم لوگوں کو اس راہ پر چلا بھی دیں۔ یہ لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ راہ اختیار کریں۔ جو یہ راہ اختیار کریں گے وہ فلاح پائیں گے، جو گریز کریں گے وہ اس کا انجام دیکھیں گے۔

'وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى'۔ یہ مذکورہ بالا تنبیہ پر مزید اضافہ ہے کہ لوگ یہ بات بھی اچھی طرح یاد رکھیں کہ آخرت ہو یا دنیا دونوں کے معاملات ہمارے ہی اختیار میں ہیں۔ نہ کوئی اپنی تدبیر اور اپنے زور سے اس دنیا میں کچھ بنا سکتا اور نہ آخرت میں کچھ بنا سکے گا۔ اگر کسی کو اپنے خاندانی شرف یا اپنے خیالی معبودوں پر ناز ہے تو وہ یاد رکھے کہ آخرت میں اس طرح کی مزعومہ چیزوں کا کوئی وجود نہیں ہو گا۔ ہر شخص کو صرف اللہ وحدہٗ لا شریک سے سابقہ پیش آئے گا۔ سورۂ نجم آیت ۲۵ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

---

[1] شامل ہو جاؤ میرے بندوں میں اور داخل ہو جاؤ میری جنت میں۔

مال دار بخیلوں کے ذہن کا خناس

اوپر آیت ۸ میں وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی کے الفاظ جو آئے ہیں یہاں ان پر دوبارہ ایک نظر ڈال لیجیے۔ مال دار بخیلوں کے ذہن میں یہ خناس سمایا ہوا ہوتا ہے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے ان کی اپنی تدبیر اور اپنے تدبّر کا ثمرہ ہے اس وجہ سے وہ اپنے کو خدا سے بالکل بے نیاز سمجھ بیٹھتے ہیں۔ قارون کو جب یاددہانی کی گئی کہ وہ خدا کے بخشے ہوئے مال میں خدا کے حق کو پہچانے تو اس نے جواب دیا کہ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ (القصص - ۲۸: ۷۸) (یہ تو مجھے اپنے علم کی بدولت ملا ہے) یعنی میں نے اس کو اپنی قابلیت و ذہانت سے حاصل کیا ہے، خدا سے اس کو کیا تعلق کہ اس میں اس کا بھی کوئی حصہ ہو! یہی ذہنیت کم و بیش ہر سرمایہ دار کی ہوتی ہے۔ قرآن نے وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰی کے الفاظ سے اس شیطانی تصور پر بھی ضرب لگا دی ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے وہ بھی خدا ہی کا دیا ملتا ہے اور آخرت میں جو کچھ ملے گا وہ بھی خدا ہی کے دیے ملے گا۔ نہ آخرت میں اس کا کوئی شریک و سہیم ہے نہ دنیا میں۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰی ۝ لَا یَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَی ۝ الَّذِیْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۝
وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی ۝ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی (۱۴-۱۸)

قریش کی طرف التفات

اصولی طور پر حقیقت بیان کر دینے کے بعد یہ خاص طور پر بھی قریش کو مخاطب کر کے واضح فرما دیا کہ ضروری تھا کہ تمہیں پہلے سے آگاہ کر دیا جائے اس وجہ سے میں نے تمہیں اس بھڑکنے والی آگ سے آگاہ کر دیا ہے جس میں وہی لوگ پڑیں گے جو نہایت بدبخت، تکذیب کرنے والے اور منہ موڑنے والے ہوں گے۔ اور وہ اس سے محفوظ رکھے جائیں گے جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے خرچ کریں گے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ امر یہاں واضح رہے کہ مقابلہ یہاں کم شقی اور زیادہ شقی یا زیادہ متقی اور کم متقی میں نہیں ہے بلکہ رسول کی تکذیب کرنے والوں اور اس کی تصدیق کرنے والوں میں ہے۔ رسول اتمام حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے جھٹلانے والے سب 'اَشْقٰی' ہوتے ہیں۔ چنانچہ 'اَشْقٰی' کی صفت 'الَّذِیْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی' آئی بھی ہے جس سے مقصود اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہاں زیر بحث وہ لوگ ہیں جو رسول کی تکذیب اس کے سامنے کر رہے تھے۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو سب سے زیادہ شقی ہیں اور یہ اس جہنم میں پڑیں گے جس کی آگ پہلے سے ان کے لیے تیار اور شعلہ زن ہے۔ برعکس اس کے رسول کے انذار سے چوکنے ہو کر جو لوگ روزِ حساب کی تیاریوں میں لگ گئے اور اپنے نفس کو آلائشوں سے پاک کرنے کے لیے اپنے مال خرچ کرنے لگے وہ سب 'اَتْقٰی' ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے ایسے وقت میں رسول کی بات مانی جب معاشرہ بحیثیت مجموعی اس کا دشمن تھا اور ایسے وقت نیکی کی راہ پر چلے جب اس پر چلنے کا حوصلہ کرنے والے بہت تھوڑے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کے ابتدائی دور کے ساتھیوں کا درجہ 'سابقین' اور 'مقربین' کا ہے جس میں بعد والوں کو شامل ہونے کی سعادت کم ہی حاصل ہو گی۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ دوزخ صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جو زیادہ شقی ہوں گے، عام شقی دوزخ میں نہیں جائیں گے، لیکن یہ بات نہایت کمزور ہے۔ اگر اس کو صحیح مانیے تو ایک شخص

اس آیت سے یہ استنباط بھی کرسکتا ہے کہ دوزخ سے صرف وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو اعلیٰ درجے کے متقی (اتقٰی) ہوں گے، عام متقی اس سے محفوظ نہیں رہیں گے یا یہ استدلال کرسکتا ہے کہ جنت کے حقدار صرف 'اتقٰی' ہوں گے، عام متقی اس سے محروم رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں صحیح نہیں ہیں۔ جن لوگوں نے بھی اس طرح کی کوئی بات کہی ہے ان کو غلط فہمی صرف آیات کا موقع و محل نہ سمجھنے سے پیش آئی ہے۔ ہم نے موقع و محل کی وضاحت کردی ہے جس کے بعد اس طرح کی غلط فہمیوں کی راہ مسدود ہوگئی ہے۔

وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ ۝ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ (۱۹-۲۰)

انفاق وہ مقبول ہے جو رضائے الٰہی کے لیے ہو

یہ 'يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ' کی وضاحت ہے یعنی تزکیۂ نفس کے مقصد کے لیے وہ انفاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک وزن رکھتا ہے جو صرف اس کی خوشنودی اور رضا جوئی کی خاطر کیا جائے۔ یہ غرض نہ ہو کہ کسی کو ممنونِ احسان کرکے اس سے کسی شکل میں اس کا بدلہ چاہا جائے۔ اوپر سورۂ دہر کی آیت 'لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا' (الدھر - ۷۶ : ۹) (ہم کسی بدلے یا شکریہ کے طالب نہیں ہیں) ہم نقل کر آئے ہیں۔ جو مضمون اس آیت کا ہے وہی مضمون دوسرے لفظوں میں یہاں بھی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ 'اور کسی کا اس پر احسان نہیں جس کا وہ بدلہ دے'۔ اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے اس ترجمہ کو غلط نہیں قرار دیا جاسکتا لیکن اس کا مطلب اگر یہ ہے کہ جو شخص اس پر کچھ خرچ کرے جس نے پہلے اس پر کوئی احسان کیا ہے تو یہ انفاق اللہ کی رضا کے لیے نہ ہوگا تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ احسان کرنے والے پر احسان کرنا اس درجہ کی نیکی نہ سہی جو کسی احسان نہ کرنے والے پر کی جاتی ہے لیکن آخر یہ نیکی کیوں نہیں ہے؟ ایک غریب نے آپ کو کبھی پیاس میں پانی پلا دیا تھا، کیا آپ اس کو بھوک میں روٹی کھلا دیں گے تو آپ کا یہ فعل رضائے الٰہی کے لیے نہ ہوگا!

ہم نے آیت کا جو ترجمہ کیا ہے اس پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ ہمارے نزدیک یہ ترجمہ زبان کے اعتبار سے بھی صحیح ہے اور تاویل کے پہلو سے بھی اس میں کوئی الجھن نہیں پیدا ہوتی۔

وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ (۲۱)

یہ ان لوگوں کو بشارت ہے جو اس طرح کے انفاق کی سعادت حاصل کریں گے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ فرمایا کہ وہ نہال ہوجائیں گے۔ ان دو لفظوں کے اندر ربِّ کریم نے جو کچھ بخش دیا ہے اس کی تعبیر سے زبانِ قلم قاصر ہے۔ یہ وہی 'رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً' کی ابدی بادشاہی ہے جس کا ذکر اس کے محل میں ہوچکا ہے۔

ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّ اٰخِرًا۔

لاہور
۲۸ - جنوری ۱۹۸۰ء
۹ - ربیع الاول ۱۴۰۰ھ

تدبّرِ قرآن

۹۳

الضّحٰی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق و لاحق سے تعلق

یہ سورہ اور بعد کی سورہ ——— اَلَمْ نَشْرَحْ ——— دونوں توام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس مشن پر مامور فرمایا ہے اس میں آپ فائز المرام ہوں گے۔ راہ میں جو رکاوٹیں اس وقت نظر آ رہی ہیں یہ سب دور ہو جائیں گی۔ یہ مضمون پچھلی سورتوں میں بھی آیا ہے۔ البتہ دوسرے مطالب کے ضمن میں آیا ہے لیکن ان دونوں کا خاص مضمون ہی یہی ہے۔ ان کے آئینہ میں آپ کی زندگی کے تمام مراحل گویا آپ کے سامنے رکھ دیے گئے ہیں۔ ان میں تسلی کا جو انداز اختیار فرمایا گیا ہے اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ ضحیٰ مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب دعوت کی مخالفت اتنی شدت اختیار کر گئی ہے کہ آپ آگے کی راہ مسدود پا کر دل گرفتہ رہنے لگے اور سورہ اَلَمْ نَشْرَحْ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب مخالفت کی شدت کے علی الرغم افق میں کامیابی کے کچھ آثار بھی نمایاں ہونے لگے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

پہلے آفاق کے شواہد سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح اس دنیا کی مادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے دن کی حرارت و روشنی کی بھی ضرورت ہے اور رات کی خنکی اور تاریکی کی بھی اسی طرح انسانی فطرت کے مخفی جواہر کو اجاگر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان عُسر اور یُسر، دکھ اور سکھ، رنج اور راحت، دونوں طرح کے حالات سے گزارا جائے۔ جو لوگ زندگی کی تربیت میں ان امتحانوں کا مقام سمجھتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں ان کی اعلیٰ صلاحیتیں ان سے پروان چڑھتی ہیں اور جو ان سے عہدہ برآ ہونے کی حکمت سے ناواقف ہوتے ہیں یا اپنی پست ہمتی کے سبب سے ان سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتے جس کے لیے قدرت نے ان کو مقدر

کیا ہے وہ اپنے آپ کو اس مقام بلند سے محروم کر لیتے ہیں جو اس امتحان سے گزرے بغیر انسان کو حاصل نہیں ہوتا۔

اس اصولی حقیقت کے بیان کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے تسلی دی ہے کہ اس وقت جس امتحان سے آپ گزر رہے ہیں وہ خدا کی طرف سے کسی بے التفاتی یا آپ پر کسی عتاب کے سبب سے نہیں پیش آیا ہے بلکہ یہ اسی امتحان کا ایک حصہ ہے جو انسان کی روحانی و اخلاقی تربیت کے لیے ضروری ہے۔

اس کے بعد آپ کو بشارت دی ہے کہ آپ اس وقت جس دور سے گزر رہے ہیں یہ مقدمہ ہے ایک ایسے دور کا جو اس سے بہت بہتر ہو گا اور اس میں آپ کا رب کریم ان فیروزمندیوں اور کامرانیوں سے آپ کو نوازے گا جو آپ کو نہال کر دیں گی۔

اس کے بعد آپ کی زندگی کے بعض ان مراحل کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو بعثت سے پہلے یا ابتدائے بعثت میں آپ کو پیش آئے اور جو بظاہر کٹھن تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے آپ کو نکالا اور اس طرح نکالا کہ دنیا کی راہیں بھی آپ کے لیے فراخ ہوئیں اور روحانی فتوحات کے دروازے بھی کھلے۔

آخر میں آپ کو ان نعمتوں کے حقوق ادا کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا گیا جو آپ کو حاصل ہوئیں۔ اس میں ضمناً ان لوگوں پر تعریض بھی ہے جن کا ذکر سابق سورتوں میں آیا ہے کہ وہ نعمتیں پا کر اللہ سے اکڑنے اور اس کے بندوں کے حقوق تلف کرنے والے بن گئے۔

سُوْرَةُ الضُّحٰی

مَكِّيَّةٌ ______ اٰيات : ١١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۱۱
وَالضُّحٰى ۝١ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝٢ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ
وَمَا قَلٰى ۝٣ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝٤ وَلَسَوْفَ
يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝٥ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝٦
وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝٧ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝٨
فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝٩ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝١٠
وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝١١ ع ۱۱ / ۱۸

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۱
شاہد ہے وقتِ چاشت اور شاہد ہے رات جب پُرسکون ہو جاتی ہے کہ تیرے خداوند نے نہ تجھے چھوڑا اور نہ تجھ سے بیزار ہوا۔ اور بعد کا دور تیرے لیے پہلے سے بہتر ہوگا۔ اور تیرا خداوند تجھے عطا فرمائے گا پس تو نہال ہو جائے گا۔ ۱ - ۵

کیا اس نے تجھے یتیم پایا تو ٹھکانا نہ دیا! جویائے راہ پایا تو راہ نہ دکھائی! اور محتاج پایا تو غنی نہیں کیا! ۶ - ۸

تو جو یتیم ہے اس کو مت دبائیو اور جو سائل ہو اس کو نہ جھڑکیو اور اپنے پروردگار کی نعمت کا بیان کیجیو۔ ۹ - ۱۱

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالضُّحٰی ۙ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی (۱-۲)

ضُحٰی چاشت کے وقت کو کہتے ہیں جب دن کی سرگرمیوں کا آغاز ہوتا اور انسان رات میں آرام کے بعد از سرِ نو تازہ دم ہو کر، جدوجہد کے میدان میں اترتا ہے۔

رات اور دن کی باہمی سازگاری

رات کی شہادت قرآن میں، موقع کی مناسبت سے، مختلف پہلوؤں سے پیش کی گئی ہے جن کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں اس کے ساتھ 'اِذَا سَجٰی' کی قید لگی ہوئی ہے۔ 'سَجٰی' کے معنی 'رَکَدَ' اور 'سَکَنَ' یعنی ٹک جانے اور ساکن ہو جانے کے آتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ یہاں رات کا وہ وقت پیش نظر ہے جب وہ دن کے شور و شغب اور ابتدائے شب کے ہنگاموں سے نکل کر اچھی طرح ٹک جاتی اور انسان کو سکون و راحت بخشنے کے قابل بن جاتی ہے۔ گویا لفظ 'ضُحٰی' سے جو حصہ دن کا مراد لیا گیا ہے 'وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی' سے اس کے بالمقابل شب کا حصہ مراد لیا گیا ہے۔

یہ دن اور رات غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اپنی شکل و صورت، اپنے مزاج اور اپنے اثرات کے لحاظ سے اگرچہ بالکل مختلف ہیں لیکن اس اختلاف کے باوجود انسان بھی اپنی زندگی کے لیے ان کا محتاج ہے اور یہ دنیا بحیثیت مجموعی بھی اپنی بقا کے لیے ان کی حاجت مند ہے اور خالق کائنات کی یہ بہت بڑی رحمت و عنایت ہے کہ اس نے دن کے ساتھ رات اور رات کے ساتھ دن کو وجود بخشا اور ان دونوں کے تفاعل سے وہ مصالح پورے ہوتے ہیں جو اس دنیا کے بقا کے لیے ضروری ہیں۔ قرآن نے ان دونوں کے تفاعل کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے، مثلاً:

هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡهِ وَالنَّهَارَ مُبۡصِرًا ؕ (یونس - ۱۰ : ۶۷)	وہی خدا ہے جس نے تمہارے لیے رات کو تاریک بنایا تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں جدوجہد کرو۔

سورۂ قصص میں فرمایا ہے:

وَمِنۡ رَّحۡمَتِهٖ جَعَلَ لَکُمُ	اور یہ اس کی رحمت میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے

---

[1] اس آیت میں حذف و ایجاز کا جو اصول ملحوظ ہے اس کی وضاحت آیت کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔

اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (القصص - ۲۸ : ۷۳)

رات اور دن بنائے تاکہ تم رات میں سکون حاصل کرو اور دن میں اس کے رزق و فضل کے طلب کرنے کے لیے بڑھو اور تاکہ تم اپنے رب کے شکر گزار رہو۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ (۳)

رنج اور راحت دونوں انسان کی تربیت کے لیے ہیں

یہ وہ اصل مدعا ہے جس کو مبرہن کرنے کے لیے اوپر کے آفاقی شواہد کی قسم کھائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس دنیا میں سورج کی روشنی اور حرارت بھی ضروری ہے اور رات کی تاریکی اور سکون بھی اسی طرح انسان کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے عسر اور یسر، نرمی اور درشتی، فقر اور غنی کی آزمائشیں بھی ضروری ہیں۔ انہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ، جیسا کہ سورۂ فجر میں وضاحت فرمائی ہے، اپنے بندے کے صبر یا شکر کا امتحان کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس وقت اگر تم مخالفوں کی مخالفت، اعوان و انصار کی قلت اور اسباب و وسائل کی کمی سے دوچار ہو یا آسمانی و روحانی کمک کی جتنی ضرورت محسوس کر رہے ہو اتنی تمھیں نہیں پہنچ رہی ہے تو اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ اب تمھارے رب نے تمھیں چھوڑ دیا ہے یا تم سے بیزار ہو گیا ہے بلکہ یہ تمھاری تربیت کے لیے تمھارا امتحان ہے تاکہ تم اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے اچھی طرح تیار ہو جاؤ۔

اس آیت کے اندر یہ سارا مضمون مضمر ہے جو اوپر کی آیات سے بھی واضح ہو رہا ہے اور آگے کی آیات اور اس کے بعد کی سورہ سے بھی، جیسا کہ آپ دیکھیں گے، واضح ہو گا لیکن تقاضائے ایجاز مقسم علیہ کی حیثیت سے سب سے نمایاں تسلی کے مضمون کے اسی پہلو کو کیا گیا ہے جس کے آپ اس دور میں خاص طور پر محتاج تھے یعنی یہ اطمینان دلا دیا گیا کہ جن حالات سے اس وقت آپ دوچار ہیں اس کی وجہ آپ کے معاملہ سے اللہ تعالیٰ کی بے تعلقی یا ناخوشی نہیں بلکہ سنتِ الٰہی کے مطابق آپ کی تربیت ہے۔

[illegible]

یہ امر واضح رہے کہ مکی دور میں قریش کی مخالفت جب زیادہ شدت اختیار کر گئی تو اس سے آپ کو خاص پریشانی جو ہوئی وہ یہی ہوئی کہ مبادا ان لوگوں کی اس بیزاری میں آپ کی کسی کوتاہی یا بے تدبیری کو کوئی دخل ہے جو اللہ تعالیٰ کے عتاب کا سبب ہوئی جس کے باعث یہ حالات پیش آ رہے ہیں۔ آپ کا یہ احساس ظاہر ہے کہ ایک نہایت کمر شکن احساس تھا چنانچہ آگے والی سورہ میں اس کو کمر شکن بوجھ سے تعبیر فرمایا بھی گیا ہے: 'وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ' (الم نشرح - ۹۴ : ۲-۳)

اس پریشانی میں قدرتی طور پر آپ کو سب سے زیادہ بے چینی کے ساتھ وحیِ الٰہی کا انتظار رہتا

اس لیے کہ یہی واحد چیز ہے جو تاریک حالات میں روشنی بھی دکھا سکتی ہے اور اسی سے آپ کو یہ اندازہ بھی ہوتا کہ آپ فریضۂ دعوت رب کے منشا کے مطابق انجام دے رہے ہیں یا اس میں کوئی کوتاہی یا بے تدبیری ہو رہی ہے۔ لیکن وحی کا معاملہ تمام تر اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ حضورؐ کو انتظار اور پریشانی ہو تو وحی نازل بھی ہو جائے۔ چنانچہ ان حالات میں وحی کے وقفہ سے آپ کی پریشانی فطری طور پر دوچند ہو جاتی۔ حضورؐ کی ان پریشانیوں کا ذکر کئی سورتوں میں جگہ جگہ ہوا ہے اور ہم ان کی پوری وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو سورہ طٰہٰ اور سورۂ قیامہ کی تفسیر میں متعلق مباحث پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اس آیت میں آپ کو جو تسلی دی گئی ہے وہ اسی طرح کے حالات میں دی گئی ہے۔ ضروری نہیں کہ کفار میں سے کسی کے اس طعنہ کے جواب میں کہ "اس شخص کو اس کے رب نے چھوڑ دیا" یہ آیت اتری ہو۔ کفار یہ مانتے کب تھے کہ اللہ تعالیٰ سے آپ کا یا آپ کی دعوت کا کوئی خاص ربط ہے اور وہ آپ پر وحی بھیجتا ہے! وہ تو آپ کو کاہن اور شاعر کہتے تھے۔ پھر یہ کہ وحی کے آنے یا نہ آنے کا تجربہ صرف حضورؐ کو ہوتا تھا، کفار کو کیسے معلوم کہ وحی کا سلسلہ قائم ہے یا بند ہے؟ جہاں تک تبلیغ و دعوت کا تعلق ہے وہ آپ نے ایک دن کے لیے بھی کبھی بند نہیں کی کہ کفار کو یہ طعنہ دینے کا موقع ملے کہ اب یہ شخص اپنے منصب پر مامور نہیں رہا یا اس کے رب نے اس کو چھوڑ دیا۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (۴)

تسلی کے مضمون کی مزید وضاحت

یہاں 'اٰخرۃ' اور 'اُولٰی' کے الفاظ دنیا اور آخرت کے اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ عام مفہوم یعنی دعوت کے دورِ آخر اور دورِ اول یا اس کے حاضر و مستقبل کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ اسی تسلی کے مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ اس وقت جو حالات ہیں وہ بدل جائیں گے اور مستقبل ماضی و حاضر سے بہت بہتر ہوگا۔ اس مضمون کی بشارت خفی اور جلی دونوں طرح قرآن نے جگہ جگہ دی ہے اور قدیم صحیفوں میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جو پیشین گوئیاں وارد ہیں ان میں آپ کی دعوت کے آغاز کو رائی کے دانے کی تمثیل سے سمجھایا ہے جو بوتا تو نہایت چھوٹا ہے لیکن جب اگتا ہے تو اس کا پودا سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ پرندے اس میں بسیرا لیتے ہیں۔

ایک جامع بشارت

لفظ 'خَیْرٌ' سے یہاں جو بشارت دی گئی ہے وہ ایک جامع بشارت ہے جس کے اندر دین کے غلبہ و تمکن، مکہ کی فتح، دشمنوں کی پامالی اور دین میں داخل ہونے والوں کی کثرت کے وہ سارے پہلو جمع ہو گئے ہیں جو سابق سورتوں میں بھی بیان ہوئے ہیں، آگے والی سورہ میں بھی ان کی طرف اشارہ

ہے اور سورۂ نصر میں بھی ان کی وضاحت آئے گی۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ (۵)

فرمایا کہ عنقریب تمہارا رب تمہیں دے گا اور تم نہال ہو جاؤ گے۔ یہاں اگرچہ واضح نہیں فرمایا کہ کیا دے گا لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہی خیر ہے جس کی بشارت اوپر والی آیت میں دی گئی ہے اور جو حاوی ہے ان تمام فیروز مندیوں اور کامرانیوں پر جو بعد کے ادوار میں اسلام کو حاصل ہوئیں۔ چونکہ ابھی یہ ساری باتیں پردۂ غیب میں تھیں اس وجہ سے 'يُعْطِيكَ' کے مفعولِ ثانی کو ظاہر نہیں فرمایا لیکن اس کے بعد 'فَتَرْضَىٰ' کے لفظ نے کسی قدر اس شاندار مستقبل کی جھلک دکھا دی کہ اتنا دے گا کہ بس تم نہال ہو جاؤ گے! ——— اس ایک ہی لفظ کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک دفتر میں بھی نہیں سما سکتا۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ (۶ - ۸)

حضورؐ کی زندگی کے بعض سبق آموز حالات کی طرف اشارہ

یہ اسی بات کو جو اوپر آیت ۴ میں ارشاد ہوئی کہ تمہارا مستقبل ماضی سے بہتر ہوگا، مؤکد کرنے کے لیے خود حضورؐ ہی کی زندگی کے بعض سبق آموز حالات کی طرف توجہ دلائی کہ غور کرو تو تمہیں اپنی ہی زندگی اس حقیقت کی نہایت عمدہ تفسیر نظر آئے گی۔

سب سے پہلے آپ کی یتیمی کا حوالہ دیا۔ یتیمی اول تو خود ہی ایک بہت بڑی مصیبت ہے لیکن معاشرہ اگر اس حد تک بگڑا ہوا ہو جس کی تصویر پچھلی سورتوں میں کھینچی گئی ہے تو اس میں یتیم کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ فرمایا ہے 'كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ' (الفجر: ۸۹: ۱۷) (ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم کی کوئی عزت نہیں کرتے) اسی طرح حضورؐ ہی کے خاندان کے بعض افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، 'فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ' (الماعون - ۱۰۷: ۲) (وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے)۔

لیکن حضورؐ کے حال پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل ہوا کہ باوجودیکہ آپؐ کے والد ماجد نے کوئی قابلِ ذکر ترکہ نہیں چھوڑا لیکن آپ کے دادا اور ان کے بعد آپ کے چچا نے آپ کی پرورش کی اور نہایت عزت اور شفقت کے ساتھ پرورش کی۔ عام حالات میں دادا کے دل میں یتیم پوتے کے لیے شفقت اور چچا کے دل میں یتیم بھتیجے کے لیے عزت و محبت کا پایا جانا کوئی نادر بات نہیں بلکہ انسانی فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے لیکن ایک فاسد معاشرہ میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ ایک نادر الوجود بات ہے اور یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی یتیم پر اپنے جمالِ محبت کا وہ پرتو ڈال دے جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ڈال دیا کہ ان کی پرورش ان کے سب سے

بڑے دشمن فرعون نے اپنے محل میں کی۔

وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی۔ یہ اس روحانی انعام کا بیان ہے جو آپ پر بعد کے دور میں ہوا۔

ایک جویائے راہ کی سرگردانیاں اور خدا کی دست گیری

معلوم ہے آپ کو جو رسوم و روایات خاندان کے بزرگوں سے وراثت میں ملیں ان پر آپ کی سلیم فطرت ایک لمحہ کے لیے بھی مطمئن نہ ہو سکی اور دوسری کوئی ایسی روشنی تھی نہیں جو آپ کے لیے سرمایۂ تسکین بن سکتی۔ آسمانی مذاہب کے پیرو جو آپ کے گرد و پیش تھے ان کا حال 'البقرۃ'، 'آل عمران' اور دوسری مدنی سورتوں سے واضح ہو چکا ہے کہ ان کے عقائد و اعمال اس قدر مسخ ہو چکے تھے کہ کوئی جویائے حقیقت ان سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس صورت حال نے آپ کو ایک شدید قسم کی ذہنی کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ آپ کی اسی کشمکش کو یہاں 'وَوَجَدَکَ ضَآلًّا' کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ 'ضَآلٌّ' یہاں گمراہ کے معنی میں نہیں بلکہ جویائے راہ کے معنی میں ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے بھی فطرت سلیم پر ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے ابتدائی دور میں بھی فطرت کی بدیہیات سے کبھی منحرف نہیں ہوتے لیکن فطرت صرف عقائد و اعمال کی موٹی موٹی باتوں ہی میں رہنمائی کر سکتی ہے۔ تمام عقائد اور ان کے سارے تضمنات و لوازم کی نہ وہ تشریح کر سکتی اور نہ تمام اعمال و اخلاق کی صحیح صحیح حد بندی اس کے بس میں ہے اس وجہ سے فطرت پر ہونے کے باوجود ایک شخص یہ جاننے کا محتاج ہی رہتا ہے کہ جس خدا کے وجود پر اس کا دل گواہی دے رہا ہے اس کی صفات اور ان صفات کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں؟ اس کے کیا حقوق بندے پر عائد ہوتے اور وہ کس طرح ادا کرنے ہیں؟ زندگی کی ایسی ضابطہ بندی کس طرح کی جائے کہ وہ پوری کی پوری، اپنے بعید ترین گوشوں میں بھی، خالق کی پسند کے مطابق ہو جائے؟ جب تک یہ سوالات حل نہ ہوں اس وقت تک نہ انسان کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا اور نہ رب کے ساتھ اس کا تعلق ہی استوار ہو سکتا۔ یہی سوالات ہیں جو پوری شدت کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر زندگی کے اس دور میں مستولی تھے جس کی طرف 'وَوَجَدَکَ ضَآلًّا' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت نہ ضلالت کی ہے اور نہ اس کو ہدایت سے تعبیر کر سکتے بلکہ صحیح الفاظ میں یہ جستجوئے راہ کی سرگردانی ہے۔ گویا ایک شخص چوراہے پر کھڑا ہو اور فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ کس سمت میں قدم بڑھائے۔ بعثت سے پہلے غارِ حراء کی تنہائیوں میں آپ انہی گتھیوں کو سلجھانے میں گم رہے۔

بعثت سے پہلے عرب میں دین حنیفی کے پیرؤں کا حال

بعثت سے پہلے عرب میں دین حنیفی کے پیرؤں کا حال کتابوں میں اس طرح بیان ہوا

ہے کہ ان میں سے بعض افراد ایسی شدید الجھن میں مبتلا تھے کہ وہ بیت اللہ سے ٹیک لگا کر حرم میں بیٹھ جاتے اور نہایت حسرت کے ساتھ کہتے کہ "اے رب! ہم نہیں جانتے کہ تیری عبادت کس طرح کریں ورنہ اسی طرح کرتے۔" یہی حال اس وقت تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی رہا ہو گا جب تک آپ ایمان کی حقیقت اور کتاب سے روشناس نہیں ہوئے۔ چنانچہ قرآن میں اسی حالت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے: وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (الشوریٰ - ۴۲: ۵۲) (اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف ایک روح وحی کی جو ہمارے امر میں سے ہے، نہ تم کتاب سے آشنا تھے اور نہ ایمان سے لیکن ہم نے اس وحی کو روشنی بنایا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں) اسی حالت کو سورۂ یوسف میں 'غفلت' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے: وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (یوسف - ۱۲: ۳) (اور بے شک اس سے پہلے تم اس سے بے خبروں میں سے تھے)۔

حقیقی غنا کا سرچشمہ ایمان اور معرفتِ الٰہی ہے

'وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى' فرمایا کہ ہم نے تمہیں محتاج پایا تو غنی کر دیا۔ غنا اور فقر کا جتنا تعلق مادی اسباب و وسائل سے ہے اس سے زیادہ قلب کے احوال سے ہے۔ آدمی کا سینہ ایمان سے خالی ہو تو وہ محتاج ہے اگرچہ اس کے پاس قارون کا خزانہ ہو اور اگر ایمان سے اس کا سینہ معمور ہے تو وہ غنی ہے اگرچہ وہ حضرت یحییٰ کی طرح کمل کی پوشاک پہنتا اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں پر گزارہ کرتا ہو۔ یہی حکمت یوں سمجھائی گئی ہے کہ 'الغنی غنی القلب' (حقیقی غنا دل کا غنا ہے) یہ حقیقی غنا ایمان، اللہ کی معرفت اور اس کی کتاب کے نور سے پیدا ہوتا ہے جس کو یہ دولت حاصل نہیں ہوئی وہ دنیا کی حرص سے کبھی پاک نہیں ہو سکتا اور جو حریص ہے اس کا کاسۂ گدائی کبھی نہیں بھرتا۔

کاسۂ چشمِ حریصاں پُر نہ شد

یہ دنیا عالمِ اسباب ہے اس وجہ سے اس میں انسان اسباب کا محتاج ہے۔ اگر سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سیدہ خدیجہؓ کے مال سے کچھ فائدہ پہنچا تو یہ حضرت خدیجہؓ اور ان کے مال کی ایسی خوش بختی ہے جو اس زمین پر کسی مال اور کسی صاحبِ مال کو مشکل ہی سے حاصل ہوئی ہو گی لیکن وہ غنا جس کا بیان ذکر ہے مجرد مال سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نہیں حاصل ہوتا بلکہ یہ اصلاً اس ہدایت کا ثمرہ ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہے اور جس کی صحیح تعبیر وہ 'شرحِ صدر' ہے جس کی تفصیل بعد کی سورہ ——— اَلَمْ نَشْرَحْ ——— میں، جو اس کی توام ہے، آئے گی۔ جن لوگوں نے اس غنا کو تمام تر حضرت خدیجہؓ کے مال کا نتیجہ قرار دیا ہے ان کی نظر صرف ظاہر پر اٹک گئی حالانکہ اصل حقیقت اس سے ماوراء ہے جو دیکھی نہیں جا سکتی بلکہ صرف سمجھی جا سکتی ہے۔ یہاں اشارات پر قناعت فرمائیے۔ آگے آخری آیت کے تحت بھی اور سورہ اَلَمْ نَشْرَحْ میں بھی اس کے بعض مخفی پہلو ان شاء اللہ زیرِ بحث آئیں گے۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝ (۹-۱۱)

انعامات کا حق — یہ ان انعامات کا، جو اوپر مذکور ہوئے، حق بیان ہوا ہے اور انداز بیان ایسا ہے جس میں ان لوگوں پر نہایت لطیف تعریض بھی ہے جن کا حال پچھلی سورتوں میں بیان ہوا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا فرمائیں ان کو اس کا انعام سمجھنے اور اس کے شکر گزار ہونے کی بجائے وہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے کہ یہ جو کچھ ان کو ملا ہے یہ اسی کے حقدار ہیں۔ فرمایا کہ تم یہ روش نہ اختیار کرنا بلکہ تمھاری یتیمی کی حالت میں تمھارے رب نے جس طرح تم کو پناہ دی اسی طرح تم یتیموں کو پناہ دینا، ان پر شفقت اور کرم کی نظر رکھنا اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنا۔ آیت وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (الفجر - ۸۹: ۱۹) کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں[1] کہ جاہلی معاشرہ میں زورآور عصبات اور اقرباء کمزور وارثوں اور یتیموں کے حقوق دبا بیٹھتے اور ساری وراثت تنہا سمیٹ لیتے۔ 'فَلَا تَقْهَرْ' کے الفاظ میں اسی صورت حال کی طرف اشارہ ہے۔ 'فَلَا تَقْهَرْ' کے معنی یہ ہیں کہ یتیم کو کمزور پاکر اس کو دبانے اور اس کے حقوق غصب کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تنبیہ ظاہر ہے کہ اس بنا پر نہیں کی گئی کہ آپ سے اس قسم کے کسی جرم کے صدور کا امکان تھا بلکہ یہ بالواسطہ قریش کے ان زورآوروں کو تنبیہ ہے جن کو پچھلی سورتوں میں ان کے اسی قسم کے غصب حقوق پر سرزنش فرمائی گئی ہے لیکن وہ اپنے رویے کی اصلاح کے بجائے رسول کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سورہ میں ان کو نظر انداز کر کے رسول کو ہدایت فرما دی کہ دوسرے جو روبہ بھی اختیار کریں ان کو ان کے حال پر چھوڑو، تمھیں بہرحال یتیموں کے حقوق کی حفاظت کرنی ہے۔

قریش کے زورآوروں کو تنبیہ

دوسرے انعام کا حق — 'وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ' یہ اس انعام کا حق بیان ہوا ہے جو اوپر 'وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ لفظ 'سائل' یہاں محدود معنی میں نہیں بلکہ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ خواہ سائل اپنے پیٹ اور تن کی کسی ضرورت کے تحت سوال کرے یا اپنی کسی ذہنی و عقلی الجھن سے متعلق سوال کرے یا اپنے دین سے متعلق سوال کرے، غرض جس طرح کی بھی مدد و رہنمائی کا طالب ہو حتی الامکان اس کی مدد و رہنمائی کی جائے اور اگر اس کا موقع نہ ہو تو خوبصورتی کے ساتھ اس کے سامنے معذرت پیش کر دی جائے، اس کو جھڑکا اور ڈانٹا نہ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات یاد رکھنا کہ ایک دور تم پر بھی ایسا گزرا ہے جب تم سراپا سوال تھے اور ان سوالوں نے تمھاری زندگی ضیق میں ڈال رکھی تھی بالآخر تمھارے رب نے تمھاری ہر خلش دور فرمائی اور تمھارے

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن - جلد ہشتم، صفحہ: ۳۵۹

ہر سوال کا جواب دیا۔ اس کا حق یہ ہے کہ تم بھی سائلوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، ان لوگوں کی روش نہ اختیار کرنا جن کا حال یہ ہے کہ خدا نے ان کو دے رکھا ہے تو مسکینوں اور سائلوں سے ترش روئی سے پیش آتے ہیں اور اگر ایسی کسی گردش میں خدا ان کو پکڑ لے تو کہیں گے کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا، اس وقت ان کو یہ بات یاد نہیں آتی کہ انھوں نے خدا کے بندوں کو کس طرح ذلیل کیا ہے۔

لوگوں کو اللہ کی حکمت سے بہرہ مند کرو

'وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ' یہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کا حق بیان ہوا ہے جو اوپر 'وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ ہم اس کی وضاحت کرتے ہوئے اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سے صرف وہ غنا مراد نہیں ہے جو حضورؐ کو حضرت خدیجہؓ کے مال سے حاصل ہوا بلکہ اصلاً اس سے دین کی وہ حکمت اور شریعت کی وہ دولت مراد ہے جس کی شان قرآن میں یہ بیان ہوئی ہے کہ 'وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا' (البقرۃ - ۲ : ۲۶۹) (اور جس کو حکمت عطا ہوئی اس کو خیر کثیر کا خزانہ بخشا گیا)۔ یہاں لفظ 'حَدِّثْ' خاص طور پر نگاہ میں رکھیے۔ یہ مال کی نعمت کے لیے نہیں بلکہ حکمت کی نعمت ہی کے لیے موزوں ہے۔ فرمایا کہ جس حکمت کے خزانے سے تمھارے رب نے تم کو بہرہ ور کیا ہے اس کی تحدیث کرو یعنی جس طرح تمھارے رب نے تمھیں مفت بخشا ہے تم بھی اس کو مفت بانٹو، فیاضانہ بانٹو، ہر آنے جانے والے کے سامنے اس کا چرچا کرو اور ہر بزم و انجمن کو اس کے ذکر سے معمور کر دو۔

ربِّ کریم کے فضل سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى اِحْسَانِهٖ۔

لاہور

۶- فروری ۱۹۸۰ء

۱۹- ربیع الاول ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۹۴

الم نشرح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ کی مثنیٰ ہے۔ سورۂ ضحیٰ کے بعد یہ بغیر کسی تمہید کے اس طرح شروع ہو گئی ہے گویا سابق سورہ میں جو مضمون اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی (الضحیٰ - ۹۳: ۶) اور اس کے بعد کی آیات میں بیان ہوا ہے اسی کی اس میں تکمیل کر دی گئی ہے۔ بس اتنا فرق نظر آتا ہے کہ سابق سورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جن الطاف و عنایات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کا ذریعہ بنایا ہے ان کا تعلق بعثت سے قبل یا ابتدائے بعثت کے دور سے ہے اور اس میں جن افضال و احسانات کا حوالہ دیا ہے وہ اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب آپ کی دعوت کا چرچا مکہ سے نکل کر عرب کے دوسرے گوشوں میں بھی پہنچ چکا ہے۔

سابق سورہ میں آپ کو یہ بشارت دی گئی کہ دعوت کے پہلو سے آپ کا مستقبل آپ کے ماضی اور حاضر سے بہت بہتر ہو گا، آپ اس وقت جن مشکلات سے دوچار ہیں وہ قانونِ قدرت کے مطابق آپ کی تربیت کے لیے ہیں وہ جلد دور ہو جائیں گی۔ اس سورہ میں اس بشارت کی صداقت کے چند نمایاں شواہد کا حوالہ دے کر تاکید کے ساتھ آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں آپ کو جو دشواری بھی پیش آئے گی اس کے پہلو بہ پہلو فیروزمندی بھی ہو گی بشرطیکہ آپ عزم و جزم کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ کریں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہے۔ اس دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس ذہنی پریشانی سے دوچار رہے اس کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرحِ صدر کی جس نعمت سے سرفراز فرمایا ہے پہلے اس کا حوالہ ہے اس کے بعد آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ جس طرح آپ نے اب تک دیکھا ہے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی نمودار ہوتی ہے اسی طرح آئندہ

بھی آپ کی دعوت کے مراحل طے ہوں گے اور کسی مرحلے میں بھی یہ کام رکنے والا نہیں ہے۔ اس کے بعد تکمیلِ دعوت کی منزل کی طرف اشارہ اور اس مرحلہ کی کامرانیوں کے حصول کی تدبیر بتائی گئی ہے۔

سُورَةُ اَلَمْ نَشْرَح

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات : ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۸
اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴿۱﴾ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ﴿۲﴾
الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ﴿۳﴾ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿۴﴾
فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿۵﴾ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿۶﴾ فَاِذَا
ع ۸/۱۹ فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴿۷﴾ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴿۸﴾

ترجمۂ آیات ۱-۸
کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا اور جو بوجھ تمہاری کمر کو توڑے دے رہا
تھا اس کو تمہارے اوپر سے اتار نہیں دیا! اور تمہارا آوازہ بلند نہیں کیا۔ ۱-۴
تو ہر مشکل کے ساتھ آسانی، بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ ۵-۶
پس جب تم فارغ ہو تو کمربستہ ہو اور اپنے رب سے لو لگاؤ۔ ۷-۸

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ ۙ وَوَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ (۱-۲)

وہ سنتِ الٰہی جو دعوتِ حق کی کامیابی کے لیے مقرر ہے

سابق سورہ کی تفسیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کی تفصیل بیان ہو چکی ہے جو بعثت سے پہلے آپ کو جستجوئے حقیقت کی راہ میں اور ابتدائے بعثت کے دور میں مخالفوں کی مخالفت کی شدت اور اعوان و انصار کی قلت کے سبب سے لاحق ہوئیں۔ ساتھ ہی اس میں یہ بشارت بھی دی گئی کہ اس وقت آپ جن حالات و مشکلات سے دوچار ہیں یہ وقتی و عارضی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو جلد دور فرما دے گا اور آپ کی دعوت کا مستقبل اس کے ماضی و حاضر سے بہت زیادہ روشن ہو گا۔ بعد میں جب وحیِ الٰہی کی روشنی نے آپ کے دل کے خلجان دور کر دیے اور حقیقت روشن ہو کر سامنے آ گئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تعلیم اور مزید حوصلہ افزائی کے لیے اپنی وہ سنت بھی نہایت واضح الفاظ میں بیان فرما دی جو اس نے دعوتِ حق کی کامیابی کے لیے مقرر فرما رکھی ہے اور جس سے لازماً ہر داعیِ حق کو سابقہ پیش آتا ہے اور جو آگے اس سورہ کے اصل مضمون کی حیثیت سے فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا (۵) (بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے) کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

سینہ کو کھول دینے سے مقصود وہ بصیرت و معرفت پیدا کرنا ہے جو صحیح ایمان کا ثمرہ ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ پر وہ اعتماد و توکل پیدا ہوتا ہے جو تمام قوت اور عزم کا سرچشمہ ہے۔ اگر یہ ایمان موجود ہو تو بڑی سے بڑی مزاحمت بھی انسان کے عزم کو متزلزل نہیں کر سکتی اور اگر یہ نہ ہو تو بغیر کسی مزاحمت کے بھی انسان شکست کھا جاتا ہے۔

'وَوَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ' یہ جملہ معناً پہلے ہی جملہ پر عطف ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ ہم نے اسی کے تحت کیا ہے۔ سورۂ نبا کی تفسیر میں اس اسلوب کی وضاحت ہو چکی ہے۔

اَلَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ (۳)

غم بالائے غم:

یہ اس 'وِزۡر' (بوجھ) کی صفت ہے کہ اس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی۔ یہ وہی بارِ غم ہے جو بعثت سے پہلے آپ کے دل پر اس سبب سے تھا کہ آپ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں و حیران تھے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا پھر جب اللہ نے آپ پر ہدایت کی راہ کھول دی تو اس غم پر مزید اضافہ اس سبب سے ہوا کہ آپ کی پوری قوم اس کی دشمن بن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس غم کو اَلَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (کمر شکن) کی صفت سے تعبیر کرنا کوئی مبالغہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس ہدایت سے آپ کا سینہ کھول دیا اس کے متعلق آپ کا یہ احساس ایک امرِ فطری تھا کہ جس طرح اس نے آپ کے سینہ میں گھر کر لیا اسی طرح ہر سینہ میں اس کو اتر جانا چاہیے۔ لیکن اس توقع کے خلاف جب آپ نے دیکھا کہ جتنی ہی دعوت کی راہ میں آپ کی سرگرمی بڑھتی جا رہی ہے اتنی ہی اس سے لوگوں کی وحشت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو قدرتی طور پر آپ کو یہ گمان گزرا کہ شاید آپ کی جدوجہد میں کوئی کمی یا خامی ہے جس کے سبب سے دعوت اثر انداز نہیں ہو رہی ہے۔ یہ گمان کر کے آپ جدوجہد میں مزید اضافہ کرتے چلے جاتے لیکن اس سے بھی جب صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو آپ کی پریشانی دوچند ہو گئی۔ علاوہ ازیں اس طرح کے حالات میں اگر وحی کے آنے میں کچھ وقفہ ہو جاتا تو یہ وقفہ بھی آپ کے غم و الم میں اضافہ کر دیتا کہ مبادا یہ اللہ تعالیٰ کے کسی عتاب کے سبب سے ہو۔ حضورؐ کی ان پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے جس طرح یہاں تسلی دی گئی ہے اسی طرح سورۂ طٰہٰ میں بھی دی گئی ہے:

طٰهٰ ۚ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۙ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۙ (طٰہٰ - ۲۰: ۱-۳)

یہ سورۂ طٰہٰ ہے۔ ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ اپنی زندگی اجیرن بنا لو۔ یہ تو بس ان لوگوں کے لیے یاددہانی ہے جو ڈرنے والے ہوں۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۴)

یعنی کیا یہ بات نہیں ہے کہ ہم نے تمہارا آوازہ بلند کیا! 'لَکَ' جس طرح پہلی آیت میں اختصاص و تائید اور نصرت کے اظہار کے لیے ہے اسی طرح یہاں بھی ہے۔ یعنی تمہاری تقویت و حوصلہ افزائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمہارا ذکر دور دور تک پھیلا دیا۔

دعوت کا چرچا اطراف و اکناف میں

اس آیت سے سورہ کا زمانۂ نزول معین ہوتا ہے کہ یہ اس دور میں اتری ہے جب آپ کی دعوت کا چرچا عرب کے اطراف و اکناف میں پھیلنے لگا ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ مکہ کے سادات جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے دعوت دی، وہ تو ایک عرصہ تک دعوت اور داعی کی مخالفت پر جمے رہے لیکن حج کے موسم میں باہر کے جو لوگ آتے ان کے ذریعہ سے یہ دعوت مکہ کے اطراف، خصوصیت کے ساتھ مدینہ کے انصار میں پھیل گئی۔ پھر بالتدریج نہ صرف عرب کے دور و قریب کے قبائل بلکہ اطراف کے دوسرے ملکوں میں بھی اس کا ذکر پہنچ گیا اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہا کہ یہ آواز دبنے والی نہیں ہے بلکہ جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ بچہ بچہ کی زبان پر اس کا چرچا ہو گا اور گوشہ گوشہ 'اللہ اکبر' کی صدا سے گونج اٹھے گا۔

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۵-۶)

اصل سبق

یہ وہ اصل سبق ہے جو اوپر کے پیش کردہ شواہد کی روشنی میں دینا مقصود ہے اور جس کو اس سورہ کے عمود کی حیثیت حاصل ہے۔ فرمایا کہ جب تم اپنے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ دیکھ رہے ہو تو اس کی اس سنت پر اطمینان رکھو کہ اس نے 'یُسر' کا دامن 'عُسر' کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ یعنی آسانی ظاہر تو ہوگی ضرور لیکن آزمائش کے دور سے گزرنے کے بعد۔ سابق سورہ میں یہی حقیقت آفاق اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات سے ثابت کی گئی ہے۔ اس سورہ میں خاص حضورؐ کی زندگی کے تجربات ہی کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے تاکہ زیادہ مؤثر ہو سکیں۔

ایک خاص نکتہ

یہاں اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ ایک ہی بات دو مرتبہ فرمائی گئی ہے۔ یہ تکرار محض تاکید کے لیے نہیں، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ 'عُسر' اور 'یُسر' دونوں اس دنیا میں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک گھاٹی کسی نے پار کر لی تو یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ بس اب کسی نئی گھاٹی سے اس کو سابقہ نہیں پیش آنا ہے بلکہ دوسری اور تیسری گھاٹی بھی آ سکتی ہے۔ چاہیے کہ ان کو عبور کرنے کا حوصلہ بھی قائم رکھے۔ زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ اس جہان میں ہر مسافر کو نشیب و فراز سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان سے گزرنے کے بعد ہی کوئی رہرو منزل مقصود پر پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ حق کے راستہ پر چلنے والوں سے بھی ہے۔ جو لوگ اس راستہ پر چلنے کا ارادہ کرتے ہیں ان کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ راہ سے تمام عقبات خود بخود دور ہو جائیں بلکہ ان کو دور کرنے کے لیے خود ان کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے یہ ضمانت ضرور ہے کہ اگر وہ راہ کی رکاوٹوں کے علی الرغم ہمت نہیں ہاریں گے اور جتنی قوت ان کے رب نے ان کو بخشی ہے اس کو استعمال کرنے سے دریغ نہیں کریں گے تو وہ ان کے لیے ہر مشکل کے بعد آسانی پیدا کرے گا جس سے تازہ دم ہو کر وہ آگے کے سفر کے لیے مزید عزم و حوصلہ حاصل کر لیں گے اور ایک کے بعد دوسری مشکل سے الجھتے اور اس کو سر کرتے ہوئے بالآخر منزل مطلوب پر پہنچ جائیں گے۔

اس امتحان کی حکمت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ منافق اور مخلص، راست باز اور ریاکار میں امتیاز کرتا ہے تاکہ ہر ایک اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے۔ کسی کو یہ شکایت نہ رہے کہ اس کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ اگر یہ امتحان نہ ہوتا تو کھوٹے اور کھرے میں وہ امتیاز نہ ہو سکتا جو ہر ایک پر حجت قائم کر دے۔

آخری منزل کے لیے جدوجہد کی ہدایت

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ (۷-۸)

یہ آخری منزل کے لیے جدوجہد کی ہدایت ہے۔ 'نصب ینصب' کے معنی جدوجہد اور محنت

کرنے کے ہیں۔ فرمایا کہ دعوت کی راہ کے عقبات طے کرتے ہوئے جب وہ مرحلہ آ جائے کہ اللہ کی نصرت بے نقاب ہو جائے، مکہ فتح ہو جائے، دشمن گھٹنے ٹیک دیں اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگیں تو پھر تم کمر کس کے آخری منزل کی تیاری کے لیے جدوجہد کرو اور کلیتہً اپنے رب کی طرف جھک پڑو۔ گویا بیک وقت ان آیات میں دو باتیں جمع کر دی گئی ہیں۔

ایک تو یہ بشارت کہ آپ تمام مشکلاتِ راہ کو عبور کرتے ہوئے دعوت کی آخری منزل پر کامیابی کے ساتھ پہنچنے اور اپنی عظیم ذمہ داری سے سرخروئی کے ساتھ فارغ ہونے کا شرف حاصل کریں گے۔

دوسری یہ کہ کامیابی کی آخری منزل پر پہنچ جانے کے بعد بھی آپ کے لیے کمر کھول دینے کا وقت نہیں آئے گا بلکہ لقائے رب کی منزل کے سفر کے لیے آپ کو مزید اہتمام سے کمر کس کے تیاری کرنی پڑے گی۔

اسی آخری ہدایت کی تعمیل کا اہتمام تھا کہ آخر دورِ حیات میں آپؐ کا انہماک عبادتِ الٰہی میں بہت بڑھ گیا تھا۔ بعض لوگوں نے آپ کا یہ حال دیکھ کر سوال کیا کہ حضورؐ آپ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ بخشے جا چکے ہیں تو آپ عبادت میں اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا: افلا اکون عبدًا شکورًا (تو کیا میں اپنے رب کا شکرگزار بندہ نہ بنوں!)

یہاں بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی۔ اس کی پوری تفصیل سورۂ نصر میں آئے گی۔ سورہ یہاں ہم نقل کیے دیتے ہیں:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ (النصر - ۱۱۰: ۱-۳)	جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے اور دیکھو کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی تسبیح کرو اس کی حمد کے ساتھ اور اس سے مغفرت مانگو۔ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ اولا واخرا۔

لاہور

۱۵ - فروری ۱۹۸۰ء

۲۷ - ربیع الاول ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۹۵

التّین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلّق اور مطالب کی ترتیب

اس سورہ کا عمود جزا و سزا کا اثبات ہے۔ اس کی تمہید یوں اٹھائی ہے کہ دنیا میں انبیائے کرام کی بعثت و دعوت کے جو اہم مراکز ہیں پہلے ان کا ذکر بصورتِ قسم یعنی بطور شہادت کیا اور اس کی روشنی میں یہ واضح فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر، نہایت اعلیٰ فطرت اور نہایت برتر صلاحیتوں کے ساتھ، پیدا کیا ہے لیکن اس برتری کو قائم رکھنے اور ان اعلیٰ صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے اس نے یہ سنت ٹھہرائی ہے کہ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کریں گے اور اس راہ کی صعوبتوں کا عزم و حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کریں گے تو وہ اپنی اس جدوجہد کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو نفس پرستی اور تن آسانی کے باعث اس راہ کے عقبات کو پار کرنے اور اس کی صعوبتوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دے گا اور وہ بالآخر اس کھڈ میں گریں گے جو یہ راہ اختیار کرنے والوں کے لیے مقدر ہے۔

یہاں پچھلی دونوں توام سورتوں میں آیات ’فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی‘ (اللیل ۹۲: ۵-۷) اور آیت ’فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا‘ (الم نشرح ۹۴: ۵) کی تفسیر پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ان میں بھی ایک دوسرے پہلو سے یہی حقیقت واضح فرمائی گئی ہے جو اس سورہ میں پیش کی گئی ہے۔ اس سے سابق اور لاحق دونوں سورتوں کا تعلق واضح ہو جائے گا۔

آخر میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ بالکل حق و عدل پر مبنی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کی نظر میں نیک و بد دونوں یکساں ہیں حالانکہ یہ بات بالبداہت باطل ہے۔ جس خدا نے لوگوں کو نیکی اور بدی کا شعور دیا ہے لازم ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر نیک اور بد میں امتیاز کرنے والا اور ہر ایک کے ساتھ اس کے استحقاق کے مطابق معاملہ کرنے والا ہو۔

آگے سورۂ عصر میں بھی یہی حقیقت ذرا مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اس کو بھی سامنے رکھ لیجیے تو اس سورہ کے رخ کو متعین کرنے میں آسانی ہو گی۔ فرمایا ہے:

وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝
إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝
(العصر - ۱۰۳ : ۱ - ۳)

زمانہ شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے
مگر وہ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک
عمل کیے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو
حق اور صبر کی تلقین کی۔

سُورَةُ التِّين

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــــــ آیات : ۸

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۸ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝۱ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝۲ وَهٰذَا الْبَلَدِ
الْاَمِيْنِ ۝۳ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴
ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝۵ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۶ فَمَا يُكَذِّبُكَ
ع ۸ / ۲۰ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝۷ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸

ترجمۂ آیات ۱-۸ شاہد ہیں جبل تین اور کوہ زیتون اور طور سینین اور یہ پُرامن سرزمین۔ ۱-۳

کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا، پھر ہم نے اس کو ادنیٰ درجہ میں ڈال دیا جب کہ وہ خود گرنے والا بنا بجز ان کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے۔ سو ان کے لیے ایک دائمی صلہ ہے۔ ۴-۶

تو اب کیا ہے جس سے تم جزاء و سزا کو جھٹلاتے ہو! کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں! ۷-۸

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالتِّيۡنِ وَالزَّيۡتُوۡنِ ﴿۱﴾

'تین' سے مراد جبلِ تین ہے

'و' یہاں قسم کے لیے ہے اور قسم سے متعلق ہم برابر وضاحت کرتے آ رہے ہیں کہ قرآن میں اشیاء اور مقامات کی جو قسمیں آئی ہیں وہ تمام تر اس دعوے پر دلیل کی حیثیت سے آئی ہیں جو قسم کے بعد مذکور ہوا ہے۔ یہاں 'تین' سے مشہور پھل انجیر مراد نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے مفسرین نے سمجھا ہے، بلکہ جبلِ تین ہے جو انجیر کی پیداوار کے لیے مشہور رہا ہے۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ تین میں اس کی جو تحقیق بیان فرمائی ہے اس کا کچھ ضروری حصہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

"'تین' ایک خاص پہاڑ کا نام ہے۔ عربی میں انجیر کو تین کہتے ہیں۔ چونکہ یہاں انجیر کی پیداوار بکثرت تھی اس وجہ سے یہ تین ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اہلِ عرب اس نام سے اس کو جانتے تھے۔ نام رکھنے کا یہ طریقہ عربوں میں معروف رہا ہے۔ جس چیز کی پیداوار جہاں زیادہ ہوتی بسا اوقات اسی کے نام سے اس مقام کو موسوم کر دیتے۔ غضی، شجرۃ، نخلۃ وغیرہ مقاموں کے نام اسی طرح پڑے ......

مشہور شاعر نابغہ ذبیانی نے اپنے شعروں میں 'تین' کا ذکر ایک مقام کی حیثیت سے کیا ہے:

صهب الظلال اتين التين عن عرض　　　یزجین غیما قلیلا ماؤہ شبما

اس میں اس نے 'تین' سے شمال کے ایک پہاڑ کو مراد لیا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ یہ حلوان اور ہمدان کے درمیان ہے۔"

آگے مولانا اس کے بارے میں بعض قیاسات کی تردید کرتے ہوئے اپنی قطعی رائے ان الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں:

"اس سے معلوم ہوا کہ تین سے مراد یا تو کوہِ جودی ہے یا اسی کے قریب کا کوئی دوسرا پہاڑ۔ تورات میں ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد بنی آدم یہیں سے ادھر ادھر متفرق ہوئے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کوہِ جودی کے پاس پیش آیا۔"

زیتون سے مراد کوہِ زیتون ہے

'زیتون' سے بھی زیتون کا درخت یا اس کا پھل مراد نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے مفسرین نے

گمان کیا ہے۔ بلکہ جبلِ زیتون ہے جو حضرت مسیحؑ کی دعوت اور عبادت کے مرکز کی حیثیت سے معروف ہے اور انجیل میں جس کا ذکر بار بار آیا ہے۔

مولاناؒ اس کے متعلق اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"ہمارے نزدیک یہ بھی مقام کا نام ہے۔ چونکہ زیتون کی پیداوار یہاں زیادہ تھی اس وجہ سے عربوں کے اس طریق تسمیہ کے مطابق، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ زیتون کے نام سے موسوم ہوگیا۔ یہ یقیناً وہی پہاڑ ہے جس کا انجیل میں اکثر ذکر آتا ہے اور جس پر حضرت مسیح علیہ السلام عبادت اور دعا کے لیے جایا کرتے تھے۔ لوقا ۲۱: ۳۷ میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:

'اور دن میں وہ ہیکل میں تعلیم دیتا تھا اور رات میں نکل جاتا تھا اور اس پہاڑ پر شب بسر کرتا تھا جس کا نام کوہ زیتون ہے'

سلف کے اقوال سے بھی اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت کعبؓ سے روایت ہے کہ زیتون سے مراد بیت المقدس ہے اور قتادہ کہتے ہیں کہ زیتون وہ پہاڑ ہے جہاں بیت المقدس واقع ہے"

وَطُوۡرِ سِيۡنِيۡنَ ۙ وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِيۡنِ (۲-۳)

طورِ سینا — ان دونوں کا مقام ہونا تو بالکل واضح ہے لیکن طورِ سینین میں لفظ سینا، جو سینین ہوگیا ہے، اس کی تحقیق مولانا کے نزدیک یہ ہے:

قرآن میں ایک جگہ طُوۡرِ سَيۡنَآءَ (المومنون - ۲۳ : ۲۰) بھی آیا ہے یعنی ایک جگہ یہ مؤنث کی صورت میں ہے اور دوسری جگہ جمع سالم کی شکل میں۔ جیسے عربی میں 'جمعًا' اور 'اجمعون' مستعمل ہیں۔ تورات میں کہیں 'سینا' آیا ہے اور کہیں 'سینیم' اور معلوم ہے کہ عبرانی میں 'یم' جمع کی علامت ہے۔"[1]

بلد امین سے کہ مراد ہے — بلد امین سے ظاہر ہے کہ مکہ مراد ہے لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صاف الفاظ میں مکہ کیوں نہیں کہا، صفت کے ساتھ کیوں اس کا ذکر کیا۔ اس سوال کا جواب ہم آگے ان شاء اللہ جب مقسم علیہ سے ان قسموں کے تعلق کی وضاحت کریں گے، دیں گے۔

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِىۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ ۖ ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِيۡنَ ۙ

---

[1] ہم اس کتاب میں واضح کر چکے ہیں کہ عربی میں بعض مرتبہ کسی چیز کی جمع اس کی وسعت اطراف کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے عبرانی میں بھی یہ قاعدہ موجود ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (۴-۶)

اصل دعویٰ جس کو ثابت کرنے کے لیے قسمیں کھائی گئی ہیں

یہ وہ اصل دعویٰ ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے مذکورہ بالا قسمیں کھائی گئی ہیں۔ فرمایا کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے لیکن ہماری سنت یہ ہے کہ جو لوگ اس انعام کی قدر کرتے اور ان کی فطرت کے اندر جو ہدایت ہم نے ودیعت کی ہے اس کو پروان چڑھاتے اور پھر نبیوں کی دعوت قبول کر کے ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کر لیتے ہیں ان کو تو ہم دائمی اجر سے نوازتے ہیں، لیکن جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے وہ ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں، اور ان کو ہم اسی گڑھے میں پھینک دیتے ہیں جس سے بچانے ہی کے لیے ہم نے ان پر یہ انعام کیا تھا۔

'لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ'۔ 'تَقْوِيمٌ' کا لغوی مفہوم تو کسی چیز کو سیدھا کرنا، مثلاً کہیں گے: قَوَّمْتُ الرُّمْحَ فَاسْتَقَامَ (میں نے نیزے کو سیدھا کیا تو وہ سیدھا ہو گیا) پھر اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی شے کو کسی خاص مقصد کے لیے موزوں اور مناسب بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

انسان کو اللہ نے نہایت اعلیٰ مقصد کے لیے بہترین صلاحیتوں سے آراستہ کیا ہے

انسان کے متعلق قرآن میں بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اس کو خدا نے عبث نہیں بلکہ ایک عظیم غایت (بِالْحَقِّ) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ غایت یہ ہے کہ اس دنیا کے دارالامتحان میں وہ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کی باطل ترغیبات و ترہیبات سے بچتا ہوا زندگی کی اس صراطِ مستقیم پر گامزن رہے جو اس کے رب نے اس کے لیے کھولی ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ابدی بادشاہی بخشے گا اور اگر وہ شیطان کی ترغیب سے بہک کر یا اس کی ترہیب سے ڈر کر اس صراطِ مستقیم کو چھوڑ بیٹھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ہلاکت کی اسی وادی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے گا جو وہ اپنے لیے پسند کرے گا۔ انسان کو اس غایت کے اعتبار سے، اللہ تعالیٰ نے نہایت بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔ اس کی ظاہری ساخت بھی گواہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور اس کی باطنی صلاحیتیں بھی اتنی اعلیٰ ہیں کہ اس زمین کی تمام مخلوقات میں سے صرف وہی ان کا اہل بن سکا ہے۔ پچھلی سورتوں میں، مختلف اسلوبوں سے، یہ بات بیان ہوئی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر میں امتیاز بخشا ہے۔ یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ بالطبع وہ خیر کو پسند کرنے والا اور شر کو ناپسند کرنے والا ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی جگہ جگہ واضح کی گئی ہے کہ وہ ذی عقل اور ذی ارادہ ہستی ہے، دوسری مخلوقات کی طرح عقل اور ارادہ سے محروم نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں شہادت دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے اس کو پیدا کیا ہے اس کے لیے تمام ضروری صلاحیتوں سے اس کو آراستہ بھی کیا ہے۔

[illegible]

'ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ'۔ یہ اس سنت کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ

اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ فرمایا کہ انسان چونکہ ذی ارادہ ہستی ہے اس وجہ سے اس احسن تقویم کے شرف سے بہرہ یاب رہنا یا اس سے محروم ہو جانا اس کے اپنے رویہ پر منحصر ہے۔ اگر وہ اس کی قدر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مدارج بلند کرتا ہے اور اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتا بلکہ نیچے ہی کی طرف جھکا رہتا ہے تو اس کو وہ نیچے ہی کی طرف لوٹا دیتا ہے اور بالآخر وہ تمام سرفرازیوں سے محروم ہو کر، لڑکھڑاتا ہوا قعرِ جہنم میں گر پڑتا ہے۔

'اَسْفَلَ' میرے نزدیک ظرف اور 'سٰفِلِیْنَ' 'رَدَدْنٰہُ' کی ضمیرِ مفعول سے حال ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نیچے کی طرف اس وجہ سے پھینکتا ہے کہ وہ نیچے کی طرف جانے ہی کی رغبت کرتا ہے، بلندیوں پر چڑھنے کا حوصلہ نہیں کرتا۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ کھٹک پیدا ہو کہ سٰفِلِیْن جمع ہے تو وہ ضمیرِ واحد سے کس طرح حال پڑ سکتا ہے؛ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ ضمیر اگرچہ واحد ہے لیکن اس کا مرجع 'اَلْاِنْسَانَ' ہے جو معناً جمع ہے چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ اس کے لیے ضمیریں واحد بھی آئی ہیں اور جمع بھی۔

ان لوگوں کی صفت جو ہلاکت سے محفوظ رہتے ہیں

'اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ' یہ ان لوگوں کی صفت بیان ہوئی ہے جن کو اللہ تعالیٰ اس ہلاکت سے محفوظ رکھتا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ 'اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ' پر پیدا کیے جانے کی قدر و قیمت سمجھتے اور ایمان و عملِ صالح کی زندگی اختیار کرنے کی توفیق پاتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نیچے نہیں پھینکتا بلکہ ان کو عزت و رفعت بخشتا ہے اور وہ ایک ابدی زندگی میں ابدی انعام سے نوازے جاتے ہیں۔

'غَیْرُ مَمْنُوْنٍ' کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس کے معنی غیر منقطع اور دائم کے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کی تاویل اس سے مختلف بھی کی ہے لیکن وہ عربیت کے خلاف ہے۔

اصل دعوے کو متعین کرنے کے بعد اب آئیے اس سوال پر غور کیجیے کہ مذکورہ بالا قسمیں کس طرح اس دعوے پر دلیل ہیں جو یہاں پیش کیا گیا ہے۔

جبلِ تین کی شہادت جزا پر

جبلِ تین کی شہادت جزا پر

سب سے پہلے جبلِ تین کی قسم کھائی گئی ہے اور روایات کی روشنی میں اوپر وضاحت ہو چکی ہے کہ اس سے مراد کوہِ جودی ہے۔ اس پہاڑ پر اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات کے دو اہم واقعات پیش آئے ہیں اور ان کی تفصیل قدیم صحیفوں میں موجود ہے۔ ایک حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ اور دوسرا حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا واقعہ۔ ان میں سے پہلے واقعہ کا ذکر مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ تین میں یوں کیا ہے:

"تین وہ پہلا مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے جزا و سزا کا پہلا واقعہ پیش آیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آدم علیہ السلام نے خدا کا عہد بھلا دیا اور اپنے حاسد کے فریب میں آکر ممنوعہ درخت کا پھل کھا بیٹھے تو ان کو اور ان کی بیوی کو جزا کے قانون سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو سرفرازی بخشی تھی اس سے وہ محروم کر دیے گئے اور جنت کی خلعت ان سے چھین لی گئی ..... اور یہ واقعہ ان کی پوری نسل کے لیے ایک یادگار واقعہ قرار پایا۔ چنانچہ قرآن میں متعدد جگہ اسی پہلو سے اس کو یاد دلایا گیا ہے، مثلاً فرمایا ہے: یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ کَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْکُمْ مِّنَ الْجَنَّۃِ یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا (الاعراف - ۷: ۲۷) (اے آدم کے بیٹو! کہیں شیطان تم کو ورغلا نہ دے جس طرح اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا چھوڑا، جنت کے خلعت سے محروم کر کے)۔

"یہاں وہ بات بھی یاد رکھیے جو تورات میں مذکور ہے کہ حضرات آدم و حوا (علیہما السلام) نے جنت کی خلعت سے محروم ہونے کے بعد جس درخت کے پتوں سے اپنے تن ڈھانکے وہ انجیر کا درخت تھا۔"

"اس واقعہ کے بعد قرآن میں تصریح ہے کہ حضرات آدم و حوا (علیہما السلام) نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور ان پر ہدایت نازل کرنے اور اس ہدایت کی پیروی کرنے والوں کو اجر دینے کا وعدہ فرمایا۔ پہلے عہد کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا عہد تھا جو اس نے حضرت آدمؑ سے کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جبل تین کا واقعہ اپنے اندر دو مختلف پہلو رکھتا ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ نے ایک طرف حضرت آدمؑ سے ایک نعمت چھینی اور دوسری طرف ایک عظیم نعمت ان کو بخشی۔ چھینی اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کے عہد کو فراموش کر دیا تھا اور بخشی اس وجہ سے کہ غفلت کے بعد وہ متنبہ ہو گئے اور انھوں نے توبہ کی۔"

جبل تین کے پاس جزا کا دوسرا واقعہ حضرت نوح علیہ السلام کے عہد میں پیش آیا۔ اس کی تفصیل مولانا رحمۃ اللہ علیہ یوں پیش کرتے ہیں:

"ان کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اسی پہاڑ کے پاس ظالموں کو تباہ کیا اور نیکوکاروں کو طوفان سے نجات دی اور برکت بخشی۔ قرآن مجید میں ہے:

وَقِیْلَ یٰٓاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَکِ	اور حکم دیا گیا، اے زمین اپنا پانی
وَیٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ وَغِیْضَ الْمَآءُ	جذب کر لے اور اے آسمان! تھم جا۔

وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (هود - ۱۱: ۴۴)

پانی اتر گیا اور کام تمام کر دیا گیا اور کشتی کوہ جودی پر ٹک گئی اور اعلان کر دیا گیا کہ ظالموں کے لیے ہلاکی ہے۔

آگے حضرت نوحؑ کی دعا کے بعد ان کو یہ ہدایت ہوئی:

قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ ۚ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ (هود - ۱۱: ۴۸)

کہا گیا، اے نوح، اترو، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اپنے اوپر اور ان قوموں پر جو تمہارے ساتھ ہیں اور تمہارے سوا اور قومیں بھی ہوں گی جن کو ہم کچھ دن بہرہ مند ہونے کا موقع دیں گے۔ پھر ان کو ہمارا دردناک عذاب پکڑے گا۔

...... اس سے معلوم ہوا کہ جبل تمین اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات کے ظہور کا ایک یادگار مقام ہے۔"

کوہ زیتون کی شہادت جزا پر

کوہ زیتون پر جزا کا جو واقعہ پیش آیا ہے اس کی تفصیل مولاناؒ یوں پیش کرتے ہیں:

"اسی پہاڑ پر خدا نے اپنی شریعت یہود سے چھینی اور وہ سلسلۂ ابراہیمی کی دوسری شاخ کے حوالہ کر دی۔ یہ واقعہ حضرت مسیحؑ کی زندگی کے آخری دور سے تعلق رکھتا ہے۔ انجیلوں میں اس کی جو تفصیلات موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک روز آپ شب بھر جاگ کر اپنے رب سے دعا و مناجات کرتے رہے کہ ان کی قوم (یہود) کی کشتی غرق ہونے سے بچ جائے لیکن تقدیر کا فیصلہ اٹل تھا۔ بالآخر وہ قوم کے مستقبل سے مایوس ہو گئے۔ بالخصوص جب آپ کو معلوم ہوا کہ یہود آپ کے قتل کے درپے ہیں تو اس بات سے آپ کو اور بھی غم ہوا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ اگر یہود نے اس طرح کا کوئی اقدام کیا تو ان پر سنتِ الٰہی کے مطابق اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جائے گی اور وہ اپنی امانت ان سے چھین کر دوسروں کے حوالے کر دے گا۔ متی باب ۲۱: ۴۲ میں ہے:

یسوع نے ان سے کہا کہ تم نے کتابِ مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا۔ وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے؟

یہ عبارت زبور ۱۱۸: ۲۲-۲۳ کی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کا حوالہ دے کر اپنی طرف سے اس کی شرح یوں فرمائی:

"اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ لیکن جس پر وہ گرے گا اس کو پیس ڈالے گا۔"

یہود سے یہ آسمانی بادشاہت چھینے جانے کا واقعہ کوہ زیتون پر پیش آیا۔ انجیلوں میں اس ماجرے کی ساری تفصیلات موجود ہیں۔"

طور سینین کی شہادت جزا پر

طور سینین کی شہادت کی تفصیل کرتے ہوئے مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"طور سینین کی شہادت جزا پر بالکل واضح ہے۔ یہی مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ایک مظلوم و مقہور قوم پر اپنی عنایت مبذول فرمائی اور اس کے صبر کے صلہ میں دشمنوں کے پنجہ سے اس کو نجات دے کر اس کا مراد نچایا اور پھر اس کو ایک ایسی شریعت عطا فرمائی جو منکروں اور دشمنوں کے لیے یکسر تازیانۂ عذاب تھی۔ یہ واقعہ مظلوموں پر لطف و نوازش اور ظالموں پر قہر و غضب کی نہایت واضح مثال ہے۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ اور قوم فرعون کے واقعات جہاں بیان ہوئے ہیں اس حقیقت کی طرف اشارات موجود ہیں۔ مثلاً:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ ۝ (الاعراف - ۷: ۱۳۷)	اور تمہارے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے لیے پورا ہوا۔ بوجہ اس کے کہ انھوں نے صبر کیا، اور ہم نے تباہ کر ڈالیں وہ عمارتیں جو فرعون اور اس کی قوم بناتے رہے تھے اور وہ بیلیں بھی جو وہ ٹٹیوں پر چڑھاتے رہے تھے۔"

مولانا نے یہ فصل وضاحت سے لکھی ہے لیکن یہ واقعات معلوم ہیں اس وجہ سے ہم نے صرف مختصر اقتباس پر کفایت کی ہے۔ جن کو تفصیل مطلوب ہو وہ اصل کتاب کی مراجعت کریں۔

بلد امین کی شہادت جزا پر

بلد امین سے مراد ظاہر ہے کہ مکہ ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک مامون گھر بنایا ہے، چنانچہ فرمایا ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (آل عمران - ۳ : ۹۷) (اور جو اس میں داخل ہوا وہ مامون ہوا) جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی کافر قوم سے ہجرت کر کے اس علاقہ میں آئے ہیں یہ بالکل غیر آباد و غیر مامون تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے لیے رزق و امن کی دعا فرمائی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی جس کی بدولت اس علاقہ میں رزق کی بھی فراوانی ہوئی اور یہ امن سے بھی معمور ہوا۔ اور یہ دونوں نعمتیں لوگوں کو حضرت ابراہیمؑ کے بنائے ہوئے گھر کی برکت سے ملیں۔ چنانچہ فرمایا ہے: فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۝ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (قریش - ۱۰۶ : ۳-۴) (پس چاہیے کہ لوگ اس گھر کے خداوند کی بندگی کریں جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور خوف سے بے خوف کیا)۔ حضرت ابراہیمؑ پر یہ انعام ان کی ان جاں بازیوں اور قربانیوں کے صلے میں ہوا جو انھوں نے کلمۂ توحید کی سربلندی کی راہ میں پیش کیں۔ پھر جب انھوں نے اس سے بھی بڑے امتحان یعنی بیٹے کی قربانی کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کر لی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بھی بڑے انعام یعنی قوموں کی امامت کے منصب سے نوازا۔ اس وقت حضرت ابراہیمؑ نے سوال کیا کہ کیا اس امامت کے انعام میں میری ذریت بھی شامل ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا کہ میرا یہ وعدہ ان لوگوں سے متعلق نہیں ہے جو شرک و کفر میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں گے۔ یعنی تم کو جو کچھ ملا ہے وہ تو انعام ہے تمھاری جاں بازیوں اور وفاداریوں کا۔ اس وجہ سے تمھاری ذریت میں سے وہی اس انعام میں شریک ہوں گے جو تمھارے طریقہ کے پیرو ہوں گے، رہے وہ جو اس راہ سے منحرف ہو جائیں گے تو وہ اپنے اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو اس طرح کے لوگوں کے لیے خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے مقدر ہے۔ قرآن میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ	اور یاد کرو جب کہ ابراہیم کو اس کے رب نے
بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ	چند باتوں سے جانچا تو اس نے وہ پوری کر
اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ	دکھائیں تو فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا
قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ	ہوں تو اس نے سوال کیا کہ کیا میری ذریت میں
لَا يَنَالُ عَهْدِي	سے بھی؟ ارشاد ہوا کہ میرا یہ عہد ان لوگوں
الظّٰلِمِيْنَ ۝	سے متعلق نہیں ہے جو اپنی جانوں پر ظلم
(البقرۃ - ۲ : ۱۲۴)	ڈھانے والے بنیں گے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ مقام نہ صرف اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات کا ایک مظہر ہے بلکہ اسی سرزمین سے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی عام منادی کرائی ہے کہ کون لوگ اس کے فضل و انعام کے حق دار ہوں گے اور کون اس کے قہر و غضب کے سزاوار ٹھہریں گے۔

ناموں کی ترتیب سے متعلق ایک سوال کا جواب

ایک سوال ان ناموں کی ترتیب سے متعلق بھی ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ ان کی تقدیم و تاخیر میں کونسا اصول ملحوظ ہے۔ استاذ امامؒ اس کا یہ جواب دیتے ہیں:

”اس میں ترتیب جمع شی بالشی کی ملحوظ ہے۔ پہلے آدم علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا اس لیے کہ تقدمِ زمانی کے لحاظ سے اسی کا ذکر ہونا تھا۔ پھر مسیح علیہ السلام کے واقعہ کا ذکر ہوا اور یہ اس مماثلت کے سبب سے ہوا جو حضرت آدمؑ اور حضرت مسیحؑ کے درمیان ہے اور جس کا ذکر قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں یوں فرمایا ہے: إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ (آل عمران - ۳: ۵۹) (عیسیٰ کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم کی ہے)“

. . . .

”اس کے بعد ان دو مقاموں کا ذکر آتا ہے جن کا تعلق حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور ان دونوں رسولوں میں جو مماثلت ہے وہ بھی قرآن سے واضح ہے۔ چنانچہ قریش کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا (المزمل - ۷۳: ۱۵)

ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا تم پر گواہ بنا کر جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا۔“

”تورات کی کتاب استثناء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بشارت وارد ہے اس میں بھی یہ مماثلت موجود ہے:

”اور میں ان کے لیے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس کو حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔“

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ۝ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ (۷-۸)

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ۔ اس آیت کی تاویل مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں یوں فرمائی ہے:

”اس آیت کی تاویل میں دو قول ہیں:

'فَمَا يُكَذِّبُكَ الآیۃ' کی تاویل

ایک یہ کہ پس اے انسان! ان واضح شہادتوں کے بعد کیا چیز ہے جو جزا کے بارے میں تیری تکذیب کرتی ہے۔ یہ تاویل مجاہدؒ نے اختیار کی ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ اس میں تو خطاب آنحضرتؐ ہیں تو انھوں نے فرمایا: معاذ اللہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، اس میں مخاطب انسان ہے۔ زمخشریؒ نے یہی تاویل اختیار کی ہے لیکن 'يُكَذِّبُ' میں 'يكذب' کے معنی 'يحمل على التكذيب' یعنی تکذیب پر ابھارنے کے لیتے ہیں۔ اگر یہ معنی ثابت ہو جائیں تو یہ تاویل نہایت واضح ہے لیکن اس کی تائید میں انھوں نے کوئی دلیل نہیں دی ہے۔"

"دوسری تاویل یہ ہے کہ پس اے پیغمبر! اس کے بعد کیا چیز ہے جو جزا کے بارے میں تمھاری تکذیب کرتی ہے! فراءؒ نے یہی تاویل اختیار کی ہے۔ اس پہلو سے تو یہ تاویل صحیح ہے کہ اس میں الفاظ کے مشہور معنی سے کوئی انحراف نہیں ہے لیکن سیاقِ کلام اور موقعِ استفہام کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو یہ تاویل صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اول تو دو دو استفہاموں کے ساتھ آنحضرت صلعم کو یہاں مخاطب کرنے کا کوئی پہلو سمجھ میں نہیں آتا۔ دوسرے 'فَمَا يُكَذِّبُكَ' کا زور اور لفظ 'بَعْدُ' کی تاکید تو یہ تاویل لینے کی صورت میں بالکل ہی مخفی رہ جاتی ہے۔ سیاق اور حسنِ نظم سے اقرب تاویل وہی معلوم ہوتی ہے جو مجاہدؒ نے اختیار کی ہے۔ اس میں لفظ اپنے اصل مفہوم پر باقی بھی رہتا ہے اور اس کے ان دونوں معنوں کے لحاظ سے جو اوپر بیان ہوئے یہاں دو تاویلیں نہایت محکم اور خوبصورت بن جاتی ہیں:

"ایک یہ کہ اے انسان! ان شہادتوں کے بعد اب کون سی شہادت اور دلیل ہے جو وقوعِ جزا کے بارے میں تیرے عقیدے کی تکذیب کرتی ہے۔ اس صورت میں مخاطب انسان ہوگا اور جو لوگ جزا پر یقین رکھنے والے ہیں ان کو اس کلام سے تقویت اور تائید حاصل ہوگی اور جو لوگ جزا کے بارے میں مذبذب ہوں گے ان کو اس پر غور کرنے کی تحریک ہوگی۔"

"پھر لفظ 'ما' کے حسنِ استعمال پر غور کیجیے۔ اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ انسان نے انکار کی راہ ہمیشہ تقلید اور ضد کی بنا پر اختیار کی ہے۔ اس راہ میں دلائل نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ دلائل اور شہادتوں کی اس پوری کائنات میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو جزا کے انکار کے حق میں ہو۔ اس وجہ سے انسانوں کو مخاطب کر کے یہ دعوت دی کہ وہ تقلید سے ہٹ کر دلائل پر غور کریں اور دیکھیں کہ کیا یہاں کوئی ایک چیز بھی ایسی ہے جو جزا کے عقیدے کو غلط ثابت کر رہی ہو؟"

"دوسری تاویل یہ کہ واقعات اور دلائل کی ان شہادتوں کے بعد آخر وہ اوہام اور آرزوئیں کیا ہیں جو جزا کے بارے میں انسان کو فریب میں مبتلا کر رہی ہیں؟"

"اس صورت میں روئے سخن منکرین کی طرف ہوگا۔ قرآن میں اس قسم کے خطاب کی نظیریں

موجود ہیں، مثلاً:

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (الانفطار - ۸۲ : ۶)　　اے انسان! تجھے تیرے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔"

ان دونوں استفہاموں کا مدعا مولانا یوں واضح فرماتے ہیں:

ان دونوں استفہاموں کا مدعا

اب دونوں استفہاموں کے مدعا پر غور کیجیے:

پہلے استفہام کا مدعا دونوں تاویلوں کی صورت میں یہ ہوگا کہ مجازات کے اس قدر دلائل سامنے آجانے کے بعد انسان کو چاہیے کہ اس کا اقرار کرے اور ان شبہات سے اپنے کو بچائے جو لوگوں کی طرف سے یا خود اس کے اپنے نفس کی طرف سے اس کے دل میں پیدا ہوں۔"

دوسرے استفہام أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ کا مقصد یہ ہے کہ لوگ مجازات کا اقرار کریں اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ گویا پوری بات یوں ہوئی کہ کیا اللہ تعالیٰ تمام حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے؟ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ انسانوں کو یونہی چھوڑ دے گا اور ان کے اچھوں اور بروں میں کوئی امتیاز نہ کرے گا؟ أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ" (القلم - ۶۸ : ۳۵-۳۶) (کیا ہم فرماں برداروں کو نافرمانوں کی طرح کر دیں گے، تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے فیصلے کرتے ہو!)"

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس سورہ میں انسان کے 'احسن تقویم' پر پیدا کیے جانے کا جو ذکر ہے اس کا خاص پہلو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو خیر و شر میں امتیاز بخشا ہے اور اس کے اندر عدل سے محبت اور ظلم سے کراہت و دلیعت فرمائی ہے۔ اس چیز کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کے اندر، جو انسان کا خالق ہے، عدل اور خیر سے محبت اور ظلم و شر سے کراہت بدرجۂ کمال موجود ہو۔ پھر یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ اس کی یہ صفت اس پر واجب کرتی ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں تمام خلق کا انصاف کرے۔ جنھوں نے نیکی کمائی ہو ان کو اچھا صلہ دے اور جنھوں نے بدی کمائی ہو ان کو ان کی بدی کے مطابق سزا دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ 'أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ' نہیں ہے حالانکہ وہ بالبداہت 'أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ' ہے۔ اس کی اس صفت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس سورہ کی تفسیر بیشتر امام فراہیؒ کی عربی تفسیر سورۃ التین' سے ماخوذ ہے، صرف بعض مقامات میں ہم نے حذف و اضافہ سے کام لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہ تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى فَضْلِهٖ وَاِحْسَانِهٖ۔

لاہور
۲۴- فروری ۱۹۸۰ء
۷- ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

٩٦

العلق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ التین ـــــ کی مثنیٰ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ سابق سورہ میں تاریخی شواہد اور فطرتِ انسانی کی اعلیٰ ساخت سے یہ حقیقت نمایاں فرمائی ہے کہ انسان کے لیے فلاح کی راہ یہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرے۔ جو لوگ یہ راہ اختیار نہیں کرتے وہ بالآخر تباہی کے کھڈ میں گر کے رہتے ہیں اور اپنے اس انجام کے وہ خود ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اسی کلیہ کی روشنی میں اس سورہ میں قریش اور ان کے لیڈروں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ سیدھی راہ اختیار کرنے کے بجائے بالکل الٹی چال چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے فضل و کرم سے ان کی رہنمائی کے لیے اپنا صحیفۂ ہدایت اتارا لیکن ان کے طغیان کا حال یہ ہے کہ اللہ کا جو بندہ ان کے لیے ایمان و عمل صالح کی راہ کھول رہا ہے یہ اس کے جانی دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ اپنے رب کی نماز پڑھتا ہے تو یہ شامت زدہ لوگ اس کے بھی روادار نہیں ہیں بلکہ اس سے بالجبر روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ اپنے اس رب کے نام سے، جو سارے جہان کا خالق ہے، تم ان لوگوں کو اس کا فرمان واجب الاذعان سناؤ۔ اسی نے انسان کو خون کے ایک تھکے سے بنایا اور وہ اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ ان کو پڑھ کر سناؤ اور اپنے رب کے اس فضلِ عظیم کو یاد دلاؤ کہ اس نے امیوں پر یہ عظیم احسان فرمایا ہے کہ ان کی تعلیم کے لیے اس تعلیم بالقلم کا اہتمام فرمایا اور ان کو وہ باتیں بتائیں جو وہ نہیں جانتے تھے۔

(۶-۸) قریش کے لیڈروں کے طغیان پر سرزنش کہ یہ مال و جاہ کے گھمنڈ میں خدا سے بے نیاز و بے پروا ہو بیٹھے ہیں حالانکہ ایک دن سب کو اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے تیرے رب ہی کی طرف

لوٹنا ہے۔

(۹-۱۳) ان سرکشوں کو خاص طور پر تہدید و وعید جو اللہ کے رسول کو نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ نہایت غضب آلود لہجہ میں یہ سوال کہ اگر اللہ کا بندہ ہدایت پر ہو یا تقویٰ کی بات بتا رہا ہو اور یہ سرکش تکذیب اور اعراض کر رہے ہوں تب ..... ! یعنی اس قسم کے سرکشوں کو اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ ان کی ان حرکتوں کا کیا انجام ہو سکتا ہے !

(۱۴-۱۸) ان سرکشوں پر مزید اظہار غضب اور ان کو چیلنج کہ کیا ان کو ہوش نہیں ہے کہ خدا ان کی یہ تمام گستاخانہ حرکتیں دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ ان بدتمیزیوں سے باز نہ آئے تو وہ دن آرہا ہے جب ہم ان کی نابکار اور گنہگار پیشانیوں کو گھسیٹیں گے۔

(۱۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین کہ ان سرکشوں کی بے ہودگیوں کی ذرا پرواہ نہ کرو۔ سجدہ کرو اور اپنے رب سے قریب تر ہو جاؤ۔

سُوْرَةُ الْعَلَقِ

مَكِّيَّةٌ ——— آیات: ۱۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۹

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ
عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ
الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝۶
اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝۷ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝۸ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ
يَنْهٰى ۝۹ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝۱۰ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۝۱۱
اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝۱۲ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝۱۳ اَلَمْ يَعْلَمْ
بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۝۱۴ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝۱۵
نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝۱۶ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۝۱۷ سَنَدْعُ
الزَّبَانِيَةَ ۝۱۸ كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝۱۹ ع ۱

ترجمۂ آیات ۱-۱۹

پڑھ اپنے اس خداوند کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو خون کے تھکے سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا ہی کریم ہے، جس نے تعلیم دی قلم کے واسطہ سے۔ اس نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔ ۱-۵

ہرگز نہیں، بے شک انسان سرکشی کر رہا ہے اپنے تئیں بے نیاز سمجھ کر۔

بے شک تیرے خداوند ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

ذرا دیکھو تو اس کو جو روکتا ہے ایک بندے کو، جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ بھلا دیکھو تو، اگر وہ ہدایت پر ہوا یا نیکی کا حکم دینے والا ہوا ..... ! بھلا دیکھو تو، اگر اس نے جھٹلایا اور منہ موڑا .... ! کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے ! ۹-۱۴

ہرگز نہیں، اگر یہ باز نہ آیا تو ہم اس کو گھسیٹیں گے، چوٹی پکڑ کر، جھوٹی نابکار گنہگار چوٹی ! پس وہ بلاوے اپنی پارٹی کو، ہم بھی بلائیں گے سرہنگوں کو ! ۱۵-۱۸

ہرگز نہیں، اس کی بات نہ مان اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔ ۱۹

۱- الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۱)

'اقرأ' بطریق دعوت سنانے کے معنی میں

لفظ 'اِقْرَاْ' (پڑھو) صرف اسی مفہوم میں نہیں آتا جس مفہوم میں ایک استاد اپنے شاگرد سے کہتا ہے: 'پڑھو!' بلکہ یہ اِقْرَاْ عَلَی النَّاسِ یا اُتْلُ عَلَی النَّاسِ یعنی دوسروں کو بطریق دعوت سنانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ لفظ اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ان کفار کو مخاطب کر کے جو قرآن کے سنانے میں مزاحم ہوتے تھے، فرمایا ہے:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا	جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو
لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ	اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا
(الاعراف - ۷: ۲۰۴)	جائے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا	اور جب تم لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناتے
بَیْنَكَ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ	ہو تو ہم تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان
بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۙ	جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک مخفی
(بنی اسرائیل - ۱۷: ۴۵)	پردہ کھڑا کر دیتے ہیں۔

قرینہ دلیل ہے کہ یہاں یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

ایک نہایت اہم تنبیہ

'بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ' یعنی اس قرآن کو اپنے اس خداوند کے نام سے پڑھ کر سناؤ جو سارے جہان کا خالق ہے۔ یہ ایک نہایت اہم تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اس کو اپنے خداوند کے فرمان واجب الاذعان کی حیثیت سے پیش کرو تاکہ لوگ یہ جانیں کہ جو کلام ان کو سنایا جا رہا ہے وہ براہِ راست رب دو جہان کا کلام ہے۔ نہ یہ داعی کا کلام ہے، نہ کسی اور شخص کا اور نہ یہ کسی سائل کی درخواست ہے کہ رد کر دی تو وہ رد ہو جائے۔ بلکہ یہ اس خالق و مالک کا کلام ہے جس کو حق ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو حکم دے اور لوگوں کا فرض ہے کہ وہ بے چون و چرا اس کی تعمیل کریں، اس کو کوئی معمولی چیز سمجھ کر ٹالنے، مذاق اڑانے یا اس کی مخالفت کرنے کی جسارت نہ کریں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن مجید براہِ راست اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس سے پہلے کسی کتاب کو یہ شرف حاصل نہیں کہ وہ کل کی کل اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ الفاظ پر مشتمل ہو۔ اس وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

کو ہدایت ہوئی کہ اس کو اپنے خداوند کے نام سے پیش کرو تاکہ اس کی اصلی عظمت لوگوں پر واضح ہو اور وہ اس کی مخالفت کر کے اپنی شامت نہ بلائیں۔ قدیم صحیفوں میں حضورؐ سے متعلق جو پیشین گوئیاں ہیں ان میں بھی یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ آپ جو کچھ کہیں گے خدا کے نام سے کہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے انتقام لے گا جو خدا کے نام پر کہی ہوئی اس کی باتوں کو رد کریں گے۔ گویا ان الفاظ سے قرآن کی اصلی عظمت بھی واضح کر دی گئی ہے اور قریش کو ڈرا بھی دیا گیا ہے کہ اگر وہ اس کی مخالفت کرنی چاہتے ہیں تو اپنے اس فعل کے انجام کو دور تک سوچ لیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۲)

یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ پہلی آیت میں تمام کائنات کے پیدا کیے جانے کا ذکر ہوا۔ اب یہ خاص اہتمام کے ساتھ انسان کے پیدا کیے جانے کی طرف اشارہ ہے۔

انسان کی خلقت کے ابتدائی مراحل کی یاددہانی سے مقصود

'عَلَقٌ' خون کی پھٹکی یا تھکے کو کہتے ہیں۔ انسان کی خلقت کے ابتدائی مراحل کی یاددہانی قرآن میں جگہ جگہ فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ حج، سورۂ مومنون، سورۂ سجدہ، سورۂ قیامہ اور سورۂ دھر وغیرہ میں۔ ہم ہر جگہ تمام اہم الفاظ کی بھی وضاحت کرتے آ رہے ہیں اور اس خاص پہلو کی طرف بھی ہم نے توجہ دلا دی ہے جو اس یاددہانی سے پیش نظر ہے۔ اس سے مقصود بالعموم تین حقیقتوں کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے:

- ایک یہ کہ جس خالق کی قدرت و حکمت کا یہ حال ہے کہ وہ خون کی ایک حقیر پھٹکی کو عاقل و مدرک اور سمیع و بصیر انسان بنا کر کھڑا کر دیتی ہے کیا اس کے لیے اس کو دوبارہ پیدا کر دینا مشکل ہو جائے گا۔
- دوسری یہ کہ انسان کی تخلیق میں خالق کی جو قدرتیں اور حکمتیں نمایاں ہیں وہ دلیل ہیں کہ یہ عبث اور بے غایت نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ اس کے لیے ایک روزِ حساب لازماً آنا ہے اور یہ اپنے اعمال کی جزا یا سزا ضرور پائے گا۔
- تیسری یہ کہ جس انسان کی پیدائش اتنے حقیر اور ذلیل عنصر سے ہوئی ہے اس کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی پاکی و پاک دامنی یا اپنے حسب و نسب کی حکایت زیادہ بڑھائے اور غرور و تکبر کا مظاہرہ کرے۔

قرآن کے بعض مقامات میں بیک وقت ان تمام حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے لیکن بعض جگہ ان میں سے ایک یا دو مدنظر ہیں۔ یہاں موقع کلام اشارہ کر رہا ہے کہ ان میں سے اوپر کی دو حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ خالقِ کائنات کا کلام خاص اس کے نام سے لوگوں کو پہنچاؤ اور ان کو یاددہانی کرو کہ جس خالق نے انسان کو خون کی پھٹکی سے وجود بخشا ہے وہ قادر ہے کہ اس کو دوبارہ پیدا کر کے اس کے اعمال کا محاسبہ کرے۔

اِقۡرَاۡ وَرَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۙ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ (۳ - ۴)

اہل عرب پر عظیم احسان

یہ 'اِقۡرَاۡ' سابق 'اِقۡرَاۡ' سے بدل کے طور پر آیا ہے اور یہ اسی حکم کی تاکید ہے جو اوپر دیا گیا ہے البتہ اس میں اظہارِ احسان کا پہلو بھی نمایاں ہے کہ قریش اللہ تعالیٰ کے اس فضل عظیم کی قدر کریں کہ اس نے ان کی ہدایت کے لیے تعلیم بالقلم کا اہتمام فرمایا۔ یہ امر واضح رہے کہ اس سے پہلے بنی اسمٰعیل کے پاس حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کی تعلیمات سے متعلق اگر کچھ روایات تھیں تو وہ زبانی روایات کی شکل میں تھیں اور امتدادِ زمانہ سے ان کی شکل بھی متغیر ہو چکی تھی۔ دوسرے انبیاء کی تعلیمات بھی زبانی ہی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکامِ عشرہ تو ضرور لکھ کر دیے گئے لیکن موجودہ تورات کی حیثیت بس قلم بند کی ہوئی روایات کی ہے۔ اس کے اندر یہ امتیاز ناممکن ہے کہ کون سی بات اللہ تعالیٰ کے لفظوں میں ہے اور کون سی بات مجہول راویوں کے الفاظ میں لیکن قرآن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام فرمایا کہ اس کا ہر لفظ اول تو براہِ راست نطقِ الٰہی ہے، پھر اس کو زبانی روایات پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس کو عین اللہ تعالیٰ کے لفظوں میں تحریری طور پر محفوظ کیا گیا اور یہ کام، جیسا کہ سورۂ قلم اور سورۂ قیامہ کی تفسیروں میں وضاحت ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کے تحت کرایا تاکہ کسی حرف میں سرمو کوئی تغیر نہ ہونے پائے۔

مزید احسان اور ایک تنبیہ

اس اہتمام خاص کی طرف یہاں 'عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ عربوں پر ایک عظیم احسان ہوا۔ اول تو جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وحی کو محفوظ کرنے کا یہ اہتمام اس سے پہلے کسی قوم کے لیے بھی نہیں کیا گیا، ثانیاً اہلِ عرب امّی ہونے کے باعث قلم کے استعمال سے اچھی طرح واقف نہ تھے لیکن قرآن کی بدولت انھوں نے اس کے ذریعہ وہ عظیم آسمانی خزانہ محفوظ کیا جو صرف انہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے سرمایۂ زندگی ہے۔

عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ (۵)

یہ اسی انعام و احسان کا ایک اور پہلو ہے کہ صرف تعلیم بالقلم ہی کا احسان امیوں پر نہیں کیا بلکہ مزید احسان یہ بھی کیا کہ ان کو وہ باتیں بتائیں اور سکھائیں جو وہ نہیں جانتے تھے۔ لفظ 'انسان' اگرچہ عام ہے لیکن قرآن کے پہلے مخاطب چونکہ امّی عرب ہی تھے اس وجہ سے یہاں اصلاً وہی مراد ہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے ان کو جاہلیت کی تاریکی سے نکالنے کے لیے ان پر اپنی یہ کامل ہدایت نازل فرمائی ہے۔ ان پر حق ہے کہ وہ اس کی قدر کریں۔ سورۂ جمعہ میں یہی مضمون یوں آیا ہے:

هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ	وہی ہے جس نے اٹھایا امیوں میں ایک رسول
رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ	انہی میں سے، وہ ان کو سناتا ہے اس کی آیتیں
اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیۡهِمۡ وَیُعَلِّمُهُمُ	اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو سکھاتا ہے

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ (الجمعۃ ۶۲: ۲) — کتاب اور حکمت ور آنحالیکہ وہ اس سے پہلے نہایت کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

یہی مضمون، الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ، البقرۃ: ۱۵۱، البقرۃ: ۱۲۹ اور آل عمران: ۱۶۴ میں بھی گزر چکا ہے اور ہم بقدر کفایت اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

اس آیت میں جہاں اظہارِ احسان ہے وہیں اس کے اندر قریش کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے کہ اگر انھوں نے اپنے رب کی اس سب سے بڑی نعمت کی قدر نہ کی تو سوچ لیں کہ ان کی اس ناسپاسی اور اس طغیان کا نتیجہ ان کے سامنے کس شکل میں آ سکتا ہے!

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (۶-۷)

یہ ان کے اس رویّہ کا بیان ہے جو انھوں نے اس ہدایت کے معاملے میں اختیار کیا۔ فرمایا کہ وہ اس رحمت کی قدر کرنے کے بجائے نہایت سرکشی کے ساتھ اس کی تکذیب کر رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو جو مال و اسباب حاصل ہے اس کو پا کر وہ اب خدا سے اپنے کو بالکل مستغنی خیال کرنے لگے ہیں۔

قریش کے رویہ کا بیان — اس آیت کا آغاز 'کَلَّا' سے ہوا ہے اس سے مقصود قریش کی ان سخن سازیوں کی تردید ہے جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کی تکذیب کے لیے کرتے تھے۔ فرمایا کہ ان کی یہ سخن سازیاں محض حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے ہیں۔ ان کے انکار کی اصل علت ہے تو خدا سے ان کی بے نیازی اور دنیا کی محبت لیکن نمائش یہ کر رہے ہیں کہ گویا ان کے پاس کچھ شبہات ہیں جن کا کوئی تسلی بخش جواب ان کو نہیں مل رہا ہے۔

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى (۸)

'رُجْعٰی' مصدر ہے 'بُشْرٰی' کے وزن پر، لوٹنے کے معنی میں۔

تنبیہ اور آخرت کی یاددہانی — فرمایا کہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں کرنے دو بالآخر ان کو لوٹنا تمھارے رب ہی کی طرف ہے جس سے یہ مستغنی اور بے خوف ہیں۔ اس وقت ان کے طغیان کی حقیقت ان کے سامنے کھل جائے گی۔ اگر ان کو گمان ہے کہ ان کے مزعومہ شرکاء ان کے مولیٰ و مرجع بنیں گے تو ان کے اس وہم سے بھی پردہ اٹھ جائے گا۔ اس دن بادشاہی صرف اللہ کی ہو گی اور اس کی پکڑ سے پناہ دینے والا کوئی نہیں ہو گا۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى (۹-۱۰)

قریش کے گُرگوں کے طغیان کی ایک مثال — یہ ان کے اس طغیان کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ فرمایا کہ بھلا دیکھو تو اس کو جو ایک بندے کو روکتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے! یہ قریش کے ان اشقیاء کی طرف اشارہ ہے جو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اور دوسرے مسلمانوں کو بھی نماز سے روکتے تھے۔ بندے پر اس کے رب کا اولین حق اس کی بندگی ہے اور بندگی میں اولین درجہ نماز کا ہے۔ اس وجہ سے جو بندہ نماز پڑھ رہا ہے وہ اپنے رب کا سب سے بڑا حق ادا کر رہا ہے اور سزاوار ہے کہ سب اس کے اس کام کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھیں اور اس کے عمل کو قابلِ تقلید جانیں۔ اگر کوئی اس چیز سے روکنے کی جسارت کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ بندے کو سب سے بڑے فرض اور خدا کے سب سے بڑے حق سے روک رہا ہے۔

'اَرَءَیْتَ' کے اسلوب پر ہم جگہ جگہ لکھ چکے ہیں کہ یہ اس وقت لاتے ہیں کہ جب کسی کی نہایت نامناسب حرکت پر لوگوں کو توجہ دلانی یا اس پر نکیر کرنی ہو۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں 'بھلا دیکھا تم نے اس کو، کیا تم نے اس کا حال دیکھا، ذرا اس کو تو دیکھو!'

'اَلَّذِیْ' سے ضروری نہیں کہ کوئی ایک معین شخص ہی مراد ہو بلکہ یہ اس طرح کی بے ہودہ حرکت کرنے والوں کو ممثّل کر دینے کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز سے روکنے والا صرف ابوجہل ہی نہیں تھا بلکہ دوسرے گنڈے بھی تھے اور یہ گنڈے صرف حضورؐ ہی کی نمازوں میں مزاحم نہیں ہوتے تھے بلکہ اللہ کے دوسرے بندوں کے ساتھ بھی وہ اسی طرح کی بدتمیزیاں کرتے تھے۔

أَرَءَيْتَ إِن كَانَ عَلَى الْهُدَىٰٓ ۝ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ (۱۱-۱۲)

اقدام سے پہلے سوچنے کی ضرورت

یعنی اس مجنونانہ اقدام سے پہلے اسے سوچنا تھا کہ اسلام دشمنی کے جوش میں اسے اتنا اندھا نہیں بن جانا چاہیے کہ اپنے انجام کا بھی کچھ ہوش نہ رہے۔ آخر امکان اس بات کا بھی تو ہے کہ یہ اللہ کا بندہ نیکی اور ہدایت پر ہو اور اپنے قول و عمل سے تقویٰ کی راہ دکھا رہا ہو اور یہ اس کو اس سے روک کر اپنی شامت کو دعوت دے رہا ہو! مطلب یہ ہے کہ آخر کس دلیل سے وہ اپنے کو برحق سمجھ کر وہ کام کرنے اٹھ کھڑا ہوا جو شیطان کے کرنے کا ہے!

أَرَءَيْتَ إِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰٓ (۱۳)

دوسرے امکان کا حوالہ

یہ اس دوسرے امکان کا حوالہ ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ یعنی کوئی بتائے کہ اگر یہی تکذیب کرنے والا اور حق سے منہ موڑنے والا ہوا تب ......! یعنی تب تو اس نے اپنے لیے جہنم کا دروازہ خود اپنے ہی ہاتھوں کھولا! یہاں عربیت کا وہ قاعدہ ملحوظ رہے جس کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ شرط کا جواب اس وجہ سے بھی حذف کر دیا جاتا ہے کہ اس کی سنگینی احاطۂ بیان سے باہر ہوتی ہے۔ یہاں اسی وجہ سے جواب محذوف ہے۔ اس کی ایک مثال سورۂ یونس میں بھی موجود ہے۔

رسول کی تکذیب کرنے اور اس کی دعوت سے منہ موڑنے والوں کا انجام سورۂ لیل میں یوں بیان ہوا ہے:

لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ؕ (الّیل - ۹۲ : ۱۵ - ۱۶)

اس جہنم میں وہی بدبخت خلائق پڑیں گے جنھوں نے جھٹلایا اور منہ موڑا۔

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى (۱۴)

یعنی کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ تعالیٰ اس کی یہ ساری تعدیاں دیکھ رہا ہے! اگر وہ دیکھ رہا ہے اور ضرور دیکھ رہا ہے تو اس کا انتقام وہ ضرور لے گا۔ وہ عادل، رحیم، عزیز اور غیور ہے۔ اس کے بندے اگر اس کی بندگی سے روکے جائیں تو وہ کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ وہ تماشائی بن کر اس کا تماشا دیکھتا رہے۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ (۱۵)

سرکشوں کو تند الفاظ میں وعید

یہ اس قسم کے سرکشوں کو نہایت تند الفاظ میں وعید ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ ان حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ 'نَاصِيَة' پیشانی اور پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو کہتے ہیں۔ 'سَفْعٌ' کسی چیز کو مٹھی میں پکڑ کر کھینچنے اور گھسیٹنے کے معنی میں آتا ہے۔ سورۂ رحمان میں اسی طرح کے سرکشوں کے بارے میں فرمایا ہے: 'فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِىْ وَالْاَقْدَامِ' (الرحمٰن - ۵۵: ۴۱) (پس وہ چوٹیوں اور ٹانگوں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیے جائیں گے)۔

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (۱۶)

یہ 'اَلنَّاصِيَة' سے بدل ہے۔ گو دونوں میں معرفہ اور نکرہ کا فرق ہے لیکن نکرہ موصوف ہو تو معرفہ سے بدل پڑ سکتا ہے۔ یہاں اس جوش غضب پر خاص طور سے نگاہ رہے جو اس آیت کے ہر لفظ سے اُبل رہا ہے۔ ان نابکاروں کی چوٹی کا ذکر انتہائی غضب آلود الفاظ میں فرمایا: 'نابکار اور گنہگار چوٹی!' ۔۔۔ چہرہ اور پیشانی آدمی کی ذات کے سب سے اشرف حصے ہیں اس وجہ سے ان سے بعض اوقات اس کی پوری شخصیت تعبیر کر دی جاتی ہے۔ یہاں یہی صورت ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ آدمی کی پیشانی کے پاس سب سے بڑا شرف سجدوں کا نشان ہے۔ اگر کوئی شخص اتنا شقی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ خود سجدہ نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو سجدہ کرنے سے روکتا بھی ہے تو ایسا نابکار و گنہگار سزاوار ہے کہ اس کی چوٹی پکڑ کر اس کو گھسیٹا اور جہنم میں جھونک دیا جائے۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۙ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (۱۷ - ۱۸)

سرکشوں کو چیلنج

یہ ان سرکشوں کو چیلنج ہے کہ اگر کسی کو اپنی قوت و جمعیت پر بڑا ناز ہے تو وہ اپنی ٹولی کو بلا لے، ہم بھی اپنے سرہنگوں کو بلائیں گے اور دیکھیں گے کہ ان کے اندر کتنا زور ہے۔۔۔ اس چیلنج کا عملی امتحان بعد کے دور میں سب سے پہلے بدر کے معرکہ میں ہوا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ خدا کے سرہنگوں

کے آگے قریش کی پوری قوت وجمعیت کس طرح غبار بن کر اڑ گئی۔

'نَادِی' کے اصل معنی مجلس اور سوسائٹی کے ہیں۔ یہاں مراد وہ افراد ہیں جو کسی رشتۂ عصبیت کے تحت باہم دگر وابستہ ہیں۔ موقع ومحل کا لحاظ کر کے اس کا اس کا ترجمہ 'ٹولی' یا پارٹی ہو سکتا ہے۔

'زَبَانِیَةَ' جمع ہے 'زِبْنِیَة' کی جس کے اصل معنی تو دفاع کرنے والے کے ہیں لیکن یہ پولیس اور پیادوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ میں نے موقع ومحل کا لحاظ کر کے اس کا ترجمہ 'سرہنگوں' کیا ہے۔ گویا یہ خدائی ٹاسک فورس کے وہ کارندے ہیں جو خاص نوعیت کی وقتی مہمات پر بھیجے جاتے ہیں۔

كَلَّا ۚ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۱۹)

نبی صلعم کو ہدایت

فرمایا کہ اگر کوئی سر پھرا تمھیں خدا کے آگے سجدہ کرنے سے روکتا ہے تو اس کی اس حرکت کو خاطر میں نہ لاؤ بلکہ سجدہ کرو اور اپنے رب سے قریب تر ہو جاؤ۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ قرآن نے جگہ جگہ نماز ہی کو صبر و عزیمت اور فتح باب نصرت کی کلید بتایا ہے اور سجدہ نماز کا سب سے اعلیٰ رکن ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کس کی مجال ہے کہ تمھیں اس چیز سے روک دے جو تمھاری زندگی کی غایت اور خدا سے تعلق کا واحد وسیلہ ہے۔ اگر کوئی ایسی جسارت کرتا ہے تو تم اس کے شر سے خدا کی پناہ چاہو جس کا واحد طریقہ اس کے آگے سربسجود ہونا ہے۔

۲۔ سورہ کا زمانۂ نزول

سورۂ علق کی تفسیر تمام ہوئی۔ اب اس پوری سورہ پر تدبر کی نگاہ ڈال کر اس کے زمانۂ نزول پر غور کیجیے۔ کسی سورہ کے زمانۂ نزول کے متعین کرنے میں سب سے زیادہ مدد اس کے مضمون، اس کے لب ولہجہ اور اس کے خطاب و اندازِ خطاب ہی سے ملتی ہے۔ اس وجہ سے میں نے اس سوال کو تمہیدی مباحث میں چھیڑنے کے بجائے یہاں اٹھایا ہے تاکہ اس مسئلہ میں ہمارے مفسرین کے درمیان جو اختلاف ہے آپ خود اس کا فیصلہ کر سکیں۔

— اس کے زمانۂ نزول سے متعلق مشہور قول تو یہ ہے کہ قرآن میں سب سے پہلے یہی سورہ نازل ہوئی۔ بعض پوری سورہ کو سب سے پہلے نازل ہونے والی قرار دیتے ہیں لیکن اکثریت پوری سورہ کو نہیں بلکہ اس کی صرف ابتدائی پانچ آیتوں کو یہ درجہ دیتی ہے۔ اس قول کی بنیاد صحیحین کی ایک روایت پر ہے۔

— دوسرا قول صاحب کشاف کا ہے، جو انھوں نے اپنی تفسیر میں بدیں الفاظ نقل کیا ہے

'اکثر المفسرین علیٰ ان الفاتحة اول ما نزل ثم سورة القلم' (اور اکثر مفسرین اس قول پر

ہیں کہ سورۂ فاتحہ سب سے پہلے نازل ہوئی پھر سورۂ قلم۔ بعض مفسرین نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے لیکن بعض نے اسے اختیار بھی کیا ہے۔

● — ایک تیسرا قول یہ ہے کہ سورۂ مدثر سب سے پہلے نازل ہوئی۔ اس قول کے قائلین بھی غالباً اس کی ابتدائی آیات ہی کو سب سے پہلے نازل ہونے والی قرار دیتے ہوں گے اس لیے کہ باقی سورہ کا لب ولہجہ اور انداز خطاب سورۂ علق کی طرح اتنا تیز و تند ہے کہ اس کو سب سے پہلے نازل ہونے والی سورہ قرار دینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

میرے نزدیک یہ پوری سورہ بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہے۔ اس کی ابتدائی پانچ آیتوں کا مزاج بھی بعد کی آیتوں سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ سورہ کا انداز خطاب و کلام اتنا تیز و تند ہے کہ بالکل پہلی ہی سورہ میں یہ انداز سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں اختیار فرمایا گیا۔ علاوہ ازیں سورہ کے الفاظ میں کوئی قرینہ یا اشارہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے اس کا دو الگ الگ قسطوں میں نازل ہونا معلوم ہوتا ہو۔ ھذا ما عندی والعلم عند اللہ وعلمہ احکم واتم و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

لاہور

۴۔ مارچ ۱۹۸۰ء

۱۶۔ ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

٩٧

القدر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور مطالب کا تجزیہ

قرآن مجید نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے خلق پر جو احسانِ عظیم فرمایا اور تعلیم بالقلم کا اہتمام کر کے اس کی حفاظت اور خلق کی ہدایت کا جو سامان کیا اس کا ذکر سابق سورہ میں بالاجمال ہوا ہے۔ اب اس سورہ کا موضوع ہی نزولِ قرآن ہے۔ اس میں خاص اس مبارک رات کی نشان دہی فرمائی گئی ہے جس میں اس کا نزول ہوا اور ساتھ ہی اس رات کی وہ اہمیت و عظمت بیان ہوئی ہے جو دوسری راتوں کے بالمقابل اس کو حاصل ہے۔ اگرچہ یہ باتیں اسرارِ کائنات سے تعلق رکھنے والی ہیں جن کی پوری حقیقت دوسرے نہیں سمجھ سکتے لیکن حقیقت بہر حال حقیقت ہے جس سے اہلِ علم فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس کے بیان سے مقصود قرآن کے مخاطبوں کو آگاہ کرنا ہے کہ وہ اس کتاب کے معاملے میں جو رویہ اختیار کریں وہ چند باتوں پر پوری سنجیدگی سے غور کر کے اختیار کریں۔

● ایک یہ کہ یہ کتاب کسی شخص کی ذاتی امنگ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی اسکیم کے تحت اور خود اپنے اہتمام میں اتاری ہے۔

● دوسری یہ کہ اس کی نوعیت کسی ہنگامی اور وقتی واقعہ کی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس رات میں اتارا ہے جو نظامِ عالم میں اس کے ہاں امورِ مہمہ کی تقسیم و تنفیذ کے لیے مخصوص ہے۔ یہ ایک ہی رات ہزار راتوں سے بڑھ کر ہے۔ اس میں ابدی قدر و قیمت رکھنے والے امور طے پاتے ہیں۔ اس کی رحمتوں سے جو اپنے کو محروم کر لیتے ہیں وہ پھر کسی اور راہ سے ان کو حاصل نہیں کر سکتے۔

● تیسری یہ کہ اس میں کسی شیطانی چھوت کا کوئی ادنیٰ دخل بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رات کو کامل سلامتی کی رات بنایا ہے جو شیاطین کی گردش، ان کی مداخلت اور ان کی دراندازیوں سے بالکل مامون ہے۔

سُورَةُ الْقَدْرِ

مَكِّيَّةٌ ———————— آیات: ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۵ إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةِ ٱلْقَدْرِ ﴿١﴾ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا لَيْلَةُ
وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم ٱلْقَدْرِ ﴿٢﴾ لَيْلَةُ ٱلْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ﴿٣﴾ تَنَزَّلُ
ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ وَٱلرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ﴿٤﴾ سَلَٰمٌ
ع ۵ / ۲۲ هِىَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ ٱلْفَجْرِ ﴿٥﴾

ترجمۂ آیات ۱-۵

ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے! شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس میں فرشتے اور روح اترتے ہیں، ہر امر میں، اپنے رب کی اجازت کے ساتھ۔ ۱-۴

وہ یکسر امان ہے! یہ صبح کے نمودار ہونے تک ہے ۵

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةِ ٱلْقَدْرِ (۱)

قرآن کا نزول اللہ تعالیٰ کی اسکیم کے تحت ہوا ہے — سابق سورہ کی آیات ۳-۵ میں اس عظیم احسان کا ذکر ہو چکا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی تعلیم کے لیے قرآن نازل کر کے فرمایا۔ اب اس سورہ میں اسی کا حوالہ، بغیر کسی تمہید کے، دے کر بتایا کہ ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔ 'اَنْزَلْنٰهُ' میں ضمیر مفعول اگرچہ بظاہر مرجع کے بغیر آ گئی ہے لیکن قرینہ بالکل واضح ہے اس وجہ سے اس طرح ضمیر لانے میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ غور کیجیے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن میں ایک سورہ کے بعد دوسری سورہ جو آتی ہے تو وہ بغیر کسی تعلق کے نہیں آ جاتی بلکہ سابق اور لاحق دونوں میں نہایت گہرا ظاہری اور باطنی ربط ہوتا ہے۔

'اِنَّا' میں جو زور اور تاکید ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کتاب نہ اس کے پیش کرنے والے کی ذاتی اپج کا نتیجہ ہے نہ اس میں کسی شیطانی تحریک یا وسوسہ کو کوئی دخل ہے، جیسا کہ اس کے مخالفین سمجھتے ہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی جانب سے خلق کی تعلیم و ہدایت کے لیے اتاری ہے، کسی دوسری طاقت کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

لیلۃ القدر — 'لَيْلَةُ الْقَدْرِ' سے مراد تقدیر امور یا تقسیم امور کی وہ رات ہے جس کا ذکر سورۂ دخان میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے:

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةٍ مُّبَٰرَكَةٍ ۚ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ ۝ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۝ أَمْرًا مِّنْ عِندِنَآ ۚ إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ۝ (الدخان - ۴۴: ۳-۴)	ہم نے اس (قرآن) کو ایک نہایت مبارک رات میں اتارا ہے۔ بے شک ہم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہوشیار کرنے والے ہیں۔ اسی رات میں تمام حکیمانہ امور کی تقسیم ہوتی ہے۔ خاص ہمارے حکم سے، بے شک ہم رسول بھیجنے والے تھے۔

اس آیت پر تدبر کی نظر ڈالیے تو اس سے دو باتیں بالکل واضح طور پر نکلتی ہیں:

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مبارک رات خاص اس کام کے لیے مقرر فرمائی ہے جس میں وہ تمام امور، جو اس عالم میں نافذ ہونے والے ہوتے ہیں، ان ملائکہ کے سپرد کیے جاتے ہیں جو ان کو نافذ کرتے ہیں۔

دوسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، قرآن کا نزول اور قریش کو انذار ان اہم امور میں سے

ہیں جن کی تنفیذ کا کام اسی مبارک رات میں متعلق فرشتوں کے حوالہ ہوا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی اہم اسکیموں اور عظیم منصوبوں میں سے ہے جو اضروری ہے کہ پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

اس رات میں قرآن کے اتارے جانے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ پورا قرآن اسی ایک رات میں اتار دیا گیا ہو بلکہ اس کے لیے یہ بھی کافی ہے کہ اس میں آتارے جانے کا فیصلہ ہو گیا، جبریل امینؑ کو یہ کام سپرد کر دیا گیا اور پہلی وحی اسی رات میں نازل ہو گئی۔ اس کے بعد اگر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا رہا اور تئیس سال کی مدت میں تمام ہوا تو اس بات میں اور اس آیت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ (۲)

شب قدر کی عظمت — یہ شب قدر کی عظمت و برکت واضح فرمائی ہے کہ وہ ایسی باعظمت و بابرکت رات ہے کہ اس کی عظمتوں اور برکتوں کا کما حقہٗ اندازہ نہیں کرایا جا سکتا۔ اس کی یہ عظمت و برکت اس وجہ سے ہے کہ اس میں اس کائنات سے متعلق بڑے بڑے فیصلے ہوتے ہیں۔ جب اس دنیا کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے وہ دن بڑی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں جن میں وہ اپنے سال بھر کے منصوبے طے کرتی ہیں تو اس رات کی اہمیت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جس میں پوری کائنات کے لیے خدائی پروگرام طے ہوتا اور سارے جہان کا فیصلہ ہوتا ہے۔

اگرچہ یہ فیصلے رحمت اور عذاب، نصب اور عزل، فتح اور شکست دونوں طرح کے امور سے متعلق ہوتے ہیں لیکن چونکہ یہ اس کی طرف سے ہوتے ہیں جس کا ہر فیصلہ عدل، رحم اور حکمت پر مبنی اور جس کا ہر کام اس مجموعی دنیا کی فلاح و بہبود کے لیے ہوتا ہے اس وجہ سے اس رات میں جو کچھ بھی ہوتا ہے مجموعی حیثیت سے مبارک ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ دخان کی مذکورہ آیت میں اس رات کو 'لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ' سے تعبیر فرمایا ہے اور آگے اس سورہ میں اس کو ہزار مہینوں سے بڑھ کر قرار دیا ہے اس کی ان صفتوں کے بیان سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، قرآن کے مخالفوں کو یہ آگاہی دینا ہے کہ ایسی عظیم اور مبارک رات میں نازل ہونے والی کتاب کو اگر کسی نے کہانت، نجوم اور شاعری کے قسم کی کوئی چیز سمجھا تو وہ گہرا اور چنیز میں امتیاز کرنے سے قاصر رہا۔ اس مبارک رات میں شیطانی القاء کی تمام راہیں مسدود ہوتی ہیں۔ اس میں وحی کا ابرِ نیساں برستا ہے جس کا ایک ایک قطرہ ایک گوہر گراں مایہ ہوتا ہے۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ (۳)

لیلۃ القدر کی برکت — یہ اس رات کی برکت بیان ہوئی ہے کہ یہ ایک رات ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ یہ بہتری ظاہر

ہے کہ حصولِ مقصد کے اعتبار سے ہے۔ جس طرح اس مادی دنیا میں فصلوں، موسموں اور اوقات کا اعتبار ہے اسی طرح روحانی عالم میں بھی ان کا اعتبار ہے۔ جس طرح خاص خاص چیزوں کے بونے کے لیے خاص خاص موسم اور مہینے ہیں، ان میں آپ بوتے ہیں تو وہ پروان چڑھتی اور مثمر ہوتی ہیں اور اگر ان موسموں اور مہینوں کو آپ نظر انداز کر دیتے ہیں تو دوسرے مہینوں کی طویل سے طویل مدت بھی ان کا بدل نہیں ہو سکتی اسی طرح روحانی عالم میں بھی خاص خاص کاموں کے لیے خاص موسم اور خاص اوقات و ایام مقرر ہیں۔ اگر ان اوقات و ایام میں وہ کام کیے جاتے ہیں تو وہ مطلوبہ نتائج پیدا کرتے ہیں اور اگر وہ ایام و اوقات نظر انداز ہو جاتے ہیں تو دوسرے ایام و اوقات کی زیادہ سے زیادہ مقدار بھی ان کی صحیح قائم مقامی نہیں کر سکتی۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ جمعہ کے لیے ایک خاص دن ہے۔ روزوں کے لیے ایک خاص مہینہ ہے۔ حج کے لیے خاص مہینہ اور خاص ایام ہیں۔ وقوفِ عرفہ کے لیے معیّنہ دن ہے۔ ان تمام ایام و اوقات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی عبادتیں مقرر کر رکھی ہیں جن کے اجر و ثواب کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے لیکن ان کی ساری برکتیں اپنی اصلی صورت میں تبھی ظاہر ہوتی ہیں جب یہ ٹھیک ٹھیک ان ایام و اوقات کی پابندی کے ساتھ عمل میں لائی جائیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ برکت فوت ہو جاتی ہے جو ان کے اندر مضمر ہوتی ہے۔

یہی حال لیلۃ القدر کا ہے۔ یہ بڑی برکتوں اور رحمتوں کی رات ہے۔ بندہ اگر اس کی جستجو میں کامیاب ہو جائے تو اس ایک ہی رات میں خدا کے قرب کی وہ اتنی منزلیں طے کر سکتا ہے جتنی ہزار راتوں میں نہیں کر سکتا۔ 'ہزار راتوں' کی تعبیر بیانِ کثرت کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور بیانِ نسبت کے لیے بھی لیکن مدعا کے اعتبار سے دونوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہوگا۔ مقصود یہی بتانا ہے کہ اس رات کے پردوں میں روح و دل کی زندگی کے بڑے خزانے چھپے ہوتے ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ جو اس کی جستجو میں سرگرم رہ سکیں اور اس کو پانے میں کامیاب ہو جائیں!

لیلۃ القدر کی تعیین میں اختلاف

اس رات سے متعلق یہ بات تو مسلّم ہے کہ اس میں قرآن کے نزول کا آغاز ہوا اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ یہ رمضان کی کوئی رات ہے۔ دوسرے مقام میں یہ تصریح ہے کہ قرآن رمضان کے مہینے میں نازل ہوا۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (البقرۃ - ۲: ۱۸۵) (رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا) رہا یہ سوال کہ یہ رمضان کی کون سی تاریخ ہے تو روایات کے اختلاف کے سبب سے اس کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے بس زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ میں اس کے ہونے کا گمان غالب ہے۔

اس باب میں جو روایات وارد ہیں ان کے اختلاف کے باعث بعض لوگوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ یہ رمضان ہی کے مہینہ کے ساتھ مخصوص ہے یا کسی دوسرے مہینہ میں بھی اس کے پائے

بدلنے کا امکان ہے؟ اسی طرح یہ سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ اس کی میعاد ایک سال ہے یا اس سے مختلف بھی ہو سکتی ہے؟ ان سوالوں کے اطمینان بخش جواب کا انحصار تمام روایاتِ باب کی تحقیق و تنقید پر ہے اور یہ ایک طویل بحث ہے جس کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ہم نے ان کی طرف یہاں صرف اس مقصد سے اشارہ کر دیا ہے کہ اہلِ علم ان پر نگاہ رکھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہم کو حدیث پر اپنی پیشِ نظر کتاب لکھنے کا موقع عنایت فرمایا تو شاید اس میں یہ سوالات زیرِ بحث آئیں۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ (۴)

اس رات کا اصل کام

یہ اس رات کے تقدیرِ امور یا تقسیمِ امور کی رات ہونے کی وضاحت ہے۔ فرمایا کہ اس میں ملائکہ اور جبریل امینؑ ان تمام معاملات میں جو زمین میں نافذ ہونے والے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی منظوری لے کر اترتے ہیں۔ یہی بات سورۂ دخان میں 'فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا' (الدخان - ۴۴ : ۴ - ۵) (اسی رات میں تمام حکیمانہ امور کی تقسیم ہوتی ہے خاص ہمارے حکم سے) کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت جو امور طے کر رکھے ہیں وہ اس رات میں تقسیم ہوتے ہیں اور متعلق فرشتے اللہ تعالیٰ کے اذن (SANCTION) سے ان کی تنفیذ کے لیے زمین میں اترتے ہیں۔ لفظ 'الرُّوْحُ' اس آیت میں قرینہ دلیل ہے کہ حضرت جبریل امینؑ کے لیے ہے۔ چونکہ ملائکہ کے زمرے میں ان کا درجہ بہت اونچا ہے اس وجہ سے ان کا ذکر خاص طور پر ہوا۔

سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۵)

اس رات میں شیاطین پابند ہو جاتے ہیں

یہ اس رات کے اس پہلو کی وضاحت ہے جس کا ذکر اوپر 'خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ فرمایا کہ یہ رات کلیتہً امان ہی امان ہے اور اس کی یہ برکت طلوعِ فجر تک محیط ہے۔

'سَلٰمٌ' میرے نزدیک مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ پورا جملہ 'هِيَ سَلٰمٌ' ہے۔ پوری توجہ خبر پر مرکوز کر دینے کے لیے مبتداء کو حذف کر دیا ہے۔ جس طرح 'زَيْدٌ عَدْلٌ' میں لفظ 'عَدْلٌ' میں مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے اسی طرح 'سَلٰمٌ' میں بھی مبالغہ کا مفہوم ہے۔ میں نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔

لفظ 'سَلٰمٌ' میں یوں تو ہر قسم کی آفات سے محفوظ ہونے کی ضمانت ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس مبارک رات میں شیاطین کی ہر قسم کی دوا دوش پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ جس طرح وحی کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ ملاءِ اعلیٰ کے حدود میں ان کی مداخلت کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں، جس کی تفصیل قرآن میں موجود ہے، اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر

یہ شیاطین آسمانی کرفیو کے تحت ہوتے ہیں اور ان پر یہ کرفیو طلوع فجر تک نافذ رہتا ہے۔ جس کے سبب سے نہ وہ اس اہم رات کے اسرار معلوم کرنے کے لیے کوئی نقل و حرکت کر سکتے اور نہ شب مبارک کی برکتوں میں کوئی خلل پیدا کر سکتے۔ هذا ما عندی والعلم عند الله و علمه اکمل واتم۔

لاہور

۱۳ - مارچ ۱۹۸۰ء

۲۵ - ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

٩٨

البیّنۃ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ——— القدر ——— کا مثنیٰ ہے۔ اس میں قرآن کی عظمت بیان ہوئی ہے اور اس میں یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین دونوں گٹھ جوڑ کر کے اس وقت قرآن کی تکذیب کے لیے جو اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ قرآن کے باب میں انھیں کوئی واقعی شبہ ہے بلکہ اس کا سبب محض ان کا استکبار ہے۔ وہ ظاہر تو یہ کر رہے ہیں کہ اگر ان کو کوئی کھلی ہوئی نشانی دکھا دی جائے تو وہ اس کو مان لیں گے لیکن یہ محض ان کا فریب ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان کو قائل کرنے والا نہیں بن سکتا۔ یہ اس کو دیکھ کر بھی اپنے استکبار پر پردہ ڈالنے کے لیے کوئی بات بنا ہی لیں گے۔ اہل کتاب آج مشرکین کی جو پشت پناہی اور قرآن کی تکذیب کے لیے ان کو جو اعتراضات القا کر رہے ہیں اگر اپنی تاریخ کے آئینہ میں اپنے کردار کو دیکھیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جس طرح کے معجزے کا مطالبہ وہ آج کر رہے ہیں اسی قسم کے معجزوں کا مطالبہ ان کے پیشرؤوں نے اپنے زمانے میں اپنے پیغمبروں سے کیا اور وہ ان کو دکھا بھی دیے گئے لیکن سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی انھوں نے اللہ کی کتاب اور اس کے دین کا تیا پانچا کر کے رکھ دیا۔ ایمان لانے کے لیے اصل چیز اللہ کی خشیت ہے۔ جن کے اندر یہ خشیت موجود ہے وہ اس کتاب پر ایمان لائیں گے۔ رہے وہ جن کے دل پتھر ہو چکے ہیں وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں خواہ ان کو کتنی ہی بڑی نشانی دکھا دی جائے۔

ب۔ سورہ کا زمانۂ نزول

بعض مفسرین نے اس سورہ کو مدنی قرار دیا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ ان لوگوں کا ذہن اس طرف اس وجہ سے گیا کہ اس میں مشرکین مکہ کے ساتھ اہل کتاب کے رویہ کا بھی حوالہ ہے لیکن محض اتنی بات کسی سورہ کو مدنی قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ سورتوں کے پچھلے گروپ آپ کی نظروں سے اگر گزر چکے ہیں تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر گروپ کی آخری مکی سورتوں

میں مشرکین مکہ کے رویے کے ساتھ ساتھ اہل کتاب کے رویے کی طرف بھی اشارے ہوتے ہیں جو بالتدریج خفی سے جلی ہوتے چلے گئے ہیں[1] اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ میں ایک نئی رسالت اور ایک نئی دعوت کا معاملہ ایسا معاملہ نہیں تھا جس سے اہل کتاب، بالخصوص یہود، بالکل غیر متعلق رہتے۔ ان کے علما اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر ایک نئی بعثت کا اندیشہ پہلے سے رکھتے تھے پھر وہ اس نئی دعوت کو نظر انداز کیسے کر سکتے تھے۔ البتہ شروع شروع میں انھوں نے اس کی مخالفت میں کوئی عملی حصہ اس وجہ سے نہیں لیا کہ قریش کی مخاصمت کا اندازہ دیکھ کر انھوں نے خیال کیا کہ اس دعوت کو ختم کر دینے کے لیے یہ خود ہی کافی ہیں لیکن جب دیکھا کہ دعوت قریش کے علی الرغم دبنے کے بجائے بڑھ ہی رہی ہے تو انھوں نے بھی ان کی پشت پناہی شروع کر دی۔ اول اول تو انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کچھ اعتراضات و سوالات قریش کو سکھائے تاکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں اور آپ کو زچ کرنے کی کوشش کریں۔ پھر اپنی مذہبی برتری کے زعم میں انھوں نے نبی کی شناخت کے لیے بعض خود ساختہ علامتیں مقرر کیں اور قریش کو مشورہ دیا کہ وہ نئے مدعی نبوت کو ان کی بتائی ہوئی کسوٹی پر پرکھیں۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ ہمارے صحیفوں میں تو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ہم اس وقت تک کسی نبی کی نبوت کی تصدیق نہ کریں جب تک اس کی پیش کی ہوئی قربانی کو کھانے کے لیے آسمان سے آگ نہ اترے۔ قرآن نے ان کی اس طرح کی شرارتوں کا جگہ جگہ حوالہ دیا ہے۔ اور یہ کام انھوں نے دعوت کے ابتدائی دور ہی سے شروع کر دیا تھا اس وجہ سے جابجا مکی سورتوں میں بھی ان کی طرف اشارہ ہوا۔ اس سورہ میں بھی اسی نوعیت سے قریش کے ساتھ ان کے گٹھ جوڑ کا ذکر فرمایا۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۳) پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین قریش کے جو اشرار تمھارے درپئے مخالفت ہیں، یہ گمان نہ کرو کہ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی ہٹ سے باز آ جائیں گے اور اس قرآن کو مان لیں گے۔ یہ تو اسی وقت مانیں گے جب آسمان سے کوئی فرشتہ صحیفے پڑھتا ہوا اترے اور وہ اس کو دیکھیں کہ وہ صحیفے لیے اتر رہا ہے۔

(۴-۵) اس کے بعد اہل کتاب پر تعریض ہے کہ یہ ناہنجار لوگ آج رسول کی مخالفت کے جوش

---

[1] ہم نے اپنی اس کتاب میں ان کی طرف ہر جگہ توجہ دلا دی ہے۔

ہیں قریش کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں حالانکہ ان کی بدبختی کا یہ حال ہے کہ انھوں نے بڑے بڑے معجزے دیکھے لیکن پھر بھی ان کو اللہ کے دین پر قائم رہنا نصیب نہ ہوا بلکہ یہ سب کچھ دیکھ کر اندھے بنے رہے اور دین کی ان اساسات پر بھی متفق نہ رہ سکے جن میں کسی اختلاف کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

(۶-۸) آخر میں اہل کتاب اور قریش دونوں کے استکبار پر ضرب لگائی ہے کہ یہ اپنے کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اس وجہ سے رسول کی دعوت کو خاطر میں نہیں لا رہے ہیں حالانکہ یہ بدترین خلائق ہیں۔ یہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ اللہ کے نزدیک درجہ صرف ان بندوں کے لیے ہے جو غیب میں رہتے اپنے رب پر ایمان لائیں اور عمل صالح کریں نہ کہ ان مغروروں کے لیے جو سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیں گے تب مانیں گے۔

سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــــــ اٰيات : ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۸-۱ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ
مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝١ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا
صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝٢ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝٣ وَمَا تَفَرَّقَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝٤
وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ
حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ
الْقَيِّمَةِ ۝٥ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ
فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝٦
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ
الْبَرِيَّةِ ۝٧ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ
ع ۱/۲۳ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝٨

ترجمۂ آیات ۸-۱ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنھوں نے (قرآن کا) انکار کیا وہ اپنی ہٹ سے

باز آنے والے نہیں ہیں، یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی ہوئی نشانی آجائے ـــــ یعنی اللہ کی طرف سے ایک فرستادہ، پاکیزہ اوراق پڑھتا ہوا، جس میں صاف احکام لکھے ہوئے ہوں۔ ۱-۳

حالانکہ اہل کتاب کھلی ہوئی نشانی آجانے کے بعد ہی اختلاف میں پڑے۔ ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ، بالکل یکسو ہو کر اور نماز کا اہتمام رکھیں اور زکوٰۃ دیں اور یہی سیدھی ملت کا دین ہے۔ ۴-۵ بے شک اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنھوں نے کفر کیا، وہ دوزخ کی آگ میں پڑیں گے، اسی میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔ یہی لوگ بدترین خلائق ہیں! ۶

بے شک جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے وہ بہترین خلائق ہیں۔ ان کا صلہ ان کے رب کے پاس ہمیشگی کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ خدا ان سے راضی وہ خدا سے راضی! یہ صلہ اس کے لیے ہے جو اپنے خداوند سے ڈرا۔ ۷-۸

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ (۱)

اہل کتاب اور مشرکین کا ضدی گروہ

یہاں 'لَمْ یَکُنْ' فعل ناقص کے مفہوم میں نہیں بلکہ جس طرح 'وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا' (النسآء - ۴ : ۱۷) (اللہ علیم و حکیم ہے) میں ہے اسی طرح یہاں بھی فعل تام کے مفہوم میں ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنھوں نے قرآن اور رسول کا کفر کیا وہ اپنی ہٹ سے باز آنے والے نہیں ہیں جب تک کھلی نشانی نہیں دیکھ لیں گے۔

'کَفَرُوْا' کا مفعول یہاں، قرینہ کی وضاحت کی بنا پر محذوف ہے۔ یعنی جنھوں نے قرآن اور رسول کا انکار کر دیا ہے۔

'اَھْلِ الْکِتٰب' اور 'مُشْرِکِیْن' کا ذکر یہاں بحیثیت دو گروہوں کے ہے جو اس دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں پیش پیش تھے، مشرکین علانیہ طور پر اور اہل کتاب، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، خفیہ طور پر۔ لفظ 'مشرکین' جب یوں آتا ہے جس طرح یہاں آیا ہے تو مشرکین قریش یا مشرکین بنی اسمٰعیل کے لیے بطور عَلَم آتا ہے۔ اس استعمال کی مثالیں قرآن میں متعدد نہایت واضح موجود ہیں۔

'مِنْ' یہاں اپنے معروف استعمال یعنی تبعیض ہی کے لیے ہے اس لیے کہ یہاں مشرکین اور اہل کتاب میں سے اس گروہ کا کردار بیان ہو رہا ہے جو اسلام کی مخالفت کے لیے اندھا بہرا بن کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ان دونوں گروہوں میں سب ایک ہی طرح کے نہیں تھے بلکہ ان میں ایسے سنجیدہ افراد بھی تھے جو اسلام لائے اور اگر اسلام نہیں لائے تو کم از کم اس معاملے میں وہ میانہ رو یا غیر جانبدار رہے۔ قرآن میں اس طرح کے لوگوں کا ذکر تحسین کے ساتھ ہوا ہے۔ یہاں 'مِنْ' اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے کہ یہ صرف اس گروہ کا کردار بیان ہو رہا ہے جو اپنے مطلوبہ معجزات دیکھے بغیر کوئی بات سننے سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

ضدیوں کا مطالبہ

'حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ' یہ ان ضدیوں کی وہ شرط بیان ہوئی جس کے پورے ہوئے بغیر وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ 'بَیِّنَۃٌ' کے معنی کھلی ہوئی نشانی کے ہیں۔ 'کھلی ہوئی نشانی' سے ان کی مراد یہ تھی کہ ان کو کوئی ایسا واضح معجزہ دکھایا جائے جس کے انکار کی کوئی

گنجائش باقی نہ رہے۔ ان کے اس مطالبہ کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے ان کے ذہن کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

سورۂ نساء میں اہل کتاب کے مطالبہ کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے:

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً۔ (النسآء - ۴ : ۱۳۵)

اہل کتاب تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم ان پر آسمان سے براہ راست ایک کتاب اتارو تب وہ مانیں گے۔ ان کا یہ مطالبہ کچھ عجیب نہیں۔ موسیٰ سے تو انھوں نے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھاؤ تب ہم مانیں گے۔

اسی طرح مشرکین سے متعلق قرآن نے سورۂ مدثر میں بیان فرمایا ہے:

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً۔ (المدثر - ۷۴ : ۵۲)

بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے صحیفے پکڑائے جائیں۔

یعنی وہ اس قرآن کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جو وحی کے ذریعے سے صرف ایک شخص پر نازل ہوتا ہے بلکہ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ آسمان سے ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ صحیفے اتریں۔ تب وہ یقین کریں گے کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے کتاب اتاری ہے۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۲-۳)

یہ 'اَلْبَیِّنَۃُ' کی وضاحت ہے کہ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم سے منوانا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرشتہ براہ راست پاک اور اچھوتے اوراق پڑھتا ہوا اترے جس میں نہایت واضح اور قطعی احکام مرقوم ہوں۔

'رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ' کے الفاظ سے واضح ہے کہ ان کا منشا یہ تھا کہ انسانوں میں سے اٹھا ہوا کوئی رسول جو مدعی ہو کہ اس پر وحی آتی ہے، ان کو مطلوب نہیں ہے بلکہ وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا کوئی فرشتہ چاہتے ہیں جو پاک اور اچھوتے اوراق پڑھتا ہوا اترے۔

'صُحُفًا مُّطَهَّرَةً'۔ 'صَحِيْفَةٌ' ورق کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ فرشتہ کی بات بھی اس صورت میں باور کریں گے جب وہ خدا کی طرف سے صرف خبر دینے والا نہ ہو بلکہ جو کچھ لائے، لکھے ہوئے اوراق میں لائے اور اس کو پڑھ کر سنائے۔ ان اوراق کے لیے 'مُطَهَّرَةٌ' کی صفت میں یہ مضمون مضمر ہے کہ یہ اوراق بالکل پاکیزہ اور اچھوتے ہوں، خدا اور فرشتہ کے سوا کسی جن و بشر نے ان

کو ہاتھ نہ لگایا ہو۔

'فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ' مذکورہ شرائط کے اوپر ایک مزید شرط یہ بھی کہ ان اوراق میں ادھر ادھر کی بہت سی سرگزشتیں اور حکایتیں نہ ہوں بلکہ سیدھے سیدھے قطعی اور واضح احکام ہوں کہ وہ ان کو سن کر بے تکلف جان لیں کہ ان کا رب ان کو کن باتوں کا حکم دیتا ہے اور کن باتوں سے روکتا ہے۔

'كُتُبٌ' جمع ہے 'كِتَابٌ' کی۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔[۱] وہاں ہم نے بتایا ہے کہ یہ لفظ قرآن میں شریعت کے احکام کے معنی میں بھی آیا ہے۔ یہاں یہ اسی معنی میں ہے۔

'قَيِّمَةٌ' کے معنی سیدھے، واضح اور قطعی کے ہیں۔ یعنی ہمیں قطعی احکام بتلائے جائیں، غیر متعلق باتیں سننے کے خواہش مند ہم نہیں ہیں۔ اس لفظ میں ان شریر لوگوں کی طرف سے قرآن مجید پر جو تعریض ہے وہ اہل ذوق خود سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح تورات کے احکام عشرہ الواح میں لکھ کر دیے گئے تھے اسی طرح واضح احکام، اوراق میں لکھے ہوئے لے کر فرشتہ آسمان سے ہمارے اوپر اترے تب ہم مانیں گے کہ یہ خدا کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ (۴)

اہل کتاب کے القاء کردہ مطالبہ کا جواب

یہ مطالبہ چونکہ اہل کتاب کی ایجادات میں سے تھا جو انھوں نے قریش کے لیڈروں کو اس لیے سکھایا تھا کہ وہ اس کو قرآن کے خلاف استعمال کریں، اس وجہ سے قرآن نے اس کا جواب انہی کو سامنے رکھ کر دیا۔ فرمایا کہ ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا بھی دیا جائے جب بھی یہ ماننے والے اسامی نہیں ہیں۔ ان کی تاریخ شاہد ہے کہ ان کو جو شریعت دی گئی تھی وہ نہایت کھلے ہوئے معجزات کے جلو میں دی گئی تھی، ان کے پیغمبر، حضرت موسیٰؑ نے قدم قدم پر ان کو قدرت خداوندی کے وہ کرشمے دکھائے جو کسی قوم کو ان سے پہلے نہیں دکھائے گئے، تورات کے احکام عشرہ ان کو الواح میں لکھ کر دیے گئے۔ ان سے شریعت کا عہد لیتے وقت پہاڑ ان کے اوپر چھتری کی طرح اڑھا دیا گیا، ان کے لیے صحرا میں سایہ اور من و سلویٰ کا انتظام کیا گیا، پہاڑ سے ان کے لیے اکٹھے بارہ چشمے جاری کر دیے گئے لیکن یہ سارے کرشمے اور معجزے دیکھنے کے بعد شریعت الٰہی کے ساتھ وفاداری کا حق انھوں نے یوں ادا کیا کہ سامری سے ایک بچھڑا بنوا کر اس کی پوجا شروع کر دی کہ یہی ہمارا معبود ہے۔ ان کے اسی فساد سے ان کے اندر سب سے پہلے انتشار پیدا ہوا جو امتداد زمانہ کے ساتھ بڑھتا گیا یہاں تک کہ اختلاف کے سوا کوئی چیز بھی ان کے درمیان مشترک نہیں رہ گئی۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا

---

[۱] ملاحظہ ہو تدبر قرآن۔ جلد اول، صفحہ: ۲۴۲

الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (۵)

یہ اس تفرق کی مثال ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ دین کی بنیادی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی باقی نہیں رہ گئی ہے جس پر یہ قائم و استوار ہوں بلکہ ہر چیز میں ان کی راہیں الگ الگ ہو گئیں یہاں تک کہ اپنے اس اختلاف کی بدولت وہ ان کو ضائع کر بیٹھے۔

ان کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توحید کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں اسی کے لیے اطاعت کو خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر، لیکن انھوں نے دین کی یہ بنیادی تعلیم برباد کر دی۔ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں انھوں نے ایک بچھڑے کی پرستش کی، عزیر کو ابن اللہ اور اپنے علماء و فقہاء کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنایا۔ جادو اور اعمالِ سفلیہ اختیار کر لیے یہاں تک کہ دوسری قوموں کے بتوں کی بھی پوجا کی جس پر ان کے نبیوں نے نہایت درد انگیز الفاظ میں نوحہ کیا۔

اسی طرح انھیں نماز اور زکوٰۃ کا بھی حکم دیا گیا تھا لیکن نماز انھوں نے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے، بالکل ہی ضائع کر دی یہاں تک کہ تورات میں اس کا ذکر بھی باقی نہیں رہا۔ تورات میں قربانی کا ذکر آتا ہے لیکن نماز کا ذکر بمنزلۂ صفر ہے۔ یہی حال زکوٰۃ کا بھی ہوا۔ رسمی طور پر تو وہ باقی رہی لیکن اس کے اصل حقدار فقراء و غرباء کی جگہ بنی لاوی کے علماء و فقہاء بن گئے اور ان کے علماء و فقہاء کی خست و نجاست کا جو حال رہا ہے اس کا اندازہ کرنا ہو تو انجیلوں اور دوسرے نبیوں کے صحیفوں میں ان کی زر پرستی کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے۔

'وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ' یہ جواب ہے ان کے اس مطالبہ کا جو اوپر 'فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ' کے الفاظ میں نقل ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ فی الواقع سیدھے اور واضح دین ہی کے طالب ہیں تو یہ احکام تو انھیں سیدھے اور فطری دین ملتِ ابراہیم کے احکام کی حیثیت سے دیے گئے تھے تو انھوں نے آخر ان کو کیوں برباد کیا؟ اور یہ قرآن بھی ان کو انہی واضح اور قطعی باتوں کی طرف بلا رہا ہے تو اس کی مخالفت کے درپے کیوں ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ اہلِ کتاب جو سوالات اٹھا رہے ہیں یہ محض ان کے حسد کی پیداوار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح یہ خود اپنے کو اللہ کی شریعت سے محروم کیے بیٹھے ہیں اسی طرح دوسرے بھی اس سے محروم ہی رہیں۔

دینِ قیم

'ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ' یہ اصل میں ذٰلِكَ دِيْنُ الْمِلَّةِ الْقَيِّمَةِ ہے۔ 'قَيِّمَة' کا موصوف یہاں حذف ہو گیا ہے اور اس قسم کا حذف، قرینہ موجود ہو تو عربی میں معروف ہے۔ اس اسلوبِ بیان سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ دین کی یہی وہ بنیادی تعلیمات ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کی دونوں شاخوں کو ان کے جدِ اعلیٰ کی وراثت کی حیثیت سے منتقل ہوئی ہیں۔ تو حیف ہے، اگر انہی کی مخالفت کے لیے دونوں شاخیں گٹھ جوڑ کرنے کی کوشش کریں۔

یہ امر واضح رہے کہ ملتِ ابراہیم کا تعارف قرآن میں جگہ جگہ 'مِلَّۃً قَیِّمَۃً' کی صفت سے کرایا گیا ہے۔ اس ملت پر مفصل بحث اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف ایک آیت کے حوالہ پر اکتفا کریں گے۔ فرمایا ہے:

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ (الانعام - ۶ : ۱۶۱)	کہہ دو، میرے رب نے میری رہنمائی ایک سیدھی راہ کی طرف فرمائی ہے، فطری دین، ملتِ ابراہیم کی طرف یکسو ہو کر۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (۶)

اہل کتاب اور مشرکین کے کبر و غرور پر ضرب

یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا ہے جو قرآن کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین سے۔ ساتھ ہی اس میں ان کے اس کبر و غرور پر بھی ضرب لگائی ہے جو اس تکذیب کا سبب بنا۔

فرمایا کہ جو بھی قرآن کی تکذیب کر کے کفر کے مرتکب ہوئے ہیں وہ سب جہنم میں بھر دیے جائیں گے، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے۔ اہل کتاب ہو کر جنھوں نے اسی اندھے پن کا ثبوت دیا جس کا مظاہرہ مشرکین نے کیا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کسی رعایت کے مستحق ٹھہریں۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی ہے کہ یہ اس جہنم میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل کیے جائیں گے۔ یہ نہیں ہو گا کہ چند دنوں کے بعد اس سے ان کو نکلنا نصیب ہو جائے۔ یہاں اہل کتاب کے اس زعم پر نظر ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا ہے کہ ان کا گمان یہ ہے کہ اول تو دوزخ کی آگ سے ان کو کوئی سابقہ پڑنے والا نہیں ہے اور پڑا بھی تو وہ چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں ہو گا۔

'أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ' یہ ان کے کبر پر ضرب لگائی گئی ہے۔ اہل کتاب اور مشرکین کے سردار، قرآن اور پیغمبر پر ایمان لانے کے لیے یہ شرط جو لگاتے تھے کہ جب تک کوئی فرشتہ آسمان سے اچھوتے صحیفے پڑھتا نہیں اترے گا یا جب تک ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں کھلے صحیفے نہیں پکڑائے جائیں گے اس وقت تک وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے دعوائے رسالت میں سچے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ شرط وہ اس غرور کی بنا پر لگاتے تھے کہ وہ اپنے ہی اندر کے ایک شخص کو، جو دنیوی اعتبار سے ان سے فروتر بھی ہے، خدا کا رسول مان کر اس کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں کس طرح ڈال لیں! ان کا یہ غرور ان کے لیے قبولِ حق سے مانع بنا حالانکہ حق خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جس کے آگے گردن جھکا دینا ہر ایک پر

واجب ہے خواہ وہ کوئی بادشاہ ہو یا غلام۔ اگر کوئی شخص حق سے اکڑتا ہے تو وہ ابلیس کی ذریت میں سے ہے اور ابلیس کی ذریت بدترین خلائق ہے جس کا ٹھکانا صرف جہنم ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ (۷)

ان بندوں کا بیان جو اسکبار سے پاک رہے

یہ اللہ کے ان بندوں کا بیان ہے جو کبر و غرور کی آلائش سے پاک رہے اس وجہ سے ان کے اندر حق کا احترام باقی رہا۔ انھوں نے جب رسول کی دعوت سنی تو اس طرح کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جس طرح کا مطالبہ مغروروں نے کیا بلکہ وہ اللہ کی کتاب پر ایمان لائے اور عمل صالح کی راہ پر چل پڑے۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو بہترین خلائق ہیں۔ اس لیے کہ انسان کی قدر و قیمت مال و اسباب اور خاندان و نسب سے نہیں بلکہ اس کے عقلی و اخلاقی اوصاف سے ہے۔ جن کے اندر یہ اوصاف موجود ہیں اللہ کے نزدیک وہی اشراف و سادات ہیں اگرچہ وہ روم یا حبش کے غلام ہوں اور جو ان اوصاف سے محروم ہیں وہ اللہ کے نزدیک ارذل خلائق ہیں اگرچہ وہ قریشی و ہاشمی سادات ہوں۔ یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے قریش کے لیڈروں کی وہ پھبتیاں ذہن میں تازہ کر لیجیے جو وہ ان غریب مسلمانوں پر چست کرتے تھے جو شروع شروع میں اسلام لائے تھے۔ ان کی طرف سے اس تو ہین و تذلیل کے بعد رب السموات والارض کی طرف سے ان کی اس سرفرازی سے کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان کے سر کتنے اونچے ہوئے ہوں گے!

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور جیسا کہ سورۂ تین میں ارشاد ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو بہترین ساخت اور نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اگر یہ اپنی قدر پہچان لے تو یہ 'خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ' ہے، خدا کی مخلوقات میں کوئی اس کے برابر کا نہیں۔ اور اگر یہ اپنی حقیقی قدر و قیمت سے بے خبر رہ کر زندگی گزارے تو یہ 'شَرُّ الۡبَرِیَّۃِ' اور 'رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ' کا بالکل صحیح مصداق ہے۔ پھر یہ اتنی پستی میں گرتا ہے جو صرف اسی کے لیے خاص ہے۔ خدا کی کوئی اور مخلوق اس پستی تک نہیں گرتی۔ جس طرح انسان کے عروج کی کوئی حد نہیں ہے اسی طرح اس کے زوال کی بھی کوئی حدِ نہایت نہیں ہے۔ بڑی ہی اعلیٰ بات کہی ہے ان حکما نے جنھوں نے کہا ہے کہ "اے انسان! تو اپنے کو پہچان!"

جَزَآؤُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّہٗ (۸)

یہ اللہ کے ان بندوں کا صلہ بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ اس دنیا میں ان کے لیے جو آزمائشیں مقدر ہیں، ان سے تو انھیں بہر حال گزرنا ہے لیکن اپنے رب کے پاس ان کے لیے اقامت کے ایسے باغ ہیں جن میں نہریں جاری ہوں گی اور یہ ان میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہوں گے۔

'جَنّٰتُ عَدْنٍ' کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

'رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ' یعنی اس جنت میں اللہ بھی ان سے راضی اور وہ بھی اس سے راضی۔ اللہ ان سے اس وجہ سے راضی کہ انھوں نے بندگی کا حق اس طرح ادا کیا جس طرح ان کو ادا کرنا چاہیے تھا اور جو ان کے رب کے معیار پر پورا اترا اور وہ اللہ سے اس وجہ سے راضی کہ ان کے رب نے نہ صرف وہ وعدے پورے کیے جو ان سے کیے تھے بلکہ ان کو وہ کچھ بخشا جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکے تھے۔

'ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ' فرمایا کہ یہ مقام ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنے رب سے، غیب میں رہتے ڈرے۔ مطلب یہ ہے کہ جو احمق سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں وہ اسی طرح بھٹکتے رہیں گے۔ ان کا علاج کوئی نہیں کر سکتا۔ اس دنیا میں انسان کا اصلی امتحان یہی ہے کہ وہ اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر ان حقائق پر ایمان لائے جن کی خبر اللہ کے رسولوں نے دی ہے۔ وہ کان اور آنکھیں بند کر کے زندگی نہ گزارے اور نہ اس بات کا منتظر رہے کہ سب کچھ سامنے دکھا دیا جائے تو وہ تب مانے گا۔ جس نے یہ امتحان پاس کر لیا وہی اس بات کا مستحق ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضلِ عظیم سے نوازے۔ جو اس میں ناکام رہا وہ جانوروں سے بھی بدتر ہے اور اس لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل کا کوئی حصہ عطا کرے۔

بتوفیقِ ایزدی ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِیْرًا۔

لاہور

۲۴- مارچ ۱۹۸۰ء

۰۶ جمادی الاول ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۹۹

الزّلزال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا مضمون اور ترتیب بیان

اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس دن انسان کی کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی بلکہ اس کی ہر نیکی و بدی خواہ اس نے کتنے ہی پردوں کے اندر چھپ کر کی ہو، اس کے سامنے رکھ دی جائے گی اور وہ اس کی جزا یا سزا پائے گا۔ اس دن ہر شخص اپنے اعمال سے متعلق خود جواب دہ ہوگا۔ کوئی دوسرا نہ اس کا حامی و مددگار ہوگا اور نہ کوئی اس کا سفارشی بنے گا۔

اس مدعا کو واضح کرنے کے لیے پہلے اس ہلچل کی تصویر کھینچی گئی ہے جو قیامت کے دن اس زمین میں برپا ہوگی اور جس کے نتیجے میں وہ سب کچھ باہر آ جائے گا جو اس کے اندر مدفون ہے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کے ایما سے اپنی ساری کہانی کہہ سنائے گی تاکہ انسان پر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اس نے اس کے اندر کہاں کہاں کیا کچھ چھپایا اور کیا کیا کہا اور کیا ہے۔ اس کے بعد ہر ایک اپنی نیکی بھی دیکھے گا، اگر اس نے کوئی نیکی کی ہوگی اگرچہ وہ کتنی ہی حقیر ہو اور وہ برائی بھی دیکھے گا جس کا وہ مرتکب ہوا ہوگا اگرچہ وہ برائی کتنی ہی چھوٹی ہو۔

پچھلی سورتوں کے مطالب اگر ذہن میں محفوظ ہیں تو اس سورہ کے انذار کی اہمیت کا اندازہ کرنے میں کچھ زحمت نہیں ہوگی۔ قیامت کے باب میں منکرین کے بڑے مغالطے تین تھے۔ ایک یہ کہ یہ زمین و آسمان بھلا درہم برہم کس طرح ہو سکتے ہیں! دوسرا یہ کہ انسان کے تمام اقوال و افعال کا بھلا کوئی احاطہ کر سکتا ہے کہ ان کا حساب کرنے بیٹھے! تیسرا یہ کہ اگر یہ باتیں ممکن بھی فرض کر لی جائیں جب بھی تو ان کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہے، ان کے شرکاء اپنی سفارش سے ان کو ہر آفت سے بچا لیں گے اور ان کو خدا کے ہاں بڑے بڑے درجے دلوائیں گے۔ اس سورہ میں ان کے ان تینوں مغالطوں پر ضرب لگائی گئی ہے۔

سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ

مَكِّيَّةٌ ——— آيات: ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴿١﴾ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ آیات ۱-۸
أَثْقَالَهَا ﴿٢﴾ وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ﴿٣﴾ يَوْمَئِذٍ
تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ﴿٤﴾ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحٰى لَهَا ﴿٥﴾ يَوْمَئِذٍ
يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ﴿٦﴾ فَمَنْ
يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ ﴿٧﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ
ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهُ ﴿٨﴾ ع ۸ ۲۴

جب کہ زمین ہلا دی جائے گی جس طرح اس کو ہلانا ہے۔ اور زمین اپنا بوجھ باہر ترجمۂ آیات ۱-۸
نکال پھینکے گی اور انسان پکار اٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے! اس دن وہ اپنی
داستان کہہ سنائے گی، تیرے خداوند کے ایما سے۔ ۱-۵

اس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے کہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں۔
پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہو گی وہ بھی اس کو دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر
بدی کی ہو گی وہ بھی اسے دیکھے گا۔ ۶-۸

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۱)

جب اس طرح اِذَا سے کسی چیز کا بیان ہوتا ہے تو مقصود اس کی یاد دہانی ہوتی ہے یعنی اس وقت کو یاد رکھو، اس دن سے ہوشیار رہو، جب کہ ایسا ایسا ہو گا۔ آپ چاہیں تو اس مخفی مضمون کو ترجمے میں ظاہر بھی کر سکتے ہیں۔

زبان کا ایک نکتہ

'زِلْزَالَ' آیا تو ہے فعل 'زُلْزِلَتْ' کی تاکید کے لیے جس طرح مفعول مطلق آیا کرتا ہے لیکن یہاں زمین کی طرف اس کی اضافت سے مضمون میں ایک خاص اضافہ ہو گیا ہے جس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ورنہ آیت کا صحیح زور سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس خاص اسلوب کو سامنے رکھ کر اس کا ترجمہ یہ ہو گا کہ جب کہ زمین ہلا دی جائے گی اس طرح جس طرح زمین کو ہلانے کا حق ہے یا جس طرح اس کا ہلایا جانا مقدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس ہلائے جانے کا صحیح تصور آج ممکن نہیں ہے، پورے کرۂ ارض کا جھنجھوڑا جانا اور اس طرح جھنجھوڑا جانا جس طرح خدا نے مقدر فرمایا ہے تصور سے ایک مافوق حادثہ ہے لیکن یہ پیش آنے والا ہے اس وجہ سے اس کو یاد رکھو، اس سے غافل رہ کر زندگی نہ گزارو۔

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (۲)

'اثقال' سے مراد

'ثِقْلٌ' کے معنی بار اور بوجھ کے ہیں۔ یہاں اس کا اوّل مصداق تو مردے ہیں جو زمین میں دفن ہیں اور قیامت کے دن زمین ان کو نکال باہر کرے گی لیکن لفظ عام ہے اس وجہ سے اس سے وہ خزانے اور دفینے بھی مراد ہو سکتے ہیں اور ان جرائم کی یادگاریں بھی جن کا مجرموں نے ارتکاب کیا اور زمین میں ان کو چھپایا۔ سورۂ انشقاق کی آیت 'وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ' (الانشقاق - ۸۴: ۴) (جو کچھ اس کے اندر ہو گا وہ اس کو ڈال کر فارغ ہو جائے گی) میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے اور آگے سورۂ عادیات کی آیت 'اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ' (العٰدیٰت - ۱۰۰: ۹) (اور جب کہ قبریں اگلوائی جائیں گی) کے تحت بعض اشارات ان شاء اللہ مزید آئیں گے۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا (۳)

انسان کی بدحواسی کی تصویر

اس ہولناک صورت حال کا انسان پر جو اثر پڑے گا یہ اس کی تعبیر ہے کہ وہ بدحواس ہو کر پکار اٹھے گا کہ ارے، یہ اسے کیا ہو گیا ہے کہ یہ کسی طرح تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے اور اپنے

اندر کی ہر چیز باہر نکالے دے رہی ہے! اسی طرح کی گھبراہٹ مجرموں پر اس وقت بھی طاری ہوگی جب ان کے اعمال کا رجسٹر کھلے گا۔ اس وقت بھی وہ کہیں گے: "مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا" (الکہف - ۱۸: ۴۹) (عجیب ہے یہ کتاب! کوئی چھوٹا یا بڑا عمل ایسا نہیں ہے جو اس کی گرفت سے باہر رہ گیا ہو!)

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (۴-۵)

زمین ہر ایک کا ریکارڈ سنا دے گی

یعنی اس دن زمین وہ تمام نیکیاں اور بدیاں جو اس کی پشت پر کی گئی ہیں خدا کے حکم سے سنا ڈالے گی۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ تصریح ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ مجرموں کے اعضا کو ناطق بنا دے گا اور وہ ان کے خلاف گواہی دیں گے یہاں تک کہ ان کی کھالیں (بدن کے رونگٹے) بھی ان کے خلاف شہادت دیں گے۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں فرمایا ہے:

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حٰمٓ السجدۃ - ۴۱: ۲۱)

اور مجرمین اپنی کھالوں سے پوچھیں گے کہ آخر تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گی کہ جس خدا نے آج ہر چیز کو گویا کر دیا ہے اس نے ہمیں بھی گویا کر دیا۔

اس دنیا میں انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اسی زمین کے اوپر یا نیچے کرتا ہے اس وجہ سے یہ انسان کے اعمال و اقوال کی سب سے بڑی گواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جس طرح انسان کے اعضاء و جوارح اور اس کے بدن کے رونگٹیں رونگٹیں کو اس کے خلاف گواہی دینے اور اس کی زندگی کا ریکارڈ سنانے کے لیے گویا کر دے گا اسی طرح زمین کو بھی ناطق بنا دے گا کہ وہ ہر ایک کا ریکارڈ سنا دے۔

یہ اللہ کے حکم سے ہوگا

'بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا'۔ لفظ 'وحی' یہاں ایما اور اشارہ کے مفہوم میں ہے۔ اس معنی میں یہ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین ایسا اس وجہ سے کرے گی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو اس کے لیے ایما ہوگا۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی مذکورہ بالا آیت 'قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ' میں جو بات فرمائی گئی ہے وہی بات یہ ذرا مختلف اسلوب میں یہاں ارشاد ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوگا خدا کے حکم سے ہوگا اور ہر چیز خدا کے حکم کی تعمیل پر مجبور ہوگی۔ چنانچہ سورۂ انشقاق میں زمین ہی سے متعلق ارشاد ہے کہ 'وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ' (الانشقاق - ۸۴: ۵) (اور وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کے لیے یہی زیبا ہے)۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ (۶)

'اَشْتَاتًا' کے معنی متفرق، اکیلے اکیلے، تنہا تنہا کے ہیں۔ یعنی اس دن لوگ قبروں سے اس طرح نکلیں گے کہ کسی کے ساتھ نہ اس کے اہل خاندان ہوں گے، نہ اعزہ و اقربا، نہ اس کا جتھا ہوگا، نہ خدم و حشم، نہ لاؤ

جا نثار، نہ اعوان و انصار، اور نہ مزعومہ شرکاء و شفعاء بلکہ ہر ایک اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے اپنے رب کے حضور تنہا حاضر ہوگا۔ یہ مضمون قرآن کے دوسرے مقامات میں نہایت وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ مریم میں فرمایا ہے: وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا (مریم - ۱۹ : ۹۵) (اور ان میں سے ہر ایک اپنے رب کے سامنے حاضر ہوگا تنہا)۔ سورۂ انعام میں فرمایا ہے: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (الانعام - ۶ : ۹۴) (اور تم آئے ہمارے پاس تنہا تنہا جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا)۔

لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ۔ یہ اس حاضری کی غایت بیان ہوئی ہے کہ یہ اس لیے ہوگی کہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں کہ دنیا کی زندگی میں انھوں نے کیا کارگزاری انجام دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دکھا دینے سے مقصود اس کا نتیجہ یعنی اس کا مزہ چکھانا ہے یعنی فعل نتیجۂ فعل کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (۷-۸)

یہ اس اجمال کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ جس نے ذرہ کے برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ بھی اس کے سامنے آئے گی اور جس نے ذرہ کے برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اس کے سامنے آئے گی۔

نیکیوں اور بدیوں کے جانچنے کے لیے ضابطہ

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ ہر مومن و کافر کی ہر چھوٹی بڑی نیکی یا بدی اس کے سامنے آئے گی تو ضرور لیکن اس قاعدے کے مطابق آئے گی جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے دوسرے مقامات میں بیان فرمایا ہے یعنی ایک مومن یہ دیکھے گا کہ اس سے نیکیوں کے ساتھ فلاں فلاں غلطیاں بھی صادر ہوئی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی فلاں فلاں نیکیوں کو ان کا کفارہ بنا دیا ہے۔ اسی طرح ایک کافر یہ دیکھے گا کہ اس نے بدیوں کے ساتھ کچھ نیک کام بھی کیے ہیں لیکن اس کے وہ نیک کام اس کے فلاں برے اعمال و عقائد کے سبب سے حبط ہوگئے، اس وجہ سے وہ ان کے صلہ سے محروم رہا۔

اس قاعدہ پر پرکھے جانے کے بعد نجات پانے والوں اور ہلاک ہونے والوں کے لیے جو ضابطہ مقرر ہوا ہے وہ سورۂ قارعہ میں یوں بیان ہوا ہے:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝	پس جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ تو دل پسند عیش میں ہوگا اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھکانا دوزخ کا کھڈ ہوگا۔
(القارعۃ - ۱۰۱ : ۶-۹)	

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ والحمد للہ علیٰ فضلہ واحسانہ۔

لاہور

۳۱ - مارچ ۱۹۸۰ء

۱۳ - جمادی الاول ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

100

العٰدیٰت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا مضمون اور ترتیب بیان

اس سورہ میں انسان کے ناشکرے پن پر اس کو تنبیہ اور ملامت ہے۔ اس کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں وہ جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے ان وسائل و ذرائع ہی سے حاصل کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو بخشے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ جب سب کچھ خدا کی عنایت سے حاصل ہوا ہے تو اس پر خدا کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کا ادا کرنا بھی واجب ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ خدا کا کوئی حق تسلیم نہیں کرتا بلکہ علانیہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوتیں اور صلاحیتیں خود اسی کے خلاف استعمال کرتا ہے اور اس بات کی ذرا پروا نہیں کرتا کہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس دن کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی بلکہ سینوں کے راز تک بھی اگلوا لیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پورے علم کے ساتھ ہر ایک کا محاسبہ کرے گا اور ہر شخص کو جزا یا سزا دے گا۔

گویا اس سورہ کا اصل مضمون تو وہی ہے جو سابق سورہ ـــــ الزلزال ـــــ کا ہے لیکن دونوں میں یہ فرق ہے کہ اُس میں اس دن کی تصویر ہے جس دن یہ سب کچھ ہوگا اور اس سورہ میں اس کی دلیل بیان ہوئی ہے جس کی وضاحت ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

ترتیبِ بیان اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے تصرّف میں جو حیوانات دیے ہیں ان میں سے خاص طور پر جنگی گھوڑوں کی ان جاں فشانیوں، جاں بازیوں اور قربانیوں کا بطریق قسم حوالہ دیا ہے جو وہ اپنے آقا یعنی انسان کی اطاعت و خدمت کی راہ میں کرتے ہیں اور پھر انسان کی ناشکری و ناسپاسی پر اس کو ملامت کی ہے کہ آخر وہ اپنے ان غلاموں اور مملوکوں کی اس وفادارانہ روش سے یہ سبق کیوں نہیں سیکھتا کہ وہ بھی کسی مالک کا مملوک، کسی رب کا مربوب اور کسی آقا کا غلام ہے اور اس پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھی انہی کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت میں سرگرم رہے۔

آخر میں انسان کے بخل اور اس کی زرپرستی پر ملامت کی ہے کہ وہ پاتا تو سب کچھ خدا سے

ہے لیکن وہ اسی سے اپنے مال کو بچا لے اور چھپانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ کہاں اور کب تک چھپائے گا! ایک دن زمین کے سارے دفینے اور دلوں کے سارے راز آشکارا ہو کر رہیں گے! عاقل وہ ہیں جو اس دن کے لیے تیاری کریں۔

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات: ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۱ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ﴿١﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ﴿٢﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ
صُبْحًا ﴿٣﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ﴿٤﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ﴿٥﴾ اِنَّ
الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ﴿٦﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ﴿٧﴾ وَاِنَّهٗ
لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴿٨﴾ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي
الْقُبُوْرِ ﴿٩﴾ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ﴿١٠﴾ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ﴿١١﴾ ع ۸ ۲۴

ترجمۂ آیات ۱-۱۱ گواہی دیتے ہیں ہانپتے، دوڑنے والے گھوڑے، ٹاپوں کی ٹھوکر سے چنگاریاں نکالنے والے، صبح کے وقت دھاوا کرنے والے، دوڑ سے غبار اٹھانے والے اور غبار کے ساتھ غول میں گھس جانے والے۔ ۱-۵

کہ انسان اپنے رب کا نہایت ناشکرا ہے اور وہ اپنے رویہ پر خود گواہ ہے۔ اور وہ دولت کا رسیا ہے۔ ۶-۸

کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبریں اگلوائی جائیں گی اور دلوں کے بھید نکلوائے جائیں گے۔ بے شک اس دن ان کا رب ان سے اچھی طرح باخبر ہوگا۔ ۹-۱۱

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا (۱)

'عادیات' سے مراد — 'عَادِیَاتٌ' کے معنی دوڑنے والے کے ہیں لیکن یہاں یہ جنگی گھوڑوں کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ آگے چار صفتیں، جو ترتیب کے ساتھ آئی ہیں، وہ جنگی گھوڑوں کے سوا کسی اور چیز پر منطبق نہیں ہوتیں۔ بعض لوگوں نے اس سے مزدلفہ میں اونٹوں کو مراد لیا ہے لیکن اس کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ آگے کی صفتیں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اونٹوں کی نہیں ہو سکتیں۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے غازیوں کے گھوڑے مراد ہیں۔ لیکن اس تخصیص کے لیے بھی کوئی قرینہ موجود نہیں ہے، خاص طور پر مقسم علیہ سے تو یہ بات بالکل ہی بے جوڑ ہو جائے گی۔ مقسم علیہ یہاں اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (۶) (بے شک انسان اپنے رب کا نہایت ناشکرا ہے) ہے، اس مقسم علیہ کو غازیوں اور مجاہدین کے گھوڑوں کے ساتھ کیا ربط ہو سکتا ہے!

یہ قول اور اوپر مزدلفہ کے اونٹوں سے متعلق جس قول کا حوالہ گزرا ہے یہ دونوں قول اس عام وہم پر مبنی ہیں کہ جس چیز کی قسم کھائی جائے ضروری ہے کہ وہ کوئی مقدس چیز ہو۔ ہم اس وہم کی تردید اس کتاب میں جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ مقسم بہ کے لیے مقدس ہونا کوئی ضروری بات نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت رکھنے والی چیز اس کا اس دعوے پر شہادت ہونا ہے جو اس کے بعد مذکور ہوتا ہے۔ آگے ہم تفصیل سے بتائیں گے کہ گھوڑوں کی قسم کن کن پہلوؤں سے انسان کی ناشکری و ناسپاسی کی دلیل ہے۔

'ضَبْحٌ' وہ خاص آواز نکالنے کے لیے آتا ہے جو گھوڑے ہانپتے ہوئے اپنے نتھنوں سے نکالتے ہیں۔ ان کے ہانپنے کا یہ خاص انداز اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے ان کو انسان کی محکومی میں دیا ہے اس کو وہ نہایت وفاداری و جاں نثاری سے پورا کرنے والے اور انسان کی مقصد برآری میں اپنی طاقت کا آخری قطرہ بھی نچوڑ کر رکھ دینے والے ہیں۔

فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا (۲)

زبان کا ایک اسلوب — 'ف' کے ذریعہ سے جب عطف ہوتا ہے تو، جیسا کہ ہم اس کے محل میں وضاحت کر چکے ہیں، ترتیب پر بھی دلیل ہوتا ہے اور اس بات پر بھی کہ تمام صفتیں ایک ہی موصوف سے تعلق رکھنے والی ہیں۔

'مُوْرِیَاتٌ' 'اِیْرَاءٌ' سے ہے جس کے معنی چقماق یا کسی چیز سے آگ نکالنے کے ہیں۔

'قَدْحٌ' ضرب لگانے، ٹھوکر لگانے اور ایک چیز کو دوسری سے ٹکرانے کے معنی میں یہاں ہے۔

انسان کی مقصد برآری میں گھوڑوں کی سرگرمی اور آتش زیر پائی

یہ انسان کی مقصد برآری میں گھوڑوں کی سرگرمی اور آتش زیر پائی کی تعبیر ہے کہ وہ اس طرح دوڑتے ہیں کہ ان کی سموں کی ٹھوکر سے چنگاریاں جھڑتی ہیں۔ گھوڑوں کے چونکہ آہنی نعل ہوتے ہیں اس وجہ سے جب وہ دشمن پر دھاوا کرنے کے لیے پتھریلی زمینوں پر دوڑتے ہیں تو ان کی سموں کی ضرب سے چقماق کی طرح چنگاریاں نکلتی ہیں۔ گویا وہ اپنے مالکوں کی رضا جوئی میں آگ کے انگاروں پر دوڑ رہے ہیں۔

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا (۳)

یہ وہ اصل مقصد بیان ہوا ہے جس کے لیے وہ یہ جان بازی کرتے ہیں یعنی وہ دشمنوں اور حریفوں پر شب خون مارتے ہیں۔ عرب میں حریفوں پر غارت گری کا سب سے موزوں وقت صبح ہی کا سمجھا جاتا تھا اس وجہ سے یہاں 'صُبْحًا' کی قید لگی ہوئی ہے۔ ان کے ہاں غارت گری کے الارم کے طور پر 'وَاصَبَاحًا' کا جو نعرہ تھا اس میں بھی صبح کا حوالہ اسی پہلو سے ہے، یہاں تک کہ لفظ 'صَبَّحَ' عربی میں حملہ اور غارت گری کے لیے ایک معروف لفظ بن گیا۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا (۴)

'اِثَارَةٌ' کے معنی اٹھانے اور ابھارنے کے اور 'نَقْعٌ' کے معنی گرد و غبار کے ہیں۔

'بِهٖ' میں 'ب' ظرف کے مفہوم میں لیجیے اور ضمیر کا مرجع 'صُبْحًا' قرار دیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ صبح کو غارتگری کرتے ہیں تو اس وقت وہ گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھا دیتے ہیں یعنی ان کا حملہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی جانب سے ایک طوفانی آندھی آ گئی۔

اور اگر 'بِهٖ' کو اس تگاپو سے متعلق مانیے جو 'عٰدِیٰت' کے اندر مضمر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی اس تگاپو سے غبار ابھار دیتے ہیں۔

دونوں ہی شکلوں میں مقصود اس کلام سے ان کی جنگی اہمیت کا اظہار ہے، یعنی ان کا آنا نسیم صبح کا آنا نہیں بلکہ ایک آندھی کا آنا ہوتا ہے۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (۵)

'بِهٖ' میں 'ب' یہاں ملابست کے مفہوم میں اور ضمیر کا مرجع 'نَقْعًا' ہے۔ یعنی وہ اسی آندھی اور طوفان کے ساتھ دشمن کے ایک پورے غول کے اندر گھس جاتے ہیں اور اس کے نیزوں اور تلواروں کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ انھیں اپنی جانوں سے زیادہ اپنے مالکوں کا مقصد عزیز ہوتا ہے۔ اس کی خاطر وہ ہر خطرے سے بے خوف ہو کر اقدام کرتے ہیں اور یہی ان کے شایان شان ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (۶)

اصل دعویٰ

یہ وہ اصل بات ہے جس پر شہادت کے لیے اوپر کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔

'کَنُوْدٌ' کے معنی ہیں ناشکرا، ناسپاس، تنہا خور، اپنے مالک کی عنایتوں کا ناقدرا۔

مطلب یہ ہے کہ جو انسان گھوڑوں کی یہ ساری جاں نثاریاں دیکھتا ہے اور ان کی قربانیوں سے بہرہ مند ہوتا ہے لیکن اسے یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ بھی اپنے رب کا غلام ہے اور اس پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھی انہی کی طرح اپنے رب کی اطاعت میں سرگرم و سینہ سپر رہے، وہ نہایت ناشکرا اور لئیم ہے۔ کیونکہ وہ جانور ہو کر اپنے مالک کا حق پہچانتے ہیں اور یہ انسان ہو کر اپنے خداوند کا حق نہیں پہچانتا۔

گھوڑوں کے خاص طور پر ذکر کی وجہ

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ گھوڑوں کا ذکر بطور مثال ہے۔ یہی وفاداری و جاں نثاری ان تمام حیوانات میں پائی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مسخر کیے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے جگہ جگہ ان کا بھی ذکر کر کے انسان کی حسِ شکر کو ابھارا ہے۔ خاص طور پر اونٹ کی صلاحیتوں اور خدمتوں کا ذکر تو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے۔ اس کی خدمت، اس کی جفاکشی اور اس کے صبر سے انسان کو سبق لینے کی دعوت دی گئی ہے کہ جس طرح وہ اپنے آقا کی تابعداری کرتا ہے اسی طرح انسان کا فرض ہے کہ اپنے اس آقا کی تابعداری کرے جس نے اونٹ جیسے عظیم اور کثیر المنافع جانور کو اس کی تابعداری میں دے دیا ہے۔

گھوڑوں کے خصوصیت سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ جنگ اور دفاع کے لیے خاص طور پر اُس دور میں، بڑی اہمیت رکھتے تھے جب ہر خاندان اور قبیلہ کی حفاظت کی ذمہ داری خود خاندان و قبیلہ پر عائد ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ہر شخص کو اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے لیے اصیل جنگی گھوڑے رکھنے پڑتے تھے اور ان گھوڑوں کی ان کے ہاں بڑی عظمت و اہمیت تھی۔ یہ گھوڑے عربی شاعری کا خاص موضوع ہیں۔ یہاں اشعار نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے محض ان کے ذوق کا اندازہ کرنے کے لیے کسی حماسی کا ایک شعر نقل کرتا ہوں جو بالکل بروقت زبانِ قلم پر آگیا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

وفی فرس نهد عتیق جعلته حجابا لبیتی ثم اخدمته عبدا

(اور میں اپنا مال ایک جوان اور اصیل گھوڑے کے لیے خرچ کرتا ہوں جس کو میں نے اپنے گھر کا پاسبان بنایا ہے اور پھر میں نے اس کی خدمت کے لیے ایک غلام رکھ چھوڑا ہے)

انسان کے لیے خاص درس

گھوڑوں کی یہ قدر و قیمت، ظاہر ہے کہ، ان کی خدمات اور جاں بازیوں کی بنا پر ہے جو وہ انسان کی انجام دیتے ہیں۔ اگر یہ خدمتیں وہ انجام نہ دیتے تو انسان نہ ان پر اپنا مال خرچ کرتا اور نہ اپنے قصیدوں میں ان کی مدح سرائی کرتا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان اس حقیقت سے

ناواقف نہیں ہے کہ غلام کی قدر و قیمت کا انحصار اس کی خدمات پر ہے لیکن خود اپنے معاملے میں وہ اس حقیقت کو فراموش کر جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ جس رب کا غلام ہے حکم تو اس کا ایک نہ مانے لیکن انعام دنیا اور آخرت دونوں میں سب سے بڑھ کر پائے۔

انسان کی ناشکری کا ایک اور پہلو بھی قابلِ توجہ ہے کہ انسان نہ گھوڑوں ہی کا خالق ہے اور نہ ان چیزوں ہی کا خالق ہے جن پر ان کی پرورش کا انحصار ہے تاہم وہ نہایت بے جگری سے انسان کی خدمت محض اس وجہ سے کرتے ہیں کہ خدا نے ان کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے۔ اس کے برعکس انسان کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا بھی خالق ہے اور اس کے کام آنے والے تمام جانوروں اور معاش و معیشت کے جملہ اسباب و وسائل کا بھی لیکن وہ خدا کی بندگی کے حقوق و فرائض سے بے پروا ہے۔

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ (۷)

انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے

فرمایا کہ اس کے اس ناشکرے پن پر کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو خود اس پر سب سے بڑا گواہ ہے۔ یہ فقرہ اسی طرح کا ہے جس طرح سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے 'بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ' (القيٰمة - ۷۵ : ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

جو باتیں انسان کی فطرت کے بدیہی مقتضیات میں سے ہیں وہ دلیل کی محتاج نہیں ہوتیں۔ ان کے حق میں سب سے بڑی گواہی خود انسان کی فطرت اور اس کے ضمیر کے اندر موجود ہوتی ہے۔ انسان اگر ان سے گریز اختیار کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ ان کے حق میں اس کو کوئی دلیل نہیں ملی بلکہ ان کو وہ اپنے نفس کی سفلی خواہشوں کے خلاف پاتا ہے اس وجہ سے ان سے گریز کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے۔ ورنہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ خود تو صرف انہی گھوڑوں کی قدر کرتا ہے جو اس کی کوئی قابلِ قدر خدمت انجام دیتے ہیں لیکن اپنے مالک اور رب کے متعلق یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کے ہاں نیکوکار اور بدکار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس نے ان کے ساتھ جو معاملہ اس دنیا میں کیا ہے اس سے بہتر معاملہ آخرت میں کرے گا، خواہ اس کے ایک حکم کی بھی وہ تعمیل نہ کرے بلکہ ساری زندگی اپنے نفس کی غلامی میں گزارے۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۸)

کردار کی گواہی

یہ اس کے ناشکرے پن پر اس کے کردار سے دلیل پیش کی ہے کہ وہ مال کی محبت میں غرق ہے۔ وہ اپنے گھوڑوں کو تو دیکھتا ہے کہ وہ جان کی بازی لگا کر اور نیزوں کے مقابل میں سینہ سپر ہو کر جو کچھ حاصل کرتے ہیں سب مالک کے حوالے کرتے ہیں، اپنے کسی حق کا مطالبہ نہیں کرتے'

مالک جو کچھ ان کے آگے ڈال دیتا ہے اس پر قانع رہتے ہیں لیکن اس کا حال یہ ہے کہ یہ جو کچھ اپنے رب کی بخشش و عنایات سے پاتا ہے اس کو اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ سمجھتا ہے اور اس پر مارِ گنج بن کر بیٹھ رہتا ہے، اس میں مالک کا کوئی حق تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتا اور اگر کوئی اس کے لیے اس کو یاد دہانی کرے تو اس کو جواب دیتا ہے کہ اس کے مال کو خدا سے کیا تعلق۔ یہ تو اس نے اپنی محنت و قابلیت سے حاصل کیا ہے۔ 'اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ' (القصص - ۲۸: ۷۸) (یہ تو مجھے اس علم کی بدولت ملا ہے جو میرے اپنے پاس ہے)۔

لفظ 'خَيْر' یہاں مال کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ عربی میں معروف ہے اور قرآن میں بھی یہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ محبت کی اصل حق دار وہ ذات ہے جو انسان کی خالق و مالک ہے اور جس کے فضل سے انسان کو وہ سب کچھ ملتا ہے جو اس دنیا میں وہ پاتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے سچے اہلِ ایمان کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی مرحلہ ایسا آتا ہے جس میں ان کے نفس اور ان کے رب کے مطالبات میں تصادم ہوتا ہے تو وہ اپنے رب کی محبت میں مضبوط ثابت ہوتے ہیں اور نفس کے مطالبے کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ 'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ' (البقرۃ - ۲: ۱۶۵) (اور جو اہلِ ایمان ہوتے ہیں وہ سب سے زیادہ سخت اللہ کی محبت میں ہوتے ہیں)۔ اس کے برعکس حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو ناشکرے اور ناسپاس ہوتے ہیں، وہ اپنے رب سے زیادہ اپنے مال کے پرستار ہوتے ہیں۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ (۹ - ۱۰)

زر پرست ناشکروں کو تنبیہ

یہ ناشکرے اور زر پرست انسانوں کو تنبیہ ہے کہ کیا وہ اس دن کو نہیں جانتے جب وہ سب کچھ جو قبروں میں ہے اگلوا لیا جائے گا اور جو کچھ لوگوں کے سینوں میں ہے وہ نکلوا لیا جائے گا۔ قبروں کے اندر سے مردوں کو نکلوانا تو بالکل واضح ہے لیکن یہاں یہ بات زر پرستوں کو تنبیہ کے سیاق میں فرمائی گئی ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ اس سے وہ دفینے بھی مراد ہیں جو بخیل مال دار، خدا اور اس کے بندوں کے حقوق مار کر، زمینوں میں دفن کر کے چھوڑتے ہیں۔ 'بُعْثِرَ' کے معنی ہیں کسی جمع کی ہوئی چیز کو جائزہ لینے کے لیے پراگندہ اور متفرق کر دینا۔ یعنی اس دن کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی بلکہ ہر چیز سب کے سامنے آ جائے گی۔

اعمال کے ریکارڈ کے ساتھ محرکاتِ اعمال کا ریکارڈ بھی خدا کے سامنے ہوگا

'وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ' یعنی دفینوں کی طرح سینوں کے سارے راز بھی اکٹھے کر لیے جائیں گے تاکہ ہر شخص پر حجت قائم کی جا سکے کہ کس نے کون سا عمل کس محرک کے تحت کیا ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ کوئی شخص کتنا ہی غلط کام کرے لیکن وہ اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے کوئی اچھا محرک تلاش کرنے کی ضرور کوشش کرتا ہے تاکہ اپنے ضمیر کو بھی چپ کر سکے اور دوسروں کی

تنقید و تحقیر سے بھی اپنے کو بچا سکے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو اپنے کو مذہبی روپ میں پیش کرتے یا قیادت کے مقام پر فائز ہوتے یا ہونے کے متمنی ہوتے ہیں وہ تو اس کے بغیر کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔ وہ اپنے باطن کو خلق کی نگاہوں سے چھپائے رکھنے کے لیے اس طرح کا کوئی لبادہ ضرور ایجاد کر لیتے ہیں۔ اس قسم کے شاطروں کو اس آیت میں متنبہ فرمایا گیا ہے کہ اس دن ان کے اعمال کے ریکارڈ کے ساتھ ساتھ ان کے محرکات کا سارا ریکارڈ بھی ان کے اور ان کے رب کے سامنے ہوگا۔

سابق سورہ ـــــ الزلزال ـــــ کی آخری آیات کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے تاکہ اس کے سارے پہلو واضح ہو جائیں۔

إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ (۱۱)

یہ بات اوپر والی تنبیہ ہی کو مؤکد کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے اعمال اور ان کے محرکات سے اچھی طرح باخبر تو آج بھی ہے لیکن آج ہر چیز کو آشکارا کرنا اس کی حکمت کے خلاف ہے البتہ وہ دن اسی لیے ہوگا کہ سارا ریکارڈ ہر شخص کے سامنے رکھ دیا جائے۔ چنانچہ جب وہ رکھ دیا جائے گا تو دوسرے بھی جان لیں گے کہ ان کا رب ان کے ظاہر و باطن دونوں سے کتنا آگاہ ہے۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ فضلہ واحسانہ۔

لاہور
۷- اپریل ۱۹۸۰ء
۲۰- جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۰۱

القارعة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا مضمون اور ترتیب بیان

اس سورہ میں یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ جس قیامت سے ڈرایا جا رہا ہے اس وقت اگرچہ کسی کو نہیں معلوم لیکن اس کا آنا یقینی ہے جس طرح کوئی اچانک آکر دروازے پر دستک دیتا ہے اسی طرح وہ اچانک آدھمکے گی۔ دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا کھٹکا ہر وقت لگا رہے۔ اس دن کسی کے پاس کوئی قوت و جمعیت نہیں ہوگی۔ لوگ قبروں سے اس طرح پراگندہ نکلیں گے جس طرح برسات میں پتنگے نکلتے ہیں۔ ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ کوئی بھی کسی دوسرے کی مدد کر سکنے کی پوزیشن میں نہ ہوگا۔ اس دن قلعے، مورچے، حصار تو درکنار پہاڑوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ دھنکی ہوئی اُون کی مانند ہو جائیں گے۔ اس دن صرف نیک عمل ہی کام آنے والا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی میزانِ عدل قائم کرے گا۔ جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ جنت کے عیش جاوداں میں ہوگا اور جس کی بدیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ دوزخ کے کھڈ میں بھڑکتی آگ کے اندر پھینک دیا جائے گا۔

سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ

مَكِّيَّةٌ ——— آیات : ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۱۱ اَلْقَارِعَةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الْقَارِعَةُ ۚ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ؕ﴿۳﴾
يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ﴿۴﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ
كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ؕ﴿۵﴾ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۶﴾ فَهُوَ فِيْ
عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ
ع ۱ ۲۶ هَاوِيَةٌ ؕ﴿۹﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ؕ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۱

کھٹکھٹانے والی!

کیا ہے کھٹکھٹانے والی!

اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے کھٹکھٹانے والی! ۱-۳

اس دن لوگ منتشر پتنگوں کے مانند ہوں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کے مانند ہو جائیں گے۔ ۴-۵

تو جس کے پلّے بھاری ہوں گے وہ تو دل پسند عیش میں ہوگا۔ اور جن کے پلّے ہلکے ہوئے تو اس کا ٹھکانا کھڈ ہوگا۔ اور تم کیا سمجھے کہ وہ کیا ہے! دہکتی آگ! ۶-۱۱

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْقَارِعَۃُ (۱)

القارعۃ' ہر ایک خاص تنبیہ مضمر ہے

یہ قیامت کے مختلف ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس کے معنی ہیں ٹھونکنے والی، کھٹکھٹانے والی۔ 'قَرَعَ الْبَابَ' کے معنی ہیں اس نے دروازہ کو ٹھونکا یا کھٹکھٹایا۔ اس نام سے قیامت کے اس خاص پہلو کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جس طرح کوئی رات میں آنے والا دروازے کو ٹھونکتا اور گھر کے تمام سونے والوں کو دفعتہً ہڑبڑا دیتا ہے، وہی حال قیامت کا بھی ہوگا۔ اس کا وقت کسی کو نہیں معلوم کہ کب آدھمکے۔ اس کا ظہور اچانک ہوگا اور وہ بالکل دفعتہً سارے عالم میں ایک ہلچل برپا کر دے گی۔ اس کے اسی نام کے اندر یہ تنبیہ بھی مضمر ہے کہ جب یہ اس کائنات کی سب سے بڑی ہلچل ہے اور اس کا وقت کسی کو نہیں معلوم ہے تو سلامتی اسی میں ہے کہ اس کا کھٹکا ہر وقت لگا رہے۔

یہ اسلوب بیان جو یہاں اختیار فرمایا گیا ہے ایک الارم کی نوعیت کا ہے تاکہ تمام کان رکھنے والے اس ہتدار کی خبر سننے کے لیے تیار ہو جائیں۔ گویا قیامت جس نوعیت کی ہڑبڑاہٹ اس دنیا میں پیدا کرے گی اسی نوعیت کی ہڑبڑاہٹ یہاں اس کا نام پیدا کر رہا ہے۔ سورۂ حاقہ میں بھی یہی اسلوب کلام اختیار کیا گیا ہے اور اس کی بقدر ضرورت وضاحت ہم کر چکے ہیں[۱]۔

مَا الْقَارِعَۃُ (۲)

اس سوال نے اس الارم کی سنگینی میں مزید اضافہ کر دیا کہ جو لوگ اس کو کوئی معمولی بات سمجھ کر اس سے بے پروا ہیں وہ چونکتے ہوں اور کان کھول کر اس کا حال سن لیں اور اس کے لیے جس تیاری کی ضرورت ہے اس کی فکر کریں۔

وَمَآ اَدْرٰىکَ مَا الْقَارِعَۃُ (۳)

لوگوں کی غفلت پر سرزنش

اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس میں سوال کے ساتھ ساتھ مخاطب کی غفلت، بلادت اور ناعاقبت بینی پر افسوس اور حسرت کا اظہار بھی ہے کہ تم کیا جانو یا کیا سمجھے کہ وہ اچانک

---

[۱] ملاحظہ ہو تدبر قرآن جلد ہشتم۔ صفحات ۵۴۱-۵۴۲

ٹوٹ پڑنے والی آفت کیا ہے اور ان لوگوں پر کیا گزرے گی جو بار بار کی تنبیہ و تذکیر کے باوجود اس کا مذاق اڑائے جا رہے ہیں۔

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ (۴)

اس دن کوئی کسی کا ساتھ نہیں دے گا

اس دن جس صورتِ حال سے سابقہ پیش آئے گا یہ اس کا بیان ہے کہ اس دن لوگ پراگندہ پتنگوں کے مانند ہوں گے۔ نہ کسی کے ساتھ اس دن اس کا خاندان و قبیلہ ہوگا، نہ کسی کی کوئی جماعت و جمعیت ہوگی اور نہ وہ شرکاء و شفعاء ہی ہوں گے جن کے اعتماد پر لوگ نچنت ہیں۔ بلکہ لوگ قبروں سے متفرق نکلیں گے اور ہر ایک کو سابقہ صرف اپنے اعمال سے پیش آئے گا۔ سورۂ زلزال میں فرمایا ہے:

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ○ (الزلزال - ۹۹ : ۶)

اس دن لوگ قبروں سے متفرق ہو کر نکلیں گے تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں۔

سورۂ مومنون میں فرمایا ہے:

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ ○ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ○ (المومنون - ۲۳ : ۱۰۱-۱۰۳)

پس جب صور پھونکا جائے گا تو ان کے آپس کے نسبی رشتے اس دن ختم ہو جائیں گے اور وہ ایک دوسرے سے مدد کے طالب نہ ہو سکیں گے۔ پس جن کے نیکیوں کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا، وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں پڑے۔

اس دن ہر شخص پر نفسی نفسی کی جو حالت طاری ہوگی اس کی تصویر سورۂ معارج میں یوں کھینچی گئی ہے:

وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ○ يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ○ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ○ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ○ وَمَن فِي الْأَرْضِ

اور اس دن کوئی دوست اپنے دوست کو نہ پوچھے گا باوجودیکہ وہ ان کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ کاش! وہ اپنے بیٹوں، اپنی بیوی اور اپنے بھائی اور اس خاندان کو، جو اس کو پناہ دیتا،

ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۙ (المعارج ۷۰: ۱۱-۱۴)
ہے، فدیہ میں دے کر اس دن کے عذاب سے اپنے کو چھڑا لے جائے۔

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ (۵)

اس دن سارے استحکامات ٹوٹ پھوٹ جائیں گے

یعنی خاندانوں اور قبیلوں کی عصبیتوں کی طرح اس دن قلعوں، گڑھیوں اور عمارتوں کے سارے استحکامات بھی درہم برہم ہو کر رہ جائیں گے۔ اس دن پہاڑوں تک کا یہ حال ہوگا کہ وہ دھنکی ہوئی اون کے مانند ہو جائیں گے۔ یعنی جس طرح دھنکی ہوئی اون کا ریشہ ریشہ الگ ہو جاتا ہے اسی طرح پہاڑوں کا ذرہ ذرہ بھی پراگندہ ہو جائے گا۔

پہاڑوں کا ذکر خاص طور پر اس وجہ سے ہوا کہ قیامت کے منکرین پہاڑوں کو غیر فانی خیال کر کے بطور استہزاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے تھے کہ کیا جب قیامت آئے گی تو وہ پہاڑوں کو بھی اکھاڑ پھینکے گی؟ ان کے اس سوال کا حوالہ اور اس کا جواب قرآن مجید میں مذکور ہے۔

'عِهْن' اس اون کو کہتے ہیں جو دھنک کر اور رنگ کر کاتنے کے لیے تیار کی جا چکی ہو۔ اس طرح کی اون کا ریشہ ریشہ الگ ہوتا ہے اس وجہ سے یہاں اس کی تشبیہ استعمال ہوئی ہے۔ تشبیہ میں اصل مقصود اون کی پراگندگی کو نمایاں کرنا ہے نہ کہ اس کے رنگ کو۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۶-۷)

اس دن صرف نیک اعمال کام آئیں گے

اس دن واحد کام آنے والی چیز آدمی کے نیک اعمال ہوں گے۔ ہر شخص کے اعمال تولے جائیں گے۔ جس کی میزان بھاری ہوگی وہ تو فلاح پائے گا اور جس کی میزان ہلکی رہ جائے گی وہ نامراد ہوگا۔ اس دن جو میزان نصب ہوگی وہ خاص میزان ہوگی جو لوگوں کے اعمال ہی کے تولنے کے لیے نصب کی جائے گی۔ سورۂ انبیاء میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (الانبیاء ۲۱: ۴۷)
اور ہم قیامت کے دن کے لیے خاص میزانِ عدل مقرر کریں گے۔

اس دن اور اس میزان کا خاص وصف سورۂ اعراف میں یہ بیان ہوا ہے کہ اس دن وزن صرف حق کے اندر ہوگا، باطل کے اندر سرے سے کوئی وزن ہی نہیں ہوگا۔ یہ میزان ہر شخص کے عمل کو تول کر بتا دے گی کہ کس کا عمل حق اور وزن دار ہے اور کس کے اعمال بالکل باطل اور پھوک ہیں۔ فرمایا ہے:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۨالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ
اس دن وزن صرف حق کا ہوگا تو جن کے پلڑے بھاری ہوئے وہ تو فلاح پانے والے ہوں گے۔

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ه وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ه (الاعراف - ۷: ۸-۹)

اور جن کے پلڑے ہلکے رہے وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا بوجہ اس کے کہ وہ ہماری آیات کی ناقدری کر کے اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔

'فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ' یہاں 'مَنْ' کے لحاظ سے ضمیر اگرچہ واحد ہے لیکن اس سے مراد جیسا کہ اوپر سورۂ اعراف کی آیات میں شہادت موجود ہے، جمع بھی لے سکتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ پسندیدہ عیش میں ہوں گے۔ یعنی جو کچھ یہ چاہیں گے وہ بھی انھیں ملے گا اور ان کا رب ان کو وہ کچھ بھی دے گا جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے ہوں گے۔

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۗ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۗ نَارٌ حَامِيَةٌ (۸-۱۱)

یہ ان لوگوں کا حشر بیان ہو رہا ہے جن کے پاس صرف باطل ہی باطل ہو گا۔ حق ان کے پاس ہو ہی گا نہیں یا ہو گا تو ان کے عقیدے اور ان کی نیت نے اس کو بھی بالکل بے وزن کر دیا ہو گا۔ فرمایا کہ ان کا ٹھکانا کھڈ ہو گا۔ اس کھڈ کی وضاحت آگے فرما دی کہ 'نَارٌ حَامِيَةٌ' وہ دوزخ کا کھڈ ہو گا جس میں آگ بھڑک رہی ہو گی۔

'اُمّ' کے معنی ماں کے ہیں لیکن یہاں یہ ملجا اور ٹھکانے کے معنی میں ہے اور نہایت بلاغت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

'مَا هِيَهْ' میں 'ہ' سکتہ کی ہے جو قافیہ کی رعایت سے آئی ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمدًا کثیرًا۔

لاہور

۱۰- اپریل ۱۹۸۰ء

۲۴ جمادی الاول ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۰۲

التّکاثر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور ترتیب بیان

یہ سورہ سابق سورہ ـــــــ القارعۃ ـــــــ کی مثنیٰ ہے۔ دونوں کے مضمون میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ سابق سورہ میں بتایا ہے کہ آخرت میں کام آنے والی چیز وہ نیکیاں ہیں جو اس دنیا میں کر لی جائیں۔ خدا کی میزان میں انہی کے اندر وزن ہوگا۔ جس نے ان کا ذخیرہ جمع کر لیا وہ فلاح پائے گا اور جو ان سے محروم رہا اس نے، خواہ کتنا ہی خزانہ اکٹھا کر لیا ہو، اس کی میزان بالکل بے وزن رہے گی۔ حسرت و اندوہ کے سوا اس کے حصہ میں کچھ نہیں آئے گا۔

اب اس سورہ میں ان لوگوں کو متنبہ فرمایا ہے جنھوں نے ساری عمر اس جدوجہد میں کھپا دی کہ مال و دولت کے اعتبار سے وہ دوسروں سے آگے نکل جائیں، ان کا بنک بیلنس سب سے زیادہ ہو جائے، کاروباری میدان میں کوئی ان کا حریف نہ رہے۔ معیارِ زندگی کی مسابقت میں وہ سب کو پیچھے چھوڑ جائیں۔ بس اسی تگ و دو میں ان کی ساری زندگی ختم ہو گئی اور اس امر پر غور کرنے کی انھیں کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ آگے ایک یقینی مرحلہ حساب کتاب اور جزا و سزا کا بھی آنے والا ہے جس سے بے پروا ہو کر زندگی گزارنے والوں کو جہنم سے سابقہ پیش آئے گا اور اس دن ہر ایک سے یہ پرسش بھی ہونی ہے کہ اس نے دنیا میں جو کچھ حاصل کیا کس راہ سے حاصل کیا اور اس کو کس راہ میں صرف کیا اور اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں اور صلاحیتیں اور جو نعمتیں اس کو بخشیں ان کا کتنا حصہ اس نے بخشنے والے کی خوشنودی کے لیے استعمال کیا اور کتنا اپنے نفس اور شیطان کی خوشنودی کے لیے۔

سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ

مَكِّيَّةٌ ——— آیات: ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۸ اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲ كَلَّا سَوْفَ
تَعْلَمُوْنَ ۝۳ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۴ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ
عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝۵ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝۶ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ
الْيَقِيْنِ ۝۷ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝۸ ع ۸ ۴۷

ترجمۂ آیات ۱-۸ تم کو طلبِ مال کی مسابقت نے غفلت میں ڈالے رکھا یہاں تک کہ قبروں میں جا پہنچے۔ ہرگز نہیں، تم آگے جانو گے! ہاں، ہرگز نہیں، تم آگے جان لوگے! ۱-۴

ہرگز نہیں، اگر تم یقین کے ساتھ جانتے کہ دوزخ سے ضرور دوچار ہوگے، پھر تم اس کو یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے، پھر تم سے اس دن نعمتوں کے باب میں پرسش ہونی ہے تو........ ۵-۸

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (۱)

'اِلْهَاءٌ' کے معنی غافل اور مبتلائے فریب رکھنے کے ہیں۔

'تَكَاثُرٌ' کے معنی ہیں مال و اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی تگ و دو۔

عرب جاہلیت میں حفاظت و مدافعت کی ذمہ داری چونکہ خاندان اور قبیلہ ہی پر ہوتی تھی اس وجہ سے قبیلہ میں سرداری کا مقام اسی خاندان کو حاصل ہوتا جس کے افراد زیادہ ہوں۔ اس چیز نے قدرتی طور پر ان کے ہاں مال کے تکاثر کے ساتھ ساتھ اولاد کے تکاثر کے جذبہ کو بھی بہت قوی کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے لٹریچر پر جن کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جس طرح وہ اپنے مال کی کثرت پر فخر کرتے اسی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اولاد کی کثرت پر بھی فخر کرتے۔ اب موجودہ دور میں اجتماعی زندگی کے بدلے ہوئے نظام اور خاص طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے تصور نے اولاد کی کثرت کے رجحان کو دبا کر اس کی جگہ معیارِ زندگی کے رجحان کو غالب کر دیا ہے۔ اس دور کی عام بیماری یہی ہے۔ مشکل ہی سے اس زمانے میں کوئی شخص اس وبا کے اثر سے محفوظ ملے گا۔ ہر شخص رات دن معیارِ زندگی اونچا کرنے کی دھن میں ہے اور چونکہ اس کی کوئی حد معیّن نہیں ہے اس وجہ سے جو اس میدان میں گامزن ہیں ان کو اپنا ہر قدم پہلا قدم معلوم ہوتا ہے، آخری منزل نگاہوں سے اوجھل ہے، کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے، کب آئے گی اور کبھی آئے گی بھی یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ معیارِ زندگی کی بلندی کا سارا انحصار مال پر ہے تو جب معیار کی کوئی حد معیّن نہیں ہے تو مال کی حرص میں بھی کسی کمی کا امکان نہیں ہے۔ چنانچہ جس رفتار سے زندگی کا معیار اونچا ہو رہا ہے اس سے زیادہ شدت کے ساتھ مال کی ترنس بڑھتی جا رہی ہے۔ یہی چیز ہے جس کو قرآن نے 'تکاثر' سے تعبیر کیا ہے اور اس کا اثر یہ بتایا ہے کہ اس نے ہر شخص کو اس طرح اپنے دامِ فریب میں گرفتار کر لیا ہے کہ اسی میں عمر بیت جاتی ہے اور کسی کو اس سوال پر غور کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے یا نہیں اور ہے تو اس کے لیے بھی کچھ کرنا ہے یا نہیں۔

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۲)

یعنی اسی تگ و دو میں زندگی گزر رہی ہے یہاں تک کہ عمر تمام ہو جاتی ہے اور قبروں میں جا پہنچے ہو۔ لفظ 'زُرْتُمْ' عربی میں بالکل سادہ معنوں میں آتا ہے۔ اردو کے لفظ 'زیارت' کی طرح اس کے اندر

کسی شرف و تقدس کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ 'زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ' کے معنی بس یہ ہوں گے کہ تم نے قبروں کو دیکھا یعنی ان کے حوالے ہوئے۔ کسی حماسی کا شعر ہے:

اذا زرت ارضا بعد طول اجتنابها فقدت صديقى والبلاد كما هيا

(جب میں کسی سرزمین کو، عرصہ تک اس سے جدا رہنے کے بعد، دیکھتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ احباب تو زمین نے سارے کھو دیے لیکن زمین اسی طرح ہے جس طرح تھی)

سرگشتگانِ دنیا کی حالت پر اظہارِ افسوس

اگرچہ عربوں میں یہ روایت بھی رہی ہے کہ اپنے قبیلہ کے ناموروں اور مقتولوں کی قبروں کا شمار رکھتے اور مفاخرت کی مجلسوں میں ان کا ذکر بھی کرتے لیکن یہ چیز یہاں مراد نہیں ہے اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے کہ اس کا یوں ذکر آئے۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلوب 'حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ' کا کیوں اختیار کیا گیا، سیدھے لفظوں میں یوں کیوں نہیں کہا گیا کہ 'یہاں تک کہ تمہاری موت آگئی'، یا یہاں تک کہ تم نے جان، جان آفریں کے حوالہ کی۔ اس کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اول تو قافیہ کی رعایت یہ اسلوب اختیار کرنے کی مقتضی ہوئی دوسرے اس سے سرگشتگانِ دنیا کی محرومی و بے نصیبی پر اظہارِ افسوس کا مضمون آیت میں پیدا ہو گیا۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ اسی تکاثر کی بھاگ دوڑ میں لگے رہے یہاں تک کہ قبروں سے دوچار ہوئے یا قبرستانوں میں جا پڑے۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ (۳-۴)

یہ ان غفلت کے ماتوں کو تنبیہ اور نہایت زوردار و مؤثر تنبیہ ہے کہ سب کچھ سمجھا دینے کے بعد بھی اگر تم آنکھیں کھولنے کے لیے تیار نہیں ہو تو سن رکھو کہ زندگی یہی نہیں ہے جو تمہیں نظر آرہی ہے اور جس کے عشق نے تمہیں فریب میں مبتلا کر رکھا ہے بلکہ اس کا اصل چہرہ تمہاری نظروں سے اوجھل ہے جس کو تم جلد دیکھو گے اور پھر سن لو کہ اس کو تم عنقریب دیکھو گے!!

یہ تاکید در تاکید انذار کو مؤثر بنانے کے لیے بھی ہے اور اس حقیقت کے اظہار کے لیے بھی کہ جس قوم کو اللہ کا رسول انذار کرتا ہے وہ اس کی تکذیب کے نتیجہ میں اس دنیا میں بھی گرفتارِ عذاب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی اس کے آگے وہ سب کچھ آئے گا جس سے رسول نے آگاہ کیا۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو اس دنیا میں بھی دیکھو گے اور آخرت میں بھی دیکھو گے اور اس میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ تمہارے لیے عدالت قائم ہو چکی ہے اور فیصلہ ہوا ہی چاہتا ہے۔ لفظ 'تَعْلَمُونَ' کے ابہام کے اندر جو وعید مضمر ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۝ ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (۵-۸)

غفلت کا اصل سبب

یہ ان غافلوں کی اس غفلت کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ تمہاری یہ حالت اس وجہ

سے ہے کہ تم کو یہ یقین نہیں آ رہا ہے کہ فی الواقع ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس دن جہنم کو یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے، پھر تم سے ان تمام نعمتوں کی بابت پرسش ہونی ہے جو تمھارے رب نے تم کو بخشیں لیکن تم نے ان کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کیا۔ اگر ان باتوں کا یقین ہوتا تو تم اپنی زندگیاں اس طرح دنیا کے پیچھے نہ گزارتے بلکہ لمحہ لمحہ اس آنے والے دن کی تیاریوں میں صرف کرتے۔

کلام کی تالیف

کلام کی تالیف پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں 'لَوْ' کا جواب محذوف ہے۔ جواب کو محذوف تو سب مانتے ہیں لیکن 'لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ' اور بعد کی آیات کو 'لَوْ' کے تحت نہیں مانتے لیکن میرے نزدیک یہ تینوں آیتیں 'لَوْ' کے تحت ہی ہیں۔ یعنی اگر تم یہ باتیں یقین کے ساتھ جانتے ہوتے تو اپنے آپ کو اس طرح نہ کھو بیٹھتے۔

'لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ' سے کلام کا پھر آغاز نہیں ہو رہا ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے خیال کیا ہے، بلکہ یہ 'لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ' کے مفعول کے محل میں ہے یعنی اگر تم یقین کے ساتھ جانتے کہ جہنم کو لازماً دیکھو گے۔ 'لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ' پر 'لَ' اس یقین کی تعبیر کے لیے ہے جس کا ہونا مطلوب ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ علم الیقین جو ان باتوں کو ماننے کے لیے مطلوب ہے اس کے وسائل اللہ تعالیٰ نے آفاق و انفس کے شواہد اور قرآن کی آیات بینات میں رکھ دیے ہیں۔ اس وجہ سے ہر عاقل مکلف ہے کہ ان کو سمجھے اور مانے۔ جو ان سے گریز کرتا ہے، خواہ سمجھنے سے گریز کرتا ہے یا اس کے قبول کرنے سے وہ اپنی بدبختی کا ذمہ دار خود ہے۔ عند اللہ وہ اپنے اس گریز کی سزا بھگتے گا۔

اس دنیا میں صرف علم الیقین حاصل ہو سکتا ہے

اس سے یہ بات بھی نکلی کہ ایک عاقل کو اس دنیا میں غیب کے حقائق کا علم الیقین تو حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ علم الیقین دلائل سے حاصل ہوتا ہے جو آفاق و انفس اور قرآن میں بیان کر دیے گئے ہیں لیکن عین الیقین کا درجہ اس کو آخرت ہی میں حاصل ہوگا اس لیے کہ اس کا تعلق معائنہ و مشاہدہ سے ہے۔ جن لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ چیز اس دنیا میں بھی حاصل ہوتی ہے ان کا دعویٰ ہمارے نزدیک بے بنیاد ہے۔ اس دنیا میں عین الیقین نہیں حاصل ہوتا بلکہ اس بات کا علم الیقین حاصل ہوتا ہے کہ قرآن جو کچھ ہمیں بتا رہا ہے وہ ایک دن ہم آنکھوں سے بھی دیکھیں گے۔ عین الیقین اس دن حاصل ہوگا جس دن تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں گے۔

نعمتوں کا حق

'ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ' یہ بات بھی 'لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ' کے تحت ہی ہے یعنی اگر تمھیں اس بات کا علم ہوتا کہ اس دن تم سے تمام نعمتوں کی پرسش ہونی ہے۔ پرسش سے مراد، ظاہر ہے کہ، وہ سزا ہے جو ان کی ناشکری، ناقدری اور ان کے سوء استعمال کے نتیجہ میں بھگتنی پڑے گی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جتنی قوتیں و صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اور جو وسائل و ذرائع بھی بخشے

ہیں وہ سب 'نعیم' میں داخل ہیں۔ ان کا فطری حق یہ ہے کہ ان کے لیے خدا کا شکر گزار رہا جائے اور ان کو اس کے مقرر کردہ حدود کے اندر ان کاموں میں استعمال کیا جائے جن کے لیے وہ عطا ہوئے ہیں۔ کوئی نعمت اگر ضائع کی گئی یا وہ خالق کی پسند کے خلاف استعمال ہوئی تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی سزا دے۔ انسان کے کان، آنکھ، دل، دماغ اور تمام اعضاء و جوارح نعمت ہیں، اسی طرح اس کو جو ظاہری و باطنی قوتیں اور صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں وہ بھی نعمت ہیں، علیٰ ہذا القیاس اس دنیا میں زندگی کے جو اسباب و وسائل اس کو عطا ہوتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمت ہیں۔ ان کا فطری حق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی ہے کہ انسان ان کو برتے اور اپنے رب کا شکر گزار رہے۔ اس ناشکرگزاری کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ ان کے برتنے میں نہ خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کرے اور نہ ان میں سے کسی کے عشق میں اس طرح مبتلا ہو جائے کہ اسی کو معبود بنا بیٹھے اور خدا کو بھول جائے۔ جو لوگ اس طرح کے کسی تجاوز میں مبتلا ہوں گے وہ قیامت کے دن لازماً اس کی سزا بھگتیں گے۔

اس سورہ میں چونکہ تکاثرِ اموال کے فتنہ سے آگاہ فرمایا گیا ہے اس وجہ سے وہ یہاں خاص طور پر پیش نظر ہے۔ ہر صاحب مال سے یہ سوال ہوگا کہ اس نے اپنا مال کن راستوں سے حاصل کیا اور کن کاموں میں صرف کیا۔ جنھوں نے نہ اس کے حاصل کرنے میں حرام و حلال کی پروا کی اور نہ اس کے صرف کرنے میں اصل مالک کی مرضی پیش نظر رکھی بلکہ مال ہی کو انھوں نے معبود بنا لیا اور اسی کے حاصل کرنے میں ساری زندگی کھپا دی ان کو اس انجام سے سابقہ پیش آئے گا جو سورۂ ھمزہ میں بیان ہوا ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۙ الَّذِي	ہلاکی ہے ہر اس اشارہ باز، عیب جو کے لیے
جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۙ يَحْسَبُ أَنَّ	جس نے مال سمیٹا اور اس کو گن گن کر رکھا۔
مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۚ كَلَّا ۖ لَيُنبَذَنَّ	یہ گمان کرتے ہوئے کہ اس کے مال نے اس
فِي الْحُطَمَةِ ۚ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۚ	کو زندہ جاوید کر دیا۔ ہرگز نہیں وہ چُور چُور
نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ۙ الَّتِي تَطَّلِعُ	کر دینے والی میں پھینکا جائے گا۔ اور کیا
عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۙ إِنَّهَا عَلَيْهِم	سمجھے کہ چُور چُور کر دینے والی کیا ہے! خدا
مُّؤْصَدَةٌ ۙ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۚ	کی بھڑکتی آگ جو دلوں پر چڑھ جائے گی۔ وہ
(الھمزۃ - ۱۰۴: ۱-۹)	اس میں بند ہوں گے لمبے ستونوں میں جکڑے۔

آخر میں 'لَو' کا جواب، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، محذوف ہے۔ شرط کا جواب ان مواقع میں حذف کر دیا جاتا ہے جہاں وہ اظہار کے بغیر واضح ہو۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔ اس

حذف سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ ساری بات محذوف مانی جاسکتی ہے جس کے لیے موقع کلام مقتضی ہو۔ اس میں یہ بلاغت بھی ہے کہ مخاطب کو گویا یہ موقع دیا جاتا ہے کہ وہ خود ٹھنڈے دل سے اپنے رویہ کا جائزہ لے اور فیصلہ کرے کہ اگر یہ باتیں صحیح ہیں (اور ان کے صحیح ہونے سے اس کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے) تو اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے اور اس نے اب تک جو زندگی گزاری ہے وہ کتنی غلط، حقائق سے کتنی بعید اور انجام کے اعتبار سے کتنی ناعاقبت اندیشانہ اور لاابالیانہ زندگی گزاری ہے۔ یہاں اس حذف سے یہ سارا مضمون پیدا ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر تم ان بدیہی حقائق پر سنجیدگی سے غور کرتے تو اپنی قیمتی زندگی یوں برباد نہ کرتے۔ اب بھی اگر بھلائی چاہتے ہو تو عقل سے کام لو اور جس زندگی کے بدلے ابدی بادشاہی حاصل کر سکتے ہو اس کو اس دنیائے فانی کے حقیر خزف ریزوں کو جمع کرنے میں برباد نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً۔

لاہور

۱۶ - اپریل ۱۹۸۰ء

۲۹ - جمادی الاول ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۰۳

العصر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا مضمون، سابق سورہ سے تعلق اور ترتیب بیان

سابق سورہ ــــــ التکاثر ــــــ میں ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی گئی ہے جو ساری عمر اسی دنیا کے مال و متاع جمع کرنے کی فکر میں گنوا بیٹھتے ہیں یہاں تک کہ موت کی گھڑی آجاتی ہے اور انھیں یہ سوچنے کی فرصت کبھی نہیں ملتی کہ یہ عمر عزیز اللہ تعالیٰ نے انھیں کس مقصد بلند کی خاطر عطا فرمائی اور وہ اس کو کس لوالہوسی و بے حاصلی میں برباد کر بیٹھے۔ اگر وہ جانتے کہ ایک دن تمام نعمتوں کی طرح زندگی کی عظیم نعمت سے متعلق بھی ان سے سوال ہوگا کہ اس کو انھوں نے کس کام میں صرف کیا تو وہ ہرگز یہ حماقت نہ کرتے کہ جس چیز سے وہ ابدی بادشاہی حاصل کر سکتے تھے اس کو دنیا کے خزف ریزے جمع کرنے اور اپنے لیے ابدی لعنت کا سامان کرنے پر قربان کر دیتے۔ اب اس سورہ میں بتایا ہے کہ زندگی کی اصل قدر و قیمت کیا ہے؟ کیا چیز اس کو ابدی فلاح کی ضامن بناتی ہے اور کیا چیز اس کو دائمی خسران میں تبدیل کر دیتی ہے؟ کس طرح انسان اس کو اپنے لیے رحمت بنا سکتا ہے اور کس طرح یہ آپ سے آپ اس کے لیے نقمت اور عذاب بن جاتی ہے اگر وہ اس کو رحمت بنانے کی کوشش نہ کرے۔

اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے اس میں زمانہ کی قسم بطور شہادت کھائی گئی ہے کہ انسان غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں اصل سرمایہ جو اسے حاصل ہے بس وہ تھوڑا سا وقت ہے جو مہلتِ حیات کی حیثیت سے اس کے حصہ میں آیا ہے۔ اس کو صحیح استعمال کر کے وہ زندگی بخشنے والے کا پسندیدہ بندہ بھی بن سکتا اور 'رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً' کا مقام بھی حاصل کر سکتا ہے اور اسی کو غلط کاموں میں ضائع کر کے ہمیشہ کے لیے اپنے کو دوزخ کے عذاب کا سزاوار بھی بنا سکتا ہے۔ اس کی فطرت یہ ہے کہ ایک شمشیرِ دو دم ہے۔ اس کو انسان نے اگر اپنے حق میں استعمال نہ کیا تو یہ آپ سے آپ اس کے ابدی دشمن ــــــ شیطان ــــــ کے حق میں استعمال ہوگا۔ اس کا بہت تھوڑا سا حصہ یعنی صرف حاضر ہے جو اس کے اختیار میں ہے جس میں وہ کوئی تصرف کر سکتا ہے، باقی یا تو ماضی بن چکا جو کسی قیمت پر بھی واپس نہیں مل سکتا یا مستقبل کے پردوں میں چھپا ہوا ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کتنا ہے اور ہے بھی یا نہیں اور ہے تو وہ اپنے ساتھ کیا احوال و مسائل اور کیا تقاضے و مطالبے

رکھتا ہے ۔ جو وقت آتا ہے وہ اپنے مطالبے اپنے ساتھ لاتا ہے ۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ انسان حاضر کے فرض کو مستقبل پر ٹال سکے ۔

اس اہم حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے بعد وہ صحیح طریقہ بتایا ہے جس کو اختیار کرنے والے اپنی مہلتِ حیات سے صحیح فائدہ اٹھاتے اور اس حیاتِ چند روزہ کے بدلے حیاتِ جاوداں پاتے ہیں ۔ اگرچہ یہ طریقہ صرف چند لفظوں میں بتایا گیا ہے لیکن ایسے جامع اور حکیمانہ اسلوب میں بتایا گیا ہے کہ انسان تدبر کرے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں سے متعلق اس پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں جو اسے ادا کرنے ہیں اور جن کے ادا کرنے ہی پر اس کی ابدی فلاح کا انحصار ہے ۔

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ قرآن کا بھی اصل مقصد اسی صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرنا اور انسان کی شخصی و اجتماعی زندگی کو آخرت کے نصب العین کے تحت منظم کرنا ہے ۔ گویا جو بات قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں میں سمجھائی گئی ہے وہ اس سورہ کی تین آیتوں میں سمو دی گئی ہے ۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں اشارہ فرمایا ہے کہ "اگر لوگ تنہا اسی سورہ ۔ العصر ۔ پر غور کریں تو ان کے لیے کفایت کرے ۔"

سُورَةُ الْعَصْرِ

مَكِّيَّةٌ ______ اٰيات : ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۳-۱ وَالْعَصْرِ ① إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ② إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③ ع ۱ / ۲۸

ترجمۂ آیات ۳-۱ زمانہ شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے بجز ان کے جو ایمان لائے اور
انھوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے
کو صبر کی نصیحت کی۔ ۱-۳

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْعَصْرِ (۱)

لفظ عصر کی تحقیق

'و' قسم کے لیے ہے اور 'عَصْر' کے معنی زمانہ کے ہیں۔ استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس لفظ کی جو تحقیق اپنی تفسیر سورۂ عصر میں بیان فرمائی ہے اس کا خلاصہ ہم اپنے لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"عصر کے معنی زمانہ کے ہیں۔ جس طرح لفظ 'دَھْر' میں زمانہ کی مجموعیت کا اعتبار ہے اسی طرح لفظ 'عَصْر' میں اس کے گزرنے اور اس کی تیز روی کی طرف اشارہ ہے چنانچہ اس کا غالب استعمال گزرے ہوئے زمانہ ہی پر ہوتا ہے۔ امرؤ القیس کا مصرع ہے:

وھل ینعمن من کان فی العصر الخالی

(اور اب ان کے لیے کیا مبارکی ہے جو گزرے ہوئے زمانوں میں ہوئے)

عبید بن الابرص نے کہا ہے:

فذالک عصر وقد ارانی		یحملنی بازل شبوب

(وہ بھی زمانہ تھا جب میں اپنے کو دیکھتا کہ ایک جوان اور خوبصورت اونٹنی پر سوار ہوں)"

کلام عرب کی روشنی میں لفظ کی تحقیق بیان کرنے کے بعد مولاناؒ خلاصۂ بحث پیش کرتے ہیں:

"اس سے معلوم ہوا کہ لفظ 'عَصْر' ایک طرف زمانۂ گزشتہ کے احوال و واقعات یاد دلا رہا ہے دوسری طرف اس کی مخصوص صفت تیز روی اور برق رفتاری کی طرف بھی متوجہ کر رہا ہے۔ ان دونوں حقیقتوں کی طرف اشارہ سے ہمارے سامنے دو اہم نتائج آتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے فیصلے ان کے اعمال کے اعتبار سے نافذ ہوں گے۔ دوسرا یہ کہ ہم کو زمانہ سے جس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی تیز روی اور برق رفتاری ہے، زیادہ سے زیادہ مستعدی سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔"

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ زمانہ کی قسم یہاں کیوں کھائی گئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم سے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے تاریخ کے ان واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس دنیا میں قانونِ مجازات کے ظہور کے پیش آئے اور جو قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بیان ہوئے ہیں۔ دوسری طرف لوگوں کو اس سے جھنجھوڑا ہے کہ لوگ اپنی زندگیاں غفلت میں نہ گزاریں بلکہ اپنی

مستعدی سے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ انہی تیز رو لمحات کے بدلے وہ ابدی بادشاہی حاصل کر سکتے ہیں اگر انھوں نے ان کی صحیح قدر پہچانی اور اگر ان کی قدر نہ پہچانی تو یاد رکھیں کہ یہ ان کے لیے ابدی لعنت بن جائیں گے۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نکتہ کی وضاحت اپنی تفسیر میں یوں فرمائی ہے:

"پچھلی قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے نافذ ہوئے وہ ٹھیک ٹھیک ان کے اعمال کا بدلہ تھے۔ انھوں نے نیکیاں اور بھلائیاں کیں تو خدا نے ان کو عروج بخشا اور اگر انھوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی تو قانونِ الٰہی نے، اتمامِ حجت کے بقدر مہلت دینے کے بعد ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ اسی حقیقت کی یاددہانی کے لیے یہاں زمانہ کی قسم کھائی کہ لوگ یاد رکھیں کہ ایک دن اس قانونِ مکافات سے لازماً انھیں بھی دوچار ہونا ہے۔"

"علاوہ ازیں اس قسم میں ایک اور نازک نکتہ بھی مضمر ہے۔ وہ یہ کہ انسان کا اصل راس المال زمانہ ہی ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ تیز روی اور برق رفتاری میں کوئی چیز بھی اس سے بڑھ کر نہیں ہے۔ پھر یہ انسان کی کیسی نادانی ہے کہ وہ زمانہ کی اس بے وفائی سے واقف ہونے کے باوجود اس پر بھروسہ کرتا اور زندگی کی بے ثباتی، قیامت کی بازپرس اور جزائے عمل کے قانون سے غافل رہتا ہے۔"

اس حقیقت کو مولاناؒ مثال سے یوں سمجھاتے ہیں:

"اس معاملے میں انسان کی مثال بالکل اس تاجر کی ہے جو برف کی تجارت کرتا ہے، لیکن بجائے اس کے کہ جلد سے جلد اس کو بیچ کر اپنے دام کھرے کرنے کی فکر کرے اس کو اس نے رکھ چھوڑا اور اس کی چمک اور ٹھنڈک کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ناعاقبت اندیش تاجر کو بہت جلد اپنی غفلت پر کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔"

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف مولاناؒ ان لفظوں میں اشارہ فرماتے ہیں:

"علاوہ بریں زمانہ کی تیز روی میں ایک پہلو بشارت اور تقویتِ صبر کا بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ اس تھوڑی سی مدت میں اگر انسان چاہے تو اجر و ثواب کا ایک لازوال خزانہ جمع کر سکتا ہے۔ ایک بدبخت انسان اس حیاتِ فانی کی چند روزہ لذتوں پر ریجھ کر اپنے کو ابدی مسرت و کامیابی سے محروم کر لیتا ہے لیکن ایک عاقل اسی فانی زندگی کے چند دنوں کے اندر، جن کی حقیقت ایک خواب اور برق خاطف سے زیادہ نہیں، تقویٰ اور ضبطِ نفس کی آزمائشیں جھیل کر ...... خدا کی خوشنودی اور اس کی محبت کا ابدی تخت و تاج حاصل کر لیتا ہے۔"

إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۲-۳)

اصل بات یہ وہ اصل بات ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے زمانہ کی قسم کھائی گئی ہے۔ جب ایک طرف مہلتِ حیات کی اہمیت اور قدر و قیمت کا حال یہ ہے کہ اسی کے بدلے میں انسان ابدی بادشاہی حاصل کر سکتا ہے اور اگر اس سے غفلت برتے تو یہ اس کے لیے ابدی لعنت بن جاتی ہے۔ دوسری طرف اس کی تیز روی کا یہ حال ہے کہ ہر سیکنڈ کے ساتھ وہ ماضی کے اندر تحلیل ہوتی جا رہی ہے، اور اس پر انسان کو کوئی قابو نہیں تو وہ سارے انسان انتہائی خسارے میں ہوئے جن کا اصل راس المال اس تیزی سے برباد ہو رہا ہے اور وہ اس سے غافل ہوں۔ چنانچہ اس کو شہادت میں پیش کر کے فرمایا کہ انسان گھاٹے میں ہیں بجز ان کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کی ساری قدر و قیمت ایمان اور عمل صالح کے اندر مضمر ہے۔ خالق نے یہ عطا فرمائی ہی اس لیے ہے کہ انسان اس کو شیطان کے علی الرغم اپنے رب کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گزارے اور اس کے صلہ میں 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کی سند اور ابدی جنت کا ٹکٹ حاصل کرلے۔ چند دنوں کے امتحان کے بدلے میں ابدی جنت کا انعام جس طرح کوئی معمولی انعام نہیں اسی طرح اس کو شیطان کی ترغیبات کے جال میں پھنس کر کھو بیٹھنا بھی کوئی معمولی محرومی نہیں ہے۔

ایمان کا مفہوم ایمان کی تعریف اس کتاب میں جگہ جگہ بیان ہو چکی ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ خدا کو اس کی تمام صفات اور ان کے لازمی مقتضیات کے ساتھ پورے صدقِ دل سے تسلیم کرنا ایمان ہے۔ استاذ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ایمان کا مفہوم ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"ایمان کی اصل 'امن' ہے۔ یہ لفظ لغت میں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ 'اٰمَنَہٗ' ای اعطاہ امنا (اس کو امن دیا) قرآن میں ہے: 'وَاٰمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ' (قریش ـ ۱۰۶: ۴) (اور ان کو خوف سے امان دی)۔ 'اٰمَنَہٗ' صدقہ و اعتمد علیہ (اس کی تصدیق کی، اس پر اعتماد کیا) 'اٰمَنَ بِہٖ' ایقن بہ (اس کا یقین کیا)"

"قرآن مجید میں یہ لفظ مذکورہ تمام صورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے مشتقات میں سے لفظ 'مُؤْمِنٌ' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں آنے والے بندوں کو پناہ دیتا ہے۔"

"یہ ایک قدیم دینی اصطلاح بھی ہے ...... پس وہ یقین جو خشیت، توکل اور اعتقاد کے تمام لوازم و شرائط کے ساتھ پایا جائے، ایمان ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دے،

اس کے فیصلوں پر راضی رہے وہ مومن ہے۔"

عملِ صالح — ایمان کے بعد عملِ صالح کی حیثیت اس کے لازمی مقتضیٰ کی ہے۔ جب حقیقی ایمان پیدا ہو گا تو وہ لازماً زندگی کے باطنی گوشوں کی طرح اس کے ظاہری اعمال کو بھی منور کرے گا۔ اگر ایمان سے اس کے تقاضوں کے مطابق عمل نہ پیدا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان نے دل میں جڑ نہیں پکڑی۔ ایمان اور عمل میں مطابقت اور ہم آہنگی ہونا لازمی ہے۔ امام فراہیؒ اپنی تفسیر میں اس نکتہ کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

"قرآن مجید میں ایمان کے بعد عملِ صالح کا جو ذکر آتا ہے وہ درحقیقت ایک طرح کی تفصیل و توضیح ہوتی ہے ...... اسی طرح اطاعتِ رسول کو اطاعت اللہ پر جو عطف کیا جاتا ہے یہ بھی عطفِ تفصیل ہوتا ہے .... اس تفصیل کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ بعض اہم الفاظ کے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں۔ ایمان کے معاملہ میں اس توضیح کی ضرورت بالکل ظاہر ہے۔ ایمان کا محل دل اور عقل ہے۔ عقل اور دل کے معاملات میں انسان نہ صرف دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے بلکہ بسا اوقات خود بھی دھوکے میں رہتا ہے۔ وہ اپنے کو مومن سمجھتا ہے حالانکہ وہ مومن نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ایمان کے دو شاہد قرار دیے گئے۔ ایک قول اور دوسرا عمل۔ قول بھی چونکہ جھوٹ ہو سکتا ہے اس وجہ سے صرف زبان سے اقرار کرنے والا مومن نہیں قرار دیا گیا بلکہ ضروری ہوا کہ آدمی کا عمل اس کے ایمان کی تصدیق کرے۔[1] چنانچہ فرمایا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا	اے وہ لوگو جو زبان سے ایمان لائے ہو!
(النساء - ۴ : ۱۳۶)	عمل سے ایمان لاؤ۔"

اعمالِ حسنہ کو 'صالحات' سے تعبیر کرنے کی حکمت امام فراہیؒ نے ان الفاظ میں واضح فرمائی ہے:

اعمالِ حسنہ کو صالحات سے تعبیر کرنے کی حکمت — "اللہ تعالیٰ نے اعمالِ حسنہ کو صالحات سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے اس عظیم حکمت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ انسان کی تمام ظاہری و باطنی، دینی و دنیوی، شخصی و اجتماعی، جسمانی و عقلی صلاح و ترقی کا ذریعہ اعمالِ صالحہ ہی ہیں۔ یعنی عملِ صالح

---

[1] یہ امر واضح رہے کہ یہاں زیرِ بحث حقیقی ایمان ہے، فقہی اور قانونی ایمان پر بحث نہیں ہے۔ جو لوگ فقہی اور قانونی ایمان کی نوعیت سمجھنا چاہتے ہوں وہ اس بحث کو اس کے محل میں دیکھیں۔ مولانا فراہیؒ نے اس کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف تفسیر سورۂ عصر میں اشارے کیے ہیں اور ہم نے بھی اس کتاب میں بعض جگہ اس کے بعض پہلو واضح کیے ہیں۔

وہ عمل ہوا جو انسان کے لیے زندگی اور نشوونما کا سبب بن سکے اور جس کے ذریعے سے انسان ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں"۔

آگے چل کر اس نکتہ کی مزید وضاحت انھوں نے یوں فرمائی ہے:

"اس نکتہ کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کائنات کی مجموعی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ اس وجہ سے اس کے اعمال میں سے صالح صرف وہی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت و تدبیر کے موافق ہوں جو اس نے اس مجموعی نظام کے لیے پسند فرمائی ہے۔ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے بازیچۂ اطفال نہیں بنایا ہے، بلکہ ایک خاص نظام حکمت ہے جو اس پورے کارخانہ میں جاری ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر جو کچھ ہو اسی نظام حکمت کے تحت ہو، اس سے الگ ہو کر نہ ہو"

انسان پر اس کے معاشرہ کا حق

"وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" اوپر والے ٹکڑے میں جو بات ارشاد ہوئی ہے اس کا تعلق اصلاً انسان کی انفرادی زندگی سے ہے لیکن انسان صرف انفرادی زندگی نہیں رکھتا بلکہ وہ فطرتاً معاشرتی مزاج رکھنے والی مخلوق ہے اور جہاں بھی پایا جاتا ہے کسی خاندان کے رکن اور معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے ہی پایا جاتا ہے۔ اگر اس نے اس کے خلاف کوئی اور روش زندگی کی اختیار کی ہے تو اپنے فطری مزاج کے تقاضے سے نہیں بلکہ کسی غیر فطری انحراف کے باعث اختیار کی ہے۔ خاندان اور معاشرہ کے ساتھ اس کا تعلق فطری ہے۔ وہ جس طرح اپنی مادی زندگی کی تعمیر و ترقی میں ان سے سہارا حاصل کرتا ہے اسی طرح اپنے اخلاقی و روحانی ارتقا میں بھی ان سے رہنمائی پاتا ہے۔ یہیں سے اس پر خاندان اور معاشرہ کا یہ حق قائم ہو جاتا ہے کہ وہ ان کی صلاح و فلاح کے فرض سے غافل نہ رہے ورنہ یہ چیز اس کی فتوت کے خلاف ہوگی۔ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ ایمان و عمل کی صراطِ مستقیم سے آشنا ہوں وہ دوسروں کو بھی اس حق کی تلقین کریں جس کی راہ ان پر ایمان و عمل صالح کی زندگی نے کھولی ہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کو صبر و عزیمت کی بھی تلقین کریں اس لیے کہ صبر و عزیمت کے بغیر نہ حق کو اختیار کرنا اور اس پر قائم رہنا آسان ہے اور نہ اس کی دعوت دینا کوئی سہل بازی ہے۔

ایک دقیق نکتہ

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بات یوں نہیں فرمائی کہ 'وہ ایمان اور عمل صالح کی دعوت دیتے ہیں' بلکہ یوں فرمائی کہ 'وہ حق اور صبر کی ایک دوسرے کو تلقین کرتے ہیں'۔ اس اسلوب نے وہ باتیں بھی اپنے اندر سمیٹ لی ہیں جو پہلے ٹکڑے میں ہیں اور ان کے اوپر مزید نہایت اہم اضافے بھی کر دیے ہیں۔ لفظ 'حق' کے اندر ایمان بدرجۂ اولیٰ داخل ہے اس لیے کہ وہ خدا کا حق اور سب سے بڑا حق ہے۔ اسی طرح اعمال حسنہ کا تعلق بھی یا تو خدا کے حقوق سے ہے یا بندوں کے حقوق سے اس وجہ

سے وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ ساری باتیں حقوق اور فرائض کی طرح ادا بھی کرتے ہیں، دوسروں کو اس کی تلقین بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ حکمت بھی لوگوں کو بتاتے ہیں کہ حقوق کو ادا کرنا کوئی سہل بازی نہیں ہے، اس کے لیے صبر و عزیمت ضروری ہے۔ جن کے اندر یہ وصف نہیں ہوگا ان کے لیے حقوق کا ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔

حق کا مفہوم

'حق' کی وضاحت امام فراہیؒ نے اپنی تفسیر میں یوں فرمائی ہے:

"'حق' اصل میں کہتے تو ہیں موجود و قائم کو لیکن استعمال میں اس کے معنی مختلف ہو گئے ہیں۔ کم از کم تین معنوں میں تو اس کا استعمال معروف ہے:

۱۔ وہ بات جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔

۲۔ وہ بات جو عقل کے نزدیک مسلّم ہو۔

۳۔ وہ بات جو اخلاقاً فرض ہو۔"

ان تینوں معنوں کی تائید میں قرآن سے دلائل نقل کرنے کے بعد مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"باقی رہا اس کا خاص مفہوم یعنی غریبوں اور کمزوروں کی ہمدردی تو وہ اسی عام معنی سے نکلا ہوا ہے۔ گویا اہل عرب کے نزدیک سب سے بڑا حق یہی ہے جو ہر صاحب استطاعت پر لازم ہے اور جو ہر مستحق کو حاصل ہونا چاہیے جو عقل کے نزدیک مسلّم اور تمام اچھے لوگوں کے نزدیک بالکل متعین و معروف ہے۔ اسی سبب سے احسان کو معروف کہتے ہیں یعنی ایک ایسی چیز جو ہر شخص کے نزدیک جانی پہچانی ہوتی ہے اور تمام معقول لوگوں کے اندر مسلّم قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق کے معنی اگر غریبوں کی ہمدردی کے لیے جائیں تو اس کے اندر ان تمام معانی کی جھلک موجود ہے جو اوپر مذکور ہوئے۔"

صبر کا مفہوم

'صبر' کی تحقیق کے ذیل میں مولانا فراہیؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ عربوں کے نزدیک صبر کوئی عجز و تذلّل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو بے بسوں اور درماندوں کا شیوہ ہے بلکہ ان کے نزدیک یہی تمام قوت و استقامت کی بنیاد ہے۔ کلام عرب میں یہ لفظ بہت استعمال ہوا ہے اور اس کے تمام استعمالات سے اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔ حاتم طائی کہتا ہے:

وغمرة موت ليس فيها هوادة يكون صدور المشرفي جسورها

(موت و ہلاکت کے کتنے ہولناک دریا جن پر تلواروں کے پل تھے)

صبرنا له في نهكها ومصابها باسيافنا حتى يبوخ سعيرها

(ہم نے ان کی تمام آفات کے مقابلہ میں اپنی تلواروں کے ساتھ ثابت قدمی دکھائی یہاں تک کہ

وہ ٹھنڈے پڑگئے"۔

بعض دوسرے مشہور شاعروں کے کلام سے نظائر پیش کرنے کے بعد مولانا فراہیؒ نے 'صبر' کا مفہوم خود قرآن سے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

"'صبر' کا اصل مفہوم قرآن نے خود کھول دیا،

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ (البقرۃ - ۲: ۱۷۷) اور صبر کرنے والے سختی میں، تکلیف میں اور لڑائی کے وقت۔"

"اس آیت میں صبر کے تین مرتبے ذکر ہوئے ہیں: غربت، بیماری اور جنگ۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تمام مصائب و شدائد کے سرچشمے یہی تین ہیں جو ان تینوں امتحانوں میں ثابت قدم رہتے ہیں وہ صابر ہیں۔"

حق و صبر کے باہمی تعلق کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"خلاصہ ان تفصیلات کا یہ ہے کہ 'حق' تمام بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہے اور 'صبر' تمام برائیوں کے دروازے بند کرتا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ 'حق' اصل محبوب و مطلوب ہے اور 'صبر' اس کے لیے جوش طلب اور سرگرمی ہے۔"

"اہل بصیرت سے یہ راز مخفی نہیں ہے کہ سعادت کے حاصل ہو جانے کے بعد اصلی چیز اس پر جمے رہنا ہے۔ اب غور کرو، دو لفظوں —— حق اور صبر —— کے اندر تمام سعادتیں اور بھلائیاں کس خوبی و اختصار کے ساتھ جمع ہو گئی ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان کس قدر گہرا اور وسیع تعلق ہے۔"

....

"یہاں درحقیقت ایک ہی جڑ سے کئی شاخیں نکلی ہیں۔ ایمان ایک اصل اور مرکز کی حیثیت سے ہے۔ اس کے بعد عمل صالح کا ذکر اس کی تفصیل کی حیثیت سے آیا۔ اسی طرح حق چونکہ دل و دماغ دونوں کو محبوب ہے اور اسی پر ان دونوں کے عروج و کمال کا انحصار ہے اس وجہ سے اس کی محبت کے نتیجے کے طور پر صبر کا بیان ہوا۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کے لیے آدمی کے اندر ثابت قدمی اور استقامت پیدا ہو۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ثابت قدمی اور استقامت محبوب کی حیثیت کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ جو شے جس قدر محبوب ہوگی اس کے لیے اسی قدر پامردی و استقلال کا جوش اُبلے گا۔ نفرت، غضب اور غیرت کے جذبات کا ظہور ہر شے کے لیے یکساں نہیں ہوتا بلکہ مختلف درجہ کا ہوتا ہے۔ دل کو جو شے جس قدر عزیز ہوتی ہے اس کے لیے اسی درجہ کا جذبۂ غیرت و حمیت بھڑکتا ہے۔"

"اللہ تعالیٰ کے غضب اور انتقام کی بنیاد بھی یہی ہے کہ اس کو حق عزیز و محبوب ہے اس وجہ سے جو لوگ اس کو پامال کرتے ہیں ان پر اس کا قہر و غضب بھڑکتا ہے۔ جو شے تم کو عزیز و محبوب ہو گی کیا تم اس کی تحقیر و اہانت چپ چاپ برداشت کر لو گے؟ اس کی حمایت کے لیے تمہاری غیرت ضرور جوش میں آئے گی۔ ماں اپنے بچہ سے محبت کرتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ یہ محبت تنہا نہیں ہوتی بلکہ اپنے ساتھ ایک مجنونانہ غیرت بھی رکھتی ہے اور جب وقت آتا ہے ماں کو بچہ کی مدافعت میں قربان کر دیتی ہے۔ یہی جوشِ غیرت و حمایت قوموں میں اپنے قومی حقوق و مطالبات کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مسکین کبوتری بھی اپنے انڈوں اور بچوں کے لیے اپنے اندر محبت کا جذبہ اور غیرت کا جوش رکھتی ہے۔ اگر تم اس کے انڈوں اور بچوں کو اس سے چھیننا چاہو گے تو وہ اپنے کمزور پروں سے ضرور تم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبر درحقیقت محبتِ حق سے پیدا ہوتا ہے۔"

ایک اور نازک سوال کا جواب

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ 'ایمان و عمل صالح' اور 'تواصی بالحق والصبر' میں باہمد گر کیا تعلق ہے؟ استاذ امام فراہیؒ اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں:

"'وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ' سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر حق اور صبر کی صفات موجود ہیں اور ہمیاں پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی ان کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ مضمون آیت کے اندر مضمر ہے اور اس کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ 'اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ' کے اندر یہ بات موجود تھی۔ ثانیاً وعظ بے عمل کی برائی اس قدر واضح ہے کہ اس درجہ کے عمل میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ لوگ دوسروں کو حق و صبر کی نصیحت کریں گے اور خود ان اوصاف سے محروم ہوں گے۔"

"اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایمان سے عملِ صالح وجود میں آیا اسی طرح عمل صالح سے 'تواصی' وجود میں آیا۔ جس شخص کی نگاہوں میں 'حق' محبوب ہو جائے گا اور وہ اس کی خاطر صبر و استقامت کی کڑیاں بھی جھیلنے پر آمادہ ہو گا اس کے بارے میں لازماً اس کا علم، اس کی محبت اور اس کی غیرت بڑھ جائے گی۔ وہ صرف یہی نہیں چاہے گا کہ خود ہی اس سے محبت کرے بلکہ یہ بھی چاہے گا کہ ساری دنیا اس سے محبت کرے اور وہ جہاں کہیں بھی حق کو مظلوم و مقہور اور باطل کو غالب و فتحمند دیکھے گا، تڑپ اٹھے گا اور ایک غیور و اولوالعزم انسان کی طرح دوسروں کو بھی ابھارے گا کہ وہ حق کی حمایت کے لیے کمربستہ ہوں۔ اس کا دوسروں کو یہ ابھارنا بھی خود اس کے اپنے ہی جذبۂ حمیتِ حق کا ایک قدرتی نتیجہ اور اسی کا ایک حصہ ہے۔ پس یہاں 'تواصی' کا ذکر 'عمل صالح' کے ایک

جزواور اس کی توضیح کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا۔

لاہور

۲۴ - اپریل ۱۹۸۰ء

۸ - جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۰۴

الھمزۃ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور ترتیب بیان

یہ سورہ سابق سورہ ــــــــ العصر ــــــــ کی تثنیٰ ہے۔ دونوں کے مضمون میں نہایت واضح مناسبت، جو اوّل وہلہ سامنے آتی ہے، یہ ہے کہ سابق سورہ میں فلاح پانے والے انسانوں کا کردار یہ بیان ہوا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق و صبر کی تلقین کرتے ہیں اور اس سورہ میں اس کے بالکل ضد کردار یعنی ان بخیلوں کا کردار بیان ہوا ہے جو روپیہ گن گن کر رکھتے ہیں اور لوگوں کو ادائے حقوق پر ابھارنا تو درکنار کسی کو اگر دیکھ پائیں کہ وہ ادائے حقوق کے معاملے میں عملاً و قولاً سرگرم ہے تو اپنے طعن و طنز اور ہمز و لمز سے اس کا قافیہ تنگ کر دیتے ہیں اور ان کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کا حوصلہ اتنا پست کر دیں کہ وہ بھی انہی کی طرح بے حس و بے غیرت بن کر رہ جائے تاکہ اس کی سنجالت پر پردہ پڑا رہے اور اس کی دعوت و تلقین سے ان کے ضمیر کو خفت و ندامت کی اذیت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

قرآن نے بخیل سرمایہ داروں کے اس کردار کی طرف جگہ جگہ اشارہ کیا ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ میں فرمایا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ	جو لوگ خوش دلی سے انفاق کرنے والے
مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ	اہل ایمان پر ان کے صدقات کے باب میں
وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا	نکتہ چینی کرتے ہیں اور جو غریب اپنی محنت و
جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ	مزدوری ہی سے انفاق کرتے ہیں تو ان
مِنْهُمْ ط سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ز	پر پھبتیاں چست کرتے ہیں، اللہ نے ان
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۵	کا مذاق اڑایا اور ان کے لیے ایک دردناک
(التوبۃ - ۹ : ۷۹)	عذاب ہے۔

اس آیت کے تحت ہم نے تدبر قرآن میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ضروری حصہ ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں تاکہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے:

"'مُتَطَوِّعٌ' اور 'مُطَّوِّعٌ' دونوں ایک ہی لفظ ہیں۔ 'مُطَّوِّعٌ' اس کو کہتے ہیں جو صرف فرائض و واجبات ہی ادا کر لینے پر قناعت نہ کر بیٹھے بلکہ اپنی خوشی اور حوصلہ مندی سے نفلی نیکیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔"

'لَمْزٌ' کے معنی عیب لگانا، ہجو کرنا، مذمت کرنا۔"

"اوپر کی آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ منافقین نہ صرف یہ کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو بھی خدا کی راہ میں خرچ کرتے دیکھ نہیں سکتے۔ جس کو خرچ کرتے دیکھتے ہیں اس کو فوراً سخر و لمز کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔ جو فیاض اور مخلص مسلمان اپنی فیاضی اور خوش دلی سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کو تو کہتے ہیں کہ یہ ریاکار اور شہرت پسند ہے، اپنی دینداری کی دھونس جمانے کے لیے خرچ کر رہا ہے۔ اور جو غریب بے چارے کچھ رکھتے ہی نہیں، بس اپنی محنت مزدوری کی گاڑھی کمائی ہی میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں ان کی حوصلہ شکنی کے لیے یہ ان کا مذاق اڑاتے اور ان پر پھبتیاں چست کرتے ہیں کہ لو، آج یہ بھی اٹھے ہیں کہ حاتم کا نام دنیا سے مٹا کے رکھ دیں گے۔"

بخیلوں اور کنجوسوں کی نفسیات کا یہ پہلو ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اپنی بخالت پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے ان کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ دوسرے بھی بخیل بنے رہیں۔ ننگا دوسروں کو بھی ننگا ہی دیکھنا چاہتا ہے تاکہ اسے کوئی ننگا کہنے والا باقی نہ رہے۔ یہی نفسیات ان بخیلوں کی بھی تھی۔ پھر اس سے ان کے اسلام دشمنی کے جذبہ کو بھی تسکین ہوتی تھی۔ وہ نہ خود خدا کی راہ میں کوڑی خرچ کرنا چاہتے تھے، نہ اس بات پر راضی تھے کہ کوئی دوسرا خرچ کرے۔ اپنی اس خواہش کے برخلاف جب دوسروں کو دیکھتے کہ وہ اسلام کے لیے اس دریا دلی سے لٹا رہے ہیں گویا اپنے ہی گھر بھر رہے ہیں، یہاں تک کہ مزدور اپنی مزدوری میں سے، بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر، اس خوشی سے دیتا ہے گویا اپنی آدھ سیر کھجور یا جَو کے عوض دولتِ کونین خرید رہا ہے تو ان بخیلوں کے سینہ پر سانپ لوٹ جاتا۔ وہ غصہ سے کھولتے اور حسد سے جلتے پھر اپنے دل کا بخار طعن و تشنیع، طنز اور پھبتی سے نکالتے۔[1]"

بخیلوں کا یہ کردار ان کی بے بسی کی تصویر ہے۔ بخالت کے سبب سے نہ یہ حوصلہ ان کے اندر ہوتا کہ ادائے حقوق کے میدان میں سبقت کر سکیں اور نہ ادائے حقوق کی دعوت

---

[1] تدبر قرآن۔ جلد سوم، صفحات: ۲۰۲-۲۰۳

دینے والوں کی زبانیں ہی بند کر سکتے۔ اپنی مدافعت کی واحد تدبیر ان کے پاس صرف یہ رہ جاتی ہے کہ ان لوگوں کا مذاق اڑائیں اور ان پر پھبتیاں چست کریں جن کی دعوت سے ان کی پردہ دری ہو رہی ہو۔ ان کی یہ کوشش چونکہ اپنے باطن پر پردہ ڈالنے کی تھی اس وجہ سے قرآن نے اس سورہ میں ان کے ظاہر و باطن کے ہر گوشہ کو اچھی طرح بے نقاب کر دیا ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ ان سورتوں میں اگرچہ اصلاً زیر بحث بخیلوں کا کردار ہے لیکن یہی کردار ان لوگوں کا بھی ہوتا ہے جو دوسری اخلاقی کمزوریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ بھی اپنے سے برتر کردار رکھنے والوں کا مقابلہ ہمیشہ اپنے ہمز و لمز سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قوم لوط کے گنڈوں نے جب دیکھا کہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی دعوتِ اصلاح کے مقابل میں ان کے لیے اپنی آبرو بچانا دشوار ہو رہا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے رویہ کی اصلاح کرتے انھوں نے حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر فقرے چست کرنے شروع کر دیے کہ یہ لوگ بڑے پارسا بنتے ہیں[1] اور قوم کو ابھارا کہ ان لوگوں کو ملک سے باہر نکالو، ورنہ یہ پوری قوم کو ذلیل کر دیں گے۔

---

[1] إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ (النمل - ۲۷ : ۵۶)

سُورَةُ الْهُمَزَةِ

مَكِّيَّةٌ ——————— آيات ٩

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝١ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝٢ آیات ۱-۹
يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝٣ كَلَّا ۖ لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝٤
وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝٥ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ۝٦ الَّتِي
تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۝٧ إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ ۝٨
فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝٩ ع ۲۹

ترجمۂ آیات ۱-۹

ہلاکی ہو ہر اشارہ باز، عیب جُو کے لیے! جس نے مال سمیٹا اور اس کو گنتا رہا۔ گویا اس کے مال نے اس کو زندہ جاوید کر دیا۔ ۱-۳

ہرگز نہیں، وہ چُور چُور کر دینے والی میں پھینکا جائے گا اور تم کیا سمجھے کہ چُور چُور کر دینے والی کیا ہے! اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ! جو دلوں پر جا چڑھے گی۔ اس میں وہ موندے ہوئے ہوں گے۔ لمبے ستونوں میں جکڑے ہوئے۔ ۴-۹

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَیۡلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ (۱)

ایک ہی کردار کے دو پہلو

'ھَمۡزٌ' کے معنی اشارہ بازی کرنے اور 'لَمۡزٌ' کے معنی عیب لگانے کے ہیں۔ 'ھُمَزَۃٌ' اور 'لُمَزَۃٌ' مبالغہ کے صیغے ہیں اور اسی سورہ میں آگے 'حُطَمَۃٌ' بھی اسی وزن پر آیا ہے۔ 'ھُمَزَۃٌ' کے معنی اشارہ باز اور 'لُمَزَۃٌ' کے معنی عیب جو اور عیب چیں کے ہیں۔ اشارہ بازی کا تعلق زیادہ تر حرکتوں اور اداؤں سے ہے اور عیب جوئی کا تعلق زبان سے ہے۔ یہ دونوں ایک ہی کردار کے دو پہلو ہیں۔ جب کسی کا مذاق اڑانا، اس کا تمسخر کرنا اور اس کو دوسروں کی نگاہوں سے گرانا مقصود ہو تو اس میں اشارہ بازی سے بھی کام لیتے ہیں اور زبان سے بھی۔ اشارہ بازی سے کسی کی تضحیک و تحقیر کے جو پہلو پیدا کیے جا سکتے ہیں بسا اوقات وہ زبان کی فقرہ بازیوں سے زیادہ کارگر ہوتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے 'ھُمَزَۃٌ' کو مقدم رکھا ہے۔

ھمز و لمز کی عادت مہذب اور شائستہ سوسائٹی میں ہمیشہ عیب سمجھی گئی ہے۔ تمام آسمانی مذاہب میں اس کی ممانعت وارد ہے۔ قرآن مجید میں نہایت واضح الفاظ میں اس سے روکا گیا ہے:

وَلَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَلَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ ؕ (الحجرات - ۴۹: ۱۱)	اور اپنے آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ اور ایک دوسرے پر پھبتیاں چست نہ کرو۔

دعوتِ حق کا مقابلہ اوچھے ہتھیاروں سے

لیکن جدید جاہلیت کی طرح قدیم جاہلیت میں بھی اس فن کو بڑا فروغ حاصل رہا ہے۔ اس زمانے میں جس طرح اخباروں میں مزاحیہ کالم بھی ہوتے ہیں اور کارٹون بھی چھپتے ہیں جو اشاروں کی زبان میں حریفوں کی تضحیک کرتے ہیں اسی طرح قدیم زمانے میں نقال، بھانڈ اور فقرہ باز ہوتے تھے جو اجرت لے کر شریفوں کی پگڑیاں اچھالتے اور اپنے سرپرستوں کا جی خوش کرتے۔ سورۂ قلم میں قریش کے لیڈروں اور ان کے گنڈوں پر قرآن نے جو جامع تبصرہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی مسلمانوں کی 'تَوَاصِیۡ بِالۡحَقِّ وَالصَّبۡرِ' کی دعوت کو اسی حربے سے شکست دینے کی کوشش کی جو حربے اس زمانے کے پیشہ ور لیڈر اپنے حریفوں کو شکست دینے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ان ہتھکنڈوں سے ہوشیار رہنے کی ہدایت فرمائی گئی:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۙ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۙ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۙ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۙ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۙ (القلم - ۶۸ : ۱۰-۱۴)

اور تم ہر لپاٹیے ذلیل کی بات کا دھیان نہ کرو، اشارہ باز اور لگائی بجھائی کرنے والے کا، بھلائی سے روکنے والا، حدود سے تجاوز کرنے والا اور حق کو تلف کرنے والا، اجڈ مزید براں چاپلوس۔ بوجہ اس کے کہ وہ مال و اولاد والا ہوا۔

اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (۲)

بخیل سرمایہ داروں کی نہایت جامع تصویر

یعنی حقوق کی یاد دہانی اور نصیحت کرنے والوں کو تو انھوں نے ہمز و لمز کے حربے سے چپ کرنے کی کوشش کی اور خود مال جمع کرنے اور اس کو گن گن کر سینتنے میں لگے رہے۔ مال کے حریص و بخیل مال داروں کی یہ نہایت جامع تصویر ہے۔ ان کا دل و دماغ ہمیشہ اپنے سرمایہ کے حساب کتاب میں لگا رہتا ہے۔ کس کاروبار میں کتنا منافع ہوا ہے؟ فلاں سرمائے سے یافت کی کتنی توقع ہے؟ فلاں خسارہ جو ہوا ہے اس کی تلافی کی کیا صورت ہو گی؟ اگلے سال تک سرمایہ کی مجموعی مقدار کہاں تک پہنچ جائے گی؟ اسی طرح کے سوال ہمیشہ ان کے دل و دماغ پر مستولی رہتے ہیں۔ اگر کسی نے ذکر کیا کہ فلاں نے غریبوں اور یتیموں کی امداد کے لیے اتنا خرچ کیا ہے تو اس پر پھبتی چست کر دی کہ شیخی باز ہے، اپنی دولت مندی کی دھونس جماتا ہے۔ آخر ہم بھی تو ڈھیروں مال لٹاتے ہیں لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ (۳)

بخیلوں کے باطن پر ایک عکس

یہ ان کے اس انہماک کے باطن پر عکس ڈالا گیا ہے کہ یہ انہماک پتہ دیتا ہے کہ وہ گویا یہ خیال کیے بیٹھے ہیں کہ یہ مال ان کو زندۂ جاوید رکھے گا۔ اگر وہ جانتے کہ یہ مال بھی فانی اور ان کی زندگی بھی فانی ہے تو وہ مال کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنے میں سبقت کرتے جو ان کی ابدی زندگی میں کام آنے والا ہوتا لیکن اس کی محبت میں ان کا یہ استغراق پتہ دیتا ہے کہ وہ اس مال ہی میں اپنی زندگی پا گئے ہیں۔ اسی ذہنیت کی تصویر سورۂ شعراء میں کھینچی گئی ہے:

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۙ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۚ (الشعرآء - ۲۶ : ۱۲۸-۱۲۹)

کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے اور شاندار محل تعمیر کرتے رہو گے گویا تھیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔

آدمی کے باطن کا سراغ دینے والی اصل چیز اس کی زبان نہیں بلکہ اس کی زندگی کا رویہ ہے۔

جو آدمی اسی دنیا کو اپنی منزل سمجھتا ہے اس کی زندگی اس شخص کی زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو اس دنیا کو منزل نہیں بلکہ راہ سمجھتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ جو شخص آخرت کا قائل اور اس کا طالب ہو وہ اپنا مال گن گن کر اس دنیا کے بنکوں اور تجوریوں میں رکھے بلکہ وہ اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھتا ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "تو اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھ اس لیے کہ جہاں تیرا مال رہے گا وہیں تیرا دل بھی رہے گا۔"

كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ (۴)

بخیلوں کے سرمایہ کا حشر

'کَلَّا' یہاں اس خیالِ باطل کی تردید کے لیے ہے جو 'یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ فرمایا کہ ہرگز نہیں، وہ بھی اور اس کا یہ سارا اندوختہ بھی چُور چُور کر دینے والی میں پھینک دیا جائے گا۔ 'حُطَمَةٌ'، 'حطم' کے مادہ سے ہے جس کے معنی چُور چُور کر دینے کے ہیں۔ یہ بھی 'هُمَزَةٌ' اور 'لُمَزَةٌ' کے وزن پر ہے اس وجہ سے اس کے اندر بھی مبالغہ کا مفہوم موجود ہے۔

وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ (۵)

یہ سوال اس کی ہولناکی کے بیان کے لیے ہے کہ اس کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو۔ وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے!

اس آگ کو 'حطمۃ' یعنی چُور چُور کر دینے والی کی صفت سے تعبیر کرنے کی حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ بخیل سرمایہ دار اپنی دولت اس زمانے میں سونے چاندی کی اینٹوں، زیورات، ظروف اور جواہرات وغیرہ کی شکل میں محفوظ کرتے تھے۔ اس طرح کی دولت کو برباد کرنے کے لیے چُور چُور کر دینے کی تعبیر زیادہ موزوں ہے یعنی یہ ساری دولت جلا کر اور چُور چُور کر کے پراگندہ کر دی جائے گی کہ جو لوگ اس کو حیاتِ جاوداں کی ضامن سمجھے بیٹھے تھے وہ اس کا حشر دیکھیں۔

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ (۶-۷)

اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ کی ایک خاص صفت

یہ اس 'حُطَمَة' کی وضاحت ہے کہ یہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔ جو دلوں پر جا چڑھے گی۔ یعنی اس کا خاص مزاج یہ ہوگا کہ وہ سب سے پہلے ان دلوں کو پکڑے گی جن میں مال کی محبت اس طرح رچی بسی رہی ہے کہ اس نے خدا اور آخرت کی یاد کے لیے کوئی جگہ ان کے اندر باقی نہیں چھوڑی۔ اس آگ کی مطلوب غذا چونکہ انہی دلوں کے اندر ہوگی اس وجہ سے اس کا سب سے پہلا حملہ انہی پر ہوگا۔ اس زمانے میں خاص خاص چیزوں کے تعاقب کے لیے ایسے ایسے آلات ایجاد ہو گئے ہیں جو دور ہی سے اپنے شکار کو بھانپ لیتے اور از خود ان کا پیچھا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ ان کو مار گراتے ہیں۔ یہی حال اللہ تعالیٰ کی بھڑکائی ہوئی اس آگ کا ہوگا۔ یہ ان دلوں پر خود بخود جا چڑھے گی۔

جو مال کے عشق میں گرفتار اور اللہ کے حاجت مند بندوں کے حقوق سے بے پروا ہے۔

اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ (۸)

یہ آگ ان پر اس طرح بھڑکے گی اور اوپر سے وہ ڈھانک بھی دی جائے گی کہ تپش کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو بلکہ سب کا سب ان کے جلانے ہی میں صرف ہو۔ 'اَوْصَدَ الباب' کے معنی ہوں گے دروازے کو بند دیا۔ یہ آگ بھی بھٹہ اور پزاپہ کی آگ کی طرح اوپر سے ڈھانک دی جائے گی تاکہ وہ پوری قوت کے ساتھ اپنا عمل کرے۔

فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (۹)

یہ ان کی ذلت اور بے بسی کی تصویر ہے کہ اس آگ کے اندر وہ لمبے لمبے ستونوں کے ساتھ بھاری بھاری زنجیروں سے جکڑے ہوئے بھی ہوں گے کہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں۔ یہاں ستونوں کا ذکر ہے، سورۂ حاقّہ' میں اسی طرح کے مجرموں کے لیے زنجیر کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا ہے:

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۙ ثُمَّ الْجَحِيْمَ	اس کو پکڑو، پھر طوق ڈالو، پھر دوزخ میں
صَلُّوْهُ ۙ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ	داخل کرو، پھر ایک زنجیر میں جس کا طول
ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۚ	ستر گز ہے، اس کو جکڑو۔ یہ خدائے
اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۙ	عظیم پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور
وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۚ	مسکین کو کھلانے پر نہیں ابھارتا
(الحاقّۃ ۶۹: ۳۰-۳۴)	تھا۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى اِحْسَانِهٖ۔

لاہور

۲۸۔ اپریل ۱۹۸۰ء

۱۲۔ جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۰۵

الفیل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق ولاحق سے تعلق اور ترتیب بیان

'القارعۃ' سے لے کر 'الھمزۃ' تک خاص بات جو قریش پر واضح فرمائی گئی ہے وہ یہی ہے کہ انھوں نے مال اور اولاد کے عشق میں مبتلا ہو کر اللہ اور بندوں کے حقوق تو تمام برباد کر دیے ہیں لیکن یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے وارث اور ان کے بنائے ہوئے گھر کے متولی ہیں۔ اب اس سورہ اور اس کے بعد کی سورہ — قریش — میں، جو اس کی توام ہے، ان کو یہ تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ تمھیں اس سرزمین میں جو امن اور رزق حاصل ہے وہ تمھاری تدبیر و قابلیت اور تمھارے استحقاق کا کرشمہ نہیں بلکہ یہ تمام تر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور ان کے بنائے ہوئے اس گھر کی برکت کا ثمرہ ہے اس وجہ سے تم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اس امن و رزق پر نازاں ہونے کے بجائے اس گھر کے خداوند کی بندگی کرو جس نے تمھیں بھوک میں کھلایا اور خطرہ سے تحفظ کیا ہے۔ یہ مضمون آگے والی سورہ میں یوں واضح فرما دیا گیا ہے: فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ (قریش - ۱۰۶: ۳-۴) (پس چاہیے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی بندگی کریں جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور خطرے سے تحفظ کیا) ان دونوں سورتوں میں بس یہ فرق ہے کہ سورۂ فیل میں ایک نہایت اہم شہادت اس امر کی پیش کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی حفاظت کے لیے اپنی کیا شان دکھائی ہے اور سورۂ قریش میں یہ واضح کیا ہے کہ اس سرزمین کے باشندوں کے لیے رزق و فضل کی جو راہیں کھلی ہیں وہ اسی گھر کے واسطہ سے کھلی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ کی سرزمین میں بسایا ہے اس وقت یہ علاقہ امن اور رزق کے وسائل سے بالکل محروم تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں چیزوں کے لیے دعا کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور ان کی ذریت کو یہ دونوں چیزیں حرم ہی کے واسطہ سے حاصل ہوئیں لیکن بعد میں لوگ اس حقیقت کو فراموش کر کے اپنی بدمستیوں میں کھو گئے۔ ان کی اس ناشکری پر قرآن نے ان کو جگہ جگہ تنبیہ فرمائی ہے جس کی وضاحت ہم کرتے آ رہے ہیں۔ اس گروپ کی سورتوں میں سے سورۂ بلد میں بھی اس کے بعض اہم پہلو زیر بحث آئے ہیں تفصیل مطلوب

ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

زیر نظر سورہ میں قریش کو ابرہہ کی اس فوج کشی کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس نے بیت اللہ الحرام کو ڈھا دینے کے ناپاک ارادے سے ساٹھ ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ، مکہ پر کی۔ ایک ایسے بھاری لشکر سے، بالخصوص جب کہ اس کا ہراول دستہ ہاتھیوں پر مشتمل ہو، عربوں کے لیے میدان میں نکل کر عہدہ برآ ہونا آسان نہیں تھا اس وجہ سے انھوں نے پہاڑوں میں محفوظ ہو کر سنگ باری کی صورت میں اپنی مدافعت کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ یہ مدافعت ایک کمزور مدافعت تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید غیبی سے ان کی اسی کمزور مدافعت کو ابرہہ کے لشکر گراں کے لیے ایک قہر الٰہی بنا دیا اور وہ اس طرح تباہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا گوشت مکہ کی وادی میں چیلوں، کوّوں اور گدھوں کو کھلا یا۔

سُوْرَةُ الْفِيْلِ

مَكِّيَّةٌ ——— آیات : ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۵
اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ﴿١﴾ اَلَمْ يَجْعَلْ
كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ﴿٢﴾ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ﴿٣﴾
تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿٤﴾ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ
مَّاْكُوْلٍ ﴿٥﴾

ترجمۂ آیات ۱-۵
کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے خداوند نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا! کیا ان کی چال بالکل برباد نہ کر دی! اور ان پر جھنڈ کی جھنڈ چڑیاں نہ بھیجیں! ۱-۳

تم ان کو مارتے تھے سنگِ گِل کے قسم کے پتھروں سے، بالآخر ان کو اللہ نے کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔ ۴-۵

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ (۱)

خطاب کی نوعیت

'اَلَمْ تَرَ' کے خطاب کی نوعیت ہم جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں کہ اگرچہ یہ لفظاً واحد ہے لیکن اس کا استعمال بیشتر جمع کو مخاطب کرنے کے لیے ہوتا ہے اور یہ طرزِ خطاب گویا مخاطب گروہ کے ایک ایک فرد کو فرداً فرداً متوجہ کرتا ہے۔ یہاں مخاطب قریش ہیں۔ ان کو مخاطب کر کے توجہ دلائی ہے کہ اصحابِ فیل کے ساتھ تمہارے رب نے جو معاملہ کیا، کیا وہ تم نے نہیں دیکھا؟ یہ امر ملحوظ رہے کہ اصحاب الفیل کے واقعہ پر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت عام الفیل ہی کے دوران میں ہوئی ہے اس وجہ سے اس سورہ کے نزول کے وقت بہت سے ایسے لوگ رہے ہوں گے جنھوں نے اس واقعہ کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہوگا اور اگر مشاہدہ نہیں کیا ہوگا تو اس تواتر کے ساتھ سنا ہوگا کہ وہ مشاہدہ ہی کے حکم میں ہے۔ اس وجہ سے 'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب یہاں بالکل اپنے موزوں محل میں ہے۔

اصحاب الفیل کون تھے؟

قرآن نے یہاں ان ہاتھی والوں کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی ہے کہ وہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور ان کے آنے کا مقصد کیا تھا؟ اجمال کے ساتھ صرف ان کے انجام کی طرف اشارہ کر کے بات ختم کر دی ہے۔ اس اجمال کی وجہ یہ ہے کہ مخاطب گروہ کو ان کا سارا واقعہ معلوم تھا۔ 'اصحاب الفیل' کے الفاظ سے ان کا تعارف ہی یہ سمجھ جانے کے لیے کافی تھا کہ یہ اشارہ یمن کے حبشی حکمران، ابرہہ کی طرف ہے جس کے حملہ آور لشکر کے ساتھ کچھ ہیکل ہاتھی بھی تھے۔ ہاتھیوں والے لشکر کا تجربہ عربوں کو پہلی بار اسی جنگ میں ہوا اس وجہ سے اسی نام سے انھوں نے اس حملہ کو یاد رکھا جس سے اس کی سنگینی کا اظہار ہوتا ہے۔

ہاتھی ایک ہی تھا یا اس سے زیادہ تھے قرآن کے الفاظ سے دونوں ہی مفہوم نکل سکتے ہیں لیکن چونکہ 'صاحب الفیل' نہیں بلکہ 'اصحاب الفیل' کہا گیا ہے اس وجہ سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ ہاتھی ایک سے زیادہ تھے اور روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھیوں کا ایک پورا دستہ فوج کے ساتھ تھا جس سے اس کی قوت اور ہیبت میں بڑا اضافہ ہو گیا تھا۔

ابرہہ اور اس کا کردار

ابرہہ کو اگرچہ بعض مورخین نے ایک بردبار حکمران لکھا ہے لیکن اس کے حالاتِ زندگی سے اس حسن ظن کی تائید نہیں ہوتی بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک موقع پرست، غدار اور نہایت متعصب عیسائی تھا۔ اس نے خود حبش کے بادشاہ کے ساتھ بھی غداری کی جس کی فوجوں کے ذریعہ سے اس نے یمن پر قبضہ کیا تھا،

اس کی تفصیل تاریخوں میں موجود ہے لیکن یہاں اس سے تعرض کا موقع نہیں ہے۔ یمن پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے نہ صرف اس کے یہودی بادشاہ کو قتل کیا بلکہ وہاں سے یہود اور یہودیت کا بیج و بن سے خاتمہ کر دیا۔

ابرہہ کی چال اور اس کی ناکامی

عیسائیت کے تعصب کے جنون میں اس نے یہ اسکیم بنائی کہ عربوں کو عیسائی بنا لے۔ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے اس نے یمن کے دارالسلطنت، صنعاء میں ایک عظیم الشان گرجا بنوایا اور حبش کے نجاشی کو، جس کے نائب السلطنت کی حیثیت سے وہ یمن پر حکومت کر رہا تھا، اس نے لکھا کہ میں نے ایک ایسا گرجا تعمیر کرایا ہے جس کی نظیر چشمِ فلک نے نہیں دیکھی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ عربوں کے حج کا رُخ بھی اسی کی طرف موڑ دوں اور ان کے مکہ کے معبد کو ڈھا دوں۔ اس کے بعد اس نے کعبہ پر حملہ کا جواز پیدا کرنے کے لیے یہ مشہور کیا کہ اس کے تعمیر کردہ گرجا کو کسی عرب نے بقصدِ توہین ناپاک کیا ہے۔ یہ واقعہ اول تو بالکل جھوٹ معلوم ہوتا ہے، عرب ہمیشہ تلوار کے دھنی رہے ہیں، بہادر قوموں کے افراد اس طرح کی پست حرکتیں نہیں کیا کرتے، لیکن بالفرض صحیح بھی ہو تو کسی ایک شخص کا انفرادی فعل اس بات کو جائز ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کا انتقام پوری قوم سے لیا جائے، یہاں تک کہ اس جرم کی پاداش میں ان کے دینی معبد کو ڈھا دینے کی جسارت کی جائے لیکن عیسائیوں کے جذبات بھڑکانے اور نجاشی کی تائید حاصل کرنے کے لیے اس جھوٹ کو خوب شہرت دی گئی یہاں تک کہ ساٹھ ہزار کا لشکر جرار، جس کے ساتھ نو دس ہاتھی بھی تھے، جمع کر کے مکہ پر حملہ کر دیا گیا۔

اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ (۲)

لیکن ابرہہ کی یہ ساری تدبیریں اللہ تعالیٰ نے بالکل پامال و رائگاں کر دیں۔ ان تدبیروں کو 'کید' (چال) سے تعبیر کرنے کی ایک واضح وجہ تو وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ ایک نہایت ظالمانہ اقدام کو جائز ثابت کرنے کے لیے ایک نہایت بے ہودہ قسم کا الزام گھڑ لیا گیا لیکن اس کے کید ہونے کے بعض اور پہلو بھی ہیں جن کی طرف امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اشارے فرمائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱- اس نے محترم مہینوں میں حملہ کیا۔ اس کو خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ خونریزی سے احتراز کرتے ہیں۔

۲- اس نے مکہ میں ایسے وقت میں داخل ہونے کی کوشش کی جب اہل مکہ دوسرے عربوں کے ساتھ حج کے مناسک ادا کرنے میں معروف ہوتے ہیں۔

۳- اس نے خاص طور پر قیام منیٰ کے دنوں میں حملہ کرنا چاہا کہ عرب یا تو منیٰ میں قربانی میں معروف ہوں گے یا تھکے ماندے گھروں کو واپس آ رہے ہوں گے۔"

اس کی ان چالوں کو ناکام کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو انتظام فرمایا اس کا خلاصہ، واقعات سے مستنبط کر کے، مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"۱۔ ان کی فوج کو وادئ محسّر میں روک دیا۔
۲۔ محصّب کے پتھروں سے عربوں نے اسلحہ کا کام لیا اور ان پر سنگ باری کی جس کی تفصیل آگے آئے گی۔
۳۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کے ان دشمنوں پر سنگ باری کرنے والی ہوا (حاصب) بھی بھیجی جس نے ان کو بالکل پامال کر دیا۔"

اس 'حاصب' کا ذکر واقعہ کے بعض عینی شاہدوں نے کیا ہے اور ابن ہشام وغیرہ نے اپنی کتابوں میں ان شہادتوں کو نقل کیا ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اس پر پوری تفصیل سے بحث کی ہے۔ ہم بقصد اختصار صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ مشہور شاعر ابو قیس اس واقعہ کے سلسلہ میں قدرتِ الٰہی کی بعض نشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے 'حاصب' کا ذکر یوں کرتا ہے:

فارسل من ربهم حاصب   يلفهم مثل لف القزم

(پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر حاصب (سنگ ریزے برسانے والی آندھی) چلی جو خس و خاشاک کی طرح ان کو لپیٹ لیتی)۔

- اسی طرح صیفی بن عامر نے بھی 'ساف' اور 'حاصب' کا ذکر کیا ہے[۱]۔ وہ کہتا ہے:

فلما اجازوا بطن نعمان ردهم   جنود الاله بين ساف وحاصب

(جونہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے، خدا کی فوجوں نے ساف اور حاصب کے درمیان نمودار ہو کر ان کو پسپا کر دیا)۔

وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ (۳)

ابرہہ کی فوجوں کی بربادی کی تعبیرِ لطیف

یہ ابرہہ کی فوجوں کی بربادی، پامالی اور بے کسی و بے بسی سے کنایہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اس طرح ان کو پامال کیا کہ کوئی ان کی لاشوں کو اٹھانے والا نہ رہا۔ وہ میدان میں پڑی رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر گوشت خوار چڑیاں بھیجیں جنھوں نے ان کا گوشت نوچا، کھایا اور وادئ مکہ کو ان کے تعفن سے پاک کیا۔ دشمن پر چڑیوں کو مسلط کرنا اس کی شکست و پامالی کی تعبیر کے لیے معروف کنایہ ہے۔ عرب شعراء نے اپنے فخریوں میں یہاں تک کہا ہے کہ جب ہماری فوجیں دشمن پر حملہ آور ہوتی ہیں تو گوشت خوار چڑیاں ہمارے ہم رکاب ہوتی ہیں، انھیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے حملہ سے دشمن پامال ہوں گے اور ان کو پیٹ بھر ان کا گوشت کھانے کا موقع ملے گا۔ تورات میں حضرت داؤدؑ اور جالوت کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس میں بھی ہے کہ جب حضرت داؤدؑ اس سے مقابلہ کرنے پر بضد ہوئے اور اس کی مغرورانہ باتوں کا جواب ترکی بہ ترکی دیا تو اس نے جھلا کر کہا کہ "اچھا، آج تیرا گوشت چیلوں اور کوؤں

---

[۱] لفظ 'ساف' بھی 'حاصب' کی طرح تند ہوا ہی کے لیے آتا ہے۔ دونوں میں صرف درجے کا فرق ہے۔

کو کھلاتا ہوں"۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اس پر غلبہ دیا اور خود اسی کے گوشت کو چیلوں اور گدھوں نے کھایا۔

ابابیل

'اَبَابِیْلَ' سے ابابیلیں مراد نہیں ہیں، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے۔ یہ لفظ گھوڑوں کی جماعت اور چڑیوں کے جھنڈ کے لیے آتا ہے۔ اس کے واحد اور جمع ہونے کے باب میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس کی واحد نہیں ہے۔ بعض اس کو 'اِبَّالَۃ' کی جمع بتاتے ہیں۔ یہاں یہ ان چڑیوں کے لیے آیا ہے جو مقتولوں کی لاشیں کھانے کے لیے جمع ہو جاتی ہیں۔

'اَرْسَلَ عَلَیْھِمْ' میں مسلط کر دینے کا مضمون ہے جس سے اصحاب فیل کی کس مپرسی کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ کوئی ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے والا نہیں تھا۔ اس وجہ سے چڑیوں کو پوری آزادی سے ان پر تصرف کرنے کا موقع ملا۔

تَرْمِیْھِمْ بِحِجَارَۃٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۝ فَجَعَلَھُمْ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ (۴-۵)

مفسرین کی ایک عام غلط فہمی

اب آخر میں بتایا کہ اس لشکر جرار کے تباہ کرنے میں کتنا حصہ عربوں کا ہے اور کتنا قدرت کا۔ فرمایا کہ تم ان کو پتھروں اور کنکروں سے مار رہے تھے، پس خدا نے ان کو کھانے کے بھس کی طرح پامال کر دیا یعنی اس لشکر جرار کے مقابلے میں تمہاری یہ مدافعت نہایت کمزور تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید غیبی سے تمہاری یہی کمزور مدافعت اتنی موثر بنا دی کہ وہ کھانے کے بھس کی طرح پامال ہو کر رہ گئے۔

ہمارے مفسرین تو عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ قریش نے ابرہہ کا کوئی مقابلہ نہیں کیا بلکہ ان کے سردار عبد المطلب قوم کو لے کر پہاڑوں میں جا چھپے اور خانہ کعبہ کو خدا کے سپرد کر دیا کہ جس کا یہ گھر ہے وہ خود اس کی حفاظت کر لے گا۔ ان کے نزدیک 'تَرْمِیْ' کا فاعل 'طَیْرًا اَبَابِیْلَ' ہے یعنی چڑیوں نے ابرہہ کی فوجوں پر سنگ باری کر کے ان کو پامال کر دیا۔ اگرچہ اس قول پر تمام مفسرین متفق ہیں لیکن گوناگوں وجوہ سے یہ بالکل غلط ہے جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے:

۱- اس میں شبہ نہیں کہ اس موقع پر قریش پہاڑوں میں چلے گئے تھے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مدافعت سے کلیۃً دست بردار ہو کر پہاڑوں میں جا چھپے تھے، بلکہ ابرہہ کی عظیم فوج کے مقابل میں مدافعت کی واحد ممکن شکل جو وہ اختیار کر سکتے تھے یہی تھی اس وجہ سے انھوں نے یہی اختیار کی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق کہ بندہ جب اپنے امکان کے حد تک اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس کی مدد فرماتا ہے، اس نے قریش کی مدد فرمائی۔

اوپر آپ پڑھ آئے ہیں کہ ابرہہ کا لشکر ساٹھ ہزار تھا اور اس کے ساتھ ہاتھیوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ میدان میں نکل کر اور صف بندی کر کے تلواروں کے ذریعہ سے کرنا قریش کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اگر اپنا پورا زور دار اثر استعمال کرتے تو بھی شاید دس بیس ہزار سے زیادہ آدمی

اکٹھے نہ کر پاتے، اس وجہ سے انھوں نے اپنے لیے بہترین جنگی پالیسی یہی خیال کی کہ میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے کے بجائے پہاڑوں میں محفوظ ہو جائیں اور وہاں سے گوریلوں کے طریقہ پر جس حد تک ان کے اقدام میں مزاحمت پیدا کر سکتے ہیں، کریں۔ یہ اسی طرح کی ایک تدبیر تھی جس طرح کی تدبیر مسلمانوں نے غزوۂ احزاب کے موقع پر اختیار کی۔ یعنی مدینہ کے اردگرد خندق کھود دی اور اس کے اندر محفوظ ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا۔

۲- جن لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قریش نے کوئی مزاحمت نہیں کی ان کا دعویٰ واقعات کے بھی خلاف ہے اور قریش کی حمیّت و غیرت کے بھی۔ تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ ابرہہ کی فوجیں جن راستوں سے گزریں ان کے عرب قبائل نے ان کو مزاحمت کے بغیر گزرنے نہیں دیا بلکہ یہ جانتے ہوئے کہ اس دل بادل فوج سے ان کے لیے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہے انھوں نے مزاحمت کر کے شکست کھانا تو گوارا کیا لیکن یہ ننگ نہیں گوارا کیا کہ دشمن خانۂ کعبہ پر حملہ کرنے کے لیے ان کے حدود کے اندر سے آسانی سے گزر جائے۔ صرف ایک قبیلہ، بنو ثقیف نے اہل عرب کی اس عام حمیّت کے خلاف روش اختیار کی۔ اس کے بعد ایک فرد، ابورغال نے ابرہہ کی فوج کو مکہ کا راستہ بتایا لیکن اس قبیلہ کو اس بے حمیّتی کی سزا یہ ملی کہ پورے عرب میں اس کی آبرو مٹ گئی اور ابورغال کا حشر یہ ہوا کہ اس کی قبر پر اہل عرب ایک مدت تک لعنت کے طور پر سنگ باری کرتے رہے۔ غور کیجیے کہ جب چھوٹے چھوٹے قبائل نے اس بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کیا تو قریش اس کے آگے اس بے حمیّتی کا اظہار کس طرح کرتے کہ اس کو بے روک ٹوک اللہ کے گھر پر قابض ہو جانے دیتے۔ اور اگر انھوں نے واقعی بغیر کسی مزاحمت کے اس کو راہ دے دی تھی تو ابورغال نے کیا گناہ کیا تھا کہ اس کی قبر پر وہ سنگ باری کرتے رہے۔ بہرحال یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ بغیر کوئی مزاحمت کیے پہاڑوں میں جا چھپے۔ قریش کی غیرت و حمیّت ہمیشہ مشہور رہی ہے۔ انھوں نے کبھی معمولی باتوں میں بھی کوئی ایسی کمزوری نہیں دکھائی جس سے ان کی غیرت و حمیت پر حرف آئے، تو وہ بیت اللہ کے معاملہ میں ایسی بے حمیّتی کا ثبوت کیونکر دے سکتے تھے جس پر ان کی دینی و دنیوی دونوں سیادتوں کا انحصار تھا۔ بیت اللہ کے بعد ان کے پاس بچ کیا رہتا تھا جس کے لیے وہ پہاڑوں میں چھپ کر زندگی بچانے کی تمنا کرتے!

۳- جن لوگوں نے قریش پر اس بے حمیّتی کا الزام لگایا ہے ان کے نزدیک اس سورہ کا درس گویا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس گھر کا محافظ خود ہے۔ اس کے پاسبان، دشمن سے ڈر کر، اگر اس کو چھوڑ کے بھاگ جائیں جب بھی خدا اس کی حفاظت کرے گا۔ چنانچہ جب قریش ابرہہ کی فوجوں سے ڈر کر پہاڑوں میں جا چھپے تو اللہ تعالیٰ نے ابابیلوں کے ذریعہ سے ان پر پتھراؤ کر کے ان کو بھس کی طرح پامال کر دیا۔ اگر فی الواقع اس سورہ کا درس یہی ہے تو یہ درس اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ

یہ نہیں ہے کہ بندے اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے بنی اسرائیل کی طرح یہ کہیں کہ فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (المائدۃ - ۵: ۲۴) (تم اور تمھارا خداوند جاؤ لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں) اور خدا ان کے لیے میدان جیت کر ان کے لیے تخت بچھا دے اور یہ اس پر براجمان ہو جائیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا کرنے والا ہوتا تو بنی اسرائیل کے ساتھ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ ان کو تو اس نے اس کی سزا یہ دی کہ چالیس سال کے لیے ان کو صحرا ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت جو قرآن سے واضح ہوتی ہے وہ تو یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی مدد فرماتا ہے جو اپنا فرض ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم اور ان کے وسائل کتنے ہی محدود ہوں۔ چنانچہ قرآن نے بیت اللہ سے متعلق سورۂ بقرہ، سورۂ توبہ، سورۂ حج وغیرہ میں ہماری جو ذمہ داریاں بتائی ہیں وہ یہی ہیں کہ ہم اس کی آزادی و حفاظت کے لیے جو کچھ ہمارے بس میں ہے وہ کریں، اللہ ہماری مدد کرے گا۔ یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ تم کچھ کرو یا نہ کرو ہماری ابابیلیں اس کی حفاظت کر لیں گی۔ بہرحال قریش نے جو کچھ ان کے امکان میں تھا وہ کیا، اگرچہ ان کی مدافعت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، کمزور تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حاصب کے ذریعہ سے ان کی اس کمزور مدافعت کے اندر اتنی قوت پیدا کر دی کہ دشمن کھانے کے بھس کی طرح پامال ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے موقع پر صرف مٹھی بھر خاک قریش کے لشکر کی طرف پھینکی تھی لیکن وہی مٹھی بھر خاک ان کے لیے طوفان بن گئی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی اہمیت یوں واضح فرمائی کہ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (الانفال - ۸: ۱۷) (اور وہ کنکریاں دشمنوں پر تم نے نہیں پھینکیں تھیں بلکہ اللہ نے پھینکیں)۔

عبدالمطلب کا اپنے رب سے استغاثہ

۴۔ عبدالمطلب نے جبل حرا پر چڑھ کر رب کعبہ سے جو استغاثہ کیا اس سے یہ بات نہیں نکلتی کہ وہ بیت اللہ کی مدافعت سے بالکل دست بردار ہو کر اور سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر کے، خود الگ ہو رہے ہیں بلکہ اس میں انھوں نے بعض فقرے تو ایسے کہے ہیں جن کے اندر ناز اور اعتماد کی وہ شان پائی جاتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا میں ہے جو آپ نے غزوۂ بدر کے موقع پر عین میدانِ جنگ میں فرمائی ہے۔ اس طرح کی دعا میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں کرتا بلکہ وہ شخص کرتا ہے جو اگرچہ حالات کی نزاکت سے پریشان تو ہوتا ہے لیکن اپنے رب کی قدرت سے مایوس نہیں ہوتا۔ اس دعا کو جن لوگوں نے فرار کے مفہوم میں لیا ہے انھوں نے نہایت بدذوقی کا ثبوت دیا ہے۔ میں تو جب اس کو پڑھتا ہوں مجھے اس کے اندر ایک رجز کی شان معلوم ہوتی ہے اور اس سے ایمان کی جھلک آتی ہے۔ آپ بھی ذرا اپنے ذوق کو بیدار کر کے یہ اشعار پڑھیے۔ ان میں کتنی حرارت اور اللہ تعالیٰ کی غیرت کو جوش میں لانے والی کتنی مؤثر اپیل ہے!

اللھم ان المرء یمنع رحله ۔۔۔ فامنع رحالك

(اے خدا، آدمی اپنے اہل وعیال کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے لوگوں کی حفاظت کر)

لا یغلبن صلیبھم — ومحالھم ابدا محالک

(ان کی صلیب اور ان کی قوت تیری قوت پر ہرگز غالب نہ ہونے پائے)

ان کنت تارکھم وقبلتنا — فامر ما بدا لک

(اگر تو ہمارے قبلہ کو ان کے رحم وکرم پر چھوڑنا چاہتا ہے تو کر جو تیری مرضی ہو)

کیا اس غیرت وحمیت کے شخص کے بارے میں یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ بہرحال یہ رائے ہمارے نزدیک بالکل بے بنیاد ہے کہ قریش میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ چڑیوں نے سنگ باری کر کے ابرہہ کی فوجوں کو پامال کیا۔ 'ترمی' کے فاعل، ہمارے نزدیک قریش ہیں جو 'الم تر' کے مخاطب ہیں۔ فعل 'ترمی' چڑیوں کے لیے کسی طرح موزوں ہے بھی نہیں۔ چڑیاں اپنی چونچوں اور چنگلوں سے سنگ ریزے گرا تو سکتی ہیں لیکن اس کو 'رمی' نہیں کہہ سکتے۔ 'رمی' صرف اسی صورت میں ہوگی جب پھینکنے میں بازو یا فلاخن کا زور استعمال ہو یا ہوا کے تند و تیز تھپیڑے اس کے ساتھ ہوں۔ چنانچہ جو لوگ چڑیوں کی رمی کے قائل ہوئے ہیں انھیں بھی، لفظ 'رمی' کھٹکا ہے۔ انھوں نے تکلف کر کے اس کی شکل یہ بیان کی ہے کہ چڑیاں مٹر کے دانوں کے برابر سنگ ریزے گراتی تھیں جو ہاتھیوں کے سواروں کے جسموں میں سے گزر کر ہاتھیوں کے جسموں میں گھس جاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے چڑیوں کی چونچوں سے گرے ہوئے سنگ ریزوں کا مؤثر ہونا تو دکھا دیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس صورت کو 'رمی' سے تعبیر کرنا کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

'سجیل' 'بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ' لفظ 'سِجِّيل' کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے۔[1] یہ فارسی کے سنگ گل سے معرب ہے۔ اس کا ترجمہ اگر کنکر کیجیے تو میرے نزدیک یہ صحیح ہوگا۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ عربوں کی یہ مدافعت ایک کمزور مدافعت تھی۔ اصل مقابلہ تو اس صورت میں ہوتا جب کھلے میدان میں صف بندی کر کے تلواروں، نیزوں اور تیروں سے دو بدو جنگ ہوتی۔ اگر حریف کے پاس ہاتھی تھے تو ان کے پاس بھی کم از کم گھوڑے ہوتے لیکن اس طرح کی جنگ کا، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، امکان نہیں تھا اس وجہ سے قریش نے آخری چارۂ کار کے طور پر یہ راہ اختیار کی کہ جہاں دا تو لگ گیا پہاڑوں سے پتھر لڑھکا کے دشمن کی راہ روکنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ یہ مدافعت ایک کمزور مدافعت تھی اور اس کی اس کمزوری ہی کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے 'بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ' کے الفاظ سے اس کی نوعیت واضح کر دی۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ (۵)

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت بیان فرمائی ہے کہ اگرچہ تمھاری مدافعت کمزور مدافعت تھی لیکن جب تم حوصلہ کر کے مدافعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی سنت کے مطابق تمھاری مدد کے لیے اپنی شان دکھائی اور ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح پامال کر دیا۔ کسی شے کا نام اس کے انجام کے اعتبار سے

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد سوم، صفحہ: ۴۰۷

رکھنا عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ "کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ" اسی نوع کی ترکیب ہے۔

یہاں یہ بات نگاہ میں رہے کہ رمی کی نسبت تو مخاطب کی طرف کی ہے لیکن ان کو کھائے کے بھس کی طرح کر دینا اللہ تعالیٰ نے اپنی شان بتائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر کو پامال کر دینا تنہا عربوں کی سنگ باری کے بس کی بات نہ تھی اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی شان دکھائی اور یہ شان ان کی سنگ باری کے پردے میں دکھائی۔ ہم پیچھے بعض عینی شاہدوں کا یہ بیان نقل کر آئے ہیں کہ ابرہہ کی فوجوں پر حاصب بھی چلی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حاصب اسی وقت چلی ہے جب عربوں نے وادیٔ محسّر کے کنکروں سے ان پر پتھراؤ کیا۔ یاد ہوگا کہ غزوۂ خندق کے موقع پر بھی ہوا نے مسلمانوں کی مدد کی تھی اسی طرح کی مدد اس موقع پر بھی نمودار ہوئی۔ ہم پیچھے یہ اشارہ کر آئے ہیں کہ ابرہہ کی فوجوں کے مقابل میں قریش نے اس سے ملتی جلتی تدبیر اختیار کی جو مسلمانوں نے احزاب کے مقابل میں اختیار کی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اب صرف ایک سوال قابلِ غور رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر واقعہ یہ ہے کہ ابرہہ کی فوجوں کی پامالی چڑیوں کی سنگ باری سے نہیں بلکہ عربوں کی سنگ باری اور حاصب کے ذریعہ سے ہوئی، چڑیاں صرف لاشوں کو کھانے آئی تھیں، تو ترتیب کلام یوں ہونی چاہیے تھی کہ "تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝" یہ سوال جن لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوا ہے ہمارے نزدیک وہ عربیت کے ایک خاص اسلوبِ بلاغت سے ناآشنا ہیں۔ وہ یہ کہ بعض مرتبہ کسی نتیجہ خیز یا شر کی مبادرت ظاہر کرنے کے لیے اس کو فعل کی پوری تفصیل سے پہلے ہی ظاہر کر دیتے ہیں۔ دعاؤں کی قبولیت کی مبادرت ظاہر کرنے کے لیے قرآن نے یہ اسلوب جگہ جگہ اختیار کیا ہے اور ہم اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں سورۂ نوح سے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں:

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ	نوح نے فریاد کی، اے میرے رب! انھوں نے
وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ	میری نافرمانی کر دی اور ان لوگوں کی پیروی کی
وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا ۝ وَمَكَرُوْا	جن کے مال اور اولاد نے ان کے خسارے ہی
مَكْرًا كُبَّارًا ۝ وَقَالُوْا	میں اضافہ کیا اور انھوں نے بڑی بڑی چالیں
لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ	چلیں اور اپنی قوم کو ورغلایا کہ اپنے معبودوں کو
لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ	ہرگز نہ چھوڑیو اور نہ چھوڑیو ود کو اور نہ سواع
وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ	کو اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو (اور اے
وَنَسْرًا ۝ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ	میرے رب) انھوں نے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر
وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ۝	رکھا ہے اور تو ان ظالموں کی گمراہی ہی میں اب
مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا	اضافہ کر، پس وہ اپنے گناہوں کی پاداش میں

فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۵ فَلَمْ یَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۵ وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ۵ اِنَّکَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا ۵

(نوح - ۷۱ : ۲۵ - ۲۷)

پانی میں غرق اور آگ میں داخل کیے گئے اور اللہ کے مقابل میں وہ اپنے لیے کوئی مددگار نہ پا سکے اور نوح نے کہا، اے میرے رب! تو ان کافروں میں سے زمین پر ایک متنفس بھی نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف نابکاروں اور ناشکروں ہی کو جنم دیں گے۔

ان آیات پر تدبر کی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے پہلے ہی فقرے کے بعد ان کی قوم کا انجام رکھ دیا گیا ہے اور ان کی باقی دعا مؤخر کر دی گئی ہے حالانکہ انجام بہرحال پوری دعا کے بعد ہی سامنے آیا ہوگا۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ قبولیتِ دعا کی مبادرت ظاہر کرنے کے لیے ترتیبِ کلام میں تقدیم یا تاخیر کر دی گئی! بالکل اسی طرح اس سورہ میں ابرہہ کی فوجوں کا انجام ظاہر کرنے کے لیے ان پر چڑیوں کے بھیجے جانے کا ذکر پہلے کیا اور ان کے پامال ہونے کا ذکر اس کے بعد کیا۔ سورہ کا مزاج چونکہ قریش پر امتنانِ احسان کا تھا اس وجہ سے بلاغت کا تقاضا یہی تھا کہ دشمن کی بدانجامی کی تصویر پہلے سامنے آئے۔

استاذ امام حمید الدین فراہی علیہ الرحمۃ نے اس سورہ کی تفسیر نہایت مفصل لکھی ہے۔ میں نے بقصدِ اختصار ان کی کتاب کی بعض باتیں اس میں نہیں لی ہیں حالانکہ وہ تفسیر کے پہلو سے نہایت اہمیت رکھنے والی ہیں۔ مولانا نے حج کے سلسلہ میں 'رمی جمرات' کی سنت کو اسی 'رمی' کی یادگار قرار دیا ہے اور بعض دوسری تحقیقات بھی نہایت اہم بیان فرمائی ہیں۔ اس کتاب کے قارئین کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ مولانا کی تفسیر بھی ضرور پڑھیں۔ اس سے ان کے زاویۂ نگاہ میں وسعت بھی ہوگی اور وہ فرق بھی سامنے آئے گا جو ان کے اور میرے نقطۂ نظر میں بہت باریک سا ہے۔

ان سطور پر اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمدًا کثیرًا۔

لاہور

۱۵- مئی ۱۹۸۰ء

۲۹- جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

١٠٦

القریش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور ترتیبِ بیان

یہ سورہ سابق سورہ ——— الفیل ——— کی توام ہے۔ اس کی تفسیر میں ہم دونوں سورتوں کے عمود کی طرف ایک جامع اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ قریش بیت اللہ کے ساتھ جس نوعیت کی وابستگی رکھتے تھے وہ ان پر واضح کر کے اس کے فطری حق کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے۔

سابق سورہ میں یہ دکھایا ہے کہ اس سرزمین میں ان کو جو امن حاصل ہے وہ اسی گھر کی بدولت حاصل ہے۔ اس سورہ میں یہ دکھایا ہے کہ اس سرزمین میں ان کو رزق کے جو وسائل حاصل ہیں ان کی راہیں بھی اسی گھر کی بدولت کھلی ہیں۔ اس وجہ سے حق ہے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں، اس کے اس حق میں بلا دلیل، دوسروں کو شریک نہ کریں۔

ایک اچھی حکومت سے شہریوں کو جو برکتیں حاصل ہوتی ہیں ان میں سرفہرست یہی دو چیزیں ہیں: امن اور رزق۔ سرزمینِ مکہ میں یہ دونوں برکتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بدولت قریش کو بیت اللہ ہی کے طفیل حاصل ہوئیں۔ اس کا فطری حق یہی تھا کہ ان کی وابستگی کلیتہً اللہ وحدہٗ لا شریک کے ساتھ ہوتی لیکن قریش نے شرک میں مبتلا ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے گھر میں دوسرے فرضی دیویوں دیوتاؤں کو لا بٹھایا۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ اس گھر کے ساتھ اپنی وابستگی کی نوعیت کو نہ بھولیں۔ یہ گھر انھیں خدا ہی نے امانت میں دیا تھا۔ اسی کی بدولت انھیں امن بھی حاصل ہوا اور اسی کے فیض سے رزق کی راہیں بھی کشادہ ہوئیں۔ اگر انھوں نے اس گھر کے رب کی ناشکری کی تو یاد رکھیں کہ اس گھر کی پاسبانی کا شرف بھی کھو بیٹھیں گے اور ساتھ ہی وہ تمام روحانی و مادی برکتیں بھی جو اس گھر کی بدولت انھیں حاصل ہیں۔

سورہ میں پہلے اس وابستگی کی خاص نوعیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو قریش کو سرزمینِ مکہ اور بیت اللہ کے ساتھ حاصل ہوئی۔ پھر ان کے ان تجارتی سفروں سے ساتھ ان کی وابستگی کا حوالہ دیا ہے جو سردیوں اور گرمیوں میں بالالتزام وہ کرتے اور جن پر ان کی تمام معاشی آسودگی کا انحصار

تھا۔ ان کی معاشی زندگی میں خون کی گردش انہی تجارتی سفروں سے تھی اور ان کی کامیابی کی ضمانت ان کو بیت اللہ کے متولّی ہونے کی بدولت حاصل تھی۔ اس شرف سے محروم ہو کر وہ یہ درجہ نہیں حاصل کر سکتے تھے کہ جو راستے دوسروں کے لیے غیر محفوظ تھے ان میں ان کے تجارتی قافلوں کی حفاظت کے لیے راہ کے قبائل بدرقہ فراہم کریں۔

سُوْرَةُ قُرَيْشٍ

مَكِّيَّةٌ ______ آیات: ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ﴿۲﴾ آیات ۱-۴
فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ﴿۳﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ
جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾ ع ۱

ترجمۂ آیات ۱-۴ بوجہ اس وابستگی کے جو قریش کو ہے۔ اس وابستگی کے سبب سے جو سردی اور گرمی کے سفر کے ساتھ ان کو ہے۔ پس چاہیے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں جس نے انھیں قحط کے سبب سے کھلایا اور خوف کے سبب سے امن بخشا۔ ۱-۴

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ (۱)

ایلاف کا مفہوم

'الف المکان والفہ ایلافا' کے معنی ہوں گے 'تعودہ واستانس بہ' وہ اس جگہ کا عادی اور اس سے مانوس ہے۔

'الفتہ مکان کذا ایلافا' کے معنی ہوں گے 'جعلتہ یالفہ' میں نے اس جگہ سے اس کو مانوس کر لیا۔

'الفہ مؤالفۃ والافا' کے معنی ہیں 'انسہ وعاشرہ' وہ اس سے مانوس ہوا اس کے ساتھ رہا سہا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ 'ایلاف' ہو یا 'الاف' دونوں ہی صورتوں میں معنی کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں ہوگا۔ اس کا اصل مفہوم اُنس، تعلق اور وابستگی ہے۔ اگرچہ 'لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ' کے مجمل الفاظ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ قریش کی کس چیز کے ساتھ وابستگی زیر بحث ہے لیکن آگے 'رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ' اور 'فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ ہٰذَا الْبَیْتِ' کے الفاظ سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں ان مفادات کے ساتھ ان کی وابستگی زیر بحث ہے جو انھیں بیت اللہ کے تعلق اور اس کی خدمت و تولیت کی بدولت حاصل ہوئے۔

گویا اس سورہ میں قریش کو یہ یاد دہانی کی جا رہی ہے کہ انھیں مکہ میں یا پورے ملک عرب میں جو عظمت و وقار اور اس کے نتیجہ میں جو غیر معمولی دنیوی مفادات حاصل ہیں ان میں اصلی دخل ان کی ذہانت و قابلیت اور ان کے حسن تدبیر و تدبر کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس گھر کے ساتھ تعلق و وابستگی کو ہے۔ اس وجہ سے ان پر واجب ہے کہ وہ اس گھر اور اس کے مالک کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت کو ہمیشہ یاد رکھیں، اپنی دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں ان حقوق و فرائض کو نہ بھول بیٹھیں جو اس گھر اور اس کے خداوند سے متعلق ان پر عائد ہوتے ہیں۔

اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ (۲)

ابہام کے بعد تفصیل

یہ سابق 'ایلاف' سے بدل ہے۔ پہلے بات مجمل طور پر کہہ کر نا تمام چھوڑ دی ہے تاکہ سننے والوں میں سوال پیدا ہو جائے کہ قریش کی کونسی وابستگی کس پہلو سے زیر بحث ہے؟ یہ اسلوب کلام قرآن میں بعض دوسرے مقامات میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کا

کو سننے کے لیے بیدار ہو جاتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی نوعیت اجمال کے بعد گویا تفصیل کی ہوتی ہے اس وجہ سے بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

قریش کے تجارتی سفروں کی نوعیت

فرمایا کہ یہاں خاص طور پر قریش کی جس وابستگی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے وہ ان کی وہ وابستگی ہے جو ان کو اپنے گرمی و سردی کے دونوں تجارتی سفروں کے ساتھ ہے۔ یہ واضح رہے کہ سردیوں میں قریش کے تجارتی قافلے یمن کا سفر کرتے اور گرمیوں میں شام و فلسطین کا۔ ان تجارتی قافلوں کے ساتھ پوری قوم کا مال اور سرمایہ ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں بہت سے تاجر ایسے ہوتے جو دوسروں کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتے اور ان کے واسطہ سے وہ لوگ بھی اس نفع بخش تجارت میں حصہ دار بن جاتے جو خود یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ یہی سفر درحقیقت اہل مکہ کی تمام دولت و ثروت کا ذریعہ تھے۔ اس طرح ان کی تمام قابل فروخت اشیاء دوسری منڈیوں میں پہنچتیں اور دوسرے بازاروں کی ضروری اشیاء ان کے صارفین کو حاصل ہوتیں۔ یہ تجارتی گزرگاہیں قریش کے لیے رگ جان کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اگرچہ یہ بین الاقوامی گزرگاہیں تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صحیح معنوں میں محفوظ صرف قریش کے لیے تھیں، دوسروں کو ان میں وہ تحفظ نہیں حاصل تھا جو قریش کو حاصل تھا۔ دوسروں کے قافلے ان میں علانیہ لُٹ جاتے، ان کو قدم قدم پر راہ میں واقع قبیلوں سے اجازت حاصل کرنی پڑتی اور اس کے لیے بھاری بھاری معاوضے ادا کرنے پڑتے، لیکن قریش کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اپنے تمام سامان تجارت کے ساتھ بے خطر گزرتے اور کسی کا ان سے تعرض کرنا تو درکنار راہ کے قبائل اپنے اپنے حدود میں ان کے لیے بدرقہ فراہم کرتے کہ یہ لوگ بیت اللہ کے خادم، اس کے متولی اور حاجیوں کی خدمت کرنے والے ہیں۔ اسی نسبت کو قرآن نے یہاں یاد دلایا ہے کہ اپنی دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں اس گھر کے رب کو نہ بھولو، تمھاری دنیوی کامیابیاں بھی اسی گھر کے طفیل سے ہیں اور اسی وقت تک تم ان کے حقدار ہو جب تک تم اس گھر کے وفادار ہو۔

بیت اللہ کے ساتھ قریش کے تعلق کی تاریخ

قریش کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ بیت اللہ کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ باہر سے کوئی قبیلہ آیا ہو، وہ مکہ میں آباد ہوا اور پھر اس گھر کا متولی بن بیٹھا ہو بلکہ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کو تعمیر کیا اسی وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کو اس گھر کے پاس بسایا تاکہ یہ اس مشن کو پورا کریں جو اس گھر کے ساتھ وابستہ ہے اور اسی وقت ان کے لیے امن اور رزق کی دعا کی جس کی برکات کا ذکر سابق سورہ میں بھی ہوا اور اس سورہ میں بھی آ رہا ہے۔ گویا قریش کو ان کی تاریخ یاد دلائی جا رہی ہے کہ اس گھر کے ساتھ ان کا تعلق اتفاقی نہیں بلکہ ایک خاص مشن اور مقصد پر مبنی اور شرائط کے ساتھ مشروط ہے جس کو وفاداری کے ساتھ نباہنے ہی میں ان کی دنیا اور آخرت کی فلاح ہے۔ اگر وہ اس کو بھول بیٹھے تو سب کچھ کھو بیٹھیں گے۔ سورۂ ابراہیم میں اس حقیقت

کی یاددہانی یوں فرمائی گئی ہے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ (ابراھیم - ۱۴: ۳۵ - ۳۷)

اور یاد کرو جب کہ ابراہیمؑ نے دعا کی: اے میرے رب! اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور مجھ کو اور میرے بیٹوں کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں! اے میرے رب! ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلقِ کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے۔ پس جو میری پیروی کریں وہ تو مجھ سے ہیں اور جو میری نافرمانی کریں تو تو غفور رحیم ہے۔ اے ہمارے رب! میں نے اپنی ذریت میں سے کچھ کو ایک بن کھیتی کی وادی میں، تیرے محترم گھر کے پاس، لا بسایا ہے تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں تو تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر اور ان کو پھلوں کی روزی دے تاکہ وہ تیرے شکرگزار رہیں۔

ان آیات سے واضح ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کے جوار میں جو بسایا تو ان مقاصد کی تکمیل کے لیے بسایا جو اس گھر کی تعمیر سے مدنظر تھے۔ اسی مقصد کی خاطر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے امن و رزق اور مرجعیتِ خلق کی دعا فرمائی جو قبول ہوئی اور ہر دور میں ان کو یہ نعمتیں حاصل رہیں۔ اسی چیز کی یہاں قریش کو یاددہانی فرمائی ہے کہ اس گھر کے ساتھ اپنے اس تعلق کو نہ بھولو، آج بھی تمہیں جو مرجعیتِ خلق حاصل ہے اور جس سے اپنے تجارتی سفروں میں فائدہ اٹھا رہے ہو اسی گھر کی برکت سے ہے۔ یہ انتہائی ناسپاسی ہوگی کہ اس کے تعلق سے تمہیں جو دنیوی فوائد حاصل ہیں ان سے تو بہرہ مند رہو اور اس کے جو حقوق و فرائض تم پر عائد ہوتے ہیں ان کو یکسر فراموش کر دو۔ یہ گھر خدائے واحد کی بندگی کے لیے تعمیر ہوا۔ اس کے مقصدِ تعمیر میں یہ بات شامل ہے کہ بتوں کی پرستش کی لعنت سے خلق کو بچایا جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی وجہ سے اس کو الگ تھلگ ایک وادی غیر ذی زرع میں بنایا لیکن تم نے اس کے کونے کونے میں بتوں کو لا بسایا یہاں تک کہ اب خدا تو اس گھر میں بالکل اجنبی ہو کے رہ گیا ہے البتہ اصنام کی خدائی اس کے ہر گوشہ پر قائم ہے۔

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۳-۴)

نعمتوں کا حق

اب یہ حق بیان فرمایا ہے اس رزق اور امن کا جو اس گھر سے وابستگی کی بدولت ان کو حاصل ہوا۔ فرمایا کہ جب ان کو رزق اور امن دونوں اسی گھر کے خداوند نے بخشے تو اس کا حق یہ ہے کہ وہ اس گھر کے خداوند ہی کی بندگی کریں۔ یہ امر واضح رہے کہ شرک کی تمام آلودگیوں کے باوجود قریش اس گھر کے خداوند سے ناآشنا نہیں ہوئے تھے۔ اپنے بتوں میں سے کسی کو بھی وہ اس گھر کا خداوند نہیں سمجھتے تھے۔ عبدالمطلب نے جو دعا ابرہہ کے حملہ کے موقع پر، جبلِ حرا پر کی اور جو سابق سورہ کی تفسیر میں مذکور ہوئی ہے، اس کو پڑھیے۔ اس میں اس گھر کی حفاظت کے لیے جو استغاثہ انھوں نے کیا ہے وہ تمام تر اس گھر کے خداوند ہی سے کیا ہے۔ اس میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی بتوں میں سے کسی کی طرف نہیں ہے۔ ان بتوں کی حیثیت ان کے نزدیک، جیسا کہ ہم جگہ جگہ اشارہ کرتے آرہے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی کہ ان کو وہ خدا کے تقرب کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اپنا خالق و مالک اور بیت اللہ کا رب وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ ان کے اس عقیدے میں کوئی فرق کبھی نہیں آیا۔

'جوع' اور 'خوف' کا خاص مفہوم

'اَلَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ'۔ اس ٹکڑے میں 'مِنْ' میرے نزدیک سببیہ ہے اور 'جوع' اور 'خوف' کے الفاظ خاص مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ 'جوع' سے مراد کسی علاقہ کی وہ خاص حالت ہے جو غذائی اشیا و اجناس کی قلت یا نایابی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح 'خوف' سے کسی علاقہ کی وہ حالت مراد ہے جو امن و امان کے فقدان اور جان و مال کے عدم تحفظ سے رونما ہوتی ہے۔ یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں اس خاص مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ (البقرۃ ۔ ۲ : ۱۵۵)

اور ہم تمھارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف، بھوک اور مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔

یہ علاقہ، جس میں حرم واقع ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد اور بیت اللہ کی تعمیر سے پہلے امن سے بھی، جیسا کہ تفصیل گزری، محروم تھا اور غذائی وسائل سے بھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نعمتوں سے اس علاقہ کو بیت اللہ کی برکت سے بہرہ ور کیا۔ قرآن میں اس کا ذکر جگہ جگہ قریش پر احسان کے طور پر ہوا ہے، مثلاً فرمایا ہے:

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجْبٰٓی اِلَیْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ (القصص ۔ ۲۸ : ۵۷)

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے تو ایک مامون حرم بپا نہیں کیا جس کی طرف ہر قسم کی پیداواریں کھنچی چلی آرہی ہیں۔

سورۂ عنکبوت میں فرمایا ہے:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (العنکبوت - ۲۹: ۶۷)

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے ایک مامون حرم بنایا اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ان کے اردگرد سے اچک لیے جاتے ہیں۔

یہی بات جامع الفاظ میں اس سورہ میں فرمائی ہے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں جس نے غذائی اجناس کی نایابی کے سبب سے ان کے لیے غذائی ضروریات کا سامان کیا اور جان ومال کے عدم تحفظ کے سبب سے ان کے لیے امن وامان فراہم کیا ـــــ مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں ان کو اس سرزمین میں حاصل ہیں تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہی سے حاصل ہیں۔ ان کے سبب سے استکبار میں مبتلا ہونے کے بجائے ان پر اپنے رب کا شکر واجب ہے اور شکر کا تقاضا رب کی بندگی اور اطاعت ہے نہ کہ نافرمانی و سرکشی۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً۔

لاہور

۲۱ - مئی ۱۹۸۰ء

۶ - رجب ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۰۷

الماعون

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق ولاحق سے تعلق اور ترتیب بیان

اوپر کی دو توں توام سورتوں ——— الفیل اور قریش ——— میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ قریش کو رزق و امن کی تمام نعمتیں بیت اللہ کی بدولت حاصل ہوئیں، اس کا حق یہ تھا کہ یہ لوگ اس گھر کے خداوند کی بندگی کرتے اور جس مقصد کے لیے یہ تعمیر ہوا تھا اور وہ ان کی تولیت میں دیا گیا تھا اس کو کامل وفاداری کے ساتھ پورا کرتے۔ اب آگے کی دونوں توام سورتوں ——— الماعون اور الکوثر ——— میں پہلے تو قریش کے ان لیڈروں کا کردار دکھایا جا رہا ہے جو سورہ کے زمانۂ نزول میں بیت اللہ کے منتظم و متولی تھے، پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اب یہ لوگ اس بات کے اہل نہیں رہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس محترم گھر کے متولی بنے رہیں، انھوں نے اس کے تمام مقاصد برباد کر دیے ہیں اس وجہ سے سزاوار ہیں کہ معزول ہوں اور یہ امانت ان لوگوں کے سپرد کی جائے جو اس کے اہل ہیں۔

سورۂ زیر بحث میں ترتیب بیان اس طرح ہے کہ پہلے قریش کے ایک لیڈر کے کردار کی طرف نہایت تعجب انگیز بلکہ نفرت انگیز انداز میں توجہ دلائی ہے کہ یہ شخص جس قساوتِ قلب کے ساتھ یتیموں کو دھکے دیتا ہے وہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ اس کا سینہ جزا و سزا کے عقیدے سے خالی ہے۔ اگرچہ اس کا نام نہیں لیا گیا ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اشارہ ابولہب کی طرف ہے جو سورہ کے زمانۂ نزول میں بیت اللہ کے تمام مالی وسائل پر تنہا قابض و متصرف تھا۔ اس کے بعد ان لوگوں کے کردار پر روشنی ڈالی ہے جو بیت اللہ میں آکر بظاہر نماز کی رسم ادا کرتے لیکن ان کی نماز بالکل بے روح، محض ایک قسم کی ایکٹنگ، ہوتی چنانچہ ان کی خست کا یہ حال تھا کہ انفاق تو در کنار روزمرہ ضروریاتِ زندگی کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ان سے کوئی مانگ بیٹھے تو وہ بھی دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ بیت اللہ کے بنیادی مقصد دو تھے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ واحد کی عبادت کا مرکز ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ فقراء اور یتامیٰ کی ہمدردی و خدمت کا ایک مؤثر ادارہ ہو۔ اس کے

متولیوں کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ان دونوں مقاصد کے پورے کرنے کا اہتمام کرتے لیکن جن متولیوں کا کردار بیان ہوا ہے ان سے ان دونوں میں سے کسی مقصد کے پورے ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس وجہ سے آگے کی سورہ میں ان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔

سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــ آیات: ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۷
أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ﴿١﴾ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ
الْيَتِيمَ ﴿٢﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴿٣﴾ فَوَيْلٌ
لِّلْمُصَلِّينَ ﴿٤﴾ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ﴿٥﴾
الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ﴿٦﴾ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ﴿٧﴾ ع ۲۲

ترجمۂ آیات ۱-۷
دیکھا تم نے اس کو جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے! وہی ہے جو یتیم کو دھکے
دیتا ہے اور مسکینوں کو کھلانے پر نہیں اُبھارتا۔ ۱-۲

پس ہلاکی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے بے خبر
ہیں۔ جو ریاکاری کرتے ہیں اور ادنیٰ چیزوں میں بھی بخالت کرتے ہیں۔ ۴-۷

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ (۱)

مکہ کا قارون

'اَرَءَيْتَ' کے اسلوبِ خطاب پر اس کے محل میں گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ اسلوب کسی کی طرف تعجب اور نفرت کے ساتھ متوجہ کرنے کے لیے آتا ہے۔ لفظ 'دِین' یہاں جزاء و سزا کے معنی میں ہے جس طرح 'مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ' (الفاتحۃ) میں ہے۔

'اَلَّذِيْ' سے کون مراد ہے؟ اس کی وضاحت یہاں نہیں ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اشارہ ابولہب کی طرف ہے۔ یہ ایک نہایت مال دار بخیل تھا جو حرم کے بیت المال (رفادہ) پر سورہ کے زمانۂ نزول میں، قابض تھا۔ آگے اس کے ذلیل کردار اور اس کی تباہی کا ذکر ایک مستقل سورہ ——— اللھب ——— میں آ رہا ہے۔ اس سورہ کی تفسیر سے واضح ہو جائے گا کہ اس نے رفادہ کو اپنی ذاتی جائداد بنا لیا تھا۔ اس کی آمدنی اپنے ذاتی مقاصد میں اس نے استعمال کی اور اس کی بدولت مکہ کا قارون بن گیا۔

یہاں اصل مقصودِ کلام تو اس کی شقاوت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جو شخص اتنا قسی القلب ہے کہ وہ یتیموں کو دھکے دیتا ہے اس سے کسی خیر کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے کہ وہ بیت اللہ کے کسی شعبہ کا ذمہ دار بن سکے لیکن بات ایسے اسلوب میں فرمائی ہے جس سے اس کا وہ باطن بھی سامنے آ گیا ہے جو اس کی اس قساوت کا اصل سبب ہے۔

آخرت کا منکر بے غرض انفاق نہیں کر سکتا

'يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ' کی صفت اس کے باطن پر عکس ڈال رہی ہے کہ وہ آخرت اور جزاء و سزا کا جھٹلانے والا ہے۔ جو شخص آخرت کا منکر ہو گا اس کے اندر اس انفاق کا کوئی محرک سرے سے باقی رہ ہی نہیں جاتا جو خدا کی خوشنودی اور خالصۃً خدمتِ خلق اور ہمدردیٔ غرباء کے لیے ہو۔ ایسا شخص اگر کچھ خرچ کرتا ہے تو اپنی کسی ذاتی غرض یا ریا و نمائش کے لیے کرتا ہے۔ بے غرض فیاضی صرف اسی شخص کے اندر پیدا ہوتی ہے جو آخرت کی جزاء و سزا پر صدقِ دل سے ایمان رکھتا ہے۔ سورۂ لیل میں اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۙ وَصَدَّقَ	پس جس نے دیا اور ڈرا اور اچھے انجام کی اس
بِالْحُسْنٰى ۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ؕ وَ	نے تصدیق کی تو ہم اس کے لیے آسان راہ ہموار
اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ وَكَذَّبَ	کریں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا

بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ (الیل - ۹۲ : ۵ - ۱۰) اور اس نے اچھے انجام کی تکذیب کی تو ہم اس کو دشوار راہ پر ڈالیں گے۔

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (۲)

اسلامی معاشرہ میں یتیم کا مرتبہ

فرمایا کہ یہی شخص ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا ہے۔ 'دَعٌّ' کے معنی دھکے دینے کے ہیں۔ فرمایا ہے، 'يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا' (الطور - ۵۲ : ۱۳) (جس دن وہ دھکے دے دے کر جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے)۔ یتیموں کے ساتھ صحیح رویہ جس کی تعلیم دی گئی ہے 'اکرام' کا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے، 'كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ' (الفجر - ۸۹ : ۱۷) (ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے) اسلامی معاشرہ میں، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے، ضعیف اس وقت تک سب سے زیادہ قوی اور باا ثر ہے جب تک اس کا حق اس کو مل نہ جائے۔ اس چیز کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد ان لوگوں کی دل سے عزت کرے جن کے حقوق ابھی ملنے ہیں۔ ان کے حقوق کی حمایت کرنا، ان کو ادا کرنے کی تلقین کرنا اور ان کو حاصل کرنے کے لیے سینہ سپر ہونا ہر حیثیت مسلمان کا فرض ہے۔

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۳)

یہ وہی بات منفی پہلو سے فرمائی ہے کہ بھلا جو شخص یتیموں کو دھکے دے گا وہ مسکینوں کی پرورش اور ان کی خدمت و اعانت پر لوگوں کو کیا ابھارے گا! اس حقیقت کی طرف جگہ جگہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ اپنی بخیلی پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی بخیل بنے رہیں تاکہ کوئی شخص ان کو بخیل کہنے والا نہ رہے۔ ان کی خواہش کے خلاف اگر کوئی کچھ خرچ کرتا ہے تو وہ، جیسا کہ سورۂ ھمزہ کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں، اس کو اپنے ہمز و لمز اور طعن و تشنیع کا ہدف بنا لیتے ہیں تاکہ شروع ہی میں اس کا حوصلہ پست کر دیں اور وہ اس راہ میں آگے نہ بڑھے۔

یہ امر واضح رہے کہ یہ اس شخص کا کردار بیان ہو رہا ہے جو اس زمانے میں بیت اللہ کے خاص اس شعبہ پر مسلط تھا جس کا تعلق غرباء و یتامیٰ کی خدمت سے تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ جب چور ہی کو توال بنا بیٹھا ہے تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ معلوم ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (۴ - ۵)

بیت اللہ کے پروہتوں کا نمازیں

یہ بیت اللہ کے ان پروہتوں کی نمازوں کی بے حقیقتی کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ یہ بیت اللہ کے متولی ہونے کے تعلق سے اپنے عوام کو دکھانے کے لیے نماز کی رسم بھی ادا کرتے ہیں لیکن ان کی نماز محض دکھاوے کی ہوتی ہے اس وجہ سے روح سے بالکل خالی، نری ریاکاری ہوتی ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ بیت اللہ کا اصل مقصد تعمیر نماز کا قیام تھا اور اس کے جوار میں حضرت اسمٰعیل

کو حضرت ابراہیمؑ نے خاص اسی مقصد سے بسایا تھا کہ وہ اور ان کی ذریت نماز کا اہتمام رکھیں۔ اسی کی خاطر انھوں نے ان کے لیے امن اور رزق کی دعا بھی فرمائی تھی۔ سورۂ ابراہیم میں یہ دعا یوں مذکور ہے:

رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (ابراہیم - ۱۴ : ۳۷)

اے ہمارے رب، میں نے اپنی ذریت میں سے بعض کو ایک بن کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے رب، تاکہ یہ نماز کا اہتمام کریں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے نماز کے قیام و اہتمام کا فریضہ جس طرح ادا فرمایا اس کی شہادت قرآن میں موجود ہے کہ وَکَانَ یَاۡمُرُ اَہۡلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ (مریم - ۱۹ : ۵۵) (اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا) اگرچہ بعد کے ادوار میں مبتدعین اور خائنوں کے تسلط کے سبب سے نماز اور زکوٰۃ دونوں کا حلیہ بالکل بگڑ گیا۔ زکوٰۃ کا جو حشر ہوا اس کی تفصیل اوپر گزری۔ نماز کا جو حال ہوا اس کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ سورۂ انفال کی آیت ۳۵ میں موجود ہے: وَمَا کَانَ صَلَاتُہُمۡ عِنۡدَ الۡبَیۡتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصۡدِیَۃً (الانفال - ۸ : ۳۵) (بیت اللہ کے پاس ان کی نماز سیٹی اور تالی بجانا رہ گئی ہے) تاہم اپنی بگڑی ہوئی صورت میں سہی یہ چیزیں باقی رہیں اور جس طرح ہر دور کے لیڈر اپنے عوام کو بے وقوف بنائے رکھنے کے لیے مذہبی رسوم کی نمائش کرتے رہتے ہیں اسی طرح قریش کے لیڈر بھی خاص خاص مواقع پر ان رسوم کی نمائش کرتے رہتے تھے۔ ان کی اسی نماز پر فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے لیے تباہی ہے جو اپنی نمازوں کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ ۙ وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (۶-۷)

نمازوں کی بے حقیقتی کی وضاحت

یہ ان کی نمازوں کی بے حقیقتی کی وضاحت ہے کہ یہ محض دکھاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی نہایت بخیل ہیں۔ یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی نمازوں کے بے روح و بے جان ہونے پر دو چیزوں سے دلیل قائم کی ہے۔ ایک ان کی ریاکاری سے دوسرے ان کی خست سے۔

نماز کی اصل حقیقت اخلاص ہے۔ یعنی وہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی خوشنودی اور رضاطلبی کے لیے پڑھی جائے۔ اس کے سوا اگر کوئی اور غرض اس میں شامل ہو جائے تو نماز بالکل باطل اور اپنے اصل مقصد کے اعتبار سے نہ صرف بے نتیجہ بلکہ نہایت مہلک ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی نمازیں اول تو ان کے فساد عقیدہ کے سبب سے اخلاص سے محروم تھیں ثانیاً وہ پڑھتے بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، محض دکھاوے ہی کے لیے تھے تاکہ ان کے عوام ان کو مذہبی سمجھیں۔ اس طرح کی نماز ظاہر ہے کہ محض

ایکٹنگ ہوتی ہے جس کا زندگی کے حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔ جس طرح کسی ڈرامے میں مجنوں کا پارٹ ادا کر دینے سے کوئی مجنوں نہیں بن جاتا اسی طرح اس قسم کے لوگ مسجد میں آجانے اور رکوع سجود اور قیام و قعود کی نمائش کر دینے سے نمازی نہیں بن جاتے۔

علاوہ ازیں ان لوگوں کی خسّت بھی اس بات کی دلیل تھی کہ ان کی نمازیں بالکل بے روح و بے جان ہیں۔ نماز کی اصل روح اپنے رب کی شکرگزاری ہے۔ جو بندہ اپنے رب کا شکرگزار ہوتا ہے وہ خسیس و لئیم نہیں ہوتا بلکہ فیاض و کریم ہوتا ہے۔ وہ اپنے رب کی نعمتوں میں دوسروں کو شریک کرتا اور اس کو ان کا حق سمجھتا ہے۔ اس کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ جب میرے رب نے مجھے بخشا ہے تو اس کی شکرگزاری کا تقاضا یہ ہے کہ میں اس میں ان لوگوں کو شریک کروں جو اس سے محروم ہیں اور یہ جذبہ اس پر اس قدر غالب ہوتا ہے کہ بسا اوقات وہ اپنی ضرورت کو نظرانداز کر کے دوسروں کی مدد کرنے میں لذت و حلاوت محسوس کرتا ہے۔ نماز اور انفاق کے باہمی تعلق پر اس کتاب میں جگہ جگہ بحث ہو چکی ہے۔ فلسفۂ دین کے اعتبار سے جذبۂ شکر کی تحریک سے سب سے پہلے نماز وجود میں آتی ہے اور پھر نماز انفاق کے لیے محرک بنتی ہے اور پھر انہی دو چیزوں پر شریعت کا پورا نظام قائم ہے۔

ماعون کا مفہوم

'وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ' لفظ 'مَاعُون' روزمرہ استعمال کی ان چیزوں کے لیے آتا ہے جن کے عاریتًہ لین دین میں کوئی قباحت خیال نہیں کی جاتی بلکہ ہر پڑوسی اپنے پڑوسی سے ان کو بعض اوقات مانگنے پر مجبور ہوتا ہے اور ان کا مانگنا اور دینا دونوں اچھے معاشرہ میں حسنِ معاشرت کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی پڑوسی کو آپ سے کسی ضرورت سے ایک چارپائی یا بستر، یا کوئی برتن یا چھری یا دیاسلائی یا اسی طرح کی کوئی اور چیز مانگنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے تو ہر شریف پڑوسی اس کی ضرورت نہایت خوش دلی سے پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ صرف وہی لوگ اس طرح کے موقع پر تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو نہایت لئیم ہوتے ہیں۔ اس طرح کے لئیم اگر نماز پڑھتے ہیں تو ان کی نماز محض نمائش ہوتی ہے۔ اس نماز کے لیے نہ کوئی محرک ان کے دل کے اندر ہوتا اور نہ یہ نماز کسی پہلو سے ان کے دل پر اثرانداز ہوتی۔ بلکہ نمائش ہونے کے سبب سے یہ ان کی قساوت میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

بعض لوگوں نے اسی 'فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ...... الاٰیۃ' والے ٹکڑے کی بنا پر اس سورہ کو مدنی قرار دیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی ریاکارانہ نماز پڑھنے والے تو مدنی دور میں پیدا ہوئے ہیں مکی دور میں اس قسم کے لوگ کہاں تھے؟ اس غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ اس سے انھوں نے وہ نماز مراد لی ہے جس کا حکم اسلام نے دیا ہے۔ حالانکہ اس سے مراد، جیسا کہ ہم نے وضاحت کی،

وہ نماز ہے جس کے قیام کا حکم حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی ذرّیت کو بیت اللہ کی تعمیر کے ساتھ ہی دیا گیا تھا اور جس کی روایت بعد کے ادوار میں بھی باقی رہی اگرچہ اس کا حلیہ بدعات کے غلبہ کے سبب سے بہت بگڑ گیا تھا۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمداً کثیرًا۔

لاہور
۲۶ - مئی سنہ ۱۹۸۰ء
۱۱ - رجب سنہ ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

١٠٨

الکوثر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور پیغمبرؐ کو بشارت

سابق سورہ ـــــ الماعون ـــــ میں آپ نے دیکھا کہ قریش کے لیڈروں پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ بیت اللہ کے جوار میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کو جس مقصد کے لیے بسایا اور جس کی خاطر ان کے لیے امن اور رزق کی دعا فرمائی وہ مقصد انھوں نے بالکل برباد کر دیا۔ یہ گھر خدائے واحد کی عبادت اور فقراء و یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے مرکز کی حیثیت سے قائم کیا گیا لیکن اب جو لوگ اس پر قابض ہیں ان کو نہ نماز کی خبر ہے نہ یتیموں اور مسکینوں کے حقوق کا کوئی لحاظ ہے۔ اس بات کے بیان سے مقصود ظاہر ہے کہ قریش کے اس فخر و ناز پر ضرب لگانا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس گھر کا متولی جو سمجھے بیٹھے ہیں اور یہ گمان جو رکھتے ہیں کہ وہ خدا کے منظورِ نظر ہیں ان کو یہاں سے کوئی ہلا نہیں سکتا، یہ محض ایک زعمِ باطل ہے۔ لیکن اس سورہ میں صرف فردِ قرارداد جرم بیان کر کے بات ختم کر دی۔ یہ نہیں بتایا کہ اس جرم پر یہ لوگ کس سزا کے مستحق ہیں؟ یہ بات مستقلاً سورۂ زیرِ بحث میں بتائی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو براہِ راست خطاب کر کے بشارت دی ہے کہ اب خیرِ کثیر کے اس خزانہ یعنی بیت اللہ کو ان خائنوں سے لے کر ہم نے تمھاری تحویل میں دیا تو تم اپنے رب ہی کی نماز پڑھنا اور اسی کے لیے قربانی کرنا، ان مشرکوں کی طرح اس کو شرک سے آلودہ نہ ہونے دینا۔ ساتھ ہی مخالفین کو یہ وعید بھی سنا دی کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی جو رحمتیں اور برکتیں حاصل ہوئیں وہ اس گھر کی بدولت ہی حاصل ہوئیں، اس سے منقطع ہو جانے کے بعد وہ تمام برکتوں سے محروم ہو جائیں گے جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ ان کی جڑ ہی کٹ جائے گی۔ ان برکتوں سے اب اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نوازے گا جو اس کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور اس کے حقوق ادا کریں گے۔ وہ اس سرزمین میں تمکن و اقتدار حاصل کر کے اس گھر کو اس کے اصل ابراہیمی جمال سے منور کریں گے۔

یہ سورہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بشارت کی سورہ ہے اور 'اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ' میں حرفِ تاکید اور صیغۂ ماضی وعدے کی قطعیت کے اظہار کے لیے ہے جس کی مثالیں قرآن میں جگہ جگہ موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں جو بات طے ہو جاتی ہے اس کو کوئی دوسرا بدل سکنے پر قادر نہیں اس وجہ سے اگرچہ وہ مستقبل کے متعلق ہو لیکن قطعیت کے اظہار کے لیے ماضی کے صیغہ میں کی جاتی ہے بالخصوص بشارت کے مواقع میں۔

مکی زندگی کے آخری دور میں، جب مسلمانوں پر مکہ میں عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے فتح و غلبہ کی بشارت مختلف سورتوں میں دی گئی ہے۔ یہ بشارت بھی اسی نوعیت کی ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس بشارت ہی کے سبب سے اس سورہ کو واقعۂ حدیبیہ کے دور سے متعلق مانا ہے، استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے، لیکن میرے نزدیک اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ قرب ہجرت کی سورتوں میں مسلمانوں کی تسلی کے لیے اس قسم کی بشارتیں دی گئی ہیں اور وہ ہر گروپ کی آخری مکی سورتوں میں موجود ہیں۔ ان کے حوالے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قریش پر روز اول ہی سے یہ بات واضح تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کا جھگڑا یہ ہے کہ ملت ابراہیم پر کون ہے، وہ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؛ پھر اسی جھگڑے کا لازمی نتیجہ یہ بھی وہ سمجھتے تھے کہ بیت اللہ کی تولیت کا اصلی حقدار وہی ہے جو اصل ملت ابراہیم کا وارث ہے۔ قریش اپنے موروثی پندار کی بنا پر اپنے آپ کو ملت ابراہیم کا وارث اور بیت اللہ کی تولیت کا حق دار سمجھتے تھے اور یہ رعونت ان کے اندر اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ حرم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے نماز پڑھنے تک کے بھی روادار نہ تھے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ذہن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے یہ حقیقت اچھی طرح راسخ ہو چکی تھی کہ بیت اللہ پر قریش کا قبضہ غاصبانہ ہے اور ایک دن اس کو ان کے قبضہ سے آزاد کرانا بعثتِ محمدی کی اصل غایت ہے۔

یہ بات بھی فریقین پر واضح تھی کہ جو اس گھر سے کٹا وہ ایک شاخ بریدہ ہو کے رہ جائے گا اور اس کی جڑ سارے عرب سے کٹ جائے گی۔ یہ چیز بھی مقتضی تھی کہ ہجرت کے موقع ہی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اطمینان دلا دیا جائے کہ بیت اللہ کی خدمت و تولیت کا شرف ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ جو کشمکش اس وقت قریش کے ساتھ برپا ہے وہ اللہ کے رسول کے غلبہ پر منتہی ہو گی اور جڑ اللہ کے رسول کی نہیں کٹے گی، جیسا کہ قریش گمان رکھتے ہیں، بلکہ اعدائے رسول کی کٹے گی۔ درحقیقت نصرتِ الٰہی کی یہی بشارت تھی جس نے مسلمانوں کے لیے ہجرت جیسے کٹھن امتحان کو آسان بنا دیا ورنہ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ کوئی آسان بازی نہیں تھی۔

سُورَةُ الكَوْثَرِ

مَكِّيَّة ______ آيات: ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿۲﴾ آیات ۱-۳
إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ﴿۳﴾ ع ۳۲

ہم نے تم کو بخشا کوثر تو اپنے خداوند ہی کی نماز پڑھو اور اسی کے لیے قربانی کرو۔ تمھارا دشمن ہی منقطع ہونے والا ہے۔ ۱-۳ ترجمۂ آیات ۱-۳

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّآ أَعْطَيْنَٰكَ ٱلْكَوْثَرَ (۱)

لفظ کوثر کی تحقیق

'کوثر' مبالغہ ہے 'کثر' کا۔ 'کثر' کے معنی دولت و ثروت کے ہیں۔ اس وجہ سے 'کوثر' کے معنی ہوں گے بڑی کثرت اور بڑی برکت و ثروت والا۔ یہ تسمیہ کے لیے بھی مستعمل ہے اور بطریق صفت بھی اس کا استعمال عام ہے۔

ازروئے عربیت یہاں کوثر کی تین تاویلیں ممکن ہیں:

۱۔ یہ اسمیت کی طرف منتقل ہو کر کسی خاص چیز کے لیے مخصوص ہو گیا ہو جس کا نام اللہ تعالیٰ نے 'کوثر' رکھا ہو۔

۲۔ اس کو کسی ایسے موصوف محذوف کی صفت مانیے جس کے ساتھ اس کو خصوصیت ہو۔ مثلاً کہتے ہیں 'مرد علیٰ جرد' یعنی رجال مرد علیٰ خیل جرد (نوخیز جوان اصیل گھوڑوں پر) قرآن مجید میں ہے: 'وَالذّٰرِیٰتِ' (الذّٰریٰت - ۵۱: ۱) یعنی والریاح الذّٰریٰت (غبار اڑانے والی ہواؤں کی قسم) ...... لیکن یہ اسی صورت میں جائز ہے جب صفت اس موصوف کے لیے اس طرح مخصوص ہو کہ یا تو صفت کا ذکر کرتے ہی موصوف ذہن میں آجائے یا کوئی واضح قرینہ اس کی طرف اشارہ کر دے۔

۳۔ تیسری شکل یہ ہے کہ اس کو اسمائے صفت کی طرح اس کے عموم ہی پر باقی رکھیے۔ اس صورت میں اس سے ہر وہ چیز مراد لی جا سکے گی جس میں خیر کثیر ہو۔ البتہ قرائن کے اشارہ سے بعض افرادِ صفت پر اس کی دلالت زیادہ واضح ہو گی۔

کوثر کے باب میں سلف کے اقوال

لفظ کی لغوی تحقیق کے بعد اب یہ دیکھیے کہ سلف نے اس کے کیا معنی لیے ہیں۔

ابن جریرؒ نے کوثر کی تاویل میں تین قول نقل کیے ہیں:

۱۔ 'کوثر' جنت میں ایک نہر ہے۔ یہ حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت انسؓ، مجاہدؒ اور ابوالعالیہؒ سے مروی ہے۔

۲۔ 'کوثر' سے مراد خیر کثیر ہے۔ یہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت سعید بن جبیرؓ، عکرمہؒ، قتادہؒ اور مجاہدؒ سے مروی ہے۔

۳۔ 'کوثر' جنت میں ایک حوض ہے۔ یہ عطاؒ سے مروی ہے۔

ان میں سے پہلے اور تیسرے قول میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حوض اسی نہر جاری کا ہو جس کا ذکر پہلے قول میں ہے۔ اس کے بعد صرف دو قول رہ جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے خاص چیز مراد لی جائے، مثلاً 'حوضِ محشر' یا 'نہرِ جنت'۔ دوسرا یہ کہ اس کو عام رکھا جائے تاکہ ہر وہ چیز مراد لی جا سکے جس میں خیرِ کثیر ہو۔

استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حسنِ تدبر سے ان دونوں قولوں میں نہایت خوبی سے تطبیق پیدا کر کے دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ انھوں نے سورہ کے موقع و محل اور اس کی اندرونی شہادتوں سے 'کوثر' سے مراد خانۂ کعبہ کو لیا ہے جو گوناگوں پہلوؤں سے خیرِ کثیر کا خزانہ بھی ہے اور اس دنیا میں اس نہرِ کوثر کا مجاز بھی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت میں ملنے والی ہے۔ انھوں نے بعض قرائن اور شہادتوں کی روشنی میں یہ بات فرمائی ہے اس کی وضاحت اپنی تفسیر سورۂ کوثر میں فرمائی ہے۔ وہ کوثر کے باب میں اقوالِ سلف کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"پچھلی فصلوں میں معلوم ہو چکا ہے کہ سلف نے کوثرِ آخرت کے بارے میں اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ لفظ کی عمومیت اور صیغۂ ماضی کی رعایت سے وہ چیزیں بھی اس کے دائرہ میں داخل کر دی ہیں جو داخل ہو سکتی تھیں تاکہ لفظ عام، وسیع اور اپنی دلالت میں اسم بامسمّٰی (کوثر) ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے مفسرین نے اس میں جستجو اور کاوش جائز سمجھی[1]۔ اگر اس کے متعلق کچھ کہنا بدعت و ضلالت ہوتا تو وہ خاموش رہتے اور سلف بھی اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ کرتے۔ اس وجہ سے میں اگر کسی ایسی تاویل کا سراغ لگاؤں جو زمین کے 'کوثر' (خانۂ کعبہ) اور آسمان کے 'کوثر' کو ایک کر دے تو جس طرح میں سلف کو اس کی تاویل میں ایک دوسرے کے خلاف نہیں پاتا اسی طرح اپنے کو بھی ان کے خلاف نہ سمجھوں گا البتہ یہ فرق ہو گا کہ انھوں نے اس کو عام قرار دے کر اس سے حوض یا نہرِ جنت سمجھی اور ان کے ماسوا ہر وہ چیز جس میں خیر کثیر ہو، مثلاً قرآن، حکمت، اسلام، نبوت جن کو حوض یا نہر سے کوئی مناسبت نہیں ہے، مگر میں اس سے وہ چیز مراد لوں گا جس کو حوض یا نہر سے نہایت واضح مشابہت ہے، جس کی کیفیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں اور جس کی حقیقت و روحانیت شبِ معراج میں آپ کے سامنے بے نقاب ہوئی۔"

اس تمہید کے بعد مولانا علیہ الرحمۃ ان اشارات کی تفصیل کرتے ہیں جن سے ان کے قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

---

[1] یہ اشارہ امام رازیؒ وغیرہ کے اقوال کی طرف ہے جن کا حوالہ مولانا فراہیؒ نے اپنی تفسیر میں دیا ہے۔

۱۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے نفوس کے اندر خدا کی طرف ایک فطری شوق و رغبت موجود ہے۔ نفسِ انسانی اس چیز سے محروم رہ کر تسلی نہیں پا سکتا۔ انسان کی یہی فطرت مذاہب و ادیان کے وجود کا باعث ہوئی ہے۔ …… اب سوچو کہ اس فطری اشتیاق اور چاہ کی موزوں تعبیر پیاس کے سوا کس چیز سے ہو سکتی ہے؟ زبور میں یہی تعبیر بار بار استعمال ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کو پیشِ نظر رکھ کر ان عاشقانِ الٰہی کے حال پر غور کرو جو حج کے ایام میں سراپا شوق و آرزو بن کر بیت اللہ کے ارد گرد جمع ہوتے ہیں۔ کیا ان کی مثال ان خشک لب پیاسوں کی نہیں ہے جو شدید تشنگی سے مضطر ہو کر کسی حوض کے پاس جمع ہو گئے ہوں؟ اگر یہ مشابہت واضح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خانۂ کعبہ ان کے لیے اس دنیا میں اس حوضِ کوثر کی مثال ہے جس پر میدانِ حشر میں وہ یکجا ہوں گے۔

۲ - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری مسجدوں کو نہر سے تشبیہ دی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:

أرأيتم لو أن نهرًا بباب	بھلا بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر
أحدكم يغتسل فيه كل	ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا ہو
يوم خمسًا (الحديث)	تو کیا اس کے اوپر کچھ میل کچیل باقی رہے گا۔

یہ تمثیل بھی اصلاً پانی ہی کی ہے۔ پانی جس طرح سیرابی کا ذریعہ ہے اسی طرح طہارت کا بھی ذریعہ ہے اور یہ معلوم ہے کہ ہماری تمام نمازوں کا سرچشمہ بیت اللہ ہے۔ اس اعتبار سے ہماری تمام مسجدیں گویا اس سرچشمہ کی نہریں ہیں جن سے ہم سیرابی اور پاکی حاصل کرتے ہیں۔

۳ - خانۂ کعبہ کے اجتماع سے جس طرح دوسری امتوں کے مقابل میں امتِ مسلمہ کی کثرت کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح حوضِ کوثر پر اس کے اجتماع سے بھی، جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے، اس کی کثرت کا اظہار ہو گا۔ اس کثرت کے ظاہر کرنے کی بہترین شکل یہی تھی کہ کسی ایک مخصوص مقام پر اس کا اجتماع ہو۔ اس اجتماع سے دوسری امتیں اندازہ کرتی ہیں کہ زائرینِ بیت اللہ کا یہ متلاطم سمندر اس بحرِ بیکراں کا صرف ایک قطرہ ہے جو پورے کرۂ ارض پر پھیلا ہوا ہے۔ پس جس طرح حوضِ کوثر پر اس کے اجتماع سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی امتوں پر اس کی کثرت واضح ہو گی اسی طرح موسمِ حج میں خانۂ کعبہ کے پاس اس کا اجتماع اظہارِ کثرت کا ایک جلوہ ہے۔ غور کرو، لفظ 'کوثر' ان دونوں کی مطابقت کس خوبی سے واضح کر رہا ہے۔

۴ - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آپ اپنی امت کو حوضِ کوثر پر وضو کے

آثار سے پہچانیں گے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ خلوص قلب کے ساتھ اس گھر کی زیارت کریں گے وہی لوگ آخرت میں اس حوض پر آئیں گے جو اس گھر کی حقیقت ہے۔

۵۔ فتح مکہ کو اللہ تعالیٰ نے امت کی کثرت کا سبب بنایا چنانچہ حج اکبر کے بعد لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوئے۔

۶۔ مسجد حرام کو اللہ تعالیٰ نے مبارک (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ۔ (آل عمران - ۳: ۹۶)

"بلاشبہ خدا کا پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا وہی ہے جو مکہ میں ہے، سرچشمۂ خیر و برکت اور لوگوں کے لیے نشانِ ہدایت۔"

ہم نے اختصار کے خیال سے صرف چند اہم اشارات یہاں نقل کیے ہیں۔ جن لوگوں کو تفصیل مطلوب ہو وہ مولانا علیہ الرحمۃ کی تفسیر سورۂ کوثر کی مراجعت کریں۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے چل کر اپنی تفسیر میں یہ بھی واضح فرمایا ہے کہ نہر کوثر درحقیقت کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی حقیقت ہے۔ ایک ضروری اقتباس اس سلسلے کا بھی ملاحظہ فرمائیے:

"معراج میں جو نہر کوثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشاہدہ کرائی گئی اس کی صفات پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ نہر کوثر درحقیقت کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی حقیقت ہے۔ اس کے متعلق مختلف طریقوں سے جو روایات منقول ہیں ان کی قدرِ مشترک یہ ہے کہ کوثر، ایک نہر ہے، اس کے کناروں پر مجوّف موتیوں کے محل ہیں۔ اس کی زمین یاقوت و مرجان اور زبرجد کی ہے۔ اس میں ظروف ہیں جو آسمان کے تاروں کے مانند ہیں، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں اور برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔ اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔ اس پر چڑیاں اترتی ہیں جن کی گردنیں قربانی کے جانوروں کی طرح ہیں۔"

آگے مولانا علیہ الرحمۃ ان مشاہدات پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہوئے زمین کے حوض کوثر اور آسمان کے حوض کوثر کی مشابہت یوں واضح فرماتے ہیں:

"اب ایک لمحہ توقف کر کے کعبہ اور اس کے ماحول کے مشاہدات پر غور کرو جب تمام اکنافِ عالم سے عشاقِ الٰہی کے قافلے، عشق و محبتِ الٰہی کی پیاس بجھانے کے لیے اس چشمۂ خیر و برکت کے پاس اکٹھے ہوتے ہیں۔ کیا ان کے احساسِ روحانی میں اس مقدس وادی کے سنگ ریزے یاقوت و زمرد سے زیادہ خوش جمال، اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار اور اس کے اردگرد

حجاج کے خیمے مجوف موتیوں کے قبوں سے زیادہ حسین و خوبصورت نہیں ہوتے! پھر حجاج اور ان کے ساتھ قربانی کے اونٹوں کی قطاروں پر بھی نظر ڈالو کیا یہ ایک چشمہ کے کنارے لمبی گردن والی چڑیوں کا جھنڈ نہیں ہے!!"

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ جنت کے حوض کوثر اور خانہ کعبہ میں نسبت حقیقت اور مجاز کی ہے۔ یہی خانہ کعبہ جنت میں حوض کوثر کی صورت میں ان لوگوں کو ملے گا جو اس پر پہنچنے کے شوق میں بیت اللہ کے حج کرتے رہے۔ سورہ کے زمانۂ نزول تک چونکہ حالات پردے میں تھے اس وجہ سے بات اشاروں میں فرمائی گئی ہے لیکن مقصد یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بشارت دی جائے کہ اگرچہ آپ کے اعداء آپ کو اس گھر سے نکال دینے کے درپے ہیں لیکن ہم نے یہ آپ کو بخش دیا اور یہ اس دنیا میں بھی آپ کے لیے خیر کثیر کا ضامن ہے اور آخرت کی نہر کوثر کا بھی ضامن ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿۲﴾

اس ذمہ داری کا بیان جس کے ساتھ یہ عطیہ مشروط ہے

یہ اس ذمہ داری کا بیان ہے جس کے ساتھ یہ عطیہ مشروط ہے۔ ہر حق کے ساتھ ذمہ داری کا ہونا لازمی اور اس کے ادا کرنے ہی پر اس حق کے قیام و بقاء کا انحصار ہوتا ہے۔ کوئی حق بھی ذمہ داری کے بغیر حاصل نہیں ہوتا! اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قریش کو اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی تولیت نہایت اہم ذمہ داریوں کے ساتھ سونپی تھی جن میں سے اہتمام نماز اور انفاق (جس کی ایک معروف شکل بیت اللہ کے تعلق سے قربانی بھی ہے) کو خاص اہمیت حاصل تھی لیکن انھوں نے نماز اور قربانی دونوں ضائع کر دی۔ نماز کے ضائع کرنے کی جو شکل ہوئی اس کی تفصیل اوپر گزر چکی۔ قربانی انھوں نے یوں ضائع کی کہ شرک میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے ان کی قربانی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں رہ گئی بلکہ اس میں ان کے شرکاء و اصنام بھی شریک ہو گئے۔ یہاں جب اس عطیۂ گرامی کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشے جانے کا اعلان فرمایا تو ساتھ ہی اس گھر سے متعلق ان دو بڑی ذمہ داریوں کی یاد دہانی بھی فرما دی جو اس کے مدعی متولیوں نے ضائع کر دی تھیں اور جن کے ضائع کرنے کے جرم ہی میں وہ اس منصب سے معزول کیے جانے کے مستحق قرار پاتے۔

قربانی کے لیے یہاں 'نَحْر' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اونٹ کی قربانی کے لیے معروف ہے لیکن یہ اپنے عام استعمال میں دوسرے بہائم کی قربانی کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں خاص طور پر اس لفظ کے استعمال سے مقصود ابراہیمی قربانی کی طرف اشارہ کرنا ہے اس لیے کہ اونٹ کی قربانی ملت ابراہیم میں ایک محبوب قربانی تھی جس کو یہود نے اپنی بدعتوں کے تحت حرام قرار دے رکھا تھا۔ بعض لوگوں نے 'نَحْر' کے معنی نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کے لیے ہیں لیکن لفظ کے معنی اختیار کرنے میں موقع و محل کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ یہاں یہ معنی لینے کا کوئی محل نہیں ہے۔ نماز اور قربانی کے حکم

کے لیے موزوں ترین اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ لفظ 'کوثر' جیسا کہ وضاحت ہو چکی ہے، یہاں اپنے مجازی مفہوم یعنی خانۂ کعبہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

نماز کے ساتھ قرآن میں بالعموم انفاق یا زکوٰۃ کا حکم آیا ہے لیکن یہاں قربانی کا ذکر آیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ بیت اللہ جس طرح نماز کا مرکز ہے اسی طرح قربانی کا بھی مرکز ہے اور اس قربانی کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے غرباء و مساکین اور ضیوفِ الٰہی کی خدمت ہوتی ہے یعنی دوسرے روحانی مقاصد کے ساتھ ساتھ قربانی سے وہ مقصد بھی پورا ہوتا ہے جو انفاق کا ہے۔

إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ (۳)

قریش کے طعنوں کا جواب

یہ قریش کے لیڈروں کی ان طعن آمیز پیشین گوئیوں کا جواب ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقبل سے متعلق وہ کرتے رہتے تھے۔ آپ کو کوثر دنیا اور کوثرِ آخرت کی بشارت دینے اور اس کی ذمہ داریاں بتانے کے بعد فرمایا کہ تمھارے دشمن کہتے ہیں کہ تمھارا کوئی مستقبل نہیں ہے، تمھاری جڑ عنقریب کٹ جائے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم کو دنیا اور آخرت دونوں کی نہایت شاندار فیروزمندیاں حاصل ہونے والی ہیں البتہ تمھارے ان دشمنوں کی جڑ کٹ کے رہے گی۔ 'شَانِئٌ' کے معنی مخالف اور عدو کے ہیں اور 'ابتر' اس کو کہتے ہیں جس کے اخلاف میں کوئی اس کا نام لیوا نہ رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی راہ میں قریش نے اپنے جبر و ظلم کے زور سے مکہ میں تو کچھ رکاوٹیں پیدا کر رکھی تھیں لیکن اطراف بالخصوص مدینہ میں بالتدریج دعوت کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اس سے قدرتی طور پر انھوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ان کے عوام اس صورتِ حال سے متاثر ہوں گے اور وہ ان وعیدوں کو سچ باور کرنے لگیں گے جو قرآن قریش کے لیڈروں بالخصوص حرم کے پروہتوں کو سنا رہا تھا۔ انھیں اندیشہ ہوا کہ اگر عوام کا اعتماد ان کی قیادت پر متزلزل ہو گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ ان کا حسنِ ظن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بڑھے گا اور وہ آپ کو مستقبل کے متوقع لیڈر کی حیثیت سے دیکھنے لگیں گے جس سے دعوت کی کامیابی کے امکانات بہت بڑھ جائیں گے۔ اس خطرے کے سدِباب کے لیے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقبل سے متعلق مایوسی پیدا کرنے والی پیشین گوئیاں پھیلانی شروع کر دیں تاکہ لوگوں کے اندر یہ خیال زور نہ پکڑنے پائے کہ آپ کا اثر روز افزوں ترقی پذیر ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے مختلف قسم کی باتیں بنائیں۔ از انجملہ دعوت کی طرف انصار کے میلان کو دیکھ کر انھوں نے یہ بات بھی پھیلانی شروع کی کہ یہ شخص اپنے نئے دین کے سبب سے اپنی قوم اور اپنے مرکزِ دینی (بیت اللہ) سے کٹ چکا ہے اور اب اگر اس نے ہم سے کٹ کر اجنبیوں کے اندر یعنی انصار کے اندر پناہ لی تو اس کی مثال ایک شاخِ بریدہ کی ہو گی جو درخت سے جدا ہو چکی ہے

اور جس کا سوکھ جانا لازمی ہے۔ ہجرت سے متصل زمانہ میں یہ قیاس لوگ کرنے لگے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر اپنی قوم اور سرزمینِ مکہ کو چھوڑا تو آپؐ انصار کے پاس جائیں گے اس لیے کہ وہی اس پوزیشن میں تھے کہ آپؐ کی حمایت و نصرت کر سکیں۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قریش نے انصار کے بعض قبائل کو، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے آئے تھے، یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر آپ لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں تو یہ سوچ کر بیعت کیجیے کہ یہ بیعت اسود و احمر سے جنگ کے لیے کر رہے ہیں۔ لیکن ان دھمکیوں کا انصار پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی عقیدت اور اسلام کے ساتھ ان کی محبت برابر بڑھتی گئی۔ یہ رنگ دیکھ کر اگرچہ قریش کو اپنے پروپیگنڈے میں کامیابی کی کوئی توقع باقی نہیں رہی لیکن وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ وہ ہجرت سے پہلے بھی اپنے عوام کو یہی باور کراتے رہے کہ انصار کی حمایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مبارک ثابت نہیں ہوگی اور ہجرت کے بعد بھی یہی باور کراتے رہے کہ اب ایک اجنبی ماحول میں العیاذ باللہ داعی اور دعوت دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن پیشین گوئی سچی قرآن کی ثابت ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعداء کی جڑ کٹ کے رہی اور حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا کے کوثر سے بھی فیضیاب ہوئے اور جنت کے کوثر پر بھی آپ سب سے پہلے پہنچیں گے اور اپنی امت کی کثرت کا مشاہدہ فرمائیں گے۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر اتمام کو پہنچی۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً۔

لاہور

۸ - جون ۱۹۸۰ء

۲۴ - رجب ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

١٠٩

الکٰفرون

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور مدعا کی ترتیب

اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قریش کے ائمۂ کفر سے براءت کا اعلان ہے۔ پچھلی سورتوں میں بھی تمام تر بحث قریش کے لیڈروں ہی سے رہی ہے لیکن خطاب ان سے قومی اور انسانی بنیاد پر ہوا ہے، کہیں بھی یٰٓاَیُّہَا الْکٰفِرُوْنَ کے الفاظ سے ان کو خطاب نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اس سورہ میں ان کو صاف صاف 'اے کافرو!' کے الفاظ سے مخاطب کر کے ان سے بالکل حتمی طور پر قطع تعلق اور براءت کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ یہ اعلانِ براءت رسولوں کی اس سنت کے مطابق ہوا ہے جس کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے کہ اللہ کے رسول اپنی قوم کو پہلے دین کی بنیادی باتوں ـــــــ توحید اور قیامت ـــــــ کی دعوت دیتے ہیں۔ اس دعوت میں وہ قوم کو 'اپنی قوم' ہی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہیں اور اس پر اس وقت تک پوری استقامت سے جمے رہتے ہیں جب تک قوم کے اعیان و اکابر اپنے رویہ سے ان کو مایوس نہیں کر دیتے۔ جب وہ مایوس کر دیتے ہیں اور بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ہٹ دھرم اپنی ضد سے باز آنے والے نہیں ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے اور وہ قوم سے اعلانِ براءت کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کر جاتا ہے۔ رسول کی ہجرت قوم کے لیے گویا آخری تنبیہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگر اس کے رویہ میں کوئی اچھی تبدیلی نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ ایک محدود مہلت دینے کے بعد قوم کے تمام مکذبین کو تباہ کر دیتا ہے، خواہ یہ تباہی رسول کی زندگی ہی میں واقع ہو یا اس کے بعد اور خواہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی قہر آسمانی نازل کرے یا رسول کے ساتھیوں کی تلوار اس کے لیے بے نیام ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام رسولوں کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے اس میں یہ مشترک حقیقت موجود ہے اور ہم اس کے تمام پہلوؤں کی وضاحت برابر کرتے آ رہے ہیں۔

یہاں یٰٓاَیُّہَا الْکٰفِرُوْنَ سے خطاب، ظاہر ہے کہ انہی ائمۂ کفر سے ہے جو اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ ان کی مسلسل مخالفت نے یہ حقیقت واضح کر

دی تھی کہ یہ چیز کسی شبہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ موروثی قیادت کا پندار ہے جس نے ان کو بالکل اندھا بہرا دشمن بنا دیا ہے اور اب خدا کے تازیانۂ عذاب کے سوا کوئی اور چیز ان پر کارگر نہیں ہو سکتی۔ مخاطب کی اس ذہنیت کی بنا پر اس سورہ میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں وہ بالکل دوٹوک الفاظ میں فرمائی گئی ہیں اور ہر بات بالکل مبنی بر حقیقت ہے۔ جن لوگوں نے اس خطاب کو مذمت یا غضب پر محمول کیا ہے ان کی رائے صحیح نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ کسی جماعت کا کفر اس وقت تک واضح ہوتا ہی نہیں جب تک اہلِ حق اس پر اتمامِ حجت نہ کر دیں۔ اتمامِ حجت کے بعد ہی اس کا کفر واضح ہوتا ہے اور اس کے بعد ہی یہ بات جائز ہوتی ہے کہ اہلِ حق اس سے علیحدگی کا اعلان کر دیں بلکہ ضرورت داعی ہو تو اس سے جہاد کریں۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے ہجرت اور جہاد کے لیے اقدام اتمامِ حجت کے بعد ہی کیا ہے اور یہی حق و عدل کا تقاضا ہے۔

اس سورہ نے قریش کے لیڈروں کے ساتھ دین کے معاملے میں کسی سمجھوتے کے تمام امکانات کا قطعی سدّباب کر دیا ہے اس وجہ سے یہ صرف ہجرت ہی کی سورہ نہیں بلکہ یہ معنًا اعلانِ جنگ کی سورہ بھی ہے۔ سورۂ یونس میں وضاحت سے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ قریش کے لیڈروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ اگر ہم سے اپنے دین کو منوانا ہے تو اس کی واحد شکل یہ ہے کہ یا تو اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ایسی مناسب ترمیم کرو کہ یہ ہمارے لیے قابلِ قبول ہو سکے: 'اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ' (یونس - ۱۰ : ۱۵) (اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کرو)۔ اس آیت کی تفسیر کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو سب سے زیادہ اصرار قرآن کی دعوتِ توحید کی ترمیم پر تھا، وہ اس کو اپنے آباء کے عقیدے کے بھی خلاف سمجھتے تھے اور یہ اندیشہ بھی رکھتے تھے کہ اگر اللہ کے سوا انھوں نے تمام معبودوں کو ہی باطل ٹھہرا دیا، جیسا کہ قرآن مطالبہ کر رہا ہے تو اس سے ان کی سیاسی ہستی ہی سرے سے ختم ہو جائے گی۔ ان کے اس مطالبہ کا جواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ دیا گیا کہ 'قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ' (یونس - ۱۰ : ۱۵) (ان سے کہہ دو کہ مجھے کیا حق ہے کہ میں بطور خود اس میں کوئی ترمیم کروں) اگرچہ یہ جواب قریش کے لیے مایوس کن تھا لیکن فیصلہ کن نہیں تھا۔ لیکن اس سورہ میں اس کا ایسا حتمی اور فیصلہ کن جواب دیا گیا ہے کہ ہمیشہ کے لیے اس بحث کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ اس معاملے میں اب کسی سمجھوتے کی گنجائش نہیں ہے، اگر قریش اپنی ضد پر قائم رہے تو بالآخر

ملاحظہ ہو تدبرِ قرآن۔ جلد سوم صفحہ: ۴۸۲

اس کا فیصلہ تلوار سے ہوگا۔

ترتیب میں اس سورہ کا سورۂ کوثر کے بعد جگہ پانا بھی اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ سورۂ کوثر میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ فتح مکہ کی بشارت ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہجرت اور اعلانِ جہاد کی سورہ سے پہلے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح و نصرت کی بشارت دے دی گئی تاکہ حضورؐ اور آپ کے صحابہؓ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اگرچہ آگے ہجرت اور جنگ کے کٹھن مرحلے آنے والے ہیں لیکن انجام ان کا نہایت شاندار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے رسول کو فتح سے نوازے گا اور وہ دنیا و آخرت دونوں کے کوثر سے شادکام ہوں گے۔ اسی طرح کی بشارت حضورؐ کو ہجرت کی اس دعا میں دی گئی ہے جو سورہ بنی اسرائیل میں مذکور ہے:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ (بنی اسرائیل - ۱۷ : ۸۰)

(اور دعا کرو کہ اے میرے رب، مجھے داخل کر عزت کا داخل کرنا اور نکال عزت کا نکالنا) اس دعا پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کے پیرائے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بشارت دے دی ہے کہ اگرچہ آپ کے مکہ سے نکلنے کا وقت اب قریب آ رہا ہے لیکن اس نکلنے سے پہلے ہی اللہ نے دار الہجرت میں آپ کے شاندار داخلہ کا انتظام کر لیا ہے۔

مختصر الفاظ میں اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قریش کے لیڈروں کے سامنے یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان دین کے بنیادی مسئلہ ——— معبود ——— کے باب میں کوئی قدرِ مشترک نہ حاضر میں ہے نہ ماضی میں رہی ہے اور نہ مستقبل میں اب اس کے پائے جانے کا امکان ہے اس وجہ سے ہمارے مابین کسی مفاہمت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اب تم اپنے دین پر چلو، ہم اپنے دین پر چلیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صادر ہو جائے۔

سُوْرَةُ الْكٰفِرِيْنَ

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات: ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۶ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱﴾ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَآ
اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴿۳﴾ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ﴿۴﴾
وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴿۵﴾ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴿۶﴾ ع ۶ ۲۴

ترجمۂ آیات ۱-۶ کہہ دو، اے کافرو! نہ میں پوجوں گا جن چیزوں کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجنے
کے جسے میں پوجتا ہوں اور نہ میں پوجنے والا ہوا جن کو تم نے پوجا اور نہ تم پوجنے
والے ہوئے جسے میں پوجتا آرہا ہوں۔ ۱-۵
تمھیں تمھارا دین اور مجھے میر دین! ۶

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (۱)

'قُلْ' اعلان کے مفہوم میں

'قُلْ' یہاں اعلان کر دینے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ اس سورہ کا مضمون اعلان کا مقتضی تھا تاکہ جو مفسدین کفر اور اسلام کے درمیان مجھوتے کے خبط میں مبتلا تھے وہ بھی اپنی اس سعیٔ نامراد سے مایوس ہو جائیں اور جو سادہ لوح اس طرح کی تجویزیں پیش کرنے والوں کو امن پسند اور صلح جو گمان کر رہے تھے ان پر بھی اصل حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ صلح و امن کی راہ نہیں بلکہ فساد کی مستقل پرورش کی راہ ہے۔

ائمۂ کفر سے خطاب

'يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ' کا خطاب ظاہر ہے کہ قریش کے ان ائمۂ کفر سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مخاطب اول تھے لیکن آپ کی برسوں کی جدوجہد کے بعد ان کے رویہ میں کوئی تبدیلی ہوئی تو یہ ہوئی کہ انھوں نے کفر اور اسلام دونوں کا ایک ملغوبہ تیار کرنے کا مطالبہ کیا۔ رسول اتمام حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر اس کی محنت بھی ان کو متاثر نہ کر سکی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ پھر کوئی بھی دوسرا ایسی چیز نہیں رہ گئی تھی جو ان کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے۔ چنانچہ ان لوگوں کے بارے میں آگے اس سورہ میں جس مایوسی کا اظہار فرمایا گیا ہے وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ ان میں سے کوئی بھی اسلام لانے والا نہیں بنا بلکہ ہر ایک اپنے غرور اور انانیت کا شکار ہوا۔

دو سوال اور ان کے جواب

یہاں اس خطاب سے متعلق دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن میں عام طور پر قریش کے لیڈروں کو اس طرح کے سخت خطاب سے کہیں مخاطب نہیں کیا گیا ہے، پھر اسی سورہ کی کیا خصوصیت ہے کہ اس میں ان کو 'يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ' سے خطاب کیا گیا۔ دوسرا یہ کہ قریش بلکہ اہل عرب بالعموم خدا کے منکر نہیں بلکہ اس کے شریک ٹھہرانے والے تھے تو قرآن نے ان کو 'اے کافرو' کیوں کہا 'اے مشرکو' سے کیوں نہیں خطاب کیا؟

ان دونوں سوالوں کے جواب اگرچہ اس کتاب میں جگہ جگہ دیے جا چکے ہیں اور تمہید میں بھی اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے لیکن ہم یہاں پھر ان کو صاف کیے دیتے ہیں۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حضورؐ نے یہ اندازِ خطاب اس وقت اختیار فرمایا ہے جب اچھی طرح اتمامِ حجت کر دینے کے بعد، قوم کے رویہ سے بالکل مایوس ہو کر، اللہ تعالیٰ کے اذن سے، آپ نے ہجرت کا فیصلہ فرما لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول کو ہجرت کا حکم اسی

وقت دیتا ہے جب قوم کے رویہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر ایمان قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے اور اس کی مکابرت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر اس کا مزید تعاقب کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ وہ رسول کو قتل کر دے۔ اس مرحلے میں رسول کے لیے یہ بات بالکل معقول ہوتی ہے کہ وہ قوم اور قوم کے معبودوں سے اپنی کامل بیزاری کا اعلان کر کے ان سے الگ ہو جائے اور چونکہ رسول کی دعوت سے کفر اور اسلام دونوں کی اچھی طرح وضاحت ہو چکی ہے اس وجہ سے جو بھی ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرتا ہے، اس کے متعلق اس شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس نے کفر یا اسلام میں سے کسی کو بے سمجھے بوجھے اختیار کیا ہے اس وجہ سے اگر اس دور میں رسول کفر پر اڑے رہنے والوں کو اے کافرو! سے خطاب کرتا ہے تو یہ خطاب بالکل برمحل، جائز اور معقول ہوتا ہے۔

اس سے ہمارے لیے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ جو چیز کفر یا شرک ہے اس کو کفر یا شرک بتانا اور اس سے لوگوں کو بچانے کی کوشش کرنا تو ہر مسلمان کی ہر لحظہ ذمہ داری ہے لیکن کسی فرد یا گروہ کو کافر قرار دے کر اس سے اعلانِ براءت کرنا یا اپنے جملہ روابط اس سے کاٹ لینا یا اس سے اعلانِ جنگ کر دینا بڑی احتیاط کا متقاضی ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کا مسئلہ بڑا مشکل ہے جو اپنی ہر گمراہی کو اسلام بنائے ہوئے ہوں اور صحیح اسلام ان کے آگے پیش کرنے کا کوئی شرعی نظام موجود نہ ہو۔ اس طرح کے حالات میں صحیح راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی غلطیوں اور گمراہیوں پر تنقید تو کرے اور لوگوں کے ان افعال میں شرکت سے اجتناب بھی کرے جو شرک و بدعت کی نوعیت کے ہوں لیکن ان کو کافر قرار دے کر ان سے کلیتہً علیحدگی کا اعلان اس وقت تک نہ کرے جب تک اس کے لیے مجبور نہ ہو جائے یا یہ باور کرنے کے لیے اس کے سامنے معقول وجوہ نہ آ جائیں کہ اس نے لوگوں پر حق واضح کر دیا اور یہ دوسری چیز نہایت مشکل ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ شرک حقیقت میں کفر ہی ہے۔ دین میں ایمان صرف وہی معتبر ہے جو کامل توحید کے ساتھ ہو یعنی آدمی خدا کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق میں کسی دوسرے کو کسی پہلو سے بھی شریک نہ ٹھہرائے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے ایمان اور اس کی بندگی کا محتاج نہیں ہے کہ وہ ہر قسم کا ایمان اور ہر قسم کی بندگی قبول ہی کرے اگرچہ اس میں شرک کی ملاوٹ بھی ہو۔ وہ اپنی بندگی اپنی شرائط پر چاہتا ہے، نہ کہ دوسروں کی شرائط پر، اس وجہ سے ہر وہ عمل خدا کے ہاں غیر مقبول ہے جو صرف اسی کے لیے نہ کیا گیا ہو بلکہ اس میں دوسروں کو بھی شریک کر دیا گیا ہو۔
قرآن کے فلسفہ کی رو سے اس شخص میں جو خدا کا منکر ہے اور اس شخص میں جو اس کو مانتا ہے لیکن خدائے واحد کی حیثیت سے نہیں بلکہ بہت سے دیوتاؤں میں سے ایک دیوتا یا سب سے بڑے دیوتا

کی حیثیت سے مانتا ہے، کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ دونوں ہی خدا کے منکر یا دوسرے الفاظ میں کافر ہیں۔ اس لیے کہ شرک کے ساتھ خدا کو ماننا اس کی تمام اعلیٰ صفات کی نفی ہے اور صفات کی نفی کے ساتھ اس کو ماننا اس کے نہ ماننے کے ہم معنی ہے۔ قرآن نے یہاں ان مشرکوں کو کافر کہہ کر اسی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ شرک درحقیقت کفر ہی ہے، کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ یہ کسی درجے میں بھی کفر کے مقابلے میں اہون یا قابلِ لحاظ ہے۔

لَآ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ (۲)

سمجھوتے کی پیشکش کا جواب

کفر کے سرغنوں کو خطاب کر کے یہ ان کی اس پیش کش کا جواب ہے جو وہ باہمی سمجھوتے کے لیے کر رہے تھے۔ فرمایا کہ میں ان چیزوں کو نہیں پوجوں گا جن کو تم پوجتے ہو۔ گویا پہلے ہی فقرے میں ان کی توقع کا خاتمہ کر دیا۔

عام طور پر لوگوں نے 'لَآ اَعۡبُدُ' کو حال کے مفہوم میں لیا ہے لیکن اس کو حال کے مفہوم میں لینا صاحبِ کشاف کے نزدیک عربیت کے خلاف ہے اور میرے نزدیک ان کی رائے صائب ہے۔ مضارع پر جب اس طرح 'لا' آئے گا تو وہ مضارع کو لازماً مستقبل کے مفہوم میں کر دے گا۔ حال کے مفہوم کے لیے 'لا' نہیں بلکہ 'ما' کا استعمال موزوں ہے۔

علاوہ ازیں حال سے متعلق کسی نفی یا اثبات کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں۔ قریش میں سے ہر شخص کو علم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان بتوں میں سے کسی کو نہیں پوجتے۔ پھر ان کو یہ بتانے سے کیا فائدہ کہ میں ان کو نہیں پوجتا جن کو تم پوجتے ہو؟ سمجھوتے کی تجویزیں پیش کرنے سے ان کا اصلی مقصد تو یہی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس رویے میں کچھ لچک پیدا کریں جس میں دوسرے معبودوں کے لیے سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں رہی ہے۔ ان کی اس توقع پر ضرب لگ سکتی تھی تو اسی صورت میں لگ سکتی تھی جب ان کو آئندہ کے لیے یہ یقین دلا دیا جائے کہ خدا کی توحید کے باب میں آپ کوئی لچک قبول کرنے والے نہیں ہیں۔

سورۂ قلم کی آیت 'وَدُّوۡا لَوۡ تُدۡهِنُ فَیُدۡهِنُوۡنَ' (القلم - ۶۸: ۹) (وہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرم پڑو تو وہ بھی کچھ نرم پڑ جائیں گے) کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں[۱] کہ قریش اپنے جبر و ظلم کے تمام حربے آزما کر ہجرت سے کچھ پہلے یہ اندازہ کر چکے تھے کہ اسلام کی روزافزوں ترقی کو روکنا ان کے امکان میں نہیں رہا۔ اب اگر کچھ امکان ہے تو صرف یہ ہے کہ دباؤ ڈال کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ 'کچھ دو اور کچھ لو' کے اصول پر معاملہ کرنے کی طرف مائل ہوں یعنی جس

---

[۱] ملاحظہ ہو تدبر قرآن۔ جلد ہفتم، صفحات ۵۱۶، ۵۱۷۔

طرح ہم اللہ تعالیٰ کے لیے ایک مقام تسلیم کرتے ہیں اسی طرح آپ ہمارے بتوں کے لیے بھی عبادت میں ایک حق تسلیم کر لیں تو یہ جھگڑا ختم ہو جائے۔ ان کو توقع تھی کہ دباؤ ڈال کر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا موقف تسلیم کرا لیں گے چنانچہ انھوں نے اپنا پورا زور صرف کر دیا یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حالات سے مجبور ہو کر ہجرت کی راہ اختیار کرنی پڑی لیکن دین کی بنیاد چونکہ توحید ہی پر ہے اس وجہ سے ہجرت کے امتحان سے گزرنا گوارا کر لیا گیا لیکن اس معاملے میں کوئی لچک گوارا نہیں کی گئی بلکہ صاف صاف 'لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ' کا اعلان کر دیا گیا۔

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۳)

ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار

ساتھ ہی ان کو اس حقیقت نفس الامری سے بھی حضورؐ نے آگاہ فرما دیا کہ تم جو یہ گمان کیے بیٹھے ہو کہ تم اس خدا کو پوجنے والے ہو یا بن جاؤ گے جس کو میں پوجتا ہوں تو تمھارا یہ گمان محض گمان ہے۔ میرے پروردگار کی بندگی کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ بندگی صرف اسی کا حق ہے، اس میں کوئی دوسرا اس کا ساجھی نہیں ہے۔ تم اگر اپنے دیویوں دیوتاؤں سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہو تو اس کے پرستار بھی نہیں بن سکتے۔ یہ تمھارا محض مغالطہ ہے کہ تم اپنے کو خدا کی عبادت کرنے والا سمجھتے ہو۔ خدا کی عبادت کے ساتھ کوئی اور عبادت جمع نہیں ہو سکتی۔ اس کی بندگی میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے تمام معبودوں کو باہر چھوڑ کر آؤ۔ اگر اس کی بندگی کے ساتھ تم نے ان کی بندگی بھی جمع کرنے کی کوشش کی تو اپنے معبودوں کے پرستار تو بے شک رہو گے لیکن خدا کی بندگی میں تمھارا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔

مشرکین کے معبودوں کے لیے 'مَا تَعْبُدُوْنَ' کا استعمال بالکل ٹھیک ہے اس لیے کہ وہ فرضی اور وہمی چیزوں کی پوجا کرتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے 'مَآ اَعْبُدُ' کا استعمال کچھ کھٹکتا ہے۔ یہ مجانست کے اسی اصول پر استعمال ہوا ہے جس کی مثالیں عربی زبان اور قرآن دونوں میں معروف ہیں، مثلاً دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوْا، 'جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا' (الشوریٰ - ۴۲: ۴۰) وغیرہ۔ اس اسلوب پر اس کے محل میں مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔[1]

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ (۴)

ماضی سے متعلق موقف کا اظہار

اوپر کا اعلان تو، جیسا کہ واضح ہوا مستقبل سے متعلق ہے۔ اب یہ ماضی سے متعلق بھی آپ نے اپنا موقف واضح فرما دیا کہ ماضی میں بھی کبھی میں ان چیزوں کا پرستار نہیں رہا ہوں جن کی تم نے پرستش

---

[1] ملاحظہ ہو تدبرِ قرآن - جلد ششم، صفحہ ۱۸۱

کی۔ صاحب کشاف نے اس آیت کی یہی تاویل کی ہے اور مجھے زبان اور نظم دونوں پہلوؤں سے یہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

'وَلَا أَنَا عَابِدٌ' کا جملہ اسمیہ ہے اس وجہ سے اس کے حاضر، ماضی اور مستقبل میں سے کسی کے ساتھ مقید ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تینوں زمانوں کے ساتھ یکساں مربوط ہو سکتا ہے بشرطیکہ قرینہ ان میں سے کسی کو ترجیح نہ دے۔ یہاں 'مَا عَبَدْتُّمْ' چونکہ ماضی ہے اس وجہ سے یہ واضح قرینہ ہے کہ 'وَلَا أَنَا عَابِدٌ' کی نفی ماضی ہی سے متعلق ہے یعنی میں پہلے بھی کبھی ان چیزوں کا پوجنے والا نہیں رہا ہوں جن چیزوں کو تم نے پوجا۔

کلام کا فائدہ — اس کلام کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس اعلانِ براءت کی شدت میں اس سے بڑا اضافہ ہو جائے گا جو اوپر کی آیت میں کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ جب میں تمہارے ان بتوں کو اپنی زندگی کے اس دور میں بھی کبھی خاطر میں نہیں لایا جب میں شرفِ نبوت سے مشرف اور نورِ وحی سے منور نہیں ہوا تھا تو اب جب کہ میں براہِ راست اپنے رب سے ہدایت حاصل کر رہا ہوں تمہاری اس ضلالت میں کس طرح مبتلا ہو سکتا ہوں۔ مطلب یہ ہوا کہ کوئی دور بھی میری اور تمہاری زندگی میں اگر ایسا گزرا ہوتا جب میں تمہارے اس دینِ شرک میں شریک رہا ہوتا تو تم مجھ سے یہ توقع کر سکتے تھے کہ شاید میں سابق دین پھر اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گا لیکن جب میرا دامن جاہلیت میں بھی شرک سے داغدار نہ ہوا تو اب مجھ سے اس کی توقع تم کیسے کر رہے ہو!

وَلَآ أَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ أَعْبُدُ (۵)

آیت کا تعلق دورِ ماضی سے ہے — یہ آیت لفظاً تو آیت ۳ کا اعادہ ہے اس وجہ سے تکرار کا شبہ پیدا ہوتا ہے لیکن معناً یہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا تعلق آیت ۴ کی طرح دورِ ماضی سے ہے جب کہ آیت ۳ کا تعلق، جیسا کہ واضح ہوا مستقبل سے ہے۔ یعنی قریش کے لیڈروں کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ تم اگر اس مغالطے میں مبتلا ہو کہ ماضی میں تم بھی اسی معبود کی پوجا کرتے رہے ہو جس کی میں پوجا کرتا رہا ہوں تو یہ محض تمہاری خام خیالی ہے۔ شرک کے ساتھ میرے معبود کی پرستش کا، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، کوئی امکان ہی نہیں ہے اور تم شرک سے کبھی پاک نہیں ہوئے اس وجہ سے نہ میں کبھی تمہارا دینی بھائی بنا نہ تم میرے دینی بھائی بنے تو یہ توقع تم کس طرح کرتے ہو کہ اپنی اس گندگی میں لتھڑے ہوئے تم مجھے اپنا دینی بھائی بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گے!

یہاں بادلِ وہلہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مطلب آیت کا یہ ہے، جو ہم نے اختیار کیا ہے تو 'مَآ أَعْبُدُ' کی جگہ 'مَا عَبَدْتُّ' کیوں نہیں فرمایا؟ اس کا جواب صاحب کشاف نے یہ دیا ہے کہ 'مَا عَبَدْتُّ' اس لیے نہیں فرمایا کہ اس دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی بندگی نہیں کی

اس وجہ سے آپ نے اس کا حوالہ نہیں دیا بلکہ صرف حال کا حوالہ دیا لیکن یہ جواب بالکل غلط ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے بھی فطرتِ سلیم پر تھے اور توحید چونکہ دینِ فطرت ہے اس وجہ سے وہ کبھی فطرت کے خلاف شرک میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ساتھ ہی وہ لازماً اپنے رب کی کسی نہ کسی شکل میں عبادت بھی کرتے رہے ہیں اگرچہ وہ طریقہ انھوں نے اپنے اجتہاد سے اختیار کیا ہو یا دین کی سابق روایات سے اخذ کیا ہو۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے بھی عبادت کرتے تھے۔ اگرچہ اس کا طریقہ واضح طور پر ہمارے سامنے نہیں ہے تاہم اتنی بات معلوم ہے کہ اس کی بنیاد حنیفیت پر تھی جس کی روایت حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے زمانے سے کسی نہ کسی شکل میں چلی آ رہی تھی۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک 'مَا عَبَدْتُّمْ' نہ کہنے کی وہ وجہ صحیح نہیں ہے جو صاحبِ کشاف نے بیان کی ہے بلکہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ آپ کا تعلق صرف ماضی ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ آپ نے جس طرح ماضی میں اپنے رب ہی کی عبادت کی اسی طرح آپ حاضر میں بھی اسی کی عبادت پر قائم تھے اس وجہ سے آپ نے 'مَا اَعْبُدُ' فرمایا جس سے تسلسل اور استمرار کا اظہار ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ تم اس خدا کے پوجنے والے ماضی میں بھی نہ بنے جس کی بندگی میں نے ماضی میں بھی کی اور اب بھی اس پر قائم و دائم ہوں۔

لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (۶)

آخری اعلان براءت — یعنی جب میرے دین اور تمھارے دین میں کوئی اشتراک ماضی میں نہ ہوا، نہ حاضر میں ہے تو آئندہ کس طرح توقع کرتے ہو کہ ہم کسی ایک نقطہ پر مجتمع ہو سکیں گے۔ اس وجہ سے سمجھوتے کی توقع بالکل لاحاصل ہے۔ میرے لیے میرا دین ہے اور تمھارے لیے تمھارا دین۔ میں اپنے طریقہ پر کام کرتا ہوں اور تم اپنے طریقہ پر کام کرو اور دیکھو کہ انجام کار کس کی بات سچی ثابت ہوتی ہے یا تمھاری۔ یہی بات سورۂ انعام میں یوں ارشاد ہوئی ہے: 'قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ' (الانعام - ۶: ۱۳۵) (کہہ دو، اے میری قوم کے لوگو، تم اپنی جگہ پر کام کرو، میں اپنی جگہ پر کام کرتا ہوں) سورۂ ہود آیت ۹۳ اور سورۂ زمر آیت ۳۹ میں بھی دوسرے رسولوں سے یہی کلمات نقل ہوئے ہیں اور مقصود اس سے صرف اس بحث و جدال کے دروازے کو بند کرنا ہے جو مخالفین اس مقصد سے کر رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے موقف کو بھی تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس اعلان سے آپ نے ان کو آخری آگاہی دے دی کہ نہ آپ اپنے دین سے ذرہ برابر ہٹنے کے لیے تیار ہیں اور نہ ان کے دین کے لیے ہی کوئی مقام تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے اعلان کا اعادہ — عام طور پر لوگوں نے اس آیت کو رواداری کے مفہوم میں لیا ہے حالانکہ یہ کفار کے رویہ سے بیزاری بلکہ انجام کار کے اعتبار سے ان سے ابدی مفارقت اور اعلان جنگ کے مفہوم میں ہے۔

مختصر الفاظ میں یہ وہی اعلان ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے کیا تھا جس کا حوالہ قرآن نے ان الفاظ میں دیا ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ إِبْرَٰهِيمَ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ إِذْ قَالُوا۟ لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءَٰٓؤُا۟ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ٱلْعَدَٰوَةُ وَٱلْبَغْضَآءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَحْدَهُۥٓ (الممتحنۃ - ۶۰ : ۴)

تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ یاد کرو جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان چیزوں سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بالکل بری ہیں، ہم نے تمہارے عقیدے کا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت اور نفرت آشکارا ہو گئی تا آنکہ تم اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ پر ایمان لاؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اصحاب کا یہ اسوۂ حسنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے سامنے رکھا ہی اس لیے گیا تھا کہ اسی طرح کا اعلانِ برارت آپ اور آپ کے صحابہؓ اپنی قوم سے کریں چنانچہ اسی کی پیروی میں یہ اعلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس کے اندر رواداری کی گنجائش کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ کلام کے سیاق و سباق اور نظم کی رعایت ملحوظ نہ رکھنے سے ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ بیزاری اور رواداری کے کلمہ میں امتیاز سے بھی قاصر رہ جاتے ہیں اور یہ آیت اس کی ایک نہایت عبرت انگیز مثال ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر اتمام کو پہنچی۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

لاہور
۲۴- جون ۱۹۸۰ء
۱۰- شعبان ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

١١٠

النّصر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلّق اور مطالب کا خلاصہ

سابق سورہ ـــــــ الکفرون ـــــــ سے متعلق وضاحت ہو چکی ہے کہ یہ براءت ہجرت اور ضمناً اعلانِ جنگ کی سورہ ہے۔ اب اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی گئی ہے کہ وہ وقت قریب ہے کہ آپؐ کے لیے خاص نصرتِ غیبی ظاہر ہو گی، مکہ فتح ہو گا اور جس مشن پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مامور فرمایا آپ اس سے سرخ روئی کے ساتھ فارغ ہو کر اپنے رب کی خوشنودی و رضا مندی سے سرفراز ہوں گے۔ سورۂ فتح کی ابتدائی آیات میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ وہاں ہم نے وضاحت سے اس کے ہر پہلو پر بحث کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

ہجرت، جہاد اور فتح و نصرت میں جو گہرا ربط ہے اس کی طرف ہم سابق سورہ ـــــــ الکفرون ـــــــ میں بھی اشارہ کر چکے ہیں اور اس کتاب کے دوسرے مقامات میں بھی اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ رسولوں کی دعوت میں ہجرت کا مرحلہ بھی وہ مرحلہ ہے جب ان کی قوم پر اللہ کی حجت تمام ہوئی ہے، جب انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ، قوم سے الگ ہو کر، اپنی ایک خاص ہیئتِ تنظیمی بنائی ہے، جب قوم تمام صالح عناصر سے خالی ہو جانے کے سبب سے بالکل ایک جسدِ بے روح ہو کر رہ گئی ہے اور اہلِ ایمان اپنے عقائد و تصورات کی آزاد فضا میں پہنچ کر ایک ایسی ناقابلِ تسخیر قوت بن گئے ہیں کہ جو ان سے ٹکرایا اس نے شکست کھائی اور جس پر وہ گرے اس کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ رسولوں نے اپنے دشمنوں سے جو جنگ کی ہے وہ ہمیشہ ہجرت کے بعد ہی کی ہے اور اس جنگ میں اگرچہ جماعت کی تربیت کے پہلو سے بعض لازمات آزمائشیں بھی ان کو پیش آئی ہیں لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ کی نصرت سے ان کو وہ فتح حاصل ہوئی ہے جس کو چیلنج کرنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات اس حقیقت پر شاہد ہیں۔

ہجرت اور فتح و نصرت کے درمیان یہی وہ رشتہ ہے جس کے سبب سے یہ سورہ جو بالاتفاق مدنی ہے، ایک مکی سورہ کی مثنیٰ قرار پائی۔ اس سورہ کے زمانۂ نزول سے متعلق دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ فتح مکہ کے بعد

نازل ہونے والی سورتوں میں یہ سب سے آخری سورہ ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ فتح مکہ سے پہلے اس کی بشارت کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ میرے نزدیک اسی دوسرے قول کو ترجیح حاصل ہے۔

اس کی اول وجہ یہ ہے کہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے یہ بات واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ملت ابراہیم پر ہوئی تھی اور ملت ابراہیم کا اصل مرکز چونکہ بیت اللہ ہی تھا اس وجہ سے اس کو خائنوں کے تسلط سے آزاد اور ملت ابراہیمی کی خصوصیات سے معمور و آباد کرنا آپ کے مشن کا اصلی اور تکمیلی کام تھا۔ چنانچہ اَلۡیَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِیۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡكُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ' (المائدۃ - ۵ : ۳) میں اسی کام کو آپ کا تکمیلی کام قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد جو کام ہوئے وہ سب اسی کے توابع و مقتضیات تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عرب میں اصل طاقت قریش ہی کی تھی جو مکہ پر قابض تھے اور بیت اللہ کے متولی ہونے کے سبب سے تمام عرب پر اپنی دھاک جمائے ہوئے تھے۔ ان کی طاقت کو توڑ دینا ہی اصل فتح تھی۔ ان کی طاقت توڑے بغیر کوئی فتح نہ حقیقی معنوں میں فتح ہو سکتی تھی اور نہ ان کی طاقت کے ٹوٹ جانے کے بعد کسی اور کے لیے یہ امکان باقی رہ جاتا تھا کہ وہ مسلمانوں کی کسی درجہ میں بھی کوئی مزاحمت کر سکے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں جس نصرت اور جس فتح کا ذکر ہے اور وہ جس انداز سے آیا ہے وہ عام نصرت اور فتح نہیں ہے بلکہ یہ اس نصرت اور فتح کا ذکر ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے وعدوں اور سنت الٰہی کے تقاضوں کی روشنی میں ہجرت کے بعد ہر مسلمان کے دل میں رچی بسی ہوئی تھی اور جس کے ظہور کا ہر مسلمان دل سے متمنی تھا۔ یہ وہ نصرت ہے جس کا ذکر سورۂ مجادلہ کی آیت اُمْ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ ' (اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول) میں آیا ہے۔ اور یہ اس فتح و نصرت کا حوالہ ہے جس کا ذکر سورۂ صف آیت ۱۳ میں بدیں الفاظ وارد ہوا ہے: وَ اُخۡرٰی تُحِبُّوۡنَهَا ؕ نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتۡحٌ قَرِیۡبٌ ' (اور ایک اور عظیم فیروزمندی بھی ہے جس کی تم تمنا رکھتے ہو، وہ ہے اللہ کی نصرت اور عنقریب ظہور میں آنے والی فتح) ان آیات میں جس نصرت اور فتح کی طرف اشارہ ہے ظاہر ہے کہ اس کا تعلق فتح مکہ سے ہے اس کے سوا کسی اور فتح و نصرت کو یہاں مراد لینے کی گنجائش نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس سورہ کا نزول فتح مکہ کے بعد مانا ہے انھیں ایک روایت کے سمجھنے میں غلط فہمی پیش آئی ہے لیکن اس پر نہ یہاں بحث کی گنجائش ہے اور نہ غالباً ہماری ساری بحث غور سے پڑھ لینے کے بعد اس کی کوئی خاص ضرورت ہی باقی رہے گی۔

یہ سورہ اپنے مزاج کے اعتبار سے یکسر بشارت ہے۔ فیصلہ کن نصرت کی بشارت، مکہ کی آزادی کی بشارت، اللہ کے دین میں لوگوں کے جوق در جوق داخل ہونے کی بشارت اور آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کو اپنے مفوضہ مشن سے سرخ روئی کے ساتھ فارغ ہونے کی بشارت۔ اس آخری بشارت سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اب دنیا سے آپؐ کے رخصت ہونے کا وقت قریب آرہا ہے! اس وجہ سے آپ کو اپنے رب کی حمد و تسبیح میں مزید اضافہ کر دینا چاہیے تاکہ اس عظیم انعام کا حق بھی ادا ہو جو تکمیل دین کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے آپ پر فرمایا اور غدائے تواب کی مزید عنایت بھی آپ کو حاصل ہو تاکہ آپ اپنی سعی کا بڑے سے بڑا اجر اپنے رب کے پاس پائیں۔ اسی ٹکڑے سے قرآن کے سب سے بڑے نکتہ دان حضرت ابن عباسؓ نے یہ نکتہ نکالا کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ نکتہ دقیق ہے، جس کے دقیق ہونے کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کی تحسین و تصویب فرمائی ہے۔ لیکن یہ نکتہ بھی اپنے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک بہت بڑی بشارت رکھتا ہے جس کی وضاحت ان شاء اللہ ہم متعلق آیت کی تفسیر کے تحت کریں گے۔

سُورَةُ النَّصْرِ (۱۱۰)

مَدَنِيَّةٌ ——— آیات: ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۳

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴿۱﴾ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ
فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا ﴿۲﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ
إِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

ترجمۂ آیات ۱-۳

جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے اور لوگوں کو دیکھو کہ وہ فوج در فوج خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے خداوند کی تسبیح پڑھو اس کی حمد کے ساتھ، اور اس سے مغفرت مانگو۔ بے شک وہ بڑا ہی معاف کرنے والا ہے۔ ۱-۳

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱)

اللہ تعالیٰ کی خاص مدد

یہاں اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح کا جس اہتمام خاص کے ساتھ ذکر ہوا ہے اور اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حمد و تسبیح کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے عام مدد اور عام فتح مراد نہیں ہے بلکہ وہ مدد اور فتح مراد ہے جو سنت الٰہی کے مطابق اللہ کے رسولوں کو ان کے مخالفوں کے مقابل میں اس وقت حاصل ہوئی ہے جب رسولوں نے اللہ کا پیغام پہنچانے میں اپنی ساری طاقت نچوڑ دی اور قوم رسول کی تکذیب اور اس کی دشمنی پر اس طرح اڑ گئی ہے کہ یہ توقع کرنے کی گنجائش باقی ہی نہیں رہ گئی ہے کہ اس کے رویے میں کوئی تبدیلی واقع ہو سکے گی۔

اس مدد کے ظہور کا وقت

سورۂ یوسف میں اس نصرت الٰہی کے ظہور کے لیے یہ ضابطہ بیان ہوا ہے کہ جب اللہ کے رسول اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے ہیں اور قوم نے اپنے رویے سے ثابت کر دیا ہے کہ العیاذ باللہ وہ رسول کے انذار کو بالکل جھوٹ اور لاف زنی خیال کرتی ہے تب اللہ کی یہ مدد ظہور میں آئی۔

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا (یوسف - ۱۲ : ۱۱۰)

یہاں تک کہ جب رسول قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے ہیں اور قوم کے لوگوں نے گمان کر لیا ہے کہ ان کو جھوٹ موٹ عذاب سے ڈرایا گیا ہے تب ہماری مدد رسولوں کے پاس آ گئی۔

یہی بات دوسرے الفاظ میں یوں ارشاد ہوئی ہے۔

فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا (الانعام - ۶ : ۳۳)

پس وہ (رسول) ثابت قدم رہے قوم کی طرف سے تکذیب اور ایذا رسانیوں کے باوجود یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ گئی۔

موعود و منتظر فتح

اسی طرح 'اَلْفَتْحُ' پر الف لام اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے مراد موعود و منتظر فتح ہے جو اللہ کے رسولوں اور ان کے ساتھیوں کے لیے سنت الٰہی کا تقاضا ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا اور جس کے وہ اپنی زندگی کے سخت سے سخت مرحلے میں بھی منتظر و متوقع رہے ہیں۔ اسی فتح کی طرف سورۂ صف کی اس آیت میں اشارہ ہے جس کا حوالہ ہم اوپر دے چکے ہیں:
'وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ' (الصف - ۶۱ : ۱۳) (اور ایک دوسری فیروزمندی بھی

ہے جس کو تم عزیز رکھتے ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اور جلد ظاہر ہونے والی فتح) قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں بھی اس کا ذکر اسی اجمال کے ساتھ ہوا ہے جس طرح یہاں ہوا ہے لیکن یہ چیز پہلے سے ذہنوں میں موجود تھی اس وجہ سے، اجمال کے باوجود، اس کے سمجھنے میں لوگوں کو کوئی تردد پیش نہیں آیا۔ مثلاً فرمایا ہے: لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ (الحدید ۵۷ : ۱۰) (تم میں سے وہ لوگ جو فتح سے پہلے انفاق اور جہاد کریں گے اور جو بعد میں کریں گے دونوں درجے میں یکساں نہیں ہوں گے)۔ یہاں دیکھیے اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ کون سی فتح مراد ہے لیکن ہر شخص سمجھتا ہے کہ اس سے فتح مکہ مراد ہے اس لیے کہ وہی فتح تھی جو جدوجہد کرنے والوں کے اعمال کی قدر و قیمت کے گھٹانے اور بڑھانے کے معاملے میں ایک میزان کا کام دے سکتی تھی۔ اس سے پہلے متعدد غزوات میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہو چکی تھی اور اس کے بعد بھی فتوحات حاصل ہوئیں لیکن نہ ان میں سے کسی کا یہ درجہ تھا کہ نام لیے بغیر اس کی طرف ذہن منتقل ہو سکیں اور نہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر ان کا یہ اثر پڑا کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کی نیکیوں کی قدر و قیمت میں ان کے سبب سے وہ تفاوت واقع ہوا ہو جو اس فتح کے سبب سے واقع ہوا۔ اس فتح کے بعد عرب میں کفر نے اسلام کے آگے اس طرح گھٹنے ٹیک دیے کہ اس کے لیے پھر سر اٹھانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس سے بعثتِ محمدی کا اصل مقصد گویا پورا ہو گیا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فتح کے بعد خانۂ کعبہ کے دروازے پر جو خطبہ دیا اس میں آپ نے فرمایا کہ:

لا الٰه الّا الله وحده صدق ۔ اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے
وعده ونصر عبده وهزم ۔ اپنا وعدہ پورا کیا اور اس نے یکہ و تنہا دشمنوں
الاحزاب وحده ۔ کی تمام جماعتوں کو شکست دی۔

اس خطبہ کے بعد ہی آپ نے قریش کے ان سرغنوں کی طرف توجہ فرمائی جو اس سے پہلے تو برسے جما جما کر آپ سے لڑتے رہے تھے لیکن اس وقت محکومانہ حاضر اور تقدیر کے فیصلہ کے منتظر تھے۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے سوال کیا کہ کیا تم جانتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ سب نے بیک زبان جواب دیا کہ آپ شریف بھائی اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں! آپ نے ان کا یہ جواب سن کر فرمایا کہ جاؤ، میں نے تم سب کی جان بخشی کی!

فتح و نصرت تائیدِ الٰہی سے حاصل ہوتی ہے

یہاں نصرت اور فتح دونوں کا ذکر جس طرح ساتھ ساتھ ہوا ہے اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ کسی کو کوئی فتح اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اس وجہ سے کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی فتح پر اترائے اور اس گھمنڈ میں مبتلا ہو کہ یہ اس کی اپنی تدبیرِ جنگ ہے اور مہارتِ دبسالت کا کرشمہ ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کی تدبیر و حکمت کا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ اوپر ہم نے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کا جو حوالہ دیا ہے اس سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ آپ نے دشمنوں کی تمام پارٹیوں کی ہزیمت کو تنہا اپنے رب ہی کی قدرت کا کرشمہ قرار دیا، اس کا کریڈٹ نہ خود لینے کی کوشش کی نہ اس میں کسی اور کو حصہ دار بنایا۔ اس سورہ میں آپ کو حمد و تسبیح کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے اس سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس فضل و انعام پر شکر کا اصل حق دار اللہ تعالیٰ ہی ہے اس وجہ سے زیادہ سے زیادہ اسی کی حمد و تسبیح ہونی چاہیے۔

وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (۲)

اس عظیم بشارت کا سب سے نمایاں پہلو

یہ اس عظیم بشارت کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی قوم سے جو جھگڑا تھا وہ دنیا کی کسی غرض کے لیے نہیں تھا، صرف اللہ کے دین کے لیے تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ قریش کے لیڈر اس امانت کا حق ادا کریں جو بیت اللہ کی صورت میں ان کی تحویل میں ہے۔ اگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر ان کو اس پر قابض رہنے اور اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین سے بجبر و ظلم روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس مذہبی جبر کو (جس کو قرآن نے فتنہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے) ختم کرنے کے لیے آپ نے قریش کو مکہ سے بے دخل کیا اور چونکہ دین کی راہ میں جو رکاوٹ تھی وہ صرف لیڈروں کے جبر و استبداد ہی کے سبب سے تھی، عوام کے دلوں میں اس کے خلاف کوئی بدگمانی نہیں تھی اس وجہ سے اس استبداد کے بند کے ٹوٹتے ہی لوگ رکے ہوئے سیلاب کی طرح قبولِ اسلام کے لیے ٹوٹ پڑے۔ فتح مکہ سے پہلے جو لوگ قبولِ اسلام کے لیے حضورؐ کی خدمت میں آتے وہ ڈرتے ڈرتے آتے۔ اس وقت تک اسلام قبول کرنا تو درکنار اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ہمدردی کا کوئی کلمہ کہنا بھی عام لوگوں کے لیے ایک خطرہ مول لینے کے حکم میں تھا۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اس دور میں انصار کے بعض وفود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرنے آئے تو قریش کے لیڈروں نے ان کو ڈرایا کہ آپ لوگ ان سے بیعت کر رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ یہ بیعت اسود و احمر سے جنگ کے ہم معنی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے استبداد کی موجودگی میں وہی لوگ اسلام لانے کا حوصلہ کر سکتے تھے جو پہاڑوں سے لڑ جانے کا حوصلہ رکھتے ہوں لیکن جب یہ استبداد پاش پاش ہو گیا تو پھر کوئی مزاحمت باقی نہیں رہ گئی۔ لوگ ہر طرف سے اس طرح مدینہ کی طرف بڑھے گویا اس چشمۂ حیواں پر پہنچنے کے لیے پیاس سے تڑپ رہے تھے۔

یہی فتح ہے جس نے ملک کے حالات میں وہ تبدیلی پیدا کی کہ لوگ اپنے دین کے انتخاب کے معاملے میں بالکل آزاد ہو گئے اور سرزمین عرب سے اس فتنہ کا بالکلیہ خاتمہ ہو گیا جس کے بل پر قریش کے لیڈر لوگوں کے دین و ایمان کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ اس بشارت کے پردے میں گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا گیا کہ اب جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ لوگ قریش کے ظلم و استبداد سے بالکل آزاد ہو کر اللہ کے دین

کی طرف دوڑیں گے اور کسی کی مجال نہ ہوگی کہ ان کی راہ میں کوئی مزاحمت پیدا کرسکے۔ یہ چیز اس بات کی نہایت محکم دلیل ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور فتح نہیں ہے جس سے یہ اثرات نمایاں ہوئے ہوں۔ جن لوگوں نے اس سے کوئی اور فتح مراد لی ہے انھوں نے اس سورہ کے مضمرات اور فتح مکہ کے اثرات دونوں کا اندازہ کرنے میں غلطی کی۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (۳)

اس آیت کے دو خاص پہلو

یہ آیت اپنے اندر یوں تو کئی پہلو رکھتی ہے لیکن دو پہلو خاص اہمیت والے ہیں۔

اوّل یہ اس فرض کی طرف رہنمائی کرتی ہے جو اس فتح و نصرت کے حاصل ہونے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت پر عائد ہوا یعنی یہ کہ اس پر اترانے اور فخر کرنے کے بجائے لوگ اپنے رب کی حمد و تسبیح کریں، اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگیں اور یہ توقع رکھیں کہ اللہ تعالیٰ بڑا ہی مہربان و کریم ہے اس کے جو بندے اپنی کوتاہیوں کی معافی کے لیے اس سے رجوع کرتے ہیں وہ ان کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے۔ سورۂ کوثر میں جس طرح فرمایا ہے: إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ۞ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (الکوثر - ۱۰۸: ۱-۲) (ہم نے تم کو بخشا کوثر تو اپنے خداوند ہی کی نماز پڑھو اور اسی کے لیے قربانی کرو) اسی طرح یہاں یہ آیت اس ذمہ داری کے بیان کے لیے بھی آئی ہے جو اس فتح و نصرت کا لازمی تقاضا ہے اور اس چیز کی بھی یہ تعلیم دے رہی ہے جو اس کے بقا کی ضامن ہے۔ بندوں کو جو نعمت بھی حاصل ہوتی ہے اس کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی لازماً وابستہ ہوتی ہیں۔ جب تک بندے ان ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں وہ نعمت ان کو حاصل رہتی ہے، جب وہ ان کو بھلا بیٹھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کچھ مہلت دینے کے بعد وہ ان سے یا تو چھین لیتا ہے یا وہ اس کے سبب سے نہایت سخت آزمائشوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

دوسرا پہلو اس کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بشارت کا ہے کہ اس فتح کے بعد آپ کے لیے اس عظیم فریضہ سے باعزت طور پر سبکدوش ہونے کا وقت آ جائے گا جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا جو بوجھ ڈالا گیا اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں آپ نے اپنی ساری طاقت جس طرح نچوڑی اور جس طرح اپنے آپ کو اس میں معروف رکھا اس کی تفصیلات پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخاطب کر کے نہایت محبت آمیز انداز میں عتاب فرمایا کہ: مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ (طٰہٰ - ۲۰: ۲) (ہم نے تم پر یہ قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ اس کی خاطر تم اپنی زندگی اجیرن بنا لو) اس حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سب سے بڑی بشارت کوئی ہو سکتی تھی تو یہی ہو سکتی تھی کہ وہ دن آئے کہ آپ اس بار عظیم سے سبکدوش ہوں اور باعزت طریقہ سے سبکدوش ہوں۔

چنانچہ اس سورہ نے آپ کو یہ بشارت دے دی اور فحوائے کلام سے یہ بات بھی نکلی کہ آپ اپنی ذمہ داری سے عزت و سرخروئی کے ساتھ فارغ ہوں گے۔ اس لیے کہ آیت میں آپ کو استغفار کی ہدایت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے توّاب ہونے کی بشارت بھی دی گئی ہے۔ لفظ 'تَوَّابٌ' جب اللہ تعالیٰ کے لیے آتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان اور ان کی لغزشوں سے درگزر کرنے والا ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام سے صادر ہونے والی لغزشوں کی نوعیت

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے اس کا تعلق اسی طرح کی باتوں سے ہے جن کی وضاحت ہم برابر کرتے آ رہے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے اتباع ہوا کے قسم کے گناہ تو صادر نہیں ہوتے لیکن بعض اوقات کوئی نیک محرک ان کو کسی نیکی میں حدِ مطلوب سے متجاوز کر دیتا ہے جس کی ایک مثال سورۂ طٰہٰ کی اس آیت میں بھی موجود ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپ کو جس بات پر ٹوکا گیا ہے وہ اتباع ہوا کے قسم کی کوئی چیز نہیں بلکہ دین میں منہمک اور ان سرکشوں کے پیچھے اپنے کو کھپانے پر ٹوکا گیا ہے جو اس ناز برداری کے اہل نہیں تھے۔

یہ بشارت اس سے زیادہ واضح لفظوں میں سورۂ فتح میں گزر چکی ہے اور ہم ہر پہلو سے اس کی وضاحت بھی کر چکے ہیں۔ آیت کا حوالہ ہم یہاں دیے دیتے ہیں جن کو تفصیل مطلوب ہو وہ تدبر قرآن میں اس کی تفسیر پڑھ لیں[1]

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ	ہم نے تمھیں ایک کھلی ہوئی فتح عطا فرمائی تاکہ
اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ	اللہ تمھاری اگلی اور پچھلی لغزشیں معاف فرمائے
وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا	اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے اور تمھیں ایک سیدھی
مُّسْتَقِيْمًا ۙ (الفتح ۴۸: ۱-۲)	راہ کی ہدایت بخشے۔

'فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ' کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ جب تسبیح اور حمد کے الفاظ ساتھ ساتھ آئیں تو تسبیح کے اندر تنزیہہ کا پہلو غالب ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ان باتوں سے پاک قرار دینا جو اس کی شانِ الوہیت کے منافی ہیں اور حمد کے اندر ان صفات کا اثبات ہوتا ہے جن سے وہ فی الحقیقت موصوف ہے۔ ان دونوں کے صحیح امتزاج ہی سے حقیقی توحید وجود میں آتی ہے جو ایمان کی بنیاد ہے۔

ربِّ کریم کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً۔

لاہور

۴ - جولائی ۱۹۸۰ء

۲۰ - شعبان ۱۴۰۰ھ

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد ششم، صفحات: ۴۳۶ - ۴۴۴

تدبّرِ قرآن

١١١

اللّھب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق و لاحق سے تعلق

اس سورہ کے عمود اور سابق و لاحق سے اس کے تعلق پر استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ایسی جامع اور حکیمانہ بحث کی ہے کہ ہم اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجائے اسی کے بعض اہم اقتباسات پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

"سورۂ نصر کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فتح مکہ پر تمام کی، اسی طرح آپ کے لائے ہوئے صحیفہ کو اس فتح عظیم کے ذکر پر ختم کیا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حق اپنے مرکز پر پہنچ گیا۔ خانۂ کعبہ کے مرکز توحید و اسلام اور سرچشمۂ ملتِ ابراہیم ہونے کے سبب سے فتح مکہ ہی آپ کی بعثت کا گویا آخری اور تکمیلی کام تھا۔ اس کے بعد صرف ثابت قدمی اور استقامت کی ضرورت رہتی تھی جس کے لیے تین سورتیں اس کے بعد لگا دی گئیں۔ سورۂ اخلاص، جو تمام معارفِ توحید کا خزانہ اور دین کی بنیاد ہے اور سورۂ فلق و سورۂ ناس دعائے استقامت کی تعلیم اور شیاطینِ جن و انس کی آفت سے اس خزانہ کی حفاظت کے لیے۔"

اس کے بعد مولانا علیہ الرحمۃ سورۂ نصر، سورۂ اخلاص اور معوذتین (سورۂ فلق اور سورۂ ناس) کے اس جھرمٹ میں سورۂ لہب کے رکھے جانے کی حکمت یہ بیان فرماتے ہیں:

"اس تمہید سے واضح ہوا کہ یہ تمام سورتیں ـــــ سورۂ نصر، سورۂ اخلاص اور معوذتین ـــــ باہم دگر مربوط ہیں اس وجہ سے سورۂ لہب کا ان کے درمیان رکھا جانا بھی لازماً کسی حکمت پر مبنی ہوگا ورنہ یہ پورا سلسلۂ نظم درہم برہم ہو جائے گا۔ چنانچہ غور و فکر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سورۂ نصر میں جس فتح و غلبہ کا ذکر ہے سورۂ لہب میں اسی کی وضاحت و بشارت۔ گویا یوں فرمایا گیا کہ اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کو غلبہ دیا اور اس کے دشمن کو برباد کیا۔ چنانچہ دوسرے مقام میں یہ بات یوں واضح فرمائی گئی:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ حق نمودار ہو گیا اور باطل برباد

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ٥　　　　ہوا۔ بلاشبہ باطل مٹنے ہی کی
(بنی اسرآءیل - ۱۷ : ۸۱)　　　　چیز ہے

اس نظم کی نہایت خوب صورت مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ میں بھی ہے جو آپ نے فتح مکہ کے دن، خانہ کعبہ کے دروازے پر دیا۔ آپ نے فرمایا :

لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ　　　　خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں۔
وصدق وعدہ ونصر　　　　اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے
عبدہ وھزم الاحزاب　　　　کی مدد فرمائی اور دشمنوں کی تمام پارٹیوں
وحدہ۔　　　　کو یکہ و تنہا شکست دی۔

بظاہر تو یہ تین الگ الگ فقرے ہیں لیکن ایک صاحب نظر کے لیے ان تینوں کے اندر علی الترتیب تین سورتوں کے مضمون پنہاں ہیں۔ پہلا فقرہ 'لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ' سورۂ کافرون کے ہم معنی ہے۔ دوسرا فقرہ 'وصدق وعدہ ونصر عبدہٗ' سورۂ نصر کا ہم مضمون ہے۔ تیسرا جملہ 'وھزم الاحزاب وحدہٗ' اور سورۂ لہب ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ معلوم ہوا کہ جس طرح یہ تینوں فقرے ایک صاحب نظر کے لیے بالکل مربوط و منظم ہیں اسی طرح جو لوگ ان سورتوں کے مضامین پر غور کریں گے وہ ان سب کو ایک ہی زنجیر کی مربوط کڑیوں کی شکل میں پائیں گے۔

ب۔ اس امر کا بیان کہ یہ سورہ مدنی اور فتح مکہ کی بشارت ہے

ایک اہم سوال اس سورہ سے متعلق یہ بھی ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی؟ ہمارے مفسرین نے عام طور پر اس کو مکی قرار دیا ہے لیکن یہ رائے کچھ قوی نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے حق میں واحد دلیل جو ان کی طرف سے پیش کی گئی ہے یہ ہے کہ یہ جواب ہے ابولہب کی اس گستاخی کا جو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کی تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ جب آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ اپنے قریبی اعزہ کو خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو ایک دن آپ علی الصباح کوہ صفا پر چڑھ گئے اور وہاں 'واصباحاہ' کا نعرہ لگایا۔ عرب میں یہ نعرہ خطرہ کا الارم سمجھا جاتا۔ یہ نعرہ سن کر قریش کے تمام خاندان آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر گراں تمہارے اوپر حملہ کے لیے گھات لگائے ہوئے ہے تو کیا تم باور کرو گے؟ سب نے جواب دیا کہ ہاں ہم ضرور باور کریں گے، ہم نے آپ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں پایا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو میں ایک سخت عذاب سے آگاہ کر رہا ہوں جو تم پر آنے والا ہے۔ یہ سن کر ابولہب نے سبقت کر کے کہا : تَبًّا لَكَ أَلِهٰذَا دَعَوْتَنَا!

(تیرا ناس ہو، کیا اسی لیے تم نے ہم سب کو دعوت دی!)

مفسرین اسی واقعہ کو اس سورہ کا شانِ نزول قرار دیتے ہیں کہ جب 'تَبًّا لَكَ' کے الفاظ سے ابولہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسلی کے لیے اس کی اور اس کی بیوی کی مذمت میں یہ سورہ اتاری۔ یہ واقعہ ظاہر ہے کہ مکہ کے بالکل ابتدائی دور میں پیش آیا اس وجہ سے مفسرین کے نزدیک سورہ کا نزول بھی اسی دور میں ہوا ہے۔ جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے اس سے تو انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ بات مختلف وجوہ سے محلِ نظر ہے کہ یہ سورہ ابولہب کے جواب اور اس کی اور اس کی بیوی کی مذمت میں نازل ہوئی ہے۔

اول تو یہی بات کھٹکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں میں سے کسی کی گستاخی کا اس طرح ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے۔ جہاں تک مخالفت، اور توہین و دل آزاری کا تعلق ہے ابولہب کی کچھ خصوصیت نہیں ہے۔ مکہ اور طائف کے اکثر لیڈر اس جرم میں شریک رہے ہیں لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تمام زیادتیوں کے جواب میں خود بھی صبر و حلم کا رویہ اختیار فرمایا، اپنے صحابہؓ کو بھی اسی کی تاکید فرمائی اور اسی رویہ کی تاکید آپ کو بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی فرمائی گئی۔ ان میں سے کسی کے جواب میں بھی، خواہ اس کی گستاخی کی نوعیت کتنی ہی سنگین رہی ہو، آپ کی زبانِ مبارک سے کوئی ایسا کلمہ نہیں نکلا جس میں مذمت کا کوئی پہلو ہو۔ آپ کو حکمت اور دل پذیر موعظت کے ساتھ دعوت کی ہدایت فرمائی گئی تھی اور آپ نے اس ہدایت پر ہمیشہ عمل فرمایا۔ مذمت اور سبّ و شتم تو در کنار آپ نے اپنی قوم کے کفار کو کفار کے لفظ سے بھی، جیسا کہ سورۂ کافرون کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے اس وقت خطاب فرمایا ہے، جب ان پر اتمامِ حجت ہو چکا ہے اور وقت آ گیا ہے کہ آپ قوم سے اعلانِ براءت کر کے ہجرت کر جائیں۔ یہی طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دوسرے انبیاء علیہم السلام کا بھی رہا ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعوت کے بالکل آغاز ہی میں اپنے چچا کے ایک فقرہ سے اس درجہ آزردہ ہو جائیں کہ اس کی مذمت کے جواب میں، آپ کی تسکینِ قلب کے لیے ایک ایسی سورہ نازل کی جائے جس میں مفسرین کے بقول صرف اسی کی نہیں بلکہ اس کی بیوی کی بھی خبر لی گئی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ 'تَبًّا لَكَ' کے الفاظ اور 'تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ' کے الفاظ میں باعتبارِ مفہوم بڑا فرق ہے۔ 'تَبًّا لَكَ' کے الفاظ تو بے شک بددعا، مذمت اور تحقیر کے لیے آتے ہیں لیکن یہ بات نہیں ہے کہ 'تَبَّ' سے جو دوسرے محاورات پیدا ہوئے ہیں ان کے اندر بھی لازماً ہجو و مذمت کا مفہوم پایا جائے۔ اگر 'تَبًّا لِاَبِيْ لَهَبٍ' کے الفاظ ہوتے تب تو اس گمان کے لیے گنجائش تھی کہ اس کو ابولہب کی بات کا ترکی بہ ترکی جواب سمجھا جائے لیکن الفاظ 'تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ'

کے ہیں۔ اس محاورے کے اندر ہجو و مذمت اور بددعا کا مضمون نہیں بلکہ جیسا کہ آیت کی تفسیر کے تحت ہم واضح کریں گے، ابولہب کے اقتدار کے ڈھے جانے، اس کے انصار و اعوان کے ٹوٹ جانے اور اس کی دولت و حشمت کے برباد ہو جانے کا مضمون پایا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ یہ جملہ انشائیہ نہیں بلکہ خبریہ ہے اور یہ خبر ماضی کے صیغہ میں ابولہب کی بربادی کی پیشین گوئی ہے جو اس وقت کی گئی ہے جب اس پر حجت تمام کی جا چکی ہے۔ پس یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے بلکہ اس کا نزول اس وقت ہوا ہے جب ابولہب کی تباہی کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔ اس کی موت غزوۂ بدر کے کچھ بعد واقع ہوئی ہے اس وجہ سے اس کا نزول بھی اسی کے لگ بھگ ہوا ہے۔ اسلوبِ کلام سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ سورہ اس کی موت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اگر موت کے بعد نازل ہوتی تو اس کا اسلوبِ کلام اس سے مختلف 'اَلَمْ تَرَ کَیْفَ' یا اس سے ملتا جلتا ہوتا۔ ماضی کا یہ اسلوبِ بیان مستقبل میں ہونے والے واقعات کی قطعیت کے اظہار کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کی بکثرت مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔

سُورَةُ اللَّهَب

مَدَنِيَّةٌ ———— آیات: ۵

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

آیات ۱-۵ تَبَّتۡ يَدَاۤ اَبِىۡ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝۱ مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُ مَالُهٗ وَمَا
كَسَبَ ۝۲ سَيَصۡلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝۳ وَّامۡرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ
الۡحَطَبِ ۝۴ فِىۡ جِيۡدِهَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ۝۵ ع ۵ / ۳۶

ترجمۂ آیات ۱-۵ ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود بھی ڈھے گا۔ نہ اس کا مال اس
کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی۔ وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ اس کی بیوی بھی
ایندھن ڈھوتی ہوئی۔ اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسّی ہوگی۔ ۱-۵

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (۱)

'تبت یدا،' کا مفہوم — 'تَبَّ' کے معنی ہلاک ہونے اور خسارہ میں پڑنے کے ہیں۔ اسی سے 'تبت یدا فلان' کا محاورہ نکلا ہے جس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ فلاں کے دونوں ہاتھ حصولِ مقصد میں ناکام و عاجز ہو گئے۔ دونوں ہاتھوں کی ناکامی اور بے بسی کامل بے بسی کی تعبیر ہے۔ اگر کہیں کہ 'تبت یداہ' تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ مقابلہ کرنے سے بالکل عاجز ہو گیا۔ اسی طرح 'کسر یدہ' (ہاتھ توڑ دینا) کسی کا زور توڑ دینے کی تعبیر ہے۔ فند الزمانی کا شعر ہے:

وترکنا دیار تغلب قفرا　　　وکسرنا من الغواۃ الجناحا

(ہم نے تغلب کے علاقہ کو چٹیل بنا کے چھوڑ دیا اور ان کے سرکشوں کے بازو توڑ دیے)

عبرانی زبان میں بھی، جو عربی کی بہن ہے، یہ محاورہ استعمال ہوا ہے۔ صحیفہ ذی الکفل کے باب ۳۰ آیات ۲۰-۲۲ کے فقرے ملاحظہ ہوں:

"گیارھویں برس کے پہلے مہینہ کی ساتویں تاریخ کو یوں ہوا کہ خداوند کا کلام مجھے پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد! میں نے مصر کے بادشاہ، فرعون کا بازو توڑا اور دیکھ وہ باندھا نہیں جائے گا اور دوا کی تدبیر کر کے اس پر پٹیاں کسی نہیں جائیں گی کہ تلوار پکڑنے کے لیے مضبوط ہو۔ اس لیے خداوند یہوہ یوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں مصر کے بادشاہ، فرعون کا مخالف ہوں اور اس کے بازوؤں کو، اسے جو زبردست ہے اور اسے جو ٹوٹا تھا، توڑوں گا اور اس کے ہاتھ سے تلوار گرا دوں گا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اس لفظ کے اندر ہجو و مذمت کا کوئی پہلو نہیں ہے بلکہ یہ صرف ابولہب کے اقتدار کے زوال اور اس کی تباہی کی پیشین گوئی ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہاں اس کا ذکر کنیت کے ساتھ ہوا ہے اور اہل عرب جب کسی کا ذکر کنیت کے ساتھ کرتے ہیں تو اس میں فی الجملہ احترام مدِنظر ہوتا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب — یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ پورے قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں میں سے کسی کا ذکر بھی اس کے نام کی تصریح کے ساتھ نہیں ہوا پھر ابولہب ہی کی کیا خصوصیت تھی کہ اس کا ذکر اس کے نام سے ہوا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خاص اہتمام کے ساتھ اس کا ذکر کرنے کی یوں تو کئی وجہیں ہو سکتی ہیں لیکن دو باتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں جن کا ہم ذکر کریں گے۔

ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابولہب کی عداوت کی نوعیت دوسرے مخالفوں کی عداوتوں سے بہت مختلف تھی۔ قریش کے دوسرے لیڈروں کو آپ سے جو اختلاف تھا اس کی بڑی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ آپ کی دعوت کو دینِ آبائی کے خلاف سمجھتے تھے، یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ اس میں اپنے ذاتی اغراض و مفادات کے لیے کوئی خطرہ محسوس کرتے ہوں۔ آپ جن مکارمِ اخلاق کی دعوت دیتے تھے ان کی عزت ان کے دلوں میں بھی تھی۔ آپ یتیموں اور مسکینوں اور غلاموں کے ساتھ جس حسنِ اخلاق پر لوگوں کو ابھارتے تھے قریش کے بہت سے شریفوں کے اندر اس کے لیے بھی بڑا احترام تھا، وہ چاہتے تھے کہ یہ سارے کام ہوں۔ اور اس معاملہ میں ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن ظن بھی تھا اس لیے کہ وہ آپ کو تمام اعلیٰ اوصاف سے عملاً متصف پاتے تھے۔ ان کو غصہ تھا تو اس بات پر تھا کہ اپنی دعوت میں آپ ان کے بتوں کی تحقیر کرتے ہیں۔ سورۂ کافرون کی تفسیر میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ وہ اس بات پر آمادہ تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بتوں کے معاملے میں اپنا لب و لہجہ کچھ نرم کر دیں تو وہ بھی آپ کی دعوت کے معاملہ میں اپنی روش تبدیل کر دیں گے۔

ابولہب کا ذکر نام کے ساتھ کیے جانے کی وجوہ

اس کے برعکس ابولہب کی مخالفت تمام تر اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ کے لیے تھی۔ وہ بیت اللہ کے بیت المال (رفادہ) کا نگران تھا اور اپنے زمانے میں اس نے اس طرح اس پر قبضہ کر رکھا تھا کہ اس کا بڑا حصہ یتیموں، مسکینوں اور حاجیوں کے بجائے اس کے اپنے جیب میں جاتا جس کی بدولت وہ اپنے زمانے کا قارون بن گیا۔ اس نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکارمِ اخلاق کی دعوت اور بیت اللہ کے مقصدِ تعمیر کی آیتیں سنیں[1] تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے احتساب کا وقت قریب آ رہا ہے۔ اگر جلد سے جلد آپ کی دعوت کو دبانے کی اس نے تدبیر نہ کی تو ان تمام مفادات سے اسے دست بردار ہونا پڑے گا جن سے وہ اس وقت بے روک ٹوک بہرہ مند ہو رہا ہے۔ چنانچہ وہ کمر باندھ کے آپ کی دعوت کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کردار کی تصویر سورۂ ھمزہ اور بعض دوسری سورتوں میں کھینچی گئی ہے۔ جن لوگوں کی مخالفت یا موافقت ذاتی اغراض سے بالاتر کسی مقصد کے لیے ہوتی ہے، اگرچہ وہ مقصد غلط ہی ہو، ان کے اندر فی الجملہ

---

[1] اس گروپ کی سورتوں میں سے بھی متعدد سورتوں میں یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ بلد، سورۂ فیل اور سورۂ قریش وغیرہ میں۔

شرافت ہوتی ہے برعکس اس کے جس کی مخالفت و موافقت محض اس کی ذات کے مفاد کے ارد گرد گھومتی ہے وہ شرافت سے بالکل تہی ہوتی ہے۔ یہی رمز ہے کہ ابوجہل اور ابوسفیان کی مخالفت اور ابولہب کے انداز مخالفت میں نمایاں فرق نظر آتا ہے اور یہی فرق ہے جو سبب ہوا اس بات کا کہ اس عدو کا ذکر خاص طور پر نام لے کر کیا جائے تاکہ لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہو کہ کس کردار کے لوگ حق کے اصلی دشمن ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا مزاج ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں وصل اور فصل کی بنیاد صرف اللہ کا دین ہے۔ وہ لوگ نبی کے ساتھی اور محبوب و محب بن جاتے ہیں جو اللہ کے دین کو اختیار کر لیتے ہیں اگرچہ وہ کتنے ہی دور کے ہوں اور وہ لوگ کاٹ پھینکے جاتے ہیں جو اللہ کے دین کے مخالف ہوتے ہیں، اگرچہ باعتبار نسب و رشتہ وہ نبی کے کتنے ہی قریبی ہوں۔ اسی حقیقت کے اظہار کے لیے قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کے واقعات نہایت خاص اہتمام کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اسی مقصد سے یہاں ابولہب کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا تاکہ یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خاندان اور نسب کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک گڈریا رسول کا محب اور محبوب بن سکتا ہے اگر وہ اس کی دعوت قبول کر لیتا ہے اور اگر اس کا چچا بھی اس کی دعوت رد کر دے تو اس کا تعلق بھی اللہ اور رسول سے یک قلم ختم ہو جاتا ہے۔ سورۂ کافرون میں اہل کفر سے براءت کا جو اعلان ہے یہ گویا اس کی عملی شہادت ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ابولہب کے اقتدار کے زوال کی پیشین گوئی کے لیے تو تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ کے الفاظ بظاہر بالکل کافی ہیں، پھر اس کے بعد 'وَّتَبَّ' کا لفظ لانے کا کیا خاص فائدہ ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے ٹکڑے میں اس کی سیاسی قوت کے ٹوٹ جانے کی پیشین گوئی ہے اور اس دوسرے میں اس کی اپنی ذات کے خاتمہ کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ یہ پیشین گوئی ٹھیک اسی طرح پوری بھی ہوئی۔ غزوۂ بدر میں قریش کے جو سردار مارے گئے ان میں سے اس کے بہت سے خاص حامی تھے جن کی موت سے اس کی سیاسی ساکھ کو بہت نقصان پہنچا۔ پھر غزوۂ بدر کے کچھ ہی بعد وہ خود چیچک میں مبتلا ہوا۔ اس بیماری کے دوران چھوت کے اندیشہ سے، نہ اس کے ساتھیوں نے اس کی خبر گیری کی نہ اس کے بیٹوں اور خاندان کے عزیزوں نے۔ اسی بےکسی کے حال میں اس نے جان دی اور لاش کئی دن تک گھر ہی میں پڑی سڑتی رہی۔ بالآخر لوگوں کے طعنوں سے تنگ آ کر اس کے بیٹوں نے کرایہ کے کچھ حبشیوں کی مدد سے لاش مکہ کے بالائی حصہ میں پھنکوائی اور دور دور ہی سے اس پر پتھر وغیرہ ڈال کر ڈھانک دی۔ یہ

امر یہاں ملحوظ رہے کہ کسی پر پتھر پھینکنا اس پر لعنت کرنے کے ہم معنی ہے۔

علاوہ ازیں یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ غزوۂ بدر میں، قریش کے تمام سردار پورے جوش و خروش سے شریک ہوئے، لیکن ابولہب نے بزدلی کے سبب سے شرکت نہیں کی بلکہ ایک دوسرے شخص کو، جس پر اس کا کچھ قرض آتا تھا، جس کی وصولی کی توقع باقی نہیں رہی تھی، اس نے مجبور کیا کہ وہ اس قرض کے عوض میں اس کی طرف سے جنگ میں شریک ہو۔ چنانچہ وہ شریک ہوا اور غالباً مارا بھی گیا اور یہ بزدل گھر میں بیٹھا رہا لیکن یہ تدبیر بھی اس کو موت سے بچانے میں کارگر نہ ہو سکی۔ اس جنگ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ چیچک میں مبتلا ہو کر نہایت ذلت کی موت مرا۔ ہمارے نزدیک 'وَتَبَّ' کا لفظ اس کے اسی انجام کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ (۲)

روپیہ کی طاقت بڑی سے بڑی مقدار بھی خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکتی

روپیہ کے حریص روپیہ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے ذہن کے اندر یہ خناس سما جاتا ہے کہ اگر روپیہ ہے تو وہ خدا کی گرفت سے بھی محفوظ ہیں۔ سورۂ ھمزہ میں زر پرست بخیلوں کی ذہنیت سے یوں پردہ اٹھایا گیا ہے:

اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ یَحْسَبُ	جس نے مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر
اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۚ	رکھا گمان کرتے ہوئے کہ اس کا مال اس
(الھمزۃ - ۱۰۴: ۲-۳)	کو ہمیشہ رکھے گا۔

ہم نے اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ یہ درحقیقت ابولہب اور اس کے ہم مشربوں کی تصویر ہے۔ اس طرح کے لوگ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ انھیں خدا سے بھی سابقہ پیش آنے والا ہے اور وہ ان کو کسی ایسی آزمائش میں ڈال سکتا ہے جس سے روپیہ کی بے حقیقتی بالکل واضح ہو جائے گی۔ ابولہب اسی خبط میں عمر بھر پڑا رہا بالآخر اس پر وہ گردش آئی کہ اس نے اپنی آنکھوں دیکھ لیا کہ روپیہ کی بڑی سے بڑی مقدار بھی خدا کی پکڑ سے انسان کو نہیں بچا سکتی۔

'وَمَا كَسَبَ' کی تاویل

'وَمَا كَسَبَ' کی تاویل میں مفسرین سے کئی قول منقول ہیں۔ بعض لوگوں نے اس سے اس کے بیٹوں کو مراد لیا ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ آخر میں، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، اس کے بیٹے بھی اس کے کچھ کام نہ آئے لیکن اس تاویل میں تکلف ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے اس کی وہ کمائی مراد لی ہے جو اس نے حرام راستوں سے حاصل کی، لیکن اس مفہوم کے لیے اول تو یہ لفظ کچھ موزوں نہیں ہے ثانیاً 'مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ' کے بعد اس کی کچھ ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہمارے نزدیک اس سے اس کے وہ اعمال مراد ہیں جو اس نے اپنی دانست میں نیکی کے سمجھ کر کیے لیکن اس کے خبث باطن اور شرک کے سبب سے وہ بھی رائگاں ہو گئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ وہ بیت اللہ کے

شعبۂ مالیات کا انچارج تھا اس وجہ سے اسے غریبوں، مسکینوں اور حاجیوں کی خدمت کے کچھ کام کرنے ہی پڑتے تھے۔ لیکن یہ محض نمائش کے لیے مجبورانہ صرف اس غرض سے کیے جاتے کہ اس کی خیانتوں پر پردہ پڑا رہے۔ اس طرح کے کام خدا کے ہاں درخورِ اعتناء نہیں ٹھہرتے۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۳)

آخرت میں جس انجام سے وہ دوچار ہوگا

پچھلی دونوں آیتوں میں اس کا وہ حشر بیان ہوا ہے جو اس دنیا میں اس کے سامنے آیا۔ اب یہ اس کا وہ انجام بیان ہو رہا ہے جس سے وہ آخرت میں دوچار ہوگا۔ فرمایا کہ وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ یہاں آگ کی صفت 'ذَاتَ لَهَبٍ' پر نظر رہے۔ اس کی کنیت 'ابولہب' تھی، اس کی رعایت سے اس کے لیے آگ "ذَاتَ لَهَبٍ" ہوگی۔ 'لَهَبٌ' کے معنی شعلہ کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ سرخ و سپید شعلہ رُو تھا اس وجہ سے اس نے یا تو خود یہ کنیت اختیار کی یا اس کے خوشامدیوں نے اس سے اس کو پکارا اور یہ اتنی مشہور ہوئی کہ اس کا اصل نام ـــــ عبدالعزّٰی ـــــ غائب ہو گیا۔ قرآن نے یہاں اس کا یہ انجام بیان کر کے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اس دنیا میں اس کو اپنی جس شعلہ روئی پر ناز رہا آخرت میں یہ اس کے لیے وبال بنے گی۔ وہ شعلوں والی آگ میں جھونکا جائے گا جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ظاہر کا حُسن کوئی فخر کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ آدمی کے لیے وبال بن سکتا ہے اگر اس کے ساتھ باطن کا حسن نہ ہو۔

وَامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۴)

فرمایا کہ اس کی بیوی بھی ایندھن ڈھوتی ہوئی اس کے ساتھ جہنم میں پڑے گی۔ عذاب میں اس کی بیوی کی یہ شرکت اسی صورت میں مطابقِ عدل ہے جب وہ بھی اس کے ان جرائم میں شریک رہی ہو جو اس کو جہنم میں لے جانے والے بنے۔ آدمی کے بیوی بچے بسا اوقات اس کے لیے ایسے جرائم کا سبب بن جاتے ہیں جو اس کی تباہی کا بھی سبب بنتے ہیں اور بیوی بچوں کی بھی۔ اسی بنا پر قرآن میں اہلِ ایمان کو خبردار کیا گیا ہے کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ	اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری
اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ	اولاد میں بعض تمہارے دشمن بھی ہیں تو ان
فَاحْذَرُوْهُمْ (التغابن - ۶۴: ۱۴)	سے بچ کے رہو۔

بیوی بچوں کے دشمن ہونے کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ ان کی بے جا خواہشوں اور فرمائشوں کی تعمیل اور ان کی غلط نازبرداری کے فتنہ میں مبتلا ہو کر آدمی خدا کے احکام و حدود کی پاسداری سے غافل اور بخل و خیانت کا مرتکب ہو جائے۔ بیوی بچوں کو اسی پہلو سے فتنہ قرار دیا گیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا ہے کہ آدمی کی اولاد اس کو بخل اور بزدلی میں مبتلا کرنے والی ہے

معلوم ہوتا ہے کہ ابولہب کی بیوی بگڑی ہوئی بیگمات کی طرح فیشن کی دلدادہ، زیورات کی شوقین، دولت کی حریص اور نمائش کی رسیا تھی۔ اس نے ابولہب کے بگڑے ہوئے مزاج کو اور بگاڑا۔ یہاں تک کہ وہ بھی اسی عذاب کی مستحق ٹھہری جس میں اس کا شوہر داخل ہوا۔

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کی تاویل

'حَمَّالَةَ الْحَطَبِ' کی تاویل میں بڑا اختلاف منقول ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے تو یہ ہے کہ یہ بطور ہجو و تحقیر اس کی وہ حالت بیان ہوئی ہے جو اس کی اس دنیا میں تھی۔ وہ لونڈیوں کی طرح گلے میں رسی ڈال کر جنگل جاتی اور سر پر ایندھن کا گٹھر لاد کر لاتی۔ یہ قول سب سے زیادہ مشہور ہے لیکن یہ جتنا ہی مشہور ہے اتنا ہی خلاف عقل و قیاس ہے۔

یہ امر یاد رکھیے کہ عرب کی عنانِ حکومت قریش کے ہاتھ میں تھی۔ خاص طور پر بنی ہاشم تو پورے عرب کے سرتاج تھے۔ ابولہب یوں تو خاندانی صاحب ثروت و دولت تھا پھر اس زمانے میں، جس کا ذکر ہے، اس کو قریش کی مذہبی حکومت میں اتنا اونچا مقام حاصل ہو گیا تھا کہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ پوری حکومت عملاً اس کے انگوٹھے کے نیچے آگئی تھی۔ کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اتنے بڑے دولت مند لیڈر کی بیگم لونڈیوں کی طرح ایندھن ڈھونے کا کام کرے گی! ان لوگوں کا حال تو یہ تھا کہ ایک ایک خوش حال کے پاس درجنوں لونڈیاں اور غلام ہوتے اور ان کی بیگمات کی نازک مزاجی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلانا بھی کسر شان سمجھتی تھیں۔ ان کے عام آدمی بھی اپنے بچوں کو دوسرے قبیلوں کی دائیوں سے دودھ پلواتے۔

پھر ابولہب کی بیوی بھی کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ یہ ام جمیل بنت حرب، خاندانِ بنی عبدالشمس کی ایک نہایت باعزت خاتون تھی جو ہاشمی خاندان میں بیاہی گئی۔ اس کے شوہر کا جو مرتبہ حکومت میں تھا اس کا اعتبار کیجیے تو یہ کہنا مبالغہ نہیں ہو گا کہ اس کو اس وقت قریش میں وہی درجہ حاصل تھا جو اس زمانے میں کسی قوم کے اندر ان بیگم صاحبہ کو حاصل ہوتا ہے جو خاتونِ اوّل کہلاتی ہیں۔

غالباً انہی اعتراضات سے بچنے کے لیے بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ وہ خاردار جھاڑیاں لا لا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر ڈالتی تھی اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کے اندر لگانے بجھانے کی عادت تھی جس کی تعبیر 'حَمَّالَةَ الْحَطَبِ' سے کی گئی ہے۔ یہ اقوال اس قدر کمزور اور عربیت سے اس درجہ بعید ہیں کہ ان پر تنقید کرنا محض اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کرنا ہے۔ اس وجہ سے ہم ان سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ اگر کسی کو تفصیل مطلوب ہو تو وہ مولانا فراہی علیہ الرحمۃ کی تفسیر میں ان پر تنقید پڑھ لے۔

ہمارے نزدیک 'حَمَّالَةَ الْحَطَبِ' ترکیب میں حال پڑا ہوا ہے اور اس کی یہ حالت اس

وقت کی بیان ہوئی ہے جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ دوزخ میں پڑے گی۔ اس وقت اس کا حال اس مجرم کا سا ہوگا جو اپنی سولی کا تختہ اور اپنے جلانے کا ایندھن خود اٹھائے ہوئے ہو۔ حال کے سوا کوئی اور ترکیب اس کی از روئے عربیت صحیح نہیں ہو سکتی اور اس صورت میں وہ تمام اقوال از خود بے معنی ہو جاتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے اس لیے کہ حالیت کی صورت میں ان کو قبول کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

قیامت کے دن مجرموں کا جو حال ہوگا اس کی تصویر قرآن میں جگہ جگہ کھینچی گئی ہے اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کے الفاظ سے جو تصویر ابولہب کی بیوی کی سامنے آتی ہے وہ ٹھیک ٹھیک اسی کے مطابق ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:

وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ ۚ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ (الانعام - ۶ : ۳۱)	اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے اور سن لو کہ نہایت ہی بری چیز ہوگی جو وہ اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

اس سے زیادہ وضاحت سورۂ نحل میں ہے:

لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۙ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ (النحل - ۱۶ : ۲۵)	تاکہ وہ اٹھائیں اپنے بوجھ قیامت کے دن پورے پورے اور ساتھ ہی ان لوگوں کے بوجھ کا بھی کچھ حصہ جن کو وہ بغیر کسی علم کے گمراہ کر رہے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہوگی اور ابولہب کے جن گناہوں کی وہ محرک بنی ہوگی کچھ بوجھ ان کا بھی اس کو اٹھانا پڑے گا اور یہ بوجھ اس کے جلانے کے ایندھن کی صورت میں ہوگا۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح ہو گئی کہ ابولہب کی بیوی کے ذکر سے مقصود یہاں اس کی مذمت اور ہجو کر کے دل کو تسلی دینا نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے گمان کیا ہے، بلکہ اصل مقصود لوگوں، بالخصوص طبقۂ نسواں کو، اس کے انجام سے عبرت دلانا ہے کہ ایک بگڑی ہوئی عورت کس طرح اپنی تباہی کا بھی سامان کرتی ہے اور اپنے شوہر اور اپنی اولاد کی تباہی کا بھی۔ قرآن نے مردوں کے پہلو بہ پہلو عورتوں کا ذکر اسی لیے کیا ہے کہ ہر طبقہ اپنے طبقہ کے لوگوں کے حال اور انجام سے زیادہ بہتر طریقہ پر سبق حاصل کر سکتا ہے۔ یہ عورت دنیوی اعتبار سے چونکہ اونچے طبقہ سے تعلق رکھنے والی تھی اس وجہ سے اس کے انجام سے لونڈیاں اور بیگمات دونوں عبرت حاصل کر سکتی ہیں۔

فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۵)

ابولہب کی بیوی کے گلے کا ہار قیامت کے دن

یہ اسی تصویر کی تکمیل ہے جو اس سے پہلے والی آیت میں کھینچی گئی ہے۔ یعنی اس کی گردن میں اس طرح کی موٹی رسی پڑی ہوگی جس طرح کی رسی ایندھن ڈھونے والی لونڈیوں کی گردن میں ہوتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس آیت میں جو حالت اس کی بیان ہوئی ہے اس کو مفسرین آخرت کے متعلق مانتے ہیں، پھر تعجب ہے کہ اس سے پہلے والے ٹکڑے کو انھوں نے آخرت سے متعلق کیوں نہیں مانا جب کہ عربیت کے قاعدے سے ان دونوں کے درمیان ایسا اتصال ہے کہ ان کو کسی طرح الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔

لفظ 'مَسَدٌ' کھجور کے اس ریشے یا پتے یا چھلکے کے لیے بولا جاتا ہے جس سے مضبوط رسیاں بٹی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لفظ عام طور پر مضبوط اور موٹی رسی کے لیے بھی آتا ہے، خواہ وہ کھجور کے ریشے کی ہو یا چمڑے کی یا اس قسم کی کسی اور چیز کی۔ چرخی کی رسی کے لیے اس کا استعمال عام ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مضبوط اور موٹی رسی کے معنی میں معروف ہے۔

آیت کی ظاہر تاویل یہ ہے کہ جب وہ قیامت کے دن اٹھے گی تو اس کی گردن میں ایک مضبوط رسی پڑی ہوگی جو ایندھن ڈھونے والی لونڈیوں کی گردن میں پڑی ہوئی رسی کی طرح موٹی ہوگی۔

اب غور کیجیے کہ اس صفت کے اضافے سے کیا نئے حقائق روشنی میں آتے ہیں:

۱۔ اس میں ابولہب کی بیوی کی اس حالت کی وضاحت ہے جو لفظ 'حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ' میں بیان ہوئی ہے۔

۲۔ اس میں اس ذلت کی تصویر ہے جس میں وہ قیامت کے دن گرفتار ہوگی۔

۳۔ اس میں عمل اور نتیجۂ عمل کی موافقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس ہار کو پہن کر وہ دنیا میں اتراتی تھی قیامت کے دن وہ موٹی رسی کی شکل میں بدل جائے گا جس کے سبب سے اس کی شکل اس لونڈی کی ہو جائے گی جو گلے میں رسی ڈال کر لکڑیاں چننے جا رہی ہو۔

۴۔ مغرور عورتیں آرائش کے ساتھ ساتھ نمائش کی بھی دلدادہ ہوتی ہیں اس وجہ سے سامانِ آرائش کے حجم اور وزن کا خاص خیال رکھتی ہیں، اس وجہ سے ضروری ہوا کہ رسی موٹی ہو۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً۔

لاہور

۱۷۔ جولائی ۱۹۸۰ء

۴۔ رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ

تدبّرِ قرآن

١١٢

الاخلاص

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا عمود، ترتیب میں اس کا مقام، زمانۂ نزول و سابق ولاحق سے تعلق

سورہ ان سورتوں میں سے ہے جن کے نام ہی سے ان کے مضمون (عمود) کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا نام 'اخلاص' ہے اور یہ اخلاص ہی اس کا عمود ہے۔ اخلاص کا مطلب اللہ واحد پر اس طرح ایمان لانا ہے کہ اس کی ذات یا صفات یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی پہلو سے کسی دوسرے کی شرکت کا کوئی شائبہ نہ پایا جائے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کو ماننے کا تعلق ہے دنیا نے اس کو ہمیشہ مانا ہے۔ یہ چیز انسانی فطرت کا بدیہی تقاضا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شیطان توحید کا ابدی دشمن ہے اس وجہ سے وہ انسان کو فریب دے دے کر اس ماننے میں ایسی ملاوٹیں کرتا رہا ہے کہ ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہو کے رہ گیا ہے۔ توحید کی اصل حقیقت کو اجاگر کرتے رہنے ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے برابر اپنے رسول بھیجے لیکن انسان بار بار اس حقیقت کو پا پا کر کھوتا رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید ہی کی خاطر اپنی قوم سے ہجرت کی اور اپنی اولاد کو ایک وادیِ غیر ذی زرع میں بسایا کہ وہ مشرکانہ ماحول سے بالکل محفوظ رہ کر صرف اللہ واحد کی عبادت کرے لیکن پچھلی سورتوں میں آپ نے دیکھا کہ آپ ہی کی ذریت نے آپ ہی کے بنائے ہوئے مرکزِ توحید (بیت اللہ) کو ایک بت خانے کی شکل میں تبدیل کر دیا اور وہ اپنے خود تراشیدہ بتوں کی عصبیت میں اتنی سخت ہو گئی کہ خدا کے آخری رسول سے وہ اس بات پر لڑتی رہی کہ جب تک ان کے بتوں کا مقام تسلیم نہ کر لیا جائے گا وہ خدا کا حق بھی تسلیم نہیں کرے گی یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے جواب میں وہ فیصلہ کن اعلانِ براءت کرنا پڑا جو سورۂ کافرون میں آپ نے پڑھا۔

یہ اعلان اگرچہ کافی تھا لیکن اس کا تعلق اصلاً قریش اور مشرکینِ مکہ سے تھا۔ عرب میں اہلِ کتاب کے بھی مختلف قبائل تھے۔ یہ لوگ اگرچہ حاملِ کتاب ہونے کے مدعی تھے لیکن شیطان نے ان کو بھی ورغلا کر شرک کی نہایت گھنونی قسموں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ مدینہ اور اس کے اطراف میں ان کا خاصا اثر تھا یہاں تک کہ دینی معاملات میں اہلِ عرب بھی ان کی برتری علانیہ تسلیم

کرتے تھے۔

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہے اس وقت تک ان کی مخالفت درپردہ رہی لیکن جب آپ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو ان کی مخالفت بھی علانیہ ہو گئی۔ یہ لوگ چونکہ اہل کتاب تھے اس وجہ سے اس پندار میں مبتلا رہے کہ قرآن ان کے عقائد و اعمال کو بہر حال مشرکین کے مقابل میں کچھ اونچا درجہ دے گا لیکن قرآن نے ان پر واضح کر دیا کہ عقائد ہوں یا اعمال، ہر پہلو سے وہ نہایت گہرے کھڈ میں گر چکے ہیں۔ خاص طور پر نصاریٰ کے شرک پر قرآن نے جو تنقید کی اس کا اثر ان پر یہ پڑا کہ وہ بھی یہود کی طرح علانیہ میدانِ مخالفت میں اتر آئے اور مخالفین کے تینوں گروہوں ——— مشرکین، یہود اور نصاریٰ ——— نے مل کر ایک متحدہ محاذ اسلام کے خلاف قائم کر لیا۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اخلاص کی حقیقت واضح کرنے کے لیے آخری سورہ ایسی جامع ہو کہ وہ شرک کے تمام رخنوں کو بیک قلم بند اور مشرکین اور اہل کتاب دونوں پر حجت تمام کر دے۔ چنانچہ یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ اگرچہ ایک گروہ نے اس کو مکی قرار دیا ہے لیکن اس سورہ کی جامعیت، جیسا کہ آگے وضاحت ہو گی، دلیل ہے کہ یہ مکہ میں نہیں بلکہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے جب اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کی مخالفت بالکل آشکارا ہو گئی ہے۔

قرآن میں اس سورہ کو سورۂ لہب کے بعد جگہ ملی ہے اور ہم پیچھے واضح کر چکے ہیں کہ یہ اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ اب حق کا سب سے بڑا دشمن ختم ہوا اور وقت آ گیا کہ اس حقیقی توحید کی منادی اس سرزمین سے پھر بلند ہو جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں حرم تعمیر فرمایا۔ سورۂ لہب سے پہلے سورۂ نصر میں فتح کی بشارت تھی۔ اس کے بعد سورۂ لہب میں اسلام کے سب سے بڑے عدو کی ہلاکت کی خبر ہے۔ پھر اس سورہ ——— الاخلاص ——— میں اسلام کے بنیادی پتھر ——— توحید ——— کے اس کے اصلی مقام میں نصب کرنے کا اعلان ہے۔ یہ اعلان پیش نظر رکھیے کہ قریش اور اہل کتاب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کشمکش ملک و مال کے لیے نہیں تھی بلکہ اس لیے تھی کہ غیر اللہ کی خدائی کے ہر نقش کو مٹا کر اس کی جگہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی خدائی کے نقش کو اس طرح اجاگر کر دیا جائے کہ کسی کے لیے بھی اس کیا کسی اشتباہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ چنانچہ اس سورہ میں توحید و اخلاص کا ہر پہلو نمایاں کر دیا گیا اور اس کو قرآن کے سب سے آخر میں جگہ دی گئی۔ اس کے بعد جو دو سورتیں ہیں وہ، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا، اسی خزانۂ توحید کے پاسبان کی حیثیت رکھتی ہیں شیطان کی رخنہ اندازیوں سے حفاظت کے لیے وہ اس کے ساتھ لگا دی گئی ہیں۔

قرآن مجید کی ترتیب اس طرح ہے کہ اس میں سب سے پہلے توحید و اخلاص کی سورہ

——— الفاتحة ——— کو جگہ دی گئی ہے اور پھر سب سے آخر میں بھی توحید و اخلاص ہی کی سورہ ——— الاخلاص ——— کو جگہ ملی ہے۔ اس سے اس دین میں توحید کی اہمیت و عظمت ظاہر ہوتی ہے کہ وہی اس میں اوّل بھی ہے اور آخر بھی۔ سورۂ فاتحہ میں خدا کی شکرگزاری کا حق اس پہلو سے واضح فرمایا گیا ہے کہ وہی 'رب العٰلمین' بھی ہے اور وہی 'مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ' بھی۔ پھر اس سورہ میں مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے اللہ تعالیٰ کی وہ صفات بیان کی گئی ہیں جو ہر اس رخنہ کو بند کر دینے والی ہیں جن سے شرک کوئی راہ پا سکتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ توحید کی تعلیم میں مبادی کی حیثیت رکھتی ہیں اور مقدمۂ کتاب میں ہم اس آخری گروپ کی اس خصوصیت پر ایک جامع تبصرہ کر چکے ہیں کہ اس میں ان سورتوں کو جگہ ملی ہے جو دین کی تعلیم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ

مَدَنِیَّۃٌ ——— اٰیات: ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ (آیات ۱-۴)
یُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴ (ع ۱ ۴۷)

(ترجمۂ آیات ۱-۴) کہہ دو، وہ اللہ سب سے الگ ہے، اللہ سب کے ساتھ ہے۔ نہ
وہ کسی کا باپ اور نہ کسی کا بیٹا اور نہ کوئی اس کا کفو۔ ۱-۴

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱)

'قُلْ' منادی کرنے کے مفہوم میں

یہ 'قُلْ' اسی مفہوم میں ہے جس میں 'قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ' (الکافرون - ۱۰۹ : ۱) میں ہے یعنی اعلان کر دو، برملا کہہ دو اور اس طرح منادی کر دو کہ ہر شخص سن اور جان لے، نہ کسی کو کوئی اشتباہ باقی رہے، نہ کسی مزید سوال و جواب کی گنجائش رہ جائے۔

اعلان کا موقع و محل

اس طرح کے اعلان کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب بحث و مناظرہ کا پورا دور گزر چکا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سمجھانے کا حق ادا ہو چکا ہے، اب جو لوگ مزید بحثیں اٹھا رہے ہیں وہ سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ بات کو الجھانے اور طول دینے کے لیے اٹھا رہے ہیں۔ اس طرح کے موقع پر یہ مناسب ہوتا ہے کہ بات دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں اس طرح کہہ دی جائے کہ مخاطب اندازہ کر لے کہ متکلم نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا، اب وہ نہ اپنا مزید وقت ضائع کرنے کے لیے تیار ہے اور نہ اس کے موقف میں کسی تبدیلی یا لچک کی گنجائش ہے۔

'هُوَ' کا مفہوم

'هُوَ' میرے نزدیک ضمیر شان ہے۔ یہ اس معہود ذہنی یا صورت حال کے لیے آتی ہے جو مخاطب اور متکلم میں اس طرح مشترک ہو کہ اس کے بولتے ہی بے تکلف ذہن اس کی طرف منتقل ہو جائے۔ اسلام کی دعوت شروع ہونے کے بعد سے اہل عرب کی ہر مجلس میں سب سے زیادہ گرم موضوع یہی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا موضوع تھا۔ دعوت کے دوسرے عنوانات ——— معاد اور رسالت ——— بھی زیر بحث آتے لیکن ان کی حیثیت ضمنی مباحث کی تھی۔ توحید کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ قریش اس کو اپنی اور اپنے آبا و اجداد کی شان کا مسئلہ بنا بیٹھے تھے اور کسی قیمت پر بھی اپنے معبودوں اور اپنے ان اجداد کی توہین گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھے جو ان کو پوجتے رہے تھے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر آتا ہے تو وہ دعوت دینے والوں پر ان کا منہ نوچنے کے لیے جھپٹ پڑتے ہیں۔ ایک طرف قریش کی یہ انانیت دوسری طرف قرآن اور رسول کا وہ بے لچک موقف جو سورۂ کافرون میں بیان ہوا کہ پوری قوم کو کاٹ پھینکنا منظور لیکن شرک کے ساتھ کوئی سمجھوتہ منظور نہیں۔

جب تک بحث صرف مشرکین قریش سے تھی اس وقت تک تو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے مسئلہ میں کچھ زیادہ الجھنیں نہیں پیدا ہوئی تھیں۔ انھوں نے تقلیداً آبا میں بت پرستی اختیار تو کر

لی تھی لیکن اس کی تائید میں انھوں نے نہ متکلمانہ قسم کی موشگافیاں پیدا کی تھیں اور نہ اپنی امیت کے سبب سے یہ چیز وہ پیدا کر ہی سکتے تھے لیکن مدینہ میں کھلم کھلا اہل کتاب سے بھی سابقہ پیش آیا جو اہل کتاب ہونے کے باوجود نہ صرف شرک کی نہایت گھنونی قسموں میں مبتلا تھے بلکہ انھوں نے اپنے شرک کی حمایت میں ایک پورا علم کلام تیار کر رکھا تھا۔ خصوصاً نصاریٰ کی میتھالوجی۔ (Mythology) تو اپنی الجھنوں کے اعتبار سے دنیا میں شاید ایک ہی ہے۔ قرآن نے ان سب کو چیلنج کیا، ان سے مباحثے کیے اور ان کی گمراہیاں ان پر واضح کیں۔ ان میں سے جن کو ایمان کی توفیق ہوئی وہ ایمان لائے۔ جو ایمان نہیں لائے ان کو قرآن نے اپنے دلائل سے اس طرح لپا کر دیا کہ ان کے اہل کتاب ہونے کا رعب کم از کم عربوں کے دلوں پر سے تو بالکل ہی اٹھ گیا۔

توحید کی شان میں ایک مختصر اور جامع سورۃ

یہ نئی صورت مقتضی ہوئی کہ توحید کے باب میں ایک مختصر سورہ بھی نازل ہو جو مشرکین اور اہل کتاب دونوں کے پیدا کردہ شرک کے ہر رخنہ کو اس طرح بند کر دے کہ شیطان کے لیے دراندازی کی کوئی راہ کھلی نہ رہ جائے اور جو جامع ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی مختصر بھی ہو کہ اس کو ہر شخص یاد کر کے تعویذ کی طرح حرزِ جاں بنا سکے۔ چنانچہ یہ سورہ نازل ہوئی جو نہایت چھوٹی چھوٹی کل چار آیتوں پر مشتمل ہے لیکن 'معانی' کے اعتبار سے اس کو بعض عارفینِ قرآن نے ثلث قرآن کے برابر قرار دیا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ بات بالکل مبنی بر حقیقت ہے۔ قرآن کے مباحث اگر اپنے مطالب کے اعتبار سے جمع کیے جائیں تو وہ تین جامع عنوانات کے تحت جمع ہو سکتے ہیں: توحید، معاد اور رسالت۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ توحید کا حصہ قرآن میں بقدر ایک ثلث کے ہے۔ یہ مباحث قرآن کی مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان پھیلے ہوئے مباحث کو اگر اچھی طرح چھانیے تو ان کے اندر سے خدا کی ذات و صفات سے متعلق وہ جواہر ریزے نکلیں گے جو اس مختصر سورہ میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ گویا قرآن میں ردِ شرک کی ساری بحث انہی چند نکتوں پر مبنی ہے جن کا اس سورہ میں اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اصل صفات جن کا علم ضروری ہے

'قُلْ هُوَ اللّٰهُ' کے الفاظ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا ہو کہ آپ اپنے اللہ کی صفات بیان کریں تب ہی آپ نے یہ سورہ سنائی ہو۔ بلکہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، فضا میں اس سوال پر گرما گرمی کا پایا جانا اس بات کے لیے کافی تھا کہ یہ سورہ نازل ہو اور لوگوں کو سنا دی جائے۔ 'هُوَ اللّٰهُ' کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ اللہ جس کے بارے میں تم سوال و جواب اور بحث و جدال کر رہے ہو اس کی صفات جاننی چاہتے ہو تو مجھ سے سنو، وہ یہ ہیں۔ اس کے بعد وہ صفات بیان ہوئی ہیں جو شرک کے تمام رخنوں کو بند کر دینے والی ہیں۔ مخاطبوں کی گمراہی دور کرنے کے لیے اصلاً انہی صفات کا جاننا ضروری تھا۔ ان کو جان لینے کے بعد دوسری صفات کے

جاننے کے لیے راہ خود باز ہو جاتی ہے۔

'اَللّٰہُ' 'اَللّٰہُ' اسم ذات ہے۔ اس کے مفہوم پر اس کے محل میں ہم گفتگو کر چکے ہیں[1]۔ مشرکین عرب اس نام کو اسم ذات ہی کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے۔ قرآن نے تمام صفاتِ حسنیٰ کا موصوف اسی اسم کو قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ وہ اللّٰہُ اَحَدٌ ہے۔ اہل لغت نے 'وَاحِدٌ' اور 'اَحَدٌ' میں یہ فرق کیا ہے کہ 'اَحَدٌ' وہ ہے جس کی ذات میں کوئی شریک نہ ہو اور 'وَاحِدٌ' وہ ہے جس کی صفات میں کوئی اس کا شریک نہ ہو۔ غالباً اسی وجہ سے لفظ 'اَحَدٌ' اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لیے صفت کے طور پر نہیں آیا۔ اس سے یکتائی و بے ہمگی من کل الوجوہ سمجھی جاتی ہے۔ ہر رشتہ و قرابت سے پاکی و برتری اس کا لازمہ ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلی کہ وہ قدیم ہے اور باقی سب حادث و مخلوق۔ ظاہر ہے کہ جو سب سے پہلے خود بخود تھا وہ ہمیشہ سے تھا کیونکہ جو کبھی نیست رہا ہو وہ خود ہرگز ہست نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے دو باتیں ماننی ضروری ہوئیں۔ ایک یہ کہ وہ ہمیشہ سے ہے۔ دوسری یہ کہ اس کے سوا جو بھی ہیں وہ سب اس کی مخلوق ہیں۔ بے ہمگی کے یہ لازمی نتیجے ہیں جن کا انکار عقل کے خلاف ہے۔ پس یہ کہنا کہ وہ 'اَحَدٌ' ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ وہ قدیم لم یزل اور خالقِ کل ہے۔

اَللّٰہُ الصَّمَدُ (۲)

'صمد' کا مفہوم لفظ 'صَمَدٌ' اصل میں اس بڑی چٹان کے لیے آتا ہے جس کی دشمن کے حملہ کے وقت پناہ پکڑتے ہیں، یہیں سے قوم کے سردار کو جو قوم کا پشت پناہ اور سب کا مرجع ہو 'صَمَدٌ' کہنے لگے۔ زبور اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں اللہ تعالیٰ کو بکثرت چٹان اور مدد کی چٹان کہا گیا ہے۔

جس طرح 'غَنِیٌّ' کے بعد قرآن میں 'حَمِیْدٌ' کی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے بطور بدرقہ آئی ہے اسی طرح یہاں 'اَحَدٌ' کے بعد 'صَمَدٌ' کی صفت بطور بدرقہ ہے۔ 'غَنِیٌّ' اور 'حَمِیْدٌ' کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ لفظ 'غَنِیٌّ' سے خدا کی بے نیازی کا جو تصور ذہن میں آتا ہے اس سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے بالکل بے تعلق ہے۔ اس کا اثر ان پر یہ پڑتا ہے کہ وہ اس کو اپنی رسائی سے بالاتر سمجھ کر دوسروں کے سہارے پکڑتے ہیں۔ لوگوں کو اس غلط فہمی سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت 'غَنِیٌّ' کے ساتھ 'حَمِیْدٌ' کا بھی ذکر فرمایا جس سے مقصود یہ رہنمائی دینا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہونے کے ساتھ ساتھ تمام سزاوارِ حمد کاموں کا منبع بھی ہے۔ اس وجہ سے اس

---

[1] ملاحظہ ہو تدبرِ قرآن۔ جلد اوّل، صفحات ۵-۶

کے بندوں کو چاہیے کہ ہمیشہ اسی سے لو لگائیں، کبھی اس سے مایوس ہو کر دوسروں کا سہارا نہ پکڑیں۔

ٹھیک اسی طرح 'اَحَدٌ' کے بعد یہاں صفت 'صَمَدٌ' کی یاد دہانی فرمائی تاکہ لفظ 'اَحَدٌ' سے خدا کی یکتائی و بے ہمگی کا جو تصور سامنے آتا ہے اس سے مغلوب ہو کر کوئی اللہ تعالیٰ کو ایک بالکل الگ تھلگ اور خاموش علۃ العلل نہ سمجھ بیٹھے ورنہ یہ غلط فہمی بھی دوسرے سہاروں کی تلاش کا سبب بن سکتی ہے۔ اس غلط فہمی سے بچانے کے لیے 'اَللّٰہُ الصَّمَدُ' کہہ کر وضاحت فرما دی کہ بے شک اللہ ہے تو سب سے الگ، بے نیاز و بے ہمہ، اگر وہ سب کی خبر گیری اور دست گیری بھی کرتا ہے، سب کے لیے پناہ کی چٹان بھی ہے، سب کا ماویٰ و مرجع بھی ہے۔ اس کے بندے جب اس سے فریاد کرتے ہیں وہ ان کی فریاد سنتا اور ان کی فریاد رسی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی متقابل صفات میں صحیح توازن قائم نہ رکھنے سے قوموں کو جو گمراہیاں پیش آئی ہیں اور ان سے شرک کے جو دروازے کھلے ہیں ان کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے بس اتنی بات یاد رکھیے کہ مذاہب کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی اکثر گمراہیوں کی تہ میں ان کا یہی عدم توازن مضمر ہے۔ اس قبیل کی جو گمراہیاں مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ کے ہاں پائی جاتی تھیں ان کا ذکر اس کتاب میں ان کے محل میں ہوا ہے۔ ان کو نگاہ میں رکھیے تو اس کی ہلاکت انگیزیوں کی پوری تصویر ذہن کے سامنے آ جائے گی۔

لَمْ یَلِدْ ۵ وَلَمْ یُوْلَدْ (۳)

نصاریٰ کی گمراہی اور ان کا امتزاج

نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی کا جنا ہوا۔ یہ بات اگرچہ لفظ 'اَحَدٌ' کے اندر بھی، جیسا کہ ہم نے اس کی وضاحت کی ہے، موجود تھی اور وہ عاقلوں کے لیے کافی ہے لیکن جو چیزیں قوموں کے لیے مزلۂ قدم ہوتی ہیں ان کو قرآن نے مختلف اسلوبوں سے اس طرح واضح کر دیا ہے کہ کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ یہ مسئلہ بھی انہی مسائل میں سے ہے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی شادی بیاہ اور ان کے اولاد و احفاد کی جو تفصیلات ہمیں یونانیوں اور ہندوؤں کی دیو مالا (MYTHOLOGY) میں ملتی ہیں اسی سے ملتی جلتی مزعومات ہمیں ان قوموں کے اندر بھی ملتی ہیں جو قرآن کی اوّلین مخاطب تھیں۔ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانتے تھے۔ یہود نے بھی تورات کے حامل ہونے کے مدعی ہوتے ہوئے عزیرؑ کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔ نصاریٰ نے باپ، بیٹے اور روح القدس کی ایک تثلیث قائم کی اور اس کے تعصب میں اس طرح گرفتار رہے کہ ان کے پادری ایک زمانہ میں جب کسی کو اپنے دین میں داخل کرتے تو اس سے پہلے اس شخص سے وہ نعوذ باللہ اس خدا پر لعنت کرواتے جس کی صفات 'قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ' میں بیان ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سورہ پر ان کا یہ غصہ اسی وجہ سے تھا کہ اس میں توحید کا جو تصور دیا گیا ہے اس کے ہوتے نہ خدا کو

باپ فرض کرنے کی گنجائش باقی رہتی تھی نہ بیٹا اور نہ کسی کو اس کی ماں بنایا جاسکتا تھا۔

قرآن نے لَمْ یَلِدْ ۚ وَلَمْ یُوْلَدْ کے الفاظ سے خدا کی یکتائی اور بے ہمگی کی حقیقت اس طرح بے نقاب کر دی ہے کہ اس کے بعد اس باب میں کسی اشتباہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے اور دنیا کو یہ روشنی سب سے پہلے قرآن ہی کے ذریعے سے ملی ہے جس کا اعتراف اب وہ لوگ بھی کرنے لگے ہیں جو اپنے قومی و مذہبی تعصبات کے خول سے باہر نکل کر حقائق کا مواجہہ کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ جو عیسائی اس خدا کو کبھی نعوذ باللہ گالی دیتے تھے جس کا ذکر سورۂ اخلاص میں ہوا ہے، اب انہی عیسائیوں کے اندر ایسے لوگ بھی پیدا ہو رہے ہیں جو علانیہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ توحید کی حقیقت سے دنیا سب سے پہلے قرآن کے ذریعہ سے آشنا ہوئی ہے۔

وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ (۴)

خدا کا صحیح تصور

'کُفُوٌ' کے معنی ہم سر، ذات، برادری کے ہیں۔ یعنی کوئی اس کے جوڑ کا نہیں۔ سب مخلوق وہ خالق، سب محتاج وہ غنی، سب فانی اور وہ تنہا باقی۔

اس سورہ میں جو مثبت و منفی صفات اللہ تعالیٰ کی مذکور ہوئی ہیں ان سب کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ کا تصور ذہن میں آراستہ کیجیے تو بالاجمال وہ تصور یہ ہوگا کہ وہ ازلی و ابدی ہے۔ جب کچھ نہیں تو وہ تھا اور جب کچھ نہیں ہوگا تب بھی وہ ہوگا۔ وہ اپنی ذات میں کامل اور بالکل بے نیاز ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے، سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ سب کے لیے سہارا اور سب کے لیے پناہ ہے۔ ہر چیز اس کے حکم سے وجود میں آتی ہے اور اسی کے حکم سے فنا ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا بلکہ سب کا خالق اور سب کا پروردگار ہے۔ کوئی چیز اس کی ذات یا اس کے جوہر سے نہیں ہے بلکہ ہر چیز اس کی مخلوق و مربوب ہے اور کوئی اس کا ہم سر یا اس کی برابری کا نہیں ہے بلکہ سب اس کے بندے، غلام اور محکوم ہیں۔

خدائے یکتا و بے ہمتا کی نوازش سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا۔

لاہور

۲۵- جولائی ۱۹۸۰ء

۱۱- رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۱۳

الفلق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورہ کا مضمون اور سابق و لاحق سے تعلّق

سابق سورہ ـــــــ الاخلاص ـــــــ کی تمہید میں ہم نے یہ واضح کیا ہے کہ توحید کو دین کی اساس کی حیثیت حاصل ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا آغاز بھی توحید ہی سے فرمایا اور پھر اس کا اتمام بھی اسی پر کیا۔ گویا اصلاً قرآن کی آخری سورۃ الاخلاص ہوئی۔ اس کے بعد دو سورتیں، جو معوّذتین کے نام سے موسوم ہیں، اس خزانۂ توحید کے پاسبان اور محافظ کی حیثیت سے اس کے ساتھ لگا دی گئی ہیں جن میں ان تمام آفتوں سے بندوں کو اپنے رب کی پناہ مانگنے کی دعا تلقین فرمائی گئی ہے جو درباب توحید ان کے لیے مزلّۂ قدم ہو سکتی ہیں۔

توحید کے لیے اس اہتمام خاص کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ یہی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، تمام دین کی بنیاد ہے۔ اگر بندے کا قدم توحید میں استوار رہے تو وہ دین پر استوار ہے۔ اگر وقتی طور پر اس سے کوئی لغزش صادر بھی ہو گی تو اساسِ دین سے وابستہ ہونے کے سبب سے امید ہے کہ اس کو اصلاح کی توفیق ملے اور وہ راہ راست پر آ جائے۔ برعکس اس کے اگر درباب توحید اس کو کوئی گمراہی پیش آ گئی تو اندیشہ ہے کہ وہ ہر قدم پر دین سے دور ہی ہوتا جائے گا اور درجہ بدرجہ اتنا دور ہو جائے گا کہ اس کے لیے دین کی طرف بازگشت کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جائے گا۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان جس امتحان میں ڈالا گیا ہے اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مرتے دم تک شیطان کا مقابلہ کرے اور اس کو شکست دے۔ شیطان کے مقابل میں اس کی اسی مستعدی پر اس کی آخروی فوز و فلاح کا انحصار ہے۔ شیطان کا خاص داؤ جس پر اس نے انسان کو شکست دینے کی قسم کھا رکھی ہے یہی توحید ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج دے رکھا ہے کہ وہ انسان کی گھات میں توحید کی راہ پر بیٹھے گا اور اس کو اس راہ سے ہٹا کر شرک کی راہ پر ڈال دے گا۔ سورۂ اعراف میں اس کے اس چیلنج کا ذکر یوں ہوا ہے:

قَالَ فَبِمَآ أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم مِّنۢ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَن شَمَآئِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَٰكِرِينَ ۝ (الاعراف - ۷: ۱۶ - ۱۷)

شیطان نے کہا، بوجہ اس کے کہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا، میں بھی ان کی (بنی آدم کی) گھات میں تیری سیدھی راہ (توحید) پر بیٹھوں گا۔ پھر میں ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے، ان کے دہنے سے اور ان کے بائیں سے ان پر تاخت کروں گا۔ پس تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکرگزار (موحّد) نہیں پائے گا۔

شیطان کے ان ہتھکنڈوں کی تفصیل جو وہ انسان کو شرک کے جال میں پھنسانے کے لیے اختیار کرے گا خود شیطان کی زبان سے سورۂ نساء میں یوں بیان ہوئی ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝ إِن يَدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا ۝ لَّعَنَهُ اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ ۚ وَمَن يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّن دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا ۝ (النساء - ۴: ۱۱۶ - ۱۱۹)

اللہ اس جرم کو ہرگز نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے سوا جو گناہ ہیں ان کو جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا تو وہ نہایت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے بھی ہیں تو دیویوں کو، اور پکارتے بھی ہیں تو شیطان سرکش کو، اس پر اللہ کی لعنت۔ اور اس نے کہہ رکھا ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقرر حصہ ہتھیا کر رہوں گا۔ ان کو گمراہ کر ڈالوں گا، ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنسا دوں گا اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلیں گے اور جو اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو کارساز بنائے گا تو وہ نہایت کھلی نامرادی میں پڑا۔

اس سے بھی زیادہ جامعیت سے یہی مضمون سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۶۱ - ۶۵ میں بھی

آیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان آیات کی تفسیر تدبر قرآن میں پڑھ لیجیے[۱] تاکہ ان کے مضمرات اچھی طرح آپ کے سامنے آ جائیں اور واضح ہو جائے کہ شیطان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ وہ انسان کو شرک کے کسی پھندے میں پھنسائے تاکہ وہ اس گناہ کا ارتکاب کر کے خدا کی رحمت سے بالکل محروم ہو جائے جس کے لیے مغفرت نہیں ہے۔ شیطان کے دل میں بنی آدم کے خلاف جو حسد و غصہ ہے وہ اسی انتقام سے تسکین پاتا ہے۔

یہ چیز مقتضی ہوئی کہ آخر میں توحید کی جامع تعلیم کے ساتھ ساتھ شیطان کے فتنوں سے محفوظ رہنے کا وہ طریقہ بھی بتا دیا جائے جو سب سے زیادہ کامیاب طریقہ ہے اور جس کو اختیار کر کے اللہ کا ہر بندہ شیطان کے حملوں سے اپنے خزانۂ توحید کی حفاظت کر سکتا ہے۔

اسی طریقہ کو واضح کرنے کے لیے آگے کی دونوں سورتوں میں پہلی بات تو یہ بتائی گئی کہ شیطان جیسے شاطر دشمن کے حملوں سے اپنے کو محفوظ رکھنے کا واحد طریق یہ ہے کہ انسان صرف اپنے رب کی پناہ ڈھونڈھے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا اس کی شاطرانہ چالوں اور کیادیوں سے بچانے والا نہیں ہے۔ اگر انسان اس کے لیے ہر لحہ چوکنا نہیں رہے گا تو اندیشہ ہے کہ وہ شیطان سے مار کھا جائے اور پھر اس کے لیے اس کے دام سے نکلنا مشکل ہو جائے۔

دوسری چیز یہ بتائی گئی ہے کہ خدا کی وہ کیا صفات ہیں جن کے واسطہ سے بندے کو خدا کی وہ پناہ حاصل ہوتی ہے جو اس کو شیطان کے فتنوں سے بالکل مامون کر دیتی ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ ہی کے بتانے کی تھی اور یہ اس کا اپنے بندوں پر عظیم احسان ہے کہ اس نے ان سورتوں میں اپنی ان صفات سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا صحیح تعلق اس کی اعلیٰ صفات ہی کے ذریعہ سے قائم ہوتا ہے اور یہ اسی کو معلوم ہے کہ اس کے بندے اپنے کس دشمن سے مقابلہ کے لیے اپنے رب کی کس صفت کو سپر بنائیں۔ یہ چیز ہر شخص نہیں جان سکتا اور اس میں معمولی غلطی بھی انسان کی جدوجہد کو بے اثر بنا سکتی ہے۔

تیسری چیز اس میں یہ بتائی گئی ہے کہ انسان کو گمراہ کرنے کے سلسلے میں شیطان کی جدوجہد کی رسائی کہاں تک ہے اور اس کے سب سے زیادہ مؤثر حربے کیا ہیں۔ اس سے مقصود انسان کو اس کے دشمن کی طاقت کا اندازہ کرا دینا ہے تاکہ وہ اس کی قوت سے نہ مرعوب ہو اور نہ اس سے بے پروا رہے بلکہ وہ اچھی طرح آگاہ رہے کہ دشمن کن راستوں سے اس پر وار کر سکتا ہے اور

---

[۱] ملاحظہ ہو تدبر قرآن۔ جلد سوم۔ صفحات: ۶۹۳ - ۶۹۵

اس کے مقابلہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود اسے کن طاقتور اسلحہ سے مسلح کر رکھا ہے۔
ان اشارات کی روشنی میں پہلے سورۂ فلق کی تلاوت فرمائیے۔

سُوْرَةُ الْفَلَقِ

مَدَنِيَّةٌ ——— آيات : ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۵ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَ
مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝۳ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ
ع ۱ ۵ ۳۸ فِي الْعُقَدِ ۝۴ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵

ترجمۂ آیات ۱-۵ کہہ، میں پناہ مانگتا ہوں نمودار کرنے والے خدا کی، ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے اور اندھیرے کی آفت سے جب وہ چھا جائے اور گرہوں میں پھونک مارنے والوں کی آفت سے اور حسد کرنے والے کی آفت سے جب وہ حسد کرے۔ ۱-۵

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱)

'فلق' کا وسیع مفہوم

'الفلق' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے صبح کیا ہے لیکن اس کے اصل معنی پھاڑنے کے ہیں۔ صبح چونکہ شب کے پردے کو چاک کر کے نمودار ہوتی ہے اس وجہ سے اس پر بھی اس کا اطلاق ہوا لیکن پھاڑ کر نمودار ہونے والی چیز صرف صبح ہی نہیں ہے۔ ہر چیز کسی نہ کسی چیز کے اندر سے اس کو چاک کر کے ہی نمودار ہوتی ہے۔ گٹھلی سے پودا نمودار ہوتا ہے، دانے کو پھاڑ کر انکھوے نکلتے ہیں، زمین کو پھاڑ کر نباتات اگتی ہے، پہاڑوں کا سینہ چاک کر کے چشمے اور دریا ابلتے ہیں، اسی طرح انڈے کو پھاڑ کر بچے نکلتے ہیں اور رحم کے منہ کو کھول کر دوسری تمام زندہ مخلوقات وجود پذیر ہوتی ہیں۔ پھر لفظ 'فلق' کو اس قدر محدود کر دینے کے لیے کیا جواز ہے؟ ہمارے نزدیک اس کو اس کے وسیع معنی میں رکھنا ہی موقع و محل کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہے۔ لغت میں یہ لفظ وسیع معنی میں آیا بھی ہے۔ قرآن میں جس طرح 'فَالِقُ الْاِصْبَاحِ' (الانعام - ۶: ۹۶) کی ترکیب استعمال ہوئی ہے اسی طرح 'فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی' (الانعام - ۶: ۹۵) کی ترکیب بھی وارد ہوئی ہے۔ اسی طرح زمین اور آسمان سے متعلق ارشاد ہے کہ 'کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا' (الانبیاء - ۲۱: ۳۰) وہ دونوں بند ہوتے ہیں تو ہم ان کو پھاڑتے ہیں۔ یعنی آسمان کو کھول کر اس سے پانی برساتے اور زمین کو پھاڑ کر اس سے نباتات اگاتے ہیں۔

میں نے لفظ کی اس وسعت کو پیش نظر رکھ کر 'رَبِّ الْفَلَقِ' کا ترجمہ نمودار کرنے والے خداوند' کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ ترجمہ زیادہ جامع اور معنی خیز ہے۔ آگے کے مضمون سے بھی اس کو، جیسا کہ وضاحت آ رہی ہے، زیادہ مناسبت ہے۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۲)

مخلوقات کے شر سے پناہ خالق ہی دے سکتا ہے

یہ اس مقصد کا حوالہ ہے جس کے لیے تمام عالم کے نمودار کرنے والے خداوند کی دہائی کی تلقین کی گئی ہے۔ فرمایا کہ جس خداوند نے تمام عالم کو نمودار کیا ہے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے شر سے پناہ ان کے پیدا کرنے والے ہی سے مانگو، کسی دوسرے سے نہ مانگو۔ کوئی دوسرا ان کے شر سے پناہ اسی صورت میں دے سکتا ہے کہ جب وہ ان کے پیدا کرنے والے سے زیادہ طاقتور ہو اور یہ بات بالکل خلاف عقل ہے کہ کوئی چیز خالق کائنات سے زیادہ قدرت و اختیار والی ہو یا ہو سکے

اس وجہ سے خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے شر سے کسی غیر خدا کی پناہ ڈھونڈنا سراسر سفاہت ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ چیزیں جتنی بھی ہیں سب خدا ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ خالق اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔

اللہ نے چیزیں مقصدِ خیر سے پیدا کی ہیں لیکن وہ اس کے حکم سے شر بھی بن جاتی ہیں،

اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں وہ اصلاً مقصدِ خیر سے پیدا کی ہیں لیکن وہ جب چاہے ان کو شر میں بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ بارش اس دنیا کے لیے سراسر رحمت ہے لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو اس کو عذاب بھی بنا دیتا ہے۔ اسی طرح خود انسان اپنی بے خبری اور سوءِ استعمال سے ایک چیز کو جو اصلاً نافع ہے، مضر بنا لیتا ہے۔ اشیاء کے ان برے پہلوؤں سے اپنے کو محفوظ رکھنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ آدمی خدا ہی سے استعاذہ کرے۔ نہ ان اشیاء میں سے کسی چیز کو مؤثر بالذّات سمجھ کر ان کی دہائی دینی شروع کر دے جس طرح مشرک قومیں کرتی ہیں اور نہ خدا کے سوا کسی 'غوث' یا 'قطب' کو پکارنا شروع کر دے کہ وہ آ کر خدا کی اس پکڑ سے اس کو بچائیں۔ خدا کی پکڑ سے خدا کے سوا کوئی دوسرا رہائی نہیں دے سکتا۔ آفتوں سے اپنے کو بچانے کی جو جائز تدبیریں انسان اختیار کرتا ہے، مثلاً کسی بیماری میں ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے، تو یہ چیز اس کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ طبیبِ حقیقی صرف اللہ ہے، شفا صرف اسی کے اختیار میں ہے، اگر وہ شفا نہ دے تو کسی دوسری طاقت کے بس میں نہیں ہے کہ وہ کسی معمولی سے معمولی بیماری سے بھی نجات دے سکے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ یہ ایک ہی کلمہ شرک کے بہت سے دروازوں کے بند کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس سے ثنویت اور خیر و شر کی الگ الگ خدائی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ مشرک قومیں ہر آفت کو بجائے خود ایک مستقل نافع و ضار وجود سمجھ کر اس کی دہائی پکارنی شروع کر دیتی ہیں۔ حالانکہ کوئی آفت اپنا خود کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں ہی کے ظلال و آثار میں سے ہیں جو اللہ ہی کے اذن سے وجود میں آتی ہیں، اسی کے حکم سے اثر انداز ہوتی ہیں اور تنہا اسی کی مدد سے ان کے شر سے نجات ملتی ہے اس وجہ سے حقیقی پناہ اور ماویٰ و ملجا وہی ہے۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ (۳)

شر کا وجود مستقل بالذات نہیں ہے

'غاسق' رات کو کہتے ہیں جب شفق غائب ہو جانے کے بعد اس کی تاریکی بڑھ جائے۔ 'وقب' کے معنی تاریکی چھا جانے کے ہیں۔ اہلِ لغت نے 'غاسق' کے معنی چاند کے بھی لکھے ہیں۔ لیکن یہاں 'إِذَا وَقَبَ' کا قرینہ اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے مراد رات ہی ہے۔ اس لیے کہ اس کی تاریکی جب بڑھتی ہے تو اپنے دامن میں آفتیں لیے ہوئے بڑھتی ہے۔

یہ ٹکڑا بہترین مثال ہے اس بات کی کہ اس دنیا میں شر کا وجود مستقل بالذات نہیں ہے کہ خیر و شر کے خالق الگ الگ مانے جائیں اور دونوں کی دہائی دی جائے بلکہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ چیز اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں ہی کے متعلقات و حواشی میں سے ہے اس وجہ سے اس سے بچنے کے لیے کسی غیر اللہ کی نہیں بلکہ اللہ ہی کی پناہ ڈھونڈنی اور اسی کی دہائی دینی چاہیے۔

قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ اس دنیا کے بقا کے لیے جس طرح دن اور اس کی روشنی و حرارت ضروری ہے اسی طرح رات اور اس کی خنکی و سکون بخشی بھی ضروری ہے، پھر ظاہری تضاد کے باوصف دنیا کے بقا میں ان دونوں کے توافق کو توحید کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہاں اسی رات کے شر سے پناہ مانگنے کی دعا تلقین کر کے گویا یہ درس دیا گیا ہے کہ رات کی جو تاریکی تمھاری راحت کے لیے ناگزیر ہے اسی کے ظلال و آثار میں سے یہ چیز بھی ہے کہ اس میں چور، قاتل، دشمن اور حشرات و ہوام نکلتے ہیں جن سے تمھیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ شب کے سکون میں ان غیر مطلوب چیزوں کی مداخلت سے یہ نتیجہ نکالنا تو بالکل غلط ہوگا کہ رات کا خالق کوئی اور ہے اور ان کے اندر نمودار ہونے والے ان ناخواندہ مہمانوں کا خالق کوئی اور، پھر دونوں کی دہائی پکاری جائے بلکہ صحیح اور موافق عقل و فطرت بات یہی ہو سکتی ہے کہ ان دونوں کا خالق ایک ہی ہے۔ اسی نے رات کا سکون بخشا ہے اور وہی اس میں خلل انداز ہونے والی آفتوں سے پناہ دے سکتا ہے۔ یعنی جس طرح اس کی برکتیں خدا ہی کے فیض سے ہیں اسی طرح اس کی زحمتیں بھی اسی کے اذن سے ہیں۔ پس ہر حال میں مرجع اسی کو بنانا چاہیے۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی طرف ہم نے پیچھے اشارہ کیا کہ شر کے وجود کی اس نوعیت کو نہ سمجھ سکنے کے سبب ہی سے نادانوں نے شر کو بھی مستقل حیثیت دے دی اور پھر خیر و شر دونوں کے الگ الگ خالق مان کر ثنویت کی بنیاد رکھ دی۔ قرآن نے یہاں بہترین مثال دے کر واضح کر دیا کہ شر کی اصل حیثیت کیا ہے اور اس سے پناہ دینے والا کون ہے۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (۴)

مادی اور محسوس آفات سے پناہ مانگنے کے بعد یہ روحانی و اخلاقی آفتوں سے پناہ مانگنے کی تلقین کی ہے۔

روحانی آفات سے پناہ مانگنے کا طریقہ

نَفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ کے معنی گرہوں میں پھونک مارنے والوں کے ہیں۔ اگرچہ یہ مؤنث ہے لیکن اس سے عورتوں کو مراد لینا لازم نہیں ہے۔ عربیت کے قاعدہ سے آپ اس سے

ارواحِ خبیثہ اور نفوسِ خبیثہ مراد لے سکتے ہیں، عام اس سے کہ وہ مرد ہوں یا عورتیں اور قطعِ نظر اس سے کہ ان کا اشارہ یہود و مجوس کی طرف ہو یا عرب کے ساحروں اور کاہنوں کی طرف۔

گرہوں میں پھونک مارنے کا یہ طریقہ ٹونے ٹوٹکے اور گنڈے کا عمل کرنے والے اختیار کرتے ہیں۔ وہ دھاگے یا تانت پر اپنے تصور کے مطابق کچھ پڑھ کر پھونکتے اور گرہیں لگاتے جاتے ہیں۔ اور ان کے زعم کے مطابق ان کا معمول اس طرح ان کے دام میں اسیر ہو جاتا ہے اور پھر وہ اس کو جو اذیت پہنچانا چاہتے ہیں پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس صفت سے ان کا ذکر کرنے سے مقصود ان کے جھگل کی تصویر کھینچنا ہے۔ یہ اسی طرح کی تصویر ہے جس طرح سورۂ شعرآء میں کاہنوں کے مراقبہ کی تصویر 'يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ' (الشعرآء - ۲۶ : ۲۲۳) (اور وہ کان لگا کر بیٹھتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں) کے الفاظ سے کھینچی گئی ہے۔ میرے نزدیک اس سے مقصود اس چیز کی لغویت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

رہا یہ سوال کہ یہ اعمالِ سفلیہ کچھ مؤثر ہوتے ہیں یا نہیں تو اس سوال پر ہم سورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۲ کے تحت، بضمن قصۂ ہاروت و ماروت، اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں[1]۔ ہمارے نزدیک اس کا اکثر حصہ، جیسا کہ سورۂ شعرآء کی محوّلہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے محض ڈھونگ اور جھگل ہے لیکن اس کے اندر اگر کچھ حقیقت ہے بھی تو قرآن میں یہ تصریح ہے کہ یہ مؤثر بالذّات نہیں ہیں بلکہ ان سے کسی کو ضرر پہنچایا جا سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اذن ہی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سحر اور اعمالِ سفلیہ ہی سے متعلق فرمایا ہے: 'وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ' (البقرۃ - ۲ : ۱۰۲) (اور اس کے ذریعہ سے وہ کسی کو ضرر پہنچانے والے نہیں بن سکتے مگر اللہ کے اذن سے) تو جب ان سے کوئی ضرر اللہ کے اذن ہی سے پہنچ سکتا ہے تو معلوم ہوا کہ اس شر سے بچنے کے لیے بھی اللہ کے سوا کسی اور کی پناہ ڈھونڈھنے کی حاجت باقی نہیں رہی۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی حفاظت کرتا ہے جو اس کو یاد رکھتے ہیں

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ لوگ اپنے ذہن جس طرح کے بناتے ہیں ان کے ساتھ وہ اسی طرح کا معاملہ کرتا ہے۔ ایک شخص اگر اپنا تعلق اپنے رب سے استوار رکھتا ہے: لاطائل اوہام سے اپنے کو بچاتا ہے، خدا کی یاد سے اپنے دل کو آباد رکھتا ہے، اگر کوئی افتاد پیش آتی ہے تو اس میں رہنمائی اور استعانت کے لیے اپنے رب ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے[2] تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر شیطان کو غلبہ پانے نہیں دیتا۔ اگر اتفاق سے اس کو کوئی چھوت لگتی بھی ہے تو اللہ کی طرف توجہ اس کے شر سے اس کو بچا لیتی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن۔ جلد اول صفحات ۲۳۸ - ۲۴۴

اس کے برعکس اگر کوئی شخص بالکل منفعل مزاج اور وہمی ہوتا ہے، عقل و بصیرت سے کام لینے کے بجائے وساوس میں مبتلا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ پر مضبوط بھروسہ رکھنے کے بجائے اپنے دل کے دروازے شبہات و شکوک کے لیے کھول دیتا ہے تو اس طرح کا آدمی بالعموم کسی شیطان جن و انس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے پھر وہ اس کو ہر وادی میں گردش کراتے ہیں۔ اس گردش سے اپنے کو محفوظ رکھنے کا واحد طریقہ اس سورہ نے یہی بتایا ہے کہ آدمی اپنے کو ہمیشہ اپنے رب کی پناہ میں رکھے، جب کبھی دل میں کوئی دغدغہ محسوس کرے فوراً اس کی امان طلب کرے جس کا بہترین ذریعہ یہ دونوں سورتیں ـــــ معوذتین ـــــ ہیں۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (۵)

حاسدوں کے حسد سے بچنے کی دعا

یہ آخر میں حاسدوں کے حسد کے شر سے بچنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ اگرچہ لفظ 'حَاسِد' یہاں عام ہے اور اس کو عام ہی رکھنا چاہیے بھی، اس لیے کہ جس حاسد کا حسد بھی بحرانی شکل اختیار کرلے وہ قابیل کے حسد کی طرح ہابیل کا خون بہا کر ہی اترتا ہے، اس وجہ سے اس سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔ لیکن سورہ کی تمہید میں ہم واضح کرچکے ہیں کہ بنی آدم کا سب سے بڑا حاسد شیطان ہے اور اس کو خاص کد عقیدۂ توحید سے ہے۔ اس عقیدہ سے برگشتہ کرنے کے لیے اس نے اپنے جس عزم بالجزم کا اظہار کیا ہے اس کے شواہد ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ یہاں سورہ بنی اسرائیل کی آیات بھی نقل کیے دیتے ہیں تاکہ 'اِذَا حَسَدَ' کے الفاظ کا زور اچھی طرح واضح ہوجائے:

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۝ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ

شیطان نے کہا، اچھا یہی ہے وہ جسے تو نے مجھ پر فضیلت بخشی ہے! اگر تو نے مجھے قیامت کے دن تک مہلت بخشی تو میں اس کی ذریت کو چٹ کر جاؤں گا، صرف تھوڑے ہی بچیں گے۔ خدا نے فرمایا، جا، جو ان میں سے تیرے پیرو بنیں گے تو تمھارا بدلہ پورا کرنے کے لیے جہنم کافی ہے تو ان میں سے جن پر تیرا بس چلے ان کو اپنے پراپیگنڈے سے گھبرا لے، ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لے اور ان کے مال و اولاد میں حصہ بٹا لے اور ان سے پر فریب وعدے کرے اور شیطان کے سارے وعدے محض فریب ہیں

وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ (بنی اسرآئیل - ۱۷ : ۶۲ - ۶۵)

میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں اور تیرا رب اعتماد کے لیے کافی ہے۔

اس آیت سے اس زور، اس ولولہ اور ان اسباب و وسائل کا اظہار ہوتا ہے جو شیطان انسان کو توحید سے ہٹانے کے لیے بروئے کار لانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اسی چیز کی طرف 'اِذَا حَسَدَ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں یعنی جب کہ یہ حاسد اپنے حسد کے جوش میں اپنے ترکش کے سارے تیر آزمانے پر آمادہ ہو جائے۔

ایک ضعیف روایت

یہ سورہ کسی شانِ نزول کی محتاج تو نہیں ہے لیکن اس کے تحت لوگوں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر العیاذ باللہ کچھ یہودیوں نے ایک زمانہ میں جادو کر دیا تھا جس سے آپ بیمار ہو گئے تو آپ کو یہ سورہ سکھائی گئی اور آپ اس جادو کے اثرات بد سے محفوظ ہو گئے۔

اگرچہ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اس جادو کا کوئی اثر آپ کے فرائض نبوت پر نہیں پڑا لیکن ساتھ ہی نہایت سادہ لوحی سے یہ اعتراف بھی کر لیا گیا ہے کہ اس کا اثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پڑا کہ آپ گھلتے جا رہے تھے، کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ کر لیا ہے لیکن نہیں کیا ہوتا، ازواج مطہراتؓ کے متعلق خیال فرماتے کہ ان کے پاس گئے ہیں لیکن نہیں گئے ہوتے، بعض اوقات اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا کہ ایک چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا۔ ان حضرات کے بیان کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت گھنٹے دو گھنٹے یا دن دو دن نہیں بلکہ پورے چھ ماہ رہی۔ اب سوال یہ ہے کہ جب پورے چھ ماہ آپ پر العیاذ باللہ تعطلِ دماغ کی یہ کیفیت طاری رہی تو کیا یہ امکان مستبعد قرار دیا جا سکتا ہے کہ، العیاذ باللہ، آپ نے خیال فرمایا ہو کہ نماز پڑھ لی ہے لیکن نہ پڑھی ہو یا یہ کہ نازل شدہ وحی کاتبینِ وحی کو لکھوا دی ہے حالانکہ نہ لکھوائی ہو یا یہ کہ جبریل امینؑ کو دیکھا ہے حالانکہ نہ دیکھا ہو؟ ان امکانات کو کس دلیل سے آپ رد کر سکتے ہیں؟ اگر کوئی کہے کہ اس طرح کی کوئی بات روایات میں نہیں ملتی تو ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ روایات میں تمام جزئیات کہاں بیان ہو سکتی ہیں، لیکن ایک ایسے شخص سے جس کی ذہنی حالت آپ کے بیان کے مطابق وہ ہے جو مذکور ہوئی تو اس سے ان باتوں کا صادر ہونا تعجب انگیز نہیں بلکہ نہ صادر ہونا تعجب انگیز ہے۔

میرے نزدیک اس شانِ نزول کو رد کرنے کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ یہ اس مسلّمہ عقیدے کے بالکل منافی ہے جو قرآن نے انبیاء علیہم السلام سے متعلق ہمیں تعلیم کیا ہے۔ عصمت، حضرات انبیاء (علیہم السلام) کی ان خصوصیات میں سے ہے جو کسی وقت بھی ان سے منفک نہیں ہو سکتیں۔ اس عصمت کو اس امر سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کہ نبی کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے یا وہ زخمی

ہوگیا یا وہ قتل کر دیا گیا۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اس کی نبوت میں قادح نہیں ہے کہ اس کو آپ اس امر کی دلیل بنائیں کہ جب نبی ان چیزوں میں مبتلا ہو سکتا ہے تو مسحور بھی ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اس کو کردہ اور ناکردہ، دیدہ اور نادیدہ میں کوئی امتیاز ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے شیطانی تصرفات سے اپنے نبیوں کو محفوظ رکھا ہے اور ان کی یہ محفوظیت دین کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ محفوظیت ہی نبی کے ہر قول و فعل کو سند بناتی ہے۔ پورا قرآن انبیاء کی عصمت پر گواہ ہے اور ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ ان کی عصمت پر ایمان رکھے۔

شانِ نزول کے اس واقعے کو اگر روایت کے اصولوں پر جانچا جائے تو اس میں نمایاں ضعف موجود ہے۔ صحاح کی ایک روایت میں رنگ آمیزی کرنے کے لیے تیسرے درجے کی ضعیف و موضوع روایتوں کا سہارا لیا گیا ہے اور اس کو ایک امر واقعہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ روایت صحاح میں سے صرف بخاریؒ، مسلمؒ اور ابن ماجہؒ نے لی ہے اور سند کے تیسرے واسطے تک یہ خبر واحد ہی رہی ہے۔ حتیٰ کہ بخاری کی ایک روایت میں سفیان بن عیینہؒ یہ اقرار کرتے ہیں کہ میں نے اسے ابن جریج سے بالکل پہلی مرتبہ سنا۔ گویا اس واقعہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے سو سال بعد شہرت پائی، اس سے پہلے اس کا علم صرف بعض افراد تک محدود رہا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ العیاذ باللہ، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھ ماہ تک مسحور رہے ہوتے تو یہ واقعہ اتنا غیر معمولی تھا کہ صدر اول ہی میں اس کا چرچا ہو جاتا اور یہ روایت ایک متواتر روایت کی حیثیت سے ہم تک پہنچتی۔

صحاح کی کسی روایت میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اگر یہ جادو ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا اثر کتنا عرصہ رہا۔ اس کے برعکس ان تینوں کتابوں کی متفق علیہ روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حتّٰی اذا کان ذات یوم او ذات لیلۃ دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم دعا ثم دعا (یہاں تک کہ جب ایک دن یا ایک رات گزر گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پے در پے دعا کی) اس سے معلوم ہوا کہ اگر اس کا کوئی اثر آپ کی قوتِ متخیلہ پر پڑا بھی تو وہ چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں رہا۔ پھر آپ نے اللہ تعالیٰ سے بار بار دعا کی اور یہ اثر جاتا رہا۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بالکل اسی قسم کی بات ہوئی جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کی رسیوں اور لاٹھیوں کو سانپ سمجھ لیا اور وقتی طور پر گھبرا گئے۔ اس طرح کی کیفیات تھوڑی دیر کے لیے طاری ہو جانا ناممکن نہیں ہوتا۔ یہ کیفیات بطور امتحان بھی نبی کو پیش آ سکتی ہیں لیکن ہوتی یہ وقتی اور عارضی ہیں تاکہ نبی کی عصمت مجروح نہ ہو۔

یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ صحاح میں نہ اس واقعہ کو سورہ کے شان نزول کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ معوّذتین کی آیات پڑھ پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی تانت کی گرہیں کھولیں۔ یہ چیز واضح کرتی ہے کہ محدثین نے اس واقعہ کو سورۂ فلق سے متعلق نہیں مانا۔ یہ بعد والوں کی ذہانت ہے کہ وہ اس روایت کو معوّذتین کے ذیل میں لے آئے، حالانکہ، جیسا کہ سورۂ فلق کی تفسیر سے واضح ہوا اور آگے سورۂ ناس کی تفسیر سے واضح ہو گا، ان کا مفہوم اس سے ابا کرتا ہے کہ ان کے نزول کو کسی مجہول جادوگر کے کسی شیطانی عمل کا نتیجہ قرار دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی احسانہ۔

لاہور

۹۔ اگست ۱۹۸۰ء

۲۶۔ رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ

تدبّرِ قرآن

١١٤

النّاس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سے تعلق اور اس کے امتیازی پہلو

سابق سورہ ـــــ الفلق ـــــ کی تمہید میں ہم اس سورہ کے موقع و محل اور اس کے عمود کی طرف بالاجمال اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ سورہ اس کی مثنیٰ ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ جس طرح وہ تعوّذ کی سورہ ہے اسی طرح یہ بھی تعوّذ کی سورہ ہے لیکن چند پہلو اس کے خاص ہیں جن کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے تاکہ اس کا امتیازی وصف سامنے رہے۔

ایک یہ کہ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ اس کی ان صفات کے توسّل سے چاہی گئی ہے جن کا تعلق براہِ راست انسان سے ہے۔ اس وجہ سے اس کی اپیل نہایت مؤثر ہے۔ اپیل مؤثر تو سابق سورہ کی بھی ہے لیکن اس پر استدلال کا پہلو غالب ہے۔ اس میں استدلال کا پہلو اگرچہ موجود ہے لیکن زیادہ نمایاں پہلو اس میں استرحام کا ہے۔

دوسرا یہ کہ سابق سورہ میں کئی آفتوں سے پناہ مانگی گئی ہے لیکن اس میں ساری توجہ صرف شیطان پر مرکوز کر دی گئی ہے جو درحقیقت تمام آفتوں کی جڑ اور (جیسا کہ سابق سورہ میں واضح ہو چکا ہے) ازلی دشمن ہے۔

تیسرا یہ کہ سابق سورہ میں شیطان کا حوالہ صرف اس کے ایک معروف کردار ـــــ حسد ـــــ سے آیا ہے لیکن اس سورہ میں اس کی اصل تکنیک، اس کے دائرۂ نفوذ و اثر، اس کی ذات اور برادری ہر چیز سے پردہ اٹھا دیا گیا ہے تاکہ لوگ اپنے اس شاطر دشمن کو اچھی طرح پہچان لیں اور جن کمین گاہوں سے وہ حملہ آور ہو سکتا ہے ان سے ہوشیار رہیں۔ اس روشنی میں سورہ کی تلاوت کیجیے۔

سُوْرَةُ النَّاسِ

مَدَنِيَّةٌ ——————— آیات: ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۶ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ① مَلِكِ النَّاسِ ② اِلٰهِ
النَّاسِ ③ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ④ الَّذِيْ
يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ⑤ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ⑥ ع ۲۹

ترجمۂ آیات ۱-۶ کہہ، میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے رب کی، لوگوں کے بادشاہ کی، لوگوں کے معبود کی وسوسہ ڈالنے والے دبک جانے والے کی آفت سے، جو دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، جنوں میں سے اور انسانوں میں سے۔ ۱-۶

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ (۱-۳)

اللہ تعالیٰ کی تین صفتوں کے واسطہ سے تعوذ

یہ اللہ تعالیٰ کی پناہ اس کی تین صفتوں کے واسطہ سے چاہی گئی ہے اور یہ تینوں صفتیں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے ان بنیادی حقوق کو بھی معین کرتی ہیں جو بندوں پر عائد ہوتے ہیں اور پھر یہ رہنمائی بھی دیتی ہیں کہ ان صفات سے جو ذات متصف ہے وہی اہل ہے کہ بندے مشکلات میں اس کی پناہ ڈھونڈیں اور وہی اس لائق ہے کہ وہ بڑے سے بڑے دشمن کے مقابل میں بھی ان کو پناہ دے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے حقوق

حقوق کی وضاحت یوں ہوتی ہے کہ جو لوگوں کا پروردگار ہے وہی حق دار ہے کہ لوگوں کا بادشاہِ حقیقی ہو اور جو بادشاہِ حقیقی ہے وہی حق دار ہے کہ لوگوں کا معبود ہو۔ اگر پروردگار کے سوا کوئی دوسرا لوگوں کا بادشاہ بن کر اپنا قانون اور حکم چلائے تو یہ چیز بھی خلافِ عقل وفطرت اور ناجائز ہے اور رب کے سوا اگر کسی اور کو لوگ اپنا معبود بنائیں تو یہ چیز بھی خلافِ عقل و فطرت اور حرام ہے۔

سورۂ فاتحہ میں ربوبیت ہی کی دلیل پر بندوں کی تمام شکرگزاری کا حق دار اللہ تعالیٰ کو ٹھہرایا گیا ہے اور پھر اسی کو تمام عبادت اور استعانت کا مرجع بتایا گیا ہے۔ وہی بات یہاں بھی فرمائی گئی ہے۔ بس الفاظ مختلف ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو ان تین صفتوں سے متصف مان لینے کے بعد غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ شرک کے تمام رخنے بند ہو جاتے ہیں اور ان صفتوں میں ایسا لزوم ہے کہ ایک کو مان لینے کے بعد دوسری صفتوں کو ماننا لازم ہو جاتا ہے۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ (۴)

اس چیز کا بیان جس سے پناہ مانگی گئی ہے

یہ اس چیز کا بیان ہے جس کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔ فرمایا کہ کہو میں وسوسہ ڈالنے والے، دبک جانے والے کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ الفاظ میں اگرچہ تصریح نہیں ہے لیکن ان صفات اور آگے کی تصریح سے واضح ہے کہ مراد اس سے شیطان ہی ہے۔

شیطان کی تکنیک

یہ شیطان کے تکنیک کی وضاحت ہے کہ اس کا سارا اعتماد وسوسہ اندازی، پراپیگنڈے اور پر فریب وعدوں پر ہے۔ انہی چیزوں سے وہ لوگوں کو اپنے دام فریب میں پھنساتا ہے۔

پھر جب پھنسا لیتا ہے تو اپنے کو بری قرار دے کر ان بے وقوفوں کی بدانجامی کا تماشا دیکھتا ہے جو اس کے دام میں پھنس کر اپنی دنیا اور عاقبت برباد کر لیتے ہیں۔

'وسواس' (وسوسہ ڈالنے والے) اور 'خنّاس' (دبک رہنے والے) کے درمیان حرف ربط نہیں ہے اور اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں صفتیں موصوف میں بیک وقت موجود ہیں۔

شیطان کا واحد ہتھیار

اس سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ شیطان کے پاس واحد ہتھیار صرف وسوسہ اندازی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور زور و اختیار اللہ تعالیٰ نے اس کو نہیں بخشا ہے کہ لازماً وہ لوگوں کو گمراہ کر ہی ڈالے۔ پُر فریب وعدوں، ملمع کی ہوئی باتوں، ناصحانہ تنبیہات اور دھمکیوں سے وہ لوگوں کو ڈرانے کی بھی کوشش کرتا ہے اور پرچانے کی بھی لیکن اللہ کے جو بندے اس کی دھمکیوں سے مرعوب نہ ہوں تو ان کا وہ کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے جب اللہ تعالیٰ کو یہ دھمکی دی تھی کہ میں اولادِ آدم کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا تو اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں یہ واضح فرما دیا کہ 'اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ' (بنی اسرائیل - ۱۷: ۶۵) (جا تیرا جو جی چاہے کر دیکھ میرے خاص بندوں پر ـــــ جو میری بندگی پر قائم رہنا چاہیں گے ـــــ تیرا کوئی زور نہیں چلے گا) ساتھ ہی بندوں کے بارے میں یہ اطمینان بھی دلا دیا تھا کہ 'وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا' (بنی اسرائیل - ۱۷: ۶۵) (اور تیرا خداوند اعتماد کے لیے بالکل کافی ہے) یعنی اس کے جو بندے اپنے رب پر بھروسہ کر کے شیطان کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اللہ تعالیٰ ان کے اعتماد کی لاج رکھے گا اور وہ سُرخ رُو ہوں گے۔

'خنّاس' کا مفہوم

'خنّاس' کے لفظ سے اس کے کردار کا دوسرا رخ واضح کیا گیا ہے۔ عام طور پر لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ چھپ کر وسوسہ اندازی کرتا ہے، خود سامنے نہیں آتا اس وجہ سے اس کو خناس کہا گیا۔ لیکن یہ بات اگر صحیح ہو سکتی ہے تو صرف انہی شیاطین کے حد تک صحیح ہو سکتی ہے جو جنات کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہیں درآنحالیکہ اسی سورہ کی آگے والی آیت میں تصریح ہے کہ شیاطین جنوں اور انسانوں دونوں میں سے ہوتے ہیں۔ اس دور کے بعض تلم کاروں نے اس کے معنی بار بار آنے والے کے لکھے ہیں لیکن اس معنی کو عربی لغت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک اس کے معنی وہی ہیں جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیے ہیں یعنی دبک رہنے والا۔ اس سے مقصود شیطان کے کردار کے اس پہلو کو سامنے لانا ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو ورغلانے کے لیے تو نمودار ہوتا ہے لیکن جب کوئی شخص اس کے چکمہ میں آ کر گناہ کر بیٹھتا ہے تو وہ اس کے نتائج کی ذمہ داری سے اپنے کو بالکل بری قرار دے کر اس کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ چنانچہ شیطان

کی صفت قرآن میں 'خَذُوْل' بھی آئی ہے یعنی اپنے مریدوں کو دغا دینے والا۔ اس کی اس دغا بازی اور بے وفائی کا ذکر قرآن میں مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ آیا ہے۔ سابق سورہ میں ہم سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت نقل کر آئے ہیں کہ 'وَمَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا' (بنیٓ اسرآءیل - ۱۷ - ۶۴) (اور شیطان کے سارے وعدے محض فریب ہیں)۔

شیطان کا یہ کردار سورۂ حشر میں نہایت واضح لفظوں میں یوں بیان ہوا ہے:

كَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ	ان کی مثال شیطان کی ہے۔ جب کہ وہ
اكْفُرْ ج فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ	انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر تو جب وہ کفر
مِّنْكَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ	کر بیٹھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری
الْعٰلَمِیْنَ (الحشر - ۵۹ : ۱۶)	ہوں، میں عالم کے خداوند اللہ سے ڈرتا ہوں۔

اسی شیطانی کردار کا مظاہرہ یہود نے جنگِ بدر کے موقع پر قریش کے ساتھ کیا کہ ان کو پھڑکی دے کر مدینہ پر چڑھا لائے کہ وہ مسلمانوں کو ختم کر دیں، مسلمان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اگر ضرورت ہوئی تو وہ بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ لیکن جب معرکہ کارزار گرم ہوا اور انھوں نے میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھا تو چھپ کر گھروں میں بیٹھ رہے۔ قرآن نے ان کے اس کردار کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

وَاِذْ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ	اور جب کہ شیطان (یہود) نے ان کے
اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ	(قریش کے) اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا
لَكُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ	دیے اور کہا کہ اب آپ لوگوں پر غالب ہونے
اِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ ج فَلَمَّا تَرَآءَتِ	کا یارا کسی میں نہیں ہے اور میں آپ لوگوں کا
الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَ	پڑوسی ہوں تو جب دونوں گروہ آمنے سامنے
قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی	ہوئے تو وہ دم دبا کر بھاگا اور بولا کہ میں تم
مَا لَا تَرَوْنَ [2]	سے بری ہوں میں وہ مشاہدہ کر رہا ہوں جو
(الانفال - ۸ : ۴۸)	تم نہیں کر رہے ہو۔

شیطان اور اس کے پیروؤں کا یہی کردار اس دنیا میں بھی ہے اور اسی کا مظاہرہ وہ آخرت میں بھی کریں گے۔ قرآن میں جگہ جگہ گمراہ لیڈروں اور ان کے پیروؤں کی اس تو تکار کی تصویر کھینچی گئی

---

[1] وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (الفرقان - ۲۵ : ۲۹) (اور شیطان انسان کے ساتھ بڑا ہی بے وفائی کرنے والا ہے)۔

[2] اس آیت کی تفسیر کے لیے ملاحظہ ہو تدبر قرآن۔ جلد سوم، صفحات ۸۰ - ۸۳

ہے جو ان کے درمیان جہنم میں برپا ہوگی۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم نے آپ لوگوں کی پیروی کی اور اس کے نتیجہ میں یہاں پہنچے تو کیا آپ لوگ اس عذاب میں سے کچھ حصہ بٹائیں گے جو ہمارے حصہ میں آیا؟ لیڈر جھٹ جواب دیں گے کہ تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی، ہم کو تمھارے اوپر کوئی زور تو حاصل نہیں تھا، تم جو کچھ بنے خود بنے تو اپنے کیے کی سزا خود بھگتو۔

لفظ 'خَنَّاسٌ' یہاں اس کے اسی کردار کی تصویر پیش کر رہا ہے تاکہ لوگ اس کے صرف اس چاؤ اور پیار ہی کو نہ دیکھیں جو وہ اس وقت ظاہر کرتا ہے جب وہ ان کے پاس فریب دینے کے لیے آتا ہے بلکہ اس کی اس غداری اور بے وفائی کو بھی پیش نظر رکھیں جس کا مظاہرہ وہ اس وقت کرتا ہے جب آدمی اس کے دامِ فریب میں پھنس جاتا ہے اور متوقع ہوتا ہے کہ وہ اپنے کیے ہوئے وعدے پورے کرے گا۔

اَلَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ (۵-۶)

شیطان کی ذات برادری — شیطان کے مشن کے ساتھ ساتھ یہ اس کی ذات برادری کی بھی نشان دہی کر دی گئی ہے تاکہ لوگ اس کو اچھی طرح پہچان لیں۔ فرمایا کہ اس کا اصل کام لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی ہے۔ 'صُدُوْرِ النَّاسِ' ظرف ہے لیکن مراد اس سے مظروف ہے یعنی دلوں میں وسوسہ اندازی۔ 'وسوسہ اندازی' کا مفہوم ظاہر ہے کہ لوگوں کو خدا کی صراطِ مستقیم سے برگشتہ کرنے کے لیے وسوسہ اندازی ہے۔ اس کا اظہار شیطان نے خود کر دیا ہے اور ہم ضروری حوالے اوپر نقل کر آئے ہیں۔ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی ہے، اپنے بندوں پر کوئی اختیار اور تصرف نہیں بخشا ہے۔ وہ صرف وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ لوگوں کو بجبر و زور گمراہ کرنے کا اختیار وہ نہیں رکھتا۔

'مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ'، یہ اس کی ذات برادری کی نشاندہی ہے کہ شیطان کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے بلکہ جنوں اور انسانوں میں سے جو دلوں میں وسوسہ اندازی کا پیشہ اختیار کر لیں وہ شیطان بن جاتے ہیں۔ جس شیطان نے بابا آدمؑ کو دھوکا دیا، قرآن میں تصریح ہے کہ 'وہ جنوں میں سے تھا'۔ جو لوگ اس کو ایک مستقل مخلوق اور زندہ جاوید ہستی سمجھتے ہیں ان کا خیال غلط ہے۔ البتہ اس نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے جس مشن کا اعلان کیا تھا وہ مشن اس کے ان مریدوں کے ذریعہ سے قیامت تک قائم رہے گا جو انسانوں اور جنوں میں سے اپنی خدمات اس کے لیے پیش کریں گے۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ تدبرِ قرآن کی بھی آخری سطریں آج سپردِ قرطاس ہوئیں۔ میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں اپنے اس رب کا شکر ادا کروں

جس نے مجھ جیسے حقیر اور بے مایہ کو اس خدمت کی توفیق بخشی۔ بس یہ دعا ہے کہ رب کریم اس ناچیز خدمت کو اپنے اس غلام کی نجات کا ذریعہ بنائے، جو باتیں قلم سے صحیح نکلی ہیں ان سے خلق کو فائدہ پہنچے اور اگر کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے تو اس کے وبال سے اپنے اس غلام کو بھی محفوظ رکھے اور کتاب کے قارئین کو بھی۔ اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین۔

لاہور

۲۹۔ رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ

۱۲؍ اگست ۱۹۸۰ء

فہرست مضامین

تفسیر سُورۃ القیٰمۃ - ۷۵

تفسیر سُورۃ الدّھر - ۷۶

تفسیر سُورۃ المُرسلٰت - ۷۷

تفسیر سورۃ النبا - ۷۸

تفسیر سورۃ النزعت - ۷۹

تفسیر سورۃ عبس - ۸۰

تفسیر سورۃ الطّارق - ۸۶

تفسیر سورۃ الاعلیٰ - ۸۷

تفسیر سورۃ الغاشیۃ - ۸۸

تفسیر سورۃ الفجر - ۸۹

تفسیر سورۃ البلد - ۹۰

تفسیر سورۃ الشمس - ۹۱

تفسیر سورۃ الیل - ۹۲

تفسیر سورۃ الضحیٰ - ۹۳

تفسیر سورۃ الم نشرح - ۹۴

تفسیر سورۃ التین - ۹۵

تفسیر سورۃ العلق - ۹۶

تفسیر سورۃ القارعۃ - ۱۰۱

تفسیر سورۃ التکاثر - ۱۰۲

تفسیر سورۃ العصر - ۱۰۳

تفسیر سورۃ الھمزۃ - ۱۰۴

تفسیر سورۃ الفیل - ۱۰۵

تفسیر سُورۃ القریش - ۱۰۶

تفسیر سُورۃ الماعون - ۱۰۷

تفسیر سُورۃ الکوثر - ۱۰۸

تفسیر سُورۃ الکفرون - ۱۰۹

تَفْسِیرُ سُورَةِ النَّصر - ۱۱۰

تَفْسِیرُ سُورَةِ اللّھب - ۱۱۱

تَفْسِیرُ سُورَةِ الْاِخلاص - ۱۱۲

تَفْسِیرُ سُورَةِ الْفلق - ۱۱۳

تفسیر سورۃ النّاس - ۱۱۴

خطاطی ـــــ عبد الغفور کیلانی